حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظِ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۂ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۷۷۷۷۶۲۰، ۷۷۷۰۰۹۴

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ المسمّٰی بہ

تقلیل الطعام
بصورۃ الصیام

حکیم الاُمّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنّان غُفِرلہٗ

مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقلیل الطعام بصورۃ الصیام

این	کہاں ہوا	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
متی	کب ہوا	۷ رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ بعد نماز جمعہ (شروع ۲ بجے)
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹے (ختم ۴ بجے ہوا)
کیف	کس طرح ہوا	کھڑے ہو کر
لِمَ	کیوں ہوا	رمضان المبارک میں اکثر مخلصین کا تقاضا ہوتا ہے کہ حضرت طالبین کو فیوض سے سیراب فرمائیں۔
ماذا	کیا مضمون تھا	روزہ کا افضل المجاہدات ہونا۔ مجاہدہ کی حقیقت اور تقسیم اور یہ کہ روزہ میں مجاہدہ بصورۃ تقلیل طعام ہے۔
لمن النفع	کس طبقہ کو زیادہ مفید	سب کو عموماً اور سالکین کو خصوصاً۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی کان اللہ لہ وعفا عنہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	تقریباً ۱۵۰
الاشتات	متفرقات	الحمد للہ کہ آج یکم محرم ۱۳۴۳ھ سے ان مواعظ کی تسوید تفصیلی کا کام شروع ہو گیا حق تعالیٰ اتمام کی توفیق عطا فرماویں اور یہ کام مکرمی جناب حاجی محمد یوسف صاحب ۴۹ پارک لین رنگون کی ہمت سے شروع ہوا۔ انھوں نے حضرت حکیم الامۃ دام ظلہم کے جملہ مواعظ کی تسوید کا کام اپنے ذمہ لیا ہے حق تعالیٰ شانہ ان کے ارادہ کو پورا فرمائے اور ان کی دین و دنیا میں ترقی و کامیابی عطا فرمائے اور حضرت حکیم الامۃ دام ظلہم کے فیوض و برکات کو تا دیر ہمارے سروں پر سایہ افگن رکھے کہ واقعی ان بیش بہا جواہرات کی اشاعت سے امت کی اصلاح بہت کچھ متوقع ہے ۱۲ جامع

(دعاء[1]) الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد

[1] حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم کا معمول ہے کہ وعظ شروع کرنے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمایا کرتے ہیں اس کے بعد خطبہ ماثورہ پڑھ کر وعظ شروع فرماتے ہیں ۱۲ قلت ذکر العلامۃ الشعرانی فی البحر المورود اخذ علینا العھد اذا خطبنا او وعظنا ان نقول فی انفسنا قبل الاخذ فی الکلام بحضور القلب دستور یا اللہ مرات دستور یا رسول اللہ مرات و دستور یا اصحاب الوقت فان ذلک یزید قوۃ فی الکلام ومددا اھ قلت قد جربت ذلک مرارا ولا یجوز ذلک لکل احد ۱۲ جامع

ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔

ہر چند کہ اس رمضان میں بیان کا ارادہ نہ تھا دو وجہ سے ایک اس وجہ سے کہ آج کل لوگوں کی طبائع میں تاثر کا مادہ نہیں رہا ایک ہوا پھیل رہی ہے جس کی وجہ سے عام طبائع ادھر مشغول ہیں۔ لوگوں کو بیان بھی وہی پسند ہوتا ہے جو اس ہوا کے موافق ہو مسائل شرعیہ کا بیان اور خالص احکام کا بیان آج کل لوگوں کو پسند نہیں رہا' یہ تو ان کا حال ہے جو اس ہوا سے متاثر ہو چکے ہیں۔ اور جو اس سے پوری طرح متاثر نہیں ہوئے ان میں بھی ایک خاص عارض سے تاثر کا مادہ کم ہو گیا کیونکہ اس ہوا کا اثر ایسا پھیلا ہوا ہے کہ قلوب عام طور پر مشوش ہیں، جو لوگ گوشہ نشین اور عزلت گزین ہیں جن کو بجز ذکر و شغل اور اللہ اللہ کرنے کے کچھ کام نہیں ان کو بھی یہ شکایت ہے کہ ذکر میں دل نہیں لگتا انوار نہیں معلوم ہوتے وجہ یہ ہے کہ قلوب میں تشویش عام ہے طمانیتِ قلب مفقود ہو گئی اس ہوا کی ظلمت کچھ ایسی ہے کہ جن کے قلوب مطمئن ہیں ان کی بھی وہ حالت نہیں ہے جو اس سے پہلے تھی کیونکہ اس ہوا کا منشا دین نہیں اگر اس کا منشا دین ہوتا تو اس میں ایک نور ہوتا ظلمت نہ ہوتی اگر کسی دینی کام کی وجہ سے تشویش لاحق ہوتی ہے تو تجربہ ہے کہ اس سے نور قلب

---

[1] اس ہوا سے تحریک ہندو مسلم اتحاد و حصول سوراج مراد ہے جو اس وقت قدرے عروج پر تھی ۱۲ جامع

میں کمی نہیں آتی بلکہ نور بڑھتا ہے ہاں جس تشویش عام کا منشار دنیا ہو اس سے بے شک ظلمت بڑھتی ہے جس کا اثر کم و بیش سب پر ہوتا ہے ان پر بھی جو اس تشویش میں مبتلا ہوں اور ان پر بھی جو اس سے الگ ہوں کیونکہ عموم بلوہ کی وجہ سے قریب قریب سب ہی مشوش ہوتے ہیں کوئی کم کوئی زیادہ تو ظلمت کا اثر بھی سب کے قلوب پر ہوتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس ہوا کے حق نہ ہونے کی یہ بھی ایک کافی دلیل ہے کہ اس سے قلوب میں ظلمت بڑھ رہی ہے احکام الٰہیہ سے متاثر ہونے کا مادہ کم ہوگیا ہے ایک تو یہ وجہ تھی بیان کا ارادہ نہ ہونے کی کیونکہ جب سامع کے اندر تاثر ہی نہ ہو یا کم ہو تو بیان کرنے والے کی طبیعت کیونکر بڑھے ؎

فہم سخن تا نکند مستمع　　　قوت طبع از متکلم مجو

(جب تک سننے والا کلام کا سمجھنے والا نہیں ہوتا۔ بولنے والے کی قوت گویائی کو تلاش مت کرو)

دوسری وجہ یہ تھی کہ کوئی مضمون ذہن میں نہ تھا اور جو مضامین تھے وہ مکرر تھے اس لئے اس رمضان میں بیان کا ارادہ ملتوی کردیا تھا لیکن بعض خیر خواہوں کی رائے ہوئی کہ کچھ بیان ضرور ہونا چاہیئے۔ اور ان دونوں شبہوں کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ اس وقت بعض لوگوں میں تو اس ہوا کا اثر ہی نہیں رہا۔ اب بہت کچھ سکون ہو چلا ہے اور جن میں وہ اثر ہے بھی تو ضعیف ہے جس میں بیان سے تغیر ممکن ہے۔ اس لئے امید ہے کہ سامعین پر بیان کا اثر ضرور ہوگا، سب پر نہ ہو تو بعض پر تو ضرور ہی ہوگا اس لئے مایوسی کیوں ہو۔

رہا مضامین کا مکرر ہونا تو مکرر میں حرج ہی کیا ہے، آخر کھانا بھی تو روزانہ مکرر ہوتا ہے جب تکرار کی وجہ سے غذائے جسمانی ترک نہیں کی جاتی تو غذائے روحانی کیوں ترک کی جائے۔ دوسرے مضامین مکرر میں بھی اکثر طرز بیان جدا ہوتا ہے جس سے نفع جدید ہوتا ہے۔ الغرض مخلصین کی اس تقریر سے بیان کا کچھ کچھ ارادہ ہوا کیونکہ ان کی درخواست سے طلب مترشح ہوتی تھی تو میں نے خیال کیا کہ اگر ایک جماعت متاثر بھی نہ ہوگی تو کم از کم یہ مخلصین تو بیان سے متاثر ہوں گے۔ پھر دوسروں کی وجہ سے طالبین کا کیوں نقصان کیا جائے اور ان کو مسائل شرعیہ سے کیوں محروم رکھا جاوے اور کیا عجب ہے کہ ان کی طلب کی برکت سے دوسروں پر بھی اثر ہو جائے۔ اس کے بعد پھر مضمون بھی ذہن میں آ گیا تو تردد جزم سے بدل گیا اور بیان کا قصد کر ہی لیا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ امید ہے کہ حسب معمول رمضان رمضان ہر جمعہ کو بیان ہوتا رہے گا۔

اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں بظاہر رمضان کے متعلقات صیام و قیام وغیرہ کا ذکر نہ ہونے سے شاید سامعین کو تشویش ہوئی ہو کہ اس وقت کا بیان مناسب وقت نہ ہوگا حالانکہ وہ اس انتظار میں بھی تھے کہ رمضان کے احکام بیان کئے جائیں گے تو وہ مطمئن رہیں کہ بیان احکام رمضان ہی کا ہوگا اور اس وقت روزہ ہی کا بیان ہوگا لیکن اس آیت میں بالذات روزہ کا بیان نہیں بلکہ اس میں اس زمانہ کی عبادات کی روح مذکور ہے تو جب عبادات رمضان کی روح بیان کی جائے گی تو صورت بھی اس کی ساتھ ساتھ تبعاً

بیان ہو جائے گی اور اگر صورت کا بیان نہ بھی ہوا تب بھی حرج نہیں کیونکہ مقصود تو روح ہوا کرتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صورت بے کار ہے اس کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ روح کا اہتمام صورت سے زیادہ ہوا کرتا ہے ورنہ مقصود دونوں ہیں۔ بیکار کوئی نہیں کیونکہ سب جانتے ہیں کہ گو انسان میں اصل چیز روح ہے مگر باایں ہمہ جسم کو بیکار کوئی نہیں سمجھتا ورنہ چاہیئے کہ اپنے بدن کی صحت وعافیت کا مطلق خیال نہ کیا جائے۔ بیماری میں دوادارو بھی نہ کی جائے کیونکہ بیماری سے جسم ہی ہلاک ہوگا روح تو ہلاک نہ ہوگی وہ تو جسم کے بغیر بھی باقی رہے گی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کوئی اس قاعدے سے کام نہیں لیتا کہ اصل مقصود روح ہے صورت کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ یہاں روح اور جسم دونوں کو مقصود سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سمجھو کہ احکام شرعیہ میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں عمل کی یہ روح ہے وہاں بھی صورت اور روح دونوں مقصود ہیں بیکار کوئی نہیں بلکہ اس روح کا حصول خاص اس صورت پر موقوف ہوتا ہے کہ بدون اس عمل کے روح مقصود حاصل ہو ہی نہیں سکتی اس لئے مقصود دونوں ہوں گے گو یہ ضرور ہے کہ روح کا اہتمام صورت سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صورت محض بیکار ہے جیسا کہ بعض ملاحدہ اور جہال صوفیہ کا خیال ہے۔

اب سنئے کہ وہ روح کیا ہے جس کا اس آیت میں بیان ہے سو مقصود بالذات اس آیت میں مجاہدہ کا بیان ہے اور یہی روح ہے عبادات رمضان کی بلکہ تمام عبادات کی بلکہ تمام شریعت کی کیونکہ سارے دین کا خلاصہ مجاہدہ ہی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ مجاہدہ کہتے ہیں لغت میں مشقت کو اور اصطلاح

میں مجاہدہ کا نام ہے مخالفت نفس، اس کا حاصل بھی مشقت ہی ہے کیونکہ مخالفت نفس میں تعب ضرور ہوتا ہے۔ اور دین کا خلاصہ بھی مشقت ہی ہے کیونکہ اس میں ایک گونہ نفس کے اوپر پابندی لازم ہوتی ہے اور نفس پر پابندی گراں ہے وہ تو طبعی طور پر آزادی کا طالب ہے اسی لئے نفس پر اعمال دینیہ شاق ہوتے ہیں اور اسی لئے دین کا نام تکلیف ہے اور احکام شرعیہ کو احکام تکلیفیہ کہا جاتا ہے اور عبد کو مکلف کہتے ہیں گو تکلیف باعث راحت ہے مگر سب کو نہیں بلکہ خواص کو راحت کا سبب ہے ورنہ عوام کو تو دین پر چلنے سے تکلیف ہی ہوتی ہے جس کی یہ وجہ نہیں کہ احکام شرعیہ واقع میں دشوار ہیں یا طاقت سے باہر ہیں اگر ایسا ہوتا تو خواص کے لئے باعث راحت کیونکر ہو جاتے جو کام فی نفسہٖ دشوار ہوتا ہے وہ تو سب ہی کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خواص کیلئے دین پر چلنا ذرا بھی دشوار نہیں معلوم ہوا کہ دین فی نفسہٖ تو دشوار نہیں بلکہ ایک عارض کی وجہ سے دشوار ہے وہ عارض یہ ہے کہ عوام کے نفوس پابندی کے عادی نہیں بلکہ آزادی کے عادی ہیں تو بس دین کی دشواری اور تکلیف کا اصل یہ ہے کہ اس میں آزادی نہیں بلکہ تقیید ہے اور ظاہر ہے کہ محض اتنی بات سے کسی قانون کو سخت اور دشوار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ پابندی تو ہر قانون میں ہوتی ہے اگر محض پابندی کا نام دشواری ہے تو ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ میں قانون سلطنت کو اس لئے نہیں مانتا کہ وہ دشوار ہے اور دشواری یہ ہے کہ اس میں مجھے پابند کیا جاتا ہے اور میرے جذبات کو دبایا جاتا ہے تو کیا کوئی عاقل اس کی اس بات کو تسلیم کر کے اسے معذور اور قانون کو دشوار مان لے گا

ہرگز نہیں تو پھر ہم محض تقلید کی وجہ سے دین کو دشوار کیسے مان لیں ہاں یہ ضرور ہے کہ جن لوگوں کی طبائع آزاد ہیں ان کو دین کی پابندی گراں ہوتی ہے مگر یہ گرانی دین میں نہیں ہے بلکہ یہ خود آپ کے اندر ہے جیسے بچہ کو روٹی کھانا اور دودھ کا چھوڑنا گراں ہوتا ہے اور وہ دودھ چھوڑتے ہوئے کیسا روتا اور مچلتا ہے تو کیا اس سے روٹی کا کھانا دشوار ہو جائے گا ہرگز نہیں ورنہ پھر آج سے بچوں پر یہ ظلم کرنا چھوڑ دیجئے اور ان کو ساری عمر ماں ہی کا دودھ پینے دیجئے مگر ایسا کوئی نہیں کرتا بلکہ یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ روٹی کھانا تو بہت سہل ہے مگر بچہ کو اس لئے گراں ہے کہ وہ دودھ کا عادی ہو رہا ہے جہاں وہ عادت چھوٹی پھر اس سے پوچھے گا کہ روٹی کھانے میں کیسا دشواری ہے اب تو اس کی یہ حالت ہوگی کہ رات دن روٹی روٹی پکارے گا اور اس کے بغیر چین نہ آئے گا اور ماں کے دودھ سے ایسی نفرت ہو جائے گی کہ خوشامد بھی کرو گے تو پاس نہ جائے گا میں کہتا ہوں کہ یہی حال دین کی دشواری کا ہے کہ جب تک آپ آزادی کے عادی ہیں اسی وقت تک یہ گراں ہے اور جس دن آپ پابندی کے عادی ہو گئے اس دن آپ خود کہنے دیں گے کہ دین پر چلنا تو بہت ہی آسان ہے اور جب آپ کو احکام شرعیہ میں لذت آنے لگے گی اس وقت تو آپ پابندی کے ایسے عاشق ہوں گے کہ آزادی کے نام سے نفرت ہو جائے گی جیسے بچہ کے منہ کو روٹی کا مزہ لگنے کے بعد ماں کے دودھ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ بہرحال گو دین میں چلنا باعث راحت ہے اور یہ تقلید ہزاروں لذتوں کا سبب ہے مگر یہ خواص کے لئے ہے عوام کے لئے تو تکلیف ہی ہے اسی لئے عاقل بالغ کو مکلف اور دین کو تکلیف کہا جاتا ہے۔ اور یہی حاصل ہے مجاہدہ کا تو سارے دین کا خلاصہ مجاہدہ ہوا۔ اور عبادات رمضان بھی

احکام دین میں سے ہیں تو ان کا خلاصہ اور روح بھی مجاہدہ ہوا شاید آپ یہ کہیں کہ اس تقریر سے آیت کا خاص تعلق عبادات رمضان سے ظاہر نہ ہوا بلکہ عام تعلق ظاہر ہوا جو تمام احکام سے برابر ہے تو سنئے کہ اس آیت کو عبادات رمضان سے دو تعلق ہیں ایک تو عام تعلق ہے جو اس وجہ سے ہے کہ یہ عبادات بھی احکام دین میں سے ہیں اور سارے دین کا خلاصہ مجاہدہ ہے۔ دوسرا خاص تعلق ہے وہ یہ کہ ان عبادات میں بہ نسبت دوسرے احکام کے مشقت زیادہ ہے تو مجاہدہ کو ان سے زیادہ خصوصیت ہے۔ نیز دوسرے احکام میں تو مجاہدہ کے اقسام میں سے ایک یا دو قسم ہی موجود ہوتی ہیں اور عبادات رمضان میں سب اقسام مجتمع کردی گئی ہیں گویا رمضان میں مجاہدہ کی تکمیل کردی گئی ہے اس وجہ سے آیت کو عبادات رمضان سے خاص تعلق ہے اور اس کی تفصیل عنقریب معلوم ہوجائے گی کہ مجاہدہ کے اقسام کیا کیا ہیں اور ان سب کو رمضان میں کیونکر جمع کیا گیا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مجاہدہ میں دو قسم کے کام ہوتے ہیں بعض تروک ہیں جو چھوڑنے کے قابل ہیں اور بعض اعمال ہیں جو کرنے کے قابل ہیں۔ معاصی تو سب کے سب تروک ہیں۔ مثلاً زبان کا گناہ، نگاہ کا گناہ، معدہ کا گناہ، دل کا گناہ یہ تو چھوڑے جاتے ہیں اور طاعات اعمال ہیں جن کو کرنا پڑتا ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ حقوق معاشرت حقوق زوجیت وغیرہ اور چونکہ یہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ مجاہدہ سارے دین کا خلاصہ ہے تو متعلق دین کے بھی یہی دو چیز ہوتے ایک طاعات جن کو کرنا پڑتا ہے دوسرے معاصی جن کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ پھر طاعات کی دو قسمیں ہیں ایک واجبہ دوسری مستحبہ یہ دونوں کرنے کے قابل ہیں اور دونوں کا

بجا لانا مجاہدہ میں داخل ہے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستحب کے کرنے میں بہ نسبت واجب کے زیادہ مجاہدہ ہے۔ کیونکہ قاعدہ طبعیہ ہے کہ جس کام کو انسان اپنے اوپر لازم سمجھ لیتا ہے کہ اس کو ضرور ہی کرنا ہے اس کے کرنے میں زیادہ مشقت نہیں ہوتی اور جس کام کو اپنے اوپر لازم نہ سمجھے بلکہ اپنے کو اس میں مخیر سمجھے اس کا کرنا گراں ہوتا ہے خصوصًا اس میں پابندی تو بہت ہی گراں ہوتی ہے۔ اس لئے مجھ سے بعض سالکین نے بیان کیا اور میں خود بھی اپنا حال دیکھتا ہوں کہ فرائض کا ادا کرنا اتنا گراں نہیں ہوتا جتنا رات کا اُٹھنا گراں ہوتا ہے کیونکہ رات کو جاگنا اور تہجد پڑھنا ہمارے ذمہ لازم نہیں صرف سنّت یا مستحب ہے اس لئے مستحبات کا بجا لانا بھی مجاہدہ میں داخل ہے۔ اور اسی لئے صوفیہ نے لکھا ہے کہ سالک کو علاوہ فرائض وواجبات کے کچھ سُنن ومستحبات کا بھی التزام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مجاہدہ بدون اس کے کامل نہیں ہوتا۔ ہمارے حاجی صاحب نے بھی اس کی وصیت فرمائی ہے۔ تو اب محل دین کے تین اجزاء ہوئے۔

(۱) معاصی۔ (۲) طاعات واجبہ (۳) طاعات مستحبہ۔ شاید یہاں کسی کو یہ اشکال پیدا ہو کہ جس طرح اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک واجب دوسری مستحب اسی طرح محل تروک کی بھی دو قسمیں ہونی چاہئیں۔ ایک وہ جن کا ترک واجب ہے۔ دوسری وہ جن کا ترک مستحب ہے۔ جس کا ترک واجب ہے وہ تو حرام اور مکروہ تحریمی ہے۔ اور جس کا ترک مستحب ہے وہ مکروہ تنزیہی ہے تو اس طرح اجزاء دین چار ہوگئے تین نہ ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب محل تروک کی تفسیر معاصی سے کر دی گئی تو اب اس کی دو قسمیں نہیں ہوسکتیں کہ ایک معاصی تو وہ ہوں جن کا ترک واجب ہے۔ اور ایک معاصی

وہ ہوں جن کا ترک مستحب ہے کیونکہ جس کا ترک مستحب ہو وہ معصیت ہی نہیں معصیت وہی ہے جس کا ترک واجب ہو بخلاف اعمال کے جس کی تفسیر طاعات سے کی گئی ہے کہ اس میں دو قسمیں موجود ہیں بعض وہ طاعات ہیں جن کا فعل واجب ہے اور بعض وہ ہیں جن کا فعل مستحب ہے رہا یہ اشکال کہ ناجائز کی بھی تو دو قسمیں ہیں ایک حرام ہے ایک مکروہ اس کا جواب یہ ہے کہ ناجائز بالمعنی الاعم کی تو دو قسمیں ہو سکتی ہیں مگر معصیت کی کہ وہ مفہوم میں ناجائز سے اخص ہے دو قسمیں نہیں ہو سکتیں جن کو معصیت کہا جائے گا۔ اس کی دو قسمیں نہیں ہوں گی بلکہ اس کا ترک واجب ہی ہوگا تو اس صورت میں بہت سے مکروہ تنزیہی معاصی میں داخل نہ ہوگا یہ تو مشہور کی بناء پر ہے اور اگر اس کو بھی معصیت مانا جائے تو اس کا ترک بھی ضروری ہوگا گو ضرورت میں تفاوت ہو اور یہی صحیح ہے کیونکہ مکروہ تنزیہی بھی ضروری الترک ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ اس پر بھی مواخذہ فرما سکتے ہیں اور جس چیز میں مواخذہ کا اندیشہ ہو وہ معمولی بات نہیں۔ پس خدا تعالیٰ کی نافرمانی گو قلیل ہی ہو اس کا ترک ضروری ہونا چاہیئے۔ دوسرے فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ صغائر گو اخف الصغائر ہی ہو اصرار سے کبائر ہو جاتے ہیں تو اس درجہ میں مکروہ تنزیہی فقہاء کے نزدیک بھی ضروری الترک ہے۔ تیسرے یہ کہ مکروہ تنزیہی کا ارتکاب بسا اوقات مکروہ تحریمی کے ارتکاب کی طرف مفضی ہو جاتا ہے کیونکہ جو شخص مکروہ تنزیہی کے ارتکاب پر اقدام کرے گا وہ اس کو معمولی بات سمجھے گا اور جب نفس میں یہ بات پیدا ہو گئی کہ وہ ادنیٰ معصیت کو معمولی بات سمجھنے لگے تو اس میں خوف کا مادہ کم ہو جاتا ہے جس سے نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کو مکروہ تحریمی

کے ارتکاب پر بھی جرأت ہو جاتی ہے اور قاعدہ ہے کہ مقدمۃ الحرام حرام۔ حرام کا مقدمہ بھی حرام ہوتا ہے۔ اس لئے مکروہ تنزیہی گو فی نفسہ حرام نہ ہو مگر اس مقدمہ پر نظر کر کے اس کا ترک بھی ضروری ہے اسی لئے حدیث میں ہے۔

لا یبلغ المؤمن درجۃ المتقین حتی یترك ما لا باس بہ حذرا مما بہ باس (او کما قال) یعنی تقویٰ کامل یہ ہے کہ جس چیز میں اندیشہ بھی نہ ہو اس کو اس چیز سے بچنے کے لئے چھوڑ دے جس میں اندیشہ ہے اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو یہ پوچھا کرتے ہیں کہ یہ کام گناہ صغیرہ ہے یا گناہ کبیرہ مجھ سے جب کوئی یہ پوچھتا ہے تو میں تعیین قسم سے جواب نہیں دیتا بلکہ اس سے سوال کرتا ہوں کہ اگر یہ گناہ صغیرہ ہوا تو کیا تمہارا ارادہ اس کے ارتکاب کا ہے اگر اس نے کہا نہیں تو میں کہتا ہوں کہ پھر تمہارا اس سوال سے مقصود کیا ہے۔ اور اگر کہتا ہے کہ جی ہاں گناہ صغیرا ہوا تو میں ارتکاب کا قصد رکھتا ہوں تو میں کہہ دیتا ہوں کہ تم قابل خطاب نہیں ہو۔ بندۂ خدا کیا تم اس کو گوارا کر سکتے ہو کہ تمہارے چھپر میں ایک چھوٹی سی چنگاری لگادی جائے، حالانکہ اس کی حقیقت ہی کیا ہے چھوٹی چنگاری تو اکثر خود ہی بجھ جاتی ہے اس میں کچھ زیادہ اندیشہ نہیں مگر با اینہمہ کوئی شخص ذرا سی چنگاری کو بھی اپنے چھپر کے لئے گوارا نہیں کرتا اور یہی کہا جاتا ہے کہ صاحب خدا بری گھڑی نہ لائے، بعض دفعہ یہ چھوٹی سی چنگاری غضب ڈھا دیتی ہے۔ افسوس ایک چار روپیہ کے چھپر کی تو اتنی قدر اور ایسی احتیاط اور متاع ایمان کی ایسی بے قدری کہ اس میں گناہ صغیرہ کی چنگاری لگانا گوارا ہے۔ یہاں یہ اندیشہ کیوں نہیں ہوتا کہ بعض دفعہ

چھوٹی سی چنگاری بھی غضب ڈھادیتی ہے اسی لئے اہل مجاہدہ نے تروک کی دو قسمیں نہیں کیں بلکہ وہ تمام افعال متروکہ کو ضروری الترک سمجھتے ہیں خواہ وہ حرام ہوں یا مکروہ تنزیہی پس ثابت ہوگیا کہ اجزاء دین کی تین قسمیں ہیں (۱) طاعات واجبہ (۲) طاعات مستحبہ (۳) معاصی من حیث الترک اور چار اقسام ہونے کا جو احتمال تھا وہ محض عقلی احتمال تھا ورنہ حقیقت میں مکروہ تنزیہی بھی معاصی بالمعنی الاعم میں داخل ہے اور اس کا ترک بھی ضروری ہے اور یہی تین اجزاء مجاہدہ کے بھی ہیں۔ پس مجاہدہ کی حقیقت یہ ہوئی کہ اعمال واجبہ ومستحبہ کو بجالائے اور معاصی سے اجتناب کرے اسی کا بیان اس آیت میں ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے۔ کہ جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ اور محنت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے دکھلادیں گے فینا میں یا تو فی سببیہ ہے یعنے جاھدوا لاجلنا۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ جو ہمارے واسطے محنت برداشت کرتے ہیں یا ظرفیہ ہے تو مضاف مقدر ہے یعنے جاھدوا فی دیننا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو ہمارے دین میں محنت کرتے ہیں اور دین خدا کا راستہ ہے چنانچہ دین کا لقب ارشاد ہے صراط اللہِ الذی لہ ما فی السموٰت اس لئے میں نے اولاً ترجمہ میں کہا تھا کہ جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ اگر فی سببیہ ہے تو اس قید کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہدایت سبیل کا وعدہ اس مجاہدہ کے لئے ہے جو محض ہمارے لئے مجاہدہ کرے ریا وغیرہ کے لئے نہ کرے اور اگر ظرفیہ ہے تو فائدہ قید کا یہ ہوگا کہ یہ وعدہ ہر مجاہدہ کرنے والے کے لئے نہیں بلکہ اس شخص کے لئے ہے کہ جو ہمارے راستے کے موافق

یعنے شریعت کے مطابق مجاہدہ کرے کیونکہ خدا کے لئے تو جوگی اور راہب بھی مجاہدہ کرتے ہیں مگر ان کو وصول نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا مجاہدہ خلافِ شریعت ہے۔ گو بعض دفعہ یہ لوگ ایسے مجاہدے کرتے ہیں کہ مسلمان اس کا عشر بھی نہیں کرتے مگر سب بیکار ہے، مسلمان کو شریعت کے موافق سہل سہل مجاہدوں میں جو قرب حاصل ہوتا ہے وہ کفار کو سخت سے سخت مجاہدوں سے عمر بھر بھی نصیب نہیں ہوسکتا وجہ اس کی یہ ہے کہ مسلمان کا مجاہدہ خدا کے راستہ پر ہے اور کفار کا مجاہدہ خلاف طریق ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ کفار میں جو لوگ ریاضت و مجاہدہ کرنے والے ہیں وہ بہ نسبت عام کفار کے راستہ سے بہت دور ہیں کیونکہ غلط راستہ پر تو دونوں ہیں مگر عام کفار تو اس غلط راستہ پر آہستہ آہستہ چل رہے ہیں اور مرتاضین بہت تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ جو شخص غلط راستہ پر تیزی کے ساتھ چلے گا وہ سیدھے راستہ سے بہت دور ہوجائے گا بخلاف اس کے جو غلط راستہ پر آہستہ آہستہ چل رہا ہے گو وہ بھی سیدھے راستہ سے دور ہے مگر زیادہ دور نہیں ہوا اسی لئے عام کفار کا اسلام کی طرف کسی وقت مائل ہوجانا زیادہ متوقع ہے بہ نسبت ان کے خواص کے چنانچہ یہ جوگی اور سنیاسی وغیرہ بہت ہی کم اسلام لاتے ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ مجاہدات سے کچھ نفسیاتی کیفیات ان پر وارد ہونے لگتی ہیں بعضوں کو وقائع مستقبلہ کا کشف بھی ہونے لگتا ہے اور گو ان چیزوں کو قربِ حق میں کچھ دخل نہیں مگر وہ لوگ اپنی جہالت سے اُن کو مقصود سمجھتے ہیں اور جب بزعم خود ان کو مقصود حاصل ہوگیا تو اب وہ اپنے طریق کفر پر پہلے سے زیادہ پختہ ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے

ہیں کہ حصولِ مقصود کے لئے ہمارا طریقہ کافی ہے اور عام کفار کو چونکہ یہ باتیں پیش نہیں آتیں اس لئے ان کو اپنے طریق کے حق ہونے کا ویسا جزم نہیں ہوتا جیسا اہلِ ریاضت کو ہوتا ہے۔ یہی راز ہے اس میں کہ ہمارے حضرات نے ہندوؤں کو ذکر شغل کی تعلیم کرنے سے منع فرمایا ہے گو نا واقف لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ان کو خدا کا نام بتلا دینا چاہیئے اس میں حرج کیا ہے شاید کسی وقت رفتہ رفتہ اسلام کی طرف آجائے۔ مگر محقق جانتا ہے کہ حالتِ کفر میں ذکر شغل کرنے سے وہ اسلام سے قریب نہ ہوگا بلکہ پہلے سے زیادہ دور ہوگا، کیونکہ ذکر شغل سے اس پر کیفیاتِ نفسانیہ کا ورود ہوگا جن کو وہ مقصود سمجھے گا، اس کے بعد یہ خیال جم جائے گا کہ میں اپنے کفر پر رہ کر بھی مقصود کو حاصل کر سکتا ہوں تو اب اس کے اسلام کی کوئی امید نہیں۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو ان جوگیوں کو عام کفار سے اچھا سمجھتے ہیں۔

اور بعض لوگ غضب کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو صاحبِ باطن سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آجکل ایک رئیس[1] المشرکین کے ساتھ بہت سے مسلمانوں کو اسی قسم کا اعتقاد ہے اور اس کی کرامتیں بیان کی جاتی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان لوگوں نے بس مطلق مجاہدات کا نام تصوف رکھ لیا ہے اور چند تصرفات کو ثمرۂ تصوف سمجھ لیا ہے حالانکہ تصوف نام ہے مجاہدہ بطریق الاسلام کا جس کا ثمرہ رضا و قربِ حق ہے کفار کے مجاہدوں کو تصوف سے کیا نسبت اور ان نفسانی تصرفات کو قربِ حق سے کیا تعلق یہ تو ادنیٰ مشق سے ایک مسمریزم والا بھی کر سکتا ہے

---

[1] مراد گاندھی ہے ۱۲ جامع

تو بس وہ بھی صوفی ہو گئے ۔ افسوس یہ ہے کہ اس غلطی میں بہت سے لکھے پڑھے مبتلا ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے مسائل تصوف کو کسی محقق سے حاصل نہیں کیا محض سُنی سُنائی باتوں پر اعتماد کرلیا ہے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کافر کو ان لوگوں نے موحد کدھر سے بنا لیا حالانکہ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ میں پکا ہندو ہوں بس وہی مثال ہے مدعی سُست گواہ چست ۔ اور یہاں سے ان سالکین کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو ان کیفیات و تصرفات اور کشف وغیرہ کو مقصود سمجھتے ہیں یاد رکھو کہ ان کیفیات اور کشف کو مقصود سے کچھ تعلق نہیں کیونکہ یہ نفسانی کیفیات تو یکسوئی سے ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہیں رجن کیفیات کو قرب میں کچھ دخل ہے وہ ان نفسانی کیفیات سے بالکل جدا ہیں اور یہ وہ کیفیات ہیں جو تجلی صفات الٰہیہ سے سالک پر وارد ہوتی ہیں باقی ذوق و شوق کا غلبہ یا یکسوئی کا بڑھ جانا یہ سب نفسانی کیفیات ہیں ان کو مقصود سے کچھ نسبت نہیں ہاں اگر یہ شخص صحیح راستہ پر چل رہا ہے تو ان نفسانی کیفیات سے طریق میں سہولت ہو جاتی ہے باقی انھیں کو مقصود سمجھ لینا یہ مقصود سے بے خبری کی دلیل ہے ۔(۱۲)

یاد رکھو کہ تصوف سے اصل مقصود یہ ہے کہ اعمال شرعیہ یعنی طاعات واجبہ و مستحبہ کا بجالانا اور معاصی سے اجتناب کرنا یہ بندہ کی طبیعت ثانیہ بن جائے بس یہ وہ چیز ہے جس سے قرب و رضاحق حاصل ہوتی ہے کیفیات و کشفیات کو اس سے کچھ تعلق نہیں اگر ایک شخص ادا طاعات و اجتناب عن المعاصی میں پختہ ہو وہ کامل صوفی ہے گو کیفیات کچھ بھی اس پر وارد نہ ہوتی ہوں اور جس پر کیفیات بکثرت وارد ہوتی ہوں

کشف و تصرف میں بھی ملکہ رکھتا ہو مگر اوامر و نواہی میں پختگی حاصل نہ ہو وہ صوفی نہیں خوب سمجھ لو بس یہ وہ معیار ہے جس میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ارشاد ہے وان اللّٰہ لمع المحسنین بعض نے اس کو اس مجاہدہ کے مقصود پر محمول کیا ہے ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مجاہدہ کرتے ہیں اول ان کو راستہ بتلا دیا جاتا ہے پھر جب وہ راستہ طے کر لیتے ہیں اس وقت ان کو نسبتِ احسان حاصل ہو جاتی ہے جس سے ان کے ساتھ معیت الٰہیہ قائم ہو جاتی ہے اب وصول ہو گیا خلاصہ یہ ہوا کہ الذین جاھدوا فینا میں طریق کا بیان تھا اور ان اللّٰہ لمع المحسنین میں مقصود کا بیان ہے مگر میرے نزدیک یہاں صریح طور پر مذکور نہیں اور ان اللّٰہ لمع المحسنین بھی طریق ہی کے متعلق ہے اور صریح اس لئے کہا کہ آگے میں یہ دعوے کروں گا کہ ہدایت سے یہاں ایصال مراد ہے ارارت طریق مراد نہیں اور ایصال کے ضمن میں ظاہر ہے کہ وصول کا بھی ذکر ہو گیا جو کہ مقصود ہے مگر یہ ذکر تبعاً و ضمناً ہے نہ کہ قصداً و استقلالاً۔ اب سنئے کہ میرے نزدیک ان اللّٰہ لمع المحسنین کو طریق کے ساتھ کس طرح تعلق ہے بات یہ ہے کہ جب الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا میں یہ وعدہ کیا گیا کہ جو لوگ مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستہ پر پہنچا دیتے ہیں اس کو سنکر کسی کو یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ راستہ تو بہت طویل ہے کیونکہ خدا کا راستہ ہے جو کہ ورار الورار ثم ورار الورار ہیں تو ان تک پہنچنے کا راستہ بھی بہت دور و دراز ہو گا چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہرچہ بروے میرسی بروی مایست

(اے بھائی حق تعالیٰ کی بارگاہ غیر متناہی ہے۔ پس جس مقام پر بھی پہنچ جاؤ اس پر

قناعت مت کرو آگے بڑھو)
اور ایک محقق کہتے ہیں۔

نگر دو قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا کہ میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا کہ یہ راستہ مثل درخت انگور
کاٹنے سے اور بڑھتا ہے یعنی غیر محدود راستہ ہے)

تو اس بنار پر اس راستہ کا تو قطع ہونا محال ہے تو اس کو اختیار کون کرے اور اس کے لئے مجاہدہ کرنے سے کیا حاصل جب طے ہی نہیں ہو سکتا عارف شیرازی نے ایک جگہ درازی طریق ہی سے پریشان ہو کر فرمایا ہے ۔

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من پیادہ میروم و ہمرہاں سوار انند

(اے خضر (مرشد طریق) ہم خستہ حالوں کی دستگیری فرمایئے کیونکہ ہم تو پیدل
چل رہے ہیں اور ہمارے رفقا سواری پر تیز رفتار ہیں)

یہاں دوسروں کو سوار اپنے لحاظ سے فرمادیا کہ دوسرے میری نسبت سے ذرا تیز چل رہے ہیں باقی فی نفسہ یہاں کوئی سوار نہیں اس راستہ کو طے کرنے کے لئے سب پیادہ ہی ہیں کسی کے پاس کوئی سواری ایسی نہیں جو اس کو طے کر سکے چنانچہ اسی لئے ایک شعر میں سب کو صیغہ جمع میں جمع کر کے یوں فرمایا ہے۔ ع

مابداں مقصد عالی نتوانیم رسید (ہم اس مقصد عالی تک پہنچنے سے قاصر ہیں)

اس میں سب کی نسبت یہی فرمایا ہے کہ ہم اس مقصد عالی تک نہیں پہونچ سکتے یہاں سوار و پیادہ کی کوئی خصوصیت نہیں بیان فرمائی بس اس راستہ میں جو لوگ سوار بھی ہیں وہ ایسے سوار ہیں جیسے بچے نے پر سوار ہوا کرتے ہیں آپ نے بچوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ لکڑی کا گھوڑا بنا کر بھاگے بھاگے پھرا کرتے ہیں تو کیا

اس سواری سے وہ امریکہ پہنچ سکتے ہیں ہرگز نہیں امریکہ تو کیا پہنچتے جلال آباد تک بھی نہیں جا سکتے تو ان اللہ لمع المحسنین میں اس اشکال کا جواب دیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تم گھبراؤ نہیں جب تم مجاہدہ کروگے ہم تم کو منزل مقصود پر پہنچاویں گے اور راستہ اس طرح قطع ہوگا کہ ہم خود تمہارے ساتھ ساتھ ہوں گے جب تم تھک جاؤ گے تو ہم تم کو گود میں اٹھاکر پہنچادیں گے اسی کو وہی عارف جنھوں نے ؎

مابداں مقصد عالی نتوانیم رسید

(ہم اس منزل مقصود تک پہنچنے سے قاصر ہیں البتہ اگر آپ کا لطف بھی کچھ قدم طالبین کی طرف آگے رکھے تو راستہ دم میں قطع ہوسکتا ہے)

طریق کی درازی اور اپنے ضعف پر نظر کرکے فرمایا تھا۔ آگے کہتے ہیں کہ ہاں ایک صورت ہے پہنچنے کی وہ کیا ؎

ہاں مگر پیش نہد لطف شما گامے چند

کہ آپ کا لطف بھی کچھ قدم آگے رکھے تو پھر دم بھر میں راستہ طے ہے تو اس آیت میں ان اللہ لمع المحسنین ایسا ہے جیسے آپ ایک بچہ سے جو گھٹنیوں چلتا ہے یہ کہیں کہ جلال آباد پہونچ جانا ظاہر ہے کہ اس کے لئے اس کی کوئی صورت نہیں۔ بچہ کہتا ہے کہ میں چلتا ہوں لیکن اگر تھک گیا تو کیا ہوگا اس پر مربی کہتا ہے کہ جب تم تھک جاؤ گے ہم گود میں اٹھالیں گے بس اب اس کی ہمت بندھ جاتی ہے پھر وہ دو چار ہی قدم چلتا ہے کہ مربی کو شفقت کا جوش آتا ہے وہ جلدی ہی اسے گود میں لے لیتا ہے یہی مطلب اس جملہ کا ہے کہ تم محنت کرو ہم تمہاری انگلی پکڑکر لے چلیں گے

؎ یہ ایک قصبہ ہے تھانہ بھون سے دو میل پر ۱۲ منہ

ہم تمہارے ساتھ ساتھ چلیں گے اور قاعدہ ہے کہ جب مربی بچہ کی انگلی پکڑ لیتا ہے تو وہ بے فکر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم بے فکر رہو ہم تم کو خود لے کر چلیں گے تنہا نہ چھوڑیں گے۔ انگلی پکڑ کر لے چلنے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

عالمگیر کے زمانہ میں ایک راجہ کا انتقال ہو گیا اس کے ایک نابالغ لڑکا تھا اس لئے تخت کا مدعی بھائی ہوا مگر وزراء چاہتے تھے کہ تخت کا مالک لڑکا ہو لیکن اس کی امید کسی کو نہ تھی سب کا یہی خیال تھا کہ عالمگیر تخت کا مالک بھائی کو بنا دیں گے اور نابالغ لڑکے کو محروم کر دیں گے۔ وزراء نے یہ تدبیر کی کہ اس نابالغ لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر دہلی چلے کہ شاید عالمگیر کو صورت دیکھ کر رحم آجائے۔ تمام راستہ وزیر اعظم اس لڑکے کو آداب شاہی وضروریات سکھاتا جارہا تھا کہ یوں سلام کرنا اور عالمگیر یہ سوال کریں تو یہ جواب دینا یہ بات پوچھیں تو تم یہ کہنا۔ جب وزیر سب کچھ پڑھا چکا اور دہلی میں داخل ہوئے تو لڑکے نے کہا کہ بھلا اگر عالمگیر نے ان سوالات کے علاوہ کوئی اور سوال کیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ وزیر اس ذہانت سے دنگ رہ گیا اس نے کہا صاحبزادے جس خدا نے تمہارے دل میں اس وقت یہ سوال ڈالا ہے وہ وقت پر عالمگیر کی بات کا جواب بھی تیرے دل میں ڈال دے گا۔ بس اب میں مطمئن ہوں غرض یہ لوگ بچہ کو لیکر عالمگیرؒ کے پاس حاضر ہوئے عالمگیر اس وقت زنانہ محل میں حوض کے کنارے پر غسل کر رہے تھے اطلاع ہونے پر اندر ہی بلا لیا وہ حاضر ہوا اور سلام کیا انھوں نے کھیل کے طور پر اس بچہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کے حوض میں لٹکا دیا اور کہا چھوڑ دوں بچہ ہنسا عالمگیر سمجھے کہ بے وقوف معلوم ہوتا ہے بھلا یہ ہنسنے کا کونسا موقعہ تھا پوچھا ہنستے کیوں ہو بات کا جواب دو بچہ نے جواب دیا کہ

حضور کی بات پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ حضور کی تو یہ شان ہے کہ آپ جس کی انگلی پکڑ لیں وہ بھی ہلاک نہیں ہو سکتا اور میرے تو دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھ میں ہیں بھلا میں کیونکر ڈوب سکتا ہوں، پھر مجھ کو کاہے سے ڈراتے ہیں۔ عالمگیر کو اس جواب پر وجد آگیا اور فرمایا لڑکا بہت ہوشیار ہے۔ تخت کا مالک اسی کو بنایا جاتا ہے۔

تو صاحبو! جب ایک بیچارہ عاجز عالمگیر جس کا ہاتھ پکڑ لے وہ ہلاک نہیں ہو سکتا تو خدا تعالیٰ جس کا ہاتھ پکڑ لیں وہ کیونکر ہلاک ہو سکتا ہے۔ (اس وقت حضرت مولانا پر خاص حالت تھی اور سامعین کا عجیب حال تھا۔ جامع) یقیناً ہلاک نہیں ہو سکتا۔ پس گو یہ راستہ بہت طویل ہے اور نہایت خطرناک۔ مگر معیت حق کی وجہ سے پھولوں ہلکا ہو جاتا ہے اور بہت نزدیک ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مجاہدہ کرنے والے کون ہیں جن کے ساتھ معیت حق ہوتی ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا کے بعد ان اللہ لمع المحسنین بڑھا کر اس پر بھی تنبیہہ فرمادی کہ ہم ہر مجاہدہ کرنے والے کے ساتھ نہیں ہوتے بلکہ جو محسن ہو ہم اس کے ہمراہ ہوں گے۔ بعض لوگ مطلقاً زیادہ مجاہدہ کرنے والوں کو مقرب سمجھتے ہیں خوب سمجھ لو کہ زیادہ چکی پیسنے پر قرب کا مدار نہیں بلکہ اس کا مدار احسان پہ ہے چکی پیسنے پر مجھے یاد آیا کہ ایک بار حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ کے ایک مدرس کو معزول کرنا چاہا کیونکہ ان کی ترتیب تعلیم اچھی نہ تھی۔ مہتمم صاحب نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ان کو معزول نہ کیا جائے کیونکہ یہ محنتی بہت ہیں تو مولانا نے فرمایا کہ اگر زیادہ محنتی ہوناہی معیار انتخاب ہے تو پسنہاری مجھ سے زیادہ محنتی ہے اور ارزاں بھی ہے

پھر مجھے چالیس پچاس روپئے کا مدرس کیوں بنا رکھا ہے میری جگہ ایک بہتا ری کو بٹھلا دیا ہوتا وہ مجھ سے زیادہ محنت کرے گی اور دو آنہ روزہ لیا کرے گی (سبحان اللہ کیا علوم ہیں ان حضرات کے ۱۲ جامع) آجکل یہ بڑا خبط ہے کہ محنتی ہونے کو کمال کا معیار سمجھتے ہیں یادرکھو زیادہ مجاہدوں پر قرب کا مدار نہیں نہ یہ معیار کمال ہے بلکہ اس طریق میں اصل مدار احسان پر ہے جس کے لغوی معنے نیکو کردن عبادت ہے اور جس کی تفسیر اخلاص سے کی گئی ہے اور حقیقت اس کی ایک حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک یعنی تعبد اللہ مشابہا بانک تراہ۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ایسی عبادت کرو جیسی اُس حالت میں کرتے جبکہ اس کو دیکھتے ہوتے کیونکہ تم اگر اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے اور اس کا بھی مقتضا وہی ہے جو تمہارے دیکھنے کی حالت کا مقتضا ہے اور خدا کا تم کو دیکھنا یقینی ہے پس اس لئے ایسی ہی عبادت کرو جیسی اس کو دیکھ کر کرتے چنانچہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کو دیکھتے ہوئے عبادت نہایت کامل ہوگی جیسے سڑک کوٹنے والا مزدور اگر حاکم کو سامنے سے آتا ہوا دیکھ لے تو اس وقت خوب کام کرتا ہے لیکن اگر مزدور کو حاکم خود بھی نظر نہ آئے گا مگر کسی معتبر ذریعے سے اسے معلوم ہو جائے کہ حاکم میرے کام کو دیکھ رہا ہے تو اس وقت بھی اس کی وہی حالت ہوگی جو آنکھوں کے سامنے حاکم کو دیکھنے کے بعد ہوتی اور مسلمان کے لئے خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بڑھ کر کیا چیز ہوسکتی ہے۔ جب قرآن وحدیث میں اس کی تصریح ہو چکی کہ حق تعالیٰ بندوں کے افعال کو دیکھ رہے ہیں تو ان کی حالت عبادت میں وہی ہونی چاہیئے جو حق تعالیٰ کو دیکھ کر ہوتی اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کو دیکھنے کے بعد بہت ہی اچھی طریق سے عبادت ہوتی اور وہ اچھا ہوتا

یہ ہے کہ ظاہراً ارکان اس کے مکمل ہوں اور باطناً اس میں ریا وغیرہ کا خیال پاس بھی نہیں آسکتا اس وقت تو اپنی بھی خبر نہ رہے گی دوسروں کی تو کیا خبر ہو گی جن کو عمل دکھلانے کا خیال ہو ؎

چو سلطانِ عزت علم برکشد ❊ جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب وہ سلطان عزت کسی دل میں جھنڈا اپنے قرب کا لہرا دیتا ہے تو اس کی نظر میں یہ جہاں کلعدم ہو جاتا ہے)

اور یہی حاصل ہے اخلاص کا اس حدیث کی ایک تفسیر مشہور اس کے علاوہ بھی ہے وہ یہ کہ بعض لوگوں نے اس کے دو جملوں سے اس میں دو مرتبے نکالے ہیں اور وہ دو مرتبے گو فی نفسہ صحیح ہیں مگر نہ معلوم حدیث کے الفاظ کی دلالت ان پر کیسے ہو گئی۔ اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اول تو عبادت اس طرح کرنی چاہیئے جیسے گویا تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو یہ تو اعلیٰ مرتبہ ہے اور اگر ایسی عبادت نہ ہو سکے تو کم از کم ایسی ہی کرو جیسے خدا تعالیٰ تم کو دیکھ رہے ہیں گویا جملہ اولیٰ میں تو مشاہدہ کی تعلیم ہے کہ عبادت میں حق تعالیٰ کو قلب سے دیکھنا چاہیئے اور دوسرے جملہ میں مراقبہ روایت کی تعلیم ہے کہ عبادت میں یہ تصور کر لیا کرو کہ حق تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں مگر یہ معنے حدیث کے مدلول نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو عبارت یوں ہوتی فان لم تعبد کانک تراہ فاعبدہ بانہ یراك کیونکہ مرتبہ اولیٰ ان تعبد اللہ کانك تراہ میں تشبیہ ہے اس کے بعد مرتبہ ثانیہ فان لم تکن تراہ میں اسی تشبیہ کی نفی ہوگی اور معنے یہ ہوں گے فان تعبد کانك تراہ اور یہ نفی صحیح نہیں کیونکہ بزعم مفسر اس تشبیہ کا مدار تو تصور اور خیال پر ہے کہ ایسی عبادت کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور تصور میں بڑی وسعت ہے اور ایسا فرض بہت سہل ہے تو اس کی نفی کی کیا ضرورت ہے

لہذا فان لم تکن تراہ کو تشبیہ رؤیت کی نفی پر محمول نہیں کیا جا سکتا اور اس صورت میں یہ دوسرا مرتبہ پہلے مرتبے کے مقابل نہیں اس لیے اس کے یہ معنے بیان کرنا کہ اگر تم حالت مشابہ رؤیت الٰہی پر قادر نہ ہو تو یہی تصور کرو کہ حق تعالیٰ تم کو دیکھ رہے ہیں۔

الفاظ سے نہایت بعید ہے پس صحیح یہ ہے کہ حدیث میں نہ مراقبے کی تعلیم ہے نہ مراقبے کے دو درجے مذکور ہیں بلکہ دوسرا جملہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک پہلے جملہ کی علت ہے جس کی تقریر آتی ہے اور فا تعلیلیہ کلام عرب میں بکثرت مستعمل ہے اور علت بیان کرنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ ان تعبد اللہ کانک تراہ پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب ہم خدا تعالےٰ کو دیکھتے ہی نہیں تو ایسی عبادت کیونکر کریں جیسی خدا کو دیکھ کر کرتے تو جملہ ثانیہ میں اس شبہ کا جواب دیا گیا اور بتلایا گیا کہ بدون خدا کو دیکھے ہوئے بھی ویسی عبادت ہو سکتی ہے جیسے دیکھنے کے بعد ہوتی کیونکہ اگر تم نہیں دیکھتے تو اس کا تو یقین ہے کہ وہ دیکھتے ہی ہیں اور اس یقین کا بھی اثر وہی ہے جو تمہارے دیکھنے کا اثر ہوتا اس کی وضاحت کے لئے میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں مولوی محمد سعید صاحب کیرانوی مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ نے مجھ سے اپنا واقعہ بیان کیا کہ جب میں قسطنطنیہ گیا اور سلطان عبدالحمید خاں رحمۃ اللہ علیہ کے ایوان کی طرف چلا تو اول تو میں بے فکری کے ساتھ چلا جب قصر شاہی میں قدم رکھا اس وقت یہ تحقیق ہوا کہ سلطان کا جو خاص کمرہ ہے سلطان اس کمرہ میں کبھی سیر و تفریح کے لئے آ بیٹھتے ہیں اس وقت اس میدان میں چلنے والے سب ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ مولوی محمد سعید صاحب کہتے تھے کہ بس یہ تصور کر کے کہ شاید اس وقت سلطان مجھے دیکھ رہے ہوں

میری یہ حالت تھی کہ قدم نہ اٹھتا تھا اور میں گردن جھکائے نہایت ادب سے چل رہا تھا اس میدان میں چاروں طرف پھول پھلواری اور عمدہ عمدہ درخت لگے ہوئے تھے مگر میں نے ایسی نگاہیں نیچی کیں کہ کسی چیز کو بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ اس وقت تک نہ میں نے سلطان کو دیکھا تھا نہ یہ یقین تھا کہ وہ مجھ کو اس وقت دیکھ رہے ہیں، محض احتمال تھا کہ شاید دیکھ رہے ہوں مگر اس احتمال ہی سے میری وہ حالت تھی جس کو میں بیان نہیں کرسکتا۔

اے صاحبو! جب ایک ادنیٰ بادشاہ کے احتمال رؤیت سے یہ حال ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کی یقینی رویت کے استحضار سے کیسا حال ہونا چاہیئے اس کو خود سمجھ لیجیئے لہٰذا فان لم تکن تراہ جملہ اولٰی کے لئے علت ہونا اس مثال سے بخوبی واضح ہوگیا۔ الغرض احسان کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کی عبادت ایسے خلوص و استحضار سے بجا لائے گویا کہ یہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ عبادت میں جس شخص کی یہ حالت ہو وہ محسن ہے اور ایسے ہی لوگوں کے لئے معیت حق کا وعدہ ہے۔ ہر مجاہدہ کرنے والے کے لئے اس کا وعدہ نہیں پس مجاہدہ کو احسان کے ساتھ مقید کر دینے سے معنے یہ ہوگئے کہ جو لوگ اخلاص و احسان کے ساتھ مجاہدہ کرتے ہیں ان کے حق میں وعدہ ہے لنھدینھم سُبلنا کہ ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور اسی تقیید سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اس میں ہدایت سے ارارت طریق مراد نہیں بلکہ ایصال علی الطریق مراد ہے۔ کیونکہ ارارت طریق صرف مجاہدین محسنین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر مسلمان کو عام ہے اور سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ لنھدینھم سبلنا مجاہدہ مقید بالاحسان کی جزا ہے پس لامحالہ ہدایت سے وہ معنے مراد

لینے چاہئیں جو ایسے مجاہدہ کی جزا ہو کر ایسے مجاہدین کے ساتھ مخصوص ہو اور وہ دوسرے ہی معنے ہو سکتے ہیں یعنی ایصال علی الطریق خلاصہ یہ ہے کہ راستہ بتانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مسافر کو علامات و نشانات بتلا دیئے جائیں کہ اس راستہ میں پہلے ایک کنواں آئے گا پھر فلاں سمت کو چلنا وہاں ایک درخت ملے گا پھر ایک پہاڑ آئے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد مسافر ان علامات کو یاد کر کے چل پڑے تو اس صورت میں بھٹکنے کی بہت گنجائش ہے اور پریشانی تو ہے ہی جب تک وہ علامات نظر نہ آئیں اس وقت تک چلنے والے کو اطمینان نہیں ہوتا ہر قدم پر غلطی کا شبہ ہوتا ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ کسی نے آپ سے راستہ پوچھا اور آپ نے بجائے علامات بتلانے کے یہ کیا کہ خود ساتھ ہو لئے کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اس صورت میں مسافر کا دل کتنا بڑھے گا اور وہ کیسا بے فکر ہو جائے گا خود ہی سوچ لیجئے پس لنھدینھم میں ہدایت سے یہی دوسرے معنے مراد ہیں کہ جو لوگ اخلاص کے ساتھ مجاہدہ کرتے ہیں حق تعالیٰ ان کو ہاتھ پکڑ کر پہنچا دیتے ہیں رستہ بتلانے پر اکتفا نہیں فرماتے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلا اختیار عبد کو اضطراری طور پر پہنچا دیں گے شاید کوئی صاحب یہ سمجھے ہوں کہ جب حق تعالیٰ ہاتھ پکڑ لیں گے اور خدا سے ہاتھ چھڑانا محال ہے تو پھر ہمارے اختیار کی کیا ضرورت ہے اب تو لامحالہ پہنچ ہی جائیں گے سو یہ سمجھنا صحیح نہیں کیونکہ اس صورت میں پہونچنے والوں کا کیا کمال ہوا اور قاصرین کی کیا کوتاہی ہوئی بلکہ حق تعالیٰ کے اس پہنچانے میں بھی بندہ کے اختیار کا لحاظ ہے جب تک بندہ میں ارادہ طلب رہتی ہے اس وقت تک تو وہ ہاتھ پکڑے رہتے ہیں اور جب اس میں ارادہ نہیں ہوتا فوراً ہاتھ جوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ صاف ارشاد ہے انلزمکموھا وانتم لھا کارھون کیا ہم

اپنی رحمت کو تمہارے اوپر چپکا دیں گو تم اُن سے کراہت ہی کرتے ہو ایسا نہیں ہوگا بلکہ جب تک تم میں طلب رہے گی اسی وقت تک ہماری طرف سے عنایات کی بارش ہوگی۔ البتہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کا کام صرف قصدِ مصمم ہے پھر عمل میں یہ تو مضطرب ہوجاتا ہے اور پھر تو کھینچ تان کر پہنچا ہی دیتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص نماز کا عامل ہے وہ قصد کے ہوتے ہوئے اس کے ترک پر قادر نہیں مگر شرط یہ ہے کہ قصد پیدا ہونے کے بعد اخیر تک باقی بھی رہے اگر کسی وقت قصد فوت ہوجائے گا تو اسی وقت سے عمل میں خلل آجائے گا اور وصول میسر نہ ہوگا۔ اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہم تو بار بار نماز کا قصد کرتے ہیں پھر بھی عمل صادر نہیں ہوتا تو وہ سمجھ لیں کہ ان کے اندر ابھی تک قصد ہی پیدا نہیں ہوا محض تمنا کا درجہ پیدا ہوا ہے اور تمنا میں اور قصد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں تک تو آیت کی تفسیر تھی اور اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ مجاہدہ کی حقیقت ارتکاب طاعات و اجتناب معاصی ہے، مگر اس پر ایک شبہ وارد ہوتا ہے میں اس کو بھی حل کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اہلِ سلوک نے بالاجماع مجاہدہ کی ایک اور قسم بیان کی ہے جو نہ ارتکاب طاعات میں داخل ہے نہ ترک معاصی کی فرد ہے۔ اور وہ قسم مجاہدہ کی ایسی مشہور اور صوفیہ کے کلام میں اس کثرت سے مذکور ہے کہ لفظ مجاہدہ سے متبادر وہی مفہوم ہونے لگی ہے۔ اور جو حقیقت اس وقت بیان کی گئی ہے وہ اس درجہ میں متبادر نہیں ہوتی چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ مجاہدہ کے چار رکن ہیں۔ (۱) تقلیل طعام (۲) تقلیل منام۔ (۳) تقلیل کلام (۴) تقلیل اختلاط مع الانام۔ اور تقلیل کا لفظ تو میں کہہ رہا ہوں وہ تو ترک ہی سے تعبیر کرتے ہیں مگر مراد ان کی بھی تقلیل ہی ہے جس کو

ترک سے اس لئے تعبیر کیا کہ بمرگش گیر تا بہ تپ راضی شود اگر وہ تقلیل کا لفظ استعمال کرتے تو ہم لوگوں کو گنجائش ملتی کہ ذراسی قلت کر کے اپنے کو مجاہد سمجھ لیا کرتے اور جب ترک کا لفظ اختیار کیا تو ہم ان کے چھوڑنے کا قصد کریں گے اور ترک کلی ہو نہیں سکے گا اس لئے لامحالہ تقلیل کے اس درجہ پر جا ٹھہریں گے جو ان کا مقصود ہے اب اشکال یہ ہے کہ مجاہدہ کی یہ قسم نہ تو اعمال میں داخل ہے کیونکہ اعمال اشیاء وجودیہ ہیں اور یہ ارکان اربعہ وجودی نہیں بلکہ عدمی ہیں چنانچہ اہل سلوک کا ان کو ترک سے تعبیر کرنا اس کی کافی دلیل ہے اور نہ یہ تروک میں داخل ہیں کیونکہ اوپر تروک کی تفسیر ترک معاصی سے کی گئی ہے اور ان ارکان اربعہ میں جو ترک ہے وہ مباحات پر دار د ہو رہا ہے کیونکہ کھانا سونا بولنا ملنا جلنا بقدر ضرورت تو واجب ہے اس کا ترک تو مراد ہی نہیں اور جس کا ترک مراد ہے یعنے زائد از ضرورت وہ گناہ نہیں بلکہ امور مباحہ ہیں ممکن ہے کہ یہاں کوئی یہ احتمال پیدا کرے کہ جس طرح تم نے اعمال کی دو قسمیں کی ہیں ایک عمل واجب۔ ایک عمل مستحب اسی طرح ہم تروک کی دو قسمیں کریں گے ایک ترک معصیت دوسرے ترک مباح تو اب ان ارکان اربعہ کا تروک سے خارج ہونا لازم نہ آئے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجاہدہ میں وہی چیزیں داخل ہو سکتی ہیں جن کو قرب و ثواب میں دخل ہو چونکہ عمل مستحب پر ثواب ملتا ہے اس لئے وہ تو مجاہدہ کی قسم بن سکتا ہے اور مباح میں کچھ ثواب نہیں نہ عملاً نہ ترکاً اس لئے ترک مباح مجاہدہ میں داخل نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ جانب اعمال میں صرف عمل واجب و عمل مستحب کو بیان کیا گیا ہے عمل مباح کو بیان نہیں کیا گیا اور بعض روایات سے جو عمل مباح پر ثواب ملنا معلوم ہوتا ہے وہ نیت مخصوصہ کے ساتھ مقید ہے اور اس قید کے بعد وہ مستحب میں داخل ہو جاتا ہے۔ مباح نہیں رہتا۔ غرض یہ مسلّم ہے کہ مباحات کو قرب و ثواب

میں کچھ دخل نہیں نہ عملاً نہ ترکاً ۔ جامع)

تو اب یہ اشکال باقی رہا کہ ترک مباح مجاہدہ کی قسم کیونکر بن گیا پھر یہ کسی ایک یا دو شخصوں کا قول نہیں بلکہ سارے اہلِ طریق کا اس پر اجماع ہے اور مجاہدہ کا ضروری ہونا مسلّم ہے تو گویا ان کی ضرورت پر اتفاق ہے اور جس طرح اہلِ ظاہر کا اجماع حجت ہے اسی طرح اہلِ باطن کا اجماع بھی حجت ہے کیونکہ تصوف بھی فقہ کی ایک فرد ہے۔ جیساکہ اہلِ اصول نے امام ابو حنیفہ رح سے اس کی تصریح کی ہے کہ الفقہ معرفۃ النفس مالھا وما علیھا (فقہ نام ہے نفس کی معرفت کا جو اس کے لئے مفید اور جو مضر ہیں)

تو صوفیہ بھی فقہاءِ امت میں داخل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسائل ظاہرہ میں فقہاء ظاہر کا اجماع تو حجت ہو اور اور مسائل سلوک میں فقہاء باطن کا اجماع حجت نہ ہو تو اب اشکال ہر طرح پختہ ہو گیا۔ اب اس کا جواب سنئے بات یہ ہے کہ مجاہدہ تو حقیقت میں ترکِ معاصی کا نام ہے ترک مباحات حقیقت میں مجاہدہ نہیں لیکن یہ حضرات طبائع کے خواص وکیفیات کو خوب جانتے ہیں جیسے اطباء ظاہر اجسام کے خواص وکیفیات کو جانتے ہیں تو ان حضرات نے طبائع بشری کی خاصیت پر نظر کر کے یہ دیکھا کہ مجاہدہ مطلوبہ (یعنی ارتکابِ طاعات واجتناب معاصی) میں بغیر ان ارکانِ اربعہ کے سہولت نہیں ہوتی۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ مشک کی طرح پیٹ کو آنٹ کر آتے ہیں ان کو تراویح پڑھنا موت ہے وہ تو الم ترکیف ہی کی مسجد ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جب یہ بقر سے زیادہ کھائیں گے تو سورۂ بقرہ ان سے کہاں سُنی جائے گی آجکل خانقاہ میں تراویح الم ترکیف ہی سے ہوتی ہے مگر پھر بھی امام سے بعض لوگوں کی درخواست ہے کہ ذرا تیز پڑھا کرو سجدے رکوع میں دیر نہ کیا کرو ان یاروں کو مسئلہ کا پتہ

نہیں چلا ورنہ یہ الم ترکیف میں بھی دو رکعتیں کرتے کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد اٹھارہ حرفوں کی آیت سے واجب ادا ہو جاتا ہے اس سے کم میں تو واجب ادا نہیں ہوتا اور اس طرح الم ترکیف میں دو رکعتیں بخوبی ہو سکتی ہیں۔ زیادہ کھانے کا یہ اثر تو اعمال پر ہوتا ہے پھر ان ہی بزرگوں کو لوگوں کی طبائع کا اندازہ کرکے یہ بھی معلوم ہوا کہ گناہ بھی زیادہ تر کھانے ہی سے ہوتے ہیں کھانے والا ترکِ معاصی پر کم قادر ہوتا ہے اور جو لوگ کم کھاتے ہیں ان کو تقاضائے معصیت کم ہوتا ہے وہ اگر بچنا چاہیں تو سہولت سے بچ سکتے ہیں کیونکہ ان میں قوت بہیمیہ ضعیف ہوتی ہے جیسے بڈھا جس میں یہ قوت ضعیف ہوتی ہے اگر زنا سے بچنا چاہے تو بآسانی بچ سکتا ہے اسی لئے حدیث میں ہے کہ حق تعالٰی کو تین شخصوں سے زیادہ بغض ہے۔ ملك كذاب و شیخ زانٍ و عائل مستکبر۔ یعنی (۱) بادشاہ جھوٹ بولنے والا کیونکہ عام لوگ اگر جھوٹ بولیں تو وہ حاجت کا بہانہ کر سکتے ہیں کہ صاحب کیا کریں بدون جھوٹ کے کام نہیں چل سکتا۔ مگر بادشاہ کو کس بلا نے گھیرا وہ کیوں جھوٹ بولتا ہے اس کے اوپر کس کا دباؤ ہے یا اس کو کس کے پاس مقدمہ لیجانا پڑتا ہے۔ پس بادشاہ کا جھوٹ بولنا محض خباثتِ نفس ہے۔ اسی طرح (۲) بڈھا زنا کرنے والا اس پر بھی خدا کا غضب زیادہ ہے کیونکہ جوان تو کچھ عذر کر سکتا ہے کہ فرطِ شبق عہ سے میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا مگر بڈھے پر کیا آفت آئی اسے کونسا شبق تھا وہ تو پہلا سبق سب بھول کھال گیا۔ اب تو وہ نہ معلوم کتنی دیر میں نفس کو آمادہ کرے گا کیونکہ غریب مُردہ ہو چکا ہے۔ جیسے ایک بڈھے قاضی نے کسی کم عمر لڑکی سے نکاح کیا تھا جو ابھی ان

عہ یعنی زیادتی خواہش جماع ۱۲

باتوں کو نہ جانتی تھی انھوں نے یہ کہہ کر راضی کیا کہ ایسا کام ایک بار کرنے سے سو کافروں کے مارنے کا ثواب ہوتا ہے وہ بیچاری راضی ہوگئی دو تین روز کے بعد پھر یہ مسئلہ بیان کیا وہ پھر راضی ہوگئی۔ اس کے بعد جب یہ جوان ہوگئی اور وہ زیادہ بوڑھے ہوگئے تو اب اس نے خود کہنا شروع کیا کہ قاضی جی آؤ کافروں کو ماریں خیر قاضی جی جہاد کو تیار ہوگئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے پھر کہا قاضی جی نے پھر بھی ہمت کی جب کئی دفعہ یہ قصہ ہوا تو قاضی جی گھبرا کر باہر چلے گئے۔ بیوی نے لڑکے کے ہاتھ کہلا کر بھیجا کہ قاضی جی کافروں نے بہت زور کر رکھا ہے تو قاضی جی صاحب نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم نے ان کافروں سے صلح کر لی ہے بس یہی حال بڈھے کے نفس کا ہوتا ہے کہ وہ بھی ان کافروں سے صلح کر چکا ہے اب اس کا زنا پر اقدام کرنا سوائے شرارت نفس کے اور کچھ نہیں۔ (۳) اور عائل متکبر کی مذمت اس لئے ہے تو نگر کے پاس تو تکبر کا کچھ سامان بظاہر موجود ہے مفلس قلاش کس بات پر اینٹھتا ہے یہ خواہ مخواہ فرعون بے سامان بنا جاتا ہے۔ جیسے ایک شخص غریب تھا مگر لوگوں پر یہ ظاہر کرتا تھا کہ میں روزانہ گھی دودھ اور قورمہ پلاؤ کھاتا ہوں اور لوگوں کو دکھانے کے لئے مونچھوں کو تیل مل کر نکلا کرتا تھا تاکہ لوگ سمجھیں کہ پلاؤ کا گھی لگ رہا ہے۔ ایک دن جو آپ نے چراغ میں سے مونچھوں کو تیل لگایا تو چراغ کی بتی بھی ساتھ میں آگئی اور داڑھی میں الجھی رہ گئی اس شان سے جب آپ باہر نکلے تو اس دن سب قلعی کھل گئی تو غریب ہو کر متکبر بننا نہایت حماقت ہے۔ غریبی کا تو مقتضا ہی تواضع ہے۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست ❊ گدا گر تواضع کند خوئے اوست

(معزز لوگوں کا تواضع کرنا کمال ہے اگر گدا تواضع کرتا ہے تو یہ تو اس کی عادت ہی ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ فقیر و مفلس کی عادت تواضع ہی ہوا کرتی ہے۔ یہ گفتگو تو حدیث کے

متعلق تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ کم کھانے والا گناہوں سے بسہولت بچ سکتا ہے جیسے بڑھا زنا سے آسانی کے ساتھ بچ سکتا ہے۔ الغرض غور سے دیکھا جائے تو سب گناہ زیادہ کھانے ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔ جیسے مولوی سالار بخش صاحب وعظ میں گناہوں کی فہرست گنوا کر فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب فساد مرچوں کا ہے۔ ان کے نزدیک سب گناہ مرچوں ہی کی وجہ سے ہوتے تھے لوگ تو اس کو ہنسی میں اڑاتے ہیں مگر میں نے اس کلام کی یہ تاویل کی ہے کہ مرچ سے کھانا لذیذ ہو جاتا ہے اور لذت کی وجہ سے بہت کھایا جاتا ہے اور بہت کھانا گناہوں کا سبب ہے۔ اس طرح مرچوں کو اس فساد میں دخل ہو گیا۔

خیر مرچوں کا فساد تو ہو یا نہ ہو لیکن یہ کلام محقق ہے کہ اکثر گناہ زیادہ کھانے سے ہوتے ہیں۔ یہ ساری باتیں مستی ہی میں سوجھتی ہیں کہ کسی کو گھور لیا۔ کسی کو چھیڑ دیا۔ کسی کے عاشق ہو گئے۔ بھوکے کو یہ مستیاں نہیں سوجھتیں جس کے گھر میں سال بھر کا غلہ بھرا ہوا ہو وہ تو عورتوں ہی کو گھورے گا اور کیا کرے گا کیونکہ معاش کی طرف سے بیفکری ہے کام کچھ ہے نہیں تو اب انہی قصوں میں وقت گذارتے ہیں ہاں اگر کبھی ان مستوں پر مقدمات قائم ہو جاتے ہیں اس وقت ساری مستی نکل جاتی ہے اب نہ کسی کو گھورنے کی مہلت ہے نہ عشق ظاہر کرنے کی ہمت ہے ہر وقت مقدمہ کی فکر لگی رہتی ہے اور اس فکر میں کھانا پینا سونا بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ انسان کو بیکار نہ رہنا چاہیئے کسی نہ کسی کام میں لگا رہنا چاہیئے۔ دین کا کام نہ ہو سکے تو دنیا ہی کے کسی مباح کام میں لگا رہے کیونکہ مشغولی میں نفس کو مستی نہیں سوجھتی توجہ کام کی طرف رہتی ہے اور بیکاری میں چاروں طرف ذہن دوڑتا ہے اس راز کو حکام نے بھی سمجھا ہے۔　　　(باقی انشاء اللہ آئندہ)

(محمد عبدالمنان [illegible] سے شائع کیا)

ضروری اطلاع: اکثر خریداروں کا پتہ بدل جاتا ہے۔ وہ لوگ اپنا جدید پتہ تو لکھ دیتے ہیں مگر سابقہ پتہ اور خریداری نمبر نہیں لکھتے اور کئی کئی ماہ کے بعد پتہ بدلنے کی اطلاع دیتے ہیں براہ کرم پتہ بدلنے کی فوری اطلاع دیا کریں تاکہ قدیم پتہ پر رسالہ نہ جا سکے ورنہ آپ کا نقصان ہو گا جس کا ادارہ ذمہ دار نہیں۔

چنانچہ جو لوگ معطل و بیکار رہتے ہیں پولیس زیادہ تر انہی کی نگہداشت میں رہتی ہے اور ایسے ہی لوگوں کا نام آوارہ گردوں میں لکھا رہتا ہے اور جب کوئی واردات ہوتی ہے ایسے ہی لوگوں کو پکڑا جاتا ہے۔ تو گویا حکام کے نزدیک بھی بیکاری بدمعاشی کا سبب ہے اور ظاہر بات ہے کہ جس شخص کو کوئی دھندا ہوگا وہ فضول پھندوں میں کیا خاک پھنسے گا اسے اپنے کام ہی سے فرصت نہ ہوگی جس کو ہر روز گھاس کھودنے کی فکر ہے وہ عورتوں کو کہاں گھورتے جائے گا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے ساتھ کسی فکر کا لگا ہونا بڑی نعمت ہے۔ یہ بہت سے گناہوں کا وقایہ ہے خواہ دنیا ہی کا فکر ہو۔ پس غریبوں کو اس نعمت پر شکر کرنا چاہیئے کہ حق تعالےٰ نے ان کو بے فکری نہیں دی امیروں کو دیکھ دیکھ کر غریبوں کی رال ٹپکتی ہے کہ ہائے ہم بھی ایسے ہی بے فکر ہوتے مگر یہ خبر نہیں کہ وہ اس بے فکری سے سیکڑوں گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور تم روٹی کی فکر میں ہزاروں گناہوں سے بچے ہوئے ہو۔ خوب کہا ہے ؎

آنکس کہ تونگرت نمی گرداند   او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو ذات پاک تجھے امیر نہیں بناتی وہ تیری مصلحت کو تجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہے)

زیادہ کھانے میں علاوہ اس نقصان کے کہ وہ گناہوں کا سبب ہوتا ہے اور بھی بہت نقصان ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ہمت کرکے گناہوں سے بچا بھی رہے تو یہ نقصان تو اُسے بھی ہوگا کہ نیند زیادہ آئے گی کم کھانے میں نیند کم آتی ہے۔ پیٹ تن کر جب سوؤ گے تو نیند بھی تن کر آئے گی۔

ضروری اطلاع :۔ خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر کا ضرور حوالہ دیں۔

اور کچھ بھوک رکھ کر کھاؤ گے تو رات میں دو تین دفعہ خود بخود آنکھ کھل جائے گی کیونکہ نیند سے وہ تھوڑے بہت کھانا بھی جو کھایا تھا جلدی ہضم ہو جائے گا پھر جب پیٹ کمر سے لگ جائے گا تو ایک کروٹ پر لیٹا نہ جائے گا بار بار کروٹیں بدلو گے اور کئی بار آنکھ کھل کھل جائے گی پھر چونکہ یہ مسلمان ہے اس لئے ذکر اللہ میں لگ جائے گا اور سوچے گا کہ یہ وقت اور کسی کام کا تو ہے نہیں اور صبح ہونے میں دیر ہے تو بیکار کیوں جاگے لاؤ کچھ اللہ اللہ ہی کرلو تو کم کھانے والے کو طاعات کی توفیق زیادہ ہوتی ہے اور زیادہ کھانے والا تو صبح کو بھی مشکل سے اٹھے گا اس لئے اس شخص کی طاعات بہت کم ہوں گی اور اگر بہت کھانیوالا اتفاق سے کسی رات کو جاگ بھی گیا تو کھانے کا کسل ایسا ہوتا ہے کہ اسکو چارپائی سے اٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی اور اگر اُٹھ بھی گیا اور وضو کر کے نماز یا ذکر میں لگ گیا تو تھوڑی دیر میں نیند کے جھونکے ایسے آئیں گے کہ سجدہ میں پڑ کر خبر بھی نہ رہے گی یا گردن جھکا کر سوتا رہے گا۔ زیادہ کھانے میں دین کا نقصان تو ہے ہی دنیا کا بھی نقصان ہے کیونکہ کھانے میں اس شخص کی رقم زیادہ خرچ ہوتی ہے ایک شخص فی وقت دس روٹی کھاتا ہے اور ایک چار روٹی کھاتا ہے دونوں کے خرچ میں آدھوں آدھ کا تفاوت ہو گا۔ پھر بہت کھانے والے کو غذا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتی آئے دن بدہضمی کی شکایت رہتی ہے جس سے طرح طرح کی بیماریوں کا شکار رہتا ہے تو دواؤں میں بہت رقم خرچ ہوتی ہے اور کم کھانے والے کو غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے اس کی تندرستی بنی رہتی ہے تو دواؤں میں اس کے روپے نہیں اٹھتے۔ شیخ سعدی نے لکھا ہے کہ ایک نصرانی بادشاہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ایک طبیب کو بھیجا تھا کہ یہ مدینہ والوں کا علاج کیا کرے گا آپ نے طبیب کو

واپس کردیا اور فرمایا کہ ہم لوگ بغیر بھوک کے کھاتے نہیں ہیں اور بھوک رکھ کر کھانا چھوڑ دیتے ہیں اس لئے ہم کو طبیب کی ضرورت نہیں۔ (قلت اخرجہ فی السیرۃ الحلبیۃ قال ورد فی روایۃ انہ اھدی مقوقس عظیم القبط الیہ طبیباً لیداوی مرض المسلمین فقال ارجع الی بلدك فلاحاجۃ لنابك فانا قوم لا ناکل حتیٰ نجوع ونقوم عنہ ولو نشبع منہ اوکماقال ۱۲ جامع)

واقعی اس دستور العمل پر عمل کرکے دیکھئے سب بیماریاں خود ہی بھاگ جائیں گی۔ کبھی اتفاقی طور پر بیماری آجائے تو اور بات ہے لیکن مجموعہ امراض تو نہ ہوگا۔ مگر آجکل لوگوں کی عادت یہ ہے کہ بھوک لگنے کا کھانا کھانے میں انتظار نہیں کرتے بلکہ اکثر وقت آنے کی رعایت سے کھاتے ہیں کہ کھانا گرم گرم ہے دیر میں کھائیں گے تو ٹھنڈا ہوجائے گا لاؤ ابھی کھالیں۔ جی ہاں اس وقت کھانا تو گرم ہے مگر کھانے والا سرد ہی ہوجائے گا کیونکہ بے بھوک کھانے سے حرارت غریزیہ منطفی ہوجاتی ہے معدہ میں تداخل ہوجاتا ہے بھلا کھانا ابھی ہضم نہیں ہوا تھا کہ دوسرا اور پہنچ گیا اب معدہ پریشان ہوتا ہے کہ کسے ہضم کروں اور خصوصاً یہ امراء کے مشیر تو بہت غضب کرتے ہیں کہ رئیس صاحب کو بھوک نہیں ہے وہ کھانے سے انکار کررہے

ف میں کہتا ہوں کہ احتمالاً مقوقس کی اس فعل میں ایک گہری چال تھی وہ اس طبیب کے ذریعے غالباً اہل مدینہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا کیونکہ عادۃً محسن کی طرف طبیعت کا میلان ضرور ہوجاتا ہے اور طبیب مریض کے حق میں بڑا محسن ہوتا ہے تو لامحالہ مریضوں کی اسکی طرف میلان ہوگا احسان میں ایک کشش ہے جس سے انسان بالاضطرار محسن کی طرف منجذب ہوجاتا ہے پھر رفتہ رفتہ طبیب کی عظمت دل میں ہوجاتی ہے پھر اس کے مذہب سے نفرت نہیں رہتی حتیٰ کہ اس کے قبول کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے چنانچہ آجکل متمدن حکومتوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کا یہی طریقہ اختیار کیا کہ پہلے اپنے شفاخانے کھولتے اور غریبوں کا مفت علاج کرتے ہیں اس کے بعد کھلم کھلا مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دقیقہ پر نظر کرکے نصرانی طبیب کو مدینہ منورہ میں نہیں رہنے دیا اور گو مسلمانوں کو طبیب کی زیادہ ضرورت نہ تھی مگر استغنا بھی نہ تھا آخر امراض تو صحابہ کو بھی پیش آتے تھے باوجودیکہ وہ اصولِ حفظ صحت کے پابند تھے ۱۲ جامع۔

ہیں تو مشیر اپنے پیٹ بھرنے کے لئے انھیں رائے دیتے ہیں کہ نہیں حضور کچھ تو کھا لیجئے فاقہ کرنا اچھا نہیں تھوڑا بہت کھا کر نمک سلیمانی استعمال کر لیجئے گا یا سوڈے کی بوتل پی لیجئے گا سب ہضم ہو جائے گا۔ اس پر چاروں طرف سے تائید ہوتی ہے۔ کثرت رائے کے بعد وہ کھانا آتا ہے۔ رئیس صاحب تو دو چار ہی لقمے کھاتے ہیں باقی سب ان مشیروں کے پیٹوں میں اترتا ہے پھر اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ رئیس صاحب کا معدہ بھاڑے کا ٹٹو ہو جاتا ہے کہ بدون نمک سلیمانی یا سوڈے کی بوتل کے کھانا ہضم ہی نہیں کرسکتا۔ بعضے یہ تدبیر کرتے ہیں کہ سالن میں لیمو نچوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور اب کھائیے دیکھئے کیسا مزہ آگیا ہے لیمو نچوڑنے سے رئیس صاحب کی بھی رال ٹپک پڑتی ہے۔ اور وہ جوں توں کھا لیتے ہیں۔ لیمو نچوڑنے پر مجھے ایک لیمو نچوڑ کی حکایت یاد آئی ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ سرائے میں بیٹھا رہتا تھا اور دو تین لیمو اپنے پاس رکھتا تھا جب کوئی ذی ثروت مسافر سرائے میں کھانا کھانے بیٹھتا یہ جا کر اس کے پیالہ میں لیمو نچوڑ دیتا کہ دیکھئے حضور اس سے سالن کیسا مزہ دار ہوگیا ہے اس کے بعد یا تو وہی ان کو بلا لیتا یا یہ خود ہی کھانے لگتے، لوگ مروت سے کچھ نہ کہتے اور یہ مفت سفت پیٹ بھر لیتا بس اس کا یہی پیشہ تھا کہ ایک پیسہ کے لیموؤں میں دونوں وقت پیٹ بھر لیا کرتا تھا ایک مرتبہ کوئی مسافر دل چلا بھی آ ٹھہرا اس کے پیالہ میں جو اس نے لیمو نچوڑا اور ساتھ کھانا شروع کیا تو اس نے زور سے ایک دھپ رسید کیا تو یہ لیمو نچوڑ کیا کہتا ہے کہ میرے ابا جان بھی مجھے یوں ہی مار مار کر کھلایا کرتے تھے آپ نے وہ زمانہ یاد دلا دیا اور بے حیا پھر بھی کھانے سے نہ رکا مسافر بھی خاموش ہو رہا کہ جب اس نے مجھے باپ بنا لیا تو اب کیا کہوں۔ واقعی یہ پیٹ بھی سب کچھ

کرا دیتا ہے کھانے کے حریص کو نہ حیا رہے نہ شرم۔ یہ تو ہنسی کی بات تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ کھانا خوب بھوک لگنے پر کھانا چاہیئے یہ نہیں کہ اس کے لئے مشورے اور کمیٹیاں کی جائیں اور کثرت رائے پر فیصلہ کر کے کھالیا جائے چاہے بھوک ہو یا نہ ہو اس لئے میں کھانے پر اصرار کرنے کو بہت بڑا سمجھتا ہوں کسی کو بے بھوک کھلانا زہر دینا ہے۔ لوگوں میں مرض ہوا کرتا ہے کہ اصرار کر کر کے کھلایا کرتے ہیں خاص کر عورتیں بچوں کو بہت بری طرح ٹھساتی ہیں۔ ایک صاحب نے یہاں غضب کیا کہ ان کے بچے نے روزہ رکھا تھا افطار میں اس نے پانی بہت پی لیا تو روٹی نہ کھائی باپ نے کہا میاں کچھ تو کھالو اس نے انکار کیا تو کہا اچھا دودھ ہی پی لو اس نے دودھ پی لیا بس روزہ کی گرمی کے بعد جو دودھ معدہ میں پہنچا ہے اس نے فوراً اخلاط میں گڑبڑ پیدا کی اور بچہ ایسا سخت بیمار ہوا کہ مرنے سے بچ گیا۔ تو بچوں کو اصرار کر کے کھلانا اور زیادہ بُرا ہے وہ تو خود ہی کھانے کے بہت حریص ہوتے ہیں اگر بچہ کبھی انکار کرے تو سمجھ لو کہ یا تو اس نے بہت ہی کھالیا ہے یا کسی مرض کی وجہ سے انکار کرتا ہے۔ اب تم اصرار کر کے ہرگز نہ کھلاؤ یہ تو زیادہ کھانے کے نقصانات تھے مگر اس میں ایک خوبی بھی ہے (یہ لطیفہ کے طور پر فرمایا) وہ یہ کہ زیادہ کھانے والے کو خدا کی نعمت کی قدر بہت ہوتی ہے یہ کھانے پر بڑی محبت سے گرتا ہے اس لئے میں زیادہ کھانے والوں کو قدر دانِ نعمت کہا کرتا ہوں۔ کم کھانے والے کھانے پر اس طرح نہیں گرتے تو ان کو اس نعمت کی قدر زیادہ نہیں جیسے حضرت حاجی صاحب نے ایک موقع پر ایسا ہی فرمایا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت کے ایک مقرب مرید کو کسی شخص نے اپنے مال کی تقسیم کے لئے وصی بنایا تھا کہ اس کے مستحقین میں تقسیم کر دیا جائے۔ انھوں نے یہ چاہا کہ حضرت کی رائے کے موافق تقسیم کروں۔ چنانچہ مستحقین کے نام ایک پرچہ لکھ کر لائے اور

حضرت سے عرض کیا کہ میں نے یہ مال ان لوگوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ حضرت کی کیا رائے ہے۔ اس پرچہ میں سارے نام ان لوگوں کے تھے جو متوکل تھے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نے فلاں فلاں کے نام نہیں لکھے وہ کہنے لگے کہ حضرت وہ تو امراء سے مل کر مانگ لیتے ہیں سوال کر کے کھا لیتے ہیں اور یہ لوگ کسی سے مانگنے نہیں جاتے ان کی یہ حالت ہے یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف کہ صورت دیکھ کر ناواقف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بڑے مالدار ہیں جبھی تو کسی سے سوال نہیں کرتے اس لئے میں نے ان کو ترجیح دی کہ یہ کسی سے مانگنے نہیں جاتے۔ حضرت نے فرمایا سبحان اللہ جو نعمت کے قدر دان ہیں تم ان کو تو دیتے نہیں (جن کو پیسہ پیسہ عزیز ہے جو اس کے لئے عزت و آبرو بھی خرچ کر دیتے ہیں) اور ان کو دیتے ہو جن کو سلطنت کی بھی پروا نہیں۔ دوسرے یہ بھیک مانگنے والے اس لئے بھی زیادہ قابل رحم ہے کہ خدا تعالیٰ بھی ان کے خاص ذمہ دار نہیں چنانچہ ارشاد ہے من جعل ھمومہ ھما واحدا ھم الآخرۃ کفی اللہ ھمومہ کلھا ومن تشعبت بہ الھموم لم یبال اللہ فی ای وادھلک اوکما قال (جو شخص سارے فکروں کو چھوڑ کر ایک فکر اختیار کر لے یعنی آخرت کی فکر تو حق تعالیٰ اس کے سب فکروں کی کفایت کرتے ہیں اور جو خود مختلف افکار میں مبتلا ہو حق تعالیٰ کو اس کی پروا نہیں کہ یہ کس جنگل میں جا کر ہلاک ہوتا ہے ۱۲ جامع) اور متوکلین کے بارہ میں نص موجود ہے ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ جو خدا پر توکل کرے خدا اسے کافی ہے تو جس کا خدا ذمہ دار ہے۔ آپ کو اس کی تو فکر ہوئی اور جس کا خدا بھی ذمہ دار نہیں اس کی فکر نہ ہوئی۔ سبحان اللہ عارفین کے علوم کیسے پاکیزہ ہوتے ہیں ان کی نظر حقیقت پر پہنچی ہے ورنہ ظاہر میں تو متوکلین کی حالت زیادہ قابل رحم معلوم ہوتی ہے مگر حاجی صاحب نے

لطیفہ کے پیرایہ میں بتلا دیا کہ جو سچا متوکل ہے اس کو کسی کے اہتمام کی ضرورت نہیں ارحم الراحمین اس پر رحم کرنے کے لئے کافی ہے۔ باقی جو جھوٹا متوکل ہو وہ محض مدعی ہے اس کا ذکر نہیں جیسے بعض لوگ توکل کا دعویٰ کرتے ہیں (یہ ایک واقعہ ہے) اور جب پریشانی پیش آتی ہے تو سوداگروں کو خطوط لکھتے کہ آجکل جاڑے کے کپڑے نہیں ہیں اتنی رقم نہیں جو بنالوں قوت دماغ کے لئے دودھ کی بھی ضرورت ہے مگر وسعت نہیں آپ دعا کریں کہ حق تعالےٰ سب باتوں کا انتظام فرمادیں۔ سبحان اللہ دعا کے واسطے بھی سوداگر ہی رہ گئے تھے اگر سچ مچ دعا کرانا ہی مقصود تھا تو غرباء سے کرائی ہوتی اور متوکل تو اپنی ضروریات کے لئے کسی سے دعا کرانے کی ضرورت کیا ہے خدا سے خود کیوں نہیں دعا کرتا ان حرکتوں سے توکل کا نام بھی کیوں بدنام کرتا ہے۔ بس یہ شخص مخلوق کو بے وقوف سمجھتا ہے کہ وہ اس طرح لکھنے کو سوال نہ سمجھیں گے مگر آجکل دنیا کے معاملہ میں ہر شخص عقلمند ہے اور یہ تو کوئی ایسی دقیق بات بھی نہیں جس کو کوئی نہ سمجھ سکے کھلی ہوئی بات ہے کہ اپنی حاجات ظاہر کرکے دعا کرانے کا مطلب بجز سوال کے اور کیا ہے اگر اس پر بھی توکل چلا جارہا ہے۔ توکل کیا ہوا بی تمیزہ کا وضو ہوگیا۔ بی بی تمیزہ ایک فاحشہ عورت تھی کسی بزرگ نے اس کو نماز کی تاکید کی اور اپنے سامنے وضو بھی کرادیا کہ اس طرح وضو کیا کرتے ہیں۔ نماز بھی سکھلادی ایک مدت کے بعد وہ بزرگ پھر اس کے پاس سے گذرے۔ پوچھا بی تمیزہ نماز پڑھتی ہو۔ کہا حضور روز پانچوں وقت پابندی سے پڑھتی ہوں۔ پوچھا وضو بھی کرتی ہو کہنے لگی کہ وضو تو اس روز آپ نے کرادیا تھا۔ اللہ کی بندی اسی وضو سے برسوں نماز پڑھتی رہی۔ بس جس طرح اس کا وضو نہ سونے سے ٹوٹتا تھا

نہ پیشاب پاخانہ سے نہ زناکاری سے اسی طرح آجکل بعض لوگوں کا توکل ہے کہ سوال بھی کرلیں اور متوکل کے متوکل بنے رہیں استغفر اللہ۔ غرض میں کہہ رہا تھا کہ جو امرار نمک اور چورن کے سہارے کھانا کھاتے ہیں وہ مرض کو خریدتے ہیں اسی طرح جو لوگ مشتہیات سے قوت جماع کو بڑھاتے ہیں وہ اپنی صحت برباد کرتے ہیں اس کے لئے بھی یہی قاعدہ ہونا چاہیئے کہ بدون سخت تقاضے کے بی بی کے پاس نہ جائیں مشتہیات کے استعمال سے قوت زیادہ نہیں ہوتی ہاں استسقار ہو جاتا ہے جیسے استسقار والا کتنا ہی پانی پی لے مگر پیاس نہیں بجھتی یہی حال ان لوگوں کا ہو جاتا ہے کہ کثرت مقاربت سے بھی ان کی پیاس نہیں بجھتی تو یہ صحت کی دلیل نہیں بلکہ سخت مرض ہے جس کا انجام خطرناک ہے اطبا نے استسقار کی بیماری تو لکھی ہے مگر استطعام کا مرض کسی نے نہیں لکھا مگر ہم نے یہ مرض بھی دیکھا ہے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا کھانے سے پیٹ نہیں بھرتا وہ کھاتے ہیں اور قے کرتے ہیں اور قے کرکے پھر کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ تو بزرگوں نے زیادہ کھانے کے یہ نقصانات دیکھے اس لئے ترک طعام کو مجاہدہ میں داخل کیا اور دوسری چیز تھی زیادہ سونا سو زیادہ سونے میں یہ نقصان ہے کہ اس سے برودت بڑھ جاتی ہے جس سے قوت فکریہ کم ہو جاتی ہے اور قوت فکریہ کی کمی سے دنیا اور دین دونوں کے کام خراب ہوتے ہیں۔ نیز اس سے امور انتظامیہ میں بہت خلل پڑتا ہے ایسے شخص کو پابندی اوقات کبھی نصیب نہیں ہوتی سوچتا یہ ہے کہ آج سویرے اُٹھ کر فلاں فلاں کام کروں گا نیند آئی تو وقت کے بہت بعد آنکھ کھلی اب اس کام کو دوسرے کاموں کے وقت میں کرتا ہے۔ دوسرے کاموں کو کل پر رکھتا ہے پھر دوسرے

دن ارادہ کرتا ہے کہ آج دوپہر کو ایک گھنٹہ سوؤں گا پھر سویرے اٹھ کر کچھ کام کروں گا۔ وہاں ڈھائی گھنٹہ کے بعد آنکھ کھلی تو پھر سارا انتظام درہم برہم ہو گیا روز یہی قصہ رہتا ہے۔ اس لئے یہ شخص کبھی منتظم نہیں ہو سکتا اور بے انتظامی جڑ ہے بہت سی خرابیوں کی اِس سے دین کو بھی ضرر پہنچتا ہے اور دنیا کو بھی چنانچہ آجکل ہمارے بھائی دوسری قوموں کو دیکھ دیکھ کر ترقی کی ہوس کرتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی ترقی کا راز کیا ہے اس کو بھی اختیار کریں یاد رکھو ہر کام میں ترقی انتظام سے ہوتی ہے جو کام جماعت کے متعلق ہو اس میں انتظام اتحاد و اتفاق سے ہوتا ہے جب سب کام کرنے والے متفق ہوں اور ہر ہر شخص منتظم ہو اس وقت ترقی ہو سکتی ہے مگر ہمارے بھائیوں کا سارا انتظام تقریروں اور تحریروں تک ہوتا ہے تجویزیں بہت لمبی لمبی اور خوشنما ہوتی ہیں مگر جب کام شروع کریں گے تو اس بے انتظامی سے جو چار دن بھی نہ چل سکے اور اس کا تجربہ کر لیا جائے کہ انتظام وہی شخص کر سکتا ہے جو کم سوتا ہو۔ سویرے اٹھتا ہو علاوہ ازیں زیادہ سونے میں جس قدر وقت صرف ہو گا اس میں کچھ کام نہ ہو گا نہ دنیا کا نہ دین کا یہ سارا وقت بیکار جاتا ہے بس جتنا وقت طبعی نیند کا ہے (جس کی مقدار اطباء نے ۶ گھنٹہ لکھی ہے ۱۲ جامع) وہ تو ضرورت میں صرف ہوا باقی سب رائیگاں گیا تو زیادہ سونے سے دنیا کی بھی کمی اور دین کا بھی نقصان ایسے شخص کی اکثر نمازیں بے وقت یا تنگ وقت میں ادا ہوتی ہیں خصوصاً عشاء اور فجر اور تہجد تو اُسے کہاں نصیب۔ اب تیسری چیز ہے زیادہ بولنا

بزرگوں نے اس میں یہ نقصان دیکھا کہ اس کے ہوتے ہوئے گناہوں سے بچنا مشکل ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ زیادہ بک بک کرتے ہیں وہ جھوٹ اور غیبت میں ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں اور کثرتِ کلام کے ساتھ ہر بات سوچ کر کرنا جو تدبیر ہے معاصی لسان سے بچنے کی دشوار ہے۔ اور اگر بالفرض کوئی شخص گناہوں سے بچا بھی رہا تو ایک نقصان سے تو کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا وہ نقصان کیا ہے ؎

دل ز پرگفتن بمیرد در بدن   گرچہ گفتارت بود دُرِّ عدن

(دل زیادہ بولنے سے بدن میں مردہ ہو جاتا ہے اگرچہ تیری گفتگو عدن کے موتی ہی جیسے کیوں نہ ہوں) یعنی کثرتِ کلام[1] سے دل مرجاتا ہے ظلمت پیدا ہوتی ہے قساوتِ قلب پیدا ہو جاتی ہے اور یہ وہ بلا ہے جس کے بعد کسی گناہ میں مبتلا ہو جانا بھی بعید نہیں ساری طاعات کا مدار حیاتِ قلب پر ہے۔ نیک کاموں کی توفیق نورِ قلب سے ہوتی ہے اور تمام معاصی کا منشا قساوت وظلمتِ قلب ہی ہے۔ جب قلب میں حیات و نور ہی نہ رہا بلکہ اس کے بجائے قساوت وظلمت پیدا ہوگئی تو اب یہ شخص سب گناہوں کے لئے قابل ہو جاتا ہے۔ پس کثرتِ کلام کے ساتھ گناہوں سے بچنا چند دن کا ہوتا ہے پھر معاصی کی طرف میلان ہونے لگتا ہے۔ اب رہی چوتھی چیز یعنی زیادہ میل جول سو اس میں یہ نقصان ہے کہ جتنا وقت اختلاط میں صرف ہوتا ہے اتنی دیر یہ شخص بیکار رہتا ہے۔ دین کا کوئی کام اس

[1] اس سے مراد وہ کثرت ہے جو اقوال مباحہ میں ہو اور اگر اصلاح خلق و تربیت طالبین کے لئے ہو جس میں احکام شرعیہ و مسائل سلوک کی تحقیق بھی داخل ہے وہ اس سے خارج ہے کیونکہ یہ کثرت اقوال مباحہ میں نہیں بلکہ اقوال واجبہ یا مستحبہ میں ہے اور ایسے اقوال سب داخل ذکر ہیں اور ذکر سے حیات قلب اور نور میں ترقی ہوتی ہے فافہم ۱۲ جامع

سے نہیں ہوتا رہا یہ کہ مسلمانوں سے ملنے میں بھی تو ثواب ہے تو اس سے مراد بقدر ضرورت ملنا ہے۔ اپنے پاس آنے والوں کی تواضع دس پندرہ منٹ میں ہوسکتی ہے اس کے لئے گھنٹے صرف کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے زیادہ میل جول میں معمولات کی پابندی نہیں ہوسکتی ایک کام لے کر بیٹھے تھے کوئی ملنے آگیا تو کام رخصت ہوا اب باتوں میں گھنٹے لگا دیئے جاتے ہیں جس سے سارے کاموں کا پتھرا ہو جاتا ہے تو ایسا شخص ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ اور میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بے انتظامی دنیا اور دین دونوں کے لئے مضر ہے دوسرے اختلاط میں خاموشی دشوار ہے خواہ مخواہ بولنا ہی پڑتا ہے جس میں اکثر غیبت و شکایت میں بھی ابتلا ہو جاتا ہے۔ تیسرے کثرت اختلاط سے باہم دوستی ہو جاتی ہے جس میں بعض دفعہ اپنے راز دوسرے پر ظاہر ہو جاتے ہیں پھر یہ دوست اپنے دوسرے دوستوں پر ان رازوں کو ظاہر کر دیتا ہے کیونکہ اس کو ان پر ویسا ہی اعتقاد تھا جیسا تم کو اس پر مگر بعض دفعہ ان میں تمہارا کوئی دشمن ہوتا ہے جو راز کو معلوم کر کے تم کو ضرر پہنچا دیتا ہے۔ نیز بعض دفعہ خود آپ کا دوست ہی بدل جاتا ہے اور دوست جب دشمنی پر آمادہ ہوتا ہے تو وہ اور دشمنوں سے زیادہ ایذا دیتا ہے۔ اسی لئے عرب کی مثل ہے اتق شر من اَحْسَنْتَ الیہ یعنی جس پر تم نے احسان کیا ہو اس کے شر سے بچتے رہو۔ اور آجکل یہ کچھ بعید نہیں کیونکہ اس زمانہ میں دوستی اور محبت اکثر اغراض کے لئے ہوتی ہے، جب تک غرض پوری ہوتی رہی دوست ہیں اور جس دن اغراض میں کمی آئی اس دن سے دشمن ہیں۔ چنانچہ تجربہ ہو گیا کہ جن لوگوں پر پورا اعتماد تھا کہ یہ دوستی سے کبھی منہ

بدلیں گے وہ بھی اپنی اعــراض میں کسی وقت نقصان دیکھ کر بالکل بدل گئے اور ایسے بدلے کہ دشمن سے بھی بدتر دشمن بن گئے پھر دشمنی سے دنیا کا ضرر تو ہوتا ہی ہے دین کا بھی نقصان ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں اطمینان قلب فوت ہوجاتا ہے اور اطمینان قلب سب کاموں کی جڑ ہے دین کا تو کوئی کام بدون اطمینانِ قلب کے اچھی طرح ہو ہی نہیں سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے بغیر دنیا کا بھی کوئی کام نہیں ہوتا تو اختلاط میں یہ کتنا بڑا ضرر ہے۔ ہمارے حاجی صاحب کو جمعیت قلب کا بہت اہتمام تھا اسی لئے حضرت نے سالکین کو وصیت کی ہے کہ کسی سے نہ دوستی بڑھائیں نہ دشمنی پیدا کریں بس سب سے معمولی صاحب سلامت رکھیں۔ کیونکہ دشمنی تو پریشانی قلب کا سبب ہے اور آجکل دوستی بھی اس کا سبب ہوجاتی ہے (جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ۱۲)

اس تفصیل سے آپ کو زیادہ کھانے زیادہ سونے زیادہ بولنے زیادہ میل جول بڑھانے کے نقصانات اور مضرتیں بخوبی معلوم ہو گئی ہوں گی۔ پس گو یہ چاروں فی نفسہ مباح ہیں مگر ایسے مباح ہیں کہ تمام گناہوں کا سلسلۂ نسب انہی تک پہنچتا ہے۔ اس لئے بزرگوں نے ان کے ترک کو مجاہدہ میں داخل کیا خلاصہ یہ ہوا کہ مجاہدہ تو ترک معاصی ہی ہے مگر ترک معاصی عادۃً ان ترک اربعہ مباحہ پر موقوف ہے تو ان کا ترک بھی مجاہدہ ہے (لان مقدمۃ الواجب واجب جس پر واجب موقوف ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے ۱۲)

الحمد للہ اس تقریر سے ان ارکان اربعہ کا مجاہدہ میں داخل ہونا واضح ہوگیا اور تقسیم مذکور پر بھی اشکال نہ رہا کیونکہ حاصل تقریر کا یہ ہوا کہ مجاہدہ

حقیقیہ تو ارتکاب طاعات و اجتناب معاصی ہی کا نام ہے اور اس معنی کر یہ ارکان اربعہ مجاہدہ میں داخل نہیں تھے مگر چونکہ اجتناب معاصی عادۃً انہی پر موقوف ہے اس لئے حکماً یہ بھی مجاہدہ میں داخل ہو گئے تو اب مجاہدہ کی دو قسمیں ہو گئیں۔

(۱) مجاہدہ حقیقیہ یعنی فعل طاعات و ترک معاصی۔ (۲) مجاہدہ حکمیہ یعنی ترک المباحات التی تجرالی المعاصی و الی ترك الطاعات (یعنی ان مباحات کا چھوڑنا جو ارتکاب معاصی و ترک طاعات کی طرف مفضی ہوتے ہیں اور وہ یہی چار مباحات ہیں جن کا ذکر بالتفصیل اوپر ہو چکا ہے ۱۲ جامع)

ایسے مباحات کا ترک کرنا یہ حکمی مجاہدہ ہے۔ اور چونکہ بوجہ مقدمہ ہونے کے یہ حقیقی ہی کے حکم میں ہے اس لئے اس کے فضائل بھی وہی ہیں جو حقیقی کے فضائل ہیں اور اس کا اہتمام بھی ویسا ہی ضروری ہے جیسا حقیقی مجاہدہ کا اہتمام ضروری ہے۔ اب یہاں ایک اشکال وارد ہوگا وہ یہ کہ جب ان مباحات اربعہ کا ترک کرنا حقیقی مجاہدہ نہیں بلکہ حکمی ہے تو اس کی کیا وجہ کہ صوفیہ نے مجاہدہ کے بیان میں حقیقی سے تعرض ہی نہ کیا بلکہ محض مجاہدۂ حکمی کے بیان پر اکتفا کر گئے حالانکہ حقیقی احق بالذکر تھا تو بات یہ ہے کہ مجاہدہ حقیقیہ کا مجاہدہ ہونا تو ظاہر تھا اس کے بیان کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ بیان اسی بات کو کیا جاتا ہے جو خود سمجھ میں نہ آسکے اور جو بات از خود سمجھ میں آسکے اس کو بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے اور اس قاعدہ کو صوفیہ نے سُنّت نبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور عادت الٰہیہ سے اخذ کیا چنانچہ شریعت نے اسی بات کا امر کیا ہے جس کی طرف از خود توجہ نہ ہو اور اسی بات سے منع کیا ہے جس سے لوگ کم بچتے ہوں۔ چنانچہ شراب نوشی سے منع کیا ہے۔

پیشاب نوشی سے نہیں منع کیا کیونکہ شراب نوشی میں لوگوں کو ابتدا ر تھا اور پیشاب بھلا کون پیتا ہے تو اُس سے منع کرنے کی ضرورت تھی اِس سے منع کرنے کی ضرورت نہ تھی ، اس سے تو انسان کی طبیعت خود بھی بچتی ہے ہاں پیشاب لگ جانے کے احکام شریعت نے بیان کئے ہیں کیونکہ اس میں ابتلا متوقع ہے اسی عادت وسنّت کے موافق صوفیہ نے مجاہدہ حقیقیہ سے تعرض نہیں کیا کیونکہ جانتے تھے کہ اس کا مجاہدہ ہونا کسی مسلمان پر مخفی نہ ہوگا اصل وجہ تو اس کے بیان نہ کرنے کی یہ تھی مگر اب جاہل صوفیہ بلکہ بہت سے لکھے پڑھے صوفی بھی اسی غلطی میں بتلا ہیں کہ وہ مجاہدہ بس انہی ارکان اربعہ کو سمجھتے ہیں جن کا تعلق مباحات سے ہے اور اعمال واجبہ اور ترکِ معاصی کا کچھ بھی اہتمام نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک صوفی رات بھر جاگتے تھے اور اس غرض کے لئے افیون کھایا کرتے تھے سبحان اللہ سونے سے تو پرہیز جو فی نفسہ مباح تھا اور نشہ کی چیز سے پرہیز نہیں جو حرام اور اقل درجہ مکروہ تحریمی تو ضرور ہے ، کیونکہ افیون بقدر سکر کھانا حرام ہے اور اگر قدر سکر سے کم ہو تو ضرورت کے وقت جائز ہے بلا ضرورت مکروہ ہے اور جاگنا کونسی ضرورت ہے جس کے لئے افیون کا استعمال جائز ہو جائے۔ بس ان حضرات کی وہی مثال تھی کہ گڑ کھادیں اور گلگلوں سے پرہیز جیسے آجکل بعضے مولوی ان باتوں سے تو منع کرتے ہیں جن کو وہ خود بھی پہلے جائز سمجھتے اور کرتے آتے تھے اور ان باتوں سے نہیں روکتے جن کو ہمیشہ سے حرام سمجھتے تھے۔ اور اگر کسی نے کسی کام کے متعلق ان سے کہا بھی کہ یہ تو گناہ ہے شرک ہے اس سے بھی تو منع کرنا چاہیئے۔ تو یہ جواب دیدیتے ہیں

میاں اس وقت تو کام ہونے دو گناہ کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ یہی مذاق اس صوفی کا تھا کہ اس وقت تو جاگنا چاہیئے افیون کے گناہ کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ بھلا ان علماء سے کوئی پوچھے کہ جب تم گناہوں سے مخلوق کو نہیں روکتے تو مباحات سے کیوں روکتے ہو اور جو شخص ان مباحات کا ارتکاب کرے اس پر ملامت اور طعن کیوں کرتے ہو گناہوں میں تو اتنا تساہل اور مباحات سے اتنا اجتناب یہ تو وہی مثال ہوئی جیسے ایک شخص نے کسی عورت سے زنا کیا تھا اُسے حمل رہ گیا بچہ ہوا۔ بدنامی ہوئی کسی دوست نے کہا کمبخت تو نے عزل ہی کر لیا ہوتا جو اس بدنامی کی تو نوبت نہ آتی تو آپ کیا کہتے ہیں کہ ہاں خیال تو ہوا تھا مگر میں نے یہ سُنا تھا کہ عزل مکروہ ہے، اس لئے نہ کیا جی ہاں اور زنا تو بہت حلال تھا واہیات مثال تو گندی ہے مگر آجکل کی حالت کے مطابق ہے۔ بہرحال مجاہدہ کی دونوں ہی قسموں کا اہتمام لازم ہے اور یہاں سے علماء خشک کی غلطی بھی ظاہر ہوگئی جو صرف اعمال واجبہ و ترکِ معاصی ہی کا اہتمام کرتے ہیں مجاہدہ حکمی کا بالکل اہتمام نہیں کرتے بلکہ اس کو مجاہدہ شرعیہ سے خارج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ترک مباحات مجاہدہ کیونکر ہوگیا سو میں بتلا چکا ہوں کہ مجاہدہ حقیقیہ عادۃً ان مباحات کے ترک ہی پر موقوف ہے بدون اس کے ارتکاب طاعات و ترک معاصی میں سہولت نہیں ہوتی اور مقدمہ مامور بہ کا مامور بہ ہوتا ہے تو یہ بھی مجاہدہ شرعیہ میں داخل ہے اور اس کا اہتمام بھی ویسا ہی ضروری ہے بلکہ ایک اعتبار سے مجاہدہ حقیقیہ سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ ؎

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل ؛ چو پر شد نہ شاید گذشتن بہ پیل

(کسی چشمہ کی ابتدا کو سرمہ کی سلائی سے بھی بند کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ پانی سے پُر ہوگیا تو ہاتھی کے گذرنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا)

قاعدہ یہی ہے کہ مقاصد سے زیادہ مقدمات کا اہتمام کیا جاتا ہے تب مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ نحو وصرف میں اس قدر محنت کی جاتی ہے کہ علوم مقصودہ میں اس کی آدھی محنت بھی نہیں کی جاتی۔ بعض دفعہ مطالعہ کا اتنا اہتمام کیا جاتا ہے کہ سبق کا بھی اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ مفتاح استعداد ہے۔ اگر مطالعہ کی استعداد پیدا ہوگئی تو سبق کو بدون استاد کے بھی سمجھ لے گا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے لا تقربوا الزنا فرمایا ہے (کہ زنا کے پاس مت جاؤ ۱۲) لا تفعلوا الزنا نہیں فرمایا لا تقربوا الزنا سے مقدمات زنا سب حرام ہوگئے جیسے نگاہ کرنا تصور کرنا۔ خلوت میں نامحرم کے پاس بیٹھنا اس کو ہاتھ لگانا وغیرہ وغیرہ کیونکہ اگر ان مقدمات کو حرام نہ کیا جاتا تو لوگ ان میں تساہل کرتے اور مقدمات میں مبتلا ہو کر پھر بچنا مشکل ہے پھر تو وہ یہ کہے گا ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ   باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(دریا کی گہرائی میں ایک تختہ سے باندھ دیا ہے اور پھر کہتا ہے کہ تو دامن تر مت کر ہوشیار رہنا)

نامحرم کے ساتھ خلوت میں بیٹھ کر پھر معصیت سے بچا رہنا بہت ہی دشوار ہے شیطان کا مقولہ ہے جو اس نے بعضے بزرگوں سے کہا تھا کہ اگر خلوت میں جنیدؒ جیسا مرد اور رابعہؒ بصری جیسی عورت جمع ہو جادیں تو میں ان کے خیالات بھی خراب کردوں پھر ہماری اور آپ کی تو کیا ہستی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کی یہ بڑی رحمت ہے کہ جس کام سے منع کرنا چاہا اس کے مقدمات کو بھی حرام کر دیا۔ اگر مقدمات حرام نہ ہوتے تو پھر معاصی سے بچنا بہت لوگوں کے

حق میں گویا تکلیف مالا یطاق ہو جاتا گویا بھلا ایک بھوکا آدمی تنہا گھر کے اندر دسترخوان بچھا ہے اور روٹی کے سامنے بیٹھا رہے اور روٹی سے صبر کئے رہے بہت مشکل ہے۔ ہاں روزہ دار ہو تو شاید بچا رہے۔ اور اگر روزہ بھی نہ ہو یا یہ شخص روزہ کی فرضیت ہی کا قائل نہ ہو تو پھر بھوکا اس حال میں کھانے سے رکنا دشوار ہے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ۔ ؎

ملحدِ گرسنہ در خانہ خالی برخواں عقل باور نکند کز رمضاں اندیشد

(منکرِ خدا بھوک کا مارا کسی خالی گھر میں کھانے لگے ہوئے دسترخوان پر ہو تو عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ وہ رمضان کے احترام سے باز رہے گا)

اسی لئے حق تعالیٰ نے نظر بد سے بھی منع کر دیا گو اس میں کلفت بہت ہوتی ہے کیونکہ دفعۃً نگاہ پڑ جانے کے بعد اس کو فوراً پھیر لینا بڑا گراں گذرتا ہے مگر یہ کلفت تو ایک ساعت کے لئے ہے اگر نگاہ بھر کر دیکھ لیتا تو شاید ساری عمر کا وبال ہو جاتا جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشاں زدۂ بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ

(میرے سینہ کے اندر تو نے زخم بے نشاں لگایا ہے میں حیرت زدہ ہوں کہ تو نے عجیب تیر بے کماں مارا ہے۔)

واقعی تیر نگاہ بہت سخت ہوتا ہے یہ تو بعض دفعہ دل میں بیٹھ کر نکلنا جانتا ہی نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ اس نگاہ کی بدولت ایمان سے بھی گئے شیخ ابن القیمؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص ایک لڑکے پر عاشق تھا محبوب اس سے بیرخی کرتا تھا حتیٰ کہ اسی غم میں وہ مرنے لگا کسی نے معشوق کو اطلاع دی اس کو رحم آیا اور اس کے ملنے کے لئے چلا کسی نے عاشق کو خبر کر دی کہ وہ آ رہا ہے یا تو مر رہا تھا یا سنتے ہی اُٹھ بیٹھا لڑکے نے راستہ میں پہونچ کر کہ میری

بدنامی ہوگی ارادہ ملتوی کردیا اور اپنے گھر کا راستہ لیا اور اس شعر پر عمل کیا ؎

کہا اس بت سے مرتا ہے وہ مومن کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

کسی نے عاشق کو اس کی بھی اطلاع کردی کہ وہ تو اپنے گھر کو لوٹ گیا بس یہ سنتے ہی گر پڑا اور نزاع شروع ہوگیا لوگوں نے کلمۂ توحید کی تلقین کی تو بجائے کلمہ کے معشوق کو خطاب کرکے کہتا ہے ؎

رضاك اشهى الى فوادى ✣ من رحمة الخالق الجليل

دلبراں جب اپنی ادا دلبری سے اپنی نزاکت حسن کا اظہار کرتے ہیں تو بڑے بڑے زاہدوں کے ایمان میں رخنہ ڈالتے ہیں)

اور اسی پر ختم ہوگیا نعوذ باللہ۔ اسی طرح میرے شناسا ایک بوڑھے قاضی صاحب نمازی ثقہ تہجد گذار تسبیح گردان کسی یہودی پر عاشق تھے خود مجھ سے کہتے تھے کہ صاحب میرا تو نہ دین رہا نہ مذہب رہا میرا تو وہی دین ہے جو اس کا ہے اگر وہ مسلمان ہے تو میں مسلمان ہوں اگر وہ یہودی ہے تو میں یہودی ہوں اگر نصرانی ہے تو میں نصرانی ہوں انا للہ وانا الیہ راجعون میں نے کہا توبہ کیجئے خیر توبہ کرلی لوگ اس نظر بد کو ہلکی بات سمجھتے ہیں مگر یہی کمبخت جڑ ہے سارے ناپاک عشق کی جس میں کبھی ایمان تک بھی برباد ہوجاتا ہے تو کیا اب بھی یہ ہلکی چیز ہے یہ تو بہت سخت احتیاط کے قابل ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

دلبراں گر دلبری زیباں کنند ✣ زاہداں را رخنہ در ایماں کنند

اس لئے مجاہدہ حکمیہ کو غیر ضروری سمجھنا زاہدان خشک کی غلطی ہے جیسا حقیقی مجاہدہ کا اہتمام نہ کرنا۔ جہلاء صوفیہ کی غلطی ہے یہاں تک مجاہدہ کی حقیقت اور اس کے اقسام معلوم ہوگئے اور اس پر جو اشکالات وارد ہوتے تھے ان کا جواب بھی ہوگیا۔ اب سمجھئے کہ مجھے اصل پر

طاعات کی حکمت بیان کرنا مقصود ہے جو اس زمانہ میں (یعنی رمضان میں) کی جاتی ہیں تو حق تعالیٰ نے اول یہ مضمون قلب میں ڈالا کہ مشترک حکمت ان افعال کی مجاہدہ ہے اور یہ مضمون اجمالاً متقدمین کے کلام میں بھی موجود ہے پھر یہ بات ذہن میں آئی کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور حکمی۔ اس کے بعد میرے دل پر یہ بات وارد ہوئی کہ ان عبادات میں تفصیل حکمت یہی چار مجاہدے ہیں جن کو صوفیہ مجاہدہ کے ارکان اربعہ قرار دیتے ہیں چنانچہ ان عبادات میں ایک تو روزہ ہے اس کی حکمت تقلیل طعام ہے۔ دوسری تراویح ہے اس کی روح تقلیل منام ہے۔ تیسری عبادت ان ایام کی تلاوت قرآن ہے۔ تلاوت قرآن کو ان ایام سے خاص خصوصیت ہے اس کا ثبوت فعل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے۔ احادیث میں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے جبرئیل علیہ السلام رمضان میں قرآن کا دور کرتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کے علاوہ بھی آپ اس زمانہ میں تلاوتِ قرآن زیادہ کرتے اور قرآن کا اہتمام بہت فرماتے تھے کیونکہ دَور کرنا خاص اہتمام ہے تو گویا اس طرح رمضان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تلاوتِ قرآن زیادہ کرائی گئی ہے اور کثرتِ تلاوت کے لئے تقلیل کلام لازم ہے۔ جب آدمی قرآن پڑھتا رہے گا تو یقیناً باتوں میں کمی آئے گی تو تلاوتِ قرآن کی روح تقلیل کلام ہے۔ چوتھی عبادت اخیر رمضان میں اعتکاف ہے اس کی روح تقلیل اختلاط مع الانام ہے کیونکہ اول تو بہت لوگ مسجد میں آتے ہی نہیں جیسے ایک گنوار کا قصہ ہے اس کا بچھڑا چھوٹ کر مسجد میں گھس آیا وہ اس کے پیچھے پیچھے آیا تو مسجد کا ملا بُرا بھلا کہنے لگا کہ لوگ نہ نماز پڑھیں نہ کچھ کریں اور جانوروں کو مسجد میں چھوڑ دیتے ہیں تو گنوار کہتا ہے کہ بس زیادہ کیوں بڑبڑ لگائی ہے

بیوقوف جانور تھا آگیا کبھی ہمیں بھی آتے دیکھا ہے ایسے لوگوں کے نزدیک تو مسجد میں آنا آدمیوں کا کام ہی نہیں جانوروں کا کام ہے ایسے تو بھلا مسجد میں کیوں آنے لگے اور جو لوگ آتے بھی ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ بس نماز پڑھی اور اپنے گھر کا رستہ لیا مسجد میں ان کا دل لگتا ہی نہیں جو نماز کے بعد کچھ دیر بیٹھیں اللہ اللہ کریں یا قرآن پڑھیں وہ تو نہ معلوم نماز کے لئے بھی دس پانچ منٹ کس مصیبت سے مسجد میں ٹھہرتے ہیں۔ دن بھر چوپایوں میں باتیں بناتے رہتے ہیں اس سے ان کے کسی کام میں ہرج نہیں ہوتا اور مسجد میں اگر امام نے نمازیوں کے انتظار کے لئے جماعت میں کچھ دیر کر دی تو اس پر اعتراض ہوتے ہیں کہ ہمیں قید ہی کر لیا۔ ہمارے کام کا ہرج ہو رہا ہے۔ چنانچہ کانپور میں ایک شخص کہتے تھے کہ میں تراویح پڑھ کر گھر جاتا تھا ایک مسجد میں سے تراویح پڑھ کر لوگ نکل رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ تراویح کیا ہے قرنطینہ ہے جب ان لوگوں کو نماز پڑھنا بھی قرنطینہ معلوم ہوتا ہے تو نماز کے بعد تو وہ کیا مسجد میں ٹھہریں گے اسی لئے الم ترکیف کی مسجد ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ جلدی سے فراغت کر کے گھر کا رستہ لیں۔

بزرگوں نے کہا ہے۔ المؤمن فی المسجد کالسمك فی الماء والمنافق فی المسجد کالطیر فی القفس۔ یعنی مؤمن کی حالت مسجد میں ایسی ہوتی ہے جیسے مچھلی پانی میں ہو کہ اس کو مسجد میں آکر راحت و سکون حاصل ہوتا ہے اور منافق کی حالت مسجد میں ایسی ہوتی ہے جیسے پرندہ پنجرے میں قید ہو

قلت و یشھد لہ حدیث اذا رأیتم الرجل یتعاھد المسجد فاشھدوا لہ بالایمان فان اللہ تعالیٰ یقول انما یعمر مساجد اللہ من اٰمن باللہ

الآیۃ اخرجہ احمد وابن منیع والترمذی وابن ماجۃ والدارمی وابن مردویہ من حدیث ابی الہیثم عن ابی سعید مرفوعًا بھذا وقال الترمذی انہ عن غریب صححہ ابن حزیمۃ وابن حبان والحاکم ولفظ الدیلمی عن معاذ بن جبل بہ مرفوعًا اذا رائیتم الرجل یلزم المسجد فلا تحرجوا ان تشہد والہ انہ مومن اھ مقاصد حسنہ ص ۱۸

قلت ولما کان لزوم المسجد وتعاھدہ من علامۃ الایمان کان عکسہ من علامۃ النفاق ویستثنیٰ منہ من لا یقدر علےٰ زیادالمکث فی المسجد لغلبۃ ھیبتہ حضرۃ اللہ علیہ فمثلہ یخرج من المسجد سریعًا کما فرغ من الفرض فہو مؤمن کامل حقا لکون قلبہ متعلقا بالمسجد دائما وملازمًا لہ ولو لم یلابسہ بالمکث الطویل اولعذر آخر ۱۲ جامع

الحمدللہ ہماری جماعت کا لقب مخالفین نے مسجد کا مینڈھا رکھا ہے کہ ان کو مسجد کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہر وقت مسجد ہی میں پڑے رہتے ہیں اس میں انھوں نے ہمارے مومن کامل ہونے کا اقرار کرلیا۔ والفضل ماشہدت بہ الاعداء وہ تو طعن کی نیت سے کہتے ہیں، مگر ہم اس لقب سے خوش ہیں۔

کیرانہ میں ایک طالب علم کو کسی نے کہا تھا کہ وہ آرہے ہیں مسجد کے مینڈھے تو اس نے خوب جواب دیا کہ پھر بھی دنیا کے کتّوں سے تو افضل ہیں (الدنیا جیفۃ وطالبھا کلاب ۱۲) خبر بھی ہے یہ مسجد کے مینڈھے کیسے ہیں یہ ایسے مینڈھے ہیں کہ جب اِن کو دین کی مستی سوجھتی ہے تو سارے عالم پر حکومت کرتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں — کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں مگر وقت مستی مجھے دیکھ کہ آسمان پر ناز اور ستاروں پر حکمرانی کرتا ہوں)

اور فرماتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم شہان بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

(گدایان عشق الٰہی کو حقیر مت جانو کہ یہ اللہ والے شہان بے کمر و خسروان بے کلاہ ہوتے ہیں)

اور فرماتے ہیں ؎

درسفالیں کاسۂ رنداں بخواری منگرید ٭ کیں حریفاں خدمت جام جہاں بیں کردہ اند

(رندان بادۂ حقیقی کے کاسۂ سفالیں کو حقارت سے مت دیکھو کہ ان حضرات نے عاشقان حق کے میکدہ کی خدمت کی ہے۔ یعنی ان کی صحبت میں رہے ہیں)

اور یہ باتیں ہی باتیں نہیں بلکہ اہل اللہ نے کرکے دکھلا دیا ہے کہ ان کے سامنے سلاطین کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک بار حضرت شاہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس غالباً جہانگیر حاضر ہوئے۔ اس وقت شاہ صاحب اپنے حجرہ میں تھے اور باہر ایک خادم کو اپنی ایک گدڑی دے رکھی تھی کہ اس کی جوئیں دیکھ دے۔ خادم نے جو بادشاہ کی سواری دیکھی دوڑ کر حجرہ کی کنڈی ہلائی کہ حضرت جلدی کواڑ کھولئے۔ شاہ صاحب اٹھے اور کواڑ کھول کر پوچھا کیا ہے، کہا بادشاہ کی سواری آگئی۔ فرمایا لاحول ولا قوۃ الا باللہ تو عجیب مہمل ہے میں تو سمجھا کوئی بڑی سی جوں پائی ہوگی اسے دکھلانے کو بلاتا ہے۔ یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ بادشاہ نے حاضری کی اجازت چاہی آپ نے اجازت دی مگر اس شان سے کہ پہلے تو پیر سکوڑ رکھے تھے، بادشاہ کے آتے ہی پیر پھیلا دیئے بادشاہ کے ساتھ ایک خشک مولوی بھی تھے ان کو یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی کہ یہ درویش بڑے ہی بے تہذیب ہوتے ہیں ان کو کسی کا بھی کچھ ادب نہیں۔ پوچھا شاہ صاحب آپ نے پیر کیوں پھیلا دیئے۔ فرمایا جب سے ہاتھ سکوڑ لئے پاؤں پھیلا دیئے

سبحان اللہ کیا مسکت اور بامعنے جواب تھا یعنی جو لوگ بادشاہوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ ان کی تعظیم کے لئے پیر سمیٹ لیا کرتے ہیں مگر جس نے ہاتھ سمیٹ لئے ہوں اس کو پیر پھیلانے کا حق ہے۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے کہا کہ سلطانِ اسلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں آپ کے ذمہ ان کی تعظیم واجب تھی۔ فرمایا یہ تمہارے بادشاہ ہوں گے تم تعظیم کرو۔ میرے تو غلامانِ غلام ہیں اس پر تو مولوی صاحب جھلا ہی اٹھے پوچھا یہ آپ کے غلامانِ غلام کدھر سے ہیں فرمایا کہ یہ ہوا وہوس کے غلام ہیں اور ہوا وہوس میرے غلام ہیں تو یہ میرے غلامانِ غلام ہوئے آپ نے دیکھا کہ یہ مسجد کے ملا ایسے کیسے ہوتے ہیں۔ یہ خلق سے ایسے مستغنی ہوتے ہیں کہ بادشاہوں کو بھی منہ نہیں لگاتے وہ اپنی اسی حال میں مست ہیں آخر کیوں نہ ہوں وہ ہیں کس کے دیوانے ؎

ما اگر قلاشِ وگر دیوانہ ایم ؛ مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگرچہ تہیدست اور دیوانہ ہیں مگر اس ساقی ازل کے اور اس کے پیمانہ کے مست ہیں)

اور جو کوئی ان کو طعن کی نیت سے دیوانہ کہتے ہے وہ اس کے جواب میں یوں کہتے ہیں ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد ؛ مرعسس را دید در خانہ نشد

(وہی دیوانہ ہے جوان کا دیوانہ نہیں ہے کوتوال کو دیکھا اور گھر کے اندر نہ بھاگا تو یہ خود دیوانہ ہے)

بخدا اس دیوانگی پر ہزاروں عقلیں قربان ہیں اسی بحر پر کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را ؛ بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دوراندیش کو ہم نے بہت آزمایا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو دیوانہ بنالیا)

ایک اور بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کی خدمت میں ایک بادشاہ حاضر ہوا جب وہ خانقاہ کے دروازہ پر پہونچا اور اندر جانے کا ارادہ کیا فوراً نقیب نے

ٹوکا کہ بلا اجازت اندر جانے کی ممانعت ہے تم یہاں ہی ٹھہرو میں شیخ سے اجازت لے کر آؤں تب جانا۔ بادشاہ جھلا ہی تو گیا مگر شیخ کے خیال سے خاموش رہا کیونکہ معتقد بن کر حاضر ہوا تھا یہ بزرگوں کے خدام بھی بڑے دلیر ہوتے ہیں یہ اپنے شیخ کے حکم کے سامنے نہ کسی رئیس کی پروا کرتے ہیں نہ بادشاہ کی چنانچہ نقیب نے شیخ کو بادشاہ کے آنے کی اطلاع دی انھوں نے اندر آنے کی اجازت دیدی تب بادشاہ صاحب اندر پہونچے جھلایا ہوا تو تھا ہی جاتے ہی فوراً یہ مصرع پڑھا ؎ دردرویش را دربان نہ باید ؂

(درویش کے دروازے پر دربان نہ چاہیئے۔)

کیونکہ دربان تو بادشاہوں کے یہاں ہوا کرتے ہیں فقیروں کو اس سے کیا واسطہ تو بزرگ نے برجستہ جواب دیا ؎

بباید تا سگ دنیا نیاید ؂ (چاہیئے تاکہ دنیا کے کتے نہ آئیں)

یعنی یہ دربان آدمیوں کی روک ٹوک کے لئے نہیں ہے بلکہ کتوں کو رد کنے کے لئے ہے اور شانِ درویشی کے خلاف دربان بمعنی اول ہے نہ بمعنی ثانی بادشاہ نے اعتراض کر کے کیسی منہ کی کھائی۔ آخر اہل اللہ کس سے ڈریں اور کیوں ڈریں بس وہ تو ایک سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی سے ڈرنے کی ان کو ضرورت نہیں آخر لوگ ان کا کیا کرلیں گے بیش بریں نیست کہ مار ڈالیں گے سو یہ تو ان کا عین مقصود ہے وہ تو اس دن خوشیاں منائیں گے جس دن روح بدن سے مفارقت کریگی ان کی تو یہ حالت ہے کہ غلبہ شوق لقا میں موت کی تمنا کیا کرتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرّم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم ؂ راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بردم

(میں بہت خوش ہوں گا جس دن اس منزل ویراں یعنی دنیا سے میں رخصت ہوں گا اور حق تعالیٰ کی لقاء سے اپنی جان کی راحت پالوں گا۔ میں نے نذر کیا ہے کہ اگر کسی دن محبوب حقیقی کا غم مجھے مل گیا تو کسی اللہ والے کے پاس شاداں و غزلخواں جا پڑوں گا)

یہ نری شاعری نہیں بلکہ سچا حال ہے واقعی سالک کو سچ مچ موت کی تمنا ہی ہوتی ہے اور یہ تمنا خلاف شرع نہیں تمنائے موت وہ ممنوع ہے جو کسی دنیوی تکلیف کی وجہ سے ہو چنانچہ حدیث میں لضر نزل بہ کی قید موجود ہے باقی اشتیاق لقاء میں تمنائے موت ہونا یہ تو ولایت خداوندی کی دلیل ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں قل یا ایھا الذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیاء للہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین ۰ دعوے ولایت پر تمنائے موت کا مطالبہ فرماتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ حصول ولایت کے لئے تمنائے موت لازم ہے۔ تو جو چیز لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی کلفت ہے عارف کے نزدیک وہ محبوب ہے تو پھر کسی سے کیوں ڈرے نیز عارف کو یقین ہوتا ہے کہ مخلوق مجھ کو نفع یا ضرر کچھ نہیں دے سکتی جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا اس لئے اس کو نہ کسی سے طمع ہوتی ہے نہ خوف۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد ز کس　　ہمیں است بنیاد توحید و بس

(ترجمہ جس کو توحید کی دولت ملتی ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاؤں پر اگر سونے کا تم نے ڈھیر ڈال دیا اس کے سر پر تلوار ہندی رکھ دو تو نہ تو پہلے شخص سے اس کو امید و طمع ہوگی اور نہ دوسرے شخص سے کوئی خوف ہوگا)

جب توحید کامل ہو جاتی ہے تو یہی حال ہوتا ہے کہ موحد خدا کے سوا کسی کو

نافع ضار نہیں سمجھتا اس لئے مخلوق سے بالکل بے فکر ہو جاتا ہے پھر یہ لوگ عوام سے تو کیا ڈرتے بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے پھر افسوس ہے کہ لوگ ان سے اپنی رائیوں میں موافقت چاہتے ہیں اور دباؤ ڈال کر ان کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں۔ ایں خیال ست و محال ست و جنوں۔ شاید کسی کو یہاں پر یہ شبہ ہو کہ بعض دفعہ بزرگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی جان کی بہت زیادہ حفاظت کرتے ہیں دماغ میں تیل لگاتے ہیں تاکہ ضعف نہ ہو جائے۔ مضرات سے پرہیز کرتے ہیں تاکہ بیمار نہ ہو جائیں، خطرات سے بچتے ہیں تاکہ کہیں جیل خانہ میں نہ پہنچ جائیں خاردار طریق میں نہیں چلتے کہ کہیں کانٹا نہ لگ جائے اس سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ خطرات سے ڈرتے ہیں حالانکہ یہ ابھی کہا تھا کہ ان کو بجز خدا کے کسی کا خوف نہیں ہوتا تو بات یہ ہے کہ ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام ؎ بس سخن کوتاہ باید والسلام

(کوئی خام شخص پختہ کار کے مقام کو نہیں سمجھ سکتا پس بات مختصر کرتا ہوں اور سلام کہتا ہوں) کامل کے حال کا اندازہ عوام کو نہیں ہو سکتا وہ اس کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من ؎ وز درون من نجست اسرار من

(ہر شخص اپنے گمان و قیاس کے مطابق میرا یار ہوا لیکن میرے اندورنی اسرار کو کوئی شخص تلاش نہیں کرتا)

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جان میں دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنی جان ہے اس لحاظ سے وہ ان کو عزیز نہیں (کیونکہ وہ کسی چیز کو اپنی سمجھتے ہی نہیں ۱۲)

دوسری یہ حیثیت ہے کہ یہ سرکار کی دی ہوئی مشین ہے اس لحاظ سے وہ عزیز و محبوب ہے۔ کیونکہ سرکاری چیز ہے جو ہم کو امانت کے طور پر دی گئی ہے اور اس کی حفاظت کا حکم کیا گیا ہے اور اسی لحاظ سے عارف کبھی اپنی مدح بھی کیا کرتا ہے۔ ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی مدح کر رہا ہے مگر حقیقت میں وہ خدا کی چیز کی مدح کر رہا ہے جو خدا ہی کی مدح ہے۔ چنانچہ حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں ؎

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست ٭ آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

دیکھئے اپنی ہمت کی تعریف ہو رہی ہے کہ خدا کا شکر ہے ہم محبوب تک پہونچ گئے اور وصال سے پہلے نہیں مرے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفریں ہے مگر حقیقت میں خدا کی نعمت پر آفریں ہو رہی ہے کہ اس نے ہم کو ایسی ہمت دی اس لحاظ سے وہ ہماری چیز تھوڑا ہی ہے بلکہ سرکاری عطا ہے اسی طرح ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است[1] ٭ اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را[2] ٭ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

[1] (میں اپنی آنکھوں پر ناز کرتا ہوں کہ انھوں نے تیرا جمال دیکھا ہے اور میں اپنے پاؤں کو بوسہ دیتا ہوں کہ یہ تیری گلی میں پہونچے ہیں [2] ہر دم ہزار بوسہ اپنے ہاتھوں کو دیتا ہوں کہ انھوں نے تیرے دامن کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ہے)

چونکہ ان ہاتھ پیروں سے طاعات کی توفیق ہوئی اور وہ وصال محبوب کا ذریعہ بن گئیں اس لحاظ سے اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیتے اور پیروں کو چومتے ہیں کہ شاباش تم نے بڑا کام کیا یہ بھی اصل میں عطائے محبوب کی مدح ہے مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی فرماتے تھے کہ وہ مکہ مکرمہ میں ایک بزرگ کی خدمت میں

حاضر تھے۔ معتقد لوگ ان کی تعریف کر رہے تھے اور وہ خوش ہو رہے
تھے مولوی صاحب کے دل میں خطرہ ہوا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو اپنی تعریف
سے خوش ہو رہے ہیں بزرگ کو خطرہ پر اطلاع ہو گئی فرمایا کہ میری تعریف
تھوڑا ہی ہو رہی ہے یہ تو میرے محبوب کی تعریف ہو رہی ہے کہ اس نے
مجھے ایسا بنایا اور یہ کمالات عطا کئے ورنہ میں کیا اپنے باپ کے گھر سے یہ
کمالات لایا تھا جو ان کو اپنے کمالات سمجھوں. البتہ صرف زاہد وہ اتنی نظر نہیں
رکھتا اس لئے ان چیزوں کی قدر نہیں کرتا چنانچہ مثنوی میں مولانا نقل فرماتے ہیں[۹]

زاہدے را گفت یارے در عمل ❊ کم گری تا چشم را ناید خلل
(ایک زاہد سے کسی نے کہا کہ کم رویا کرنا کہ تیری آنکھیں خراب نہ ہوں)
گفت زاہد از دو بیروں نیست حال ❊ چشم بیند یا نہ بیند آں جمال
(کہا کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو آنکھیں جمال محبوب دیکھ لیں گی یا نہ دیکھیں گی)
گر[۱] بہ بیند نورِ حق را چہ غم است ❊ در وصال حق دو دیدہ کے کم است
وَر[۲] نہ بیند نورِ حق را گو برو ❊ ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

(۱) اگر جمال حق کو دیکھ لیا تو کیا غم ہے اللہ تعالیٰ کی وصال کی لذت کے مقابلہ میں دو آنکھیں کیا ہیں
(۲) اور اگر ان آنکھوں نے جمال محبوب نہ دیکھا تو ایسی آنکھوں کو جو منحوس ہیں نہ ہونا ہی بہتر ہے)

تو زاہد کی نظر اس پر ہوتی ہے کہ وہ میری نظر ہے اور اگر کوئی عارف ہوتا تو اس کی نظر
اس پر ہوتی کہ ہمارے گھر کی کونسی چیز ہے ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست ❊ تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست
(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا ہوں جو چیز ہمارے پاس ہے سب آپ کی عطا ہے اور میں خود بھی آپ کا ہوں)

وہ اگر روتا بھی تو حدود کے اندر روتا جیسے سرکاری چیز کا استعمال حد کے
اندر کیا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سید العاشقین ہیں مگر آنکھوں کی آپ
اتنی خاطر فرماتے تھے کہ کان یکتحل ثلثا فی ھذہ وثلثا فی ھذہ یعنی سُرمہ کی تین سلائی ایک آنکھ

ہیں لگاتے اور تین سلائی دوسری ہیں۔ اسی طرح آپ سے کبھی یہ ثابت نہیں کہ رات بھر جاگے ہوں اور امت کے لئے ارشاد فرماتے ہیں۔

ان لنفسك عليك حقا و ان لعينك عليك حقا الحديث کہ تمہاری جان کا بھی تم پر کچھ حق ہے اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر کچھ حق ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ہماری نہیں ہیں ورنہ ہم کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہوتا بلکہ سرکاری چیزیں ہیں جن کے کچھ حقوق سرکار نے مقرر فرمادیئے ہیں جن کی رعایت ہمارے ذمہ ضروری ہے۔ اس لئے عارف اپنی جان میں خلافِ حکم کوئی تصرف نہیں کرتا یہ راز ہے اس کا کہ عارف کسی وقت تو جان کی ذرا پروا نہیں کرتا اور کسی وقت بہت حفاظت کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جہاں حکمِ شریعت ہوتا ہے وہاں تو وہ جان کی پروا نہیں کرتا اور جہاں حکم نہیں ہوتا یا ممانعت ہوتی ہے وہاں جان کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ شریعت نے بعض وقت جان کو خطرہ میں ڈالنے سے منع بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے لا تلقوا بايديكم الى التهلكة جس سے فقہاء نے یہ مستنبط فرمایا ہے کہ جس جگہ امید نفع موہوم اور ضرر کا یقین یا غلبہ ظن ہو وہاں جان کو ڈالنا القاء نفس فی الہلاکت ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔ نیز حدیث مرفوع میں ہے جس کو ترمذی نے روایت کیا ہے لا ينبغي للمؤمن ان يذل نفسه قالوا يا رسول الله وكيف يذل نفسه قال يتحمل من البلاء لما لا يطيقه اھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان کے لئے اپنے نفس کو ذلیل کرنا مناسب نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان اپنے کو خود ذلیل کیسے کرتا ہے فرمایا کہ ایسی بلاء اپنے سر دھر لے جس کے تحمل کی اس میں طاقت نہیں۔ سبحان اللہ! کیا عجیب تعلیم ہے کہ کام اتنا ہی اپنے

ذمہ لو جس کو کر سکو خوامخواہ ڈینگیں نہ مارو اور اپنی چادرہ سے باہر پیر نہ نکالو کہ اس کا انجام بجز ذلت کے کچھ نہیں۔ دشمنوں کو ہنسنے کا موقعہ ملتا ہے کہ بس کچھ ہو تو نہ سکا بڑے بڑے دعوے کرتے تھے کہ ایک سال میں یہ ہو جائیگا واللہ مسلمان کے لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں ساری سیاست موجود ہے مگر کوئی قدر دان بھی ہو دیکھ لیجئے اسی ارشاد کی مخالفت کر کے مسلمانوں کی آجکل کیا حالت ہو رہی ہے کہ دشمن بھی ان پر ہنستے ہیں تو عارف ایسے موقعہ پر ضرور اپنی جان و آبرو کی حفاظت کرے گا کہ جہاں شریعت نے جان کو خطرہ میں ڈالنے اور اپنے کو ذلیل کرنے سے منع فرمایا ہو خوب سمجھ لو یہ ساری گفتگو اس پر چلی تھی کہ لوگ ملانوں کو مسجد کے مینڈھے کہتے ہیں میں نے کہا تھا کہ یہ لقب تو ہمارے لئے باعث فخر ہے ہم اس سے برا نہیں مانتے کیونکہ اس میں ہمارے لئے ایک اقراری فضیلت ہے پھر میں کہتا ہوں کہ یہ مسجد کے مینڈھے تم سے ظاہری مسکین میں بھی اچھے ہیں کیونکہ مسجد خدا کا گھر تو ہے ہی اس لئے برکات میں تو دوسرے مساکن سے احسن ہی ہے لیکن وہ ظاہری شان وشوکت میں بھی تمہارے اکثر گھروں سے افضل ہے عمارت بھی چونہ گچ کی ہے ہر روز اس کی صفائی ہوتی رہتی ہے جھاڑو دی جاتی ہے اور ہر سال ایک مرتبہ پوتا پھیرا جاتا ہے پھر بعض مسجدوں میں مینارا در گنبد بھی ہوتے ہیں جیسے بادشاہ کا قلعہ ہو پھر بادشاہوں کے قلعہ میں تو گھوڑوں بیلوں۔ مچھروں کے پیشاب پاخانہ کی بدبو بھی ہوتی ہے۔ مسجد اس سے بھی پاک ہے اور زیادہ فضائل بیان کرنے کو جی بھی نہیں چاہتا کیونکہ ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ؛ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار عشق و مستی مت کہو اس متکبر خود بیں کو خود پرستی کے رنج میں مرنے دو)

کہیں یہ فضائل معلوم کرکے تم بھی مسجد ہی میں نہ آپڑو پھر ہماری راحت میں خلل پڑے۔ پس تم اپنے محلوں ہی میں خوش رہو اور ہمیں مسجدوں ہی میں رہنے دو۔ غرض جب لوگوں کو مسجد سے اتنا توحش ہے تو معتکف تو اکثر وہاں تو ہی بیٹھا رہے گا (یعنی اکیلا رہے گا ۱۲) اس کی تنہائی میں خلل کون ڈالے گا تو لامحالہ اعتکاف میں قلت اختلاط مع الانام ہو جائے گا یہ روح ہے اعتکاف کی۔ یہ مضمون میرے ذہن میں ابھی یعنی دو چار روز ہوئے آیا تھا اس سے پہلے اس طرف کبھی ذہن نہیں گیا یہ نعمت حق تعالےٰ نے ابھی عطا فرمائی ہے میں نے جب بیان کا ارادہ کیا تو اول احیاء العلوم بھی دیکھی تھی مگر اس میں امام نے رمضان کے آداب واحکام واسرار تو یہاں کے مناسب لکھے ہیں اس میں اکثر مجاہدات اسی زمانہ متقدمین کے مناسب ہیں۔ اس زمانہ متاخرین کے موافق نہیں اصول تو اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے اصول کبھی نہیں بدلا کرتے مگر طریق معالجہ تبدل زمان سے بدل جاتے ہیں اطباء اس کو جانتے ہیں کہ طب یونانی کے اصول تو اب بھی بحالہا ہیں مگر طرق علاج میں زمانہ کے تبدل سے تغیر ہو جاتا ہے۔ تو تعلیم یافتہ طبقہ اس میں غلطی کرتا ہے وہ اصول کو بھی تبدل زمان سے بدلنا چاہتے ہیں اور اصول کو طرق پر قیاس کرتے ہیں کہ جیسے طرق مجاہدہ پہلے اور تھے اور اب اور ہیں اسی طرح علماء کو مسائل شرع میں ضرورت وقت کا لحاظ کر لینے کا مشورہ دیتے ہیں مگر یہ قیاس مع الفارق ہے۔ کیونکہ اصول کلی ہوتے ہیں اور کلیات اس تغیر سے محفوظ ہیں اور طرق جزئی ہوتے ہیں اور جزئیات میں یہ تغیر ہو سکتا ہے۔ غرض اس وجہ سے احیاء العلوم کے مضامین سے دلچسپی نہ ہوئی اور نہ بیان کے وقت اس کے مضامین کچھ یاد آئے کیونکہ وہ آجکل کے مناسب نہ تھے اور اسی لئے میں اپنے احباب کو ان کتابوں کے

دیکھنے سے منع بھی کیا کرتا ہوں کہ خواہ مخواہ دیکھ کر عمل کی ہوس ہوگی اور اس کے موافق عمل کی ہمت آجکل کے طبائع میں ہے نہیں تو اس سے بجز پریشانی بڑھنے کے اور کچھ نفع نہ ہوگا۔ سو میں ان کتابوں کے مطالعہ سے اس لئے نہیں روکتا کہ وہ قابل مطالعہ نہیں بلکہ اس لئے روکتا ہوں کہ ہم ان کے مطالعہ کے قابل نہیں۔ بہر حال یہ مضمون جو میں نے بیان کیا ہے کتابی مضمون نہیں میری نظر سے آج تک کسی کتاب میں نہیں گذرا اور نہ میرے ذہن میں اس سے پہلے کبھی آیا بس یہ مضمون تو وارد ہے کہ حق تعالٰے کی طرف سے نیا آیا ہوا ہے اشارۃ الی الحدیث انہ حدیث عہد بربہ ۱۲ جامع) اس کی قدر کرنا چاہیئے گو یہ مسالہ سے خالی ہے جوشیلا نہیں ہے مگر وہی مضمون ہے اور بات یہ ہے کہ حقائق صحیحہ میں جوش خروش ہوا بھی نہیں کرتا وہ تو سادے اور پھیکے ہی ہوا کرتے ہیں جوشیلے مضامین زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن میں خارج سے نمک مرچ لگایا جائے۔ دیکھئے احادیث و قرآن کے مضامین کیسے سادے ہوتے ہیں اور دیوان حافظ و مثنوی کے مضامین جوشیلے ہیں تو مقاصد میں جوش نہیں ہوا کرتا یہ تو مقدمات میں یا عوارض میں ہوا کرتا ہے اس لئے ان پر نظر نہ کرنا چاہیئے حقیقت پر نظر رکھنا چاہیئے۔ غرض حق تعالٰی نے عبادات رمضان میں آپ کو ان چاروں مجاہدات کی روح سے کامیاب فرمانا چاہا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک عبادت روزہ ہے جس کی حقیقت ہے ترک طعام و ترکِ شراب و ترکِ وقاع۔ (جامع)

۱؎ یعنی عوارض کے رنگ کا نہیں ہوتا گو دوسرے رنگ کا ہو جو اس سے بھی الذ و اقوی ہے جیسے چٹنی میں ایک خاص لذت ہے جو معجون صحت و قوت بخش میں نہیں لیکن اس صحت و قوت کے بعد جو طبیعت میں نشاط و فرح پیدا ہوگا وہ اس چٹنی میں کوسوں بھی نہیں ۱۲ منہ

صوفیہ نے ترکِ وقاع کو مجاہدہ میں اس لئے شمار نہیں کیا کہ ترکِ طعام و شراب اس کو مستلزم ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ جو شخص کھانا کم کھائے گا اس کو شہوت وقاع کم ہوگی دوسرے مجاہدہ کا حاصل کسر قوت بہیمیہ ہے اور اس میں ترکِ وقاع کو دخل نہیں بلکہ برعکس وقاع کو اس میں دخل ہے کیونکہ قوت بہیمیہ جماع سے منکسر ہوتی ہے ترکِ جماع سے تو اس کو قوت ہوتی ہے لہذا ترکِ وقاع صوفیہ کا مبحوث عنہ نہیں ہاں اس کو قیام صحت جسم میں ضرور دخل ہے یعنی کثرتِ جماع صحت کے لئے مضر ہے اس لحاظ سے اطباء نے اس سے بحث کی ہے اور چونکہ کثرتِ جماع ایک عارض دین کے لئے بھی مضر ہے وہ عارض یہ کہ صحت کی خرابی سے بعض دفعہ دین کے کاموں میں بھی خلل آجاتا ہے اس جہت سے بزرگوں نے بھی ترکِ وقاع کی وصیت کی ہے چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے ؎

احفظ منيك ان يصب فانه ماء الحياة يصب فى الارحام

(اپنے منی کی حفاظت کر یعنی کثرت جماع سے احتیاط رکھو کہ یہ آب حیات ہے جو ارحام میں ڈالا جاتا ہے)

شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

بہ بے رغبتی شہوت انگیختن ٭ برغبت بود خونِ خود ریختن

(بے رغبتی کے باوجود جماع کرنے کے لئے بہ تکلف شہوت کو ابھارنا اپنے خون کو رائیگاں خرچ کرنے کے مترادف ہے)

مجھ سے ایک محقق صوفی نے کہا تھا کہ بی بی سے کم ملنا چاہیئے کیونکہ کثرت جماع سے حرارت غریزیہ کم ہوتی ہے اور سالک کو حرارت غریزیہ کی حفاظت ضروری ہے کیونکہ اس سے طبیعت کو انتعاش والتہاب ہوتا ہے جس سے عشق کی گرم بازاری ہوتی ہے مگر یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ ترکِ وقاع سے جو التہاب ہوتا ہے وہ نفسانی التہاب ہوتا ہے روحانی نہیں جس کی بابت

ضروری اطلاع: خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دیا کریں۔

حدیث میں ہے جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ تفصیل اس کی یہ ہے کہ عشق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عشق طبعی دوسری عشق عقلی اور مقصود اصلی عشق عقلی ہے عشق طبعی مقصود نہیں گو مقصود کے لئے مفید و معین ضرور ہے پس حرارت غریزیہ کے انتعاش سے عشق طبعی میں زیادتی ہوتی ہے عشق عقلی میں ترقی نہیں ہوتی بلکہ اس کی ترقی معرفت کے بڑھنے سے ہوتی ہے چنانچہ بڑھاپے میں ہرچند کہ عارف کی حرارت غریزیہ کم ہو جاتی ہے مگر اس عشق عقلی میں کمی نہیں آتی بلکہ اس وقت چونکہ معرفت کامل ہوتی ہے اس لئے اس وقت جوانی سے بھی زیادہ عشق عقلی کامل ہوتا ہے اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ہرچند پیر و خستہ دل و بس ناتواں شدم ✿ ہرگہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(ہرچند کہ پیر و کمزور ناتواں ہوں لیکن جب آپ کے چہرہ کو دیکھتا ہوں تو جوان ہو جاتا ہوں)

اور راز اس میں یہ ہے کہ عشق عقلی کا تعلق روح سے ہے اور عشق طبعی کا نفس سے اور بڑھاپے میں نفس تو کمزور ہو جاتا ہے مگر روح کمزور نہیں ہوتی بلکہ عارف کی روح بڑھاپے میں جوانی سے بھی زیادہ قوی ہو جاتی ہے کیونکہ قوتِ روح کا مدار معرفت پر ہے اور معرفت بڑھاپے میں کامل ہوتی ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

خود قوی تر میشود خمرِ کہن ✿ خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب قوی ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب یعنی روحانی کیف اور لذۃ طاعات جو من جانب اللہ عطا ہوتی ہے وہ بڑھاپے میں اور تیز ہو جاتی ہے)

شرابِ معرفت کا تو خاصہ یہ ہے کہ یہ جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی تیز ہوتی ہے۔ پس بڑھاپے میں طاعات کی روحانی لذت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ

ہوتی ہے اور حدیث جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ میں بھی روحانی لذت مراد ہے نفسانی لذت مراد نہیں جس میں حرارت غریزہ کے انتعاش سے التہاب ہوتا ہے اور یہاں سے سالکین کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر کسی وقت طاعات و ذکر کی لذت کم ہو جائے تو پریشان نہ ہوں کیونکہ یہ وہ لذت نہیں ہے جس کی بابت مولانا کا ارشاد ہے ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود ✣ گر زباغِ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر ان کے باغِ دل سے ایک خلال بھی کم ہو جائے)

مولانا کی مراد یہ ہے کہ اگر کسی وقت آثارِ قرب میں کچھ کمی ہو جاتی ہے تو سالک کے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے اور آثارِ قرب میں کمی معصیت یا غفلت سے ہوتی ہے۔ پس جو سالک معصیت اور غفلت میں مبتلا نہیں ہے اور پھر اس کو طاعات و ذکر میں لذت پہلے سے کم ہو جائے وہ بے فکر رہے کیونکہ یہ نفسانی لذت تھی جس کی کمی سے قرب میں کچھ کمی نہیں آتی اور نفسانی لذت کا قاعدہ یہ ہے کہ شروع میں جوش پر ہوتی ہے پھر مداومت ذکر سے جوش کم ہو جاتا ہے مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ذاکر نے شکایت کی کہ حضرت اب ذکر میں پہلے جیسی لذت نہیں آتی فرمایا تم نے سُنا نہیں کہ پُرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ سبحان اللہ کیا عجیب مثال دی۔ حاصل جواب کا وہی ہے کہ یہ لذت نفسانی ہے جس کا جوش کچھ دنوں رہا کرتا ہے جیسے بیوی کے ساتھ جوشِ محبت چند روز رہتا ہے اور سال دو سال گذرنے کے بعد وہ پہلا سا جوش نہیں رہتا البتہ اُنس پہلے سے زیادہ ہو جاتا ہو جاتا بچہ جس بیوی کے ساتھ صحبت طویلہ رہی ہو اس کی محبت رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہے۔ یہی حال ذکر کا ہے کہ زمانِ طویل کے بعد جوش تو کم

ہوجاتا ہے مگر اُنس بڑھ جاتا ہے۔ اور پُرانی جورو کے اماں ہوجانے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ہندوستان میں ایک کابلی رئیس تھے جن کے لئے حکومت کی طرف سے کچھ جاگیر و معافی تھی اور حکام میں ان کی بہت وقعت تھی۔ بڑھاپے میں ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا تو حاکم ضلع تعزیت کے لئے آیا اور کہا آغا صاحب ہم کو آپ کی بی بی کے انتقال کا بہت صدمہ ہے تو وہ رونے لگے اور کہا کلکٹر صاحب وہ ہمارا بی بی نہ تھا اماں تھا ہم کو روٹی کھلاتا تھا بدن دباتا تھا۔ واقعی بوڑھے کی بیوی تو اماں ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ کام کے دونوں نہیں رہتے بس وہ حال ہوتا ہے کہ لینے دینے کے منہ میں خاک محبت رکھیں پاک اب ان کا تعلق نفسانی غرض کے لئے نہیں ہوتا محض پاک محبت ہوتی ہے۔ تو سالک کو چاہیئے کہ ان نفسانی کیفیات کو مقصود نہ سمجھے بلکہ ذکر اور طاعات کو مقصود سمجھے ؂

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ؛ کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(فراق اور وصل کیا چیز ہے رضائے دوست طلب کیجئے کہ اس محبوب حقیقی سے اس کے غیر کی طلب باعث حیف و افسوس ہے)

اور حصول رضا کا ذریعہ طاعات و ذکر میں منحصر ہے بس ان پر دوام رکھے خواہ لذت ہو یا نہ ہو البتہ اگر کسی کو یہ کیفیات بھی حاصل ہوجائیں تو ان کی قدر کریں بلا وجہ ضائع نہ کرے۔ اور قدر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جماع میں تقلیل کرے کہ اس کو ان نفسانی کیفیات کے بقار میں بڑا دخل ہے۔ کیونکہ احتباس مادۂ منویہ سے انتعاش و التہاب ہوتا ہے جو سبب ہوتا ہے نشاط و سرور کا جس سے طاعات میں لذت آتی ہے اور لذت سے دوام طاعات

کی امید ہے اس طرح بالواسطہ ترک دقلع بھی سلوک میں مفید ہوتا ہے تو صوفیہ نے اس کو مجاہدات میں تو داخل نہیں کیا لیکن اس واسطہ پر نظر کر کے اس کی وصیت کی ہے۔ بہرحال اس تقریر سے اشکال مذکور کا جواب نکل آیا۔ غرض روزہ کی روح تقلیل طعام ہے اب سمجھو کہ قلت طعام کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کھانا کھاؤ اور کم کھاؤ مثلاً جس کی غذا آدھ سیر ہے وہ پاؤ بھر کھائے جس کی پاؤ بھر ہے وہ آدھ پاؤ کھائے۔ اکثر صوفیہ کی نظر تو یہیں تک رہی اور ان کو ان احادیث سے تائید مل گئی جن میں جوع کی فضیلت اور شبع کی مذمت ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے اکثرھم شبعا فی الدنیا اطولھم جوعا یوم القیمۃ یعنی جو دنیا میں زیادہ پیٹ بھرے گا وہ قیامت کے دن زیادہ بھوکا رہے گا۔ اس قسم کی احادیث سے ان حضرات نے جوع کی فضیلت اور شبع کی مذمت مستنبط کر کے یہ فرمایا کہ تقلیل طعام کے معنے یہ ہیں کہ پیٹ بھر کے کھانا نہ کھائے بلکہ بھوکا رہا کرے چنانچہ ان حضرات نے یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص رمضان میں افطار و سحر کے وقت پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے اس نے حقیقت صوم و روح صوم کو باطل کر دیا زیادہ لوگ اسی طرف ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ شارع علیہ السلام نے تقلیل طعام کو تجویز کیا ہی نہیں بلکہ شارع نے کھانے کے اوقات معتادہ کو بدل کر ان میں فصل زیادہ تجویز کیا ہے اور اس تبدل عادت و زیادت فصل سے جو نفس کو تکلیف ہوتی ہے اسی کو شریعت نے تقلیل طعام کے قائم مقام سمجھا ہے اھ۔ اور یہ دوسری صورت ہے تقلیل طعام کی پس کم کھانا اور بھوکا رہنا یہ شرعی مجاہدہ نہیں اور رمضان میں پیٹ بھر کے کھانا

روح صوم کو کچھ مضر نہیں میں نے شاہ صاحب سے پہلے کسی کا قول نہیں دیکھا اور یہ مضمون اولاً خود بخود میرے قلب پر وارد ہوا تھا اس وقت تک میں نے شاہ صاحب کا قول بھی نہیں دیکھا تھا اور میں نے توکلا علی اللہ ایک وعظ میں اس کو بیان بھی کر دیا تھا بعد میں شاہ صاحب کے قول سے تائید ملی تو میں بہت خوش ہوا کہ الحمد للہ میں اس قول میں متفرد نہیں ہوں بلکہ امت کا ایک بہت بڑا محقق میرے ساتھ ہے ممکن ہے کسی اور نے بھی اس کی تصریح کی ہو مگر میں نے شاہ صاحب سے پہلے کسی کے کلام میں یہ مضمون نہیں دیکھا اور میری نظر کتابوں پر زیادہ ہے بھی نہیں صرف درسیات پر تھوڑی بہت نظر ہے اور درسیات بھی میں نے اس طرح ختم کی ہیں کہ ایک کتاب جماعت نے ختم کر لی اور میں زیادہ غیر حاضر رہا تو جماعت کے ختم کرنے سے میرے حق میں بھی وہ کتاب ختم ہو گئی بہر حال میرے نزدیک تقلیل طعام کی صورت شریعت میں یہ نہیں ہے کہ کھانا سامنے رکھا ہوا اور تم پیٹ بھر کے نہ کھاؤ بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اوقات طعام میں فصل کر دو جیسا کہ روزہ میں ہوتا ہے پھر افطار و سحر میں پیٹ بھر کے کھالو تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ تجربہ ہے کہ سحر میں پیٹ بھر کے کھالے سے بھی دوپہر کو اپنے وقت پر بھوک کا تقاضا ضرور ہوتا ہے اور روزہ کی وجہ سے جب نہیں کھا سکتے تو نفس کو کلفت ہوتی ہے بس یہی شرعی مجاہدہ ہے لیکن میں اس میں اپنے نفس کو متہم سمجھتا ہوں دوسرے علماء بھی اس میں غور کر لیں لیکن وہ ایسے نہ ہوں جو کھانے کے طالب ہوں اور اگر سب ایسے ہی ہوئے تو وہی مثال ہوگی کہ امام بھی ننگا اور مقتدی بھی ننگے مگر دوسرا ان کی اقتدا نہیں کر سکتا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرت ان لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے جن کی بی بیاں باہر پھرتی ہیں فرمایا تمہاری

بیبیاں بھی نامحرموں کے سامنے آتی ہیں پھوپھی زاد، ماموں زاد، خالہ زاد بھائیوں سے پردہ نہیں کرتیں دیور جیٹھ کے سامنے آتی ہیں تو امام بھی ننگا مقتدی بھی ننگے اور جب سب ننگے ہوں تو نماز درست ہے اس لئے سب کی نماز صحیح ہے پس تقلیل طعام جو مجاہدہ کے ارکان اربعہ میں سے ایک رکن ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ سالک روزے زیادہ رکھا کرے یہ معنی نہیں کہ روزہ رکھ کر یا بغیر روزہ ہی کے بھوکا رہا کرے اور یہ تفسیر اس لئے راجح ہے کہ شریعت نے اسی کو مشروع کیا ہے دوسری صورت کا وجود شریعت میں نہیں نیز یہ اس لئے بھی راجح ہے کہ اس میں راحت ہے دن بھر روزہ رکھ کر جب افطار میں پیٹ بھر کے کھائے گا تو نفس اور جسم کو راحت حاصل ہوگی اور اگر افطار میں بھی بھوکا رہا تو کیا خاک راحت ملے گی۔ اور جب مجاہدہ بھی سہل نہ ہوا تو مقصود کیونکر حاصل ہوگا کیونکہ نظریات کی انتہا تو بدیہیات پر ہوتی ہے اگر بدیہیات بھی نظری ہو جائیں تو نتیجہ کیسے برآمد ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ مجاہدہ دشوار نہ ہو بلکہ سہل ہو ورنہ طاعات کی سہولت کے لئے تو مجاہدہ اختیار کیا تھا اور مجاہدہ بھی دشوار ہوا تو اب اس کی سہولت کے لئے کوئی اور مجاہدہ تجویز ہونا چاہیئے اس طرح تو سلسلہ غیر متناہی چلے گا۔ تیسرے یہ کہ امام غزالی نے روزہ میں ایک حکمت یہ بیان کی ہے کہ اس میں تشبہ بالملائکہ ہے جیسے ملائکہ کھانا نہیں کھاتے پانی نہیں پیتے اسی طرح روزہ دار ہوتا ہے میں کہتا ہوں اس سے بھی میرے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کیونکہ جیسے ملائکہ میں احتیاج طعام نہیں ہے، اسی طرح ان میں سوزش جوع بھی نہیں ہے پس جو شخص روزہ رکھ کر افطار وسحر میں تقلیل طعام کر کے بھوکا رہے وہ ملائکہ کے زیادہ مشابہ نہیں ہوا کیونکہ گو وہ کھانے سے رکا ہوا ہے مگر سوزش جوع میں مبتلا ہے بلکہ ملائکہ کے

مشابہ وہ شخص ہے جو سحر وافطار میں اچھی طرح مگر اعتدال کے ساتھ کھانا کھاتا ہے اس میں روزہ کے وقت نہ سوزش جوع زیادہ ہوگی نہ کسل طعام چوتھے یہ کہ صعوبت کا برداشت کرنا بامید سہولت آسان ہے اور اگر صعوبت کے بعد بھی صعوبت ہی رہی تو برداشت مشکل ہے اور سہولت ایک اخروی ہے ایک دنیوی اور ظاہر ہے کہ صعوبت عاجلہ کے بعد علاوہ سہولت آجلہ کے سہولت عاجلہ بھی کچھ ہونی چاہئے کیونکہ عام طبائع صرف سہولتِ آجلہ کے بھروسے صعوبت عاجلہ کو برداشت نہیں کرسکتیں اور سہولت عاجلہ اسی صورت میں ہے کہ روزہ کے بعد پیٹ بھر کر کھالے کی اجازت دی جائے ورنہ جب تم ہمیشہ بھوکے ہی اٹھو گے تو سہولت کیا خاک ہوئی اس طرح سے صعوبت کا تحمل دشوار ہوجاوے گا۔ پانچویں یہ کہ اس صورت میں مجاہدہ ادوم ہے جو شخص روزہ رکھ کر اچھی طرح کھائے پیئے گا وہ تقلیل غذا کا عادی نہ ہوگا اور جو بھوکا رہ کر تقلیل طعام کرے گا وہ چند دن میں اس کا عادی ہوجائیگا پھر وہ زیادہ کھانا بھی چاہے تو نہ کھاسکے گا اب یہ تقلیل مجاہدہ نہ رہے گی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روز روز کے روزہ سے منع فرمایا ہے۔ اول تو آپ نے مہینہ میں تین روزے تجویز فرمائے ہیں (ایام بیض کے) اور جس کو اس سے زیادہ ہمت ہو تو اس کے لئے ہفتہ میں دو دن تجویز فرمائے ہیں کہ ہر پیر۔ جمعرات کو روزہ رکھا کرے کیونکہ ان دنوں میں مخلوق کے اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوتے ہیں اگر کوئی اس سے بھی زیادہ ہمت رکھتا ہو تو اس کے لئے ارشاد ہے احب الصوم الی اللہ صوم داؤد کان یصوم یوما ویفطر یوما کہ صوم داؤد اختیار کرے۔ یہ حق تعالیٰ کو بہت محبوب ہے جس کی صورت یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے ایک دن افطار کرے اس طرح قیامت تک بھی روزہ کی عادت نہیں ہوسکتی ایک صحابی نے اس پر بھی زیادتی چاہی تھی وہ ہر دن روزہ رکھنا چاہتے

تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ بس صوم داؤد سے بہتر اور کوئی نہیں ہے اور ایک حدیث میں صوم دہر کی نسبت صاف تصریح ہے لاصام ولا افطر مطلب یہ کہ جو شخص سال بھر تک روزہ ہی رکھا کرے اس نے روزہ رکھا کیونکہ عادت ہونے سے غرض حاصل نہ ہوئی اور نہ افطار کیا یعنی ظاہراً اس میں صوم دہر سے منع فرما دیا اور خود بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی ثابت نہیں کہ آپ نے پورے سال بھر روزے رکھے ہوں اور راز اس میں یہ ہے کہ عادت صوم کے بعد اس کا نفع باقی نہیں رہتا اسی طرح صوفیہ نے جو صورت بیان کی ہے کہ غذا کم کرتا رہے اور اکثر اوقات بھوکا رہا کرے چند روز کے بعد معدہ اس کا عادی ہو جاتا ہے تو مجاہدہ کا نفع باقی نہیں رہتا بلکہ جسمانی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس طریقہ کو اختیار کیا ان کی صحت عمر بھر کیلئے خراب ہو گئی بخلاف اس صورت کے کہ سال میں ایک مہینہ روزے رکھے اور زیادہ ہمت ہو تو رمضان کے علاوہ بھی ہر مہینہ میں تین چار دن روزہ رکھ لیا کرے اور افطار میں اچھی طرح کھا لیا کرے اس سے صحت پر کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ تندرستی قائم رہتی ہے اور روزہ بدن کے لئے تنقیہ کا کام دیتا ہے رہا یہ کہ پھر ان احادیث کا کیا مطلب ہے جن میں شبع کی مذمت اور جوع کی فضیلت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ شبع کے دو درجے ہیں ایک طبعی اور ایک اس سے زیادہ یعنی ایک تو پیٹ بھرنا ہے یہ تو شبع طبعی ہے اور ایک پیٹ ٹھنسا کہ بھوک دفع ہو گئی مگر نیت ہی نہیں بھری خواہ مخواہ پیٹ کو آنٹتا چلا جاتا ہے تو حدیث میں جس شبع کی مذمت ہے وہ وہ ہے جو شبع طبعی سے زیادہ[1] ہو جس سے بدہضمی اور ہیضہ ہو جائے جس کو بعض لوگ مبارک مرض سمجھتے ہیں جیسے ایک اعرابی کی حکایت ہے کہ ایک گاؤں میں ہیضہ ہوا تھا تو وہاں کے آدمی بھاگ بھاگ کر اس اعرابی کے گاؤں میں آرہے تھے یہاں قحط

[1] قلت ویؤیدہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثرہم شبعاً ولم یقل من شبع منہم ۱۲ جامع

پڑ رہا تھا کہ لوگوں کو روٹی بھی میسر نہ تھی اعرابی نے پوچھا کہ تم لوگ کیوں بھاگے آرہے ہو کہا گاؤں میں ہیضہ پھیل رہا ہے۔ اعرابی نے کہا کہ ہیضہ کیا ہوتا ہے لوگوں نے بتلادیا کہ زیادہ کھانے سے بدہضمی ہوجاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ افسوس یہ مبارک مرض ہمکو کبھی نہ ہوا تو شریعت نے اس شبع سے منع فرمایا ہے جس سے یہ مبارک مرض پیدا ہو شبع طبعی سے منع نہیں فرمایا اور جوع کی جو فضیلت وارد ہے تو میرے نزدیک اس سے اختیاری جوع مراد نہیں بلکہ غیر اختیاری مراد ہے یعنے یہ اس بھوک کے فضائل نہیں ہیں جو باوجود غلہ گھر ہونے کے اختیار کی جائی بلکہ کسی شخص پر فاقہ آپڑے تنگدستی ہو تو اس کی تسلی کے لئے یہ فضائل بیان کردیئے گئے ہیں کہ مسلمان کو فاقہ میں پریشان نہ ہونا چاہیئے اس سے اس کو ثواب ملتا ہے۔ درجات میں ترقی ہوتی ہے اور یہ فضائل جوع میرے نزدیک ایسے ہی ہیں[1] جیسے احادیث میں بیماری کے فضائل اور اس پر ثواب بیان کیا گیا ہے یقیناً اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود بیمار پڑجایا کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر اتفاقاً بیمار ہوجائے تو ان فضائل سے اس وقت تسلی کرلیا کرے اور اس کی تائید میرے پاس قرآن سے ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصٰبرین○

یعنی ہم تم کو آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور صبر کرنے والوں کو بشارت دیجیے۔ اس میں حق تعالےٰ نے بندوں کو

---

[1] قلت ویؤید قول الشیخ ہذا ما ذکرہ مجدد عصرہ العلامۃ المحدث علی بن سلطان القاریؒ فی شرح الشمائل للترمذی ناقلا عن ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ بما نصہ ومن جہلۃ الصوفیۃ من یقلل المطعم واکل الدسم حتی ییبس بدنہ ویعذب نفسہ بلبس الصوف ویمتنع من الماء البارد وما ہذہ طریقۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا طریق صحابتہم واتباعہم وانما کانوا یجوعون اذا لم یجدوا شیأ فاذا وجدوا اکلوا وقد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاکل اللحم ویحبہ ویاکل الدجاج ویحب الحلواء ویستعذب لہ الماء البارد فان الماء الحار یوذی المعدۃ ولا یروی وکان رجل یقول لا اکل الخبیص لانی لا اقوم بشکرہ فقال الحسن البصری ہذا رجل احمق وہل یقوم بشکر الماء البارد وقد کان سفیان الثوری اذا سافر حمل معہ فی سفرتہ اللحم المشوی والفالوذج انتہی ومحلہ قولہ تعالی قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق وقال تعالی یاایہا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا اھ (ص ۲۰۴ ج ۱) جامع

مطلع فرمایا ہے کہ تمہارے اوپر یہ مصائب نازل ہوں گے ان پر صبر کرنا تو اس آیت میں حق تعالیٰ نے جوع کو بھی مصائب میں شمار فرمایا ہے تو بس جوع کے فضائل ویسے ہی ہیں جیسے اور مصائب کے فضائل ہیں اور دیگر مصائب میں اتفاق ہے کہ ان سے غیر اختیاری مصائب مراد ہیں یہ مطلب نہیں کہ مصائب کو خود اپنے اوپر لادا کرے اسی طرح جوع سے مراد غیر اختیاری ہے ان فضائل کا یہ مطلب نہیں کہ اناج غلّہ گھر میں ہوتے ہوئے بھوکا رہا کرے رمضان میں افطار وسحر کے وقت پیٹ بھر کے کھانے میں یہ بھی راز ہے کہ بھوک کے بعد سیر ہو کر کھانے والا صابر بھی ہے اور شاکر[1] بھی ہے تو اس کی یہ حالت ہوتی ہے مرج البحرین یلتقیان دونوں دریا ملے جلے رہتے ہیں اور جو شخص بھوکا رہتا ہے وہ صرف صابر ہے شاکر نہیں۔ اور ایک راز یہ ہے کہ اچھی طرح کھانے والا اور عمدہ غذائیں کھانے والا نعمت الٰہی کا مشاہدہ زیادہ کرتا ہے جس سے حق تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے اور یہ نصف سلوک ہے پہلے زمانہ میں شاید خوف زیادہ قائد اعمال ہوتا ہو اس لئے تقلیل غذا سے نفع ہوتا ہوگا کیونکہ جوع میں ہر وقت استحضار ہے عقوبت کا لیکن آجکل تو محبت زیادہ قائد ہے اور وہ اچھی طرح کھانے پینے ہی سے بڑھتی ہے اس لئے ضرورت ہے شیخ کو محقق ہونے کی یہ نہیں کہ جو کتابوں میں لکھا ہو اسی کے موافق علاج کرنے لگے بلکہ اپنے زمانہ کی حالت سے بھی باخبر ہونا چاہیئے۔ بعض شیوخ کی عادت ہوتی ہے کہ سب طالبین کو ایک ہی

[1] قال السید ابوالحسن الشاذلی قدس سرہٗ الذی یشرب الماء البارد یحمد اللہ من وسط قلبہ اھ یعنی د مرتبۃ الشکر اتم من حالۃ الصبر فان الاول یورث المحبۃ نعم اذا لم یوجد فمقامہ الصبر آہ کذا فی شرح الشمائل للجد القاری ص ۲۰۴ ج ۱ جامع۔

مجاہدہ تعلیم کرتے ہیں اور ایک ہی ذکر بتلاتے ہیں چاہے کسی سے ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ عارف شیرازی ایسے مشائخ کی شکایت فرماتے ہیں جو ضعفاء کی رعایت نہیں کرتے ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود ؎ گر تو بیداد کنی شرط مروّت نبود

(کمزوروں کو اگر طلب ہے اور قوت رسائی منزل کی نہیں ہے تو اے راہبر اگر تو سختی راہ میں ان کو مبتلا کرتا ہے تو یہ خلاف شفقت و مروت ہوگا)

مولانا فرماتے ہیں ؎

طفل را گر ناں دہی برجائے شیر ؎ طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

(تو بچہ کو اگر دودھ کے بجائے روٹی دے گا تو اس مسکین کمزور بچے کو تو روٹی سے مار ڈالے گا)

اور فرماتے ہیں ؎

چار پا را قدر طاقت بار نہ ؎ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

(جانور پر بقدر طاقت بوجھ رکھو اور کمزوروں پر ان کی ہمت کے اندازے سے بار رکھو)

ہمارے حاجی صاحب کے یہاں ہر شخص کے مناسب نسخے تجویز ہوتے تھے کسی کو خوف کے راستہ سے پہونچایا کسی کو محبت کے راستہ سے کسی کو کثرت ذکر تعلیم کیا کسی کو تلاوت و نوافل بتلائے جس کے جو مناسب ہوا بتلا دیا اور اسی سے بحمد اللہ کامیابی ہوتی تھی اور جو لوگ سب کو ایک لاٹھی ہانکتے ہیں وہ بڑا ظلم کرتے ہیں۔ بہرحال اچھی طرح کھانا پینا جالب محبت ہے اور بھوکا رہنا کہ وہ خود ایک عقوبت ہے سبب خوف ہے اور محبت بہ نسبت خوف کے زیادہ قائد اعمال ہے اور قائد الی الاعمال ہونے کے سبب ہی خوف میں مقصودیت ہے

اس میں بالذات مقصودیت نہیں اور اس قائد ہونے میں محبت اس سے اقوی ہے تو اس کے اسباب زیادہ مطلوب ہوں گے۔ یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ خوف تو جزو ایمان ہے اس لحاظ سے وہ بالذات مقصود ہوا کو سمجھ لینا چاہیئے کہ خوف جو ایمان میں داخل ہے وہ خوف عقلی ہے بمعنی یحتمل ان یدخل النار یعنی یہ مضمون دل میں حاضر رہے کہ شاید ہم کو جہنم میں بھیج دیا جائے یہ بھی آدھا سلوک ہے رہا خوف طبعی وہ بالذات مقصود نہیں بلکہ وہ اس لئے مقصود ہے کہ اعمال کی طرف قائد ہے اور اس درجہ میں عشق اُس سے بڑھا ہوا ہے اس عشق سے زیادہ کوئی قائد نہیں کیونکہ ایک دم سے سب تعلقات مانعہ کو فنا کر دیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت ٭ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
(عشق وہ آگ ہے جو روشن ہونے کے بعد معشوق کے ماسوا کو جلا کر خاک کر دیتا ہے)
تیغ لا در قتل غیر حق براند ٭ در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
(لا الہ کی تلوار سے غیر حق کو قتل کر اور پھر دیکھ کہ اس کے بعد کیا باقی رہتا ہے)
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ٭ مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت
(یعنی صرف الا اللہ باقی رہے گا اور باقی سب فنا ہو جاوے گا۔ مرحبا اے عشق کہ تو ہر غیر محبوب کو جلا دینے والا ہے۔)

ایک مقام پر دل کھول کر عشق کی مدح فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ٭ اے طبیب جملہ علتہائے ما
(اے عشق تو شاد رہ کہ بہت اچھی بیماری ہے کہ تو تمام بیماریوں کے لئے طبیب ہے۔)

اے دوائے نخوت و ناموس ما ✤ اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق تو تکبر اور نخوت اور ناموس کی دوا ہے اور تو ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس ہے)

واقعی عشق سے زیادہ تکبر و نخوت کو کوئی چیز نہیں نکالتی اور فرماتے ہیں ؎

عشق جان طور آمد عاشقا ✤ طور مست و خرّ موسیٰ صاعقا

(طور پہاڑ میں جب عشق آیا تو طور مست ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے تجلی حق سے)

اور فرماتے ہیں ؎

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ ✤ زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

(ہر طرف محبوب حقیقی کے نشانات ہیں عاشق خود حجاب ہے اور محبوب تو زندہ ہے اور عاشق فانی اور مردہ ہے۔)

اب اس شعر میں چونکہ بات دور پہنچ گئی یعنی وحدۃ الوجود کا مسئلہ آگیا جو کہ عوام کے لئے مضر ہے اس لئے عشق کی تعریف ختم کرتے ہیں اور اس ختم کرنے میں اپنا عذر بیان کرتے ہیں ؎

سر پنہاں است اندر زیر و بم ✤ فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(راز پوشیدہ ہے زیر و بم میں اگر میں راز ظاہر کر دوں تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے)

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جو لوگ زیادہ کھاتے پیتے ہیں وہ زیادہ معاصی میں مبتلا ہیں خدا کے ساتھ محبت و عشق کا ان میں نام بھی نہیں اگر زیادہ کھانے پینے سے محبت الٰہی پیدا ہوا کرتی تو سب سے

زیادہ امراء اور رؤسا کو خدا سے محبت ہوتی اور وہی زیادہ مطیع ہوتے مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے اس کا جواب یہ ہے کہ طبائع سلیمہ کا تو خاصہ یہی ہے کہ جتنا مشاہدہ نعم زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی منعم کی محبت میں گھلتا ہے اور اطاعت کی کوشش کرتا ہے ہاں اگر طبائع میں کجی ہے تو پھر اس میں مستی پیدا ہوگی جیسا کہ بعض امراء میں اس کا مشاہدہ ہے مگر محل کی عدم قابلیت سے اگر مؤثر کا اثر ظاہر نہ ہو تو یہ مؤثر کا قصور نہیں بلکہ محل کا قصور ہے۔ شیخ فرماتے ہیں ؎

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ؛ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

(بارش اپنی لطافت طبع کے لحاظ سے ایک ہی حقیقت رکھتی ہے مگر باغ میں اسی سے لالہ پھول پیدا ہوتے ہیں اور زمین شور میں خس وخاشاک اور کانٹے اُگتے ہیں۔)

بارش کتنی پاکیزہ اور لطیف چیز ہے مگر قابلیت وعدم قابلیت محل کا یہ اثر ہے کہ بارش سے کہیں تو پھول پھلواری اور عمدہ عمدہ پھل پیدا ہوتے ہیں اور کہیں خس وخاشاک اور کانٹے اور خاردار درخت اُگتے ہیں تو کیا اس سے بارش کو کوئی مضر کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں بس یہی حال انعامات کی بارش کا ہے اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو آدمی ٹھنڈا پانی پیکر حیا سے زمین میں گڑا جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ مجھ گنہگار پر یہ انعام کہ مجھے ٹھنڈا پانی دیا برف دیا حالانکہ میں تو گناہوں کی وجہ سے اس قابل تھا کہ مجھے غارت کر دیا جاتا سو انعام کا اصل اثر تو یہی ہے ہاں کسی کی طبیعت ہی میں خباثت بھری ہو تو اس سے بحث نہیں اور ایسے خبیث النفس کو جب انعامات سے خدا کی طرف جذب حاصل نہ ہوا اسے بھوکے رہ کر کیا خاک تعلق پیدا ہوگا بلکہ انعامات کے ساتھ گو اس کی طاعات کی توفیق نہیں ہوئی اور معاصی میں مبتلا ہے مگر اس کا ایمان تو محفوظ رہتا ہے۔ اور اگر یہ شخص بھوکا رہے تو اس کے ایمان ہی زائل ہونے کا اندیشہ ہے چنانچہ کثرت سے واقعات اس کے شاہد ہیں بہرحال جن لوگوں میں زیادہ کھانے پینے کی وجہ سے معاصی کا ظہور دیکھا جاتا ہے وہاں بھی کھانا پینا فی الجملہ مفید ہو رہا ہے کہ ایمان ہی کی حفاظت ہوگئی چنانچہ آپ نے کھاتے پیتے رئیسوں کو مرتد ہوتے کم دیکھا ہوگا جو لوگ مرتد ہوتے ہیں وہ اکثر وہی لوگ ہیں جو بھوکے رہنے والے فاقہ زدہ تھے۔

پس آجکل یہ مجاہدہ مناسب نہیں کہ طالبوں کو بھوکا مارا جائے بلکہ مشاہدہ نعم کے ساتھ مجاہدہ کرانا چاہیئے اول ان کو حسی نعمتوں سے بھاؤ کھانے پینے کی اچھی طرح اجازت دو پھر وہ معنوی نعمتوں کی بھی قدر کریگا اور نعمتوں کے مشاہدہ سے جب اس میں محبت پیدا ہو جائے گی تو پھر وہ کسی مصیبت سے پریشان نہ ہوگا اور یوں کہے گا ؎

ناخوش تو خوش بود برجانِ من ⁂ دل فدائے یار دل رنجانِ من

(اے محبوب آپ کی ناخوشی یعنی آپ کی طرف سے رنج بھی ہمارے لئے خوشی ہے کیونکہ یہ دل محبوب پر فدا ہے پس ان کی طرف سے ناخوشگوار حالات سے بھی راضی ہے)

لہذا روزہ رکھ کر افطار و سحری میں خوب کھاؤ اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ صاحب جب سحری میں خوب ٹھونس لیا تو روزہ میں مجاہدہ ہی کیا ہوا میں کہتا ہوں افسوس تم اپنے نفس کی حالت سے بھی غافل ہو صاحب نفس کو اپنی عادت کے بدلنے سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ سحری میں چاہے آپ کتنا ہی کھالیں مگر روزہ کی وجہ سے ضعف ضرور ہوتا ہے پہلے بھی یہ مضمون آچکا ہے خصوصاً رمضان کے اخیر حصہ میں ہر شخص کے چہرہ سے ضعف کے آثار مترشح ہوتے ہیں۔ غرض جو لوگ سحری میں اچھی طرح کھانے والے ہیں رمضان کا اثر ان پر بھی ضرور ہوتا ہے۔ اسی لئے شارع نے صوم کو مجاہدہ میں داخل کر لیا مگر یہ لطیف مجاہدہ ہے جو لطیف طبائع کے لئے موزوں ہے اور سخت طبیعت والوں کے لئے دوسرا مجاہدہ ہے۔ ان کے واسطے امام غزالی کی کتاب علاج ہے جس میں تاکید ہے تقلیل مقدار طعام کی لطیف اور کثیف طبیعت پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

دیوبند کے ایک رئیس کے یہاں تقریب تھی جس میں عمدہ عمدہ کھانے پلاؤ زردہ فیرینی وغیرہ پکے تھے۔ اتفاق سے بیگار میں ان کی رعیت کے چمار آئے تھے ان کو بھی کھانا دلوا دیا گیا تو پلاؤ زردہ کو انھوں نے ناک منہ چڑھا کر کھایا کیونکہ وہ گنوار ان کھانوں کا پورا لطف کیا جانیں لیکن

جب فیرینی چکھی تو ان سے نہ رہا گیا آپس میں کہنے لگے کہ یہ تھوک سا کیسے ہے (کیا ہے؟) بھلا وہ گڑ بٹا کے کھانے والے ان کو فیرینی کی لطیف شیرینی کیا محسوس ہوتی ان کے منہ کو وہ پھیکی ہی لگی اس لئے تھوک سے تشبیہ دی ایسے ہی جو لوگ سخت طبیعت رکھتے ہوں ان کیلئے واقعی مجاہدہ صوم کافی نہ ہوگا مگر آجکل ایسی سخت طبیعتیں کہاں ہیں آجکل تو سارے نازک ہی نازک ہیں۔ امام غزالی کی تحقیق اس زمانہ کے مناسب ہوگی اس وقت قویٰ مضبوط تھے آجکل کے مناسب نہیں کیونکہ مجاہدہ سے مقصود کسر قوت بہیمیہ ہے اور اب تو قوت بہیمیہ خود ہی ٹوٹی ہوئی ہے اس پر بھی مخلوق کو بھوکا رہنے کو تعلیم کرنا اس مثل کا مصداق ہوجائے گا کہ مرے کو مارے شاہ مدار۔ البتہ ان احادیث پر نظر کر کے جن میں کثرت شبع کی مذمت ہے اور محققین کے اقوال میں غور کر کے اتنی بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ شبع طبعی سے زیادہ نہ کھاوے اناڑی کی طرح بندوق نہ بھرے بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ تراویح بیٹھ کر پڑھنا کیسا ہے میں اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ جس نے افطار میں ناک ناک پانی بھرا ہو اور گلے تک کھانا ٹھونسا ہو اُسے ناجائز ہے کیونکہ وہ اپنے ہاتھوں معذور بنا اور جس نے عادت کے موافق پیٹ بھر کے کھایا ہو اُسے جائز ہے۔ کیونکہ وہ واقعی معذور ہے۔ فقہا نے بھی سحری میں اتنا کھانے سے منع کیا ہے جس سے روزہ میں کھٹی ڈکاریں آویں۔ اور یہ جبھی ہوگا جب شبع طبعی سے زیادہ کھاوے گا سو اتنا کھانا مکروہ ہے ہاں معمول کیموافق پیٹ بھر کے کھانے کا مضائقہ نہیں اور یہ جو بعض صوفیہ نے جن پر فلسفیت غالب ہے لکھدیا ہے کہ جو شخص رمضان میں بھی اور دنوں کی طرح پیٹ بھر کے کھائے اس نے روح صوم کو باطل کر دیا میرے نزدیک غلط ہے میں شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر پیٹ بھر کے کھانا صوم کو مضر ہوتا تو بخدا شارع اس کو ممنوعات صوم میں ضرور قرار دیتے کیونکہ یہ ضرر کچھ کم نہیں ہے کہ روح عبادت ہی باطل ہوجائے اگر حرام بھی نہ کرتے تو کم از کم مکروہ ہی قرار دیتے مگر ممنوعات صوم میں شارع نے شبع کا

ذکر تک کہیں نہیں کیا آخر جو چیزیں روح صوم کو مضر تھیں شارع نے ان کو بیان کیا ہی ہے چنانچہ ارشاد ہے ۔ من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ یعنی جو شخص جھوٹ بولنا اور غلط باتوں پر عمل کرنا نہ چھوڑے (اس میں سب معاصی آگئے ۱۲) تو خدا کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کچھ ضرورت نہیں ۔ تو دیکھئے قول زور مفطر صوم نہیں جھوٹ بولنے سے روزہ ٹوٹتا نہیں مگر چونکہ روح صوم کو مضر تھا اس لئے شارع نے اس کا مضر ہونا ظاہر کر دیا اگر شبع بھی روح صوم کو مضر تھا تو شارع نے اس سے کیونکر تعرض نہیں فرمایا جب شارع نے اس سے تعرض نہیں کیا تو ہم دل کھول کر کہتے ہیں کہ شبع روح صوم کو کچھ مضر نہیں جس کو غلاف کعبہ کے اندر سے کعبہ نظر آرہا ہو وہ تو کعبہ ہی کی طرف منہ کرے گا اس کو غلاف کی طرف منہ کرنے کی کیا ضرورت ہے ایسے ہی جب مجکو حقیقت منکشف ہوگئی تو میں وہی کہوں گا جو میں سمجھا ہوں ممکن ہے کسی محقق کے نزدیک یہ تحقیق صحیح نہ ہو تو ان کو وہ علم مبارک ہو جو ان کے پاس ہے اور چونکہ وہ ان کا اجتہاد ہے اس لئے اجر اُن کو بھی ملے گا ۔ پس اب میں ختم کرتا ہوں الحمدللہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ تقلیل طعام میں جتنی صورتیں مجاہدہ کی نکل سکتی ہیں روزہ ان سب میں افضل ہے ۔ باقی کے متعلق انشاءاللہ آئندہ بیان کروں گا اور مناسبت مضمون کے اعتبار سے اس بیان کا نام تقلیل الطعام ۔ بصورۃ الصیام) تجویز کرتا ہوں ۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو برکات صوم سے متمتع فرمادے اور فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین ۔ والحمد للہ رب العٰلمین وصلے اللہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ المسمّٰی بہ

تقلیل المنام ــ بصورۃ القیام

وھو الجزو الثانی من المجموعۃ الملقبۃ بہ

ابواب المجاہدہ ــ واسباب المشاہدہ

حکیم الاُمّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

ــــــ ناشر ــــــ

مُحمّد عبد المنّان غُفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ المسمّٰی بہ

تقلیل المنام ۔ بصورۃ القیام

وھو الجزء الثانی من المجموعۃ الملقبۃ بہ

ابواب المجاہدہ واسباب المشاہدہ

این	متٰی	کم	کیف	لم	ماذا	ضبط من	ای شان من	المستمعین	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے ضبط کیا	کس طبقہ کو زیادہ مقصود تھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	۱۴ رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ بعد نماز جمعہ	۲ گھنٹہ	کھڑے ہو کر	وجہ ان سب مواعظ متحدۃ المعانی کی واحد ہے	تقلیل منام کی جو صورت شریعت نے تراویح کی صورت میں تجویز کی ہے اس سے بہتر تقلیل منام کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ وکان لہ	سب مسلمانوں کو عموماً اور جہلا صوفیہ کو خصوصاً	تقریباً ۱۰۰	اس وعظ کی تسوید تفصیلی ۱۱ محرم ۱۳۴۳ھ بروز پنجشنبہ شروع ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا

هادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔

غالباً سامعین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ جمعہ کو بھی یہی آیت پڑھی گئی تھی اور اس کی تفسیر میں بہت سے ضروری مضامین بیان ہوئے تھے۔ مگر راس واساس سب کا مجاہدہ تھا جس کے چار ارکان بتلائے گئے تھے۔ تقلیل طعام، تقلیل منام۔ تقلیل کلام و تقلیل الاختلاط مع الانام۔ اور یہ دعوےٰ کیا گیا تھا کہ تقلیل طعام کو شریعت نے روزہ کی صورت میں مقرر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ جو صورتیں اہل مجاہدہ نے تقلیل طعام کی اختیار کر رکھی ہیں شریعت میں اس کی مقصودیت کی اصل نہیں اور اس کے ضمن میں وجوہ ترجیح مجاہدہ شرعیہ کی مجاہدہ عرفیہ پر بیان کی گئی تھیں جن کا عدد اس وقت یاد نہیں اور اس وقت دو وجوہ ترجیح اور یاد آئے وہ یہ کہ مجاہدہ عرفیہ مظنہ ہے فتنہ و غائلہ کا اور مجاہدہ شرعیہ میں یہ احتمال نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ جو طریقہ مجاہدہ تقلیل طعام کا مرتاضین میں مستعمل ہے کہ کوئی ایک وقت کھانا کھاتا ہے کوئی دو وقت کھاتا ہے تو غذا میں بہت کمی کر دیتا ہے اس طریقہ سے عجب و ناز پیدا ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو بزرگ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں بڑا صاحب مجاہدہ ہوں کہ دوسروں سے کم کھاتا ہوں۔ اور جو اس سے زیادہ کھاتے ہیں ان کو وہ بہائم و جانور سمجھتا ہے کہ یہ لوگ خاک مجاہدہ نہیں کرتے اور گو عجب کا علاج ممکن ہے مگر مشاہدہ یہی ہے کہ عجب کا اکثر علاج نہیں کیا جاتا۔ اور علاج کرے کیونکر

وہ تو اپنی حالت کو اچھی سمجھتا ہے کیونکہ عجب کے معنے ہی یہ ہیں کہ اپنی حالت کو اچھا سمجھے اور جب وہ اپنی حالت کو اچھا سمجھیگا تو علاج کیسے کرے گا اور اگر علاج کرنا بھی چاہے تو ایک مانع قوی ایسا ہے جس کی وجہ سے ضعفاء کو علاج کی ہمت نہیں ہوتی۔ اصول سے اس عجب کا علاج (جو کم کھانے سے پیدا ہوا ہو) یہ ہے کہ خوب کھانے لگے مگر اس میں ان کو یہ عار دامنگیر ہوتی ہے کہ تیرا کم کھانا تو مشہور ہو چکا ہے اب اگر کھاتے پر گرے گا اور خوب کھانے لگے گا تو لوگ کہیں گے کہ بس اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے ایک وقت کھانے پر نباہ نہ ہوسکا۔ اب یہ شخص محض مخلوق کے دکھانے کو ایک وقت کھاتا ہے تاکہ اس کا مجاہدہ لوگوں میں بنا رہے اور یہ ریا کا شعبہ ہے اس کا علاج بھی وہی ہے کہ خوب کھانے لگے اور ایک وقت کی جگہ دو وقت کھانے لگے یہ علاج ایسا ہے کہ جو امر اس سے مانع ہے یہ اس کا رافع ہے مگر اس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے کہ ایک دفعہ کو ننگ و ناموس کی پروا نہ کرے ان کو چولھے میں ڈالے اس کا خیال نہ کرے کہ لوگ کیا کہیں گے پھر تو اس علاج میں کچھ دشواری نہیں دشواری اسی وقت تک ہے جب تک ریا و عجب دل میں بھرے ہوتے ہیں اور یہ بڑے سنگین امراض ہیں بزرگوں نے لکھا ہے کہ ریا و عجب قلب میں سے سب سے اخیر میں نکلتے ہیں واقعی ان دونوں سے بہت ہی کم لوگ بچے ہوئے ہیں ورنہ اکثر لوگوں کے تو رگ رگ میں عجب و ریا و کبر گھسا ہوا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات ریا سے بچنے کی صورت میں ریا ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض ذاکرین جن کو ذکر جہر تعلیم کیا جاتا ہے وہ یوں کہتے ہیں کہ حضرت اس میں تو ریا ہوتی ہے۔ یعنی ہم کو ذکر خفی کی اجازت دیدی جائے مگر یاد رکھو اس نفس کا ایک کید ہے۔ میں

مطلب نہیں کہ سبھی میں کید ہوتا ہے بلکہ اس کا مدار شیخ محقق کی رائے پر ہے جس کیلئے
شیخ ہی خود ذکر خفی تجویز کرے اس میں تو کید نہیں اور جس کے لئے شیخ جہر تجویز کرے
اور طالب خفی کو تجویز کرے تو اس میں کید ہے اور وہ کید یہ ہے کہ یہ شخص یوں
چاہتا ہے کہ میں ذکر میں آزاد ہوں لوگ میری ناغہ سے مطلع نہ ہوں اور یہ آزادی
ذکر خفی ہی میں ہو سکتی ہے اگر تم سال بھر بھی ذکر نہ کرو تو ملنے ملانے والے یہی
سمجھتے رہیں گے کہ چپکے چپکے کام کر لیتے ہوں گے اور ذکر جہر میں اگر ایک رات
بھی آنکھ نہ کھلی تو سارا محلہ جان جائے گا کہ آج آنکھ نہیں کھلی بس سارا زور شور
ختم ہو گیا تو اس میں ناغہ کا فوراً بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے جب کوئی
مجھ سے کہتا ہے کہ ذکر جہر میں تو ریا ہوتی ہے میں کہہ دیتا ہوں جس دن ناغہ ہوگا
اس دن تواضع بھی پیدا ہو جائے گی خود شرماؤ گے کہ میری ناغہ کی سب کو اطلاع
ہوگئی اور ذکر خفی میں یہ تواضع کہاں نصیب چاہے روز ناغہ کرتے رہو لوگ سمجھیں گے
کہ مولانا ذکر خفی کیا کرتے ہیں اس لئے آواز نہیں آتی چاہے مولانا سو ہی رہے
ہوں۔ اس لئے یہ وسوسے واہیات اور فضول ہیں کہ ذکر جہر میں ریا ہوتی ہے
اس کا منشا ر بھی ریا و عجب ہی ہے کہ تم اپنے نقص کو لوگوں سے چھپانا چاہتے
ہو اور اس کا علاج یہی ہے کہ جہر کیا کرو۔ الغرض تقلیل طعام کی جو صورت
مرتاضین میں مستعمل ہے اس میں عجب و کبر کا بڑا اغائلہ ہے اور اس کا علاج
محققین کے اصول پر خوب کھانا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اگر کسی عبادت میں
عجب کا احتمال ہو تو اس کو ترک کر دے اس طرح تو سب عبادات چھوٹ جائیں گی
بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کسی عبادت کے دو طریقے ہوں جن میں سے ایک میں تو
عجب کا مظنہ ہو اور دوسرے میں عجب کا احتمال بھی نہ ہو تو دوسرا طریق بہتر ہے
اور شریعت نے جو صورت تقلیل طعام کی مقرر کی ہے (کہ روزہ میں صرف کھانے کے

اوقات کو بدل دو غذا میں کمی نہ کرو ۱۲) اس میں عجب تو کیا پیدا ہوتا بلکہ اس کا مقابل تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ افطار کے وقت ایسا روزہ دار ٹھنڈے پانی پر برف پر اور مختلف قسم کے کھانوں پر گرتا ہے۔ رمضان میں اکثر گھروں میں اور دنوں سے زیادہ کھانے پکتے ہیں۔ روٹی دال کے علاوہ گوشت اور پھلکیاں اور چنے کے دانے وغیرہ بھی پکائے جاتے ہیں پھر احباب کو بھی کچھ بھیجدیتے ہیں خصوص موذن تو رمضان میں ایسے مختلف کھانے کھاتے ہیں کہ امراء سے بھی اچھے پڑ جاتے ہیں تو جو شخص اتنی چیزوں پر گرے گا تو اس میں عجب کیا پیدا ہوتا وہ تو اپنے کو بہت ہی شرمندہ پائے گا کہ آج میں کتنا کھا گیا لوگ کیا کہتے ہوں گے اور پھر مزا یہ ہے کہ اس کے ساتھ مجاہدہ بھی حاصل ہو گیا چنانچہ اس کا پہلے بیان ہو چکا ہے اور ایک مفسدہ مجاہدہ عرفیہ میں وہ ہے جس کو میں اپنے احباب کے سامنے اکثر کہتا رہتا ہوں اور اس کو میں نصف العلم کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجاہدہ عرفیہ والا اپنے اعمال کو زیادہ اور نعماء الٰہیہ کو کم سمجھتا ہے اور دوسرے لوگوں کو اعمال میں کم اور نعماء سے زیادہ منتفع ہونے والا خیال کرتا ہے۔ نیز خیال کرتا ہے لوگ لذات سے منتفع ہیں اور میں لذات سے الگ ہوں حالانکہ تقلیل طعام تو مجاہدہ ہے مگر ترک لذات مجاہدہ نہیں" یہ محض اہل ریاضت کی عادت ہے۔ جو دلیل شرعی نہیں ہو سکتی شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں دیکھئے الذ الاشیاء دنیا میں وقاع ہے لیکن شریعت نے بضمن نکاح اس کی ترغیب دی ہے۔ حدیث شریف میں ہے یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہا اغض للبصر واحصن للفرج اور ترغیب نکاح سے محض شہوت ہی مقصود نہیں بلکہ لذت بھی مراد ہے۔ ورنہ کسر شہوت کی تو اور بھی صورتیں تھیں چنانچہ رہبانیت ہے اختصاء ہے کافور کھا لینا ہے بعض صحابہ نے اپنے اجتہاد سے یاراہبوں کو دیکھ کر اختصاء کی اجازت چاہی تھی تو حضور صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے منع فرمایا۔پھر شریعت میں عزل سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس میں شیخ کامل ولذت اکمل نہیں ہوتی اگر نکاح سے محض کسر شہوت ہی مقصود ہوتی تو عزل پر انکار نہ کیا جاتا اور گو بعض نصوص سے اس ترغیب سے مقصود تو الد ہے لیکن وہ خود موقوف ہے لذت پر تو مشروط کی ترغیب شرط کی ترغیب ہے پھر نکاح کی ترغیب کے بعد کثرت وقاع سے بھی شریعت نے منع نہیں کیا، چنانچہ قلت وکثرت طعام کے لئے تو کچھ حدود حدیث میں وارد بھی ہیں۔ثلث لطعامہ۔وثلث لشرابہ وثلث لنفسہ کہ تہائی پیٹ کھانے میں بھرے اور تہائی پانی میں اور تہائی سانس کے لئے رکھے ۱۲) مگر کثرت وقع کے لئے شریعت میں کوئی حد وارد نہیں شریعت نے اس سے بحث ہی نہیں کی کہ یہ طبی مسئلہ ہے اس سے اطباء بحث کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ کثرت وقاع سے باطن کو ضرر نہیں ہوتا ورنہ شریعت اس سے ضرور بحث کرتی پھر اہل شریعت کا طرز عمل دیکھو تو ان میں سب سے بڑے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ تقلیل طعام تو آپ نے کی ہے لیکن تقلیل وقاع کا آپ کے یہاں اہتمام نہ تھا آپ کے پاس نو بیبیاں تھیں اور دو خاص باندیاں ملاکر گیارہ کا عدد پورا ہوگیا تو بعض دفعہ آپ نے ایک رات میں سب سے فراغت کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ قوت بھی اور لوگوں سے بہت زیادہ تھی۔حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہم باہم کہا کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس مردوں کی قوت ہے اور بعض روایات میں چالیس بھی آیا ہے۔اسی لئے حق تعالیٰ نے آپ کو امت سے زیادہ بیبیاں رکھنے کی اجازت دی۔بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نو پر اکتفا کیا یہ بھی آپ کا صبر تھا ورنہ آپکے تو تیس چالیس نکاح کرنے چاہئیں تھے اپنی قوت کے موافق مگر مخالفین نو ہی پر شور مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے بہت نکاح کئے حالانکہ کثرت وقلت امور

اضافیہ ہیں تمہاری قوت کے اعتبار سے اگر یہ مقدار زیادہ ہے تو کیا یہ عدد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کے اعتبار سے بھی زیادہ ہے ہرگز نہیں آپ کی قوت کے لحاظ سے تو یہ کچھ بھی نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت وقاع سے احتراز نہیں فرمایا۔ اگر یہ مضر باطن ہوتا تو آپ ضرور اس سے احتراز کرتے اس پر شاید کوئی یوں کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے باطنی ضرر نہ تھا اس لئے آپ احتراز نہ کرتے تھے مگر ہم کو احتراز کرنا چاہیئے تو میں کہتا ہوں کہ یہ وہی بات ہے جس کا جواب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیا جس کا قصہ احادیث میں اس طرح ہے کہ حضرات ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بعض صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات پوچھے انھوں نے ظاہر فرمادیا جس کا حاصل یہ تھا کہ آپ رات کو کچھ دیر سوتے ہیں۔ کچھ دیر جاگتے ہیں کچھ دیر عبادت کرتے ہیں کچھ وقت بیبیوں کی باتوں میں صرف کردیتے ہیں کبھی روزہ رکھتے ہیں کبھی افطار کرتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں فکانھم تقالوھا وقالوا این نحن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد غفر اللہ ما تقدم من ذنبہ وما تأخر فقال احدھم اما انا فاصلی اللیل ابداً وقال اٰخر انا اصوم النھار ابداً ولا افطر وقال الاٰخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابداً۔

یعنی ان حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستور العمل کو سہل دیکھ کر قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں اور تقلیل عمل مضر نہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ بخشدیئے ہیں (بالفرض اگر ہوں ورنہ آپ میں گناہ کا وجود ہی نہ تھا) لیکن ہم کو بوجہ اپنے نقصان مرتبہ کے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ اس لئے ایک نے قسم کھالی کہ میں تو آج سے تمام رات نہ سوؤں گا یہ عمل شاق تو اس نے اختیار کیا۔ دوسرے بولے کہ میں ساری عمر روزے ہی رکھا کروں گا تیسرے بولے کہ میں کبھی نکاح ہی نہ کروں گا صحابہ کی بھی عجب حالت تھی کہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو قلیل دیکھ کر یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ لاؤ ہم بھی کم ہی کیا کریں کیوں مصیبت میں پڑے۔ واقعی ہم تو اپنے مرشد کی عبادت کم دیکھ کر یہی کہیں کہ ہم کو بھی زیادہ کی کیا ضرورت ہے۔ مگر صحابہؓ نے اس کے برعکس یہ کہا کہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کم کریں مگر ہم کو زیادہ ہی کرنا چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور ان حضرات کے خیالات کی غلطی ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تم نے ایسا ایسا کہا یاد رکھو میں تم سے زیادہ حق تعالیٰ سے ڈرتا ہوں لیکن باوجود اس کے اصوم و افطروا صلی وارقد و اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی متفق علیہ یعنی میں کبھی روزہ رکھتا ہوں کبھی افطار کرتا ہوں اور کچھ جاگتا ہوں کچھ سوتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میری سنت ہے) اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ تو دیکھئے ان صحابہ کے خیال کا یہی حاصل تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لذات کے استعمال سے ضرر نہیں ہوتا۔ مگر ہم کو ضرر ہوگا اس لئے ہمیں لذات سے بچنا چاہیئے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کو خلاف سنت بتلایا۔ پس ثابت ہوا کہ کثرت وقاع سے ضرر کا اعتقاد رکھنا دین میں بدعت ایجاد کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کثرت وقاع میں ہر شخص کو اپنی قوت کا اندازہ کر لینا ضروری ہے۔ اسراف تو ہر شے میں مذموم ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کے طرز عمل کو دیکھا جاوے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں افطار کر کے عشاء کے وقت تک گیارہ عورتوں سے فارغ ہوا کرتے تھے ان میں باندیاں بھی تھیں شاید کوئی یہ کہے کہ مغرب سے عشاء تک وقت ہی کیا ہوتا ہے جس میں گیارہ سے فراغت کر لیتے تھے اور اگر جلدی جلدی فارغ ہوتے تھے تو یہ ان کے ضعف کی دلیل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں عشاء کی نماز دیر میں ہوتی تھی اس لئے ان کو کافی وقت ملتا تھا اور ہم اس لئے جلدی پڑھتے ہیں کہ شاید زیادہ دیر

کرنے سے کوئی نماز ہی کو نہ آوے اور ہم کسی کو کیوں کہیں ہمیں سب سے پہلے اپنا ہی احتمال ہے کہ شاید ہم ہی نہ آویں. غرض کہ صحابہ کا کثرت وقاع میں یہ طرز عمل تھا۔ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ یہ وہ بزرگ ہیں جو اتباع سنت و زہد و عبادت میں صحابہ کے اندر ممتاز تھے۔ ان کے طرز سے بھی معلوم ہوا کہ کثرت وقاع زہد و عبادت کے خلاف نہیں اور نہ باطن کو مضر ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی لذت نہیں۔ جب شریعت نے اس سے نہیں روکا بلکہ ترغیب دی ہے تو ثابت ہو گیا کہ ترک لذات کو مجاہدہ میں کوئی دخل نہیں یہ محض اہل ریاضت کا معمول ہے اگر اس میں اعتقاد فاسد نہ ہو تو ایک طبی معالجہ ہے. بس افطار میں شربت و برف پینا خلاف مجاہدہ ہرگز نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجاہدہ عرفیہ والے کی نظر اپنے مجاہدہ پر ہو جاتی ہے وہ اپنے کو نعماء الٰہیہ سے بہ نسبت دوسروں کے کم منتفع سمجھتا ہے اور زیادہ کھانے والا اس بلا میں مبتلا نہیں ہوتا وہ تو اپنے کو سر سے پیر تک خدا کی نعمتوں میں غرق پاتا ہے اور پھر سمجھتا ہے کہ میں مجاہدہ کیا خاک کرتا ہوں روزہ افطار کر کے تو میں نے اتنا کھا لیا کہ دو آدمی بھی اتنا نہ کھاتے اس لئے اس میں تواضع کی شان پیدا ہوتی ہے اور جو تقلیل طعام کرنے والا اپنے کو نعماء الٰہیہ سے کم منتفع ہونے والا سمجھتا ہے وہ احمق بس خدا کی نعمتوں کو روٹیوں ہی میں منحصر سمجھتا ہے حالانکہ اس کے سوا اور ہزاروں نعمتیں خدا کی اس پر ہیں جن میں یہ شخص سر سے پیر تک غرق ہے۔ مثلاً درندوں اور سانپ بچھو سے حفاظت کی جاتی ہے یہ کتنی بڑی نعمت ہے خدا نے لباس دیا یہ نعمت ہے علم دیا یہ نعمت ہے عزت و جاہ دی یہ نعمت ہے، اپنے ذکر کی توفیق دی یہ نعمت ہے، مکان دیا بیوی بچے دیئے یہ نعمت ہے ہم زبان لوگوں میں رکھا یہ نعمت ہے اور اس نعمت کی

قدر بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں۔ مگر جب کہیں غیر ملک میں سفر کا اتفاق ہو جہاں کی زبان آپ نہ جانتے ہوں اور نہ وہاں کوئی آپ کی زبان جانتا ہو تب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے کہ ہم زبانوں میں ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ ایک حاجی اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ وہ حج کو جاتے ہوئے راستہ میں سوئیس پر اتر پڑے وہاں اردو داں کوئی نہ تھا۔ اب یہ اپنے لئے مکان اور کھانے کا انتظام کرنا چاہتے ہیں مگر ان کی سمجھے کون بیحد پریشان ہوئے ایک شخص نے صرف ہندی داں کا پتہ بتلانے کے لئے ان سے چار روپیہ اجرت کے لئے وہ ڈاک خانہ کا ملازم تھا یہودی تب یہ اس کے پاس پہنچے۔ اور نہ معلوم پہلے شخص سے اجرت کا معاملہ کیونکر طے کیا ہوگا اور کس طرح اشاروں میں یہ مفہوم ادا کیا ہوگا کہ میں کسی ہندی داں سے ملنا چاہتا ہوں کیا خبر زبان باہر نکالی ہوگی یا کس طرح سمجھایا ہوگا۔ زبان باہر نکالنے پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص ہرن خرید کر لایا کسی نے اس کی قیمت پوچھی اس کی قیمت گیارہ روپئے بتلانا چاہتا تھا مگر یہ لغت یاد نہیں آیا اس لئے اس نے گیارہ روپیہ کا عدد اس طرح بتلایا کہ اول ایک ہاتھ کی انگلیاں کھول کر پانچ کا عدد بتلایا پھر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے پانچ اور بتلانا چاہا تو رسی ہرن کی منہ میں پکڑ لی دس تو یہ ہوئے پھر گیارھواں بتلانے کے لئے جیب باہر نکالدی ترکیب تو اچھی تھی مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ہرن بھاگ گیا۔ تو صاحبو زبان کا نطق بھی خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جس کو ہم رات دن قینچی کی طرح چلاتے رہتے ہیں۔ پھر زبان دینے کے بعد ہم زبانوں میں رکھنا یہ بھی بڑی نعمت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا ٭ بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

(جو شخص اپنے ہم زبان سے جدا ہو جاتا ہے تو وہ سیکڑوں مضامین قلب میں رکھتے ہوئے بھی بے زبان اور بے آواز رہتا ہے)

مولانا نے تو کسی اور حالت پر فرمایا ہے۔ مگر اس حالت پر بھی یہ چسپاں ہوتا ہے مولانا کی مراد تو ہم زبان سے ہم زبان باطنی یعنے ہمراز ہے شیخ محقق ہو جماعت ذاکرین ہو۔ کہ جب ذاکر اپنے شیخ یا اپنی جماعت سے الگ ہوتا ہے تو سخت الجھن میں پڑجاتا ہے۔ واقعی نااہلوں میں پھنسکر اپنی جماعت کی قدر ہوتی ہے تو مولانا کی مراد ہمزبان سے ہمزبان باطن ہے۔ کیونکہ اس طریق میں ظاہری ہمزبان کی ضرورت نہیں اگر طالب و شیخ کی زبان جدا جدا ہو جب بھی فیض ہوتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ایک رومی شیخ آئے تھے جن کا نام تھا سعد آفندی۔ حضرت اس وقت مثنوی پڑھا رہے تھے اور تقریر اردو ہی میں فرمایا کرتے تھے مگر وہ محظوظ تھے۔ ایک خادم نے حضرت سے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے تو ان کو اور زیادہ حظ آتا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس حظ کے لئے اس زبان کی ضرورت نہیں اور یہ شعر پڑھا ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر ست ٭ عشق را خود صد زبان دیگر است

(فارسی میں بات کر دگرچہ عربی زبان خوشتر اور افضل ہے۔ عشق کے لئے سیکڑوں زبانیں اور بھی ہوتی ہیں)

بوئے آں دلبر چو پراں می شود ٭ ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

(اس محبوب حقیقی کی خوشبوئے قرب جب دل محسوس کرتا ہے تو اس کو ظاہر کرنے کے لئے جملہ زبانیں قاصر اور محو حیرت ہو جاتی ہیں)

تو دیکھئے ہمزبانوں میں ہونا کتنی بڑی نعمت ہے مگر وہ احمق ان نعمتوں پر نظر نہیں کرتا وہ صرف دو روٹیوں ہی کو نعمت سمجھتا ہے حالانکہ حق تعالٰے کی نعمتیں اتنی ہیں کہ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا جس کا ادنیٰ طریقۂ امتحان وہ ہے جو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بیان فرمایا ہے۔ ہر نفسے کو فرومی رود ممد حیات است

وچوں می آید مفرح ذات پس در ہر نفسے دو نعمت موجود است و در ہر نعمتے شکرے واجب یعنی جو سانس اندر جاتا ہے۔ معین حیات ہے اور جو سانس باہر آتا ہے وہ روح کا مفرح ہے اس لئے ہر سانس میں دو نعمتیں ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے اب خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا احصار کیونکر ہو سکتا ہے تم جتنی مقدار معین کروگے ہر سانس پہلی میزان کو غلط کردے گا بلکہ خود یہ سانس ہی ایک نعمت ایسی ہے کہ اس کا بھی احصار نہیں ہو سکتا بعض لوگوں نے حبس دم کرکے اس نعمت سے منتفع ہونے میں بھی تقلیل کی ہے مگر اس نعمت میں تقلیل کا قصد کرنا ان کا بیہودہ پن ہے۔ اور میں حبس دم کو بیہودہ نہیں کہتا بلکہ اس خیال کو بیہودہ کہتا ہوں۔ یعنی تقلیل نعمت کے خیال سے حبس دم کرنے کو ورنہ حبس دم کو بعض اغراض محمودہ کے لئے بزرگوں نے بھی کیا ہے۔ شیخ ابوسعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ایک مرتبہ ایک تجلی کے اشتیاق میں جو ایک بار پہلے حاصل ہوئی تھی حبس دم کرکے یہاں تک عزم کرلیا کہ جب تک تجلی نہ ہوگی سانس نہ چھوڑوں گا۔ جب بہت دیر ہوگئی اضطراراً شدت کے ساتھ جو سانس چھوٹا ہے اس کے صدمہ سے پسلی ٹوٹ گئی اس وقت وہ تجلی ظاہر ہوئی اور اس میں ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس میں معجون کی طرح کوئی دوا تھی وہ ان کے منہ میں ڈال دی گئی۔ اس کے کھاتے ہی پسلی جڑ گئی اور اسی حالت میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ چوزہ کا شوربا چند روز پیو۔ شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کو جو ان کے شیخ تھے اس واقعہ کی اطلاع دی انہوں نے اسی روز سے چوزہ کے شوربے کا ان کے لئے اہتمام فرمادیا۔ مگر خدا کے لئے کوئی صاحب غلط کشف نہ گھڑنے لگیں کہ روز آ آکر شیخ کو سنایا کریں کہ آج مجھے یہ کھانے کا حکم ہوا ہے۔ آج یہ پینے کا حکم ہوا ہے جیسے آجکل ایک شیخ پورب کی طرف ہیں ان کے یہاں کشف کا بازار بڑا گرم ہے ان کے مریدوں کو

روز ایسے ہی کشف ہوتے ہیں کہ آج حکم ہوا کہ فلاں شخص کو اتنے روپے دیدو۔ فلاں جگہ فاتحہ کردو فلاں جگہ عرس میں شرکت کرو۔ فلاں ملازم کو ترقی دو۔ فلاں کو معزول کردو۔ اور وہ خدا کے بندے سب کو صحیح سمجھتے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ شیخ محقق کے یہاں چھوٹے کشف نہیں چل سکتے وہاں قلعی کھل ہی جاتی ہے تو پھر کفش پڑنے لگتے ہیں۔ اور شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ جس خاص تجلی کے اشتیاق میں حبس دم کرکے بیٹھے تھے اس کا پہلی بار حاصل ہونے کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ شیخ نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے بعد تعلیم ذکر و شغل کے نظر بصیرت سے یہ معلوم کرکے کہ ذکر و شغل سے ان میں عجب ہو گیا ہے سب ذکر و شغل چھوڑ واکر معالجہ کے طور پر شکاری کتوں کی خدمت ان کے سپرد کی تھی۔ ایک مرتبہ یہ ان کتوں کو جنگل میں لے جارہے تھے کہ کتوں نے دور سے کسی شکار کو دیکھا بس اب وہ کہاں تھے وہ بھی ہرن ہو گئے۔ کچھ دور تو شیخ ابوسعید ان کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے جب دیکھا کہ میرے قابو سے باہر ہیں تو اس خوف سے کہ کہیں رسی ہاتھ سے چھوٹ جائے اور کتے بھاگ جائیں تو شیخ کا عتاب ہوگا انھوں نے کتوں کی زنجیر کو اپنی کمر سے باندھ لیا کتوں نے جو زور میں دوڑنا شروع کیا تو بیچارے نہ سنبھل سکے گر پڑے اور اب یہ حال ہے کہ کتے دوڑتے چلے جارہے ہیں اور یہ ڈھیلوں پتھروں پر گھسٹتے جارہے ہیں بدن میں کانٹے چبھ رہے ہیں سر میں چوٹ آرہی ہے مگر یہ راضی ہیں۔ اسی حالت میں ان پر ایک خاص تجلی نمودار ہوئی جس کی لذت میں سب تکالیف بھول گئے۔ ادھر حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ پر ان کی حالت مکشوف ہوئی تو خدام سے فرمایا کہ ابوسعید پر اس وقت خدا کی فضل ہو گیا اور جنگل میں اُسے دولت نصیب ہو گئی جاؤ اس کو اٹھالاؤ پھر اسی وقت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کو مکشوف ہوئی کہ شیخ فرمارہے ہیں نظام الدین! محنت لینے کا تو مضائقہ نہیں مگر ہم نے یعنی ہمارے مجاز نے تم سے اتنی محنت نہ لی تھی شیخ نظام الدین شیخ کے اس عتاب سے کانپ اٹھے اور پھر کبھی شیخ ابوسعید سے ایسی محنت نہیں لی۔

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

تھوڑی دیر میں جو شیخ ابوسعید جنگل سے آئے شیخ نے ان کو پھر ذکر و شغل میں لگا دیا جس کے بعد وہ حبس دم کا قصہ ہوا۔ اس قصہ کے بعد شیخ نے فرمایا ابوسعید جو دولت میں تمہارے گھر سے لایا تھا وہ آج تم کو سونپ رہا ہوں گویا حصول نسبت کی بشارت تھی۔ اسی طرح شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کے قصہ کی نظیر شیخ سرزی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ بھی ہے جو مولانا نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے۔ انھوں نے بھی کسی تجلی کے شوق میں جب کسی مجاہدہ سے کام نہ چلا حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا تو وہ تجلی ہو ورنہ میں اپنی حیات کو منقطع کردوں گا۔ وہاں سے جواب ملا کہ زندگی تیرے قبضہ میں تھوڑا ہی ہے۔ دیکھیں حیات کو کیسے منقطع کردو گے انھوں نے فوراً اپنے کو پہاڑ کے اوپر سے گرا دیا مگر کچھ بھی نہ ہوا چوٹ تک بھی نہ لگی اب یہ بڑے جھنجلائے اور کہا یہ کیا مصیبت ہے کہ نہ مرنے دیں نہ جینے دیں۔ یہ ناز کا مقام تھا اس لئے ایسے الفاظ کہہ گئے اور ان کے لئے یہ الفاظ خلاف ادب نہ تھے ہر وقت کا جدا ادب ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گفتگوئے عاشقاں درکار رب (۱) ؛ جوشش عشق است نے ترک ادب

آگے فیصلہ خوب ہے ؎

بے ادب تر نیست زوکس در جہاں (۲) ؛ باادب تر نیست زوکس در نہاں

(۱ و ۲) عاشقان خدا کی گفتگو کبھی جوش عشق سے بظاہر بے ادبی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ تارک ادب نہیں ہوتے اگرچہ بظاہر الفاظ بے ادبی کے غلبۂ محبت سے نکل جاتے ہیں اس لئے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کیونکہ ان کا باطن اوروں سے زیادہ باادب ہوتا ہے)

یعنے باطن میں اس سے بڑھ کر باادب کوئی نہیں اور ظاہر میں اس سے بڑھ کر بے ادب کوئی نہیں کیونکہ ظاہر میں بعض دفعہ اہل ناز ایسے الفاظ کہہ ڈالتے ہیں کہ

دوسرا کہے تو مردود ہوجائے مگر وہ غلبۂ حال کی وجہ سے معذور ہوتے ہیں مگر باطن میں وہ اتنے مودب ہوتے ہیں کہ جان تک فدا کردیتے ہیں۔ غرض جب پہاڑ پر سے بھی گر کر نہ مرے اور یہ کہا کہ نہ مرنے دیں نہ جینے دیں۔ تو غیب سے ارشاد ہوا کہ تم خود ہی تجویز کرتے ہو راستہ ہم سے پوچھو۔ جب وہ تجلی نصیب ہوگی پوچھا کہ پھر بتلا دیجئے وہ کیا راستہ ہے حکم ہوا کہ بارہ برس تک بھیک مانگو۔ چنانچہ یہ خلوت ترک کر کے شہر میں آئے اور در بدر بھیک مانگنے میں لگ گئے اور کہیں کہیں دھکے اور مکے بھی کھائے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں چنیں شیخ گدائے کو بکو ٭ عشق آمد لاابالی فاتقوا

(اتنا بڑا شیخ عشق الٰہی میں گلی در گلی پھر رہا ہے عشق بڑا ہی لاابالی ہوتا ہے پس ذرا سنبھل کر قدم رکھنا)

بارہ برس جب بھیک مانگنے کے پورے ہوچکے تو حکم ہوا کہ ابھی بارہ برس اور باقی ہیں۔ اب دینا شروع کرو۔ پوچھا دوں کہاں سے آپ نے جمع کرنے تو دیا ہی نہیں واقعی وہ اپنے عاشقوں کو خوب نچاتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے گو الفاظ سخت ہیں ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ٭ دل بدست دگرے دادن و حیران بودن

(عاشقی کیا ہے کہہ دو کہ محبوب کی غلامی کا نام ہے۔ دل تو دیدے محبوب کو اور خود حیران رہے)

سوئے زلفش نظرے کردن در ویش دیدن ٭ گاہ کافر شدن و گاہ مسلمان بودن

(کبھی محبوب کی زلف کو دیکھے کبھی اس کے چہرہ کو دیکھے۔ اس طرح فنا اور بقا کا مشاہدہ کرتا رہے)

اس میں کفر سے مراد فنا ہے اور اسلام سے مراد بقا یہ صوفیہ کی خاص اصطلاح ہے ولا مشاحۃ فی الاصطلاح جیسے کافر عشقم یعنے فانی عشقم قرآن میں بھی کفر کا اطلاق معنی حسن میں آیا ہے جیسے وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ اور ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے کہا تھا كَفَرْنَا بِكُمْ ہم نے تم سے کفر کیا یعنی الگ ہوتے ہیں تو کفر کا لفظ اس شعر میں ظاہری

میں سخت معلوم ہوتا ہے ورنہ معنے اچھے ہیں جیسے ان آیتوں میں اچھے معنے میں کفر کا استعمال ہوا ہے غرض شیخ سرزی نے پوچھا دوں کہاں سے حکم ہوا کہ اب تمہارے پاس چاروں طرف سے دنیا آوے گی اس کو خرچ کرنا شروع کرو۔ چنانچہ اب ایک جگہ بیٹھ گئے اور فتوحات شروع ہوئیں بارہ برس تک خوب سخاوت کی اس کے بعد وہ نعمت حاصل ہوئی۔ یہ گفتگو حبس دم کے سلسلہ میں آگئی تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ سانس ہی ایک ایسی نعمت ہے جس کا احصاء نہیں ہوسکتا مگر جو شخص مجاہدہ عرفیہ اختیار کرتا ہے وہ ان نعمتوں کو نعمت ہی نہیں سمجھتا بس وہ کھانے پینے ہی کو نعمت سمجھتا ہے۔ اور جب اس نے کھانے پینے میں کمی کردی تو وہ اپنے اعمال کو زیادہ سمجھتا ہے اور نعمائے الٰہی کو اپنے اوپر کم سمجھتا ہے گویا وہ دو روٹی کم کھانے سے خدا کے خزانہ میں زیادتی کررہا ہے۔ پاگل وہاں کیا بچت ہوتی۔ ایک ایک جانور اتنا کھانے والا ہے کہ وہاں تم جیسوں کو پوچھتا کون ہے۔ تمہاری ان دو روٹیوں کے کم کرنے سے وہاں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ پھر جب اس شخص کو اپنے اندر کیفیات و ذوق و شوق کی کمی محسوس ہوتی ہے تو خدا سے اس کے دل میں شکایت پیدا ہوتی ہے کہ میں اتنا مجاہدہ کرتا ہوں پھر بھی میرے حال پر رحم نہیں کیا جاتا حالانکہ ؎

آنکس کہ تو نگرت نمی کرد اند ۔ او مصلحتِ تو از تو بہتر داند

(جو خدا پاک کہ تجھے مالدار نہیں بناتا ہے وہ تیری مصلحت کو تجھ سے زیادہ جانتا ہے)

نہ معلوم کیفیات پیدا ہوتیں تو تیرا کیا حال ہوتا ادنیٰ بات تو یہ ہے کہ یہ شخص ان کو خدا کا فضل و انعام نہ سمجھے گا بلکہ اپنے مجاہدہ کا ثمرہ اور

اپنا حق سمجھے گا کہ یہ تو ہونا ہی چاہیئے تھا کہ میں اتنی مصیبتیں جھیلتا رہتا ہوں پس مجاہدہ عرفیہ والے کو نعمت باطن ملے تو وہ تو اس کے نزدیک اس کا حق ہے گویا یوں ہی ہونا چاہیئے تھا اور نہ ملے تو شکایت کرتا رہیگا اور جو زیادہ کھا کر روزہ رکھتا ہے اور افطار میں بھی خوب کھاتا ہے اُسے جب کوئی نعمت باطن حاصل ہوتی ہے اور اس کو اپنا حق یا اپنے مجاہدہ کا ثمرہ نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اپنے نزدیک صاحب مجاہدہ ہے ہی نہیں بلکہ وہ ہر نعمت کو محض فضل و انعام حق سمجھے گا اور اگر کچھ ذوق و شوق وکیفیت حاصل نہ ہو تو اس کے دل میں خدا سے شکایت کبھی نہ ہوگی بلکہ اپنے نفس ہی سے شکایت ہوگی کہ کمبخت تو کرتا ہی کیا ہے جو تجھے کچھ حاصل ہوتا تو یہ شخص متواضع بھی ہے اور شاکر بھی اور مجاہدہ عرفیہ والا معجب بھی ہے اور شاکی بھی یہ تو تتمہ ہے ماسبق کا اب میں مجاہدہ کے دوسرے رکن کو بیان کرتا ہوں دوسرا رکن ہے مجاہدہ کا تقلیل منام رمضان اس کا بھی جامع ہے کہ اس میں ایک عبادت ایسی مشروع ہے جو تقلیل منام کو مستلزم ہے اور وہ تراویح ہے جس کا نام قیام رمضان ہے۔ حدیث میں ہے ان اللہ فرض لکم صیامہ وسننت لکم قیامہ (اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے روزہ فرض فرمایا اور میں نے تمہارے لئے تراویح کو سنت قرار دیا) اس پر سب کو اتفاق ہے کہ مراد قیامہ سے حدیث میں تراویح ہے رہا عدد سو اس وقت اس کے اثبات سے ہم کو بحث نہیں عمل کے لئے ہم کو اتنا کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح اور تین وتر جماعت کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ یہ روایت موطا امام مالک میں گو منقطع ہے مگر عملاً متواتر ہے۔ امت کے عمل نے اس کو متواتر کردیا ہے

بس عمل کے لئے اتنا کافی ہے۔ دیکھئے اگر کوئی پنساری کے پاس دوا لینے جائے تو اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ دوا کہاں سے آئی اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی دوا ہے جو میں لینا چاہتا ہوں بلکہ اگر شبہ ہوتا ہے تو ایک دو جاننے والوں کو دکھلا کر اطمینان کرلیا جاتا ہے اب اگر کوئی پنساری سے یہ کہے کہ میرا اطمینان تو اس وقت ہوگا جب تم بائع کے دستخط دکھلادوگے کہ تم نے اس سے یہ دوا خریدی ہے تو لوگ یہ کہیں گے کہ اس کو دوا کی ضرورت ہی نہیں اور پنساری بھی صاف کہدے گا کہ مجھے دستخط دکھلانے کی ضرورت نہیں لیتے ہو لو نہیں لیتے ہو مت لو۔ اسی طرح محققین سلف کا طرز یہ ہے کہ وہ مدعی کے لئے مغز زنی نہیں کرتے بس مسئلہ بتلا دیا اور اگر کسی نے اس میں حجتیں نکالیں تو صاف کہدیا کہ کسی دوسرے سے تحقیق کرلو جس پر تم کو اعتماد ہو ہمیں بحث کی ضرورت نہیں۔

مولانا عبدالقیوم صاحب مقیم بھوپال رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو کتاب میں دیکھ کر جواب دیا کرتے تھے اور فرما دیا کرتے تھے کہ کتاب میں یوں لکھا ہے اور جو کوئی حدیث پوچھتا تو فرما دیتے کہ بھائی میں نومسلم نہیں ہوں میرے آباؤ اجداد سب مسلمان تھے اور اسی طرح ان کے آباؤ اجداد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک سب مسلمان تھے تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو دیکھ کر عمل کیا اور جو ان کے بعد تھے انھوں نے اپنے بڑوں کو دیکھ کر عمل کیا اسی طرح سلسلہ یہ سلسلہ ہمارے گھر میں وہی ہوتا آتا رہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل تھا۔ اس لئے مجھے حدیث ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں اس کی ضرورت تو نومسلموں کو ہے۔ اس جواب کا حاصل وہی قطع نزاع

کہ فضول بحث کو یہ حضرات پسند نہ کرتے تھے۔ بھلا عوام کو اگر بتلا بھی دیا جائے کہ حدیث میں یہ ہے تو ان کو طریق استنباط کا علم کس طرح ہوگا اس میں پھر وہ فقہار کے محتاج ہوں گے تو پہلے ہی سے فقہار کے بیان پر کیوں اعتماد نہیں کرتے مولانا عبدالقیوم صاحب بڑے عجیب بزرگ تھے ایک مرتبہ بیگم صاحبہ ان کی زیارت کے لئے آئیں جب رخصت ہو کر گھر کو واپس جانے لگیں تو مولانا نے ان کے جوتے سیدھے کر دیئے وہ کہنے لگیں مولانا آپ نے یہ کیا کیا آپ تو ہمارے بزرگ ہیں میں آپ کی جوتیاں سیدھی کرتی نہ کہ الٹا آپ نے مجھے شرمندہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تم مجھ سے زیادہ بزرگ ہو۔ انھوں نے عرض کیا تو یہ تو بہ میں کیا چیز ہوں' فرمایا میرے پاس اس کی دلیل ہے وہ یہ کہ میں بیس برس سے وعظ کہہ رہا ہوں کہ بیوہ عورتیں نکاح کرلیں مگر کچھ اثر نہیں ہوا یہ تو میری بزرگی تھی۔ اب تم اپنی بزرگی کا امتحان کر دیکھو ایک اشتہار دیدو کہ جو بیوہ عورت نکاح نہیں کرے گی اس کو سزا ہو گی۔ اور اگر بے سروسامانی کا عذر ہو تو سرکار کی طرف سے اس کے نکاح میں امداد کی جائے گی۔ دیکھو پھر کتنی بیوہ عورتیں نکاح کرتی ہیں بیگم صاحبہ کو علمار کی بڑی قدر تھی فوراً مولانا کے ارشاد کی تعمیل کی۔ اب کیا تھا دھڑا دھڑ نکاح ہونے لگے۔ دیکھئے مولانا نے دین کا کام کس خوبصورتی سے نکالا پھر افسوس ہے کہ ان لوگوں کو تارک عمل بالحدیث کہا جاتا ہے۔ بس لوگوں نے دو چار مسئلوں میں غل شور کرنے کا نام عمل بالحدیث رکھ لیا ہے ورنہ واللہ عامل بالحدیث ہمارے ہی حضرات ہیں۔ البتہ کسی سے الجھنا اور بحث کرنا پسند نہیں کرتے اور اگر کوئی خواہ مخواہ الجھتا ہی ہے تو اس میں اُن کا وہ مذاق ہے جو حاجی صاحب فرماتے تھے جب کوئی تم سے مناظرہ کرے تو سب رطب و یابس جمع کر کے اس کے سامنے رکھدو اور

کہدو کہ ان دلائل میں تم خود فیصلہ کرلو کون قوی ہے کون ضعیف ہے۔ اور کونسی شق حق ہے اور کونسی باطل ہے مجھے فیصلہ کی فرصت نہیں (کیونکہ تمہارے فیصلہ پر وہ پھر نقض وارد کرے گا تو سلسلۂ کلام ختم نہ ہوگا) اور حضرت حاجی صاحب نے اس پر ایک حجام کی حکایت بیان فرمائی کہ وہ کسی کی حجامت بنار ہا تھا اس نے کہا کہ میری ڈاڑھی میں سے سفید بال چن دینا اس نے اُسترہ لیکر ساری ڈاڑھی مونڈکر سامنے رکھدی کہ جناب آپ خود سفید و سیاہ کو الگ کر لیجئے مجھے انتخاب کی فرصت نہیں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فحش حکایت مثنوی میں بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص بیٹھا ہوا بانسری بجارہا تھا کہ دفعۃً ریح خارج ہوئی تو اس نے بانسری ادھر لگادی کہ بی اگر میرا بجانا تجکو پسند نہیں تو اب تو بجالے۔ حکایت تو ظاہر میں گندی ہے مگر اس کا مطلب عجیب ہے یعنی جب مدعی بک بک کرنے لگے تو تم خاموش ہوجاؤ اور اس سے کہو کہ میاں اب تم بولو ہم خاموش ہوتے ہیں۔ واقعی اس مضمون کے ادا کے لئے اس سے بہتر کوئی حکایت نہ تھی صاحب حق کا بولنا ایسا ہی خوشنما ہے جیسا منہ سے بانسری کا بولنا کیونکہ بانسری خود نہیں بولتی بلکہ اس کے اندر کوئی دوسرا بولتا ہے یہی حال صاحب حق کا ہے کہ وہ خود نہیں بولتا بلکہ حق اس کی زبان سے بولتا ہے۔ بی یسمع۔ بی ینطق۔ بی یبصر الحدیث

عارف فرماتے ہیں ؎

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ٭ آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

(آئینہ کے پیچھے حق تعالیٰ نے مجھے طوطی صفت بنایا ہے جو کچھ کہ حق تعالیٰ نے روز ازل ہمارے اندر معلوم موہوب فرمائے ہیں میں انھیں کا ناقل ہوں ہمارا کوئی ذاتی کمال نہیں ہے)

اور جس طرح بانسری کی آواز سے انس و جن وحش و طیور مست ہوجاتے ہیں اسی طرح صاحب حق کی گفتگو ایک عالم کو منور کردیتی ہے اور مدعی کا بولنا ایسا ہی ہے

جیسے مقعد کا بولنا کہ عالم میں اس سے بدعت اور گمراہی اور سرکشی کی سڑاہند پھیل جاتی ہے اس کا تو خاموش ہی رہنا زیبا ہے لیکن اگر وہ بک بک کرنے لگے اور منع کی قدرت نہ ہو تو اس سے الجھو نہیں تم خاموش ہو جاؤ اور اسے بولنے دو اہل بصیرت حق کی خوشبو اور باطل کی بدبو کا خود امتیاز کر لیں گے۔ الغرض عمل کے لئے تو تراویح کا اتنا ثبوت کافی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً اس کو مسنون فرمایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہ عملاً تراویح کی بیس رکعتیں پڑھتے تھے عوام کے لئے اتنا کافی ہے اس سے زیادہ تحقیق علماء کا منصب ہے اس وقت اس سے بحث نہیں اس تراویح کا نام قیام رمضان بھی ہے کیونکہ یہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے اور احادیث میں اس کو قیام رمضان سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے کہ تراویح تہجد سے الگ کوئی عبادت ہے کیونکہ تہجد رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں اور اس کے علاوہ اس پر اور بھی دلائل قائم ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں اب اصل مدعا سنئے کہ جس طرح صوم کو تقلیل طعام میں دخل ہے اسی طرح تراویح کو تقلیل منام میں دخل ہے۔ اور جیسا روزہ میں تبدیل عادت کی وجہ سے مجاہدہ کی شان آئی تھی اسی طرح یہاں بھی شریعت نے محض تبدیل عادت سے مجاہدہ کا کام لیا ہے کیونکہ عام عادت یہی ہے کہ اکثر لوگ عشا کے بعد فوراً سو رہتے ہیں تو نیند کے وقت میں تراویح کا امر کر کے عادت کو بدل دیا۔ جس سے نفس پر گرانی ہوتی ہے جو کہ مجاہدہ ہے۔ پھر قاعدہ ہے کہ نیند کا وقت نکل جانے کے بعد پھر دیر میں نیند آتی ہے اس طرح بھی تقلیل منام ہو جاتی ہے اور اگر کوئی شخص روزانہ دس بجے ہی سونے کا پہلے سے عادی ہو اسے بھی تراویح سے مجاہدہ کا ثمرہ اس طرح حاصل ہو جاتا ہے کہ آزادی کے ساتھ جاگنا گراں نہیں ہوتا مگر تقلید کے ساتھ فوراً ہی گرانی شروع ہو جاتی ہے دیکھئے آپ اپنی خوشی سے ایک جگہ گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں

لیکن اگر کوئی تم سے یہ کہہ جائے کہ میاں گیارہ بجے تک تم یہیں بیٹھے رہنا۔ تو بس اسی وقت سے آپ بھاگنا چاہتے ہیں اور ایک ایک منٹ گراں گزرنے لگتا ہے شریعت نے اس راز کو سمجھا اور محض ذرا سی تقلید سے مجاہدہ کا کام لے لیا تو شریعت نے تقلیل منام کے لئے بھی عجیب مجاہدہ تجویز کیا ہے۔ واللہ شریعت پر تو یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم ؛ کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

(سر سے بیشک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں۔ کرشمہ میرے دل کا دامن کھینچتا ہے کہ بس اسی جگہ نظر جمائے رہ)

ایسی سہل شریعت کو پھر لوگ خونخوار کہتے ہیں ان کو خدا کا خوف نہیں آتا اور اگر بالفرض کسی کو شریعت کے احکام میں کچھ گرانی معلوم بھی ہو تو آخر کیا تم کڑوی دوا نہیں پیتے کریلے نہیں کھاتے، تمباکو نہیں کھاتے جس سے اول اول چکر آتے ہیں مگر عادت کے بعد اس کے بغیر چین نہیں آتا تو یہی سمجھ کر تم ذرا اعمال شریعت کی عادت تو کرلو واللہ پھر یہ خود تم کو چمٹ جائیں گے معشوق اگر منہ نہ لگائے تو اس کی تلخی کیوں جھیلتے ہو اور معشوق تو اکثر تلخ مزاج ہی ہوتے ہیں اگر وہ نرمی سے ملنے لگے تو پھر اس میں اور بازاری عورت میں کیا فرق ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست ؛ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

(خوبی اسی کرشمہ و ناز کا نام نہیں ہے بہت سی ادائیں معشوقوں کی ایسی ہیں جن کا نام بھی لغت میں نہیں ملتا)

تو جب دنیا کے کاموں میں تلخی اور گرانی کے جھیلنے سے بچے ہوئے نہیں ہو پھر دین ہی کے کاموں میں اس سے بچنا کیوں چاہتے ہو خصوصاً جبکہ یہ تلخی لذیذ بھی ہے جیسے تمباکو والوں کو اس کی تلخی لذیذ معلوم ہوتی ہے اور اگر تم کو اس کی تلخی میں مزا نہیں آتا تو صبر ہی کر لیا ہوتا جیسا دنیا میں بعض قوانین سخت ہوتے ہیں اور ان پر صبر کیا جاتا ہے۔ عارف

فرماتے ہیں ؎

صبر کن حافظ بتلخی روز و شب ✤ عاقبت روزے بیابی کام را

(اے حافظ دن ورات کی تلخی پر صبر کر ایک دن انجام کار تو کامیاب ہوجائیگا)
یہ تو ان کے لئے ہے جو عاشق نہیں کہ تلخی کو محسوس کرتے ہیں اور صبر کرتے ہیں اور جو عشاق ہیں ان کے لئے تو حافظ یوں فرماتے ہیں ؎

آں تلخوش کہ صوفی ام الخبائث خواند ✤ اشہی لنا و احلی من قبلۃ العذاری

(جس شراب کی تلخی کو صوفی ام الخبائث کہتا ہے مجھے تو محبوب کے بوسہ سے زیادہ شیریں ہے)
یعنی تلخی ہی محسوس نہیں ہوتی۔ تلخوش سے مراد طریق عشق ہے اور زاہد خشک اس کو ام الخبائث اس لئے کہتا ہے کہ عشق میں بعض دفعہ ظاہراً حدود شریعت سے تجاوز ہوجاتا ہے اور حقیقت میں وہ تجاوز نہیں ہوتا مگر اس حقیقت کی زاہد خشک کو خبر نہیں ہوتی اس لئے وہ اہل عشق پر خواہ مخواہ ملامت کرتا ہے اور اسی تلخی کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من ✤ دل فدائے یار دل رنجان من

(آپ کی طرف سے ناموافق حالات بھی مجھے اچھے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ آپ پر ہمارا دل فدا ہے پس دل آپ کی مرضی پر تسلیم سر کا لطف لیتا ہے)
غرض عشاق کو احکام شریعت کی تلخی لذیذ معلوم ہوتی ہے جیسے مرچوں کی تیزی لذیذ ہوتی ہے مرچیں کھاتے ہوئے روتے بھی ہیں اور کھاتے بھی جاتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ رونا ہمیشہ محرومی اور رنج ہی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ رونا کبھی لذت سے بھی ہوتا ہے۔ کعبہ کو پہلی بار دیکھ کر جو حال ہوتا ہے اس کو یاد کر لیجئے عشق کی خاصیت ہے کہ وصال کے وقت بھی آنکھ قبضہ میں نہیں رہتی اس وقت بھی رونا آتا ہے مگر وہ رونا محرومی کا نہیں بلکہ دوسری ہی قسم کا روتا ہے کعبہ کو دیکھ کر یہ حال تو عام

طور پر ہوتا ہے اور جن کی خاص حالت ہوتی ہے انھوں نے تو اس موقع پر جان دیدی ہے۔ ایک عاشق کا قصہ ہے کہ وہ حج کو جارہے ہیں ہاتھ میں ایک ڈھپلی ہے اس کو بجاتے اور کودتے ناچتے جارہے ہیں۔ اول تو لوگ اس کو مسخرہ سمجھے مگر جب مکہ مکرمہ میں پہنچے اور مطوف کے ساتھ طواف بیت اللہ کو چلے تو جس وقت دروازہ میں سے بیت اللہ پر نظر پڑی ہے تو ان پر وجد طاری ہوا۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر ٭ کہ مبادا بارِ دیگر نہ رسی بدیں تمنا

(جب کوئے دلبر میں پہنچ گئے تو جان مضطر کو قربان کردو کہ شاید دوسری بار پھر یہ آرزو پوری ہو کہ نہ ہو)

اور گرتے ہی جان نکل گئی بیت اللہ تک پہونچنے بھی نہ پایا غرض رونا کبھی دوسری قسم کا بھی ہوتا ہے جیسے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حق تعالیٰ کا حکم ہوا ہے کہ تم کو ایک سورت پڑھ کر سناؤں تو وہ دریافت فرماتے ہیں اللہ سمانی کیا خدا تعالیٰ نے میرا نام لیکر فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں تو وہ رونے لگے۔ حضرت حاجی صاحب کی تحقیق ہے کہ یہ رونا گرم بازاری عشق کا ہے۔ اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بلبل برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت ٭ واندراں برگ نوا خوش نالہا زار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست ٭ گفت ما را جلوۂ معشوق دریں کار داشت

(بلبل چونچ میں برگ گل لئے ہوئے خوشی کا نالہ ہائے زار بلند کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ حالت وصل میں فریاد و نالہ کیوں ہے جواب دیا کہ جلوۂ معشوق نے مجھے اس کام میں لگا رکھا ہے)

پس یہ خوشی کا رونا ہے نہ غم کا مولانا فرماتے ہیں ؎

عاشقی زیں ہر دو حالت برتر است

(عاشقی ان دونوں حالتوں سے برتر ہے)

تو شریعت میں اگر تلخی بھی ہوتی وہ بھی لذیذ ہوتی اور اگر لذیذ بھی نہ ہوتی تو اس کو صبر

ہی کا محل سمجھا ہوتا مگر وہاں تو تلخی ہے ہی نہیں وہاں تو سر سے پیر تک حلاوت ہی حلاوت ہے جس کی دلکشی کا یہ حال ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ٭ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

(سر سے پاؤں تک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں محبوب کے حُسن کا کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے کہ بس اسی جگہ نظر کو جما لے)

غرض شریعت نے رمضان میں صرف بیس رکعت تراویح مقرر کر کے تقلیل منام کی ایک معتدل صورت کر دی جس میں بہت زیادہ جاگنا بھی نہیں پڑتا اتنی دیر تک تو عام طور پر لوگ جاگتے رہتے ہیں جتنی دیر تراویح میں لگتی ہے مگر تقیید کے ساتھ جاگنے سے مجاہدہ کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرے طریق میں مرتاضین آنکھیں پھوڑتے تھے چھت میں رسیاں باندھتے تھے کہ جب نیند آتی اس میں لٹک جاتے ہیں جس سے نیند اڑ جاتی تھی ان دونوں مجاہدوں میں ایسا فرق ہے جیسے قند میں اور شیرہ میں۔ اس لطافت کا ادراک لطیف ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص چاہیے جس کو شریعت کی لطافت کا ادراک ہو اگر ان کو اس لطافت کا ادراک نہ ہوتا تو وہ دین کے ایسے عاشق نہ ہوتے کہ دین کے واسطے جان ہی دے دی۔ آپ کے زمانہ میں شیعہ کو دہلی کے اندر بہت غلبہ تھا اور یہ لوگ مرزا صاحب کے دشمن تھے جان لینے کو پھرتے تھے جس دن کی صبح کو آپ شہید ہوں گے رات میں آپ کو مکشوف ہو گیا تھا کہ آج شہادت کا دن ہے۔ تو آپ نے صبح سے پہلے غسل کیا نہا دھو کر سرمہ و عطر لگا کر شہادت کے لئے تیار ہو گئے اور باہر جو تشریف لائے تو بار بار یہ شعر پڑھتے تھے ؎

سر جدا کرد از تنم یارے کہ با ما یار بود ٭ قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

(سر جدا کردیا میرے جسم سے اس یار نے کہ جو میرا یار تھا زندگی میں زندگی کا قصہ ختم کردیا کہ مجھے زندگی ایک درد سر تھی)

اسی حالت میں مخالفین آئے اور آپ سے کچھ سوالات کیے جواب حق ہلا تو ظالموں نے قرابینوں سے آپ کو شہید کر دیا۔ دفن کے وقت لوگوں نے چاہا کہ پتھر پر کوئی شعر حسب حال کندہ کرا کر قبر پر نصب کریں مگر کوئی شعر حسب حال نہ ہلا تو ایک اہل دل نے کہا کہ خود ان ہی کے دیوان سے نکالو۔ تو اول ہی دہلہ میں یہ شعر نکلا ؎

بلوح تربت من یا فتند از غیب تحریری ✽ کہ ایں مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیری

(میرے قبر کے پتھر کے لئے یہ غیبی تحریر پر ان لوگوں نے پالیا کہ یہ مقتول بیگناہ اور بے قصور ہے)

واقعی بہت ہی حسب حال شعر ہے۔ غرض شریعت کی لطافت کو ایسے حضرات سمجھتے تھے تم اگر نہ سمجھ سکو تو تم کو تحقیق کی کیا ضرورت ہے بس خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھ کر عمل شروع کر دو۔ آخر اگر کوئی فقیر تم کو گولیاں دیدے کہ یہ قوت باہ کی ہیں تو ان کو جلدی سے منہ میں کیوں دبا لیتے ہو (یعنی رکھ لیتے ہو) ہندی مثل ہے کہ آم کھانے سے کام پیڑ گننے سے کیا کام۔ تم کو اسرار کے پیچھے پڑنے سے کیا مطلب تم کو عمل سے کام ہے۔ روزہ میں اور تراویح میں کچھ ہی اسرار ہوں تم کو اس سے کیا بحث مقصود تو رضائے حق ہے اور وہ عمل سے حاصل ہو جاتی ہے اسرار کے جاننے پر رضا موقوف نہیں پھر تم ان کے درپے کیوں ہوتے ہو پھر یہ کیا ضرور ہے کہ جن سے تم پوچھتے ہو ان کو بھی اسرار معلوم ہوں اور اگر معلوم بھی ہوں تو یہ کیا ضرور ہے کہ وہ تم کو بتلا بھی دیں کیونکہ ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو اسرار نہیں بتلایا کرتے جس کو اہل دیکھتے ہیں اسی کو بتلاتے ہیں اور نا اہل کے متعلق ان کا یہ ارشاد ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ٭ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

مدعی (متکبر) کے ساتھ اسرار عشق و مستی کی بات مت کرو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو تاکہ خود پرستی اور تکبر کے غم میں مرتا رہے

مولوی غوث علی صاحب پانی پتی کے پاس ایک خان صاحب آئے اور کہا میں نے سنا ہے کہ آپ کو کیمیا آتی ہے۔ کہا ہاں آتی ہے۔ خان صاحب نے کہا پھر ہمیں بھی بتلا دیجئے کہا نہیں بتلاتے۔ اس نے کہا آخر کیوں نہیں بتلاتے کہا کیا میں تمہارے باوا کا نوکر ہوں۔ پھر کہا خانصاحب خدمتیں کرو بدن دباؤ۔ حقہ بھرو کبھی سال دو سال میں جی چاہ گیا تو بتلا بھی دیں گے۔ جس محنت سے ہم نے حاصل کی ہے تم اس کی آدھی محنت تو دکھلاؤ۔ اسی طرح عارفین برسوں ناک رگڑوا کر جسے اہل سمجھتے ہیں اُسے اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں ہر ایک کو نہیں بتلایا کرتے گو جانتے بھی ہوں حافظ رحمۃ اللہ علیہ اسی کو فرماتے ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ٭ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں کہ پردہ سے راز ظاہر ہو جائے ورنہ اہل اللہ احکام کے اسرار سے باخبر ہوتے ہیں)

مصلحت نیست کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ بدون اسرار جانے عمل کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے اور اسرار جاننے سے فائدہ کم ہوتا ہے۔ جیسے حکیم اپنے گھر سے بنی بنائی دوا دیدے تو اعتقاد زیادہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ وہ ایسی معمولی چیز ہوتی ہے کہ اجزاء معلوم ہو جانے کے بعد اس کی وقعت نہیں رہتی جیسے ایک عالم صاحب کے سر میں شدت کا درد ہوا۔ انھوں نے ایک درویش سے تعویذ لیا۔ اس کے باندھتے ہی فوراً درد جاتا رہا بڑا تعجب ہوا

ہوا تعویذ کھول کر دیکھا تو اس میں صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی تھی ان کے خیال میں یہ بات آئی کہ یہ تو میں بھی لکھ سکتا تھا اس خیال کے آتے ہی فوراً درد شروع ہو گیا۔ اب تعویذ کو لا کھ باندھتے ہیں اثر ہی نہیں ہوتا اسی لئے اکثر تعویذ دینے والے تعویذ کو کھول کر دیکھنے سے منع کیا کرتے ہیں تاکہ اعتقاد کم نہ ہو۔ اسی طرح احکام شرعیہ کے اسرار جاننے سے بعض کج فہموں کے دل میں احکام کی وقعت کم ہو جاتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بس یہی حکمت مقصود ہے تراویح سے کہ تقیید کے ساتھ جاگنا ہو اس سے اول تو تراویح کی وقعت کم ہوتی ہے پھر وہ الحاد میں پھنستا ہے کہ مقصود تقیید ہے تو ہم کسی دوسرے طریقہ سے تقیید کر لیں گے حالانکہ اول تو حکمت کا اسی میں انحصار نہیں نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی پھر یہ حکمت اس قید کے ساتھ مقصود ہے کہ اس خاص عمل کے ساتھ پائی جاوے اس عمل کے بغیر یہ حکمت مطلوب نہیں پس دونوں کا مجموعہ مطلوب ہوا پھر دوسرے طریقہ سے یہ مقصود کیونکر حاصل ہو جائیگا غرض اہل ریاضت تقلیل منام کے لئے جو صورتیں مجاہدات کی اختیار کرتے ہیں ان کو دیکھ کر پھر شرعی مجاہدہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے شاہانہ علاج کیا ہے کہ نہ آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت ہے نہ رسیاں باندھنے کی ضرورت ہے نہ سیاہ مرچیں چبانے کی ضرورت ہے بلکہ بیس رکعت تراویح عشا کے بعد پڑھ کر سو رہو تقلیل منام ہو گیا پھر مزید لطافت یہ کہ تراویح جماعت سے ہوتی ہے الگ الگ جاگنا مشکل تھا جماعت کے ساتھ جاگنا اور بھی سہل ہو گیا پھر بیچ میں نیند آنے لگے تو ہر چار رکعت پر قدرے توقف مستحب کیا گیا جس میں اگر کسی کو نیند آنے لگی تو وہ ٹہل سکتا ہے پانی منہ میں ڈال سکتا ہے باتیں کر کے

نیند کو دفع کر سکتا ہے اس طرح سے بیس رکعت کی مقدار جاگنا کچھ بھی دشوار نہیں پس یہ ویسا ہی علاج ہے جیسا ایک بادشاہ نے طبیب سے کہا تھا کہ میں آج بیمار ہوں میری نبض دیکھ کر علاج کرو مگر شرط یہ ہے کہ مجھے نہ دوا پینی پڑے نہ لگانی پڑے بس ویسے ہی علاج ہو جائے۔ طبیب نے نبض دیکھ کر کہا بہتر ہے ایسا ہی علاج ہو جائے گا اس نے گھر جا کر ایک پنکھے پر کچھ دوا چھڑک دی اور شاہی خادم سے کہا کہ بادشاہ کو اس پنکھے سے ہوا کرنا۔ پس پنکھا جھلتے ہی فوراً ہی نیند آگئی اور سانس کے ذریعے سے دوا کا اثر دماغ میں اور دماغ سے دل میں پہنچا تو جب بادشاہ جاگا ہے تو خاصا چوق و چوبند تھا بیماری کا نام کو بھی نشان نہ تھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ دہلی میں شاہزادہ نے روزہ رکھا تھا اس کی روزہ کشائی کا بڑی دھوم سے انتظام ہوا گو یہ رسم روزہ کشائی کی بدعت ہے مگر اس وقت اس سے روزہ کی تعظیم ہوتی تھی اور اس بہانہ سے غرباء کو بہت کچھ مل جاتا تھا اسی لئے فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں کہ جب سے ریاکار مر گئے اور مخلصین پیدا ہوئے اس وقت سے لوگ بھوکے مرنے لگے کیونکہ ریاکار بہت کام دین کے کرتے تھے۔ کوئی وقف کرتا تھا کوئی لنگر جاری کرتا تھا کوئی سرائے اور مسافر خانہ بناتا تھا گو یا سب نام و نمود کے لئے ہوتا تھا۔ مگر مخلوق کو تو راحت ہوتی تھی پھر کیا عجب ہے کہ مخلوق کی دعاؤں سے اُن ریاکاروں کی بھی مغفرت ہو گئی ہو۔ تو روزہ کشائی کی رسم ہمارے واسطے تو بدعت ہے لیکن اگر بادشاہ کریں تو ان کے واسطے بدعت نہیں ہے بلکہ غنیمت سمجھا جاوے گا کہ دین کی قدر و عظمت تو انھوں نے کی۔

جیسے کالج علیگڈھ میں مولود شریف ہونے کی بابت میرے ایک دوست نے خوب لطیفہ کہا تھا کہ مولود شریف کی محفل ہمارے لئے تو بدعت ہے مگر کالج میں واجب ہے کیونکہ بددینی کا کچھ انسداد تو ہے۔ مگر اس فتوے کے لئے محقق کی ضرورت ہے ہر شخص کا یہ کام نہیں کہ بدعات کو جائز کرنے لگے۔ غرض روزہ کشائی کا انتظام ہوا بہت کھانے پکوائے گئے ہزاروں آدمیوں کو دعوت دی گئی۔ بچے نے عصر کے وقت تک تو صبر کیا۔ مگر عصر کے بعد اس نے پانی مانگا کہ میرا پیاس سے بڑا حال ہے بادشاہ کو بڑی پریشانی ہوئی کہ اگر اس وقت اس نے روزہ توڑ دیا تو ساری خوشی خاک میں مل جائے گی اور ساری محنت برباد ہو جائے گی۔ اُدھر بچے کی حالت کا بھی فکر تھا کہ وہ پیاس سے بے تاب ہے فوراً طبیبوں کو بلایا کہ کوئی تدبیر ایسی کرو جس سے شاہزادہ کی پیاس کو تسکین ہو جائے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے سب اطبار عاجز ہو گئے کسی کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی۔ صرف ایک ہندو طبیب کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اس نے کہا۔ حضور اسی وقت لیموں منگائے جائیں چنانچہ منگائے گئے اس نے چند لڑکوں کو بلا کر کہا کہ تم شاہزادہ کے سامنے تراش تراش کر کھانا شروع کرو بس دوسروں کو لیمو کھاتے دیکھ کر بچے کے منہ میں پانی بھر آیا طبیب نے کہا اس لعاب کو نگلتے رہو لعاب کے نگلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اب کیا تھا اب تو منہ میں لعاب کا دریا پیدا ہو گیا اور بچے نے اس کو نگلنا شروع کیا فوراً پیاس کو سکون ہو گیا۔ صاحبو! اس پر تو آپ کو تعجب ہوتا ہے مگر میں بقسم کہتا ہوں کہ شریعت نے امراض باطنہ کے سارے علاج شاہانہ ہی کئے ہیں اور اس طرح ہر چیز کا علاج کر کے دعوے سے فرماتے ہیں الدین یسر کہ دین آسان ہے کسی طبیب کا منہ نہیں ہے کہ وہ یہ دعوے کرے الطب یسر کیونکہ اس میں چیر پھاڑ بھی ہے اپریشن بھی ہے نشتر بھی لگایا جاتا ہے مگر حق تعالے

احکام کو بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں ما جعل علیکم فی الدین من حرج خدا نے تم پر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ الہ آباد میں ایک بار اس آیت کا میں نے بیان کیا تھا اور دعوے کیا تھا کہ آج میں اس مسئلہ کو ثابت کروں گا کہ دین میں کہیں ذرہ برابر تنگی نہیں اس وعظ میں تو تعلیم یافتہ بہت تھے وہ میرا منہ تکتے تھے مگر جب میں نے تقریر شروع کی اور دلائل بیان کئے تو سب مان گئے اور سب کی گردنیں خم ہو گئیں اس وعظ[1] کے لئے دعا کیجئے کہ جلد طبع ہو جائے اس کے مطالعہ سے اس قسم کے تمام شبہات دور ہو جائیں گے بخدا شریعت میں تنگی نہیں بلکہ جہاں اس کا توہم ہوتا ہے وہ تنگی خود ہمارے اندر ہے ہم اپنی تنگی کو شریعت کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں ایک گنوار عورت اپنے بچے کو پاخانہ پھرا کر جلدی میں اُسے پونچھ پانچھ کر عید کا چاند دیکھنے کھڑی ہو گئی انگلی میں کچھ پاخانہ لگا رہ گیا تھا۔ ناک پر انگلی رکھنے کی عورتوں میں بہت عادت ہے اس نے جو ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا تو اپنی انگلی میں سے پاخانہ کی بدبو ناک میں پہنچی تو وہ کہتی ہے کہ اوئی اب کے سڑا ہوا چاند کیوں نکلا۔ جس طرح اس بیوقوف نے اپنی انگلی کی سڑاہند کو چاند کی طرف منسوب کیا تھا یوں ہی ہم لوگ اپنی طبائع کی تنگی کو دین کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ دین تنگ ہے ہم لوگوں کو آئینہ شریعت میں اپنی بھونڈی صورت نظر آ رہی ہے اب لگے آئینہ ہی کو برا کہنے۔ جیسے ایک حبشی چلا جا رہا تھا راستہ میں ایک آئینہ پڑا پایا اٹھا کر جو اپنا منہ دیکھا تو ایک ڈراونی صورت نظر آئی۔ تو آپ آئینہ کو پھینک کر فرماتے ہیں کہ ایسی بری صورت کا تھا جبھی تو کوئی پھینک گیا۔ سبحان اللہ آپ نے آئینہ کو بدصورت قرار دیا مگر اپنی بابت یہ بدگمانی نہ ہوئی کہ شاید میری ہی صورت

---

[1] الحمد للہ یہ وعظ مسمیٰ بہ نفی الحرج طبع ہو گیا ہے ۱۲ جامع۔

نظر آئی ہو یہی حال ہمارا ہو رہا ہے کہ آئینہ شریعت میں اپنی صورت جب بدنما نظر آتی ہے تو شریعت کا قصور بتلاتے ہیں جیسے ایک بچہ کے ہاتھ سے لوٹے میں روٹی کا ٹکڑا اگر پڑا تھا اس نے جو جھک کر نکالنا چاہا تو پانی میں اسے اپنی صورت نظر آئی اس نے باپ کو پکارا کہ ابا اس نے میری روٹی چھین لی اس نے پوچھا کس نے چھین لی کہا اس نے یہ جو لوٹے میں بیٹھا ہے ابا جان بھی دیکھنے میں آئے کہ لوٹے میں کون بیٹھا ہے وہ جو لوٹے پر جھکے تو پانی میں ان کو اپنی صورت نظر آئی مقطع ڈاڑھی سفید بال تو آپ اس کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تجھے شرم نہیں آئی یہ لمبی ڈاڑھی لگا کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا تف ہے تیری اوقات پر۔ اسی طرح جس کو شریعت میں شبہ ہو تو درحقیقت وہ خبط اس کے اندر ہے شریعت میں کوئی شبہ نہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت قرآن شریف میں ارشاد ہے ذالک الکتاب لاریب فیہ یہ کتاب کامل ہے اس میں شک نہیں حالانکہ اس میں تو بہت کفار شک کرتے ہیں اور بعض کج فہم مسلمان بھی۔ فرمایا کہ وہ شک ان کے اندر ہے قرآن کے اندر نہیں اور حق تعالیٰ نے لاریب فیہ فرمایا ہے لاریب فیھم نہیں فرمایا اس کی ایسی مثال ہے جیسے یرقان والا کہتا ہے ہذالثوب اصفر (یہ کپڑا زرد ہے ۱۲) مگر طبیب کہتا ہے ھذ الاصفرۃ فیہ وانما الصفرۃ فی عینیک (کہ اس کپڑے میں تو زردی نہیں ہاں تیری آنکھوں میں زردی ہے جس سے تجھ کو ہر چیز زرد نظر آتی ہے ۱۲) بتلایئے یہ کلام سچا ہے یا نہیں یقیناً سچا ہے بس یوں ہی قرآن کا دعوے ہے کہ دین میں تنگی نہیں۔ اب جو کوئی تنگی کا مدعی ہے اس کی نگاہ میں خود تنگی ہے یا فہم میں تنگی ہے۔ صاحبو اگر قرآن کے اس دعوے میں کچھ بھی خامی ہوتی تو یہ آیت ایک عالم کے سامنے جن میں ملاحدہ و فلاسفہ و اہل کتاب سب ہی موجود ہیں دعوے کے ساتھ پیش نہ کی جاتی پھر اوپر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم الدین یسرٌ فرما کر اس کی تاکید

نہ فرماتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عالم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ دین آسان ہے اور ہم بھی حقیقت کے بھروسے پر دعوے کرتے ہیں کہ بیشک دین آسان ہے اسی الدین یسر کا ایک نمونہ ہے کہ شریعت نے تقلیل منام کی صورت تراویح میں تجویز کی اور اس تقلیل کو تہجد سے اور تقویت ہو جاتی ہے خصوصاً لیالی قدر میں کہ ان راتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے تمام اجزاء سے زیادہ جاگنے کا اہتمام فرمایا ہے ان راتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کو بھی اہتمام کے ساتھ جگاتے تھے پھر ان میں بھی شریعت نے ہماری راحت کی کس قدر رعایت کی ہے کہ لیالی قدر پے در پے نہیں ہیں بلکہ طاق راتیں ہیں یعنی اکیسویں اور تیئسویں اور پچیسویں اور ستائیسویں اور انتیسویں راتیں کہ بیچ میں ایک ایک رات کا فصل رکھا گیا ہے تاکہ ایک رات زیادہ جاگ کر بیچ کی رات میں زیادہ سو لو اور تہجد کے لئے جاگنا خاص رمضان کی راتوں میں کچھ بھی مشکل نہیں کیونکہ سحری کے لئے اکثر لوگ اٹھتے ہی ہیں تو کھانے سے پہلے کچھ رکعتیں نماز کی پڑھ لینا کیا دشوار ہے۔ اسی لئے جو شخص تہجد کا عادی بننا چاہے اس کو رمضان میں عادی بننا نہایت آسان ہے کیونکہ اس میں تہجد کے لئے اٹھنا مشکل نہیں سحری کھانے سب ہی اٹھتے ہیں۔ پھر انشاء اللہ تعالیٰ سال بھر کے لئے عادی ہو جائے گا۔ غرض تراویح اور تہجد کے اہتمام سے تقلیل منام ہو جاتی ہے اور یہ خود دینی مجاہدہ بھی ہے پھر اس میں دینی فوائد کے علاوہ دنیوی فوائد کے بھی ہیں۔ چنانچہ نیند کم ہونے سے رطوبت فضیلہ کم ہوتی ہیں جو صحت کے لئے معین ہے نیز اس سے چہرہ پر نور پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک محدث کا قول ہے من کثرت صلوٰۃ فی اللیل حسن وجھہ فی النھار بعض لوگوں نے اس کو حدیث مرفوع بنایا ہے مگر یہ صحیح نہیں ان لوگوں کو مغالطہ ہوا واقعہ یہ ہے کہ ایک محدث حدیث بیان کر رہے تھے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کذا و کذا درمیان میں ایک بزرگ آگئے جن کے چہرہ پرانوار تھے تو محدث نے ان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا من کثرت صلوتہ فی اللیل حسن وجھہ فی النہار کہ جو رات کو نماز زیادہ پڑھے گا دن میں اس کا چہرہ خوبصورت ہو جاوے گا تو بعض لوگ جو پوری مجلس میں حاضر نہ تھے وہ اسی کو حدیث سمجھے حالانکہ حدیث اس کے بعد بیان ہوئی تھی اسی لئے مجلس علم میں اخیر تک رہنا چاہیئے تب صحیح مضمون حاصل ہوتا ہے ورنہ وہی مثال ہوتی ہے کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر عالمگیر کے زمانہ میں ایک عورت نے چار آشنا کر رکھے تھے اور ہر ایک سے نکاح بھی کر رکھا تھا مگر ایک شوہر کو دوسرے کی اطلاع نہ تھی عالمگیر کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس عورت کو بلوایا نہایت پریشانی میں جارہی تھی راستہ میں اسے طالب علم ملے اور کہا کہ اگر تو مجھے اتنے روپے دے تو میں تجھے رہائی کی تدبیر بتلاؤں ورنہ عالمگیر تجھے زندہ نہ چھوڑیں گے اس نے وعدہ کیا کہ جو کہو گے وہ دوں گی تم تدبیر بتلاؤ اس نے کہا یہ کہہ دینا کہ میں نے ایک عالم کے وعظ میں سنا تھا کہ خوامخواہ بدکاری کی جاتی ہے خدا تعالےٰ نے چار نکاح تک جائز کئے ہیں اور وہ پوچھیں کہ یہ مردوں کے لئے کہا تھا یا عورتوں کے لئے تو کہہ دینا کہ آگے میں نے سنا نہیں اس نے جاکر یہی بیان کر دیا عالمگیر نے معذور سمجھ کر سزا نہ دی اور آئندہ کے لئے ہدایت کر دی کہ خبردار وعظ کبھی ادھورا نہیں سنا کرتے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ تہجد سے چہرہ پر نور پیدا ہوتا ہے۔ واللہ اگر تہجد پڑھنے والا حسین بھی نہ ہو تب بھی اس پر حُسن ہوتا ہے ؎

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی ⁂ نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(ولی کے اندر نورِ حق تجھے ظاہر ہو جائے گا بشرطیکہ تو نیک ہیں اور اہل دل بھی ہو)
کسی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے ؎

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور   کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

الغرض رات کو جاگنا باعث حسن ظاہری دلنورد جہ ہے تو تقلیل منام میں علاوہ مجاہدہ ہونے کے یہ فوائد بھی ہیں پھر اس کے ساتھ شریعت نے ایک اور رعایت کی ہے جس پر سو جان سے فدا ہونے کو جی چاہتا ہے وہ یہ کہ مجاہدہ مرتاضین کے نزدیک تو محض ترک کا نام ہے مثلاً ترک طعام و ترک منام وغیرہ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ترک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ افعال بھی مشروع فرمائے ہیں اور مجاہدات حقیقیہ یہ اعمال ہی ہیں اور تروک تو مجاہدہ حکمیہ ہیں یعنی مجاہدات حقیقیہ کے لئے معین ہونے کے سبب بحکم مجاہدہ ہیں وجہ یہ کہ قرب الی اللہ کے لئے اعمال ہی موضوع ہیں مثلاً روزہ میں صرف ترک طعام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اور کام بھی مشروع کئے گئے ہیں۔ عملاً بھی و قولاً بھی عملاً تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان حدیث شریف میں وارد ہے۔

کان اجود الناس بالخیر وکان اجود مایکون فی رمضان کان جبریل یلقاہ کل لیلۃ فی رمضان یعرض علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم القران فاذا لقیہ جبریل کان اجود بالخیر من الریح المرسلۃ

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو ہر وقت ہی سب سے زیادہ سخی تھے۔ مگر سب سے بڑھ کر رمضان میں آپ سخی ہوتے تھے اور جبریل علیہ السلام ہر شب میں آپ سے ملتے تھے ان کی ملاقات کے وقت آپ ہوا سے بھی زیادہ فیض رساں ہوتے تھے (ہوا کی فیض رسانی کہ اس سے بارش ہوتی ہے

معلوم ہے اس جود میں سے بعض کی تصریح بھی وارد ہے مشکوٰۃ میں بیہقی سے بروایت ابن عباس آیا ہے۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل شھر رمضان اطلق کل اسیر واعطی کل سائل (حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان مبارک میں ہر قیدی کو آزاد فرما دیتے تھے اور ہر سائل کو عطا فرماتے تھے) اس میں آپ نے عملی تعلیم فرمائی ہے کہ رمضان میں اور دنوں سے زیادہ فیض رساں ہونا چاہیئے اور قولاً یہ کہ آپ ارشاد فرماتے ہیں ھذا شھر المواساۃ ھذا شھر یزاد فیہ رزق المومن من تقرب فیہ بخصلۃ من الخیر کان کمن ادی فریضۃ فیما سواہ ومن ادی فریضۃ فیہ کان کمن ادی سبعین فریضۃ فیما سواہ۔ یعنی یہ مہینہ ہمدردی کا ہے اس مہینہ میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے جو اس میں نفل کام کرے اس کو اور دنوں کے فرض کے برابر ثواب ملے گا اس میں کس قدر ترغیب وتحریص ہے۔ صدقہ خیرات اور اعمال صالحہ کی کہ رمضان میں رکعات نافلہ کا ثواب فرض نمازوں کے برابر ملتا ہے۔ صدقہ نافلہ کا ثواب صدقہ مفروضہ کے برابر ملتا ہے اور جو فرض کو اس ماہ میں ادا کرتے ہیں ان کو ستر فرضوں کا ثواب ملتا ہے۔ مگر اس سے بعض لوگوں نے کیسا الٹا مطلب سمجھا کہ بعض لوگ رمضان سے پہلے بعض نیک کاموں کو روکے رکھتے ہیں مثلاً کسی کی زکوٰۃ کا سال شعبان میں پورا ہوگیا اب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا رمضان کے انتظار میں روکے رکھتا ہے چاہے رمضان میں اس کو توفیق ہی نہ ہو روپیہ چوری ہی ہوجائے یا رمضان کے انتظار میں محتاج کا قلیہ ہی ہوجائے۔ یاد رکھو شارع کا اس ترغیب سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رمضان کے انتظار میں نیک کاموں کو روکا جائے بلکہ شارع کا مقصود تاخیر عن رمضان سے روکنا ہے کہ اگر رمضان تک کسی کو توفیق نہ ہوئی ہو تو رمضان میں ہرگز دیر نہ کرے جو کرنا ہو کر

کر ڈالے التقدیم علی رمضان سے روکنا مقصود نہیں۔ وشتّان بینہما (ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے) مگر کم فہمی نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ لوگ رمضان میں خرچ کرنے کے فضائل اور ثواب سن کر اس کے انتظار میں طاعات کو روکنے لگے۔ خوب سمجھ لو کہ تعجیل فی الخیر میں خود بہت بڑا ثواب ہے اور وہ اتنا بڑا ثواب ہے کہ رمضان سے پہلے جو تم خرچ کرو گے تو گو اس میں کمّاً بہ نسبت رمضان میں خرچ کرنے کے ثواب کم ہو مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کیفاً وتقریباً الی اللہ وہ تعجیل بہتر ہے اور اس درجہ میں اس کا ثواب رمضان کے ثواب سے بڑھ جائیگا۔ مجھے کوئی تو اطمینان ہے جو میں شرح صدر کے ساتھ اس مضمون کو بیان کر رہا ہوں بس قسم سے زیادہ اطمینان دلانے کا ذریعہ میرے پاس کوئی نہیں تمہیں کیا خبر ہے کہ شعبان میں اگر تم غریب کو زکوٰۃ دیدیتے۔ تو اس وقت اس کے دل سے کیسی دعا نکل جاتی جس کے سامنے ستر رمضان بھی ہیچ ہیں۔ یہی بات تو لوگوں کو معلوم نہیں۔ یاد رکھو جب زکوٰۃ کا سال پورا ہو جائے اس کے بعد تاخیر کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اس تاخیر سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں بعض وجوب علی الفور کے قائل ہیں ان کے نزدیک تاخیر سے گناہ ہوتا ہے اور بعض وجوب علی التراخی کے قائل ہیں ان کے نزدیک گناہ نہیں ہوتا پس احتیاط اسی میں ہے کہ وجوب کے بعد دیر نہ کی جائے تاکہ سب کے نزدیک گناہ سے محفوظ رہے پھر اگر رمضان کے انتظار میں صدقات کا روکنا موجب ثواب ہوتا تو شریعت نے کہیں تو یہ کہا ہوتا کہ رمضان سے اتنے دن پہلے تمام صدقات کو روک دو جب شریعت نے کہیں یہ نہیں کہا تو اب ہمارا ایسا کرنا یہ زیادۃ فی الدین اور بدعت ہے کہ جس کام کے لئے شریعت نے ثواب بیان نہیں کیا تم اس کو ثواب سمجھ کر کرتے ہو یہ مقادمت ہے حکم شرع کی مگر چونکہ اب تک جہل میں مبتلا تھے علم نہیں تھا اس لئے امید ہے کہ گنہگار نہیں ہوئے ہوگے

ہاں اب جو لوگ ایسا کریں گے وہ گنہگار ہوں گے کیونکہ اب مطلع صاف ہو گیا غرض شریعت نے محض تقلیل طعام بصورت صیام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اعمال کی بھی ترغیب دی ہے۔ اسی طرح تقلیل منام میں بھی محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا کہ خالی بیٹھے جاگتے رہو بلکہ فرماتے ہیں۔

کانوا قلیلاً من اللیل ما یھجعون ۔ وبالاسحار ھم یستغفرون ۔ نیک بندوں کی تعریف فرماتے ہیں کہ وہ رات کو کم سویا کرتے تھے اور پچھلے حصہ شب میں استغفار کیا کرتے تھے یہاں تو استغفار شروع ہوا دوسری جگہ ارشاد ہے تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً وطمعاً ۔ ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ رہتے ہیں اپنے پروردگار کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں یہاں مفسرین کا قول یہ ہے یدعون سے یصلون مراد ہے مطلب یہ کہ رات کو نماز پڑھتے ہیں مگر طرز کلام سے عموم ظاہر ہو رہا ہے لہذا مطلق دعا و ذکر بھی مراد ہو سکتی ہے اسی لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو تہجد کی توفیق نہ ہو تو وہ رات کو کسی وقت جاگ کر تین بار سبحان اللہ کہہ کر ہی سو رہا کرے وہ بھی یدعون ربھم خوفاً وطمعا میں داخل ہو جائے گا بس دو تین بجے جب آنکھ کھل جائے سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ لیا کرے یہ تسبیح بھی کام آجائے گی حق تعالیٰ کے یہاں بڑی رحمت ہے۔ اسی وسعت رحمت پر قاضی یحییٰ بن اکثم محدث کی حکایت یاد آگئی کہ جب ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی روح کو حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کیا گیا تو ان سے سوالات شروع ہوئے یہ کسی بات کا جواب نہیں دیتے اور ہکا بکا خاموش کھڑے ہیں ادھر سے سختی کے ساتھ حکم ہوا کہ بڈھے بولتا کیوں نہیں تو آپ نے حدیث بیان کرنا شروع کی حدثنا فلان عن فلان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان اللہ یستحی من ذی الشیبۃ المسلم کہ ہم سے

فلاں نے اور ان سے فلاں نے روایت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ بڈھے مسلمان سے حیا فرماتے ہیں تو میں اس وقت اس لئے خاموش ہوں کہ سوچ رہا ہوں کہ یہاں اس حدیث کے خلاف میرے ساتھ معاملہ کیوں ہو رہا ہے کیا اس حدیث کے راوی ثقہ نہیں یا کیا بات ہے، وہاں سے ارشاد ہوا کہ ہمارے نبی سچے ہیں اور تمہارے راوی بھی سب ثقہ جاؤ آج ہم تم کو اسی حدیث کی وجہ سے بخشتے ہیں اور بڈھا سمجھ کر چھوڑے دیتے ہیں ؎

رحمت حق بہانہ می جوید ٭ رحمت حق بہا نمی جوید

(رحمت حق بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ رحمت حق قیمت نہیں تلاش کرتی ہے)
تو جس طرح قاضی یحییٰ کا حدثنا حدثنا بلکہ بڑھاپا وہاں کام آگیا اسی طرح انشاء اللہ آپ کا رات کو کروٹیں بدلتے ہوئے اللہ اللہ کرلینا بھی کام آجائیگا۔ اور آپ تہجد والوں میں شمار ہو جاویں گے اور بے نماز کے تہجد ہوگی گویا صرف اذان ہی ہوگی جیسے مرغا رات کو اذان دیا کرتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا۔ بس آپ کی بھی اذان اذان ہی ہوگی نماز تو ہوگی نہیں مگر خدا کے واسطے اس اذان کی تشبیہ سے اس وقت چلا چلا کر سبحان اللہ یا اللہ اللہ مت کہنے لگنا کہیں سونے والوں کی نیند میں خلل آوے پھر تو وہ پریشان کہنے میں حافظ جنازہ کی اذان ہو جائے گی (یہ اس خانقاہ کے متعلقین میں سے ایک بھولے شخص تھے) جو ایک غیر آباد مسجد میں موذن تھے۔ ایک دفعہ مغرب کے بعد کھانا کھا کر سو گئے زیادہ رات گئے جو آنکھ کھلی تو آپ نے عشاء کی اذان کہی تقریباً بارہ بجے ہوں گے پھر خیال ہوا کہ کوئی صبح کی اذان سمجھ کر سحری سے نہ رک جائے تو اذان کے بعد یہ بھی پکار دیا کہ یہ عشاء کی اذان ہے صبح کی نہیں ہے لوگ پریشان نہ ہوں یعنی مسجد میں نہ آویں پڑے سوتے رہیں اور کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ عبداللہ بن عباس کے موذن نے بھی تو اذان کے اخیر میں

الاصلوا فی الرحال کہا تھا کہ اپنے گھروں ہی میں نماز پڑھ لو مسجد میں آنے کی ضرورت نہیں بات یہ ہے کہ وہ اذان تو بوقت ہی تھی اس لئے ادائے سنت کے لئے اعلان کے ساتھ اذان دیکر الاصلوا فی الرحال کہدیا تھا تاکہ لوگ پریشانی سے بچیں۔ بخلاف حافظ جنازہ کی اذان کے کہ بیوقت تھی اس لئے خود پریشانی کا سبب تھی ان سے کوئی پوچھے کہ جب تم کو بلانا مقصود نہیں اور نہ ۱۲ ۔ بجے لوگ آسکیں تو ایسے وقت میں چلا کر اذان دینے کی کیا ضرورت تھی آہستہ ہی اذان کہہ لی ہوتی اس سے بھی سنّت ادا ہو جاتی غرض شریعت نے جاگنے کے ساتھ ذکر و استغفار و صلوٰۃ کو بھی مشروع فرمایا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا پھر اس میں بھی کوئی یہ قید نہیں کہ دو بجے اٹھو یا تین بجے اٹھو بس صبح سے پہلے اٹھنا چاہیئے۔ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے ان ربك یعلم انك تقوم ادنیٰ ثلثی اللیل ونصفهٗ وثلثهٗ وطآئفة من الذین معك واللّٰه یقدر اللیل والنهار ط آپ کے پروردگار کو معلوم ہے کہ آپ کبھی دو تہائی رات سے کچھ کم جاگتے ہیں کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات جاگتے ہیں اور ایک جماعت بھی ان لوگوں میں سے جو آپ کے ساتھ ہے اس کے بعد فرماتے ہیں واللّٰه یقدر اللیل والنهار کہ رات اور دن کا پورا اندازہ حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں یہ جملہ بیکار نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اندازہ ٹھیک طور پر نہیں کرسکتے کہ ہمیشہ ایک ہی وقت پر اٹھو اس لئے کسی خاص وقت کی تعیین لازم نہیں کی جاتی جب آنکھ کھل جائے اسی وقت اٹھ جانا چاہیئے یہی معنی ہیں اس کے جو فرمایا ہے علم ان لن تحصوہ فتاب علیکم فاقرءوا ما تیسر من القراٰن ط اور پھر بیماروں کو اور کسب معاش کرنے والوں کو دقت تھی ان کی آنکھ بعض صبح کے قریب ہی کھلتی ہے تو ارشاد فرماتے ہیں علم ان سیکون منکم مرضٰی واٰخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللّٰه واٰخرون یقاتلون فی سبیل اللّٰه فاقرءوا ما تیسر منه ط یعنی بیماروں اور مسافروں کو زیادہ

بیداری معاف ہے ۔ ان کی جب آنکھ کھل جائے صبح سے پہلے پہلے وہ جتنا قرآن پڑھ سکیں نماز میں پڑھ لیا کریں چاہے دو ہی رکعت پڑھ لیا کریں اس سے بھی کامل ثواب مل جائے گا۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو حدیث میں آتا ہے کہ بعد وتر کے دو رکعت پڑھ لیا کرے اس کی نسبت کفتاہ وارد ہے جس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے بھی تہجد کا ثواب مل جاتا ہے ۔ سبحان اللہ ہماری رڈیول کی بھی تو رعایت ہے کہ تجارت کے لئے سفر کرو تو طویل بیداری معاف ہے جتنا ہو سکے کر لیا کرو ۔ کوئی طبیب ایسا ہے جو یوں کہدے کہ اس نسخہ میں سے آدھا پی لو یا ربع پی لو یا ایک گھونٹ ہی پی لو تو صحت کے لئے کافی ہے ایسا کوئی طبیب نہ ملے گا وہ تو قدحے ہی پلاوے گا ۔ مگر حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ رعایت پر رعایت فرماتے جاتے ہیں کہ زیادہ نہ ہو سکے تو اخیر شب میں دو رکعت ہی پڑھ لو اتنا بھی نہ ہو سکے تو سونے سے پہلے وتر کے بعد دو رکعت پڑھ لو یا رات کو دو تین بار سبحان اللہ ہی کہہ لو بس کافی ہے ۔ غرض یہاں بھی ترک منام کے ساتھ فعل مشروع ہوا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں فرمایا ۔ اور اس میں ایک مسئلہ دقیقہ پر تنبیہہ فرمادی ہے ۔ تمہید اس کی یہ ہے کہ بعض لوگ مجاہدات بعضے ترو ک ہی کو مقصود سمجھ جاتے ہیں ان میں بعض تو ملحد ہیں جو ضرورت اعمال ہی کے منکر ہیں اُن سے تو اس وقت بحث نہیں غضب تو یہ ہے کہ بکثرت اہل علم کا بھی یہی حال ہے کو اعتقاد نہ ہو کہ وہ مجاہدات حکمیہ تقلیل طعام و تقلیل منام و تقلیل کلام و تقلیل اختلاط مع الانام کو نہایت اہتمام سے اختیار کرتے ہیں اور گو جانتے ہیں کہ ان سے مقصود سہولت فی الاعمال ہے مگر باوجود اس کے پھر کیفیات کو حالاً مقصود سمجھتے ہیں اور اعمال کو حالاً اصل مقصود نہیں سمجھتے گو ان کا یہ اعتقاد نہ ہو مگر برتاؤ یہی ہے ۔

چنانچہ مجاہدات کے بعد جب ان پر کیفیات ذوق وشوق ونشاط کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ کام میں لگے رہتے ہیں اور جہاں کبھی کسی وجہ سے ان کیفیات میں کمی پیدا ہوئی تو اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مجاہدہ ہی بیکار ہوا اور ہمارا رتبہ خدا کے یہاں کم ہوگیا پھر اس خیال کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اعمال ہی سے بے رغبتی ہو جاتی ہے اب اگر جاہل ہے تو اعمال بالکل چھوٹ گئے اور اگر پکے ہوئے تو استغفار میں لگ گئے تاکہ وہ کیفیت عود کر آئے۔ استغفار اچھی چیز ہے مگر اس حالت کا تو علاج نہیں خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔ تمہارا وہ خیال ہی غلط ہے کہ میں مردود ہو گیا جس کے تدارک کے لئے استغفار کر رہے ہو نہ مجاہدہ بیکار ہوا نہ تم مردود ہوئے۔

اصل بات یہ ہے کہ کبھی تو ابتدا میں مجاہدہ کا اثر جدت کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے ذوق وشوق کا غلبہ ہوتا ہے اور اب انس کی حالت ہے جس میں غلبہ نہیں رہا اس لئے کیفیات میں کمی ہوگئی تو بھلا استغفار سے حالت انس مبدل بحالت ابتدا کیونکر ہو جائے گی۔ کبھی کبھی بیماری کی وجہ سے کیفیات میں کمی آجاتی ہے استغفار اس کا رافع کیونکر ہوگا۔ کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہوتا ہے کہ ہمارا بندہ اپنے لطف کے واسطے ہی کام کرتا ہے یا ہم اس کے مطلوب ہیں اس لئے کیفیات سلب کر لی جاتی ہیں۔ یہاں استغفار سے کیسے کام چلے گا۔ اکثر مشائخ ایسے شخص کو استغفار تعلیم کرتے ہیں اور جب استغفار میں بھی دل نہ لگا تو کچھ اور وظیفہ بتلا دیتے ہیں، جب اس سے بھی جی گھبرایا تو کچھ اور بتلا دیتے ہیں۔ اب یہ شخص مجموعۃ الاوراد ہو جاتا ہے۔ مگر مرض اب بھی جوں کا توں ہے۔ البتہ اگر خوش قسمتی سے اسے کوئی طبیب الٰہی مل گیا وہ ان تعلیمات کو سُن کر کہے گا۔

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند ✤ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

(اس طبیب روحانی نے کہا کہ ان حکمائے یونان نے جو علاج بھی کیا وہ سب غلط اور بجائے تعمیر کے تخریب کی راہ ہے)

بیخبر بودند از حالِ درون ✤ استعیذ اللہ مما یفترون

(یہ لوگ اندر کے حال سے بیخبر ہیں اللہ تعالیٰ سے پناہ چاہتا ہوں جو کچھ یہ لوگ افترا کر رہے ہیں)

ایسے یہ قلت کیفیات کسی معصیت کی وجہ سے تھوڑا ہی تھی جو استغفار بتلا دیا بلکہ اس کا منشار تو کچھ اور تھا ؎

دید از زاریش کو زار دل ست ✤ تن خوش ست اما گرفتار دل ست

(اس کی زاری سے دل کا راز سمجھ لیا کہ جسم بیمار نہیں دل گرفتار عشق ہے۔)

عاشقی پیدا است از زاری دل ✤ نیست بیماری چو بیماری دل

(عاشقی دل کے زاری سے پیدا ہوتی ہے دل جیسی بیماری دنیا میں نہیں ہے)

اب طبیب الٰہی علاج کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس مرض کی دوا یہ ہے کہ تم ان کیفیات پر التفات ہی نہ کرو اگر کیفیات نہ رہیں نہ سہی خدا تو ہے۔

روز ہا گر رفت گو رو باک نیست ✤ تو بماں لے آنکہ چوں تو پاک نیست

(اگر کیفیات نہ رہیں تو غم نہ کرو خدا تو موجود ہے۔ دن و رات تو آنے جانے والے ہیں آپ تو باقی ہیں اور آپ کی طرح کون ہے جو تغیرات سے پاک ہے)

طاعات میں صرف خدا کو مطلوب سمجھو کیفیات کو ہرگز مطلوب نہ سمجھو بلکہ جس کو وصال سمجھ رہے ہو اس پر بھی نظر نہ کرو ہمکو وصال میسر ہوگا یا نہیں تم صرف عمل کو مقصود سمجھو ہمت سے اسی میں لگے رہو اور زبان حال سے یوں کہتے رہو ؎

یابم اورا یا نہ یابم جستجوئے میکنم ✤ حاصل آید یا نہ آید آرزوئے میکنم

(اسکو پاؤں یا نہ پاؤں جستجو کئے جاتا ہوں۔ اسے حاصل کر لوں یا نہ کر سکوں اسکی آرزو کرتا ہوں)

عارف فرماتے ہیں ؎

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں دوست کی رضا طلب کرو اس کی رضا کے علاوہ کسی چیز کی تمنا کرنا قابل افسوس ہے)۔ اور ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق

ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میری خواہش وصال کی ہے اور محبوب کی خواہش فراق کی ہے۔ پس اپنا ارادہ ترک کردو تاکہ محبوب کی مراد پوری ہو)

ارید وصالہ و یرید ہجری   فاترک ما ارید لما یرید

(میں ارادہ کرتا ہوں اس کے وصال کا وہ ارادہ کرتا ہے میری جدائی کا پس اپنا ارادہ ترک کرتا ہوں اس کے ارادہ کی کامیابی کی خاطر سے)

عارف کہتا ہے کہ تم کیفیات کو کیا لئے پھرتے ہو ہمارے نزدیک تو فراق ووصل بھی کوئی چیز نہیں بلکہ اصل چیز رضائے محبوب ہے جس کا ذریعہ عمل ہے۔ جب تک تم عمل میں لگے رہوئے ہو رضا حاصل ہے اور جب رضا حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے چاہے وصال ہو یا نہ ہو کیفیات ہوں یا نہ ہوں اس تعلیم کے بعد راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے اور ساری پریشانی ایک منٹ میں جاتی رہتی ہے۔

اس تعلیم کا خلاصہ پھر کہے دیتا ہوں کہ کیفیات پر نظر نہ کرو محقق ایک نکتہ میں علاج کردیتا ہوں بشرطیکہ اس کا انقیاد کرو ہمارے حاجی صاحب کی یہی تعلیم تھی جب کوئی ذاکر شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو فرماتے یہ کیا کچھ کم نفع ہے کہ تم ذکر تو کر رہے ہو حالانکہ خدا کی ایک مخلوق اس سے محروم ہے۔

اب اس تمہید کے بعد سمجھو کہ شریعت نے مجاہدات کے ساتھ اعمال کی قید لگا کر جس نکتہ

پر تنبیہ کی ہے وہ یہ ہے کہ اصل مقصود رضاء الٰہی ہے جس کا طریق عمل ہے اور مجاہدات حکمیہ اس کے لئے محض سبب سہولت ہیں خود مقصود نہیں پس اگر عمل موجود ہوا اور مجاہدہ کے آثار خاصہ مرتب نہ ہوں تو کچھ حرج نہیں اور اگر مجاہدہ کے آثار خاصہ موجود ہوں اور عمل مفقود ہو تو وہ محض بیکا چیز ہیں اس لئے شریعت نے ہر مجاہدہ کے ساتھ ایک نہ ایک عمل بتلا دیا روزہ میں بھی اعمال کی ترغیب دی ہے تاکہ معلوم ہو کہ تقلیل طعام خود مقصود نہیں بلکہ عمل مقصود ہے اور تقلیل منام کی صورت بھی تراویح اور تہجد کی نماز میں تجویز کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ محض جاگنا مقصود نہیں بلکہ عمل مقصود ہے۔ پس اگر یہ عمل نہ ہوں تو تقلیل منام کی عادۃ کوئی فائدہ مند چیز نہیں اور اگر اعمال موجود ہیں اور تقلیل منام کا ثمرہ حاصل نہ ہو کیفیات طاری نہ ہوں تو بے فکر رہو غرض شریعت نے کسی مجاہدہ حکمیہ کو مجاہدہ حقیقیہ سے خالی نہیں رکھا اور کسی جگہ محض ترک پر اکتفا نہیں کیا یہ فرق ہے مجاہدہ عرفیہ اور مجاہدہ شرعیہ میں یہ دوسرا رکن تھا مجاہدہ کا جس کے متعلق اس وقت بیان ہوا۔ اب دو رکن اور رہے ان شاء اللہ ان کے متعلق پھر کبھی بیان ہو جائے گا۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام تقلیل المنام بصورۃ القیام تجویز کرتا ہوں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی توفیق عنایت ہو۔ آمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ط

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمٰی بہ

تقلیل الکلام

بصورۃ

تلاوۃ کلام الملک العلام

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:- محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقار
مسافر خانہ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی

ضروری اطلاع:- خط وکتابت کرتے وقت یا پتہ بدلتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرماویں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

تقلیل الکلام

بصورۃ

تلاوۃ کلام الملک العلام

(الوعظ مسمّٰی بہ) تقلیل الکلام + بصورۃ تلاوۃ کلام الملک العلام وہو الجزء الثالث من اجزاء ابواب المجاہدہ + واسباب المشاہدہ

الاشتات	المستمعون	من ضبط	من ای شان	ماذا	لم	کیف	کم	متٰی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد	کس نے لکھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کیا مضمون تھا	سبب وعظ	کیونکر ہوا	کتنی دیر ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
×	تقریباً ۱۰۰	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ وکان لہ	سب مسلمانوں کو عموماً اور اہل ریاضت کو خصوصاً	شریعت نے تقلیل کلام کی صورت تلاوت قرآن کے ضمن میں مشروع کی ہے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی اور مجاہدہ عرفیہ ہے اس کی فضیلت کے وجوہ و دلائل	ان جملہ مواعظ متحدۃ المعانی کا سبب واحد ہی ہے	کھڑے ہو کر	ساڑھے تین گھنٹے (۳ ½)	۱۲ رمضان ۱۳۴۰ھ بعد نماز جمعہ	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان

ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالٰی علیہ و علیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین ۔ یہ وہی آیت ہے جس کی اس کے قبل دو دفعہ تلاوت کی گئی ہے اور آج پھر تلاوت کی گئی ہے کیونکہ اس کے ذیل میں جو مضمون بیان ہورہا ہے وہ ابھی تمام نہیں ہوا اس سے پہلے بیان ہوچکا ہے کہ مجاہدات حکمیہ کی چار قسمیں ہیں۔ تقلیل طعام ۔ تقلیل منام ۔ تقلیل کلام ۔ تقلیل اختلاط مع الانام ۔ ان میں سے دو کا بیان ہوچکا ہے اور دو باقی ہیں اور جن دو کا بیان ہوا ہے وہ مستقلاً نہیں ہوا بلکہ اس حیثیت سے بیان ہوا ہے کہ رمضان کی عبادت میں ان مجاہدات کی رعایت کی گئی ہے ۔ اب دو جو باقی ہیں ان کی بھی اسی حیثیت سے تقریر ہوگی جن میں سے آج تقلیل کلام کے متعلق بیان کا ارادہ ہے اگرچہ بعض مقتضیات کی وجہ سے اس وقت تقلیل اختلاط مع الانام کا بیان ہونا چاہیئے تھا کیونکہ یہ زمانہ اعتکاف کا ہے لیکن میں نے چند وجوہ سے تقلیل کلام کا بیان مقدم کیا ایک یہ کہ اعتکاف ایک خاص وقتی عبادت ہے جس میں اتنا عموم ضرورت نہیں جتنا تقلیل کلام میں عموم ضرورت ہے ۔ اعتکاف سب لوگ نہیں کرسکتے بلکہ اگر سب کرنا چاہیں تو ان کو منع کیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے حوائج وضروریات معطل ہوجائیں گی یہی وجہ ہے کہ اعتکاف سنت علی الکفایہ ہے۔ بستی بھر میں ایک آدمی اعتکاف کرنے کو کافی ہے ۔ اور تقلیل کلام کے مخاطب تمام افراد ہیں۔ فرداً فرداً اور اس پر سب کے سب عمل کرسکتے ہیں کیونکہ تقلیل کلام کی جو حقیقت آگے بیان کی جائے گی اس سے معلوم ہوجائے گا کہ اس پر سب کے عمل کرنے سے کسی ضرورت کا تعطل نہیں ہوسکتا ۔ دوسرے تقلیل کلام کی رعایت جس عمل کے ضمن میں کی گئی ہے وہ عمل بھی بہ نسبت اعتکاف کے زیادہ عام ہے ۔ چنانچہ آگے بیان کیا جائے گا کہ رمضان میں تلاوت قرآن کے ضمن میں تقلیل الکلام کی رعایت کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عمل عام ہے تلاوت قرآن کرنے والوں کا عدد سے بہت زیادہ ہے۔ پھر یہ عمل ہر شخص کو اور ہر وقت

سہل ہے اور اعتکاف ہر اک کو آسان نہیں نہ ہر وقت ہو سکتا ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی کثرت تلاوت کا تھا اور اعتکاف اس کثرت سے نہ کیا جاتا تھا۔ تیسرے خود قلت اختلاط اور قلت کلام میں فی نفسہٖ قلت کلام زیادہ ضروری ہے کیونکہ قلت اختلاط اگر نہ بھی ہو مگر تقلیل کلام کی عادت ہو تو غوائل سے بچ سکتا ہے اور اگر تقلیل کلام نہ ہو تو محض قلت اختلاط سے غوائل سے نہیں بچ سکتا۔ جو شخص زیادہ بک بک کرنے کا عادی ہوتا ہے وہ ایک ہی مجلس میں بہت باتیں گناہ کی کہہ ڈالتا ہے۔ الغرض جن اعمال کے ضمن میں تقلیل کلام و تقلیل اختلاط کی رعایت کی گئی ہے خود ان اعمال میں بھی تفاوت ہے اور خود ان دونوں مجاہدوں میں بھی تفاوت ہے ان وجوہ سے میں نے تقلیل کلام کے بیان کو مقدم کیا لیکن مثل جمعہ گذشتہ کے اس وقت بھی مضمون سابق کا کچھ تتمہ ذہن میں آگیا ہے اور وہ دو تتمے ہیں جن کو پہلے بیان کر دینا مناسب ہے میں نے پہلے بیان کیا تھا کہ شریعت نے محض ان مجاہدات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اعمال بھی منضم کر دیئے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود اعمال ہیں اور یہ مجاہدات تسہیل اعمال کا ذریعہ ہیں پس اگر مجاہدہ کا ثمرہ حاصل نہ ہو یعنی کیفیات نہ ہوں اور اعمال موجود ہوں تو کافی ہے اور اگر اعمال نہ ہوں تو کیفیات کافی نہیں مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے روزہ رکھتا ہے زکوٰۃ دیتا ہے، بیوی بچوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔ حرام آمدنی سے بچتا ہے کسی کا قرض لے کر نہیں مارتا جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے اجتناب کرتا ہے مگر اس کو وہ ثمرات حاصل نہیں جو مجاہدہ پر مرتب ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً غلبۂ ذوق و شوق و یکسوئی وغیرہ نہیں تو یہ شخص بے فکر رہے اس کو مقصود حاصل ہے اور جو مفقود ہے وہ مقصود نہیں اس کا غم نہ کرے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اعمال کافی ہیں اور غلبہ ذوق و شوق و یکسوئی وغیرہ کی ضرورت نہیں تو طریق باطن کی کیا ضرورت ہے اعمال تو ہم ویسے بھی کر سکتے ہیں اتنی بات کے لئے مشائخ کی خدمت اور مجاہدات و ریاضات و اذکار و اشغال کی

کیا ضرورت رہی یہ تو بدون اس کے بھی ہو سکتا ہے اس شبہ والے نے مقصود طریق ہی کو نہیں سمجھا یہ شخص محض کیفیات ہی کو مقصود طریق سمجھتا ہے اسی لئے میرے اس کہنے پر کہ یہ کیفیات نہ ہوں تو بے فکر رہو اس کو طریق کے بیکار ہونے کا شبہ ہوا۔ "سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست" میں پھر کہتا ہوں کہ کیفیات مقصود طریق نہیں بلکہ مقصود طریق اعمال ہی نہیں اور یہ کیفیات خود ان اعمال کے تابع ہیں اگر عمل نہ ہو تو یہ کیفیات کبھی باقی نہیں رہ سکتیں تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے مگر جو اعمال مقصود طریق ہیں ان میں یہ شرط ہے کہ ان میں خلوص ہو رہا یہ کہ پھر مقصود طریق کیا ہے تو سنئے کہ مقصود طریق اور خلوص فی الاعمال یہی باطن عمل ہے جس کے متعلق ارشاد ہے۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ اور حدیث میں ارشاد ہے ان تعبد اللہ کانک تراہ تو آپ نے میرے اس قول سے کہ اعمال کافی ہیں یہ مطلب سمجھا کہ محض ظاہری اعمال کافی ہیں اسی لئے طریق باطن کے بیکار ہونے کا شبہ ہوا حالانکہ میرا مطلب یہ تھا کہ اعمال مع اپنی صورت ظاہرہ اور مع اپنی روح کے موجود ہوں تو کافی ہیں اور روح اعمال خلوص ہے اور تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس خلوص کے حصول میں طرق صوفیہ سے سہولت ہو جاتی ہے علم باطن میں ان ہی طرق کا بیان ہوتا ہے اور اسی کے لئے مشائخ کی صحبت اختیار کی جاتی ہے اور اسی کے لئے اذکار و اشغال بتلائے جاتے ہیں۔ اسی خلوص میں کیفیات ذوق و شوق و یکسوئی سے بھی سہولت ہو جاتی ہے لیکن خلوص ان پر موقوف نہیں خلوص اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے گو دقت اور مشقت سے ہی ہو مگر ہو سکتا ہے اور طریق باطن سے یہ سہولت حاصل ہو جاتا ہے اور حقیقت اس خلوص کی یہ ہے کہ مثلاً نماز پڑھے تو اس میں ریا نہ ہو عجب نہ ہو قصداً حضار وساوس نہ ہو۔ تو اب اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوا اور سوائے رضائے حق کے اس کی کوئی غرض نہیں اور جو غرض بھی آتی ہے اس کو دفع کرتا ہے اور وساوس بھی دل میں خود نہیں لاتا تو یہ نماز خلوص کے ساتھ تمام ہوئی ہاں اگر یہ شخص کیفیات سے خالی ہے تو اس کے اہتمام میں اس کو مشقت بہت ہو گی لیکن اگر وہ اس مشقت کو

برداشت کرتا رہے اور ہمت کر کے از خود نماز میں کوئی وسوسہ نہ لادے نہ ریا ء و عجب کو پاس آنے دے تو مقصود میں یہ شخص کامیاب ہے اور اس کو مشقت کی وجہ سے اجر بھی زیادہ ہوگا جس کی دلیل وہ حدیث ہے الذی یقرأ القراٰن وھو بہ ماھر فھو مع السفرۃ الکرام البررۃ والذی تیعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران (او کما قال) لیکن اس مشقت کا روزانہ برداشت کرنا آسان نہیں بعض دفعہ آدمی گھبراجاتا ہے اور نفس کو ڈھیل دیدیتا ہے تو نماز میں اول سے آخر تک وساوس ہی وساوس ہوتے ہیں کبھی عجب بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ریا میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے سو طریق باطن کی تحصیل سے یہ مشقت باقی نہیں رہتی پھر حضور سہل ہو جاتا اور خلوص آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے تو طریق باطن بیکار نہ ہوا کیونکہ خلوص جو روح اعمال ہے وہ اس طریق سے بسہولت حاصل ہو جاتا ہے تو اب میرا یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ اعمال کافی ہیں اور مقصود ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ طریق بیکار نہیں مقصود میں معین ہے اور برخلاف اس کے جب آدمی یہ عقیدہ کر لیتا ہے کہ کیفیات مقصود ہیں اور اعمال مقصود نہیں تو اس پر دو مفسدے مرتب ہوتے ہیں۔ ایسا تو کون ہوگا جو نماز کو مقصود نہ سمجھے مگر مقصود بالذات و بالعرض میں کلام ہے۔ بعض لوگ اعمال کو ان کیفیات کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور مقصودِ بالذات کیفیات کو سمجھتے ہیں۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ نماز میں کیفیات حاصل ہوئی اور جی لگا تو سمجھتے ہیں کہ آج نماز پڑھی اور اگر جی نہ لگا تو سمجھتے ہیں کہ نماز نہیں پڑھی مگر فرض کو تو ترک نہیں کرتے فرائض کو تو گناہ کے خوف سے ادا کر لیتے ہیں لیکن جو اعمال مندوب ہیں جیسے تلاوت و ذکر اور نوافل وغیرہ ان کو تو چھوڑ ہی بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ اکثر ذاکرین کی یہی حالت ہے کہ جب ذکر میں ان کا دل نہیں لگتا تو اس دن ذکر ناغہ کر دیتے ہیں نوافل میں جی گھبرایا تو ان کو بھی چھوڑ دیتے ہیں یاد رکھو یہ حالت سخت خطرناک ہے اگر تم جی لگنے کے ایسے ہی تابع رہو گے تو شیطان تم کو ہمیشہ عبادات و ذکر سے روکتا رہے گا جب وہ دیکھے گا کہ یہ شخص کثرت وساوس سے پریشان ہو کر کام ہی چھوڑ دیتا ہے تو وہ تمہارا پیچھا کبھی نہ چھوڑے گا اور تم کو اعمال سے معطل کر دیگا

ایسے وقت میں وہی شخص کام کرسکتا ہے جو کیفیات کو مقصود نہ سمجھے عمل کو مقصود سمجھے وہ ہر حالت میں کام کرے گا خواہ دل لگے یا نہ لگے ان لوگوں نے ایک شعر یاد کر رکھا ہے جس کو اکثر واعظین وعظ میں پڑھا کرتے ہیں اور اس کو مولانا رومی کی طرف منسوب کرتے ہیں

بر زباں تسبیح در دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر[1]

(زباں پر تسبیح ہے۔ اور دل میں گائے اور گدھے کا دھیان ہے اس طرح کی تسبیح کب اثر رکھتی ہے)

مگر میرے علم میں یہ مولانا کا شعر نہیں ہے مثنوی میں اس کا پتہ نہیں، غالباً بہاؤالدین عاملی کا شعر ہے اور وہ کوئی محقق نہیں، میرے نزدیک اس شعر کا مضمون بھی صحیح نہیں بلکہ تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ "ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر" رات دن کا تجربہ ہے کہ ابتدا میں وساوس کی کثرت ہوتی ہی ہے بہت کم ذاکر ایسے ہوں گے جن کی ابتدا میں وسوسے نہ آتے ہوں۔ مگر میں ذاکرین سے کہدیتا ہوں کہ اس طرف التفات نہ کرو وساوس کے ساتھ ہی ذکر کرتے رہو رفتہ رفتہ حضور حاصل ہو جائے گا چنانچہ وہ ذکر مع الوساوس ہی ایک نہ ایک دن اپنا اثر دکھاتا ہے اور زبانی تسبیح اپنا رنگ لاتی ہے اور حضور میسر ہو جاتا ہے۔ پس میں کیسے مان لوں کہ وسوسہ کے ساتھ ذکر نافع نہیں ہوتا ہاں اگر اس شعر میں یہ تاویل کی جائے کہ جو شخص ذکر کے وقت خود وساوس کو جمع کر کے لاتا ہے تو ایسا ذکر مؤثر نہیں تو وہ شعر صحیح ہو سکتا ہے گو ذکر بیکار اب بھی نہیں ثواب تو ملے ہی گا کیونکہ زبان تو ذکر میں مشغول ہے مگر اس صورت میں قلب پر اس کا اثر نہ ہوگا یہ قلب کو از خود دوسری طرف متوجہ کر رہا ہے تو ذکر کی طرف خاک توجہ ہوگی اور جب ذکر کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تو قلب پر اثر کیسے ہوگا لیکن اگر از خود وساوس نہیں لاتا بلکہ وساوس بلا قصد آتے ہیں اور یہ ان پر التفات نہیں کرتا تو یہ ذکر نافع بھی ہے اور موثر بھی اور اس صورۃ میں وہ قول صحیح نہیں بلکہ اس کی نقیض صحیح ہے۔ کہ ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر۔ اور

[1] اس طرح کی تسبیح بھی اثر رکھتی ہے۔

اگر وساوس مطلقاً مضر ہوتے اور اثر سے مانع ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جب صحابہ نے وساوس کی شکایت کی تھی آپ ان سے یہ کیوں فرماتے اوجدتموہ قالوانعم قال ذالک صریح الایمان آپ فرماتے ہیں کیا تم کو وسوسے آنے لگے اور تم نے ان کو اپنے اندر پالیا صحابہ نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا کہ یہ تو خالص ایمان ہے مطمئن رہو۔ جو لوگ ذکر میں جی نہ لگنے سے ذکر چھوڑ بیٹھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا سے تعلق ہی نہیں اور اس کی طلب ہی نہیں ورنہ صاحب بھوکا آدمی کھانا سامنے آنے کے بعد یہ نہیں دیکھا کرتا کہ اس میں نمک ہے یا نہیں بھوکے کو مزے سے کیا بحث اسے تو کھانے سے کام ہاں جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اس کو یہ نخرے سوجھتے ہیں، اگر مزہ آیا کھالیا مزہ نہ آیا چھوڑ کر الگ ہوگیا پس تم کو بھی اگر طلب اور بھوک ہوتی تو تم مزہ کو ہرگز نہ دیکھتے بلکہ تمہارا یہ مذاق ہوتا ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ... کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں رضائے دوست طلب کرو محبوب حقیقی کی رضا کے علاوہ کسی چیز کی طلب قابل افسوس ہے)

صاحب یہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہارا امتحان ہے کہ ذکر میں لذت کے طالب ہو یا ہمارے طالب ہو اگر تم کو خدا سے تعلق اور عشق ہوتا اور اسی کی طلب ہوتی تو یہ حال ہوتا ؎

"گر مرادت را مذاق شکر است" (اگر تمہارے مراد کی لذت شکر کی طرح ہے)۔ یعنی یہ مسلم لیکن ؎ "بیمرادی ہم مراد دلبر است" (لیکن نامرادی محبوب کی مراد ہے جو اس سے زیادہ لذیذ ہونی چاہیئے) افسوس تم محبوب کی مراد پر اپنی مراد کو مقدم کرتے ہو ارے جب وہی چاہتے ہیں کہ وساوس کے ساتھ ہی ہمارا ذکر کرو تو تم وساوس سے خالی ہونا کیوں چاہتے ہو اور ذکر کے لئے اس انتظار میں کیوں ہو کہ جی لگے تو کروں ؎

بس زبون وسوسہ باشی دلا ... گر طرب را باز دانی از بلا

(یعنی اپنے دل میں بُرا وسوسہ ہے کہ تو عاشق ہو کر طرب اور تعب میں
فرق کرتا ہے۔ یعنی عاشق کو محبت کے راستے میں مشقت کو بھی لذیذ سمجھنا چاہیئے)
جو شخص طرب اور تعب میں فرق سمجھے وہ ابھی تک وسوسہ نفسانی کا شکار ہے ذاکر کو
ہر حال میں اپنا کام کرنا چاہیئے۔ خواہ طرب ہو یا تعب ہو ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ؛ کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں رضا کے دوست طلب کر (محبوب حقیقی کی رضا
کے علاوہ کسی چیز کی طلب قابل افسوس ہے)

یہ شخص اس کو فراق سمجھتا ہے کہ لذت میں کمی ہوگئی سمجھتا ہے کہ بس میں مردود ہو گیا
اسے کیا کیفیت خدا ہے جس کے زوال سے یہ سمجھتا ہے کہ میں خدا سے دور ہو گیا
جب یہ خدا نہیں تو پھر اس کے طالب کیوں ہوتے ہو طالب خدا ہو کر غیر پر نظر افسوس
کی بات ہے شاید یہاں کوئی ذہین یہ شبہ کرے کہ رضائے خدا کیا ہے ظاہر ہے کہ
خدا نہیں تو پھر تم رضا کے طالب کیوں ہو تم بھی طالب غیر خدا ہوئے۔ اس شبہ کا
جواب یہ ہے کہ رضا گو عین خدا نہیں مگر غیر بھی نہیں کیونکہ رضا صفات الٰہیہ میں سے
ہے اور صفات لا عین لا غیر ہیں یہ تو اجمالی جواب ہے جو اہل علم کے مناسب ہے اور
تفصیلی جواب یہ ہے کہ طلب خدا کی تفسیر یہی ہے کہ رضار خدا کو طلب کرے اِبْتِغَاءَ
وَجْہِ اللہِ کے معنی یہی ہیں کہ ابتغاء مرضاۃ اللہ ہو چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک مقام پر
تو یُرِیْدُوْنَ وَجْہَہٗ فرمایا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے مَثَلُ الَّذِیْنَ
یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللہِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ کَمَثَلِ جَنَّۃٍ بِرَبْوَۃٍ الآیۃ
یہاں طلب رضار کا حکم ہے معلوم ہوا کہ ابتغار وجہ اللہ یہی ہے کہ رضار الٰہی کا طالب ہو
اور راز اس میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طلب بدون واسطہ صفات کے دشوار ہے۔
کیونکہ ذات کا نہ تصور ہو سکتا ہے نہ اس کا حصول ہو سکتا ہے۔ ذات کا تصور جب
ہوگا صفات کے ہی واسطے سے ہوگا اور بلا واسطہ یعنی تصور بالکنہ اس کی ذات کا محال
ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

در تصور ذات او را گنج کو　　　　تا در آید در تصور مثل او

(ہمارے تصور میں اللہ تعالیٰ کی ذات غیر محدود کیسے آسکتی ہے تصور میں جو کچھ آتا ہے وہ مثل ہے)

عارف شیرازی اسی کی نسبت کہتے ہیں ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں　　　　کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(عنقا کا شکار کوئی شخص نہیں کر سکتا جال یہاں سے ہٹا لے کہ عنقا کے شکار کی ہوس جس نے کی اس کے جال میں سوا ہوا کے کچھ حاصل نہ ہوا)

کسی شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ　　　　کہ عنقا را بلند ست آشیانہ

(اے مخاطب جا اور جال کسی دوسری چڑیا کے لئے لگا کہ عنقا کا آشیانہ تیرے جال سے بہت بلند ہے)

اسی واسطے عراقی اور غزالی نے ایک روایت نقل کی ہے جس کی تخریج عراقی نے ابو نعیم اصبہانی سے کی ہے لا تفکروا فی اللہ فانکم لن تقدروا قدرہ یعنی خدا کی ذات میں تفکر نہ کرو تم اس کا احاطہ نہیں کر سکو گے تو جس ذات میں تصور بالکنہ محال ہے اس کی طلب بلا واسطہ کیونکر ہو سکتی ہے پس رضا کی طلب یہی طلب خدا ہے اور اسی کی طلب کا امر بھی ہے اگر یہ کہو کہ جنت کی طلب کا بھی تو امر ہے اور وہ یقیناً غیر خدا ہے تو طلب غیر خدا جائز ہوئی تو پھر کیفیات کی طلب میں کیا حرج ہے اگر وہ طلب رضا کے برابر نہیں تو طلب جنت ہی کے مثل سہی اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو جنت کی طلب کا امر درجۂ مقصودیت میں نہیں بلکہ اس کا امر بھی طلب رضا ہی کے لئے ہے کہ جنت چونکہ محل رضا ہے اور رضا مقصود ہے اس لئے محل کو بھی طلب کرنا چاہئے پس محل رضا کی طلب حقیقت میں رضا ہی کی طلب ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے اللھم انی اسئلک رضاک والجنۃ واعوذبک من سخطک والنار اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول رضا کو طلب کیا پھر جنت کو کیونکہ وہ محل رضا ہے اور

اول غضب الٰہی سے پناہ مانگی ہے پھر جہنم سے کیونکہ وہ محل غضب ہے اس حدیث نے مطلع صاف کردیا کہ اصل مقصود رضا ہے اور جنت مقصود بالذات نہیں بلکہ محل رضا ہونے کی وجہ سے مطلوب ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا　　با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے محبوب تیرے بغیر جنت بھی مجھ کو دوزخ ہے اور اگر تو ساتھ رہے تو دوزخ بھی مجھے جنت ہے)

غرض جنت مقصود بالذات تو نہیں سمجھا جاتا بخلاف کیفیات کے کہ اکثر ذاکرین ان کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں چنانچہ جی نہ لگنے کے وقت عمل کو چھوڑ دینا یا ذکر میں کمی کرنا اس کی علامت ہے اس پر مجھے انکار ہے باقی میں کیفیات کو بیکار تو نہیں کہتا ان سے عمل میں سہولت ضرور ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ نہ ہوں تو عمل کیوں چھوڑا جائے سہولت سے نہیں صعوبت ہی سے کرلے۔ سو ایک فرق تو طلب جنت و طلب کیفیت میں یہ ہوا۔ دوسرے خود جنت و کیفیات میں ایک فرق ہے اس لئے ان کو متماثل نہیں کہہ سکتے وہ یہ کہ جنت لوازم رضا سے ہے اسی لئے موعود ہے اور کیفیات لوازم رضا سے نہیں اس لئے موعود بھی نہیں تو اس کی مقصودیت سے بھی گھٹی ہوئی ہے اسی لئے اکابر نے فرمایا ہے کہ کیفیات محمود ہیں مقصود نہیں البتہ محمود یا معین مقصود ہونے کے سبب اگر اس کے لئے دعا کی جاوے تو اس کی طلب یعنی دعا کا حرج نہیں تو اعانت طاعت میں اس کا درجہ صرف اس قدر ہے کہ اس سے مقصود یعنی عمل میں قدرے سہولت ہو جاتی ہے جیسے چٹنی سے کھانا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ دسترخوان پر چٹنی نہ ہو تو ضروری کھانا ہی چھوڑ دیا جائے کیونکہ اصل مقصود تو غذا ہے چٹنی اس کے ہضم کے لئے معین ہے۔ اس کو غذا کا موقوف علیہ نہیں بنایا جاتا بلکہ گاہے گاہے اگر دسترخوان پر چٹنی نہ آئے تو اچھا ہے تاکہ معدہ اس کا عادی ہو کر کمزور نہ ہو جائے اسی طرح گاہے گاہے کیفیات کا نہ ہونا بھی اچھا ہے تاکہ نفس ان کا عادی نہ ہو جائے۔ پھر ان کے بغیر کام ہی نہ کرے گا حالانکہ طالب کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ کیفیات کا

نہ ہوتا تو کیا اگر غیب سے یہ بھی آواز آجائے کہ تیرا عمل کچھ قبول نہیں تو مردود ہے اور یقین ہو جاوے کہ یہ ندا غیبی ہے جب بھی اپنے کام میں لگا رہے اور ہرگز عمل کو ترک نہ کرے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ مجاہدات بہت کرتا تھا راتوں کو تہجد پڑھتا تھا مگر اس کو کیفیات تو کیا ہوتیں ایک دن غیب سے اس کو ایسا فضیحت کیا گیا کہ رات کو جب وہ تہجد کے لئے اٹھا تو ہاتف نے آواز دی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں اور یہ آواز اس زور سے آئی کہ اس کے ایک مرید نے بھی سُن لی مگر وہ اللہ کا بندہ اس پر بھی اپنا کام پورا کرکے ہٹا اگلی رات ہوئی تو پھر لوٹا بدھنا لیکر تہجد کو اٹھے مرید نے کہا اجی غیرت بھی کوئی چیز ہے جب وہ کچھ بھی قبول نہیں کرتے تو پھر کاہے کے لئے مصیبت جھیلتے ہو پڑکے سو بھی رہو مرید کی اصلی رائے یہ نہ تھی کہ شیخ کام چھوڑ دے لیکن اپنے محسن کی حالت پر اس کا جی کڑھا اس لئے یہ بات منہ سے نکل گئی اس کو اپنے شیخ کی حالت پر رنج تھا اب شیخ کا جواب سنئے واقعی طالب ایسے ہوتے ہیں نہ کہ آجکل جیسے کہ ایک دن نماز میں جی نہ لگا تو نہ تہجد ہے نہ ذکر ہے اس نے کہا بیٹا یہ تو معلوم ہے کہ وہ کچھ قبول نہیں کرتے مگر ان کے سوا میرے لئے کوئی دوسرا دروازہ بھی تو نہیں کہ ان کو چھوڑ کر دہاں چلا جاؤں میرے لئے تو بس یہی ایک در ہے اسی پر جان دیدوں گا چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں ؎

توانی ازاں دل بپرداختن کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

(اللہ تعالیٰ کے دروازہ سے بھاگ کر میں کہاں جاؤں بغیر اس دروازہ کے ہمارا کہاں اور ٹھکانا ہے)

بس اس پر رحمت الٰہی کو جوش آگیا اور دوبارہ ندا آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہے دگر نیستت

(سب قبول ہے اگرچہ ہنر نہیں ہے کہ ہمارے سوا تیرا اور کوئی ٹھکانہ بھی تو نہیں ہے اب بھی ایک چرکہ لگا دیا کہ ہنر تو کچھ نہیں مگر اس کے لئے قبول کرلیا کہ ہمارے سوا تیرے

لئے پناہ کوئی نہیں۔ مگر اس چرکہ کا مزا عشاق کے دل سے پوچھو ان کو اس پر وجد آتا ہے اور یوں کہتے ہیں ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی　　جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(آپ نے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے بہت اچھا کہا یہ تلخ جواب محبوب کے شیریں لبوں سے بہت ہی زیب دیتا ہے)

ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ جب ذکر کے لئے بیٹھتے تو یہ آواز آتی کہ تو کچھ ہی کر مگر کافر ہو کر مرے گا۔ بڑے پریشان ہوئے شیخ بڑی نعمت ہے ان کے شیخ زندہ تھے جا کر حال عرض کیا شیخ نے فرمایا کہ اس آواز پر کچھ خیال نہ کرو یہ دشنام محبت ہے ان کی عادت ہے کہ عاشقوں کو یونہی پریشان کیا کرتے ہیں تم کام کئے جاؤ مگر وہ دشنام غلط نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مزاح کے متعلق فرماتے ہیں انی لا مازح ولکن لا اقول الا حقا۔ کہ میں مزاح کرتا ہوں مگر مزاح میں بھی سچی ہی بات کہتا ہوں تو پھر حق تعالیٰ کی دشنام تو غلط کیونکر ہو سکتی ہے بات یہ ہے کہ یہاں کافر سے معنی مشہور کا فر باللہ مراد نہ تھے اور ان بزرگ نے معنی مشہور سمجھ کر ہی پریشانی ظاہر کی بلکہ یہاں کافر سے کافر بالطاغوت مراد تھا چنانچہ یہ اطلاق قرآن شریف میں بھی وارد ہے۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ اور یہ معنی اچھے ہیں مگر گول مول لفظ تھا اس لئے وہ بیچارے پریشان ہو گئے اور ایسی باتیں اس لئے فرما دیا کرتے ہیں کہ اس سے طالب کا امتحان ہوتا ہے کہ دیکھیں اب بھی کام میں لگا رہتا ہے یا چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے مگر یہ امتحان اپنے دیکھنے کے لئے نہیں ان کو تو سب کچھ معلوم ہے بلکہ دکھلاتے ہیں کن کو ان کو جنھوں نے انسان کے متعلق کہا تھا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ کہ آپ زمین میں ایسے لوگوں کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد اور خونریزی کریں گے۔ ان کو دکھلاتے ہیں کہ دیکھ لو یہ مفسد کس شان کے ہیں یہ ہمارے کیسے طالب ہیں اور اسی لئے تبدیل ملائکہ کا وقت نماز کا وقت رکھا گیا حدیث میں آتا ہے کہ ملائکہ کی تبدیلی صبح اور عصر کی نماز کے وقت ہوتی ہے۔

تاکہ ہر دن جاکر عرض کریں ربنا اتیناھم وھم یصلون و فارقناھم وھم یصلون یعنی اے پروردگار ہم نے جا کر بھی تیرے بندوں کو نماز میں مشغول پایا اور آتے ہوئے بھی نماز میں چھوڑا وہ بیچارے گواہی دیتے دیتے تھک بھی گئے ہوں گے مگر پیچھا نہیں چھوڑا گیا۔ روزانہ ان سے سوال ہوتا ہے کہ ہمارے بندوں کو کس حال میں چھوڑا پھر عید بقرعید اور عرفات کے موقعہ پر حق تعالیٰ مسلمانوں کے اجتماع عبادت پر فرشتوں کے سامنے مباہات فرماتے ہیں کہ دیکھو میرے بندے جوق جوق کیسے چلے آتے ہیں اور جب مجالس وعظ میں جمع ہوتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ مجھے کیسا پکار رہے ہیں یہ کیا چاہتے ہیں فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ کی رضا و مغفرت اور جنت کو طلب کرتے ہیں اور آپ کے غصہ و غضب اور جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں گواہ رہو میں نے ان سب کو بخشا اور جو یہ مانگتے ہیں میں نے عطا کیا۔ اللہ اللہ ہماری ذراسی بات کی وہاں کیسی قدر ہوتی ہے اور فرشتوں کے سامنے کس طرح اس کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ ہر دن ان کو اپنے اس قول کا جواب ملتا رہے اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا الغرض کبھی کیفیات میں اس لئے کمی کر دی جاتی ہے تاکہ طالب کا امتحان ہو اور اس امتحان سے اس کے اندر پستی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس کو مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ میرے اختیار میں کوئی چیز نہیں سب کچھ حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور پستی وہ چیز ہے جس سے معیت الٰہی بہت جلد حاصل ہوتی ہے۔

حدیث قدسی میں ارشاد ہے[۱] انا عند المنکسرۃ قلوبھم میں ان لوگوں کے پاس ہوں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کیفیات کا ہونا نعمت ہے اسی طرح کسی وقت ان کا بند ہو جانا بھی رحمت ہے کیونکہ سلب کیفیات سے شکستگی قلب حاصل ہوتی ہے اور یہ شکستگی ترقی کا سبب ہے پس سالک کو کیفیات کے ہونے یا نہ ہونے کی پرواہ نہ کرنا چاہیے جو شخص کیفیات ہی کے مزے میں پڑ جاتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص سفر کر رہا ہو اور کسی خاص منزل پر پہونچنا

[۱] فی شرح الاحیاء وروی ابو نعیم بسندہ فی الحلیۃ عن مالک بن دینار ۱۲ قال قال موسیٰ علیہ السلام یا رب این ابغیک قال عند المنکسرۃ

چاہتا ہو راستہ میں گرمی دوپہر کے وقت اسے ایک دریا ملا یہ اس میں گھسا تو وہاں ٹھنڈک پہونچی اب یہ اس میں سے نکلنا نہیں چاہتا ٹھنڈک کی وجہ سے اسی میں رہنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں راستہ طے نہیں ہوسکتا اور نہ یہ شخص منزل پر پہونچ سکتا ہے اس کے ساتھ ایک رفیق بھی تھا وہ دریا سے پار ہوگیا اور اس کو پکار رہا ہے کہ جلدی آ یہ کہتا ہے کہ میں تو دریا ہی میں رہوں گا اس نے آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر نکال دیا اب خشکی میں آکر اسے پھر پیاس اور گرمی معلوم ہوئی تو دریا کو یاد کرکے روتا ہے کہ ہائے میں وہاں سے کیوں نکال دیا گیا رفیق کہتا ہے کہ کمبخت تو دریا میں سے نکلکر مقصود کے قریب ہوگیا اگر وہیں رہتا تو منزل پر کبھی نہ پہونچتا۔ اسی طرح سالک کے لئے گاہے گاہے کیفیات کا پیش آنا اس لئے ہے تاکہ کسی قدر کلفت سفر کم ہوجائے اور شدت کے بعد راحت مل جائے تاکہ آئندہ کے لئے ہمت تازہ ہوجائے لیکن اگر وہ اسی راحت میں رہنا چاہے تو یقیناً راستہ ہی میں رہ جائے گا اور مقصود تک نہ پہونچیگا تو تم کو کیفیات دیکر پھر سلب اس واسطے کریں تاکہ تم کو آگے بڑھا دیں نہ اس لئے کہ نیچے گرادیں مگر تم رو رہے ہو کہ ہائے میری کیفیات کیا ہوئیں میں تو انھیں میں رہتا اس شخص کا وہ حال ہے جیسے کسی نے گدھے کو دیا تھا نمک، اس نے کہا میری آنکھیں ہی پھوڑ دیں حق تعالےٰ تو تم کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں مگر تم کیفیات میں پڑکر راستہ ہی میں رہنا چاہتے ہو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کہ مجتہد فن اور مجدد وقت تھے فرمایا کرتے تھے کہ یہ انوار وکیفیات حجاب نورانی ہیں اور حجاب نورانی حجاب ظلمانی سے اشد ہے سالک کو یہ سب حجابات پس پشت ڈالنا چاہئیں ان کی طرف ہرگز التفات نہ کرے کیونکہ جس شخص کو بادشاہ سے ملنا ہے وہ نہ بھنگیوں کے مکان پر ٹھہرتا ہے نہ عطاروں کی دکان پر ٹھہرتا ہے بلکہ سیدھا تخت شاہی پر پہونچنا چاہتا ہے تو حجاب ظلمانی تو بھنگیوں کے مکانات ہیں اور حجاب نورانی عطاروں کی دکانات ہیں سالک کو کسی پر توقف نہ کرنا چاہیئے اس کو آگے چلتا رہنا چاہیئے مقصود وراء الوراء ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست　　　انچہ بروے میرسی بروے مایست

(اے بھائی اللہ تعالیٰ کا راستہ غیر متناہی ہے پس اس راستے میں جس مقام پر پہنچ جاؤ

اس پر ٹھہرنا مت آگے بڑھ جانا تاکہ ترقی جاری رہے)

اس بلا میں ہر زمانہ میں لوگ بتلا ہوتے ہیں کہ کیفیات کو مقصود سمجھ کر عمل کو ان کے تابع کرتے تھے کہ ذرا کیفیات میں کمی آئی عمل کو ترک کر دیا مثنوی میں بھی مولانا نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ ذاکر شاغل تھا مگر اُسے کچھ کیفیات وغیرہ حاصل نہ تھیں شیطان نے اسے بہکایا کہ اندھیری کوٹھری میں ٹکریں مارتا ہے ادھر سے نہ کچھ پیام نہ سلام نہ کیفیات نہ واردات یہ عقلمند تہجد اور ذکر وغیرہ سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گیا کہ واقعی اتنے دن کام کرتے کرتے ہو گئے ادھر سے کچھ جواب ہی نہیں رسید ہی نہیں ملتی یہ شخص مراد کا مقام رکھتا تھا اس لئے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو تنبیہہ کی گئی۔ مرید اور مراد میں فرق یہ ہے کہ مرید ابھی تک عاشق ہی ہے محبوب نہیں بنا اور مراد عاشق بھی ہے محبوب بھی۔ مرید اعراض کرے تو یہ کہکر دھکے دیدیئے جاتے ہیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برد　　　دار و گیر حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

(جو شخص آنا چاہے تو کہدو آجائے اور جو جانا چاہے تو کہدو وہ چلا جائے)

اور مراد اعراض کرے تو اس کو پکڑ کر بلواتے ہیں کیونکہ وہ محبوب بھی ہے جیسے خوبصورت مرغ وحشی کہ وہ بھاگتا ہے مگر دانہ دکھلا کر اس کو جذب کرتے ہیں ایسے ہی محبوب کا قول ہے ؎

مرغ باغ ملکوتیم دریں دیر خراب　　　میشود نور تجلائے خدا دانۂ ما

(میں عالم ملکوت کی چڑیا ہوں اس دنیا میں ہمارا دانہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے انوار ہیں)

تو جب یہ شخص سب کام چھوڑ کر سو رہا تو حق تعالیٰ کی طرف سے حضرت خضر علیہ السلام کو یا کسی فرشتہ کو حکم ہوا کہ اس احمق کو سمجھاؤ کہ وہ نماز و ذکر وغیرہ کو چھوڑ کر کیوں بیٹھ رہا وہ خواب میں آئے اور پوچھا کہ بھائی تو آج کیوں سو رہا اس نے وہی شکایت کی کہ اتنے دن کام کرتے کرتے ہو گئے وہاں سے کوئی رسید ہی نہیں ملتی نہ سوال ہے نہ جواب اس لئے میں نے سب چھوڑ دیا جواب ارشاد ہوا ؎

گفت آں اللہِ تو لبیک ماست　　دیں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(فرمایا کہ اے بندہ تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک ہے اگر تیرا پہلا اللہ قبول نہ ہوتا تو دوسری بار توفیق دوسرے اللہ کی نہ ہوتی یہ نیازمندی اور سوز و گداز کی توفیق ہماری طرف سے قاصد ہیں)

یہ تیرا اللہ اللہ کرنا ہی ہمارا جواب ہے۔ اگر ہم کو تیرا ذکر پسند نہ ہوتا تو ہم تیری زبان سے اپنا نام نکلنے نہ دیتے بلکہ زبان پکڑ لیتے جس سے ایک دفعہ بھی اللہ نہ نکل سکتا بس ایک بار اللہ کہکر جب دوبارہ اس کا نام کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلا قبول ہو گیا اور یہی دوسرا ہماری طرف سے جواب ہے علیٰ ہذا تمہارے دل میں جو سوز و درد ہے یہ ہماری طرف سے قاصد ہے اگر ہم کو تعلق نہ ہوتا تو اپنا قاصد تیرے پاس نہ بھیجتے کیونکہ ہمارا قاصد ہر شخص کے پاس نہیں جایا کرتا بلکہ جہاں ہم بھیجنا چاہتے وہیں جاتا ہے اور یہ کیا ضرور ہے کہ قاصد عربی ہی بولتا آوے یہ سوز و درد بھی قاصد ہے یہ وہ سکینہ ہے جس کے متعلق ارشاد ہے هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ اور ذکر کے وقت یہ سکینہ ضرور نازل ہوتا ہے یقیناً ذکر سے پہلے قلب کی جو حالت تھی ذکر کے بعد وہ حالت نہ ہوگی بلکہ کچھ اور حالت ہوگی یہ اسی سکینہ کا اثر ہے جس سے ذکر کے بعد دل میں کبھی ایک ٹھنڈک سی معلوم ہوتی ہے کبھی درد و سوزش محسوس ہوتی ہے یہ سب خدائی قاصد ہیں ان کو بیکار نہ سمجھو اسی کو فرماتے ہیں ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　دیں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(فرمایا کہ اے بندہ تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک ہے اگر تیرا پہلا اللہ قبول نہ ہوتا تو دوسری بار توفیق دوسرے اللہ کی نہ ہوتی یہ نیازمندی اور سوز و گداز کی توفیق ہماری طرف سے قاصد ہیں۔)

اس مضمون کو ہمارے حضرت حاجی صاحب نے ایک بار اس طرح بیان فرمایا کہ اگر ایک آدمی تمہارے گھر پر روزانہ آتا ہو اور تم کو اس کے روک دینے کی قدرت ہو تو اگر تم کو اُس کا آنا ناگوار ہوگا۔ تو تم اس کو صاف صاف روک دو گے کہ آپ یہاں

نہ آیا کریں مجھے تکلیف ہوتی ہے اور اگر باوجود قدرت کے تم اس کو نہ روکو تو یہ اس کی علامت ہے کہ اس کا آنا تم کو ناگوار نہیں بلکہ تم اس کا آنا چاہتے ہو اسی طرح اگر حق تعالیٰ کو تمہارے مسجد میں آنا اور نماز پڑھنا پسند نہ ہوتا تو وہ تم کو خود روک دیتے مگر جب پانچ وقت مسجد میں آنے کی اور نماز میں اپنے سے بات چیت کرنے کی تم کو توفیق دے رکھی ہے تو سمجھ لو کہ تمہارا آنا ان کو ناگوار نہیں ہے اور تمہاری عبادات خدا کے یہاں مقبول ہیں۔ رہا یہ کہ حق تعالے اگر روکنا چاہیں تو کس طرح روکیں گے کیا وہاں سے کوئی سپاہی آئے گا ہاں وہ اس طرح روک دیں گے کہ تم کو نماز کی توفیق ہی نہ ہوگی وہ سپاہی یہی ہے جیسے ایک آقا اور غلام کا قصہ ہے کہ غلام آقا کے ساتھ بازار میں گیا راستہ میں نماز کا وقت آگیا غلام نمازی تھا وہ آقا سے اجازت لے کر مسجد میں نماز کے لئے گیا اور آقا صاحب مسجد کے باہر بیٹھ گئے اب تمام نمازی نماز پڑھ پڑھ کر مسجد سے جارہے ہیں مگر غلام باہر ہی نہیں آتا اس نے اطمینان سے فرض پڑھے پھر نفلیں شروع کر دیں پھر وظیفہ میں لگ گیا جب بہت دیر ہوگئی تو آقا نے آواز دی کہ میاں اتنی دیر کہاں لگا دی باہر کیوں نہیں آتے غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتے کہا کون نہیں آنے دیتے کہا جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھکو باہر نہیں آنے دیتا۔ واقعی جب ان کو کسی کا مسجد میں آنا ناگوار ہوتا ہے تو اس کو مسجد میں قدم رکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ بہت لوگ برسوں مسجد کے دروازے پر کباب بنا کر بیچتے ہیں مگر ایک دن بھی مسجد کے اندر جانے کی توفیق نہیں ہوتی یہ ہے ان کا روکنا وہ اس طرح روکا کرتے ہیں پس جن کو پانچوں وقت نماز کی توفیق ہو رہی ہے وہ امید رکھیں کہ ان شاء اللہ تعالے ان کی عبادات مقبول ہو رہی ہیں گو ہماری عبادات اس قابل تو نہیں ہیں مگر محض رحمت سے قبول ہو جاتی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

این قبول ذکر تو از رحمت است ‏ ‏ ‏ ‏ چوں نماز مستحاضہ رخصت است

(تمہارے ذکر کا قبول ہونا محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے جس طرح استحاضہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور شریعت کے احکام نے اس کو پاک قرار دیا ہے)

کیا غضب کی مثال ہے کہ جس طرح مستحاضہ عورت حقیقت میں ناپاک ہے مگر شریعت اسی حالت میں اس کو نماز کی اجازت دیتی ہے اور احکام میں اس کو پاک شمار کرلیتی ہے۔ اسی طرح ہماری عبادات گو حقیقت میں ناقص ہیں مگر حق تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو قابل بنا کر قبول فرمالیتے ہیں اگر قبول نہ فرماتے تو اس کی توفیق ہی نہ دیتے ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پاس ایک ذاکر شخص آئے اور آکر عرض کیا کہ حضرت میں نے طائف میں چلہ کیا تھا۔ روزانہ سوا لاکھ مرتبہ ذکر کرتا تھا مگر نفع نہیں ہوا شاید حضرت مجھ سے کچھ ناراض تھے جو نفع نہ ہوا۔ حضرت کو جوش آیا اور فرمایا کہ میاں اگر ہم ناراض ہوتے تو سوا لاکھ مرتبہ ذکر کی توفیق ہی نہ ہوتی اور تم جو نفع کی شکایت کرتے ہو تو کیا یہ نفع نہیں ہے کہ زبان سے سوا لاکھ دفعہ اللہ اللہ نکلتا تھا۔

صاحبو! جب اہل اللہ کے خذلان سے توفیق سلب ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ کے خذلان کے بعد تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ حضرت نے سچ فرمایا کہ اگر حق تعالیٰ نہ چاہیں تو ایک مرتبہ بھی زبان سے اللہ نہیں نکل سکتا۔ مولانا رومی ایک مقام پر دعا کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو — ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

(دعا کی توفیق بھی اے خدا آپ ہی کی طرف سے ہے اور قبولیت بھی آپ ہی کی طرف سے ہے امن اور سکون کا احساس بھی آپ کی طرف سے ہے اور خوف و ہیبت بھی آپ کی طرف سے ہے)

واقعی دعا کی توفیق بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اگر وہ توفیق نہ دیں تو ہماری زبان سے دعا بھی نہیں نکل سکتی یہ ساری گفتگو اس ذاکر کے قصہ پر چل پڑی تھی کہ اس کو شیطان نے بہکایا تھا کہ جب نہ کیفیات ہیں نہ واردات ہیں نہ خطاب ہے نہ جواب ہے تو اندھیری کوٹھری میں ٹکریں مارنے سے کیا فائدہ اور اس لئے اس وسوسہ کی وجہ سے تہجد و ذکر چھوڑ دیا تھا یہ قصہ اس پر نقل کیا تھا کہ کیفیات کو مقصود سمجھنے کی غلطی میں ہر زمانہ میں لوگ مبتلا ہوئے ہیں ایک مفسدہ کیفیات کے مقصود سمجھنے میں پہلے کا عکس ہے یعنی بعض

لوگ کیفیات کے حصول کے بعد عمل کو چھوڑ دیتے ہیں جب تک کیفیت حاصل رہے اس وقت تک عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے یہ مطلب نہیں کہ فرائض کو بھی چھوڑ دیتے ہیں یہ تو ملحدین کرتے ہیں اُن سے اس وقت بحث نہیں جو لوگ اہل حق ہیں وہ فرائض تو ترک نہیں کرتے مگر حصول کیفیات کے بعد ذکر و نوافل و تلاوت قرآن وغیرہ کو چھوڑ بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں مقصود تو حاصل ہی ہے پھر اتنی مشقت کی کیا ضرورت ہے کہ چھ ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کریں یا تہجد کے لئے اٹھیں اب تو ملکۂ یادداشت حاصل ہوگیا ہے اب تو ہمارا سوتا بھی ذکر ہے سو جب تک کیفیت رہے اس وقت تک عمل ہی نہیں کرتے اور جب کیفیت نہ رہی اب پھر ذکر و شغل اور تہجد وغیرہ شروع کر دیتے ہیں غرض ان لوگوں کے دل میں عجیب عجیب موجیں اٹھتی ہیں کوئی تو کیفیت کے نہ ہونے سے عمل میں کمی کرتا ہے اور کوئی اس کے ہونے سے عمل میں کوتاہی کرتا ہے اور نہ ہو تو پھر کوشش کرتا ہے یہ شخص بھی کیفیت ہی کو مقصود سمجھتا ہے چونکہ وہ عمل ہی سے پیدا ہوئی تھی اس لئے سلب کیفیت یا قلت کیفیت کے وقت عمل کا اہتمام کرتا ہے یہ بھی غلطی پر ہے بس راستہ پر وہ شخص ہے جو عمل ہی کو مقصود سمجھتا ہے اور کیفیت ہو یا نہ ہو ہر حال میں عمل پر دوام رکھتا ہے یہ مسئلہ میں نے اس لئے بھی ظاہر کیا ہے تاکہ مزدوری پیشہ اور کھیتی کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم بھلا کیا ذکر کریں ہمیں یہ حالات کیا پیش آئیں گے سو خوب سمجھ لو کہ واللہ مقصود تم کو بھی حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ مقصود سب طرق سے خلوص ہے جو بدون ان کیفیات و حالات کے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مقصود ان گردن جھکانے والے صوفیوں کو یکسوئی کے سبب سہولت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے اور تم کو ذرا دقت سے اور دیر میں حاصل ہوگا اور سہولت کا وعدہ کیسے کرلوں اتنا تو میں نے تم سے اناج بھی وصول نہیں کیا جو تمہاری خاطر صحیح بات کو غلط کر دوں اور یہ کہہ دوں کہ تم کو بھی اسی سہولت سے مقصود حاصل ہو جائے گا جس صورت سے خانقاہ میں پڑ مرنے والوں کو حاصل ہوتا ہے نہ بھائی ان کی برابر تو سہولت نہ ہوگی مگر ایسی دقت بھی نہ ہوگی جس کو تم برداشت نہ کر سکو

بس اتنا ہی فرق ہوگا کہ اگر ان کو سال بھر میں مقصود حاصل ہو جاتا ہے تو تم کو دو سال تین سال میں حاصل ہوگا اور ان کو دو سال میں ہوگا تو تم کو چار سال میں ہوگا۔ اور یہ بات ہے کہ ہر شخص اپنے بچھڑے کے دانت خوب جانتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب جانتے ہیں انھوں نے ہر شخص کے مناسب اس کے اندر استعداد رکھی ہے چنانچہ اسی بناء پر خدا تعالےٰ نے تم کو ظاہری رزق بھی مشقت سے دیا ہے کہ جو بل جوتتے ہو کھیت میں پانی دیتے ہو زمین کو درست کرتے ہو گرمی اور بارش کی تکلیف اٹھاتے ہو تب روٹی ملتی ہے۔ اسی طرح باطنی رزق بھی تم کو مشقت سے ملے گا یہاں بھی تم کو خانقاہ والوں سے زیادہ محنت کرنی پڑے گی جب مقصود حاصل ہوگا تمہارے لئے اسی میں مصلحت ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں ایک حدیث قدسی نقل کی ہے جس کی تخریج مجھ کو یاد نہیں رہی اور وہ تو اگر تخریج بھی نہ کرتے تب بھی وہ بیہقی وقت ہیں حدیث پر ان کی بہت نظر ہے بدون ثبوت کے حدیث نہیں لکھتے اس لئے ہمیں ان کی محض نقل پر بھی اعتماد ہوتا ہے حدیث کا مضمون یہ ہے کہ میرے بعضے بندے بیماری میں مومن رہتے ہیں اگر میں ان کو تندرست کردوں لبغوا فی الارض تو وہ زمین میں فساد برپا کردیں میرے بعضے بندے تکلیف و مشقت میں مومن رہتے ہیں اگر میں ان کو راحت دیدوں تو وہ کافر ہو جائیں میرے بعضے بندے راحت ہی میں مومن رہتے ہیں اگر میں تکلیف میں رکھوں تو کافر ہو جائیں تو گانوں والوں کے لئے خدا تعالےٰ نے مشقت ہی کی استعداد رکھی ہے کہ ان کو رزق ظاہر و رزق باطن دونوں مشقت سے ملتے ہیں باقی یہ سب استعدادیں انھیں کی پیدا کی ہوئی ہیں کسی کو ان کی لم دریافت کرنے کا حق نہیں کہ فلاں میں یہ استعداد کیوں رکھی فلاں میں کیوں نہیں رکھی ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں — بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

(یہ کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور گل نے کیا سنا اور صبا نے کیا کام کیا)

اس میں حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں کہ ہر شخص میں مختلف استعداد رکھی ہے یہ مسئلہ قدر کے

متعلق ہے اور عارفین نے فرمایا ہے کہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت جنت میں بھی منکشف نہ ہوگی ایک مسئلہ قدر دوسرے کنہ ذات اور اصل میں مسئلہ قدر بھی ذات ہی کی طرف راجع ہے تو جب کنہ ذات کا انکشاف آخرت میں نہ ہوگا تو مسئلہ قدر کا انکشاف بھی وہاں نہ ہوگا۔ اور یہ مسئلہ عدم ادراک کنہ ذات حدیث میں بھی مذکور ہے مگر ملاحسن کی اصطلاحات میں مذکور نہیں اسی لئے طلبہ کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی کیونکہ یہ تو ہر بات کو اصطلاحات معقول میں سمجھنا چاہتے ہیں مگر حدیث کی اصطلاحات ملاحسن کی اصطلاحات سے جدا ہیں سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تجلی جنت کے باب میں فرماتے ہیں لا یبقے علے وجهه الا رداء الکبریاء اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ بجز کنہ ذات مخفی ہونے کے وہاں اور کوئی حجاب نہ رہے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنہ ذات کو کبریا سے تعبیر فرمایا ہے کیونکہ کبریا و عظمت اس کے لئے لازم ذات ہے اور کنہ ذات کا مخفی رہنا یہ اعلیٰ درجہ کی عظمت ہے تو یہ لازم اس سے منفک نہ ہوگا اس لئے وہاں دیدار تو ہوگا اور حق تعالےٰ بے پردہ اس طرح ظاہر ہوں گے جیسے چاند کھلا ہوا ہو مگر ایک پردہ جلال و کبریا کا باقی رہ جائے گا جس کی وجہ سے ہم احاطہ حسن الٰہی کا نہ کرسکیں گے کیونکہ وہ غیر محدود ہے اور ہم محدود ہیں اور محدود غیر محدود کا احاطہ نہیں کرسکتا اس لئے یہ حجاب باقی رہے گا یہ راز تو تحقیقی ہے اور ایک راز عاشقانہ ہے وہ یہ کہ اگر کوئی حجاب باقی نہ رہتا اور خدا کا حسن بھی محبوبان دنیا کے حسن کی طرح محدود ہوتا تو چند روز میں جی بھر جاتا جیسا کہ محبوبان دنیا سے جی بھر جاتا ہے کیونکہ ان کا حسن محدود ہوتا ہے اور ہمارا تمتع بھی محدود ہوتا ہے۔ اگر خدا کا حسن بھی ایسا ہی ہوتا اور غیر محدود نہ ہوتا تو کچھ مدت کے بعد لوگ جنت سے گھبرا کر وہاں سے نکلنے کی تمنا کرتے جیسے ایک اندھے حافظ جی کا قصہ ہے کہ ان کو حوروں کی بہت تمنا تھی روز دعا کرتے تھے کہ اے اللہ حور کو بھیج دے۔ پڑوس میں چند فاحشہ عورتیں رہتی تھیں انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اندھا روز حور کی دعا کرتا ہے لاؤ آج اس سے مذاق کریں اور حوروں کا مزہ چکھائیں ہم میں سے ایک ایک اس کے پاس جا کے حافظ جی میں حور ہوں مجھے خدا نے بھیجا ہے۔ چنانچہ پہلے ایک آئی اور کہا حافظ جی میں حور ہوں مجھے خدا نے بھیجا ہے۔ آپ کی دعا قبول ہوگئی حافظ جی

بڑے خوش ہوئے اور اس سے منہ کالا کیا وہ نکلی تو دوسری پہنچی خیر حافظ جی اس سے بھی مشغول ہوئے۔ پھر تیسری پہنچی پھر بھی کچھ ہمت کی اب چوتھی پہونچی پھر پانچویں پہنچی تو حافظ جی حوروں کو گالی دے کر گھبرا کر کہتے ہیں کہ کیا ساری حوریں میرے ہی حصہ میں آ گئیں، جاؤ اب کسی اور کے پاس جاؤ مجھے حور نہیں چاہیئے میں حوروں سے باز آیا حافظ جی کی اس بات پر کہ مجھے حور نہیں چاہیئے ایک اور حکایت یاد آئی۔

ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ جنگل میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر روز دعا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ ایک مسخرے نے سُن لیا اس نے اس کی اصلاح کرنی چاہی ایک دن درخت کے اوپر ایک مضبوط رسی لے کر بیٹھ گیا جب اس شخص نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ تو اس نے رسی میں پھندا بنا کر لٹکا دیا اور آواز بنا کر کہا کہ میرے بندے یہ رسی گلے میں ڈال لے میں کھینچ لوں گا، یہ بڑا خوش ہوا کہ میری دعا قبول ہو گئی اس نے رسی کا پھندا گلے میں ڈال لیا اور مسخرے نے کھینچنا شروع کیا اب جو گلا گھٹا اور سانس رکا تو وہ کہتا ہے کہ اللہ مجھے چھوڑ میں نہیں کھنچتا پھر اس درخت کے پاس بھی نہیں پھٹکا۔ غرض اگر حق تعالٰے کے حسن کا نعوذ باللہ احاطہ ہو جاتا اور کوئی حجاب باقی نہ رہتا تو جنت وبال جان ہو جاتی مگر چونکہ ان کا حسن غیر محدود ہے اس لئے کبھی جی نہ بھرے گا بس وہ حال ہو گا

؎ یزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ نظرا

(جتنی دفعہ تو اس محبوب کو دیکھے گا اس کا حسن تجھ کو زیادہ ہی معلوم ہو گا)

جتنی دفعہ دیدار ہو گا نیا ہی حسن معلوم ہو گا تو جیسی کنہ ذات جنت میں مکشوف نہ ہو گی آج مسئلہ قدر بھی اور استعداد کا اختلاف مسئلہ قدر کی طرف راجع ہے جب اس کی حقیقت آخرت میں بھی منکشف نہ ہو گی تو دنیا میں کیا امید ہے ہاں بعضوں کو کچھ کچھ اسرار ذوقی طور پر بتلا دیئے گئے ہیں مگر وہ ان کو ظاہر نہیں کر سکتے اگر تقدیر کے اسرار ظاہر ہو جائیں تو بد نفس لوگ اپنے کو معذور قرار دے کر شورش برپا کر دیں اور تمام عالم درہم برہم ہو جائے۔ اسی مثال کو مولانا فرماتے ہیں ؎

سر پنہان است اندر زیر و بم فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(زیر وبم کے اندر اسرار پوشیدہ ہیں اگر فاش کردوں تو جہاں کو درہم برہم کردوں)
شاید اس پر کوئی کہتا ناتمام ہی کہدو صاف صاف نہ کہو تو جواب دیتے ہیں ؎

بالب دمساز خود گر جفتمے ہمچو نے من گفتنیہا گفتمے

(وہاں اہل اور مناسبت والا مل جاوے تو خود تقاضا ہوگا کہ اس سے راز دل کو کہا جائے)

یعنی ناتمام بھی ہر شخص سے نہیں کہہ سکتے بلکہ دمساز سے کہہ سکتے ہیں یعنی اہل سے کہ وہی ہمراز ہے نااہل سے تو ناتمام اسرار بھی بیان نہیں کر سکتے اور بعض دفعہ جو مخاطب کو اہل دیکھ کر بیان کا تقاضا بھی ہوا ہے تب بھی عذر فرمایا ہے چنانچہ ایک مقام پر فرمایا ہے ؎

لاتکلفنی فانی فی الفنا کلت افہامی فلا احصی ثنا

کل شیٔ قالہ غیر المفیق ان تکلف اوتصلف لایلیق

ہرچہ میگوید موافق چوں نبود چوں تکلف نیک نالائق نمود

(۱، ۲، ۳۔ میں مقام فنا میں ہوں حق تعالیٰ کے غیر محدود صفات کا میرا افہام احاطہ نہیں کر سکتے۔ ایک بے ہوش جو کچھ بھی کہے گا وہ نا مناسب رہے گا اگرچہ بات صحیح ہو لیکن تکلف سے بات بے مزہ ہوتی ہے انشراح قلب نہ ہونے سے خاموشی مناسب ہے)

غرض یہ خدا تعالیٰ کے اسرار ہیں کہ کسی میں کیسی استعداد رکھدی کسی میں کیسی اس لئے اس دال کا کسی کو حق نہیں کہ فلاں کو مقصود سہولت سے کیوں دیا اور ہم کو مشقت سے کیوں دیا وہ یہی چاہتے ہیں کہ ایک کو ہنسائیں ایک کو رلائیں کسی کا ہنستے کھیلتے گھر بس جاتا ہے کسی کو برسوں رونے سے بھی جلدی حاصل نہیں ہوتا ؎

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خندان ست بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان ست

(گل کے کان میں کیا کہدیا ہے کہ وہ ہنس رہا ہے (شگفتہ ہے) اور بلبل کے کان میں آپ نے کیا راز کہدیا کہ وہ ہر وقت نالاں ہے)

اور جب سر قدر کا احاطہ نہ ہو سکتا تھا اور حصول اس کی کنہ کا ممتنع تھا تو یہ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی رحمت ہے کہ آپ نے ہم کو سوال قدر سے منع ہی فرما دیا اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس میں بحث کرے گا قیامت کو اس سے پوچھا جاوے گا اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس عمل کا ثواب ہوگا کیونکہ اس میں سب اعمال متساوی ہیں اس کی تخصیص کیا بلکہ محققین کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جو شخص تقدیر میں گفتگو کرے گا اس سے قیامت میں یہ پوچھا جائے گا کہ بتلاؤ تقدیر کی حقیقت کیا تحقیق کی اور حقیقت میں معلوم ہوگی نہیں تو یہ شخص جواب سے عاجز ہو کر سزا میں گرفتار ہوگا اور جو اس میں گفتگو نہ کریگا وہ بے کھٹکے ناجی رہے گا نیز تقدیر کا مسئلہ گفتگو سے حل بھی نہیں ہو سکتا اس میں اطمینان و شرح صدر صرف نور باطن سے ہوتا ہے اور جن پر یہ راز خود بخود منکشف ہوگیا ہے کچھ نہ پوچھو ان پر کیا گذرتی ہے اس سے معرفت و معیت حق کا تو مزا ہوتا ہے کیونکہ اس سے معرفت بڑھتی ہے اور حق تعالیٰ کی معیت میں ترقی ہوتی ہے مگر ساتھ ہی یہ مزہ گی بھی ایک خاص قسم کی ہوتی ہے کہ دوسرا شخص اس کا تحمل بھی نہیں کر سکتا وہ یہ کہ ہر وقت دل پر ایک حیرت سی غالب رہتی ہے کبھی جبر کی طرف چلتا ہے کبھی اختیار کی طرف پھر گو محقق نہ جبر پر جمتا ہے نہ اختیار پر بلکہ بین بین رہتا ہے لیکن دل تو حیرت میں ہوتا ہے کبھی ادھر جاتا ہے کبھی اُدھر مولانا علماً اس معیت کو تو یوں فرماتے ہیں ؎

گر بعلم[1] آئیم ما ایوان اوست | ور بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب[2] آئیم مستان ویم | ور بہ بیداری بدستان ویم

(سلہ، سلہ اگر صفت علم کی تجلی ہوتی ہے تو ہم اس کے حضوری کے محل میں ہوتے ہیں اور جب وہ تجلی مستور ہو جاتی ہے تو ظلمت جہل کے سبب اگر نیند میں ہوتے ہیں تو غایت تعلق مع اللہ سے ہم انھیں کے مست ہوتے ہیں اور بیداری میں انھیں کے دستِ قدرت کے تحت رہتا ہوں)

اور کنیات متعارضہ میں معیت کی نسبت فرماتے ہیں ؎

در تردد ہر کہ او آشفتہ است | حق بگوش او معمہ گفتہ است

(جو شخص تردد سے پریشان ہے کہ یہ کروں یا وہ کروں تو اس کو مولانا فرماتے ہیں

کہ یہ حق تعالیٰ نے اس کے کان میں معمّہ کہدیا ہے کہ اس کو حل کرو)

اور علاً معیت کو یوں فرماتے ہیں ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(میرے دوست نے میری گردن میں ایک رسّی ڈال رکھی ہے اور جدھر اس کا دل چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے)

اور حیرت کی نسبت یوں فرماتے ہیں ؎

گہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں　　　　جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی اس طرح دکھاتا ہے کبھی اس کے خلاف دکھاتا ہے بس اس طرح مجھے محبت کے راستے میں محو حیرت رکھتے ہیں۔)

غرض تقدیر کے باب میں نہ گفتگو کرنا چاہیئے اور نہ اس کی لم دریافت کرنا چاہیئے کہ ہر شخص میں استعداد مختلف کیوں رکھی ہے یہ حق تعالیٰ کے اسرار ہیں خدا نے استعداد و مقادیر مختلف بنا کر اپنے بعض بندوں کو یہ دولت عطا کی ہے کہ جہاں انھوں نے نماز شروع کی اور خدا تعالیٰ کی طرف فوراً دل کا رخ ہو گیا حضور میں غرق ہو گئے پھر اس کے ساتھ روٹی بھی بے مشقت دی ہے ان کا مرغ اور گھی اور حلوے بھی بے تکلف دے رکھے ہیں اور یہ باطنی مٹھائی بھی بے تکلف دیدی اور تم کو دنیا کی نعمتیں بھی مشقت سے ملتی ہیں اور دین کی نعمت بھی مشقت سے ملے گی چنانچہ بعضوں کی حالت یہ ہے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اس ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ کل کو کہاں سے کھاؤں گا آج تو گھر میں آٹا بھی نہیں کل کو قرض خواہ تقاضا کرنے آئے گا اسے کہاں سے دوں گا آج تو جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں یہاں تک کہ انھیں خرافات میں نماز ختم ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی ایسے ہی لوگوں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ ؎

شب چو عقد نماز بربندم　　　　چہ خورد بامداد فرزندم

(رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں تو فوراً یہ خیال ستاتا ہے کہ کل میرے بچے کیا کھائیں گے)

کہ رات کو جب یہ لوگ نماز کی نیت باندھتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں کہ کل کو بچے کیسا کھادیں گے ایک اہل زبان نے اس شعر کی عجیب تفسیر کی ؎

"شب چو عقد نماز بربندم چناں درفکر عیال مستغرق باشم کہ بجائے تکبیر تحریمہ میگویم چہ خورد بامداد فرزندم"

واقعی اہلِ زبان اپنی زبان کو خوب سمجھتے ہیں ہمارا ذہن تو اس طرف نہ جاتا مگر وہ صاحب زبان تھا خوب سمجھا اس پر ایک حکایت یاد آئی۔

دہلی سے ایک ہندوستانی ایرانی گیا اور وہاں برسوں رہ کر فارسی سیکھی پھر ہندوستان واپس آکر دعوے کیا کہ مجھے اہل زبان کی برابر فارسی آتی ہے۔ ایک ایرانی کو سن کر جوش آیا کہ ہندوستانی آدمی اہل فارس کی برابری کا دعوے کرتا ہے جھوٹا ہے میں اس کا امتحان کروں گا' چنانچہ امتحان کے لئے آیا اور کہا کوئی شعر بالبدیہہ فارسی کا سناؤ اس نے اسی وقت ایک شعر لطیف پڑھا ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے نازنیں دیدم   بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے آتشیں دیدم

(سیاہ چوڑی اس معشوق کی کلائی میں ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے صندل کی کسی شاخ میں سانپ لپٹا ہوا ہو)

بظاہر شعر نہایت نفیس مگر ایرانی نے یہ سنتے ہی کہا تف تف یہ نازنیں دیدم آتشیں دیدم کیا بلا ہے بس اتنا کافی ہے ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے   بشاخِ صندلیں پیچیدہ مارے

(سیاہ چوڑی اس معشوق کے ہاتھ میں اس طرح معلوم ہوئی جیسے شاخ صندلیں پر سانپ لپٹا ہوا ہو)

ارے اس تشبیہ کا مدار تیرے دیکھنے پر تھوڑا ہی موقوف ہے جو تو نے دیدم دیدم دونوں جگہ بڑھایا ہے۔ واقعی اس اصلاح سے یہ شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور معلوم ہو گیا کہ غیر اہل زبان چاہے کتنا ہی ماہر ہو جائے اہل زبان کی برابر نہیں ہو سکتا دیوبند میں ایک ایرانی طالب علم گلستاں کے اس جملے پر وجد کرتا تھا۔

درعنفوان جوانی چنانچہ افتد دانی نظر داشتم بر روئے وگذر داشتم در کوئے اور کہتا تھا کہ یہ جملہ نہایت ہی بلیغ ہے اس میں فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے مگر ہم لوگوں نے بارہا اس کو پڑھا پڑھایا ہے ایک دن بھی وجد نہ ہوا تو اپنی زبان کو زبان داں ہی سمجھ سکتا ہے جیساکہ اس ایرانی نے اس شعر کا مطلب سمجھا ؎

شب چو عقد نماز بربندم چہ خورد بامداد فرزندم

(شب کو جب نماز کی نیت باندھی تو خیال آیا کہ کل بچے کیا کھائیں گے)

یعنی تکبیر تحریمہ کے بجائے منہ سے یہ نکلتا ہے "چہ خورد بامداد فرزندم" اور پریشانی کے وقت نماز میں منہ سے ایسی بات کا نکل جانا مستبعد نہیں ہوسکتا کہ یہ لفظ ہی زبان پر جاری ہو جاتے جیسے ہمارے ایک دوست حافظ اکبر کا قصہ ہے کہ وہ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے دو مقتدی اور تھے امام کو حدث ہوا تو اس نے ان کو سمجھدار واقف مسائل خیال کر کے خلیفہ بنادیا یہ مصلے پر جا پہنچے تو ان دو مقتدیوں میں سے ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ ارے یہ کیا ہوا' دوسرے نے کہا چپ رہ یوں بھی ہوا کرتا ہے دونوں مقتدیوں کی نماز تو فاسد ہوئی اب حافظ اکبر صاحب مصلے پر کھڑے کھڑے فرماتے ہیں کہ میں کس کو نماز پڑھاؤں ان کی بھی گئی یہ سب سے بڑھ کر عقلمند نکلے کہ میں کسے نماز پڑھاؤں' بندۂ خدا اپنے ہی کو پڑھائی ہوتی مگر اس وقت بے ساختہ ان کی زبان سے یہ جملہ نکل ہی گیا اسی طرح بے ساختگی میں مفلس پریشان کی زبان سے بجائے اللہ اکبر کے "چہ خورد بامداد فرزندم" نکل سکتا ہے۔ الغرض اس میں بھی حکمت الٰہی ہے کہ بعضوں کو خلوص بسہولت حاصل ہو جاتا ہے اور گاؤں والوں کو دقت سے حاصل ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ گاؤں والے خلوص کے مکلّف ہی نہ ہوں مکلّف ضرور ہیں اس پر بظاہر ایک اشکال بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر گاؤں والوں کو ایسی حالت میں تو خلوص حاصل نہیں ہوسکتا پھر ان کو اس کا مکلّف کرنا تکلیف مالایطاق ہے اور بہت لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ان کو یہ دولت حاصل نہیں ہوسکتی ہے اسی واسطے بعض لوگ ان کو

بہا ئم سمجھتے ہیں مگر یہ خیال غلط ہے گاؤں والوں کو مکلف بہ تحصیل خلوص ہونا تکلیف مالا یطاق کو ہرگز مستلزم نہیں کیونکہ خلوص کی تحصیل ان کی قدرت میں داخل ہے خارج از طاقت نہیں اگر وہ ارادہ اور کوشش کریں تو مقصود میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اس کے لئے ان کو اپنی کھیتی کے کام بھی چھوڑنا نہ پڑیں گے بلکہ اپنے کام میں مشغول ہو کر بھی مقصود حاصل کر سکتے ہیں چنانچہ کر کے دیکھ لیں ہوتا ہے یا نہیں اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ پھر طریق بیکار ہے کیونکہ جب گاؤں والوں کو بھی مقصود حاصل ہو سکتا ہے گو اپنے کام ہی میں لگے رہیں اور باقاعدہ سلوک طے نہ کریں تو پھر طریق سلوک سے کیا نفع ہوا جواب یہ ہے کہ نفس حصول خلوص تو طریق پر موقوف نہیں لیکن سہولت حصول خلوص ضرور طریق پر موقوف ہے جس شخص نے طریق کو حاصل نہیں کیا وہ بھی خلوص میں کامیاب ہو سکتا ہے مگر دقت اور دشواری سے اور جس نے طریق کو طے کر لیا ہے وہ نہایت سہولت سے اس میں کامیاب ہوتا ہے اور ان دونوں کی ایسی مثال ہے جیسے پکا حافظ اور کچا حافظ، تراویح میں قرآن دونوں سنا سکتے ہیں مگر دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے پکا حافظ تو اللہ اکبر کہتے ہی بے تکلف رواں پڑھتا چلا جائے گا اسے کہیں متشابہ نہ لگے گا اور کچا حافظ بیسیوں جگہ اٹکے گا اور متشابہ کی وجہ سے کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا پھر لوٹ کر اوپر سے پڑھے گا اور سوچ سوچ کر متشابہ کو نکالے گا اسی طرح جو لوگ طریق کو حاصل کئے ہوئے ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں انھوں نے نماز کی نیت کی اور فوراً ذکر میں غرق ہو گئے اُن کے خیالات ادھر اُدھر پریشان نہیں پھرتے کیوں انھوں نے مجاہدے کئے ہیں ریا وکبر وغیرہ کا علاج کیا ہے مشقتیں جھیلیں ہیں اب ان کے دل میں غیر خدا کا خیال بھی نہیں آتا اور اگر آیا بھی تو ذرا سی توجہ سے دفع ہو گیا اور جن لوگوں نے طریق طے نہیں کیا اور یہ مشقتیں نہیں جھیلیں نہ مجاہدات وریاضات کئے ہیں ان کے لئے یہ مشکل ہے کہ نیت باندھتے ہی دل کا رُخ حق تعالیٰ کی طرف ہو جائے ان کو چاہیے کہ اپنی طرف سے کوشش کر کے نفس کو پنجرے میں بند کریں اور اپنے ارادہ سے

کوئی خیال نہ لادیں اور نفس کو گھیر گھار کر مقید کریں جیسے مرغی کو گھیر گھار کر کھڈے میں بند کیا کرتے ہیں اگر اس نے اس کا اہتمام کرلیا تو دونوں کی نمازیں ایک میزان میں ہوں گی بلکہ جس نے نفس کو مشقت سے گھیر گھار کر مقید کیا ہے اور مصیبت کے ساتھ خیالات کی آمد کو روکا ہے اس کے لئے مشقت کا اجر زیادہ ہوگا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا حضرت آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا کہ خدا تعالٰے نے مجھے بخشدیا اور نہایت چین میں ہوں مگر ہمارا پڑوسی ہم سے بھی بڑھ گیا' حالانکہ نہ اس نے وہ مجاہدات کئے جو ہم نے کئے تھے نہ طریق سلوک طے کیا۔ وہ بیچارہ اہل وعیال والا تھا سوائے ضروریات واجبات وفرائض کے کچھ نہ کرتا تھا دن بھر اہل وعیال کے لئے کسب معاش کرتا تھا لیکن ہر وقت اس میں رہتا تھا کہ کاش میرے لئے بھی کبھی وہ دن آئے کہ ابراہیم بن ادہم کی طرح مطمئن ہو کر اللہ کا نام لوں اور یہ حال ہو ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ۔۔۔ بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہای ہوی

(فراغ قلب سے ایک نظر معشوق کے چہرہ پر ڈالنا اس شاہی چھتری سے بہتر ہے کہ سلطنت کی ہائے ہوئے کا شور وغوغا ہو)

اور یہ حال ہو ؎

چہ خوش است باتو بزمے بنہفتہ ساز کردن ۔۔۔ در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیا ہی اچھا ہو کہ تیرے ساتھ ایک خفیہ مجلس ہو اور گھر کا دروازہ بند کر کے جام شراب کی مہر کھولی جائے)

ساری عمر وہ اسی تمنا میں رہا مگر ایک دن بھی اسے فراغ نصیب نہ ہوا لیکن آج جو اس کو درجات ملے ہیں ابراہیم ان کو ترس رہا ہے۔ اور حق تعالٰی نے اس کی نیت پر نظر فرمائی گو عمل قلیل تھا مگر اس کا ارادہ تو ہر وقت یہی تھا کہ ذرا فراغ نصیب ہو تو یوں ذکر کروں اس طرح نمازیں پڑھوں اور اس طرح مجاہدات کروں بس اس کی یہ نیت قبول ہوگئی اب کیا حقیر سمجھتے ہو اے صوفیو! تم ان گاؤں والوں کو۔ ممکن ہے کہ یہ تصوف میں

بھی تم سے افضل ہوں کیونکہ تصوف تام خلوص فے الاعمال کا ہے تو ممکن ہے کہ بعضے گاؤں والے خلوص میں تم سے بڑھے ہوئے ہوں پھر جس مشقت سے وہ اپنی اہل وعیال کے لئے کسب معاش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ خلوص میں جوان کو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ سے ان کے درجات آخرت میں تم سے بڑھ جائیں یہ حق تعالیٰ کا راستہ ہے جو ہر شخص کے لئے مختلف ہے کسی کو کھیتی اور ہل جوتتے ہی میں مقصود تک پہنچا دیا۔ کسی کو خانقاہ میں رکھ کر پہنچا دیا کسی کو سہولت سے پہنچایا کسی کو مشقت سے کسی کو بسط کی راہ سے لے گئے کسی کو قبض کی راہ سے۔ ایک ایسے عاشق ہیں کہ ڈھول پیٹتے ناچتے کودتے مقصود تک پہنچتے ہیں جیسے چشتیہ ہیں کہ یہ اپنے کو بھی بدنام کرتے ہیں اور محبوب کا بھی پردہ کھول دیتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں است دستیر عشق عاشق با دو صد طبل ونفیر

(معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور پنہاں ہوتا ہے اور عاشقوں کا عشق ہوا اور سیکڑوں ڈھول اور نفیر کی طرح شور و غوغا کرتا ہے)

ایک نقشبندیہ ہیں جو چپ چاپ راستہ طے کرتے ہیں نہ اپنے عشق کو ظاہر کریں نہ محبوب کا راز فاش کریں۔ مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالارانند کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

(نقشبندی سلسلے کے لوگ عجیب سالار قافلہ ہیں کہ مخفی راہ سے مراقبہ کئے ہوئے کعبہ شریف (حرم) تک قافلۂ طالباں کو پہنچا دیتے ہیں یعنی سلوک طے کرا دیتے ہیں)

ایک کو مسہل دے دیا ہے وہ بھڑ بھڑ کر رہا ہے، ایک کو لخلخہ سونگھا دیا ہے وہ خراٹے لے رہا ہے ایک کو ایسی نفیس دوا دی کہ آواز بھی نہیں نکلتی کسی کو کسی پر اعتراض کا حق نہیں طبیب نے جس کے مناسب جو دوا دیکھی وہی اس کو دیدی اس میں مریض پر کیا اعتراض ہے۔ ایک شخص کو تو پھول دیدیئے وہ تو اس کی خوشبو میں مست ہے اور ایک سے پھول خرچ کرا کر اس کے دل میں ایک باغ لگا دیا ؎

خود کہ باید ایں چنیں بازار را کہ بیک گل میخری گلزار را

(ایسے کریم کا بازار لطف وکرم کون پا سکتا ہے کہ ایک گل کے عوض میں گلزار خرید سکتے ہو)

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(یہ وہی جان لیتے ہیں مجاہدات میں اور اس کے انعام میں سیکڑوں جانیں عطا فرماتے ہیں۔ بلکہ ایسی نعمتیں بھی عطا فرماتے ہیں جو تیرے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی ہیں)

یہ روتا ہے کہ ہائے مجھ سے پھول چھین لئے وہ تسلی دیتے ہیں کہ بے وقوف تجھے ہم باغ دیں گے جس میں ہزاروں پھول دار درخت ہوں گے یہ پھول تو چند روز میں کمہلا جائیں گے اور درخت لگنے کے بعد ہمیشہ تازہ بتازہ نو بہ نو پھول لگیں گے یہی حال اس شخص کا جس سے کیفیات چھین لی جاتی ہیں وہ روتا ہے کہ ہائے کیفیات جاتی رہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد مقامات عطا ہوں گے جو بمنزلہ باغ کے ہیں حصول مقامات کے بعد سب کیفیات تمہارے قبضہ میں ہو جائیں گی کہ جس وقت جس کیفیت کو چاہو اپنے اوپر وارد کرلو اب تو گھر میں درخت موجود ہے اب کیا غم ہے غرض یہ حق تعالیٰ کا راستہ ہے جو صوفیوں ہی کے لئے مخصوص نہیں۔ گاؤں والے بھی اس کو طے کر سکتے ہیں گو مشقت ہی سے طے کریں سو مشقت والوں کو حقیر مت سمجھو ان پر ہنسو نہیں کہ یہ کس مصیبت سے چل رہا ہے اور ہم کیسے ہلکے پھلکے چل رہے ہیں تم کو کیا خبر ہے کہ عنداللہ کون بڑھا ہوا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب قیامت میں اہل مصیبت کو نعمتیں دی جائیں گی تو اہل نعمت کہیں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھال قینچی سے کتری گئی ہوتی اور آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے تو تم کو کیا قدر ہے ان مصیبت والوں کی۔ لکھنؤ والوں کو مرچوں کی کیا قدر وہ ہم پر ہنستے ہیں کہ یہ کھانا کیا کھاتے ہیں آگ کھاتے ہیں اور ہم ان پر ہنستے ہیں کہ تم کھانا کیا کھاتے ہو خاک کھاتے ہو واقعی جس کھانے میں مرچیں نہ ہوں وہ تو مٹی ہے بعض لوگ کریلے کی تلخی دور کرکے پکاتے ہیں میں کہا کرتا ہوں کہ وہ کریلا ہی کیا جو کڑوا نہ ہو۔

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

(بستان عالم ماہ ۱۹۳۲ء)

ملّا جیون کا قصہ ہے کہ شاہ عالمگیر نے ان کی دعوت کی اور عرض کیا کہ آپ کچھ فرمائش کیجئے انھوں نے گلگلوں کی فرمائش کی۔ باورچی نے نہایت اعلیٰ درجہ کے گلگلے تیار کئے مگر ان کو پسند نہ آئے۔ بادشاہ کو محسوس ہوا حکم دیا اور اچھے پکائے جادیں، پہلے سے بھی اعلیٰ درجہ کے پکائے وہ بھی پسند نہ آئے باورچی سمجھ گیا۔ تیسرے دن اس نے گڑ اور تیل کے پکائے۔ بہت خوش ہوئے کہ ہاں آج پکے ہیں۔ تو اے صاحبو! جب دنیا کی بعض چیزیں ایسی ہیں جو تلخی کے ساتھ ہی لذیذ ہیں پھر دین کے کاموں میں کیوں تعجب ہوتا ہے اگر وہ باوجود تلخی کے کسی کو لذیذ معلوم ہوتے ہوں پھر دین کے واسطے ذرا سی تلخی کیوں گوارا نہیں ہوتی مجھے اس کی دو زندہ مثالیں یاد ہیں۔ ایک مرچ ایک تمباکو کہ ان کی لذت سوزش اور تلخی ہی کے ساتھ ہے، تمباکو جتنا تیز اور کڑوا ہو اتنا ہی تمباکو کھانے والوں کے نزدیک عزیز ہے پھر حیرت ہے کہ دین کے لئے ذرا سی سوزش اور تلخی گوارا نہ ہو اسی طرح مرچ جتنی تیز اور تلخ ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر آج تم کو دین کا کوئی کام گراں اور ناگوار معلوم ہوتا ہے تو تم اس پر عمل کر کے دیکھو چند دن میں اس کی تلخی لذیذ معلوم ہوگی۔ پس گاؤں والوں کو ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔ اور گو ان کو دین کے کاموں میں مشقت معلوم ہو مگر ہمّت کر کے عمل کرنا چاہیئے۔ پھر جس طرح ان کو ہل جوتنا آسان ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ دین کے کام آسان ہو جائیں گے۔

چند روزے جہد کن باقی بخند۔ اسی طرح جس شخص کو پہلے کیفیات حاصل تھیں جن سے کام آسانی سے ہو رہا تھا اور اب کیفیات حاصل نہیں جس کی وجہ سے کام میں جی نہیں لگتا وہ بھی پریشان نہ ہو ہمت کر کے تلخی کی برداشت کر کے کام میں لگا رہے۔ اس طریق میں قبض و بسط کا پیش آنا ناگزیر ہے۔ بلکہ قبض اگر نہ ہو تو عاشق کو لذت نہیں آتی۔ مزا اس میں ہے کہ آج بسط ہے کل قبض ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم　　گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور
(محبوب کی طرف سے جدائی کا غم آنے پر شکایت نہیں کرتا ہوں کیونکہ اگر غیبت نہ ہو حضوری کی لذت بھی نہ آئے یعنی لذت وصال کی قدر تکلیف فراق کے بعد ہی ہوتی ہے)

عاشق اگر واقعی عاشق ہے تو اس کو یہ خواہش ہو گی کہ محبوب کبھی عتاب بھی کرے منہ بھی چڑھاوے ہاں فاسق یہ چاہا کرتا ہے کہ معشوق ہر وقت اس کا مطیع ہی رہے عاشق ہمیشہ خود مطیع ہونا چاہتا ہے معشوق کو مطیع کرنا نہیں چاہتا حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ آدم علیہ السلام نے جنت میں صرف لطف کی شان دیکھی تھی اس وقت تک تفصیلی معرفت کامل نہ تھی جب ان سے لغزش کا صدور ہوا تو اس میں ان کو شان جلال دکھلائی گئی اس سے ان کی تفصیلی معرفت کامل ہو گئی تجلی جلال و تجلی جمال دونوں سے واقف ہو گئے واقعی یہ عجیب راستہ ہے جس میں عقل کام نہیں دیتی بس یہاں تو حیرت ہی حیرت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں　　جز کہ حیرانی نباشد کار دیں
(کبھی اس طرح دکھاتے ہیں کبھی اس کے ضد کو دکھاتے ہیں۔ دین کے کام میں حیرانی ہی حیرانی ہے)

مگر یہ حیرت جہل کی نہیں بلکہ کمال معرفت کی وجہ سے حیرانی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوی دوست　　بل چنیں حیراں کہ رویش روی دوست
(لیکن یہ حیرانی ایسی نہیں ہے کہ دوست کی پیٹھ دوست کی طرف ہو بلکہ ایسی حیرانی ہے محبوب کا چہرہ عاشق کے چہرہ کی طرف ہے)

یعنی ایک حیرت تو اس شخص کی ہے جس کو محبوب کا پتہ نہیں ملا غلط راستہ پر چل رہا ہے یہ تو حیرت مذمومہ ہے اور ایک حیرت اس شخص کی ہے جو محبوب کا جمال دیکھ کر حیران ہو رہا ہے محبوب کی طرف رُخ کئے ہوئے ہے اور اپنے سے بے خبر اس کی حیرت حیرت محمودہ ہے تو عارف کو قبض میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام کے لئے یہ حالت حالت

قبض ہی تھی جس میں ان کو پہلے سے زیادہ ترقی ہوئی ؂

سیر زاہد در ہے یک روزہ راہ سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

(زاہد کی سیر ایک ماہ میں ایک دن کا راستہ ہے اور عارف ہر سانس میں شاہ حقیقی کے تخت تک پہنچتا ہے)

عارف کی کوئی حالت ترقی سے خالی نہیں ہوتی اس کی سیر ہر دم عرش تک ہوتی ہے پس جس طرح بسط میں ایک حیات ہے قبض میں بھی ایک حیات ہے اس لئے محقق کبھی کیفیات کی قلت سے پریشان نہیں ہوتا وہ ہر حال میں اپنا کام کئے جاتا ہے باقی غیر محقق چونکہ کیفیات ہی کو مقصود سمجھتا ہے وہ دو مفسدوں میں مبتلا ہو جاتا ہے بعضے تو کیفیت کے نہ ہونے سے عمل میں کمی کر دیتے ہیں اور بعضے کیفیت کے ہونے سے عمل میں کمی کر دیتے ہیں جیسا کہ اوپر مفصلاً بیان کیا گیا ہے یہ دونوں حالتیں اچھی نہیں اس لئے اس خیال کو دل سے نکال دینا چاہیئے اور کیفیات کو مقصود نہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ تتمہ تھا پہلے بیان کا اور اتنی لمبی تقریر کا قصد نہ تھا ارادہ مختصر تقریر کا تھا مگر بلا قصد کے اتنی لمبی ہو گئی۔ خیر حرج ہی کیا ہے، ہر چیز کا لمبا ہونا بُرا نہیں۔ قد کا لمبا ہونا تو بُرا ہے مگر زلف کا دراز ہونا محبوب ہے ایک مرتبہ ناسخ اور ایک اور شاعر کسی مجلس رقص میں جمع ہو گئے رقاصہ لمبی بے ڈول تھی تو ان میں سے ایک نے کہا ؂ طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے ؛

رقاصہ نے ہنس کر بغرض جواب دینے کے کہا کیا، دوسرے نے فوراً کہا ؂

وہ زلف مسلسل جو تیرے رُخ پہ پڑی ہے ؛ اس مصرع نے اس طول کو حسین بنا دیا جو پہلے مصرع سے مذموم معلوم ہوا تھا کیونکہ اس نے اس طول کو زلف کی طرف راجع کر دیا اور زلف کا دراز ہونا عیب نہیں بلکہ مدح ہے۔ ایک تتمہ تو مضمون سابق کا یہ تھا۔ اور دوسرا تتمہ یہ ہے کہ میں نے بیان گذشتہ سے پہلے بیان کیا تھا کہ تقلیل طعام کو تو شریعت نے مجاہدہ قرار دیا ہے مگر ترک وقاع یا تقلیل وقاع کو مجاہدہ قرار نہیں دیا اس وقت میں اس مضمون کی کسی قدر تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

اور شاید میں نے پہلے یہ بھی کہا تھا یا نہیں کہ زہد کے لئے تقلیل اللذات کافی ہے، ترک لذات زہد میں ضروری نہیں کیونکہ سب سے بڑھ کر الذ الاشیاء وقاع ہے اگر ترک لذات لازم ہوتا تو کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے رُکتے جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا جس کی وجہ سے آج عیسائی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے نبی تارک لذات تھے اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے نبی تارک لذات نہ تھے متبع شہوت تھے کہ نو نکاح کئے جس سے ناواقف مسلمان ان کے سامنے جھینپتے ہیں سو اگر ترک لذات لازم زہد ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کو ضرور ترک کرتے تاکہ مخالفین کو مسلمانوں پر اس اعتراض کا موقع نہ ہوتا جس اعتراض کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک بے ادب گنوار نے ایک بے ادب عیسائی کے جواب میں یک دیا کہ پہلے تم یہ تو ثابت کر دو کہ عیسیٰ علیہ السلام میں قوت مردانگی بھی تھی اسی وقت ان کے ترک نکاح پر فخر کرنا۔ مگر یہ بھی سخت بے ادبی ہے عیسیٰ علیہ السلام پر اس ضعف کا شبہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حدیث بخاری میں ہرقل کا قول مذکور ہے جس پر اجلہ صحابہ نے سکوت کیا جس سے اس کی تقریر ہو گئی کذلک الرسل تبعث فی احساب قومہا کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اعلےٰ حسب میں مبعوث ہوتے ہیں کمالات ذاتیہ کو جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام تمام کمالات سے علیٰ وجہ الکمال موصوف ہوتے ہیں تاکہ کسی کو ان کے اتباع سے عار نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اگر آپ کسی شخص کی نسبت یہ سن لیں کہ وہ عنین ہے تو طبیعت کو اس سے معًا رکاوٹ ہو جاتی ہے اور وہ شخص فوراً نگاہوں سے گر جاتا ہے حالانکہ اس وقت زیادہ معتقد ہونا چاہیئے تھا کیونکہ معلوم ہوا کہ فرشتہ ہے مگر کچھ قاعدہ ہے کہ انسان کے ساتھ اعتقاد جب ہی ہوتا ہے جبکہ اس میں مواد تو سب موجود ہوں پھر اس کے روکنے میں فرشتہ ہو اور اگر خالص فرشتہ ہو تو اعتقاد کم ہوتا ہے۔ اسی واسطے یحییٰ علیہ السلام کے بارہ میں جو حصوراً وارد ہے اس کے معنے مفسرین نے صبوراً لکھے ہیں اور عنین کے ساتھ تفسیر کو منکر کہا ہے (کذا فی الشفاء معللا بان ہذہ نقیصۃ

وعیب ولا تلیق بالانبیا علیہم السلام) بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکنے والے ہیں چنانچہ سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ علیہ السلام نے اخیر عمر میں نکاح کیا تھا (کذا فی الشفاء) جس سے ان کے عنین ہونے کا شبہ بالکل زائل ہوگیا۔ بلکہ معلوم ہوا کہ ایسے قوی مرد تھے کہ ان کی قوت مردانگی بڑھاپے میں باقی رہی[1] اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اخیر زمانہ میں نازل ہو کر نکاح کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے ویولدلہ کہ ان کے اولاد بھی ہوگی جس سے ان کے ضعیف ہونے کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ معلوم ہوا کہ ان کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ ہزاروں برس فرشتوں میں رہ کر بھی طاقت کم نہ ہوئی بلکہ اس سے تو یہ بظاہر نظر ان کی یہ قوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر نصوص سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات میں انبیاء علیہم السلام سے اکمل ہیں اس لئے یہ شبہ نہیں ہوسکتا الغرض ترک لذات لازم زہد نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح نہ کرتے بلکہ تقلیل لذات زہد کے لئے کافی ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے نکاح کئے ہیں آپ کی اصلی قوت کے اعتبار سے وہ تقلیل لذات ہی میں داخل ہیں کیونکہ احادیث میں وارد ہے کہ صحابہ آپ کے اندر تیس مردوں اور بعض روایات میں ہے کہ چالیس[2] مردوں کی قوت کا اندازہ کرتے تھے اور ایک مرد کی قوت چار عورتوں کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے شریعت نے چار نکاح تک کی اجازت دی ہے۔ اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی قوت تھی جو ایک سو بیس عورتوں کو اور دوسری روایت کے موافق ایک سو ساٹھ عورتوں کے لئے کافی تھی۔ بلکہ شرح شفاء میں ابو نعیم سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ چالیس مرد جنت کے مردوں میں سے ہیں اور ان میں ہر مرد کی قوت حسب روایت ترمذی ستر مردوں کی برابر ہوگی اور ایک روایت میں سو مردوں کی برابر آیا ہے تو ایک حساب سے آپ میں قریب تین ہزار مرد کے برابر اور ایک حساب سے چار ہزار مرد کے برابر قوت ہوئی

[1] کما علله فی شرح الشفا لبعض البصر ودفع الفتنة ۱۲ منه [2] کلا الروایتین فی الشفاء ۱۲ منه

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نو پر صبر کرنا یہ کمال زہد تھا۔ اور آپ اس پر بھی قادر تھے کہ بالکل صبر کر لیتے چنانچہ جوانی میں آپ نے پورا صبر کیا کہ پچیس سال کی عمر میں چالیس سال کی بیوہ عورت سے نکاح کیا، بھلا کنوارا مرد ایسی عورت سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کی ماں بن سکے ہرگز نہیں۔ پس جوانی میں آپ کا چالیس سالہ عورت سے نکاح کرنا اور ساری جوانی اسی کے ساتھ تیر کر دینا اس کی کافی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم متبع شہوات ہرگز نہ تھے بلکہ آپ اعلیٰ درجہ کے زاہد تھے مگر بوڑھاپے میں آپ نے نو نکاح کئے تو ضرور آپ کے ان نکاحوں میں کوئی حکمت تھی۔ چنانچہ ایک حکمت تو وہ تھی جو بعض عارفین نے بیان کی ہے کہ منشاء تکوین عالم محبت ہے جیسا کہ کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق سے معلوم ہوتا ہے گو یہ حدیث ان الفاظ سے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں مگر مضمون صحیح ہے جو حدیث ان اللہ جمیل یحب الجمال سے ثابت ہے جس کی تقریر نکت دقیقہ کے مضمون ہشدہم میں اور کلید مثنوی دفتر اول قبول کردن خلیفہ ہدیہ را تحت شعر گنج مخفی بد ز پیری جوش کرد میں احقر نے کی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس محبت تکوین کا مظہر سب سے زیادہ وقاع ہے کہ اس میں بھی محض محبت بواسطہ وقاع کے سبب ہو جاتا ہے تکوّن ولد کا بدون کسی تدبیر خاص کے جیسے تکوین عالم میں محض محبت بواسطہ کلمہ کن کے سبب ہو گیا تکون عالم بدون کسی خاص تدبیر کے پس عارف کو عورت کے تلبس میں یعنی جماع میں محبت تکوین کی تجلّی کا مشاہدہ ہوتا ہے اس لئے وہ نکاح کرتا ہے اور اسی لئے جماع کی اس کو دوسروں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور حدیث حُبّبَ الیّ من دنیاکم النسا کا مبنیٰ اسی راز کو بعض عارفین نے فرمایا ہے۔ دوسری حکمت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں یہ تھی کہ امت کو عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ معلوم ہو اگر آپ نکاح نہ کرتے اور پھر عورتوں کے حقوق کی تعلیم دیتے تو اس کا زیادہ اثر نہ ہوتا۔ کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

خود تو نکاح کیا نہیں اس لئے بلا تامل عورتوں کے اتنے حقوق بیان فرما دیئے نکاح کرتے تو شاید ان حقوق کا ادا کرنا مشکل ہوتا اور اب کسی کو یہ کہنے کا منہ نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے زیادہ نکاح کر کے دکھا دیئے اور سب کے حقوق اس خوبی سے ادا فرمائے کہ اس کی نظیر کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ حقیقت میں بیبیوں کے حقوق ادا کرنا بڑے عقلمند کا کام ہے۔ کیونکہ بی بی سے دو قسم کے تعلق ہوتے ہیں ایک علاقہ حاکمیت و محکومیت کا کہ مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت محکوم۔ دوسرا علاقہ محبیت و محبوبیت کا کہ مرد محب اور عورت محبوب ہوتی ہے۔ علاقہ حکومت کے ساتھ علاقہ محبت کی رعایت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر محبت کے حقوق ادا کرتے ہیں تو حکومت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں چنانچہ جو لوگ بیبیوں کے عاشق مشہور ہیں وہ اکثر ان کی غلامی ہی کرنے لگتے ہیں ان کی خاک حکومت نہیں ہوتی بیوی پر نہ کچھ رعب ہوتا ہے اور جو لوگ حکومت کے حقوق ادا کرتے ہیں ان سے محبت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں، دونوں کو جمع کرنا اور ہر ایک کے پورے پورے حقوق ادا کرنا کہ بی بی پر رعب بھی ہو حکومت بھی ہو اور اس کے ساتھ اس کا دل بھی شوہر سے کھلا ہوا ہو کہ بے تکلف ہنس بھی لے بول بھی لے اور مذاق بھی کر لے اور اس پر ناز بھی کر لے یہ انسان کامل کا کام ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کر سکتے تھے یا وہ شخص کر سکتا ہے جو آپ کا کامل متبع ہو۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کو یاد فرمایا تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ آپ اُن بڑھیا کو کیا یاد فرمایا کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھی آپ کو دے دی حدیث میں ہے فغضب حتی قلت والذی بعثک بالحق لا اذکرھا بعد ھذا الا بخیر۔ یعنی آپ کو غصہ آگیا جس سے حضرت عائشہؓ ڈر گئیں اور بقسم عرض کیا کہ اب سے جب کبھی ان کا ذکر کروں گی بھلائی سے کروں گی۔ یہ حالت رعب کی حضرت عائشہ پر تھی جن کو سب سے زیادہ ناز تھا تو دوسرے ازواج کی تو کیا حالت ہوگی تو ناز برداری کے ساتھ رعب کا

جمع کرنا سرسری بات نہیں - تیسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نکاح کر کے یہ بھی بتلادیا کہ جس کے چند بیبیاں ہوں اسے سب کے ساتھ کس طرح عدل کرنا چاہیئے، خصوصاً اگر ایک کے ساتھ محبت زیادہ ہو اور دوسریوں سے کم ہو تو اس وقت اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ایک کی ترجیح ظاہر ہو بلکہ امور اختیاریہ میں برابری کا پورا خیال رکھے۔ چنانچہ آپ نے یہ بھی کر کے دکھا دیا کہ باوجودیکہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر عدل میں کبھی آپ نے فرق نہیں کیا ان میں اور دوسری بیبیوں میں بلکہ ہمیشہ سب میں عدل کی پوری رعایت فرماتے تھے باقی دل کا ایک طرف زیادہ مائل ہونا یہ آپ کے اختیار سے باہر تھا اس میں برابری کیسے کرتے اس لئے آپ فرمایا کرتے تھے اللھم ھذا قسمی فی ما املك فلا تلمنی فیما تملك ولا املك۔ اے اللہ یہ میری برابری ہے اس چیز میں جس پر مجھے قدرت ہے پس مجھ سے اس بات میں مواخذہ نہ کیا جائے جس چیز پر مجھے قدرت نہیں۔ اس میں میلان قلب ہی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عائشہؓ کی طرف زیادہ تھا۔ اور یہ بات آپ کی طرف سے نہ تھی بلکہ غیب سے ایسے سامان کئے گئے کہ خواہ مخواہ آپ کے دل کو حضرت عائشہؓ کی طرف زیادہ میلان ہو چنانچہ نکاح سے پہلے حق تعالیٰ نے خود ایک حریر کے کپڑے میں فرشتہ کے ذریعہ سے حضرت عائشہؓ کی تصویر بھیجی تھی کہ یہ آپ کی بی بی ہیں جب آپ نے اس کو کھولا تو حضرت عائشہؓ کی تصویر پر نظر پڑی اور وہاں یعنی عالم آخرت میں تصویر جائز ہے۔ اگر تم وہاں اپنا فوٹو کھچواؤ گے تو ہم منع نہ کریں گے یہ معاملہ حق تعالیٰ نے کسی اور بی بی کے ساتھ نہیں کیا۔ دوسرے وحی میں یہ معاملہ تھا کہ کسی بیوی کے لحاف میں آپ پر وحی نہ آتی تھی بجز حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا کے کہ ان کے لحاف میں بھی آپ ہوتے تو بے تکلف وحی آتی تھی تو یہ باتیں تھیں جنکی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ ہی نے حضرت عائشہ کی جانب زیادہ مائل فرمادیا، پھر اس پر ان کی قدرتی ذہانت و فقاہت اور حسن سیرت سونے پر سہاگا تھا۔

اصل وجوہ آپ کی محبت کے وہی تھے جو پہلے مذکور ہوئے۔ حق تعالیٰ کو بھی حضرت عائشہؓ کے ساتھ سب بیبیوں سے زیادہ محبت تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر کیوں محبت نہ ہوتی مگر بایں ہمہ سوائے محبت قلبی کے ظاہری برتاؤ آپ کا سب کے ساتھ برابر تھا۔ پھر آپ نے جس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور حضرت عائشہؓ کی نو سال کی تھی وہ بالکل بچی تھیں اور بجز ان کے کوئی بی بی آپ کی کنواری نہ تھیں۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ کو امت کو یہ دکھلانا تھا کہ جس شخص کی عمر زیادہ ہو

عہ اور اس واقعہ سے یہ شبہ نہ ہو جو صحاح میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات نے مجتمع ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت ام سلمہ کو اور ان کے بعد حضرت زینب کو بھیجا تھا فقالت ان ازواجك ینشدنك العدل فی ابنة ابی قحافة کہ آپ کی ازواج مطہرات عائشہ کے متعلق آپ سے عدل کی درخواست کرتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس واقعہ میں ازواج مطہرات کی درخواست یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرمادیں کہ وہ اپنے ہدایا میں عائشہؓ کی باری کا انتظار نہ کیا کریں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس بیوی کے یہاں بھی ہوں وہیں ہدایا بھیجا کریں اس کی کیا وجہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے یہاں ہوتے ہیں اسی وقت ہدایا بھیجے جاتے ہیں اور دوسری بیبیوں کی باری میں نہیں بھیجتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انکار فرماتے تھے کہ میں صحابہؓ سے ایسا نہ کہوں گا۔ بس آپ کے اس انکار کو ازواج مطہرات نے عائشہؓ کی طرفداری پر محمول فرمالیا حالانکہ یہ ان کی غلطی اجتہادی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ سے ایسی بات کہنے سے غیرت مانع تھی کیونکہ ہدیہ تو دینے والے کی خوشی پر ہے اب آپ ان سے یہ فرمائیں کہ تم مجھے ایک دن نہ دیا کرو بلکہ ہر دن دیا کرو۔ اس میں اول تو ایک قسم کا سوال ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیور طبیعت کے بالکل خلاف تھا۔ دوسرے ہدیہ دینے والوں کی خوشی کو فوت کرنا ہے جو روح ہے ہدیہ کی ان وجوہ سے آپ انکار فرماتے تھے کہ میں صحابہ سے ہدیہ کے متعلق کچھ نہ کہوں گا، بتلائیے اس میں حضرت عائشہؓ کی کیا طرفداری ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرتی طور پر اس بات سے غیرت تھی کہ کس لئے کہنے سے رکتے تھے۔ مگر ازواج نے اس کو بلاوجہ طرفداری پر محمول فرمالیا پھر بعد میں وہ بھی سمجھ گئیں کہ آپ کے انکار کا منشا طبعی غیرت ہے، کسی کی طرفداری نہیں خوب سمجھ لو ۱۲ جامع

اس کو کنواری بچّی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے عموماً عادت یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرد کا برتاؤ اپنی عمر کے تقاضے کے موافق ہوا کرتا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو ان کی بچپن کی عمر کا تقاضا تھا ان کے بچپن کی آپ پوری رعایت فرماتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ مسجد کے قرب میں حبشی لڑکے عید کے دن کھیل کود رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ حبشیوں کا کھیل کود دیکھوگی انھوں نے خواہش ظاہر کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ کرکے دیر تک ان کو کھیل[۱] دکھلایا اور جب تک وہ خود ہی نہ ہٹ گئیں اس وقت تک آپ برابر کھڑے ہو کر ان کو کھیل دکھلاتے رہے۔ حضرت عائشہؓ کو بچپن کی وجہ سے گڑیوں[۲] کے کھیل کا بہت شوق تھا اور محلہ کی لڑکیاں بھی ان کے پاس کھیلنے کے لئے آتی تھیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں متفرق ہو جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جمع کرکے پھر لاتے کہ آؤ بھاگتی کیوں ہو جس طرح کھیلتی تھیں کھیلتی رہو۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ مسابقت بھی کی کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ اس وقت حضرت عائشہؓ ہلکی پھلکی تھیں وہ آگے نکل گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ آپ نے پھر مسابقت کی۔ اس وقت حضرت عائشہ کا بدن بھاری ہو چلا تھا اس مرتبہ آپ آگے نکل گئے تو آپ نے یہ فرمایا کہ اس کا بدلہ ہے۔ بتلایئے کنواری بچّی کی دلجوئی اور دل داری اور اس کے جذبات عمر کی رعایت بڑھاپے میں کوئی مرد اس طرح کر سکتا ہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی حاشا وکلا بوڑھوں سے یہ بہت دشوار ہے مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بڑھاپے میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو جوان شوہر کو جوان بی بی کے ساتھ کرنا

---

[۱] اور وہ محض کہنے میں تو کھیل تھا ورنہ ورزش اگر اچھی نیت سے ہو عبادت ہے اور چونکہ ان کھیلنے والوں کو دیکھنے میں کوئی فتنہ نہ تھا اس لئے یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اجنبی مردوں کو کیسے دیکھا ۱۲

[۲] یہ نام کی گڑیاں تھیں تصویریں نہ تھیں ۱۲ منہ

چاہیے بلکہ کوئی جوان بھی اتنا نہیں کر سکتا جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ کیا آجکل جو لوگ وقار وقار پکارتے ہیں یہ وقار تکبر کا پوٹلہ ہے ان لوگوں نے تکبر کا نام وقار رکھ لیا ہے۔ یاد رکھو وقار کے خلاف کام وہ ہے جس میں دین پر بات آتی ہو اور جس میں دین مصلحت پر کوئی اثر نہ پہونچے محض اپنی عرفی سُبکی ہوتی ہو تو ایسا کام کرنا عین تواضع ہے آجکل جو لوگ وقار کا پوٹلہ بغل میں دبائے ہوئے ہیں وہ بیوی کے ساتھ دوڑنے کو خلاف وقار سمجھیں گے مگر وہ ذرا زبان سنبھالیں اور آنکھیں کھولکر دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے ساتھ مسابقت کی ہے تو کیا معاذ اللہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو بھی خلاف وقار سمجھتے ہیں ہرگز نہیں اور اگر کوئی ایسا کہے تو اس کے ایمان کی خیر نہیں یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل خلاف وقار نہ تھا ہاں تکبر کے خلاف ضرور تھا پس اگر آجکل کے مدعیان وقار متکبر نہیں ہیں تو ذرا وہ ہم کو بیوی کے ساتھ دوڑ کر کے دکھلائیں مگر ان سے قیامت تک ایسا نہ ہوسکے گا ہاں جو شخص متکبر نہ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہوگا وہ ایسا ضرور کر سکتا ہے اور بحمد اللہ ہم نے بھی اس سنت پر عمل کیا ہے۔ ایک حکمت یہ تھی کہ عورتوں کے متعلق جو خاص احکام ہیں ان میں عورت کا واسطہ ہونا زیادہ نافع اور موجب سہولت ہو سکتا ہے۔ دوسری عورتوں کے لئے پھر وہ احکام جن امور کے متعلق ہیں ان میں عادات عورتوں کی مختلف ہوتی ہیں تو یہ نہایت مصلحت کی بات ہے کہ وہ وسائط متعدد ہوں تاکہ ہر قسم کے احکام سہولت سے ظاہر ہو سکیں اور ظاہر ہے کہ منکوحہ کی برابر کوئی بے تکلف واسطہ نہیں ہو سکتا۔ غرض یہ حکمتیں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاحوں میں اور یہ بھی نمونہ کے طور پر چند بیان کر دی گئیں ہیں ورنہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جن کے بیان کو عمر طویل چاہیئے ان وجوہ سے آپ نے متعدد نکاح کئے ہیں ورنہ اگر آپ چاہتے تو بالکل صبر کر لیتے اور جس طرح ساری جوانی ایک چالیس سالہ بیوہ کے ساتھ آپ نے گذار دی بوڑھاپے کو بھی ایک بیوی کے ساتھ گذار سکتے تھے۔ مگر آپ نے ان حکمتوں کی وجہ سے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے

متعدد نکاح کئے جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ترک لذات زہد کے لئے لازم نہیں بلکہ صرف تقلیل لذات کافی ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترک نکاح ضرور کرتے دوسرے یہ کہ مجاہدات وریاضات سے مقصود کسر قوت بہیمیہ ہے اور وقاع سے یہ کسر زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔ منؐ استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر و احصن للفرج ومن لم فلیصم فانہ لہ وجاء۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح صوم سے کسر قوت بہیمیہ ہوتی ہے اسی طرح نکاح سے بھی یہ قوت منکسر ہوتی ہے بلکہ نکاح کو اس میں زیادہ دخل ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقدم فرمایا غرض ثابت ہوا کہ ترک وقاع مجاہدہ نہیں ہے۔ ایک تتمہ سابق کا اور بھی ہے وہ یہ کہ میں نے پہلے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ تقلیل طعام کے لئے غذا کم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ فصل بین الاکلتین مجاہدہ کے لئے کافی ہے اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس وقت رمضان کا اخیر ہے سب دیکھ لیں تو صرف اس فصل ہی کی وجہ سے مجاہدہ کے آثار سب پر نمایاں ہو رہے ہیں، چنانچہ اس وقت سب کی قوت میں کمی معلوم ہو رہی ہے۔ سب لوگ ڈھیلے ڈھیلے ہو رہے ہیں باوجودیکہ افطار وسحر میں خوب کھاتے پیتے تھے مگر پھر بھی روزہ نے اپنا اثر دکھا دیا۔ ابتداء رمضان میں شبع بھی زیادہ تھا اور اب وہ بھی بہت کم ہے پس جن فلسفی مذاق صوفیہ نے یہ لکھا ہے کہ جو شخص رمضان میں بھی اور دنوں کی طرح پیٹ بھر کر کھاتا رہے اس نے روح صوم کو باطل کر دیا یہ ان کی اجتہادی غلطی ہے جس کا منشا صرف یہ ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ مقصود صوم سے کسر قوت بہیمیہ ہے سو جب رات کو خوب پیٹ بھر کر کھایا تو یہ کسر کہاں حاصل ہوا سو اول تو خود یہ حکمت اجتہادی ہے اس کے انتفاء سے روح صوم کو باطل کہہ دینا رائے محض ہے اور اس رائے سے ابہام ہوتا ہے کہ اگر رات کو شبع کے ساتھ غذا ہو تو صوم ہی کا ثواب نہ ملے گا کیونکہ بدون روح کے محض صورت

ؐ جو شخص قدرت رکھتا ہو تم میں سے تو وہ نکاح کر لے اس لئے کہ نکاح سے حفاظت نظر اور حفاظت فرج میں مدد ملتی ہے اور جو قدرت نہ رکھتا ہو وہ روزہ کثرت سے رکھا کرے یہ اس کے لئے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

بیکار ہے اور یہ یقیناً غلط ہے کہ جس شخص سے کوئی معصیت سرزد نہ ہو اس کا ثواب کم ہو جاوے دوسرے بعد تسلیم کسر اس صورت میں بھی حاصل ہے اور یہ غیر مسلم ہے کہ کسر کے لئے شب کا شبع بھی مضر ہے اس لئے یقیناً کہا جاوے گا کہ پیٹ بھر کر کھانے سے روح صوم ہرگز باطل نہیں ہوتی چنانچہ مشاہدہ ہمارے سامنے ہے کہ باوجود شب کے شبع کے سب کی قوت بہیمیہ منکسر ہو رہی ہے خصوصاً جبکہ شریعت میں اس قول کی کوئی اصل نہیں ملتی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی تصریح کی ہے باقی احادیث میں جو جوع کی فضیلت آئی ہے وہ ایسی ہے جیسے مرض کی فضیلت آئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قصداً بیمار ہوا کریں اسی طرح یہ لازم نہیں کہ قصداً بھوکے رہا کریں اسی طرح جو شبع کی مذمت وارد ہے اس سے مراد شبع مفرط ہے جس کو فقہاء نے بھی منع کیا ہے مطلق شبع مراد نہیں ورنہ اگر مطلق شبع منکسر ہوتا تو حدیث میں صائم کو شکم سیر کرنے کی فضیلت وارد نہ ہوتی کیونکہ منکر پر اعانت کرنا فضیلت کیسے ہو سکتا ہے اس پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ یہ کیسا مجاہدہ ہے کہ ایک ماہ کو تو دن میں کھانا پینا بند کر دیا پھر سال بھر کے لئے چھوڑ دیا کہ اب گیارہ مہینے رات دن کھاؤ پیو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو میرے اس قول کی تائید ہے کہ مجاہدہ خود مقصود نہیں بلکہ مقصود عمل ہے اسی واسطے شریعت نے سال بھر میں ایک مہینہ مجاہدہ کے لئے مخصوص کیا ہے باقی ایام میں مجاہدہ مقرر نہیں کیا بلکہ وہ اس عمل کا زمانہ ہے جس کے لئے مہینہ بھر مجاہدہ کیا ہے اور میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ ایک مہینہ کا مجاہدہ ہی اصلاح نفس کے لئے کافی ہے اس کا اثر سال بھر رہتا ہے بشرطیکہ رمضان کو اس کے حقوق کے ساتھ پورا کیا جائے تجربہ[۱] ہے کہ جن کاموں کی عادت رمضان میں کر لی جاتی ہے سال بھر کے لئے وہ کام آسان ہو جاتا ہے۔ پس جو شخص رمضان میں تقلیل کلام تقلیل منام تقلیل اختلاط کا عادی ہو جائے گا سال بھر اس کو یہ کام آسان رہیں گے

---

[۱] اور ایک حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے روی ابن حبان فی الضعفاء و ابو نعیم فی الحلیۃ من حدیث عائشۃ رضی اللہ عنہا اذا اسلم رمضان سلمت السنۃ کذا فی تخریج العراقی ۱۲ منہ

بشرطیکہ اس کا ارادہ بھی کرتا رہے اور نفس کی نگہداشت سے غافل نہ ہو ورنہ قصداً گناہ کرنے کا تو کچھ علاج ہی نہیں غرض اگر رمضان کو اچھی طرح گذارا جائے تو واللہ سال بھر معاصی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے بشرطیکہ گناہ سے بچنا بھی چاہے اور جو بچنا ہی نہ چاہے تو اس نے مجاہدہ کا قصد ہی نہیں کیا پس تم رمضان میں مجاہدہ کا قصد کرو اور اصلاح نفس کا اہتمام کرو پھر اگر تم گناہوں سے بچنا چاہو گے تو دیکھ لینا کتنی آسانی ہوتی ہے غرض مجاہدہ خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود عمل ہے اور مجاہدہ تسہیل عمل کے لئے مشروع ہوا ہے جیسے مسہل معدہ کو نرم کرنے کے لئے دیا جاتا ہے تاکہ مادہ متعفنہ نکلکر معدہ کی اصلاح ہو جائے اور ظاہر ہے کہ مسہل روز روز نہیں ہوا کرتا سال بھر میں ایک دفعہ ہوتا ہے کہ معدہ درست ہو جائے تو سال بھر غذا کھائی جائے اور اس کے ہضم سے قوت حاصل کی جائے۔ اسی طرح شریعت نے مجاہدہ کا زمانہ ایک ماہ رکھا ہے اور اس کو بھی عمل سے خالی نہیں رکھا بلکہ ہر مجاہدہ کے ساتھ ایک عمل ضرور رکھا ہے باقی مہینے خالص عمل کے لئے رکھے تاکہ معلوم ہو کہ اصل مقصود عمل ہی ہے یہ علوم جواہرات ہیں ان کی قدر کرو واللہ ان سے بہت سے مشکلات و عقبات حل ہو جاتے ہیں یہ سب اصول ہیں فن کے، یہ سب بیان اس پر چلا تھا کہ وقاع میں خود کسر قوت بہیمیہ ہے اس لئے اس کے ترک کو مجاہدہ میں شمار نہیں کیا گیا اور جب ترک وقاع مجاہدہ نہیں حالانکہ وہ الذ الاشیا رہے تو اس سے ثابت ہوا کہ ترک الذات کوئی مجاہدہ نہیں اور نہ ترک لذات کا نام زہد ہے اور جن لوگوں نے ترک لذات کو زہد کے لئے ضروری سمجھا ہے وہ محقق نہیں ہیں چنانچہ ایک بزرگ نے سنا کہ فلاں صوفی شوربے میں پانی ملاکر کھاتا ہے فرمایا وہ طفل مکتب ہے وہ اس تجلّی کو معطل کرتا ہے جو شوربے کی لذت میں ظاہر ہے ہمارے حاجی صاحب کا ارشاد ہے جو خود مجھ سے فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پینا ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے گا اور گرم پانی پیو گے تو زبان تو الحمد للہ کہے گی مگر دل اس کا ساتھ نہ دے گا یہ ہیں حقائق جن کو محقق ہی سمجھتا ہے۔ اب بتلایئے اگر کوئی شخص ٹھنڈے پانی میں گرم پانی ملاکر پئے تو

اس نے اس نعمت کو باطل کیا یا نہیں جو ٹھنڈے پانی میں رکھی ہوئی ہے یقیناً اس نے نعمت کی ناقدری کی اسی طرح لذیذ شوربا کھا کر جیسا دل خوش ہوتا ہے اور خوش ہوکر نعمت الٰہی کا شکر کرتا ہے پانی پلانے کے بعد وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی ہے ہرگز نہیں عارف ہر چیز کے حقوق ادا کرتا ہے ٹھنڈے پانی کے بھی اور لذیذ شوربے کے بھی اور نفیس کپڑے کے بھی اور ناقص ان کے حقوق کو ضائع کرتا ہے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ہم تو عطر اس واسطے ملتے ہیں تاکہ خدا تعالیٰ کو اچھے لگیں عمدہ کپڑے اس واسطے پہنتے ہیں تاکہ خدا کو اچھے لگیں کیا کہنا ہے ان بزرگوں کی حالت اور نیت کا یہ ہر کام میں رضائے محبوب ہی کا قصد کرتے ہیں عام لوگ ان کی حالت کو کیا پہچانیں ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

(خام شخص کاملین کے حالات کو نہیں سمجھ سکتے پس کلام مختصر کرو اور ایسے نادان اور خام سے سلام کرلو (کلام نہ کرو)

مگر تم ان کی ریس مت کرنے لگنا کہ لگو آج ہی سے عمدہ عمدہ کپڑوں کا اہتمام کرنے کیونکہ اول تو وہ حضرت فنا نفس سے مشرف ہو چکے تھے دوسرے ان کاموں کیلئے اہتمام نہ کرتے تھے ہاں جب خدا نے عمدہ کھانے عمدہ پہننے کو دیا تو اس کو اچھی نیت سے استعمال کرتے تھے ہر شخص کو ان کی ریس نہ کرنی چاہیے ورنہ وہی حال ہوگا جو ایک بادشا کا ہوا تھا ایک بادشاہ نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ روزانہ دو گولی کھایا کرتے ہیں بادشاہ نے پوچھا کہ یہ گولیاں کیسی ہیں، فرمایا قوت کے لئے ہیں۔ اس نے کہا مجھے بھی ایک عنایت کردیجئے۔ آپ نے ایک گولی اس کو بھی دیدی تھوڑی دیر کے بعد جو اس نے اپنا اثر کیا تو بادشاہ سے ضبط نہ ہو سکا محلسرا میں گیا اور اپنی بی بی اور باندیوں سے رات بھر مشغول رہا مگر کسی طرح خواہش اور قوت کم نہ ہوتی تھی۔ اب اسے خطرہ پیدا ہوا کہ ایک گولی میں تو میرا یہ حال ہوا اور یہ بزرگ مدت سے دو گولیاں روز کھاتے ہیں ان سے کیونکر ضبط ہوتا ہے ان کی

حالت کا تجسس کرنا چاہیئے کہیں یہ کسی سے خراب وخستہ نہ ہوتے ہوں گو بوجہ عقیدت قدیم کے اس خطرہ کو دفع کر دیا مگر اس خطرہ کا ان بزرگ کو کشف ہو گیا اور چاہا کہ اس کو بالکل صاف کر دیا جاوے۔ بادشاہ اگلے دن حاضر خدمت ہوا تو انھوں نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ مجھ کو معلوم ہوا کہ تمہاری زندگی کے تھوڑے روز باقی رہ گئے ہیں۔ چالیس دن کے بعد تم مرجاؤ گے مگر چونکہ عبادت کے لئے قوت کی ضرورت ہے اس لئے یہ گولیاں پاس رکھو روزانہ کھالیا کرو تاکہ عبادت آسانی سے ہو سکے چونکہ بادشاہ کو ان سے اعتقاد تھا اس لئے یقین آگیا کہ بس میری زندگی کے چالیس دن باقی ہیں، پھر تو حالت یہ ہوئی کہ دو گولیاں روزانہ کھا کر بھی نفس کو مطلق ہیجان نہیں ہوتا۔ موت کے خیال نے نفس کو پژمردہ کر دیا اب نہ بیوی کی طرف التفات ہے نہ باندیوں کا خیال ہے۔ ہر وقت موت کا فکر ہے۔ سب کام چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر خدا کی یاد میں لگ رہا ہے۔ جب چالیس دن پورے ہو گئے اور موت نہ آئی تو بزرگ کی خدمت میں پھر حاضر ہوا اور کہا حضور چالیس دن تو گذر گئے مگر آپ کا کشف پورا نہ ہوا، فرمایا وہ گولیاں بھی کھائی تھیں کہا ہاں۔ فرمایا کیا ویسا ہی اثر ہوا کہا حضور خاک بھی اثر نہیں ہوا مجھے تو ہر وقت موت کا فکر لگا ہوا تھا۔ فرمایا میرا مقصود تمہارے خطرہ کا جواب دینا تھا دیکھو کہ تم کو تو چالیس دن کی مہلت کا بھی یقین تھا مگر پھر بھی موت کے فکر نے تمہارا یہ حال کر دیا اور جس کو چالیس منٹ کی مہلت کا بھی یقین نہ ہو اور ہر وقت موت ہی کا دھیان لگا رہتا ہو کہ دیکھئے کب بلاوا آجاوے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ اب بادشاہ سمجھا کہ واقعی میرے خطرہ کا جواب ہو گیا۔ واقعی جس کو موت کا ہر دم فکر لگا ہوا ہے ان گولیوں سے کیا ہیجان ہوتا۔

صاحبو! تم تو یہ دیکھتے ہو کہ بزرگ عمدہ کھاتے عمدہ پہنتے ہیں مگر ان کے دل پر جو آرے چلتے ہیں ان کی تمہیں کیا خبر، تم ان کو ظاہر میں خوش حال دیکھ کر اپنے اوپر قیاس کرتے ہو کہ بس یہ بھی ہر وقت تنعم میں رہتے ہیں مگر ان کے دل کی کیا خبر کہ

اس پر کیا گذر رہی ہے اس لئے تم ان کی ریس نہ کرو تمہاری سلامتی اس میں ہے کہ عبادات میں تو ان کی تقلید کرو احوال میں تقلید نہ کرو کیونکہ تم ان احوال کے حقوق ادا نہیں کر سکتے اور جب اس قابل ہو جاؤ گے پھر تقلید احوال کا بھی مضائقہ نہیں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ترک وقاع مجاہدہ نہیں ہے نہ ترک لذات کا نام زہد ہے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ اگر ترک وقاع مجاہدہ نہیں تو پھر روزے میں ترک اکل و شرب کے ساتھ ترک وقاع کیوں مشروع ہوا خوب سمجھ لو کہ روزہ میں ترک وقاع کے ضروری ہونے سے اس کا مجاہدہ ہونا لازم نہیں آتا بلکہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے کا دوسرا سبب ہے میرے یہ علوم نقلی نہیں ہیں کیونکہ میری نظر کتابوں پر بہت کم ہے۔ اسی لئے بعض لوگ مجھے کم ہمت بھی کہتے ہیں بلکہ یہ علوم میرے قلب پر خود بخود چلے آتے ہیں جیسے ایک ڈوم کی آنکھوں میں چاند گھسا آتا تھا اس نے کہیں سن لیا تھا کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہوتا ہے اس نے کہا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے جو روزہ فرض ہو۔ ایک دفعہ وہ تالاب کے کنارہ پر آب دست لے رہا تھا کہ پانی میں چاند کا عکس نظر آیا تو کہنے لگا گھس جا آنکھوں میں کر دے روزہ فرض تو جیسے اس کی آنکھوں میں چاند خود بخود گھسا آتا تھا ایسے ہی میرے دل پر یہ علوم خود بخود چلے آتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ آنکھیں بند کر لیتا تھا میں کھلی رکھتا ہوں تو بات یہ ہے کہ گو وقاع بھی مانع مشاہدہ نہیں ہے کہ اس کے ترک کو مجاہدہ کہا جاوے بلکہ مشاہدہ پر معین ہے جیسا میں اوپر بتا چکا ہوں کہ عارفین کو اس میں بھی ایک تجلّی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا مقتضا واقع میں یہی تھا کہ ترک وقاع صوم کے لئے ضروری نہ ہوتا مگر یہ مشاہدہ بواسطہ ہے اور ترک وقاع میں مشاہدہ بلاواسطہ دوسرے وقاع میں مشاہدہ ہونا یہ حالت عارفین کے ساتھ مخصوص ہے غیر عارف کو تو اس وقت حضور بھی مشکل ہے کیونکہ اکثر لوگ تو اس وقت نفسانی لذت میں ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ ان کو حضور حق کی طرف التفات بھی نہیں ہو سکتا اور عارف کو گو اس وقت حضور ہو سکتا ہے مگر اس میں

شک نہیں کہ اس کے لئے بھی یہ حضور بواسطہ ہے باقی حضور بلا واسطہ وہ ترک وقاع ہی میں ہے جیسا کہ عارف کو خلوت میں حضور بلا واسطہ ہوتا ہے اور اختلاط مع الخلق میں بواسطہ اور یہی تفسیر ہے حدیث انہ لیغان علے قلبی کی (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے دل پر بھی بعض دفعہ ابر سا چھا جاتا ہے ۱۲) کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو تو خلوت میں توجہ الی الحق بلا واسطہ حاصل تھی پھر ان کو تبلیغ کے لئے مخلوق سے ملنے ملانے کا حکم ہوا تو اس میں بھی توجہ الی الحق محفوظ ہے مگر یہ توجہ بواسطہ ہے اور توجہ بلا واسطہ یقیناً الذ ہے توجہ بواسطہ سے جیسے ایک تو معشوق کو بلا واسطہ آئینہ کے دیکھا جائے اس طرح کہ وہ بالکل تمہارے سامنے ہو اور ایک یہ کہ محبوب کے سامنے آئینہ رکھا ہوا ہو اور اس میں سے محبوب کی صورت دیکھی جائے گو دونوں صورتوں میں آپ محبوب ہی کو دیکھ رہے ہیں مگر یقیناً دونوں میں فرق ہے۔ اسی طرح گو انبیاء کے حق میں تمام مخلوق مرآۃ جمال حق ہے اور وہ مخلوق سے ملنے ملانے میں بھی توجہ الی الحق ہی رکھتے ہیں مگر یہ توجہ بواسطہ ہے جس میں وہ لذت نہیں جو خلوت میں بلا واسطہ توجہ الی الحق میں ہوتی ہے اسی تفاوت کو حضور غین سے تعبیر فرماتے ہیں غرض حالت وقاع میں اول تو مشاہدہ بلا واسطہ نہیں صرف بواسطہ ہے پھر وہ بھی ہر ایک کو نہیں صرف عارف کو ہوتا ہے اس لئے روزہ میں ترک وقاع مشروع ہوا تاکہ روزہ میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ اعلیٰ درجہ کی علی وجہ الکمال پائی جاوے یہ راز ہے ترک وقاع کے ضروری ہونے کا صوم میں نہ یہ کہ ترک وقاع مجاہدہ ہے دوسری بات یہ ہے کہ بزرگوں کے کلام میں تصریح ہے کہ روزہ میں شان تنزیہ کا ظہور ہے یعنی روزہ فی الجملہ تخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے اس لئے کھانے پینے کے ساتھ جماع سے بھی روک دیا گیا کیونکہ حق تعالیٰ ان افعال سے منزہ ہیں اور اس کا مقتضا یہ بھی تھا کہ پیشاب و پاخانہ سے بھی منع کر دیا جاتا مگر اس کی ممانعت اس لئے نہیں کی گئی کہ یہ تکلیف مالایطاق تھی انسان پیشاب پاخانہ کے تقاضے کو نہیں روک سکتا اگر اس سے بھی ممانعت ہو جاتی تو انبیٹھ کے ایک پورانے مولوی صاحب کی مریدنیوں

کا سارا روزہ ہو جاتا اور ان کا خدا جانے کہاں سے یہ اعتقاد تھا کہ روزہ پائخانہ پیشاب کرنے سے بھی ٹوٹ جاتا ہے تو یہ مریدنیاں دن بھر ان کاموں سے رُکی رہتی تھیں مگر بُرا حال ہوتا تھا، پھر افطار کے وقت دوسرے تو کھانے پینے پر گرتے تھے اور وہ مریدنیا لوٹا لیکر پائخانہ کو بھاگتی تھیں ان کا روزہ پیشاب کرنے سے افطار ہوتا تھا اس وجہ سے استنجے کی ممانعت نہ ہوئی اکل و شرب و وقاع سے ممانعت ہو گئی نیز روزہ میں ایک اور نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ دن بھر تو شان تنزیہ و استغنا کا ظہور ہوتا ہے اور افطار کے وقت شان عبدیت و افتقار کا کامل ظہور ہوتا ہے اذان ہوتے ہی کیسے کھانے پینے پر گرتے ہیں اس سے بندہ کو اپنا محتاج ہونا معلوم ہو جاتا ہے پھر احتیاج کے ساتھ بندہ کے ایک نقص کا ظہور ہوتا ہے اس طرح کہ اکل و شرب کے لئے عادۃً لازم بول و براز پس ملزوم سے لازم کی طرف ذہن منتقل ہو کر عبدیت کے اس نقص کا استحضار ہو جاتا ہے جیسے بعض مفسرین نے اسی استلزام و انتقال ذہن کی بنا پر کانا یاکلان الطعام کی تفسیر میں کہا ہے اے وکانا یبولان و یبرزان ایضاً یعنی نصاریٰ نے جو عیسیٰ علیہ السلام و مریم علیہا السلام کو خدا کا بیٹا و خدا کی بیوی بنا رکھا ہے حق تعالےٰ اس کا رد فرماتے ہیں کہ وہ دونوں تو خدا کے مقبول بندے تھے خدا ہرگز نہ تھے چنانچہ دونوں کھایا پیا کرتے تھے۔ یہ مفسرین کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہگتے موتتے بھی تھے اور جو شخص ہگتا موتتا ہو اس سے زیادہ محتاج کون ہو گا لیکن حق تعالےٰ نے تہذیب کی پوری رعایت فرمائی ہے کہ ملزوم پر اکتفا کر کے لازم کی طرف اشارہ فرما دیا کیونکہ اس کو تو عقلاً خود ہی سمجھ جاویں گے کیونکہ جو کھائے پئے گا وہ ہگے موتے گا بھی ضرور اس لئے کان یبولان و یبرزان صراحۃً نہیں فرمایا تاکہ کلام میں تہذیب کی رعایت رہے اور بعض لوگوں نے کانا یاکلان الطعام کی دوسری تفسیر کی ہے وہ بے تکلف ہے اس کا حاصل وہی ہے جو اس قطعہ کا ہے ؂

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

رباد ل اور ہوا اور آفتاب و آسمان سب اپنے کام میں لگے ہیں تاکہ تو جب روٹی
ہاتھ میں لیوے تو غفلت سے نہ کھالیوے بلکہ سوچے کہ اس روٹی کے انتظام
میں بادل اور ہوا اور سورج اور آسمان کے خدمات بھی شامل ہیں)

یعنی جو شخص کھانے کا محتاج ہے وہ سیکڑوں ہزاروں چیزوں کا محتاج ہے کیونکہ طعام کے لئے زمین کی ضرورت، بیلوں کی ضرورت، بیج کی ضرورت، کمیروں بالدیوں کی ضرورت، پھر آفتاب اور چاند کی ضرورت کیونکہ پیدا وار بدون تمازت آفتاب و نور قمر کے نہیں ہوسکتی۔ پھر بارش کی ضرورت پھر کھیتی پکنے کے لئے دھوپ کی ضرورت، پھر کھیتی کٹنے کے بعد جب غلہ گاہتے ہیں تو بھوسہ اور غلہ کو الگ کرنے کے لئے ہوا کی ضرورت، پھر جب غلہ گھر میں آگیا تو پیسنے والے اور پکانے والے کی ضرورت، پھر ہل وغیرہ بنانے کے لئے لوہار اور بڑھئی کی ضرورت۔ غرض ایک روٹی کے لئے سیکڑوں ہی سامان کی احتیاج ہے تو جو شخص کھانے کا محتاج ہے حقیقت میں اس سے زیادہ محتاج کوئی نہیں اور عیسیٰ اور مریم علیہما السلام دونوں کھانے کے محتاج تھے تو پھر ایسے سراپا احتیاج خدا یا خدا کے بیٹے اور بیوی کیونکر ہوسکتے ہیں خدا میں اور ان میں مناسبت ہی کیا وہ سراپا غنا یہ سراپا احتیاج اور اولاد کو باپ سے اور بیوی کو شوہر سے مناسبت ہونا ضرور یہاں کچھ بھی مناسبت نہیں۔ پھر نصاریٰ کی حماقت ہی نہیں جو ان کو عبدیت سے بڑھا کر الوہیت تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ حاصل ہے دوسری تفسیر کا واللہ اعلم۔

غرض روزہ میں شان تنزیہ کا کامل ظہور ہے اس لئے جن چیزوں کے ترک کو تنزیہ میں دخل تھا ان سے روزہ میں روک دیا گیا جس سے روکنا ہوا اسی واسطے جماع سے بھی روک دیا گیا کہ ترک جماع کو بھی تنزیہ میں دخل ہے۔ اب یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے وہ یہ کہ معاصی کا ارتکاب بھی تو تنزیہ کے خلاف ہے تو چاہیئے کہ ان سے بھی روزہ فاسد ہوجاوے کیونکہ ان سے شان تنزیہ فوت ہوگئی حالانکہ

بجز اکل و شرب و وقاع کے اور کسی فعل کو مفسد صوم نہیں کہا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ تنزیہ کا حال استغنا ہے اس کے خلاف وہ افعال ہوں گے جن میں احتیاج کی شان ظاہر ہے اور وہ انہی افعال ثلثہ میں ہے۔ اور دوسری معاصی گو قبح میں اشد ہوں مگر ان میں احتیاج کی شان اتنی زیادہ نہیں بلکہ اگر ہے تو کبر کی شان ہے چنانچہ احکام خداوندی کی سرکشی سے بڑھ کر کیا کبر ہوگا اس لئے جن گناہوں میں اکل و شرب و جماع نہ پایا جائے ان سے بچنا روزہ کا جزو اور رکن نہیں یعنی ان سے روزہ باطل بھی نہیں ہوتا گو عذاب سخت ہو کیونکہ ان سے بچنے کو تنزیہ میں (جو کہ تخلق باخلاق اللہ ہے) کوئی دخل نہیں اور روزہ نام ہے تخلق باخلاق اللہ کا اور یہی معنے ہیں حدیث الصوم لی وانا اجزی بہ کے کہ روزہ میرے لئے ہے اور اس کی جزا میں خود دوں گا اہل ظاہر نے اس کی شرح میں یہ کہا ہے کہ روزے میں خلوص زیادہ ہے (اس میں ریا نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی حقیقت ترک ہے جو کہ عدمی ہے اور ریا وجودی میں ہوا کرتی ہے اس لئے اس کو لی فرمایا ہے یعنی اس کو میرے ساتھ خاص خصوصیت ہے بوجہ اس کے کہ اس میں غیر اللہ کے دکھلانے کی گنجائش نہیں مگر عارفین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ روزہ میں شان تنزیہ ہے اس میں تشبہ بحق و تخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے اس سے خدا تعالے کے ساتھ مناسبت ہو جاتی ہے لی کی یہ تفسیر کی ہے اور یہاں سے تفسیر ہوگئی میرے ایک خواب کی بچپن کا خواب ہے۔ میں نے خواب دیکھا کہ کسی نے مجھ سے سوال کیا کہ اس کے کیا معنے ہیں کہ روزہ اللہ کا اور نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ میں نے جواب دیا کہ روزہ میں تنزیہ کے سبب حق تعالے کے ساتھ زیادہ تشبہ ہے اس لئے اس کو اللہ کا کہا جاتا ہے۔ اور نماز میں شان عبدیت کا ظہور ہے اور عبدیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے اس لئے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تشبہ ہے اس جواب کی تصدیق کی گئی غرض یہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے سے اس کا مجاہدہ ہونا معلوم ہوتا ہے میں نے بتلا دیا

کہ اس کا سبب مجاہدہ ہونا نہیں ہے بلکہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے کا سبب اور ہے یہ سب تتمہ تھا سابق کا جو مقصود سے بھی غالباً لمبا ہے جیسے مور کی دم مور سے لمبی ہوتی ہے مگر بدنما نہیں ہوتی اس کی یہاں تک قدر ہوتی ہے کہ اس کے پر قرآن میں رکھے جاتے ہیں، اسی طرح یہ تتمہ بھی گو لمبا ہے مگر بدنما نہیں بلکہ خوشنما ہے اب میں مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں، وہ یہ کہ تیسرا رکن مجاہدہ کا تقلیل کلام ہے اور یہ تقلیل طعام و تقلیل منام سے بھی زیادہ دشوار ہے کیونکہ کھانے میں کچھ اہتمام تو کرنا پڑتا ہے۔ طعام کو تیار کرنا پڑتا ہے پھر منہ چلانا پڑتا ہے پھر ہضم کی فکر ہوتی ہے کبھی کچھ چورن وغیرہ کھانا بھی پڑتا ہے تقلیل میں ان سب امور کی تخفیف ہے پھر کیا دشوار ہے ایک دو دفعہ زیادہ کھائیگا پھر کہاں تک کھائے گا جب ہضم نہ ہوگا تو خود ہی تقلیل طعام ہو جائے گا بخلاف بولنے کے کہ اس میں کچھ اہتمام ہی کرنا نہیں پڑتا نہ زیادہ بولنے سے بدہضمی ہوتی ہے اس لئے اس کی تقلیل کا کوئی قوی داعی نہیں اسی طرح سونا ہے تو اس میں کبھی تقلیل ہو گی آخر کہاں تک سوئے گا کبھی تو جاگے گا بخلاف اس زبان کے چرخہ کے کہ اس کی کہیں انتہا ہی نہیں یہ چرخہ چلنے سے تھکتا ہی نہیں کیونکہ اس کے لئے کچھ اہتمام کرنا ہی نہیں پڑتا نہ زبان چلانے سے کچھ تعب ہوتا ہے دوسرا راز یہ ہے کہ انسان جس قدر حظوظ اختیار کرتا ہے لذت کے لئے اختیار کرتا ہے سو کلام کے سوا دوسرے جس قدر حظوظ ہیں ان میں کرنے سے لذت کم ہو جاتی ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد پھر کھانے میں مزا نہیں آتا نیند بھر جانے کے بعد پھر سونے میں لذت نہیں آتی بلکہ سونے سے جی گھبرا جاتا ہے مگر بولنے کی لذت ختم نہیں ہوتی بلکہ جتنا بولتے جاؤ اتنی ہی لذت بڑھتی جاتی ہے اس لئے تقلیل کلام سب سے زیادہ دشوار ہے مگر باوجود دشواری کے اس میں آزادی اس لئے نہیں دی گئی کہ زیادہ بولنے میں آفات بہت ہیں اور اس سے گناہوں میں ابتلا بکثرت ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تقلیل کو مجاہدہ کا ایک رکن قرار دیا گیا لیکن تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ ضروری باتوں کو بھی کم کر دے بلکہ مطلب

یہ ہے کہ فضول کلام چھوڑ دے گو مباح ہی ہو باقی جو باتیں حرام ہیں جیسے جھوٹ اور غیبت وبہتان وغیرہ وہ تو اس سے خود ہی چھوٹ جائیں گے کیونکہ وہ تو مجاہدہ حقیقیہ ہے جو شخص مجاہدہ حکمیہ کرے گا وہ مجاہدہ حقیقیہ کو کیسے ترک کرسکتا ہے رہا ضروری کلام سو اس کا ترک کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے یا ضروریات میں حرج یا مخاطب کو تکلیف ہوگی بعض لوگ غلو کے سبب ضروری کلام میں بھی تقلیل کرتے ہیں کوئی بات پوچھے تو پورا جواب ہی نہیں دیتے بس آدھی بات منہ میں ہوتی ہے اور آدھی پیٹ میں اور وظیفے کے اندر تو بولنا حرام ہی سمجھتے ہیں خواہ کوئی کیسی ہی ضروری بات ہو مگر یہ ایسی چپ سادھ کر بیٹھتے ہیں کہ جواب ہی نہیں دیتے بس ہوں ہوں کئے جاتے ہیں نہ معلوم اس سے کیا مراد ہے ہمارے علم میں تو چھوٹے بچے ہگنے موتنے کو بتلانے کے واسطے ہوں ہوں کیا کرتے ہیں جب ان کو پیشاب یا پاخانہ کا تقاضا ہوتا ہے اس وقت ایسے اشارے کیا کرتے ہیں شریعت مقدسہ نے ضروری کلام کے واسطے نماز تک قطع کرنے کا حکم دیا ہے مثلاً کوئی اندھا جارہا ہو اور اس کے سامنے گڑھا ہو جس میں اس کے گرنے کا اندیشہ ہے تو اگر تم نماز بھی پڑھ رہے ہو تب بھی واجب ہے کہ اندھے کو گرنے سے بچاؤ نماز کو توڑ دو اور اس سے کہو کہ ذرا بچ کر چلے آگے گڑھا ہے ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است　　　اگر خاموش بنشینم گناہ است

(اگر دیکھوں کہ نابینا کے سامنے کنواں ہے پھر بھی خاموش رہوں اور نہ بتاؤں تو گناہ ہے)

ایسے وقت میں خاموشی گناہ ہے بلکہ نماز توڑ کر نابینا کو گڑھے میں گرنے سے بچانا واجب ہے مگر آج کل کے وظیفچی نماز کو تو چاہے توڑ دیں مگر وظیفے کو نہیں توڑ سکتے اس میں بات کرنے کی مجال نہیں چاہے کسی پر کچھ ہی آبنے اللہ بچائے ایسے وظیفوں سے آجکل وظیفوں کے ساتھ قرآن سے بھی زیادہ ادب کا معاملہ کیا جاتا ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو دنیا کی ہزار باتیں کرلیں اور وظیفہ پڑھتے ہوئے دین کی بھی ضروری

بات نہ کریں۔ شریعت نے ضرورت کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر بلی کتے سے تمہارا نقصان چار آنے سے زیادہ کا ہوتا ہے تو نماز کو توڑ کر اپنے مال کی حفاظت کرلو شریعت پر چلنے والا کہیں نہیں اٹک سکتا اس کو قدم قدم پر شریعت کی وسعت کا اندازہ ہوتا رہتا ہے اور کیوں نہ ہو شریعت کا دعوے ہے ما جعل علیکم فی الدین من حرج کہ خدا نے تمہارے اوپر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی نفی الحرج میرا ایک وعظ ہے جو الہ آباد میں ہوا تھا اور پہلے اس کے تمام ہونے کے لئے دعا بھی کرائی تھی اب وہ پورا ہو چلا ہے اور مطبع والے کہتے ہیں کہ جلدی طبع ہو جائے گا وہ اس مضمون میں بہت ہی کافی ہے امید ہے کہ اب وہ جلدی طبع ہو جائے گا یہ وعظ مولوی سعید احمد مرحوم کا ضبط کیا ہوا ہے مگر تسوید تفصیلی کا ان کو موقع نہیں ملا دوسرے لوگوں نے صاف کیا ہے مرحوم کے اشارے بھی بہت کافی ہوتے ہیں اس لئے کام چل گیا ورنہ صاف کرنے والے نے تو محض پنسل پر سیاہی پھیر دی ہے تفصیل کچھ نہیں کی غرض شریعت میں تنگی بالکل نہیں ہے اسی لئے ضروری کلام کا ترک کرنا ممنوع ہے کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کو ایذا اور پریشانی ہوتی ہے اور شریعت مخلوق کو تکلیف سے بچانا چاہتی ہے اسی لئے حکم ہے کہ اگر بیٹا نفل نماز پڑھ رہا ہو اور والدین میں سے کوئی پکارے تو دیکھے کہ ان کو اس کا نماز میں ہونا معلوم ہے یا نہیں اگر انھیں معلوم ہے کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے اور پھر بھی پکار رہے ہیں تو نہ بولے کیونکہ جان کر پکارنا ان کی شرارت ہے اور اگر ان کو معلوم نہیں کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے تو بول پڑے اور نماز کا بعد میں اعادہ کرلے یہ مسئلہ فقہاء نے حدیث سے سمجھا ہے۔ واقعی دو فرقے امت کے لئے رحمت ہیں ایک فقہا دوسرے صوفیہ فقہا نے اس مسئلہ کو حدیث جریج سے مستنبط کیا ہے۔ جریج بنی اسرائیل کا ایک عابد تھا۔ ایک دفعہ یہ اپنے صومعہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی ماں کسی ضرورت سے آئی اور اس نے صومعہ کے نیچے کھڑے ہو کر آواز دی جریج جریج۔ یہ نماز پڑھ رہا تھا اس نے دل میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ میں نماز میں ہوں اور میری ماں پکار رہی ہے یعنی

ہیں جواب دینے سے معذور ہوں غرض نماز میں مشغول رہا۔ اُس نے پھر آواز دی جریج نے پھر وہی کہا اللھم امی وصلاتی اور بدستور نماز میں مشغول رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کو بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں لو کان فقیھا لاجاب امہ اگر جریج فقیہہ ہوتا تو اپنی ماں کے پکارنے کا جواب دے دیتا اس سے فقہائنے سمجھا ہے کہ والدین کے پکارنے پر نماز میں بول پڑنا جائز ہے بشرطیکہ ان کو اس کا نماز میں ہونا معلوم نہ ہو یہ قید دوسرے دلائل کی وجہ سے بڑھائی گئی جریج کی ماں نے اس موقعہ پر اپنے بیٹے کو کوسا بھی تھا جب اس نے کئی آوازیں دیں اور یہ نہ بولا تو اس نے بددعا دی اللھم لا تمتہ حتی تریہ وجوہ المومسات یعنی خداوندا اسے اس وقت تک موت نہ دیجو جب تک یہ کسی فاحشہ کا منہ نہ دیکھ لے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دینداری بہت ہی زیادہ تھی کہ رنڈی کا منہ دیکھنا اس زمانہ میں بددعا اور کوسنے میں بیان کیا جاتا تھا گویا غیر عورت کا منہ دیکھنا مردوں کے لئے بہت ہی بڑا عیب سمجھا جاتا تھا جبھی تو اس کو کوسنے میں بیان کیا اور آجکل منہ دیکھنا تو کیسا اس سے منہ کالا کرنا بھی عیب نہیں سمجھا جاتا اسی لئے عورتوں میں مشہور ہے کہ مرد تانبہ ہے اور عورت موتی ہے۔ تانبہ تو دس مرتبہ سیاہ ہو جائے تو قلعی سے پھر ویسا کا ویسا ہی ہو جاتا ہے اور موتی کی ایک دفعہ آب جاتی رہے تو پھر کسی طرح اس میں آب پیدا نہیں ہو سکتی مطلب یہ ہے کہ مرد تو غیر عورت سے چاہے کتنی دفعہ منہ کالا کرلے چند دن کے بعد جب بات رفع دفع ہو جاتی ہے پھر ویسا کا ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ اور عورت اگر غیر مرد کے سامنے ایک دفعہ آجائے تو پھر ساری عمر کو اس کی آبرو برباد ہو جاتی ہے عمر بھر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ کلام غلط ہے۔ آج کل بے حیائی بڑھ گئی ہے اس لئے مردوں میں غیر عورت کے پاس جانا کوئی عیب نہیں رہا اگر حیا ہوتی تو مرد بھی عورت کے طرح ایک دفعہ بے حیائی کا کام کر کے عمر بھر کو منہ دکھلانے کے قابل نہ رہتا پس حقیقت میں مرد و عورت دونوں کی آبرو موتی ہی جیسی ہے مگر

بے حیائی کے غلبہ نے مردوں کو تانبہ بنادیا ہے اور اگر یہی حال بے حیائی کا
رہا تو چند دنوں میں عورتیں بھی موتی نہ رہیں گی وہ بھی مردوں کی طرح تانبہ ہوجائیں گی
چنانچہ ایسے قصے ہونے لگے ہیں کہ مرد نے بیوی کو تین طلاق کے بعد پھر گھر میں ڈال
لیا اور وہ خوشی خوشی اس کے گھر میں رہتی ہے اور بے حیائی کو گوارا کرتی ہے
اور پھر خاصہ منہ لے کر برادری کے سامنے آتی ہے اور برادری کی عورتیں اس سے
اسی طرح ملتی ہیں جس طرح تین طلاق سے پہلے ملتی تھیں کچھ ٹھکانا ہے اس بے حیائی کا
(اگر یہی حال رہا تو کچھ دنوں میں کھلم کھلا بدکاری کرنے کے بعد بھی عورت مرد کے
گھر میں خاصی طرح رہا کرے گی اور کوئی بھی اس کی بدکاری پر التفات نہ کرے گا
کیونکہ تین طلاق کے بعد شوہر کے پاس رہنے میں اور بدکاری میں فرق ہی کیا ہے
اللہ بچائے اس فتنہ سے ۱۲ جامع) غرض جریح کی ماں نے اس کو یہ کوسنا دیا کہ
خدا اسے موت سے پہلے فاحشہ عورت سے پالا ڈالے بددعا قبول ہوگئی اور ایک
فاحشہ عورت جریح کے پیچھے پڑی اور اس کے صومعہ میں آکر بدکاری پر اسے
برانگیختہ کرنا چاہا یہ شخص متقی تھا اس نے دھکا کر اسے نکال دیا اس نے کہا کہ میں
تجھ کو بدنام کر کے رہوں گی بڑا متقی بنا ہے۔ چنانچہ جنگل کے کسی چرواہے سے اس نے
منہ کالا کیا جس سے حمل رہ گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو لوگوں نے پوچھا یہ بچہ کس کے
زنا سے ہوا۔ اسنے جریح کا نام لے دیا۔ پس اب لوگ کہاں تھے بلا تحقیق گمان
پکا لیا اور جریح کے صومعہ پر جا چڑھے اور لگے اس کو ڈھانے جریح اندر سے نکلا
اور لوگوں سے کہا کہ میرے صومعہ کو کیوں گراتے ہو کہا کمبخت تو اس قابل نہیں کہ
صومعہ میں رہے تو زناکار بدکار ہے اور ظاہر میں متقی بنا ہوا ہے اس نے پوچھا کہ
آخر تم سے کس نے کہا کہ میں زانی ہوں لوگوں نے اس عورت کو معہ بچہ کے پیش کیا
کہ دیکھ یہ عورت کیا کہتی ہے کہ تو نے اس سے زنا کیا اور یہ بچہ تیرے زنا کا ہے
جریح نے کہا ذرا ٹھہرو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے اس کے بعد اس نے وضو کیا اور
دو رکعت نماز پڑھی پھر اس بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا اے بچہ خدا کے حکم سے

بول اور بتلا کہ تیرا باپ کون ہے خدا تعالیٰ نے بچہ کو گویائی عطا فرمائی اس نے کہا کہ میرا باپ فلاں چرواہا ہے۔ اب تو سب کو یقین ہو گیا کہ یہ عورت جھوٹی ہے اور اس نے چرواہے سے منہ کالا کر کے جھوٹ موٹ جریج کا نام لیا ہے۔ اتنی بڑی کرامت کے بعد کیا شبہ ہو سکتا تھا پس سب کے سب جریج کے قدموں پر گر پڑے کہ ہماری خطا معاف کرو ہم نے بلا تحقیق تم کو متہم کیا اور اب ہم تمہارا صومعہ سونے کی اینٹوں سے بنادیں گے۔ اس نے کہا نہیں جیسا پہلے تھا تم ویسا ہی بنا دو غنیمت ہوا کہ جریج کی ماں نے اتنی ہی بددعا کی تھی کہ خدا اسے رنڈی کا منہ دکھا دے آگے اور کچھ نہ کہا تھا تو جریج نے رنڈی کا منہ ہی دیکھا اور کچھ نہ ہوا اس لئے والدین کی بددعا سے ڈرتا چاہیئے مگر ناحق کی بددعا نہیں لگتی اور یہاں جو ام جریج کی بددعا لگ گئی تو وہ ناحق بددعا نہ تھی بلکہ جریج کے نہ بولنے سے اس کو ایذا ہوئی اور اس ایذا میں جریج کے فعل کو بھی دخل تھا کہ اس نے بے موقعہ سکوت کیا گو وہ بوجہ جہل کے اس سکوت میں معذور رہو مگر نفس جہل خود ایک جرم ہے اس لئے بددعا لگ گئی اور اس کی معذوری کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ جلدی ہی برأت ہو گئی اور جن کو سوء عقیدت ہوئی تھی ان کو پھر حسن عقیدت ہو گئی اور یہاں سے ایک بات بھی ثابت ہو گئی جس کو ہمارے اُستاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ عوام کے اعتقاد کا بھی کچھ اعتبار نہیں بیوقوف آدمی خواہ مخواہ لوگوں کے اعتقاد سے خوش ہوتا ہے کہ میرے اتنے معتقد ہیں ان عوام کے اعتقاد کی ایسی مثال ہے جیسے گدھے کا خاص عضو کہ کبھی تو اتنا بڑھتا ہے جس کی حد نہیں اور کبھی ایسا غائب ہوتا ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ گدھا ہے یا گدھی، چنانچہ عوام نے محض ایک فاحشہ کے قول پر بلا دلیل جریج کے صومعہ کو ڈھانا شروع کر دیا۔ مدت دراز کا اعتقاد ذرا سی بات میں بالکل غائب ہو گیا اور جب اس کی کرامت سے بچہ بول پڑا تو پھر ایسے معتقد ہوئے کہ اس کا صومعہ سونے کی اینٹوں سے بنانے پر تیار ہو گئے اس لئے عوام کے اعتقاد کا کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے بلکہ معیار کسی کی حقیقت کمال کا

یہ ہے کہ اہل نظر اس کے کمال کے معتقد ہوں صائب نے خوب کہا ہے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہرِ خود را عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اے شخص اپنے موتی کو کسی اہل نظر کو دکھا چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہوسکتا)

غرض شریعت نے ضرورت کی اتنی رعایت کی ہے کہ ضرورت کے وقت نفل نماز توڑنے کی توسع کی ساتھ اجازت ہے اور بعض شرائط کے ساتھ فرض نماز توڑنے کی بھی اجازت ہے جیسے اندھے کے گرنے کا اندیشہ ہو اس لئے تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی ضروری باتیں بھی نہ کیا کرے لیکن ضرورت کی تفسیر سمجھ لینی چاہئے کہیں آپ سب باتوں کو ضرورت ہی میں نہ داخل کرلیں بعضے ایسے وہمی بھی ہیں جن کو یہ سن کر کہ یہ ضروری باتوں کو ترک نہ کرنا چاہیئے بات بات میں ضرورت کا وہم پیدا ہوگا کہ یہ بات بھی ضروری معلوم ہوتی ہے پھر ان کے نزدیک غیر ضروری بات کوئی بھی نہ رہے گی تو ضرورت کی تفسیر سنئے (اور یہ جواہرات کا ٹکڑا ہے، اس کی قدر کرو کتابوں میں سر مارنے سے یہ جواہرات نہ ملیں گے) ضرورت کی تفسیر یہ ہے لو لاہ لتضرر (یعنی جس کے نہ ہونے سے ضرر ہو پس جس بات کے ترک سے دنیا کا یا دین کا ضرر ہو وہ بات ضروری ہے مثلاً ایک شخص تاجر ہے اس کے پاس کوئی خریدار آئے اور گھنٹہ بھر تک چیزوں کی قیمت دریافت کرتا رہے اور تاجر کو امید ہے کہ یہ ضرور کچھ خریدے گا تو جب تک یہ امید ہو اس وقت تک خریدار سے باتیں کرنا ضرورت میں داخل ہے کیونکہ اس صورت میں خریدار سے باتیں نہ کرنے میں دنیا کا ضرر ہے تجارت کو نقصان پہونچے گا اس لئے شریعت اجازت دیتی ہے کہ وہ دو گھنٹے بھی تجارت کی باتیں کرے تو تم اس سے باتیں کرتے رہو ہاں سچی باتیں کرو جھوٹ اور مبالغہ سے کام نہ لو کہ خواہ مخواہ اپنے مال کی حد سے زیادہ تعریف کرو تو یہ سب باتیں ضرورت میں داخل ہیں اس سے قلب میں ذرہ برابر ظلمت نہیں ہوتی یا کوئی شخص آپ سے ملنے آیا اس سے باتیں کرنا

مزاج پوچھنا اور یہ دریافت کرنا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں مکان سے کب چلے تھے یہاں کب تک قیام رہے گا یہ بھی ضرورت میں داخل ہے۔ بعض خشک زاہدان باتوں کو فضول سمجھتے ہیں مگر یہ لوگ فقیہ نہیں یہاں سے معلوم ہوا کہ اس بات کا سمجھنا کہ کس بات کے ترک سے ضرر ہوتا ہے اور کس کے ترک سے ضرر نہیں ہوتا یہ بھی فقہا ہی کا کام ہے فقیہ کہتا ہے کہ اس صورت میں مہمان سے اس قسم کی باتیں کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ سوال نہ کرنے سے اس کی دل شکنی ہوگی دل ٹوٹے گا کہ میری بات بھی نہ پوچھی اور مسلمان کا دل سنبھالنا بھی شرع میں مقصود ہے غرض ضرر کے مواقع فقہا کے طرز پر میں کہاں تک بیان کروں اس کے لئے تو بڑے وسیع وقت کی ضرورت ہے اور پھر بھی جزئیات کا احاطہ نہ ہو سکے گا کلیات میں نے بیان کر دیئے ہیں جزئیات کو تم خود نکال لو اور جن میں اس کا مادہ بالکل نہیں وہ علماء سے مل کر پوچھتے رہیں، اور بھی کچھ نہ کر سکیں تو کم از کم ان گناہوں سے تو بچتے رہیں جو زبان کے متعلق ہیں چاہے دقائق کی رعایت نہ کریں اور دقائق کی رعایت عوام تو کیا کریں گے علماء بھی خاص خاص ہی ان باتوں کو سمجھتے ہیں کہ کہاں ترک کلام سے ضرر ہوتا ہے کہاں ضرر نہیں ہوتا مگر جو باتیں گناہ کی ہیں وہ تو سب کو معلوم ہو سکتی ہیں ان کا ترک تو سب پر ضروری ہے اس ذراسی جبیا میں (جیب یعنی زبان کی تصغیر ۱۲) بیس آفات ہیں جن کو امام غزالی نے احیاء میں بیان کیا ہے اور آجکل احیاء کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے، اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے اگر اس کو طویل سمجھا جاوے تو کیمیائے سعادت کا ترجمہ اکسیر ہدایت بہت اچھی کتاب ہے اسی کا مطالعہ کر لو تو زبان کی آفات معلوم ہوں گی پس عوام کے لئے تو تقلیل کلام میں یہ درجہ کافی ہے کہ وہ زبان کے گناہوں سے بچتے رہیں۔ اور جو خواص ہیں ان کو ضرورت والے ضرورت کا لحاظ بھی کرنا چاہیئے کیونکہ مجاہدہ بدون اس کے کامل نہیں ہو سکتا یہ تو تقلیل کلام کی حقیقت پر گفتگو تھی اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ روزہ میں تقلیل کلام کی کس طرح رعایت کی گئی ہے

تقلیل کلام کی ایک صورت تو یہ ہے کہ زبان کو بند کرلیا جائے روزہ میں کسی سے
بات ہی نہ کی جائے یہ طریقہ ہماری شریعت میں نہیں ہے۔ پہلی شریعتوں میں صوم
سکوت مشروع تھا جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے فاما ترین من البشر
احداً فقولی انی نذرت للرحمٰن صوما فلن اکلم الیوم انسیا مگر شریعت محمدیہ
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کر دیا اب روزے میں بالکل بات نہ کرنا
مکروہ ہے بلکہ ضرورت کے موقع پر بات کرنی چاہیئے کیونکہ میں پہلے بیان کر چکا
ہوں کہ ضرورت کے وقت بات نہ کرنے سے حرج یا لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اس
لئے شریعت اسلامیہ نے صوم سکوت کو مشروع نہیں کیا کیونکہ روزے کا وقت
ممتد ہے اتنے طویل سکوت سے دنیوی کاروبار بھی بند ہو جاویں گے اور بہت
سے ضروری کاموں میں خلل پڑے گا دین کے کام بھی مثل وعظ و تبلیغ وغیرہ کے
بند ہو جائیں گے۔ ہاں نماز میں سکوت مشروع ہے مگر نماز تھوڑی دیر کی عبادت ہے
فرض نمازیں تو پانچ منٹ میں ختم ہو جاتی ہیں اور نوافل میں بھی کچھ زیادہ دیر نہیں
لگتی پھر نوافل ہمارے اختیار میں ہیں جس کو ضرر کا اندیشہ ہو وہ نوافل میں مشغول نہ
ہو۔ غرض نماز میں تھوڑی دیر کا سکوت ہے اس سے ضرر نہیں ہو سکتا اتنی دیر تو
آدمی ویسے بھی خاموش رہا کرتا ہے البتہ روزے میں سکوت مشروع ہوتا تو اس سے
دنیوی کاروبار میں بہت حرج واقع ہوتا اس لئے شریعت نے ہمارے حال پر
رحم کر کے صوم سکوت کو منسوخ کر دیا۔ مگر ایک دوسرے طریقے سے روزے میں
تقلیل کلام کی رعایت کی گئی ہے اس لئے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لینا چاہیئے وہ یہ کہ
قاعدہ ہے کہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا' اسی طرح زبان بھی ایک
وقت میں دو قسم کی باتیں نہیں کر سکتی۔ مثلاً جو شخص کتاب پڑھ رہا ہو وہ کتاب پڑھتے
ہوئے بات نہیں کر سکتا اگر بات کرے گا تو اس وقت کتاب نہ پڑھے گا تو شریعت نے
روزے میں کلام کو تو ممنوع نہیں کیا لیکن نفس اور زبان کو دوسرے کام کی طرف متوجہ
کر دیا اس طرح کہ روزے میں تلاوت قرآن کا اور ایام سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے

چنانچہ تراویح میں ایک قرآن ختم کرنا جبکہ کوئی عذر نہ ہو حسب قول مشہور سنت موکدہ کر دیا گیا جس کی وجہ سے حفاظ کو خواہ مخواہ دن میں کئی مرتبہ سپارہ پڑھنا پڑتا ہے اور دور بھی کرنا پڑتا ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں خود تلاوت قرآن کا اور دنوں سے زیادہ اہتمام فرما کر چنانچہ حدیثوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ بالالتزام دور فرمانا مصرح ہے سب مسلمانوں کو عملاً اس کی ترغیب دی ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن زیادہ کریں خواہ وہ حافظ ہوں یا نہ ہوں تراویح میں قرآن سنادیں یا نہ سنادیں پھر آپ کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور یہ بھی ارشاد ہے کہ رمضان میں نفل طاعت کا ثواب فرض کے برابر ملتا ہے تو اب رمضان میں تلاوت قرآن کرنے سے ایک ایک حرف پر جو دس نیکیاں ملیں گی ان میں ہر نیکی پر فرض کام کے برابر ثواب ملے گا۔ اللہ اکبر کچھ ٹھکانا ہے اس ثواب کا اس سے بھی لوگوں کو خواہ مخواہ تلاوت کی رغبت زیادہ ہوگی۔ غرض رمضان میں تلاوت قرآن کا شریعت نے بہت ہی اہتمام کیا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ نزول قرآن آسمان اول پر رمضان ہی کے مہینے میں ہوا ہے پھر وہاں سے تدریجاً تیئس (۲۳) سال میں نازل ہوا تو اس ماہ کو قرآن کے ساتھ خاص تعلق ہے جو دوسرے ایام کو نہیں یہی وجہ ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن بالمشاہدہ اور دنوں سے زیادہ آسان بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب انسان تلاوت قرآن میں مشغول ہوگا تو لامحالہ دنیوی باتوں میں تقلیل ہوگی کیونکہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تو تلاوت قرآن کے وقت اگر توجہ کے ساتھ تلاوت ہو دوسری باتوں کا خیال بھی نہ آئے گا ورنہ زبان تو جب تک اس میں مشغول رہے گی اس وقت تک دنیوی باتوں سے رکی رہے گی اس طرح سے تلاوت قرآن کے ضمن میں تقلیل کلام ہو جائے گی۔ پھر محض یہی نہیں کہ تقلیل کلام کا مجاہدہ حاصل ہو گیا اور کوئی نفع حاصل نہ ہو بلکہ اس میں ثواب بھی اتنا ہوتا ہے کہ کسی طاعت میں اتنا ثواب نہیں کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور رمضان میں وہ دس نیکیاں دس فرض کے برابر ہوتی ہیں یہ تو عام ثواب ہے اور جو کوئی زیادہ

مخلص ہو تو اس کو ایک حرف پر سات سو نیکیاں تک ملتی ہیں بلکہ واللہ یضاعف لمن یشاء یعنی سات سو پر بھی انتہا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں۔ اب بتلایئے اگر شریعت بھی تقلیل کلام کی وہی صورت تجویز کرتی جو اہل ریاضت میں مستعمل ہے کہ بس زبان کو گوند لگا دیا جائے اور بالکل خاموش بیٹھے رہا کریں تو یہ دولت بے شمار کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ شریعت کے قربان جایئے کہ اس نے مجاہدہ تقلیل کلام کی وہ صورت تجویز کی جس سے اس مجاہدہ کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے کہ زبان گناہوں سے بچی رہے فضول باتیں کرنے کی عادت کم ہو جائے اور اس کے ساتھ ثواب بھی بے شمار ملتا رہے اور ثواب ہی پر بس نہیں بلکہ تلاوت قرآن میں بندے کو حق تعالیٰ کا ایک خاص قرب بھی حاصل ہوتا ہے جو خاموش رہنے میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن میں ایک خاص تجلی ہے جب اس کا ظہور قلب پر ہوتا ہے تو دل میں حق سبحانہ کے سوا کسی کی گنجائش نہیں رہتی قلب عظمت حق سے پُر ہو جاتا ہے بس وہ حال ہوتا ہے ؎

چو سلطان عزت علم بر کشد جہاں سر بجیب عدم در کشد

(جب وہ سلطان عزت جھنڈا بلند کرتا ہے تو یہ کائنات تمام عدم کے جیب میں سر ڈال دیتی ہے)

پھر ان باطنی دولتوں کے ساتھ قرآن میں ایک ظاہری لذت بھی ہے جس کی وجہ سے کثرت تلاوت قرآن آسان ہو گئی اگر ذرا سا بھی ذوق ہو تو قرآن سے زیادہ کوئی کلام لذیذ نہیں اس میں وہ لذت ہے کہ جتنا پڑھتے جاؤ لذت بڑھتی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ کثرت تلاوت سے جی نہیں گھبراتا۔ بعض خدا کے بندے روزانہ ایک ختم کرتے ہیں اگر قرآن میں یہ لذت نہ ہوتی تو بھلا روزانہ ایک ختم ہو سکتا تھا ہرگز نہیں بعضے دو دن میں ایک ختم کرتے ہیں بعضے دس پارے روزانہ پڑھ کر تین دن میں ختم کر لیتے ہیں۔ اور ایسے تو اللہ کے بندے بہت ہیں جو رمضان میں تین چار دفعہ قرآن شریف ختم کر لیتے ہیں۔

آخر قرآن میں کوئی تو لذت ہے جو اس کی بار بار تلاوت کرنا آسان ہے بعض کلاموں میں یہ کمال ہوتا ہے کہ ان میں بدون سمجھے بھی لطف آتا ہے قرآن میں یہ صفت سب سے زیادہ ہے اور اگر خدا نے فہم معانی کی بھی توفیق دی ہے۔ پھر تو اس لذت کا پوچھنا ہی کیا بعض لوگ جن کو معانی قرآن کا ذوق ہے ایک ایک آیت پر گھنٹوں وجد کرتے ہیں بعض اللہ کے بندوں نے ایک ہی آیت کے تکرار میں رات سے صبح کر دی ہے روتے جاتے ہیں اور ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے جاتے ہیں پھر بھی لذت ختم نہیں ہوتی اگر کوئی صحیح قرآن پڑھنے والا ہو اور اس کے ساتھ خوش آواز بھی ہو اس کا قرآن سننے والا اللہ بدون سمجھے بھی وہ لطف آئیگا جو کسی کلام میں نہ آئے گا قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھا جائے تو ہر لہجہ میں مزہ آتا ہے ہاں موسیقی کے قواعد پر نہ پڑھنا چاہیئے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ قرآن کے بعد مثنوی میں بھی یہ صفت ہے کہ اس کے اشعار سننے میں ہر شخص کو مزا آتا ہے چاہے مطلب کچھ بھی نہ سمجھتا ہو اسی لئے مولانا جامی نے کہا ہے ؎

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن در زبان پہلوی

بظاہر اس میں شبہ ہوتا ہے کہ پوری مثنوی میں تو قرآن کے مضامین نہیں ہیں پھر اس کو قرآن در زبان پہلوی کیسے کہدیا۔ حضرت حاجی صاحب نے اس کا مطلب اور بیان فرمایا ہے کہ اس جگہ قرآن کے معنے مطلق کلام الہامی ہے مطلب یہ ہوا کہ مثنوی فارسی میں الہامی کتاب ہے کیونکہ روایات سیر سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا رومی پر غیبی واردات کا غلبہ ہوتا تھا اس وقت مثنوی کے اشعار آپ کی زبان پر جاری ہوتے تھے اور مولانا حسام الدین ان کو لکھ لیتے تھے جب حالت فرو ہو جاتی تو اشعار کی آمد بند بھی ہو جاتی تھی اسی طرح اس کی تصنیف تمام ہوئی ہے تو یہ ساری کتاب غلبۂ حال میں لکھی گئی ہے اس وقت بطور الہام کے یہ کلام مولانا کی زبان سے نکلتا تھا اسی لئے مثنوی میں ایک شوکت اور حلاوت ایسی ہے جو دوسروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن میں ایک لذت ہے جو بے سمجھے پڑھنے میں بھی ہر شخص کو حاصل

ع۵ یہ مثنوی مولانا رومی فارسی زبان میں الہامی کتاب ہے۔

ہوتی ہے قرآن میں ایک بات یہ ہے لا یخلق من کثرۃ الرد کہ یہ کلام بار بار پڑھنے سے پُرانا نہیں ہوتا ہر دفعہ تازہ کلام معلوم ہوتا ہے۔ کوئی غزل کیسی ہی عمدہ ہو دس مرتبہ سن لو تو پھر اس کے سننے میں مزا نہیں آتا بلکہ جی گھبرانے لگتا ہے اور قرآن کو نہ معلوم کتنی مرتبہ سنا ہوگا اور کتنی مرتبہ پڑھا ہوگا یہ پُرانا نہیں ہوتا ہر دفعہ نیا لطف آتا ہے بلکہ بار بار ختم کر کے پھر شروع کرنے کو جی چاہتا ہے چنانچہ جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں ان سے پوچھ لیجئے اور تم عادت کر کے دیکھ لو پھر خود ہی تجربہ ہو جائیگا جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں اگر کسی دن ان کا معمول پورا نہ ہو اور تلاوت کا موقع نہ ملے تو دن بھر ان کا دل بُرا رہتا ہے جیسے بھوکے پیاسے کو روٹی اور پانی کی طلب ہوتی ہے اس طرح ان کا دل تلاوت کو ترستا رہتا ہے جب قرآن پڑھ لیتے ہیں اس وقت تسلی ہوتی ہے جیسے بھوکے کو غذا مل گئی پیاسے کو پانی مل گیا ورنہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہتے ہیں اگر کثرت تلاوت سے قرآن پُرانا ہو جایا کرتا تو یہ طلب اور یہ بے چینی کبھی نہ ہوتی خصوصًا ان لوگوں کو جو مہینہ میں کئی بار ختم کرتے ہیں مگر یہاں یہ حالت ہے کہ جو جتنا زیادہ تلاوت کا عادی ہے وہ اتنا ہی اس کے لئے بے چین ہے تو شریعت نے عجیب مجاہدہ تجویز کیا ہے جس میں تقلیل کلام کے ساتھ ظاہری لذت بھی ہے جس کی کثرت قلب پر گراں بھی نہیں ہوتی پھر اس میں قرب بھی بے انتہا ہے ثواب بھی بے شمار ہے بھلا تقلیل کلام کی ایسی صورت کوئی بتلا سکتا ہے (پھر جو صورت مجاہدہ تقلیل کلام کی اہل ریاضت نے تجویز کی ہے کہ زبان کو بند کر لیا جائے اس میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس طرح قوت گویائی کم ہو جاتی ہے اگر ایسا شخص کسی وقت تقریر کرنا چاہے تو اس کے کلام میں شوکت و قوت نہ ہوگی اور قوت نطق انسان میں بڑا جوہر ہے زبان سے بعض دفعہ وہ کام لئے گئے ہیں جو تلوار سے نہ ہو سکتے تھے تو اس قوت کا معطل و بیکار ہو جانا بہت بڑا نقص ہے مگر شریعت نے تقلیل کلام کی جو صورت تجویز کی ہے اس سے قوت کلام بڑھتی ہے تجربہ ہے کہ کثرت تلاوت قرآن سے کلام میں بلاغت و فصاحت پیدا ہوتی ہے اور گویائی میں قوت پیدا ہوتی ہے تو سبحان اللہ کیا عجیب مجاہدہ ہے کہ تقلیل کلام کے ساتھ تقویت کلام مجتمع کر دی بھلا

ضدین کو کوئی اس طرح جمع کر سکتا ہے ہرگز نہیں یہ بات تلاوت قرآن ہی میں ہے کہ اس کی مشغولی میں تقلیل کلام بھی ہے اور ساتھ ساتھ گویائی کی قوت بھی حاصل ہوتی۔ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جو شخص اپنے کلام میں بلاغت پیدا کرنا چاہے وہ تلاوت قرآن کثرت سے کیا کرے ۱۲ جامع) اب میں ایک مسئلہ تصوف کا مقام کے متعلق بیان کر کے شاید بیان کو ختم کر دوں خدا نے آج وعظ کی لاج رکھ لی کہ پہلے بیانات کے تتموں سے وعظ طویل ہو گیا ورنہ تقلیل کلام کے متعلق زیادہ مضمون ذہن میں نہیں ہے یا یوں کہئے کہ تنگی وقت کی وجہ سے مضمون آتا نہیں کیونکہ اب دیر بہت ہو گئی ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ سلوک طریق کے دو جز ہیں ایک تحلیہ (بالحاء المہملۃ) دوسرے تخلیہ (بالخاء المعجمہ) تحلیہ کے معنے لغت میں آراستہ کرنا اور اصطلاح صوفیہ میں تحلیہ یہ ہے کہ سالک اپنے کو اخلاق حمیدہ و تعلق مع اللہ سے آراستہ کرے جس کا طریقہ طاعات و ذکر میں مشغول ہونا ہے اور تخلیہ کے معنے لغت میں خالی کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں سالک کا اپنے کو اخلاق رذیلہ سے پاک کرنا اور غیر سے تعلق منقطع کرنا ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ سلوک کیلئے تحلیہ اور تخلیہ دونوں کی ضرورت ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ تحلیہ کو مقدم کیا جاوے یا تخلیہ کو مشائخ میں دونوں طریقے مستعمل ہیں۔ بعض تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اس کے بعد تخلیہ کرتے ہیں بعض تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں اس کے بعد تحلیہ کرتے ہیں اور ہر دونوں طریق سے کامیابی ہوتی ہے جیسے معالجات امراض جسمانیہ میں بھی یہ دونوں طریقے مستعمل ہیں حکماء یونان تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں یعنی پہلے مادہ فاسدہ کو نکالتے ہیں بعد میں تقویت طبع کا اہتمام کرتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ جب تک مادۂ فاسدہ کا اخراج نہ ہو اور مرض زائل نہ ہو اس وقت تک تقویت کی تمام تدبیریں بیکار رہیں۔ اس صورت میں اگر تم طبیعت کو قوت پہنچاؤ گے تو اس سے ممکن ہے کہ مرض کو قوت پہونچے۔ اس لئے طب یونانی میں بحالت مرض تقویت کی تدبیریں نہیں کی جاتیں۔ ہاں صحت کے بعد کوئی خمیرہ یا معجون وغیرہ قوت کے لئے کھلاتے ہیں یعنی تخلیہ کے بعد تحلیہ کرتے ہیں۔

اور حکماء یورپ کی رائے یہ ہے کہ مرض کی حالت میں سب سے پہلے

تقویت طبع کا اہتمام کرنا چاہیئے اگر اس میں دیر کی گئی اور ازالہ سبب مرض ہی پر صرف توجہ کی گئی اور تقویت طبع کا خیال نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ازالہ سبب مرض تک طبیعت نہایت کمزور ہو جائے گی اور جب تک تم سبب کا ازالہ کروگے اس وقت تک مریض ضعف طبع سے کہیں سے کہیں تک پہنچ جائیگا پھر غایت ضعف کی حالت میں سنبھال دشوار ہو جائے گی اس لئے حکماء یورپ اول تقویت طبع کا اہتمام کرتے ہیں یعنی تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحلیہ سے تخلیہ خود ہو جاتا ہے یعنی جب طبیعت قوی ہو جاتی ہے تو وہ مرض کو خود زائل کر دیتی ہے۔ حکماء یونان اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ضعف طبع کا سبب تو مرض ہی ہوا ہے اور اگر مرض اور سبب مرض کا ازالہ ہو گیا تو طبیعت خود قوی ہو جائے گی اور جب تک سبب ضعف موجود ہے اس وقت تک طبیعت کو قوت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کسی تیز دوا سے قوت پہنچا بھی دیگئی تو وہ عارضی قوت ہو گی دیرپا نہ ہو گی قابل اعتبار وہی قوت ہے جو مانع کے ارتفاع کے بعد پیدا ہو۔ غرض طرفین سے دلائل بیان کئے جاتے ہیں اور دونوں طریقوں سے کامیابی ہوتی ہے۔ اجسام طبعیہ کے خواص میں نظر کرنے سے بھی دونوں کی تائید ہوتی ہے بعض خواص سے حکماء یونان کے قول کی تائید ہوتی ہے اور بعض خواص سے حکماء یورپ کے قول کی۔

مثلاً جس بوتل میں پانی بھرا ہوا ہے اس میں اگر آپ ہوا بھرنا چاہیں تو جب تک پانی بھرا ہوا ہے اس وقت تک ہوا اس کے اندر نہیں پہونچ سکتی۔ پانی گرادو تو ہوا خود بخود بھر جائے گی۔ اس میں حکماء یونان کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ تخلیہ کے بعد تحلیہ آسان ہو جاتا ہے جہاں ظرف کو غیر سے خالی کیا پھر اصلی حالت خود بخود عود کر آتی ہے۔ اور اگر کسی بوتل میں ہوا بھری ہو اور آپ اس کو نکال کر پانی بھرنا چاہیں تو ہوا کو پہلے نکالنے کی ضرورت نہیں بلکہ بوتل میں پانی بھرنا شروع کر دیں ہوا ساتھ کے ساتھ خود نکلتی رہے گی چنانچہ جس وقت بوتل منہ تک پانی سے بھر جائے گی

اس وقت ہوا بالکل نہ رہے گی اس خاصیت سے حکمار حال کی تائید ہوتی ہے کہ تحلیہ سے تخلیہ خود بخود ہو جاتا ہے تحلیہ کو مقدم کرنے کی ضرورت نہیں تم تحلیہ شروع کردو طبیعت عوارض سے خود ہی خالی ہوتی چلی جائے گی۔ اسی طرح صوفیہ کی بھی رائے مختلف ہو گئی بعض کے یہاں صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پہلے پیدا کیا جاتا ہے پھر رذائم کی اصلاح کی جاتی ہے اور بعض کے یہاں صفات رذیلہ اور تعلق غیر کو اول قطع کیا جاتا ہے پھر صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پیدا کیا جاتا ہے اور ہر فریق نے اپنی تائید کے لئے قرآن سے بھی استنباط کیا ہے۔ فریق اول اس آیت کو اپنی تائید میں پیش کرتا ہے واذکر اسم ربك و تبتل الیه تبتیلا۔ دیکھئے اس آیت میں ذکر اللہ کا حکم مقدم کیا گیا ہے جو کہ تحلیہ ہے اور تبتل یعنی قطع تعلقات غیر کو موخر کیا گیا ہے اور یہی تخلیہ ہے تو اس آیت میں تحلیہ کو تخلیہ پر مقدم کیا گیا ہے۔ دوسرا فریق یہ آیت پیش کرتا ہے واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ کہ اس آیت میں استعانت بالصبر کو مقدم کیا گیا ہے اور صبر کے معنے ہیں کف النفس عن المعاصی یعنی نفس کو معاصی سے روکنا اور یہی حاصل ہے تخلیہ کا اور استعانت بالصلوٰۃ کو مؤخر کیا گیا ہے جو کہ تحلیہ کی قسم میں سے ہے تو اس آیت کو تخلیہ کو تحلیہ پر مقدم کیا گیا ہے مگر اس میں قول فیصل یہ ہے کہ نہ تحلیہ کو مطلقاً مقدم کیا جائے نہ تخلیہ کو بلکہ دونوں کو دوش بدوش لے چلنا چاہئے کہ ساتھ ساتھ تحلیہ و تخلیہ دونوں ہوتے رہیں اگر تحلیہ کو مطلقاً مقدم کیا گیا تو بعض دفعہ رذائل ایسے قوی ہوتے ہیں کہ سارا تحلیہ بیکار ہو جاتا ہے مثلاً کوئی شخص سر سے پیر تک پائخانہ میں بھرا ہوا ہو تو اس کے بدن پر عطر ملنا بیکار ہے وہ عطر کو بھی لے ڈوبے گا اسی طرح اگر تخلیہ کو مقدم کیا گیا تو اتنا زمانہ تحلیہ کی برکات سے خالی جائے گا پھر ممکن ہے کہ تخلیہ میں دیر لگ جائے اور کوتاہی عمر کی وجہ سے تحلیہ کی نوبت ہی نہ آئے تو یہ شخص تعلق مع اللہ سے بالکل ہی کورا جائے گا اس لئے محققین کی رائے اب یہ ہے کہ تحلیہ اور تخلیہ ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے۔ چشتیہ کے یہاں پہلے تخلیہ مقدم تھا اور اب بھی ان کو تخلیہ کے ساتھ تحلیہ کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے مگر پہلے یہ حالت تھی کہ برسوں مجاہدات کراتے تھے پھر مدت کے بعد بارہ تسبیح وغیرہ تعلیم کرتے اور نقشبندیہ پہلے ہی

ہی دن ذکر تعلیم کر دیتے تھے ان کے یہاں تحلیہ مقدم تھا بعد میں تخلیہ کراتے تھے اور اب گو دونوں سلسلے کے محققین کی رائے بدل گئی مگر مذاق پر چشتیہ کے تخلیہ غالب ہے اور نقشبندیہ کے مذاق پر تحلیہ غالب ہے مگر باوجود اس کے اہل تربیت جو محقق ہیں اس میں طالب کے مذاق پر زیادہ مدار رکھتے ہیں جس کو وہ اپنے خداداد بصیرت سے تشخیص کر لیتے ہیں چنانچہ مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کے متعلق مشورہ لیا کہ میں چشتیہ سلسلہ میں داخل ہوں یا نقشبندیہ میں حضرت حاجی صاحب نے ان سے فرمایا اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر ایک زمین میں جھاڑ جھنکار بکثرت کھڑے ہوں اور کوئی شخص اس میں تخم پاشی کرنا چاہے تو اس کی بہتر صورت کیا ہے آیا اس کو اول جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنا چاہیئے اور بعد میں تخم پاشی کرے یا پہلے تخم پاشی کرے اور بعد میں جھاڑ جھنکار کو صاف کرتا رہے۔ مولانا محمد منیر صاحب نے کہا حضرت میری رائے میں تو تخم پاشی پہلے کر دینا چاہیئے کچھ تو پیدا ہو جائے گا پھر جھاڑ جھنکاڑ کو بھی صاف کرتا رہے اگر اول جھاڑ جھنکاڑ وغیرہ کی صفائی میں لگ گیا تو ایسا نہ ہو کہ عمر اسی میں تمام ہو جائے اور تخم پاشی کی نوبت ہی نہ آئے۔ حاجی صاحب نے ہنسکر فرمایا کہ بس نقشبندیوں میں جاؤ تمہاری طبیعت کو اسی طریق ہی سے مناسبت ہے یہ مذاق نقشبندیہ ہی کا ہے کہ جھاڑ جھنکاڑ کو بعد میں صاف کرے تخم پاشی پہلے کر دے چشتیہ کا مذاق یہ ہے کہ وہ پہلے جھاڑوں کو صاف کرتے ہیں بعد میں تخم پاشی کرتے ہیں تو چشتیہ کا اصلی مذاق تو یہی ہے۔ مگر اب زمانہ کی حالت اور عمر کی کوتاہی اور فراغ کی قلت پر نظر کر کے دونوں طریق کے محقق نے فیصلہ کر دیا ہے کہ دونوں کو دوش بدوش لے چلو یعنی زمین کو بھی تھوڑا تھوڑا صاف کرتے جاؤ اور جتنی زمین صاف ہوتی جائے اس میں تخم پاشی بھی کرتے جاؤ۔ ساری زمین کی صفائی کا انتظار نہ کرو تو اب الحمد للہ جو محقق ہیں وہ تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ کرتے ہیں چشتی اور نقشبندی دونوں طریقوں کو ملا دیا بس وہ حال ہو گیا مرج البحرین یلتقیان دونوں دریاؤں کو ساتھ ساتھ لیجا رہے ہیں اب جس دن یہ شخص فارغ ہو گا نقشبندی ہو گا اور چشتی بھی دونوں طریق کا فاضل ہو گا اور یہ فیصلہ ایسا ہے جیسا مدرسین کے طرز میں پہلا اختلاف تھا کہ

منقولات کو تعلیم میں مقدم کرنا چاہیے یا معقولات کو بعض کی رائے یہ تھی کہ منقولات کو مقدم کرنا چاہیے کیونکہ وہ مقاصد ہیں اگر معقولات کو مقدم کیا گیا تو ایسا نہ ہو کہ پھر یہ شخص قلت فراغ یا قصر عمر کی وجہ سے منقولات سے محروم ہی رہ جائے تو یہ سارا زمانہ تعلیم کا بیکار ہی گیا کیونکہ یہ تو غیر مقصود کی تحصیل میں گذرا بعض کی رائے یہ تھی کہ معقولات کو مقدم کرنا چاہیے کیونکہ وہ مقدمات میں سے ہے اور اس سے عقل میں تیزی پیدا ہوتی ہے اور اس کی ضرورت مقاصد سے پہلے ہے جب اول عقل روشن ہو جائے گی تب مقاصد کا فہم آسان ہوگا دوسرے اگر معقولات کو مؤخر کیا گیا تو اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس شخص پر رنگ معقول ہی کا غالب ہوگا کیونکہ جو رنگ اخیر میں چڑھتا ہے وہی غالب رہتا ہے اور اسی کا اثر طبیعت پر رہ جاتا ہے اور اگر منقول کو مؤخر کیا گیا تو اخیر میں اسی کا رنگ طبیعت پر غالب رہے گا۔ یہ تو ہر فریق کے دلائل تھے مگر علماء محققین نے اب فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ معقول کو علی الاطلاق مقدم کرو نہ منقول کو بلکہ دونوں کو دوش بدوش لے چلو اور معقول بقدر ضرورت پڑھاؤ منقول زیادہ پڑھاؤ تو اخیر میں اس شخص پر منقول ہی کا اثر غالب رہے گا اور ساتھ ساتھ معقولات پڑھنے سے فہم منقول میں مدد بھی ملے گی۔ چنانچہ اب مدارس میں اسی طریق پر عمل ہے یہ تو مسئلہ تھا۔ اب میں بتلانا چاہتا ہوں کہ جو بات محققین نے عرصہ دراز کے بعد طے کی ہے شریعت مقدسہ نے اس کو پہلے ہی طے کر دیا ہے مگر اس پر کسی کی نظر نہیں پہنچی وہ یہ کہ شریعت نے تمام مجاہدات میں اس کی رعایت کی ہے کہ محض تخلیہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مجاہدہ کی صورت وہ تجویز کی جس میں تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ ہوتا ہے مثلاً تقلیل منام کی یہ صورت تجویز نہیں کی کہ رات کو خالی بیٹھے جاگا کرو بلکہ اس کو تراویح اور تہجد کی صورت میں تجویز کیا جس میں جاگنا بھی ہو گیا جو ترک راحت ہونے کی وجہ سے تخلیہ ہے اور ساتھ ساتھ عمل بھی ہوتا رہا جو تحلیہ ہے۔ اسی طرح تقلیل کلام کی یہ صورت تجویز نہیں کی کہ زبان کو بند کر کے بیٹھ جاؤ بلکہ اس کی یہ صورت تجویز کی کہ تلاوت قرآن میں مشغول رہو اس میں زبان رذائل و ذمائم سے بھی محفوظ ہو گئی۔ یہ تو تخلیہ تھا اور ساتھ ساتھ ذکر بھی ہو رہا ہے یہ تحلیہ ہے اور اس میں ایک بڑا راز ہے جس کے معلوم ہو جانے کے بعد ایک بہت بڑا خطرہ رفع ہو جائے گا جو سالکین کو پیش آتا ہے وہ خطرہ یہ ہے کہ بعض

سالکین کو ترک تعلقات کا بے حد اہتمام ہوتا ہے اور اسی کے دقائق میں غور وفکر اور عمل کو لگائے رکھتا ہے مثلاً کسی نے اپنے ذمے بہت سے فضول کام لے رکھے تھے انھیں کم کردیا یا زار کے کام کم کر دیئے۔ معاملات و تعلقات میل جول وغیرہ کو اس مصلحت سے گھٹا دیا کہ ان تعلقات کے کم ہونے سے تعلق مع اللہ پیدا ہو پھر قلب کو خالی کر کے متوجہ بحق ہو یہ نیت اچھی ہے اور مذاق چشتیہ کے موافق ہے مگر اس کے استعمال میں بعض دفعہ غلطی ہوجاتی ہے وہ یہ کہ تخلیہ اور تحلیہ دونوں ساتھ ساتھ تو تھے نہیں یعنی جس زمانہ میں یہ شخص تقلیل تعلقات غیر میں مشغول ہوتا ہے اس وقت تکثیر تعلق مع اللہ میں مشغول نہیں ہوتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک وقت اس پر ایسا گذرتا ہے کہ اس کا دل بالکل خالی ہوجاتا ہے کہ نہ اس میں تعلق مع الخلق ہے نہ تعلق مع اللہ کیونکہ تعلق مع اللہ سے تو قلب کو بھرنے کا اس نے قصد ہی نہیں کیا یا قصد کیا ہو مگر اس کے لئے عمل تھوڑا کیا جو کافی نہیں ہوا اور تعلق مع اللہ چونکہ تعلق مع الغائب ہے اس لئے وہ ابھی ایسا قوی نہیں ہوا کہ دوسرے تعلقات کو دل سے نکال کر خود اس میں بھر جائے تو اس نے اپنے نزدیک مخلوق سے اپنے دل کو خالی کیا لیکن وہ اس وقت تعلق مع الحق سے بھی خالی ہے تو شیطان نے میدان خالی پاکر اپنا قبضہ جمالیا کیونکہ خالی میدان پر دشمن کا قبضہ آسانی سے ہوجاتا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ تم نے سپاہیوں کے واسطے ایک گاڑی خالی کرائی جس میں چمار بیٹھے تھے لیکن غلطی یہ کی کہ چماروں کے اترنے کے ساتھ سپاہیوں کو بھرنا شروع نہ کیا بلکہ گاڑی کے خالی ہونے کا انتظار کیا اب جس وقت گاڑی چماروں سے خالی ہوگئی اور سپاہیوں سے بھی خالی تھی دشمن نے خالی دیکھ کر وہاں بستر جمالیا تم کو چاہیئے تھا کہ جو چمار اترتا جاتا اس کی جگہ ایک سپاہی کو بٹھاتے جاتے تاکہ گاڑی خالی نہ ہوتی اور دشمن کو

سہولت سے قبضہ کرنے کا موقع نہ ملتا اسی لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ بعض دفعہ تعلقات مباحہ بھی دل کے واسطے شیطان سے پہرہ دار ہوتے ہیں، کیونکہ دل بھرا ہوا تو ہے گو تعلق مع اللہ سے نہ سہی تعلقات مباحہ ہی سے بھرا ہوا سہی مگر میدان خالی تو نہیں تو دشمن وہاں نہیں آسکتا اسی لئے وہ طالب کو نوکری چھوڑنے کی جلدی اجازت نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ تعلق مع اللہ ابھی ایسا قوی نہیں ہوا جو دل کو پُر کر دے اگر نوکری کا جائز تعلق بھی قلب سے نکل گیا تو دل بالکل خالی رہ جائے گا اور اس میں تشویشات پیدا ہوں گی جن کو ضعیف تعلق مع اللہ جو اس حالت میں ہے رفع نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قلب کا بالکل خالی رہنا اچھا نہیں اس میں کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے جبھی شیطان سے حفاظت ہو سکتی ہے جب تک تعلق مع اللہ سے قلب پُر نہیں ہوا ہو تو تعلق مع الخلق ہی سے پُر رہے بشرطیکہ وہ تعلق مباح ہو۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تحقیق ہے کہ جب تک تعلق مع اللہ قوی نہ ہو اس وقت تک تعلقات مباح کو ترک نہ کرو ایسا نہ ہو کہ زمین کو موروثی سے چھڑالو اور خود بھی کھیتی نہ کر سکو تو زمین خالی دیکھ کر کوئی دشمن قبضہ کر کے دعوے دار ہو جائے پہلے کسی کو کاشت کے واسطے مقرر کر لو پھر موروثی کو الگ کرنا۔ خلاصہ یہ کہ قلب کا بالکل خالی ہونا اچھا نہیں اب سمجھو کہ شریعت نے جو مجاہدات میں محض ترک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ عمل بھی مشروع کیا اس میں راز یہی ہے کہ اگر مجاہدہ میں صرف ترک پر اکتفا کیا جائے اور اس کے ساتھ کوئی عمل تعلق مع اللہ کے بڑھانے والا نہ کیا جائے تو نتیجہ مجاہدہ کا یہ ہوگا کہ قلب تعلقات غیر سے خالی ہونے کے ساتھ تعلق مع اللہ سے بھی خالی ہوگا اور اس صورت میں شیطان کا قلب پر قبضہ جما لینا آسان ہو جائے گا۔ اسی واسطے شریعت نے ہر مجاہدہ میں اس کی رعایت کی ہے کہ تعلقات مباحہ کو

ترک کر کے اعمال میں مشغول کر دیا ہے تاکہ قلب خالی نہ ہو یہ مسئلہ شیخ ابن قیم کی تقریر سے اول حل ہوا تھا حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے (انھوں نے اپنی کتاب الدوار الکافی میں یہ مضمون لکھا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ ابن القیم صوفی محقق تھے خشک زاہد نہ تھے حق تعالےٰ ان کو جزائے خیر دے عجیب بات لکھی اسی اصل پر میں کہتا ہوں کہ شریعت نے تقلیل کلام کی جو صورت تجویز کی ہے اس میں بھی اسی راز کی رعایت ہے یعنی شریعت نے یہ نہیں کہا کہ روزے میں زبان بند کر لیا کرو کیونکہ اس سے صرف تعلق مع الخلق میں کمی ہو گی تعلق مع الحق میں کیا زیادتی ہوئی تو نتیجہ وہی ہوگا کہ دل دونوں سے خالی ہو جائے گا' بلکہ یہ صورت تجویز کی کہ قرآن کی تلاوت میں مشغول رہو اس سے تعلق مع الخلق کی کمی کے ساتھ تعلق مع الحق بڑھتا رہیگا اب دل خالی نہ ہوگا ایک چیز نکلے گی اور اس کی جگہ تعلق مع اللہ بھرے گا تو دل شیطان سے بالکل محفوظ رہے گا۔ بحمد اللہ ہر پہلو سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ شریعت نے مجاہدہ تقلیل کلام کی جو صورت تجویز کی ہے وہ سب سے بہتر صورت ہے اور اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی اس میں کوئی خطرہ کچھ بھی نہیں اور منافع بے شمار ہیں اور مجاہدہ عرفیہ جو تقلیل کلام کے لئے اہل ریاضت میں مستعمل ہے خطرہ سے خالی نہیں اور اس میں اتنے منافع بھی نہیں۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام "تقلیل الکلام بصورۃ تلاوۃ کلام الملک العلام" تجویز کرتا ہوں۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالےٰ ہم کو رمضان میں تلاوۃ قرآن کی توفیق دیں اور تقلیل کلام کے ثمرات سے کامیاب فرما دیں اور فہم سلیم عطا ہو۔

آمین وصلے اللہ تعالےٰ علےٰ خیر خلقہ سیدنا

محمد وعلےٰ آلہ واصحابہ اجمعین

واٰخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

تقلیل الاختلاط مع الانام

فی

صورۃ الاعتکاف فی خیر مقام

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ملہ

ایم۔ اے جناح روڈ

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

تقلیل الاختلاط مع الانام

فی

صورۃ الاعتکاف فی خیر مقام

این	متٰی	کم	کیف	لم	ماذا	من ضبط	من الذی	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے ضبط کیا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	۲۹ رمضان ۱۳۳۴ھ بعد نماز جمعہ	۳/۴ ۲ گھنٹہ (تین گھنٹہ ۴۵ منٹ)	کھڑے ہو کر	ان مواعظ متحد المعانی کا سبب واحد ہی ہے۔	اعتکاف جامع خلوت وجلوت ہے تقلیل الاختلاط کی اس سے بہتر صورت نہیں ہو سکتی۔	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ وکان لہٗ	سب مسلمانوں کو عموماً اور اہلِ ریاضت کو خصوصاً	۲۵۰ تقریباً	. . . .

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(دعاء) الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۞ وَالَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا فِیۡنَا لَنَھۡدِیَنَّھُمۡ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللہَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۞

آج چوتھا جمعہ ہے کہ اسی آیت کے متعلق سلسلہ وار بیان ہو رہا ہے۔ بس آج اس کا بیان ختم[1] کئے دیتا ہوں۔ یہ بات تو پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ اس آیت میں مجاہدہ کا بیان ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدہ حقیقیہ یعنی ارتکاب اعمال واجتناب عن المعاصی دوسرے مجاہدہ حکمیہ یعنی ان مباحات کو ترک کرنا جو معاصی کی طرف مفضی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مجاہدہ حکمیہ کے چار ارکان ہیں جن میں سے تین ارکان کا ذکر تو ہو چکا ہے آج چوتھے رکن کا بیان ہوگا۔ یعنی تقلیل اختلاط مع الانام کا۔ مجاہدہ حکمیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ایسے جائز کاموں سے بچنا جو مفضی ہو جاتے ہیں گناہوں کی طرف اس پر بعض لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ یہ صوفی جائز کاموں سے بھی منع کرتے ہیں مگر ان کو حقیقت کی خبر نہیں بعض دفعہ طبیب امور مفضیہ سے بھی منع کر دیتا ہے گو فی نفسہ اس مفضی میں ضرر نہ ہو مگر یہ کیا ضرر تھوڑا ہے کہ وہ مضر کی طرف مفضی ہے مثلاً کوئی چیز جیسے مصری تین تولہ کی مقدار میں تو مضر ہے اور ایک تولہ کی مقدار میں مضر نہیں۔ لیکن طبیب کو حق ہے کہ ایک تولہ سے بھی منع کر دے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک تولہ کھا کر اس سے صبر نہ ہوگا پھر یہ ڈیڑھ تولہ کھائے گا پھر دو تولہ کھائے گا یہاں تک کہ ایک دن تین تولہ تک نوبت پہونچ جائے گی اور اس وقت ضرر پہونچ جائے گا۔ اس لئے وہ پہلے ہی دن اس سے بالکل منع کر دیتا ہے۔ یا ایک مریض کے متعلق طبیب جانتا ہے کہ اس کو تھوڑی سی مقدار میں گوشت کھانا مضر نہیں اور زیادہ مضر ہے مگر پھر بھی وہ اس سے یہ نہیں کہے گا کہ تم زیادہ گوشت سے پرہیز کیا کرو اور تھوڑا سا کھا لیا کرو۔ بلکہ وہ یہ کہے گا کہ تم گوشت بالکل نہ کھانا۔ بس مونگ کی دال یا ہری ترکاری کھانا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گوشت سامنے آنے کے بعد تھوڑے اور زیادہ مقدار کا لحاظ کرنا مریض سے

[1] اس وقت یہی خیال تھا۔

دشوار ہے اس لئے وہ قطعاً منع کر دیتا ہے حالانکہ قلیل مقدار مباح تھی مگر خوف افضا کی وجہ سے اس کو بھی منع کر دیا اسی طرح کلام مباح و نوم مباح و اختلاط مباح گو گناہ نہیں مگر چونکہ یہ مباحات اکثر مفضی الی الذنب ہو جاتے ہیں (جس کی تفصیل پہلے وعظ میں گذر چکی (۱)) اس لئے صوفیہ ان سے بھی منع کرتے ہیں۔ اور مجاہدہ کے ذریعہ سے ان کی تقلیل کراتے ہیں جیسے بعض مسکرات میں (جیسے افیون) قدر قلیل غیر مسکر گو حرام نہیں مگر چونکہ مقدار قلیل مفضی الی القدر المسکر ہو جاتی ہے اس لئے قلیل سے بھی منع کیا جاتا ہے۔ فقہاء و صوفیہ نے اس قاعدہ کا بہت لحاظ کیا ہے کہ جو مباح و مستحب مفضی الی المعصیت ہو جائے۔ وہ بھی ممنوع ہے بعض لوگ فقہاء پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے بعض مباحات کو بھی حرام کر دیا۔ مگر وہ اس راز سے بے خبر ہیں۔ حقیقت میں فقہاء نے مباح کو حرام نہیں کیا بلکہ مقدمۂ حرام کو حرام کہا ہے۔ اور عقلاً یہ قاعدہ مسلم ہے کہ مقدمہ واجب کا واجب اور مقدمہ حرام کا حرام ہے تو وہ مباح جس سے فقہاء منع کرتے ہیں مقدمہ حرام ہونے کی حیثیت سے مباح کی فرد ہی نہیں رہا بلکہ اس حیثیت کے لحاظ سے وہ حرام کی فرد بن گیا اور اختلاف حیثیات سے احکام کا اختلاف ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔

بہت چیزیں ایسی ہیں کہ ایک حیثیت سے حسن اور دوسری حیثیت سے قبیح ہیں۔ نماز کے حُسن میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ مگر پاخانہ کا تقاضا ہو تو اس وقت نماز مکروہ ہے۔ اب اگر کوئی اعتراض کرنے لگے کہ صاحب نماز کو قبیح کہدیا۔ تو یہ اس کی حماقت ہے نماز تو فی نفسہا حسن ہی ہے مگر اس وقت ایک عارض کی وجہ سے اس میں قبح آگیا ہے۔ وہ یہ کہ تقاضائے حاجت کے وقت نماز میں اطمینان نہ ہوگا اس طرح ممکن ہے کہ ایک فعل فی نفسہ مباح ہو مگر دوسری حیثیت سے اس میں قبح آجائے اور وہ حیثیت افضاء الی المعصیت کی ہے۔ پس اب نہ فقہاء پر اعتراض رہا نہ صوفیہ پر۔ لیکن اس جگہ میں اس پر متنبہ کئے دیتا ہوں کہ کسی مباح کو کسی مصلحت یا مفسدہ کی وجہ سے ناجائز و حرام کہنے میں ہر کس و ناکس کا اجتہاد معتبر نہیں

بلکہ اس کو محقق حکیم ہی سمجھ سکتا ہے کہ کون سا مفسدہ قابل اعتبار ہے جس کی وجہ سے فعل مستحب کو ترک کر دینا چاہیئے اور کون سا مفسدہ قابل اعتبار نہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ گو یہ قاعدہ شرعی ہے کہ جس مباح و مستحب میں احتمال مفسدہ ہو اس مباح و مستحب کو ترک کر دینا چاہیئے مگر اس کا فیصلہ کرنا کہ کون سا مفسدہ قابل اعتبار ہے اور کون سا قابل التفات نہیں۔ یہ ہر شخص کا کام نہیں۔ بلکہ اس کا فیصلہ بھی شارع ہی کر سکتا ہے یا وہ شخص جو کلام شارع کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔ چنانچہ شریعت میں اس کی وہ نظیریں موجود ہیں کہ دونوں جگہ بعض خاص افعال میں مفسدہ کا احتمال تھا مگر حق تعالےٰ نے ایک جگہ تو مفسدہ کا اعتبار کیا۔ اور دوسری جگہ اعتبار نہیں کیا ان میں سے ایک تو واقعہ حطیم ہے کہ قریش نے تنگئ خرچ کی وجہ سے حطیم کو بیت اللہ سے خارج کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بیت اللہ میں داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس خیال سے ملتوی کر دیا کہ اہل مکہ نئے ابھی اسلام لائے ہیں اگر میں نے کعبہ کو منہدم کیا تو ان کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ کیسے نبی ہیں جو کعبہ کو منہدم کر کے اس کی بے حرمتی کرتے ہیں تو ان کے اسلام میں ضعف پیدا ہوگا۔ حق تعالےٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خیال کی تقریر فرمائی اور مفسدہ کی وجہ سے ترک مستحب کو گوارا فرمایا۔

دوسرا واقعہ حضرت زینب رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے نکاح کا ہے جب حضرت زید بن حارثہ نے ان کو طلاق دے دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ زینب اور ان کے اولیار کی دلجوئی کی اب صرف ایک صورت ہے کہ میں ان سے نکاح کر لوں۔ مگر آپ اس خیال سے رُکتے تھے۔ کہ زید بن حارثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ تھے اور اس وقت متبنی کو مثل اپنی اولاد کے سمجھا جاتا تھا۔ اگر میں نے زینبؓ سے نکاح کیا تو جہلار مشرکین و منافقین طعن کریں گے

لـه قلت وفى قصة زينب هذه اشكال قد يختلج فى بعض الاذهان اريد ازاحته بما افاض الله

کہ بیٹے کی بہو سے نکاح کرلیا۔ اور اس طعن کی وجہ سے بہت لوگ اسلام سے رُک جائیں گے۔ اور ممکن ہے بعض ضعفاء اسلام ہی سے مرتد ہوجائیں تو دیکھئے نکاح زینب میں بھی اُسی مفسدہ کا احتمال تھا جس کا قصہ حطیم میں احتمال تھا مگر حق تعالیٰ نے یہاں مفسدہ کی پرواہ نہیں کی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ زینب سے نکاح کرلیں اور طعن منافقین کی پروا نہ کریں۔ بلکہ خود ہی نکاح بھی کردیا اور آیت میں زوجنکھا نازل ہوا کہ ہم نے آپ کا نکاح زینب سے کردیا۔ ان دونوں واقعوں سے معلوم ہوگیا کہ ہر مفسدہ قابل اعتبار نہیں اور ہر مصلحت قابل تحصیل نہیں پس کسی مصلحت کے فوت ہونے یا کسی مفسدہ کے پیدا ہونے کے احتمال سے مباح و مستحب کو ناجائز کہنے کا ہر کسی کو حق نہیں بلکہ یہ منصب خاص حضرات مجتہدین کا ہے۔ اس میں ہر شخص کا اجتہاد معتبر نہیں کیونکہ اجتہاد کے بعض اسباب مکتسب ہیں۔ اور بعض اسباب

(بقیہ صفحہ گذشتہ) علینا من برکات الشیخ ادام اللہ مجدہٗ تقریر الاشکال ان اللہ تعالیٰ قال فی حقہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وتخفی فی نفسك ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ اثبت فیہ خشیۃ الناس فی حقہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال فی حق غیرہ من الانبیاء والرسل الذین یبلغون رسٰلٰت اللہ ویخشونہ ولایخشون احداً الا اللہ ط اظہر فیہ ان رسل اللہ کانوا لایخشون احداً غیر اللہ وھذہ الیقتضی بظاہرہ فضیلۃ سائر الانبیاء علیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا الوصف بعینہ واجاب عنہ الشیخ بما نصہ ان معنی الآیۃ انك یا محمد انما تخشی الناس فی ھذا الامر لعدم علمك بان ھذا النکاح من قبیل تبلیغ الرسالۃ عملاً ولو علمت ذلك لم تخش احداً فان اللہ احق ان تخشاہ فی ترك التبلیغ ولو علمت کونہ من التبلیغ لفعلت کما کان الرسل تفعلہ من انہم کانوا یبلغون رسٰلٰت اللہ یخشونہ ولایخشون احداً الا اللہ فاندفع الاشکال راساً واساساً وکان صلی اللہ علیہ وسلم کسائر الانبیاء بعد علمہ بکون ھذا النکاح من تبلیغ رسالات اللہ عملاً فبادر الی النکاح ولم یخش احداً الا اللہ وانما خشی عن الناس وطعنہم فی الدین ما لم یعلم کونہ من تبلیغ الرسالات واما بعد ذالك فلا فلم یثبت من الآیۃ خشیۃ صلی اللہ علیہ وسلم عن الناس فی تبلیغ الاحکام حتی یلزم فضیلۃ سائر الانبیاء علیہ بل غایۃ ما ثبت انہ کان یخشی الناس قبل علمہ بکون ذلك من جملۃ التبلیغ وبعد علمہ بہ کان کسائر الرسل ۱۲ جامع

موہوب ہیں ذوق صحیح اور فہم سلیم کسی کی سعی سے حاصل نہیں ہوسکتی بس جن کو خدا نے یہ دولت عطا کر دی ہے وہی دین میں اجتہاد کا حق رکھتے ہیں ہر شخص دین میں مجتہد نہیں ہوسکتا۔ جیسے قوانین سلطنت میں ہر کسی کی رائے نہیں لی جاتی نہ ہر شخص کو رائے دینے کا حق ہے۔ اور جیسے طبیب کے سوا دوسرے کی رائے علاج و پرہیز میں معتبر نہیں نظام عالم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ ہر شخص کی رائے کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اگر ہر اک کی رائے معتبر ہو تو تابعیت و متبوعیت زائل ہو جائے گی سب مساوات کا دعویٰ کریں گے۔ حالانکہ نظام عالم اس پر قائم ہے کہ بعض تابع ہوں اور بعض متبوع ہوں آپ اپنے گھر میں افسر ہیں یہ افسریت اسی وقت تک باقی ہے۔ جب تک بیوی اور نوکر چاکر حشم خدم آپ کی رائے اور حکم کا اتباع کریں اور اگر آپ کی اولاد اور حشم خدم یا بیوی جو بعض وجوہ سے ہمسر بھی ہے آپ کی رائے میں مزاحمت کرنے لگے تو آپ کو ہرگز گوارا نہ ہوگا۔ اور اگر آپ اس کو گوارا کرلیں تو پھر وہ تابع رہیں گے نہ آپ متبوع۔ پھر گھر میں روز جوتی بیزار ہوا کرے گی۔ آپ کی کچھ رائے ہوگی۔ اور اولاد کی کچھ رائے ہوگی۔ نوکر کچھ چاہے گا بیوی کچھ چاہے گی۔ اور سب کی رائے معتبر ہے تو بتلایئے گھر کا انتظام کیونکر ہوگا۔ آخر کس کی رائے کے موافق عمل ہوگا اگر سب کی رائے پر عمل ہوا تو ذرا کر کے دیکھ لیجئے کہ اس طرح کتنے دن نباہ ہوسکتا ہے۔ اور یہ تو احتمال عقلی پر گفتگو ہو رہی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جس دن نوکر یا اولاد وغیرہ آپ کی رائے میں مزاحمت کریں گے اسی دن آپ کان پکڑ کر گھر سے نکال دیں گے آخر یہ کیوں محض اس لئے کہ نظام عالم تابعیت و متبوعیت کو چاہتا ہے اسی لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں۔ اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے تاکہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو سب کے سب آزاد نہ ہوں۔ بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے یہ حقیقت ہے سلطنت کی۔ اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہوگا۔ اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں اور نہ کسی نے آج تک اس کو گوارا کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں چنانچہ

آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدون سلطنت کے انتظام اور نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا۔ اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا وہی سلطنت کے مصداق ہو گئے کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہوگئی اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہو جائے کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدا تعالےٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے چنانچہ حق تعالےٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطہ سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے، ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آ گرا کرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا۔ نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا نہ خلیفہ کا نہ علماء و مجتہدین کا۔ شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پریس کہاں۔ میں کہتا ہوں کہ جب تم نے پریس ایجاد کر لئے ہیں تو خدا تعالیٰ کو پریس بنا لینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے۔ تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے۔ دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالےٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو بھی نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے۔ تو پھر جو کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس ڈال دیا کریں تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالےٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہو جائے۔ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں وہ بھی آزادی کا عام ہونا گوارا نہیں

کرتے کیونکہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی۔ تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہوجائے گی ہم تو آزادی کا دعوےٰ جب جانیں کہ کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جائے بلکہ جس کے جو جی میں آئے کرنے دیا جائے۔ کسی سے کچھ مزاحمت نہ کی جائے کیونکہ تم آزادی کے حامی ہو تو آزادی تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔ پھر تم لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناکرتے ہو۔ یا کم از کم یہی کرو کہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لیا کرو۔ قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے کا تابع کیوں بنا رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں۔ مگر ہر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے۔ کبھی حکمی فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے۔ مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں مگر مجموعہ ملکر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو شخص جو رائے دیدے وہی قانون ہوجایا کرے اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعوےٰ صحیح ہوتا۔ مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے۔ کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہوجاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور تم شخص واحد حکمی کے حامی ہو جمہوریت کے حامی ہو تو تم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کا رل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا نہ ایک بادشاہ کا نہ پالیمنٹ کے دس ممبروں کا۔ اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنادیا۔ ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے تم نے دس کا غلام بنادیا۔ اب تم ہی فیصلہ کرلو کہ ایک کا غلام بنانا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا

ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو وہ اس سے بہتر ہے جس پر دس بیس کی حکومت ہو یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں۔ مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔ شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوے کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعوے ہی نہیں کیا جو اس پر نقض وارد ہو۔ اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں کسی وقت ان کو اپنے دعوے سے ہٹنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں ہٹتے ہو اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلے کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو اس کو پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے۔ مگر کیونکر آزاد رہنے دیں نظام عالم بدون اس کے قائم نہیں ہوسکتا۔ کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں بعض متبوع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں اس لئے یہاں آکر ان کو اپنے دعوے آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے اور شریعت کو کبھی اپنے دعوے سے ہٹنا نہیں پڑتا کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانہ میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے دوسرے متبوع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے۔ جو بنی اسرائیل و قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے، مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے۔ دونوں برابر درجہ میں نہ تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیدا کر دیا جس سے اس حقیقت کا ظہور ہوگیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام توراۃ لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور ان کی اصلاح کرتے رہنا یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ

سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں قدم جبریل کی مٹی ڈال دی جس سے اس میں حیات پیدا ہوگئی فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ؕ جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو یہ ہے۔ وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے بس بیوقوف لگے اس کی عبادت کرنے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی، وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ اس وقت انھوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب یہ کمبخت گمراہ ہوگئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے میرے پاس باقی ماندہ جماعت کو لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں اُن کا سر اور داڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے قال یاابن ام لا تاخذ بلحیتی ولا برأسی۔ ہارون علیہ السلام نے کہا کہ اے بھائی میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑو۔ میری بات سنو۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں ان کو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر ان کو سمجھایا کیوں نہیں ان کی اصلاح کیوں نہ کی اس لئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھاتا رہا۔ حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں اُن کے تابع تھے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے بے تکلف اپنی متبوعیت اور ان کی تابعیت کی مقتضا پر عمل کیا۔ اور وہ برتاؤ کیا جو حاکم محکوم کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

آج ایک سب انسپکٹر باوجودیکہ انسپکٹر کا تابع اور ماتحت ہوتا ہے۔ مگر انسپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھیں۔ معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی۔ بلکہ واقعی تابعیت تھی جس کا اس واقعہ سے ظہور ہوگیا اور لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ ان دونوں رسولوں میں ایک تابع ہیں ایک متبوع ہیں۔ دونوں یکساں مرتبہ میں نہیں ہیں۔ اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیجئے ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آگئی کہ حق تعالیٰ کو ان کی متبوعیت و تابعیت کا ظاہر کرنا تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ سے ایسا بیتاب کر دیا جس سے انھوں نے اپنی حکومت و

متبوعیت کے مقتضا پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔ غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور نہ جمہوری میں متیقن ہیں۔ شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہے کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے حالانکہ ممکن ہے کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیئے۔ بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے۔ بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہونچتا ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا۔ ایک نے ریل کو ایجاد کیا۔ تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صدہا ہزارہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے۔ اب بتلایئے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے۔ تو بادشاہ اپنی رائے پر عمل نہیں کر سکتا۔ بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہوکر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے۔ اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے۔ وہ کسی سے مغلوب نہیں ہوتا۔ اگر وزراء کی رائے صحیح معلوم ہوئی اس پر عمل کر لیتا ہے اگر وزراء کی رائے غلط معلوم ہوئی تو وہ اپنی رائے پر عمل کر سکتا ہے اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی بھی صورت نہیں

سب مجبور رہیں غلط رائے کی موافقت پر اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے۔ خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو۔

مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے سید احمد خاں سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بے وقوف زیادہ تو اس قاعدہ کی بناء پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اُس صورت میں ہے جبکہ بہت سے آدمیوں کو کیفما اتفق جمع کرلیا جائے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے لیکن ہم جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیفما اتفق جمع نہیں کئے جاتے بلکہ انتخاب کرکے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں سب عقلاء ہی ہوتے ہیں۔ تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوفوں کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلاء کی کثرت ہوگی۔ مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کرلیا جائے کہ ہزار عاقلوں میں کامل العقل ایک ہی دو ہوتے ہیں۔ تو عقلاء میں بھی کثرت ان ہی لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔ سید احمد خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا بالکل خاموش ہوگئے۔ غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے۔ خواہ وہ غلط ہو یا صحیح بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے قول کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی۔ تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوگیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہوسکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں اور بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا

بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہوں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے۔ اُن کو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنایا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل وعقد اور اے جماعت عقلاء بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہوسکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی رزانت نہ ہو اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زرین ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل وعقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔ پس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو رزین العقل صائب الرائے سمجھتے ہیں۔ اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے ہی کی کیا ضرورت ہے جس کے لئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو۔ بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صائب العقل رزین سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے۔ اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں وشاورھم فی الامر مگر یہ بالکل غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کے دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا

پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا اُن کے آقا نے کردیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں۔ اگر چاہیں فسخ کردیں اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں۔ اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ نے نکاح سابق کو فسخ کردیا۔ لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی وہ صدمہ فراق میں مدینہ منورہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہ سے آپؐ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہو۔ اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے۔ اگر حکم ہے تو بسر وچشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو۔ آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ تو حضرت بریرہؓ نے صاف عرض کردیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس مشورہ کو قبول نہیں کرتی۔ لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفہ تو بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے۔ چنانچہ جب حضرت بریرہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے۔ نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا نہ اُن پر کچھ عتاب ہوا تو جب امت اور رعایا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہوجائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے پس وشاورھم فی الامر سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعا سے مشورہ کرلیا کریں یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں۔ اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اس وقت تک وشاورھم فی الامر سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے

مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعوے ہی دعوے ہے۔ اور ہمارے پاس حدیث بریرہ سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں خواہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہرگز نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کرکے اس پر عمل کریں یہاں اذا عزمت صیغہ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو اذا عزمت نہ فرماتے بلکہ اس کے بجائے اذا عزم اکثرکم فتوکلوا علی اللہ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ ہے حفظت شیئًا وغابت عنك اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کرلیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ تم ازخود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو۔ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں۔ اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کرسکیں۔ چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وھو حقکم علیھم کہیں نہیں کہا گیا جب رعایا کو ازخود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجۂ لزوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو ازخود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ اس سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کردے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدون مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے۔ ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعوے بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے اور جس

آیت سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں میں نے بتلا دیا کہ اُس سے استدلال نہیں ہو سکتا بلکہ اگر غور کریں تو اُسی آیت سے شخصی حکومت کا ثبوت ہو رہا ہے اور اس آیت میں فتوکل علی اللہ جو حق تعالےٰ نے فرمایا ہے اس میں ایک عجیب حکمت ہے یہ بات اسی وقت ذہن میں آئی ہے وہ حکمت یہ ہے کہ بعض لوگوں کا جو خیال ہے کہ ایک شخص کی تنہا رائے کبھی صحیح نہیں ہو سکتی ضرور اس میں غلطی ہوگی۔ اس کا جواب فتوکل علی اللہ میں دیا گیا ہے سبحان اللہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آوے گا جس میں مادہ پرستی غالب ہوگی۔ اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہوگا کہ شخص واحد کی رائے ضرور غلطی کرے گی۔ اس لئے پہلے ہی سے اس کا بھی جواب دیدیا اور ایسا جواب دیا جس میں گفتگو کی مجال نہیں۔ اس خیال کا ایک جواب تو یہ تھا کہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے تم تجربہ کر کے دیکھ لو معلوم ہو جائے گا کہ بعض دفعہ ایک شخص کی رائے تمام دنیا کے خلاف صحیح ہوتی ہے۔ مگر اس سے گفتگو قطع نہیں ہوتی اور تو تو میں میں شروع ہو جاتی ہے چنانچہ آجکل یہ جواب دیکر دیکھ لو جو کبھی گفتگو قطع ہو۔ مخاطب کبھی اس کو اتفاق پر محمول کرے گا کبھی یہ کہے گا کہ واقع میں تو اکثر ہی کی رائے صحیح تھی۔ مگر بعض موانع کی وجہ سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی اور شخص واحد کی رائے واقع میں غلط تھی۔ مگر اسباب خارجیہ ایسے پیش آگئے جن کی وجہ سے اس کی رائے کامیاب ہوگئی۔ وعلیٰ ہذا۔ کچھ نہ کچھ توجیہیں نکال لی جائیں گی مگر حق تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا۔ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جواب ایسا دیا کرتے ہیں جس سے مخاطب کی تسلی ہو جائے۔ قرآن میں مقدمات اور صغریٰ کبریٰ اور قیاسی اشکال سے جواب نہیں دیا گیا کیونکہ اس سے گفتگو قطع نہیں ہوتی۔ مخاطب مقدمات میں گفتگو کرنے لگتا ہے بلکہ قرآن میں جواب ایسی مختصر بات سے دیا جاتا ہے جو دل میں گھس جائے اور مخاطب کو گفتگو کی جگہ نہ ملے چنانچہ اس کا خیال کا دوسرا جواب وہ ہے جو فتوکل علی اللہ میں دیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حاکم کا قلب مشورہ کے بعد جب ایک شق کی طرف مائل ہو جائے تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل شروع کر دے تمہارے ہاتھوں میں خزائن کامیابی نہیں ہیں بلکہ سب خزائن ہمارے ہاتھ میں ہیں

تم خدا پر بھروسہ کر کے عمل کرو حق تعالیٰ شخص واحد کی رائے کو بھی کامیاب کر سکتے ہیں بلکہ اگر وہ رائے غلط بھی ہوگی تب بھی توکل کی برکت سے صحیح ہو جائے گی۔ اور اگر عقل اس کو تسلیم نہ کرے تو تم عقل کے فتوے پر عمل نہ کرو۔ بلکہ ہمارے قانون پر عمل کرو ہمارا قانون یہ ہے کہ مشورہ کے بعد حاکم کی رائے جس طرف قائم ہو جائے اس کو اپنی رائے کے موافق عمل کرنا چاہیئے اور خدا پر نظر رکھنی چاہیئے۔ وہ ایک آدمی کی رائے کو بھی تمام عالم کی رائے پر غالب کر سکتے ہیں۔ عقل اگر یہ کہے کہ ایک کی رائے صحیح نہیں ہو سکتی تو اس کی بات پر التفات نہ کرو عقل بے چاری ہے کیا چیز۔ جو قانون خداوندی میں اس کے فتوے سے مزاحمت کی جاوے عقل کی بس اتنی حقیقت ہے کہ اُسے خود اپنی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ عقلاء میں اب تک اختلاف ہے کہ عقل جوہر مجرد ہے یا جوہر مادی ہے۔ اور یہ نفس ناطقہ کے علاوہ کوئی چیز ہے یا خود نفس ہی کا نام عقل ہے یہ عقل کا علم ہے پھر اس کو احکام خداوندی میں مزاحمت کا کیا حق ہے جو لوگ عقل کے بہت متبع ہیں وہ ہر وقت پریشان ہیں۔ ہر چیز کی لِم دریافت کرنا چاہتے ہیں مگر بعض جگہ گاڑی اٹک جاتی ہے اور کوئی بات نہیں بنتی۔ اور جہاں کچھ اسباب و علل معلوم بھی ہو جاتے ہیں وہ بھی اٹکل اور تخمین سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پرسوں آندھی آئی تھی میں کہہ رہا تھا کہ عقلاء کے نزدیک اس کے بھی کچھ اسباب ہیں تو یہ لوگ اُن اسباب میں تصرف کر کے ذرا اس کو روک تو دیں۔ آخر اور بہت سے اسباب میں یہ تصرف کے مدعی ہیں۔ آندھی کے اسباب میں بھی تو ذرا تصرف کر کے دکھلائیں دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ اسباب اختیاری ہیں یا غیر اختیاری ہیں اور قابل تصرف نہیں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ آندھی کا آنا اور اس کا روکنا کسی کے اختیار میں نہیں تو پھر خواہ مخواہ اسباب کا نام کیوں کرتے ہیں۔ موحد کی طرح صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ حق تعالیٰ کے حکم سے آندھی آتی ہے، اسی طرح زلزلہ آتا ہے۔ اس کے لئے بھی ان کے نزدیک کچھ اسباب ہیں۔ تو ذرا اُن اسباب میں تصرف کر کے زلزلہ کو روک تو دیں۔ زلزلہ کو تو کیا روکتے جن چیزوں کا ان کو تجربہ سے علم بھی ہو چکا ہے ان کی بھی

لم معلوم نہیں۔ مثلاً زلزلہ سے کچھ پہلے مقناطیس کی خاصیت جذب زائل ہوجاتی ہے ذرا اس کی لم مجھے کوئی بتلا دے کہ آخر زلزلہ میں اور مقناطیس کی قوت میں تعلق کیا ہے۔ زلزلہ سے اس کی قوت جذب کیوں زائل ہوجاتی ہے کوئی شخص اس کی لم بیان نہیں کرسکتا۔ باقی اٹکل پچو بات گھڑ دینا تو ہر ایک کو آسان ہے لم تو وہ ہے جس کو دل بھی قبول کرلے ورنہ گھڑ گھڑ کے بیان کردینا کیا مشکل ہے۔ مگر وہ ایسی لم ہوگی جیسے بعض لوگوں نے چیتے کے بدن پر نشانات کی وجہ بتلائی ہے کہ وہ دھوپ میں سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھتا تھا۔ اس لئے جہاں دھوپ پڑی وہاں سے سفید ہوگیا جہاں سایہ پڑا وہاں سے سیاہ ہوگیا۔ واہیات بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اس چیتے کے پاس کوئی پرکار تھی کہ ہر روز ایک ہی جگہ میں ٹھیک بیٹھتا تھا اور آہستہ آہستہ دھوپ سے سایہ میں اور سایہ سے دھوپ میں اس طرح ہٹتا تھا کہ بدن پر گول ہی نشانات پڑیں کوئی نشان مربع یا مستطیل یا مثلث ومکعب نہ ہو۔ کیا کسی کے دل کو یہ بات لگ سکتی ہے۔ چیتا کیا ہوا بڑا ماہر انجنیر ہوا مگر ان احمقانہ وجوہ پر یہ لوگ خوش ہیں۔ کہ ہم نے وجہ تو بیان کردی ہے چاہے وہ ایسی ہی وجہ ہو جیسے ایک شیخ نے جاٹ سے کہا تھا کہ جاٹ اے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ۔ اس نے کہا شیخ رے شیخ تیرے سر پر کولھو۔ شیخ نے کہا واہ قافیہ تو ملا ہی نہیں۔ کہنے لگا قافیہ نہ سہی بوجھ میں تو مرے گا۔ ایسے ہی ان کی وجہ ہوتی ہے کہ چاہے جوڑ نہ ہو مگر وجہ ہونی چاہیئے۔ یہ ساری خرابی ہے طبیعت بے شعور کو فاعل ماننے کی کیونکہ یہ لوگ یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ نشانات طبیعت نے بلا واسطہ بنا دیئے ہیں کیونکہ طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ کس طرح افعال مختلفہ بناتی اس لئے اسباب کا واسطہ مانتے ہیں پھر اٹکل پچو اسباب گھڑ کر نکالتے ہیں اور موحد کو کسی جگہ اٹکاؤ نہیں۔ وہ بڑا بے فکر ہے جس بات کی اس سے وجہ پوچھو وہ کہتا ہے کہ خدا نے یوں ہی بنانا چاہا تھا بنا دیا۔ اور گو وہ واحد حقیقی ہے مگر ارادہ کے تعلق کی وجہ سے افعال میں اختلاف واقع ہوگیا اس لئے الواحد لا

یصدر عنہ الا الواحد کے بھی خلاف نہیں کیونکہ یہ حکم علت موجبہ میں ہے اور حق تعالے ایجاب سے منزہ ہیں۔ اور طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ علت موجبہ ہی ہوگی اس لئے اس کی طرف ان افعال کی نسبت نہیں کر سکتے۔ ہائے کیسے غیر ذی شعور کو فاعل مانا۔ اور جس جگہ ان سے کوئی تاویل نہیں بنتی نہ الٹی نہ سیدھی نہ کوئی سبب ظاہری سمجھ میں آتا ہے تو وہاں بھی ظالم خدا کو فاعل نہیں مانتے بلکہ ان مواقع کے لئے بخت واتفاق کو گھڑ لیا ہے۔ مگر یہ محض نام ہی نام ہے۔ اِنْ هِیَ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّیْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ۔ کوئی ان سے پوچھے بخت و اتفاق ہے کیا بلا اس میں فاعلیت کی قوت کہاں سے آگئی اور یہ کیونکر سبب بن گیا۔ بس اس کا کچھ جواب نہیں یہ ہے عقل محض کے اتباع کا نتیجہ جس سے ایسی بے عقلی کی باتیں ماننا پڑتی ہیں۔ موحد کیسی چین میں ہے کہ اس کو ایسی دور از کار باتیں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سب کا فاعل خدا ہے۔ اس نے جس طرح پیدا کرنا چاہا پیدا کر دیا نہ اس کو طبیعت کی ضرورت ہے نہ بخت و اتفاق کی اور جہاں ظاہر میں کچھ اسباب کا دخل معلوم بھی ہوتا ہے۔ وہاں وہ کہتا ہے۔

کہ اسباب موثر بالذات نہیں ہیں۔ بلکہ یا تو موثر باذن الخالق ہیں جیساکہ ایک قول ہے اور یا موثر ہی نہیں بلکہ محض علامات ہیں، جیسا ایک قول ہے۔ جیسے جھنڈی کا ہلنا ریل کے چلنے کی محض علامت ہے موثر بالذات حق تعالیٰ ہیں اگر وہ ارادہ نہ کریں تو سارے اسباب بے کار پڑے رہیں۔ جیسے ڈرایور گاڑی کو روکنا نہ چاہے تو ہزاروں سرخ جھنڈیاں بیکار ہو جاتی ہیں۔ بتلایئے یہ شخص چین میں ہے یا وہ شخص جو کبھی اسباب کو فاعل مانتا ہے۔ کبھی طبیعت کو۔ کبھی بخت و اتفاق کو۔ موحد ان اسباب پرستوں کی پریشانی دیکھ کر یوں کہتا ہے ؎

اربا[1] واحداً ام الف رب ادین اذا تقسمت الامور
ترکت[2] اللات والعزیٰ جمیعًا کذلک یفعل الرجل البصیر

[1] و [2] (کیا میں ایک رب کی عبادت کروں یا ہزاروں رب کی اس صورت میں تو

امور انتظامیہ کی تقسیم بہت سے خداؤں میں ہو گی۔ میں نے ترک کیا
لات اور عزّیٰ (جو بتوں کے نام ہیں) سب کو اور عقل والے انسان
اسی طرح کرتے ہیں)

وہ ان سب لات وعزیٰ پر لات مارتا ہے اور ایک خدا کو فاعل مانتا ہے اور اسباب پرستوں سے کہتا ہے کہ تم ایک خدا کو چھوڑ کر کہاں مارے مارے پھرتے ہو چھوڑ دو ان خرافات کو اور یہ مذہب اختیار کرو ؎

مصلحت دید من آں است کہ یاراں ہمہ کار　　بگذارند و خمِ طرۂ یارے گیرند

(میری تحقیق تو یہ ہے کہ ہمارے احباب سب کام چھوڑیں اور محبوب کے زلف کے
خم کو پکڑ لیں یعنی حق تعالےٰ سے رابطہ قائم کریں)

اور مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

خلیل آسا در ملک یقین زن　　نوائے لا احب الآفلین زن

(مثل حضرت ابراہیم علیہ السلام ملک یقین کا دروازہ کھٹکھٹاؤ اور میں کسی فانی
سے محبت نہیں کرتا کا نعرہ لگاؤ)

کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اسباب سب اس کے قبضہ میں ہیں ؎

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند　　بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

(خاک وہوا و پانی اور آگ سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں ہمارے سامنے تو مردہ
ہیں مگر حق تعالےٰ کے ساتھ یہ زندہ ہیں)

واللہ مواحد سے بڑھ کر کوئی چین میں نہیں پھر مشرکین کے بعضے معبود ایسے ہیں کہ ان میں باہم رقابت ہے۔ وہ ایک کی عبادت دوسرے سے چھپا کر کرتے ہیں۔ کہیں وہ یہ معلوم کرکے کہ یہ دوسرے کے پاس بھی جاتا ہے ناخوش نہ ہو جائے۔ جیسے کوئی رنڈی دو آشنا کرے تو وہ ایک کے پاس دوسرے سے چھپ کر جاتی ہے اور موحد کو ایسا اطمینان ہوتا ہے جیسا بچہ کو ماں کی گود میں اطمینان ہوتا ہے۔ بچہ ماں کی گود میں جاکر بالکل بے فکر ہو جاتا ہے۔ کہ بس اب کسی کا خوف نہیں اور اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ

دوسرا پیار سے بھی بلائے تو اس سے بھاگتا ہے اور ماں اگر مارتی بھی ہے تو اس سے بھاگتا نہیں۔ بلکہ رو کر اسی کو چمٹ جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

مادرش گر سیلے بروئے زند ہم بما در آید ابروئے تند

(اس کی ماں اگر طمانچہ لگاتی ہے تو وہ بچہ ماں ہی کے اوپر لپٹ جاتا ہے)

از کسے یاری نخواہد غیر او اوست جملہ شر او و خیر او

(ماں کے علاوہ کسی سے یاری اور مدد نہیں چاہتا صرف ماں کو شر و خیر کا مالک سمجھتا ہے)

(دفتر چہارم ثلثہ اربا ع)

افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور خدا تعالیٰ تیر انداز ہوں تو اس سے بھاگ کر کہاں جائے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جا کھڑا ہو کیونکہ تیر دور والے کے لگتا ہے پاس والے کے نہیں لگتا۔

افلاطون نے کہا کہ یہ جواب بجز نبی کے کوئی نہیں دے سکتا واقعی آپ نبی ہیں۔ مگر بایں ہمہ یہ حکماء اتباع نہیں کرتے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ نبی کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جنھوں نے اپنے نفوس کی اصلاح نہیں کی۔ ونحن قوم هذبنا انفسنا فلاحاجة لنا الى من يهذبنا۔ اور ہم اپنے نفسوں کو مہذب بنا چکے ہیں، ہمیں کسی مذہب بتانے والے کی ضرورت نہیں۔

مگر بخدا ان کا یہ خیال غلط تھا۔ بھلا عقلی تہذیب بھی کہیں نبی سے مستغنی کر سکتی ہے۔ ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی تہذیب کو دیکھا ہی نہیں۔ ورنہ اقرار کر لیتے کہ اس کے سامنے ہماری تہذیب سراسر بد تہذیبی ہے۔ چنانچہ مجاہدات و ریاضات میں حکماء یونان کو کمال حاصل تھا اور اسی تہذیب کے وہ مدعی تھے مگر میں نے بیانات سابقہ میں ثابت کر دیا ہے۔ کہ مجاہدات کی جو صورت شریعت نے تجویز کی ہے اس کی حکماء یونان کو ہوا بھی نہیں لگی۔ جو طریقے اُن لوگوں نے ریاضت و مجاہدہ کے لئے تجویز کئے ان میں بیشمار غوائل و فتن ہیں اور منافع بہت کم۔

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

اور شریعت نے جو طریقے مجاہدات کے تجویز کئے ہیں وہ عوامل سے محفوظ اور منافع سے پر ہیں۔ ذرا کوئی ان کی نظیر تو دکھلائے۔ یہ کلام تو ان حکمار کی تہذیب میں تھا باقی آج کل جس چیز کا نام تہذیب رکھا جاتا ہے میں تو اس کو تعذیب کہا کرتا ہوں۔ یہ تو ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو تہذیب کہا جائے اس سے تو حکمار یونان کی ہی تہذیب اچھی تھی۔ کیونکہ ان میں کسیقدر روحانیت بھی تھی، وہ لوگ خدا کے قائل تھے۔ توحید کے قائل تھے۔ گو توحید میں اتنا غلو کیا کہ خدا کو معطل کر کے عقول عشرہ کو فاعل اور قدیم مان لیا مگر پھر وہ لوگ آجکل کے حکمار سے اچھے تھے خدا کے وجود کے تو قائل تھے اور جہاں تک ان کی عقل نے کام دیا وہاں تک صفات کمال کو بھی حق تعالیٰ کے لئے ثابت کرتے تھے اور آجکل کے حکمار تو ایسے بدتہذیب ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک چپراسی اپنے افسر سے تنخواہ لیتا ہو۔ مگر تنخواہ لینے کے بعد کہتا ہے کہ میرا کوئی افسر نہیں نہ مجھے کوئی تنخواہ دیتا ہے بلکہ زمین سے خود بخود روپیہ پیدا ہو جاتے ہیں اور ہوا سے اڑ کر میرے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ رسالہ حمیدیہ میں موحد اور دہری کی مثال ایک گفتگو کے پیرایہ میں خوب لکھی ہے کہ ایک موحد اور ایک دہری کسی جزیرہ میں گئے۔ وہاں ایک مکان نہایت خوبصورت مستحکم بنا ہوا دیکھا جس میں ایک طرف کھانے کا کمرہ ہے جو فرش فروش اور آئینوں سے سجا ہوا ہے۔ ایک طرف سونے کا کمرہ ہے جس میں عمدہ عمدہ مسہریاں بچھی ہوئی اور فرشی پنکھے لگے ہوئے ہیں ہر کمرہ میں ہوا کے لئے روشندان بنے ہوئے ہیں، ایک طرف باغ لگا ہوا ہے جس کے درخت نہایت قرینے سے لگائے گئے ہیں، ایک طرف حوض بنا ہوا ہے جس میں فوارہ سے ہر وقت پانی آتا ہے۔ موحد نے اس مکان کو دیکھ کر کہا کہ اس کا بنانے والا بڑا ہی صناع اور بہت ہی ماہر تھا جس نے نہایت عمدگی اور مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ اس مکان کو تیار کیا۔ دہری نے کہا کہ اس کا بنانے والا کوئی نہیں بلکہ عرصہ دراز تک بارش ہونے سے زمین کی مٹی جم گئی پھر دھوپ سے پختہ اینٹیں بن گئیں۔

پھر ہوا سے اڑ اڑ کر وہ اینٹیں اس جگہ آ کر جمع ہو گئیں۔ پھر ہوا چلی اور ان کو اوپر نیچے کر دیا اس طرح دیواریں بن گئیں، پھر پہاڑوں سے پتھر گرے اور ہوا نے ان کو اڑا کر یہاں کھڑا کر دیا اس کے ستون بن گئے، پھر درختوں کی لکڑیاں ہوا سے ٹوٹ گئیں وہ اڑ کر یہاں چھت کی صورت میں قائم ہو گئیں اسی طرح اس نے سارے مکان کو ہوا اور دھوپ سے تیار کر دیا۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ بتلائیے ان میں گدھا کون ہے اور آدمی کون ہے۔ یقیناً وہ شخص بالکل گدھا ہے جو ایسے مکان کی نسبت یوں کہتا ہے کہ وہ خود بخود تیار ہو گیا۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جو لوگ آسمان و زمین کی اتنی بڑی عجیب و غریب اور عظیم الشان عمارت کو کسی صانع کی بنائی ہوئی نہیں مانتے بلکہ از خود تیار مانتے ہیں وہ بے وقوف ہیں یا نہیں۔ تو یونان کی حکمت اس حکمت سے پھر اچھی تھی۔ وہ لوگ خدا کے تو قائل تھے۔ اور اہل سائنس تو غضب کرتے ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں اور سائنس والوں میں سے جو مسلمان خدا کے قائل بھی ہیں یہ ان کی محض وضعداری ہے۔ ورنہ ان کا خدا کو ماننا ایسا ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی سے پوچھے کہ تو نے بادشاہ کو دیکھا ہے وہ کہے ہاں دیکھا ہے۔ اُس کے ایک سونڈ تھی اور ذرا سا سر تھا۔ اور آنکھیں نہیں تھیں۔ تو پہلا شخص یہ اوصاف سُن کر کہے گا کہ کمبخت تو نے بادشاہ کو نہیں دیکھا۔ نہ معلوم کس بلا کو دیکھ لیا ہے بادشاہ تو ایسا بدصورت نہیں ہے یہی حال ان سائنس داں مسلمانوں کا ہے جو خدا کے قائل ہیں مگر اس کے کمالات کے منکر ہیں جن میں سے ایک بڑا کمال یہ ہے یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس خدا نے عالم کو پیدا کر کے طبیعت اور مادہ کے سپرد سارا کام کر دیا ہے۔ اب جو ہوتا ہے وہ اسباب طبعیہ سے ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے ارادہ کو کچھ دخل نہیں گویا خدا نے گھڑی میں کوک بھر دی ہے اب اس کے چلنے میں فنر اور بال کمانی کی طاقت کو دخل ہے خدا کو کچھ دخل نہیں۔ اسی لئے یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام پر نار کے گلزار ہونے کا انکار کرتے ہیں کہ آگ بھلا کیونکر ٹھنڈی ہو گئی یہ قانون طبیعت کے خلاف ہے بھلا بنی اسرائیل پر پہاڑ کیونکر معلق ہو گیا۔ اور ایک ذرا سے پتھر میں سے

بارہ چشمے کیونکر بہنے لگے۔ یہ تو قانون فطرت کے خلاف ہے ان لوگوں نے خدا تعالے کو قانون فطرت کے تابع بنا دیا۔ موحد کہتا ہے کہ نہ معلوم تم کس عاجز کو خدا سمجھتے ہو۔ خدا تو ایسا عاجز نہیں۔ اس کی تو شان یہ ہے کہ ایک پتہ بھی اس کے حکم و ارادہ کے خلاف نہیں ہل سکتا اور اگر وہ چاہے تو تمام عناصر کی خاصیت کو دم بھر میں بدلدے۔ پس ان اوصاف کے ساتھ یہ ان کا کہنا کہ ہم خدا کے قائل ہیں ویسا ہی ہے جیسا اس شخص نے کہا تھا کہ ہاں میں نے بادشاہ کو دیکھا ہے اس کے ایک سونڈ تھی اور آنکھیں ندارد تھیں۔ مگر با ایں ہمہ ان کو کافر نہ کہیں گے کیونکہ ان کے اقوال سے خدا کا انکار صرف لازم آیا ہے التزام نہیں پایا گیا۔ اور لزوم کفر کفر نہیں۔ التزام کفر کفر ہے۔ اس لئے ہم ایسے مسلمانوں کو کافر نہیں کہتے پھر بھی یہ لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں۔ میں اس کے جواب میں کہا کرتا ہوں کہ مولوی کافر بناتے نہیں بلکہ کافر بتاتے ہیں۔ یعنی جو شخص اپنی حرکتوں سے کافر بن جاتا ہے مولوی اس کے کفر کو ظاہر کر دیتے ہیں جیسے کسی شخص کے کپڑے میں پاخانہ لگا ہوا ہو۔ اور دوسرا شخص اس سے کہدے کہ آپ کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے۔ اس کو دھو لیجئے۔ تو کہئے اس نے پاخانہ لگایا یا کہ پاخانہ لگا ہوا بتا دیا پس آپ کا مولویوں پر جھلانا ایسا ہی ہے۔ جیسا وہ شخص جس کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے۔ بتلانے ولے کو دھمکانے لگے کہ واہ صاحب تم ہمارے لباس میں پاخانہ لگاتے ہو۔ وہ کہے گا بیوقوف میں نے تو لگایا نہیں نہ میرے پاس پاخانہ موجود ہے جو میں لگاتا۔ تو نے خود اپنی بے احتیاطی سے کہیں لگا لیا ہے۔ میں نے تو تجھے اطلاع کی ہے، کہئے ان دونوں میں کون حق پر ہے۔

دیکھو کافر بنانا تو یہ ہے کہ کسی کو کفر کی تلقین کی جائے۔ جیسے مسلمان بنانا یہ ہے کہ کسی کو اسلام کی تلقین کی جائے۔ تو جس طرح ہم کافروں کو اسلام کی تلقین کر کے مسلمان بناتے ہیں کیا اسی طرح کسی مسلمان کو تلقین کفر کرتے ہوئے

آپ نے کسی مولوی کو دیکھا ہے۔ کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مولوی کافر بناتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ کافر بتاتے ہیں۔ ایک اور مزے کی بات سنئے۔ جب اہل سائنس نے خدا کا انکار کیا اور طبیعت کو فاعل مانا تو ان کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ اسباب طبعیہ کے موافق انسان کی اصل دریافت کی جائے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کا خدا کے ہاتھ سے پیدا ہوتا تو ان کو مسلم نہیں۔ یہ تو ان کی عقل سے بعید ہے۔ تو ڈارون کو یہ کہنا پڑا کہ انسان کی اصل بندر ہے۔ بندر ترقی کر کے انسان بن گیا۔ اس کا نام مسئلہ ارتقاء ہے اس بیچارہ کو اپنے مناسب تمام حیوانات میں بندر ہی نظر آیا۔ جب کوئی اس قول کی تردید کے درپے ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس قول کے انکار کی ضرورت نہیں اس کو اپنے نسب کا حال ہم سے زیادہ معلوم ہے اس لئے وہ اپنا نسب بیان کرتا ہے۔ وہ بندر ہی کی نسل سے ہوگا۔ اور ہم کو اپنے نسب کا حال اس سے زیادہ معلوم ہے کہ ہم آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ تو تم اس کی بات کا کیوں انکار کرتے ہو وہ بیچارہ تو اپنا نسب بتلا رہا ہے، تمہارا نسب تھوڑا ہی بتلا رہا ہے اور جس دن وہ ہمارا نسب بتلائے گا ہم کہدیں گے۔ صاحب البیت ادری بما فیہ۔ کہ گھر والے کو اپنے گھر کی خبر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے نسب کی خبر تجھ کو ہم سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ ہمارے پاس شجرۂ نسب آدم علیہ السلام تک محفوظ ہے تجھے ہمارے نسب میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں تیرے پاس اپنا شجرۂ نسب محفوظ نہ ہوگا۔ تو تجھے اختیار ہے کہ جس سے چاہے اپنا نسب ملالے (مجہول النسب یہ نہ کرے تو اور کیا کرے ۱۲ جامع)

یہ ساری خرابی طبیعت کو فاعل ماننے سے لازم آئی۔ خدا کو مان لیتے تو اس جھگڑے میں نہ پھنستے۔ یہ تو اُن سائنس والوں کا حال تھا جو خدا کے منکر ہیں۔ اب اُن سائنس والوں کا حال سنئے جو برائے نام خدا کے قائل ہیں ان میں سے ایک صاحب علم کا قصہ ہے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کا قصہ ڈارون کی تحقیق کے مصادم ہے۔ تو وہ بولے کہ شاید وہ پہلا بندر

جس نے انسان کی طرف سب سے پہلے ترقی کی ہے (نعوذ باللہ) آدم علیہ السلام ہی ہوں۔ استغفر اللہ استغفر اللہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس بات کی نقل سے بھی۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور خدا کا قائل بتلاتے ہیں یہ محض وضعداری ہے ورنہ حقیقت میں یہ خدا کے قائل نہیں۔ بھلا ڈارون کو تو اس قول پر اس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ خدا کو فاعل نہیں مانتا طبیعت کو فاعل مانتا ہے۔ اور طبیعت دفعۃً ترقی نہیں کر سکتی تدریجاً ترقی کرتی ہے کہ پہلے اجسام بسیط یعنی عناصر کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے جمادات مرکبہ کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے حیوانات کی صورت اختیار کی۔ پھر حیوانات میں سے کسی نے ترقی کر کے انسان کی صورت اختیار کر لی۔ مگر جو شخص خدا تعالےٰ کو فاعل مختار مانتا ہو اس کو اس قول کی طرف کس چیز نے مضطر کیا۔ اس کے نزدیک اس میں کیا استحالہ ہے کہ خدا تعالےٰ آدم علیہ السلام کے پتلہ کو مٹی اور پانی سے بنا کر دفعۃً اس کو انسان بنا دیں۔ اس ظالم کو ڈارون کی تقلید پر کس بات نے مجبور کیا کہ وہ خوامخواہ ایک نبی کی توہین پر آمادہ ہوتا ہے۔ پھر اس میں علاوہ توہین نبی کے یہ بھی خرابی ہے کہ یہ تاویل ڈارون کے قول پر بھی غلط ہے۔ کیونکہ ڈارون اس کا قائل نہیں کہ دنیا میں صرف ایک بندر ترقی کر کے انسان ہوا ہو جس کی نسل میں یہ سب انسان ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ جس وقت بندر کی طبیعت نے ترقی کی تو ایک خاص وقت میں ہر جگہ ہزاروں لاکھوں بندر آدمی بن گئے اور یہ سب ایک کی نسل سے نہیں تو اس شخص نے ڈارون کی تقلید میں قرآن کے اندر تحریف کی۔ اور وہ تحریف بھی ڈارون کے یہاں قبول نہ ہوئی تو ادھر سے بھی گئے اُدھر سے بھی گئے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

ہائے یہ لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر کدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ موحد کو ایک

خدا سے تعلق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ سے بلاواسطہ علاقہ ہے. اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں غلطی نہیں ہوسکتی۔ آپ کی شان یہ ہے ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(اس کا کہا ہوا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اگرچہ عبد اللہ کے حلق سے وہ حروف نکلے ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلق ہی سے قرآن نکلا مگر وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے)

اس لئے موحد کو اپنے علوم پر اطمینان ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو وہ علوم ہی اطمینان بخش ہیں موحد کہتا ہے کہ ہر چیز کا فاعل خدا ہے خدا نے آدم علیہ السلام کو دفعۃً مٹی سے پیدا کر کے دفعۃً انسان بنا دیا۔ اس کو کچھ ضرورت نہیں کہ اپنا نسب بندر یا سور سے ملائے تو خدا کو فاعل ماننے میں کیسی راحت ہے کہ سب جھگڑوں سے نجات ہوگئی۔ یہ تو علمی راحت ہے۔ اور دنیوی حسی راحت یہ ہے کہ حوادث و مصائب میں موحد مستقل و مطمئن رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے

قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا و علی اللہ فلیتوکل المؤمنون ط

کہ ہم کو وہی پیش آئیگا جو خدا نے مقدر کر دیا ہے۔ اس کے خلاف ہرگز کچھ پیش نہیں آسکتا اور حق تعالیٰ ہمارے آقا اور مولیٰ ہیں ان کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آئیگا اس میں رحمت و حکمت ہی ہوگی اس لئے خدا ہی پر مسلمان کو بھروسہ کرنا چاہیئے بتلایئے جس کا یہ اعتقاد ہو وہ مصائب میں کب پریشان ہوسکتا ہے اور ملحد پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کی پریشانی کی کوئی حد نہیں رہتی کیونکہ اس کو اسباب پر اعتماد تھا۔ اور اسباب اس کے مخالف ہوگئے تو اب اس کے پاس کوئی سہارا نہیں۔ اور موحد کو خدا پر اعتماد ہے اور خدا کو وہ اپنا مخالف نہیں سمجھتا بلکہ مولیٰ اور آقا سمجھتا ہے اُس کو اسباب کے مخالف ہوجانے پر بھی یہ امید ہے کہ شاید خدا تعالیٰ اسباب مخالفہ کو موافق بنا دیں اور اگر اسباب مخالف ہی رہے اور اس کو ناکامیابی بھی ہوجائے تب بھی وہ راضی ہے. کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی

طرف سے جو بات بھی آتی ہے اس میں خیر ہی ہوتی ہے پس اس صورت میں اگر دنیا کا ضرر ہوا۔ تو میری آخرت کی ترقی ہوگی قُلْ هَلْ تربصون بنا الا احدی الحسنیین ط موحد کے لئے مصائب میں بھی فائدہ ہی ہے۔ اور وہ ترکالیف سے بھی خوش ہوتا ہے جیسے بچہ دودھ چھوٹنے کے وقت گو پریشان ہوتا ہے اور اس وقت اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر بعد میں ماں کو دعا دیتا ہے کہ ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دیں کہ میری آنکھیں کھولدیں اور میری جان کو محبوب حقیقی سے آگاہ کر دیا۔)

وہ کہتا ہے خدا اس ماں کا بھلا کرے۔ جس نے دودھ چھڑا کر مجھے اس قابل کر دیا کہ آج میں پلاؤ زردہ قورمہ اور کباب کھا رہا ہوں اگر دودھ ہی پیتا رہتا تو یہ نفیس و لذیذ غذائیں کیونکر کھاتا۔ اسی طرح موحد کو مصیبت کے وقت گو ظاہر میں تکلیف ہوتی ہے مگر تکلیف کے بعد جب اپنی ترقی کا احساس ہوتا ہے تو وہ خوش ہو کر یوں کہتا ہے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

(آپ کی طرف سے ناموافق بات بھی مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ میرا دل اس یار پر فدا ہے جو مجھ کو رنج دینے والا ہے)

اور موحد عارف کو تو عین مصیبت کے وقت اس کی حکمتیں اور اپنی ترقی محسوس ہو جاتی ہے اس لئے وہ تکلیف بھی لذیذ ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر مصیبت لوگوں کی نظر میں موت ہے۔ یہ منتہی المصائب ہے کہ وہ تمام مصائب کا انتہائی درجہ ہے اور اسی کے اندیشہ سے آدمی تمام مصائب سے گھبراتا ہے مگر عارف موحد کے نزدیک یہ زہر کا پیالہ بھی شیریں ہے وہ کہتا ہے ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

(مبارک وہ دن ہوگا جس دن اس دنیا کے ویران سے رخصت ہوں گا اور

راحت جان طلب کردن گا اور اپنے محبوب کے پاس جاؤں گا)

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا در میکدہ شادان وغزلخواں بروم

(میں نے نذر کیا ہے کہ جس دن اس محبوب حقیقی کا وصال مجھے عطا ہوگا تو میکدہ تک خوش خوش غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا)

یعنی وہ تو موت کا مشتاق ہوتا ہے اور اس کے لئے نذریں مانتا ہے۔ شاید کوئی کہے کہ یہ سارا اشتیاق موت سے پہلے ہی ہوگا۔ مرتے وقت تو نانی یاد آئی ہوگی۔ صاحبو! نہیں نہ ان کو نانی یاد آئی نہ دادی یاد آئی۔ بلکہ وہی ایک یاد رہا جس کے لئے موت کی تمنا کرتے تھے کون ایک، وہ ایک جس کے متعلق حضرت قلندر فرماتے ہیں ؂

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(اپنی آنکھ سے غیرت ہے مجھے کہ ان آنکھوں کو تجھے نہ دیکھنے دوں اور اپنے کان سے مجھے غیرت ہے کہ ان کو تیری بات نہ سننے دوں)

اور ؂

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

(اور اگر ملک الموت میری جان لینے آوے گا تو میں جب تک آپ کا رُخ نہ دیکھ لوں گا روح اپنی نہ نکلنے دوں گا)

اور ایک بزرگ مرتے وقت جب کہ لوگ رو رہے تھے۔ مگر وہ خوش ہو کر فرما رہے تھے ؂

چیست توحید آنکہ از غیر خدا فرد آئی در خلا و در ملا

(توحید کیا ہے یہ کہ تو غیر خدا سے تنہا رہے خواہ خلوت ہو یا جلوت ہو)

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وقت وہ آگیا کہ میں عریاں ہو جاؤں یعنی جسم کو ترک کر دوں اور صرف روح ہو جاؤں)

کہ اب تو مدت کے بعد وہ وقت آیا کہ میں جسم سے مجرد ہو کر سرتاپا روح ہو کر حق تعالیٰ

جناب میں پہونچوں گا اور اس قید خانۂ ناسوت سے نجات پاؤں گا تم روتے کس لئے ہو یہ تو خوشی کا وقت ہے۔ مگر یہ عدم توحش موت سے وہ محمود ہے جو حق کی محبت سے ناشی ہو ورنہ بعضے ایسے متہور بھی ہیں جو باوجود معاصی میں مبتلا ہونے کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایسے بہادر ہیں ہم جیل خانہ سے نہیں ڈرتے ہم کو موت کا خوف نہیں سو چونکہ منشاء اس کا محض اتباع نفس اور دعوے ہے اس لئے کوئی کمال نہیں بلکہ جرأت مذموم ہے عارف کو موت کا اشتیاق ہوتا ہے مگر وہ ڈینگیں نہیں مارا کرتا۔ دعوے کرنا اور ڈینگیں مارنا اتباع نفس کی علامت ہے یہ کچھ کمال نہیں ایسے متہور تو کفار میں بھی ہوتے ہیں ان کو بھی جیل خانہ کا خوف نہیں ہوتا نہ موت کا اندیشہ مگر یہ سب حقیقت بینی سے پہلے ہی پہلے ہے۔ باقی جب موت کے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں اُس وقت ساری بہادری خاک میں مل جاتی ہے۔ اگر یہ تہور بھی کچھ کمال ہے تو ایسے کافروں کو بھی صاحب کمال کہنا چاہیئے۔ جو کہ موت سے نہیں ڈرتے۔ پھانسی کے وقت بعض کفار نے جرأت ظاہر کی ہے مگر ظاہر ہے کہ کفر کے ساتھ کوئی دینی کمال جمع نہیں ہوسکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ تہور دینی کمال نہیں۔ بس دینی کمال یہ ہے کہ جہاں خدا کہے وہاں خوشی سے جان دو۔ ورنہ اپنی جان کو آرام دو۔ خدا کی مرضی کے موافق جب آدمی جان دیتا ہے تو اس کو عین موت کے وقت بھی راحت نصیب ہوتی ہے جس کے آثار مخفی نہیں رہتے۔ اس وقت دیندار اور متہور میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے (کما قال الشاعر) ؎

اذا اشتبکت الدموع علی خدود تبین من بکی ممن تباکی

(جب آنسوؤں کی لڑیاں رخساروں پر بہتی ہیں اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سچ مچ رو رہا ہے اور کون رونے کے لئے منہ بنا رہا ہے ۱۲ جامع)

بہادری ہر موقعہ میں کمال نہیں اور جان دینا ہر وقت دین کا کام نہیں۔ بلکہ جب وقت خدا کا حکم ہو اس وقت جان دینا دین ہے۔ ورنہ اتباع نفس ہے۔ اگر کسی موقعہ میں خدا تعالےٰ جان دینے سے منع کر دیں اس وقت جان کی حفاظت

فرض ہے۔ دیکھو شریعت نے ایک وقت میں نماز کو حرام کیا ہے۔ اور پاخانہ میں جانا فرض کیا ہے۔ اس وقت نماز پڑھنے سے گناہ ہوگا اور پاخانہ میں جانے سے ثواب ہوگا اسے کہتے ہیں حکومت کہ بندہ کو اپنے حکم کا تابع بنایا ہے۔ جب چاہا طاعت کو حرام کر دیا۔ اور نفس کی راحت دینے کو واجب کر دیا شاید تم اس مسئلے کو نہ سمجھے ہو۔ مگر فقہاء نے صاف تصریح کی ہے کہ تقاضائے بول و براز کے وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور پاخانہ پیشاب سے فراغت کرنا واجب ہے۔ اب جو عاشق ہیں وہ ہر وقت حکم کا اتباع کرتے ہیں خواہش نفس کا اتباع نہیں کرتے۔ ایک وقت ان کا جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھیں مگر شریعت حکم دیتی ہے کہ پاخانہ جاؤ تو وہ حکم شریعت کو نفس کی خواہش پر مقدم کریں گے۔ گو اس میں اُن کی جماعت فوت ہو جائے اور لوگ ملامت کریں۔ مگر ان کو ملامت کی پروا نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر کسی وقت بہادری کا جوش ہو اور دین کے لئے جان دینے کا تقاضا ہو مگر شریعت اجازت نہ دے تو وہ اپنے تقاضے کو روک لیں گے اور حکم شریعت کا اتباع کر کے جان کی حفاظت کریں گے۔ گو اس میں ان پر چاروں طرف سے ملامت ہو کہ بڑا بزدل ہے جان دینے سے ڈرتا ہے جیل خانہ جانے سے گھبراتا ہے مگر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے اور صاف کہتے ہیں ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عاقلوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم ننگ و نام نہیں چاہتے)

عشق کا خاصہ ہے کہ یہ سب سے پہلے ننگ و ناموس کو پھونکتا ہے۔ عاشق کو بدنامی اور رسوائی کی پروا کبھی نہیں ہوتی۔ رضائے محبوب کے سامنے۔ دیکھو اگر کوئی شخص ایک طوائف پر عاشق ہو اور وہ اس سے یہ کہے کہ میاں میں تم سے کچھ نہیں مانگتی بس یہ چاہتی ہوں کہ تم سب کپڑے اتار کر ایک لنگوٹی باندھکر بازار کے بیچ میں سے نکل جاؤ۔ تو اگر یہ عاشق ہے گو فاسق ہی ہو تو گذرے گا

کیوں ؟ اس لئے کہ عشق سے نخوت وناموس خاک میں مل جاتی ہے۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق وخوش سودائے ما اے طبیب جملہ علتہائے ما

(اے عشق تو خوش رہ اور اے سودا (جنوں ودیوانگی) تو خوش رہے تو تمام بیماریوں (علائق غیر اللہ) ہمارے کا طبیب ہے۔)

اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق تو ہماری نخوت و ناموس کی دوا ہے اور تو ہی ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس ہے)

جب ایک چڑیل کے حکم کے سامنے عاشق کو اپنے عزت وناموس کا خیال نہیں رہتا تو محبوب حقیقی کے عاشق کو اس کے احکام کے سامنے اپنی عزت وناموس کا خیال اور مخلوق کی ملامت وطعن کا خوف کیونکر ہوسکتا ہے ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

(عشق مولیٰ عشق لیلےٰ سے کم نہیں ہوسکتا محبوب حقیقی کے لئے گیند بن جانا اولیٰ ہے)

صاحبو! دنیا بھر کی گالیاں سننا آسان نہیں ہر وقت ملامت وطعن کا تحمل سہل نہیں مگر یہ عشق وہ چیز ہے کہ اس سے سب احکام سہل ہو جاتے ہیں اور کوئی کام مشکل نہیں معلوم ہوتا اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ نری عقل کافی نہیں عشق حاصل کرو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقل بیکار محض ہے۔ عقل کا کام مبادی تک پہنچانا ہے۔ آگے عشق کی ضرورت ہے وہاں عقل کا دخل نہیں پس عقل کا کام اتنا ہے جتنا مشاطہ کا کام ہوتا ہے کہ وہ دولہا دلہن میں وصال کراتی ہے۔ اور دلہن کو بنا سنوار کر تیار کر دیتی ہے مگر وصال کے بعد الگ ہو جاتی ہے۔ اب اگر جھانکے تو جوتے کھائے گی۔ اسی طرح وصال کی ابتدائی مرحلہ تک عقل ساتھ رہتی ہے۔ مگر جب وصال شروع ہو گیا تو اس کے بعد عقل بیکار ہے۔ اب عشق

ہی تنہا رہ جاتا ہے اب عقل کو کچھ دخل نہیں رہتا اور اس کو اسرار الٰہیہ میں گفتگو کرنے کا کچھ حق نہیں رہتا بلکہ اُس پر ہاں یہ حق ہے کہ اپنے کو تابع بنا دے۔ جب عقل تابع ہو گی عشق کی تو لازم ہے کہ اہل حق اتباع کریں اہل عشق کا۔ بلکہ اہل عشق کی شان بعض اوقات یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کی غلطیاں بھی منقلب ہو جاتی ہیں صواب سے اور اسی کی طرف اشارہ ہے حدیث شریف میں اللھم ادر الحق معہ (اے مع علیؓ) حیث دار۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے لئے دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ حق کو علی کے ساتھ گھماتے رہئے۔ جدھر وہ گھومیں۔ بظاہر یہ دعا اس طرح ہونی چاہیئے تھی اللھم ادرہ مع الحق حیث دار (یعنے اے اللہ علی کو حق کے ساتھ گھماتے رہیئے جدھر حق گھومے۔ مگر نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ حق کو علی کے ساتھ گھماتے رہیئے۔ یعنی جس طرح علی حق کے تابع ہیں اسی طرح حق کو علی کا تابع کر دیجئے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ پر تنبیہہ فرمائی ہے کہ بعض لوگ ایسے محبوب ہوتے ہیں کہ محبوبیت کے مقام میں امر حق ان کا تابع ہو جاتا ہے۔ کہ اگر وہ اجتہاد سے کسی غلط شق کو بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ تو حق تعالےٰ اسی کو حق بنا دیتے ہیں۔ جیسے ایک بزرگ کسی پر اجتہاد سے ناراض ہوں اور واقع میں وہ ناراضی بے جا ہو تو غیب سے سامان ایسا ہو جاتا ہے کہ اسی مجلس ناراضی میں اس شخص سے کوئی حرکت ایسی صادر ہو جاتی ہے جس سے وہ ناراضی صحیح ہو جاتی ہے۔ یا کسی شیخ نے مرید کے اندر مرض کبر وعجب تشخیص کیا اور واقع میں یہ مرض اس کے اندر نہ تھا۔ اب اگر مرید نے شیخ کے قول کو بیچون وچرا تسلیم کر لیا۔ تب تو خیر وہ اس مرض سے محفوظ رہتا ہے کیونکہ شیخ کا بھی اس تشخیص سے مقصود یہی تھا کہ اس میں یہ مرض نہ رہے اور اگر اس نے شیخ کی تشخیص کو رد کیا اور اعتراض کیا تو حق تعالےٰ سامان ایسے پیدا کر دیتے ہیں جس سے اس میں وہ مرض پیدا ہو کہ شیخ کی تشخیص صحیح ہو جاتی ہے۔ تو ایسا شخص کیونکر قابل اتباع نہ رہے گا۔ یہ تقریر بہت طویل ہو گئی۔ اصل میں میں یہ کہہ رہا تھا کہ احکام شرعیہ میں ہر اک کی رائے معتبر نہیں اس پر یہ مضمون

چل پڑا تھا کہ آزادی مطلق سے کبھی انتظام نہیں ہوسکتا نہ دنیا کا نہ دین کا بلکہ تابعیت ومتبوعیت ہی سے ہمیشہ انتظام درست ہوا ہے اس لئے دین میں بھی بعض کو تابع اور بعض کو متبوع ہونا چاہیئے ہر ایک کی رائے کو دخل نہ ہونا چاہیئے۔
اس پر جمہوریت وشخصیت کی بحث درمیان میں آگئی کیونکہ جمہوریت والے آزادی کے مدعی ہیں میں نے بتلا دیا کہ وہ بھی اس دعوئے آزادی سے کسی نہ کسی وقت ہٹتے ہیں اور یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی۔ کہ میں نے کہا تھا کہ فقہا وصوفیہ نے اس قاعدہ کا ہمیشہ لحاظ کیا ہے کہ جو مباح مفضی الی المعصیۃ ہو اس سے بھی منع کر دیتے ہیں اس پر میں نے بطور تنبیہ کے یہ کہا تھا کہ اس قاعدہ سے ہر شخص کو کام لینے کا حق نہیں کہ بس لگے مباحات کو حرام کرنے بلکہ یہ خاص خاص محققین کا منصب ہے۔ بہر حال مجاہدات حکمیہ میں جن چیزوں سے روکا جاتا ہے گو وہ فی نفسہ مباح ہیں مگر افضا الی المعصیت کی وجہ سے صوفیہ نے ان کے ترک کی تاکید کی ہے اور اس مجاہدہ حکمیہ کی چار قسمیں ہیں جن میں سے تین کا ذکر تو ہو چکا۔ اب ایک قسم کا ذکر رہ گیا جو کہ قلت اختلاط مع الانام ہے۔ آج اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قلت کلام کی ضرورت فی نفسہ اس قلت اختلاط سے زیادہ ہے مگر قلت کلام عادۃ موقوف ہے قلت اختلاط پر کیونکہ لوگوں سے میل جول کرکے زبان کو سنبھالنا دشوار ہے اس لئے قلت کلام کی سہل صورت یہی ہے کہ مخلوق سے الگ رہے۔ گوشہ نشینی اختیار کرے کیونکہ مجمع کا قرب بھی اختلاط کی مثل ہے۔ مجمع کے قرب سے بھی سکوت نہیں ہوسکتا اس لئے صوفیہ نے عزلت کو اختیار کیا ہے اور اس کی بہت تاکید کی ہے۔ البتہ سلف کے کلام کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں مجاہدات کا یہ طرز نہ تھا جو متاخرین میں ہے گو اصل سب کی موجود ہے۔ مگر ہیئت مختلف ہے۔ اسی وجہ سے سلف کے کلام میں عزلت اور گوشہ نشینی کی تاکید بہت کم نظر آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں عزلت کا وہ اہتمام نہ تھا جو متاخرین میں ہے بلکہ وہ اختلاط زیادہ کرتے تھے اسی وجہ سے ان کے کلام میں منافع

اختلاط کا زیادہ ذکر ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اختلاط میں ایک نفع تو یہ ہے کہ تعلیم و تعلم اسی پر موقوف ہے۔ عزلت سے تعلیم و تعلم کا باب مسدود ہو جائے گا دوسرے اختلاط میں خدمت خلق کا موقع ملتا ہے جو شخص سب سے منعزل ہوگا۔ وہ خدمت خلق کی فضیلت سے محروم رہے گا۔ تیسرے جماعت کی فضیلت اختلاط ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو شخص عزلت گزیں ہوگا وہ جماعت کے ثواب سے محروم رہے گا۔ چوتھا نفع اختلاط میں یہ ہے کہ اس سے تواضع پیدا ہوتی ہے جب آدمی مخلوق سے ملے گا تو بہت لوگوں کو اپنے سے افضل پائے گا تو اس شخص کی نظر اپنے اعمال پر کم ہوگی کیونکہ اپنے سے افضل کے اعمال کو دیکھ کر سمجھے گا کہ میں کرتا ہی کیا ہوں اللہ کے بعض بندے مجھ سے زیادہ عمل کرنے والے ہیں اور عزلت میں دوسروں کے اعمال تو پیش نظر ہوتے نہیں۔ بس اپنے ہی اعمال پر نظر ہوتی ہے تو اس سے بعض دفعہ عجب و کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ پانچواں نفع یہ ہے کہ اختلاط میں بزرگان دین سے فیض حاصل ہو جاتا ہے بدون اختلاط کے بزرگوں سے فیض حاصل کرنا دشوار ہے اس کے سوا اور بھی منافع اختلاط میں انھوں نے بتلائے ہیں۔ اب جو لوگ محقق نہیں ہیں وہ سلف کے کلام میں اختلاط کے یہ منافع دیکھ کر ایک غلطی میں مبتلا ہو گئے وہ مطلقاً اختلاط کو عزلت پر ترجیح دینے لگے اور عزلت کی مذمت کرنے لگے۔ پھر حالت یہ ہوئی کہ یہ لوگ مخلوق سے اختلاط تو حظ نفس کے لئے کرتے ہیں اور تمسک بزرگوں کے اقوال سے کرتے ہیں۔ یہ نہ دیکھا کہ جس اختلاط کے یہ فضائل سلف نے بیان کئے ہیں وہ کونسا اختلاط ہے کیا یہ وہ اختلاط ہے جس میں تم مبتلا ہو جس سے حظ نفس کے سوا کچھ مقصود نہیں۔ نہ غیبت سے احتراز ہے نہ کذب و زور سے نہ لایعنی باتوں سے پرہیز ہے نہ فضول بک بک سے اس حالت میں بزرگوں کے اقوال و افعال سے ان کا تمسک کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص طبیب کو سنکھیا کے منافع بیان کرتے ہوئے دیکھ کر خود سنکھیا کھانے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ میاں کھاتے ہی مر گئے۔ یا کسی

مریض نے طبیب کو ایک قوی غذا کھاتے ہوئے دیکھا۔ مریض اس کو دیکھ کر خود بھی کھانے لگے۔ انجام یہ ہوا کہ میاں مرنے کے قریب ہو گئے۔ کیونکہ طبیب نے جو سنکھیا کے منافع بیان کئے تھے اس میں کچھ شرائط و قیود بھی تھیں کہ بدقت کے ساتھ استعمال کیا جائے پہلے اس کو مدبر کیا جائے۔ اس شخص کو ان قیود کی تو خبر نہ تھی لگا ویسے ہی استعمال کرنے تو اب بجز ہلاکت کے کیا نتیجہ ہوگا یا طبیب کو جو قوی غذا کھاتے ہوئے دیکھا تھا اس کے لئے معدہ کا تندرست ہونا شرط تھا اور مریض کا معدہ تندرست نہ تھا اس نے اپنے کو طبیب پر قیاس کر کے وہ چیز کھالی ظاہر ہے کہ اس کو ضرر ہوگا اسی طرح جس اختلاط کے منافع بزرگوں نے بیان کئے ہیں ان کے لئے غوائل نفس سے مامون ہونا شرط ہے۔ اور تمہارے اندر یہ شرط مفقود ہے پس تم کو اس باب میں ان کے اقوال سے تمسک کرنے کا حق نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

تو صاحب نفسی اے غافل میاں خاک و خوں میخور
کہ صاحب دل اگر زہرے خورد آں انگبیں باشد

(تو صاحب نفس ہے اے غافل میاں خاک و خوں شراب پیتا رہ تو کیا جانے
کہ اہل دل اگر زہر بھی کھالیں تو وہ شکر ان کے اندر بن جاتا ہے)

اسی لئے نیم ملا خطرہ ایمان ہوتا ہے جیسے عالمگیر کے دربار میں ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوا جس نے چار نکاح کر رکھے تھے اور ایک خاوند کو دوسرے کی اطلاع نہ تھی۔ ظالم نے ہر ایک سے یہ شرط کر رکھی ہو گی کہ میں سال میں تین مہینہ تمہارے گھر رہوں گی اور نو مہینہ اپنے گھر رہوں گی۔ تین مہینے کے بعد وہ دوسرے خاوند کے پاس رہتی اس سے بھی غالباً یہی شرط تھی پھر تین مہینہ کے بعد تیسرے خاوند کے پاس رہتی ان میں ہر اک یہ سمجھتا تھا کہ شرط کے موافق نو مہینے اپنے گھر رہنے گئی ہے یہ خبر کسی کو نہ تھی۔ کہ یہ اس مدت میں اپنے دوسرے آشناؤں کے پاس جاتی ہے۔ دہلی بڑا شہر ہے وہاں ایسے واقعات کا مخفی رہ جانا کچھ دشوار

نہیں مگر کب تک. آخر کو بھانڈا پھوٹا. اور عالمگیر کے دربار میں یہ واقعہ پیش ہوا۔ عالمگیر کا زمانہ ایسا نہ تھا جیسا آجکل کا زمانہ ہے کہ رضامندی کے ساتھ زنا پر کوئی مواخذہ ہی نہیں غیر غیر مسلم ایسا قانون مقرر کریں تو کچھ زیادہ تعجب نہیں افسوس یہ ہے کہ آجکل بعض مسلمانوں کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ رڑکی میں چند مسلمانوں کا ایک مجمع ہوا تھا۔ جس میں یہ رائے پیش ہو رہی تھی کہ نکاح کی کیا ضرورت ہے، خوامخواہ کی قید ہے۔ بس جس کو جو عورت پسند آئے اُس کو اپنے پاس رضامندی سے رکھ لے۔ جب دوسری پسند آئے پہلی کو الگ کر کے دوسری کو رکھ لے اسی طرح اپنی خواہش کو پورا کر لینا چاہیئے جس میں طرفین کو کو آزادی ہے کوئی کسی کا پابند نہیں نہ کسی قسم کی قید ہے۔ آج کل مسلمانوں میں بھی یہ رائے رکھنے والے موجود ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مگر عالمگیر اس خیال کے مسلمان نہ تھے۔ وہ نہایت پابند شریعت تھے. لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کا زوال عالمگیر سے ہوا کہ تمام راجاؤں کو اپنا مخالف بنالیا رعایا کو بددل کر دیا مگر میں کہتا ہوں کہ سلطنت کا زوال عالمگیر سے نہیں ہوا بلکہ اکبر نے اس کو زائل کیا ہے۔ اُس نے غیر قوموں کو سلطنت میں دخیل کار بنا کر ان کے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ دیدی تھی۔ اگر غیر قوموں کا یہی اقتدار باقی رہتا تو ایک نہ ایک دن سلطنت پر ضرور زوال آتا۔ عالمگیر نے اس کی اصلاح کرنی چاہی تھی اور غیر قوموں کے اقتدار کو کم کرنا چاہا تھا اگر سب مسلمان اس میں ان کا ساتھ دیتے تو سلطنت کی بنیاد مستحکم ہو جاتی مگر افسوس مسلمانوں ہی نے اس میں مخالفت کی اور عالمگیر کا ساتھ نہ دیا۔ اس لئے ہندوؤں کی بغاوت کو ترقی ہوگئی۔ تو بتلایئے اس میں عالمگیر کی کیا خطا ہے قصور اُس شخص کا ہے جس نے سلطنت میں غیروں کو دخل دیا۔ دیکھئے اگر کوئی شخص کسی کو سوئی کھلا دے اور وہ پیٹ میں جا کر زخم ڈال دے اور ایک ڈاکٹر سوئی نکالنے کے لئے اس کا آپریشن کرے اور آپریشن کر کے پیٹ میں ٹانکے لگا دے۔ مگر اس شخص کی انگڑائی لینے سے ٹانکے ٹوٹ جائیں جس کے صدمے سے وہ ہلاک ہو جائے

تو آپ کیا کہیں گے کیا یہ کہیں گے کہ ڈاکٹر نے اس کو ہلاک کیا یا یہ کہیں گے کہ سوئی کھلانے والے نے ہلاک کیا یقیناً ہر عاقل سوئی کھلانے والے کو قاتل کہے گا ڈاکٹر کی خطا کوئی نہ بتلائے گا اس بیچارہ نے تو صحت کی تدبیر کی تھی۔ اگر وہ آپریشن نہ کرتا جب بھی سوئی کے پیٹ میں ہونے سے وہ ضرور ہلاک ہوتا۔ اور اپریشن کے بعد ٹانکے نہ ٹوٹتے تو ساری عمر کے لئے صحت ہو چکی تھی۔ اس نے تو احسان کیا تھا مگر اس کی انگڑائی سے نقصان ہو گیا۔ یہی حال اکبر و عالمگیر کا ہے۔ اکبر نے سلطنت کے پیٹ میں ایک سوئی چبھا دی تھی جس سے ناسور پڑ گیا تھا عالمگیر نے شریعت کی طب پڑھی تھی اس نے شریعت کے موافق اپریشن کر کے ناسور صاف کیا پھر ٹانکے لگا دیئے مگر مسلمانوں کی مخالفت نے ٹانکوں کو توڑ دیا۔ اس لئے سلطنت پر زوال آیا اگر سب متفق ہو کر عالمگیر کا ساتھ دیتے تو زوال کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بہر حال مقدمہ پیش ہوا۔ اور وہ عورت طلب کی گئی۔ ایک طالب علم نے اس عورت سے کچھ رقم لینا کی۔ اور رہائی کی تدبیر بتلائی کہ تو یہ کہدینا کہ میں نے ایک مولوی صاحب کو وعظ میں یہ کہتے سُنا تھا کہ لوگ فضول حرامکاری کرتے ہیں۔ خدا تعالےٰ نے تو چار نکاح تک کی اجازت دی ہے۔ اور اگر یہ دریافت کیا جائے کہ مولوی صاحب نے یہ اجازت مردوں کے لئے بیان کی تھی یا عورتوں کے لئے۔ تو کہدینا کہ بس میں نے تو اتنا ہی سُنا تھا۔ کہ پھر میں ساگ لینے چلی گئی۔ میں نے تو اس اجازت کو عام ہی سمجھا تھا تو جیسے یہ طالب علم نیم ملاّ خطرہ ایمان تھا کہ اس نے چار نکاحوں کی اجازت کو کو عام کر دیا ایسے ہی وہ لوگ بھی نیم ملا ہیں جو اختلاط کے منافع کو عام کرتے ہیں اور بزرگوں کے اقوال میں منافع اختلاط کا ذکر دیکھ کر اپنے نفسانی اختلاط کو اس میں داخل کرتے ہیں حالانکہ اختلاط زہر ہے اور سنکھیا کھانے کا طبیب ہی کو حق ہے کیونکہ اس کے پاس تریاق بھی ہے۔ تم کو یہ حق نہیں۔ تم اپنے کو اس پر قیاس نہ کرو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

لقمہ و نکتہ است کامل را حلال　　　　تو نئی کامل مخور می باش لال

(لقمہ و نکتہ کامل کو حلال ہے تو کامل نہیں ہے تدمت کھا خاموش ہو جا)

یعنی بعض غذائیں ایسی ہیں جو کامل کے لئے حلال ہیں۔ تمہارے واسطے حلال نہیں تم ان کو نہ کھاؤ۔ ایک جگہ دونوں میں فرق بتلاتے ہیں ؎

ایں خرد گردد پلیدی زو غذا　　　　واں خورد گردد ہمہ نور خدا

(اہل نفس کی اس غذا سے عقل پلید ہو جاتی ہے اور کامل جو کھاتا ہے اس کے اندر نور خدا بنتا ہے)

تم کھاؤ گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ساری غذا گندگی بن جائے گی۔ اور کامل کھاتا ہے تو سب کا سب نور بن جاتا ہے۔ مجھے اس شعر پر شبہ ہوا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے کیا بزرگوں کو پاخانہ نہیں ہوتا۔ جیسے ہمارے یہاں لوگ ایک بزرگ کو حضرت حضرت کہتے تھے۔ تو ایک بڑھیا ہمارے گھر میں آکر کہنے لگی کہ اے بہو لوگ فلانے کو حضرت حضرت کہتے ہیں۔ میں یوں پوچھوں کہ حضرت کہیں ہگا بھی کریں ہیں۔ تو اس بڑھیا کے نزدیک حضرت بننے کے لئے یہ بھی شرط تھی کہ وہ ہگا نہ کریں تو مجھے حیرت تھی کہ کیا اس شعر کا بھی وہی مطلب ہے جو اس بڑھیا کا اعتقاد تھا۔ پھر ہم حضرت حاجی صاحب کے پاس سبق پڑھنے کے لئے گئے تو حضرت نے فرمایا ؎

ایں خورد گردد پلیدی زو جدا　　　　یعنی اخلاق رذیلہ پیدا شوند

(یعنی اہل نفس جو کھاتا ہے اس سے اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں)

واں خورد گردد ہمہ نور خدا　　　　یعنی اخلاق حمیدہ ہویدا گردند

(اور اہل دل کامل جب کھاتا ہے تو اس کی غذا سے نور بننے کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے اخلاق حمیدہ ظاہر ہوتے ہیں)

اب معلوم ہوا کہ یہ مطلب نہیں کہ بزرگوں کو پاخانہ نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ناقص ایک غذا کو کھاتا ہے تو اس میں اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں اور کامل

اسی کو کھاتا ہے۔ تو اس میں اخلاق حمیدہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ فرق ہے تمہارے کھانے میں اور بزرگوں کے کھانے میں۔ اسی طرح مجھے مثنوی کے ایک اور شعر پر اشکال ہوا تھا مولانا نے اول ایک تمثیل کے ضمن میں مسئلہ وحدۃ الوجود کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

ماہمہ شیراں ولے شیر علم　　حملہ شاں از باد باشد دمبدم

کہ ہم بھی ظاہر میں شیر معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ہم ایسے شیر ہیں جیسے جھنڈے پر شیر کی تصویر بنی ہوتی ہے کہ جب ہوا سے جھنڈا ہلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شیر حملہ کر رہا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد　　آنچہ ناپیداست ہرگز کم مباد

یعنی شیر علم کا حملہ تو ظاہر ہوتا ہے اور ہوا مخفی ہوتی ہے اور حقیقت میں اس حملہ کا ظہور اُسی سے ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہم لوگ ظاہر میں فاعل مختار معلوم ہوتے ہیں مگر ہم کو جو حرکت دے رہا ہے وہ مخفی ہے یعنی حق تعالےٰ تو ناپیدا سے مراد یہاں حق تعالےٰ ہیں اب آگے فرماتے ہیں کہ وہ جو ناپیدا ہے خدا کرے وہ کم نہ ہو تو میں یہ سمجھا کہ اس میں ظاہراً تو خدا تعالےٰ کو دعا دینا لازم آتا ہے۔ کہ ان کے کمالات میں کمی نہ آوے۔ تو مجھے حیرت تھی کہ خدا تعالےٰ کو یہ دعا کیسی یہ تو ویسی ہی دعا ہوئی جیسے کانپور میں جاہل عورتیں حق تعالیٰ کی سلامتی گایا کرتی ہیں۔ بعضی خاص رات ہوتی ہے جس میں رت جگا کرتی ہیں اس میں یہ فقرہ خدا تعالیٰ کی سلامتی منایا کرتا ہے۔ مگر چونکہ وہ محبت میں یہ مضمون گاتی ہیں اس لئے شاید مواخذہ بھی نہ ہو۔ جیسے کانپور میں مجھ سے ایک پورب کے رہنے والے صاحب نے ایک عجیب حکایت بیان کی تھی ایک جاہل سنی کہیں غالی شیعہ کی مجلس میں پھنس گیا وہاں ظالموں نے ایک نقل بنا رکھی تھی۔ بہت سے پتلے تیار کئے تھے جس میں کسی کا نام امام حسین تھا، کسی کا نام امام حسن تھا کسی کا نام حضرت علی تھا۔ ایک پتلہ کا نام حضرت فاطمہ تھا۔ ایک پتلہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب تھا اور ایک سب سے بڑا پتلہ

تھا نعوذ باللہ وہ خدا کا پتلہ تھا۔ پہلے امام حسین کا پتلہ لایا گیا اور صدر مجلس جو کہ مجتہد بنا ہوا تھا۔ اس سے پوچھا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ اس نے کہا کہ سارا فساد انہی کا ہے۔ انھوں نے خوامخواہ یزید سے بغاوت کی اور اس کی فوج سے مقابلہ کیا اور سارے خاندان اہلبیت کو تباہ و برباد کیا اگر تقیہّ کر لیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا لہذا ان کی گردن ماردو۔ پھر امام حسن کا پتلہ آیا۔ کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ کہا یہی تو بانی فساد ہیں۔ انھوں نے اپنے کو خلافت سے معزول کر کے (حضرت) معاویہ کو خلافت سونپ دی جبھی تو یزید کو سلطنت ملی اور اُسے خاندان نبوت کے برباد کرنے کا موقع ملا۔ اگر یہ اپنے کو خلافت سے معزول نہ کرتے تو یزید کو یہ موقع کیوں ملتا لہذا ان کی بھی گردن ماردو۔ پھر حضرت علیؓ کا پتلہ آیا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ کہا ارے سارا بیج فساد کا انہی کا بویا ہوا ہے۔ انھوں نے (حضرت) ابوبکر و عمر کا ساتھ دیا۔ اوران کے زمانہ میں خلافت بلافصل کا دعوے نہ کیا جس سے خلافت دوسروں کے ہاتھ میں پہونچ گئی تو انھوں نے امیر معاویہ کو شام کا حاکم بنا دیا جس کی بدولت حضرت علی سے مقابلہ کی ان کو ہمت ہوئی۔ اگر یہ اول ہی سے خلافت بلافصل کا دعوے کرتے تو غیروں کو یہ حوصلہ نہ ہوتا کہ وہ اہل بیت کے مقابلہ میں سر اٹھائیں لہذا ان کی بھی گردن ماردو۔ پھر حضرت فاطمہ کا پتلا لایا گیا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ کہا یہ اپنے ابّا جان سے دعا کرا کے سب کچھ کرا سکتی تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ حسین شہید ہوں گے پھر بھی انھوں نے دشمنوں کے واسطے بد دعا نہ کرائی یہ بھی قصوروار ہیں ان کی بھی گردن ماردو۔ پھر نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پتلہ آیا کہ ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ کہا یہی تو سب سے بڑے قصوروار ہیں (نعوذ باللہ) یہ تو خدا تعالےٰ سے کہہ کر سب کچھ کرا سکتے تھے مگر باوجود شہادت حسین کے علم کے انھوں نے کچھ نہ کیا لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پتلے کے واسطے بھی وہی حکم ہوا جو اوروں کے واسطے ہوا تھا۔ سنّی بے چارہ یہ خرافات دیکھ کر دل میں

پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ حیران تھا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ سب کے بعد وہ لمبا پتلا لایا گیا جو نعوذ باللہ خدا کا پتلہ تھا۔ پوچھا ان کے واسطے کیا حکم ہے۔ مجتہد نے کہا ارے یہ تو سب کچھ کر سکتے تھے۔ سارے عالم کے خدا تھے ان کے قبضہ میں تو سب کچھ تھا مگر انھوں نے قصداً امام حسین کو شہید کرایا اور یزید کا ساتھ دیا۔ پھر اس کے لئے بھی وہی حکم ہوا جو اوروں کے واسطے ہوا تھا جب اس پتلہ کی گردن مارنے کو چلے تو سنی سے نہ رہا گیا وہ غریب سمجھا کہ سچ مچ یہی خدا ہے اسے فکر ہوئی کہ جب اللہ میاں نہ رہے تو پھر بارش کون دے گا. روزی کون دے گا۔ اولاد کون دے گا بس جوشِ محبت میں اٹھ کر وہ پتلہ شیعہ کے ہاتھ سے چھین یہ جا وہ جا۔ شیعہ لاٹھیاں لیکر اس کے پیچھے دوڑے کہ ہماری مجلس میں یہ غیر کون آگیا۔ مگر وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا قریب ہی سنیوں کی بستی تھی انھوں نے جو شور سنا باہر نکل آئے اور دیکھا کہ ایک سنی کو مارنے کو شیعہ آرہے ہیں لوگوں نے سنی کو بچا لیا۔ شیعہ بھی سنیوں کی جمعیت دیکھ کر لوٹ گئے۔ اب لوگوں نے اس پردیسی کو تسلی دی کہ تم مطمئن رہو خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو ان موذیوں سے بچا لیا تو وہ کہتا ہے کہ واہ میں نے ہی خدا کو بچا لیا وہ مجھے کیا بچاتے۔ میں نہ ہوتا تو شیعہ ان کو بھی مار ڈالتے۔ لوگوں نے کہا توبہ کر توبہ کر کمبخت کیا کہتا ہے تو خدا کو کیا بچاتا اور انھیں کون مار سکتا ہے اس نے کہا کہ یہ پتلہ جو میں لیکر بھاگا ہوں یہی تو خدا ہے میں نے اسے بچا لیا شیعہ اس کو مارے ڈالتے تھے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ یہ کیا ہے شیعہ کی شرارت تھی یہ سب پتلے اُن کے بنائے ہوئے اور گھڑے ہوئے تھے بھلا خدا کا بھی کہیں پتلا ہو سکتا ہے اُسے تو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ ان کے ہاتھوں میں آجائے تب اس کی تسلی ہوئی اور سمجھا کہ یہ جھوٹ موٹ کی نقل تھی اور یہ پتلہ خدا نہیں ہے تو اس بیچارہ نے تو محبت ہی میں یہ فعل کیا تھا گو جاہل تھا شاید اس پر مواخذہ نہ ہو۔ اور محبت کی وجہ سے بخش دیا جاوے۔ ایسے ہی کانپور میں محبت کی وجہ سے خدا کی سلامتی گائی جاتی ہے شاید

اس پر بھی مواخذہ نہ ہو مگر مولانا پر حیرت تھی کہ عالم ہو کر خدا کو دعا کیسی دی جاتی ہے اس کے بعد شیخ محقق کی خدمت میں چلے جب یہ شعر پڑھا۔

"آنچہ ناپیداست یارب کم مباد" (جو کچھ کہ ظاہر نہیں یا رب کم نہ ہو)

حاجی صاحب نے فرمایا اے از دل ما۔ بس جان ہی تو پڑ گئی شعر میں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ خدا کو دعا نہیں دی بلکہ اپنے واسطے دعا کی ہے کہ وہ جو ناپیدا ہے خدا کرے وہ ہمارے دل سے کم نہ ہو۔ یعنی اس کی یاد ہمارے دل سے کم نہ ہو واقعی محقق کی ضرورت قدم قدم پر ہے اسی طرح مجھے مثنوی کے ایک اور شعر کی تفسیر میں تحیر تھا۔ مصداق متعین نہ ہوتا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغ پولاد ست تیز ❊ چوں نداری تو سپر واپس گریز

(سلوک کے باریک نکات مثل تیز تلوار کے ہیں جب تک فہم سلیم کی سپر نہ رکھو واپس بھاگو قریب مت ہو)

پیش ایں الماس بے اسپر میا ❊ کز بریدن تیغ را نبود حیا

(اس تلوار کے سامنے بدون سپر مت آؤ کیونکہ تلوار کو کاٹنے میں شرم نہیں آتی)

میں سوچتا تھا کہ سلوک میں باریک نکات کا ہونا تو مسلم مگر سپر کیا چیز ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ سپر سے مراد فہم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان باریک نکات کے لئے فہم صحیح کی ضرورت ہے اگر فہم سلیم حاصل ہے تو حقیقت کو سمجھ جاؤ گے اور اگر فہم نہیں تو پھر بے سمجھے بوجھے بزرگوں کی تقلید کرو گے کہ جو کام دوسروں کو کرتے دیکھا خود بھی کرنے لگے پھر اس تقلید کا وہ انجام ہوگا جو بندر کی تقلید کا انجام ہوا تھا کہ ایک بندر کسی حجام کا استرہ لے کر بھاگ گیا تھا۔ حجام بڑا پریشان ہوا کہ اس سے کس طرح چھینوں۔ اس نے یہ عقلمندی کی کہ دوسرا استرا نکال کر آہستہ آہستہ اپنی ناک پر پھیرا۔ بندر کو اتنی عقل کہاں جو اس فعل کی حقیقت سمجھتا اس نے بھی تقلید کی اور استرہ کو زور سے اپنی ناک پر پھرایا۔ جس سے ناک کٹ گئی پھر تو بڑا

گھبرایا اور استرہ کو وہیں ڈال کر چلاّتا ہوا بھاگا۔ حجام نے اپنا استرہ اٹھالیا۔ تو بدون عقل کے تقلید کا یہ انجام ہوتا ہے اس لئے بزرگوں کے افعال کی تقلید کے لئے عقل کی بہت ضرورت ہے۔ شاید اس پر یہ شبہ ہو کہ اس سے تو تقلید کی مذمت ظاہر ہوتی ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اس سے اس تقلید کی مذمت معلوم ہوئی جو عمل میں تقلید ہو بلا دریافت اُس کی بناء صحیح کے جیسے ایک صوفی سفر میں کسی خانقاہ میں ٹھہرا ان لوگوں پر کئی وقت کا فاقہ تھا۔ انھوں نے رات میں خادم کو غافل پاکر صوفی کا گدھا کھول کر بازار میں بیچ دیا اور خوب کھایا پیا اور صوفی کی بھی دعوت کی اور کھانے کے بعد قوالی ہوئی اور قوال سے فرمائش کردی کہ یہ شعر پڑھو ؎

خر برفت و خر برفت و خر برفت　　خر برفت و خر برفت و خر برفت

(گدھا گیا گدھا گیا گدھا گیا)

اور چونکہ سب کھانا پینا اسی خر برفت کی بدولت تھا اسی خوشی میں صوفیوں پر حال بھی طاری ہوگیا اور سب یہی کہنے لگے۔

خر برفت و خر برفت و خر برفت

گدھے کا مالک بھی یہی کہہ رہا تھا۔ صبح کو جو دیکھا تو گدھا ندارد۔ خادم سے پوچھا اس نے کہا وہ تو رات سے غائب ہے۔ اور میں نے حضور کو اطلاع کرنا چاہی تھی مگر آپ خود ہی کہہ رہے تھے۔

خر برفت و خر برفت و خر برفت

میں سمجھا کہ آپ کو کشف سے اطلاع ہوچکی ہے اس لئے خاموش واپس آگیا کہنے لگا کمبخت مجھ کو کیا خبر تھی۔ میں تو اوروں کی تقلید میں کہہ رہا تھا۔ پس ایسی تقلید کو مولانا فرماتے ہیں ؎

خلق را تقلید شاں برباد داد　　کہ دو صد لعنت بریں تقلید باد

(مخلوق خدا کو ان جاہلوں کی تقلید نے تباہ کردیا ایسی تقلید پر دو سو لعنتیں ہوں)

اس سے بعض غیر مقلدین نے تقلید کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مولانا

نے مطلق تقلید پر لعنت کہاں کی ہے بلکہ وہ تو خاص قسم کی تقلید پر لعنت فرماتے ہیں یعنی خر برفت جیسی تقلید پر جس میں ایک فعل کی تقلید تھی بدون دریافت حال کے چنانچہ یہ نہیں فرمایا کہ لعنت بر تقلید باد۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ لعنت برین تقلید باد۔ اور ہم جو بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں۔ تو وہ ایسی تقلید نہیں ہے بلکہ بنا صحیح کی تحقیق کے بعد ہے۔ اس لئے وہ اس شعر کا مصداق نہیں۔ الغرض بعض لوگوں نے اختلاط تو اختیار کر رکھا ہے حظ نفس کے لئے اور بزرگوں کے اقوال کو سند بنا لیا ہے یہ ان کی غلطی ہے۔ بہرحال اسی تفاوت حالت کے سبب سلف کا اصل مذاق اختلاط ہے اور متاخرین نے عزلت کو ترجیح دی ہے اور اس کے منافع کثیرہ بیان فرماتے ہیں جن میں ایک نفع یہ ہے کہ عزلت میں گناہوں سے اجتناب ہوتا ہے بشرطیکہ ایسی عزلت نہ ہو کہ تنہائی میں رہ کر روشندان سے عورتوں کو گھورا کرے۔ بلکہ ایسی عزلت ہو جس میں نگاہ کی بھی حفاظت کرے۔ کان کی بھی حفاظت کرے دل کی بھی حفاظت کرے کہ قصداً کسی غیر کا خیال دل میں نہ لائے۔ اگر آجائے تو ذکر میں مشغول ہو کر اُسے دفع کر دے۔ ایسی عزلت میں واقعی گناہوں سے بہت حفاظت ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ دفع مضرت مقدم ہے جلب منفعت پر تو عزلت اختلاط پر مقدم ہے۔ کیونکہ اختلاط میں گو منافع بہت ہیں مگر ساتھ ہی یہ مضرت بھی ہے کہ اس میں اکثر گناہ ہو جاتے ہیں۔ شیخ سعدی اس پر ایک حکایت فرماتے ہیں ؎

بزرگے دیدم اندر کوہسارے ⁂ نشستہ از جہاں در کنج غارے

(ایک بزرگ کو پہاڑ میں دیکھا کہ تنہائی میں دنیا سے دور ہو کر بیٹھے ہیں)

چرا گفتم بشہر اندر نیائی ⁂ کہ بارے بندے از دل برکشائی

(میں نے تو پوچھا کہ شہر کیوں نہیں آتے کہ دل کی گرہ ایک ایک بار تو کھول دے)

بگفت آنجا پری رویاں نغز اند ⁂ چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

(فرمایا شہر میں حسین چہرے گاتے پھرتے ہیں اور جب کیچڑ زیادہ ہو جاتی ہے تو ہاتھی بھی پھسل جاتا ہے)

تو اس بزرگ نے اختلاط کی بھی مضرت بتلائی کہ اس میں نامحرم پر نگاہ پڑ جاتی ہے جس سے بعض دفعہ سنبھلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے بعضے بزرگ منہ پر چادر لپیٹ کر سر جھکا کر چلتے ہیں کسی طرف نہیں دیکھتے بلکہ زمین پر نگاہ رکھتے ہیں۔ لوگوں نے اور اس کی وجہ میں بعض نے فرمایا ہے کہ شیطان تو ہر طرف سے انسان کے پاس آسکتا ہے۔ مگر نیچے اور اوپر سے نہیں آسکتا اور اوپر نگاہ رکھنا ہر وقت دشوار ہے اس لئے میں نگاہ نیچی رکھتا ہوں۔ قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے قرآن میں شیطان کے قول کی حکایت کی گئی ہے۔

لآتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم ؕ شیطان نے حق تعالیٰ سے کہا کہ میں بنی آدم کے پاس سامنے سے آؤں گا اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے اس میں صرف چار جہت کا ذکر ہے۔ فوق و تحت مذکور نہیں معلوم ہوا کہ فوق و تحت سے شیطان نہیں آسکتا (مگر فوق سے مراد وہ ہے جو کہ بالکل تحت کے مقابل ہو۔ جس میں جہت قدام کا شائبہ بھی نہ ہو۔ تو یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اوپر نگاہ کرنے سے تو اکثر نامحرموں پر نظر پڑ جاتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ اگر نگاہ بالکل اوپر ہو تو نظر صرف آسمان پر پڑے گی اور وہاں کوئی نامحرم نہیں۔ ہاں نگاہ اونچی کر کے جب سامنے بھی نظر کو دوڑایا جاوے گا تب البتہ شیطان کو موقع ملے گا خوب سمجھ لو ۱۲ جامع)

بہر حال بزرگوں نے زمین پر نگاہ رکھنے کی تائید کی ہے۔ ہاں اگر اس سے امتیاز کی شان پیدا ہونے لگے۔ تو ہمارے مشائخ کا طرز یہ ہے کہ وہ امتیاز سے بچتے ہیں ایسی ہیئت سے نگاہ نیچی نہیں کرتے کہ گردن بھی جھک جائے بلکہ معمول کے موافق چلتے ہیں اور نگاہ نیچی رکھتے ہیں۔ نگاہ کے جھکانے کے لئے گردن جھکانے کی کیا ضرورت ہے۔ پس امتیازی شان نہ بنانا چاہیئے اسی لئے ہمارے بزرگ نہ عبا پہنتے ہیں نہ چوغہ نہ صدری کہ اس سے آدمی خواہ مخواہ دوسروں سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ صدری میں آجکل ہماری جماعت میں اختلاف ہے

بعضے اس کی ضرورت سمجھتے ہیں، اور میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ زائد چیز ہے۔ ہمارے مدرسہ میں ایک کیرانہ کا لڑکا صدری پہنتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی کیا ضرورت ہے، اُس نے یہ ضرورت بتلائی کہ کرتا پھٹ رہا ہے اس سے کمر نظر آتی ہے۔ میں نے کہا پھر تم صدری کو کرتہ کے نیچے پہنو یہ ضرورت پوری ہو جائے گی کرتہ کے اوپر پہننا تو محض زینت کے لئے ہے یہ تو ایک امتیازی شان ہو گئی ہے۔ ہم نے اپنے اکابر کو صدری پہننے کا عادی نہیں دیکھا یہ رواج عموم ولزوم کے ساتھ آجکل ہی نکلا ہے اور اس کو بھی لوگوں نے علماء کا خاص ایک امتیاز شعار بنا لیا ہے۔ جس سے ہمارے اکابر بچتے تھے۔ چنانچہ اگر کسی وقت عزلت سے بھی ہونے لگے تو ہمارے اکابر عزلت بھی اختیار نہ کرتے تھے۔ بلکہ اختلاط کے ساتھ زبان کی حفاظت کرتے تھے۔ مگر یہ کام صدیقین کا ہے کہ اختلاط کے ساتھ بھی کوئی بات خلاف شرع نہ کرے۔ بحمداللہ ہمارے اکابر نے ایسا بھی کرکے دکھلا دیا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اکثر اوقات لوگوں میں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ تنہائی کے خاص اوقات تھے زیادہ وقت مولانا کا مجلس ہی میں گذرتا تھا مگر باوجود اختلاط کے باتیں بہت کم کرتے تھے مجلس میں بیٹھے ہوئے اکثر درود شریف پڑھتے رہتے تھے مگر جب باتیں کرتے تھے تو دریا بہتا تھا۔ پھر خاموش ہو جاتے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ خاموشی ناگوار تھی مولانا کی شکایت کرتے تھے کہ بڑے رکھے ہیں ہم گھنٹوں بیٹھے رہے دو چار بات کے سوا کوئی بات ہی نہیں کی۔ میں نے دل میں

؎ قلت ولکن فی لبسہ فوق القمیص من سہولۃ النزع وقت الحر وغیرہ مالیس فی لبسہ تحتہ ولذا لم یختلفوا فی الصدری المحشوا بالقطن واجازوا لبسہ فوق القمیص لاجل تلک العلۃ بعینہا وبالجملۃ ففی کونہ داخلا فی مالا یعنی نظر نعم الاخلاف فی قبحہ اذا لبسہ لمحض لزینۃ بدون الحاجۃ واللہ اعلم ۱۲ جامع وکذا اذا خیف علی المبتدی وقوعہ من الحاجۃ الی الزینۃ منعہ الشیخ سدا للباب مادام ہذا الخوف وہذا علی رای الشیخ ۱۲ اشرف علی۔

کہاتم بڑے سوکھے ہو جو مولانا کو روکھا بتلاتے ہو یا بہت تر ہو کہ ڈوبنے کے قابل ہو۔ بس تمہارے نزدیک بڑا سخی اور با اخلاق وہ ہے جو اپنا قیمتی وقت ضائع کرتا رہے۔ افسوس اگر سفید چمڑے والے وقت کا انضباط کریں تو اس میں تو حکمت ہے انتظام ہے اور مولوی وقت کا انضباط کریں تو بدخلقی ہے، روکھا پن ہے آخر دونوں میں فرق کیا ہے بس یہی فرق ہے نا کہ وہ امیر ہیں اور مولوی غریب ہیں۔ امیروں کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے گو بری ہی کیوں نہ ہو۔ اور غریبوں کی اچھی بات بھی بری معلوم ہوتی ہے۔ جیسے ایک غریب نے کہا تھا کہ آجکل غریبوں کی ایسی ذلت ہے کہ امیر گوز مارے تو کہتے ہیں مبارک ہو صحت ہوئی، سلامتی ہوئی۔ اور غریب گوز مارے تو کہتے ہیں بڑا بدتہذیب ہے۔ دماغ سڑا دیا واقعی بات تو یہی ہے۔

اس پر اگر کوئی یوں کہے کہ صاحب انگریز تو ہم سے مستغنی ہیں وہ اگر اپنے وقت کا انضباط کریں تو ان کو حق ہے مگر مولویوں کو کیا حق ہے کہ یہ ہم سے اینٹھیں اور بات بھی نہ کریں یہ تو چندہ کے لئے ہمارے گھروں پر آتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لعنت ہے ایسے چندہ پر جس کی وجہ سے لوگ علماء سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ان کی آواز پر حاضر ہو جایا کریں۔ جو لوگ اس غرض سے چندہ دیتے ہیں مہربانی کر کے وہ اپنے چندہ کو اپنے گھر رکھیں، علماء اپنے واسطے چندہ نہیں کرتے بلکہ دینی کاموں کے واسطے کرتے ہیں اور دین سب مسلمانوں کا ہے تنہا مولویوں کا نہیں ہے پس علماء کا تم پر یہ احسان ہے کہ وہ تمہارا مال دین کے کام میں لگا دیتے ہیں تمہارا ان پر کیا احسان ہے۔ تمہارا احسان جب ہوتا جب تم ان کی ذات خاص کے واسطے چندہ دیتے۔ مگر جب تم خدا کے واسطے اور دین کے کاموں کے واسطے دیتے ہو تو یہ تو اپنے کام کے واسطے دینا ہوا تو اس دینے کا مولویوں پر کیا احسان ہے اور اس کی وجہ سے تم کو کیا حق ہے کہ مولویوں سے اپنی تعظیم و تکریم کی امید رکھو اور یہ کہ وہ تمہاری خاطر سے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا کریں۔ اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ علماء آجکل چندہ دینے والوں کا لمبے چوڑے القاب میں شکریہ ادا کرتے ہیں

مجھے تو یہ طرز بہت ناگوار ہے۔ آخر علماء پر انھوں نے کیا احسان کیا ہے جس کا وہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہاں دعاء دینے کا مضائقہ نہیں۔ یہ تو نص سے ثابت ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۔ و فی الحدیث انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللھم صلے علے ال ابی اوفی اھ پس جب کوئی چندہ دیا کرے اس کے حق میں اس طرح دعا کرنے کا مضائقہ نہیں کہ حق تعالیٰ آپ کے چندہ کو قبول فرمائے اس کا اجر دے، آپ کو دین و دنیا میں ترقی دے۔ اعمال صالحہ کی توفیق بڑھائے وغیر ذلک۔ لیکن شکریہ ادا کرنے کے کیا معنے۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ چندہ دینے والوں نے مولویوں پر کچھ احسان کیا ہے تو کیا یہ چندہ تمہارے گھر کے خرچ کے لئے دیا ہے یا تمہارا ارادہ اس کو اپنے خرچ میں لانے کا ہے جب یہ نہیں تو آپ پر کیا احسان اگر احسان کیا ہے تو دینے والے نے اپنی ذات پر احسان کیا ہے۔ کہ ثواب کے لئے خدا کے کام میں اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس صورت میں تو چندہ دینے والوں کو علماء کا شکرگذار ہونا چاہیئے کہ وہ ان کا روپیہ اچھے مصرف میں لگا رہے ہیں۔ الٹا تم کیوں شکریہ ادا کرتے ہو (۱۲ جامع) اس سے لوگوں کے دماغ خراب ہو گئے ہیں اور وہ علماء کے اس شکریہ سے (جس کا منشا ان کی تواضع ہے ۱۲) یہ سمجھ گئے کہ سچ مچ ہم نے کچھ ان پر احسان کیا ہے۔ پس اب وہ اس کے منتظر رہنے لگے کہ علماء ہماری تعظیم و تکریم بھی کریں ہمارے لئے اپنے گھنٹے بھی ضائع کیا کریں۔ حالانکہ حقیقت میں ان کو اس کا کچھ حق نہیں کیونکہ میں بتلا چکا کہ اس چندہ سے وہ علماء پر کچھ بھی احسان نہیں کرتے۔ انصاف سے بتلاؤ اگر کسی وقت گورنمنٹ اپنی کسی ضرورت کے لئے رعایا سے چندہ طلب کرے اور تحصیلدار وغیرہ کو چندہ وصول کرنے کے لئے مامور کرے تو کیا اس وقت بھی آپ یہ سمجھیں گے کہ تحصیلدار صاحب پر ہم نے احسان کیا ہے اس لئے ان کو ہماری خاطر مدارات اور تعظیم و تکریم کرنی چاہیئے۔ ہرگز نہیں بلکہ وہاں تو آپ چندہ بھی دیں گے اور تحصیل دار صاحب کو

نذرانہ بھی دیں گے۔ اور اگر وہ نذرانہ قبول کرلیں تو ان کا احسان سمجھیں گے اس کا کبھی وسوسہ بھی نہ آئے گا کہ تحصیل دار پر ہم نے کچھ احسان کیا ہے پھر علماء کو چندہ دیکر آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ان پر احسان ہوا بس یہی تو فرق ہے کہ حکام دنیا کی قلوب میں وقعت ہے اور دین کی وقعت نہیں اگر کسی درجہ میں آپ کی یہ بات معقول بھی ہو تب بھی آپ کو سب علماء سے یہ امید رکھنے کا حق نہیں کہ وہ آپ کی تعظیم و تکریم کریں۔ اور تمہارے لئے اپنا وقت ضائع کریں۔ اگر کچھ حق ہے تو ان علماء پر ہے جو تم سے چندہ مانگتے ہیں۔ اور جو چندہ نہیں مانگتے ان سے یہ امید رکھنے کا آپ کو کیا حق ہے اور اگر وہ انضباط اوقات کریں تو ان کی شکایت کیوں کی جاتی ہے۔ یہاں سے ان لوگوں کی حماقت ظاہر ہوگئی جو مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی کم گوئی پر اعتراض کرتے تھے۔ آخر مولانا ان کی وجہ سے اپنا وقت ضائع کیوں کرتے وہ کب اور کس دن ان سے چندہ مانگنے آئے تھے۔ ایک تحصیلدار صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ میں مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے گیا تھا۔ اس وقت چارپائی پر لیٹے ہوئے جاگ رہے تھے مگر مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں منہ پھیر لیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئے، بہت ہی روکھے تھے۔ میں نے دل میں کہا کہ وہ تمہارے باپ کے نوکر تھے کہ جس وقت تم جاؤ اسی وقت اٹھ کر بیٹھ جائیں اور تم سے باتیں بنانے لگیں، یہ تمہاری حماقت تھی کہ سونے کے وقت ملنے گئے بھلا یہ وقت ملنے کا تھا تم کو چاہیئے تھا کہ حجرہ سے باہر بیٹھتے جب مولانا نماز کے لئے باہر آتے اور نماز سے فارغ ہوکر جلسہ عام میں بیٹھتے اس وقت ملتے پھر دیکھتے کہ مولانا روکھے ہیں یا تم سوکھے ہو۔

ایک صاحب نے مجھ سے ایک حاکم انگریز کی حکایت بیان کی کہ اس نے کسی دوسرے حاکم سے چارج لینے کے لئے دس بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ چنانچہ دس بجے کے قریب یہ انگریز کچہری میں پہونچا مگر قریب پہونچکر اس انگریز نے گھڑی دیکھی

تو دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے تو وہ کچہری کے اندر نہیں گیا۔ بلکہ پانچ منٹ تک کچہری کے باہر ٹہلتا رہا جب گھڑی میں پورے دس بج گئے اس وقت اس نے اندر قدم رکھا اور دوسرے حاکم سے چارج لیا۔ یہ حکایت بیان کر کے وہ بہت مدح کر رہے تھے کہ یہ لوگ اوقات کے بہت ہی پابند ہیں۔ وہ مدح کر رہے تھے اور میں حیرت کرتا تھا۔ کہ اگر کوئی مولوی ایسا کرے تو اس کی شکایت بیان کی جاتی ہے کہ ہم وقت سے پانچ منٹ پہلے پہونچے تھے تو ہم سے بات نہ کی۔ اور یہ شکایت محض اس لئے کی جاتی ہے کہ مولوی ان سے چندہ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ معترض صاحب چندہ میں مولویوں سے زیادہ مبتلا ہیں ہر لکچر میں چندہ کی مانگ ہوتی ہے۔ آج کالج کیلئے چندہ ہو رہا ہے۔ کل یونیورسٹی کے لئے کبھی کانگریس کے لئے کبھی اور کسی خاک بلا کے لئے۔ اکبر حسین جج الہ آبادی لکھتے ہیں ؎

دریں ہر لکچر آخر چندہ ایست ؛ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(ہر لکچر کے بعد چندہ کا سوال ہے جو انجام پر نظر رکھتا ہے وہ مبارک بندہ ہے)

(یعنی جو ابتداء لکچر ہی سے انجام کو سمجھ لے کہ اخیر میں چندہ مانگا جائے گا اور یہ سمجھ کر پہلے ہی سے چلا جائے وہ بہت مبارک بندہ ہے ۱۲ جامع)

اکبر حسین مرحوم کہتے تھے کہ وعظ تو ہم نے چندہ سے خالی بہت سنے مگر لکچر ایک بھی اس سے خالی نہیں سُنا ہے تو ظاہر میں دعوے مگر میں دعوی کی نیت سے نہیں کہتا کہ واللہ وعظ تو ہم پچاسوں چندہ سے خالی سنا دیں گے تم لکچر ایک تو اس سے خالی دکھا دو۔ مگر فرق یہ ہے کہ جنٹلمین چندہ کرتے ہیں قیمتی کپڑے پہن کر اور مولوی چندہ کرتے ہیں معمولی کپڑے پہن کر۔ اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ہم جو بعض معززین کی درخواست پر شملے گئے تو وہاں وعظ کا اعلان ہوا۔ کرنیل عبدالمجید صاحب نے اپنے نام سے اعلان کیا جس وقت میں وعظ کیلئے کھڑا ہوا تو میرے کپڑے دیکھ کر بعض جنٹلمینوں نے کرنل صاحب سے کہا کہ تمہارے علماء کے کپڑے تو ایسے ہیں جیسے ابھی پاخانہ سے نکل کر آرہے ہوں حالانکہ میں کھدر

پہنے ہوئے بھی نہ تھا اور نہ میرا ارادہ کھدّر پہننے کا ہے۔ چکن اور لٹھے کے کپڑے تھے اور چونکہ جمعہ کا دن تھا اس لئے صاف بلکہ کلف استری کے ہوئے تھے مگر ہاں کرتہ لمبا تھا اور پاجامہ اونچا تھا یہ نہ تھا کہ کرتہ اونچا ہو اور پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہو اُن نو تعلیم یافتہ صاحب کو یہ لباس حقیر معلوم ہوا کرنل صاحب نے اُن سے کہا کہ میں ابھی اس بات کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ وعظ ختم ہونے کے بعد پوچھنا اس وقت جواب دوں گا۔ چنانچہ بعد ختم وعظ کرنل صاحب منتظر رہے کہ یہ اس اعتراض کا اعادہ کریں مگر وہ کچھ نہیں بولے تب کرنل صاحب نے خود یاد دلایا کہ اب آپ کہئے کیا کہتے تھے کہنے لگے کچھ نہیں کہتا اور جو کچھ کہا تھا حماقت تھی۔ میں یوں سمجھا تھا کہ لیاقت بھی کپڑوں کے موافق ہوتی ہے مگر اس وقت اپنی غلطی ظاہر ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ کپڑے معیار لیاقت نہیں۔ اتفاق سے یہ بات میرے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ میں نے دوسرے جلسہ میں ممبر پر آتے ہی کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض حضرات ہمارے لباس پر خاص رائے رکھتے ہیں اور میں حسن ظن منشا راس کا نیک نیتی ہی سمجھتا ہوں۔ غالباً محبت ہے۔ وہ چاہتے ہوں گے کہ علمار عمدہ اور قیمتی لباس پہن کر وعظ کہا کریں تاکہ سامعین کے قلوب میں ان کی عظمت ہو۔ اور اُن کی عظمت سے مضمون کی عظمت ہو۔ مجھے اس منشار پر اعتراض نہیں اور میں اس کے حسن قبح سے اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتا میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ علمار کو عمدہ لباس پہنکر ہی وعظ کہنا چاہئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ عمدہ لباس آئے کہاں سے ہمارے پاس تو اتنا روپیہ نہیں جو آپ کی تجویز اور منشار کے موافق لباس بنائیں تو اس صورت میں اتنا روپیہ کہاں سے آوے۔ زیادہ روپیہ حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض تو شرعاً قبیح ہیں جن کو ہم جائز نہیں رکھتے جیسے ڈپٹی کلکٹری و سب ججی وغیرہ اور بعض عقلاً بھی قبیح ہیں جن کو نہ ہم جائز رکھیں نہ آپ جیسے وعظ کہکر اپنی حاجت پیش کرنا جب یہ دونوں ذرائع ناجائز ہیں صرف ایک ذریعہ یہی رہ گیا کہ ہم میں کوئی مدرس ہے

ے کیونکہ کھدر پہننا آجکل گاندھی پرست جماعت کا شعار ہو گیا ہے ۱۲ جامع

کوئی مصنف۔ کوئی محشی کوئی کسی مطبع کا مصحح تو اس صورت ہماری مالی حیثیت اسی لباس کی ہوگی جو ہم پہنے ہوئے ہیں اور اگر اس سے زیادہ حیثیت بھی ہوتی تب بھی یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ آپ کی منشا کے موافق کس قیمت کا لباس ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ ہم اس موجودہ لباس سے بڑھیا لباس پہنکر آئیں اور آپ کی نظر میں وہ بھی حقیر ہو۔ اس لئے اس کی آسان صورت یہ ہے کہ معترض صاحب اپنی منشاء کے موافق نہایت عمدہ قیمتی جوڑے ہمارے لئے بنادیں تاکہ جب تک ہم شملہ میں رہیں اسی لباس کو پہنکر وعظ کہا کریں اور اس کا ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب شملہ سے جانے لگیں گے وہ لباس آپ کے حوالہ کر جائیں گے اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے تاکہ ہمارے بعد کوئی اور مولوی وعظ کہنے آئے تو آپ اس کو بھی وہ لباس دے سکیں کہ مولانا یہ کپڑے پہن کر وعظ فرمایئے اس میں آپ کا مقصود بھی حاصل ہوجائے گا کہ سامعین وعظ کی نظروں میں قیمتی لباس کی وجہ سے علماء کی عظمت ہوگی۔ اور ہم بھی خرچ کے بارے سبکدوش رہیں گے اور آپ کا بنایا ہوا لباس پھر آپ کے پاس واپس آجائے گا۔ آپ کو ہر مولوی کے واسطے بار بار جوڑا تیار نہ کرنا پڑے گا۔ ایک دفعہ کا بنایا ہوا برسوں کام دے گا اور غالباً معترض صاحب میں اتنی وسعت تو ضرور ہوگی کہ ایک دفعہ ہمارے لئے قیمتی جوڑے تیار کردیں۔ کیونکہ ہمارا لباس اس شخص کی نظروں میں حقیر ہوسکتا ہے جو بڑا مالدار صاحب وسعت ہو کیونکہ دوسرے مقامات پر ہمارے لباس کو کسی نے حقیر نہیں بتلایا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بہت ہی مالدار لوگ رہتے ہیں جن کی نظروں میں ہمارا چکن کا لباس بھی حقیر ہے۔ تو مہربانی فرماکر وہ لباس ہمارے لئے تیار کرادیں ہم اس کو پہنکر وعظ کہدیا کریں گے۔ اس سے ہمیں انکار نہ ہوگا اور یہاں سے روانگی کے بعد اگر کسی دوسری جگہ بھی ہمارے لباس کو حقیر سمجھا گیا تو ہم وہاں کے لوگوں سے بھی یہی کہدینگے جو آپ سے کہا ہے۔ اگر ان کو قیمتی لباس میں وعظ سننا ہوگا تو وہ بھی اس کا انتظام خود کریں گے۔ آپ کے بنائے ہوئے جوڑے ہم یہیں چھوڑ جائیں گے یہ صورت اس لئے بھی سہل ہے کہ وعظ کہنے والا تو ایک آدمی ہے جو سیکڑوں مقامات پر جاتا ہے۔

تو ایک آدمی کو ہر جگہ کے مذاق کی رعایت کرنا دشوار ہے۔ اور ہر ہر شہر کے آدمیوں کو ایک جوڑا اپنے مذاق کے موافق تیار کرلینا آسان ہے۔ اب میں منتظر ہوں کہ ہمارے واسطے جوڑے تیار ہوکر کب آتے ہیں۔ اگر غیرت ہوگی تو بہت جلد اس کا انتظام کیا جاوے گا اس تقریر سے معترضین کی گردنیں جھک گئیں اور نگاہیں نیچی ہوگئیں۔ تو آجکل لوگوں کا مذاق ایسا بگڑا ہے کہ ان کی نظروں میں صرف قیمتی لباس والے کی عظمت ہوتی ہے حالانکہ چندہ کرنے میں جنٹلمین اور مولوی دونوں شریک ہیں مگر وہ لوگ قیمتی کپڑے پہن کر چندہ مانگتے ہیں۔ اس لئے ان کی ذلت نہیں ہوتی اور مولویوں کو ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ عقل کا مقتضا یہ ہے کہ چندہ مانگنے والے کو قیمتی لباس نہ پہننا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا اثر مسلمانوں پر یہ ہوتا ہے کہ غریب آدمی چندہ میں شرکت نہیں کرسکتا وہ سوچتا ہے کہ جو شخص سو روپیہ کا لباس پہن کر سوال کر رہا ہے اسے چار پانچ روپے کیا دوں کم از کم سو پچاس تو دوں اور جو وسعت والے بھی ہیں اگر ان کی نیت بیس روپے دینے کی ہوتی ہے تو وہ لکچرار کے لباس کو دیکھ کر اور اس کی شان وشوکت سے دب کر بیس کی جگہ پچاس دیتا ہے۔ اور جو چندہ دباؤ سے وصول ہو وہ حرام ہے مگر افسوس ہے کہ عوام میں پھر بھی ان ہی لوگوں کی عزت ہے جو دباؤ سے چندہ لیتے ہیں۔ مولوی تو دس پانچ روپیہ پر ہی قناعت کرلیتے ہیں۔ اور دینے والے کو دعائیں دیتے ہیں اور جنٹلمین دو سو پانچسو سے کم پر قناعت ہی نہیں کرتے اور اگر کوئی یہ کہے کہ مولوی چندہ کھاتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ واللہ مولوی اگر کھاتے بھی ہیں تو جنٹلمینوں سے کم کھاتے ہیں۔ ان میں اگر

کوئی کمبخت کھاتا بھی ہے تو بہت سے بہت چار پانچسو روپیہ کھالے گا اور جنٹلمین تو ہزاروں لاکھوں کھا کر بھی ڈکار نہیں لیتے چنانچہ آجکل جو چندوں میں خیانت کا راز کھلا ہے تو معلوم ہوا کہ بعضے جنٹلمین ہزاروں لاکھوں روپیہ ہضم کر گئے اور ایک پیسہ کا بھی حساب نہیں دیا۔ تو مولوی تو برزخ ہیں قبر ایک ہی مردہ سے بھر جاتی ہے اور یہ لوگ دوزخ ہیں جس کی حالت یہ ہے یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝ دوزخ کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا وہ یہی کہتی رہے گی کہ اور لاؤ اور لاؤ۔ پس جو لوگ چندہ کے باب میں مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ ان سے زیادہ محل اعتراض ہیں لیکن اس پر بھی میں علماء سے یہی کہتا ہوں کہ خدا کے لئے تم یہ چندہ کا کام چھوڑ دو۔ اگر جنٹلمین چندہ کریں انہیں کرنے دو۔ تم یہ کام مت کرو واللہ شرم کی جگہ ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ روپیہ مولوی کی حاضرات ہے کہ جہاں فلیتہ سلگایا اور جن حاضر ہو گئے اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ چندہ کے بغیر دین کا کام کیونکر چلے گا۔ میں کہتا ہوں کہ دین کا کام سب مسلمانوں کا کام ہے سب لوگ مل کر کام کریں۔ مولویوں کا کام وعظ کہنا تبلیغ کرنا درس دینا وغیرہ ہے یہ کام تو وہ کریں۔ چندہ کرنا ان امراء و رؤسا کا کام ہے جن پر کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکے کہ یہ اپنے واسطے مانگ رہا ہے۔ کیونکہ جانتے ہیں کہ اس کی اتنی بڑی حیثیت ہے کہ ہم دس دیں گے تو یہ اپنے پاس سے پچاس دے سکتا ہے۔ ایسے شخص کا چندہ کرنا ذلت کا سبب نہیں ہو سکتا تو یہ کام امراء و رؤسا کریں یہ لوگ چندہ جمع کر کے پھر علماء سے پوچھ کر کام میں لگا دیں اس طرح کر کے دیکھئے معلوم ہو جائے گا کہ دین کا کام چلتا ہے یا نہیں باقی مولویوں کو تو چندہ کے لئے وعظ بھی ہرگز نہ کہنا چاہیئے۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ دینی ضرورتوں سے مسلمانوں کو مطلع کر دیا جائے کہ فلاں جگہ یہ کام دین کا ہو رہا ہے اس میں مسلمانوں کی امداد کی

ضرورت ہے اس کے بعد اگر کوئی چندہ دے تو تم اپنے ہاتھ میں بھی ہرگز نہ لو بلکہ اس سے کہدو کہ منی آرڈر وغیرہ کے ذریعہ سے خازن کے پاس خود بھیجو اگر قسمت میں ہے تو واللہ وہ روپیہ مدرسہ میں ضرور آئے گا۔ ایک صاحب نے تھانہ بھون کے مدرسہ میں دوسو روپے بھیجے اور خط میں اتنا اور لکھدیا کہ زیارت کا بہت اشتیاق ہے۔ کوئی تاریخ مقرر فرمائی جائے تو بہت عنایت ہو، میں نے روپیہ واپس کردیا اور لکھدیا کہ خط میں اگر میرے آنے کی تحریک نہ ہوتی تو میں روپیہ وصول کرلیتا۔ مگر اب نہیں لے سکتا کیونکہ مجھے شبہ ہوگیا کہ شاید آپ مدرسہ میں یہ رقم دے کر مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اب ضرور آئے گا کیونکہ ہم مدرسہ کے اتنے بڑے معاون ہیں تھوڑے دنوں کے بعد روپیہ پھر واپس آیا جس کی ساتھ ایک خط بھی آیا اس میں لکھا تھا کہ واقعی مجھ سے بڑی بد تہذیبی ہوئی مجھے رقم بھیجنے کے ساتھ شوق زیارت کا ذکر نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اب میں اپنی اس تحریک کو واپس لیتا ہوں۔ للہ آپ یہ رقم وصول کرکے مدرسہ میں داخل کردیجئے میں تو مدرسہ میں یہ رقم دے رہا ہوں آپ کو تھوڑا ہی دے رہا ہوں۔ اس لئے آپ پر اس کا کچھ بھی احسان نہیں نہ کسی قسم کا دباؤ ہے۔ اس شائستہ جواب کے بعد میں نے رقم لے کر مدرسہ میں داخل کردی۔ اور ان کو جواب میں لکھا کہ پہلے آپ کو اشتیاق ملاقات تھا۔ اب مجھ کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوگیا۔ آپ کی سلامتی طبیعت سے بہت دل خوش ہوا۔ پھر انھوں نے کئی ماہ کے بعد مجھے بلایا میں نے لکھا کہ اس شرط کے ساتھ آسکتا ہوں کہ مجھے نذرانہ کچھ نہ دیا جائے اور اگر کچھ دیا گیا تو میں واپس کردوں گا۔ انھوں نے شرط منظور کرلی۔ میں چلا گیا واپسی کے وقت انھوں نے اپنی والدہ کی طرف سے کچھ دینا چاہا اور کہا کہ میں نے تو آپ کی شرط پر عمل کیا۔ مگر والدہ سے کوئی شرط نہ ہوئی تھی یہ رقم انھوں نے پیش کی ہے۔ اس کو قبول

کرلیا جائے۔ میں نے کہا والدہ اور ولد سب ایک ہیں اس لئے میں قبول نہیں کرسکتا یہ بھی میری شرط کے خلاف ہے۔ وہ کہنے لگے پھر کسی کا دل ہدیہ کو چاہے تو وہ کیونکر پیش کرے میں نے کہا کیا ہدیہ دینے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ گھر پر بیلا کردیا جائے یہ بھی تو طریقہ ہے کہ میرے گھر پر آکر دو۔ آپ تھانہ بھون تشریف لادیں وہاں ہدیہ دیں گے تو میں لے لوں گا۔ چنانچہ وہ تھانہ بھون آئے اور مجھے تین گنّی دیں میں نے لے لیں۔ گھر پر تو وہ غالباً ایک یا دو ہی گنی والدہ کی طرف سے دے رہے تھے۔ شاید اُس پر انکار کی وجہ سے ایک یا دو اور بڑھ گئیں۔ کیونکہ نخروں سے قیمت بڑھ جاتی ہے۔

ایک صاحب نے طلبہ کے لئے پانچ روپے بھیجے اور ساتھ ہی دعا کی استدعا بھی لکھی میں نے روپے واپس کردیئے کہ یہاں دعا کی دوکان نہیں ہم بدون ہدیہ کے بھی سب مسلمانوں کی بھلائی کے لئے دعا کرتے ہیں روپیہ پھر واپس آیا اور ساتھ میں خط بھی آیا کہ مجھ سے حماقت ہوئی۔ واقعی مجھے ہدیہ کے ساتھ دعا کی درخواست نہ کرنی چاہیئے تھی اب میں دعا نہیں کرانا چاہتا۔ آپ للہ طلبہ کے لئے یہ ہدیہ قبول فرمالیں۔ اب میں نے لے لیا۔ اور اُن کو لکھدیا کہ آپ کے مقصد کے لئے دعا بھی کردی گئی۔ تو جہاں روپیہ لینے سے دین کی وقعت کم ہوتی ہو وہاں ہرگز روپیہ بھی نہ لیا جائے واپس کردینا چاہیئے۔ واللہ لاکھوں اور کروڑوں روپیہ بھی ملتے ہوں مگر دین کی عزت کم ہو تو ایسے روپیہ پر لعنت بھیجنی چاہیئے۔ اور مانگنا تو درکنار رہا یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ باوجود اختلاط کے باتیں کم کرتے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ بات ناگوار تھی یہ لوگ مولانا کو روکھا بتلاتے تھے اس پر یہ ساری گفتگو درمیان میں آگئی کہ لوگ علماء کی اچھی باتوں پر بھی اعتراض کرتے ہیں اور وہی باتیں امراء کریں تو مدح ہوتی ہے۔ بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اختلاط کے ساتھ قلت کلام بہت دشوار ہے یہ

کام صدیقین و کاملین کا ہے۔ ورنہ اکثر حالت یہی ہے کہ اختلاط میں فضول باتیں بہت کرنا پڑتی ہیں۔ اب اگر یہ دستورالعمل رکھا جاوے کہ جو شخص بھی ملنے آئے اس کے ساتھ خاطر مدارات و تعظیم و تکریم کا معاملہ کیا جائے اور گھنٹوں باتیں بنائی جائیں تو سارا وقت اسی کا ہو رہے اپنا کوئی کام بھی نہ ہوگا۔ اور اگر ایک کے ساتھ یہ برتاؤ کیا دوسرے کے ساتھ نہ کیا تو اس کو ناگوار ہوگا اور جس کی تم نے خاطر مدارات کی تھی اس کے ساتھ حسد پیدا ہو جائے گا کہ اس کی بہت خاطر ہوتی ہے۔ پھر یہ شبہ بھی ہونے لگے گا کہ شاید کسی نے شیخ سے میری شکایت کی ہوگی۔ اس لئے میرے حال پر وہ عنایت نہیں جو دوسروں کے حال پر ہے۔ اب گمان ہی گمان پر کسی کی غیبت شروع کر دی جس سے دشمنی بڑھ گئی۔ دشمنی کے بعد رات دن اس کو اس کی ایذا کی فکر ہے۔ اس کو اس کی فکر ہے۔ بس اسی کے ہو لئے نہ ذکر میں دل لگتا ہے نہ نماز میں نہ تلاوت میں نہ کسی کام میں ہر وقت فکر سوار ہے۔ ضرر کثرت اختلاط کا یہ ہے کہ آپ کے وہ دوست صاحب ہر روز تمہارے پاس موجود ہیں۔ دو گھنٹے تین گھنٹے روز ضائع کرتے ہیں کسی معمول کو لے کر بیٹھے تھے کہ دوست صاحب آگئے۔ بس معمول تو رخصت ہوا ان کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوگئے۔ اس طرح اوقات و اوراد کا بہت ناس ہوتا ہے۔ اسی لئے میں نے خانقاہ میں قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ کہ نہ کسی سے دوستی بڑھاؤ نہ دشمنی پیدا کرو نہ زیادہ مجلس آرائی کرو۔ کیونکہ یہ مجلس آرائی فساد کی جڑ ہے ہم نے دیکھا ہے کہ چوپال میں بیٹھ کر زیادہ باتیں کرنے سے اکثر لڑائی ہو جاتی ہے اس لئے سلامتی عزلت و قلت اختلاط ہی میں ہے۔ مگر ایک بات قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ قلت اختلاط سے بھی بعض دفعہ شہرت ہو جاتی ہے اور شہرت دنیا و دین دونوں کے لئے مضر ہے۔

مگر تجربہ یہ ہے کہ اگر قلت اختلاط اول ہی سے اختیار کرلو تو شہرت بھی نہ ہوگی کیونکہ لوگوں کی نظر میں یہ حالت کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ جانیں گے کہ اس شخص کی طبیعت ہی ایسی ہے، اور اختلاط کے بعد اگر قلت اختلاط کروگے تو شہرت ہو جائے گی کیونکہ لوگوں کو ایک نئی بات معلوم ہوگی کہیں گے کہ آجکل فلاں شخص چلاکشی کر رہا ہے۔ گوشہ نشین ہوگیا ہے۔ پھر شہرت کے بعد چین نہ ملے گا۔

اسی زمانہ میں ایک بزرگ نے اختلاط کے بعد جوعزلت اختیار کی تو پہلے سے زیادہ شہرت ہوگئی۔ مخلوق کا رجوع زیادہ ہوگیا بڑے پریشان ہوئے ایک دوسرے بزرگ نے ان کو لکھا ؎

آنروز کہ مہ شدی نمی دانستی کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

(جس دن تم چاند بنے تھے نہیں جانتے تھے کہ انگشت نمائے عالم ہوجاؤ گے)

یعنی اب کیا گھبراتے ہو جس دن تم چاند بنے تھے اس دن تمہیں معلوم نہ تھا کہ چاند انگشت نمائے عالم ہوا کرتا ہے۔ اس لئے لازم تھا کہ پہلے ہی سے چاند نہ بنتے یعنی اختلاط کر کے اپنے کو ظاہر نہ کرتے پس شہرت کے طریقے سے بچنا چاہیئے اور اول ہی سے گمنامی اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ زیادہ شہرت دین ودنیا دونوں کے لئے ضرر رساں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خویش را رنجور سازو زار زار تا ترا بیروں کنند از اشتہار

(اپنے کو خراب وخستہ حالت میں رکھو تا کہ تم کو شہرت سے آزادی حاصل رہے)

کیوں اس لئے کہ ؎

اشتہار خلق بند محکم است بند ایں از بند آہن کے کم است

(مخلوق میں شہرت مضبوط قید ہے یہ قید لوہے کی قید سے کم نہیں ہے)

اینش گوید نے منم ہمراز تو آنش گوید نے منم انبار تو

(کوئی تو یہ کہتا ہے میں آپ کا ہمراز ہوں کوئی کہتا ہے کہ میں آپکا ساتھی ہوں)

او چو بیند خلق را سرمست خویش
از تکبر می رود از دست خویش
(جب خلق کو اپنا عاشق و دیوانہ دیکھتا ہے تو تکبر کے سبب سے اپنے سے باہر ہو جاتا ہے)

یعنی جب وہ دیکھتا ہے کہ ساری دنیا میری معتقد ہے۔ کوئی ہاتھ چومتا ہے کوئی پیر تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ تو دین کا ضرر ہے۔ اور دنیا کا ضرر یہ ہے۔

چشمہا و خشمہا و رشکہا . بر سرت ریزد چو آب از مشکہا
(مشہور ہونے کے بعد عوام کا غصہ اور حسد اور رشک تجھ پر اس طرح ہوگا جیسے مشک سے پانی ٹپکتا ہے)

چنانچہ مشہور آدمی سے عام لوگوں کو بھی حسد اور رشک پیدا ہو جاتا ہے اور حکام کی نظر بھی مشہور لوگوں پر زیادہ ہوتی ہے جب کوئی قصہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے مشہور لوگوں پر آفت آتی ہے آجکل جو عوام حکومت کے مقابلہ میں بہادر بنے ہیں اس کا راز یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم کو پوچھتا کون ہے۔ ہاں جو لوگ مشہور ہیں ان کا حکومت سے مقابلہ کرنا بے شک بہادری ہے کیونکہ ان کو ہر وقت اپنے اوپر خطرہ ہے۔ گو اس سے بحث نہیں کہ یہ بہادری جائز ہے یا حرام اور یہ دینی شجاعت ہے یا نفسانی تہور۔ اس کو علماء سے پوچھو۔ مگر صاف بات یہ ہے کہ علماء بھی سب نہیں ہیں۔ بلکہ علماء حقیقت میں صرف وہ ہیں جو لیڈروں کے تابع نہ ہوں حکم شرعی کے تابع ہوں اور جو علماء لیڈروں کے تابع ہیں ان کی تو حالت یہ ہے کہ واللہ اگر لیڈر آج اپنی رائے کو بدل دیں تو یہ علماء بھی ادھر ہی ہو جائیں مگر ہیں عقلمند فوراً اپنے فتوے کو نہ بدلیں گے کیونکہ اس سے عوام کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان کے فتوے لیڈروں کی رائے کے تابع ہیں بلکہ آہستہ آہستہ اپنی رائے کو بدل کر لیڈروں کے راستہ پر آجائیں گے آج کل علما لیڈروں کے ساتھ دو وجہ سے ہیں۔ یا تو اس لئے کہ ان سے

علیحدگی میں زوال جاہ کا اندیشہ ہے چنانچہ مشاہد ہے کہ جو علماء ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ ان کو عوام نے کیسا بدنام کیا اور کتنا بُرا بھلا کہا۔ یا روپیہ کی طمع سے ان کے ساتھ ہیں کہ اگر ہم نے ان تحریکات میں شرکت نہ کی تو مدرسہ کا چندہ بند ہو جائے گا کوئی مدرسہ کی اعانت نہ کرے گا۔ ایک عالم نے مجھے لکھا تھا کہ ان تحریکات سے علیحدگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ کوئی تمہارے ساتھ نہ ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے خدا کا ساتھ ہونا کافی ہے اور کسی کے ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں۔ لعنت ہے ایسے مال و جاہ پر جس سے مخلوق کی رضا مقصود ہو۔ مسلمانوں کی شان تو یہ ہونا چاہیئے کہ رضاء الٰہی کے سامنے اس کو کسی کی پرواہ نہ ہو۔ اگر مخلوق اس کو پاگل بنا کر چھوڑ دے مگر خدا راضی ہو تو وہی اس کے لئے سلطنت ہے اگر وہ پاگل بھی ہے تو کس کا پاگل ہے ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور اگر دیوانہ ہیں لیکن اس ساقی ازل کے مست دیوانہ ہیں)

اس کے نزدیک جو خدا کا دیوانہ ہو وہ خود دیوانہ ہے ؎

او ست دیوانہ کہ دیوانہ نشد　　مرعس را دیدہ و در خانہ شد

(وہی دیوانہ ہے جو ان کا دیوانہ نہ ہوا۔ کوتوال شہر کو دیکھا اور گھر کے اندر ہوا)

مگر ان کی دیوانگی بے عقلی کی دیوانگی نہیں بلکہ مستی عقل سے ان پر ایک نشہ سوار ہے یہ وہ دیوانگی ہے جس پر ہزار عقلیں قربان ہیں ؎

او گل سرخ ست تو خونش مخواں　　مست عقل است او تو مجنونش مخواں

(وہ گلاب کا پھول ہے اس کی سُرخی کو تم خون مت کہو وہ مست عقل ہے اس کو دیوانہ مت کہو)

کوئی تو اس کے لئے نیند میں پڑا سو رہا ہے کہ روٹی نہیں ملی فاقہ گذر رہا ہے اور

یہ اس لئے نیند میں ہے کہ کھا بہت گیا ہے۔ بہت کھانے سے بھی نیند آیا کرتی ہے۔ اسی طرح کوئی تو اس لئے مجنوں ہے کہ اس کے پاس عقل نہیں۔ اور کوئی اس لئے مجنوں ہے کہ غلبہ عقل سے مست ہو گیا ہے۔ یہ لوگ مصالح کو مسالہ کی طرح پیس ڈالتے ہیں ان کی بڑی مصلحت یہ ہوتی ہے۔ کہ ایک کو راضی کر لیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند دخم طرہ یارے گیرند

(میری بصیرت کی رائے یہ ہے کہ یاران طریق سب کام چھوڑ کر محبوب حقیقی کی رضا کے طالب ہو جائیں زلف محبوب کے خم سے یہی مراد ہے)

یاد رکھو سلطنت خود مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں۔ اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون و ہامان و نمرود و شداد بڑے مقرب ہونے چاہئیں۔ حالانکہ وہ مردود ہیں معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضاء حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضاء حق نہ ہو وہ وبال جان ہے۔ اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پاخانہ اٹھانے پر بھی راضی ہیں اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں۔ آخر حضرت ابراہیم بن ادہم کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی پھر کیوں چھوڑ دی محض اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود دوسری چیز ہے۔ کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم ہر فن کے امام ہیں۔ حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں اور فقہاء میں فقیہہ۔ اور صوفیہ میں تو امام ہیں ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا جو ان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے۔ پھر دیکھ لو انھوں نے کیا کیا۔ جب رضاء حق میں سلطنت کو

مزاحم دیکھا تو بادشاہت پر لات مار کے الگ ہو گئے۔ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو سلطنت مضر مقصود نہ تھی تو ان کو اجازت دی گئی کہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لئے مضر مقصود تھی تو ان کے لئے حکم ہے لا تلین مال یتیم ولا تقضین بین اثنین اس سے صاف معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود رضائے حق ہے اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا۔ حضرت ابوذر تو اتباع احکام کا ارادہ بھی کرتے تھے۔ ان کو جب بھی قضاء و حکومت کی اجازت نہ دی گئی۔ اور تم تو اتباع احکام کا بھی قصد نہیں کرتے اس حال پر تم کو کیونکر اجازت دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ جو لوگ ابھی تھوڑا زمانہ ہوا پنچایت میں مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے ان کے کتنے فیصلے شریعت کے موافق ہوتے تھے اور وہ خود اتباع احکام کتنا کرتے تھے حالت یہ تھی کہ خود لوگوں کے حقوق دبائے ہوئے ہیں اور پنچایت میں فیصلے کر رہے ہیں جن میں اکثر فیصلے خلاف شریعت ہوتے تھے۔ اگر ان لوگوں کو سلطنت مل جاتی تو مخلوق کو کچا کھا جاتے تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ اس ظلم کی حالت میں تم کو سلطنت دے دیں گے۔ ارے اگر تم بادشاہ بن جاتے تو نہ معلوم مخلوق کا کیسا حال ہوتا۔ بڑی خیر ہوئی کہ خدا نے گنجے کو ناخن ہی نہ دیئے۔ اتنا ہی فرق دیکھ لو اپنے میں اور ان لوگوں میں جن کو خدا نے سلطنت دے رکھی ہے کہ تم نے اپنے مخالفوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اہل سلطنت نے تمہارے ساتھ باوجود تمہاری اس مخالفت کے کیا برتاؤ کیا۔ اگر تم بادشاہ ہوتے اور اس وقت تمہارے ساتھ کوئی اس طرح مقابلہ سے پیش آتا جیسا تم اس وقت سلطنت کے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو تو نہ معلوم تم کتنوں کو پھانسی پر لٹکا دیتے اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ تم صرف سلطنت کو مقصود سمجھتے ہو رضاء حق کو مقصود نہیں سمجھتے اس لئے

تم کو خلاف شرع اقوال و افعال سے ذرا باک نہیں۔ حالانکہ فقیر کا مقصود پلاؤ ہے۔ اگر رکابی بھی ساتھ میں مل گئی فبہا ورنہ صرف ڈھوبرے جمع کرنے سے کیا فائدہ یہ تو نری حماقت ہے، خصوصاً پھوٹے ہوئے ڈھوبرے جمع کرنا تو سخت حماقت ہے۔ لوگ تو پھوٹا ہوا بیل بھی نہیں لیتے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ کہ ایک شخص نے بیل خریدا تھا۔ وہ موتنے لگا تو اس نے بیچنے والے سے کہا کہ اپنا بیل لے جاؤ ہم نہیں خریدتے یہ تو پھوٹا ہوا ہے۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ جاہ سے دین اور دنیا دونوں کا ضرر ہوتا ہے اس لئے عزلت میں ایسا طریقہ اختیار نہ کرنا چاہیئے جس سے شہرت و جاہ حاصل ہو لیکن جس جاہ سے ضرر ہوتا ہے یہ وہ جاہ ہے جو طلب سے حاصل ہو۔ اور جو بدون طلب کے حاصل ہو وہ مضر نہیں ہوتی۔ اس میں خدا تعالیٰ کی امداد ہوتی ہے۔ اگر لوگ اس پر حسد کریں اور اس کو برا بھلا کہنے لگیں تو حق تعالیٰ اس کے دل کو قوی کر دیتے ہیں جس سے کوئی اذیت اس کے نزدیک اذیت نہیں رہتی نیز ان مصائب سے جو باطنی ترقی ہوتی ہے حق تعالیٰ اُسے قلب پر منکشف فرما دیتے اور ہر واقعہ کی حکمت پر مطلع فرما دیتے ہیں۔ اب اُسے کچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ خوش ہوتا ہے جیسے انسپکٹر اپنے عہدہ سے خوش ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی ڈاکوؤں کے مقابلہ میں گولی بھی لگتی ہے مگر بایں ہمہ اس عہدہ پر مبارکبادہی دی جاتی ہے، اور گولی کھانے کے بعد بھی کوئی اس عہدہ کو نہیں چھوڑتا کیونکہ

لہ رضا رحق کو پلاؤ سے تشبیہ دی ہے اور سلطنت کو رکابی سے۔ اور ظاہر ہے کہ پلاؤ بدون رکابی کے بھی مقصود ہے اور رکابی بدون پلاؤ کے بے کار ہے۔ اسی طرح رضا رحق بدون سلطنت کے بھی مقصود ہے اور سلطنت بدون رضار حق کے بے کار محض ہے خوب سمجھ لو خصوصاً جبکہ سلطنت بھی ظلم و بے انتظامی کی سلطنت ہو وہ تو پھوٹی ہوئی رکابی کے مشابہ ہے ۱۲ جامع

اس حالت میں ترقی کی امید ہوتی ہے۔ سو یہاں تو صرف امید ترقی پر گولیاں کھانا آسان ہوگیا اور جس کو مصیبت کی حالت میں اپنی ترقی محسوس ہو رہی ہو اس کا تو کیا حال ہوگا۔ پس طلب شہرت سے جو جاہ حاصل ہوتا ہے وہ تو دنیا و دین دونوں کے لئے مضر ہے۔ اور بدون طلب کے جو جاہ حاصل ہو وہ مضر نہیں۔ اور اس کی تائید حدیث شریف سے ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا یاعبد الرحمٰن بن سمرة لا تسئل الامارة فانك ان عطیتها من مسئلة وكلت الیها وان اعطیتها عن غیر مسئلة اعنت علیها۔ اے عبد الرحمٰن بن سمرہ حکومت کا سوال نہ کرنا کیونکہ اگر تم سوال کے بعد حکومت دیئے گئے تو تم کو اسی کے حوالہ کر دیا جائیگا اور اگر بدون سوال کئے دیئے گئے تو تمہاری اعانت و امداد کی جائے گی پس اختلاط میں ایک ضرر تو یہ ہے کہ اس کے بعد عزلت اختیار کرنے میں شہرت ہوتی ہے۔ اور ایک ضرر اختلاط میں یہ ہے کہ اس میں ذکر کا موقع نہیں ملتا اور فکر کا موقع تو بہت ہی کم ملتا ہے فکر تو اختلاط میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے لئے تو یکسوئی اور تنہائی کی سخت ضرورت ہے اور فکر بہت بڑی چیز ہے۔ حق تعالٰی نے جہاں ذکر کا بیان فرمایا ہے وہاں فکر کو بھی ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یاد رکھو تمام علوم و اسرار کا ورود قلب پر فکر ہی کی برکت سے ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ فکر کے بغیر علوم و اسرار قلب پر نہیں آتے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ورود علوم و اسرار کی قابلیت بدون فکر کے حاصل نہیں ہوتی۔ قلب علوم و اسرار کے قابل فکر ہی سے ہوتا ہے پھر قابلیت کے بعد بدون فکر کے بھی علوم آنے لگتے ہیں اس وقت یہ حال ہوتا ہے ؎

بینی اندر خود علوم انبیا   بے کتاب و بے معید و اوستا
(تو اپنے اندر علوم انبیا دیکھے گا بے کتاب اور بے تکرار کرانے والے اور بے استاد کے)

جو شخص عرصہ تک فکر میں مشغول رہ چکتا ہے اس کے بعد اختلاط میں بھی اس کے دل پر اسرار و علوم منکشف ہوتے رہتے ہیں۔ بشرطیکہ تھوڑا بہت وقت خلوت کے لئے بھی رکھے اس لئے ہر سالک کے لئے ایک وقت خلوت کا ہونا ضروری ہے جس میں وہ یکسوئی کے ساتھ ذکر و فکر میں مشغول ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا آپ نے بھی اپنے لئے ایک وقت خلوت کا مقرر کر رکھا تھا چنانچہ آپ رات کو جب سب لوگ سو جاتے تھے اٹھ کر نماز وغیرہ میں مشغول ہوتے تھے حق تعالے نے قیام لیل کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ دن میں مشاغل کثیرہ کی وجہ سے یکسوئی کا وقت نہیں مل سکتا اس لئے رات کو اٹھنا چاہیئے اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ط وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ط یعنی رات کے اٹھنے میں نفس پر مشقت بھی زیادہ ہے اور بات بھی اچھی طرح زبان سے نکلتی ہے۔ تجربہ ہے کہ رات کو اٹھنے کے بعد نماز و غیرہ میں زبان سے ذکر و قرآن میں سے جو بات نکلتی ہے گو یا دل سے نکلتی ہے۔ آگے ارشاد ہے کہ دن میں آپ کو بہت شغل ہے اس لئے رات کو اٹھنا چاہیئے اور اس وقت خدا کا ذکر کیجئے، اور اسی کی طرف یکسو ہو جایئے۔ یہ خلوت شب تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر اختیار کی اور نبوت سے پہلے چھ مہینہ تک رات دن آپ خلوت میں رہتے تھے اور غار حرا میں جا کر جو مکہ مکرمہ سے فاصلہ پر ہے تنہا رہتے تھے۔ خلوت کی مثال ایسی ہے جیسے کنویں سے پانی خوب بھر کر تھوڑی دیر کے لئے اس کو چھوڑ دیتے ہیں تاکہ پانی کی آمد زیادہ ہو اور اچھی طرح جمع ہو جائے اس کے بعد پھر بھرنے لگتے ہیں۔ اگر کچھ دیر کنویں کو نہ چھوڑا جائے پھر گارا کیچڑ آنے لگتا ہے پانی شفاف نہیں آتا۔ اسی طرح

جو لوگ ہر وقت اختلاط میں رہتے اور باتیں ہی بناتے رہتے ہیں ان کا قلب خالی ہو جاتا ہے اور دل کا خالی ہو جانا بہت ہی بُرا ہے اس لئے چاہیئے کہ ایک وقت خلوت کا ضرور ہو جس میں قلب انوار ذکر و فکر سے پر ہو جائے پھر اختلاط کے وقت علوم و اسرار ظاہر ہوں گے اور اختلاط کے بعد پھر خلوت ہونی چاہیئے تاکہ اختلاط سے جو انوار میں کمی ہوئی تھی وہ پوری ہو جائے اور جن لوگوں کا کوئی وقت خلوت کے لئے مخصوص نہیں ہوتا رفتہ رفتہ ان کا قلب انوار سے بالکل خالی ہو جاتا ہے پھر بجائے علوم و اسرار کے ظلمانی اقوال اُن کی زبان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں بزرگان دین جلوت میں جو اسرار و علوم بیان کرتے ہیں وہ خلوت میں ان کی تلقی کرتے ہیں اور گو یہ مسئلہ فی نفسہ اختلافی ہے کہ عزلت بہتر ہے یا اختلاط۔ بعض صوفیہ نے اختلاط کو ترجیح دی ہے اور وہ اس کے منافع بیان کرتے ہیں اور عزلت میں مفاسد بتلاتے ہیں بعض نے عزلت کو ترجیح دی ہے اور اس کے منافع بیان کئے ہیں اور اختلاط میں مضرتیں بتلاتے ہیں جس کا سب سے اچھا فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ الوحدۃ خیر من جلیس السوء والجلیس الصالح خیر من الوحدۃ یعنی نہ خلوت مطلقاً بہتر ہے نہ جلوت بلکہ ملنے والے بد ہوں تو ان سے علیحدگی اور خلوت ہی بہتر ہے اور نیک ہوں تو اُن سے ملنا خلوت سے بہتر ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ آجکل جو حالات واقع ہیں وہ مقتضی خلوت ہی کی ترجیح کو ہیں۔ میری رائے اس باب میں یہاں تک ہے کہ گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں سے ملنا خلوت سے ہر حال میں بہتر ہوگا۔ مگر میں آجکل کبھی کبھی اپنے احباب کو ایک مشورہ دیا کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں کو بزرگوں کی زیارت کا بہت شوق ہوتا ہے وہ آئے دن سفر ہی میں رہتے ہیں۔ آج ایک بزرگ کے پاس جا رہے ہیں کل دوسرے بزرگ کے پاس، میں ان کو منع کیا کرتا ہوں کہ بزرگوں سے بہت نہ ملا کرو۔ بس ایک کو اپنا بزرگ بنالو اور جم کر اس کے پاس رہو۔ اور

اُس کے پاس بھی زیادہ آمدورفت نہ کرو۔ بلکہ ایک دفعہ بہت سارہ لو۔ پھر اپنے گھر بیٹھو۔ برس میں ایک دفعہ پھر مل لینا۔ ہر مہینہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ۔ اوراس مشورہ کاراز یہ ہے کہ حدیث شریف میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الجلیس الصالح خیر من الوحدۃ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جلیس صالح سے اختلاط کرنا ہر حال میں وحدت سے بہتر ہے بلکہ قاعدہ لغت کے موافق اس کا مطلب یہ ہے کہ جلیس صالح سے ملنا صلاح کے لئے مقصود ہے تو جب تک اس کے اختلاط سے صلاح حاصل ہو اسی وقت تک اس سے ملنا وحدت سے بہتر ہے۔ اور کبھی بزرگوں کی زیارت سے بھی صلاح حاصل نہ ہو بلکہ فساد بڑھنے لگے تو اس وقت اختلاط صالح سے بھی منع کردیا جائے گا۔ اب واقعات یہ ہیں کہ بعض لوگ تو بزرگوں کی زیارت کا نام کرتے ہیں اور مقصود سیروسیاحت ہوتی ہے تاکہ سیاحت سے تفریح حاصل ہو اور عمدہ عمدہ غذائیں کھانے کو ملیں یہ مقصود تو ان کو حاصل ہو جاتا ہے مگر باطن کا ضرر ہوتا ہے، کیونکہ جب نیت درست نہیں۔ تو بزرگوں سے فیض حاصل نہیں ہوتا۔ پھر رات دن گشت سے اوراد میں خلل پڑتا ہے جس میں یہ لوگ اپنے کو سفر کی وجہ سے معذور سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سفر عذر کی وجہ سے نہیں کیا تھا۔ اور مسافر وہی معذور ہے جو ضرورت کی وجہ سے سفر کرے۔ اور بعضوں کو زیارت ہی مقصود ہوتی ہے سیروسیاحت کا قصد نہیں ہوتا مگر یہ لوگ ایک مستحب کو ادا کرتے ہیں اور بہت سے فرائض میں خلل ڈالتے ہیں چنانچہ بہت لوگ بزرگوں کے یہاں ہفتوں قیام کرتے ہیں اور اپنے

لہ وہ قاعدہ یہ ہے کہ جب مسند الیہ مشتق ہو یا منعوت بنعت ہو تو علت حکم مادۂ اشتقاق یا نعت ہوا کرتی ہے کما فی قولہ تعالےٰ۔ والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما فالعلۃ السرقۃ ولعبد مؤمن خیر من مشرک فعلۃ الخیریۃ الایمان وامثال ذلک واللہ اعلم ۱۲ جامع

کھانے کا خود انتظام نہیں کرتے بزرگوں ہی کے سر پڑ جاتے ہیں وہ مروت کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے مگر انتظام وغیرہ میں ان کو کلفت ضرور ہوتی ہے۔ اور بلا وجہ ایک مسلمان کو خاص کر اپنے بزرگ کو تکلیف دینا کہاں جائز ہے۔

سفر میں بعض دفعہ نمازیں قضا ہو جاتی ہیں اور جماعت کا خون تو ضرور ہوتا ہے، بلا وجہ جماعت کو ترک کرنا کب مناسب ہے اگر سفر کا عذر کرو تو میں کہہ چکا کہ سفر ہی عذر ہے جو ضرورت سے ہو بلا ضرورت سفر عذر نہیں۔ عارف مسعود بک تو اس حال میں حج نفل سے بھی منع کرتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجا ئید کجا ئید
معشوق دریں جاست بیا ئید بیا ئید

(اے قوم جو حج کے لئے گئی ہے کہاں تم ہو کہاں تم ہو معشوق حقیقی تو
اسی جگہ ہے یہاں آؤ یہاں آؤ)

یعنی جس حج کے تم طالب ہو وہ اس حالت میں بیت اللہ میں نہ ہوگا بلکہ اپنے گھر رہ کر ہوگا۔ کیونکہ تم ایک حج نفل کے لئے بیسیوں نمازیں ضائع کرو گے، اوراد و تہجد میں خلل ڈالو گے جس سے بجائے ترقی کے تنزل کا اندیشہ ہے تمہارا حج (یعنی ترقی ۱۲) اسی میں ہے کہ اپنے گھر رہو اور معمولات و فرائض کو پابندی سے ادا کرتے رہو۔ ایک خرابی بزرگوں کی زیادہ زیارت میں یہ ہے کہ بعض دفعہ ان کی حالت سمجھ میں نہیں آتی۔ جیسے شیخ یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص ملنے گیا دیکھا ان کی گود میں ایک حسین لڑکا بیٹھا ہوا ہے اور سامنے شراب کی بوتل رکھی ہے۔ یہ شخص بدون تحقیق حال کے اُن سے بدگمان ہو گیا، حالانکہ وہ لڑکا ان کا بیٹا تھا اور بوتل میں کوئی شربت بصورت شراب تھا۔ لوگوں کے امتحان کے لئے انھوں نے یہ صورت

اختیار کی تھی۔ تو بزرگوں کی ایسی حالت کے دیکھنے سے بعض دفعہ قلب میں انکار پیدا ہو جاتا ہے اور اہل اللہ کے انکار قلب میں پیدا ہو جانا سخت وبال کا باعث ہے جس سے بعض دفعہ ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد
تا دل صاحب دلے نامد بدرد

(کسی قوم کو حق تعالیٰ رسوا نہیں فرماتے جب تک کہ وہ قوم کسی اہل دل کو نہیں ستاتی)
بزرگوں پر انکار کرنا اور اُن پر طعن کرنا عذاب کا سبب ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد برافتاد

(بارہا تجربہ کیا ہم نے اس جہان مکافات میں کہ جس نے ستایا اہل اللہ کو وہ تباہ کر دیا گیا)
ایک خرابی یہ ہے کہ اگر ایسی حالت دیکھ کر بزرگوں سے بداعتقادی نہ ہوئی اور حقیقت بھی منکشف نہ ہوئی تو یہ شخص خود بھی وہ کام کرنے لگتا ہے جس میں بزعم خود بزرگ کو مبتلا دیکھا تھا۔ ان کی گود میں تو اپنا بیٹا تھا۔ یہ اجنبی لڑکوں سے اختلاط کرنے اور ان کے ساتھ ناجائز افعال کرنے لگتا ہے۔ بزرگ کے سامنے تو شربت کی بوتل تھی یہ سچ مچ شراب پینے لگتا ہے۔ اس کا دین تو برباد ہوا۔ تو جس پیر سے ایسے اعمال ظاہر ہوں جو تاویل کے محتاج ہوں اس سے زیادہ نہ ملو بلکہ ناقص العقل کے لئے تو فتویٰ یہ ہے کہ اُس سے بالکل نہ ملے۔ لوگ بزرگوں کی زیارت کو روٹی کا نوالہ سمجھتے۔ مگر بعض دفعہ وہ لقمہ گلے میں ایسا پھنستا ہے کہ جان پر بن جاتی ہے۔ اہل اللہ پر مختلف حالات کا ورود ہوتا ہے جن کی حقیقت بہت کم لوگوں کی سمجھ میں

آتی ہے۔ ناسمجھ کا وہاں کام نہیں اس کا تو بیڑا ہوجاتا ہے۔ مولانا ایسے ہی قول کے باب میں فرماتے ہیں ؎

بیم سر یا بیم سر یا بیم دین　　امتحان نیست ما را مثل این

(راز کا خوف یا عجب وکبر کا خوف یا دین کا خوف اس کے مثل ہمارا امتحان نہیں ہے)

اور اختلاف حالات کے متعلق فرماتے ہیں ؎

گہ چنیں بنماید و گہ ضد این　　جز کہ حیرانی نباشد کار دین

(کبھی ایسا دکھاتے ہیں کبھی اس کا ضد دکھاتے ہیں سوائے حیرانی کار دین نہیں ہے)

ان مختلف حالات کو دیکھ کر طالب حیران ہوجاتا ہے۔ پھر بعض تو اس وقت بھی شیخ سے بداعتقاد نہیں ہوتے اور نہ خود ویسے اعمال کرتے ہیں بلکہ انکشاف حقیقت کے منتظر رہتے ہیں اور بعض یا تو شیخ سے بداعتقاد ہوگئے یا بدون کشف حقیقت کے تقلید کرنے لگے۔ ایک خرابی مختلف بزرگوں سے ملنے میں یہ ہے کہ شاید کوئی بزرگ اس کو اپنے پیر سے زیادہ نظر آگئے ان کی کوئی ادا پسند آجائے جس نے اس کو فریفتہ کردیا۔ جیسے جہانگیر تو لڑکپن میں نورجہاں کی کہ وہ بھی اس وقت بچی تھی۔ اس ادا پر فریفتہ ہوگیا تھا کہ کسی میلہ میں شہزادہ بھی گیا تھا۔ وہ بھی آئی تھی۔ شہزادہ کے پاس دو کبوتر تھے۔ ہاتھ سے کوئی کام لینے کی ضرورت ہوئی اتفاقاً یہ سامنے موجود تھی۔ شہزادہ نے وہ دونوں کبوتر اس کے ہاتھ میں دے دیئے کہ ان کو تھامے رہے۔ جب جہانگیر فارغ ہوا تو ایک کبوتر ندارد، پوچھا کبوتر کیا ہوا۔ نورجہاں نے کہا اڑگیا۔ اس نے غصہ میں کہا کہ کیسے اڑگیا۔ نورجہاں نے دوسرے کو بھی چھوڑ دیا کہ ایسے اڑگیا جہانگیر اس ادا پر سو جان سے فریفتہ ہوگیا۔ حالانکہ یہ بات اور زیادہ موجب غضب تھی کہ ایک تو گیا ہی تھا اس نے دوسرا بھی کھودیا۔ مگر دل کے آنے کا کچھ قاعدہ نہیں۔ بعض دفعہ یہ دل ایسی بات پر فریفتہ ہوجاتا ہے جو حقیقت میں قابل فریفتگی کے نہیں ہوتی۔

اسی طرح ممکن ہے کہ آپ کو کسی بزرگ کی کوئی ادا پسند آجائے کیونکہ اس کے کمالات ظاہر تھے اور آپ کے شیخ کے کمالات مخفی تھے۔ وہاں تک نظر نہیں پہنچی۔ اب لگے دوسرے بزرگ سے بیعت ہونے وہ صاحب فراست تھے انھوں نے پوچھا کہ تم کسی سے بیعت تو نہیں۔ اس نے اقرار کیا کہ جی ہاں فلاں بزرگ سے بیعت ہوں، اب وہ خفا ہو گئے کہ پھر تم مجھ سے کیوں بیعت ہوتے ہو، وہ تو بڑے کامل ہیں۔ تم ان سے کیوں انحراف کرتے ہو جاؤ میں تم کو بیعت نہ کروں گا۔ اب دونوں طرف سے راندہ گیا۔ اپنے شیخ سے تو اعتقاد نہ رہا اس لئے وہاں سے فیض بند ہو گیا اور دوسرے نے بیعت نہ کیا۔ وہاں سے بھی محروم رہا اور اگر دوسرے نے بیعت بھی کر لیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو فلاں شخص سے بیعت تھا اس نے مجھے دھوکہ دیا کہ یہ بات مجھ سے ظاہر نہ کی تو اب بعد میں وہ اس سے خفا ہو گئے اور بیعت فسخ کر دی پھر بھی دونوں جگہ سے منہ کالا ہوا۔

اور ایک خرابی مختلف بزرگوں کے ملنے میں یہ ہے کہ کسی وقت دوسرے بزرگ کے مریدوں سے یہ اپنے شیخ کی تعریف کرنے لگتا ہے اس کے جواب میں وہ اپنے شیخ کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ پھر یہ اپنے شیخ کے کمالات ظاہر کرتا ہے وہ اس کے جواب میں اس کے شیخ کے عیوب بیان کرتے ہیں۔ یہ ان کے شیخ میں عیوب نکالتا ہے۔ اب تبرا ہونے لگا اور شیعہ سنیوں کی طرح پارٹی بندی ہو گئی جس کے مفاسد ظاہر ہیں، محتاج بیان نہیں۔ پس آج کل مختلف بزرگوں کی زیارت میں صلاح حاصل نہیں ہوتی بلکہ فساد بڑھتا ہے۔ اس لئے میں بعض لوگوں کو اس سے منع کیا کرتا ہوں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اپنے پیر کے پاس بھی کم جاؤ زیادہ نہ لپٹو۔ کیونکہ گاہے گاہے خاص اوقات میں اس کے پاس جاؤ گے تو اس کو ذکر میں مشغول دیکھو گے رزانت و متانت کی حالت میں پاؤ گے اس سے اعتقاد بڑھے گا اور اگر

ہر وقت لپٹے رہو گے تو کبھی ہگتے دیکھو گے کبھی موتتے ہوئے کبھی تھوکتے سنکتے دیکھو گے اس سے تمہیں اعتقاد کم ہوگا، ہاں عقلاء کو ان حالات کے مشاہدہ سے اعتقاد بڑھتا ہے کیونکہ وہ جانیں گے کہ یہ شیخ فرشتہ نہیں بشر ہے مگر بشر ہو کر بے شر ہے تو بڑا کامل ہے اور ناقص العقل کبھی شیخ میں اور اس کی بیوی میں جھگڑا دیکھے گا۔ اس کا ان باتوں سے اعتقاد کم ہوگا، اور اگر اعتقاد بھی کم نہ ہو تب بھی ہر وقت نہ لپٹو کیونکہ آخر شیخ کو بھی تو اپنے اوقات کی پابندی ضروری ہے۔ زیادہ لپٹنے سے اس کو کدورت ہوگی۔ اور شیخ کو مکدر کرنا طالب کے لئے مضر ہے اس کی رعایت بہت ضروری ہے کہ جس کے پاس جاؤ ایسے وقت میں جاؤ کہ اس وقت تمہارے جانے سے اس کو کدورت نہ ہو۔ فقہاء نے تو اس کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جہالت کی وجہ سے کسی دن میں عیادت کو منحوس سمجھتا ہو تو اس کی عیادت کو اس دن نہ جاؤ کیونکہ اس سے اس کو وحشت ہوگی۔ اب بعض خشک مولوی اس مذاق کے ہیں کہ نہیں اسی دن جانا چاہیئے اور اس کے عقیدے کی اصلاح کرنا چاہیئے۔ سبحان اللہ اصلاح عقیدہ کا وقت بھی یہی رہ گیا یاد رکھو اس دن میں جانے سے جب پہلے ہی اس کو توحش ہو جائے گا تو وہ تمہاری بات پر توجہ بھی نہ کرے گا اصلاح کا طریقہ بھی یہ ہے کہ دوسرے دن جاؤ اور باتوں باتوں میں اس کے عقیدہ کی اصلاح کرو۔

واقعی حضرات فقہاء کا وجود بھی امت کے لئے رحمت ہے۔ مسلمانوں کو تکدر اور وحشت سے بچانے کا کتنا خیال کیا ہے کہ عیادت میں جاہلانہ عقائد کی بھی رعایت کی ہے کہ جس دن میں جہلا عیادت کو منحوس سمجھتے ہوں اس دن عیادت نہ کرو۔ ورنہ وہ عیادت ایسی ہوگی۔ جیسے ایک بہرہ اپنے دوست کی عیادت کو گیا تھا وہ اس کی صورت ہی دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ یہ کمبخت کہاں آمرا۔ اپنی سب کہے گا اور میری کچھ نہ سنے گا۔ چنانچہ بہرہ نے مزاج پرسی کی کہ اب کیا حال ہے۔ مریض نے جھلا کر کہا کہ مر رہا ہوں۔

وہ سمجھا یوں کہتا ہے اب افاقہ ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں الحمد للہ پھر پوچھا کہ آج کل کونسی دوا استعمال میں ہے۔ مریض نے کہا کہ زہر پی رہا ہوں آپ سمجھے کہ کسی دوا کا نام لیا ہوگا۔ تو فرماتے خدا اسے رگ رگ میں پیوست کرے۔ پھر پوچھا کون سے حکیم کا علاج ہے۔ مریض نے کہا ملک الموت کا بہرہ نے جواب دیا کہ خدا ان کے قدم کو مبارک کرے بڑے اچھے طبیب ہیں۔ تو بتلایئے ایسی عیادت سے کیا نفع جس سے مریض کو بجائے تسلی کے وحشت ہو اس لئے عیادت کے واسطے وہ لوگ جائیں جن سے مریض کو انس ہو اور اُن کے جانے سے تسلی ہو ایسے لوگوں کی عیادت سے واقعی مرض میں تخفیف ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بار کانپور میں مجھے والد صاحب کا خط ملا کہ میں آجکل ایک ضرورت سے الہ آباد آیا تھا یہاں مجھ کو بخار ہو گیا ہے۔ میں خط دیکھتے ہی الہ آباد آگیا۔ پس میرے جاتے ہی والد صاحب بالکل اچھے ہو گئے۔ تو عیادت کے لئے صرف ایسے لوگوں کو جانا چاہیئے جن سے مریض کو انس ہو۔ اور دوسرے لوگ جائیں بھی تو وہاں جاکر زیادہ باتیں نہ بنانی چاہئیں اس سے مریض کو وحشت ہوتی ہے۔ پس مزاج پرسی کر کے تھوڑی دیر بیٹھیں پھر اپنے کام میں لگیں۔ مگر آج کل عادت یہ ہے کہ مریض کے پاس گھنٹوں بیٹھتے اور باتیں بناتے ہیں جس سے اس غریب کو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر یہ اپنے گمان میں اس پر احسان کر رہے ہیں۔ افسوس غیر مسلموں میں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی سے ملنے جاتا ہے تو وہ پوچھ لیتا ہے کہ آپ کو کچھ کہنا ہے اگر کہنا ہوا تو فوراً سن لیا اور جو کچھ کہنا نہ ہوا تو فوراً رخصت کر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں کوئی ایسا کرے تو کمبختی آجائے طعن و تشنیع ہونے لگے اور اس کا راز یہ ہے کہ ہم لوگوں کو کوئی کام نہیں اس لئے وقت کی بھی قدر نہیں الغرض تعزیت میں ان لوگوں کو جانا چاہیئے جن سے وارثوں کو تسلی ہو باقی لوگوں کو خط سے تعزیت کرنا چاہیئے مگر آج کل قاعدہ یہ ہے کہ جہاں برادری میں کوئی مرا چاروں طرف سے گاڑیاں لیکر برادری والے اس کے یہاں دھما ڈلتے ہیں اس بیچارے کو ایک غم تو اپنے

عزیز کے مرنے کا تھا دوسرا غم ان زندوں کے کھلانے پلانے کا ہوتا ہے پھر گاڑیوں کے گھاس والے کا الگ تردد۔ یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔ ضلع بلند شہر میں بھی یہی رواج تھا کہ چالیسویں کے دن میت کے گھر ساری برادری جمع ہوتی تھی ایک رئیس زادے نے اس کا خوب علاج کیا اس کے والد کے انتقال کے بعد جب موقع پر ساری برادری جمع ہوئی اُسے ناگوار ہوا کہ مجھے ایک تو والد کا غم تھا دوسرا غم برادری کے کھلانے پلانے کا سر پڑا اُس نے ملامت کے خوف سے عمدہ عمدہ کھانے تو پکوائے اور سارا انتظام کیا جب کھانا تیار ہو گیا اور برادری کے لوگ کھانے کے واسطے بیٹھے اس وقت رئیس زادہ نے سب کو خطاب کر کے کہا کہ مجھے آپ حضرات سے ایک بات عرض کرنی ہے وہ یہ کہ سب صاحبو کو معلوم ہے کہ میرے سر پر سے والد صاحب قبلہ کا سایہ اُٹھ گیا ہے اور اس کا جتنا رنج وغم بیٹے کو ہوتا ہے سب جانتے ہیں تو اس حالت میں میری ایک ہمدردی کرنا چاہیئے۔ کیا یہی ہمدردی ہے جو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ میں تو غم میں مبتلا اور آپ پلاؤ زردہ کھانے کے واسطے تیار۔ بس مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا، اب بسم اللہ کیجیئے۔ لوگوں نے کہا کہ تم نے جوتے تو پہلے ہی کھلا دیئے اب کھانا خاک کھاویں۔ یہ کہہ کر سب لوگ دستر خوان پر سے اٹھ گئے اور دوسرے مکان میں جمع ہو کر ان کی کمیٹی ہوئی کہ واقعی یہ رسم بہت واہیات ہے اس کو توڑنا چاہیئے، چنانچہ طے ہو گیا کہ میت کے گھر تعزیت کے لئے سب کو جانے کی ضرورت نہیں خاص خاص عزیزوں کو جانا چاہیئے اور برادری والے جائیں بھی تو تعزیت کر کے فوراً واپس چلے آئیں وہاں کھانا نہ کھائیں۔ یہ طے کر کے سب چلے آئے اور وہ کھانا غرباء کو کھلایا گیا۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ شیخ کے پاس ایسے وقت میں جانا چاہیئے جس میں تمہارا جانا اس پر گراں نہ ہو، بزرگوں کو زیادہ لپٹنے میں یہ بھی خرابی ہے کہ بعض دفعہ ایسی حرکات تم سے صادر ہوں گی جن سے ان کو انقباض ہوگا تھوڑی دیر پاس بیٹھنے میں تو تم اپنی حرکات کی نگہداشت کر سکتے ہو اور ہر وقت پاس رہنے میں اس کی رعایت دشوار ہے۔ اور اہل اللہ میں چونکہ لطافت زیادہ ہوتی ہے

اس لئے ان کو بعض ایسی حرکات سے انقباض ہوجاتا ہے جن کو تم معمولی بات سمجھتے ہو۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک مرید سال میں دو دفعہ آیا کرتا تھا۔ ایک بار ان سے عرض کیا کہ حضرت مجھے حاضر خدمت ہوتے ہوئے اتنا زمانہ گذر گیا آپ نے مجھ سے کوئی فرمائش نہیں فرمائی میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کوئی فرمائش کریں اور میں اس کو پورا کروں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ بھائی تم محبت سے مل لیتے ہو بس یہی کافی ہے۔ فرمائش کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے پھر اصرار کیا۔ تو فرمایا کہ تمہارے اصرار کے بعد میں ایک فرمائش کرتا ہوں بُرا نہ ماننا۔ اس نے کہا حضرت میں تو غلام ہوں۔ میری کیا مجال کہ حضرت کی فرمائش سے بُرا مالوں۔ خصوصاً جب میرے اصرار ہی سے آپ فرمارہے ہیں۔ فرمایا بھائی میری تم سے یہ فرمائش ہے کہ تم سال میں دو دفعہ آیا کرتے ہو اب سے ایک دفعہ آیا کرو کیونکہ تم کھاتے بہت ہو تمہارے کھانے کو دیکھ کر میرے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگتی ہے پھر جب تک مسہل نہیں لے لیتا اس وقت تک طبیعت درست نہیں ہوتی تو سال میں ایک بار مسہل لینا تو آسان ہے۔ مگر دو دفعہ مشکل ہے۔ کیا ٹھکانا ہے لطافت کا کہ دوسرے کو زیادہ کھاتے ہوئے دیکھ کر آپ کے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگتی ہے۔ چاہے کھانے والے کو خاک بھی اثر نہ ہوتا ہو۔

اسی طرح ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت ان کے پاجامہ میں سلوٹیں ایک طرف کم تھیں ایک طرف زیادہ پڑی ہوئی تھیں، مرزا صاحب کی نظر جو سلوٹوں پر پڑی پریشان ہوگئے۔ اتنے تو نازک تھے مگر اسی کے ساتھ آپ کے عدل کی یہ حالت تھی کہ ایک مرید سے آپ نے فرمایا کہ تم اپنے بچوں کو ہمارے پاس نہیں لاتے وہ بیچارہ کچھ بہانہ کر دیتا۔ کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ مرزا صاحب بہت نازک مزاج ہیں اور بچے شوخ ہوتے ہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی کسی حرکت سے آپ کو تکلیف پہونچے جب آپ نے کئی بار تقاضا کیا تو تین چار دن ٹال کر وہ اپنے بچوں کو لائے اور اس عرصہ میں ان کو خوب تعلیم دی کہ اس طرح سر جھکا کر بیٹھنا

یوں ادب کرنا۔ مجلس میں ادھر اُدھر نہ دیکھتا بچوں نے اسی طرح کیا کہ سلام کر کے بت کی طرح خاموش بیٹھ گئے نہ نگاہ اوپر اٹھائی نہ کوئی بات کی۔ اب مرزا صاحب ان کو کھولنا چاہتے ہیں تو کھلتے نہیں۔ مرزا صاحب نے مرید سے فرمایا کہ میاں تم آج بھی اپنے بچوں کو نہ لائے اس نے عرض کیا حضرت یہ حاضر تو ہیں، فرمایا یہ بچے ہیں یہ تو تمہارے بھی ابا ہیں۔ بچّے تو کھیلتے ہیں کودتے ہیں، شوخیاں کرتے ہیں، کوئی ہماری ٹوپی اتارتا کوئی کمر پر سوار ہوتا بچّے تو ایسے ہوتے ہیں اور یہ تو تمہارے بھی ابا بن کر بیٹھ گئے۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نازک نہیں ہیں بلکہ لطیف المزاج ہیں اور لطافت میں خلافت اعتدال حرکات ناگوار ہوا کرتی ہیں۔ اور بچوں کی شوخی اعتدال کے خلاف نہیں۔ کیونکہ بچپن کا مقتضا یہی ہے کہ بچہ بچوں کی طرح شوخ ہو۔ باوا دادا کی طرح متین نہ ہو۔ اس لئے یہاں آپ کو شوخی ہی پسند تھی متانت پسند نہ تھی۔ غرض اہل اللہ میں چونکہ ذکر اللہ سے لطافت بڑھ جاتی ہے اس لئے ان کو لوگوں کی بے ڈھنگی حرکات سے انقباض ہوتا ہے اور جب شیخ کو انقباض ہوگا تو اس کا قلب تم سے مکدر ہو جائے گا۔ اور شیخ کی مثال پرنالہ جیسی ہے۔ اگر پرنالہ میں گارا کیچڑ بھر دو گے تو پانی بھی گدلا آئیگا اسی طرح جب تم شیخ کو مکدر کر دوگے تو فیض بھی مکدر ہو کر آئے گا اس لئے اپنے شیخ کو بھی زیادہ نہ لپٹنا چاہیئے۔ ایک ضرر شیخ کو زیادہ لپٹنے سے یہ ہوتا ہے کہ تم نے بزرگوں کے قصے دیکھے تھے کہ فلاں بزرگ رات میں سو رکعتیں پڑھتے اور اشراق کی اتنی رکعتیں پڑھتے تھے اور دن رات میں اتنا ذکر کرتے تھے۔ زیادہ اختلاط سے تم نے اپنے شیخ کو ویسا نہ پایا۔ تو اب تم شیخ سے ضعیف الاعتقاد ہو گئے۔ حالانکہ تم کو اپنے شیخ کے سامنے کسی کی طرف التفات بھی نہ کرنا چاہیئے تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر کسی مجلس میں جنید و شبلی ہوں۔ اور حاجی صاحب بھی ہوں تو ہم تو جنید و شبلی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ بس حاجی صاحب ہی کی طرف اپنی نگاہ رکھیں۔ ہاں حاجی صاحب کا جی چاہے وہ ان کی طرف دیکھیں ہم تو کسی کی طرف

بھی نہ دیکھیں گے سبحان اللہ یہ حضرات ہیں شیخ کی قدر جاننے والے۔
جب میں مکہ معظمہ گیا تو حاجی صاحب کی مجلس کے سوا کہیں نہ جاتا تھا۔ اس وقت خلیل پاشا بہت بڑے بزرگ وہاں موجود تھے۔ حاجی صاحب بھی ان کی تعریف فرماتے تھے مگر میں کبھی ان کی خدمت میں نہیں ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تم خلیل پاشا سے ملنے نہیں گئے میں نے کہا کہ شیوخ طرق ہیں اور طرق کی مثال ایسی ہے جیسے کراچی اور بمبئی مکہ مکرمہ پہونچنے کے لئے تو اب جو شخص کراچی بندر سے سوار ہوا اس کو بمبئی کے بندر پر آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور جو بمبئی کے بندر سے سوار ہوا اس کو کراچی جانے کی کیا ضرورت ہے مقصود تو کعبہ ہے اس کے لئے کسی ایک بندر سے سوار ہونا کافی ہے اسی طرح مقصود وصول الی اللہ ہے اس کے لئے ایک شیخ کی صحبت کافی ہے۔ دنیا بھر کے شیوخ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے میرے اس جواب پر وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔

تو جس طرح اپنے شیخ کے ہوتے ہوئے دوسرے شیوخ احیاء کی طرف التفات خلاف ادب ہے اسی طرح شیوخ اموات کی طرف التفات بھی مضر ہے اور اپنے شیخ کے حالات کو ان کے حالات سے موازنہ کرنا تو بہت ہی حماقت ہے مگر کثرت اختلاط میں بعض لوگ اپنے شیخ کے اعمال کو پہلے بزرگوں کے اعمال سے موازنہ کرنے لگتے ہیں یہ طالب کے لئے بہت مضر ہے بزرگوں کی صحبت کے آداب سلاطین کی صحبت سے بھی زیادہ ہیں کیونکہ سلاطین تو اپنی سلطنت کے بقاء کے لئے بعض دفعہ اہل دربار کی رعایت بھی کرتے ہیں کہ مبادا یہ ہم سے برگشتہ ہو کر کسی دوسرے کو بادشاہ نہ بنالیں۔ نیز سلاطین میں بزرگوں کے برابر لطافت بھی نہیں ہوتی اس لئے ان کو اہل دربار کی بعض حرکتوں پر التفات بھی نہیں ہوتا اور اہل اللہ کو نہ کسی کا خوف ہے بجز خدا کے نہ کسی کا ان پر دباؤ ہے اور لطافت ان میں بہت ہوتی ہے اس لئے ان کی صحبت کے آداب بہت سخت ہیں جو ان آداب کی رعایت نہ کر سکے اس کو بزرگوں کے زیادہ اختلاط سے منع کیا جائے گا اور جب بزرگوں سے زیادہ اختلاط کرنا بھی مضر ہوتا ہے تو اشرار سے اختلاط کیوں

مضر نہ ہوگا بس سالک کو اکثر اوقات عزلت میں رہنا چاہیئے ہاں جس شخص کی صحبت میں دین ہی دین ہو۔ صلاح ہی صلاح ہو فساد کا بالکل اندیشہ نہ ہو۔ اس سے ملنے کا مضائقہ نہیں بلکہ ایسی جلوت خلوت سے بہتر ہے اور جس کے اختلاط میں فساد کا کچھ بھی اندیشہ ہو اس سے نہ ملے حتیٰ کہ اگر اپنے شیخ کی مجلس میں بھی غیبت ہونے لگے تو فوراً اٹھ جاؤ جیسے بارش عمدہ چیز ہے اور اس میں نہانا مفید بھی ہے مگر اولے پڑنے لگیں تو بھاگنا ہی چاہیئے۔ اسی طرح شیخ کی باتیں بارش کے مشابہ ہیں اور غیبت وغیرہ اولے کے مشابہ ہے جب تک بارش ہی بارش ہو جمے رہو اور جب اولے پڑنے لگیں تو بھاگو۔

جب آپ کو کثرت اختلاط کے مفاسد اور قلت اختلاط کے منافع معلوم ہو چکے تو اب سنئے کہ شریعت نے قلت اختلاط کی کیا صورت تجویز کی ہے شریعت نے قلت اختلاط کی صورت اعتکاف تجویز کی ہے اور رمضان میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے چنانچہ عشرہ اخیرہ میں اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے اس لئے رمضان سے اس کو بھی خاص تعلق ہے بہرحال تقلیل اختلاط کی یہ ایسی صورت ہے کہ کوئی صاحب ریاضت اسکی نظیر نہیں دکھلا سکتا اعتکاف میں نہ وہ غوائل ہیں جو خلوت محضہ میں ہیں نہ وہ غوائل ہیں جو اختلاط صرف میں ہیں۔ کیونکہ معتکف خلوت میں بھی ہے اور جلوت میں بھی۔ یہ ریاضت خلوت وجلوت دونوں کو جامع ہے۔ ایسی ریاضت جو دونوں کو جامع ہو کسی صاحب ریاضت کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی۔ اہل اختلاط نے عزلت میں ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ اس سے تعلیم وتعلم کا باب مسدود ہوتا ہے تو یہ خرابی اعتکاف میں نہیں کیونکہ معتکف کو تعلیم وتعلم سے منع نہیں کیا گیا اور چونکہ اعتکاف مسجد میں ہوتا ہے جہاں اہل علم آتے رہتے ہیں اس لئے معتکف کو تعلیم وتعلم میں کوئی دقت بھی نہیں ہوسکتی۔ ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت میں جماعت کے ثواب سے محروم ہوجاتا ہے۔ اعتکاف اس سے بھی منزہ ہے کیونکہ اعتکاف کے لئے مسجد جماعت شرط ہے معتکف سے زیادہ تو جماعت کا ثواب کسی کو مل ہی نہیں سکتا وہ تو ہر نماز میں تکبیر اولیٰ کو پاتا ہے اور ہر وقت جماعت کے انتظار میں رہتا ہے اور انتظار جماعت کا ثواب بھی جماعت کے برابر ہے۔ ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت میں بزرگوں کے فیض سے محروم ہوجاتا ہے

اعتکاف اس سے بھی منزہ ہے کیونکہ یہ شخص پانچوں وقت نمازیوں سے ملتا ہے جن میں بعض اولیاء بھی ہوتے ہیں۔ ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت میں صرف اپنے اعمال پیش نظر ہوتے ہیں جس سے عجب و کبر کا اندیشہ ہے اور اختلاط میں اپنے سے افضل کے اعمال پر بھی نظر پڑتی ہے تو تواضع پیدا ہوتی ہے۔ اعتکاف میں یہ غائلہ بھی نہیں کیونکہ مسجد میں بہت لوگ نماز کے لئے آتے ہیں جن میں بعضے بہت عبادت کرنے والے ہوتے ہیں معتکف کی نظر ان کے اعمال پر بھی پڑتی ہے تو کبر و عجب پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک خرابی یہ بتلائی تھی کہ عزلت سے شہرت ہو جاتی ہے۔ اعتکاف میں یہ بات بھی نہیں کیونکہ معتکف کسی پہاڑ کی کھو میں نہیں بیٹھتا جس سے شہرت ہو بلکہ بستی کی مسجد میں بیٹھتا ہے جہاں سب سے ملاقات ہوتی رہتی ہے اور اس کو عرفاً گوشہ نشینی اور عزلت گزینی نہیں شمار کیا جاتا اس لئے معتکف کی شہرت بھی نہیں ہوتی۔ ہر سال بیسیوں آدمی اعتکاف کرتے ہیں کوئی بھی بزرگ مشہور نہیں ہوتا۔ اسی طرح اعتکاف میں وہ غوائل بھی نہیں جو اختلاط صرف میں تھے۔ اختلاط میں ایک مضرت یہ تھی کہ اس میں اشرار کی صحبت بھی بعض دفعہ ہوتی ہے اور اشرار کی صحبت سے دین کا ضرر ہوتا ہے سو معتکف اس سے محفوظ ہے کیونکہ اشرار مسجد میں آتے ہی نہیں مسجد میں نمازی آتے ہیں اور نمازی اکثر نیک ہوتے ہیں اور اگر بعضے بد بھی ہوں تو نماز کے وقت تو وہ نیک ہی بن جاتے ہیں اس لئے ان کی صحبت مضر نہیں ہوتی۔ پھر وہ صحبت طویل نہیں ہوتی ایسے لوگ مسجد میں نماز کے بعد ٹھہرتے ہی نہیں تو صرف نماز کے وقت میں تھوڑی دیر کی صحبت ہوتی ہے اور اس میں بھی اشرار شر سے خالی اور نیک کام میں مشغول ہوتے ہیں ایک مفسدہ یہ بتلایا گیا تھا کہ اختلاط میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ باتوں میں وقت برباد ہوتا ہے معتکف اس سے بھی محفوظ ہے کیونکہ اس کے پاس باتیں کرنے والے آتے ہی نہیں مسجد میں نماز سے فراغت کے بعد ٹھہرتا کون ہے جو معتکف سے باتیں کرے دوست احباب بھی گھر پر ہی آتے ہیں مسجد میں کوئی نہیں آتا اس لئے معتکف کو باتیں بنانے کا موقع نہیں ملتا۔ اور کثرت کلام کے غوائل سے وہ محفوظ رہتا ہے اور ذکر و فکر و تلاوت و نماز کے لئے اس کو بہت وقت ملتا ہے۔

ایک مفسدہ اختلاط میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس میں نگاہ کی حفاظت نہیں ہوتی معتکف اس سے بھی محفوظ ہے اس کے پاس نا محرم عورت کوئی نہیں آتی اور مسجد میں امارد بھی کم آتے ہیں اور جو آتے ہیں وہ نماز کے بعد بھاگ جاتے ہیں غرضکہ معتکف سے ایسا اختلاط کسی کا نہیں ہوتا جو اس کا وقت ضائع ہو یا دوستی یا دشمنی پیدا ہو اور مزہ یہ ہے کہ معتکف سے نماز کے وقت سب ملنے آتے ہیں یہ کسی سے ملنے نہیں جاتا اور ویسے بھی کسی کو اس سے ملنا ہو تو خود ہی آئے گا۔ یہ کہیں نہیں جاتا تو خوب آزاد رہتا ہے اور اس کی آزادی کی یہ حالت ہوتی ہے سے

نہ بر اشتر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم

نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

(نہ تو اونٹ پر سوار ہوں اور نہ مثل اونٹ زیر بار ہوں میں نہ کسی رعایا کا مالک ہوں نہ کسی بادشاہ کا غلام ہوں)

غرض اعتکاف ایسی عجیب ریاضت ہے کہ خلوت و جلوت دونوں کے منافع اس میں موجود ہیں اور غوائل سے دونوں کے مبرا ہے اس لئے شریعت میں اعتکاف کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے هو (ای المعتکف) یعتکف الذنوب و یجزی لہ من الحسنات کعامل الحسنات کلھا رواہ ابن ماجہ کہ معتکف گناہوں سے الگ رہتا ہے اس پر بظاہر ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص اعتکاف نہ کرے اور ویسے ہی گھر بند کر کے خلوت اختیار کر لے وہ بھی گناہوں سے بچ سکتا ہے پھر اعتکاف کی اس میں کیا خصوصیت ہے اور اگر خصوصیت نہیں تو اس حکم کو بعنوان معتکف بیان کرنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ بقاعدہ بلاغت مسند الیہ مشتق میں مادۂ اشتقاق علت حکم ہوا کرتا ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ کف عن الذنوب کی علت اعتکاف ہے اور یہ مطلب بدون خصوصیت کے صحیح نہیں ہو سکتا جواب یہ ہے کہ گناہوں کے ترک کرنے کی دو قسمیں ہیں اور ہر ایک کا جدا جدا حکم سو ایک ترک تو اصلی ہے یعنی گناہ کا عدم اصلی کے ساتھ منعدم ہوتا اور ایک وہ ترک ہے جو عزم کے ساتھ ہو یعنی ترک کو قصد کے ساتھ متعلق کیا سو اول قسم ہو تو کوئی ثواب

نہیں ملتا اس لئے کہ ثواب اعتقاد قصد پر ہے۔ دوسرے ایسے تروک تو غیر متناہی ہیں۔ تو چاہیئے ہر آن میں غیر متناہی اجر ملا کرے۔ اور اس کا کوئی قائل نہیں اس کا التزام خلاف اجماع ہے اور دوسری قسم پر ثواب ہوتا ہے یعنی کسی معصیت کی طرف التفات ہو اور اس سے اپنے کو روک لیا اس پر ثواب ملتا ہے یہ قاعدہ تو عام ہے اب سمجھو کہ اعتکاف میں یہ تخصیص ہے کہ معتکف کو تمام تروک پر ثواب ملتا ہے گو وہ اس کے ذہن میں بھی نہ ہوں اور اس نے ان کے ترک کا قصد بھی نہ کیا ہو بس یہ خصوصیت ہے اعتکاف میں جو مطلق خلوت میں نہیں جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھوا (ای المعتکف) یعتکف الذنوب اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ویجزی لہ من الحسنات کعامل الحسنات کلھا یعنی جن حسنات پر یہ قادر تھا اور اعتکاف کی وجہ سے نہیں کر سکتا گو اس نے ان کی نیت بھی نہ کی ہو ان سب کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے (اور دلیل اس عموم کی الحسنات کلھا کا عموم ہے) پس جب معتکف کے لئے تمام حسنات کا ثواب لکھا جاتا ہے تو اس سے پہلے جملہ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام گناہوں سے بچنے کا ثواب بھی لکھا جاتا ہے گو اس نے ان سے بچنے کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ اہل اختلاط نے جو عزلت میں یہ خرابی بیان کی تھی کہ اس کی وجہ سے آدمی خدمت خلق کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے اعتکاف اس سے بھی بری ہے کیونکہ اس میں تمام طاعات کا جن پر معتکف قادر تھا مگر اعتکاف کی وجہ سے نہ کر سکا ثواب ملتا ہے پس مطلق خلوت اعتکاف کے برابر نہیں ہے گو گناہوں سے بچنا اس میں بھی ممکن ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اعتکاف میں عبدیت زیادہ ہے کہ لوگ کمانے کھانے اور سیر و تفریح میں مشغول ہیں اور معتکف اپنے آقا کے دروازہ پر پڑا ہے اور زبانِ حال سے یوں کہہ رہا ہے ؎

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما　　شاید کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب الوطن آپ کی گلی میں پڑا ہوا ہے امید کہ اللہ کے لئے ہم غریبوں کی طرف توجہ فرمایئے)

اگر معتکفین اس شعر کے مضمون کو مستحضر رکھیں تو اعتکاف میں ان کو ایک خاص کیفیت حاصل ہوگی بلکہ گاہے گاہے اس شعر کو پڑھ لیا کریں تو اور اچھا ہے۔ غرض شریعت نے جو مجاہدہ بھی تجویز کیا ہے وہ نہایت عجیب ہے کہ منافع مجاہدہ کے اس میں سب مجتمع ہیں بلکہ مع شئے زائد اور غائلہ کچھ نہیں۔ بحمداللہ اب چاروں مجاہدات کا بیان ختم ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ رمضان میں مجاہدات اربعہ کی ایسی عجیب طرز سے رعایت کی گئی ہے کہ کسی صاحب ریاضت نے آجتک ایسی رعایت نہیں کی اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ بقیہ ایام میں ہم کو عمل کی توفیق دیں۔ اور اگر روزہ وذکر وتلاوت قرآن وتراویح وغیرہ میں ہم سے کچھ کوتاہی ہوگئی ہو تو حق تعالیٰ بقیہ ایام میں اس کی تلافی کی ہمت عطا فرمادیں ابھی ایک رات اور باقی ہے جس میں شب قدر کا احتمال ہے کیونکہ شب قدر بعض قول پر رمضان کی تیسویں شب میں بھی ہوتی ہے[ؔ] اور اگر شب قدر نہ بھی ہو تب بھی رمضان کی رات تو ہے اور رمضان کی ہر رات قابل قدر ہے اور اگر چاند بھی ہوجاوے تو شب عید تو ہے جس کے احیاء کو فقہاء نے مستحب فرمایا ہے۔ کما فی الدر المختار۔ بلکہ رمضان اور عید کی کیا خصوصیت ہے رات کو ہر اک ہی قابل قدر ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی
ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

(اے خواجہ شب قدر کی نشانی کیا پوچھتے ہو تم ارے ہر شب شب قدر ہے اگر تو قدر داں ہوتا)

ؔ کما فی النواوی وقیل تختص باوتار العشر وقیل باشفاعہا کما فی حدیث ابی سعید اھ والحدیث رواہ مسلم وفیہ فالتمسوھا من العشر الاواخر من رمضان التمسوھا فی التاسعۃ والسابعۃ والخامسۃ قال قلت یا ابا سعید انکم اعلم بالعدد منا قال اجل نحن احق بذلک منکم قال قلت ما التاسعۃ والسابعۃ والخامسۃ قال اذا مضت واحدۃ وعشرون فالتی تلیہا ثنتین وعشرین وھی التاسعۃ فاذا مضی ثلث وعشرون فالتی تلیہا السابعۃ فاذا مضی خمس وعشرون فالتی تلیہا الخامسۃ الحدیث قلت وکذا اذا مضی سبع وعشرون فالتی تلیہا الثالثۃ اذا مضی تسع وعشرون فالتی تلیہا ھی الاولیٰ فھذہ تسع لیال واللہ اعلم ۱۲ منہ

اس لئے اس رات میں جاگنا چاہیئے اور اگر کسی کو خود جاگنا نہ آتا ہو تو کم از کم جاگنے والوں کے پاس ہی آ پڑے ان کی حالت دیکھ کر چُکھی ہو جائے گی پھر خود بھی جاگنا آسان ہو جائے گا۔ اس لئے مولانا نے اس جماعت کی مجاورت ہی کا مشورہ دیا ہے فرماتے ہیں؎

خواب را بگذار امشب اے پدر
یک شبے در کوئے بے خواباں گذر

(اے پدر خواب کو ایک رات ترک فرمائیے ایک رات کسی بے خواب کی گلی میں جائیے)

جن لوگوں کو تہجد کی عادت نہ ہو وہ چند روز خانقاہ میں آکر رہیں انشاء اللہ بہت بہت جلد عادت ہو جائے گی۔ ایک بات قابل تنبیہ یہ ہے کہ شب قدر میں تمام رات جاگنا لازم نہیں بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ شب قدر میں تمام رات جاگنا ضروری ہے تبھی اسکی فضیلت حاصل ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ شب قدر ایک خاص وقت کا نام ہے جس میں تجلی ہوتی ہے یہ صحیح نہیں بلکہ تمام رات کا ہر حصہ شب قدر ہے چنانچہ قرآن میں ہے ھی حتی مطلع الفجر اور یہ جو حدیث میں آتا ہے من حرمها فقد حرم الخیر کلہ وہ بھی ہماری ہی دلیل ہے کیونکہ محروم ہونا یہ ہے کہ کچھ نہ ملے اور اگر کچھ مل جائے تو وہ محروم نہیں جیسے سائل کو ایک روپیہ یا ایک پیسہ ہی مل جائے تو اس کو محروم نہیں کہہ سکتے۔ پس اگر کوئی شخص تمام رات نہ جاگے۔ بلکہ سحری ہی میں اٹھ کر صبح سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے اس نے بھی شب قدر کی فضیلت حاصل کر لی محروم نہیں ہوا چنانچہ شامی نے امداد سے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے وقیل بساعة منه باب السنن والنوافل اور جو ہمت کر کے زیادہ جاگے بیشک اس کو زیادہ فضیلت حاصل ہو گی لیکن احیاء لیل کے لئے تمام رات جاگنا ضروری نہیں بلکہ بعض کو تو ساری رات جاگنا ممنوع ہے جن کو اس سے اپنے بیمار ہونے کا اندیشہ ہو۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو طالبین جمع ہوتے تھے وہ سب کے سب دو بجے رات کو جاگتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی دو بجے اٹھنا چاہتے تو حاجی صاحب ان سے فرماتے کہ ابھی بہت رات ہے سو رہو۔ بس مولانا صبح کے قریب اٹھتے تھے کیونکہ بوجہ نازک مزاجی کے مولانا کو زیادہ جاگنا مضر تھا

اس لئے حاجی صاحب دو بجے اٹھنے سے ان کو منع فرماتے اور ایسے ہی موقع پر حضرت حاجی صاحب یہ شعر پڑھ دیتے تھے ؎

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہونچے وہاں — گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

یہ شعر حاجی صاحب ہی کا ہے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ زیادہ محنت کرنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ قاعدہ کے ساتھ کام کرنے سے نفع ہوتا ہے ایک شخص دو بجے سے جاگ کر ذکر میں مشغول ہو گیا مگر سر میں درد ہے، کام میں جی نہیں لگتا یا نیند کے جھونکے آرہے ہیں یہ مفید نہیں اس شخص کو تین بجے اٹھنا چاہیئے جب نیند خوب بھر جائے اب جو یہ کام میں لگے گا دماغ تازہ ہوگا توجہ بھی خوب ہوگی اس سے نفع ہوگا۔ شب قدر کے متعلق یہ ضروری مضمون تھا اس لئے بیان کر دیا۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور اس بیان کا نام "تقلیل الاختلاط مع الانام فی صورۃ الاعتکاف فی خیر مقام" تجویز کرتا ہوں اور خیر مقام سے مراد مسجد ہے۔ جیسے یہ وعظ لمبا ہے ایسے ہی اس کا نام بھی لمبا ہو گیا اور مجموعہ مواعظ اربعہ کا نام "ابواب المجاہدہ" رکھتا ہوں۔ چونکہ یہ چاروں وعظ ایک ہی آیت کے متعلق ہیں اور ان میں مضمون بھی ایک ہی بیان ہوا ہے یعنی مجاہدہ کا اس لئے جو صاحب ان کو طبع کریں وہ سب کو یک جا طبع کریں متفرقاً طبع نہ کریں کہ اس سے مضمون میں تشتت ہو جاوے گا۔ اس سے پہلے بھی رمضان کے متعلق چند مواعظ یک جا ہی طبع ہوئے ہیں جن کا لقب ہفت اختر ہے چونکہ یہ وعظ چار ہیں اس لئے ان کا لقب عناصر اربعہ مناسب ہے کیونکہ ان میں مجاہدہ کے چار ارکان بیان ہوئے ہیں اور لغت میں ارکان و عناصر ہم معنے ہیں۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی توفیق دے آمین

وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

والحمد للہ الذی بنعمتہ وجلالہ تتم الصالحات

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

طریق القلندر

تحریق السمندر

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ـــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی

ضروری اطلاع :۔ خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کرتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

طریق القلندر — تحریق السمندر

این	متٰی	کم	کیف	لم	ماذا	من زی شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	[illegible]	کس نے ضبط کیا	سامعین کتنے تھے	متفرقات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	احقر عزیز الحسن نہایت محجوب ہے کہ تقریباً ۱۴ سال کے بعد احقر چار ماہ کی رخصت لیکر حاضر خانقاہ یہ وعظ بہ فیض حضرت اقدس صاف ہو کر قابل شائع ہوسکا۔ اس سے قبل اتنی طویل فرصت میسر ہی نہ آئی اس وعظ کا احباب کو بیحد اشتیاق اور اصرار تھا۔ الحمدللہ کہ وہ پورا ہوا یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ وعظ صرف اپنی حقیقت ہی ؎

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور

؎ کے لحاظ سے قلندرانہ شان نہیں رکھتا بلکہ جس ہیئت سے بیان کیا گیا جس کیفیت سے سنا گیا اور جس صورت سے صاف ہوا وہ بھی قلندرانہ تھی چنانچہ صاف ہونے کی تو یہ صورت ہوئی کہ چودہ برس میں طویل وقفات کے بعد اس کی تکمیل ہوئی اور بیان کے وقت حضرت واعظ کی ہیئت تھی کہ ایک سادہ دیہاتی لٹھ سر سے اونچا ہاتھ میں (کیونکہ عین وقت پر کوئی ہلکا عصا نہ مل سکا) کمر بند گھٹنوں سے نیچا لٹکا ہوا عمامہ کے پیچ ادھر اُدھر ڈھلے ہوئے اچکن کے بٹن اور بند کھلے ہوئے لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ اس وارستہ حالی میں بھی حضرت پر ایک عجب شان دلربائی برس رہی تھی اور ہزار حسن اس ادا پر قربان ہو رہے تھے بس اس شعر کا پورا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا ؎ قبا وا کردہ و کاکل پریشاں کج کلہ آیند ببیں ایں بے سر و ساماں چہ ساماں کردہ می آید۔ سامعین کی یہ کیفیت تھی کہ گویا کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ ہو رہا تھا ع قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جب قریب اختتام حضرت نے یہ فرمایا کہ میں اب صرف پانچ منٹ اور بیان کروں گا تو بزبان حال یہ کہہ رہے تھے (بقول شخصے) ؎ دلربا پہلو سے اُٹھ کر اب جدا ہونے کو ہے ٭ کیا غضب ہے کیا قیامت ہے یہ کیا ہونے کو ہے۔ ؎ آج تو جی بھر کے پی لینے دے اے ساقی مجھے ٭ جان ہی جاتی رہے گی اور کیا ہونے کو ہے۔ اور بوقت رخصت یہ ؎ کہتے جاؤ آرزو پوری کسی مشتاق کی ٭ ایک ذرا ٹھیرو کوئی تم پر فدا ہونے کو ہے ٭ شوخ رفتاری کا اپنی دیکھ تو مڑ کر اثر ٭ ساتھ ساتھ اٹھ کر رواں ہر نقش پا ہونے کو ہے صوفیوں پر تو وجد کی کیفیت طاری تھی۔ اللہ تعالیٰ حضرت واعظ کو مدت مدید تک بعافیت تمام سلامت باکرامت رکھے اور ممدوح کے فیوض و برکات کو تا قیامت جاری رکھے ویرحم اللہ عبداً قال آمینا ؎۳ آخر میں عرض ہے کہ واللہ یہ محض حضرت کی دعا کی توجہ کی برکت ہے کہ اس قدر دشوار کام مجھ جیسے سہل انگار و لا ابالی شخص سے لے لیا گیا جس کو چودہ برس تک میں نہ کرسکا یہ زمانہ رخصت بھی یوں ہی ختم ہوگیا تھا صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا جبکہ حضرت کو خاص توجہ ہوئی پھر تو یہ حال تھا کہ دن رات ایک کردیئے اور الحمدللہ کہ خانقاہ کو چھوڑنے سے صرف دو دن قبل وعظ ختم ہوگیا اور آج یہ تمہید بھی ختم ہوئی اور کل یہاں سے بصد حسرت و یاس روانہ ہو جاؤں گا ؎

دیکھ لیں سب قوت بازوئے دوست ٭ مجھ سے سرکش پر ہوا قابو دوست۔ (والسلام جمعہ ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ)

؎ اس ترکیب ایمائی میں مقصود تشبیہ دینا ہے طریق کو یعنی عشق کو نار کے ساتھ وہ قلندر کو یعنی عاشق کو سمندر کے ساتھ کہ آتشی جانور ہے اور نار اس کی غذا ہے اسی طرح عشق غذا عاشق کی ہے ۱۲

انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلےٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا من یرتد منکم عن دینہٖ فسوف یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ط ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ ۝ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغَالِبُوْنَ ۝

(ترجمہ) اے ایمان والو جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم پیدا کر دے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہو گی اور اللہ تعالیٰ سے ان کو محبت ہو گی۔ مہربان ہوں گے وہ مسلمانوں پر تیز ہوں گے کافروں پر جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال نہ کریں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہیں عطا فرما دیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں بڑے علم والے ہیں تمہارے دوست تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان دار لوگ ہیں جو کہ اس حالت سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں کہ ان میں خشوع ہوتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے دوستی رکھتا ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ایمان دار لوگوں سے سو اللہ کا گروہ بلاشک غالب ہے۔

جن آیتوں کی میں نے تلاوت کی ہے ان میں ہر چند کہ مضامین متعدد ہیں مگر باوجود تعدد کے غیر مربوط نہیں بلکہ ان مضامین میں باہم ارتباط ہے اور ارتباط بھی ایسا کہ تابعیت اور متبوعیت یا اصالت اور غیریت کا کیا معنی کہ ان میں بعض اجزا اصل ہیں اور بعض فروع و

توابع یا یوں کہئے کہ بعض مقصود ہیں اور بعض متمم اور مکمل یا یوں کہئے کہ بعض مقصود ہیں اور بعض علامات و آثار بہرحال جس عنوان سے چاہے تعبیر کیجئے حاصل یہ ہے کہ بعض مضامین اصل ہیں اور بعض تابع اب اس اصل کو جس لفظ سے چاہے تعبیر کر دیا جاوے اور تابع کو جس لفظ سے چاہے تعبیر کر دیا جاوے لیکن یہ خوب سمجھ لیا جاوے کہ تابع کے یہ معنی نہیں کہ وہ مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ بھی ہیں مگر مقصود مقصود ہیں فرق ہوتا ہے یعنی ایک تو مقصود ہوتا ہے من کل الوجوہ اور ایک مقصود ہوتا ہے من بعض الوجوہ گو لزوم وجوب دونوں میں مشترک ہوتا ہے مثلاً جیسے نماز اور وضو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نماز اصل ہے اور وضو تابع اور اس کی شرط ہے مگر باوجود اس کے یہ نہیں ہے کہ وضو کسی درجہ میں بھی مقصود نہیں یعنی اس معنی کر غیر مقصود نہیں ہے کہ بلا وضو بھی نماز کو جائز سمجھا جاوے بلکہ دونوں میں عجیب تعلق ہے کہ وضو تو بلا نماز کے صحیح ہے لیکن نماز بلا وضو کے صحیح نہیں یعنی یہ تو ہے کہ بدون وضو کے نماز درست نہیں لیکن اس کا عکس نہیں ہے مثلاً اگر کوئی وضو تو کر لے مگر نماز نہ پڑھے یعنی جس نماز کے لئے وضو کیا ہے اس نماز کے وقت کے اندر اس وضو سے اس نماز کو ادا نہ کرے تب بھی جب دوسرا وقت نماز کا آئے گا تو کسی مفتی کا فتویٰ نہیں کہ اس دوسری نماز کے لئے پھر وضو کرنے کی ضرورت ہے بلکہ وہی وضو کافی ہوگا دوسری نماز کے لئے اداءً اور پہلی نماز کے لئے قضاءً غرض وضو بلا نماز صحیح ہو سکتا ہے لیکن نماز بلا وضو صحیح نہیں ہو سکتی یہ مثال اور اس مثال کے اندر یہ خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے تاکہ اجمالاً ایک غلطی معلوم ہو جاوے جو بعض لوگ اعمال کے اندر کرتے ہیں کہ مقاصد غیر مقاصد کے اندر تفصیل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اعمال غیر مقصود کا حذف بھی جائز ہے یعنی آجکل یہ بہت زبان زد ہے کہ مقصود تو حق تعالیٰ کی یاد ہے اور نماز روزہ وغیرہ محض اس کے ذرائع ہیں اور غیر مقصود ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں بہت لوگوں نے یہ مشرب اختیار کر رکھا ہے۔ اس مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نماز روزہ وغیرہ کا غیر مقصود ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ وضو کا کہ گو غیر مقصود ہے لیکن کیا اس کو جائز الحذف

یا جائز الترک کہہ سکتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ غیر مقصود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مقصود کے برابر نہیں اور غیر مقصود بھی محض اس درجہ میں ہے کہ نماز کا رکن اور اس میں داخل نہیں کیونکہ شرط ہمیشہ مشروط سے خارج ہوا کرتی ہے مگر بوجہ شرط ہونے کے مقصود کی تکمیل و متمم ہونے کے درجہ میں یہ بھی مقصود ہے۔ بہرحال مقصود کے درجات ہوا کرتے ہیں خوب سمجھ لیجئے۔ میرے الفاظ مقصود و غیر مقصود سے شبہ ہوسکتا تھا اس کو رفع کرنا ضروری تھا چنانچہ اس مثال سے اس کو رفع کر دیا گیا بلکہ اس طرح کہا جاوے تو اور زیادہ واضح ہے کہ مقصود تو سب اعمال ہیں لیکن بعض مقصود ہیں اور بعض مقصود المقصود و مقصود اعظم ہیں۔ بہرحال وہ شبہ حذف ہو گیا اب بعد حذف شبہ کے میں پھر عود کرتا ہوں اپنی تقریر کی طرف یعنی جتنے اجزاء ان آیتوں میں ہیں وہ ہیں تو سب کے سب مقصود لیکن ان میں جو مضمون مقصود اعظم ہے اس کو اس وقت بیان کرنے کے لئے میں نے تجویز کیا ہے کیونکہ وہ مضمون از روئے قواعد شرعیہ کے نیز باعتبار اپنی نوع کے اصل ہے باقی مضامین اُسی کے متمم اور توابع اور لاحق ہیں یہ حاصل ہے اس مضمون کا۔ اس مضمون کا حاصل مفصل تو ان آیتوں میں ہے جو عنقریب بیان میں ان شاء اللہ تعالیٰ آنے والا ہے اور مجمل حاصل ایک اور بھی ہے کہ جو حضرت عراقی کے ایک شعر میں ایک دوسرے عنوان سے مذکور ہے جس کے متعلق ایک دوست نے مجھے مشورہ بھی دیا کہ اس شعر کا مضمون آج بیان کیا جاوے۔ وہ شعر حضرت عراقی کا یہ ہے ؎

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی — کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(میرے مرشد مجھے تو طریق جذب کا رستہ دکھلا دے۔ کیونکہ ریاضت و محنت کا راستہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے)

اس وقت اس فرمائش کو میں نے قبول نہیں کیا تھا مگر رد بھی نہیں کیا تھا وجہ یہ ہے کہ بیان بالکل اختیار میں نہیں نہ پہلے سے کوئی مضمون تجویز کیا جاتا ہے۔ عادت اللہ ہر ایک کے ساتھ جدا ہے اکثر اور غالب معاملہ اپنے ساتھ یہی دیکھا جاتا ہے کہ عین وقت پر

یا قریب کوئی مضمون خود تقاضا کرتا ہے قلب میں۔ بس اسی کا اتباع کیا جاتا ہے اور اسی کو بیان کر دیا جاتا ہے جس عنوان سے بھی میسر ہوا۔ تو اس وقت گو اس فرمائش کو قبول نہیں کیا گیا لیکن رد کی بھی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ ذہن خالی تھا۔ مگر وقت کے قریب اسی مضمون کا تقاضا قلب میں پیدا ہوا میں نکتہ اس وقت یہ سمجھا تھا کہ چونکہ یہ بیان ایک بزرگ کے مزار کے قریب ہے جو بزرگ اسی لقب کے ساتھ مشہور ہیں (یعنی حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندر قدس سرہٗ العزیز ۱۲ جامع) اس لئے یہ فرمائش کی گئی ہے۔ غرض میں یہ سمجھا تھا کہ محض شاعری نکتہ ہے اسی واسطے قلب نے اُس فرمائش کو قبول نہیں کیا لیکن بعد اُس کے اس کی ضرورت بھی معلوم ہوئی۔ وہ ضرورت یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر تو وہ ہیں کہ جنھیں اعمال کی طرف توجہ ہی نہیں۔ بہت سے ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ نہ نماز نہ روزہ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ نماز روزہ کے ساتھ تمسخر بھی ہے۔ اور استہزار بھی ہے کوئی تہذیب کے ساتھ استہزار کرتا ہے کوئی بدتہذیبی کے ساتھ تو فقط ترک ہی نہیں بلکہ استہزار اور استخفاف بھی ہے۔ اور اگر خیر استہزا اور استخفاف نہ بھی ہو تو اخلال اور سستی اور کسل تو ضرور ہے استطاعت ہے اعمال کی مگر نہیں کرتے نماز روزہ کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔ بدنگاہی سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ غیبت سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ پرائے حقوق سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ سب وستم۔ لڑائی جھگڑا۔ مکروفریب ان سب سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے۔ کثرت سے تو ہم لوگوں کی یہی حالت ہے کہ گویا اعمال ہیں ہی نہیں بلکہ بجائے ان کے دوسرے اعمال ہیں یعنی معاصی میں مبتلا ہیں۔ اور زیادہ ایسے ہی ہیں مگر اس کے ساتھ ان لوگوں کو اپنے اعمال وطاعات کا دعوے بھی نہیں اس لئے یہ لوگ اتنے زیادہ قابل شکایت نہیں جتنے قابل شکایت وہ لوگ ہیں کہ ان کے یہاں اعمال بھی ہیں تقویٰ بھی طہارت بھی اور اپنے کو عابد وزاہد بھی سمجھتے ہیں مگر ان اعمال میں روح نہ ہونے سے وہ اعمال ایسے ہیں جیسے بادام بلا مغز۔ یا دودھ بلا روغن۔ ان کے حال پر زیادہ تاسف ہے اور وہ زیادہ قابل رحم ہیں۔ دودھ سے

ایک تو یہ کہ بیچاروں نے محنت بھی کی مشقت بھی اٹھائی مجاہدے بھی کئے مگر افسوس پھر بھی مقصود حاصل نہ ہوا۔ سارے دن چلے دھوپ سہی، خاک پھانکی پیروں میں آبلے پڑے مگر منزل پھر بھی نہ قطع ہوئی مجھے یاد ہے کہ میرے ایک عزیز نے رات کو سفر کا قصد کیا۔ سواروں میں نوکر تھے رخصت قریب ختم تھی۔ ملازمت پر واپس جارہے تھے۔ بھتیجے نے کہا بھی کہ اندھیری رات ہے اس وقت نہ جایئے پریشان ہوجیئے گا۔ لیکن نہیں مانا۔ کہا تم بچہ ہو۔ کیا سمجھو نوکری کا معاملہ ہے رضا ختم ہوگئی ہے میں کیسے رک سکتا ہوں۔ بھتیجہ نے کہا بہت اچھا جایئے مگر پریشان ہوجیئے گا۔ خیر صاحب چلے وہاں سے۔ رات ایسی اندھیری کہ چل تو رہے مگر کچھ پتہ نہیں کہ کدھر جارہے ہیں۔ دو چار میل تو خیر ٹھیک چلے کیونکہ اپنے گاؤں سے اتنی دور تک تو راستہ ہر شخص کو معلوم رہتا ہی ہے بلے دیکھے بھی آدمی جاسکتا ہے مگر آگے چل کر خدا معلوم رُخ کس طرف کو ہوگیا کہ راستہ بھولے اور ایسے بھولے کہ بھولنے کو بھی بھول گئے۔ اور بھولنا تو وہی ہے کہ بھولنے کو بھی بھول جاوے، چنانچہ رستہ بھول کر خدا جانے کہاں کے کہاں پہونچے۔ اور بالآخر خدا جانے کیسا چکر کھایا کہ پھر اسی رستے کو ہولئے جس سے روانہ ہوئے تھے، اب وہ تو سمجھ رہے ہیں کہ ہم آگے کو چل رہے ہیں اور حقیقت میں ہٹ رہے ہیں پیچھے۔ غرض ساری رات گھوم گھام کر صبح کو لوٹ کر پھر وطن شریف ہی میں آپہونچے۔ صبح صادق کا وقت تھا ان کے مکان کے قریب جامع مسجد ہے جو بہت کرسی دار ہے۔ اور اس کے فنا میں ایک برگد کا درخت ہے۔ جامع مسجد کو دیکھ کر کہا اخّاہ یہ کونسا گاؤں ہے جس کی مسجد بھی ایسی ہی ہے جیسی ہمارے گاؤں کی پھر برگد ملا، کہا ارے میاں یہ تو درخت بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارے گاؤں کا، یہ گانوں تو ہمارے وطن کا مذکر ہے۔ بھائی یہ گانوں تو بہت اچھا ہے۔ آگے بڑھے تو اپنا سا مکان بھی معلوم ہوا۔ اب سمجھ میں آیا کہ کیا قصہ ہے بھتیجے صاحب مکان سے نکل کر نماز کو جارہے تھے۔ انھوں نے کہا اسلام علیکم کہا کون۔ فلانے۔ کہا ہاں۔ کہا میاں یہ تو بتاؤ میں ہوں کہاں۔ کہا وہیں ہو

جہاں میں ہوں اور کہاں ہوتے۔ کہا ارے میاں میں تو رات بھر چلتا رہا اور پھر گھر کے گھر ہی میں رکھے ہوئے لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو بڑی واہیات بات ہوئی بھتیجے نے کہا میں نے آپ سے کہا نہ تھا لیکن آپ نے مانا ہی نہیں تو بڑا افسوس ہے ایسے مسافر پہ جو ساری رات تو سفر کرے اور صبح کو پھر وہیں آجاوے جہاں سے چلا تھا۔ تھکا بھی ماندہ بھی ہوا۔ وقت بھی صرف ہوا پھر بھی وہیں کا وہیں جہاں پہلے تھا خیر یہاں یہ بات تو نہیں ہے کہ یہ شخص بالکل مشابہ ہے اس مسافر کے۔ یہاں راستہ کچھ نہ کچھ قطع تو ہوتا ہے لیکن بالکل ناتمام یعنی ایسے جیسے چھکڑے کی چال کہ صبح سے شام تک تو چلا اور کتنا آیا۔ دس میل۔ اور ایک ریل ہے کہ اتنے میں دو سو میل نکل گئی۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ ریل اور چھکڑے کی رفتار میں جو اس قدر تفاوت ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔ ریل میں آخر وہ چیز کیا ہے جس نے اس کی رفتار کو اس درجہ تک پہنچا دیا ہے سبب اس تفاوت رفتار کا یہی ہے کہ ریل میں مشین لگی ہوئی ہے اُسی نے اس کو ہوا بنا رکھا ہے۔ اگر چھکڑے میں بھی ویسی ہی مشین لگا دیں تو اس میں بھی وہی بات پیدا ہو جاوے گی بالخصوص جبکہ اس میں مشین لگانا ممکن بھی ہو اور سہل بھی ہو تو حسرت ہے اس شخص پر جو پھر بھی مشین نہ لگائے پھر ایسے لوگوں میں بھی بعض تو وہ ہیں جو متقی پرہیزگار ہیں اور بعضے ایسے ہیں جو محض ریاکار ہیں جس میں ریا اور نمائش ہے اس کی تو بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے اس مسافر کی۔ اور بعینہٖ وہی حالت ہے کیونکہ ریا حابط عمل ہے گو فرض تو سر سے اتر جاتا ہے لیکن مقبول نہیں ہوتا اور مقصود مقبولیت ہی ہے جب مقبول ہی نہ ہوا تو وہ پھر عمل ہی کیا ہوا وہ تو لاشئی محض ہوا اس کی تو وہ پہلی ہی مثال ہے چنانچہ جو لوگ محض نمائش کے لئے عمل کرتے ہیں یعنی فقط اس واسطے کہ لوگ کہیں کہ صاحب یہ بڑے عمل کرنے والے ہیں۔ ان کی بابت حدیث شریف میں وارد ہے۔

فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ قیامت میں سب سے اول ایک

ایسے شخص کو لایا جاوے گا جو شہید ہوا ہوگا اللہ کے راستہ میں اس کو بتلایا جاوے گا کہ ہم نے تم کو یہ نعمتیں دی تھیں وہ ان سب نعمتوں کا اقرار کرے گا پھر اس سے پوچھا جاوے گا کہ ہم نے تو تم کو یہ یہ نعمتیں دیں اور تم نے اس میں عمل کیا کیا وہ عرض کریگا کہ میں نے آپ کی راہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ اپنی جان دیدی۔ ارشاد ہوگا کہ تم جھوٹے ہو، ہم کو خوش کرنے کے لیے جان نہیں دی بل لیقال انك جری بلکہ اس لئے جان دی کہ سب میں یہ شہرت ہو جائے کہ بڑے بہادر تھے فقد قیل تو تمہاری تعریف اور شہرت ہو چکی۔ جو تمہارا مطلب تھا وہ دنیا ہی میں تم کو حاصل ہو چکا دوم تمہارا مدعا پورا ہو گیا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو منہ کے بل جہنم میں پھینکدیا جاوے پھر بلایا جائیگا ایک بڑے عالم کو اسی طرح اس سے پوچھا جاوے گا کہ کہئے صاحب آپ نے کیا کیا وہ کہے گا میں نے یوں وعظ کہے یوں نصیحتیں کیں یوں لوگوں کو ہدیت کی اور یوں علم سکھایا ارشاد ہوگا یہ ہمارے واسطے نہیں کیا بل لیقال انك قاری بلکہ اس واسطے کہ لوگوں میں مشہور ہو کہ بڑے عالم ہیں بس تو آپ بھی وہیں تشریف لے جائیے جہاں آپ کے بھائی صاحب گئے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے یہ آیا ہے حدیث میں کہ اس کو بھی منہ کے بل جہنم میں پھینکدیا جاوے گا۔ پھر ایک سخی صاحب لائے جاویں گے ان سے بھی یہی سوال کیا جاوے گا۔ وہ کہے گا کہ میں نے بہت مال و دولت اللہ کے راستہ میں خرچ کیا تھا' ارشاد ہوگا کہ اس واسطے نہیں کیا کہ ہم راضی ہوں بل لیقال انك جواد بلکہ اس واسطے کہ لوگ کہیں کہ بڑے سخی ہیں، ان کی داد و دہش کا کیا کہنا ہے بس سارے شہر میں وہی تو ایک سخی ہیں اگر کوئی اور بھی سخی ہوگا تو فلانے کے برابر نہیں ہوگا۔ فقد قیل جو تمہارا مقصد تھا وہ حاصل ہو چکا لہذا تم بھی وہیں جاؤ جہاں تمہارے دو بھائی جا چکے ہیں چنانچہ اس کو بھی جہنم میں منہ کے بل پھینکدیا جاوے گا۔ تو حضرت یہ تین عمل کتنے بڑے بڑے ہیں۔ علم دین۔ سخاوت۔ شہادت اب ان سے بڑھ کر اور کون عمل ہوگا، لیکن دیکھ لیجئے ریا کی بدولت ان کی کیا گت بنی ہے وجہ یہ کہ

اس شخص کا عمل صرف صورت عمل ہے حقیقتاً عمل ہی نہیں اور واقعی جو لوگ محض ریاکار ہیں ان کا تو وہی حال ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پُر حلل — واندروں قہر خدائے عز و جل

(باہر سے تو کافر کی قبر کی طرح آراستہ ہے۔ اور قبر کے اندر خدا کا قہر و غضب ہے)

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — واز درونت ننگ می دارد یزید

(ظاہر میں تو تو بایزید بسطامی پر طعنہ زنی کرتا ہے۔ اور تیری اندرونی حالت سے یزید بھی شرماتا ہے)

ان بزرگوں کی تو یہ حالت ہوئی اور بعض وہ لوگ ہیں جن کے عمل ریا سے تو نہیں ہیں خلوص کے ساتھ ہیں مگر ناتمام اور غیر مکمل گویا جسد بلا روح ہیں خیر وہ کچھ ہیں تو سہی مگر ایسے ہی ہیں جیسے چھکڑے کی رفتار بمقابلہ ریل کے تو اگر کوئی نادان ایسا ہو کہ اس کو ریل عطا کی گئی ہو جس میں انجن بھی ہے اور سامان آگ کا بھی موجود ہے مگر صرف آگ ڈالنے اور مشین چلانے کی کسر ہے۔ اگر اس میں آگ چھوڑ دی اور بھاپ پیدا کر دی تو پھر وہ ریل ہے کہ صبح سے شام تک دو سو تین سو میل نکل گئی بلکہ زیادہ نہیں تو بس ایک ٹھیلہ ہے تو انجن بھی موجود آگ کا سامان بھی موجود لیکن بیوقوف ڈرائیور ہے کہ اس کو ٹھیلتا ہے ٹھیلنے کے لئے اول تو نیچے اترنا پڑتا ہے پھر بہت کچھ زور بھی لگانا پڑتا ہے گو اس طرح ٹھیلنے سے بھی وہ چلتی ہے کیونکہ آخر لوہے کی سڑک پر ہے، مگر کتنی صبح سے شام تک دو تین چار میل بس اور جہاں چھوڑ دیا بس کھڑی ہو گئی اگر فوراً نہیں تو کچھ دور اور چل کر سہی۔ غرض ٹھیلنے سے دن بھر میں دو چار میل چل سکتی ہے اور بہت سے بہت دس میل اگر اگر کوئی بہت ہی قوی ہوا اور برابر چلا گیا دھکیلتا ہوا تو اس شخص مذکور کی حالت اس کے مشابہ ہے اور یہ حالت بھی قابل افسوس ہے، ہم نے بہت لوگ ایسے دیکھے ہیں۔ کہ تقویٰ بھی طہارت بھی ظاہری حالت بھی درست۔ ڈاڑھی بھی نیچی۔ پائجامے بھی ٹھیک۔ نماز بھی۔ روزہ بھی۔ یہ سب کچھ مگر ساتھ ہی اس کے روح جس کو میں آگے بیان کروں گا وہ نہیں۔ غرض ہر عمل بے روح ہے یعنی کم جان ہے گو بالکل بے جان نہیں اس کی رفتار

ایسی ہی سست ہے جیسی ٹھیلہ کی۔ حق سبحانہ تعالیٰ اجل جلالہ وعم نوالہ نے ایک انجن گاڑی اس شخص کو دی جس کی کلیں بھی بہت اچھی اچھی ہیں بھاپ بنانے کے لئے سب سامان بھی دیا کوئلہ بھی۔ پانی بھی' دیاسلائی بھی۔ مگر آگ سلگائے کون اور بھاپ بنائے کون اس کی بلاستی کی وجہ سے ہاتھ پاؤں کو اتنی حرکت دینا بھی گراں ہو رہا ہے تو یہاں کسر کاہے کی ہے۔ صرف بھاپ کی اور آگ سلگانے کی۔ چونکہ بھاپ نہیں ہے اس لئے رفتار تیز نہیں ہے اس وقت اسی بھاپ کو ذکر کیا جارہا ہے اور یہی مراد ہے میری روح سے اور بھاپ نہ تو موجود ہے نہ اس کی فکر و کوشش ہے۔ اسی کو حضرت عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر میں ذکر کیا ہے اشارۃً ؎

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی کہ دراز دور دیدم رہ ورسم پارسائی

(اے مرشد مجھ کو تو قلندری کا رستہ بتلا دیجئے۔ کیونکہ پارسائی کا رستہ تو بہت دور دراز ہے)

تو یہ ضرورت میری سمجھ میں آئی اس مضمون کی اور اس لئے یہ مضمون باوقعت معلوم ہوا کہ اس میں ایک بڑی کوتاہی کی تکمیل ہے اور اسی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا اور اس ضروری چیز کی شرح اور تعیین میں آگے چل کر کر دوں گا مگر اجمالاً حضرت عراقی کے اس شعر سے سمجھ میں آجاوے گی اصل تو یہ وجہ ہے اس شعر کے مضمون کو اختیار کرنے کی باقی اس میں وہ شاعری نکتہ بھی ہے جس کی بناء پر میرے دوست نے مجھے مشورہ دیا تھا یعنی مقام بیان میں اس لقب کے ایک بزرگ کا مزار ہونا مگر ممکن ہے ان کا ذہن بھی اس مضمون کی ضرورت کی طرف ہو گیا ہو۔ بہرحال دو نکتے جمع ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ فی نفسہ بھی یہ مضمون ضروری ہے' دوسرے خصوصیت مقام سے اس استحسان اور بڑھ جاتا کیونکہ جس مقام پر یہ بیان ہو رہا ہے وہاں ایک ایسے بزرگ کا مزار مبارک ہے جو اس لقب قلندری کے ساتھ مشہور ہیں نیز ایک برکت کی بھی ان شاء اللہ تعالیٰ توقع ہے۔ پھر چونکہ یہ وعظ ایک بزرگ کے ساتھ نامزد ہے اس لئے بھی امید اس مضمون کے نافع ہونے کی ہے مگر یہ سب درجہ تائید و تزئین میں یہ نکتے درجۂ مقصودیت میں نہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ مجھے اس وقت اس طریق کو بیان کرنا ہے جس کے متعلق ہم میں کمی ہو رہی ہے اور جس کی

طرف اب ہمارا التفات نہیں رہا اس وجہ سے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے تو حق سبحانہٗ تعالےٰ نے جو مضمون اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے وہ اس طریق کی تفصیل ہے البتہ قرآن میں یہ اصطلاح نہیں ہے اور یہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو اصطلاح چاہے مقرر کرلے تعبیر کرنے والے کو اختیار ہے جس اصطلاح میں چاہے کسی مضمون کو تعبیر کرے گو اس آیت میں یہ اصطلاح نہیں ہے لیکن یہ مضمون ہے وہی چنانچہ تفصیل سے معلوم ہوجاوے گا لیکن اس کے قبل ممکن ہے کہ کسی کو اس شعر کے متعلق ایک شبہ ہو اس کو رفع کئے دیتا ہوں وہ شبہ یہ ہے کہ حضرات عراقی نے اس شعر میں رہ قلندر اور رہ پارسائی کو متقابل فرمایا ہے فرماتے ہیں ؏ صنما رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی (اے مرشد مجھکو قلندر کا رستہ بتلادیجئے)

؏ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی + کیونکہ رستہ پارسائی کا تو بہت دور دراز ہے۔

یہ ترجمہ ہے اس شعر کا اس سے شبہ ہوسکتا ہے کہ قلندر کا رستہ پارسائی کے رستے کے مقابل ہے تو گویا اس طریق قلندری میں پارسائی نہ ہوتی ہوگی یعنی آدمی بالکل آزاد اور رند بے قید ہوجاتا ہوگا اسی ڈاڑھی رکھنی بھی ضروری نہ رہتی ہوگی اس پر نماز بھی فرض نہ رہتی ہوگی۔ شراب بھی اُسے حلال ہوجاتی ہوگی۔ غرض حلال حرام کی بالکل تمیز نہ رہتی ہوگی شاید طریق قلندری کا خلاصہ ذہنوں میں یہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ بچاوے ایسے طریق سے غرض کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے اس شعر کے مضمون سے اس کو پہلے رفع کئے دیتا ہوں کیونکہ اس کا رفع کرنا فی نفسہ بھی ضروری ہے نیز اس کی اس بیان میں بھی ضرورت ہوگی جو مجھے اس وقت کرنا ہے اور یہ اس بیان میں معین بھی ہوگا۔ اب یہاں ضرورت ہے تھوڑے سے علم درسی کی مگر خیر میں حتی الامکان آسانی سے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ غیر اہل علم بھی بقدر ضرورت سمجھ سکیں۔

تقریر اس کی یہ ہے کہ عراقی کے شعر میں جو طریق قلندری و طریق پارسائی میں تقابل واقع ہوا ہے وہ ظاہر سیاق سے تباین پر ضرور دال ہے جس کے لئے عدم تصادق لازم ہے لیکن تباین و عدم تصادق کے لئے تنافی و عدم اجتماع ضروری نہیں دیکھئے کل میں اور اس کے اجزاء خارجیہ میں تباین و عدم تصادق متحقق ہے لیکن تنافی نہیں۔

اور اجتماع ہوتا ہے جیسے بیت کے لئے جدار اور سقف اجزاء خارجیہ ہیں جن میں باہم تصادق نہیں بلکہ تقابل ہے لیکن ایک کُل ہے اور دوسرا جزو اور دلائل سے ثابت ہے جس کا کافی بیان اس وعظ میں بھی ہے کہ طریق قلندر کے دو جزو ہیں ایک عمل جو حقیقت ہے طریق پارسائی کی اور دوسرا محبت اور طریق قلندر نام ہے ان دونوں کے مجموعہ کا اور چونکہ یہ اجزاء خارجیہ ہیں ان میں تصادق تو نہیں مگر کلیت وجزئیت کا تعلق ہے پس طریق قلندر کل ہوا اور طریق پارسائی اس کا ایک جزو ہوا اور جزء کے انتفاء سے کل کا انتفاء لازم ہے پس طریق پارسائی جہاں منتفی ہوگا وہاں طریق قلندری بھی منتفی ہو جاویگا سو حاصل شعر کا یہ ہوا کہ محض طریق پارسائی کافی نہیں جو کہ ایک جزو ہے طریق قلندری کا بلکہ طریق قلندری مطلوب ہے جس میں دونوں جزو جمع ہیں۔ طریق پارسائی بھی اور طریق محبت بھی۔ پس اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ باقی اب یہ دوسری تحقیق ہے کہ ان دونوں میں اصل کون ہے محبت یا اعمال اس کا فیصلہ بھی ہوا جاتا ہے ان شاء اللہ تعالےٰ یہاں اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ طریق قلندر وہ طریق ہے جو مرکب ہو محبت اور اعمال دونوں سے آگے ایک اصطلاحوں کا فرق ہے جو اصطلاح متقدمین میں پائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے وہ قلندر میں یہ بھی قید ہے کہ جس میں اعمال کی تقلیل ہو یعنی اعمال ظاہرہ مستحبہ کی کیا معنی کہ بہت نفلیں اور وظائف نہ ہوں بلکہ محبت کی خاص رعایت ہو یعنی تفکر اور مراقبہ زیادہ ہو۔ ایک تو یہ اصطلاح ہے اور ایک اصطلاح اور ہے یعنی خواہ ان اعمال کی تکثیر بھی ہو مگر غلبہ آزادی کو ہو لیکن آزادی خلق سے نہ کہ خالق سے کیا معنی کہ قلندر کو دنیا کی وضع اور رسوم کی پروا نہیں نہ مصالح پر نظر ہوتی ہے مثلاً ہم یہ بھی نظر کرتے ہیں کہ بھائی ایسا نہ کہو کوئی کیا کہیگا اور مثلاً ہم لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ فلانے کو کچھ کہو مت۔ بُرا مانے گا۔ وحشت ہوگی بھائی مگر بشرطیکہ ان رعایتوں کا شریعت سے اذن بھی ہو اور قلندر کو اس کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ کوئی بُرا مانے گا یا بھلا مانے گا اس کا دل صاف اور سادہ ہوتا ہے۔

غرض وہ آزاد ہوتا ہے مصالح سے اس کی مصلحت صرف ایک ہوتی ہے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار — بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(مصلحت دید میری یہ ہے کہ تمام دوست دنیا کو چھوڑ دیں اور صرف یار کی زلف کو پکڑ لیں)

اس کی بڑی مصلحت یہی ہوتی ہے کہ ایک کو لیکر سب کو ترک کردو اس کی تو بس یہ حالت ہوتی ہے۔

دل آرامے کہ داری دل دروبند　　　دگر چشم از ہمہ عالم فروبند

(اے دل جس کو تو دوست رکھتا ہے اسی میں دل لگا۔ اور تمام جہاں سے آنکھیں بند کرلے)

اور اس کا یہ مشرب ہوتا ہے ؎

ہمہ شہر پُرز خوباں منم و خیال ماہے　　　چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

(تمام شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند ہی کے خیال میں محو ہوں۔ کیا کروں میں یہ کاش کہ بدخو کی نظر کسی پر بھی نہ پڑتی)

سوائے محبوب کے کسی پر اس کی نظر ہی نہیں پڑتی بجز ایک کے سارے جہان کو انھوں نے ہیچ اور فنا کر دیا ہے جب انھوں نے اپنے ہی کو ہیچ اور فنا کر دیا تو پھر دوسرے پر کیا نظر کریں، کہتے ہیں ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا　　　اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

جب اپنی ہی ہستی مٹادی تو دوسروں کی ہستی کی انھیں کیا پروا مشہور ہے کہ جب اپنی ہی ٹوپی اتار دی تو پھر دوسروں کی ٹوپی کی کیا پروا۔ جب وہ اپنی ہی ہستی کو مٹا چکا تو دوسروں کی ہستی کی پروا ہو اس کی جوتی کو ایسے شخص کو اصطلاح صوفیہ میں حُر کہتے ہیں بعض صوفیائے کرام نے قرآن مجید میں سے ایک لطیفہ نکالا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کے اس قول سے رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ (ترجمہ) اے پروردگار میں نے نذر مانی ہے آپ کے لئے اس بچہ کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جائیگا سو آپ اس کو مجھ سے قبول کرلیجئے) اے اللہ میں تیرے نذر کرتی ہوں جو کچھ میری نیت میں ہے اور تیرے راستے میں اُسے آزاد کرتی ہوں اس کا یہ تھوڑا ہی مطلب ہے کہ وہ غلام تھا اب اُسے آزاد کرتی ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میں اسے تیرے ہی لئے خاص کرتی ہوں اے اللہ میاں یہ خالص تمہارا ہے۔ تمہارے دین کی خدمت میں ساری عمر رہے گا۔ تو حُر کے معنی خالص کے ہوئے چنانچہ اہل لغت نے لکھا ہے طین حُر یعنی وہ مٹی جس میں کنکر وغیرہ نہ ملا ہو حُر خالص مٹی کو کہتے ہیں۔ یہاں بھی حُر کے معنی ہیں خالص اللہ کا۔ اور اب تو خالص کے وہ معنی ہوگئے جو مخالص کے ہیں یعنی اس کے

جو اصلی معنی ہیں اس معنی کر نہیں جیسے عوام پوچھتے ہیں کہ یہ گھی نخالص ہے بیچنے والا کہتا ہے کہ ہاں بالکل نخالص ہے۔ ایسے ہی احرار کی دو قسمیں ہیں ایک خالص ایک نخالص۔ نخالص کون جس میں میل ہو، میل کاہے کا ہو۔ میل ہو حُبِ دنیا کا میل ہو حب غیر کا میل ہو معصیت کا شرک کفر کا۔ یعنی آجکل آزاد اس کو کہتے ہیں جو شریعت سے آزاد ہو۔ اللہ اکبر۔ ایسا شخص بھی کہیں آزاد کہا جا سکتا ہے۔ حضرت یہ تو وہ آزاد ہے جو ہزاروں قیدوں میں ہے یعنی معصیتوں میں مبتلا ہے پھر آزادی کہاں رہی۔ کیونکہ معصیت کی قید تو سب قیدوں سے سخت قید ہے غرض بے قید کوئی نہیں۔ کوئی خدا کی قید میں ہے کوئی شیطان کی قید میں بہرحال قید سے تو خالی کوئی نہیں۔ اب اس کا فیصلہ خود کر لو۔ کہ کونسی قید پسند کے قابل ہے۔ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

اسیرش نخواہد رہائی زبند | شکارش نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے آزادی نہیں چاہتا۔ اس کا شکار کمند سے رہائی نہیں چاہتا)

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم | غیر زلف آں نگارے دلبرم

یعنی اگر سیکڑوں قیدوں میں بھی ڈالدیا جاؤں تو ساری قیدیں توڑ ڈالوں مگر معشوق کی زلف کی قید کہ اس کو توڑنا ہرگز گوارا نہ کردں۔ کیونکہ یہ قید تو محبوب قید ہے۔ غرض قید بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو محبوب قید اور ایک ناگوار قید دیکھو تو سہی اگر عاشق کو کسی دعوت کے لئے پکڑ دتو وہ رَستے توڑا کر بھاگے گا کہ نہیں دعوت سے کیا مطلب ہم تو آزاد ہیں اب فرض کر و اسی رو میں محبوب بھی آ گیا اور اس نے بھی کہا کہ چلو میاں تمہاری آج دعوت ہے ہمارے یہاں اور وہ اس سے بھی کہدے کہ نہیں جناب میں تو آزاد ہوں میں دعوتوں میں نہیں جایا کرتا۔ کوئی اس سے کہے کہ ارے احمق جس کی بدولت تو آزاد ہوا ہے اسی کے یہاں تو آج دعوت ہے جس کے لئے تو نے سارے تعلقات قطع کئے آج کی دعوت اسی شخص کے تعلق سے مسدیب ہے اس کی دعوت میں بھی جانے سے تو آزاد بنتا ہے تو تو عاشق ہی نہیں یہ اچھی آزادی ہوئی صاحب کہ نماز بھی چھوڑ دی روزہ بھی چھوڑ دیا۔ یہ آزاد کہاں سے ہوا یہ تو ہزاروں قید کے اندر

جکڑا ہوا ہے۔ آزاد وہ ہے جو غیر اللہ سے آزاد ہو۔ جو خالص اور حُرّ ہو تو قلندر کے یہ معنی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ متقدمین کی اصطلاح میں تو قلندر وہ ہے جس میں اعمال غیر واجبہ کی تقلیل ہو اور متاخرین نے اس کے معنے میں وسعت کی ہے یعنی قطع نظر اس سے کہ اعمال میں تقلیل ہو یا تکثیر لیکن خلق سے آزاد ہو اور یہ دونوں اصطلاحیں جُدا جدا ہیں لیکن ایک نکتہ کی بناء پر یہ دونوں اصطلاحیں متوافق بھی ہو جاتی ہیں یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ قلندر کے اعمال میں تقلیل ہوتی ہے تو قلت اور کثرت امور اضافیہ میں سے ہیں یعنی بمقابلہ دوسرے اہل اعمال کے تو وہ عمل میں بھی بڑھا ہوا ہے یعنی اوروں سے تو اس کا عمل بھی غالب ہے لیکن خود اس میں جو محبت اور عمل دو چیزیں جمع ہیں ان میں محبت کا حصہ عمل سے بڑھا ہوا ہے۔ پس اس کمی کا یہ مطلب نہیں کہ عمل میں فی نفسہ کوئی کمی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ گو عمل بھی بہت بڑھا ہوا ہے لیکن محبت میں اس سے زیادہ بیٹھی ہے عمل تو کامل ہے ہی مگر محبت کامل سے بھی آگے یعنی اکمل ہے اس تقریر سے یہ دونوں اصطلاحیں باہم متوافق ہو گئیں اب ایک اور تیسری اصطلاح جہلاء کی ہے جو بالکل بدعت ہے کہ قلندر وہ ہے جو چار ابرو کا صفایا کر دے اور نماز و روزہ سب کو رخصت کر دے ایسے شخص کو جہلاء کہتے ہیں کہ صاحب یہ قلندر ہیں استغفر اللہ وہ کیا قلندر ہوتا ہاں اگر کوئی معذور ہو غیر مکلف ہو مثلاً مجنوں ہے دیوانہ ہے تو وہ مستثنیٰ ہے یعنی خدا کے یہاں اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا یہ دوسری گفتگو ہے کہ آیا وہ کامل بھی ہے سو یہ خوب سمجھ لیجئے کہ نہ وہ کامل ہے نہ مکمل کیونکہ مکمل ہونے کے لئے خود کامل ہونا ضروری ہے تکمیل کے لئے کمال شرط ہے۔ جو خود ہی درزی کا کام نہ جانتا ہو وہ دوسرے کو سینا کیونکر سکھا سکتا ہے تو مجاذیب اور بہلول جو ہوتے ہیں چونکہ یہ خود کامل نہیں ہوتے لہذا دوسرے کی تکمیل بھی نہیں کر سکتے کامل اور مکمل وہی ہے جو قدم بقدم ہو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے جس کا ظاہر ہو مثل ظاہر پیغمبر کے اور باطن ہو مثل باطن پیغمبر کے یعنی ہر امر میں اور ہر حال میں پیغمبر ہی اس کے قبلہ و کعبہ ہوں اس کے ظاہر کا قبلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہر ہو اور اس کے باطن کا قبلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باطن ہو اس کو خوب سمجھ لیجئے۔ دیکھئے تو یہی نماز کی صحت کے لئے قبلہ رخ ہونا ضروری ہے۔ ہاں قبلہ سے تھوڑا فرق ہو تو خیر مضائقہ نہیں نماز صحیح

ہوجاوے گی چاہے رکعتیں بھی زیادہ نہ پڑھے اور چاہے قرات میں بھی کچھ تقلیل ہو مگر ہو قبلہ رُخ تب ہی نماز کی صحت متحقق ہو گی اور اگر مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تو چاہے رکعتوں کی تعداد بھی زیادہ ہو اور قراۃ میں بھی تطویل ہو لیکن نماز صحیح نہ ہو گی۔ دیکھو یہ مسجد بنی ہوئی ہے (بیان مسجد سے متصل ہو رہا تھا ۱۲ جامع) اس کی سمت کی طرف نماز صحیح ہو جاتی ہے وجہ کیا کہ یہ مسجد خانہ کعبہ کی طرف گویا منہ کئے ہوئے ہے لہٰذا جو کوئی اس کی سمت کی طرف اپنا منہ کر کے نماز پڑھے گا چاہے دو رکعت ہی کیوں نہ ہوں اس کی نماز صحیح ہو جاوے گی برخلاف اس مسجد کی سمت کے مقابل مشرق کی جانب اگر آپ اس مسجد کی ایک شکل بنا کر (کیونکہ وہ مسجد کیا ہو گی مسجد کی محض شکل ہی ہو گی) اس میں نماز پڑھیں جس میں اتنی لمبی لمبی سورتیں ہوں کہ ایک رکعت میں تو سورۂ بقر ہو دوسری میں سورۂ آل عمران پھر تیسری میں سورۂ نساء اور چوتھی میں سورۂ مائدہ غرض چار رکعتوں میں یہ بڑی بڑی چار سورتیں ختم کی گئیں۔ اب آپ ہی کہئے یہ نماز کیسی ہوئی بالکل ہیچ در ہیچ، اس پر ثواب تو کیا ملتا بلکہ اور عذاب ہوگا۔ تو اس نماز میں کیا چیز کم ہے فقط کمی یہ ہے کہ رُخ قبلہ سے ہٹا ہوا نہیں ہے اس کے سوا اور کوئی کمی نہیں شکل بھی نماز کی مسجد کی بھی ساری ہیئت وہی لیکن تحریف قبلہ کے سبب وہ نماز ہرگز مقبول نہیں بلکہ مردود ہے نماز بھی اور نمازی بھی تو ہمارے اعمال کا قبلہ وکعبہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال ہیں جس عمل کا رخ اس قبلہ کی طرف ہوگا وہی مقبول ہوگا۔ پس ہمارے ظاہر کا قبلہ پیغمبر کا ظاہر ہے اور باطن کا قبلہ پیغمبر کا باطن ہے۔ یعنی ہماری ظاہری حالت وہ ہونی چاہیئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حالت تھی۔ یعنی آپ کپڑا پہنتے تھے ہمیں بھی ننگا نہیں رہنا چاہیئے۔ آپ ڈاڑھی رکھتے تھے ہماری ڈاڑھی بھی منڈی یا کٹی نہ ہونا چاہیئے۔ آپ کے ٹخنے کھلے ہوئے رہتے تھے ہمارے بھی کھلے رہنے چاہئیں اور یہ ہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹخنے کھلے رہتے تھے بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹخنے ڈھانکنے سے منع بھی فرمایا ہے۔ اسی طرح حضور صلی علیہ وسلم کے ناخن

ترشے ہوئے اور لبیں بنی ہوئی رہتی تھیں یہ ہی حالت ہمارے ناخن اور لبوں کی ہونی چاہیئے غرض ہمارا ظاہر بالکل مشابہ ہونا چاہیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر کے کہ بس صورت دیکھتے ہی معلوم ہو جاوے کہ یہ غلام ہے ایسے آقا کا ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید الہ آباد کے رہنے والے تھے، میں الہ آباد گیا ہوا تھا وعظ کے اندر دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھے شخص ڈاڑھی منڈی ہوئی خوب گورے چٹے گوٹہ ٹھپے کے کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے ہیں جاڑے کے دن تھے رضائی جو اوڑھے ہوئے تھے اس پر بھی گوٹہ اور ہمیک لگی ہوئی تھی وعظ کے بعد میرے پاس آکر بڑی محبت سے بولے کہ مولوی منہ کھول دے میں نے دل میں کہا کہ جب یہ ایسی محبت سے کہہ رہا ہے تو لاؤ منہ کھول دو میرا کیا بگڑتا ہے کوئی تھوک تو دے گا نہیں۔ غرض میں نے اپنا منہ کھول دیا اس نے فوراً ہی ایک لڈو میرے منہ میں رکھدیا میں نے کھا لیا کہ خدا کی نعمت ہے کسی کے ہاتھ سے دلوائیں میں نے پوچھا تم کون ہو۔ یہ سنتے ہی اس کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ تھا صاحب محبت۔ غلطی میں مبتلا تھا مگر اس کا تدارک نہ تھا، زار زار آنسو بہہ رہے تھے وہ خود ہی شرمندہ تھا اپنی اس حالت پر رو کر کہا اس نالائق کو بندۂ امداد اللہ کہتے ہیں مجھ کو بھی رحم آ گیا۔ آخر پیر بھائی کا خیال ہوتا ہی ہے اور نہ بھی ہوتا پیر بھائی تو کیا تھا۔ جو شرارت اور سرکشی نہ کرے اور اپنے آپ کو خطاوار سمجھے اس پر رحم ہی آتا ہے۔ البتہ شرارت کرنے والے پر غصہ آتا ہے، خیر میں نے ان سے بات چیت کی اور مناسب تسلی دی اور اس وقت تو ان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع ملا نہیں۔ اتفاق سے ایک مرتبہ میں گنگوہ گیا ہوا تھا وہ بھی وہاں چلتے پھرتے آ گئے میری جو خبر سنی تو اطلاع کر کے مع ایک مجمع عظیم کے میرے پاس پہونچے اور آتے ہی پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ میں نے ہار تو ہاتھ میں لے لیا اور انبساط کے لئے پوچھا یہ کیسے ہیں۔ کہا ہم ایک باغ میں گئے تھے۔ عوام الناس ایسوں کے بڑے معتقد ہوتے ہیں سمجھتے ہیں کہ قطب الاقطاب ہیں، ارے قطب الاقطاب ہوتے تو ڈاڑھی ہی کہاں جاتی مگر ان کے نزدیک تو ڈاڑھی کا نہ ہونا ہی دلیل قطبیت ہے اگر یہ بات ہے تو پھر سارا چین اور جاپان بس اقطاب اور اغواث ہی سے بھرا پڑا ہے،

کیونکہ وہاں قدرتی طور پر کسی کے ڈاڑھی مونچھ نکلتی ہی نہیں۔ غرض ایسوں کو برکت کے لئے کوئی باغ میں لیجاتا ہے کوئی کھیتوں پر لیجاتا ہے۔ ان حضرات کو بھی کوئی اپنے باغ میں لے گیا ہوگا۔ غرض انھوں نے کہا کہ ہم ایک باغ میں گئے تھے باغ والے نے پھول دیدیئے تھے۔ سو کچھ تو حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چڑھائے جی چاہا کہ کچھ تمہیں بھی دیدیں۔ کیونکہ وہ پیارے تھے مردوں میں تم پیارے ہو زندوں میں۔ اپنے پیاروں کو اچھی چیز دیا ہی کرتے ہیں۔ یہ انھوں نے تقریر کی۔ بڑا مجمع تھا میں نے کہا شاہ صاحب یہ پھول جو آپ لے شیخ کے مزار پر چڑھائے ہیں آپ کے نزدیک تو بڑی چیز ہیں۔ لیکن ایک مثال فرض کرو اگر کوئی شخص ہو جو سو روپیہ تولہ کا عطر سونگھنے والا ہو اور تم چار آنہ تولہ کا عطر بہت ہی گھٹیا اور چکٹا ہوا لے جاؤ اور جاکر اس کی ناک میں دیدو تو کیسا۔ کیا یہ ایذارسانی نہیں ہے۔ کہا بیشک۔ میں نے کہا اچھا اب یہ بتاؤ کہ حضرت شیخ تمہارے نزدیک شمائم وروائح جنت سے مشرف ہیں یا محروم ہیں کہنے لگے معاذاللہ کون کہہ سکتا ہے کہ محروم ہیں میں نے کہا تو بس یہ جو پھول تم نے حضرت شیخ کے مزار پر چڑھائے ہیں دو حال سے خالی نہیں یا تو ان کی خوشبو پہنچتی ہے یا نہیں پہونچتی ہے۔ اگر نہیں پہونچتی تو پھول چڑھانا بیکار اور اگر پہونچتی ہے تو ان جنت کے پھولوں کے مقابلہ میں جو حضرت شیخ کو حاصل ہیں تمہارے یہ دنیا کے پھول سو روپیہ تولہ کے عطر کے مقابلہ میں چار آنہ تولہ کا چکٹا ہوا عطر ہے یا نہیں کہا بیشک میں نے کہا تو بس یہ تو وہی مثال ہوئی کہ سو روپیہ تولہ کے عطر سونگھنے والے کی ناک میں چار آنہ تولہ کا سڑا ہوا عطر دے دیا تم نے پھول چڑھا کر حضرت شیخ کی روح کو تکلیف پہنچائی ہے کہنے لگے میں توبہ کرتا ہوں یہ مسئلہ آج سمجھ میں آیا ہے۔ اب کبھی کسی مزار پر پھول نہ چڑھاؤں گا میری توبہ ہے اس کے بعد ہم لوگ نماز کے لئے مسجد میں گئے لوگ وضو کرنے لگے اور وہ ایک طرف بیٹھ گئے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا اور آہستہ سے کہا کہ تم میرے پیر بھائی ہو اس لئے تم سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ تمہیں حضرت حاجی صاحب سے محبت ہے یا نہیں۔ بس رونے لگے کہا میں تو عاشق ہوں۔ میں نے کہا پھر عاشق ہو کر کیوں اپنے محبوب

کی مخالفت کرتے ہو۔ کیا حضرت حاجی صاحب کی ایسی ہی ڈاڑھی تھی۔ کہا میں توبہ کرتا ہوں میں اب کبھی ڈاڑھی نہیں منڈاؤں گا صاحب انھوں نے ڈاڑھی منڈانے سے بھی توبہ کرلی میں اس شبہ میں رہا کہ کہیں منہ دیکھے کی توبہ تو نہیں ہے۔ مگر پھر جو میرا الہ آباد جانا ہوا تو رستہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص خوب مقطع ڈاڑھی لئے ہوئے سامنے سے چلے آرہے ہیں میں نے پہچانا بھی نہیں۔ ایک شخص نے بتلایا کہ یہ فلانے ہیں تب میں بہت خوش ہوا اور بغلگیر ہو کر ملا۔ تو ان کی اصلاح اسی اصول سے کی گئی کہ جب تمہاری صورت حضرت حاجی صاحب جیسی نہیں پھر تم ان کے عاشق کیا ہوئے۔ تو قلندر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنا ظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر کے خلاف رکھے نہ۔ بزرگوں کے کلام میں کہیں اس کے یہ معنی منقول ہیں محض لغو اصطلاح ہے اور اس غلط اصطلاح کے ہونے سے ایک اور خرابی ہوگئی وہ یہ کہ جن بزرگان دین کا جن میں کہ علماء دین بھی تھے قلندر لقب ہوگیا۔ چنانچہ حضرت قلندر صاحب صاحب مزار بھی عالم تھے، عوام ان کی نسبت اس لفظ کو سنکر یہ سمجھتے ہیں کہ معاذ اللہ یہ حضرات بھی ایسے ہی ہوں گے کہ نہ ڈاڑھی نہ مونچھ۔ نہ نماز نہ روزہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ حاشا وکلا یہ حضرت نہایت متبع سنت اور پابند شریعت تھے اور کوئی بزرگ بھی ایسے نہیں ہوئے جنھوں نے اتباع سنت نہ کیا ہو حتیٰ کہ اگر غلبہ حال سے کبھی اتباع میں کبھی کچھ کمی بھی ہوگئی ہے تو اپنی اس حالت کو ناقص سمجھا ہے اور کبھی اس پر اصرار نہیں کیا نہ کہ نعوذ باللہ اس کو قصداً اختیار کرتے۔ غرض یہ بالکل تہمت ہے کہ بعض بزرگوں کا طریق خلاف شریعت بھی رہا ہے سب بزرگوں کا ایک ہی طریق رہا ہے اور وہ طریق شریعت ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کُلُّ مَارَدَّتْہُ الشَّرِیْعَۃُ فَھِیَ زِنْدَقَۃٌ یعنی جس حال یا جس مقال کو شریعت رد کرے وہ بالکل الحاد اور زندقہ ہے۔

حضرت خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں۔ بر ہوا پری مگسے باشی برآب روی خسے باشی دل بدست آر کہ کسے باشی۔ اگر بزور کرامت ہوا پر بھی اڑو گے تو کیا ہے گویا مکھی ہو جاؤ گے کہ وہ بھی تو ہوا میں بلا تکلف اڑتی ہے، پانی پر چلو گے تو یوں سمجھو کہ ایک تنکا ہو گئے کیونکہ وہ بھی تو پانی کی سطح پر بہتا ہوا جاتا ہے ہاں اپنے دل کو قابو میں کرو تب انسان بنو گے۔ اور اسی قسم کے بہت سے اقوال ہیں میری کتاب تعلیم الدین میں جمع ہیں اس میں دیکھ لیجئے۔

حضرت جنیدؒ سے کسی نے کہا کہ ایک قوم ہے جو یہ کہتی ہے نَحْنُ وَصَلْنَا فَلَا حَاجَةَ اِلَى الصَّلٰوةِ وَالصِّيَامِ ہم واصل ہو گئے ہیں لہٰذا ہمیں حاجت نہیں رہی نماز کی اور روزہ کی۔ حضرت جنید نے اس کے جواب میں فرمایا صَدَقُوْا فِي الْوُصُوْلِ وَلٰكِنْ اِلٰى سَقَرٍ یہ تو وہ سچ کہتے ہیں کہ واصل ہو گئے ہیں لیکن جہنم واصل ہوئے ہیں خدا واصل نہیں ہوئے پھر ارشاد فرمایا وَلَوْ عِشْتُ اَلْفَ عَامٍ لَمَا تَرَكْتُ مِنْ اَوْرَادِيْ شَيْئًا اِلَّا بِعُذْرٍ شَرْعِيٍّ یعنی اگر ہزار برس بھی میں بندہ رہوں تب بھی نماز تو بڑی چیز ہے کیونکہ فرض ہے۔ وظیفے جو محض مستحب ہیں بلکہ بعض مستحب کے درجہ میں بھی نہیں یہ بھی کبھی نہ چھوڑوں الا بعذر شرعی، ہاں کوئی عذر شرعی لاحق ہو جاوے تو مجبوری ہے ورنہ کوئی وظیفہ تک بھی کبھی نہ چھوڑوں چنانچہ حضرت جنیدؒ اخیر عمر تک ہاتھ میں تسبیح رکھتے تھے۔ دیکھئے وظیفہ تو وظیفہ تسبیح رکھنا تک بھی عمر بھر نہ چھوڑا حالانکہ تسبیح کا رکھنا نہ سنت نہ مستحب کچھ بھی نہیں نہ موقوف علیہ کسی وظیفہ کا نہ کسی وظیفہ کے لئے شرط نہ منتہی ہو جانے کے بعد حضرت جنید کو اس کی حاجت باقی رہی تھی کیونکہ مبتدی کے لئے تو خیر وہ آلہ تذکرہ بھی ہو سکتی ہے منتہی تو تذکر میں راسخ ہو جاتا ہے اسی لئے منتہی کی شان میں لکھا گیا ہے خلوت و چلّہ بر د لازم نماند مگر اس پر بھی حضرت جنیدؒ نے اس اپنی ابتدا کی حالت کو بھی نہ چھوڑا کسی نے عرض بھی کیا کہ حضرت اب تو آپ منتہی اور واصل کامل ہو چکے اب آپ کو ہر وقت ہاتھ میں تسبیح لئے رہنے کی کیا ضرورت ہے فرمایا ارے اس تسبیح ہی نے تو مجھے واصل بنایا ہے اور اس درجہ تک پہونچایا ہے پھر کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دوں اسی کی بدولت تو یہاں تک پہونچے کیا اسی کو رخصت کر دوں اسی نے تو محبوب تک پہنچایا ہے تو پھر یہ بڑی ناشکری ہے کہ آج اس کو جواب دے دوں اللہ اکبر کیسے تھے یہ حضرات جناب یہ ائمہ طریق ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ناواقف تھے یا خشک ملّا تھے یہ لوگ بڑے بڑے عارف کامل اور عاقل گذرے ہیں ان کے یہ اقوال و افعال ہیں حضرت جنیدؒ کی خدمت میں ایک شخص دس برس رہا چلتے وقت عرض کیا کہ حضرت میں نے اتنی مدت خدمت میں قیام کیا لیکن کبھی کوئی کرامت آپ کی نہیں دیکھی۔ میں نے سُنا تھا کہ آپ بہت بڑے کامل ہیں اسی لئے خدمت میں

حاضر ہوا تھا کہ کچھ فیض حاصل کروں گا مگر اتنی مدت قیام کو گذر گئی کوئی کرامت آپ سے کبھی صادر نہ ہوئی۔ یہ سُن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا جوش میں آکر فرمایا کہ اچھا یہ بتلا جنید سے تو نے اس عرصہ میں کوئی فعل سنت کے خلاف ہوتے بھی کبھی دیکھا ہے اس نے کہا نہیں یہ بات تو نہیں دیکھی اس پر آپ نے جوش میں آکر فرمایا کہ ارے پھر اس سے بڑھ کر جنید کی اور کیا کرامت ہو گی کہ اس نے دس برس تک اپنے خدا کو ایک لمحہ کے لئے بھی ناراض نہیں کیا اس سے بڑھ کر اور کیا کرامت ہو گی تو جنید کی دیکھنا چاہتا ہے واقعی اس سے بڑھ کر کیا کوئی کرامت ہو سکتی ہے حقیقی کرامت تو یہی ہے بڑی کرامت تو استقامت ہے۔ اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ اسی واسطے خدا تعالےٰ نے یہ دعا تعلیم فرمائی ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اور صراط اہل الکرامات نہیں فرمایا خوب سمجھ لو شریعت کا اتباع کسی حال میں متروک نہیں سب بزرگوں کا اس پر اتفاق ہے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ طریق چشتیہ کے کتنے بڑے شیخ اور صاحب حال وقال درویش ہیں انہیں کے مکتوبات کو دیکھ لو کوئی مکتوب اتباع شرع کی تاکید اور ترغیب سے خالی نہیں غرض طریقہ تھا بزرگوں کا تو یہ معنی قلندر کے بالکل گھڑے ہوئے ہیں کہ نہ نماز ہو نہ روزہ نہ ڈاڑھی ہو نہ مونچھ غرض دراصل صرف دو اصطلاح صحیح ہیں جن کی حقیقت کی تفصیل میں پہلے عرض کر چکا ہوں ایک کتابی اصطلاح ہے ایک زبانی۔ ایک کتاب میں ہے اور ایک اگرچہ کتاب میں نہیں لیکن مستند حضرات کی زبان پر ہے چنانچہ حضرات عراقی نے بھی اپنے شعر میں اس دوسری ہی اصطلاح کو لیا ہے۔ اس اصطلاح میں خلاصہ طریق قلندر کا یہ ہے کہ وہ جامع ہوتا ہے اعمال اور محبت کا عمل اور محبت کے تفاوت کی ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کا بدون بھاپ کے ٹھیلنے سے چلنا اور جیسے بھاپ سے چلنا اگر انجن میں بھاپ نہیں ہے تو ریل ڈھکیلنے سے بھی چلے گی تو ضرور مگر کتنی زیادہ سے زیادہ دو چار چھ یا آٹھ دس میل اور وہ بھی بمشکل اور اگر انجن میں بھاپ ہے تو بس چھوٹتے ہی اڑ گیا ساری گاڑی کو لیکر ہوا کی طرح۔ ولایتی ڈاک کی رفتار نہیں دیکھی آخر اس میں کیا چیز زیادہ ہے۔

اس میں اور ایک ٹھیلہ گاڑی میں جس کو مزدور چلاتے ہیں کیا فرق ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ ایک میں بھاپ ہے اور ایک میں بھاپ نہیں ورنہ پہیئے مشین گاڑیاں سب چیزیں ویسی ہی ہیں مگر فرق کیا ہے' دونوں میں صرف بھاپ کا فرق ہے اگر ولایتی ڈاک میں بھی بھاپ نہ رہے تو وہ بھی ٹھیلہ ہے۔ تو عمل مثل گاڑی کے ہے اور محبت گویا بھاپ ہے جو بمنزلہ گاڑی کی روح کے ہے تو اصل چیز ریل میں بھاپ ہی ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پہیئے توڑ کر رکھ دو۔ اگر کہیں پہیئے توڑ کر رکھ دیئے تو بھاپ کا نہ ہونا تو خیر اتنا مضر بھی نہیں لیکن ایسی حالت میں بھاپ کا ہونا ہی بس غضب ہے۔ دیکھو ریل کبھی پٹڑی پر سے اترتی ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ہاتھوں سے ٹھیلتے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ زور کی آندھی آئی یا کوئی اور سبب ہو گیا کہ پہیئے لین سے اتر گئے اب چونکہ اس وقت بھاپ کے زور سے نہیں چل رہی ہے اس لئے لین سے بھی اترے گی تو زمین کے اوپر ہی چلنے لگے گی اگر زمین سخت ہوئی ورنہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کھڑی ہو رہے گی اور اگر کہیں خدانخواستہ ایسا ہوا کہ بھاپ کے زور میں اڑی چلی جا رہی تھی کہ پہیہ لائن سے اتر گیا تو بھاپ کی یہ برکت ہوئی کہ پہیئے زمین کے اندر گھس گئے پرزے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ڈرائیور اور سواریاں سب ہلاک ہو گئیں ایک قیامت برپا ہو گئی تو بس بھاپ موجود ہونے کی صورت میں اگر یہ لین پر رہی تب تو یہ مسافت کو نہایت سہولت اور امن و عافیت اور تیزی کے ساتھ قطع کرتی رہے گی اور اگر کہیں لین کو چھوڑ دیا تو واللہ قیامت برپا ہو جاوے گی مشین کا بھی گاڑیوں کا بھی چلانے والے کا بھی مسافروں کا بھی سب کا تہس نہس ہو جاوے گا تو اس مثال میں گویا تین حالتیں ہوئیں ایک تو یہ کہ بھاپ نہیں ہے لیکن لائن پر ہے اس صورت میں رفتار ضرور آہستہ ہو گی لیکن خیر کوئی خطرہ بھی نہیں۔ دوسری حالت یہ ہے کہ بھاپ تو اس میں ہے لیکن لائن پر نہیں ہے یہ بس قیامت کا سامنا ہے اور ایک حالت نورٌ علیٰ نور وہ یہ ہے کہ بھاپ بھی ہو اور لائن پر بھی ہو سبحان اللہ یہ ہے

البتہ لطف۔ تو اے صاحبو جس نے اپنی ریل میں بھاپ تو پیدا کرلی لیکن اس کو لین پر سے اتار دیا واللہ وہ نہایت خطرناک حالت میں ہے اور وہ بھاپ کیا ہے وہ بھاپ ہے محبت جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں اور لین کیا ہے لین ہے صراط مستقیم شریعت کی یعنی جس نے محبت تو پیدا کرلی لیکن اعمال شریعت کو رخصت کردیا وہ قطع طریق تو کیا کرتا اور الٹا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت باطنی میں ڈالدیا اور جس نے محبت تو پیدا نہیں کی لیکن عمل شریعت پر کرتا رہا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے بلا بھاپ کی ریل کہ ٹھیل رہے ہیں اول تو رفتار نہایت سست پھر جہاں ٹھیلنا چھوڑ دیا بس رک گئی اس لئے یہ بھی کچھ نہیں۔ اے صاحب عمل کو اور محبت کو دونوں کو جمع کرلو یہ البتہ ہوگی وہ ریل جس میں بھاپ بھی ہے پہیے بھی ہیں اور لین پر بھی ہے۔ پھر دیکھو کیسی جلدی مسافت قطع ہوتی ہے۔ تو میں نے ریل کی مثال میں جو یہ کہا تھا کہ بھاپ اصل چیز ہے اس کے یہ معنے نہ تھے کہ پہیوں کی ضرورت نہیں ہی اسی طرح محبت کو جو میں نے کہا ہے کہ اصل چیز ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط محبت کافی ہے عمل کی حاجت نہیں بلکہ بھاپ کے اصل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ پہیوں کی تیزی کا ذریعہ یہی ہے بغیر اس کے رفتار میں تیزی ممکن ہی نہیں لیکن اگر سرے سے پہیے ہی ندارد ہوں تو نری بھاپ کیا کرسکتی ہے سوائے اس کے کہ وہیں کے وہیں۔ سی۔ سی بھک بھک ہوتی رہی اسی لئے جس میں محض جوش وخروش ہے اس میں سوائے اس کے کہ حق حق اور الا اللہ الا اللہ کے نعرے لگالئے اور بھی کچھ ہے نفع کیا اس سے غل شور تو بہت مگر ہیں وہیں جہاں پہلے تھے تو نفع کیا اس جوش وخروش سے یہ جوش وخروش تو ایسا ہی ہے جیسا اس ریل کا جس کے انجن میں آگ بھی دہک رہی ہے بھاپ بھی بھری ہوئی ہے مگر کسر ہے تو کیا کہ پہیے ٹوٹ گئے ہیں تو وہ بیچاری سوائے اس کے کہ کھڑی دھواں دیئے جاویں اور ''ٹیں ٹاں ٹیں ٹاں'' کئے جاوے اور کیا کرسکتی ہے۔ جہاں صبح تھیں حضرت وہیں شام۔ اور جو گاڑی بے بھاپ کی چلی جارہی ہے اس میں غل شور تو بہت نہیں مگر راستہ آناً فاناً قطع ہو رہا

ہے کاش جس گاڑی میں بھاپ تھی پہیئے بھی درست ہوتے اور لین پر بھی ہوتی تب لطف تھا کہ ایک ساتھ کلکتہ جاکر دم لیتی اور اب تو نری بھاپ بالکل بیکار ہے۔ تو محبت کو جو میں نے اصل کہا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اعمال کی تکمیل کا بلکہ خود اعمال کا بھی ذریعہ ہے کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ بدون محبت کے اعمال کا صدور بھی ممکن نہیں حتیٰ کہ محبت ضعیف یعنی محبت کا ادنیٰ درجہ وہ ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں۔ اور یہ مسلم مسئلہ فلسفہ کا ہے کہ بلا ارادہ کے کوئی عمل وجود میں آہی نہیں سکتا ہر عمل کے لئے صدور سے قبل ارادہ کا متعلق ہونا شرط ہے تو محبت کا ادنیٰ درجہ ارادہ ہوا مثلاً ہم نے جب چاہا اور ارادہ کیا تو محبت ضعیف متحقق ہوگئی چونکہ چاہنے ہی کو تو محبت کہتے ہیں گو تڑپ نہ ہو یہ تو ادنیٰ درجہ کی محبت ہوئی جس کے بدون ادنے درجہ کا عمل ہی صادر نہیں ہو سکتا۔ اور اعلیٰ درجہ کی محبت یہ ہے کہ ؎

تو درو گم شو وصال این ست و بس　　　گم شدن گم کن کمال این ست بس

(تو اس میں فنا ہو جا یہی وصال کافی ہے۔ اپنا گم ہو جانا بھول جا انتہائی کمال یہ ہے)

ہائے کیا اچھا مضمون ہے ؎

تو درو گم شو وصال این ست و بس　　　گم شدن گم کن کمال این ست بس

گویا فنا کا درجہ جس کو کہتے ہیں وہ اعلیٰ درجہ ہے محبت کا یعنی تمام تعلقات غیر اللہ اس قدر مغلوب ہو جائیں کہ کوئی نہ معبود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے لا الہ الا اللہ کا اور نہ مقصود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا (تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے) کا اور نہ سالک کے نظر میں موجود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز ذات پروردگار کے) کا جب اسم فاعل کو معنی حال پر محمول کیا جاوے کما ہو احد الوجوہ فی التفسیر پس اول ادنیٰ درجہ کی محبت پیدا ہوئی اس سے عمل ادنیٰ درجہ کا

ہوتا ہے پھر اس عمل کی برکت سے محبت کا اس سے قوی درجہ پیدا ہوتا ہے پھر اس سے پہلے درجہ سے قوی عمل پیدا ہوتا ہے اسی طرح سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے تو ترتیب یوں ہوئی کہ اول محبت ضعیف سی ہوتی ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں اس سے ایک عمل پیدا ہوا اور اس کے ساتھ اور بھی موئدات کو مدد کے لئے جمع کر لیا تو اس محبت میں اب ترقی ہوئی اس عمل کی برکت سے پھر اسی محبت زائد سے جو عمل پیدا ہوا اس سے اور محبت زیادہ پیدا ہوئی پھر اس محبت سے اور عمل پیدا ہوا۔ پھر اس عمل کی اور برکت ہوئی پھر اس سے اور عمل پیدا ہوا۔ خلاصہ یہ کہ دونوں میں یہ ترتیب رہتی ہے کہ اول محبت ضعیف پھر عمل ضعیف۔ پھر محبت زائد پھر عمل زائد۔ پھر اور محبت زائد، پھر اور عمل زائد۔ غرض ساری عمر یہ دونوں سلسلے چلتے رہتے ہیں کہ ہر عمل سے محبت اور ہر مزید محبت سے مزید عمل غرض نہ اس سے استغنا نہ اس سے ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہو گئی تو بس سارا سلسلہ منقطع تو حضرت یہ تو ساری عمر کا دھندا ہے کہ محبت پھر عمل پھر محبت پھر عمل وعلیٰ ہذا۔ نہ اس سے کبھی فارغ نہ اس سے کبھی مستغنی یہ ہے گویا حاصل اس طریق جامع بین المحبت والعمل کا جس کو حضرت عراقی نے اپنے شعر میں طریق قلندر سے تعبیر کیا ہے۔ غرض ذہن میں یہ مضمون آیا تھا جو حضرت عراقی کے اس شعر میں مذکور ہے جس کو میں نے اس وقت بیان کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔

پھر میں نے سوچا کہ کیا کوئی آیت بھی اس مضمون کی ہے سو الحمد للہ قرآن کی یہ آیت بھی ذہن میں آ گئی جس سے یہ ہی مضمون موجود ہے۔ اور یہاں سے بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ تصوف کے اصول صحیحہ قرآن و حدیث میں سب موجود ہیں اور یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف قرآن حدیث میں نہیں ہے بالکل غلط ہے یعنی غالی صوفیوں کا بھی یہی خیال ہے اور خشک علماء کا بھی کہ تصوف سے قرآن و حدیث خالی ہیں۔ مگر دونوں غلط سمجھے۔ خشک علماء تو یہ کہتے ہیں کہ تصوف کوئی

چیز نہیں یہ سب واہیات ہے۔ میاں بس نماز روزہ قرآن حدیث سے ثابت اسی کو کرنا چاہیئے یہ تصوف صوفیوں نے کہاں کا جھگڑا نکالا ہے تو گویا ان کے نزدیک قرآن و حدیث تصوف سے خالی ہیں اور خالی صوفی یوں کہتے ہیں کہ قرآن حدیث میں تو ظاہری احکام ہیں تصوف علم باطن ہے ان کے نزدیک نعوذ باللہ قرآن حدیث ہی کی ضرورت نہیں۔ غرض دونوں فرقے قرآن حدیث کو تصوف سے خالی سمجھتے ہیں۔ پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک نے تو تصوف کو چھوڑ دیا اور ایک نے قرآن حدیث کو جنھوں نے قرآن حدیث کو چھوڑ دیا انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ قرآن حدیث تو محض ظاہری انتظام کی چیزیں ہیں درویشی کا ان سے کیا علاقہ میاں درویشی تو چیز ہی اور ہے جو باطن سے تعلق رکھتی ہے اے صاحبو کیا غضب کرتے ہو۔ خدا سے ڈرو اس کے متعلق میری ایک مستقل کتاب بھی ہے اول تو الحمدللہ یہ بات کہ قرآن حدیث سارا لبریز ہے تصوف سے ہر تصنیف سے۔ ظاہر ہے لیکن میں نے اس مضمون پر دو مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں ایک تو حقیقت الطریقۃ جو مدت ہوئی مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہے جس میں مسائل تصوف کی حقیقت احادیث سے ثابت کی گئی ہے۔ اب ایک رسالہ مستقل اور بھی آجکل لکھ رہا ہوں جس میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ تصوف کے مسائل قرآن مجید سے بھی ثابت ہیں۔ پاؤ قرآن یعنی آٹھ پارے تو ہو گئے ہیں بائیس پارے اور باقی ہیں خدا مدد فرمائے۔ یہ رسالہ دراصل عربی میں ہے۔ پھر خیال ہوا کہ ساتھ ساتھ اردو میں بھی ترجمہ ہوتا جائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ ہو رہا ہے اور وہ جو رسالہ ہے حقیقت الطریقہ وہ تو اصل ہی سے اردو میں ہے تو ان دونوں کتابوں سے معلوم ہوگا کہ قرآن حدیث لبریز ہے تصوف سے اور واقعی وہ تصوف ہی نہیں جو قرآن حدیث میں نہ ہو۔ غرض جتنے صحیح اور مقصود مسائل تصوف کے ہیں وہ سب قرآن میں موجود ہیں۔ کوئی آیت شاید خالی ہو جس میں ایک آدھ مسئلہ تصوف کا مذکور نہ ہو۔ چنانچہ اسی آیت کو دیکھئے جو اس وقت تلاوت کی گئی ہے، اس میں بھی تصوف موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ الیٰ آخر الایاتؔ[1] حق سبحانہ تعالےٰ اپنے دین کے محفوظ ہونے کی خبر دے رہے ہیں کوئی یہ ناز نہ کرے کہ دین کا کام ہماری وجہ سے چل رہا ہے اے ایمان والو اگر تم میں سے کوئی نعوذ باللہ دین سے پھر جاوے تو سرکاری کام بند نہ ہوگا چاہے سارے ٹھیکیدار اور مزدور استعفا دیدیں جیسے دنیا میں سارے عملے والے دفتر کا کام چھوڑ دیں تو حکام کو عین وقت پر پریشانی اور تشویش ضرور ہوتی ہے اس واسطے کہ جب عملے والے سب مخالف ہو گئے تو اب کام کس سے لیں۔ اسی طرح شبہ یہ ہوسکتا تھا کہ اگر نعوذ باللہ سب کے سب مسلمان مرتد ہو جائیں تو شاید اللہ میاں کو بھی سوچ ہو جیسے آج ہی میں ایک حکایت بیان کر رہا تھا کہ ایک نابینا حافظ نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم چار آدمی نماز پڑھ رہے تھے تین مقتدی اور ایک امام۔ امام صاحب کا وضو ٹوٹا انھوں نے مجھے خلیفہ بنایا اور خود وضو کرنے چلے گئے اب ایک امام اور دو مقتدی رہ گئے مقتدیوں میں سے ایک نے دوسرے سے نماز کے اندر ہی چپکے سے پوچھا کہ ارے یہ کیا ہوا۔ بیچارہ نے استخلاف امام کا مسئلہ کبھی سُنا نہ تھا۔ دوسرا نصیحت کرتا ہے کہ ارے چپ رہ یوں بھی ہوا کرے ہے (ہوا کرتا ہے) یہ بڑے بوجھ بجکڑ تھے۔ اب امام صاحب کی سنئے جو خلیفہ بنائے جانے کے لائق سمجھے گئے تھے۔ آپ فرماتے ہیں ارے اب میں کسے نماز پڑھاؤں۔ یہ دو ہی تو مقتدی تھے اور ان دونوں کی نماز بولنے سے فاسد ہو گئی۔ غرض اس لے بھی اپنی نماز تباہ کی۔ تو دیکھئے ذرا سی بات میں اس کی نماز رخصت ہو گئی، یہاں کی نماز تو ایسی ہے کہ جب مقتدی نہ رہیں تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ اب میں کسے نماز پڑھاؤں۔ اسی طرح اگر کسی بادشاہ سے ساری رعایا باغی ہو جائے تو اب وہ کس پر سلطنت کرے یہاں کے حکام تو ایسے ہیں کہ رعایا نے ہڑتال کردی تو بس ان کی حکومت ندارد۔ اللہ میاں کو بھی شاید کوئی نعوذ باللہ ایسا ہی سمجھ جاتا۔ سو اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہمارے

[1] اس آیۃ کریمہ کا ترجمہ خطبہ ماثورہ میں گذر چکا۔

یہاں یہ قصہ نہیں دین سے پھر کر دیکھ لو۔ سب ایک دم سے باغی ہو جاؤ۔ اول تو تمہارے پھر جانے سے ہمارا کوئی کام اٹکتا نہیں اور واقعی اللہ میاں کا ہمارے ایمان اور نماز روزہ سے کیا فائدہ مگر خیر جیسا بھی کچھ کام ہو رہا ہے گو وہ بندوں ہی کی مصلحت کے لئے ہو رہا ہے سو اس کے متعلق بھی خداوند تعالےٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں کہ کسی کے مرتد ہونے سے وہ بھی نہیں رک سکتا۔ یہی حاصل ہے اس آیت کا یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ اے ایمان والو تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے پھر جاوے فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ نزدیک ہی یعنی بہت جلد ایسی قوم کو اللہ میاں پیدا فرمادیں گے جس کی ایسی شان ہوگی کہ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ وہ اللہ میاں کو دوست رکھیں گے اور اللہ میاں ان کو دوست رکھیں گے دیکھئے سوف کے ساتھ فرماتے ہیں جو تقریب کے لئے آتا ہے یعنی فوراً اور واقعی انھیں کیا ضرورت ہے کسی انتظام یا اہتمام کی ایک لفظ کن سے مولوی، شیخ، غوث، ابدال، قطب جو چاہیں بنادیں۔ اور جس کو چاہیں بنادیں۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے حضرت غوث اعظم کی ایک حکایت لکھی ہے۔

ان کے خادم کی روایت ہے کہ ایک بار اخیر شب میں حضرت اٹھے، خادم کہتے ہیں کہ میں سمجھا نماز تہجد کی تیاری کریں گے چنانچہ میں بھی اٹھا تاکہ حضرت کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ویسے حضرت کو اپنے اٹھنے کی اطلاع نہ ہونے دی واقعی بزرگوں کی خدمت ہے بڑی مشکل انھوں نے جو کیا ٹھیک کیا اطلاع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی کوئی احسان جتلانا تھوڑا ہی تھا۔ اب تو اگر کوئی خدمت کرتے ہیں تو جتلا کر کرتے ہیں حالانکہ ادب کی بات یہ ہے کہ خیال اور نگرانی تو رکھے مگر خوامخواہ جا کر مزاحمت نہ کرے اور تنہائی میں مخل نہ ہو خصوص اخیر رات میں تو بزرگ یہ چاہتے ہیں کہ نہ کوئی ہمیں وضو کے لئے پانی لاکر دے نہ استنجے کا ڈھیلہ لاکر دے بلکہ اس وقت تو یہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سامنے بھی نہ آئے۔ اپنے ہاتھ سے سب کام کریں کیونکہ وہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے   کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ کوئی محب اپنے محبوب کے وصال سے لطف اندوز ہو)

بس اس وقت یہ جی چاہتا ہے کہ بالکل تنہائی کا عالم ہو بلکہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اپنے وجود کو بھی جی چاہتا ہے کہ یہ بھی نہ رہے۔ خود اپنا وجود بھی حجاب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت قلندرؒ جو اس موقع کے صاحب مزار ہیں اسی مضمون کو اپنے ایک شعر میں بیان فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم + لیجئے اپنی آنکھ پر بھی غصہ ہے یہ کیوں دیکھتی ہے میں ہی تجھے دیکھتا اور ؎ گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم + میں ہی تیرا کلام سنتا یہ کان کیوں سنیں۔ واقعی صاحب یہی حالت ہوتی ہے۔ حضرت عارف شیرازیؒ بھی اس مضمون کو فرماتے ہیں اور وہ تو قسم کھا رہے ہیں ؎

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود   کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے

(خدا کی قسم مجھے اپنی دونوں روشن آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ایسے حسین سے بھی میری نظر دور ہی رہتی)

آنکھوں پر بھی رشک آتا ہے سو وہ تو وقت ہی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی مٹانے کو جی چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی اپنا خادم خاص بھی اس وقت پاس کھڑا ہو تو وہ بھی پسند نہیں آتا اسی واسطے مؤدب خدام یہ کرتے ہیں کہ پاس کو تو لگے رہے لیکن اس طرح کہ اپنی موجودگی کی تو خبر نہ ہونے دی لیکن جب دیکھا کہ کوئی کام مخدوم کے قابو کا نہیں ہے فوراً حاضر ہو کر شریک ہو گئے اور بعد فراغت پھر غائب۔ چنانچہ اس خادم نے بھی ایسا ہی کیا کہ خفیہ طور پر حضرت غوث پاکؒ کے پیچھے پیچھے لگا رہا اِدھر حضرت نے کچھ توجہ بھی نہیں کی کہ میرے ساتھ کوئی اور شخص تو نہیں ہے، غرض حضرت اٹھ کر خانقاہ سے نکلکر سیدھے شہر پناہ کے پھاٹک پر پہونچے حضرت شیخ کی برکت اور کرامت سے شہر پناہ کا قفل خود بخود کھل کر گر گیا۔ حضرت کواڑ کھول کر شہر سے باہر ہو گئے چند ہی قدم چلے تھے کہ ایک بڑا بھاری شہر نظر پڑا۔ حالانکہ بغداد کے قریب کوئی اتنا بڑا شہر کہاں اب خادم کو بڑی حیرت کہ یا اللہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں لیکن بولے نہیں

چپ چاپ ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ اُس شہر کے اندر داخل ہو کر ایک مقام پر پہونچے۔ وہاں ایک مکان تھا اس کے اندر داخل ہوئے اس میں چند آدمیوں کا ایک مختصر سا مجمع تھا اور ایک مسند پر تکیہ لگا ہوا تھا جیسے کسی کی آمد کا انتظار ہو رہا ہو حضرت شیخ کو دیکھتے ہی وہ لوگ تعظیم کے لئے اُٹھے اور حضرت کو مسند پر بٹھایا پھر اشاروں سے کچھ عرض معروض کی جس کو حضرت ہی سمجھے خادم کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس کے بعد ایک طرف سے آواز کراہنے کی آئی آہ آہ۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ آواز بند ہو گئی، پھر کچھ دیر بعد ایسی آواز آنے لگی جیسے پانی ڈھلنے کی ہوتی ہے پھر وہ بند ہو گئی پھر تھوڑی دیر بعد ایک حجرہ کھلا اور اس کے اندر سے ایک جنازہ نکلا جس کے ہمراہ چند آدمی تھے ان میں ایک بوڑھے نورانی شکل کے بزرگ بھی تھے۔ حضرت شیخ کے سامنے جنازہ رکھا گیا حضرت نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر وہ لوگ جنازہ کو لے گئے۔ ادھر یہ لوگ جنھوں نے حضرت شیخ کا استقبال کیا تھا پھر آکر سب حضرت کے گرد بیٹھ گئے اور اسی طرح اشاروں میں دوبارہ پھر کچھ عرض کیا اس پر حضرت شیخ اسی وقت گردن جھکا کر مراقب ہوئے تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک زنار دار شخص عیسائی لباس پہنے ہوئے حاضر ہوا آپ نے اپنے دست مبارک سے اُس کا زنار توڑا اور کلمہ شریف پڑھا کر اس کو مسلمان کیا پھر حاضرین سے ارشاد فرمایا کہ یہ ہے پھر حضرت اس جگہ سے اپنے مکان پر لوٹ آئے۔ خادم کو اسی ادھیڑ بن میں اور حیرت میں صبح ہو گئی کہ اے اللہ کیا قصہ ہے۔ یہ حضرت کی خدمت میں کچھ سبق بھی پڑھتے تھے کیونکہ پہلے درویش اکثر عالم بھی ہوتے تھے تو چونکہ یہ خادم محض مرید نہ تھے بلکہ شاگرد بھی تھے اس لئے دل کھلا ہوا تھا کیونکہ یہ علاقہ شاگردی استادی کا بے تکلفی کا ہوتا ہے بخلاف پیری مریدی کے تعلق کے کہ اس میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوتی چنانچہ انھوں نے رات کے واقعہ کے متعلق دریافت کیا کہ حضرت یہ کیا معاملہ تھا مجھے اس قدر حیرت ہے کہ میرے حواس درست نہیں فرمایا کہ وہ شہر موصل تھا جو بغداد سے بہت دور ہے لیکن حق تعالٰے نے میرے لئے اُسے بالکل قریب کر دیا

اور طے ارض ہو گیا اور وہ مجمع جنھوں نے میرا استقبال کیا ابدال تھے اور ان ہی میں سے ایک ابدال قریب مرگ تھے جن کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ اور وہ بوڑھے نورانی شکل والے بزرگ جو جنازہ لے کر نکلے تھے وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے اس جماعت نے مجھ سے باطنی طور پر مجھ کو اطلاع دے کر دریافت کیا کہ اس کی جگہ کون ابدال مقرر کیا جائے میں نے حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی ارشاد ہوا کہ قسطنطنیہ کے گرجا میں اس وقت ایک نصرانی صلیب کو پوج رہا ہے اس کو کر دیا جائے چونکہ کافر تو کسی عہدہ باطنی پر ہو نہیں سکتا جیسا آجکل لوگ سمجھتے ہیں کہ چار چوڑھے بھی صاحب خدمت ہوتے ہیں کیا اللہ میاں کو خدمت کے لئے مسلمان نہیں ملتے جو چوڑھوں چماروں سے کام لیں۔ سبحان اللہ اچھی قدر کی ولایت کی خوب سمجھ لو کہ کافر ہر گز ولی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی کافر کو ولی کرنا بھی ہوتا ہے تو اول اس کو اسلام کی توفیق دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس نصرانی کے معاملہ میں بھی یہ ہی ہوا کہ قسطنطنیہ سے ایک دم میں زمین کی طنابیں کھینچکر اس کو حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچایا گیا اور حضرت شیخ کی توجہ کی برکت سے کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی وہ رتبہ ابدالیت پر پہنچ گیا، حالانکہ نہ کوئی مجاہدہ کیا نہ ریاضت اسی کو تو کہتے ہیں حضرت مسعود بک سے مرشد جو کامل ست چلہ شد شد نشد نشد + لیکن یہ محض شاذ و نادر ہے کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے ورنہ چکی ہی پیسنا پڑتی ہے جو کچھ ملتا ہے چکی ہی پیسنے سے ملتا ہے، خدا کے واسطے کہیں اس شاذ و نادر ہی پر نہ بیٹھ رہنا۔ شاذ و نادر پر بیٹھے رہنا تو ایسا ہے جیسے کوئی عورت اس بنا پر بے نکاح بیٹھی رہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے بھی تو بے مرد کے اولاد ہو گئی تھی یا کوئی مرد صاحب اس بھروسہ پر کسی عورت کو نکاح کے لئے تلاش نہ کریں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حضرت حوا علیہا السلام بدون عورت ہی پیدا ہو گئی تھیں میری پسلی سے ایک ہوا (چھوٹی ہ سے) نکل آئے گی یہ دونوں بالکل احمق ہیں۔ میاں خدا نے ایک دفعہ یوں بھی کر دیا کہ بلا نکاح کے

(پرنٹنگ محل کراچی)

عورت کو اولاد دے دی اور ایک مرتبہ یہ بھی قدرت دکھلادی کہ مرد کی پسلی سے عورت پیدا کر دی اب یہ تو نہیں کہ روز روز ایسا ہی ہوا کرے اور لوگ اس شاذ و نادر ہی کے منتظر بیٹھے رہیں نہ عورت مرد سے نکاح کرے نہ مرد عورت کی فکر کرے آجکل یہ عجیب واہیات ہے کہ طالبین شاذ و نادر پر بیٹھے رہتے ہیں کہ پیر ایک نظر کر دے گا تو بس بیڑا پار ہو جائیگا اور خود کچھ کرتے کراتے نہیں کیوں جی وہ تمہارے باوا کا نوکر تو ہے نہیں اگر نظر نہ کرے تو کیا کر لوگے یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے نیز اس کے قبضہ کی بھی تو بات نہیں اگر کسی کے اختیار میں ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کے قلب میں ضرور اسلام ڈال دیتے، بھائی بلا کام کئے بھی کہیں کامیابی ہوتی ہے اصل طریق تو یہی ہے کہ ؎

کارکن کار بگذار از گفتار کاندریں راہ کار باید کار

(کام کر بیکار باتیں چھوڑ اس طریق الفت میں صرف عمل ہے)

؎ قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(طریقت میں عمل کرنا چاہیئے نہ کہ دعویٰ کیونکہ دعویٰ بغیر عمل کے بے حقیقت ہے)

نری آرزوؤں اور ہوس سے کام نہیں چلتا اسی کو کہتے ہیں ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صدسال می تواں بہ تمنا گریستن

(عرفی اگر رونے سے وصال میسر آجائے تو اس کی تمنا میں سو سال تک رو سکتا ہوں)

تو کیا ہوتا ہے نری آرزوؤں اور تمناؤں سے کام تو کام کرنے ہی سے ہوتا ہے اور کام بھی ایسا جس میں کام ہی کو ثمرہ سمجھا جاوے گو اور کوئی ثمرہ نہ ملے جب کام اور ثمرہ ایک ہی چیز ہے تو بدون کام کئے ثمرہ کا حصول چہ معنی جب کام نہیں تو ثمرہ بھی نہیں کیونکہ ثمرہ تو وہی کام تھا۔ حضرت سرمد رحمتہ اللہ علیہ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد

(اے سرمد شکایت کو مختصر کر اور دو کاموں میں سے ایک کام کر)

ے یا تن بہ رضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

(یا تو بدن کو دوست کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف کردے۔ یا دوست سے قطع نظر کر)

ثمرات میں ناکامی کی شکایت کرنے والوں سے کہتے ہیں کہ میاں ان حکایات شکایات کے دفتر کو توطے کرو۔ زیادہ قیل وقال کی حاجت نہیں ہم تو ایک مختصر سی بات کہتے ہیں کہ بعض ان دو کاموں میں سے ایک کام کو اختیار کرلو۔ یا تو یہ کرو کہ جس بات میں محبوب حقیقی راضی ہو خواہ وہ ناکامی ہی کیوں نہ ہو اس پر راضی رہو یعنی کام ہی کو ثمرہ سمجھو کیونکہ یہ تسلیم و رضا جب ہی ہوسکتی ہے جبکہ عطائے حق کو کہ توفیق عمل ہے ثمرہ سمجھے اور اگر یہ پسند نہیں اور اس سے تم خفا ہوتے ہو تو بھائی سیدھی بات یہ ہے کہ پھر اپنے لیے کوئی دوسرا خدا ڈھونڈلو۔ اس خدا کو چھوڑ دو۔ یہ حضرت سرمد نے خوب دو ٹوک بات کہی واقعی یہ مجذوبوں والی ہی بات ٹھیک ہے کہ ے

یا تن بہ رضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

غرض کام ہی کو مقصود سمجھ کر اس میں لگا رہے کام کر کے بھی ثمرات کا انتظار نہ کرے نہ کہ بے کام کئے ثمرات کی توقع رکھے ایں خیال ست و محال ست و جنوں بہر حال کام کرنا چاہیئے کہ ثمرات بھی حسب سنۃ اللہ کام ہی سے ملتے ہیں۔ لیکن کبھی خدا تعالے اپنی یہ قدرت بھی دکھلا دیتے ہیں کہ بلا اسباب بھی مقصود پیدا کر دیتے ہیں چنانچہ اس آیت میں بھی اپنی ایسی ہی قدرت کا بیان فرماتے ہیں ارشاد ہوتا ہے فسوف یاتی اللہ یعنی تمہارے مرتد ہوجانے سے خدائی کام میں کچھ قطور واقع نہ ہوگا جیسے کوئی یہ غلط قیاس کرلے کہ ساری رعایا کے باغی ہوجانے سے سلطنت کا کام تو نہیں چل سکتا تو خدا کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو وہ کسی سے مجبور نہیں ان کی ذات قادر مطلق ہے دم میں جو چاہیں کردیں فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ عنقریب ایک ایسی قوم پیدا کردیں گے جس کی

شان ایسی ایسی ہوگی آگے اس کی حالت کا بیان ہے یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ الخ تو اس موقع پر جس قوم کا ذکر فرمایا ہے وہ قوم ظاہر ہے کہ بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہوگی اس واسطے کہ مقابلہ کے موقع پر سنا رہے ہیں کہ بجائے تمہارے ان کو تیار فرمادیں گے تو لازمی طور پر وہ قوم ایسی ہونی چاہیئے جو ہر طرح کامل اور اعلیٰ درجہ کی ہو تاکہ مرتد ہونے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے پھرنے ہٹنے سے کیا ہوا ہماری جگہ دوسری قوم ہم سے بھی بڑھ چڑھ کر اسلام میں داخل ہوگئی تو کیا اس قوم کا اعلیٰ درجہ کی صفات سے متصف ہونا خود سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ غرض جو صفات اس مقام پر مذکور ہوں گی وہ نہایت عظیم الشان اور قابل اعتبار ہوں گی۔ اب ان صفات کو سنئے کہ وہ کیا ہیں سب سے اول جو صفت بیان کی گئی وہ یہ ہے کہ یحبھم ویحبونھم یعنی خدا کو ان سے محبت ہوگی اور ان کو خدا سے دیکھئے حضرت سب سے پہلے حق تعالیٰ نے یہی صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ لوگ اہل محبت ہوں گے اس تقدیم ذکر سے صفت محبت کا سب سے زیادہ مہتم بالشان ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اسی سے میں نے استدلال کر کے یہ عرض کیا تھا کہ بس دین میں محبت ہی اساس ہے راس ہے جڑ ہے اصل ہے اور بنیاد ہے، جب یہ بات ہے تو اے صاحبو آپ نے کیا کوشش کی اپنے اندر محبت پیدا کرنے کی نمازی بھی ہوگئے روزہ دار بھی ہوگئے حاجی بھی ہوگئے مگر محبت جو اصل چیز ہے آخر اس کی بھی کچھ کوشش کی کچھ بھی نہیں کوشش تو کیا اور الٹا یہ کیا ہے کہ جو محبت والے ہیں ان پر ہنستے ہیں ان کو پاگل اور مجنوں اور نہ جانے کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں اور ان کی بھی بڑی کوتاہی ہوگی اگر وہ پاگل اور مجنوں کا لقب سن کر برا مانیں کچھ خبر بھی ہے یہ لقب تو بہت بڑا ہے، ارے یہ لقب تو ایسا لقب ہے کہ اس کو سن کر تمہیں خدا کا شکر کرنا چاہیئے نہ کہ برا مانو۔ کیونکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مخالف بھی تمہارے اعلیٰ درجہ کے محب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی شہادت دینے لگے بات یہ ہے کہ مخالف یہ لقب اسی کو دیتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کا محب ہو اور اس کا راز یہ ہے کہ جو شخص اعلیٰ درجہ کا محب

ہوتا ہے اس کے افعال عقل معاش اور دنیوی مصلحتوں کے خلاف ہونے لگتے ہیں اور یہی تو وجہ ہے کہ جو لوگ محض عقل معاش رکھتے ہیں وہی ایسے شخص کو مجنون اور بے وقوف کہتے ہیں اور یہ لقب بہت پرانا ہے، چنانچہ کلام مجید اس پر شاہد ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لاویں گے جیسا ایمان لائے ہیں یہ بے وقوف لوگ) دیکھئے حضرات صحابہ کو جو اعلیٰ درجہ کا ایمان رکھتے تھے منافقین نے نعوذ باللہ سفہا کا لقب دے رکھا تھا کیونکہ وہ حضرات اپنے سب اعزا و اقربا کو چھوڑ کر اور مال و متاع کو خیرباد کہہ کر ایمان لائے تھے جو بظاہر عقل معاش کے بالکل خلاف تھا اسی لئے منافقین کہتے تھے کہ ان کی عقل ماری گئی ہے کہ اپنا اتنا بڑا نقصان کر کے ایمان لائے ہیں یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لے آئے ہیں تو دیکھئے ان احمقوں نے حضرات صحابہ کو بھی نعوذ باللہ بیوقوف بتایا اس زمانہ میں بھی یہی حال ہے۔

ہمارے قصبہ میں ایک شخص نومسلم ہیں وہ پہلے بہت امیر کبیر گھرانے کے تھے جب وہ مسلمان ہو گئے تو ظاہر بات ہے کہ پھر ظالم لوگ بھلا وہ دولت و ثروت ان کو کہاں دیتے، بے چارے ہمارے بھائی کے یہاں دس بارہ روپیہ کے نوکر ہیں۔ یا تو خود صاحب جائداد تھے یا اب نوکری کرتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں، مگر جس جگہ نوکر ہیں وہاں پر ہیں بہت عزت اور آرام کے ساتھ جس جگہ کے رہنے والے ہیں وہاں ایک مرتبہ کسی کام سے ان کا جانا ہوا وہاں ان کے عزیز قریب سب ہی ہیں مگر اب ان سے کیا علاقہ لہٰذا وہ جا کر کسی موقع پر ٹھیر گئے ان کے عزیز قریب سب ملنے آئے اور اُن کی بڑی خاطر کی۔ وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ میں لیٹا ہوا تھا اور وہ لوگ بھی پاس بیٹھے تھے وہ سمجھے کہ یہ سو رہا ہے لیکن میں جاگ رہا تھا۔ ایک بولا کہ ارے سنا ہے یہ بڑے آرام میں ہے۔ ایک شیخ کے یہاں کارندہ ہے اس کی بہت بڑی حویلی ہے نوکر چاکر

گائیں بھینسیں سبھی کچھ ہے اور یہ سب پر حکومت کرتا ہے، بڑی عزت ہے بڑے مزہ میں ہے۔ دوسرا بولا کہ بھائی سب کچھ سہی مگر اس نے کی بہت کھوٹی بات (یعنی بری بات) کہ اپنے عزیز قریب، بیوی بچے سب چھوڑ دیئے اور مسلمان ہو گیا۔ لیجئے یہ ان کو لقب ملا۔ تو سمجھنے کی بات ہے کہ باپ بھائی جائیداد۔ بیوی سب کو چھوڑ دینا آسان کام نہیں ان کی پہلی بیوی مسلمان نہیں ہوئی وہ اب بھی موجود ہے اور اب بھی کبھی کبھی جب ساس نندوں سے پریشان ہوتی ہے ان سے کہلا بھیجتی ہے کہ تم میری مدد نہیں کرتے۔ اب بھی اتنا ناز ہے۔ بہر حال انھیں بیوقوف اس بنا پر قرار دیا کہ عزیز قریب سب کو چھوڑ دیا اور ایمان کے مقابلہ میں کسی چیز کی پروانہ کی تو صاحب یہ شان ہوتی ہے اعلیٰ درجہ کے محب کی اور یہ لقب اس کو ملتے ہیں اور لیجئے سب سے بڑھ کر عاقل سید العقلاء حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کفار نعوذ باللہ مجنون کہتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جا بجا ان کے یہ اقوال موجود ہیں أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ پارہ ۱۸ ترجمہ (یا یہ لوگ آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں) وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ پ ۲۹ ترجمہ (اور کہتے ہیں کہ یہ (محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) مجنون ہیں (معاذ اللہ) اور خدا تعالےٰ نے اس کی نفی فرمائی ہے۔ مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ پ ۲۹ (آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں) گو یہ احتمال بھی ہے کہ اور کچھ تو بن نہ پڑتا تھا محض جل کر یہ کہہ دیتے ہوں کوئی اور منشاء نہ ہو اس قول کا مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے۔ چنانچہ شاعر اور ساحر بھی تو کہتے تھے تو وہ لوگ یہ تینوں لقب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اطلاق کرتے تھے یعنی شاعر، ساحر اور مجنون۔ اور شاعر اور ساحر کا منشاء ہمیں معلوم ہے چنانچہ میں ابھی عرض کردوں گا جب دو کا منشاء معلوم ہے تو ظاہر یہ ہے کہ تیسرے لقب کا منشاء بھی ضرور ہو گا۔ شاعر اور ساحر کہنے کا منشاء سنئے وہ ایسا ہے جیسا کسی نے کہا ہے معشوق من آنست کہ نزدیک تو زشت است۔ شاعر اور ساحر اس لئے کہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک میں ایسا اثر تھا کہ جب کفار سنتے تھے تو ان کے خیالات میں عظیم الشان تبدیلی واقع ہو جاتی تھی، پس طرز بیان کی تاثیر کو تو شاعری اور

مضمون کی تاثیر کو ساحری کہتے تھے اسی لئے کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہ سنیں چنانچہ ڈرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو ان کا کلام مت سنو لَاتَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ خبردار قرآن مت سُننا بس اس کا سُننا ہی غضب ہے وَالْغَوْا فِیْهِ اور اگر وہ پڑھنے ہی لگیں تو تم شور و غل مچانا گھپڑ سپڑ کرنا شروع کر دو لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ شاید اسی سے جیت جاؤ (اس طرح سے کہ وہ مجبور ہو کر خاموش ہو جائیں) یہ تہذیب تھی ماشاء اللہ۔ غرض وہ بہت ہی ڈرتے تھے کہ یہ تو شاعر اور ساحر ہیں ان کا کلام سنا نہیں اور اثر ہوا نہیں بس اسی واسطے شاعر اور ساحر کہتے تھے غرض کلام کے قوت تاثیر اس کا منشا تھا۔ اسی طرح مجنون جو کہتے تھے تو اس کا بھی ایک منشا تھا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کے مقابلہ میں ساری دنیا کی مصلحتوں کو چھوڑ دیا یعنی ان بے وقوفوں کے نزدیک نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عقل کے خلاف بات کی۔ چنانچہ سب نے مل کر ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک سفیر بھیجا جو حاضر ہو کر آپ کی خدمت میں منافع و مصالح پیش کرے اس نے آکر عرض کیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ سردار بننا چاہتے ہیں تو ہم لوگ سب آپ کو بخوشی اپنا سردار بنالیں کیونکہ آپ نہایت شریف النسب ہیں۔ آپ جس قبیلہ میں پیدا ہوئے وہ حسبُ نسب میں سب سے بڑھ کر ہے ان کو اپنا سردار بنا لینے میں ہم کو کوئی عار نہیں، مگر ہمارے بتوں کو بُرا نہ کہئے۔ اگر آپ عورتیں چاہتے ہیں تو قریش کی ساری لڑکیاں حاضر ہیں ایک سے ایک حسین موجود ہے جتنی چاہیں پسند کر لیجئے اپنی بہنیں اور لڑکیاں آپ کے نکاح میں دینا ہمارے لئے فخر ہے بلکہ انھیں خود آپ کی لونڈیاں بننا باعث عزت ہے۔ اور اگر مال کی خواہش ہے تو ہم ابھی ایک بڑا خزانہ آپ کے لئے فراہم کر دیں بس آپ قرار اور سکون سے بیٹھے رہیئے اور ہمارے بتوں کو برا کہنا چھوڑ دیجئے۔ جب سفیر یہ سب باتیں کہہ چکا تو آپ نے بجائے جواب کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۂ حٰم سجدہ کا شروع کا حصہ تلاوت

فرمایا حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ الی آخر الآیات (یہ کلام رحمٰن۔ رحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی ہے ایسے لوگوں کے لئے ہے جو دانشمند ہیں بشارت دینے والا ہے ڈرانے والا ہے سو اکثر لوگوں نے روگردانی کی پھر وہ سنتے ہی نہیں)

اور اس کی یہ حالت تھی کہ بالکل ساکت اور صامت تھا جیسے کہ نقش دیوار۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھتے پڑھتے یہ آیت تلاوت فرمائی فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ (پھر اگر یہ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد و ثمود پر آئی تھی) تو گھبرا کر کہنے لگا بس کیجئے بس کیجئے، اب سننے کی تاب نہیں اس قدر اثر ہوا کہ سنا نہیں گیا اور اٹھ کر بھاگا اور بھاگ کر اپنے ساتھیوں میں پہنچا جنھوں نے اُسے بھیجا تھا یعنی ابوجہل وغیرہ وہ سب منتظر بیٹھے تھے ابوجہل بڑا ذہین تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ کر تاڑ لیا کہا کہ بھائی یہ گیا تو تھا اور چہرہ سے اور آرہا ہے اور چہرہ سے ایسا شریر تھا کہ دور ہی سے پہچان گیا کہ ارے یہ تو کچھ ڈھیلے ڈھیلے گھٹنوں سے آرہا ہے اس کے چہرہ کا تو کچھ رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ گیا تھا اور چہرہ سے آرہا ہے اور چہرہ سے جب پاس پہنچا تو سب نے پوچھا کہ ارے یار کہہ تو سہی کیا گذری۔ اس نے کہا اجی کیا پوچھتے ہو جب میں سب باتیں پیش کر چکا تو انھوں نے ایک ایسا کلام پڑھا کہ واللہ اگر میں وہاں تھوڑی دیر اور بیٹھا رہتا تو سخت اندیشہ تھا کہ کوئی بجلی میرے اوپر آگرتی کیا پوچھتے ہو کیا کیفیت تھی اثر کی جب انھوں نے یہ کہا کہ میں تم کو ایک ایسی کڑک سے ڈراتا ہوں جیسی کہ عاد اور ثمود پر گرائی گئی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس اب بجلی گری خدا جانے کیا کلام تھا اور کس غضب کا اس میں اثر تھا واللہ اگر اور تھوڑی دیر بیٹھوں اور سنوں تو بجز اس کے کہ مسلمان ہو جاؤں اور کوئی صورت نہ تھی مشکل سے اپنا پیچھا چھڑا کر آیا ہوں۔ تو یہ حال تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اثر کا چونکہ وہ لوگ

رات دن دیکھتے تھے کہ یہ الٹ پلٹ کر دیتے ہیں ایک جلسہ تمام قوموں کو (قوموں جمع ہے قوم کی بمناسبت مقابلہ لفظ جلسہ جامع ۱۲) اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ شاعر اور ساحر کہتے تھے جب اس قوم نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری مل رہی ہے وہ نہیں لیتے اونٹ مل رہے وہ نہیں لیتے، مال مل رہا ہے تو وہ نہیں لیتے حسین حسین عورتیں مل رہی ہیں وہ نہیں لیتے تو وہ نامعقول سمجھے بھلا یہ کونسی عقل کی بات ہے جب دنیا کی ساری نعمتیں مل رہی ہیں تو پھر خوامخواہ انکار ہے عقل کی بات تو یہ ہے کہ میاں جب اتنا چندہ اور روپے مل رہے ہیں تو لے لو کام آ دیں گے۔ احمقوں نے اپنے اوپر قیاس کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ ایک مقام پر میری ایک انگریز سے جو کہ جنٹ تھا اس کی خواہش پر ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو میں اس نے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے میں نے کہا ہاں صاحب لکھی ہے تو آپ کیا کہتے ہیں آپ کو کتنا روپیہ ملا' میں نے دل میں کہا کہ واہ دالبس یہ ہے آپ کا مبلغ پرواز اور مطمح نظر۔ جب میں نے کہا کچھ بھی نہیں ملا تو بڑے تعجب سے پوچھا کہ آپ نے اتنی بڑی کتاب لکھی اور کچھ بھی نہیں ملا تو پھر کیا فائدہ ہوا اتنی محنت ہی پھر کیوں کی۔ اس کے نزدیک جسے روپیہ نہ ملے وہ کوئی دین کا کام ہی نہ کرے۔ خیر میں نے اسی کے مذاق کے موافق اسے سمجھایا میں نے کہا کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ علاوہ اس زندگی کے ہم مسلمانوں کے اعتقاد کے موافق ایک دوسری زندگی بھی ہے جس کو ہم لوگ آخرت کہتے ہیں وہاں ایسے کاموں کا عوض ملنے کی ہمیں توقع ہے اور دوسرا فائدہ دنیا کا بھی ہے وہ یہ کہ میں نے جو تفسیر لکھی ہے اپنے بھائی مسلمانوں کے فائدہ کے لئے لکھی ہے اور یہ ایک قومی خدمت ہے جب میں اس تفسیر کو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں دیکھتا ہوں تو مجھے اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ میری قوم کو اس سے نفع پہونچ رہا ہے چونکہ یہ تقریر اس کے مذاق کے موافق تھی اس کو سن کر اس کی نظر میں میری بڑی وقعت ہوئی۔ تو جو روپیہ پیسے اور جاہ کو مقصود سمجھے گا تو وہ ضرور ایسے شخص کو کہیگا کہ یہ بڑا بے وقوف ہے کہ اس نے محض دین کیلئے اپنا جاہ و مال سب برباد کر دیا۔ ہمارے ایک دوست نے ناجائز ہونے کی بنا پر ڈپٹی کلکٹری چھوڑ دی ہے (یہ واقعہ ضابط واعظ کا ہے) تو اب سب لوگ انھیں لتاڑتے ہیں کہ عقل ہی ماری گئی ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہاری ہی عقل ماری گئی ہے جو اس کو خلاف عقل کہتے ہو ع اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد جو لوگ جاہ اور مال ہی کو مقصود سمجھتے ہیں اور جنھوں نے فقط دنیا ہی کو اپنا قبلہ توجہ بنا رکھا ہے

ایسوں پر ہنستے ہیں لیکن اگر وہ ہم پر ہنستے ہیں تو ہم ان پر ہنستے ہیں فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو) حضرت نوح علی نبیا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب حسب ارشاد خداوندی کشتی بنائی تو ان کی قوم ان پر ہنستی تھی۔ کوئی پوچھتا کہ کشتی کیوں بنائی جا رہی ہے آپ فرماتے ایک بڑا سخت طوفان آنیوالا ہے اس وقت یہ کام آویگی۔ لوگ یہ سن کر کہتے کہ قحط تو پڑ رہا ہے آپ کو طوفان کی سوجھ رہی ہے لوگ ان پر ہنستے کہ بس نبوت تو ختم ہوئی اب نجاری شروع کی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نہایت متانت سے فرماتے ہیں اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو سو ابھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا اور اس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے) تم اس وقت ہم پر ہنستے ہو ہم اس وقت تم پر ہنسیں گے اس میں تو دونوں برابر۔ کل فرق معلوم ہوگا کہ کس پر عذاب آتا ہے اور کون ذلیل ہوتا ہے تو لوگ احمق ہوئے ہیں جو ایسوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ تھے حضرت محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی قصبہ رامپور کے ایک رئیس کے بیٹے ان کے مرید ہو گئے یعنی حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان دونوں بزرگوں کی خدمت میں آنے جانے لگے ان کے فیض صحبت سے ان کی حالت بدل گئی دنیا کی طرف سے بے رغبتی اور آخرت کی جانب رغبت پیدا ہو گئی ان کے باپ کے پاس ایک دفعہ کچھ گنوار آئے اور کہنے لگے کہ تمہارے (یعنی تمہارے) بیٹے کا بڑا افسوس ہے فقیر ہو گیا وہ بولے خیر بھائی۔ تو ایک گنوار کیا کہتا ہے اجی بری صحبت ایسی ہی ہو ہے (یعنی ہوتی ہے) جبھی تو بڑے بوڑھے بری صحبت سے منع کریں ہیں (کرتے ہیں) دیکھو نہ۔ بگڑ گیا فقیر ہو گیا تو گویا بیوقوف نے دینداروں کی صحبت کو بری صحبت سمجھا۔ استغفر اللہ۔ ان ہی حضرت حافظ صاحب کا ایک اور واقعہ ہے کوئی نوجوان شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اس کی حالت بدلنے لگی ایک بار اس کا باپ حاضر ہو کر نہایت بے باکی سے کہنے لگا کہ جب میرا بیٹا آپ کے پاس آنے لگا بگڑ گیا۔ حضرت تھے بڑے جلالی فرمایا اپنے بیٹے کو ہمارے پاس نہ آنے دو روک دو ہمارے پاس

جو کوئی آئے گا ہم تو اسے بگاڑیں ہی گے۔ جس کو لاکھ مرتبہ غرض ہو اور بگڑنا چاہے وہ ہمارے پاس آئے ہمیں تو بگاڑنا ہی آتا ہے ہمیں بھی تو کسی نے بگاڑا ہی ہے ہمنے تو اپنے پیر سے بگڑنا ہی سیکھا ہے اجی جو بگڑنے سے ڈرے وہ ہمارے پاس آوے ہی کیوں ایسے کے پاس جائے جسے سنوارنا آتا ہو ہمیں تو بگاڑنا ہی آتا ہے۔ اللہ اکبر ایک شخص کی جیب میں کوڑیاں تھیں اس نے ان کو نکال کر پھینکدیا اور ان کی جگہ اشرفیاں بھرلیں تو کیا وہ بیوقوف ہے وہ ہرگز بے وقوف نہیں البتہ جو لوگ اشرفیوں کی قیمت سے واقف نہیں وہ کوڑیاں پھینکتے وقت اُسے ضرور بُرا بھلا کہیں گے کہ لو جی بھری ہوئی جیب ہی خالی کردی ارے تمہیں کیا خبر اس نے کوڑیوں سے جیب خالی کر کے اشرفیوں کے لئے جگہ کی ہے اگر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ موجود ہے اس سے کوئی کیمیا سکھانے والا کہے کہ مجھے ایک لاکھ روپیہ دیدو میں کیمیا بنانا سکھادوں گا اور وہ وعدہ کرنے والا نہایت معتبر ہو تو وہ فوراً لاکھ روپیہ دیدے گا۔ پھر اس نے ایک لاکھ روپیہ لے کر کیمیا سکھلادی تو اب وہ سیکھنے والا اس قدر خوش ہے کہ پھولا نہیں سماتا اُسے اسکا مطلق افسوس نہیں کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کیوں دیدیا بلکہ وہ زبانِ حال سے کہتا ہے ؎

جمادے چند دادم جاں خریدم ۔ بحمداللہ عجب ارزاں خریدم

مگر اس کا پڑوسی جو کیمیا کا قائل اور اس فن کو جانتا نہیں وہ اسے بیوقوف بناتا ہے کہ میاں تم بھی بڑے احمق ہو ایک لاکھ روپیہ یوں ہی دیدیا اتنی بڑی رقم فضول ہی ضائع کردی جب وہ کہتا ہے کہ بھائی میں نے یہ رقم ضائع نہیں کی بلکہ اس کے بدلے کیمیا بنانا سیکھ لیا ہے تو کہتا ہے جاؤ میاں بیٹھو بھی۔ بیوقوف ہوئے ہو کیسی کیمیا۔ لاکھ روپیہ دے دیا ایک وہمی اور فضول سی چیز کیمیا کے لئے یہ حضرت صرف لاکھ روپے کو رو رہے ہیں مگر وہ ایک ہی دن میں لاکھ روپیہ بنالے گا۔ بلکہ جسے کیمیا بنانا آتا ہے وہ دل کا اس قدر غنی ہو جاتا ہے کہ اسے بنانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی وہ ہر وقت مطمئن ہے کہ جب چاہوں گا اور جتنا چاہونگا لاکھ دو لاکھ بنالوں گا۔ تمہیں کیا خبر کہ جس نے مال اور جاہ کو چھوڑا ہے اسے کیا کیمیا مل گئی ہے ؎

کیمیائیست عجب بندگیٔ پیر مغاں ۔ خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

(مرشد کی تابعداری عجیب کیمیا ہے کہ مجھ کو اس کے پاؤں کی خاک بننے سے بڑے درجے ملے)

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند — واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند
(کل صبح کے وقت مجھ کو غصہ سے نجات دی گویا اندھیری میں مجھ کو آب حیات بخشی)
یہ ہے وہ کیمیا اور وہ دولت جو حاصل ہوتی ہے اور جس کے حصول کے بعد جوش میں آکر یہ کہتے ہیں ؎
دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند — واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند
دوسروں کو کیا خبر اس دولت کی اندھے مادر زاد کو کیا خبر کہ نظر کسے کہتے ہیں اور روشنی کیسی ہوتی ہے عنین کیا جانے کہ نکاح میں کیا مزہ ہے اور منکوحہ کیسی قابل قدر چیز ہے اسی طرح جن کی باطنی آنکھیں پٹ ہیں وہ باطنی دولت کی حقیقت کیا سمجھیں وہ تو ظاہری جاہ و مال چھوڑنے والوں کو بیوقوف ہی بتاویں گے کہ لو صاحب روپیہ پیسہ ملتا تھا نہیں لیا سرداری مل رہی تھی نہیں قبول کی۔ اب دیکھئے کہ کس کی حالت تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی۔ تو اعلیٰ درجہ کی حالت یہ ہے کہ عقلاء زمانہ بیوقوف کہا کریں اور دیوانہ سمجھا کریں یہ تو بڑے فخر کی بات ہے ایسی دیوانگی تو مطلوب ہے یہ دیوانگی تو وہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے ؎
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد — مرعس را دید در خانہ نہ شد
اور ؎ ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم — مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم
اور حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎
اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی — بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں — شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی
بلکہ اگر وہ جنون کم ہو جائے تو غم ہوتا ہے اور جب وہ پھر عود کرتا ہے تو خوش ہو کر فرماتے ہیں ؎
باز دیوانہ شدم من اے طبیب — باز سودائی شدم من اے حبیب
باز آمد آب من در جوئے من — باز آمد یار من در کوئے من
خوش ہوتے ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں کہ دیوانگی پھر آگئی اور عقل کو یوں خطاب کرتے ہیں ؎
آزمودم عقل دور اندیش را — بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

تو یہ حالت ہوتی ہے۔ تو حالت مطلوب کیا ہوئی یہ ہوئی کہ طلب میں ایسی حالت ہو جائے کہ لوگ دیوانہ سمجھنے لگیں۔ حدیث میں بھی تو آتا ہے حصن حصین میں ہے۔ اذکروا اللہ حتی یقولوا انہ لمجنون اللہ تعالیٰ کی اتنی یاد کرو کہ لوگ تم کو پاگل کہنے لگیں اور واقعی ایسی حالت ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ تھے وہ خط بنوا رہے تھے مگر زبان سے ذکر اللہ جاری تھا۔ نائی نے لبیں لیتے وقت عرض کیا کہ حضور تھوڑی سی دیر کے لئے خاموش ہو جائیں ورنہ ہونٹ کٹ جائے گا آپ نے فرمایا کہ اگر ہونٹ کٹ جائیگا تو کیا ڈر ہے پھر جوڑ جائیگا لیکن اگر اللہ کی یاد کو میں نے منقطع کر دیا تو جو سانس غفلت میں گذرے گا اس کا کوئی تدارک نہیں بس میں اپنا کام کروں تم اپنا کام کرو۔ اگر ہونٹ کٹتے ہیں کٹنے دو چاہے سارے ہی کٹ جائیں میں ذکر کو منقطع نہ کروں گا۔ ہائے مولانا نے بھی ایک ایسی ہی حکایت لکھی ہے ؎

زاہدے را گفت یارے در عمل　　کم گری تا چشم را نا ید خلل

ایک زاہد تھے جو رویا بہت کرتے تھے ان کے ایک رفیق طریق نے کہا کم رویا کرو ورنہ آنکھیں خراب ہو جائیں گی ؎

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال　　چشم بیند یا نہ بیند آں جمال

زاہد نے کہا کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ کہ آنکھیں وہ جمال دیکھیں گی یا نہ دیکھیں گی ؎

گر بہ بیند نور حق خود چہ غم است　　در وصال حق دو دیدہ کے کم است

اگر ان آنکھوں سے میں نے جمال حق دیکھ لیا تو پھر ان آنکھوں کے نہ رہنے کا کیا غم یہ دو آنکھیں کیا ایسی ایسی لاکھوں آنکھیں بھی ہوں تو اس جمال پر نثار ہیں ؎

ور نہ بیند نور حق را گو برو　　ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

اور اگر اس جمال کو نہ دیکھا تو ایسی کمبخت آنکھوں کا پھوٹ جانا ہی بہتر ہے وہ آنکھ ہی کیا جس کو وہ جمال دکھائی نہ دے اور وہ کان ہی کیا جس کو وہ خطاب نہ سنائی دے ایسی آنکھ اور ایسے کان ہی کو میں کیا کروں گا۔ حضرت یہ لوگ آنکھ کو کان کو جان کو مال کو

سب کو محبت حق میں فنا کر دیتے ہیں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے ۔۔۔ تیری ہستی کی رنگ و بو نہ رہے

جتنا تعلق ذات حق سے بڑھتا جاتا ہے اور سب کو فنا کرتے جاتے ہیں تو ایسوں کو لوگ بیوقوف تو بتاویں ہی گے کہیں گے اچھے متقی ہوئے ہونٹ ہی کٹا بیٹھے اور کرد اللہ اللہ کوئی ان سے کہے کہ میاں تمہیں کیا ہونٹ کٹے تو ان کے کٹے تم سے تو شکایت نہیں۔ ایک بزرگ صرف ستو ہی گھول کر پی لیتے کہ کھانا کھانے میں دیر لگتی ہے۔ حرج بہت ہوتا ہے ستو گھولا اور جلدی سے ایک گھونٹ پی لیا پھر اپنے اللہ کی یاد میں لگ گئے ان کی غذا تو بس یہ ہے۔ ایسے شخص کو ظاہر ہے کہ لوگ بیوقوف ہی کہیں گے چونکہ ہر وقت توجہ حق کی طرف رہتی ہے ایک استغراق کا سا عالم طاری رہتا ہے اور جب توجہ ہی کسی اور طرف نہیں تو بہت سی باتوں میں بھول ہو جاتی ہے محبوب حقیقی کے سوا انھیں اور کچھ یاد ہی نہیں رہتا بقول (احقر جامع ۱۲) ؎

گشتۂ حیرت کوئی مجھ سا بھی نہیں ہے ۔۔۔ میں خود ہوں کہیں دل ہے کہیں ہوش کہیں ہے

؎ ہمیشہ رہتا ہوں اک بیخودی کے عالم میں ۔۔۔ جہاں نہ میرے لئے ہے نہ میں جہاں کے لئے

تو ایسے شخص کو اہل دنیا پاگل نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ میں نے اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے خود سنا ہے مولانا علاوہ زبردست عالم ہونے کے بڑے درویش اور صاحب باطن شیخ تھے فرماتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ خط لکھ کر آخر میں دستخط کرنا چاہے تو اپنا نام ہی بھول گیا بہت یاد کیا مگر یاد ہی نہ آیا۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے استغراق کا کہ اپنا نام ہی یاد نہ رہا ایسا حیرت ناک واقعہ ہے کہ اگر میں نے خود حضرت سے نہ سنا ہوتا تو باور آنا بھی مشکل تھا۔ حضرات صحابہ میں بھی اس رنگ کے ایک بزرگ گذرے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن آپ کی صاحبزادی صاحبہ بھی ساتھ جا رہی تھیں لوگوں نے پوچھا یہ لڑکی آپ کی ہے تو آپ بہت غور سے اس کو دیکھ کر فرماتے ہیں کہ ہاں گھر والے کہتے تو تھے کہ یہ میری لڑکی ہے۔ یعنی یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میری لڑکی ہے، گھر والوں کے قول سے استدلال کیا۔

میں نے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ کی زیارت کی ان کا بھی یہی رنگ تھا۔ ایک بار مولانا کے پوتے کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ مجمع کو دیکھ کر پوچھا کہ ارے بھائی یہ لوگ کیوں جمع ہیں عرض کر دیا گیا کہ حضرت کے پوتے کا نکاح ہے فرمایا اچھا ان کا نکاح ہے تھوڑی دیر بعد پھر فرماتے ہیں ارے بھائی یہ لوگ کیوں جمع ہیں پھر عرض کر دیا گیا کہ پوتے صاحب کا نکاح ہے فرمانے لگے ہاں میاں ہاں ابھی تو تم نے کہا تھا کہ نکاح ہے ہم بھول ہی گئے تمہارا کیا قصور ہے ہمارا ہی یاد خراب ہے، یاد ہی نہیں رہتا پھر تھوڑی دیر بعد وہی سوال کیا کہ میاں یہ کیا ہو رہا ہے یہ لوگ کس لئے جمع ہوئے ہیں۔ پھر کہہ دیا گیا کہ حضرت نکاح ہے فرمایا ارے بھائی ہم تو بھول بھول جاتے ہیں کیا کریں۔ اب ہم پوچھیں بھی تو مت بتلانا کوئی کہاں تک بتلائے۔ اجی ہوگا ہمیں پوچھنے ہی کی کیا ضرورت ہے حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کا حال حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس قدر استغراق تھا کہ ہمیشہ تو نماز جماعت سے جامع مسجد میں پڑھتے تھے لیکن راستہ عمر بھر بھی یاد نہ ہوا یہ کیفیت تھی استغراق کی کہ حضرت کے ایک خادم تھے بختیار وہ آگے آگے چلتے اور حق حق کہتے جاتے بس اس آواز پر چلتے جاتے اور مسجد تک پہنچ جاتے کیا ٹھکانا ہے استغراق کا کہ تیس برس تک ایک ہی مسجد میں نماز پڑھی مگر راستہ ہی یاد نہ ہوا اس قدر تو استغراق تھا مگر اتباع سنت کا یہ حال تھا کہ کسی ادنیٰ سنت کو بھی کبھی ترک نہیں کیا۔ غرض تیس برس تک نماز باجماعت جامع مسجد میں ادا کی لیکن پھر بھی راستہ یاد نہ ہوا وجہ یہ کہ ایک دل میں دو چیزیں نہیں سما سکتیں اہل اللہ کے قلب میں ایک ایسی چیز بس گئی ہے کہ کسی دوسری چیز کی اس میں گنجائش ہی نہیں رہی حضرت ایسوں کو عقلاء مجنون نہ کہیں تو کیا کہیں جنھیں نہ راستہ یاد نہ اولاد یاد نہ خادم یاد۔ عقلاء تو ایسوں کے بارے میں یہی کہیں گے کہ معلوم ہوتا ہے دماغ میں خلل ہے ارے نادانو تمہارے ہی دماغ میں خلل ہے۔ جو چیز ان کے اندر ہے اگر تمہارے اندر ہو تو کلیجہ پھٹ جائے (بقول احقر جامع ؎

درد یہ اور کو ملتا تو وہ مر ہی جاتا ؛؛ کر کے نالے بھی مجھے ناز شکیبائی ہے)

یہ ان کی دماغ ہی کی توصحت و قوت ہے اس قدر ضبط ہے چنانچہ حضرت مخدوم عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ باوجود اس قدر مغلوب الحال ہونے کے فرماتے ہیں۔ منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بہ فریاد آمد اینجا مردانند کہ دریا ہا فرو برند و آروغ نزنند۔ ہم کو تو نقل کرتے بھی جھجک ہوتی ہے لیکن ان کو حق حاصل ہے فرماتے ہیں۔ منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ میں شور مچانے لگا یہاں مرد ہیں کہ سمندر کے سمندر چڑھا جائیں اور ڈکار نہ لیں۔ (بقول جامع)

کر چکے رندی بس اے مجذوب تم ایک چلّو میں یہ حالت ہو گئی

تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر ایک ایسی چیز تھی جس کو منصور بھی ضبط نہ کر سکے جب منصور سے وہ چیز ضبط نہ ہو سکی تو اوروں سے تو کیا ہو سکتی ہے ایسی چیز جس کے اندر ہو کیا اسے جامع مسجد کا راستہ یاد رہ سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی استقامت ایسی تھی کہ نماز تو نماز جماعت بھی کبھی نہ چھوٹی یہ تھا اتباع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس اتباع ہی کی برکت سے اس درجہ تک پہنچے اور یہ رتبہ پایا اور اتباع میں ایسی برکت ہونے کا ایک راز ہے جس کے متعلق پہلے ایک حکایت سن لیجئے۔ قنوج میں ایک وکیل ہیں شیخ محمد عالم وہ خود مجھ سے اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی اور بستی میں جا رہا تھا راستہ میں ایک مکان کی دہلیز میں سے ایک بڑی بی کی آواز آئی۔ انھوں نے مجکو بلا کر بڑی محبت سے میرے سر پر اور میری کمر پر ہاتھ پھیرا اور پیار کیا اور بٹھلا کر میرے لئے حلوا تیار کیا اور کہا کہ اگر کبھی تمہارا آنا ہوا کرے تو میرے پاس ہو کر جایا کرو۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بڑھیا سے نہ میری جان نہ پہچان یہ کیوں ایسی محبت سے پیش آ رہی ہے۔ آخر میں نے پوچھا کہ بڑی بی تم میری کیوں اتنی خاطر کر رہی ہو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا کہ تمہاری شکل کا ایک میرا بیٹا ہے وہ بہت دن سے پردیس میں ہے اس کی ایسی ہی شکل ہے جیسی تمہاری تمہیں دیکھ کر مجھے وہ یاد آگیا اور اس کی سی شکل ہونے کی وجہ سے مجھے تم سے محبت ہو گئی تم میرے بیٹے کی شکل ہو اس لئے تم پر پیار آگیا۔ یہ ایک مثال ہے اسی طرح حق تعالےٰ کے محبوب جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جو شخص آپ کی سی ہیئت بناتا ہے اس پر خدا

خدا لی کو محبت اور پیار آتا ہے کہ یہ میرے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہمشکل ہے۔ یہ راز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں خاص برکت کا اور یہ ایسا طریق ہے وصول کا جو سب سے زیادہ نزدیک ہے اس کو جو اختیار کرے گا وہ بہت جلد پہونچے گا اور وہ بہت جلد کامیاب ہوگا ورنہ ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید

کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

(رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کرنیوالا آدمی کبھی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتا)

مپندار سعدی کہ راہ صفا

تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(سعدی یہ مت خیال کر کہ سیدھا راستہ بغیر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طے ہو سکتا ہے)

بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے کچھ نہیں ہو سکتا خود حق تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ کہدیجئے یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو خدا کو تم سے محبت ہو جائے گی۔

ظاہری نسق کلام کا یہ مقتضا تھا کہ یوں فرماتے کہ تم کو خدا سے محبت ہوجائیگی یوں نہیں فرمایا، گویا اس طرف اشارہ ہے کہ تم تو کیا خدا سے محبت کرتے تمہارا تو کیا منہ ہے ہاں خدا ہی کو تم سے محبت ہو جائے گی اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو گے۔ اللہ اکبر ہم اگر چاہتے اور کوشش کرتے کہ ہم سے خدا کو محبت ہو جائے تو قیامت تک بھی یہ دولت نصیب نہ ہو پاتی کیوں کہ کہاں ممکن کہاں واجب چہ نسبت خاک را با عالم پاک لیکن اتنا بڑا رتبہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے حاصل ہو جاتا ہے۔ تو صاحبو بڑی چیز یہ ہے یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع۔ حضرت شیخ عبد الحق ردولوی کو بھی اتنا بڑا رتبہ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم ہی کے اتباع سے حاصل ہوا تھا چنانچہ آپ سے کبھی کوئی سنت ترک نہ ہوتی تھی مگر استغراق اتنا رہتا تھا کہ تیس برس تک جامع مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے جاتے آتے رہے لیکن راستہ یاد نہ ہوا تو ایسا استغراق تھا۔ ایک دن ردولی سے باہر دور ایک ندی کے کنارے جا رہے تھے یہ جگہ بہت پسند آئی فرمایا یہ تو بڑے لطف کی جگہ ہے اب یہیں رہا کریں گے بختیار خادم تھے عاشق عرض کیا بہت بہتر اور دونوں وہیں رہنے لگے بہت زمانہ کے بعد ایک دن کچھ افاقہ ہوا تو دفعتہً دریا پر نظر پڑی خادم سے فرمایا کہ ارے میاں ردولی میں تو پہلے کوئی دریا نہ تھا اب یہاں دریا بھی بہنے لگا سیر و تفریح کی جگہ ہوگئی خادم نے عرض کیا کہ حضرت یہ ردولی کہاں ہے یہ تو فلانے مقام کا دریا ہے ردولی سے آئے ہوئے تو حضور کو بہت دن ہوگئے۔ تب فرمایا کہ اگر یہ ردولی نہیں ہے تو چلو بھائی یہاں سے گھر سے بے گھر ہونا ٹھیک نہیں لیجئے یہ بھی خبر نہیں کہ یہ ردولی ہے یا کوئی اور مقام ایسے شخص کو عقلاءِ زمانہ لیکن جہلاءِ آخرت کیا پاگل نہ کہیں گے۔ مگر مقبول ہے یہ لقب اور مطلوب ہے یہ حالت اس واسطے کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی کہا گیا ہے جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں۔ اور اولیاء اللہ کو بھی یہی کہا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ کفار اہل ایمان کو ذلیل سمجھ کر اُن پر ہنستے ہیں اور ان کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں لیکن ایمان والوں کو اس سے دلگیر نہ ہونا چاہیئے ہنسنے والے یہاں ایمان والوں پر ہنس لیں اور اپنے آپ کو ان سے بڑھا ہوا سمجھ لیں لیکن قیامت کے روز اہل تقویٰ اُن سے بڑھے ہوئے رہیں گے اور یہ گھٹے ہوئے ہوں گے۔ (بقول حضرت سعدی علیہ الرحمۃ ؎

بسا سوار کہ آنجا پیادہ خواہد شد ‌ ‌ ‌ بسا پیادہ کہ آنجا سوار خواہد بود

(بہت سے سوار وہاں پیدل ہوجائیں گے اور بہت سے پیدل وہاں سوار ہوجائیں گے)

یا بقول ملّا دررسالہ مناظرہ مسٹر و مُلّا ؎

وہاں اپنی حقیقت تجکو دکھلاؤں گا اے مسٹر ‌ ‌ ‌ یہاں رکھتی ہے میری کامرانی شکل حرمانی)

مطلب میرا یہ ہے کہ شریعت کا اتباع کرنے والے مصالح دنیویہ کو پیش نظر کیوں رکھتے ہیں وہ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ مصالح دینیہ و دنیویہ دونوں کو جمع رکھیں یعنی اس معنی کر کہ دنیا بھی خوب کماؤ کھاؤ اور دین کے بھی پھلے بنے رہو۔ ادھر مخلوق کو بھی راضی رکھو اُدھر خدا کو بھی۔ اگر خدا کو

معبود اور مقصود سمجھتے ہو تو مخلوق کو راضی یا ناراضی کرنے سے قطع نظر کرلو۔ قصداً تو کسی سے لڑو بھڑو نہیں لیکن اس کی بھی کوشش نہ کرو کہ مخلوق ہم سے راضی ہی رہے بس اس شان کا ہونا چاہیئے مسلمان کو لیکن یہ ضروری بات ہے کہ یہ شان جبھی پیدا ہوسکتی ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا پورا اتباع کیا جائے گو یہ بھی ضرور ہے کہ اس حالت میں لوگ ملامت کریں گے مگر تمہارا یہ مذہب ہونا چاہیئے ؎

نسازد عشق را کنج سلامت　　　　خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق سلامتی کے گوشہ کی موافقت نہیں کرتا۔ اسکو تو ملامت کے کوچہ کی رسوائی اچھی معلوم ہوتی ہے)

اور خوش ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ جس میں ملامت ہوجاتی ہے اس میں آدمی پکا ہوجاتا ہے۔ مثلاً کسی نے داڑھی رکھ لی تو داڑھی منڈانے والے اس پر ہنسیں گے کہ آیئے مولانا صاحب آیئے حضرت قبلہ یہ ضرور ہوگا۔ اور یہ ناگوار بھی ہوگا لیکن اس کا اثر یہ ہوگا کہ اگر کبھی جی بھی چاہے گا منڈانے کو تب بھی اس غصہ میں آکر نہ منڈائے گا اور انکی ضد میں داڑھی رکھنے کا اور بھی پختہ عزم کرلے گا۔ تو یہ نفع ہے ملامت میں۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں ملامت کی ہرگز پرواہ نہ کرنی چاہیئے اگر لوگ تم پر ہنسیں یا طعن کریں تو دلگیر ہونے کی کیا وجہ ہے۔ سبحان اللہ میاں یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو وہ رتبہ ہے جو حضرات صحابہ کو حق تعالےٰ نے عطا فرمایا تھا اس وقت بھی اہل ایمان پر یوں ہی لوگ ہنسا کرتے تھے تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کروگے لوگ ہنسیں گے ضرور لیکن اس کی کچھ پرواہ نہ کرو۔ اب فرض کرو تم نے کوئی شادی کی بلا رسم تو لوگ طعنے دینا شروع کریں گے اور سینکڑوں لتاڑیں پڑنی شروع ہوں گی کہ یہ بڑے متقی نکلے ہیں کہ باوا دادا سے بھی بڑھ گئے۔ باوا دادا سے جو رسمیں چلی آرہی تھیں سب ناجائز ہی قرار دیدیں، ایسے کنجوس ہیں کہ برادری کا کھانا بھی اڑا دیا۔ یہ سب طعن و تشنیع سن کر بھی تم خوش رہو اور کچھ پرواہ مت کرو۔ عشق میں بھلا رسوائیوں سے کبھی کوئی سلامت رہا ہے۔ لہذا تم کو خوش ہونا چاہیئے اور یہ کہنا چاہیئے ؎

نسازد عشق را کنج سلامت　　　　خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق سلامتی کے گوشہ کی موافقت نہیں کرتا اس کو تو ملامت کے کوچہ کی رسوائی اچھی معلوم ہوتی ہے)

اور سنو اگر لباس شرع کے موافق پہنو گے تو جنٹلمین لوگ ہنسیں گے کہ یہ کیا دقیانوسی لباس پہنا ہے اُول جلُول کتے کی جھول۔ چہرہ دیکھو تو وحشت برستی ہے ارے عاشقوں کے چہرہ پر تو وحشت ہی زیب دیتی ہے۔ مانگ پٹی تو زنانوں کا شعار ہے واللہ وہ عاشق نہیں جو کوٹ بوٹ سے درست ہو۔ خدا کی قسم جن کے دلوں میں محبت گھس گئی ہے انھیں اپنے سر اور پاؤں کی بھی خبر نہیں کوٹ بوٹ تو کیا پہنتے اگر ان کے پاس پھٹی جوتی اور پھٹا لباس بھی ہوگا تو انھیں عار نہ ہوگی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہاں وہ عاشق نہیں جسے سر و پاؤں کی خبر ہو جو عاشق ہوگا وہ تو ایسا ہی ہوگا جسے نہ سر کی خبر ہوگی نہ پاؤں کی اور واقع میں یہ نہیں کہ اُسے خبر نہ ہوگی۔ خبر تو ہوگی مگر پروا نہ ہوگی اور اب تو یہ حالت ہے کہ بھلا مرد تو مرد عورتوں نے باریک کپڑے پہننے شروع کر دیئے ہیں اگر کوئی اچھے کپڑے شریعت کے موافق پہنے تو کہتی ہیں کہ یہ کیا کنجڑوں اور قصائنیوں[1] کے سے کپڑے پہنے ہیں اس قدر چست اور منڈھا ہوا لباس پہنتی ہیں کہ بدن کی ساخت اور ساری ہیئت ہی ظاہر ہونے لگتی ہے اگر اتفاق سے غیر محرم کی نظر پڑ جائے تو کس قدر بے غیرتی ہے اور پائنچے ایسے چست کہ پنڈلی میں چٹکی لیں تو کھال بلکہ گوشت کی بوٹی تک اکھڑ آئے پھر اوپر سے کھڑے جوتے حالانکہ حرام ہیں عورتوں کے لئے مردوں سے مشابہت حدیث میں لعنت آئی ہے ایسی عورتوں پر جو مردوں سے مشابہت کریں اور اس قدر چست پائنچے یا زار والی فاسق فاجر عورتوں کا شعار ہے اور مشابہت فساق فجار کی بھی ناجائز ہے اُس کا منشاء فقط تفاخر ہے مقصود یہ ہے کہ ذرا آن بان سے رہیں اور خوبصورت معلوم ہوں اور کوئی یوں نہ کہے کہ یہ کیسے باؤلوں کے سے ڈھیلے پائنچے ہیں جیسے جھلی مارنی پہنے پھرتی ہیں (یعنی سینگی لگانے والیاں) تو اب عورتیں بھی اس طرح سے طعن کرنے لگی ہیں غرض عورتوں نے بھی اب آپس میں مردوں کا سا تفاخر کرنا شروع کر دیا ہے مینڈکی کو بھی لو زکام ہوا۔ مردوں کو تو یہ مرض تھا ہی عورتوں کو بھی ہوا اور مردوں کا تفاخر تو خیر چل بھی سکتا ہے کیونکہ ایک کو دوسرے کی اندرونی حالت معلوم نہیں جیسا چاہو اپنے کو ظاہر کر سکتے ہو مگر عورتیں گھروں میں آنے جانے والیاں ایک کو دوسرے کے گھر کی ہر ایک

[1] قصائی کا مؤنث ۱۲

حالت کی خبر ہے یہ ایک دوسرے سے کیونکر اپنا اصلی حال چھپا سکتی ہیں اس لئے مرد اگر تفاخر کرتے ہیں تو ان کی اتنی بیوقوفی نہیں کیونکہ ایک کو دوسرے کا حال معلوم نہیں کہ گھر میں چوہے قلابازی کھا رہے ہیں قلعی نہیں کھلتی بس ایک جوڑا انگریزی بنا لیا اور ہر موقع پر اچھے خاصے جنٹلمین بن گئے جو غریب ہیں انھوں نے بھی بس ایک اچکن بڑھیا بنوالی اور ہر موقع پہ وہی اچکن ڈاٹ لی اور نواب کے بچے بن گئے حالانکہ گھر میں خاک بھی نہیں، بعض لوگ انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے لیکن جنٹلمین رنگ روغن بناتے ہیں روغن پر ایک حکایت یاد آئی، کوئی ایسے ہی تھے شیخی باز۔ ظاہری وضع تو نہایت امیرانہ اور گھر میں کھانے تک کو نہیں روز گھر سے آکر اپنے دوستوں میں شیخی بگھارا کرتے کہ آج گوشت بہت مزیدار پکا تھا، پلاؤ بھی اچھا تھا چاہے گھر میں دال اور خشکہ بھی میسر نہ آیا ہو میاں فاقہ ہی سے ہوں اور ترکیب یہ کرتے کہ گھر میں جو جلنے کا چراغ تھا اس کا تیل انگلیوں اور مونچھوں کو لگا لیتے تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ واقعی نواب صاحب بہت مرغن گوشت اور پلاؤ کھا کر آرہے ہیں ایک دن عجیب دل لگی ہوئی حسب دستور چراغ میں سے تیل لیکر جو مونچھوں کو چپڑنے لگے تو اتفاق سے بتی بھی مونچھوں میں لپٹ گئی اور چونکہ وہ جلتے جلتے چھوٹی سی رہ گئی تھی اس لئے ان حضرت کو وہ محسوس بھی نہ ہوئی۔ باہر آکر حسب عادت دستور ڈینگیں مارنے لگے کہ واللہ آج کا پلاؤ تو بہت ہی مزیدار تھا۔ ایک صاحب کی نظر مونچھوں پر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ چراغ کی بتی لپٹی ہوئی ہے بس ساری قلعی کھل گئی کہ حضرت چراغ کا تیل مونچھوں میں لگا لگا کر آتے ہیں تاکہ لوگوں پر ظاہر ہو کہ بہت مرغن کھانے کھاتے ہیں فوراً انھوں نے کہا کہ جناب بجا ہے اور دیکھئے پلاؤ کا ایک چاول بھی مونچھوں میں لپٹ آیا ہے ہاتھ پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ چراغ کی بتی ہے بہت ہی خفیف ہوئے تو اس شیخی بازی سے فائدہ کیا خیر یہ تو اتفاقی بات تھی کہ لوگوں کو پتہ چل گیا۔ ورنہ مردوں کی شیخی تو کچھ چل بھی جاتی ہے کیونکہ گھر کے اندر کا حال مردوں کو کیا معلوم لیکن عورتوں کو تو ایک دوسری کا حال معلوم ہے کہ اتنے پانی میں ہے پھر شیخی کیسی۔ پھر بیگم صاحبہ خواہ مخواہ ہی اینٹھ مروڑ میں مری جاتی ہیں۔ پھر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اگر لباس قیمتی ہی پہننے کا شوق ہو! پہنو تو ایک تو شریعت کے خلاف نہ ہونا چاہیئے دوسرے

زینت میں غلو نہ ہو بس اتنا تجمل کافی ہے کہ کوئی ذلیل نہ سمجھے کوئی باؤلا جھلا نہ کہے (یعنی پاگل) اور اصلی بات تو یہ ہے کہ نہ ذلت کی پروا ہو نہ بدنامی کی یہ دونوں شانیں عشق کے لوازم میں سے ہیں یحبھم و یحبونہ اور لایخافون لومۃ لائم اسی طرف اشارہ ہے محبین پر تو ملامت ہوتی ہے۔ مثلاً پردہ ہی ہے بعض عورتیں جو متشرع ہیں وہ سب نامحرموں سے پردہ کرتی ہیں حتیٰ کہ چچا زاد بھائی بھی ان کے اوپر بڑے طعن ہوتے ہیں کہ بھلا بھائی سے بھی کہیں پردہ ہوتا عورتوں کے نزدیک چچا کا لڑکا ایسا ہے جیسے سگا بھائی ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سگا بھائی ہے لیکن ایسا سگا ہے جو سگ سے ماخوذ ہے اور الف جو آخر میں ہے وہ ایسا ہے جیسے کسی بڑی ہانڈی کو ہنڈا کہہ دیتے ہیں اسی طرح یہاں سگا کے معنے ہیں بڑا سگ۔ ایک شہری بچہ سے کسی نے پوچھا کہ فلانا تمہارا سگا بھائی ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ میرا حقیقی بھائی ہے۔ سگ تو کتے کو کہتے ہیں۔ چھوٹا سا بچہ تھا لیکن کسی سے سن لیا ہوگا کہ سگ کتے کو کہتے ہیں تو کہتا ہے کہ حقیقی بھائی کہیے سگ نہ کہیے۔ تو غرض یہ کہ عورتیں چچا زاد بھائی کو مثل حقیقی بھائی کے سمجھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس سے کیا پردہ عورتیں تو عورتیں ایسے پردہ سے مرد بھی خفا ہیں، کسی نے ہمت کر کے اپنے قریبی نامحرم رشتہ داروں سے بھی پردہ کرنا شروع کیا تو اب چاروں طرف سے اعتراض کی بھرمار ہے ایک صاحب کہتے ہیں کہ میاں کچھ نہیں اب عزیزوں میں آپس میں محبت ہی نہیں رہی دوسرے صاحب بھی اینٹھ گئے کہ ان کے گھر جاویں تو کیا دیواروں سے بولیں۔ اب ہم ان کے یہاں جانا ہی بند کر دیں گے کہ سبحان اللہ کیا عزیزوں کے تعلقات اور آپس کا میل جول بے پردگی ہی پر موقوف ہے اگر یہ معنی ہیں تو یہ تو نعوذ باللہ میاں پر اعتراض ہے کہ ایسے قریبی رشتہ داروں کو بھی نامحرم قرار دیدیا استغفراللہ مگر اسی میں بعضی ایسی بھی ہمت والیاں ہیں کہ چاہے کوئی ہو وہ کسی نامحرم کے سامنے نہیں آتیں چاہے کوئی برا مانے یا بھلا مانے اور اکثر جگہ تو پردہ کی ایسی کمی ہے کہ محرمیت نہیں کچھ نہیں دور دور کے رشتہ داروں کو بے تکلف گھر میں بلا لیتی ہیں اور بے محابا ان کے سامنے آجاتی ہیں یہ بالکل ناجائز ہے اور گناہ ہے مردوں کو چاہیئے کہ وہ انھیں تنبیہ کریں اور سب نامحرموں سے پردہ کرائیں۔ اگر کسی کو ناگوار ہو تو بلا سے ہو کچھ پرواہ مت کرو ہرگز ڈھیلا پن نہ برتو بلکہ مردوں کو چاہیئے کہ اگر کوئی نامحرم

عورت اُن سے پردہ نہ کرے تو وہ خود اس سے چھپا کریں۔ میری ایک خالہ تھیں یعنی میرے والد صاحب کی سالی یہ دستور ہے ہی کہ عموماً سالیاں بہنوئی سے پردہ نہیں کرتیں چنانچہ وہ بھی والد صاحب کے سامنے آنے لگیں۔ والد صاحب اگرچہ عمر میں اُن سے بہت بڑے تھے اور باپ کے برابر تھے لیکن ان کو غیرت آئی اور سامنے آنے سے منع کر دیا انھوں نے مانا نہیں اور پھر بھی سامنے آئیں گو والد صاحب دنیا دار تھے مگر غیرت دار بڑے تھے۔ ایک بار خوب ڈانٹا کہ خبردار جو کبھی میرے سامنے آئی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ بہت برا مانا اور بہت روئیں کہ بھائی نے مجھے ایسا کہا۔ مگر پھر کبھی سامنے نہیں آئیں پردہ کرنے لگیں تو انھوں نے بُرا مانا مگر والد صاحب نے کچھ پرواہ نہ کی پردہ کرا کر چھوڑا اسی طرح تم کرو۔ اگر کوئی بُرا مانتا ہے مانا کرے کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیئے بُرا مان کر کوئی کرے گا کیا۔ اچھا تو ہے سب چھوڑ دیں کوئی اپنا نہ رہے یوں ہی تعلق خلق سے گھٹے جب کوئی اپنا نہ رہے گا اور سب سے توقع منقطع ہو جائے گی۔ تب تو سوچے گا کہ بس جی اب تو اللہ میاں ہی سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے بقول کسی کے۔ ع

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا (بقول جامع ؎

دشمنی خلق میری رہنما ہونے کو ہے — اب مرا دست طلب دستِ دعا ہونے کو ہے

بیکسی ہی سے حصول مدعا ہونے کو ہے — کوئی مت پوچھو مجھے میرا خدا ہونے کو ہے

اب سمجھے گا کہ اعزا قربا یار دوست یہ سب حجاب تھے اب کوئی حجاب نہ رہا (بقول جامع ؎

اب تو میں ہوں اور شغل یاد دوست — سارے جھگڑوں سے فراغت ہو گئی

اب خدا کے بنو جتنے تعلقات کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے ہمارے ایک بزرگ تھے ماموں امداد علی صاحب ویسے تو ایک آزاد منش دُرویش تھے مگر باتیں بڑی حکمت کی فرمایا کرتے تھے کہتے تھے کہ تارک الدنیا ہونا تو بہت مشکل ہے۔ مگر ہاں جب کسی پر میاں کا فضل ہوتا ہے تو اس کو متروک الدنیا بنا دیا جاتا ہے یعنی ایسے اسباب غیب سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ خود دنیا اس کو چھوڑ دیتی ہے یہ صورت ہوتی ہے ترک دنیا اور ترک تعلقات کی یعنی جب متروک الدنیا ہو گیا تو دنیا سے نفور ہو کر تارک الدنیا بھی ہو ہی گیا اور بھائی یہ تو سوچو کہ کس کس کو راضی کرو گے۔ راضی تو ایک ہی ہوتا ہے کئی تو راضی ہوا نہیں کرتے تو حضرت یہ کیجئے کہ صرف ایک اللہ کو

راضی رکھنے بہت سے آدمیوں کو کہاں تک راضی رکھے گا۔ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً رَّجُلاً فِیْہِ شُرَکَآءُ مُتَشَاکِسُوْنَ وَرَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ ط ھَلْ یَسْتَوِیَانِ مَثَلاً (ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص ہے جس میں کئی ساجھی ہیں جن میں باہم ضدّا ضدّی ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا ہے کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہے ؎

دلا رامے کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

میں کہتا ہوں کہ ایک مردار بازاری عورت کی محبت میں اس کی رضامندی کی خاطر اپنی آبرو جائداد اور خاندان کی عزت سب برباد کر دیتے ہو کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تو کیا خدا کی محبت اس سے بھی کم ہو گئی۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولا کے کم از لیلےٰ بود   گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

کیا عشق مولا عشق لیلیٰ سے بھی کم ہو گیا۔ دیکھو لیلیٰ کی محبت میں مجنوں کی کیا کیفیت تھی۔ پھر تم تو خالق لیلیٰ کے مجنون ہو تمہاری تو اس سے بھی بڑھ کر حالت ہونی چاہیئے خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ کی رضا کے مقابلہ میں کسی کی ناراضی کا خیال نہ کرو۔ یہ میں نہیں کہتا کہ باؤلے بنو۔ بلکہ مستقیم رہو شریعت پر اور پختہ کار ہو جاؤ محبت میں اگرچہ سارا جہان خلاف ہو جاوے ساری دنیا لتاڑے۔ بُرا بھلا کہے ملامت کرے (بقول احقر جامع ؎

تری رضا میں ہے سارا جہاں خفا ہم سے
اگر یہی ہے زیاں تب تو کچھ زیاں نہ ہوا

بلکہ ملامت سے تو عشاق خوش ہوتے ہیں اور ایک راز ہے خوش ہونے کا۔ ایک تو اس سے خوش ہوتے ہیں کہ الحمد للہ ہمیں لوگ اللہ میاں کا عاشق سمجھتے ہیں ایک یہ کہ ضد میں دین اور پختہ ہو جاتا ہے مثلاً شادی کی اور بارات میں صرف چار آدمی لے گئے۔ پھر اس پر چاروں طرف سے لتاڑ پڑنا شروع ہوا تو اس سے اور بھی چڑ پیدا ہو جائے گی۔ اور ضد میں آ کر کہے گا کہ اب کی بار اس سے بھی مختصر لو۔ اب کے تو چار آدمی بھی تھے اب کے دیکھنا ان شاء اللہ تعالےٰ چار آدمی بھی ہوں۔ کر لو میرا کیا کرتے ہو۔ اگر لتاڑ نہ پڑے تو اتنے پختہ نہ ہوں جتنے لتاڑ میں پختہ ہو جاتے ہیں اس لئے لتاڑ بھی اللہ میاں کی

بڑی رحمت ہے بس تو نیک کام پر اگر لتاڑ پڑے تو خدا کا شکر کرو۔ خلاصہ یہ کہ طریق محبت اصل لیکن اس کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے اس واسطے کہ اگر عمل نہ کیا تو محبت باقی نہیں رہتی بلکہ گھٹ جاتی ہے اور گھٹتے گھٹتے بالآخر بالکل ہی فنا ہو جاتی ہے (جیسے چراغ میں اگر تیل ڈالنا چھوڑ دیں تو لو کم ہوتی چلی جائے گی اور رفتہ رفتہ چراغ گل ہو جائے گا) چنانچہ اسی طریق محبت کی طرف اشارہ ہے آیت کے اس جز ویں یحبھم و یحبونہ یعنی وہ لوگ ایسے ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ محبت کریں گے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں گے اس سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے آگے ان کی علامت مذکور ہے کہ وہ کیسے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یعنی اللہ کے ماننے والوں کے سامنے تو نرم ہیں کیونکہ جس سے محبت کی ہے اس کے متعلقین سے بھی محبت ہوتی ہے اور اللہ کے مخالفین کے سامنے سخت ہیں یعنی فقط یہی نہیں کہ ان سے محبت اور میل جول نہیں بلکہ ان سے اعراض ہے اور ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ ہے۔ محبت کا تو یہی مقتضا ہے کہ محبوب کے مخالفین سے اعراض ہو۔ صاحب یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب کی نافرمانی کرنے والوں سے بھی محبت ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ آپ نہ پاویں گے ان لوگوں کو جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہوں کہ وہ دوستی کریں اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مخالفوں کے ساتھ چاہے وہ اُن کے باپ ہوں یا اولاد ہوں یا بھائی ہوں یا چاہے ان کا کنبہ ہی کیوں نہ ہو ان سب کو مخاطب کر کے صاف کہدیا ہے

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　خدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

(ہزار رشتہ دار جو خدا سے بے تعلق ہوں اس ایک بیگانہ شخص پر قربان ہیں جو خدا کا دیوانہ ہے)

اور صاف کہدیا کہ سن لو صاحب ہم میں تم میں میل نہیں ہے ہمارا تمہارا مذہبی اختلاف ہے ہم سے

تم سے کوئی تعلق نہیں بس معاف کرو۔ خیر اگر اتنی ہمت نہ ہو تو کم از کم محبت اور دوستی تو نہ ہو مثلاً میل جول شادیوں میں شرکت وغیرہ یہ اور بات ہے۔ مصرع۔ مل گئے صاحب سلامت ہوگئی۔ حدیث شریف میں بھی اہل باطل کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنے کا حکم ہے ارشاد ہے لَا تُصَلُّوْا عَلٰی جَنَائِزِهِمْ وَلَا تَعُوْدُوْهُمْ یعنی اگر بیمار پڑیں تو جاکر ان کی عیادت مت کرو اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازہ کی نماز مت پڑھو اگر مخالفین حق سے قطع تعلق ہی ہوگیا تو ہو جانے دو۔ آخر یہ علاقے کیا کام آئیں گے بلکہ ان علاقوں کے قطع ہو جانے پر حق سبحانہ تعالیٰ ایسی ایسی بشارتیں دے رہے ہیں فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان کو راسخ کر دیا ہے آگے سبحان اللہ کیا وعدہ ہے وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ یعنی خدا نے مدد دی ان کو ایک روح کے ساتھ وہ روح کیا ہے نسبت باطنی خدا کے ساتھ اس سے ایسی قوت قلب میں پیدا ہوتی ہے کہ اگر سارا عالم بھی مخالف ہو جائے تو بھی کچھ پروا نہیں ہوتی تعلق مع اللہ سے ایک نور قلب میں پیدا ہوتا ہے اس نور کو روح اس لئے کہدیا کہ اس سے قلب میں حیات پیدا ہوتی ہے حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق بڑھتا ہے کہ بس یہ شان ہو جاتی ہے ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　چہ شمشیر ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس　　ہمیں است بنیاد توحید و بس

(موحد کے قدموں پر سونا نچھاور کر دیا اس کے سر پر ہندی تلوار رکھ دو امید و خوف اس کو کسی سے نہ ہوگا بس توحید کی بنیاد یہی ہے)

اور بھی بشارت سنئے وَیُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا یعنی ان کو ایسی جنتوں میں داخل کر دیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور اس سے بھی بڑی نعمت یہ ہوگی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ خدا ان سے راضی ہوگا اور وہ خدا سے راضی ہوں گے۔ پھر فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ یہ خدا کی جماعت ہے یہ خدائی پارٹی ہے اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اور سن لو خدا ہی کی پارٹی کے لوگ فلاح پانے والے ہیں تو حضرت اب کیا تو برادری کیا رشتہ داری دور دور کی

کہتے ہیں کہ صاحب برادری کو تو چھوڑا نہیں جاتا کیا کریں۔ بہت اچھا صاحب برادری کو نہیں چھوڑا جاتا تو پھر اللہ میاں کو چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک دل میں اللہ بھی ہو اور اللہ کا مخالف بھی ہو تو حضرت نماز روزہ تو ہے مگر محبت نہیں جس کے آثار آگے مذکور ہیں۔ یہ آثار مسلمانوں میں کم ہیں اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ محبت کے آثار یہ ہیں اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ اللہ والوں کے ساتھ نرم ہیں اور اللہ کے مخالفوں کے ساتھ سخت ہیں ایک تو یہ آثار ہیں دوسرے آثار کیا ہیں یہ ہیں یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بڑی محنت کے عمل کرتے ہیں۔ تو دیکھئے محبت کے آثار میں سے عمل بھی ہے اور صاحب کیوں نہ ہو اگر محبت ہو تو وہ ظاہر کیوں نہ ہوگی (بقول شخصے ع ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو) بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ اگر کہیں تمہارا محبوب مدتوں کے بعد ترستے ترستے تم کو مل جاوے تو بھائی ایمان سے کہو تمہارا کیا جی چاہے گا؟ کیا یہ جی نہ چاہے گا کہ اس کو فوراً سلام کریں اور دوڑ کر اس کے پاس پہنچیں اور جا کر اس سے لپٹ جائیں اور کیا مزے لے لیکر اس سے گفتگو نہ کرو گے اور کیا زبان سے یہ نہ کہو گے کہ اللہ کا شکر ہے مدتوں کی آرزو پوری ہوئی اور کیا یہ دعائیں نہ دو گے کہ خدا عمر دراز کرے اور زیادہ ہمّت ہوئی تو کیا اس کی جوتیاں بھی ہاتھ میں لے کر سر آنکھوں پر نہ رکھو گے اور کیا اس کے تلووں سے آنکھیں نہ ملو گے غرض کیا کیا نہیں کرو گے اگر اس سے محبت ہے اور ایک عاشق ایسا ہے کہ معشوق ملا اور یہ منہ پھیر کر بیٹھ گئے کسی نے پوچھا یہ کیا۔ کہا تم کیا جانو ہم اہلِ باطن ہیں ہمارے باطن میں محبت بھری ہوئی ہے ہمارا باطن لبریز ہے محبت سے مگر اظہار کی ضرورت نہیں بھائی دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کو محبت ہے۔ بلکہ ہر شخص یہی کہے گا۔ اور بالکل سچ کہے گا کہ جھوٹا ہے مکّار ہے ؎

تعصی الالٰہ وانت تظھر حبہ — ھذا العمری فی الفعال بدیع
لوکان حبک صادقاً لاطعتہ — ان المحب لمن یحب مطیع

(ترجمہ) نافرمانی کرتا ہے تو خدا کی اور ظاہر کرتا ہے اس کی محبت کو یہ قسم ہے میری جان کی کہ عجیب بات ہے اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا۔ کیونکہ محب جس سے محبت رکھتا ہے اس کا مطیع ہوتا ہے تو صاحبو ایسے شخص کو بھلا کوئی بھی عاشق کہے گا جو کوئی سنے گا یہی کہے گا کہ واہ صاحب اچھے عاشق ہیں اور اچھی محبت ہے کہ معشوق نے پکارا تھا بولے ہی نہیں۔ بلایا تھا گئے ہی نہیں یہ شخص ہرگز عاشق نہیں جھوٹا ہے نالائق ہے خوامخواہ شیخی بگھارتا ہے کیا عاشق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اجی حضرت یہ تو بڑی بات ہے کہ کہنا نہ مانا۔ اہل صدق نے تو ذرا سی بات سے عاشق کو اہل وفا کے زمرہ سے خارج کر دیا ہے چنانچہ کسی ہوسناک کا شعر تھا ؎

اس کے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں ۔۔۔ تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

اب سنئے ایک عاشق نے اس کا کیا خوب جواب دیا ہے ؎

اس کے کوچہ سے کب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں ۔۔۔ وہ ہوسناک ہیں جو رو بقضا جاتے ہیں

جو عاشق ہوگا وہ کوچۂ محبوب سے اٹھ کر ہی کیوں جائے گا۔ محبوب ہی اٹھ کر چلا جائے تو یہ دوسری بات ہے تو دیکھئے اس کو بھی خلاف محبت کہا۔ صاحب اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تو دعویٰ اور حال یہ کہ جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ نماز پڑھو۔ تو آپ کہتے ہیں نہیں صاحب میں تو نہیں پڑھتا جب زکوٰۃ کا حکم دیتے ہیں تو کہتے ہیں میں نہیں دیتا جب روزہ کے لئے کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں میں نہیں رکھتا۔ اسی طرح جب خلاف شرع لباس سے شرک سے بدعت سے منع کیا جاتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ نہیں صاحب میں تو نہیں مانتا اور کہنے کو اللہ کے عاشق ہیں زبان پر ہے ہائے اللہ ہائے اللہ یہ اچھے عاشق ہیں صاحب میں کہتا ہوں کہ جیسے مخلوق کی محبت تھی کہ محبوب کو دیکھتے ہی رہ نہ سکا بدون ہاتھ پاؤں چومے بدون لپٹے بدون قدموں پر گرے بدون تلوے چاٹے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جانے سے گر پڑنے سے تعریف کرنے سے کیسے رہا گیا۔ اگر محبت ہوتی تو تعظیم کے کلمات بھی کیوں نہ زبان سے نکلتے جھک بھی کیوں نہ جاتا سجدہ میں بھی کیوں نہ گر پڑتا اسی کا تو نام نماز ہے تو نماز تو پڑھتے نہیں اور اللہ کے

عاشق ہیں اچھے عاشق ہیں۔ کوئی شعر سنا تھا یا گانا بجانا سنا تھا اس پر کودنے لگے بس عاشق ہیں اگر یہی ہے تو پھر سانپ بھی اولیاء اللہ ہیں کیونکہ جب بین کی آواز سنتے ہیں تو وہ بھی مست ہو جاتے ہیں آدمی کیا بہت سے جانور بھی گانے بجانے پر عاشق ہیں۔ بھلا یہ کوئی محبت ہے۔ محبت تو وہ چیز ہے کہ خدا کی قسم نہ گانے کی ضرورت نہ بجانے کی ضرورت اور بے چین ہیں ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند　　　برآواز دولاب مستی کنند
(جو لوگ خدا کی پوجا کرتے ہیں　　　وہ رہٹ کی آواز پر مستی کرتے ہیں)

بلکہ اس کی بھی ضرورت نہیں ان کی تو ہر وقت یہ شان ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش　　　اگر ریش بینند وگر مرہمش
(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر غم دیکھتے ہیں اور اگر اس پہ مرہم رکھتے ہیں)

؎ دمادم شراب الم درکشند　　　دگر تلخ بینند دم درکشند
(ہر وقت غم کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

؎ گدایانے از بادشاہی نفور　　　بامیدش اندر گدائی صبور
(ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرلے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنیوالے)

حضرت ان کے سر پر ہر وقت آرے چلتے ہیں ان کی حالت کی دوسرے کو کیا خبر کسی نے خوب کہا ہے

؎ اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند
(اے تیرے پاؤں میں تو کانٹا تک نہیں لگا تو ان شیروں کا حال کیا جانے جن پر مصیبت کی تلوار پڑی ہے)

؎ کشتگانِ خنجر تسلیم را　　　ہر زماں از غیب جانے دیگر ست
(مقتولان خنجر تسلیم تو ہر گھڑی یاد خدا میں لذت محسوس کرتے ہیں)

ان کی حالت تو یہ ہے کہ ان سے ذرہ برابر نافرمانی نہیں ہوتی حضرت عشق اور محبت تو یہ ہے اسی واسطے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یُجَاهِدُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وہ لوگ اللہ تعالیٰ

کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں یعنی صرف عمل نہیں بلکہ سخت سے سخت محنت کے کام کرتے ہیں پھر ایسوں کو بھلا کہاں بھوک پیاس کہاں چین آرام کہاں حظوظ و لذائذ کا اہتمام کہاں مرغن کھانوں کی رغبت ہاں خدا دے تو کھا بھی لیتے ہیں مگر اہتمام نہیں نہ ان چیزوں سے ان کو دلچسپی بلکہ ان کا مذہب یہ ہوتا ہے ؎

عاقبت سازد ترا از دیں بری — ایں تن آرائی و ایں تن پروری

(تیرا بدن سجانا اور تن پروری آخر کار تجھکو دین سے دور کر دے گا)

وہ تو ان سب خرافات سے یکسو ہو چکے ہیں اور ہر وقت خدا جانے کس شغل میں ہیں (بقول احقر جامع ؎)

اب تو میں ہوں اور شغل یاد دوست — سارے جھگڑوں سے فراغت ہو گئی

چونکہ وہ اہل محبت ہیں اس واسطے سخت سے سخت کام بھی کر لیتے ہیں مشکل سے مشکل کام بھی ان کے لئے آسان ہو جاتا ہے (بقول احقر جامع ؎

درد دل نے اور سب دردوں کا درماں کر دیا — عشق کی مشکل نے ہر مشکل کو آسان کر دیا)

تو دیکھئے خود حق تعالےٰ کے ارشاد یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ سے معلوم ہوا کہ محب کے واسطے عمل معاف نہیں بلکہ اس پر اور زیادہ محنت پڑتی ہے۔ نیز محبت کے آثار میں سے یہ بھی ہے کہ لَا یَخَافُوْنَ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ کوئی کچھ کہے پرواہ نہیں کرتے اپنے کام میں مشغول ہیں کوئی کچھ ہی کہا کرے۔ ذرہ برابر التفات نہیں کرتے آگے فرماتے ہیں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ اور اللہ میاں بڑی وسعت والے ہیں تو سب کو یہ نعمت عطا فرما دیں مگر وہ علیم بھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ کون دینے کی قابل ہے کون نہیں۔ جو مانگتا ہے اسی کو دیتے ہیں کسی کے سر نہیں منڈھتے۔ یہ ہے آیت کا ترجمہ اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ کن لوگوں کی مدح ہے اور مدح کا کیا حاصل ہے۔ مدح کا حاصل یہ ہے کہ خدا سے کامل محبت رکھتے ہیں۔ خدمت اور طاعت میں پوری مشقت اٹھاتے ہیں۔

اور کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے بس اسی شان کے شخص کو قلندر کہتے ہیں اور یہی
معنی قلندر کے حضرت عراقی کے اس شعر میں ہیں ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(میرے مرشد مجھکو تو طریق جذب کا رستہ دکھلا دے۔ کیونکہ محنت و ریاضت
کا راستہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے)

تو گویا عراقی کا شعر خلاصہ ہے قرآن مجید کی آیت کا اور قرآن مجید کی آیت تفصیل ہے
عراقی کے قول کی پس قلندر وہ ہے جس میں عمل اور محبت دونوں جمع ہوں اور جس کی یہ شان ہو

؎ برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

(ایک ہاتھ میں شریعت کا جام دوسرے ہاتھ میں عشق کا ہتھوڑا۔ ہر بوالہوس جام اور سندان
سے کھیلنا نہیں جانتا)

(احقر جامع کا شعر ہے ؎

دیکھا نہ زمانہ میں مجذوب سا مستانہ فرزانہ کا فرزانہ دیوانہ کا دیوانہ

اور رہ پارسائی وہ ہے جس میں نرا عمل ہو بلا محبت اب میں صرف پانچ منٹ
اور بیان کروں گا پھر ختم کر دوں گا چونکہ بہت دیر ہو گئی ہے اس لئے نیت تو یہیں
ختم کر دینے کی تھی لیکن اصل مقصود بیان کرنے سے باقی رہ گیا ہے یعنی رہ قلندر کی
حقیقت تو بیان ہو چکی ہے مگر اس کا طریق عمل بیان کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ
محض حقیقت کا معلوم ہو جانا عمل کے لئے کافی نہیں لہٰذا رہِ قلندر کی تحصیل کا طریق بھی
بیان کرتا ہوں اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایسا طریق ہے جو محبت اور عمل دونوں کا
جامع ہے۔ پس ان دونوں چیزوں کی تحصیل کا طریق معلوم ہونا چاہیئے سو عمل کے
متعلق تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمت کرو عمل ہو جائے گا پس اس کا یہی طریق ہے لیکن
سوال یہ ہے کہ محبت کیونکر پیدا ہو۔ تو لیجئے میں اس کا ایک نسخہ لاکھوں روپیہ کا مفت
بتائے دیتا ہوں وہ نسخہ مرکب ہے چند اجزاء سے اور وہ سب چھوٹی چھوٹی چیزیں
ہیں غور سے سنئے وہ چند چیزیں یہ ہیں سب سے اول ہے عمل کیونکہ میں اول ہی تقریر

میں عرض کرچکا ہوں کہ عمل میں خاصیت ہے محبت پیدا کردینے کی اور اس کو بہت بڑا دخل ہے محبت پیدا کرنے میں چاہے تجربہ کرلو روز روز کسی کے پاس جایا کرو دیکھو محبت ہوجاوے گی پہلے تھوڑی ہوگی پھر جاتے جاتے ایسا تعلق ہوجاوے گا کہ بہت ہی زیادہ غرض یہ مسلم امر ہے کہ میل جول جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی زیادہ محبت ہوگی وہ جو کہتے ہیں پالے کی محبت اس کی یہی تو اصل ہے غرض ایک عمل میں یہ برکت ہے کہ اس سے محبت حق پیدا ہوجاتی ہے اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم تو مدت سے نیک عمل کررہے ہیں مگر محبت پیدا نہیں ہوئی جواب یہ ہے کہ نیک عمل کے مفہوم میں ایک یہ ہی جزء تو نہیں کہ بس عمل کرلیا۔ بلکہ وہ مرکب ہے اور اجزاء سے بھی ایک جزء تو عمل کرنا ہے دوسرا جزء یہ ہے کہ عمل کو اس کے طریق کے مطابق کیا جائے مثلاً صرف ٹکریں مارنے کو نماز نہیں کہتے، نیک عمل جس طرح کیا جاتا ہے اور جو اس کا مامور بہ طریق ہے اس طریق سے اس کو کرو پھر دیکھو محبت کیسے نہیں پیدا ہوتی۔ تیسری وجہ اثر نہ ہونے کی یہ ہے کہ تم نے عمل کو صرف عادت سمجھ کر کیا اس نیت سے نہیں کیا کہ اللہ کی محبت بڑھ جاوے عمل میں یہ نیت نہیں کی کہ اے اللہ آپ کی محبت پیدا ہوجائے سو اس نیت سے عمل کرو پھر دیکھو ان شاء اللہ تعالیٰ کیسا اثر ہوتا ہے۔ بہرحال ایک جزء تو اس نسخہ کا یہ ہے کہ نیک عمل میں بہ نیت ازدیاد محبت استقامت کے ساتھ مشغول رہو۔ دوسری بات ضروری یہ ہے کہ اللہ کا نام لو جی لگا کر یعنی تھوڑا اللہ اللہ بھی کرو تیسری بات یہ ہے اور بہت ہی ضروری ہے کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو۔ اس سے لوگ بھاگتے ہیں۔ اول تو اس طرف توجہ ہی نہیں کہ کسی بزرگ کی خدمت میں جا کر رہیں بس تھوڑی سی کتابیں پڑھ لیں اور سمجھ لیا کہ ہم کامل مکمل ہوگئے بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل مکمل ہوا ہے ہاں تم کمبل تو ہوگئے یعنی کمبل پوش باقی نہ کامل ہوئے نہ مکمل ارے بھائی موٹی بات ہے کہ بلا بڑھئی کے پاس بیٹھے کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا حتیٰ کہ اگر بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لیکر اٹھائیگا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھا جا سکیگا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی کے پکڑنے کا اندازہ بھی نہیں آتا۔ بلا خوشنویس کے پاس بیٹھے ہوئے اور بلا قلم کی گرفت اور خط کی کشش کو دیکھے ہوئے ہرگز خوشنویس نہیں ہوسکتا۔ غرض بدون صحبت کامل کے کوئی کامل نہیں بن سکتا لہٰذا پیر کامل کی صحبت لازمی ہے پھر تو ایسا ہوتا ہے

کہ کبھی مرید پیر سے بھی بڑھ جاتا ہے مگر ابتدا میں تو کسی شیخ کامل کی صحبت کے بغیر چارہ نہیں اور آجکل اسی کی ضرورت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کبھی کسی مصلح کے پاس گئے بھی تو وہاں تو ہوتی ہے اصلاح پہونچتے ہی لتاڑ پڑنا شروع ہوگئی تو اب یہ حضرت گھبرا گئے کہ میاں کس مصیبت میں آپھنسے ہم تو آئے تھے بزرگ سمجھ کر انھوں نے لتاڑنا ہی شروع کیا یہ کیسے بزرگ ہیں یہ کیسے اللہ والے ہیں اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی معدہ کا مریض طبیب کے پاس جا کر کہے کہ دیکھو جی ہم اپنے گھر حلوے کھایا کرتے تھے حلوے ہی ہمارے لئے تجویز کرنا۔ ذرا حماقت تو دیکھئے حالانکہ خدا کے فضل سے آپ کو دست بھی ہو رہے ہیں معدہ بھی خراب ہے ہضم بھی درست نہیں۔ یہ تو حضرت کی حالت اور حلوے کی فرمائش طبیب بھلا اس کی کیوں رعایت کرتا۔ اس نے اس کی حالت کے مناسب کڑوا مسہل تجویز کیا اور جب اس نے پینے سے انکار کیا اور تین پانچ کی تو گرا کر زبردستی چمچوں کے ذریعہ سے پلا دیا لیکن اس نے قصداً قے کر کر کے سارے پئے ہوئے مسہل کو پیٹ سے نکال دیا آپ قے کرتے جاتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ واہ جی ہم تو اپنے گھر میں حلوے کھایا کرتے تھے حکیم جی نے نہ جانے کیا الابلا پلا دی کاش کوئی خیر خواہی سے کہتا کہ ارے بیوقوف تو کیا سمجھے تجھے جو وہ اس وقت کڑوا مسہل پلا رہا ہے تو تیرے ساتھ وہ دشمنی نہیں کر رہا ہے بلکہ دراصل وہ تجھے حلوے کھلانے کے قابل بنا رہا ہے ابھی تیرا معدہ حلوے کے قابل نہیں ایسی ہی حالت میں حلوا کھانے سے تو تجھے دست ہو رہے ہیں۔ تو حضرت اصلاح تو اصلاح ہی کے طریقہ سے ہوتی ہے مولانا نے مثنوی میں اسی مضمون کو ایک حکایت کے ضمن میں لکھا ہے حکایت یہ لکھی ہے کہ ایک قزوینی نے ایک ولاک سے کہا کہ تم میرے شانہ پر ایک تصویر شیر کی گود دو چنانچہ اس نے گودنا شروع کیا اور سوئی لیکر کچھ سے کر دیا۔ قزوینی کو جو تکلیف ہوئی تو ہائے واویلا کرنے لگا اور کہنے لگا ارے میاں یہ کیا کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ کر کیا رہا ہوں شیر کی شکل بنا رہا ہوں۔ پوچھا کس عضو سے شروع کیا ہے کونسی چیز بنا رہے ہو۔ کہا دم کی طرف سے شروع کیا ہے دم بنا رہا ہوں کہا میاں اس شیر کے لئے دم کی کیا ضرورت ہے بے دُم ہی کا سہی۔ اجی چھوڑو بھی اس دُم کو میرا تو اس نے دُم ہی نکال دیا۔ پھر اس نے دوسری طرف سے شروع کیا۔ پھر کچ سے سوئی چبھوئی پھر وہ چیخنے چلانے لگا اور پھر پوچھا کہ اب کونسا عضو بنا رہے ہو کہا کہ اب کی دفعہ کان بنا رہا ہوں وہ بولا کہ ارے میاں بعضے شیر بوچے بھی تو

([illegible])

(باقی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

ہوتے ہیں کان بھی چھوڑ دو۔ بولا ہی شیر سہی۔ پھر تیسری جگہ سوئی لگائی تو وہ پھر چلانے لگا۔ اور پوچھنے لگا کہ بھائی اب کیا بنا رہے ہو۔ کہا پیٹ کہا میاں تم بھی عجیب آدمی ہو ابھی وہ سسرا کھائے پیئے گا تھوڑا ہی جو پیٹ بنا رہے ہو۔ یہ بھی رہنے دو۔ اب تو اب تو دلاک کو بڑا غصہ آیا۔ سوئی اٹھا کر زمین پر پھینک دی اور جھلا کر کہا ؎

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید　　این چنیں شیرے خدا ہم نا فرید

(میاں ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا جس کے نہ سر ہو نہ کان نہ پیٹ)

پھر مولانا اس سے نتیجہ نکالتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقت سوزن دن　　این چنیں شیر ژیاں پس دم مزن

تم جو شیخ کے پاس اصلاح کی غرض سے آئے ہو تو اس کی سختی اور لتاڑ کو برداشت کرو اور اگر قزوینی کی طرح سوزن کی برداشت نہیں ہے تو شیر کا نام ہی مت لو۔ اصلاح کی درخواست ہی نہ کرو۔ بھائی وہاں تو اصلاح اصلاح ہی کے طریقہ سے ہوگی۔ پھوڑا لیکر گئے ہو تو نشتر لگے ہی گا۔ اب وہاں تو نشتر لگانا ضروری اور یہاں یہ حال ؎

تو بیک زخمے گریزانی زعشق　　تو بجز نامے چہ می دانی زعشق

(تو تو عشق کے زخم سے ہی بھاگتا ہے۔ تو نے عشق کے نام کے سوا دیکھا ہی کیا ہے)

بس نام ہی نام ہے عشق کا ایک ہی زخم لگا تھا کہ بھاگے وہاں کا تو ادب یہ ہے کہ ؎

چوں گزیدی پیر نازک دل مباش　　سست و ریزندہ چو آب و گل مباش

(جب تو بھاگے پیر نازک دل نہ بن پانی اور مٹی کی طرح سست اور گرنے والا نہ بن)

ورنہ ہر زخمے تو پر کینہ شوی　　پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

(اگر ہر زخم پر بغض اور کینہ دل میں رکھنے لگے گا تو کیسے بغیر پالش کے آئینہ بن جائیگا)

یہ مصیبت ہو گئی ہے تو حضرت نرا وظیفہ اصلاح کے لئے ہرگز کافی نہیں نرے وظیفہ والے پیروں سے واللہ ثم واللہ ثم واللہ جو کبھی اصلاح ہو اصلاح تو ہوتی ہے اصلاح کے طریقہ سے تو اہل محبت کے پاس جاؤ اور وہ جو کہیں وہ کرو تھوڑے دنوں میں دل نور سے معمور ہو جائے گا اور خدا کی قسم اس قدر محظوظ ہوگے کہ تمہاری نظر میں پھر سلطنت کی بھی کچھ حقیقت

اور وقعت نہ رہے گی (حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

چو بے خود گشت حافظ کے شمارد … تبیک جو مملکت کاؤس کے را

(جب حافظ بیخود ہو گیا۔ ایک جو کے برابر بھی کیکاؤس کی حکومت کو کب شمار میں لاسکتا ہے)

جامع کے شعر ہیں ؎

دل ہو وہ جس میں کچھ نہ ہو جلوہ یار کے سوا … میری نظر میں خاک بھی جام جہاں نما نہیں

کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر … تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تخت سلیماں تھا

جناب میرے پاس اس قسم سے زیادہ کوئی ذریعہ یقین دلانے کا نہیں لے صاحب میں مکرر قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو اس طریق سے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرلیگا وہ ایسا ہو جائے گا کہ پھر اس کو نہ موت کا خوف ہوگا نہ ذات الجنب کا نہ نمونیہ کا نہ بخار کا نہ قحط کا نہ وبا کا کوئی غم نہ رہے گا بس بالکل جنت کی سی حالت ہو جائے گی ہاں غم ہوگا تو ایک کہ اللہ میاں تو ناراض نہیں۔ خدا کے نزدیک میں کیسا ہوں نہ جانے وہ مجھ سے راضی ہیں یا ناراض بس اس غم کے سوا اور کوئی غم نہ ہوگا مگر یہ غم ایسا لذیذ ہے کہ ہزاروں خوشیاں اس پر نثار اس شخص سے اگر کوئی کہنے لگے کہ لاؤ تمہارا یہ غم تو ہم لے لیں اور اس کے عوض اپنی ساری خوشیاں تمہیں دیدیں تو کبھی نہ بدلے گا تو حضرت یہ دولت ملے گی اہل اللہ کے پاس جانے سے اور ان کا اتباع کرنے سے تو حاصل طریق کا یہ ہے کہ اعمال میں ہمت کرکے شریعت کے پابند رہو ظاہراً و باطناً اور اللہ اللہ کرو۔ اور کبھی کبھی اہل اللہ کی صحبت میں جایا کرو۔ اور ان کی غیبت میں جو کتابیں وہ بتائیں ان کو پڑھا کرو۔ لو جی یہ چار چیزیں ہیں۔ میں ٹھیکہ لیتا ہوں کہ جو ان چار پر عمل کرکے دکھلاوے گا وہ یحبہم ویحبونہ کا مصداق یعنی اللہ تعالیٰ کا محبوب اور محب ہو جاوے گا ضرور ہو جاوے گا ضرور ہو جاویگا ضرور اور بالضرور ہو جاوے گا۔ لو صاحب اب اختیار ہے جو چاہے عمل کرکے دیکھ لو اور تجربہ کرلو۔ اور اس کی ضرورت نہیں کہ مرید ہو جاوے۔ اجی کس کی پیری مریدی لئے پھرتے ہو یہ تو پکھنڈ ہے بیعت کی صورت ضروری نہیں۔ اصل چیز بیعت کی روح یعنی اتباع ہے (حقیر جامع کا شعر ہے) ؎ تین حق مرشد کے ہیں رکھو ان کو یاد ٭ اعتقاد و اعتماد و انقیاد جیسے طبیب سے رجوع کرتے وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ تحقیق نیت کرتا ہوں میں کہ آج سے

بناؤں گا تم کو طبیب اپنا اللہ اکبر اسی کی طرح اس کی کیا ضرورت ہے کہ پیر کہے میں نے تمہیں مرید کیا اور مرید کہے میں نے تمہیں پیر بنایا اس پٹہ اور قبولیت کی ضرورت ہی کیا ہے اگر پکے کاشتکار ہوگے اور طریقہ سے کاشتکاری کرو گے تو بلا پٹہ اور قبولیت کے بھی غلہ پیدا ہوگا۔ غرض مرید ہونے کی ضرورت نہیں پیر کے کہنے کے مطابق کام شروع کر دو بس ہو گیا تعلق۔ واللہ وہی نفع ہو گا جو پیری مریدی میں ہوتا ہے۔ اب لوگوں کا عجب حال ہے کہ کام بتاؤ تو نہ کریں بس بیعت کا نام کرنا چاہتے ہیں بیعت کیا ہے محض رسم ہی رسم رہ گئی ہے چنانچہ جو پیر ایسے ہیں کہ مرید تو کر لیتے ہیں لیکن کام کچھ نہیں بتلاتے ان سے تو لوگ بہت خوش ہیں اور میں مرید تو کرتا نہیں لیکن کام بتلاتا ہوں تو مجھ سے ناراض ہیں یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ بھید میں فقیر کے وہ انچھر ہیں پریم کے وہ مریدوں ہی کو بتائے جاتے ہیں۔ یہ خیال ہے کہ مرید کرتے ہی پیر بس پریم کے وہ انچھر بتا دیگا اور اللہ والے ہو جائیں گے۔ دھرے تھے انچھر دھرے تھے بھید ڈلے پتھر۔ میاں خدا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لو اور احکام بجالاؤ۔ بس یہی انچھر ہیں اصلاح نفس کے طریقے پیر سے پوچھو یہی بھید ہیں اگر کوئی کہے کہ کیا باطنی طریق بس یہی ہے تو ہم باواز دہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے اور کبھی اس طریق میں بڑے بڑے حالات بھی پیش آئیں گے بڑی بڑی کیفیات بھی طاری ہوں گی یہ سب ہوگا مگر یہ مقصود نہیں ہے۔ بھائی حالات تو سڑک کے درخت ہیں پھولوں کے نظر آئے تو کیا نہ نظر آئے تو کیا سڑک تو بہرحال قطع ہوگی درختوں اور پھولوں کا نظر نہ آنا سڑک کے قطع ہونے کے لئے ضروری نہیں نظر پڑیں گے تب قطع ہوگی نہ نظر پڑے گی تب قطع بس چلتے رہنا شرط ہے اور بعضوں کو یہ درخت اور پھول عمر بھر بھی نظر نہیں آتے۔ واللہ جن حالات کو آپ بڑا کمال سمجھتے ہیں طریق میں بس ایسے ہیں جیسے سڑک پر دو طرفہ درخت لگے ہوں گلاب اور بیلے کے کبھی نظر نیچی کر کے چلتے ہیں تو کیا راستہ قطع نہیں ہوتا۔ راستہ تو برابر قطع ہوتا ہے چاہے درخت نظر پڑیں یا نہ پڑیں افسوس ہے تصوف کا ناس کر دیا ہے ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہاؤ بنا رکھا ہے کہتے ہیں کہ چلّے کھینچو بیوی کو طلاق دیدو اولاد کو عاق کر دو دروازہ کو تیغا کر دو چالیس چنے رکھو اور ایک چنا روز کھاؤ بدون اس کے اصل فقیری ملتی ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں واللہ دو مثالوں میں گدے تکیوں میں سلطنت میں مرغن کھانوں میں فقیری ملتی ہے مگر گھر میں نہیں شیخ کامل کی

خدمت میں ملتی ہے چنانچہ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جن کی شان اتنی بڑی ہے کہ مولانا روم جیسے عارف کی ان کے بارہ میں یہ رائے ہے ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت　　ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

(عطار نے عشق کے سات شہروں کی سیر کی ہے ہم تو ابھی عشق کے ایک کوچہ ہی کے پیچ و خم میں جل رہے ہیں)

وہ فرماتے ہیں ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر و پس بیا

(اے دل اگر اس محبت کے سفر کو طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو کسی رہبر کامل کے دامن کو مضبوط پکڑے چلا آ۔)

در ارادت باش صادق اے فرید[۱]　　تا بیابی گنج عرفاں را کلید

؎ بے رفیقی ہر کہ شد در راہ عشق　　عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

(بلا مرشد کے طریق عشق میں جس نے قدم رکھا اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا)

مگر شیخ ہونا چاہیئے کامل اور کامل شیخ کی پہچان یہ ہے کہ شریعت کا پورا متبع ہو بدعت اور شرک سے محفوظ ہو کوئی جہل کی بات نہ کرتا ہو۔ اس کی صحبت میں بیٹھنے کا یہ اثر ہو کہ دنیا کی محبت گھٹتی جائے اور حق تعالیٰ محبت بڑھتی جائے اور جو مرض باطنی بیان کرو اس کو بہت توجہ سے سن کر اس کا علاج تجویز کرے اور جو علاج تجویز کرے اس علاج سے دم بدم نفع ہوتا چلا جائے اور اس کے اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی چلی جائے۔ یہ علامت ہے شیخ کامل کی ایسا شخص مل جائے تو وہ اکسیر اعظم ہے تو یہ ہے طریقہ محبت پیدا کرنیکا۔ اس سے تو ہوگی محبت آگے رہا عمل تو اس کے لئے ضرورت ہوگی ہمت کی۔ اب ایک اور غلطی میں لوگ مبتلا ہیں کہ پیر بنا کر اس کو ٹھیکہ دار اور ذمہ دار اعمال کا سمجھتے ہیں اس میں ان کا قصور نہیں کیونکہ ان کو بہکایا ہے دوکانداروں نے چنانچہ ایک گاؤں میں ایک پیر صاحب آیا جایا کرتے تھے ایک بار آئے تو کچھ دبلے ہو رہے تھے گھر پر مرغن کھانے نہ ملے ہوں گے۔ ایک چودھری نے جو مرید تھا دیکھ کر کہا کہ اے پیر یہ کیا بات ہے توں (یعنی تو) ڈبلا بہت ہو رہا ہے اب کیا تھا انھیں موقع مل گیا کہا چودھری جی ڈبلا نہ ہوں تو کیا ہوں تمہاری طرف سے کام بھی تو مجھے بہت کرنے پڑتے ہیں تم نماز نہیں پڑھتے تمہاری طرف سے مجھے نماز پڑھنی پڑتی ہے تم روزے نہیں رکھتے تمہاری طرف سے مجھے

[۱] اے فرید حسن عقیدت و ارادت کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے تاکہ تجھ کو گنج معرفت کی کنجی حاصل ہو جائے)

روزے رکھنے پڑتے ہیں اور سب سے مشکل کام یہ ہے کہ تمہاری طرف سے مجھے پلصراط پر چلنا پڑتا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے بس اسی فکر میں جان سوکھی جاتی ہے اب تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ کیوں دُبلا ہو رہا ہوں ان ہی وجہوں سے دبلا ہو گیا۔ یہ سنکر چودھری کو بڑا رحم آیا کہنے لگا دَہ دَہ (کلمۂ تاسف) اے پیر تجھے تو بڑے کام کرنے پڑتے ہیں تیرے اوپر تو بڑی محنت پڑے ہے جا میں نے تجھے اپنا مونجی کا کھیت دیا پیر صاحب نے سوچا کہ یہ گاؤں کے لوگ ہیں ان کا کیا اعتبار ہے ابھی چل کر کھیت پر قبضہ کر لینا چاہیئے ورنہ ممکن ہے بعد کو رائے بدل جائے فوراً کہا کہ چودھری جی میں نے تمہارا وہ کھیت کبھی دیکھا نہیں چل کے مجھے دکھا دو اور قبضہ کرادو اس نے کہا چل۔ اب پیر صاحب تو آگے آگے اور مرید صاحب پیچھے پیچھے کھیتوں میں راستہ نہیں ہوتا پتلی پتلی ڈولیں ہوتی ہیں خاص طور سے مونجی اور دھان کے کھیتوں کی ڈول بہت اونچی اور پتلی ہوتی ہیں اور کھیتوں میں پانی بھرا رہتا ہے یہ دونوں بھی ایک پتلی سی ڈول پر چلے جا رہے تھے۔ دفعۃً پیر صاحب کا پاؤں پھسلا اور دھڑام سے نیچے آرہے کیونکہ پانی کی وجہ سے مٹی بھی چکنی ہو رہی تھی چودھری نے کود کر اوپر سے ایک لات رسید کی اور کہا کہ ٹھہرے تو تو کہے تھا کہ میں پلصراط پر چلوں ہوں جو بال سے بھی باریک ہے تو بالکل جھوٹا ہے ایک بالشت چوڑی مینڈ پر تو تجھ سے چلا ہی نہ گیا بال سے باریک پلصراط پر تو تو ضرور چلتا ہو گا، جا میں کھیت نہیں دیتا میں تو پلصراط کے بدلے دوں تھا اب کیوں دوں۔ جا میں اب نہیں دیتا کھیت کا کھیت بیچارے کے ہاتھ سے گیا۔ پانی میں جدا گرا اور اوپر سے لات پڑی سو الگ، تو جناب ان جاہلوں کو لیسے دوکانداروں نے یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ تمہیں کچھ عمل کرنے کی ضرورت نہیں سب ہمیں کر لیں گے بس اب وہ سچے پیروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ چنانچہ میرے پاس خطوط آتے ہیں کہ صاحب تہجد کے لئے آنکھ نہیں کھلتی دعا کر دو کہ آنکھ کھلا کرے میں لکھدیتا ہوں کہ اچھا میں اس شرط پر دعا کروں گا کہ آپ میرے لئے یہ دعا کر دیجئے کہ میری ایسی ٹانگیں ہو جائیں کہ میں روز کلکتہ پہونچکر اور آپکا ہاتھ پکڑ کر آپ کو اٹھا دیا کروں، بیوقوف ہوتے ہو۔ آنکھ نہیں کھلتی تو میں کیا کروں، میاں اٹھو کسی طرح اور اگر کسی طرح نہیں اٹھا جاتا تو عشاء کے بعد ہی تہجد کی رکعتیں پڑھ لیا کرو۔ غرض ہر چیز کا علاج ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ وظیفہ پورا نہیں ہوتا کوئی ایسی توجہ دیجئے کہ وظیفہ پورا ہو جایا کرے بس سارے کام توجہ ہی سے چلانا چاہتے ہو لاؤ میں توجہ کی حقیقت ظاہر کر دوں صاحبو کہیں دوسروں کی توجہ سے بھی کام چلتا ہے جب تک کہ خود توجہ نہ کرے اور ہمت سے کام نہ لے سارا کام

ہمت پر موقوف ہے بیوقوف یوں سمجھتے ہیں کہ بس سب کچھ پیروں کے ہاتھ میں ہے، پیر تو بیچارے کیا چیز ہیں خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابوطالب کے لئے بہت چاہا کہ مسلمان ہو جائیں مگر ہدایت نہ ہوئی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کو ارشاد ہوا انک لا تھدی من احببت یعنی آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں، لیجئے جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی اپنی توجہ سے ہدایت نہ کر سکے تو پیر بیچارے تو کیا کرتے دیکھا آپ نے۔ اب تو صاحبو آپ کو توجہ کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ پھر ایک اور غضب یہ ہے کہ دین تو دین دنیا کے کام بھی پیر ہی کے سپرد کئے جاتے ہیں ایک صاحب نے مجھے خط لکھا کہ یہاں اتنے آدمی اب تک طاعون میں مر چکے ہیں خیر جو مر چکے وہ تو مر چکے اب جو زندہ ہیں ان کی خیریت چاہیے۔ ایسی دعا کیجئے کہ وہ نہ مریں میں نے لکھا کہ حضور آپ کو تو ماشاء اللہ وہاں کی انسپکٹری مل گئی ہے جو وہاں کے انتظامات کی فکر ہے لیکن مجھے ابھی ٹھیکیداری نہیں ملی۔ تم تو انسپکٹر ہو گئے ہو مگر میں تو ٹھیکیدار نہیں ہوا۔ یہ درخواست تو ایسی ہے کہ گویا حوالات سے اتنے مجرم تو بھاگ گئے بقیہ کا میں پہرہ دوں سو مجھے اس چوکیداری سے معاف رکھئے۔ اس قسم کی حماقتیں کرتے ہیں نعوذ باللہ شرک میں مبتلا ہو گئے لوگ غرض یہاں تو جو کچھ حاصل ہوتا ہے کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور تم چاہتے ہو کہ کچھ کرنا نہ پڑے، پیر کی توجہ ہی سے سب کام بن جائیں اور کمال حاصل ہو جائے۔ ارے بھائی جن سے یہ درخواست ہے پہلے ان سے تو تحقیق کر لو کہ انھیں جو کمال حاصل ہوا ہے وہ کاہے سے حاصل ہوا ہے حضرت چکی پیسنے سے پہلے چکی پیسی پھر آٹا نکل آیا پھر پانی ڈال کر آٹا گوندھا پھر روٹی بنا کر توے پر ڈالی پھر وہ پک گئی پھر کھالی۔ اب تم چاہتے ہو کہ کرنا تو کچھ نہ پڑے اور پیٹ بھر جائے۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی، دو شخص ہم سفر تھے کسی مقام پر روٹی پکانے کے لئے ٹھہرے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ آٹا تو میں لے آؤں گا لکڑی تم لے آؤ۔ اس نے کہا بھائی مجھ سے تو نہیں اٹھا جاتا میں تو بہت تھک گیا ہوں تمہیں دونوں چیزیں لے آنا خیر وہ آٹا بھی لے آیا لکڑی بھی لے آیا۔ پھر اس نے کہا میں آگ جلاؤں تم آٹا گوندھ لو۔ کہا اجی صاحب معلوم نہیں پتلا ہو جائے سخت ہو جائے پھر تم خفا ہونے لگو بس تم ہی گوندھ لو بیچارے نے آٹا بھی گوندھ لیا، پھر اس نے کہا تم توے پر روٹی ڈالتے جاؤ میں سینکتا جاؤں۔ کہا میں نے تو بھائی کبھی روٹی پکائی نہیں کچی رہ جاوے جل جائے تمہیں اچھی پکاؤ گے خیر اس نے روٹی بھی پکالی۔

جب سیر ہو ہو اچکا اور روٹی پک پکا کر تیار ہو گئی تو اس نے ساتھی سے کہا کہ آؤ روٹی تیار ہے کھالو کہنے لگا بھائی تمہارے خلاف کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی اب کہاں تک خلاف کروں اور کب تک انکار کرتا رہوں شرم آتی ہے اچھا لاؤ کھالوں بسم اللہ الرحمن الرحیم بس احسان جتلا کر کھانے بیٹھ گئے خیر غنیمت ہے ایک بات تو مانی ۔ تو اب تم بھی چاہتے ہو کہ ایسا پیر ملے جو پکی پکائی کھلادے لیکن ایسا نہ ہوگا ع ایں خیال است و محال است و جنوں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو پکی پکائی کھلائی ہی نہیں اور کسی کی تو کیا ہستی ہے اور کیا مجال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو غایت شفقت سے بہت چاہتے تھے کہ پکی پکائی ہی کھلا دیں مگر غیرت حق اور مصلحت دین کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت نہ دی تو بھائی خوب سمجھ لو کہ کام کرنے ہی سے کام چلے گا بس طریق یہی ہے کہ کام کرو محنت کرو خدا برکت دیگا ۔ اگر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ کام کرو اور محنت کرو جیسا کہ یجاھدون فی سبیل اللہ سے میں ثابت کر چکا ہوں خلاصہ یہ کہ جو پیر ایسا کامل مکمل ہو اور جس میں مذکورہ علامتیں ہوں اس کی خدمت میں رجوع کرو لیکن بیعت پر اصرار نہ کرو درخواست پر اگر وہ کر لے اس کی عنایت ہے باقی تم اس کو دق نہ کرو پھر جو وہ کہے کرو۔ اگر محنت کراوے محنت کرو ۔ ذکر وشغل کراوے ذکر شغل کرو غرض اس کی فکر میں لگ جاؤ کہ کسی کامل مکمل کی صحبت میسر آئے اب آخر میں یہ عرض ہے کہ مقصود میں کوتاہی کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں ان کو چاہیئے کہ اپنے قصد کو پختہ کریں اور ہمت سے کام لیں ۔ دوسرے وہ ہیں جن میں محبت کی کمی ہے وہ اہل محبت کی صحبت اختیار کریں غرض یہ دونوں چیزیں لازم طریق ہیں ایک عمل دوسری محبت اول میں ہمت کی ضرورت ہے دوسری میں اہل اللہ کی صحبت اور ان کے اتباع کی اس سے ان صفات کی جامع اور ان ثمرات کے مستحق ہو جاؤ گے جو اس وقت بہ ضمن آیت قرآن بالتفصیل بیان کئے گئے ۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا میں کہہ چکا اب میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام اس کی خصوصیات کے لحاظ سے جو کہ ظاہر ہیں "طریق القلندر" رکھتا ہوں ۔ اس نام میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قلندر کے متعلق چونکہ عموماً لوگ بہت غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اس نام کو سن کر یا دیکھ کر بے اختیار ان کو اشتیاق ہوگا کہ لاؤ دیکھیں اس وعظ میں طریق قلندر کی کیا حقیقت بیان کی گئی ہے اور جب دیکھیں گے تو ساری عمر بھر کیلئے ساری غلط فہمیوں سے محفوظ ہو جائیں گے اور حضرت حافظ کے ان اشعار کی حقیقت کی تحقیق اور حقیقت کی تصدیق ہو جاوے گی ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(یعنی جو شخص بھی چہرہ آراستہ کرے یہ لازم نہیں کہ دلبری جانتا ہو جیسے جو شخص آئینہ بناتا ہو یہ لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو)

۵ ہزار نکتۂ باریکتر زمو اینجا ست ۔ نہ ہرکہ سر بتراشد قلندری داند

(اس جگہ ہزاروں باریکیاں بال سے زیادہ باریک ہیں جو شخص بھی سر منڈائے ضروری نہیں کہ قلندری بھی جانتا ہو)

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائیں اور قلندر کی جو صفت اس وقت کتاب وسنت اور اقوال مشائخ دائمہ طریق سو بیان کی گئی ہے اس کا پورا پورا مصداق بنائیں اور ہر قسم کی گمراہی اور کجی سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھیں چونکہ یہ بیان حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے قریب ہوا ہے جس میں حضرت کا روحانی فیض شامل ہونا بھی بعید نہیں اس لئے میں اس کا ثواب حضرت کی روح مبارک کو پہنچاتا ہوں (پھر سارے مجمع نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور بعد دعا حضرت نے فرمایا کہ مصافحہ سے معافی چاہتا ہوں مجھکو بھی تکلیف ہوگی اور سب کو تکلیف ہوگی گیارہ بج چکے ہیں رات زیادہ ہوگئی سب صاحب آرام فرمائیں فقط وعظ تمام شد ۔ اشرف علی

جامع وعظ ہذا احقر عبد الحسن عرض کرتا ہے کہ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ یہ معرکۃ الآرا وعظ تقریباً چودہ برس بعد آج ۲۰ ذوالحجہ ۱۳۵۰ھ یوم چہارشنبہ ٹھیک اذان مغرب کے وقت سہ دری حضرت حاجی صاحب میں بمقام خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفرنگر صاف ہوکر قابل اشاعت ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کو نافع اور مقبول فرمائے اور میرے لئے کفارۂ سیأت و ذخیرہ آخرت کرے ۔ جو صاحب فائدہ اٹھائیں حضرت واعظ ظلہم العالی کی طول حیات بایں فیوض و برکات کیلئے نیز جامع وعظ و ناشر وعظ کے لئے توفیق مرضیات و حسن خاتمہ کی دعا فرمائیں ۔ جناب مولوی حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری کے لئے بھی دعا فرمائیں ' جن کے مسودہ اجمالی سے مجکو مدد ملی اور تسوید تفصیلی میں بھی بہت سے مشکل مقامات اُن سے حل ہوئے ۔ مکرمی حافظ صغیر احمد صاحب سے بھی بہت مدد ملی کیونکہ نقل و مقابلہ انھیں نے کیا اور اگر وہ رات دن محنت کر کے اس کام کو نہ کرتے تو سارے کام اتنی قلیل مدت میں ہرگز ختم نہ ہوسکتے تھے ان کیلئے بھی دعا کیجئے اب آخر میں یہ احقر بھی اس وعظ کی تبییض کا ثواب بہ تبعیت حضرت واعظ مدفیوضہم العالی حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی روح پُرفتوح کو پہنچا کر ختم کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ۔

والسلام مع خیر الکلام الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات ۔ ۲۷ ذی حجہ ۱۳۵۰ھ

ملنے کا پتہ

مکتبہ تھانوی ــــ دفتر الابقاء بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

آثار العباد

(منجملہ ارشادات)

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر: محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی ۱

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمٰی بہ

آثار العبادہ

این	متٰی	کم	کیف	من ای شان	لم	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	ہیئت بیان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	سبب وعظ	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
مدرسہ نظامیہ شبلی گنج حیدرآباد دکن	۲۷ ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۲ھ روز شنبہ بعد عشاء	۳ گھنٹہ	کرسی پر بیٹھ کر	.	.	.	احمد عبدالحلیم کانپوری لیدر ورکس مسٹن روڈ کانپور اور پھر حاجی محمد یوسف صاحب کے مرتب سے احقر ظفر احمد عفا عنہ نے اس کو اور حیدرآباد کے دوسرے وعظ اسرار العبادہ پر نظر کرکے دونوں کو مرتبط کیا	۳۰۰	.

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دعاء خطبہ ماثورہ۔ تعوذ و تسمیہ۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا (وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان ہے سو تو عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے) یہ ایک آیت ہے سورہ مریم جس کی تلاوت اس کے قبل ایک نہایت مختصر جلسہ بیان میں کی گئی تھی چونکہ مضمون نہایت ضروری تھا اس لئے اس کی شرح کو یہاں بھی کافی سمجھا گیا اور اسی کی تلاوت بھی کی گئی اور اس مضمون کا خلاصہ آیت کے سننے ہی سے معلوم

ہوگیا ہوگا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ کس قدر ضروری مضمون ہے اور ضرورت بھی ایسی ویسی معمولی نہیں بلکہ اس کا بڑا شدید درجہ ہے جس کے اعتبار سے اس کو اہم کہہ سکتے ہیں۔ اور جو مقصود ہے آیت سے اس کا مادہ خود آیت میں موجود ہے اس لئے مجھے اس کے تعیین کی ضرورت نہیں اور وہ مادہ کیا ہے وہ عبادۃ ہے جو فاعبدہ (پس اس کی عبادت کرو) میں مذکور ہے اور اس کا سیاق و سباق اسی کی تمہید کے لئے ہے یا تاکید کے لئے باقی مقصود صرف فاعبدہ ہے جس میں عبادت کا امر ہے جو عام طور پر اس کے سننے ہی سے مسلمانوں کے ذہنوں میں آ گیا ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کو فاعبدہ کا صیغہ اور ترکیب نہ معلوم ہو مگر یہ تو سب ہی کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت گو ایک شرعی اصطلاح ہے مگر مخفی نہیں ہے۔ کون مسلمان ایسا ہے جو لفظ عبادت کا استعمال نہ کرتا ہو۔ متعدد موقعوں پر اس کا برابر استعمال کیا جاتا ہے اس لئے آیت کا مفہوم تو سب کے ذہنوں میں متعین ہو گیا ہوگا کہ اس آیت میں عبادت کا امر ہے اور یہی اس کا خلاصہ ہے۔ جب مقصود کی تعیین ہو گئی تو اس کا ضروری ہونا بھی معلوم ہو گیا کیونکہ حق تعالیٰ اس کا امر فرما رہے ہیں مگر غور طلب بات یہ ہے کہ عبادت کا مفہوم اس قدر تو سہل کہ روزمرہ کی بول چال میں آتا ہے اور اس قدر ضروری کہ ہر وقت انسان اس کا مکلف ہے مگر پھر کیوں اس کی طرف توجہ نہیں اور یہ ایک عجیب رحمت حق ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ عام ضرورت کی ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سہل ہوتی ہے مگر غافلین کی بے قدری سے یہ کیفیت ہوتی ہے کہ چیز جس قدر سہل ہوتی ہے اسی قدر اس کی وقعت گھٹتی جاتی ہے۔ حالانکہ سہولت واقع میں وقعت گھٹنے کا سبب نہیں بلکہ اور زیادہ توجہ کا سبب ہے کیونکہ سہولت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے طبائع و اذہان میں زیادہ مناسبت پیدا کر دی گئی ہے اور مناسبت عامہ اسی چیز سے پیدا کی جاتی ہے جو اہم ہو جو چیز جس قدر زیادہ اہم ہے اتنا ہی زیادہ عام ہے یہ ایک قدرتی انتظام ہے اور یہ انتظام بھی عام ہے۔ تکوین کو بھی تشریع کو بھی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے لئے ہوا کی ہر وقت کس درجہ ضرورت ہے۔ چنانچہ سانس کی آمد و رفت ہی پر قوام عیش کا دارومدار ہے

چنانچہ اگر سانس بند کردی جاوے تو ہلاکت یقینی ہے اور اگر ہوا معدوم کردی جائے تو سانس بند ہونا یقینی ہے غرض ہوا کا عناصر اربعہ میں ضرورت میں سب سے اشد ہے مگر باوجود اس کے کتنی ارزاں اور کس قدر عام ہے کہ ہر جگہ ہے اور مفت ہے کہ کہیں بھی نہیں بکتی گو اس کے آلات بکتے ہوں۔ مگر وہ آلات ہوا پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتے صرف ساکن ہوا کو حرکت دینے کے لئے ہوتے ہیں مثلاً پنکھا کہ اس کے ذریعہ سے ہوا میں حرکت پیدا کی جاتی ہے جس سے راحت میں زیادتی ہو جاتی ہے مگر نفس راحت پنکھے پر منحصر نہیں وہ محض ہوا سے ہے۔ چنانچہ اگر پنکھا نہ ہو تو یہ اور بات ہے کہ گرمی کی تکلیف ہو مگر ہلاکت نہیں ہو سکتی بخلاف ہوا کے کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان ہلاک ہی ہو جاوے۔ بہر حال ہوا چونکہ مدار زندگی ہے اس لئے قدرتی انتظام ہے کہ اس کا ایک کرہ ہے جو ہوا میں بھرا ہوا ہے جس کی نہ قیمت نہ تخصیص بلکہ بے حد تعمیم ہے۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ جس قدر زیادہ ضرورت کی چیز ہو اسی قدر زیادہ مہنگی اور دشوار یاب ہو مگر نہیں قدرتی انتظام بالکل اس کے برعکس ہے کہ جو چیز جس قدر زیادہ ضرورت کی ہے اسی قدر زیادہ ارزاں ہے۔ چنانچہ ہوا کی کیفیت آپ نے دیکھ لی پھر ہوا کے بعد پانی کا درجہ ہے۔ سو چونکہ اس کا درجہ ہوا سے کم تھا، اس لئے کہیں کہیں، کبھی کبھی بکتا بھی ہے۔ پھر دیکھئے سب میں کم کام آنے والی چیز جواہرات اور موتی ہیں۔ چنانچہ ہزاروں آدمیوں نے شاید زندگی بھر بھی جواہرات دیکھے بھی نہ ہوں گے اور نہ استعمال کئے ہوں گے تو کسی کی ضرورت اس پر اٹکی نہیں۔ مگر باوجود اس کے دیکھ لیجئے کس قدر قیمتی ہیں اور جیسے تکوین میں آپ نے دیکھا کہ ضروری چیزیں ارزاں ہیں اور غیر ضروری گراں یہی انتظام حق تعالیٰ نے تشریع میں بھی رکھا ہے۔ چنانچہ تشریع میں سب میں ضروری اور اہم اور سب سے بڑا ایمان ہے کہ کوئی وقت اور کوئی حالت ایسی نہیں جس میں یہ ساقط ہو جاوے اس لئے اس میں اس قدر تعمیم ہے کہ اگر زبان سے نہ ہو سکے تو قلب سے ہو اور ایک دفعہ زبان وقلب سے ہو جانے کے بعد اگر غفلت کی وجہ سے

قلب میں دوام استحضار نہ ہو تو مضر نہیں بلکہ ایک دفعہ کا استحضار بھی کافی ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اس کی ضد کا استحضار نہ ہو۔ چنانچہ کوئی شخص ایک مرتبہ ایمان کا اعتقاد کر کے سو گیا یا کسی دوسرے شغل میں منہمک ہو گیا تو ظاہر ہے اس وقت اس کو ایمان کا استحضار نہیں، کیونکہ قاعدہ ہے اَلنَّفْسُ لَاتَتَوَجَّہُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدَۃٍ عَادَۃً (نفس آن واحد میں عادۃً دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) اور عادۃً کی قید اس لئے لگائی کہ نفس کی توجہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف ہونے میں کوئی امتناع عقلی ثابت نہیں ہے بلکہ عقلاً ایسا ممکن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ توجہ تام نہ ہو غیر تام ہو مگر توجہ دو طرف ہو سکتی ہے گو عادۃً ایسا کم ہوتا ہے اس لئے یہ قید بڑھائی۔ تو سو جانے کے بعد یا کسی اور ایسے کام میں مشغول ہو جانے کے بعد جس میں انہماک کی ضرورت ہو کہ اس کو انجام دیتے ہوئے اور کوئی بات ذہن میں نہ رہ سکتی ہو ایمان سے بجائے استحضار کے ذہول محض ہو جاتا ہے مگر یہ ذہول حکم بالایمان میں مضر نہیں تو حق تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ ایمان کے استحضار دوامی کو فرض نہیں کیا، ورنہ اگر استحضار دواماً فرض ہوتا تو نہ سونا جائز ہوتا، اور نہ کوئی ایسا کام کرنا جائز ہوتا جس میں شدید انہماک ہو اس لئے اس میں اس قدر وسعت کر دی کہ اگر کسی وقت کسی عذر کی وجہ سے تصدیق باللسان بھی نہ ہو سکے تو تصدیق بالجنان بھی کافی ہے اور اگر تصدیق بالجنان ایک دفعہ کر کے پھر ذہول ہو گیا تو یہ بھی کافی ہے کہ ضد تصدیق کا یعنی تکذیب کا استحضار نہ ہو بس یہ عدم استحضار ضد ہی استحضار ایمان سمجھا جائے گا، حالانکہ ان کی شان عظمت کا تو یہ حق تھا کہ ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی | شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار اس محبوب حقیقی غافل مت ہو شاید وہ توجہ کرے اور تو آگاہ نہ ہو)

کیونکہ جتنے تعلقات یا کمالات موجب یادداشت ہو سکتے ہیں وہ سب یہاں بدرجہ اتم واکمل موجود ہیں مثلاً انعام و احسان حسن و جمال فضل و کمال علم و غنا جود و سخا و عدل و قدرت قہر وغیرہ یہ تمام اوصاف کمال علی وجہ الکمال حق تعالےٰ میں پائے

جاتے ہیں جب تمام اسباب موجب ذکر ان میں موجود ہیں تو عقل اس کو مقتضی ہے کہ ذکر بھی ہر وقت ہونا چاہیئے کیونکہ جب کمالات احسانات میں کسی آن انقطاع نہیں تو ذکر و توجہ میں انقطاع کیوں ہو اس میں بھی کسی آن انقطاع نہ ہونا چاہیئے یہاں ایک مسئلہ استطراداً بیان کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ آجکل ہر بات میں عقل پرستی کا زور ہے ہر معاملہ میں اسی کو فیصلہ کے لئے حکم بنایا جاتا ہے حتیٰ کہ شرعیات میں بھی اور شرعیات سے معادیں بھی۔ اور پھر عقل بھی کونسی وہ جو دنیا کے معاملات میں بھی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے تعجب ہے اس کو حکم بنایا گیا ہے ایسے عظیم فیصلہ کے واسطے۔ اور تمنا کی جاتی ہے کہ اگر عقل کے موافق احکام ہوتے تو خوب ہوتا لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی شریعت خیر خواہ ہے دیکھئے اسی مقام پر عقل کا فتوٰی تو یہ ہے کہ استحضار تصدیق دواماً ضروری ہو ایک ساعت بھی غفلت جائز نہ ہو جیسا ایک بزرگ غلبہ میں کہتے ہیں ؎

ہر آں کہ غافل از حق یک زمان ست ۔ در آندم کافر اماں نہان است

(جو شخص اللہ تعالیٰ سے تھوڑے زمانہ میں بھی غافل ہے اس وقت مومن کامل نہیں ہے)

یہاں کافر سے کافر اصطلاحی مراد ہے یعنی مومن کامل کے مقابل اور کامل بھی کیسا جو اکملیت کے درجہ پر پہنچا ہوا ہو۔ کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں ایک درجہ کامل کا ہے اور ایک اکمل کا۔ اور پھر اکملیت کے بھی مختلف درجے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ جو حق تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھے وہ مومن اکمل ہے اس کے مقابلہ میں جو شخص یاد میں غفلت کرے اُسے اضافۃً کافر کہدیا ہے اس سے حقیقی دفقہی کافر مراد نہیں غرض غلبہ حال کا جو اقتضا ہے کہ استحضار دواماً ہو عقل کا بھی وہی اقتضا ہے تو اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی اور محض عقل ہی حاکم ہوتی تو وہ تو سب کو عاصی قرار دیتی شریعت مقدسہ نے یہ رحمت فرمائی کہ آپ کو ذہول کی اجازت دے دی اور عدم تصدیق کو بھی

جب کہ تکذیب نہ ہو تصدیق کا قائم مقام کردیا۔ اب بتلایئے عقل زیادہ خیرخواہ ہوئی یا شریعت مقدسہ یہ تو ان عقل پرستوں کو خطاب تھا جن پر سائنس کا غلبہ ہے۔ اور عقل کو شرع پر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح ایک اور جماعت ہے جو حقیقت کو شریعت پر ترجیح دیتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ شریعت اور ہے حقیقت اور ہے میں ان کو بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ جس شریعت کی وہ جڑیں اکھاڑتے ہیں وہی ان کی خیرخواہ ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اگر حقیقت محضہ کو حکم بنایا جاوے تو زندگی تلخ اور زیست وبال اور حرام ہو جائے مثلاً آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز میری ہے اور یہ زید کی اگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو نہ آپ کی ہے نہ زید کی کیونکہ ؎

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست　　　　این امانت چند روزہ نزد ماست

(حقیقت میں مالک ہر شے کے خدا ہیں یہ امانت چند دن کے لئے ہمارے پاس ہے)

زید و عمرو کی طرف محض مجازی نسبت ہے، مگر شریعت کے قربان جایئے کہ اس نے اس ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ حقیقت کا سا کیا ہے اور اس کا بھی پورا اعتبار کیا ہے نہ کسی کی چیز غصب کرنا جائز۔ نہ بے اجازت استعمال کرنا جائز اور اگر حقیقت سے پوچھئے تو ہر چیز کا وہ حال ہوتا۔ جیسے مسجد کے لوٹے اور فرش جن کا کوئی مالک ہی نہیں نہ آپ نہ میں بلکہ ہر شخص کو ان کے استعمال کا حق ہے۔ گو یہ جائز نہ ہو کہ آپ اٹھا کر گھر میں رکھ لیں لیکن استعمال کا حق تو سب کو ہے۔ اسی طرح جو کپڑے آپ نے گٹھڑی میں باندھ کر گھر میں رکھے ہیں ان کا بھی یہی حال ہوتا کہ چونکہ وہ بھی آپ کے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہیں۔ اور خدا کی چیز میں ہر شخص کا حق مساوی ہے سو آپ نے جو انھیں باندھ کر گھر میں رکھا ہے اگر حقیقت ہی حکمراں ہوتی تو یہ آپ کا فعل کیسے جائز ہوتا اور اگر پھر بھی آپ ایسے ہی حقیقت پرست ہیں تو کوئی شخص آپ کی اچکن آپ کے بدن پر سے اتارنے لگے کہ اتنے دن تک آپ پہنے رہے اب میں پہنوں گا۔ تو آپ اُسے منع نہ کیجئے۔ واقعی اگر شریعت نہ ہوتی تو

دنیا میں لوٹ اور غارت کا بازار گرم ہو جاتا اور امن و چین رخصت ہو جاتا۔ مولانا رومی نے ایک ایسے ہی حقیقت پرست جبری کی حکایت لکھی ہے کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا اور جاکے درختوں کے پھل توڑ توڑ کے کھانا شروع کردیئے۔ مالک کو خبر ہوئی اسے منع کیا تو آپ کہتے ہیں کہ باغ بھی خدا کا اور درخت بھی خدا کا اور پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا۔ غرض آکل بھی خدا کا اور ماکول بھی خدا کا تو ہے کون منع کرنے والا تو تیرا اس میں ہی کیا۔ مالک تھا حکیم اس نے نوکر سے ڈنڈا اور رسا منگایا اور باندھ کے مارنا شروع کر دیا اب تو لگا غل مچانے۔ اس نے کہا کہ ڈنڈا بھی خدا کا اور رسا بھی خدا کا تو بھی خدا کا میں بھی خدا کا غرض ضارب بھی خدا کا اور مضروب بھی خدا کا پھر تو کیوں غل مچاتا ہے پس پھر کیا تھا ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار اختیار ست اختیار ست اختیار

(میں جبر سے توبہ کی اختیار ہے اختیار ہے اختیار)

ہوش درست ہوگئے۔ یہیں سے توحید وجودی خالی از شریعت کے اثر کا مسئلہ حل ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

فاش اگر گویم جہاں برہم زنم سر پنہاں ست اندر زیر و بم

(یعنی عشاق اپنے کلمات عشقیہ کو اجمالاً کہہ رہے ہیں میں اگر اس کے راز کو اور حقیقت کو ظاہر اور مفصل کہدوں تو عالم تباہ ہو جائے)

اس کی تفسیر میں نے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے پسنی ہے کہ سر پنہاں سے مراد توحید وجودی ہے مگر وہ نہیں جو ملحدین کی ہے بلکہ توحید وجودی حقیقی جو محققین کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ چونکہ افہام صحیح نہیں ہے اس لئے میں اُسے اگر صاف بیان کردوں تو اس کو غلط سمجھ کر لوگ عالم میں فساد مچادیں۔ یہ نہیں کہ توحید وجودی کا مسئلہ مضر ہے بلکہ افہام ٹھیک نہیں ہیں ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ اس کے اظہار سے ایک طوفان بے تمیزی عالم میں مچ جائے جس کو ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے یہی معنے ہیں جہاں برہم زنم کے بطور اسناد الی السبب کے تو یہ شریعت کی رحمت ہے کہ اس نے ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ ملک حقیقی کا

کا سا کیا ہے کہ مثلاً میراث کے ذریعہ سے جو چیز کسی کے پاس آوے وہ اس کی ملک ہے یا بیع کے یا ہبہ کے ذریعہ سے اس کے پاس آوے وہ بھی ملک ہے۔ رہے مباحات عامہ وہ کسی کی ملک نہیں مگر قبضہ کرنے کے بعد وہ بھی قابض کی ملک ہیں۔ مثلاً پانی یا خود رو گھاس یا جنگل کا جانور شکار اور مچھلیاں ان پر جو اول قبضہ کرے اسی کی ملک ہے۔ دیکھئے شریعت کی بدولت کس قدر انتظام درست ہے اگر یہ نہ ہو تو تمدن ہی درست نہ ہو۔ ایک غدر مچ جاوے اور ہر وقت وہ کیفیت رہے جیسے ڈاکہ پڑا کرتا ہے کہ آپ نے مجھ سے چھین لیا اور آپ سے اس نے چھین لیا غرض ہر وقت جنگ کا سامنا رہتا۔ اب بتلایئے حقیقت ہم پر زیادہ شفیق ہے یا شریعت مقدسہ خوب سمجھ لیجئے حق تعالیٰ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ دنیا میں عقل پرست اور حقیقت پرست دونوں گروہ پیدا ہوں گے اور دونوں کے مقتضا پر عمل کرنے سے یہ تنگی ہوگی اس لئے شریعت کو نازل فرمایا جس نے ہر قسم کی تنگی کو دور کردیا۔ اسی احسان کا اعلان فرماتے ہیں۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) کتنے بڑے دعوے کے لفظ ہیں۔ حضرت یہ دعوے آسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہر جگہ ہر طبیعت کے لوگ موجود ہیں اور ہر زمانہ میں ہوتے آئے ہیں۔ اگر اس دعوے میں کچھ بھی خامی ہوتی تو اس شدومد سے تاکید کے ساتھ نہ فرماتے۔ شاید اس مقام پر کسی کو شبہ ہو کہ ہم تو دین میں تنگی کا کھلا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص شریعت پر عمل کرتا ہے اس کے ہر کام میں روڑے اٹکتے ہیں ہم اپنے معاملات کے لئے چند مسئلے پوچھنے گئے تھے تو مولانا نے جو جواب دیئے کہ فلاں کام جائز ہے اور فلاں ناجائز تو ان میں زیادہ جواب یہی ملا تھا کہ ناجائز ہے۔ چنانچہ ہم قرض لیتے ہیں مگر سود کے بغیر نہیں ملتا اور بغیر قرض کے کام نہیں چلتا۔ اور شریعت سود کو حرام بتلاتی ہے۔ اب اس موقع پر عقل پرست تو یہ کہیگا کہ دین میں سخت حرج ہے بلکہ آجکل تو عقل پرستوں کا اجماع ہے کہ ساری خرابی شریعت ہی کی بدولت ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کا ایک قصہ یاد آیا' ایک صاحب

میرے پاس روزانہ آتے تھے۔ وہ ایک روز ذرا دیر میں آئے میں نے تاخیر کا سبب پوچھا کہا کہ ایک جلسہ کی شرکت کی وجہ سے دیر ہو گئی جس میں مسلمانوں کے اسباب تنزل پر غور کیا جارہا تھا۔ میں نے پوچھا آخر کیا طے ہوا' انھوں نے کہا خیر یہ طے ہوا تھا کہ نعوذ باللہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب اسلام ہے۔ وجہ یہ کہ ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے ہر کام میں رکاوٹ ہے۔ چنانچہ جس نوکری کے فرائض بیان کر کے مسئلہ پوچھتے ہیں تو فتویٰ عدم جواز کا ملتا ہے۔ تجارت کے طریقوں کے متعلق پوچھنے پر کسی کو قمار بتایا جاتا ہے' کسی کو ربوا۔ جب ہر قدم پر لَا یَجُوْزُ (جائز نہیں ہے) کا فتویٰ ہے تو اب بجز اس کے کہ بیکار بیٹھ رہیں اور کیا کریں۔ اب شبہ یہ ہے کہ جب ہر ہر قدم پر تنگی اور حرج ہے تو پھر قرآن میں حرج کی نفی کیسے کی گئی اب اس شبہ کا جواب سنئے کہ خدا تعالیٰ کو اس زمانہ کا بھی علم تھا اور باوجود اس کے پھر جو فرماتے ہیں وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) سو کوئی تو بات ہے جس پر اتنا بڑا دعوےٰ کیا گیا ہے' ورنہ نزول قرآن کے زمانہ سے آج تک کسی نے اس نفی پر کیوں نہ اعتراض کیا حالانکہ ہر زمانہ میں مخالفین بکثرت رہے ہیں۔ پھر نفی بھی معمولی نہیں۔ نکرہ ہے تحت میں نفی کے جس کے معنے یہ کہ ذرا سی اور چھوٹی سے چھوٹی تنگی بھی نہیں ہے۔ سو اُس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کو جو یہ پہاڑ کی برابر تنگی نظر آرہی ہے یہ تنگی واقع میں آپ میں ہے شریعت میں نہیں' جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد　　ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(اے احمق اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

حقیقت میں تنگی اُدھر سے ہے۔ اِدھر سے نہیں ہے۔ معترض نے تنگی کا محل نہیں دیکھا۔ اپنی تنگی کو شریعت کی تنگی سمجھ گیا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہماری بستی میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک عورت بچّہ کو پاخانہ پھرا رہی تھی۔ چاند دیکھنے کا وقت تھا۔ سب چاند دیکھنے لگے، وہ بھی جھٹ سے پاخانہ صاف کر کے چاند دیکھنے

کھڑی ہوئی۔ اتفاق سے کچھ پاخانہ اس کی انگلی میں لگا رہ گیا تھا۔ عورتوں کی عادت کے موافق ناک میں انگلی رکھی تو انگلی میں سے بو آئی۔ کہنے لگی اے ہے آج سڑا ہوا چاند کیوں نکلا۔ اب تمام عقلاء سمجھتے ہیں کہ چاند سڑا ہوا نہ تھا اس کی انگلی سڑی ہوئی تھی اور یہ اس کی حماقت تھی جو اسے اپنی انگلی کی گندگی کی خبر نہ ہوئی اور چاند کو سڑا ہوا کہنے لگی اسی طرح تنگی ہمارے اندر ہے شریعت میں نہیں ہے۔ اس کی ایک اور مثال لیجئے۔ ایک طبیب حاذق کے پاس ایک مریض گیا کسی کوردہ کا رہنے والا۔ جہاں نہ دوا ملتی ہے نہ پرہیزی غذا ملتی ہے تخم کاسنی اسطوخودوس بھی دستیاب نہیں ہوتا اب حکیم صاحب نے اُسے نسخہ لکھ دیا۔ اس نے کہا حکیم صاحب کیا کھائیں۔ حکیم۔ بکری کا گوشت۔" مریض۔ یہ تو ہمارے یہاں نہیں ملتا" حکیم۔ اچھا ترئی کا سالن۔" مریض۔ یہ بھی نہیں ملتا حکیم اچھا کدو پالک کا ساگ۔ مریض یہ اجی یہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ حکیم آخر پھر کیا ملتا ہے۔ مریض۔ کریلے ملتے ہیں۔ حکیم دیکھو کریلے نہ کھانا مریض بیگن ملتے ہیں۔ حکیم بیگن بھی نہ کھانا۔ اس نے کہا ارے صاحب اس کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اب یہ مریض صاحب بہت تنگ دل ہو کے اور ناک منہ چڑھا کے آئے اور لوگوں سے کہنے لگے کہ طب یونانی بہت تنگ ہے۔ حکیم صاحب سے جو کچھ بھی پوچھو اس کے کھانے کو منع کرتے ہیں۔ اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کا مطب تنگ ہے یا اس دیہاتی کا گاؤں تنگ ہے۔ اب سمجھئے کہ شریعت کی تنگی تو جب ثابت ہوتی کہ سب لوگ مل کر شریعت پر عمل کرتے پھر بھی نہ ہو سکتا بتلایئے یہ تنگی ہے کہ وسعت ہے۔ یقیناً اس کو کوئی تنگی نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً بیع ہے کہ بعت و اشتریت سے ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کے کہے بغیر بھی ہو جاتی ہے جسے بیع تعاطی کہتے ہیں۔ تنگی تو جب ہوتی کہ ایسا ہوتا کہ جب تک ایک ہزار مرتبہ بائع بعت اور مشتری اشتریت نہ کہے اس وقت تک بیع نہ ہوگی۔ ریل پر بیٹھے ہیں سودا لیا ہے اس وظیفہ کے پورا ہونے تک ریل ٹھہرتی نہیں۔ تب واقعی مشکل ہوتی۔ اب کیا مشکل ہے۔ اور جس جگہ آپ کو اشکال نظر آتا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ آپ تنہا

شریعت کے موافق معاملہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا شخص اس کی پروا نہیں کرتا۔ تو اس طرح تو ہر قانون تنگ ہو جائے گا۔ آپ کوئی قانون شریعت کا ایسا بتلا دیجئے کہ سب مل کر اس پر عمل کرنا چاہیں اور نہ ہو سکے۔ اس لئے نہایت قوت کے ساتھ فرماتے ہیں مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) بہرحال اتنا بڑا دعوےٰ عقل پرستی کے زمانہ میں اگر واقعی دین میں سہولت نہ ہوتی۔ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ بحمداللہ شبہ کا جواب ہو گیا۔ اس سے پہلے یہ بیان ہو رہا تھا کہ شریعت کی سہولت و رعایت اس قدر ہے کہ عدم اعتقاد ضد کو قائم مقام کر دیا۔ اعتقاد توحید کا یہ تو شریعت کی شفقت ہے۔ اور عقل کا فتوےٰ یہ ہے کہ ہم اعتقاد توحید کا دواماً استحضار رکھیں۔ تو زیادہ خیر خواہ کون ہوا عقل کے ان ہی آثار کو دیکھ کر تو مولانا فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو بارہا آزما لیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

اس کے یہ معنے نہیں کہ عقل کو پھینک ہی دیں کہ محض بیکار ہے۔ نہیں وہ بہت کار آمد ہے مگر ایک حد کے اندر اندر۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص پہاڑ پر چڑھنا چاہتا ہے اور اس پر اتنی چھوٹی اور ایسی اونچی سیڑھیاں ہیں کہ ان پر گھوڑا نہیں چڑھ سکتا ہاں دامن کوہ تک پہونچا سکتا ہے تو کیا پہاڑ پر کار آمد نہ ہونے سے گھوڑا بالکل بیکار ہو گیا۔ ہرگز نہیں کیونکہ دامن کوہ تک بھی بہت مسافت ہے جس میں گھوڑے سے مدد ملتی ہے بس یہی حال عقل کا ہے کہ توحید و رسالت اور اصول اسلام کے سمجھنے میں بہت کار آمد ہے۔ اصول کو تو عقل سے سمجھ لیجئے، اس کے بعد اس کو بالکل چھوڑ دیجئے۔ ورنہ گھوڑے کی طرح گرے گی اور خواہ مخواہ آپ کی بھی ہڈیاں پسلیاں توڑے گی۔ جب خدا کا خدا ہونا۔ اور

رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا برحق اور مطاع ہونا عقل سے ثابت ہوگیا۔ بس اب اسے چھوڑ دیجئے۔ اور آگے عشق و محبت سے کام لیجئے اور اس طرح سے اپنے آپ کو سپرد کر دیجئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر فدا ہیں۔ جان آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہیں)

یعنی جب توحید و رسالت کو سمجھ لیا تو اس کے بعد اب ضرورت اس کی ہے کہ جو ارشاد ہو آمنا و صدقنا۔ نہ یہ کہ خوامخواہ اس میں شبہات پیدا کریں کہ صاحب پلصراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے، عذاب قبر عقل کے خلاف ہے۔ جب مُردہ میں جان ہی نہیں ہے تو عذاب کس پر۔ اور اگر کہو جسم پر عذاب ہے تو ہم جسم کو بھی فنا کر دیں گے اور ہم نہ کریں تو چار دن میں وہ خود ہی فنا ہو جائے گا۔ پھر عذاب کیسے ہوگا جیسے کسی افیونی کی ناک پر مکھی بار بار بیٹھتی تھی اور وہ بار بار اڑا دیتا تھا آخرکار جھنجلا کے ناک ہی کاٹ ڈالی کہ لے اب اڈا ہی نہیں رہا۔ اب کہاں بیٹھے گی۔ اسی طرح جب وہاں قبر میں مردہ ہی گل سڑ کے ختم ہوگیا تو اب عذاب کس پر ہوگا۔ صاحبو ہمارے پاس جواب ہر شبہ کا ہے۔ بحمد اللہ علماء جواب سے قاصر نہیں ہیں مگر یہ غور کرو کہ آیا ان شبہات کا جواب دینا علماء کا فرض منصبی ہے بھی یا نہیں۔ اس کو بھی ایک مثال سے سمجھئے۔

آپ کا ایک مقدمہ ہے کسی جج کے اجلاس پر اس نے آپ کا مقدمہ ہرا دیا۔ اور دفعہ کا حوالہ بھی دے دیا۔ اب آپ جج کے پاس جاویں کہ صاحب فیصلہ تو قانون کے موافق ہے، مگر خود قانون میں سقم عقلی ہے اس لئے مجھے اس میں کلام ہے۔ تو جج کیا کرے گا وہ کہے گا کہ ہم اور کچھ نہیں جانتے بس جو قانون ہے ہم اسی کے پابند ہیں، اور تمام عقلاء جج کے اس

جواب کو معقول اور صحیح کہیں گے اور اس دفعہ پر جو اس شخص کے اعتراضات ہیں ان کا جواب دینا جج کے ذمہ نہ سمجھیں گے۔ تو تعجب کی بات ہے کہ جج کا یہ کہنا تو کافی سمجھا جائے گا اور علماء کا یہ کہنا کہ حکم الٰہی یہی ہے کافی نہ سمجھا جائے کیونکہ جس طرح حاکم بالقانون ہے واضع قانون نہیں ہے اسی طرح علماء بھی عالم بالقانون ہیں واضع قانون نہیں ہیں ان کے ذمہ قانون کا بتلا دینا ہے۔ لم اور وجہ کا بتلانا نہیں ہے۔ گو وہ احکام کی لمیات کو بکثرت جانتے ہیں۔ لیکن جاننے کے بعد بتلا دینا ان پر ضروری نہیں۔ بلکہ سوال عن العلل۔ (علتوں سے سوال) کے جواب میں ان کا یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(افشار کرنا راز کا مصلحت نہیں ورنہ علماء کی مجلس کوئی خبر ایسی نہیں کہ نہ ہو)

پس علماء پر ضروری نہیں ہے اسرار کا ظاہر کرنا بلکہ صوفیہ کرام جو زیادہ غیور ہیں وہ تو اظہار کی ممانعت کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں ؎

با مدعی گوئید اسرار عشق و مستی   بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی اسرار عشق و مستی مت بیان کر اس کو تکبر و خود پرستی میں مرنے دو)

دیکھئے صوفیہ تو اظہار اسرار سے بالکل منع ہی کرتے ہیں اور علماء بیچارے تو کبھی کبھی بتا بھی دیتے ہیں مگر حیرت ہے کہ صوفیہ پر کچھ اعتراض نہیں کیا جاتا جو کچھ کمبختی ہے علماء ہی کی ہے کہ ان کی تو نماز بھی ناجائز اور صوفیہ کی گالیاں بھی جائز۔ بس جی اب تو علماء بھی صوفیہ بنیں تو کچھ کام چلے۔ مگر خدا کے لئے دوکان دار صوفی نہ بنیں بلکہ سچ مچ کے صوفی بنیں۔ تو جب علماء کا یہ اظہار علل فرض منصبی نہیں تو وہ کیوں ظاہر کریں بلکہ صرف ضابطہ کا جواب دے کر بات کو ختم کر دیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے درس میں ایک طالب علم تھے غبی۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت ایام حیض کے روزہ کی تو قضا ہے اور نماز کی

قضا نہیں ہے اس کی کیا وجہ ہے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کے خلاف کروگے تو اتنی جوتیاں لگیں گی کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔ مولانا حکیم تھے۔ اسی باب میں ان کا ایک شعر ہے ؎

اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِکَمِ وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ وُعَّاظٌ عَلَی الْقِمَمِ

(نصیحت اگر علم وحکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر پڑتی نصیحت گروں میں سے سب سے بلیغ نصیحت گر ہے)

تو ضرورت ضابطہ کے جواب کی بھی ہے تاکہ لوگوں کو اپنی غلطی پر تنبیہ ہوتا رہے بہر حال ایمان لانے کے بعد ضرورت نہیں لم وکیف کی۔ بلکہ وہ مسلک رکھنا چاہیئے جیسا عارف گنجوری فرماتے ہیں ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کارِ تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

غور سے سننے کی بات ہے کہ اگر کسی کو تعشق ہوجاوے کسی مردار کے ساتھ یا کسی بڑے مرد کے ساتھ یعنی امرد کے ساتھ کہ جس میں افعل التفضیل کا ہمزہ بھی لگا ہوا ہے۔ یا کسی بازاری عورت کے ساتھ اور وہ کہتی ہو کہ میں اس وقت ملوں گی کہ تم پہلے کرتہ ٹوپی اتار کے سات دفعہ بازار کے بیچ سے ننگے طواف کرتے ہوئے نکل جاؤ۔ اگر یہ واقعی محب ہے تو کبھی یہ نہیں پوچھے گا کہ مجھے اس طرح رسوا کرانے میں تیرا کیا نفع۔ بلکہ کہے گا کہ بہت اچھا اور پاجامہ بھی اتارنے کو تیار ہوجائے گا اور اگر کوئی ملامت بھی کرے گا تو اسے یہ جواب دے گا ؎

نہ سازد عشق را گنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق کا گوشہ سلامتی کے موافق نہیں اس کے مناسب کوچہ ملامت کی رسوائی بہت اچھی ہے)

اسی طرح وہ اگر پچاس چپت بھی لگادے تو برا نہ مانے گا۔ بلکہ اگر قتل بھی کرے تو راضی رہے گا اور یہ کہے گا ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ایسے محبوب پر دل قربان ہے جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے)

تنویر میں ابن عطار نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کوئی شخص کسی پر عاشق ہوا تھا اتفاق سے وہ پکڑا گیا اور اس کو سو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ جب کوڑے مارے جا رہے تھے تو وہ بالکل خاموش تھا یہاں تک کہ ننانوے کوڑے لگ چکے جب سواں کوڑا مارا گیا تو آہ کی۔ کسی نے پوچھا یہ کیا کہ ننانوے کا تو تحمل کر لیا اور ایک کا تحمل نہ کر سکا۔ کہا ننانوے تک محبوب دیکھ رہا تھا، اور جب سواں لگا تو وہ چلا گیا تھا ؎

بجرمِ عشق توام میکشند و غوغا ئیست تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ئیست

(تیری محبت کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور اسی کا شور و غل ہے تو بھی بام پر آجا اچھا تماشا ہو رہا ہے)

محبوب کے سامنے تکلیف میں بھی مزہ ہے۔ یہی وہ مراقبہ ہے جس کی تعلیم حق تعالےٰ نے اپنے محبوب کو دی ہے فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ یعنی آپ صبر کیجئے (مخالفین کی باتوں پر اور یہ صبر اس لئے آسان ہو سکتا ہے کہ) آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں جو کچھ ہو رہا ہے ہمارے دیکھتے ہوئے ہو رہا ہے۔ تو کشتن کی تکلیف تو ہے مگر تو نیز بر سر بام آ کی راحت بھی ہے جس سے یہ کلفت سہل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ معشوق کی امر و نہی بھی ناگوار نہیں ہوتی اس کی مار کوٹ بھی ناگوار نہیں ہوتی، یہ جو احکام تشریعیہ ہیں یہ تو محبوب کے اوامر و نواہی ہیں اور احکام تکوینیہ محبوب کی مار کوٹ ہے کہ آج بیمار ہیں۔ آج زخمی ہے آج ذلیل ہے۔ اور جو اُن کا واقعی عاشق ہے اس کا ان دونوں میں یہ مسلک ہے

؎ خوشا وقت شوریدگانِ غمش کہ گر ریش بینند و گر مرہمش

گدایان از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر

ع؎ تو بھی بام پر آ۔

مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر
نفقیری میں قناعت کرنے والے ہیں)

؎ دمادم شراب الم در کشند وگر تلخ بینند دم در کشند
(ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں
تو خاموش ہو رہتے ہیں)

تو بس بعد تحقیق اصول کے کہ وہ عقلی ہیں ایسی چیز کی ضرورت ہے جو آگے پہاڑ پر چڑھانے والی ہو۔ تو معلوم ہو گیا کہ عقل کی عملداری کہاں تک ہے اور عشق کی کہاں سے۔ اب لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں ہوائی جہاز کی ضرورت ہے وہاں گھوڑے کو لے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ گھوڑے کو ماریں گے اور اپنی بھی ہڈی توڑیں گے اسی لئے تو کہتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را
(عقل دور اندیش کو بارہا آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

اب تو آپ کو عقل کی حد معلوم ہو گئی کہ یہ بیکار تو نہیں ہے مگر ایک خاص حد تک کارآمد ہو سکتی ہے اس سے آگے نہیں۔ اب یہ بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عقل شریعت سے زیادہ شفیق نہیں ہے جیسا کہ اوپر اس کی دلیل بھی مذکور ہوئی ہے اور پھر مع شئے زائد ذکر کرتا ہوں کہ عقل کا مقتضا تو یہ تھا کہ کسی وقت بھی ذکر و توجہ سے غافل نہ ہو مگر شریعت مقدسہ نے عدم توجہ کی بھی اجازت دیدی ہے۔ پھر اجازت بھی مطلق نہیں بلکہ اس کا بھی بڑا درجہ۔ کیونکہ اجازت کے دو مرتبے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ حالت بے توجہی معصیت نہیں گو ناقص ہے۔ سو شریعت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس پر رنج کرنے سے بھی ممانعت فرمادی ہے۔ حالانکہ یہ شخص اکمل کے مقابلہ میں ناقص ہے مگر خود اسے ناقص سمجھنے کی بھی اجازت نہیں ہے یہ اجازت کا دوسرا مرتبہ ہے کہ معصیت کی

نفی کر کے اپنے کو ناقص سمجھنے سے بھی منع کر دیا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت حنظلہ کی ملاقات ہوئی حضرت صدیق اکبرؓ سے، انھوں نے پوچھا اے حنظلہ کیسے ہو، جواب دیا نَافَقَ حَنْظَلَۃُ حَنْظَلَۃُ (یعنی میں) تو منافق ہو گیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا یہ کیسے۔ فرمایا کہ جب ہم حاضر ہوتے ہیں دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا جنت و دوزخ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب وہاں سے آتے ہیں بال بچوں میں مشغول ہو کر سب بھول جاتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر یہ نفاق ہے تو پھر میں بھی منافق ہوں۔ کیونکہ میں بھی اس میں مبتلا ہوں۔ آؤ چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا علاج پوچھیں۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سب حال بیان کیا، آپؐ نے فرمایا یاد رکھو لَوْ کُنْتُمْ کَمَا تَکُوْنُوْنَ عِنْدِیْ لَصَافَحَتْکُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَلٰکِنْ یَا حَنْظَلَۃُ سَاعَۃً (یعنی اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ تمہاری ہر وقت وہی حالت رہتی جو میرے سامنے ہوتی ہے تو تم سے ملائکہ مصافحہ کیا کرتے مگر اے حنظلہ ایک ساعت کیسی اور ایک ساعت کیسی) اس حدیث کے سمجھنے میں علماء قشر پریشان ہو گئے اول تو ان کو نَافَقَ حَنْظَلَۃُ (حنظلہ منافق ہو گیا) پر اشکال ہوا کہ محض تفاوت حالت کو انھوں نے نفاق کیسے کہدیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب پر انھیں شبہ ہوا کہ اس جواب سے حضرت حنظلہ کا اشکال کیونکر حل ہوا۔ اس جواب کی شرح صوفیہ سمجھے اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ مقصود تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا حضرت حنظلہ کی تسلی کرنا ہے۔ مگر سوال یہ ہے اس جواب سے تسلی کیسے ہو گئی۔ اول تو یہ سمجھئے کہ یہاں نفاق سے

حقیقی نفاق مراد نہیں۔ کیونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ و حضرت حنظلہ ضرور یہ بات جانتے تھے کہ نفاق نام ہے ابطان الکفر و اظہار الایمان کا۔ اور جب ہم جانتے ہیں تو کیا وہ نہیں جانتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں ابطان الکفر نہ تھا۔ مگر مجازاً اس کو نفاق کہدیا اور اس کا منشار یہ تھا کہ حالت حضور میں ایمان کامل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت عالم غیب رائے العین ہوتا ہے تو تصدیق بھی کامل ہوتی ہے اور حالت غیبت میں تصدیق کی یہ شان نہیں ہوتی صرف عقلی تصدیق ہوتی ہے جو علم کا درجہ ہے معائنہ و مشاہدہ کی سی کیفیت نہیں ہوتی۔ اس تفاوت کی وجہ سے وہ یہ سمجھے کہ ہمارا ایمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور طرح کا ہوتا ہے، پیچھے اور طرح کا ہوتا ہے گویا کبھی کامل ہے کبھی ناقص ہے اور مطلوب ایمان کامل ہے تو جب اس میں نقص ہوگا وہ نفاق کے مشابہ ہوگا گو حقیقی نفاق نہ ہو۔ یہ نَافَقَ حَنْظَلَۃُ کی تفسیر ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت حنظلہ نے اپنی حالت ادنیٰ درجہ کی سمجھ کر اس پر تاسف کا اظہار کیا تھا تو جواب میں کوئی تسلی کا مضمون ہونا چاہیئے۔ اور جو جواب حدیث میں مذکور ہے بظاہر وہ تسلی کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ ساعۃً ساعۃً ہی پر تو انھیں تاسف ہے۔ پھر یہ جواب وجہ تسلی کیونکر ہو سکتا ہے۔

میرے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی حقیقت بیان فرمائی تھی کہ حکمت حق اس کو مقتضی ہے کہ ملکوت سے ناسوت میں انسان کو آباد کیا جائے اور اگر ہر وقت وہی حالت رہتی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رہتی ہے تو انسان ناسوت میں نہ رہتا۔ بلکہ ملکوت میں پہنچا دیا جاتا۔ اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں ہے، اجمالاً اتنا بتائے دیتا ہوں کہ باہم دو شخصوں میں مصافحہ جب ہوتا ہے عادتاً ایک عالم میں ہوتا ہے اور جس عالم میں ہم ہیں یہ محسوس ہے اگر یہ مصافحہ یہاں ہو تو ملائکہ

جب تک محسوس نہ ہوں گے عادتاً مصافحہ نہ ہوگا اگر کوئی کہے کہ محسوس ہونے کی کیا ضرورت ہے یوں ہی مصافحہ کرتے تو سمجھو محسوس کے معنی مرئی یا مبصر کے نہیں ہیں لمس بھی تو حواس میں سے ہے تو مصافحہ کم از کم بغیر لمس کے نہیں ہوتا جو لوگ آنکھ سے معذور ہیں وہ بھی حواس کے حصہ دار ہیں گو لامسہ ہی سہی۔ بہر حال اس عالم میں مصافحہ ہونا عادتاً موقوف اس پر ہے کہ ملائکہ محسوس ہوں اور عادتاً ملائکہ صرف ملکوت میں محسوس ہوتے ہیں، ناسوت میں محسوس نہیں ہوتے تو وہ مصافحہ اس طرح ہوتا کہ ہم ملکوت میں منتقل کر دیئے جاتے۔ تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایک ہی حالت پر قائم رہتے تو تم ملکوت میں منتقل کر دیئے جاتے اور ایسا ہوتا تو تمہارے ناسوت میں رہنے کی جو حکمت تھی اس کا ابطال لازم آتا تو اس غیبت پر تاسف و تقلق کرنا گو اس ابطال حکمت کی تمنا کرنا ہے جو کہ غیر محمود ہے تو اس ذہول و غیبت کی اجازت کا بڑا درجہ اس سے ثابت ہو گیا۔ تو کتنی بڑی رحمت ہے شریعت کی بمقابلہ عقل کے اور صوفیہ نے اس حکمت کو اس تقریر سے بھی زیادہ واضح و سہل عنوان سے ظاہر کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

(محبوب کی جدائی کی شکایت نہیں اگر جدائی نہ ہوتی تو وصل میں لطف و لذت نہ ہوتی)

یعنی جس طرح بدون پیاس کے پانی کی قدر نہیں اسی طرح غیبت ہی کی بدولت حضور کی لذت ہے گو حضور کی حالت فی نفسہ افضل و اکمل ہے مگر حضور کی روح و لذت خود غیبت پر موقوف ہے اس لئے اس عارض پر نظر کر کے حالت اکمل و اعلیٰ یہی ہے کہ کبھی غیبت ہو کبھی حضور ہو۔ اسی واسطے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے ایک خادم کو جواب دیا تھا جنہوں نے یہ عرض کیا تھا کہ حضرت ذکر میں اب ویسا مزہ نہیں آتا جیسے پہلے آیا کرتا تھا

آپ نے فرمایا میاں تم کو خبر نہیں۔ پورانی جورواماں ہوجاتی ہے۔ میں کہتا ہوں پُرانی سے مراد بُڑھیا نہیں بلکہ جوان بھی رہے تب بھی ویسا شوق شوق باقی نہیں رہتا اور اگر کچھ دنوں کے لئے جُدائی ہوجاوے مثلاً کہیں سفر سے آویں تو اس وقت پھر ایک خاص کیفیت شوق کی عود کر آتی ہے سو یہ حکمت ہے اس انقطاع توجہ میں کہ غیبت ہی پر حضور کی لذت موقوف ہے اس کے علاوہ دوسری حکمت یہ ہے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ باوجود عدم تقاضا کے حق کی عبادت کرتا رہے۔ تیسرے یہ کہ حضور کے وقت معاصی کا تقاضا بھی نہیں ہوتا اس لئے اگر اس وقت معاصی سے بچے تو کیا کمال ہے وہ تو فرشتے بھی کرتے ہیں، انسان کا کمال یہی ہے کہ تقاضائے معصیت کے ساتھ معصیت سے بچے پس اگر حضور دائمی ہوتا تو انسان گویا فرشتہ ہوجاتا انسان نہ رہتا۔ اور جب آپ آپ نہ رہے تو آپ کا کمال ہی کیا ہوا۔

غرض یہ کہ اگر یہ حالت غیبت نہ ہوتی تو آپ بھی فرشتہ بن جاتے حکمت مقتضی تھی انسان کو بسانے کی اس لئے اس حکمت حق کا تقاضا دوسرے انسانوں کے بنانے کا ہوتا جو انسان بن کر کام کرتے تو آپ ہی کیوں نہ انسان رہیں اور خدا کو خبر کہ اس میں کیا کیا حکمتیں ہوں گی یہ تو وہ ہیں جو ہم جیسے ضعفا بھی سمجھ لیتے ہیں ورنہ حکمتیں تو غیر متناہی ہیں قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ (آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہوجائے اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر مدد کے لئے ہم لے آویں) سو حق تعالےٰ کے کلمات واسرار وحکم کا کون احاطہ کرسکتا ہے۔ اگر تمام دنیا کے موجودات کاتب ہوں اور تمام روئے زمین کے سمندر روشنائی بن جائیں تو سب ختم ہوجائیں مگر وہ ختم نہ ہوں۔ مگر اہل اللہ کی عادت ہے کہ جو کچھ وہ سمجھتے ہیں اس میں سے کچھ ہم لوگوں کی قناعت کے لئے بیان بھی

کر دیتے۔ اب سمجھ میں آگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب کیسا تسلی بخش جواب ہے کہ یہی حالت قرین حکمت ہے کہ کبھی کچھ ہو کبھی کچھ ہو اسی واسطے جو عارف ہیں وہ ایسے ذہول کو مضر نہیں سمجھتے مگر ان کا ذہول ہمارا سا ذہول نہیں کہ ہمیں بالکل کچھ پتہ ہی نہیں رہتا۔ اُن کا ذہول بس اتنا ہوتا ہے کہ استحضار کا غلبہ نہیں رہتا۔ جیسے عاشق کو معشوق کا ذہول کلی تو کبھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی کبھی بے کلی ہوتی ہے اور کبھی کچھ سکون بھی ہو جاتا ہے بس وہی عارف کا ذہول ہے اور اسی کو فراق کہتے ہیں۔ ان میں جو محقق نہیں ہیں وہ اس حالت پر متاسف ہوتے ہیں اور محقق کو گو طبعاً قلق ہوتا ہے مگر وہ اُسے عقلاً دفع کرتا ہے۔ چنانچہ اسی غلبہ استحضار کا نام اصطلاح میں وصل اور ذہول کا نام فراق ہونے کی بناء پر عارف محقق کہنے لگتا ہے ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　که حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(کیسا وصال اور کس کا فراق رضائے محبوب کی تمنا ہونی چاہیئے اس سے غیر اس کی تمنا کے افسوس ہوگا)

یہ فراق حقیقی نہیں بلکہ فراق صوری مراد ہے یعنی جب غلبہ استحضار کا نہ ہو بس وہ ان کی اصطلاح میں فراق ہے۔ اور جس فراق کی علی الاطلاق حافظ نے مذمت کی ہے وہ اصطلاحی فراق نہیں ہے بلکہ وہ لغوی فراق ہے یعنی ذہول محض چنانچہ کہتے ہیں ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت　　　فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر　　　کنایتے است کہ از روزگار ہجراں گفت

(میں نے پیر مرشد سے ایک اچھی بات سُنی کہ فراق یار (یعنی عدم معرفت) وہ حالت پیدا کرتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ واعظ شہر روز قیامت کے ہول وخوف بیان کر کے ڈراتا ہے وہ میرے روزگار ہجر پر آفت کا ایک اشارہ ہے)

تو دونوں قولوں میں اب تعارض نہیں رہا ابتدائے عشق میں یہی اصطلاحی فراق قلق میں ڈالتا ہے اور انتہائے عشق میں رضا کا غلبہ تسلی دیتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ

عشق کے مقتضیات میں سے یہ بھی ہے کہ جو محبوب پسند کرے اسے یہ بھی پسند کرے مثلاً محبوب نے دو روپے دیئے کہ آم خرید لاؤ۔ تو جو محقق تھا وہ تو چلا گیا اور جو ہوسناک تھا وہ وہیں مچل گیا کہ ہائے میں دولت دیدار کو چھوڑ کر بازار کیسے جاؤں یہ تو بُعد ہے وصل کے بعد فراق کو کیسے گوارا کروں اور محقق اس وقت یوں کہتا ہے ؎

اُرِیْدُ وِصَالَہٗ وَیُرِیْدُ ھِجْرِیْ فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

یعنی میں پاس رہنا چاہتا ہوں اور محبوب دور رکھنا چاہتا ہے میں اپنی مراد کو اس کی مراد پر فدا کرتا ہوں اور جو اس کی تجویز ہے وہی مناسب ہے اسی کا ترجمہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوے فراق

ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میری خواہش وصال کی ہے اور محبوب ہجر کا خواہشمند ہے میں نے اپنی خواہش کو ترک کر دیا تاکہ محبوب کی خواہش پوری ہو جائے)

تو محقق عاشق اس فراق ہی کو ترجیح دے گا گو اس میں بے کلی ہی ہو ہوا کرے کیونکہ محبوب تو خوش ہے اور محققین نے اسی اصل پر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تفسیر کی ہے کہ اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے قلب پر بھی ایک پردہ سا پڑتا ہے جس کیلئے میں استغفار کرتا ہوں دن میں سو مرتبہ یا ستر مرتبہ۔ علماء تو یہاں گھبرا گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر پردہ کیسا مگر صوفیہ نے اس کی شرح کی ہے اس غین یا غیم کی پوری حقیقت تو وہی بیان کر سکتا ہے۔ جس کو وہ مقام حاصل ہو مگر مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ۔ (اگر کل نہ پا سکے تو کل ہی ترک نہ کر دے) کچھ کچھ نمونہ کے طور پر بیان کرنے میں مضائقہ

بھی نہیں سو صوفیہ کہتے ہیں کہ آپ کا جو درجہ علیا ہے اس کے اعتبار سے بھی ایک مرتبہ ذکر کا اور ایک مرتبہ ذہول کا تھا گو واقع میں وہ ذہول نہ تھا۔ کیونکہ آپ کی شان تو یہ تھی کَانَ یَذْکُرُ اللّٰہَ فِیْ کُلِّ اَحْیَانِہٖ۔ آپ ہر وقت ذکر کرتے تھے مگر ذکر بھی دو قسم کا ہے ایک ذکر بواسطہ ایک ذکر بلا واسطہ جیسے محبوب کا مشاہدہ کہ ایک بواسطہ ایک بلا واسطہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مشاہدہ تو یہ ہے کہ چہرہ پر نگاہ اٹھا کر دیکھ لیا اور ایک یہ ہے کہ محبوب کہتا ہے کہ اس وقت ہماری طرف نگاہ مت کرو۔ آئینہ میں جو ہمارا چہرہ نظر آتا ہے اُسے دیکھو۔ ہے تو یہ بھی مشاہدہ ہی مگر دونوں درجوں میں بڑا فرق ہے اور عاشق کو طبعًا یہ واسطہ گراں ہوتا ہے۔ گو عقلاً گراں نہ ہو مگر طبیعت یہ چاہتی ہے کہ بلا واسطہ مشاہدہ ہو وہ تو وسائط کے ارتفاع کی تمنا میں یہ کہتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کا چہرۂ انور نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

سو گو عاشق طبعًا اس واسطہ کو بھی گراں سمجھتا ہے مگر حکم ہے محبوب کا ہمیں اس وقت آئینہ ہی میں دیکھو اس لئے عقلاً اس سے راضی ہوتا ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ کہ اہل اللہ نے ثابت کر دیا ہے کہ مخلوقات مراۃ جمال الٰہی ہیں کہ ان میں غور کرنے سے حق تعالیٰ کے وجود اور اس کے کمالات کا پتہ چلتا ہے پھر مراتب میں بھی مختلف درجے ہیں عوام کے لئے اور ہے خواص کے لئے اور۔ چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے میں البتہ دلائل ہیں عقل والوں کے لئے)

(آل عمران ۱۹۰)

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

اس میں اُلی الالباب کی قید سے فرق مراتب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور اسی آیت سے مخلوقات کا مرآۃ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں مقدمے سمجھ میں آگئے تو اب یہ سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامور ہیں اصلاح امت کے اور یہ کام ہو نہیں سکتا تاوقتیکہ شفقت نہ ہو۔ اور شفقت کے لئے ضروری ہے توجہ الی المخلوق۔ گو اس وقت بھی توجہ الی الخالق ہوتی تھی مگر تھوڑی سی توجہ مخلوق کی طرف بھی کرنا پڑتی تھی اور اس وقت مشاہدہ حق بواسطہ مرآۃ کے ہوتا تھا اسی توجہ الی المخلوق کو آپ غین یا غیم (پردہ) سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور چونکہ اس پر آپ کو طبعاً قلق ہوتا تھا اس لئے استغفار کی کثرت فرماتے تھے تاکہ اس کا تدارک ہوجاوے تو جس کیفیت کا نام حضور کے درجہ کے اعتبار سے ذہول رکھا تھا وہ توجہ الی الحق بواسطہ تھی۔ یہ حالت اگر نقص کی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ تجویز ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی کمال ہے اور انسان کے لئے اس حالت کا ہونا حکمت ہے۔ بہرحال دواماً استحضار ذکر کو کیا واجب ہوتا جو کہ فی ذاتہ مستحب ہی ہے استحضار تصدیق بھی دواماً واجب نہیں جو کہ فی ذاتہ واجب ہے۔ چنانچہ اسی لئے شریعت نے اس حالت میں فتویٰ دیا ہے کہ مومن جاگنے میں بھی مومن ہے اور سونے میں بھی مومن اور حقیقت اور عقل کا فتویٰ یہ تھا کہ جاگنے میں تو مومن ہے اور سونے میں کافر۔ اب دیکھی آپ نے شریعت کی رحمت (ہائے لوگ ایسی شریعت سے بھاگتے ہیں) اور آپ کو تحقیق ہوگیا کہ مثل تکوینیات کے تشریعات میں بھی قدرت نے اس کی رعایت کی ہے کہ جو چیز جس قدر بھی زیادہ ضروری اور نافع ہوتی ہے اسی قدر اس میں سہولت فرمادیتے ہیں۔ اور سہولت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عبادت کی حقیقت رب کے ذہن میں ہے جیسا مفصلاً بالکل شروع تمہید میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے

ضروری اطلاع :۔ گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

معلوم ہوا کہ عبادت کوئی بڑا ہی امر مہم ہے۔ پس فَاعْبُدْهُ (سو اس کی عبادت کرتے رہو) میں اسی بڑی مہم چیز کا ذکر ہے اور اصل مقصود یہی حصہ ہے۔ باقی سیاق و سباق اسی کی تاکید و تمہید کے واسطے ہیں اور اسی آیت کے متعلق ہیں۔

اس سے پہلے بھی ایک مختصر جلسہ میں بیان کر چکا ہوں جس سے آج کی تقریر گو ایک گونہ تکریر تو ہوئی مگر ہر تکریر موجب ملال نہیں ہے۔ دیکھئے دونوں ہاتھوں میں سے اگر ایک پر فالج گر جاتا ہے تو علاج کیوں کرتے ہو۔ اگر محبوب کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ پھوٹ گئی ہو تو کیوں کہتے ہو کہ حسن کم ہو گیا تو اسی طرح تکرار تلاوت یا بیان بھی موجب ملال نہ ہونا چاہیئے۔ پھر تکرار بھی من کل الوجوہ نہیں کیونکہ گو آیت تو وہی تلاوت کی ہے مگر آج کے بیان میں مضامین کی جدت ضرور ہے۔ چنانچہ اس بیان سابق میں عبادت کی حقیقت اجمالاً بیان کی تھی۔ مگر تفریعات رہ گئی تھیں اس لئے آج پھر وہی آیت اختیار کی تاکہ جو مضمون اس کے متعلق رہ گیا ہے اسے بھی بیان کر دیا جائے۔ سو عرض کرتا ہوں۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالےٰ جل علیٰ شانہ تربیت کرنے والے ہیں آسمانوں کے اور زمین کے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے۔ جب یہ شان ہے کہ وہ سب کے مربی و محسن ہیں اور مَا بَيْنَهُمَا (جو چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں) میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن سے تمہیں بھی منافع پہونچ رہے ہیں۔ تو وہ مربی ہیں تمہارے بواسطہ بھی اور بلاواسطہ بھی۔ کیونکہ جو اسباب تمہارے حدوث و بقا کے ہیں وہ ان کے بھی مربی ہیں تو وہ اعلیٰ درجہ کے محسن ہوئے تو اس شان کا مقتضا یہ ہے کہ ان کا حق ادا کرو یعنی فَاعْبُدْهُ ان کی عبادت کرو۔ عبادت کے معنے ہیں عبد شدن مگر بعضے محاورات جو کثیر الاستعمال ہے ان کے مفصل معنیٰ کا ذہن سے اکثر ذہول (بندہ ہونا) ہو جاتا ہے اور وہ لفظ بھی خود

اپنے معنے کا قائم مقام ہوجاتا ہے۔ لفظ عبادت بھی ایسا ہی ہے کہ اس کے مفصل معنے عبد شدن (بندہ ہونا) ہیں مگر بجائے اس معنے کے اب خود لفظ عبادت ہی ذہن میں آکر رہ جاتا ہے۔ کلام لفظی کے درجہ میں بھی دونوں درجوں میں صرف عبادت ہی آتا ہے اور اس کا دوسرا عنوان اتنا مستعمل نہیں اس لئے وہ ذہن میں نہیں آتا۔ یعنی عبد شدن غلام ہوجانا۔ اسی عارض کے سبب حقیقت عبادت کی بہت لوگوں پر مخفی ہوگئی تو اب فَاعْبُدْهُ کے معنے یہ ہوئے کہ غلام ہوجاؤ۔ یہ حاصل ہوا اس آیت کا اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ امر اس درجہ تو ضروری ہے کہ حق تعالےٰ نہایت تمہید وتاکید کے ساتھ اس کا حکم فرما رہے ہیں مگر ہماری حالت کیا ہے۔ کہ اس کی ذرا قدر نہیں اور قدر اس لئے نہیں کہ توجہ نہیں۔ شاید کوئی کہے کہ ہم تو عبادت کو ضروری سمجھتے ہیں میں کہتا ہوں محض اعتقاد و تلفظ کافی نہیں۔ کیونکہ جو غایت ہے ضروری سمجھنے کی جب وہ حاصل نہ ہوئی تو کیونکر معلوم ہو کہ آپ نے اس کو ضروری سمجھا مسلم ہے کہ اَلشَّیْ اِذَا خَلَا عَنْ فَائِدَۃٍ لَغَا۔ جب کوئی شئے اپنے فائدہ سے خالی سمجھی جاتی ہے تو وہ منتفی و معدوم ہوجاتی ہے۔ ضروری سمجھنا تو ایسا ہوتا ہے جس طرح تم دوا کو ضروری اور مفید سمجھتے ہو اور استعمال کرتے ہو اور قاعدہ کے موافق نسخہ بنلاتے ہو حکیم کے کہنے پر چلتے ہو، پرہیز بھی کرتے ہو اور جب اس کی ضرورت نہیں سمجھتے تو استعمال بھی نہیں کرتے اسی طرح عبادت ہے کہ جو ضروری سمجھے گا وہ اس کو پابندی سے ادا کرے گا اور قاعدہ کے موافق ادا کرے گا اور جو اس کے ساتھ پرہیز ہیں ان کو بھی لازم سمجھے گا اگر ایسا نہ کیا تو وہ ضروری سمجھنا معتبر نہ ہوا اس پر شاید آپ اپنے دل میں خوش ہوں گے کہ ہم تو پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں اس لئے ہم تو عبادت کرتے ہیں۔ ہاں لغۃً بیشک آپ پر مصلی صادق آگیا مگر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ صرف عید بقرعید کی نماز پڑھ لیتے ہیں لغت کے اعتبار سے

تو مصلی وہ بھی ہیں مگر انھیں آپ بھی نمازی نہ کہیں گے کیونکہ محاورہ میں نمازی اسی کو کہتے ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہوں اگر کسی نے ایک دن باپ کی اطاعت کی اور حاکم کی تعظیم کی اور ایک دن نہ کی تو کیا اسے مودب و مہذب کہیں گے۔ لغۃً تو کہیں گے مگر محاورہ میں نہیں کہیں گے کیونکہ اس محاورہ میں لغت سے کچھ اضافہ ہے۔ ادب کرنے والا محاورہ میں اس کو نہیں کہیں گے جو ایک دن کرے اور ایک دن نہ کرے۔

اسی طرح قرآن و حدیث بھی محاورات میں ہے۔ تو شرعاً عابد اسی کو کہیں گے جو دوام کرے۔ غلامی پر دیکھئے اگر کوئی غلام ایسا کرے کہ کھانا تو آقا کے سامنے لاکر رکھدے اور پانی مانگنے کے وقت انکار کردے کہ پانی تو میں نہیں لاؤں گا، اسے آپ فرمانبردار کہیں گے یا سرکش۔ یقیناً سرکش کہیں گے اسی طرح ننانوے حکم آقا کے مانے اور صرف ایک نہ مانے تب بھی وہ سرکش ہی کہلائے گا۔ چہ جائے کہ ہماری طرح ایک مانے اور ننانوے نہ مانے اگر کوئی کہے کہ ہم تو خدا کے احکام مانتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ تمام اوامر ونواہی میں اپنی حالت جانچ لیں کہ کل کو مانتے ہیں یا نہیں۔ جانچنے کے بعد معلوم ہو جائیگا کہ واقع میں تم اپنے کو محض زبان سے غلام بتاتے ہو مگر حقیقت بھی غلامی کی نہیں سمجھتے بس وہی حالت ہے کہ ہجے تو کریں گے تے بے زبر تب اور بے تے زبر بت اور رداں کہیں گے بطخ کہ ہجے میں تو ہم غلام بنتے ہیں۔ اور جب غلامی کرنے کا وقت آتا ہے تو بطخ بن جاتے ہیں ارے بھائی یہ تو تبت ہوا تھا بطخ کہاں سے ہوا۔ یاد رکھو غلام تو وہی ہے کہ جو بغیر اگر مگر کے ہر امر میں آقا کی اطاعت کرے اس معیار کو سمجھ کر دیکھئے کیا آپ واقعی غلام ہیں تو بہت سے تو ایسے نکلیں گے جو عبادت کرتے ہی نہیں اور بعضے کرتے ہیں تو پابندی سے نہیں کرتے ہیں اور جو پابندی بھی کرتے ہیں وہ قاعدہ سے نہیں کرتے ہیں یوں ہی بے ڈھنگی ادا کرتے ہیں اور بعضے وہ ہیں جو احکام الٰہیہ میں شبہات نکالتے ہیں۔

صاحبو کیا اسی کا نام غلامی ہے ہرگز نہیں یہ تو غلامی کا دعویٰ ہے حقیقت غلامی نہیں۔ اور ضرورت اس کی ہے اور گو اس کا اہتمام فرداً فرداً ہر شخص پر فرض ہے مگر اس کے اہتمام و انتظام میں جن جماعتوں کا زیادہ دخل ہے وہ دو گروہ ہیں جو مخلوق کو خدا کا حقیقی غلام بنا کے اطاعت کرا سکتے ہیں اس میں ایک تو علماء کا گروہ ہے ان کا بڑا اثر ہوتا ہے اگر یہ خدانخواستہ گمراہ ہوں تو سارے عالم کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ زَلَّۃُ الْعَالِمِ زَلَّۃُ الْعَالَمِ (عالِم کی لغزش جہان کی لغزش ہے) اور دوسرا امراء کا ہے علماء کا عوام پر دینی اثر ہے اور امراء کا دنیوی۔ علماء کا دینی اثر تو یہ ہے کہ ان کی اعتقادی وجاہت ہے اور ان کے احکام کی قلب میں قدر و وقعت ہے۔ وہ عوام کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں تو اس سے کچھ آخرت کے اجر کی طمع اور کچھ وہاں کے عذاب کا خوف پیدا ہوتا ہے اور امراء کے احکام کا اثر ان کے دنیوی اقتدار کے خوف یا طمع سے ہوتا ہے۔ بہرحال دونوں جگہ خوف بھی ہے اور طمع بھی۔ ایک جگہ آخرت کا ایک جگہ دنیا کا۔ پس یہ دو گروہ تھے جو خود غلام بن کے اپنا نمونہ پیش کرتے تو پھر عوام بھی ان کے ساتھ ہوتے اور اب تو ایک تیسرا فرقہ خوامخواہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ فرقہ کون ہے وہ صوفیہ کرام کا گروہ ہے۔ حالانکہ یہ کوئی نیا گروہ نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت میں یہ وہی علماء ہیں مگر علماء نے ایک کام چھوڑ دیا اس وجہ سے یہ تیسرا گروہ پیدا ہو گیا۔ وہ کام کیا ہے۔ مجاہدہ و ریاضت کیونکہ ذرا یہ کام ہے مشکل، کہ کھانا چھوڑ دو۔ لوگوں سے ملو جلو نہیں، اچھا کپڑا مت پہنو۔ ٹھنڈا پانی مت پیو۔ اور چند روز سے صوفیت کی یہی تعریف رہ گئی ہے تو جن لوگوں نے اس کو اختیار کر لیا وہ صوفی کہلانے لگے خواہ ان کو نہ علم ہو نہ عمل تو اس طرح سے یہ تیسرا فرقہ ہو گیا حالانکہ صوفیت واقع میں اور ہی چیز ہے جسے ان باتوں سے کچھ بھی تعلق نہیں اور یہ بھی تصوف کی تعریف کچھ دنوں پہلے تک تھی اور اب تو اس سے بھی سہل صوفیت نکلی ہے کہ کپڑے رنگ لئے

بال بڑھا لئے تسبیح پڑھ لی تھوڑا سا ذکر کر لیا۔ بس لوگ معتقد ہو گئے۔ اور وہ گناہ بھی کریں تو بھی بزرگی نہیں ڈھلتی۔ بس ہیں یہ بڑے مزہ میں نہ بولے تو چپ شاہ اور اگر بولے اور بے ڈھنگی بولے تو صاحب رموز ہیں۔ اور ڈھنگ کی بولے تو عارف ہیں۔ خرابی تو بیچارے مولوی کی ہے کہ کہیں ایک بھی مسئلہ غلط کہا تو قلعی کھل گئی اور صوفی صاحب کیسی ہی غلطیاں کریں مگر وہ صاحب رموز ہیں پھر اوپر سے معتقدین کا ہر بات میں حضور حضور کرنا طرہ بر دستار ہو گیا یہ انہیں اور زیادہ خراب کرتے ہیں۔

جیسے ایک امیر تھے وہ جھوٹ بہت بولا کرتے تھے اور ان کا ایک مصاحب ان کے جھوٹ کی توجیہ کیا کرتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے بیان کیا کہ میں شکار کو گیا ایک ہرن پر جو گولی چلائی تو سم کو توڑ کے ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے کہ کہاں سم کہاں ماتھا۔ مصاحب نے فوراً توجیہ کی کہ ہاں حضور اس وقت وہ کھجلا رہا تھا۔ امراء کے یہاں تو رات دن ایسے خوشامدی مصاحب رہتے ہی ہیں۔ مگر مشائخ کے یہاں بھی اب ایسے ہی معتقد رہ گئے ہیں کہ خواہ مخواہ رات دن ان کی کرامتوں کا تذکرہ کیا کرتے ہیں اور ان کے عیب کو ہنر بتلاتے ہیں تو بہر حال علماء میں سے ایک شاخ نکلکر فقراء بن گئی۔ مگر واقع میں صوفیہ علماء ہی ہیں۔ اور جو جاہل ہو وہ صوفی ہی نہیں۔ اور احادیث میں جن علماء کی فضیلت آئی ہے وہ واقع میں وہی علماء ہیں جو صوفی بھی ہیں۔ خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ یعنی جسم انسانی میں ایک پارہ گوشت ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا بدن درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے خبردار رہو وہ قلب ہے تو جس نے اپنے قلب کی اصلاح نہ کی ہو اور اس لئے اس کی تمام عملی حالت تباہ ہو وہ کیونکر عالم مورد فضائل وارده کہلائے گا مستحق ہو سکتا ہے۔ بہر حال علماء وہی

ہیں جو صوفیہ ہیں اور جن علماء کے فضائل نصوص میں وارد ہیں وہی علماء ہیں جو درویش بھی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنی خوف وخشیت خدا سے صرف علماء ہی کو حاصل ہے۔ اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ مراد ہیں کیونکہ خشیت کاملہ ان ہی میں ہے۔ اسی طرح علماء کو ورثۃ الانبیاء کہا گیا ہے اس بنا پر کہ انبیاء نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ زراعت نہ تجارت انھوں نے صرف علم چھوڑا تو جن کے پاس یہ علم موروث انبیاء ہوگا وہی لقب عالم کا مستحق ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کا علم یہ علم رسمی نہ تھا علم حقیقی وقلبی تھا جس کی شان یہ ہے ؎

علم چوں بر تن زنی مارے شود علم چوں بر دل زنی یارے شود

(علم کا جب قلب پر اثر ہوگا تو وہ وصول الی اللہ معین ہوگا اور اگر تن پر اثر ہوا تو زا اور وبال ہوگا)

دوسرے محقق کہتے ہیں ؎

علم رسمی سر بسر قیل ست وقال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی زدل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت در دلت افزوں کند

(رسمی علم محض قیل وقال ہے نہ اس سے کوئی کیفیت حاصل ہو نہ حال علم وہی ہے کہ تم کو خدا کا راستہ دکھلادے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کردے حرص وہوا سے چھڑا کر دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت پیدا کر دے)

اور ہماری حالت کیا ہے اسے بھی بیان کرتے ہیں ؎

تو ندانی جز یجوز و لا یجوز خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز
اَیُّھَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَہ کُلَّمَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَہ
علم نبود غیر علم عاشقی ما بقی تلبیس ابلیس شقی

(تم کو یجوز (یہ چیز جائز ہے) اور لا یجوز (یہ چیز ناجائز) کے سوا کہ تم خود (بقول) ہو یا عجوز (مردود) جو کچھ مدرسہ میں علم لفظی حاصل کیا وہ وسوسہ تھا علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے۔)

توحضرت وہ علم جو انبیاء نے چھوڑا وہ یہ ہے کہ جس کے خواص آپ نے سُنے اور جو اس علم کے عامل ہیں وہ ہیں نائب رسول اور ورثۃ الانبیاء، تو حقیقت میں درویش بھی علماء ہوئے۔ غرض دو طبقے ایسے ثابت ہوئے جن کی اصلاح سب سے مقدم ہے کیونکہ ان کا اثر سب سے زیادہ ہے اس لئے اگر یہ گمراہ ہوں گے تو سب کو گمراہ کریں گے۔ سو افسوس یہ ہے کہ عبادت کے متعلق یہ طبقے بھی غلطیوں میں مبتلا ہیں تو عوام کیونکر غلطیوں سے بچتے۔ چنانچہ منجملہ ان غلطیوں کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ عبادت کے معنے صحیح نہیں سمجھے۔ عوام کی تو غلطی یہ تھی کہ وہ عبادت کے معنے غلط سمجھتے ہیں کہ صرف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ خاص اعمال میں منحصر سمجھتے ہیں اس لئے دوسرے اعمال میں کوتاہی کرنا عجیب نہیں کہ وہ ان کو عبادت ہی نہیں سمجھتے۔ مگر لکھے پڑھوں کی غلطی نہایت سخت ہے کہ وہ عبادت کے معنے بھی جانتے ہیں کہ اطاعت مطلقہ ہیں پھر اس میں غلطی کرتے ہیں کہ اس کے محل سے ناواقف ہیں یا بے پرواہیں اور یہی مراد ہے صحیح معنے نہ سمجھنے سے۔ یعنی معنی تو سمجھے مگر صحیح نہیں سمجھے۔ اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ اس جلسہ میں زیادہ تر طلبہ موجود ہیں عرض کردوں کہ اطاعت مطلقہ کے محل کیا کیا ہیں سو سنئے کہ سب سے اول محل تو عقائد ہیں یعنی جس طرح شریعت نے عقائد سکھلائے ہیں اسی کے موافق اعتقاد رکھیں۔ دوسرا محل اعمال دیانات ہیں۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ انھیں بھی شریعت کے موافق پابندی سے صحیح طور پر ادا کریں۔ تیسرا محل معاملات ہیں بیع وشراء وغیرہ کہ ان کو بھی احکام شرع کے مطابق کریں اور یہ معلوم کریں کہ کونسی بیع فاسد ہے اور کونسی باطل، کونسا معاملہ صحیح ہے اور کونسا فاسد۔ کس معاملہ میں ربوا لازم آتا ہے اور کس میں قمار یہ سب شریعت سے معلوم کرکے اسی کے موافق کیا کریں۔ چوتھا محل معاشرت ہے کہ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا، ملنا جلنا اس کو معلوم کریں کہ اس کے شریعت میں کیا آداب ہیں۔ پانچواں محل اخلاق ہیں۔ اخلاق کے یہ معنے

نہیں کہ نرمی سے بول لئے یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے یا ادب سے سلام کرلیا۔ یہ تو آثار ہیں اخلاق کے۔ خود اخلاق نہیں۔ اخلاق یہ ہیں تواضع۔ صبر شکر۔ زہد و قناعت شوق و رضا وغیرہ یہ ہیں اخلاق یعنے اعمال باطنی ان کے مقابلہ میں ان کے اضداد ہیں۔ کبر بے صبری۔ ناشکری۔ طمع وحرص حسد بغض۔ کینہ۔ یہ اخلاق ذمیمہ ہیں۔ تو اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عبادت کیا ہے۔ عبادت ان تمام شعبوں کی تکمیل کا نام ہے۔ اب اس میں غلطی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعضے یہی نہیں جانتے کہ ان پانچ میں اصل کیا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ تصحیح عقائد کی فکر نہیں کرتے گو کسی قدر اعمال کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور بعضے یہ تو جانتے ہیں کہ ان میں اصل عقیدہ ہے۔ یہی راس العبادات اور اساس العبادات ہے۔ کہ بغیر اس کے کچھ بھی صحیح نہیں مگر ان سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ جب اسے بڑا سمجھ لیا تو ان کے نفس نے یہ کہا کہ بڑے کے سامنے چھوٹے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ننانوے کے ہوتے ہوئے ایک کی کمی چنداں مضر نہیں۔ تو ان کی نظر سے اعمال کا اہتمام جاتا رہا۔ چنانچہ بہت لوگ جو عقائد حقہ رکھنے والے ہیں اور ان کے اعمال بھی درست ہیں۔ وہ اگر کسی کے عقائد درست دیکھتے ہیں۔ گو اعمال درست نہ ہوں تو تسامح کرتے ہیں اور اس سے نفرت نہیں کرتے یعنے اتنی نفرت بھی نہیں کرتے جتنی شرعاً کرنی چاہیئے بلکہ تعریف کے طور پر کہدیتے ہیں کہ فلانے کے عقائد بہت اچھے ہیں گو وہ رشوت بھی لیتا ہو ظلم بھی کرتا ہو بے نماز بھی ہو مگر عقائد صحیح ہونے کی وجہ سے اس کی کسی بات سے نفرت نہیں۔ مثلاً کوئی نماز نہ پڑھے تو اس سے انھیں نفرت نہیں حالانکہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (جس نے قصداً نماز ترک کردی مثل کافر کے ہوگیا) میں فَقَدْ كَفَرَ نفرت ہی کی تو دلیل ہے کہ شریعت نے تارک الصلوٰۃ کو مثل کافر کے اسی لئے تو فرمایا تاکہ مصلین ترک صلوٰۃ نہ کریں۔ اور تارک صلوٰۃ نمازی بن جاوے۔ اور تارک صلوٰۃ کو بھی اپنی حالت سے نفرت ہو اور نماز شروع کردے مصلی اس سے نفرت

ظاہر کرے تعلق قطع کرے اور خلا ملا نہ رکھے مگر ساتھ ہی اپنے کو مقدس اور اس کو حقیر نہ سمجھے۔ یہاں تو قدم قدم پر لغزشیں اور رہزن موجود ہیں۔ یا تو بے نمازی سے نفرت نہ کریں گے یا کریں گے تو اپنے کو مقدس سمجھیں گے جو کہ کبر ہے جو کہ ترک نماز سے بھی قبیح ہے۔

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ بے نمازی کو سلام کرنا کیسا ہے۔ اور سوال کیا تحقیر کے لہجہ میں مجھے لب ولہجہ سے معلوم ہو گیا کہ منشار اس سوال کا کبر ہے اگر مجھ سے پوچھتے کہ اس کی دلیل کیا تو یہ میں نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے نبض دیکھ کر طبیب کہتا ہے کہ تم کو پرانا بخار ہے اب تم عطائی ہو وہ تمہیں کیونکر سمجھائے اسی طرح میں دلیل نہیں بتا سکتا۔ لیکن ہاں حق تعالیٰ کی یہ ایک نعمت ہے کہ مجھے لب ولہجہ سے اکثر قلبی حالت کا پتہ چل جاتا ہے اور یہ فیض ہے محبت سنت کا حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (اور آپ ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے) حب سنت سے ایسا فہم حاصل ہو جاتا ہے اس کا کوئی قاعدہ کلیہ بیان نہیں ہو سکتا اگر اس کے لئے کوئی دلیل بیان کی جائے گی تو اس کی وہ گت ہو گی۔ جیسے ایک طبیب کے صاحبزادے تھے اناڑی ان کے باپ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ انھیں بھی ساتھ لے گئے جا کے مریض کی نبض دیکھی تو نبض سے اتنا معلوم ہوا کہ کوئی بد پرہیزی ہوئی ہے۔ اتفاق سے وہاں چارپائی کے نیچے نارنگی کے چھلکے بھی پڑے تھے تو طبیب نے کہا معلوم ہوتا ہے تم نے نارنگی کھائی ہے۔ واقعی مریض نے نارنگی کھائی تھی۔ اب صاحبزادے نے ایک قاعدہ کلیہ اخذ کیا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے پڑی ہو وہ ضرور مریض کی کھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اتفاق سے وہ طبیب مر گئے۔ اب صاحبزادے ان کے قائم مقام ہوئے۔ ایک مریض کو دیکھنے گئے اس کی چارپائی کے

نیچے نمدہ پڑا تھا کہنے لگے معلوم ہوتا ہے آپ نے نمدہ کھایا ہے۔ اس نے کہا وہ صاحب کہیں نمدہ بھی کھایا جاتا ہے۔ کہنے لگے صاحب نبض سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔ مریض نے کہا نکالو اس کو اس کی دم میں نمدہ تو جس طرح بخار پہچاننے کے لئے محض سرعت نبض کافی نہیں۔ بلکہ ایک ذوق کی ضرورت ہے جس سے طبیب کو پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح لب ولہجہ سے پہچان لینا یہ بھی ذوقی امر ہے۔ اور یہ کوئی بزرگی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ تو مناسبت سے حاصل ہو جاتا ہے جو خدمت خلائق کے کام کرنے والے کو حق تعالیٰ عطا فرما دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس سوال کا سبب کبر ہے اس لئے میں نے کہا کہ تمہارے واسطے تو یہی ضروری ہے کہ فاسق کو ابتداءً سلام کیا کرو۔ غرض نفرت کی بھی قسمیں ہیں۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ کبھی متکبرین کو سند مل جائے۔ چنانچہ جنھیں تقویٰ کا ہیضہ ہوتا ہے وہ خدا جانے مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں۔ یاد رکھو اہل معاصی سے نفرت کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے کو بڑا سمجھے اور تکبر کرے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو تو سب سے کم سمجھے اور پھر شریعت کے حکم کی وجہ سے نفرت کرے اور یہاں بڑا زبردست اشکال ہے وہ یہ کہ تواضع کا اقتضا یہ ہے کہ کسی سے بھی نفرت نہ کرے اور بغض فی اللہ کا مقتضا یہ ہے کہ عاصی سے نفرت کرے اور نفرت جب کرے گا تو ضرور اسے کمتر سمجھے گا۔ اور جب اسے معصیت کے سبب کمتر سمجھے گا تو پھر اپنے کو کہ معصیت سے محفوظ ہے اس سے کیسے کمتر سمجھے گا۔ اسی واسطے کسی غیر محقق نے تنگ ہو کر کہدیا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ　　　باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(گہرے دریا میں تختہ میں باندھ کر ڈالدیا پھر کہتے ہو خبردار رہ کہ دامن تر نہ ہو)

مگر محقق دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیتا ہے کہ دریا میں بھی جائے اور خشک دامن بھی رہے اس کو ایسا تیرنا آتا ہے کہ کھڑے ہو کر تیرتا ہے اس کی حقیقت نہایت ہی آسان ہے محققین نے اس کو بھی حل کر دیا ہے۔ ایک مثال اس کے لئے کافی ہے کہ مثلاً بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ شہزادے نے فلاں جرم کیا ہے اس کو

ایک درجن بید لگاؤ۔ اب یہاں دو حکم ہیں ایک تو یہ کہ یہ شہزادہ ہے اسے عظیم الشان سمجھو اور دوسرا یہ کہ اس نے ایک قصور کیا ہے اس لئے مجرم بھی سمجھو۔ اب وہ بھنگی جانتا ہے کہ یہ سزا کے قابل ہے اور میں سزا کے قابل نہیں ۔ اس حیثیت سے میں افضل ہوں مگر باوجود اس کے یہ بھی جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں بھنگی ہوں اس لئے باوجود مجرم ہونے کے بھی یہ مجھ سے بدرجہا افضل ہے۔ دیکھئے دونوں امر کس طرح جمع ہو گئے اور بھنگی بادشاہ کے امتثال کے لئے تو مارتا ہے اور اپنے اعتقاد سے تعظیم کرتا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب یہ سمجھو کہ جب تم کسی مسلمان سے معصیت کی وجہ سے نفرت کرو تو اس کے ساتھ یہ بھی سمجھو کہ ممکن ہے کہ عند اللہ اس کا رتبہ مجھ سے اس لئے بڑھا ہوا ہو کہ اس میں کوئی دوسرا کمال ایسا ہو جو مجھ میں نہ ہو مگر اس حیثیت سے کہ یہ بے نمازی ہے حکم شاہی ہے کہ بے نمازی کو سلام نہ کرو۔ اس واسطے میں سلام نہیں کرتا۔ باقی میں اس سے افضل نہیں ہوں. ممکن ہے کہ کسی خفی عمل کی بدولت یہ عند اللہ مجھ سے افضل ہو کیونکہ اعمال کا انحصار نماز ہی میں نہیں ہے. ممکن ہے کہ توحید اس کی اتنی خالص ہو کہ بلا محاسبہ بخشا جائے تو آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ عند اللہ بھی میں اس سے افضل ہوں اور وہ تو پھر مسلمان ہے. محققین تو کفار کے بارہ میں بھی یہ خیال رکھتے ہیں ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید ۔۔۔ کہ مسلماں بودنش باشد امید

(کسی کافر کو حقارت سے نہ دیکھو اس لئے کہ اسکے مسلمان ہونے کی امید ہے)

ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو کر مرے۔ تو پھر کیا خبر ہے کہ وہ افضل ہو گا یا آپ. ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے میں نے کہا اس شخص کو جائز ہے جسے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا خاتمہ یزید سے اچھا ہوگا۔ ارے اپنے کام میں لگو لعنت کا وظیفہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔

حضرت رابعہ سے کسی نے پوچھا تم ابلیس پر لعنت نہیں کرتیں، کہنے لگیں جتنی دیر میں اس پر لعنت کروں میں اپنے محبوب کی یاد ہی نہ کروں۔ لعنت کے باب میں بعضوں کا دوسرا مذاق بھی ہے۔ ایک شخص تھا وہ روزانہ ایک ہزار

مرتبہ شیطان پر لعنت کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس دشمن نے بھی کیسا بدلا لیا کہ دیوار کے نیچے سورہا تھا۔ اس نے آکر جگا دیا کہ اٹھو اُٹھو بھاگو یہ جیسے ہی وہاں ہٹا دیوار گر پڑی یہ بہت خوش ہوا کہ یہ تو کوئی بڑا خیر خواہ ہے۔ پوچھا تم کون ہو کہا نام نہ پوچھو نام سُنکر تم خوش نہ ہوگے۔ کہا صاحب بتلاؤ بھی۔ کہا میں وہی شیطان ہوں جس پر تم ہزار مرتبہ روزانہ لعنت بھیجا کرتے ہو۔ کیا تم تو میرے بڑے خیر خواہ نکلے۔ اس نے کہا کہ میں نے خیر خواہی سے نہیں بچایا بلکہ اس خیال سے بچایا کہ دیوار کے نیچے دب کے مروگے تو شہید ہو جاؤگے اور بے حساب بخشے جاؤگے۔ تو مجھے فکر ہوئی کہ کسی طرح اتنے بڑے ثواب سے محروم کردوں دوسرے اگر جیتا رہیگا تو تجھ پر خوب مشق کیا کروں گا۔ ابھی بہت دن نچاؤں گا جیسے بندر ریچھ کہ اگر مر جاوے تو بندر والا پھر کہاں سے کمائیگا۔ بہر حال کسی پر لعنت کرنا فضول حرکت ہے۔ جب کہ اپنے ہی حال کی خبر نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکئ ما   گہ خندہ زند دیو ز بے ناپاکئ ما

ایماں چو سلامت بہ لب گور بریم   احسنت بریں چستی و چالاکئ ما

(کبھی ہماری پاکی پر فرشتہ رشک کرتا ہے کبھی ہماری ناپاکی پر شیطان ہنستا ہے۔ ایمان اگر قبر میں سالم لے جائیں اس وقت ہماری چستی و چالاکی پر آفریں ہے)

جب خاتمہ ہوگا اس وقت معلوم ہوگا کہ کس حالت میں گئے بس تو پھر کیا منہ لے کے کسی کو کہیں۔ جس پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو وہ میونسپلٹی کے چار آنہ آٹھ آنہ والے جرمانہ کے مجرم پر ہنسے تو کیا یہ حماقت ہی نہیں۔ اور جب یزید و ابلیس پر بھی لعنت کرنا فضول یا خطرناک ہے تو مسلمان کی غیبت کیا کچھ ہوگی اور آجکل تو اس سے بڑھ کر یہ تماشا ہے کہ غیبت کے لئے بھی صلحاء و اتقیاء ہی تجویز کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ مشائخ کی مجلسوں میں اکثر دوسرے مشائخ و علماء کی ہی غیبتیں ہوا کرتی ہیں جہاں فساق کی بھی پردہ دری جائز نہیں تھی۔ غرض کسی کو حقیر مت سمجھو۔ ابھی خود تمہاری ہی کشتی منجدھار

یں ہے۔ البتہ جہاں شریعت اجازت دے وہ مواقع مستثنیٰ ہیں باقی جہاں اجازت نہیں وہاں غیبت کرنا خصوصی سب کام چھوڑ کے اسی کا شغل کر لینا میں اس کو منع کر رہا ہوں بالخصوص جبکہ نہ اپنا انجام معلوم ہو نہ اس کا جس کی غیبت کر رہے ہو اسی پر کسی نے متنبہ کیا ہے ۔

غافل مرو کہ مرکب میدان مرد را　　در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

(غافل مت چل اس لئے کہ مرد میدان نے سخت جنگلوں میں گھوڑا دوڑایا ہے)

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(ناامید بھی مت ہو کہ لند شرابی لوگ ایک نالہ میں منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں)

تو جن کے لئے ترک سلام کا حکم ہے وہاں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ترک اس حیثیت سے کہ ہم اس سے افضل ہیں یہ تو ممنوع ہے۔ اور ایک اس حیثیت سے کہ یہ حکم شرع ہے۔ یہ مطلوب و مامور بہ ہے اور وہ بھی وہاں جہاں ترک میں مصلحت ہو ورنہ جہاں مفسد کا احتمال ہو وہاں جائز نہیں مثلاً یہ اندیشہ ہو کہ اس سے اور ضد بڑھ جاوے گی اور اس شخص کا دین اور تباہ ہو گا۔ اسی واسطے تو دین میں ہر جگہ حکیم کی ضرورت ہے۔ ہر کام میں کسی محقق کو اپنا رہبر بناؤ اور اس سے ایک ایک جزئی پوچھو البتہ اس کے انتخاب میں بڑے غور و خوض کی ضرورت ہو گی۔ اب اول تو انتخاب ہی میں غلطی ہوتی ہے۔ اور اگر انتخاب بھی صحیح ہوا تو اتخاذ شیخ اس واسطے کرتے ہیں کہ ان سے مقدمات میں دعا کرایا کریں گے۔ تعویذ گنڈے کرایا کریں گے۔ گویا شیخ ان کے نوکر ہیں ششماہی نذرانہ تنخواہ میں پاتے ہیں اور اگر زیادہ خوش اعتقاد ہوئے تو اس خیال سے پیر بناتے ہیں کہ بس وہ خدا کے ہاں بخشا لیں گے، چاہے وہ خود بھی نہ بخشے جائیں۔ حضرت شیخ ان کاموں کے لئے نہیں ہے، وہ تو طبیب ہے ان کے سامنے اپنے امراض ظاہر کرو اور ان سے اپنی حالت کا فیصلہ کراؤ اور جو وہ علاج بتلائیں اس پر عمل کرو۔ جب ایسا انتظام ہو گا تو حضرت اس بارہ میں بھی شیخ ہی کے مشورہ پر عمل ہو گا۔ کہ کہاں سلام نہ کریں اور کہاں کریں۔ کہاں مصلحت ہے اور کہاں مفسدہ ۔

یار باید راہ را تنہا مرو　　بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

(ساتھی ضرور چاہیئے تمھارا استہ مت چل خصوصاً اس طریق میں بلا رہبر کے قدم مت رکھ)

اور اگر کسی کے پاس رہبر محقق نہیں ہے تو وہ اگر دین پر عمل کرنا چاہے گا تو صورت دین پر عمل کرنا آجائے گا۔ مگر حقیقت دین پر عمل کرنا مشکل ہوگا کیونکہ صورت میں بہت چیزیں متشابہ ہیں جو واقع میں اضداد ہیں ؎

گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی یہ دکھلاتے ہیں کبھی اس کی ضد سوائے حیرانی کے کار دین میں نہیں ہے)

یہ سب کلام اس پر چلا تھا کہ معاصی پر گرانی ہونا ضروری ہے لیکن حدود وقیود کی رعایت سے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ اہلِ حق نے اعمال کو عقائد پر اکتفار کر کے اتنا ترک کر دیا ہے کہ کسی کے ترک اعمال سے گرانی بھی نہیں ہوتی۔ اور جو مبتلا ہے وہ تو کیوں گراں سمجھتا۔ بس یہ حالت ہے کہ جو جس میں مبتلا ہے۔ اُسے گراں نہیں سمجھتا بے نمازی نماز پڑھنے کو گراں نہیں سمجھتا اور جو نمازی مگر دوسری آفتوں میں مبتلا ہے وہ انھیں گراں نہیں سمجھتا۔ مثلاً امارد و نساء پر نظر کیا کرتا ہے اور اُسے بُرا نہیں سمجھتا۔ اور یہ گناہ گو ہے تو صغیرہ مگر بعض اوقات صغیرہ میں اتنے مفاسد ہوتے ہیں کہ وہ ان مفاسد میں کبیرہ سے بھی بڑھ جاتا ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ گناہ میں دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک امتداد اور ایک اشتداد سو کبیرہ میں جو سختی ہے وہ اشتداد کی وجہ سے ہے اور جس گناہ میں اشتداد کم ہے وہ صغیرہ ہے۔ مگر گناہ میں ایک درجہ ہے امتداد کا۔ اور یہ اکثر صغیرہ ہی میں زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اشتداد کا تدارک اکثر اس لئے آسان ہے کہ اس کا معصیت ہونا بین ہے اس لئے ڈر کر ایک مرتبہ دل سے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ مجھ کو بخشدے) کہہ لیا گویا پہاڑ کو بارود سے توڑ دیا۔ لیکن امتداد کا تدارک اس لئے مشکل ہے کہ اس کو سرسری سمجھ کر کرتا رہتا ہے اور اس عادت کے سبب اس کا اثر راسخ ہوتا رہتا ہے پھر توبہ کا عزم سست ہو جاتا ہے، مثلاً بدنگاہی ہی کو لیجئے کہ اس میں گو اشتداد نہیں مگر امتداد کبیرہ سے بڑھ کر ہے سرسری سمجھنے سے بھی اور خود اس کی خصوصیت

سے بھی۔ چنانچہ مشاہدہ کہ نماز نہ پڑھنے سے کوئی ایسا اثر قلب میں نہیں ہوتا جس سے نجات نہ ہو سکے مگر نگاہ بد کے اثر سے بعض اوقات عمر بھر بھی نجات مشکل ہو جاتی ہے اس کی تو وہ شان ہو جاتی ہے ؂

درون سینۂ من زخم بے نشاں زدۂ بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ

(تونے میرے سینہ کے اندر زخم بے نشان کیا ہے حیرت میں ہوں کہ عجیب تیر کمان سے مارا ہے)

چنانچہ ہزاروں قصے ہیں کہ بس ایک دفعہ نگاہ پڑ گئی اور عمر بھر کو بے چینی لگ گئی کیونکہ محبوب کے نہ محلہ کی خبر نہ کچھ پتہ۔ اب فکر ہے کہ دوبارہ کہاں دیکھ لیں اب گھل رہے ہیں۔ یا مثلاً پردہ دار ہے اور وہ فوراً چھپ گئی تو اُسے پھر کیونکر دیکھیں۔ اب اس نے اس پر ایک اور غضب یہ کیا کہ اس خیال کو اپنے دل میں پالا اُسے جمایا کہ بت پرست کی طرح سوچتا رہا کہ ہائے اس کا ایسا رخسارہ ہے اور ایسی ادا اور ایسی زلف جب وہ اچھی طرح دل میں جم گیا تو پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ ملامت نافع ہے نہ خوف نہ حیا نہ شرم۔ کما قیل ؂

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِیَ التَّائِہِ وَھَوَی الْاَحِبَّۃِ مِنْہُ فِیْ سُوْدَائِہٖ

(ملامت کرنے والوں کی ملامت قلب کے اردگرد ہے دوستوں کی محبت سودائے قلب میں یعنی دل کے اندر ہے)

اب مرض بڑھا کہ نہ نماز میں جی لگتا ہے نہ روزہ میں۔ نہ اللہ یاد رہا نہ رسول بس ہر وقت وہی مردار ہے حتیٰ کہ اب نماز روزہ بھی ترک ہونے لگا۔ اعمال پر اثر پڑا پھر صحت پر اثر پڑا اور بیمار پڑ گیا اور بیماری بھی اتنی بڑھی کہ حالت مایوسی کی ہو گئی۔ غرض ایمان اور جان سب اسی کی نذر ہو گیا یہ سب خرابی اسی نگاہ بد منحوس کی بدولت ہوئی مگر اس میں اسے وہ لذت ہے کہ ترک کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا، جیسے خارش والے کو کھجلانے سے خارش بڑھتی ہے مگر اس میں وہ مزہ ہے جیسے شاعر نے کہا ہے ؂

لڈو میں نہ برفی میں نہ پیڑے میں مزہ ہے جو حضرت کھجلی کے کھجانے میں مزہ ہے

مگر کسی مبتلا کو اب بھی مایوس نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ مرض بھی گو سخت ہے مگر لاعلاج نہیں مَاجَعَلَ اللّٰہُ دَاءً اِلَّا وَقَدْ جَعَلَ لَہٗ دَوَاءً خدا نے کوئی مرض ایسا نہیں بنایا جس کا

علاج نہ ہو۔ چنانچہ اس عشق مجازی کی بھی دوا ہے اگر کوئی کرتا ہی نہ چاہے تو اور بات ہے۔ جیسے مجنوں کہ وہ اپنی محبت کو خود زائل کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اس کے باپ نے اس سے کہا کہ خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا کرو۔ اَللّٰھُمَّ اَزِلْ عَنِّیْ حُبَّ لَیْلٰی (اے اللہ مجھ سے لیلیٰ کی محبت دور کردے) تو آپ فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ حُبَّ لَیْلٰی (اے اللہ مجھ میں لیلیٰ کی محبت بڑھا دے) اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

الٰہی تُبْتُ من کُلِّ المَعَاصِیْ — وَلٰکِنْ حُبَّ لَیْلٰی لَا اَتُوْبُ

(یعنی اے اللہ میں سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں مگر لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا) گو وہ فاسق نہ تھا پاک عاشق تھا اور اپنے عشق میں اتنا کامل ہوگیا تھا کہ اُسے بجائے محبوب کے خود محبت ہی مقصود ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ لیلیٰ خود اس کے پاس پہنچ گئی تھی پوچھا مَنْ اَنْتَ تو کون۔ اس نے کہا اَنَا لَیْلٰی۔ میں لیلیٰ ہوں۔ کہا اِلَیْكَ عَنِّیْ فَاِنَّ حُبَّكَ شَغَلَنِیْ مِنْكَ ہٹ مجھے تیری محبت نے تجھ سے بے نیاز کر دیا تو یہ عشق تھا۔ اور اب تو سراسر فسق ہوتا ہے ؎

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود — ایں فساد خوردن گندم بود

(یہ عشق جو عام لوگوں میں ہوتا ہے یہ عشق نہیں ہے بلکہ گندم کھانے کا فساد ہے)

سو مجنوں نے علاج نہ چاہا مبتلائے معصیت رہا لیکن وہ فاسق نہ تھا اس لئے علاج نہ کرنا صرف اس کی جان ہی تک مضر رہا۔ اور اب تو فسق کے سبب ایمان کی بھی خیر نہیں اس لئے علاج کی سخت ضرورت ہے ورنہ یاد رکھو کہ اگر یہ عشق ختم نہ ہوا تو عجب نہیں اعمال و ایمان ہی ختم ہو جائیں۔ چنانچہ کانپور میں ایک بوڑھے آدمی تھے وہ ایک بہو دن پر عاشق ہوئے۔ میں ان کے بڑھاپے کی وجہ سے ان کا ادب باپ کا سا کرتا تھا اور وہ طالب علم سمجھ کر میرا ادب کرتے تھے مگر اس حیا سوز عشق میں یہاں تک نوبت پہونچی کہ وہ سب ادب و حیا کو بالائے طاق رکھ کر ایک دن

مجھ سے کہنے لگے کہ اگر وہ یہودن ہے تو میں یہودی ہوں۔ اگر وہ عیسائی ہے تو میں عیسائی ہوں۔ نعوذ باللہ وہ تھے تہجد گذار مگر دیکھئے ایک بدنگاہی سے سب ختم ہوگیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس سے بہت بچنا چاہیئے۔ ابن القیم نے دوا الکافی میں ایک حکایت لکھی ہے ایک نہایت حسین عورت نے ایک آدمی سے حمام منجانب کا راستہ پوچھا کچھ نظر اور کچھ اس کی باتوں سے اور کچھ اس کی صورت سے یہ گرویدہ ہوگیا۔ اور اسے دھوکہ دیا کہ اپنے ہی مکان کو حمام منجانب بتادیا جب وہ مکان میں گئی یہ بھی اندر گھس گیا۔ وہ تھی عفیفہ اس کی بدنیتی کو سمجھ گئی۔ اس نے کہا کہ میں تو خود تجھ پر فریفتہ ہوں مگر اس وقت میں بہت بھوکی ہوں۔ پہلے میرے لئے کچھ کھانے کو لاؤ۔ آپ بازار میں گئے۔ جب اس نے گھر اکیلا پایا تو چپکے نکل کر چلدی۔ اب جو کھانا لے کر آیا اور اسے نہ پایا تو مارے غم کے بیمار پڑ گیا اور یہاں تک کہ وقت اخیر آگیا لوگوں نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہو تو یہ بجائے اس کے یہ کہتا ہے ؎

یَارَبِّ سَائِلَةٌ یَوْمًا وَقَدْ تَعِبَتْ اَیْنَ الطَّرِیْقُ اِلٰی حَمَّامِ مِنْجَابٍ

(اے رب حمام منجانب کے راستہ کو پوچھنے والی کہاں ہے)

اور اسی پر خاتمہ ہوگیا۔ انھوں نے ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص ایک لڑکے پر عاشق تھا اس کے فراق میں بیمار ہوگیا۔ کسی نے اس لڑکے کو سمجھایا کہ تمہارے سامنے چلے جانے سے اُسے افاقہ ہوجائے گا۔ چنانچہ وہ راضی ہوگیا۔ اس کو بھی کسی نے خبر دیدی کہ وہ لڑکا آرہا ہے یہ مارے خوشی کے اُٹھ بیٹھا۔ پھر وہ راستہ ہی سے لوٹ گیا کہ جانے میں رسوائی ہے اس کی بھی اُسے کسی نے خبر دیدی وہ پھر گر پڑا اور یہ شعر پڑھنے لگا ؎

رِضَاكَ اَشْهٰى اِلٰى فُؤَادِیْ مِنْ رَحْمَةِ الْخَالِقِ الْجَلِیْلِ

(تیری خوشنودی میرے دل کی زیادہ خواہش مند ہے خالق جلیل کی رحمت سے)

بس اسی پر دم نکل گیا۔ ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص شہوات ومعاصی میں

منہمک تھا اس سے اخیر وقت میں کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو کہتا ہے کہ اتنے معاصی کے ہوتے ہوئے کلمہ ہی سے کیا ہوگا اور اسی پر دم نکل گیا۔ کمبخت معاصی میں بھی خاصیت ہے کہ رحمت خداوندی سے مایوس کردیتی ہے۔ تب ہی تو کلمہ سے انکار کیا اور اس کو بیکار سمجھا۔ اسی کے مناسب ایک واقعہ یاد آیا۔ ہمارے یہاں قریب کے ایک قصبہ میں ایک خون ہوگیا تھا۔ اس میں دو آدمی ماخوذ ہوئے اور دونوں کو پھانسی کا حکم ہوگیا۔ حکم کے بعد پوچھا گیا تم کچھ چاہتے ہو تو ایک نے تو کہا کہ میرے بھائی کو بلا دو اور مجھے غسل و نماز کی اجازت دو۔ چنانچہ اجازت ہوگئی اس نے اپنے بھائی کو چند وصیتیں کیں اور کہا کہ میاں آج میرا وقت پورا ہوچکا تھا اگر پھانسی نہ ہوتی تو میں اور کسی طرح مرتا۔ پھر اس نے دو رکعت نماز پڑھی اور کلمہ پڑھ کے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اور دوسرے نے اپنے عزیزوں سے اس قسم کی خرافات وصیتیں کیں کہ مثلاً میرا پیسہ کبھی کسی مسجد میں لگنے نہ پائے اس سے کہا گیا کہ کلمہ پڑھ تو کہتا ہے عمر بھر پڑھا تو کیا ہوا اور اب پڑھوں گا تو کیا ہوگا، اسی کے بعد پھانسی ہوگئی نعوذ باللہ۔ تو بہرحال بڑی ضرورت ہے ایسی چیزوں سے بچنے کی جن میں یہ آثار ہوں اور سب ہی معاصی ایسے ہیں خصوص یہ عشق نفسانی اور اس میں ایک اور بڑی آفت ہے وہ یہ کہ اگر کسی نے جوانی میں احتیاط اور توبہ نہ کی ہو تو یہ مرض بڑھاپے میں اور بڑھ جاتا ہے۔ اس پر ایک تفریع فقہی کرتا ہوں وہ یہ کہ بوڑھے آدمی سے اپنے سیانے لڑکے اور سیانی لڑکی کو زیادہ بچانا چاہیئے۔ وجہ یہ کہ جوانی میں اگر شہوت زیادہ ہوتی ہے تو قوت ضبط بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس قوت ضبط ہی سے قوت شہوت میں لذت ہوتی ہے۔ تو اگر کوئی خوف حق سے ابھی ضبط نہ کرے گا تو لذت ہی کے لئے ضبط کرے گا۔ اور یہ لذت معین ہوجاوے گی ادامت ضبط پر اور اس سے رفتہ رفتہ وہ اس ضبط میں خوف حق کی نیت کر کے متقی بن جائے گا اور بوڑھے میں گو قوت شہوت کم ہے مگر قوت ضبط بھی کم ہے۔ کیونکہ شہوت اور ضبط کا دارو مدار حرارت غریزیہ پر ہے اور وہ بڑھاپے میں کم ہوجاتی ہے اس لئے اس میں ضبط کم ہوگا۔ پس وہ زیادہ احتیاط کے قابل ہے گو وہ بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اب تو یہ غضب ہے

کہ لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو پیروں سے تو بالکل پردہ نہیں کراتے پیر خواہ جوان ہوں یا بوڑھے عورتیں ان کے ہاتھ پیر دباتے ہیں۔ اے اللہ کہاں گئی شریعت اور کہاں گئی شرم و غیرت۔ ہم نے مانا کہ پیر صاحب ایسے پیر اور ایسے متقی ہیں کہ ان سے خطرہ نہیں ہے مگر دوسروں کو اپنی بے حیائی کے لئے سند تو ہو جاوے گی۔ بہرحال یہ مرض نظر بد عشق نفسانی سخت مرض ہے مگر علاج اس کا بھی ہے البتہ ذرا دار وئے تلخ ہے مگر اس تلخی کے ساتھ اس میں دین کی لذت بھی ہے سو اس کی لذت کے لئے تلخی کو تو گوارا کرلو۔ شاید کوئی کہے کہ تلخی میں لذت کہاں میں کہتا ہوں کہ کیا تم مرچ نہیں کھاتے کہ منہ سے بھی نہر جاری ہے اور ناک سے بھی اور آنکھ سے بھی مگر چھوڑتے نہیں تو دیکھئے تلخ ہے اور مزہ دار کسی کو مرچ کی عادت نہ ہو تو تمباکو لے لیجئے اس میں جتنی زیادہ تلخی ہو اتنا ہی زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔ میں نے کبھی پیا نہیں مگر کھانے والے پینے والوں کے قصے سنے ہیں اس لئے تقلیداً کہتا ہوں۔ ہائے افسوس لذت کے سبب مرچوں کی تلخی مطلوب اور تمباکو کی تلخی مطلوب مگر دین کی لذت کے لئے علاج کی تکلیف سے نفرت کیا دین کی تمباکو اور مرچوں کی برابر بھی وقعت نہیں۔ اب وہ علاج بتلاتا ہوں جس سے اس مرض عشق نفسانی سے شفا ہو جائے اور وہ علاج صرف یہ ہے کہ اس کی طرف بالکل توجہ نہ کرے، اور توجہ کی بھی قسمیں ہیں۔ توجہ بالقلب۔ توجہ باللسان۔ توجہ بالبصر۔ توجہ بالید۔ توجہ بالرجل۔ تو ان سب کو ترک کرے یعنی نہ تو اس کا تصوّر کرے نہ تذکرہ کرے نہ اس کی طرف دیکھے نہ اسے ہاتھ سے چھوئے نہ پیروں سے چل کے اس تک جائے۔ خلاصہ یہ کہ جتنا اس سے بُعد ہوگا اتنا ہی نفع ہوگا۔ اس میں مجھ کو ایک احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید کوئی یہ علاج شروع کر کے اگلے ہی دن کہنے بیٹھ جائے کہ علاج تو کیا مگر اب تک وہی حال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا تو امراض حسیہ میں بھی بہت ہوتا ہے کہ ایک مسہل میں درد نہیں جاتا بلکہ بعض دفعہ اکیس اکیس مسہل ہوتے ہیں تب کہیں مادہ خارج ہوتا ہے کوئی علاج نہیں چھوڑ دیتا

تو اس میں بھی جلدی نہ کرو علاج کرتے رہو ان شاء اللہ تعالےٰ ضرور نفع ہوگا۔ ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ اور سب باتیں تو آسان ہیں مثلاً ہاتھ پاؤں، زبان، آنکھ سب قابو میں ہیں مگر دل کو کیا کریں کہ خیال آتا ہی ہے میں کہتا ہوں اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّہُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدٍ (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) یہ قضیۂ لازمہ عادیہ ہے۔ اب تم یہ کرو کہ کسی دوسری شئے کا تصور کیا کرو اور ادھر کی طرف قصداً توجہ نہ کرو۔ قصداً دوسری طرف توجہ رکھو۔ اس سے وہ آپ دفع ہو جاوے گا۔ بلکہ یہ بھی نہ کرو کہ اس کو قصداً دفع کرو کیونکہ اس سے تو پھر ادھر توجہ ہو گئی۔ غرض رفع کے قصد سے بھی ادھر متوجہ نہ ہو اس کی مثال تار بجلی جیسی ہے کہ اگر ہٹانے کے لئے ہاتھ لگا دیا جب بھی لپیٹے گا اور کھینچنے کے لئے لگایا تب بھی لپٹے گا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ہاتھ ہی مت لگاؤ نہ ہٹانے کے قصد سے نہ لانے کے قصد سے اور یہی علاج ہے بعینہ وساوس کا کہ ادھر توجہ نہ کی جاوے اس سے خود دفع ہو جاویں گے۔ اس میں بھی بعضے ایسے ہی غلطی کرتے ہیں کہ قصداً انھیں ہٹاتے ہیں حالانکہ اس کا یہ علاج نہیں یہ لوگ علاج ہی میں غلطی کرتے ہیں۔ بلقول مولانا ؎

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند آں عمارت نیست ویراں کردہ اند
بے خبر بودند از حال درون استعیذ اللہ مما یفترون

(اس نے کہا انھوں نے جو کچھ علاج و معالجہ کیا سب بیکار ثابت ہوا اندرونی حال سے وہ بے خبر تھے اللہ سے اس بات کی پناہ جس کو وہ اظہار افترا کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ مرض کچھ تھا اور بتلا دیا کچھ)

مولانا نے یہاں ایک حکیم کی حکایت لکھی ہے کہ اس نے ایک مریض کو دیکھ کر کہا تھا کہ جتنا لوگوں نے علاج کیا ہے سب الٹا ہی کیا اسی طرح غیر محقق کے علاج کو محقق کہتا ہے۔ تصوف واقعی حکمت ہے اس میں بڑے ماہر محقق کی ضرورت ہے۔ پس وسوسہ کا صحیح علاج یہ ہے کہ اس کو قصداً دفع نہ کرو بلکہ دوسری طرف توجہ کر لو۔ اب ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ ہم نے یہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے

کہ جب وساوس آتے ہیں تو الفاظ قرآنیہ کی طرف توجہ منصرف کر دیتے ہیں مگر اس وقت بھی سامنے وساوس ہوتے ہیں اس کے جواب کی حقیقت سمجھنے کے لئے اول ایک مثال سمجھئے اور وہ بھی مسئلہ فلسفہ ہی کا ہے وہ یہ کہ علم مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ کسی چیز کے نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے شعاعیں نکلکر مرئی کو محیط ہو جاتی ہیں مگر جو چیزیں مرئی کے گرد و پیش ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ نظر آتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک نقطہ ہے آپ ٹکٹکی باندھ کر اسی کو دیکھ رہے ہیں مگر اس کے آس پاس کے دوسرے نقطے بھی بلا قصد نظر آتے ہیں اگر کوئی استاد حکم دے کہ اور نقطہ کو مت دیکھو تو مطلب یہ ہے کہ بالقصد مت دیکھو کیونکہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اسی طرح نفس کی حالت ہے کہ جب قصداً تم مثلاً الفاظ قرآنیہ کو ذہن سے دیکھ رہے ہو تو علاج پر عمل ہو گیا۔ گو اور چیزیں جو متخیلہ میں جمع ہیں وہ بھی ذہن کے سامنے آجاویں پس ان کا خیال آنا منع نہیں ہے ہاں لانا منع ہے۔ اب اس پر کوئی کہے کہ جب وساوس آگئے خواہ لانے سے یا بے لائے تو پھر علاج کا فائدہ کیا ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ چند روز تک تو وہ آتے ہیں اور اس کے بعد پھر خود بخود غائب ہو جاتے ہیں اور یہی فرق ہے بصیرت و بصارت میں کہ بصر سے تو وہ گرد پیش کی چیزیں غائب نہیں ہوتیں مگر بصیرت سے غائب ہو جاتی ہیں پھر اس وقت یہ حالت نصیب ہو جاتی ہے ؎

دل آرامے کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے تم نے دل لگا لیا ہے تو پھر تمام جہان سے آنکھیں بند کر لو)

اسی طرح تم وساوس کے ہجوم کے وقت کسی دوسری چیز کی طرف توجہ منعطف کر لیا کرو چاہے وہ دوسری چیز کلام ہو چاہے ڈھیلا مٹی اور چاہے تصور شیخ ہو۔ اس اثر میں سب برابر ہیں اور یہاں سے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق بھی ہو گئی کہ وہ کوئی مستقل شغل نہیں ہے بلکہ اس کا تصور اس لئے دل میں لاتے ہیں تاکہ خطرات دفع ہو جاویں اور گو یہ غرض دوسرے تصورات سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

مگر شیخ محبوب ہے اور محبوب کے تصور کو اس غرض میں زیادہ دخل ہے اس لئے اہلِ طریق نے اس کو اختیار کیا، پھر جب خطرات دفع ہو گئے جس کی ضرورت سے تصورِ شیخ کیا تھا، اب شیخ کو بھی رخصت کرو اور خالص ذاتِ الٰہی کی طرف توجہ کرو۔ جیسے دولہا اور دلہن کے بیچ میں مشاطہ اور نائن ہوتی ہے مگر جب خلوت کا وقت آتا ہے تو صرف دولہا اور دلہن رہ جاتے ہیں اور نائن باہر کر دی جاتی ہے تو تصورِ شیخ مشاطہ تھا توجہ بحق کے وقت یہ بھی رخصت بقول مولانا ؎

جلوہ بیند شاہ و غیرِ شاہ نیز　　وقت خلوت نیست جز شاہِ عزیز

(جلوہ دیکھتا ہے بادشاہ اور غیر بادشاہ بھی خلوت کے وقت بادشاہ کے سوا کوئی عزیز)

اور یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ پیر کا حق اس کو رہبر بنانا ہے پرستش نہیں کیونکہ معبود کبھی علیحدہ نہیں کیا جاتا اسی طرح عشقِ نفسانی میں جب محبوب کا خیال بلا قصد آئے تو اس وقت دوسرے کسی مباح التصور امر کا تصور کر لے تو اس سے محبوب مجازی کی صورت آہستہ آہستہ اکھڑ کر جاتی رہتی ہے اور یہ امر بھی قابل تنبیہ ہے کہ جاتے رہنے کی بھی یہ صورت ہوتی ہے کہ اول بتدریج میلان میں کمی ہو گی پھر چند روز کے بعد میلان بالکل نہیں رہے گا۔ مگر اس کے بعد کچھ کچھ محبت معلوم ہوا کرے گی مگر ادنیٰ اہتمام سے وہ مضمحل ہو جاوے گی۔ اس میں بھی بعضوں کو غلطی ہوتی ہے کہ جب دوبارہ پھر میلان ہوا تو وہ سمجھا کہ میرا مرض پھر عود کر آیا۔ مگر نہیں وہ مطمئن رہے کہ مرض نے عود نہیں کیا ورنہ ادنےٰ اہتمام سے دفع نہ ہوتا ازالہ رذائل کے معنے یہی ہیں کہ غلبہ جاتا رہے۔ باقی جڑ باقی رہتی ہے اور اس قدر اصل کا باقی رہنا بھی حکمت الٰہیہ ہے۔ کیونکہ اگر رذائل کی اصل ہی نہ رہے تو پھر مقاومت کا اجر کیسے ملے۔ اسی کو مولانا

فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است　　　　که ازو حمام تقوی روشن است

(دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگیٹھی کے ہے کیونکہ اس سے تقوی کا حمام روشن ہے)

گوبر کے اُپلے اور کنڈے نجس تو ہیں مگر یہ نہ ہو تو حمام کا پانی گرم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تقوے کا نور بھی شہوت ہی سے ہے بشرطیکہ اس کو جلاتے رہو جمع کر کے دل میں نہ رکھو۔ الحمد للہ ہر پہلو سے یہ مسئلہ صاف ہو گیا۔ اور عشق نفسانی کا علاج معلوم ہو گیا۔ یعنی اس طرف التفات نہ کرو اس سے محبت مغلوب ہو جاوے گی۔ اور مطلق میلان نہ ہونا مطلوب نہیں اگر اتنا میلان بھی نہ ہو تو بے حسی ہے جیسے گلاب میں سے کسی کو خوشبو کے بجائے بدبو آنے لگے تو معلوم ہوا۔ اس کی قوت شامہ خراب ہو گئی ہے کیونکہ اچھی چیز تو اچھی ہی لگنی چاہئے۔ اگر ایسا ہو تو یہ شخص سلیم الحواس نہیں۔ پس میلان سے تو نہ گھبراؤ۔ ہاں اس کے مقتضا پر عمل نہ کرو۔ یعنی میلان کے بعد اس کو دیکھنے میں مشغول نہ ہو کہ خدا تعالےٰ سے تعلق رکھ کر قصداً دوسری طرف مشغول ہونا بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ اگر خود غیرت نہیں رہی تو غیرت حق کو سوچو اور دیکھو کہ اگر کسی کو بادشاہ کا قرب میسر ہو جاوے اور اس کو محل میں جانے کی اجازت ہو جاوے اور وہ وہاں جا کے لونڈیوں کو دیکھنے لگے تو بادشاہ کیا کہے گا۔ اسی طرح خدا کی بھی غیرت آتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے لوگ فواحش میں مبتلا ہوں۔ حقیقت میں خدا کے ہوتے ہوئے کسی اور پر نظر کرنا بڑی سخت بات ہے۔

اختتام مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک خوبصورت عورت جارہی تھی ایک شخص اس کے پیچھے ہولیا وہ سمجھ گئی۔ اس نے کہا کہ مجھے کیا دیکھتا ہے میرے پیچھے میری دوسری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے بہت زیادہ حسین ہے۔ یہ اس کے دیکھنے کے لئے پلٹا۔ اس نے ایک دھول رسید کیا اور کہا کہ ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی / در بیان دعوئے خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر / این بود دعوئ عشق اے بے ہنر

(اس نے کہا اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعوے کے بیان میں سچا ہے تو پھر تو نے غیر کی طرف کیوں نظر ڈالی بے غیرت کیا یہی عشق کا دعویٰ تھا)

جب اس عورت کو غیر پر نظر کرنے سے اتنا غیظ ہوا تو کیا حق تعالےٰ کو غیظ نہ ہوگا۔ غرض یہ مرض بڑا شدید ہے۔ ابتدا میں تو صغیر ہے مگر اثر میں اور انتہا میں شدید و مدید ہے۔ اصل میں یہ گفتگو اس پر تھی کہ ایک شخص بے نمازی کو تو بُرا سمجھتا ہے مگر اپنی بدنگاہی سے نفرت نہیں کرتا جس کے اتنے مفاسد ہیں۔ تو بعضے ایسے لوگ جن کے عقائد تو درست ہیں اور یہ غلطی بکثرت اہل علم کو یا انکی صحبت والوں کو ہوتی ہے یعنی اگر وہ کسی کی نسبت مثلاً یہ سُن لیں کہ یہ شخص بدعات سے مجتنب ہے گو اس کے تمام اعمال تباہ ہوں۔ بس پھر اُسے اس اہل بدعت پر بھی ترجیح دینے لگتے ہیں۔ جہاں منشا بدعت کا محض خطائے اجتہادی ہی ہو یہ غلو فی الدین نہیں تو کیا ہے۔ انھوں نے عبادت کے درجات کو چھوڑ کر عقائد کو اساس قرار دے کر فروع کو بے وقعت سمجھ لیا ہے جیسے کوئی درختوں کی شاخیں کاٹ دیا کرے اور صرف تنہ دیکھ کر خوش ہوا کرے کہ باغ لگا ہوا ہے حالانکہ اس باغ دین کی تو یہ شان ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود / گر ز باغ دل خلالے کم بود

(عارف کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے)

کہاں تو یہ حالت کہ ایک تنکا بھی کم ہوتا گوارا نہیں اور کہاں یہ کہ تمام شاخیں کاٹ کے بھی خوش ہیں کہ جڑیں تو ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بنیاد بھر کر خوش ہو کہ میں نے مکان بنا لیا ہے۔ اگر کسی نے بنیاد یں بھر دیں اور مکان بنایا نہیں تو برسات آنے دو۔ اب پانی برسا تو کیڑے بہے بہے پھرتے ہیں

سب سامان بھیگ رہا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ میں نے بڑی غلطی کی جو بنیاد کو کافی سمجھا۔ کام تو دیواروں اور چھت سے پڑے گا گو بقار ان کا بیشک بنیاد سے ہے۔ میں نے بڑی نادانی کی کہ پہلے ہی بنیاد کے ساتھ دیواریں نہ بنالیں ہاں البتہ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا جس کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں اس کی عمارت جب بنے گی جلدی تیار ہو گی۔ اور مضبوط بنے گی اور جس کی جڑ ہی کھوکھلی ہوگی اس کو مشکل ہو گی۔ خلاصہ یہ کہ اہم الاجزار عقائد بیشک ہیں مگر ان کے بعد دوسرا درجہ اعمال کا بھی تو آخر کچھ ہے ایک غلطی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ تصحیح عقائد کو ضروری نہیں سمجھتے تسبیح، نماز، روزہ تو کرتے ہیں مگر عقائد کی تصحیح کی فکر نہیں کرتے اور اکثر اس میں ان کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ قصور ان کا ہے جو بیعت کرکے کچھ وظائف بتلا کے خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی فکر ہی نہیں کہ عقائد اس شخص کے کیسے ہیں جن کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک درویش صاحب نے مجھ سے پوچھا تصور شیخ جائز ہے یا ناجائز۔ میں نے کہا پہلے آپ اس کے معنے بتایئے تو کہتے کیا ہیں کہ خدا کو پیر کی شکل میں سمجھنا۔ نعوذ باللہ۔ وہ تو حضرت پابند صوم وصلوٰۃ بھی تھے اور تہجد وذکر والے بھی تھے اور عقیدہ یہ۔ اور پھر مزہ یہ کہ اس بدعقیدگی کو مضر نہیں سمجھتے۔ ایک شخص نے مجھے خط لکھا کہ جب نماز تنہا پڑھتا ہوں تو وساوس نہیں آتے۔ اور جماعت سے پڑھتا ہوں تو وساوس بہت آتے ہیں تو جی چاہتا ہے جماعت چھوڑ دوں۔ تو یہ بزرگ خلاف سنت کو سنت سے افضل سمجھ رہے تھے۔ درحقیقت یہ طریق بہت نازک ہے۔ عارف شیرازی نے خوب کہا ہے ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است　　ہشدار گوش را بہ پیام سروش دار

(راہِ سلوک میں شیطان کے وساوس بہت ہوتے ہیں ہوشیار رہو اور وحی کی طرف کان لگائے رہو)

یعنی ہر قدم پر وسوسہ ہے شیطان کا بس وحی کا اتباع کرو دیکھئے کتنے بڑے دھوکے میں مبتلا کیا شیطان نے کہ حضور قلب نماز کی روح ہے اور ہر شے میں مقصود روح ہوتی ہے تو نماز میں بھی زیادہ مقصود حضور قلب ہی ہے اس کے بعد دیکھا کہ جماعت میں یہ روح ملتی نہیں اور قاعدہ ہے کہ اَلشَّیْءُ اِذَا خَلَا عَنْ فَائِدَۃٍ اِنْتَفٰی۔ یعنی جو شے مقصود سے خالی ہو گی وہ منتفی ہو جائے گی۔ بس یہ نتیجہ نکال کے گمراہ ہوا کہ جماعت ہی سے نماز نہ پڑھے۔ اس کا جواب قاطع بحث تو یہ ہے کہ ترک جماعت جب شریعت کے خلاف ہو تو اس میں ہزار مصالح ہوں سب لغو ہیں یہ تو سنار کی سو کھٹ کھٹ کے مقابلہ میں لوہار کی ایک ہے۔ خیر میں کھٹ کھٹ کا ہی جواب دیتا ہوں کہ حقیقت میں یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ حضور قلب کے یہی معنی ہیں جو سائل نے سمجھے۔ یعنی وساوس کا نہ آنا لفظ حضور قلب تو ایک تعبیر ہے اور حقیقت اس کی احضار القلب ہے اہل علم تو اتنے ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر میں سب کے سمجھنے کے لئے تفصیل بھی کئے دیتا ہوں یعنی ایک تو ہے وساوس کی آمد اور ایک ہے آورد۔ سو آورد مضر ہے آمد مضر نہیں تو مقصود نماز میں صرف قلب کو اپنے قصد سے حاضر کرنا ہے پھر خواہ حاضر ہو یا نہ ہو اور یہ احضار خواہ ذکر کی طرف توجہ کرنے سے ہو خواہ مذکور کی طرف توجہ کرنے سے ہو یعنی اس کے دو طریقے ہیں۔ مبتدی کے لئے تو یہ ہے کہ ذکر کی طرف توجہ کرے اس کا طریقہ نہایت سہل۔ ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے بتایا کہ نماز کے ہر جزو کو اپنے قصد سے ادا کرو۔ صرف یاد سے مت پڑھو۔ یعنی اب تو یہ عادت ہے کہ گھڑی کی کوک کی طرح اللہ اکبر کہہ لیا کہ یہ تو نماز کی کوک ہے اور الحمد اور انا اعطینا اور قل ھو اللہ یہ سب ہی کو ازبر ہے۔ بس شروع سے آخر تک سب خود بخود نکلتا چلا گیا۔ تو ایسا مت کرو بلکہ اللہ اکبر کہو تو سوچ کے اور ارادہ سے کہو کہ میں اللہ اکبر کہہ رہا ہوں۔ اس کے

بعد سبحانک اللہم پڑھو تو اس طرح پڑھو کہ ایک ایک لفظ کو مستقل ارادہ سے کہو پھر اسی طرح الحمد پڑھو۔ پھر اسی طرح سورت ملاؤ۔ غرض ہر ہر لفظ ارادہ سے ادا کرو۔ یہ تو مبتدی کا طریقہ تھا۔ اور منتہی کا یہ ہے کہ بلا واسطہ حضرت حق کی طرف توجہ کو قائم کر دے اور یہ حالت جب ہی حاصل ہوگی جبکہ اول مبتدی کی طرح عمل کرو گے۔ بس تم اول ذکر پر توجہ کرو پھر شدہ شدہ مذکور کی طرف توجہ حاصل ہو گی۔ اور اس سے ایک نکتہ اولہ سمجھ میں آیا ہو گا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ رہو) تو یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ وذکر ربک کیوں نہیں فرمایا اسم کیوں بڑھایا۔ اس کے جواب میں بعض نے کہا ہے کہ اسم زائد ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اسم کو زائد کہنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس میں مبتدی کا درجہ بتایا ہے کہ وہ اسم ہی کی طرف توجہ کرے تو کافی ہے پھر اسی سے مسمیٰ تک پہونچ جاوے اور وتبتل الیہ میں منتہی کا کیونکہ ابھی بلا واسطہ ذکر رب پر قدرت نہیں اس لئے اس کو ذکر اسم رب کافی ہے اور منتہی کو اس پر قدرت ہے۔ اس لئے اس کو حضرت حق کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ مگر یہ تفسیر نہیں نکتہ ہے لیکن اس پر میرا استدلال موقوف بھی نہیں۔ بہرحال احضار قلب کے دو طریقے ہیں ایک بواسطہ توجہ الی الذکر کے اور ایک بواسطہ توجہ الی المذکور کے تو درج نماز کی یہ احضار قلب ہے اگر اس احضار کے بعد وسوسے آدیں تو یہ حضور قلب کے منافی نہیں ہے تو جماعت کی نماز میں جب احضار کر لیا گو حضور نہ ہو تو یہ کہنا سراسر غلط ہو گیا کہ جماعت میں حضور قلب نہیں ہوتا تو دیکھیے کتنی بڑی دولت سے شیطان نے محروم کرنا چاہا تھا۔ حدیث شریف میں ہے۔ جماعت کی ایک نماز میں پچیس نماز کا ثواب ملتا ہے اس لئے کسی بات میں اپنی رائے پر عمل نہیں کرنا چاہیئے بلکہ شریعت پر چلتے رہو

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست   بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(شریعت میں جو حالت بھی سالک کو پیش آئے اس کے لئے بہتر ہے اے دل صراط مستقیم پر کوئی شخص گمراہ نہیں ہے)

صراط مستقیم سے مراد شریعت ہے مطلب یہ ہے کہ جب حالت شریعت کے موافق ہو تو پھر جو حالت بھی بلا اختیار پیش آوے جیسے لفظ آید اس پر دال ہے وہ سب خیر ہی ہے خواہ وساوس ہوں یا اس سے بڑھ کر کچھ ہو۔ اسی طرح دعا میں بھی شیطان بہکاتا ہے کہ ہماری دعا ہی کیا جب حضور قلب نہ ہو۔ ایک شخص میرے پاس آئے کہ میں بہت مقروض ہو گیا ہوں میرے لئے ادار قرض کی دعا کرد۔ میں نے کہا میں بھی کرتا ہوں تم بھی کرو کہنے لگے اجی ہماری دعا ہی کیا۔ میں نے کہا کلمہ طیبہ جس سے آدمی مسلمان ہوتا ہے افضل ہے یا دعا کہنے لگے کلمہ طیبہ میں نے کہا بس یہی کہہ کے اسے بھی چھوڑ دو کہ ہمارا اسلام ہی کیا۔ میں کہتا ہوں جو کچھ ہے اسی کو غنیمت سمجھو۔ بلا بودتے اگر ایں ہم نہ بودے۔ (مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتا) غرض ایسے ہی جہل سے لوگوں کے عقائد خراب ہو رہے ہیں اور جب عقائد خراب ہوئے تو عبادت بھی ناقص ہوگی کیونکہ عبادت کے معنے عبد شدن ہے۔ اور اس میں عقائد و اعمال سب داخل ہیں جب ایک جزو بھی ناقص ہوا تو مجموعہ ضرور ناقص ہوگا۔ یہ پہلی اور دوسری غلطی تو عقائد و اعمال کے متعلق تھی۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ بعض نے معاملات کو ضروری نہیں سمجھا چنانچہ اجارات و تجارات میں بیع و شرار میں باستثنار شاذ و نادر کوئی جانتا تک بھی نہیں کہ اس کے متعلق شریعت میں کچھ احکام بھی ہیں۔ ریل میں بے ٹکٹ سفر کرنے کو حرج نہیں سمجھتے۔ اور جو ٹکٹ لیتے ہیں تو قانون سے زائد اسباب لیجانیکو برا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ریل حق العبد ہے۔ جب ہم نے اس کو استعمال کیا ہے تو ہمیں اس کا حق معہودہ کرایہ بھی دینا چاہیئے۔ اسی طرح مدارس اور انجمنوں کے چندے بھی حق العبد ہیں اس کی تحصیل میں جبر کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ بلکہ قصداً زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ زیادہ چندہ وصول ہو۔ اسی طرح کل معاملات میں سخت بے پروائی ہے۔ چنانچہ اس کی کھلی دلیل ہے کہ جس طرح نماز روزہ میں علمار سے پوچھتے ہیں معاملات میں کبھی نہیں پوچھتے۔ رہن نامہ۔ بیعنامہ کی دستاویز لکھ کر وکیل کو تو دکھلائیں گے کہ قانون حکومت کے خلاف تو نہیں مگر کسی عالم کو کبھی نہیں دکھائیں گے

کہ قانون شرعی کے تو خلاف نہیں اسی طرح مقدمہ میں جھوٹ بولنا کہ اس میں علماء سے بالکل نہیں پوچھیں گے کیونکہ یہ عام طور پر معلوم ہے لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (اللہ کی جھوٹوں پر لعنت ہے) اس سے وہ سمجھتے ہیں کہ پوچھنے پر یہی فتویٰ ملے گا تو پوچھکر خود کیوں لعنت سُنی۔ اپنے فعل پر لعنت سننے سے عرب کے ایک معلم کا قصہ یاد آیا۔ کہ ایک لڑکا استاد سے قرآن کا سبق لے رہا تھا اور استاد کی طرف منہ کرکے اس آیت کا تکرار کر رہا تھا وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ط۔ وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (قیامت تک تجھ پر اللہ کی لعنت ہے) استاد اس ہیئت خطاب سے جھنجھلا گیا اور کہا اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ وَعَلٰى وَالِدَيْكَ (تجھ پر لعنت ہو اور تیرے ماں باپ پر بھی) لڑکا سمجھا کہ آیت یونہی ہوگی اس نے یوں ہی کہنا شروع کر دیا اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ وَعَلٰى وَالِدَيْكَ (تجھ پر لعنت ہو اور تیرے ماں باپ پر بھی) غرض جھوٹ بولنے کی نسبت علماء سے نہیں پوچھیں گے میں کہتا ہوں کہ پوچھا تو ہوتا شاید اجازت ہی مل جاتی اور گو بات تو کہنے کی نہ تھی مگر کیا کروں اس کے کہنے کی بھی ضرورت ہے کہ بعض جگہ جھوٹ بولنا بھی جائز ہے۔ تم پوچھ کے تو دیکھو معلوم ہوگا کہ کہاں کہاں جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اس کی تفصیل میں اس وقت نہیں بتا سکتا کیونکہ میں اس وقت فقہ کی کتاب تھوڑا ہی لکھ رہا ہوں۔ مگر اس اجمال کے بعد اتنا ضرور کہوں گا کہ علماء سے وحشت مت کرو اور یہ بدگمانی مت کرو کہ وہ ہر جھوٹ کو حرام ہی کہیں گے اسی سے تو لوگ درویشوں کو اچھا سمجھتے ہیں کہ کسی کو روکتے ٹوکتے نہیں شفقت سے کسی کو بچہ کہدیا اور کسی کو باوا بنا دیا۔ مگر بشارت دیتا ہوں کہ آجکل تو نوعمر مولوی بھی اسی طرح کا برتاؤ کرنے لگے ہیں۔ کہ باوجودیکہ وہ آپ کی سب بیہودہ حالت سمجھتے ہیں مگر کچھ نہیں کہتے۔ مثلاً میں کسی کی ڈاڑھی مونڈی ہوئی دیکھتا ہوں مگر کہنا دل شکنی سمجھتا ہوں۔ تو آپ اس زمانہ کے نوعمر تہذیب دیدہ مولویوں کے پاس جائیے اور نوعمر کے یہ معنے نہیں کہ وہ آپ سے بھی زیادہ نوعمر ہوں۔ اس وصف میں تو آپ ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ جیسے نوشیرواں سے کسی نے شکایت کی کہ فلاں شخص نے مجھ پر ظلم کیا

تو نوشیرواں نے کہا کہ تو کوتاہ قامت یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص کوتہ قامت پر ظلم کر سکے وہ خود متقی ہوتا ہے اس نے کہا اجی جس نے مجھ پر ظلم کیا وہ مجھ سے زیادہ کوتہ قامت ہے۔ چنانچہ تحقیقات سے ایسا ہی نکلا۔ بلکہ نو عمر کا مطلب یہ ہے کہ بہت پرانے مولویوں کے سامنے جو نو عمر ہوں گے وہ تسامح کریں گے تو اخلاقاً وہ بھی درویش ہی ہیں وہ آپ کی بہت خاطر کریں گے۔ تہذیب کے ساتھ پیش آویں گے یہاں تک کہ آپ کے دل میں ان کی محبت پیدا ہوگی تو آپ خود ڈاڑھی رکھ لیں گے کیونکہ ان کے اخلاق دیکھ کر پھر آپ منڈواتے ہوئے خود شرمائیں گے مگر ان کو سن کر ڈرمت جانا کہ بس جی اگر مولویوں سے ملنے میں یہ خاصیت ہے کہ خود بخود ڈاڑھی رکھ لیتا ہے تو ہم ملیں ہی گے نہیں۔ جیسے کسی نے کہا تھا کہ چاند دیکھ کے روزہ فرض ہوجاتا ہے۔ دوسرے نے کہا میں دیکھوں ہی گا نہیں جو فرض ہو۔ مگر صاحب جب مولوی آپ سے ڈاڑھی کی بات کچھ نہ کہیں بلکہ آپ بدون کہے خود ہی رکھ لیں تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ جبکہ آپ بلا کلفت ڈاڑھی رکھ لیں پھر ڈرنے کی کیا بات ہے۔ بہرحال آپ علماء سے ضرور ملئے اور ہر بات کو ضرور پوچھئے بلکہ میں تو علی سبیل الترقی کہتا ہوں کہ اگر عمل نہ بھی کرنا ہو تب بھی پوچھئے کیونکہ اگر مسئلہ بھی نہ معلوم ہوا تو ایک تو ترک علم کا گناہ ہوا اور ایک ترک عمل کا تو اس میں ایک یہی فائدہ ہوگا کہ تحصیل علم کا فرض تو ادا ہوجائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کبھی توفیق عمل کی ہوگئی تو علم اپنے پاس ہوگا جیسے کسی کو خارش ہو اور وہ نسخہ کا ایک جزو گندھک سُن لے اور بدبودار سمجھ کے نسخہ ہی نہ سُنے یہ اس کی غلطی ہے کم از کم نسخہ تو معلوم کر لے کہ اگر کبھی علاج کو جی چاہے تو اس وقت طبیب کو تو ڈھونڈنا نہ پڑے گا۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ علم کی خاصیت خشیت ہے۔ امام غزالی نے ایک بزرگ کا مقولہ لکھا ہے کہ ہم نے علم اور اغراض سے سیکھا تھا کہ تحصیل علم کے بعد قاضی بنیں گے مفتی بنیں گے مگر علم نے ہمیں چھوڑا نہیں اور وہ ہمیں اللہ ہی کا بنا کے رہا تو علم کی خاصیت ہے کہ کبھی نہ کبھی خشیت پیدا ہو ہی جاتی ہے تو علماء سے احکام ضرور پوچھ لیا کرو اور ہر امر کے متعلق پوچھا کرو مثلاً مقدمہ عدالت میں

لے جانا ہو تو بھی علمار سے پوچھ لیں۔ جب آپ ہر بات کو پوچھیں گے اس وقت آپ کا یہ گمان کہ علمار سے صرف لَا یَجُوْز (یہ جائز نہیں) کا سبق پڑھا ہے غلط ثابت ہوگا۔ بہرحال معاملات سے آجکل اتنی بے فکری ہے کہ اکثر لوگ معاملات کو دین میں داخل ہی نہیں سمجھتے۔ اور اگر کوئی پوچھنے کو کہے بھی تو کہتے ہیں کہ مولویوں کو اس سے کیا بحث، ان کا کام نماز روزہ کا بتلانا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ خیال بالکل ہی غلط ہے۔ قرآن وحدیث و فقہ میں سب چیزوں کی تعلیم موجود ہے۔ معاملات کی بھی، معاشرت کی بھی لیکن معاشرت کو معاملات سے بھی زیادہ دین سے الگ سمجھتے ہیں۔ کہ لباس پہنے گے دوسری اقوام کا سا۔ باتیں کریں گے تو انھیں کی زبان یا انھیں کے لب ولہجہ میں حتیٰ کہ کمرہ بھی سجائیں گے تو اسی طرح جن کے معنے یہ ہوئے کہ ہم معاشرت میں دریوزہ گر ہیں دوسری قوموں کے اور گویا اس کا اقرار ہے اور نہایت گندہ اقرار ہے کہ ہمیں اس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں دی۔ حالانکہ ان قوموں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم سے معاشرت کا طریقہ سیکھا ہے۔ مگر آپ کی تو وہ حالت ہے ؎

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر — تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تا بزانوئے میاں قعر آب — از عطش و ز جوع گشتی خراب

(تیرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا رکھا ہے تو ایک روٹی کے ٹکڑے کو دربدر مارا پھرتا ہے۔ تو زانو تک نہر میں کھڑا ہوا ہے اور پیاس اور بھوک سے خراب ہو رہا ہے)

یعنی سر پر ٹوکرا روٹیوں کا اور پیروں کے نیچے اتنا پانی کہ تو سارے شہر کو سیراب کردے مگر عادت تو پڑگئی ہے بھیک مانگنے کی۔ اس لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ جیسے ایک چلتی پھرتی عورت کی حکایت ہے کہ بھیک مانگتی پھرتی تھی مگر تھی حسین بادشاہ کو پسند آگئی۔ اپنے ساتھ لے گیا مگر تھوڑے دنوں میں دُبلی ہوگئی بادشاہ کو تعجب ہوا کہ اس عیش وعشرت میں دُبلا ہونے کے کیا معنے اس سے بھی پوچھا کہنے لگی میں آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی مجھے کھانا الگ دے دیا کیجئے (باقی آئندہ)

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

خیر بادشاہ نے ایسا ہی کیا تو تروتازہ ہونا شروع ہوئی۔ بادشاہ نے ماماؤں سے کہا کہ یہ کیا کھاتی ہے انھوں نے کہا ہمارے سامنے تو کھاتی نہیں کھانا رکھوا کر ہم کو رخصت کر دیتی ہے اور کمرہ بند کر لیتی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ روشندان میں سے دیکھو کہ کیا کرتی ہے۔ جب ماما کھانا رکھ کر چلی گئی تو اس نے حسب معمول دروازہ بند کر لیا۔ اب روشن دان میں سے جھانک کے دیکھا تو اس نے یہ کیا کہ روٹی تو ایک طاق میں رکھی اور پیالہ دوسرے طاق میں اور رکابی تیسرے طاق میں۔ اور ایک طاق کے پاس گئی اور کہا کہ اللہ کے واسطے ایک ٹکڑا دے دے۔ بس ایک لقمہ کھالیا۔ پھر دوسرے طاق کے پاس گئی اور اسی طرح کہا پھر ایک لقمہ کھالیا بس اسی طرح سارا کھانا کھالیا، بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا تو فوراً اُسے نکالا کہ کمبخت اب بھی بھیک کی عادت نہ گئی۔

واللہ مجھے بہت افسوس ہے کہ یہی حالت ہماری ہے کہ اپنے یہاں کی دولتیں ناپسند اور دوسروں کے یہاں کی مانگی ہوئی بھیک پسند۔ کوئی کام ہندو کرنے لگیں یہ بھی ان کی دیکھا دیکھی کھڑے ہوجائیں گے عیسائیوں کو کچھ کرتے دیکھیں گے ان کی حرص میں یہ بھی کرنے لگیں گے۔ اور پھر تقلید بھی کریں گے تو کورانہ۔ بے سمجھے پھر اس میں بھی استقلال نہیں کہ چار دن میں بیٹھ رہیں گے۔ حالانکہ دوسری قومیں جو کام کرتی ہیں نباہ کر کرتی ہیں۔

غرض معاشرت بھی جزو دین ہے اس کو بھی اپنے ہی گھر سے سیکھو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب کوئی رواج ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکتا میں بطور

ضروری اطلاع :۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔

مثال کے ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتا ہوں کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمایا ہے کہ اگر تین آدمی ہوں دو آدمیوں کو تیسرے سے جدا ہو کے سرگوشی کی اجازت نہیں۔ سلف کا دستور یہ تھا کہ ایسے موقع پر جب چوتھا آدمی آجاتا تب ان میں سے دو اٹھ کے سرگوشی کر لیتے تاکہ تیسرے کی دل شکنی نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کسی مذہب میں بھی ایسا قانون ہے۔ بھلا کوئی اس کی نظیر دکھلا تو دے۔ آج کسی تمدن میں بھی ایسے قانون کا پتہ نہیں واقعی جو اصول اسلام نے سکھلائے ہیں وہ کسی قوم میں بھی نہیں۔ میں تو دوسری اقوام کے سامنے اپنے بزرگان دین کو پیش کر کے یہ کہوں گا ؎

أُولٰئِكَ آبَائِي فَجِئْنِي بِمِثْلِهِمْ ۔۔۔ إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيرُ الْمَجَامِعُ

(یہ ہیں ہمارے آبار (بزرگ) تو اے جریر ان کی مثل تو ہمارے پاس لا جبکہ ہم مجمعوں کو جمع کریں)

بھلا کوئی لا سکتا ہے ایسے اصول بس یہیں تو وہی معاشرت چاہیئے جس کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی اور گو وہ ظاہر میں شاندار نہ ہو تو نہ ہو مگر واللہ ہیبت اصلی اسی میں ہے۔ بقول مولانا ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ۔۔۔ ہیبتِ از صاحب ایں دلق نیست

یہ شعر حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے قصے میں ہے کہ ان کو سفیر روم نے اینٹ پر سر رکھ کر سوتے دیکھا تھا اور اسی حالت میں جب چہرۂ مبارک پر نظر پڑی تو مارے رعب کے کانپ اُٹھا۔ اس پر سخت متعجب ہوا اور یہ فیصلہ کیا کہ بے شک یہ شخص حق پر ہے اور یہ حق ہی کی ہیبت ہے ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ۔۔۔ ہیبتِ از صاحب ایں دلق نیست

(یہ ہیبت حق کی ہے خلق کی نہیں ہے کچھ ہیبت صاحب دلق کی نہیں ہے)

اب بھی دیکھ لیجئے کہ جس شخص کو اللہ سے جتنا تعلق ہوتا ہے قلوب میں اتنی ہی ہیبت زیادہ ہوتی ہے کہ بادشاہ سے بھی نہیں ہوتی اور اس ہیبت کے ساتھ ہی اس کی محبت بھی بے حد ہوتی ہے۔ بہرحال یہ تو ہماری روزمرہ کی معاشرت کا حال ہے۔ پھر شادی بیاہ میں اور غمی کی رسموں میں تو شریعت سے استفتار کون کرے یہ تو گویا ہماری قومی باتیں ہیں، شریعت کو ان سے کیا غرض نعوذ باللہ۔ اسی لئے ان رسموں میں وہ روپیہ اڑتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

ہمارے اطراف میں کیرانہ ایک قصبہ ہے وہاں کا قصہ ہے کہ ایک گوجر بیمار ہوا۔ اس کا بیٹا حکیم کے پاس آیا اور کہنے لگا اجی حکیم جی جس طرح ہو اب کے تو میرے باپ کو اچھا ہی کردو۔ کیونکہ چاول بہت مہنگے ہیں، برادری کو کہاں سے کھلاؤں گا۔ مجھ کو باپ کے مرنے کا تو غم نہیں ہے صرف برادری کو کھلانے کی فکر ہے۔ کس قدر معاشرت بگڑی ہے۔ اسی طرح خود ہمارے قصبہ کا واقعہ ہے کہ ایک ساس مرگئی تو بہو بیٹھی رو رہی تھی کہ کفن دفن تو کسی طرح چندہ خیرات سے ہو ہی جائے گا مگر آٹھ آنے کے پان برادری کیلئے کہاں سے لاؤں، جب میں نے سنا تو اپنے گھر میں کہا کہ گو ایسے موقع پر تمہارا جانا جائز نہیں اور تم کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہو۔ مگر خدا کے لئے جس کے گھر میت ہو وہاں ضرور جایا کرو اور جا کے پان دان پر قبضہ کرلیا کرو۔ اور کسی کو پان نہ کھانے دو۔ یہ کہاں کی مصیبت ہے۔ چنانچہ انھوں نے جب سے ایسا کیا۔ الحمد للہ ہمارے یہاں سے تو یہ رواج اُٹھ گیا۔ کیوں صاحب یہی معنی ہیں دین کے کہ اس طرح پرایا مال کھا جایا کرو۔

اس وقت بہت وقت ہوگیا ہے اس لئے میں پانچواں جزو یعنی اخلاق کے بیان پر ختم کردوں گا۔ اوّل یہ سمجھئے کہ اخلاق کیا چیز ہیں اس کی حقیقت ہے اپنے نفس کی اصلاح کرنا، اس کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں رہا۔ بس

مرید ہو گئے اور عقیدہ پکا لیا کہ پیر اللہ میاں کے یہاں بخشوائیں گے۔ ادھر پیر روٹیوں سے مطمئن ہو گئے کہ اب سلسلہ میں تو آ ہی گیا پھر کیا غم گویا ایک خاندانی رسم ورواج بن گیا ہے۔ چنانچہ بعض اطراف میں یہ قاعدہ ہو گیا ہے کہ اگر ایک خاندان میں کا ایک شخص کسی کا مرید ہو گیا تو اب سارے خاندان کو اسی کا مرید ہونا ضروری ہے۔ پھر ان کی اولاد کو اس پیر کی اولاد کا مرید ہونا ضروری ہے گو اہلیت کا نام ونشان بھی نہ ہو تو بجز گمراہ کرنے کے اس مشیخت کا کیا نتیجہ ہے۔ ایک ایسے ہی گمراہ کن پیر جی کا قصہ یاد آگیا کہ مریدوں کے گھر گوجروں کے کسی گاؤں میں پہونچے کچھ دُبلے ہو رہے تھے ایک گوجر مرید نے پوچھا پیر جی دُبلے کیوں ہو رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ کمبختو تم لوگ نہ نماز پڑھتے ہو نہ روزہ رکھتے ہو تمہارے بدلہ مجھ ہی کو روزہ نماز کرنا پڑتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ بھی فکر کہ تم سب کے بدلے مجھ ہی کو پل صراط پر چلنا پڑتا ہے پھر بتلاؤ دبلا ہوں یا نہ ہوں۔ مرید بڑا خوش ہوا کہ واقعی پیر جی ہماری طرف سے بڑی محنت کرتے ہیں۔ خوش ہو کے کہنے لگا کہ جا فلانا کھیت وہاں کا تم کو دے دیا۔ پیر جی تھے ہوشیار کہا چل کے قبضہ کرا دے۔ اب یہ بڑے خوش کہ اچھا احمق پھنسا دھانوں کے کھیت میں پانی تو بہت ہوتا ہے اور مینڈ ذرا پتلی ہوتی ہے جس کو عادت نہ ہو وہ اس پر سے نہیں گذر سکتا۔ پیر جی اس پر سے چلے تو پیر لڑکھڑایا اور کھیت میں جا رہے۔ مرید نے جو پیر جی کو گرتے دیکھا تو اوپر سے ایک لات دی کہ تو بڑا جھوٹا ہے جب اتنے چوڑے راستہ پر نہیں چل سکا تو پلصراط پر کیا چلے گا جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے جا ہم کھیت نہیں دیتے۔ اب پیر جی کو کچھ تو گرنے کا کھسیانپن اور کچھ لات کی چوٹ اور کچھ کھیت نہ ملنے کا غم بیچارے کا بہت ہی بُرا حال ہوا۔ غضب تو یہ ہے کہ ایسے

جھوٹوں نے سچوں کو بھی بدنام کر رکھا ہے تو اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جسے رہبر محقق مل جائے وہ رہبر کسی کے بتانے سے نہ بناؤ بلکہ علامات سے خود منتخب کرو اور چند علامتیں ہیں بس انھیں سمجھ لے اس کے بعد انتخاب آسان ہو جائے گا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ اُسے علم دین ہے یا نہیں۔ اور یہ ضرور نہیں کہ وہ عربی ہی جانتا ہو۔ چاہے اردو فارسی ہی جانتا ہو یا یہ بھی نہ جانتا ہو۔ مگر بقدر حاجت دین کے احکام سے واقف ہو مگر یہ اس کا مطلب بھی نہیں کہ صرف راہ نجات ہرنی کے قصہ ہی کا عالم ہو۔ بلکہ عقائد و دیانات۔ معاملات۔ معاشرات۔ اخلاق سب شعبوں کو اچھی طرح جانتا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ وہ ان چیزوں کو جانتا ہے یا نہیں۔ سو اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ چند روز اس کے پاس رہ کر دیکھو کہ ہر امر میں اپنی معلومات سے مریدوں کی اصلاح کرتا ہے یا نہیں۔ اور اگر پاس نہ رہ سکو تو وقتاً فوقتاً خط و کتابت سے پوچھتے رہو اگر اسے ضروری مسائل بھی معلوم نہ ہوں تو اس کو تو چھوڑو دوسرے کی تلاش کرو۔ اور دوسری علامت یہ ہے کہ وہ خود بھی شریعت پر عامل ہو۔ تیسری علامت یہ ہے کہ اُسے عادت ہو طالبین کو امر و نہی کرنے کی سختی سے یا نرمی سے چوتھی یہ کہ اس کی صحبت میں رہ نہ برنہ حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہو اور دنیا کی محبت گھٹتی ہو۔ پانچویں علامت یہ ہے کہ بزرگوں سے سنی ہے کہ اس کی طرف عوام و اہل دنیا کا رجحان کم ہو اور اہل علم و اہل فہم و صلحا کا رجحان زیادہ ہو۔ اور جس کی طرف عوام اور دنیا داروں کا رجحان زیادہ ہو وہ کامل نہیں ہے۔

پس جس میں یہ پانچوں علامتیں مل جاویں اُسے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ اس کا اتباع مطلق کرنا چاہیئے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کے حکم کا منتظر رہے۔

بلکہ خود بھی پوچھتا رہے۔ مثلاً یہ دیکھے کہ میرے اندر تکبر ہے اس کا علاج پوچھے کینہ ہے علاج پوچھے۔ غصہ ہے، غیبت کی عادت ہے ان کا علاج پوچھے یا مال کی محبت ہے کہ فقیر کو دیتے ہوئے دم نکلتا ہے اس کا علاج پوچھے کیونکہ باطنی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج نہ ہو اس لئے رب کو پوچھنا چاہیئے اور جو نہیں پوچھتا وہ گویا اپنے کو بیمار نہیں سمجھتا۔ یہ علامتیں اس لئے میں نے بتادیں کہ بہت سے پیر بھی ایسے ہیں کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل | و اندروں قہر خدائے عز و جل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید | وز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر خدائے عز و جل کا عذاب ہو رہا ہے۔ باہر سے تو بایزید بسطامیؒ جیسے پر طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے یزید بھی شرماتا ہے۔)

اور ان امراض کے علاج سے جیسا مریدوں کو بے فکر نہ ہونا چاہیئے شیوخ بھی بے فکر نہ رہیں اس لئے کہ جس طرح ہم بیمار ہیں اسی طرح بعض اوقات شیوخ بھی بیمار ہو جاتے ہیں اور اس میں تعجب ہی کیا ہے کیا حکیم بیمار نہیں ہوتے بلکہ یہ تو ایسے بیمار ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ان کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی طب کے گھمنڈ پر بد پرہیزی بہت کرتے ہیں۔ اسی طرح شیوخ ہیں کہ ان کی بیماری عوام سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ان کے واسطے علاج کی صرف یہ صورت ہے کہ یہ بزرگوں کی کتابیں دیکھیں اور ان سے اپنا علاج کریں۔ اور یہ کتابیں مبتدی کو تو کافی نہیں ہوتیں مگر منتہی کو کافی ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ فن جانتا ہے۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنے معاصرین میں سے جسے اہل دیکھے اس سے رجوع کرے۔ ایک علامت شیخ کامل کی یہ بھی ہے کہ یہ دیکھے کہ اس کے پاس بیٹھنے والوں میں اکثر کی حالت

روز بروز بہتر ہوتی جاتی ہے یا نہیں۔ اگر اکثر کی حالت بہتر ہو تو وہ شیخ کامل ہے گو سب کی نہ ہو کیونکہ لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ (اکثر کے لئے کل کا حکم ہے) اور اکثر کی خراب ہو اور ایک آدھ کی اچھی ہو تو وہ شیخ کامل نہیں اس سے ہرگز رجوع نہ کرے ورنہ یہ بھی ناقص ہی رہے گا کیونکہ جب پیر میں کمال نہیں اس میں کہاں سے آجائے گا۔ ایسا ہی ہوگا۔ جیسے ایک مرید نے کہا تھا۔ ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے رامپور وہاں کا ایک شخص کسی پیر کا مرید ہوگیا۔ اس سے کسی نے پوچھا میاں کچھ ملا بھی۔ تو اس نے کہا کہ میاں جب سقاوہ ہی میں کچھ نہ ہو تو بدھنی میں کہاں سے آوے اور واقعی جب پیر ہی کی حالت درست نہیں ہے تو بیچارے مرید کی کب اصلاح ہوگی۔ غرض جس کے مریدوں میں اکثر کی حالت درست ہو وہ کامل ہے یہ علامت دیکھ کر تب اس سے اصلاح کا تعلق کرے اور اس کے متعلق ایک اور ضروری تنبیہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر اس میں سب علامات ہیں اور اس کی تعلیم وصحبت سے اکثر کی حالت درست بھی ہے مگر خود اس مرید کی حالت درست نہیں ہوتی تو اس سے یہ تو نہ سمجھے کہ شیخ کامل نہیں ہے لیکن شیخ سے اپنی حالت کا ذکر کرتا رہے۔ اور جب ایک معتدبہ مدت گذرنے پر بھی حالت درست نہ ہو تو بدگمانی تو جب بھی نہ کرے لیکن اس وقت یہ سمجھے کہ مجھے اس سے مناسبت نہیں ہے پھر کوئی اور مناسبت کی جگہ تلاش کرے اور شیخ سے بھی کہدے۔ اگر شیخ محقق ہے تو وہ فوراً دوسرے سے رجوع کرنے کی اجازت دیدے گا۔ اور اگر دوکان دار ہے تو مکدر ہوگا۔ تو اس حالت میں وہ واجب الاتباع بھی نہیں۔ دوکاندار کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے طالب کی کتنی ہی پریشانی وناکامی بڑھ جاوے مگر یوں کبھی نہ کہیں گے کہ میں تمہارے لئے کافی نہیں اور سے رجوع کرو۔ جیسے مدعی طماع طبیب کہ چاہے مریض مر ہی جاوے مگر اپنے علاج کے قاصر ہونے

کا کبھی اقرار نہ کریں گے۔ جیسے ایک جاہل حکیم کا قصہ ہے کہ اس نے کسی مریض کو بڑا سخت مسہل دیدیا تھا۔ تیمار دار نے خبر دی کہ حکیم جی دست بہت آرہے ہیں کہا آنے دو مادہ بہت ہے اچھا ہے نکل جاوے۔ جب اور زیادتی ہوئی پھر اطلاع کی گئی۔ پھر یہی جواب ملا۔ غرض بار بار اطلاع ہوتی رہی اور حکیم جی یہی کہتے رہے کہ مادہ سخت ہے نکلنے دو۔ یہاں تک کہ ضعف کے مارے مریض کا دم نکل گیا۔ اس کی بھی اطلاع ہوئی تو حکیم جی کیا کہتے ہیں اللہ رے مادے جس کے نکلنے سے مرگیا خدا جانے رہتا تو کیا ہوتا۔ ارے منحوس مرنے کے بعد اور کیا ہوتا شاید دوزخی بنا دیتا۔ تو حضرت ایسے ہی بعضے طبیب روحانی بھی ہوتے ہیں محض اناڑی۔

جیسے دہلی میں کسی پیر نے ایک مرید کو حبس دم بتایا تھا۔ اب اُسے تکلیف ہوئی اس نے اطلاع کی کہا کئے جا مجاہدہ میں تو تکلیف ہوتی ہی ہے یہاں تک کہ اس غریب کا دم نکل گیا تو کہا چلو شہید ہوا۔ میں کہتا ہوں بیشک۔ مگر خبر بھی ہے کہ شہید وہ ہوتا ہے جسے کوئی ظالم قتل کرے تو یہ پیر ظالم ہوا۔ اسی لئے اس طریق میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے جلدی سے کسی کو پیر نہ بنانا چاہیئے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نباید داد دست

(آدمیوں کی صورت میں بہت سے شیطان بھی ہیں یعنی دھوکہ باز پیر
پس ہر شخص کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیئے یعنی مرید نہ ہونا چاہیئے)

اور ایک جگہ علامات کے اسباب میں فرماتے ہیں ؎

کار مرداں روشنی و گرمی ست　　کار دوناں حیلہ و بے شرمی ست

(مردان حق کا کام روشنی و گرمی یعنی محبت اور معرفت ہے کمینوں یعنی دھوکہ باز پیروں کا کام حیلہ اور بے شرمی ہے)

روشنی سے مراد معرفت اور گرمی سے مراد محبت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس میں معرفت اور محبت کامل ہو اس کو شیخ بناؤ۔ اور معرفت کے لوازم میں سے ایک یہ امر بھی ہوگا کہ اگر کسی عارض کے سبب اس سے نفع نہ ہو مرید کو دوسری جگہ جانے کو فوراً کہدے گا ورنہ بیچارہ مرید ہی میں دس کھوٹ نکالکر حیلہ بہانہ کردے گا۔

ایک شیخ کامل محقق کا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ہمارے دادا پیر حضرت میانجی صاحب سے کاندھلہ کے ایک عالم بیعت ہوئے جو پہلے مخالف تھے پھر موافق ہوگئے تھے۔ اور مخالفت کے زمانہ میں حضرت میانجی صاحب کی شان میں گستاخی کیا کرتے تھے۔ میانجی صاحب نے بیعت تو کرلیا اور طریق کی تعلیم بھی شروع کی۔ مگر چند روز کے بعد خود ہی فرمادیا کہ مولانا اس طریق کی بنا محض صدق وخلوص پر ہے اس لئے میں بے تکلف کہتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے نفع نہ ہوگا۔ جس وقت میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اسی وقت آپ کے وہ پچھلے کلمات دیوار آہنی بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ آپ کسی دوسرے سے رجوع فرمادیں اور میں دعا کرتا ہوں۔ آج کل خود تو کیا کسی دوسرے کے پاس بھیجیں گے۔ اگر کوئی خود سے بھی چلا جائے تو اس قدر ناراض ہوتے ہیں کہ گویا مرتد ہوگیا۔ تو شیخ محقق کی یہ شان ہوتی ہے۔ غرض جب شیخ کا انتخاب کر چکے جس کی یہ علامات ہیں جو مذکور ہوئیں تو اب اس کا کامل اتباع کرے کہ جو وہ کہے وہ کرے اور جو مرض وہ بتائے اس کا علاج کرے اور خود سے بھی اپنے امراض کا اظہار کرتا رہے اس بھروسہ پر نہ رہے کہ شیخ کو خود کشف سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ اول تو یہ ضروری نہیں دوسرے جب طبیب سے مزید اطمینان کے لئے نبض وقارورہ دکھادینے کے بعد بھی حال بیان کرتے ہیں تو یہاں بھی ایسا ہی کرو یہ بھی تو طبیب روحانی ہے

تیسرے ما ناکہ بغیر کہے پیر کو انکشاف ہی ہو گیا ہو مگر بغیر کہے اُسے آپ کی طلب کیسے معلوم ہو گی۔ بغیر طلب کے تو حق تعالیٰ بھی متوجہ نہیں ہوتے اَنُلْزِمُكُمُوهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ ۝ (کیا اس کو تمہارے گلے منڈھ دیں اور تم ہم سے نفرت کئے جاؤ) یعنی اگر تم ایک مرتبہ ہماری رحمت سے بھاگتے ہو تو جاؤ ہم ہزار دفعہ مستغنی ہیں اور طالب کے لئے یہ وعدہ ہے۔ مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا وَ مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا (جو شخص میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز آتا ہوں اور جو شخص میری طرف ایک گز آتا ہے میں اس کی طرف ایک باع (دونوں ہاتھ) آتا ہوں) تو طالب کی طرف خود اس قدر متوجہ ہوتے ہیں کہ اس کی ذرا سی حرکت پر وہ خود برسوں کی مسافت طے کر دیتے ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست — تا بجوشد آبت از بالا و پست

تشنگاں گر آب جویند از جہاں — آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پانی کو کم تلاش کرو پیاس پیدا کرو تاکہ تمہارے لئے پانی بلندی اور پستی سے جوش مارے پیاسے اگر پانی تلاش کرتے ہیں جہان میں پانی بھی ڈھونڈھتا ہے پیاسوں کو دنیا میں)

حضرت فرید الدین عطار فرماتے ہیں ؎

گر تو ہستی طالب حق مرد راہ — درد خواہ و درد خواہ و درد خواہ

(اگر تو طالب مرد سالک ہے تو درد عشق طلب کر درد عشق طلب کر)

پھر مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود — ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود — ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہیں جاتا ہے جس جگہ مشکل ہوتی ہے جواب وہیں دیا جاتا ہے جہاں مرض ہوتا ہے وہیں شفا پہنچتی ہے. جہاں بیماری ہوتی ہے وہیں دوا دیجاتی ہے)

اور فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش   آزموں را یک زمانے خاک باش

(برسوں تک تو دل خراش پتھر بنے رہے آزمائش کے لئے ایک زمانہ خاک بن کر دیکھو)

ان سب میں طلب ہی کی ترغیب ہے کہ تم خود بھی تو طلب ظاہر کرو۔ ایک شخص کے متعلق حاکم چاہتا ہے کہ اسے تحصیلدار کردے۔ مگر چاہتا یہ ہے کہ یہ بھی تو منہ سے کہے۔ وجہ یہ کہ اگر یوں ہی مل جائے گی تو قدر نہیں کرے گا ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد   گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

تو اگر شیخ صاحب کو کشف بھی ہو تب بھی آپ کی طرف سے بھی تو طلب ہو۔ جب طلب ہوگی تب ہی عنایت ہوگی۔ یہی اصلاح اخلاق فقیری ہے۔ طریق حق جس کے لئے لوگوں نے ایک الگ جماعت تجویز کر رکھی ہے اور جس کی تعریف یہ گھڑ رکھی ہے کہ دنیا کے کسی کام سے تعلق نہ ہو حالانکہ اس فقیری کی یہ تعریف ہے۔ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ یعنی اللہ سے ایسا ڈرو جیسا ڈرنے کا حق ہے حَقَّ تُقٰتِهٖ کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ یُطَاعُ وَلَا یُعْصٰی۔ یُطَاعُ کے معنی ہیں اطاعت کیا جاوے یہ طوع سے ماخوذ ہے اور طوع کہتے ہیں رغبت اور خوشی کو تو اطاعت خوشی سے کہنا ماننا ہوا۔ اب سچ کہو کہ کیا کسل کے وقت نماز رغبت سے پڑھی جاتی ہے۔ بخل کے وقت زکوٰۃ خوشی سے دی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بس اسی کی کسر ہے ہماری غلامی میں۔ تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسا بھی درجہ ہے جس میں اعمال شرعیہ طبیعت ثانیہ بن جاویں کہ بے تکلف خوشی سے ادا ہونے لگیں۔ اور یہ ہے وہ درجہ جو کنز و ہدایہ میں نہ ملے گا۔ بلکہ وہ اس طرح ملے گا ؎

قال را بگذار و مرد حال شو   پیش مردے کاملے پا مال شو
(قال کو چھوڑو حال کو پیدا کرو یہ اس وقت ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جاکر پڑجاؤ)
گر تو سنگ خارہ مرمر شوی   چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی
(اگر تو سخت پتھر مرمر بھی ہو جب کسی اہل دل کے پاس پہونچے گوہر ہوجائے)۔

یہ انھیں اہل دل کی صحبت کا اثر ہے کہ پتھر کو گوہر بنا دیتے ہیں ۔ اس دولت کی تحصیل کے لئے ان کا اتباع ضروری ہے وہی دل کی اصلاح کرتے ہیں جس کے متعلق ارشاد ہے اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ (جب وہ درست ہو تو تمام جسم درست ہوجاتا ہے) الحدیث ۔ اور جب اصلاح قلب پر تمامتر اصلاح موقوف ہے۔ تو اس کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہوگیا۔ کیا یہ حدیث اس حکم کے افادہ کے لئے کافی نہیں ہے۔ یقیناً کافی ہے۔ تو اب یہ کہنا کہ اس طریق کی پیروی کرنا سب کے ذمہ فرض و واجب نہیں۔ جیساکہ اس شعبہ کو اکثر لوگوں نے دین میں غیر ضروری قرار دے رکھا ہے ۔ بالکل غلط ٹھہرا۔ لیکن اس میں دنیا کے چھوڑنے اور بیوی بچوں سے منہ موڑنے کی ضرورت نہیں ۔ اور اسی سے تو لوگوں کو توحش ہوا ہے۔ اور اسی سے اس کو دین سے علیحدہ سمجھا ہے ۔ سو ایسا نہیں بلکہ اسی عیش و راحت کی حالت میں طریق طے ہوسکتا ہے ؎

چو فقر اندر لباس شاہی آمد   بہ تدبیر عبید اللٰہی آمد
(جب فقر لباس شاہی میں آیا تو اللہ کے بندہ کی تدبیر سے آیا)

محققیں شاہانہ لباس کے ساتھ بھی تم کو درویش بنا دیں گے اور بعضوں نے جو اچھا لباس چھوڑ دیا وہ اُن کا غلبۂ حال تھا۔ جیسے بعض لوگوں کی بیوی مرجاتی ہے تو بچوں کی محبت میں دوسری بیوی نہیں کرتے اور جن پر ایسا غلبہ نہیں ہوتا وہ بوڑھے ہوکر بھی نکاح کرتے ہیں گو لوگ ان کو ہنستے بھی ہوں مگر اُن کا کیا ضرر ہے آرام تو ملیگا

ہنسنے پر ایک بڑے میاں کا قصہ یاد آیا۔ ایک نوے سال کے بوڑھے نے جوان کنواری بچی سے نکاح کیا تھا۔ رات کو ماما صاحبہ آئیں کہ لڑکے کو گھر میں بلاتی ہیں۔ ماشاء اللہ کیسے اچھے لڑکے ہیں۔ جن کی ڈاڑھی سفید گالا ہو چکی ہے کچھ دانت بھی گر چکے ہیں۔ اور ساس جن کے ابھی بال بھی سفید نہیں ہوئے وہ بڑے میاں سے کہتی ہیں۔ بیٹا میں تمہیں لونڈی دیتی ہوں۔ بیٹا کیا کہتے ہیں کہ اجی اماں جان آپ یہ کیا کہتی ہیں۔ لونڈی نہیں ہیں تو بجائے بیٹی کے رکھوں گا۔ تو غرض جس طرح بعضے نکاح کرتے ہیں بعضے نہیں کرتے بس اسی طرح بعضے بزرگوں نے دیکھا کہ ہم خالق و مخلوق دونوں کے حقوق کو جمع نہ کر سکیں گے۔ انھوں نے تعلقات خلق کو چھوڑ دیا۔ ورنہ اس طریق میں فی نفسہ یہ مانع نہیں ہے۔ بس ہر شخص کے لئے ضرورت ثابت ہوئی کہ اپنے باطن کی درستی کرے اور اس کے لئے کچھ بیعت ہی کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں تو بعض دفعہ مضرت ہو جاتی ہے کہ اگر کہیں پھنس گئے تو بس بعد تک بھر رہے ہیں کہ اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا اور ایسے بہت کم ہیں۔ جو متنبہ ہو کر اپنے کو اس ورطہ میں نکال لیں بلکہ خود پیر کو بھی متنبہ کر دیں جیسے ایک دیندار مرید نے ایسی جرأت کی مگر لطافت کے ساتھ وہ دھوکہ میں آکر ایک دنیا دار پیر کے ہاتھ میں پھنس گیا۔ اس لے چاہا کہ پیر کی حالت پیر کے کان میں ڈالے۔ چنانچہ ایک بار پیر صاحب سے کہا آج میں نے ایک خواب دیکھا ہے، کہ میری انگلیاں گوہ میں بھری ہوئی ہیں اور آپ کی شہد میں۔ پیر نے کہا کیوں نہ ہو تم دنیا کے کتے ہو خباثت میں بھرے ہو۔ اور ہم بحمد اللہ پاک و صاف شیریں ہیں کہا حضور ابھی خواب کا ایک جزو باقی ہے۔ وہ یہ کہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں آپ کی انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور آپ میری۔ اصل میں اس نے

لطافت سے یہ بات پیر کے کان میں ڈالی کہ آپ مجھ سے دنیا حاصل کر رہے ہیں اور میں آپ سے دین۔

تو بعض وقت اس طرح پھنس جاتے ہیں اس لئے بیعت میں جلدی نہیں چاہیئے پہلے خوب پیر کو اچھی طرح جانچ لے اور جانچنے کی صورت قابل اطمینان یہی ہے کہ چندے پاس رہے بلکہ اس میں بھی اچھی صورت یہ ہے کہ اس کے وطن میں جاکر رہے۔ اور اگر پاس رہنے کی گنجائش نہ ہو تو کم از کم برس دو برس خط و کتابت ہی کرے اور اس میں اپنے امراض لکھے اور ان کا علاج پوچھے جب اچھی طرح اطمینان ہو جاوے کہ نفع ہوگا تب بیعت کا بھی مضائقہ نہیں۔

یہ ہے بیان شعبۂ اخلاق کا اور اسی پر اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔ اور مختصر الفاظ میں تمام بیان کا خلاصہ عرض کئے دیتا ہوں وہ خلاصہ یہ ہے کہ عبادت کے معنے ہیں عبد شدن یعنی غلام ہوجانا اور غلام اسی کو کہتے ہیں جو اپنے آقا کی تمام اوامر و نواہی میں اطاعت کرے۔ اور وہ اوامر و نواہی یہ ہیں کہ اپنے عقائد درست کیجئے، اعمال درست کیجئے۔ معاملات اور معاشرت درست کیجئے۔ اخلاق کی اصلاح کیجئے اور یہ موقوف اس پر ہے کہ علمِ دین کی کتابیں دیکھا کیجئے۔ خود بھی دیکھئے اور اپنے بچوں کو بھی پڑھایئے۔ اور اپنے دیکھنے میں جہاں سمجھ میں نہ آوے کسی عالم سے تحقیق کیجئے اور کسی زندہ اہل اللہ سے تعلق رکھئے اور اس سے اپنے امراض کا علاج پوچھتے رہیئے۔ اور عمل کرتے رہئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس طور پر بہت جلد کمال دینی حاصل ہوجائے گا۔ اور اس وقت آپ عبد کہلانے کے مستحق ہوں گے۔ بس اب میں ختم کرچکا حق تعالیٰ سے علم و عمل اور فہم و توفیق کی دعا کیجئے۔ فقط دعا۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

—— مسمّٰی بہ ——

اسرار العبادۃ

—— منجملہ ارشادات ——

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ)

ناشر:- محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم-اے جناح روڈ

سلسلہ التبلیغ کا واعظ مسمّٰی بہ

اسرار العبادۃ

اَین	متیٰ	کم	کیف	لِم	علیٰ من	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	ہیئت بیان	سبب وعظ	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	.
[illegible]	۱۴ محرم ۱۳۳۲ھ شنبہ بعد فجر	۴ ½ گھنٹہ	کرسی پر بیٹھ کر	.	.	.	[illegible]	۴۰۰۰	.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعاء۔ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان محمدا عبدہ ورسولہٗ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ط بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ط (وہ رب ہے

آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں سو تو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت میں قائم رہ بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفات جانتا ہے)

یہ وہی آیت ہے جو اس کے قبل کے جلسۂ وعظ میں تلاوت کی گئی تھی اور اس جلسہ میں یہ بھی اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے قبل بھی اسی کی تلاوت ہوچکی ہے گویا آج تیسری بار اس کی تلاوت کی گئی ہے، وجہ یہ ہے کہ ان دونوں جلسوں میں اس کے متعلق بیان مکمل نہ ہوا تھا اس واسطے حاجت اعادہ کی ہوئی تاکہ اس مضمون کی کسی قدر تکمیل ہوجاوے۔ اور کسی قدر اس لئے کہا کہ پوری تکمیل کے لئے تو مدت دراز چاہیئے۔ حتیٰ کہ تکمیل عرفی کے لئے بھی باقی تکمیل حقیقی کیلئے تو تمام عمر بھی کافی نہیں مگر خیر مَا لَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ (توکل نہ پاسکے تو کل کو بھی مت چھوڑ) کے قاعدہ پر جتنی تکمیل بھی اس مختصر وقت میں ہوسکتی ہو وہ تو کردینا چاہیئے۔ بس ایسی حالت میں یہ تکمیل گویا بقدر ضرورت ہی ہوگی یعنی جن امور مہمہ کی طرف توجہ نہیں رہی ان کی طرف متوجہ کردیا جاوے گا۔ کیونکہ اصل ہمارے تمام امراض کی بے توجہی ہی ہے کہ ہم کو تکمیل دین کی طرف توجہ نہیں اور چونکہ بحمد اللہ عقائد تو ان لوگوں کے جو شہروں میں رہتے ہیں یا جو تعلیم یافتہ ہیں اور ان کو صلحا کی صحبت میسر ہے کافی درجہ میں صحیح ہیں اس لئے عقیدہ کے متعلق تو کسی جدید تعلیم کی ضرورت نہیں ہے البتہ وہ مستحضر نہیں ہیں مگر ضرورت کے موقع پر ان کا استحضار بھی ہوجاتا ہے چنانچہ اگر کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارا پروردگار کون ہے اور تم کس کی عبادت کرتے ہو تو وہی جواب میں کہیں گے جو حاصل ہے اس آیت کا اس سے ثابت ہوا کہ وہ عقائد ذہن میں حاضر تو ہیں مگر دوسری چیزیں ذہن میں اس قدر غالب ہوگئی ہیں کہ وہ حاضر بھی مثل غائب کے ہوگیا شاید کسی کو اس تقریر سے یہ خلجان ہوا ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ وہ حاضر بھی ہیں اور پھر مثل غائب کے ہیں۔ تو میں اس شبہ کے رفع کرنے کیلئے

ایک مثال بیان کرتا ہوں مثلاً موٹی سی بات ہے کہ خط لکھنے بیٹھتے تو کاغذ کا نظر آنا قلم کا نظر آنا روشنائی کا نظر آنا ضروری ہے مگر ان سب کے نظر آنے کے واسطے ضیا کی ضرورت ہے دن کو بھی اور رات کو بھی دن کو آفتاب کی روشنی کی مدد سے ہر چیز نظر آتی ہے اور رات کو لالٹین وغیرہ کی روشنی سے غرض نورانیت کی ضرورت ہر حال میں ہے کہ بغیر اس کی استعانت کے خط نہیں لکھ سکتے اور لکھتے وقت جب کاغذ پر اور حروف پر نظر پڑتی ہے تو اس ضیاء پر بھی ضرور پڑتی ہے۔ بلکہ اول روشنی ہی پر نظر پڑتی ہے۔ مگر سچ بتایئے کہ کبھی لکھنے کے وقت کسی کو بھی اس طرف توجہ ہوتی ہے کہ اول ہماری نظر ضیاء پر پڑتی ہے عموماً کسی کو بھی اس پر التفات نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی لکھتے ہوئے آپ سے پوچھے کہ کیا اس وقت آفتاب نکل رہا ہے تو آپ بلیساختہ کہیں گے کہ ہاں نکل رہا ہے اور اس جواب میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے مگر باوجود اس کے پھر بھی دوسری طرف کی توجہ نے اس توجہ الی الضیاء کو مستور ہی نہیں بلکہ معدوم کر دیا ہے اب اس مثال سے آپ آسانی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ذہن میں موجود ہو اور پھر مثل غائب کے ہو بس اسی طرح عقائد کے دو درجے ہیں ایک تو مرتبہ تحقیق ورسوخ کا ہے اور ایک مرتبہ استحضار و توجہ کا ہے جس کو دوسری عبارت میں یوں کہیے کہ ایک مرتبہ علم کا ہے اور دوسرا مرتبہ حال کا ہے تو بحمد اللہ مرتبہ تحقق ورسوخ میں تو کمی نہیں ہے البتہ توجہ واستحضار میں کمی ہے حالانکہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے اس لئے میں آج توجہ کے متعلق بیان کرتا ہوں اور اس کا محل متعدد امور ہیں جن میں سے بعض کا بیان تو کر چکا ہوں اور بعض باقی ہیں اور وہ بعض باقی کلیات کے درجہ میں بیان کئے جا سکتے ہیں جزئیات میں ان سے خود کام لے لیا جائے گا اس لئے ان کلیات کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے یہ ہے مبہم تمہید اور مفسریہ ہے کہ اس آیت کا حاصل امر یہ عبادت ہے اور یہی روح ہے اس آیت کی اور اس کے قبل اسی کی تمہید ہے اور اس کے بعد اسی کی تاکید ہے چنانچہ بقدر ضرورت عرض

کرتا ہوں وہ روح یہ ہے فاعْبُدُوْہُ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ عبادت کیجئے۔ عبادت کا لفظ ہر مسلمان کے کان میں برابر پڑتا رہتا ہے اور اکثر اطلاق سے معنی بھی اس کے قریب قریب سب کو معلوم ہیں جس سے اس کے معنی و مفہوم کے متعلق بیان کرنا تو کوئی نئی بات نہ ہوگی البتہ کمی یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت ہمارے ذہن میں نہیں آتی اور اسی لئے اس کے حقوق کی طرف بھی توجہ نہیں چنانچہ جب ہم اپنی حالت کا موازنہ کرتے ہیں تو بہت شرم آتی ہے کہ قرآن میں تو عبادت کے متعلق امر کا صیغہ ہے کہ جس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت ضروری ہے اور یہاں اس کا پتہ بھی نہیں تو اگر حقیقت عبادت کی معلوم ہو تو ادھر توجہ بھی ہو اس لئے اس کو بتلاتا ہوں اور بہت سہل عنوان سے بتلاتا ہوں سو عبادت کا وہ سہل عنوان ہے عبد شدن یعنی غلام ہو جانا تو فَاعْبُدُوْہُ کے یہ معنی ہوئے کہ غلام بن جاؤ اب اس عنوان ہی پر نظر کرکے اب آپ اپنی حالت کو دیکھ لیجئے کہ آیا ہم نے غلامی اختیار کی ہے یا نہیں اور اختیار کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ غلامی کی دو قسمیں ہیں ایک تو اضطراری وہ یہ کہ جس نے خریدا وہ مالک ہو گیا اور خرید شدہ غلام ہو گیا جس میں غلام کے اختیار کو اصلاً دخل نہیں سو اس قسم کی غلامی تو غلام کا کوئی کمال نہیں یہ تو ایجاب و قبول کے بعد بلا اس کے اختیار کے ہو ہی جائے گا جیسے عورت پر طلاق کہ ادائے صیغ طلاق سے فوراً ہو جاوے گی چاہے عورت چاہے یا نہ چاہے یا کوئی مر جاوے تو متروکہ وارث کی ملک میں ہو جاوے گا خواہ وہ ارادہ کرے یا نہ کرے۔ اور ایک غلامی اختیاری ہے کہ اپنے قصد سے کسی کا منقاد و مطیع ہو جاوے اسی کا نص میں امر ہے اور یہی کمال مطلوب ہے یہ وجہ اختیار کے قید لگانے کی اور اضطراری غلامی تو تمام مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ حاصل ہے جس سے نکلنا محال ہے اور اوپر جو اضطراری غلامی کو وقوع طلاق و ثبوت ملک وارث کے ساتھ تشبیہ دی گئی اس پر کچھ مضمون ضروری اس اطلاق و میراث کے متعلق یاد آ گیا وہ بھی استطراداً عرض کئے دیتا ہوں طلاق کے متعلق میرے پاس ایک استفتاء آیا تھا کہ ایک شخص نے

اپنی عورت کو طلاق دی۔ عورت نے کہا میں تو نہیں لیتی۔ سائل نے پوچھا تھا کہ اس صورت میں طلاق ہوتی یا نہیں یہاں سے جواب گیا کہ طلاق ہو گئی عورت کے نہ لینے سے کچھ نہیں ہو سکتا اس کو تو جھک مار کے لینا پڑے گی اور وہ نہ لے جب بھی پڑ جائے گی۔ ع گر نہ ستانی بہ ستم میر سد (اگر نہیں لیتی تو زبردستی پہونچے گی)۔

اب اگر کوئی عورت کہے کہ میری لیاقت اور شائستگی تھی کہ میں نے تمہاری خاطر سے طلاق کو قبول کر لیا۔ تو کوئی عقلمند اس کا احسان مانے گا ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص اس کی بات پر ہنسے گا کہ سبحان اللہ یہ بڑا کمال کیا آپ نے بھلا اس کے نہ قبول کرنے سے ہوتا کیا ہے ذرا قبول نہ کر کے تو دیکھ لیجئے۔ مثلاً طلاق و انقضائے عدت کے بعد کے متعلق اگر عدالت میں نالش کرے اپنے نان و نفقہ کی تو عدالت خواہ رسمی ہو خواہ قانونی خواہ عرفی ہو خواہ شرعی یہی حکم کرے گی کہ چونکہ طلاق واقع ہو گئی اس لئے نان و نفقہ واجب نہیں رہا جب نہ قبول کرنے کا کچھ اثر نہیں تو قبول میں کچھ کمال بھی نہیں قبول کرنا اسی چیز کا کمال ہے جو نہ قبول کرنے سے رد ہو سکے۔ اسی طرح ملک اضطراری بھی کوئی کمال نہیں چنانچہ میراث میں بھی یہی ہے کہ ملک اضطراراً ثابت ہو جاتی ہے جو رد سے بھی رد نہیں ہوتی۔ اگر ایک وارث یوں کہتا رہے کہ میں وارث نہیں بنتا۔ جب بھی وہ وارث ہوتا ہے۔ یہاں اس مثال پر ایک تفریع بھی ہے جس کے متعلق بعض اہل علم بھی ایک غلطی میں مبتلا ہیں وہ یہ کہ بعض دفعہ کوئی خاص وارث اپنا حق نہیں لینا چاہتا مثلاً بہن عام طور پر اپنا حق نہیں لیتی اور اس کی بنا ابتداءً تو ظلم سے ہوئی ہے مگر اب رسم عام ہو گئی کہ میراث میں سے حصہ لینا عورت کے لئے عیوب میں داخل سمجھا جاتا ہے اس واسطے وہ حصہ نہیں لیتی بلکہ یہ کہہ دیتی ہے کہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میرا حصہ بھائی لے لے۔ تو اس کے اس کہنے سے بھائی اس بہن کے حصہ کا مالک نہیں ہوتا کیونکہ اول تو جب اس رسم و رواج کی بنا ظلم پر ہے تو بہن نے طیب قلب سے اپنا حصہ نہیں چھوڑا اور بدون طیب قلب کے کسی کا مال دوسرے کے لئے حلال نہیں۔ دوسرے اگر فرض کیجئے کہ اس کہنے کی بنا ظلم بھی نہ ہو بلکہ طیب خاطر سے بھی کہدے تب بھی بوجہ اس کے

اضطراراً مالک ہو جانے کے وہ حصہ اس کی ملک ہو گیا اور ملک ہو جانے کے بعد کوئی عقد انتقال ملک کا پایا نہیں گیا اس لئے وہ حصہ اس کی ملک سے خارج نہیں ہوا بلکہ وہ ترکہ میں سے اپنے حصہ کی بدستور مالک ہے۔ اب اس مسئلہ کے چند فروع ہیں ایک یہ کہ اگر اس نے اپنی زندگی میں نہ لیا تو مرنے کے بعد بہن کی اولاد اس کا حصہ پاوے گی وہ اگر ماموں سے لینا چاہیں تو شرعاً مطالبہ کر سکتے ہیں اس میں غلطی کی بناء یہ ہوئی ہے کہ بہن کے اس کہنے کو کہ میں اپنا حصہ لینا نہیں چاہتی کافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ کافی نہیں اس پر شاید یہ سوال ہو کہ اچھا پھر کیا کہیں کیا یوں کہدے کہ میں اپنے حصہ سے دست بردار ہوتی ہوں سو یہ بھی کافی نہیں کیونکہ ابراء دیون سے ہوتا ہے اعیان سے نہیں ہوتا یعنی اگر کسی کے ذمہ میرے دس روپے آتے تھے اور میں نے کہا کہ میں نے یہ روپیہ معاف کر دیئے تو میرے اس کہنے سے قرض اس کے ذمہ سے ساقط ہو گیا یہ تو ہے برارت عن الدین اور اگر میرا قلمدان رکھا ہے میں نے کہا جاؤ میں نے تمہیں یہ قلمدان معاف کر دیا تو اس کہنے سے نہ وہ میرے ملک سے خارج ہوا نہ آپ کی ملک میں داخل ہوا وہاں وَهَبْتُ نَحَلْتُ اَعْطَيْتُ (میں نے ہبہ کیا یا بخشش کیا یا عطا رکیا) یا اور انھیں کے ہم معنی الفاظ کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح تمام شرائط ہبہ کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ اس واسطے بہن کے معاف کر دینے سے وہ حق وراثت معاف نہیں ہوا۔ اور نہ بھائی کی ملک میں داخل ہوا کیونکہ وہ حصہ حصہ عین ہے دین نہیں ہے اگر اس کے واقعی دینے ہی کی ہو تو اس کو الفاظ ہبہ کے ساتھ ہبہ کرنا چاہئے یا بیع کرنا چاہیئے اور جو کچھ کرے اس کے شرائط پورے ادا کرنا چاہیئے مثلاً اگر ہبہ کرے تو مسئلہ یہ ہے کہ قبل تقسیم کے ہبہ صحیح نہیں مثلاً ایک جائداد قابل تقسیم ہے اور اس میں بہن کا حصہ ہے اور بہن نے تقسیم سے پہلے ہبہ کیا تو یہ ہبہ جائز نہیں اور اگر تقسیم کے بعد ہبہ ہوا ہے تو بشرط قبض صحیح ہے۔ غرض ہبہ صرف کاغذی نہیں ہونا چاہیئے حسی و حقیقی ہونا چاہیئے کاغذ تو محض تکمیل ہبہ کی سند اور حکایت ہے جس سے پہلے محکی عنہ کا وجود ضروری ہے محض کاغذی کارروائی پر ایک

حکایت یاد آئی۔ ایک مہاجن تھا نہایت محاسب مگر عقل سے کورا وہ اپنے کنبہ کو ساتھ لیکر بہلی میں سوار ہو کر کہیں سفر کو نکلا راستہ میں ایک ندی پڑی بہلبان سے کہا ٹھہر جاؤ میں ذرا حساب لگا لوں کہ پانی کتنا ہے بانس لے کے پانی میں اترا اور جا بجا پانی کو بانس سے ناپ لیا کہ یہاں ایک ہاتھ ہے آگے دو ہاتھ ہے آگے چوتھائی بانس ہے اس سے آگے آدھا اور پھر ایک بانس ہے سو بعض جگہ ڈوباؤ کی مقدار بھی تھا مگر اس نے اس سرے سے اس سرے تک سب ناپ کر حساب کر کے اوسط نکالا کہ کمر تک ہے تو بہلی کیوں ڈوبنے لگی بہلی بان سے کہا چل وہ چلا آگے جا کے بہلی لگی ڈوبنے تو آپ نے پھر اپنا حساب جانچا کہ کہیں غلطی تو نہیں ہو گئی۔ حساب بالکل ٹھیک تھا تو آپ کہتے ہیں لیکھا جوں کا توں پھر کنبہ ڈوبا کیوں۔ میں نے اس واسطے یہ قصہ سنایا کہ خود قانون داں بھی اس کاغذی تقسیم کو حقیقی تقسیم سمجھتے ہیں حالانکہ شرعاً جو تقسیم مطلوب ہے وہ کاغذی نہیں کہ سہام قائم کر دیئے حسی حد بندی ہونا چاہیئے یہ تو ہبہ کے لئے قضاءً شرط ہے ایک شرط دیانتاً بھی ہے وہ یہ کہ خوش دلی اور طیب خاطر سے ہونا چاہیئے اگر خوش دلی نہیں ہے تو ہبہ سے ملک تو ہو جاوے گی مگر ملک خبیث رہے گی۔ فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا (ہاں اگر وہ بیویاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو ان مہر میں کا کوئی جزء تو تم اس کو کھاؤ خوشگوار سمجھ کر) اس کی صریح دلیل ہے یہ آیت زوجین کے بارہ میں ہے اور ظاہر ہے کہ میاں بی بی میں جتنی بے تکلفی ہوتی ہے اتنی بھائی بہن میں نہیں ہوتی مگر دیکھئے کہ میاں بی بی کے بارہ میں بھی یہ ارشاد ہے کہ اگر وہ مہر معاف کر دیں طیب خاطر سے تو کھاؤ ورنہ نہیں بس جہاں اتنی بے تکلفی بھی نہیں وہاں کیونکر طیب خاطر کا لحاظ ضروری نہ ہوگا نیز حدیث شریف میں ہے لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ (کسی مسلمان کا مال بدون اس کی خوش دلی کے حلال نہیں ہوتا) اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ بہن جو دیتی ہے وہ طیب خاطر سے نہیں دیتی بلکہ بدنامی کے خوف سے

دیتی ہے اس لئے یہ ہبہ عند اللہ صحیح نہیں ہوا باقی یہ کہ خوشدلی کیونکر معلوم ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ جائیداد تقسیم کر کے بہن کو اس کے حصے پر قبضہ کرا دو اور دو تین سال تک اُسے جائداد کی آمدنی سے منتفع ہونے دو کہ اُسے جائداد کا حظ تو آجائے اور معلوم ہو جائے کہ زمینداری کیسا چیز ہے اس کے بعد دیکھئے کتنی بہنیں اپنی حصہ دیتی ہیں۔ اس طیب خاطر پر ایک اور فرع بھی متفرع ہوتی ہے وہ یہ کہ آجکل چندہ کی عام رسم ہے اور اس کی کچھ پرواہ نہیں کی جاتی کہ دینے والا جبرو کراہت سے دیتا ہے یا کہ طوع و رغبت سے عام حالت یہ ہے کہ قصداً جبرو کراہت کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے اسی لئے کسی صاحب اثر اور ذی وجاہت کو چندہ وصول کرنے کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے خواہ وجاہت دینیہ ہو جیسے علماء و مشائخ اور خواہ دنیویہ جیسے عہدہ دار یا امراء۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ یہ چندہ حلال بھی ہوا یا نہیں اس کے لئے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ کافی ہے لَا یَحِلُّ مَالُ امْرَءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِّنْہُ یعنی کسی شخص کا مال اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خوش دلی نہ ہو اس کے متعلق وہ عذر کئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ صاحب ہم نے جبر کہاں کیا کوئی تلوار تھوڑا ہی اس کے گلے پر رکھی تھی کہ ہمیں زبردستی دو۔ ہم نے تو سب سے یہ بھی کہدیا تھا کہ خوشی ہو دو ورنہ مت دو۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کا یہ کہنا تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ آپ کہیں دعوت میں جہاں صرف آپ کو بلایا گیا تھا اپنے بچوں کو بھی ہمراہ لے جائیں اور وہاں پہونچکر صاحب خانہ سے کہیں کہ صاحب خوشی ہو تو یہ بھی دستر خوان پر بیٹھیں ورنہ نہیں۔ اب بتلایئے وہ کیا کہے گا۔ زبان سے تو بیشک کہدے گا کہ اس پوچھنے کی کیا ضرورت ہے لیکن دل میں وہ کیا کہتا ہوگا اس کو خود سوچ لیجئے اگر کوئی آپ کے یہاں ایسا کرے تو آپ دل میں خود کہیں گے کہ یا اللہ یہ فوج کی فوج کہاں سے آگئی مگر زبان سے یہی کہیں گے کہ ہاں صاحب ضرور بیٹھیں تشریف

لائیے سب آپ ہی کا تو ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ خوشی ہے یا صرف الفاظ ہیں خوشی کے یقیناً خوشی سے نہیں کہا جاتا مگر زبردستی کوئی سر پر آپڑے تو غریب کیا کرے کیا تہذیب کو چھوڑکر صاف کہدے کہ یہ نہ بیٹھیں ایسی ہمت ہر ایک کو نہیں ہوتی ہاں بعضے صاف بھی کہدیتے ہیں۔ جیسے ایک شخص نے نماز کی نیت میں صفائی کی تھی ساڈھورے میں ایک واعظ آئے تھے وہ لوگوں کو لٹھ مار مار کے نماز پڑھاتے تھے۔ ایک بوڑھے شخص کو زبردستی مسجد میں نماز کے لئے لائے۔ وہ بیچارہ کھڑا ہوا اور نماز کی نیت کہلوائی تو آپ نے اس طرح نیت کی کہ نیت کرتا ہوں میں چار رکعت عصر کی منہ میرا طرف کعبہ شریف کے پیچھے اس امام کے ظلم اس مولوی صاحب کا اللہ اکبر۔ بیچارہ صاف دل تھا خدا کو دھوکا نہیں دیا اگرچہ ظلم ہی سے پڑھی مگر پڑھی تو اور پھر صاف کہہ بھی دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اس کو چھپایا نہیں اس شعر کا عامل تھا ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند　　حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

(تم ان لوگوں میں سے ہرگز مت ہو جو اللہ تعالیٰ کو ایک سجدے سے اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں)

اس بیچارہ نے جیسی پڑھی تھی زبان سے بھی صاف کہدیا کہ اس کی نماز ہماری ریا کی نماز سے تو اچھی تھی کہ ہم ظاہر میں تو خدا کے لئے نماز پڑھتے ہیں اور نیت دوسروں کو دکھانے کی ہے اور پھر اس کو چھپاتے ہیں اسی کی نسبت فرماتے ہیں ؎

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم　　چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

(قمار خانہ میں جاکر میں تمام لوگوں کو اصول کا پابند پایا، عبادت خانہ میں پہنچا تو ان کو اصول کا پابند نہ پایا)

حقیقت میں اس تقدس ریائی سے تو رندی اچھی لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ رندوں کو تقدس کی ضرورت نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اہل تقدس کو ریا سے بچنے کی ضرورت ہے اور رندوں کو تقدس کی ضرورت نہ یہ کہ عابد تو عبادت چھوڑدے

اور رند رندی پر قائم رہے بلکہ گفتگو صرف یہ ہے کہ ان دونوں میں کون اچھا ہے تو وہی اچھا جس سے لوگوں کو دھوکا نہ ہوے

گناہ آمرز رندانِ قدح خوار بہ طاعت گیر پیرانِ ریاکار

(خدا شرابی رندوں کے گناہ بخشنے والا ریاکار عبادت گذاروں کو پکڑنے والا ہے)

تو جب اس غریب نے زبان سے کہدیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اور واقع میں تھا بھی ایسا ہی تو اس نے دھوکا تو نہیں دیا مگر ایسے صاف گو اب کہاں جو چندہ میں زبان سے کہدیں کہ تمہارے ظلم سے دے رہا ہوں بلکہ غالب یہ ہے کہ زبان سے خوشی ظاہر کرتے ہیں اور دل میں کراہت ہوتی ہے تو یہ چندہ بھی حلال نہیں ہوگا اور اب تو دعوتوں میں بھی ایک کی جگہ دو کے آنے سے گرانی ہوتی ہے کیونکہ اب پہلے کی سی ارزانی نہیں رہی اور ممکن ہے کہ یہاں پر کسی کو گرانی نہ ہوتا ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں لوگوں کو ثروت دی ہے مگر جب ثروت سے زیادہ بار ہونے لگے تو سب ہی کو گرانی ہوگی مثلاً پچاس آدمی کی دعوت کی تھی اور دوسو آگئے تو داعی میں ثروت تو ہے کہ بازار سے منگا کر کھلادیں گے مگر لوگوں کی نظر میں کرکری تو ہو جاوے گی کہ ان کے گھر میں کھانا نہیں تھا تو اس سے بار ہوسکتا ہے اس لئے اپنے ساتھ بچوں کو لیجا کر صاحب خانہ سے پوچھنا کافی نہیں بلکہ لے جانا ہی نہ چاہیئے اس مقام پر شاید کوئی اس پوچھنے کی کفایت پر اس حدیث سے استدلال کرنے لگے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تھی اور ایک شخص راستہ سے آپ کے ساتھ ہوگیا جب آپ وہاں پہونچے تو آپ نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ تمہاری خوشی ہو تو یہ شخص آوے ورنہ نہیں۔ صاحب خانہ نے کہا کہ خوشی ہے کہ آوے۔ میں کہتا ہوں بس آپ نے ایک حدیث پر نظر کی دوسری حدیث پر نظر نہیں کی وہ یہ کہ ایک شخص فارس کا رہنے والا شوربا اچھا پکاتا تھا۔ ایک روز اس کا جی چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کھلاوے۔ چنانچہ حاضر ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے چلئے تھوڑا شوربا نوش فرمالیجئے آپؐ نے فرمایا کہ عائشہؓ بھی

چلیں گی اس وقت تک حجاب نازل نہ ہوا تھا۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہماری کوئی دعوت کرے اور ہم قبول دعوت میں کوئی شرط لگالیں تو اس بنا پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بھئی ہمارا ایک مہمان بھی ہے اور جیسے ہم کو شرط لگانے کا اختیار ہے اسی طرح داعی کو بھی اختیار ہے کہ خواہ وہ ہماری شرط کو منظور کرے یا نہ کرے اس صورت میں جبر نہیں ہے اس لئے یہ جائز ہے تو آپ نے فرمایا عائشہ بھی۔ گو اس شخص کا پہلے سے حضرت عائشہؓ کی دعوت کا ارادہ نہ تھا مگر اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے وہ ارادہ کرسکتا تھا۔ مگر اس نے اپنے ارادہ کو چھپایا نہیں، صاف کہدیا کہ نہیں حضرت عائشہ کی دعوت نہیں اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا اندازہ کیجئے کہ آپ کے یہاں آزادی کی تعلیم اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں عائشہ بھی اور وہ کہتا ہے نہیں عائشہ نہیں۔ آپ نے صحابہ کو اتنا آزاد بنایا تھا کہ وہ جان دینے کو ہر وقت تیار مگر کھانا دینے کو ہر وقت تیار نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہ کی جان نثاری کی تو یہ حالت تھی جیسا کہ ایک صحابی فرماتے ہیں ؎

فَاِنَّ اَبِیْ وَوَالِدَتِیْ وَعِرْضِیْ　　　لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْکُمْ وِقَاءٌ

(میرا باپ اور میری ماں اور میری آبرو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آبرو کے لئے وقایہ ہیں)

مگر اس کے ساتھ ہی وہ امور اختیاریہ میں بے تکلف بھی اس درجہ تھے کہ آپ حضرت عائشہ کی دعوت کو شرط بناتے ہیں وہ نہیں مانتا آخر آپ نے فرمایا کہ عائشہ نہیں تو ہم بھی نہیں اس نے کہا نہ سہی اور چلدیا۔ آج تو کوئی مرید اپنے پیر کے ساتھ ایسا کرلے دیکھئے پھر کیا ہوتا ہے بجائے مرید کے اس کا لقب مرتد ہوجائے گا مگر اس سے تو اس کی اور ترقی ہوگئی کہ نیچے کے دو نقطے اوپر آگئے اور پھر دال بھی مشدد ہے کیونکہ دو دال ہیں ایک کا دوسرے میں ادغام ہوگیا مرید کے تو چار ہی حرف تھے اور یہاں پانچ حرف ہوگئے گو حساب ابجد میں پانچ حرف نہیں مانے جائیں گے کیونکہ اس کا قاعدہ اور ہے وہاں حرف ملفوظی کو نہیں دیکھا

جاتا بلکہ مکتوبی کو دیکھا جاتا ہے غرض یہ تو اور احسان ہوا پیر کا کہ مرید کی ترقی کر دی مگر میں مرشد کو مشورہ دیتا ہوں کہ ایسے مرید کو مرتد تو نہ کہو بلکہ ایسا ہی غصہ نکالنا چاہو تو مُرید ہی کہہ لو بفتح المیم کہ پہلے تو میم کو رفع تھا جو رفعت کی علامت تھی اور اب نصب ہو گیا مشقت کے معنے میں ہے غرض آجکل کوئی ایسا معاملہ کرے تو مرشد صاحب اس کو گستاخی اور بے ادبی پر محمول کریں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کس کا حق ہوگا ہمیں تو اپنے واسطے آپ کو نمونہ بنانا چاہیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص پھر لوٹا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑا سا شوربا نوش فرما لیجئے آپ نے فرمایا کہ اور عائشہؓ بھی اس نے پھر یہی کہا کہ نہیں عائشہ نہیں۔ حقیقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلاموں کو کس قدر بے تکلف بنادیا تھا میں مرشدوں اور استادوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو ایسا ہی بے تکلف رکھو مگر نوکروں کو نہیں کیونکہ اگر اسے گستاخ کر لیا تو وہ آقا کو پریشان کرے گا مگر اتنا ذلیل بھی نہیں کرنا چاہیئے جیسا آجکل کیا جاتا ہے کہ بارہ پہر باہر رہو جب گھنٹی بجادیں تب آؤ یہ صاف کبر ہے اور نہایت بری بات ہے ممکن ہے کہ کسی وقت وہ ہماری جگہ ہو جاوے تو سوچ لیجئے کہ اگر آپ کی ساتھ یہ معاملہ کیا جائے تو آپ کو کس قدر ناگوار ہو شاید تم یہ کہو کہ ایسا ہو نا تو بعید ہے اجی اتنا سا انقلاب خدا کو کیا مشکل ہے جب سلطنتیں بدل جاتی ہیں تو ایک غریب کا امیر ہو جانا اور ایک امیر کا غریب ہو جانا کیا بعید ہے۔ چنانچہ اس قسم کی بہت حکایتیں ہیں۔ ان میں سے ایک حکایت بہت مشہور ہے کہ جو بوستان میں لکھی ہے۔ ایک تونگر کے یہاں ایک فقیر آیا اس نے سوال کیا اُسے نکال دیا۔ پھر اتفاق سے تونگر پر افلاس آگیا اور ایسی مصیبت پڑی کہ بیوی تک کو طلاق دینا پڑی اور اب بھیک کی نوبت پہونچ گئی۔ اتفاق سے یہ کسی جگہ پہونچا وہاں جا کر سوال کیا صاحب خانہ نے اپنی عورت سے کہا کہ سائل کو کچھ دے آؤ عورت نے جو سائل کو دیکھا تو زار زار رونے لگی اس نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ میرا پہلا شوہر

تھا ایک مرتبہ ہم میاں بی بی بیٹھے تھے کہ ایک سائل آیا اس کو اس نے بہت سختی سے جھڑک دیا اسی کے وبال میں یہ گرفتار ہوا۔ اس نے کہا وہ سائل میں ہی تھا۔ دیکھئے کیسا انقلاب ہوا کہ سائل مسئول ہو گیا اور مسئول سائل اور پھر دولت تو دولت بیوی تک اس کے قبضے میں پہنچ گئی۔ خدا کی قدرت ہے اور اگر دنیا میں ایسا نہ بھی ہوا تو کیا آخرت میں بھی کچھ نہ ہوگا۔ غرض نوکر کی نہ اتنی تحقیر کرو جو خدا کو بری لگے اور نہ اس سے اتنی بے تکلفی کرو کہ گستاخ ہو جائے بہر حال گستاخ تو نہ کیجئے مگر شفقت کے ساتھ رکھئے غرض اعتدال کی رعایت ضروری ہے۔ میرے ایک دوست ڈپٹی کلکٹر تھے وہ اپنے نوکر کھانا تک ساتھ کھلاتے تھے میں نے انھیں اس سے منع کیا انھوں نے نہ مانا آخر میں اس کی گستاخی اتنی بڑھ گئی کہ انھیں علحدہ کرنا پڑا۔ اسی طرح مرید اور شاگرد کو پیر اور استاد تو مثل اولاد کے سمجھے اور مرید اور شاگرد اپنے کو غلام سمجھے۔ بہر حال ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سبق لینا چاہیئے۔ وہ شخص پھر تیسری بار آیا کہ چل کے تھوڑا سا شوربا نوش فرما لیجئے، آپؐ نے پھر فرمایا کہ عائشہؓ بھی اس نے کہا اچھا عائشہؓ بھی۔ پھر دونوں حضرات تشریف لے گئے اور شاید اس پر کسی کو شبہ جبر کا ہو کہ حضرت عائشہؓ نے تو اس شخص کے یہاں بلا طیب خاطر کھایا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اب اس کی رائے بدل گئی پہلے یہ خیال تھا کہ شوربا ہے ایک آدمی بھر کا اور اس کا یہ جی چاہتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سیر ہو کر کھا دیں مگر اس نے جب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی آدھا پیٹ کھانا چاہتے ہیں تو میرا کیا بگڑتا ہے تو اب اس میں حضرت عائشہ کے لئے کراہت نہیں رہی۔ پس اس حدیث کو پہلی حدیث کے ساتھ ملا کر دیکھئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو گھر پر جا کر صحابی سے پوچھا کہ اگر اجازت دو تو یہ آئے ورنہ نہیں یہ کس صورت اور کس حالت میں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت پوچھا تھا جبکہ آپ نے صحابہ کو اپنے ساتھ اتنا بے تکلف بنا دیا تھا کہ اجنبی تو اجنبی وہ تو حضرت عائشہؓ کے باب میں

بھی صاف صاف عرض کر سکتے تھے۔ اب بتلایئے کہ آپ نے بھی اپنے دوستوں کو اتنا بے تکلف کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اتنا بے تکلف کر رکھا تھا کہ میزبان کو یقین تھا کہ اگر وہ اجازت بھی نہ دے گا تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ویسے ہی بشاش رہیں گے۔ جیسے اجازت کے بعد ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اتنی رعایت فرماتے تھے کہ کسی کو تنگدلی نہ ہو تو ہم کو کیا حق ہے کہ ہم کسی پر جبر کر کے چندہ لیں چاہے اس کا دل چاہے یا نہ چاہے۔ محققین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی سائل قرائن سے جانتا کہ اگر کسی سے مجمع میں سوال کرے گا تو وہ ایک روپیہ دے گا اور اگر یہی سائل تنہائی میں سوال کرتا تو وہ آٹھ آنے دیتا اس صورت میں سائل کو آٹھ آنہ سے زیادہ حلال نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجمع کا لحاظ ہوتا ہے اور شرم ہوتی ہے اس لئے ایسی حالت میں مجمع میں مانگنا بھی جائز نہیں۔ تو حضرت جبر تلوار دکھانے کو نہیں کہتے۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ جسم کو اذیت پہنچا کر لینا حرام ہے اسی طرح قلب کو اذیت پہنچا کر اور بوجھ ڈال کر لینا بھی حرام ہے بلکہ دل تو بدن سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اس واسطے چندوں میں اہل وجاہت کو درمیان میں نہ ڈالیں بلکہ خود تحریک کریں اور تحریک بھی عام کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ فہرست لے کے اس کے پاس پہونچ گئے اس نے دس روپے لکھے تو اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی شان تو پچاس روپے کے قابل ہے۔ اس نے شرما شرمی بیس روپے کر دیئے ایک عذر کا جواب تو یہ تھا جو خوشی ہو دو نہ ہو نہ دو اس تقریر سے اس کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ دوسرا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ہم کچھ اپنے واسطے تھوڑا ہی کرتے ہیں ہم تو اللہ کے واسطے کرتے ہیں تو اگر جبر بھی ہو تو کیا ہے یہ عجیب عذر ہے اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے واسطے جبر جائز ہے تو بتلایئے کہ اللہ تعالٰی نے کہاں کہا ہے کہ میرے لئے ڈکیتی کرو۔ اگر یہی مسئلہ ہے تو آج تو یوں چندہ وصول کیا کل کل چوری بھی کر دو گے اور کہہ دو گے کہ اپنے واسطے تھوڑا ہی کی ہے ہم نے تو مسجد کے لئے کی ہے۔ اور عدالت میں بھی جا کر یہی عذر کر دینا دیکھیں عدالت کیسے چھوڑ دے گی۔

اسی طرح عدالت عالیہ کو سمجھے بلکہ غور کیا جاوے تو اس میں ایک اور باریک بات ہے وہ یہ کہ اگر اپنے نفس کے واسطے جبر کرتے تو اتنا برا نہ ہوتا جتنا اللہ کے واسطے کرنا برا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس کام کی غرض نہ حاصل ہو وہ بے کار ہوتا ہے اب سوچو کہ اگر نفس کے واسطے کسی سے وصول کرتے اور غرض یہ ہوتی کہ تم کو دنیا کا نفع ہو تو جبر کی صورت میں یہ مقصود تو حاصل ہو جاتا اور اگر خدا کے واسطے جبر کیا جس میں غرض یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ خوش ہوں تو اس میں تو وہ مقصود بھی حاصل نہیں ہوا بلکہ جبر سے الٹا گناہ ہوا تو اور زیادہ بُرا ہوا۔ غرض اپنے نفس کے لئے جبر کرتے تو کچھ فائدہ تو حاصل ہوتا کہ روپیہ جیب میں آتا اور خدا کے واسطے ناجائز طریقہ سے روپیہ حاصل کیا تو خدا تعالیٰ بھی ناراض ہوئے اور کیا تھا خوش کرنے کو اب تو یہ فعل محض لغو اور بیہودہ ہوا تو یہ دوسرا عذر تو بالکل عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہو گیا یہ تو ایسا ہی ہو گیا جیسے ایک شخص نے ایک آدمی کو طمانچہ لگایا وہ ناراض ہوا تو آپ کہتے ہیں معاف کیجئے میں آپ کے ابا جان کو سمجھا تھا سبحان اللہ یہ عذر بڑا اچھا ہوا تو یہ کہنا کہ ہم دین کے واسطے کام کرتے ہیں اپنے واسطے نہیں کرتے ایسا ہی عذر گناہ بدتر از گناہ ہوا تو خدا کے واسطے کام کرنے میں تو اور زیادہ احتیاط چاہیئے۔ بہرحال ایسے ہی چندہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِّنْہُ (کسی مسلمان کا مال بدون اس کی خوش دلی کے حلال نہیں ہو سکتا) اور یہاں ایک شبہہ نئے مجتہدوں کی طرف سے اور بھی ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلم کی قید لگائی ہے تو کافر کا مال جبراً لینے میں کیا حرج ہے کیونکہ آجکل مجتہد کثرت سے ہونے لگے ہیں پہلے تو جب کوئی علوم میں امام ابو حنیفہؒ کے درجہ پر پہونچتا تھا جب مجتہد ہوتا تھا اور آجکل بس ترجمہ قرآن دیکھ لیا اور مجتہد ہو گئے اور پھر غضب تو یہ ہے کہ کافر بھی ہمارے مذہب میں اجتہاد کرنے لگے۔ چنانچہ میں ایک مقام پر ایک صاحب کے یہاں دعوت کی تقریب سے بلایا ہوا گیا وہ ملے نہیں نوکر سے پوچھا کہاں گئے ہیں کہا کھیلنے گئے ہیں میں حیران ہوا کہ وہ کیا بچے ہیں جو کھیلنے گئے ہیں

ارے ظالمو اس کا نام تفریح ہی رکھدیا ہوتا کیونکہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کی بھی شائستگی سکھلائی ہے۔ چنانچہ جی متلانے کے معنے میں اہل عرب خَبُثَتْ کہا کرتے تھے جس کا ترجمہ میرا جی میلا ہو رہا ہے یا خراب ہو رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ نہ کہو بلکہ یوں کہو تَقَسَّتْ نَفْسِیْ جس کا ترجمہ ہے میرا جی متلاتا ہے کیونکہ خَبُثَتْ نَفْسِیْ میں خبث کی اسناد ہے اپنی نفس کی طرف جو سننے سے بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے ہم تو اس کھیل کے لفظ پر بھی ضرور مواخذہ کریں گے جس سے آپ بچپن میں داخل ہونا چاہتے ہیں حالانکہ پہنچ چکے ہیں بچپن میں۔ میں ان کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ وہاں ایک انگریز بھی ان سے ملنے آیا تھا وہ بھی اسی جلسہ میں بیٹھ گیا اس نے لوگوں سے باتیں کرنا شروع کیں۔ کہنے لگا کہ کُرآن (قرآن) میں آیا ہے کہ طاعون ایک سے دوسرے کو لگتا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اے اللہ قرآن کی کونسی آیت میں یہ مضمون ہے۔ اتنے میں آپ نے خود ہی تفسیر کی کہ دیکھو کُرآن (قرآن) میں آیا ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں بھی مت جاؤ اور وہاں سے بھی مت جاؤ۔ اول تو اس ظالم نے حدیث کو قرآن بتایا پھر اس میں اپنا اجتہاد ٹھونسا اور دوسرے جزو سے اس طرح استدلال کیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں سے دوسری جگہ جانے کو اس لئے منع فرمایا ہے کہ دوسری جگہ جا کے طاعون پھیلاؤ گے۔ سبحان اللہ اس کو نص کا مدلول بتلاتے ہیں۔ غرض اجتہاد اتنا عام ہو گیا ہے کہ کافر بھی ہمارے دین میں اجتہاد کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ آجکل گاندھی بھی مسلمانوں کے مذہب میں مجتہد سمجھے گئے ہیں اور یہ ایسے مجتہد مصیب مطلق ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ سے تو اجتہاد میں غلطی بھی ہوتی تھی چنانچہ اسی بنا پر بعض مسائل میں ان سے رجوع ثابت ہے یا خود علماء احناف نے ان کے بعض فتوں کو چھوڑ کر صاحبین کے قول پر عمل کر لیا ہے۔ مگر گاندھی کی زبان سے کوئی غلط بات نکلتی ہی نہیں بس جو بات اس کے منہ سے نکلی نعوذ باللہ گویا قرآن و حدیث ہاتھ باندھے اس کی تائید کو کھڑے ہیں کہ مولویوں نے فوراً اسکو شریعت سے ثابت کر دیا خدا خیر کرے ؎ اِذَا کَانَ الْغُرَابُ دَلِیْلَ قَوْمٍ ✽ سَیَھْدِیْھِمْ طَرِیْقَ الْھَالِکِیْنَا

(جب نااہل کسی قوم کا سربراہ ہو تو گمراہوں کے ہی راستہ پر لیجائیگا)

اگر ایسے ہی مجتہد ہوئے تو وہ ضرور قوم کو تباہ کریں گے اور کرہی دیا۔ خلاصہ یہ کہ آجکل اجتہاد کا زور ہے حتیٰ کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے تو مسلمان کا مال تو بدون طیب قلب کے حلال نہیں ہوگا لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے اور پھر شاید اس استدلال سے منتفع ہوکر ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمانوں کی نہیں ہے اور غیر مسلم اس کے مالک ہیں خواہ ان کے پاس ٹھیکہ ہے اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں مگر بہت لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً کچھ حرج نہیں خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلم کا مال جبراً لینے کو منع فرمایا ہے اس کا ایک جواب ظاہر تو یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کہ عادتاً مسلمانوں کو سابقہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی مال حلال نہیں چنانچہ بعض احادیث وعید میں اَلرَّجُلُ يَقْتَطِعُ مَالَ الرَّجُلِ آیا ہے۔ رواہ الترغیب عن الحاکم وَقَالَ صَحِيحٌ عَلٰى شَرْطِهِمَا (آدمی آدمی کا مال قطع کرتا ہے اس کو ترغیب ترہیب میں حاکم سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح شرط بخاری مسلم پر) اور دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر ذمی اور کافر مسلم حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے ہے لَهُمْ مَا لَنَا وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْنَا (ان کے لئے وہ ہے جو ہمارے لئے ہے اور جو ان پر ہے وہ ہم پر بھی ہے) البتہ کافر محارب کا مال مباح ہے مگر وہاں بھی فریب اور غدر جائز نہیں۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھائی اگر کسی کا حق ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھ لے کافر کا نہ رکھے کیونکہ قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جاویں تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز روزہ ظالم کا اس کے بھائی ہی کو ملے گا۔ خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی کہ اپنی نیکیاں اس کو دیدیں اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پرائے گھر پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا نہ اس کا بھلا کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا اگر کوئی کہے کہ اُسے نفع کیا ہوا جب نیکیاں اس کے کار آمد نہ ہوئیں۔ جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا

کم ہوگا کہ اسے محسوس نہ ہوگا جیسے اگر کسی کے پاس من بھر سونے کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھر سونا چرا لیا واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوگی لیکن اس سے کوئی عادل اور کوئی عاقل اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا سا چرا لیا کرو مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملانے کی اجازت نہ ہو اور کوئی یہ کہہ کے ملا دے کہ ایک من میں ایک لوٹا کیا معلوم ہوگا تو کیا یہ جرم نہیں یقیناً جرم ہے اگر اطلاع ہو جائے تو ضرور سزا ہوگی مگر اکثر اطلاع نہیں ہوتی کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے مگر عدم احساس سے بطلان شے تو لازم نہیں آتا اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو مگر سزا میں کچھ تخفیف ہو گئی ہو تو اس سے نفع کا بطلان لازم نہیں آتا اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی گو اسے خفت کا احساس نہ ہو۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی یہ تعارض ہوا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسی تخفیف نہ ہوگی جس سے راحت محسوس ہو باقی یہ مطلب اس آیت کا نہیں ہے کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہ ہوگا کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمال مراتب میں متفاوت ہیں کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق میں سخت ہیں اور بعضے ایسے نہیں اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں یہ نہیں کہ فرعون اور شداد و نمرود کی برابر اس کافر کو بھی عذاب ہو جو غریب مسکین مظلوم تھا تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا کسی کو اس کا ضعف ہوگا اور کسی کو ضعفین (چار گنا) اور یہ سب قرآن میں آیا ہے البتہ جس کے لئے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہو جائے گا پھر اس سے کمی نہ ہوگی۔ اور یہ دوسرا جواب ہے یعنی مطلق خفت کی نفی نہیں ہے بلکہ عذاب مجوز میں خفت کی نفی ہے بہر حال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے اب تیسرا جواب سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل امت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہونچائے گا اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلو تراشی کریگا کیونکہ عام طور پر اس وقت لوگوں کا خیال یہ تھا کہ خانہ دوستاں بروب و در دشمناں مکوب (دوستوں کا گھر جھاڑ دشمنوں کا دروازہ مت کھٹکھٹا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی روک دیا جس سے اب خانہ دوستاں بروب (دوستوں کے گھر جھاڑنے) کی بھی گنجائش نہ رہی. اس کی اس لئے تصریح کر دی کہ شاید اس قول کے ظاہر پر عمل کرنے لگے مگر ایسے شخص کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے. کہ اگر وہ دوست بھی اس پر عمل کرے اور جو کچھ آپ اس کے گھر سے لائے ہیں وہ بھی اور جو آپ کے گھر کا ہے وہ بھی سب لے جائے تو کیا آپ کو گوارا کرنا پڑے گا. اگر گوارا نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجئے اور شیخ کے کلام میں روفتن (جھاڑنا) کا وہ درجہ مراد ہے جس کو گوارا کیا جا سکے جیسے بعضی نوعتیں دوستوں میں بے تکلفی کی ہوتی ہیں. غرض اس پر کلام بڑھ گیا تھا کہ بدون طیب خاطر کے کسی کا مال حلال نہیں ہوتا. اسی طرح بہنوں کا حصہ بھی حلال نہیں کیونکہ عموماً طیب خاطر سے وہ نہیں دیتیں محض رسم و رواج سے دیتی ہیں اس میں صحت ہبہ کے لئے دیانت کا بھی حکم ہے کہ ان کے قبضے میں رقم اور جائداد آنے کے بعد اور اس کی آمدنی وصول کرنے اور خرچ کرنے کے بعد اگر وہ دیں تو یہ ہبہ صحیح ہے ورنہ نہیں اور قضا کا حکم یہ ہے کہ وہ ہبہ کر دے حسب شرائط یا بیع کر دے محض معاف کر دینے یا دست بردار ہونے سے اس کی ملک زائل نہیں ہوتی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ زبانی بیع کرا لیجئے اور اختیار ہے کہ اگر دس لاکھ کا بھی حصہ ہے اور وہ دس روپیہ میں بیچ دے تو معاملہ درست ہو جائے گا.

اور پھر کہہ دے کہ میں نے زرِ ثمن معاف کر دیا کیونکہ بیع میں غیر مشاع ہونا ضروری نہیں یہ سب کلام ملک اضطراری پر چلا تھا اور اصل مضمون یہ تھا کہ ایک درجہ تو ہماری غلامی کا یہ ہے کہ ہم بطور ملک اضطراری کے خدا کے غلام ہیں سو یہ تو ہماری کوئی خوبی نہیں. خوبی یہ ہے [illegible] چاہیں غلام [illegible] جیسے آسمان و زمین سے کہا گیا تھا فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا اور انہوں نے عرض کیا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ [illegible] حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے زمین و آسمان سے کہا کہ ہماری اطاعت میں داخل ہو جا

خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے انھوں نے کہا کہ ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں۔ قہری اطاعت تو یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ آج آسمانوں کو توڑنا چاہیں یا زمین کو شق کرنا چاہیں اور وہ نہ چاہیں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اور جو حکم ہوگا لامحالہ وہ واقع ہو جاوے گا یہ تو اطاعت قہریہ ہے مگر آسمان و زمین نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ تسبیح و تقدیس و اعتقاد الوہیت کو اختیار کئے ہوئے ہیں اگر کوئی کہے کہ ان میں جان تھوڑا ہی ہے جو انھوں نے یہ باتیں کیں میں کہتا ہوں آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ ان میں جان نہیں ہے۔ کیوں نہیں جب قرآن میں ان کے متعلق طلوع رغبت ثابت ہے تو اس کے لوازم بھی ضرور ثابت ہیں حاصل یہ کہ معترض کے نزدیک اگر طلوع و رغبت روح ہونے پر موقوف ہے تو ان میں بھی روح ہے مگر آپ کی سی روح ہونا ضروری نہیں ہے اگر زیادہ نہیں تو اتنی ضرور ہے کہ ان کو شعور ہے اور وہ قصد کرتے ہیں ذکر و اطاعت کا۔ اور صوفیہ نے تو صاف صاف کہا ہے کہ ان میں روح ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند بامن و تو مردہ با حق زندہ اند

(خاک، ہوا، پانی، آگ یہ چار عنصر حق تعالیٰ کے بندے ہیں۔ ہمارے تمہارے روبرو گو مردہ ہیں مگر حق تعالیٰ کے روبرو زندہ ہیں)

مولانا نے ایک حکایت کے ضمن میں اس کو فرمایا ہے۔ حکایت یہ ہے کہ ایک بادشاہ کافر بت پرست تھا وہ اپنی رعایا کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا اور انکار پر آگ میں ڈال دیتا تھا چنانچہ ایک عورت سے بھی کہا گیا جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا وہ سجدہ بت پر راضی نہ ہوئی تو اس کے بچہ کو چھین کے دہکتی ہوئی آگ کے حوض میں ڈال دیا۔ اور کہا گیا کہ تیرا بھی یہی حشر ہوگا وہ بیچاری گھبرا گئی ؎

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت بانگ برزد طفل کانی لم امت

(اس عورت نے چاہا کہ بت کے روبرو سجدہ کر لوں۔ فوراً لڑکے نے پکارا میں مرا نہیں ہوں)

قریب تھا کہ وہ بادشاہ کے خوف سے بت کے روبرو سجدہ میں گر پڑے مگر لڑکے نے آگ

ہی میں سے پکارا کہ گھبراتا نہیں میں زندہ ہوں اور مزید برآں یہ کہنا شروع کیا ؎

اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم　　گرچہ در صورت میان آتشم

(اے ماں اندر چلی آ میں اس جگہ خوش ہوں اگرچہ ظاہر میں آگ کے اندر ہوں)

اندر آ مادر ببیں برہان حق　　تا بہ بینی عشرت خاصان حق

اندر آ اسرار ابراہیم بیں　　کہ در آتش یافت ورد و یاسمیں

اندر آ مادر بحق مادری　　بیں کہ ایں آذر ندارد آذری

اندر آ مادر کہ اقبال آمدست　　اندر آ مادر مدہ دولت ز دست

(اے ماں اندر چلی آ برہان حق کا ملاحظہ کرتا کہ دیکھ لے تو خاصان حق کے عیش و عشرت کو اے ماں تو اندر چلی آ اور دیکھ تو یہ آگ نہیں گلزار ابراہیمی ہے اندر چلی آ مادری حق کے طفیل میں دیکھ تو کہ یہ آذر آذری نہیں رکھتا اے ماں اندر آ کر اقبال جاگا اندر چلی آ اور دولت اسلام کو ہاتھ سے نہ کھو)

اور پھر ترقی کر کے اوروں کو بلانا شروع کیا ؎

اندر آئید اے ہمہ پروانہ وار　　اندریں آتش کہ دارد صد بہار

اندر آئید اے مسلمانان ہمہ　　غیر عذب دیں عذابست آں ہمہ

(اے تمام مسلمانو پروانہ کی طرح اندر چلے آؤ اور آگ کے اندر سیکڑوں بہاریں دیکھو اے تمام مسلمانوں اندر چلے آؤ دین شیریں کے علاوہ سب عذاب ہے)

ماں سنتے ہی فوراً آگ میں کود پڑی اور اس نے بھی وہی کہنا شروع کیا۔ پھر تو تمام لوگ لگے آگ میں گرنے حتیٰ کہ بادشاہ کو پولیس کے ذریعے سے لوگوں کو آگ میں گرنے سے روکنا پڑا کہ اگر یہی حال رہا تو بادشاہ کے مذہب کا بطلان شائع ہو جائے گا۔ پھر بادشاہ نے دیکھا کہ ان لوگوں کو آگ سے کوئی گزند نہیں پہونچتا تو اس حالت کو دیکھ کے بادشاہ بہت جھنجلایا اور غصہ میں فرضی خطاب کے طور پر کہا کہ اری آگ آج تجھے کیا ہو گیا تو جلاتی کیوں نہیں کہاں گئی تیری وہ تیزی اور گرمی اور کہاں گئی تیری قوت محرقہ کیا تو آگ نہیں رہی۔ حق تعالیٰ نے آگ کو زبان دی اور

اس نے جواب دیا کہ ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم اندر آ تو تا بہ بینی تابشم

یعنی میں تو وہی آگ ہوں تو ذرا اندر آ تو تجھے معلوم ہو کہ میں آگ ہی ہوں ؎

طبع من دیگر نہ گشت و عنصرم تیغ حقم ہم بدستوری برم

یعنی میری خاصیت نہیں بدلی لیکن میں خدا کی تلوار ہوں اس کی اجازت سے کاٹ سکتی ہوں تیری خواہش سے نہیں کاٹ سکتی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو آگ کو حکم ہوا کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا (ہو جا ٹھنڈی سلامتی کے ساتھ) وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ اسی طرح جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو حضرت ابراہیم نے اپنا کام شروع کر دیا کہ کاٹ رہے ہیں اور چھری خوب تیز ہے مگر چھری کاٹتی نہیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ نے غضبناک ہو کر کہا اری چھری تجھے کیا ہوا تو کاٹتی نہیں۔ تو وہ کہتی ہے مجھے آپ کیا فرماتے ہیں آپ کو حکم ہوا ہے کاٹنے کا۔ اور مجھے حکم ہوا ہے نہ کاٹنے کا۔ آپ اپنا کام کریں میں اپنا کام کروں گی جو کچھ کہنا ہو حق تعالےٰ سے کہئے۔ اگر وہ اجازت دیدیں گے تو کاٹ دوں گی۔ غرض کہ حکم الٰہی سے آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بے کار رہی، چھری حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بیکار رہی۔ اس مقام پر مفسرین نے ایک علمی لطیفہ لکھا ہے کہ اگر بَرْدًا کے ساتھ سَلَامًا نہ ہوتا تو آگ اس قدر سرد ہو جاتی کہ پھر ٹھنڈک سے تکلیف ہونے لگتی اس لئے حق تعالےٰ نے صرف بردًا نہیں فرمایا بلکہ سلامًا بھی فرمایا۔ تو مولانا نے اس حکایت پر متفرع کر کے فرمایا ہے ؎

بادہ خاک و آب و آتش بندہ اند با من و تو مردہ با حق زندہ اند

(ہوا، خاک، پانی، آگ چاروں عنصر حق تعالےٰ کے بندے ہیں گو ہمارے تمہارے رو برو مُردہ ہیں مگر حق تعالےٰ کے رو برو زندہ ہیں)

یہ تو حکایت تاریخی سے استدلال تھا۔ آگے قصہ منصوصہ سے استدلال فرماتے ہیں ؎

گر نبودے واقف از حق جان باد فرق چوں کردے میان قوم عاد

(اگر جان ہوا حق تعالیٰ سے واقف نہ ہوتی تو قوم عاد میں فرق نہ کرتی)

تو حضرت یہ سب چیزیں جاندار ہیں۔ اور لیجئے ارشاد ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط

(اے مخاطب کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی بھی)

یعنی یہ سب سجدہ میں مشغول ہیں وجہ استدلال یہ ہے کہ یہاں حق تعالیٰ نے سب مخلوقات کی فہرست بتلا کر کسی میں کوئی قید نہیں لگائی مگر ہمارے متعلق فرمایا وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط (اور بہت سے آدمی بھی) کہ بہت سے آدمی بھی سجدہ کرتے ہیں۔ ہمیں پھسڈی نکلے کہ سوائے ہمارے اور تو سب سجدے میں ہیں اور جب ہمارا نمبر آیا تو کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ کی قید سے فرمایا آگے دوسرے مقابل کی نسبت فرماتے ہیں وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ الْعَذَابُ ط (اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہوگیا) اور یہ ظاہر ہے کہ عبادت وسجدہ قسریہ سے کفار بھی خالی نہیں اگر یہاں عبادت قسریہ مراد ہوتی تو انسان کے ساتھ کثیر کی قید نہ ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ یہاں عبادت اختیاریہ مراد ہے۔ پس اور مخلوقات تو سب کی سب خوشی سے عبادت میں مشغول ہیں بجز انسان کے کہ ان میں بہت سے تو خوشی سے عبادت کرتے ہیں اور بہت سے کافر ہیں جو عبادت اختیاریہ سے محروم ہیں اور جب آسمان وزمین شجر و دواب نجوم وغیرہ خوشی سے عبادت کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ آسمان وزمین وغیرہ میں اتنا ادراک ہے جس سے وہ حق تعالیٰ کو پہچانتے ہیں اور یہ ادراک ان کا قیامت کے قریب سب پر ظاہر ہوگا چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جب یہودیوں کو قتل کیا جاوے گا اور وہ چھپتے پھریں گے تو اگر وہ کسی پتھر کے پیچھے چھپے گا تو پتھر بھی کہدے گا کہ اے مسلم میرے پیچھے یہودی ہے اور پھر قیامت میں تو سب ہی بولیں گے چنانچہ ارشاد ہے وَقَالُوْا لِجُلُوْدِھِمْ لِمَ شَھِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ کُلَّ

شَیْئٍ (یہ لوگ اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ جواب دیں گے کہ ہم کو اس نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی) اور ارشاد ہے یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۔ یعنی جس دن زمین سب اپنے پترے کھولدے گی۔ اور دہریوں نے جو اس کا انکار کیا ہے میں کہتا ہوں اُن کے پاس دلیل کیا ہے امتناع کی کچھ بھی نہیں پھر الٹا ہم سے پوچھتے ہیں کہ تم اس کا ثبوت لاؤ اور ثبوت بھی دلائل عقلیہ سے نہیں وہ تو ہم بیان کر چکے کہ اس کا امتناع ثابت نہیں تو امکان ثابت اور جب ممکن کے وقوع کی مخبر صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خبر دے اس کا وقوع ثابت بس اس ممکن کا وقوع ثابت ہوگیا تو پھر ہم سے ثبوت کیا مانگتے کہتے ہیں نظیر لاؤ تاکہ اسے دیکھ کر استبعاد رفع کریں۔ آجکل یہ بھی ایک جہل ہے کہ نظیر بتلانے کا نام ثبوت رکھا ہے حالانکہ ثبوت نام ہے دلیل عقلی یا نقلی کا اور نظیر سے تو دلیل کی توضیح مقصود ہوتی ہے نظیر سے اثبات مدعا نہیں ہوا کرتا مگر آجکل یہ الٹی منطق ہے کہ نظیر کو دلیل سمجھتے۔ چنانچہ ایک شخص رامپور میں معراج جسمانی کا انکار کرتے تھے۔ میں نے کہا معراج جسمانی ہی تھی روحانی نہ تھی تو کہا ثبوت لاؤ یعنی نظیر لاؤ کہ کسی اور کو بھی ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ نظیر اثباتِ مدعا کے لئے نہیں ہوتی بلکہ توضیح دلائل کے لئے ہوتی ہے مگر اس کو وہ سمجھتے ہی نہیں۔ سوال تو کردیا اور جواب سمجھنے کی صلاحیت نہیں اب ہم پر الزام ہے کہ علماء جواب نہیں دے سکتے میں کہتا ہوں کہ تم جواب سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ورنہ جواب سے ہم کب عاجز ہیں۔ اسی واسطے بعض دفعہ اُن سے خطاب کرنے کو دل نہیں چاہتا بقول عارف شیرازی کے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔۔۔ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ مجلس عارفین کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہو)

غرض وہ تو بار بار یہی کہتے جاتے ہیں کہ ثبوت لاؤ یعنی نظیر لاؤ اس کا ایک اور جواب ہے وہ یہ کہ اگر ہر واقعہ کے ثبوت کے لئے نظیر کی ضرورت ہے تو نظیر بھی ایک واقعہ ہے کہ اس کے لئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو کلیہ ٹوٹ گیا اور اگر ہے تو نظیر کے لئے بھی اسی طرح نظیر کی ضرورت ہوگی تو پھر اس میں بھی یہی کلام ہے۔ غرض اگر نظیر مسلسل

ختم ہو گیا تو کلیہ ٹوٹ گیا اور اگر ختم نہیں ہوا تو تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اور جو مستلزم محال ہے وہ بھی محال ہے مگر وہ ایسے بھی نہیں سمجھتے۔ اب ثبوت میں صرف اس کی کسر رہ گئی کہ چھوٹ پھوٹ جائے اور میں اوچک کران کے سامنے اڑجاؤں کہ لو صاحب معراج ہو گئی ایک صاحب اس پر الجھے تھے کہ اگر معراج جسمانی ہوئی تو ہوا کے کرہ کے بعد آگ کا کرہ ہے یا یوں کہئے کہ ہوا نہیں ہے جہاں بغیر سانس لئے کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے کہا کہ اس دعوے کی کہ بغیر سانس لئے ہوئے زندہ نہیں رہ سکتا دلیل کیا ہے تو قاعدہ سے تو اتنا ہی جواب میرے ذمہ تھا۔ مگر ایک بات دفعہ استبعاد کے لئے بعد میں سمجھ میں آئی کہ سیر کی دو قسمیں ہیں۔ سیر سریع اور سیر بطیئی یعنی ایک جلدی گذرنا اور ایک ٹھہر ٹھہر کے گذرنا سو جلدی گذرنے میں استبعاد بھی نہیں کیونکہ سرعت کے ساتھ آگ سے نکل جائے تو جل نہیں سکتا۔ جیسے ایک شعلہ ہو اس کے اندر سے جلدی جلدی انگلی کو یا ہاتھ کو نکالو تو رونگٹا بھی نہیں جلیگا بس اگر اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی معراج میں اس سرعت کے ساتھ پہونچا دیئے گئے کہ یہ چیزیں اثر نہ کر سکیں تو استبعاد بھی نہیں رہا۔ اسی طرح ان چیزوں کے بولنے میں امتناع عقلی تو نہیں ہے صرف استبعادی ہے اور اب تو استبعادی بھی نہیں کیونکہ روزانہ نئی ایجادیں نکلتی ہیں جن سے بہت سے مستبعدات کا مشاہدہ ہونے لگا یہ اللہ کی رحمت ہے کہ ایسے لوگوں سے تائید دین کا کام لیا ہے جو کافر ہیں کہ وہ نئی نئی ایجادیں کر دیں جن سے بہت سے شبہات حل ہو گئے چنانچہ لوگوں کو شبہ تھا کہ زمین کیسے بولے گی کیونکہ وہ تو جمادات میں سے ہے خدا نے اس کی نظیر گراموفون ایجاد کرا دیا کہ یہ نہ انسان ہے نہ حیوان اور نہ نباتات اور پھر بولتا ہے اب اس کو کس قسم میں داخل کرو گے جو اس کے لئے نطق کو جائز رکھو گے۔ اس سوال پر کہ کس قسم میں داخل کرو گے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک انسپکٹر تھے تعلیمات کے وہ جہاں جاتے تھے لڑکوں سے پوچھا کرتے تھے کہ موجودات کی کتنی قسمیں ہیں بتلاؤ۔ وہ کہتے کہ تین قسمیں جمادات نباتات حیوانات پھر پوچھتے کہ بتلاؤ میز کس قسم میں ہے اگر لڑکے نے اس کو نباتات کہدیا تو وہ

کہتے کہ اس میں نمو کہاں ہے اور اگر جمادات سے کہدیا تو کہا یہ تو لکڑی ہے اور لکڑی درخت کی ہے اور درخت نباتات میں سے ہے غرض بچوں کو بہت دق کرتے تھے۔ ایک لڑکا تھا بہت ذہین اس نے کہا کہ موجودات کی چار قسمیں ہیں۔ حیوانات، نباتات، جمادات اور متفرقات۔ بس جو چیز ان تین قسموں میں داخل نہ معلوم ہوئی کہدیا کہ یہ متفرقات میں سے ہے۔ بس اس کے بعد ان کا سوال ختم ہو گیا کہ وہ تو ان کا بھی استاذ نکلا۔

بس اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ حق تعالےٰ نے موجودات میں سے کچھ چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کو تم متفرقات میں داخل کروگے مثلاً گراموفون کہ اس پر شبہ ہوتا ہے کہ اگر یہ جمادات میں سے ہے تو بولتا کیوں ہے اور اگر حیوانات میں سے ہے تو کبھی مرتا کیوں نہیں حالانکہ یہ جن کی آواز کی حکایت کرتا ہے وہ تو مر کے ختم بھی ہو گئے مگر یہ نہیں ختم ہوتا۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جمادات میں سے ہے تو جمادات کے بولنے کا استبعاد بھی ختم ہو گیا۔ البتہ اب تک یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں مخارج کہاں ہیں اور حروف کیسے ادا ہوتے ہیں اور یہ حیرت بھی اس لئے ہے کہ ہم اس کی حقیقت نہیں جانتے۔ ورنہ موجدوں کو کچھ بھی حیرت نہیں اسی سے سمجھ لیجئے کہ جس نے اس کے موجد کو ایجاد کیا وہ کیسا ہوگا ع

چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا (وہ نگار کیسا ہوگا جس نے یہ نگار ایجاد کئے ہیں)

اور در اصل تو گراموفون کو بھی موجد حقیقی نے ہی ایجاد کیا ہے گو ظاہر میں ایک انسان موجد نظر آتا ہے کیونکہ یہ ایجاد نتیجہ ہے فعل دماغ کا اور موجد کا کام صرف سوچنا تھا پھر سوچنے کے بعد ایجاد کا ذہن میں آجانا اس کے اختیار میں نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ بات اس کے اختیار میں نہیں کہ ایجاد کی صورت چار دن میں ذہن میں آجائے۔ یا برس روز میں اگر ایجاد کا ذہن میں آنا اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ فوراً ہی کیوں نہ سمجھ لیتا سالہا سال تک ادھیڑ بن میں کیوں لگے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور موجد ہے اور یہ محض واسطہ ہے ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں یار بیروں فتنۂ او در جہاں

(یار تو جہاں سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا)

کام کوئی کرتا ہے اور نام کسی کا ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں　　کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

اور یہ ستمگاری معنی مجازی پر محمول ہے مگر اہل ادب اس مجاز سے بچتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک مرتبہ ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں یہ شعر بھی لکھا تھا تو میرے ایک بزرگ نے اس شعر کو ادب کی بناء پر کاٹ کے اس کے بجائے دوسرا شعر لکھ دیا کہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل　　نسیم صبح تیری مہربانی

اور میں نے ایک شعر دوسرا لکھا تھا اسے باقی رکھا کہ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں　　مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی محبوب کے زلف کا کام ہے مگر عشاق نے مصلحت کی وجہ سے چین کے ہرنوں کے سر منڈھ دی ہے)

یعنی مشک کے بارہ میں چینی ہرن کا نام لگا دیا ہے ورنہ یہ سب آپ ہی کی زلف کی خوشبو ہے درحقیقت صوفیہ کرام نے اسی کو سمجھ کر کہا ہے کہ مخلوقات مظہر صفات الٰہیہ اور محض واسطہ ہیں اور فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہی ہیں۔ مقصود تو اتنا ہی تھا باقی جوش میں بعض سے ایسے الفاظ بھی نکل گئے ہیں کہ کم فہموں کے ایمان کی صفائی ہو گئی جس سے وہ ہر شے کو خدا سمجھنے لگے۔ مثلاً ؎

ز دریا موج گوناگوں بر آمد　　ز بیچوں برنگ چوں بر آمد

گہے درکسوت لیلیٰ فروشد　　گہے درصورت مجنوں بر آمد

(دریا سے رنگ برنگ کی موج اٹھتی ہے بے مثل بر نگ مثل ظاہر ہوا کبھی لیلیٰ کے لباس میں اتر آیا کبھی مجنوں کی صورت میں ظاہر ہوا)

تو یہ سب غلبۂ حال میں نکلا ہے کہ خدا تعالیٰ کو کبھی لیلیٰ کہہ دیا اور کبھی مجنوں خوب سمجھ لو اور وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست اسی مسئلہ کا نام ہے اور ان تعبیرات مجازی کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً کسی بڑے حاکم کے پاس ایک مظلوم پہونچا اور جا کر کسی کے ظلم

کی فریاد کی حاکم کہتا ہے کہ پہلے پولیس میں رپورٹ لکھواؤ پھر ابتدائی عدالت میں باقاعدہ چارہ جوئی کرو وہاں تمہارے مفید نہ ہو تو درمیانی عدالت میں جاؤ وہاں بھی نہ ہو تو پھر ہائی کورٹ یا عدالت العالیہ میں رجوع کرو اور جب وہاں بھی نہ ہو تب میرے پاس لاؤ۔ ابھی سے خلاف ضابطہ میرے پاس کیسے آگئے۔ تو وہ کہتا ہے حضور میں نہیں جانتا پولیس و عدالت میرے تو حضور ہی پولیس ہیں اور حضور ہی عدالت ابتدائی۔ اور حضور ہی عدالت انتہائی۔ اب میں پوچھتا ہوں یہ کلام صحیح ہے یا غلط بالکل صحیح ہے۔ اب ایک کم فہم جاہل نے بھی وہاں دربار میں یہ کلام سنا اور یہ سمجھا کہ اچھا یہ بادشاہ صاحب کانسٹبل بھی ہیں، تھانہ دار بھی ہیں اور اب جو دربار میں گیا تو جا کے بادشاہ سے کہا کانسٹبل صاحب السلام علیکم اس پر اس کے اتنے جوتے لگیں گے کہ یاد کرے گا کیونکہ یہ کلام بالکل غلط ہے بس یہی فیصلہ ہے وحدۃ الوجود کا یہی حاصل ہے عارفین کے ان اشعار کا مثلاً ؎

یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو
ہرچہ بینم درجہاں غیر تو نیست

(مطلب یہ ہے کہ تمام عالم آپ کے صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

اور مثلاً عارف جامیؒ کا شعر جس میں اس کی بنا بھی تلادی ؎

ہرچہ پیدا می شود از دور پندارم توئی
بسکہ درجان فگار و چشم بیدارم توئی

یعنی چونکہ آپ میری جان و دل میں ہر وقت حاضر ہیں اس لئے میں ہر چیز کو یوں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی ہیں۔ پندارم سے معلوم ہو گیا کہ اس کا منشا غلبہ خیال ہے۔ یہ نہیں کہ واقع میں ہر چیز معاذ اللہ خدا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ آدمی جب کسی کے انتظار میں ہوتا ہے تو جب کوئی سامنے سے آتا ہے تو یوں ہی سمجھتا ہے کہ وہی آگیا۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ جب مولانا یہ شعر پڑھ رہے تھے ایک منکر تصوف نے کہا مولانا اگر خر پیدا شود۔ تو آپ نے فی البدیہہ جواب دیا۔ پندارم توئی یعنی میں سمجھوں گا کہ تو ہے۔ سبحان اللہ جواب میں بھی اس کلیہ سے نہیں نکلے اور جواب

ایسا دیا کہ مخاطب پر چسپاں ہوگیا کیا ذہانت ہے۔ اس احمق نے مولانا کے ذوق کو بھی برباد کیا۔ غرض یہ ہے وحدۃ الوجود کی حقیقت اور ہمہ اوست کا عنوان ایسا ہے جیسا اس مظلوم کا بادشاہ سے کہنا کہ حضور ہمارے تو پولیس بھی آپ ہیں۔ مجسٹریٹ بھی آپ ہی اور عدالت العالیہ بھی آپ ہی ہیں۔ تو یہ قول اس کا صحیح ہے یا غلط اگر مجاز نہ لیا جائے تو غلط ہے ورنہ صحیح ہے اس قول کے معنے یہ ہیں کہ حقیقی حاکم آپ ہیں اور سب واسطہ اور برائے نام حاکم ہیں اور وہ سب آپ کے مقابلہ میں ضعیف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اقوی ہیں اور اقویٰ کے سامنے اضعف کچھ بھی نہیں یہی مطلب وحدۃ الوجود کا ہے کہ موجود حقیقی حق تعالےٰ ہیں۔ باقی سب برائے نام موجود ہیں۔ اسے سعدیؒ نے خوب واضح کیا ہے ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید
خجل شد چو دریائے پہنا پدید

ایک قطرہ پانی کا ابر سے یہ دعویٰ کرتا چلا انا مدور۔ انا منور۔ انا مطہر کہ میں ایک کرہ کی طرح گول ہوں اور آئینہ کی طرح پاک وصاف ہوں مگر جوں ہی دریا کے قریب پہونچا تو اپنے دعووں سے شرمندہ ہو کر بے ساختہ کہتا ہے ؎

کہ جائیکہ دریاست من کیستم
گر او ہست حقا کہ من نیستم

جہاں دریا ہے میں کیا چیز ہوں اس سے تو مجھکو یہ نسبت ہے کہ اگر وہ ہست ہے تو میں نیست ہوں واقع میں تو نیست نہیں مگر اس کے مقابلہ میں گویا نیست ہوں یہ کلام تشبیہی ہے جیسے بہادری کے اظہار میں کمال مبالغہ منظور ہوتا ہے تو کہدیتے ہیں زید اسد زید شیر ہے۔ اب کسی احمق نے بھی یہ سنا وہ زید کے پیچھے جا کے بیٹھا ارے یہ کیا۔ کہاں ہیں دُم دیکھتا ہوں کیونکہ تم نے کہا بھی تھا

کہ زید شیر ہے۔ احمق کہیں کا ارے یہ تو تشبیہ کے واسطے کہہ دیا تھا سچ مچ وہ شیر تھوڑا ہی ہے۔ تو حضرت اگر ان عنوانات کا مدلول ایسا ہی اتحاد ہے تو پھر سارے محاورات ہی بے کار ہو جائیں گے۔ اسی محاورہ کے موافق من نیستم یہاں بھی کہا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ میری ہستی اتنی کمتر ہے کہ دریا کے سامنے مثل نیستی کے ہے۔ آگے مقصود کی تصریح ہے ؎

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمترانند
کہ با ہستیش نام ہستی برند

یعنی مخلوقات ہست تو ہیں مگر ایسے ہست ہیں کہ اس کے سامنے ان کو ہست کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جیسے کوئی بڑا حاکم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو اور بادشاہ پوچھے کہ آپ حاکم ہیں تو وہ شرما کر کہیگا کہ حضور میں حضور کے سامنے کیسے کہوں کہ حاکم ہوں۔ اگر حقیقت کے اعتبار سے کہے کہ میں حاکم نہیں تو ناشکری کی اور اگر کہے کہ ہاں حضور میں حاکم ہوں تو ادب کے خلاف دعوے اور گستاخی ہے کہ بادشاہ کے سامنے دعوئے حکومت کرتا ہے وہاں یہی کہنا چاہیئے کہ حضور کے سامنے کیسے کہوں حقیقت کا انکار بھی نہ کرے اور ادب کو بھی نہ چھوڑے کیونکہ جیسے دعوئے مذموم ہے اسی طرح انکار حقیقت بھی قبیح ہے اور اگر ایسا ہی حقیقت سے انکار ہے تو بس پھر اگر کوئی یہ کہے تم آدمی ہو تو یوں کہا کرو کہ نہیں ہم تو گدھے ہیں مگر یہ ایسی تواضع ہوگی جیسے میں ایک مرتبہ الہ آباد سے کانپور کا سفر کر رہا تھا جس گاڑی میں میں بیٹھا تھا اس میں چند جنٹلمین مل گئے۔ وہ سب مسلمان تھے صرف ایک شخص دوسرے مذہب کا جو منصف بھی تھا کہیں سے ان میں ملگیا وہ بے فکرے تو تھے ہی آپس میں شعر اشعار کی چھیڑ چھاڑ کرتے جاتے تھے اتفاقاً ان میں سے کسی نے ایک شعر جو پڑھا تو منصف کے منہ سے نکل گیا جناب پھر تو فرمایئے۔ بس کم بختی آگئی۔ ایک نے کہا آہا آپ شاعر بھی ہیں

اس نے کہا نہیں صاحب دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ ضرور شاعر ہیں یہ آپ کی تواضع ہے ورنہ شعر کا اعادہ نہ کراتے۔ تیسرے نے کہا جناب مسکین آپ کا تخلص ہے تو ایک۔ کہتا ہے آہا تو یہ شعر بھی آپ ہی کا ہے کہ ؎

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است

چوں بار ہمیں برد عزیز است

(مسکین گدھا اگرچہ بے تمیز ہے جب بوجھ لے جاتا ہے پیارا ہے)

یہ سب تمسخر کر رہے تھے اور مجھ سے بار بار کہتے جاتے تھے کہ معاف فرمائیے آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی اگرچہ مجھے جانتے نہ تھے میں نے اپنے دل میں کہا کہ حضور آپ کی یہی بڑی عنایت ہے کہ مجھ پر مشق نہیں ہو رہی ہے۔ غرض اس کے ساتھ ان لوگوں نے بڑی شرارت کی۔ پھر کھانا لے کے بیٹھے تو اس سے کہا منصف صاحب آئیے کچھ گوہ موت آپ بھی کھا لیجئے۔ ان میں سے ایک بولا گوہ موت کیسا تم کھانے کی بے ادبی کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا یہ تواضع ہے اپنے کھانے کو کھانا کہنا کبر ہے اس لئے اپنے کھانے کو تحقیر ہی کے ساتھ ذکر کرنا چاہیئے تو کیا آپ اس کو بھی تواضع کہیں گے یہ تو صریح ناشکری ہے۔ اگر بادشاہ نے کہا کیا تم حاکم ہو تو یہاں دو شخصوں کی دو حالتیں ہیں۔ ایک شخص تو اس قدر مرعوب ہے اور اس پر اس قدر اثر ہے سلطان کی عظمت کا کہ فانی فی السلطان ہے وہ اگر کہہ دے کہ میں حاکم نہیں تو کچھ حرج نہیں اور ایک ایسا مغلوب نہیں ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ میں حاکم نہیں ہوں تو اس کہنے کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو حکومت سے الگ کر دے گا کہ یہ بڑا ناشکرا ہے کہ ہم نے تو اسے عنایت کر کے حاکم بنایا اور یہ ہماری عنایت کو مٹاتا ہے۔ اسی طرح وحدۃ الوجود میں سمجھئے کہ اگر اس پر غلبہ ہے موجود مطلق کا اور اس وقت یہ کہتا ہے کہ

ہمارا وجود نہیں تو مقبول ہے ورنہ مردود غرض حال مقبول اور قال خض غیر مقبول اسی کو کہا گیا ہے ؎

مغرور سخن مشو کہ توحید خدائے
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(مغرور سخن نہ ہو اس لئے توحید خدا کو واحد دیکھنا ہے نہ واحد کہنا)

تو جن صوفیہ پر غلبہ تھا حال کا انھوں نے سب کی نفی کر دی وہ یوں بھی کہہ سکیں گے کہ گراموفون وغیرہ کو اس مشہور موجد نے ایجاد نہیں کیا بلکہ اس نے ایجاد کیا جس نے پہلے دماغ میں ڈالا پھر اس کے بیان کرنے کے لئے زبان میں حرکت دی پھر اس کے بنانے کے لئے ہاتھ میں حرکت دی جس کے سامنے موجد کی یہ حالت ہے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کر دیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں)

تو جس کی حقیقت پر نظر پہونچ گئی اُسے تو یہ کہتے ہوئے شرم ہی آوے گی کہ یہ کام میں نے کیا اگر نفی کر دے تو معذور ہے۔ اب یہاں ایک سخت اشکال ہے کہ اگر حقیقت کے اعتبار سے افعال عبد کی بالکل نفی کر دیں تو عام لوگوں پر مفسدہ کا اندیشہ ہے کہ وہ گناہ کر کے بھی اپنے کو بے خطا سمجھیں گے اور اگر ہر فعل کو اپنی طرف منسوب کرنے کی اجازت دیں تو چونکہ ہر شخص اس درجہ کا ہے نہیں جس درجہ کے عارفین ہیں۔ تو اس اجازت میں مفسدہ ہے۔ خود بینی کا کہ اتنے بڑے قادر کے سامنے یوں کہیں کہ ہم نے یہ کام کیا جس میں اپنے کاموں پر صریح ناز ہے۔ اس اشکال کا حل جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے حق تعالٰے نے ایسی ترکیب سے فرمایا ہے جس کے بعد

اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(دریا میں تختہ میں باندھ کر ڈال دیا ہے۔ پھر کہتے ہو کہ خبردار دامن تر نہ ہو)

اور وہ ترکیب یہ ہے کہ ارشاد فرمایا۔ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّی فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ ط جس کا حاصل یہ ہوا کہ یوں کہو کہ کام تو ہم نے کیا مگر خدا کے چاہنے سے کیا اب دونوں شقوں کے مفاسد برطرف ہوگئے۔ سبحان اللہ کتنا لطیف جمع ہے دونوں شقوں کا کہ نہ تو دعوٰے ہے اور نہ اپنا تبریہ پس اشکال بھی رفع ہوگیا یہ سب کلام اس پر چلا تھا کہ آسمان وزمین نے بھی اختیاری غلامی اختیار کی تھی۔ اسی مسئلہ میں دوسرے مضامین آگئے تھے۔ اب میں اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ اوپر یہ شبہ تھا کہ کیا آسمان وزمین میں ادراک بھی ہے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ ہاں ادراک ہے۔ چنانچہ قَالَتَا اَتَیْنَا طَائِعِیْنَ (انھوں نے کہا کہ ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں) سے تو استدلال گذر چکا ہے اور لیجئے ارشاد ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ط۔ ترجمہ۔ ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا سب نے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ وہ انسان بہت ظلوم جہول ہے اگر ان میں ادراک نہ تھا تو عذر کیسے کیا اور پھر ڈرے کیسے۔ ڈر تو فعل قلب کا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت کے مناسب قلب بھی ہے اور زبان بھی ہے کیونکہ وہ چیز جس سے بولتے ہیں وہ زبان ہے اور وہ چیز جس سے ڈرتے ہیں وہ قلب ہے باقی وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (انسان نے اس کو اٹھالیا) کی کیا وجہ بھی وہ وجہ یہ تھی کہ ان حضرت کو عقل بھی زیادہ تھی اور ان میں مادہ محبت کا بھی زیادہ تھا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو اصل مابہ الامتیاز انسان میں یہ محبت ہی ہے۔ چنانچہ جب میں کانپور میں پڑھتا تھا

تو معقولات بھی پڑھاتا تھا اس وقت میں نے کہا تھا کہ اہل معقول انسان کی حقیقت حیوان ناطق بتلاتے ہیں لیکن میرے نزدیک حیوان عاشق کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ فصل ایسا ہونا چاہیئے جو دوسری انواع سے ممیز ہو تو نطق تو انسان کے لئے اتنا ممیز نہیں جتنا عاشق کیونکہ یہ تو ملائکہ اور جنات میں بھی مشترک ہے اور عشق کا مادہ بجز انسان کے کسی میں نہیں یہ مادۂ عشق ہی تو تھا جس سے امانت پیش ہونے کے واسطے جو اس سے خطاب کیا گیا۔ اس خطاب میں ایسا خاص حظ اور کچھ ایسی عجیب لذت ہوئی کہ فوراً لینے کے لئے مستعد ہو گیا کیونکہ اس میں عشق بھی تھا اور عقل بھی۔ عشق سے تو لذت خطاب کا ادراک ہوا اور یہ سوچا کہ ایک بار کے کلام میں جب ایسا حظ ہوا تو حمل امانت سے تو بار بار کے کلام کا موقع ملے گا اس میں کتنا حظ ہو گا۔ بس امانت یعنی احکام شرعیہ کی تکلیف کو قبول کر لیا گو اس کا انجام یہ بھی ہوا کہ لِیُعَذِّبَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ (تاکہ اللہ تعالےٰ منافقوں کو عذاب دیں) الی آخرہ مگر عشق کی وجہ سے اس کی پرواہ نہ کی کہ عذاب بھی بھگتنا پڑے گا اس کو لے ہی لیا۔ حافظ شیرازیؒ کے کلام میں اسی علّت کی طرف اشارہ بھی ہے ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان بار امانت نہ اٹھا سکا قرعۂ فال مجھ دیوانہ کے نام نکل آیا)

اس شعر میں یہی واقعہ مذکور ہے اور دیوانہ کے لفظ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ امانت لینے کا سبب عشق ہوا یہ مضمون حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (انسان نے اس کو اٹھا لیا) کا استطراداً آ گیا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ سمٰوٰت و ارض و جبال نے جو امانت لینے سے عذر کیا اور ڈر گئے اس سے ان کا بھی ذی شعور و ذی روح وغیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے پس سوال جو ان کے ادراک کے استبعاد پر ہوا تھا وہ حل ہو گیا اور اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ ط (ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں)

سے انکار اختیاری غلامی کو اختیار کرنا ثابت ہو گیا اور ان کا خطاب میں جو طوعاً اور کرہاً واقع ہے اس میں اسی عبدیت اختیاری و عبدیت اضطراری کی طرف اشارہ ہے جس کو میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک غلامی تو اضطراری ہے جیسے موت بیماری وغیرہ کہ اس میں اگر اطاعت کی تو کیا کمال کیا اگر نہ کرتے کیا کر لیتے۔ کمال تو اس بندگی میں ہے جو آپ کے اختیار سے ہو اور یہ غلامی اختیاری ہے اور انسان اسی کا مکلّف ہے سو صورت کے درجہ میں تو ہم لوگ اس عبادت اختیاریہ کو ضروری سمجھتے ہیں مگر حقیقت کے درجہ میں ہمیں اس کی طرف مطلق توجہ نہیں ہے۔ اسلئے میں اس عبادت یعنی غلامی کی حقیقت بتلاتا ہوں اس کے بعد معلوم ہو سکے گا کہ آیا ہم اس درجہ کی غلامی کر بھی رہے ہیں یا نہیں سو اس کی سہل نظیر سمجھنے کے لئے یہ ہے۔ کہ آپ کا کوئی نوکر ہو اور وہ آپ کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو آپ نے خدا کے ساتھ کر رکھا ہے تو اس وقت آپ کی کیا حالت ہو گی بس اسی پر فیصلہ ہے۔ اب بتلایئے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خدا کا حکم ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ نماز پڑھو اگر نوکر سے کہیں کھانا لاؤ اور وہ نہ لاوے تو آپ کو کتنا غصہ آوے گا یقیناً اسی دن نوکری سے الگ کر دو گے حق تعالٰی کو تو اپنے بندوں کی نافرمانی پر اتنا غصہ آتا بھی نہیں جتنا ہم کو نوکروں پر آتا ہے کیونکہ انہیں محبت بھی ہے اس لئے وہ بہت سے گناہوں پر انتقام نہیں لیتے اور کبھی لیتے بھی ہیں تو بہت مہلت دیکر مگر انہیں حق تو ہے فوراً انتقام لینے کا۔ پھر آپ کے نوکر نے آپ کی نافرمانی کی تو بتلایئے اس نے آپ کا کیا حق ضائع کیا کچھ بھی نہیں کیونکہ عقد اجارہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک جانب منافع ہوتے ہیں اور ایک جانب روپیہ نوکر اپنے منافع آپ کے ہاتھ بیچتا ہے۔ منافع یہ کہ کھانا پکانا، بازار جانا سودا لانا۔ تو نوکر رکھنے کے معنے یہ ہوئے کہ آپ نے اس کے منافع خرید ے۔ اب آپ کے غصہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے منافع ہم کو نہیں دیئے اس کا بدلہ یہ ہے کہ آپ اس منفعت کی برابر اس کو

تنخواہ نہ دیجئے مگر نہیں اس پر بس نہیں کرتے سزا بھی دیتے ہیں ذلت کے ساتھ نکال بھی دیتے ہیں اور پھر وہ منافع مملوک بھی کیسے ہیں کہ جب چاہے وہ نوکری چھوڑ دے بس آپ کی ملک ختم اور یہاں تو منافع بھی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ہاتھ پیر بھی انھیں کے دیئے ہوتے۔ ہائے افسوس ہم انھیں کی چیزوں سے انھیں کی معصیت کرتے ہیں۔ اسی طرح آنکھیں بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں جن کو معصیت کا آلہ بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کا نور بھی۔ کیونکہ دماغ میں ایک مجمع النور ہے جو ایک نور کی نہر ہے اور ہر وقت جاری ہے اور اس میں اس قدر نور پیدا ہوتا ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور وہ برابر آنکھوں میں آتا رہتا ہے اور جوں جوں آپ نگاہ کرتے اور دیکھتے ہیں وہ ختم ہوتا جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آتا رہتا ہے۔ جیسے پانی کی نہر یا بجلی کی روشنی کہ برابر بجلی آتی رہتی ہے۔ اسی طرح نور بھی کہ اگر کسی دن دماغ سے نہ آوے تو آنکھیں پٹ ہوجاویں اس پر ایک ملحد کو متنبہ کیا گیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ قرآن میں حق تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاۗؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَاۗءٍ مَّعِيْنٍ ؀ بتلاؤ اگر پانی نیچے اتر جاوے تو کون ہے جو اسے لا سکتا ہے۔ ایک ملحد نے جب یہ آیت سنی تو آپ نے قافیہ ملایا۔ اگرچہ پھر آپ ہی کا قافیہ تنگ ہو گیا کہ تَاْتِيْ بِهَا بِالْمَعْوْلِ وَالْمُعِيْنِ اگر پانی اتر جاوے تو ہم کدال اور مزدور کی مدد سے پھر نکال لیں۔ تو گویا آپ نے یہ جواب دیا اللہ میاں کو اور وہاں تو عادت یہ ہے کہ اگرچہ دیر گیر و سخت گیرد (اگرچہ دیر سے پکڑے سخت پکڑے) کیونکہ وہ کوئی بے تاب تو ہوتے نہیں کہ فوراً بدلے لیں۔ خیر رات ہوئی اب یہ سویا خواب میں ایک فرشتہ آیا اور اس نے منہ پر ایک تھپڑ لگایا اور کہا ذَهَبْنَا بِمَا عَيْنَيْكَ فَاْتِ بِهَا بِالْمَعْوْلِ وَالْمُعِيْنِ ؀ جیسے ہم نے تیری دونوں آنکھوں کا پانی زائل کر دیا اسے بھی مزدور لگا کے پیدا کر لے صبح اٹھا تو پٹ تھا۔

مولانا اس مقام پر فرماتے ہیں۔ اگر توبہ کر لیتا تو اس پر بھی معاف کر دیا جاتا۔ اور آنکھوں کی روشنی بحال ہو جاتی مگر قساوت کب اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ اس قبول توبہ کی تائید میں ایک اور قصہ ہے کہ قارون نے جب ایک فاحشہ کو بہکایا کہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ تہمت لگانا حق تعالیٰ نے اس کو توفیق دی کہ مجمع عام میں سچ کہدیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا اور زمین سے فرمایا کہ یَا اَرْضُ خُذِیْہِ کہ اے زمین پکڑ اس قارون کو۔ چنانچہ وہ دھنستا شروع ہوا۔ اس نے پکارا اے موسیٰ مجھے چھوڑ دو۔ آپ نے جوش میں پھر فرمایا یَا اَرْضُ خُذِیْہِ (اے زمین اس کو پکڑ) وہ چلاتا تھا اور آپ برابر یَا اَرْضُ خُذِیْہِ (اے زمین تو اس کو پکڑ) یہاں تک کہ بالکل دھنس گیا۔ بعد میں حق تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ آپ اس وقت بہت غصہ میں تھے اس لئے ہم نے بھی کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ بجائے آپ کے ہم کو پکارتا تو ہم تو چھوڑ دیتے کیا انتہا ہے اس رحمت کا کہ ؎

اگر خشم گیرد بکردار زشت
چو باز آمدی ماجرا درنوشت

(اگر غصہ پکڑے برے کام پر جب واپس آئے یعنی توبہ کرے ماجرا لپیٹے)

اس کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک دفعہ جب میں کانپور ہی میں تھا تو ایک آقا اور نوکر میں کچھ بے لطفی ہو گئی۔ نوکر میرے پاس آیا کہ میری سفارش کر دو۔ آقا بولے کہ اگر تم کہو تو معاف کر دوں میں نے کہا میں زور نہیں دیتا۔ مگر ایک قصہ سن لیجئے۔ پھر یہ قصہ بیان کر دیا اور یہ کہا کہ آپ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کی بھی سنت ہے اور اللہ تعالیٰ کی بھی۔ اب آپ کو اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں میں سفارش نہیں کرتا۔ بھلا خدا کی سنت کے ہوتے ہوئے موسیٰ کی سنت پر کب عمل کر سکتے تھے۔ تو حق تعالیٰ کی ایسی رحمت تھی کہ اگر وہ ملحد

اپنی گستاخی سے توبہ کرتا تو ضرور معاف کر دیتے اور اس کی آنکھیں پھر منور کر دیتے۔ غرض آیت میں حق تعالیٰ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اسباب عادیہ کو ہم اگر معطل کر دیں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی واسطے عارفین مشاہدہ سے کہتے ہیں ؎

عقل دراسباب میدارد نظر　　عشق میگوید مسبب را نگر

(عقل کی نظر اسباب پر ہے عشق مسبب کو دیکھتا ہے)

تو یہ جس قدر اسباب ہیں یہ سب انھیں کے عطا کئے ہوئے ہیں مگر نام ہمارا کر دیا جیسے ہم اپنے بچوں کے واسطے بعض چیزیں ان کے خوش کرنے کے لئے نامزد کر دیتے ہیں کہ مثلاً یہ کھٹولی تمہاری ہے اور یہ چوکی اس کی ہے اسی طرح سب چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں۔ اور محض ہمارے خوش کرنے کو ہماری طرف ان کی اسناد مجازی کر دی ہے تو اس صورت میں بڑی شرم کی بات ہے کہ ان ہی چیزوں سے ان ہی کا مقابلہ کریں۔ اس پر اگر کوئی کہے کہ جب سب چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں تو ہماری ملک کیسے ہو سکتی ہیں۔ صاحبو اُس ملک کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض اسباب کے وجود پر یہ قانون مقرر کر دیا کہ اس میں فلاں شخص کو تصرف کی اجازت ہے دوسروں کو بدون اس کے اذن کے نہیں۔ پس یہ ہے حقیقت اس ملک کی اور اس سے ہمارے اس دعوے میں کوئی قدح نہیں ہوا۔

اگر کوئی کہے کہ اس اسناد مجازی میں حکمت کیا ہے اگر اتنی نسبت بھی نہ ہوتی تو شاید یہ معصیت پر معصیت نہ کرتا تو میں حکمت بتلاتا ہوں اور اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی ظاہر ہو جاوے گی جنھوں نے شریعت پر حقیقت کو ترجیح دی ہے میں مناقشہ تو کرتا نہیں لیکن یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حقیقت کو اگر ترجیح ہوتی شریعت پر تو بڑا لطف ہوتا کہ ہر شخص حقیقت پر عمل کر کے ایک دوسرے کی چیز ملے کر بھاگ جایا کرتا کہ یہ تو اللہ میاں کی ہے تیری کہاں سے آئی اور اس کا جو انجام ہوتا ظاہر ہے اس لئے حق تعالیٰ نے اتنی نسبت لگا دی کہ جو چیز

اسباب شرعیہ کے موافق کسی کو مل جائے وہ اسی کی ملک ہے سو اس نسبت کے لگا دینے میں تو کہ فلاں چیز فلاں کی ہے ایک ہی خطرہ ہے کہ بس اپنی ملک کا ناز ہی ہے جس کا علاج بھی آسان ہے اور وہاں حقیقت پر عمل کرنے میں قتل و خونریزی ہے۔ مثلاً آپ کے پاس ایک گھوڑا ہے اور آپ اسے اپنی ملک سمجھتے ہیں ایک دوسرا آدمی جو آپ سے زبردست ہو وہ کہے آپ کی ملک کدھر سے ہے کہ ؎

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست

ایں امانت چند روزہ نزد ماست

(درحقیقت ہر چیز کے مالک خدا تعالیٰ ہیں یہ ہمارے پاس چند دن کیلئے امانت ہے)

حقیقت کا فتویٰ تو یہ ہے نہیں کہ گھوڑا آپ کا ہے یہ تو شریعت کا فتویٰ ہے اور تم شریعت کو مانتے نہیں پھر یہ آپ کی زیادتی ہے کہ آپ دو برس سے غیر مملوک چیز پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اب لائیے میرا حق ہے آخر میں بھی خدا کا بندہ ہوں اس کے بعد پھر نوبت پہونچتی بچوں کی اور بیوی کی تو نتیجہ یہ ہوتا کہ عالم ایک رزم گاہ ہوتا ہر وقت قتل و خونریزی کا بازار گرم رہا کرتا۔ اس وقت ہم یہ کہتے حضرت یہ سب آپ کی انکار شریعت کی بدولت ہو رہا ہے۔ غرض اس سے تو انکار نہیں کہ عالم میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا مملوک و غلام ہے مگر یہ کہنا کہ یہ فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا یہ بھی خدا ہی کا حکم و کلام ہے اگر اس کا کوئی اثر نہیں تو کیا خدا کا یہ کہنا بیکار ہے۔ یہ راز شریعت کی عینک نے دکھلایا ہے۔ اگر شریعت نہ ہوتی تو عالم میں ایک فساد برپا ہو جاتا۔ مولانا رومی نے مثنوی میں ایک جبری کا قصہ لکھا ہے کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا اور پھل توڑ کے کھانے لگا مالک باغ نے منع کیا تو کہا تو کون ہوتا ہے باغ بھی خدا کا پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا سو تو کون ہے منع کرنے والا اس نے کہا اچھا اور اپنے نوکر سے کہا کہ لا تو رسّا اور ختکا۔ پھر رسّے سے باندھ کے خوب ہی ڈنڈے

لگائے اب تو لگا چلانے اس لے کہا چلاتا کیوں ہے۔ ارے میں بھی خدا کا تو بھی خدا کا رستا بھی خدا کا اور ختکا بھی خدا کا غرض سب خدا کا اب سمجھ میں آیا تو کہتا ہے ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار
اختیارست اختیارست اختیار

(میں نے جبر سے توبہ کی اب تو اختیار ہی اختیار ہے)

ہاں بھئی اب تو اختیار ہی اختیار ہے تو حضرت اگر شریعت نہ ہوتی سارے عالم میں ایسا ہی ہڑبونگ مچ جاتا یہ تو شریعت ہی کی عنایت ہے کہ اس نے ملک مجازی کو بھی ان احکام میں مثل ملک حقیقی ہی کے قرار دیا ہے ورنہ پھر تو بڑا مزہ ہوتا کہ کوئی کسی کو قتل کر دیتا تو قصاص بھی نہ ہوتا۔ اور وہ کہتا کہ قاتل تو حقیقت میں اللہ میاں ہیں پھر میرا کیا دخل۔ حضرت سچ یہ ہے کہ شریعت آپ کی آپ سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو آپ سب حقیقت بھول جاتے مگر افسوس ہے اس پر بھی شریعت کی قدر نہیں کرتے۔ غرض حق تعالیٰ نے براہ عنایت بعض اشیاء کو ہمارے نام زد کر دیا ہے۔ مگر اس کے آثار یہ نہ ہونا چاہیئے۔ کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں ان کو اپنی کہنے لگو۔ ہاں دوسرے کے مقابلہ میں اس کہنے کی اجازت ہے۔ پس اگر خدا پوچھے کہ یہ انگرکھا کس کا ہے تو کہئے آپ کا۔ اور اگر کوئی آدمی پوچھے کہ کس کا ہے تو کہئے ہمارا۔ کیونکہ اگر آپ اس آدمی سے بھی یہی کہیں گے کہ آپ کا ہے تو وہ اتار لے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب سب انہیں کا ہے تو انہیں کے آلات لے کر انھیں کی نافرمانی کرنا بڑے غضب کی بات ہے دیکھئے اگر کوئی نوکر بچہ سا اور کمزور اور بیمار ہمارے پاس آیا ہو اور ہم نے اُسے کھلا پلا کے اور علاج کرا کے تندرست اور توانا اور بڑا کیا اور پھر تلوار بندوق بھی دی۔ اب وہ اسی تلوار بندوق سے ہمارا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاوے تو اس سے یہی کہا جاوے گا کہ میاں ہماری تلوار بندوق رکھدو اور اپنے گھر سے ہتیار لاؤ مقابلہ کے لئے اسی طرح اگر خدا کی نافرمانی کرنا ہے

تو خدا کی چیزیں واپس کر دو اور اپنے گھر سے لاؤ مگر جب لانا چاہو گے اس وقت یہی کہنا پڑے گا ؎

نیا وردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا یہ سب آپ کا دیا ہوا ہے میری کیا حقیقت ہے)

تو جس طرح آپ کو اس نوکر کی نافرمانی ناگوار ہے اسی طرح خدا کو آپ کی نافرمانی ناگوار ہے۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ جس کا کھاویں اُسی پر غرّا دیں۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ غلامی حقیقت جو سمجھے گا پھر ممکن نہیں کہ اس کے حقوق ادا نہ کرے۔ اور حقیقت اس کی اوپر معلوم ہو چکی ہے تو اس کے حقوق بھی ادا کرنا لازم ہو گا اور ادائے حقوق کے لئے علم حقوق شرط ہے اس لئے ضرورت ہو گی حقوق معلوم کرنے کی اب ان کو اجمالاً عرض کرتا ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ تین حق ہیں ان میں سے ایک تو اطاعت ہے مگر اطاعت کے وہ معنے نہیں جو محض اہل قشر ظاہر پرست سمجھتے ہیں۔ یعنی محض ضابطہ کی اطاعت بلکہ حقیقی اطاعت ہونا چاہیئے اسے اس طرح سمجھئے کہ نوکر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو یوروپین مذاق کا ہے کہ کھانا پکا دیا اور چلدیا۔ اگر آقا نے کبھی کہا بھی کہ بھی ذرا پنکھا جھلدو کہا صاحب میرے فرائض میں نہیں ہے۔ اور ایک نوکر ایشیائی مذاق کا ہے کہ کھانا بھی پکا دیا اور کھلا بھی دیا۔ اور پنکھا بھی جھل رہا ہے اور اس سے فارغ ہو کے بیٹھ گیا۔ آقا کے پاؤں دبانے لگا۔ آپ کہتے بھی ہیں کہ بس بھائی جاؤ یہ کام تمہارے ذمہ نہیں ہے۔ مگر وہ کہتا ہے نہیں گو ذمہ نہ ہو مگر مجھے تو آپ کی خدمت سے راحت ہوتی ہے۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ آپ زیادہ کس نوکر کی قدر کریں گے۔ اسی طرح خدا کے بندے بھی دو قسم کے ہیں ایک وہ جنھوں نے وقت پر اطاعت کر لی پھر کچھ بھی مطلب نہیں رہا نہ خدا سے محبت ہے نہ ادب ہے کوئی گناہ صغیرہ

ہو گیا تو کہتے ہیں یہ تو صغیرہ ہے اور نماز و روزہ کے بعد چلتے پھرتے نظر آئیے نہ خدا کی یاد ہے نہ اشتیاق ہے یہ ویسی اطاعت ہے جیسے یورپین مذاق کے نوکر آپ کی خدمت کیا کرتے ہیں آپ اس نوکر سے منقبض کیوں ہوتے ہیں جو کھانا پکا کر چل دیتا اور تھوڑی دیر پنکھا بھی نہیں جھلتا اسی لئے تو کہ اتنے احسانات کے بعد بھی تجھے قلبی تعلق نہیں ہوا کہ ٹکا سا جواب دیدیا تو معلوم ہوا کہ آپ اپنے نوکر سے دو حقوق کے طالب ہیں ایک خدمت دوسرا تعلق قلبی تو کیا خدا کا حق اتنا بھی آپ پر نہیں جتنا آپ اپنا حق نوکر پر سمجھتے ہیں مجھے اس پر ایک نوکر کی حکایت یاد آئی کہ ایک ضابطہ کا نوکر تھا کہ آقا نے جو کہدیا کر دیا اور جو نہ کہا نہ کیا بلکہ اس میں بھی تاویل کر کے تخفیف نکال لیتا تھا۔ اس سے آقا نے ایک بار پوچھا کہ کیا بارش ہو رہی ہے کہنے لگا ہو رہی ہے لیٹے ہی لیٹے جواب دیدیا اٹھا تک نہیں پوچھا کیسے معلوم ہوا۔ کہا ایک بلی میری چارپائی کے نیچے آئی تھی۔ میں نے اس پر ہاتھ رکھا تو وہ بھیگی ہوئی تھی پھر کہا میاں چراغ تو گل کر دے۔ کہا چادر سے منہ ڈھانک لیجئے بس اندھیرا ہو جاوےگا کہا اچھا ذرا دروازہ ہی بند کر دے۔ تھا ہوشیار اس میں کوئی تاویل نہیں کی سمجھا کہ اس میں تاویل کرنے سے چوری ہو جانے کا اندیشہ ہے تو کیا کہتا ہے جناب دو کام میں نے کئے ایک آپ کر لیجئے آخر میرا بھی تو حق ہے۔ ایک اور ضابطہ ہی کا نوکر تھا جو کام تو سب کرتا تھا مگر صرف وہی جو بتلا دیا۔ اور وہ بھی بالکل بے فکری سے اس لئے اکثر کام رہ بھی جاتے تھے۔ ایک بار مالک زیادہ ناخوش ہوا کہ تو نے یہ نہیں کیا وہ نہیں وہ نہیں کیا تو اس نے کہا صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کون کام میرے ذمہ ہیں آپ مجھے سب کاموں کی ایک فہرست لکھ کر دیدیجئے۔ چنانچہ آقا نے فہرست لکھ کے حوالہ کر دی۔ اتفاق سے کہیں سفر کا موقع ہوا آقا گھوڑے پر سوار آگے آگے تھا اور نوکر صاحب پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے آقا کے کندھے پر سے دوشالہ کھسک کر زمین پر جا گرا۔ تھوڑی دور کے بعد جو دیکھا تو ندارد نوکر سے پوچھا ارے تو نے تو نہیں دیکھا۔ اس نے کہا وہ تو بہت دور پیچھے گر گیا۔ کہا اٹھایا کیوں نہیں۔ کہا دیکھئے

فہرست میں کہاں لکھا ہے کہ دوشالہ گر ے تو اٹھالینا۔ آقا نے کہا اچھا لا اب لکھ دوں۔ اب یہ سوچے کہ جس چیز کا نام لکھدوں گا یہ وہی اٹھائے گا اور اس کے علاوہ اگر کچھ اور گرے گا تو نہیں اٹھائے گا۔ اس لئے فہرست میں یہ لکھدیا کہ اگر کوئی چیز گر جاوے اُسے اٹھالیا کرو۔ اب جو منزل پر پہونچے تو نوکر صاحب نے ایک پوٹ کا پوٹ لا کے سامنے رکھدیا۔ پوچھا یہ کیا کہنے لگا دیکھ لیجئے۔ کھولا تو لید۔ ارے یہ کیا حرکت ہے کہنے لگا آپ ہی نے تو حکم دیا تھا کہ جو چیز گر جائے اٹھالینا سو میں نے اس کو بھی اٹھالیا تو ضابطہ کے لوگ ایسے ہوتے ہیں یہی معاملہ ہمارا ہے خدا کے ساتھ تو کیا خدا کے ساتھ ہمارا بس ایسا ہی تعلق ہے جیسے ایک ڈپٹی کلکٹر جو بجل میں مشہور تھے کہنے تھے کہ جب خدا نے حقوق مالیہ کی فہرست بتادی ہے تو یہ غلو ہے کہ اس سے زیادہ کا اہتمام کریں۔ اس لئے وہ زکوٰۃ سے ایک پیسہ زیادہ نہ دیتے تھے۔ حالانکہ ایسے ذہین لوگوں کا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمادیا ہے کہ اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ ثُمَّ تَلٰی۔ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ (تمہارے مال میں سوائے زکوٰۃ اور بھی حق ہے اور آپ نے اس کی دلیل میں یہ آیت پڑھی لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ یعنی نیکی نہیں کہ تم اپنے چہروں کو قبلہ کی طرف پھیر لو الخ) حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آیت سے استدلال کیا کیونکہ اس میں اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ط (اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں) اول فرمایا ہے اس کے بعد اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ج (نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو) یعنی انفاق کا ایک مرتبہ تو یہ فرمایا کہ مال دیا قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو۔ پھر دوسرا عمل یہ فرمایا کہ زکوٰۃ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال دینے سے اور مراد ہے۔ اور زکوٰۃ دینے سے اور اسی کو سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ (مال میں سوائے زکوٰۃ کے اور بھی حق ہے) اس لئے ہمیں یہ حقوق سمجھ کر فرائض کے

علاوہ اور بھی کچھ کرنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ جن کاموں کو ضابطہ میں اور فہرست میں لکھدیا ہوان کو تو سب سے پہلے کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حق تعالےٰ سے محبت کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا یہ تو ضابطہ ہی میں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو یہاں تک فرماتے ہیں لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ مَالِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ؕ اور فرماتے ہیں مَنْ کَانَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا یعنی جب تک میں ہر ایک کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں مال سے بھی اور اولاد سے بھی اور تمام لوگوں سے بھی اس وقت تک تم میں کوئی مومن نہ ہوگا۔ اور ایسا ہی درجہ محبت کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی۔ تو نری محبت بھی کافی نہ ہوئی بلکہ سب محبتوں سے بڑھ کر محبت فرض ہوئی۔ اب بتلایئے محبت فرض ہوگئی یا نہیں یہ دوسرا حق ہے منجملہ تین حقوق کے اور تیسرا حق ادب اور تعظیم ہے چنانچہ حق تعالےٰ نے اپنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کو بھی فرض فرمایا ہے لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُعَزِّرُوْہُ وَتُوَقِّرُوْہُ (تاکہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو) مرجع ان ضمائر کا واحد ہے۔ الغرض خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کا یہ بھی ایک حق فرض ہوا یعنی ادب وتعظیم اور اس مضمون سے تمام حدیثیں بھری ہوئی ہیں۔ بلکہ اگر غور کیجئے تو خود اسی آیت میں بھی ان حقوق کا ذکر ہے کیونکہ اطاعت تو اس کا مرادف ہی ہے اب اس کی حقیقت دیکھو کیا ہے سو اطاعت ماخوذ ہے طوع سے اور طوع کے معنے ہیں خوشی سو اطاعت کے معنے ہوئے خوشی سے کہنا ماننا اور یہ بالکل یقینی ہے کہ خوشی سے کہنا ماننا بدون محبت وعظمت کے عادتاً ممکن نہیں۔ پس اطاعت کی فرضیت کے ضمن میں محبت اور عظمت بھی فرض ہوگئی اب یہاں معنے اطاعت کے متعلق ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ وضو کو پورا کرنا باوجود ناگواری کے اعمال فاضلہ میں سے ہے۔ تو جب ناگواری کے ساتھ کیا گیا تو اطاعت نہ ہوئی۔ پھر فضیلت کیسی اسی طرح حدیث ہے حُفَّتِ الْجَنَّۃُ

بالمکارہ (یعنی جنت گھیر دی گئی ہے ناگوار چیزوں میں) اعمال شاقہ کو مکارہ فرمایا تو ان میں رغبت نہ ہوئی اور جب رغبت نہ ہوئی تو اطاعت نہ ہوئی اور اطاعت نہ ہوئی تو جنت کی بشارت کیسے ممکن ہے تو اہل قشر اس میں اشکال کو حل نہ کر سکیں گے۔ مگر صوفیہ کرام ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ لیکن کون سے صوفی جو صافی ہیں اور کا ہے سے صافی رذائل باطنہ سے اور صوفیت یہی ہے۔ کیونکہ تصوف کی تعریف ہے تعمیر الظاہر والباطن۔ یعنی آباد کرنا ظاہر کا اعمال سے اور باطن کا احوال سے اور یہ محض دعوے سے نہیں ہوتا اس کا طریقہ تو یہ ہے ؎

صوفی نہ شود صافی تا در نہ کشد جامے ۔۔۔ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

سفر سے مراد مریدوں کے گھر کا سفر نہیں کہ کبھی پونا کبھی بمبئی کبھی سورت کبھی ہندوستان پہنچ گئے۔ پختہ خبر مقدم ہے اور شود افعال ناقصہ میں سے ہے اور خامے اس کا اسم موخر ہے یعنی جو خام ہے اس کے پختہ ہونے کے لئے بہت سفر کی ضرورت ہے اور بمبئی اور پونا کے سفر میں تو اس کے برعکس ہوگا کہ پختگی کی جگہ اور خامی ہو جائے گی تو سفر سے مراد سفر سلوک ہے جس میں مختلف درجات و مراتب طے کرنا پڑتے ہیں تب کہیں وہ صوفی صافی بنتا ہے اس کی تعبیر ایک دوسرے عنوان سے حافظؒ نے فرمائی ہے ؎

شنیدم رہروے در سرزمینے ۔۔۔ ہمیں گفت ایں معما با قرینے

کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف ۔۔۔ کہ در شیشہ بماند اربعینے

(اپنے ہم نشین سے کوئی سالک یہ معمہ کہہ رہا تھا کہ شراب تو اس وقت صاف ہوگی جب چالیس دن شیشہ میں رہے)

اربعین سے مراد چلہ ہے یہ ادنیٰ مقدار ہے سلوک کی۔ اس وقت بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اتنی مدت بھی خالص اس کے لئے صرف کرتے ہوں۔ اب تو تصوف بہت سستا ہو گیا ہے کہ دو پیسے میں آتا ہے۔ ایک پیسہ کی تسبیح لے لی اور ایک کا گیرو منگا کے کپڑے

رنگ لئے بس صوفی بن گئے اور صوفی بھی رجسٹری شدہ کہ کسی حال میں ان کے کمال میں شبہ نہیں ہوتا۔ اگر خاموش رہے تو چپ شاہ کہلائے اور اگر اینڈی بینڈی بولے تو اہل اسرار و اہل رموز کہلائے۔ اور اگر ٹھکانے کی کہدی تو اہل حقائق اہل معارف بن گئے غرض ہر حال میں انھیں کی جیت ہے۔ ایک ہندو کا قول ہے کہ مسلمان بڑے اچھے گھٹ گئے تو فقیر، بڑھ گئے تو امیر۔ مرگئے تو پیر۔ تو صوفی سے مراد ایسا صوفی نہیں۔ بلکہ محقق صوفی اور قرآن و حدیث کا متبع۔ ہمارے حضرت اس قدر قرآن و حدیث کے متبع تھے کہ باوجود امام فن ہونے کے اپنے خدام علماء سے فرمایا کرتے تھے کہ میں جو کہوں اگر وہ قرآن و حدیث پر منطبق ہو تو ماننا ورنہ مجھکو خود مطلع کرنا۔ اور اگر یہ قید نہ ہو تو یوں تو بہت نکتے بیان کئے جاسکتے ہیں کیا وہ سب تصوف ہو جائیں گے۔ جیسے ایک جاہل صوفی نے تفسیر کی تھی وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى اے نفس تیری یہی سجا (سزا) شاید اس کا ماخذ یہ ہو کہ لیل بھی کالی ہوتی ہے اور نفس بھی کالا ہے اس مناسبت سے لیل کے معنے نفس کے لئے اور اذا میں ہمزہ زائد آگیا ہوگا اور ذا کے معنی یہی کیونکہ اسم اشارہ ہے اور سجا معرب سزا کا۔ ایسے ہی ایک بانوا فقیر کی حکایت ہے کہ اس نے کسی سے پوچھا کہ بتلا رزق بڑا یا محمد بڑے۔ اس شخص نے کہا کہ محمد ہی بڑے ہیں کہ وہ اشرف المخلوقات ہیں۔ اور رزق مخلوق ہے۔ کہنے لگا کہ واہ تو بے پیرا ہے ارے رزق بڑا ہے دیکھ کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ میں اَن پہلے آیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیچھے آئے۔ اَن کہتے ہیں ہندی میں اناج کو خیر یہ تو محض جاہلوں کے قصے ہیں۔ بعضے وہ نکتے ہیں کہ ظاہر میں علمی ہیں مگر شریعت کے خلاف ہونے سے سرمایہ ضلال ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشما دوختند ازسخنہا عالمے را سوختند

(بڑے ظالم تھے جنھوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کر دیا)

ہاں تو صوفیہ محققین نے اس اشکال منافاۃ کراہت و اطاعت کو حل کر دیا ہے اور دونوں کی صحیح تفسیر کر دی ہے اور کیا ہی اچھا فیصلہ کیا ہے کہ کراہت دو قسم کی ہے۔ ایک کراہت

طبعی ایک کراہت عقلی تو اطاعت کے خلاف مطلق کراہت نہیں ہے بلکہ صرف کراہت عقلی ہے اور وضو میں جو ناگواری ہے وہ طبعی ہے اور وہ مضر نہیں کیونکہ شریعت کو رغبت وطوع مطلوب ہے جو وسع میں ہو اور وہ عقلی ہے اور کراہت طبعیہ بوجہ غیر مقدور ہونے کے شریعت کو مطلوب ہی نہیں تو اس کا فقدان یعنی کراہت طبعی مضر بھی نہیں اسے ایک مثال سے سمجھئے مثلاً کسی کے دنبل نکل آیا وہ ڈاکٹر کے پاس گیا کہ آپریشن کردو اور بیہوشی کی دوا سنگھانے سے منع کردیا کہ اس سے دماغ کمزور ہوتا ہے اس نے نشتر دیا اب یہ بڑے زور سے چلایا اس نے خوب زور سے دبا دیا کے مواد نکال کے مرہم لگا کے پٹی باندھ دی اب یہ سنبھل کے بیٹھے اور پچاس روپے اسے انعام دیا۔ اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ اگر نشتر سے ناگواری نہ تھی تو آہ کیوں کی تھی اور اگر ناگواری تھی تو انعام کیوں دیا اس کا جواب یہی ہے کہ ناگواری تو طبعی تھی اور رغبت عقلی تھی۔ تو اسی طرح حضرات صوفیہ نے بھی اس مسئلہ کو حل کیا ہے کہ کراہت طبعیہ اور رغبت عقلیہ دونوں جمع ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کے انتقال پر روئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے پوچھا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ بھی روتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ رحمت کا اثر ہے جو شخص بندوں پر رحمت نہیں کرتا خدا اس پر رحمت نہیں کرتا البتہ زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہیئے۔ اور بعضے اولیا متوسطین کے واقعات اس کے خلاف ہیں کہ ان کو لڑکے کے مرنے کی خبر ملی تو وہ ہنس دیئے۔ اب اگر کسی سے دونوں واقعے بیان کردیئے جائیں اور یہ نہ بتایا جائے کہ کون کس کا واقعہ ہے اور پوچھا جائے کہ دونوں واقعے والوں میں کون افضل ہے تو وہ تو یہی کہیگا کہ جو نہیں رویا وہ افضل ہے حالانکہ بالکل غلط۔ باقی یہ کہ اس کا کیا سبب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس واقعہ کا اثر ہوا۔ اور اس متوسط ولی پر نہیں ہوا۔ سو اسے بھی ایک مثال سے سمجھئے۔ آپریشن دو آدمیوں کا ہوا ایک کو دارو ئے بیہوشی سنگھائی گئی اور ایک کو نہیں سنگھائی گئی کیونکہ جس کا دل زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور وہ قوی و توانا ہوتا ہے اسے بیہوشی کی دوا نہیں سنگھاتے تو اب جس کو داروئے بیہوشی نہیں سنگھائی گئی تھی اس نے تو اپریشن کے وقت زور سے آہ کی اور جو بیہوش تھا وہ خاموش رہا اسی طرح متوسطین داروئے بیہوشی سونگھے ہوئے ہوتے ہیں

اور وہ دار و مغلوب الحال ہوتا ہے اور انبیا اور اولیا کاملین کو نہیں سنگھائی جاتی تو اب جس نے لڑکے کے مرنے کی خبر سنی اور وہ نہیں رویا وہ حال میں اتنا مغلوب ہے کہ اسے حس ہی نہیں الم کی۔ تو اس کا نہ روتا کچھ بھی کمال نہیں جیسے کوئی اندھا کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ کیسی ہی حسین عورت میرے سامنے سے گذر جائے مگر میں اسے نہیں دیکھتا تو اس کا نہ دیکھنا کیا کمال ہے کمال اس کا ہے جس کی آنکھیں بھی روشن ہیں اور دوربین عینک بھی لگی ہوئی ہے اور اس کے سامنے سے حسین عورت گذرتی ہے اور وہ پرواہ بھی نہیں کرتا. ہاں حسن کا اثر بلا اختیار طبعاً اس پر اتنا ہوتا ہے کہ بعض اوقات دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اور جو اندھا ہے اس کا دل نہیں دھڑکتا تو اندھا بڑا کامل نہیں ہے کیونکہ اس نے تو دیکھا ہی نہیں کمال اس کا ہے کہ دل دھڑک رہا ہے اور علاج سکون کا یہی ہے کہ پھر دیکھ لے مگر خدا کے خوف سے نہیں دیکھتا اور کہتا ہے دیکھوں گا تو غیرت خداوندی جوش میں آوے گی اور کہا جاویگا ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی | در بیان دعوئے خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر | این بود دعوی عشق اے بے ہنر

(کہاں اے بیوقوف اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعوی عشق میں سچا ہے تو پھر غیر کی طرف کیوں نظر ڈالی بیہودہ! [illegible])

یہاں ایک استطرادی سوال و جواب ہے وہ یہ کہ شاید تم کہو کہ دعویٰ عشق ہم نے کب کیا ہے وہ کونسا دعویٰ ہے تو سنئے وہ دعوے یہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اگر کوئی کہے کہ ہم نے کلمہ تو بیشک پڑھا ہے مگر ہم نے یہ تو نہیں کہا کہ ہم عاشق بھی ہیں. خبر بھی ہے کہ یہ وہی کہنا دعوئے ہے عشق کا کیونکہ اس کلمہ سے تم مومن ہو گئے اور مومن کے لوازم میں سے ہے عشق جس کی دلیل یہ ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (اور جو مومن ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سخت قوی محبت ہے) تو کلمہ کی ایسی مثال ہوئی کہ کسی نے نکاح کیا۔ اب بیوی نے کہا کہ اناج لاؤ تو کھانا پکے اس نے کہا کہ میں یہ جھگڑا کیا جانوں میں نے تو قَبِلْتُ سے تجھ کو قبول کیا تھا اس بکھیڑے کا نہ وہاں ذکر تھا اور نہ میں نے قبول کیا تھا۔ اب لڑائی شروع ہو گئی اور محلہ والے جمع ہو گئے تو وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں ارے قَبِلْتُ (میں نے قبول کیا) میں سب کچھ آ گیا. تو بس حضور اسی طرح لا الٰہ الا اللہ میں سب کچھ آ گیا جیسا ابھی مذکور ہوا کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (اور جو مومن ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سخت قوی محبت ہے)

لوازم ایمان سے ہے اور اشد حباً کے معنے یہی عاشق کے ہیں کیونکہ شدت حب ہی تو عشق ہے گو خود عشق کا مادہ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ مگر ایک جاہل صوفی نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ عشق کا مادہ بھی قرآن میں ہے۔ پوچھا گیا کہاں ہے۔ کہا قرآن میں ہے نہیں حٰمٓ عٓسٓقٓ یہ مادہ عشق ہی کی تعبیر ہے باقی یہ کہ اس میں تو سین ہے اور عشق میں شین ہے تو آپ کہتے ہیں اصل میں تو شین ہی مراد ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ پڑھے ہوئے تھے نہیں اور اس لئے (نعوذ باللہ) آپ سے شین ادا نہ ہو سکتا تھا اس لئے آپ کی رعایت سے سین نازل کیا گیا۔ کمبخت سے کوئی پوچھے کہ اگر ایسا ہوتا تو سارے قرآن میں کہیں بھی شین نہ ہوتا۔ بہرحال یہ دعویٰ تو لغو اور بیہودہ ہے کہ عشق کا ذکر قرآن میں ہے محدثین تو احادیث میں بھی اس کے ذکر سے منکر ہیں اور حدیث مَنْ عَشِقَ فَعَفَّ (جو عشق میں مبتلا ہو گیا پھر پاک دامن رہا) کے ثبوت میں کلام کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت عشق قرآن سے ضرور ثابت ہے۔ چنانچہ اَشَدُّ حُبًّا کی تفسیر سے اوپر ثابت کیا گیا ہے۔ بس تو جب آپ عاشق ہو گئے تو اب آپ سے یہ ضرور پوچھا جائے گا اگر غیر کی طرف التفات کرو گے ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی   در بیان دعوئے خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر   ایں بود دعوئ عشق اے بے ہنر

(کہا بیوقوف اگر تو عاشق ہے اور اپنے عشق کے دعوی کے بیان میں سچا ہے تو پھر محبوب کے علاوہ دوسرے کی طرف کیوں نظر کی بے ہودہ کیا یہی عشق کا دعویٰ ہے)

آپ اس کا کیا جواب دیں گے اگر کسی کی بیوی کسی غیر مرد کو تکنے لگے تو یہ دل چاہے گا کہ تلوار مار دے۔ حالانکہ یہاں تو یہ عذر بھی ممکن ہے کہ شاید یہ شخص زشت منظر (بدصورت) ہو اور وہ جس کو تکتی ہو وہ حسین ہو۔ مگر یہاں تو یہ عذر بھی نہیں چل سکتا کیونکہ خدا سے زیادہ کون حسین ہو گا۔ اگر کوئی کہے کیا معلوم دیکھا تو ہے ہی نہیں۔ صاحبو اگو خدا تعالیٰ کو دیکھا نہیں مگر سنا تو ہے۔ اور عشق کا مدار کچھ دیکھنے ہی پر نہیں ہے ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(محض دیکھنے ہی سے عشق پیدا نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات یہ دولت گفتار سے پیدا ہوتی ہے)

اس پر بھی اگر کوئی کہے کہ نہیں ہم تو دیکھیں گے تب ہی عاشق ہوں گے ہمارے اندر سننے کا اثر نہیں ہوتا

(بقیہ صفحہ نمبر ۶۴ پر)

اچھا بھئی دیکھو مگر کیا دیکھنا آنکھ ہی پر منحصر ہے ہرگز نہیں۔ اگر کوئی معاملہ پیچیدہ ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ اس کام کو خوب دیکھ بھال کے کرو۔ آپ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ میں نے خوب دیکھ بھال لیا میرے نزدیک بالکل مناسب ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں آپ نے اس معاملہ کو کیونکر دیکھ لیا کیا آنکھ سے دیکھ لیا تو ذرا ہمیں بھی تو آنکھوں سے دکھا دو۔ اس وقت آپ کہیں گے کہ ہر شے کا دیکھنا جدا ہے کسی کو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور کسی کو دل سے بس اسی طرح خدا بھی دل سے دکھائی دیتا ہے آنکھ سے نہیں دکھائی دے سکتا اگر کوئی کہے اچھا دل ہی سے دکھا دو سو بیشک تم دل سے دیکھ سکتے ہو مگر دل پر جو پردہ پڑا ہوا ہے پہلے اُسے ہٹا دو پھر حق تعالیٰ سامنے ہی تو ہیں ہمارے ماموں صاحب کا شعر ہے ؎

کر غور ذرا دل میں کچھ جلوہ گری ہوگی　　　یہ شیشہ نہیں خالی دیکھا ہمیں پری ہوگی

ان سے چھوٹے ایک ماموں صاحب کا شعر ہے ؎

شد ہفت پردہ بر چشم ایں ہفت پردہ چشم　　　بے پردہ در نہ ماہے چوں آفتاب دارم

(اس آنکھ کے سات پردے آنکھ پر سات پردہ ہو گئے ورنہ میں ایک چاند مثل آفتاب کے رکھتا ہوں)

اور اس پردہ کے اٹھانے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظا از میاں برخیز

(عاشق و معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہو رہی ہے حافظ خودی کو درمیان سے اٹھا دے)

بتلا دیا کہ خودی اور انانیت یعنی تکبر یہ حجاب ہے اس کو دور کر دو پھر وصال ہی وصال ہے (شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

تعلق حجاب است و بےحاصلی　　　چو پیوند ہا بگسلی واصلی

(تعلقات غیر اللہ حجاب اور لاحاصل ہیں جب ان تعلقات کو قطع کرو گے تو تم واصل ہو گے)

۱۲ جامع) بس موانع کو اٹھا دو خدا سامنے ہی ہے باقی اس پردہ کے اٹھانے کا طریقہ

کیا ہے سو میں ان طرق کو نہیں چھپاتا جن کو صوفیہ چھپاتے ہیں۔ مجھے علی الاعلان کہنے کی بزرگوں سے اجازت ہے اس لئے میں طرق رفع حجب کو ممبر پر بیٹھ کر کہتا ہوں وہ رفع حجاب کا طریق یہ ہے کہ توجہ الیٰ غیر اللہ (غیر اللہ کی طرف نظر کرنے) کو چھوڑ دو۔ اگر ابتدا میں آپ کی بھی نظر حق تعالیٰ پر نہ پڑی تو ان کی تو تم پر پڑے گی بقول کسی عاشق کے

؎ یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدور بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو)

اصل میں تو شاہ کی جگہ لفظ ماہ تھا مگر میں نے ادب کی وجہ سے شاہ کر دیا۔ پھر آپ کی توجہ اور ان کی نظر سے آپ کے قلب کو خدا تعالیٰ سے ایک خاص تعلق ہو گا بس وہی تعلق دل سے دیکھنا ہے اور یہ کہنے کی بات ہے الفاظ سے سمجھنے کی نہیں ہے۔ دیکھو اگر کوئی کابلی پوچھے کہ آم کیسا ہوتا ہے اور آپ کہیں میٹھا ہوتا ہے وہ کہیگا کیسا میٹھا جیسے گڑ، آپ کہیں گے نہیں وہ کہیگا جیسے انگور، انار، سیب آپ ہر ایک کی نفی کریں گے وہ کہیگا پھر تعیین کے ساتھ بتلاؤ کیسا میٹھا ہوتا ہے آپ کہیں گے کہ الفاظ سے اس کا مٹھاس بیان نہیں ہو سکتا چکھ کر دیکھ لو۔ اور اگر آپ ہزار کوشش کریں کہ لفظوں سے اس کو آم کی شیرینی سمجھا دیں تو وہ نہ معلوم آم کو کیلے سے کیا سمجھ جائے گا۔ جیسے ایک حافظ جی نے جو آنکھوں کے بھی حافظ تھے (یعنی نابینا) کسی شخص سے جسنے کھیر کی دعوت کی تھی پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے اس نے کہا سفید سفید ہوتی ہے انھوں نے پوچھا سفید کس کو کہتے ہیں کہا جیسے بگلا کہا بگلا کیسا ہوتا ہے اس نے ہاتھ کو بگلے کی شکل بنا کر پیش کر دیا تو آپ ٹٹول کر کہتے ہیں یہ ٹیڑھی کھیر کیسے گلے سے اترے گی۔ یہ جو ٹیڑھی کھیر محاورہ میں مشہور ہے اس کی شان ورود یہی ہے۔ تو حافظ جی نے بوسائط یہ سمجھا کہ بگلا جیسے ٹیڑھا ہے کھیر کی شکل بھی یہی ہو گی۔ تو دیکھئے اس نے ذوقی چیز کو لفظوں سے سمجھانا چاہا تو نوبت کہاں پہونچی۔ بتانے والے نے غلطی یہ کی کہ امور حسیہ کو الفاظ میں ادا کیا حالانکہ کھیر کی حقیقت سمجھنے چکھنے کی ضرورت تھی اسی طرح یہ بھی کرنے کی بات ہے اور کرنے کے کام خاموشی کے ساتھ کام

میں لگنے سے سمجھ میں آتے ہیں زبان چلانے سے سمجھ میں نہیں آتے۔ بقول مولانا رحمہ اللہ ؎

گرچہ تفسیر زباں روشنگر است لیک عشق بے زباں روشن تر است

یعنی گو عشق کی تفسیر زبان سے بھی ہوتی ہے مگر حقیقت اسی تفسیر سے معلوم ہوتی ہے جو زبان بند کرکے حاصل ہوتی ہے۔ غرض دفع حجاب کا طریق ترک التفات الی الغیر ہے پھر اس ترک التفات الی الغیر کا بھی ایک طریق ہے وہ یہ کہ چند روز کسی محقق کی تعلیم کے موافق خلوت میں بیٹھ جاؤ اور جو وہ بتائے وہ کرو اس کے بعد غیر حق سے بے تعلقی اور خدا سے تعلق پیدا ہوگا اس وقت مشاہدہ حسب استعداد ہوگا اور اس مشاہدہ سے معلوم ہوگا کہ محبت اور عشق کیا چیز ہے اور اس وقت حقیقت وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (اور جو لوگ مومن ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں سخت قوی ہیں) کی منکشف ہوگی اگر کوئی کہے کہ ہم نے مجاہدہ کیا تھا اور یہ بات حاصل بھی ہوگئی تھی مگر چند روز کے بعد وہ حالت اصلیہ پھر عود کر آئی۔ تو اس کی بقا کا طریق بھی معلوم ہونا چاہیے تو میں اس غلطی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ مجاہدہ کا یہ اثر نہیں ہے کہ جذبات نفسانیہ فنا ہو جاویں جیسا سائل کو شبہ ہوا اور اسی بناء پر عود کا اشکال کیا۔ بلکہ اس کا اثر صرف یہ ہے کہ وہ جذبات مغلوب ہو جاتے ہیں یعنی قبل مجاہدہ جو ہم تقاضائے نفسانی کی مقاومت کرتے تھے تو دشوار ہوتا تھا اور بعد مجاہدہ کے وہ مقاومت کرنا آسان ہو جاتا ہے اور علت اس آسانی کی وہی مجاہدہ ہے۔ پس جب مجاہدہ میں کمی ہوگی عود ضروری ہے اس لئے بقار اس کیفیت مغلوبیہ کا اس پر موقوف ہے کہ مجاہدہ برابر جاری رہے اور عود کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے مجاہدہ کے بعد کسی دفعہ تقاضائے نفس کی مقاومت چھوڑ دی پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا پھر مقاومت نہیں کی پھر ایسا ہی ہوا پھر نہیں کی پس چند روز

تک اسی طرح کرتا رہا اس سے مجاہدہ کا اثر مضمحل ہو کے رذائل ہو گیا ایسا کوئی مادہ بتاؤ کہ کوئی شخص برابر مقاومت کرتا رہا ہو۔ اور پھر حالت صلیہ عود کر آئی ہو۔ پس یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجاہدہ کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب ہمارے اندر سے رذائل نکل گئے اس کے بعد جو نفس کا تقاضا ہوا تو اس کو رذیلہ نہیں سمجھا بلکہ کوئی اچھی حالت سمجھی حالانکہ رذائل فنا تو ہوتے نہیں مجاہدہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں اس لئے بیفکری سے وہ پھر ادھر آتے ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

نفس اژدرہاست او کے مردہ است ۔۔۔ از غم بے التی افسردہ است

(نفس اژدہا ہے وہ مرا نہیں ہے بے التی کے غم سے افسردہ ہو گیا ہے)

اور فنائے نفس کا جو مرتبہ مشہور ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ وہ مغلوب ہو گیا اور توجہ الی اللہ غالب ہو گئی لیکن اصل باقی ہے اس لئے اور مجاہدہ کے بعد بے فکری سے عود کا ضرور اندیشہ ہے اس طریق میں بے فکری کی کہاں گنجائش یہ تو عمر بھر کا دھندا ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش ۔۔۔ تا دم آخر دمے فارغ مباش

تا دم آخر دمے آخر بود ۔۔۔ کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(تم کو چاہیے اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ اڈھیر بن میں لگے رہو اور آخری دم تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی گھڑی ایسی تو ضرور ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی یعنی طلب میں لگے رہو گے تو کسی وقت ضرور وصول الی اللہ ہو جائیگا)

اگر کسی کو مولانا کے دوسرے شعر سے شبہ ہو کہ مولانا تو کامیابی کے احتمال کو وقت موت تک ممتد فرماتے ہیں اور تم کہتے ہو کہ چالیس روز میں حاصل ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک کفایت کا درجہ ہے اور ایک نہایت کا۔ کفایت کا درجہ تو چالیس روز میں کسی محقق کی صحبت میں بیٹھنے سے حاصل

ہو جائے گا جس کی حقیقت یہ ہے کہ طریق کی بصیرت ہو جائے گی راہ پر لگ جاوے گا اس کے بعد درجہ نہایت کا ہے جس کو مولانا فرمارہے ہیں جس کے وہ آثار ہیں جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں نِعْمَ الْعَبْدُ صُهَيْبٌ لَوْ لَمْ يَخَفِ اللّٰهَ لَمْ يَعْصِهِ یعنی اگر صہیب کو خدا کا خوف بھی نہ ہو تب بھی نافرمانی نہ کرے یہ درجہ جب ہی حاصل ہوتا ہے جبکہ برابر مجاہدۂ نفس میں مشغول رہے جس سے کسی دن محبت ایسی راسخ ہوگی کہ خوف کی بھی ضرورت نہ رہے گی یہ نہایت ہے اس کی ایسی مثال سمجھو کہ عالم بننے کے لئے ایک درجہ تو کفایت اور ضرورت کا ہے کہ نصاب درس ختم کر لیا جائے۔ اور ایک درجہ نہایت کا ہے کہ برسوں پڑھنے پڑھانے کتب بینی کرنے سے تجربہ کا درجہ حاصل ہو جائے۔ پس میرے دعوے میں جو حافظ کے کلام میں بھی منصوص ہے اور حضرت مولانا رومی کے ارشاد میں تعارض نہ رہا میں اوپر یہ گفتگو کر رہا تھا کہ کراہت طبعی اطاعت کے خلاف نہیں۔ درمیان میں استطراداً دوسرے مضامین اسی کے متعلق آ گئے تھے اب میں اسی طرف عود کرتا ہوں کہ اصل اطاعت یہی ہے کہ عقلی کراہت نہ ہو باقی طبعی کراہت نہ رہنا یہ اطاعت کا جزو یا لازم نہیں اور اسی لئے یہ حالت اکثر متوسطین کو پیش آتی ہے کیونکہ متوسطین تو اپنے حال میں اس قدر مغلوب ہوتے ہیں کہ اس وقت لذت طبعیہ اور کراہت طبعیہ کچھ بھی نہیں رہتی غلبہ کیفیت سے امور طبعیہ مغلوب ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ابتدائے ذکر میں زیادہ مزہ آتا ہے کیونکہ اس وقت کیفیت کا ورود غلبہ سے ہوتا ہے جس سے نفس کی کشاکش مغلوب ہو جاتی ہے یکسوئی کامل ہوتی ہے اور یہی منشاء ہے لذت کا حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے ان کے ایک خادم نے شکایت کی کہ حضرت ذکر میں اب ویسا مزہ نہیں آتا جیسا شروع میں آتا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ میاں تم نے سنا نہیں کہ پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ دیکھو اگر کوئی کسی پر عاشق ہو گیا ہو پھر نکاح ہو جائے تو ہفتہ دو ہفتہ کے بعد وہ

کیفیت نہیں رہے گی جو ابتدا میں تھی۔ اگر کوئی کہے کہ بس جی پھر تو جنت کا مزہ بھی مغلوب ہو جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تو مغلوبیت کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اس شے کے تمتع اور حسن کا احاطہ کر لیا ہے اگر یہاں بھی حسن غیر محدود ہوتا تو شوق کبھی ختم نہ ہوتا یہاں وہ حسن بھی محدود ہے اور اپنی قوت بھی محدود ہے اور جنت کا حسن بھی غیر محدود ہے اور تمہاری قوت بھی غیر محدود ہوگی پھر شوق کیوں ختم ہوگا وہاں تو یہ حال ہوگا۔

یزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ نظرا ؎

(جس قدر تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا ہوں حسن کو زیادہ پاتا ہوں)

اور یہی وجہ ہے کہ ذکر میں لذت نفسانیہ تو کچھ دنوں کے بعد کم ہو جاتی ہے مگر شوق روحانی کم نہیں ہوتا کیوں کی روح کی قوت نفس سے زیادہ ہے اور محبوب حقیقی کے کمالات حسن وغیرہ غیر متناہی ہیں تو شوق روحانی کا وہ حال ہوتا ہے جس کو حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

دل آرام در بر دل آرام جو   لب از تشنگی خشک و بر طرف جو
نگویم کہ بر آب قادر نیند   کہ بر ساحل نیل مستقی اند

(محبوب بغل میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈھ رہے ہیں نہر کے کنارہ پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ دریائے نیل کے کنارے پر جلندر کے بیمار کی طرح ہیں)

اور ایک دوسرے عارف فرماتے ہیں ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش   کہ حسن ایں قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ سیاہی بکھیر اور کاغذ جلا اور خاموش رہ حسن یہ عشق کا قصہ ہے دفتر میں نہیں سما سکتا)

اور کسی نے کہا ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار   گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

(تیرے حسن کے گل بہت ہیں تیرے بہار کے گلچیں کو تنگ دامنی کا گلہ ہے)

اور چونکہ جنت میں روح کی قوت یہاں سے بھی زیادہ ہوگی اس لئے وہاں یہ

شوق یہاں سے بھی زیادہ ہوگا اس مقام پر بعض غیر محقق صوفیہ کو شبہ ہوگیا ہے کہ عشاق کو جنت میں بھی بے چینی رہے گی۔ مگر واقع میں یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ شوق میں ہمیشہ بے چینی ہوتی ہے۔ بے چینی جب ہوتی ہے کہ محبوب کا حصول شوق کے درجہ تک نہ ہو۔ اور وہاں جیسے شوق غیر متناہی ہوگا ایسے ہی حصول بھی غیر متناہی ہے اور ہر درجہ حصول کا اس وقت کے شوق کے موافق ہوگا۔ پھر اس میں کیا استبعاد ہے کہ شوق موجود ہو اور بے چینی نہ ہو اور راز اس میں یہ ہے کہ جس حالت میں جس قدر قرب محبوب کی استعداد ہوگی شوق بھی اسی درجہ کا ہوگا۔ پھر استعداد میں بھی ترقی ہوگی اور اسی قدر شوق میں بھی اور بے چینی اس وقت ہوتی ہے جب استعداد سے کم قرب ہو ان کو دھوکہ ہوا ہے قیاس الغائب علی الشاہد سے کہ آخرت کو دنیا پر قیاس کیا۔ بہرحال سالک کو یہ بات پیش آتی ہے کہ ابتدا میں یہ ابن الوقت ہوتا ہے کہ حالات اس پر غالب ہوتے ہیں اور یہ ان میں مغلوب ہوتا ہے اور انتہا میں ابوالوقت ہوتا ہے کہ حالات پر یہ غالب ہوتا ہے۔ جیسے قرآن یاد کرنے میں ابتدا میں تو قرآن کو رٹنا پڑتا ہے اور جب یاد ہوگیا تو اب کچھ محنت نہیں اب نہ وہ رات دن رٹتا ہے نہ سُناتا ہے۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ حافظ ہے اور رٹنے والے کی حالت کو دیکھ کر سب سمجھ جاتے ہیں کہ یہ حافظ ہے۔ اسی طرح اولیاء کاملین کی حالت انتہا میں کسی کو معلوم نہیں ہوتی کہ یہ کس درجہ کے ہیں۔ بس ایسی حالت معلوم ہوتی ہے جیسے معمولی ناظرہ خواں ہو۔ ہاں مبتدی سلوک کی حالت سب کو معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ تو مثل قرآن حفظ کرنے والے کے ہے کہ رٹ رہا ہے رات دن اور حافظ کا حال کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ بس رمضان آیا اور سُنادیا پس جس مقام پر صبر کا امر ہے کاملین کو وہاں طبعی ناگواری ہوتی ہے اور وہ اس مقام میں صبر سے کام لیتے ہیں اور مبتدی کو غلبہ حال سے بے چینی ہی نہیں ہوتی اس لئے وہ ہنستا ہے مگر یہ کمال نہیں کمال وہی ہے کہ بے چینی بھی ہو اور پھر

صبر ہو یہ اولیاء کاملین کا حال ہے اور انبیاء کی حالت ان سے بھی بڑھی ہوئی ہے ہے وہ سب سے زیادہ ادراک بھی رکھتے ہیں پھر اپنے مقامات پر غالب ہوتے ہیں اور دونوں کا فرق میں ابھی کلورا فارم کی مثال میں بتا چکا ہوں کہ ایک کلورا فارم سونگھے ہوئے ہے اس کو حس ہی نہیں الم کا اور ایک ذی ہوش ہے اس کو حس ہے الم کا اور باوجود احساس الم کے پھر اُف نہیں کرتا بتلایئے دونوں میں کون کامل ہے تو انبیاء کے مقابلہ میں اولیا متوسطین ایسے ہی ہیں اسی طرح جس کی حسین عورت پر نظر پڑ گئی اور میلان بھی ہوا مگر غیرت الٰہی کے خوف سے اس طرف التفات نہ کیا اس کی حالت اندھے اکمل وبہتر ہے جس کو حسن کا ادراک ہی نہیں ہوا۔ اب حُفَّتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ (گھیر دی گئی ہے جنت ناگوار چیزوں سے) کی حقیقت خوب منکشف ہوگئی کہ جاڑے میں صبح کی نماز کے لئے اٹھے سردی کے مارے وضو ناگوار ہے مگر محبت عقلیہ کی وجہ سے کرتا ہے تو اس میں جو شبہ اطاعت و کراہت کے تنافی کا متوہم ہوتا تھا وہ دفع ہو گیا۔ غرض ایک تو قانونی اطاعت ہے اور ایک حقیقی جس میں حق تعالےٰ کی محبت کی بھی چاشنی ہو کہ مستقلاً فرض ہے۔ اب رہی یہ بات کہ وہ محبت حاصل کیسے ہو اس کی بھی ایک تدبیر ہے وہ یہ ہے کہ اہل محبت کے پاس رہو اور وہ جو بتلا دیں کرو اور جب تک جانا میسر نہ ہو اس وقت تک کے لئے ایک وقتی نسخہ بتلائے دیتا ہوں وہ یہ کہ چند باتوں کا التزام کر لو۔ ایک یہ کہ کوئی معصیت اور نافرمانی نہ ہو گو اس میں کلفت ہی کیوں نہ ہو اس میں راز یہ ہے کہ جب ہم نافرمانی نہ کریں گے تو حق تعالیٰ کی نظر محبت ہم پر ہوگی اور اس سے خود بخود آپ کو حق تعالےٰ کی طرف کشش ہوگی اور کشش اصل میں اُدھر ہی سے ہوتی ہے اور علت وصول کی یہی ہے مگر اس سے آپ کی کوشش و اجتناب عن المعصیت کا بیکار ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ وہ کشش تب ہی ہوتی ہے جبکہ آپ قصد کریں اور قصد یہی ہے اور گو اس میں چند روز تکلیف ہوگی کہ ہر وقت نفس کی مخالفت کرنا پڑے گی مگر پھر عادت سے سہولت ہو جاویگی۔ ایک بات یہ کیجئے کہ

دوسرے تیسرے دن تھوڑا سا وقت نکال کے خلوت میں بیٹھ کے توجہ کے ساتھ اللہ اللہ کر لیا کیجئے اور اس میں وساوس کے آنے کا اندیشہ نہ کیجئے آپ اللہ اللہ کی طرف نگاہ رکھئے خواہ لکھا ہوا سامنے رکھئے چاہے لکھا ہوا فرض کر لیجئے کہ میں اس لکھئے ہوئے کو دیکھ رہا ہوں یا ارادہ کے ساتھ ادا کیجئے محض یاد سے نہیں۔ کہ دھیان اور طرف ہو اور لفظ اللہ زبان پر ہو۔ بلکہ دل سے سوچ سوچ کے زبان پر لائیے۔ پھر ادھر توجہ رکھنے کی حالت میں وساوس خود بخود دفع ہو جاویں گے اور اگر نہ بھی دفع ہوں تو کچھ مضر نہیں اور اگر آپ یہ چاہیں کہ خطرات میں بھی حق کی ہی طرف توجہ ہو تو اس کا یہی طریقہ ہمارے حضرت اقدس سرہ نے بتایا ہے کہ یہ سوچئے کہ سبحان اللہ کیا قدرت ہے حق تعالیٰ کی کہ قلب میں بھی دریا کی سی موجیں پیدا کر دیں تو پھر وہ سارے خطرات آئینہ جمال الٰہی بن جاویں گے شیطان نے تو جال پھیلایا تھا حق سے دور کرنے کے لئے مگر اہل اللہ نے اس پر کیسا صیقل کر دیا کہ وہ اپنی سلیٹ کوری لیکر چلا گیا۔ اب اگر وہ دوبارہ آوے گا بھی تو لیٹ ہو کے آوے گا مگر کہیں اس اطمینان پر آپ نہ لیٹ رہیں۔ اور ایک جزو یہ ہے کہ وقت مقرر کر کے تھوڑی دیر خدا کی نعمتوں کا اور اپنی کوتاہیوں کا مراقبہ کیجئے۔ اور ایک یہ جزو ہے کہ کسی کامل بزرگ سے خط و کتابت رکھئے اور اپنے حالات اُسے لکھئے اور اگر کچھ حالات نہ ہوں تو یہی لکھ دیجئے کہ کوئی حالت نہیں ہے اگرچہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ مفید یا مضر کوئی حالت نہ ہو۔ اور ایک جزو یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی حکایات مجاہدہ و ریاضت و ترک دنیا کی دیکھا کیجئے مگر ان کی دقیق ملفوظات کا مطالعہ نہ کیجئے ورنہ ایمان برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغ فولاد ست تیز چوں نہ داری تو سپر واپس گریز

(نکتے مثل تلوار ہندی کے تیز ہیں جب تمہارے پاس ڈھال نہیں ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ)

سپر سے مراد علم و فہم ہے ؎

پیش ایں الماس بے اسپر میا کز بریدن تیغ را نبود حیا

(اس تلوار کے سامنے بغیر ڈھال کے مت آؤ اس لئے کہ تلوار کاٹنے سے نہیں شرماتی)

خوب ہی فرمایا ہے کہ تلوار نہیں شرماتی کاٹنے سے۔ آگے مولانا ان لوگوں کی خبر لیتے

ہیں جو ایسے دقیق مضامین بلاضرورت نااہلوں کے سامنے بیان کرتے رہتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند وز سخنہا عالمے را سوختند

(بڑے ہی ظالم ہیں جنھوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کر دیا)

یعنی سچی باتیں بھی جب عوام کی فہم سے بالاتر ہوں ان کو عوام سے بیان کرنا ممنوع ہے حضرت شیخ اکبر فرماتے ہیں یَحْرُمُ النَّظَرُ فِی کُتُبِنَا ہماری کتابیں دیکھنا حرام ہیں نہ اس لئے کہ ان کے مضامین مفید نہیں بلکہ اس لئے کہ عوام میں استفادہ کی قابلیت نہیں۔ جیسے طبیب کسی ضعیف المعدہ سے کہے کہ بھنا ہوا گوشت مت کھایا کرو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ فی نفسہ مضر ہے بلکہ فی نفسہ تو وہ لذیذ و مفید ہے مگر اس کے معدہ میں اس کے ہضم کی طاقت نہیں ہے۔ اسی طرح مبتدی کو ایسی کتب کا مطالعہ مناسب نہیں۔ ہاں ایسی کتابیں دیکھئے جیسے روض الریاحین ہے کہ میں نے اس کا ترجمہ اردو میں کرادیا ہے اور وہ چھپ بھی گیا ہے اس میں اولیاء اللہ کی پانسو حکائتیں تھیں اور پانچویں نے دوسری کتب سے ملادیں اب ہزار ہو گئیں اور اس کا نام رکھا ہے نزہۃ البساتین۔ یہ کتاب خود بھی مطالعہ میں رکھئے اور گھر والوں کو بھی سنایا کیجئے۔ البتہ بعض حکایات اس میں بھی غامض ہیں ان کو چھوڑ دیا کیجئے۔ اس پر نفس پرستوں کو یہ وسوسہ ضرور ہوگا کہ اس سے تو دنیا کا مزہ ہی جاتا رہے گا۔ میں کہتا ہوں خدا کی قسم اس سے تو دنیا میں پہلے سے زیادہ مزہ آنے لگے گا۔ دیکھئے آرام کی لذت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو خود آم بلا شیریں مزہ دار تو اس میں تو محض آم ہی کا مزہ ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ محبوب نے آپ کو مزہ دار آم دیا تو اس میں دو لطف ہیں ایک عین کا اور اضافت کا یعنی اس کے انتساب الی المحبوب کا کہ کھاتے ہوئے اس کا بھی مزہ لے رہے ہیں کہ یہ ہم کو محبوب نے بھیجا ہے تو بتلائیے کہ اب مزہ زیادہ ہے یا پہلے زیادہ تھا۔ اسی طرح تعلق مع اللہ سے پہلے آپ گھر میں بیٹھے تورمہ کھا رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد تعلق مع اللہ

کے اثر سے آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تو محبوب کا دیا ہوا ہے تو اب جو مزہ آویگا قورمہ میں وہ پہلے ہرگز نہ تھا۔ پہلے صرف قورمہ ہی تھا اور اب محبوب کا دیا ہوا قورمہ ہے۔ تو بتلایئے لطف بڑھے گا یا کم ہوگا۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ محبان حق کو خود دنیا میں بھی جو لطف حاصل ہے دنیا دار اس لطف سے محروم ہیں کیونکہ انھیں اس انتساب کا لطف میسر نہیں اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو خود قورمہ کا بھی لطف حاصل نہیں کیونکہ وہ جس ظرف میں کھا رہے اس میں مٹی پڑی ہوئی ہے جس سے سارا قورمہ کرکرا ہو رہا ہے وہ ظرف ذہن ہے اور مٹی کدورت و تشویشات و تفکرات دنیا ہیں کہ فلانے نے دعوٰے کر دیا ہے۔ یا فلانے کے ذمہ اتنا روپیہ ہے دیکھئے وصول بھی ہو یا نہ ہو۔ اہل اللہ کے پیالے میں یہ مٹی نہیں ہے وہاں تو خالص قورمہ ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ اہل اللہ کو حوادث و تفکرات پیش نہیں آتے۔ پیش آتے ہیں مگر آپ میں اور ان میں حوادث کی حالت میں بھی فرق ہے وہ یہ کہ آپ حوادث کے متعلق تجویز و رائے رکھتے ہیں کہ اس طرح ہونا چاہیئے اور وہ اختیار میں نہیں اس سے سخت پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں اور اہل اللہ اپنی تجویزیں تمام تر مشیت الٰہی میں فنا کر دیتے ہیں اور ان کا مذہب یہ ہوگیا ہے کہ ؎ ع

ہر چہ از دوست میرسد نیکو است (جو کچھ دوست کی جانب سے پہونچتا ہے وہ بہتر ہے)

اور یہ مذہب ہے کہ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من ۔۔۔ دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو وہ مجھ کو پسندیدہ ہے۔ میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

باقی یہ کہ یہ مذہب ان کا کیسے ہو جاتا ہے سو اس طرح ہو جاتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے محبوب کے حکم سے ہوتا ہے یہ عقیدہ ان کا حال

بن گیا ہے تو اب ان کی کلفت کی ایسی مثال ہے جیسے محبوب کسی عاشق کو پیچھے سے آکر اپنی آغوش میں زور سے دبالے تو جب تک اس نے محبوب کو دیکھا نہیں اس وقت تک تو جھنجلاتا ہے کہ یہ کون مجھے دبانے لگا مگر پھر جو دیکھا کہ محبوب دبا رہا ہے تو اب یہ حالت ہے کہ پہلے سے زیادہ دبانے کی تمنا کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ تکلیف ہوئی ہو تو چھوڑ دوں اور تیرا رقیب چاہتا ہے کہ مجھے دبالو تو میں اس کو دبالوں تو اس وقت وہ عاشق کہتا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو جو آپ تلوار سے ہلاک ہو دوستوں ہی کا سر سلامت ہے کہ اس پر آپ خنجر کے وار کریں)

اسی طرح اہل اللہ کی حالت ہے کہ انھیں تکالیف دنیا تو کیا گوارا ہوتیں ان کو موت بھی ناگوار نہیں کیونکہ وہ سب ایسی ذات کا تصرف ہے جو ان کا دلربا ہے اس لئے یہ حالت ہے کہ بچہ بھی بیمار ہے مگر جیسی سوچ ان اہل دنیا کو ہوتی ہے کہ ہائے مرگیا تو کیا ہوگا وہاں کچھ بھی نہیں اور اس تمام تر پریشانی ورنج کی جڑ یہ تجویز ہی ہے اور جب تجویز ہی نہ کرے تو رنج کیسا اس لئے کہتا ہوں کہ آپ کے پیالہ میں سے تو قورمہ کا بھی لطف مفقود ہے سو ایک تو آپ کا قورمہ ہے کہ اس میں مٹی ملی ہوئی ہے اور ایک اہل اللہ کا قورمہ ہے کہ بالکل صاف ہے کوئی کہے اہل اللہ کا قورمہ کیسا کیا اہل اللہ بھی قورمہ کھاتے ہیں کیوں کیا ہوا کیا قورمہ کھانا حرام ہے بعض لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اہل اللہ کو لذائذ حرام ہیں۔ جیسے ایک شخص نے میری نسبت اعتراضاً کہا تھا کہ کپڑا اچھا پہنتا ہے اسی طرح لوگوں نے اہل اللہ کی نسبت سوچ رکھا ہے کہ بس یہ سوکھی روٹیاں کھاویں تو اہل اللہ ہیں ورنہ نہیں ہیں یہ غلط ہے۔ ہاں اہل اللہ کو قورمہ کی فکر نہیں ہوتی ان کے سامنے جو نعمت بھی آجاوے وہ قورمہ ہی ہے اور جو قورمہ بھی آجاوے وہ اس کو نعمت سمجھ کر کھاتے ہیں لذت نفس کے لئے نہیں کھاتے تو انھیں ایک تو قورمہ کا لطف دوسرے انتساب الی المحبوب کا اور تیسرے یہ کہ وہ کرکرا نہیں ہے۔ کیونکہ نہ وہاں مقدمہ کی فکر ہے نہ بیٹے کا غم اور اس سب کی

وجہ وہی محبت اور محبت واقع میں ایسی ہی چیز ہے ؎
از محبت تلخہا شیریں شود (محبت سے ناگوار باتیں بھی گوارا ہیں)
حقیقت میں شاہی زندگی اہل اللہ ہی کی ہے اسی کو فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ (جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس کو بالعلف زندگی دیں گے اور ان کو اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے) یعنی عمل صالح کی جزا محض ادھار ہی نہیں ہے جیسے عوام کا خیال ہے بلکہ اس کی ایک جزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور وہ حیات طیبہ ہے کہ جس میں کوئی غم وفکر نہیں ہے کسی نے حضرت بہلول دانا سے پوچھا کہ آپ کا مزاج کیسا ہے۔ کہا کیا پوچھتے ہو اس شخص کا مزاج کہ دنیا میں کوئی کام اس کی خواہش کے خلاف نہ ہو۔ اس نے پوچھا یہ کیسے فرمایا دنیا میں جو کام ہوتا ہے یہ تو مسلم ہے کہ وہ خدا کے ارادہ کے خلاف نہیں ہوتا اور میں نے اپنے ارادہ کو ان کے ارادہ میں فنا کر دیا ہے تو جب وہ خدا کے ارادہ کے موافق ہے تو میری بھی خواہش کے مطابق ہوا۔ حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ جو معاصر ہیں حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فرماتے ہیں جب ارواح کو جمع کیا گیا تو ہر ایک سے پوچھا گیا کیا چاہتے ہو تو جس کی سمجھ میں آیا وہ اس نے مانگا جب اس نا چیز کی نوبت آئی اور پوچھا گیا کیا چاہتے ہو۔ میں نے کہا اُرِيْدُ اَنْ لَّا اُرِيْدَ وَاَخْتَارُ اَنْ لَّا اَخْتَارَ یعنی میں یہی تجویز کرتا ہوں کہ کچھ تجویز نہ کروں۔ اور یہی چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں فَاَعْطَانِيْ مَا لَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ اِلٰى مِنْ اَهْلِ هٰذَا الْعَصْرِ پس مجھے وہ چیزیں عطا ہوئیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں ان کا وسوسہ ہی آیا اس زمانہ والوں سے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کا رتبہ حضرت غوث اعظم سے بھی بڑھا ہوا ہو ممکن ہے کہ اکثر اہل عصر مراد ہوں اور ایک حیثیت سے یہ بڑھے ہوئے ہوں اور ایک حیثیت سے

عہ حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مشہور کتاب "بنیان المشید" ملنے کا پتہ (مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی) ۱۲

وہ اس بارہ میں گو نص تو ہے نہیں جو کسی ایک شق کا جزم کیا جاوے اور یہی فیصلہ ان صحابہ کے بارہ میں بھی ہے جن کی افضلیت مطلقہ منصوص نہیں ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کہ آپ تو علی الاطلاق سب سے افضل ہیں۔ باقی انبیاء کے تفاضل میں بھی یہی فیصلہ ہے کہ ایک فضیلت کے اعتبار سے ایک افضل ہوں اور دوسری فضیلت کے اعتبار سے دوسرے۔ تو دیکھئے فنا کا ارادہ کیا چیز ہے کہ اتنی بڑی دولت اس کی بدولت ملی۔ ایک منطقی نے اس پر اعتراض کیا کہ جب عدم ارادہ کا ارادہ کیا تو یہ بھی ایک ارادہ ہے تو ارادہ پایا گیا پھر عدم ارادہ کا حکم کیسے صحیح ہوا مگر یہ لوگ خادم الفاظ ہوتے ہیں اور صوفیہ اہل معانی ہیں ابن عطار نے اس کا خوب جواب دیا ہے کہ وہ مطلق ارادہ کے فنا کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اس ارادہ کے فنا کو کہتے ہیں جو مزاحم رضا رحق ہو اور عدم ارادہ کا مزاحم ارادہ اور حق نہیں تو اس کے ارادہ کی نفی نہیں کرتے معترض تو منہ دیکھ کے رہ گیا ہوگا یہ معقولی لوگ ہمیشہ لفظوں ہی کے گورکھ دھندے میں رہتے ہیں پھر اپنے کو اہل معانی کہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مشہور اور لغو اشکال ہے کلامی ہذا کاذب ہیں کہ ہذا کا مشار الیہ یہی کلام ہو تو یہ کلام صادق ہے یا کاذب اور پھر اس پر بڑی بڑی بحثوں میں وقت ضائع کیا ہے مگر اے اللہ محاورہ میں کسی نے بھی یہ جملہ آج تک استعمال کیا ہے بس ایک صورت اپنی طرف سے گھڑلی اور اشکال کر دیا ہے اس کا وقوع ہو یا نہ ہو انہیں صوفیہ تو کیا منہ لگاتے عوام بھی نہیں پوچھتے۔ چنانچہ ایک منطقی طالب علم کسی تیلی کی دوکان پر گئے تیل خریدنے اس کے بیل کے گلے میں گھنٹی بندھی دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیوں باندھی ہے اس نے کہا اس لئے تاکہ گھنٹی کی آواز سے یہ معلوم ہو جائے کہ بیل چل رہا ہے آپ نے کہا آواز سے تو بیل کا چلنا لازم نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ وہ کھڑے کھڑے گردن ہلایا کرے۔ اس نے کہا جی ہاں یہ تو سچ ہے مگر میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی ہے۔ آپ میرے بیل کو بگاڑنے آئے ہیں مہربانی کر کے تشریف لے جایئے یہ قدر کی منطقی صاحب کی اس تیلی نے تو غرض فنا، ارادہ صوفیہ کا ایک

خاص مشرب ہے کہ اس کے بعد وہ ہر حال میں خوش ہیں ہاں الم طبعی رضائے عقلی کے خلاف نہیں۔ تو کیا اچھا نسخہ ہے محبت الٰہیہ جس سے دنیا بھی لذیذ اور دین بھی کامل یہ تو اہل محبت کی جماعت ہے کہ مزے لوٹ رہے ہیں کہ ایک جماعت منکرین کی ہے کہ ان کو مزہ تو کیا نصیب ہوتا خود وجود محبت ہی کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ محبت الٰہیہ کے کوئی معنی ہی نہیں کیونکہ بے دیکھے محبت ہو ہی نہیں سکتی اور حق تعالےٰ کو کوئی دیکھ نہیں سکتا مگر اس شخص نے نہایت بے حسی سے کام لیا ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ہم لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا اور نہ اپنے کانوں سے آپ کی باتیں سنیں۔ اور پھر آپ کی محبت مسلمانوں کے دل میں کس قدر ہے کہ جان دینے کو تیار ہیں تو محبت رویت ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہاں محبت کی بعض قسمیں ایسی بھی ہیں جو دیکھنے پر موقوف ہیں۔ لیکن عقلی محبت تو کسی طرح بھی اس پر موقوف نہیں۔ مثلاً ہم لوگوں کو حضرت امام ابو حنیفہ رؒ سے بوجہ ان کے کمالات فقیہ وعبادت و ورع کے خاص محبت ہے اگر کسی طرح سے آپ کو دیکھ لیں اور یہ معلوم ہو جاوے کہ آپ حسین نہیں ہیں تو کیا یہ محبت گھٹے گی ہرگز نہیں کیونکہ ہمیں جو محبت ہے وہ تو آپ کے کمالات سے ہے اور اس کا ادراک بصر پر موقوف نہیں۔ تو پھر خدا تعالےٰ کے ساتھ محبت میں کیا استبعاد رہا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس کا نام ہے محبت حسن وہ بھی درحقیقت کمال ہی کی محبت ہے کیونکہ حسن بھی ایک کمال ہے اور اگر کمال سے قطع نظر حسن ہی کو بالذات موثر فی المحبت کہا جاوے تب بھی اگر زیادہ غور کیا جاوے تو جس حسین کی بھی محبت ہو وہ واقع میں حق تعالیٰ ہی کی ہے۔ اب میں منکرین محبت حق پر احتجاج کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ حسن وجمال جس محبوب کی صفت ہے وہ اس کی صفت بالذات ہے یا بالعرض اگر بالذات ہے تو زائل کیوں ہوتی ہے۔ چار دن بخار آیا اور چہرہ زرد پڑ گیا ذرا سی چیچک نکل آئی اور معلوم ہوا کہ مرغ نے گوبریں ٹھونگیں مار دی ہیں اور اسی لئے صفت کی زوال کے ساتھ خود محبت بھی رخصت ہو جاتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

عشق با مردہ نباشد پائدار — عشق را باحی و با قیوم دار

عشق ہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں — عشق ہائے اولیں و آخریں

(مردہ کے ساتھ عشق کو پائیداری نہیں اس سے اس حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے جو عشق و محبت محض رنگ و روپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں بلکہ محض ننگ ہوتا ہے یعنی انجام اس کا حسرت ہے عشق حقیقی میں غرق ہو جا اس میں غرق ہونا اولین و

اور جب یہ مجازی حسن و جمال صفت بالذات نہیں بالعرض ہے تو اس کے لئے ما بالذات کی ضرورت ہوگی اور تم جس کو ما بالذات بتاؤ گے اگر وہ فانی و حادث ہے تو یہی کلام اس میں برابر ہوتا رہے گا یہاں تک کہ منتہا ہوگا حق تعالیٰ پر اَلَا اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ (یاد رکھو کہ تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں) اور چونکہ ہے کمالات مقصودہ سے اس لئے مرجعیت کی صورت اتصاف بالذات ہوگا تو معلوم ہوا کہ حسن و جمال بھی اصل صفت حق تعالیٰ ہی کی ہے مگر کہیں اس سے یہ نہ سمجھے گا کہ یہ صفت خدا تعالےٰ کی صفت اسی ہیئت سے ہے جس ہیئت سے مخلوق میں ظاہر ہے ہرگز نہیں ہرگز نہیں بلکہ بلاتشبیہ اس کی ایسی ناتمام مثال ہے جیسے آفتاب نکلا اور اس کی کرن کسی آئینہ میں سرخ اور کسی میں سبز معلوم ہونے لگی تو کیا آفتاب کو سرخ و سبز کہنے لگیں گے ہرگز نہیں آفتاب کی شعاع کا رنگ تو ایک ہی ہے مگر خصوصیت محل کی وجہ سے یہ فرق ہو گیا ہے۔ اسی طرح حق تعالےٰ کا حسن تو واحد ہے اور اس کی کوئی مثال بھی بیان نہیں کی جا سکتی مگر اس کی شعاعیں مختلف محلوں میں مختلف نظر آتی ہیں اور ناتمام اس لئے کہا کہ مشبہ بہ میں تو حقیقت شعاع کی اور اس کے تعلق بآئینہ کی حقیقت معلوم ہے اور مشبہ میں نہ صفت حق کی حقیقت معلوم نہ اس کے وجہ تعلق بالمظاہر کی۔ مگر جو مقصود ہے تشبیہ سے وہ ظاہر ہے اور وہ مقصود یہ ہے کہ جب عشق حسن پر ہوتا ہے اور وہ اصل میں صفت حق تعالےٰ کی ہے تو وہ درحقیقت حق تعالےٰ ہی کے حسن کا عشق

کسی نے اس مضمون کو ناتمام تعبیر کیا ہے ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ　　پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

(اپنے حسن کو حسینوں کے چہرہ سے ظاہر کیا ہے۔ عاشقوں کی آنکھ میں اپنے آپ کو تماشہ بنایا ہے)

پرتو حسنت نگنجد در زمین و آسماں　　در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جاں کردۂ

(آپ کے حسن کا پرتو زمین و آسمان میں نہیں سماتا ہے میں حیران ہوں کہ میرے حریم سینہ میں کیونکر جگہ کرلی ہے)

اور ایک حسن ہی کیا۔ تمام صفات کمال کا یہی حال ہے کہ انسان کا علم فضل عطا جود حسن وغیرہ تمام صفات کمال میں حق تعالیٰ ہی متصف بالذات ہیں پس اگر حسن کی یا اور کسی کمال کی وجہ سے کوئی کسی پر عاشق ہے تو وہ در حقیقت حضرت حق ہی کا عاشق ہے مگر اسے خبر نہیں جیسے دیوار پر آفتاب کی روشنی دیکھ کے کوئی دیوار کا عاشق ہوا تو وہ در حقیقت آفتاب کا عاشق ہے دیوار کا عاشق نہیں مگر اُسے آفتاب کی خبر نہیں۔ اب جو آفتاب غروب ہونے لگا اور روشنی چلی تو چلاتا ہے کہ ہائے میرا محبوب چلا اور اگر اس کو حقیقت معلوم ہوجاتی تو یہ پریشانی نہ ہوتی۔ کیونکہ غروب کے سبب صرف دیوار کے اوپر سے وہ روشنی غائب ہوئی ہے آفتاب سے تو غائب نہیں ہوئی۔ وہاں تو اب بھی موجود ہے اسی طرح علم کو صحیح کرلیا جائے تو پھر کسی محبوب مجازی کے فوت سے غم نہ ہو کیوں کہ اس میں تو محبوب حقیقی کا عکس تھا۔ جب محبوب حقیقی باقی ہے تو یہ کمال بھی باقی ہے پھر رنج کاہے کا۔ پس اگر کسی سے سخاوت کی وجہ سے محبت ہے تو اب بھی وہی ذات پاک محبوب ہے۔ اور اگر علم کی وجہ سے محبت ہے تو وہ بھی وہی محبوب ہے اور حسن کی وجہ سے محبت ہے تو بھی وہی محبوب ہے اسی واسطے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے مدلول کا ایک درجہ عارفین کے نزدیک یہ بھی ہے کہ لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہ بلکہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ (اللہ کے سوا کوئی مطلوب نہیں اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں) مگر شریعت نے اس کے ساتھ حکمت کی رعایت سے اسباب کا بھی لحاظ کیا ہے۔ ورنہ لاموجود الا اللہ کی بنا پر تو بندہ کا کسی پر کچھ احسان ہی نہ ہوتا اور نہ کوئی کسی کا احسان مانتا اور اس سے تمدن برباد ہوجانے کا اندیشہ تھا اسی واسطے بقائے تمدن کے لئے یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہ (جو شخص لوگوں کا شکریہ ادا نہ کرے وہ اللہ کے شکریہ سے بھی سبکدوش نہیں ہوا)

اگر کوئی احسان کرے تو گو محسن حقیقی تو حق تعالیٰ ہی ہیں اس لئے اصل شکر تو ان کا ہونا چاہیئے مگر یہ ظاہری محسن درمیان میں واسطہ تو ہے اس لئے اس کا بھی شکر کرنا چاہیئے پھر دیکھئے شریعت نے معاملہ بواسطہ میں بھی تعدیل فرمائی ہے کہ یہ بتا دیا کہ مخلوق واسطہ تو ہے مگر ہے انہیں کا بنایا ہوا۔ اس لئے یہاں بھی انتساب الی المحبوب ہی سبب شکر ومحبت کا ہونا چاہیئے اور اس کو بھی مرآت جمال حق بنانا چاہیئے یہ نہیں کہ اسی کا عاشق ہو جائے اور اس کو مستقل سمجھ لیا جائے اور یہاں ایک دقیقہ ہے جسے صوفیہ نے سمجھا ہے۔ وہ یہ کہ محبوبوں کی عادت ہے کہ کبھی بے حجاب ہو کے جمال دکھاتے ہیں اور کبھی باریک پردہ چہرہ پر ڈال لیتے ہیں کہ خفیف سی جھلک عاشق کو دکھلائی دے اسی عادت کے موافق سمجھو کہ جس وقت دوسرے کے واسطے سے کوئی احسان ہوتا ہے اس وقت بھی حق تعالیٰ ہی کی تجلی ہو رہی ہے مگر چلمن کے پیچھے سے یا نقاب کے اندر سے اور اس میں بھی ایک لطیف حکمت ہوتی ہے وہ یہ کہ ناسوتی استعداد کے اقتضا سے ایک ہی طرح کی تجلی عاشق کے جذبات محبت بھڑکانے کو کافی نہیں۔ بلکہ گوناں گوں تجلیات سے اس کا شوق زیادہ ہوتا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں مُشَاهَدَةُ الْاَبْرَارِ بَيْنَ التَّجَلِّيْ وَالْاِسْتِتَارِ (عارفین کا مشاہدہ تجلی اور استتار کے درمیان ہوتا ہے) یہاں مقابلہ کی وجہ سے دوسری تجلی کو استتار کہا کہ اس کے سامنے وہ استتار ہی معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ تجلی وہ بھی ہے گو خفیف ہے تو یوں سمجھئے کہ ایک مرتبہ تو بلا آئینہ کے جمال دکھاتے ہیں اور ایک مرتبہ آئینہ کے اندر سے دکھلاتے ہیں جس میں راز یہ ہے کہ انسان اُسی ناسوتی استعداد کی خاصیت سے ایک حالت سے اکتا جاتا ہے اگر یہ استتار یا غیبت بالکل نہ ہوتی تو دوام تجلی کا لطف ہی برباد ہو جاتا ؂

از دستِ ہجرِ یار شکایت نمی کنم ۔۔۔ گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

(محبوب کی جدائی کی شکایت نہیں اگر جدائی نہ ہوتی تو وصل میں لطف ولذت نہ ہوتی)

تو حق تعالیٰ نے واسطہ کے ذریعے سے سالک کا مزہ بڑھا دیا۔ اور یہاں تفریع کرتا ہوں کہ اب تو سمجھ میں آگیا ہوگا کہ جو مرے تصوف کے ہیں وہ شریعت ہی کی

بدولت ہیں یہ بات بھی شریعت ہی کی بدولت تو معلوم ہوئی کہ یہ وسائط مرایا جمال حق کے ہیں ان کا بھی حق ادا کرنا چاہیئے اور اس واسطہ سے بھی مشاہدہ کی لذت حاصل کرنا چاہیئے اب جو لوگ ان وسائط کو درمیان سے اڑانا چاہتے ہیں اور ہر وقت تجلی بلا واسطہ کے طالب ہیں وہ لذت مشاہدہ سے محروم ہیں۔ اسی واسطے جو لوگ کثرت سے سماع سنتے ہیں انھیں کچھ مزا نہیں آتا کیونکہ اب وہ بدون سماع کے چل ہی نہیں سکتے نہ اُن کو نماز میں لطف آتا ہے نہ ذکر میں اور بزرگوں نے جو ایسا کیا ہے اس کے لئے کچھ شرائط مقرر کر دیتے ہیں اور مقصود شرائط کا یہ ہے کہ تقلیل ہو اور تقلیل سے مزہ آوے ورنہ روز کی دال روٹی میں کیا مزہ اور اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تقلیل کے ساتھ علی الاطلاق اجازت ہے خود اس میں بھی شرائط ہیں۔ جن کی حکمت علاوہ تقلیل کے دوسری مضرتوں سے بچانا بھی ہے جو فاقد شرائط میں مرتب ہو جاتی ہیں۔ مقصود مقام کا یہ ہے کہ کثرت سماع میں اگر بالفرض مضرتیں بھی نہ ہوتیں تب بھی اس لئے واجب الترک تھا کہ یہی مصلحت ہے سماع میں وہ اس میں نہیں پائی جاتیں خیر یہ تو تفریع تھی حکمت واسطہ پر مقصود یہ کہنا ہے کہ ظاہر محسن محض واسطہ ہے باقی اصل میں سارے کمالات حقیقۃً انھیں کے ہیں اس لئے بندہ جس سے جس کمال کی وجہ سے بھی محبت کر رہا ہے حقیقت میں وہ انھیں سے محبت ہے پھر محبت حق کے حاصل کرنے کو جو طرق بتلائے جاتے ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ محبت تو اس شخص کو خدا تعالیٰ کے ساتھ پہلے سے ہے صرف امالہ کی ضرورت ہے اور اس امالہ کے لئے وہی دستور العمل ہے جو میں نے اوپر بتایا ہے اُسے کر لیجئے اور حیوٰۃ طیبہ لے لیجئے اور اس میں ایک جزو اہل اللہ سے تعلق رکھنا بھی ہے۔ اس کا ایک حق ضروری بھی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ جب اہل اللہ کے یہاں پہنچ جائے تو وظیفہ ومطالعہ سب کو الگ کیجئے مگر ضروریات دین کو الگ نہ کیجئے اور اب جو وہ دین اُسے لیجئے اور بالکل ان کے یہاں ایسے ہو جایئے ؎

قال را بگذار مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑو حال پیدا کرو یہ اس وقت پیدا ہو گا جب کسی اہل اللہ کے قدموں جا کر پڑجاؤ)

ہاں یہ شرط ہے کہ وہ مرد کامل ہو مرد کاہل نہ ہو اور پھر مرد ہو مردہ نہ ہو کیونکہ مردہ تو خود ہی پامال ہو رہا ہے وہ آپ کو کیا پامال کرے گا اسی واسطے حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ؎

عالمت خفتہ و تو ہم خفتہ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

(پیر تمہارا سویا ہوا ہے اور تم بھی سوئے ہوئے ہو سویا ہوا سوئے ہوئے کو بیدار نہیں کر سکتا)

پیر جی بنایا تو وہ بھی خفتہ اب یہ مرید کیسے بیدار ہو گا۔ اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس شعر کو رد کیا ہے کہ ؎

باطل است آنچہ مدعی گوید خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

(یہ جو مدعی کہتا ہے سوئے ہوئے کو سویا ہوا کب بیدار کر سکتا ہے باطل ہے)

اس سے غرض شعر کا رد کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ظاہر شعر سے احتمال تھا کسی کے تمسک کرنے کا کہ ہمارے علماء بے عمل ہیں اس لئے ہم ان کا اتباع نہیں کرتے اس کو رد فرماتے ہیں چنانچہ شیخ کا شعر سابق اس کا قرینہ ہے ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ور نبشت است پند بر دیوار

(آدمی کو ایسا ہونا چاہیئے کہ نصیحت کی بات اگر دیوار پر بھی لکھی ہو تو اس کو بھی حاصل کر لے)

اور غرض سنائی کی نفی کرتا ہے تاثیر کا سو یہ بالکل صحیح اور مشاہد ہے اور میری غرض بھی اس کے لانے سے یہ ہے کہ صاحب تاثیر سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے کہ زیادہ نفع ہو۔ اب اس کی تحقیق باقی رہی کہ اس مرد کامل کی پہچان کیا ہے سو اس سے پہلے جلسہ میں شیخ کامل کے علامات بتا چکا ہوں اگر وہ علامات نہ ہوں گی تو پھر پیر الماث ہی الماث ہیں تو تم بھی الماث میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ یہاں تک یہ سب بیان تھا معبود کے حقوق اور ان حقوق کی تحصیل و تکمیل کے طریقہ کے متعلق اب ایک مضمون جو اس کا تتمہ ہے باقی رہ گیا اور وہ حقوق ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے

اور گو اب اس کا وقت نہیں رہا مگر دس منٹ میں اس کے متعلق کچھ کہے دیتا ہوں وہ یہ کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نائب کامل اور مظہر اتم ہیں حضرت حق کے اور اس سے زیادہ آپ کا ہم پر کیا احسان ہوگا کہ دین ملا آپ ہی کی بدولت اور ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ (جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکریہ ادا نہیں کر سکتا) اور اس کلیہ کے علاوہ خود مستقل حقوق بھی جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن میں آئے ہیں اور وہ مثل حقوق الہیہ کے تین ہی حق ہیں اطاعت و محبت و عظمت۔ چنانچہ مختصراً و مختلطاً مع بعض فروع کے ان کو عرض کرتا ہوں مثلاً۔ ایک نوع حق محبت کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کا دل دکھانے کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ ارشاد ہے وَمَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ الآیۃ (تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہ دینی چاہئے) وَغَیْرُھَا مِنَ الْآیَاتِ۔ اس پر میں ایک تفریع کرتا ہوں وہ یہ کہ احادیث میں وارد ہے کہ آپ پر امتیوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو ہماری بداعمالیوں سے جبکہ ملائکہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہوں گے آپ کا کتنا دل دکھتا ہوگا تو اس سے کس قدر احتراز لازم ہوگا اور عظمت کے متعلق آپ کا یہ حق وارد ہے کہ لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تم سبقت مت کیا کرو) اور اسی باب میں فرماتے ہیں۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ (اے ایمان والو اپنی آوازیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند مت کیا کرو) آپ کے آگے چیخ کے مت بولو اور اسی طرح ارشاد ہے وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (اور نہ ان سے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو) یعنی معمولی طور سے آپ کو پکارو مت کبھی ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال غارت ہو جاویں آگے فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ط وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ یعنی جو لوگ حجروں کے پیچھے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں واقعہ یہ ہوا تھا کہ کچھ دیہاتی بیوقوف آئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت زنانہ میں تشریف رکھتے تھے مگر انہیں یہ نہ معلوم تھا کہ کون سے قطعہ میں ہیں انہوں نے کہا ایک ایک آدمی ایک ایک

حجرہ کے مقابل کھڑے ہو کر پکارے کہیں تو سن لیں گے۔ اس پر حق تعالیٰ نے انھیں آیت بالا میں ڈانٹا۔ اور اس کی یہ اصلاح فرمائی کہ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ یعنی اگر ذرا دیر اور ٹھہرے رہتے یہاں تک کہ آپ خود ہی باہر تشریف لے آتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ یعنی انھیں کیا حق ہے کہ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکاریں۔ اس مقام پر میں حضرات سامعین سے تفریعًا و تفریحًا ایک سوال کرتا ہوں کہ جب حجرہ کے باہر سے آپ کو پکارنا جائز نہیں تو ہندوستان سے پکارنا کب جائز ہوگا میں فتویٰ نہیں دیتا آپ سے پوچھتا ہوں یہ تو عظمت کے متعلق کچھ مضمون تھا۔ اسی طرح جیسے حق تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے ویسی ہی آپ کی بھی فرض ہے۔ اور اسی طرح جیسے حق تعالیٰ کی محبت فرض ہے ویسی ہی آپ کی بھی فرض ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک سب سے زائد محبوب نہ ہو جاؤں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا مجھے آپ کے ساتھ سب سے زائد محبت ہے بجز اپنے نفس کے تو آپ نے فرمایا کہ جب تک اپنے نفس سے بھی زیادہ مجھ سے محبت نہ کرو گے مومن نہ ہو گے اس کے بعد انھوں نے عرض کیا کہ اب نفس سے بھی زیادہ آپ کی محبت پاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تو بس اب مومن بھی ہو۔ خیر اس حدیث کی ایک شرح بھی ہے۔ جس کا اب وقت نہیں ہے مگر اتنا سنا دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی جان سے بھی زیادہ محبت ہونا چاہیئے۔ اگر طبعی نہ ہو تو عقلی تو ہوتا ہی چاہیئے اور آپ کے ان حقوق کی بجا آوری میں بھی عام کوتاہی ہو رہی ہے حتیٰ کہ جو لوگ آپ کے حقوق کو بزعم خود ادا کر رہے ہیں وہ بھی اُس کوتاہی سے بری نہیں اور وہ اس طرح کہ آپ کے جو تین حق ہیں۔ مطاوعت، عظمت، محبت جن کا اوپر بیان ہوا ہے ان میں اکثر لوگوں نے تجزیہ کر رکھا ہے سو بعضوں نے تو صرف مطاوعت کو لے لیا ہے مگر محبت و عظمت کے

؎ اس مقام کے متعلق ایک حاشیہ ہے جو وعظ کے اخیر میں ملحق ہے ملاحظہ فرمالیا جاوے ۱۲ اشرف علی

حقوق کو چھوڑ دیا ہے۔ باقی بعض جگہ یہ بھی ہوا ہے کہ واقع میں تو نہیں چھوڑا ہے لیکن دوسرے لوگوں نے اپنی سوء فہمی سے اُسے زبردستی سے موہم گستاخی کا بنا لیا تو اس کا ذکر نہیں اور اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں ایسے تو اعتراض تو لوگوں نے اللہ تعالےٰ پر بھی کئے ہیں کہ ہائے اللہ میاں قرآن میں مکھی مچھر کا ذکر کرتے ہیں جو حقیر چیزیں ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ اور بعض نے یہ کیا کہ محبت کا تو دم بھرتے ہیں مگر مطاوعت و عظمت کو بالکل ہی اڑا دیا ہے کہ نہ نماز ہے نہ روزہ نہ دین کے اور کام اور گمان یہ ہے کہ نری محبت سے نجات ہو جاوے گی اور یہ شعر یاد کر لیا ہے ؎

نہ ماند بعصیاں کسے در گرو   کہ دارد چنیں سید پیشرو

(گناہوں کی وجہ وہ شخص نہ رہے گا جو آپ جیسا سردار سربراہ رکھتا ہو)

حالانکہ اس کے ساتھ قرآن کی یہ آیت بھی ملانا چاہیئے کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ رَهِينَةٌ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر نفس کو اس کے اعمال کے بدلے میں قید حبس ہوگی ہاں اتنا ضرور ہے کہ مومن اخیر تک محبوس عذاب نہیں رہیگا شفاعت سے کسی وقت نجات ہو جائے گی تو کیا جہنم کی تھوڑی سی قید آپ کو گوارا ہے۔ صاحبو وہاں کا عذاب تحمل سے باہر ہے اس کے علاوہ میں خود دعوے محبت ہی کے متعلق کہتا ہوں کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی سے محبت ہو اور اس کی اطاعت نہ ہو۔ ایک شخص سے محبت کا تو دعوے مگر نہ اس سے بات کرتے ہیں نہ اس کی طرف دیکھتے ہیں نہ اس سے مصافحہ کرتے ہیں کسی نے کہا ارے یہ کیسی محبت ہے تو کہا ہیں پاک محبت ہے تو کیا کوئی کہے گا کہ اسے محبت ہے ہرگز نہیں۔ کیونکہ محبت کے لئے تو لازم ہے اقتراب۔ اور یہ شخص اسباب بعد میں مبتلا ہے بلکہ از خود ان اسباب کو اختیار کر رہا ہے پھر محبت کیسی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعوےٰ ہو اور اطاعت نہ کی جاوے تو یہ کیسی محبت ہے۔ فرض کرو ایک محب ہے کسی محبوب نے

کہاکہ دو روپے کے آم لے آؤ اس نے کہا نہ صاحب میں تو نہ لاؤں گا۔ کیونکہ اتنی دیر تک آپ کو کیسے دیکھوں گا ہر شخص یہی کہے گا کہ بس معلوم ہوا کہ یہ محب ہی نہیں۔ ورنہ اطاعت کرتا اور فوراً چل دیتا کیونکہ محب کا تو یہ مذہب ہوتا ہے ؎

اُرِیْدُ وِصَالَہٗ وَیُرِیْدُ ھِجْرِیْ فَاَتْرُكُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

(میں محبوب کے وصال کا خواہاں ہوں اور وہ ہجر کے خواہاں سو میں نے اپنی خواہش کو ان کی خواہش کی وجہ سے ترک کر دیا)

اسی کا ترجمہ حضرت حافظ کرتے ہیں ؎

میل من سوی وصال و میل او سوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میری خواہش وصال کی ہے محبوب فراق کا خواہشمند ہے۔ میں نے اپنی خواہش کو ترک کر دیا محبوب کی خواہش پوری ہو)

یعنی مجھے اپنی مرضی کو محبوب کی مرضی کے آگے فنا کر دینا چاہیئے۔ اگرچہ اس کی مرضی پر چلنے سے ظاہراً بعد ہی ہوتا ہے اور چہ جائیکہ اطاعت سے قرب بھی ہو چنانچہ ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (نماز پڑھتے رہئے اور قرب حاصل کرتے رہیئے) اور حدیث میں ہے۔ اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ حِیْنَ یَسْجُدُ فِی الصَّلٰوۃِ یعنی سب سے افضل حالت قرب کی سجدہ ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہم نماز سے غافل تو یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب تو آپ کو اپنے سے قریب کرنا چاہے اور آپ اس سے دور ہونا چاہتے ہیں اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

تَعْصِی الرَّسُوْلَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ ھٰذَا الْعَمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور آپ کی محبت کا اظہار کرتا ہے یہ بات تو نادر ہے)

لَوْ کَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

(اگر تیری محبت سچی ہوتی تو آپ کی اطاعت کرتا اس لئے محب جن کو محبوب پسند کرے اسکی اطاعت کرتا ہے)

اور بعض نے محبت اور مطاوعت دونوں کو اڑا دیا صرف تعظیم ہی لے لی اور وہ بھی اپنی طرف سے گھڑ کر جو واقع میں تعظیم بھی نہیں۔ اور یہ ان لوگوں نے کیا ہے جنھوں نے آجکل حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی خاص طرز کی سوانح عمریاں لکھی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اور آپ کے خلفاء میں اعلیٰ انتظام سلطنت کا ثابت کیا اور اپنے نزدیک آپ کی بڑی شان ظاہر کی مگر کمی یہ کی ہے کہ سلطان اور ملک دونوں کی حیثیت سے تو آپ کی عظمت بتائی مگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونے کی حیثیت سے نہیں بتائی معلوم ہوا کہ وہ آپ کی عظمت محض سلطنت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ حالانکہ اصل شان آپ کی نبوّت ہی ہے۔ اور سلطنت تو تابع ہے اور پھر اس پر ناز بھی ہے کہ ہم نے ایسی سیرت لکھی اور ویسی لکھی اور کہتے ہیں علماء تو تاریخ لکھنا نہیں آتی واقعی سچ ہے ایسی تاریخ لکھنا تو بے شک ہم کو نہیں آتی ہمارا تو یہ کام ہے ؎

ماقصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم   ازما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے دارا اور سکندر کے قصے نہیں پڑھے ہم سے سوائے عشق و محبت کی باتوں کے کچھ نہ دریافت کرو)

اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہ بھی ہیں مگر اصل صفت آپ کی نبوت ہی ہے اور سلطنت تو اس کے تابع ہے یعنی وہ بھی محض اس واسطے عطا ہوئی ہے تاکہ اس سے اغراض نبوت کی تکمیل ہو ورنہ آپ کا اصل جوہر تو یہ ہے کُنْتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ کہ میں اس وقت نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا کہ حضرت آدمؑ کے جسد کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا روح بھی اس میں نہ آئی تھی اور اسی طرح اصل کمال آپ کا یہ ہے کہ آپ خاتم ہیں سو آپ کا اصل کمال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے نبی ہیں اور سب کے آخر بھی کسی نے اس اولیت و آخریت میں نکتہ خوب نکالا ہے ؎

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدۂ   ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ

اے ختم رسل قرب تو معلومم شد   دیر آمدۂ از راہ دور آمدۂ

(پہلے تمام بادشاہوں سے آپ غیور آئے ہر چند کہ آخر ظہور میں آئے اے ختم رسل (صلی اللہ علیہ وسلم)

ؔ مراد اس سے محض تاریخ ہے جو کہ ان مدعیان تاریخ نویسی کا مطمح نظر ہے حتیٰ کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات لکھنے میں بھی ان صاحبوں کے نزدیک یہی حیثیت مقصود ہے اور ہماری نظر جس حیثیت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات پر ہے وہ حکایات مہر و وفا میں داخل ہے نہ تاریخ محض جو کہ قصہ سکندر و دارا سے مراد ہے ۱۲ منہ عفی عنہ۔

آپ کا قرب تو مجھ کو معلوم ہے دیر میں آئے دور راستے سے آئے)

واقعی نکتہ ہے عجیب و غریب کہ آپ چونکہ بہت دور سے آرہے ہیں اس لئے آنے میں اتنی دیر لگی۔ دوسرے انبیا مسافت قریبہ سے آئے ہیں اس لئے جلدی آگئے ان کو علمی دلیل نہ سمجھئے نشاط کے لئے لطیفہ کے طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس پر حضرات خلفاء کی فضیلت اور ترتیب کے متعلق بعض نکات یاد آگئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ (بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے) لفظ قرنی میں نکتہ یہ کہا گیا ہے کہ اس میں اشارہ ہے زمانہ خلافت نبوت کی طرف کیونکہ خلفاء اربعہ کے نام کے آخری حروف اس میں بہ ترتیب آگئے ہیں یعنی صدیقؓ کا ق اور عمرؓ کی ر اور عثمانؓ کا نون اور علیؓ کی ی۔ اور ایک نکتہ اردو میں بھی کسی نے نظم کیا ہے ؎

بو بکر یکسو علی ایک جانب خلافت کو گھیرے ہیں باصد صفائی
الف اور ی کی طرح ان کو جانو کہ محصور ہے جنمیں ساری خدائی
یہ تشبیہ ہے واقعی توجگہ بھی الف اور ی نے یہ ترتیب پائی
وہ اول خلیفہ کے اول میں آیا یہ آخر خلیفہ کے آخر میں آئی

بھلا کوئی شعر کہے ایسے تو کہے۔ غرض بادشاہی سے اغراض نبوت کی تکمیل مقصود تھی وہ خود مقصود نہ تھی اور وہ نبوت کی غرض اصلاح خلق ہے اور اصلاح خلق دو صورتوں سے ہو سکتی ہے۔ ایک حکومت سے دوسرے عقیدت سے یعنی ایک تو یہ کہ بادشاہ کی عقیدت ہے کہ لوگ اُسے بزرگ اور نیک سمجھ کے بڑا مانتے ہیں۔ اور ایک یہ کہ اگر نہ مانیں گے تو تلوار کے زور سے منوایا جائے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حق تعالیٰ نے اصلاح خلق کے لئے بھیجا تو دونوں قوتیں آپ میں جمع کردیں کہ جو اہل بصیرت ہیں وہ تو عقیدت سے مانیں گے اور آپ کے کمالات ذاتیہ کو پہچانیں گے اور جو اہل بصیرت نہیں ہیں وہ تلوار کے زور سے مانیں گے کیونکہ تلوار بھی بڑا واعظ ہے ہمارے استاد رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے ؎

اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِکَمِ وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ وَعَّاظٍ عَلَی الْقِمَمِ

(نصیحت اگر علم وحکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سر پر پڑتی نصیحت گروں میں سب سے بلیغ نصیحت گر ہے)

کہ سب سے بڑی وعظ تو تلوار ہے۔ یہ شعر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ہے۔ اور قرآن میں اس کا ماخذ یہ آیت ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (ہم نے اپنے پیغمبروں (علیہم السلام) کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کو نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے) اس کی تفسیر میں ہمارے مولانا فرمایا کرتے تھے۔ حدید سے مراد ہے نعلدار جوتہ (یعنی فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ کی صفت کے اعتبار سے سلاح مراد ہے جس کی تعبیر اہل محاورہ اس عنوان سے کیا کرتے ہیں) کیونکہ جو فہیم کم ہوتے ہیں ان کے لئے جوتہ کی بھی ضرورت ہے۔ بہرحال آپ میں نبوت کی بھی شان ہے اور سلطنت کی بھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سیرت نبویہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات سلطنت بیان نہ کئے جائیں آپ سلطنت کی شان ضرور بیان کیجئے مگر کتاب کو دو باب کیجئے۔ ایک میں سلطنت کی شان بیان کیجئے اور ایک میں نبوت کی۔ جب نبوت کا ذکر ہی نہیں تو اب تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ جو دعویٰ ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت پہچانی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ آپ نے عظمت پہچانی تو مگر ادھوری اور نامکمل اسی طرح ایک صاحب نے حضرت عمرؓ کی سوانحعمری لکھی کہ اس کے دیکھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ حضرت عمرؓ کی سوانحعمری ہے بلکہ اگر حضرت عمرؓ کا نام اس میں چھپا لیا جاوے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوشیرواں کی یا کسی بڑے مدبر و منتظم بادشاہ کی سوانحعمری ہے کیونکہ اس میں اس کا پتہ ہی نہیں کہ آپ کا تقویٰ کس درجہ کا تھا۔ دین سے آپ کو کس درجہ الفت تھی آپ کا زہد آپ کی ریاضت اور خلق اور شدت علی الکفار اور کرامات وغیرہ کس شان کی تھیں۔ غرض کسی چیز کا پتہ نہیں۔ بس صرف انتظام تمدن کو لئے پھرتے ہیں حالانکہ اتنے بڑے بڑے کمالات کے ہوتے ہوئے صرف سیاست مدن کی تعریف کرنا ایسا ہے ۔

شاہ را گوید کسے جولا ہہ نیست   ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

(بادشاہ کو کوئی ہے کہ وہ جولاہہ نہیں تو یہ اس کی تعریف نہیں بلکہ ناواقفی کی بات ہے)

یعنے جیسے بادشاہ کی تعریف میں یہ کہنا کہ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ کیونکہ جولاہے نہیں ہیں تو اس درجہ کی ہیں یہ سواا سخریاں۔ خلاصہ یہ کہ مطاوعت و عظمت محبت یہ تینوں حقوق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادا کرنا چاہیئے۔ اور آپ سے اول حق تعالےٰ کے یہی حقوق مگر محققین سے اور ان کی کتابوں سے معلوم ہوگا کہ مطاوعت عظمت محبت کی حقیقت کیا ہے۔ تم اپنی طرف سے ان کی تفسیر نہ گھڑنا وہی بتائیں گے۔ اور جنھیں آپ نے عظمت و محبت وغیرہ سمجھ رکھا ہے ان کی حالت آپ کو بھی معلوم ہو چکی ہے کہ واقع میں وہ مطاوعت و عظمت و محبت نہیں ہیں۔ بہرحال آپ کے ظاہری و باطنی دونوں قسم کے حقوق کو جمع کرو اور اس جمع کے طریق کو کسی ایسے محقق سے حاصل کرو جس کی جامعیت کی خود یہ شان ہو ؎

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق   ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(ادہر شریعت کا خیال ادہر عشق کا خیال شریعت اور عشق کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

اور یہ طریق جمع کا حاصل کرنا یا تو محققین کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے اگر زماناً ومکاناً قریب ہو یا ان کے حکایات و ملفوظات کے مطالعہ سے اگر زماناً بُعد ہو۔ یا ان سے خط و کتابت سے اگر مکاناً بُعد ہو۔ اب ایک[عہ] بات اور رہ گئی اور اس کے بعد ختم کردونگا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں ہیں۔ ایک شان سلطنت دوسری شان نبوت اور دونوں کے حقوق ہیں۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو پردہ میں ہیں۔ مگر آپکی

عہ اس مضمون کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہوئی تھی بعض محبان اسلام نے یہ درخواست کی تھی کہ مجلس وعظ میں حضور نظام جعلہ اللہ تعالیٰ معینا للاسلام کے لئے دعا کی جاوے۔ چنانچہ وعظ کے قبل ایک خاندانی حیدرآبادی نوجوان نے ایک مختصر تقریر کے بعد تمام مجمع کے ساتھ دعا کی اور وہ فرمائش ختم ہوگئی مگر احقر کو ختم وعظ کے قریب دوبارہ دعا کا جوش ہوا اور بجائے مستقلاً دعا کرنے کے اس عنوان خاص سے دعا کرتا ہوا اچھا معلوم ہوا جس سے وہ دعا کا مضمون جزو وعظ بھی ہوگیا اور دینی حیثیت سے اس کی ضرورت بھی معلوم ہوگئی اور اغراض دنیویہ کے شائبہ کے ایہام سے خلو بھی رہا۔ والحمد للہ ۱۲ منہ

دونوں شانوں کے مظاہر موجود ہیں چنانچہ شان نبوت کے مظاہر حضرات صوفیہ کرام و علماء ہیں اور شان سلطنت کے مظاہر مسلمان عادل بادشاہ ہیں اس واسطے مظاہر ہونے کی حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کے حقوق ادا کرنا بھی تتمہ ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے حقوق کا۔ پس ہم کو ان کے حقوق بھی ادا کرنا چاہیئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غیبت ظاہری کے بعد انھیں غنیمت سمجھنا چاہیئے ؎ بقول مولانا۔

چونکہ شد خورشید و ما را کرد داغ چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی خورشید تو چھپ گیا ہے تو اب بجز چراغ کے اور کیا چارہ ہے۔ پس علماء کا حق یہ ہے کہ ان سے دین کے احکام کو پوچھا جائے۔ اور یہ حق علماء کا مسلمان بادشاہوں پر بھی فرض ہے کہ ان کو بھی اپنے احکام جاری کرنے کے قبل علماء سے استفتا کرنا چاہیئے اور مسلمان بادشاہوں کا حق یہ ہے کہ امور انتظامیہ میں ان کی اطاعت کی جا دے حتیٰ کہ علماء کے ذمہ بھی ان امور میں ان کی اطاعت ضروری اور ان دونوں جماعتوں کا مشترک حق سب کے ذمہ یہ ہے کہ ان کی بقاء کی اور ان کی نصرت کی دعا کریں اور یہ بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ ان دونوں کو اپنے اپنے مناصب ادا کرنے کی توفیق دے۔ یعنی یہ دعا کریں کہ حق تعالیٰ علماء سے دین کی خدمت لے۔ اور سلاطین کو امت پر رحیم و شفیق بنا دے۔ اور اپنے لئے یہ دعا کریں کہ حق تعالےٰ انھیں دونوں جماعتوں کی برکات سے منتفع کرے۔ آمین (تمام جماعت کے ساتھ عامہ مسلمین و علماء و سلاطین خصوص مقامی بادشاہ کے لئے فلاح دنیا و دین کے لئے دعا کی گئی اور جلسہ ختم ہوا)

حاشیہ متعلقہ صفحہ ۵۰۲ من الخطیب

قولہ۔ اس مقام پر حضرات سامعین سے تفریعًا و تفریحًا ایک سوال کرتا ہوں کہ جب حجرہ کے باہر پاس سے آپ کو پکارنا جائز نہیں تو ہندوستان سے پکارنا کب جائز ہوگا۔ میں فتویٰ نہیں دیتا آپ ہی سے پوچھتا ہوں اھ

اقول۔ اس مضمون کے متعلق وعظ کے بعد ایک صاحب خوش فہم نے بلدہ ہی

میں مجھ سے ایک سوال تقریراً کیا۔ اور ایک ذی علم نے بعد واپسی وطن میرے ایک رفیق سفر سے ایک خیال کا اظہار تحریراً کیا۔ دونوں کو مع جواب افادہ ناظرین کے لئے نقل کرتا ہوں۔

سوال تقریری۔ جس کے الفاظ بُعد زماں کے سبب یاد نہیں معنے یہ تھے کہ یہ استدلال کس درجہ کا ہے۔

جواب۔ اس وقت غالباً اتنا عرض کیا تھا کہ عام لوگوں کی سہولت فہم کے لئے اس وقت ایک لطیفہ کے عنوان سے کہہ دیا گیا تھا بعد میں اس کی تکمیل کردی جاوے گی، چنانچہ اس وقت اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں۔

تحقیق۔ اس مضمون کی یہ ہے کہ ندا من وراء الحجرات سے نہی کی علت صرف یہی ہے کہ یہ ندا کمال ادب کے خلاف ہے اور ظاہر ہے کہ اس ندا کا کمال ادب کے خلاف ہونا نہ ایسا جلی تھا کہ اعراب کی عقول بدون تنبیہ یا تامل کے اس کا ادراک کرسکتے اور نہ کسی نص سے اس پر دلالت کی گئی تھی باوجود اس کے اس کو مذموم اور اس کے فاعل کو ملوم قرار دیا گیا اور نداء من البعید جس اعتقاد اور قصد سے اکثر عوام میں شائع ہے وہ یہ کہ آپ کو لزوماً اطلاع بھی ہوجاتی ہے اور آپ اس کی اجابت اور منادی کی اعانت بھی فرماتے ہیں اس سے نہی صریح وارد ہے تو یہ منہی عنہ ہونے میں اس سے اشد و اثقل ہوا پھر جب اخف کو جائز نہیں رکھا گیا تو اشد و اثقل کیسے جائز ہوجاوے گا۔ سو حاصل اس مضمون کا استدلال بدلالۃ النص ہے جیسے حرمت تافیف سے حرمت ضرب و شتم پر استدلال کیا جاتا ہے پس مضمون مضمون علمی و برہانی ہے گو عنوان بصورت لطیفہ ہونے کے سبب خطابی ہے۔

خیال تحریری۔ یہ ایک خط ہے جو بعینہ درج کیا جاتا ہے۔

مولوی صاحب السلام علیکم فدوی نے بلدہ میں جناب سے نیاز حاصل کیا ہے اور حضرت اقدس کے جملہ مواعظ کی مجلسوں میں شرکت حاصل کر کے مستفید ہوا اور اب اس وقت اپنے وطن آچکا ہوں بلدہ میں آپ کی روانگی کے بعد مجھ سے ایک مولوی

صاحب سے ملاقات ہوئی غالباً وہ مولوی صاحب بغداد کی طرف کے باشندہ ہیں۔ مگر عرصہ سے بلدہ میں مقیم ہیں۔ اور حضرت اقدس سے ایک وقت ملاقات کئے ہوئے تھے اور دونوں وعظ میں بھی شریک تھے اچھے عالم ہیں محقق و موحد معلوم ہوتے ہیں مولانا کے ثنا خواں ہیں مگر انوار العلوم نام پلی میں جو وعظ ہوا اس کے آخری حصہ میں مولانا نے فرمایا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ہندوستان سے پکارنا بے ادبی ہے یا نہیں۔ اس پر غور کرو میں فتویٰ تو نہیں دیتا۔ اس پر مولوی صاحب میرے سے یہ تذکرہ فرما رہے تھے کہ اس مقام پر کچھ تشریح ہو جاتی تو بہتر تھا۔ کیونکہ بعض صورتیں پکارنے کی جائز بھی ہیں چنانچہ فرط محبت سے اگر پکارا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے اس خاکسار نے جرات کر کے اس کیفیت کی اطلاع حضرت اقدس کو دی ہے (یہ مجھ کو یاد نہیں ۱۲ اشرف علی) اور احتیاطاً آپ سے بھی عرض کیا جاتا ہے کہ واقعی مولوی صاحب موصوف کی رائے اگر درست نہیں ہے تو خصوص بلدہ حیدر آباد کے لحاظ کرتے ہوئے منجانب کاتب وعظ یا خود حضرت اقدس کی جانب سے وعظ کے حاشیہ میں اس کی تشریح ہو تو مناسب و بہتر ہوگا۔ مخفی مباد کہ میں نے ایک اہل بدعت کی کتاب میں جملہ قسم ندا کے جواز کا فتویٰ دیکھا۔ مگر میں صرف مولوی صاحب مذکور کی رائے کے موافق چند جائز صورتیں درج ذیل کرتا ہوں اس لئے اگر یہ صورتیں جائز ہیں یا نہیں اس کا علم مجھ کو بھی ہو جائے۔

صورت اول ندا بطریق تعبد ہے۔ مثلاً کوئی شخص سورۂ یاایھا المزمل پڑھتا ہے تو صرف بطریق تعبد تلاوت قرآن کرتا ہے۔ یا التحیات میں بھی بطریق عبادت السلام علیك ایھا النبی۔ جس میں عالم غیب نہیں سمجھا جاتا۔

(۲) کبھی متکلم علم بدیع و فصاحت کے قاعدہ سے شخص غائب کو فرضی طور پر دل میں حاضر تصور کر کے مخاطب کرتا ہے جیسا کہ قصیدہ بردہ وغیرہ میں ہے۔

(۳) کبھی فرط غم و فرط محبت میں اپنے عزیز یا محبوب سے ندا کی جاتی ہے۔

پہلی صورت ندا کی تو ظاہر ہے کہ اس کے جواز میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ اب رہی دوسری و تیسری صورت اگر فرضی طور پر اس طرح ندا کی جائے اور مخاطب کو در اصل حاضر و ناظر یا عالم الغیب نہ سمجھے تو اس میں کیا حرج ہے آیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں۔ براہ کرم مولٰنا کا اس میں کیا ارشاد ہے۔ دریافت فرما کر مطلع فرمائیں یا آپ خود اپنی رائے سے مطلع فرمایئے تو نہایت مہربانی ہوگی۔ بصورت جواز اگر مصلحت معلوم ہو تو وعظ مذکور کے حاشیہ میں تشریح ہو جائے۔

جواب

یہ تفصیل صحیح ہے اور اس سے مجھ کو اتفاق ہے لیکن اس میں اتنے اضافہ کی اور ضرورت ہے کہ اگر صورت ثانیہ و ثالثہ میں خواص کے فعل سے عوام کے فساد عقیدہ کا اندیشہ ہو تو خواص پر واجب ہے کہ عوام پر اپنے فعل کا اظہار نہ کریں فقہا حنفیہ نے اس مسئلہ کی تصریح فرمائی ہے اور اسی مصلحت سے وعظ میں اس تفصیل کا اظہار مناسب نہ تھا کہ عوام کے لئے حیلہ نہ ہو جائے دوسرے یہ مضمون محض استطراداً بیان میں آگیا تھا استقلالاً نہ تھا اس لئے بھی تفصیل کی طرف ذہن کو توجہ نہیں ہوئی۔ خیر اب اتفاق سے تفصیل ہو گئی۔

وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ ط انتہت الحاشیۃ۔

کتبہا اشرف علی فی اوائل شعبان ۱۳۴۲ھ بعد سنتین و نصف من زمان الوعظ۔

رسالہ الابقاء ماہ صفر ۱۴۰۰ھ شمارہ ۱ جلد ۱۵ ۔ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۰ء

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

تفصیل الدین

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی —— دفتر الابقاء
مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

ضروری اطلاع: خط وکتابت کرتے وقت یا پتہ بدلتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

تفصیل الدّین

این	کہاں ہوا	جامع مسجد غازی پور
متی	کب ہوا	شب ۲۳ محرم ۱۳۳۱ھ
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹہ ۴۰ منٹ
کیف	کس طرح ہوا	
لم	کیوں ہوا	غالباً اہل شہر کی درخواست پر ہوا
ماذا	کیا مضمون تھا	اصل مقصود محبوبیت ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے محبوب بن جاویں اس کا طریقہ ایمان و عمل صالح ہے اور اس کی تفصیل بیان فرمائی۔
من انتفع	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	عموماً سب مسلمانوں کو
من ضبط	کس نے ضبط کیا	مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تسوید اجمالی میں ضبط کیا اور احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ نے تسوید تفصیلی کی۔
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	اجمالی مسودہ میں تعداد نہیں لکھی
الاشتات	متفرقات	تسوید تفصیلی ۸ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ کو شروع ہو کر ۱۰ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ بروز چہارشنبہ تمام ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ، و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ و علٰی آلہ و اصحابہ و بارک وسلم

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ؁
(جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کے لئے حق تعالیٰ محبوبیت پیدا کر دیں گے)

صاحبو! یہ وہی آیت ہے جس کے متعلق کل ایک ضروری مضمون بیان کیا گیا تھا چونکہ وہ دو اجزا سے مرکب تھا اور کل ایک ہی جزو کا تفصیلاً ذکر ہوا تھا اور دوسرا جزو تفصیل سے رہ گیا تھا گو مجملاً اس کا ذکر بھی ہو چکا تھا اور وہ اجمال گو شافی نہ تھا مگر کافی ضرور تھا حتیٰ کہ اگر آج کا بیان نہ بھی ہوتا تب بھی کچھ ضرر نہ تھا کیونکہ ایک جزو کی تفصیل بھی ہو چکی تھی اور دوسرے جزو کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا گیا تھا جس کے پیش نظر رکھنے کے بعد تفصیل کا نہ ہونا مضر نہ تھا مگر جب تفصیل کا موقع مل گیا تو میں نے چاہا کہ اس کی بھی کسی قدر تفصیل کر دی جائے۔ کسی قدر کی قید اس لئے بڑھا دی کہ تفصیل علیٰ قدر اتم کے لئے ایک جلسہ کافی نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس ۲۳ برس تک اس کی تفصیل فرمائی پھر بھی اس کے لئے توضیح کی ضرورت ہوئی اور اس کے لئے حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر زمانہ میں حاملان دین کو پیدا فرمایا جو برابر اس کی توضیح کرتے رہے۔ حتیٰ کہ خیر القرون کے ختم تک (یعنی قرن ثالث پر جو تبع تابعین کا زمانہ ہے اور جملہ ائمہ مجتہدین اسی زمانہ میں ہوئے ہیں) وہ توضیح بھی علی وجہ الکمال ہو گئی (تو جس مضمون کی تفصیل اتنے عرصہ دراز میں ہوئی ہو اس کو علیٰ قدر اتم ایک جلسہ میں کیونکر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اب سمجھئے کہ اس مضمون کی تفصیل و توضیح تو خیر القرون کے ختم تک پوری ہو گئی ۱۲) لیکن اب دو مرتبے باقی رہ گئے۔ ایک تفریع کہ قیامت تک انہی اصول پر حوادث جزئیہ کے احکام کی تفریع کرتے رہنا یہ کام علم و فہم کا ہے اگرچہ حق تعالیٰ نے اجتہاد مطلق کو ختم کر دیا ہے نہ اس وجہ سے کہ خداوند کریم کی رحمت (معاذ اللہ) ختم ہو گئی بلکہ اس لئے کہ خداوند تعالیٰ کا قاعدہ اور ان کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی اس وقت اس کو

ختم کردیتے ہیں اس عادت کے موافق چونکہ حضرات مجتہدین کے بعد اجتہاد کی ضرورت نہ رہی تھی اس لئے اس کو ختم کردیا البتہ تفریع کی ضرورت قیامت تک رہے گی اس لئے اتنا اجتہاد اور اتنا فہم قیامت تک کے لئے باقی ہے جس سے مجتہدین کے اصول پر علماء جزئیات کو متفرع کرتے رہیں چنانچہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو نئے نئے جزئیات میں حکم شرعی بتلاتے رہتے ہیں اور مجتہدین کے اصول ہی پر جزئیات حادثہ کو متفرع کرتے رہتے ہیں دوسرے اس کی ضرورت بھی باقی ہے کہ ہر زمانہ میں حق کو باطل سے ممتاز کردیا جائے کیونکہ زمانہ نبوت سے بُعد ہوجانے کی وجہ سے بعض دفعہ حق و باطل مختلط ہوجاتا ہے خواہ عوام کی بے تمیزی سے یا اہل غرض علماء کی وجہ سے تو ایسے وقت میں حق تعالیٰ کسی ایسے مقبول بندے کو پیدا فرماتے ہیں جو حق کو باطل سے ممتاز کرکے صراط مستقیم کو واضح کردیتا ہے یہ درجہ تجدید ہے اس کے متعلق حدیث میں پیشین گوئی ہے اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ فِىْ أُمَّتِىْ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا کہ حق تعالیٰ میری امت میں ہر سو برس کے بعد ایک ایسے شخص کو مبعوث فرماتے ہیں جو دین کی تجدید کردیتا ہے یعنی حق کو باطل سے ممتاز کردیتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر صدی پر کوئی نہ کوئی مجدد ضرور ہوا ہے تو یہ دو درجے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک رہیں گے ایک تفریع ایک تجدید اور یہ دونوں خدمتیں الگ الگ ہیں اور اگر کوئی اللہ کا بندہ دونوں کا جامع[ع] ہو تو یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے تو اب توضیح و تفصیل کا

ع قلت ومن الجامعين لهما سيدي حكيم الامة مجدد الملة ادام الله فيوضهم وبركاتهم سالت العارف بالله سيدي مولانا محمد يحيى رحمة الله عليه الخادم الخاص لسيدي قطب زمانه الشيخ مولانا رشيد احمد گنگوہی عن مجدد ہذہ السنة الحاضرة فقال كنت اظن او قال انه شيخي مولانا رشيد احمد قدس الله سره ثم رأيته قد انتقل الى ربه على راس المائة والآن مجدد ہذہ المائة عندي فلان مولانا اشرف علي ادام الله فيوضه لو قلت اذ عن بهذا القول طائفة من المقبولين وايده عموم فيضه اطال الله بقاءه وانتشار صيته في العالم وامتيازه من بين العلماء بكثرة الرحلة اليه من الطالبين ثم بزيادة الينا الحق على يديه بالتصانيف المفيدة في كل علم من علوم الدين وبالمواعظ المتكثرة المتازة بشانها وبتسهيل طريق الباطن وتوضيحه بحيث يدري القشر من اللباب والله اعلم ۱۲

جو درجہ ہے اس کو اگر ابہام کے ساتھ بیان کیا جائے تو ایک جلسہ میں بیان ہو سکتا ہے مگر یہ بیکار ہے کیونکہ جس تفصیل کو کوئی نہ سمجھے وہ فضول ہے اور پوری طرح بیان کیا جائے تو بتلایئے اس کے لئے ایک دو جلسہ کیسے کافی ہو سکتا ہے اس لئے میں نے کسی قدر کی قید لگائی یعنی یہ تفصیل اضافی ہوگی جو تفصیل اتم کے مقابلہ میں تو اجمال ہے اور اجمال سابق کے مقابلہ میں تفصیل ہے تو یہ درجہ تفصیل اضافی کا باقی رہ گیا تھا اس کو میں آج بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی لئے اُسی آیت کو اختیار کیا گیا جس کو کل بیان کیا گیا تھا باقی یہ جو میں نے کہا ہے کہ کل جزو ثانی کو بھی اجمالاً بیان کر چکا ہوں تو شاید کسی کے ذہن میں وہ اجمال نہ رہا ہو اس لئے میں اس کو بھی یاد دلاتا ہوں کہ میں نے اخیر مضمون میں کہا تھا کہ حق تعالیٰ نے وُدّ (اور محبوبیت) کا مدار ایمان اور عمل صالح پر رکھا ہے اس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ اس کا طریقہ علوم دین ہیں جو دو طرح حاصل ہو سکتے ہیں یا تعلیم و تعلم سے یا علماء کی مخالطت اور ان کے اقوال و مواعظ سننے سے پس کل گو اس مضمون کی تفصیل نہ کی گئی تھی مگر وہ طریقہ بتلا دیا گیا تھا جس سے عمر بھر تفصیل ہو سکتی تھی تو وہ بیان بھی مکمل تھا اس میں ابہام نہ تھا کیونکہ ابہام کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کلام مفہم مراد نہ ہو اور یہ اجمالی بیان غیر مفہم نہ تھا بلکہ کافی تھا اگر آج کا بیان نہ ہوتا تب بھی کوئی جزو سمجھنے سے باقی نہ رہا تھا البتہ ایک جزو کی تفصیل پہلے جزو کی برابر نہ ہوئی تھی۔ تو اس کے بیان کے لئے خدا تعالیٰ نے اس وقت موقعہ دے دیا ہے تو اس وقت میں اس کی بھی تفصیل کرنا چاہتا ہوں یہ حاصل ہے آج کے بیان کا۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر مقصود میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک نفس مقصود اور ایک اس کا ذریعہ اب سمجھو کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر وُدّ کا مدار رکھا ہے اس میں بھی دو چیزیں ہیں ایک مقصود جس کا بیان سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا میں ہے اور ایک طریق ایمان و عمل صالح جس کا

بیان الذین آمنوا وعملوا الصلحت میں ہے توکل کے بیان کا حاصل مقصود کی تفصیل تھی۔ اور آج طریق کی تفصیل ہے۔ اور مقصود بہت ہی مختصر ہے اور اس کی تفصیل میں بھی کچھ طول نہیں ہے۔ یعنی محبوبیت اس میں بہت سی اقسام بیان کرنے کی حاجت نہیں بس یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ہم حق تعالےٰ کے محبوب بن جاویں گے اور اس کے فروع میں سے یہ بھی بتلا دیا گیا تھا کہ یہ شخص خلق کا بھی محبوب ہو جاوے گا تو یہ مضمون زیادہ تفصیل کا محتاج نہ تھا مگر اس کی تفصیل اس لئے بیان کی گئی تھی کہ آجکل لوگ ثمرات آخرت کو بہت ہی بے وقعت سمجھتے ہیں بس ان کے نزدیک بڑا ثمرہ یہ ہے کہ کچھ روپیہ مل جائے۔ چنانچہ ایک عہدہ دار کی بیوی نماز پڑھتی تھی تو وہ اس سے پوچھا کرتے تھے کہ تجھ کو نماز پڑھ کر کیا ملا۔ اسی طرح سودا کی حکایت ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ایک دن پوچھنے لگا کہ تو نماز کس واسطے پڑھا کرتی ہے۔ اس نے کہا ہمیں جنت ملے گی تو سودا کیا کہتا ہے کہ جا باؤلی تو وہاں بھی غریبوں ملانوں طالب علموں اور جلاہوں کے ساتھ رہے گی اور دیکھ ہم جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے بادشاہ اور وزرا اور امرا ہوں گے فرعون۔ ہامان۔ نمرود۔ شداد۔ قارون وغیرہ۔

یہ تو سودا قصہ ہے مگر آجکل بھی قلوب کو ٹٹولا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنی وقعت لوگوں کے قلوب میں ایک ہزار روپیہ کی ہے اس سے نصف بھی دین کی وقعت نہیں ہے نہ ثمرات آخرت کی حالانکہ ان کی وہ قیمت ہے کہ

ـــــ قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تونے اپنی قیمت دونوں جہان بیان کی ہے نرخ بڑھا ابھی تو ارزاں ہے)

دونوں جہاں بھی بخدا اس کی قیمت میں کم ہیں۔ اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو لوگ قرآن کو تراویح میں اجرت لیکر سناتے ہیں اس میں علاوہ فقہی گناہ کے

بے غیرتی بھی کس قدر ہے کہ قرآن کو جو خدا تعالےٰ کا کلام ہے ادنیٰ سی اجرت کے معاوضہ میں سناتے پھریں۔ اور یہ ساری بے قدری اس لئے ہے کہ قرآن سستا مل گیا ہے اس دولت کے حصول میں ہم کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا

زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

(اے کاہل تو نے مجھ کو بیقدر سمجھ رکھا ہے وجہ یہ ہے کہ میں تجھ کو مفت مل گیا ہوں)

یعنی قرآن زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ مجھے اس واسطے بے قدر کر رکھا ہے کہ میرے حاصل کرنے میں تمہارے کچھ دام نہیں لگے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ جب کسی فقیر کو فقر و فاقہ کی شکایت کرتے ہوئے دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ تم اس کی قدر کیا جانو تم کو گھر بیٹھے یہ دولت مل گئی ہے اس کی قدر ابراہیم بن ادھم کے دل سے پوچھو جس نے سلطنت بیچ کر اس کو خریدا ہے۔ اسی طرح ہم نے ایمان کی دولت کو باپ ماں سے لیا ہے۔ بے محنت و مشقت ہم کو مل گئی ہے اسی لئے اس کی بے قدری ہے ورنہ خدا کا نام وہ چیز ہے جس کے مقابلہ میں تمام دنیا ہیچ ہے کیونکہ جنت کی سلطنت اسی کے عوض میں ملے گی جس کے سامنے دنیا کی ہزار سلطنتیں بھی گرد ہیں مگر افسوس آجکل دو پیسہ کے برابر بھی خدا کے نام کی قدر نہیں چنانچہ وہ عہدہ دار اپنی بیوی سے پوچھتے ہی تھے کہ تجھ کو نماز سے کیا ملا وہ تو ملنا اس کو سمجھتے تھے جیسے ایک شخص کو ملا کرتا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ ایک عہدہ دار رشوت لیا کرتے تھے اور نماز کے بھی بہت پابند تھے حتیٰ کہ فجر کی نماز کے بعد اشراق تک وظیفہ بھی پڑھا کرتے تھے اور یہی وقت مقدمہ والوں سے رشوت طے کرنے کا تھا مقدمہ والے آتے اور اشاروں سے رشوت کی رقم طے ہوتی تھی کیونکہ پیر نے وظیفہ میں بولنے سے منع کر رکھا تھا بس وہ اشاروں سے سو کہتا اور یہ دو انگلیاں اٹھادیتے کہ دو سولوں گا پھر اشاروں ہی سے

کوئی رقم طے ہو جاتی تو یہ مصلیٰ کا کونا پکڑ کر اٹھا دیتے کہ یہاں روپیہ رکھدو پھر کوئی دوسرا آتا اور اس سے بھی یوں ہی گفتگو ہوتی۔

غرض یہ ظالم اشراق پڑھ کر کئی سو روپے لے کر اٹھتا تھا تو آجکل تو ملنا اسے کہتے ہیں اور اسی واسطے وظیفے بھی پڑھے جاتے ہیں پھر غضب ہے کہ بعض لوگ قرآن پڑھنے میں تو بول پڑتے ہیں اور وظیفے میں نہیں بولتے گویا نعوذ باللہ قرآن کی وقعت وظیفوں کی بھی برابر نہیں یہ کیسی بیقدری ہے۔

اسی جہل کا ایک یہ اثر ہے کہ حدیث و قرآن کی دعاؤں کا لوگوں کے ذہن میں وہ درجہ نہیں جو پیرزادوں کی گھڑی ہوئی دعاؤں کا درجہ ہے چنانچہ جب میں حج کو گیا تھا تو اس وقت میرے ابتدائی کتابوں کے استاد کانپور میں میری جگہ تدریس کے لئے تشریف لے آئے تھے۔ وہاں ان سے ایک شخص نے اپنے قرض کے لئے وظیفہ پوچھا انھوں نے ایک دعا بتلا دی اس نے بڑی رغبت سے یاد کی اور انھوں نے زیادہ رغبت دلانے کے لئے یہ بھی فرمادیا کہ یہ دعا حدیث میں آئی ہے اور اس کی یہ فضیلت ہے۔ بس یہ سنکر اس شخص کا منہ پھیکا سا ہوگیا اور کہنے لگا حضرت میں تو کوئی ایسا وظیفہ چاہتا ہوں جو آپ کے پاس سینہ بسینہ چلا آرہا ہو حدیث کی دعا تو عام ہے سب ہی پڑھ لیتے ہیں۔

سو لوگ آجکل ایسی ہی بے قدری کرتے ہیں۔ ایک شخص مجھ سے خود کہتے تھے کہ میری نماز تو قضا ہو جاتی ہے مگر پیر نے جو وظیفہ بتلایا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ عجیب حالت ہے کہ اول تو دین کی طرف توجہ ہی نہیں اور جو توجہ بھی ہے تو اس خوبصورتی کے ساتھ۔

اسی طرح ان عہدہ دار صاحب کو پیر نے منع کر دیا تھا کہ وظیفہ میں بولنا نہیں اس لئے ان کو بولنا تو ناجائز تھا مگر رشوت لینا جائز تھا بلکہ شاید وہ وظیفہ بھی اسی واسطے پڑھتے ہوں کہ رشوت خوب ملے اور رشوت کے لئے

بھی نہ سہی تو اس میں تو شک نہیں کہ آج کل وظائف زیادہ تر دنیا کے واسطے پڑھے جاتے ہیں کہ مال میں برکت ہو نوکری مل جائے قرض اتر جائے رضائے حق کے واسطے بہت ہی کم پڑھے جاتے ہیں میں یہ تو نہیں کہتا کہ دنیا کے کاموں کے لئے وظیفہ پڑھنا ناجائز ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ دنیا کے لئے اگر چالیس بار پڑھتے ہو تو آخرت کے لئے کم سے کم چار بار تو کوئی وظیفہ پڑھو مگر اس کی ذرا بھی فکر نہیں اور جب آپ کو دین کی فہم کامل حاصل ہو گی اس وقت میں یہ کہوں گا کہ ؎

ازخدا غیر خدا را خواستن
ظن افزونی ست کلی کاستن

خدا تعالیٰ سے غیر خدا کو چاہنا حقیقت میں پستی ہے یہ سلطنت نہیں ہے کہ خدا سے دنیا مانگو بلکہ یہ پست ہمتی اور دنارت ہے مگر اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو دنیا کے واسطے خدا تعالیٰ سے دعا کرنا اور دعا کے ذریعہ سے مانگنا یہ مذموم نہیں ہے بلکہ یہ تو شان عبدیت ہے اور ایک وظیفہ پڑھ کر مانگنا یہ مذموم ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے وہ یہ کہ دعا کر کے مانگنے میں ایک ذلت کی شان ہے اور یہ اس مقصود کے موافق ہے جو بندوں کے پیدا کرنے سے اصل مقصود ہے جس کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ (میں نے جن و انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) اسی لئے حدیث میں ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ (کہ دعا عبادت کا مغز ہے) اور میں نے عبادت کو جو اصل مقصود کہا ہے اس میں اصل کی قید اس واسطے لگائی کہ کوئی یوں نہ سمجھیں کہ کھانا کمانا اور دنیا کے کاروبار کرنا ناجائز ہے سو خوب سمجھ لو کہ یہ ناجائز نہیں بلکہ جائز ہے بلکہ ایک درجہ میں مطلوب بھی ہے مگر اصل مقصود نہیں بلکہ تابع مقصود ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کھانا پکوائے جس میں پانچ روپے صرف ہوں تو گو اصل مقصود کی لاگت اس سے کم ہے مگر جب کوئی پوچھتا ہے کہ اس کھانے کی تیاری میں کیا خرچ ہوا ہے

تو جواب یہی دیا جاتا ہے کہ پانچ روپے صرف ہوئے ہیں اور جب وہ تفصیل پوچھے تو آپ کہتے ہیں کہ ایک روپیہ کا گھی اور ایک روپیہ کا آٹا اور ایک روپیہ کا گوشت اور آٹھ آنے کا مسالہ وغیرہ اور آٹھ آنے کی لکڑیاں کوئلے اور چار آنے پکانے والے کی مزدوری وعلیٰ ہذا۔

اس جواب کو سن کر وہ سائل کہنے لگے کہ کیا آپ لکڑیاں اور کوئلے بھی کھایا کرتے ہیں جو اس کو کھانے کے حساب میں شمار کیا تو بتلایئے کہ آپ کیا جواب دیں گے یقیناً یہی کہیں گے کہ لکڑیاں گو مقصود نہیں مگر مقصود کے تابع ضرور ہے اس لئے ان کو بھی مقصود کے ساتھ شمار کیا جائے گا تو بعینہٖ یہی تعلق دنیا کا آخرت سے ہے کہ گو وہ بھی کسی درجہ میں مطلوب ہے مگر اصل مقصود نہیں بلکہ تابع مقصود ہے۔

اب اگر کوئی شخص صرف دنیا ہی کے جمع کرنے میں لگا رہے اس کو ایسا سمجھا جاوے گا جیسے کوئی کھانا تو تیار کرے نہیں نہ کھانے کی چیزیں خریدے صرف لکڑیاں گھر میں بھر لے تو بتلایئے اگر کوئی اپنے گھر میں لکڑیاں ہی بھر لے تو اس کو کوئی شخص عاقل کہے گا ہرگز نہیں۔ اسی طرح محض دنیا طلبی میں رہنا بھی عاقل کا کام نہیں اور اگر کوئی کھانے کا سارا سامان کر لے مگر ایندھن نہ خریدے تو اس کو بھی کھانا میسر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح محض دین میں لگا رہنا اور باوجود حاجت دنیا کی مطلق فکر نہ کرنا بھی غیر مطلوب ہے بلکہ اصل مقصود دین کو سمجھے اور اس میں زیادہ مشغول ہو اور کچھ فکر دنیا کی بھی رکھے مگر اس میں منہمک نہ ہو بلکہ اتنا سامان کر لینا چاہیے کہ مثلاً ایک سال کے لئے علی اختلاف الاحوال کافی ہو جائے کیونکہ اَلضَّرُوْرَةُ یَتَقَدَّرُ بِقَدْرِ الضَّرُوْرَةِ (ضرورۃ بقدر ضرورۃ ہوتی ہے) اور رفع ضرورت کے لئے اتنا سامان کافی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں یہ غلط ہے۔ چھڑاتے کہاں ہیں بلکہ وہ تو دنیا کو دین کا ذریعہ بتاتے ہیں اتنا فرق ہے کہ آپ اسی کو مقصود سمجھتے ہیں اور میں اس کو بقدر ضرورت ضروری کہتا ہوں پس دنیا تابع ہے

اور اصل مقصود آخرت ہے اس لئے میں نے اصل کا لفظ بڑھا دیا تھا کہ خلقت عالم سے اصل مقصود عبادت ہے اب سمجھئے کہ دعا میں ایک خاصہ ہے جس کی وجہ سے دعا کے دنیا مانگنا جائز ہے اور وظیفہ میں وہ بات نہیں اس لئے مذموم ہے۔ دعا کی حقیقت وہ ہے جو عبادت کی روح ہے یعنی تذلل واظہار احتیاج اور یہ وہ چیز ہے کہ اگر کوئی سادہ طبیعت آدمی کسی بادشاہ یا امیر کو دعا کرتے دیکھے اور دعا کے وقت جو عاجزی کے الفاظ وہ کہہ رہا ہے ان کو سُنے تو اس کو حیرت ہو جائے گی کہ اللہ یہ شخص بھی اتنا محتاج ہے جو اس عاجزی سے اپنی احتیاج کو ظاہر کر رہا ہے۔

اکبر بادشاہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ شکار میں وہ کسی طرف رستہ بھول کر جا نکلا وہاں ایک دیہاتی زمیندار تھا اس نے بادشاہ کو پہچانا تو نہیں مگر اپنی کریم النفسی سے اس کی خوب خاطر مدارات کی اکبر بہت خوش ہوا تھوڑی دیر میں لشکر بھی آملا۔ تب دیہاتی کو معلوم ہوا کہ یہ تو بادشاہ تھا اکبر نے چلتے وقت کچھ دیا بھی اور کہدیا کہ جب یہ ختم ہو جاوے ہمارے پاس پھر آجانا اور دربانوں سے کہدیا کہ یہ جب آوے روکنا نہیں۔ چنانچہ ایک بار وہ آپہونچا اور اس کو محل میں پہونچا دیا گیا۔ اتفاق سے اکبر اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ اس دیہاتی کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بادشاہ ہو کر کسی کے سامنے جھک رہا ہے جب اکبر نماز سے فارغ ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے تو دیہاتی کو اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ کس سے مانگ رہا ہے۔ آخر جب وہ دعا سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو دیہاتی نے پوچھا کہ تم کس کے سامنے جھکتے اور کس سے ہاتھ پسار کر مانگ رہے تھے۔ اکبر نے کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی عبادت کر رہا تھا اور اس سے اپنی حاجتیں مانگ رہا تھا۔ یہ سن کر دیہاتی پر ایک حالت طاری ہوئی اور کہنے لگا کہ جب خدا تمہاری حاجت پوری کر سکتا ہے تو کیا میری حاجت پوری نہ کرے گا بس میں اب تم سے کچھ نہیں مانگتا میں بھی خدا ہی سے مانگوں گا تو صاحبو! دعا کا یہ رنگ ہے جس سے سراسر احتیاج اور عاجزی ٹپکتی ہے اور

وظیفہ پڑھنے میں یہ بات نہیں (بلکہ اکثر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وظیفہ کے زور سے ہمارا مقصود ضرور حاصل ہوگا تو اس حالت میں عجز و احتیاج کہاں رہیں دنیا کے واسطے وظیفہ پڑھنا اور دنیا کے لئے دعا کرنا برابر نہیں ۱۲)

اس لئے اگر کوئی دنیا کے واسطے دعا مانگے اور یوں کہے کہ اے خدا مجھے سو روپے دیدیجئے تو یہ جائز ہے بلکہ اس میں بھی وہی ثواب ہے جو آخرت کے لئے دعا کرنے میں ہے بشرطیکہ دعا ناجائز کام کے لئے نہ ہو کیونکہ دنیا کے لئے ہر دعا جائز نہیں بلکہ جو شریعت کے موافق ہو وہی جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص ناجائز ملازمت کے لئے دعا مانگے تو یہ جائز نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے حاکم کے یہاں ایک تو تحصیلداری کی درخواست دینا اور ایک ڈکیتی کی درخواست دینا ظاہر ہے کہ جس کام کو حاکم نے ممنوع قرار دے دیا ہے اس کی درخواست حاکم سے کرنا اور حاکم کو اس کے حصول کا ذریعہ بنانا بھی ممنوع ہوگا تو جو دعا حدود شرعیہ سے باہر ہو وہ تو پسندیدہ ہے ہی نہیں پھر اس کو پیش کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔ آجکل لوگ اس کی بھی رعایت نہیں کرتے کہ دعا شریعت کے موافق ہو۔ واقعی بات یہ ہے کہ ہم لوگ بڑی غفلت میں ہیں جس کی وجہ زیادہ تر بے علمی ہے ہم لوگ بعض دفعہ خدا تعالیٰ سے ایسی چیزیں مانگتے ہیں جو خدا تعالیٰ کو ناپسند ہیں چنانچہ اس وقت بہت سی ایسی نوکریاں ہیں جو ناجائز ہیں اور ان کے لئے دعا کرائی جاتی ہے اور اگر وہ مل جائے تو مبارک باد دی جاتی ہے افسوس کس کس بات کی اصلاح کی جائے۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(تمام بدن داغ داغ ہوگیا ہے پھوئے کہاں کہاں رکھے جائیں)

اور غضب یہ ہے کہ ایسی ناجائز ملازمتوں کے لئے اہل اللہ سے جاکر دعا کرائی جاتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مُردوں کے پاس جاکر کہتے ہیں کہ آپ ہمارا یہ کام کر دیجئے گویا سارا اختیار ان کے ہاتھوں میں ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمنؒ صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت میرا یہ کام کر دیجئے شاہ صاحب نے فوراً حکم دیا کہ نکالو اس مشرک کو یہ مجھ سے کہتا ہے کہ میرا کام کر دیجئے ارے کیا تیرا کام کر دینا میرے اختیار میں ہے۔

پس آجکل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تسبیح چلانے والے خدا تعالےٰ کے رشتہ دار ہو گئے کہ جو یہ کہدیں گے ضرور ہو جائے گا خدا تعالےٰ فرماتے ہیں یَا اَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ (اے اہل کتاب دین میں غلو مت کرو) اس میں غلو فی الدین سے منع فرمایا گیا ہے۔ پس گو حضرات اولیاءؒ کی تعظیم ضروری ہے اور دین میں داخل ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کی ایسی تعظیم کی جائے کہ خدا تعالیٰ کی توہین ہونے لگے اور شرک لازم آجائے۔ دیکھو اگر کوئی حاکم کے پاس جا کر سرشتہ دار کو بھی سلام کرلے تو اس کا مضائقہ نہیں لیکن اگر اس سے وہ باتیں کہنے لگے جو حاکم سے کہنا چاہئیں مثلاً یوں کہے کہ سرشتہ دار صاحب بس سارا معاملہ آپ ہی کے ہاتھ میں ہے آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور اس کی ویسی ہی تعظیم کرنے لگے جیسی حاکم کی کی جاتی ہے تو کیا حاکم اس سے خوش ہوگا یقیناً حاکم اس شخص کو دربار سے نکال دیگا اور یقیناً سرشتہ دار بھی ایسی تعظیم گوارا نہیں کر سکتا (اور جو گوارا کرے گا تو وہ بھی دربار سے نکالا جائے گا ۱۲)

اب بتلاؤ کہ جو معاملہ خدا تعالےٰ سے کیا جاتا ہے وہ غیر خدا کے ساتھ کیونکر پسندیدہ ہو سکتا ہے یقیناً اس سے حق تعالےٰ ناخوش ہوتے ہی ہیں وہ بزرگ بھی ناراض اور ناخوش ہوتے ہیں جن کی ایسی تعظیم کی جاتی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ لوگ بزرگوں کے مزارات پر جا کر ایسے بیہودہ کلمات سے ان کا دل دکھاتے ہیں۔ غرض ناجائز ملازمتوں کے لئے زندوں اور مردوں کو دونوں کو جا کر دق کرتے ہیں پھر زندوں میں بعض تو صاف ہوتے ہیں جو ان کے منہ ہی پر کہدیتے ہیں کہ ہم ناجائز کام کے لئے دعا نہ کریں گے ان کو تو بدمزاج اور سخت کہکر بدنام کیا جاتا ہے اور اکثر اپنے اخلاق سے کہدیتے ہیں کہ ہاں

دعا کریں گے یہ بہت خوش اخلاق شمار ہوتے ہیں اور اس وقت اہل الرائے کی رائے یہی ہے کہ علماء کو ایسے ہی اخلاق چاہئیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق بات کو ظاہر نہ کیا کریں۔ غرض بعض اہل اللہ اپنے اخلاق سے مجمل وعدہ بھی کر لیتے ہیں مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ دعا کس طرح کرتے ہیں ذرا خلوت میں کبھی ان کی دعاؤں کو سنو تو معلوم ہو اور بعض تو خلوت میں خدا تعالےٰ کے سامنے بھی اخلاق برتتے ہیں مگر یہ غیر محقق ہیں اکثر اہل اللہ خلوت میں یوں دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ اگر یہ بلا زمت شریعت کے موافق ہو اور اس شخص کے دین کو مضر نہ ہو تو اسے نصیب کر دیجئے ورنہ ہرگز نہ دیجئے۔

مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب سے ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضرت میرے مقدمے کے واسطے دعا کیجئے اسی وقت دوسرا فریق بھی آیا اس نے بھی دعا چاہی اس مقام پر اس گلجھڑی کو سلجھانا ہر ایک کا کام نہیں۔ اب یا تو دوسرے فریق سے انکار کریں تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے اور اس سے بھی وعدہ کریں تو کس طرح کریں۔ ہاں جس کو خدا تعالےٰ نورِ باطن عطا فرماویں وہ اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے اسی وقت اس طرح دعا کی کہ اے اللہ جس کا حق ہو اُسے مل جاوے۔ لیجئے دونوں کا حق پورا ہو گیا سو مولانا نے تو جلوت ہی میں یہ دعا کر دی باقی اور بزرگ بھی گو جلوت میں تم سے کیسا ہی وعدہ کر لیں خلوت میں وہ بھی اسی طرح دعا کرتے ہیں کہ اگر یہ کام خلاف شریعت نہ ہو تو پورا ہو جائے ورنہ ہرگز پورا نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کے مقرب ہیں پھر وہ خدا تعالےٰ کی مرضی کے خلاف کوئی دعا کیسے کر سکتے ہیں بلکہ عوام الناس تو خدا تعالےٰ سے کچھ کھلے ہوئے بھی ہوتے ہیں (جیسے بعض دیہاتی حکام کے سامنے بے تکلف باتیں کر لیتے ہیں)

اور یہ حضرات نہایت ہیبت زدہ ہوتے ہیں وہ ناجائز امور کے لئے

تو کیا دعا کرتے مباح امور میں بھی دعا کرتے ہوئے ان کی یہ حالت ہوتی ہے سہ

اُحِبُّ مُنَاجَاۃَ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُہٖ وَلٰکِنْ لِسَانَ الْمُذْنِبِیْنَ کَلِیْل

(مناجات حبیب کے پسندیدہ بہت سے طریقے ہیں۔ مگر گناہ گاروں کی زبان توتلی اور کند ہے)

بعض دفعہ وہ بہت کچھ مانگنا چاہتے ہیں لیکن اپنی خطاؤں کے استحضار سے زبان سے کچھ نکلتا نہیں۔ حضرات! مغفرت کی دعا کس قدر محبوب اور سراپا محمود ہے مگر اس میں بھی بعض دفعہ استحضار ذنوب کے سبب ان کی زبان رک جاتی ہے گو پھر امر کی وجہ سے دعا کرتے ہیں اور کرنا چاہئے کیونکہ وہ صاحب حال ہونے کے ساتھ صاحب عرفان بھی ہوتے ہیں اس لئے امر کی وجہ سے دعا کرتے ہیں اور اپنے جی کو سمجھاتے ہیں کہ شرماویں کس سے اور شرم کی وجہ تو یہی ہے کہ ہم اپنے کو ناپاک سمجھتے ہیں کہ اس وجہ سے اُس دربار میں کچھ عرض کرنے کے قابل اپنے کو نہیں سمجھتے مگر پھر دور دور رہ کر پاک کیسے ہوں گے پاک ہونا بھی تو حاضری دربار ہی پر موقوف ہے اب اگر حاضری اس پر موقوف ہو کہ پہلے پاک ہولیں تو دور لازم آتا ہے اس لئے وہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر طبیعت پر جبر کرکے دعا کرتے ہیں مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک آلودہ نجاست دریا پر سے گذرا دریا نے کہا کہ آ میرے اندر چلا آ اس نے جواب دیا کہ میں ناپاک اور تو پاک وصاف میں تجھ تک کیسے آؤں پاک ہو کر آؤں گا دریا نے ہنس کر کہا کہ اے بیوقوف پاک ہونے کا بھی طریقہ یہی ہے کہ تو اسی حالت میں میرے پاس چلا آ مجھ سے دور رہ کر تو پاک ہی نہیں ہو سکتا ایک بار تو ناپاکی کی حالت ہی میں چلا آ تا پھر پاک ہو کر بھی آنا نصیب ہوگا۔

اور جو اس انتظار میں رہا کہ پہلے پاک ہولوں پھر پانی کے پاس جاؤں گا

تو عمر بھر نہ تجھے پاکی نصیب ہوگی نہ پانی کا قرب نصیب ہوگا۔

صاحبو! اسی طرح خدا تعالیٰ کے دربار میں آنے کے لئے تم اس کا انتظار نہ کرو کہ پہلے دنیا کے جھگڑوں سے فارغ ہولیں پھر یکسو ہوکر خدا کی یاد میں لگیں گے کیونکہ یوں تو ساری عمر گذر جائے گی اور تم کو خدا کے ساتھ علاقہ نصیب نہ ہوگا یہ شیطانی اغواء ہے کہ اس نے علم کے پیرایہ میں جہل کے اندر مبتلا کر رکھا ہے کہ عام لوگوں کو یہ پٹی پڑھادی ہے کہ بیٹے بیٹیوں کی شادی کر کے بہت سی جائداد اور روپیہ حاصل کر کے پھر اللہ کی یاد میں لگنا اس وقت تو دل دنیا کی گندگیوں سے ملوث ہے ان سے پاک ہوکر آنا مگر ان لوگوں کو عمر بھر بھی خدا کی یاد نصیب نہیں ہوتی کیونکہ دنیا کے تعلقات بدون خدا سے علاقہ پیدا کئے قطع ہو ہی نہیں سکتے۔ دنیا کے کاموں کی یہ حالت ہے کہ ؎

لَا یَنْتَہِیْ اِرْبٌ اِلَّا اِلٰی اِرْبٍ

(ایک حاجت گئی دوسری حاجت درپیش آگئی)

ان کی انتہا ہی کہیں نہیں ہے ایک کام کے بعد دوسرا کام نکلتا چلا جاتا ہے۔ بس ان لوگوں کی ہمیشہ وہ حالت رہتی ہے۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم

باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

روز یہی کہتے رہتے ہیں کہ کل کو یہ کام چھوڑ دیں گے مگر جب کل ہوتی ہے پھر وہی حال ہوجاتا ہے۔ تو صاحبو! اس کا انتظار نہ کیجئے آپ جس حال میں ہیں اُسی حال سے چلے آیئے دور رہ کر پاک ہونے کا انتظار نہ کیجئے پاک ہونے کا بھی طریقہ یہی ہے کہ ایک بار ناپاکی کی حالت ہی میں آجایئے۔ اس لئے فرماتے ہیں ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(واپس آ واپس آ جو کچھ بھی تو ہے واپس آ جا اگرچہ کافر و آتش پرست اور بت پرست ہے واپس آ جا ہمارا دربار نا امیدی کا دربار نہیں ہے سو بار اگر تو نے توبہ توڑی ہے واپس آ جا)

ان شاء اللہ تعالیٰ خدا کے دربار میں حاضر ہونے سے بہت جلد یہ دلدر دھل جاویگا اور ایک دن یوں ہی بیڑا پار ہو جائے گا۔ بہت لوگ بزرگوں کے پاس اسی خیال سے نہیں جاتے کہ یہ دنیا کا پاخانہ لیکر ان کے پاس کیا جاویں وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

صاحبو! اس کا وسوسہ ہرگز نہ لاؤ وہ حضرات تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ جیسے اخلاق اختیار کرو) سے متصف ہوتے ہیں وہ کسی آنے والے کو حقیر نہیں سمجھتے وہ عیب پوش اور کریم النفس ہوتے ہیں بلکہ بخدا ان کی نظر میں اپنے سے زیادہ کوئی بھی ذلیل نہیں ہوتا پھر وہ کسی کو نظر حقارت سے کیا دیکھتے اس لئے تم اس ناپاکی سمیت ہی ان کے پاس چلے آؤ مجھے ایک صاحب کی حالت تو نہیں مگر اس کی بنا بہت ہی پسند آئی۔ وہ جونپور سے میرے پاس بیعت ہونے آئے تھے اور اس حال سے آئے کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے اور ڈاڑھی منڈی ہوئی مونچھیں خوب بڑھی ہوئی۔ اور آکر مجھ سے اپنے سب حالات کہدیئے پھر بیعت کی درخواست کی میں نے بعد مغرب کا وقت مقرر کر دیا وہ دن جمعہ کا تھا۔ بھلے مانس نے اس دن بھی حجامت بنوائی تو جو کچھ بال ڈاڑھی کے نکل آئے تھے وہ بھی منڈوا دیئے یہ حرکت مجھے بہت ناگوار ہوئی کہ یہاں آکر بھی انھوں نے اس گناہ کو نہ چھوڑا مگر بعد نماز جمعہ کے انھوں نے اپنے اس فعل کی جو بنا بیان کی اس پر مجھے وجد آگیا۔ کہنے لگے کہ غالباً آپ کو آج میرا ڈاڑھی منڈانا ناگوار ہوا ہوگا میں نے کہا بے شک۔ کہنے لگے کہ خیال مجھے بھی ہوا تھا کہ آپ کو ناگوار ہوگا۔ مگر میں نے یہ چاہا کہ طبیب کے سامنے

اپنے مرض کی اصلی حالت صاف صاف ظاہر کردوں اس لئے میں نے اس شکل سے اپنے کو پلیش کردیا۔ اب آپ جو تصرف چاہیں مجھ میں فرمائیں میں سب کے لئے حاضر ہوں۔

سو وہ گو فعل مجھے ناگوار ہوا مگر اس بنا، کی قدر ہوئی اور معلوم ہو گیا کہ اس شخص پر صدق کا حال غالب ہے گو بوجہ جہل کے بری طرح ظاہر ہوا مگر واقعی میں اس کے صدق کی قدر کرتا ہوں اور یہ ایسی قدر ہے جیسے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چور کی قدر کی تھی انھوں نے ایک شخص کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھا تھا ساتھ والوں سے پوچھا کہ اس کو سولی کیوں دیگئی لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ بڑا پکا چور تھا۔ ایک بار اس نے چوری کی تو دایا ہاتھ کاٹا گیا پھر باز نہ آیا اور دوبارہ چوری کی تو بایاں پیر کاٹا گیا۔ پھر باز نہ آیا تو قید کر دیا گیا اس نے قید خانہ میں بھی چوری کی تو حاکم نے سولی کا حکم دیا یہ سن کر حضرت جنید نے دوڑ کر اس کے قدم چوم لئے۔ اہلِ ظاہر نے اعتراض کیا کہ آپ ایک ایسے پکے چور کے قدم چومتے ہیں فرمایا میں نے چور کے قدم نہیں چومے بلکہ اس کے استقلال کے قدم چومے ہیں کہ وہ جیسا بھی کچھ تھا اپنی طلب کا پکا تھا۔ اس کا محبوب گو کیسا ہی برا تھا مگر اس نے اس کے پیچھے جان دے دی اس کا یہ حال تھا کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بجانا یا جاں ز تن برآید

(طلب سے ہاتھ نہ روکونگا جب میرا مقصد پورا نہ ہو جائے بدن یا تو محبوب کے پاس پہونچ جائے یا جان تن سے نکل جائے)

میں اس کے استقلال کی قدر کرتا ہوں۔

اے لوگو! اگر ہم کو حق پر ثابت قدم رہنے میں ایسا استقلال حاصل ہو جائے تو ہمارا کام بن جائے۔ دیکھئے حضرت جنیدؒ نے اس شخص کے استقلال

کی قدر کی گو اس استقلال کی صورت بری تھی۔ اسی طرح گو ان صاحب نے ایک بری حرکت کی کہ ڈاڑھی منڈائی مگر چونکہ یہ حرکت صدق پر مبنی تھی اس لئے مجھے اس کی قدر ہوئی (کیونکہ ایسے سچے اور صاف دل آدمی سے یہ امید قوی ہوتی ہے کہ وہ بیعت کے وقت جو کچھ اقرار کرے گا سچے دل سے کرے گا پھر اس کے خلاف نہ کرے گا۔

چنانچہ ان صاحب نے تھانہ بھون سے جاکر پھر عمر بھر ڈاڑھی نہیں منڈائی بلکہ ایک وقت میں ان کی اتنی بڑی ڈاڑھی ہوگئی تھی کہ دیکھنے والے پہچانتے بھی نہ تھے کہ یہ وہی شخص ہے جو پہلے بالکل آزاد رند تھا غرض وہ پورے نیک صالح بن گئے (بات یہ ہے کہ صفات حمیدہ ہر حال میں حمیدہ ہیں جس میں کوئی صفت حمیدہ ہوتی ہے گو ایک وقت میں بری صورت سے اس کا ظہور ہو رہا ہو مگر جب اصلاح ہوگی تو کامل ہوگی خوب سمجھ لو ۱۲)

تو میں کہتا ہوں کہ آپ کو اس شخص کی طرح گندگی اور بدحالی ہی میں اپنے کو کسی بزرگ کے سپرد کر دینا چاہیئے اس کا خیال نہ کیجئے کہ اس صورت سے ہم بزرگوں کے پاس کیسے جائیں۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ بعض دفعہ اہل اللہ کو دعائے مغفرت سے بھی شرم آتی ہے مگر وہ اس سے رکتے نہیں بلکہ وہ دل کو سمجھاتے ہیں کہ شرم کس سے کریں اگر اسی شرم میں رہے اور خدا تعالیٰ سے دعا نہ کی تو یہ ناپاکی کیونکر دھلے گی۔ تو جب وہ حضرات امور مباحہ کی دعا سے بھی شرماتے ہیں (گو اس پر عمل نہ کریں) تو آپ کے ناجائز کاموں کے لئے تو کیوں دعا کی ہمت کریں گے اس لئے زندہ یا مُردہ بزرگوں سے ایسی دعائیں کرانا محض بے سود اور صرف ان کو تکلیف دینا ہے۔ پس ناجائز دعائیں تو مستثنیٰ ہیں رہی جائز دعا چاہے دنیا ہی کی کیوں نہ ہو وہ تو عبادت ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ دعا عبادت کا مغز ہے کیونکہ دعا میں تذلل اور عاجزی کی شان ہوتی ہے دعا کرنے والا اپنے کو ذلیل و محتاج سمجھ کر دعا کرتا ہے بخلاف اُس کے جو وظیفہ پڑھتا ہے اس کی

حالت تذلل کی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حالت دعوے کی ہوتی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ وظیفہ سے کامیابی ضروری ہے ان کے مکالمات سے یہ بات ظاہر ہے چنانچہ وہ کہا کرتے ہیں کہ حضرت ایسا وظیفہ بتلائیے کہ تیر بہدف ہو اور اگر کسی وظیفہ کی نسبت یہ لکھدیا جائے کہ یہ مجرب ہے تو اس پر ایسا بھروسہ ہوجاتا ہے کہ گویا تخلف ہوگا ہی نہیں تو چونکہ اس میں دعوے کی شان ہے اس لئے یہ ناپسند ہے مگر آجکل لوگ اکثر دعا کو چھوڑ کر وظائف پڑھتے ہیں گو ان کا پڑھنا جائز تو ہے (اگر ان میں کوئی بات خلاف شریعت نہ ہو)

مگر اس میں ثواب کچھ نہ ہوگا کیونکہ ثواب کے لئے یہ قاعدہ ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے) اور وظائف میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی بلکہ محض دنیا ملنے کی نیت ہوتی ہے اس لئے ثواب کچھ نہ ہوگا بخلاف دعا کے کہ وہ اپنی ذات سے عبادت ہے حتیٰ کہ اس میں اگر دنیا مانگی جائے تب بھی شریعت اس کو عبادت کہتی ہے۔ چنانچہ خود شریعت نے اس کو دنیا مانگنے کا طریق تجویز فرمایا ہے پس دنیا کی نیت کرنا دعا کے منافی نہیں کیونکہ احادیث میں دنیا کی نیت سے بھی دعا کرنے کا حکم ہے مثلاً ایک حدیث میں ہے وَسَلُوا اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا مانگو۔ اسی طرح حصول رزق و حصول غنا و ادار دین وغیرہ کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں تعلیم فرمائی ہیں۔ اور اگر احادیث میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دنیوی راحت کو نہیں چھوڑا جس کے لئے کوئی دعا نہ بتلائی ہو اور کسی مصیبت کو نہیں چھوڑا جس سے پناہ مانگنے کا طریقہ نہ بتلایا ہو بلکہ راحت و مصیبت کے علاوہ بھی ہر حالت کے متعلق ایک نہ ایک دعا آپ نے مقرر فرمائی ہے مثلاً گھر میں آنا گھر سے باہر جانا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا بیمار کی عیادت کرنا مسجد میں جانا وہاں سے نکلنا بازار میں جانا۔ سفر شروع کرنا سفر میں کسی جگہ اترنا پھر وطن کو واپس آنا۔ بیت الخلاء میں جانا وہاں سے نکلنا، خوشی یا رنج کی بات دیکھنا،

چاند دیکھنا وغیرہ وغیرہ سب کے لئے احادیث میں الگ الگ دعائیں وارد ہیں۔ تو دنیا کے لئے دعا مانگنا بھی عبادت اور طاعت ہے بخلاف عملیات کے کہ وہ دین کے لئے ہوں تو طاعت ہیں ورنہ نہیں۔

اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دعا زیادہ قابل توجہ ہے مگر اس وقت بالکل برعکس معاملہ ہو رہا ہے کہ وظیفہ کی قدر دعا سے زیادہ ہے بلکہ قرآن سے بھی زیادہ کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو بات چیت کر لیتے ہیں مگر وظیفے میں بولنا حرام سمجھتے ہیں جیسے وہ عہدہ دار صاحب وظیفہ میں ہوں ہوں کیا کرتے اور اشاروں سے رشوت کی مقدار طے کیا کرتے تھے اور جب اشراق کی نماز کو کھڑے ہوتے تو اس سے پہلے کئی سو روپے مصلے کے نیچے آجاتے تھے۔ یہ قیمت تھی ان کی نماز کی آجکل تو اس کو ملنا کہتے ہیں اور اسی اصطلاح کے موافق وہ دوسرے عہدہ دار اپنی بیوی سے پوچھتے تھے کہ تجھے نماز پڑھنے سے کیا ملتا ہے تو چونکہ لوگ آجکل دینی ثمرات کو ثمرات ہی نہیں سمجھتے اس لئے ضرورت ہوتی ہے ان ثمرات کو تفصیل سے بیان کرنے کی چنانچہ میں نے اسی واسطے کل کے بیان میں ان کو ذرا تفصیل سے بیان کر دیا تھا ورنہ اصلی مقصود محتاج تفصیل نہ تھا اس کا حاصل تو صرف اتنا ہے کہ ہم دین کو اختیار کر کے خدا تعالیٰ کے محبوب ہو جاویں گے یہ اس آیت کا جزو تھا جس کو مقصود کہنا چاہئے اور اس کا بیان کل ہو چکا اب اس کا ایک دوسرا جزو ہے یعنی طریق کی تفصیل اس کو آج بیان کیا جائے گا اور ممکن ہے کہ آج کا بیان کل کی برابر مفصل و مطول نہ ہو کیونکہ اس وقت کچھ طبیعت مضمحل ہے مگر ضروری اجزاء ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور بیان ہو جاویں گے اور ایسی تفصیل ہو جائے گی جس سے کچھ بے خبری دور ہو جائے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ یہ آیت دو جزو پر مشتمل ہے۔ ایک مقصود۔ دوسرے طریق مقصود کا بیان وعظ سابق میں ہو چکا۔ اب سمجھئے کہ طریق مقصود کیا ہے۔ وہ دو چیزیں ہیں اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (ایمان لائیں اور نیک کام کریں) کیونکہ حق تعالیٰ یہی تو فرماتے ہیں کہ

؎ دعاء ماثورہ مناجات مقبول کے ہمراہ ترجمہ کی صورت میں شائع ہوئی ہے۔

جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کے لئے حق تعالیٰ محبوبیت پیدا کر دیں گے جس میں محبوبیت کو ایمان و عمل صالح پر مرتب کیا گیا ہے تو مقصود اور نتیجہ تو وُدّ ہے اور ایمان و عمل صالح اس کے ترتب کی شرط ہے یہی حاصل ہے طریق ہونے کا اس۔ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جو محبوب و مقبول بننا چاہے اس کو پہلے ایمان لانا اور عمل صالح اختیار کرنا چاہیئے اور یہاں سے یہ ثابت ہو گیا کہ جب ایمان و عمل صالح مقبولیت و نجات کا طریق ہے تو بدون اس کے تمام نسبتیں نجات کے لئے ناکافی ہیں مثلاً کسی بزرگ کی اولاد ہونا یا اپنے پاس کسی بزرگ کا تبرک ہونا یہ تنہا نجات کے لئے کافی نہیں۔

صاحبو! ہمیں بزرگوں کی تبرکات سے انکار نہیں مگر ان کی اصل اتنی ہے جیسے ایک مثال سے واضح ہوگا اور مجھے مثال دیتے ہوئے شرم بھی آتی ہے کہ ایک دینی مسئلہ کے لئے دنیا کی مثال دوں مگر کیا کیا جائے کہ آج کل لوگوں کے ذہن میں خدائی معاملات کی اتنی قدر نہیں جتنی دنیوی معاملات کی قدر ہے اس۔ لئے جب کسی خدائی معاملہ کو دنیوی معاملہ سے مطابق کر دیا جاتا ہے تو وہ جلدی لوگوں کے ذہن میں آجاتا ہے اس لئے میں شرماتا ہوا مثال دیتا ہوں کہ ان تبرکات کا اتنا اثر ہے جیسے دو شخصوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا ہو اور نوکری کی درخواست دی ہو مگر ان میں ایک تو ایسا ہے جس کا خاندان خیر خواہ سرکار ہونے میں مشہور ہے اور دوسرا ایسا نہیں تو ان دونوں میں اول ملازمت سے وہ کامیاب ہوگا جس کا خاندان خیر خواہ سرکار ہے اور اگر دونوں ساتھ ہی ملازم ہو جائیں تو اس شخص کو بڑا عہدہ ملے گا اور دوسرے کو اس سے کم۔ غرض معزز خاندان والے کا ضرور لحاظ ہوتا ہے خواہ جلدی کامیاب ہونے میں یا بڑا عہدہ ملنے میں کیونکہ وہ ایسے خاندان کی طرف منسوب ہے جو خیر خواہ سرکار ہے لیکن اگر یہ نرا صاحب انتساب ہی ہو اور کوئی امتحان اس۔ نے پاس نہ کیا ہو بلکہ خود جاہل اور بدمعاش ہو تو اس صورت میں اس کو

یہ کہنا کچھ مفید نہ ہوگا کہ پدر من سلطان بود (میرا باپ بادشاہ تھا) بلکہ اس کے جرائم پروردوں سے زیادہ قوی مقدمہ قائم ہوگا اور اس سے کہا جائے گا کہ افسوس تم باوجود حقوق سلطنت سے واقف ہونے کے سلطنت کی مخالفت کرتے ہو تم تو حکومت کے آشنا تھے تمہارے تو بچہ بچہ کی زبان پر حکومت کے حقوق و احسانات کا تذکرہ تھا تجھ پر کیا مار آئی جو مخالفت قانون پر پیشقدمی کرنے لگا تو عجب نہیں کہ اس شخص کے جرم پر ایسا سنگین مقدمہ قائم ہو جو ایک جلاہے دھوبی کے جرم پر نہ قائم ہو اور یہ حکومت کی نظر میں زیادہ مبغوض و قابل نفرین قرار پائے۔ چنانچہ واقعات اس پر شاہد ہیں۔

اسی طرح بزرگوں کی طرف انتساب سے یہ نفع ضرور ہوتا ہے کہ یہ شخص اگر ایمان و عمل صالح اختیار کرے تو دوسروں سے جلدی کامیاب ہوتا یا بڑے درجہ میں پہنچ جاتا لیکن اگر یہ سرکشی سے پیش آوے تو اس وقت نرا انتساب کافی نہ ہوگا اس وقت مجھے اپنے استاد علیہ الرحمۃ کا ایک ارشاد یاد آیا جو ایک حدیث کی شرح میں انھوں نے فرمایا تھا اول میں حدیث سنا دوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک منافق تھا عبد اللہ بن ابی یہ رئیس المنافقین تھا مگر اس کے لڑکے صحابی اور مؤمن مخلص تھے۔ جب اس منافق کا انتقال ہوا تو اس کے لڑکے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے اس کے کفن کے لئے اپنا کرتہ عطا فرما دیجئے (شاید اس کی برکت سے خدا اس کی مغفرت فرما دے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ دے دیا اور تجہیز و تکفین میں بھی شریک ہوئے حتیٰ کہ نماز جنازہ بھی پڑھانا چاہی اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جوش آگیا۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک پکڑ لی کہ آپ کس کی نماز پڑھانا چاہتے ہیں ایک منافق کی جن کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ

تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ یعنی چاہے آپ منافقین کے لئے ستر مرتبہ بھی دعا و استغفار فرمائیں خدا تعالےٰ ان کو نہ بخشیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالےٰ نے مجھ کو استغفار سے منع نہیں فرمایا اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستر دفعہ سے زیادہ استغفار کرنے سے ان کی مغفرت ہو جائے گی تو میں زیادہ استغفار کر لوں گا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ کی نماز پڑھا دی۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی کیا عجیب شفقت و رحمت تھی کہ دشمنوں سے بھی رحمت میں آپ کو دریغ نہ تھا۔

صاحبو! ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہم کو ایسے رحیم و کریم پیغمبر (صلی اللہ علیٰ سیدی و روحی وسلم) نصیب ہوئے ہمیں تو آپ سے بہت کچھ امیدیں ہیں ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو
کہ دارد چنیں سید پیشرو

(وہ شخص دوزخ میں گناہوں کی وجہ سے نہیں رہے گا جو ایسا سردار پیشرو رکھتا ہو)

جب دشمنوں پر بھی آپ کی یہ رحمت ہے تو اپنے غلاموں پر تو کیا کچھ ہو گی۔ غرض آپ نماز پڑھ چکے اور دفن میں بھی شریک ہوئے اور اس منافق کے قبر میں رکھے جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں ڈال دیا اس کے بعد آیت نازل ہوئی وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَمَاتُوۡا وَهُمۡ فٰسِقُوۡنَ۔ (اور ان میں کوئی مر جائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو جئے انھوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ حالت کفر ہی میں مرے ہیں) جس میں منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے اور ان کے دفن وغیرہ میں شرکت کرنے کی

صاف صاف ممانعت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بعد میں بڑی ندامت و شرمندگی ہوئی کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیسی جرأت کی آپ کو ایک کام سے رد کرنے لگا (میرا کیا منصب تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو سب سے زیادہ ہر ایک بات کو جاننے والے ہیں ۱۲)

خیر یہ تو واقعہ تھا اس میں بہت گفتگو اور کلام ہے کہ آپ نے باوجود لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (ہرگز نہ بخشے گا اللہ ان کو) وارد ہو چکنے کے پھر اس منافق کی نماز کیوں پڑھی مگر یہ تو طالب علمانہ مباحث ہیں طالب علم ان کو خود حل کرلیں گے۔ مگر اس میں اس بات کا بتلانا مقصود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منافق کو اپنا کرتہ کیوں پہنایا اور اس کے منہ میں لعاب دہن مبارک کیوں ڈالا۔

شراح حدیث نے تو یہ لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کی خاطر سے جو مخلص مومن تھے یہ سب کچھ کیا (تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی نجات کی سعی میں کوئی کوتاہی نہیں رہی آپ نے دعا بھی کردی نماز بھی پڑھ دی اپنے تبرکات بھی عطا فرما دیئے اب بھی اگر اس کی مغفرت نہ ہو تو یہ خود اسی کا قصور ہے ۱۲) اور بعض نے کہا ہے کہ اس منافق نے جنگ بدر کے موقعہ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ (عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک کرتہ پہنایا تھا آپ نے اس کی مکافات میں مرنے کے بعد اُسے کرتہ پہنا دیا (بلکہ مع شئے زائد) یہ سب توجیہات شراح نے کی ہیں مگر ان باتوں سے ہم کو شفا نہیں ہوئی ہیں تو اپنے استاد علیہ رحمۃ کی بات پسند آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منافق کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے فرمایا تاکہ امت کو یہ ضروری مسئلہ بتلا دیں کہ اگر کسی میں ایمان نہ ہو تو پھر چاہے اس کے پاس لاکھ تبرکات ہوں اور چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا شخص اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھ دے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قمیص

اس کا کفن ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں پڑ جائے جب بھی نجات نہیں ہوسکتی اس لئے تنہا ان تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے چنانچہ عبد اللہ بن ابی کے پاس اصل سرمایہ ایمان کا نہ تھا اس لئے اس کے بارہ میں کہا گیا اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہیں جس کو عذاب سب سے زیادہ سخت ہے ۱۲) تو اب معلوم ہو گیا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں اور ہمارے بزرگوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر لیا تھا کہ ہماری اولاد میں سے یا اتباع میں سے کوئی دوزخ میں نہ جائے کیا کارآمد ہوسکتا ہے جب تک اپنے پاس کچھ سرمایہ نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اپنے قریبی رشتہ داروں کو (آتش دوزخ سے) ڈرایئے) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب خاندان کو جمع کیا اور سب کے ساتھ صاحبزادی صاحبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کر کے فرمایا یَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ اِنْقِذِیْ نَفْسَکِ مِنَ النَّارِ لَا اُغْنِیْ عَنْکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا (اے فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رہا کرا اپنے نفس کو آتش (دوزخ) سے میں تجھ سے کسی چیز کو اللہ تعالیٰ سے بے پرواہ نہیں کر سکتا) اور اپنی پھوپھی صاحبہ کو خطاب کر کے فرمایا یَا صَفِیَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اِنْقِذِیْ نَفْسَکِ مِنَ النَّارِ لَا اُغْنِیْ عَنْکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔ (اے صفیہ عمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نفس کو (اعمال صالحہ کر کے) دوزخ سے بچا میں کسی چیز سے تجھ کو اللہ سے بے پرواہ نہیں کر سکتا) اسی طرح سب اعزہ سے فرمایا کہ اپنے آپ کو جہنم سے بچا لو میں تمہارے کام نہ آسکوں گا یعنی اگر نرے میرے بھروسہ پر رہ گئے تو اس صورت میں میں کچھ کام نہ آؤں گا ہاں خود بھی کچھ سرمایہ جمع کر لو تو بیشک آپ کام آئیں گے۔ بس یہ درجہ ہے انتساب اور تبرکات کا کہ وہ بدون اپنے عمل کے تنہا کافی نہیں ہوتے باقی اپنے پاس بھی کچھ عمل ہو تو پھر وہ ضرور

نافع ہیں ان کی برکت کا انکار نہیں ہو سکتا اگر تبرکات نافع نہ ہوتے تو سلف صالحین اس کا اہتمام نہ کرتے حالانکہ سلف سے اس کا اہتمام منقول ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبرکات دیئے ہیں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چادرہ مبارک ایک صحابی کو عطا فرمایا اور حج کے موقع پر اپنے بال تقسیم فرمائے۔ اور بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ تبرکات واقعی کام بھی آتے ہیں مگر نرے تبرکات کام نہیں آتے بلکہ اصل سرمایہ کے ساتھ یہ بھی مل جائیں تو نفع بڑھ جاتا ہے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کھانے کے ساتھ چٹنی اور مربہ کہ اس سے کھانے کا لطف بڑھ جاتا ہے اب اگر کوئی شخص دوستوں کی دعوت کرے اور سارا دستر خوان چٹنی اور مربوں ہی سے بھر دے تو کیا یہ دعوت ہوگی یہ تو مسخرا پن ہوگا۔ اسی طرح جو چیزیں زوائد میں سے ہیں وہ سب ایسی ہی ہیں کہ ان پر حصول مقصود موقوف نہیں ہوتا اور وہ تنہا مقصود سے مغنی نہیں ہوتیں ہاں ضروریات کے ساتھ جمع ہو جائیں تو مفید ہوتی ہیں۔ دیکھو اگر دستر خوان پر چٹنی مربے نہ ہوں تو وہ دعوت ضرور ہے اور اگر چٹنی مربا ہی ہو کھانا نہ ہو تو اسے دعوت نہیں کہہ سکتے اور دونوں جمع ہو جائیں تو اعلیٰ درجہ کی اور لذیذ دعوت ہوگی۔

اسی طرح تبرکات نافع ضرور ہیں مگر ان کی نافعیت کے لئے کچھ شرطیں ہیں (یعنی ایمان و عمل صالح) جیسے گورنمنٹ اپنے وفاداروں کی رعایت کرتی ہے بشرطیکہ وہ بغاوت و اقدام جرائم نہ کریں بلکہ تعلیم و تہذیب سے آراستہ ہو کر گورنمنٹ کی اطاعت بھی کریں تو ان کا خیال دوسروں سے زیادہ کیا جاتا ہے اسی لئے سلف نے بزرگوں کی نیک اولاد کا ہمیشہ احترام کیا ہے اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگ بھی اپنی اولاد کا خیال رکھتے ہیں۔

میری ایک رشتہ کی پھوپی تھیں جو بچیوں کو پڑھایا کرتی تھیں، ہمارے یہاں رسم یہ ہے کہ لڑکیاں گھروں ہی میں تعلیم پاتی ہیں ان کے لئے کوئی زنانہ اسکول

نہیں اور نہ یہ مناسب ہے (اس میں بہت مفاسد ہیں جن کا تجربہ رات دن ہوتا جاتا ہے ۱۲) تو اسی طرح میری پھوپی صاحبہ اپنے گھر پر لڑکیوں کو پڑھاتی تھیں اور کسی سے معاوضہ وغیرہ کچھ نہ لیتی تھیں ایک مرتبہ ان کے یہاں ایک سید کی لڑکی پڑھنے آئی وہ فرماتی تھیں کہ اسی روز رات کو میں نے حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا فرماتی تھیں کہ عمدۃ النساء دیکھو ذرا میری بچی کو محبت سے پڑھانا۔ اسی طرح اور بہت سی بشارتیں اور منامات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو اپنی اولاد کا خیال رہتا ہے اور آخرت میں اس نسبت سے یہ نفع ہوگا کہ حق تعالیٰ بزرگوں کی اولاد کو انہی بزرگوں کے درجوں میں پہنچادیں گے چنانچہ ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ اس میں افراط و تفریط دونوں کا علاج کر دیا گیا فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ایمان لائے اور ان کی اولاد ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتے رہیں یعنی کافر و شریر نہ ہوں تو ہم ان کو بھی اون ہی کے ساتھ ملادیں گے یعنی گو عمل میں دونوں برابر نہ ہوں مگر پھر بھی سب کو برابر کر دیا جائے گا جیسے کوئی بادشاہ کہیں مہمان بن کر جائے اور اس کا بیٹا بھی اس کی ہمراہ ہو تو وہ بھی اسی جگہ ٹھہرے گا جہاں بادشاہ ٹھہرے گا اب یہاں کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اس برابری کی صورت یہ ہو کہ اوپر کے درجہ والوں کو نیچے کر دیا جائے یا کچھ ان کو گھٹایا جائے اور کچھ ان کو بڑھایا جائے اور اوسط پورا کر کے درمیانی درجہ دے دیا جائے تو اس کا جواب دیتے ہیں وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ کہ ہم بلند درجہ والوں کے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کریں گے بس معلوم ہو گیا کہ برابری کی صورت یہ ہو گی کہ ناقص الاعمال کو کامل الاعمال کے درجہ میں بھیجدیا جائے گا کاملین کے درجات میں کمی نہ کی جائے گی اب اس کو سن کر شاید کسی کو ہوس ہوتی کہ پھر ہم کو عمل کی کیا ضرورت ہے تو آگے ایسا فیصلہ

فرمایا ہے جس سے اس خیال کا استیصال ہو گیا۔ فرماتے ہیں کُلُّ امْرِئٍ بِمَا کَسَبَ رَهِيْنٌ کہ ہر شخص اپنے کئے ہوئے (اعمال) کے ساتھ مقید ہو گا معلوم ہوا کہ عمل کی پھر بھی ضرورت ہے بدون عمل کے یہ دولت نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہاں سے یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ شرف نسب نافع ہے یا نہیں اس وقت اس بارے میں غلو ہو رہا ہے۔ بعض تو اسی کو اصل قرار دیتے ہیں اور بعض اس کو مٹاتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں اور دیکھا یہ گیا ہے کہ جو لوگ ذی نسب نہیں ہیں وہی زیادہ تر اس کو مٹاتے ہیں اور دونوں کا منشا تکبر ہے جو لوگ نسبت تو اصل قرار دیتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنی بڑی چیز ہے ہم کو بڑا سمجھو اور جو اس کو مٹاتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہم شرفاء سے کسی بات میں کم نہیں ہیں کیونکہ شرافت نسب کوئی چیز نہیں۔ بعض نے تو یہ کیا کہ نسبت ہی کا استیصال کر دیا اور بعض نے یہ کیا کہ اپنے کو کھینچ تان کر شرفاء میں داخل کر دیا۔ میں ایک مقام پر گیا وہاں کی چھوٹی قوموں نے اپنی چار قسمیں کر لیں۔ شیخ، سید، مغل، پٹھان اور اپنے محلہ کا نام بھی بدل دیا۔ میں اس جگہ کا نام نہیں لینا چاہتا جب میں وہاں گیا تو مجھ سے بیان کی درخواست کی گئی تو اتفاقاً میں نے نسب ہی کا بیان کیا (حالانکہ مجھے اس واقعہ کی اطلاع نہ تھی نہ کسی نے مجھ سے کچھ کہا تھا ۱۲) تو وہ لوگ بہت ناراض ہوئے جنھوں نے اپنے کو شرفاء میں داخل کیا تھا اور کہنے لگے کہ بھلا یہی مضمون بیان کے لئے رہ گیا تھا۔

وہ یہ سمجھے کہ وہاں کے شیخ زادوں نے یہ مضمون فرمائش کر کے بیان کرایا ہے۔ اس لئے وہ شیخ زادوں سے بھی بہت خفا ہوئے (حالانکہ میری یہ بالکل عادت نہیں کہ فرمائشی مضمون بیان کروں بس وقت پر جو بات دل میں آ جاتی ہے بیان کر دیتا ہوں ۱۲) غرض نسبت کے بارہ میں یہ غلو ہو رہا ہے اور منشا اس کا محض تکبر ہے جنھیں قدرت ہوتی ہے ان کا تکبر زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور جن کو قدرت نہیں ان کے بھی برتاؤ سے

پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اپنے کو بڑا بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں ایک قصبہ میں جس کا نام کاندھلہ ہے گیا ہوا تھا وہاں ایک نائی نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ جو شخص السلام علیکم کہنے سے چڑے وہ کیسا ہے۔ یہ سوال اس نے بھرے مجمع میں کیا تھا جہاں وہ رؤسا بھی موجود تھے جو اس شخص کے زعم میں السلام علیکم سے چڑتے تھے وہ بڑے متفکر ہوئے کہ دیکھئے کیا فتویٰ لگتا ہے۔ میں نے کہا کہ جو السلام علیکم سے چڑے وہ بہت بُرا اور جو السلام علیکم مساوات اور برابری جتلانے کے لئے تان کر اور لٹھ سا مار دے وہ اس سے بھی بُرا چھوٹا آدمی بڑوں کو سلام کرے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹا بن کر نرمی سے السلام علیکم کہے لٹھ سا نہ مارے بس اس طرح کہے جیسے بیٹا باپ کو السلام علیکم کہا کرتا ہے اس سے نہ کوئی چڑے گا نہ کسی کو ناگواری ہوگی۔ پس کہو السلام علیکم ہی مگر اس طرح کہو۔

جب سائل چلا گیا تو سارے رؤسا ہنسنے لگے اور کہا کہ صاحب تم نے اس مرض کو سمجھا واقعی یہ جب سلام کرتا ہے لٹھ سا مارتا ہے جیسے کوئی برابری جتلاتا ہو۔ اسی سے ہم کو ناگواری ہوتی ہے ورنہ آدمیت سے سلام کرے تو کون چڑتا ہے۔ غرض شرفاء کو تو متکبر کہا ہی جاتا ہے مگر یہ غریب بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ ا

ایک قصہ اس کے مقابل مجھکو یاد آگیا کہ ایک نائی کسی کا خط لیکر ایک قصبہ میں گیا وہاں جا کر اس نے السلام علیکم کہا تو شیخزادوں نے اسے خوب پیٹا اس نے پوچھا کہ حضور پھر کیا کہوں لوگوں نے کہا کہ حضرت سلامت کہا کرو۔ اس کے بعد نماز جمعہ کا وقت آیا تو جب امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو اس نائی نے پکار کر کہا حضرت سلامت ورحمۃ اللہ حضرت سلامت ورحمۃ اللہ۔ امام نے اسے بلا کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت میرا قصہ سُن لیجئے بات یہ ہے کہ میں نے یہاں کے رئیسوں کو السلام علیکم کہہ کر سلام کیا

تھا تو انھوں نے مجھے بہت مارا اور یہ کہا کہ حضرت سلامت کہنا چاہیئے مجھے ڈر ہوا کہ اگر کہیں فرشتے بھی السلام علیکم سے خفا ہو گئے تو ان میں ایک فرشتہ ملک الموت بھی ہے وہ تو میری جان ہی نکال لیں گے اس لئے میں نے نماز میں بھی حضرت سلامت ہی کہا اس پر امام صاحب نے وعظ میں ان رئیسوں کی خبر لی کہ یہ کیا واہیات ہے تم لوگوں کو طریق سنت سے منع کرتے ہو سو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔

ایک اور قصہ یاد آیا، کانپور میں ایک دفعہ میرے پاس دیہات کے ایک قاضی صاحب تشریف لائے اور السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر میں کہنے لگے کہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں میں نے کہا کہ فرمایئے کہنے لگے کہ اس عملداری میں شرفا اور غربا میں بالکل مساوات ہو گئی۔ البتہ صرف ایک فرق السلام علیکم کا رہ گیا تھا ہمارے مولویوں نے یہ بھی اٹھا دیا سب کے لئے وہی السلام علیکم۔ میں نے کہا قاضی صاحب شرفا اور غربا میں جو فرق ہے تو یہ دینی امور میں ہے یا دنیوی امور میں۔ اگر دینی امور میں بھی ہے تو جا کر اپنے شہر میں غربا سے کہہ دیجئے کہ ظہر و عصر و عشا کی تین رکعت پڑھا کرو (اور مغرب کی دو اور صبح کی ایک) اور اگر وہ نہ مانیں تو تم چار کی پانچ اور تین کی چار اور دو کی تین پڑھا کرو تاکہ برابری نہ ہو جاوے وہ بہت ہی چپ ہوئے پھر میں نے کہا کہ اب بتلایئے کہ السلام علیکم دین کا کام ہے یا دنیا کا ظاہر ہے کہ دین کا کام ہے پھر اس میں امیر و غریب کا فرق کیوں ہو باقی دنیوی امور میں فرق کرنے سے ہم منع نہیں کرتے یہی فرق بہت ہے کہ تم سرہانے بیٹھتے ہو اور غربا پائینتی پر بیٹھتے ہیں (اگر کوئی غریب آدمی امیر کی برابر سرہانے پر چڑھ کر بیٹھے گا تو ہم اس کو ضرور منع کریں گے ۱۲) غرض نسبت کے باب میں جانبین سے یہ غلو ہو رہا ہے کہ بعض نے اسی کو اصل قرار دے لیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بالکل کوئی چیز نہیں اس لئے میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں جو اسی آیت کے مضمون سے اور اسی مقام سے مستنبط ہوتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت جو لوگ شریف ہیں

اور اپنے کو صدیقی یا فاروقی یا سید کہتے ہیں تو وہ بتلائیں کہ ان کے اسلاف میں شرف کہاں سے آیا ظاہر ہے کہ یہ حضرات منتسب الیہم چونکہ دین میں کامل تھے اس لئے ان کی طرف انتساب سبب شرف ہوگیا تو اصل وجہ شرف دین وایمان ٹھہرا یہی سبب ہے ہمارے اسلاف کے شرف کا اور اسی وجہ سے ان کی طرف انتساب بھی سبب شرف ہوگیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے ساتھ وہ حضرات عالی خاندان بھی تھے مگر تنہا یہی سبب شرف نہیں (کیونکہ عالی خاندان تو ابوجہل وابولھب بھی تھے مگر ان کی طرف انتساب کسی کو بھی گوارا نہیں ۱۲) بلکہ اس کے ساتھ چونکہ ان حضرات کا کمال دین بھی مل گیا ہے اس لئے انتساب میں شرف آگیا تو یہ بالکل بے اصل چیز نہیں ہے بلکہ شریعت نے اس شرف کا اعتبار کیا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ چنانچہ دنیا میں تو اس طرح اعتبار کیا گیا ہے کہ حدیث میں حکم ہے کہ نکاح اکفاء میں کیا کرو اور شریعت نے کسی شریف زادی کا کفو غیر شریف کو نہیں مانا اور آخرت میں بھی اتنا نفع ہے کہ جو شخص ان شرفاء کی اولاد میں ہوگا وہ اگر ایمان وعمل صالح کو اختیار کرے تو اس کو دوسروں سے کچھ زیادہ ملے گا اور جنت میں وہ اپنے اسلاف کے درجہ میں ہوگا گو اعمال اس درجہ کے نہ ہوں لیکن یہ نفع کچھ عرفی شرفاء ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر کوئی جُلاہا بھی ولی ہو تو اس کے بیٹے کو بھی وہی نفع حاصل ہوگا جو ان شرفاء کے بیٹوں کو ہوگا غرض شرافت میں آخرت کا بھی نفع ہے مگر وہ اصطلاحی شریف کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو بھی مقبول عنداللہ ہوگا اس کی طرف انتساب نافع ہوگا پس یہ کہنا غلط ہے کہ شرف نسب نافع نہیں نافع ضرور ہے مگر وہ شرف انتسابی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو شریف عنداللہ ہو اس کی طرف انتساب نافع ہے خواہ وہ تمہاری اصطلاح کے موافق شریف ہوں یا نہ ہوں پس آخرت میں تو شریف اور غیر شریف میں اس طرح تفاوت ہوگا باقی دنیا میں تو تفاوت ہے ہی کہ غیر شریف کو شریف زادی کا کفو نہیں مانا گیا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

(نیز عقل و فہم تہذیب و اخلاق وغیرہ میں بھی شریف و غیر شریف کا تفاوت ظاہر ہو جاتا ہے ۱۲) مگر اس کا یہ اثر نہ ہونا چاہئے کہ تم دوسروں کو ذلیل سمجھو بس ایسا تفاوت سمجھنا چاہئے جیسے چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی یا باپ اور بیٹے میں اور حاکم و محکوم میں ہوا کرتا ہے اس تفاوت کا یہ اثر نہیں ہوا کرتا کہ بڑا بھائی چھوٹے کو یا باپ بیٹے کو حقیر سمجھنے لگے یہ فیصلہ ہوا اس اختلاف کا یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل میں میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ نرا انتساب کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایمان و عمل صالح بھی ضروری ہے چنانچہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ (جو لوگ ایمان لائے اور ان کی ذریت (اولاد) نے ایمان میں ان کا اتباع کیا) سے یہ مضمون صاف طور سے نکل آیا۔ پس اب کسی کو اس پر قناعت نہ کرنا چاہئے کہ ہم بزرگوں کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں یا ہمارے پاس ان کے تبرکات ہیں بلکہ ایمان و عمل کا اہتمام کرنا چاہئے اس کے ساتھ اس انتساب کی برکت بھی کام دے گی ورنہ بیکار ہے یہی مضمون اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے) اسے بھی مستفاد ہوتا ہے کیونکہ اس میں مقبولیت کا مدار ایمان و عمل صالح ہی کو ٹھہرایا گیا ہے معلوم ہوا کہ ان کے سوا اور کوئی شئے مدار کار نہیں بلکہ زوائد کی قبیل سے ہیں۔ بہرحال مقصود مقام یہ ہے کہ اس آیت کے اول جزء میں طریق حصول مقصود مذکور ہے اور اس کی فہرست بتلائی گئی ہے جس کے دو جزء ہیں ایک ایمان ایک عمل صالح اور اس وقت میں اسی طریق کی تفصیل کرنا چاہتا ہوں سو ایمان کی تفصیل کے لئے تو باب العقائد دیکھنے کی ضرورت ہے اگر میں تمام عقائد کی تفصیل کروں تو اس کے لئے ایک جلسہ ناکافی ہے اس لئے میں اس وقت پوری تفصیل تو ذکر کرنا نہیں چاہتا صرف اقسام اولیہ ذکر کرنا چاہتا ہوں جن میں

آجکل لوگوں نے غلطی کر رکھی ہے تو سمجھئے کہ آجکل لوگوں کو عقائد کے باب میں دو قسم کی غلطیاں واقع ہو رہی ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو عقائد کو ضروری سمجھتے ہیں مگر ضرورت کو اسی میں منحصر کہتے ہیں یعنی اعمال کی ضرورت نہیں سمجھتے چنانچہ عام طور سے یہ عقیدہ ہے کہ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس شخص نے لاالہ الا اللہ کہا جنت میں داخل ہوا) کہ جو توحید و رسالت کا قائل ہو اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا معتقد ہو بس وہ جنتی ہے اب اسے کسی عمل کی ضرورت نہیں پھر بعض نے اور انتخاب کیا کہ ایمان کا بھی اختصار کر لیا کیونکہ ایمان کی حقیقت تو یہ ہے اَلتَّصْدِیْقُ بِمَا جَاءَ بِهِ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (ان تمام چیزوں کی تصدیق کرنا جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جو خبریں دی ہیں کہ اللہ واحد ہے، قیامت آنے والی ہے، وزن حق ہے، حساب کتاب حق ہے، دوزخ جنت حق ہے، تقدیر کا مسئلہ حق ہے، فرشتوں کا وجود حق ہے، پلصراط پر چلنا حق ہے، نماز کی فرضیت حق ہے، زکوٰۃ اور روزہ و حج سب کی فرضیت حق ہے کیونکہ یہ طاعات گو اعمال ہیں مگر ان کی فرضیت کا اقرار کرنا ایمان میں داخل ہے۔ یعنی ایک تو نماز کا پڑھنا ہے اور روزہ رکھنا زکوٰۃ دینا، حج کرنا یہ تو عمل ہے اور ایک ان کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا ہے یہ ایمان کا جزو ہے بدون اس اعتقاد فرضیت کے ایمان کا تحقق نہیں ہو سکتا تو ایمان نام تھا ان سب چیزوں کی تصدیق کا مگر آجکل لوگوں نے اس میں بھی انتخاب کر لیا ہے۔ بعضے وزن اعمال کی تصدیق کو ضروری نہیں سمجھتے بعضے صراط کی تصدیق کو ایمان میں داخل نہیں سمجھتے کوئی تقدیر کے مسئلہ کا انکار کرتا ہے وعلیٰ ہذا اور پھر بھی وہ اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں تھوڑے دنوں پہلے یہ حالت تھی کہ ان عقائد میں کسی کو اختلاف نہ تھا گو فروع میں اختلاف تھا کیونکہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں ایک تو ایسے امور میں اختلاف جن میں اختلاف کی گنجائش ہے یہ تو فروع ظنیہ میں ہوتا ہے جیسا کہ مجتہدین میں اختلاف ہوا ہے

یا ان کے بعد ان کے اتباع میں ہوا ہے یہ تو سب اعمال کے درجہ میں اختلاف ہے عقائد میں کسی کو اختلاف نہ تھا اور عقائد میں بھی کسی نے اختلاف کیا ہے تو وہ عقائد مہمہ مقصودہ میں نہ تھا بلکہ عقائد مہمہ کی فروع میں تھا مگر کچھ دنوں سے ایک ایسا اختلاف پیدا ہوا ہے جس کے ذکر کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا یعنی اب ان امور میں بھی اختلاف ہونے لگا ہے جن میں کچھ دن پہلے کسی کو شبہ بھی نہ تھا مگر اس وقت اس نئی تعلیم کی بدولت بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ علم دین نہ ہونے یا دین سے محبت اور علماء کی صحبت نہ ہونے کی بدولت عقائد مہمہ میں بھی اختلاف ہونے لگا ہے۔ ہمارے بزرگوں میں گو علم دین تو عام طور پر کامل نہ ہوتا تھا عالم دو چار دس پانچ ہی ہوتے تھے مگر یہ دو چیزیں ان کے پاس بڑی کام کی تھیں یعنی دین کی محبت اور علماء کی صحبت مگر اس وقت ہمارے بھائیوں نے علم دین کو تو چھوڑا ہی تھا ساتھ میں ان دونوں کو بھی چھوڑ دیا اور یہی وجہ ہے ہماری خرابیوں کی کیونکہ جو شخص طبیب کے پاس نہ جائے گا اس کو صحت نہیں ہو سکتی اور طبیب کے پاس وہ جائے گا جس کو صحت مطلوب ہو۔ تو آجکل ہمارے بھائیوں کو دراصل دین ہی سے محبت نہیں اسی لئے اطباء دین کے پاس بھی نہیں جاتے اسی لئے ان کے ایمان و دین کو قسم قسم کے روگ لگ جاتے ہیں جن کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی اور سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ بیمار کو بیماری کی اطلاع بھی نہ ہو اور اس سے سخت یہ ہے کہ وہ تندرستوں کو بیمار سمجھنے لگے جیسے ایک نکٹا ناک والوں کو ناکو کہتا تھا یہی حالت ہمارے بھائیوں کی ہے کہ وہ پُرانے لوگوں کو جو ایمان میں کامل ہیں تندرست تو کیا سمجھتے ان کے لئے ایسے ایسے لقب تجویز کرتے ہیں کہ وہ اپنے جواب ہی کی فکر میں پڑجاویں عجیب الٹا زمانہ آگیا ہے۔

صاحبو! پرانے لوگوں میں بھی گنہگار تو ہیں فاسق بھی ہیں مگر ان کی حالت یہ ہے کہ اہل علم کے سامنے جھک جاتے ہیں اگر ان کو عذاب آخرت سے ڈرایا جائے تو ڈر جاتے ہیں وہ اپنے کو اہل الرائے نہیں سمجھتے اسی لئے ان کا

ایمان سلامت ہے۔ باقی جہاں نئی تعلیم ہے اور نری تعلیم ہی تعلیم ہے وہاں تو ایمان کی خیر صلاّ ہے نہ ان میں دین کی محبت ہے نہ اہلِ دین کی عظمت ہے۔ ہر شخص اپنے کو صاحب رائے سمجھتا ہے اور علماء سے مسائل دینیہ میں مزاحمت کرتا ہے باقی جہاں نئی تعلیم کے ساتھ یہ دونوں دولتیں بھی ہوں یعنی دین کی محبت اور اہل اللہ کی صحبت تو وہاں اس سے دین کا کچھ ضرر نہیں ہوتا بلکہ وہاں دنیا کے ساتھ دین بھی جمع ہوتا ہے اسی محبت و علم دین کی نسبت کہتے ہیں۔

درین زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مے ناب و سفینۂ غزل ست

(اس زمانہ میں جو رفیق خلل سے خالی ہے وہ محبت الٰہی اور علم دین ہے)

صراحی مے ناب سے محبت مراد ہے یہ ان کی خاص اصطلاح ہے اور سفینۂ غزل سے علم دین مراد ہے جس کا ایک طریق تو تعلیم ہے اگر یہ میسر نہ ہو تو صحبت اہل اللہ ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو دین کی کتابوں کا مطالعہ ہے مگر کتاب کے لئے بھی صحبت کی ضرورت ہے نری کتب بینی سے دین کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کسی عالم سے سبقاً سبقاً نہ پڑھا جاوے خواہ وہ کتاب اردو زبان ہی میں کیوں نہ ہو جیسے اردو میں طب کی کتابیں دیکھ کر کوئی شخص طبیب نہیں بن سکتا جب تک کسی طبیب کے پاس رہ کر نہ پڑھے پھر اس زمانہ میں تو لوگ کتابیں بھی ایسی مختلف دیکھتے ہیں کہ خدا کی پناہ بس جو کتاب سامنے آئی دیکھنے لگے چاہے اس کا مصنف محقق ہو یا غیر محقق پھر مختلف لوگوں کی کتابیں دیکھ کر خود ہی فیصلہ بھی کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس مسئلہ کو دوسرے سے اچھا لکھا ہے اور غضب یہ کہ اپنے فیصلہ کو معتبر بھی سمجھتے ہیں بھلا اگر کوئی ایسا شخص جو قانون گورنمنٹ سے ناواقف ہو کر کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے لگے تو کیا اس کا فیصلہ معتبر ہو گا؟ ہرگز نہیں پھر حیرت ہے کہ جو شخص خدا کے قانون سے ناواقف ہے اس کے فیصلہ کو معتبر مانا جاوے اگر ایسا ہے تو پھر وکلاء اور بیرسٹروں کی کیا حاجت ہے بس ہر شخص کو قانون کو

دیکھ کر فیصلہ کرلیا کرے مگر یہاں سب اس پر متفق ہیں کہ قانون سلطنت کا سمجھنا ہر اک کا کام نہیں بلکہ جس نے اس کو باقاعدہ پڑھا ہو اور اس میں امتحان دے کر پاس ہوگیا ہو اسی کی رائے معتبر ہے مگر حیرت ہے کہ قانون الٰہی کے سمجھنے کے لئے کسی امتحان اور پاس کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شخص اس میں رائے زنی کرنے کے لئے تیار رہے اور دو چار اردو کی کتابیں دیکھ کر فیصلہ کرنے کو آمادہ ہے اور فیصلہ بھی کیسے صحیح اصول پر مبنی کہ جو سمجھ میں نہیں آیا اس کی نفی کردی بس ہمارے بھائیوں نے یہی ایک سبق یاد کرلیا ہے جن سے ایک استاد نے اپنے ایک بیوقوف شاگرد کو سکھلا دیا تھا کہ جو مسئلہ تجھ سے پوچھا جاوے اگر معلوم ہوا تو بتلا دیا اور جو معلوم نہ ہوا تو یہ کہدیا کہ اس میں اختلاف ہے (اس سے جہالت کا عیب چھپا رہے گا لوگ سمجھیں گے کہ ان کو معلوم تو ہے مگر اختلاف کی وجہ سے ایک شق کو معین نہیں کرتے اور مختلف فیہ مسائل بکثرت ہیں اس لئے اکثر مواقع میں یہ جواب صحیح ہوگا مگر وہ بیوقوف تو تھا ہی اس نے بعض متفق علیہ مسائل میں بھی کہدیا کہ اس میں اختلاف ہے بالآخر اس کی حماقت ظاہر ہوکر رہی ۱۲) اسی طرح ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہدیا کہ یہ عقل کے خلاف ہے اس لئے قابل قبول نہیں اور لگے نصوص میں تحریف وتاویل کرنے چنانچہ ان کے نزدیک صراط بھی خلاف عقل ہے اور ساری معادیات اور معجزات خلاف عقل ہیں تو اس طرح انھوں نے عقائد میں بھی اختصار وانتخاب کرنا شروع کیا (اب ایمان کے معنے وہ نہ رہے جو پہلے تھے یعنی تصدیق بِمَا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (جو چیزیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں ان کی تصدیق) بلکہ یہ معنے ہوگئے کہ تصدیق بِمَا وَافَقَ الْعَقْلُ مِمَّا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو ۱۲) میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے، تو وہ کس کی عقل کے خلاف ہے

تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے دوسری شق تو مسلم نہیں کیونکہ علماء راسخین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی ان کو خلاف عقل نہیں کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو اسی صورت پر تسلیم کرتے آئے ہیں جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے چنانچہ حضرات صحابہ و تابعین و علماء و صلحاء رحمت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلم مگر یہ کبریٰ مسلم نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور نا قابل قبول ہے کیونکہ قوانین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتیں مگر تم قانون دانوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو اسکو بھی جانے دو میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا یہ تمہاری عقل میں آتا ہے۔ واللہ ہم کو اس پر حیرت اس لئے نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہرگز عقل میں نہ آتا اس کا امتحان اس طرح ہوسکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچہ کی اس طرح نگرانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کرتا ہے اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ پڑھا دیں مگر یہ مسئلہ نہ پڑھائیں جس میں طریق ولادت کا ذکر ہو پھر جب وہ بی اے اور ایم اے اور ایل ایل بی ہو جائے اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے تو کیونکر پیدا ہوا تھا اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا جس سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ میں اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے علقہ پھر مضغہ بنا پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی جس کی پرورش عرصہ تک خون رحم سے ہوتی رہی پھر نو ماہ کے بعد تو شرمگاہ مادر سے نکلا اور اب وہی خون رحم دودھ کی شکل میں ماں کی پستان میں آگیا جس سے دو برس تک پرورش پاتا رہا الیٰ آخرہ تو میں سچ کہتا ہوں کہ

واللہ العظیم وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہے گا کہ ایک قطرے سے ایسے حسین جسم کا بننا پھر اس کا شرمگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اب بتلایئے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جائے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہوا کرے تو پھر آپ کا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں جیسے وہ نوزائیدہ بچہ جس کی ایسی نگرانی کی گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلاف عقل کہے گا کیونکہ اس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سنی نہ تھی اور آپ اس کو خلاف عقل اس لئے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی ورنہ آپ بھی وہی کہتے جو وہ کہتا ہے اور ظاہر ہے کہ خلاف عقل کا وقوع نہیں ہو سکتا تو معلوم ہوا کہ آپ خلافِ عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن کا وقوع مشاہدہ ہو جائے تو وہ خلاف عقل نہ رہیں معلوم ہوا کہ آپ دراصل خلاف عادت کو خلاف عقل کہہ رہے ہیں اور کسی بات کو صحیح ہونے کے لئے خلاف عادت ہونا مضر نہیں اور نہ یہ غلط ہونے کی دلیل ہے ورنہ پھر اس لڑکے کے قول کو بھی مان لینا چاہئے جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونے کو غلط کہتا تھا اور نیز بہت سی باتوں کو جنھیں آپ چار دن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج ان کا مشاہدہ ہو رہا ہے غلط کہنا چاہئے (جیسے ریل کا ایک گھنٹہ میں ساٹھ میل طے کر لینا اور پانچ منٹ میں لندن سے تار کے ذریعہ سے خبر آ جانا وغیرہ وغیرہ ۱۲) اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے ایک مرغی کا بچہ دیکھا ہے جس کے چار پیر تھے (اور آجکل دہلی میں دو لڑکیاں جڑی ہوئی نمائش میں آئی تھیں جن کے تمام اعضا جدا جدا تھے مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ تھی مگر پیشاب نکلتا ایک کے رستہ سے تھا ۱۲) تو بتلایئے کیا خلاف عادت کے لئے بھی کوئی ضابطہ ہو سکتا ہے جس کے اوپر بنا کر کے بعض امور کو مانا جائے کسی بات کے متعلق یہ کہا جائے

کہ چونکہ یہ خلاف عادت ہے اس لئے ہم نہیں مانتے صاحب آپ کا عدم سے وجود میں آنا ہی عادت کے خلاف ہے کیونکہ عادت کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہر شے اپنی اصلی حالت پر رہے جو معدوم ہے معدوم رہے اور جو موجود ہے وہ کبھی فنا نہ ہو مگر رات دن اس کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے ہزارہا معدوم وجود میں آتے اور لاکھوں موجود معدوم ہو جاتے ہیں معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلاف عادت ہونا اس کے غلط ہونے کو مستلزم نہیں. اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں میں فرق نہیں کرتے حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے. سنئے میں اس کا فرق بتلاتا ہوں ۔ خلاف عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو مگر مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے دشوار و مستبعد معلوم ہوتا ہے (اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے یعنی عقل اس کے استحالہ پر دلیل قائم کر سکے اور استحالہ کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے سے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے ۱۲)

اب جو لوگ معادیات کو اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل کہتے ہیں وہ مہربانی کر کے ان کے استحالہ پر دلیل عقلی قائم کریں (اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیونکر لازم آتا ہے ۱۲) یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحالہ پر نہیں قائم کر سکتے بس بہت سے بہت یہی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو جائے گا اس کی نظیر دکھلاؤ بس آجکل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اس لئے یہ محال ہے اور جو دعوے امکان کا کرتا ہے وہ اس کی نظیر دکھلائے۔ عجب اندھیر ہے کہ نظیر پر ثبوت شے کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اس کو خلاف عقل اور محال کہا جاتا ہے لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں (میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجائبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہد ہوئی ہیں کیا اس زمانہ سے

پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی اور اگر نہ تھی تو کیا اس وقت یہ خلاف عقل اور محال تھیں اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیونکر ہوا معلوم ہوا کہ کسی شے کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں ۱۲) تو خوب سمجھئے کہ کسی دعوٰی کا ثبوت نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تنویر کے لئے ہوا کرتی ہے مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں خصوصاً ایسے مدعی کے ذمہ جو کسی امر کے ثبوت کا دعوٰے یہ کہہ کر کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہوا یا قیامت میں خلاف عادت یوں ہوگا اس کے ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو اپنے دعوے میں تصریح کررہا ہے کہ مدعی بے نظیری کی صفت کے ساتھ متصف ہے (اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں لازم بھی ہوسکتا ہے تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہوسکتا ہے جو اپنے مدعٰی کو موافق عادت بتلائے اور جو خرق عادت کا مدعی ہو اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجب ہے ۱۲)

اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں جس کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق ایسا بگڑ گیا ہے کہ آج علماء سے معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے شق القمر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے تو سنئے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو جانتے ہیں مدعی اگر نظیر بیان کردے تو یہ اس کا تبرع ہے بلکہ ثبوت خبر کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک مخبر بہ کا ممکن ہونا دوسرے مخبر کا صادق ہونا پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرنا ہے ایک یہ کہ وہ فی نفسہ ممکن ہوں دوسرے مخبر صادق نے ان کے وقوع کی خبر دی ہو ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔

اب ہم معراج وغیرہ اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہیں یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس پر لازم ہے کہ ان کے امتناع پر دلیل قائم کرے اور ہم کو

امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا یہی امکان کی دلیل ہے (اور اوپر معلوم ہو چکا کہ امتناع کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو محل واحد میں آن واحد میں جہت واحدہ سے تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے ۱۲) دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی کوئی مخبر صادق خبر دے وہ ثابت ہے (اور ان معجزات و معادیات کے وقوع کی خبر مخبر صادق نے دی ہے) پس یہ امور واقع و ثابت ہیں۔ اب ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے باقی نظیر کا پیش کرنا ہمارے ذمہ نہیں مثلاً اگر کوئی کہے پلصراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تو میں کہوں گا کہ بتلاؤ کیوں سمجھ میں نہیں آتا اس میں کیا استحالہ ہے کہ ایک باریک چیز پر پیر آجائے جب یہ محال نہیں اور مخبر صادق اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ اگر کوئی انکار کرے تو اس کو یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ مخبر صادق کی خبر نہیں تو ہم دلیل امتناع سننے کے لئے تیار ہیں اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں ہے کہ ہم اپنے سب معلومات آپ کو بتلا دیا کریں ہاں اگر تم یہ ثابت کر دو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے تو جب ثابت کر دو گے اس وقت دیکھا جائے گا بدون اس کے ہم زوائد کے ساتھ جواب نہ دیں گے یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے عوام سمجھے کہ یہ بھی مجیب کے ذمہ ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لزوم کا کرے وہ دلیل قائم کرے۔ یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات و معادیات میں برابر چل سکتی ہے اور جو دلیلیں آجکل بیان کی جاتی ہیں جن میں زیادہ تر نظیر سے جواب دیا جاتا ہے وہ مطرد نہیں ہیں اب میں

عقلاً یہ ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس کے لئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں ہے وعلیٰ ہذا اگر ہر نظیر کے لئے نظیر کی ضرورت رہی تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا اور نظیر سے ایک دعویٰ بھی ثابت نہ ہو سکے گا اور اگر کہیں جا کر ٹھہر و گے کہ اس نظیر کے لئے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدون نظیر کے بھی ہو گیا تو پھر پہلے ہی کے لئے نظیر کی کیوں ضرورت ہے اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقعہ کو بلا نظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمہ نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے ہاں اگر بیان کر دے تو یہ اس کی شفقت ہے اور اس کا موقعہ اس وقت ہے جبکہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جاوے اور تسلیم کر لے کہ واقعی دلیل سے یہ دعوےٰ ثابت ہو گیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں اس وقت اگر مجیب تقریب فہم کے لئے کوئی نظیر دیدے تو اس کا احسان ہے (اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعوے کو موقوف بتلا رہا ہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس سے اس توقف علی النظیر کی دلیل مانگے ۱۲) چنانچہ اس وقت میں ثبوت پل صراط پر دلیل قائم کر کے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں اول پلصراط کی حقیقت سمجھئے مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی ہے اس طور پر پلصراط کو سمجھنا واجب نہیں اصل تو یہی ہے کہ آدمی عملاً پختہ عقیدہ رکھے باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں ان کے لئے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں اگر وہ اس طرح بھی پلصراط کو سمجھ لیں تو کچھ حرج نہیں مگر لازم بھی نہیں لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے۔ اس تنبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اول اس کی حقیقت سمجھو جس کے لئے اول یہ مقدمہ سنو کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے (مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے اور مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس ان کے جواب کے لئے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل

امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر مخبر صادق نے دی ہو وہ ثابت ہے پس دوسرا عالم ثابت ہے اور مخبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں"

دوسرا مقدمہ یہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں (اس کی بھی دلیل تو وہی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لئے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں ۱۲) جیسے اقالیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں (مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے یہاں آجکل گرمی ہے اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے وعلیٰ ہذا یہاں ۲۴ گھنٹے کا دن ہے اور بعض اقالیم میں چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینہ کی رات ہے اور یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن میں جو آیا ہے کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے۔ اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ ان کی حماقت ہے اس میں استبعاد کیا ہے جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہد ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو اختلاف عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے (یہ مقدمہ بدیہی ہے محتاج دلیل نہیں اور جو شخص کسی حد پر انتہاء اختلاف کا دعوے کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو ممتنع کہے وہ اس پر دلیل قائم کرے")

چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جاکر جوہر ہو جائے (اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے یہ تو مسلم کہ ایک آن اور ایک محل میں شئے واحد عرض و جوہر نہیں ہو سکتی مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شے یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جوہر ہو جائے اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی اگر کسی کے پاس دلیل ہو پیش کرے ۱۲) اور استیناس کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالانکہ پہلے حکماء ان کو مقولہ کیف سے سمجھتے تھے جس کے لئے وزن و مقدار نہیں ہو سکتی

مگر اس زمانہ میں ان کے لئے وزن ہونا ثابت ہوگیا اسی لئے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جتنی یہ نئی نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کے لئے معین و ممد ہیں چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے کیونکہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں اور کلام کرتا ہے تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب ہے جن میں حیات کا تلبس ہے اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا بعض لوگ اس پر ہنستے تھے کہ جنت و دوزخ تو آسمان زمین سے بھی بڑی بتلائی جاتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیوار پر کیونکر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کر دیا فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جا سکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دیکھائی جا سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھدی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کو اصلی حالت پر نظر آگئیں ہوں۔ اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے مُثِّلَتْ لِیَ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ (ممثل ہوگی واسطے میرے جنت اور دوزخ) یہ نہیں فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں اتر آئی تھیں بلکہ آپ نے فرمایا کہ وہ میرے لئے ممثل ہوگئیں اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آجکل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا کہ اس مکان میں کس وزن کی حرارت ہے اور کس درجہ کی برودت ہے (اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے ۱۲) اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلتی ہے تو اس کو کتنا تعجب ہوگا۔ تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے مابہ الوزن کے انخفاض وارتفاع سے مقدار کا معلوم ہوجانا جو کہ سرسری نظر

میں خواص جوہر سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جوہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے اور لیجئے اگر ایک برتن ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا آخر کمی بیشی کیوں ہے پانی کی مقدار تو دونوں حالتوں میں یکساں تھی معلوم ہوا کہ برودت و حرارت کا بھی کچھ وزن ہے اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے مگر بشرط برودت و حرارت کے مگر آخران کو وزن میں دخل تو ہوا تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جاوے کہ یہ عرض جوہر بن جائے تو کیا تعجب ہے اور سنئے اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراوی وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جوہر ہے پس اس عالم میں عرض کا جوہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔ اب پلصراط کی حقیقت سمجھئے گو اس کے بیان کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے

حدیث مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

(محبت اور عشق الٰہی کا بیان کرو زار دہر کے پیچھے نہ پڑو اس لئے کہ کسی نے حکمت اور دانائی سے اس معمہ کو حل نہیں کیا اور نہ کوئی حل کر سکے)

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں میرے ذمہ تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں مگر اس میں حظ نہ آیا تھا اس لئے تبرعاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے تو سنئے پلصراط کی حقیقت شریعت ہے (کما قال اَصْحَابُ الْکَشْفِ مِنَ الْعُرَفَاءِ ۱۲) (جیسا عارفین صاحب کشف نے بیان کیا ہے) پس دنیا میں پلصراط کی نظیر شریعت موجود ہے اتنا فرق ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جا کر جوہر بن جائے گی باقی اور تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے جیسے وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے جس پر چلنا دشوار ہے اسی طرح طریق شریعت نہایت باریک اور نازک ہے جس پر استقامت کے ساتھ چل لینا ہر ایک کا

کام نہیں کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم وعمل سے تو اس پر چلنے کے لئے دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ ایک قوتِ علمیہ کی دوسرے قوت عملیہ کی قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت عملیہ کا ارادہ سے پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضرت کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں اور جو دفع مضرت کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں تو شریعت پر چلنے کے لئے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔ قوتِ عقلیہ، قوتِ شہویہ، قوتِ غضبیہ۔ یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں۔ افراط، تفریط، توسط۔ اور شریعت نام ہے توسط کا شریعت میں افراط عقل سے بھی کام نہیں چلتا نہ تفریط سے کام چلتا ہے بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے اور قوت عقلیہ کے افراط کا نام جز بزہ ہے یہ نہایت مضر ہے۔ جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے۔ جیسے اہلِ فلسفہ میں ایک فرقہ لاادریہ مشہور ہے وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دور سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں اور وہ گدھا نکلتا ہے بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بدصورت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اس کو کڑوی بتلاتا ہے۔ اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے کوئی غلط تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا خلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے تو یہ کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں اور جس کو ہم زمین کہتے ہیں وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں ممکن ہے ہماری نظر نے غلطی کی ہو اور جس بات کو ہم حق سمجھتے ہیں ممکن ہے وہاں ہماری فہم نے غلطی کی ہو بس اب ان کا حال یہ ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے فَهُوَ شَاكٌّ

وَشَالِّقٌ فِيْ اَنَّهٗ شَاكٌّ (وہ شک کرنے والا اور اس بات میں شک کرنے والا کہ وہ شک کرنے والا) تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کردیتی ہے اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کی تباہ ہونے کی کہ انھوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا اور ہر چیز کا اپنی حد سے نکل جانا مضر ہے میں تو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لئے۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہوکر پہاڑ تک پہونچے اور پھر پہاڑ پر بھی اسی پر سوار ہوکر چڑھنے لگے یہ غلطی پر ہیں ضرور کسی سیدھی چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہونچ کر تھک گئے یہ بھی نہ چڑھ سکے تو ان دونوں کی رائے غلط تھی پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا باکار سمجھا کہ اخیر تک اُسی سے راستہ طے کرنا چاہا اور دوسرے نے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا صحیح بات تو یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لئے بیکار اس کے لئے کسی اور سواری کی ضرورت ہے یہی حال عقل کا ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے بس عقل سے اتنا کام تو لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو اس سے آگے فروع میں عقل سے کام نہ لینا چاہیئے بلکہ اب خدا و رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہیئے چاہے ان کی حکمت عقل میں آوے یا نہ آئے دیکھئے قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جائے کہ جارج پنجم بادشاہ ہیں اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہدیا جائے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں اس لئے ماننا پڑیں گے تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلاء ایسا ہی کرتے ہیں

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جارج پنجم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا تو بتلایئے اس شخص کا کیا حال ہوگا ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہوگا اور عقلا کہیں گے کہ جب بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانون سلطنت ہونا معلوم تو پھر انکار کی کیا وجہ ضرور ماننا پڑے گا چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے معلوم ہوا کہ صاحب سلطنت کے پہچاننے کے لئے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں پھر کیا وجہ کہ آپ دین کے معاملہ میں اخیر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں یہ سخت غلطی ہے جس سے بجز ذلت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جب خدا کا ہونا مسلم تو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رسول ہونا مسلم کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم۔ پھر ہر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے اور ہر شخص آپ کو بیوقوف بنائے گا۔ اور تمام عقلاء کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے سچ یہ ہے ؎

عزیزیکہ از درگہش سر بتافت
بھر درکہ شد ہیچ عزت نیافت

(وہ (اللہ) ایسے غالب اور قادر ہیں کہ جس نے ان کی درگاہ سے سر پھیرا جس دروازہ پر گیا کچھ عزت نہ پائی بلکہ ذلیل ہوا)

غرض عقل سے اس وقت تک کام لو جب تک وہ کام دے سکے اور جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کرو تو عقل کی بھی ایک حد ہوئی اور کیوں نہ ہو وہ بھی تو ایک قوت ہے، جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے اور اس کی ایک حد ہے اس سے آگے دوربین لگانے کی ضرورت ہے ایسے ہی شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تنہا بیکار ہے دوربین وحی سے کام لینا ضروری ہے۔ ایسے ہی کان کی ایک قوت ہے جس کے لئے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلیفون سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ پیروں کی ایک قوت ہے جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے

توجب ہر قوت محدود ہے تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی' ضرور ہوگی۔ اس سے آگے وحی سے کام لو ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر رستہ نہ ملے گا کیونکہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں وہاں تو اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضرورت ہے اور سہ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے خلاف جس نے اور راستہ اختیار کیا وہ
ہرگز منزل مقصود نہ پہنچیگا)

صاحبو! دنیا میں بھی تو آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں دیکھئے جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ اطباء موجودین میں سے کون زیادہ حاذق و تجربہ کار ہے، اور جب ایک طبیب کا حاذق ہونا معلوم ہوگیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس نسخہ میں فلاں دوا کیوں لکھی اور فلاں کیوں نہیں لکھی اور اس دوا کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا چھ ماشہ کیوں نہ لکھا ہمنے کسی کو طبیب سے ان باتوں میں الجھتا ہوا نہیں دیکھا اور اگر کوئی اس سے الجھنے لگے تو سب عقلا اس کو بیوقوف بناتے ہیں اور طبیب بھی صاف کہدیتا ہے کہ اگر تم میرے پاس مجھ کو طبیب سمجھ کر آئے ہو تو جو نسخہ میں تجویز کردوں اس میں تم کو چون وچرا کا کوئی حق نہیں اور اگر چون وچرا کرتے ہو تو اس کے معنے ہیں کہ تم مجھ کو طبیب نہیں سمجھتے پھر میرے پاس کیوں آئے تھے۔ اور اس کے اس جواب کو تمام عقلاء صحیح کہتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو ان کے تابع نہ کیا جاوے اور بات بات میں الجھا جاوے کہ یہ تو خلاف عقل ہے ہم اسے کیونکر مان لیں۔ صاحب اگر تم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مان لیا ہے تو پھر ہر بات کو بلا چون وچرا ماننا پڑے گا اور یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ ہماری عقل میں

یہ بات نہیں آتی ورنہ اس کے معنے یہ ہیں کہ تم نے اب تک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی نہیں سمجھا اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا۔ افسوس دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جائے اور امور آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو۔

صاحبو! جب دنیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے کہ عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جائے اور بلا چون و چرا دوسرے کا اتباع کیا جائے تو آخرت کا کام بدون اس کے کیونکر چلے گا۔ کیونکہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی ہیں ان میں کسی قدر عقل چل سکتی ہے پھر بھی اس کو چھوڑ کر کاملین و ماہرین کی تقلید کی جاتی ہے اور آخرت سے تو ہم سب اندھے ہیں وہاں بدون تقلید وحی کے کیسے کام چلے گا اور اگر اس میں عقل سے کام لیا گیا تو وہی مثال ہوگی جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ شان ورود اس کا یہ ہے کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کے لئے گھر سے کھیر کی دعوت کرنے آیا۔ پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے کہا سفید ہوتی ہے حافظ جی نے سفید سیاہ میں کیوں فرق کیا تھا ان کے نزدیک تو نہ کوئی چیز سفید تھی نہ سیاہ کیونکہ آنکھیں ہی نہ تھی تو آپ پوچھتے ہیں کہ سفید کیسا ہوتا ہے اس نے کہا جیسا بگلا حافظ جی نے پوچھا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے لڑکے نے ہاتھ کو اس طرح موڑ کر (ا) کہا کہ ایسا ہوتا ہے حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھیر کر اس شکل سے تصور کیا تو کہنے لگے بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے میرے گلے سے کیونکر اترے گی تو دیکھئے جو چیز آنکھ سے دیکھی نہ ہو اس میں عقل سے کام لینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ معمولی سی کھیر کا کیا سے کیا بن گیا جس میں چبانے اور نگلنے کی بھی مشقت نہ تھی اب وہ گلے میں پھنسنے لگی تو واقعی اندھے کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے اگر حافظ جی ساری عمر بھی اسی سبق میں رہیں تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی خیر خواہ سوانکھے کی تقلید کر لی جائے۔

اسی طرح اگر تم کسی ولائتی کو جس نے آم کبھی نہ کھایا ہو آم کا مزہ سمجھانا چاہو تو کیا وہ سمجھ جائے گا ہرگز نہیں تم کہو گے کہ آم میٹھا ہوتا ہے وہ کہے گا کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں بس آم ایسا ہی ہوتا ہوگا صاحب اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک آم لاکر اسے کھلا دو اور اگر یہ نہیں تو پھر اس کو تقلیداً مان لینا چاہئے اور اپنی عقل سے اس کی نظیریں نہ نکالنا چاہئیں، اسی طرح امور آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر رہو مرنے کے بعد صراط اور وزن اعمال وغیرہ سب کی حقیقت سامنے آجائے گی اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا چاہتے ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہہ دیا ہے اس کی تقلید کرو اور ان کی نظیریں دریافت کرنے کے درپے نہ ہو۔ مثالوں سے تم آخرت کی حقیقت ایسی ہی سمجھو گے جیسے حافظ جی نے کھیر کو ٹیڑھا بتلایا تھا بس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے جس سے بڑھ جانا مضر ہے۔ اطباء نے بھی تو اس کو مضر لکھا ہے اور امراض میں سے شمار کیا ہے کیونکہ افراط عقل کا نتیجہ اوہام و شکوک میں ابتلاء ہے جس سے قلب و دماغ دونوں ضعیف ہو جاتے ہیں۔

فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوا بیچتا پھرتا تھا اس سے پوچھا کَیْفَ تَبِیْعُ الْحَلْوَاءَ تو حلوا کس طرح بیچتا ہے اُس نے جواب دیا کَنْ اِبْدَاً اِنَّنِیْ کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں تو آپ کہتے ہیں اَسْئَلُکَ عَنِ الْکَیْفِیَّۃِ وَتُجِیْبُنِیْ عَنِ الْکَمِیَّۃِ میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کمیت سے جواب دیتا ہے آپ حلوائی سے الجھ گئے اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں کہ ہر وقت اسی کے چکر میں رہے چنانچہ افراط عقل ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفہ نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا اور جب عاجز ہو گئے تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا مگر کہنے لگے کہ یہ جاہلوں کے واسطے نبی ہیں ہم کو نبی کی ضرورت نہیں نَحْنُ قَوْمٌ قَدْ هَذَّبْنَا نُفُوْسَنَا بِالْحِکْمَۃِ ہم نے تو اپنے کو حکمت سے مہذب بنا لیا ہے حق تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ یہ لوگ اپنے علم پر نازاں ہو گئے

اور یہ نہ سمجھے کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں چنانچہ الٰہیات میں فلاسفہ نے جو تحقیقات بیان کی ہیں ان میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ آج مسلمان کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے یہ تو افراط فی العقل ہے اور ایک ہے تفریط کا درجہ یعنی عقل کی کمی اس کو حماقت کہتے ہیں شریعت میں یہ دونوں درجے بیکار اور مذموم ہیں بلکہ مطلوب توسط ہے جس کو حکمت کہتے ہیں دوسری قوت شہویہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں ایک افراط جس کا نام فجور ہے شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں کیونکہ اس کا انجام فسق ہے اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بن جائے کہ ضروری انتفاعات سے بھی محروم ہو یہ بھی مطلوب نہیں (کیونکہ اس سے ہمت اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور اولوالعزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہو جاتے ہیں جو بڑا نقص ہے ۱۲) اور ایک ہے توسط جس کا نام عفت ہے یہ مطلوب ہے۔ تیسری چیز قوت غضبیہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں ایک افراط جس کو طہور کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھے اندھا دھند جوش دکھلانے لگے جیسا آجکل ہو رہا ہے کہ جس طرف چلتے ہیں جوش میں اندھے بن کر چلتے ہیں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہوگا یا نقصان یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں اور ایک ہے تفریط جس کو جبن اور بزدلی کہتے ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت بھی ہمت سے کام نہ لیا جائے جیسے بعض لوگ ایسے ڈرپوک ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجات ظاہر نہیں کر سکتے یہ بھی مطلوب نہیں اور ایک درجہ توسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے یہ مطلوب ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور موقع پر جوش ظاہر کیا جائے جہاں نفع کا ظن غالب ہو اور بے موقع جوش سے کام نہ لیا جائے جہاں نفع کی کچھ امید نہیں محض نقصان ہی نقصان ہے۔ غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں حکمتؔ، عفتؔ، شجاعتؔ۔ اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت

کا حاصل ہے۔ اور قرآن میں جو فرمایا ہے وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا
اس سے بھی عدل مراد ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے (ایک ایسی شریعت دیکر جو کہ
سراپا عدل ہے) امت وَسَطًا یعنی امۃ عادلہ بنایا ایک مقدمہ اور لیجئے کہ وسط
دو قسم کا ہوتا ہے ایک وسط حقیقی ایک وسط عرفی وسط حقیقی وہ خط ہے
جو بالکل بیچوں بیچ ہو وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا اور ایک وسط عرفی ہے جیسے
کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں کیونکہ وہ تو منقسم
ہے اس کے اندر بھی ایک جزو دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں
نکل سکتا ہے پھر وہ وسط حقیقی کہاں ہوا حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں
دایاں بایاں کچھ نہ نکل سکے سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔ پس سمجھو لو کہ
شریعت اس (وقت) وسط کا نام ہے جس میں افراط تفریط کا ذرا بھی نام نہو
بلکہ عین توسط ہو یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے اور یہی کمال ہے اور
اوپر معلوم ہو چکا کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی
غیر منقسم ہے۔ چنانچہ جن اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے ان میں افراط تفریط
کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا نہ تفریط کی
طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے پس
شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے
تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی کیونکہ بال بھی منقسم
ہے اور وسط حقیقی غیر منقسم ہے پس قیامت میں یہی روح شریعت یعنی وسط
حقیقی جو ہر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا جس پر سے مسلمانوں کو چلایا
جائے گا پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی وسہولت کے ساتھ چلا
ہوگا وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا کیونکہ وہ یہی شریعت تو ہوگی
جس پر دنیا میں چل چکا ہے اور جو یہاں نہیں چلا یا کم چلا ہے وہ پل صراط
پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا لیجئے میں نے آپ کو پل صراط کی

نظیر بھی دکھلادی۔ اب تو کوئی اشکال نہیں رہا۔ اسی طرح ہمارے پاس تمام شرعیات کے لئے عقلی نظائر موجود ہیں یہ نہ سمجھئے کہ یہ پل صراط ہی کی خصوصیت ہے لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے ہمارا اصلی مذہب تو یہ ہے کہ ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کے قصے نہیں پڑھے ہم سے مہر و وفا کے قصوں کے علاوہ نہ دریافت کرو)

باقی میں نے نمونہ کے طور پر یہ تحقیق اس لئے بیان کر دی تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں اور سمجھ میں آجائے کہ علوم شرعیہ کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی وقعت نہیں جس میں سے نمونہ کے طور پر اس وقت میں نے کچھ بیان کر دیا ہے تاکہ آپ علمائے اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں بحمداللہ ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت زیادہ ہے لیکن ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ عارفین کی مجلس میں کوئی چیز چیز ایسی نہیں ہے کہ نہ ہو)

مصلحت اس واسطے نہیں کہ ہر شخص اس قسم کی تحقیقات بتلانے کے قابل نہیں اور جو قابل ہوں اُن کو بھی ہم نہیں بتلاتے کیونکہ ان کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں (کیونکہ طبیب کے ذمہ صرف نسخہ بتلانا ہے اس کی رعایت اور ترکیب کی اسرار اور وزن کی علت بتلانا اس کے ذمہ نہیں ۱۲) ہاں بعض قابلوں کو بتلا بھی دیتے ہیں جو ہمارے پاس آکر رہیں اور ہمارے کہنے کے موافق

عمل کریں اطاعت میں پختگی ظاہر کریں ایسے شخص کو کبھی نشاط میں آکر خود ہی بتلا دیتے ہیں اور پوچھنے پر اُسے بھی نہیں بتلاتے کیونکہ یہ اسرار ہیں جن کو نشاط کے وقت خود ہی بیان کر دیا جاتا ہے اور ان کا از خود کسی کا پوچھنا ناگوار گذرتا ہے (جیسے طبیب بعض دفعہ خوشی میں آکر مریض سے خود اپنے نسخہ کی تعریف اور حقیقت بیان کر دیتا ہے اور اگر مریض پوچھے تو اسے ناگوار ہوتا ہے اور (۲) جیسے کوئی شخص بادشاہ کا مطیع و محبوب ہو تو بادشاہ اُسے کبھی اپنے محل کی سیر بھی کرا دیتا ہے کہ دیکھو یہ خزانہ ہے اور یہ چور دروازہ ہے اور یہ ہماری بیگمات کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ آرام گاہ ہے لیکن اگر وہ از خود پوچھنے لگے کہ حضور کی بیگم کہاں رہتی ہیں اور خزانہ کہاں ہے تو ایسی بے نقط سنائی جائے گی کہ حواس باختہ ہو جائیں گے۔ پس اسرار کے دریافت کرنے کی درخواست بھی ایسی ہی درخواست کے مشابہ ہے لو میں نے اسرار کی حقیقت بھی بتلا دی ان کے معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتلا دیا اگر کسی کو شوق ہو تو اس طریقے سے عمل شروع کر دے یعنی اطاعت میں لگ جائے میں سچ کہتا ہوں کہ تم ہمارے اس کہنے پر عمل کرنے لگو تو پھر تم کو دریافت کی بھی ضرورت نہ ہو گی خود ہی سب حقائق منکشف ہو جائیں گے اور یہ حال ہو گا ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر بے کتاب و بے مددگار و استاد کے انبیاء جیسے علوم دیکھو گے)

اور جن کو یہ حقائق حاصل ہوئے ہیں محض عمل اور اطاعت ہی سے حاصل ہوتے ہیں ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(عقل و فہم کو تیز کرنا طریق نہیں ہے فضل الٰہی بجز شکستگی کے متوجہ نہیں ہوتا)
یہ اسرار عقل پرستی اور فہم کے تیز کرنے سے معلوم نہیں ہوتے بلکہ شکستگی اور انقیاد سے خدا کا فضل متوجہ ہو جاتا ہے۔ آگے بتلاتے ہیں کہ اس شکستگی پر فضل کس طرح ہو جاتا ہے ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(جس جگہ نیچان ہو اسی طرف پانی رواں ہوتا ہے جہاں مشکل پیش آئی وہاں ہی جواب دیا جاتا ہے)

ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں بیماری ہوتی ہے وہیں دوا کا استعمال کیا جاتا ہے اور جہاں مرض ہوتا ہے وہیں شفا جاتی ہے)
پس فضل اطاعت و عبدیت سے ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو فنا کر دے اپنی عقل و فہم کو ناقص سمجھ کر چھوڑ دے۔ فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش
آزموں را یک زمانے خاک باش

(برسوں تم دل خراش پتھر بنے رہے ہو آزمائش کے طور پر کچھ زمانہ خاک بنکر بھی دیکھ لو)
یعنی عقل کی اطاعت میں سنگدل بنے ہوئے تو بہت دن ہو گئے اس نے کچھ بھی حقیقت نہ بتلائی اب ذرا کچھ دنوں خاک ہو کر دیکھو پھر کیا ہوگا۔ فرماتے ہیں ؎

در بہاراں کے شود سر سبز رنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(بہار کے موسم میں پتھر سرسبز نہیں ہوتے خاک بنو تاکہ رنگ برنگ کے پھول اگیں)

پھر تمہارے اندر عجیب عجیب علوم القا ہوں گے صاحب یہ ہے طریقہ علوم عالیہ حاصل کرنے کا خوب سمجھ لیجئے مگر اس وقت مذاق ایسا فاسد ہوا ہے کہ ہر شخص علوم عالیہ کے درپے ہے اور اپنی عقل سے ان کو دریافت کرنا چاہتا ہے حالانکہ عقل سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ میں کس کا بیٹا ہوں اور میرا باپ کون ہے۔ کانپور میں ایک جنٹلمین نے اپنے باپ کو لکھا تھا کہ یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ آپ میرے باپ ہیں اس کی عقلی دلیل کیا ہے اس نے واقعی درایت پر عمل کیا عقل کا تو مقتضا یہ ہے کہ جاہل کی اولاد بھی جاہل ہی ہو یہ عقل میں کیونکر آسکتا ہے کہ باپ تو جاہل لٹھ ہو اور بیٹا انٹرنس پاس کرکے فلسفی بن جائے دلیل عقلی تو اس کو ثابت کر نہیں سکتی اسی لئے اس نے کہا کہ بتلاؤ کاہے سے معلوم ہوا کہ تم میرے باپ ہو اس کا جواب اگر ہے تو یہی ہے کہ دایہ سے پوچھ لے جس نے تجھے ماں کے پیٹ سے جنایا تھا اور ماں سے پوچھ لے کہ وہ کیونکر حاملہ ہوئی تھی تو یہ عقل تو بڑی نکمی چیز نکلی جس سے باپ کا باپ ہونا بھی ثابت نہیں ہوسکتا یہ ہے خرابی عقل کے اتباع میں اسی لئے کہتے ہیں ؎

آزمودم عقل دوراندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دوراندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو دیوانہ بنالیا)

دیوانگی سے مراد اطاعت کاملہ ہے جس میں بلاچون وچرا اتباع ہو اگر کوئی اس حالت پر ہنسے تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم
مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش و دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے یہی کیا دولت کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی اور اس کی محبت کے متوالے ہیں)

یعنی جو کوئی ہنسے اس سے کہدو کہ ہماری دیوانگی ہی تمہاری عقل سے اچھی ہے

ہمارے نزدیک تو جو ایسا دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

مرعسس را دید درخانہ نشد

(جو دیوانہ نہیں وہی دیوانہ ہے جو شخص کو توال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے اسی طرح جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا تو عقل رفو چکر ہو جاتی ہے)

تو یہ کیسا بھدا مذاق ہے کہ ہر بات کو عقل ہی سے معلوم کرنا چاہتے ہیں پھر اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو اس جنٹلمین میں ظاہر ہوا کہ باپ سے بھی دلیل عقلی مانگتا تھا اس کے باپ ہونے پر اور جب یہ لوگ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی عقل سے معارضہ کرتے ہیں تو باپ کے ساتھ کریں تو کیا تعجب ہے مگر افسوس یہ ہے کہ باپ کے ساتھ ایسا معارضہ کیا جائے تو باپ کو بھی ناگوار ہوتا اور وہ ایسے بیٹے کو نالائق سمجھ کر عاق کر دیتا ہے اور دنیا بھی اس کو برا بھلا کہتی ہے مگر احکام خدا اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی یہ برتاؤ کرے تو نہ باپ اسے کچھ کہتا ہے نہ دنیا والے کچھ کہتے ہیں بلکہ اور الٹا ایسے شخص کو عاقل اور فاضل کا خطاب دیتے ہیں۔

صاحبو! کچھ تو انصاف کرو کہ جس عقل کا معاوضہ آپ کو اپنے ساتھ بھی گوارا نہیں وہ معارضہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیونکر گوارا کیا جاتا ہے میں اسی کی شکایت کر رہا تھا کہ بعض لوگوں نے اتباع عقل سے عقائد میں اتنا اختصار کر لیا ہے کہ وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے اعتقاد ہی کو ایمان کے لئے کافی سمجھتے ہیں بقیہ معادیات کی تصدیق کو ایمان کے لئے ضروری نہیں سمجھتے اور بعض نے یہ غضب کیا کہ مُحَمَّدٌ رسول اللہ کو بھی اڑا دیا کیونکہ حدیث میں تو اتنا ہی آیا ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ (جس نے لا الہ الا اللہ کہا جنت میں داخل ہوا) اس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قید کہاں ہے چنانچہ انھوں نے کہدیا کہ جو شخص موحد ہو خواہ کسی مذہب کا ہو اور گو رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر ہو وہ جنتی اور ناجی ہے۔ میں

اس وقت ان لوگوں کا نام نہیں لینا چاہتا مگر ان کے استدلال پر مجھے ایک حکایت یاد آگئی رامپور میں مجھ سے ایک طالب علم نے کسی ضرورت کے لئے وظیفہ پوچھا میں نے کہدیا کہ لاحول کثرت سے پڑھا کرو کچھ دنوں کے بعد وہ پھر ملے اور کہنے لگے کہ میں وظیفہ پڑھتا ہوں مگر نفع نہیں ہوا میں نے ویسے ہی اتفاقاً پوچھ لیا کہ تم نے کیا پڑھا تھا تو آپ کہتے ہیں کہ اسی طرح لاحول لاحول لاحول میں نے کہا کہ تمہارے اس لاحول پر بھی لاحول تو اگر اس طالب علم کا یہ سمجھنا صحیح تھا تو ان لوگوں کی دلیل بھی صحیح ہوسکتی مگر کون نہیں جانتا کہ لاحول ایک پوری دعا کا پتہ ہے یعنی لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کا جیسے بسم اللہ ایک پوری آیت کا پتہ ہے اور الحمد پوری سورت کا اسی طرح قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ یٰسین پوری سورت کا پتہ ہے (اور آلم ایک پورے سیپارہ کا پتہ ہے ۱۲) پس اگر ہم کسی سے یہ کہیں کہ نماز میں الحمد پڑھنا واجب ہے اور یٰس کا ثواب دس قرآن کے برابر ہے اور وہ اس کا یہ مطلب سمجھے کہ صرف لفظ الحمد نماز میں واجب ہے اور اتنا ہی کافی ہے اور محض یٰس یٰس کہنے کا ثواب دس قرآن کے برابر ہے تو بتلایئے وہ احمق ہے یا نہیں اور کیا ہر شخص یہ نہ کہے گا کہ بیوقوف یہ لفظ تو پتہ کے طور پر تھا اور اس سے مراد پوری سورت ہے اسی طرح حدیث میں لا الہ الا اللہ پورے کلمہ کا پتہ ہے بلکہ پوری شریعت کا پتہ ہے اور مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جائے وہ جنتی ہے اب یہ شریعت کے دوسرے مقامات سے پوچھو کہ مسلمان ہونا کسے کہتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتقاد بھی شرط ہے اور جنت و دوزخ کا بھی اور ملائکہ کے وجود کا بھی اور تقدیر کے حق ہونے کا بھی اور صراط و وزن وحساب وکتاب کا قائل ہونا بھی اور فرضیت صلوٰۃ وزکوٰۃ وصوم وحج کا اقرار بھی الخ مگر ان عقلمندوں نے اس طالب علم کی طرح صرف لا الہ الا اللہ کو کافی سمجھ لیا۔

بلند شہر میں بھی ایک بڑے عہدہ دار اس خیال کے ساتھ کہ وہ بھی صرف توحید کے قائل ہونے کو نجات کے واسطے کافی سمجھتے تھے میں نے سن کر ایک تقریر میں کہا کہ جو رسالت کا قائل نہیں وہ توحید کا بھی قائل نہیں بدون اقرار رسالت کے توحید کا تحقق ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ توحید کے یہ تو معنے ہیں نہیں کہ خدا تعالےٰ کو صرف ایک مان لے چاہے اس کے ساتھ عیوب سے بھی اس کو متصف مانتا رہے یقیناً اس کو توحید کوئی نہیں کہہ سکتا بلکہ توحید کے معنے یہ ہیں کہ حق تعالےٰ کو تمام عیوب سے منزہ اور تمام کمالات الوہیت کے ساتھ متصف مانے جن میں سے ایک کمال صدق بھی ہے جس سے خدا تعالےٰ کو متصف اور کذب سے منزہ ماننا لازم ہے اور جو شخص منکر رسالت ہے وہ حق تعالیٰ کو کاذب قرار دیتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اور یہ اس میں خدا تعالےٰ کو صادق نہیں مانتا تو ایک عیب سے خدا کو موصوف مانتا ہے اور یہ توحید نہیں پس منکر رسالت موحد نہیں ہوسکتا (اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر عقلی و نقلی دلائل ہر وقت قائم کر سکتے ہیں ۱۲) پھر میں نے کہا کہ اس کے جواب کے لئے میں قائل کو دس برس کی مہلت دیتا ہوں آخر میں وہ سمجھ گئے تھے اور اس عقیدہ سے توبہ کرلی تھی اس کے بعد جو ملاقات ہوئی تو اس وقت وہ صحیح عقیدہ پر جمے ہوئے تھے اور اب وہ خیال نہ رہا تھا تو ان بعض نے تو عقائد میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختصار کیا تھا جن کی غلطی معلوم ہوگئی اور بعض نے عقائد میں تو اختصار نہیں کیا مگر وہ اعمال کا اختصار نہیں کیا مگر وہ اعمال کا اختصار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نجات کے لئے مسلمان ہونا کافی ہے اور مسلمان توحید و رسالت کے اقرار سے ہوجاتا ہے پھر اور چیزوں کی کیا ضرورت ہے اور دلیل وہی کہ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَیْ مَعَ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلُ اللّٰهِ -

صاحبو! یوں تو اس کا اصل جواب بہت عمیق ہے مگر میں اس وقت ایک

موٹی سی بات عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو کافی سمجھنا ایسا ہے جیسے ایک شخص نے نکاح کے وقت ایجاب وقبول کیا ہو اور جب بیوی اس سے نفقہ وکپڑا مانگے تو کہنے لگے کہ میں نے تو صرف تجھے قبول کیا تھا کھانا کپڑا کب قبول کیا تھا یہ میرے ذمہ نہیں تو بتلایئے کیا اس کی یہ بات قبول کی جائے گی ہر گز نہیں بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ بیوقوف بیوی کا قبول کرنا نکاح کے سب لوازم کو قبول کرنا ہے اور ساری برادری اس کو احمق بنائے گی۔ صاحبو! اسی طرح لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا تو مذہب کو قبول کرنا ہے یہ بھی محض ایجاب وقبول ہے جس میں سارے لوازم مذہب کا قبول داخل ہے۔ حضرت! یہ سب کم فہمی کی باتیں ہیں جو آجکل کہی جاتی ہیں بلکہ کم فہمی بھی نہیں یوں کہنا چاہیئے کہ کم فہم بن گئے ورنہ کیا وجہ ہے کہ جو برتاؤ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی برتاؤ اور اور برادری کے ساتھ کیوں نہیں کیا جاتا اگر آپ ایسے ہی محقق ہیں کہ بدون لم اور کیف کے کوئی بات مانتے ہی نہیں اور آپ کے نزدیک ہر چیز کا لازم ہونا صراحۃً قبول کرنے پر موقوف ہے تو پھر یہاں نکاح کے معاملہ میں لم اور کیف کیوں نہیں کیا جاتا اور نان ونفقہ کے بدون قبول صریح کے کیوں لازم مان لیا جاتا ہے بلکہ ہونا تو یوں چاہیئے تھا کہ مخلوق کے ساتھ لم اور کیف ہوتا اور خدا کے ساتھ نہ ہوتا مگر اب الٹا معاملہ ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں چون وچرا اور بیوی برادری کے معاملہ میں تسلیم ورضا پس حدیث مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ (جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا وہ جنت میں داخل ہوگا) اسے عدم ضرورت اعمال پر استدلال کرنا محض غلط ہے یہ تو وہ لوگ تھے جو عقاید میں اختصار کرتے اور اعمال کو غیر ضروری سمجھتے تھے ایک جماعت ان کے علاوہ اور پیدا ہوئی جنھوں نے عقائد میں تو اختصار نہیں کیا اور نہ اعمال کو غیر ضروری سمجھا مگر انھوں نے اعمال میں اختصار کیا کچھ اعمال کو لے لیا اور بہت سے اعمال کو چھوڑ دیا بس جو چیز آسان معلوم ہوئی وہ تو

لے لی اور جس میں ذرا سی بھی دقت معلوم ہوئی اس کو اڑا دیا اور اس میں طبائع مختلف ہیں بعض کو عبادات بدنیہ آسان ہیں اور مالیہ مشکل ہیں، انھوں نے نماز اور روزہ تسبیح و نوافل کو اختیار کیا مقدس صورت بنا لی مگر وہ ایسے مقدس ہیں کہ نہ حج فرض ادا کرتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں نہ معاملات میں احتیاط کرتے ہیں ان کا لین دین نہایت خراب ہے اور بعضے ایسے ہیں جن کو مال خرچ کرنا آسان ہے وہ حج بھی کرتے ہیں زکوٰۃ خیرات بھی دیتے ہیں مگر جان کا خرچ کرنا ان کو دشوار ہے اس لئے نماز روزہ سے جان چراتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو طاعات بدنیہ اور مالیہ دونوں کو بجالاتے ہیں مگر انھوں نے طاعات قلب کو چھوڑ رکھا ہے ظاہر میں بڑے مقدس ہیں مگر دل میں تکبر و حسد ریا و عجب بھرا ہوا ہے محبت و خشیت الٰہی برائے نام ہے مگر اس کو وہ ضروری نہیں سمجھتے بعض نے ان اخلاق کا بھی اہتمام کیا مگر ان کی معاشرت گندی ہے ذکر و شغل کرتے ہیں مگر اس کا اہتمام نہیں کہ ہمارے ہاتھ سے دوسروں کو ایذا نہ پہونچے غرض ہر ایک کو جو بات آسان لگی وہ تو لے لی اور جس میں کچھ محنت کرنی پڑی اس کو چھوڑ دیا۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ آجکل سائنس کی ترقی ہے ہر چیز کا ست نکالا جاتا ہے تو ہمارے بھائیوں نے بھی اعمال کا ست نکال لیا مگر صاحبو! ست کا ست نہیں نکلا کرتا۔ دین تو سارا کا سارا خود ہی ست ہے اس کا ہر جزو ضروری ہے اب آپ دوبارہ اس کا ست نہیں نکال سکتے اور اگر نکالو گے تو وہ ست نہ ہوگا بلکہ اجزائے ضروریہ کو فوت کرنا ہوگا جیسے کوئی شخص انسان کا ست نکالنا چاہے کہ اس کا ایک ہاتھ کاٹ دے اور ایک پیر اور ایک آنکھ پھوڑ دے اور ایک کان بند کر دے تو کیا اس کو ست کہا جائے گا ہرگز نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے ضروری اجزا کو حذف کر کے ایک آدمی کو بیکار بنا دیا یہی حال ہمارے بھائیوں نے دین کا بنا رکھا ہے کسی نے یہ کیا کہ اعمال تو بہت اچھے مگر عقائد میں کتاب و سنت کو چھوڑ کر رسوم بدعت کو داخل کر لیا اور اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں بعض نے عقائد کو سنت کے موافق رکھا اور اعمال میں نہایت کوتاہی

کی اور ان کو اپنے متبع سنت ہونے کا ناز ہے غرض یہ مختلف فرقے ہمارے اندر پیدا ہوگئے اور ساری خرابی کا منشا یہ ہے کہ لوگوں نے دین کے اجزاء کو پوری طرح نہیں سمجھا تو غور سے سن لیجئے کہ دین کے پانچ اجزاء ہیں ایک جزو تو ہے عقائد کا کہ دل سے اور زبان سے یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی جس طور پر خبر دی ہے وہی حق ہے اس کی تفصیل کتب عقائد سے معلوم ہوگی) دوسرا جزو عبادات ہیں یعنی نماز روزہ زکوٰۃ و حج وغیرہ تیسرا جزو معاملات ہیں یعنی احکام نکاح و طلاق و حدود و کفارات و بیع و شراء و اجارہ و زراعت وغیرہ اور ان کے جزو دین ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت یہ سکھاتی ہے کہ کھیتی یوں بویا کرو اور تجارت فلاں فلاں چیز کی کیا کرو بلکہ ان میں شریعت یہ بتلاتی ہے کہ کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو اور اس طرح معاملہ نہ کرو جس میں نزاع کا اندیشہ ہو غرض جواز و عدم جواز بیان کیا جاتا ہے چوتھا جزو ہے معاشرت یعنی اوٹھنا بیٹھنا ملنا جلنا، مہمان بننا کسی کے گھر پر جانا کیونکر چاہیئے اور اس کے کیا آداب ہیں بیوی بچوں عزیزوں اور اجنبیوں اور نوکروں وغیرہ کے ساتھ کیونکر برتاؤ کرنا چاہیئے۔ پانچواں جزو جس کا نام ڈراؤنا ہے تصوف ہے اور ڈراؤنا اس لئے ہے کہ آجکل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کے لئے بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ بالکل غلط ہے یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے غرض یہ پانچواں جزو ہے جس کو شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں تو یہ پانچ اجزاء دین کے ہیں ان پانچوں کے مجموعہ کا نام دین ہے اگر کسی میں ایک جزو بھی ان میں سے کم ہو تو وہ ناقص الدین ہے جیسے کسی کے ایک ہاتھ نہ ہو تو وہ ناقص الخلقت ہے اب دیکھ لیجئے کہ ہم نے ان پانچوں کا کتنا اہتمام کر رکھا ہے حالت یہ ہے کہ بعض نے تو عقائد و عبادات کو کم کر رکھا ہے اور بعض میں معاملات کی کمی ہے اور معاملات کی تو یہ حالت ہے کہ بڑے بڑے اتقیاء معاملات کو دین ہی نہیں سمجھتے چنانچہ برتاؤ سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے وہ برتاؤ یہ ہے کہ نماز و روزہ کے مسائل تو مولویوں سے پوچھے جاتے ہیں مگر معاملات کو کوئی اکثر نہیں پوچھتا مثلاً کوئی گانوں خریدیں یا کسی مورث کے مرنے کے بعد تقسیم جائداد کا قصہ ہو تو اس میں آپنے کہیں نہ دیکھا ہوگا کہ دستاویز علماء کو بلا کر دکھائی جاتی ہو کہ دیکھئے اس میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کوئی بات خلاف شرع تو نہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کو دین ہی نہیں سمجھتے حالانکہ معاملات کا دین میں داخل ہونا بالکل بدیہی ہے قرآن میں آیت مداینہ کو دیکھئے صرف قرض لینے کے کتنے احکام بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جب تم مدت معلومہ کے لئے ادھار قرض کا معاملہ کیا کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور خود لکھنا نہ جانتے ہو تو کسی سے لکھوا لیا کرو۔ اور کاتب کے لئے حکم ہے وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ کہ لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ لکھدیا کرے اگر لکھنے والا کوئی نہ ہو تو حکم ہے کہ دو آدمیوں کو گواہ بنا دو اور گواہوں کو ضرورت کے وقت گواہی دینا لازم ہے کتمان سے گناہ ہوگا جس پر وعید مذکور ہے۔

اسی طرح اور بہت سے معاملات کے احکام قرآن میں موجود ہیں اور احادیث میں تو بہت ہی زیادہ ہیں پھر فقہ میں تو اتنی تفصیل ہے کہ کوئی قانون بھی اس سے زیادہ مفصل نہیں ہو سکتا اس سے تو ان لوگوں کا جواب نکل آیا جو معاملات کو دین میں داخل تو سمجھتے ہیں مگر وہ علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ان کو سوائے لَا یَجُوْزُ (ناجائز ہے) کے کچھ نہیں آتا۔ کوئی دستاویز ان کو دکھلاؤ تو ناجائز۔ کسی ملازمت کو دریافت کرو تو ناجائز بس مولوی صاحب نے تو ایک لَا یَجُوْزُ (یہ ناجائز ہے) کا سبق پڑھ لیا ہے یہ تو ایک عام الزام ہے بعض نے اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ مذہب ہی بڑا سخت ہے (پہلی جماعت تو علماء ہی کو الزام دیتی تھی انھوں نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی الزام لگا دیا ۱۲) میں ان لوگوں کے اقوال کی کیا حکایت کروں ڈر بھی لگتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔

لکھنؤ میں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں سب مسلمان ہی جمع ہوئے تھے اور اس بات کی تحقیق کی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کے تنزل کا کیا سبب ہے بالآخر یہ طے کیا گیا کہ تنزل کا اصل سبب اسلام ہی ہے۔ صاحبو! یہ وہ لوگ ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ٹھیٹ اسلام ہمارا ہی اسلام ہے اور ہم ہی حامی اسلام ہیں ان کی تجویز یہ ہے کہ مذہب اسلام ہی تنزل کا سبب ہے۔ افسوس وہ اسلام جس کی بدولت حضرات صحابہؓ کو وہ ترقی حاصل ہوئی تھی کہ عالم میں

اس کی نظیر نہیں مل سکتی آج اس کو تنزل کا سبب کہا جاتا ہے۔ بخدا ان لوگوں نے اسلام کو سمجھا ہی نہیں عمل تو درکنار جن لوگوں نے اسلام کو سمجھا اور اس پر عمل کیا تھا ان کو تو کبھی تنزل نہ ہوا ہاں جو اس پر عمل ہی نہ کریں ان کو تنزل ہونے لگے تو اس کا کیا علاج مگر اس کا سبب اسلام ہوگا یا ترک اسلام ۱۲) ان لوگوں کی صحبت کا یہ اثر ہے کہ میں ایک دفعہ بریلی گیا تھا تو وہاں ایک بوڑھے میاں آپنے پوتے کو میرے پاس لائے کہ یہ نماز نہیں پڑھتا اسے کچھ نصیحت کر دیجئے میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی تم نماز کیوں نہیں پڑھتے تو وہ کہنے لگا کہ مجھے تو خدا کے وجود ہی میں شک ہے نماز کس کی پڑھوں اور یہ کہکر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے بوڑھے میاں سے کہا کہ تم کو نماز کی فکر ہے صاحبزادے کو تو ایمان بھی نصیب نہیں پہلے اس کی فکر کرو وہ مجھ ہی سے اس کی تدبیر پوچھنے لگے میں نے کہا کہ یہ کس جگہ تعلیم پاتا ہے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے ایک کالج میں پڑھتا ہے میں نے کہا کہ آپ اس کو بجائے کالج کے کسی گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیجئے۔ اس وقت تو ان کی سمجھ میں یہ علاج نہ آیا مگر انھوں نے اسی کے موافق عمل کیا اگلے سال جو میں گیا تو معلوم ہوا کہ لڑکا بڑا پکا مسلمان ہے اور نماز بھی خوب پڑھتا ہے۔ اس وقت لوگوں نے مجھ سے اس کی وجہ دریافت کی کہ کالج میں رہ کر اسکا اسلام کیوں کمزور ہوا اور گورنمنٹی اسکول میں داخل ہو کر کیسے محفوظ ہو گیا حالانکہ اس کالج میں سب لڑکے مسلمان ہی ہیں وہاں تو اسلام کو قوت ہونا چاہیئے تھی اور گورنمنٹی اسکول میں ہندو مسلمان سب قسم کے ہوتے ہیں میں نے کہا کہ کالج میں جتنے بھی مسلمان ہیں سب آزاد ہیں اور وہاں رات دن ایسے ہی لوگوں کی صحبت ہے وہی مشغلہ ہے تو حالت بھی وہی ہو جاتی ہے جو سب کی ہے کیونکہ ان سے نفرت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی ظاہر میں سب مسلمان معلوم ہوتے ہیں اس لئے ان کے خیالات اور صحبت کا اثر جلدی ہوتا ہے اور گورنمنٹی اسکول میں چونکہ مسلمان لڑکوں کو ہندوؤں کے مذہب سے دلی نفرت ہے اس لئے ان کی صحبت کا مذہب پر برا اثر نہیں پڑتا اور نفرت کی وجہ سے چونکہ مقابلہ رہتا ہے اس لئے مقابلہ آکر یہ اپنے مذہب پر پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ مولوی انگریزی پڑھانے سے منع نہیں کرتے بلکہ عقائد کے بگاڑنے سے روکتے ہیں۔

بعض لوگ اس کا جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم تو انگریزی کے ساتھ اب دین کی تعلیم بھی دینے لگے ہیں تو اب تو اس سے منع نہ کرنا چاہیئے مگر صاحبو! محض دین کی تعلیم دینا کافی نہیں کیونکہ دین کی تعلیم دینے والے بھی تو وہی لوگ ہیں جن کے خیالات آزادی کی طرف مائل ہیں بلکہ تعلیم دین کے ساتھ صحبت نیک بھی ضرور تجویز کرنا چاہیئے اگر وہ بھی کچھ نہ ہو تو کم از کم تعطیلوں ہی میں ان لڑکوں کو کسی محقق کی صحبت میں بھیجدیا کیجئے میں یہ نہیں کہتا کہ آپ دین کے لئے اپنا قیمتی وقت صرف کریں کیونکہ اتنی ہمت کی آپ سے مجھے امید نہیں کیونکہ آجکل ہماری حالت یہ ہے کہ اللہ تام کے لئے خراب سے خراب چیزیں تجویز کی جاتی ہیں تو آپ اپنا اچھا وقت خدا کے لئے کیوں صرف کریں گے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک عورت نے کھیر پکا کر رکابی میں نکال کر رکھدی اتفاق سے اس رکابی میں کتا منہ ڈال گیا تو اس نے مٹی کی دوسری رکابی میں اسے نکال کر اپنے لڑکے کو دی کہ مسجد کے ملاّ کو دے آ وہ ملاجی کے پاس لایا تو وہ بڑے خوش ہوئے اور فوراً ہاتھ مارنے لگے اور ادھر ہی سے منہ مارا جدھر سے کتے نے کھائی تھی لڑکے نے کہا کہ ادھر سے نہ کھاؤ ادھر سے کتے کی کھائی ہوئی ہے۔ یہ سن کر تو ملاجی جھلاّ گئے اور رکابی کو بہت دور پھینکا وہ پھوٹ گئی تو بچہ رونے لگا کہ ہائے میری ماں مارے گی۔ ملاجی نے کہا کہ ابے مٹی ہی کی تو تھی کہنے لگا اجی میری ماں میرے چھوٹے بھائی کو اس میں ہگایا کرتی تھی یہ سن کر تو ملاجی کو متلی ہونے لگی (کہ ظرف و مظروف دونوں ہی تو بھرے تھے ۱۲) یہ حالت ہے ہم لوگوں کی اللہ کے واسطے خراب سے خراب اور ناپاک چیزیں تجویز کرتے ہیں پھر غضب یہ کہ مسجد کے ملاؤں کے ساتھ خود ہی تو یہ برتاؤ کرتے ہیں اور خود ہی ان کو ذلیل سمجھتے ہیں ارے بھائی جب تم اپنے آپ اچھے سے اچھا کھاؤ اور ان کو کبھی نہ پوچھو اور جو پوچھو بھی تو ایسے وقت جبکہ تم خود نہ کھا سکو تو بتلاؤ وہ حریص ہوں گے یا نہیں پھر تنخواہ ان کی ایسی قلیل مقرر کی جاتی ہے جس میں روکھی روٹی بھی وہ نہیں کھا سکتے تو پھر وہ حریص نہ ہوں تو اور کیا ہوں اسی لئے میں تو

کہا کرتا ہوں کہ جب محلہ میں کوئی رئیس بیمار ہوتا ہے تو مسجد کے موذن تو اس کی صحت کے لئے ہرگز دعا نہ کرتے ہوں گے وہ تو یہ چاہتا ہوگا کہ اچھا ہے یہ مرے تو تیجے دسویں چالیسویں کو فاتحہ کا کھانا خوب فراغت سے ملے گا کیونکہ خوشی میں ان کو کون پوچھتا ہے ایسے ہی مواقع میں پوچھا جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان مواقع کے منتظر رہیں گے اور اس حرص کی یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے کہ کیرانہ میں ایک شخص کا انتقال ہوا تو کفن کا چادرہ لوگوں لے قبرستان کے تکیہ دار کو نہ دیا کسی دوسرے غریب کو دے دیا وہ تکیہ دار جھگڑنے لگا کہ یہ تو میرا حق ہے لوگوں نے کہا بھائی ہمیشہ تم کو دیا جاتا ہے آج اس غریب کو دینے دو تو وہ تکیہ دار کیا کہتا ہے کہ واہ حضور خدا خدا کرکے تو یہ دن آتا ہے اسی میں آپ ہمارا حق دوسروں کو دیتے ہیں لوگوں نے کہا کمبخت کیا تو اس دن کا متمنی رہتا ہے کہ کوئی مرے تو تجھے کپڑا ملے جو یہ دن تیرے لئے خدا خدا کرکے آتا ہے وہ بات بنانے لگا مگر دل کی بات زبان پر آ ہی گئی تو صاحبو! اس کی بھی کیا خطا جب تم اس وقت کے سوا کبھی بھی اسے نہ پوچھو جب اسکی آمدنی یوں ہی ٹھہری تو وہ تو اسی کا وظیفہ پڑھے گا غرض چونکہ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم خدا کی راہ میں نکمی ہی چیز دیا کرتے ہیں اس لئے میں وقت کے بارہ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ تعطیل کا نکما اور فالتو وقت خدا کی راہ میں نکال دو اور اگر سارا وقت نہیں دے سکتے تو کم از کم آدھا ہی دے دو اور اس وقت میں بچوں کو محقق کی صحبت میں بھیجدیا کرو کیونکہ ؎

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

محض کتابیں پڑھانے سے دین پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے صحبت صالحین کی بھی بہت ضرورت ہے بس میں انگریزی پڑھانے سے منع نہیں کرتا بلکہ یہ کہتا ہوں کہ تم علماء سے پوچھکر اپنے لڑکوں کے دین سنبھالنے کا بھی کوئی انتظام کرو چنانچہ میں نے اس لڑکے کی اصلاح کا طریقہ بتلایا اور بحمداللہ نفع ہوا اب تو لوگ علماء سے اس لئے نہیں دریافت کرتے کہ یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ سب سے

پہلے انگریزی کو حرام بتائیں گے حالانکہ ان کو دنیا سے کچھ ضد تھوڑا ہی ہے وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ دنیا کمائیں مگر دین برباد نہ ہو رہی یہ بات کہ مولویوں نے لایجوز ہی کا سبق پڑھا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ ساری باتیں چھانٹ چھانٹ کر ایسی ہی پوچھیں گے جو ناجائز ہوں تو ان کا جواب لایجوز کے سوا کیا ہوگا صاحب اس کے بعد ان سے یہ بھی تو پوچھیئے کہ تجارت وزراعت کے جائز طریقے کتنے ہیں اور ملازمتیں جائز کون کون سی ہیں پھر دیکھئے وہ جائز کا کتنا وسیع دفتر آپ کے سامنے کھولتے ہیں وسعت قانون کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اس میں ممنوعات بالکل نہ ہوں ایسا تو کوئی بھی قانون نہ ہوگا اور اگر کوئی قانون اس شان کا ہو بھی تو وہ قانون کہلانے کا مستحق نہیں بلکہ وسعت قانون کے معنے یہ ہیں کہ اس میں ممنوعات کی فہرست کم ہو اور جائزات کی فہرست زیادہ ہو تو آپ قانون شرع کو بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر باب کے اندر اس میں ممنوعات کم اور مباحات زیادہ ہیں لیکن اگر کوئی تمام صورتوں میں سے ممنوعات ہی انتخاب کر کے سوال کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ سب کے جواب لایجوز ہی کہا جائیگا۔

پھر اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ علماء نے لایجوز ہی کا سبق یاد کر لیا ہے تب بھی ان سے پوچھ لینے میں آپ کا نفع ہی ہے گو ان کے لایجوز کہنے سے اس عمل کو ترک نہ کیا جائے وہ یہ کہ اگر آپ بدون پوچھے عمل ترک کرتے تو شاید حرام کو جائز سمجھ کر کرتے اور اب ناجائز سمجھ کر کریں گے پہلی صورت میں گناہ کر کے اپنے کو گنہگار بھی نہ سمجھتے اور یہ حالت زیادہ خطرناک ہے اور دوسری صورت میں آپ اپنے کو گنہگار تو سمجھیں گے اور اس میں امید ہے کہ شاید کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جاوے یہ تو معاملات کی حالت تھی اور بعض نے اگر لین دین کے اس جزو کو بھی درست کر لیا تو اس نے معاشرت کو خراب کر رکھا ہے پھر بعض نے تو یہ کیا کہ گو تہذیب قدیم کو نہیں لیا مگر تہذیب جدید کو بھی نہیں لیا اور بعض نے تہذیب قدیم کو چھوڑ کر تہذیب جدید کو لے لیا میں کہتا ہوں کہ اس میں جواز و ناجواز کی بحث تو الگ رہی اس سے قطع نظر کر کے ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ رات دن جس قومیت کا سبق رٹا کرتے ہیں کہ

ہر تقریر و تحریر میں ان کی زبان و قلم پر قوم قوم کا لفظ چڑھا ہوا ہے۔ تہذیب جدید کے اختیار کرنے میں اس قومیت کا ابطال ہے کیونکہ ہر قوم کا ایک خاص امتیاز ہوتا ہے اور اس امتیاز کو باطل کرنا قومیت کا ابطال ہے تو عجیب بات ہے کہ زبان سے تو یہ اپنے کو حامی قوم اور ہمدردی قوم ثابت کرتے ہیں اور طرز عمل سے قومیت کی جڑیں اکھاڑتے ہیں کہ ان کی صورت سے اور بات سے کوئی اسلامی امتیاز ظاہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنی قوم سے جدا معلوم ہوتے ہیں بس ان کی وہ حالت ہے ؎

یکے بر سر شاخ و بن می برید
خداوند بستاں نگہ کرد و دید

(ایک شخص شاخ کی جڑ میں بیٹھا ہوا شاخ کاٹ رہا تھا مالک باغ نے نگہ ڈالی اور کہا)

علاوہ ازیں دوسری قوم کی معاشرت اختیار کرنا گویا اس بات کا اقرار ہے کہ (نعوذ باللہ) اسلام میں معاشرت نہیں ہے یا ہے تو عمدہ اور کافی نہیں ہے۔ ورنہ پھر یہ لوگ دوسری قوموں کی معاشرت کیوں اختیار کرتے ہیں واللہ اسلام میں تو معاشرت ایسی ہے کہ کہیں بھی اس کی نظیر نہیں مگر معاشرت اس کو نہیں کہتے کہ باجا بھی ہو اور تکلفات بھی ہوں (اور تکبر کا سامان بھی ہو کیونکہ تکبر اور تکلف تو معاشرت کی جڑیں اکھاڑتا ہے اس لئے کہ متکبر دوسروں سے بڑا بن کر رہتا ہے پھر دوسروں کے ساتھ مساوات اور ہمدردی کہاں رہی اسلام میں معاشرت کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے جس سے انسان میں تواضع پیدا ہو اور تجربہ کر لیا جائے کہ بدون تواضع کے ہمدردی اور اتفاق پیدا نہیں ہوسکتا اور یہی معاشرت کی جڑ ہے بس ۱۲) اصل معاشرت اسلام ہی میں ہے مثلاً کھانے پینے میں اسلامی معاشرت سنئے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے بھی ارشاد فرمایا ہے اور کر کے بھی دکھلایا ہے اٰکُلُ کَمَا یَاکُلُ الْعَبْدُ کہ میں تو اس طرح کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتا ہے۔ آپ کی عادت تھی کہ جھک کر اکڑو بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اب ہمارے بھائیوں کی نشست ملاحظہ ہو جو سراسر متکبرانہ ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ عقل کے قریب کونسا طریقہ ہے اس کو ایک مثال میں سمجھئے میں پوچھتا ہوں کہ آپ جارج پنجم کے دربار میں جاویں اور وہاں آپ کو کوئی چیز کھانے کے لئے دی جائے اور حکم ہو کہ ہمارے سامنے کھاؤ تو بتلایئے اس وقت آپ کس طرح کھائیں گے۔ کیا وہاں بھی آپ میز کے منتظر ہوں گے اور پالتھی مار کر بیٹھیں گے یا غلاموں کی طرح جھک کر کھائیں گے۔ اور لیجئے کہ اس وقت جو چیزیں آپ کو دی جائیں اگر ان میں سے کوئی شے مرغوب نہ ہو تو انصاف سے کہئے کہ آپ اس کو بے رغبتی ظاہر کر کے ناز و انداز سے کھائیں گے یا رغبت سے کھائیں گے، یقیناً آپ رغبت ظاہر کر کے کھائیں گے۔ بے رغبتی ہرگز ظاہر نہ ہونے دیں گے۔ بس یہی اسلامی تہذیب ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ کَانَ یَاکُلُ اَکْلاً ذَرِیعًا کہ آپ (رغبت ظاہر کر کے) جلدی جلدی کھاتے تھے مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ نہایت ہی ناز و انداز سے کھاتے ہیں۔ حضرت یہ ساری باتیں اس وقت تک ہیں جب تک حقیقت منکشف نہیں ہوئی اور اگر حقیقت کھل جائے اور معلوم ہو جائے کہ احکم الحاکمین کے دربار سے ہم کو یہ چیز کھانے کے لئے ملی ہے اور وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں تو پھر خود بخود یہی طرز اختیار کرنا پڑے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔

چنانچہ اسی مثال میں غور کر لیجئے کہ آپ جارج پنجم کے عطیہ کو اس کے سامنے بے رغبتی اور بے پروائی سے کھائیں گے یا نہایت رغبت سے اور

لیجئے حدیث میں ہے کہ اگر لقمہ گر پڑے تو اس کو صاف کر کے کھالو اس کو بعض متکبر تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں مگر میں اسی مثال میں پوچھتا ہوں کہ اگر جارج پنجم کی دی ہوئی چیز میں سے کچھ گر پڑے تو آپ کیا کریں گے کیا اس کو ویسے ہی چھوڑ دیں گے یا اٹھا کر سر پر دھریں گے۔ حضرت سارے مرحلے یہیں طے ہو جاتے ہیں جبکہ قلب میں کسی کی عظمت ہو بس فرق یہ ہے کہ ہم لوگ یہ بات نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالےٰ دیکھ رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھتے تھے اگر ہماری بھی آنکھیں کھل جائیں تو وہی کرنے لگیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور جہاں جا کر یہ آنکھیں کھلتی ہیں اور کسی کی عظمت دل میں مستحضر ہوتی ہے وہاں اب بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے تو جبکہ اسلام میں معاشرت علی وجہ اتم موجود ہے تو پھر دوسروں سے کیوں لیتے ہو غیرت اور حمیت (اور دعوٰی قومیت ۱۲) کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اسلامی معاشرت ناتمام بھی ہوتی جب بھی آپ دوسروں کی معاشرت اختیار نہ کرتے چنانچہ کسی نے کہا ہے ؎

کہن خرقۂ خویش پیراستن
بہ از جامہ عاریت خواستن

(اپنی پرانی گدڑی پہننا مانگے ہوئے کپڑے سے بہتر ہے)

اپنا تو پرانا کمبل بھی دوسروں کی شال سے زیادہ عزیز ہوا کرتا ہے۔ نہ یہ کہ اپنے پاس دوشالہ موجود ہے اور تم اس کو اتار کر دوسروں کا پھٹا ہوا کمبل اوڑھتے ہو۔ اسی طرح لباس میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کی معاشرت اختیار کر لی ہے حالانکہ اسلامی معاشرت کے برابر لباس میں بھی کوئی معاشرت نہیں ہو سکتی کتنی کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام میں لباس کے متعلق ماذونات کی فہرست بڑی اور ممنوعات کی چھوٹی ہے اور ہمارے بھائیوں کی معاشرت میں ماذونات کی فہرست تنگ اور

ممنوعات کی بڑی ہے حیرت کی بات ہے کہ آپ رات دن وسعت وسعت پکارتے ہیں اور علماء کو رائے دیتے ہوئے یہ کہتے کہ معاشرت میں تنگی نہ ہونا چاہیئے اور طرز عمل یہ ہے کہ آپ نے ایسی معاشرت اختیار کر رکھی ہے جس میں سراسر تنگی ہے بھلا جس میں ماذونات کم اور ممنوعات زیادہ ہوں وہاں وسعت کہاں آپ خود ہی تو ایک قاعدہ بناتے ہیں کہ وسعت ہونی چاہیئے اور خود ہی اس کو توڑتے ہیں اور یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ درحقیقت آزادی شریعت ہی کی معاشرت میں ہے کیونکہ اس میں ماذونات زیادہ اور ممنوعات وقیود کم ہیں برخلاف جدید معاشرت کے کہ اس میں سراسر تنگی ہی تنگی ہے یہ لوگ اس وقت تک کھا نہیں سکتے جب تک کرسی اور میز نہ ہو اور ہم لوگ پلنگ پر کھالیں بستر پر کھالیں بوریئے پر کھالیں بلکہ زمین پر بھی کھالیں ہمارے لئے کوئی قید نہیں بتلایئے آزادی کی حالت میں کون ہے۔ اب جدید معاشرت کو دیکھیئے میں ایک مرتبہ اپنے بھائی کے یہاں کھانا کھارہا تھا تو ہم لوگ فرش پر بیٹھے ہوئے کھارہے تھے اس وقت ایک جنٹلمین بھی مہمان تھے وہ کھانے کے لئے اس حلیہ سے آئے کہ کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تھے بیچارے آکر کھڑے ہوگئے اور اس کے منتظر رہے کہ شاید میرے واسطے کرسی لائی جاوے مگر بھائی نے میری وجہ سے کرسی وغیرہ کا انتظام نہ کیا دیر تک وہ کھڑے رہے مجھے شرم بھی آئی کہ ایسے کھڑے ہیں جیسے کوئی مانگنے آیا ہو بالآخر وہ بہ تکلف اس طرح بیٹھے کہ دونوں پیر ایک طرف لمبے کردیئے اور دھم سے گر پڑے اور کہنے لگے کہ معاف فرمایئے گا میں پیر لمبے کرنے پر مجبور ہوں میں نے کہا کہ معاف فرمایئے گا میں کرسی پر کھانے سے معذور ہوں۔ ان کو پیر لمبے کرنے سے شرم آتی تھی اور مجھے کرسی پر کھانے سے شرم آتی میری شرم ایسی تھی جیسے علامہ تفتازانی کی شرم تھی اور ان کی شرم تیمور لنگ جیسی تھی واقعہ یہ ہے کہ تیمور لنگ دربار میں پیر پھیلا کر بیٹھا تھا کیونکہ اس کا ایک پیر بوجہ لنگ کے سیدھا نہ ہوتا تھا علامہ تفتازانی اس کے زمانہ میں بہت بڑے عالم تھے تیمور ان کی اتنی وقعت کرتا تھا کہ دربار میں ان کو اپنے پاس تخت پر بٹھلاتا تھا جب

پہلی مرتبہ علامہ تفتازانی دربار میں بلائے گئے اور تیمور نے ان کو تخت پر بٹھلایا تو یہ بھی تیمور کی طرح ایک پیر لمبا کر کے بیٹھے تیمور نے ناگواری سے کہا معذورم دار کہ مرا لنگ ست یعنی مجھے معذور سمجھے کیونکہ میرے پیر میں لنگ ہے میں نے قصداً پیر لمبا نہیں کیا جس کا آپ نے مقابلہ کیا ہے علامہ نے جواب دیا معذورم دار کہ مرا ننگ ست یعنی آپ بھی مجھے معذور سمجھئے کیونکہ مجھے ننگ و عار آتا ہے کہ ظاہر میں بادشاہ کی وضع سے کمتر وضع اختیار کروں کیونکہ اس میں دیکھنے والوں کی نظر میں علم کی تحقیر ہے تیمور خاموش ہوگیا پھر ہمیشہ یہی دستور رہا کہ علامہ پاؤں پھیلا کر ہی تخت پر بیٹھتے تھے اسی لئے میں نے بھی ان حضرات کے لئے کرسی نہ منگوائی کیونکہ اس میں اسلامی معاشرت کی توہین تھی میں نے کہا اچھا ہے ذرا آج یہ اپنی معاشرت کا مزا تو چکھیں کہ اس میں کتنی مصیبت ہے تو یہ کیا آزادی ہے کہ انسان بدون کرسی اور میز کے بیٹھ ہی نہ سکے۔ ایک دفعہ میں کانپور میں مسجد میں حدیث شریف پڑھا رہا تھا کہ ایک انسپکٹر پولیس جو کہ جنٹلمین تھے اسی طرح کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تشریف لائے اور لب فرش پر منتظر کھڑے رہے کہ یہ اٹھ کر میرے پاس آئے اور میں باتیں کروں مگر میں حدیث کو ان کے لئے کیوں چھوڑتا بالآخر تھوڑی دیر کھڑے رہ کر چلدیئے۔ واللہ اس لباس سے زیادہ کیا جیلخانہ ہوگا جس میں کرسی کے نہ ہونے تک انسان کو مجرموں کی طرح کھڑا رہنا پڑے تو میں اس وقت جائز و ناجائز سے بحث نہیں کرتا یہ تو دوسری بات ہے ان سب سے قطع نظر کر کے میں کہتا ہوں کہ دوسری قوموں کی معاشرت اختیار کر کے وہ امتیاز قومی کہاں رہا جس کے یہ لوگ بڑے مدعی ہیں اور اسلام کی وقعت کہاں رہی جس کے حامی اور خادم ہونیکا ان کو دعویٰ ہے کیا اسلام کی یہی وقعت ہے کہ تم دوسروں کی معاشرت اختیار کر کے زبان حال سے اسلامی معاشرت کا ناکافی ہونا ظاہر کرو نیز اس میں یہ خرابی الگ ہے کہ جس میں معاشرت کو آپ لے رہے ہیں اس میں تنگی اور قید بہت زیادہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری لازم اور اس کو تیسری چیز لازم ان قیود کی پابندی میں وہ آزادی کہاں رہی جس کا آپ سبق پڑھا کرتے ہیں آجکل ہمارے نوجوان آزادی کا سبق پڑھ کر شادی بیاہ کی رسموں کو منع کرنے لگے ہیں مگر میں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ یہ ہمارے لئے خوش کن بات نہیں کیونکہ آپ ان رسموں کو اپنی رسموں کے پورا کرنے کے لئے منع کرتے ہیں خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کی وجہ سے منع نہیں کرتے البتہ رسوم کو رد کرنا علماء کا حق ہے جن کا مذہب ہے تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيعًا میں نے لات اور عزیٰ

بتوں کو چھوڑ دیا) اور لیجئے سلام وکلام میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کا طریقہ اختیار کرلیا ہے گویا شریعت کی معاشرت کو بالکل چھوڑ دیا (کوئی ٹوپی اتار کر سلام کرتا ہے کوئی انگریزی لفظوں میں سلام کرتا ہے کوئی آداب و تسلیمات کہتا ہے وغیرہ وغیرہ ۱۲) اور معاشرت کے بعض اجزاء کے متعلق تو بعض لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں رہی کہ یہ شریعت کا حکم ہے بھی یا نہیں بلکہ اکثر لوگ اس کو اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ جیسے استیذان کا مسئلہ اس کو بہت لوگ نئی بات سمجھتے ہیں اور اگر کوئی شخص یہ قانون مقرر کردے کہ جب کوئی ملنے آئے تو پہلے اطلاع کردے تو اس کو بدنام کہتے ہیں کہ اس نے انگریزوں کا طریقہ اختیار کرلیا حالانکہ استیذان کا مسئلہ اسلام ہی سے سب نے سیکھا ہے چنانچہ یہ حکم قرآن میں موجود ہے، حدیث میں موجود ہے اور سلف کا طرز عمل بھی یہی تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس پر عمل کرکے دکھلایا ہے البتہ اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کیونکہ جس طرح آجکل نوجوانوں نے طرز اختیار کیا ہے یہ انھوں نے حکم اسلامی کے اتباع کے لئے نہیں کیا بلکہ اس میں بھی وہ دوسری قوموں کا اتباع کرتے ہیں تو سن لیجئے کہ اسلام میں استیذان کے لئے کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہر جگہ اور ہر مکان کے لئے اجازت مانگنے کی ضرورت ہے بلکہ جب قرائن سے یہ معلوم ہوجائے کہ کوئی شخص خلوت میں بیٹھا ہے مثلاً بیٹھک کے کواڑ بند کر رکھے یا پردے چھوڑ رکھے ہیں یا زنانہ مکان ہے تو اس وقت استیذان کی ضرورت ہے اور اگر مردانہ مکان ہے اور کواڑ بند نہیں نہ پردے چھوٹے ہوئے ہیں تو بلا استیذان کے جانا جائز ہے (مگر یہ کہ قرائن سے معلوم ہوجائے کہ اس وقت کسی ضروری کام میں مشغول ہے جس میں دوسروں کے آنے سے خلل واقع ہوگا ۱۲) اور جہاں استیذان کی ضرورت ہے وہاں یہ طریقہ ہے کہ پہلے جاکر سلام کرو السلام علیکم پھر اپنا نام بتلا کر کہو کہ میں اندر آسکتا ہوں اگر وہ اجازت دے چلے جاؤ ورنہ تین دفعہ اس طرح کہہ کے لوٹ جاؤ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور تین دفعہ اسی طرح کرکے واپس ہوگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خادم سے فرمایا کہ میں نے ابوموسیٰ کی آواز سنی تھی ان کو بلالو اس نے باہر آکر دیکھا تو وہ واپس ہوچکے تھے آکر عرض کیا تو فرمایا کہ جہاں ہوئیں ہیں سے بلاؤ جب وہ تشریف لائے تو پوچھا کہ آپ واپس کیوں ہوگئے تھے فرمایا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم فرمایا ہے کہ تین دفعہ سلام و استیذان کے بعد جواب نہ آئے تو واپس ہوجایا کرو۔ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا اس لئے فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی گواہ ہے جو تمہارے موافق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بیان کرسکے حضرت ابو موسیٰ گواہ کی تلاش میں مسجد نبوی میں آئے جہاں انصار کا مجمع موجود تھا انھوں نے فرمایا کہ ہم سب اس مسئلہ پر گواہ ہیں مگر تمہارے ساتھ ہم اپنے میں سب سے چھوٹے کو بھیجیں گے تاکہ حضرت عمر کو معلوم ہو جائے کہ انصار کے بچے بھی اس مسئلہ کو جانتے ہیں چنانچہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے وہ گواہی کے لئے حاضر ہوئے اور آکر بیان کیا کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ کے بعد لوٹ جانے کا حکم دیا ہے یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ارشادی تھا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی اس حکم کو ظاہر فرمایا ہے چنانچہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے اور تین مرتبہ فرمایا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَاَدْخُلُ (السلام علیکم میں اندر آؤں) حضرت سعد تینوں دفعہ اس خیال سے خاموش رہے کہ اچھا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سلام فرمائیں تو ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت زیادہ نصیب ہو جب تیسری دفعہ کے بعد بھی آپ نے سلام نہ کیا تو وہ گھر سے نکلکر دوڑے اور دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لیجا رہے ہیں۔ جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تو مزید برکت حاصل کرنے کے لئے خاموش ہو رہا تھا آپ واپس کیوں چلے۔ فرمایا کہ مجھ کو یہی حکم ہے کہ تین دفعہ سے زیادہ استیذان نہ کروں غرض پھر آپ واپس تشریف لائے۔ اگر آج کوئی ایسا قانون مقرر کردے کہ اجازت لیکر آؤ اور تین دفعہ میں جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ تو لوگ اس کو فرعون اور مغرور سمجھیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرات سلف کا یہی طریقہ تھا اور تین دفعہ اجازت مانگنے پر اگر اجازت نہ ملے تو وہ بخوشی واپس ہو جاتے تھے گرانی مطلق نہ ہوتی تھی تو دیکھئے یہ صورت کیسی آسان ہے اور اس میں کس قدر مصالح ہیں پس ہماری معاشرت ہر طرح سے مکمل ہے کھانے پینے میں بھی اور ملنے ملانے میں بھی مگر افسوس ہم لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور خواہ مخواہ دوسروں کے دروازے پر دریوزہ گری کرتے ہیں۔ پانچواں جزو دین کا تصوف ہے اس کو تو لوگوں نے بالکل ہی چھوڑ رکھا ہے اکثر لوگوں نے تو تصوف کے متعلق یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ بہت ہی مشکل ہے کیونکہ اس میں بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے یہ بالکل غلط ہے صاحبو! تصوف کی حقیقت ہے خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھانا سو اس میں تعلقات ناجائز تو بیشک چھوڑنا پڑتے ہیں باقی تعلقات جائزہ ضرور یہ تو پہلے سے بھی بڑھ جاتے ہیں صوفیہ کے تعلقات اور معاملات بیوی بچوں کے ساتھ ایسے خوشگوار ہوتے ہیں کہ اہل تمدن کے بھی ویسے نہیں ہوتے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تصوف والے سنگدل ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ ایسے رحمدل ہوتے ہیں کہ انسان تو انسان جانوروں تک پر رحم

کرتے ہیں چنانچہ ان حضرات کے پاس رہ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہر شخص کی راحت کا کس قدر خیال کرتے ہیں لہٰذا اس سے متوحش ہونا نادانی ہے جس کی وجہ سے اسلام کا ایک ضروری جزو لوگوں سے فوت ہو رہا ہے یہ جزو ایسا ضروری ہے کہ قرآن شریف میں اس کی تحصیل کا جابجا امر ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِہٖ یعنی اے ایمان والو حق تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ حق ڈرنے کا ہے اسمیں تکمیل تقویٰ کا امر ہے یہی تصوف کا حاصل ہے اور مشاہدہ ہے کہ ایسا ڈرنا سوائے صوفیہ کرام اہل اللہ کے کسی کو بھی نصیب نہیں ہے ان کی بات بات میں خشیت ہوتی ہے بیباکی اور آزادی کہیں نام کو بھی نہیں ہوتی۔ اب حدیث میں اسکی تاکید لیجئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّ فِیْ جَسَدِ ابْنِ اٰدَمَ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّہٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ یعنی انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے سن لو وہ دل ہے اس میں اصلاح قلب کی کتنی تاکید ہے کہ اسی کو مدار اصلاح قرار دیا گیا ہے اور یہی تصوف کا حاصل ہے اس میں بھی اصلاح قلب ہی کا اہتمام ہوتا ہے ایک اور حدیث میں ہے (جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے) کہ ایک دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام بصورت انسان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور صحابہ کی تعلیم کے لئے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سوالات کئے جن میں پہلا سوال یہ تھا یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بتلائیے کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے قَالَ اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِیْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِیَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا آپ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ اللہ کے لَا شَرِیْکَ لَہٗ (اس کا کوئی شریک نہیں) ہونے کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی گواہی دو اور نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر وہاں تک پہونچنے کی استطاعت ہو۔ قَالَ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِہٖ وَكُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ حضرت جبریل نے پھر پوچھا کہ مجھے ایمان کی حقیقت بتلائیے آپ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور سب کتابوں اور سب رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان لاؤ اور ان سب کی تصدیق کرو اس سے معلوم ہو گیا کہ اسلام کے لئے تصدیق رسالت اور ایمان کے لئے قیامت اور تقدیر اور ملائکہ کی تصدیق کی بھی ضرورت ہے اس کے بدون آدمی مومن نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ قیامت کا ماننا اس کا نام نہیں کہ جس طرح جی چاہے مان لے بلکہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے اس طرح مانے تو اس میں حساب کتاب اور وزن اعمال

اور پل صراط وغیرہ سب کا ماننا داخل ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام کا ایک جزو اعمال بھی ہیں پس اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جنھوں نے اجزاء دین میں انتخاب کر رکھا ہے جیسا کہ اوپر مفصل ذکر ہو چکا ہے ۱۲) قَالَ فَاخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ پھر حضرت جبرئیلؑ نے پوچھا کہ بتلایئے احسان (واخلاص) کیا چیز ہے آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھ رہا ہے (اور اس کا بھی مقتضا یہی ہے کہ جیسی عبادت خود ان کو دیکھ کر کرتے ویسی ہی اب بھی کرو کیونکہ نوکر کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ حاکم مجھے دیکھ رہا ہے گو اُسے نظر نہ آتا ہو جب بھی وہ ویسا ہی کام کرتا ہے جیسا کہ خود اُسے آنکھوں سے دیکھ کر کرتا ۱۲) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان کی تکمیل کرنے والی ایک تیسری چیز اور ہے جس سے عبادت بدرجۂ کمال ادا ہوتی ہے وہ احسان ہے اور اسی کی تحصیل تصوف میں مطلوب ہے حقیقت اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک اعمال جوارح دوسرے اعمال قلب۔ اعمال جوارح تو عبادات و معاملات و معاشرات وغیرہ ہیں، اور اعمال قلب کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا معلوم کرنا اور یقین کر لینا کافی ہے ان کو عقائد کہتے ہیں دوسرے وہ جن کو قلب کے اندر پیدا کرنا اور ان کی اضداد سے دل کو پاک کرنا ضروری ہے جیسے اخلاص صبر شکر محبت و خشیت و رضا توکل و تواضع و قناعت وغیرہ ان کا تو حاصل کرنا ضروری ہے اور ان کے اضداد کا دل سے نکالنا ضروری ہے جیسے ریا۔ کبر۔ غصہ۔ طمع۔ حب دنیا وغیرہ غرض کچھ کرنے کے کام ہیں اور کچھ نہ کرنے کے اور اسی سے اعمال جوارح عبادات وغیرہ درجۂ کمال پر پہنچتے ہیں اور ان سب کی تکمیل کا نام احسان ہے۔ اب قرآن و حدیث سے دیکھئے کہ ان اعمال باطنہ کی تاکید ہے یا نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے امر و نہی اور وعدہ وعید سو قرآن میں ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ (بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں جو ایسے ہیں کہ ریاکاری کرتے ہیں) اس میں نماز میں ریا و غفلت پر سخت وعید ہے ۱۲) اور حدیث میں ہے لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ یعنی جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو اسی طرح قرآن و حدیث کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جا بجا اخلاق رذیلہ کی ممانعت اور ان پر وعید مذکور ہے اور اخلاق حمیدہ کی تاکید اور ان پر وعدہ موجود ہے تو اس جزو اخلاق کا حاصل کرنا واجب ہوا اور یہی حقیقت ہے تصوف کی پس تصوف کا جزو دین ہونا ثابت ہو گیا مگر قاعدہ ہے کہ ہر چیز کے کچھ توابع اور ذرائع

ہوا کرتے ہیں جیسے حج کے لئے سفر کرنا اور زادِ راہ ساتھ لینا جس سے وصول میں سہولت ہو اسی طرح تصوف میں اصل مقصود تو اصلاح قلب ہے کہ اخلاق حمیدہ حاصل اور رذیلہ زائل ہوں مگر اس مقصود کے لئے کچھ توابع وذرائع ہیں جن سے مقصود میں آسانی ہو جاتی ہے جیسے اذکار و اشغال و احوال و کیفیات جن کو آجکل لوگوں نے غلطی سے مقصود قرار دے رکھا ہے مگر یہ محض توابع و ذرائع ہیں اصل مقصود اصلاح قلب ہے اور اس مقصود کا بھی ایک مقصود ہے یعنی رضاء حق جس کا ثمرہ ہے قرب باری تعالیٰ پس حاصل یہ ہوا کہ دین کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ اول تو عقائد کو صحیح کرے پھر اعمال جوارح عبادات و معاملات و معاشرات کو درست کرے پھر اصلاح قلب کا اہتمام کرے جس کا طریقہ کسی شیخ کامل سے پوچھے اور اس کے کہنے کے موافق ذکر و شغل میں لگے اس سے اعمال قلب کی اصلاح آسانی سے ہو گی کیونکہ ذکر و شغل سے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھ جاتا ہے تو قلب میں اخلاق حمیدہ کی قابلیت جلدی پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے ذکر کے ساتھ اخلاق کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیے (کیونکہ اصل چیز یہی ہے جس کی تحصیل ضروری اور فرض ہے رہا ذکر و شغل وہ تو امر مستحب ہے جو اس مقصود کا ذریعہ ہے ۱۲) یہ ہے امر مہم اور یہ ہے اصل درس مگر بعض لوگ صرف ذکر و اشغال پر اکتفا کرتے ہیں اخلاق کی درستی کا اہتمام نہیں کرتے یہ حقیقت سے ناواقفی کی دلیل ہے اور اخلاق باطنیہ کی درستی اس طرح ہوتی ہے کہ شیخ کے سامنے اپنے امراض قلبیہ بیان کئے جائیں کہ ہمارے اندر فلاں فلاں امراض ہیں ریا یا عجب یا کبر وغیرہ پھر جو تدبیر شیخ بتلائے اس پر عمل کرے جیسا کہ امام غزالیؒ نے ہر ہر مرض کی حقیقت اور ہر ایک کا جدا جدا علاج (احیاء العلوم میں) بیان فرمایا ہے۔ صحیح طریقہ تو یہ ہے تصوف کا اور ایک وہ ہے جو آجکل لوگوں نے اپنی رائے سے سمجھ رکھا ہے کہ بس ذکر و شغل ہی پر کفایت کرنے لگے۔ یاد رکھو اس طرح باطن کی اصلاح نہیں ہوتی بلکہ صورت وہی ہے کہ امراض کا علاج بھی کرو مثلاً ایک شخص میں تکبر ہے تو شیخ کو چاہیے کہ ذکر و شغل کے ساتھ اس کے سپرد ایسا کام بھی کرے جس سے نفس میں تواضع پیدا ہو مثلاً نمازیوں کے لئے لوٹے بھر بھر کے رکھنا ان کی جوتیاں سیدھی کرنا وغیرہ اور اگر شیخ نہ بتلاوے تو طالب کو خود ایسے کام کرنا چاہئیں جن سے نفس میں تذلل پیدا ہو و علیٰ ہذا اگر کسی میں حسد ہے تو اس کو چاہیے کہ محسود کی تعریفیں کیا کرے اس سے قلب کا غبار نکل جائیگا۔ اسی طرح ہر ہر مرض کا ایک خاص علاج ہے جو تصوف کی کتابوں سے معلوم ہو سکتا ہے یہ ہے تہذیب اخلاق اس کے بعد اس کا ثمرہ ہے یعنی رضاء حق مگر آجکل لوگوں نے ثمرہ اس کو سمجھ لیا ہے کہ کچھ

لطائف جاری ہو جائیں کچھ گریہ اور رقت طاری ہونے لگے۔ صاحبو! یہ تو احوال ہیں جو غیر اختیاری ہیں یہ مطلوب نہیں ہیں مطلوب وہ امور ہیں جو بندہ کے اختیار میں ہیں یعنی اخلاق حمیدہ کا حاصل کرنا اور رذائل کا علاج کرنا اسی طرح کشف بھی مطلوب نہیں جس کو کشف ہوتا ہو اس کے لئے نعمت ہے شکر کرے بشرطیکہ غوائل کبر و عجب وغیرہ سے محفوظ ہو اور جس کو نہ ہوتا ہو وہ اس کے درپے نہ ہو وہ سمجھ لے کہ میرے لئے کامیابی کا طریقہ یہی تجویز کیا گیا ہے کہ کشف نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ کشف سے انسان بہت ہی بلاؤں میں پھنس جاتا ہے بس تم اپنے لئے کوئی طریقہ تجویز نہ کرو ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش ٭ کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

(تجھے صاف اور گدلے سے مطلب نہیں خاموش رہ جو کچھ ساقی نے ہمارے پیالہ میں ڈال دیا ہے وہ عین لطف ہے)

اور فرماتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(حافظ! تو بندگی بشرط مزدوری فقیروں کی طرح مت کر اس لئے آقا بندہ پروری کا طریقہ خود جانتا ہے)

اور ساری وجہ پریشانی کی یہی ہوتی ہے کہ لوگ حالات و کیفیات کو مقصود سمجھتے ہیں حالانکہ میں نے بتلا دیا کہ یہ مقاصد میں سے نہیں محض توابع و ذرائع ہیں جو ہر اک کو مختلف طور پر پیش آتے ہیں بس یہ خلاصہ ہے دین کا کہ ان پانچوں اجزاء کو حاصل کیا جائے اسی کا بیان مختصر لفظوں میں اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ۝ (جو لوگ ایمان لائیں اور عمل صالحہ کریں اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے) پانچوں اجزاء کی تحصیل پر آپ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے) کے مصداق بنیں گے پھر اس پر وہ ثمرہ مرتب ہوگا جو آیت میں مذکور ہے یعنی حق تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہو گی جس کا تفصیل کے ساتھ پہلے ذکر ہو چکا ہے آج تو تفصیل طریق کا بیان تھا سو بحمد اللہ اس وقت بقدر ضرورت طریق کی تفصیل بھی میں نے بیان کر دی ہے اب عمل کرنا آپ کا کام ہے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی ہمت دیں آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین

والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصلحت

شاہنامہ اسلام :۔ حفیظ جالندھری، کامل مجلد چار جلدوں میں چند نسخے دستیاب ہیں۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ المسمٰی بہ

الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

ناشر:- محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ــــ دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس ہیئت سے ہوا۔	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	۲ شوال ۱۳۴۵ھ بروز شنبہ بوقت صبح	۳ گھنٹے ۵۴ منٹ	جالسًا علی الکرسی	مولانا الحافظ الحاج مولوی عبداللطیف صاحب مدرس اول مدرسہ مظاہر العلوم کی درخواست پر	اسلام کی حقیقت تفویض ہے اور تفویض سے زیادہ کسی چیز میں راحت نہیں	ہر طبقہ کو عمومًا اور علماء و سالکین کو خصوصًا	ظفر احمد عفا اللہ عنہ و غفر لوالدیہ	تقریبًا پچاس ۵۰	یہ بیان اپنے علوم میں واحد ہے

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ط یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ

اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا اور مضبوطی سے پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈالی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔

یہ آیتیں ہر چند کہ ایک خاص قصہ میں نازل ہوئی ہیں مگر مقصود اسی قصہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ حق تعالیٰ نے ان میں ہم کو ایک دستور العمل بتلایا ہے تاکہ پھر ویسے قصے رونما نہ ہوں اور دیگر آفات سے بھی محفوظ رہیں۔ قصہ یہ ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے پہلے آپ کے دو خاندانوں میں جن کا نام اوس وخزرج ہے سخت عداوت تھی جب مدینہ والے مسلمان ہو گئے تو یہ عداوت اتحاد سے اور وہ بغض و نفرت دوستی اور محبت سے مبدل ہو گئی اور جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے اس وقت تو یہ اتحاد اور بھی زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اور یہ اتحاد یہود کو بہت ناگوار گذرا اور ایک یہودی نے جو اوس وخزرج دونوں قبیلوں کے آدمیوں کو ایک جلسہ میں باہم شیر وشکر دیکھا تو حسد سے جل مرا اور اس نے ایک شخص کو اس کام پر مقرر کیا کہ اوس وخزرج میں جو وقائع وحروب ہوئے ہیں اور ان کے متعلق ہر قبیلے کے شعراء نے اشعار کہے ہیں وہ اشعار انصار کی مجلسوں میں پڑھ دے

چنانچہ اس میں وہ کسی قدر کامیاب ہوگیا کہ اشعار کا پڑھنا تھا فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی یہاں تک کہ لڑائی کا موقع اور وقت بھی مقرر ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اطلاع ہوئی آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا یہ کیا اندھیر ہے کہ میرے سامنے ہی کہ میں تمہارے اندر زندہ موجود ہوں پھر مسلمان ہو جانے اور باہم متفق و متحد ہو جانے کے بعد یہ واہیات حرکت۔ کیا تم اسلام کے بعد پھر اسی حالت کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے سب کو تنبہ ہوا اور سمجھے کہ یہ شیطانی حرکت تھی اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی جس سے حاسدین کی کوشش اکارت گئی۔ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (ان لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کرنا چاہا تھا سو ہم نے ان ہی لوگوں کو ناکام کر دیا) کیونکہ اب پہلے سے بھی زیادہ اتحاد ہوگیا اور صحابہ کو معلوم ہوگیا کہ نفسانیت کی بنا پر باہم قتال و جدال علی کفر ہے اس لئے ہمیشہ کے واسطے اس کا دروازہ[ف] بند ہوگیا۔ جس سے دشمنوں کی تدابیر الٹی ہوگئیں اور صحابہ میں پہلے سے بھی زیادہ محبت و الفت قائم ہوگئی مضلین کو بھی بعض دفعہ دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کام کرتے ہیں اہل حق کو ضرر پہنچانے کے لئے اور اس کا انجام خیر ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ شیطان کو بھی جو رئیس المضلین ہے دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ بندہ سے ایک معصیت کرانا چاہتا ہے تاکہ خدا تعالیٰ سے اس کو بعد ہو جائے مگر اس کو پہلے سے بھی زیادہ قرب بڑھ جاتا ہے بعض دفعہ تو اس طرح کہ وہ گناہ کا ارادہ کر کے پھر خدا کے خوف سے رک جاتا ہے اور بعض دفعہ گناہ کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے بعد ندامت

ف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگ ہوئی اس کا منشا جاہلیت کی عداوت نہ تھی بلکہ اس کا منشا محض دین تھا کہ ایک فریق دوسرے کو دین کے خلاف عمل کرنے والا سمجھتا تھا اس لئے ہر ایک اپنے زعم میں دوسرے کو دین پر لانے کے لئے جنگ کر رہا تھا گو ان میں ایک فریق واقع میں غلطی پر تھا مگر اپنے اجتہاد میں ہر ایک حق پر تھا اور خطا اجتہادی معصیت نہیں بلکہ اس پر بھی اجر کا وعدہ ہے ۱۲ جامع

اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ بندہ روتے روتے ہلاکت کے قریب ہوجاتا ہے
اللہ تعالےٰ کو یہ عجز و نیاز پسند ہے وہ اس کو پہلے سے بھی زیادہ مقرب بنالیتے
ہیں پھر یہ شخص آئندہ کو اس گناہ کے وہ دروازے بالکل بند کردیتا ہے جن کی
وجہ سے شیطان کے دھوکہ میں آیا تھا غرض شیاطین الانس والجن دونوں کو بعض
دفعہ دھوکہ ہوجاتا ہے جیسا کہ اس یہودی کو ہوا جس نے اوس وخزرج میں نفاق
وشقاق ڈالنا چاہا تھا اگر اسے یہ معلوم ہوجاتا کہ میری سعی کا یہ انجام ہوگا تو وہ
کبھی ایسا نہ کرتا کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس کی کوشش کو صرف اسی واقعہ میں ناکام نہیں
کیا بلکہ آئندہ کا بھی انتظام فرمادیا اور جدال وقتال کے دروازے بالکل بند
کردیئے چنانچہ اس سے پہلے جو آیات ہیں ان میں اول تو اہل کتاب پر ملامت ہے
جنھوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت سے کی گئی کہ اس فعل پر
ملامت کرنے سے پہلے ان کو کفر پر ملامت کی گئی جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہیئے تو یہ تھا کہ
تم خود بھی مسلمان ہوجاتے نہ یہ کہ الٹا دوسروں کے گمراہ کرنے کی فکر میں لگ رہے ہو
پھر مسلمانوں کو خطاب اور فہمائش ہے کہ اہل کتاب کو تمہارا اتحاد و اتفاق جو ذریعہ ہے
دین و دنیا کی ترقی کا سخت ناگوار ہے وہ تم کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں اور اگر تم ان کا
کہنا مانو گے تو وہ تم کو ایمان کے بعد کافر بنادیں گے (اور دشمنوں کے فریب میں آکر اپنا
نقصان کرنا اور ان کا دل خوش کرنا سخت جہالت و حماقت ہے۔ اس سے پہلے ارشاد ہے
وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ
بِاللهِ فَقَدْ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞ اور بھلا تم کیسے کفر کرسکتے ہو حالانکہ
(اسباب مانعہ عن الکفر (کفر سے روکنے والے پورے طور پر جمع ہیں کہ) تم کو اللہ تعالےٰ
کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور (پھر) تم میں اللہ کے رسول (صلی اللہ
علیہ وسلم) بھی موجود ہیں (اور یہ دونوں قوی ذرائع ہیں ایمان پر قائم رہنے کے
پس تم کو چاہیئے کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ایمان
پر اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو) اور (یاد رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط

پکڑتا ہے (یعنی اس کی اطاعت کرتا اور اس کے مخالف کی اطاعت نہیں کرتا ہے) تو ایسا شخص ضرور راہِ راست کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں کفر سے مراد معنی عام ہیں جو کفر اعتقادی وعملی دونوں کو شامل ہے اور قتال وجدال کفر عملی ہے کیونکہ فعل قریب کفر ہے اس سے نا اتفاقی پیدا ہوتی ہے جو گناہ بھی ہے اور قوت وترقی کی زائل کرنے والی بھی پھران بکھیڑوں میں پڑ کر دین حق سے بُعد ہو جاتا ہے نا اتفاقی میں ہر شخص دوسرے کو زک دینے کے لئے ہر ممکن سے ممکن تدبیر کو کام میں لاتا ہے خواہ جائز ہو یا ناجائز انسانیت سے قریب ہو یا بعید اسی واسطے حدیث میں فساد ذات البین کو حالقہ فرمایا ہے کہ یہ مونڈنے والی چیز ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر بھی خود ہی فرمائی لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب مسلمان کو دین سے بعد ہوگا تو کفر سے قرب ہوگا (اور قاعدہ عقلیہ ہے۔ اَلْقَرِیْبُ مِنَ الشَّیْءِ یَاْخُذُ حُکْمَہٗ کہ جو جس سے قریب ہو اسی کا حکم لے لیتا ہے اسی وجہ سے فقہاء نے اَقْرَبُ اِلَی الْقُعُوْدِ (بیٹھنے کی طرف قریب تر) کو قاعد اور اَقْرَبُ اِلَی الْقِیَامِ (کھڑے ہونے کے قریب) کو قائم اور غالب الغش (کھوٹ غالب) کو مغشوش اور غالب الفضہ (چاندی غالب) کو فضّہ (چاندی) فرمایا ہے۔ اس قاعدہ سے عمل قَرِیْبٌ مِنَ الْکُفْرِ (قریب کفر کے) کو کفر کہنا اور اس کے مرتکب کو عملاً کافر کہنا صحیح ہے ۱۲) صاحبو قرآن محاورات میں نازل ہوا ہے اور محاورات میں اس کی نظیر موجود ہے کہ جو شخص جس قوم کے افعال کرتا ہے اسپر اسی قوم کا اطلاق کرتے ہیں جیسے کمینہ حرکت کرنے والے کو کہتے ہیں کہ تو تو چمار ہے یعنی چماروں کی سی حرکت کرتا ہے اس سے ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ تنفیر کے لئے یہ عنوان اختیار کیا گیا ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شخص اگر شیخ و سید تھا تو شیخ و سید نہیں رہا بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ عملاً چمار ہو گیا گو واقع میں سید ہے اسی طرح یہاں یہ مراد ہے کہ قتال وجدال کرنے والا عملاً کافر ہے گو واقع میں مومن ہے۔

پس جیسا کہ چمار کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی چمار جس کی ذات بھی چمار ہو ایک عملی چمار جو چماروں جیسے کام کرے اسی طرح کافر کی بھی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی کافر جو اعتقاداً کفر کے مرتکب ہیں دوسرے عملی کافر جو کافروں جیسے کام کرتے ہیں اور یہ تقسیم محاورات کے بالکل موافق ہے کوئی دقیق بات نہیں مگر خوارج و معتزلہ کی عقل ماری گئی کہ انھوں نے اس محاورہ کو نہیں سمجھا اور محاورہ کے موافق مستعمل لفظ میں تدقیق کرنے لگے کفر کو حقیقی معنی پر محمول کر کے یہ حکم لگا دیا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر ہے اور مرتکب کبیرہ سچ مچ کافر یا خارج عن الایمان ہے۔ جب ان لوگوں نے قرآن کے معانی کو بدلنا شروع کیا تو اہل حق کو جواب دینے کی ضرورت ہوئی اور انھوں نے ہیئت ایمان کفار کی تحقیق کی صحابہ کو اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ سب کے سب محاورات کے جاننے والے اور کلام الٰہی کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے ان میں باہم ایسے اختلافات کم ہوتے تھے اس لئے ان کو ایسے مسائل میں گفتگو کی ضرورت نہ تھی اور جس قدر ضرورت تھی اس کے موافق انھوں نے بھی گفتگو کی مگر اس وقت علم کلام کی تدوین کی ضرورت نہ ہوئی تھی اور ایک علم کلام ہی کیا صحابہ کے زمانہ میں تو فقہ کی بھی تدوین نہ تھی کیونکہ ان میں اتباع کا مذاق غالب تھا تدقیق عمل کا مذاق نہ تھا تو ان کو اس سے بحث نہ تھی کہ فرض کون ہے اور واجب کون۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تھا اور اسباغ وضو کے فضائل سنے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر وضو کرنے لگے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا بس اُسی طرح پڑھنے لگے جیسے آپ پڑھتے تھے۔ ان کو اس کھود کرید کی حاجت نہ تھی کہ نماز میں کیا تو فرض ہے اور کیا واجب اور کون مستحب کیونکہ جس کو نسخہ پینا ہے وہ نسخہ کی تحقیق نہیں کیا کرتا کہ اس کا جزو اعظم کیا ہے مزاج کیسا ہے مگر جب کسی کو پورا نسخہ پینا منظور نہ ہو اور وہ تحقیق کے درپے ہو جائے تو طبیب شفیق جزو اعظم وغیرہ کی تحقیق بھی بیان کر دے گا اور اس کو مدون بھی کر دے گا تاکہ کوئی پورا نسخہ نہ استعمال کرے تو بالکل محروم بھی نہ رہے وہ جزو اعظم ہی استعمال کرے کہ وہ بھی

حصول مقصود کے لئے کسی درجہ میں تو کافی ہے گو اثر دیر میں ہوگا اور پورے نسخہ کے برابر نہ ہوگا تو اگر مسلمان حضرات صحابہ ہی کے طرز پر رہتے اور عبادات کو ناقص نہ کرتے تو فقہاء کو تدوین فقہ اور تحقیق فرائض و واجبات و شرائط وارکان کی ضرورت نہ ہوتی اسی طرح اگر سب مسلمان مذاہب اصلیہ پر رہتے اور تدقیق شروع نہ کرتے تو متکلمین کو بھی تَکْفُرُوْنَ (تم کفر کرتے ہو) کی تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی کہ یہاں کفر عملی مراد ہے نہ کفر حقیقی نہ اُن کو اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کی تاویل بیان کرنا پڑتی متکلمین کو بھی اس کی ضرورت جب ہی ہوئی جبکہ اہلِ بدعت نے تلبیس شروع کردی اور یہ یقینی ہے کہ اگر علوم قرآن اپنی سذاجت اصلیہ پر رہتے تو اس سے نفع زیادہ ہوتا اور فضول ابحاث میں عوام کا اور علما کا وقت صرف نہ ہوتا بلکہ تمام علماء ضروری علوم کی تدوین و تحقیق میں مصروف ہوتے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ صحابہؓ کے بعد مسلمانوں کی طبائع میں اتباع کا مادہ کم ہوگیا عقول میں سلامتی کم ہوگئی اور تحقیق و تدقیق کے درپے ہونے لگے اہلِ بدعت و ہوا نے تلبیس و تحریف شروع کردی تو اب علماء میں تقسیم خدمات ہوگئی کسی نے بلاغت کو لے لیا کسی نے نحو و صرف کو کسی نے علم کلام کو کسی نے حدیث کو کسی نے فقہ کو کسی نے تفسیر کو اور ایک جماعت نے علوم عقلیہ کی خدمت اختیار کی اور اب علوم عقلیہ کی بھی ضرورت ہے کیونکہ آجکل عقول میں سلامتی نہیں رہی وہ بدون علوم عقلیہ کی مدد کے دقیق علوم کو نہیں سمجھ سکتے اگر عقول میں سلامتی ہو تو پھر علوم میزانیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ حضرات صحابہ و مجتہدین کو اس کی ضرورت نہ تھی مگر باوجود اس کے ان کے تمام دلائل قوانین عقلیہ پر منطبق ہیں لیکن اب بدون علوم عقلیہ کے فہم اس لئے مشکل ہوگیا کہ جو اشکالات شریعت پر کئے جاتے ہیں خود ان میں علوم عقلیہ و فلسفیہ کی بہت آمیزش ہے خصوصاً معتزلہ کے اشکالات میں اور گو علوم عقلیہ کے ذریعہ سے معتزلہ کے اشکالات رفع کردیئے گئے مگر یہ ضرور ہے کہ متاخرین کے کلام میں علوم قرآن بہت کم ہیں اور سلف کے کلام میں

علوم قرآن زیادہ ہیں اور سلف کی باتیں دل کو لگتی ہیں کیونکہ سذاجت کا خاصہ ہے کہ دل کو کشش کرتی ہے سادگی سے جو بات بیان کی جاوے وہ دل میں پیوستہ ہو جاتی ہے متاخرین کے کلام میں یہ رنگ نہیں ان کی باتیں اس قدر دل کو نہیں لگتیں مگر وہ کیا کریں وہ اس رنگ کے اختیار کرنے پر مجبور تھے کیونکہ معترضین نے اسی رنگ سے اعتراضات پیش کئے تھے اور یہ بھی خدا کی رحمت ہے کہ ہم سے پہلے یہ شبہات پیدا ہو چکے اور متقدمین متکلمین نے اُن کے جواب میں قیامت تک کا انتظام کر دیا کہ علم کلام کی بنیاد ڈال کر قیامت تک کے شبہات کا ازالہ کر دیا اگر ہم جیسے کم ہمتوں کے سامنے معتزلہ کے شبہات پیش ہوتے تو ہم سے یہ کام دشوار تھا غرض اس میں تو شک نہیں کہ متکلمین نے جو کچھ تحقیق و تدقیق کی وہ ایک ضروری کام تھا جس پر مخالفین اہل بدعت و ہوی کی تلبیس نے ان کو مجبور کیا (گو اس مجبوری کے بعد بعض ابحاث انھوں نے ایسی بھی چھیڑ دیں جن کے چھیڑنے پر وہ مجبور نہ تھے اور ایسی ابحاث کی شمار بہت قلیل ہے ۱۲) لیکن متکلمین کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مسلمانوں کو قرآن پر ایسی تحقیق و تدقیق کے ساتھ ایمان لانا چاہیے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ اگر کوئی مخالف اسلام پر اعتراض کرے اور اس کی فہم میں سلامتی نہ ہو اور وہ سذاجت کے ساتھ ودقائل نہ ہو سکے تو اس کے مقابلہ میں اس سے کام لیا جائے اور خود اپنے اعتقاد رکھنے کے واسطے سذاجت ہی کا رنگ اختیار کرنا چاہیے خصوصاً عوام کو تو یہی لازم ہے کہ قرآن پر سذاجت کے ساتھ ایمان لائیں کیونکہ تدقیقات سے شبہات دفع نہیں ہوتے بلکہ اس سے تو شبہات اور بڑھتے ہیں جن سے بعض دفعہ نجات مشکل ہو جاتی ہے اور اخیر میں جب کبھی نجات ہوئی ہے سذاجت ہی سے ہوئی ہے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اُن کا حکم سر آنکھوں پر ہے خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے (میں پھر کہتا ہوں کہ متکلمین کا تدقیقات سے یہ مطلب نہ تھا کہ تم اپنے شبہات ان کے ذریعہ سے زائل کرو بلکہ صرف یہ مقصود تھا کہ اگر مخالف ان تدقیقات کے پیرایہ میں اعتراض کرے تو تم اس کو اُسی کے طرز سے خاموش کر سکو ۱۲ جامع)

اور سادہ تعلیم کے بعد بہ نسبت فلسفیات کے تصوف کی تحصیل سے بھی شبہات سے نجات جلد ہو جاتی ہے مگر اسی شرط سے ساتھ کہ تصوف بھی سذاجت اصلیہ پر ہو جس میں علوم فلسفہ کا رنگ نہ ہو یعنی علوم کشفیہ کی تحقیق نہ ہو جو واقع میں تو علوم فلسفیہ نہیں لیکن ان کی تعبیر فلسفہ کے رنگ میں ہوتی ہے اس لئے وہ علوم فلسفہ معلوم ہوتے ہیں گو اصل مفہوم کے اعتبار سے تو فلسفہ علم حکمت کو کہتے ہیں جو تمام علوم کشفیہ کو شامل ہے مگر میں علوم فلسفیہ بمعنے علوم دقیقہ زائدہ سے منع کرتا ہوں کہ محاورہ میں انہیں کو علوم فلسفیہ کہتے ہیں غرض تصوف سے بھی اسی وقت شبہات کا مادہ منقطع ہوگا جبکہ کشفیات سے الگ رہے اور ان کی تحقیق میں نہ پڑے ورنہ شبہات سے نجات دشوار ہے چنانچہ خود اہل کشف کا ارشاد ہے اَنْتُمْ تَخَافُوْنَ الْمَعَاصِیَ وَنَحْنُ نَخَافُ الْکُفْرَ کہ علمائے ظاہر کو تو معاصی ہی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے مگر ہم کو کفر کا اندیشہ لگا رہتا ہے کیونکہ علوم کشفیہ کی فہم میں جب غلطی ہوتی ہے تو وہ کفر سے ادھر نہیں رہتی اس لئے ان کے درپے ہونا بہت مضر ہے اس کے ساتھ ہی مشائخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ علوم کشفیہ کی تحقیق و تدقیق تو نہ کرے لیکن اجمالاً ان کی تصدیق کردے تاکہ صاحب کشف کے گمراہ سمجھنے کا عقیدہ پیدا نہ ہو کیونکہ یہ عقیدہ سخت مضر ہوگا وہ مقبولان الٰہی ہیں جن کی شان میں یہ ارشاد وارد ہے مَنْ اٰذٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ (جو میرے ولی کو ایذا دے اس کو میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے) اور تصدیق اجمالی کے معنے یہ ہیں کہ یوں سمجھے کہ یہ قول محتمل حق وصواب ہے ممکن ہے صحیح ہو۔ احتمال و امکان کی قید اس لئے میں نے بڑھا دی تاکہ الہام کے قطعی ہونے کا اعتقاد نہ ہو گو بعض صوفیہ کے کلام میں یہ بھی وارد ہے کہ اہل کشف صحیح تلبیس ابلیس سے محفوظ ہو جاتے ہیں میں بھی بہت دنوں اس کے اندر چکر میں رہا کہ اس قول کا مطلب کیا ہے کیونکہ ہمارا عقیدہ تو ظنیت الہام کا ہے اور اس کو تلبیس ابلیس سے محفوظ اور بالکل صحیح فرماتے ہیں جس سے متبادر یہ ہے کہ ان کے نزدیک الہام قطعی ہے میں عرصہ دراز تک اس اشکال کا

وجہ سے پریشان رہا اور جو بات اس پریشانی کے متعلق مجھے معلوم ہوئی ہے وہ عرض کرتا ہوں اور میں محقق ہونے کا دعوےٰ نہیں کرتا بلکہ محض شفقت کی بناء پر کہتا ہوں کہ میرا عمر بھر کا تجربہ یہ ہے کہ علوم کشفیہ کا مطالعہ مضر ہے ان کا مطالعہ کبھی نہ کرے نہ ان کی تحقیق کے درپے ہو ہاں اجمالاً اہلِ کشف کی بزرگی کا معتقد رہے اور اجمالاً ان کی تصدیق بھی کرے مگر تفصیل کی فکر میں نہ پڑے حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو بڑے رتبہ کے ہیں وہ تو بے دھڑک فرماتے ہیں کہ شیخ اکبر از مقبولان نظر می آید مگر علوم او نامقبول اند (شیخ اکبر مقبولانِ الٰہی میں سے معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے علوم نامقبول ہیں) مگر مشکل ہماری ہے ہم شیخ کی باتوں کو نامقبول کیسے کہیں ہمارا تو یہ رتبہ نہیں سو الحمد للہ کچھ دن ہوئے ہیں کہ اس اشکال کا جواب سمجھ میں آ گیا مگر ایک مسئلہ سمجھ میں آ جانے کے بھروسہ دوسرے مسائل کا مطالعہ یہ سمجھ کر نہ کرنا چاہیئے کہ ہم کو تو دامن چھڑانا آتا ہے کیونکہ بعض دفعہ ایسا خار لگتا ہے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے وہ دامن کو بھی پھاڑ کے رکھ دیتا ہے اور خود نہیں نکلتا دیکھو اگر ایک شخص کو نگاہ نیچی کر لینے کی مشق ہے تو اس کو یہ تو مناسب نہیں کہ اس کے بھروسہ خود قصد کر کے بازار میں ایسی جگہ کو نکلا کرے جہاں بازاری عورتوں کا مجمع رہتا ہے سا جو! بہتر تو یہی ہے کہ بازار ہی میں نہ جایئے تاکہ کوئی عورت نظر ہی نہ پڑے ورنہ کبھی تو ایسی نظر پڑے گی کہ یہ ساری مشق رکھی رہ جائے گی تم ہزار نگاہ نیچی کرنا چاہو گے وہ پھر اوپر کو آنکھ اٹھا دے گی اور نگاہ نیچی کر بھی لی تو ایک بار کی نظر سے بعض دفعہ دل پر ایسا تیر لگتا ہے کہ عمر بھر دل سے نہیں نکلتا پھر یوں کہو گے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشان زدۂ
بحیرتم چہ عجب تیر بے کمان زدۂ

(تو نے میرے سینہ میں بے نشان زخم مارا ہے حیرت ہے کہ کیا عجیب تیر بلا کمان کے مارا ہے)

اس لئے اہل تجربہ کا قول ہے "رہ راست رو اگرچہ دور است" (سیدھے رستہ

پر چلو اگرچہ دور ہو) اس قول پر اہل اقلیدس کو شبہ ہوا ہے کہ خط مستقیم تو بوجہ اقصر الخطوط الواصلہ بین النقطتین (دو نقطوں کے درمیان جو خطوط ہیں ان سب سے چھوٹے خط کو خط مستقیم کہتے ہیں) ہونے کے اقرب الطرق (راستوں میں قریب تر) ہوگا۔ وہ دور کیونکر ہو سکتا ہے یہ اسی خرابی کا نتیجہ ہے کہ محاورات کو تدقیقات پر محمول کرنے لگے۔ محاورہ میں راہ راست کہتے ہیں راہ بے خطر کو مطلب یہ ہے کہ جس راستہ میں خطرہ نہ ہو اس کو اختیار کرو اگرچہ وہ دور ہی کیوں نہ ہو۔ اب کچھ شبہ نہیں پس علوم کشفیہ کا مطالعہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ خطرہ سے خالی نہیں بلکہ صرف علوم معاملہ کا مطالعہ کرے کہ وہ بے خطر ہیں اور میں نے وہ قول کشف صحیح کے مامون عن التلبیس ہونے کا قصداً نہیں دیکھا تھا بلکہ بلا قصد نظر سے گذر گیا اور آفت آگئی اور کہیں حاشیہ یا شرح میں اس کا حل بھی نہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ باوجود کسی شخص کی عدم اعانت کے اشکال حل ہو گیا وہ حل یہ ہے کہ ہم نے مانا کہ صاحب کشف صحیح تلبیس ابلیس سے مامون ہو جاتا ہے لیکن باوجود امن عن التلبیس کے حجت شرعیہ اس کو لازم نہیں کیونکہ ایسی نظائر موجود ہیں جہاں باوجود امن عن التلبیس کے شرعاً ایک شئے حجت نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ابصار بالنظر کو اکثر اوقات مامون عن التلبیس ہے جس کی نگاہ درست ہو اس کا ابصار عموماً غلطی نہیں کرتا مگر پھر بھی وہ شرعاً حجت نہیں نہ اس کے مقتضا پر اعتقاد واجب ہے نہ اس کے خلاف کا احتمال گناہ ہے مثلاً ہم کو چاند سورج سے چھوٹا نظر آتا ہے مگر اس پر اعتقاد لازم نہیں ممکن ہے کہ واقع میں بڑا ہو اور ہم کو چھوٹا نظر آتا ہو ہاں وہ مواقع مستثنیٰ ہیں جن میں شریعت نے ابصار کو حجت مانا ہے جیسے رویت ہلال وغیرہ اس نظیر کا ذہن میں آنا تھا کہ بادل سا پھٹا اور اشکال کی ظلمت رفع ہو کر دل میں نور چمکا اور حق تعالیٰ کا بار بار شکر ادا کیا ورنہ دل پر پہاڑ سا رکھا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر پہاڑ پر یہ ثقل ہوتا تو پھٹ جاتا بس خطرات میں قصداً پڑ کر پھر نکلنا یہ عقلمندی نہیں بلکہ سلامتی اسی میں ہے کہ خطرات کے

پاس ہی نہ جاؤ ؎

ہر گز بگندمی گوں لا تقربوا کہ زہر ست

حال پدر بیاد از ام الکتاب دارم

(گندمی رنگ کے ہرگز قریب مت جاؤ کہ زہر ہے ام الکتاب حال پدر کی یاد رکھتا ہوں)

وہ تو شیخ اکبر تھے مگر کہیں تم ان کے علوم کشفیہ کو دیکھ کر شیخ اکفر نہ ہو جاؤ جیسے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اکبر شاہ کے متعلق کہا کرتے جدما اکفر بود (ہمارا دادا اکفر تھا) وہاں تو خود اکبر کو اکفر کہہ رہے ہیں یہاں اکبر تو اکبر ہی رہیں گے ہاں ان کے کلام کا دیکھنے والا اکفر ہو جائے گا۔ اکبر کے درباری کچھ ایسے بیدین واقع ہوئے تھے کہ ہمیشہ اس غریب کو نئے نئے طریقے سے کافر بنانے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ سب نے مل کر اس کو نبی بنایا اور ایک شخص ابوبکر بنا اور ایک عمر بنا ملا دو پیازے بھی اس مجلس میں موجود تھے جب ان کی باری آئی اور ان سے پوچھا گیا کہ ملا جی آپ کیا بننا چاہتے ہیں تو بولے میں اس جماعت کا ابوجہل ہوں میں تم سب کی تکذیب کرتا ہوں کہ تمہارا نبی بھی جھوٹا اور اس کے ساتھی بھی جھوٹے کیونکہ نبی کے واسطے اس کی بھی ضرورت ہے کہ کوئی اس کا مکذب بھی تو ہو وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ط (اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن جن میں سے بعضے دوسرے بعض کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں)

ملا جی کی اس بات پر دربار میں قہقہہ پڑ گیا وہ نبوت درہم برہم ہو گئی۔ اور یہ حکایات افواہی ہیں۔ ابوالفضل میں اکبر نے ایک مکتوب میں ان سب خرافات سے اپنا تبریہ بھی کیا ہے جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ پس خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ ہم نے مانا کہ صاحب کشف صحیح کو تلبیس نہیں ہوتی مگر پھر بھی کشف شرعاً حجت

نہیں نہ خود صاحب کشف پر نہ دوسروں پر جیسے میں نے ابھی کہا کہ چاند کو ہم آفتاب سے چھوٹا دیکھتے ہیں مگر شرعاً یہ ابصار حجت نہیں نہ اس پر اعتقاد رکھنا واجب نہ اس کے خلاف کا اعتقاد حرام۔ بہرحال میں اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ شیخ اکبر کی تصانیف کا ہرگز مطالعہ نہ کریں نہ معلوم کس چکر میں پڑ جائیں۔ تمہارے لئے شیخ اکبر سے شیخ اصغر ہی اچھا۔ یہ بات میں تجربہ کے بعد کہہ رہا ہوں اور مشہور تعلیم ہے سَلِ الْمُجَرِّبَ وَلَا تَسْئَلِ الْحَکِیْمَ (تجربہ کار سے دریافت کرو حکیم سے مت پوچھو) اور یاد رکھو کہ علوم کشفیہ کو تصوف سے کچھ تعلق نہیں مگر چونکہ بعض صوفیہ اہل کشف تھے اور انھوں نے اپنی کشفیات کو تقریراً و تحریراً ظاہر کیا جس سے ناقص الفہم گمراہ ہونے لگے اس لئے محققین صوفیہ نے ان کی حقیقت ظاہر کر کے اشکالات کو رفع کرنا چاہا اس لئے علوم کشفیہ تصوف سمجھے جانے لگے اگر یہ حضرات اہل کشف اپنے علوم کشفیہ کو ظاہر نہ کرتے تو محققین کو ان سے بحث کرنے کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ وہ اصل مقصود ہی کی تحقیق میں رہتے یعنی علوم معاملہ کی تفصیل میں کیونکہ قرب حق کا مدار معاملہ پر ہے نہ کہ علوم کشفیہ پر خوب سمجھ لو۔ اب یہاں سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ متکلمین پر جو بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے علوم قرآن کو چھوڑ کر خواہ مخواہ تدقیق سے کام لیا یہ ان کی کوتاہ نظری ہے کیونکہ متکلمین نے ضرورت سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے جبکہ لوگ خود تدقیق کرنے لگے اور شبہات میں پڑ گئے تھے اگر لوگ شبہات میں نہ پڑتے تو ان کو ضرورت نہ تھی پس تم بھی شبہات میں نہ پڑو اور سذاجت اصلیہ پر رہو تو واقعی اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں۔

امام ابوالحسن اشعریؒ کی حکایت ایک ثقہ سے سنی ہے کہ ایک عالم ان سے ملنے گئے مگر چونکہ صورت سے ناآشنا تھے اس لئے خود آپ ہی سے پوچھا کہ شیخ ابوالحسن اشعری کون سے ہیں۔ فرمایا تم میری ساتھ دربار شاہی میں چلو وہاں بتلاؤں گا چنانچہ دونوں دربار شاہی میں پہنچے وہاں ہر قسم کے علماء مجتمع تھے محدثین بھی فقہاء بھی فلاسفہ بھی متکلمین بھی معتزلہ بھی اور اہل سنت بھی امام ابوالحسن اشعریؒ کے پہنچنے کے بعد

ایک شخص نے ذات وصفات کے کسی مسئلہ میں گفتگو شروع کی اس کے بعد دوسرے علماء نے اس کے متعلق اپنی اپنی تحقیقات بیان کیں معتزلہ نے اہلِ سنت کے مسلک پر اعتراضات کئے اہلِ سنت نے ان کو جواب دیئے یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر امام ابوالحسن خاموش بیٹھے رہے جب سب علماء اپنی اپنی کہہ چکے تو اخیر میں شیخ نے کھڑے ہو کر معتزلہ و فلاسفہ کو خطاب کر کے ان کی سب باتوں کا جواب دیا اور ان مسائل کی ایسی تحقیق کی کہ جس پر فلاسفہ کو بولنے کا موقع نہ رہا اس سے فارغ ہو کر بیٹھے تو اپنے رفیق سے کہا کہ ابوالحسن میں ہی ہوں یہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور کہا واقعی جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر آپ کو پایا پھر ان بزرگ نے اپنی کتاب میں امام کی بہت تعریف لکھی اور اخیر میں یہ لکھا ہے کہ جب امام ابوالحسنؒ سب کو جواب دے چکے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے اول ہی ان مسائل کی وہ تحقیق کیوں نہ بیان کر دی جو اخیر میں بیان فرمائی ہے تاکہ مخالفین کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملتا۔ امام نے جو اس سوال کا جواب دیا وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ ان مسائل میں خود تکلم کرنا بدعت ہے کیونکہ ان میں تکلم کرنا خلاف سنت ہے تو میں نے ابتداءً ان میں تکلم کو جائز نہ سمجھا مگر جب اہل بدعت نے مذہب حق پر اعتراض کیا تو اب جواب کی غرض سے تکلم کی ضرورت ہوئی اس لئے میں ابتداء میں خاموش رہا اور اخیر میں مجبور ہو کر بولا جب کہ حق پر اعتراضات ہونے لگے کہ اب سکوت کی گنجائش نہ رہی اب ایسے محتاط علماء کہاں ہیں اب تو ہر شخص ذرا سے سوال پر اپنی تحقیقات بیان کرنے لگتا ہے چنانچہ آجکل لوگوں کو یہ سبق مل گیا ہے کہ جو ملتا ہے سلطان ابن سعود کے متعلق سوال کرتا ہے کہ ان کے بارے میں آپ کا کیا اعتقاد ہے اب لگے مولوی صاحب اپنی تحقیق بیان کرنے جس میں خوامخواہ فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔ صاحبو! صاف یوں ہی کیوں نہ کہہ دو کہ ہم کو کچھ خبر نہیں اور یہ کہہ کر اپنے کام میں لگو اور واقعی ہندوستان کے رہنے والوں کو کیا خبر۔ ہمارے پاس بجز اخباروں کے

تحقیق کا ذریعہ ہی کیا ہے اور اخباروں کی دیانت کا جو حال ہے سب کو معلوم ہے رہا حجاج کے بیان سے استدلال کرنا سو اس کی یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنے مذاق کے موافق حالت بیان کرتا ہے بعض لوگ اول اول ابن سعود کی تعریف کرتے ہوئے آئے تھے کیونکہ اس وقت تک ابن سعود کا طرز عمل بظاہر ان کے مذاق کے موافق تھا اور ان کو یہ امید تھی کہ وہ شخصی سلطنت قائم نہ کریں گے بلکہ جمہوری قائم کریں گے پھر دوبارہ جو یہ رنگ دیکھ کر آئے کہ سلطان نے اپنی ملوکیت کا اعلان کر دیا اور شخصی سلطنت قائم کر دی تو وہی تعریف کرنے والے جو سلطان کو امام وقت اور فرشتہ خصلت کہتے تھے اب اس کو شیطان سے بدتر کہنے لگے اس حالت میں کسی کے بیان پر کیا خاک اعتماد کیا جائے بس اسلم یہی ہے کہ سکوت کیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ ہم کو تحقیق نہیں مگر اس جواب سے شرماتے ہیں کیونکہ اس میں جہل کا اقرار ہے حالانکہ صاحب علم ہونے کے لئے ہر بات کا جاننا ضروری نہیں تو کسی ایک بات کے نہ جاننے سے آپ کا جاہل ہونا کیونکر لازم آیا۔

بزرجمہر کا قصہ ہے جو نوشیروان کا وزیر اعظم تھا کہ اس سے ایک بڑھیا نے کسی بات کے متعلق سوال کیا بزرجمہر نے کہا کہ مجھے اس کی تحقیق نہیں۔ بڑھیا نے حیرت سے کہا کہ تم کو وزیر ہو کر اس بات کی خبر نہیں ہے پھر تم اتنی بڑی تنخواہ کس بات کی پاتے ہو۔ بزرجمہر نے کہا کہ اتنی تنخواہ تو میں اپنی معلومات کے عوض میں پاتا ہوں اگر مجہولات کی تنخواہ پاتا تو خزائن ہفت اقلیم بھی کافی نہ ہوتے۔ دوسرے آپ کو معلوم بھی ہے لا ادری (میں نہیں جانتا) کہنا جہل کی دلیل نہیں بلکہ علم کی دلیل ہے چنانچہ ایک بار مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ فرمایا کسی نے کہا سبحان اللہ کیا علوم ہیں۔ مولانا نے فرمایا میں تو کچھ بھی نہیں جانتا اس شخص نے کہا یہ حضرت کی تواضع ہے فرمایا یہ تواضع نہیں بلکہ تکبر کا قول ہے۔ کیونکہ لا اعلم (میں نہیں جانتا) بڑا عالم ہی کہہ سکتا ہے جس پر علم کی وسعت منکشف ہو چکی ہو ورنہ جس پر وسعت علم منکشف نہیں ہوئی وہ ہر بات میں علم کا دعویٰ کرتا ہے۔

تیسرے لا اعلم کہدینا بڑی راحت کی بات ہے اور اعلم (میں جانتا ہوں) کہنا مصیبت کو اپنے سر لینا ہے۔ اس لئے ایک عاقل کی رائے ہے کہ حتی الامکان جواب نفی میں دیا کرو کیونکہ نفی میں جواب دینا اہون ہے اور اثبات میں جواب دینا اشد ہے مثلاً اگر تم سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے کلکتہ دیکھا ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہ کہدیا کہ ہاں دیکھا تو بس سوالات شروع ہو جائیں گے کہ بتلاؤ وہاں کیا کیا عجائبات ہیں، چڑیا گھر کتنا بڑا ہے اور قلعہ کیسا ہے وغیرہ وغیرہ اور اگر یہ کہدیا کہ میں نے کلکتہ دیکھا نہیں تو اس پر کوئی سوال نہیں ہو سکتا پس راحت اسی میں ہے کہ جب کوئی فضول سوال کرے تو اس کے جواب میں یا تو اپنے جاہل ہونے کا اقرار کرے یا سائل کو جاہل بنا دے اگر لڑائی کا اندیشہ نہ ہو اور یہ کہدے کہ اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے تمہارا فہم کافی نہیں جیسے علیگڈھ میں میرے پاس ایک صاحب آئے جو کالج میں عربی یا انگریزی کے پروفیسر تھے اور وہاں دونوں زبانوں میں یکتا مشہور تھے۔ انھوں نے ایک حدیث کا متن پڑھا جس کا یہ مفہوم ہے کہ جہاں زنا کی کثرت ہوتی ہے وہاں طاعون پھیلتا ہے اور یہ کہا کہ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنایت اور عقوبت میں ارتباط سمجھ میں نہیں آیا کہا ارتباط سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا ارتباط نہ سمجھنے سے ضرر کیا ہوا کہنے لگے کہ ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے میں نفع تھا۔ میں نے کہا وہ نفع کیا تھا کہنے لگے اطمینان ہو جاتا میں نے کہا کہ خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل کہنے لگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (لیکن اس لئے تاکہ میرا قلب مطمئن ہو جائے) میں نے کہا اور اس کی کیا دلیل کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان مفید تھا تو آپ کو بھی ہوگا۔ کیونکہ ممکن ہے ایک شے کسی کو مفید ہو اور کسی کو مفید نہ ہو جیسا کہ ادویہ میں مشاہدہ ہے کہ ایک دوا ایک شخص کو موافق ہوتی ہے دوسرے کو موافق نہیں ہوتی۔ اس پر

ضروری اطلاع:- خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ بدلتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمادیں۔

وہ خاموش ہو گئے۔ بعد میں میں نے کہا کہ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ مولویوں کو احکام کی حکمتیں معلوم نہیں الحمد للہ ہمارے پاس اسرار و حکم کا خزانہ موجود ہے مگر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز فاش ہو جائے ورنہ عارفین کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ معلوم نہ ہو)

اور گو یہ ظاہر میں تکبر تھا مگر صوفیہ کا ارشاد ہے اَلتَّکَبُّرُ مَعَ الْمُتَکَبِّرِیْنَ عِبَادَۃٌ (متکبرین سے تکبر کرنا عبادت ہے) یہ بات میں نے اس لئے کہہ دی تاکہ وہ نہ سمجھیں کہ علماء کورے ہیں ان کو کچھ معلوم نہیں کیونکہ آجکل تو تعلیم یافتہ جماعت کو اپنی عقل و فہم پر بہت ناز ہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے دوستوں کے سامنے اس حدیث کے متعلق ایک تحقیق بیان کی جو میرے ذہن میں تھی جس سے زنا و طاعون کے درمیان ارتباط ظاہر ہوتا ہے۔ احباب کہنے لگے کہ تم نے یہ تحقیق ان پروفیسر صاحب کے سامنے بیان نہ کر دی وہ بہت خوش ہوتے۔ میں نے کہا تم نہیں جانتے یہ لوگ حکم کو بناء احکام قرار دیتے ہیں۔ ان کو حکمت بتلانا ان کے مرض کو بڑھاتا ہے ان کے لئے اسی جواب کی ضرورت ہے کہ حکمت کا جاننا کیا ضرور ہے اور آپ لوگ حکمت کو بناء احکام نہیں سمجھتے۔ دوسرے یہ کہ وہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے اطمینان کے مطلوب ہونے پر استدلال کرتے ہیں تو اول تو یہ استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب اطمینان کا اظہار کیا تھا مخلوق سے انہوں نے اطمینان نہیں چاہا تھا پھر تم مخلوق سے اطمینان کے طالب کیوں ہو۔ دوسرے وہاں حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اطمینان مشاہدہ سے کر دیا تھا کہ مردہ کو زندہ کر کے دکھلا دیا جس میں شبہ کی گنجائش نہ تھی اور میں اگر ان پروفیسر صاحب کا اطمینان کرتا تو مقدمات ظنیّہ سے کرتا جو ممکن ہے کسی وقت ٹوٹ جاتے یا کم از کم

ان کے نزدیک مخدوش ہوجاتے تو پھران کا اطمینان بھی رخصت ہوجاتا اور اطمینان زائل ہونے کے بعد وہ حدیث کی بھی تصدیق نہ کرتے کیونکہ ان کے ذہن میں حدیث کی صحت ان ہی مقدمات پر مبنی تھی اس لئے ان کے سامنے یہ تقریر مناسب نہ تھی میں جواب میں سائل کے مذاق کا اتباع نہیں کرتا بلکہ اس کے مرض کا علاج کرتا ہوں تاکہ اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہو۔

میرے پاس ایک صاحب جو ایک اردو کے اسکول میں مدرس تھے آئے کہ مجھے تقدیر کا مسئلہ سمجھادو۔ میں نے کہا کہ آپ کی عوض سمجھے گا کون کہنے لگے میں سمجھوں گا میں نے کہا تم نہیں سمجھ سکتے اور میں ایسے شخص سے خطاب نہیں کرسکتا جس کو میں جانتا ہوں کہ اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ تم کسی طالب علم کو لے آؤ میں اس کے سامنے تقریر کردوں گا تم بھی سن لینا اس سے تم کو یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ تم نہیں سمجھ سکتے اور یہ معلوم ہوجائے گا کہ مولویوں کے پاس تمہارے سوالوں کا جواب ہیں۔ میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ یہ صاحب اسکول کے معلم تھے جن کی لیاقت کا یہ حال ہے کہ ایک صاحب نے اعتراض کو اعتراز لکھا تھا کسی نے ٹوکا تو کہا جی ہاں غلطی ہوگئی ظاء سے لکھنا چاہیئے تھا۔ انگریزی میں تو بے۔ اے ایم۔ اے ہوجاتے ہیں اور علوم عربیہ سے اتنی اجنبیت کہ اعتراض کا املا بھی صحیح نہیں میں تو کہا کرتا ہوں کہ انگریزی خواں ترقی معکوس کرتے ہیں مردسے بی بنتے ہیں یعنی عورت جو بی اے کا جزء اول ہے پھر میم بن جاتے ہیں کہ ایم اے اور میمیں قریب قریب ہیں اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم ہر بات کو سمجھتے ہیں اور ہمارے علماء ایسے خوش اخلاق ہیں کہ ان لوگوں کے ہر سوال پر جواب کی تقریر کرنے لگتے ہیں اور احکام شرعیہ کی حکمتیں بیان کرنے لگتے ہیں یہ خوش اخلاقی نہیں بچہ کے ہاتھ میں سانپ دینا ہے تم کو تو سانپ کا پکڑنا جائز ہے کیونکہ تمہارے پاس منتر اور تریاق موجود ہے۔ بچہ کو سانپ دینا اسے ہلاک کرنا ہے اسی طرح علوم غامضہ کی تقریر جاہلوں کے سامنے کرنا ان کو ہلاک کرنا ہے کیونکہ اس سے جو

ان کو شبہات پیدا ہوں گے ان کا علاج ان کے پاس نہیں پس ان کو تو صاف جواب دو کہ قرآن وحدیث میں یہی آیا ہے تم کو ماننا پڑے گا اور جو اس جواب کو نہ مانے اس کو منہ نہ لگاؤ ؎

آنکس کہ بقرآن و خبر زو نہ رہی
آنست جوابش کہ جوابش نہ دہی
(جس شخص سے قرآن وحدیث سے تو نہ چھوٹے اس کا جواب یہی ہے
کہ اس کو جواب نہ دو)

اور میں بقسم کہتا ہوں کہ اطمینان اور تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ میں اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بلا دلیل مانتا ہوں اسرار اور حکم کے درپے ہونے سے پوری تسلی نہیں ہوتی۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے معقولی اور فلسفی ہیں متکلم بھی بڑے درجے کے ہیں۔ اخیر عمر میں اپنی عمر بھر کا تجربہ بیان کرتے ہیں ؎

نِهَايَةُ أَقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالٌ ۔۔۔ وَغَايَةُ سَعْيِ الْعَالَمِيْنَ ضَلَالٌ
وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بَحْثِنَا طُوْلَ عُمْرِنَا ۔۔۔ سِوَىٰ أَنْ جَمَعْنَا فِيْهِ قِيْلَ يُقَالُ
(دنیا والوں کی کوشش کا خلاصہ ضلال ثابت ہوا بجز بک بک اور
قیل وقال کے کچھ حاصل نہ ہوا عمر یوں ہی ضائع کی)

کہ ہم کو عمر بھر کی بحث سے سوائے قیل وقال کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ان ہی امام رازی کا قصہ سنا گیا ہے کہ یہ شیخ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے گئے تھے۔ شیخ نے بیعت کیا اور ذکر وشغل تعلیم کر کے ایک حجرہ میں رہنے کا امر کیا یہ ذکر وشغل میں مشغول ہو گئے تو چند روز کے بعد یہ محسوس ہوا کہ دل میں سے کوئی چیز نکل کر بھاگی جا رہی ہے۔ شیخ سے عرض کیا فرمایا یہ آپ کا منطق وفلسفہ ہے جو قلب سے نکل رہا ہے۔ انھوں نے کہا حضرت میں نے تو اس کو بڑی محنت سے حاصل کیا تھا اس کا قلب سے محو ہونا تو مجھے گوارا نہیں فرمایا

اس کے عوض تم کو حق تعالےٰ دوسرے علوم عطا فرمائیں گے جو حقیقی علوم ہیں اور یہ تو کتابی علم ہے وہ وہبی علم ہوگا سہ

بینی اندر خود علوم انبیار
بے کتاب و بے معید واوستا

(بے کتاب وبے مددگار واستاد کے اپنے اندر انبیار جیسے علوم پاؤگے) مگر امام رازی کو گوارا نہ ہوا۔ شیخ نے کہا پھر تمھیں اختیار ہے چنانچہ یہ ذکر و شغل چھوڑ کر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے اتفاق سے شیخ کی زندگی ہی میں امام کی وفات کا وقت آگیا اور نزع کی حالت میں شیطان ان کے پاس آیا اور کہا تم دنیا سے جا رہے ہو توحید بھی سالم لے چلے ہو کہا ہاں الحمد للہ میری توحید سالم ہے شیطان نے کہا ذرا مجھے تو بتلاؤ تمہارے پاس توحید کی کیا دلیل ہے امام رازی نے کتاب التوحید میں توحید کے سو دلائل لکھے تھے وہ بیان کرنا شروع کئے اور شیطان کمبخت نے ایک ایک دلیل کو توڑنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کے تمام دلائل کو توڑ دیا اب تو امام رازی کا رنگ فق ہوگیا۔ شیطان نے کہا کہ یہ تو آپ کی توحید کا حال تھا جو رکن اعظم اسلام ہے جس میں آپ جہل مرکب کے اندر مبتلا تھے اس پر دوسرے مسائل کو بھی قیاس کرلو۔ یہ واقعہ شیخ نجم الدین کبریٰ کو منکشف ہوگیا اس وقت شیخ وضو کر رہے تھے۔ امام رازی کی پریشانی دیکھ شیخ گھبرا گئے اور فرمایا کہ اس وقت ایک بہت بڑے عالم کا ایمان خطرہ میں ہے۔ ایک خادم جو حضرت کو وضو کرا رہا تھا بولا کہ حضرت پھر آپ دستگیری فرمایئے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جگہ سے ایک چلو پانی امام رازی کی طرف پھینکا حالانکہ وہ بہت دور دراز فاصلہ پر تھے مگر شیخ کی کرامت تھی کہ حق تعالےٰ نے وہ چلو بھر پانی امام رازی کے منہ پر پہنچا دیا جس سے ان کے حواس بجا ہوئے پھر شیخ نے کہا کہ شیطان سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ نامعقول میں بلا دلیل خدا کو واحد اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مانتا ہوں۔ بطور کرامت ہی کے یہ آواز بھی ان کے کان میں پہنچی۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہوئے منکشف ہوا کہ لشکر اسلام دشمن کے نرغہ میں ہے اور دشمن غالب ہوا چاہتا ہے تو آپ نے خطبہ ہی میں جوش سے فرمایا یَاسَارِیَۃُ الْجَبَلَ یَاسَارِیَۃُ الْجَبَلَ کہ اے ساریہ (یہ سردار لشکر کا نام ہے) پہاڑ کی پناہ لو اور حق تعالےٰ نے یہ آواز مدینہ سے لشکر اسلام میں پہنچا دی جو اس وقت شام یا عراق میں تھا۔ اور حضرت ساریہ رضؓ نے حضرت عمر رضؓ کی آواز سن کر پہاڑی مورچہ پر قبضہ کر لیا جس کے بعد دشمن کی فوج کے حوصلے پست ہو گئے اور لشکر اسلام کو فتح ہوئی ایسا ہی یہاں ہوا اور امام رازیؒ نے شیطان کو بھی جواب دیا کہ اور نا معقول میں بلا دلیل کے خدا کو واحد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مانتا ہوں۔ یہ جواب دینا تھا کہ شیطان دم دبا کر بھاگا اور حضرت شیخ نے خادم کو بشارت دی کہ الحمد للہ امام رازی شیطان کے جال سے نکل گئے سچ ہے ؎

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست
دست او جز قبضۂ اللہ نیست

(پیر کا ہاتھ (توجہ) غائبوں سے کوتاہ نہیں ہے اس کا سوائے اللہ کے دوسرے کے قبضہ میں نہیں ہے)

اس میں علم غیب کا دعویٰ نہیں ہے کہ معاذ اللہ پیروں کو مریدوں کا حال ہمیشہ معلوم ہو جاتا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ حضرات مقبولانِ الٰہی ہیں تو جو ان سے وابستہ ہو تا ہے اللہ تعالیٰ اس کو محروم نہیں رکھنا چاہتے جس کے طرق مختلف ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک طریق یہ بھی ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالےٰ ان مشائخ کو کشف کے ذریعہ سے اطلاع دیدیتے ہیں اور ان کو حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی امداد کرو اور کبھی شیخ کو اطلاع بھی نہیں ہوتی کوئی لطیفہ غیبی شیخ کی صورت

یں آکر مدد کر جاتا ہے بس اصل یہ ہے کہ اگر ابتلاءً اللہ کی طرف سے وارد ہے تو لطفاً انہی کی طرف سے درمان بھی ہے ؎

دردا زیار ست و درماں نیز ہم
دل فدلئے او شد و جان نیز ہم

(بیماری دوست کی طرف سے اور علاج بھی۔ اس پر میرا دل فدا ہے اور جان بھی)

بیماری بھی وہی دیتے ہیں نسخہ بھی وہی پلاتے ہیں یہ ہر وقت کا مشاہدہ ہے کہ اس طریق میں جال بھی ہیں اور ان کے کاٹنے کی قینچیاں بھی ہیں اسی کو مولانا نہایت جوش سے فرماتے ہیں ؎

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا ما چو مرغان حریص و بے نوا
دمبدم پابستہ دام تو ایم گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم
می رہانی ہر دمے مارا و باز سوے دامے می رویم اے بے نیاز

(اے خدا سینکڑوں جال اور دانہ ہیں ہم پرندوں کی طرح حریص و بے نوا ہیں ہر آپ کے جال کے پابستہ ہیں اگر چہ شہباز اور سیمرغ کیوں نہ ہوں ایک جال سے آپ ہم کو رہائی دیتے اور ہم دوسرے جال میں پھنس جاتے ہیں)

ایک جال سے نکلتے ہیں دوسرے میں پھنستے ہیں پھر حق تعالیٰ نے اس کے کاٹنے کو بھی قینچی تیار کر رکھی ہے بس یہی قصہ ہے کہ ہر وقت کا مرنا اور ہر وقت کا جینا ہے

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جان دیگر است

(خنجر تسلیم کے کشتوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے)

چنانچہ امام رازیؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیماری دی کہ شیطان نے ان کو پریشان کر دیا تو اس کی ساتھ دوا بھی نازل کی کہ شیخ کو کشف ہو گیا شیخ نے خادم کو اس حال پر مطلع کیا اس نے امام کی سفارش کی کہ دستگیری فرمایئے شیخ کو جوش ہوا کیونکہ

وہ ماذون من اللہ تھے اور انھوں نے باطناً بھی توجہ کی جس سے امام رازی کے قلب سے وساوس وخطرات رفع ہوگئے اور ظاہری اعانت بھی کی کہ وہ جواب تعلیم کیا جس نے شیطان کے جال کو تار تار کرکے توڑ دیا اسی لئے تو حدیث میں ہے فَقِیْہٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ۔ ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔ یہاں فقیہ سے مراد عارف ہے جو مکائد شیطان سے واقف ہو جزئیات فقہ کا حافظ مراد نہیں کیونکہ جزئیات فقہ تو امام رازیؒ کو شیخ نجم الدین کبریٰؒ سے زیادہ یاد تھے مگر دیکھ لیجئے کہ شیطان کے جال کو کس نے توڑا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اسرار اور حکم اور ابحاث سے تسلی حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ ان سے شیطان بھاگتا ہے۔ تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ خدا کا حکم یوں ہی ہے بس ہم بے دلیل کے مانتے ہیں اسرار وحکم کے یا علوم کشفیہ کے درپے نہ ہو یہ خطرات سے خالی نہیں بس طریق تصوف سے اتنا حصہ لے لو کہ اخلاص واحسان حاصل کرلو جس کو نسبت کہتے ہیں بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ لو صوفیہ کی تحقیقات اور کشفیات کا مطالعہ یہ سانپ ہیں ان سے دور رہو ؎

نکتہ ہا چوں تیغ پولاد ست تیز   چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا   کز بریدن تیغ را نبود حیا

(تصوف کی باریکیاں فولادی تلوار سے بھی زیادہ تیز ہیں جب تمہارے پاس ڈھال نہیں ہے واپس آؤ اس تلوار کے سامنے بغیر ڈھال نہ آؤ اس لئے تلوار کو کاٹنے سے حیا نہیں آتی)

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ علل اور ابحاث سے تسلی نہیں ہوتی بلکہ اطمینان اسی سے ہوتا ہے کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے اس کی تائید اس قصہ سے تو ہوتی ہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسہ کا علاج یہ بتلایا ہے کہ

وسوسہ کے وقت اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا)
کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل معلوم نہ تھے یقیناً معلوم تھے مگر دلائل میں
غور کرنے کی تعلیم اسی لئے نہیں فرمائی کہ یہ سلسلہ غیر متناہی ہے اس سلسلہ میں
شبہات پر شبہات نکلتے چلے آئیں گے اس لئے وہ بوٹی بتلائی جو ہزار جواہرات
سے بھی انفع ہے مگر افسوس اس کی قدر نہیں کی جاتی کیونکہ بوٹی بہ نسبت جواہر کے
ارزاں اور سہل الحصول ہے اور قاعدہ ہے ؎

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دہد
گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(جو شخص کسی چیز کو ارزاں لیتا ہے ارزاں دے بھی دیتا ہے چنانچہ بچہ نادان
قیمتی موتی کو روٹی کے ٹکڑے کے عوض دیدیتا ہے)

لوگ لمبے لمبے جوابوں کی قدر کرتے ہیں مختصر اور سہل جواب کی قدر نہیں کرتے
آجکل ہی میں شاملی سے ایک پان فروش کا خط آیا تھا جس میں اسی قسم کا سوال
تھا میں نے اس کا مختصر جواب دیا تو وہ لکھتے ہیں کہ خشک جواب سے تسلی
نہیں ہوتی چونکہ وہ پان فروش ہے اور پان پانی کا نر ہے تو اس نے پانوں کی
طرح جواب کے لئے بھی تری لازمی سمجھی مگر یہ ایسا قیاس ہے جیسا شیخ
سعدیؒ کی باندی نے قیاس کیا تھا کہ ایک شخص شیخ سے ملنے آیا باندی دروازہ
پر نام پوچھنے گئی اور کچھ دیر تک اس سے باتیں کر کے واپس آئی تو شیخ نے پوچھا
کون تھا کہا غبداللہ (غین معجمہ سے) شیخ نے فرمایا غبداللہ کیا بلا ہے کہا اس کی
عین یعنی آنکھ میں نقطہ یعنی پھولا ہے اس لئے میں نے بجائے عبداللہ کے غبداللہ
کہا پوچھا وہ کیا کہتا تھا کہا کچھ نہیں ایک معمولی بات تھی۔ میں نے خود ہی جواب
دیا وہ یہ پوچھتا تھا کہ استنجے میں پاکی کب ہوتی ہے کتنا دھویا جائے میں نے
کہا اتنا دھویا جائے کہ کھال چوں چوں بولنے لگے جیسے برتن کو رگڑتے ہیں
تو وہ چوں چوں کرتا ہے اس نے موضع استنجا کو برتن پر قیاس کیا ایسے ہی

اس پان فروش نے جواب سوال کو پانوں پر قیاس کیا کہ جواب بھی تر ہونا چاہئے حالانکہ یہ قیاس غلط ہے جواب کے لئے تری کی ضرورت نہیں بعض دفعہ خشکی کی بھی ضرورت ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ ضرب یضرب یعنی سختی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ضرب یضرب میں ایسی برکت ہے کہ اس سے بہت جلد تمام شبہات حل ہو جاتے ہیں ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے ؎

اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْبِالْعِلْمِ وَالْحِکَمِ وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ وُعَّاظٍ عَلَی الْقِمَمِ

نصیحت اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر پڑنی نصیحت گروں میں سب سے بلیغ نصیحت گر ہے)

اور اگر مرتبہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے آسمان سے پانچ کتابیں نازل فرمائی ہیں چار تو مشہور ہیں توراۃ و زبور و انجیل و قرآن اور ایک پانچویں کتاب بھی آسمان ہی سے نازل ہوئی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے) جب چاروں کتابوں سے کسی کی اصلاح نہ ہو تو اس کے لئے پانچویں کتاب کی ضرورت ہے وہ حدید ہے یعنی تعلدار جوتا ایک شخص وساوس میں مبتلا تھے اور میں ان کا علاج کرتا تھا ایک دن وہ کہنے لگے کہ اب تو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ عیسائی ہو جاؤں میں نے اس کے جواب میں زور سے ایک دھول رسید کیا اور کہا نالائق جا دور ہو ابھی عیسائی ہو جا اسلام کو ایسے ناپاکوں کی ضرورت نہیں ! اس دھول کی ایسی برکت ہوئی کہ دس برس سے زیادہ زمانہ ہوا آج تک ان کو ایک دو شبہات بھی تو نہ ہوئے - اسی طرح ایک ذاکر کی عادت تھی کہ وہ ذکر میں اٹھ اٹھ کر بھاگتے تھے - میں نے اس کا یہ علاج کیا کہ اپنے پاس بٹھلا کر ان سے ذکر کرایا اور جب بھاگنے لگے زور سے ہاتھ پکڑ کر بٹھلا دیا اور دو دھپ رسید کئے پھر عمر بھر ان کو یہ جوش نہ آیا - خیر یہ طرز عمل تو سب کی ساتھ نہیں ہو سکتا

کیونکہ ہماری حکومت نہیں لیکن یہ تو ہوسکتا ہے کہ جاہلوں کو منہ نہ لگایا جائے اور ان کے لایعنی سوالات کا خشک جواب دیا جائے اس سے بھی ان کا دماغ درست ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں سہارنپور گیا تو وہاں ایک صاحب بہشتی زیور بغل میں دباتے ہوئے لائے اور ایک مسئلہ دکھا کر مجھ سے کہنے لگے کہ یہ مسئلہ دیکھ لیجئے۔ میں نے کہا کہ میری تو ساری کتاب بار بار کی دیکھی ہوئی ہے مجھے آپ کیا دکھلاتے ہیں۔ کہنے لگے یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کہ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا یا اس کی دلیل سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر مطلب سمجھ میں نہیں آیا تو میں اس سے زیادہ آسان عبارت میں بیان کرنے پر قادر نہیں میرے نزدیک بہشتی زیور نہایت آسان اردو میں ہے۔ کہنے لگے کہ مطلب تو سمجھ لیا دلیل سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا کہ کیا اس مسئلہ کے سوا بہشتی زیور کے تمام مسائل کی دلیلیں آپ نے سمجھ لی ہیں یا اور بھی کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی دلیل معلوم نہیں ہوئی اور اگر سب کی دلیلیں معلوم ہو چکی ہیں تو مجھے سوال کی اجازت دیجئے کہ میں کسی مسئلہ کی دلیل آپ سے دریافت کروں کہنے لگے کہ نہیں اور بھی بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی دلیل مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا پھر اس کو بھی اسی مہر میں داخل کر لیجئے اسی کی دلیل جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ بس اب ان کی منطق ختم ہوگئی اور کتاب بغل میں دبا کر رخصت ہوگئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس شخص نے تین روز سے حضرات علمائے سہارنپور کو تنگ کر رکھا تھا اور وہ حضرات خوش اخلاقی سے اس کو دلیل سمجھا رہے تھے لیکن میں نے چار منٹ میں اس کو لاجواب کر کے اٹھا دیا۔ ان کے جانے کے بعد ایک صاحب جنٹلمین تشریف لائے اور تہذیب وخیر خواہی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ بعض جہلا اس مسئلہ پر طعن کرتے ہیں جس سے ہمارا دل دکھتا ہے کہ ہمارے سامنے ہمارے بزرگوں کو برا بھلا کہا جاوے اس لئے مناسب ہے کہ بہشتی زیور کے اس مسئلہ کے متعلق جو مخالفین کا اعتراض ہے اس کے جواب کے لئے ایک جلسہ منعقد کر کے حق کو

واضح کر دیا جائے میں نے کہا کہ آپ کی خیر خواہی میں شک نہیں مگر یہ بتلایئے دنیا میں ایک جماعت یعنی دہریہ خدا تعالیٰ کو اور ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ایک جماعت صحابہؓ کو اور ائمہ مجتہدین کو بُرا بھلا کہتی ہے اور یقیناً اس سے بھی آپ کا دل مجروح ہوتا ہے آپ نے اس کا کیا انتظام کیا ہے۔ ہر کام ترتیب سے اچھا ہوتا ہے آپ پہلے ان جماعتوں کا انتظام کر دیجئے اخیر میں ایسے جماعت کا میں انتظام کر دوں گا جو بہشتی زیور پر طعن کرتے ہیں بس اس کا کچھ جواب نہ تھا میں کہتا ہوں جاہلوں کا انتظام علمی جوابوں سے نہیں ہوسکتا بس ان کے لئے تو یا پانچویں کتاب ہو یا یہ کہ ان کو جواب مت دو بلکہ دھکا دو یا خشک جواب دیدو جیسا میں نے سہارنپور میں دیا تھا۔ ہاں اگر کوئی استفادہ کی غرض سے سوال کرے اور اس میں استفادہ کی قابلیت بھی ہو تو اس کے لئے ہم ہر وقت علمی جواب دینے کو تیار ہیں اور اگر استفادہ مطلوب نہ ہو یا اس میں اس تحقیق کی استعداد نہ ہو تو اس کو علمی جواب ہرگز نہ دو کیونکہ اس سے اس کی اصلاح نہ ہوگی بلکہ اور زیادہ ہلاک ہوگا اور شبہات کا سلسلہ بڑھتا چلا جائیگا دیکھو اگر ایک پورا سا آدمی آئے اور یہ کہے کہ میرے سر پر یہ دو من کا بورا اٹھوا دو بتلایئے ہم کیونکر دو من کا بورا اس کو اٹھوا دیں یقیناً اس کا تو گوہ نکل جائے گا۔ جیسے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ رات کو بستر پر پیشاب کر لیا کرتا تھا۔ بیوی نے ملامت کی کمبخت یہ کیا حرکت ہے کہ تو بڑی عمر کا آدمی ہو کر رات کو بستر پر موتتا ہے کہنے لگا کیا بتلاؤں رات کو ہر روز شیطان خواب میں آتا ہے کہ چلو سیر کو چلیں میں ساتھ ہو لیتا ہوں راستہ میں پیشاب کی ضرورت ہوتی ہے، اس وقت میں اپنے نزدیک قدمچہ پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں اور وہ بستر پر نکل جاتا ہے۔ بیوی بھی اس کی بیوقوف تھی کہنے لگی کہ جب شیطان جو جنات کا بادشاہ ہے تمہارا ایسا دوست ہے تو اس سے یوں کہنا کہ ہم غریب آدمی ہیں کہیں سے بہت سا روپیہ ہم کو لا دے۔ مرد نے کہا آج کی رات آیا تو

ضرور کہوں گا۔ چنانچہ رات کو خواب میں شیطان آیا اور اس نے بیوی کی فرمائش اس سے ظاہر کی۔ شیطان نے کہا یہ کون بڑی بات ہے دونوں چلے اور خزانہ میں لیجاکر شیطان نے اس کے اوپر روپیہ لادنا شروع کیا اتنا لادا کہ میاں کا گوہ نکل گیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو خزانہ تو غائب البتہ بستر پر پیشاب کی ساتھ گوہ کا ڈھیر موجود تھا۔ بیوی نے کہا کیا واہیات ہے۔ اس نے سارا قصہ کہا وہ کہنے لگی کہ میں ایسے خزانہ سے باز آئی تم پیشاب ہی کر لیا کرو تو صاحبو! تحمل سے زیادہ کسی پر بوجھ لادنے کا انجام یہی ہے کہ اس کو حاصل تو کچھ نہ ہوگا ہاں ہلاکت میں پڑ جائے گا۔ اس لئے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مناظرہ سے بہت نفرت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تم سے کسی مسئلہ میں الجھے تو تم بحث کبھی نہ کرو بلکہ سب رطب و یابس اس کے سامنے رکھ کر خود الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ تم اس میں حق و باطل کو خود ہی انتخاب کر لو جیسے ایک شخص نے حجام سے کہا تھا کہ میری ڈاڑھی میں سے سفید سفید بال چن کر الگ کر دو۔ حجام نے استرہ سے ساری ڈاڑھی جدا کر کے اس کے سامنے رکھدی کہ مجھ کو اتنی فرصت نہیں آپ خود سفید و سیاہ کو الگ کر لیجئے۔

مولانا رومیؒ نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص بانسری بجا رہا تھا کہ دفعۃً ریح صادر ہوئی تو اس نے بانسری منہ سے ہٹا کر دبر میں لگا دی اور کہا کہ اگر تو مجھ سے اچھا بجانا جانتی ہے تو تو ہی بجالے۔ حکایت تو فحش ہے مگر مولانا نے اس سے نتیجہ بہت عمدہ نکالا ہے فرماتے ہیں کہ جب تم کوئی مضمون بیان کر رہے ہو اور کوئی مدعی نااہل بک بک کرنے لگے تو تم چپ ہو جاؤ اور اس سے کہدو کہ اچھا بھائی تو ہی بول لے ہم خاموش ہوتے ہیں۔ مولانا نے اس جگہ مدعی کو دبر سے تشبیہ دی ہے واقعی بلیغ تشبیہ ہے کیونکہ مدعی بھی اپنی خرافات عالم کو متعفن کرتا ہے مگر آجکل طلبہ میں یہ مرض ہو گیا ہے کہ وہ

ہر شخص کے جواب دینے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو کچھ کام نہیں اس لئے ذرا ذرا سی بات میں بحث کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ میں ریل میں سوار تھا اپنے احباب میں تصویر کے مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ وہاں ایک پادری بھی بیٹھا ہوا تھا وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہمارے پاس آیا اور کہا میں بھی پوچھ سکتا ہوں (یہ آجکل محاورہ ہو گیا ہے کہ وقوع سے صیغہ امکان میں سوال کرتے ہیں) میں نے کہا آیئے جناب پوچھئے (میں کفار کو جنابت سے جناب کہا کرتا ہوں کیونکہ وہ غسل جنابت نہیں کرتے) کہنے لگا کہ اسلام میں تصویر کیوں حرام ہے۔ اگر یہ سوال کسی نئے مولوی سے کیا جاتا تو دو گھنٹہ تک اس سے بحث کرتے مگر میں اس روگ کو نہیں پالتا میں نے جواب دیا کہ مسئلہ فروع میں سے ہے اور فروع سے اصول مقدم ہیں۔ آپ کو ابھی تک ہمارے اصول ہی مسلم نہیں اس لئے فروع کے سوال کا آپ کو حق نہیں کہنے لگا یہ تو سچ ہے کہ مجھے اس سوال کا حق نہیں مگر میں نے چاہا تھا کہ سفر میں علمی گفتگو سے مشغلہ ہو جاتا میں نے کہا کہ مذہبی مسائل کو مشغلہ بنانا آپ کو مبارک ہو۔ ہمارا مذہب ایسا نہیں کہ ہم اس کو مشغلہ بنائیں۔ بس اب وہ خاموش تھا اور اپنے اس جواب پر سخت شرمندہ تھا۔ اسی طرح ایک بار ایک ہندو آریہ نے ریل میں مجھ سے پوچھا کہ اگر کوئی مسلمان ایک نیک کام کرے اور وہی کام کافر بھی کرے تو دونوں کا اجر برابر ہوگا یا کم زیادہ۔ میں نے کہا افسوس ہے آپ مجھ سے ایسا سوال کر رہے ہیں جس کا جواب خود آپ کے ذہن میں موجود ہے کہنے لگا یہ کیونکر میں نے کہا اس لئے کہ اُس جواب کے مقدمات سب آپ کے ذہن میں ہیں کہنے لگا یہ کیونکر معلوم ہوا میں نے کہا ابھی آپ اقرار کئے لیتے ہیں۔ سنئے کیا آپ نہیں جانتے کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب کو حق اور دوسرے مذاہب کو باطل سمجھتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مذہب حق والا مثل مطیع سلطنت کے اور مذہب باطل والا مثل باغی سلطنت کے

اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ بغاوت ایسا جرم ہے جو انسان کے تمام کمالات کو بیکار اور لاشئے کر دیتا ہے چنانچہ اگر کسی جامع الکمالات باغی کو پھانسی ہونے لگے کوئی عاقل یہ شبہ نہیں کرتا کہ اس کے کمالات کو مانع سزا نہیں سمجھا گیا اور یہ سب مقدمات بدیہی ہیں جو آپ کو پہلے سے معلوم ہیں اب ان سب کو ملا کر دیکھئے آپ کے سوال کا جواب خود نکل آئے گا اور ان مقدمات کو جان کر مجھ سے سوال کرنے کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ میرے منہ سے اپنی نسبت کافر کا لفظ سننا چاہتے ہیں تو وہ آریہ اس تقریر پر فریفتہ ہو کر کہنے لگا کہ واقعی میری نیت یہی تھی کہ آپ مجھے کافر کہیں کیونکہ ایسے منہ سے کافر کا لفظ سننا بھی موجب لذت ہے میں نے کہا یہ آپ کی لیاقت ہے لیکن میری اسلامی تہذیب مجھے اس سے منع کرتی ہے کہ میں بلا ضرورت کسی کا دل دکھاؤں۔ ریل میں سفر کرتے ہوئے اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ہم لوگ آپس میں مسائل شرعیہ کی تحقیق میں گفتگو کرتے تو کفار ان کو غور سے سنتے اور ان پر اثر ہوتا تھا کیونکہ حق میں ایک خاص کشش ہے جو باطل میں کبھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک دفعہ ہم لوگ باتیں کر رہے تھے تو چند ہندو آپس میں کہنے لگے کہ ان کی باتوں کی طرف دل کھنچتا ہے دوسرے نے کہا یہ سچے ہونے کی علامت ہے۔ ایک دفعہ ہم باتیں کر رہے تھے جب اسٹیشن آگیا اور اترنے لگے تو ایک ہندو نے حاضرین سے کہا کہ کیا نور برس رہا تھا اب سارا نور یہ اپنی ساتھ لے چلے تو صاحبو! آپ بحث و مباحثہ نہ کریں آپس میں مسلمانوں ہی سے اسلام کی تعلیم پر گفتگو کرتے رہیں اسی کا کفار پر اثر ہوگا بحث کا اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس میں مخالف ضد پر آجاتا ہے اور سچے طالب تحقیق آجکل کہاں ہیں۔ یہ سب گفتگو اس پر چلی تھی کہ اس جگہ حق تعالٰے نے قتال و شقاق کو تکفرون سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور میں نے کہا تھا کہ یہ استعمال محاورات کے موافق ہے حقیقت پر محمول نہیں۔ خوارج و معتزلہ کی جہالت ہے کہ انھوں نے محاورات کو تدقیق پر محمول کرنا شروع کر دیا اس لئے متکلمین کو علم کلام

مدون کرنے کی ضرورت ہوئی اس پر یہ تقریر طویل ہو گئی اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آجکل جو ہم لوگوں میں یعنی مسلمانوں میں نااتفاقی ہے دیکھ لیا جائے کہ یہ کیسی سخت حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ حضرات صحابہ اس کو سن کر چونکے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے ان کو دستور العمل بتلایا کہ خیر جو ہو چکا ہو چکا گذشتہ تو گذشتہ ہوا آئندہ کا بندوبست کرو تاکہ پھر اس معصیت کا خطرہ نہ رہے۔ چنانچہ اول تقویٰ اور اسلام پر مداومت کا امر ہے پھر اعتصام بحبل اللہ کا حکم ہے پھر ارشاد ہے وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۤءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں الفت ڈالدی سو تم خدا کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے) جس میں نعمت اتفاق کے یاد کرنے کا حکم ہے کہ اس نعمت کو اور اس کی برکات کو یاد کرو اور موازنہ کرو کہ تمہاری پہلے کیا حالت تھی اور اس کا نتیجہ کیسا وخیم تھا اور اتفاق کے بعد کیا حالت ہو گئی اور اس کا انجام نعیم مقیم ہے۔ شاید بعض لوگوں کو اس وقت یہ خیال ہوا ہو گا کہ میں آج اتفاق و اتحاد کا مضمون بیان کروں گا کیونکہ بظاہر یہاں یہی مضمون مذکور ہے لیکن مجھے دوسری بات بیان کرنا ہے جو اتفاق و اتحاد کی بھی جڑ ہے اور وہ ایسی بات ہے جو راستہ طے کرنے والوں کو پیش آتی ہے اور ان کی ضرورت کی ہے کیونکہ مسلمانوں میں دو قسم کے آدمی ہیں ایک تو وہ جنھوں نے دین کا کام ہی شروع نہیں کیا دوسرے وہ جو کام شروع کر چکے ہیں اور راستہ میں ہیں پہلی جماعت کا علاج تو یہ ہے کہ ان کو کام میں لگا دیا جائے اور جو لوگ راستہ طے کر رہے ہیں ان کے لئے ایصال کی ضرورت ہے تو یہ مضمون ایصال کی قبیل

لہ یہ تفسیر اس لئے کی گئی کہ بعض جاہلوں نے ایک جلسہ میں لفظ ہم کی تفسیر ہندو مسلمان سے کی ہے اس طرح سے کہ ہ سے مراد ہندو اور میم سے مراد مسلمان ۱۲ جامع

سے ہے ارارۃ طریق کی قبیل سے نہیں اور گو مضمون نیا نہیں لیکن عنوان نیا ہے۔ چنانچہ معلوم ہو جائے گا کہ اس آیت کا مطلب اس عنوان سے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہوگا اب میں مقصود کو شروع کرتا ہوں اور ان شاء اللہ تعالیٰ مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ اول تو وہ بات ہی مختصر ہے۔ دوسرے اس وقت کچھ طبیعت بھی مضمحل ہے جن بزرگوں کی وجہ سے یہ بیان ہو رہا ہے اُن کی درخواست تو کل گذشتہ کے متعلق تھی مگر کل طبیعت زیادہ مضمحل تھی کیونکہ کل رات ایک طوطے نے بیوقت ٹرٹر لگائی جس سے نیند اچاٹ ہوگئی پھر دیر تک نیند نہ آئی اور جب کچھ نیند آئی تو اس نے پھر بولنا شروع کیا آخر اُس کو عالم بالا میں پہنچایا (یعنی بالاخانہ پر) تب کچھ نیند آئی مگر پھری نہیں آج بھی طبیعت پر قدرے اضمحلال کا اثر ہے مگر کل جیسا نہیں اس لئے مختصر ہی بیان کروں گا حضرات صحابہؓ نے بھی بعض دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختصر بات کا سوال کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رد نہیں فرمایا بلکہ درخواست کو قبول کر کے مختصر بات بتلادی چنانچہ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکام شرعیہ بہت زیادہ ہوگئے ہیں مجھے ایک مختصر بات بتلادیجئے جس کو میں دستور العمل بنالوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (ایمان لایا میں اللہ پر اور اس پر استقامت کر)

صحابی کے اس سوال سے یہ مراد نہ تھی کہ فرائض میں اختصار ہو جائے یا ایسی بات بتلادی جائے جس سے سب مسائل مستنبط ہو جائیں کیونکہ اس جواب سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے سب مسائل کیسے مستنبط ہوں گے بھلا سجدہ سہو کا وجوب اس سے کیونکر مستنبط ہوگا اور اگر کھینچ تان کر کے نکالا بھی گیا تو وہ استنباط نہ ہوگا بلکہ چرکاٹ ہوگا۔ جیسے آجکل ایک فرقہ قرآنیہ نکلا ہے جو حدیث کو نہیں مانتا پہلے ایک فرقہ غیر مقلدین نکلا تھا جس نے فقہ کو اڑادیا تھا اب یہ فرقہ نکلا ہے جس نے حدیث کو بھی اڑادیا اندیشہ ہے

کوئی کمبخت ایسا نہ نکلے جو قرآن ہی کو اڑا دے (معلوم ہوا ہے کہ پٹیالہ میں ایک مدعی نبوت نکلا ہے وہ قرآن کی بھی نفی کرتا ہے۔ قاتلہ اللہ من لعین مارد ۱۲)
آجکل یہ حالت ہے کہ ایک فتنہ دبنے نہیں پاتا کہ دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے۔

ع اِذَا اسُدَّ مِنْهَا مَنْخِرٌ جَاشَ مَنْخِرٌ

(ایک فتنہ دباؤ تو دوسرا فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے)

سو اس فرقہ کے بانی سے کسی نے پوچھا کہ تم حدیث کی تو نفی کرتے ہو اور سارے مسائل قرآن ہی سے مستنبط کرتے ہو تو بتلاؤ کہ عدد رکعات نماز کی دلیل قرآن میں کہاں ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس کا جواب کل دوں گا۔ بھلا یہ حماقت تو دیکھئے کہ استدلال تو کل ہوگا اور عمل پہلے ہی سے شروع کر دیا اگر یہ عمل قرآن پر مبنی تھا تو اس میں سوچ کیوں ہوئی اور قرآن پر مبنی نہ تھا تو کس پر مبنی تھا اگر حدیث و فقہ پر مبنی تھا تو اس نے عمل ثابت کر دیا کہ قرآن کے سوا بھی کوئی چیز حجت ہے۔ غرض اگلے دن آپ تشریف لائے اور دعویٰ کیا کہ میں قرآن سے رکعات صلوٰۃ کا ثبوت دوں گا۔ سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیام رساں بنایا ہے جن میں کسی کے دو بازو ہیں کسی کے تین کسی کے چار بس ایسی ہی نمازوں کی رکعات کا عدد مختلف ہے بھلا کوئی پوچھے کہ یہاں تو فرشتوں کی بازوؤں کا ذکر ہے اس کو رکعات صلوٰۃ سے کیا تعلق اور اگر محض عدد کا ذکر ہی استنباط کے لئے کافی ہے تو پھر ایک رکعت کی بھی ہونا چاہئے کیونکہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں ایک کا ذکر ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ کسی طالب علم سے کسی نے کہا تھا کہ دو اور دو کے ہوتے ہیں وہ جواب دیتا ہے کہ چار روٹیاں تو جیسے دو اور دو کی دلالت روٹیوں پر ہے ایسے ہی مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کی دلالت رکعات پر ہوگی اس کو اثبات بالقرآن نہیں کہہ سکتے اثبات تو وہ ہے جو خود مفید مطلوب ہو بدون ضم ضمیمہ کے۔ اگر حدیث

سے پانچ وقت کی نمازیں اور ان کی رکعاتیں کی شمار معلوم نہ ہوتی تو کوئی شخص مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ سے رکعات نماز سمجھ سکتا تھا ہرگز نہیں تو اگر اس طرح اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (اللہ پر ایمان لا اور اس پر مستقیم رہ) سے سب مسائل مستنبط کئے جائیں تو اس کا تو کچھ علاج نہیں ورنہ خود یہ کلام استنباط مسائل کے لئے ہرگز کافی نہیں اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب ہے کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (ایمان لائے اللہ پر پھر اس پر مستقیم رہو۔) سارے مسائل کے استنباط کو کافی ہے اب یہ سوال ہوگا کہ پھر صحابی کے سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا کیا مطلب ہے تو اس کو حضرات صوفیہ نے سمجھا وہ فرماتے ہیں کہ صحابی نے ایسا دستور العمل پوچھنا چاہا تھا جو تمام اعمال میں کام آوے اور سب کو سمیٹ دے جیسا کہ صوفیہ مریدین کو مراقبۂ رؤیت وغیرہ بتلایا کرتے ہیں جو تمام اخلاق رذیلہ غضب وحرص و کبر وغیرہ میں کام آتا ہے اور تنہا سب کے علاج کو کافی ہوجاتا ہے اگر ہر مرض کا جدا جدا علاج کیا جائے تو بڑی مدت چاہئے۔ اب انھوں نے ایسی بات بتلائی جس کے رسوخ سے ایک دم سارے امراض اور معاصی کی جڑ اکھڑ جائے گی کیونکہ جو شخص ہر وقت اس بات کو پیش نظر رکھے گا کہ حق تعالیٰ مجھ کو دیکھ رہے ہیں وہ نہ تکبر کرسکے گا نہ غصہ بیجا نہ گناہ صغیرہ کرسکے گا نہ کبیرہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابی نے ایسی ہی بات دریافت کرنا چاہی تھی جس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا استحضار رکھو اور اس کے بعد ہر عمل میں استقامت کا لحاظ کرو کہ نہ کسل ہو نہ تسویف ہو ظاہر ہے کہ جو شخص ہر وقت اس کا استحضار رکھے گا کہ میں خدا پر ایمان لاچکا ہوں تو وہ تمام احکام کو خوشی سے بجالائے گا اور کسی حکم میں چون وچرا نہ کرے گا یہ تو تسہیل عمل کا طریق تھا اس کے بعد تکمیل عمل کا طریقہ بتلادیا کہ استقامت کا

لحاظ رکھو یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے دو جملوں میں تمام طریق کو سمیٹ دیا جس میں تسہیل عمل بھی ہے اور تکمیل بھی ہے تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مختصر بات کا دریافت کرنا اور بتلانا بھی سنت ہے اسی لئے مجھے طریق میں اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ ایسی مختصر بات بتلائی جائے جو سب باتوں کو حاوی ہو چنانچہ ایک دفعہ میں نے اخلاق رذیلہ کا علاج دو لفظوں میں تجویز کیا تھا تامل وتحمل کہ جو کام کرے سوچ کے کرے کہ شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جلدی نہ کرے بلکہ تحمل سے کام کیا کرے مجھے اختصار کے ساتھ قافیہ کا بھی خبط ہے اس سے یاد میں سہولت ہوتی ہے اس لئے ایک دوست کا فیصلہ ہے کہ یہ نثر میں شاعر ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں نے ایک زمین لی ہے جب اس کے لینے کا ارادہ ہوا تو میں نے اس کے متعلق یہ دعا تجویز کی تھی اَللّٰھُمَّ حَصِّلْ اَللّٰھُمَّ کَمِّلْ اَللّٰھُمَّ عَجِّلْ اَللّٰھُمَّ سَھِّلْ (اے اللہ حاصل کرا دے۔ اے اللہ پورا کرا دے اے اللہ جلدی کرا دے اے اللہ آسان کرا دے) جس میں چاروں جملے مقفی ہیں اسی طرح طریق میں طالبین کے لئے ایک بار یہ دستور العمل تجویز کیا اطلاع و اتباع۔ کہ اپنے احوال و اعمال سے شیخ کو مطلع کرتے رہیں اور اس کی تجویز پر عمل کریں ایک دفعہ یہ تجویز کیا تھا کہ انقیاد و اعتماد۔ اس وقت پہلی مقفی عبارت ذہن سے نکل گئی تھی تو جب ایک قافیہ دار عبارت بھول جاتا ہوں دوسری قافیہ دار عبارت تجویز کر لیتا ہوں ممکن ہے کسی وقت یہ بھی ذہن سے نکل جائے تو تیسری قافیہ دار عبارت تجویز کر لوں گا یہ تو جنم روگ ہے جیسا ایک آزاد مزاج بزرگ نے حفظ قرآن کو جنم روگ بمعنی دائم الرعایۃ فرمایا تھا کیونکہ حفظ قرآن کے لئے بھی ہر وقت فکر کی ضرورت ہے جہاں ذرا غافل ہوا اور ذہن سے نکلا چنانچہ جو لوگ ہمیشہ نہیں پڑھتے ان کو اس سے اجنبیت ہو جاتی ہے جیسے مولوی احمد حسن صاحب کانپوری فرماتے تھے کہ رمضان میں جو میں قرآن تراویح کے اندر پڑھتا ہوں تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ

قرآن پڑھ رہا ہوں یا توراۃ و انجیل، کیونکہ ان کو سال کے اندر کثرت تدریس کے سبب تلاوت کی نوبت کم آتی تھی مگر بعض لوگوں کا حافظہ اچھا ہوتا ہے وہ باوجود عدم مشغولی کے اور بیفکری کے بھی نہیں بھولتے حالی شاعر کا واقعہ میں نے پانی پت میں مولوی عبدالسلام صاحب انصاری مرحوم سے سنا ہے کہ ان کو قرآن حفظ تھا مگر حفظ کے بعد ابتدائے جوانی میں کبھی محراب سنائی ہوگی پھر شاعری اور لیڈری کے قصہ میں پڑ گئے تو برسوں محراب نہیں سنائی نہ تلاوت کا شغل رہا مگر حافظہ ایسا اچھا تھا کہ بڑھاپے میں بھی قرآن خوب یاد تھا چنانچہ ان کے بڑھاپے میں ایک دفعہ پانی پت کے چند لڑکوں نے شبینہ کرنا چاہا اور یہ شوخی سوجھی کہ حالی سے اس شبینہ کی شرکت کی درخواست کرو چنانچہ سب مل کر ان کے پاس گئے کہ حضور آج ہم سب نے شبینہ کا قصد کیا ہے آپ ہماری سرپرستی فرمائیں اور ایک منزل آپ بھی سنائیں۔ حالی نے کہا کہ بھائی میں نے تو بہت زمانہ سے قرآن نہیں سنایا جو کچھ یاد تھا سب بھول بھال گیا مجھے معاف کرو مگر لڑکوں نے نہ مانا اور اصرار کیا مجبور ہو کر درخواست منظور کی اور کہا کہ اتنا تو بتادو کہ میرے ذمہ کونسی منزل ہوگی چنانچہ سب سے زیادہ مشکل منزل جس میں متشابہات زیادہ ہیں ان کے لئے تجویز کی گئی اور نوجوان حافظ اپنے دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج بڈھے کو خوب رسوائی ہوگی یقیناً خوب غوطے کھادیں گے۔ مگر جب رات ہوئی اور حالی کے پڑھنے کی باری آئی تو ظالم نے ایسا اچھا سنایا کہ ایک جگہ بھی تو نہ اڑکا اس وقت سب کو معلوم ہوا کہ ان کو قرآن واقعی یاد ہے بھولے نہیں سو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کو باوجود عدم مزاولت کے بھی ایسا یاد رہے ورنہ عام حالت یہی ہے کہ قرآن بدون دائمی مزاولت کے یاد نہیں رہتا۔ اسی قیاس پر ایک اور تفریع کرتا ہوں کہ اسی طرح اس طریق میں بھی قلت کی نگہداشت عمر بھر کا روگ ہے کسی وقت غفلت کی اجازت نہیں ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی
(ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو)

اور ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش — تادمے آخر دمے فارغ مباش
تادم آخر دمے آخر بود — کہ عنایت باتو صاحب سربود

(تم کو چاہئے کہ طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ اُدھیڑبن میں لگے رہو اور آخری وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک تک کوئی گھڑی ایسی تو ضرور ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی)

اور ایک اور لطف صنع ہے کہ اگر کسی وقت سالک غافل ہونا بھی چاہے تو حضرت حق غافل نہیں ہونے دیتے ایک سپاہی ایسا مسلط کر دیا ہے جو کان پکڑ کر کھڑا کر دیتا ہے بیفکر نہیں ہونے دیتا۔ اور اس سپاہی کا حلیہ میں بیان نہیں کر سکتا کہیں سننے والے بے چین نہ ہو جائیں جو لوگ آرام میں ہیں ان کو کیوں بے چین کیا تو وہ سپاہی آکر کہتا ہے کہ ایک دن پچاس ہزار سال کی برابر آنے والا ہے اس سے غافل ہو کر کہاں جا رہا ہے بس جہاں غفلت ہوئی اور یہ دن پیش نظر ہو جاتا ہے اس لئے سالک غافل نہیں رہ سکتا کبھی تجلی جلالی منکشف ہوتی ہے وہ دل کو تھرا دیتی ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اہل اللہ بڑی چین میں ہیں ان کو کچھ فکر نہیں بیشک دنیا کی تو ان کو فکر نہیں مگر دنیا کی فکر نہ ہونے کا منشا بے فکری نہیں بلکہ ایسی عظیم الشان فکر ہے جس نے عصائے موسوی کی طرح سب فکروں کو نگل لیا ہے واللہ جو فکر ان کو ہے اگر آپ کو ہو جائے تو رات کا سونا بھول جائیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلواریں چل رہی ہیں)

سعدی علیہ الرحمۃ نے اس کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش | اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایانِ از بادشاہی نفور | بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند | وگر تلخ بینند دم درکشند

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں، ایسے فقیر بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کرواہٹ دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

غرض سالک کے لئے نئے نئے سبق ہمیشہ تازہ ہوتے رہتے ہیں جو کسی وقت اس کو غفلت نہیں ہونے دیتے اور وہ سب تقوی ہی کی افراد ہیں جس کا یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرو ڈرنے کا حق سوائے اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دو) میں امر ہے اس وقت اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تقوی کا عنوان بہت وسیع ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ مختصر بات بتلائی جائے جس سے تمام اعمال سہل ہو جائیں اور تمام مقامات طریق حل ہو جائیں میں، یہ یہ دعوی نہیں کرتا کہ اس مضمون کے بعد آپ کو پریشانی ہی نہیں ہوگی بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اگر پریشانی ہوگی تو لذیذ ہوگی کہ آپ اس پریشانی کے بدلہ ہفت اقلیم کا لینا بھی منظور نہ کریں گے باقی پریشانی کے رفع ہونے سے تو امید ہی قطع کر دیجئے کیونکہ آپ تو پریشانی ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں یہ تو جنت ہی میں

پہنچکر ختم ہو گی۔ خدا تعالیٰ وہاں سرخرو کر کے ہم کو پہنچا دیں (آمین ثم آمین)
اور بعض کوتاہ نظر عاشقوں نے تو جنت میں بھی پریشانی کو ختم نہیں مانا۔ چنانچہ ایک عاشق کا قول ہے اِنَّ فِی الجنان لجنۃ لیس فیھا حورٌ وَّلا قصورٌ وَّلا لٰکِنْ فِیْھَا اَرِنِیْ اَرِنِیْ (جنتوں میں ایک جنت ایسی ہے جس میں نہ حوریں نہ محلات اور ارنی ارنی مجھ کو اپنا دیدار دکھا مجھ کو اپنا دیدار دکھا)
قولؔ واقع میں صحیح نہیں اور کشف حجت نہیں مگر اس صاحب کشف نے جو دلیل بیان کی ہے اس دلیل سے مجھے بھی بہت دنوں شبہ رہا وہ یہ کہ حسن و جمال حق حقیقۃً بے نہایت ہے اور عاشق کا عشق و طلب بمعنے لا تقف عند حدّ بے نہایت پھر چین کیونکر ہو وہاں تو یہ حال ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریاں ہمچناں باقی

(نہ اس کے حسن کی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی کوئی انتہا ہے جیسے جلندھر والا پیاسا مر جاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح محبوب کا بیان باقی رہ گیا)
اور یہ کیفیت ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

(دامانِ نگاہ تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول بیحد ہیں گل چین تنگیٔ دامن کا گلہ رکھتا ہے)

ؔ قلت ویحتمل ان یکون الکشف صحیحا ولکنہ ای صاحب الکشف اخطأ فی قولہ ازاھل ھذہ الجنۃ لا راحۃ لھم وانھم فی کربۃ اضطراب بل لیکن ان یکون لھم فی ارنی ارنی راحۃ لیس بغیرھم فی الحور والقصور ولا یکون منشأ قولھم ارنی ارنی کربھم واضطرابھم ولا قلقھم ھل منشاء ولعلہ الادلال علی اللہ وطلب رویتہ اظھارا للمحبۃ واھذا فانھم لا رب لھم فی غیرہ جل وعلا واللہ اعلم ۱۲

اور ایک عاشق کہتا ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز کاغذ سوز ودم درکش
حسن ایں قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ روشنائی بکھیر کاغذ جلا خاموش رہ جس پر عشق کا قصہ ہے جو دفتر میں نہیں سما سکتا)

اور ایک شاعر کہتا ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا جس طرح انگور کو جتنا زیادہ قطع کرو اور بڑھتا ہے یہی حال اس راستہ کا ہے)

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست
ہر چہ بروے می رسی برفے مایست

(اے برادر بے نہایت درگاہ ہے جس درجہ پر پہونچو اس پر مت ٹھیرو بلکہ آگے کو ترقی کرو۔)

اور گو عاشق کا عشق بالفعل متناہی ہے مگر چونکہ اس کا منشا حسن وجمال حق ہے اور وہ بے غایت ہے تو اس کا عشق بھی لا تقف عند حد ضرور ہوگا پھر چین کیونکر آئے عاشقان مجازی کو تو وصال محبوب سے اس لئے چین آجاتا ہے کہ ان کے محبوب کا حسن متناہی ہے وصال کے بعد جی بھر کر اس سے متمتع ہو گئے اور سکون ہو گیا اور جس کے محبوب کا حسن بے غایت ہو اس سے تو جتنا متمتع ہوگا اور نیا درجہ حسن کا ظاہر ہوگا جیسے ایک شاعر کہتا ہے ؎

یَزِیْدُكَ وَجْهُهٗ حُسْنًا ۔ اِذَا مَا زِدْتَّهٗ نَظَرًا

(جتنی زیادہ تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا اتنا تیرے چہرے حسن زیادہ معلوم ہوتا ہے)

یہ ہے ان کی دلیل اس دلیل سے میں بہت روز تک چکر میں رہا اسی واسطے کہتا ہوں کہ بس نماز روزہ میں لگے رہو اور ان کشفیات واسرار کے پیچھے نہ پڑو یہ بلائے بے درماں ہے پھر بحمداللہ اس کا جواب سمجھ میں آگیا وہ یہ کہ یہاں تو شوق لاتقف عند حد اس لئے ہے کہ ہمارے اندر وصال حق کی جتنی استعداد پیدا کی گئی ہے یہاں کے مشاہدہ سے اس استعداد کا تقاضا پورا نہیں ہوتا یہاں ہم کو حق تعالٰے کا ناتمام وصال حاصل ہوتا ہے کہ بعض افراد میں استعداد اس سے زیادہ ہیں وہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہمارا حق بھی ادا ہو اور جنت میں تمام افراد استعداد کا تقاضا پورا کر دیا جائے گا پھر چین ہو جائے گا اور اس سے حسن حق کا محدود ہونا لازم نہیں آتا بلکہ استعداد طالب کا متناہی ہونا لازم آیا مگر اس عاشق نے استعداد طالب کو بھی غیر متناہی بمعنی لاتقف عند حد سمجھ لیا اس لئے اشکال پیش آیا اور منشا اس دھوکہ کا یہ ہوا کہ دنیا میں عاشق کا شوق لاتقف عند حد ہی ہے اس سے وہ یہ سمجھا کہ عشق فی نفسہ لاتقف عند حد ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ فی نفسہ محدود و متناہی ہے اور دنیا میں اس لئے لاتقف عند حد ہے کہ یہاں اس کی استعداد کے تمام افراد کا تقاضا پورا نہیں کیا گیا اور جنت میں ہر فرد استعداد کا تقاضا پورا ہو جائیگا جس سے سکون کامل ہو جائے گا اور یہ میں کسی طبعی قاعدہ پر مبنی کر کے نہیں کہتا بلکہ نص کی بناء پر کہتا ہوں حق تعالٰے فرماتے ہیں وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (اور کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا قدردان ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں ہم کو کوئی کلفت نہیں اور نہ کوئی ہم کو خستگی پہونچے گی)

اگر جنت میں بھی پریشانی رہی تو پھر عشق کو لے کر کیا کریں گے اس صاحب کشف کی نظر سے یہ مقدمہ نکل گیا کہ دنیا میں عشق اس لئے لاتقف عند حد ہے کہ یہاں استعداد عاشق کے جملہ افراد کا تقاضا پورا نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے ناکاروں کو اس مقدمہ پر اطلاع کردی اور یہ بھی ان بزرگوں کی برکت ہے جیسے کبھی کمزور باپ کے قوی لڑکا پیدا ہوتا ہے لیکن وہ قوی ہو کر بھی ہے بیٹا ہی اور وہ کمزور اس کا باپ ہے بہر حال جنت میں تو چین ہوگا مگر دنیا میں چین نہیں بعض لوگ یہاں طالب راحت ہیں یہ ان کی غلطی ہے بھلا عشق اور چین ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن　　دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

سوئے زلفش نظرے کردن و رویش دیدن　　گاہ کافر شدن وگاہ مسلماں بودن

(عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے (محبوب) کے قبضہ میں دیدینا اور حیران رہنا محبوب کی زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کے چہرہ انور کو دیکھنا کبھی فانی ہونا اور کبھی باقی ہونا ہے)

کافر شدن سے پریشان نہ ہونا یہ ان صوفیوں کی اصطلاح ہے ان کے یہاں فانی کو کافر اور صاحب بقا کو مسلمان کہتے ہیں اور ایسی وحشت ناک اصطلاحیں انھوں نے گالیاں کھانے کو مقرر کی ہیں مگر اعتراض کا کسی کو حق نہیں کیونکہ قرآن میں بھی تو ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ (سو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو

اور ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا كَفَرْنَا بِكُمْ (ہم تمہارے منکر ہیں)۔ بس اتنا فرق ہے کہ قرآن میں صلہ بھی مذکور ہے اس لئے وحشت نہیں ہوتی اور صوفیہ کو صلہ رحمی نہیں آتی ان کی بات سے لوگ متوحش ہوتے ہیں مگر حقیقت واضح ہو جانے کے بعد الفاظ سے متوحش نہ ہونا چاہئے اسی اصطلاح کے موافق حضرت خسرو فرماتے ہیں ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
(میں عشق میں فانی ہوں بقا مجھے درکار نہیں ہے میری رگ تار ہوگئی ہے
اتار کی ضرورت نہیں)

مگر تم ان اشعار کو نقل کے طور پر بھی نہ پڑھنا کیونکہ وہ تو مغلوب تھے اس لئے معذور تھے اور تم ان کو پڑھ کر مسلوب ہی ہوجاؤ گے اور اگر کوئی بخدی آگیا تو مصلوب بھی ہوجاؤ گے اور جو عاشق ہوگا وہ تو خود ہی یک یک لگائے گا۔ بالصاد وہ میرا اور تمہارا کسی کا کہنا نہ مانے گا لیکن وہ نقل کے طور پر نہ پڑھے گا بلکہ مغلوب ہو کر پڑھے گا سو وہ بھی امیر خسرو کی طرح معذور ہے۔ غرض تم آرام کے طالب نہ بنو جیسا بعض سالکین دفع خطرات کے طالب ہیں کہ ایسی حالت ہوجائے کہ وساوس وخطرات پاس ہی نہ آئیں یہ بھی راحت کے طالب ہیں میں اس وقت آپ کو ایسی چیز بتلانا چاہتا ہوں جو پریشانی کو لذیذ کردے کیونکہ میں کہہ چکا کہ پریشانی تو جنت سے ورے ختم نہیں ہوسکتی ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ پریشانی کو لذیذ کردیا جائے اور یہ بھی ایک طرح پریشانی کا خاتمہ ہی ہے تو میں ایسی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جو تمام اعمالوں میں کام آئے اور غفلت سے روکتی رہے اور پریشانی کے وقت ہمت بندھائے اور وہ نئی بات نہیں بلکہ وہ وہی ہے جس کا نام قرآن میں کہیں تقویٰ ہے کہیں کہیں اعتصام بحبل اللہ ہے اور اسی کا نام ذکر نعمت بھی ہے ؂

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی جمال محبوب ہے ہر ایک عنوان اسی جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے)

یہ سب عنوانات ایک ہی معنوں کے ہیں جاننے والا ہر لباس میں اس کو پہچان لیتا ہے ؂

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم
(خواہ کسی رنگ کا لباس پہن لو قد کے اندازے میں پہچان لیتا ہوں)

صاحبو! اس وقت میں جس چیز کا پتہ دینا چاہتا ہوں وہ اسلام ہے جو ظاہر ہے کہ ان سب عنوانات میں موجود ہے مگر میں اس وقت اسلام کو دوسرے عنوان سے بیان کروں گا کہ اس عنوان سے بہت کم لوگوں نے اس کو دیکھا ہے اسی لئے اسلام کے لفظ سے ادھر ذہن نہیں جاتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام کا لفظ زبانوں پر اس درجہ شائع ہو گیا ہے کہ اب اس سے اس کا مصداق تو متبادر ہوتا ہے مگر مفہوم کی طرف کسی کو التفات نہیں ہوتا اگر لوگ اسلام کے لغوی معنی پر بھی نظر کر لیا کرتے تو اس حقیقت سے قریب ہو جاتے جس کو میں اس وقت بیان کروں گا۔ تو سنئے اسلام معنے لغت میں سپرد کرنے کے ہیں جس کو تسلیم بھی کہتے ہیں میں اسی کو اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو صوفیہ نے تفویض سے تعبیر کیا ہے یہی اسلام کی حقیقت ہے مگر اب لفظ اسلام سے اس کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا قرآن میں کہیں اسلام کا ذکر مجملاً ہے کہیں مفصل ہے اور مفصل میں تفویض ہی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ الآیہ (ہاں جو شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو) دوسری جگہ ہے وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (اور ایسے شخص سے زیادہ اچھا کس کا دین ہو گا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ شخص مخلص بھی ہو اور ملت ابراہیم کا اتباع کرے جس میں کمی کا نام نہیں) اور ایک جگہ ہے وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَی اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی (اور جو شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص

بھی ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) یہاں اسلام وجہ کی ساتھ اتباع ملت ابراہیم کا بھی ذکر ہے اور اس کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے۔
وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (اور ملت ابراہیمی سے وہی روگردانی کریگا جو اپنی ذات سے احمق ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے پروردگار نے ان سے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العلمین کی) جس سے معلوم ہوا کہ ملۃ ابراہیم بھی اسلام وجہ رب العلمین ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کردے جس کو ایک مقام پر حضرت ابراہیم نے إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا (میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) سے بیان فرمایا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن میں اسلام کی تفسیر اسلام وجہ ہے جس کے پورے معنے نماز روزہ کے نہیں ہیں بلکہ اسلام وجہ بمعنے تفویض ہے یعنی اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دینا اور اپنے کو ہر تصرف الٰہی کے لئے آمادہ کر دینا کہ وہ جو چاہیں کریں جو چاہیں حکم دیں سب منظور ہے نماز روزہ بھی اس تفویض کا ایک فرد ہے لیکن عین نہیں اگر قرآن میں اسلام کا استعمال اطلاق ہی کے ساتھ ہوتا اور اس کے ساتھ وجہ اللہ یا وجہ الی اللہ مذکور نہ ہوتا تو یہ بھی احتمال تھا کہ اسلام بمعنی اطاعت ہے مگر ان قیود کے ساتھ اطاعت کے معنے نہیں بنتے بلکہ تفویض ہی کے معنے مستقیم ہوتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ آیات میں بعض بعض کی مفسر ہوتی ہیں تو اب جہاں اسلام بلا قید مذکور ہے وہاں بھی مقید ہی مراد ہے جیسے احادیث میں علم کے فضائل بلا قید مذکور ہیں حالانکہ علم مصدر ہے جس کے لئے قید کی ضرورت ہے خواہ بصورت

مفعول ہو یا مضاف الیہ اس لئے لفظ کے اطلاق سے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فضائل مطلق علم کے ہیں بلکہ یقینی بات ہے کہ علم سے علم دین مراد ہے ایسے ہی نصوص میں اسلام سے اسلام وجہ مراد ہے یعنی تفویض یہی وہ چیز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات و فضائل ہیں۔ جا بجا حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ پس ان آیات میں اصل مقصود لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (بجز اسلام کے اور کسی حالت میں جان مت دو) ہے اور اِتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ سے ڈرو) وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ (اللہ کے انعام کو یاد کرو) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو) یہ سب اسی کے لقب ہیں۔ اسی لئے میں نے اس بیان کا نام "الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام" تجویز کیا ہے جس میں اصل مقصود کے ساتھ اس کے دوسرے عنوانات پر بھی دلالت ہے جیسے مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی کا سجع میں نے کہا تھا ثاقب از لطف محمد اسحاق جس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف سے روشن ہوئے ہیں مگر اس میں لطیفہ یہ بھی ہے کہ اس مصرع میں مولوی محمد اسحٰق صاحب اور ان کے والد کا اور دادا کا نام بھی آگیا ہے کیونکہ ان کے والد کا نام لطف اللہ یا لطف الہدیٰ تھا اور دادا کا محمد ثاقب ایسے ہی اس وعظ کے نام میں اسلام بھی ہے اور اعتصام بھی ہے اور نعمت پر بھی دلالت ہے جس سے وہ تمام عنوانات جمع ہو گئے جو اس آیت میں اختیار کئے گئے ہیں بہر حال اس جگہ اول تو اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (تو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) فرمایا گیا ہے جس میں تفویض کی کسی قدر تفصیل ہے پھر وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اور تم اسلام کے سوا کسی حالت میں جان مت دو) میں مجملاً تفویض کا ذکر ہے اس کے بعد پھر تفصیل ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (اللہ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو اور اللہ کے نام کو یاد کرو) میں کیونکہ مقصود کی علامت یہی ہے کہ اس کا ذکر شروع میں بھی

ہو۔ درمیان میں بھی ہو تو یہاں اول ترکیب ہے پھر جمع ہے۔ پھر تحلیل ہے جس کا لطف اہل علم کو خاص طور سے حاصل ہوگا۔ اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم بجز اسلام کے کسی حالت پر جان نہ دینا یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے) تو مشکل ہے خدا کی شان کے لائق تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے تو آیت میں تکلیف مالایطاق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حَقَّ تُقٰتِهٖ سے مراد غایۃ مَا تَقْدِرُوْنَ عَلَیْهِ (جس قدر تم اس پر قادر ہو) ہے کہ جتنا تم کر سکتے ہو اتنا تقویٰ کرو۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دوسری جگہ اس مضمون کو دوسرے سہل عنوان سے بیان فرمایا کیونکہ ہم سے اپنی اطاعت کے موافق بھی تو نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم استطاعت رکھتے ہو) جس میں بجائے قدرت کے استطاعت کا لفظ وارد ہے اور استطاعت کہتے ہیں قدرۃ یسیرہ کو نہ قدرت ممکنہ کو بعض صحابہ نے دوسری آیت کو پہلے کے لئے ناسخ فرمایا ہے اس سے بعض طلبہ خوش ہوئے ہوں گے کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ منسوخ ہو گیا چلو چھٹی ہوئی۔ ارے منسوخ تو وہ ہو جس میں نسخ کی قابلیت بھی ہو بھلا ایمان بھی کہیں منسوخ ہوا ہے اور اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) یہ اسی شان کا امر ہے جیسے اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (اللہ پر ایمان لاؤ) میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ تقویٰ حق تقاتہ کیا جائے اور مقتضائے عظمت بدل نہیں سکتا بلکہ بات یہ ہے کہ صحابہ کے عرف میں لفظ نسخ بیان تبدیل ہی کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر کو بھی نسخ کہتے ہیں پس قواعد شرعیہ کے اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کا مطلب ہی یہ تھا کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو یہ تو طالب علمانہ اشکال کا جواب تھا مگر افسوس یہ ہے کہ طلبہ تو صرف تفسیر میں پڑ گئے اشکالات اور شبہات حل کرنے کے درپے ہوگئے اصل مقصود پر نظر ہی نہیں کہ یہاں امر کس چیز کا ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہئے۔

صاحبو! ضرورت اس کی ہے کہ تمام مضامین کو سمیٹ کر مقصود کا پتہ لگایا جائے۔ جیسے ایک کابلی طالب علم نے جس نے ابتدا ہی سے شرح جامی شروع کی اور جب لوگوں نے کہا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں پہلے میزان و منشعب اور ہدایۃ النحو و کافیہ پڑھو پھر شرح جامی پڑھنا کہا کہ شرح جامی ان سب کتابوں کی ماں ہے اور وہ سب اس کے بچے ہیں اور ہم نے اپنی والدہ کو دیکھا تھا کہ جب وہ مرغی کے بچوں کو کھڈلے میں بند کرنا چاہتیں تو بچے بہت پریشان کرتے کوئی ادھر بھاگتا کوئی اُدھر آخر وہ مرغی کو پکڑ لیتیں تو سب بچے ساتھ ساتھ ہو لیتے۔ اسی طرح ہم نے شرح جامی کو پکڑ لیا ہے یہ آجائے گی تو سب کتابیں آجائیں گی۔ تو مضامین منتشرہ کے سمیٹنے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ اصل مقصود کا پتہ لگاؤ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں اصل مقصود ایک ہی ہے باقی سب اس کے عنوانات ہیں اب اگر تقویٰ کو اصل مقصود کہا جائے تو یہ بھی صحیح ہے کیونکہ مقصود کا یہ بھی ایک عنوان ہے مگر اس کا مصداق یہ تو بہت وسیع ہے جس کی تفصیل پر ہم کو قدرت نہیں اور ضرورت سمیٹنے کی ہے جس کے لئے مختصر حقیقت چاہیئے سو وہ حقیقت اسلام ہے یعنی یہاں حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اسلام یعنی تفویض پر مداومت رکھو کسی وقت اس کو ہاتھ سے نہ دو یہ ہے وہ چیز جس کو میں نے کہا تھا کہ وہ پریشانی کو بھی لذیذ کر دیتی ہے مگر وہ لذت مٹھائی اور حلوے جیسی نہیں بلکہ مرچوں بھرے کباب جیسی جس کی لذت وہی جانتے ہیں جو مرچ کھانے

کے عادی ہیں چنانچہ عارفین کو بھی ہر طرح کی مشقت و مصائب و آلام پیش آتے ہیں مگر ان کو اس میں بھی لذت آتی ہے اور وہ یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

پس یہ مت سمجھنا کہ تفویض کے بعد پریشانیاں یا پریشان کن واقعات پیش نہ آئیں گے ہاں یہ ضرور ہے کہ پہلے وہ ناگوار تھے اب خوشگوار ہو جائیں گے جیسے مرچ کھانے والے کو مرچوں بھرا کباب خوشگوار ولذیذ ہوتا ہے کہ روتا بھی جاتا ہے اور کھاتا بھی جاتا ہے یہاں ایک اشکال طالب علمی اور ہے اس کو بھی حل کر دوں۔ وہ یہ کہ اصولی قاعدہ ہے کہ امر و نہی کا تعلق امور اختیاریہ سے ہوتا ہے اور یہاں موت پر نہی وارد ہے جو غیر اختیاری ہے جواب یہ ہے کہ یہ کلام محاورہ کے موافق ہے محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ بے وفا بن کر جان مت دینا اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر وفادار رہنا اور اسی پر جان نکل جائے پس یہاں بھی گو ظاہر میں موت پر نہی وارد ہے مگر موت سے منع کرنا مراد نہیں بلکہ بے وفائی سے منع کرنا مقصود ہے اسی طرح آیت میں دوام اسلام کا امر مقصود ہے جس کو محاورہ کے موافق اس عنوان سے بیان کیا گیا ہے تقدیر یہ ہے دَاوِمُوْا عَلَى الْاِسْلَامِ حَتّٰى لَا تَمُوْتُوْا اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (دوام کرو اسلام پر اور تم اسلام کے سوا اور کسی حالت میں جان نہ دینا)

اب یہاں سے ایک خام صوفی کی غلطی ظاہر ہو گئی جس نے اس آیت

سے موت نفس کو ثابت کیا ہے جو صوفیہ کی اصطلاح ہے اور استدلال میں یہی کہا ہے کہ یہاں موت پر نہی وارد ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں وہ موت مراد نہیں جو غیر اختیاری ہے بلکہ اختیاری موت مراد ہے تو اس سے مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (مر جاؤ تم مرنے سے پہلے) کا مسئلہ ثابت ہوا تو سمجھ لو کہ یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ یہاں موت پر نہی وارد ہی نہیں جیسا ابھی بیان کیا گیا بلکہ وہ مسئلہ ایک حدیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا تھا یَا عَبْدَ اللّٰہِ اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَاِذَا اَمْسَیْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ عِدْ نَفْسَكَ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ۔

بہرحال یہاں مراد دَاوِمُوْا عَلَی الْاِسْلَامِ (اسلام پر مداومت کرو) ہے مگر اس کو لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اسلام کے علاوہ اور کسی حالت میں جان مت دو) کے عنوان سے اس لئے ظاہر کیا گیا کہ دَاوِمُوْا عَلَی الْاِسْلَامِ (اسلام پر مداومت کرو) کو سن کر عشاق پر مصیبت آجاتی کہ حکم تو دوام علی التفویض کا ہے اور ہم سے اس میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس عنوان میں ان کی تسلی کر دی گئی کہ اگر موت کے وقت بھی تفویض کامل ہو جائے تو کافی ہے عوام تو اس کو سن کر بے فکر ہو گئے ہوں گے کہ بس مرتے ہوئے تفویض کلی حاصل کر لیں گے ارے اس کے ساتھ یہ مقدمہ بھی تو ملاؤ کہ مرتے وقت تفویض کلی عادۃً اسی کو حاصل ہوتی ہے جو زندگی بھر اسی میں مشغول رہا ہو ورنہ موت کا وقت تو سخت نازک ہے وہ تحصیل نسبت وطے مقامات وتکمیل تفویض کا وقت تھوڑا ہی ہے کہ اسی وقت کام شروع کرو اور اسی وقت حاصل بھی کر لو اور یوں خلاف عادت حق تعالٰی جو چاہیں کر دیں جیسے عیسٰی علیہ السلام و آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کو بدون

ماں باپ کے بنا دیا، ورنہ عادت یہی ہے کہ بدون مرد و عورت کے مباشرت کے بچہ پیدا نہیں ہوتا اسی طرح عادۃ مرتے ہوئے انہی کے مقامات حاصل ہوتے ہیں جو زندگی بھر انہی کی فکر میں لگے رہے تھے۔

پس عوام کی بے فکری بے معنی ہے اور یہ شیطان نے ان کا راہ مار رکھا ہے کہ عمر بھر یہی پٹی پڑھاتا رہتا ہے کہ ابھی زندگی بہت ہے ذرا دنیا کے لطف اٹھا لو پھر خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کریں گے غرض تفویض وہ چیز ہے کہ ہر کام میں اس کی ضرورت ہے خواہ دنیا کا ہو یا دین کا۔ اہلِ باطن تو اس سے ابتدا ہی میں کام لیتے ہیں اور اہلِ دنیا بعد میں اس سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً کسی پر مقدمہ قائم ہو جائے اگر وہ صاحب باطن ہے تو اسی وقت سے معاملہ خدا کے سپرد کر دے گا اور جو نتیجہ ہو اس پر اول ہی سے راضی ہو گا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر کو چھوڑ دے گا کیونکہ تدبیر تفویض کے منافی نہیں یہ بھی اسی کا حکم ہے جس کا حق وہ تفویض ہے پس یہ تدبیر بھی کرے گا مگر اپنی طرف سے کوئی نتیجہ تجویز نہ کرے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے گا کہ جو ان کی رضا ہے میں اس پر راضی ہوں۔
دنیا دار بھی اخیر میں یہی کرتا ہے مگر وہ اول اول اپنی تدبیر پر نظر کرتا ہے اور اپنی طرف سے نتیجہ کی ایک شق متعین کر لیتا ہے کہ نتیجہ یوں ہونا چاہیئے۔ پھر جب ہار جاتا ہے تو کہتا ہے کہ تقدیر میں یوں ہی تھا میں خدا کی مرضی پر راضی ہوں اسی طرح ایک فرع اس کی مثلاً مدرسہ ہے جس کے چلانے کے لئے تدبیر کی بیشک ضرورت ہے مگر صاحب تفویض تو ابتدا ہی سے تفویض کرتا ہے اور تدبیر جو کچھ کرتا ہے محض سنت و اطاعت سمجھ کر کرتا ہے اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ تدبیر ضرور

کامیاب ہی ہو بلکہ وہ کامیابی اور ناکامی کو حق تعالیٰ کے سپرد کرکے کوشش کرتا ہے۔ اگر کامیابی ہوگئی تو اور ناکامی ہوئی تو وہ ہر حال میں خوش ہے اور جو شخص اس ارادہ سے تدبیر کرتا ہے کہ مجھے کامیابی ہی ہو اور جس طرح میں چاہتا ہوں مدرسہ اسی طرح چلے اس کی پریشانیوں کی کوئی حد نہیں رہتی کیونکہ جہاں کوئی بات ناگوار طبع پیش آئے گی اس کو اپنی ناکامی کا رنج ہوگا تو بتلاؤ کہ تفویض سے زیادہ راحت کا آلہ دنیا میں کیا ہے حضرت تلاش کرتے کرتے تھک جائیے گا اس سے بڑھ کر راحت کا آلہ کوئی نہ ملے گا مگر راحت کی نیت سے تفویض کرنا دین نہیں بلکہ دنیا ہے حقیقی تفویض وہ ہے جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا بلکہ محض رضاء حق کا قصد ہو ورنہ وہ مثال ہوگی۔

جیسے ایک دیہاتی نے مولوی صاحب کی ترغیب سے نماز شروع کی مولوی صاحب کا جو پھر وہاں گذر ہوا نماز کی نسبت پوچھا کہنے لگا کہ نماز سے بڑا پھایدہ (فائدہ) ہے جب ہی موندھا پڑوں (یعنی سجدہ کروں) جبھی بادی (ریح) خوب نکرطے (نکلے) آپ کو ریح کا مرض تھا اور سجدہ میں گوز اڑا یا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ فائدہ کس درجہ کا ہے۔ یوں ہی تفویض بقصد راحت سے بھی گو راحت حاصل ہوگی مگر یہ نفع قابل اعتبار نہیں۔ تفویض معتبر وہی ہے جس سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور کچھ مقصود نہ ہو۔ چنانچہ شیخ ابن عطاء اسکندری رحمۃ اللہ علیہ نے کسی کی حکایت لکھی ہے۔

کہ میں ایک بزرگ سے ملنے گیا تو وہ یہ دعا کررہے تھے کہ اے اللہ میں لذت تفویض سے پناہ مانگتا ہوں واقعی تفویض میں بڑی لذت ہے مگر اہل اللہ اس سے پناہ مانگتے ہیں کہ مبادا ہم لذت کی وجہ سے تفویض کررہے ہوں لیکن یہ ان بزرگ کا حال تھا تم

یہ بھی دعا نہ کرو کیونکہ لوگ بدون لذت کے تفویض نہیں کر سکتے
بس تم نہ لذت کا قصد کرو نہ اس کی نفی کی دعا کرو بلکہ یہ مذاق
رکھو ع

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست
(جو کچھ محبوب کی جانب سے پہونچے وہ بہتر ہے)

اب اگر لذت عطا ہو جائے تو یہ نعمت حق ہے اس سے گھبراتے
کیوں ہو اس سے پناہ نہ مانگو نہ اس کے دفع کی دعا کرو اور
لذت حاصل نہ ہو جب بھی راضی رہو اصحاب مقام یوں فرماتے
ہیں کہ اگر وہ چپت ماریں چپت کھالو اور پیار کریں تو پیار کرالو اور
اس کی لذت حاصل ہو تو اس کو نعمت سمجھو شاید کسی کو اس مقام پر
حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت سے شبہ ہو کہ
ایک دفعہ ان کی نماز تہجد ناغہ ہو گئی اس کا ان کو رنج ہوا اور اگلی
رات جاگنے کا زیادہ اہتمام کیا تو اس رات ایسی نیند آئی کہ صبح کی
نماز بھی قضا ہو گئی اب تو وہ سخت پریشان ہوئے الہام ہوا کہ
اے ابراہیم تم نے اپنی تدبیر کو دیکھ لیا اب تفویض کرو۔
(نَحْنُ إِذَا اَنَمْنَا وَقُمْ إِذَا اَقَمْنَا) (جب ہم سلائیں سو رہو جب
اٹھائیں اٹھ جاؤ ۱۲)

حضرت ابراہیم فرماتے ہیں فَفَوَّضْتُ فَاسْتَرَحْتُ کہ میں نے
تفویض کردی اور راحت میں ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے
کہ انھوں نے راحت کے لئے تفویض اختیار کی تھی جواب یہ ہے
کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس میں تو صرف ترتب راحت
کا ذکر ہے قصد استراحت پر کوئی لفظ دال نہیں مگر اس حکایت
سے جاہل لوگ خوش ہوئے ہوں گے کہ بڑا مزہ آیا۔ اب سے

ہم بھی نماز روزہ کے لئے اہتمام و تدبیر نہ کیا کریں گے بلکہ تفویض کر دیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ بہت اچھا پھر اللہ تعالےٰ تم کو سزا دیں گے اس وقت بھی تفویض کرنا۔

جیسے مثنوی میں ایک جبری کی حکایت مولانا نے لکھی ہے کہ وہ اختیار کا قائل نہ تھا۔ ایک دن وہ کسی شخص کے باغ میں جاکر انگور توڑ توڑ کے کھانے لگا مالک باغ نے جو دیکھا تو اس نے دھمکایا کہ یہ کیا کر رہا ہے، میرے انگور کیوں کھاتا ہے۔ کہا چُپ رہو۔ زمین بھی خدا کی، درخت بھی خدا کا، انگور بھی خدا کے میں بھی خدا کا۔ تو منع کرنے والا کون ہے۔ وہ باغ والا بھی ذہین تھا اس نے اپنے نوکر کو آواز دی کہ ایک کھٹکا اور ایک رسّا لاوہ لے آیا تو اُس نے اس جبری کو رسّے سے باندھ کر خوب مارا وہ چلّانے لگا کہ اللہ کے واسطے چھوڑ دے کہا چُپ رہ میں بھی خدا کا تو بھی خدا کا رسّا بھی خدا کا کھٹکا بھی خدا کا پھر کیوں چلّاتا ہے وہ کہنے لگا ؎

گفت توبہ کردم از جبر ای عیار
اختیار است اختیار است اختیار

(اس نے کہا کہ میں جبر سے توبہ کی اور اختیار کا قائل ہوا)

یاد رکھو تفویض کے معنی ترک تدبیر نہیں بلکہ تفویض کے معنے صرف یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے تدبیر کرے اور تدبیر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کرے۔ اور حضرت ابراہیم نے تدبیر فرض سے زیادہ تدبیر کی تھی اس لئے ان کو تنبیہ کی گئی کیونکہ خواص کو تدبیر فرض سے زیادہ کی اجازت نہیں ہوتی اور ہم کو تدبیر فرض سے زیادہ کی بھی اجازت ہے کیونکہ ہم گنوار ہیں اور گنواروں کے لئے وہ قواعد نہیں ہوتے جو خواص کے لئے

ہیں۔ جیسے ایک حکیم کا قصہ ہے کہ اس نے ایک گنوار کو دیکھا کہ چنے کی چار پانچ روٹیاں کھا کر اوپر سے چھاچھ کا بنٹا پی رہا ہے حکیم نے کہا کہ چھاچھ کو کھانے کے درمیان میں پینا چاہیئے اخیر میں پینا مضر ہے۔ گنوار نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ ارے فُلاتے ایک چار ٹکڑ (یعنی روٹی) اور لیا اسے چھاکو بیچ میں کر لوں یو (یہ) حکیم کہہ رہا ہے۔ چنانچہ وہ چار پچنگ اور کھا گیا۔ حکیم صاحب نے یہ منظر دیکھ کر کہا چودھری جی تمہارے واسطے کوئی قاعدہ قانون نہیں تم چاہے بیچ میں پیو یا اخیر میں۔ اسی طرح ہمارے واسطے یہ قاعدہ نہیں کہ تدبیر فرض سے زیادہ تدبیر نہ کریں بلکہ ہم تو جب فرض سے زیادہ کریں گے جب فرض تک پہونچیں گے۔

غرض اس میں شک نہیں کہ تفویض سے دنیا کے کاموں میں بھی راحت ہے اور دین کے کاموں میں بھی۔ دنیا میں مقدمہ اور مدرسہ کی مثال تو گذر چکی۔ ایک اور مثال لو۔

مثلاً تم اپنے لڑکے کا رشتہ کر رہے ہو اور کامیابی نہیں ہوتی اس سے رنج ہوگا کیونکہ تفویض نہیں تھی تم نے اپنی طرف سے ایک شق تجویز کر لی تھی کہ یوں ہونا چاہیئے اور اگر ابتدا ہی سے تجویز نہ کرتے بلکہ تفویض کرتے تو ہرگز ناکامی سے رنج نہ ہوتا یا کوئی عزیز مریض تھا تم اس کے لئے تعویذ لے گئے اور نفع نہ ہوا تو اس وقت بھی رنج ہوگا کیونکہ تفویض نہ تھی بلکہ اس اعتقاد سے تعویذ لیا گیا تھا کہ بس اس کے باندھتے ہی آرام ہو جائے گا۔ اگر تفویض ہوتی تو اول ہی سے ہر شق پر راضی ہوتے اور وہ تعویذ تفویض ہو جاتا۔

آجکل مدرسہ دیوبند میں ایک شور برپا ہے سخت شورش

ہو رہی ہے (کہ وہ لوگ جن کو مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے باپ بنکر پالا پرورش کیا پڑھایا لکھایا اور تدابیر سے ان کو بڑا بنایا آج وہ انہی کے مقابلہ میں بڑائی جتلا رہے ہیں اور ان کے ہاتھ سے مدرسہ کا اہتمام لینا چاہ رہے ہیں اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ایسے بے نفس ہیں کہ مدرسہ کے اہتمام سے استعفاء دینے کو آمادہ ہو گئے کہ جب میری خدمت لوگوں کو پسند نہیں تو میں ہی الگ ہو جاؤں لیکن اراکین مدرسہ نے ان کو اس خیال سے روک رکھا ہے ۱۲ جامع) اور اس شورش کے رفع کرنے میں مہتمم مدرسہ اور اراکین سب کوشاں ہیں مگر میں نے مہتمم صاحب کو لکھدیا ہے کہ تم اسیوقت سے ہر نتیجہ کے لئے آمادہ ہو جاؤ یہ تجویز ذہن میں نہ کرو کہ مدرسہ رہے یا تمہارے ہاتھ میں رہے بلکہ اگر مدرسہ ٹوٹ جائے یا بند ہو جائے تو تم ابھی سے اس پر راضی ہو جاؤ اور خدا پر نظر کر کے قوت کے ساتھ اپنے اصول پر قائم رہو۔ اور یہ قوت بدون تفویض کے پیدا نہیں ہو سکتی اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر نہ کرو کیونکہ تفویض ترک تدبیر کا نام نہیں چنانچہ میں کہہ چکا ہوں کہ تدبیر بھی اسی کا حکم ہے جس کے لئے تم تفویض کر رہے ہو دلیلہ الصریح وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (اس کی صریح دلیل یہ ہے واعدوا لہم یعنی اور ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو ان پر جو اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں) بس تفویض یہ ہے کہ تدبیر کرو مگر اس پر نظر نہ کرو اور اپنی تجویز سے کوئی شق نتیجہ کی متعین نہ کرو کہ یوں ہونا چاہیئے۔

میرے اس لکھنے کا یہ اثر ہوا کہ مہتمم صاحب بڑے مضبوط ہو گئے اور لکھتے ہیں کہ تیری وجہ سے ہمیں بہت قوت ہو گئی۔

میرے ایک اور دوست ہیں ان کے ذمہ قرض بہت ہو گیا ہے بنئے نالش کرنا چاہتے ہیں اس سے وہ بیچارے بڑے پریشان ہو رہے تھے مجھے بھی اپنی پریشانی لکھی۔ میں نے لکھا کہ پریشان کیوں ہوتے ہو آخر وہ نالش کر دیں گے تو کیا ہو جائے گا بہت سے بہت تم کو قید کرا دیں گے تو تم قید خانہ میں چلے جانا

یا زمین و مکان نیلام ہو جائے گا تم زمین و مکان نیلام کرا دینا جس خدا نے اب تک روزی دی ہے وہ پھر بھی روزی دے گا تم اپنی طرف سے اسی وقت ہر نتیجہ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اس کے بعد مقدمہ میں تدبیر اس کی کرو کہ قرض کی قسطیں ہو جائیں یہ خط پڑھ کر ان کو ایسا سکون و اطمینان ہوا کہ اب لکھتے ہیں کہ یوں جی چاہتا ہے کہ سب قرضخواہوں سے کہدوں کہ سب مل کر نالش کر دو جو ہونا ہوگا ہو جائیگا میں نے لکھا کہ ایسا بھی نہ کرنا کہ یہ بھی خلاف تفویض ہے اپنی طرف سے تم نہ بلا تجویز کرو نہ راحت بلکہ جو وہ تجویز کر دیں اس پر راضی رہو۔ حضرت یہ نسخہ اکسیر میں نے ایسا بتلا دیا جس سے نہ اہل دنیا کو استغنا ہے نہ اہل دین کو نہ علماء کو استغناء ہے نہ عرفاء کو بلکہ تمام عالم اس کا محتاج ہے اور اس کی زیادہ قدر ان سالکین کو ہوگی جو کسی بلائے باطنی میں پھنسے ہوئے ہوں کیونکہ بعض حالات سالکین کو ایسے پیش آتے ہیں کہ اگر پہاڑ پر رکھے جائیں تو پہاڑ پھٹ جائیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسماں بار امانت نہ اٹھا سکا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام آیا)

یہ روح انسانی ہی کی طاقت ہے کہ وہ ایسے ثقیل وشدید امور کا تحمل کرتی ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا اور ایک آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس تو یہ باعتبار مادۂ انسانی کے ہے سو اس میں کیا شک ہے کہ مادۂ انسان مادہ سموات سے اضعف ہے لیکن روح انسانی اَشَدُّ مِنَ الْجِبَال (پہاڑوں سے زیادہ سخت) ہے روح انسان کی قوت سمٰوٰت و ارض سب سے زیادہ ہے جس کا تجربہ سالکین کو ہوتا ہے جن پر یہ احوال شدائد گذرتے رہتے ہیں اور اس وقت تفویض کے سوا کوئی آلہ راحت کا نہیں بس سالکین تفویض کر کے دیکھیں ان شاء اللہ سب شدائد کا تحمل آسان ہو جائے گا اور نہ بھی آسان ہو تو تفویض کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

باغباں گر چند روزے صحبت گل بایدش　　بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
(باغبان کو اگر چند روز گل کی صحبت چاہیئے تو خار ہجران کی زیادتی پر بلبل کا سا صبر درکار ہے)

اگر کبھی وصال کے بعد فراق ہو جائے تو صبر سے کام لو تفویض کرو۔ اگر تجلی جمال کے بعد تجلی قہر و جلال ہو تو اس وقت بھی تفویض سے ہی کام لو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ مجھے چین کیونکر ہو، اسرافیل صور منہ میں لئے ہے اور کان جھکائے حکم کا منتظر ہے کہ ذرا حکم ہو تو عالم کو درہم برہم کر دوں۔ صحابہ اس کو سن کر لرز گئے گھبرا گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے) یعنی گھبراؤ نہیں بلکہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کہو یعنی تفویض کرو اور خدا پر نظر رکھو۔ ارے جب سارے راستے ان کے ہی قبضے میں ہیں اور تم کہیں سے نکل کر بھاگ نہیں سکتے تو اب بجز تفویض کے چارہ ہی کیا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

اے حریفان راہ ہا را بست یار　　آہو لنگیم و او شیر شکار
(اے حریفو یار نے تمام راستے بند کر دیئے ہیں ہم لنگڑے ہرن کی طرح اور شکار کے ہرن کی طرح ہے)

واللہ سارے راستے بند ہیں تم کہیں ان کے قبضہ سے باہر نہیں جا سکتے بس ہماری ایسی مثال ہے جیسے لنگڑا ہرن شیر کے پنجہ میں ہو اب بتلاؤ لنگڑا ہرن شیر کے پنجہ سے چھوٹنے کی کوشش کرے تو یہ اس کی حماقت ہے یا نہیں بس اس کی خیر اسی میں ہے کہ اپنے کو شیر کے سامنے ڈالدے اور اس کے ہر تصرف پر راضی ہو جائے خواہ کھالے خواہ چھوڑ دے ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ　　در کف شیر نر خونخوارۂ
(سوائے تسلیم و رضائے کوئی چارہ نہیں تم مثل خونخوار شیر نر کی مٹھی میں ہو)

ہائے اللہ ہائے اللہ اے اللہ اے اللہ (صاح الشیخ و بکی و ولول و اضطرب اضطرابا شدیدا لم نشاھدہ بہ قط) شیخ چلائے اور روئے اور سخت مضطرب ہوا سے پہلے کبھی ایسا مشاہدہ نہیں ہوا، دیر تک خاموش رہنے کے بعد فرمایا کہ (جامع) واللہ بجز تسلیم ورضا کے کچھ چارہ نہیں ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ در کف شیر نرِ خونخوارۂ

آہوئے لنگ کو یہی چاہئے کہ اپنے کو شیر کے آگے ڈالدے اور اپنا ضعف و عجز ظاہر کرے اب یہ ہوگا کہ شیر اس پر رحم کرکے خود اس کی پرورش کرے گا اور جنگل سے شکار لاکر اس کے آگے ڈالیگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہی علاج بتلایا ہے قُولُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (کہو ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے) جس پر وعدہ ہے ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شیء قدرا (۱) اس شعر کے بعد حافظ فرماتے ہیں ؎

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

یعنی تمہاری مثال ایسی ہے جیسے مرغ جال میں پھنسا ہوا ہو اس کو تحمل ہی چاہئے کہ صبر و سکون کے ساتھ پابزنجیر ہو جاوے ورنہ جتنا پھڑپھڑائے گا اور زیادہ پھنسے گا (تڑپوگے جتنا جال کے اندر، جال گھسے گا کھال کے اندر) اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار
کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(اندر عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل و تدبیر چاہئے)

یعنی تدبیر کے درپے ہونا اور اسی فکر میں رہنا غلام کا کام نہیں یہ کام بادشاہوں کا ہے اور تم بادشاہ نہیں ہو بلکہ غلام ہو بادشاہ صرف ایک ہے اور سب اس کے غلام ہیں۔ پس ان تدابیر پر نظر کرنا چھوڑ دو خدا پر نظر رکھو آگے علم و عمل پر بھروسہ

کرنے کو منع فرماتے ہیں ؎

تکیہ بر تقوی و دانش در طریقت کافریست
راہرو گرصد ہنر دارد توکل بایدش

(طریقت میں عقل و تقویٰ پر بھروسہ کرنا کفر ہے سالک اگر سو ہنر جانتا ہو پھر اس کو توکل یعنی اپنے کو اہل اللہ کے سپرد کرنا چاہئے)

یہاں بڑے بڑے متقی اور عارف سالک کو توکل ہی لازم ہے اسی سے کام چلے گا ورنہ جہاں اسنے اپنی عقل یا تقوی پر اعتماد کیا اور تباہ ہوا حضرت یہی ہے تفویض اور یہی حقیقت ہے اسلام کی اور اسی کا حکم ہے اس آیت میں لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سوائے اسلام کے اور کسی حالت میں مت جان دو) مگر ہم نے اسلام کا صرف لفظ یاد کرلیا ہے اس کی حقیقت پر کبھی نظر نہیں کی جن کو طریق احوال پیش آتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ جہاں تدبیر کے پیچھے پڑے اور اس پر نظر کی وہیں پریشانی اٹھائی اور جب تفویض کی فوراً ہلکے پھلکے ہوگئے اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا کوئی یوں کہہ رہا ہے ؎

من غم تو می خورم تو غم مخور بر تو من مشفق ترم از صد پدید

(میں تیرا غمخوار ہوں تو غم مت کر میں تجھ پر سیکڑوں باپوں سے زیادہ شفیق ہوں)

پس ہمیشہ کے لئے یہی دستور العمل بنالو کہ شریعت نے جس تدبیر کی اجازت دی ہے خواہ دین کے متعلق ہو یا دنیا کے وہ کرکے آگے نتیجہ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردو بس اسی سے نجات ہوگی اب میں تمام دنیا سے کہتا ہوں کہ کوئی اس سے بہتر نسخہ تو لائے ذرا ہم بھی دیکھیں ان شاء اللہ قیامت آجائے گی اور اس سے بہتر نسخہ کوئی نہ لاسکیگا اسی کو حق تعالیٰ اس جگہ بیان فرماتے ہیں وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سوائے اسلام اور کسی حالت میں جان مت دو) اس کے بعد فرماتے ہیں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کہ اللہ کی رسی کو (یعنی قرآن واحکام قرآن کو جس میں حدیث و فقہ بھی سب شامل ہیں کیونکہ سب اسی ایک متن کی شروح ہیں) مضبوط پکڑلو اور آپس میں افتراق نہ کرو کیونکہ اس سے

دین کو بھی سخت ضرر پہونچتا ہے جس کی بنا پر حدیث میں فساد ذات البین کو حالقہ فرمایا گیا ہے کما تقدم، وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا اور اللہ کی اس نعمت کو اپنے اوپر یاد کرو کہ تم پہلے باہم دشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈالدی جس سے تم بھائی بھائی ہوگئے (یہ تو دنیوی نعمت ہے) وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا اور تم جہنم کے گڑھے کے کنارہ پر کھڑے تھے کہ جہنم میں جانے کے لئے صرف مرنے کی دیر تھی کہ اللہ تعالےٰ نے تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اس سے بچالیا یہ دینی نعمت ہے) ان نعمتوں کو یاد کرکے ان کا شکر ادا کرو اور شکر وہی ہے کہ حبل اللہ کو مضبوط پکڑ لو یہ تو ترجمہ تھا اور مقصود ظاہر ہے کہ حبل اللہ اسلام ہے اور اسلام کی حقیقت تفویض ہے جو تمام حالات کو شامل ہے خواہ حالات آفاقیہ ہوں خواہ نفسیہ ہوں پھر انفسیہ میں خواہ احوال حسیہ ہوں جیسے مرض وصحت و قوت وضعف خواہ باطنیہ ہوں جیسے قبض وبسط ہیبت وانس ومحبت وشوق وامثالہا سب کو اپنے سر آنکھوں پر رکھے پس مقصود یہ ہوا کہ ہر حال میں تفویض پر مداومت رکھو چونکہ مجھے اس مضمون سے خود بہت نفع ہوا ہے اس لئے میں نے دوستوں کو بھی اس سے مطلع کرنا چاہا۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالےٰ ہم کو یہ دولت عظمیٰ نصیب فرمائیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ آمین وصلے اللہ علے سیدنا خیر خلقہ محمد وعلے الہ واصحابہ وازواجہ وذریتہ اجمعین واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین۔

تمت

الابقاء کی توسیع اشاعت کے لئے جدید خریدار بناکر الابقاء کی امداد فرمائیں

جزاکم اللہ تعالیٰ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ وَأْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِہَا

چوں آیت مزبورہ بمعنا ہا دال ست

برضرورت حدود ۔ دربر مقصود

وعظ

آداب التبلیغ

مشتمل برحدود مقصودہ تبلیغ بود۔ افادۃً للمبلغین

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ــــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی نمبر ۱

وعظ مسمّیٰ بہ

آداب التبلیغ

این	کہاں ہوا	مدرسہ دار العلوم دیوبند ضلع سہارنپور
متیٰ	کب ہوا	۱۰ ذوالحجہ سنہ ۱۳۳۴ھ بروز جمعرات
کم	کتنی دیر ہوا	دو گھنٹے ۴۵ منٹ
کیف	کیونکر ہوا	کرسی پر بیٹھ کر
لم	کیوں ہوا	جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم مدرسہ مذکور کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	آداب تبلیغ اور شکایت کم توجہی کی
من ای شان	کس طبقے کیلئے زیادہ مفید تھا	زیادہ تر علماء اور طلباء کے لئے
من ضبط	کس نے ضبط کیا	مولوی اطہر علی سلہٹی
المستمعون	سامعین کی تعداد	تقریباً ایک ہزار
الاشتات	متفرقات	.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا وخطبہ کے بعد - امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین ٥ جس مضمون کو اس وقت میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ کوئی نیا مضمون نہیں مگر ایک اعتبار سے نیا بھی ہے یعنی اصل وحقیقت کے اعتبار سے تو جدید نہیں ہاں عارض کے اعتبار سے جدید ہے یعنی واقع میں تو یہ پرانا ہے مگر اس کا جو مقتضا تھا اس میں آجکل کمی ہے۔ اُس کمی کو دور کرلے اور اس کے حقوق کما ینبغی پر آگاہ کرنے کے لئے یعنی جس درجہ اس کا اہتمام ہونا چاہیئے تھا اور آجکل وہ نہیں ہے اس اعتبار خاص سے جدید بھی کہا جا سکتا ہے

چنانچہ اس کے تعیین سے معلوم ہو جائے گا کہ اس میں آجکل کس قدر کمی ہے اور حقیقت میں اس میں کیسا اہتمام ہونا چاہیئے تھا اور ہر چند کہ بیان میں کوئی نیا مضمون ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک اعتبار سے جدید ہونا مضر بھی ہے کیونکہ جدید وہ ہوگا جو بدعت ہو اور دین سے خارج اور زائد ہوا اور جو پہلے سے دین کا جزو ہو وہ تو قدیم ہی ہوگا لہٰذا انتظار مضمون جدید کا علی الاطلاق تو غلطی ہے۔ مگر عام لوگوں کا طبعًا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وعظ میں کوئی نیا مضمون ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں جی لگتا ہے اس مصلحت کا لحاظ فی الجملہ کر کے جی چاہا کرتا ہے کہ بیان میں گو نہ جدت ہو تو اچھا ہے خواہ جدید اس اعتبار سے ہو کہ اب تک سامعین کو بالکل معلوم ہی نہیں ہوا یا توجہ کے درجہ میں جدید ہو یعنی معلوم تو ہے مگر ادھر توجہ نہیں رہی اس لئے بیان میں اس جدت خاص کے اعتبار سے اس کی رعایت کی جاتی ہے کہ کوئی نیا مضمون ہو ورنہ جدید ہونے کی ضرورت نہیں حتیٰ کہ اگر کسی قسم کی جدت بھی نہ ہو خواہ بالذات یا بالعرض بیان پھر بھی مفید ہوتا ہے اگر یہ شبہ ہو کہ جب کسی قسم کی بھی جدت نہیں تو اس بیان سے کیا فائدہ یہ تو تحصیل حاصل ہے سو یہ کہنا غلط ہے کیونکہ اگر اور کچھ فائدہ نہ ہو تو مکرر کرنے سے تاکید ہی ہو جائے گی اور تاکید کا مفید و مؤثر ہونا علم بلاغت میں ثابت ہے تو یقینًا تکرار سے ایک نیا نفع ہوگا یعنی تاکید کا اثر جو کہ قبل از بیان نہیں تھا تو یہ کیا تھوڑا فائدہ ہے تو تحصیل حاصل کہاں ہوئی بلکہ یہ تو تحصیل غیر حاصل ہے مگر تاہم عمومًا طبعی اقتضاء یہ ہے کہ ایسی بات بیان ہو جو پہلے سے بالکل ذہن میں نہ تھی خواہ حصول کے اعتبار سے کہ وہ چیز ذہن میں حاصل ہی نہ تھی یا ذہول کے اعتبار سے کہ حاصل تو تھی مگر اس سے ذہول ہو گیا تھا اس کی طرف توجہ نہ تھی تو اس طبعی اقتضاء کو دیکھ کر بعض دفعہ جی چاہا کرتا ہے کہ اگر اس کی رعایت کی جائے کہ مضمون میں گو نہ جدت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں چنانچہ اس وقت بھی اس کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ مضمون خاص اعتبار سے نیا ہے اب اس کو متعین کرتا ہوں اہل علم

کو تو آیت کی تلاوت ہی سے اس مضمون کی تعیین ہو گئی ہو گی کیونکہ مجمع اہل علم کا ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض لوگ جو اہل علم نہیں نہ سمجھے ہوں اون کا ترجمہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا اس لئے ترجمہ کرتا ہوں تاکہ ان کے نزدیک بھی متعین جائے۔ حق تعالے فرماتے ہیں ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین۔ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ بلائے اور (اگر مجادلہ کی ضرورت ہو تو) ان سے مجادلہ (بھی) کیجئے (مگر) احسن طریقہ سے (ہو) ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ کیا مضمون بیان کرتا ہے وہ مضمون خدا کے سبیل کی طرف بلانے کا ہے خدا کا سبیل کیا ہے سبیل رب وہ ہے جس سے ان تک رسائی ہو جائے اور ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ وہ سبیل صرف اسلام ہے اگر انسان اسلام کے احکام بجا لاتا ہے تو اس کو ان تک رسائی ہو سکتی ہے اور یہی سبیل رب ہے اسی کی طرف لوگوں کو بلانے کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو امر ہوا ہے اور اسلام کے اندر احکام دو قسم کے ہیں ایک اصولی ایک فروع لفظ سبیل دونوں کو عام ہے مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو اصول کی بھی دعوت کیجئے اور فروع کی بھی تو خلاصہ یہ نکلا کہ اصول اور فروع پر بتلا کر ان کو اسلام کی طرف بلائے باقی دعوت کا ایک طریقہ ہے وہ اس کے متعلقات سے ہے یعنی اس کے آداب اور لوازم جن کا ذکر اپنے موقعہ پر آجائیگا مگر تعین مضمون کے واسطے اتنا ہی کافی ہو گیا کہ وہ مضمون اسلام کی طرف بلاتا ہے اور اسلام ہی دین حق ہے وہی سبیل رب ہے وہی صراط مستقیم ہے یہ اس کے القاب ہیں اور ظاہر ہے کہ گو یہاں ادع کا خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سب اس کے مخاطب ہیں۔ ہاں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خطاب اولاً ہے اور دوسروں کو ثانیاً۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس

حکم کی طرف توجہ ہے یا نہیں تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں اعتقاداً تو اس کو مامور بہ سمجھتے ہیں بلکہ اگر اس میں بھی غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے، اس کو درجہ وجوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے کوئی مستحب سمجھتا ہے اور کوئی مستحسن اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ کسی مصلحت سیاسیہ وغیرہ کے خلاف نہ ہو ورنہ وہ بھی ندارد اول تو یہی غضب تھا کہ بعض نے واجب کو مستحب کہا پھر یہ دوسرا غضب ہے کہ اس میں یہ قید لگادی کہ مصلحت کے خلاف نہ ہو وہ کیوں محض اپنے اغراض کے سبب کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں کہ یہ اس کے بھی موافق ہیں یا نہیں اگر ہوا فبہا ورنہ کھینچ تان کر اس کو اغراض کے تابع بناتے ہیں اور اغراض کو متبوع یعنی پہلے اغراض تجویز کر لئے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف پھر وہ غرض جہاں دہ فوت ہونے لگی کہد یا کہ یہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے، لہذا مستحب بھی نہیں رہا اب اس کو اصلاً مامور بہ بھی نہیں سمجھتے بلکہ عجب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ بتلانے لگیں افسوس مسلمانوں سے یہ نہیں ہوتا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں کہ اصل تو یہی ہے وہ سرانجام پا جائے پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں مگر افسوس یہ نہیں کرتے بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لئے دعوت الی الاسلام کا نام فتنہ اور فساد رکھا ہے، اور یہی وجہ ہے بے توجہی کی کہ اس میں اپنی اغراض کی وجہ سے بے حد تساہل کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی اور ایسے بہت نکلیں گے تو ہماری یہ ہمت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہدیں کہ صل فانك لم تصل اور اس کی وجہ صرف اتباع ہوئی ہے

لہ اشارہ ہے پرستاران تحریکات جدیدہ کے معاملات کی طرف ۱۲

اس لئے باوجود علم کے محض رکیک تاویلیں گھڑ لیتے ہیں مگر خدا کے ساتھ یہ حیلہ و تزویر چل نہیں سکتا بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ ولوالقٰی معاذیرۃ ۰ اگر انصاف سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اصل میں دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے، امر بالمعروف نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیوی اغراض فوت ہوتے ہیں دوستی نہیں رہے گی میل ملاپ نہیں رہے گا ہنسی خوشی جاتی رہے گی اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو وہ ناخوش ہو جائے گا۔ پھر ناخوش ہو کے آزار کے درپے ہو جاوے گا۔ پھر آزار سے ہم کو تکلیف ہوگی اور یہ آزار و تکلیف بھی سب وہمی محض ایسے مواقع کے متعلق وزرا علماء سے تو دریافت کرلو کہ صاحب امر بالمعروف میں اگر ایسی ایسی باتیں پیش آدیں تو ایسی حالت میں ہم معذور ہیں یا نہیں اُن سے پوچھو تو کہ کون کون سی چیزیں سقط وجوب امر ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں اس کے لئے کوئی شرط و ضابطہ ہی نہیں ہے اور ضرور ہے مگر شرائط و ضوابط و آداب و اعذار علماء سے دریافت کرو خود مفتی بن کر کیوں فتویٰ لگا لیا کہ ہم تو معذور ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط و آداب کا طالب حقیقی بھی وہی ہوگا جس نے پکا ارادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کر لیا ہو، اس کو البتہ حق ہے شرائط و ضوابط پوچھنے کا وہ اگر آداب و اعذار معلوم کرے تو اس کو سب کچھ بتلایا جاوے گا باقی حالت موجودہ میں جبکہ اس کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں اس حالت میں آپ کو اعذار و شرائط پوچھنے اور سمجھنے کا بھی کچھ حق نہیں جو شخص کام کا ارادہ ہی نہ کرے، اس کو نہ شرائط ضوابط بتلائے جائیں گے اور نہ اس کو آداب و اعذار پوچھنے کا کوئی حق ہے وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط و اعذار اس لئے تلاش کرے گا تاکہ امر بالمعروف کرنا نہ پڑے بلکہ کسی طرح اس سے مخلصی اور رہائی مل جاوے جب اعذار معلوم ہو جائیں گے تو کوئی نہ کوئی بات تراش لیگا کہ مجھ میں یہ یہ عذر موجود ہیں یہ شرطیں مجھ میں نہیں پائی جاتی ہم کیسے امر بالمعروف کریں اس لئے علماء کو چاہئے کہ

قبل از شروع عمل کسی کو اعذار و شرائط بتلایا ہی نہ کریں جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا ہے کہ نماز کے شرائط کیا ہیں، اس کے اعذار و موانع کیا کیا ہیں ایسے شخص کو شرائط و اعذار نہ بتانا چاہیئے ورنہ وہ تو مسقط صلوٰۃ کو ہر حالت میں تلاش کرے گا ہر وقت اسی دھن میں رہے گا کہ کوئی بات ایسی ہو جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جاوے البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا وہ پوچھے تو اس کو بیشک بتلایا جاوے لیکن اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ محض مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیئے ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دے بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو عذار و موانع کی اطلاع کرنا جائز بھی نہ ہوگا یاد رکھو ہر سائل کو یکساں جواب دینا مناسب نہیں کیونکہ ہر شخص کا حال برابر نہیں۔

مجھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جواب بہت پسند آیا ایک دن درس میں یہ حدیث آئی کہ من صلی رکعتین مقبلا علیھما بقلبہ الخ کہ جو شخص ایسی دو رکعت نماز پڑھے جن کی طرف دل سے متوجہ ہو کر حدیث نفس اور وسوسہ خطرہ عمداً بالکل نہ لاوے تو اس کے تمام گناہ معاف ہو جاویں گے ایک طالب علم نے کہا حضرت اس طرح نماز پڑھنا ممکن بھی ہے نماز میں تو خیالات بہت ہی آتے ہیں۔ فرمایا تجھ کو شرم نہ آئی یہ سوال کرتے ہوئے، ارے کبھی اسکا قصد بھی کیا تھا جو محال نظر آیا ہو بس پہلے ہی پوچھنے بیٹھ گئے میاں کبھی ارادہ بھی تو کیا ہوتا۔ خدا کے بندے پہلے کرتے پھر پوچھتے کہ ہم نے کیا تھا مگر نہ ہوا تو واقعی یہ جواب نہایت حکیمانہ و بزرگانہ ہے واقعی جواب محض منطقیانہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ حکیمانہ جواب بھی دینا چاہیئے اس سے اثر ہوتا ہے چنانچہ مولانا کے ارشاد سے نفع یہ ہوا کہ سائل کو تنبہ ہوا اپنی غلطی پر اسے ندامت و خجلت ہوئی اس لئے میں کہتا ہوں کہ شرائط علماء سے پوچھنا جائز بھی ہے اور ان کو بتلانے سے بھی انکار نہیں مگر یہ دیکھنا چاہیئے کہ مستفتی کون ہے آیا وہ شخص ہے جو ارادہ رکھتا ہے امر بالمعروف کا جس کو اس کا اہتمام ہے عزم ہے جس کو واقعی یہ حالات

واعذار پیش آویں گے اس کو بیشک ہر حالت کے آداب واعذار معلوم کرنا چاہیئے کیونکہ اس کو یہ امور پیش آویں گے یا مستفتی وہ ہے جس کا نہ کبھی ارادہ ہوا امر بالمعروف کا اور نہ آئندہ ہوگا بلکہ ظالم کا یہ قصد ہے کہ عمر بھر کبھی کسی کو کچھ نہ کہوں گا کیونکہ دوسرے کی دل شکنی کروں محض اپنے بچاؤ کے واسطے شرائط معلوم کرتا ہے تاکہ ان کو آڑ بنا وے اس لئے صرف مسقطات کی فہرست جاننا چاہتا ہے تاکہ ہر حالت میں جی کو سمجھالے ایک تاویل کھڑے اور ہر حال کے لئے ایک من گھڑت عذر تراش لے، صاحبو امر بالمعروف بھی ایک فرض ہے جیسے اور فرائض ہیں اور کوئی ایسی حالت نہیں جس میں فرائض ساقط ہوسکیں بجز جنون واکراہ وغلبۂ عقل اور خاص خاص اعذار کے باقی کسی حال میں فرائض ساقط نہیں ہوتے اور مغلوب العقل بھی وہی معتبر ہے جس کو شریعت مغلوب العقل تسلیم کرلے، تمہاری من گھڑت تفسیر کا اعتبار نہیں حیرت کی بات ہے کہ ایک قصبہ میں ایک شخص نے اپنی عورت کو طلاق مغلظ دی تھی عدت بھی گذر چکی تھی اس کے بعد ایک مفتی آئے انھوں نے اس کو سمجھایا اور کہا کہ طلاق واقع ہونے کے لئے عقل شرط ہے اور تم تو اس وقت مغلوب العقل تھے بس اس تاویل سے حرام عورت حلال کرلی، اور ان کے نزدیک حلال بھی ہوگئی تو اس طرح جس کا جی چاہے دعوے کردے مغلوب العقل ہونے کا پھر تو سارا جہان مغلوب العقل ہوجائے گا مثلاً امر بالمعروف کرنے میں اصل تو تعلقات شگفتہ نہ رہنے کا خوف تھا مگر تاویل کرلی کہ میں بغض فی اللہ کے سبب ہوش باختہ ہوگیا تھا اس لئے امر بالمعروف نہ کرسکا یا طمع تھی کسی چیز کے ملنے کی مگر وہاں بھی وہی تاویل گھڑ لی۔ صاحبو اس سے کچھ نہیں ہوتا ان تاویلات کا جو تمہاری تراشی ہوئی ہیں کچھ اعتبار نہیں تمہارے فتوے سے امر بالمعروف ساقط نہیں ہوسکتا، یہ نہیں کہ جو تمہارا دل چاہے وہی ہوجاوے تمہاری رائے معتبر نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

کسی صاحب کمال سے پوچھنا چاہیئے اگر وہ کہدے کہ تم معذور ہو تو ٹھیک ہے ورنہ تمہارے خیالات کا یا جہلاء کے کہنے کا کچھ اعتبار نہیں کسی صاحب بصیرت کی شہادت ہونی چاہیئے ورنہ اس طرح تو ہر شخص کوئی نہ کوئی عذر تراش لے گا غرض پہلے ہر شخص قلب کو ٹٹول کر دیکھ لے کہ امر بالمعروف کا قصد ہے یا کہ قصد نہیں محض اس سے رہائی اور مخلصی ہی چاہتا ہے اگر قصد ہو تو وہ بیشک اس کے آداب واعذار و شرائط سیکھے علماء سے پوچھ کر یا کتاب سے دیکھ کر اس لئے کہ امر بالمعروف کا حکم علی الاطلاق نہیں ہے کہ جس طرح ہوا اندھا دھند دعوت و تبلیغ کردو کہ نہ شرائط کی پرواہ نہ آداب کی رعایت بلکہ اس کے لئے ضوابط اور طرق مقرر ہیں کیونکہ امر بالمعروف فرضیت میں نماز سے تو بڑھ کر نہیں بلکہ برابر بھی نہیں اور اسی لئے قرآن میں اقامت صلوٰۃ کے بعد امر بالمعروف کا حکم ہے اقم الصلوٰۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر مگر پھر بھی نماز کے لئے کچھ آداب واعذار و ضوابط ہیں یہ نہیں کہ جو نماز پڑھنا چاہے اس کے لئے کوئی ضابطہ ہی نہیں نہ وضو کی ضرورت نہ ستر عورت کی نہ قرارت کی نہ پاکی کا خیال نہ استقبال قبلہ کی ضرورت یہ نہیں بلکہ اگر نماز پڑھنا ہے تو اول قرارت سیکھو، ناپاک ہو تو نہاؤ قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر کھڑے ہو۔ یہ فرائض ہیں نماز کے کہ بغیر ان کے نماز ہوتی نہیں تو جیسے نماز فرض ہے اور پھر بھی اس کے لئے شرائط وارکان وغیرہ ہیں ایسے ہی امر بالمعروف کے لئے بھی کچھ قواعد و آداب ہیں۔ علماء سے ان آداب و ضوابط کو پوچھنا چاہیئے علمائے محققین اس کو بتلا دیں گے کہ اس کے لئے کیا شرط ہے اور کیا ضابطہ ہے۔ چنانچہ امر بالمعروف کی ایک قسم اصول کی تبلیغ کرنا ہے اس کے الگ آداب ہیں، ایک فروع کی تبلیغ کرنا ہے اس کے الگ آداب ہیں علماء سب پہلوؤں کو جانتے ہیں ان کا علم تم سے زیادہ محیط

پس اس کا طریق ان سے سیکھو، یہ تھوڑا ہی ہے کہ بس جیسے ہو کر لو نہ کوئی ضابطہ نہ قاعدہ جو ملا اس کو امر بالمعروف اندھا دھند کر دیا گویا ایک لٹھ سا مار دیا، مثلاً کوئی کافر ملا اس سے کہا ابے تو مسلمان ہو جا اس نے جواب میں کہلا بے تو کافر ہو جا بس اب کیا تھا لٹھ چل پڑا، صاحبو یہ کوئی معمولی کام نہیں بہت نازک کام ہے اس کے واسطے بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں ان میں اس کے آداب مذکور ہیں یہ بھی ایک مستقل فن ہے اس کو سیکھ کر پھر عمل شروع کرو محقق علماء سے کام کرنے کا طریقہ سیکھو اپنی رائے سے کچھ نہ کرو، اپنی رائے کا شریعت میں کچھ اعتبار نہیں بلکہ اہل علم کو بھی چاہیئے کہ جو کام کریں اپنے سے زیادہ عالم سے پوچھ کر کریں بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ بڑوں کو بھی چاہیئے کہ چھوٹوں سے مشورہ کر لیا کریں (مشورہ کا لفظ میں نے ادب کے لئے استعمال کیا ہے) اگرچہ بڑوں کو اکثر چھوٹوں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر کبھی چھوٹے کو کوئی بات ایسی معلوم ہوتی ہے جو بڑے کو نہیں ہوتی گو غالب ایسا نہیں ہوتا اکثر تو بڑوں ہی کو زیادہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی مشورہ کر لینا چاہیئے اگرچہ ان کا علم زیادہ نہیں لیکن ممکن ہے کہ اون کو کوئی خاص مصلحت معلوم ہو کوئی واقعہ معلوم ہو بلکہ بکثرت واقع ہے کہ واقعات چھوٹے کو زیادہ معلوم ہوتے ہیں بڑوں کو معلوم نہیں ہوتے اور واقعات کی لاعلمی سے ان کے کمال میں کوئی نقصان نہیں آتا۔

دیکھئے ہدہد جیسا کوئی آدمی چھوٹا نہیں اور سلیمان علیہ السلام جیسا کوئی بڑا آدمی نہیں مگر پھر ہدہد حضرت سلیمانؑ سے کہتا ہے احطت بما لم تحط به وجئتك من سبا بنبا یقین ہ کہ میں سبا سے ایک خبر لایا ہوں جس کو آپ نہیں جانتے ہیں اس پر سلیمان علیہ السلام نے نکیر نہیں کیا اور نہ اللہ تعالےٰ نے بلکہ اللہ تعالےٰ نے تو اہتمام کے ساتھ اس قصہ کو بیان فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ بڑوں کو کسی واقعہ سے لاعلمی ہونا یہ نقصان

فی الکمال نہیں کیونکہ واقعات امور غیر مقصود ہوتے ہیں ہاں امور مقصودہ یعنی احکام کا علم بڑوں کو زیادہ ہوتا ہے اور اس میں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ چاہے چھوٹے کے پاس کچھ علم نہ ہو مگر مشورہ سے کم از کم اتنا فائدہ ہوگا کہ اس سے مزید اطمینان ہو جاوے گا۔

صاحبو! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ لینے کے مامور ہیں وشاورھم فی الامر تو ہم کو تو ضرور مشورہ لینا چاہیئے یہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ہمارے اکابر کا بھی یہی طرز تھا وجہ یہ کہ مشورہ کرنے سے خواہ وہ چھوٹوں ہی سے ہو بعض دفعہ کوئی کام کی بات نکل آتی ہے اور جب بڑے کو چھوٹے سے مشورہ کرنے کا حکم ہے تو چھوٹے کو تو بطریق اولیٰ بڑوں سے پوچھنا چاہیئے پھر جس طرح اپنے اکابر اپنے مقتدا حکم دیں اس طرح کرے یہ طریقہ کام کرنے کا امر بالمعروف کے یہ معنی نہیں کہ بس جو کافر ملے ہاتھ پکڑ کے اسے مسلمان بنانا شروع کردے بعض دفعہ یہ طرز مضر ہوتا ہے اس لئے اس کا ڈھنگ اور طرز سیکھنا چاہیئے اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ قید لگائی ہے ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ یعنی حکمت سے بلائیے معلوم ہوا کہ اس میں حکمت کی ضرورت ہے ورنہ مطلق فرماتے بالحکمۃ نہ فرماتے۔

بہر حال اس کے شرائط ضرور ہیں مگر وہ اسی کے لئے ہیں جو کام کرنے کا قصد کرے۔ اب تو دیکھا جاتا ہے کہ لوگ قصد ہی نہیں کرتے اور عوام تو عوام خواص کو بھی ادھر توجہ نہیں اور خواص میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو مشائخ نہیں ان کی تو کیا شکایت کیونکہ عوام اُن کے زیادہ معتقد نہیں ہوتے ان میں جو مشائخ ہیں اور مقتدائے وقت مانے جاتے ہیں جن کے بہت لوگ معتقد ہیں سب سے زیادہ کوتاہی انہیں میں ہے وہ بس اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ ہاتھ میں تسبیح لیکر بیٹھ جائیں جنت میں پہنچ جاویں گے ان کو کسی کی اصلاح کی کچھ پرواہ نہیں بلکہ اس کو تو شان مشیخت سے اس قدر بعید سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شیخ اس کام کو

شروع کرے تواس کو مشیخت کے دفتر سے خارج کر کے محض علماء کے دفتر میں داخل سمجھتے ہیں چنانچہ میں ایک دفعہ الہ آباد گیا تھا والد صاحب کی بیمار پرسی کے لئے وہاں ایک درویش تھے، والد صاحب ان کے پاس مجھے لے لئے جب درویش نے مجھے دیکھا تو مجھ سے کہا کہ اس آیت کا مطلب بتلاؤ لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر میں نے ترجمہ کر دیا تو کہنے لگے دیکھو حق تعالیٰ منع کرتا ہے منازعت سے پھر ہم کسی کو روک ٹوک کیوں کریں موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین جو جس کے جی میں آوے کرے ہمیں کسی سے تعرض کرنے کی ضرورت کیا پڑی یہ تفسیر کی انھوں نے اس وقت میرے ذہن میں کوئی تفسیر حاضر نہیں تھی میں نے لفظوں ہی سے ان کو جواب دیا میں نے کہا حق تعالے نے لاینازعنک فرمایا ہے کہ وہ آپ سے منازعت نہ کریں لا تنازعھم نہیں فرمایا کہ آپ بھی ان کو روک ٹوک نہ کریں بلکہ آپ کے لئے تو خود اس کے متصل ہی امر فرماتے ہیں وادع الی ربک انک لعلی ھدی مستقیم یعنی دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو باطل پر تھے حق سے ہٹے ہوئے تھے اور ایک وہ جو صراط مستقیم پر تھے توحق تعالے فرماتے ہیں کہ اہل باطل کو اہل حق سے منازعت کرنے کی اجازت نہیں. پس حاصل آیۃ کا یہ ہے کہ آپ صراط مستقیم پر ہیں آپ کو تو حق ہے منازعت صوری یعنی دعوت کا مگر ان کو حق نہیں کہ آپ سے منازعت کریں میں نے کہا کہ اس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو عدم منازعت کا حکم نہیں بلکہ ان کو حکم ہے کہ آپ سے منازعت نہ کریں۔ پس شاہ صاحب کا ذرا سا منہ نکل آیا اور ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا والد صاحب بھی میرے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کی لطیف لطیف تفسیریں بھی نظر سے گذریں لیکن یہ تفسیر کسی نے نہیں لکھی، مگر یہ مطلب کسی نص کا معارض بھی نہیں اور بعض نے جو اس آیت کی تفسیر میں لا ینازعنک کا مطلب لاتنازعھم لکھدیا ہے کہ آپ ان سے منازعت نہ کریں یقیناً شاہ صاحب کی اس تفسیر پر نظر نہ

تھی ورنہ وہ ضرور اس کو پیش کرتے۔ مگر میں اس وقت یہ جواب دیتا کہ منازعت اور کو ہے دعوت اور ہے اگر منازعت حقیقیہ سے ممانعت ہے دعوت سے تو ممانعت نہیں پس تم منازعت نہ کرو محض دعوت ہی کر دیا کرو مگر غضب تو یہ ہے کہ آجکل تو درویش کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ بس کچھ نہ کرے اور کسی کو کچھ نہ کہے بلکہ سب کی ساتھ صلح وکل ہوکر رہے وہ تو درویشی ہے ورنہ نہیں اور اس کے لئے ایک شعر گھڑا ہے اور اس کو حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب کیا ہے اس لئے کہ اس کے اول میں حافظا آگیا ہے اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملا لیا جائے کہ جس شعر میں حافظ آجائے بس وہ حافظ شیرازی ہی کا ہے مگر یہ محض مہمل دلیل ہے کیا کوئی دوسرا شخص اپنا تخلص حافظ نہیں کر سکتا یا اپنا شعر رائج کرنے کو جعلی طور پر حافظ کا لفظ اپنے شعر میں نہیں بڑھا سکتا۔ پس ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ یہ شعر اول تو حافظ کا ہے نہیں اور اگر ہوتا بھی تو چونکہ ہم کو ان سے حسن ظن ہے ہم اس کی تاویل کرتے ہاں جو خشک دماغ ہے وہ تو تاویل نہیں کرے گا بلکہ حافظ پر طعن کرنے لگے گا مگر ہم ایسے بے ادب نہیں پس یہی قاعدہ غلط ہے کہ جس شعر میں لفظ حافظ ہو اس کو حافظ شیرازی کی طرف منسوب کر دیا جاوے اسی طرح جو کلام مثنوی کے وزن پر ہو تو اس کو مولانا روم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اب سنئے کہ انہوں نے کونسا شعر گھڑا ہے اور اس کو حافظ کی طرف منسوب کیا حالانکہ وہ حافظ کا کسی طرح نہیں ہوسکتا وہ شعر یہ ہے ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

(اے حافظ اگر قرب چاہتے ہو تو تم ہر خاص و عام سے صلح کرو۔ دوستوں سے لطف و مہربانی دشمنوں سے ظاہری مداراۃ کر لو کہ فراغ دل سے دین کے کام میں لگو)

بھلا جس کو ذرا بھی حافظ کی بلاغت و فصاحت کا ذوق ہے وہ تسلیم کر سکتا ہے کہ یہ ان کا

کلام ہے ہرگز نہیں۔ دوسرے حافظ شیرازی رام رام جانتے بھی نہ تھے انھوں نے تو عمر بھر کبھی سنا بھی نہ ہوگا اور بڑی بات یہ ہے کہ حافظ کا دیوان موجود ہے اس میں دیکھ لو اور تماشہ یہ کیا کہ باوجودیکہ دیوان کے اندر تحریف بہت ہوئی ہیں مگر یہ شعر تحریف کے بعد بھی اس میں موجود نہیں۔ پس یہ شعر دیوانِ حافظ کا تو ہے نہیں ہاں کسی دیوانہ حافظ کا ہوگا۔ ایک اور شعر بھی ہے جس سے آجکل کے صوفی اپنے مسلک صلح کل پر استدلال کرتے ہیں اور وہ واقعی حافظ کا ہے ؎

مباش درپئے آزار وہرچہ خواہی کن
کہ درشریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

کسی کو ایذا رسانی نہ کرو اور جو چاہے وہ کرو کہ ہمارے آئین میں اس کے سوا کوئی گناہ نہیں لیکن ہر گناہ میں ایذا ہے خواہ لازمی یا متعدی پس ہر گناہ سے بچنا بھی ضروری اس شعر سے ثابت ہوا)

اس کو بھی صوفیوں نے اپنا مستدل ٹھہرایا ہے کہ بس کسی کو آزار دینا نہ چاہیئے دل دکھانا اچھا نہیں پھر کیوں کسی کو امر بالمعروف کیا میں کہتا ہوں کیا ایک متکبر کا دل دکھانا بھی منع ہے اگر اس شعر میں ہر آزار کی ممانعت ہے تو پھر ہرچہ خواہی کن کی بھی عام اجازت ہونی چاہیئے پھر کیا ہے بس زنا کی بھی اجازت ہونی چاہیئے چوری کی بھی اور غصب لوٹ مار اور ڈاکہ کی بھی بس جو چاہو کرو سب کی اجازت ہے اگر کہو کہ چوری سے تو آزار ہوتا ہے لہٰذا وہ آزار کی ممانعت میں داخل ہے میں کہتا ہوں زنا میں تو آزار نہیں شاید کہو کہ شوہر اور خاندان کو آزار ہے تو اگر کسی کو کوئی ایسی عورت مل جاوے کہ نہ اس کے خاوند ہے نہ باپ ہے نہ بھائی کوئی نہیں ہے اور وہ خوشی سے یہ فعل کراتی ہے تو یہاں کسی کو آزار نہیں ہے نہ اس کو نہ اور کسی کو تو کیا اس کی اجازت ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر اس میں تخصیص کرو گے اور تخصیص کسی دلیل سے کرو گے یا بے دلیل جیسے بھی ہو اگر تم ہرچہ

خواہی کن میں تخصیص کرتے ہو تو ہم یہاں (یعنی آزاریں) بھی تخصیص کریں گے یعنی مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار بقصد آزار نہ دو اور درحقیقت درپئے آزار ہونا یہی ہے اور جو شخص آزار بغرض اصلاح دے جیسے طبیب اور ڈاکٹر آپریشن کرتا ہے یا باپ استاد بچہ کو تادیباً مارتا ہے اس کو ہرگز درپئے آزار شدن نہیں کہہ سکتے پھر امر بالمعروف کرنے والے سے اگر کسی کو آزار پہونچے بھی تو اس کو درپئے آزار کہنا صحیح نہیں لہٰذا وہ اس شعر کا مصداق ہی نہیں پس امر بالمعروف سے رُکنے کے واسطے اس شعر کو آڑ بنانا محض باطل ہے دوسرے یہ کہ مباش درپئے آزار میں اگر آزار ایسا ہی عام ہے تو پھر اس میں مخاطب ہی کی کیا خصوصیت ہے کہ صرف مخاطب ہی کو آزار نہ پہونچایا جاوے غائب کو آزار پہنچ جاوے سبحان اللہ بلکہ اس کو بھی عام کہو کہ صاحب آزار کوئی ہو آزار میں تعمیم کر کے صاحب آزار میں کیوں تخصیص کی جاتی ہے بلکہ جیسے آزار میں تعمیم کرتے ہو صاحب آزار میں بھی تعمیم کرو۔ اگر صاحب آزار میں بھی تعمیم کروگے تو پھر کوئی بھی معصیت ایسی نہ ہوگی جس سے کسی نہ کسی کو تکلیف نہ ہو ایسا کوئی امر نہ نکلے گا جو کسی نہ کسی کے لئے سبب آزار نہ ہو شاید آپ سوچتے ہوں گے کہ ہمارے گناہوں سے کس کو آزار پہونچتا ہے تو آپ ایک حکایت سے اس کا اندازہ کر لیجئے مرزا بیدل شاعر کی حکایت ہے کہ ان کے اشعار تصوف کا رنگ لئے ہوتے تھے کسی ایرانی نے ان کے اشعار کو دیکھ کر پسند کیا اور ان کو بزرگ سمجھ کر ان کے پاس آیا جب ان کے پاس پہونچا تو یہ حجام سے ڈاڑھی منڈا رہے تھے اس کو یہ دیکھ کر غصہ آگیا اور جھلا کر اس نے پوچھا آغا ریش میتراشی شاعر نے جواب دیا آرے ریش میتراشم ولے دلِ کسے نمی خراشم وہ بیچارہ مخلص تھا اس نے آزادانہ جواب دیا آرے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میخراشی۔ مخلص تو درپئے مصلحت کے نہیں ہوتا اس کی بڑی مصلحت تو یہ ہے کہ

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار

بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(عشق کی مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ یار لوگ سب کام چھوڑ کر محبوب کے قرب کو لازم کر لیں)

شاعر نے تصوف مزعوم کے اعتبار سے اور اس عرفی تصوف کے طور پر جواب دیا تھا کہ دل کسے نمی خراشم ایرانی نے جواب دیا کہ ظالم تو تو سب سے بڑے دل کو چھیل رہا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ دل کسے نمیخراشم بلے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میخراشی تم یہ ڈاڑھی پر استرہ نہیں پھرا رہے ہو بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر چھری چلا رہے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب اعمال پیش ہوتے ہیں اور آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ میری امت کا ایک شخص یہ حرکت کرتا ہے کیا اس سے آپ کا دل نہیں دکھتا اور کیا آپ کا دل دکھانا چھوٹی بات نہیں ہے آپ کا قلب تو سید القلوب ہے جب تم سید القلوب کو تکلیف دیتے ہو پھر یہ دعویٰ کیسے کرتے ہو کہ ہم کسی کا دل نہیں دکھاتے ہیں، ارے تم درپئے آزار تو ہو گئے یہ سنکر مرزا کی آنکھ کھلی اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا ہوش میں آیا تو توبہ کی اور بزبان حال یا قال یہ کہتا تھا ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی
مرا باجان جاں ہمراز کردی

(آپ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھ کو محبوب سے ہمراز کر دیا)

یعنی میں تو اندھا تھا میری کبھی ادھر نظر ہی نہیں گئی کہ مجھ سے اتنے بڑے قلب کو ایذا ہو رہی ہے یہاں تک میرے ذہن کی رسائی ہی نہیں ہوئی تو نے میری آنکھیں کھول دیں خدا تجھ کو اس کی جزا دے۔ اب اس حکایت سے سمجھ لیجئے کہ جب آپ سے کوئی امر غیر مشروع سرزد ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے آزار ہوگا یا نہیں اس لئے ترک احکام شرعیہ کے لئے اس کو آڑ بنانا اور یہ کہنا کہ مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن بالکل واہیات ہے۔ پھر بڑی

بات یہ ہے کہ سنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک ہم تمہیں ہر ہر بات کا کہاں تک جواب دیں تم نے ایک بات نکالی ہم نے اس کا جواب دیا دوسری نکالی اس کا دیا آخر یہ سلسلہ کہاں تک رہے گا۔ سیدھا جواب یہ ہے کہ نصوص کے مقابلہ میں سب اشعار ہیچ ہیں۔ بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ یہ خدا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حکم ہے۔ اس کے سامنے کہاں کی مصلحت کہاں کی حکمت۔ نصوص کے اندر امر بالمعروف کا حکم موجود ہے اور نہ کرنے پر نکیر ہے ہم تو یہ جانتے ہیں بس اس کو کرو البتہ شرائط واحکام کے ساتھ کرو اندھا دھند لسٹم پسٹم مت کرو۔ فقہاء نے اس کی ایک مستقل بحث لکھدی ہے اس کے قوانین وضوابط کو مدون کر دیا ہے اس کو سیکھو علماء سے پوچھو وہ تم کو راستہ بتا دیں گے اور اس قسم کے اشعار سے نصوص کا مقابلہ نہ کرو اور جو کوئی جاہل نصوص کا مقابلہ ان اشعار سے کرے اس کو ڈانٹ دینا چاہیے حدیث میں ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنین کی دیت میں غرۃ عبد یا أمنه کا حکم دیا تھا۔ مدعا علیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ کہا کیف اغرم من لا شرب ولا اکل ولا نطق ولا استھل ومثل ذلك يطل یعنی ایسے بچہ کی کیا دیت جس نے نہ کھایا نہ پیا اور نہ بولا نہ چلایا اور ایسا معاملہ تو یوں ہی نظر کر دیا جاتا ہے آپ نے فرمایا اسجع كسجع الكهان کیا واہیات ہے کاہنوں جیسی مسجع مقفی عبارت سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہو۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ڈانٹ دیا تو بعض جگہ اس کی بھی ضرورت ہے کہیں حاکمانہ جواب مناسب ہوتا ہے اور کہیں حکیمانہ سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا عوام اسی سے بگڑ گئے علماء کے حکیمانہ جواب ہی سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا حتیٰ کہ اب ہر بات کی علل واسرار پوچھنے کی جرأت ہو گئی۔

ایک شخص نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ حائض سے نماز تو ساقط ہو گئی اور روزہ

کی قضا لازم ۔ جواب دیا کہ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کروگے تو اتنے جوتے سر پر پڑیں گے سر پر بال بھی نہ رہیں گے اس جواب کی یہ وجہ نہ تھی کہ مولانا کو حکمت معلوم نہ تھی بلکہ اس کے لئے یہی جواب مناسب تھا کیونکہ مابہ الفرق سمجھنے کی لیاقت اس میں نہیں تھی۔ چنانچہ اسی سوال کو دوسرے ایک فہیم لے دوسری مجلس میں پوچھا تو آپ نے اس کو مفصلا بیان کردیا۔ تو ہر مخاطب کا مذاق جدا ہے ہر ایک کی حالت جدی ہے اس کے رتبے کے موافق جواب دینا چاہیئے۔

میرے پاس ایک سب انسپکٹر کا خط آیا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے وہ اس کی علت دریافت کرنا چاہتے تھے میں نے جواب میں لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے۔ پھر انھوں نے لکھا کہ علماء کو ایسا خشک نہ ہونا چاہیئے۔ میں نے دل میں جواب دیا کہ جہلاء کو اتنا تر نہ ہونا چاہیئے کہ ڈوب ہی جاویں اس کے بعد ایک جگہ وہ مجھ سے ملے اور اپنا پتہ بتلایا کہ میں وہی ہوں جس کا ایسا ایسا خط گیا تھا اور تم نے یہ جواب دیا تھا جب سارا قصہ بیان کیا تو میں نے پہچان لیا اور کہا ماشاءاللہ آپ سے تو بڑا پرانا یارانہ ہے پھر مجھ سے انھوں نے کہا کہ آپ نے یہ خشک جواب کیوں دیا تھا میں نے کہا انصاف سے بتلایئے آپ سب انسپکٹر ہیں مگر پھر بھی کیا آپ کے تعلقات و معاملات سب کے ساتھ یکساں ہیں یا کسی سے خصوصیت ہے اور کسی سے نہیں ہے کیا آپ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں یا مخصوصین کے ساتھ خصوصیت کے برتاؤ سے پیش آتے ہیں اور غیر مخصوصین کے ساتھ ضابطہ کے برتاؤ سے کہا سب سے یکساں برتاؤ کیسے ہوسکتا ہے فرق ضرور ہے۔ میں نے کہا ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہے جن سے خصوصیت ہے ان سے خصوصیت کا برتاؤ ہے اور جن سے نہیں ہے ان سے ضابطہ کا مگر اب سے ایسا برتاؤ آپ کے ساتھ نہیں کیا جاوے گا کیونکہ

اب تعارف ہو گیا ہے پھر میں نے یہ خیال کیا کہ ذرا ان کو بھی تو باندھنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ آئندہ آپ دل کھول کر ہر بات کے حکم اور علل پوچھنے لگیں تو میں نے کہا اس ملاقات کا جیسا مجھ پر اثر ہوا ہے کہ میں آئندہ ایسا برتاؤ نہیں کروں گا ایسا ہی اس کا آپ پر بھی یہ اثر ہوگا کہ آپ بھی آئندہ ایسی اینڈی بینڈی باتیں نہ پوچھیں گے ایسا ہی ایک اور شخص کا خط میرے پاس آیا کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے میں نے لکھا کہ سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے خدا کے حکم کی حکمت تو ممکن ہے کہ بندہ کو معلوم نہ ہو مگر سوال تو تمہارا فعل ہے تم کو اپنے فعل کی حکمت ضروری ہی معلوم ہے مہربانی کر کے ذرا بتلاؤ تو سہی میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اگر وہ سوال عن الحکمۃ کی کچھ حکمت بتلا دیں گے تو میں اس کو باطل کر دوں گا، غرض کبھی اس قسم کے بھی جواب دینا چاہئیں، علماء نے عوام کا حوصلہ بڑھا دیا ہے نرم جواب دے دے کر ایک اور شخص نے ایک سوال کیا تھا میں نے کہا اس کا جواب تمھاری سمجھ میں نہیں آویگا تو کہتے ہیں کہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے آپ کہیئے میں نے کہا میرا دماغ مفت کا نہیں مگر وہ بڑا ہی ہٹی تھا کسی طرح سے ٹلا ہی نہیں جب بہت ہی تنگ کیا تو میں نے کہا کہ ایک طالب علم کو بلا لو میں اس کے سامنے تقریر کر دوں گا اس میں دو فائدہ ہیں ایک تو یہ کہ ہم طلبہ کے متعلق جو آپ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ ایسے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے اس کا غلط ہونا معلوم ہو جاوے گا۔ گو ہم کسی مصلحت سے جواب نہ دیں اور میں نے یہ شعر پڑھا سہ

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ پردہ سے راز فاش ہو جائے ورنہ عاشقانِ حق کو معارف وحقائق راہ کی پوری خبر ہے)

یعنی یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر نا اہل نا جنس پر ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے

کہ تم دیکھ لوگے کہ تم اس تقریر کو نہیں سمجھ سکتے اور جب نہیں سمجھ سکتے تو تم سے خطاب کرنا موت ہے، میری زبان ہی نہیں چلے گی کیونکہ ؎

فہم سخن تا نہ کند مستمع ٭ قوت طبع از متکلم مجو

(بات سمجھنے کی سعی اگر سننے والا نہ کرے تو متکلم سے جوش تکلم کی تمنا عبث ہے)

اگر جہلاء کو اس طرح حاکمانہ جواب دیا جاوے تو ان کی جرأت نہ بڑھے گی۔ میں ایک دفعہ سہارنپور گیا تو ایک شخص نے وہاں بہشتی زیور کا ایک باریک مسئلہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے پوچھا تھا۔ مولانا نے اپنے حسنِ اخلاق سے اس کو سمجھا دیا تھا مگر وہی مرغی کی ایک ٹانگ ان کی سمجھ میں کہاں آنا تھا کیونکہ سمجھنا مطلوب ہی نہ تھا۔ جب میں گیا تو وہ سمجھے کہ یہ تو مؤلف ہی آگیا ان سے پوچھنا چاہیئے۔ چنانچہ میرے پاس بھی آئے پہلے آن کے تو زور سے کہا السلام علیکم سلام ہی سے خشونت اور اکھڑپن ٹپکتا تھا پھر کہنے لگے کہ یہ عبارت ہے بہشتی زیور کی ذرا اس کو دیکھ لیجئے میں نے کہا کہ میں نے تو سب دیکھ ہی کے لکھا ہے آپ کہئے کیا کہنا ہے۔ کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا مطلب نہیں سمجھے یا علت نہیں سمجھے مطلب تو ظاہر ہے اردو میں سہل کر کے لکھا گیا ہے کہا اجی علت نہیں سمجھا کہ اس کی علت کیا ہے۔ میں نے کہا آپ کو کچھ اور بھی مسائل یاد ہیں، کہا جی ہاں بہت میں نے کہا کیا اُن سب کی علت کو آپ نے معلوم کر لیا ہے۔ یا بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی علت اور حکمت معلوم نہیں۔ اگر سب کی علت معلوم ہو چکی تو مجھے اجازت دیجئے کہ دو چار کی میں بھی علت دریافت کروں کہا ہاں غیر معلوم العلت بھی بہت سے ہیں میں نے کہا پھر اسے بھی اُسی فہرست میں داخل کر لیجئے۔ اس جواب سے وہ ناراض تو بہت ہوئے مگر بولے کچھ نہیں بس کتاب بغل میں دبا جلدی سے اُٹھ گئے۔

مولانا نے فرمایا کہ تم نے تو بڑی جلدی ساکت کر دیا میں نے کہا حضرت میں آپ کی طرح خلیق نہیں کہ ایک کوڑمغز کے ساتھ چار گھنٹے مغز ماروں۔ اخیر میں

بر اخفش کی طرح وہ کہے میں نہیں سمجھا اور پھر میں تقریر کروں قصہ بر اخفش کا طالب علموں میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے بکرے سے سبق کا تکرار کیا کرتے تقریر ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھتے کہ سمجھا اور اس کو یہ تعلیم کر رکھا تھا کہ وہ نفی کے طور پر سر ہلا دیتا یہ پھر تقریر شروع کرتے ایسے ہی مکرر سہ کرر تقریر کرتے تو مجھ سے اخفش نہیں بنا جاتا اس کے بعد ادر ایک جنٹلمین صاحب آئے وہ بھی اسی علت میں مبتلا تھے مہذب عنوان سے کہنے لگے کہ حضرت جب لوگ علماء کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو ہم کو برا معلوم ہوتا ہے بہت رنج ہوجاتا ہے، چنانچہ اس مسئلہ میں جہلا اعتراض کرتے ہیں جو ناگوار ہوتا ہے اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک چھوٹا سا جلسہ جمع کردوں آپ اس میں اُن چند مسائل کی تقریر کردیں۔ میں نے کہا میں آپ کی محبت کا نہایت ممنون ہوں مگر عقلی قاعدہ ہے کہ الاہم فالاہم جو کام سب سے اہم ہو پہلے اس کے اہتمام کرنا چاہیئے یہ آپ کو مسلم ہے یا نہیں کہا ضرور مسلم ہے کیونکہ یہ مقدمہ تو عقل کے موافق تھا اس کو بغیر تسلیم کرے تو چارہ ہی نہ تھا ان لوگوں کو عقلیات سارے مسلم ہیں بس نقلیات ہی میں کلام ہے۔ میں نے کہا جو لوگ علماء کو بُرا بھلا کہتے ہیں واقعی وہ گستاخی کرتے ہیں سو ایک تو یہ طبقہ ہے جو علماء کی شان میں گستاخی کرتا ہے مگر اس سے بڑھ کے ایک طبقہ وہ ہے جو ائمہ مجتہدین کی شان میں گستاخی کرتا ہے وہ ان سے بدتر ہے اور ایک وہ طبقہ ہے جو صحابہ پر طعن کرتا ہے وہ ان سے بھی گستاخ تر ہے۔ ان سے بڑھ کر ایک وہ فرقہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے اور سب سے بدتر وہ گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب وشتم کرتا ہے تو ترتیب سے کام کرنا چاہیئے۔ آپ اول ان لوگوں کی اصلاح کا انتظام کر دیجئے جو اللہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، پھر ان کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں۔ پھر ان کی جو صحابہ کو نہیں چھوڑتے پھر ان کی جو ائمہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں جب ان سب کا انتظام ہوجاوے گا آخر میں یہ جماعت علماء کی شان میں گستاخی کرنے والی رہے گی اس کا انتظام میں کردوں گا۔

اب وہ چپ کیا جواب دیں جب دیکھا کہ اس طرح کام نہ چلا تو گفتگو کا طرز بدلا اور کہا یہ تو سمجھ میں آگیا کہ اس وقت ان کی اصلاح کی ضرورت تو نہیں لیکن اگر کر دی جاوے تو ضرر ہی کیا ہے میں نے کہا کچھ ضرر نہیں کہنے لگے پھر ایسا کر دیجئے میں نے کہا یہ مشورہ ہے یا حکم ہے اگر حکم ہے تو آپ کو حکومت کا کوئی حق نہیں میں آپ کا کوئی محکوم نہیں نوکر نہیں آپ کا شاگرد نہیں، مرید نہیں اور اگر مشورہ ہے تو مشورہ میں مخاطب کے ماننے کا انتظار نہیں ہوتا آپ اپنے فرض منصبی سے فارغ ہو چکے آگے ہمارا کام ہے ہماری جو سمجھ میں آوے گا کریں گے آپ کی کچہری کا وقت آگیا ہے تشریف لیجائیے غرض یہ بھی چلے گئے۔ تمام دن یہی قصہ رہا مگر میں نے کسی کو ایک منٹ میں ختم کیا کسی کو دو منٹ میں اور پہلے ایک ہی آدمی نے کئی دن سے اکابر کو تنگ کر رکھا تھا غرض یہ کہ ہر سائل کیسا تھ نہ تو مطلقاً خشکی برتے اور نہ ہر جگہ خلیق بنے اصلاح اسی طرح ہوتی ہے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ اول تو حقیقت ظاہر کرو اور اگر نہ سمجھے تو آخر میں کہدو کہ بس جاؤ یہ خدا کا حکم ہے خدا کے حکم کے مقابلہ میں ہم تمہاری واہیات خرافات کو نہیں مانتے ہیں اسی کے مناسب ایک اور حکایت ہے کہ۔

مولانا محمد یعقوب صاحب ایک بار ایک دعوت کے جلسہ میں رڑکی تشریف رکھتے تھے اس جلسہ میں ایک عالی صوفی صاحب سماع جوازِ سماع کے دلائل بیان کر رہے تھے مولانا کی وضع سادی تھی اس لئے وضع سے کسی نے یہ نہیں پہچانا کہ یہ کوئی عالم یا بزرگ ہیں۔ اُس صوفی نے دلیل جواز سمع میں مولانا رومی کا یہ شعر پیش کیا ؎

بشنو از نئے چوں حکایت میکند
وز جدا ئیہا شکایت میکند

(جس طرح بانسری اپنے مرکز سے جُدائی کا غم رو رہی ہے اور اپنی جدائی کی شکایت کر رہی ہے تم بھی اپنے مرکز آخرت کو یاد کرو (بانسری سننا حرام ہے) صرف نصیحت کیلئے یہ مثال ہے۔

اور کہا کہ اس میں لشنوا امر ہے اور امر وجوب کے لئے ہے اس کا حقیقی جواب تو یہ تھا کہ بیشک امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے مگر کس کے امر سے مولانا کے امر سے یا اللہ تعالیٰ کے امر سے مگر یہ جہلا لوگ تو اس کو کچھ نہ سمجھتے بس ان کو تو اڑتی ہوئی ایک بات ہاتھ لگ گئی کہ امر وجوب کے لئے ہے وہ جہلا ران باتوں کو کیا جانیں کہ امر کے اقسام کتنے ہیں۔ اس لئے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ مولانا رومی کا قول تو جب حجت ہو کہ پہلے خود ان کا حجت ہونا ثابت کیا جاوے سو سب سے پہلے تو تم ان کا مسلمان ہونا ثابت کرو۔ بس اس جواب سے ان پر تو مٹی پڑ گئی اور سارے دلائل گاؤ خورد ہو گئے غرض ہر جگہ جواب کا مختلف طریقہ ہے کہیں نرمی کا جواب اچھا ہے کہیں سختی کا اور کہیں جوتہ کا جواب بہتر ہوتا ہے۔ مولانا ہی کا شعر ہے ؎

الوعظ ینفع لو بالعلم والحکم
والسیف ابلغ وعاظ علی القمم

(وعظ نفع دیتا ہے علم اور حکمت سے اور تلوار نہایت زبردست وعظ ہے سرکشوں کو)

اور فرمایا کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں چار کتابیں نازل فرمائی ہیں وہاں ایک پانچویں کتاب حدید بھی اتاری ہے۔ چنانچہ ارسل مرسل وانزل کتب کے بعد ارشاد ہے وانزلنا الحدید فیہ باس شدید فرمایا کہ اس میں حدید سے مراد تعلدار جوتا ہے کہ اس سے دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا مقولہ ہے یزع السلطان اکثر مما یزع القرآن یعنی بعض قرآن کی نصیحت اتنا نہیں روکتی جتنا ایک نیزہ کی نوک روک دیتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ اول دلائل بیان کرو اگر ان دلائل کو نہ مانے تو صاف جواب دو کہ یہ خدا کا حکم ہے احکام الٰہی کے سامنے کوئی چیز حجت نہیں اس لئے یہ اشعار بھی کچھ حجت نہیں ہیں غرض امر بالمعروف یقیناً واجب ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ اس طرف توجہ بالکل نہیں اور یہ ایک بڑی کوتاہی ہے اسی کوتاہی کو رفع کرنے کے لئے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ نماز اور روزہ کی طرح یہ بھی فرض ہے البتہ مختلف اوقات میں اس کے طرق مختلف ہیں مثلاً اس وقت آپ لوگوں کا پڑھنا

بھی تبلیغ ہے اگر نیت اچھی ہے کیونکہ انما الاعمال بالنیات اگر آپ کی نیت ایں یہ ہو کہ پڑھنے سے فارغ ہو کر امر بالمعروف کروں گا تو یہ پڑھنا بھی شعبہ تبلیغ ہی کا ہے اگر یہ نیت نہ ہو تو پھر تبلیغ نہیں دیکھو اگر کوئی شخص نماز کی نیت نہ کرے تو نماز نہیں ہوتی ایسا ہی روزہ ہے اگر نیت نہ کرے اور دن بھر فاقہ کرے تو روزہ نہیں ہوتا غضب کی بات ہے کہ ہم رات دن پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر اعمال وطاعات کی نیت نہ کرنے کی وجہ سے ثواب سے محروم ہیں، غرض اچھی نیت سے اس وقت یہی کتابیں پڑھنا بیشک اصل تبلیغ ہے اور میں نے اس وقت کی قید اس لئے لگائی کہ پہلے زمانہ میں صحابہ و تابعین کو تدریس متعارف کی کوئی حاجت نہیں تھی ان کا تو بغیر اس کے کام چلتا تھا کیونکہ حافظے اور اذہان کافی تھے اور تدین بھی تھا اور اس وقت اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ اگر کتابیں مدون نہ ہوں اور آجکل لوگوں کا نہ حافظ ویسا ہے نہ ویسا تدین ہے نہ ان کے قول پر ان جیسا وثوق ہے پھر زبانی کوئی مضمون حدیث و فقہ کا بیان کیا جاتا تو سامعین کو ہرگز تسلی نہ ہوتی اور خیال ہوتا کہ نہیں معلوم یہ کچھ کہتے ہیں ٹھیک بھی ہے یا یوں ہی الٹ پلٹ ہانک رہے ہیں اگر کتابیں مدون نہ ہوتیں تو بڑا اغلت مبحث ہوتا دین میں بڑا فساد پھیلتا خدا کا بڑا احسان ہے کہ اپنی عنایت و رحمت سے اس نے کتابیں مدون کرادیں۔ مدرسے قائم کرادیئے اس کے سامان مہیا دئے منجملہ ان سامانوں کے ایک یہ ہے کہ مدرسہ کے لئے چندہ بھی کیا جاوے مگر شرط یہ ہے کہ طیب خاطر سے ہو اور جب ان چیزوں کی ضرورت ثابت ہوگی کہ بغیر ان کے کام نہیں چلتا چنانچہ اگر کتابیں نہ ہوں تو سلف کی باتیں ہم تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں اور بغیر مدارس قائم کئے تعلیم کتب ممکن نہیں لہذا یہ بدعت نہیں ہے بلکہ سنت ہے کیونکہ اس درس تدریس سے بھی مقصود تبلیغ ہی ہے خواہ بلا واسطہ یا بالواسطہ چنانچہ بلا واسطہ تو تبلیغ مخاطب اول کو ہے یعنی طلبہ کو اور بالواسطہ مخاطب ثانی کو یعنی عوام کو سو یہ درس و تدریس تبلیغ کا اتنا بڑا فرد ہے مگر ہم نیت تبلیغ نہ کرنے سے

اس کے ثواب سے محروم ہیں انما الاعمال بالنیات سے معلوم ہوتا ہے نیت نہ کرنے سے اعمال کا ثواب نہیں ملتا گو عمل متحقق ہو جاوے اور بعض اعمال تو بلا نیت متحقق ہی نہیں ہوتے کیونکہ اعمال دو قسم کے ہیں بعض اعمال تو ایسے ہیں کہ ان کا تحقق بھی بلا نیت نہیں ہوتا اور بعض ایسے ہیں کہ ان کا تحقق تو ہو جاتا ہے مگر ثواب نہیں ہوتا جیسے پڑھنا پڑھانا کہ اس کا تحقق بلا نیت بھی ہو جاتا ہے مگر ثواب نہیں ملتا بخلاف نماز روزہ کے کہ ان کا تحقق ہی بلا نیت نہیں ہوتا۔ چاہے یوں جہل سے کوئی کہہ لے کہ ہمارے یہاں تحقق نماز بدون نیت کے بھی ہو جاتا ہے جیسے کسی نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے دو میاں بی بی کے نکاح کے متعلق مسئلہ پوچھا کہ ان کا یہ رشتہ ہے ان میں نکاح ہو جاوے گا یا نہیں مولانا نے فرمایا نہیں ہو سکتا، تو وہ کیا کہتا ہے کہ ہم نے تو کیا تھا ہو گیا تھا اور جیسے ایک گنوار بے وضو نماز پڑھا کرتا تھا کسی واعظ سے سنا کہ بلا وضو نماز نہیں ہوتی تو وہ کہتا ہے کہ بارہا کردیم و شد اسی طرح اس گنوار نے سمجھا کہ بس ایجاب و قبول ہو گیا تو نکاح ہو گیا حالانکہ رفع موانع شرائط تحقق سے ہے مگر بعض اعمال بغیر نیت کے بھی ہو جاتے ہیں مگر اجر نہیں ہوتا جیسے تعلیم و تعلم سو ہم لوگوں کا کتنا بڑا حرمان ہے کہ چوبیس گھنٹے ہم اس میں مشغول مگر نیت نہ ہونے سے ثواب سے محروم رہا یہ شبہ کہ اگر نیت بھی دین کی اور تبلیغ کی ہوتی تب بھی ثواب نہ ملتا کیونکہ اسکی ساتھ تنخواہ کی بھی تو نیت ہے اور یہ دنیا ہے تو نیت تبلیغ کے بعد بھی ثواب کہاں ہوتا۔ کیونکہ خالص تبلیغ ہی کی تو نیت نہیں بلکہ مدرسین کو تو تنخواہ بھی مطلوب ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے ایک تو وہ تنخواہ لینے والا ہے جس کو مقصود اصلی صرف نوکری اور تنخواہ ہے اور ایک وہ جو تنخواہ نفقہ کے طور پر لیتا ہے جیسے قاضی بیت المال سے تنخواہ لیتا ہے اور اصل مقصود اس کا خدمت دین ہے ان دونوں میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ جس کو مقصود بالذات دنیا تھی اس کو ثواب نہیں ملے گا اور جس کو مقصود بالذات دین ہے

مگر روپیہ گذراوقات کے لئے لیتا ہے اس کو ثواب ملے گا اگر یہ شبہ ہو کہ جب دین کے ساتھ دنیا کا بھی خیال ہے تو مجموعہ تو دینا ہی ہوا کیونکہ مرکب دین و دنیا سے دنیا ہے کیونکہ نتیجہ تابع اخس کا ہوتا ہے جواب یہ ہے کہ جس کو تنخواہ مدنظر نہیں صرف گذراوقات کے لئے لیتا ہے اس کا مقصود تنخواہ کو کہا ہی نہ جاوے گا خواہ بلا شرط ہو یا بالشرط ورنہ قاضی مفتی بلکہ خلفاء راشدین کسی کو بھی ثواب نہ ملتا اب اس کی علامت کیا ہے کہ اس شخص کو مقصود صرف دین ہے اور تنخواہ صرف رفع حاجت کے لئے سواس کی علامت کیا ہے کہ اس شخص کو مقصود صرف دین ہے اور تنخواہ صرف رفع حاجت کے لئے سواس کی علامت یہ ہے کہ جس کو تنخواہ ملتی ہے اس کی دو حالتیں ہیں ایک حالت تو یہ ہے کہ جتنی تنخواہ اس کو ملتی ہے وہ اس کے نان ونفقہ کو کافی نہیں اس حالت میں تو دوسری کوئی بڑی نوکری تلاش کرنا اس کے لئے علامت قصد دنیا کی نہیں لیکن اگر وہ رفع حوائج کے لئے کافی ہے معاش میں کوئی تنگی نہیں ہے اور پھر بھی اس کو بڑی ملازمت کی تلاش ہے کہ اگر دوسری جگہ تنخواہ زیادہ ملے تو فوراً چلا جائے اور اس وقت محض ترقی ہی کی وجہ سے جاتا ہے یہ تو علامت اس کی ہے کہ اس کو دین مقصود نہیں دنیا مقصود ہے۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ کفایت کی صورت میں دوسری جگہ کی تلاش نہ ہو اور ملے بھی تو نہ جائے یہ علامت ہے کہ دین مقصود ہے۔ ہاں یہ بھی دیکھا جاوے گا کہ اس شخص سے دونوں جگہ دین کا نفع برابر ہے یا دوسری جگہ زیادہ ہے اگر اس سے دوسری جگہ کو ترجیح ہے تو اور بات ہے بشرطیکہ قصد دین کا ہو ورنہ اگر دوسری جگہ کو نفع دینی زیادہ ہو مگر مقصود اس کا یہ نہیں بلکہ مقصود تو ہے ترقی دنیا اور نفع دینی کو آڑ بناتا ہے تو اس شخص کی نسبت کہا جاوے گا کہ یہ ملازمت محض دنیا کے لئے کرتا ہے دین کے لئے نہیں کرتا۔ دین کے لئے ملازمت وہ ہے جس میں عزم دین کا ہو اس کو ہر شخص دل میں ٹٹول کر دیکھ لے حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے محض منطقی نیت سے کام نہیں چلتا۔

جیسے ایک دفعہ کانپور میں مسافرانہ طور سے گیا ہوا تھا اور دوسری جگہ جانے کو تیار ٹکٹ لینے کے لئے آگے آدمی کو بھیجدیا اور خود عشا پڑھ کر جانے کو تھا عشا کی امامت کے لئے مجھ سے کہا گیا میں نے کہا کہ اگر کوئی مقیم پڑھا دے تو بہتر ہے۔ شاید بعض مقتدی امامت مسافر کے مسائل سے ناواقف ہوں۔ تو ایک صاحب فرماتے ہیں کہ تم اقامت کی نیت کرکے پوری نماز پڑھادو تو ظاہر ہے کہ وہ نیت لفظی یا خیالی نیت ہوتی حقیقی نیت نہ ہوتی غرض محض تصور سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ تصور نیت نیت نہیں جیسا تصور کفر کفر نہیں بلکہ عزم کفر کفر ہے اسی طرح تصور ریا، ریا نہیں بلکہ عزم ریا ریا ہے۔ بہرحال مقصود کو دیکھنا چاہیئے اور ہر شخص اپنے وجدان کو دیکھے کہ اس وقت جہاں تنخواہ پر کام کر رہا ہے اگر دوسری جگہ اس سے زیادہ ملے تو چلا جاوے گا یا نہیں اگر زیادہ ملنے پر بھی نہ جاوے تو معلوم ہوگا کہ یہ شخص حسبۃ اللہ کام کرتا ہے ورنہ اجیر ہے یہ اور بات ہے کہ اجرت لینے میں گناہ نہ ہو۔ کیونکہ امام شافعی جواز کے قائل ہیں اور ہمارے علماء نے اس پر فتویٰ دیدیا ہے مگر گفتگو اجر و ثواب میں ہے یہ میری رائے ہے اگر غلطی ہو تو مجھ کو اطلاع کردی جاوے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفقہ قاضی کے طور پر تنخواہ لیتا ہے اس کو اجر ملیگا ورنہ نہیں۔ اب صرف ایک شبہ اور رہ گیا وہ یہ کہ جب یہ نفقہ قاضی کی مثل ہے تو پھر تنخواہ کی تعیین کریں جواب یہ ہے کہ تعیین تنخواہ محض رفع نزع کے لئے ہے کیونکہ اصل معیار تو رفع حاجت ہے اور حاجت کبھی کم ہوتی ہے کبھی زیادہ اور دراصل اس میں معتبر قول صاحبِ حاجت کا ہے شاید کسی کو اس پر شبہ ہوتا کہ ممکن ہے کہ حاجت پانچ روپیہ کی ہو اور اس نے بتلا دیئے دس روپے۔ پھر نزاع ہوتا اس لئے مصلحت یہ ہے کہ تعیین ہو جاوے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے نفقہ زوجہ کو اس میں بھی اصل عدم تعیین ہے کیونکہ وہ اجرت نہیں بلکہ حق واجب ہے اور اصل معیار اس کا حاجت ہے۔ چنانچہ قبل فرض

قاضی بھی اس کا ادا کرنا واجب ہے لیکن بعض دفعہ مصلحت عدم نزاع کے لئے قاضی نفقہ کی مقدار معین کر دیتا ہے اور ظاہر ہے فرض قاضی کے بعد بھی وہ نفقہ ہی ہوتا ہے اجرت نہیں ہو جاتی پس اگر تعیین منافی ثواب ہوتی تو چاہیئے کہ نفقہ زوجہ بعد فرض کے نفقہ نہ رہے بلکہ اجرت ہو جائے اور اس کا کوئی قائل نہیں یہ اجمالی جواب ہے واللہ اعلم بتفاصیلہ اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو اصلاح کر دی جائے غرض تنخواہ لینے کے بعد بھی بعض صورتوں میں اجر ملتا ہے تو پھر نیت تبلیغ کی کیوں نہ کی جائے۔ پس مدرسین وطلبہ تبلیغ کا ثواب سن کر پڑھنا پڑھانا نہ چھوڑیں بلکہ وہ اس میں نیت تبلیغ کر لیں اور اگر تبلیغ کی قسمیں کر دی جائیں کہ ایک تبلیغ اصول وعقائد کی ہے کفار کو۔ دوسری قسم تبلیغ فروع ہے مسلمانوں کو تیسری قسم ایک جماعت کو تبلیغ کے قابل بنانا پھر تو درس وتدریس کا تبلیغ میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے اور جب تبلیغ کی مختلف قسمیں ہیں تو اب یہ ضرور نہیں کہ ہر شخص ساری قسمیں ادا کرے بلکہ اس کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے۔ پس ان سب کاموں کو خاص خاص جماعت کے سپرد کیا جائے یعنی قابلیت اور مناسبت کو دیکھ کر تقسیم خدمات کی جائے کیونکہ ہر ایک آدمی ہر ایک کام کے قابل نہیں ہوتا خود قرآن سے بھی تقسیم خدمات کا ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ اس میں حق تعالے نے سب کو دفعۃً جہاد میں جانے پر عتاب فرمایا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ایک جماعت جہاد میں جاتی اور ایک علم حاصل کرتی اس سے اس آیت میں بحث نہیں کی کہ اس تقسیم کے لئے مرجح کیا ہے کس کو تحصیل علم کرنا چاہیئے اور کس کو جہاد میں جانا چاہیئے مگر اتنی بات ثابت ہو گئی کہ دونوں میں مشترک خدمات کو تقسیم کیا گیا اسی طرح جب تبلیغ کے اقسام ہیں تو کسی کو کوئی خدمت کرنا چاہیئے کسی کو کچھ کرنا چاہیئے۔ سب ایک ہی کام نہ کریں کہ اس سے دین کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی۔ باقی یہ پھر کہوں گا کہ جو کچھ کرد

اپنے بڑے سے پوچھ کر کر وہ متعین کر دیں گے کہ کس کو کیا کرنا چاہیئے وہ جس کو پڑھنے کا حکم کریں وہ پڑھیں جن کو تبلیغ متعارف کے واسطے مقرر کریں وہ مبلغ بنے پھر تبلیغ کے اندر جس کو جو خدمت سپرد کریں وہ اسی کو انجام دے مثلاً کسی کو مالی خدمت بتا دیں گے کسی کو جانی کسی کو تالیف و تصنیف کی پس یہ مت سمجھو کہ یہ تبلیغ نہیں ہے یہ بھی تبلیغ ہی ہے کیونکہ مقدمات تبلیغ ملحق بالتبلیغ ہیں پس مال دہندہ بھی مبلغ ہے اور احکام سنانے والا بھی مبلغ ہے اور مضامین لکھنے والا بھی مبلغ ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی سے پوچھو کہ تمہارے کھانے میں کیا صرف ہوتا ہے تو وہ پانچ روپے بتلا دے گا مثلاً پھر اس کی تفصیل میں کوئلہ اور اوپلے کو بھی شمار کرے گا مثلاً دو روپیہ کا اناج ہے اور ایک روپیہ کی دال اور چار آنے کے اوپلے اب اگر کوئی کہے کہ میاں ہم تو تم سے کھانے کا حساب پوچھ رہے ہیں تم اوپلے کو اس میں کیسے شمار کرتے ہو تو کہا جاوے گا کہ یہ شخص یعنی معترض احمق ہے کیونکہ یہ بھی کھانے کے متعلقات میں سے ہے کھانا بغیر لکڑی یا اوپلے کوئلے کے کیسے پک سکتا ہے یہ تو عرف کے موافق کلام ہے اور قواعد شرعیہ سے بھی ثابت ہے کہ مقدمات شے بھی اسی حکم میں ہوتے ہیں جو اصل کا حکم ہے چنانچہ ارشاد ہے تعاونوا علی البر و التقوٰی معلوم ہوا کہ معاونت بر بھی بر ہے کیونکہ اس میں تعاون با مور بر کے اور مامور بہ کا بر ہونا لازم ہے۔ بہر حال تبلیغ کے متعلق متعدد خدمات ہیں پس ایک جماعت ایسی ہو جو اشاعت اسلام کرے اور ایک جماعت ایسی ہو کہ مال سے ان امداد کرے وغیرہ وغیرہ میں نے اس کو مکرر اس لئے بیان کیا کہ ہم لوگوں میں کام کے وقت غلو ہو جاتا ہے کہ بس جدھر رخ کرتے ہیں سب ایک ہی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں اس لئے تبلیغ کی ضرورت بیان کرتے ہوئے مجھے اندیشہ ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ مدرسین و طلبہ پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیں، بلکہ اس کو اپنے بزرگوں سے پوچھو کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے آیا سبق چھوڑ کر چلے جاویں یا پڑھتے رہیں یا ایک وہاں سے چلا آوے

دوسرا جاوے غرض اپنی رائے سے کچھ نہ کرو ورنہ بجائے اصلاح کے فساد ہوگا
میں نے اس کو قصداً عرض کیا ہے، کیونکہ میں یہ رنگ دیکھ رہا ہوں کہ آجکل
وہ طلبہ بھی جو علم سے فارغ نہیں ہوئے تبلیغ میں مشغول ہونا چاہتے ہیں حالانکہ
میرے نزدیک ان کے لئے تکمیل علم اول ضروری ہے کیونکہ اگر یہ پڑھنا پڑھانا
نہ ہو تو تصنیف و تبلیغ وغیرہ بھی سب بیکار ہے کیونکہ ناقص کی تبلیغ وغیرہ کچھ
قابل اعتبار نہیں بلکہ اس طرح تو چند روز میں علم بالکل معدوم ہی ہوجاویگا
تو تعلیم و تعلم بھی ایک فرد ہے۔

تبلیغ کی اب دوسری بات کہتا ہوں کہ تبلیغ کی اس فرد کی طرف کچھ تو توجہ
ہے مگر اس کی جو دوسری فرد ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس کی طرف
تو بالکل ہی توجہ نہیں حالانکہ یہ بھی ایک فرد اعظم ہے تبلیغ کی اور اس میں بھی ایک
تفصیل ہے وہ یہ کہ اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک خطاب خاص ایک خطاب عام،
امر بالمعروف خاص تو سب کے ذمہ ہے یہ کسی فرد بشر سے ساقط نہیں ہوتا اور
امر بالمعروف عام یعنی وعظ کہنا یہ سب کے ذمہ فرض نہیں بلکہ صرف یہ علماء پر واجب
ہے اور امر بالمعروف خاص کا مدار قدرت پر ہے یعنی جس کو جس کسی پر جتنی قدرت
ہے اس کے ذمہ واجب ہے کہ اس کو امر بالمعروف کرے مثلاً ماں باپ کے
ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز روزہ کی نصیحت کریں خاوند مہ فرض ہے کہ اپنی
بی بی کو احکام شرعیہ پر مجبور کرے۔ آقا کے لئے لازم ہے کہ اپنے نوکر چاکر اور جو ان
کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے حدیث میں ہے مروا صبیانکم بالصلوٰۃ
اذا بلغوا سبعا واضربوھم اذا بلغوا عشرا غرض ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے
ماتحتوں کو حکم کرے امور خیر کا اور خلاف شرع باتوں سے روکے اس میں عالم ہونے
کی ضرورت نہیں ہاں جہاں علم درکار ہے مثلاً کوئی مختلف فیہ مسئلہ ہے یا ایسا
کوئی مسئلہ ہے جس کے بہت شقوق ہیں اور وہ ان شقوق کا احاطہ نہیں کر سکا یا
احاطہ تو کرلیا مگر درجہ معلوم نہیں کہ متفق علیہ مسئلہ ہے یا مختلف فیہ مسئلہ مختلف فیہ

میں گنجائش ہوتی ہے تو ایسا مسئلہ بتلانا ہر شخص کے لئے جائز نہیں بلکہ جس کی نظر کافی نہ ہو اس کو ایسا مسئلہ بیان کرنا بھی جائز نہیں یہ علماء کے بتلانے کا ہے پس تبلیغ خاص کے لئے تو مسئلہ کی حقیقت کا پورے طور سے منکشف ہونا اور قدرت ہونا شرط ہے اور تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا یہ علماء کا کام ہے خواہ درسیات پڑھ کر عالم ہوا ہو یا کسی عالم سے مسائل سن کر عالم ہو گیا ہو اس کو بھی تبلیغ عام کی اجازت ہے بشرطیکہ کسی بڑے نے اس کو اس کام کے لئے معین کیا ہو چنانچہ صحابہ نے کہاں پڑھا تھا وہ بھی تو سن سنکر تبلیغ کرتے تھے مگر ہر شخص خود نہ سمجھے کہ میں اس کے قابل ہوں جب تک کوئی کامل نہ کہدے کہ تم قابل ہو بقول ایک حکیم کے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنے موتی کو کسی صاحب نظر کو دکھاؤ چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہو جاتا۔ یعنی اے اہل علم کسی اللہ والے کی جوتیاں سیدھی کرو وہ تمہاری اصلاح کر دیں گے ورنہ اپنے کو نہ جانے تکبر سے کیا سمجھنے لگوگے)

جیسے آجکل بعض لوگ اردو کتابیں دیکھ کر وعظ کہنے لگے اور مسائل میں ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ کچھ انتہا نہیں ترجمہ تک غلط کرتے ہیں۔ ایک عالم حکایت فرماتے تھے کہ کسی مقام میں ایک واعظ آئے وعظ میں انّا اعطینٰك الكوثر کا ترجمہ کیا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دیا ہم نے تم کو مثل کوثر کے" ان راوی عالم نے کہا کہ بھائی مثل کا ہے کے معنی ہیں تو فرماتے ہیں کہ یہ کاف کے معنی ہیں یہ کاف تشبیہ کا کہلاتا ہے انھوں نے کہا کہ حضرت یہ کاف تشبیہ کا نہیں ہے یہ کاف خطاب کا ہے تو کہتے ہیں کیا دلیل ہے کہ یہ تشبیہ کا نہیں خطاب کا ہے اب وہ چکرائے کہ اس جاہل کو کیسے سمجھائیں۔ سوچ کر کہا کہ وہ گول گول لکھا جاتا ہے جب الف سے ملا ہوا ہو اور یہ ایسا نہیں کہا ہاں مجھ کو معلوم نہ تھا۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ اس نے اتنا بھی مان لیا ورنہ کہتا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ گول گول

ہوتا ہے اگر کہتے کہ استاد نے بتلایا ہے وہ کہتا کیا دلیل ہے کہ استاد نے بتلایا اور
پھر استاد ہی کو نہ مانے تو کوئی کیا کر لیتا مگر پھر بھی اس میں دین کی اہلیت تھی
کہ اس نے اپنی غلطی کو مان لیا۔ ورنہ اب تو یہ حالت ہے کہ جو بات منہ سے نکل
جاتی ہے خواہ بالکل ہی غلط ہو مگر غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے۔ تو آجکل ایسے
ایسے جاہل بھی وعظ کہنے کھڑے ہو جاتے ہیں خود یہاں دیوبند ہی کی میرے
سامنے کی حکایت ہے کہ ایک جاہل اندھا واعظ آیا اس زمانہ میں مولانا رفیع الدین
صاحب بھی تشریف رکھتے تھے ان ہی کی مسجد کا قصہ ہے بعد مغرب وعظ شروع
کیا وعظ میں یہ آیت پڑھی یاایھا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ
فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ آیت کے اول جز
کا ترجمہ تو قریب قریب ٹھیک بیان کر گئے آگے دوسرے جز میں تماشا کیا ذٰلکم خیر لکم
ان کنتم تعلمون کا آپ نے یہ ترجمہ کیا کہ یہ بہتر ہے تمہارے لئے کہ دوکان کو تالا لگادو
آپ نے تعلمون کی گت بنائی اس کو تالا موند سمجھا مگر قرآن میں تو مون ہے موند نا کہاں
مگر شاید وہ کہتا کہ یہ مون مرخم ہے موند کا حالانکہ موندنا اس معنی میں مستعمل بھی نہیں
ہوتا بلکہ کیواڑ بند کرنے کو موندنا کہتے ہیں نہ کہ تالا لگانے کو۔ مولانا کو غصہ آیا پوچھا
کہ یہ ترجمہ تو نے کہاں سیکھا تو سیکری میں ایک شخص بہت ظریف تھے، ان کا نام
مولوی صادق علی تھا کہا کہ مجھ کو مولوی صادق علی نے یہ ترجمہ بتلایا ہے۔ مولانا نے
فرمایا اس نے تجھے پٹوانے کو ایسا ترجمہ بتلایا ہے۔ تو اگر ایسے لوگوں کو وعظ گوئی
کی گنجائش دی جائے تو بڑا مفسدہ پھیلے گا۔ مگر ہاں بعض ان پڑھ بھی صاحب کمال
اور دیندار فہیم ہوتے ہیں ان کا حافظہ بھی اچھا ہوتا ہے اور باوجود اس کے اگر
کوئی بات ان سے پوچھی جاوے اور ان کو معلوم نہ ہو تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں
معلوم نہیں۔ ان کو وعظ کہنا کسی عالم کی اجازت کے بعد جائز ہے۔ اب تو یہ مصیبت
ہے کہ جو لوگ نام کے مولوی بھی ہیں اور بدون تحقیق مسئلہ بتلانے کی وعید بھی جانتے
ہیں ان کو بھی یہ کہتے ہوئے عار آتی ہے کہ ہمیں معلوم نہیں بس ان سے جو بات بھی

پوچھی جائے فوراً بتلانے کو تیار اور گڑبڑ کرکے جواب دیدیتے ہیں، ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک بالکل بد دین اور ایک کچھ دین دار ہیں۔ جو بد دین ہیں وہ تو غلط سلط بتلاتے ہیں اور جو ذرا دیندار ہیں وہ گول گول جواب دیتے ہیں کہ مخاطب کو جواب کا کچھ پتہ ہی نہ چلے اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان کو مسئلہ معلوم نہیں وہ اس طرح اپنی جہالت کو چھپاتے ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ گنگوہ میں ایک جاہل مفتی تھے مولانا نے امتحاناً ان سے پوچھا کہ حاملہ سے نکاح کرنا کب ہے۔ مولانا نے مسئلہ بھی چھانٹ کر وہ پوچھا جو بہت ہی شقوق رکھتا ہے مگر وہ شخص تھا متدین یہ جواب دیا کہ بیوہ سے نکاح کرنا ایسا ہے جیسے گھیرا دیدینا، پوچھا مطلب کیا ہے کہا تم خود سمجھ لو غرض وہ بڑا ہوشیار تھا جواب ایسا دیا کہ مخاطب کو کچھ پتہ ہی نہ چلے نہ حلت کا پتہ لگے نہ حرمت کا اور نہ عقیدہ بگاڑا مگر سائل کو اس جواب سے کیا حاصل ہوا بجز اس کے کہ متحیر رہے مگر خیر پہلے کچھ تو اہلیت تھی، اب تو من گھڑت سے بھی باک نہیں کوئی کچھ ہی پوچھے جواب تراش کر کہہ ڈالا خواہ غلط ہی ہو تو ایسوں کو تو وعظ کہنا حرام محض ہے۔ البتہ اگر کوئی جاہل اچھا حافظہ والا ہو اور اس کے اندر تدین بھی ہو اور کوئی عالم اس کو اجازت دے تو اس کو وعظ کہنا جائز ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ عالم پہلے اس کے متعدد تقریریں بھی سن لیں پھر اجازت دیں

مولانا عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک امی شخص وعظ کہتا تھا مگر اس کا حافظہ ایسا اچھا تھا کہ وہ شاہ صاحب کے وعظ کو ازبر یاد کرلیتا تھا تو ایسے شخص کو اجازت ہے جبکہ ہر پہلو سے یقین ہوجاوے کہ قوی الحافظہ ہے متدین ہے اور اس کے دین کی بھی جانچ کرلی ہو جیسے ڈاکخانہ کے افسر اپنے ہاتھ سے ڈاک کے خانہ میں اپنے نام کے خط چھوڑ چھوڑ کر ڈاکیہ کی جانچ کے لئے دیکھتے ہیں کہ پہنچتا ہے یا نہیں اسی طرح مختلف جلسوں میں اس شخص سے مسائل پوچھواؤ پھر دیکھو جو باتیں اس کو معلوم نہیں ہیں ان کا کیا جواب دیتا ہے اگر کہدے کہ معلوم

نہیں تو سمجھ لو کہ اس میں تدین ہے اسی طرح اگر کسی طالب علم کو وعظ کے لئے متعین کیا جائے تو جائز ہے مگر اس کے حدود مقرر کردو کہ اس حد تک کام کرو آگے کو نہ بڑھو آخر دنیا کے بھی تو ہر کام کی ایک ایک حد ہے کہ اس حد سے تجاوز جائز نہیں رکھا جاتا غرض اس طریق سے سب کو تبلیغ میں مشغول ہونا چاہیے جس سے جتنا ہوسکے اسی لئے اللہ تعالے نے کسی کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ ادع الی سبیل ربک میں عام حکم دیدیا ہے اور یہاں جو بظاہر خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے تو مقصود خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب کرنا نہیں بلکہ عام ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے قل هٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی کہ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت کرتے ہیں اس تفسیر پر انا ضمیر ادعو کی تاکید ہے اور من اتبعنی اس پر معطوف اور گو علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ میں بھی بصیرت پر ہوں اور میرے متبعین بھی اس صورت میں یہ مستقل جملہ ہوگا یعنی علی بصیرۃ خبر مقدم اور انا مع اپنے معطوف کے مبتدا موخر اور ادعو کا معمول نہ ہوگا مگر چونکہ دوسری نصوص میں وعید عدم دعوت کی عام ہے چنانچہ ترمذی میں ایک حدیث ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف نہیں کرتے ہیں اللہ تعالے ان کو عقاب عام کرے گا اور آپ نے استشہاد کے لئے یہ آیت پڑھی واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ تو اس کے انضمام سے معلوم ہوا کہ امت کا ہر فرد بھی وجوب دعوت کی حکم میں داخل ہے۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پہلی امتیں امر بالمعروف کے ترک سے ہلاک ہوئی ہیں اور امم سابقہ کے حالات نقل کرکے اگر نکیر بہ نہ کیا جائے تو وہ بھی حجت ہے اور اس لئے کہ حق تعالے نے بنی اسرائیل کے صید کے قصہ میں فرمایا ہے واذ قالت امۃ منھم لم تعظون قوما اللہ مھلکھم او معذبھم عذابا شدیدا یعنی بعض صلحا نے دوسروں سے کہا تھا کہ ان نافرمانوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو تو انھوں نے جواب دیا قالوا

معذرۃ الیٰ ربکم کہ خدا کے یہاں عذر قائم کرلے کے لئے تاکہ معذور سمجھے جائیں کہ ہم نے تو ان سے ترک معصیت کے لئے کہا تھا مگر انھوں نے نہیں مانا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت میں تخصیص کسی کی نہیں بلکہ امتی کے ذمہ بھی امر بالمعروف ضروری ہے اور حکم سب کو عام ہے ہاں اس میں وہ تفصیل کہ کس کے ذمہ کیا حکم ہے یعنی تبلیغ خاص ہے یا عام سو اس کو میں نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ تبلیغ عام علماء کا منصب ہے تبلیغ خاص تو ہر جگہ اور ہر شخص پر ہے، بہرحال حکم عام ہے باقی خطاب کا خاص ہونا خصوصیت مقام سے ہوتا ہے بلکہ اکثر جگہ قرآن میں خطاب خاص ہی ہے لیکن جب آپ کسی حکم کے مامور ہیں تو اور سب تو بطریق اولیٰ مامور ہوں گے جبکہ کوئی دلیل تخصیص کی نہ ہو چنانچہ قاعدہ ہے کہ سلاطین کا خطاب اول بڑوں کو ہوا کرتا ہے اور چھوٹے ان کے تابع ہوا کرتے ہیں جب مقربین کو کسی بات کا حکم ہے تو غیر مقربین پر تو فرض متحتم ہوگا پس حق تعالےٰ فرماتے ہیں ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن اس میں سبیل رب کی طرف بلانے کا حکم ہے اب رہا یہ کہ طریقہ کیا ہے دعوت کا سو اس کے متعلق حق تعالےٰ نے تین چیزیں بتلائی ہیں۔ دعوت بالحکمۃ، دعوت بالموعظۃ الحسنہ اور ایک مجادلہ یعنی ایک قسم تو دعوت کی یہ ہے کہ حکمت کے ساتھ کی جائے دوسری قسم یہ ہے موعظۂ حسنہ کے ساتھ دعوت کی جائے اور ایک یہ کہ مجادلہ حسنہ کیا جاوے اس کی توجیہ مختلف ہوسکتی ہے جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں جب کسی کو سبیل رب کی طرف ہوگی تو اس میں ایک تو دعویٰ خاص داعی کا مطلوب ہوگا اور ایک اس کی نقیض ہوگی جو کہ مذہب مخالف کا ہے پھر گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک اپنے دعویٰ کا اثبات اور دوسرے کے دعوے کا ابطال تو حکمت یہ ہے کہ اپنے دعوے پر علمی دلائل قائم کئے جاویں۔ اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے مدعیٰ کو باطل کیا جاوے اصل مقصود تو یہ دونوں ہیں باقی تیسری ایک چیز اور ہے وہ

موعظہ حسنہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کو عباد کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے اس لئے موعظہ حسنہ بھی ایک طریق بتلا دیا اس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پری کر دیتا ہے دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے مثلاً ایک تو منادی کا حکم سنانا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے صرف حکم کا پہونچا اس کا فرض منصبی ہے اب تم مانو یا نہ مانو اس سے اس کو کوئی بحث نہیں اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی شفقت اس بات کو مقتضی ہوتی ہے کہ کسی صورت سے اس کو منوا لوں اس لئے وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا مان ہی لے تو دیکھئے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی خیر خواہ نہیں تو محض شفقت ہی کے مقتضات اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ بھی کرتے رہو جس کی حقیقت تقابل سے معلوم ہوتی ہے کہ حکمت سے جب علمی دلائل مراد ہیں تو موعظہ حسنہ سے دلائل کے علاوہ کچھ اور مراد ہوگا سو وہ ایسے مضامین موثرہ ہیں جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو دل پگھل جاوے اور ان مضامین مرقعہ کا مصداق ترغیب و ترہیب ہے کہ درجات جنت کی ترغیب اور درکات جہنم سے ترہیب کرنا وغیر ذلک غرض اصل مقصود تو احکام کا سنانا ہے خواہ اصل ہوں یا فروع باقی ایک درجہ مخاطب کے متاثر کرنے کے لئے ترغیب و ترہیب کا بھی ہے گو وہ بھی ایک حیثیت سے احکام ہی میں سے ہے مثلاً جنت اور دوزخ کا مضمون عقیدہ کے درجہ میں تو احکام ہی میں داخل ہے اور اصول میں سے مگر دوسری حیثیت سے ترغیب و ترہیب ہے یعنی جہاں احکام کا سنانا اور دوزخ و جنت کا

معتقد بنانا مقصود نہ ہو صرف ترقیق قلب مقصود ہو وہاں ترغیب و ترہیب ہے مثلاً کسی کو کہا کہ اگر نماز پڑھو گے تو ایسی جنت ملے گی جس کی یہ شان ہے یہ حالات ہیں اس کے اندر ایسی ایسی آسائشیں ہیں اور اگر نہیں پڑھو گے تو دوزخ میں جاؤ گے جس کے یہ واقعات ہیں تو یہ مضمون ترغیب و ترہیب کی حیثیت سے محض مرقق ہے قلب کا اس سے مخاطب کے قلب میں صلاحیت قبول احکام کی پیدا ہو گی پھر عمل کرنے کی توفیق ہو گی کیونکہ عمل اول اول تکلف سے ہوتا ہے کیونکہ طبیعت کے خلاف کام ہے اس کے واسطے کوئی امر آمادہ کرنے والا اور ابھارنے والا ہونا چاہیئے طبیعت کے خلاف دنیا کا کوئی کام بھی بلا طمع یا بغیر خوف کے نہیں ہوتا پھر عادت ہو جاتی ہے تو ترغیب و ترہیب کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اس لئے ترغیب کی بھی ضرورت ہوئی اور ترہیب کی بھی شفیق کی تعلیم ایسی ہی ہوئی ہے مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی مضر چیز سے روکتا ہے تو گو اتنا کہدینا کہ یہ چیز مت کھانا حاکمانہ حق ادا کرنے کے لئے کافی ہے آگے اس کو اختیار ہے چاہے احتراز کرے یا بھاڑ میں پڑے مگر باپ اتنی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ شفقت کی وجہ سے کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے دست آور ہے اسے مت کھانا یہ پیٹ میں درد پیدا کر دے گی، اس کے کھانے سے پھنسیاں نکل آئے گی تو اتنا لگنا لپٹنا شفیق ہونے کی حیثیت سے ہے ورنہ اس کو خوف دلانے کی کیا ضرورت پڑی تھی اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لو گے تو تم کو یہ دوں گا وہ دوں گا خود میرا ایک واقعہ ہے بچپن میں ایک دفعہ بیمار ہوا تو حکیم صاحب نے مسہل تجویز کیا مگر میں پیتا نہ تھا تو والد صاحب نے کہا اگر دوا پی لو گے تم کو ایک روپیہ دوں گا بس روپیہ کے لالچ میں پی گیا تو اس واسطے ضرورت ہے ترغیب و ترہیب کی کیونکہ ایسے آدمی بہت کم نکلیں گے جو بلا ترغیب ترہیب کے امتثال امر کرلیں گو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا ترغیب ترہیب کے بھی کر لیتے ہیں جیسے ایک صحابی کے متعلق حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا ہے لولم یخف اللہ لم یعصہ کہ اگر اس کے دل میں خوف خدا بھی نہ ہوتا تب بھی خدا کی نافرمانی نہ کرتا تو بعض کو تو فطری طور پر خدا سے تعلق ہوتا ہے مگر اکثر تو خوف ہی سے کچھ رکھتے ہیں پھر وہ درجہ بھی نصیب ہو جاتا ہے لیکن اول ہی سے ایسے کم ہوتے ہیں مثلاً بچہ پہلے پہلے مار دھاڑ سے پڑھتا ہے اور پھر تو اگر سبق کے لئے اپنے پاس سے بھی کچھ خرچ کرنا پڑے جب بھی نہ چھوڑے تو اس لئے ترغیب ترہیب کی ضرورت ہے یہ موعظہ حسنہ ہے۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی شفقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور امت کو یہ ترکیب بتلائی کہ آپ اس طریقہ سے کام کیجئے کس قدر رحمت ہے کہ دشوار عمل کو کس طرح آسان کر دیا۔

اس کے بعد ارشاد ہے جادلھم یعنی ان سے مجادلہ کیجئے اس میں دو احتمال تھے ایک مجادلہ حسنہ کا ایک سیئہ کا اس لئے احسن کی قید لگادی اور مجادلہ سیئہ سے ممانعت کردی۔ رہا یہ کہ مجادلہ میں تو احسن کی قید لگائی اور حکمت کے ساتھ حسنہ کی قید کیوں نہیں لگائی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غیر حسنہ کا احتمال ہی نہیں کیونکہ اپنے دعوے کی دلیل بیان کرنے میں کسی کو ناگواری نہیں ہوتی اور دوسرے کے دعوے کو رد کرنے میں اسے کبھی انقباض ہوتا ہے اس لئے وہاں قید نہیں لگائی اور یہاں قید لگائی کہ رد اگر ہو احسن طریقہ سے ہو جس سے کسی کو رنج اور کلفت نہ ہو۔ سبحان اللہ کس قدر شفقت ہے عباد پر کہ مخالف کی اتنی رعایت کہ اس کا رد اگر ہو ایسے طریقہ سے ہو کہ اس پر حقیقت تو منکشف ہو جائے مگر برا بھلا کسی کو نہ کہا جائے اور میں نے جو رد میں یہ قید لگائی کہ حقیقت ظاہر ہو جائے یہ اس لئے ہے کہ بعض دفعہ جواب ایسا گول مول ہوتا ہے کہ خصم پر حقیقت بھی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ حسن مجادلہ کے خلاف ہے اس لئے چاہیئے کہ کہے تو صاف صاف مگر احسن طریقہ سے۔ چنانچہ فاصدع بما تومر کا یہی مطلب ہے کہ کھول کے صاف صاف بیان کرو ورنہ جہل سے نجات نہیں ہوتی جو شخص گول مول بات کرتا ہے اس سے ہر شخص راضی تو رہتا ہے مگر اس کا اثر برا ہوتا ہے

کہ مخاطب جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ بات صاف صاف ہو مگر الفاظ سخت نہ ہوں قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن کا یہی مطلب ہے کہ سخت الفاظ سے بچو اب ایک باریک ادب تبلیغ کا اور رہ گیا وہ یہ کہ تبلیغ کر کے ظہور نتیجہ وحصول ثمرہ کی فکر میں نہ پڑنا چاہیئے بعض دفعہ اس سے بہت برا اثر ہوتا ہے اور یہ بالخصوص مبلغ شفیق کو پیش آتا ہے جاد لعو تک تو یہ معلوم ہوا کہ تبلیغ شفقت کے ساتھ ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تبلیغ کے بعد بھی شفقت کی وجہ سے اس کی فکر میں لگے رہو اس میں ایک غائلہ ہے جس کو لوگ کمال سمجھتے ہیں اور ہے واقع میں نقص اس سے تبلیغ کے اندر نقصان ہو جاتا ہے وہ یہ کہ جب شفقت زیادہ ہوتی ہے تو نتیجہ عاجلہ پر نظر ہوتی ہے مگر اوس نتیجہ کو اول سوچ لیتے ہیں کہ اس کا یہ اثر ہوگا حالانکہ اصل نتیجہ رضائے حق ہے اور وہ تبلیغ بطریق مذکور پر فوراً مرتب ہو جاتا ہے اور ثمرہ عاجلہ بھی اگر ہوتا ہے اسی کی برکت سے مرتب ہوتا ہے مگر ہم لوگوں کے اندر عجلت زیادہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ جلدی اثر ظاہر ہو جائے گو اس میں نیت دین ہی کی ہو مثلاً کسی کو نماز سکھاتے ہیں تو اس کا ثمرہ عاجلہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھ سے اس کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیں اسی طرح تبلیغ اسلام میں یہ چاہتے ہیں کہ ہماری تحریک کے ساتھ ہی بہت سے مسلمان نظر آنے لگیں اور اس میں بعض وقت یہ مصلحت بھی نیت میں ہوتی ہے کہ اس سے اہل حق کا مجمع زیادہ ہوگا اور حق بڑھے تو حق کو قوت ہوگی اور جب اہل حق کو قوت ہوگی اہل باطل مغلوب ہوں گے تو وہ مضرت بھی پہونچا سکیں گے یہ مصلحت پیش نظر ہو تو یہ دین ہے مگر اس میں غلو نہ چاہیئے ۔ اور اگر ثمرہ دنیا ہے مثلاً یہ کہ ہمارا نام ہوگا کہ یہ خوب کام کرتا ہے تو وہ تو ہے ہی برا اگرچہ بصورت نماز ہی ہو غرض بعض وقت ثمرہ دینی ہوتا ہے اور کبھی دنیاوی مگر یہ سب ثمرات عاجلہ ہیں جن پر بعض مبلغین کی نظر ہوتی ہے پھر اگر ان ثمرات کا ترتب نہیں ہوتا تو حزن وملال ہوتا ہے اور بعض وقت یاس تک نوبت آجاتی ہے اور مخاطب پر غیظ پیدا ہوتا ہے

اور حاضر یا غائب برا بھلا کہتے ہیں کہ جانا لائق بچھے اس قدر سمجھایا اتنی کوشش کی
مگر تونے سمجھا ہی نہیں میری اوقات کو ضائع کیا اتنی محنت ہی رائیگاں گئی اور اگر
اس پر قدرت ہوتی ہے تو کبھی اس کو سزا بھی سزا بھی دیدیتے ہیں اور وہ بھی
اعتدال سے زیادہ اور بعض وقت دل تنگ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جا بھاڑ میں پڑ
کام چھوڑ بیٹھتے ہیں یہ اثر ہوا ثمرات پر نظر ہونے سے بظاہر تو جب مبلغ کو محزون
اور غمگین دیکھا جاتا ہے۔ اس کا بڑا ہی کمال سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ درجہ کا مبلغ
شمار کیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا کمال ہوگا کہ ہمہ تن اس طرف متوجہ ہے
اور دوسروں سے بھی کہہ رہے ہیں کہ بھائی اس کے لئے دعا کرو کہ اس کی اصلاح
ہو جائے مثلاً اپنا بیٹا نماز نہیں پڑھتا تو اس کو سمجھانے میں کڑھتے ہیں دل سے
دعا کرتے ہیں اوروں سے بھی دعا کراتے ہیں کسی سے کہتے ہیں اجی ایک تعویذ ہی
کر دو یہ سب افعال گو محمود ہیں مگر جب غلو ہو جاتا ہے تو اس کا اثر برا ہوتا ہے
کہ اس کا انجام یاس اور یاس کا انجام تعطل ہوتا ہے تو جس کو آپ نے تبلیغ کا فرد
کامل سمجھا تھا اب وہ مفضی الی التعطل و ترک التبلیغ ہو گیا اور تبلیغ سے ہاتھ دھو بیٹھے
سو یاد رکھو جو درجہ شفقت کا ایسا ہوگا وہ کامل نہیں بلکہ ناقص ہے حاصل اس
ادب کا یہ ہوا کہ ثمرات کے مرتب نہ ہونے سے محزون نہ ہو ایک طبعی حزن ہوتا ہے
اس کا تو مضائقہ نہیں بلکہ اس میں ثواب ہوگا اور یہ ایک یہ کہ اس میں غلو اور
مبالغہ ہو جائے کہ ثمرہ مرتب نہ ہونے سے ہمت ہی توڑ دے اور روتے روتے آنکھیں
پھوڑ دے یہ برا ہے نصوص کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنے حزن و ملال کی
اجازت بھی نہیں حق تعالیٰ جا بجا فرماتے ہیں لا تحزن علیہم ولا تک فی ضیق
مما یمکرون ۔ لست علیہم بمصیطر اور لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا
مومنین اور ما انت علیہم بوکیل اور فان استطعت ان تبتغی نفقا
فی الارض او سلما فی السماء فتاتیہم بآیۃ یہ سب آیات مبالغہ فی الحزن
سے منع کرتی ہیں یعنی اتنا حزن جس سے اپنی صحت ہی برباد ہو جائے یا کام سے

تعطل ہوجائے اس کی اجازت نہیں کوشش کی ممانعت نہیں اس کا تو حکم ہے مگر عدم ظہور نتائج پر اس درجہ کا حزن مضر ہے اللہ تعالیٰ اس آیت میں جادلہم کے بعد اس ضرر کا تدارک کیا عجیب فرماتے ہیں ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین یعنی تبلیغ کرکے نتیجہ کی فکر میں نہ پڑو۔ یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے یہ بھی ایک وجہ ربط ہے ما قبل کو ما بعد سے اور ممکن ہے اور کوئی وجہ ربط اس سے بھی عمدہ کسی کی سمجھ میں آجاوے تو گویا اس مقام میں اللہ تعالیٰ نے دونوں درجوں سے تعرض کیا ہے یعنی ایک تو تفریط فی التبلیغ سے اس کے تدرک کے لئے فرمایا ادع الی سبیل ربك الآیۃ اور ایک افراط فی التبلیغ سے اس کی ممانعت اس جزو میں مذکور ہے ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین غرض تبلیغ کے اندر کبھی افراط ہوجاتا ہے کبھی تفریط یہ دونوں مضر ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں شفقت کی کمی کا تو احتمال ہی نہ تھا تو یہ مجموعی انتظام ہم لوگوں کے واسطے فرمایا گیا ہے کہ تبلیغ میں نہ افراط کرنا نہ تفریط چنانچہ اول میں تفریط کا انسداد ہے اور آخر میں افراط کا حاصل یہ ہے کہ ایک درجہ تبلیغ کا یہ بھی ہے کہ آخر میں ناکامیابی سے اتنا غم سوار ہوتا ہے کہ یاس کی نوبت آجاتی ہے اس کے بعد تعطل ہوجاتا ہے اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ اس سے کیا بحث ثمرہ ہو یا نہ ہو آپ اپنا کام کئے جایئے ثمرات کا مرتب کرنا ہمارا کام ہے، ہم جانتے ہیں کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت میں ہے ایک اور جگہ لطیف عنوان سے اس کو بیان فرمایا ہے ولو شاء ربك لآمن من فی الارض کلهم جمیعا افانت تکره الناس حتی یکونوا مومنین وما کان لنفس ان تومن الا باذن اللہ جن کے اندر شفقت ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مخاطب کے عدم تاثیر سے کس قدر تکلیف ہوتی ہے سو نفس حزن کی ممانعت نہیں وہ تو طبعی اور غیر اختیاری ہے اس میں انسان مجبور ہے بلکہ ممانعت اس کی

جو حد ضیق تک پہونچے اس لئے فرماتے ہیں ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین آپ کو اس سے کیا کہ کوئی مسلمان ہوا یا نہیں ہوا اس کو اللہ جانتا ہے آپ اس کی فکر نہ کیجئے اس کے خدا کے سپرد کر دیجئے اور جہاں اتنی شفقت نہ ہو اور اس لئے تیز لہجہ اور سختی سے تبلیغ کرنے لگیں اس کی بھی ممانعت فرمادی وقل لعبادی یقول التی ھی احسن غرض ایک ہی مقام کی آیتیں افراط تفریط دونوں کی ممانعت کے لئے کافی ہوگئیں امید ہے کہ اب بقدر ضرورت بیان کافی ہوگیا ہے۔ ایک مضمون اور رہ گیا اس کیلئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ کہ مقدمہ مقصود کا مقصود ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ فقہی مسئلہ ہے مقدمۃ الواجب تو اس وقت جن چیزوں کا تبلیغ کے لئے موقوف علیہ ہوتا ثابت ہو جاوے خواہ لولاہ لامتنع کے درجہ میں یا مصحح لدخول الفا کے درجہ میں مثلاً وہ امور جن کو اہل بصیرت بتلاویں کہ تبلیغ کے لئے ان کی بھی ضرورت ہے تو ان کا اتباع کر کے ان مقدمات کو بھی جمع کریں بشرطیکہ شرعی حدود سے باہر نہ ہو چنانچہ اولاً خط کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا اور اب یہاں آکر دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہاں مدرسہ میں سنسکرت کی تعلیم دی جارہی ہے تو ہر چند کہ سنسکرت کا سیکھنا وجوب کے درجہ میں نہیں مگر تبلیغ میں بیحد مفید ہے اس سے معاندین اسلام کے مذہب پر کما حقہ اطلاع ہوگی اور انھیں کی کتب سے ان کا جواب دیا جاوے گا تو بڑا کارگر ہوگا خصم ہی کے مسلمات سے جواب دینا بڑا فائدہ مند ہوتا ہے اس سے وہ ساکت اور دنگ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہت جگہ دیکھا گیا کہ الزامی جواب جس قدر مفید ہوتا ہے تحقیق معاند کے لئے اتنا شفا بخش نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک درجہ ہے تبلیغ کا اس سے ہم بالکل ہی چپ ہو جاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے مجمع کے اوپر اثر زیادہ پڑتا ہے عوام اس کو نہیں دیکھتے کہ کس کی تقریر کیسی ہے ان کے نزدیک تو جس نے ساکت کر دیا بس وہی جیتا

وہ تو مسکت ہونے کے وصف کو دیکھتے ہیں دلیل کی حقیقت کو نہیں دیکھتے ہیں تو بربنائے مقدمۃ الواجب واجب یہ بھی ہو سکتا ہے اور اگر واجب نہیں تو آپ کے نزدیک استحباب ہی کے درجہ میں سہی مگر مفید تو ہے اور یہ عذر کرنا کہ سبق کا حرج ہوتا ہے اجی سبق کے وقت میں اس کا شغل نہ کیجئے بلکہ فضول گوئی میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس میں اس کام کو کیجئے اور ایک مقدمہ تبلیغ کا اور ہے یعنی تقریر کی مشق وہ بھی کیجئے بحمد اللہ آپ کے اساتذہ اہل بصیرت ہیں اور سامان بھی مدرسہ میں موجود ہے اس کو غنیمت سمجھئے اور ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ دیجئے ایسا سامان کہیں نہیں ملے گا۔

ایک حکایت یاد آئی ہے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کہ کسی نے ان کی کمال کی تعریف کی تھی تو آپ نے تواضعاً فرمایا کہ میاں ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے روڑکی گودام کا کاریگر کہ جب تک گودام میں ہے کاریگر ہے جہاں باہر نکلا کچھ نہیں کیونکہ اس گودام میں مشین کے ذریعہ سے سب کام ہوتے ہیں ایک چیز ایک کل میں لگا دی تو ایک نے اسے کاٹا دوسری کل نے ہتوڑا مارا تیسری نے بنا بنایا ایک جگہ رکھ دیا ایسے ہی ہمارا کمال ہے کہ جب تک مدرسہ کے اندر ہیں سب کچھ ہیں اور جہاں باہر نکلے کچھ بھی نہیں۔ خیر مولانا کی شان تو ایسی کیوں ہوتی مگر ہماری حالت تو واقعی یہی ہے کہ مدرسہ ہی ہمارے کمالات کا موقع ہے صاحبو ایسا سامان آپ کو اور کہیں میسر نہیں آوے گا اور نہ وقت بھی نہیں ملیگا اس وقت کو غنیمت سمجھو میں یہ نہیں کہتا کہ مقدمات ہی کے اندر سارے اوقات کو ضائع کر دو بلکہ ہر چیز کو اپنے درجہ میں رکھ کر حاصل کرو اصل مقصود تو دین ہے مگر اس کے حاصل کرنے کے طرق ہیں قرآن کا صحیح کرنا بھی دین ہے، حدیث تفسیر پڑھنا بھی دین ہے، اسی طرح فقہ بھی دین ہے سب پر نظر رکھنا چاہیئے مگر ترتیب سے کرنا چاہیئے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کس کو کتنی مقدار میں حاصل کرنا چاہیئے اور یہ اساتذہ کی رائے پر ہے وہ جس کی استعداد جیسی دیکھیں گے

اس کی صلاحیت کو سمجھ کر خود رائے دیں گے پھر وہ جو رائے دیں ویسے ہی کرو۔

میرے پاس بعض طلبہ کے خطوط آتے ہیں کہ ہم کو منطق نہیں آتی میں لکھ دیتا ہوں اذالم تستطع شیئًا فدع جس کو حمداللہ نہ آوے وہ الحمدللہ پڑھ لے اور جس کے لئے منطق دین میں مفید سمجھی جاوے اس کے لئے وہ بھی دین ہے۔ حضرت مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفہ منطق کی کتابیں درس سے خارج کر دی تھیں تو ایک طالب علم نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا لیجئے حضرت معقول پڑھنا بھی مولانا نے حرام کر دیا اس نے اعتراض کے طور پر کہا تھا مولانا نے فرمایا کہ بھائی مولانا نے حرام نہیں کیا تمہاری طبیعتوں نے حرام کیا ہے تمہارے فہم میں کجی آگئی ہے اس لئے ممانعت کی جاتی ہے۔ اور ہم تو جیسے بخاری میں ثواب سمجھتے ہیں ویسا ہی امور عامہ میں اتنا بڑا دعوے اطمینان کا یہ مولانا ہی جیسے کامل کا کام ہے غرض ہر شخص کا الگ حال ہے جس کو اساتذہ و کاملین سمجھتے ہیں اس لئے سب کے ساتھ ایک برتاؤ نہیں کرتے۔

میرے پاس ایک خط آیا کہ مجھ کو عربی نہیں آتی میں نے لکھا چھوڑ دو اردو میں مسائل پڑھو۔ پنجابی، کابلی، بنگلہ جو زبان آوے اسی میں پڑھ لو کوئی عربی پڑھنا فرض تھوڑا ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کس کو کیا کرنا چاہیئے اور کتنی مقدار کرنا چاہیئے یہ اساتذہ کی رائے پر ہے کیونکہ ہر ایک کی حالت جدا ہے، استعداد جدا ہے۔ سب کو ایک لکڑی نہیں ہانکا جاتا غرض اپنی رائے سے افراط تفریط مت کرو۔ ہمارے اندر بڑی خرابی یہ ہے کہ یا تو کسی کام پر بالکل توجہ ہی نہیں اور یا متوجہ ہوئے تو سب کے سب ایک ہی طرف ٹوٹ پڑے چھوٹے بڑے سب اس میں منہمک ہو گئے

اور سب کاموں کو چھوڑ بیٹھے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی ؛ چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

اور کسی اردو کے شاعر نے کہا ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

وہی مثال ہے ہماری کہ کنویں سے نکلے کھائی میں گرے غرض ہمارے کاموں میں گڑبڑ بہت ہے اعتدال اور استقامت بالکل نہیں وجہ یہ ہے کہ اب خود رائی پھیل گئی ہے یہ بڑا مرض ہے اس لئے میں نے کہا ہے کہ جو کچھ کرے بڑے سے پوچھ کر کرے بلکہ اکابر بھی چھوٹوں کو مناسب ہے کہ مشورہ میں شامل کر لیا کریں اور یہ سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اس خود رائی کو صوفیہ تو سخت ہی مضر فرماتے ہیں۔ عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور اپنی فکر محبت کے راستے میں نہیں ہونی چاہیئے
مذہب عشق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے یعنی سخت قبیح ہے)

وہ تو اس کو کفر فرماتے ہیں لیکن اس سے وحشت نہ ہونا چاہیئے کیونکہ کفر کے بھی مراتب ہیں یہ کفر دون کفر ہے اور سبب کلی اس خود رائی کا یہ ہے کہ ہم لوگوں میں اصلاح اخلاق کی کمی ہے۔ چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں ورنہ بزرگوں نے تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بغیر مشورہ نہیں کیا اور سبب جزئی یہ ہے کہ ہم لوگ ہوش سے کام نہیں لیتے ہیں نرے جوش سے کام لیتے ہیں بس جوش میں مشورہ کا بھی تو ہوش نہیں رہتا اور جوش بھی فی نفسہ بری چیز نہیں جوش ہو مگر ہوش کے تابع ہو۔ جب آپ ہوش سے کام لیں گے تو اس کو بھی سمجھیں گے کہ آپ

لوگ مقتدا بننے والے ہیں اس لئے آپ کے اندر سب شعبے دین کے ہونا چاہئیں اگر کسی بات کی کمی ہو تو نقصان ہے حسین وہ ہے جس کے آنکھ، کان، ناک سب ہی اچھی ہو سب چیزیں موزوں ہوں اگر سب چیزیں تو اچھی ہوں مگر آنکھوں سے اندھا ہو وہ حسین نہیں یا ناک کٹا ہوا ہو تو وہ بھی حسین نہیں اسی طرح دین دار وہ ہے جو دین کے تمام شعبوں کا جامع ہو، عالم وہ ہے جو تمام شعب علوم کا جامع ہو ان ہی شعبوں میں سے امر بالمعروف کے وہ آداب بھی ہیں جو بتلائے گئے ہیں ان سب کو جمع کرنا چاہئے۔ بحمداللہ ضرورت کے موافق بیان ہو گیا ہے اسی بیان کا تتمہ ایک یہ بھی ہے کہ اہل اضلال ہیں اس وقت دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو ارتداد کی صورت میں مرتد بنا رہے ہیں اور ایک وہ جو اسلام کی شکل میں خود پہلے سے مرتد ہیں اور وہ دوسروں کو اپنی طرف بلاتے ہیں یہ فرقہ زیادہ مضر ہے یعنی اس وقت ایک فرقہ تو آریہ کا ہے وہ تو علانیہ کفر کی دعوت کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو اسلام کے پردہ میں کفر کو پھیلا رہے ہیں وہ مرزائیوں کا گروہ ہے ان پر کفر و ارتداد کا فتویٰ ہو چکا ہے۔ مبلغین کو دونوں کی مدافعت کرنی چاہئے جیسے آریہ ہیں ایسے ہی یہ ناریہ بھی ہیں دونوں کافر ہیں یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ پہلے شعبان میں کانپور میں میرا ایک وعظ ہوا تھا۔ اس کا نام دعوۃ الی اللہ ہے وہ چھپ بھی گیا ہے میں نے اس میں بیان کیا تھا کہ اب صرف آریہ کا مقابلہ کرنا چاہئے اور آپس میں جو فرقے ہیں جیسے رضائی یا مرزائی ان سے لڑنا نہ چاہئے یعنی جب وہ لوگ یعنی نو مسلم یا جاہل مسلمان ہمارے گھر کے اندر لڑائی دیکھیں گے تو متحیر رہ جائیں گے کہ یہ سب ہی مسلمان ہیں اور ایک دوسرے کو اہل باطل سمجھتے ہیں پھر ہم کدھر جائیں اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا اب مجھے تنبہ ہوا کہ یہ خیال میرا صحیح نہیں ہے پہلے مجھے واقعات معلوم نہ تھے میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ لوگ بھی صرف

توحید و رسالت ہی کی اشاعت کرتے ہیں یعنی رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اب معلوم ہوا کہ وہ رسالت مرزائیہ کی اشاعت کرتے ہیں اور اس کی ساتھ یہ سنا تھا کہ وہ اُن سے الجھتے ہیں تو اس وقت یہ رائے دی تھی کہ آپس میں نہ لڑو اس سے جاہل مسلمان یا مرتدین پریشاں ہوں گے اسلام سے رُک جاویں گے اسلام سے متوحش ہوں گے پہلے ان کو کسی کے ہی ذریعہ سے مسلمان ہونے دو جب وہ مسلمان ہوجاویں گے پھر بتلا دینا کہ یہ مذہب باطل ہے اور یہ حق ہے اور اسی دعوۃ الی اللہ میں یہ بھی کہا تھا کہ یہ جب تک ہے کہ وہ مرزائی وغیرہ اپنے مذہب سے تعرض نہ کریں نہ اپنے عقائد کی اشاعت کریں اور اگر وہ اس سے تعرض کریں تو تم بھی دریغ نہ کرو اب ایک دوست نے لکھا ہے کہ تمہارے وعظ میں جو یہ مضمون ہے اس سے تو لازم آتا ہے کہ ہم اور کفار ایک جگہ ہو کر اسلام کی اشاعت کریں اور اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ اپنے عقائد کی اشاعت سے تعرض بھی کرنے لگے ہیں تو میں نے جواب لکھا کہ اس میں اس حالت میں عدم سکوت کی طرف خود اشارہ ہے اور یہ اجازت دی کہ اب شائع کردو کہ اگر وہ اپنے مذہب سے تعرض کریں تو ہم بھی اُن سے ضرور تعرض کریں گے۔ پھر ایک دوست نے مجھ کو یہ لکھا کہ اگر وہ تعرض نہ بھی کریں جب بھی ہم کو تعرض کرنا چاہئے کیونکہ حقیقت میں گو وہ مسلمان نہیں مگر ہمارے سکوت سے عام مسلمانوں کو تو یہ خیال ہوگا کہ یہ مسلمان ہیں تو پھر تو چندے وہ انھیں کو اپنے مقتدا اور پیر خیال کریں گے۔ پھر اس سے لوگوں کو ہٹانا مشکل ہوگا اس وقت میری آنکھیں کھل گئیں کہ بیشک میرا خیال غلط تھا۔ پھر میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ ہمارے مبلغین کو کیا کرنا چاہئے

ان سے تعرض کرنے میں تو ضرر یہ تھا کہ کہیں دعوت ہی نہ ترک جائے اور بجائے مرتدین کو مسلمان بنانے کے کہیں مرزائیوں ہی کے مناظرہ میں سارا وقت صرف نہ ہو جائے اور تعرض نہ کرنے میں یہ خیال ہوا کہ اگر لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس کے ہاتھ پر چاہیں اسلام لے آئیں چاہے ہمارے ہاتھ پر یا مرزائیوں کے تو بعد اسلام لانے کے بعض نومسلموں پر ان کا اثر ہو جاوے گا پھر ہٹانا مشکل ہوگا اس لئے مشورہ کیا گیا غرض اس مصلحت کا بھی خیال تھا کہ اگر اب نہ روکا جائے تو انجام میں اثر اچھا نہ ہوگا اور اس مفسدہ کا بھی خیال تھا کہ اس سے وہ نومسلم پریشان ہوں گے کہ ہم کدھر جائیں تو مشورہ پر بعض نے کہا کہ مقصود تو دعوت ہے تو مرزائیوں سے تعرض کرنا بھی دعوت ہے اس کو کیوں ترک کریں مسلمان بنانا تو ہمارے ذمہ فرض نہیں ہمارا کام دعوت ہے خواہ اس تعرض کے بعد کوئی مسلمان ہو یا نہ ہو اس کی پرواہ نہ کرنا چاہیئے اور اب یہاں آن کر بھی معلوم ہوا کہ راجح یہی ہے کہ ان کا رد ضرور کیا جائے اور نتیجہ پر نظر نہ کی جاوے اور اسی کو تو فرماتے ہیں ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین اور وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض دفعہ جی چاہتا تھا کہ وہی معجزہ ظاہر ہو جائے جو کفار چاہتے ہیں تو اس کا کیا عجیب و غریب جواب ملا۔ ان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بایۃ ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدی فلا تکونن من الجاھلین پوری آیت کا مطلب تو ظاہر ہے صرف ولا تکونن من الجاھلین کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں بظاہر ترجمہ دیکھنے والوں کو خیال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

حق تعالیٰ نے ایسا سخت لفظ فرمایا یہ شبہ اصل میں غلط محاورہ سے ہوا ہے ہمارے محاورہ میں جاہل بہت سخت لفظ ہے اور اسی کا اگر ترجمہ کیا جائے تو آسان لفظ ہو جاتا ہے۔ جاہل کا ترجمہ نادان ہے یہ کتنا پیارا لفظ ہے اس سے توہین لازم نہیں آتی بلکہ شفقت کے موقع پر یہی بولا کرتے ہیں، چنانچہ ہمارے محاورہ میں بھی کہتے ہیں دیکھو میاں نادان کیسی باتیں نہ کرو دیکھو بچوں کی سی باتیں نہ کرو تو دیکھئے ظاہر میں تو جاہل کا لفظ کتنا سخت ہے مگر ترجمہ کے بعد اس کی حقیقت بالکل آسان ہے یہ اشکالات غلط محاورہ سے ہوتے ہیں۔

چنانچہ وطن میں ایک شخص نے میرے سامنے ایک اشکال پیش کیا اس طرح سے کہ پہلے مجھ سے پوچھا ووجدك ضالا فهدى کا ترجمہ کردو پھر اشکال کروں گا میں سمجھ گیا کہ کیا اشکال ان کو پیش آیا ہے منشا اشکال کا یہ تھا کہ قرآن مجید کے بعض تراجم میں ضال کے معنی گمراہ کے لکھے ہوئے ہیں بس شبہ یہ تھا کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گمراہ کہا گیا ہے میں نے کہا کہ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ پایا آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا۔ اب وہ میرا منہ تکنے لگے میں نے کہا میاں بتلاؤ کیا اشکال تھا کہنے لگے ابتو کچھ بھی نہیں اس جگہ راز یہ ہے کہ ضلالۃ کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک مذموم ہے چنانچہ ولا الضالین میں جو ضال کہا گیا ہے وہاں تو مذموم میں مستعمل ہے یعنی جو بعد وضوع حق بھی اتباع حق نہ کرے۔ اور ایک غیر مذموم ہے یہ کہ اب تک وضوع حق نہیں ہوا اس کے معنی ناواقفی کے ہیں جو نقص نہیں کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جس میں آپ پر حقائق واضح نہیں ہوئے تھے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ماكنت تدري ما الكتاب ولا الايمان یعنی نزول وحی سے پہلے آپ ان علوم کو کچھ بھی نہیں جانتے تھے ووجدك ضالا فهدى میں یہی درجہ مراد ہے کہ پہلے آپ پر وضوع حقائق

نہیں ہوا تھا اب ہم نے وحی نازل کر کے حقائق کو واضح کر دیا اور ولا الضالین میں وہ درجہ مراد ہے کہ وضوع حق ہو چکا تھا مگر بعد وضوع حق بھی کجی اختیار کی تو جس طرح ضلالت کے دو معنی ہیں اسی طرح لفظ گمراہ بھی فارسی میں دونوں معنوں کو شامل ہے اسی لحاظ سے بعض مترجمول نے ضال کا ترجمہ گمراہ کیا ہے مگر اب ہمارے محاورہ میں گمراہ کا لفظ زیادہ تر معنی ثانی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس لئے اب ضرورت ہے ترجمہ بدلنے کی کہ ایسے الفاظ سے ترجمہ نہ کیا جاوے جس سے عوام دھوکہ میں پڑیں۔ اسی طرح لاتکونن من الجاھلین کے معنی یہ ہیں کہ آپ نادانوں کی سی باتیں نہ کیجئے اس سے کچھ بھی ابہام نہیں ہوتا بلکہ پیار کا لفظ ہے۔ دیکھو اگر تم کسی کو کہو او مرغی کے بچے تو وہ بھڑک اٹھتا ہے غضبناک ہوتا ہے گویا آگ لگا دی۔ اور اگر کہو او چوزے تو ہنس دیتا ہے اور یہ لفظ کس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کو گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہو گیا ہو تو دیکھئے لغت کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے۔ اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ ایسا کیا جائے جس سے سامعین کو وحشت نہ ہو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جی چاہتا تھا کہ کفار کو وہی معجزہ دکھلایا جاوے جس کو وہ چاہتے ہیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض الآیۃ حاصل آیت کا یہ ہے کہ ہم تو ایسا معجزہ نہیں دکھلاتے اگر آپ کا جی چاہتا ہے تو زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر لے آیئے، ہم بھی دیکھیں آپ کہاں سے لائیں گے کس قدر خشک اور مایوس کن جواب ہے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ کام کرنے والے کو ثمرہ عاجلہ پر نظر نہ ہونی چاہیئے اور اس کے عدم ترتب سے محزون نہ ہونا چاہیئے اور ایک تو طبعی حزن ہوتا ہے اس میں تو آدمی معذور ہے بلکہ ماجور ہے اور ایک مبالغہ فی الحزن ہے۔ یعنی

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

سورج سورج کر مجزون ہونا اس کی اجازت نہیں میں ان دونوں کے جمع کا طریق بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ کسی میں نیت فقط رضائے خدا کی ہو یہ نیت ہی نہ ہو کہ وہ مسلمان ہی ہو جائے ہاں دعا کرتے رہے کہ یا اللہ اس کو مسلمان بنا دیجئے اور اس کے دل کے اندر اپنا خوف پیدا کر دیجئے دعا تو یہ کرے اور عمل وہ کرے کہ اپنے کام میں رضائے حق کو مد نظر رکھے اپنا کام صرف تبلیغ کو سمجھے خواہ ثمرہ مرتب ہو یا نہ ہو وہ خدا کے اختیار میں ہے اور اگر کسی کے ذہن میں اور کوئی صورت جمع کی ہو تو مطلع فرمائیں (اہل مجلس کی طرف سے جواب آیا کہ یہی بالکل صحیح ہے) ذوق گواہی دیتا ہے کہ یہ طرز کافی شافی ہے اس سے تکلیف بھی نہیں ہوگی حزن وملال بھی نہ ہوگا اور چونکہ دعا میں عرض معروض ثمرہ ہی کے متعلق ہوگی تو اس میں یہ نیت بھی ایک درجہ میں ہو جاوے گی کہ ثمرہ مرتب ہو بس اتنی نیت کافی ہے ثمرہ مرتب ہونے کے لئے اس سے زیادہ مناسب نہیں اور نیت بھی ایسے طریق سے ہے کہ حق تعالیٰ سے عرض حاجت کی ہے امید ہے کہ وہ پوری ہوگی قلوب ان کے ہاتھ میں ہیں انشاء اللہ تعالیٰ وہ قلوب کو پھیر دیں گے اور اگر اس دعا کے بعد بھی کامیابی نہ ہو بلا سے نہ ہو تم اس کی پرواہ مت کرو نیز دعا میں بھی یہ قصد نہ کرو کہ یہ ثمرہ ضرور مرتب ہو ہی جاوے گی اگر کوئی کہے کہ یہ تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال کرنا کہ مقصود پورا ہو ہی جاوے یہ دعا میں محمود ہے حدیث ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے اندر یہ قصد ہونا چاہیئے نیز ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابۃ اور تم اسے منع کرتے ہو تو یہ بات یہ ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دعا میں عزم تو یہی ہو کہ یہ مقصود پورا ہو جائے مگر اس کی ساتھ دوسری شق پر بھی رضا رہے یعنی دعا تو اسی نیت سے کرے کہ مراد پوری ہو ہی جائے لیکن یہ بھی دل میں رکھے کہ اگر نہ ہو تو اس پر بھی راضی اور خوش رہوں گا۔ مثلاً تندرستی کے لئے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ ہمیں تندرست کر دیجئے تو یہ نیت نہ کرے کہ اگر آپ کا جی چاہے تو کر دیجئے اور مرضی نہ ہو تو نہ کیجئے اس لئے کہ دعا کے اندر ان شئت کہنے کی ممانعت ہے

ضروری اطلاع: یہ الابقاء جولائی اور اگست کا ڈبل ۴۶ صفحے ارسال ہیں

حدیث میں ہے کہ ان شئت مت کہو کیونکہ ان کو مجبور کرنے والا کون ہے وہ خود ہی جو مناسب ہوگا کریں گے جو تمہارے لئے بہتر ہوگا وہی تجویز کریں گے تم اپنی طرف سے یہی غرض کرو کہ میری مراد پوری ہو جاوے، البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ جس چیز کی دعا کرتا ہے وہ شریعت کے موافق ہو اور اس موافق سمجھنے میں اگر اجتہادی غلطی ہو جاوے تو عفو ہے مثلاً جس چیز کی دعا کرتا ہے یہ اس کو قواعد شرع کے موافق سمجھتا تا اور واقع میں شریعت کے مخالف تھی تو اس پر دارو گیر نہ ہوگی غرض مراد تو شریعت کے موافق ہونا چاہیئے خواہ واقع میں یا اس کے اجتہاد میں مگر دعا تردد کے ساتھ نہ کرے جزم کے ساتھ کرے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سمجھے کہ اگر قبول نہ ہو تو بھی میں راضی رہونگا اور میرے لئے وہی بہتر ہوگا اور اسی میں خیریت ہوگی تو اس قضیہ معلقہ ذہنیہ سے اس غیر معلقہ ملفوظ کی تعدیل ہو جائے گی جب حقیقت دعا کی سمجھ میں آئے گی تو اب شبہ رفع ہوگیا اور جزم بالدعا و عدم قصد ثمرہ میں تعارض نہیں رہا خلاصہ یہ ہے کہ اصل مقصود سعی سے رضائے حق ہے نہ کہ ثمرہ اور اس کے ساتھ ہی ثمرہ کے لئے دعا کی بھی اجازت ہے مگر مبالغہ کے ساتھ اس کے پیچھے مت پڑو کہ ہو ہی جائے اور نہ ہو رنج کرنے بیٹھ جاؤ۔ چنانچہ فانت له تصدی اور لست علیهم بمصیطر میں اسی کی تعلیم ہے کہ آپ تبلیغ کرنے کے زیادہ پیچھے نہ پڑے وہ قبول کریں یا نہ کریں اس سے بحث نہ ہونا چاہیئے آپ اس کے درپے نہ ہوں آپ کا کام رضائے حق حاصل کرنا ہے نہ کہ ثمرات کہ وہ نہ اختیاری ہیں نہ موعود اسی لئے ہم کو کسی کے مسلمان بنانے کا حکم نہیں کیونکہ وہ دوسرے کے اختیار میں ہے اور ظاہر ہے قادر بقدرت الغیر کیسے قادر ہو سکتا ہے اختیار تو دوسروں کا اور اس سے کام لیں آپ یہ کیسے ہو سکتا ہے اس لئے ایسے امور کے متصدی ہونے سے بہت تکلیف ہوتی ہے بالخصوص سالکین کو ان کی تو ثمرات عاجلہ پر نظر کرنے سے گویا موت آجاتی ہے کیونکہ اہل علم کو ثمرۂ علم مرتب نہ ہونے سے بدحالی کا شبہ نہیں ہوتا اور سالکین کو ثمرہ عمل حاصل نہ ہونے سے بدحالی کا شبہ ہو جاتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذوق شوق ہو گریہ طاری ہو میلان الی المعاصی نہ ہو معصیت کا وسوسہ بھی نہ ہو ہر وقت

محویت رہے مگر انسان اس کا مکلف کب ہے وہ تو صرف اس کا مکلف ہے اور اتنا ہی اس کے اختیار میں ہے کہ معاصی کا مرتکب نہ ہو جوارح اور قلب کو گناہ سے پاک رکھے نہ ہاتھ سے گناہ کرے نہ پیر سے اور نہ زبان اور دل کو معاصی میں مبتلا کرے خلاصہ یہ کہ تقاضائے معصیت پر عمل نہ کرے اگر تقاضے پر عمل نہ ہو تو پھر خواہ کتنا ہی میلان ہو واللہ ذرہ برابر بھی نقص نہیں بلکہ ماجور ہے کیونکہ اس وقت مشقت زیادہ ہوتی ہے نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے بار بار تقاضا ہوتا ہے اور وہ اس کو روکتا ہے اور جو شخص یوں چاہتا ہے کہ میلان ہی نہ ہو اول تو یہ اختیار میں نہیں اس کا قصد بے معنی پھر اگر ایسا کیا تو حقیقت میں وہ طالب حق نہیں طالب راحت ہے پس اس میں کید نفس ہے کہ مشقت سے بھاگنا چاہتا ہے مجاہدہ سے اکتاتا ہے پس میلان الی المعاصی کوئی نقصان کی بات نہیں یہ تھوڑا بہت سب کو ہوتا ہے حتیٰ کہ کاملین کو بھی ہوتا ہے ہاں کسی کا نفس ایسا مطمئنہ ہو جائے کہ گناہ کا خطرہ ہی نہ گذرے یہ اور بات ہے مگر یہ نادر ہے غرض خطرات کا آنا کوئی مضر چیز نہیں پس اس غم میں نہ پڑنا چاہئے گو غم میں پڑ جانا بھی فی نفسہ مضر دین نہیں لیکن اس سے کلفت تو ہوتی ہے اور اس کلفت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ کوئی بیماری لگ جاتی ہے پھر دین کے کاموں میں خلل پڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں ایک شخص حاضر تھے جو مجاہدہ بہت کرتے تھے کھانا بہت کم کھاتے تھے اور اس سے ضعیف ہو گئے تھے تو مولانا نے فرمایا کہ حدیث میں ہے المؤمن القوی خیر من الضعیف وفی کل خیر یعنی اگر مومن تندرست طاقتور ہے تو کسی کی کچھ خدمت کر دے گا کسی کے لئے پانی لادے گا اور اگر ضعف آگیا تو بجائے خادم ہونے کے مخدوم بن جائے گا دوسروں کا محتاج ہوگا کہ بھائی مجھے پانی پلا دو یہ لا دو وہ لا دو حتیٰ کہ بعض دفعہ نماز روزہ ادا کرنا بھی مشکل ہو جاوے گا ہاں ضعف اضطراری الگ بات ہے یہاں تو اختیاری کا ذکر ہے مگر انہوں نے نہ مانا اس کے بعد ان کے معدہ نے خشکی پیدا ہوئی اس سے کچھ الوان اور روشنیاں نظر آنے لگیں جن کو انہوں نے مولانا کی خدمت میں ظاہر کیا مولانا نے فرمایا کہ یہ مقدمہ جنون کا ہے علاج کرو مگر وہ اس کو بزرگی سمجھے ہوئے تھے علاج نہ کیا آخر مجنون ہو گئے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ برہنہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہتے تھے وظائف

اور مجاہدہ تو الگ رہا فرائض بھی چھوٹ گئے۔ اس سے کیا نفع ہوا غرض امور غیر اختیاریہ کے درپے ہونے سے بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت سے بیمار ہوجاتا ہے بعض وقت مرجاتا ہے بعض لوگ خود کشی کرلیتے ہیں چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں ایک طالب علم نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ رامپور میں ایک شخص تھے ان کو ایسا ہی قبض طاری ہوا ساری کیفیات جاتی رہیں وہ سمجھے میں مردود ہوگیا اور کوئی دستگیر ہادی ملا نہیں آخر خود کشی کرلی۔ باقی یہ کہ اس سے مواخذہ ہوگا یا نہیں اس میں کلام کرنے کی ضرورت نہیں یہ مقدمہ ہمارے پاس نہیں آوے گا خدا جانتا ہے کہ وہ مغلوب الحال تھے یا نہیں مگر نقصان تو ہوا اور اس میں ایک باریک بات اور ہے وہ یہ کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہو ایسی ہو یہ شخص اپنے لئے خود تجویز کرتا ہے جو کہ خلاف عبدیت اور بے ادبی اور گستاخی ہے تمھیں کیا حق ہے تجویز کرنے کا تمھاری تو یہ حالت ہونا چاہیئے ؎

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش | چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب وہ باندھ دیں بندھے رہو اور جب کھولدیں تو کھل جاؤ اور خوشی سے کودنے لگو)

چنانچہ ایک حکایت ہے حاجی صاحب کی اس سے آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہوگی کہ ایک طالب آپ کے پاس آیا اور مرض کی شکایت کی کہ اتنے دنوں بیمار رہا اس مدت میں حرم شریف میں نماز پڑھنا بھی نصیب نہ ہوئی دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ صحت و قوت بخشے اس وقت حضرت نے اس کے لئے دعا کی کہ جب وہ چلا گیا تو فرمایا یہ شخص عارف نہیں ہے اگر عارف ہوتا تو نماز حرم کی غیر حاضری سے مغموم نہ ہوتا کیونکہ مقصود اصلی تو قرب ہے جس طرح بھی حاصل ہو اس کے طرق مختلف ہیں ایک طریق یہ بھی ہے کہ حرم میں آن کر نماز پڑھنے سے قرب حاصل ہو ایک طریق یہ بھی ہے کہ بیمار ہوجائے اور اس پر صبر کرے شکوہ شکایت نہ کرے اور اس سے قرب ہو تو مقصود جس طریق سے بھی حاصل ہوجائے اس پر راضی رہنا چاہیئے حصول مقصود کے بعد کسی طریق کے فوت پر حسرت کرنا مقصود کی بیقدری ہے اور اس کی ایک مثال بیان فرمائی کہ دیکھو لوگ جو حج کرنے آتے ہیں تو مقصود کیا ہے ظاہر ہے کہ مقصود حضوری بیت اللہ ہے کوئی خاص راستہ مقصود نہیں کہ مثلاً بمبئی ہی ہو کر آوے اب

ایک شخص تو بمبئی ہو کر آیا اس کو بہت سے حالات راستہ کے معلوم ہوئے اور ایک کراچی ہو کر آیا جس کو وہ خاص حالات معلوم نہ ہوئے اب کوئی بیوقوف ہی ایسا ہوگا جو جج کو چھوڑ کر کراچی سے بمبئی آوے تاکہ یہ حالات معلوم ہوں صوفیہ نے لکھا ہے طرق الوصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق کسی کے لئے کوئی طریق ہے کسی کے لئے کوئی طریق ہے کوئی طریق مقصود نہیں مقصود رضا ہے جب رضا حاصل ہے تو اب تمنا کرنا کہ یہ ہو وہ ہو یہ تجویز ہے جو ادب طریق کے خلاف ہے۔ صوفیہ تو اپنے ارادہ کو ایسا مٹاتے ہیں کہ یہاں تک کہتے ہیں ؎

ارید وصاله ویرید هجری　　　فاترک ما ارید لما یرید

(میں تو ان کا وصال چاہتا ہوں وہ ہم سے دوری چاہتے ہیں پس میں اپنا ارادہ ترک کرتا ہوں تاکہ محبوب کا ارادہ پورا ہو)

اور حافظ شیرازی نے اسی کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے فرماتے ہیں کہ ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق　　　ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میری خواہش وصل کی ہے اور محبوب کی خواہش فراق کی ہے میں اپنے مقصد سے باز آگیا تاکہ میرے محبوب کا مقصد حاصل ہو جائے)

پس عبدیت یہ ہے کہ اپنی خواہش کو فنا کر دے جو ان کا ارادہ ہے اسی پر راضی رہے بعض عارفین نے فرمایا ہے ارید ان لا ارید واختار ان لا اختار اسپر ابن عطا اسکندری نے ایک اشکال وارد کر کے خود جواب دیا ہے اشکال یہ ہے کہ عدم ارادہ کا ارادہ یہ بھی تو ایک ارادہ ہوا پھر ارادہ کا فناء کہاں ہوا کسی معقول کا اشکال معلوم ہوتا ہے پھر خود جواب دیا ہے کہ مطلوب مطلق ارادہ کا فنا کرنا نہیں بلکہ صرف اس ارادہ کا جو کہ رضا کے خلاف ہو اور عدم ارادہ کا ارادہ رضا کے خلاف نہیں کیونکہ خداوند کریم بھی چاہتے ہیں کہ بندہ کسی ایسی بات کا ارادہ نہ کرے جو رضا کے خلاف ہو پس عدم ارادہ کا ارادہ فناء ارادہ کے منافی نہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ اعمال اختیاریہ میں کمی نہ کرے اور ثمرات غیر اختیاریہ میں تفویض کرے اس قدر ان کے درپے نہ ہو کہ فقدان پر غم کرنے لگے البتہ جو ان میں محمود ہیں ان کے لئے دعا کا مضائقہ نہیں پھر حاصل ہوں تب اور نہ حاصل

ہوں تب دونوں حال میں راضی رہو اور اختیاری اعمال میں لگے رہو کیونکہ غم تو جب ہوتا ہے جب ان ثمرات کا وعدہ ہوتا۔ یہ وعدہ کہاں ہے کہ ذوق شوق بھی عطا کروں گا ہاں حدیث میں اس کی دعا آئی ہے تو ذوق شوق کے واسطے دعا کرو اس سے کام میں سہولت ضرور ہوتی ہے اس لئے اہل طریق نے کہا ہے کہ یہ احوال مقصود نہیں ہیں ہاں محمود ہیں جب محمود ہیں تو دعا کرو اور جب مقصود نہیں اس کے فقدان سے پریشان نہ ہو نہ ان کا انتظار کرو جیسے مقولہ مشہور ہے الحائک اذا صلی یومین انتظر الوحی ایسے امور غیر اختیاریہ وغیر موعودہ کے متعلق حضرت حاجی صاحب سے کوئی شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو حضرت فرماتے کہ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ خدا نے تم کو اپنا نام لینے کی توفیق دی اور اکثر یہ شعر پڑھتے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم　　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(اس محبوب کو پا جاؤں یا نہ پاؤں ہم تو ان کی تلاش میں لگے رہیں گے وہ حاصل ہوں یا نہ حاصل ہوں ہم ان کی آرزو سے دستبردار نہ ہوں گے)

یہاں ایک علمی اشکال ہے وہ یہ کہ یافتن حق تو نصاً مطلوب ہے اور اسی کے پانے کے لئے تو رات دن مستانہ وار پھرتے ہیں پھر نہ یافتن پر رضا جواب یہ ہے کہ قائل کی اصلاح نہ جاننے سے یہ اشکال وارد ہوا ہر فن کی اصلاح جدا ہے عشاق کی الگ اصلاح ہے علماء کی جدا اصلاح ہے تو ہر متکلم کی اول اصلاح جاننا چاہیئے۔ یہاں یافتن حق سے مراد یافتن حقیقی نہیں یافتن مرغوب ہے جو اس نے اپنے ذہن میں تراش رکھا ہے کہ اگر یہ بات حاصل ہو جو میرے ذہن میں ہے تب تو یافتن متحقق ہو ورنہ نہیں ہوا تو اس کو فرماتے ہے کہ یہ خواہ حاصل ہو یا نہ ہو اس کو چھوڑو اپنا کام کئے جاؤ اسی کو عارف شیرازی دوسرے صاف عنوان سے فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں اصل چیز دوست کو راضی کرنا ہے بس یہی طلب کرو رضائے دوست کے علاوہ کچھ اور تمنا کرنا افسوس کی بات ہے)

فراق اور وصل دونوں کی نفی کر کے رضا کو مطلوب فرماتے اس سے صاف معلوم ہوا کہ وصال

حقیقی مراد نہیں وہ تو عین رضا ہے نہ کہ مقابل رضا کا اسیطرح فراق حقیقی مراد نہیں وہ تو منافی رضا کا ہے نہ کہ ممکن الاجتماع رضا کی ساتھ بلکہ وصال وفراق مزعوم یعنی تم جس کو فراق یا وصل سمجھے ہوئے ہو اس کا کچھ اعتبار نہیں تم اپنی نظر رضا پر رکھو۔ باقی حقیقی وصال اور رضا میں تو تلازم کا علاقہ ہے یعنی رضا مستلزم ہے وصال کو یا یوں کہو کہ وصال مستلزم ہے رضا کو وصال میسر ہو تب بھی مطلوب حاصل رضا میسر ہو جب بھی مدعا حاصل اسی کو کہتے ہیں کہ ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف　　گر بکشد زہے طرب در بکشم زہے شرف

(اگر قسمت نے موافقت کی تو محبوب کے دامن کو ہاتھ میں پکڑ لوں گا پھر اگر اس نے کھینچ لیا کیا ہی لطف ہوگا اور اگر ہم نے کھینچ لیا تو میری خوش قسمتی ہوگی)

یعنی خواہ یہ لازم ہو اس کو یا وہ لازم ہو اس کو دونوں طرح مطلب حاصل ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وصال بلا رضا ہو جائے جب یہ ہے تو پھر اس کے کوئی معنی ہی نہیں کہ رضا تو طلب کرو اور وصال کے طالب مت بنو تو اس سے صاف معلوم ہوا کہ وصال دو قسم پر ہے ایک وصال مزعوم اور ایک واقعی نفی وصال مزعوم کی ہے اور طلب وصال واقعی کی اب میں اس کے مصداق کی تعیین کرتا ہوں اس لئے کہ اس غلطی میں سالکین بکثرت مبتلا ہیں وہ وصال مزعوم بسط ہے اور فراق مزعوم قبض ہے جب قبض ہوتا ہے تو سالک کو بڑی تنگی ہوتی ہے اور اس کو یہ متوہم ہوتا ہے کہ میں مردود ہو گیا اور یہ کم وبیش سب کو پیش آتا ہے الا ماشاء اللہ تو فراق سے یہ قبض مراد ہے اور وصل سے اس کا مقابل بسط اور یہاں قبض وبسط اصطلاحی مراد ہے نہ کہ لغوی یعنی واردات واحوال کا فیضان وفقدان پس عارف شیرازی اس کے متعلق تسلی فرماتے ہیں کہ قبض وبسط کیا چیز ہے جس کو تم فراق ووصل سمجھ رہے ہو اور اس کے پیچھے پڑے ہو۔ تمہارا کام تحصیل رضائے حق ہے اسی کے طالب بنو اور یہی معنی ہیں یا بم اور ایا نیا بم کے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جستجو میکنم کے بعد نیا بم کا احتمال رہے حالانکہ حدیث میں ہے من تقرب الی شبراً تقربت الیہ ذراعاً الحدیث خلاصہ یہ کہ صوفیہ کے نزدیک تسلیم ورضا روح سلوک ہے اور جتنے عقبات اس طریق میں پیش آتے ہیں

ان میں بڑا حصہ کا حل یہی رضا ہے اور اسی کا تتمہ یہ ہے کہ غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑے یہ دونوں باتیں اگر سمجھ میں آجائیں تو پھر کبھی پریشانی نہ ہوگی اور میں نے صوفیہ کا یہ قول کہ ثمرات کا مرتکب ہونا مقصود نہیں مقصود رضا ہے اپنے مضمون کی تائید میں پیش کردیا ورنہ یہ مضمون خود قرآن کی آیات میں موجود ہے کہ تبلیغ میں ثمرہ مقصود نہیں اصل مقصود رضا ہے جس کا طریق عمل وسعی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو کجی سے بچاوے اور فہم سلیم و توفیق عمل عطا فرماوے آمین۔ وصلے اللہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مختصر کیفیت سفر رقم زدہ صاحب وعظ جس میں یہ وعظ ہوا معنون بہ حکمت حقہ

منقول از رسالہ النور ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

جس کو منتظم اشاعۃ وعظ نے لطف ناظرین وعظ کے لئے وعظ کے ساتھ ملحق کردیا وھو ہذا

حکمت حقہ

یعنی

بگذر از ظن خطا اے بدگمان ان بعض الظن اثم را بخوان

کا ایک اہم مصداق

حضرات علماء مدرسۂ دیوبند بارک اللہ تعالیٰ مدفیوضہم کے متعلق مختلف روایات اس احقر کے بارہ میں سننے میں آتی تھیں چونکہ بعض واقعات اس کے معارض بھی ظاہر ہوتے تھے چنانچہ اسی زمانہ میں جناب مہتمم صاحب کا اپنی صاحبزادی کی شادی میں یاد فرمانا اور احقر کے عذر کے بعد جناب نائب مہتمم صاحب کا محض ملاقات کیلئے یاد فرمانا جس سے وہ حضرات فضیلت سبقت وارد حدیث خیرھما الذی بدءٔ بالسلام پر فائز اور اس کے بجائز ہے گو مجھ کو ان ارشادات کی تعمیل کی توفیق نہیں ہوئی اس لئے بمقتضائے آیت ولا تقف مالیس لک بہ علم وقولہ تعالیٰ فی الحجرات فتبینوا ان آیات پر وثوق نہ کرکے وسوسہ طبیعت کے ازالہ کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ رسالہ موذی مرید حضرات کی خدمت میں بغرض تحصیل رائے متعلق موذی مذکور واحقر عدیم الشعور بھیجا گیا جس پر وہ جواب آیا جو النور بابت رمضان وشوال ۱۳۴۲ھ میں صفحہ الف و ب پر شائع ہوا ہے اس کے بعد پھر تیسری بار

حاضری کی تحریک فرمائی اس پر احقر نے مجملاً روایت بعض حضرات کے تکدر کی اپنے عذر حاضری میں نقل کردی، اس کے جواب میں جو خط آیا اس کے بعض جملے یہ ہیں۔

(۱) یہاں بحمد اللہ کسی کو انقباض و تکدر نہیں۔ (۲) اگر فی الواقع ایسا ہو بھی تب بھی مجھے جناب سے یہی توقع رکھنی چاہیئے کہ اس عقدہ کو حل فرماکر جماعت کو انتشار و تشتت سے بچالیں اگر غیر مناسب نہ ہو تو طیب و طاہر حاضر ہو جائیں اور جناب کے ساتھ ہی یہاں واپس آئیں اور اگر سردست میری معروضات کے قبول کا وقت نہیں آیا تو پھر میں حاضر ہوں گا۔ اس پر میں نے ان روایات کی کچھ مختصر تفصیل ان کی تحقیق کی جس کے جواب کے بعض جملے یہ ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ باہم اکابر و اصاغر و اوساط میں اختلاف رائے رہا اور رہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے باہم اعتراضات بھی ہوئے مجھے خود بھی جناب سے بعض رایوں میں اختلاف تھا لیکن الحمد للہ تنقیص و توہین کو سننا بھی گوارا نہیں کیا۔ اختلاف آرار مسائل کی صورت میں اعتراض کرنا شرعاً مذموم نہیں سمجھا گیا سب سے اول مشاجرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھا جائے کہ جلیل القدر صحابہ یہاں تک کہ عشرہ مبشرہ بلکہ خلفاء راشدین میں بوجہ اختلاف اعتراض کئے گئے ہیں بلکہ بعض اوقات سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یہاں تک کہ قتال کی نوبت پہنچ گئی لیکن یہ اسی حد تک تھا جہاں تک اختلاف رائے کا تعلق تھا اور جب نفس ذات پر نظر جاتی تھی تو وہی اصل ارتباط معلوم ہوتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ و حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے واقعات موجود ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک فروعی مسئلہ میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی نسبت سخت الفاظ استعمال فرمائے

اس کے بعد ائمہ مجتہدین اور ان کے اتباع کے اختلافات موجود ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ حضرت امام اعظم پر اور ان کے متبعین پر سخت الفاظ میں اعتراض کرتے ہیں لیکن جب نفس ذات امام اعظم اور ان کے فضل وکمال پر نظر جاتی ہے تو غایت درجہ کا ادب کرتے ہیں یہاں تک کہ نماز صبح میں قنوت بھی ترک کر دیتے ہیں اسی طرح امام شافعی اپنے استاد امام مالک پر سختی سے اعتراض کرتے ہیں، یہ بھی بطور قاعدہ کلیہ کے ہے کہ اختلاف اگرچہ اصولی نہ ہوں فروعی ہوں حقیقی نہ ہوں لفظی ہوں مگر ابتداء میں بوجہ جوش و ہیجان ایک دوسرے کے خلاف جوشیلے الفاظ استعمال کر لیتے ہیں اور بسا اوقات یہ جزوی اختلاف فساد کی طرف منجر ہو جاتے ہیں لیکن انجام کار سکون پیدا ہو جاتا ہے اشاعرہ وماتریدیہ اصولاً متفق ہیں صرف چند مسائل میں اختلاف کی وجہ سے کیسے کیسے خلاف ہوئے طعن وتشنیع کے دروازے کھلے، نوبت بہ مخاصمت و تضلیل پہونچی مگر انجام جب صلح ہوئی تو معلوم ہوا کہ اکثر اختلافات لفظی تھے اور جو بعض اختلاف حقیقی بھی تھے تو ان سے تضلیل و تفسیق ہوئی بجنسہ یہی حالت ہم لوگوں کی جناب کے ساتھ تھی اختلاف ضرور تھا، اعتراض بھی کرتے تھے لیکن جناب کی ذات سے وہی تعلق تھا۔ کسی نے حالت ناراضی میں کوئی لفظ بھی کہا تو وہ اس حالت کا اقتضاء تھا اس سے زیادہ کچھ نہ تھا اور ہم میں سے اکثروں نے بالکل احتیاط کا طریقہ رکھا اور اکثروں کا طریقہ یہ رہا کہ نفس مسئلہ میں اختلاف کے ساتھ جناب کی طرف سے مدافعت کرتے رہے۔ مثال کے طور پر مولوی حسین احمد صاحب کو خیال فرمالیا جاوے کہ رسالہ بھی لکھا لیکن جناب کی ذات سے ان کا تعلق ویسا ہی رہا معترضین کو بگڑ کر جواب دیتے رہے۔ یہ میں نے جو کچھ عرض کیا اس سے میری غرض یہ ہے کہ ایسے شدید ہیجان جوش

اور اختلاف رائے کے وقت اگر کسی سے کوئی امر خلاف شان سرزد ہوا تو ایسی حالت میں کہ اصولاً سب متفق ہیں اختلاف ہے تو صرف مصالح دینی کی بنا پر جس کے نزدیک جو جانب راجح معلوم ہوئی اس پر عمل کیا تو میرے نزدیک اس میں زیادہ کنج دکاؤ نہ کی جائے بلکہ اصول کو مدنظر رکھ کر عارضی اختلافات کو رفع کر دیا جائے۔ خلاصہ عرض یہ ہے کہ بہت سی روایات اور واقعات اصلی حالت میں نہیں پہنچے اس میں شک نہیں کہ اختلاف پیدا ہوا اور اس کی وجہ سے شکوہ شکایت اور اعتراضات کی نوبت پہونچی، لیکن بایںہمہ یہ اعتراضات مخالفانہ یا معاندانہ نہ تھے بلکہ جیسا کہ اہل حق کی دو جماعتوں میں اکثر ہوا ہے تھے اکثر اختلافات کا مبنی عزیمت و رخصت پر تھا ایسی حالت میں باوجود اختلاف کے دینی تعلقات برابر قائم رہے اور ہیں جن اکابر یا بالخصوص اصاغر کی طرف جناب کو خیال ہے ان کی طرف بہت سی باتیں غلط طور پر منسوب ہو جائیں، صورت حال ایسی تھی کہ جو کچھ روایت ہوا چسپاں ہو گیا اور اس میں کسی ایک جانب کی خصوصیت نہیں ہے یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ تعلقات کبھی بھی منقطع نہیں ہوئے مجھے امید ہے کہ جناب ان روایات پر توجہ نہ فرماویں گے اور میری نیازمندانہ عرض قبول فرما کر یہاں تشریف لانے کا قصد فرمائیں فقط والسلام

احقر حبیب الرحمٰن عفی عنہ از دیوبند ۲ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

اس پر احقر نے عرض کیا کہ قبول ارشادات پر کلام کو ختم کرتا ہوں اور دو سوال محض ناز سے اور کرتا ہوں۔ ۱ اگر دوسرے فریق کی طرف سے بعینہ یہی معاملہ حضرات دیوبندی رحمۃ اللہ کی ساتھ ہوا ہو کیا اس عذر سے وہ بھی منتفع ہو سکتا ہے۔ ۲ اگر یہ تحریکات حد تمنا تک کامیاب ہو جائیں کیا اسی لطف و کرم کی ابتدا اس احقر کے ساتھ پھر بھی ہوتی۔ اس کا جواب آیا۔

۱ فریقین نے اختلاف رائے کی وجہ سے اعتراض کئے توہین و تنقیص نہیں کی اور نہ

ان کا مقصود یہ تھا تو دونوں اس حیثیت میں مساوی ہیں اگر معذور ہیں تو دونوں اگر نہیں ہیں تو دونوں کوئی وجہ فرق نہیں۔ ۲؎ اگر تمام تمنائیں پوری ہو جاتی تو سچ عرض کرتا ہوں کہ اس سے زیادہ الحاح کے ساتھ ابتدار کرتا الی آخرہ۔

(حبیب الرحمٰن ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ شنبہ)

اس کے بعد میں نے عذر کی کوئی گنجائش نہیں دیکھی اور چہارشنبہ ہی کے روز دیوبند حاضر ہو گیا اور پنجشنبہ کو تمام دن لقاء احباب جانبین میں عید کا لطف حاصل رہا اور اس لطف کی تکمیل شب جمعہ کے ایک وعظ پر ہوئی جس کی احقر کو فرمائش کی گئی اس سرور کے واقعات اور ان کے زمان و قوع کا اس شعر نے گویا نقشہ کھینچ دیا ہے ؎

عید و عید و عید صرن مجتمعہ ؞ وجہ الحبیب (اشارۃ الی اسم حضرت الداعی)

و شہر العید (ذی الحجہ) والجمعۃ (لیلۃ الوعظ) اس صلح کی مسرت کے ساتھ ایک دوسری صلح کی مسرت نورٌ علیٰ نور ہو گئی یعنی زمان مکاتبت میں ایک عزیز کے خط میں یہ خبر نظر سے گذری آج ترکوں کا معاہدہ اپنے مخالفین سے مکمل ہو چکا اور دستخط ہو گئے۔ آہ ان دو صلح کی مسرت کے ساتھ ایک تیسری چھوٹی سی صلح کی مسرت کا اور اضافہ ہوا یعنی قصبہ ہذا میں مسلمانوں کی ایک جماعت میں کچھ اور آویزش تھی خط اخیر کی آمد ہی کے روز باہمی فیصلہ پر فریقین کی رضامندی گوش زد ہوئی جس سے ایک نور طبعی نے نورین کو انوار بنا دیا۔ اس اجتماع کا شکر ایک شعر میں ظاہر کر کے ختم کرتا ہوں ؎

سرور فی سرور فی سرور ؞ و نور فوق نور فوق نور

للتاسع عشر من ذی الحجہ یوم الجمعۃ ۱۳۴۱ھ

کتبہ اشرف علی

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

مَوَاعِظ

عود العید

آداب الاعلام

احکام مسائل موت

آداب الکسب

ادب الطریق

مجموعہ
آٹھ مواعظ

: مجلس ارشادات :

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم-اے جناح روڈ

ادب الاعلام

ملقب بالکنز النامی

بمناسبت بڑھل گنج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ در کیمپ نرہر پور ضلع گورکھپور مورخہ ۱۲ صفر ۱۳۳۵ھ روز دوشنبہ شروع سات بجکر ۳۲ منٹ صبح ختم پونے نو بجے در راہ بڑھل گنج مطابق ۱۸ دسمبر ۱۹۱۶ء کل وقت ایک گھنٹہ ۱۳ منٹ ماہ صفر ۱۳۳۵ھ میں حضرت والا کا سفر بغرض تبدیل آب و ہوا اور ملاقات اپنے بھائی صاحب منشی اکبر علی صاحب منیجر ریاست مجھولی ضلع گورکھپور کے ہوا چونکہ منشی اکبر علی صاحب دورہ پر تھے اور مقام نرہر پور میں قیام تھا اس واسطے حضرت والا وہیں تشریف لے گئے۔ وہاں سے ایک قصبہ بڑھل گنج قریب میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے. وہاں کے لوگوں کے اشتیاق ظاہر کرنے کی وجہ سے یہ تجویز ہوئی کہ صبح کو بوقت ہواخوری اسی طرف تشریف لے چلیں چنانچہ منیجر صاحب نے ہاتھی بھجوا دیا اور حضرت والا مع چار خدام کے بڑھل گنج کو روانہ ہوئے۔ ہاتھی پر گھنٹہ بھی تھا راستہ میں اسی پر گفتگو شروع ہوئی اور اس تقریر کو ایسا امتداد ہوا کہ بڑھل گنج پہونچ کر مسجد میں بھی دیر تک منقطع نہ ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹہ تک سلسلہ جاری رہا۔ چونکہ مضمون نہایت معنی خیز تھا اس واسطے دل چاہا کہ یہ تقریر علیحدہ دیگر مواعظ کی طرح ضبط ہو جائے۔ اور احقر نے حضرت سے عرض کیا کہ اس کا نام

بھی علیحدہ تجویز فرما دیا جاوے۔ چنانچہ حضرت نے مجموعہ مضامین پر خیال فرما کر ادب الاعلام تجویز فرما دیا جس کی مناسبت مطالعہ تحریر ہذا سے بخوبی واضح ہو جائے گی اور بمناسبت بڑھل گنج لقب اس کا کنز نامی تجویز فرمایا۔

فرمایا اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ گھنٹہ جائز ہے یا ناجائز ترجیح اس کو دی ہے کہ جائز ہے۔ احقر نے عرض کیا حدیث میں تو اس کی ممانعت آئی ہے۔ فرمایا اس میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ کسی نے اس کو معلل بعلت سمجھا اور کسی نے غیر معلل مجوزین نے علت اس کی تفاخر قرار دی ہے۔ جہاں یہ علت نہ ہو وہاں حکم منع بھی نہ رہے گا چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ راستہ والوں کو خبر کرنے کے لئے یا جانور کو نشاط میں لانے کے لئے درست ہے ہاں جہاں کوئی فائدہ نہ ہو اور صرف تفاخر رہ جاوے تو درست نہیں جیسے امراء اکثر صرف نمود اور رفع شان کے لئے لگاتے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ایجاد تو غرض صحیح کے لئے تھی پھر اس میں نمود اور تفاخر شامل ہو گیا اور اب تک بھی غرض صحیح اس میں موجود ہے۔ چنانچہ میں نے ایک گاڑی بان سے پوچھا کہ تم لوگ گھنٹہ اور ٹالیں کیوں لگاتے ہو کہا تجربہ ہے کہ اس سے بیل چلتے زیادہ ہیں اور ہاتھی کے گھنٹہ سے راستہ والوں کی اطلاع کے علاوہ یہ بھی فائدہ کہ آبادی میں کو جاوے تو وہ عورتیں پردہ کر لیں جن کے مکانوں کی دیواریں پست ہیں۔ محدثین نے اس کی علت صرف یہ سمجھی ہے کہ جرس سے اس واسطے منع فرمایا گیا تھا کہ دشمن کو خبر نہ ہو جائے۔ یہ علت سوائے جہاد کے اور کہیں نہیں پائی جاتی اس واسطے سوائے مجاہدین کے قافلہ کے اور کہیں ان کے نزدیک منع نہ ہوگا اور فقہا نے علت تفاخر کو سمجھا لہذا جس جگہ بھی یہ علت ہو منع ہوگا تو فتوی محدثین کا اس بارہ میں اوسع ہے فقہاء سے

محدثین کا مطمح نظر روایت ہوتی ہے اور فقہا درایت سے کام لیتے ہیں جیسے غنا محدثین کے نزدیک بلا مزامیر جائز ہے کیونکہ حدیث میں لفظ معازف کا آیا ہے اور فقہاء کے نزدیک بلا مزامیر بھی جائز نہیں کیونکہ وہ علت کو سمجھتے ہیں اور وہ خوف فتنہ ہے وہ جیسے مزامیر میں ہے غنائے صرف میں بھی موجود ہے محدثین موقع نص سے تجاوز نہیں کرتے اور فقہاء اصل منشار حکم کو معلوم کر کے دیگر مواقع تک حکم کو متعدی کرتے ہیں (پھر ایک مضمون کے سلسلہ میں محققین کا ذکر ہوا اس پر فرمایا) محقق کی نظر بہت وسیع ہوتی ہے وہ حقیقت کا جویاں ہوتا ہے لایعنی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا صحابہ کی شان بھی یہی تھی ان کے آپس کے اختلافات دیکھ کر شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کے کیسے اخلاق تھے۔ چنانچہ بعض جاہل ان حضرات پر اعتراض کرتے ہی ہیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جہاں موقعہ اتحاد کا ہوتا تھا وہاں ایسے ایک جان دو قالب ہوتے تھے کہ کہیں دنیا میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے یہ دونوں باتیں کیسے جمع کہ اخلاق ایسے خراب ہوں کہ ایسی ایسی منازعتیں ان میں ہوں اور دوسرے وقت وہی حضرات ایسے ایک دل ہو جائیں گویا منازعت کا ان میں مادہ ہی نہیں ضرور ہے کہ وہ منازعت فساد اخلاق پر مبنی نہ تھی بلکہ تحقیق پر مبنی تھا دو محقق جو انتہا درجہ کے محقق ہوں بہت کم ایک بات پر متفق ہو سکتے ہیں یہ بات ظاہراً بعید ہی معلوم ہوتی ہوگی لیکن بالکل صحیح ہے اور یہ کچھ دین ہی پر موقوف نہیں دنیا کی باتوں میں بھی دیکھ لیجئے کسی فن کو اٹھا کر دیکھئے دو محقق کی رائے کبھی موافق نہ ہوگی طبی مسائل میں جالینوس کی تحقیق اور ہے اور شیخ کی اور ہے اور بقراط کی اور ہے یہ اختلاف کیوں ہے ظاہر ہے کہ یہ سب ائمہ فن تھے اور ان کو طب کی ترقی کی کوشش تھی طب کے ساتھ ان کو عداوت نہ تھی پھر ان کے اختلاف کے کیا معنے انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ اختلاف اسی اصول پر مبنی ہے کہ دو محقق کی رائے متفق نہیں ہوتی محققین کی شان ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ حقیقت کو سمجھنا چاہتا ہے اور حقیقت کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں اور احاطہ سب پہلوؤں کا یہ خدا کا کام ہے تو ایک ایک پہلو پر

نظر جاتی ہے اس لئے ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتا وسیع النظر اتنا ہوتا ہے کہ دوسرے محقق کی نسبت کوئی برالفظ بھی کہنا پسند نہیں کرتا ائمہ مجتہدین کا اختلاف بھی اسی قسم کا ہے کہ آپس میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک صاحب ایک چیز کو فرض کہتے ہیں اور دوسرے اسی کو حرام کہتے ہیں یہ کتنا بڑا اختلاف ہے مگر ساتھ ہی اس کے یہ حالت بھی انھیں کی ہے کہ امام شافعی کا ادب امام ابو حنیفہ کے ساتھ مشہور ہے دیکھئے اتنا اختلاف اور اتنا اتحاد اس اختلاف کی وجہ سوائے غایت درجہ کے محقق ہونے کے کچھ نہیں ہے اور محقق ہمیشہ وسیع النظر ہوتا ہے۔ اور ایک شان محقق کی یہ ہوتی ہے کہ فضول مباحثہ سے بچتا ہے اور غیر محقق اور غبی سے گفتگو نہیں کرتا بلکہ اگر غبی سے گفتگو ہو تو ذرا میں خاموش ہو جاتا ہے جس کو عوام ہار جانا سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اس کے پاس دلیل نہیں ہے اور یہ کہ وہ واقع میں ہار گیا بلکہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ نا حقیقت شناس کو سمجھانا وہ مشکل سمجھتا ہے اور ہار مان جانے کو سہل سمجھتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک سو انکھا شخص آفتاب کو دیکھ رہا ہے اور ایک مادر زاد اندھا آفتاب کا انکار کر رہا ہے اگر وہ اندھا اس سو انکھے سے الجھے کہ آفتاب کے ہونے کا کوئی ثبوت لاؤ تو وہ کیا ثبوت دے سکتا ہے اس کو یہ کہنا سہل ہے کہ میں ہارا اور تو جیتا آفتاب کا وجود نہ سہی تو اپنے خیال میں خوش رہے میں اپنے خیال میں خوش ہوں۔ اب بتلایئے کہ یہ سوانکھا شخص ہارا ہوا ہے یا جیتا ہوا آجکل بعضے لوگ کہتے ہیں کہ ہم حق کے متلاشی ہیں اور یہ لوگ ائمہ کے ساتھ اختلاف مسائل میں بے ادبی کرتے ہیں اور اس اختلاف کی بنا احادیث کی مخالفت بتلاتے ہیں اگر ان کے [illegible]ات کو دیکھئے تو صاف ظاہر ہو جاوے کہ تحقیق کا تو پتہ بھی نہیں نہ تحقیق کی لائق علم اور نہ تحقیق کا ارادہ صرف اس مخالفت کی بنا ہوائے نفسانی پر ہے کس درجہ سب وشتم صالحین کے بارہ میں کرتے ہیں۔

آئمہ کا اختلاف تو بلا شبہ اختلاف امتی رحمتہ میں داخل تھا اور ان لوگوں کا اختلاف ویتبع غیر سبیل المؤمنین کی جنس سے ہے۔ بس آج کل خیریت ہے تو سلف کے اتباع ہی میں ہے اور رائے کو دخل دینے میں مفاسد ہی مفاسد ہیں۔ تجربہ ہے کہ اتباع سے نکل کر آدمی بڑی دور پہنچتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات اسلام سے نکل جاتا ہے۔ دیکھئے رائے پر عمل کرنے سے بڑے بڑوں سے ایسی غلطی ہوتی ہے کہ امام رازی نے حدیث۔ لم یکذب ابراھیمؑ الاثلث کذبات سے انکار کر دیا اس وجہ سے کہ کذب انبیاء علیہم السلام سے محال ہے اور جمہور نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کذب میں تاویلیں کی ہیں امام رازی نے تو اپنے نزدیک بڑا کام کیا کہ تاویل کی ضرورت ہی نہیں رکھی لیکن کس قدر فاحشہ غلطی کی کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک ایسی حدیث کو جو سند صحیح سے ثابت ہے ایسی اشکالوں کی وجہ سے رد کر دیا جاوے تو اس کا باب مفتوح ہوتا ہے کہ ہر شخص کو مجاز ہوگا کہ جس حدیث میں اپنے نزدیک کوئی اشکال پائے اس کو رد کر دے اس سے تمام دین کی اساس ہی منہدم ہوتی ہے ایسے امام سے یہ غلطی کس وجہ سے ہوئی صرف اتباع رائے سے۔

میرا ایک خواب ہے جو موافقت قواعد صحیحہ کی وجہ سے میرے نزدیک خوب ہے اور اس سے اچھا تو اس مبحث کا شاید ہی ملے میرے دل میں کھٹک پیدا ہوئی اور یہ زمانہ طالب علمی دیوبند کا ذکر ہے کہ غیر مقلد اپنے ہر مدعا پر حدیث پیش کرتے ہیں جو ہمارے امام کے خلاف ہوتی ہے۔ شاید ان ہی کا طریق حق ہو۔ خواب دیکھا کہ میں دہلی میں ایک محدث میاں صاحب کے مکان پر ہوں۔ دیکھا کہ وہاں چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے۔ مجھے چھاچھ کا شوق ہے۔ انھوں نے مجھ کو بھی دی مگر میں نے

نہیں لی۔ بس آنکھ کھل گئی معاً تعبیر ذہن میں آئی کہ علم کی صورت رویا میں لبن ہے جیسا کہ حدیث میں موجود ہے اور چھاچھ کی صورت تو دودھ کی ہے۔ مگر حقیقت بالکل مغائر ہے معنیٰ اور مغز اس میں نہیں پس یہ سمجھ میں آیا کہ ان کا طریقہ صورت دین تو ہے مگر اس میں معنی دین بالکل ندارد ہے۔ یہ لوگ امام صاحب پر خلاف حدیث کا اعتراض کرتے ہیں۔ امام صاحب نے بھی حدیث کے خلاف کوئی بات نہیں کہی مگر معنی اور مغز کو لے کر اور یہ لوگ صرف صورت سے شبہ کرتے ہیں تو یہ معارضہ معارضۂ حدیث نہ ہوا بلکہ معارضۂ معنی و صورت حدیث ہوا اور ایسا ممکن ہے جیسا کہ میں چند نظیر دل میں دکھاتا ہوں۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے باوجود امر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اس غلام پر حد جاری نہ کی اس سے کوئی ظاہر بیں کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حدیث کی مخالفت کی جیسا کہ یہ لوگ ہر بات میں امام صاحب کو طعنہ دیتے ہیں کہ حدیث کی مخالفت کرتے ہیں لیکن معنی فہیم آدمی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے گو ظاہر حدیث کی مخالفت کی لیکن حقیقت میں مخالفت نہیں کی اور ان کو یہی کرنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اسی کو تصویب فرمائی حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو یہ مسئلہ معلوم تھا کہ از روئے کتاب وسنت غیر زانی پر حد نہیں ہوسکتی جبکہ وہ غلام مقطوع الذکر تھا تو اس سے زنا ممکن ہی نہیں تھا پھر حد کیسی انصاف سے کہئے کہ تعمیل حدیث یہ ہے یا وہ ہوتی۔

اسی طرح امام صاحب کے اقوال ہیں کہ وہ مغز حدیث پر مبنی ہیں اور ان لوگوں کے اقوال صرف صورت حدیث پر مغز کا نام بھی نہیں اور

وہ بھی دو چار مسئلوں میں میں نے قنوج میں ایک مرتبہ وعظ کہا اور کچھ رسوم مروجہ کے متعلق گفتگو کی منصف غیر مقلدوں نے کہا کہ آج معلوم ہوا کہ متبع سنت ہم بھی نہیں صرف دو چار سنن پر عمل کر رکھا ہے۔

اسی طرح ایک غیر مقلد گنگوہی نے کہا کہ ہم لوگوں میں احتیاط بالکل نہیں ہے۔ ہمارا عمل بالحدیث صرف آمین بالجہر اور رفع یدین میں ہے اس کے سوا کسی عمل کی طرف ہمارا ذہن ہی نہیں جاتا چنانچہ میں عطر میں تیل ملا کر بیچتا ہوں اور واقعی متقی جس کو کہتے ہیں وہ ان میں ایک بھی نہیں الا ماشاء اللہ یہ کیسی گہری بات ہے اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیوں ان میں متقی نہیں ہوتے جبکہ ہر بات میں عمل بالحدیث کا دعوے ہے وجہ یہ بھی ہے کہ کسی ایک کے پابند نہیں ہیں ذرا کوئی بات پیش آئی سوچ کر کسی ایک روایت پر عمل کر لیا اور روایتوں میں سے انتخاب کرنے کے لئے اپنی رائے کو کافی سمجھا پس اس کو صورۃً تو چاہے کوئی اتباع حدیث کہہ لے مگر جب اس کا منشا رائے پر ہے تو واقع میں اتباع رائے ہی تو ہوا۔ اتباع ہونے سے بچنا جب ہی ہوتا ہے جب ایک سے بندھ جائے ورنہ نرے دعوے ہی دعوے ہیں مقلدین میں بہت سے لوگوں کی حالت اچھی نکلے گی بخلاف غیر مقلدین کے کہ کوئی شاذ و نادر متقی نکل آئے تو نکل آئے ورنہ بہت سے حیلہ جو اور نفس پرور ہیں۔ ابوحنیفہؒ سے بندھتا ہے نفس ورنہ چھچھوندر کی طرح یہ ہانڈی جا سونگھی وہ ہانڈی جا سونگھی۔ یوں کوئی محتاط بھی نکل آئے لیکن حکم اکثر پر ہوتا ہے۔ اچھے اچھوں کے حالات ٹٹول کر دیکھ لئے ہیں۔ اتفاقاً ایک میں بھی نہ پایا الا ماشاء اللہ اس کا اقرار خود ان کے گروہ کو بھی ہے ہاں اگر کوئی احتیاط کرے اور مختلف اقوال میں سے احوط پر عمل کرے تو اس کو اتباع نفس و ہویٰ نہ کہیں گے اور اس میں فی نفسہ کوئی حرج بھی نہیں لیکن اول تو ایسا کرتا

کون ہے اور یہ بہت مشکل ہے کوئی کرکے دیکھے تو معلوم ہو کہ کس قدر دشواریاں پیش آئیں گی اور ایسے محتاط کو بھی اجازت اس واسطے نہ دیں گے کہ دوسروں پر اثر برا پڑتا ہے۔ اس کی احتیاط کی تقلید تو کوئی نہ کرے گا ہاں اس کی عدم تقلید کی تقلید کرلیں گے اور پھر وہی اتباع ہوی باقی رہ جائیگا۔ ہاں اگر یہ شخص گمنام جگہ ہوا ور اطمینان ہو کہ دوسروں پر اثر نہ پڑیگا تو اس کا معاملہ اللہ پر ہے اگر اس کی نیت سچی ہے اور خوف خدا سے احوط کو اختیار کرتا ہے تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن ایسی نظیر شاید ایک بھی ملنا مشکل ہے یہ صرف توسیع عقلی ہے۔ مفتی صاحب نے پوچھا کہ اگر عامی شخص کو کسی مسئلہ میں ثابت ہو جائے کہ مجتہد کا قول حدیث کے خلاف ہے تو اس وقت میں حدیث پر عمل کیوں جائز نہ ہوگا۔ ورنہ حدیث پر قول مجتہد کی ترجیح لازم آتی ہے فرمایا یہ صرف فرضی صورت ہے عامی کو یہ کہنے کا منصب ہی کہاں ہے کہ مجتہد کا قول حدیث کے معارض ہے اس کو حدیث کا علم مجتہد کے برابر کب ہے نیز وہ تعارض اور تطبیق کو مجتہد کی برابر کیسے جان سکتا ہے تو اول تو یہ صورت فرضی ہے کہ قول مجتہد حدیث کے معارض ہو پھر میں تنزل کرکے کہتا ہوں کہ اگر اس عامی شخص کا قلب گواہی دیتا ہو کہ اس مسئلہ میں مجتہد کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس صورت میں بھی ترک تقلید جائز نہیں اس کی نظیر یہ ہے کہ طبیب سے نسخہ لکھواتے ہیں تو اس نسخہ کو غلط کہنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے عامی تو عامی کوئی دوسرا طبیب بھی اس نسخہ کو غلط نہیں کہہ سکتا دوسرا نسخہ دوسرا طبیب تجویز کردے لیکن اس نسخہ کو غلط کہنے کا مجاز نہیں اس وقت تک کہ اس نسخہ کو بالکل صریح غلط نہ ثابت کر سکے دوسری تجویز کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں حتیٰ کہ یہ بھی ایک وجہ ہوتی ہے کہ ایک

دہلی کا تعلیم یافتہ ہے دوسرا لکھنؤ کا، لکھنؤ کا طرزِ مطب اور ہے اور دہلی کا اور۔ اور اوزان ادویہ تک میں فرق ہے تو ایک دہلی کے تعلیم یافتہ کو لکھنؤ کے نسخہ کو صرف اس وجہ سے غلط کہدینا کہ اس کے اوزان میں فرق ہے کیسے درست ہوسکتا ہے علیٰ ہذا مجتہدین کے اختلاف کے وجوہ بھی بہت ہیں۔ بعض وقت رائے کا اختلاف موضع کے اختلاف سے بھی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ امام شافعی صاحب کا فقہ جدید اور ہے قدیم کے منضبط کرنے کے بعد انھوں نے مصر کا سفر کیا تو بہت سے اقوال میں تغیر کرنا پڑا جیسا فقہ کے جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں، اس کی یہ وجہ نہیں کہ سفر کرنے سے دلیلیں بدل گئیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ سفر سے لوگوں کے حالات کا تجربہ مزید حاصل ہوا۔ جس سے بہت سے مواقع حرج کے معلوم ہوئے جو پہلے معلوم نہ تھے۔ پہلے حکم اور تھا اور حرج معلوم ہونے کے بعد ظاہر ہے کہ وہ حکم بدلنا ضرور ہوا اسی طرح بہت سی رایوں میں اختلاف ہوا غرض وجوہ اختلاف کا احصار مشکل ہے لوگوں نے اس کے واسطے قواعد منضبط ضرور کئے ہیں (جن کو اصول فقہ کہتے ہیں) لیکن وہ قواعد خود محیط نہیں، اس کی مثال علم نحو کی ہے جس میں کلام کی ترکیب کے قواعد منضبط کئے گئے ہیں اور یہ علم بہت مفید ہے لیکن تاہم اس کے انضباط کا مقصود یہ نہیں کہ اہلِ زبان اس کے پابند ہوں اور اس لئے اس کا احاطہ پورا کیا گیا ہو۔ بلکہ محض غیر اہلِ زبان کے واسطے اہلِ زبان کا کلام سمجھنے اور ان کے ساتھ مکالمت کرنے کا آلہ ہے۔ پس اگر اہلِ زبان سے کوئی کلام ایسا ثابت ہوجائے جس میں قواعد نحو جاری نہ ہوسکیں تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اہلِ زبان نے غلطی کی بلکہ یہ کہا جاوے گا کہ علم نحو میں اتنا نقصان تھا کہ یہ قاعدہ ضبط سے رہ گیا۔

اسی طرح مجتہد کو اصول فقہ سے الزام دینا صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ ایسے موقع پر جہاں مجتہد کا قول اصول پر منطبق نہ ہوتا ہو یہ کہنا چاہیئے کہ علم اصول ناقص رہا اس تقریر کے بعد یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ مجتہد کے پاس اُس کے قول کی کوئی دلیل نہیں اس واسطے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر قلب ذرا بھی گواہی دے کہ مجتہد کے پاس اپنے قول کی دلیل ہو گی تو ترک تقلید جائز نہ ہو گا۔ اگرچہ درجۂ امکان عقلی میں یہ بھی ہے کہ مجتہد کے پاس دلیل نہ ہو یا اس نے غلطی کی ہو جیسے کہ درجۂ امکان میں یہ بھی ہے کہ طبیب کیسا ہی بڑا ماہر کیوں نہ ہو غلطی کر سکتا ہے، لیکن اگر ایسی فرضی صورتوں سے مجتہد کا اتباع چھوڑ دیا جائے تو کارخانہ دین درہم برہم ہو جائے جیسا کہ اسی کی نظیر یعنی امر معالجہ میں یہ فرضی صورت جاری کرنے سے کہ طبیب معصوم نہیں ہے غلطی کر سکتا ہے اور اس کا اتباع چھوڑ دینے سے امر معالجہ درہم برہم ہوتا ہے وہاں تو امر معالجہ کا نظام قائم رکھنے کے لئے یہ بات عام طور سے مان لی گئی ہے کہ طبیب زہر بھی کھلائے تو چون و چرا نہ کرنا چاہیئے، حالانکہ یہ عقل کے خلاف ہے جب ایک چیز کو زہر کہا تو زہر کے معنے قاتل نفس ہے۔ پھر اس کے کھانے کے جواز کے کیا معنی مگر اس جملہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ زہر جو طبیب کھلاتا ہے اس کو نہ اس واسطے کھا لینا چاہیئے کہ وہ زہر ہے بلکہ اس واسطے کہ گو وہ صورۃً زہر ہے مگر حقیقت میں زہر نہیں طبیب پر اطمینان ہے کہ وہ قاتل نفس شے نہ کھلائیگا اسی طرح جب ایک شخص کو مجتہد مانا گیا تو (لفظ تو برا ہے) مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تو اس کے زعم میں خلاف دلیل بات بھی بتلائے تو کر لی جائے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ طبیب زہر بھی کھلائے تو کھا لینا چاہیئے جو تاویل وہاں تھی وہ ہی یہاں بھی ہے کہ طبیب زہر نہیں کھلائے گا ایسا ہی مجتہد خلاف دلیل بات نہ بتلائے گا۔ پھر یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ مجتہد کے پاس اپنے قول کی دلیل نہ ہو گی۔ اسی وجہ سے میں نے یہ کہا اگر قلب ذرا بھی گواہی دے کہ

مجتہد کے پاس کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہوگی تو ترک تقلید جائز نہیں البتہ کوئی متبحر عالم اگر کسی مسئلہ کو خلاف دلیل سمجھے تو اس کا سمجھنا معتبر ہوگا۔ اس پر مفتی صاحب نے پوچھا کہ مجتہد کس کو کہتے ہیں جبکہ ایک شخص کو مسئلہ کا علم دلیل سے ہے تو اس مسئلہ کا یہ بھی مجتہد ہے پھر یہ کیسے کہا جائے گا کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کی تقلید لازم جواب دیا کہ لغۃً تو ہر شخص کچھ نہ کچھ مجتہد ہے اس بنا پر تو تقلید سے آزاد کہنے کا انجام یہ ہی ہے کہ تقلید بالکل نہ رہے حالانکہ یہ بلا نکیر جاری ہے اس کی ایک مثال ہے کہ مال دار ہمارے عرف میں کس کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص مال دار ہے میں پوچھتا ہوں ایسا کون شخص ہے جو مالدار نہیں لغۃً تو مال دار وہ شخص بھی ہے جس کے پاس ایک پیسہ پھوٹی کوڑی بھی ہو تو جو احکام مالداروں کے ساتھ متعلق ہیں دنیا کے ہوں یا دین کے ہر ہر شخص پر جاری ہونے چاہئیں زکوٰۃ کا مطالبہ بھی ہونا چاہیئے اور خراج اور محصول بھی بادشاہ کو ہر شخص سے لینا چاہیئے فما ہو جوابکم فہو جوابنا اسی طرح لغۃً مجتہد ہر شخص سہی لیکن وہ مجتہد جس پر احکام اجتہاد جاری ہو سکیں اس کے واسطے کچھ شرائط ہیں جن کا حاصل ایک ذوق خاص شریعت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ معلل اور غیر معلل کو جانچ سکے اور وجوہ دلالت یا وجوہ ترجیح کو سمجھ سکے اور یہ اجتہاد ختم ہو گیا پس ایک مسئلہ کی دلیل جان لینے سے اس مسئلہ کا وہ محقق تو نہیں ہو گیا پھر محقق کے اتباع کو وہ کیسے چھوڑیگا جیسے کہ محدث درجہ عبور میں ہر شخص ہو سکتا ہے لیکن کمال اس کا بعض افراد پر ختم ہو گیا اب کوئی محدث موجود نہیں۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء آجکل جو لوگ اجتہاد کے مدعی ہیں ان سے ایسی فاحش غلطیاں ہوتی ہیں کہ ہر شخص کا قلب ان کے غلطی ہونے کو تسلیم کر لیتا ہے جیسے کہ آجکل کوئی کچھ سندیں بتا کر محدث بننا چاہے تو اس کی محدثیت تسلیم نہیں کی جاتی آجکل تو سلامت اسی میں ہے کہ اجتہاد کی اجازت نہ دی جائے۔

نظم دین جو کچھ ہو گیا اس سے اس میں بڑا خلل پڑتا ہے میں تو کہتا ہوں کہ آجکل وہ زمانہ ہے کہ اگر کسی کام کو درجہ اُلویت پر کرتے ہیں عوام کے فساد کا احتمال ہو تو اس وقت خلاف اولی کہنے والا مثاب ہوگا۔ نظیر اس کی قصہ حطیم ہے جو حدیث میں موجود ہے یہ میری تقریر ایسی ہے جس سے تقلید کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین ہی نے دین کی حقیقت کو سمجھا ہے بس جو لوگ تارک تقلید ہیں وہ کہنے کو تو ائمہ کے خلاف ہیں مگر درحقیقت دین کے خلاف ہیں اس کی بنا صرف خود رائے پر ہے اور اتباع ہوئی اور اعجاب سب جانتے ہیں مہلک چیزیں ہیں جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے کہ تارکین تقلید میں اکثر یہ دونوں مرض رگ و پے میں گھسے ہوئے ہوتے ہیں ہمارا علم کچھ بھی نہیں ہم سے بڑوں نے اور ان لوگوں نے جن کا علم مسلم ہے کیوں تقلید کو اختیار کیا معلوم کہ ہماری رائے غلط اور متہم ہے تقلید شخصی چھوڑ کر گنجائشیں نکالی جاویں تو نتیجہ اس کا بہت ہی جلد آزادی نفس پیدا ہو جاتا ہے ان میں سے بعض کے نزدیک اجتہاد ہی کوئی چیز نہیں بدون نص کے ان کے نزدیک کوئی حکم ہی ثابت نہیں حالانکہ احادیث میں اس کے ثبوت بہت ملتے ہیں دیکھئے حضرت عمر فاروقؓ کا ذوق اجتہادی ہے تو جس پر ایسا اطمینان ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ کو بشارت سے روک دیا اور یہ روکنا عند اللہ مقبول رہا حالانکہ حضرت عمرؓ کی رائے کو قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نص پر کسی طرح ترجیح نہیں ہو سکتی مگر ان کے ذوق اجتہادی ہی نے بتا دیا تھا کہ یہ بشارت نظم دین میں مخل ہو گی اور باوجود ابوہریرہؓ کے دلیل پیش کرنے کے اس شدّ و مد سے تردید کی کہ ان کو دھکا دے کر گرا بھی دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سارا قصہ پیش ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمرؓ مجرم کیوں نہ ہوئے اس قصّہ سے اجتہاد کا یہ بھی ثبوت ملتا ہے۔ یہ کوئی کچا محل نہیں ہے دین کا اہل اجتہاد نے من گھڑت باتوں پر بنا نہیں رکھی ہے ان کے یہاں تو خود رائی کا تو کام ہی نہیں جیسے کہ مجتہدین دوسروں کو پابند بناتے ہیں خود بھی پابند ہیں کوئی بات بلا قرآن و

حدیث کے نہیں کہتے تو ان کی تقلید تقلید قرآن و حدیث ہوئی نام اس کا چاہے کچھ رکھ لو
جیسا صرف و نحو پڑھنے والا اولاً تو مقلد ہے اخفش اور سیبویہ کا لیکن اخفش و سیبویہ
خود موجد زبان نہیں بلکہ مقلد ہیں اہل زبان کے واسطے صرف و نحو پڑھنے والا درحقیقت
مقلد ہوا اہلِ زبان کا یہ کیسی غلطی ہے کہ مقلد فقہا، کو تو تارک قرآن و حدیث کہا جاوے
اور مقلد اخفش و سیبویہ کو تارک زبان نہ کہا جاوے یہ مضامین یاد رکھنے کے ہیں ہر وقت
ذہن میں نہیں آتے۔ ابن تیمیہ کی ایک کتاب ہے دفع الملام عن الائمۃ الاعلام اس میں
انھوں نے ثابت کیا ہے کہ وجود دلالت کے اس قدر کثیر ہیں کہ کسی مجتہد پر یہ الزام
صحیح نہیں ہوسکتا کہ اس نے حدیث کا انکار کیا یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔ ابن تیمیہ
اور ابن القیم استاد شاگرد ہیں دونوں بڑے عالم ہیں بعض افاضل کا ان کے بارہ میں قول
ہے کہ علمہا اکثر من عقلہما یہ دونوں حنبلی مشہور ہیں مگر ہیں نہیں حنبلی ان کی تحریروں سے
معلوم ہوتا ہے خود مجتہد ہونے کے مدعی ہیں ایسا محقق کسی بات میں ائمہ مجتہدین کا
خلاف کرے تو مضائقہ بھی نہیں اور یہ تھوڑا ہے کہ بولنے تک کی تمیز نہیں اور ائمہ کے منہ
آنے لگے ایک شخص کہتا تھا کہ بلا قرأت فاتحہ نماز کیسے ہوسکتی ہے حدیث میں تو ہے کہداج
کہداج (خداج خداج) ایسے بیہودوں سے تو کلام بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک صاحب
کنیڈہ میں ملے اور پوچھا کہ ترک فاتحہ پر کیا دلیل ہے مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایسی ہی لیاقت
رکھتے ہیں جیسے کہداج والا تھا مجھے سخت گراں گذرا کہ ان کے ساتھ کیا مغز ماروں میں نے
کہا پہلے یہ بتایئے کہ یہ مسئلہ اصول میں سے ہے یا فروع میں سے کہا فروع میں سے ہے میں نے
کہا آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو دین کی تحقیق کی طرف خاص توجہ ہے جب کہ
ایک فرعی مسئلہ کی طرف اس قدر توجہ ہے تو اصول کی طرف اور زیادہ ہوگی اصول کی تو
آپ شاید پوری تحقیق کر چکے ہوں گے اور اب فروع کی طرف متوجہ ہوئے ہیں پس اصل الاصول
توحید ہے اس کو آپ ضرور دلیل سے تحقیق کر چکے ہوں گے اگر ایسا ہے تو میں چند شبہات
توحید پر پیش کرتا ہوں ذرا ان کا حل تو کر دیجیے اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ توحید کو کسی
کی تقلید سے مان لیا ہے تو آپ دلیل سے تحقیق نہیں کرسکتے تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ

اصول میں تو تقلید کی اور فروع میں تقلید نہیں کرتے حالانکہ اصول زیادہ اہم ہیں تقلید سے خلع عنان کرنا اول تو مجتہدین کی سب وشتم کی طرف مفضی ہوتا ہے پھر صحابہؓ کے سب وشتم کی طرف پھر سب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف پھر حق تعالیٰ پر بھی کبھی نوبت پہنچتی ہے۔ مولانا فتح محمد صاحبؒ بیان کرتے تھے کہ ایک غیر مقلد حدیث پڑھا رہے تھے اور جہاں حدیث کی تاویل نہ بن آئی تو کہتے تھے تعجب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں کچھ فرما دیتے ہیں کہیں کچھ فرما دیتے ہیں یہ کیا فرما دیا یہ نتائج ہیں آزادی کے۔

اس سے عار آتی ہے کہ ہم کسی کے محکوم کہے جاویں خیر صاحب انھیں مجتہدین کی محکومیت سے عار ہوگی ہمیں تو بہت سوں کے حکومت میں رہنا پسند ہے۔ ابوحنیفہؒ کی بھی حکومت ہے ماں باپ کی بھی حکومت ہے شیخ طریقت کی بھی حکومت ہے یہ بات نفس کے چاہے خلاف ہو مگر یہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ ہمارے اتنے مصلح ہیں نفس و شیطان ہمارا کچھ بھی نہیں کرسکتا بخلاف ان کے کہ ائمہ کی حکومت میں سے تو نکل گئے اور شیطان کی حکومت میں آگئے ہم جن کے محکوم ہیں وہ سب ہمارے خیرخواہ ہیں اور یہ جس کی حکومت میں گئے وہ عدو مبین ہے اپنی اصلاح کے لئے اپنے اوپر کسی کو بھی اعتماد نہ چاہیے۔ دیکھو حضرت عمرؓ جیسے مبصر نے اس شخص سے کیا کہا جس نے کہا تھا کہ اگر تم بگڑو تو ہم اس تلوار سے تم کو سیدھا کریں گے تو فرمایا تھا کہ الحمد للہ میں ایسی قوم میں ہوں جس میں میرے محافظ بہت سے موجود ہیں۔ بیعت مروجہ میں یہی مصلحت ہے کہ جانبین کو خیال ہو جاتا ہے دونوں کو ایک دوسرے سے اعانت کی امید ہوتی ہے۔ ایک دیہاتی آدمی مجھ سے بیعت ہوا میں نے پوچھا بیعت کی تمھارے نزدیک کیا ضرورت ثابت ہوئی نماز روزہ تو بلا اس کے بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہا میں بیعت اس واسطے ہوا ہوں کہ ویسے تو ذرا سستی بھی نماز روزہ میں ہو جاتی ہے بیعت سے ذرا خیال ہو جاتا ہے کیا کام کی بات ہے۔

تقریر ادب الاعلام ختم ہوئی

اسی سفر میں اس سے تیسرے دن یعنی بتاریخ ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ روز بدھ اسی مقام بڑہل گنج میں ایک مختصر سی تقریر اور ہوئی جس میں تقلید کی بحث ہے وہ بھی یہاں درج کی جاتی ہے۔

سوال محکمہ تعلیم کے مصارف محکمہ چنگی سے پورے ہوتے ہیں تو محکمہ کی تعلیم کی تنخواہ حلال ہے یا نہیں۔ فرمایا استیلاء کا فر موجب ملک ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہاں بھی مسئلہ امام ابوحنیفہ ہی کا کام آتا ہے۔ ایک انگریز نے لکھا ہے کہ سلطنت کسی کے فقہ پر نہیں چل سکتی سوائے فقہ حنفی کے ایک سیاسی شخص کا یہ کہنا ضرور بڑے تجربے کی خبر دیتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی عجیب نظر ہے دیکھئے امام صاحب کا قول ہے کہ آلات لہو کا توڑ ڈالنا واعظ کو یا کسی کو جائز نہیں اگر کوئی توڑ ڈالے تو ضمان لازم آئے گا یہ کام سلطان کا ہے وہ احتساب کرے اور توڑے پھوڑے اور سزا دے جو چاہے کرے دیکھئے اس میں کتنا امن ہے سوائے سلطان کے اور کسی کے احتساب کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ کام بند تو ہوتا نہیں جنگ و جدل و فتنہ ہو جاتا ہے اور باہمی منازعات بڑی دور تک پہنچ جاتے ہیں۔

علیٰ ہذا اقامت حدود سلطان ہی کے ساتھ ہیں فقہ بڑی مشکل چیز ہے فقیہ کو جامع ہونا چاہیئے۔ فقیہ بھی ہو محدث بھی ہو متکلم بھی ہو سیاسی دماغ بھی رکھتا ہو بلکہ کہیں کہیں طب کی بھی ضرورت ہے بعضے امور میں تشریح کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ فقہ مشکل چیز ہے مگر آجکل بعض لوگوں نے اس کی کیا قدر کی ہے کہ فقہاء پر سب وشتم کرتے ہیں یہ گروہ نہایت درجہ مفسد ہے یہ لوگ جان جان کر فساد کرتے ہیں اور اشتعال دلاتے ہیں بعض وقت تو ذرا سی بات میں بڑا فتنہ ہو جاتا ہے ایک شخص نے کہا حضور ہاں ایک جگہ مقلدین کی جماعت میں ایک غیر مقلد آگیا اور آمین زور سے کہی تو اس پر بڑا فساد ہوا اور پولیس تک نوبت پہنچی اور مقدمہ کو بڑا طول ہوا فرمایا

حضرت والا نے اس پر جنگ وجدل کرنا ہے تو زیادتی لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ عمل کچھ ہو مگر جس نیت سے کیا جاوے اس کا اثر ضرور ہوتا ہے اگر اس نے خلوص سے اور عمل بالسنت کی نیت سے کیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی غیر مقلدین کی آمین اکثر صرف شورش اور مقلدین کے چڑانے کیلئے ہوتی ہے میرے بھائی محمد مظہر نے قنوج میں غیر مقلدین کی آمین سنکر کہا آمین تو دعا ہے اس میں خشوع کی شان ہونی چاہئے اور ان لوگوں کے لہجہ میں خشوع کی شان نہیں ہے خود سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی کو چھیڑتے ہوں اس نے عرض کیا کہ یہ واقعی بات ہے مقدمہ مذکور جب پولیس میں پہنچا تو ایک ہندو تھانیدار اس کی تحقیقات پر تعینات ہوا وہ بہت سمجھ دار تھا اس نے فساد کا الزام غیر مقلد ہی پر رکھا اور رپورٹ میں لکھا کہ یہ لوگ شورش پسند ہیں اور بلا وجہ اشتعال دلاتے ہیں اور آمین صرف فساد اٹھانے کے لئے کہتے ہیں۔ اس پر غیر مقلدین نے بڑا غل مچایا اور کہا کہ آمین مکہ میں بھی ہوتی ہے، داروغہ نے کہا کہ مکہ کرمہ میں آمین خدا کی یاد کے لئے ہوتی ہوگی دنگے کے لئے نہ ہوتی ہوگی یہاں دنگے کے لئے ہے۔ فرمایا میرا شریک حجرہ ایک لڑکا بیان کرتا تھا کہ ایسے ہی ایک موقع پر ایک انگریز نے تحقیقات کی اور آخیر میں گویا تمام واقعہ کا فوٹو کھینچ دیا اور کہا آمین تین قسم کی ہیں۔ ایک آمین بالجہر اور اہل اسلام کے ایک فرقہ کا وہ مذہب ہے اور حدیثیں بھی اس کے ثبوت میں موجود ہیں اور ایک آمین بالسر ہے اور وہ بھی ایک فرقہ کا مذہب ہے اور حدیثوں میں موجود ہے۔ اور تیسرے آمین بالشر ہے جو آجکل کے لوگ کہتے ہیں اس شخص نے بیان کیا کہ ہندو داروغہ کے سامنے غیر مقلدوں نے امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کیا کہ امام صاحب قائل ہیں کہ اگر کوئی محرم عورت سے نکاح کرے اور وطی کرے تو اس پر حد واجب نہیں یہ کیسی غلطی ہے۔ فرمایا حضرت والا

نے اسی مسئلہ میں امام صاحب پر فدا ہو جانا چاہیئے اس کے بیان کے لئے دو مقدموں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ حدیث میں ہے ادرؤا الحدود بالشبہات ایک مقدمہ یہ ہوا اور دوسرا یہ کہ شبہ کس کو کہتے ہیں شبہ کہتے ہیں مشابہ حقیقت کو اور مشابہت کے لئے کوئی وجہ شبہ ہوتی ہے اور اس کے مراتب مختلف ہیں کبھی مشابہت قوی ہوتی اور کبھی ضعیف امام صاحب نے حدود کے ساقط کرنے کے لئے ادنیٰ درجہ کی مشابہت کو بھی معتبر مانا ہے اور صرف نکاح کی صورت پیدا ہو جانے سے کہ باوجود حقیقت نکاح نہ ہوتے کے مشابہ تو نکاح کے ہے حد کو ساقط کر دیا انصاف کرنا چاہیئے کہ کہ یہ کس درجہ عمل بالحدیث ہے بات یہ ہے کہ ایک صحیح معنیٰ کو بُرے اور مہیب الفاظ کی صورت پہنادی گئی ہے اس فتوے کی حقیقت تو غایت درجہ کا اتباع حدیث ہے لیکن اس کو بیان اس طرح کیا جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ امام صاحب نے نکاح بالمحرمات کو چنداں برا نہیں سمجھا اس کے سوا اور بھی چند مسائل اسی طرح بُری صورت سے بیان کر کے اعتراض کئے جاتے ہیں مسئلہ مذکورہ پر اعتراض جب تھا کہ اس پر امام صاحب کوئی زجر و احتساب تجویز نہ کرتے ایسے موقعوں پر جہاں حد کو فقہا ساقط کرتے ہیں تعزیر کا حکم دیتے ہیں ایسے موقعے تمام ائمہ کے نزدیک بہت سے ہیں کہ شبہ سے حد ساقط ہو گئی آخر حدیث اور وا الحدود بالشبہات کی تعمیل کہیں تو ہوگی اور کوئی موقع تو ہوگا جہاں اس کو کر کے دکھایا جاوے۔ کیا غضب ہے جو شخص حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر مقدم رکھے وہ کس قدر عامل بالحدیث ہے فدا ہو جانا ایسے شخص پر تعجب ہے کہ امام مالک صاحب خبر واحد پر بھی قیاس کو مقدم رکھتے ہیں اور ان کو لوگ عامل بالحدیث کہتے ہیں اور امام صاحب حدیث ضعیف پر بھی قیاس کو مقدم نہیں رکھتے اور ان کو تارک حدیث کہا جاتا ہے فقط

ادب الطریق

ملقب بہ

ادب الرفیق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً۔ تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مسمی **ادب الطریق** ملقب بہ ادب الرفیق سفر گورکھپور میں مختلف موقعوں پر حضرت والا نے تقریریں فرمائیں ان میں جن کو ذرا استداد ہوا ان کا نام بھی الگ تجویز فرما دیا منجملہ ان کے ایک تقریر یہ ہے جس کی مناسبت نام کے ساتھ مطالعہ سے معلوم ہو جاوے گی۔ یہ تقریر اس وقت ہوئی کہ حضرت والا مقام زبر پور ضلع گورکھپور سے بیل گاڑی پر مقام شاہ پور کو روانہ ہوئے بوجہ بعد مسافت راستہ میں ایک پڑاؤ قصبہ گوالا میں کیا رات کو وہاں رہے صبح کو شاہ پور کو روانہ ہوئے اس راستہ میں یہ تقریر ہوئی۔ حضرت والا کے ساتھ اس وقت احقر اور مفتی محمد یوسف صاحب رامپوری اور حضرت کے بھائی منشی محمد اختر صاحب اور ایک خادم اور تھے موخر الذکر خادم ایک مولوی صاحب تھے ان سے خطاب شروع ہوا فرمایا آپ کے حالات سے اور مختلف وقتوں میں سوالات سے اور بات چیت سے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔ عرض کیا ہاں کچھ پریشانی تو ضرور ہے فرمایا پریشانی کو چھوڑیئے اور حصول مقصود میں جلدی نہ کیجئے (یعنی اس کے جلدی حاصل ہونیکا انتظار نہ کیجئے نہ یہ کہ اس کی تحصیل میں جلدی نہ کیجئے) اس کا نتیجہ سوائے حیرانی کے کچھ نہیں آپ کا کام طلب ہے باقی حصول مقصود کے آپ مکلف نہیں میرے خیال میں یہی وجہ پریشانی کی ہے مولوی صاحب کی حالت ان کلمات کو سن کر ایسی ہوئی جیسے کوئی بچہ کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد یکلخت اپنی مادر مہربان کے پاس پہنچ جاوے اور اس سے اپنی مصیبتیں کہنے لگے۔ آبدیدہ ہو کر عرض کیا سارا قصہ ہی کہہ دوں میں ابتداء میں گیارہ مہینے حضور کی خدمت میں تھانہ بھون میں رہا پھر کانپور چلا گیا پھر گیا حضرت

قدس سرہ حیات تھے۔ حضرت کی تجویز یہ ہوئی کہ مجھے نقشبندیت سے مناسبت ہے، اور اسی کے موافق تعلیم فرمائی اس سے پریشانی بہت پیدا ہوئی حتیٰ کہ نیند بالکل نہ آئی ہوگئی اور دماغ مختل ہوگیا۔ حضرت نے مجھے بیعت تو نہیں کیا مگر تعلیم نقشبندیت کی کی پریشان ہوکر مکان پر آگیا چند روز بالکل قطع تعلق کرکے متوکلانہ بسر کی لوگوں سے ملنا جلنا بالکل بند کردیا۔ حضرت قدس سرہٗ کا ۱۳۲۳ھ میں وصال ہوگیا مولوی محمد سمیع صاحب میرے بھائی کو شاہ گنج لے گئے۔ وہاں ایک بزرگ تھے جو سلسلہ میں بڑے سید صاحب کے تھے میرے بھائی کو ان سے بڑا نفع ہوا تب وہ مجھ کو بھی ان کے پاس لے گئے۔ انھوں نے اول درود شریف پڑھنے کو بتلایا اور اس کے بعد مراقبہ ان کے یہاں مراقبہ کا ہونا ضروری ہے پھر مراقبہ لطائف ستہ وغیرہ بتلایا پھر بیعت میں بھی داخل کرلیا مگر میں ہمیشہ حضور کی اجازت ہر کام میں لے لیا کرتا تھا ان کے بعض مریدین میں پریشانی اور بدعقیدگی پائی گئی اس واسطے میرا دل اکھڑ گیا اور ان کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بہت پریشانی بڑھ گئی اور یہ خیال ہوا کہ تو تو کہیں کا بھی نہ رہا ان پر دل نہ جما اور کہیں جانے کی اس واسطے ہمت نہ ہوئی کہ وہ ناراض ہوں گے عجیب کشمکش میں پڑگیا میرے حواس خراب ہوگئے کہ کیا کروں اپنا سب سے بڑا مرجع حضور کو سمجھتا تھا۔ ایسے وقت میں سوا حضور کے کسی پر نظر نہ پڑی مگر حضور تک جا نہ سکا ادھر یہ خیال ستاتا تھا کہ بلا حاضری کے کچھ ہوگا نہیں تاہم حضور کو خط لکھا اور اس بات کی اجازت چاہی کہ ... صاحب کے پاس جاؤں۔ آپ نے اس کی اجازت دی۔

حضرت والا نے فرمایا اجازت اور چیز ہے اور مشورہ اور چیز۔ آپ نے اجازت کو مشورہ سمجھا میں اجازت تو عام طور سے دیتا ہوں کہ صلحاء کے پاس جانے میں کچھ حرج نہیں ہے اور مشورے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ بات بتاؤں کہ جو صرف غیر مضر نہیں بلکہ مفید بھی ہو اس کی مثال یہ ہے کہ طبیب سے اجازت چاہتے ہیں کہ گنا کھالیں وہ اس کو اگر مضر نہیں دیکھتا تو کہہ دیتا ہے کھالو یہ اجازت ہے اور مشورہ یہ ہے کہ طبیب سے کہتے ہیں کہ آپ کے سپرد ہے جو مناسب تدبیر ہو بتلائیے

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

وہ اس وقت ایسی تدابیر نہیں بتلائے گا جو غیر مضر اور مفید ہوں بلکہ وہ تدابیر بتلائے گا جو مفید ہوں اس وقت یہ کبھی نہ کہے گا کہ گنا کھاؤ بلکہ اس وقت کہے گا گلو پیو اور شاہترہ پیو اور کونین کھاؤ اس وقت وہ آپ کا متبع نہ ہوگا بلکہ اپنی رائے کا متبع ہوگا خواہ آپ کی طبیعت کے خلاف ہو اور یہ اتفاقی بات ہے کہ اس کی رائے آپ کی طبیعت کے موافق آپڑے آپ نے مجھ سے اجازت چاہی تھی میں نے اباحت کے درجہ میں منع نہیں کیا مشورہ آج دونگا میرا اصول یہ ہے کہ میں کسی کے کام میں دخل نہیں دیا کرتا جو لوگ مجھ سے کسی کام میں رائے لینا چاہتے ہیں تو میں دیکھتا ہوں کہ ان کا دل کسی طرف راغب ہے یا نہیں اگر دل ان کا کسی طرف راغب ہوتا ہے تو میں ان کو مقید کرنا نہیں چاہتا اور اگر اس کام میں کوئی خاص محظور نہیں ہے تو اس کام سے منع نہیں کرتا یہ مرتبہ اجازت کا ہے۔ اور مشورہ کا موقع وہ ہے کہ رائے لینے والے کا دل کسی طرف مائل نہ ہو اس وقت میں وہ رائے دیتا ہوں جو علاوہ غیر مستلزم محظور ہونے کے مفید اور ضروری ہو بلکہ اپنے نزدیک وہ رائے منتخب کرتا ہوں جو مفید رایوں میں سے بھی اعلیٰ درجہ کی ہو اور اس وقت بھی میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ رائے لینے والے کو مجبور کروں کہ ایسا ضرور کرو بلکہ خلوص کے ساتھ وہ رائے پیش کر دیتا ہوں اور اس بات کا دعویٰ بھی نہیں ہوتا کہ میری رائے ٹھیک ہی ہے۔

مولوی صاحب نے عرض کیا کہ جو کچھ بھی ہو اب میں اپنا قصہ بیان کر لوں پھر آج حضرت مجھ کو مشورہ دیں .... نے قرآن شریف اور درود شریف کی کثرت کی تعلیم فرمائی جس کا میں اب تک پابند ہوں تین چار سال سے یہی حالت ہے کہ میں نہ ادھر کا ہوں نہ اُدھر کا پریشانیاں بڑھتی

جاتی ہیں حالانکہ میں اس کے دفعیہ کی کوشش برابر کرتا ہوں، جیسے کوئی کہتا ہے ویسے ہی کرتا ہوں مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ شیخ اول کو بھی چھوڑا طبیعت اس میں پریشان رہی کہ ان کا عتاب نہ ہو دوسرے کسی نے بھی کوئی تسلی بخش بات نہ بتلائی جب کسی کے پاس گیا حضور سے اجازت بھی لے لی خواب بہت دیکھے اپنے نزدیک اطمینان کر کے کسی کے پاس گیا۔ فرمایا خوابوں کا کیا اعتبار اول تو آجکل کسی کا خواب بھی معتبر نہیں خصوصاً اس شخص کا جس کا دماغ مشوش ہو (مولوی صاحب نے چند خواب بیان کئے) فرمایا کہ سب میں احتمال ہے کہ حدیث النفس ہو خوابوں پر بنا کرنا میرے نزدیک صحیح نہیں ہاں استخارہ مسنون ہے۔ استخارہ کے بعد جس بات پر دل جمے وہ کرنا چاہئے اس میں امید صلح ہوتی ہے اور جب تک جمعیت قلب حاصل نہ ہو برابر استخارہ کرنا چاہئے مولوی صاحب نے عرض کیا استخارہ بھی بہت کیا۔ استخارہ میں یہ آیت قلب میں آئی ہے أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ۔ فرمایا حضرت مولانا نے کہ یہ غیر قابل اعتبار ہے میرے نزدیک یہ تصرفات دماغی ہیں جس طرف رائے ہوتی ہے قوۃ واہمہ اسی طرف مائل ہو کر اجازت کی صورت میں دکھلائی ہے۔ آپ مولوی آدمی ہیں علم رکھتے ہیں ہمیشہ کو یاد کر لیجئے کہ ایسی باتوں میں نہ پڑیئے۔ عرض کیا یہ آیت بھی قلب میں آتی تھی لیکن شکوک بھی رہتے تھے۔ فرمایا تشویش بڑھنے سے دماغ میں بیس آگیا ہے۔ اور قوۃ واہمہ کا فعل قوی ہو گیا ہے۔ یہ شکوک بھی اوہام ہیں۔ مولوی صاحب ساکت ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا۔

ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات یہ تشخیص کہ آپ کو نقشبندیت سے مناسبت ہے میرے دل کو بالکل نہیں لگی آپ کی مناسبت چشتیہ سے اتنی صاف ہے کہ شک کرنا بھی مشکل ہے آپ کی طبیعت میں فطرتاً شورش اور وارفتگی موجود ہے۔ یہ عشق اور محبت کا مادہ ہے اور یہی چشتیت کا ماحصل ہے ایسے شخص کو نقشبندیت کی

تعلیم کرنا فطرت کو بدلنا ہے جس سے کبھی نفع نہیں ہو سکتا نقشبندی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں متانت ہوتی ہے ان کے مزاج سلاطین کے سے ہوتے ہیں نقشبندی سلوک اہتمام کا ہے اس میں سب کام ضابطہ کے ہیں آپ کے مزاج کے مناسب تو بے سروپا سلوک ہے آپ کو ضابطہ میں مقید کرنا تکلیف مالایطاق ہے. عرض کیا آپ کی صحبت میں تو مجھ کو سکون تھا اس کے بعد کہیں سکون نہیں فرمایا۔ سبو لہا منہا علیہا شواہد۔ الحمدللہ خود آپ کو اس بات کا اقرار ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری تشخیص صحیح تھی پھر آپ کو کیا سوجھی تھی کہ دوسری جگہ مارے مارے پھرے، مگر اس میں بھی ایک نفع ہے الاشیاء تعریف باضدادہا۔ اب آپ کو زیادہ نفع کی امید ہے کیونکہ آپ کو حیرانی بہت ہو چکی اب اگر سکون ہوگا تو بہت آپ کو اس کی قدر ہوگی اور فرمایا ہاں .... کو نقشبندیت سے مناسبت تھی غالباً ان کو دوسری جگہ پریشانی نہیں ہوگی ان سے ہمارا دل زیادہ نہ ملتا تھا عرض کیا ہاں ان کو دوسری جگہ نفع ہوا تھا تب ہی تو انھوں نے مجھ کو بھی کھینچا فرمایا یہ عجیب بات ہے کہ دو بھائیوں کا مزاج ایک سا ہی ہوتا ہے یہ تجویز صحیح نہیں ہے کہ ان کو نفع ہوا تو آپ کو بھی نفع ہوگا۔ نقشبندی نسبت عاقلانہ اور حکیمانہ ہے اور چشتیہ مجنونانہ ہے بس اب تو آپ کے حسب حال یہ ہے ؎

آزمودم عقل دوراندیش را — بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

آپ بہت مزے چکھ چکے اور دیکھ چکے کہ بھٹکے پھرنے سے کچھ نتیجہ نہیں ہوا اب تو آپ ایک ہی طرف کے ہو جائیے (ایک شخص نے عرض کیا سہروردی خاندان میں کیا بات ہوتی ہے فرمایا وظائف زیادہ تر ہیں۔ اشغال بالکل نہیں اصلاح اعمال بہت اون کا طریقہ سلف کا سا ہے) مولوی صاحب نے عرض کیا بیشک مجھے آپ کے پاس رہنے سے بہت نفع تھا لیکن کیا کروں مجبوری ہے میں دور بہت ہوں تھانہ بھون آنے اور رہنے کی مقدرت نہیں دور سے کیا ہو سکتا ہے فرمایا چند روز پاس رہنے کی ضرورت ہے پھر دور سے بھی کام ہو سکتا ہے اور

فرمایا میں اور زیادہ وسعت کرتا ہوں کئی طرف قلب کا کھینچنا سبب ہے آپ کی پریشانی کا آپ کو جن جن حضرات سے تعلق ہوا ہے ان سے قطع تعلق کی نسبت آپ کا خیال ہے کہ باعث ناراضی ہے اور یہ خوف آپ کے دل میں بیٹھ گیا ہے اور یہی اصل ہے آپ کی پریشانی کی اس کا ازالہ رفع سبب سے ہوسکتا ہے جب سبب اس کا تعدد تعلقات ہے تو اس کا ازالہ ازالہ تعدد ہے میں کھلے الفاظ میں کہتا ہوں کہ ایک طرف ہوجایئے اتنا دل کمزور نہ کیجئے آخر کون چیز آپ کو یکسو ہونے سے مانع ہے کسی کی ناراضی کا خوف ہے ناراضی کا مضر ہونا کیسے معلوم ہوسکتا ہے اس کے لئے اگر کوئی معیار ہوسکتا ہے تو وہ شریعت ہے آپ غور کیجئے کہ یکسو ہونے میں آپ کونسا کام خلاف شرع کر رہے ہیں جب کوئی کام خلاف شرع نہیں ہے تو حق تعالٰی کی خفگی کا خوف تو ہے نہیں کسی انسان کی خفگی اگر ہوگی تو کیا ہوگا ؎

ساقیا برخیز در دہ جام را — خاک برسر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں — مانمے خواہیم ننگ و نام را

اور میں کہتا ہوں جو انسان خفا ہو بعد اس کے کہ معلوم ہوجائے کہ حق تعالٰی اس کام پر خفا نہیں وہ کیا انسان ہے اور اس کی خفگی سے کیا ہوگا اور وہ انسان ہے تو خفا ہوگا ہی نہیں آپ کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا ہے کہ پہلے شیخ خفا ہوجائیں گے میں اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ اگر واقعی شیوخ ہیں تو ہرگز خفا نہ ہوں گے، اس وہم کو قلب سے نکال دیجئے ہاں ان کی مخالفت نہ کیجئے اور ان کو اطلاع کر دیجئے تاکہ ان کو کسی دوسرے سے سن کر صدمہ نہ ہو اور کبھی ان کی شان میں کوئی گستاخی نہ کیجئے ۔ مجھے پریشانی کا مرحلہ ایسا پیش آچکا ہے کہ کم کسی کو آیا ہوگا متین شیوخ ان مصیبتوں کو کیا جانیں ان کا علم تو اسی شخص کو ہوتا ہے جو خود ان کو چکھ چکا ہے مجھے بچپن سے خوش عقیدگی بہت تھی سوء ظن کا

مادہ بالکل نہ تھا ہر شخص کے ساتھ اعتقاد ہوجاتا تھا اور اصلیت اس کی یہ تھی کہ مجھے طلب بہت تھی ایسی حالت تھی جیسے پیاسا پانی کو ڈھونڈھتا ہے ہر شخص پر یہی نظر پڑتی تھی کہ شاید اس سے کچھ مل جاوے یہ حالت بہت خطرناک ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ نے فضل کیا کہ کسی جعلساز اور مکار کے پھندے میں نہیں پڑ گیا۔ اول حضرت گنگوہی سے تعلق پیدا کرنا چاہا مگر حضرت نے طالب علمی کے سبب انکار کیا۔ پھر حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا یہ ابتدائے زمانہ شباب کا ذکر ہے حضرت کے پاس سے لوٹ کر آیا تو سیری نہ ہوئی تھی۔ جو کچھ حضرت حاجی صاحبؒ نے تعلیم فرمایا وہ کرتا رہا مگر اس میں انتظار رہا ثمرات کا اور انتظار بھی تعجیل کے ساتھ میں یہ چاہتا تھا کہ آج ہو جاوے جو کچھ ہونا ہے مل گئے ... صاحب اور انھوں نے خود خواہش کی کہ مجھ سے کچھ حاصل کرو میں طالب تھا ہی اور عقیدت کا مادہ بہت بڑھا ہوا تھا میں نے منظور کرلیا انھوں نے کچھ بتلایا میں نے اس کے موافق شغل شروع کر دیا تو اس قدر پریشانی بڑھ گئی کہ میں بیان نہیں کرسکتا دل دو طرف کھنچتا تھا اور دونوں تعلیموں میں کچھ اختلاف بھی تھا۔ ایسے وقت میں اس شخص کی حالت جس کی پیاس بڑھی ہو اور تعجیل حد سے زیادہ ہو آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں دو مہینے تک یہ حالت رہی کہ خودکشی تک کے وسوسے آتے تھے اگر حق تعالیٰ کی دستگیری نہ ہوتی تو خودکشی میں کچھ بھی کسر نہ تھی۔ حتیٰ کہ ایک روز تنہائی میں ایک شخص میرے پاس آئے ان کے ہاتھ میں بندوق تھی اس وقت میں بالکل آمادہ ہوگیا کہ اپنی خواہش ان سے ظاہر کردوں کہ میں حیات سے تنگ آگیا اب دنیا کو مجھ سے پاک کردو اور قریب تھا کہ ان سے کہہ ہی بیٹھوں پھر سوچا کہ یہ کسی طرح مانیں گے نہیں ہر شخص کو اپنا پس و پیش بھی تو ہوتا ہے۔ قتل وہ شخص کرسکتا ہے جو اپنی جان کھونے پر پہلے آمادہ ہو جائے پھر میرے وہ کوئی مخالف نہیں تھے بلکہ محبت رکھنے والے تھے یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ ایسی بے ہودہ بات کو مان لیں سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا کہ میرا چھچھوراپن ظاہر ہوتا اس خیال سے زبان پر

آئی ہوئی بات رک گئی خدا تعالیٰ کو بہتر کرنا تھا غرض اس قدر پریشانی تھی کہ یہ نوبتیں ہو ہو گئیں بآخر حضرت حاجی صاحبؒ کو لکھا حضرت گنگوہی کو اس واسطے اطلاع نہ کی کہ میں خود جانتا تھا کہ مولانا یہی کہیں گے کہ سب کو چھوڑ کر ایک طرف ہو جاؤ اور میرے دل میں خیال یہ جما ہوا تھا کہ خذ ما صفا ودع ما کدر حضرت حاجی صاحبؒ کو لکھا حضرت کو سخت تشویش ہوئی۔ حضرت کو مجھ سے بیحد محبت تھی حضرت پریشان ہو گئے اور سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ جوان آدمی ہے جوش بڑھا ہوا ہے تحمل نہ ہوا وہاں سے کوئی صاحب آنیوالے تھے زبانی کہلا بھیجا کہ جبتک تمہارا یہ خادم زندہ ہے کیوں کسی سے رجوع کرتے ہو۔ حضرت کی عادت کے بالکل خلاف ہے کبھی کسی کو اپنی طرف رجوع کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں کہا مگر میرے ساتھ اس قدر خصوصیت تھی (حق تعالیٰ کو یوں ہی منظور تھا) کہ یہ لفظ فرمائے اور خط بھی لکھا۔ میں کانپور میں تھا ظہر کا وقت تھا یہ پیام اور خط پہنچا وہ اثر کیا اُس نے جو آگ پر پانی کرتا ہے مغرب کا وقت نہ آیا تھا کہ سب پریشانی رفع ہو گئی پھر اطمینان سے کام کرتا رہا الحمدللہ حضرت کی برکت سے طریق کی حقیقت سمجھ میں آگئی پھر یہ وسوسہ ہوا کہ دوسرے صاحب سے قطع تعلق ہوگا تو ناراض ہوں گے سوچتا رہا کیا کروں سمجھ میں یہ آیا کہ گول مول بات رکھنا تو ٹھیک نہیں اطلاع کر دینا چاہئے۔ پھر خفا ہوں یا کچھ ہوں جوانی اور ہوشیاری کا عالم تھا ایک تدبیر کے ساتھ ان سے قطع تعلق کیا تاکہ قطع کی نسبت انہیں کی طرف رہے وہ ... ہیں تھے میں نے ان کو خط لکھا کہ بمقتضائے الدین نصح میں نہایت ادب سے خیر خواہانہ عرض کرتا ہوں کہ بعض باتیں آپ کے خلاف شرع ہیں ان کو چھوڑ دیجئے اور میں نے یہ بھی لکھا کہ میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی حالت شریعت کے مطابق ہو جاوے اس سے وہ بیحد خفا ہوئے اور خود ہی قطع تعلق کر دیا اور نہایت خفگی کا خط آیا جس میں یہ بھی تھا کہ میں تم کو وہ دولت دینا چاہتا تھا جو مجھ کو حضرت علیؓ سے پہنچی ہے تم اس کے اہل تھے مگر قسمت تمہاری اور اخیر میں یہاں تک لکھا تھا کہ دعا کرو خدا میرا میرے زندقہ پر اور تمہارا تمہاری شریعت پر خاتمہ کرے میری جو غرض تھی یعنی قطع تعلق وہ پوری ہو گئی میں بے قصد تھا اس واسطے میں نے اس کی کچھ پروا نہ کی پھر ... وہ صاحب تھانہ بھون آئے یہ وقت میرے واسطے بہت نازک تھا میں

سوچتا تھا کہ اب ان سے ملاقات ضروری ہوگی میں کیا عذر کروں گا اور یہ ممکن نہیں کہ میں ملوں نہیں مگر میں دل کڑا کر کے گیا تو نہ ان سے ملا نہ اُن کے پاس گیا نہ کچھ کہا نہ کچھ سُنا انھوں نے جب ایسا دیکھا تو بہت بُرا بھلا کہا۔ ایک لوہار نے اس کو مجھ سے نقل کرنا چاہا اور میرا طرفدار بن کر... صاحب کی شان میں کچھ گستاخی کرنا چاہی میں نے اس کو ڈانٹ دیا کہ خبردار جو کچھ کہا ہم جانیں اور وہ جانیں تم کون بیچ میں بولنے والے (بحمد اللہ میں نے تہذیب سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا) وہ میرے بزرگ ہیں ان کو منصب ہے کہنے کا اور جانے کتنی دفعہ انھوں نے ہم کو بچپن میں مارا ہوگا اور ہم نے کتنی دفعہ ان پر پیشاب کیا ہوگا ہم اور وہ دو دو نہیں ہیں اس نے یہ باتیں جا کر اُن سے نقل کر دیں اس کا بڑا اثر ہوا پھر ایک شخص نے ان سے کہا آپ ہی مل لیجئے کہا مل تو لوں مگر میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے نہ ملے گا اور کہیں ٹل جاوے گا اس نے کہا نہیں ایسا ہرگز نہ ہوگا میں ذمہ دار ہوں مگر ان کو بہت غیظ تھا کہا میں ملوں گا بھی تو بڑا بن کر تو ملوں گا نہیں وہ بڑا سمجھتا تو خود ہی آ کر نہ ملتا ہاں رند بن کر ملوں گا اور پائجامہ اتار کر اس کے سامنے جاؤں گا تو کیا اس حالت میں بھی وہ مجھ سے ملے گا اس شخص نے کہا اس حالت میں میں ذمہ نہیں کرتا۔ اسی اثنا میں عید آگئی اتفاق سے ان سے موٹھ بھیڑ ہوگئی مگر میں نے سلام نہیں کیا اس پر بڑے خفا ہوئے پھر بقرعید آگئی مجھے اس وقت قرائن سے معلوم ہوگیا کہ آج امامت کرنا پڑے گی تردد ہوا کہ میں ان کے سامنے نماز کیسے پڑھاؤں گا ان کو امام بنانا چاہیئے مگر اس کو اور لوگ شاید نہ مانیں اور میں امام بن گیا تو علاوہ بدتمیزی کے ان کو کدورت رہے گی کیونکہ مجھ کو باطل پرست سمجھتے ہیں آخر یہ کیا کہ نماز جلال آباد جا کر پڑھی غرض ان سے بول چال نہیں ہوئی پھر وہ چلے گئے اور وفات بھی ہوگئی بس سن لیا آپ نے بہت یوں کرنا چاہیئے مولوی صاحب نے عرض کیا اس سے پریشانی ہے کہ میں حضرت سے دور ہوں اور حضوری کی کوئی صورت نہیں فرمایا آپ کچھ بھی کہیں لیکن بڑی وجہ پریشانی کی کشاکشی ہے اور میں

کہتا ہوں کہ ان قصوں سے نفع یہ ہے کہ آپ کو راہ کی بصیرت ہوئی مجھے اس پریشانی سے بڑا نفع ہوا گھر میں اس کی مثال دیا کرتے ہیں کہ ایسا ہے جیسے کوئی گلستان میں رستہ قطع کر رہا تھا درمیان میں برابر ایک خارستان آ گیا یہ شخص اس میں جا گھسا پھر لوٹ پھر کے اسی گلستان میں آ کر چلنے لگا تو اس کو مقصود کی قدر زیادہ ہوئی ہے نیز اس کو اس خارستان میں گذرنے تمام ان دشواریوں کا علم ہو جاتا ہے جو راہ میں پیش آتی ہیں پھر وہ دوسروں کو لے چلنے میں بڑا ماہر ہو جاتا ہے گھر میں سمجھ اس فن کی بہت اچھی ہے ہاں عمل میں نہیں افسوس کہ ایسا آدمی کام نہ کرے۔ کام نہ کرنے سے بعضے اخلاق بھی بے اصلاح ہیں اور اس پریشانی سے مختلف شیوخ کے بعد حضرت کی دستگیری دیکھ کر بڑا نفع ظہور شان حاجی صاحبؒ کا ہوا زمانہ قبض میں اوروں سے بھی رجوع کیا حضرت کسی لے وظیفے بتا دیئے اور کسی نے کچھ کسی نے کچھ محقق ایک بھی نہ ملا۔ حضرت کا عجیب طریقہ تھا اور اصل میں مرض کو ایسا صحیح پکڑ لیتے تھے کہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا اور شفقت ایسی تھی کہ نظیر ملنا مشکل ہے اسی وجہ شفا حکمی ہوتی تھی۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ بھی حضرت ہی کے طریقہ پر تھے اور حضرت کے طریقہ کے پورے جامع تھے۔ مگر لوگوں کو اس کا پتہ نہ چلتا تھا کیونکہ مولانا کو مجلس میں اصول و فروع کے بیان کا اہتمام نہ تھا صرف ایک عالم معلوم ہوتے تھے اور میں ایسا اوچھا ہوں کہ کسی بات کو نہیں چھپاتا میرا خیال ہے کہ فن تصوف کو آجکل طشت از بام کرنا چاہیئے ہزاروں قسم کی گمراہیوں اور تلبیسوں میں لوگ پڑے ہوئے ہیں اصلاح بلا اس کے کیسے ہو میں اصول و فروع سب کو کھلم کھلا بیان کر دیتا ہوں چھپانے کی چیز اپنی حالت ہے (میرا خیال اس کی نسبت بھی یہ ہے کہ خاص خاص لوگوں کے سامنے بمصلحت اس کو بھی ظاہر کر دے تو حرج نہیں) اپنی حالت ایک راز ہوتا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ دوسروں پر اس کا ظاہر کرنا حق تعالیٰ کی غیرت کے خلاف ہے اور فن کو تو علی الاعلان پکار پکار کر ظاہر کرنا اور شائع کرنا چاہیئے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا مجھے عقیدت راسخ تو آپ ہی سے ہے فرمایا مجھے اس کا انتظار ہی نہیں کہ دوسرے کسی سے اتنا عقیدہ نہ ہو جتنا مجھ سے ہو محبت احباب کا تو انتظار ہے محبت اور عقیدت

الگ الگ چیزیں ہیں خدا کا کوئی طالب ہو اور مجھ سے سو دفعہ قطع کر دے پھر میں ویسا ہی خادم ہوں میں اس کو بڑی تنگ ظرفی سمجھتا ہوں جو آجکل کے مشائخ میں ہے کہ ذرا طالب جدا ہوا تو مردود بنا یا پھر کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتے کوئی ان سے پوچھے کہ تم سے بھی اپنے شیخ کے ساتھ کوئی غلطی ہوئی تھی یا معصوم تھے اور بسا اوقات طالب سے غلطی کثرت محبت کی وجہ سے ہو جاتی ہے اس کی تو قدر کرنا چاہیئے اس وقت اس کو مردود بنانا خود ان ہی کی غلطی ہے ایسا طالب تو بے بہا نعمت ہے ہر چھوٹا چھوٹا نہیں ہوتا بعض وقت حق تعالےٰ بڑے لوگوں پر چھوٹوں کی برکت سے فضل فرماتے ہیں اس وقت بڑا بننا تکبر ہے حقیقت میں بڑا وہ ہے۔

فرمایا مولوی صاحب آپ کے پاس تو عذر بھی ہے اوروں سے قطع تعلق کرنے کے لئے کہ میں پہلے سے تھانہ بھون ہی سے تعلق رکھتا ہوں ما الحب الا للحبیب الاول، بس ایک طرف ہو جایئے ہاں اتنا ضرور ہے کہ پہلے شیخ کو گو وہ کیسے ہی بے نفس ہوں اطلاع کر دیجئے تاکہ آپ کا اور ان کا دونوں کا قلب مطمئن ہو جاوے۔ اطلاع نہ کرنے میں آپ کو یکسوئی نہ ہوگی۔ مولوی صاحب نے عرض کیا نہیں بلکہ میرے قلب کی حالت یہ ہے کہ اطلاع کرنے میں یکسوئی نہ رہے گی فرمایا تو اطلاع کی ضرورت نہیں کوئی گناہ تو کرہی نہیں رہے بس ایک طرف ہو کر بنام خدا کام شروع کیجئے آپ کو چشتیت کی تعلیم ہونا چاہیئے آپ کا ہر حال اس کا شاہد ہے چشتیہ اور نقشبندیہ دونوں کی شان میرے مذاق میں تو اسی ایک شعر سے واضح ہوتی ہیں ؏ رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار یہ چشتی کی حالت ہے کہ ؏ کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش۔ یہ نقشبندی کی حالت ہے کہ ہر کام میں انتظام اور تدبیر ہوتی ہے جیسے سلاطین میں ہوتی ہے۔

مولوی صاحب نے عرض کیا حضور کی دعا سے اس وقت میرے قلب کو بہت طمانیت حاصل ہوئی مگر مشکل یہ ہے کہ سامنے آپ کے اور حالت

ہوتی ہے اور پیچھے اور فرمایا یہ ضرور ہے مگر یہ تقلب مضر نہیں پریشانی کبھی نہ ہوگی اس قسم کا تغیر ہر شخص کو پیش آتا ہے مرید تو کیا شیخ کی حالت میں بھی وقت افادہ اور غیر افادہ میں فرق ہوتا ہے مرید کو شیخ کے پاس بیٹھنے سے نفع ہوتا ہی ہے شیخ کو بھی مرید کی بدولت بہت سی باتیں حاصل ہوتی ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بانگ مے آید کہ اے طالب بیا　　　جود محتاج گدایان چوں گدا

دیکھئے مدرسہ میں مدرس طالب علموں کے افادہ کے لئے مقرر ہوتا ہے اور طالب علموں کو اس سے نفع پہنچتا ہے اور طالب علموں کا نفع اس پر موقوف ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مدرس کو طالب علموں سے کچھ نفع نہیں پہنچتا آپ خود عالم ہیں اس بات کو بخوبی جانتے ہیں بارہا کا تجربہ ہے کہ کوئی مضمون کتاب میں پڑھتے وقت باوجود کوشش اور مطالعہ کے اور باوجود استاد کے سمجھانے کے سمجھ میں نہ آیا اور ہمیشہ اس میں الجھن رہی اور جس وقت طالب علم پڑھنے بیٹھا قلب میں دفعۃً آگیا یہ طالب علم ہی کی برکت ہے یا کچھ اور فائدہ کے وقت حق تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے طالب اور مطلوب کی باہم احتیاج کے لئے یہ شعر حافظ کا خوب ہے۔ شعر

سایہ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد
ما باو محتاج بودیم او بما مشتاق بود

اسی شعر میں مولانا کے شعر مذکور سے ادب ازید ہے اس میں طالب و مطلوب میں مساوات سی پائی جاتی ہے اور اس میں لفظ بدل دیا طالب کے لئے احتیاج اور مطلوب کے لئے اشتیاق اطلاق کیا۔

تقریر ادب الطریق ختم ہوئی۔

تاریخ بیضہ ۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ روز چہار شنبہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۷ء مقام میرٹھ محلہ کریم علی

ادب الاعتدال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مسمی ادب الاعتدال

یہ تقریر بھی منجملہ ان تقریروں کے ہے جو سفر گورکھپور میں ہوئیں یہ تقریر ریل میں مابین اسٹیشن مؤ و اعظم گڈھ ہوئی وقت ٹھیک ہوتے دو گھنٹے تاریخ ۲ صفر ۱۳۳۵ھ روز یکشنبہ بعد طلوع آفتاب مطابق ۲۴ دسمبر ۱۹۱۶ء۔ اس ہمراہیوں سے دو درجے بھرے ہوئے تھے تخمیناً چودہ پندرہ آدمی۔

موضع[1] اعظم گڈھ میں زائرین کا بہت ہجوم ہوا اور بہت سے ان میں اس بات کے طالب ہوئے کہ ہماری بستی میں تشریف لے چلئے۔ فرمایا وقت بہت تنگ ہے میں خواجہ عزیز الحسن صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں کہ ان کے ساتھ ایک مقام پر ریاست بھرت پور میں جاؤں اور ان کو لکھا جس کا دل چاہے کہ مجھ کو منگل کے روز الہ آباد میں ملیں آج اتوار ہے مجھ کو پرسوں الہ آباد پہنچنا ضروری ہے بیچ میں سرائے میر اور فتح پور کا بھی وعدہ کر چکا ہے اب اتنا وقت کسی طرح نہیں ہے کہ اور کہیں جاسکوں۔ فتحپور کیلئے بھی بمشکل دو گھنٹے ملے ہیں اور مقامات پر جانے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت تو میں الہ آباد چلا جاؤں اور خواجہ صاحب سے مشورہ کر دوں وہ وہاں ملیں گے اگر وہ اپنے ساتھ لیجانا ملتوی کر دیں تو الہ آباد سے پھر لوٹ آؤں گو مجھ کو اس میں تکلیف ہوگی مگر خیر میں اس کو گوارا کر دوں گا بد نظمی نہ ہونی چاہیئے لیکن اس کے لئے بھی کئی شرطیں ہیں ایک یہ کہ میں حتمی وعدہ نہیں کرتا کہ میں لوٹ آؤں گا۔ خواجہ صاحب سے مشورہ کے بعد جو کچھ

[1] یہ ایک موضع ہے ضلع اعظم گڈھ میں۔

طے ہوگا اس پر عمل ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں خواجہ صاحب پر زور نہیں دوں گا کہ وہ اپنے ساتھ نہ لیجائیں۔ اس واسطے مناسب ہے کہ جس جس کو مجھے اپنے یہاں لے چلنا ہو وہ سب اپنا اپنا ایک ایک وکیل جوان کے نزدیک معتمد علیہ ہو میری ہمراہ بھیجدیں وہ وکلا وہاں خواجہ صاحب سے کہیں اگر خواجہ صاحب نے منظور کرلیا تو میں ان وکلاء کے ساتھ واپس آجاؤں گا اور اس میں بھی شرط یہ ہے کہ معتد بہ تعداد مقامات کی ہوجاوے ایک دو جگہ کے لئے اتنے لمبے سفر کو دہرانا نہیں ہوسکتا اس وقت لوگ مقامات کے نام لکھوادیں اگر تعداد معتد بہ ہوگئی تو خیر یہ طول گوارا کیا جاوے گا۔ لوگوں نے کہا خواجہ صاحب کو تار دیدیں فرمایا تار کے قصے بہت دیکھے ہیں مشورہ طلب باتوں میں تار سے کچھ کام نہیں چلتا کیونکہ اتنا مضمون تار میں کیسے جاسکتا ہے آپ لوگ آپس میں مشورہ کرکے وکلا منتخب کرلیں اور میرے پاس لے آویں اگر پانچ مقام بھی ہوگئے تو میں چلا آؤں گا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد چار جگہ کے آدمیوں نے آمادگی ظاہر کی وہ چار جگہ یہ ہیں۔ ہمی پور، پورہ معروف، مبارک پور، بہادر گنج ان سب نے پوری آمادگی ظاہر کی۔ لیکن جب مؤ سے روانہ ہوئے تو اسٹیشن پر انبوہ میں کچھ پتہ نہ چلا کہ کس کس کے وکیل ساتھ ہیں جب ریل میں بیٹھ گئے اور روانہ ہوگئے تو فرمایا جو جو لوگ بلانا چاہتے تھے انھوں نے اپنے اپنے وکیلوں کے بھیجنے کا کیا انتظام کیا۔ خدام نے عرض کیا ہم کو نہیں معلوم ظاہراً تو لوگ سست ہوگئے اس وجہ سے کہ ان کو پوری امید نہیں رہی فرمایا میں جب کسی کا بلایا ہوا جاتا ہوں تو اس کے آدمی کو ضرور ساتھ لے لیتا ہوں بس یہ کام ساتھ رہنے کا مشکل ہے صرف بلاوا دیدینا تو کچھ بات نہیں تمام راستہ کا بار سفر کا اور انتظامات کا مدعو کے سر رہتا ہے بلانے والے کی صرف زبان ہلتی ہے اور بہت سے بہت یہ کہ روپیہ خرچ کردیا جب انتظام کا بار اپنے ذمہ پڑتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ بلانا کیا چیز ہے انتظام کارے دارد۔ اس سے طلب کی بھی جانچ ہوجاتی ہے جو طالب ہوگا وہ سو بکھیڑے اپنے ذمہ لے گا اور اس میں اپنی اسائیش بھی ہے راستہ اور سفر کی ضروریات سے جیسا کہ داعی کا آدمی

واقف ہو سکتا ہے ایسا مدعو نہیں ہو سکتا اسی سفر میں اگر بھائی اکبر علی کا آدمی گورکھپور سے ساتھ نہ ہوتا تو ڈوری گھاٹ کے اسٹیشن پر کس قدر مصیبت کا سامنا ہوتا جو کچھ تجویزیں ہم نے اور بھائی اکبر علی نے کی تھیں کہ سواری وغیرہ کا انتظام پورا کر دیا تھا وہ سب درمیان میں ایک جگہ ریل نہ ملنے سے الٹ پلٹ ہو گئیں اگر وہ خدمتگار نہ ہوتا تو سردی میں اور اندھیرے میں رات کو کہاں پڑتے۔ وہ واقف تھا اس نے اتنا تو کر لیا کہ دھرم شالہ میں جا ٹھیرایا میں کہیں از خود جانے سے بڑی عار رکھتا ہوں الا آنکہ بہت ہی مخلص اور خاص آدمی ہو کہ اس کے یہاں جانے میں کچھ تامل نہیں کرتا اس سے شرطیں لگانے کو تکلف اور ایذا سمجھتا ہوں اور بلا خاص تعلق کے کسی کے یہاں جانے میں میں بہت ہی شرطیں لگاتا ہوں اور پوری طرح دیکھ لیتا ہوں کہ وہ دل سے بلاتا ہے یا نہیں اور بھی کوئی دینی یا دنیاوی مفسدہ تو اس پر مرتب نہیں پوری طرح چھان بین کر کے جب جاتا ہوں حتیٰ کہ بعض لوگ میری ان شرائط کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے مزاج میں بہت خودکشی ہے مگر تعجب ہے کہ اس پر بھی ایک مہربان نے اس کو آوارہ گردی سمجھ کر اعتراض کیا۔ یہ ایک صاحب ہمارے مجمع کے مخالف ہیں بڑے ناز نخروں سے سفر کرتے ہیں۔ ایک موقع پر کسی نے بلایا تو طعنہ کے طور پر کہا کہ ہم پٹواریوں کی طرح مارے مارے نہیں پھرتے اور ایک دفعہ بعض اہل بدعت نے وہابیوں کی شناخت یہ بھی چھاپی تھی کہ دور دور کی دعوتیں کھاتے ہیں کیا مشکل ہے ایک طرف تو وہ اعتراض کہ یہ اپنے آپ کو کھینچتے ہیں اور ایک طرف یہ کہ پٹواری بنا دیا اگر معترضین کے کہنے کا خیال کیا جاوے تو زندگی محال ہے اس واسطے آدمی کو چاہیئے کہ اپنا معاملہ حق تعالےٰ کے ساتھ صاف رکھے اور دنیا کو بکنے دے کوئی کچھ کہا کرے۔ احقر نے عرض کیا تعجب ہے کہ مخالفین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم لوگ دعوتیں کھاتے پھرتے ہیں وہ خود تو بہت زیادہ دعوتیں کھاتے ہیں اور تکلف کی دعوتیں چاہتے ہیں۔ منہ سے مانگ کر لیتے ہیں جیسے مناظرہ رامپور میں ہوا

کہ قادیانی لوگ فرمائش کر کر کے بہت سا گھی اور شکر اور انڈا اور مرغی اور بکرے کا گوشت اور کیا کیا روزانہ لیتے تھے اور سفر خرچ میں بھی نواب صاحب سے سینکڑوں کی رقم وصول کی بخلاف ہمارے مجمع کے کہ کبھی کوئی فرمائش نہیں کی اور بہت اصرار کی بھی تو ماش کی دال کی اور سالن میں گھی کم کر دینے کی۔ فرمایا ہاں بہت جگہ دیکھا کہ یہ لوگ گھر گھر کے وصول کرتے ہیں کسی کے پانچ انڈے روز مقرر ہیں اور کسی کے ناشتے میں حلوا اور پراٹھے مقرر ہیں۔ کسی کی فیس بہت زیادہ مقرر ہے جو علاوہ سفر خرچ کے وصول کی جاتی ہے غرض سیاحین میں کوئی مجمع صلحار کا نہیں دیکھا کہیں یہ نہیں دیکھا کہ دس پانچ آدمی ایسے ہوں جن کو صالح اور دیندار کہا جا سکے کوئی شاذ و نادر اور اکیلا دیندار ہو تو ہو۔ اور ہمارے ہاں بحمد اللہ اتنے دیندار موجود ہیں کہ مجمع کے مجمع ہو سکتے ہیں۔ ہر مجمع میں ممکن ہے کہ دس پانچ آدمی ایسے دکھائے جا سکیں جن کا صالح ہونا مسلم ہو۔ اکثر غیر مقلد لوگ اپنا نام اہل حدیث رکھتے ہیں لیکن حدیث سے ان کو مس بھی نہیں ہوتا صرف الفاظ پر رہتے ہیں اور حدیث میں جو بات سمجھنے کی ہے جس کی نسبت وارد ہے۔ من یرد اللہ بہ خیرا الفقیہ فی الدین وہ اور چیز ہے اگر وہ صرف الفاظ کا سمجھنا ہوتا تو کفار بھی تو الفاظ سمجھتے تھے وہ بھی فقیہ ہوتے اور اہل خیر ہوتے تفقہ فی الدین یہ ہے کہ الفاظ کے ساتھ دین کی حقیقت کی پوری معرفت ہو سو ایسے لوگ حنفیہ میں بکثرت ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ ایک شیخ تھے عالم ظاہری پورے نہ تھے مگر تحقیق کی شان یہ تھی کہ ایک دفعہ بھوپال سے حج کرنے آئے تھے حضرت سے بیعت ہوتے، ان کے ساتھ ایک دوسرے شخص بھوپال کے تھے جو سخت غیر مقلد تھے اور ان پہلے صاحب کو بھی وہ غیر مقلد سمجھتے تھے۔ ان بھوپالی غیر مقلد صاحب نے اس سے سمجھا کہ حضرت غیر مقلد کو بھی بیعت کر لیتے ہیں انھوں نے ان صاحب کی معرفت حضرت حاجی صاحب سے دریافت کرایا کہ میں بھی بیعت ہونا چاہتا ہوں مگر غیر مقلد ہی رہوں گا۔ حضرت نے اس شرط کو منظور فرما لیا پھر وہ خود حاضر ہوئے

اور تصریحاً پوچھا فرمایا ہاں کچھ حرج نہیں۔ بس بیعت کرلیا لیکن بیعت ہوتا تھا خدا جانے کیا اثر ہوا کہ اس کے بعد اول ہی وقت نماز میں نہ آمین کہی نہ رفع یدین کیا۔ حضرت کو خبر ہوئی تو حضرت چونک اٹھے اور بلاکر ان سے پوچھا کہ اگر آپ کی تحقیق اور رائے بدل گئی تب تو خیر اور اگر میری خاطر سے ایسا کیا تو میں ترک سنت کا وبال اپنے اوپر نہیں لیتا۔ یہ دیکھئے تحقیق کی شان ہے اور سنت سے ہمارے حضرات کو اور خصوصاً حضرت حاجی صاحب رح کو سنت کے ساتھ غایت درجہ کا تعشق تھا پھر ایسے لوگوں کو متعصب کہا جائے تو کس قدر ظلم ہے ہاں متصلب ہیں متعصب نہیں۔ تصلب اور چیز ہے اور تعصب اور چیز۔ متصلب فی الدین اس شخص کو کہتے ہیں جو دین میں پختہ ہو اور متعصب ناحق ہٹ کرنے والے کو کہتے ہیں۔

علیگڈھ کالج کے بعض طلبہ نے مجھ سے کہا کہ علماء متعصب ہیں میں نے کہا ایک مثال دیتا ہوں اور آپ ہی پر فیصلہ رکھتا ہوں اس سے بخوبی واضح ہوجائیگا کہ سنا ہے تمہاری ماں اول رنڈی تھی پھر نکاح کرلیا اس کے بعد تم پیدا ہوئے کیا یہ بات صحیح ہے۔ سو اول تو اس میں عیب کیا ہے کہ ایک عورت رنڈی تھی اس نے توبہ کرلی اور نکاح کرلیا اس کے بعد جو اولاد ہوگی وہ تو حلال کی ہوگی اس سے اس شخص کے نسب میں کچھ طعن نہیں ہوتا۔ دوسرے اس سے قطع نظر اگر یہ بات واقعی ہو تب تو ایک واقعی بات کے تحقیق کرنے میں کچھ بھی حرج نہیں اب میں پوچھتا ہوں آپ سے کہ میں فرضی صورت کو چھوڑ کر یہی صورت اختیار کرتا ہوں کہ یہ بات واقعی ہو اور ایک مجمع میں بیان کی جائے تو کیا وہ شخص ٹھنڈے دل سے اس واقعہ کو سنکر جواب دے گا یا جوش کے مارے آپے میں نہ رہے گا بلکہ اگر اس پر جوش نہ ہو تو آپ کے نزدیک یہ داخل بیغیرتی ہوگا یا نہیں اور اگر آپ انکار کریں تو ہم امتحان کرکے دکھادیں۔ بتلائیے کہ اس کو جوش کیوں ہوگا اور یہ جوش کا ہونا آپ کے نزدیک بجا کیوں ہے اور جوش کا نہ ہونا بیغیرتی کیوں ہے۔

اگر وہ شخص واقعی بات کہتا ہے تب تو سچی بات پر غیظ آنا کیا معنے اور اگر جھوٹی بات کہتا ہے تب بھی جوش کے کچھ معنے نہیں خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اس کی ماں میں یہ عیب نہیں اور اس کہنے والے کو نرمی سے اور دل سوزی سے اور جن الفاظ کو وہ پسند کرے ان الفاظ سے سمجھا دینا چاہیئے کہ بھائی یہ بات غلط ہے اور اگر نہ مانے تو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے اور اس سے کچھ تعرض نہ کرنا چاہئے تو اس پر جوش ہونے کی وجہ یہی ہے کہ اپنی ماں کی عزت ہر شخص کے دل میں ہوتی ہے اس کی نسبت کوئی برا لفظ سننا قطع نظر واقعیت اور غیر واقعیت سے گوارا نہیں ہوتا بس ہم کو ہماری نظر میں دین کی عزت ماں سے زیادہ ہے کوئی ناشائستہ لفظ دین کی نسبت سننا گوارہ نہیں ہوتا اور فوراً جوش آہی جاتا ہے اور جوش نہ آنے کو ہم بے غیرتی سمجھتے ہیں. سوال کی طرح سوال کر دتب دیکھو ہم ناراض ہوتے ہیں یا نہیں خود ہماری کتابوں ہی میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسے سوال لکھے ہوئے ہیں جن سے توحید اور رسالت اڑی جاتی ہے اور علماء نے ان کے جواب نہایت متانت سے دیئے ہیں غیظ و غضب کا کچھ کام نہیں ان سوالوں میں تحقیق مدِ نظر ہے اور آپ لوگوں کو تحقیق مدنظر صرف استہزا بالدین اور چھیڑ چھاڑ منظور ہے سو اس کو تو ہم کبھی نہیں سُن سکتے۔ یہ جواب ہے تمہارے سوال کا اور اگر اس کو بھی تعصب ہی کہتے ہو تو دوسری بات لیجئے آپ ایسے متعصبین سے تحقیق ہی نہ کیجئے ایسے جوش کے حضرات پر لسنے علماء ہیں جنھوں نے کبھی ایسی بد دینی کی باتیں نہ سنیں تھیں آپ ہم سے پوچھئے ہم ایسے غیرت دار نہیں وجہ یہ کہ ہم تمھاری صحبت سے اور بار بار سننے سے بے غیرت ہوگئے ہیں ہم سے بے تکلف پوچھئے جو کچھ پوچھنا ہو۔ جن صاحب نے یہ کہا تھا کہ علماء میں تعصب ہے ان پر تو ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً میرے موافق بن گئے اور طالب علموں کو بھی سنا کہ آپس میں کہتے تھے جس کو جواب لینا ہو یہاں آجاؤ مگر کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ سوالات کرتے۔ بلکہ ان سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ اپنے شبہات

آزادی کے ساتھ لکھ کر بھیجد و یہ بھی کسی سے نہ ہوا ان لوگوں کی باتیں ہی باتیں ہیں دوسرے کے سر الزام رکھ کر خود کام سے بچنا چاہتے ہیں غرض علماء سے بدگمانی دور ہی دور سے ہے ہمارے علماء تو ایسے کریم النفس اور شفیق ہیں کہ ان سے نفرت ہو ہی نہیں سکتی لیکن تصلب کیسے چھوڑ دیں نرمی اور چیز ہے اور مداہنت اور چیز ہمارے علماء نرم تو بہت ہی زیادہ ہیں ہمارے علماء کی کوئی تحریر دل آزار نہیں دکھائی جاسکتی ہاں جواب ایسا ہوتا ہے کہ اس کا جواب نہ آسکے تحقیق کی شان یہ ہے لیکن کہیں کوئی کلمہ بیہودہ نہ ہوگا بات کا جواب پورا دیں گے کسی کی رورعایت نہ کریں گے ان سے مداہنت نہیں ہوسکتی۔ یہ طریقہ ان کو پسند نہیں کہ گنگا پر گئے تو گنگاداس اور جمنا پر گئے تو جمناداس۔ آج کل لوگوں نے یہ شعر یاد کر لیا ہے ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن باخاص وعام

بامسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام

یہ حافظ کا شعر کہا جاتا ہے مگر یہ حافظ شیرازی کا نہیں ہے کوئی آنکھوں کا حافظ ہوگا وہ تو ہندوستان آئے بھی نہ تھے رام رام کیا جانیں ہمارے ان علماء سے جب کوئی ملتا ہے تو پھر کبھی نہیں کہتا کہ متشدد ہیں ہاں مخالفین کے علماء متشدد بھی ہیں اور ان کا عالم بھی بہت ہی ناتمام ہے ایک غیر مقلد مجھ سے کہنے لگے کہ ہمارے علماء سوائے آمین اور رفع یدین کے کچھ نہیں جانتے اسی واسطے ہم معاملات کے مسائل آپ سے پوچھا کرتے ہیں حالانکہ یہ شخص بہت ہی سخت ہیں ان کے دوسرے بھائی بھی غیر مقلد ہیں مگر وہ نرم ہیں وہ کہنے لگے ہمارا یہی دعوے غلط ہے کہ ہم غیر مقلد ہیں ہم تو نہ عالم ہیں نہ محدث جبتک حضرت

ؔ مگر حضرت نے خود ہی سنے سنائے شبہات کو جمع کر کے ان کا حل کیا اس رسالہ کا نام "الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ" رکھدیا یہ جامع رسالہ قابل دید ہے اس کو علم کلام جدید کہنا چاہئے اس کی نظیر پہلے کبھی نہیں ہوئی ۱۲

گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ زندہ تھے ان سے پوچھتے تھے اب آپ سے پوچھتے ہیں اور فرمایا ہم ایک دفعہ گڑھی گئے (یہ ایک قصبہ ہے ضلع مظفر نگر میں) وہاں کے رئیس نے کسی تقریب میں مجمع کیا تھا اور یہ دونوں بھائی بھی آئے ہوئے تھے وہاں انھوں نے آمین پکار کر نہیں کہی مجھے اس کی قدر ہوئی۔ مولانا شیخ محمدؒ کے زمانہ میں ایک دفعہ کیرٹی کے ایک آدمی جمعہ میں آئے ہوئے تھے انھوں نے مولانا کے پیچھے آمین کہی تمام جماعت بھر میں کھلبلی مچ گئی کسی نے کہا نکال دو کسی نے کہا مار دو۔ مولانا نے سب لوگوں کو ساکت کیا اور کہا کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو اس قدر غل مچاتے ہو پھر ان صاحب کو بلا کر پوچھا جنھوں نے آمین بالجہر کہی تھی کہ جن لوگوں نے آمین زور سے نہیں کہی ان کی نماز تمھارے نزدیک ہوئی یا نہیں۔ جواب دیا نماز تو ہوگئی فرمایا پھر کیوں اتنے مجمع کو پریشان کرنا کیا ضرورت تھی۔ فرمایا حضرت والا نے ہم لوگوں کا بھی یہی مسلک ہے ہم آمین بالجہر کے ایسے خلاف نہیں کہ اس کے واسطے فوجداریاں کی جائیں۔ قنوج کی جامع مسجد میں ایک دفعہ میرے وعظ کی خبر سُن کر غیر مقلدین جمعہ میں شریک ہوئے اور آمین بھی زور سے کہی جب کسی نے کچھ نہ کہا تو دوسری رکعت میں تھوڑو لے کہی۔ دیکھئے نرمی کا یہ اثر ہوتا ہے بعد نماز میں نے وعظ کہا اور بدعات رسوم کا بیان کیا غیر مقلدین نے کہا آج معلوم ہوا کہ ہم بھی بدعات میں مبتلا ہیں۔ آیت یہ تھی۔ قل لازواجك ان كنتن تردن الحيوٰة الدنيا وزينتها فتعالين امتعكن واسرحكن سراحا جميلا۔ جس میں میں نے بیان کیا کہ قرآن شریف کے الفاظ تو بتلاتے ہیں کہ بیبیوں سے کہہ دینا چاہیئے کہ اگر تم دین کی پابندی نہ کرو گی تو تم کو طلاق دیدیں گے یہ ان کی محبت تھی دیکھئے ہم لوگوں نے آمین کے باب میں سختی نہیں کی ہمارے علماء میں تشدد ہی نہیں قنوج ہی میں مجھ سے ایک شخص نے مولود شریف پڑھنے کی درخواست کی میں نے کہا مجھے پڑھنے سے تو انکار نہیں ہے مگر میرا پڑھنا آپ کو پسند نہ آئے گا وہ بولے

جس طرح پڑھو گے ہم کو پسند ہے میں نے وعدہ کرلیا وہاں ایک غیر مقلد بیٹھے تھے صاحب فرمائش نے ان سے کہا تم بھی آنا جن کے مکان پر میں ٹھیرا ہوا تھا انھوں نے کہا لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میں نے کہا لاحول کا ہے پر پڑھی آپ کو کیا معلوم ہے کہ میں کیسے پڑھوں گا آپ آویں اور مجلس کے کنارہ پر بیٹھیں اور کوئی بدعت ہو فوراً اُٹھ جاویں چنانچہ بعد عصر بیان ہوا اور میں نے بطور وعظ بیان کیا وہ صاحب علیٰحدہ بیٹھے رہے میں نے اس آیت کا بیان کیا۔ الٓمرٰ کتب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور الایۃ مغرب تک بیان ہوا اور وہ برابر بیٹھے رہے اور بعد میں کہا ایسے مولود شریف سے کیا انکار ہے وہی غیر مقلد کہنے لگے کہ ہم اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہتے ہیں مگر ہمارا عمل بالحدیث صرف آمین بالجہر اور رفع یدین تک محدود ہے اور دیگر امور میں یہ حالت ہے کہ میں عطر میں تیل ملا کر بیچتا ہوں۔ کبھی وسوسہ بھی نہیں گذرا کہ یہ حدیث کے خلاف ہے۔ فرمایا حضرت والا نے یہ حالت ہے ان لوگوں کی جو حدیث حدیث کہتے پھرتے ہیں خود ایک غیر مقلد کہتے تھے کہ ہم میں متقی کم ہیں اور حنفیہ میں خشیت اتقاء زہد وغیرہ والے کثرت سے ہیں۔ محمد آباد کے اسٹیشن پر چار پانچ آدمی ملنے کو آئے اور بہت خلوص سے ملے فرمایا اس نواح میں دو چار دن رہنا ہوتا ہے تو سرور ہوتا ہے یہاں کے لوگ بڑے مخلص جانبین سے محبت ہو تو عجیب نعمت ہے یہ حب فی اللہ ہے۔ یہی کچھ چیز ہے اور جو محبت کسی غرض سے ہوتی ہے وہ لاشے اور محض دھوکہ ہے۔ امام شافعی صاحب کا قول ہے کہ جنت کی تمنا یہ خبر سن کر ہوگئی ہے کہ وہاں احباب سے ملاقات ہوگی پہلے تھے صوفی اور فقیہ اب لوگوں نے تصوف اور فقہ دونوں کے معنے بدل دیئے ہیں اور دونوں کو متنافیین قرار دیا ہے حالانکہ ان میں متنافی نہیں کیونکہ تصوف کے معنے ہیں تعمیر الظاہر والباطن ظاہر کی تعمیر اعمال سے اور باطن کی اخلاق سے اور فقہ کی امام صاحب نے تعریف کی ہے معرفت النفس مالہا وما علیہا یہ عام ہے۔ اعمال ظاہری و باطنی سب کو تو تصوف

اور فقر میں منافات کہاں ہے پہلے لوگ فقر اور تصوف کے جامع ہوتے تھے یہ بلا آجکل ہی پھیلی ہے کہ دونوں کو علیحدہ سمجھ کر دونوں کو خراب کیا حالانکہ ان دونوں کا ساتھ ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ صحبت کیلئے اس شخص کو اختیار کرو جو محدث بھی ہو اور فقیہ بھی صوفی بھی اعتدال اسی سے ہوتا ہے یہ قول ان کا قول جمیل میں ہے۔ شاہ عبد العزیز صاحب کا خاندان ماشاء اللہ ان اوصاف کا جامع ہے جن میں مولانا اسمٰعیل صاحب بھی ہیں بعض لوگ مولانا کو غیر مقلد سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ میرے ایک استاد بیان فرماتے تھے کہ وہ سید صاحب کے قافلے کے ایک شخص سے ملے ہیں ان سے پوچھا تھا کہ مولانا غیر مقلد تھے انھوں نے کہا یہ تو ہم کو معلوم نہیں لیکن سید صاحب کے تمام قافلہ میں یہ مشہور تھا کہ غیر مقلد چھوٹے رافضی ہوتے ہیں اس سے سمجھ لو کہ اس قافلہ میں کوئی غیر مقلد ہو سکتا ہے ایک حکایت اور فرمائی سند یاد نہیں، کسی نے مولانا سے مسئلہ پوچھا فرمایا کہ امام صاحب کے نزدیک یوں ہے اس نے کہا آپ اپنی تحقیق فرمایئے فرمایا میں کیا کہتا ہوں امام صاحب کے سامنے۔ مولانا کے غیر مقلد مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ مولانا بعض جاہل غالی مقلدین کے مقابلہ میں بعض مسائل خاص عنوان سے تعبیر کر لئے اور ایک بار ان کے مقابلہ میں آمین زور سے کہدی کیونکہ غلو اس وقت ایسا تھا کہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک شخص نے زور سے آمین کہدی تھی تو اس کو مسجد کے اونچے فرش پر سے گرا دیا تھا، مولانا کو اس پر بہت جوش ہوا اس کتاب میں ہے کہ آپ نے بیس مرتبہ آمین کہی۔ شاہ عبد العزیز صاحب سے لوگوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا ان کو سمجھایئے فرمایا وہ خود عالم ہیں اور تیز ہیں کہنے سے ضد بڑھ جاوے گی خاموش رہو۔ مولانا نے ایک رسالہ بھی رفع یدین کے اثبات میں لکھا ہے لیکن غیر مقلد ہرگز نہ تھے۔ ایک حکایت مولوی فخر الحسن صاحب بیان کرتے تھے اس سے بھی مولانا کے حنفی ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مولانا کے ایک بیٹے محمد عمر نام مجذوب تھے اور بہت بھولے لیکن بہت ذہین چنانچہ

ایک شخص ان کے سامنے کنز لے گیا کہ اس کا سبق پڑھا دیجئے، کہا میں نے یہ کتاب کبھی دیکھی نہیں مگر جب وہ طالب علم پڑھنے بیٹھا تو بہت اچھی طرح سے پڑھا دی حتیٰ کہ تھوڑا تھوڑا پڑھ کر اس نے کتاب بند کی تو کہا بھائی دس ورق تو پڑھو اور بھولے ایسے تھے کہ ایک بار مولوی محبوب علی صاحب کے وعظ میں پہنچے۔ مجمع بہت تھا مگر واعظ صاحب کی آواز پست تھی ان کو آواز نہ آئی تو گھر لوٹ کر گئے اور کہا کہ دعا کریں گے کہ اس واعظ کی آواز بڑھ جاوے اور دعا مانگی پھر فوراً آدمی بھیجا دیکھنے کے لئے کہ بتلاؤ آواز کچھ بڑھی یا نہیں۔ سو یہ صاحبزادے ایک دفعہ جامع مسجد کے حوض کے پاس کو گذرے وہاں غیر مقلدین میں مذاکرہ حدیث ہو رہا تھا یہ بھی بیٹھ گئے۔ ہمراہیوں نے عرض کیا حضرت کہ یہ لوگ غیر مقلد ہیں فرمایا بلا سے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو بیان ہو رہا ہے۔ بیان کرنے والے نے ایک مقام میں امام صاحب پر کچھ طعن کیا انھوں نے ایک دھول رسید کی اور کہا چلو یہاں بے ایمان ہیں، ان کی وجاہت بہت تھی کوئی بول نہ سکا سو اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غیر مقلد نہ تھے اگر غیر مقلد ہوتے تو ان کا بیٹا ایسا کیوں ہوتا، واللہ اعلم جیسے ہمارے مجمع کو بھی تو بعض لوگ غیر مقلد کہتے ہیں اور غیر مقلد ہم کو مشرک کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے مجمع میں بعض مقلدین کی طرح تقلید جائز نہیں حتیٰ کہ اگر امام صاحب کی دلیل سوائے قیاس کے کچھ نہ ہو اور حدیث معارض موجود ہو تو قول امام کو چھوڑ دیا جاتا ہے جیسے ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام میں ہوا ہے کہ امام صاحب نے قدر غیر مسکر کو جائز کہا ہے اور حدیث میں اس کے خلاف کی تصریح موجود ہے یہاں امام صاحب کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں مگر اس کے لئے بڑے متبحر کی ضرورت ہے کسی مسئلہ کی نسبت یہ کہنا بڑی مشکل ہے کہ اس میں

دلیل سوائے قیاس کے کچھ نہیں ہے۔ اس واسطے کہ کہیں احتجاج بعبارت النص ہوتا ہے اور کہیں باشارۃ النص ہوتا ہے اور یہ سب احتجاج بالحدیث ہے۔

البتہ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام کے خلاف واقعی کوئی دلیل سوائے قیاس کے نہیں ہے رہے آثار صحابہ سو وہ حدیث کے مقابل نہیں ہو سکتے فرمایا ایک صاحب کہتے تھے کہ غیر مقلدین جو عمل بالحدیث کا دعوے کرتے ہیں اس سے کیا مراد ہے بعض احادیث مراد ہیں یا کل اگر بعض مراد ہیں تو ہم بھی عامل بالحدیث ہیں اور اگر کل مراد ہیں تو وہ بھی عامل بالحدیث نہیں کیونکہ تعارض کے وقت دو حدیثوں میں سے ایک کو ضروری چھوڑنا پڑتا ہے۔

فرمایا جو لوگ اہل حق کو سب وشتم کرتے ہیں ان کے چہروں پر نور علم نہیں پایا جاتا بلکہ خالص کفار اتنے ممسوخ نہیں پائے جاتے جتنے یہ لوگ ہیں۔ اس کی وجہ میں نے بطور لطیفہ کے کہا تھا کہ کفر فعل باطن ہے اس کا اثر چھپا ہوا رہتا ہے اور سب وشتم فعل ظاہر ہے اس کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے۔ انگریزی خوانوں پر نور ایمان نہ سہی مگر شان تو ہوتی ہے ان میں وہ بھی نہیں خدا بچاوے۔ شعر

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

دیگر

چوں خدا خواہد کہ پوشد عیب کس
کم زند۔ در عیب معیوباں نفس

تبیض ختم ۸ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ۔ بمقام میرٹھ
یہ تقریر سب ریل میں ہوئی ما بین اسٹیشن مود اعظم گڈھ

ادب العثیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیا :- تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مسمیٰ بہ ادب العثیر بتاریخ ۲۷ صفر ۱۳۳۵ھ روز یکشنبہ بعد مغرب وقت تخمیناً ۳۱ منٹ ۔ مطابق ۲۴ دسمبر ۱۹۱۶ء۔

یہ تقریر سفر گورکھپور میں ہوئی اس وقت کہ حضرت والا گورکھپور سے بجانب مئو روانہ ہوئے راستہ میں اسٹیشن انڈارا جنکشن پر گاڑی تبدیل کرنے کے لئے اترنا ہوا گاڑی میں کچھ وقفہ تھا لوگوں نے ویٹنگ روم میں بٹھا دیا اس وقت تیس چالیس زائرین کا مجمع ہو گیا وہاں یہ تقریر ہوئی۔

فرمایا ایک شخص نے جو پانی پت کے قریب کے رہنے والے تھے پندرہ روپے تھانہ بھون کے مدرسہ میں دئے میرا دل کھٹکا اس سے پوچھا تم اس مدرسہ میں یہ رقم کیوں دیتے ہو کہا کارِ خیر سمجھ کر۔ میں نے کہا کارِ خیر سمجھ کر دیتا تھا تو کسی اپنے قریب کے مدرسہ میں جیسے پانی پت میں کیوں نہیں دیا مجھ کو یہ شبہ ہے کہ تھانہ بھون کے مدرسہ کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ مجھے بھی خوش کرنا منظور ہے اس نے اس کا اقرار کیا میں نے کہا یہ نیت کس قدر فاسد ہے کہ کارِ خیر میں شرک کی نیت کیسی میں ایسی رقم نہیں لیتا۔

لوگ ظاہر صورت عمل کی دیکھ لیتے ہیں کہ کارِ خیر ہے اور اس کی اصل اور حقیقت پر نظر نہیں کرتے یہ کیا کارِ خیر ہوا جس میں مصلحت سے زیادہ مفسدے ہیں آجکل عام طور سے یہ خیال ہو گیا ہے کہ نیک جگہ خرچ کرنا ہر حال میں اچھا ہے اور لینے والوں کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ لے لینا کسی حال میں بُرا نہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

بعض جگہ لینے میں مفاسد بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ الہ آباد میں مجھ سے ایک شخص

بیعت ہوا اور بعد میں ایک روپیہ نذر دیا میں نے لینے سے انکار کیا
اس نے کہا میں خلوص سے دیتا ہوں، میں نے کہا مانا تم خلوص سے دیتے
ہو اور اس وجہ سے مجھ کو واپس بھی نہ کرنا چاہیئے لیکن اس میں ایک بڑا مفسدہ ہے
وہ یہ کہ جن کے پاس روپیہ دینے کو نہیں ہے وہ بیعت نہ ہو سکیں گے تو غریب
آدمیوں کے لئے بیعت کا سلسلہ مسدود ہی ہو جائے گا تو اس کے یہ معنی ہوئے
کہ خدائے تعالیٰ کا راستہ بھی روپے ہی سے مل سکتا ہے۔

میرے نزدیک بیعت کے بعد دینے کی رسم یصدون عن سبیل اللہ میں
داخل ہے یہ بات اس شخص کی سمجھ میں نہ آئی مگر طوعاً و کرہاً اس نے روپیہ رکھ لیا
تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اسی مجمع میں سے ایک غریب آدمی کھڑا ہوا اور بیعت کی
درخواست کی اور کہا میں بہت دیر سے اس تمنا میں تھا مگر دینے کو کچھ پاس نہ تھا
اس وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی میں نے اس شخص سے کہا دیکھ لیجئے اسی وقت حق تعالیٰ
نے دکھا دیا اب آپ بتایئے کہ یہ روپیہ میں لے لیتا تو اس سے کس قدر لوگوں کو ضرر ہوتا۔

حضرت رسوم میں یہی خرابیاں ہیں کہ ان کی بدولت حقائق بالکل مٹ گئے ہیں جسکی
ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ رسمیں اہلِ بدعت کی نکالی ہوئی ہیں اور بدعت کا خاصہ یہ ہے
کہ اس سے نورِ قلب اور نورِ عرفان ندارد ہو جاتا ہے اور آدمی ایسے مغالطوں میں
پڑ جاتا ہے چنانچہ اہلِ بدعت کے جتنے استدلال آپ دیکھیں گے سب ایسے ہی ہوں گے
کہ ان سے اپنا دل خوش کر لیتے ہیں لیکن جس کے قلب کو حقیقت شناسی سے ذرا بھی
مس ہو وہ اس کو کبھی قبول نہیں کرتا حتیٰ کہ اگر اس کے خلاف پر دلیل بھی اس کے
پاس اس وقت نہ ہو مگر قلب ہے کہ انکار کئے جاتا ہے۔ پھر یہ کہ رسوم اگر امورِ
دنیا میں ہی ہوتے تب بھی اتنا مضائقہ نہ تھا مصیبت تو یہ ہے کہ دین میں بھی رسوم
شامل کر لئے ہیں سو ان رسوم میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کو آدمی ہمیشہ دین ہی
سمجھتا رہتا ہے اور تمام عمر اس پر تنبہ نہیں ہوتا اور غیر دین کو دین سمجھے جاتا ہے
دنیاوی رسوم میں تو کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی کوئی دنیوی خرابی وقوع میں

آجاتی ہے تو متنبہ ہو سکتا ہے مثلاً شادی بیاہ کے رسوم کہ ان کے نتائج تباہی و بربادی ظاہر ہو جاتے ہیں تو لوگوں کو تنبہ ہو جاتا ہے اور مضر دین سمجھ کر نہ سہی مضر دنیا سمجھ کر تو چھوڑ سکتے ہیں بخلاف رسوم دین کے کہ ان پر تنبہ ہونے کا کون باعث ہو سکتا ہے بلکہ بالعکس ان میں عدم تنبہ کا ایک داعی موجود ہوتا ہے وہ یہ کہ ان رسوم میں چٹک مٹک بہت ہوتی ہے جس میں دل خوب لگتا ہے پھر آدمی ان کو چھوڑے تو کیونکر اور ہم نے تو ایسے لوگوں کی صحبت پائی ہے جن میں رسمیں بالکل نہ تھیں سادہ زندگی بسر کرنے والے تھے ان کی معشت دیکھ کر ہم کو تو یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ آسائش کی زندگی بھی وہی ہے جس میں تصنع اور تکلف اور بناوٹ نہ ہو۔ ہماری طرف کاندھلہ ایک قصبہ ہے وہاں کے رہنے والے ایک بزرگ مولوی مظفر حسین صاحب تھے ان کے یہاں جب کوئی مہمان آتا تو پوچھ لیتے کہ کھانا کھا کر آئے ہو یا یہاں کھاؤ گے۔ اگر اس نے کہا یہاں کھاؤں گا تو پوچھتے کہ تازہ پکوایا جائے یا رکھا ہوا کھا لو گے اگر اس نے کہا تازہ کھاؤں گا تو پوچھ لیتے کہ کونسی شے مرغوب ہے جو چیز مرغوب ہوتی وہی پکوا دیتے یہ کس قدر آرام دہ بات ہے۔

انھیں بزرگ کا قصہ ہے کہ انھوں نے مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی سے فرمایا جن کا قیام دہلی رہتا تھا کہ مولانا جب آپ وطن جایا کریں تو راستہ میں مجھ سے مل کر جایا کریں مولانا نے کہا اچھا لیکن میری منزل میں حرج نہ ہوا کرے انھوں نے کہا نہیں جیسا آپ فرماتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ مولانا دہلی سے نانوتہ جارہے تھے راستہ میں مولوی مظفر حسین صاحب سے ملنے کے لئے ٹھہرے مولوی مظفر حسین صاحب نے حسب معمول پوچھا کھانا کھا لیا ہے یا کھاؤ گے۔ انھوں نے کہا کہ کھائیں گے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ تازہ تیار کراؤں یا جو رکھا ہوا ہو وہی لے آؤں انھوں نے کہا جو رکھا ہوا ہو وہی لے آئیے۔ مولوی صاحب ایک مٹی کے برتن میں کھچڑی کی کھرچن لے آئے اور کہا کہ رکھا ہوا تو یہ ہے بس وہ

اسی کو کھا کر رخصت ہو گئے۔ بتایئے اس میں آرام ہے یا ان رسوم میں جس کے آجکل لوگ پابند ہیں اور جس کو تہذیب و خاطر داری کہا جاتا ہے۔ ان حضرات کا خود بھی معمول یہی تھا مولوی مظفر حسین صاحب جہاں جاتے فوراً کہدیتے میں تمہارا مہمان ہوں ایک دن ٹھہروں گا یا دو دن۔ ایک دفعہ یہ بزرگ مولانا گنگوہی قدس سرہ کے مہمان ہوئے صبح کو مولانا نے ناشتہ کے لئے کہا آپ رامپور جانے والے تھے اس لئے آپ نے کہا کہ کھانا تیار ہونے میں دیر لگے گی میری منزل کھوٹی ہوگی ہاں اگر رات کا رکھا ہوا ہو تو لاؤ مولانا نے ماش کی دال اور باسی روٹی لادی آپ نے دال روٹی پر الٹ کر پلے میں باندھ لی اور رخصت ہو گئے۔ جب رامپور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین صاحب سے کہا کہ مولوی رشید احمد بڑے اچھے آدمی ہیں حکیم صاحب نے کہا ہاں۔ بڑے بزرگ ہیں۔ فرمایا میں ان کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا ہوں میں تو کہہ رہا ہوں کہ وہ بہت اچھے آدمی ہیں اگر خود نہیں سمجھتے ہو تو پوچھ ہی لو، انھوں نے کہا اچھا حضرت فرمایئے آپ نے کہا دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں انھوں نے مجھے کھانے کے لئے کہا مگر میرے کہنے پر جو کھانا رکھا ہوا تھا بلا تکلف لادیا میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔

ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہی مولانا محمد یعقوب صاحب کے صاحبزادہ حکیم معین الدین صاحب کے یہاں مہمان ہوئے یہ صاحب بہت ہی بے تکلف ہیں اتفاق سے ان کے یہاں اس روز کھانے کو کچھ بھی نہ تھا مولانا سے عرض کیا کہ ہمارے یہاں تو آج فاقہ ہے لیکن اکثر احباب آپ کی دعوت کیا کرتے ہیں اگر آپ فرمائیں تو میں ان کی دعوت منظور کرلوں فرمایا میں تو تمہارا مہمان ہوں جو حال تمہارا ہے وہی میرا بس فاقہ ہی سے بیٹھ رہے خدا کی قدرت شام کے قریب ایک جگہ سے گیارہ روپے آگئے وہ خوش خوش مولانا کے پاس آئے کہ لیجئے آپ کی برکت سے گیارہ روپے آگئے اب تو خوب بڑھیا دعوت کریں گے مولانا نے فرمایا نہیں معمولی کھانا پکوالو کہا اب ہم معمولی کیوں پکوائیں گے۔ اب تو جس طرح جی چاہے گا دعوت کریں گے۔ تو جب ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے پھر ہماری نظروں میں آجکل کی خاطر داری

کیا آسکتی ہے۔ جس کی حقیقت سوائے تصنع اور دکھلاوے کے کچھ بھی نہیں اور جس میں مفاسد ہی مفاسد ہیں اگر دنیادار بھی نمائش چھوڑ کر یہی طریقہ اختیار کریں تو قطع نظر گناہوں سے بچنے کے دنیا میں بھی تو تباہ نہ ہوں دیکھئے کیسی کیسی ریاستیں ان تکلفات میں تباہ ہوگئیں اور لطف یہ ہے کہ خود سب کے سب ان رسوم کے شاکی ہیں مگر چھوڑتے نہیں آدمی کو چاہیئے اتنے پاؤں پھیلائے جتنی گنجائش ہو اوران تکلفات میں اس کا خیال ہو ہی نہیں سکتا سب کو چاہیئے کہ ایک دم ان رسوم کو الگ کریں سادہ زندگی عجیب چیز ہے اور حلال کی کمائی میں تو سوائے سادہ زندگی کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا یہ چٹک مٹک جب ہی ہو سکتی ہے جب کمائی حرام کی ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست ہیں مولوی ظہور الحسن صاحب سب رجسٹرار ان کو اپنے ایک بھائی کے مقدمہ میں الہ آباد جانا پڑتا تھا۔ الہ آباد میں ایک وکیل تھے مولوی محمد نام (مولوی جزو علم ہے لقب نہیں ہے) انھوں نے ان کو وکیل کیا تو یہ جب الہ آباد جاتے انھیں کے یہاں ٹھہرتے۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ یہ ان کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے ان کے بچوں کو سنا یہ کہتے پھرتے تھے کہ آج ہمارے یہاں شیخ جی آئے ہیں یہ سمجھے کہ کوئی اور مہمان ہوں گے مگر اس روز وقت پر کھانا نہیں آیا انھوں نے خیال کیا کہ آج شیخ جی جو آئے ہوئے ہیں ان کے لئے پُر تکلف کھانے پکے ہوں گے اس وجہ سے دیر ہوگئی ہے۔ جب بہت ہی دیر ہوگئی تو انھوں نے ایک نوکر سے پوچھا کہ وہ شیخ جی جو ان کے یہاں آئے ہوئے ہیں نظر نہیں آئے وہ کہاں ہیں نوکر یہ سن کر بہت ہنسا اور کہا کہ ان کے یہاں کی اصطلاح ہے کہ شیخ جی فاقہ کو کہتے ہیں آج ان کے یہاں فاقہ ہے دیکھئے سادگی اس کا نام ہے کہ پاس ہوا تو خود بھی کھا لیا اور مہمان کو بھی کھلا دیا اور نہ ہوا تو قرض نہ کیا اور تربیت دیکھئے کتنی اچھی ہے کہ اولاد کو بچپن ہی سے تنعم کے خلاف کا عادی بنا دیا آجکل تنعم اس قدر ہو گیا ہے کہ ایسی باتوں کو ذلت کی تعلیم سمجھتے ہیں اپنے آپ کو کھینچنا بڑا سمجھنا کسی کے سامنے نہ لچنا آجکل کی یہی

تہذیب ہے اور نوکر کو تو آدمی ہی نہیں سمجھتے ہر کام میں وہ بات اختیار کی جاتی ہے جس میں ترفع تکبر بناوٹ ضرور ہو نئی نئی وضع نئے نئے فیشن بنائے جاتے ہیں اور ان میں جو کچھ ایجادیں اور اضافے ہوتے ہیں ان سب کی بنا تکبر ہی پر ہوتی ہے پھر اسی کی عادت بچوں کو ڈالتے ہیں حتیٰ کہ یہ معاشرت طبعی ہو جاتی ہے بول چال میں کھانے پینے میں اٹھنے بیٹھنے میں چلنے پھرنے میں غرض تمام حرکات سکنات تکلف سے خالی نہیں۔ ایک دفعہ ایک شخص میرے پاس آئے اور نہایت انکساری سے کہا میں خادم ہونا چاہتا ہوں بعد تفتیش کے معلوم ہوا ان کی مراد اس سے بیعت کی درخواست تھی۔ کوئی آکر کہتا ہے دامن میں لے لو، کوئی کہتا ہے غلام بنا لو یہ کیا تکلفات ہیں۔

ایک صاحب تشریف لائے اور سلام کر کے کھڑے ہو گئے بہت دیر ہو گئی میں نے کہا بیٹھتے کیوں نہیں کہنے لگے بلا اجازت کیسے بیٹھوں میں نے کہا اچھا ایک ہفتہ تک اجازت نہیں بس فوراً بیٹھ گئے۔ میں نے کہا یہ کیا واہیات ہے یا تو بلا امر بیٹھتے نہ تھے یا اب باوجود نہی کے بیٹھ گئے اور رواج یہ ہے کہ جب رخصت ہوں گے تو اُلٹے پاؤں چلیں گے پشت کرنا بے ادبی سمجھتے ہیں ظاہری برتاؤ تو اس قدر اچھا مگر اطاعت کا نام نہیں ہاں رسمی تعظیم و تکریم بہت ہے ہم لوگوں کی طبیعتیں ہی بدل گئیں۔

صحابہؓ رسمی تعظیم بہت نہ کرتے تھے مگر مطیع اس قدر تھے کہ دنیا کو معلوم ہے صحابہ کو جو تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا وہ تعشق کا مرتبہ ایسا رکھتا ہے کہ دنیا میں کسی محب اور محبوب میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے لیکن حالت یہ تھی کہ اس کے بھی پابند نہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آتے دیکھ کر کھڑے ہی ہو جایا کریں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو اس سے منع فرما رکھا تھا۔ لباس میں وضع میں بیٹھنے کی جگہ میں کسی بات میں دوسروں سے امتیاز نہ رکھتے تھے۔ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چلنے میں اس کے بھی پابند نہ تھے

کہ سب سے آگے رہیں بلکہ کبھی برابر ہو کر چلتے تھے کبھی پیچھے ہو جاتے تھے آجکل
کی تہذیب تو یہ ہوتی ہے کہ سب سے آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم رہا کرتے۔ سو
غور سے دیکھئے کہ آجکل کے لوگ اپنے بزرگوں کے زیادہ جان نثار ہیں یا صحابہ
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ جان نثار تھے۔ تجربہ تو یہ بتلاتا ہے کہ جہاں ظاہری
بناوٹ ہوتی ہے وہاں حقیقت نہیں ہوتی۔ جس کو بات بات میں جھکتا اور تسلیم
اور آداب عرض کرتے دیکھئے سمجھ لیجئے کہ دل میں اس کے آپ کی وقعت ذرا بھی
نہیں ہے زیادہ تعظیم وتکریم میں علاوہ اس کے کہ بے معنے چیز ہے یہ بھی بڑی خرابی
ہے کہ دوسرے کو ضرر ہوتا ہے اس میں رعونت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے
حدیث میں مدح فی الوجہ سے ممانعت آئی ہے۔ اسی حدیث سے تعظیم وتکریم کی
ممانعت بھی بدرجہ اولیٰ ثابت ہوتی ہے کیونکہ مدح کی دو قسمیں ہیں قالی اور
حالی تعظیم مدح حالی ہے۔ جب قالی سے ممانعت ہے تو حالی سے بدرجہ اولےٰ
ہوگی نیز بہت زیادہ تکلف کرنے کا ادنیٰ اثر یہ ہے کہ اس سے دل نہیں ملتا
اور بعض لوگوں کی اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ دوسرے کو اپنی طرف مائل
کریں سو اس کی تدبیر بھی یہ نہیں ہے بلکہ اس کی تدبیر بھی یہی ہے کہ زیادہ تکلف
نہ کیا جاوے۔ دیکھئے غور کے قابل بات ہے بعض بزرگوں کا برتاؤ مہمان کے
ساتھ میں سنتا ہوں کہ وہ ظاہراً تو بدتمیزی ہے اور آجکل کی تہذیب کے خلاف
ہے مگر درحقیقت بہت گہری بات اور عاقلانہ اور کریمانہ برتاؤ ہے وہ یہ ہے
کہ انھوں نے کھانا منگایا اور مہمانوں کے اور اپنے سب کے سامنے چنا گیا بس
پہلے اپنے آپ کھانا شروع کر دیا تاکہ مہمان سمجھ لے کہ یہاں تکلف نہیں ہے
اور دل کھول کر کھاوے پھر وہ کھانا کھاتے میں مہمان کی طرف دیکھتے بھی نہیں
اور ایسے بن جاتے ہیں کہ گویا ان کو کھانا کھلانے کا سلیقہ ہی نہیں اور درحقیقت
اس پر نظر رکھتے ہیں کہ کھانا دسترخوان پر ہے یا نہیں بلکہ خدمتگار کو تعلیم ہے کہ ذرا
کسی کے سامنے کھانا کم ہو فوراً لاؤ اس طریقہ سے مہمان کس قدر انبساط اور

آزادی سے کھا سکتا ہے مگر آجکل کی تہذیب یہ ہے کہ میزبان مہمان پر مسلط ہو جاتا ہے۔ قبلہ یہ کھائیے قبلہ وہ کھائیے اس سے مہمان بالکل منقبض ہو جاتا ہے ممکن ہے کہ اس کا جی اس وقت ایک چیز کو چاہتا ہو دوسری کو نہ چاہتا ہو اور اس جبر سے وہ کھالے تو انبساط نہ ہوا اور بعض وقت متعدد کھانے اس طرح سے کھلائے گئے کہ مقداریں بڑھ گئے اور ہضم نہ ہوئے آپ کی تو خاطرداری ہوئی اور مہمان کو تکلیف ہوئی یہ کیا خاطرداری ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دسترخوان نہایت وسیع ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے دسترخوان پر ایک اعرابی بھی تھا وہ ذرا بڑے بڑے لقمے کھاتا تھا آپ نے اس سے کہا کہ بھائی بڑے بڑے لقمے مت کھاؤ اس سے نقصان پہنچنا محتمل ہے وہ اعرابی فوراً کھڑا ہو گیا اور کہا کہ وہ شخص کریم نہیں جس کی نظر مہمانوں کے لقموں پر ہو تمھیں کھلانے کا سلیقہ نہیں تمھارا کھانا نہ کھانا چاہیئے۔ انھوں نے بہت کچھ عذر کیا کہ اس میں یہ مصلحت تھی مگر اس نے ایک نہ سنی خفا ہوتا ہوا چلدیا۔ امام مالک صاحبؒ کے یہاں امام شافعی صاحب مہمان ہوئے جب کھانے کا وقت آیا تو خادم نے پہلے امام شافعی صاحب کے سامنے کھانا رکھا امام مالک صاحب نے اس کو منع کیا اور پہلے اپنے سامنے رکھوایا ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ مہمان کو اپنے سے کم سمجھا چنانچہ اگر آجکل کوئی ایسا کرے تو ضرور یہی سمجھا جائے کہ مہمان سے اپنے آپ کو بڑا سمجھا اور عجب نہیں کہ مہمان خفا ہو کر اٹھ جائیں اور بعض مواقع میں یہ بات بے اصل بھی نہ ہو گی آجکل ہم لوگوں میں تکبر ہے ہی وہ لوگ بے نفس تھے اور اخلاق شرعی ان کے لئے عادت بن گئے تھے ان کا یہ فعل ہرگز از راہ تکبر نہ تھا بلکہ اس واسطے تھا کہ مہمان کو انقباض نہ ہو دیکھئے کتنی باریک نظر ہے اور چونکہ اس میں خلوص تھا اس واسطے مہمان پر بھی برا اثر نہ ہوا یہاں سے اور یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہو گی کہ آجکل ایسا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم نے کس واسطے ایسا کیا یہاں اس میں سلامتی ہے کہ اکرام کی صورت باقی رکھی جائے۔ کیا کیا جائے کہ یہاں تکلفات عادت ہو گئے

ہیں جن کو طبیعت ثانیہ کہا جا سکتا ہے یہاں تو تکلفات کی وہ مثال ہو گئی ہے جیسے ہمارے یہاں تھانہ بھون میں ایک شخص تھے کہ گالی بکنے کے بہت عادی تھے کسی سے بے گالی بات نہ کرتے گو ان کا گالی بکنا از راہِ تکبر نہ ہوتا تھا صرف عادت تھی لیکن سننے والوں کو تو بُری بات گوارا نہیں ہو سکتی اس پر کون نظر کرتا کہ اس کا منشاء کیا ہے لوگ ان کی فکر میں تھے یہ تو سب کو ذلیل کرتا ہی ہے کسی موقع پر اس کو بھی ذلیل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک شادی کا موقع ہوا سب لوگوں نے یہ اتفاق کر لیا آج اس کے یہاں کوئی مت جاؤ اب یہ بہت پریشان ہوئے اور برادری کی خوشامد در آمد کرنا شروع کی مگر لوگوں نے کہا کہ ہم یوں نہ مانیں گے گالیاں بکنے سے توبہ کرو اور تو بھی شاہ ولایت صاحب کے مزار پر چل کر اور قبر پر ہاتھ رکھ کر کہو مجبور ہو کر گئے اور قبر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ شاہ صاحب میں نے ان لوگوں کو بہت گالیاں دی ہیں آج میں تو یہ کرتا ہوں کہ ان کی ماں کو یوں تو ن کروں کبھی گالی نہ دوں گا لوگ ہنس پڑے اور کہا یہ شخص معذور ہے اس کی خطا معاف کرو۔ وہی حالت ہمارے تکلفات کی ہو گئی ہے کہ سمجھا دیا جائے اور بتلا دیا جائے اور جزئیات ایک ایک بیان کر دی جائیں اور ان کی زبان سے سب کو دہروا دیا جائے مگر جب کوئی کام کریں گے تو وہ ہو گا تکلف ہی کا اصل یہ ہے کہ تعلیم پر عادت غالب ہوتی ہے۔ جیسے ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس نے وزیر سے دریافت کیا کہ طبع غالب ہوتی ہے یا تعلیم اس نے کہا کہ طبع غالب ہوتی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ ایسا نہیں ہے تعلیم وہ چیز ہے کہ حیوان کو بھی مہذب بنا دیتی ہے۔ دیکھو یہ ہماری بلّی ہے اپنے سر پر شمع لے کر برابر کھڑی رہتی ہے۔ بتلائیے طبیعت غالب ہوئی یا تعلیم وزیر اس وقت تو خاموش ہو گیا اگلے دن ایک چوہا پکڑ کر ساتھ لے گیا اور بادشاہ کے سامنے ہی اس بلّی کے آگے وہ چوہا چھوڑ دیا۔ بس تعلیم و تہذیب سب ندارد ہو گئی اور بلّی شمع کو پٹک کر چوہے کے پیچھے دوڑی۔ وزیر نے کہا حضور اب بتلائیے وہ تعلیم کہاں گئی۔ بات یہی ہے کہ تعلیم طبیعت پر کبھی غالب نہیں ہو سکتی ۔

جب تک کوئی غرض مزاحم نہ ہو اس وقت تک بناوٹ کی تہذیب رہتی ہے مگر کوئی غرض غالب ہوجاوے تو طبیعت اصلیہ کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

بس اب ریل آگئی اور یہ تقریر ختم ہوئی لیکن اسی سفر میں اور کئی موقعوں پہ بھی اسی موضوع پر تقریریں ہوئیں جن کا الحاق خود حضرت والا نے اسی کے ساتھ مناسب سمجھا لہٰذا وہ بھی یہیں درج کی جاتی ہیں۔ ازاں جملہ وہ تقریر ہے جو سرائے میر کے اسٹیشن پر شب ۲۲ صفر ۱۳۳۹ھ شب دوشنبہ ایک بجے شب ہوئی جبکہ لوگوں نے مصافحہ میں بہت تنگ کیا اسٹیشن پر یہ حالت تھی کہ پلیٹ فارم پر پہنچنا مشکل ہوگیا اور دن بھر قصبہ سرائے میر میں بھی یہی ہوا تھا کہ ہر نقل و حرکت کے بعد جدید مصافحہ کرتے تھے حتیٰ کہ استنجے کو جاتے وقت بھی مصافحہ کرتے اور بیت الخلا سے نکلنے کے بعد پھر مصافحہ اور منع کرنے پر بھی نہ مانتے اور کپڑے اور ہاتھ پکڑ پکڑ کر مصافحہ کے لئے کھینچتے اسٹیشن پر فرمایا تھا کہ تھانہ بھون کی ایک حکایت سن لو ایک وقت میں چند شریر لڑکوں کی ایک کمیٹی قائم تھی وہ شہر کے انتظامات میں بھی دخل دیتے تھے اتفاق سے تھانہ بھون میں ایک میاں جی تشریف لائے جو کہ بہت دیندار شخص تھے ان کے آنے سے پہلے ایک میاں جی تھے ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر لوگ انھیں ترجیح دیں اس لئے انھوں نے اُن لڑکوں کو ایک عرضی لکھی کہ ان میاں جی کے رہنے سے مجھے اپنے نقصان کا اندیشہ ہے ان کے یہاں سے نکلنے کا انتظام کر دیا جائے۔ جب وہ عرضی پہنچی تو ایک لڑکے نے کہا کہ اس کا انتظام میں کردوں گا بس وہ لڑکا اپنے گھر آیا اور اپنی ماں سے کہا کہ میرے لئے دو روغنی روٹیاں پکا دو آج میں دوپہر میں نہیں آؤں گا مجھے کچھ کام ہے۔ بس آپ روٹیوں کو باندھ وہیں پہنچے جہاں وہ نئے میاں جی تھے وہ بیچارے اشراق کی نماز پڑھ رہے تھے جب وہ نماز سے فارغ ہوکر چلے تو آپ نے ان کے سامنے جاکر سلام کیا انھوں نے جواب دیدیا آپ نے دو قدم کے بعد سلام کیا انھوں نے دوبارہ بھی جواب دیا چار قدم کے بعد پھر تیسری مرتبہ سلام کیا اب وہ متغیر ہوئے کہ یہ قدم قدم پر سلام

(بقیہ حاشیہ)

کیسا اس نے جب دیکھا کہ یہ چڑنے لگے پھر تو سلام کا تار باندھ دیا اب وہ بیچارے بہت گھبرائے ارادہ کیا کہ جس مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں چلے جائیں اس نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کہاں چلے میں تو سنت ادا کرتا ہوں اور آپ واجب کے ادا کرنے میں بھی سستی کرتے ہیں بس زبردستی گھر میں جانے سے روک لیا جب کھانے کا وقت آیا اور انھوں نے اس وقت جانا چاہا اس نے روٹیاں سامنے رکھدیں کہ کھانا یہیں کھا لیجئے۔ دوپہر میں سنت ادا کریں گے وہ بیچارے ایسے گھبرائے کہ بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسکرا کر فرمایا یہ بار بار مصافحہ کرنا ان میاں جی کی طرح سے میرے بھی نکالنے کی ترکیب ہے۔ صاحبو! میں ویسے ہی نکل جاؤں گا ترکیبوں کی کیا ضرورت ہے۔ پھر فرمایا حدیث میں آیا ہے ان من تمام تحیاتکم المصافحۃ جس کا مطلب یہ ہے کہ مصافحہ متمم سلام ہے اور سلام کے لئے کچھ قواعد مقرر ہیں تو مصافحہ کے لئے جو کہ اس کا تابع ہے بطریق اولیٰ ہوں گے مثلاً لکھا ہے کہ اذان کے وقت سلام نہ کرو کھانا کھاتے وقت سلام نہ کرو اور اور بھی مواقع ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ مشغولی کے وقت سلام نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشغولی کے وقت مصافحہ بھی نہیں چاہیئے۔ بہت سے علماء تو وداعی مصافحہ کو بھی بدعت کہتے ہیں مگر خیر ہمارے علماء جائز کہتے ہیں چونکہ وداع کے وقت سلام تو نصوص سے ثابت ہے اور مصافحہ متمم سلام ہے تو مصافحہ بھی درست ہوا مگر ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔

یہاں مصافحہ کی کوئی حد ہی نہیں ہے استنجے کے بعد بھی مصافحہ اٹھنے کے بعد بھی مصافحہ۔ بیٹھنے کے بعد بھی مصافحہ اسی واسطے میں نے یہ ترکیب کی تھی کہ کمرہ میں بیٹھ کر کواڑ بند کر لیتا تھا اس سے بہتوں

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دیں۔

کی دل شکنی ہوئی ہوگی مگر کیا کیا جائے اپنا تحمل بھی تو دیکھنا چاہیے میری طبیعت کسل مند ہے یہ سفر میں نے بغرض آسایش کیا ہے اور جب یہ بھر مار مصافحہ کی ہوگی تو پھر آسایش کہاں نیز تعلیم کی بھی ضرورت ہے کبھی کسی کے کان میں یہ پڑا ہی نہیں کہ ایسا مصافحہ نہ چاہیئے مصیبت یہ ہے کہ آجکل کے مشائخ بجائے اس کے کہ اس سے منع کریں اور اس کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس سے ان کی گرم بازاری ہوتی ہے اس واسطے میں نے اس دل شکنی کو گوارا کیا کہ یہ بات یاد تو رہے گی۔ سنا ہے مدینہ طیبہ میں رجبی کے دن خطیب معراج شریف کا بیان کرتا ہے بعد ختم بیان کے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کے بدن کو ہاتھ لگانا موجب برکت ہے۔ مجمع بہت ہوتا ہے خطیب تنگ آجاتا ہے اس کے لئے پہلے ہی سے کپڑے کا ایک مقصورہ بنایا جاتا ہے پس وہ اٹھ کر اس میں چلا جاتا ہے اور پھر اس کے چاروں طرف پہرہ ہو جاتا ہے تب نجات ملتی ہے اور واقعی بات یہ ہے کہ ہر وقت کا مصافحہ مصیبت ہے ہر چیز موقع کی اچھی ہوتی ہے محبت کی بھی تو حد ہونی چاہیئے یہ نہیں کہ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے دوسرے کی تکلیف کا بھی خیال نہ کیا جائے متنبی کہتا ہے ؎

واسکت کے مالا یکون جواب یعنی میں خاموش رہتا ہوں تاکہ محبوب کو جواب دینے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے مصیبت یہ ہے کہ دین صرف نماز روزہ کا نام سمجھ لیا ہے دین کا ایک جزو یہ بھی تو ہے جو حدیث میں ہے واحب لاخیک المسلم ما تحب لنفسك تکن مسلما یعنی دوسرے مسلمان کے لئے وہی بات پسند کرو جو اپنے واسطے کرتے ہو تب مسلمان ہوگے جب اپنی تکلیف گوارا نہیں ہوتی ہے تو دوسرے کی تکلیف کیوں گوارا کی جائے اس کی تعلیم سے حدیثیں بھری پڑی ہیں کہ اپنے کسی فعل سے بھی دوسرے کو تکلیف نہ دی جائے نہ قولاً نہ فعلاً مسلم میں حدیث ہے مقداد بن اسود اس کے راوی ہیں یہ اپنا قصہ بیان کرتے ہیں کہ ہم تیرہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان ہوئے صحابہ کی عادت تھی کہ مہمانوں کو تقسیم کر لیا کرتے تھے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی تقسیم کر دیا چند آدمی اپنے حصے میں رکھے ان میں یہ بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے

ؔ یہ اگر التزام سے کیا جائے تو بدعت ہے جیسا کہ آجکل ہوتا ہے ۱۲ جامع عفت انتخابات التالفات

بعد تشریف لائے اور ہم لیٹے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح سلام کرتے کہ جاگتا آدمی تو سن لے اور سوتا آدمی جاگ نہ جائے۔ دیکھئے تہذیب یہ ہے کہ دوسرے کو تکلیف نہ پہونچے اس کی رعایت ہر شخص کے ساتھ چاہیئے اور حدیث بقیع غرقد میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں قام رویداً وانطلق رویداً یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ آہستہ اٹھے اور آہستہ آہستہ تشریف لے گئے تاکہ حضرت عائشہ کی نیند میں خلل نہ آئے اپنے سے چھوٹوں کی بھی یہ رعایت ہے آجکل بڑوں کے سامنے بھی دبنا نہیں چاہتے۔ اب لوگ تہجد کو اٹھتے ہیں تو ڈھیلے پھوڑتے ہیں کھٹ کھٹ چلتے ہیں گویا بتلانا چاہتے ہیں کہ ہم تہجد کو اٹھے تہذیب تو کہیں باقی ہی نہیں رہی ادب کے معنے لوگوں نے بار بار جھکنے کھڑے ہونے اور آداب و تسلیمات لے لئے ہیں حقیقت میں مؤدب تھے تو صحابہ تھے مگر نہ ان میں بار بار اٹھنا تھا نہ بار بار جھکنا تھا نہ چبا چبا کر باتیں کرنا تھا لیکن موقع پر دیکھئے کہ جان دینے میں بھی تامل نہ تھا۔ زیادہ صورت تعظیم و تکریم کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ شخص وقت پر کچھ بھی کام نہ دے گا نیز ایسی تعظیم سے دوسرے شخص کا ضرر ہوتا ہے کہ اس کے اندر عجب پیدا ہو جاتا ہے حدیث میں جو آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو کچھ آدمیوں کو آگے اور کچھ کو پیچھے کر لیتے جب اس پر عمل کر کے دیکھا جاتا ہے تب اس کی قدر ہوتی ہے کہ اس میں جانبین کی کس قدر منفعت ہے مگر ان باتوں کا خیال تو کیا ان کا داخل شریعت ہونا بھی اب معلوم نہیں رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح بیٹھتے کہ کوئی امتیاز نہ ہوتا۔ عرب میں اب بھی یہ رسم ہے کہ سب یکساں بیٹھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں پاشا نے حجاج کو محمد حسین سندھی مطوف کے مکان پر جمع کیا سب لوگ وقت سے پہلے پہنچ گئے پاشا اپنے وقت پر آئے، لوگ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے مگر وہ ایک کونے میں بیٹھ گئے جہاں پہلے ایک معمولی آدمی بیٹھتا تھا اور مجمع میں سے کسی نے اونچی جگہ بیٹھنے کی تواضع بھونج کی بتایئے اس میں کیا حرج ہو گیا تکلفات کے رواج ڈال لینے سے ایک خرابی یہی پیدا ہوتی ہے کہ اگر پھر تکلف نہ کیا جائے تو برا ماننے کی

نوبت آتی ہے اور جب تکلفات کا رواج ہی نہیں تو برا ماننے کا موقع بھی نہ ہوگا
حدیث میں آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجمع میں اس طرح بیٹھتے کہ کوئی ناواقف
آتا تو اس کو پوچھنا پڑتا من محمد فیکم صحابہ کہتے ھذا الابیض المتکئ متکئ
کے معنی ٹیک لگانے والے کے ہیں کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ ٹیکے بیٹھے
ہوں گے اس وقت یہ لفظ کہا گیا ہے اور اس کے یہ معنے نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم تکیے پر بیٹھے تھے۔ کیونکہ عربی زبان میں اتکا کے معنے مطلق ٹیک لگانے کے ہیں
اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ اور مسند پر بیٹھا کرتے تو آنے والا شناخت ہی نہ کر لیتا
کیونکہ ظاہر ہے کہ مجلس میں جو تکیہ پر بیٹھا ہوتا ہے وہی بڑا ہوتا ہے۔ اور ہجرت
کے واقعہ میں ہے کہ جب مسجد قبا میں آنے والے حضرت صدیق اکبرؓ سے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے دھوکہ میں مصافحہ کرتے رہے جب دھوپ چڑھ آئی تو حضرت صدیق حضور
صلی اللہ علیہ وسلم پر چادر تان کر کھڑے ہو گئے تب معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
یہ ہیں۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر سادگی سے رہتے تھے اب یہاں قابل لحاظ
یہ بات ہے کہ معلوم ہونے پر دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے مصافحہ نہیں کیا
نیز یہ کہ حضرت صدیقؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے بچانے کے لئے خود ہی سب
سے مصافحہ کیا کہیے کیا ادب ہے حقیقی ادب اس کو کہتے ہیں کس جان نثاری سے لوگ
آئے تھے اور ان کے لئے مصافحہ کس درجہ نعمت غیر مترقبہ تھی مگر اپنی خواہش پوری کرنے
کے مقابلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا زیادہ پاس کیا آجکل کا مصافحہ نہ تھا۔
آجکل تو لوگ غضب ہی کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں گردن جھکائے وظیفہ پڑھتا تھا ایک
شخص آئے اور مصافحہ کے لئے کھڑے رہے میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ چلے جائیں
مگر وہ اس پر بھی نہ گئے اور پکار کر کہا کہ مصافحہ میں نے بھی کہدیا کہ وظیفہ اور بعض لوگ
کندھا پکڑ پکڑ کر کھینچتے ہیں کہ مصافحہ کر لیجیے۔ مصافحہ کیا ہوا کہ بلائے جان ہو گیا اور
پھر کتنا ہی کہیے کوئی سنتا نہیں ابھی ایک شخص کو منع کیا اور دوسرا اسی طرح مصافحہ
کرنے کو تیار۔ فرمایا اور یہ رسم بھی قابل اصلاح ہے کہ مسافر چلتے وقت جبکہ اسباب باندھتا

ہوتا ہے اس وقت اس کو گھیرتے ہیں اس وقت اس کو مخلی بالطبع چھوڑ دینا چاہیئے جب تک اسباب باندھے اس سے ہٹکر ایک طرف بیٹھ جانا چاہیئے ہاں اس کی اعانت کے واسطے اگر ایک دو آدمی پاس رہیں جن سے بے تکلفی ہو تو خیر جب تہیئہ سفر کر چکے تو اطمینان سے مل لیں فقط

سرائے میر کے اسٹیشن کی تقریر ختم ہوئی پھر ایک تقریر اسی موضوع پر ریل میں مابین الہ آباد و کانپور ہوئی بتاریخ یکم ربیع الاول ۱۳۳۵ھ شب پنجشنبہ وہ بھی حسب ایما حضرت والا کے ادب العشیر کے ساتھ ملحق کی جاتی ہے وہ یہ کہ عدل بین النساء کا ذکر ہوا خواجہ صاحب نے کہا عدل کیا مشکل ہے کیونکہ فعل اعضاء ہے دونوں کو ہر بات میں برابر رکھا کسی بات میں ایک کو ترجیح نہ دی یہ مشکل کیا ہے فرمایا یہ عنوان تو بہت مختصر ہے آپ نے تو وہ مثال کر دی کہ کسی نے ایک شعر لکھا تھا جس کا ایک مصرعہ بہت چھوٹا اور ایک بہت بڑا تھا کسی شاعر نے اعتراض کیا کہ میاں مصرعے برابر نہیں فرمایا ضرورت شعری میں ایسا ہوتا ہی ہے مولانا جامی کے کلام میں بھی موجود ہے ؎ الٰہی غنچۂ امید بکشا (اس کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھا) گلے از روضۂ جاوید بنما۔ اس کو جلدی سے ادا کر دیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ مصرعے چھوٹے بڑے ہیں۔ ایسے ہی آپ نے مختصر عنوان لے لیا اور جلدی سے کہکر ثابت کر دیا کہ عدل کچھ بڑا کام نہیں ذرا سی بات ہے فعل اعضاء ہی تو ہے اول تو خود فعل اعضاء بھی کہنے ہی میں ذرا سا ہے مگر کرنے میں ذرا سا نہیں کیونکہ یہاں ایک بلی کی میاؤں بھی ہے کہ اس عدل کی مانع ہو جاتی ہے۔ آپ نے اس کا قصہ سنا ہو گا کہ چوہوں نے بلی کو زیر کرنے کی تجویزیں سوچیں کسی نے کہا میں کان پکڑ لوں گا اور کسی نے کہا میں گلا دباؤں گا اور کسی نے کہا میں دُم کاٹ لوں گا۔ ایک پرانا تجربہ کار چوہا بولا کہ ایک چیز اور رہ گئی وہ کون پکڑے گا جس وقت وہ میاؤں کرے گی اس کو کون پکڑے گا۔ تو حضرت ایک میاؤں بھی ہے کہ اس کے سامنے آپ کا مختصر عنوان کام نہیں دیتا وہ یہ ہے کہ عورت کجی کرے گی اور سمجھانے سے جب وہ راضی نہ ہو گی تو مرد کیا کرے گا بہت سے بہت آپ یہ کہیں گے کہ اس کا کہنا نہ مانے اور عدل پر قائم

رہے جو فعل اعضا ہے مگر قلب کو رنج تو ضرور ہو گا اور دل اس میں مشغول ہو جاویگا پھر وہ رنج لے کر دوسری کے پاس جاوے گا اس سے بھی بے لطفی ہو گی عجب نہیں کہ اس رنج کی وجہ سے اس کی بھی کوئی بات ناگوار ہو اور اس سے بھی ناچاقی ہو جاوے اور ایک میاؤں کی جگہ دو میاں ہو جاویں بتایئے اس کی کیا ترکیب ہے سخت مصیبت کا سامنا ہے مگر یہ جب ہے کہ مرد سلیم القلب ہو رنج اور خوشی کا احساس اس کو ہوتا ہو ایسے شخص کی تو اس صورت میں واقعی زندگی تلخ ہو گی اور جس کو احساس ہی نہ ہو تو اس کا ذکر ہی نہیں وہ تو آدمیت سے ہی خارج ہے مگر وہ عدل ہی کیا کرے گا۔ پس یہ کام تو صابر کا ہے یا سخت مزاج کا کہ رنج و الم سہا کرے اور عدل کو ہاتھ سے نہ دے یا ڈنڈے مار کر سیدھا کر لے مار کے سامنے سب سیدھے ہو جاتے ہیں یا عدل کا لفظ ہی اٹھا دے۔ بس ایک طرف کا ہو جاوے دوسرے کو کالمعلقہ کر دے اور اپنی زندگی آسایش سے بسر کرے مگر یہ شخص وہاں کی زندگی تلخ پاوے گا۔ جس کی تلخی اس زندگی کی تلخی سے اشد ہے آپ نے کہہ تو دیا کہ عدل کیا مشکل ہے مگر میں ایک مثال میں پوچھتا ہوں کہ ایک کپڑا آوے اور دونوں بیبیاں اس کی خواہش کریں اور عورتوں کی ہٹ آپ جانتے ہیں اس وقت بتلایئے مرد کیا کرے گا۔ ایک کو دے تو عدل کے خلاف اور مصیبت کا سامنا اور دونوں کو نہ دے تو دونوں ناراض بس یہ ہو سکتا ہے کہ دو ٹکڑے کر دے مگر اس صورت میں کپڑا بے بیونت ہو کر ایک کے بھی کام کا نہ رہے گا اور پھر تو سب کا ناک مُنہ چڑھے گا پھر آخر یہ شخص کہاں تک ان امور کا تحمل کرے گا کہہ دینا تو سہل ہے کہ کے دکھایئے بس تخالف نہ ہونے کی صورت ایک یہی ہو سکتی ہے کہ دونوں عورتیں سلیم الطبع ہوں اور خود ہی باہم تخالف نہ کریں جیسا کہ بعض جگہ موجود ہے۔ فقط

ادب الاسلام

لقب ذم شبیہ اہل الاصنام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

این	متٰی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	تعداد سامعین	متفرقات
شاہپور ضلع گورکھپور جامع مسجد [?]	۲۶ صفر ۱۳۳۵ھ روز جمعہ	ایک گھنٹہ ۱۲ منٹ	بیٹھ کر [?]	عباداتِ اسلامی کی تحریف اور تشبیہ بالکفار کی تردید	احقر محمد مصطفےٰ مقیم میرٹھ محلہ کرم علی	۱۰۰ سو آدمی	سفر گورکھپور میں ہوا۔

تمہید

حضرت والا نے بغرض تبدیل آب و ہوا و استراحت گورکھپور کی طرف ماہ صفر ۱۳۳۵ھ میں سفر کیا اور اپنے بھائی منشی اکبر علی صاحب منیجر ریاست مجھولی ضلع گورکھپور کے پاس دورہ میں تشریف لے گئے دو تین دن مختلف مقامات پر قیام رہا کیونکہ منشی صاحب دورہ میں تھے۔ اسی دورہ میں منشی صاحب نے قصبہ شاہپور ضلع گورکھپور کا کوچ کیا حضرت والا بھی اسی مقام پر پہنچے اتفاقاً جمعہ کا دن اسی مقام پر آگیا قیام حضرت والا کا قصبہ سے قریب ایک میل کے فاصلہ پر تھا جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے قصبہ میں تشریف لے چلے۔ جب بنگلہ سے جمعہ کی نماز کو چلے تھے تو راستہ

میں منشی اکبر علی صاحب نے احقر سے پوچھا کہ آج بعد نماز جمعہ وعظ ہوگا یا نہیں میں نے عرض کیا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں حضرت کی رائے پر ہے ہاں اتنا مجھے معلوم ہے کہ اب تک کہیں وعظ نہیں فرمایا ہے۔ گورکھپور میں بھی درخواست کی گئی تھی تو یہی جواب دیا تھا کہ میں نے یہ سفر استراحت کے لئے کیا ہے۔ طبیعت ضعیف ہے وعظ کے تعب کی متحمل نہیں بیان کرنے سے سفر کی غایت ہی فوت ہو جاوے گی۔ یہ سن کر منشی اکبر علی صاحب خاموش ہو گئے۔ بعد نماز جمعہ قاضی صاحب امام جامع مسجد کھڑے ہوئے اور پکار کر کہا کہ آپ لوگوں کو اگر شوق وعظ کا ہو تو مولانا صاحب سے عرض کیا جاوے اس پر چند آدمیوں نے یکے بعد دیگرے شوق ظاہر کیا اور رفتہ رفتہ سب نمازیوں نے اتفاق کیا کہ ہاں وعظ ضرور ہونا چاہئے قاضی صاحب نے کہا حضرت کچھ بیان فرما دیجئے۔ فرمایا میں اس سے معذور ہوں کیونکہ تھوڑے بیان سے لوگوں کی سیری نہ ہوگی اور زیادہ بیان کا میں متحمل نہیں ہوں قاضی صاحب نے کہا ہم یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ تھوڑے سے تھوڑا بیان بھی ہماری تسلی کے لئے کافی ہے۔ دیکھئے قرآن شریف میں بڑی سورتیں بھی ہیں اور قل ھو اللہ بھی ہے۔ فرمایا بس قل ھو اللہ پڑھ دوں تو آپ کافی سمجھیں گے۔ کہا ہاں چاہے آپ صرف قل ہو اللہ ہی پڑھ دیں اور اس کا ترجمہ بھی نہ کریں اور یہ بات ہم صاف اور سچے دل سے کہتے ہیں۔ اس پر حضرت والا بیان پر آمادہ ہو گئے اور بیان سے پہلے فرمایا کہ میرا ارادہ اس سفر میں بیان کا بالکل نہ تھا مگر اس وقت ایسے پیرایہ سے فرمائش کی گئی ہے جس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا ایسا کہ اصرار کرنے سے ہرگز نہ ہوتا وہ یہ کہ وعظ کی مقدار کو میری رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے یہ ترک اصرار میرے اوپر اصرار سے زیادہ موثر ہوا۔ لہذا بیان کرتا ہوں۔ احقر اس سے تعجب کر رہا تھا کہ قاضی صاحب نے درخواست کی اور اول دو چار آدمیوں نے اس سے اتفاق کیا پھر تمام مجمع نے اس ترتیب سے مترشح ہوتا تھا کہ باہمی متفق تجویز سے ایسا ہوا ہے۔ چنانچہ بعد میں معلوم ہوا کہ جناب منشی اکبر علی صاحب کی سکھائی ہوئی یہ تدبیر تھی کہ اس طرح

درخواست اور تائید کرنا اور کوئی اسرار نہ کرنا نہ مطلق وعظ پر نہ وعظ کی مقدار پر سو یہ تدبیر کارگر ہو گئی اور وعظ ہوا۔

خطبہ ماثورہ: امابعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o اقیموا الصلوٰۃ ولاتکونوا من المشرکین o یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس میں اللہ جل شانہ وعم نوالہ نے ایک بات کا حکم کیا ہے اور ایک بات سے منع کیا ہے میں یہ بیان کرتا ہوں کہ کس بات سے منع کیا ہے اور کس بات کا حکم کیا ہے اور دونوں باتوں میں تعلق کیا ہے اس سے ایک بڑی بات نکلے گی کہ وہ ایک دستور العمل ہوگا اور تمام اعمال میں اس کا خیال نہایت نافع ہوگا۔ یہ حاصل ہے میرے اس وقت کے تمام بیان کا۔ ترجمہ نماز کو قائم کرو اور مشرکین میں سے مت ہو۔ قائم کرنے کے معنے ہیں درست کرنا اور سیدھے سیدھے پڑھنا اور پابندی کے ساتھ پڑھنا اس کے لئے دوسرا لفظ یہ ہے کہ نماز کے حقوق پورے پورے ادا کرو اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کی درستی اسی وقت ہوتی ہے جبکہ اس کے تمام اجزاء ٹھیک ہوں اور جو نسبت باہم ان اجزاء میں ہو وہ بھی قائم رہے اور اگر ایسا نہ کیا جاوے تو اس کو درست کرنا نہیں کہتے مثلاً کوئی کھانا پکائے تو کھانا اچھا جب ہی کہا جائے گا کہ جب سارے اجزاء اس کے ڈالے گئے ہوں اور ان اجزاء کی باہمی نسبت بھی ٹھیک ہو حتیٰ کہ اگر نمک بھی زیادہ کر دیا گیا تو یہ نہیں کہا جاوے گا کہ کھانا ٹھیک پکایا۔ اسی طرح اس حکم کی تعمیل کہ نماز کو درست کرو۔ جب ہی ہو گی جبکہ اس کے پورے حقوق ادا کئے جائیں اس وقت کہا جائے گا کہ نماز کو درست کیا۔ درست کرنے کا ترجمہ عربی میں اقامت ہے اور اگر ایسا نہ کیا اس کے اجزاء پورے ادا نہ کئے یا ان اجزاء کے تناسب کو قائم نہ رکھا تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز کو درست کیا بلکہ یہ کہیں گے کہ نماز کو بگاڑا اور خراب کیا تو اقیموا الصلوٰۃ کے یہ معنے ہوئے کہ نماز پڑھو اور اس طرح پڑھو کہ پورے حقوق ادا ہوں نہ کہ

ایسی نماز کہ فقط نام نماز کا لگ جاوے اس کو نماز ہی نہ کہا جائے گا دیکھو
موٹی سی بات ہے کہ ایک حاکم یا آپ کا ایک دوست کہے کہ ایک نوکر ہم کو لادو
اور آپ اس کے اس حکم کی تعمیل یہ کریں کہ چار پائی پر ڈال کر ایک آدمی لنجا اپاہج
بیمار جو کسی کام کا نہ ہو فقط جان اس میں ہو لیجا کر پیش کریں اور وہ پوچھے کہ یہ
کیا ہے آپ جواب دیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے آدمی لایا ہوں تو اس
پر وہ حاکم کیا برتاؤ کرے گا یا وہ دوست آپ کا اس فرمائش کی تعمیل سے
خوش ہوگا اور کیا جب وہ کہے کہ یہ کیسا آدمی لائے ہو تو یہ جواب معقول
ہوگا کہ آپ نے آدمی مانگا تھا۔ آدمی آدم کی اولاد کو کہتے ہیں یہ اولاد آدم ہے
اور جاندار ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آدمی نہیں ہے آپ کے حکم کی تعمیل پوری
کردی گئی وہ اس کے جواب میں کہے کہ تم اس کو آدمی کہہ لو ہم نے نام کا آدمی
نہیں مانگا تھا کام کا آدمی مانگا تھا ہم کو تو اس سے خدمت لینی تھی اور یہ
الٹا خود خدمت کا محتاج ہے۔ صاحبو یہ بات اس کی ٹھیک ہے یا وہ ضابطہ
کا جواب کہ آپ نے آدمی مانگا تھا آدمی لا دیا بالکل ظاہر ہے کہ ٹھیک بات
اسی کی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جس چیز کی فرمائش ہو اس میں ایک نام کا درجہ
ہوتا ہے اور ایک کام کا نام کا درجہ کوئی منظور نہیں کرتا۔ ہر شخص کی غرض
یہی ہوتی ہے کہ کام کی چیز ملے دیکھئے پنساری سے آپ بادام مانگیں اور
وہ نام کے بادام دیدے یعنی ایسے بادام دے جن کے اندر مغز نہ ہو تو آپ
واپس کریں گے یا نہیں اگر وہ آپ کو کہے کہ بادام مانگے تھے میں نے بادام
دیدیئے تو آپ یہی کہیں گے کہ اصلی مقصود تو کام ہے اور وہ مغز سے نکلتا
ہے نام کے بادام کس کام آدیں گے اے صاحبو ذرا ہم کو شرم کرنی چاہئیے
کہ اپنے معاملات میں تو درجہ کام کا چاہتے ہیں اور خدا کے معاملات میں نام
کے درجہ کو کافی سمجھتے ہیں اور اس پر اطمینان کر لیتے ہیں کہ ہم نے خدا تعالیٰ کے
حکم کی تعمیل کردی اور اس پر ثواب اور جزا کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ نماز

ایسی پڑھتے ہیں کہ نہ طہارت کی خبر نہ کپڑے کی خبر بعض لوگ ایسا چھوٹا کپڑا باندھتے ہیں کہ رکوع اور سجدہ میں ستر کھل جاتا ہے۔ اگر چوتھائی گھٹنا بھی کھل گیا[1] تو نماز نہیں ہوئی مگر اس کی کچھ پرواہ نہیں نہ سجدہ ٹھیک نہ رکوع نہ دو سجدوں میں فصل بعض لوگ سجدہ میں سے اتنا سر نہیں اٹھاتے جو فاصل بین السجدتین ہوجائے کتابوں میں لکھا ہے ایسے دونوں سجدے ایک ہی سجدہ کے حکم میں ہیں تو اس صورت میں ایک سجدہ ہوا جب دوسرا سجدہ ہی نہیں ہوا تو نماز کیسی ایک سجدہ کر لینے کے بعد چاہیئے کہ سیدھا بیٹھ جائے اور سب اعضاء ٹھہر جائیں تب دوسرا سجدہ کرے اگر اتنا وقفہ بھی نہ ہو تو اتنا تو فرض ہے کہ اتنا سر اٹھایا جائے کہ اقرب الی القعود ہو جائے گو ایسی نماز مکروہ ہوگی اور ایک اور نئی ایجاد ہوئی ہے نماز میں کہ بہت لوگوں نے عادت کر لی ہے کہ قومہ بالکل ہی ندارد کر دیتے ہیں۔ قومہ کہتے ہیں رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہونے کو یہ نماز میں واجب ہے بلا اس کے نماز نہیں ہوتی اور یہ مسئلہ سب نماز پڑھنے والوں کو معلوم ہے۔ گو بعض کو اس کا وجوب نہ معلوم ہو تب بھی یہ تو ضرور معلوم ہے کہ رکوع کے بعد سمع اللہ لمن حمدہ یا ربنا لک الحمد کہا جاتا ہے معلوم نہیں جن لوگوں نے قومہ اڑا دیا ہے یہ دونوں لفظ وہ کس وقت کہتے ہوں گے شاید رکوع میں کہتے ہوں مگر رکوع بھی ان کا لمبا نہیں دیکھا جاتا بس سوائے اس کے کیا کہا جاوے کہ نماز کا ایک جز واڑا ہی دیا یہ تو خدا کی بتلائی ہوئی نماز میں ترمیم ہے جب نماز پڑھتے ہی ہو تو اس سے کیا فائدہ کہ پڑھی پڑھائی کو غارت کر دو اگر اعلیٰ درجہ کی نہیں ہو سکتی تو ادنےٰ درجہ کی تو ہو جائے اس کے اجزاء ضروریہ تو ادا ہو جائیں جس سے کسی درجہ میں تو کہا جا سکے کہ نماز ہے نماز کی صورت تو درست ہو جائے حقیقت نہ سہی مگر ہم نے تو صورت کی بھی

[1] بعض کے نزدیک گھٹنا مستقل عضو ہے اور بعض کے نزدیک ران کے تابع ہے چوتھائی گھٹنا کھلنے سے نماز کا فاسد ہونا پہلے قول پر ہے حضرت مولانا نے احتیاطاً اسی کو اختیار کیا ہے ۱۲ ناظر

یہ گت بنائی ہے روح تو الگ رہی ہماری اس نماز کی مثال تو وہ بھی صحیح نہیں رہی جو ابھی میں نے بیان کی تھی کہ پنساری کے یہاں جاویں اور بادام مانگیں اور وہ نرے چھلکے مغز سے خالی دیدے یا کوئی آدمی منگائے اور ایک اپاہج بیمار کو اس کے سامنے پیش کردیں۔ اب یہ مثالیں بھی ہماری نماز کی نہ رہیں بلکہ ہماری اس نماز کی مثال اب تو یہ ہوگئی کہ کسی سے بادام مانگیں اور وہ بادام کے کوئلے ہاتھ میں رکھدے یا آدمی مانگا جائے اور وہ مرگھٹ میں سے ایک مردہ لاکر پیش کردے صاحبو یہ کیا بیہودگی ہے کیا ایسی نماز سے ہمارا پیچھا چھوٹ سکتا ہے ذرا تو ہم کو خیال چاہیئے یہ کیا غضب ہے کہ اپنی فرمائش پر تو نام کی چیز ملنے سے بھی ناراض اور خدا تعالیٰ کی فرمائش پر نام کی چیز بھی نہیں مہیا کی جاتی حالانکہ حق تو یہ تھا کہ حق تعالیٰ کی فرمائش پر وہ چیز پیش کی جاتی جو کام کی بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ ہوتی اگر یہ بھی نہ ہو تو علیٰ سبیل التنزل کہا جاتا ہے کہ ایسی چیز تو ہوتی جو اپنی فرمائش پر پیش کی جاسکے کام کی چیز تو وہ ہوتی ہے جس میں روح ہو نماز کی روح کیا چیز ہے اس کا بیان آیت میں اس طرح ہے اقم الصلوٰۃ لذکری یعنی نماز کو درست کرو میری یاد کے واسطے خدا تعالیٰ کا تصور قلب میں اور اس کو یاد رکھنا نماز کی روح ہے اس سے تو ہم کوسوں دور ہیں کام کی نماز تو یہی ہے جس میں حق تعالیٰ ہی کی طرف دھیان ہوتا یہ اگر میسر نہیں تو کاش نام ہی کی نماز ہوتی کہ رحمت خدا کیا عجب ہے اسی وقت قبول کرلیتی مگر جبکہ اس کے اجزاء ضروریہ ہی ندارد ہیں تو اس پر تو نماز کا نام بھی نہیں لگ سکتا صاحبو عمل کی صورت تو درست کرلو بڑوں کے یہاں کبھی محض صورت بھی قبول ہوجاتی ہے بلکہ بعض اوقات حقیقت سے زیادہ صورت کی قدر کی جاتی ہے۔ جیسے مٹی کے خربوزے ککڑی بناکر رئیسوں کے یہاں لیجاتے ہیں تو اس پر انعام ملتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نقل تو ہو انعام اسی بات کا ملتا ہے کہ اس نے ہوبہو نقل اتار دی۔ یہاں تو نقل بھی نہیں نماز کی صرف شکل بھی

اگر بنائی جائے تو امید ہے کہ اس زمانہ میں قبول ہو جائے اس کا ثبوت حدیث میں ہے کہ فرمایا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے کہ تمہارا وہ زمانہ ہے کہ اگر کوئی دسواں حصہ مامور بہ میں کمی کرے تو ہلاک ہو جاوے قبول نہیں اور ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اگر کوئی دسواں حصہ عمل کا بھی کر لے گا یعنی کیفاً تو نجات پا جاوےگا تو ہم لوگوں کے واسطے تو بہت ہی آسان ہے مگر شاباش ہماری غفلت کو کہ ہم سے آسان کام بھی نہیں ہو سکتا ہم کو تو اس انعام کی بہت قدر کرنی چاہیے اس حدیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ زمانہ وہ ہوگا کہ اس میں اعمال کے حقوق کی رعایت میں کمی ہو جائے گی اور یہی راز ہے معمولی عمل کے کافی ہو جانیکا کیونکہ جب کسی شے کی کمی ہو جاتی ہے تو تھوڑی چیز بھی غنیمت سمجھی جاتی ہے ہم لوگ تو اس قدر آسانی میں ہیں کہ ذراسی توجہ سے اور ہاتھ پیر ہلانے سے بڑے بڑوں کی برابر حصہ پا سکتے ہیں ہمارے واسطے مشقت تو رہی ہی نہیں صحابہ نے ایسی مشقتیں اٹھائی ہیں کہ ہمارا کیا حوصلہ ہے مگر اللہ اکبر اُن کا استقلال کہ جب جس نے بھی عمل کیا تو عزیمت کے اوپر کیا رخصت پر بھی عمل نہ کیا بدون کسی عذر یا مصلحت کے۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ ایک صحابی ہیں انھوں نے اسلام کا چرچا سنا تو اپنے گاؤں سے اپنے بھائی کو مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تفتیش کریں تاکہ حق کی تحقیق ہو جائے۔ انھوں نے واپس جا کر کچھ حالات بیان کئے مگر ان سے ان کی تسلی نہ ہوئی بآخر خود مکہ مکرمہ آئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل نہ سکے کیونکہ اس وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنا بہت مشکل تھا بچہ بچہ اسلام کا اور مسلمانوں کا دشمن تھا یہ پردیسی آدمی کوئی ان کا ٹھکانا بھی مکہ مکرمہ میں نہ تھا جہاں ٹھہرتے اور کھانے پینے کا آرام ہوتا مگر زمزم شریف عجیب دولت ہے انھوں نے ایک مہینے تک اسی پر گذر کی جب بھوک لگتی تو اسی کو پی لیتے جب پیاس لگتی تو اسی کو پی لیتے ایک روایت میں ہے کہ ابو ذرؓ ایسے موٹے ہو گئے کہ پیٹ میں بٹ پڑ گئے۔

مدت کے بعد حضرت علیؓ نے ان سے پوچھا تم یہاں کیسے ٹھیرے ہوا نھوں نے اپنا سارا قصہ ان سے کہدیا حضرت علیؓ نے کہا کہ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک تمھیں میں پہنچا دوں مگر زمانہ خوف کا ہے اس طرح چلو کہ کوئی یہ نہ پہچانے کہ تم میرے ساتھ چل رہے ہو، میں آگے آگے تھوڑے فاصلے پر چلوں گا اور تم میرے پیچھے آنا اور اس پر بھی اگر کوئی شخص مل گیا تو میں پیشاب کرنے کے بہانے سے راستہ کے کنارے بیٹھ جاؤں گا تم گذرتے چلے جانا کسی طرح یہ ثابت نہ ہو کہ تم میرے ساتھ ہو ورنہ تمھارے واسطے بھی برا ہوگا اور میرے واسطے بھی یہ وہ وقت تھا کہ مسلمان کے ساتھ ہونا بھی جرم تھا دیکھئے کس قدر خطرناک وقت تھا کہ مسلمان کے ساتھ ہونا بھی جرم تھا مگر دل کی لگی اس کو کہتے ہیں کہ اسی ترکیب سے سیدھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور اول ہی جلسہ میں مسلمان ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تم اپنے گاؤں کو چلے جاؤ، ہمیں امید ہے کہ ہجرت کی اجازت ہو جاوے گی تب وہاں آجانا اور اپنے اسلام کو یہاں ظاہر نہ کرنا ابوذرؓ نے عرض کیا کہ حضرت کفر کو تو ہمیشہ ظاہر کیا اسلام کو کیا چھپاؤں گا۔ یہاں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ مخالفت امر نہیں ہے کیونکہ اظہار سے نہی شفقۃً تھی اس خیال سے کہ مبادا کوئی مخالف ایذا پہنچاوے اس صورت میں تعمیل امر نہ کرنا مخالفت نہیں ہے بلکہ عمل علی العزیمت ہے (اور اسی لئے یہ قصہ بیان کیا گیا ہے) غرض انھوں نے گوارا نہ کیا کہ اخفاء اسلام کریں اور اظہار کے لئے بھی یہ غضب کیا کہ وہ صورت اختیار کی جس میں جان کا خطرہ تھا مسجد حرام میں پہنچے وہیں کفار کی بیٹھک تھی جس کا نام دارالندوہ تھا جو اب حرم شریف کا جزو ہے وہاں سب کفار جمع تھے آپ نے کیا کیا کہ اپنے ایمان کی اذان دیدی اذان بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بمعنی اعلان ایمان کے ہے یعنی سب کے سامنے کھڑے ہو کر علی الاعلان کلمۂ شہادت پڑھا پھر کیا تھا کفار تو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے سب لپٹ پڑے اور بہت مارا۔ شعر

بجرم عشق توام میکشند وغوغا نیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ئیست

اور اس سے کچھ تعجب نہ کیجئے کہ ایک شخص دین کے واسطے اتنی ہمت کرے کیونکہ ایک مخلوق کی محبت میں دیکھا ہوگا کہ کیا کیا ہو جاتا ہے۔ ایک بازاری عورت کے پیچھے لوگوں کی بعض دفعہ کیا کیا گتیں بنتی ہیں اس مار کی قدر وہی شخص جان سکتا ہے جس کو عشق کا مزہ آچکا ہو۔ حضرت ابوذرؓ نے نہ غل مچایا نہ کچھ ان کی خوشامد درآمد کی بلکہ چپ چاپ کھڑے پٹتے رہے، عجب نہ تھا کہ کفار مارہی ڈالتے مگر قدرت خدا کہ حضرت عباسؓ آگئے یہ بڑے رحمدل تھے اور بڑے قوی تھے ان کی آواز بارہ میل جاتی تھی اور کیوں نہ ہو ہاشمی تھے خاندان بنی ہاشم تھا ہی بہت قوی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس آدمیوں کی قوت تھی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پہلوان کو پچھاڑا تھا ان کا نام رکانہ تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے اور کہا تھا کہ اگر آپ مجھے پچھاڑ دیں تو میں مسلمان ہو جاؤں آپ نے انکو پچھاڑ دیا انھوں نے کہا کہ یہ اتفاقی بات تھی کہ ہیں پچھڑ لیا۔ اب کے پچھاڑتے تو جانوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اُن کو اٹھا کر پھینک دیا یہ صاف ثبوت ہے اس بات کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں قوت بدنی بھی بہت تھی۔ غرض یہ بات ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس آدمیوں کی قوت تھی۔ یہاں سے ملحدوں کے تعداد ازواج پر اعتراض کا جواب بھی نکلتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس آدمیوں کی برابر قوت تھی اور ایک آدمی کو ایک بیوی رکھنے کی اجازت تمام دنیا دیتی ہے تو اس حساب سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تیس بیویاں رکھنے کی گنجائش تھی تیس کی جگہ اگر نو ہی رکھی تو اس تعداد ازواج پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کمی کی حساب سے ایک تہائی سے بھی کم پر بس کیا، ذرا انصاف سے کام لینا چاہیئے اور یوں کوئی بک بک کرتا پھرے تو اس کا کیا علاج اور یہ تعداد ازواج بھی بطور نفس پروری نہ تھا کیونکہ اس کے

خلاف پر بہت سے قرائن ہیں۔ دیکھئے سوائے حضرت عائشہ کے سب بیواؤں سے عقد کیا اور سب سے اول جو شادی کی اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس برس کی تھی یہ وقت عین شباب کا تھا اس وقت میں تو کنواری سے کرنا تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے کیا ان کی عمر اس وقت چالیس برس کی تھی اور بیوہ تھیں دیکھئے یہ نفس پروری ہے یا نفس کشی اور جب تک وہ زندہ رہیں ان کے سامنے اور کوئی نکاح نہیں کیا۔ یہاں سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بیوہ عورتوں سے اس واسطے عقد کئے کہ کنواری ملتی کہاں آپ کوئی گھر کے امیر نہ تھے اور شبہ اس طرح رفع ہوا کہ حضرت خدیجہؓ ملکۃ العرب کہلاتی تھیں انہوں نے خود اپنی خواہش سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کیا تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وقعت لوگوں کے دلوں میں یہ تھی کہ ملکۃ العرب نے خود خواہش کی تو غریب غربا کنواریوں کا ملنا کیا مشکل تھا۔ نیز دوسری دلیل اس بیہودہ بکواس کی تردید کی کہ کنواری لڑکیاں مل کہاں سکتی تھیں سورۂ حٰم سجدہ کے پڑھ کر سنانے کا واقعہ ہے وہ اس طرح ہے کہ کفار نے ایک دفعہ اکٹھا ہو کر مشورہ کیا ان میں ابوجہل بھی تھا کہ یہ شخص جو دعوے نبوت کرتے ہیں اس کے فرو کرنے کے واسطے بجائے مخالفت کے تدبیر سے کام لیا جائے تو بہتر ہے وہ یہ ہے کہ ان سے پوچھنا چاہیئے کہ یہ دعویٰ کس غرض سے کرتے ہیں۔ اگر وہ غرض بِلا اس دعوے کے پوری کر دی جاوے تو غالباً یہ دعوے آپ چھوڑ دیں گے اس طرح بہت سہولت کے ساتھ ہم کو کامیابی ہو جاتے گی۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص نے جو بہت فصیح اور بلیغ تھا اس کام کا بیڑا اٹھایا اور حضور میں حاضر ہوا اور کہا کہ آپ یہ بتلا دیجئے کہ آپ کو اس دعوے سے کیا مقصود ہے اگر حسین لڑکیوں کی خواہش ہے تو وہ جتنی آپ کہیں ہم بہنچا دی جا دیں اور اگر مال مقصود ہے تو جتنا آپ کہیں ہم مال جمع کر دیں اور اگر عمارت اور سرداری منظور ہے تو ہم سب آج سے آپ کو اپنا سردار مانے لیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی باتوں کو خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جواب

یں جلدی نہ کرتے تھے اوّل پوری بات سن لیتے تھے تب جواب دیتے تھے۔ جب
وہ جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہہ چکے اب جواب سنو
اور سورۂ حم سجدہ کے شروع کی آیتیں شروع کیں حم تنزیل من الرحمٰن الرحیم
آگے تک جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پر پہونچے فان اعرضوا فقل انذرتکم
صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و ثمود اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نہیں مانو گے تو
یں ڈراتا ہوں اس عذاب سے جو عاد اور ثمود پر آیا تھا۔ اس آیت کو سن کر وہ
کہتا ہے۔ خدا کے لئے بس کیجئے اور وہاں سے بھاگا اور نہایت بدحواسی کیساتھ
اسی مجمع میں پہنچا ابوجہل وہاں موجود تھا ہی اس نے دور سے اس کو دیکھ کر کہا کہ
یہ گیا تھا اور چہرہ لیکر اور آرہا ہے اور چہرہ لے کر، ابوجہل فراست اور دانائی
اور عقلمندی میں مشہور تھا وہ بشرہ سے یہ سمجھ گیا کہ اس پر بھی کچھ اثر ہوگیا
کیونکہ قرآن شریف کی دلربائی کفار بھی جانتے تھے حتیٰ کہ یہ تجویز ہوا کرتی تھی کہ
جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف پڑھا کریں اس وقت گڑبڑ کیا کرو
اور غل مچایا کرو تاکہ کوئی سننے نہ پاوے کیونکہ سننے کے بعد ممکن نہیں کہ قرآن کی طرف
کشش نہ ہو اس کا ذکر اس آیت میں ہے وقال الذین کفروا لاتسمعوا لھٰذا القرآن
والغوا فیہ لعلکم تغلبون اور یہاں سے خدا کی قدرت بھی نظر آتی ہے کہ عقلمندوں کو ایسے
گڑھوں میں گراتا ہے کہ قرآن کے اس قدر قائل اور فراست اور دانائی اور عقلمندی میں
مشہور مگر ایمان نہ لاتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ ہدایت بلا توفیق خداوندی کے نہیں ہو سکتی
دیکھئے عقلاء یورپ موجد ہیں ایسے صنائع کے جن کی ایجادوں سے حیرت ہوتی ہے
مگر ایسے صریح مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ نہایت درجہ قابل حیرت ہے جس قدر
عقلمندی میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں اسی قدر ان میں دہریت ہے اور خدا کے منکر
ہیں دنیا میں تو کوئی فعل بلا فاعل کے نہ ہو سکے اور اتنے بڑے عالم کے لئے
صانع کی ضرورت تسلیم نہیں کرتے یہ قدرت خدا کا نظارہ ہے۔ غرض ابوجہل نے
اُسے دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ یہ گیا تو تھا اور چہرہ لے کر اور آیا اور چہرہ لے کر

جب وہ پہونچا اس نے سارا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ جب انھوں نے یہ آیت پڑھی ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اب بجلی گرنے کو ہے میں اپنی جان بچا کر بھاگا۔ دیکھئے اس واقعہ سے ثابت ہے کہ عورتیں بھی آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو اس کہنے کی گنجائش نہیں رہی کہ بیوہ عورتیں اس واسطے کی تھیں کہ کنواری لڑکیاں مل نہ سکتی تھیں جبکہ آپ نے باوجود کنواریاں مل سکنے کے بیوہ عورتوں سے عقد کئے تو وہ شخص جس کو ذراسی بھی عقل ہے سمجھ سکتا ہے کہ کسی اور مصلحت پر اس کی بنا تھی ان مصلحتوں کا بیان کرنا یہاں مقصود نہیں بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ ایسے شخص کو شہوت پرست کہنا دین تو برباد کرنا ہے ہی عقل کے پیچھے بھی لٹھ لے کر پھرنا ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ہر طرح کی قوت تھی اور یہ آپ کا ذاتی کمال تو تھا ہی خاندان سے بھی میراث میں پایا تھا۔ بنی ہاشم سب قوی تھے۔ حضرت عباسؓ انھیں میں سے تھے۔ حضرت ابوذرؓ کے پٹنے کے وقت، وہ آگئے انھوں نے سب کو ہٹایا اس طرح کہ خود ان پر الٹے پڑ گئے ان میں اسلام سے پہلے بھی یہ رحم تھا یہ عالی خاندانی کی دلیل ہے۔ خاندانی اور غیر خاندانی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند تعالے نے ایسے خاندان میں پیدا کیا تاکہ کسی بڑے سے بڑے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار کرنے میں عار نہ ہو اسی واسطے حق تعالیٰ نے سب انبیاء کو خاندانی بنایا ہے۔ اگرچہ خدائے تعالے کے یہاں نسب کا چنداں اعتبار نہیں بلکہ کسب کا اعتبار ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم مگر لوگوں کے مذاق کا اعتبار کیا تاکہ کسی کو بھی اتباع سے عار نہ ہو غرض حضرت عباسؓ نے ان کو اپنی جان پر کھیل کر بچالیا یہ خون سے ایسے رنگین ہوگئے تھے جیسے بت قربانی کے خون سے رنگے جاتے تھے۔ اب یہاں کوئی سننے والا کہہ سکتا ہے کہ آج کی مار سے سب نشہ ان کا اتر گیا ہوگا۔ اور آئندہ ان کو ہمت نہ رہی ہوگی کہ کسی کے سامنے اظہار ایمان کریں مگر

شعر

نہ سازد عشق را کنج سلامت   خوشا رسوائیے کوئے ملامت

اگلے دن پھر اسی مجمع میں پہونچے اور پھر اسی اعلان کے ساتھ کہا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ، آج اس سے بھی زیادہ غیظ و غضب کے ساتھ کفار لپٹ پڑے اور اور بھی زیادہ مارا خدا کی قدرت کہ پھر حضرت عباسؓ آگئے۔ پھر انھوں نے اُسی طرح اُن کو بمشکل بچایا۔ اس کو کہتے ہیں محبت اور یہ ہے اسلام ہمارا کیا مُنہ ہے کہ ہم بھی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا نام لیں، پھر یہ اپنے گاؤں چلے گئے۔ یہاں کوئی یہ شبہ کر سکتا ہے کہ دین تو مشکل اس وقت تھا جیسا کہ ان شواہد سے معلوم ہوا پھر یہ بات کیسے صحیح ہوئی کہ آج کل دین کی گرانی ہے دین کی گرانی تو اس وقت تھی اس کے جواب کے لئے ذرا سی سائنس دانی کی ضرورت ہے وہ یہ کہ سائنس کا اصول ہے کہ جب کسی کا محبوب سامنے ہوتا ہے تو اس کو قوت رہتی ہے اور وہ اسی قوت کی وجہ سے بہت سے موانع کو دفع کر سکتا ہے۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں یہ بات موجود تھی یہ کتنی بڑی بات تھی کہ ہمارے سر پر ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اس قوت کی وجہ سے موانع کا اثر کم ہو سکتا تھا تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے قوت تھی اس وجہ سے موانع کا چنداں اثر نہ ہوتا تھا۔ دوسرے اس وقت صرف بیرونی موانع تھے اندرونی موانع نہ تھے اور اس وقت میں قسم قسم کے دواعی شر کے موجود ہیں۔ اغیار تو باعث شر کے ہوتے ہی ہیں اپنے بھی داعی شر ہیں بلکہ کفار سے آجکل صرف ضرر ظاہری ہے اور جو کفار مہذب ہیں اُن سے ضرر ظاہری بھی نہیں ہے وہ زبان سے بھی کہتے ہیں کہ مداخلت مذہبی نہ کریں گے اور نہ برتاؤ میں بھی اُن کے تہذیب ہے۔ دل آزاری بھی پسند نہیں کرتے وہ کسی طرح بھی مخل فی الدین نہیں ہیں۔ آجکل زیادہ مخل فی الدین وہ لوگ ہیں جو اغیار نہیں سمجھے جاتے۔ وہ اس قدر داعی الی الشر ہیں کہ خدا کی پناہ کسی کو کھلم کھلا شر کی طرف بلاتے نہیں پھرتے مگر کتابیں اس طرح کی تیار کر دی ہیں جو کھلم کھلا بلانے سے بہت زیادہ اثر رکھتی ہیں۔ بس وہ اپنا کام کر رہی ہیں اس اثر سے عوام کی آجکل وہ حالت ہے کہ صبح کو کچھ شام کو کچھ کسی کو اپنے ایمان پر بھروسہ نہیں رہا یصبح الرجل مؤمناء و یمسا کافرا اور سبب اس زہریلے اثر کا دین

کی ناواقفی ہے اور دین سے اس ناواقفی کے بہت سے اسباب موجود ہیں مثلاً یہ کہ مسلمان عام طور سے معاش کی تعلیم وغیرہ میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنی فرصت ہی نہیں کہ دین کی طرف توجہ کریں پھر مذہب کی کیا خبر ہو۔ اور اس میں بھی چنداں مضائقہ نہ ہوتا۔ اگر ذہن میں یہ بات رہتی کہ ہم دنیا دار ہیں مصیبت تو یہ ہے کہ باوجود دین سے مس نہ رہنے کے اپنے آپ کو دین دار سمجھتے ہیں بلکہ دوسروں کی رہبری کے لئے تیار ہیں اس وقت میں مسلمانوں کو مسلمانوں ہی سے زیادہ ضرر پہونچ رہا ہے۔ یہ لوگ اس قدر آزاد ہیں جن پر مسلمان ہونے کا اطلاق ہونا بھی مشکل ہے ہمارے نواح کے ایک قصبہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص ایک بار کہنے لگے کہ میں محمد صاحب کی بہت قدر کرتا ہوں آپ بڑے ریفارمر تھے اور بہت اصلاح قوم کی کی۔ رہی نبوت سووہ صرف ایک مذہبی خیال ہے۔ مسلمانوں نے خوش عقیدگی کی وجہ سے مان لیا ہے بتایئے ایسے شخص کے کفر میں کیا شبہ ہے یا اسلام ایسی چیز ہے کہ کسی طرح جا ہی نہیں سکتا کفر کے عقیدے دل میں رکھو اور کلمات کفر زبان سے بکو اور اسلام ہے کہ اس میں فرق ہی نہیں آتا حضرت اسلام خداوند تعالےٰ سے ایک خاص تعلق کا نام ہے اور خداوند تعالیٰ کی ذات سب سے زیادہ بے نیاز ہے اس کو زبردستی تعلق قائم رکھنے کی ضرورت نہیں دنیا دار جو ذرا سا بھی بڑا ہے وہ کسی کو مُنہ بھی نہیں لگاتا پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خداوند تعالےٰ سے کوئی تعلق قطع کرے اور خدا تعالےٰ اُس سے زبردستی جوڑتے پھریں۔ پھر اگر مرتے کھپتے پر بھی بندہ کے تعلق کو حق تعالےٰ منظور فرمالیں تو زہے قسمت اور زہے عنایت ہے سو ایسے کلمات بکنے سے یقیناً اسلام جاتا رہتا ہے اور غضب یہ ہے کہ اس شخص کے نکاح میں ایک مسلمان عورت ہے نکاح کسی طرح قائم نہیں اور جھڑا جھڑ بچے بے نکاح ہو رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہونے کا نام لگ جانے سے عوام الناس میں ایسے لوگوں کی عزت ہو جاتی ہے

اور اُن کا اثر پڑتا ہے۔ بتایئے کہ اتنا نقصان مسلمانوں کو غیر قوم سے پہونچ سکتا ہے ہرگز نہیں اب مولوی جو اس تعلیم سے منع کرتے ہیں تو لوگ تعجب سے پوچھتے ہیں کہ صاحب دنیاوی تعلیم میں کیا حرج ہے مگر جو نتائج ظہور میں آرہے ہیں ان کو دیکھئے۔

بریلی میں ایک لڑکا میرے سامنے لایا گیا کہ اس کو ذرا نصیحت کردیجئے یہ نماز نہیں پڑھتا میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی نماز کیوں نہیں پڑھتے اس نے کہا کہ سچ کہدوں میں تو خدا تعالےٰ کے وجود ہی کا قائل نہیں یہ کہا اور کہکر رد یا اور کہنے لگا کہ میرے ماں باپ سے مواخذہ ہوگا کہ مجھے علم دین نہیں پڑھایا اور نہ نیک صحبت کی طرف کبھی توجہ دلائی۔ یہ لڑکا ایک اسلامی کالج میں پڑھتا تھا۔ اب دیکھئے اس کی کیا حالت ہے میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اس کو اس کالج سے نکال کر گورنمنٹ کالج میں بھیجئے وہاں یہ اتنا خراب نہ ہوگا جتنا کہ یہاں ہوا گیا انتہا ہے کہ گورنمنٹ کالج کو ترجیح دینی پڑی اس کالج پر جو مسلمانوں کا کالج کہلاتا ہے اور جس پر لوگ ہم سے لڑتے مرتے ہیں کہ اس کالج کو علماء بُرا کہتے ہیں دیکھئے یہ اثر آپ کے نزدیک برا ہے یا نہیں۔ گورنمنٹ کالج میں یہ اثر نہیں ہوتا وجہ یہ کہ اس میں ہندو بھی ہوتے ہیں جب دو قوم اجنبی ایک جگہ رہتی ہیں تو دونوں میں مقابلہ رہتا ہے۔ اُس مقابلہ میں مذہبی پختگی بڑھ جاتی ہے اور وہاں ایک قوم ہے کوئی ایک دوسرے کا مقابل نہیں اس لئے خوب آزادی ہے اور مذہبی امور کی طرف کسی کو توجہ ہے نہیں حمیت پیدا نہیں ہوتی اور وہاں اس قدر خرافاتیں ہوتی ہیں کہ بات بات میں کفر کی نوبت آتی ہے۔

ایک دفعہ چند شریر لڑکے اکٹھے ہوئے ڈاڑھی منڈواتے تو سب ہی ہیں۔ مگر جہل کو مرکب بنایا اور معصیت کو کفر تک پہونچایا اس طرح کہ ایک لڑکا داڑھی نہیں منڈاتا تھا اس کو کہہ سُن کر داڑھی منڈانے پر راضی کیا اور ایک بکرا منگایا پھر لڑکوں میں اعلان کیا کہ آج فلاں کمرہ میں عقیقہ ہوگا۔ جب سب جمع ہوگئے تو ایک باپ بنا اور اس لڑکے کو بیٹا بنایا اور اس کو سب کے بیچ میں بٹھا کر ڈاڑھی منڈوائی

اور اس پر خوب قہقہے اڑے اور بکرا ذبح کر کے کھانا کھلایا گیا۔ یہ ایک بہت ہی ادنیٰ حرکت ہے مگر اس کی حقیقت یوں معلوم ہو سکتی ہے کہ گورنمنٹ کے کسی حکم کے ساتھ اس کا نصف معاملہ کر کے دیکھو بغاوت ہوتی ہے یا نہیں پھر حق تعالیٰ کے احکام کے ساتھ یہ بغاوت کیسے نہیں ہے اس بغاوت ہی کو شریعت کی اصطلاح میں کفر کہتے ہیں عدالت میں اگر کوئی حاکم حکم سنا دے اس پر ذرا ہنس دیجئے کوئی کلمہ بھی منہ سے نہ نکالئے مگر دیکھئے اسی وقت توہین میں چالان ہوتا ہے یا نہیں حضرات مسلمانوں کی یہ نوبت ہے یہ ہیں وہ مضرتیں جو قوم کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے پہونچ رہی ہیں اور غیر قوموں سے یہ نقصان نہیں پہونچتے غرض وہ لڑکا گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا۔ ایک سال کے بعد اس کی حالت یہ ہوئی کہ خدا کا بھی قائل تھا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی قائل تھا اور نماز کا بھی پابند تھا۔ بات یہ ہے کہ لوگ بچوں کو ابتدا سے فکر معاش میں اس طرح ڈالتے ہیں کہ بالکل اسی میں منہمک کر دیتے ہیں اگر کتابی تعلیم دین کی نہیں ہو سکتی تو زبانی تعلیم تو ممکن ہے مگر یہ بھی نہیں کرتے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچوں کو نماز سکھلائی جاوے۔ دین کے ارکان اُن ان کو سنائے جائیں اس میں تو ان کو کچھ محنت نہیں پڑے گی اور کچھ وقت بھی زیادہ خرچ نہ ہوگا۔ اگر بڑوں کو خیال ہو تو دین کے تمام ضروری اصول و فروع اُن کو سکھا سکتے ہیں مگر یہ سب کچھ جب ہی ہو جبکہ دین کی پرواہ ہو اصل یہ ہے کہ دین کی کسی کو پرواہ ہی نہیں چھوٹوں کو یہ عذر ہے کہ بڑوں نے ہم کو اس طرف نہ لگایا اور بڑوں نے یوں دل کو سمجھا لیا ہے کہ علم معاش سے فرصت نہیں ہے، کیوں صاحبو! قانون کی ضروری باتیں بچوں کے کان میں کیسے پڑ جاتی ہیں کسی بچے کو ہم نے یہ نہ دیکھا کہ علم معاش میں منہمک ہو کر اسے یہ معلوم نہ ہوا ہو کہ مارنا پیٹنا جرم ہے اور وہ سر بازار دنگا فساد کرتا پھرتا ہو اگر کسی بچے نے ایسا کیا ہوگا تو اس کے مربی نے فوراً ڈانٹا ہوگا کہ یہ طریقہ شرفا کا نہیں ہے اور قانوناً جرم بھی ہے اس سے جیل خانہ پہونچ جانے کا اندیشہ ہے میں انھیں مربی سے پوچھتا

ہوں کہ اسی بچہ نے جب نماز نہیں پڑھی تو کیوں نہیں ٹوکا کیا اس کا ان کے
پاس کوئی جواب ہے۔ بس اصل یہ ہے کہ دین کی پرواہ نہیں اس کا نتیجہ آنکھ مچنے پر
معلوم ہوگا۔ دین کو ایسا چھوڑا ہے کہ نام ہی آنا غضب ہے اس کا نام آیا اور سو
چیلے کھڑے ہوئے۔ تعلیم معاش پر ہماری اول تو یہی شکایت تھی کہ اس میں انہماک
افراط کے درجہ پر پہونچ گیا ہے جس سے دین سے بیخبر ہوگئی ہے اور دوسری شکایت
یہ ہے کہ وہ صرف دین سے غافل کرنے والا ہی نہیں بلکہ دین سے مخالف بنانے والا
بھی ہے غرض ہر چہار طرف سے دین سے غفلت ہے اور دین کو بگاڑنے کے سامان
جمع ہیں جب یہ حالت ہے کہ دین کے مد اسباب تو موجود نہیں اور دین کے مخالف
اسباب موجود ہیں تو یہ زمانہ دین کی گرانی کا زمانہ ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ گرانی کے
زمانہ میں تھوڑی چیز بھی بہت سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اس وقت دین کی قیمت خدائے
تعالےٰ کے یہاں بہت ہے۔ یہ مضمون اُس حدیث سے نکلتا ہے جس کو میں نے ابھی
بیان کیا تھا کہ فرمایا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ اب زمانہ وہ ہے کہ اگر کوئی ماموٗر
میں دسویں حصہ کی بھی کمی کرے تو ہلاک ہو جائے اور ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اگر
کوئی مامور بہ کا دسواں حصہ بھی بجا لا دے گا تو وہ نجات پا جاوے گا۔ اس حدیث
کا مضمون کافی طور سے بیان ہو چکا اور اس مضمون کی تائید ایک اور حدیث سے بھی
ہوتی ہے وہ یہ ہے یاتی زمانٌ القابض علی الدین کالقابض علی الجمر او کما قال
دیکھ لیجئے آجکل کوئی شریعت پر عمل چاہتا ہے تو ضرور رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں عقائد
سے تو کوئی ہٹا نہیں سکتا کیونکہ عقیدہ فعل قلب ہے۔ ہاں اعمال میں رکاوٹیں ہیں۔
خصوصًا معاملات میں کہ پچاس میں ایک بھی معاملات میں عامل بالدین نکلنا مشکل ہے
اور معاملات میں رکاوٹیں اعمال سے زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عمل پھر بھی شخص
واحد کا فعل ہے آدمی تنہا اپنے اختیار سے کر سکتا ہے اور معاملات وہ اعمال ہیں
کہ جن کا تعلق دوسرے سے ہوتا ہے جب تک کہ دونوں باہمت اور پکے نہ ہوں معاملہ
کی اصلاح کیسے ہو۔ مذاق عام طور سے بگڑے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص اصلاح معاملہ

کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا ایکا نہیں ہوتا اور آپڑوسن مجھ سی ہو اس کو بھی بگاڑ لیتا ہے بس اسی طرح سے ایک سے دوسرا دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر سب ایک بلائے عام میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ سب کے معاملات بگڑ گئے ہیں اور مسائل شرعیہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ بہت تنگ ہیں۔ حالانکہ تنگی خود کرلی ہے جب ایک بات کا رواج سب مل کر چھوڑ دیں تو اس کے کرنے میں تنگی ہو ہی جائے گی۔ مثلاً اب رواج پڑیہ کا ہوگیا اب لوگ پرانے زمانہ کو یاد کرکے کہتے ہیں کہ پہلے رنگ کی بہت تکلیف تھی کسم بھگویا جاتا تھا اور کئی کئی روز تک ٹپکایا جاتا تھا اور بڑے اہتمام کرنے پڑتے تھے جب کپڑے رنگے جاتے تھے اب اُن کو اُس طریقہ سے رنگنا دشوار نظر آتا ہے مگر اس کی وجہ یہ نہیں کہ واقعی دشوار ہے بلکہ رواج چھوٹ گیا ہے صرف اس وجہ سے دشوار معلوم ہوتا ہے ورنہ پہلے زمانہ میں رنگتے ہی تھے پہلے تو کچھ بھی دشواری نہ معلوم ہوتی تھی غرض جس ایک کام کو عام طور سے آدمی کرنے لگیں وہ کیسا ہی مشکل ہو آسان ہو جاتا ہے اور اگر آسان سے آسان کام کو بھی چھوڑ دیں تو مشکل ہو جاتا ہے اور جس کام کی عادت ڈال لیں خواہ وہ کیسا ہی بُرا ہو اس کی برائی نظر سے چھپ جاتی ہے۔ جیسا ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ وزیر نے پیشین گوئی کی کہ کل کو ایسی بارش ہوگی کہ جو شخص اس کا پانی پیوے گا وہ پاگل ہوجائے گا۔ بادشاہ نے برتنوں میں پانی بھروا کر رکھ لیا اگلے دن بارش ہوئی تمام لوگوں سے اس کا پانی پیا سب کے سب پاگل ہوگئے۔ بادشاہ اور وزیر نے جو پانی پہلے سے بھروا کر رکھ لیا تھا وہ پیا اس لئے وہ جنون سے محفوظ رہے اب لوگوں میں چلسے ہونے شروع ہوئے کہ بادشاہ اور وزیر پاگل ہوگئے ہیں ان کو معزول کر دینا چاہیئے۔ بادشاہ نے و سے کہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے وزیر نے کہا کہ تدبیر یہی ہے کہ ہم بھی بارش کا پانی پی لیں۔ غرض بادشاہ اور وزیر نے بھی وہ پانی پی لیا اور جیسے اور پاگل تھے ویسے ہی وہ بھی ہوگئے اب لوگوں میں یہ چلسے ہوئے کہ بادشاہ اور وزیر اچھے ہوگئے اب ان کو معزول کرنے کی ضرورت نہیں تو جیسے ان

پاگلوں نے بادشاہ اور وزیر کو اپنی طرف نہ ہونے کی وجہ سے پاگل سمجھا اسی طرح اب بددین لوگ دینداروں پر ہنستے ہیں کیونکہ بددینی کا مذاق غالب ہوگیا ہے اس کی برائی ذہن سے جاتی رہی ہے اور دینداری کم رہ گئی ہے اگر کسی میں وہ ہے بھی تو ایک نئی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ریل کے معاملات میں بعض دفعہ مشاہد ہوا کہ حقوق ادا کرنے والے پر لوگ ہنستے ہیں حالانکہ ادائے حقوق جملہ عقلاء کے نزدیک بھی اور شرعاً بھی مستحسن ہے اور اس کی ضد بالاتفاق قبیح ہے مگر طبائع میں خیانت اور حق تلفی کا مادہ غالب ہو رہا ہے اس واسطے ادائے حقوق پر بھی تعجب ہوتا ہے۔ ایک ڈپٹی صاحب ہیں جو بہت دیندار ہیں وہ اپنے ایک لڑکے کا ٹکٹ آدھا لیتے تھے۔ اور گھر والوں سے اس کی تحقیق کر رہے تھے کہ اس کی عمر کیا ہے۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کی اتنی عمر ہے جس پر ٹکٹ پورا لگنا چاہیے۔ آس پاس جو لوگ کھڑے تھے وہ سب ہنس رہے تھے کہ دیکھو اس بچے کے لئے آدھا ٹکٹ بھی کھپ سکتا تھا اگر آدھا ٹکٹ لیتے تب بھی کوئی نہ ٹوکتا یہ خود ہی اپنا پیسہ پھینکتے ہیں۔ ایک اور شخص بی اے ہیں وہ ریل میں سوار ہوئے وقت کم تھا اسباب تلوا نہ سکے جہاں اترے وہاں انھوں نے کہا اسباب تول لو بابو نے دیکھا اور کہا جاؤ لیجاؤ انھوں نے کہا نہیں اسباب زیادہ ہے (خدا تجھے نیکی دے وہ ایسے ہی ہوتے ہیں) ان کی وضع قطع سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ انگریزی جانتے ہیں اس لئے اسٹیشن ماسٹر اور وہ بابو انگریزی میں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شراب پی رکھی ہے اس کے نشہ میں ہے۔ انھوں نے کہا جناب میں شراب پیئے ہوئے نہیں ہوں میں مسلمان ہوں مذہب اسلام میں حق تلفی جائز نہیں محصول لے لیجئے۔ بابو نے کہا کہ جاؤ جی ہم کو فرصت نہیں (عجب بات ہے کہ چھپے ہوئے کو تو پکڑتے ہیں اس کے واسطے چلتی گاڑی میں بھی گشت کرتے ہیں اور یہ محصول دے رہے ہیں اور نہیں لیتے) اب انھیں فکر ہوئی کہ آخر میں کیا کروں میں محصول

دے رہا ہوں اور یہ لوگ نہیں لیتے مگر حق تعالےٰ کا ارشاد ہے ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجًا فوراً سمجھ میں آگیا بس حساب کیا کہ کتنا محصول واجب ہے اتنی رقم کا ایک ٹکٹ کسی اسٹیشن کا لے کر پھاڑ دیا اس طرح کرایہ ادا ہوگیا یہ خدا کا خوف تھا لیکن اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طبائع میں بالکل انقلاب ماہیت ہوگیا ہے اور یہ اگرچہ ہدایۃً بُرا ہے لیکن اس کے عام ہوجانے سے اس کی برائی نظروں سے اٹھ گئی ہے بلکہ بجائے برائی کے رواج عام ہوجانے سے اس کی بھلائی ذہنوں میں آگئی ہے پھر ایسے فعل پر عمل کیسے ہو جس کے مقابل کی بھلائی ذہنوں میں موجود ہے یہ دشواریاں ہیں جس کی وجہ سے دین پر قائم رہنے والے کو چنگاری کے ہاتھ میں لینے کے ساتھ حدیث میں تشبیہ دی گئی ہے۔ لیکن جس طرح عمل اس وقت میں دشوار ہے اسی طرح (میں بشارت سناتا ہوں آپ کو کہ) اس وقت عمل کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ ایسے وقت میں ایک عمل کرنے والے کو ثواب پچاس آدمیوں کا ملے گا صحابہؓ نے سوال کیا ان میں کے پچاس کا یا ہم میں کے پچاس کا (ان کے پچاس ہونگے تو سارے نکمے ہوں گے) جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم میں کے پچاس کا، دیکھئے کتنی بڑی بات ہے اس حدیث کے بموجب اس وقت ایک عمل کا ثواب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کے پچاس عمل کے برابر ملتا ہے کتنی بڑی فضیلت ہے یہ اور بات ہے کہ ان کا ایک ہی حصّہ ہمارے پچاس سے کیفاً بڑھا ہوا ہو۔ صحابہ کے اعمال ہم سے ضرور بڑھے ہوئے ہیں ان کا ایک اور ہمارے سو بھی برابر نہیں ہوسکتے حدیث میں موجود ہے لو انفقوا احدکم مثل الاحد ذھبا ما بلغ مد احدھم ولا نصیفہ اوکما قال یعنی اگر کوئی احد پہاڑ کی برابر بھی سونا خیرات کردے گا تو صحابی کے ایک مُدؔ یا اس کے نصف کے برابر بھی نہ ہوگا ہمارے اعمال کیسے بھی ہوں لیکن ان میں وہ چیز نہیں ہے جو صحابہؓ کے اعمال میں تھی اُن میں روح بھری ہوئی تھی اور ہمارے اعمال میں صرف صورت ہے اور کسی کے عمل میں روح ہو بھی تب بھی اُن کیسی روح نہیں ہے خیر پچاس تو ہیں گو وہ

ف؎ مد دہلی کی تول سے تقریباً ایک سیر کا ہوتا ہے ۱۲

پچاس ایک کے بھی برابر نہ ہوں ہم صحابہؓ سے تو بن نہیں سکتے تاہم ان کی نقل تو کر سکتے
ہیں۔ ہماری نماز نقل بھی ہوتی تو قدر سے دیکھی جاتی مگر کچھ بھی نہیں ہے، ہم لوگوں نے نماز
کو غارت ہی کر دیا ہے نہ اس میں روح ہے نہ صورت اگر پڑھتے ہیں تب بھی کسی کام کی
نہیں ہوتی چہ جائے کہ پڑھیں بھی نہیں۔ ان ہی حالات کی وجہ سے فرماتے ہیں اقیمو
الصلوٰۃ یعنی نماز کو درست کرو صرف پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا بلکہ درست کر کے ادا
کرنے کا حکم فرمایا درست کرنا کیا معنیٰ درست کرنا یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا کئے
جائیں سو ان حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس پر پابندی ہو میں نے اس واسطے
اس بیان کو چھیڑا کہ دیہات میں نماز کی پابندی نہیں ہے۔ اول تو پڑھتے ہی نہیں
اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو گنڈے دار اور اگر کوئی پابندی بھی ہے تو بہت سے
بہت یہ کہ وقت کے اندر ادا کر لیتے ہیں جماعت کی پابندی نہیں کرتے حالانکہ یہ
سب ضروری باتیں ہیں اور اگر کوئی اس کا بھی پابند ہے تو صرف اس کی ذات تک
وہ پابندی محدود ہے گھر میں دوسروں کو تاکید نہیں کرتے صاحبو! خود بھی پابندی کرو اور
عورتوں اور بچوں کو بھی پڑھواؤ۔ ان کا سوال بھی تم سے ہوگا۔ سب پابندی کے ساتھ
پڑھواؤ کسی کی نماز بھی گنڈے دار نہ ہو۔ ہمارے یہاں ایک مولانا شیخ محمد صاحب تھے ایک
دفعہ چاند ہوا گاؤں کے لوگ ان کے سامنے گواہی دینے کے لئے آئے انھوں نے ایک شخص سے
پوچھا کہ نماز بھی پڑھتے ہو کہا ایک دفعہ مولویوں نے بہت غل مچایا تھا اور سب لوگوں
نے ایکا کر لیا تھا کہ جو کوئی نماز نہ پڑھے گا اس کے جنازے کی نماز نہ پڑھی جائے گی جب
تو ہم نے نماز پڑھی تھی پھر تو ہاری توبہ ہے، دیہات میں یہی حالت ہے (توبہ توبہ) بعض
لوگ نماز کو منحوس سمجھتے ہیں خیر ایسوں نے تو اگر کسی کے دباؤ سے نماز پڑھ بھی لی تو
نمازیوں میں ان کا شمار نہیں کیونکہ دل میں نماز کے قائل تک نہیں میرا خطاب اس وقت
ان لوگوں سے ہے جو نماز کے قائل ہیں اور اس کو اچھا سمجھتے ہیں ان کو تو چاہیئے کہ نماز کو
نماز کی طرح پڑھیں یعنی ایک تو یہ کہ پابندی ہونی چاہیئے اور ایک یہ کہ وقت کا خیال
رہے بعض لوگ عصر کی نماز اس وقت پڑھتے ہیں کہ جب سب کاموں سے نمٹ جائیں

سورج ڈوب رہا ہے اور یہ نماز پڑھ رہے ہیں اور اس کی وجہ کچھ تو سستی اور لاپروائی ہے اور کچھ یہ ہے کہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ابھی پھر مغرب کی نماز پڑھنا ہے دو دو دفعہ کام کا حرج کون کرے ایک دفعہ ہی نمٹ کر دونوں کو پڑھ لیں گے صاحبو موٹی سی بات ہے کہ دونوں نمازوں میں جتنی دیر لگتی ہے دونوں کو جمع کر کے پڑھو تب اور دونوں کو علیحدہ پڑھو تب ہر حالت میں اتنی ہی دیر لگے گی مثلاً پانچ پانچ منٹ دونوں میں لگتے ہیں تو اگر دونوں کو جمع کر کے پڑھو گے تو بھی دس ہی منٹ کا حرج ہوگا اور اگر دونوں کو الگ الگ اپنے اپنے وقت پر پڑھو تو گو پانچ پانچ منٹ کر کے دو دفعہ حرج ہوگا مگر ہوگا تو وہی دس منٹ کا تو اگر کام کو چھوڑ کر وقت پر نماز پڑھ لو گے تو نماز بھی ٹھیک ہو جاتے گی اور حرج بھی اتنا ہی ہوگا پھر یہ خیال کیسے ٹھیک ہے کہ دو دو دفعہ حرج کون کرے دو دفعہ کرنے میں حرج بھی تو آدھا آدھا ہوتا ہے اسی طرح ایک حق یہ ہے کہ رکوع سجدہ ٹھیک کرو نیز جو تسبیح و اذکار نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ سب کسی کو سنالو نیز قرآن شریف بھی صحیح کرو اگر شین قاف نہ نکلے تو زیر زبر کی تو غلطی نکال لو نیز خود بھی پڑھو جورو بچوں کو بھی پڑھاؤ ان کے اوپر حق تعالیٰ نے تم کو حاکم کیا ہے جیسے دنیا کے کام ان کو سکھلاتے ہو دین کے بھی سکھلاؤ ورنہ تم سے باز پرس ہوگی۔ پھر جن پر قدرت ہے ان میں سے جو کوئی نماز نہ پڑھے اس پر سختی کرو کوئی سزا مقرر کرو جرمانہ تو حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں اور طرح سے اس کے ساتھ سختی کرو مثلاً یہ کہ اس کو اپنے ساتھ کھانا نہ کھلاؤ ایک ہی دفعہ میں عقل سیدھی ہو جائیگی اور میں خود اس شخص سے کہتا ہوں کہ نماز برادری والوں کا یا محلہ والوں کا تو کام نہیں خدا تعالیٰ کا کام ہے اس کا ادا کرنا ضروری ہے جس شخص کی نماز فوت ہوتی ہو اس کو چاہیئے کہ خود اپنے اوپر یہ سزا مقرر کر لے کہ جس دن نماز قضا ہو جاوے کھانا نہ کھاوے۔ ایک وقت یا چند وقت ایسا کرے آپ ہوش درست ہو جاتے گا اور نفس قابو میں آجاوے گا اور یہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک وقت نہ

کھانے سے یا چند وقت نہ کھانے سے مرے گا نہیں۔ یہ بات طبّاً ثابت ہے
کہ آدمی کئی کئی دن تک فاقہ کرنے سے مر نہیں سکتا۔ غرض ہمت کر کے
کام کرو اور بے ہمت تو لقمہ بھی منہ میں نہیں جاتا یہ تو بیان ہوا اقیموا الصلوٰۃ
کا اور اس میں خلاف ارادہ طول ہو گیا خیر اس سے بھی کچھ نفع ہی ہو گا۔
ان شاءاللہ۔ آگے فرماتے ہیں ولاتکونوا من المشرکین۔ جس کا ترجمہ
یہ ہے کہ مشرکین میں سے مت ہو اس میں غور کرنے کی یہ بات ہے کہ نماز
کے حکم میں اور اسی نہی میں جوڑ کیا ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ
مشرکین عرب حج کرتے تھے مگر نماز نہ پڑھتے تھے چنانچہ حج کرنے والوں کو
نہ روکتے تھے اور نماز پڑھنے والوں کو سخت تکلیفیں پہونچاتے تھے۔ سو
وہ حج کے تو خلاف نہ تھے لیکن نماز کے بالکل خلاف تھے اور یہود و نصاریٰ
نماز پڑھتے تھے حج نہ کرتے تھے اس لئے حج نہ کرنے پر حدیث میں یہودی یا نصرانی
ہو کر مرنے کی وعید کی گئی ہے اور یہاں آیت میں بے نمازی کو مشرک سے تشبیہ
دی گئی اور گو یہ دونوں فرقے ہیں کافر لیکن یہود و نصاریٰ سے مشرک اور
زیادہ برے ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ موحد تو ہیں گو ان کی توحید کارآمد اور
کافی نہیں اور عدم مغفرت میں دونوں برابر ہیں تو نماز کا ترک کرنا دوسرے
عبادات کے ترک سے زیادہ برا ہوا پس مطلب یہ ہوا کہ نماز چھوڑ کر مشرکوں
کے مشابہ نہ بنو اور اس عنوان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا کوئی کام نہ کرنا
چاہیئے جس میں کفار کے ساتھ مشابہت ہو۔ اب رہا یہ کہ آیت میں اقیموا الصلوٰۃ
پر کیوں نہیں اکتفا کیا تو اس میں نکتہ یہ ہے کہ مسلمان بے نمازی سے نفرت
پیدا ہو کیونکہ کوئی ایسا نہیں جس کو شرک سے نفرت نہ ہو کیونکہ توحید
ہر شخص کو محبوب ہے اور توحید کی ضد مبغوض ہے۔ جب فرمایا کہ نماز پڑھو
اور مشرک نہ بنو تو اس لفظ سے وحشت ہو گی یہ ایسا ہے جیسے کہا جائے
کہ اطاعت اختیار کرو اور باغی نہ بنو تو اس کے معنی یہی ہوتے کہ اطاعت

اختیار کرو اور باغی نہ بنو تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اطاعت اختیار کرنا بغاوت سے بچنا ہے اور ترک اطاعت بغاوت ہے ایسے ہی نماز پڑھنا شرک سے بچنا ہے اور نہ پڑھنا مشرک بننا ہے گو اس کے معنی یہ نہیں کہ نماز نہ پڑھنے سے آدمی کافر و مشرک ہو جاتا ہے کیونکہ یہ عقیدہ اہلِ سنت کے خلاف ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ یہ عمل مشرکوں کا سا ہے۔

جیسے حدیث میں وارد ہے من ترك الصلوٰة متعمدا فقد كفر ای عملاً یعنی کام کافروں کا سا کیا جیسے کہتے ہیں کہ فلانا چمار ہو گیا اس کے یہ معنی نہیں کہ واقعی چمار ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چماروں کے سے کام کرنے لگا تو نماز نہ پڑھنے والے کو مشرک فرمانا بمعنی حقیقی تو نہیں ہے مگر جس معنی میں بھی ہو لفظ نہایت موحش ہے مشرک سے برا کوئی نہیں اس واسطے اللہ تعالےٰ نے نفرت دلانے کے لئے اقیموا الصلوٰۃ کے ساتھ ولا تکونوا من المشرکین بھی بڑھا دیا کیونکہ صرف نماز کے حکم سے اتنی تاکید نہ ہوتی اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مشرک بننا ترک نماز سے بہت زیادہ برا ہے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے تو وجہ شبہ مشبہ بہ میں زیادہ ہوتی ہے خواہ زیادتی کسی حیثیت سے ہو مثلاً کہتے ہیں کہ زید شیر ہے یعنی ایسا بہادر ہے جیسا شیر تو اس میں ضرور ہے کہ بہادری شیر میں زید سے زیادہ ہے، ایسے ہی جب ترک نماز کو مشرک بننے کے ساتھ تشبیہ دی گئی تو یہ بات مسلم ہوئی کہ شرک ترک نماز سے بھی زیادہ برا ہے تو شرک کس قدر بری چیز ہوئی۔ دیہات میں شرک بھی کثرت سے ہے خصوصاً عورتوں میں شرک کا اثر بہت ہے مسلمانوں کے گھروں میں یہ بلا ہے کہ دیوی اور سیتلا کو پوجتی ہیں کسی کے چیچک نکلتی ہے تو اس سے ڈرتی ہیں اور اس کو کوئی متصرف چیز سمجھتی ہیں اور سیتلا کی پوجا کرتی ہیں یہ کیا خرافات ہے جیسے اور مرض ہیں

ایسے ہی چیچک بھی ہے اور مرضوں کو کیوں نہیں پوجتے اور مسلمان کے نزدیک تو کوئی با ارادہ اور مؤثر چیز بھی خواہ وہ کتنی ہی بڑی با تصرف کیوں نہ ہو پوجنے کے قابل نہیں ہوسکتی مسلمان کے نزدیک تو پوجنے کے قابل بس ایک خدا ہے۔ اُسی کا اُس کو خوف ہوسکتا ہے اور اسی سے امداد چاہ سکتا ہے اس کے سوا اور کوئی چیز مسلمان کی نظر میں قابل خوف اور قابل استعانت نہیں تمام دنیا خدا تعالےٰ کے سامنے ایسی ہی بندی ہے جیسے ہم ہیں پھر ہم کو اپنے جیسے عاجزوں کا کیسا خوف مگر جہالت نے راہ مار رکھی ہے۔ فرضی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مندروں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور یہ مسلمان اور شرک کے اور بھی شعبے ہیں مثلاً بعض لوگ کسی دن کو منحوس سمجھتے ہیں یا اور کسی چیز کو منحوس سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ شگون لیتے ہیں اور بعض سمجھتے ہیں کہ شہید لپٹے پھرتے ہیں کوئی بیمار ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ شہید مرد آگئے اور اُن کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ پھر اُن شہید مرد صاحب سے غیب کی خبریں پوچھتے ہیں اول تو یہی غلط ہے کہ شہید لپٹے پھرتے ہیں شہیدوں کو نعم آخرت کے سامنے اس کی کیا ضرورت ہے کہ دنیا میں آدیں اور آدیں بھی کاہے کے لئے لوگوں کو ستانے کے لئے جنھوں نے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر گردنیں کٹوادی ہیں وہ اس گناہ کے مرتکب ہوں گے کہ خلق خدا کو ستاتے پھریں یہ تو صریح اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہے اور معمولی گناہ نہیں بلکہ بہت سخت گناہ ہے کیونکہ حق العبد ہے جو توبہ کرنے سے بھی معاف نہیں ہوتا ان کی نسبت یہ خیال جنھوں نے اللہ کے لئے گردنیں کٹوائی ہیں کس قدر لغو خیال ہے اور اُن کو عالم الغیب سمجھنا یہ دوسری غلطی ہے کیا شہید ہوجانے سے غیب کا علم ہوجاتا ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ شریعت نے ان باتوں کو رد کیا ہے شہیدوں کا

لپٹنا جس کو کہتے ہیں صرف شیطانی اثر ہے وہ کبھی شہید بنتا ہے اور کبھی کوئی مشہور نام لے دیتا ہے کہ میں شیخ سدو ہوں یا فلانا ہوں مسلمان کو بڑا پکا ہونا چاہیئے۔ شیاطین کا کیا ڈر یہ سب شرک کی باتیں ہیں مرد عورت سب اس میں مبتلا ہیں۔ صاحبو ہمارے حالات کس قدر ابتر ہیں۔ دین کا کوئی جزو بھی باقی نہیں عقاید کی تو یہ حالت اور اعمال کو دیکھیے کہ جو فعل اول اعمال ہے یعنی نماز علی العموم وہ بھی متروک ہے مسلمانوں کی بستی ہے اور مشکل سے دو چار نمازی نکلتے ہیں ہر کام میں حکم اکثر پہ ہوا کرتا ہے مسلمان آدھے سے زیادہ نمازی ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ مسلمان نماز پڑھتے ہیں لیکن آدھے سے کم بھی نمازی نہیں فیصدی دو چار بھی مشکل سے نمازی نکلتے ہیں تو ئے قاعدہ مذکورہ یعنی للاکثر حکم الکل یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسلمان بے نماز ہیں نماز کی تو یہ حالت ہوئی۔ ایک عمل روزہ ہے اس کی حالت یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس کی طرف سے بعض جگہ اس قدر جہالت ہے کہ بعض عورتوں نے سنا بھی نہیں کہ روزہ بھی مسلمانوں کے یہاں کوئی چیز ہے۔ جب ان روزمرّہ کے اعمال کی یہ حالت ہے تو ان اعمال اسلام کی نسبت کیا کہا جائے جن کا کوئی معین وقت نہیں جیسے زکوٰۃ اور حج اعمال کی حالت یہ ہوئی۔ اور ایک جزو دین کا معاشرت ہے اس میں تو نہ صرف جہالت ہے بلکہ شرعی معاشرت کے مقابلہ میں ایک دوسری معاشرت کھلم کھلا موجود ہے چوکا دیتے ہیں۔ پیتل کے وہ برتن جو ہندوؤں کے ساتھ مخصوص ہیں مسلمان رکھتے ہیں جیسے لوٹیا وغیرہ۔ عورتیں لہنگا پہنتی ہیں پیٹ اور دوسرے وہ اعضاء جو ستر میں داخل ہیں کھلے رہتے ہیں۔ شادی بیاہوں میں ہندوؤں کی رسمیں کرتے ہیں جیسے کنگنا باندھنا وغیرہ تمام معاشرت بالکل ہندوؤں کیسی ہے۔ دھوتی باندھتے ہیں بعض دھوتی باندھنے والے نماز کے وقت دھوتی کو پیچھے سے کھول لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب تو کچھ حرج نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

باندھنے والے خود بھی دھوتی کو برا جانتے ہیں جب ہی تو نماز کے وقت اس کو کھولنے کو ضروری سمجھتے ہیں ورنہ کھولنے کی کیا ضرورت ہے پھر صاجو جب برا جانتے ہو تو بجائے دھوتی کے لنگی اور پاجامہ پہنو کھیت کیار کے کام سب ہماری طرف بھی ہوتے ہیں اور ہماری طرف اکثر لوگ لنگی اور پاجامہ ہی پہنتے ہیں دھوتی بہت کم لوگ باندھتے ہیں اس کی جتنی ضرورتیں بتلائی جاتی ہیں وہ سب خیالات ہیں بس صرف رواج اور رسم ہے۔ میں کہتا ہوں بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم نے تو کثرت سے ہندوؤں کی رسمیں اختیار کر رکھی ہیں بھلا ہندوؤں نے بھی کوئی رسم ہماری لی ہے قطع نظر گناہ سے غیرت بھی تو کوئی چیز ہے یہ اور بات ہے کہ ہندوؤں میں سے کوئی خاص شخص مسلمانوں کی کوئی عادت اختیار کر لے مگر ساری قوم میں کوئی رسم ہماری نہیں پھیلی اور ہمارے یہاں ان کی رسمیں ساری قوم میں موجود ہیں، حالانکہ مشرکین کی کوئی بات بھی نہیں لینا چاہیئے۔ ہمارے اسلام میں اپنی عادات اور تعلیمات بہت کافی اور سب سے اچھی موجود ہیں پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم دوسروں کی معاشرت لیتے پھریں اور معاشرت کوئی دین سے الگ چیز نہیں ہے وہ بھی دین کا ایک جزو ہے کیونکہ دین کے پانچ جزو ہیں۔ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق۔ پانچوں جزو کسی کے اندر پورے ہوں تب اس کو دین دار کہیں گے۔

دیکھئے حسین وہ شخص ہے جس کا چہرہ بھی ٹھیک ہو، آنکھیں بھی ٹھیک ہوں، قد بھی ٹھیک ہو۔ اگر ایک بات میں بھی کمی ہو اور ذرا سا بھی عیب ہو تو حسین نہ کہا جائے گا۔ مثلاً سارا جسم ٹھیک ہو لیکن نکٹا ہو تو اس کو حسین نہیں کہا جائے گا اور آج کل مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ پانچوں

ضروری اطلاع، خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ بدل واتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

چیزوں میں سے ایک چیز بھی نہیں اور حسین بننے کو تیار ہیں اور اگر بعض افراد میں اجزائے دین ہیں بھی تو سارے اجزا نہیں ایک دو کو لے کر باقی کو چھوڑ دیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ ہم کامل ہو گئے۔ یاد رکھو کامل وہ ہے جو سب اجزا کو لے سب چیز مسلمانوں کی سی ہو کوئی چیز بھی مشابہ کفار نہ ہو حدیث میں آیا ہے کہ میری امت میں تہتر فرقے ہو جائیں گے اور سب دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک کے۔ پوچھا گیا کہ وہ ایک کونسا ہے اشارہ فرمایا وہ وہ ہے کہ جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہو۔ سو یہ لفظ جو ترجمہ ہے ماکا عام ہے کیا مطلب کہ وہ اجزائے خمسہ میں متبع ہو قولاً بھی فعلاً بھی اور اتباع قولی عام ہے خواہ قول جزئی ہو یا قول کلی ہو جس سے کہ قاعدہ کلیہ ثابت ہو پس اجازت کے موقع پر جائز فعل کا کرنا بھی قول کلی کا اتباع ہے۔ میرے اس جملہ سے یہ اعتراض اٹھ گیا جو ممکن ہے کہ کسی کو ہوتا کہ مولوی لوگ بھی پورے متبع نہیں مثلاً اچکن پہنتے ہیں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یا صحابیؓ سے اچکن پہننا ثابت نہیں اصل یہ ہے کہ عادات میں اصل اباحت ہے جو وضع شریعت میں ممنوع نہ ہو (تشبہ بھی ممانعت کی علت ہے) تو اس میں کچھ حرج نہیں تو یہ بھی اتباع ہی ہوا کہ شریعت نے جس چیز کو منع نہیں کیا اس کو اختیار کر لیا جائے یعنی شریعت کی حدود سے قدم باہر نہ رکھا جائے مثلاً شریعت نے لنگی یا پاجامہ کی حد مقرر کر دی ہے کہ ٹخنوں سے نیچا نہ ہو تو ٹخنے کھلا پاجامہ خواہ کسی وضع ہو بشرطیکہ تشبہ بالکفار نہ ہو شریعت جائز رکھتی ہے تو جواز کی حد میں رہنا بھی قولاً اتباع ہے اگر بالکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو کہ سنن عادیہ میں سے بھی کوئی سنت نہ چھوڑے تو سبحان اللہ۔ مگر ہم میں اتنی ہمت نہیں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنھوں نے سرِ مو اتباع سے قدم باہر نہیں رکھا۔ ایک بزرگ نے صرف اس وجہ سے خربوزہ نہیں کھایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت قطع کسی حدیث میں نہیں ملی۔ صحابہؓ نے بے چھنا جو کا آٹا کھایا صرف پھونک مار کر بھوسی اڑا دیتے

تھے اور گیہوں کا آٹا ہوتا تو اس کی روٹی بے سالن کے کھاتے کیونکہ گیہوں خود سالن ہے۔ خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ خدام سے فرمایا کہ صحابہؓ جو کہ آٹے کی روٹی بغیر چھانے ہوئے کھایا کرتے تھے اس سنت پر بھی عمل کرنا چاہیئے اب سے اسی طرح روٹی پکائی جائے کہ جو کا آٹا ہو اور اس کو چھانا نہ جائے چنانچہ اُسی طرح روٹی پکائی گئی اس کے کھانے سے سب کے پیٹ میں درد ہوا آپ نے فرمایا کہ ہم سے بڑی بے ادبی ہوئی کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برابری کا دعوٰے کیا ہم کو نیچے کے درجے میں رہنا چاہیئے اور رفقاء سے کہا تو یہ کرو آٹا چھان کر کھایا کرو بے چھنا آٹا کھانا حالاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برابری کا دعوٰے ہے کس قدر باریک بات ہے یہ بات ذکر اللہ اور صحبت سے حاصل ہوتی ہے کہ آدمی حق تعالےٰ کے معاملات کو سمجھنے لگتا ہے۔ شیخ نے وسعت بھی اختیار کی تو کس نیت سے پھر وسعت پر عمل کرنے میں سنت کے ادب کو بھی ملحوظ رکھا ہم حیوان ہوتے تو کہتے اچھا عمل بالسنت کیا کہ پیٹ میں درد ہی ہو گیا گویا (نعوذ باللہ) سنت سے وحشت ہو جاتی ہماری حالت یہ ہے کہ جو بات اپنے آپ کو پسند ہوئی اور اتفاق سے شریعت نے بھی اُس کا امر کیا تو اس پر تو عمل کر لیا اور شریعت کی تعریف کرنے لگے اور جو بات اپنے آپ کو پسند نہ ہوئی یا اس میں اپنا کچھ نقصان ہوا تو اس کے پاس کو بھی نہ جاویں یہ وہ حالت ہے کہ جس کو خدا تعالےٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف فان اصابہ خیر اطمان بہ وان اصابتہ فتنۃ انقلب علی وجھہ خسر الدنیا والاٰخرۃ ذٰلک ھو الخسران المبین یعنی بعض آدمی وہ ہیں جو حق تعالےٰ کی عبادت کا دم بھرتے ہیں مگر کنارے پر رہتے اگر ان کو کچھ نفع پہونچا تب تو مطمئن ہو گئے اور اگر کوئی تکلیف پہونچی تو بس منہ پھیر کر چلدیئے فرماتے ہیں کہ انھوں نے دنیا بھی کھوئی اور دین بھی آجکل یہ حالت ہے کہ لوگ فرائض کے مسئلے پوچھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی حکم کی طلب ہے حالانکہ مقصود صرف یہی ہوتا ہے کہ ہم کو میراث مل جائے اگر ان کو دور کے

رشتہ سے پانچہزار میراث کے مل گئے تو کہتے ہیں شریعت کیسا اچھا قانون ہے کسی کا حق نہیں مارتا ہر ایک کا پورا پورا حق دلواتا ہے حق تلفی تو اس قانون میں ہے ہی نہیں اور اگر انھیں معلوم ہو گیا کہ ہمیں کچھ نہ ملے گا تو کہتے ہیں بس رہنے دیجئے فرائض نکالنے کی ضرورت نہیں ہم سے تو یہ مال گیا حتیٰ کہ بعض لوگوں نے فرائض نکلوائے جب دیکھا کہ ان کا حصہ نہیں ہے تو کہا بس رہنے دو آگے کیوں تکلیف کرتے ہو اب ضرورت نہیں رہی۔ ایک شخص نے مجھ سے ایک فرائض لکھوائی اس کا ان کا حصہ نہ آیا تو پوچھنے لگے کہ میرا حصہ کیوں نہ آیا مجھے تو بڑی امید تھی میں نے کہا کہ فلاں وارث موجود ہے اس کے ہوتے آپ کو نہیں مل سکتا تو کہنے لگے کہ پھر اس وارث کو نہ لکھو سبحان اللہ واقعات میں تراشش خراش ہوئی اختیاری ہو گئی یہ حالت ہے ہم لوگوں کی کہ بس دنیا کے نفع نقصان کو دیکھتے ہیں اگر دین بھی ساتھ میں آگیا تو خیر ورنہ کچھ اس کی پرواہ نہیں تو ہم لوگ دین کو بھی دین ہونے کی نیت سے نہیں لیتے اور اہل اللہ اگر دنیا بھی لیتے ہیں تو دین کی نیت سے۔ دیکھئے حضرت خواجہ نقشبند نے وسعت بھی اختیار کی تو کس نیت سے ہم لوگ اگر وسعت اختیار کرنے میں بھی نیت کر لیں کہ عزیمت پر عمل کرنے میں تکلیف ہے اور ہم کو اس کے تحمل کی ہمت نہیں تب بھی غنیمت ہے مگر ایک تو حدِ جواز سے باہر نہ جانا چاہیئے۔ دوسرے صرف کسی ایک جزو دین کو منتہیٰ نہ قرار دے لیں بلکہ تمام اجزاء دین میں پورا پورا اتباع کریں کیونکہ ما انا علیہ میں ما کلمہ عموم ہے جو شامل ہے اجزاءِ خمسہ کو عقائد میں عبادات میں معاملات میں معاشرت میں اخلاق میں سب میں دین کے پابند رہیں سلام کھانا پینا سونا اٹھنا بیٹھنا سب اسلام کا سا ہو۔ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عشار کو عتمہ کہنے سے منع فرمایا حالانکہ یہ بھی ایک لغت تھا مگر چونکہ اہلِ جاہلیت اس کو بولتے تھے اس واسطے پسند نہیں فرمایا تشبہ کے بارے میں بہت لوگوں کی طبیعتوں میں الجھن ہوتی ہے کہ اس میں کیا حرج ہے مگر میں اس کا پتہ آپ ہی کے برتاؤ میں بتاتا ہوں۔ دیکھئے اگر اس وقت زمانۂ حرب میں کوئی جرمنی

لباس پہنے بلاضرورت زبان جرمنی بولے محض اترانے اور تفاخر کے لئے تو حکام کو کیسا ناگوار ہو جبکہ تشبہ کوئی چیز نہیں تو یہ ناگواری کیوں ہوتی ہے. پھر شریعت پر کیا اعتراض ہے اگر وہ منکرین اور مخالفین کی مشابہت سے منع کرتی ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کی بھی اجازت نہیں دیتے جن کو کفار استعمال کرتے تھے اس سے وہ الفاظ گو بالکل حرام نہیں ہو جاتے مگر ان کا استعمال بے ادبی تو ہے بلکہ یہ سن لینے کے بعد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ممانعت فرمائی ہے پھر حرام اور مکروہ کا سوال کرنا ہی دلیل ہے عدم محبت کی۔ حرام اور مکروہ کی تحقیق کیوں ہے جس کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا اس سے رک جانا چاہیئے۔ آجکل لوگوں نے متکبرانہ انگریزی کے الفاظ ایسے زبان پر چڑھائے ہیں کہ کوئی جملہ ان سے خالی نہیں ہوتا پھر علماء سے پوچھتے ہیں کہ کیا انگریزی کا لفظ بولنا حرام ہے علماء ان کو حرام تو کہیں گے نہیں۔ بس ان کو گنجائش مل جاتی ہے کہ جب حرام نہیں تو پھر ہم پر کیا اعتراض میں کہتا ہوں کبھی کچہری میں جا کر عربی اور فارسی کے پرانے الفاظ نہ بولے ذرا یہ بھی تو کیجئے یہ بھی تو حرام نہیں۔ اور میں ذمہ لیتا ہوں کہ ان کے بولنے سے آپ پر کچہری میں کوئی مقدمہ بھی قائم نہ ہوگا اور کسی قسم کا خطرہ بھی نہیں بلکہ آپ کی لیاقت کی دلیل ہوگی کہ آپ کو یہ زبانیں بھی آتی ہیں مگر آپ کبھی ایسا نہ کریں گے۔ وجہ کیا ہے کہ حکام اسکو اگرچہ ناجائز اور کوئی جرم نہیں کہتے مگر پسند بھی نہیں کرتے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ناپسند بھی نہیں کرتے صرف اتنی بات ہے کہ خود نہیں بولتے بس آپ صرف اس بات سے کہ وہ خود استعمال نہیں کرتے ان الفاظ کو ناپسند کرنے لگے اتباع کے یہ معنی ہیں جس شخص کو اللہ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اسی طرح اُس کو بے دین قوم کے الفاظ استعمال نہ کرنے کے لئے یہ وجہ کافی ہے کہ اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خود استعمال نہیں کیا نہ عارض کی وجہ سے ان کو پسند کیا۔ حرام اور مکروہ کیا چیز ہے جیسے عربی و فارسی کے الفاظ حکام کے سامنے اس واسطے نہیں بولے جاتے کہ حکام ان کو خود نہیں بولتے ہیں مگر آجکل اس کا عکس ہے کہ جان جان کر کفار کے الفاظ

بولتے ہیں۔ کانپور میں ایک مرتبہ دو لڑکے مسجد میں نماز پڑھنے آئے ان میں سے ایک دوسرے سے انگریزی میں گفتگو کرنے لگا دوسرے نے کہا کہ بھائی مسجد میں تو انگریزی مت بولو اس نے کہا کیوں کیا مسجد میں انگریزی بولنا گناہ ہے پھر انھوں نے ایک ملازم کو مجھ سے دریافت کرنے کے لئے بھیجا میں نے کہا گناہ تو نہیں مگر ادب کے خلاف ضرور ہے لوگ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں گو اس پر فتویٰ کوئی نہ لگایا جاسکے مگر آخر ادب بھی تو کوئی چیز ہے۔ دیکھئے بعض آداب کے ترک پر عدالت میں ناخوشی ہوتی ہے میرے ایک ملنے والے کا مقدمہ عدالت میں تھا وہ پیشی کے وقت عطر مل کر گئے مقدمہ سے وہ رہا کر دیئے گئے مگر پھر بلا کر سمجھایا گیا کہ دیکھو یورپین کے سامنے عطر مل کر کبھی مت جانا سو عطر مل کر آنا کوئی جرم نہ تھا چنانچہ عدالت نے بھی اس کو جرم قرار نہیں دیا اس کی وجہ سے کوئی مقدمہ ان پر قائم نہیں ہوا لیکن فہمائش کی گئی اس وقت کسی نے یہ نہ کہا کہ عطر مل کر آنا کیا جرم ہے بلکہ یہی کہا ہوگا کہ بہت اچھا حضور قصور ہوا پھر کیا وجہ ہے کہ خدا کا اور خدا کے گھر کا ادب نہ ہو اور وہاں وہ الفاظ استعمال کئے جائیں جو مخالفین و کفار کے الفاظ ہیں۔ ادب ایک بڑی چیز ہے اور ترک ادب کوئی معمولی بات نہیں حرام اور مکروہ کا تلاش کرنا یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ جب دل میں ادب نہ ہو اور جب دل میں ادب ہوتا ہے تو حکم سنتے ہی آدمی گردن جھکا لیتا ہے صحابہؓ کی یہی شان تھی صحابہؓ نے کبھی حرام اور مکروہ نہیں پوچھا۔ جب بعد میں اس قسم کے سوالات ہونے لگے تب فقہاء نے احکام کے مراتب کو استنباط کر کے قائم کر دیا۔ غرض اجزاء خمسہ دین میں بھی یہی برتاؤ رکھئے کہ جس بات کی نسبت معلوم ہو جائے کہ یہ دین کی بات ہے اس کو اختیار کیجئے اور جس کی نسبت معلوم ہو جائے کہ یہ دین کے خلاف ہے اس سے الگ رہئے یہ ہے اسلام کامل اس پر کاربند ہو کر دیکھئے کہ پھر کسی بات کی دوسروں سے حاصل کرنے کی کونسی احتیاج رہتی ہے جس کو کسی چیز سے انس ہوتا ہے دوسری چیز کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ جس کو اسلامی مذاق حاصل ہے وہ دوسروں کے افعال کی طرف کیوں مائل ہوگا۔ بلاضرورت کوئی چیز بھی غیر قوم کی نہ لیجئے اس وقت مجھ کو بالقصد یہ بیان کرنا تھا لاتکونوا من المشرکین سے یہ مسئلہ بخوبی مستنبط ہو گیا جس چیز میں بھی مشرکین کی مشابہت ہو وہ سب اس میں داخل ہیں سب صاحب رسوم شرکیہ چھوڑ دیں چال ڈھال میں کھانے پینے میں لباس میں شادی بیاہ میں کوئی عادت اور رسم کفار کی نہ رکھیں اور نماز پابندی سے پڑھیں اور خود بھی پڑھیں اور اپنے گھر والوں سے اور اوروں سے بھی پڑھوادیں۔ اب دعا کریں کہ حق تعالیٰ توفیق دیں۔ آمین ثم آمین۔

ـــــــــــــــ

اَدَبُ التَّرک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامدًا و مُصلیًا

تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مسمّیٰ با دب الترک

یہ تقریر بھی منجملہ ان تقریروں کے ہے جو سفر گورکھپور میں ہوئیں یہ تقریر ریل میں مابین میرٹھ و دیوبند ہوئی۔ تاریخ ۵ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ روز دوشنبہ یکم جنوری ۱۹۱۷ء قبل دوپہر حاضرین احقر اور میر معصوم علی صاحب اور خواجہ عزیز الحسن صاحب اور حاجی وجیہہ الدین صاحب سوداگر میرٹھ مقدار وقت یاد نہیں غالباً آدھا گھنٹہ۔

خواجہ صاحب نے پوچھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ توکل کروں اور سب تعلقات چھوڑ کر اللہ اللہ کروں ہنس کر فرمایا جلدی نہ کیجئے جب سب اولاد کی شادی بیاہ ہو چکیں اور آمد بھی بند ہو جاوے اس وقت مناسب ہے اور تعلقات والے کو ترک اسباب کرنا مشکل ہے ہفتہ میں دو ہفتہ میں اللہ اللہ کرنے سے جی اکتا جاتا ہے یہ مباحات ہی کی برکت ہے کہ اشغال مختلف ہونے سے نشاط بحال ہو جاتا ہے۔ میں اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں کہ (کہنے کی بات تو ہے نہیں مگر اس وقت سب اپنے ہی ہیں) میں نے بھی ایک دفعہ ترک تعلقات کیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ وساوس میں مبتلا ہو گیا کیونکہ حق تعالیٰ مرئی تو ہے نہیں محض خیال سے دفعۃً پُر ہونا قلب کا مشکل ہے اور تعلقات سے قلب خالی کیا گیا اور پُر ہوا نہیں خالی قلب میں شیطان کو دخل کا موقع مل گیا اور وساوس پیدا ہوئے سمجھ میں آیا کہ یہ ٹھیک نہیں ذکر شغل طاعت میں مشغول رہے اور مباحات بالکلیہ نہ چھوڑے سفر کرنا چلنا پھرنا احباب سے ملنا خط و کتابت یہ سب اشغال تھوڑے تھوڑے رکھے یہی حکمت ہے۔ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم ادعیہ مختلفہ کی تعلیم فرماتے ہیں چلنے کی اور اٹھنے کی اور سوار ہونے کی اور جاگنے کی اور کھانے کی اور پینے کی کہ ایک شغل سے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ البتہ اگر مغلوب العشق ترک کرے تو مضائقہ نہیں مگر غلبہ عشق غیر اختیاری چیز ہے اپنے ارادہ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا ارادہ والے کے لئے یہی ترک ہے کہ انضباط اوقات کرے ایک وقت طاعت کے لئے ہو تو ایک وقت مباحات کے لئے بھی ہو وقت کو ضائع نہ کرے۔ غیر مفید یا مضر کام میں صرف نہ کرے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر منشی صاحب ایک بزرگ سے بیعت ہوئے اور ترک تعلقات کر دیا ملنا، سفر کرنا، خط و کتابت سب چھوڑ دیا ضربیں ایسی لگاتے کہ محلہ بھر تنگ آگیا سب کوستے تھے کہ یہ مر جاوے تو اچھا ہو ان کے دماغ میں یبوست مفرط ہوگئی اور نہ کوئی کیفیت اور مزہ بھی ذکر کا حاصل نہ ہوا پیر صاحب کو لکھا جواب ندارد مجھے لکھا میں نے جواب دیا کہ تفصیلی مشورہ تو بعد میں دوں گا، فوری علاج یہ ہے کہ جن اشغال میں آپ لگے رہتے ہیں سب ایک دم چھوڑ دیجئے لوگوں سے ملئے ہدایا لیجئے دیجئے تفریح ہوا خوری کیجئے اول ہی دن میں سب پریشانی جاتی رہی پھر مفصل مشورہ دیا گیا کہ بالکلیہ ترک مباحات نہ کیجئے تقلیل کر دیجئے اور بہتر یہ ہے کہ یہاں چند روز کے لئے چلے آیئے میں آپ کے حالات دیکھ کر انضباط اوقات کی صورتیں بتا دوں گا چنانچہ وہ آئے میں نے بہت تھوڑا سا ذکر بتا دیا اور مختلف کاموں کے لئے اوقات مقرر کر دیئے بس شگفتہ ہوگئے پھر اہل محلہ دعا دیتے تھے کہ جس نے ان کی ضربیں چھوڑائی ہیں اس کا خدا بھلا کرے اب ان کو اپنا حال لکھنے کے لئے یہ الفاظ کافی ہوتے ہیں کہ الحمد للہ میری حالت اچھی ہے لوگوں کو مقصود کا ہی پتہ نہیں غیر مقصود کو مقصود سمجھ کر عمر بھر خبط میں مبتلا رہتے مقصود کام کرنا ہے نہ ثمرات نہ حالات عرض کیا گیا سخت سخت مجاہدہ سے فائدہ تو بہت جلدی ہوتا ہوگا فرمایا اگر ایسا ہوتا تو اکھاڑہ کے پہلوان اور چکی پیسنے والی بڑے ولی ہوتے کیونکہ محنت سخت کرتے ہیں محنت قاعدہ کی زیادہ مفید ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ایک تالا بند ہوگیا تھا اس پر لوگوں نے بہت زور لگائے مگر نہ کھلا میں نے کنجی سے

آہستہ سے کھولا فوراً کھل گیا تالے کے ساتھ کشتی لڑنے سے کیا فائدہ تالا طریقہ سے کھلتا ہے ایسے ہی اصلاح کے لئے اور وصول الی اللہ کے لئے یہی طریقہ ہے اور وہ اتباع سنت ہے یہ ہمارے واسطے اس لئے مقرر ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طریقہ جانتے تھے ہمیں کوئی ضرورت غور وفکر واختراع وایجاد کی نہیں آنکھ میچ کر پیچھے چلے جاویں اب سنت کو دیکھئے حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ آدمیوں کو خواب میں دیکھا کہ دریا کا سفر کر رہے ہیں حدیث کا لفظ یہ ہے ملوك على الاسرة بادشاہوں کی وضع سے تخت پر بیٹھے جا رہے ہیں یہ بادشاہ ہی تھے جنھوں نے جہاد کئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی فضیلت فرمائی اس سے معلوم ہوا کہ مال دین کے لئے مضر نہیں جبکہ اس کے ساتھ اتباع ہو حاصل یہ کہ مال قبیح لعینہ نہیں بلکہ مقاسد کی وجہ سے قبیح ہو جاتا ہے ہاں اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کی طبیعت ہی ایسی ہو کہ اتباع اور مال دونوں جمع نہ ہو سکیں تو اس کو ترک مال ہی کا مشورہ دیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ بہت غلو ترک میں مناسب نہیں توسط اور اعتدال چاہیئے سب کو ترک اسباب کی تعلیم بھی نہ دینی چاہیئے ہر شخص کی طبیعت اور حالت مختلف ہوتی ہے اس واسطے ترک کے درجات بھی مختلف بتانے چاہئیں۔ ساری دنیا اگر ایک سی ہو جاوے تو تارکین تو تارکین اسباب بھی پھر تارک نہ رہیں کیونکہ ضرورتیں ان کی پوری نہ ہوں اور مشغولی اختیار کرنی پڑے ان کا اطمینان بھی ان بے اطمینانیوں کی وجہ سے ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ شیطان ہر شخص کی موجودہ حالت کو بیوقعت بتاتا ہے اور اس سے اپنا کام خوب بناتا ہے اہل توکل سے تو کہتا ہے کہ اس حالت میں یہ خرابی ہے کہ اپنا بوجھ دوسروں پر ہے یہ نامردی ہے ؎

چو باز باش کہ صیدے کنی ولقمہ دہی
طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پر و بال

ان سے توکل چھوڑا کر اسباب میں گھسا دیتا ہے اور اہل تعلقات سے کہتا ہے

تمھاری بھی کیا حالت ہے دن بھر تو تو میں میں رہتے ہو کوئی وقت بھی یادِ خدا کا نہیں فلاں شخص کیسا تارکِ اسباب ہے تم کیا نہیں کر سکتے یہاں تک کہ ان سے تعلقات کو چھوڑا کر ہی چھوڑتا ہے اور ان میں اتنی ہمت ہوتی نہیں کہ ترک اسباب کے بعد مطمئن رہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پریشان ہو جاتے ہیں اور بعد چندے اس سے پشیمانی ہوتی ہے اور یہ ادھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے لطف یہ ہے کہ اگر کوئی ترک اسباب کی ہمت کرے بھی تو اس حالت پر بھی قیام نہیں رہنے دیتا اس کو بھی پھر بے وقت ثابت کرتا ہے یہ شیطان کا ایسا مکر ہے کہ ہر جگہ چل ہی جاتا ہے اور اس مکر کو پہچاننا آسان کام نہیں بہت ہی باریک نظر کی ضرورت ہے چاہیئے کہ اپنی طرف سے حالت کے بدلنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اول کسی بڑے مبصر سے ضرور رائے لیلے اسی واسطے شیطان ایسے بزرگوں سے بہت گھبراتا ہے کیونکہ وہ اس کے مدت کے مکر ذرا میں توڑ دیتے ہیں عرض کیا گیا کہ بلا ترک تعلقات اصلاح کیسے ہو۔ فرمایا ترک ضروری بیشک ہے مگر ترک کی حقیقت تقلیل تعلقات ہے یعنی فضول تعلقات کو اور مضر تعلقات کو چھوڑ دینا نہ مطلقاً تارک بن جانا اس کے مبصر تو حضرت حاجی صاحب تھے۔ تصوف بالکل مردہ ہو گیا تھا حضرت حاجی صاحب نے اس کو زندہ کیا اور حقائق بالکل محو ہو چکی تھیں ان کو تازہ کر دیا تصوف رسم کا نام رہ گیا تھا اول تو جعلسازیاں بہت اور سچے لوگوں میں بھی صرف ڈھچر رہ گیا تھا حضرت نے اس کو بالکل زندہ کر دیا حضرت کا الہامی طریقہ سب کے کام کا ہے۔ حضرت کی مجلس میں بیٹھ کر ہر شخص کو حص آتا اور امیدیں بڑھتی تھیں اور امنگیں پیدا ہوتی تھیں کہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے کہا عمدہ ترکیب یہ سمجھ میں آتی ہے کہ تھوڑی جائیداد خرید لے جو خرچ کے لئے کافی ہو بس پھر اللہ اللہ کیا کرے اس طرح ذکر بڑے اطمینان سے ہو سکتا ہے۔ فرمایا جائیداد سے بھی اطمینان نہیں ہو سکتا اس میں بھی بکھیڑے ہیں

اگر اس کی نگرانی نہ کرو اور دوسرے کے سپرد کردو تو تلف ہو جاتی ہے وہ بھی جب ہی باقی رہتی ہے جب خود اس میں کھپے رہو پھر اطمینان کہاں اور اصل بات یہ ہے کہ اپنی تجویز سے کچھ ہوتا نہیں حق تعالیٰ کی طرف سے جو پیش آوے اس پر راضی رہے اس میں تائید بھی ہوتی ہے تجویز سے تفویض بہتر ہے ؎

گر گریزی بر امید راحتے　　زاں طرف ہم پیشت آید آفتے

اور فرمایا ہے ؎

چونکہ بر میخت بہ بندد سر شتہ باش　　چوں کشاید چابک ابر جستہ باش

جو شیخ صاحب جائداد ہوتا ہے اس سے فیض کم ہوتا ہے نیز اس کی طرف کشش بھی کم ہوتی ہے کیونکہ اس میں شان مسکنت کی کم ہوتی ہے اپنی امتیازی شان سے اس کو طالبین کی طرف ایسا التفات ہونا مشکل ہے جیسے متوکل محض کو ہو کہ وہ اپنے کو مساکین کا ہم جنس دیکھتا ہے نیز لوگوں کے ذہن میں بھی یہ رہتا ہے کہ ہم کو وہ کیوں منہ لگائیں گے وہ بڑے آدمی ہیں اور امیر وہ مستغنی ہیں اس واسطے رجوع بھی کم کریں گے اور جو شیخ ہدایا لینے والا ہوتا ہے اس سے فیض بہت ہوتا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف کشش زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ہدیہ میں خاصیت ہے تحائف کی لینے والے کو اور دینے والے کو دونوں کو ایک دوسرے کی طرف میلان ہوتا ہے۔ یہ حدیث میں بھی ہے اور تجربہ سے بھی ثابت ہے اور طالب اور مطلوب دونوں کو میلان ہوتا ہی اصل ہے فیض کی گو ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہدایا لینے والے شیخ میں حرص ہوگی اور اس وجہ سے بھی اس سے فیض کم ہوگا لیکن یہ غلط ہے اس کو حرص نہیں کہتے حرص کے معنی ہیں نہ ملنے کی صورت میں تلاش کرنا اور قلب کا اس کی طرف کھنچنا یہ اگر پایا جاوے تو واقعی مرض ہے۔ خلاصہ یہ کہ یوں تو ہدیہ لینے میں بھی کچھ خدشات ہیں مگر خیر ان کا علاج ہو سکتا ہے معاملہ فی ما بینہ و بین اللہ صاف رکھنا چاہیے دوسروں کے شبہوں کو کہاں تک مٹایا جاوے اور ان مفاسد سے بچنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کے سامنے ہدیہ نہ لے لیکن اس میں بھی ایک مفسدہ ہے وہ یہ کہ بات چھپتی ہے نہیں

معلوم ہو ہی جائے گا کہ یہ ہدایہ لیتے ہیں پھر جبکہ کسی کو مقدار نہ معلوم ہو گی تو عام طور سے یہ خیال ہو گا کہ بہت ہدایا آتے ہوں گے اور یہ بڑے آدمی ہیں پھر وہی بات پیدا ہو جاوے گی جو ریاست اور جائداد کے ہونے میں تھی۔ اسی لئے میں روپے کو چھپاتا نہیں اس واسطے کہ اصلی حالت ظاہر ہے چھپانے میں کسی کو تو یہ خیال ہوتا ہے کہ آمدنی بہت ہے اور یہ بڑے آدمی ہیں اور اس میں وہی خرابی ہے جو میں نے بیان کی اور کسی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ مطلق لیتے ہی نہیں ہیں اس خیال کے علم سے لینے والے کے دل میں عُجب پیدا ہوتا ہے ان سب باتوں کے خیال رکھنے کی ضرورت ہے میں کچھ نہ کچھ سب پہلوؤں پر نظر رکھتا ہوں لیکن کچھ نہ کچھ مفسدہ مرتب ہو ہی جاتا ہے اور آنکھ تو ہر حال میں جھپکتی ہے باوجود اتنی پرانی مشق کے کہ مدت ہو گئی ہدایا ہی پر گذر ہے۔

اسی سفر میں قنوج میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص نے جن سے کچھ تعلقات تھے گو مراسم نہ تھے دو روپے دیئے میں نے انکار کیا لیکن انھوں نے کسی طرح نہ مانا اور نہایت عاجزی کے ساتھ اصرار کیا اور دوسروں نے بھی سفارش کی مجھ کو روپے لینے پڑے اس کے بعد انھوں نے ایک سوال کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک عیسائی کے پیش کردہ اعتراضوں کے جواب مانگتے تھے اور جواب بھی وہ جو اس کے مذاق کے موافق ہوں میں نے ان کو ناصحانہ فہمایش کی کہ اس کی صحبت کو چھوڑ دیں اور اس سے کہدیں کہ علماء سے تحقیق کرو مگر وہ یہی چاہتے رہے کہ اس کے مذاق ہی کے موافق جواب مل جاوے۔ گفتگو بہت بڑھ گئی تب میں نے ان کو لوٹا دیا مگر قرائن سے معلوم ہوا کہ اس کا اثر بھی ان پر اچھا نہیں ہوا۔ مجھ کو بہت

کوفت ہوئی اور دماغ پر صدمہ محسوس ہوا۔ اس کے بعد وہ مجھ کو اپنے گھر میں لے گئے اور مستورات نے پھر ہدیہ دیا اس وقت مجھ کو نہایت شرمندگی ہوئی کہ میں نے تو ان کو لتاڑا اور ان کی طرف سے یہ احسان کیا جارہا ہے تو اس پر انفعال ہوا کہ ان سے وہ دو روپے لینے سے پہلے کیوں نہ سوچ لیا تھا اور کسی کے کہنے میں جلدی کیوں آگیا اب میں دو مصیبتوں میں مبتلا ہوگیا کہ جو ہدیہ گھر میں دیا گیا اس کو لوں تو طبیعت کے خلاف ہے کہ ابھی ان کو لتاڑا ہے اور ابھی ان کے گھر سے ہدیہ لے لوں۔ اور اگر نہ لوں تو وہ دو روپے بھی واپس کرنے چاہئیں جو باہر لئے تھے اور ان کے واپس کر لے میں کچھ فائدہ نہ تھا کیونکہ اس سے ان پر کچھ اثر اچھا نہ پڑتا بلکہ عناد پیدا ہوتا اور ان کے ظاہری مراسم قائم رہنے سے کچھ امید اصلاح کی تھی وہ بھی جاتی رہتی۔ عجب کشمکس تھی غصہ بہت آیا ہوا تھا لیکن بالآخر یہی ذہن میں آیا کہ اس بات کو نسیًا منسیا کر دینا چاہیئے اور یہ گھر میں کا ہدیہ بھی لے لینا چاہیئے اور میں اس وقت ایسا بن گیا کہ گویا ان سے تیز گفتگو ہوئی ہی نہیں تھی دیکھیے اس لین دین میں یہ کشمکش پیش آتی ہے۔ ہے تو یہ بہت جھگڑے کی جڑ ہے اس میں مصلحت بھی بہت بڑی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں علاج ہوتا ہے پندار اور دعوائے استغنا کا ریاست اور جائداد ہونے کی صورت میں یہ مصلحتیں فوت ہوتی ہیں۔

غرض شیخ کے لئے زیادہ مناسب ہے کہ ریاست و جائداد نہ رکھے رہے طالبین ان کا حکم یہ ہے کہ ان کے واسطے کوئی ضابطہ معین نہیں ہوسکتا بعضوں کے لئے ترک اسباب مناسب ہوتا ہے اور بعضوں کے لئے ترک اسباب زہر کا اثر رکھتا ہے۔ لہذا تجویز

حسب موقع مناسب ہے جو حالت جس طالب کی دیکھے اسی کے موافق ہدایت کرے اور وقوع کے وقت سوچنے سے بات سمجھنے میں آہی جاتی ہے اور حق تعالےٰ تائید فرماتے ہیں پہلے سے کاوش میں نہ پڑے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے جب کوئی بات پوچھی جاتی تو فرماتے کہ یہ واقعہ ہوا ہے یا نہیں اگر کہا جاتا کہ نہیں ہوا ہے اور ویسے ہی فرضی صورت پوچھی جاتی ہے تو پوچھنے سے منع فرماتے تھے کہ غیر واقعہ بلائیں کیوں پڑے وقت پر ضرور کوئی بتلانے والا مل جاوے گا اور اگر کوئی شبہ کرے کہ مجتہدین نے کیوں فرضی صورتیں نکال نکال کر فتوے لکھے اور کتابیں بنائیں تو اس کا جواب یہ ہے مجتہدین کو اس ضبط کی ضرورت تھی۔ احکام ظاہری اگر ضبط نہ ہو جاتے تو دین بالکل گڑبڑ ہو جاتا اب دین منضبط ہو چکا اب فرضی صورتوں کے تراشنے کی ضرورت نہیں جب واقعہ پیش آوے گا کوئی بتلانے والا مل جاوے گا اور اگر کوئی بتلانے والا نہ ہو تو اس وقت طالب کو چاہیئے کہ دعا کرے حق تعالےٰ کی طرف سے وہ مشکل حل ہوگی۔

خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضور نے توکل کیا تھا اور اسباب کو ایک دم چھوڑ دیا تھا۔ فرمایا میری نہ کہیئے میرے ساتھ کچھ بکھیڑا نہ تھا صرف ایک اہل کا فکر تھا اور نوکری چھوڑتے وقت یہ ضرور قلب پر بار تھا کہ خدا جانے ان کی حالت کیا ہو یہ متحمل ہوں یا نہ ہوں خدا کی قدرت کہ انھوں نے مجھ سے بھی زیادہ مستعدی ظاہر کی تو ایسے شخص کو ترک اسباب کرنا کیا مشکل ہے ایسے شخص کی ریس عیال دار لوگ کیسے کر سکتے ہیں اس کے آگے کچھ تھوڑا سا مضمون اور تھا وہ ضبط سے رہ گیا۔ فقط۔

تاریخ ختم مبیضہ ۶ رجمادی الاول ۱۳۳۵ھ

وعظ جناب مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ
مقام چرتھاول ضلع مظفر نگر

احکام اور مسائل متعلق موت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چونکہ موت کے متعلق مسائل کے معلوم ہونے کی زیادہ ضرورت ہے لہذا اس وقت بیان کئے جاتے ہیں افسوس ایسی یقینی چیز جس کے آنے میں کسی کو کلام نہیں اُس کو ایسا دل سے بھلا رکھا ہے۔ دیکھو اللہ تعالےٰ کے وجود میں ملحدین کو شبہ ہوا ہے لیکن موت کے آنے میں کسی کو شک نہیں۔ موت وہ چیز ہے کہ عیش و آرام کو مکدر راحت و چین کو منغص کر دیتی ہے بلکہ منکرین حساب کو بہ نسبت معتقدین کے زیادہ خوف ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان کے عقیدے کے بموجب ان کے تمام آرام چین موت کے ساتھ منقطع ہوتے ہیں لیکن اس کی نسبت ایسی غفلت ہوئی ہے کہ مومنین و منکرین سب نے مل کر بھلا دیا ہے۔ موت کے یاد دلانے کے واسطے سب سے بڑا محرک مردہ کو دیکھنا اور تجہیز و تکفین میں حاضر ہوتا ہے لیکن افسوس آجکل مردہ کو دیکھ کر ہر شخص بھی خیال کرتا ہے کہ یہ دن اسی کے واسطے تھا نہ کہ میرے لئے اگر یہ سمجھا جاتا کہ یہ حال ہمارا بھی ہونے والا ہے اور ہمارے واسطے بھی یہ دن آنے والا ہے تو واللہ ہرگز ایسی بیفکری کی باتیں ظہور میں نہ آتیں۔ میت کی تجہیز و تکفین کے واسطے آتے ہیں اور طرح طرح کی گفتگو ہوتی ہے کبھی ترکہ کا ذکر ہے کہ منقولہ میں کیا چھوڑا اور جائداد کیا ہے۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت ہے کہ ذکر تو مردہ ہی کا ہے لیکن بعض تو اپنے مقدمہ معاملہ کا ذکر شروع کرتے ہیں کل ہمارے فلاں مقدمہ کی تاریخ ہے فلاں وکیل کے پاس جانے کی ضرورت ہے کبھی مدت کے ملے ہوئے دوستوں سے مل کر اظہار خوشی ہو رہا ہے آپ سے تو عرصہ میں ملاقات ہوئی کیا کہوں فرصت نہیں ہوتی گویا یہ بھی دوستوں کی

ملاقات کا ایک ذریعہ ہے عورتوں کی حالت کیا بیان کی جائے ہر شخص جانتا ہے کہ ایسی مجمعوں میں بھی کیسی بیہودگی اور بے تمیزی سے کام لیتی ہیں تعزیت کے لئے جاتی ہیں اور وہاں اپنے مردہ رشتہ داروں کا ذکر کر کرکے روتی ہیں لیکن یہ مصنوعی رونا بھی تھوڑی دیر کے بعد ختم ہوجاتا ہے اور پھر ادھر اُدھر کی فضول باتیں شروع ہوجاتی ہیں کسی کی غیبت ہورہی ہے کسی کے افعال پر اعتراض ہورہا ہے کسی کے نسب پر حرف گیری ہورہی ہے اور پھر بڑا غضب یہ ہے کہ ایک بیوہ کو سب کے ساتھ علیحدہ علیحدہ منہ ڈھکنا پڑتا ہے بھلا کہاں تک خون کا پانی کرے کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ ایک تو یہ بیچاری خود ہی زندہ درگور ہوگئی ہے اس کی ذرا تو دلداری کرتے نہیں بلکہ ہر آنے والی بی بی کو اس امر میں کوشش ہوتی ہے کہ میرے ساتھ نالہ و بکا زیادہ جوش کے ساتھ ہو تاکہ اظہار ہمدردی ہو۔ ایک بیوہ کو دیکھو اور اس کا دن میں صبح سے شام تک چالیس پچاس کے ساتھ رونا اور بیان کرنا ظاہر اکوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ بندی خدا کی کس طرح زندہ رہجاتی ہے بجز اس کے کہ اپنی زندگی کی وجہ سے بچ جاتی ہے اور پھر یہ زور شور تین روز اس درجہ کا رہتا ہے کہ العظمت اللہ اور بعد تیجے کے بھی چالیسویں تک اگر چالیس پچاس کا نمبر روزانہ نہیں ہوتا تو دس پندرہ سے کم بھی نہیں کیسی ہی تندرست عورت ہو لیکن بعد چالیسویں کے اگر کوئی دیکھے تو معلوم ہو کہ ناک پکڑے سے دم نکلتا ہے علاوہ حرمت شرعی کے کیا یہ امور اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی اصلاح کے واسطے تمام ادنیٰ و اعلیٰ پوری کوشش کریں بھائیو اگر ایمان کی پرواہ نہیں تو ذرہ جان ہی کا خیال کرلو مرنے والا مرگیا ان زندوں کے مال پر رحم کرو میرے ایک دوست بیان کرتے تھے کہ میرے بھائی صاحب کے انتقال کے بعد چالیس روز میں والدہ کی ایسی کیفیت ہوئی تھی جیسے کوئی پرانا دق کا مریض ہو اور یہ صرف اسی کا نتیجہ تھا کہ برادری کی عورتوں کے ساتھ ہر روز بیس بیس مرتبہ طوعاً و کرہاً رونا پڑتا تھا کھانا کھانے بیٹھے ہیں اور کوئی ڈولی آگئی بس کہاں کا کھانا فوراً جٹا نی بچھا منہ ڈھک لیا دوپہر کو مرکھپ کر ذرا کمر ٹیکی ہے اور کوئی دوسرے مہربان آپہونچیں بس فوراً گریہ شروع ہوگیا یہاں تک کہ رات میں ایک دو بجے اگر کوئی مہمان آتا ہے تو بجائے اس کے کہ سلام دعا ہو بس دروازہ ہی سے رونے کی

آواز سے اپنی آمد کی خبر دی جاتی ہے غرض چالیس روز تک اس کے مقابلہ میں فرض و واجب کی بھی کیا حقیقت ہے۔ بعض عورتیں تو فی الحقیقت ایسی بدحواس ہو جاتی ہیں کہ نماز وغیرہ ان سے چھوٹ جاتی ہے اور جو عالی ہمت پڑھنے والی ہوتی ہیں ان کو نماز کی برکت سے کبھی دس پانچ منٹ کی راحت بھی مل جاتی ہے کیونکہ اگر نماز پڑھنا شروع کر دیا ہے تو کسی کے آنے پر نماز کے ختم تک کام شروع کرنے میں تامل کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی دعا کی نوبت نہیں پہونچی بس سلام پھیرتے ہی منہ بسورنا شروع ہو جاتا ہے۔ غرض کہاں تک کوئی ان مکروہات کو بیان کرے مفصل کیفیت ہر شخص بخوبی جانتا ہے۔ بتلاؤ تو جب علماء ان امور میں اصلاح کی شکایت کرتے ہیں ان کا کیا نفع ہے تمھاری جان کو دنیا و آخرت کے عذاب سے بچاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے جو امور شرعاً ممنوع ہیں اور قابل وعید ہیں ان پر دنیا میں بھی کوئی کم یا زیادہ سزا ضرور ہے نوحہ پر جو عذاب اخروی ہونے والا ہے اگر اس سے قطع نظر کر کے دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ عذاب دنیوی بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن شارع علیہ السلام نے جو طریقہ موت کی یاد کا ارشاد فرمایا ہے اس پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی بلکہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے ساری خرابیں موت کے بھلا دینے ہی کی وجہ سے ہو رہی ہیں۔ حقیقی بھائی ادنیٰ ادنیٰ چیزوں پر کیسے ایک دوسرے کے دشمن جانی ہو جاتے ہیں کہیں تالو پر سر پھوٹ رہے ہیں کہیں آنچک پر تلواریں کھنچ رہی ہیں کیا ممکن کہ چار بزرگوں میں کوئی بات فیصل ہو جائے ہزار ہا روپیہ برباد کیا جاتا ہے اور ہائی کورٹ تک نوبت پہونچتی ہے۔ اگر موت کا ذرا بھی خیال ہوتا تو ہرگز یہ حال نہ ہوتا اگر کوئی فرشتہ ہمارا دنیوی معاملات میں انہماک دیکھ کر آسمان پر جائے اور اس سے فرشتے دریافت کریں کہ دنیا والے کبھی موت کو بھی یاد کرتے ہیں تو وہ ضرور کہے کہ ان کے کسی برتاؤ و انداز سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ابھی تک آپ کو مرنے والا سمجھتے ہیں دیکھو اگر کسی شخص پر کوئی مقدمہ فوجداری کا قائم ہو جائے اور پیشی مقدمہ میں ایک مہینہ کی مہلت بھی ہو لیکن اس کو ہنسنا بولنا سب ناگوار ہوتا ہے اگر کوئی اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میاں تمکو ہنسی سوجھتی ہے یہاں دل کو لگ رہی ہے اس شخص کو تو ایک مہینہ کی مہلت بھی تھی

موت کی تو کچھ بھی مہلت نہیں لیکن باوجود اس کے کسی برتاؤ سے اس کا خوف ظاہر نہیں ہوتا زبانی یہ کہنا کہ ہم کو موت کا خوف ہے ہرگز قابل تصدیق نہیں کیونکہ الیقین ہو الاعتقاد الجازم مع غلبۃ الحال۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ موت کے آنے کا یقین بہت ضعیف ہے اور ساری خرابیاں کی جڑ یہی ہے کہ لوگ موت سے بیخبر ہیں اگر یہ یاد رہے تو سارے حوصلے بجھ جائیں شہوت و غضب کا غلبہ نہ رہے۔ جب دنیوی تکلیف کے اندیشے سے کسی مقدمہ وغیرہ میں ہمارا عزیز ایسا ہوتا تو افسوس خیال ہوتا ہے کیوں ہمارا عیش و آرام تلخ نہ کر دیا بالخصوص بوڑھوں کے لئے بچوں کو توقع ہے کہ ہم جوان ہوں گے جوانوں کو یہ کہ ہم بوڑھے ہوں گے لیکن افسوس یہ بوڑھے کس خیال میں ہیں کیا آپ کو بچپن اور جوانی کی امید ہے دنیوی امور میں سب سے زیادہ چاق و چوبند یہ بوڑھے ہی ہوتے ہیں۔ انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے اوس کے ساتھ حرص مال بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اس میں اولاد کی بہبودی کی بڑی فکر ہوتی ہے یہ خواہش ہوتی ہے کہ جہاں سے ہو سمیٹ سمیٹ کر ان کے واسطے چھوڑ جائیے اولاد کی فکر میں اپنی اوقات ضائع کرنا اور زندگی تلخ کرنا بڑی نادانی کی بات ہے تمہارا آرام و تکلیف تو تمہارے اعمال پر موقوف ہے اگر اولاد کے واسطے دین برباد کیا اور ان کے عیش کا سامان مہیا کیا تو ان کا عیش تمہارے کس کام آئیگا یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ ایک پیسہ بھی تمہارے واسطے خرچ کریں اگر یہ خیال ہو کہ ہمارے واسطے تیجہ اور دسواں کیا جائیگا تو یاد رکھو کہ اس سے تم کو کچھ بھی نفع نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ امور برادری کے خوف سے کئے جاتے ہیں اور جب خرابی نیت سے خود کوئی ثواب نہیں پاتے تو تم کو کیا بخشیں گے۔ اس پر تعجب نہیں ہو سکتا کہ کلمہ و قرآن پڑھا جائے اور ثواب کچھ نہ ہو دیکھو خود نماز جو لوگوں کے دکھلانے کو پڑھی جائے مقبول نہیں ہوتی بلکہ دوزخ میں لے جانے والی ہے جیسا کہ فرمایا ہے شیخ شیرازیؒ نے ؎ شعر

کلید در دوزخ است آں نماز ؛ که در چشم مردم گذاری دراز

تیجہ میں جو لوگ ہوتے ہیں وہ دو قسم سے خالی نہیں یا تو برادری کے خوف سے حاضر ہوتے ہیں کہ اگر ہم نہ جائیں گے تو ہمارے یہاں کون آئیگا۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر کچھ بھی نہ پڑھے اور عذر بیان کر کے چلا جائے تو کچھ شکایت نہیں ہوتی اور اگر کوئی گھر بیٹھے سارا قرآن ختم کر کر مردہ کو بخشدے ہرگز شکایت رفع نہیں ہوتی پھر ظاہر ہے جو لوگ اس برادری کی شکایت رفع کرنے کی نیت سے

آئے ہیں ان کے پڑھنے پڑھانے کا کیا ثواب ہو سکتا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو پیسوں اور چنوں کے واسطے آئے ہیں ان کی برائی یہی کافی ہے کہ ہمیشہ تمہارا مرنا مناتے ہیں جب کوئی کم تا پیتا بیمار ہوتا ہے یہ لوگ اس کی موت کا انتظار کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں جب ان کی وسعت اور فراغت اسی پر منحصر ہے یہ بھی صاف ظاہر ہے جو پیسوں اور چنوں کے واسطے آئے ہیں ان کے کلمہ کلام کا کیا ثواب ہوگا نہ دینے والوں کو نفع نہ لینے والے کو۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے کلمہ سے کیا خوش ہونگے جو اس کے اسم مقدس کو ایک ایک چنے کے عوض میں بیچتے ہیں اللہ تعالیٰ کا نام دونوں عالم کی قیمت میں بھی ارزاں ہے۔ شعر

قیمت ہر دو عالم گفتیٔ — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حدیث شریف میں مذکور ہے کہ قیامت میں ایک گنہگار کے ۹۹ دفتر اعمال بد کے کھولے جائیں گے اور ہر دفتر اتنا بڑا ہوگا جہاں تک نظر پہنچے میزان رکھی ہوگی اور پلہ برائیوں کا جھک جائے گا وہ شخص نہایت مایوس ہوگا اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے شخص ہم تجھ پر ظلم نہیں کریں گے تیری ایک نیکی ہمارے پاس باقی ہے وہ عرض کرے گا اے باری تعالیٰ ان ۹۹ دفتروں کے سامنے ایک نیکی کیا کام دے گی حکم ہوگا تو اس کو لے تو جا اور وزن کرا وہ پرچہ لیکر میزان پر جائے گا اور وزن کرائیگا فوراً پلہ نیکیوں کا وزنی ہو کر جھک جائیگا اس پرچہ میں یہ کلمہ شہادت ہی لکھا ہوگا یہ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت ہے کہ قیامت رکی ہوئی ہے لاتقوم القیامۃ حتیٰ یقال اللہ اللہ اور دنیا میں بھی اس قاعدہ کی پابندی ہے جب رعایا باغی ہو جاتی ہے ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور عام سزا کا حکم دیا جاتا ہے اسی طرح سے صور پھونکا جائیگا۔ گویا اللہ کا نام تمام آسمان وزمین کی جان ہے ایسے عزیز نام کو ایک ایک چنے کی عوض میں بیچنا کیسی حماقت اور گستاخی ہے۔ اگر کوئی قرآن مجید کو اوپلے کے عوض میں بیچنے لگے تو کیا یہ کسی مسلمان کو ناگوار نہ ہوگا لیکن حقیقت میں یہ دونوں کام یکساں ہیں کیونکہ روپیہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے مقابلہ میں اوپلے سے بھی حقیر ہے۔ اشعار

اللہ اللہ میکنی از بہر نان ؛ بے طمع پیش آ واللہ را بخواں + کہ گہے اللہ دُغے میزنی ؛ از برائے مسکہ دوغے میزنی
خلق را گیرم کہ بفریبی تمام ؛ در غلط اندازی تا ہر خاص و عام + کارہا با خلق آری جملہ راست ؛ با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن ؛ رایت اخلاص و صدق افراشتن + اگر کوئی تمہارے سامنے پاخانہ پھرے اور پھر بغیر وضو کئے ہوئے نماز شروع کر دے تو جیسے تم کو اس پر غصہ آئیگا اور منع کرو گے

ایسے ہی علما جب لڑکے قاعدہ قرآن پڑھتے دیکھتے ہیں تو منع کرتے ہیں اس پر قرآن شریف کی تعلیم کی اجرت کو قیاس نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ تو ضرورۃً اشاعت قرآن کے لیے جائز ہے اور یہاں ثواب مقصود ہے اور ثواب کی قیمت دونوں عالم بھی نہیں ہوسکتے لہذا تعلیم پر حق الخدمت کو تیجے کی قرآن خوانی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اسی طرح ختم تراویح کے دن جو حافظ کو چندہ اکٹھا کر کر دیا جاتا ہے وہ بھی ناجائز ہے جہاں مشروط یا معروف ہو کیونکہ روپیہ کی طمع سے قرآن پڑھنا ہے ایسے پڑھنے کا ثواب کیا ہوسکتا ہے یہ غنیمت ہو اگر اس پر مواخذہ نہ ہو اور حافظ کا محض روپیہ کے واسطے پڑھنا ظاہر ہے کیونکہ ۱۵ رمضان کو اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ کچھ نہ ملے گا تو حافظ صاحب ہرگز نہ پڑھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو بھی محنت کی عوض میں دیا جاتا ہے تو کسی چکی پیسنے والی کو بلا لیا ہوتا اس سے نصف بلکہ چوتھائی پر راضی ہو جاتی اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب بغیر اس کے کوئی حافظ نہیں ملتا تو میں یہ کہوں گا کہ ایسے حافظوں سے قرآن مجید سننے سے یہ بہتر ہے کہ کوئی الم تر کیف سے تراویح پڑھا دیا کرے یا اول تو دین فروشی ہے اور دوسرے لوگوں پر دباؤ ڈال کر چندہ لیا جاتا ہے چندہ کی فہرست مجمع میں پیش کی جاتی ہے دوسروں کی دیکھا دیکھی کچھ لکھنا ہی پڑتا ہے بعد کو غیرت دلائی جاتی ہے میاں یہ تو تمہاری حیثیت کے خلاف ہے کم سے کم دو چند تو کر دیجیے طوعاً و کرہاً جب چاروں طرف سے زور ڈالا جاتا ہے بیچارہ کو بڑھانا پڑتا ہے۔ یہ رقم قطعاً حرام ہوتی ہے کیونکہ حلت عطایا میں طیب خاطر شرط ہے اول تو یہ وہ موقع تھا کہ خوشی سے دیا جاتا تب بھی لینا جائز نہ ہوتا اور اس پر اور ایک امر موجب حرمت مزید ہو گیا جب معلوم ہوا کہ ایسے کاموں سے میت کو ثواب نہیں ہوتا تو کس امید پر انسان اولاد کے واسطے اپنا ایمان خراب کرے جبکہ مرنے کے بعد ان سے کچھ بھی نفع نہ پہنچے اور اس کے اعمال اس پر سوار ہو جاویں ان کی قسمت میں اگر عیش ہے تو عیش ملیگا اگر مصیبت ہے مصیبت پہونچے گی غرض ان کی کیفیت کے بعد مرنے کے تم کو کچھ خبر نہ ہوگی۔ بعضے بڑھیوں کا مسئلہ ہے کہ اولاد اگر آرام سے ہوگی تو میری گور ٹھنڈی رہیگی یہ خبر نہیں کہ ٹھنڈک وہاں کچھ کام نہیں آسکتی۔ اولاد کا عیش و آرام قبر کے سانپ بچھوؤں اور آگ سے کچھ بھی ٹھنڈک نہیں پہونچا سکتا اگر مفید ہے تو اپنا عمل ہے اور موت کا یاد رکھنا جیسا کہ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثروا ذکر ھادم اللذات کیا اس سے یہ مراد ہے کہ صرف موت کا نام لے لیا کرے بلکہ اگر اول سے آخر تک ساری حالت پیش آمدنی میں میں

مرتبہ غور کرلیا کرے تو شہید کا ثواب پائے بعض علماء نے لکھا ہے کہ موت کی تکلیف اس سے زیادہ ہے کہ چھ سو تلواریں ایک دم سے لگائی جائیں۔ ایک بال پکڑ کر دیکھو سارے جسم کو اس کیا نسبت ہے جب بال کے اکھڑنے سے ایسی تکلیف ہوتی ہے تو خیال میں آسکتا ہے کہ تمام جسم سے روح نکلنے میں کیسی تکلیف ہوتی ہوگی اور کوئی عذاب بھی نہ ہو تو صرف یہی تکلیف دنیا کے عیش تلخ کرنے کو کافی ہے۔ حضرت ابراہیم ادھمؒ کے ترک سلطنت کے بعد ایک وزیر آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ نے ہم لوگوں کا دل توڑ دیا اگر سلطنت کے ساتھ درویشی کو جمع کیا جاتا تو کیا مضائقہ تھا آپ نے فرمایا بھائی فکر کے ساتھ کوئی کام نہیں ہوسکتا اگر تم مجھ کو ایک فکر سے چھوڑا سکو تو میں سلطنت کرلے کا وعدہ کرتا ہوں۔ وزیر نے خیال کیا کوئی دنیوی فکر ہوگی جس میں ہم لوگوں کی کوشش کارآمد ہوگی بہت خوشی سے کہا حضرت فرمایئے کیا فکر ہے آپنے فرمایا اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے فریقٌ فی الجنۃ و فریق فی السعیر مجھے اس امر کی فکر ہے کہ میں کس فریق میں ہوں گا۔ وزیر سنکر متحیر ہوگیا اور کچھ جواب نہ دیسکا مجملہ معتقدات کے منکر نکیر کا قبر میں آنا اور مردہ سے سوال کرنا ہے اگر جواب معقول نہیں ملتا تو نہایت سختی کرتے ہیں سر کو مونگری سے کوٹتے ہیں وہ ایسی مونگری ہے اگر پہاڑ پر پڑے تو ریزہ ریزہ کردے ایک اور فرشتہ اندھا اور بہرہ عذاب کے لئے مسلط ہوتا ہے اور قیامت تک عذاب ہوتا رہتا ہے پھر اس کا خیال کرے کہ قیامت میں زمین مثل گرم تانبے کے ہوگی سب بیقرار ہونگے گرمی آفتاب سے بھیجے مثل ہانڈیوں کے پکتے ہوں گے کسی کو قرار و چین نہ ہوگا جب یہ واقعات پیش آنے والے ہیں تو کس خواب غفلت میں پڑے سو رہے ہو کیا معافی کا پروانہ آگیا ہے اگر اعمال صالحہ سے امید نجات ہے تو معاصی کی وجہ سے احتمال مواخذہ بھی ہے نہ معلوم نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں آئے یا بائیں میں۔ ایک بزرگ نے کہا ہے قیامت میں جس نے جو گناہ کیا ہوگا اس کی صورت نظر آئے گی مثلاً بدکار بدکاری کرتا ہوا نظر آئیگا چور چوری کرتا ہوا معلوم ہوگا۔ عقائد میں سے ایک یہ ہے کہ پل صراط پر گذر ہوگا ابرار سلامتی سے گذر جائیں گے کفار و فاسق کٹ کٹ کر گریں گے۔ شعر

چوں چنیں کارا ست اندر رہ ترا خواب چوں می آید اے ابلہ ترا

یہ مراد نہیں ہے کہ سومت بلکہ یہ کہ اس سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے اس تفصیل سے جو موت کو یاد کریگا

اور بیس مرتبہ اس سے گناہ کبیرہ صادر ہو سکتے ہیں وہ تو دلی کامل ہو جائے گا۔ حکایت مشہور ہے کہ ایک بادشاہ کسی درویش سے ملا کرتے تھے ایک مرتبہ جب چلنے لگے تو فقیر نے ایک گولی منگا کر ان کو دی بادشاہ نے درویش کا تبرک سمجھ کر اس کو کھالیا تھوری دیر کے بعد اس قدر غلبہ شہوت ہوا کہ بے تاب ہو گئے تمام بیبیوں اور لونڈیوں سے صحبت کی لیکن پھر بھی چین نہ آیا دل میں خیال کیا کہ مجھ کو ایک گولی سے یہ حالت پیش آئی شاہ صاحب دن میں کئی گولیاں کھاتے ہیں معلوم ہوتا ہے بڑے بدکار ہوں گے درویش کو کشف سے بادشاہ کا خطرہ معلوم ہو گیا بعد کو جب بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو درویش نے کہا افسوس ہے کہ ایک چلہ میں شاید تمہارا انتقال ہو جائے سنتے ہی سناٹا نکل گیا فوراً تخت سلطنت چھوڑ چھاڑ کر گوشۂ عزلت اختیار کر لیا لڑکے کو ولیعہد بنایا چلتے وقت درویش نے بہت سی گولیاں دیدی تھیں اور کہا تھا صبح شام ان میں سے ایک ایک کھالیا کرنا عبادت کی قوت رہے گی چنانچہ یہ روز ان میں سے دو گولیاں استعمال کرتے رہے لیکن خبر بھی نہ ہوئی ایک دن کم ہوا اور دوسرا گذرا یہاں تک کہ چالیسواں دن آپہونچا لیکن موت کے متعلق آثار نہ معلوم ہوئے چالیس دن جب پورے گذر گئے تو بادشاہ درویش کے پاس پھر حاضر ہوئے اور مدت گذرنے اور موت کے نہ آنے کا حال بیان کیا درویش نے کہا یہ تمہارے خطرہ کا جواب تھا کہ یہ فقیر بڑا بدکار ہو گا۔ تمہیں تو چالیس دن کی مہلت تھی پھر بھی گولیوں سے تم پر کچھ اثر نہ ہوا مجھ کو تو ایک ساعت کا بھی اطمینان نہیں۔ موت کی یاد میں یہ بھی داخل ہے کہ معاملات کو صاف رکھے اپنے ذمہ میں لوگوں کے جو حقوق ہوں ان کی اطلاع اپنے عزیزوں کو کرتا رہے تاکہ اگر کسی کو رحم آجائے تو اس کے بعد اس کو دین سے بری کرا دے صاحب قرض کی روح جنت میں نہیں جاتی بلکہ جب تک قرض ادا نہ ہو معلق رہتی ہے افسوس ہے کہ جن ماں باپ نے اس کے واسطے اپنے ایمان کو فدا کر دیا ان کی روح کو یہ معلق رکھتا ہے درمختار میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک ایک دانگ کے عوض میں جو دو تین پیسہ کا ہوتا ہے سات سو نمازیں دلائی جائیں گی آجکل تو لوگ اس کو بھی لازمۂ ریاست سمجھتے ہیں کہ کسی کا حق ٹال کر دیں مطل الغنی ظلم اجارہ میں قبل شروع کرنے کام کے جانبین کی رضامندی شرط ہے بعد کو اپنی تجویز سے دیدینا حرام ہے بلکہ حکام کو بازار کے نرخ میں دست اندازی شرعاً جائز نہیں ہے مالک کو اختیار ہے چاہے

جس نرخ سے فروخت کرے نرخ تو اللہ تعالیٰ ہی کی جانب ہے ان اللہ ھو القابض الباسط حقوق عباد ایسی سخت چیز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت میں سب لوگوں کو جمع کر کر فرمایا کہ لوگو جس کسی کا مجھ پر کوئی حق ہو وہ آج مجھ سے لیلے میں نہیں چاہتا ہوں کہ قیامت میں مجھ پر دارو گیر ہو اگرچہ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کسی کا حق مار لیا لیکن حقیقت میں بہت ہی کم ظلم کا مال ہضم ہوتا ہے کسی پر کوئی مقدمہ قائم ہو گیا ہزاروں کے وارے نیارے ہو گئے کسی کو کوئی بیماری ایسی لگ جاتی ہے کہ دوا و ڈاکٹروں کی فیس میں گھر بک جاتا ہے کیا خوب کہا ہے۔ شعر

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از در حق بہر استقبال می آید

انچہ برتو آید از ظلمات دغم آں ز بیباکی و گستاخی است ہم

بعض مسلمان سود میں مبتلا ہیں بہت کم ایسے ہوں گے جو سود دینے سے بچے ہونگے جائداد کو رہن کرنے میں سود دیتے ہیں۔ بعض اوقات کسی نئی جائداد پر مائل ہو کر مکان کو و جائداد کو رہن کر دیتے ہیں اور برسوں سود دیتے رہتے ہیں جب سود دینے کی برائی سنتے ہیں تو اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں تو بہ نہیں کرتے ایسے لوگوں کے حال سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ تو موت کے خیال سے کوسوں بھاگتے ہوں گے اگر موت کو قریب و یقینی سمجھتے تو کیوں اس طول امل و بلائے عظیم میں مبتلا ہوتے ایسے لوگوں کا بجز اس کے کوئی علاج نہیں کہ اس جائداد کو فوراً بیچکر قرضہ سے اپنی جان کو آزاد کریں ورنہ سود کا قصہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا اگر کہیں سے روپیہ برسنے کی امید تھی تو خریداری ہی کو اتنے عرصہ تک ملتوی کرنا چاہئے تھا جہاں تک تجربہ ہوا معلوم ہوا ہے کہ ایسے لوگ اکثر اپنی پہلی جائداد کو بھی کھو بیٹھتے ہیں سود لینے والے کو ستر گناہ ہوتے ہیں ان میں سے ادنیٰ یہ ہے کہ اپنی ماں سے برا کام کیا اور باقی ۶۹ اس سے زیادہ ہیں اور دینا اور لینا برابر ہے بقولہ علیہ السلام وھم سواءٌ اگر مہاجن آپس میں یہ تجویز کریں کہ کسی مسلمان کو ہرگز روپیہ نہ دیا جائے تو کارروائی کی ہزاروں تجویزیں سمجھ میں آجاویں لیکن دین کی تو فکر ہی نہیں سوچے بیماری بلا اگر چھوڑنے کا ارادہ کیا جائے تو سو باتیں نکل آئیں لیکن بعضے ان میں سے خلاف وضع ہوں گی پھر وضع ہی کو اختیار کر لو یا دین کو دنیا میں کوئی کسی پر عاشق ہو جاتا ہے تو کیا کیا ذلت گوارا کرتا ہے بر سر بازار جوتیاں کھانا گوارا ہوتی ہیں لیکن دوست کی گلی نہیں چھوٹتی اللہ تعالےٰ جوتیاں بھی نہیں لگاتے

محبت اور وضع داری جمع نہیں ہوسکتیں۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

صاحبزادہ کی شادی میں اگر کہیں قرض نہ ملے تو آخری تجویز یہی ہوتی ہے کہ زمین زیور بیچ کر کام کیا جاوے اور یہ سب بلا ضرورت برادری کی خوشی کے واسطے کیا جاتا ہے اللہ تعالےٰ کی رضا مندی کے واسطے اگر یہ کام کیا جائے تو کیا بعید ہے جب ظاہراً کوئی امید ادائیگی کی بالفعل نہیں ہے تو کس امید پر زیور مکان رہن کرتے ہو کوئی بزرگوں کے پاس آکر کہتا ہے صاحب ایسا تعویذ یا وظیفہ بتلایئے کہ قرض ادا ہو جائے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کوئی کہے صاحب ایسا تعویذ دیجئے کہ بیٹا ہو جائے لیکن نکاح نہ کروں گا تو پھر بیٹا کیا منہ سے جھڑے گا۔

چند امور ایسے عرض کرتا ہوں جن کا مرنے کے وقت خیال رکھنا چاہیئے ہماری حالت پر افسوس ہے کہ لوگوں کو مرنا بھی نہیں آتا۔ صحابہ سب لکھے پڑھے نہ تھے لیکن سمجھدار تھے یہ کیا مبارک شریعت ہے جس میں مرنے کے بھی قاعدے بتلائے گئے ہیں جب کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے واسطے جانا مسنون ہے کوئی ایسی بات نہ کہے جس سے مریض کو کسی قسم کا یاس ہو بلکہ امید کی بات کہے۔ اکثر عورتیں مریض کے پاس بیٹھ کر ایسی نا امیدی کے کلمات کہتی ہیں جس سے مریض کی دل شکنی ہوتی ہے خدا ہی کرے گا جو یہ بچ جائیگا۔ شارع علیہ السلام نے جانوروں پر بھی رحم فرمایا اور حکم دیا کہ ایک جانور کے سامنے دوسرا نہ ذبح کیا جائے تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو بھلا اتنا تو خیال کرنا چاہیئے کہ اس کا دل نہ دکھے جب ایسی نا امیدی کے کلمے اس کے سامنے کہے جائیں گے تو مریض کو ضرور اپنی جان کا اندیشہ ہو جائیگا۔ بلکہ ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہیئں جس سے اس کو معلوم ہو کہ اب مرض بہت ہی خفیف ہے اور میں جلد اچھا ہو جاؤں گا۔

مسلمان کی دلداری بڑی عبادت ہے ہر امر میں اس کا لحاظ چاہیئے اس کی نسبت ایک کام کی بات عرض کرتا ہوں جس سے یہ امر سہل ہو جائے۔ دیکھو ہر شخص جانتا ہے کہ اولیا اللہ کی تعظیم ضروری ہے اور انھیں مسلمانوں میں اولیا بھی ہیں کسی کے ماتھے پر تو لکھا ہی نہیں ہر شخص کی نسبت یہی گمان کرے کہ شاید یہ اللہ کا ولی ہو یا آئندہ ہو جائے جب ایسا خیال کرے تو کیوں کسی کے دل کو دکھائے المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ۔ جب کسی مریض سے مایوسی ہو جائے اور خود اس کی بھی توقع زیست نہ رہے تو آخری وقت میں ان باتوں کا خیال رہے۔ اس کے سامنے دنیا کی بات نہ کہی جائے کوئی بات ایسی نہ کہی جائے جس سے اس کی توجہ الی الحق میں فرق آوے جیسا کہ رواج ہے ایک طرف بی بی کھڑی کہہ رہی ہے مجھے کس پر چھوڑ چلے۔ کبھی بچوں کو اس کے سامنے لایا جاتا ہے تھوڑا سا وقت کلمہ کلام میں صرف کرتا وہ پیار و محبت میں جاتا ہے اس بات کی کوشش چاہیئے کہ خاتمہ تو خیر پر ہو جائے خود کسی بچہ وغیرہ کو سامنے مت لاؤ اگر دیکھنا چاہے تو فوراً دکھلا دو تاکہ اس کے خیال سے بھی جلد نجات ہو۔ اس کے سامنے اللہ کا نام لو کلمہ پڑھو توبہ استغفار پکار پکار کر کرو لیکن اس سے مت کہو اس مضمون کو اردو میں بھی کہو کہ اے اللہ میرے گناہ معاف فرما تاکہ وہ بھی سن کر کہنے لگے قرآن مجید خاص کر لیسین شریف قریب پڑھی جائے۔ آجکل اس سورت سے جاہلوں کو بڑی وحشت ہوتی ہے بعضے برا مان جاتے ہیں اور نعوذ باللہ نا مبارک سمجھتے ہیں۔

اس پر ایک قصہ یاد آیا دہلی میں ایک ڈوم تراویح میں آتا تھا حافظ صاحب سے کہہ رکھا تھا کہ جس دن وہ سورت آوے جو مُردوں پر پڑھی جاتی ہے مجھے خبر کر دینا تاکہ میں اس روز نہ آؤں لوگ اس کو مذاق سمجھے ایک روز پوچھنے لگا حافظ صاحب وہ سورت کب آجائیگی انھوں نے کہا وہ تو رات پڑھی گئی سنتے ہی نہایت غمگین ہوا اٹھ کر چلا گیا دوست آشناؤں سے ملا یہاں تک کہ تیسرے روز مر گیا۔ یہ سورت اس وقت کے واسطے اس لئے مقرر فرمائی گئی ہے کہ اس میں بعث و نشر کا ذکر ہے قیامت کے حالات ہیں اور آخر میں مبارک الفاظ بھی سبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون ط نہایت مناسب ہیں تاکہ اس کے عقیدے تازے ہو جادیں۔

(۳) جنت کا ذکر کرے اور دوزخ کا ذکر مردہ کے سامنے نہ کیا جائے اس میں ایک نکتہ ہے ایمان کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں خوف و امید۔ خوف اس غرض سے کہ گناہوں کو چھوڑے اور اعمال صالحہ کی طرف متوجہ رہے۔ مرتے وقت اعمال کا موقع نہیں ڈرانے سے پھر کیا نتیجہ ہو سکتا ہے بجز اس کے کہ ناامید ہو کر بے ایمان مرے سبحان اللہ یہ شریعت کیسی معقول ہے اگر غور کیا جائے تو سب حکمتیں سمجھ میں آجائیں۔

(۴) قریب مرتے کے منہ قبلہ کی طرف کر دیں۔ اگر مردہ کے منہ سے کوئی کلمہ کفر کا نکلا ہو یا کلمہ سے انکار کیا ہو تب بھی غیبت نہ کریں کیونکہ وہ معاف ہے۔ جب بیماری میں معذور تھا تو اب تو بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیئے اور قلب کی ہم کو خبر نہیں ہے۔ حضرت مرشدی حاجی صاحبؒ بیان فرماتے تھے کہ لوہاری میں ایک بزرگ تھے جب وہ مرنے لگے تو لوگوں نے کہا حضرت کلمہ پڑھئے آپ نے منہ پھیر لیا۔ پھر کہا گیا۔ پھر آپ نے منہ پھیر لیا لوگوں کو نہایت حیرت ہوئی دل میں کہنے لگے اب کیا امید ہے کہ جب ایسا شیخ کامل کافر ہو کر مرے۔ میانجی نور محمد صاحب تشریف لائے پوچھا خانصاحب کیسے ہو کہنے لگے الحمدللہ اور کہا حضرت ان لوگوں سے فرما دیجئے کہ مجھ کو دق نہ کریں یہ مجھ کو مسمیٰ سے اسم کی طرف لاتے ہیں۔ شعر

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ
پائے بوسی اندراں دم شرم گاہ

جب مشاہدہ ہو گیا پھر اسم کی کیا ضرورت ہے ایسے مقام پر تو یہ تنزل ہے۔ اگر موت میں سختی ہو اس سے بھی بدگمانی نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بعض روایات میں آیا ہے جب کسی بندہ کا درجہ بڑھانا منظور ہوتا ہے اور اس کے گناہ بہت ہوتے ہیں سکرات کی تکالیف میں مبتلا کیا جاتا ہے جس سے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے اور دنیا سے پاک و صاف ہو کر جاتا ہے ساری خرابیاں جہالت کی ہیں اگر علماء کی صحبت اختیار کریں تو ضروری باتیں سب معلوم ہو جادیں لیکن لوگوں کو تو ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو مولوی صاحب کچھ کہہ بیٹھیں میاں تمہاری

صورت خلاف شرع ہے، پاجامہ خلاف سنت ہے برخلاف اس کے اگر کوئی طبیب کہدے کہ میاں تم پر سوداویت کا غلبہ معلوم ہوتا ہے جلد اس کا علاج کرلو ایسا نہ ہو کہ مرض بڑھ جائے تو اس کو بڑی شفقت سمجھتے ہیں افسوس ایمان کو بدن کی برابر بھی عزیز نہیں رکھتے اگر ان لوگوں کو جسم کی برابر بھی ایمان کی محبت ہوتی تو مولویوں کی نصیحت پر برا نہ مانتے اوپر کی مثال سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ مردہ پر تکالیف وغیرہ دیکھ بدگمانی نہ کریں بعض اوقات اولیاء اللہ کو خود اپنا حال نہیں معلوم ہوتا کہ میں کس درجہ کا ہوں اس میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کسی نوکر کی خدمت تم کو پسند ہوتی ہے اور اس کو اپنے دل میں بہت محبوب وعزیز سمجھتے ہو لیکن اس کے سامنے اپنی توجہ ومحبت کا اظہار نہیں کرتے ایسا نہ ہو کہ گستاخ ہوجائے اور کام میں بے پروائی کرنے لگے یہی معاملہ بعض لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایک بزرگ نجم الدینؒ صاحب تھے ان کو اس کی نہایت تمنا والتجا تھی کہ کسی طرح یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا کیا مقام ہے ایک مرتبہ ان کے ایک مرید ان کی اجازت سے کسی دوسرے بزرگ کی زیارت کو گئے انھوں نے دریافت کیا کہو بھائی تمھارے یہودی پیر اچھے ہیں انھوں نے اس وقت بہت ضبط کیا جب واپس آئے تو پیر نے پوچھا کہ وہاں گئے تھے کہا حضرت گیا تو تھا مگر وہ تو بڑے ہی گستاخ وبے ہودہ معلوم ہوتے ہیں، انھوں نے کہا کیا معاملہ ہوا کہنے لگے حضرت آپ کی شان میں ایسی گستاخی کی جس سے مجھ کو بہت رنج ہوا۔ پیر نے کہا کیا کہا اصرار کے بعد کہا حضرت انھوں نے آپ کو اس طرح پوچھا کہ تمھارے یہودی پیر اچھے ہیں۔ پیر کو یہ سنتے ہی حالت وجد طاری ہوگئی۔ یہ ایک رمز تھا دونوں بزرگوں کے درمیان انھوں نے یہ خبر کی تھی کہ تم کو نسبت موسوی حاصل ہے لیکن یہ نسبتیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں آپ ہی کی ذات مبارک سے فیض آیا ہے بعض اوقات جن کی یہ نسبت ہوتی ہے موسیٰ علیہ السّلام کا نام لے کر مرتے ہیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

ایک اس بات کا خیال چاہیئے کہ بعد مرنے کے اس کی تعریف کریں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک جنازہ گذرا لوگوں نے اس کی تعریف کی آپؐ نے فرمایا وجبت دوسرا ایک اور جنازہ گذرا تو لوگوں نے اس کی برائی کی آپؐ نے فرمایا وجبت صحابہ نے عرض کیا حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے آپ کی کیا مراد تھی۔ آپ نے فرمایا جسکی تمنے تعریف کی اس کے واسطے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تمنے برائی کی اس پر دوزخ واجب ہوگئی انتم شہداء اللہ فی الارض۔

مکہ معظمہ میں اب بھی یہ دستور ہے جب بازار میں سے کوئی جنازہ نکلتا ہے سب دکاندار کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں بڑا اچھا آدمی تھا۔ آخر معدن دین اور معدن الاسلام ہے۔ یہاں لوگ کفار کی رسموں کی تقلید کرتے ہیں اور ہر امر میں ان سے فیض حاصل کرتے ہیں ہندوؤں کی رسمیں ہندوؤں کے عقیدے اختیار کرتے ہیں۔ چیچک میں گوشت سے پرہیز کرتے ہیں۔ بعض جگہ شادی کی تاریخیں پنڈتوں سے پوچھی جاتی ہیں بعض جگہ لباس ہندوؤں کا استعمال کرتے ہیں۔ بجائے لنگی کے دھوتیاں باندھتے ہیں برتن ہندوؤں کے برتتے ہیں نام ہندوؤں کے سے رکھتے ہیں۔

جو زیادہ تہذیب وتعلیم کے مدعی ہیں وہ اپنی شان کے مناسب نصاریٰ کی وضع اختیار کرتے ہیں کھانے میں چھری کانٹے استعمال کئے جاتے ہیں گویا اپنے انجام کی خبر دیتے ہیں کہ ہم چھریوں اور کانٹوں کے عذاب کے مستحق ہیں۔ لباس میں کوٹ پتلون کو پسند کرتے ہیں۔ ایسے ایک شخص ایک مرتبہ میرے پاس تشریف لائے تھے کوئی کرسی وغیرہ نہ تھی بہت دیر تک کھڑے رہے جب زیادہ دیر ہوئی اور بیٹھنے پر اصرار ہوا تو ایک دفعہ اپنے بدن کو تول کر بھد سے گرگئے۔ چونکہ اجسام ثقیل کا میلان مرکز کی طرف ہوتا ہے اس وجہ سے گرنا تو سہل ہوا لیکن اٹھنے میں بے چاروں پر مصیبت ہوگئی۔ انگریز جن کا لباس ہے ان کو اس کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مزاج ان کے گرم ہیں اس وجہ سے جنگلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں حفاظت کے لئے کتے رکھتے ہیں بھلا ہم لوگوں کو کتوں کی کیا ضرورت ہے بجز

اس کے کہ ایک شان سمجھی جائے۔ اور حاکم وقت کی تقلید ہے۔

ایک شخص ریل میں کتا لئے ہوئے بیٹھے تھے اور ظاہرا وضع بھی ایسی نہ تھی جس سے مسلمان سمجھے جاتے۔ ایک دوسرے صاحب گئے تو آپ نے شکایت کی کہ آپ نے سنت سلام سے کیوں پرہیز کیا انھوں نے یہ عذر کیا کہ حضرت میں نے مسلمان نہیں سمجھا تھا کہنے لگے کیا اسلام صرف وضع سے معلوم ہوتا ہے اور کہنے لگے میں نے سنا ہے حدیث شریف میں مذکور ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے پس یہ خیال کر کر کہ جب تک کتا میرے پاس رہے گا موت کا فرشتہ نہیں آنے کا میں نے کتا رکھنا اختیار کیا ہے۔ انھوں نے کہا جناب کتے بھی تو مرتے ہیں جو فرشتہ کتے کی جان نکالے گا وہی آپ کے واسطے بھی کافی ہوگا۔ کتے کی موت مرد گے۔

حکایت:۔ ایک بزرگ کے زمانے میں کوئی کفن چور مشہور تھا اور وہ ان کا عقیدت مند بھی تھا۔ ایک روز ان بزرگ نے چور سے کہا کہ تم ہمارا کفن بھی کیوں چھوڑو گے۔ کہنے لگا حضرت آپ کیا فرماتے ہیں آپ کے ساتھ ایسی گستاخی کر کے کہاں رہوں گا۔ درویش نے کہا تمھارا کچھ اعتبار نہیں مجھ کو اطمینان نہیں ہو سکتا۔ چور نے کہا آخر آپ کو کس طرح اطمینان ہو کہا مجھ سے پانچ روپے لے لو۔ اس نے کہا آپ کے اطمینان کے لئے یہی صحیح۔ ایک روز درویش صاحب کا انتقال ہو گیا اور کفن چور اپنی حسب عادت کفن کی فکر میں گئے جب ہی اندر ہاتھ بڑھایا انھوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیوں صاحب یہی ٹھہری تھی۔

اولیاء اللہ سے شاذ و نادر ایسی باتیں وقوع میں آئی ہیں۔ عقیدے نہ خراب کرنے چاہئیں۔ ہاتھ پکڑتے ہی کفن چور فوراً ڈر کر مر گیا۔ بزرگ اپنے ایک خلیفہ کو خواب میں نظر آئے۔ اور یہ سب قصہ بیان کیا کہ وہ

بد عہد آیا تھا دیکھو ہم سے روپیہ بھی لے چکا تھا لیکن پھر بھی اپنی حرکت سے باز آیا۔ ہم نے تو ہنسی سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا لیکن وہ ایسا بزدل تھا کہ مر ہی گیا ہمیں تو محض اسے مطلع کرنا تھا کفن کا کچھ ایسا خیال نہ تھا۔

عریاں ہی دفن کرنا تھا زیر زمیں مجھے
ایک دوستوں نے اور لگادی کفن کی شاخ

خلیفہ کو حکم دیا کہ تم اس کی تجہیز و تکفین کرو اور میرے پاس دفن کرنا۔ مجھے ہاتھ پکڑنے کی لاج ہے میں اس کے واسطے بخشش طلب کروں گا۔ بزرگوں سے تعلق رکھنے کا یہ نفع ہے۔

ایک ضروری امر یہ ہے کہ کفن دفن میں دیر نہ کی جائے اس میں گوشت وپوست بگڑ جانے کا احتمال ہے۔ بدبو سے آب و ہوا کے خراب ہونیکا بھی اندیشہ ہے۔ شریعت نے ان امور پر کیسی توجہ فرمائی ہے۔ کیسی پردہ داری ہے اگر اولاد ماں باپ کو ایسی بری حالت میں اپنی آنکھوں سے دیکھے گی تو اس کو کیسا صدمہ ہوگا یا نفرت ہو جائے گی۔ بعض اوقات کوئی ایسا مادہ ہوتا ہے جس کے اثر سے خراب بدبو آجاتی ہے۔ بعض لاش کو دوسری جگہ لے جاتے ہیں اس خیال سے کہ ماں باپ کے پاس دفن کریں گے، کیا وہاں بھی ماں کا دودھ پیئے گا۔ اگر منع کیا جائے تو سختی سمجھتے ہیں حالانکہ حدیث شریف میں ہے مومن کے واسطے گھر سے اس کی قبر تک فرشتے دعا و استغفار کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ جس قدر زیادہ فاصلہ ہوگا اس کی رحمت کا سامان ہے یہ بڑی نادانی ہے۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مصلحتوں میں دخل دینا اگر کوئی باورچی کھانا پکاتا ہے تو کوئی اس کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ اگر انجینئر کسی اچھے خاصے مکان کے گرانے کا حکم دے تو فوراً اگر لاکھ روپیہ کا مکان ہو گرا دیا جاتا ہے۔ نہ معلوم اللہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کاموں میں دخل

دینے کی کیوں جرات کی جاتی ہے یہ رب کو معلوم ہے کہ انسان کی خلقت خاک ہے اور زمین اس کی اصل ہے اس لئے جہاں تک جلد ممکن ہو سکے اصل میں پہنچا دو۔ کیا بری رسم ہے کہ مردوں کو عورتوں کے اختیار میں چھوڑ دیتے ہیں عورتوں کو ان امور میں ہرگز دخل نہ دیجئے دو ان کو رونے چھیکنے دو۔ عاقل مردوں کو جمع کرو۔ بعد مرنے کے فوراً اہتمام تجہیز و تکفین شروع کر دو۔ جب لیکر چلو تو جلدی چلو حدیث شریف میں ہے مُردوں کو جلد قبر کی طرف لے چلو اگر نیک ہے تو اس کی راحت کی طرف جلد لیجاؤ اگر بد ہے تو جلد اپنی گردنوں کو اس سے چھوڑاؤ۔ اگر اچھا ہے تو انعام واکرام کی طرف لیجاتے ہو جیسے پیاسے کو پانی کے پاس دارالظلمت جس کو سمجھے ہوئے ہو وہ مومن کے لئے بڑی نورانی ہے۔ ایک روز شاہ اکبر کی رات میں آنکھ کھل گئی چراغ گل ہو گیا تھا بہت گھبرائے قبر یاد آئی فوراً چراغ روشن کرایا، بیربل کو بلایا اور کہا کہ اس اندھیرے کو دیکھ کر مجھ کو قبر کی تاریکی یاد آئی جس سے نہایت وحشت ہے۔ خدا نے دشمن کے منہ سے سچی بات نکلوادی اس نے کہا حضور مسلمانوں کی قبر میں اندھیرا ہی نہیں۔ آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ۲۳ سال کی روشنی جیسے آب و تاب کے ساتھ اب تک قائم ہے اسی طرح جب آپ زیر زمین تشریف لے گئے ہیں وہی روشنی زیر زمین موجود ہے جس سے مسلمانوں کی قبریں روشن اور نورانی ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات اس نے خوشامد میں کہی لیکن سچی کہی فی الحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ایسی ہی ہے جس سے قبر میں روشنی ہوتی ہے۔ مُردے سے جب فرشتے پوچھتے ہیں من ھذا الرجل مومن جواب میں کہتا ہے یہ ہمارے نبی علیہ السلام ہیں۔ نور ایمان سے اس جواب کی توفیق ہوتی ہے۔ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک سے اس کی قبر تک پردے اٹھ جاتے ہیں اور یہ صورت مبارک کو دیکھ لیتا ہے۔ اس طرح زیارت کی امید پر مسلمانوں کو موت کی تمنا بھی جائز ہے کسی نے شوق میں کیا خوب کہا ہے ؎

کشتئے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدینساں　　بجنازہ گرنیائی بمزار خواہی آمد

ایک خراب رسم موت کے متعلق یہ ہے کہ موت کی خبر دور دراز تک دی جاتی ہے باہر سے لوگوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے گھر والے کو مہمانداری کی فکر میں ایک دوسری مصیبت پیش آتی ہے آٹے پسوائے جاتے ہیں دالنے دلوائے جاتے ہیں شادی کی طرح جنس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور مہمانوں کی آسائش کی فکر کیجاتی ہے

اس سے سمجھدار شخص خیال کرسکتا ہے کہ اس طرح لوگوں کے آنے سے اس مصیبت زدہ کا غم غلط ہوتا ہے یا اور بلا کا سامنا ہے یتیم و بیوہ کا مال اس طرح برباد ہوتا ہے اس کی اصلاح یوں ہوسکتی ہے کہ عزیز و اقارب کو موت کی اطلاع دی جائے اور ساتھ ہی اس میں یہ بھی لکھدیا جائے کہ تم ہرگز یہاں کا ارادہ نہ کرنا ہمنے مولویوں سے ممانعت سنی ہے جانے والا تو رسم ادا کرنے کو جاتا ہے ورنہ بعد مرجانیکے اس کے ہاں جانے کی اب کیا حاجت ہے اس کو سنکر خوش ہوجائیگا کہ ایک دردسری گئی اگر بالفرض ناراض بھی ہوگا تو مضائقہ نہیں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا رضامند کرنا مقدم ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ مخلوق بھی خوش رہے اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پوری تعمیل ہوجائے۔ اگر اللہ سے کچھ تعلق ہے تو کوئی دقت و دشواری نہیں دنیا میں اگر کوئی کسی پر عاشق ہوجاتا ہے تو اس کی رضا کے مقابلہ میں کسی کے ملامت و فضیحت کی پرواہ نہیں کرتا اگر اس محبت میں یہ امور پیش آویں تو کیا عجب ہے۔ ایک رسم یہ ہے کہ مُردے کے ساتھ اناج وغیرہ قبر پر لیجاتے ہیں اس میں اظہار و نمود کی نیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس نیت کا اظہار کرے تو اس سے پوچھا جائے کہ اگر صرف ایصال ثواب مقصود تھا تو قبر تک لیجانے کے کیا ضرورت تھی ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں تھے جس سے ثواب زیادہ ہوتا صدقات میں سب جانتے ہیں کہ اخفا بہتر ہے۔ باوجود انکار کے منکرین کے دل اپنی نیتوں سے خوب واقف ہوں گے یہ اناج مُردے کے واسطے ہوتا ہے یا برادری کے خوف سے اور ملامت سے بچنے کے لئے اس طریقہ کو بالکل چھوڑ دینا چاہیئے اور ہرگز کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کرنا چاہیئے اس کا ہرگز انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ پہلے کوئی دوسرا کرے۔ برادری کے برا کہنے کا خوف ہے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی کا خیال نہیں ہمت کرو ان رسوم کفار کو چھوڑ دو۔ اس میں تمھارے دین و دنیا کی سلامتی ہے۔ ایصال ثواب سے منع نہیں کیا جاتا لیکن اس میں نیت اظہار و نمود نہ ہو بالخصوص غریبوں کو احکام شریعت پر زیادہ توجہ سے عمل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ امیر تو اپنے غم میں یہاں کچھ عیش بھی اٹھاتے ہیں اور تمھاری سب امیدیں آخرت پر ہی منحصر ہیں تو کیسے افسوس و حسرت کا سبب ہوگا اگر تم اپنی حرکتوں سے آخرت بھی برباد کردو گے۔

تمت

تمہید وعظ عُوْدُ العید

(بضم عین عُود)

بعد الحمد والصلوٰۃ یہ احقر مدعا طراز ہے کہ جس روز اس تقریر کے بیان کرنے کا ارادہ تھا اتفاق سے کوئی ضبط کرنے والا نہ تھا اور باوجود گنجائش زمانہ کے بعض مشاغل کی تنگی تاخیر کی اجازت دیتی نہ تھی اس لئے خود احقر نے اس کو قبل بیان بہت مختصر ضبط کر لیا اور وعظ کے وقت اسی کو کسیقدر بسط کے ساتھ بیان کر دیا اجزاء ما بہ البسط چونکہ اصل تقریر کے درجہ میں ضروری نہ تھا اس لئے ان کا ضبط نہ ہونا مضر نہیں سمجھا گیا بس اُسی تحریر شدہ تقریر کو داخل مواعظ کیا جاتا ہے گو اور وعظوں سے صورۃً یہ بہت چھوٹا ہوگا لیکن مَاقَلَّ وَدَلَّ (کلام مختصر مطالب کثیر) کا مصداق ہونے سے معناً یہ کسی سے چھوٹا نہیں۔

کتبہ: اشرف علی عفی عنہ

۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ۔ مقام تھانہ بھون

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

عُوْدُ العِید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیاٰت اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اما بعد فقد قال اللّٰہ تعالٰی لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا

ضروری اطلاع:۔ خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر کریں۔

هَدٰکُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (ترجمہ) اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ خون ان کا لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اسیطرح اللہ تعالےٰ نے ان جانوروں کو تمہارا زیرِ حکم کردیا ہے تاکہ تم اس بات پر اللہ کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو توفیق دی اور اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔

اس آیت میں کچھ مضمون قربانی کے متعلق مذکور ہے قرب ذی الحجہ کے سبب اس بیان کو اختیار کیا جاتا ہے کہ سامعین ابھی سے اس کے اہتمام کے لئے آمادہ ہوجاویں۔ حاصل اس آیت کا قربانی کی بعضی غایتوں اور حکمتوں کا بیان فرمانا ہے اور گو آیت موقع ذکر حج میں وارد ہے۔ مگر خود ان حکمتوں کے بیان میں تخصیص حج کی مقصود نہیں گو حج کو بھی شامل ہے اور حاصل ان حکمتوں کے دو امر ہیں ایک امر باطنی ایک امر ظاہری امر باطنی نیت تقرب واخلاص ہے جس کو ایک عنوان عام یعنی تقویٰ سے تعبیر فرمایا ہے کہ یہ دونوں یعنی نیت تقرب واخلاص اس کے اعلیٰ شعبوں سے ہیں اور باطنی ہونا اس کا ظاہر ہے مشاہدہ بھی ہے کہ فعل قلب ہے اور حدیث میں بھی ہے اِنَّ التَّقْوٰی هٰهُنَا وَاَشَارَ اِلٰی صَدْرِہٖ (تقویٰ اس جگہ ہے آپ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا) اس کی مقصودیت کو اوپر کی آیتوں میں تعظیم شعائر سے کہ وہ بھی امر مبطن ہے اور اس آیت میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُهَا الخ (اللہ تعالےٰ کے پاس ان کا گوشت نہیں پہنچتا) اور امر ظاہری ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا جس کو اوپر کی آیتوں میں لِیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلٰی مَارَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ (تاکہ وہ ان مخصوص چوپاؤں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے ہیں) سے اور اس آیت میں لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ (تاکہ تم اس بات پر اللہ کی بڑائی بیان کرو) سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ امر ظاہری یعنی ذکر اسم اللہ اور تکبیر اللہ اسی امر باطنی یعنی تعظیم بالقلب و نیت تقرب واخلاص کا ترجمان ہے یعنی اسی لئے موضوع ہے کہ اس سے اُس کا اظہار ہو پس ان میں باہم دال ومدلول کا سا تعلق ہے پس ان میں حقیقی اتحاد اور اعتباری تغایر ہے اس اعتبار سے یہ دونوں حکمتیں ایک ہی حکمت ہیں اور ہر چند کہ ظاہر اً عَلٰی مَاهَدٰکُمْ (اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی) مطلق ہدایت کو شامل ہے لیکن خصوصیت مقام و نقل عن اہل التفسیر سے اس کی تفسیر خاص یہ ہے

عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ مِنَ الَّذِیۡ مِّنَ اللّٰهِ تعالٰی (اس بات پر کہ تم کو اللہ کے لئے ذبح کرنے کی توفیق دی) جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اس بات پر اللہ تعالٰی کی بڑائی کرو یعنی ذبیحہ پر اللہ اکبر کہو کہ اس نے تم کو اس فعل موجب تقرب کی توفیق دی چنانچہ اگر وہ توفیق نہ دیتے تو ممکن ہے کہ بعض کی طرح تم ذبح ہی میں شبہات نکال لیتے یا ذبح کرتے مگر غیر اللہ کے نام یا اللہ ہی کے نام پر ذبح کرتے یا نیت درست نہ ہوتی یا تو بالکل اخلاص نہ ہوتا یا کامل نہ ہوتا جیسے بعض لوگ ردی جانور ذبح کرتے ہیں جو علامت ہے محبت کی کمی کی اور جس قدر محبت کم ہوگی اسی قدر اخلاص کم ہوتا ہے کیونکہ اس میں آمیزش ہوگی غیر کی محبت کی اور اس غیر کو من وجہ مقصود سمجھنے کی مثلاً مال اگر اس کو مقصود نہ ہوتا تو ردی کیوں ڈھونڈھتا غرض یہ عمل اخلاص کے ساتھ کرنا توفیق ہی پر موقوف ہے پس اس توفیق پر تم حق تعالٰی کی دل سے بھی تعظیم کرو اور زبان سے بھی اللہ اکبر کہہ کر اس کا اظہار کرو پس یہ تفسیر ہے عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ (اس بات پر کہ اس نے تم کو توفیق دی) کی اور اسی تعظیم و تکبیر کی مقصودیت کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں دوسرے طرق سے یہ تکبیر مشروع ہوئی ہے چنانچہ ایک تو عید کا دوگانہ مقرر کیا گیا جس میں ایک تو تکبیرات انتقالات مشترک تکبیریں ہیں یعنی جیسی اور نمازوں میں ہیں اور ان کے علاوہ تکبیرات زائدہ بھی ہیں جن کا عدد ائمہ کے نزدیک مختلف ہے امام صاحب کے نزدیک چھ تکبیریں ہیں جو نماز کی گیارہ تکبیروں کے ساتھ مل کر سترہ ہوتی ہیں جو رکعات فرائض کے برابر ہونے سے ایک مہتم بالشان عدد ہے اور دوسرا طریق اس کی مشروعیت کا یہ ہوا کہ یوم عرفہ کے شروع سے ایام تشریق کے خاتمہ تک ہر نماز کے بعد بآواز بلند تکبیر کہی جاتی ہے تیسرا طریق یہ ہے کہ عیدگاہ کے راستہ میں بھی کہی جاتی ہے اور اس تکبیر کے اشتراک سے ذبح اور صلوٰۃ کا جو باہمی تناسب معلوم ہوتا ہے مولانا رومی کے ارشاد میں اس کی تصریح بھی ہے ؎

معنی تکبیر این ست اے امیم	کای خدا پیش تو ما قرباں شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر میکنی	ہمچنیں در ذبح نفس کشتنی
گوی اللہ اکبر و ایں شوم را	سر ببر تا وارہد جاں از عنا
تن چو اسمٰعیل و جاں ہمچو خلیل	کرد جاں تکبیر بر جسم نبیل

ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

ِتکبر کی حقیقت یہ ہے کہ اے خدا تمھارے سامنے قربان ہوتے ہیں ذبح کے وقت تو تکبیر کہتا ہے ایسے ذبح نفس کے وقت جو مارنے کے لائق ہے اللہ اکبر کہو اور اس منحوس کا سر کاٹ اور جان کو تکلیف سے رہائی دے مثل تن اسمٰعیلؑ کے اور جان مانند خلیل اللہؑ کے کی جان نے تکبیر بر رگ جسم پر مانند اسمٰعیلؑ اپنا سر اس محبوب حقیقی کے سامنے رکھ اور ہنسی خوشی اسکی تلوار کے سامنے جان دے) اور اگر لِتُکَبِّرُوا اللہَ (تاکہ اللہ کی بڑائی بیان کرو) کو جو کہ آیت میں مذکور ہے ان سب تکبیرات صلوتیہ وغیر صلوتیہ کے لئے عام لیا جاوے جیسا کہ وَاذْکُرُوا اللہَ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ (اور چند دن اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) میں ان ایام کے سب اذکار و تکبیرات بالاجماع مراد ہیں تو تقریر آیت کی اس طرح ہو گی کہ تسخیر انعام اس لئے ہوئی کہ ہمکو تکبیر مقصود ہے چنانچہ ہم نے دوسرے طرق سے اس تکبیر کو مشروع فرمایا ہے جو علامت ہے اس کے مقصود ہونے کی اور اس تسخیر للذبح سے یہ مقصود حاصل ہوتا ہے اس لئے اس مقصود کی تحصیل کے لئے ہم نے انعام (چوپائے) کو مسخر کر دیا پس آیت ہی مشتمل ہو جاوے گی۔ ان ایام کی تمام طاعات کو قربانی کو بھی تکبیرات غیر صلوتیہ کو بھی اور صلوۃ کو بھی جیسا کہ اس کی ردیف یعنی عید الفطر کی نماز کو بعض مفسرین نے سورۂ بقرہ کی آیت شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ الخ (رمضان کا ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) میں جو ایسا ہی ایک جملہ یعنی لتکبروا اللہ علٰی مَا ھَدٰکُمْ (تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اس نے تم کو توفیق) واقع ہے اس کا مدلول تفسیری کہا ہے پس ادھر ان دونوں یوم کے بعض احکام کا اشتراک اور ادھر ان دونوں میں اس جملہ کا اشتراک اور پھر جملہ سورۂ بقرہ کا مفسر بصلوٰۃ العید ہونا اس جملہ سورۂ حج کے مشتمل بصلوٰۃ العید ہونے کو قریب کئے دیتا ہے پس اس تقریر پر یہ آیت مشتمل ہو گی ان ایام کی دو قسم کی طاعت کو ایک باطن جس کی یہ تعبیریں ہیں نیت تقربؔ اخلاص و تعظیم بالقلب اور ایک ظاہر جس کی یہ تعبیریں ہیں صلوٰۃ، تکبیرات تسمیہ علی الذبیحہ (ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا) پس سامعین کو ان ایام میں دونوں امر کی رعایت ضروری ہے نہ صرف ظاہر پر کفایت کریں کہ قربانی اور نماز کا نام کر لیا اور بس اور نہ مدعیان کاذب کی طرح نرے باطن پر کفایت کریں کہ اخلاص ہی اصل ہے اور ہم

اس اصل کو لئے ہوئے ہیں کہ یہ اعتقاد نری گمراہی ہے وعظ روح الارواح اس جامعیت کی ضرورت کے بیان میں قابل ملاحظہ ہے اور خود قرآن ہی کیسا اس میں واضح ہے کہ آیت میں دونوں امر سے تفصیصاً تعرض ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم سلیم اور دونوں طاعتوں کے جمع کی توفیق دے۔ اب میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام عُودالعید رکھتا ہوں اس لئے کہ عُود کے دو معنے ہیں ایک خوشبوئے خاص دوسرے ساز خاص اور چونکہ یہ تقریر مشتمل ہے دو طاعت کے بیان میں ایک ذبح جس میں اراقۃ دم (خون بہانا) ہوتا ہے اور یہ دم فی سبیل اللہ ہے اور بعض دمار فی سبیل اللہ کی نسبت حدیث میں ہے لَوْنُہٗ لَوْنُ الدَّمِ وَرِیْحُہٗ رِیْحُ الْمِسْکِ (اس کا رنگ خون کا رنگ ہے اور اس کی بو مشک کی بو ہے)۔ پس اس دم ذبیحہ کو بھی مشابہت دم شہید کے سبب حکماً خوشبودار قرار دے کر عود سوختنی سے تشبیہ دی گئی اور عود سے یہ مناسبت سمجھی گئی کہ ایک تو عود کو آگ سے مناسبت ہے اور دم طحال وکبد ولحم ذبیحہ کو بھی بوجہ پکائے جانے کے آگ سے تلبس ہے دوسرے اس عمل کی جزا جنت میں ہے اور جنت میں عُود کا سلگنا حدیثوں میں آیا ہے سو طاعۃ اراقۃ کو تو عُود کے ایک معنے سے مناسبت ہوئی دوسری طاعت یعنی تکبیر صلوٰتیہ یا غیر صلوٰتیہ اس کو جہر کے سبب عود کے دوسرے معنے سے مناسبت ہوئی دوسری طاعت یعنی تکبیر صلوٰتیہ یا غیر صلوٰتیہ اس کو جہر کے سبب عود کے دوسرے معنے سے مناسبت ہے اس لئے ان معانی کی رعایت سے اس کا یہ نام مناسب ہوا نیز لفظی لطافت اس نام میں یہ ہے کہ اس کے متصل والی عید الفطر کے متعلق جو بیان ہوا تھا اس بیان کا نام عَودالعِیْد رکھا گیا ایک حرکت کی تبدیلی کے بعد گویا وہی نام اس کا ہو گیا اور اس میں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ عُود تو آلات محرمہ سے ہے طاعت کو اس سے تشبیہ دینا خلاف ادب ہے بات یہ ہے کہ مجازات واستعارات وتشبیہات میں ایسی تنگی نہیں خود قرآن مجید میں متاع کی مذمت ہے اور حدیث میں امرأۃ صالحۃ (نیک عورت) کو خَیْرُ الْمَتَاعِ (بہتر پونجی) فرمایا گیا ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عید ہی کے متعلق ارشاد ہے لِکُلِّ قَوْمٍ عِیْدٌ وَھٰذَا عِیْدُنَا (ہر قوم کے لئے عید ہے اور ہماری یہ عید ہے)

ع بفتح العین عود ۱۲

ظاہر ہے کہ قوم کفار کی عید بمعنی لہو ولعب ہے تو ذوق لسانی میں ہذا عیدنا کا صاف مدلول یہ ہے کہ ھٰذَا لَعِبُنَا (یہ ہمارا کھیل ہے) تو مجازاً اس کو یوم اللعب کہدیا گیا اور حضرت علیؓ کا قول ہے ؎

اَلسَّیْفُ وَالْخنجر رِیحَانُنَا   اُفٍّ عَلَی النَّرْجِسِ وَالْآسِ

شَرَابُنَا مِنْ دَمِ اَعْدَ ائِنَا   وَکَاسُنَا جُمْجُمَۃُ الرَّاسِ

(تلوار اور خنجر ہمارے پھول ہیں نرگس اور کیلہ پر تف ہے اپنے دشمنوں کا خون پیتے ہیں اور ہمارے پیالے ان کے سروں کی کھوپڑیاں ہیں)

بہرحال یہ کوئی شبہ کی بات نہیں۔

بحمداللہ اصل تقریر تو ختم ہو چکی اب ایک مختصر شبہہ کا رفع کرنا باقی ہے بس پھر مجلس ختم ہے وہ شبہہ بھی ایسے شخص کو ہوگا جس نے میری تقریر حدیث سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ (تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے) کے متعلق جو ابھی پر سول کیرانہ میں ہوئی ہے جس کا نام میں نے سنتُ ابراہیم رکھا ہے سنی ہوگی یا بعد ضبط اوس کی نظر سے گذرے گی اول میں اس تقریر کا خلاصہ عرض کرتا ہوں پھر اس سے جو شبہہ ہو سکتا ہے اس کو ظاہر کروں گا، پھر اس کا جواب دوں گا وہ تقریر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ رضؓ نے عرض کیا مَا ھٰذِہِ الْاُضَاحِیُّ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ یعنی یہ قربانیاں کیا چیز ہیں آپ نے فرمایا سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ (تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے) سو احقر نے اس میں یہ بیان کیا تھا کہ صحابہ نے قربانی کی حقیقت پوچھی تھی آپؐ نے حقیقت بیان فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سنت ہے ابراہیم علیہ السلام کی اور ظاہر ہے کہ سنت سے مراد ہر سنت تو ہے نہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کا ہر فعل تو قربانی نہیں ہے بلکہ مراد سنت خاصہ ہے بس جواب یہ ہوا کہ اَلتَّضْحِیَۃُ سُنَّۃٌ خَاصَّۃٌ لِاِبْرَاھِیْمَ (قربانی سنت خاصہ ابراہیم کی) بس ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو حدیث سے ثابت ہے اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ سنت خاصہ کونسا فعل ہے سو قرآن میں جو اس کے متعلق قصہ مذکور ہے اس میں ان کے دو فعل منقول ہیں۔ ایک ذبح ولد دوسرا ذبح کبش (مینڈھا) فدیہ اور ہر چند کہ سرسری نظر میں

جو آپ کا اخیر فعل ہے یعنی ذبح کبش وہ مصداق معلوم ہوتا ہے سنت ابراھیم کا لیکن اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اس بنا پر کہ اصل مامور بہ ذبح ولد تھا یہی احق ہے سنت کے مصداق ہونیکا پس دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ سنۃ ابراھیم ذبح الولد جو قرآن سے ثابت ہے اور اس کے عدم وقوع کو مانع ارادہ نہ سمجھا جاوے کیونکہ ذبح بمعنے ذبح کردن جو کہ فعل اختیاری ہے وہ تو واقع ہوا البتہ اس کا اثر مطاوع یعنی مذبوح شدن واقع نہیں ہوا تو ذبح پر عدم وقوع کا حکم ہی غلط ہے نیز انبیا علیہم السلام کا خواب وحی ہے اور وحی میں غلط کا احتمال نہیں اور خواب میں إِنِّي أَذْبَحُكَ (میں تم کو ذبح کرتا ہوں) نص ہے تو ضرور ذبح کو واقع کہا جاوے گا پس حیب یہ اس کا مصداق ہوا تو اب عبارت جواب کی یہ ہے کہ التَّضْحِيَةُ ذِبْحُ الْوَلَدِ (قربانی لڑکے کا ذبح کرنا ہے) اور ظاہر ہے کہ یہ حل ظاہراً صحیح نہیں اور تصحیح ضروری ہے کیونکہ دونوں مقدمے صحیح ہیں تو نتیجہ ضرور صحیح ہوگا یعنی التضحیۃ ذبح الولد اور اس کو نتیجہ بالمعنی الاصطلاحی نہ سمجھا جاوے کیونکہ وہ لازم ہوتا ہے صغریٰ اور کبریٰ کو اور یہاں سنۃ ابراھیم ذبح الولد جو مقدمہ ثانیہ ہے کلیہ نہیں مگر مدعا کا اثبات اس کے کبریٰ ہونے کے طور پر کیا بھی نہیں گیا بلکہ تقریر کی توجیہ یہ ہے کہ سنت سے مراد جب ذبح الولد ہے تو جملہ التضحیۃ سنۃ ابراھیم میں بجائے لفظ سنت ابراھیم کے لفظ ذبح الولد رکھدو تو عبارت یہ بن جاوے گی کہ التضحیۃ ذبح الولد اور یہی مدعا تھا، غرض جب دونوں مقدمے صحیح ہیں تو مدعا بھی صحیح ہونا لازم ہے پس اس کو سمجھنا چاہئے یہاں موضوع و محمول میں دو دو احتمال ہونے سے کل چار احتمال اس حل میں ہو سکتے ہیں ایک صورۃ التَّضْحِيَةِ صُورَةُ ذِبْحِ الْوَلَدِ (صورت قربانی لڑکے کا ذبح کرنا ہے) دوسرا رُوحُ التَّضْحِيَةِ رُوحُ ذِبْحِ الْوَلَدِ (روح قربانی ذبح کرنا روح ولد کا ہے) تیسرا صُورَةُ التَّضْحِيَةِ رُوحُ ذِبْحِ الْوَلَدِ (قربانی کی صورت روح ہے ذبح ولد کی) چوتھا رُوحُ التَّضْحِيَةِ صُورَةُ ذِبْحِ الْوَلَدِ (روح قربانی کی ذبح ولد کی صورت ہے) اور بجز ثانی کے سب کا بطلان ظاہر ہے پس ثانی متعین ہو گیا یعنی ان دونوں فعل کی روح اور لب اور مغز ایک ہے مطلب یہ کہ تضحیہ کی جو حقیقت اور مغز ہے وہ وہ ہے جو ذبح ولد کی حقیقت اور مغز ہے اب یہ بات رہ گئی کہ وہ مغز ذبح الولد کا کیا ہے کہ اسی کو روح تضحیہ کہا جاویگا سو وہ مغز ذبح الولد کا بالکل امر وجدانی ہے یعنی وہی امر ہے کہ تصور کیا جاوے کہ اگر بحکم حق میں ولد کو ذبح کر ڈالوں تو

مجھ پر کیا حالت گذرے سو ظاہر ہے کہ سخت ناگواری طبعی گذرے اور ایسی حالت میں اس فعل کو کرڈالنا یہ اس ناگواری طبعی کو برداشت کرلینا ہو پس وہ امر جو گذرے وہ یہ ہوا کہ طبعی ناگواری شدید کو خدا کے حکم سے برداشت کرنا اور اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں فنا نفس کہتے ہیں پس روح ذبح الولد کی فنا نفس ٹھہرا پس یہی فنا نفس روح تضحیہ کی ہوئی پس معنی جملہ التضحیۃ ذبح الولد کے یہ ہوئے کہ روح التضحیۃ روح ذبح الولد پس حقیقت تضحیہ کی فنا نفس ہوا اور میں نے اس پر یہ حکم متفرع کیا تھا کہ جب روح اور حقیقت تضحیہ کی یہ ہے تو خود اس تضحیہ میں اور اس کے متعلق جمیع احکام و اعمال میں نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے بالکل احکام شرعیہ کا اتباع کیا جاوے واجبات میں لزوماً اور مستحبات میں بطریق محبت پس یہ حاصل تھا اس تقریر کا اس تقریر سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ تقریر سنۃ ابراہیم سے تو قربانی کی حقیقت فنا نفس معلوم ہوتی ہے اور آج کی تقریر عُود العید (بضم عین) سے قربانی کی حقیقت تعظیم بالقلب معلوم ہوتی ہے جس کا ترجمان تکبیر باللسان (زبان سے اللہ اکبر کہنا) ہے پس ان میں تدافع ہوتا ہے جواب یہ ہے کہ سنۃ ابراہیم میں حقیقت بمعنے ماہیت ہے چنانچہ حدیث میں حمل اس کی دلیل ہے اور عود العید میں حقیقت بمعنی غایت ہے چنانچہ قرآن میں لام کے لِتُکَبِّرُوا اللہ (تاکہ وہ اللہ کا نام لیں) اس کی دلیل ہے اور صوفیہ کی اصطلاح میں لفظ حقیقت کا اطلاق دونوں معنی میں شائع ہے اُس اصطلاح پر دونوں تقریروں میں لفظ حقیقت وارد ہوگیا پس کچھ تدافع نہ رہا اور باوجود اس کے میں نے تقریر عود العید میں لفظ حقیقت کو بھی بچا لیا ہے۔ اب ختم کرتا ہوں اور اس غایت پر بھی میں وہی احکام متفرع کرتا ہوں جو سنت ابراہیم میں حقیقت تضحیہ یعنی فنا نفس پر متفرع کئے تھے یعنی جب حکمت اس طاعت کی تکبیر بالقلب واللسان (دل اور زبان سے تکبیر کہنا) ہے اور اس تکبیر کیلئے لازم ہے نفس کی تصغیر پس کبیر کے مقابلہ میں صغیر کا اتباع نہ کیا جاوے کبیر ہی کے احکام کو متبوع اصل قرار دیا جاوے۔ خلاصہ یہ کہ ان احکام میں مثل جمیع احکام کے نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے پس ترجیح احکام النصوص علی احکام النفوس[عہ] لازم عام ہے وعظ سنت ابراہیم کی حقیقت کے لئے اور وعظ عود العید کی غایت کیلئے سو اس طرح سے دونوں وعظوں کی تفریعات بھی متماثل ہوگئیں۔ پس دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم صحیح اور توفیق عمل نصیب فرماویں۔ آمین

فقط ختم وعظ عُود العید

(عہ احکام نصوص کو احکام نفوس پر ترجیح دینا)

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

— مسمّٰی بہ —

سبیل النجاح

— منجملہ ارشادات —

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ)

ناشر: محمد عبدالمنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰے بہ

سبیل النجاح

الاشتات	المستمعون	من ضبط	من ای شان	ماذا	لم	کیف	کم	متیٰ	این
متفرقات	سامعین کی تخمینی تعداد	کس نے ضبط کیا	کس طبقہ کو زیادہ نافع تھا	کیا مضمون تھا	سبب بیان کیا تھا	کس ہیئت پر بیان ہوا	کتنی دیر ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
تسوید تفصیلی۔ ۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ کو شروع ہوکر ۸؍ جمادی الاولیٰ بروز جمعہ کو تمام ہوئی۔	مسودہ اجمالی میں نہیں لکھی	مولانا مولوی سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسودہ اجمالی ضبط کیا اور ان کے برادر خورد ظفر احمد عفا اللہ عنہ نے تسوید تفصیلی کی۔	عموماً سب مسلمانوں کو اور خصوصاً نو تعلیم یافتوں کو	کامیابی کی حقیقت اور اسکا طریقہ اور یہ کہ احکام شرعیہ سے اصل مقصود فلاح آخرت ہے مگر فلاح دنیا بھی ان کو لازم ہے اور ان لوگوں کی اصلاح جو منافع و مصالح دنیا کو احکام کے اسرار میں بیان کرتے ہیں۔	اہل شہر کی درخواست پر	منبر پر بیٹھ کر بیان فرمایا	دو گھنٹہ ۳۰ منٹ	۱۶ صفر المظفر ۱۳۳۱ھ	جامع مسجد۔ قنوج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم **اما بعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (اے ایمان والو (تکالیف پر خود)

صبر کرو اور رجب کفار سے مقابلہ ہو تو مقابلہ میں) صبر کرو اور (احتمال مقابلہ کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پورے کامیاب ہو جاؤ)

یہ آیت سورۂ آل عمران کے خاتمہ کی ہے سورۂ آل عمران میں حق تعالیٰ نے مختلف ابواب کے احکام بیان فرمائے ہیں جیسا کہ ان کی تفصیل مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے ان سب احکام کو بیان فرما کر خاتمہ پر انہی احکام کے متعلق چند ضروری امور بیان فرماتے ہیں جن پر ان کی تکمیل موقوف ہے اور جس طرح یہ تکملہ ہیں ان احکام کا اسی طرح ان کی تسہیل کرنے والے بھی ہیں اور یہاں سے آپ کو قرآن کا حسن ختام معلوم ہوگا کہ جس طرح قرآن کے مضامین بے نظیر ہیں اسی طرح اس کا اختتام اور افتتاح بھی بے نظیر ہے عموماً خاتمہ سورت پر جو مضمون ذکر کیا جاتا ہے وہ تمام سورت کا خلاصہ اور اس کے احکام کا تکملہ اور ان کو سہل کرنے والا ہوتا ہے اور اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کو اپنے بندوں پر بہت ہی شفقت ہے کہ جن مضامین کو تسہیل میں کچھ بھی دخل ہے ان کو چھوڑا نہیں بلکہ احکام بیان فرما کر ان کی تسہیل کا طریقہ بھی بیان فرما دیا ہے اور یہی فرق ہے وحی اور غیر وحی میں کلام غیر وحی میں اتنے دقائق کی رعایت نہیں ہو سکتی کیونکہ جب متکلم غیر صاحب وحی ہوگا تو اس کی نظر جو کہ مدار ہے کلام کا ضرور قاصر ہوگی اور اس کے کلام میں یہ بڑی کمی ہوگی کہ اس میں دقیق شقوں پر نظر نہیں ہوتی اور صاحب وحی کی نظر محیط ہوتی ہے۔ اس لئے اگر خود اس کا کلام بھی ہو تب بھی امداد وحی سے اس کی نظر تمام شقوں پر گہری ہوتی ہے اور اگر اس کے کلام میں کوئی شق دشوار ہوتی ہے تو وہ دشواری کو معلوم کر کے اس کی تسہیل بھی ساتھ ساتھ کر دیتا ہے اور اگر وہ بعینہٖ وحی کا کلام ہے تو یہ وصف اس میں اعلیٰ اور بالا ولیٰ ہوگا۔ غیر صاحب وحی کو اول تو بوجہ قصور نظر کے یہی معلوم نہیں ہوتا کہ میرے کلام میں کوئی شق دشوار بھی ہے اور اگر معلوم بھی ہو جائے تو وہ اس کی تسہیل پر قادر نہیں ہوتا۔ اور صاحب

وحی کی نظر چونکہ محیط ہوتی ہے اس لئے وہ تمام شقوق کی رعایت کر لیتا ہے
اول تو اس کے کلام میں کوئی شق فی نفسہ دشوار بھی نہیں ہوتی اور اگر کسی عارض
سے مثلاً یہ کہ مخاطب اب تک آزادی کا عادی رہا ہے پابندی سے گھبراتا ہے
کوئی شق ظاہر میں دشوار بھی ہو تو وہ اس کے آسان اور سہل کرنے کا طریقہ بھی بتلا
دیتا ہے اور صاحب وحی کے جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہوا ہے دو معنی ہیں ایک
تو وحی کا نازل کرنے والا یعنی خدائے تعالیٰ دوسرے وہ جس پر وحی نازل ہو یعنی
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ سو اگر صاحب وحی سے مراد حق تعالیٰ ہیں تو ان کی نظر کا
محیط ہونا ظاہر ہے اور اگر صاحب وحی سے مراد دوسرے معنے کے اعتبار سے نبی
منزل علیہ ہیں تو ان کی نظر کا محیط ہونا بھی دلیل سے ثابت ہے کیونکہ آپ کو
نبوت ورسالت ایک وہبی صفت بطور منصب کے عطا ہوئی ہے اور مناصب
موہوبہ میں نقص نہیں ہوتا جب حق تعالیٰ کی طرف سے ایک وہبی منصب
کسی کو عطا ہوتا ہے تو اس کے خواص بھی علی وجہ الکمال عطا ہوتے ہیں دیکھئے
دنیا میں اگر کوئی حاکم کسی کو عہدہ دیتا ہے تو اپنے نزدیک وہ انتخاب میں کوتاہی
نہیں کرتا پھر اگر انتخاب کرنے والے خدا تعالیٰ ہیں تو اس انتخاب میں غلطی کا بھی
احتمال نہیں۔ حکام دنیا اپنی طرف سے گو انتخاب میں کمی نہ کریں مگر ان کے انتخاب
میں غلطی ممکن ہے لیکن حق تعالیٰ کے انتخاب میں غلطی نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے
کہ انبیاء علیہم السلام علماً وعملاً ہر طرح کامل ہوتے ہیں اسی لئے اہل حق نے انبیاء
علیہم السلام کو معصوم کہا ہے جس کا حاصل کمال عمل ہے کیونکہ اگر عصمت نہ ہو اور
نبی سے گناہ سرزد ہو سکیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا عمل ناقص ہے کمال عمل
یہی ہے کہ کوئی کام رضاء حق کے خلاف سرزد نہ ہو سکے اور نبی کے لئے یہ کمال لازم
ہے کیونکہ ان کو حق تعالیٰ نے ایک منصب عطا فرمایا ہے اور منصب عطا کرنے میں
چند امور کا لحاظ ضروری ہے ایک یہ کہ جس کو وہ منصب دیا گیا ہے اس میں اس منصب کی اہلیت
ہو تاکہ وہ اس کے فرائض کو بخوبی انجام دے سکے دوسرے یہ کہ وہ منصب عطا کنندہ کا پورا

مطیع وتابعدار ہو مثلاً اگر بادشاہ کسی کو وائسرائے بنا کر بھیجے تو وہ دو باتوں پر نظر کرے گا ایک یہ کہ اس کو انتظام ملکی کا سلیقہ اعلیٰ درجہ کا ہو دوسرے یہ کہ اس میں گورنمنٹ کی اطاعت پوری پوری ہو مخالفت اور بغاوت کا شائبہ بھی نہ ہو کوئی بادشاہ ایسے شخص کو کوئی عہدہ نہیں دیا کرتا جس میں ذرا بھی مخالفت و بغاوت کا احتمال و شائبہ ہو پس اگر کوئی شخص وائسرائے میں قابلیت انتظام کی کمی کا عیب نکالے یا اس کی وفاداری پر اعتراض کرے تو حقیقت میں یہ اعتراض بادشاہ پر ہوگا کیونکہ اسی نے اس کو یہ منصب دیا ہے پس اعتراض کا یہ حاصل ہوگا کہ بادشاہ نے ایک نا قابل کو یا مخالف گورنمنٹ کو وائسرائے بنایا ہے اور اس صورت میں معترض پر توہین شاہی کا جرم قائم کیا جائیگا لیکن وائسرائے پر اعتراض کرنے میں ممکن ہے کہ کسی وقت معترض ہی حق بجانب ہو کیونکہ شاہان دنیا کا علم محیط نہیں اس لئے ان سے انتخاب میں غلطی ہو جانا بعید نہیں لیکن خدا تعالیٰ کے اوپر تو اس اعتراض کی کسی طرح بھی گنجائش نہیں تو جس کو حق تعالیٰ اپنے انتخاب سے کوئی عہدہ دیں اس میں اس عہدہ کی پوری قابلیت اور خدا تعالیٰ کی کامل اطاعت کا ہونا لابدی ہے تو معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کو جو عہدہ دیا جاتا ہے اس میں وہ علماً کامل ہوتے ہیں اور چونکہ خدا تعالیٰ نے ان کو اپنے انتخاب سے ایک منصب دیا ہے تو ان میں مخالفت و نافرمانی حق کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ عملاً بھی کامل ہوتے ہیں اور یہی معنے ہیں عصمت کے پس اگر کوئی شخص انبیاء علیہم السلام کے علم و عمل پر کسی قسم کا اعتراض کرے تو درحقیقت وہ خدا تعالیٰ پر اعتراض ہے پس نبوت کے ساتھ مخالفت حق ممکن ہی نہیں اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ محض نقلی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے نیز انبیاء علیہم السلام کے علوم میں بھی نقص ممکن نہیں بلکہ ان کے علوم کامل ہوتے ہیں۔ یعنی وہ علوم جنکی اس منصب میں ضرورت ہے کیونکہ حق تعالیٰ ایسے شخص کو کسی عہدہ کے واسطے منتخب نہیں کر سکتے جس میں اس منصب کی قابلیت نہ ہو اور قابلیت کے معنے ہی یہ ہیں کہ اس منصب کو جن علوم کی ضرورت ہو وہ اس شخص کو کامل طور پر حاصل ہوں۔ ہاں یہ ضرور نہیں کہ اس منصب کے علاوہ دیگر امور کا بھی اسے علم ہو کیونکہ تحصیلدار کو انہی علوم کی ضرورت ہے جن کو تحصیلداری سے تعلق ہے یعنی قانون۔ اسی طرح اگر کسی کو طبیب اور معالج بنایا جاوے تو اس کو انہی علوم میں کامل ہونا چاہیے جن کو طب سے

تعلق ہے یعنی صحت و مرض وغیرہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا بھی انہی علوم میں کامل ہونا ضروری ہے جو نبوت کے متعلق ہیں اوران علوم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی نظر مصالح عبادمیں وسیع ہو اس لئے اگر صاحب وحی سے مراد نبی ہے تو اس کی نظر بھی مصالح عباد میں اس وجہ سے وسیع ہونا چاہیئے کہ خدا تعالےٰ نے وہی طوران کو نبوت کا منصب عطا فرمایا ہے جس کا تعلق مصالحہ عباد سے ہے بہرحال یہ دعویٰ ثابت ہوگیا کہ وحی میں تمام پہلوؤں کی اعلیٰ درجہ کی رعایت ہوگی اسی لئے قرآن میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ایسی رعایت نہیں ہے قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا اس مضمون کا آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ حکام دو قسم کے ہیں ایک وہ جو محض ضابطہ کے پابند ہیں ضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے وہ کردیا اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کردیئے ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا ان کے سہل و آسان کرنے کی تدبیر بتائیں۔ دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہونچانا چاہتے ہیں وہ حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں اور اس تجویز میں ان پر تعب ضرور ہوتا ہے مگر یہ شفقت پر مبنی ہے اتنی رعایتیں وہی حاکم کرسکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو۔ اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاد ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ استاد تو ضابطہ پری کردیتا ہے مگر باپ ضابطہ پری نہیں کرسکتا وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں گھر کرلے کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کی اصلاح ہوجائے اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جاوے اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس کا طریقہ وہ اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہوجائے اور ان سب رعایتوں کا منشا وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کیساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جاسکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ربط اور بے ترتیب بھی ہوجاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو اسی درمیان میں اس نے

دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کرکے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کردے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے بری صحبت سے منع کرتے ہیں لقمہ کا کیا ذکر مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے دوسری بات کو بیچ میں کہکر پھر پہلی بات کو پورا کرے یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے اس ظاہری بے ربطی کا منشا شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے بلکہ وہ ایک مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے۔ سورۂ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقعہ ڈھونڈے گا۔ اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہوگی اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کام جتلا دیئے جائیں گے پھر فرماتے ہیں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ؕ یعنی (انسان کا اپنے اعمال) سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ اس دن) انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہے (کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا) اگرچہ وہ (باقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا اس لئے یہ جتلانا محض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاددہانی کے لئے یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے اس کے بعد فرماتے ہیں لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ

لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ
اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے
یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جما دینا اور
زبان سے پڑھوا دینا تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتے کی قرارت کا اتباع کیجئے
پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت
کا مضمون ہے کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ۔ کہ تم لوگ دنیا کے طالب
ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔
بعضوں کے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ (آپ اپنی زبان کو نہ ہلایا کیجئے) سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور
بعد کو بھی اسی کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے
کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے۔ لوگ اس زبان کے ربط میں تھک گئے ہیں اور
بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے کلامیکہ
محتاج لیعنی باشد لا یعنی ست۔ (جو کلام یعنی کا محتاج ہو لا یعنی ہے) تو جس کو حق تعالیٰ کے
اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی
طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے صاحبو! اس کا وہی موقع ہے
جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے
مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا یہ
کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط
ہے لیکن جو باپ ہوا ہوگا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے
کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی
تنبیہ کر دی۔ اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور صلی اللہ
علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ ساتھ
پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ

یا دکرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں قرآن پاک آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا ہی کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے چنانچہ جو رسالے ربط کے باب میں لکھے گئے ہیں ان سے اس آیت کا مضمون قیامت سے ربط معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی اپنے ایک رسالہ عربی میں اور اپنی تفسیر کے اندر اردو میں اس کا ماقبل سے ارتباط بیان کیا ہے جو کہ تبرع اور احسان کے درجہ میں ہے ۔ؔ

ؔ چنانچہ رسالہ سبق الغایات میں اس آیت کا ربط ماقبل سے اول وہی تحریر فرمایا ہے جو اس جگہ بیان ہوا کہ درمیان میں فرط شفقت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تحریک لسان سے اس لئے منع فرما دیا کہ آپ غالباً اس وقت خود بھی پڑھنے لگے تھے۔ دوسرا ربط نقلاً عن القفال یہ تحریر فرمایا ہے کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب نہیں بلکہ یہ خطاب قیامت میں انسان کو ہوگا کہ نامۂ اعمال کے پڑھنے میں جلدی نہ کر ہم تیرے سب اعمال جتلاتے ہیں تو نامۂ اعمال کو دیکھتا رہ اور ہماری تقریر سنتا رہ الخ اور تفسیر میں لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب مانکر ربط یہ بیان فرمایا ہے کہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کو قیامت میں اس کے تمام اعمال پر مطلع کیا جائے گا اور اس کا مطلع ہونا جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ علم ضروری کے طور پر وہ خود بھی اپنے نفس کے سب احوال سے خوب واقف ہوگا اس سے دو مضمون مستفاد ہوئے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے عالم اور محیط ہیں۔ دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ کسی حکمت سے بعض دفعہ مخلوق کے ذہن میں بہت سے غائب شدہ علوم کو دفعۃً حاضر کر دیتے ہیں گو ان علوم غائبہ کثیرہ کا دفعۃً حاضر ہو جانا عادت طبعی کے خلاف ہو جیسا کہ قیامت میں ایسا کیا جائے گا جب یہ بات ہے تو آپ نزول وحی کے وقت یاد کرنے کی فکر کیوں کرتے ہیں بلکہ مطمئن ہو کر سنتے رہا کیجئے ہم قرآن کو آپ کے دل میں جما دیں گے اور جب کبھی آپ پڑھنا چاہیں گے آپ کی زبان سے اس کو ادا کرا دیں گے ۔ قلت وھذا اولیٰ مما قالہ القفال رحمہ اللہ لان

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

یہاں ربط کی ضرورت ہی نہ تھی شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب ربط کی ضرورت نہ تھی تو ممکن ہے کہ یہ روابط سب مخترع ہوں پھر ان کی حاجت ہی کیا تھی (کیونکہ تقریر سابق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرط شفقت کا مقتضا یہ ہے کہ ترتیب و ربط کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ مخاطب کی ضرورت کے موافق کلام کیا جائے چاہے ربط ہو یا نہ ہو اور قرآن کا طرز کلام یہی ہے تو اس صورت میں جو کچھ ربط بیان کیا جائے گا وہ مخترع ہوگا کیونکہ متکلم نے ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں ۱۲) اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں اور اس ربط ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوت (مصحف اور ہے یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہوگئی پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہوگئی وعلیٰ ہذا۔ تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عز اسمہ نے بدلدی یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی تو جبریل علیہ السلام بحکم خداوندی حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے کہ اس آیت کو مثلاً سورۂ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جائے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورت کے ساتھ وعلیٰ ہذا تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نزول الآیۃ فی تحریک النبی صلی اللہ علیہ وسلم لسانہ وقت التنزیل مذکور فی الصحیحین فتادیل الآیۃ لغیرہ لایحسن ولیجبنی ایضاً ما قالہ الاستاذ العلامۃ الفاضل مولانا محمد اسحٰق البردوانی ان ہذہ الآیۃ مرتبط۔ بقولہ تعالیٰ بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ یارۃ لما کان سبحانہ وتعالیٰ قادرا علی جمع العظام وہی رمیم وعلی تسویۃ البنان وہی رفات فہو قادر بالاولی علی جمع القرآن الازلی الابدی الذی لایبدل ولایفنی فی قلب حی مثلک یا محمد فلا تعالج من نزولہ شدۃ ولا تحرک بہ لسانک لتعجیل بہ فللہ درہ ما ابہی دررہ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم ۱۲ جامع۔

بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی
آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ
اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہوا تو ترتیب نزدل کا بدلنا مفید نہ ہوگا تو عجب بے نظیر
کلام ہے کہ باوجود ضرورت ربط نہ ہونے کے پھر بھی اس میں ربط ہے اور پورا ربط ہے
پس خدا تعالیٰ کے کلام میں اس مستقل دلیل سے ہم ربط کے قائل ہیں لیکن اگر ربط نہ
بھی ہوتا تب بھی قرآن پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی ہم کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں طرز تصنیف
نہیں اختیار کیا گیا بلکہ نصیحت مع لحاظ شفقت اختیار کیا گیا ہے اور اس میں ضرورت
مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے جس کی بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے اور
یہی شفقت منشا ہے اس امر کا کہ قرآن کی ہر تعلیم کامل ہے جس میں تمام پہلوؤں کی پوری پوری
رعایت کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ ہر سورت میں بہت سے احکام بیان
فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں جو سب کی جامع ہوتی ہے اور جس پر عمل کرنے
سے تمام احکام مذکورہ میں سہولت ہو جاتی ہے چنانچہ سورۂ آل عمران میں مختلف ابواب
کے احکام بیان فرما کر کلام کو ختم نہیں کیا بلکہ اخیر کی آیت میں بطور میزان الکل کے
ایک بات ایسی بتلادی جو سب کو جامع ہے یہ ایسا ہے جیسا تفصیلی حساب کے بعد میزان
دی جایا کرتی ہے اگرچہ مفصل حساب بیان کرنے کے بعد میزان کی ضرورت نہیں ہوتی مگر
ظاہر ہے کہ میزان بیان کر دینے سے ایک قسم کا ضبط وتکرار ہو جاتا ہے مفصل حساب کا یاد
رہنا دشوار ہے اور میزان کا یاد رکھنا آسان ہے۔ اسی طرح یہ آیت اخیرہ تمام سورت
کی میزان ہے جس میں بالاجماع جملہ احکام مذکورہ داخل ہیں اور دیکھنے میں دو تین
باتیں ہیں جن پر عمل بہت سہل ہے خدا تعالیٰ نے اس بات کی رعایت ہر جگہ رکھی ہے یہ
طرز سوائے قرآن کے کسی کلام میں بھی نہیں ہے کہ تمام باتوں کو ختم کر کے ایک بات ایسی
بتلادی جو سب کو جامع ہے یہ ایسا ہے جیسا شفیق باپ مفصل نصیحتیں کر کے اخیر میں ایک
گر بتلا دیتا ہے اور منشا اس کا شفقت ہے کہ لڑکے کو ساری باتیں شاید یاد نہ رہیں یا
اتنی باتوں کو سنکر گھبرا جاوے تو اخیر میں ایک گر بتلا دیتا ہے کہ بس اس کو یاد کر لو تو جس نے

دوسروں کو شفقت سکھلائی اس کے کلام میں شفقت کی پوری رعایت کیوں نہ ہوگی غرض اس مقام پر اس آیت میں وہی بات مذکور ہے جو ساری سورت میں بیان کی گئی ہے اور اس میں ابہام نہیں ہے کہ ایک گول بات کہدی ہو جس کا مطلب بھی سمجھ میں نہ آوے بلکہ ساری سورت کا مضمون اس آیت میں اجمال کے ساتھ مذکور ہے (جس کو بلاغت میں ایجاز کہتے ہیں ۱۲) کہ تھوڑے سے مختصر لفظوں میں بڑا مضمون ادا کر دیا جو تفصیل پر دلالت میں کافی وافی ہے اور اجمال کہنے کی یہ وجہ ہے کہ اس آیت میں ایک گونہ کلیت ہے اور ہرچند کہ کلیات کے تحت میں جزئیات سب ہوتے ہیں مگر بالاجمال ہوتے ہیں نہ کہ تفصیلاً۔ یہ ایسی بات ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان شرائع اسلام قد کثرت علی فقل لی قولا احفظہ واخذ بہ (اوکما قال) کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکام اسلام مجھ پر بہت زیادہ ہو گئے آپ مجھے ایک بات ایسی بتلا دیجئے جس کو میں یاد کرلوں اور اسی کے موافق عمل کرتا رہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ کہ تم یوں کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر استقامت کے ساتھ رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری شریعت ابتداء سے انتہا تک اس ایک جملہ میں بھر دی حالانکہ سائل نے ابتداء سے سوال بھی نہ کیا تھا پس اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ (میں اللہ پر ایمان لایا) میں آپ نے بالاجمال تمام اعتقادیات کو بیان فرما دیا اور ثُمَّ اسْتَقِمْ (پھر استقامت کے ساتھ رہو) میں اعمال کے اندر استقامت کی تعلیم دی جس میں نماز روزہ حج زکوٰۃ معاملات ومعاشرات سب آگئے (کیونکہ استقامت واعتدال اعمال شرعیہ کی خاص صفت ہے ان سے تجاوز کر کے عمل میں اعتدال باقی نہیں رہ سکتا ۱۲) استقامت کی ہر جگہ ہر عمل میں ضرورت ہے (تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سائل کو ایسی بات بتلادی جس سے وہ ہر عمل کا جواز وناجواز دریافت کر سکے پس جہاں استقامت واعتدال موجود ہو وہ شرعی عمل ہے اور جہاں یہ صفت مفقود ہو وہ شریعت سے خارج ہے ۱۲) باقی یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ سائل کی درخواست یہ تھی کہ مجھے ایسی) بات بتلا دیجئے کہ تمام احکام کو بھلا کر میں اس ایک بات کو یاد کرلوں بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے ایسی بات

بتلا دیجئے جس کی تمام شریعت میں رعایت کروں اور جس سے ہر حکم کا شرعی و غیر شرعی ہونا معلوم کرلیا کروں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے موافق ایسی بات بتلادی جو شریعت کا موضوع ہے یعنی اعتقاد عظمتِ الٰہی و استقامت افعال و احوال۔ اور ظاہر ہے کہ موضوع علم معلوم ہوجانے سے اس کے تمام مسائل دوسرے علوم کے مسائل سے ممتاز ہوجاتے ہیں اور جس کو موضوع کا علم ہے گویا بالاجمال اسے تمام مسائل کا علم ہے کیونکہ اب جو مسئلہ اس کے سامنے آئے گا وہ بآسانی معلوم کرلے گا کہ یہ مسئلہ اس علم کا ہے یا نہیں چنانچہ اسی لئے ہر فن میں موضوع کی تعیین کی جاتی ہے مثلاً طب میں چونکہ مسائل کثیرہ منتشرہ ہیں جن کا ضبط دشوار ہے اور حفظ مسائل کے ذریعہ سے تمام جزئیات میں یہ امتیاز مشکل ہے کہ کونسا مسئلہ طب کے متعلق ہے اور کونسا نہیں مثلاً یہ بات کہ اتنے اونچے مکان کی بنیاد کیسی گہری اور چوڑی ہونا چاہیئے یہ طب کا مسئلہ ہے یا نہیں محض مسائل کے پڑھ لینے سے معلوم نہیں ہوسکتی کیونکہ کتابوں میں تمام جزئیات کا احصا نہیں کیا گیا اور نہ ہوسکتا ہے تو اب جن جزئیات کا کتاب میں ذکر نہیں یا ہم کو یاد نہیں ان کی بابت یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان کو طب سے علاقہ ہے یا نہیں اس کے لئے حکماء نے طب کا ایک موضوع قرار دیا وہ کیا بَدَنُ الْاِنْسَانِ مِنْ حَیْثُ الصِّحَّۃِ وَالْمَرَضِ یعنی طب کا موضوع بدن انسانی ہے بحیثیت تندرستی اور بیماری کے یہ موضوع معلوم کرلینے کے بعد تمام مسائل کا امتیاز ہوگیا اب اگر سنا کہ بنفشہ زکام کو نافع ہے فوراً سمجھ میں آگیا کہ یہ مسئلہ طب کے متعلق ہے اور اگر یہ سنا کہ اتنی گہری بنیاد ہو تو اتنا اونچا مکان بنایا جاسکتا ہے تو سنتے ہی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ مسئلہ طب کے متعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اگر یہ سنا کہ بدن انسان حادث ہے جب بھی سمجھ لیں گے کہ یہ طب کا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ گو اس میں بدن انسان کی ایک حالت مذکور ہے مگر اس حالت کو صحت و مرض سے کچھ واسطہ نہیں اور موضوع طب بدن انسان مطلقاً نہیں ہے بلکہ صحت و مرض کی حیثیت سے ہے غرض جس کو موضوع معلوم ہوگا وہ ہر جگہ ہر مسئلہ میں اس کی رعایت کرلے گا۔ اسی طرح اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو شریعت کا موضوع بتلادیا جس کے حفظ سے گویا تمام

مسائل بالاجمال اسے محفوظ ہو گئے اور اب وہ ہر بات کے متعلق یہ معلوم کر سکے گا کہ اس کو شریعت سے تعلق ہے یا نہیں کیونکہ وہ اس موضوع کی ہر جگہ رعایت کرے گا ایسے ہی اس مقام پر حق تعالیٰ بھی تمام احکام کو ذکر کر کے اخیر میں ایک ایسا گر بتلاتے ہیں جو گویا تمام سورت کا موضوع ہے جس کو اس کے سب احکام سے تعلق ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ اے ایمان والو (تکالیف پر) خود صبر اور (جب کفار سے مقابلہ ہو تو مقابلہ میں صبر کرو اور (احتمال مقابلہ کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (حدود شرعیہ سے باہر نہ نکلو) تاکہ تم پورے کامیاب رہو (آخرت میں تو ضرور ہی اور اکثر اوقات ان اعمال پر محافظت کی بدولت دنیا میں بھی پوری کامیابی ہوتی ہے) جن باتوں کا اس آیت میں ذکر ہے یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کو اس سورت کے احکام سے تو تعلق ہے ہی میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس قدر بھی احکام شرعیہ ہیں سب سے ان کا تعلق ہے اور اس سے آگے میں اور ترقی کرتا ہوں کہ اتفاق سے ہم کو یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ جیسے ان کو احکام شرعیہ سے تعلق ہے اسی طرح تمام دنیوی مصالح معاشیہ سے بھی ان کو تعلق ہے مگر نہ اس وجہ سے کہ یہ شریعت کا موضوع و مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ شریعت تکمیل آخرت کے ساتھ ہماری دنیا کی بھی تکمیل ساتھ ساتھ کرتی ہے اس لئے احکام شرعیہ اس طور سے مقرر کئے گئے ہیں جو تبعاً مصالح دنیویہ کو بھی متضمن ہیں آجکل احکام شرعیہ میں مصالح دنیویہ بیان کرنے والوں کی جماعتیں ہیں کہ ایک تو وہ جو اصل چیز مصلحت دنیا ہی کو سمجھتے ہیں اور احکام شرعیہ کو انہی مصالح پر مبنی سمجھتے ہیں چنانچہ یہ لوگ مصالح دنیا کی تحصیل کی طرف اول ترغیب دیتے ہیں پھر ان کی تائید احکام شرعیہ سے کرتے ہیں اور اس طرز تقریر سے اکثر لوگوں کو ان کے حامی دین ہونے کا دھوکہ ہو جاتا ہے حالانکہ وہ اثر کے اعتبار سے ماحیٔ دین ہیں چنانچہ اس وقت کثرت سے اس قسم کے مضامین اخباروں اور لکچروں میں دیکھنے میں آتے ہیں کہ اتفاق ایسی چیز ہے کہ شریعت میں اس کا اس قدر اہتمام ہے کہ پانچ وقت کی نمازیں خدا تعالیٰ نے جماعت کو اسی لئے واجب کیا تاکہ ہر محلہ کے سب مسلمان دن میں پانچ دفعہ کم از کم ملتے رہیں ہر شخص کو ایک دوسرے کی حالت کا

علم ہوا اور میل جول بڑا اتفاق بڑھے پھر ہفتہ میں ایک بار تمام بستی میں آدمیوں کے باہمی اجتماع کے لئے جمعہ کی نماز مقرر کی تاکہ تمام بستی کے مسلمانوں سے شناسائی ہوا اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا موقع ملے پھر بعض مسلمان ایسے ہیں جو شہر سے بھی دور رہتے ہیں ان کے اجتماع کے لئے عیدین کی نماز مقرر کی تاکہ سال بھر میں دو دفعہ آس پاس کے دیہاتی مسلمانوں سے بھی ملاقات ہو جایا کرے پھر ساری دنیا کے مسلمانوں کو یکجا کرنے کیلئے حج کی عبادت شروع کی گئی کہ عمر بھر میں ایک دفعہ تو سب طرف کے مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر تبادلہ خیالات کر لیا کریں۔ اس مضمون کو آج بڑے افتخار کی ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور بہت سے بھولے بھالے ایسے مقرروں کو شریعت کا راز داں سمجھتے ہیں کہ بس یہ شخص شریعت کے اسرار کو سمجھ گیا اور کہتے ہیں کہ دیکھئے علم اس کو کہتے ہیں کہ نقلی بات کو عقلی بنا دیا اور شریعت کے اسرار کو زمانہ کے موافق بیان کر دیا مگر واللہ اس کی وہ مثال ہے ۔ چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند (جب حقیقت کا پتہ نہ چلا تو ڈھکوسلوں کا راستہ اختیار کیا) نہ یہ کچھ راز ہے اور نہ اس میں سمجھنے والوں کا کچھ کمال ہے بلکہ اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے جو اس کو جان لے گا وہ سمجھ جائیگا کہ یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کے ساتھ دوستی نہیں کرتے بلکہ دشمنی کرتے ہیں اور یہ لوگ حامی اسلام نہیں بلکہ اسلام کے نادان دوست ہیں اور ۔ دوستی بیخرد چوں دشمنی است۔ (بے عقل کی دوستی دشمنی ہوا کرتی ہے) اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے اس مضمون کا حاصل یہ ہے کہ بس اصل چیز تو اتفاق ہے اور جماعت پنجگانہ اور جمعہ و عیدین و حج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کے واسطے ذرائع و وسائل ہیں تو عجب نہیں کہ بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں اور اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہوا تو وہ بہت آسانی سے جماعت اور نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے کیونکہ ان کے خیال میں تو یہ سب احکام حصول اتفاق کیلئے مقرر ہوئے ہیں اور ان کو کلب میں جانے اور تھیٹر میں ملکر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی ہے جہاں راحت سے آرام کرسی اور گدی تکیوں پر جگہ ملتی ہے تو وہ خواہ مخواہ مسجد میں کیوں آنے لگے اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے چنانچہ اس وقت ان تقریروں کا یہ ضرر نمایاں ہو رہا ہے۔ اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا کہ وضو کی ضرورت ابتداء اسلام میں تھی آجکل نہیں ہے کیونکہ اس وقت بدوی لوگ پاک

صاف نہ رہتے تھے جنگل کے کاروبار سے غبار آلود آتے تھے اس لئے ان کو وضو کا حکم کیا گیا اور ہم لوگ آجکل صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں ہر وقت موزے اور دستانے چڑھائے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ پیر گرد سے محفوظ رہتے ہیں ہم کو وضو کی ضرورت نہیں یہ نتیجہ ہے ایسے اسرار بیان کرنے کا کہ اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے کچھ تعجب نہیں کہ وہ نماز کو بھی چھوڑ دے اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتدائے اسلام میں اس لئے تھی کہ اس زمانے کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر و سرکش ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کے لئے یہ افعال تواضع وخشوع کے تعلیم فرمائے گئے تھے اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہوگئی ہے ہم کو نماز کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ایک شخص نے جو کہ مسلمان ہیں انگلستان سے مجھ کو لکھا تھا کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل عقل کے خلاف ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جائے جن کا گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے چنانچہ اسی لئے منیٰ میں قربانی کرتے ہی جانوروں کو کھتوں میں ڈالدیا جاتا ہے غضب یہ ہے کہ آجکل خدا پر بھی عقل کی حکومت ہونے لگی افسوس میں کہتا ہوں کہ اگر ایک جج کسی مجرم کو سزا دے اور مجرم یہ کہے کہ یہ سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کریگا ہرگز نہیں بلکہ وہ صاف یہ کہیگا کہ قانون پر تمہاری عقل کی حکومت نہیں بلکہ قانون عقل پر حاکم ہے اور اس کے اس جواب کو سب عقلاء تسلیم کرتے ہیں مگر حیرت ہے کہ قانون الٰہی کو آجکل کے مسلمان اپنی عقل پر حاکم نہیں مانتے بلکہ اس کو اپنی عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور یہ جواب علیٰ سبیل التنزیل ہے ورنہ قانون الٰہی تو بالکل عقل کے مطابق ہے بشرطیکہ عقل سلیم ہو یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کی عقل میں

؎ ان حضرت نے منیٰ میں کھتوں کے اندر جانوروں کے دبانے کی جو یہ وجہ بتلائی ہے کہ اتنا گوشت آدمیوں سے کھایا نہیں جاتا یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موسم حج پر جتنے آدمی جمع ہوتے ہیں سب کے سب مالدار نہیں ہوتے اور نہ سب قربانی کرتے ہیں بلکہ حجاج میں زیادہ تر غربا ہوتے ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر منیٰ کی قربانی کا سارا گوشت حجاج میں اور بدویوں میں تقسیم کردیا جائے تو وہ ہرگز سب کو کافی نہ ہوگا بلکہ بہت سے لوگ پھر بھی محروم رہجائیں گے بلکہ منیٰ میں قربانی کے جانوروں کو محض ڈاکٹروں کی رائے سے دبایا جاتا ہے پس اس خلاف عقل حرکت کے جواب دہ وہ ڈاکٹر ہیں جن کی رائے سے ایسا کیا جاتا ہے ۱۲ ظ

اس کی حکمتیں آجایا کریں آخر پارلیمنٹ کے عقلا جو قوانین تجویز کرتے ہیں کیا ہر عامی کی عقل اس کی مصالح و حکم کو خاص خاص حکام ہی سمجھتے ہیں۔ پھر قانون الٰہی کی حکمتوں اور مصالح کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے اور یہاں یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ قانونِ الٰہی عقل کے مطابق ضرور ہے مگر ہماری عقلیں اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور بالفرض اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں بھی نہ آئے تو قانون کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں کیونکہ قانون پر عقل حاکم نہیں بلکہ اس کی ماتحت اور اس کی تابع ہے غرض ان حضرت نے مجھے لکھا کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود غرباء کی امداد ہے اور ابتداء اسلام میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا مویشی زیادہ تھے اس لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جانور ذبح کر کے غرباء کو گوشت دیدو اور اس زمانہ میں نقد بھی بہت موجود ہے غلہ بھی موجود ہے پس آجکل بجائے قربانی کرنے کے نقد روپیہ سے غرباء کی امداد کرنا چاہئے۔ تو اس شخص نے قربانی کی حکمت امداد غرباء سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بھی باآسانی حاصل ہو سکتی ہے قربانی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا حالانکہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں کیونکہ مقصود تو تعمیل حکم ہے اگر یہ حکمت مقصود ہوتی تو اس کی کیا وجہ کہ غرباء کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہیں ہوتا اگر اس زمانہ میں نقد اور غلہ کم تھا اور مویشی زیادہ تھے اس لئے جانوروں کے ذریعہ سے غرباء کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا تو اس کے کیا معنے کہ جانور کو ذبح کر کے غرباء کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہوا اور زندہ جانور کسی غریب کو دیدیں تو واجب ادا نہ ہو پھر کیا پہلے زمانہ میں مسلمانوں پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی بالکل غلط۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ صحابہ نے جس وقت کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کئے ہیں تو مسلمانوں کے پاس نقد سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آجکل تو اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا پھر اس وقت صحابہ کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھ کر سوجھی اور صحابہ نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا دوسرے اگر یہ حکمت قربانی سے مقصود بالذات ہوتی تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصہ کا تصدق ضرور واجب ہوتا حالانکہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھالے اور غریبوں کو حبہ برابر بھی نہ دے تو قربانی

میں کچھ قصور نہیں آتا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غرباء قربانی سے مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود کچھ اور ہے مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہنچا ہے کہ ہر شخص اپنی مخترع حکمتوں پر احکام کا مدار سمجھنے لگا ۱۲) اور اس خیال کا اثر یہ ہوا کہ چندہ بلقان میں یہ مادہ پھوٹ ہی پڑا آخر اہل جرأت نے یہ فتویٰ دے ہی دیا خدا ان کو ہدایت کرے کہ اگر مسلمان اس سال قربانی نہ کریں اور بلقان کے چندہ میں جانور کی نقد قیمت دیدیں تو یہ زیادہ بہتر ہے اور اس طرح بھی قربانی ادا ہو جائے گی کیونکہ قربانی سے مقصود غریب مسلمانوں کی امداد ہے اور اس وقت ترکوں کو نقد امداد سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے اس کا جواب ایک عامی آدمی نے خوب دیا ہے اس نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی غزوات ہوئے تھے یا نہیں اور اس وقت بھی غازیوں کے لئے نقد امداد کی ضرورت ہوتی تھی یا نہیں تو کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ تجویز کیا کہ اس سال قربانی کو موقوف کر کے مسلمان نقد روپیہ سے غزوات میں امداد کریں۔ اس کا جواب کسی کے پاس کچھ نہ تھا تو جب قربانی کے متعلق بعض لوگوں کو ایک خیال فاسد ہوا تھا جو بالآخر پھوٹ کر رہا۔

اسی طرح اور احکام کی حکمتوں میں بھی جو رنگین مضامین آجکل لکھے جاتے ہیں ان کا بھی اثر یہی ہے کہ لوگ ان مصالح اور حکمتوں کو مقصود بالذات سمجھنے لگیں گے اور جب وہ حکمت کسی اور طریقہ سے حاصل ہوتی ہوئی دیکھیں گے فوراً احکام کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے اس کی ایک اور نظیر مجھے یاد آئی اس وقت سب لوگ مانے ہوئے ہیں کہ اتفاق ضروری ہے اور کچھ ٹھوکریں کھا کر یہ بھی ان کو ثابت ہو گیا ہے کہ اتفاق بدون پابندی مذہب کے حاصل نہیں ہو سکتا تو اب عموماً لکچروں میں پابندی مذہب پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے بغیر مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد نہیں ہو سکتا اور بدون اتفاق کے ترقی نہیں ہو سکتی۔ ظاہر میں یہ بہت ہی خوش کن جملہ ہے مگر اس میں بھی وہی زہر مخفی ہے کہ اصل میں تو مذہب مقصود نہیں بلکہ اتفاق مطلوب ہے مگر چونکہ مذہب اس کا ذریعہ ہے اس لئے مذہب کی بھی ضرورت ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جب تک ان لوگوں کو اسلام پر رہنے سے اتفاق کی امید ہے اس وقت تک تو یہ اسلام پر رہیں گے اور دوسروں کو

بھی اس کی ترغیب دیں گے اور جہاں یہ امید منقطع ہوئی اسی دن یہ اسلام کو ترک کردیتے مثلاً فرض کرلو کہ کسی زمانہ میں مسلمانوں پر ایسی کشاکشی کا وقت آپڑے کہ وہ اسلام کو قائم رکھ کر اتفاق نہ پیدا کرسکیں اور ان لوگوں کو یہ ثابت ہوجائے کہ فلاں مذہب اختیار کرلینے سے اتفاق حاصل ہوگا تو یہ فوراً اسلام کو خیرباد کہکر دوسرا مذہب اختیار کرلیں گے کیونکہ ان کے نزدیک تو اسلام محض اتفاق کے لئے مطلوب تھا مقصود بالذات نہ تھا تو یہ بڑا خطرناک مسلک ہے کہ مصالح دنیویہ پر احکام کی بنا قرار دی جاتی ہے اس کا کبھی نام بھی نہ لیجئے سو ایک تو اس مشرب کے لوگ ہیں جو اس درجہ مصالح دنیویہ کا اثبات کرتے ہیں ان کی غلطی تو واضح ہوگئی۔ ایک دوسرا مشرب یہ ہے کہ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ مذہب سے فقط دین ہی کی فلاح حاصل ہوتی ہے دنیوی فلاح حاصل نہیں ہوتی تو یہ مصالح دنیویہ کی بالکل ہی نفی کرتے ہیں یہ اس درجہ کا تو غلط نہیں جیسا پہلا مشرب غلط تھا اور اگر نصوص اس کے خلاف نہ ہوتے تو ہم اس کے مان لیتے مگر نصوص اس کے بھی خلاف موجود ہے اس لئے یہ بھی غلط ہے کیونکہ نصوص سے ثابت ہے کہ اطاعت خداوندی سے دنیاوی مصالح اور راحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں اور معصیت و مخالفت خداوندی سے دنیوی خسارہ بھی ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ترجمہ) اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھولدیتے لیکن انھوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا اور ایک جگہ اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ یعنی اگر اہل کتاب توراۃ و انجیل پر اور جو (قرآن) آپ پر نازل ہوا ہے اس پر پوری طرح عمل کرتے (اور جیسا کہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع کا امر ہے اس کے موافق آپ کا اتباع اختیار کرلیتے) تو اوپر سے بھی روزی حاصل کرتے (یعنی آسمان سے) اور اپنے پیروں تلے سے بھی (یعنی زمین سے) ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ

کَثِیْرٍ ہ کہ تم کو جو کچھ مصائب پہونچتے ہیں یہ تمہاری اعمال کے سبب سے ہیں اور حق تعالیٰ بہت سی باتوں کو معاف ہی کر دیتے ہیں ان کے علاوہ اور بہت سی نصوص ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعت سے دنیوی فلاح بھی ہوتی ہے اور معیشت سے دنیوی خسارہ ہوتا ہے تو ہم اس مشرب کے بھی قائل نہیں ہو سکتے اب سامعین کو شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ جو لوگ احکام میں دنیوی مصالح بتلاتے ہیں ان کے مشرب کو بھی غلط کر دیا اور جو نہیں بتلاتے ان کے مشرب کو بھی غلط کر دیا یہ دونوں غلط کیونکر ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک بات تو صحیح ہونی چاہیے تو ہاں صاحب میں نے دونوں کو غلط کر دیا اور ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں بلکہ ان دونوں کے علاوہ ایک درمیانی درجہ ہے وہ صحیح ہے اور ہم اسی کے قائل ہیں وہ یہ کہ احکام شرعیہ سے فلاح دنیوی حاصل تو ہوتی ہے مگر احکام شرعیہ سے فلاح دنیوی مقصود نہیں بلکہ اُن سے اصل مقصود تو رضاء خدا ہے ہاں ساتھ میں تبعًا یہ دنیوی نعمت بھی حاصل ہو جاتی ہے اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے حج کے رستہ میں بمبئی آتا ہے مگر بمبئی مقصود نہیں تو اب یوں سمجھئے کہ تین مشرب ہوئے ایک تو یہ کہتا ہے کہ حج سے بمبئی کی سیر ہی مقصود ہے تاکہ مسلمانوں کو دنیا کے کاروبار اور تجارت وصنعت کی اطلاع ہو جائے اور ایک یہ کہتا ہے کہ حج سے مقصود زیارت کعبہ ہے اور بمبئی رستہ میں بھی نہیں آتا یہ دونوں غلط ہیں صحیح مشرب تیسرا ہے کہ حج سے مقصود زیارت بیت اور رضاء خدا ہے اور رستہ میں بمبئی بھی آتا ہے مگر وہ مقصود نہیں اسی طرح احکام شرعیہ کو فلاح دنیا سے نہ تو اتنا تعلق ہے کہ وہی مقصود ہو اور نہ اتنی بے تعلقی ہے کہ وہ ان پر مرتب نہ ہو صحیح مذہب یہ ہے کہ احکام شرعیہ پر فلاح دنیا کا ترتب تو ہوتا ہے مگر یہ مقصود نہیں اور اگر کوئی شخص اعمال صالحہ سے دنیا کو مقصود سمجھے گا اور مصالح دنیویہ کے لئے ان کو اختیار کرے گا تو وہ اعمال صالحہ نہ رہیں گے چنانچہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ہِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَہِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ہِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُہَا اَوِامْرَاَۃٍ یَتَزَوَّجُہَا فَہِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ہَاجَرَ اِلَیْہِ کہ اعمال کا اعتبار نیت سے ہے اور ہر شخص کو

وہی ملے گا جو اسے مقصود ہے اگر کوئی اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہجرت کرے تو اس کی ہجرت تو واقعی اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہے اور مقبول ہے اور جو کوئی دنیا کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے، ہجرت کرے تو اسکی ہجرت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں بلکہ اسی چیز کی طرف ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ اس سے صاف فیصلہ ہوگیا کہ دنیا کو اعمال صالحہ میں مقصود سمجھنے سے اعمال صالحہ باقی نہیں رہتے بلکہ صرف اعمال کی نقل رہ جاتی ہے پس اعمال شرعیہ سے دنیا کو غرض بنانا تو ناجائز ہے مگر تبعاً طاعات سے فلاح دنیوی بھی حاصل ہوجاتی ہے اب وہ جملہ آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا جو میں نے اوپر کہا تھا کہ اس مقام پر حق تعالٰی نے جو احکام کلیہ بتلائے ہیں ان کا تعلق مصالح دنیویہ سے بھی ہے گو وہ دنیوی مصالح مقصود نہیں اب سمجھئے کہ وہ احکام کیا ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا الآیہ یعنی اے ایمان والو صبر کرو۔ اِصْبِرُوْا کا تعلق تو اعمال لازمہ سے ہے جن میں دوسروں سے کچھ تعلق نہیں ان میں حکم ہے صبر کا اور ایک صبر دوسرے مقام پر ہے وہ یہ کہ کسی عمل میں مخالفت کی مزاحمت ہو اس کے متعلق ارشاد ہے وَصَابِرُوْا کہ مقابلہ میں بھی صبر کرو یعنی استقلال کے ساتھ رہو آگے ارشاد ہے وَرَابِطُوْا اس کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ سرحد کی حفاظت کرو دوسرے یہ کہ مستعد رہو پہلے معنی خاص عمل کے متعلق ہیں اور دوسرے معنے سب اعمال کو عام ہوسکتے ہیں آگے فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم کو فلاح حاصل ہوجائے۔ اس ترجمہ سے حاصل ہوا ہوگا کہ اس مقام پر ایک تو صبر کا حکم ہے اور صبر کے دو درجے ہیں۔ اور ایک رباط کا حکم ہے اور ایک تقوے کا تو چار حکم ہوئے ایک پانچویں اور ایک چھٹی چیز اور ہے جن میں سے ایک کا اول میں ذکر ہے اور ایک کا آخر میں اول میں ایمان ہے اور آخر میں فلاح ہے ایک چیز بطور مبدا کے ہے اور ایک صورت نتیجہ میں ہے اور چار حکم درمیان میں ہیں کل چھ ہوئے اور ان کے مراتب

میں فرق ایسا ہے جیسے سفر اور مسافت اور منزل میں فرق ہے کہ سفر کی ایک ابتدا ہوتی ہے اور ایک درمیانی مسافت ہوتی ہے جس کے بُعد کے لئے کچھ مراتب ہوتے ہیں اور ایک نتیجہ ہوتا ہے یعنی منزل مقصود پر پہونچنا پس یہ کلام ایسا ہے جیسے ہم کسی سے یوں کہیں کہ اے مسافر فلاں راستہ سے جانا اور فلاں مقامات پر ٹھہرنا اور چوروں سے اپنی حفاظت رکھنا تو دہلی پہونچ جائے گا۔ اس کلام سے تین باتیں معلوم ہوں گی ایک یہ کہ دہلی پہونچنے کے لئے سفر کی بھی ضرورت ہے کیونکہ یہ وعدہ مسافر ہی سے کیا گیا ہے مگر اس کو بصورت امر اس لئے ظاہر نہیں کیا کہ مخاطب خود ہی سفر شروع کر چکا ہے اب اس سے یہ کہنا کہ اے مسافر سفر کر تحصیل حاصل ہے اور بلا ضرورت کلام کو طول دینا ہے بس سفر کی ضرورت اس کو مسافر کہکر خطاب کرنے ہی سے معلوم ہوگئی یہ مختصر کلام ہے اور دلالت اس کی علی التمام ہے غرض ایک تو سفر کرنا ضروری ہوا اور دوسری یہ بات معلوم ہوئی کہ منازل پر سے گذرنا اور اپنی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے تیسرا وعدہ ہے کہ اس طرح تم دہلی پہونچو گے تو سفر شرط وصول ہے۔ اور درمیانی باتیں احکام وصول ہیں اور تیسری بات نتیجہ ہے۔ ہر مقصود کے لئے ان تین باتوں کا ہونا ضروری ہے اس کی ایک اور مثال لیجئے مثلاً کوئی کہے کہ اے طالب علم رات کو جاگنا اور محنت کرنا تو علم آویگا۔ اس کلام سے اول تو طلب علم کا ضروری ہونا معلوم ہوا دوسرے رات کو جاگنے اور محنت کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی تیسرے نتیجہ کا وعدہ ہے کہ اس طرح کرنے سے علم حاصل ہو جائیگا مگر یہاں بھی طلب علم کو بصورت امر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب خود ہی طلب میں مشغول ہے اسی طرح یہاں بھی یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو!) سے ایمان کی ضرورت معلوم ہوئی لیکن اس کو بصورت امر اٰمِنُوْا (تم ایمان والو) کہکر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب اہل ایمان ہی ہیں ان کو اٰمِنُوْا (ایمان لاؤ) کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ احکام کی دو قسمیں ہیں ایک وہ احکام جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جنھوں نے ایمان قبول کر لیا ہے پہلی قسم میں اول ایمان کا حکم کیا جائے گا اور دوسری قسم میں ایمان کا حکم صیغۂ امر سے نہ کیا جائیگا جیسے طالب علم کے متعلق ایک تو غیر طالب علم کو خطاب کیا جائے اور ایک طالب علم کو تو جس وقت غیر طالب علم کو خطاب کیا جائے اس وقت اس کہنے کی ضرورت ہے کہ علم طلب کرو

اور جس وقت طالب علم مخاطب ہو اس وقت اس شرط کے اظہار کی ضرورت نہیں قرآن میں بھی اسی طرح دونوں قسم کے خطاب ہیں اور یہ مثالیں میں نے اس لئے دیدیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کے مضامین کوئی نئے نہیں ہیں اگر غور کیا جائے تو جس طرح ہم لوگ محاورات میں گفتگو کرتے ہیں اسی طرح قرآن میں بھی کلام کیا جاتا ہے ہاں طرز تعلیم ایسا عجیب ہے کہ دوسرے سے ممکن نہیں کیونکہ قرآن میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہوتی ہے بہرحال چونکہ اس صورت میں زیادہ احکام اور اکثر خطابات مومنین کو ہیں اس لئے اٰمِنُوْا (ایمان لاؤ) بصیغہ امر نہیں کہا گیا مگر یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا[۱] سے ایمان کا شرط ہونا ایمان کا شرط ہونا معلوم ہو گیا جیسا کہ اوپر چند مثالوں سے میں نے اس کو سمجھا دیا ہے مجھکو اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ آجکل بہت سے لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ فلاح کے لئے ایمان کو بھی شرط نہیں سمجھتے اس وقت ہم کو دنیوی فلاح سے تو بحث نہیں اس کے متعلق تو ہماری حالت یہ ہے ؂

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم　　　　از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

(ہم دارا اور سکندر کے قصہ نہیں پڑھے ہیں ہم سے تو محبت اور وفا کے علاوہ کچھ نہ پوچھو)

ہم دنیوی ترقی سے منع بھی نہیں کرتے مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو اس کے احکام بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں تو ہم اس سے بحث نہیں کرتے کہ دنیوی فلاح و ترقی کے لئے بھی ایمان شرط ہے یا نہیں بلکہ اس وقت فلاح آخرت سے بحث ہے تو افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمان فلاح آخرت اور وصول اللہ کے لئے بھی اس کو ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ بہت لوگ ایسے بھنگڑوں کے پیچھے پھرتے ہیں جن کو نہ ایمان سے واسطہ ہے نہ نماز روزہ سے اور کہتے ہیں کہ درویشی کا رستہ ہی دوسرا ہے چنانچہ اگر کوئی ہندو جوگی آجاوے اور دو چار شبدے ظاہر کر دے اور کسی پر اس کی توجہ سے کچھ اثر بھی ہونے لگے تو اس کو ولی سمجھنے لگتے ہیں اور بہت سے لوگ معتقد ہو جاتے ہیں۔ کانپور میں ایک عیسائی تھا بالکل سڑی اور مجنوں مگر کانپور کے عوام الناس اس کو ولی اور اہلِ خدمت سمجھتے تھے حالانکہ اس کی صورت پر ایسی نحوست برستی تھی کہ الامان مگر اس پر

---

[۱] اے ایمان والو!

بھی لوگ معتقد تھے۔ غرض عوام کے نزدیک ولایت کے لئے کوئی شرط نہیں ہاں ترک شریعت کی البتہ شرط ہے تو یہ ایسا عجیب عہدہ ہے کہ اس کے لئے کسی کورس کے پڑھنے اور پاس کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں سارے کورس کے چھوڑ دینے کی ضرورت ہے۔ کانپور میں ایک وکیل کہتے تھے کہ ایک بھنگڑ یہاں آیا جو ہمہ اوست کہتا تھا اس نے آکر رنڈیوں میں قیام کیا اور بھنگ پی کر رنڈیوں سے بھی منہ کالا کیا مگر عوام اس کے بہت معتقد تھے کہ بڑا پہنچا ہوا ہے اور اس کے لئے یہ بات یاد کر لی ہے کہ بزرگوں میں ایک فرقہ ملامتی ہوتا ہے جو ظاہر میں ایسے افعال کرتے ہیں جن سے لوگ ان کو برا بھلا کہیں اس بنا پر لوگوں نے ان بھنگڑوں کو بھی ملامتی فرقہ میں داخل کر کے ان کے افعال میں تاویل کر لی ہے میں کہتا ہوں کہ آخر ملامتی کی کوئی جامع مانع تعریف بھی ہے یا اس کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ ہر شخص اس میں داخل ہو سکتا ہے اگر ایسا ہے تو پھر صحابہ نے بڑی غلطی کی کہ تلوار لے کر کفار کو قتل کیا جب ملامتی کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ کفار بھی اس کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں تو صحابہ نے کفار کو ملامتی سمجھ ان کے کفر میں کیوں تاویل نہ کر لی اگر تاویل اتنی ہی سستی ہے تو یوں تو ہر امر کی تاویل ہو سکتی ہے پھر شریعت نے خوامخواہ اسلام و کفر کے احکام بیان کئے صاحبو! تاویل تو وہاں کیجاتی ہے جہاں آثار تقویٰ غالب ہوں اور ذرا سی کوئی بات خلاف تقویٰ سرزد ہو جائے تو اس میں تاویل کی جاتی ہے یہ نہیں کہ تاویل اوڑھنا بچھونا ہو جائے کہ سر سے پیر تک تمام افعال ہی میں تاویل کی جلئے۔ یوں تو پھر یہ بھی ایک تاویل ہے جو میرے ایک عزیز نے ایک ہندو سے سنی تھی۔ وہ ریاست گوالیار میں ملازم تھے گھر کے قریب کوئی مندر تھا وہاں ایک بت پرست روزانہ صبح کو آکر بت کو پانی دیا کرتا تھا ایک روز جو وہ پانی دے کر لوٹنے لگا تو ایک کتا آیا اور ٹانگ اٹھا کر بت پر پیشاب کرنے لگا تو میرے عزیز نے اس ہندو کو آواز دی کہ پنڈت جی ذرا یہاں تو آؤ وہ لوٹ کر آیا تو کہا کہ دیکھئے یہ کتا آپ کے دیوتا کے ساتھ کیا کر رہا ہے ہندو نے کہا حضور کچھ نہیں یہ بھی دیوتا کو پانی دے رہا ہے اگر تاویل ایسی ہی سستی ہے تو پھر کتے کے موتنے کو پانی دینا کہنا یہ بھی ایک تاویل تھی یہی حال آجکل عوام کی تاویلوں کا ہے کہ چاہے کوئی کافر ہو یا فاسق فاجر ہو اور کیسی ہی بیہودہ حرکتیں کرتا

سب میں یہ تاویل ہے کہ یہ ملامتی بزرگ ہیں آپ کو خبر بھی ہے کہ ملامتی کی تعریف کیا ہے یہ لفظ صوفیہ کی اصطلاحات میں سے ہے اس کے معنی انہی سے دریافت کرنے چاہئیں غضب تو یہ ہے کہ لوگ کسی فن کو حاصل تو کرتے نہیں محض چند الفاظ یاد کر کے ان کو گاتے پھرتے ہیں۔ سنئے ملامتی اس کو کہتے ہیں جو اعمال صالحہ کو سوائے فرائض کے مخفی رکھے اور چھپ چھپ کر نوافل پڑھے کھلم کھلا نوافل کو ادا نہ کرے تاکہ لوگ اس کو معمولی آدمی سمجھیں اسی طرح ایک فرقہ قلندر کہلاتا ہے، قلندر کی تعریف یہ ہے جو اعمال نافلہ کم کرے اور قلب سے ذکر و شغل زیادہ کرے اس کو اعمال ظاہرہ میں فرائض و واجبات کے سوا اور اعمال کا اہتمام نہیں ہوتا بلکہ باطن کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ملامتی گناہوں کا ارتکاب بھی کرتا ہے یہ تو محض اختراع اور افترا ہے جو شخص کھلم کھلا گناہ کرتا ہو اس کو ولایت سے کیا واسطہ ہاں شیطانی ولایت سے اس کو البتہ واسطہ ہے پس ان بھنگڑوں کو ملامتی کہنا بالکل غلط ہے ہاں اس جگہ ایک سوال باقی رہا وہ یہ کہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انھوں نے بعض باتیں خلاف شرع کی ہیں تاکہ لوگ ان کو برا بھلا کہیں تو یہ لوگ بزرگ تھے یا نہیں اگر وہ بزرگ تھے تو یہ بھنگڑ بھی ویسے ہی بزرگ ہیں ہم ان کو بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں تو اس کا جواب بھی سنئے اول تو جن بزرگوں سے ایسی ویسی باتیں منقول ہیں وہ محض وضع کے خلاف تھیں شریعت کے خلاف نہ تھیں یہ تو ایسا ہے جیسے میں صرف پاجامہ پہنکر بازار میں چلا جاؤں اس میں کچھ گناہ نہیں البتہ وضع کے خلاف ہے کہ اس صورت سے نکلنے والے کو لوگ بُرا بھلا کہتے ہیں اور اگر کسی نے کوئی کام خلاف شریعت بھی کیا ہے تو وہ محض ظاہر میں ناواقفوں کو خلاف شرع معلوم ہوتا تھا واقع میں خلاف شرع نہ تھا (جیسے ایک بزرگ چلے جا رہے تھے رستہ میں ایک عورت ملی انھوں نے دوڑ کر اس کا بوسہ لے لیا۔ یہ حرکت دیکھ کر بہت سے مرید برگشتہ ہو گئے مگر چند لوگ پھر بھی ساتھ رہے، آگے چل کر ایک دکان پر پہونچے اور بدون دکاندار کی اجازت کے حلوا اٹھا کر کھانے لگے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عورت ان کی باندی تھی جس کا بوسہ لینا شرعاً جائز تھا اور وہ حلوائی ان کا جان نثار مرید تھا جو شیخ کو آتا ہوا دیکھ کر خود ہدیہ پیش کرنے کی نیت کر رہا تھا اور شیخ کے اس طرح بے تکلف کھانے سے وہ باغ باغ ہو گیا ۱۲) دوسری یہ بات دیکھنی چاہیے

کہ پہلے بزرگوں نے ایسے اعتراض کے کام کس غرض سے کئے تھے اس کا اصلی منشا کبر کا علاج تھا کہ لوگ ہم کو بزرگ نہ سمجھیں اس وقت یہ غرض رندانہ وضع سے حاصل ہوتی تھی اور ایسی وضع بنانے والے کو سزائیں دیجاتی تھیں اس لئے وہ ایک دو حرکت رندانہ کر لیا کرتے تھے تاکہ عوام معتقد ہو کر پریشان نہ کریں۔ اور اب تو ایسے لوگوں کو عوام قطب و ابدال سمجھتے ہیں تو اب یہ غرض رندانہ وضع سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ اب یہ بات حاصل ہوتی ہے ملّانوں کی سی شکل بنانے اور شریعت کی پابندی کرنے سے آجکل جو شخص ملانوں کی سی شکل بنالے تو ساری دنیا اس کو کمالات سے خالی سمجھتی ہے اور یوں کہتے ہیں کہ اس کو سوائے مسئلے مسائل کے کچھ نہیں آتا پس آجکل ملامتی بننے کا طریقہ بھی پابندی شریعت ہی ہے غرض یہ بالکل غلط ہے کہ پہلے بزرگوں نے قصداً خلاف شرع کام کئے ہیں بلکہ اس کی حقیقت وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کی خوب سمجھ لو کہ جو شخص شریعت کی مخالفت کرتا ہے وہ کبھی بزرگ نہیں ہوسکتا اور اگر تم کو کسی پر ایسا ہی رحم آتا ہے تو اس کو برا بھلا مت کہو لیکن معتقد بھی نہ بنو کسی کو برا کہنے کا منصب عوام کا نہیں بلکہ یہ علماء کا منصب ہے تم کسی کو کچھ نہ کہو بلکہ یہ کام جس جماعت کا ہے اسی پر چھوڑ دو۔ اور علماء کو فاسقوں کے برا کہنے کا تو منصب ہے ہی ان کو تو یہ بھی حق حاصل ہے کہ اچھوں کو بھی برا کہدیں اگر انتظام شریعت کے لئے اس کی ضرورت ہو چنانچہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بزرگ عالم ساری عمر زندیق کہتے رہے مگر جب شیخ اکبر کے انتقال کی خبر آئی تو رونے لگے اور فرمایا کہ افسوس آج بہت بڑے صدیق کا انتقال ہوگیا لوگوں کو حیرت ہوئی کہ عمر بھر تو ان کو زندیق کہتے رہے اور آج بہت بڑا صدیق بتلاتے ہیں۔ آخر دریافت کیا کہ اگر وہ ایسا عالی مرتبہ شخص تھا تو آپ نے آب تک زندیق کہکر ہمکو اس کی برکات و فیوض سے کیوں محروم رکھا۔ فرمایا واقعی وہ بہت بڑا صدیق تھا مگر تم کو اس سے کچھ نفع نہ ہوتا اگر تم اس کی صحبت میں رہتے تو زندیق ہی بن جاتے کیونکہ اس کے دقیق علوم عام عقول سے بالاتر تھے تم اس کی باتوں کو سنکر اپنی سمجھ کے موافق مطلب نکالتے حقیقت تک نہ پہونچتے اور زندقہ میں مبتلا ہوتے اس لئے میں تم کو اس سے بچاتا رہا اور ظاہر میں زندیق کہتا رہا۔ غرض علماء نے انتظام شریعت کے لئے بعض دفعہ اچھے آدمیوں کو بھی جان کر برا کہا ہے مگر یہ علماء ہی کا منصب ہے عوام کا منصب نہیں تو اگر آپ کو کسی بھنگڑ سنگڑ پر ولایت کا شبہ ہو تو آپ اس کو برا نہ کہئے کیونکہ

برا کہنا آپ پر فرض نہیں ہے حضرت رابعہ تو شیطان کو بھی برا نہ کہتی تھیں اور فرمایا کرتیں کہ مجھے دوست کی یاد سے اتنی فرصت کہاں جو دشمن کا ذکر لیکر بیٹھوں تو اگر آپ کسی کو برا نہ کہیں تو اس پر ملامت نہ کی جائے گی یہ تو اچھی بات ہے بلکہ ملامت اس پر کیجاتی ہے کہ تم ان بھنگڑوں سے دینی نفع یا دنیوی فائدہ حاصل کرنے جاؤ اگر ان میں سے کوئی سچ مچ بھی مجذوب ہو تو تمھیں اس سے کیا نفع۔ دین کا نفع نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے دنیا کا بھی ان سے کچھ نفع نہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ مجذوب سیف زبان ہوتے ہیں جو کہدیتے ہیں وہی ہو جاتا ہے تو سمجھو کہ ان کی زبان سے نکلتا وہی جو ہونے والا ہوتا ہے انکے کہنے کو وقوع میں کچھ دخل نہیں اس میں بھی لوگوں کی نادانی ہے کہ ان کی باتوں کو وقوع کا سبب سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اپنے اختیار سے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے ان کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہے اگر وہ نہ کہتے جب بھی اس کا وقوع ضرور ہوتا تو جب مجذوبوں سے نہ دین کا نفع ہے نہ دنیا کا پھر تم مفت میں وہاں جاکر گالیاں کیوں کھاتے ہو عجیب بات ہے کہ جو بزرگ خوش اخلاقی سے ملیں ان سے تو عوام بھاگتے ہیں اور جو بات بات میں گالیاں دیں ان کو لپٹتے ہیں وہی قصہ ہو گیا جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس کی بیوی نہایت حسین تھی مگر وہ اسے منہ نہ لگاتا تھا بلکہ ایک رنڈی سے پھنسا ہوا تھا بیوی کو فکر ہوئی کہ دیکھنا چاہیئے وہ رنڈی کیسی ہے، دیکھا تو صورت میں خاک بھی نہ تھی مگر حالت یہ تھی کہ میاں جب اس کے پاس پہونچتے تو اس نے دو چار جوتے لگائے کہ بھڑوے کہاں تھا اتنی دیر کہاں لگائی وہ جوتے مارتی جاتی اور یہ خوشامدیں کرتا بیوی نے سمجھ لیا کہ اس مرد کے لئے اس انداز کی ضرورت ہے چنانچہ اس کے بعد جو مرد گھر میں آیا تو بیوی نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا کہ دو چار جوتے لگائے اور گالیاں برسانے لگی تو وہ مرد ہنس کر کہنے لگا کہ بی تیرے اندر بس اسی کی کسر تھی اب سے میں کہیں نہ جاؤں گا۔ (تو واقعی لات کا آدمی بات سے نہیں مانا کرتا) بعض آدمی اسی کے مشتاق ہوتے ہیں کہ گالیاں کھائیں برا بھلا سنیں سو یہ طریقہ تو سب کو آتا ہے مگر تہذیب مانع ہوتی ہے۔ بعض لوگ مجذوبوں سے دعا کے واسطے کہتے ہیں تو یاد رکھو وہ کسی کے واسطے دعا نہیں کرتے وہاں دعا کا محکمہ ہی نہیں بلکہ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ حکم کیا ہو رہا ہے۔ مولانا اسکی بابت فرماتے ہیں ؎

کفر باشد نزد شاں کردن دعا ۔۔۔ کائے خدا از ما بگرداں ایں قضا

(ان کے نزدیک دعا کرنا کفر ہے کہ اے خدا ہم سے اس حکم کو پھیر دے)

خوب سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوتوال ہوتا ہے اور ایک ہوتا ہے مصاحب تو کوتوال کی یہ مجال نہیں کہ وہ کسی مجرم کی سفارش کر سکے وہ تو حکم کا تابع ہے جس کے لئے سزا کا حکم ہوا سزا کر دیتا ہے اور جس کے لئے رہائی کا حکم ہو گیا اسے رہا کر دیتا ہے اور مصاحب کو سفارش کا اختیار ہوتا ہے وہ بڑے سے بڑے مجرم کی سفارش کر سکتا ہے تو مجذوبوں کا درجہ کوتوال کا سا ہے وہ سفارش اور دعا نہیں کر سکتے اور سالک کی حالت دوسری ہے یعنی ان میں مصاحبت کی شان ہوتی ہے وہ دعا اور سفارش کر سکتے ہیں گو ان کے اختیارات زیادہ نہیں ہوتے مگر مقبول بھی زیادہ ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے سلطان محمود کے سامنے ایک تو ایاز تھا اور ایک حسن میمندی حسن میمندی کے اختیارات بہت کچھ تھے کیونکہ وزیر اعظم تھا اور ایاز کے اختیارات باضابطہ کچھ نہ تھے کیونکہ وہ کسی عہدہ پر معین نہ تھا مگر قبولیت اور قرب کی یہ حالت تھی کہ جب محمود کو کسی بات پر غصہ آجاتا تو کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی اور حسن میمندی کے سب اختیارات رکھے رہ جاتے اس وقت سب لوگ ایاز ہی کی خوشامدیں کرتے تھے کہ اس وقت سلطان سے تمہارے سوا کوئی بات نہیں کر سکتا پس سالکین کی وہ شان ہے جو ایاز کی شان تھی یہ ہر وقت دعا، اور سفارش کر سکتے ہیں تو دنیا بھی انہی کے پاس سے ملتی ہے اور ملنے کے یہ معنے نہیں کہ وہ خود تم کو خزانے دیدیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حاکم سے عرض کر دیں گے اور دین تو انہی میں منحصر ہے مگر لوگوں نے عجیب خلط ملط کر رکھا ہے مجذوبوں ہی سے دنیا بھی طلب کرتے ہیں اور دین بھی حالانکہ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں گو وہ خود صاحب ولایت ہوتے ہیں مگر کسی کو کچھ دے نہیں سکتے اور یہ بھی جب ہے کہ وہ مجذوب ہوں اور صاحب حال ہوں اور اگر صاحب حال نہ ہوں جیسے آجکل عموماً بھنگڑ سنگڑ پھرتے ہیں تو وہ صاحب ولایت بھی نہیں بلکہ ان میں بعض تو پاگل سڑی ہوتے ہیں اور بعضے بنے ہوئے ہوتے ہیں وہ تو پورے شیطان ہیں اور صاحب حال کی پہچان اہل علم کے لئے یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھ کر خدا کی محبت زیادہ ہو اور دنیا کی محبت کم ہو اب دیکھئے ان بھنگڑوں کے پاس جا کر بھی کبھی ایسا ہوتا ہے ہرگز نہیں پس خوب سمجھ لو کہ ہر مجنون مجذوب نہیں اور اگر کوئی

ہو بھی تو وہاں نہ دنیا ہے نہ دین دنیا تو اس لئے نہیں کہ وہ دعا نہیں کر سکتا اور دین اس لئے نہیں کہ اس کے پاس تعلیم نہیں پس ان کی زیارت تو کرو وہ بھی جب کہ ان میں صاحب حال ہونے کی علامت موجود ہو جس کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں ورنہ جاہل کو تو مجذوب اور مجنون میں فرق نہیں معلوم ہو سکتا مگر زیارت کے سوا اور کوئی تعلق نہ رکھو حتیٰ کہ میں تو اہل علم کو بھی خاص طور پر یہی کہتا ہوں غرض یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) سے یہ مسئلہ مستنبط ہو گیا کہ فلاح آخرت کے لئے ایمان یقیناً شرط ہے اور اس سے قرآن کی جامعیت معلوم ہوتی ہے کہ ذرا سے لفظ سے کتنا بڑا مسئلہ ثابت ہو گیا گو یہاں اس پر کوئی زور نہیں دیا گیا نہ صیغہ امر سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے مگر طرز خطاب ہی سے یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کر رہا ہے کہ فلاح کے لئے سب سے اول ایمان شرط ہے. پس اول درجہ تو ایمان کا ہے دوسرا درجہ اس کے بعد مراتب متوسط کا ہے جن کو اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ (صبر کرو خود تکالیف اور کفار کے مقابلہ پر صبر کرو اور مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو) میں بیان کیا گیا ہے یہ چار چیزیں ہیں اور تیسرا درجہ نتیجہ کا ہے جس کا بیان لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (تاکہ تم فلاح پاؤ) میں ہے جو شمار میں چھٹی چیز ہے گو ترتیب کا مقتضا یہ تھا کہ میں اول مراتب متوسط کو بیان کرتا لیکن میں ضرورت کی وجہ سے نتیجہ کو مقدم کرتا ہوں کیونکہ آجکل ترقی و فلاح پر بہت گفتگو ہو رہی ہے اور ہر شخص اس کا طالب ہے تو سنئے حق تعالےٰ ایمان اور چند احکام کا بیان فرما کر بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ کہ امید ہے تم کو فلاح حاصل ہو اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اخیر چیز اور مقصود فلاح ہے دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس کا وعدہ ان اعمال مذکورہ پر کیا گیا ہے اور یہاں فلاح مطلق ہے جس کو فلاح دین وغیرہ کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا تو اس درجہ میں عموم الفاظ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ فلاح خواہ دین کی ہو یا دنیا کی ان احکام پر ہی عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اعمال شرعیہ سے مقصود تو محض فلاح دین ہے مگر ترتب فلاح دنیا کا بھی ہوتا ہے پس فلاح دین تو اس لفظ کا مدلول مطابقی ہے اور فلاح دنیا مدلول التزامی ہے یعنی اعمال شرعیہ کے لئے فلاح دنیا لازم ہے گو مقصود نہ ہو. اب سنئے کہ اس زمانہ میں ہر شخص فلاح کا طالب ہے فلاح دنیوی کے طالب تو بہت کثرت سے ہیں حتیٰ کہ اس کے لئے دین کو بھی برباد کر دیا جاتا ہے اور اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں

کہ جب تک دین کو برباد نہ کریں اس وقت تک فلاح دنیوی حاصل نہیں ہوسکتی چنانچہ بعض لوگوں کو جب گناہوں سے بچنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ صاحب ہم تو دنیادار آدمی ہیں ہم سے تقویٰ طہارت کہاں ہوسکتا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دنیادار ہونا تقویٰ طہارت کے منافی ہے گویا یوں کہیے کہ دین کو ترقی دنیا کے لئے مضر اور مانع سمجھتے ہیں اسی لئے کوئی تجارت کرتا ہے تو اس میں احکام شرعیہ کی رعایت نہیں کرتا کوئی زراعت کرتا ہے تو اس میں ناجائز امور سے اجتناب نہیں کرتا اور عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دیندار ہونے کے معنی یہ کہ تجارت وزراعت وغیرہ سب کو بالائے طاق رکھدے اور ان کاموں میں مشغول ہوکر دیندار بننا مشکل ہے کیونکہ دین ان کاموں میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے سو خوب سمجھ لو کہ یہ خیال بالکل غلط ہے دین ہرگز فلاح دنیا اور ترقی دنیا کے لئے مانع نہیں ہے اور دیندار بن کر بھی تجارت وزراعت ہوسکتی ہے مگر اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ وہ ذریعہ معاش دین کے خلاف نہ ہو تب تو وہ دنیا نہیں ہے بلکہ عین دین ہے کیونکہ حدیث میں ہے کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ مِّنْ بَعْدِ الْفَرِیْضَۃِ (حلال کمائی فرض ہے فرض کے بعد) اس صورت میں تجارت وزراعت بھی باعث ثواب ہے، بلکہ ان کاموں میں مشغول ہوکر دین کی پابندی کرنا یہ نرے ذکر وشغل سے افضل ہے چنانچہ ایک بزرگ کا انتقال ہوا جو بہت بڑے تارک اور زاہد اور صوفی تھے انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا پوچھا کہ حضرت آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا مجھے بخشدیا گیا مگر بھائی ہمارے پڑوس میں جو ایک مزدور صاحب عیال رہتا تھا وہ ہم سے افضل رہا کیونکہ وہ رات دن اپنے بال بچوں کے لئے محنت مزدوری کرتا اور ذکر وشغل کم کرتا تھا مگر ہر وقت اس کی تمنا یہ تھی کہ فرصت ملے تو میری طرح ذکر میں مشغول ہو حق تعالیٰ نے اس نیت کی برکت سے اس کو وہ درجہ عطا کیا جو مجھے بھی نصیب نہیں ہوا اس سے معلوم ہوا کہ کسب حلال کے ساتھ احکام الٰہیہ کی پابندی کرنا نرے ذکر وشغل ہونے سے بعض دفعہ افضل ہو جاتا ہے مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ سب کے لئے یہی طریقہ افضل ہے اور بس ہر شخص اسی طریق کو اختیار کرلے بات یہ ہے کہ مصالح باہم متعارض ہیں کسی کے لئے ایک طریق مصلحت ہے اور کسی کے لئے مفسدہ ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے طب میں ایک ایک مرض کے لئے متعدد دوائیں نافع ہوتی ہیں مگر ہر دوا

ہر شخص کے لئے مفید نہیں ہوتی بلکہ اس میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہر شخص کے مزاج کا لحاظ کر کے چند دواؤں میں سے ایک کو منتخب کیا جائے اور اس کے ساتھ کچھ اور دوائیں بھی ملائی جائیں جو اس کی مضرتوں کی اصلاح کر دیں اور نفع کو قوی کر دیں چنانچہ طبیب ان سب باتوں کا لحاظ کر کے نسخہ مرتب کرتا ہے اب اگر کوئی مریض حکیم کے نسخہ کو چھوڑ دے اور اس میں سے صرف ایک دوا کو چھانٹ لے تو یہ اس کی غلطی ہے اس طرح وہ کبھی شفایاب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خود دوا جو اس نے منتخب کی ہے اس مرض کو مفید ہے مگر اس مریض کے مزاج کے لحاظ سے اس کے ساتھ بدرقہ اور مصلح کی بھی ضرورت تھی جس کے بغیر یہ دوا مرض کو زائل نہیں کر سکتی اسی طرح باطن میں بھی ہر مریض کو شیخ کی تجویز کا اتباع ضروری ہے اپنی رائے سے کسی طریق کے تجویز کر لینے کا اسے حق نہیں ہم نے مانا کہ اشتغال بالکسب بھی بعض دفعہ وصول کے لئے کافی ہو جاتا ہے مگر ہر ایک کو نہیں بلکہ خاص استعداد والوں کو کافی ہوتا ہے اور بدون اس خاص استعداد کے اس سے نفع نہیں ہوتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے طلبہ میں مشہور ہے کہ شرح ملا جامی کسی کو اچھی طرح آجائے تو استعداد علوم کے لئے کافی ہے تو ایک طالب علم نے یہ بات سنکر اول ہی سے شرح جامی شروع کر دی اور دس بارہ برس تک اسی میں مشغول رہا تو یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ شرح جامی کو استعداد علوم کے لئے کافی ہے مگر خود اس کے لئے بھی تو خاص استعداد کی ضرورت ہے جو میزان منشعب اور نحو میر و ہدایۃ النحو وغیرہ کے بغیر حاصل نہ ہوگی اسی طرح اشتغال بالکسب ضرور کافی ہے مگر اس کے لئے بھی خاص استعداد کی ضرورت ہے اور وہ استعداد حاصل کرنے کے لئے طبیب کامل سے مشورہ کی ضرورت ہے پھر جس کے لئے وہ اشتغال بالکسب تجویز کرے اس کو یہی طریق مناسب ہے اور جس کے لئے ترک اسباب تجویز کرے اس کے مناسب یہی طریق ہے کیونکہ جس طریق کو شیخ تجویز کرتا ہے حق تعالیٰ اس کو طالب کے مناسب ہی کر دیتے ہیں کسی طریق کا مناسب ہونا یا غیر مناسب ہونا تو در اصل حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور وہیں سے سب کچھ ملتا ہے مگر وہ اکثر مشائخ کاملین کے دل میں ہر ایک کے مناسب ایک بات ڈالدیتے ہیں کہ اس مریض کے لئے فلاں طریق تجویز کرنا مناسب ہے ؂

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ۔۔۔ مصلحت را تہمتے برآہوئے چین بستہ اند

(خشک افشانی تیرے زلف کا کام مصلحت کی وجہ سے چین کے ہرنوں پر تہمت باندھ دی ہے)

غرض حق تعالیٰ نے ہر ایک سکے لئے ایک خاص طریق مقرر کیا ہے کہ اس کو اسی سے وصول ہوتا ہے کسی کو اشتغال بالکسب سے دولت ملتی ہے اور کسی کو ترک اسباب سے پس جس کے لئے جو طریقہ تجویز کر دے وہ اسی کو اختیار کرے اور اسی پر راضی رہے کسی کے لئے خندہ مناسب ہے اور کسی کے لئے گریہ مناسب ہے اس میں اپنی رائے کو دخل نہ دینا چاہیئے اسی کو کہتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان ست | بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان ست

(گل کے کان میں کیا کہدیا ہے کہ وہ خندان ہے اور بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ وہ نالاں ہے)

مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ بر میخت ببندد بستہ باش | چوں کشاید چابک و برجستہ باش

یعنی جب وہ باندھ دیں بندے رہو اور جب کھولدیں کودتے پھرو اگر وہ بیفکری دیں بے فکر رہو۔ اور اگر افکار میں بتلا رکھیں تو اسی میں خوش رہو کیونکہ افکار و تشویشات سے بھی ترقی ہوتی ہے اور ثواب بڑھتا ہے طلب اسی کا نام ہے اور بدون اس کے کام نہیں چل سکتا اس طریق میں اپنی تجویز کو فنا کر دینا چاہیئے۔ بعض لوگ ان تجویزوں ہی کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے لئے ایک خاص حالت تجویز کر لیتے ہیں کہ ہم اس حال میں رہیں تو اچھا ہے پھر جب اس کے خلاف دوسری حالت طاری ہوتی ہے تو گھبرا جاتے ہیں۔ میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو عالم آدمی ممبر ڈپٹی کلکٹر تھے جب ان کی پنشن ہوگئی تو ان کا جی چاہتا تھا کہ الگ بیٹھ کر اللہ اللہ کروں خدا کی قدرت کہ ذکر و شغل شروع کرنے کے بعد ان کے دو بیٹے ایک دم سے مجنوں ہوگئے ایک تو ان کا لڑکا ہے اور ایک لڑکے کا لڑکا ہے تو وہ سخت پریشان ہوگئے کیونکہ اب ان کے علاج معالجہ میں مشغول ہونا پڑا وہ خلوت و یکسوئی فوت ہوگئی اور بعض دفعہ اللہ اللہ کرنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا لیکن عارف کے لئے کچھ پریشانی نہیں کیونکہ عارف اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہیں کیا کرتا جب تک حق تعالیٰ خلوت میں رکھیں خلوت میں رہتا ہے اور جب وہ خلوت سے نکالنا چاہیں نکل جاتا ہے اور اسی میں راضی رہتا ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

چونکہ برمیخت بہ بند دبستہ باش — چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب وہ باندھ دیں بندھے رہو جب کھول دیں کودتے اچھلتے پھرو)

میں کہتا ہوں کہ اصل مقصود تو رضائے حق ہے اور وہ جس طرح خلوت میں ہوتی ہے بعض دفعہ خدمت خلق میں ہوتی ہے تو کیا ان کو مجنون کی خدمت میں ثواب نہ ملتا ضرور ملتا اس صورت میں یہ فکر ہی ترقی کا موجب ہے اس وقت بفکری اور خلوت مقید نہیں بلکہ خلوت میں اللہ اللہ کرنے سے جو ثواب ملتا خدمت مجنوں میں اس سے زیادہ ملتا پھر پریشانی کس لئے۔ ایک شخص حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بیمار ہو گیا تھا کئی وقت سے حرم میں جاکر نماز بھی نہ پڑھ سکا اس کا بہت رنج ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ قرب کے طریقے مختلف ہیں یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ گھر پر نماز پڑھو اور حرم کی حاضری کو ترسو۔ جس حال میں وہ رکھیں اسی میں راضی رہنا چاہیئے۔ پھر فرمایا کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے حج کو بمبئی سے بھی جاتے ہیں اور کراچی سے بھی اگر وہ بمبئی سے بلا دیں بمبئی سے چلے جاؤ اور کراچی سے بلاویں تو کراچی سے چلے جاؤ مقصود دونوں حالتوں میں حاصل ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

چونکہ برمیخت بہ بند دبستہ باش — چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب باندھیں بندھے رہو جب کھولدیں کودتے اچھلتے پھرو)

اسی طرح اگر حق تعالےٰ کسی کو اسباب میں رکھیں اسباب میں رہو اور ترک اسباب میں رکھیں تو اسی میں رہو چنانچہ اگر کوئی شخص زراعت و تجارت اس طرح کرے کہ وہ دین کے موافق ہو کوئی بات خلاف شرع نہ ہو تو یہ عین ثواب ہے اور اس حالت میں یہ دنیا نہیں بلکہ عین دین ہے ہاں اگر کوئی بات دین کے خلاف ہے تو البتہ یہ دنیا ہے جو دین کو مضر ہے پس یہ خیال غلط ہے جو عام طور پر لوگوں کے دل میں جما ہوا ہے کہ دین کے ساتھ دنیا کے کام نہیں ہو سکتے اور دنیاوی فلاح بدون ترک دین کے حاصل نہیں ہو سکتی خدا تعالےٰ کا کلام اس خیال کو غلط بتلا رہا ہے کیونکہ یہاں حق تعالےٰ نے چند احکام بیان فرما کر لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (تاکہ تم فلاح پاؤ کامیاب ہو جاؤ) فرمایا ہے جو اپنے عموم سے فلاح دنیوی کو بھی شامل ہے

اس میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ اعمال شرعیہ فلاح اخروی کا طریق تو ہیں ہی مگر فلاح دنیوی بھی ان کو لازم ہے لیکن سب سے پہلے فلاح کی حقیقت سمجھنا چاہیئے تو سمجھو کہ فلاح کہتے ہیں کامیابی کو نہ کہ مالیابی کو آجکل لوگوں نے کثرت مال کو فلاح سمجھ لیا ہے یہ غلط ہے دیکھئے قارون کو بہت لوگ صاحب نصیب اور صاحب فلاح سمجھتے تھے وہ بھی اسی خیال کے لوگ تھے جیسے آجکل بعض لوگوں کا خیال ہے چنانچہ جب وہ اپنے حشم خدم لیکر سازوسامان کے ساتھ نکلا ہے تو ان لوگوں کی رال ٹپک پڑی اور کہنے لگے يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ سازوسامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے واقعی وہ بڑا صاحب نصیب ہے تو اس وقت جو عقلا تھے انھوں نے ان لوگوں کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا اور بتلایا کہ فلاح اور خوش نصیبی کثرت مال سے نہیں ہے بلکہ یہ تو اطاعت خداوندی سے حاصل ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوا تھا وہ کہنے لگے کہ ارے تمہارا ناس ہو (تم اس مال اور سامان پر کیا للچاتے ہو) اللہ تعالیٰ کا ثواب ہزار درجہ (اس سے) بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور وہ (کامل طور پر) انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو (دنیوی حرص و طمع سے) صبر کرنے والے ہیں۔ اس جواب سے معلوم ہوگیا کہ کثرت مال سے خوش نصیبی اور فلاح نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی فلاح اور خوش نصیبی بھی اطاعت الٰہیہ ہی سے حاصل ہوتی ہے اس زمانہ کے عوام عقلاً تو اس جواب سے خاموش ہوگئے ہوں گے مگر شاید کسی کو دلیل حسی کا انتظار رہا ہو تو وہ زمانہ عجیب تھا کہ بات بات کے لئے دلائل و آیات ظاہر ہوتی تھیں چنانچہ حق تعالیٰ نے ایسی نشانی ظاہر کردی جس سے دنیا داروں کو بھی اقرار کرنا پڑا کہ واقعی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والوں کو دنیوی فلاح بھی حاصل نہیں ہوسکتی گو وہ کیسے ہی مالدار ہوں بلکہ دنیا میں بھی خوش نصیب اور صاحب فلاح دیندار ہی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ

وَيْكَأَنَّهُ لَوْلَا أَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَأَنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ؕ پھر ہم نے قارون کو اور اس کے محلسرائے کو زمین میں دھنسا دیا سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ کے عذاب سے بچا لیتی اور نہ وہ خود ہی اپنے آپ کو بچا سکا اور کل جو لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ (آج دھنستا ہوا دیکھ کر) کہنے لگے کہ بس جی یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دیدیتا ہے (اور جس کو چاہے) تنگی سے دیتا ہے (یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم کثرت مال کو خوش نصیبی سمجھتے تھے بس جی خوش نصیبی اور بدنصیبی کا مدار اس پر نہیں بلکہ یہ تو محض کسی حکمت کی وجہ سے ہے) اگر ہم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا) (کیونکہ جب دنیا کے گناہ میں ہم بھی مبتلا ہو گئے تھے) بس جی معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی (گو چند روز مزے لوٹ لیں مگر انجام پھر ناکامی اور خسران ہی ہے) اس میں حق تعالیٰ نے دنیا داروں کا قول نقل فرمایا ہے کہ آخر کو انھوں نے بھی اقرار کر لیا کہ کافروں کو فلاح اور کامیابی نہیں ہوتی اور یقیناً قارون کی جو حالت آخیر میں ہوئی اس کو دیکھ کر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ قارون کامیاب تھا ہرگز نہیں، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مالیاب تھا پس معلوم ہو گیا کہ فلاح کامیابی کا نام ہے نہ مالیابی کا اور یہ ضرور نہیں کہ جو شخص مالیاب ہو وہ کامیاب بھی ہو مگر عجب اندھیر ہے کہ آجکل لوگ تمول ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ مال خود مقصود نہیں بلکہ یہ تو مقصود کا وسیلہ ہے مال تو ایسا ہے جیسے بادام کا خول اور مقصود ایسا ہے جیسے بادام کا مغز تو بڑا نادان ہے وہ شخص جو چھلکے کو مقصود سمجھے اور انہی کو جمع کرنے میں ساری عمر گنوادے اس کے دماغ کو بادام سے خاک بھی قوت حاصل نہ ہوگی اور یقیناً وہ مقصود سے ناکام رہیگا۔ اور جو شخص مغز کو مقصود سمجھے اور اسی کو جمع کرے گو اس کے پاس چھلکہ ایک بھی نہ ہو وہ کامیاب ہے اس کے دماغ میں بیشک قوت پہونچے گی اب سمجھو کہ اصل مقصود کیا ہے تو سب جانتے ہیں کہ مال آرام و راحت کے لئے جمع کیا جاتا ہے پس راحت و آرام اصل چیز ہے اور یہی مغز ہے اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی کو بدون مال کے آرام و چین حاصل ہو تو وہ کامیاب ہوگا یا نہیں یقیناً وہ کامیاب ہے اور اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کسی کے پاس بادام کی گریاں موجود ہوں گو چھلکے نہ ہوں اور اگر کسی کو باوجود کثرت مال کے آرام و چین نصیب نہ ہو تو بتلائیے وہ

ناکام ہے یا نہیں یقیناً وہ ناکام ہے۔ اور بے چینی کے ساتھ اس کے پاس مال کا جمع ہونا ایسا ہے جیسے کسی کے پاس خالی بادام کے چھلکے جمع ہوں جن میں مغز کا نام نہ ہو تو میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ مطیع خدا کے برابر دنیا کا آرام و چین بھی کسی کو حاصل نہیں ہوتا اس کو وہ راحت ہوتی ہے جو کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہیں مجھے آپ کوئی دیندار دنیوی آسائش سے محروم دکھا دیجئے اور میں دنیادار ہزاروں آرام سے محروم بتلا ہوں جو ہر وقت سینکڑوں تشویشات اور ہزاروں افکار میں مبتلا ہیں میں بقسم کہتا ہوں کہ مجھ کو امیروں پر غریبوں سے زیادہ رحم آتا ہے کیونکہ غریبوں کو اتنے افکار نہیں ہیں جتنے امراء کو ہیں ہمارے اکثر بھائی چند دن میں امیروں کی گردنیں دباتے ہیں اور ان سے زیادہ وصول کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ظاہر میں وہ غریبوں سے زیادہ مالدار ہیں مگر مجھے ان پر رحم آتا ہے کیونکہ جیسا مال ان کے پاس زیادہ ہے ویسے ہی ان کے افکار بھی زیادہ ہیں اور خرچ بھی بہت ہیں مثلاً کسی کی آمدنی پانچسو روپیہ ماہوار کی ہے تو اس کے اخراجات سات سو روپئے ماہوار کے ہیں اور خرچ کا آمدنی سے زیادہ ہونا جڑ ہے کلفت اور پریشانی کی اور جو لوگ غریب ہیں ان کی آمدنی اور خرچ عموماً برابر ہے جتنا کمالیا وہی کھالیا پہن لیا بلکہ اس میں سے بھی بعض دفعہ کچھ بچا لیتے ہیں اس لئے غریب آدمی دس پیسوں میں سے ایک پیسہ بآسانی دے سکتا ہے اور امیر آدمی ایک ہزار میں سے بھی ایک روپیہ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ ہزار سے زیادہ کا مقروض ہے وہ اگر ایک روپیہ دیگا تو اس سے بھی قرض میں ہی کچھ اضافہ ہوگا تو جو اس راز کو سمجھے گا وہ امیروں پر غرباء سے زیادہ رحم کریگا مگر لوگ ان کے ظاہری سامان کو دیکھ کر انہی کی گردن دبلتے ہیں تو ان بیچاروں کو زیادہ نہ ستانا چاہیئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ غریب آدمی کے اگر اخراجات بڑھتے ہیں تو وہ آمدنی بھی بڑھادیتے ہیں مثلاً پہلے دو آنہ یومیہ پر مزدوری کرتے تھے کسی سال گرانی ہوگئی تو انھوں نے مزدوری بڑھادی اب چار آنہ یومیہ پر کام کرنے لگے اور کام لینے والے مجبور ہو کر وہی دیتے ہیں جو مزدور مانگتا ہے تو غریبوں کی آمدنی ان کے اختیار میں ہے اور امراء کی آمدنی ان کے قبضہ میں نہیں۔ نیز امراء کے تعلقات بھی وسیع ہوتے ہیں غرباء کے تعلقات اس درجہ وسیع نہیں ہوتے غریب کو بہت سے بہت اپنے گھر کا فکر ہے اور بال بچوں کا یا دو چار جانور دو بکری

اور امیروں کو گھر کا الگ فکر احباب اور حکام کی خاطر مدارات کا جدا فکر پھر جائیداد اور زمین کا بھی خیال ہے کوئی بیمار ہو جائے تو طبیب کے بلانے کا بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے غرباء اول تو بیمار کم ہوتے ہیں اور جو ہوئے بھی تو ویسے ہی دو چار دن پھر پھرا کر اچھے ہو جاتے ہیں غرض امراء کے ساتھ تعلقات بہت لگے ہوئے ہیں اور جتنے یہ تعلقات زیادہ ہوتے ہیں اتنا ہی سوہان روح زیادہ ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (ان کے اموال و اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے دنیاوی زندگی میں ان کو عذاب دینا چاہتے ہیں) حق تعالیٰ نے اموال و اولاد کو اس جگہ آلہ عذاب فرمایا ہے اور واقعی غور کر کے دیکھا جائے تو کثرت مال و اولاد کے ساتھ افکار و تشویشات بھی زیادہ ہو جاتی ہیں اور یہی کلفت و پریشانی کی حقیقت ہے جس میں امراء اکثر مبتلا ہیں چنانچہ کسی مالدار کے اولاد نہ ہو تو اس کو اپنے مال کی فکر ہوتی ہے کہ میرے بعد یہ تیرے میرے پاس پہنچے گا اس لئے وہ کسی نہ کسی کو متبنیٰ بناتا ہے اور بعد میں اپنے بھی اولاد ہو جائے تو پریشان ہوتا ہے اور اگر کسی کو مال کے ساتھ اولاد بھی نصیب ہو جائے تو خیر ایک غم تو ڈھلا اب یہ فکر ہے کہ بچہ بڑا ہوا ہے اس کی تعلیم و تربیت کرنا چاہیے اور یہ ایسی چیز ہے کہ کسی کے قبضہ و اختیار میں نہیں بعض دفعہ لاکھ کوشش کرو مگر اولاد نالائق اٹھتی ہے اور جو لائق بھی ہوئی تو پھر اس کے نکاح کی فکر ہے۔ سو پریشانیوں کے بعد نکاح بھی ہوا تو اب یہ فکر ہے کہ بیٹے کے اولاد نہیں ہوتی اگر لڑکا بے اولاد رہ گیا تو پھر جائیداد کے غیروں کے پاس جانے کا اندیشہ ہے۔ غرض عمر بھر یہی پریشانی رہتی ہے۔ میں نے ایک بڑی بی کو دیکھا جو اپنے بچوں کو بہت چاہتی تھیں رات سب بچوں کو اپنے ہی پلنگ پر لیکر سوتی تھی جب اولاد زیادہ ہوئی تو پلنگ کے بجائے فرش پر سب کو لیکر سوتی تھیں اور رات کو یہ حالت تھی کہ بار بار اٹھ کر سب کو ہاتھ سے ٹٹولتی تھیں کہ سب زندہ بھی ہیں یا نہیں اور اگر کبھی کسی کو ذرا تکلیف ہوگئی تو بس ساری رات کی نیند اڑ گئی تو بھلا اس صورت میں یہ اولاد آلہ عذاب نہیں تو کیا ہے خدا کی قسم راحت میں وہ ہے جس کے دل میں صرف ایک کی محبت ہو وہ ایک کون خدا تعالیٰ اور یہ حالت ہو ۔۔۔

یکے بین دیکے دان دیکے گوئے
یکے خواہ دیکے خوان دیکے جوئے
(ایک ہی کو دیکھ ایک ہی کو جان اور ایک ہی کہو ایک ہی کو چاہ ایک ہی کو پڑھ اور ایک ہی کی تلاش کر)

خلیل آسا درِ ملک یقین زن
نوائے لا احب الآفلین زن
(حضرت خلیل اللہؑ کی طرح یقین کا دروازہ کھٹکھٹا اور لا احب الآفلین کی صدا بلند کر یعنی میں فانی ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خمِ طرۂ یارے گیرند
(مصلحت یہ ہے کہ دوست ساری جہان کی مصلحتوں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوجائیں)

اور فرماتے ہیں ؎

دلآرامیکہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند
(جس محبوب سے تمہارا لبستہ ہے تو پھر تمام جہان سے آنکھیں بند کرلو)

شاید کسی کو یہاں پر یہ شبہ ہو کہ پہلے تو تم یہ کہہ رہے تھےؔ کہ پریشانی میں بھی ثواب ہوتا ہے اور اب پریشانی کی مذمت کرنے لگے تو سمجھو کہ پریشانی دو قسم کی ہے ایک اضطراری۔ ایک اختیاری پہلی قسم کی میں نے فضیلت بیان کی تھی کہ اگر منجانب اللہ کسی کو افکار میں مبتلا کر دیا جائے تو وہ اسی پر راضی رہے اس دقت فکر ہی سے ترقی ہوگی اور ثواب بڑھے گا اور دوسری قسم کی مذمت کر رہا ہوں کہ اپنے اختیار سے پریشانی کو مول لینا سراسر موجب کلفت ہے۔ غرض تعلقات ماسویٰ اللہ یہ ہیں۔ حقیقت میں تکلیف دہ اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ سلاسل واغلال جہنم کی حقیقت تعلقات ماسویٰ اللہ ہیں یعنی سلاسل واغلال جہنم ان تعلقات کی صورت ہیں جو دنیا میں انسان غیر اللہ سے پیدا کرتا ہے جن سے یہاں بھی پریشان ہوتا ہے اور آخرت میں بھی وہ سلاسل واغلال کی صورت میں ظاہر ہوں گے تو کیا ایسے مالدار کو کامیاب کہیں گے جو باوجود کثرت مال کے راحت قلب سے محروم ہو ہرگز نہیں۔ البتہ اگر مال سے قلب کو تعلق نہ ہو تو پھر وہ آلہ عذاب نہ ہوگا اور نہ اس صورت میں کثرت مال کا کچھ حرج ہے۔ غرض اصل مقصود

ؔ یہ مضمون صفحہ ۱۱ میں گذر چکا ہے ۱۲ جامع

راحت و آسائش ہے اور وہ دنیا میں بھی دینداروں ہی کو حاصل ہے پس آخرت کی فلاح تو ان کے لئے ہے ہی دنیا کی فلاح بھی ان ہی کے لئے ہے کیونکہ روحانی راحت دنیا میں ان کے سوا کسی کو نہیں بلکہ میں اس سے بھی ترقی کر کے کہتا ہوں کہ دینداروں کو روحانی راحت تو حاصل ہے ہی جسمانی راحت بھی انہی کو حاصل ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بیماری اور حوادث میں ان کو روحانی اطمینان کے ساتھ جسمانی اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے وہ مصائب میں نہایت استقلال کے اور سکون کے ساتھ رہتے ہیں اور دنیا داروں کو ایسے وقت میں روحانی اطمینان تو ہوتا ہی نہیں جسمانی راحت بھی نہیں ہوتی ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتی اور باتوں سے گھبراہٹ و بیصبری نمایاں ہوتی ہے مثلاً جب طاعون آتا ہے تو جتنے لوگ دیندار ہیں ان کو پریشانی نہیں ہوتی نہ وہ گھبراہٹ کی باتیں کرتے ہیں نہ مُردوں کی شمار کرتے پھرتے ہیں کہ آج کتنے مرے اور کل کتنے نہ اپنی مجلسوں میں ہر وقت اس کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور نہ وہ اپنے مرنے سے گھبراتے ہیں ان کی طاعون کی پروا بھی نہیں ہوتی کیونکہ ان کا تو مذاق یہ ہے اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ کہ مر کر ہم اپنے خدا کے پاس پہونچ جائیں گے تو جو شخص موت کو معراج سمجھتا ہو وہ طاعون سے کیا ڈرے گا بلکہ اہل اللہ تو اس کے مشتاق رہتے ہیں. چنانچہ حافظ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں

؎ خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم راحت جاں طلبم وزپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا در میکدہ شادان وغزل خواں بردم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جاں طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں) وہ تو موت کو ایسا شیریں سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے نذریں مانتے ہیں خیر یہ تو بڑے دینداروں کی حالت ہوتی ہے مگر معمولی دینداروں کو بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ طاعون سے اس قدر پریشان نہیں ہوتے جتنا دنیا دار پریشان ہوتے ہیں. میں نے طاعون میں ایک ہندو کو مرتے ہوئے دیکھا چونکہ وہ سب سے میل جول رکھنے والا تھا اس لئے بیماری میں اس کے دیکھنے کو ہندو مسلمان سبھی جاتے تھے تو میں نے دیکھا کہ وہ ہائے ہائے کرتا تھا اور سخت پریشان تھا حالانکہ بڑا مالدار تھا مگر اس وقت مال نے اس کی پریشانی کو کچھ کم نہ کیا اور ہم نے مسلمانوں کو بھی طاعون میں مرتے

ہوئے دیکھا ہے کہ بڑے خوش و خرم جان دیتے تھے۔ ہمارے یہاں ایک دفعہ طاعون بہت زور کا ہوا تو مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتب سے پردیسی طلبہ اپنے اپنے وطن جانے لگے کیونکہ مولانا کا اسی طاعون میں وصال ہو چکا تھا تو ان میں ایک طالب علم نور احمد نامی بھی جس کی عمر ۱۸ برس کی تھی گھر جانے کے لئے تیار تھا اسباب بندھا رکھا تھا کہ رات ہی کو اسے بخار ہوا اور گلٹی نمودار ہوئی سب کو بڑا رنج ہوا کہ اس بیچارہ کو اپنے وطن کی کیسی حسرت ہوگی گھر جانے کو تیار بیٹھا تھا اور اب موت کا سامان ہونے لگا تو بعض لوگوں نے تسلی کے طور پر اس سے کہا کہ نور احمد گھبراؤ نہیں انشاء اللہ تم اچھے ہو جاؤ گے اور تندرست ہو کر اپنے گھر جاؤ گے تو وہ کہنے لگا بس اب میرے واسطے ایسی دعا نہ کرو اب تو خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے یہ دعا کرو کہ ایمان پر خاتمہ ہو جائے اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اسے گھر کی ذرا بھی حسرت نہیں چنانچہ ایک دو روز میں اس کا انتقال ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے جنازہ پر ایک نور تھا۔

صاحبو بھلا ایسے لوگ کیا پریشان ہوں گے جو خدا تعالیٰ کے ہر حکم پر راضی ہیں۔ کھانے کو کم ملے تو اس پر راضی، پہننے کو پھٹا پرانا ملے اس پر راضی، بیماری آوے تو اس پر راضی پھر انہیں کاہے کا غم ان کی طرف سے دنیا میں جو چاہے ہوتا رہے وہ کبھی پریشان نہ ہوں گے کیونکہ وہ سب کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں اور سے

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ دوست سے پہنچے اچھا ہے) اور سے

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود (جو کچھ بادشاہ حقیقی تصرف کریں دل پسند ہوتا ہے)

حضرت بہلول دانا نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ فرمایئے کہ آجکل کیونکر گذرتی ہے فرمایا اس شخص کی خوشی کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی خواہش کے خلاف عالم میں کچھ نہیں ہوتا جو کچھ ہوتا ہے اس کی خواہش کے موافق ہوتا ہے۔ بہلول نے کہا کہ یہ کیونکر فرمایا کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یقیناً خدا کے ارادہ کے موافق ہوتا ہے اور میں نے اپنے ارادہ کو ان کے ارادہ میں فنا کر دیا ہے تو اب جو کچھ ہوتا ہے وہ میری خواہش کے بھی موافق ہوتا ہے الخ سو بتلایئے جس نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو اس کو پھر غم

کا ہے کا اس سے بڑھ کر کیسے آسائش ہوگی۔ صاحب آپ کسی اہل کے پاس بیماری کی حالت میں جاکر دیکھئے جو نادار بھی ہوں واللہ آپ ان کو پریشان نہ پاویں گے اس کے بعد کسی والیٔ ریاست کے پاس جاکر دیکھئے تو وہ بیماری میں سخت پریشان ہوگا گو ظاہر میں اس کے خدمت گار اور تیماردار بہت ہوں گے مگر وہ راحت میں نہ ہوگا، نہایت بیچین ہوگا اور ایسا بھی کم ہوتا ہے کہ امراء، وزُرساء کو بیماری میں تیماردار اور خدمت گار خیرخواہ نصیب ہو جائیں زیادہ تو یہی دیکھا ہے کہ بیماری میں راحت جسمانی بھی دینداروں کو امراء سے زیادہ نصیب ہوتی ہے ہم نے دیکھا ہے کہ بزرگ بیمار ہوتے ہیں ان کو دل سے خدمت کرنے والے جان نثار خادم بہت میسر ہوتے ہیں اور امیروں کو ایک بھی نصیب نہیں ہوتا ان کے خدمتگار محض اوپر کے دل سے خدمت کرتے ہیں۔ پھر کوئی بزرگ بیمار ہوتا ہے تو ہر مُرید اور ہر عالم ان کے لئے دل سے دعائے صحت کرتا ہے اور امیروں کے لئے ایک بھی دل سے دعا نہیں کرتا۔ چنانچہ ایک رئیس بیمار ہوئے اور حکیموں نے نسخے لکھے تو ان کے ورثہ نسخوں کو چھپاتے پھرتے تھے کہ دوائیں استعمال کر کے اگر یہ جی گیا تو سارا مال اور ریاست کا کام پھر اسی کے قبضہ میں رہیگا یہ تو مالداروں کی حالت ہے۔ اور چرتھاول میں ایک مزدور کو ہم نے دیکھا کہ وہ بیمار ہوا تو اس کے سب بچے اور گھر والے وظیفے پڑھ پڑھ کر دعا کرتے اور یہ چاہتے تھے کہ خدا کرے یہ نہ مرے اور کسی طرح اچھا ہی ہو جائے تو بتلایئے کیا اس پر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ فلاح و کامیابی کثرتِ مال سے ہے ہرگز نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ دنیوی فلاح بھی دین ہی سے حاصل ہوتی ہے اور ایک کھلی دلیل اس کی یہ ہے کہ اہل دنیا دینداروں کے دروازوں پر دنیا کی حاجتیں لے کر جاتے ہیں چنانچہ اہل اللہ کے دروازوں پر آپ ہزاروں دنیا داروں کو جاتا دیکھیں گے معلوم ہوا کہ دنیا دار بھی سمجھتے ہیں کہ دنیا بھی ان دینداروں ہی کے پاس ہے جب تو ان کے پاس دنیا کی حاجتیں لے جاتے ہیں اور آپ نے کسی دیندار بزرگ کو اہل دنیا کے پاس کوئی حاجت لے کر جاتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا پس معلوم ہوا کہ اہل دنیا محتاج ہیں اور اہل دین غنی ہیں گو وہ کیسے ہی خستہ حال ہوں یہ تو واقعات ہیں ان

کھلے ہوئے مشاہدوں سے کون انکار کرسکتا ہے اور کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ یوں ہی ہوا ہے کہ اہل دنیا اہل دین کے محتاج رہے اور دین دار اُن کے محتاج نہیں ہوئے ؎

گدا بادشاہست و نامش گداست

(فقیر بادشاہ ہے اور اس کا نام فقیر ہے)

ہاں اگر کوئی دنیا دار ایسا ہو کہ اس کو خدا تعالے نے دین و دنیا کی دونوں دولتیں دی ہوں جیسے بعض اہل اللہ سلطان وقت ہوئے ہیں تو وہ اپنے وقت کا سلیمان ہے اس کو دین داروں سے استغنا ہوسکتا ہے مگر اس کو بھی استغنار دین کی بدولت حاصل ہوا نری دنیا کے ساتھ اس کو کبھی اہل دین سے استغنا نہیں ہوسکتا تھا اور گفتگو اسی میں ہے کہ اگر کسی کے پاس صرف ایک ہی دولت ہو تو دونوں میں کونسی حالت اچھی ہے تو میں اس کو بتلا رہا ہوں کہ اہل دین تو بدون مال کے کامیاب ہیں اور اہل دنیا بغیر دین کے کامیاب نہیں ہوسکتے بلکہ پریشان رہیں گے تو اب ثابت ہوگیا کہ بدون دین کے اختیار کئے دنیا کی راحت بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی کو اس پر یہ شبہ ہو کہ اہل یورپ تو بغیر دین کے آرام میں ہیں تو اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ وہ آرام میں نہیں ہے آپ محض ان کے سازوسامان کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ آرام میں ہیں حالانکہ راحت اصل میں اطمینانِ قلب کا نام ہے اور واللہ وہ بے دین کو کبھی حاصل نہیں ہوسکتی مگر یہ جواب ایسا ہے کہ اس کی حقیقت کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ جس کو قلوب کفار کی حالت منکشف ہوگئی ہو وہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے میں دوسرا جواب دیتا ہوں وہ یہ کہ اچھا میں فرض کرتا ہوں کہ وہ آرام میں ہیں مگر آپ اپنے کو ان پر قیاس نہیں کرسکتے ان کو بدون دین کے راحت دنیا حاصل ہوسکتی ہیں مگر آپ کو بغیر دین کے دنیا کی راحت ہرگز نصیب نہیں ہوسکتی کیونکہ آپ مدعی اطاعت کے ہیں اور وہ اطاعت کے مدعی نہیں بلکہ کفر اختیار کرکے وہ خدا سے باغی ہوچکے ہیں۔ پس آپ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے گا جو مدعی اطاعت کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بات بات پر گرفت ہوگی اور جہاں

ذرا قانون شریعت سے باہر قدم رکھا فوراً سزا ہو گی اور ان سے وہ برتاؤ کیا جا رہا ہے جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ باغی اگر دن میں سو دفعہ قانون کی مخالفت کرے تو اس سے جزوی تعرض نہیں کیا جاتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو بلقانی ریاستیں سلطان سے باغی ہو کر ان کے احکام کی مخالفت کرتی ہیں اور ایک کوئی ترک سلطان کے کسی حکم کی مخالفت کرے تو بلقانی ریاستوں کی جزوی مخالفتوں پر نظر نہیں کی جاتی بلکہ ان کو بغاوت کی سزا اکٹھی دی جاوے گی اور اس کا کچھ تذکرہ بھی نہ ہو گا کہ بغاوت کے بعد انھوں نے اور کون کون سے کام خلاف قانون کئے تھے کیونکہ بغاوت اتنا بڑا جرم ہے جس نے دوسرے جرائم کو نظر انداز کر دیا۔ اور ترک ذرا سی مخالفت کرے تو فوراً سزا کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے کو مطیع سلطنت کہتا ہے اس لئے اس کی ہر بات پر مواخذہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ مسلمان کو ذرا ذرا سی مخالفت پر سزا ملتی ہے اور جہاں اس نے کوئی گناہ کیا فوراً اس کی دنیوی راحت سلب کر لی جاتی ہے گو ظاہری ساز و سامان جلدی سلب نہ کیا جاوے مگر راحت قلب تو فوراً سلب ہو جاتی ہے جو کہ فلاح و کامیابی کی اصل حقیقت ہے کیونکہ وہ اطاعت کا مدعی ہے اور کفار کے جزوی افعال پر نظر نہیں کی جاتی بس ان کو تو بغاوت کی سزا اکھٹی دیجاوے گی جس کے لئے ایک میعاد معین ہے شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ اس دعوے اطاعت سے تو بغاوت ہی اچھی کہ روز روز کی گرفت سے تو بچے رہیں گے تو سمجھ لیجئے کہ مطیع کو تو ابھی سزا ہو گئی مگر یہ سزا بھگتنے کے بعد پھر وہ ہمیشہ کے لئے راحت میں ہے، جیسے کوئی ترک چوری یا زنا کرے تو اس کو اس وقت کچھ دنوں کے واسطے قید کر دیا جاتا ہے مگر قید کاٹنے کے بعد پھر سلطنت میں وہ کوئی عہدہ لے سکتا ہے اور اپنی زندگی آرام سے گذار سکتا ہے مگر باغی کو چند روز یا چند سال کے لئے گو کچھ نہ کہا جائے لیکن جب پکڑا جائے گا تو اس کی سزا سولی سے ادھر نہ ہو گی۔ اسی طرح جو خدا تعالیٰ سے بغاوت کرے گا وہ چند روز دنیا میں گو راحت سے گزار لے مگر

جب اس کو پکڑا جائے گا تو ابدالاباد کے عذاب جہنم سے ادھر اس کی سزا نہ ہوگی اب اختیار ہے جس کو چاہو اختیار کر لو۔ غرض آسائش کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو کوئی بالکل باغی ہو کر رہے تو سزائے بغاوت کے وقت سے پہلے اس کو چین ہے اور یا بالکل مطیع ہو کر رہے تو اس کو ہمیشہ کے لئے چین ہے یہاں بھی اور آخرت میں بھی باقی مطیع و نافرماں دونوں بنکر دنیا کی راحت تو حاصل نہیں ہو سکتی ہاں آخرت میں کچھ سزا بھگتنے کے بعد پھر راحت ہو جائیگی خلاصہ کلام یہ ہوا کہ آسائش کا طریقہ جو کہ اصل ہے فلاح کی بدون دین کی پابندی کے ممکن نہیں اس مضمون کو میں نے اس لئے بیان کیا کہ آج کل سب لوگ فلاح کے طالب ہیں جن میں زیادہ تر فلاح دنیا کے طالب ہیں تو میں نے بتلا دیا کہ فلاح دنیا بھی دین ہی کے اتباع سے مل سکتی ہے اس کے بغیر مسلمان کو تو مل نہیں سکتی اور اس وقت مسلمانوں ہی سے خطاب ہے یہ مسئلہ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (تاکہ تم کامیاب ہو) سے مستنبط ہوا اور یہاں لَعَلَّ شک کے لئے نہیں ہے بلکہ ترجی یعنی امید دلانے کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ اعمال بجالا کر فلاح کے امیدوار رہو لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں کوئی وعدہ تو ہے ہی نہیں تو شاید ایسا نہ بھی ہو کیونکہ یہ شاہانہ کلام ہے اور بادشاہ کسی کو امید دلا کر ناامید نہیں کیا کرتے۔ شاہانہ کلام میں امیدوار باشند (امیدوار رہو) ہزار پختہ وعدوں سے زیادہ ہوتا ہے پھر رفع شک کے لئے بعض مقامات پر حق تعالیٰ نے پختہ وعدہ بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (ہم پر مومنین کی مدد کرنا حق ہے) رہا یہ کہ پھر سب جگہ حَقًّا عَلَيْنَا (ہم پر حق ہے) ہی کیوں نہ فرمایا کہیں لَعَلَّكُمْ کس لئے فرمایا تو اس میں ایک راز ہے جو اہل سنت نے سمجھا ہے وہ یہ کہ پختہ وعدہ کے بعد بعض جگہ لَعَلَّ فرما کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ہم وعدہ کر کے مجبور نہیں ہو گئے بلکہ اب بھی جزا کا دینا اور نہ دینا ہمارے اختیار میں ہے تمہاری مجال نہیں کہ ہم پر تقاضا کرنے لگو اور ہم کو ایفاء وعدہ پر مجبور سمجھ کر کچھ سے کچھ ہانکنے اور بکنے لگو ہماری شان یہ ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (جو وہ کرتا ہے اس سے اس کو نہ پوچھا جائے گا اور ان سے دریافت کیا جائے گا) یہ اور بات ہے کہ ہم وعدہ کر کے ایفا ضرور کریں گے مگر اس پر مجبور بھی نہیں ہیں بلکہ وعدہ کے بعد بھی ویسے ہی مختار ہیں جیسے قبل وعدہ تھے اس لئے تم تو لَعَلَّكُمْ ہی کے مفہوم پر نظر

رسولاتَ پر ناز نہ کرو گو ہمارے یہاں لَعَلَّ بھی لَاتَ ہی کے حکم میں ہے اس نکتہ کو اہل سنت ہی نے سمجھا ہے معتزلہ نے یہاں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں وہ خدا پر بھی بعض امور کو واجب سمجھتے ہیں یہاں تک تو جزو اول اور جزو آخیر کا بیان تھا۔ اب میں ان احکام کو بیان کرتا ہوں جو درمیان میں مذکور ہیں جن پر فلاح کو موقوف کیا گیا ہے۔ ارادہ تو تھا ان کے مفصل بیان کا مگر وقت نہیں ہے اس لئے مختصراً بیان کر دوں گا اور گو مفصل بھی پورا پورا تو نہ ہوتا مگر خیر کسی قدر تفصیل ہو جاتی تو سمجھئے کہ وہ چار چیزیں ہیں۔ اِصْبِرُوْا۔ وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ وَاتَّقُوْا اللّٰہَ میں نے تمہید میں کہا تھا کہ ان احکام کو تمام سورت سے بلکہ تمام شریعت سے بلکہ تمام مصالح دنیویہ سے تعلق ہے۔ اب میں اس کو بتلانا چاہتا ہوں تفصیل اس کی یہ ہے کہ۔

اعمال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جن کا وقت آ گیا۔ ایک وہ جن کا وقت نہیں آیا۔ سو یہاں ایک حکم قسم اول کے متعلق ہے اور ایک حکم قسم دوم کے متعلق ہے۔ قسم اول کے متعلق تو اِصْبِرُوْا ہے یعنی جس عمل کا وقت آ جاوے اس وقت صبر سے کام لو یعنی پابندی اور استقلال سے رہو تو حق تعالےٰ نے اس میں اعمال حاضرہ میں مستقل رہنے کا حکم فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دینداری کے یہی معنی ہیں کہ ہر کام کو پابندی اور استقلال سے کیا جاوے۔ آجکل بعض لوگ ولولے اور جوش میں بہت سا کام شروع کر دیتے ہیں پھر نباہ نہیں ہوتا تو یہ دینداری کامل نہیں ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے اتنا ہی کام بتلایا ہے جس پر نباہ ہو سکے واجبات و فرائض و سنن موکدہ پر نباہ کچھ دشوار نہیں اس سے زیادہ کام کرنے میں البتہ بعض سے نباہ نہیں ہوتا تو ان کو اپنے ذمہ اتنا ہی کام بڑھانا چاہیئے جس پر نباہ اور دوام ہو سکے تو اِصْبِرُوْا کا حکم ان اعمال کے متعلق ہے جن کا وقت آ گیا ہے پھر ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے دوسرے وہ جن کا تعلق دوسروں سے بھی ہے ان کے متعلق صَابِرُوْا فرمایا ہے کہ دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو بعض لوگ اپنے ذاتی کام تو کر لیتے ہیں مثلاً نماز وغیرہ مگر دوسروں کے متعلق باہمت نہیں ہوتے اور اگر کچھ ہمت بھی کی تو وہ اسی وقت

تک رہتی ہے جب تک کوئی دوسرا مزاحم نہ ہو اور اگر کوئی مزاحم ہوا تو پھر مستقل نہیں رہتے جیسے نکاح وغیرہ کی رسموں میں اکثر لوگوں کی یہی حالت ہے کہ بیٹے والا بیٹی والوں کی مزاحمت کو برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو نچاتا ہے پھر یہ دین پر مستقل نہیں رہ سکتے اس کے متعلق صَابِرُوْا میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں بھی ثابت قدم رہو اسی طرح اگر کبھی اعداء اللہ دین میں مزاحمت کرنے لگیں تو ان کے مقابلہ میں بھی مستقل رہنے کا صَابِرُوْا میں حکم ہے۔ غرض ایک تو وہ افعال ہیں جن میں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا ان پر مداومت واستقلال کرنے کا حکم تو اِصْبِرُوْا میں ہے اور جن میں دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان میں ثابت قدم رہنے کا حکم صَابِرُوْا میں ہے یہ تو وہ افعال تھے جن کا وقت آگیا ہے اور ایک وہ افعال ہیں جن کا ابھی وقت نہیں آیا ان کے متعلق حکم رَابِطُوْا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کاموں کے لئے تیار ومستعد رہنا چاہیئے اور یہ میں نے اس سے سمجھا کہ لغت میں رِبَاط کے معنے اعداء کے مقابلہ میں سرحد پر گھوڑے باندھنا ہے یعنی مورچہ بندی اور ظاہر ہے کہ مورچہ بندی حفظ ماتقدم کے لئے اور پہلے سے مقابلہ کو تیار ومستعد رہنے کے واسطے کی جاتی ہے عام لغت کے موافق ایک تفسیر تو رباط کی یہ ہے دوسری ایک تفسیر حدیث میں آئی ہے اِنْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ یعنی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے لئے منتظر رہنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق بھی فرمایا ہے فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ یہی رباط ہے یہی رباط ہے اور اس تفسیر میں اور پہلی تفسیر میں کچھ منافات نہیں بلکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ رباط اعداء ظاہری کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ جیسے اعداء ظاہری کے مقابلہ میں رباط ہوتا ہے اسی طرح کبھی اعداء باطنی یعنی نفس وشیطان کے مقابلہ میں بھی رباط ہوتا ہے وہ مجاہدہ ظاہری کا رباط ہے اور مجاہدۂ باطنی کا رباط ہے۔ اسی کو ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

اِلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَایَا وَالذُّنُوْبَ

(مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے مہاجر وہ جو گناہوں اور خطاؤں سے بچتا ہے)

یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے مقابلہ میں مجاہدہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ کی ایک قسم مجاہدۂ نفس بھی ہے اور اس کے لئے بھی ایک رباط ہے جیسے اعداء ظاہر کے مقابلہ کی پہلے سے تیاری کی جاتی ہے اسی طرح نفس وشیطان کے مقابلہ میں بھی مورچہ بندی کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بھی بڑے سخت دشمن ہیں جو بدون مورچہ بندی کے قابو میں نہیں آتے اسی کو فرماتے ہیں ؎

اے شہاں کشتیم ما خصمے بروں ماند خصمے زو تبر در اندروں

(اے بزرگو ہم نے ظاہری دشمن کو تو ہلاک کر دیا مگر ایک دشمن جو اس سے بھی بدتر اور زیادہ ضرر رساں ہے باطن میں رہ گیا جس کو نفس کہتے ہیں)

اور فرماتے ہیں ؎

کشتن ایں کار عقل وہوش نیست شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

(اس باطنی دشمن کو ہلاک کرنا محض عقل وہوشیاری کا کام نہیں ہے کیونکہ شیر باطن خرگوش کے قابو کا نہیں ہے)

یعنی اس کا زیر کرنا عقل وہوش کا کام نہیں کیونکہ شیر خرگوش کے پھندے میں نہیں آیا کرتا بلکہ ان کو زیر کرنے کے لئے شارع علیہ السلام کی تعلیم کا اتباع ضروری ہے چنانچہ اسی کا ایک شعبہ یہ رباط ہے یعنی نماز کا انتظار کرنا بعد ایک نماز کے یہ نفس پر سب سے زیادہ گراں ہے کیونکہ اس میں کوئی حظ نہیں ہے۔ بس نماز پڑھ کر خالی بیٹھے ہیں اور دوسری نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج کل بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس خالی بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ میں کہتا ہوں اس میں دو فائدے ہیں ایک تو نفس کو طاعات پر جمانا دوسرے وہ فائدہ ہے جس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔

اِنَّ الْعَبْدَ فِی الصَّلٰوۃِ مَا انْتَظَرَ الصَّلٰوۃَ کہ بندہ جب تک نماز کے انتظار میں

اس وقت تک وہ نماز میں ہی رہتا ہے یعنی اس انتظار میں بالکل وہی ثواب ملتا ہے جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے مگر چونکہ ثواب نظر نہیں آتا اس لئے نفس پر یہ انتظار گراں ہوتا ہے اسی واسطے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو رباط فرمایا ہے تو ایک تفسیر رباط کی یہ ہے جو پہلی تفسیر کی بھی موئد ہے اور ان دونوں میں ایک امر مشترک ہے یعنی مستعد اور تیار رہنا اگلی عبادت اور آئندہ کام کے لئے تو رباط کی روح اصل میں تیاری اور استعداد ہے اس لئے میں نے رَابِطُوْا کی تفسیر یہ کی کہ جن کاموں کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیار و مستعد رہنا چاہیئے۔ پس صبر کی ضرورت تو ان افعال میں ہے جن کا وقت آگیا اور رباط کی ضرورت ان کاموں میں ہے جن کا وقت نہیں آیا۔ دین کا خلاصہ یہی ہے کہ جن کاموں کا وقت آگیا ہو ان کو استقلال و پابندی سے ادا کیا جائے اور جن کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیار و مستعد رہے کسی وقت بے فکر ہو کر نہ بیٹھے بلکہ یہ حال ہونا چاہیئے ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش — تادم آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دمے آخر بود — کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(تم کو چاہیئے کہ اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ خراش تراش میں لگے رہو آخر دم تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی تو گھڑی ایسی ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی یعنی طلب میں لگے رہو تو کسی وقت ضرور وصول الی اللہ ہو جائے گا)

بس دین یہ ہے کہ آدمی کو ہر دم ایک دھن لگی رہے یا تو کسی کام میں لگا ہوا ہو یا کسی کام کی تیاری میں مشغول ہو۔ اے مسلمانو! خدا کے ساتھ وہ حالت تو ہونی چاہیئے جو ایک محبوب مجازی کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر دم عاشق اسی کی دھن میں رہتا ہے گو دنیا کے سارے دھندے بھی کرتا ہے مگر اس کا خیال کبھی دل سے نہیں اترتا بس یہ حال ہوتا ہے ؎

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد
(جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے)

تو کم از کم طالب خدا کا یہ حال تو ہونا چاہیئے جو ایک مردار کسی کے عاشق کا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی وقت دل سے نہیں اترتی ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود ٭ گوی گشتن بہراو اولےٰ بود

(اللہ تعالیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے بھی کیا کم ہو اس کے لئے تو کوچہ گردی کرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

صاحبو! کیا خدا کی محبت ایک مخلوق کی محبت سے بھی کم ہو گئی اگر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ خدا کی ایسی دھن نہ ہو واللہ جو سچا طالب ہو گا اس کے دل کو ہر وقت خدا تعالیٰ کی دھن لگی ہو گی چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی بابت ارشاد ہے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم دنیا کا بھی کام کریں اور اس کے ساتھ خدا کی یاد بھی رہے میں نے کہا یہ ایسے ہو سکتا ہے جیسے آپ کو خدا کے کام کے ساتھ دنیا یاد رہتی ہے۔ اگر ایک کام کے ساتھ دوسرے کی یاد نہیں ہو سکتی تو پھر نماز اور تلاوت قرآن و ذکر میں دنیا کیونکر یاد رہتی ہے اگر دنیا کے ساتھ خدا کا یاد رہنا تعجب کی بات ہے تو اس پر بھی تعجب ہونا چاہیئے اور اگر اس پر تعجب نہیں تو اس کے عکس پر کیوں تعجب ہے بات یہ ہے کہ جو چیز دل میں بس جاتی ہے وہ ہر کام کے ساتھ یاد رہا کرتی ہے۔ چونکہ ہمارے دلوں میں دنیا بسی ہوئی ہے اس لئے خدا کے کام میں بھی وہ یاد رہتی ہے اور اگر کبھی خدا دل میں بس جائے گا تو پھر وہ بھی دنیا کے کاموں میں یاد رہے اور اس کی ایک بڑی نظیر طاعون کی بدولت مل گئی ہے۔ اس سے ایک حدیث پر سے اشکال رفع ہو گیا حدیث میں آتا ہے اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَاِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ وَعِدْ نَفْسَكَ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ۔ یعنی جب صبح کرو تو اپنے دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام ہو تو دل میں صبح کا خیال نہ لاؤ اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی اور کہتے تھے کہ

ایسا سمجھ بیٹھیں تو پھر دنیا کے کاروبار سب چھوٹ جائیں گے کسی سے کوئی کام دنیا کا نہ ہو سکے گا مگر طاعون نے اس کو حل کر دیا کہ اس زمانہ میں دنیا کا کوئی کام بھی نہیں چھٹا دوکان دار تجارت کرتے رہے کاشتکار کھیتی کرتے رہے ملازمت پیشہ اپنی ملازمت کے کام میں لگے رہے ریل اور تار اور ڈاک اور کارخانے سب بدستور رہے مگر لوگوں کی حالت یہ تھی کہ صبح کو شام کی امید نہ ہوتی تھی اور شام کو صبح کی امید نہ ہوتی تھی ہر شخص کو موت کا خطرہ لگا ہوا تھا تو سارے کام بھی ہوتے رہے اور مراقبۂ موت بھی حاصل ہو گیا بس اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جیسا تم طاعون و ہیضہ کے زمانہ میں ہو جاتے ہو بارہ مہینے ایسے ہی رہو مگر آج تو یہ حالت ہے کہ جہاں طاعون گیا اور بے فکر ہو گئے گویا اب خدا تعالٰے ان کو مار ہی نہیں سکتے تو جیسے طاعون کے زمانہ میں ہر کام کے ساتھ موت کا دھیان لگا رہتا ہے اور اس سے کسی کام میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی یوں ہی اہل اللہ کو دنیا کے ہر کام میں خدا تعالٰی کی یاد بھی رہتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ (یہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی) اور اس سے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ہوتی اور یہی حاصل ہے اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا کا کہ ہر وقت کے متعلق جو کام ہے اس کو بجا لاؤ اور جس کا وقت نہیں آیا اس کے دھیان میں رہو اور اس کے لئے پہلے سے تیار و مستعد رہو (اور احکام الٰہیہ کے دھیان میں رہنا اور اس کے لئے تیاری کرنا یہی ذکر اللہ بھی ہے اور اسی سے خدا کی یاد دل میں پیوستہ ہو جاتی ہے ۱۲ جامع)

اور اِصْبِرُوْا فرمانے سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا وہ یہ کہ اصل مقصود احکام کی پابندی ہے لذت مقصود نہیں پس اگر کوئی شخص احکام کو پابندی سے بجا لاتا ہو گو لذت اور مزا نہ آتا ہو تو وہ مقصود سے کامیاب ہے اگر ناگواری مطلوب نہ ہوتی تو حق تعالٰے اِصْبِرُوْا نہ فرماتے پس جا بجا اہتمام کے ساتھ اِصْبِرُوْا فرمانا بتلا رہا ہے۔ کہ لذت مقصود نہیں بلکہ صبر و استقلال مطلوب ہے مگر آجکل اکثر سالکین اس کے شاکی

نظر آتے ہیں کہ ہائے ہم کو طاعات میں مزا نہیں آتا اور اس کو طاعات کے لئے نقص سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نفس کا ایک کید ہے کہ اس کو دنیا میں بھی حظ مطلوب ہے حالانکہ طاعات سے دنیا میں حظ مطلوب نہیں بلکہ آخرت میں اس سے حظ حاصل ہوگا لیکن اگر کسی کو بدون طلب کے حظ نصیب ہوجائے تو یہ لذت بیکار بھی نہیں نعمت الٰہیہ ہے اس کی ناقدری نہ کرے کیونکہ بعض کے لئے یہ بہت مفید ہوتی ہے پس جس کو یہ دولت حاصل ہو وہ کلفت کا ثواب سنکر زوالِ لذت کا بھی طالب نہ ہو اور جس کو حاصل نہ ہو وہ اس کے درپے نہ ہو غرض جس حالت میں وہ رکھیں اسی میں خوش رہنا چاہیئے وہ تمہارے لئے جس کیفیت کو مصلحت جانیں وہی بہتر ہے ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں ست

بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں است

(گل کے کان میں کیا کہہ دیا ہے کہ وہ خنداں ہے اور بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ وہ نالاں ہے)

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب ایک مریض کو تو حب ایارج دے اور ایک کو خمیرہ گاؤزبان دے وہاں کوئی مزاحمت نہیں کرتا کہ اس کو میٹھی دوا اور مجھے کڑوی دوا کیوں دی اس جگہ سب عاقل بن جاتے ہیں کہ بھائی اس کے لئے یہی مصلحت ہے اور اس کے لئے یہی مناسب ہے۔ مگر یہاں طب باطنی میں لوگ طبیب سے مزاحمت کرتے ہیں کہ فلاں کو تو خدا تعالےٰ نے لذت و بسط میں رکھا ہے اور ہم کو کلفت و قبض دے دیا ہے نہ معلوم وہ کیا ان کا عزیز ہے صاحبو! عزیز کوئی نہیں سب غلام ہیں اور غلام کو تجویز کا کوئی حق نہیں۔ غلام کی تو وہ حالت ہونی چاہیئے جیسے ایک غلام کی حکایت ہے کہ اس کو کسی نے خریدا اور گھر لاکر پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے، کہا اب تک تو جو کچھ نام تھا وہ تھا آج سے میرا نام وہ ہے جس سے آپ پکاریں۔ پوچھا تم کھاتے کیا ہو کہا اب تک تو جو کچھ بھی کھاتا تھا

آج سے وہ کھاؤں گا جو آپ کھلائیں۔ اے صاحبو! غلام کا تو یہ مذاق ہونا چاہیئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہو۔ دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں میں راضی ہوں)

اور یہ مذہب ہونا چاہیئے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش | اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایانِ از بادشاہی نفور | بامیدش اندر گدائی صبور
دما دم شراب الم درکشند | وگر تلخ بینند دم درکشند

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر ہیں جو بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہردم رنج وغم کی شراب پیتے ہیں جب اس رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش رہتے ہیں)

بات یہ ہے کہ راہ محبت ایسی ہی چیز ہے کہ اس میں طالب کو کسی تجویز کا حق نہیں محبت تو نام ہی فنا کا ہے پھر یہ آواز کیوں نکلتی ہے کہ ہائے یوں ہوتا ہائے ووں ہوتا۔ اور صاحبو! اس وقت تو طاعات میں ناگواری اور بدمزگی ہی ہے آپ ایسے گھبرا گئے یہ کیا چیز ہے اگر کبھی آپ پر وہ امور پیش آتے جو بزرگوں کو پیش آئے ہیں تو حقیقت نظر آجاتی۔ بزرگوں کو تو اس راہ میں وہ وہ سختیاں پیش آئی ہیں کہ ان کے سامنے یہ ذراسی ناگواری کچھ بھی نہیں۔ ایک بزرگ کو تہجد کے وقت غیب سے آواز آئی کہ کچھ بھی کرو یہاں کچھ قبول نہیں اور اس زور سے آواز آئی کہ ان کے ایک خادم نے بھی سن لی مگر وہ ایسے عاشق تھے کہ وضو کرکے پھر بھی نماز میں لگ گئے۔ اگلے دن پھر لوٹا بدھنا لیکر تہجد کو اٹھے مرید نے کہا حضرت

جب وہ منہ بھی نہیں لگاتے اور کچھ قبول نہیں کرتے تو آپ ہی کیوں مصیبت جھیلتے ہیں۔ لیٹ کر سو بھی رہیئے۔ بس ان بزرگ پر حال طاری ہو گیا اور رو کر فرمایا کہ بیٹا میں ان کو چھوڑ تو دوں مگر یہ تو بتلاؤ کہ ان کے در کے سوا کوئی اور در بھی اس قابل ہے جہاں چلا جاؤں ظاہر ہے کہ اور کوئی در اس قابل نہیں تو پھر میں تو اسی در پر جان دے دوں گا چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں اس جواب پر رحمت کو جوش آیا اور پھر آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہے دگر نیستت

(قبول ہے اگرچہ تیرا ہنر نہیں ہے اس لئے کہ سوائے ہمارے تیرے لئے دوسری جگہ پناہ نہیں ہے)

اگر آج کسی کو ایسی آواز آجائے تو بس سارا کام چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جائے کیونکہ محبت پوری نہیں ہے۔ اسی طرح ایک بزرگ کو ذکر کے وقت یہ آواز آتی تھی کہ چاہے کتنا ہی کر تیرا خاتمہ کفر پر ہوگا کافر ہو کر مرے گا جب بہت دن اسی قصہ میں ہو گئے اور یہ آواز موقوف ہی نہ ہوئی تو آخر گھبرا گئے مگر کام نہیں چھوڑا گھبراہٹ کا اثر یہ ہوا کہ اپنے شیخ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے یہ قصہ عرض کیا۔ واقعی شیخ کا زندہ ہونا بھی بڑی نعمت ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ دشنام محبت ہے محبوبوں کی عادت ہے کہ عاشقوں کو چھیڑ چھاڑ سے تنگ کیا کرتے ہیں اس سے دلگیر نہ ہو۔ اسی طرح ایک بار حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ مسجد کی طرف چلے جا رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی اے شبلی کیا یہ ناپاک قدم اس قابل ہیں کہ ہمارا رستہ ان سے قطع کیا جائے یہ کھڑے رہ گئے، پھر آواز آئی کہ اے شبلی تم کو ہماری طرف چلنے سے کیسے صبر آگیا۔ حضرت شبلی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے کہ نہ چلنے دیتے ہیں نہ ٹھہرنے دیتے ہیں۔

صاحبو! اگر آپ ایسے ایسے شکنجوں میں کسے جاتے تو پھر آپ کا کیا حال ہوتا اب تو اتنا ہی ہے کہ ذکر میں مزا نہیں آتا آپ اس سے ہی گھبرا گئے اول تو اگر اس کلفت پر اجر بھی نہ ملتا تب بھی آپ کیا کر لیتے محبت کا مقتضا یہ تھا کہ بدون اجر کے بھی اس پر راضی رہتے مگر اب تو اجر بھی ملتا ہے پھر ناگواری اور شکایت کیوں ہے اور اگر مزا مطلوب ہوتا تو آپ دنیا ہی میں کیوں آتے مزا تو جنت میں تھا۔

وہاں سے جو آپ دنیا میں آئے ہیں تو مزے کے لئے تھوڑا ہی آئے ہیں بلکہ بدمزگی اور کلفت کے لئے آئے ہیں خوب کہا ہے ؎

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ؕ کہ ہم نے انسان کو مشقت میں مبتلا کر کے پیدا کیا ہے اور جناب آپ تو کیا چیز ہیں اس کلفت سے تو بڑے بڑے بھی نہیں بچے۔ چنانچہ جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اول وحی نازل ہوئی ہے تو پھر اس کے بعد تین برس تک منقطع رہی حضور صلے اللہ علیہ وسلم تین سال تک وحی کو ترستے رہے اور شدت حزن کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ پہاڑ پر سے گر کر اپنے کو ہلاک کرنا چاہتے تھے مگر فوراً حضرت جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ کو سنبھالتے تھے تو جب تین برس تک حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کلفت میں رکھا گیا تو ہم کیا چیز ہیں ہمیں تو اگر تین سو برس تک بدمزگی میں رکھا جائے تو حق ہے دیکھو اگر کوئی حاکم یا اختیار اپنے بیٹے کو کسی ملازمت کے لئے تین برس امیدوار رکھے اور ہم تین روز میں جا کر ملازم ہو جانا چاہیں تو یہ حماقت ہے یا نہیں پس جو لوگ ذکر شغل شروع کرتے ہی بدمزگی اور قبض کی شکایت کرنے لگتے ہیں وہ کم از کم تین برس تو صبر کریں گو حق تو یہ تھا کہ زیادہ مدت تک صبر کریں مگر افسوس آج کل تو لوگ اتنے عرصہ تک بھی صبر نہیں کرتے جتنے عرصہ تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فترۃ وحی میں قبض رہا۔

غرض اول تو مزا مطلوب نہیں۔ دوسرے محبت کا مقتضا یہ ہے کہ مزے کا طالب نہ ہو۔ تیسرے اگر مزا مطلوب بھی ہو تو کم از کم کچھ دنوں تک تو بدمزگی کا تحمل کیا جائے۔ چوتھے اس میں ثواب بھی ملتا ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ کہ اس میں باطنی مصلحت بھی ہوتی ہے یعنے اقسام تربیت کے اسی پر موقوف ہیں

کہ طالب کو ظاہراً ناکام رکھا جائے۔ جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعضی عورتوں کو اسقاط میں سات آٹھ دن تک طبیب بھوکا رکھتا ہے اوران کو بھوک بہت لگتی ہے وہ روٹی کے لئے ضد بھی بہت کرتی ہیں مگر اس وقت ان کو ناکام رکھنا ہی تربیت ہے۔ آپ خود سمجھ لیجئے کہ اس وقت ان کو روٹی دینا محبت ہے یا نہ دینا یقیناً نہ دینا ہی محبت ہے اور اسی میں مصلحت ہے پس اسی طرح باطن میں سمجھ لیجئے کہ بعض دفعہ لذت سے محروم کر دینا ہی مصلحت ہوتا ہے ؎

آنکس کہ توانگرت نمی گرداند
او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جس نے تجھ کو مالدار نہیں بنایا تو تیری مصلحت کو تجھ سے زیادہ بہتر جانتا ہے)

افسوس کہ کیا اللہ میاں طبیب کے برابر بھی نہیں کہ طبیب بھوکا مارے تو اس کو شفقت سمجھتے ہو اور اللہ میاں لذت سے ترسا دیں تو شکایت کرتے ہو۔ بہرحال اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا کا تعلق تو ان اعمال سے ہے جن کا وقت آگیا اور رَابِطُوْا کا تعلق ان اعمال سے ہے جن کا وقت نہیں آیا اب سمجھو کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہر ایک باطن اور اعمال ظاہرہ کی یہ تقسیم تھی جو میں نے اب تک بیان کی کہ ان میں ایک قسم تو وہ ہے جس کا وقت آگیا اور پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک اپنے متعلق ایک دوسروں کے متعلق اور دوسری قسم وہ ہے جس کا وقت نہیں آیا ان سب اقسام کے احکام تو اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا میں مذکور ہوئے اور اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ان احکام کا تعلق تمام شریعت سے ہے کیونکہ کوئی عمل اس تقسیم سے باہر نہیں ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مصالح دنیویہ سے بھی ان احکام کو پورا تعلق ہے کیونکہ دنیا کے کام بھی دو ہی قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کا وقت آگیا ان میں استقلال و ثبات قدم کی ضرورت ہے دوسرے وہ جن کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیاری و مستعدی کی ضرورت ہے۔ اب ایک قسم رہ گئی یعنی اعمال باطنہ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللّٰہَ کہ خدا سے ڈرتے رہو یہ تمام اعمال باطنہ کی جڑ ہے مگر اس میں بہت

بسط کی ضرورت ہے جس کے لئے وقت نہیں کتب تصوف سے اس کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے مگر میرا مقصود حاصل ہو گیا وہ یہ کہ اگر آپ کو فلاح کی تمنا ہے فلاح دنیا کی تبعاً اور فلاح آخرت کی قصداً تو اس کی صورت یہ ہے کہ دین کو اختیار کرو اور ان احکام پر عمل کرو کیونکہ حق تعالیٰ نے فلاح کو انہی پر مرتب فرمایا ہے سو اس مقصود کے لئے اتنی تقریر کافی ہے اور یہاں اِتَّقُوا اللّٰہَ (خدا سے ڈرتے رہو) کو موخر فرمانے میں یہ نکتہ ہے کہ یہ اعمال ظاہرہ اسی وقت مقبول ہیں جبکہ تقویٰ بھی ساتھ ساتھ ہو اور اسی وقت ان پر فلاح کا ترتب ہو سکتا ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ لوگ اس وقت طلب فلاح میں کدھر کدھر الٹے جا رہے ہیں اور جو اصلی طریقہ فلاح کا ہے اس پر کسی کو بھی توجہ نہیں پس ان لوگوں کی حالت پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی　　　کیں رہ کہ تو میروی بہ کفرستان ست

(اے اعرابی مجھے خوف ہے کہ تو بیت اللہ نہ پہونچے گا یہ راستہ جس پر تو چل رہا ہے کفرستان کا ہے)

شعر میں تو ترکستان ست ہے مگر میں نے کفرستان ست اس لئے کہا کہ آجکل لوگ کفار کے طریقے ختیار کر کے ہی فلاح حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا انجام فلاح نہیں بلکہ کفر سے نزدیک ہونا ہے۔ بس فلاح کا اگر کوئی طریقہ ہے تو وہ یہ ہے جو سچے فلسفہ سے معلوم ہوا کہ دین ہی فلاح کا طریقہ ہے اور اگر دین ہی نہیں تو خدا کی قسم اگر ساری دنیا کی سلطنت بھی حاصل ہو جائے تو فلاح حاصل نہ ہو گی یعنی راحت و اطمینان جو اصل فلاح ہے اب دعا کیجئے کہ حق سبحانہ عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔ وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین

اعلان ختم سال

دسمبر ۱۹۵۸ء کا رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہے اس رسالہ پر آنجناب کا زر سالانہ ختم ہو گیا۔ سال ۱۹۵۹ء کیلئے اگر الابقا رجاری رکھنا ہے تو بیس ۲۰ روپے آج ہی روانہ فرمادیں۔ وی پی کی رجسٹری کا خرچہ ڈیڑھ روپے زائد ہو گا۔ اگر دو روپے کے نقصان سے بچنا چاہیں تو آج ہی اولین فرصت میں بیس ۲۰ روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں والسلام

محمد عبد المنان غفرلہ

(باقی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۷۷۷۶۲۰، ۷۷۰۰۹۴۷۷

قال اللہ تعالیٰ

فَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ

وعظ ملقب بہ

مِفتاح الخیر

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر:۔ محمّد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقا

مسافرخانہ بندر روڈ (ایم - اے جناح روڈ) کراچی ۱

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ ملقب بہ مفتاح الخیر

اشتات	المستمعون	من ضبط	لم	من ای شان	ماذا	کیف	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد	کس نے لکھا	کیوں ہوا	کس نے بیان کیا [illegible]	کیا مضمون تھا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
عوام اور خواص کا مجمع تھا	سو کے قریب	احقر حسن علی عفی عنہ	بتقریب افتتاح مدرسہ اسلامیہ	عوام کو زیادہ مفید ہوا	حکمت یعنی علم کی فضیلت	کھڑے ہو کر	ایک گھنٹہ ۱۵ منٹ	۱۳ محرم ۱۳۳۲ھ	قصبہ جلال آباد ضلع مظفر نگر

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلے اللہ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔ **یہ جملہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق تعالیٰ کی حکمت** کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اس بیان کا موقع ظاہر ہے کہ تقریب افتتاح مدرسہ اسلامیہ کی ہے اور میرا مقصود اس بیان سے استمداد مالی نہیں۔ ہے کہ آپ لوگ مدرسہ کی مدد کریں بلکہ مقصود یہ۔ ہے کہ اس فعل کی حقیقت معلوم ہو کر آپ کو مسرت ہو۔ کہ الحمد للہ ہم کو ایسے بڑے کار خیر میں شرکت کی توفیق ہوئی باقی اس کام کی حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے خواہ وہ آپ حضرات کے ذریعہ سے تکمیل فرمادیں یا دوسرے لوگوں کے ہاتھ سے میری غرض تقریر سے صرف اسی قدر ہے کہ اس فعل کی حقیقت سے آپ حضرات آگاہ ہوجاویں اور مسرور ہو کر شکر خداوندی بجالاویں کہ ایسے عظیم الشان دین کے کام کی توفیق ہوئی۔

حق تعالیٰ نے اِن مختصر الفاظ میں علم دین کی فضیلت عنوان حکمت سے جس کے معنی حقیقت شناسی کے ہیں بیان فرمائی ہے اور اس پر اجماع ہے علماء حکماء عقلاء کا کہ مراد حکمت سے حقیقت شناسی ہے یہ دوسری بات ہے کہ حقیقت کی تعیین میں اختلاف واقع ہو جاوے چنانچہ فلاسفہ یونانیین نے جن امور کو حقائق سمجھا ہے وہ اور ہیں اور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ نے جو حقائق ارشاد فرمائے ہیں وہ اور ہیں اور اس کا فیصلہ کہ کون سے حقائق صحیح اور حق ہیں آسانی سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ جانبین کے دلائل میں غور کیا جاوے اس سے معلوم ہو جاوے گا کہ کونسے دلائل صحیح ہیں اور کون سے فاسد ہیں اس سے صاف معلوم ہو جاوے گا کہ کس کا دعویٰ صحیح اور کس کا غلط ہے کیونکہ صحت و فساد دعوے کا دلیل ہی کے صحت فساد سے معلوم ہوتا ہے سو دلائل میں غور کرنے سے کالشمس فی نصف النہار صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکماء کے دلائل و مقدمات نہایت ضعیف اور لچر ہیں اور اس بات کو جو پابند مذہب نہیں وہ بھی جانتے ہیں بلکہ خود مستدلین بھی اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم کیسی پوچ باتیں کہہ رہے ہیں اور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ کے دلائل و مقدمات نہایت قوی ہیں اور یقینی ہیں اور صرف نقلی ہی نہیں ہیں بلکہ عقلی بھی ہیں کیونکہ نقلیات کا مرجع عقلیات ہوا کرتے ہیں مثال اس کی یہ ہے کہ مثلاً قیامت کا وقوع دلیل سے ثابت ہے اور صرف عقل سے اس کا ادراک نہیں ہو سکتا لہذا یہ مسئلہ نقلیہ ہے مگر اس طرح یہ مسئلہ عقلیہ ہے کہ اس کی دلیل مرکب ہے اور مقدموں سے پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے وقوع کی قرآن مجید میں خبر دی ہے اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جو کلام اللہ میں بتلایا جاوے وہ صحیح ہے اور اس سے پہلے مقدمے کو اس حیثیت سے بیان نہیں کیا گیا کہ یہ کلام اللہ ہے اور اس کا صحیح ہونا لازم ہے بلکہ یہ ایک دوسرا مستقل مقدمہ ہے جس کی دلیل عقلی خود قرآن مجید میں یہ موجود ہے وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ جس کا محصل یہ ہے کہ اگر تم کو اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے اور کلام بشر ہونے کا احتمال ہے تو اس کی مثل ایک ہی سورۃ تصنیف کر لاؤ اور (آخر تم فصحاء بلغاء و اہل زبان ہو سو تم کو تو اس میں کچھ بھی تامل نہ ہونا چاہیئے قالہ الجامع عفی عنہ) اور چونکہ وہ لوگ باوجود مخالفت شدیدہ و سعی بلیغ کے قرآن کے مقابل ایک سورۃ تو کیا ایک

آیت بھی نہ لاسکے تو ثابت ہو گیا کہ یہ کلام بشر نہیں ہے اور کلام عزوجل ہے بس معلوم ہو گیا کہ مسئلہ وقوع قیامت کا تقریر مذکور کے اعتبار سے عقلی ہے اور تمام دعاوی نقلیہ مقدمات عقلیہ سے ثابت ہونے کی وجہ سے عقلیہ ہوتے ہیں لہذا عقلی ہونے کی وجہ سے حکماء پر بھی حجت ہیں اور حکماء میں خود باہم جوتی پیزار ہوتا اور ایک دوسرے کی دلیلوں کا توڑنا یہ بھی ان کے مقاصد و مقدمات کے ضعف کی دلیل ہے بخلاف ان مقاصد و مقدمات کے جن کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لائے ہیں کہ ان سب کا مقصود واحد اور اصول متفق ہیں گو بعض فروع ہیں باختلاف ازمنہ اختلاف واقع ہوا ہے لیکن اس اختلاف میں اور حکماء کے اختلاف میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس اختلاف میں تناقض نہیں اور اگر مجتہدین کے اختلاف میں کہیں تناقض بھی ہے۔ تب بھی ایک کو دوسرے کے رد کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ اور حکماء کے اختلاف میں علاوہ تناقض کے ان کو بجز رد و قدح کے اور مقصود ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر بعض مدعیان عقل نے انبیاء علیہم السلام کے دعوؤں کو بھی رد کرنا چاہا مگر مبطل کو ہمیشہ محرومی ہی ہوئی ہے اور کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ غرض دلائل سے معلوم ہو رہا ہے کہ حقائق کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ ہی نے سمجھا ہے پس اس آیت میں حکمت سے مراد یہی حقائق ہیں جو انبیاءؑ کے بتلائے ہوئے ہیں جس کا حاصل دین ہے اور بجائے لفظ علم کے حکمت کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا کہ حکمت کی خیریت متفق علیہ ہے۔ گو اس کی حقیقت کی تعیین مختلف فیہ ہو تو اس صورت میں صرف تعیین حقیقت ہی میں کلام رہے گا۔ باقی حکمت کا خیر کثیر ہونا مسلم رہے گا بخلاف عنوان دین کے کہ اس میں خود اس حکم ہی میں اختلاف ہو جاتا غرض حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص حکمت یعنی علم دین عطا کیا جاوے تو اس کو بیشک خیر کثیر مل گئی۔ اب یہ سمجھئے کہ آیت میں یوت الحکمۃ فرمایا یہ نہیں ارشاد فرمایا من تعلم الحکمۃ یا من حصل الحکمۃ یعنی حق تعالےٰ نے یہ فرمایا کہ جو شخص حکمت دیا جاوے اس کو خیر کثیر مل گئی یہ نہیں فرمایا جو حکمت سیکھے یا جو حکمت حاصل کرے اس کو خیر کثیر مل گئی اس میں یہ رمز ہے کہ کہیں طالب علم و محصل کو زعم اور عجب اور ناز نہ پیدا ہو جاوے کہ میں نے اپنی فطانت و ذہانت و محنت سے علم حاصل کیا۔ ہے پس من یوت میں یہ بتلا دیا کہ یہ محض موہبت خداوندی ہے جس کو چاہیں عطا فرماویں گو اس کے اسباب مکتسبہ ضرور ہیں اور اسی بنا پر انسان اس کی تحصیل کا مکلف قرار دیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (رواہ الجامع

رواہ ابن عبداللہ باسناد صحیح کما فی الجامع الصغیر (والمتن) قال ابن القطان صاحب ابن ماجہ فی کتاب العلل عقب ایرادلہ من جہۃ سلام الطویل عن انس و موقوعا انہ غریب حسن الاسناد و قال العراقی قد صحیح بعض الائمۃ بعض طرقہ و قال المزی ان طرقہ تبلغ بہ رتبتہ الحسن ورد بناہ فی ثانی السمعونیات من حدیث موسی بن داود ثنا حماد بن سلمۃ عن قتادۃ عن انس بہ درجالہ ثقات ھذا اکلہ فی المقاصد الحسنۃ قال الجامع دبسط فیہ الکلام لان المشہور انہ لیس لہ اسناد ثابت) مگر سچ یہ ہے کہ بعد سعی کے علم دین کا حاصل ہوجانا یہ محض موہوب من اللہ ہے مکسوب نہیں ہے جیسے نکاح فعل اختیاری ہے اور اسی طرح مجامعت بھی فعل اختیاری ہے۔ مگر اولاد کا ہونا بالکل غیر اختیاری ہے اگر حق تعالیٰ چاہیں عطا فرمادیں اور چاہیں محروم فرمائیں سو اسی طرح کتاب پڑھنا محنت کرنا سامان تحصیل مہیا کرنا افعال اختیاریہ ہیں لیکن حصول علم دین غیر اختیاری ہے کیونکہ درحقیقت علم دین حقائق دینیہ کا قلب پر وارد ہونا ہے۔ اور وہ محض موہوب ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ دو طالب علم لیجئے جو ہر طرح ظاہری اسباب تحصیل میں مساوی درجہ کے ہوں یعنی اوستاد دونوں کا ایک ہو توجہ بھی استاد کی دونوں پر مساوات کے ساتھ ہو تدریس و تحشیہ و تصنیف وغیرہ کا کام بھی دونوں سے برابر درجہ میں لیا گیا ہو مدت تکمیل بھی دونوں کی ایک ہو عمر بھی ایک ہو فطانت و ذہانت میں بھی برابر ہوں مگر ایک میں تقویٰ زیادہ ہو تو ضرور ہے کہ متقی کا علم لطیف اور بڑھا ہوا ہوگا اور یہ امر مشاہد ہے۔ لاریب فیہ بلکہ بعض اوقات متقی اس درجہ کا ذہین نہیں ہوتا جس درجہ کا وہ دوسرا شخص ذہین ہوتا ہے جو اس سے تقویٰ میں کم درجہ کا ہے مگر باوجود اس کے متقی کا علم زیادہ اور لطیف ہوتا ہے۔ پھر اسباب ظاہریہ کی مساوات

---

۵ اگر شبہ ہو کہ تقویٰ بھی تحصیل علم کا سبب ہے، اور وہ ایک شخص میں کم ہے اسی لئے اس کے علم میں بھی کمی ہے پھر موہوب علم کہاں رہا اور مساوات کہاں متحقق ہوئی تو جواب یہ ہے کہ اول تو ہم تو یہی مسلم نہیں کہ تقویٰ بھی تحصیل علم کا ایک سبب ہے چنانچہ کوئی شخص خاص اس نیت سے تقویٰ کرکے دیکھے کہ ہمارے علم میں ترقی ہوگی سو دیکھ لیگا کہ ان شاءاللہ تعالیٰ اس کے علم میں خاک بھی ترقی نہ ہوگی ترقی تو عادۃً ہو جاتی ہے جبکہ مقصود تقویٰ سے خالص رضائے الٰہی ہو اور برتقدیر تسلیم یہ اسباب ظاہریہ میں سے نہیں ہے، اور یہاں ذکر اسباب ظاہری کا ہے اور جو اسباب کو عام لیا جاوے تو اسباب غیر ظاہری تو رحمت خداوندی بھی ہے جو سبب ہے موہبت کا تو پھر یہ بھی کہا جاوے گا کہ ایک کے شامل رحمت الٰہیہ ہے اور وہ سبب ہے زیادت کا اور دوسرے کو یہ میسر نہیں خلاف مساوات حالانکہ یہ اعتراض کوئی فہیم نہیں کر سکتا ۱۲ جامع عفی عنہ۔

کے ہوتے ہوئے تقویٰ سے علم کا زیادہ لطیف ہوجانا یہ موہوب ہونے کے سبب سے نہیں تو اور کیا ہے پس معلوم ہوا کہ حصول علم دین محض وہبی ہے و للّٰہ در العارف الرومی حیث یقول ؎

بینی اندر خود علوم انبیا — بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر علوم انبیاء مشاہدہ کرو گے بدون کتاب اور تکرار کرانے والے کے اور استاد کے)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرضوان کے دیکھنے والے اس جماعت میں موجود ہیں مولانا کی تقریر آپ حضرات نے سنی ہوگی کہ کس درجہ کی ہوتی تھی اور مولانا کا کیسا علم تھا اور مولانا کی طالب علمی کی شان دیکھنے والوں سے سننے والے بھی موجود ہیں کہ کس بے پروائی سے مولانا نے پڑھا تھا۔ ابتدا ہی سے ویرانوں جنگلوں سے الفت اور تجرد دیست تھے کہیں جمنا میں تیر رہے ہیں کہیں سیر و سیاحت کر رہے ہیں ایک آزاد طبیعت تھی بخلاف ان کے اقران و ہمعصر حضرات کے کہ انھوں نے توجہ سے پڑھا محنت کی اساتذہ کاملین سے تحصیل کی مگر مولانا کے علوم کی شان ان میں نہ پیدا ہوئی یہ صرف تقویٰ کی برکت تھی حدیث میں ہے من عمل بما علم ورثہ اللّٰہ علم مالم یعلم او کما قال (اخرجہ فی حلیۃ الاولیاء کما اوردہ فی بہشتی جوہر حصہ اول قال السامع) یعنی جو عالم اپنے علم پر عمل کرے وارث کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ ایسے علم کا جس کو نہیں جانتا ہے حضرت استاذی و مولائی مولوی شاہ محمد یعقوب صاحب قدس سرہ سے میرے سامنے پوچھا گیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو اس درجہ کا علم کس طرح حاصل ہوگیا۔ آپ نے چند اسباب ذکر فرمائے کہ اساتذہ کامل تھے پیر کامل تھے تقویٰ تھا اساتذہ کا ادب زیادہ فرماتے تھے اور یہ امور آپ کے اقران میں بھی تھے مگر باطنی تقویٰ کی ایک خاص شان آپ کے اندر تھی جو آپ کے معاصرین کو کم میسر تھی سب سے بڑی وجہ علم کی ترقی کی یہی ہوئی غرض اس لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں من یؤت الحکمۃ الخ یعنی جس کو حکمت عنایت فرمائی گئی اس کو خیر کثیر مل گئی اشارہ اس طرف ہے کہ اگر تم حکمت کا لینا چاہتے ہو تو براہ راست اس کا حاصل ہوجانا تمھارے اختیار میں نہیں ہے اس کے حاصل ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ اپنے اندر قابلیت ایسی پیدا کرلو کہ جس سے ہمارا عطیہ اور موہوبہ لینے کے قابل ہوجاؤ اور وہ قابلیت تقویٰ کا اختیار کرنا ہے مگر یاد رہے کہ اس قصد سے تقویٰ اختیار کرنا کہ علوم القا ہوں ہرگز زیبا نہیں ورنہ اس طریق سے کامیابی کی امید بلکہ تقویٰ محض مخلصاً للّٰہ تعالیٰ اور رضائے الٰہی کیلئے ہو عادت خداوندی کے موافق اس کی قابلیت کے اندازہ سے جو علوم حق تعالیٰ اس کو عطا فرمانے ہوں گے وہ عطا فرما دیں گے اور جس کو سچا تعلق خداوند تعالیٰ سے

ہوگا وہ تو عبادت لغیر اللہ تعالیٰ کیوں کرنے لگا۔ اور ایسا ہی شخص محل نزول برکات بھی ہے اور حکمت کا لفظ بجائے علم کے ارشاد فرمانے کی اس کی وجہ جو میں پیشتر بیان کرچکا ہوں اس کے نظائر قرآن مجید میں اور بھی ہیں چنانچہ فرماتے ہیں تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم یعنی اے اہل کتاب تم ایسی بات کی طرف چلے آؤ اور وہ امر قبول کرلو جو ہمارے اور تمھارے درمیان میں اتفاقی ہے اور وہ توحید ہے چنانچہ فرماتے ہیں ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرك به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ یعنی وہ کلمہ یہ ہے جس کی طرف ہم داعی ہیں کہ ہم اور تم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی شے کو اس کا شریک نہ ٹھہراویں اور بعض ہم میں سے بعض کو اپنا رب نہ بنائیں خدا کو چھوڑ کر جیسا وہ لوگ علماء کے ساتھ برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اب اس عنوان سے ایک درجہ میں اُن سے موافقت کرلی کہ تم بھی توحید کو مانتے ہو اور ہم بھی پھر موافقت کے بعد ان سے یہ کہنا کہ تمھاری توحید واقع میں توحید نہیں ہے کہ ممزوج بشرک ہے اور ہماری توحید خالص اور واقعی توحید ہے اتفاق کے بعد اختلاف بھی ان پر زیادہ گراں نہ ہوگا اور اگر پہلے ہی سے ان کو مشرک کہا جاتا تو وہ اول ہی سے سخت برانگیختہ ہوجاتے اور توحید کے مضمون کو سننا بھی گوارا نہ کرتے اور ایک بات سمجھنے کی ہے کہ آیت میں حکمت یعنی علم دین کو خیر کثیر کہا گیا حالانکہ صرف خیر کا لفظ بھی کافی تھا کیونکہ یہ لفظ ہم تفصیل ہے اس کے معنی ہیں بہت اچھا اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جیسی عظیم الشان ذات جس چیز کو بہت اچھا فرمائے اس کی خوبی کس درجہ کی ہوگی مگر صرف اسی لفظ پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مزید مبالغہ کے لئے کثیر کا لفظ بھی اضافہ فرمایا یعنی علم دین بہت ہی بڑی نعمت ہے اور بہت اچھا ہونے کے دو درجے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی چیز بہت سی چیزوں سے یا کسی خاص چیز سے بہت اچھی ہو اور دوسرے یہ کہ تمام چیزوں سے زیادہ عمدہ ہو اور یہاں ظاہراً دوسری صورت مراد ہے کیونکہ یہاں مفضل علیہ مذکور نہیں ہے پس مراد یہ ہے کہ علم دین تمام اچھی چیزوں سے زیادہ بڑھ کر ہے واضح ہو کہ اس خیر کے مفضل علیہ میں تمام واقعی عمدہ چیزیں داخل ہیں اور مال و دولت تو واقع میں کمال ہی نہیں اور نہ وہ کچھ زیادہ اچھا ہے بلکہ بقدر حاجت روا ئی محمود ہے اور وسیلہ ہے مقصود کا خود بذاتہ کچھ محمود مقصود نہیں اس لئے اس خیر کے مفضل علیہ میں اس کے داخل ماننے کی ضرورت ہی نہیں اب رہا ایمان سو وہ خود ایمان اس علم ہی میں داخل ہے کیونکہ ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علم ہے۔ اب رہی جنت سو وہ اس خیر کے مفضل علیہ میں داخل ہے کیونکہ ایمان کہ علم دین کی ایک فرد ہے۔ جنت سے افضل ہے۔ گو بعض لوگوں نے جنت کو ایمان سے افضل کہا ہے اور یہ دلیل بیان کی ہے

کہ من جاء بالحسنۃ فلہ خیر منہا یعنی جو شخص نیکی کرے تو اس کو اس نیکی سے بڑھ کر جزا دی جاوے گی اس سے معلوم ہوا کہ عمل سے جزاء افضل ہے اور اعمال میں ایمان بھی ہے۔ لہٰذا ایمان کی جزاء یعنی جنت ایمان سے افضل ہوئی لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں خیر سے مراد جنت نہیں بلکہ نفس حسنہ ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آدمی جو نیکی کرتا ہے خواہ وہ ایمان ہو یا دیگر اعمال اللہ تعالیٰ اس عمل کو بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک نیکی کو بڑھا کر دس نیکی کر دیں پھر ان دس نیکی پر جزاء مرتب ہوتی ہے اور دوسری آیت میں تصریح ہے کہ وہ بڑھائی ہوئی چیز حسنہ ہی ہے چنانچہ فرمایا ہے من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا اور ظاہر ہے کہ امثالہا میں ضمیر مضاف الیہ کا مرجع حسنہ ہے تو حسنہ کے امثال حسنات ہی ہیں۔ مثلاً کسی نے دو رکعت نماز پڑھی تو اس کو اول بیس رکعت یعنی دس گنا فرمایا پھر اس بیس رکعت کا ثواب مرحمت فرمایا کام کمزور تھا۔ لکھا گیا قوی تھوڑا کیا تھا تحریر میں لایا گیا زیادہ۔ پس حسنات مضاعفہ کا حسنہ معمول بہا سے افضل ہونا لازم آیا نہ کہ جزاء کا عمل سے اور اسی کی تائید کے درجہ میں نہ کہ احتجاج کے مرتبے میں عرض کرتا ہوں کہ بعض حضرات نے اولٰئک یبدل اللہ سیئاتہم حسنات کی تفسیر کی ہے کہ سیئات سے مراد وہ طاعات ہیں جو موافق امر کے بجا نہیں لائی گئیں پس اللہ تعالیٰ بجائے ان کے خالص طاعات مرحمت فرما دیں گے مثلاً نماز پڑھی اس میں مکروہات و محرمات کا ارتکاب ہو گیا تو وہ نماز تھی سیئہ[1] عطا ہوئی نماز خالص اور تفسیر کچھ بعید نہیں کیونکہ بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ گناہ گن گن کر بعضے لوگوں کو حق تعالیٰ ان گناہوں کے عوض نیکیاں مرحمت فرما دیں گے سو جب مستقل معاصی کی عوض حسنات دی جاویں گی تو عارضی معاصی کے عوض حسنات عطا فرمایا جانا کیا بعید ہے سو یہاں پر ان اعمال ناقصہ کے عوض اعمال کاملہ عطا ہونا مذکور ہے اسی طرح فلہ خیر منہا میں بھی حسنہ ناقصہ قلیلہ کے عوض میں ایسے اعمال جو اس سے خیر ہوں عطا ہونا مراد ہو سکتا ہے پس اس سے بھی تائید دعوے مذکورہ کی ہو گئی پس اجزاء کا عمل سے اعلیٰ و افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اور حق تعالیٰ نے حکمت کو جو خیر کثیر ارشاد فرمایا ہے اور کثیر کی کوئی حد نہیں فرمائی سو اول تو حق تعالیٰ جس چیز کو کثیر فرما دیں اس کی کثرت ظاہر ہے کہ کس درجہ کی ہو گی پھر اس کثیر کو بھی جب کسی حد سے مقید و محدود نہیں فرمایا بلکہ مطلق رکھا پس یہ کثرت

[1] وہو ظاہر الآیۃ وتقییدہ المعاصی بالمکروہات التنزیہیۃ بعید فی الجملۃ وتحول عن الظاہر نعم لک ان تقول ان التبدیل نعیم سائر المعاصی سواء کانت محرمۃ او مکروہۃ وتحمل الحدیث والآیۃ علیہ فافہم ۱۲ جامع

نہایت ہی عظیم الشان کثیر ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں حکمت یعنی علم دین کو ان مبالغات کے ساتھ خیر کثیر کے لقب سے ملقب فرمایا ہے یہ مضمون ایک مقدمہ ہے جو قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور دوسرا مقدمہ حدیث شریف سے اخذ کر کے بیان کرتا ہوں اور چونکہ قرآن مجید و حدیث شریف دونوں ادلہ شرعیہ میں سے ہیں اس لئے ہم کو اختیار ہے کہ خواہ دونوں مقدموں کی حدیث و قرآن پر توزیع کر دیں یا دونوں کو صرف قرآن مجید یا فقط حدیث شریف سے اخذ کر لیں وہ حدیث یہ ہے فطوبی لعبد جعلہ اللہ مفتاحا للخیر مغلاقا للشر و ویل لعبد جعلہ اللہ مفتاحا للشر مغلاقا للخیر (اخرج ابن ماجہ وفی سندہ عبد الرحمٰن بن زید ھو ضعیف ولیحقق بقیۃ سندہ قالہ الجامع) یعنی خوش حالی اور خوبی ہے۔ اس شخص کے لئے اللہ نے بھلائی اور نیکی کی کنجی بنایا اور برائی اور شر کا قفل بنایا اور خرابی ہے اس کے لیے جس کو حق تعالیٰ نے شر کی کنجی اور خیر کا قفل بنایا۔ اھ کنجی کی خاصیت ہے کھولنا اور تالے کی خاصیت ہے بند کرنا۔ اب یہ شبہ رہا کہ کنجی تو تالا کھولتے اور بند کرتے وقت دونوں جگہ استعمال کی جاتی ہے۔ کیونکہ اصل حاجت کنجی کی ہے اور خاصیت اس کی یہی ہے کہ تالا کھولنے وقت استعمال کی جاوے گو بند کرتے وقت عارضی طور پر کبھی اس کی حاجت ہو جاتی ہے جبکہ وہ تالا ایسا ہو جو بغیر کنجی کے بند نہ ہو سکے بعض قفل بغیر کنجی کے بند ہو جاتے ہیں لیکن بغیر کنجی کے کھلتا کوئی نہیں حاصل یہ ہے کہ جس شخص سے امر خیر کا افتتاح ہو اور شر کا انسداد ہو اس کے لئے خوش حالی ہے کہ دارین میں رحمت خداوندی سے مشرف رہیگا قالہ الجامع) اور جس کے ذریعہ سے خیر کا انسداد اور شر کا افتتاح ہو اس کے لئے بدحالی ہے کہ دونوں جہان میں رحمت الٰہیہ سے بعید اور مردود رہیگا قالہ الجامع) گو کارخانہ تکوین کے اعتبار سے بدحالی والے کا بھی وجود مصلحت ہے کہ عمارت عالم بغیر اس کے درست نہیں ہوتی فان الاشیاء تعرف باضدادہا جیسے کہ باغ انبہ وغیرہ طرح طرح کے عمدہ درخت ہوتے ہیں مگر باڑھ کیکر کے درختوں کی لگائی جاتی ہے ولقد اجاد العارف الشیرازی فیما قال ؎

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر ست آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

کارخانۂ عشق میں کفر کا وجود بھی ضروری تھا ورنہ آگ کس کو جلاتی اگر بولہب نہ ہوتا یعنی کفر کی نسبت حق تعالیٰ کی ایجاد کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے اپنی رحمت سے ہم سب کو ایمان کی دولت سے نوازا۔

دیکھو مکان تیار کیا جاتا ہے اس میں شہ نشین بھی ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ کس قدر نفیس اور باوقعت شے ہے اور پاخانہ بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ نفرت کی چیز ہے مگر چونکہ ایک درجہ میں اس کی بھی ضرورت ہے اس لئے بغیر اس نفرت کی چیز کے مکان کی عمارت کامل نہیں ہوتی اور ناقص رہتا ہے اسی طرح تعمیر عالم اور اس کی تکمیل کے لئے بُری چیزوں کا وجود بھی ضرور ہے لیکن یہ خیال رہے کہ یہ حکمت بُرائی کے ارتکاب کے لئے عذر نہیں ہوسکتی کیونکہ برائی کرنے والے اپنے اختیار سے عصیان خداوندی کا مرتکب ہوتا ہے اور وہ اس کارخانہ کا داروغہ نہیں ہے جو وہ اپنے کو اس کام کے لئے منتخب کرے لہذا وہ معذور نہیں۔ ہے یہ حکمت تو خلق خداوندی کے اعتبار سے ہے نہ کہ کسب عباد کے اعتبار سے اب یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ حدیث میں لوگوں کی دو قسمیں ذکر کی گئی ہیں اور ظاہر عنوان سے ان میں انحصار معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تیسری قسم نہیں۔ ہے لیکن بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ اور قسمیں بھی نکلتی ہیں اور استیعاب اقسام کا یہ ہے۔ اول خیر کا مفتاح ہونا۔ شر کا مغلاق ہونا۔ ثانی خیر کا مغلاق ہونا شر کا مفتاح ہونا۔ اور یہ دو قسمیں تو حدیث میں مذکور ہیں۔ ثالث خیر کا مفتاح ہونا۔ شر کا مغلاق ہونا۔ رابع شر کا مفتاح ہونا خیر کا مغلاق نہ ہونا۔ خامس خیر کا مفتاح نہ ہونا شر کا مغلاق ہونا۔ سادس شر کا مفتاح نہ ہونا خیر کا مغلاق ہونا۔ سابع خیر و شر دونوں کا مفتاح ہونا۔ خیر و شر دونوں کا مغلاق ہونا۔ ثامن دونوں کا مفتاح و مغلاق نہ ہونا پس یہ اقسام ہیں لیکن یہ تمام اقسام جو حدیث میں ظاہراً مذکور نہیں ہے حقیقۃً حدیث ہی کے تحت میں داخل ہیں اس لئے انحصار منقوض نہیں ہوتا اور دخول کی یہ صورت ہے کہ خیر و شر باہم ایسے تقابل ہیں کہ ایک کا فتح دوسرے کے غلق کو اور ہر ایک کا غلق دوسرے کے فتح کو مستلزم ہے۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو حدیث میں غور فرمایئے جب کوئی شخص مفتاح خیر ہوگا تو اس کے لئے مغلاق شر ہونا لازم ہے کیونکہ اس خیر کی فتح نہ ہوتی تو ایک شر جو اس کا مقابل ہے باقی رہتا اب فتح خیر سے اس شر کا انسداد ہو گیا پس قسم ثالث متحقق نہیں اسی طرح جو شر کا مفتاح ہوگا اس کے لئے اس کا مغلاق ہونا جو اس شر کے مقابل ہے لازم ہے پس قسم رابع کوئی قسم نہ ہوئی اسی طرح جو مغلاق شر ہوگا اس کے لئے مفتاح خیر ہونا لازم ہے کیونکہ شر کا بند کرنا یہ بھی ایک خیر ہے پس قسم خامس معدوم ہوگئی۔ اسی طرح جو خیر کا مغلاق ہوگا وہ مفتاح شر ضرور ہوگا۔ پس قسم سادس نہ رہی اور جو دونوں کا مغلاق ہے وہ مختلف خیر و شر کے اعتبار سے مفتاح

خیر بھی ہے اور مغلاق شر بھی ہے اسی طرح وہ مغلاق خیر بھی ہے اور مفتاح شر بھی پس قسم سابع بھی ان ہی دو قسموں میں داخل ہے اور خیر و شر دونوں کا مفتاح و مغلاق نہ ہوتا اس کے لئے بھی فتح خیر اور سد شر اور فتح شر اور سد خیر لازم ہے پس قسم ثامن بھی ان ہی دو قسموں میں داخل ہوتی۔ غرض حدیث میں انحصار ہے اب ہر شخص دیکھ لیوے کہ میں مفتاح خیر اور مغلاق شر ہوں یا اس کا عکس اور بعضے لوگ صرف اسباب پر خوش نہ ہوں کہ اگر ہم مفتاح خیر نہیں ہیں تو مفتاح شر بھی نہیں ہیں نہ اچھے کی مدد کرتے ہیں نہ برے کی مدد کرتے ہیں کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے مفتاح خیر نہ ہونے کے لئے مفتاح شر ہونا لازم ہے۔ اس لئے کہ جب تم خیر کو نہ کھولو گے تو ظاہر ہے کہ خیر بند نہ ہوگا اور خیر کا بند رکھنا شر کا کھولنا ہے خیر کا نہ کھولنے والا اضطراراً شر کا کھولنے والا ہو جاتا ہے۔ لہذا ذیل کی وعید میں ایسا شخص بھی داخل ہوگا سو ہر شخص کو مفتاح خیر ہونے کی سعی کرنا چاہیئے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث میں حکم مذکور ہر خیر و شر کے لئے عام ہے۔ اور پہلی تقریر سے معلوم ہو چکا ہے کہ علم دین بہت بڑی خیر ہے تو خواہ اس خیر کو عموم حدیث میں داخل ہونے کے بعد حدیث کا احق مصداق کہا جاوے یا خیر سے خیر کامل مراد لے کر حدیث کو علم دین ہی پر محمول کیا جاوے غرض دونوں صورتوں میں علم دین کی خدمت کرنے والے کے لئے حدیث میں خوش حالی کی بشارت ہے اور اس میں حصہ نہ لینے والے کے لئے وعید ہے۔ اور حدیث شریف گو بظاہر کلام ہے۔ جناب سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لیکن حقیقت میں وہ کلام ہے حق تعالیٰ کا کیونکہ آپ اپنی طرف سے تھوڑا ہی احکام بیان فرماتے تھے جو کچھ فرماتے تھے رب حق تعالیٰ کا ارشاد ہوتا تھا قال تعالیٰ ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ و صدق من قال ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(ان کا کہا ہوا ارشادات حق ہوتے ہیں گرچہ وحی الٰہی زبان رسالت ہی سے ادا ہوتی ہے)

دونوں مقدموں کا نتیجہ یہ ہے کہ فاتح علم خیر کے لئے خوش حالی کی بشارت ہے اور اس کی فتح میں سعی نہ کرنے والے کے لئے وعید ہے اور اسی نتیجہ کے لئے میں نے تقریر کی تھی گو درمیان میں مضامین علیحدہ بھی آگئے کیونکہ جو مضمون جس نوع کا ہوتا ہے وہ تو اسی شرح سے ادا ہو سکتا ہے مگر مضائقہ نہیں اس لئے کہ اصل مضمون جتنا ہے اس کو سب ہی سمجھ گئے ہیں اب آپ خدا تعالیٰ کا شکر کیجئے کہ الحمد للہ تعالیٰ حق تعالیٰ نے آپ کو یہ موقع عطا فرمایا کہ ایسے کار خیر میں شرکت اور اس کا افتتاح آپ کے ہاتھ سے ہوا اور آپ اس کام کو چھوٹا سا کام سمجھ کر اس کو بے وقعتی کی نظر سے نہ دیکھیں کیونکہ خلوص کے ساتھ چھوٹا سا کام

بھی بہت بڑا ہو جاتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اے عائشہؓ کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو وجہ یہ کہ کیا خبر ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں معمولی نیکی کا وہ درجہ خاص کے سبب عطا ہو جائے جو بڑی نیکی سے بھی بوجہ کسی عارض عدم خلوص وغیرہ کے نہ عطا ہوتا اور سمجھ لیجئے کہ دینی کاموں میں خلوص کی حاجت تو خلوص سے بہت زیادہ ہے اکثر لوگوں کو مدارس کے مقاصد میں فلوس کی طرف زیادہ نظر ہو جاتی ہے اور خلوص کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا حالانکہ فلوس تو خود آجاتے ہیں۔ کیونکہ اس کام کا رحمت اور خیر ہونا تو معلوم ہو چکا اور جو خیر منجانب اللہ مفتوح ہوتی ہے جس میں بڑا دخل خلوص کو ہے اس کا کوئی روکنے والا نہیں چنانچہ حق فرماتے ہیں۔ ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لھا وما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہ کا یعنی جو رحمت اللہ تعالیٰ عطاء فرماویں اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس رحمت کو وہ روک لیں اس کو کوئی دینے والا نہیں لہذا بھروسہ حق تعالیٰ کی ذات پر ہوتا چاہئے۔ جتنے کارخانے خلوص پر مبنی ہوئے ہیں ان سب میں ترقی ہوئی ہے خود اصل دین کی حالت کو ملاحظہ فرمائیے کہ ابتداء اس کی کیا تھی تمام عالم مخالف تھا اور بات بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی ارشاد فرمائی تھی جو سارے جہان کے خلاف تھی اور یہی وجہ مخالفت کی تھی ورنہ قبل دعوئی نبوت تو لوگ آپ کو بہت چاہتے تھے۔ مگر باوجود اس مخالفت کے دیکھئے اسلام کہاں سے کہاں پہنچا پس یہ برکت محض اخلاص کی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام کے پاس اس وقت کہاں کا لشکر تھا اس وقت یہ چند حضرات مسلمان تھے۔ عورتوں میں حضرت سیدتنا خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ سب سے پہلے ایمان لائیں لڑکوں میں سب سے پہلے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ۔ غلاموں میں حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ۔ بوڑھوں میں حضرت امام الامۃ مقدام الملۃ افضل اولیاء الامم اعظم الاتقیاء الملل سیدنا ومولانا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ ایمان لائے یہ اسلامی کمیٹی تھی اور ایمانی لشکر تھا جس نے ساری دنیا کو زیر و زبر کر دیا سلطنت کا انتظام بہت بڑی قوت پر مبنی ہوتا ہے یہاں کونسی قوت تھی۔ صرف اخلاص کی برکت تھی کون خیال کر سکتا تھا کہ یہ سلطنت عالمگیر ہو جاوے گی۔ اور بعضے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے چلا ہے سو اول تو یہ مسلم نہیں ہے اور علی تقدیر التسلیم صرف تلوار سے تو کام بھی نہیں چلتا تلوار کے لئے کوئی اس کا چلانے والا بھی تو ہونا ضروری ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ یہی فرمایا کرتے تھے کہ میاں تلوار کے لئے

کوئی تلوار چلانے والا بھی تو ہونا ضرور ہے اور وہ چلانے والے کہاں سے آئے وہ مجمع کس نے پیدا کر دیا یہ سب خلوص کی برکت سے حق تعالیٰ نے پیدا فرما دیا اور یہ بات کہ تلوار سے اسلام کی اشاعت ہوئی ہے وہ شخص کہہ سکتا ہے جو تاریخ سے بالکل ناواقف ہو دیکھو ابتداءً کبھی تلوار نہیں چلائی گئی بلکہ پہلے یہ کہا گیا کہ اسلام لاؤ یا اہل اسلام کی اطاعت قبول کرو اور جو دونوں امر منظور نہ ہوں تو پھر تلوار ہے۔ پھر قبول اطاعت کا قانون ایسا وسیع ہے کہ ظاہراً اسلام کے لئے نہایت خطرناک تھا۔ کیونکہ کبھی اطاعت تلبیس سے بھی ہوتی ہے ظاہر میں اقرار کر لیا کہ ہم اطاعت قبول کرتے ہیں پھر دھوکا دیدیا جب موقع پایا لیکن اس خطرہ کی پرواہ نہیں کی گئی، کیونکہ کام کرنے والا حقیقت میں خدائے تعالیٰ ہے کما قال یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون ؎

چراغے را کہ ایزد بر فروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

(جس چراغ کو حق تعالیٰ روشن کرنا چاہتے ہیں اوس کو جو بھی بجھانا چاہتا ہے اسکی ہی داڑھی کو جلا دیتے ہیں)

اور ایسے خطرات پیش بھی آئے مگر پھر بھی جو قانون مقرر کر دیا گیا وہ برابر جاری رہا قیامت تک وہی رہے گا اہل سلطنت کے قوانین میں تھوڑی تھوڑی مصلحت کے لئے تغیر کیا جاتا ہے اور یہاں ایسے ایسے خطرناک قوانین کو بھی استقامت دی گئی سبحانہ ما اعظم شانہ ولہ الکبریاء فی السموات والارض۔ صاحبو تلوار اخیر درجہ میں اٹھائی گئی ہے۔ جب دونوں شقیں منظور نہ کیں نہ اسلام لائے نہ اطاعت قبول کی۔ اور یہ تلوار اٹھانا بھی اس اضطرار کی وجہ سے تھا کہ بغیر اس کے مخالفین کے شر سے محفوظ رہنا ممکن نہ تھا۔ اور بدون اطاعت کے محض صلح کی حالت کا اقرار امن وامان کا کہ وہ اہل اسلام کو ضرر نہ پہونچاویں گے موجب اطمینان نہ تھا۔ لہذا ضرور تھا کہ انسداد شر باضابطہ ہو تا کہ اس سے محفوظ رہ کر حق تعالیٰ کی اطاعت اطمینان کے ساتھ ہو سکے اور اس ضابطہ کی صرف یہی صورتیں ہیں کہ یا تو مخالفین اسلام لادیں یا باضابطہ اطاعت اسلام قبول کریں اور جو یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تو مجبوری کو مقاتلہ سے کام لیا جاوے خود قرآن مجید بتلا رہا ہے کہ صرف فتنہ فرو کرنے کے لئے تلوار کی اجازت دی گئی ہے

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للّٰہ **اور پھر عین اس مقاتلہ** میں بھی ایسا قانون مقرر کیا جس میں مخالفین کو خداع کا بہت بڑا موقع تھا مگر مسلمانوں کو اس شبہ کی گنجائش نہیں دی گئی کہ شاید مخالفین نے دھوکا دیا ہو اگر کسی اور ملت و دین میں یہ قانون ہوتا تو وہ ملت ہرگز ترقی نہ کر سکتی اور جس کا جی چاہے اب بھی کوئی ملت یہ قانون مقرر کر کے دیکھ لے ہرگز ہرگز ترقی نہ کر سکے گی یہ صدق اسلامی ہی کی برکت ہے کہ باوجود ایسے وسیع قانون کے پھر بھی اسلام نے ترقی کی۔ وہ قانون یہ ہے کہ اگر کسی کافر پر تلوار اٹھائی ہو اور کافر بھی وہ جس کے ہاتھ سے اس تلوار اٹھانے والے کے تمام خاندان والے مسلمان قتل ہو چکے تھے اور اس نے عین اس حالت میں کلمہ پڑھ لیا تو حکم ہے کہ فوراً ہاتھ روک لو اور اگر اس نے اس طور پر اپنی جان کی حفاظت کر لی اور اگلے دن اس نے دھوکا دیا اور پھر ایسا ہی کیا پھر بھی اسلامی قانون یہی رہا کہ جب کوئی کلمہ پڑھ لے اس سے درگزر کرو اور مسلمانوں جیسا برتاؤ اس کے ساتھ کرو گو وہ پھر دھوکا ہی کیوں نہ دیدے۔ تم کو شبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ خلوص سے ایمان لایا عدم خلوص سے یہ تو ایسی وسعت ہے کہ لوگ جب چاہیں مسلمانوں کا قلع قمع کر دیں لیکن اسلام کے صدق کی قوت ہے کہ باوجود ایسا موقع ملنے کے بھی مخالف لوگ اسلام کی قوت کو نہ توڑ سکے اور صحابہ میں بھی خلوص تھا اور صدق تھا جس کی وجہ سے اسلام کو ترقی ہوئی۔ غرض یہ ہے کہ خلوص سے کام کرنا چاہیے فلوس کی زیادہ فکر نہ کرو۔ مشہور مثل ہے سر سلامت چاہیئے ٹوپیاں بہت خلوص و فلوس کی ایک لطیف مثال ذہن میں آئی جو حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے ارشاد فرمائی تھی کہ ایک جانور اڑا جا رہا ہے اور اس کے سایہ کا شکاری شکار کرنا چاہتا ہے تو خود سایہ کو کوئی پکڑنا چاہے ہاتھ نہ آوے گا۔ اس کے شکار کرنے کی صرف یہی تدبیر ہے کہ خود اس جانور کے تیر لگاؤ اور سایہ اس کی ہمراہ خود آ جاوے گا اور اس طرح آوے گا کہ تم علیحدہ کرنا چاہو گے اور وہ جدا نہ ہوگا حدیث میں ہے اتتہ الدنیا وھی راغمۃ یعنی ایسے لوگوں کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے اور اس کی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے فواحش عورتیں مستغنی کے پیچھے پڑتی ہیں اور چاہنے والے سے ناز و نخرہ کرتی ہیں۔ حضرت حاجی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ جو طالب دنیا ہونا چاہے وہ تارک دنیا ہو جائے اھ مگر یہ یاد رہے کہ جو اخلاص سے حق تعالیٰ کی رضا کے لئے ترک دنیا کرتا ہے اس کے پیچھے

دنیا پڑتی ہے اور جو محض نقل ہی کرے اور تحصیل دنیا کی ایک تدبیر ترک دنیا کو سمجھے اور اس کو عمل میں لاوے تو چونکہ وہ سچا تارک نہیں اس لئے ثمرہ بھی اس کی اس تدبیر پر مترتب نہوگا اور اگر تارک حقیقی ہو تو اس کے لئے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اتقیاء کو راحت و چین مرحمت فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب۔ مشاہدہ کر لیجئے ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہتے ہیں۔ کانپور میں جب میں نے اسی تقریر سے جو یہاں بیان کیا تھا تو اس میں یہ بھی کہا تھا کہ صاحبو کام شروع کرو روپیہ خود آرہیگا۔ کام کے اندر مقناطیس جیسی خاصیت ہے جیسے وہ لوہے کو کھینچتا ہے اسی طرح کار خیر زر کو کھینچتا ہے ہاں اخلاص اور استعانت من اللہ کی حاجت ہے مقناطیس کامل ہو اور اس کے پاس لوہا خود آجاویگا اس کو لوہے کے پاس جانے کی کیا حاجت ہے اہل اللہ سلطنت پر لات مار دیتے ہیں مگر پھر بھی دنیا ان کی گرتی ہے اور استغنا حقیقی تو بڑی چیز ہے اس کی نقل میں بھی کشش ہوتی ہے۔

ایک شخص میری یہ تقریر سن کر میرے ایک عزیز سے میرے متعلق بطور اعتراض کہنے لگے کہ ان کا استغنا بھی ایک تدبیر ہے تحصیل دنیا کی اور یہ ان کی واقع میں غلطی تھی جو مجھے مستغنی سمجھتے تھے میں تو دنیا داروں سے بھی بدتر ہوں خیر میں نے جب یہ حکایت سنی تو ضابطہ کا جواب دیدیا کہ بھائی میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں مستغنی ہوں اور میرے اندر جو یہ عیب ہے تو دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے پاک فرمادیں میں نے تو صرف یہی ضابطہ کا جواب دیا لیکن ان عزیز نے یہ جواب دیا کہ صاحب اگر یہ طرز بطور تدبیر کے ہوتا تو ظاہر ہے۔ ایسی تدبیر کو تو لوگ چھپایا کرتے ہیں تاکہ دوسرے اس سے مال نہ حاصل کرلیں اور یہ شخص تو برسر منبر اس کو بیان کرتا ہے کہ اہل علم کو استغنا اختیار کرنا چاہئے دنیا خود ان کے پیچھے دوڑے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہ نیت تدبیر یہ طرز اختیار نہیں کیا مگر سچا جواب تو وہی ہے جو میں نے دیا۔ غرض کار خیر کے اندر خاص کشش ہے گو کار خیر کی نقل ہی ہو پھر اگر اصل ہو جاوے تو کیا ٹھیک ہے۔

قال العارف الرومی ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند صاف گر باشد ندانم چوں کند

(جرعہ خاک آمیز جب مجنوں کرتا ہے تو اگر صاف ہو تو نہ جانے کیا اثر دکھائیگا)

یعنی ایسی شراب جس میں مٹی ملی ہو اس درجہ کا نشہ لاتی ہے کہ آدمی مجنون ہو جاتا ہے اگر وہ صاف ہو تو خدا جانے کیا غضب برپا کرے۔ غرض خلوص کو اختیار کرنا چاہئے عمل بڑھیگا جیسے کہ رائی کا ایک دانہ بویا جاتا ہے

پھر اس سے کس قدر ترقی ہوتی ہے مثل ضرب حسابی کے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جیسے اگر برگد کے درخت کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاوے اور اس کی داڑھی نہ کاٹی جاوے تو اس قدر پھیلے کہ ساری کمشنری میں بھی نہ سماوے۔ دیکھو اس ننھے سے رائی کے دانہ کی بدولت کس قدر ترقی ہوئی اسی طرح اگر لوگ خلوص سے جو نیک کام بھی شروع کریں وہ ترقی پذیر ہوگا اور برابر ترقی جاری رہے گی۔ ہاں اگر درمیان میں خلوص کا سلسلہ ٹوٹ جاوے اور اس کی وجہ سے سلسلہ ترقی کا مسدود ہو جاوے یہ دوسری بات ہے اور اپنی کوتاہی ہے آج حق تعالیٰ نے بناء مدرسہ کی آپ کو توفیق عطا فرمائی خلوص کے ساتھ شکریہ کیجئے قولاً بھی اور عملاً بھی کہ اس کی خدمت میں سعی کیجئے اس شکر سے نعمت بڑھے گی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لئن شکرتم لازیدنکم یعنی اگر تم شکر کرو گے تو ہم زیادہ عطا فرمادیں گے۔ اس قصبے میں مدرسہ کی ضرورت بھی تھی گو آس پاس مدارس دینیہ موجود ہیں لیکن علم دین کے انتظام کی تو ہر جگہ ہی حاجت ہے اور اگر قرب و جوار کے مدارس اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں تو جلال آباد میں کنوؤں کی بھی حاجت نہ ہونا چاہیئے قرب و جوار میں کنوئیں بہت ہیں تھانہ بھون کے کنوؤں سے پانی منگالیا کرو۔ مگر یہ کسی کو گوارا نہیں اور نہ اس طرح کام چل سکتا ہے بلکہ لوگ تو کنوؤں کو اس کثرت سے بنانا چاہتے ہیں کہ ہر ہر گھر میں کنواں ہو جاوے تو اچھا ہے۔ صاحبو جیسے جسم کی زندگی پانی سے ہے اسی طرح دل کی حیات علم دین سے ہے اگر تنافس نہ ہوتا تو میں تو یہ رائے دیتا کہ ہر ہر محلہ میں مدرسہ ہونا چاہیئے مگر آجکل تعداد مدارس کا نتیجہ تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ باہم منافست اور مخالفت پیدا ہو جاتی ہے مدرسہ کے نام میں ہی آجکل یہ اثر ہو گیا ہے کہ متعدد مدارس ہوئے مخالفت رونما ہوئی ہاں جو مکتب یہاں پہلے سے ہیں ان میں یہ احتمال نہیں اور وجہ اس مخالفت کی صرف چندہ ہے مکاتیب میں چونکہ چندہ نہیں ہے اس لئے مخالفت بھی نہیں ہوتی اور مدارس میں چونکہ ہر مدرسہ کے مہتمین اور کارپرداز یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مدرسہ کی طرف لوگوں کا زیادہ رجحان ہو اور اسی مدرسہ میں چندہ زیادہ آوے یہ تو خیال ہوتا نہیں کہ ہر مدرسہ خدائے تعالیٰ کا ہے جہاں جس کا جی چاہے دیوے ہم کو تزاحم کا کیا حق ہے۔ سو اس وجہ سے مخالفت ہوتی ہے میں جب تھانہ بھون آکر بطریق استقلال رہا تو میری فرمائش تو تھی نہیں میرا تو صرف یہ قصد تھا کہ مجھ سے خود جس قدر علم دین کی خدمت ہو سکے گی کروں گا۔ مگر لوگوں نے چندہ سے مدرسہ کی شکل بنائی چندہ ہوتے ہی تزاحم اور حکومت شروع ہوئی کوئی مدرس پر اعتراض کرتا ہے۔ کوئی طلبہ پر حکومت کرتا ہے۔ میں نے جو اس کے اسباب پر غور کیا تو ان تمام امور کی جڑ چندہ سمجھ میں آئی میں نے

چندہ حذف کر دیا جیسے کہ ایک مجذوب برہنہ پھرتے تھے مریدوں نے کپڑے بنا دیئے۔ کپڑوں کو چوہوں نے کتر لیا۔ اس کلفت کے ازالہ کے لئے بلی پالی بلی کھانے خراب کرنے لگی تو کتا پالا وہ کھانوں کو ناپاک کرنے لگا تو آدمی مقرر کیا۔ وہ آدمی مرغن کھانے کھا کر مستانے لگا اُدھر پھرنے لگا اس لئے اس کی شادی کر دی بیوی آئی بال بچے ہوئے شاہ صاحب آزاد منش تھے ان سب جھگڑوں کو دیکھ کر گھبرائے اور فرمانے لگے کہ ان سب کی جڑ لنگوٹا ہے اس کو اتار کر پھینکدیا غرض میں نے چندہ موقوف کرا دیا لیکن یہ نہیں کیا کہ کوئی مدرسہ کی اعانت خلوص سے کرے اس کو بھی اعانت کی اجازت نہ ہو بلکہ یہ اطلاع کرادی کہ اب یہ توکل کا مدرسہ ہے نہ روئداد ہوگی نہ حساب کتاب ہوگا نہ رسید ہوگی نہ باضابطہ قواعد مقرر ہوں گے جس کا جی چاہے اس میں اعانت کرے اور جس کا جی نہ چاہے نکرے اور جو کرے وہ اس شرط سے کہ اس کو اس قدر تحمل ہو کہ اگر میں ساری رقم اس کی خود بھی کھا جاؤں تو گوارا کرلے سو الحمدللہ کہ پہلے سے زیادہ آمدنی اور اطمینان ہے بعضے لوگوں نے کہا کہ اس طرح تم نے تو چلا لیا۔ مگر اور کسی سے نہ چل سکے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ہر وہ شخص چلائے گا جو خلوص سے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر کام کرے گا اور اگر نہ بھی چلے تو چھوڑ دے میں نے بھی یہی قصد کر لیا تھا کہ جتنا کام اپنی ذات سے ہو سکیگا وہ کرلوں گا اور اس سے زیادہ اگر حق تعالیٰ چاہیں گے کسی ذریعہ سے کرادیں گے ورنہ اس کے عدم ہی میں مصلحت سمجھوں گا۔ حدیث قدسی میں ہے انا عند ظن عبدی بی (اخرجہ الشیخان والحاکم بسند صحیح) یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں بندہ کے گمان کے پاس ہوں مطلب یہ ہے کہ اگر مجھ سے اچھا گمان رکھیگا تو میں بھی اچھا برتاؤ کروں گا اور جو بدگمانی کرے گا تو اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جاوے گا سو جن لوگوں کا گمان یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کام چلائیں گے ان کے ساتھ ان کے گمان کے موافق برتاؤ کیا جاتا ہے اور جن کا یہ گمان ہوتا ہے کہ بغیر ظاہری سبب کے کام نہیں چل سکتا تو حق تعالیٰ ان کو اس گمان کا ثمرہ مرحمت فرماتے ہیں یعنی وہ کام بغیر ظاہری سبب کے نہیں چل سکتا چور کا گمان ہے کہ بغیر چوری کے رزق نہیں ملتا تو اس کو بغیر اس فعل شنیع کے روزی نہیں ملتی اس کی پھٹی ہوئی جھولی ہے اس میں برکت نہیں ہوتی آتا تو ہے مگر نکل جاتا ہے دیکھئے اسٹیشن کی مسجد کی تعمیر میں کونسی لوٹ کھسوٹ ہوئی تھی کام دیکھ کر خود لوگوں کو رغبت ہوئی۔ بھوپال معمولی طور پر ایک غریب آدمی کی طرف سے اطلاع دی گئی کہ نہ خط کی رجسٹری کرائی گئی نہ کوئی خاص اہتمام سفارش کا

ہوا خصوصاً ایسے وقت میں کہ دلیعہد بیمار تھے اور اس وجہ سے بیگم صاحبہ کاروبار کی طرف پورے طور پر متوجہ بھی نہ ہوتی تھیں مگر پھر خدا تعالیٰ نے ان کو متوجہ کر دیا اور خط کے جواب میں انھوں نے تخمینہ دریافت کیا۔ تخمینہ بھی پورا پورا لکھ دیا گیا بڑھا کر نہیں لکھا اسی وجہ سے بعض بڑے لوگوں نے کہا کہ تعمیر کے کام میں اندازہ سے زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اس لئے تخمینہ زیادہ لکھنا چاہیے میں نے کہا کہ کیا واہیات بات ہے ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے غرض وہاں سے اعانت ہوئی پھر کمی رہی پھر اطلاع دی گئی اس طریق سے کہ آپ سے یہ درخواست نہیں ہے کہ آپ اس کام کی تکمیل کرا دیں بلکہ اس غرض سے اطلاع دی جاتی ہے کہ کام ناتمام ہے شاید آپ مطلع ہو کر شکایت فرما دیں کہ ہم کو کیوں نہیں خبر دی ہم اس کو پورا کرا دیتے۔ انھوں نے اس درخواست پر بھی بقدر تکمیل مدد فرمائی اور کچھ متفرق لوگوں نے اعانت کی۔ غرض سب کام اسی طرح ہو گیا۔ غرض چندہ پر زور دینا سبب ہوتا ہے تحاسد و تنافس مدارس کا اور مدارس میں اکثر ایسا ہوتا ہے اس لئے میں ایک بستی میں تعدد کی رائے نہیں دیتا۔ ہاں تعدد مدارس وہاں مضر نہیں ہوتا جہاں حکومت کا اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں داعی ہی نہیں یعنی چندہ اور مانع موجود ہے یعنی حکومت۔ ایک طالب علم بخاری کہتے تھے کہ بخارا میں ۳۶ مدرسے ہیں ہر مدرسہ میں پائیں باغ اور بڑے بڑے مکانات اور طلبہ کو باغوں کے میوے وغیرہ تصرف میں لانے کی بے تکلف اجازت۔ اور ان کا جیب خرچ مقرر ہے تو چونکہ وہاں حکومت اسلامیہ کے ماتحت مدارس ہیں اس لئے تنافس اور تخالف کا اثر نہیں اور میں نے چندہ پر زور ڈالنے سے منع کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس مدرسہ کی اعانت کو منع کرتا ہوں۔ میں مانع للخیر نہیں ہوں لیکن متعارف درخواست نہیں کرتا ہوں ہاں عام ترغیب دلاتا ہوں لا یسئلون الناس الحافا کے موافق درخواست بے خوش قسمتی ہے۔ آپ حضرات کو کہ ایسا موقع میسر ہو گیا ہے اگر اور بھی کچھ نہ ہو سکے تو دعا ہی کر دیا کرو ؎

لا خیل عندک تہدیہا و لا مال فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

(نہیں ہے گھوڑا تمھارے پاس کہ تم ہدیہ کرو اور نہ مال ہے کہ اسے دو تو صرف زبان ہی سے موافقت کرو اگر تمہارا حال موافقت نہیں کرتا)

دعا بہت بڑی چیز ہے گو لوگ اس کو معمولی اور حقیر سمجھتے ہیں لیکن صرف اسی پر قناعت بھی نہ کیجیے بلکہ ہر طرح سے جو کچھ مدد ہو سکے فرمایئے اور اس مثل کے مصداق نہ ہو جیے (محبت رکھوں پاک لینے دینے کے منہ میں خاک)

گو بخیل کی (تبسم کے لہجہ میں ۱۲ جامع) دعائیں اس حیثیت سے زیادہ اثر کی امید ہے کہ وہاں خلوص زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں تو صرف دعا ہی دعا ہے اور کچھ ہے ہی نہیں مگر ایک دوسری حیثیت سے اور وہ حیثیت نحوست بخل ہے۔ قبولیت دعا میں کمی ہو جاوے مگر خلوص تو بہت ہی ہوتا ہے اور عجب نہیں کہ خلوص برکت بخل کی نحوست پر غالب آجائے اور ضرورت اس کام کی آپ کو معلوم ہی ہو چکی جب تک حضرت قاری محمد علی خاں صاحب قدس سرہ یہاں تشریف فرما تھے تو اس قدر یہاں مدرسہ کی حاجت نہ تھی گو کسی درجہ میں جب بھی تھی اب کون ہے جس سے ضرورت کے وقت مسئلہ دریافت کیا جاوے۔ صرف کتابوں سے کام نہیں چل سکتا کیونکہ کتابوں کا پورے طور پر سمجھنا عالم کے سوا دوسرے کا کام نہیں ہے کبھی کسی کی ہمت پڑی ہے کہ کتابوں سے مسہل دیکھ کر استعمال کیا ہو ہمیشہ طبیب ہی کی حاجت ہوتی ہے۔ پھر جب طب جسمانی کے لئے صرف کتابیں کافی نہیں سمجھی جاتیں تو تعجب ہے کہ طب روحانی کیلئے کیونکر کتابوں پر قناعت ہو جاتی ہے حالانکہ قلب کی اصلاح جسم کی اصلاح سے اہم اور اس سے زیادہ نازک ہے لہذا یہاں مدرسہ میں ایک عالم کی حاجت ہے اور وہ عالم ایسے ہوں جن کی درسیات پوری ہو چکی ہوں اور ان کے متعلق تین کام ہونا چاہئے ایک تو بچوں کا گھیرنا اور محبوس رکھنا تاکہ وہ آوارگی سے بچیں اور گو گھیر گھار سرکاری مدارس میں بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن وہاں صرف علم معاش کی تعلیم ہوتی ہے علم معاد سے کوئی تعلق نہیں اُس سے نفس کی اصلاح نہیں ہوتی اور میں علم معاش کا مخالف نہیں ہوں مگر مسلمان اسکو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ علم معاش کے اہتمام میں اپنی عمر تمام کر دے اور معاد سے بے بہرہ رہے کم سے کم علم معاد میں قرآن مجید اور اردو کے رسائل جن سے ضروری مسائل پر عبور ہو جاوے اتنا ہی پڑھ جاوے اور دوسرا کام ان عالم کا یہ ہو کہ بوقت ضرورت مسائل بتلا دیں اور اس عالم کا متدین ہونا بھی ضرور ہے تاکہ جن مسائل کو کتاب کی مدد سے بھی نہ بتلا سکے ان کے پوچھنے کے لئے اپنے سے بڑے عالم کا پتہ بتلا دے اور نیم ٹر عالم اگر متدین ہوگا تب تو کام نہ کر سکیگا اور جو متدین ہوگا تو جو چاہے گا بتلائیگا صحیح وغلط کی پرواہ نہ کرے گا تیسرا کام گاہے گاہے وعظ کہنا ہے۔ کیونکہ تدریس سے تعلیم خاص حاصل ہوتی ہے اور وعظ سے تعلیم عام ہے اگر اسی طرح تھوڑے عرصہ تک کام چلتا رہا تو بہت سے فاسق متقی ہو جاویں گے بہت سے جاہل عالم ہو جاویں گے بہت سے ناواقف واقف ہو جاویں گے۔ بہت سے طلبا بڑے مدارس عربیہ میں داخل ہونے کے لائق ہو جاوینگے اور تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جب تک مدرسہ کا مکان خاص نہ ہو اس وقت تک اطمینان سے تعلیم نہیں ہو سکتی۔

مسجد میں اول تو تنخواہ دار کا پڑھانا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے دوسرے مسجد کا ادب ملحوظ رکھنا تدریس کی صورت میں دشوار ہے اور اگر مدرسہ کسی کی بیٹھک میں قائم کیا جاوے تو اس کا استقرار دشوار ہے ممکن ہے کسی وقت میں صاحب بیٹھک اہل مدرسہ کو وہاں سے اٹھا دے نیز مسجد کی آبادی نمازیوں سے کافی ہو جاتی ہے طلبہ پر موقوف نہیں اس لئے مسجد میں مدرسہ ہونے سے لوگوں کا خاص طور پر مدرسہ کی آبادی کا اہتمام نہیں ہو سکتا۔ اور جب مدرسہ مستقل ہو گا تو اس وقت اس کی آبادی کا خیال ہو گا درجہ اس مدرسہ کا یہ ہو گا کہ عربی کی ابتدائی کتابوں تک تعلیم رہے گی جب طلبہ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہو چکیں کسی بڑے مدرسہ میں داخل ہو جاویں یہاں تو مختصر ہی مدرسہ مناسب ہے خصوصاً ابتدائی حالت میں۔ ایک اللہ کے بندے نے کچھ چندہ بھی جمع کر لیا ہے اور ایک عالم بھی ذہن میں قرار دے لئے ہیں ایک عالم کا بستی میں رہنا ضروری ہے اب وقت اس کا ہے کہ آپ لوگ عمارت کی بنیاد رکھیں اور یہ دعا کریں ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم یہ دعا ہے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جو بوقت بنا ر کعبہ کے آپ نے جناب باری میں عرض کی تھی اور واقع میں حق تعالے کی اعانت کی نہایت ضرورت ہے کیونکہ خلوص بھی جب ہی مؤثر ہے جبکہ حق تعالیٰ قبول فرمالیں اس لئے کہ سوائے اللہ جل جلالہ کے تمام اشیا حادث ہیں اور خلوص بھی انہی میں سے ہے اور کوئی حادث فاعل بالذات نہیں ہو تا پس خلوص بغیر اعانت خداوندی مؤثر نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک ہو سکے جلدی سے جلد اس کام کو شروع کر دیجئے اور چونکہ یہ افتتاح عمارت مدرسہ کا وقت ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ کبھی یہاں مدرسہ اس سے پہلے ہوا ہو اس مناسبت سے بھی اور نیز اس مناسبت سے کہ افتتاحی کتابیں یہاں پڑھائی جاویں گی اور نیز اس مناسبت سے بھی فتح باب خیر ہے اور اس مناسبت سے بھی کہ حدیث میں جو یہاں بیان کی گئی ہے لفظ مفتاح واقع ہوا ہے۔ اس مدرسہ کا نام مفتاح العلوم رکھتا ہوں اور اس وعظ کا نام مفتاح الخیر چونکہ یہ اسماء مقتبس من الحدیث ہیں اس لئے مدرسہ میں نیز اس وعظ میں برکت کی زیادہ امید ہے۔ اب دعا فرمایئے۔ (دعا پر جلسہ ختم ہوا اور سنگ بنیاد مدرسہ کا رکھا گیا)

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

(رواہ البخاری)

السوق لاہل الشوق

منجملہ ارشادات :-

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر:- محمّد عبدالمنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ——— دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی

السوق لاہل الشوق

این	متی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
مدرسہ قاسم العلوم مسجد شاہی بازار چوک مراد آباد	۲۲ شعبان ۱۳۳۶ھ یوم الاحد ۲ رجون ۱۹۱۸ء	از ۷ بجے ۴۳ منٹ صبح تا ۱۰ بجے ۵۵ منٹ کل وقت ۳ گھنٹے ۱۲ منٹ	کرسی پر لب حوض بیٹھ کر	ترغیب علم و احوال دوزخ و جنت	احقر محمد مصطفےٰ بجنوری مقیم میرٹھ محلہ کرم علی	۱۵۰۰ یا ۲۰۰۰	

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

دعا خطبہ۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط وما قدروا اللہ حق قدرہ والارض جمیعا قبضتہ یوم القیمۃ والسمٰوات مطویات بیمینہ سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوات ومن فی الارض الا من شاء اللہ ثم نفخ فیہ اخریٰ فاذا ھم قیام ینظرون واشرقت الارض بنور ربھا ووضع الکتاب وجائی بالنبیین والشھداء وقضی بینھم بالحق وھم لا یظلمون۔ ووفیت کل نفس ما عملت وھو اعلم بما یفعلون وسیق الذین کفروا الیٰ جھنم زمرا حتّٰی اذا جاء وھا فتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا الم یاتکم رسل منکم یتلون علیکم اٰیات ربکم وینذرونکم لقاء یومکم ھذا قالوا بلیٰ ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکافرین قیل ادخلوا ابواب جھنم خٰلدین فیھا فبئس مثوی المتکبرین وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا حتّٰی اذا جاء وھا و

فتحت ابوابها وقال لهم خزنتها سلام علیکم طبتم فادخلوها خلدین وقال الحمد لله الذی صدقنا وعده واورثنا الارض نتبوا من الجنة حیث نشاء فنعم اجر العملین وتری الملئکة حافین من حول العرش یسبحون بحمد ربهم وقضی بینهم بالحق وقیل الحمد لله رب العلمین ط یہ چند آئتیں ہیں جن میں حق جل شانہ وعم نوالہ نے اکثر حصہ میں معاد کا ایک مضمون بیان فرمایا ہے اور اس سے مقصود اس مقام پر توحید کی ترغیب اور تاکید ہے اور ترک توحید پر ترہیب ہے تو یہ دو مضمون ہوئے اور ان دونوں میں سے بھی زیادہ مقصود اثبات توحید ہے گو عبارت میں معاد کے بیان کو زیادہ طول ہے اور اس میرے دعوے پر کہ مقصود اثبات توحید ہے آیت میں صریح قرینہ وما قدروا اللہ حق قدرہ ہے جس کا میں ترجمہ کروں گا تو بہت وضاحت کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آجاوے گی۔ غرض اس آیت میں کھلے کھلے الفاظ ایسے موجود ہیں جن سے میرا مدعا ثابت ہوتا ہے۔ ترجمہ کے عنوان میں غور کرنے سے معلوم ہو جاوے گا کہ مقصود زیادہ تر اثبات توحید ہے اور اس مضمون کی تاکید کے لئے معاد کا بیان کیا گیا ہے اور اس آیت میں اوپر تو بہت ہی صریح الفاظ اس مضمون کے موجود ہیں۔ دیکھئے فرماتے ہیں قل افغیر اللہ تأمرونی اعبد ایها الجاهلون یعنی اے جاہلو کیا تم مجھے خدا تعالےٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کے لئے کہتے ہو۔ اس میں غیر اللہ کی عبادت پر انکار کیا گیا یعنی شرک کی نفی کی گئی اور یہ عین اثبات توحید ہے اور اس سے بھی صریح عنوان اس کے آگے یہ موجود ہے۔ ولقد اوحی الیك والی الذین من قبلك لئن اشرکت لیحبطن عملك ولتکونن من الخاسرین اس میں لفظ لئن اشرکت موجود ہے نفی شرک کے لئے اس سے زیادہ کونسا لفظ صریح ہو سکتا ہے۔ اور ہر چند کہ لئن اشرکت واحد حاضر کا صیغہ ہے جس میں بظاہر خطاب صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مقصود یہ نہیں ہے کہ یہ حکم یعنی شرک کی ممانعت اور توحید کی تاکید صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات مبارک کے ساتھ خاص ہے کیونکہ اس پر سینکڑوں نصوص اور دلائل موجود ہیں کہ توحید کا قائل ہونا ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور شرک سب کے لئے ممنوع ہے۔ بلکہ اس آیت میں اصل مقصود ملازمت ثابت کرنا ہے درمیان شرک اور حبط عمل کے یعنی جہاں شرک کا وجود ہوگا اس کے ساتھ حبط کا عمل بھی ضرور ہوگا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کا مخاطب اس لئے کیا گیا کہ وحی کے مخاطب اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں غرض خطاب خاص کے صورت میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ کہ شرک کو حبط عمل لازم ہے یہ تو مشہور جواب ہے اس بات کا کہ اس موقع پر یا اسی جیسے دوسرے موقعوں پر قرآن شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیوں بنایا گیا ہے اور اس کا ایک نہایت لطیف جواب اور ہے وہ یہ کہ لئن اشرکت میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے ہی نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان غایت نزاہت رکھتی ہے شرکت جیسی گندی چیز کا وہاں کیا ذکر اور کیا احتمال شرک تو وہ اکبر الکبائر اور اقبح القبائح ہے جس کو کسی صاحب عقل نے بھی جائز نہیں رکھا شانِ نبوت تو بہت اعلیٰ ارفع ہے بلکہ اس کا خطاب دوسرے مخاطبین کو ہے اور اس پر کوئی لفظ اوحی الیک سے اشکال نہ کرے جو اسی جملہ میں موجود ہے کہ اوحی الیک میں تو یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اس کا مخاطب تو ہر شخص نہیں ہو سکتا جب ایک جملہ میں آپ کو خطاب ہے تو جملہ ثانیہ لئن اشرکت الخ کے مخاطب بھی آپ ہی ہوں گے۔ کیونکہ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ آیت میں کئی مضمون تو سب کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور باقی مضامین تبلیغ کے لئے ہوں اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی طرف اور تمام انبیاء کی طرف وحی بھیجی گئی ہے اس مضمون کی کہ لئن اشرکت ایہا المخاطب لیحبطن عملک تاکہ یہ حکم خدا کے بندوں کو پہنچا دو کہ جو کوئی شرک کرے گا اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ تو لئن اشرکت میں تو خطاب افراد امت کو ہوا

اور لقد اوحی الیک الخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو خطاب ہوا بہرحال خطاب خواہ عام ہو یا خاص آحاد امت کو ہو مقصود آیت میں نفی اور ابطال شرک ہے اور پوری آیت سیاق و سباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کو باطل کرنا اور توحید کو ثابت کرنا منظور ہے چنانچہ فرماتے ہیں ما قدروا اللہ حق قدرہ یعنی ان لوگوں نے خدا کی اتنی عظمت نہیں جانی جتنی کہ واقع میں ہے اس میں شکایت ہے شرک کی کیونکہ شرک کے معنی یہی ہیں کہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس واسطے دوسرے کو ماننے کی ضرورت ہے کوئی دوسرے کو کسی کام میں جب ہی شریک کرتا ہے کہ وہ کام خود اس سے پورا نہ ہو سکے مثلاً تجارت میں کوئی دوسرے کو اسی وجہ سے شریک کرتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ کم ہے یا یہ اس میں کماحقہ محنت نہیں کر سکتا غرض اس میں مالی یا جانی کمی ہے اس کے پورا کرنے کیلئے دوسرے کو شریک کرتا ہے تو خدا کے ساتھ جب کسی کو شریک کیا جاوے گا تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ نعوذ باللہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس کے پورا کرنے کے لئے دوسرے کی ضرورت ہے اس صورت میں خدا تعالیٰ کو کمال و آثار کمال میں تفرد نہ ہوگا تو مشرک نے خدا کو کامل نہیں مانا بلکہ ناقص مانا تو اس نے خدا کی پوری تعظیم نہیں کی کیونکہ پوری تعظیم بدون اس کے نہیں ہو سکتی کہ کمال یا اس کے آثار میں کمی نہ مانی جاوے میں نے یہ دو لفظ یعنی کمال و آثار کمال اس واسطے کہے کہ بعض دفعہ اعتقاد درجہ کمال میں شرک نہیں ہوتا مثلاً خالقیت وغیرہ میں خدائے تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ مانا جاوے مگر آثار میں شریک مانا جاوے جیسے مشرکین عرب کرتے تھے کہ مقصودیت و خالقیت میں کسی کو حق تعالیٰ کی برابر نہیں مانتے تھے ہاں اس کے آثار میں غلطی کرتے تھے اس کی شہادت قرآن میں موجود ہے حق تعالیٰ نے ان کا قول نقل فرمایا ہے ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی یعنی مشرکین کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی پرستش صرف اس واسطے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کے یہاں پہنچاویں اور مقرب بناویں اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ خدا کے برابر تو کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں

خدا کے تصرفات میں بعض دخل کو دخیل مانتے تھے بلفظ دیگر یہ کہ کمال میں تو شریک نہیں کرتے تھے لیکن آثار کمال میں شریک کرتے تھے اور حدیث میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک سے پوچھا تیرے کتنے معبود ہیں کہا سات ہیں ان میں سے سب سے بڑا تو آسمان میں ہے۔ بڑے بڑے کاموں کے لئے اس کو پکارا جاتا ہے اور معمولی کاموں کیلئے دوسرے معبود ہیں دیکھئے یہ لوگ کمال مطلق تو حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت کرتے تھے کیونکہ اس سے بڑا کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں کمال کے آثار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پہنچانے اور قریب کرنے کے لئے ان کو معبود مانتے تھے مگر اس پر بھی حق تعالےٰ نے انکار فرمایا چنانچہ آیت مذکورہ میں ان کا وہی قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں والذین اتخذوا من دونہ اولیاء ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ ان اللہ یحکم بینھم فی ما ھم فیہ یختلفون ان اللہ لا یھدی من ھو کاذب کفار ایسے لوگوں کو کفار فرمایا ہے۔ غرض یہ دونوں شرک ہیں اسی واسطے میں نے دو لفظ عظمت کے ساتھ کہے کہ کمال میں اور اس کے آثار و مقتضیات میں جب تک کمی کی بالکلیہ نفی نہ کی جاوے اس وقت تک پوری تعظیم نہیں ہوسکتی اگر ایک میں بھی کمی مانی جاوے گی تو پوری تعظیم نہ ہوگی خواہ کمال میں کمی ہو یا اس کے آثار و مقتضیات میں یہ دونوں منافی ہیں حق تعالیٰ کی عظمت کے اور ان سے کسی ایک کا بھی قائل ہونا شرک ہے پوری بڑائی یہی ہے کہ نہ کمال میں کسی کو شریک مانا جاوے اور نہ مقتضیات کمال میں غرض شکایت کرتے ہیں کہ ما قدروا اللہ حق قدرہ ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی پوری عظمت نہیں کی حالانکہ پوری پوری عظمت کرنی چاہیے کیونکہ خدائے تعالےٰ کی ایسی شان ہے کہ زمین اس کی ایک مٹھی ہے اور آسمان ایک ہاتھ میں لپیٹ لئے جاویں گے اور صور پھونکا جاوے اور قیامت قائم ہوگی اور کفار جہنم میں جاویں گے اور مومنین کو جنت ملے گی غرض حق و باطل پر اس اہتمام کے ساتھ جزا و سزا ہونے والی ہے پھر یہ لوگ کس خیال میں ہیں اور کیوں خدائے تعالیٰ کی عظمت کما حقہ نہیں کرتے اور شرک کئے جاتے ہیں اول تو کمال ذاتی ہی

قرآن شریف میں اس عنوان کو اختیار کیا گیا ہے کہ توحید کے بیان کے ساتھ معاد کا بیان کیا گیا کہ اب ایسا ہونے والا ہے یوم الفصل آنے والا ہے اور وہاں یہ یہ ہوگا باوجود اس کے تعجب ہے کہ مشرکین پوری تعظیم نہیں کرتے اور شرک سے باز نہیں آتے جیسے بچہ سے کہیں کہ کل کو امتحان ہونے والا ہے اور ایسی ایسی قمچیاں منگائی گئی ہیں اور ایسے ایسے جلاد بلائے گئے ہیں جو بالکل بے رحم ہیں اگر اس پر بھی وہ یاد نہ کرے تو تعجب کیا جاوے گا کہ کس قدر دلیر اور بدطینت ہے کہ علم اول تو ویسے ہی قدر کی چیز ہے بے علم آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہے قطع نظر اس سے اس بے حیا کو ایسی مار کا بھی خوف نہ ہوا ظاہر ہے کہ بچہ کے سامنے یہ ہولناک چیزیں سنانے سے غرض اس کو علم سکھانا ہے اسی طرح آیت میں مقصود توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اسی کے لئے معاد کا ذکر فرمایا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں متن قرآن یعنی اس کے اصول مسائل تین چیز ہیں توحید اور رسالت اور معاد یہ تینوں اصول اور متن ہیں باقی سب ان کی شرح ہیں ان میں سے دو مسئلے اس آیت میں مذکور ہیں یعنی توحید اور معاد اور غور کیا جاوے تو تیسرا مسئلہ یعنی مسئلہ رسالت بھی اس آیت میں مذکور ہے کیونکہ ان ہی آیات میں صاف موجود ہے اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یعنی فرشتے کفار سے بطور سرزنش کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے اور وہ حسرت سے جواب دیں گے کہ بَلٰی وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَۃُ الْعَذَابِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یعنی پیغمبر آئے تو بیشک تھے مگر قسمت ہماری کہ یہ عذاب چکھنا تھا ان کی بات کو نہ مانا معلوم ہوا کہ مسئلہ رسالت بھی ضروری اور ماننے کی چیز ہے تو تینوں اصول دین اس آیت میں مذکور ہیں اور مسئلہ رسالت کے ضروری ہونے کا راز یہ ہے کہ مسئلہ توحید موقوف ہے رسالت پر اور مسئلہ توحید ضروری ہی ہے تو مسئلہ رسالت بھی ضروری ہوا۔ اور مسئلہ توحید کے مسئلہ رسالت پر موقوف ہونے کا بیان یہ ہے کہ توحید خداتعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت ایک تعلق ہوتا ہے درمیان دو شخصوں کے

اور تعلق کے لئے مناسبت شرط ہے اور بندوں میں اور خدا میں کچھ مناسبت نہیں اس واسطے ضرورت ہوئی واسطہ کی اس واسطہ ہی کو رسول کہتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی شان یہ ہے انت کما اثنیت علےٰ نفسک یہ سید العارفین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقولہ ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ آپ خود ہی اپنی ذات وصفات کو خوب جانتے ہیں، ہم نہیں جان سکتے اور یہ بطور مبالغہ نہیں ہے بالکل سچی اور واقعی بات ہے ذات وصفات واجب تعالےٰ کا علم ممکن کو ہو ہی نہیں سکتا اپنا علم انھیں کو ہے اگر کوئی عقل سے کچھ دریافت کرنا چاہے گا تو قیاس الغائب علی الشاہد ہوگا کیونکہ ان کی کوئی نظیر نہیں تو بہت سے بہت یہ ہوگا کہ شاہان دنیا پر قیاس کریں گے کہ ان کی بھی قدرت اور علم اور دیگر صفات ایسی ہی ہوں گی اور یہ بات کہ ان کی قدرت عام اور علم محیط ہے کوئی چیز خارج نہیں یہ بلاوحی کے ثابت نہیں ہوسکتی، تو خدا کی معرفت عقل سے جو کچھ ہوتی بھی وہ بالکل ناقص ہوتی چنانچہ جن لوگوں نے وحی سے استفادہ نہیں کیا اور اپنی عقل کے زعم میں رہے انھوں نے الٰہیات میں ایسی غلطیاں کی ہیں جن پر آج اہل حق کے بچے بھی ہنستے ہیں۔ جب تک وحی نہیں تھی وہ لوگ بڑے عقلمند اور حکیم مانے جاتے تھے لیکن وحی کے آنے پر ان کی قلعی کھل گئی کہ کیسی فاش غلطیوں میں مبتلا تھے غرض خدائے تعالےٰ کی معرفت بلا اُسی طرف کی خبر کے اور بلا توسط واسطہ کے جس کو رسول کہتے ہیں نہیں ہوسکتی اگرچہ خبر کے بعد بھی کنہ اس کی مُدرک نہیں مگر خبر سے اتنا تو ہوا کہ وجہ تو اس کی مُدرک ہوئی (یعنی علم بالوجہ تو ہوگیا) اجمالاً اتنا تو معلوم ہوگیا کہ خدائے تعالیٰ وہ ہے جس کی قدرت اور علم سے کوئی چیز خارج نہیں بلا وحی اور بلا رسول کے اتنا بھی معلوم نہیں ہوسکتا یہ راز ہے مسئلہ رسالت کی ضرورت کا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ توحید بلا مسئلہ رسالت کے پورا نہیں ہوسکتا۔

غرض تینوں اصول مسائل اس آیت میں مذکور ہیں توحید بھی اور رسالت

بھی اور معاد بھی، ہاں بیان مبسوط معاد کا ہے گو مقصود توحید ہے۔ اور اس سے تعجب نہ کیا جاوے اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اگر مقصود مسئلہ توحید ہوتا تو اس کے بیان میں بسط ہوتا نہ کہ اس مسئلہ کے بیان میں جو مقصود نہیں اور تبعاً اور ضرورتاً لایا گیا ہے گویا طریق کو مقصود سے بڑھا دیا گیا سو جو کبھی تو طیہ و تمہید میں زیادہ کام ہوتا ہے بہ نسبت اصل مقصود کے جیسے کھانا ایک مقصود ہے کہ یہ ذرا دیر کا کام ہے مگر اس کے تمہید اور مقدمات کو دیکھئے کہ اللہ تو یہ کس قدر طول طویل اور دشوار ہیں اس کا شروع مثلاً کھیتی سے ہوتا ہے۔ اس کے لئے برسات کے موسم کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بہت انتظار کے بعد موسم آیا تو بیلوں کی ضرورت ہے اور آدمیوں کی ضرورت ہے سب مل کر کام کرتے ہیں حتیٰ کہ مالک کو بھی ان کے ساتھ لگنا پڑتا ہے۔ برسات کی دھوپ ہے اور سر سے پیر تک پسینہ بہ رہا ہے ہزار کوششوں اور دردسریوں کے بعد کھیت پیدا ہوا اور عرصہ تک نگاہداشت اور غور و پرداخت کے بعد اس میں دانہ پیدا ہوا پھر وہ کاٹا گیا اور پیروں میں لاکر گاہا گیا دانہ الگ کیا گیا اور بھوسہ الگ، پھر اس دانہ کو پیسا گیا، پھر پکایا گیا اور پکانے کے لئے ماما کی تلاش کرنی پڑی غرض ہزار وقت یہ نوبت آئی کہ کھانا تیار ہوا اس میں کتنا عرصہ لگا اور کتنے بکھیڑے ہوئے کہ خدا کی پناہ اور یہ سب ذریعہ اور تمہید کا مرتبہ تھا اور جو اصل مقصود ہے یعنی کھانا وہ پانچ منٹ میں ختم۔ دیکھئے اس مثال میں مقصود سے ذریعہ اور تمہید کو اتنا طول ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہ نسبت مقصود کے ذریعہ میں طول ہے بلکہ طریق کا بہ نسبت مقصود کے طویل ہونا تو موافق عادت کے ہے اور امر اکثری ہے دیکھئے آپ کہیں سیر کرنے یا اور کسی کام کے لئے جاتے ہیں تو اصل مقصود طول عرض میں کتنا ہوتا ہے اور اس کا طریق کتنا ہوتا ہے۔ مثلاً کلکتہ سیر کے لئے جاتے ہیں تو سیر گاہ یعنی شہر کلکتہ تو دو چار میل ہی کا طول عرض رکھتا ہے مگر طریق اس کا ایک ہزار میل کا ہے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ رہی کہ طریق مقصود سے بڑا ہے بلکہ امر

معتاد یہی ہے کہ طریق مقصود سے طول ہو ہاں جلالت قدر میں مقصود کا ذریعہ سے بڑا ہونا ضروری ہے اگر اس کا خیال نہ رکھا جاوے تو غلطی ہوگی مثلاً کلکتہ جانا سیر کے لئے اور عجائبات دیکھنے کے لئے تو مضائقہ نہیں کیونکہ یہ چیزیں کسی درجہ میں مہتم بالشان ہیں اور اگر مثلاً کوئی اس واسطے جاوے کہ ایک مٹھی گھاس کی ضرورت ہے اور اس کے لئے اتنا سفر کرے تو ہر شخص بے وقوف بنادے گا کہ اتنی ذرا سی بات کے واسطے اتنا بڑا راستہ کیوں طے کیا اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مقصود جلالت قدر میں طریق کی برابر نہیں آیت میں مقصود مسئلہ توحید ہے اور یہ جس قدر جلیل القدر مسئلہ ہے سب جانتے ہیں اس کے لئے طریق کو جتنا بھی طول ہو تعجب کی بات نہیں بلکہ عین عادت اور عقل کے موافق ہے غرض اتنی تقریر سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ آیت میں بالقصد مسئلہ توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اور اس کی تاکید کے لئے مسئلہ معاد نہایت شدومد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور مسئلہ رسالت بھی آیت میں مذکور ہے غرض تینوں اصول دین آیت میں مذکور ہیں لیکن مجھ کو اس وقت صرف مسئلہ معاد کو بیان کرنا مقصود ہے اور نتیجہ یہ نکالوں گا کہ جب معاد میں ایسے واقعات ہونے والے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی درستی کی سخت ضرورت ہوئی تو اس کا جاننا بھی سخت ضروری ٹھہرا کہ معاد کی درستی کیسے ہوتی ہے اور چونکہ یہ احتمال تھا کہ پھر یاد رہے نہ رہے اس لئے اس کو میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہیں بتائے دیتا ہوں کہ معاد کی درستی کے طریقے میں اخیر میں کیا بتاؤں گا سو اس طریق کا حاصل وہ یہ ہے کہ عقائد و اعمال کی اصلاح کی جاوے اور یہ موقوف ہے علم پر تو علم کی ضرورت ثابت ہو جاوے گی اور یہ مضمون اس علمی جلسہ کے مناسب ہو جاوے گا صاحبو یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ہی سے ضرورت علم کی معلوم ہے بہت سی حدیثیں علم کی فضیلت اور اس کے طلب وجوب کے متعلق موجود ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہم کو مل گیا تو ضرورت معلوم ہوگئی کہ اس کام کو کرنا چاہیے اب اور کسی ضرورت کے تلاش کی حاجت نہیں رہی لیکن اگر عقل سے بھی ثابت ہو جاوے اس طرح سے کہ تحرز عن المضرت

اور جلب منفعت ضروری چیز ہے اور منجملہ مضرتوں کے مضار آخرت بھی ہیں بلکہ مضرت کے
افراد میں اکمل وہی ہیں تو آخرت کے مضار سے بچنا بھی ضرور ہوا اور وہ موقوف ہے مضار
آخرت کے علم پر جس کا ذریعہ محض علم دین ہے تو اس سے یہ مضمون اور زیادہ اقرب الی الفہم
اور موجب طمانیت قلب ہو گا اس واسطے میں بیان معاد کے بعد اصلاح عقائد و اعمال
کی ضرورت بیان کروں گا اس کے لئے علم کی ضرورت ثابت کروں گا تاکہ اچھی طرح
ذہن نشین ہو جاوے اس وقت اس اصلاح مذکور کے طریق کے متعلق کچھ عرض کرتا
ہوں آجکل اس کو سب مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے تمام حالات میں اصلاح
کی حاجت ہے اور اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مسلمان مل کر
کوشش کریں یہ کام ایک دو افراد کا نہیں ہے اور اصلاح کے لئے علم کی ضرورت
ہے تو اس بات کی ضرورت ہوئی کہ علم کے لئے سب مسلمان مل کر کوشش کریں
گھر گھر علم کا چرچا ہو جگہ جگہ مجمع اہل علم کے موجود ہوں چنانچہ بحمد اللہ بہ نسبت
پہلے زمانہ کے اس میں ترقی بھی ہے ہر جگہ مدرسہ موجود ہے کچھ نہ کچھ مجمع اہل علم کا
موجود رہتا ہے اور مدرسہ جگہ جگہ ہونے سے بہت فائدہ پہنچا ہے کیونکہ جب علم کی
مسلمانوں کو ضرورت ہے اور علم کی ترقی علمی مجالس سے ہوتی ہے تو علمی مجالس جس قدر
زیادہ ہوں اسی قدر علم کو ترقی ہونے کی اور اسی قدر مسلمانوں کو نفع پہونچنے اور قوت علمی بڑھنے کی امید ہو گی علم کی مثال
ریل کے انجن کی سی ہے کہ اسی کی طاقت سے ریل چلتی ہے۔ انجن جتنا زوردار ہو
اتنی ہی رفتار ریل کی زیادہ ہوتی ہے اور اگر ایک انجن کی جگہ دو انجن جوڑ دیئے
جاویں تو ظاہر ہے کہ قوت اور بڑھ جاوے گی۔ بنا بریں جتنی مجالس علمی یعنی مدارس
تعداد میں زیادہ ہوں گے علمی قوت بڑھے گی اور مسلمانوں کو نفع ہی پہونچے گا یہاں
سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوتی ہے جو کہا کرتے ہیں کہ مدرسہ کھولنے کی کیا ضرورت
ہے شہر میں ایک ہی مدرسہ کافی ہے۔ بازار میں اگر دس دکانوں کی جگہ گیارہ
ہو جاویں تو اس کو بازار کی ترقی کہا جاتا ہے اور جتنی بڑھتی جاویں اس کو اچھی نظر
سے دیکھا جاتا ہے پھر نہ معلوم مدرسوں کی تعداد بڑھنے پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے

غور سے دیکھئے تو اس پر اعتراض کا منشاء صرف یہ ہے کہ دین کی کچھ وقعت ان کے ذہن میں نہیں ہے اس واسطے اس کے ذرائع کی بھی حاجت نہیں سمجھتے در اصل ایک مدرسہ بھی ان کے دل میں کھٹکتا ہے مگر چونکہ نام اسلامی مدرسہ کا لگا ہوا ہے اس واسطے اس سے کچھ تعرض نہیں کر سکتے کیونکہ لوگ مطعون کریں گے پس یہ خوف ان کو اس مدرسہ کی مخالفت سے روکے ہوئے ہے ورنہ ان کے دل کی پوچھو تو اس ایک مدرسہ کو بھی نہ رہنے دیتے تعدد تو کہاں گوارا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ذرا سی کوتاہی مدرسہ میں ہو جاتی ہے تو یہ لوگ مخالفوں کی طرح طعن کرنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ خاموشی کی جو اصل وجہ تھی یعنی اعتراض کرنے سے لوگوں کا مطعون کرنا وہ اب نہیں رہی کیونکہ اس کوتاہی کی وجہ سے سب لوگ مدرسہ کے موافق نہیں رہے کچھ ان کے بھی ہم خیال پیدا ہو گئے ہیں اب ان کا اصلی خیال ظاہر ہونے کا موقعہ مل جاتا ہے وہ ظاہر ہوتا ہے اور مدرسہ والوں کے گلے پر چھری پھیرنے کو تیار ہوتے ہیں اور اگر مدرسہ بیخ و بنیاد سے بھی جاتا رہے تو ان کے کان پر جوں نہ رینگے اگر یہ صرف تعدد کے مخالف ہوتے تو اس ایک مدرسہ سے تو ہمدردی رکھتے اور ایسے وقت میں اس کی اصلاح کی کوشش کرتے نہ کہ اس کے بھی اٹھا دینے کی غرض تعدد کی مخالفت جس طرح آجکل ہو رہی ہے وہ تو بیجا ہے اور اس کا منشاء دین سے لاپروائی ہے جو مسلمان کے لئے کسی طرح زیبا نہیں حیرت کی بات ہے کہ ہر مذہب والے کو یہ خیال ہے کہ مذہبی ترقی ہو اور اس کے ذرائع سوچتے ہیں اور اس کو منجملہ ضروریات کے سمجھتے ہیں لیکن مسلمانوں کا خیال یہ ہوتا جاتا ہے کہ مذہب کی کوئی ضرورت نہیں اور اسی وجہ سے اس کے ذرائع کو بیکار سمجھتے ہیں اور وہ ذرائع جتنے زیادہ ہوں ان کے طبیعت کے زیادہ خلاف ہوتے ہیں یہ تو غلطی ہے اور اس بنا پر تعدد مدارس کی مخالفت در حقیقت دین کی مخالفت ہے لیکن اس تعدد مدارس کے متعلق ایک شکایت واقعی بھی ہے وہ یہ کہ تکثیر مدارس فی نفسہ تو واقعی مفید اور باعث ترقی دین ہے لیکن آج کل یہ تکثیر ظاہراً تو تکسیر ہے اور در حقیقت تکثیر بالثاء بمعنی تعدد نہیں بلکہ تکسیر بالسین بمعنی شکستن ہے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

ایک کی جگہ دو مدرسہ اس واسطے نہیں ہوتے کہ مسلمانوں کی علمی قوت دوچند ہو جاوے اس مدرسہ کو اس سے قوت پہنچے اور اس کو اس سے بلکہ اس واسطے ہوتے ہیں کہ ایک قوت دو جگہ بٹ جاوے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو قوت دیتی ہے نہ اس کو اس کی مثال یہ ہوئی کہ ایک روٹی ایک آدمی کے پاس ہے بجائے اس کے کہ وہ اس کو اکیلا کھاوے دوسرا اور شریک ہو گیا تو ظاہر ہے کہ نہ اس کا پیٹ بھرے گا نہ اُس کا تو یہ تعدد اشخاص روٹی کے لئے تکسیر ہوئی یعنی دو حصے کر دینا تکثیر بمعنی کثیر کردن جب ہوئی کہ وہ دوسرا آدمی اس روٹی میں حصہ دار نہ بنتا بلکہ اور روٹی لا کر شامل کرتا تو ایک سے دو زیادہ روٹیاں ہو جائیں یہی حالت آجکل کے تعدد مدارس کی ہے کہ اس واسطے تعدد نہیں ہوتا کہ دوسرے کو علمی اور دینی قوت پہنچا دیں بلکہ اس واسطے ہوتا ہے کہ اس کی علمی اور دینی قوت آدھی بانٹ لیں بلکہ یہ بھی نہیں ہر ایک کی یہ نیت ہوتی ہے کہ اس کی سب قوت چھین لے تو اب مثال یہ ہوئی کہ ایک روٹی والے کے پاس دوسرا آدمی آیا اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ وہ کل روٹی اس سے چھین لے اور خود کھالے اور اس کو نہ دے بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ یہ مثال بھی صحیح نہیں ٹھیک مثال یہ ہے کہ وہ دوسرا صرف یہ چاہتا ہے کہ اس سے وہ روٹی چھن جاوے چاہے اس کو بھی نہ ملے جس کو حسد کہتے ہیں اسی طرح ہر مدرسہ والا یہ چاہتا ہے کہ دوسرا مدرسہ نہ رہے چاہے یہ مدرسہ بھی رہے یا نہ رہے اور افسوس اس میں کون مبتلا ہیں وہ لوگ جو مقتدا اور علما کہلاتے ہیں اور جن کو لوگ دین کا حامل سمجھتے ہیں اور ان کے وجود سے دین کا وجود سمجھا جاتا ہے جبہ قبہ سے تو ان کو جیسا چاہیے سمجھ لیجئے ورنہ درحقیقت ان کی حالت دنیا داروں سے بھی بدتر ہے اور یہ ان لوگوں سے بھی زیادہ خطرناک امراض میں مبتلا ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کہ وہ ظاہراً صرف تعدد مدارس کے خلاف ہیں اور درحقیقت ایک مدرسہ کی بھی ان کے نزدیک

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔

ضرورت نہیں کیوں کہ ان کے نزدیک دین ہی کی ضرورت نہیں ان علماء کی حالت ان سے بدتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اس بات میں تو برابر ہیں کہ نہ وہ مدرسہ کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں نہ تعدد کو (اور اس کی وجہ سوائے قلت مبالات کے کچھ نہیں) گو دونوں زبان سے مدرسہ کی حمایت ہی کا دم بھرتے ہیں لیکن حقیقت وہی ہے جو میں نے عرض کی ایک فریق لوگوں کے مطعون کرنے سے ڈر رہا ہے اس واسطے حمایت کا دم بھرتا ہے اور ایک اپنے پیٹ کی وجہ سے کہ مدرسہ نہ رہے گا تو ہمارا گذارہ کیسے ہوگا غرض اس میں تو دونوں برابر ہیں کہ ضرورت مدرسہ کی جس حیثیت سے ہونی چاہیئے ایک کے ذہن میں بھی نہیں اور ان علما صاحبان میں اتنی بات زیادہ ہے کہ قلت مبالات بالدین کے ساتھ یہاں حسد بھی شریک ہے جو بدترین امراض ہے اور اس میں ایک شدت اور یہ بڑھ گئی کہ اہل دنیا کا تو جو فعل بھی ہوتا ہے دنیا کے رنگ میں ہوتا ہے اس سے کوئی دھوکا نہیں کھاتا اور ان حضرات کا ہر فعل دین کے رنگ میں ہوتا ہے گویا معصیت طاعت کی شکل میں ہوتی ہے اس سے بہت دھوکا ہوتا ہے۔ اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہ مقتدا صاحبان اہل دنیا سے بھی خراب حالت میں ہیں اور ان کی کوشش تعدد مدارس کے لئے علم کو بڑھانے اور قوت پہنچانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس موجودہ قوت کو مٹانے کے لئے ہے" تو یہ مدارس کی تکثیر بالشار نہ ہوئی بلکہ تکسیر بالسین ہوئی اور ان پر جو تعدد کی مثال یہ دی گئی تھی کہ ریل میں دو انجن لگا دیئے گئے تو قوت اور رفتار بڑھ جاوے گی۔ یہاں یہ مثال جب صحیح ہوتی جبکہ دونوں میں تزاحم نہ ہوتا اور جب تزاحم ہو تو مثال یہ ہو گی کہ انجن جوڑے گئے لیکن رفتار دونوں کی ایک طرف کو نہیں رکھی گئی۔ ایک کو مغرب کی طرف چلایا گیا اور ایک کو مشرق کی طرف۔ تو ظاہر ہے کہ ریل کو اس سے کوئی فائدہ بھی نہ پہونچے گا کیونکہ ان دونوں انجنوں میں سے ایک بھی نہ چل سکے گا جب تک ایک کو اس میں سے

الگ نہ کرلیا جاوے ورنہ یا تو ٹرین ایک ہی جگہ کھڑی رہے گی یا دونوں کے زور سے بیچ سے ٹوٹ جاوے گی کچھ اس کے ساتھ ہو جاوے گی اور کچھ اس کے ساتھ یہی حالت مدرسوں کے اس تعدد کے وقت ہوتی ہے کہ دونوں میں تزاحم ہوتا ہے جس دین کی قوت کے لئے مدارس کی ضرورت تھی اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں بلکہ اس کا تزاحم ایسا ہوتا ہے جیسے دو انجنوں کا آمنے سامنے سے مقابلہ ہو۔ جس کو ریل لڑنا کہتے ہیں جس کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے خدا نہ دکھاوے۔ وہی حالت ان حضرات کے تزاحم سے دین کی ہورہی ہے کہ اس کے واسطے یہی کہنا پڑتا ہے کہ خدا نہ دکھاوے مگر افسوس ہر جگہ یہ تزاحم واقع ہورہا ہے اور دیکھتے دیکھتے عادت ہوگئی اس واسطے اس سے کچھ زیادہ انقباض بھی نہیں ہوتا غرض آجکل تعدد مدارس کی حقیقت اور اس کا کچا چٹھا یہ ہے تو یہ بات موجب شکایت ہے یا نہیں اور اس حالت میں تو تعدد مدارس سے جو طبیعتوں کو انقباض ہوتا ہے وہ مطلقاً بے اصل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کچھ واقعیت ضرور ہے گو نئے تعلیم یا فتوں کو جو انقباض ہوتا ہے وہ تو بے اصل ہی ہے کیونکہ اس کا منشا دین سے علیحدگی ہے اور کاش تزاحم کے وقت دونوں میں سے ایک فریق تواضع اختیار کرلیتا اور کہتا کہ لے بھائی تو مجھے ہی پیچھے ہٹالے اور ہم ہی دب گئے تو بات ختم ہو جاتی اور تزاحم جاتا رہتا دب جانے پر ایک حکایت یاد آئی۔

ایک شیخ صاحب ڈاڑھی چڑھائے ہوئے چلے جارہے تھے راستہ میں ایک خاں صاحب ملے ان کو شیخ صاحب کا ڈاڑھی چڑھانا سخت ناگوار ہوا اور کہا کیوں بے تو ہماری برابری کرنے لگا شیخ جی بڑے چالاک تھے کہا برابری کیوں نہ کریں ہم تجھ سے کس بات میں کم ہیں خانصاحب کو اور غصہ آگیا اور کہا اچھا آلڑلے شیخ جی نے کہا یوں نہیں لڑتے لڑائی لڑنی ہے تو اچھی طرح لڑیں گے پھر اپنے پیچھے جورو بچوں کو بیوہ اور یتیم چھوڑ گئے تو کس کام کی بات ہوگی لڑنا

ہے تو پہلے اپنے اپنے کنبہ کو ختم کرلو پھر دل کھول کر لڑو خاں صاحب کو غصہ بے حد چڑھا ہوا تھا زور میں آکر اس کے لئے بھی تیار ہو گئے اور گھر جا کر تمام کنبہ کو صاف کر دیا اور لوٹ کر آئے کہ اب لڑلے۔ شیخ جی نے کیا کیا کہ اپنی ڈاڑھی اتار لی اور کہا کہ لو بھائی تم ہی جیتے میں ہارا، میں تمھاری برابری نہیں کرتا، تم بڑے اور میں چھوٹا تو اضع ایسی چیز ہے جس کی بدولت شیخ جی اور شیخ جی کا کنبہ صحیح و سالم رہا اور تکبر ایسی چیز ہے جس کی بدولت خانصاحب کا سارا کنبہ غارت ہو گیا اور اگر شیخ جی بھی اکڑ بیٹھے ہی جاتے اس کا مصداق ہوتا ؂

دگر از ہر دو جانب جاہلانند
اگر زنجیر باشد بگسلانند

(اگر ہر دو جانب جاہل لوگ ہوتے ہیں تو اگر لوہے کی زنجیر بھی ہو تو توڑ دیں گے یعنی محبت اور تعلق مضبوط سے مضبوط ختم کر دیتے ہیں۔)

اور نتیجہ وہی ہوتا کہ شیخ جی کا سارا کنبہ بھی صاف ہو جاتا بلکہ شیخ جی بھی نہ رہتے اور خانصاحب بھی نہ رہتے اگر مرتے بھی نہیں تو زخمی تو ہو ہی جاتے۔ ایک تواضع نے ایک کا کنبہ بچایا اور دونوں کی جان بچائی۔ دو ریلیں جب لڑتی ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ دونوں انجنوں میں سے کوئی پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا اگر ایک انجن خود یا بواسطہ ڈرائیور کے یہ کہتا کہ میں مزاحمت نہیں کرتا اور آگے کو نہیں چلتا بلکہ واپس ہوتا ہوں میری چال پیچھے ہی کو سہی تو وہ تمام آفتیں نہ آتیں جو تزاحم سے آتی ہیں اور مالی اور جانی نقصان سب سے حفاظت رہتی۔ ہاں ایک بات یہ ہوتی کہ ذرا دیر کو ہیٹی ہوتی اور تابعیت کا اطلاق آتا سو یہ کوئی بات نہیں تابعیت تو کوئی عیب نہیں کیونکہ متبوعیت کو کوئی کہاں تک نبھاہے گا کسی نہ کسی بات میں تو ہر شخص کو کسی نہ کسی کا تابع بننا ہی پڑتا ہے پھر اس موقع پر بھی تابعیت اختیار کر لی جاوے تو کیا عیب لگ جاوے گا تابعیت اور چھوٹا پن تو بڑی اچھی چیز ہے اس سے اپنا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے تم متبوع بن کر بھی دیکھو اور تابع بن کر

بھی دیکھو اندازہ ہو جاوے گا کہ کس میں راحت ہے دیکھو ایک عالم سے کوئی مسئلہ پوچھا جاوے اور وہ اس میں غور وخوض کرے مگر اطمینان نہ ہو تو اگر وہ کہدے کہ مجھے شرح صدر نہیں ہوا دوسرے سے پوچھ لو تو کتنا بوجھ ہلکا ہو جاوے گا مگر آجکل اس کو کسر شان سمجھا جاتا ہے اور علم کی شان یہی سمجھی جاتی ہے کہ مسئلہ کا جواب ضرور دیا جاوے خواہ وہ غلط ہی ہو۔ بس اس شان نے تباہ کیا اسی سے علماء میں اتفاق نہیں ہوتا، کوئی عالم دوسرے کا تابع بننا نہیں چاہتا حالانکہ اتفاق اور تابعیت سے مونت کم ہو جاتی اور بوجھ بٹ جاتا ہے مگر ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ بے علمی کا اقرار کرنے سے کرکری ہو گی اور اس کو گوارا نہیں کرتا مگر اس سے کرکری میں پڑ جاتے ہیں۔ بعض دفعہ تو وہ کرکری یہیں دنیا ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے مثلاً دوسرے سے رائے نہ لینے کی وجہ سے جواب میں غلطی رہ گئی اور وہ غلطی پکڑ لی گئی بعض دفعہ وہ غلطی ایسی فاش ہوتی ہے کہ آدمی کو بہت خفیف ہونا پڑتا ہے اور اگر یہاں ظاہر نہ بھی ہوئی تو ایک وقت وہ آنے والا ہے جس میں وہ بہت رنگ لادے گی وہ وقت آنکھ بند ہونے کے بعد کا ہے وہ کرکری ایسی سخت ہو گی کہ اس کا کچھ علاج نہ ہو سکے گا مگر ہم لوگ ایسے بے حس ہو گئے ہیں کہ کرکری سے بھاگتے ہیں اور کرکری میں مزا آتا ہے اور بے دھڑک مسئلہ کا جواب دیدیتے ہیں اور اس سے جو کسی قدر شان بڑھتی ہے اُس میں لطف آتا ہے یہ ایسا ہے جیسے تمباکو کھانے والے کہتے ہیں کہ تمباکو میں مزا آتا ہے ذرا ان سے پوچھو تو کہ سسرا تمباکو بھی کوئی مزے کی چیز ہے مگر چونکہ تم عادی ہو گئے ہو اس واسطے حس خراب ہو گیا ہے۔ ذرا ایک نئے آدمی کو کھلا کر دیکھو کیسا چکر آتا ہے اور کیسی ہچکیاں آنے لگتی ہیں ہلکے سے ہلکا تمباکو بھی کھلا دو تو وہ برداشت نہیں کر سکتا اور کھانے والوں کی یہ حالت ہے کہ جتنا کڑوا اور تیز ہو اتنا ہی ان کو مزا آتا ہے اور اس کو اچھا سمجھتے ہیں۔

اس پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص نے دوکان سے تمباکو خریدا اور اس کو پیا تو

ہلکا ثابت ہوا پھر آیا کہ اس سے کڑوا دو دوکان دار نے اور تیز قسم کا تمباکو دے دیا مگر خریدار کو وہ بھی ہلکا معلوم ہوا کہا اس سے بھی کڑوا دو تو دوکان دار کہتا ہے بس اس سے کڑوا اللہ کا نام ۔ لفظ تو بیہودہ ہے مگر معنے صحیح ہیں وہ یہ کہ کڑوا ہونا تمباکو کے لئے کمال سمجھا جاتا ہے تو اس لفظ کے معنے یہ ہوئے کہ تمباکو کو تو اتنا ہی کمال حاصل ہے اس سے زیادہ کمال اللہ کے نام کو ہے اس معنے کے اعتبار سے یہ شخص کافر نہیں ہوا کبھی فتویٰ لگا دیا جاوے یہ ایسا تلخ ہوا جیسے عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

آں تلخ وش کہ صوفی ام الخبائثش خواند
اشہیٰ لنا واحلیٰ من قبلۃ العذارے

غرض اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کا نام کڑوا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس سے زیادہ لذیذ اللہ کا نام ہے اور کڑوے سے اس واسطے تعبیر کیا کہ تمباکو میں کڑوا ہونا ہی لذت ہے یہ سیدھی سی توجیہ ہے ۔ آدمی کو چاہیئے کہ حقیقت پر نظر کرے نہ کہ عنوان و صورت پر اس مثال سے غرض یہ ہے کہ عادت ہو جانے سے حس ایسا بدل جاتا ہے کہ کڑوا پن بھی کمال سمجھا جاتا ہے حالانکہ کڑوا ہونا بھی کوئی کمال ہے بس عادت نے حس میں تبدیلی کر دی ہے کہ کڑوے ہی میں لذت آتی ہے جیسے ہماری طرف ایک شخص مقدمہ باز تھے وہ مقدمہ بازی کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ بلا کچہری جائے ان کو چین ہی نہ آتا تھا اور گھر کی روٹی اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی خواہ مخواہ سرائے میں جا کر پڑتے اور ان کی روکھی پھیکی روٹی کھاتے اور اس میں خوش رہتے گھر پر دودھ گھی سے بھی منہ سیدھا نہ ہوتا تو ان کو اگر مقدمہ بازی میں لطف آتا تھا تو کیا اس سے کوئی عقلمند یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مقدمہ بازی لذت اور مزے کی چیز ہے نہیں بلکہ یہی کہا جاوے گا کہ ان کا حس خراب ہو گیا ہے اور عادت نے حقیقت پر پردہ ڈالدیا ہے جیسے تمباکو حقیقت میں تکلیف کی چیز تھی مگر عادت سے اس میں مزہ آنے لگا اسی عادت سے مقدمہ بازی جیسی

بری چیز میں لطف آنے لگا حالانکہ کس قدر بکھیڑے کی چیز ہے توڑ پھوڑ پارٹیاں بنانا جھوٹے گواہ بہم پہونچانا وکلاء کی خوشامد کرنا اور دن میں مارے مارے پھرنا ایک مجمع کو جمع کرنا اور ان کو ساتھ لئے پھرنا عملہ والوں کو رشوتیں دینا اور ہاتھ جوڑنا اللہ توبہ لوگوں کا اس سے جی نہیں گھبراتا مگر کیا کیجئے عادت سے حقیقت پر پردہ پڑ گیا ہے اور ایسی بدمزہ چیز لذیذ بن گئی ہے۔ ان بکھیڑوں کے تو تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ بس اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ عادت سے سہارا ہوگئی ہے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ بعض تکلف کی چیزیں بھی عادت ہوجانے سے لذیذ معلوم ہونے لگتی ہیں اسی قبیل سے وہ تکلیفیں بھی ہیں جو مدارس کے تزاحم سے پیش آتی ہیں۔ بعض دفعہ اس کی نوبت کہاں تک پہنچتی ہے کہ دونوں مدرسوں کے مہتمموں کے خاندانوں میں عداوت ہوجاتی ہے۔ اور اس پر بھی بس نہیں ہوتا کیونکہ مدرسہ دینی کام ہے اس سے تمام مسلمانوں کو تعلق ہوتا ہے اس لئے ان کے تزاحم کا اثر صرف دو خاندانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ عام مسلمانوں پر پڑتا ہے اور مدرسوں کے تزاحم کے وقت عام مسلمانوں میں فرقہ بندی ہوجاتی ہے اور بہت سے فریق بن جاتے ہیں جن میں عداوتیں پیدا ہوجاتی ہیں پھر یہ عداوتیں بچے دیتی ہیں اور جس بات پر ان کی بنا ہوئی اس پر بھی محدود نہیں رہتیں بلکہ ذاتی عداوتیں طرح طرح کی پیدا ہوجاتی ہیں آپ جانتے ہیں کہ عداوت اتفاق کی ضد ہے اور سب جانتے ہیں کہ اتفاق تمام راحتوں کی جڑ ہے تو اس کی ضد تمام تکالیف کی جڑ ہوگی تو یہ تزاحم ایسی بری چیز ہوئی کہ تمام تکالیف کی جڑ ہے مگر آجکل ایسی بے حسی چھائی ہوئی ہے کہ ہر جگہ مدارس میں یہ تزاحم موجود ہے اور لوگوں کو اس سے ذرا بھی گرانی نہیں ہوتی یہ بے حسی داخل عادت ہوگئی ہے گویا مدرسہ کے لئے یہ بات مان لی گئی کہ تزاحم بھی لازمی چیز ہے جب مدرسہ کا کام شروع کیا تو اس کو بھی شروع کر دیا اور سمجھتے ہیں کہ جہاں مدرسہ کے اور کاموں میں محنت و مشقت ہے اسی جنس سے یہ بھی ہے۔

اور نیز یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جیسے مدرسہ کے اور کاموں

میں اجر ہے ایسے ہی اس توڑ پھوڑ میں بھی اجر ہے بلکہ اور کاموں سے زیادہ اجر ہے کیونکہ اس میں مجاہدہ زیادہ ہے اس غلطی میں اچھے اچھے پڑھے لکھے مبتلا ہیں اور مقدمہ بازیوں اور پالیسیوں کو مدرسہ کا کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب بنار فاسد علی الفاسد ہے یہ مستحسن جب ہوتا جب شریعت نے اس کا حکم کیا ہوتا یا شریعت کے کسی حکم پر اس کی بنار ہوتی اس کی بنار تو بہت گندی اور شریعت کے خلاف امر پر ہے اور امر وہی ہے جس کو میں نے اوپر عرض کیا کہ تعدد مدارس دوسرے مدرسہ کو توڑنے اور دین کی موجودہ قوت مٹانے کے لئے ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ اس کی بنار اکثر حسد پر ہوتی ہے۔ پھر جس چیز کی بنا حسد پر ہو اس سے شریعت کو کیا واسطہ شریعت میں تو حسد منجملہ بدترین اعمال کے ہے تو جس کام کی بنار اس پر ہو اس پر اجر کی توقع رکھنا نہ معلوم کہاں تک صحیح ہے تعدد فی نفسہ تو برا نہ تھا کیونکہ مدرسہ دارالعلم ہے اور دین کے لئے علم کی ضرورت ہے تو جتنے دارالعلم زیادہ ہوں گے اتنے ہی دین کو قوت ہوگی اور اس کی نظیر بھی موجود ہے۔ دیکھئے ایک شہر میں بلکہ ایک قصبہ میں مسجدیں متعدد ہوتی ہیں اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ کسی کا دل نہیں کھٹکتا پھر مدارس نے کیا قصور کیا ہے مسجد دارالعمل ہے اور مدارس دارالعلم تو جیسے دارالعمل کا تعدد دین کے لئے مضر نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے آرام دہ ہے اور ترقی دین کی علامت ہے ایسے ہی دارالعلم کا تعدد بھی دین کے لئے مفید اور علامت ترقی ہونا چاہیئے لیکن عجیب بات ہے کہ مساجد کے تعدد سے کوئی نہیں کھٹکتا اور مدارس کے تعدد سے کھٹکتے ہیں۔ یہ بات دراصل بے بنیاد بھی نہیں ہے۔ اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ عادۃً تعدد مساجد کی بنا ان باتوں پر نہیں ہوتی جن پر تعدد مدارس کی بنا ہوتی ہے یعنی باہمی مخالفت اور جاہ اور بڑائی اس واسطے مساجد سے کوئی نہیں کھٹکتا اور مدارس سے کھٹکتے ہیں اور جہاں کہیں مساجد میں بھی یہ خرافات شامل ہوجاتی ہیں اور تعدد کی بنا جاہ اور بڑائی پر ہوجاتی ہے وہاں مساجد کی بھی یہی گت ہوجاتی ہے کہ ہر شخص ان کو بری نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ چنانچہ کانپور میں دو مسجدیں برابر ایسی ہی

موجود ہیں پہلے ایک مسجد تھی پھر ایک شخص نے صرف اپنی بڑائی دکھانے کے لئے دوسری بنائی اب دونوں میں مخالفت کی یہ نوبت آئی کہ ہر ایک میں کوشش کی جاتی ہے کہ یہاں نمازی زیادہ ہوں اس کے لئے تعارف سے بھی کام لیا جاتا ہے اور اپنے جان پہچان لوگوں کو ہر مسجد والا اپنی مسجد میں کھینچ کر لے جاتا ہے جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو مٹھائی بانٹی جاتی ہے اور عمدہ عمدہ مٹھائیاں بنوائی جاتی ہیں یہ مسجد گو احکام مسجد میں ہو مگر باعتبار ثواب کے مسجد نہیں ہے کیونکہ ثواب مسجد خدا کے لئے بنانے سے ہوتا ہے اور جب اس میں دوسری حیثیت لگ گئی وہ یہ کہ خدا کے حکم کے خلاف بنائی گئی تو اب اس میں ثواب کیا دیکھو مسجد ضرار کی نسبت قرآن شریف میں موجود ہے کہ وہ مسجد مع اہل مسجد کے دوزخ میں گرے گی دیکھئے جہاں تعدد کی بنا فاسد ہو وہاں مسجد جیسی متبرک چیز میں سے بھی برکت جاتی رہتی ہے اور اس کا تعدد بھی برا ہو جاتا ہے وہ بنا فاسد کیا ہے مسجد ضرار میں تو کفر کی تائید اور اسلام کا ضرر تھا اور یہ بنا متیقن تھی اس لئے وہ احکام میں بھی مسجد نہ ہوئی اور یہاں یہ تو نہیں بلکہ اس سے ہلکی چیز ہے یعنی اپنا نام مقصود ہونا اس کا منشا حب جاہ اور کبر ہے اس لئے وہ احکام میں مسجد ضرار نہیں لیکن ثواب نہ ہونے میں اسی کے مشابہ ہے لیکن چونکہ عام طور سے مساجد میں یہ بنا نہیں ہوتی اس لئے اس سے کوئی نہیں کھٹکتا اور تعدد مدارس کی بنا اس پر ہوتی ہے اس وجہ سے اس سے سب کھٹکتے ہیں پس راز اس کا یہ ہوا کہ کہیں تعدد سے مقصود ثواب ہوتا ہے تو وہاں تزاحم نہیں ہوتا اور نتیجہ اس کا اچھا نکلتا ہے اور کہیں مقصود ثواب نہیں ہوتا بلکہ سباب ہوتا ہے پھر وہاں ثواب کہاں سباب کے معنے گالیاں بکنا ہے گالیاں بکنے میں ثواب کا کیا کام اس صورت میں نتیجہ کبھی اچھا نکل نہیں سکتا اور تزاحم ضرور ہوتا ہے اور یہ اثر ہر جگہ لازم ہے خواہ دار العمل یعنی مسجد میں ہو تو اور دار العلم یعنی مدرسہ میں ہو تو جہاں تعدد ہو مسجد کا ہو یا مدرسہ کا اگر ثواب کے لئے ہو یعنی اس میں خلوص ہو اور محض دین مقصود ہو تو وہاں تزاحم نہ ہوگا اور وہی تعدد مسجد کا ہو یا مدرسہ کا اگر ثواب کے لئے

نہیں ہے یعنی اس میں خلوص نہیں ہے تو تزاحم ضرور ہوگا اس وقت تعدد سے زیادہ تر مقصود بجائے ثواب دین کی تائید کے اپنا بڑا بننا ہوتا ہے اسی کی شکایت ہے کہ تعدد مدارس فی نفسہ تو برا نہ تھا مگر آجکل اکثر جگہ اس کی بنا رحب مال یا جاہ پر ہوتی ہے اس واسطے قابل اعتراض ہے دیکھ لیجئے اس سے بہت کم مدرسہ خالی ہوں گے جہاں دو مدرسہ ہوئے بس وہاں ثواب اور خلوص سے تو بحث نہیں رہتی بس یہ نیت ہوتی ہے کہ کام کی نسبت ہماری طرف ہو کیوں صاحب اگر دین مقصود ہے تو اس خصوصیت کو کیا دخل ہے یہ تو کھلا ہوا حب جاہ ہے کیونکہ دین مقصود ہوتا تو نظر اس پر رہتی کہ دین کا کام ہو جاوے خواہ ہمارے ہاتھ سے ہو یا دوسرے کے ہاتھ سے اور جب اپنی خصوصیت مدنظر ہوئی تو مقصود یہ ہوا کہ ہمارا نام ہو اسی کا نام حُبِ جاہ ہے۔

کانپور کا قصہ ہے کہ ایک طالب علم ایک مدرسہ میں پڑھتا تھا جب وہ قریب فراغ پہنچا تو دوسرے مدرسہ میں جا نام لکھا یا دستار بندی کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اب صبح کو جلسہ ہے شام کو پہلے مدرسہ والوں نے اس کو بلایا اور کہا محنت تو کی ہم نے اس کے کیا معنی کہ دستار بندی دوسرے مدرسہ میں ہو لہٰذا تم یہیں آجاؤ اس پر ایک قصہ در یاد آیا۔ دو بھائی تھے ان کے یہاں کچھ مہمان آئے تو ایک بھائی بولا کہ آج دوپہر کی دعوت میرے یہاں ہے اور دوسرے سے کہا شام کی دعوت تم کر دینا چنانچہ اس پر طرفین کی تراضی ہوگئی جس کے یہاں صبح کی دعوت تھی اس نے کیا کیا کہ اُن سے کہا کہ چلو جنگل ہو آویں ذرا ہوا خوری اور تفریح ہو گی جنگل میں ایک گولر کے درخت کے نیچے جا کھڑا کیا اور کہا گولر خوب پک رہے ہیں دل چاہتا ہے کہ گولر کھاویں چنانچہ کسی کو درخت پر چڑھا کر خوب گولر جھڑوائے اور خود بھی کھائے ان کو بھی کھلائے مقصود ان کو ہی کھلانا تھا تاکہ روٹی کم کھاویں جب دوسرے بھائی کو خبر ہوئی تو اُس نے کہا اس وقت کی دعوت تو میرے یہاں ہے تو شام کو کھلا دینا۔ اس نے کہا واہ یہ خوب رہی گولر ایا تو ہم نے اور کھانا تو کھلائے گا ایسا نہیں ہو سکتا سو حضرت یہی قصہ یہاں ہوا کہ ایک مدرسہ والوں نے اس طالب علم سے کہا کہ تجھے گولر ایا تو ہم نے یعنی محنت کی اور تیار کیا اور

وقت پر دوسرے آگودے اس مدرسہ والوں نے اس طالب علم کو کچھ روپے دینے کو بھی کہے اور اس پر پکا کرلیا کہ دستار بندی دوسرے مدرسہ میں نہ ہو بلکہ یہیں ہو اس کی خبر دوسرے مدرسہ والوں کو بھی لگ گئی انھوں نے کمیٹی کی کہ کیا کرنا چاہیے بعض چالاکوں نے ایک ترکیب نکالی اور اس طالب علم کو کسی حیلہ سے بلا کر ایک کوٹھری میں بند کردیا نہ کہتا نہ سنتا کسی کو کانوں کان خبر نہیں بس کوٹھری میں بند کرکے تالا ڈالدیا اس سے مقصود اُن کو دق کرنا نہیں تھا بلکہ صرف محبوس کرلینا اور اپنے قبضہ میں رکھنا منظور تھا اسی واسطے کوٹھری میں اس کے کھانے پینے وغیرہ کا کل سامان فراغت کے ساتھ جمع کردیا چند قسم کے پھل رکھدیئے پانی پینے کے لئے گھڑا لوٹا گلاس سب کچھ سامان کردیا معلوم نہیں نماز کیسے پڑھی ہوگی اور بیچارہ کیسے بھرا ہوگا۔ اسی طرح ان کو قید رکھا پہلے مدرسہ والے ان کو تلاش کرکے مایوس ہوکر بیٹھ رہے، یہ سمجھے ہوں گے کہ طالب علم لاأبالی ہوتے ہی ہیں کہیں کو چلدیئے ہوں گے جب عین جلسہ کا وقت ہوا تو دوسرے مدرسہ والوں نے ان کو کوٹھری میں سے نکال کر بہت حفاظت کے ساتھ جلسہ میں پہنچایا اور دستار بندی کردی جب کام نکل گیا تو چھوڑ دیا کہ اب جہاں چاہے تشریف لیجایئے وہاں تو روپے بھی ملتے تھے یہاں کچھ بھی نہ ملا مفت ہی میں کام نکالا۔ یہ نوبت ہے تزاحم کی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کی بنا ثواب پر ہے اس کی بنا صرف جاہ پر ہے کہ یوں نام ہوگا کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے طلبہ کی دستار بندی ہوئی اگر دین کی ترقی منظور ہوتی تو اس بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی بس ایک عالم تیار ہوا تھا جس سے دین کی امداد ہونے کی توقع ہے اس مدرسہ سے ہوا تو کیا اور اُس مدرسہ سے ہوا تو کیا مگر یہ تو منظور ہی نہیں منظور تو یہ ہے کہ ہمارا نام ہو اور اس کی وجہ وہی بڑائی ہے جس کو جاہ کہتے ہیں کہ یہ کہا جاوے کہ ہمارے مدرسہ سے اتنے آدمی پڑھ کر نکلے جس طرح ہو تعداد بڑھائی جاوے اس موقع پر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ایک بات یاد آئی وہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ حضرات مخلص تھے اور ہم مفلس ہیں یعنی خلوص سے خالی ہاتھ ہیں مفلس کے لفظ پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک شخص سے میں نے کہا آپ بڑے مخلص ہیں انھوں نے

شاید کبھی مخلص کا لفظ سنا نہ تھا وہ مفلس سمجھے تو کہنے لگے جی اللہ کا فضل ہے کھانے کو سب کچھ ہے) مولانا فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی راہ نجات بھی پڑھتا ہے وہ بھی ہمارا معین ہے، ہمارا کام بٹاتا ہے ہم کو بھی اس کی اعانت کرنی چاہیئے اور ملا جُلا رہنا چاہیئے یہ ہے خلوص اور یہ ہے ثواب کے واسطے دین کی تعلیم دینا یہ انبیاء علیہم السلام کا سا باہمی علاقہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں انبیاء سب بھائی بھائی ہیں یہ ہے طریقہ سنت اور طریقہ حق اور یہی مشائخ اور علما اور فقراء کو چاہیئے کہ باہم ایسا علاقہ رکھیں مگر آجکل اگر کسی دوسرے کو بھائی کہتے بھی ہیں تو اس کے معنے وہ ہوتے ہیں جو ہندو بھائی اور عیسائی بھائی کے معنے ہیں کہا جاتا ہے ہمارے ہندو بھائی یوں کہتے ہیں اور عیسائی بھائی یوں کہتے ہیں یہ لفظ تہذیب کا ہے ورنہ مراد دشمن ہے تو مشائخ یا علماء اگر کسی اپنے ہمعصر کی نسبت بھائی یا برادر کا لفظ بولتے ہیں تو برادران وطن مراد ہوتے ہیں جس کا اطلاق ہندوؤں پر آتا ہے نہ برادران طریق پر۔ علماء کو بھی چاہیئے کہ اتحاد سے رہیں اور دین کا کام دین کی طرح کریں نہ آجکل کے مدرسوں کی طرح کہ دوسرے مدرسہ میں چاہے کیسی ہی اچھی تعلیم ہوتی ہو اور کیسے ہی قابل لوگ وہاں موجود ہوں مگر جب اسے یاد کریں گے تو برائی ہی سے یاد کریں گے کیا اس حالت پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ خلوص سے کام کیا جاتا ہے۔ خلوص تو کوسوں دور ہے بس مقصود دوسرا ہی ہے کہیں مقصود جاہ ہے یعنی انتساب کہ ہم اتنا کام کرتے ہیں اور کہیں مال یعنی چندہ رسی کی ضرورت سے مجمع بڑھایا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ طالب علم زیادہ ہوں کیونکہ جب طالب علم زیادہ ہوں گے تو لوگ سمجھیں گے کہ کام خوب ہو رہا ہے لہذا چندہ بھی زیادہ دیں گے یہ چندہ ایسا مطمح نظر ہوا ہے کہ اس پر بھی نظر نہیں رہی کہ چندہ مقصود بالذات ہے یا کسی چیز کا ذریعہ ہے اور اس کی وہ حالت ہوگئی جیسے بعض لوگ کھانے کے حریص ہوتے ہیں اور کھائے چلے جاتے ہیں خواہ اس پر وہ غرض جس کے لئے کھانا موضوع ہے مرتب نہ بھی ہو یعنی تغذیہ بدن ہو یا نہ ہو

چاہے دست ہی آتے رہیں مگر کھائے ضرور جاتے ہیں اور جب کوئی ٹوکے تو کہتے ہیں سب کام تو قوت پر موقوف ہیں اور قوت موقوف ہے کھانے پر تو سب کام موقوف ہیں کھانے پر تو کھانا ایسی ضروری چیز ہے اور تم اس سے منع کرتے ہو اس بیوقوف نے یہ نہیں سمجھا کہ اس دلیل میں ایک مقدمہ میں تفصیل کی کسر ہے وہ یہ کہ یہ تو صحیح ہے کہ سب کام موقوف ہیں قوت پر اور یہ بھی صحیح ہے کہ قوت موقوف ہے کھانے پر مگر یہ کہ کونسا کھانا مورث قوت ہے اس میں کلام ہے اگر یہ کہا جاوے کہ مطلق کھانا مورث قوت ہے تو اس پر ہم لانسلم کہیں گے کیونکہ کھانا وہ مورث قوت ہوتا ہے جو ہضم ہو اور ہضم جب ہی ہوگا جب پیٹ کے موافق کھایا جاوے اور جب پیٹ سے زیادہ کھایا جاوے گا تو وہ ہضم نہیں ہو سکتا اور جب ہضم نہ ہوگا تو اس سے طبیعت غذا نہیں حاصل کر سکتی بلکہ مجبور ہوگی اس کی دفع پر اور اس میں کوئی فعل نہ کرے گی بجز اس کے کہ دستوں کے راہ نکالدے تو اس کھانے کا نتیجہ تو محض یہ ہوا کہ ایک راہ سے پیٹ میں داخل کیا گیا اور دوسرے راہ سے نکالدیا گیا تو اس دلیل میں غلطی یہ تھی کہ ایک مقدمہ کا خیال نہیں رہا جس پر نتیجہ کی صحت موقوف تھی۔ خلاصہ غلطی کا یہ ہوا کہ ذریعہ کو اختیار کیا گیا مگر نہ بہ حیثیت منتج مقصود ہونے کے بلکہ ذریعہ کو مقصود بنا لیا گیا۔ یہی حالت آجکل کے چندہ کی ہے کہ لوگ ایسے اس کے پیچھے پڑے ہیں کہ فنا فی الچندہ ہو گئے۔ نہ جائز کو دیکھتے ہیں نہ ناجائز کو بس چندہ ہونا چاہیے اور جب کوئی ان سے کہے کہ چندہ میں یہ خرابیاں ہیں تو وہی جواب یہاں بھی ملتا ہے جو اس کھانے والے نے دیا تھا کہ سارے کام تو آجکل مالی قوت پر موقوف ہیں اور مالی قوت کا مدار چندہ پر ہے تو سارے کام موقوف ہوئے چندہ پر اور تم اس سے منع کرتے ہو۔

صاحبو! یہ دونوں مقدمے ٹھیک ہیں مگر ایک مقدمہ یہاں بھی قابل تفصیل ہے کہ یہ چندہ جس میں حدود کا خیال نہ رکھا جاوے یہ بھی مفضی الی القوت ہے یا نہیں۔ سو دعوی کیا جاتا ہے کہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ قوت سے مراد دینی قوت ہے

(اس کو خوب ذہن نشین کر لیجیے) اور جب چندہ اس طریق سے لیا گیا جو شرعاً ممنوع ہے تو دین تو پہلے ہی غارت ہو گیا پھر اس سے دینی قوت کی توقع رکھنا کیا معنے یہ تو ایسا ہوا جیسے کھانے کے شوق میں آکر ڈھیلے دپتھر کھالئے اور خوش ہیں کہ اس سے قوت آوے گی بلکہ ڈھیلے پتھر بھی نہیں سنکھیا کھالیا اور دل خوش کر لیا کہ اس سے قوت آوئے گی۔ اسں سے جیسی قوت آوے گی ابھی ذرا دیر میں معلوم ہو جائے گی۔ غلطی یہی ہے کہ چندہ کو مقصود بالذات سمجھا ذریعہ نہیں سمجھا اگر ذریعہ سمجھتے تو ظاہر ہے کہ چندہ ذریعہ کا ہے کا ہے دین کا تو دین اس کے واسطے غارت نہ کرتے اور دین کو غارت کر کے چندہ لیا تو یہ تو ایسا ہوا جیسے چھت کی مرمت کے لئے سیڑھی کی ضرورت تھی اور کوئی یوں کرے کہ چھت ہی میں سے دو کڑیاں نکال کر ان کی سیڑھی بنالے تو کیا آپ اس کو عقلمند کہیں گے ہرگز نہیں اس میں بھی تو غلطی یہ ہے کہ اس نے مقصود اور ذریعہ میں فرق نہیں کیا اور ذریعہ کے لئے یعنی سیڑھی کے لئے مقصود کو یعنی چھت ہی کو بگاڑ ڈالا اسی طرح یہ چندہ والے کرتے ہیں کہ چندہ جو کہ ذریعہ ہے دین کی درستی کا اس کے لئے دین ہی کو خراب کر لیتے ہیں اور سنئے آپ کو معلوم ہوگا کہ اصلاح ذات البین اور اتفاق بھی ایک فرد ہے دین کا اور اس کا مقابل تخریب دین ہے تو چندہ اگر موجب ہوا فساد اور نفاق اور عداوت کا تو وہ قوت دین کا ذریعہ کہاں بنا بلکہ تخریب دین کا ذریعہ بن گیا بس اس وقت تو یہی کہا جاوے گا کہ مقصود سے کچھ غرض نہیں ذریعہ ہی کو مقصود بنا لیا ہے جہاں دو مدرسے ہو جاتے ہیں وہاں کیا کیا بُرے اور شرمناک واقعات ہوتے ہیں اور سب کی اصل نکالی جاوے گی تو وہی چندہ اصل نکلے گی کہ ہر مدرسہ والا اس کی کمی سے ڈر رہا ہے اس واسطے دوسرے مدرسہ کی مخالفت کرتا ہے اور دونوں آپس میں لڑتے ہیں حتیٰ کہ ہاتھا پائی اور فوجداری کی نوبت آجاتی ہے پھر کیسا فضیحت ہونا پڑتا ہے عدالت تک نوبت آتی ہے اور موافق اور مخالف سب کے سامنے ہنسائی ہوتی ہے حالانکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر دو مدرسے ہو گئے تو حرج کیا ہو گیا کام ہلکا ہو گیا پہلے

سب کام ایک کو کرنا پڑتا تھا اب دو ہو گئے تو کام بٹ گیا۔ اس کو تو غنیمت سمجھنا چاہئے ہمارے یہاں تھانہ بھون میں مدرسہ ہے جس کو لوگ جانتے ہیں ایک دفعہ ایک نیا مدرسہ ہونے کو تھا میں نے کہلا بھیجا کہ چشم ماروشن دل ماشاد اچھا ہے ہمارا کام آپ اپنے سر لے لیں اگر آپ مدرسہ کرتے ہیں تو ہم مخالفت نہیں کریں گے جس سے آپ کے چندہ میں کچھ کمی ہو بلکہ ہم اپنا مدرسہ اٹھا دیں گے یہ چندہ بھی جو کچھ ہو آپ ہی لے لیجئے اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ نیا مدرسہ موقوف رہا (اگر دوسرے مدرسہ کو روکنا بھی ہو تو یہ ترکیب ہے نہ یہ کہ اس سے لڑا جاوے اور فوجداری کی جاوے) میں نے در اصل یہ ترکیب نہیں چلی تھی اور صرف کہلا بھیجنا نہ تھا بلکہ دل سے یہی ارادہ تھا حتیٰ کہ یہ کیا کہ اپنے یہاں کے مدرسین کو تین چار مہینہ کی تنخواہیں پیشگی دے کر میں باہر چلا گیا اور ان سے کہہ گیا کہ اگر وہ مدرسہ واقعی شروع ہو جاوے تو مزاحمت نہ کرنا بلکہ اس میں چلے جانا اور تنخواہیں اس واسطے دیدیں کہ شاید اس میں بالفعل چندہ کی کمی ہو اور اس لئے وہاں مدرسین کو تنخواہیں نہ مل سکیں اور وہ اس وجہ سے وہاں جانے سے نہ رک جاویں اور باہر اس وجہ سے چلا گیا کہ شاید میری موجودگی میں نئے مدرسہ والوں کو کچھ رکاوٹ ہو۔ میں تو اس کے لئے بالکل تیار تھا مگر اثر یہ ہوا کہ وہ مدرسہ شروع ہی ہو کر رہ گیا ایک نرم ہو جاوے تو اس کا دوسرے پر بھی اثر ہوتا ہے اور وہ بھی نرم ہو جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہ سمجھئے کہ اس ترکیب سے اس غرض کے لئے کام لینا چاہیئے دوسرے پر یہ اثر ہو کہ وہ نرم پڑ جاوے اور اس سے دب جاوے اور دوسرا مدرسہ جاتا رہے یہ تو خود طلبی اور دھوکا دینا ہے اور اس کو پالیسی کہتے ہیں اور اس سے اثر بھی نہیں ہوتا بلکہ جب یہ بات کھل جاتی ہے کہ اس میں پالیسی تھی تو اثر برعکس ہوتا ہے اور ہر شخص پہلے مدرسہ والوں کا مخالف بن جاتا ہے اور لوگ کہنے لگتے ہیں کہ مولویوں کو بھی مکاری آتی ہے بلکہ نرم برتاؤ فی نفسہ مامور بہ اور محمود ہے اور دونوں اس کے مخاطب ہیں یہ سمجھ کر دونوں کو چاہئے کہ نرمی کا برتاؤ کریں اور خلوص سے کام کریں جس سے بھی جو کام دین کا ہو جاوے اس کو غنیمت سمجھے تزاحم کیوں کیا جاتا ہے

یہ صورت ہے اتفاق کی۔

حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے پھرتے ہیں مگر جو اصل ہے اتفاق کی اس سے بہت دور ہیں تو اتفاق کی اصل تواضع ہے جن دو شخصوں میں تواضع ہوگی ان میں نا اتفاقی نہیں ہو سکتی اور تواضع کی ضد تکبر ہے جہاں تکبر ہوگا وہاں اتفاق نہیں ہو سکتا اب لوگ ہر بات میں تکبر کو اختیار کرتے ہیں اور زبان سے اتفاق اتفاق پکارتے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے اگر دونوں تواضع سے کام لیں تو اتفاق قائم رہے اور تواضع جب ہوتی ہے جبکہ حُبّ مال وجاہ نہ ہو اور جہاں مال وجاہ کا دخل ہوگا وہاں تزاحم ضرور ہوگا یہ حب مال وجاہ فساد کی جڑ ہیں اگر یہ نہ ہوں تو خدا کی قسم ہے کہ تزاحم کبھی نہ ہو جیسے اسی کی ایک نظیر موجود ہے کہ مساجد میں تزاحم نہیں ہوتا کیونکہ عادۃً اکثر مساجد کے بنانے میں مال وجاہ مقصود نہیں ہوتا اور جہاں مساجد میں بھی یہ بلا شامل ہے وہاں تزاحم بھی موجود ہے مساجد کو بھی چھوڑیئے مدرسوں ہی میں جہاں یہ بلا نہیں ہے وہاں تزاحم بھی نہیں دیکھ لیجئے گورنمنٹ کے ہزاروں مدرسے ہیں اور آپس میں تزاحم نہیں کیونکہ ان میں مال وجاہ کی غرض شامل نہیں کیونکہ ہر شخص کو اپنی تنخواہ سے مطلب ہے۔ یہ خیال کسی کو نہیں کہ ایک مدرسہ میں طالب علم زیادہ ہوں گے تو دوسرے سے بڑھ جاوے گا۔ اور چندہ زیادہ آوے گا اور نام ہوگا کہ فلانے کا مدرسہ خوب چلتا ہے۔ وہ مدرسے تو سب ایک ہی کے ہیں چندہ کا وہاں کام نہیں اور طالب علم زیادہ ہونے سے کسی ایک شخص کا نام نہیں ہوتا۔ غرض مال وجاہ کی شرکت نہیں اس واسطے تزاحم بھی نہیں اگر ہمارے مدرسوں میں بھی یہ بلا نہ رہے تو متزاحم نہ رہے اور اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ دونوں میں سے ایک ماتحت بن جاوے دوسرے کا تو حقیقت میں دونوں ایک ہوں گے۔ ایک اصل اور ایک فرع تو تزاحم نہ ہوگا کیونکہ ایک کی ترقی دوسرے کی ترقی کو مانع نہ سمجھی جاوے گی بلکہ ہر ایک کی ترقی دوسرے کی بھی ترقی سمجھی جاوے گی اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے تابع نہ

سہی مگر آپس میں محبت رکھیں اور غور کرنے سے یہ صورت ثانی زیادہ مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہم لوگ ایسے فاسد المذاق ہوگئے ہیں کہ بلا حکومت اور دباؤ کے مل کر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ بہرحال جتنی کوشش ہو سکے اچھا ہے آپس میں میل اور اتحاد پیدا ہونے کی کچھ تدبیریں ہیں مثلاً ایک یہ کہ علماء ایک دوسرے سے ملتے رہیں، دوسرے یہ کہ دوسرے مدرسہ کے طالب علم کو اپنے مدرسہ میں داخل نہ کریں تاوقتیکہ وہاں کی اجازت نہ ہو اور مہتمم کے دستخط نہ لے آویں ایک طرف سے یہ ہو اور دوسری طرف سے یہ ہو کہ اس طالب علم کو اس مدرسہ میں داخل ہونے سے منع نہ کریں اور دستخط اور اجازت دیدیا کریں کیونکہ مقصود تعلیم دین ہے ممکن ہے کہ ایک کتاب ایک مدرسہ میں ہوتی ہو جس شرکت کی طالب علم کو ضرورت ہے اور دوسرے مدرسے میں وہ نہیں ہوتی تو اس صورت میں اس طالب علم کو ایک مدرسہ کا مقید کرنا اس کا وقت ضائع کرنا ہے اور مقید کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ غرض آپس میں اتحاد رکھنا ہو تو اس کی یہ تدابیر ہیں ان تدابیر کو اگر بتکلف بھی اختیار کیا جاوے تو اثر ہوتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اخلاق باطنی کو دخل ہے ظاہری برتاؤ میں کہ جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی برتاؤ اس سے ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی اس کا عکس بھی ہے کہ ظاہری برتاؤ کو بھی دخل ہے باطنی اخلاق کے پیدا ہوجانے میں کہ جیسا برتاؤ بتکلف اختیار کیا جاوے ویسے ہی اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم ط یعنی اگر کسی سے تکلیف پہونچے تو اس کی مکافات اچھے برتاؤ کے ساتھ کیجئے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس کو آپ سے عداوت تھی وہ پکا دوست بن جاوے گا صدیق صداقت سے ہے جس کے معنی ہیں محبت اور خلت یعنی وہ دوستی جو قلب میں گھس گئی ہو۔ معلوم ہوا کہ نیک برتاؤ کا گو وہ تکلف ہی سے ہو یہ اثر ہے کہ دوسرے شخص کے قلب میں سچی اور واقعی محبت پیدا ہو جاتی ہے آیت سے یہ مسئلہ بدلالۃ النص ثابت ہوگیا کہ اگر یہ تدابیر اتحاد دل سے بھی نہیں اختیار کر سکتے تو بتکلف ہی اختیار

کریں غرض اتحاد اچھی چیز ہے اس کے حاصل کرنے کی تدابیر کرنی چاہئیں پھر اتحاد کی صورت میں تعدد مدارس بھی کچھ برا نہیں مگر یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ مقصود علم دین کی خدمت ہو نہ کہ جاہ اور مال اگر مقصود تعدد سے علم دین کی خدمت ہو تو جتنا تعدد ہوگا علم دین کی خدمت زیادہ ہوگی یہ ایسا ہوگا جیسے ایک آدمی کے ساتھ دس آدمی ہو جاویں تو دس گنا کام ہوگا اور اس کو ہر شخص چاہتا ہے کہ علم دین کی جس قدر زیادہ خدمت ہو سکے ضروری ہے خصوصاً اس زمانہ میں کہ ضلالت سے بچنا بلا اس کے ناممکن ہے یعنی خصوصاً اس واسطے کہا کہ پہلے زمانہ میں تو اہل تزاحم کم تھے اس لئے تھوڑے جماعت کی دین سے واقفیت کافی تھی اور ناواقفوں کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ جو ضرورت پیش آئے اس کا حکم کسی سے پوچھ لیا اب اہل باطل کی مزاحمت بھی موجود ہے زمانہ آزادی اور خودداری کا ہے ہر شخص جدا جدا اسلام پر حملہ کرنے کو تیار ہے۔ غیر اسلام والے بھی اسلام پر حملہ کرتے ہیں اور خود اہل اسلام میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام پر حملہ کرتے ہیں۔ اور یہ حملہ زیادہ مضر ہے کیونکہ غیر اہل اسلام تو مخالف ہیں صورۃً وحقیقۃً دونوں طرح ان کو دشمن سمجھا جاتا ہے اور دشمن کی بات کا زیادہ اثر نہیں ہوتا اور یہ لوگ دشمن بصورت دوست ہیں ان کے جال سے بچنا مشکل ہے اب تو دین کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی صورت ہی نہیں کہ علم کافی والوں کی بہت بڑی جماعت ہو اور اتنا بڑا مجمع اہل علم کا بلا کافی قوت اور کوشش کے نہیں ہو سکتا اس واسطے ضرورت ہے کہ سب مسلمان متفق ہو کر کوشش کریں اب وقت اختلاف کا نہیں رہا اس تقریر سے علم اور کافی علم کی ضرورت ثابت ہو گئی اور یہی علم ذریعہ ہے دین کی حفاظت کا اسی سے عقائد درست ہو سکتے ہیں اور اسی سے اعمال درست ہو سکتے ہیں اور اس مجموعہ اصلاح کا خلاصہ درستی معاد ہے تو حاصل یہ ہوا کہ درستی معاد ہوتی ہے علم سے اس واسطے علم کی سخت ضرورت ہے اور اس وقت جو آیت تلاوت کی گئی اس کے ضمن میں مسئلہ معاد ہی کا بیان مجھے مقصود ہے۔ اب میں آیت کا ترجمہ ہی کئے دیتا ہوں متعلقات کو طول نہیں دوں گا۔ اب تک

میرا یہ طریقہ تھا کہ ایک آیت پڑھی اور اس کے متعلق تمام مالہ و ماعلیہ سے بحث کی اور اس ضمن میں اصل مضمون کے متعلقات اور متعلقات کے متعلقات اور ان کے متعلقات سب ہی آجاتے تھے اور بات کہیں سے کہیں پہونچ جاتی تھی گو اس سلسلہ کے بڑھ جانے سے بھی کلام میں تشتت نہ ہوتا تھا اور اصل مضمون محفوظ رہتا تھا کیونکہ نظر اصل مضمون ہی کی طرف رہتی تھی تاہم اصل مضامین کے ساتھ متعلقات بہت زیادہ ہوتے تھے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت تھوڑی ہوتی تھی اور بیان زیادہ ہوتا تھا۔ اور آج اس طرز کو چھوڑ کر دوسرے طرز سے بیان کروں گا۔ وہ یہ ہے کہ متعلقات کو طول نہیں دوں گا صرف آیتوں کا ترجمہ کروں گا اور مختصر طور پر توضیح مطلب کردوں گا۔ اس طرز کا نتیجہ یہ ہے کہ آیتیں زیادہ ہوں گی اور متعلقات کا بیان کم ہوگا اور میرا قدیم طریقہ یہی تھا گو اس دوسرے طریقے کی ایک مدت سے عادت ہوجانے کے سبب یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ قدیم طریقہ تھا اور آج جدید طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعی بات یہ ہے کہ قدیم طریقہ عرصہ سے بدلا ہوا تھا اور بجائے اس کے دوسرا طریقہ اختیار کیا ہوا تھا آج پھر اسی قدیم طریقہ کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ بیان ذریعہ ہے اور اصل مقصود مضمون آیت ہے تو نظر مقصود پر رہنی چاہیے ذریعہ وہی اختیار کرنا چاہیے جو موصول الی المقصود ہو اور بس اگر ایک کام کے چند ذرائع ہوں تو ظاہر ہے کہ جو ذریعہ احقر ہو یعنی چھوٹے سے چھوٹا ہو اسی کو اختیار کرنا چاہیے قدیم طریقہ مختصر اور بہت سہل تھا اس واسطے اس کو درمیانی طریقہ پر ترجیح ہوسکتی ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ ترجمہ اور مضامین اصلیہ کے بیان کرنے میں کچھ بھی دقت نہیں اور اس دوسرے طریقہ میں چند چیزوں کی ضرورت ہے (جیسا کہ آگے معلوم ہوگا) تو چند چیزوں کے جمع کرنے میں اتنی سہولت نہیں ہوسکتی جتنی ایک چیز میں ہوگی۔ یہاں میں پھر وہ بات یاد دلاتا ہوں کہ طریق مقصود نہیں بلکہ مقصود ہی مقصود ہے۔ مقصود کیا ہے وہ یہ ہے جس کا بیان خود قرآن میں موجود ہے وذکر فان الذکری تنفع المومنین جس کا خلاصہ نصیحت ہے مسلمانوں کو جب مقصود نصیحت ہے اور بیان اس کا ذریعہ اور طریق ہوا تو کیا

ضرور ہے کہ ایک ہی طریقہ کا التزام کر لیا جاوے بلکہ جب کوئی دوسرا طریقہ انفع معلوم ہو تو چاہیئے کہ پہلے کو بدل دیا جاوے اور یہ مؤید بالسنت بھی ہے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ہے ما خیر بین امرین الا اختار ایسرھما یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی دو بات میں اختیار دیا جاتا اُن سے اُسی کو اختیار فرماتے تھے جو آسان ہو۔ یہ ایسا ہے جیسے حج کو جانے کے دو رستے ہوں ایک قریب اور ایک بعید تو عقل کی بات یہی ہے کہ قریب کا راستہ اختیار کیا جاوے اس میں بعض غلطی کرتے ہیں اور طریق طویل کے اختیار کرنے کو باعث ازدیاد ثواب اور مجاہدہ سمجھتے ہیں۔ وطن میں ایک صاحب سے میری گفتگو ہوئی وہ اسی خیال کے تھے اور کہتے تھے کہ دین میں سہولت پسندی اچھی نہیں کیونکہ جتنی مشقت زیادہ ہوگی اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا حدیث موجود ہے اجرکِ علیٰ قدر نصبکِ یعنی اجر بقدر محنت کے ہے اور میں کہتا تھا کہ اس حدیث سے طریق طویل کو اختیار کرنے کی فضیلت بتلانا مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ بڑے مقصود کو حاصل کرو اور اس کی تحصیل میں جو مشقتیں پیش آئیں ان کی وجہ سے ہمت نہ ہارو کیونکہ اجر علیٰ قدر نصبک ان مشقتوں پر اجر بھی زیادہ ملے گا یہ مقصود نہیں کہ مقصود کے دو طریقوں میں سے اعسر اور اطول کو اختیار کرو اس امید پر کہ اس سے ثواب بڑھ جاوے گا یہ تو درحقیقت مقصود سے محرومی ہے اور ذریعہ کو مقصود بنانا ہے وہ کسی طرح مانتے نہ تھے میں نے کہا اچھا اگر یہی بات ہے کہ جتنا ذریعہ کو طول دیا جاوے اتنا ہی باعث فضیلت ہے تو آپ یوں کیا کریں کہ اگرچہ پانی تھانہ بھون میں بھی موجود ہے مگر فضیلت بڑھانے کے لئے وضو کے واسطے پانی جلال آباد سے لایا کیجئے اور اس سے وضو کر کے نماز پڑھا کیجئے اس طرح ہر نماز کا ثواب بہت بڑھ جاویگا کیا آپ کے دل کو یہ بات لگتی ہے تب ان کی سمجھ میں آیا۔ تو اصل بات یہی ہے کہ ذریعہ اور طریق کو طول دینا کچھ فضیلت کی بات نہیں ہاں اگر مقصود کے لئے کوئی طریق ہی نہ ہو سوائے طریق طویل کے تو ہمت نہ ہارے غرض وعظ ایک طریق ہے

جس سے مقصود مسلمانوں کا نفع ہے تو جس طریق میں بلامشقت و مضرت ہو وہی طریق اچھا ہوگا اور جو طرز آجکل اختیار کیا گیا ہے اس کی یہی شان ہے اس دوسری طریق میں ایک مضرت یہ ثابت ہوئی کہ بعض سامعین کو غلط فہمی ہوتی تھی کیونکہ بعض مضامین نئے ہوتے تھے جو کتابوں میں نظر سے نہیں گذرتے اکثر طبائع نئی بات سے چونکتی ہیں اس واسطے لوگ ان سے متوحش ہوتے تھے اور غور کرنے کا مادہ طبیعتوں میں رہا ہی نہیں ہے بس نئی بات سنکر خواہ مخواہ اعتراض کر دیتے تھے اور نئے مضامین ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس طریق میں صرف منقولات پر اکتفا نہ ہوتا تھا کہ فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے اور فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے بلکہ معقولات بھی شامل ہوتے تھے یعنی سیاق و سباق اور قواعد سے استنباط کر کے ایسے مضامین بھی بیان ہوتے تھے جو کسی نے نہیں لکھے کیونکہ ہر مضمون کا کتاب میں لکھا ہوا ہونا ضروری نہیں اور کتابوں میں قواعد کے درج کرنے کا یہی تو حاصل ہے کہ جزئیات کے لکھنے کی ضرورت نہ رہے بس چند اصول کلی لکھ دیئے ہیں جن سے سیکڑوں جزئیات نکالے جا سکتے ہیں تو وعظ کے وقت ان جزئیات کو مستنبط کر کے بیان کر دینے میں کیا حرج ہے اول تو ہمیں اس کی لیاقت کہاں اور قواعد ہم کو ایسے مستحضر کہاں ہیں جن سے ہم زیادہ استنباط کر سکیں مگر خیر ہم بہت تواضع بھی کیوں کریں آخر کچھ تو علم خدا تعالیٰ نے دیا ہی ہے کہیں کہیں استنباط سے بھی کام لیا جاتا تھا اور کچھ نہ کچھ ایسے مضامین بھی جو کسی سے بالتصریح منقول نہ ہوں بیان میں آجاتے تھے ان سے بعض لوگ چونکتے تھے اور خواہ مخواہ اعتراض کرتے تھے یا بعض مضامین ایسے ہوتے تھے کہ ان کے سمجھنے کی لیاقت سامعین میں نہیں ہوتی تھی نہ اُس کے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے بس جو مدلول سرسری طور پر اپنی سمجھ میں آگیا اسی کو واقعی مطلب سمجھ کر اعتراض کر دیتے تھے ان مضرتوں کو دیکھ کر خیال ہوا کہ اس بکھیڑے کو کیوں مول لیا۔ اس طریقہ کو چھوڑ ہی کیوں نہ دیا جاوے جس سے یہ سب خرابیاں پیدا ہوئیں گو اس سے یہ فائدہ بھی ہوتا تھا کہ وہ نئے مضامین اگر کسی کو پسند آگئے تو وہ بہت محظوظ ہوتے تھے لیکن پھر یہ مفسدہ ہوتا تھا

کہ کبھی مضامین منقولہ و غیر منقولہ میں تعارض کے توہم سے فرقہ بندی شروع ہوگئی اور ایک اس کے طرفدار ہوگئے اور ایک اس کے۔ گو اس فرقہ بندی سے بیان کنندہ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی ایسی فرقہ بندی سلف کے وقت میں بھی ہوئی ہے مگر مجھے اس سے بھی غیرت آتی ہے کوئی قاسمی بنے اور کوئی رشیدی کوئی اشرفی اور کوئی روپیہ صاحبو! انسان بنئے اشرفی روپیہ بننے سے کیا فائدہ پھر غور سے سمجھ میں آیا کہ یہ ساری خرابی استنباط کی ہے نہ یہ ہو نہ اختلافات ہوں جب نقل محض ہوگی اور صرف ترجمہ ہوگا تو بات بڑھے ہی گی نہیں پھر استنباط کی نوبت ہی نہیں آوے گی تو اس طریق میں خطرہ نہیں جب کوئی اشکال کرے کہدیا دیکھ لو یہ ترجمہ اور یہ مضمون فلاں صاحب نے لکھا ہے اپنے اوپر کچھ بھی بار نہ رہا اس طریق میں دماغ پر بھی تعجب بہت ہوتا تھا کیونکہ آیت میں سے ایک مضمون نکالا اور اس مضمون میں سے اور مضمون نکالا اور اس میں سے اور نکالا ان سب کا سلسلہ یاد رکھنا اور ہر مضمون کے لئے اصل کو تلاش کرنا اور ہر پہلو پر نظر رکھنا ظاہر ہے کہ کس قدر دماغ کا کام ہے اور اس صورت میں آیت کے الفاظ کا اتباع ہے جو مضامین سیدھے سیدھے اُن الفاظ سے سمجھ میں آویں بیان کر دے تو بہت سا کام کم ہوگیا۔ غرض اُس طریق میں بہت بکھیڑے تھے نیز حضرؐ بھی دیکھا تو اس سنت پر عمل کرنے کو جی چاہا ما خیر بین امرین الا اختار اھونھما اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ طریقہ بدل دیا جاوے اس واسطے اب میں سیدھے سیدھے ترجمہ پر اکتفا کروں گا بعضوں کا خیال یہ ہے کہ اس طریق کے بیان میں مزا نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مزا مقصود نہیں شفا مقصود ہے۔

دیکھئے حکیم محمود خاں مریض کے لئے نسخہ لکھتے تھے۔ اس میں مزہ کہاں ہوتا تھا بلکہ بعضے نسخے تو نہایت بدمزہ ہوتے ہوں گے پھر یہ تھوڑا ہی ممکن تھا کہ کوئی بدمزہ ہونے کی وجہ سے اس نسخہ کو چھوڑ کر مومن خاں کے مزہ دار اشعار پڑھ لیا کرے مزہ شعر میں ہے مگر شفا نسخہ میں ہے حتیٰ کہ بمقتضائے انا عند ظن عبدی بی بعض دفعہ صرف کاغذ گھول کر پلا دینے سے شفا ہوگئی اور مومن خان اور ذوق اور شوق کے تمام دیوان بھی

پی جاوے تو شفا نہیں ہو سکتی تو مقصود نفع ہے نہ مزہ جس کی نظر مقصود پر ہے اس کے نزدیک دونوں طریقے یکساں ہیں اصلاح کے مضامین اس میں بھی ہوں گے کیونکہ نرا ترجمہ سہی مگر ہے تو ترجمہ اسی کلام کا جس میں سرتاپا اصلاح بھری ہوئی ہے رنگینی نہ سہی اور اس بے مزہ طریق کو اختیار کرنے میں بھی ایک نفع ہے کہ لوگ مجھے وعظ کے لئے کم بلاویں گے اور گرمی میں دق نہ کریں گے مجھے آرام ملے گا نیز بلانے والوں کی محبت بھی معلوم ہو جاوے گی کہ صرف اپنے کام کے لئے بلاتے ہیں یا محبت ہی اس کی محرک ہوئی ہے چنانچہ یہاں کے بلانے والوں سے میں نے صاف کہدیا تھا کہ اگر وعظ مقصود ہے تو میں وعظ تو اب پھیکا اور بے مزہ کہوں گا اگر اس پر بھی آپ حضرات راضی ہوں تو میں حاضر ہوں چنانچہ اس وعدہ کا اس وقت ایفا کروں گا حضرات داعین کی محبت ہے کہ انھوں نے اس کو منظور کیا گویا اصل محبت تو یہی ہے کہ روٹیاں کھلادیں اور بوٹیاں نہ نوچیں اور کام لے کر اور پوری محنت کرا کے روٹی دی تو کیا احسان کیا یہ تو مزدوری ہے خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ اصل وجہ اس تبدیل طریقہ کی محض مضرات ہیں جن کا اب احساس ہوا بیان تو کیا جاتا ہے نفع کے لئے اور پیدا ہوا نقصان تو کیوں ایسا طریقہ اختیار کیا جاوے میں نے اترے پترے سب کھولدیئے مجھے بناوٹ پسند نہیں جو بات صاف ہے وہ کہدی اب جس کا جی چاہے وعظ سنے اور جس کا جی چاہے نہ سُنے۔ اب میں ترجمہ کرتا ہوں

فرماتے ہیں وما قدروا اللہ حق قدرہ لوگوں نے حق تعالیٰ کی ایسی عظمت نہ کی جیسا عظمت کرنا چاہیئے تھا حالانکہ ان کی عظمت وہ ہے کہ والارض جمیعًا قبضتہٗ یوم القیمۃ تمام زمین ان کی ایک مٹھی میں ہوگی قیامت میں۔ والسمٰوات مطویات بیمینہ اور کل آسمان ان کے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے یمین کا لفظ اور ایسی ہی قبضہ کا لفظ متشابہات میں سے ہے جن کا بیان کوئی کر نہیں سکتا صرف اتنا معلوم ہے کہ ان الفاظ کے معنی متعارف مراد نہیں حدیث میں ہے فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کلتا یدی ربی یمین یعنی خدائے تعالیٰ کے دونوں ہاتھ یمین ہیں

مراد یہ ہے کہ قوت میں یمین ہی کی طرح ہیں وہاں فرق نہیں ہے کہ ایک ہاتھ قوی اور ایک ضعیف ہو جیسے مخلوقات میں متعارف ہے کہ داہنا ہاتھ قوی اور بایاں ضعیف ہوتا ہے متشابہات کے متعلق تحقیق یہی ہے کہ ان میں گفتگو نہ کرے اور ان پر ایمان رکھے مثلاً خدائے تعالٰے کے لئے شریعت میں ید کا اطلاق آیا ہے لہذا اس کا تو قائل ہو کہ ید ثابت ہے مگر اس کی کیفیت وغیرہ سے بحث نہ کرے۔ بس سیدھی بات ہے جیسا اللہ ویسا ہی اس کا ید ہم کو اللہ کی حقیقت کہاں معلوم ہے اور اس کا علم بالکنہ کہاں حاصل ہے بس ایسے ہی اُس کے ید کا بھی علم نہیں ہے۔ یہ تو قبضہ اور یمینہ کی بحث ہوئی اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین پر قدرت بیان کرنے کے لئے تو قبضہ فرمایا اور آسمانوں کے لئے مطویات بیمینہ فرمایا۔ دونوں کے واسطے عنوانوں میں فرق کیوں کیا کہ زمین کی بابت تو فرمایا کہ مٹھی میں ہوگی اور آسمانوں کی نسبت فرمایا کہ لپٹے ہوئے ہاتھ میں ہوں گے گویا ہتھیلی پر رکھے ہیں سیدھی بات یہ تھی کہ یوں فرما دیتے۔ والارض و السمٰوات جمیعًا قبضتہ یعنی زمین و آسمان سب اس کی مٹھی میں ہوں گے اس کا نکتہ ایک ان پڑھ آدمی کی سمجھ میں آیا بلکہ آدمی کے نہیں آدمن کے سمجھ میں آیا جو مجھ سے ترجمہ پڑھا کرتی تھی اور مجھے وہ نکتہ بہت پسند آیا حتیٰ کہ میں نے اس کو اپنی کتاب میں درج بھی کر دیا میں نے اس سے پوچھا کہ یہ فرق عنوانوں میں کیوں کیا گیا ہے کہا کہ زمین بہ نسبت آسمان کے چھوٹی ہے اور چھوٹی چیز کے لئے یہی عادت ہے کہ مٹھی میں بند کی جاتی ہے اور بڑی چیز کے لئے عادت یہ ہے کہ لپیٹ کر کھلے ہاتھ پر رکھ لی جاتی ہے مٹھی کو بند نہیں کیا جاتا اس واسطے زمین کے لئے وہ عنوان اختیار کیا گیا اور آسمان کے لئے یہ دیکھئے یہ علوم قرآنیہ ہیں ان میں خصوصیت پڑھے لکھوں اور علماء فضلاء کی نہیں ہے جس کو حق تعالٰے چاہیں القاء کر دیں خدا کی دین ہے جس کو چاہے دیدیں بعض وقت ایک عامی آدمی کی سمجھ میں وہ بات آجاتی ہے جو ایک بڑے عالم کی سمجھ میں نہیں آتی اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ عامی آدمیوں کی سمجھ میں دین کی بات آجاتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ دین فطرت کے بہت قریب ہے جس کی فطرت میں سلامت ہو

اس کا ذہن اس تک پہونچ جاتا ہے گو عامی آدمی اس مضمون کو اصطلاحی الفاظ میں ادا نہ کر سکے مگر اعتبار تو معانی کا ہے الفاظ کوتاہ ہوں تو کیا حرج ہے یہ نور ایمان کی برکت ہے اور نور ایمان کم و بیش ہر مسلمان کو حاصل ہے خواص کی کچھ خصوصیت نہیں مگر اس کو سنکر ان پڑھ لوگ فخر نہ کرنے لگیں کہ ہم بھی نکات جانتے ہیں کیونکہ ان کے نکات صحیح و غلط ہونے کا معیار یہی ہے کہ اہل علم ان کے جس نکتہ کو صحیح کہیں وہ صحیح ہے ورنہ غلط ہے ان کے واردات اہل علم کی رجسٹری کے محتاج ہیں علم اور بے علمی برابر نہیں ہے بلکہ عوام تو کیا غیر متبحرین کی واردات بھی جبھی معتبر ہیں جب کہ متبحرین کے نزدیک صحیح ہوں۔ اصل میں تو ان کے صحیح ہونے کا معیار یہ ہے کہ شریعت کے موافق ہوں اور شریعت کے موافق ہونے کو پہچاننا یہ متبحرین کا کام ہے اس واسطے یہ کہدیا گیا کہ وہ متبحرین کے نزدیک صحیح ہوں آج اس غلطی میں اچھے اچھے پڑھے لکھے مبتلا ہیں ذرا سی کسی کو کوئی کیفیت حاصل ہوئی یا کوئی وارد قلب پر آیا اور اس کو وحی سمجھنے لگے اور کہتے ہیں ہم کو یہ القا ہوا ہے گویا یہ مقدمہ ان کے نزدیک مسلم ہے کہ القا شدہ بات کبھی غلط نہیں ہوتی صاحبو یہ بڑی غلطی ہے۔ القا کا منجانب اللہ ہونا ضروری نہیں القا منجانب شیطان بھی ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے خود نص موجود ہے وان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم یعنی شیاطین اپنے ہم جنسوں پر القا کرتے ہیں آجکل اس غلطی میں بڑے بڑے لوگ مبتلا ہیں اسی غلطی میں پڑ کر کوئی مدعی ولایت بن گیا اور کوئی مدعی نبوت صاحبو جب نص موجود ہے کہ القا شیطانی بھی ہوتا ہے تو پھر ہر القا کو صحیح اور قطعی سمجھ لینا کیسے ٹھیک ہے اس کے لئے ایک ہی معیار ہے کہ اگر وہ شریعت کے موافق ہے تو صحیح ہے ورنہ غلط ہے۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کبھی اپنے حالات اور واردات پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے تا وقتیکہ کوئی متبحر اور تجربہ کار اس کو شریعت کے موافق نہ کہے اہل فن نے بالتصریح لکھ دیا ہے کہ کل حقیقۃ ردتھا الشریعۃ فھی زندیقۃ۔

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کو اس بارہ میں اس قدر احتیاط تھی کہ علماء کے

سامنے کوئی نکتہ بیان فرماتے تو یہ بھی فرمادیتے کہ بھائی میرے نکات اور اقوال میں تم غور کرلینا اگر کچھ غلطی ہو تو بتلادینا اور اس بارے میں ادب سے کام نہ لینا میں کہہ چکا اب تم ذمہ دار ہو۔

جب ایسے کاملین اور عارفین کو اس قدر احتیاط تھی تو ہما و شما چہ رسد۔ اس باب میں ہرگز جرأت نہیں کرنا چاہیئے کسی حال اور کسی وارد کو صحیح مت سمجھو جب تک کہ وہ شریعت کے موافق نہ ہو اور شریعت کے موافق ہونے کے لئے بھی اپنی تحقیق پہ بس نہ کرو بلکہ اس کو اس وقت تک شریعت کے موافق نہ سمجھو جب تک کوئی متبحر عالم اس کو شریعت کے موافق نہ کہدے۔ غرض عام لوگ اپنی یہ ایک تعریف سن کر کہ عوام کی عوام کی سمجھ میں بھی نکات صحیح طور پر آجاتے ہیں کیونکہ دین فطرت کے بہت قریب ہے اور ان لوگوں کی فطرت میں تصنع وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سلامتی ہوتی ہے شریعت میں نکات نکالنے کی جرأت نہ کریں ورنہ وہ قصہ ہوگا کہ ایک ہمارے ابتدائی کتابوں کے استاد تھے ان کے پاس ایک درزی بیٹھا تھا اس نے آمنت باللہ بھی اور والبعث بعد الموت پر ایک آہ کی اور کہا کہ بادل کی بھی موت ہے ع بعد کا ظاہر نہ ہوا تھا الف پڑھا تھا اس لئے یہ نکتہ مستنبط کیا یا کسی نے من ذا الذی یشفع کا ترجمہ کیا تھا۔ من ذل جو شخص ذلیل کرے ذی یعنی نفس کو (شاید ذی کو جی پڑھا یا اسم اشارہ سمجھا) یشف شفا پاوے گا۔ ع یاد رکھ ایسے ہی ایک صاحب تھے کہ وہ بی بی کو تو خوب کھلاتے پلاتے تھے اور ان کی ماں بھی موجود تھی اس کی خبر گیری نہ کرتے تھے ان سے ایک مولوی صاحب نے کہا کہ تو ماں کو کچھ کھانے کو کیوں نہیں دیتا۔ کہا کہ قرآن میں تو کھلانے کا حکم بی بی ہی کے لئے آیا ہے۔ واطعمهم من جوع یعنی جوئے کو کھانا دو (جوئے یعنی زوجہ) مولوی صاحب بھی بڑے حاضر جواب تھے۔ کہا بھلے مانس بی بی کے لئے تو کھانا ہی دینے کا حکم آیا ہے اور ماں کے لئے تو یہ حکم ہے کہ مالہٗ وما کسب یعنی ماں کا سب مال ہے جو کچھ تیرے پاس ہے سب ماں کا ہے اس حکم کے رو سے تو جوئے کا کھانا تو الگ رہا تو بھی اپنے مال میں سے بلا اجازت ماں کے کچھ نہیں کھا سکتا۔ اب وہ لاجواب ہوئے

یہاں طالب علمانہ ذرا سا اشکال ہے اس کو اور اس کے حل کو بھی سن لیجئے وہ یہ کہ اس شخص نے جو استدلال قرآن شریف سے کیا یعنی اطعمہم من جوع کے معنی یہ لئے کہ بی بی کو کھانا دے اس کو تو غلط کہا گیا اور جاہلانہ نکات میں شامل کیا گیا لیکن اس کے جواب میں مولوی صاحب نے بھی ایسی گنوارو بات کہی کہ وہ بھی بجنسہ ویسی ہی ہے کیونکہ ماکسب کے معنے عربی زبان میں یہ کہاں ہیں کہ بیٹے کا مال سب ماں ہی کی ملک ہے پھر ایک گنوار ہی پر کیا الزام ہے معلوم ہوا کہ علما بھی ایسے نکلتے نکالتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم یہ نہیں کہتے کہ مولوی صاحب نے ٹھیک جواب دیا ہے اور قرآن کا یہی مدلول ہے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا یہ نکتہ مقبول ہے اور اس گنوار کا وہ نکتہ مقبول نہیں بلکہ ہم دونوں کو یہی کہتے ہیں کہ یہ جاہلانہ نکات ہیں دونوں یکساں ہیں اور اس قسم کے نکات قرآن میں نکالنا درست نہیں یہ مولوی صاحب والا نکتہ بھی غلط ہے اور بجنسہ ویسا ہی ہے جیسا وہ گنوار والا نکتہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ واقعہ ایک بڑے عالم کا ہے اس واسطے یہ نہیں کہا جاتا کہ قرآن میں تحریف کی گئی ہے یا وہ ماکسب کے معنی یہی سمجھتے تھے بلکہ اس میں تاویل کی جائے گی کہ مولوی صاحب نے جواب الزامی دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ایسے نکات سے حکم ثابت ہوسکتا ہے جیسا اس نے لایلاف سے جوئے کا حق ثابت کیا تو تبت سے مال کا سب حق ثابت ہو جاوے گا یہ جواب اس کے ساتھ استدلال کے رد کرنے کے لئے بہت کافی ہے یہ تقریر ہے اس طالبعلمانہ شبہ کی اور اس کے جواب کی غرض یہ ہے کہ عوام کے نکات اکثر ایسے لغو ہوتے ہیں جیسے مثالوں میں بیان ہوئے لہذا عوام کو قرآن میں نکات نکالنے کی اجازت نہیں اور اس سے عوام خوش نہ ہوں کہ ایک شخص کے ایک نکتہ کی میں نے تعریف کر دی آیت والارض جمیعاً قبضتہ اور والسموات مطویات بیمینہ کے متعلق اس کی سمجھ میں آگیا تھا اور میں نے تعریف میں یہ لفظ کہدیا کہ عوام کا مذاق چونکہ فطرت کے بہت قریب ہوتا ہے اور دین بھی فطرت کے موافق ہے اس واسطے دین کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی ہے مطلب یہ ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوام کے ذہن میں کوئی صحیح نکتہ آجاتا ہے اور علما کو بھی یہ نہ چاہیئے کہ ہر بات کو صرف یہ دیکھ کر کہ عوام کے منہ سے نکلی ہوئی ہے غلط سمجھنے لگیں بلکہ اس بات میں غور کریں اور دیکھیں کہ قواعد شرعی کے مخالف ہے یا نہیں اگر مخالف نہ ہو تو اس کو مان لیں اور اس کو اپنے لئے کسر شان نہ سمجھیں دین کچھ ان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے دین تو سب کی مشترک جائداد ہے نور ایمان سب میں موجود ہے اس کی برکت سے اگر کسی وقت ایک عامی آدمی کی سمجھ میں ایسی بات آجاوے جو کسی عالم کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو کیا استبعاد ہے۔ خدا کی دین ہے جس کو چاہیں دیدیں اسی قبیل سے یہ نکتہ ہے جو والارض جمیعًا قبضتہٗ یوم القیمۃ والسموٰات مطویات بیمینہ میں ایک عامی آدمی کے منہ سے نکلا مجھے یہ پسند ہوا لہذا میں نے اس کو اپنی کتاب تفسیر بیان القرآن میں بھی درج کردیا ہے آگے فرماتے ہیں سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون۔ ترجمہ یہ ہے کہ پاک ہے حق تعالےٰ اور برتر ہے اس سے جو شرک کرتے ہیں دیکھئے جملہ سابقہ پر اس جملہ کو مترتب کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام آیت سے مقصود نفی شرک ہے جس کا میں نے شروع ہی میں دعویٰ کیا تھا کہ گو بظاہر یہاں معاد کا بیان ہے مگر مقصود اس سے توحید الٰہی کا اثبات ہے جس کو شکایت کے عنوان میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا کہ لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی عظمت نہیں پہچانی اور اب اس کی شرح کی ہے کہ سبحنہ وتعالےٰ عما یشرکون اس میں تصریحًا شرک سے تنزیہ ہے۔ غرض آیت کے الفاظ سے بہت وضوح کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مضمونوں میں سے یعنی توحید اور معاد میں سے گو مضمون معاد کو طول کے ساتھ بیان کیا گیا ہے مگر مقصود اثبات توحید ہے آگے فرماتے ہیں ونفخ فی الصور فصعق من فی السموٰات ومن فی الارض الا من شاء اللہ معنی یہ ہیں کہ نفخ صور سے گر پڑیں گے تمام وہ لوگ جو آسمان اور زمین میں ہیں۔ صعق کے معنی بے ہوش ہو کر گر پڑنا ہیں۔ تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مرجاویں گے کیونکہ مرنے میں بے ہوشی اور گر پڑنا ہوتا ہی ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ غشی طاری

ہو جاوے گی کیونکہ صور کی آواز ایسی ہولناک ہوگی کہ سب کے حواس جاتے رہیں گے الا من شاء اللہ من فی السمٰوات ومن فی الارض سے مستثنیٰ کیا من شاء اللہ کو معنی یہ ہوئے کہ تمام آسمان اور زمین کے لوگ بے ہوش ہو جاویں گے سوائے اُس کے جس کا بے ہوش ہونا حق تعالےٰ کو منظور نہ ہو اس سے بظاہر معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو بے ہوش نہ ہوں گے۔ باقی یہ اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کون کون ہیں اور ایک توجیہہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ الا من شاء اللہ گو بظاہر استثنار ہے مگر بمعنی شرط کے ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ کسی کا بے ہوش نہ ہونا مشیت ایزدی پر ہے اگر چاہیں تو کسی کو صعق کے حکم کلی سے مستثنیٰ ابھی کر سکتے ہیں تو اس کا تحقق جب بھی صحیح ہے کہ کسی کو بھی صعق سے نہ بچایا جائے کیونکہ ماحصل اس کا یہ ہوا کہ مستثنےٰ کرنا مشیت پر موقوف ہے مشیت اس کے وقوع کے متعلق ہوئی تو وقوع ہوگا اور عدم وقوع کے متعلق ہوئی تو عدم وقوع ہوگا تو یہ مضمون ہر حال میں صادق رہا کہ بعض افراد بشرط مشیت مستثنےٰ ہوسکتے ہیں اس کے لئے استثنار کا وقوع ضروری نہیں ثم نفخ فیہ اخریٰ فاذا ھم قیام ینظرون۔ ترجمہ پھر نفخ صور دوبارہ ہوگا تو ایک دم سب کھڑے ہو جاویں گے اور محشر کا تماشا پیش نظر ہوگا۔ اگر صعق کے معنے مرجانے کے ہیں تو یہ معنے ہوئے کہ مردے زندہ ہو جاویں گے اور اگر صعق کے معنے بے ہوش ہو جانے کے ہوں تو یہ معنی ہوئے کہ بے ہوشی سے ہوش میں آجاویں گے اس میں اختلاف ہے کہ نفخ صور کے دفعہ ہوگا۔ اس آیت سے بتفسیر مشہور اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نفخہ سے تمام عالم مرجاوے گا مگر میں نے کہا تھا کہ صعق کے معنے بے ہوش ہوجانے کے بھی ہیں اس لحاظ سے اس کے معنے یہ بیان کئے ہیں کہ جو لوگ اس وقت زندہ ہوں گے وہ مرجاویں گے اور جو لوگ اس سے پہلے مرچکے ہیں ان کی روحیں بے ہوش ہوجاویں گی اور نفخہ ثانیہ سے مردے زندہ ہو جاویں گے اور بے ہوش روحیں ہوش میں آجاویں گی اسی کا نام حشر ہے سب اگلے پچھلے مردے انسان اور حیوان اور حشرات ایک ایک زندہ ہوجاویں گے

یہاں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ زمین ان سب کے لئے کافی کیسے ہوگی کیونکہ اگر مردم شماری سے دیکھا جاوے تو اولین و آخرین تمام انسانوں ہی کی تعداد اس قدر ہوسکتی ہے کہ زمین ان کے جمع ہونے کے لئے کافی نہ ہو چہ جائیکہ تمام وحوش و طیور وغیرہ سب کے سب جمع ہوں۔ جواب یہ ہے کہ واقعی زمین موجودہ حالت میں تو اس کے لئے کافی نہیں ہوسکتی لیکن اس وقت زمین کو وسعت دیدی جاوے گی جیسے ربڑ کو پھیلا دیں تو وہ بڑھ جاتا ہے کہ ربڑ پہلے چھوٹا ہوتا ہے مگر کھینچنے سے بڑھ جاتا ہے یہی خاصیت زمین میں ہے کہ اس وقت چھوٹی ہے اور اس وقت اس کو کھینچ کر بڑھا دیا جاوے گا۔ اور یہ بات عام طبائع میں بھی محال نہیں بلکہ ممکن ہے چنانچہ محاورات میں بولتے ہیں کہ زمین کی طنابیں کھنچ گئیں معلوم ہوا کہ عوام بھی زمین کو بڑھنے اور کھینچنے کے قابل سمجھتے ہیں بلفظ دیگر یوں کہئے کہ زمین میں تخلخل ہو جاوے گا تخلخل کو حکماء نے بھی ممکن مانا ہے تخلخل کے لفظ سے یہ مضمون سہولت سے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور استبعاد رفع ہو جاتا ہے کیونکہ تخلخل کا امکان ذہنوں میں موجود ہے۔

یہاں سے ایک بات طالب علموں کے کام کی بھی نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں ایک قصہ آتا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے قتل کئے تھے اس کے بعد اس کو کچھ تنبہ ہوا اور خیال ہوا کہ میری مغفرت کیسے ہوگی۔ اس کے دریافت کرنے کے لئے ایک عالم کے پاس پہونچے اور سب واقعہ بیان کیا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں میری مغفرت کی بھی کوئی صورت ہے وہ خفا ہوئے اور کہا کہ ایک ہی قتل دوزخ میں جانے کیلئے کافی ہے چہ جائیکہ ننانوے قتل جاؤ اب کوئی صورت بخشش کی نہیں ہوسکتی اُسے بہت رنج ہوا اور غصہ بھی آیا اور کہا جب یہی بات ہے کہ دوزخ میں جانا ضرور ہے تو آپ کو بھی کیوں چھوڑوں جس نے میرے دل پر نشتر لگایا ہے جہاں ننانوے قتل ہوئے ہیں ایک اور بھی سہی پورے سو بھی کیوں نہ ہو جائیں۔ چنانچہ ان کو بھی قتل کر دیا مگر پھر دل نے نہ مانا اور دوسرے عالم کے پاس پہنچا اور سارا واقعہ بیان کیا کہ ننانوے قتل کئے تھے اور ایک قتل ابھی کر کے آیا ہوں میری مغفرت کی بھی کوئی صورت ہے۔

میں توبہ کرلوں تو میری بخشش ہوسکتی ہے یا نہیں وہ حکیم بھی تھے اور شاید کچھ اس شخص سے کچھ خوف بھی ہوا ہو اس لئے خیال ہوا کہ اس وقت ترہیب کا موقعہ نہیں ہے ترغیب کی ضرورت ہے ترغیب ہی سے اثر ہوگا کہا توبہ سب کی قبول ہے سو قتل کیا اگر ہزار بھی کئے ہوں تب بھی توبہ قبول ہوسکتی ہے تم توبہ کرو مگر تکمیل توبہ کی شرط یہ ہے کہ اس سرزمین سے چلے جاؤ اور کسی نیک بستی میں جاکر رہو اس نے ایسا ہی کیا ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور ایک دوسری بستی کو چلا راستہ میں موت کا وقت آگیا اور ملک الموت علیہ السلام نے اس کی جان قبض کرلی اس وقت اس کو نہایت یاس ہوئی اور کچھ تو نہ ہوسکا اتنا کیا کہ اپنا سینہ اسی بستی کی طرف بڑھا دیا جہاں جانا تھا۔ اب اس کے پاس ملائکہ دونوں قسم کے آئے عذاب کے بھی اور رحمت کے بھی۔ وہ کہتے تھے کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے، اور وہ کہتے تھے ہم لے جائیں گے۔ اخیر اس جھگڑے کے فیصلے کے لئے حق تعالےٰ نے ایک فرشتہ بھیجا اور اس نے کہا اس راستہ کی پیمائش کرو جس بستی کے یہ شخص قریب ہو اسی کا حکم ہوگا واقع میں وہ شخص اپنی بستی کے قریب تھا تو فیصلہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ عذاب ہی کے فرشتے غالب آتے مگر حق تعالےٰ نے خود ہی یہ فیصلہ کیا اور خود ہی اس کی تکمیل بھی فرمادی یہ اس کی نیت کی برکت تھی کہ اس سے جو کچھ ہوسکتا تھا کرچکا اور وہ ارادہ ہے یہ اس کے اختیار سے باہر تھا کہ دوسری بستی میں پہنچ جاوے آدمی کا اختیاری فعل نیت کرتا ہے اور بقدر وسعت کوشش کرتا رہے اس کی تکمیل اور نتیجہ کا متفرع ہوجانا یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں وہ شخص نیت کرچکا اور جہاں تک اس کے امکان میں تھا چل چکا۔ حق تعالیٰ نے اس پر نتیجہ اپنی رحمت سے متفرع فرمایا اس طرح باوجودیکہ وہ اپنی بستی سے قریب تھا لیکن زمین کے اس حصے کو حکم دیا کہ دور ہوجا اور دوسرے حصّے کو حکم دیا کہ قریب ہوجا بس فرشتوں نے پیمائش کی تو وہ اس دوسری بستی سے قریب ثابت ہوا جہاں کو جارہا تھا اور قریب بھی صرف اس قدر کہ اس کا سینہ اس طرف بڑھا ہوا تھا لہذا رحمت کے فرشتے غالب آئے۔ اس قصہ میں بیان کرنا اس بات کا مقصود ہے کہ کوئی طالب علم پوچھ سکتا ہے کہ

وہ دونوں بستیاں کس طرح قریب اور بعید ہوگئیں۔ جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں اور اس میں اشکال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ جس بات کے استحالہ پر کوئی دلیل عقلی قائم نہیں ہے وہ ممکن ہے پھر ممکن کے وقوع میں کیا استبعاد ہے مگر طبیعت چاہتی ہے کہ اس قریب اور بعید ہونے کی کوئی صورت بھی بیان کی جائے جس سے قریب الی الفہم ہوجاوے اور استبعاد بالکل باقی نہ رہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تخلخل اور تکاثف کا حکم ہوا ایک حصہ میں تخلخل ہوا اور اس کی مسافت بڑھ گئی اور دوسرے حصہ میں تکاثف ہوا اس کے اجزاء سمٹ گئے اور مسافت گھٹ گئی پھر بعد میں خواہ ہر حصہ اپنی حالت سابقہ پر لوٹ آیا ہو یا اسی حالت میں رہ گیا ہو اس تقریر سے واقعہ قریب الی الفہم ہوجاتا ہے اور استبعاد رفع ہوجاتا ہے مگر دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ یہی صورت ہوئی تھی صرف احتمال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اس قرب اور بعد کے ہونے کی یہ بھی صورت ممکن ہے سو دفع اشکال کے واسطے یہ احتمال بھی کافی ہے اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ قیامت میں تمام عالم کے حشر کے لئے زمین کافی ہوگی اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس زمین کے اجزاء میں تخلخل ہوجائے گا جس سے اتنی وسعت ہوجائے گی کہ حشر کے لئے کافی ہو اب آگے محشر کے واقعات گنوائے ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے واشرقت الارض بنور ربہا یعنی زمین چمک اٹھے گی خدائے تعالیٰ کے نور سے خود آیت میں ہے کہ یہ نور حق تعالیٰ کی تجلی کا ہوگا۔ دوسری آیت میں حق تعالیٰ کی آمد صاف الفاظ میں ہے ۔ وجاء ربک والملک صفا صفا یہ آیتیں متشابہات میں سے ہیں ان کی حقیقت سے کاوش کرنا ٹھیک نہیں بس سیدھے سیدھے یہ معنی کہے جاویں کہ حق تعالیٰ زمین کی طرف متوجہ ہوں گے اور تشریف لاویں گے یہ تو ترجمہ ہوگیا آیت کا باقی اس کے حقیقی معنی کی نسبت یہی کہیں گے کہ اللہ اعلم بمرادہ بذالک حق تعالیٰ ہی کا کلام ہے اور انہیں کو اس کے معنے خوب معلوم ہیں یہ آیت ایسی ہے جیسے آیت الرحمٰن علی العرش استویٰ ہے کہ اس کے معنی میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ استواء یلیق بہ اس وقت استواء عرش پر ہے

اور اس وقت یعنی قیامت میں زمین کی طرف مجیئ ہو یہ معنی ہیں جاء ربك کے اور اگر مجیٔ سے کیف سمجھ میں نہ آوے تو تقریب الی الفہم کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ جب بادشاہ کے خدم وحشم آتے ہیں تو کہتے ہیں بادشاہ آرہا ہے حالانکہ ابھی بادشاہ نہیں آیا تو ایسی ہی جاء ربك سے معنے مجازی مراد لے لیجئے کہ حق تعالیٰ کے خدم وحشم آویں گے یعنی فرشتے مع جنت اور نار وغیرہ آئیں گے اور عدالت قائم ہوگی اور حساب وکتاب ہوگا مگر اس سے جزماً یہ نہ سمجھا جاوے کہ یہی معنی مراد ہیں کیونکہ متشابہات کے بارہ میں سلف کا مسلک یہی ہے کہ معنی نہ بیان کئے جاویں اور ان کے علم کو حق تعالےٰ کی سپرد کیا جاوے نہ حقیقی معنوں سے بحث کی جاوے نہ مجازی سے بس یہ کہہ کر چھوڑ دیا جاوے کہ اللہ اعلم بمرادہ بذلک مگر متاخرین نے عوام کی وحشت رفع کرنے کے لئے معنی مجازی بیان کرنے کی اجازت دی ہے مگر ان کا مطلب یہ نہیں کہ جو معنی مجازی بیان کئے جائیں ان پر یقین کرلیا جاوے کہ یہی معنی مراد ہیں اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جو واقعات محشر کی آیت میں مذکور ہیں وہ فرضی نہیں ہیں بلکہ واقعی ہیں آج کل اس مذاق کے لوگ بھی بہت ہیں جن کو ان واقعات سے اس قدر استعجاب ہوتا ہے کہ ان کو ناممکن کہدیا ہے اور آیات اور نصوص میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ ترغیب وترہیب کے لئے یہ فرضی باتیں فرمادی ہیں تاکہ جنت کے شوق میں اعمالِ صالحہ کریں اور دوزخ سے ڈر کر معاصی سے باز رہیں اور جو واقعہ قیامت کا بیان کیا جاتا ہے اس کی نظیر مانگتے ہیں۔

صاحبو! بہت سے واقعات وہاں کے ایسے ہیں جن کی نظیر یہاں موجود نہیں ہے کیونکہ دنیا عالم طبائع ہے اور وہاں طبائع کو دخل نہ ہوگا۔ لیکن چونکہ ان کے استحالہ پر کوئی دلیل عقلی نہیں ہے اس واسطے ان کو ممکن کہا جاوے گا اور ممکن کے وقوع کا اگر صحیح دلیل سے دعوےٰ کیا جاوے

ضروری اطلاع :- خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

تو کسی کو اس کی تکذیب کا یا اس میں کوئی اشکال نکالنے کا حق نہیں ہو سکتا لہٰذا ان لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حق تعالے محض ترغیب و ترہیب کے لئے فرضی واقعات بیان فرمائیں جب کلام میں فرضیت پر کوئی لفظ دال نہیں تو ان کو فرضی مثال لکھنے کے لئے کوئی دلیل ہونی چاہیے اور اگر بلا دلیل کسی بات کو فرضی کہا جا سکتا ہے تو اس طرح تو اوامر و نواہی اور احکام سے بھی اطمینان اٹھ جائے گا کیونکہ ممکن ہے کہ یہ بھی سب فرضی باتیں ہوں حالانکہ کوئی مسلمان اس کا قائل نہیں ہو سکتا ووضع الکتاب۔ ترجمہ اور نامۂ اعمال لائے جاویں گے یعنی سب کے ہاتھوں میں دیئے جا دیں گے کیفیت اُن کے دیئے جانے کی دوسری آیتوں میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ نیکوں کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جاویں گے اور بدوں کے بائیں ہاتھ میں یہ نامۂ اعمال کا لایا جانا ایسا ہے جیسے عدالت میں مسل پیش کی جاتی ہے کہ اب اس کے موافق مقدمہ ہوگا اور جرح قدح ہوگی وجیئ بالنبیین۔ ترجمہ۔ انبیاء علیہم السلام کو بھی بلایا جاوے گا یہ ایسا ہے جیسے عدالت میں گواہ بلائے جاتے ہیں۔ و قضی بینھم بالحق وھو لا یظلمون (ترجمہ) اور تمام فیصلے ٹھیک ٹھیک کئے جاویں گے اور کسی کا حق نہیں مارا جاوے گا یعنی یہ نہیں ہوگا کہ کسی نے کوئی نیکی ذرا سی بھی کی ہو اور وہ نامۂ اعمال میں نہ ہو یا کوئی برائی کسی نے نہ کی ہو اور وہ نامۂ اعمال میں درج کر دی گئی ہو بلکہ بمقتضائے سبقت رحمتی علی غضبی ایسا ہوگا کہ ایک نیکی انسان نے نہ کی ہو اور نامۂ اعمال میں درج ہو[1] وہاں داد و دہش اور انعامات بہت ہوں گے بات بات پر رحمت ہوگی، بعضوں کی بخشش صرف اتنی سی بات پر ہو جاوے گی کہ راستہ سے انھوں نے ایک کانٹا ہٹا دیا تھا۔ ایک عورت کی بخشش اس بات پر ہو جاوے گی کہ اس نے ایک کتے کو

[1] مثلاً جن نیکیوں کا ارادہ کیا اور کرنے نہیں پایا جو اعمال بیماری یا سفر میں ناغہ ہو گئے یا اس کے مرنے کے بعد کسی کے بخشنے سے نامۂ اعمال میں درج کر دیئے گئے ۱۲ محمد مصطفےٰ

دیکھا کہ کنوے کے کنارہ پر پیاس کے مارے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے اس کو رحم آیا اور اپنے چرمی موزہ کو اس نے اپنی اوڑھنی میں باندھ کر کنوے میں لٹکا کر پانی نکالا اور اس کو پلایا۔ وہ عورت بدکار تھی لیکن حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے ہماری مخلوق پر رحم کیا ہے لہٰذا ہم اس پر رحم کرتے ہیں۔ یہ دونوں قصے حدیث میں آئے ہیں اور مکشوفات تو ایسے بہت ہیں مثلاً ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ نیکوکار اور پرہیزگار تھا اس کا انتقال ہو گیا کسی نے خواب میں اس کو دیکھا پوچھا کہئے کیسا معاملہ ہوا کہا یہاں مجاہدے اور ریاضتیں تو کچھ کام نہیں آئیں (مطلب یہ ہے کہ ان میں کسر تھی اور وہ اس قابل نہ تھے کہ ان پر بخشش کا استحقاق سمجھا جاوے اس واسطے کہا گیا کہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مجاہدہ وریاضت اور اعمال بیکار چیزیں ہیں ہرگز نہیں۔ یہ ضرور کام کی چیزیں ہیں مگر ایسے اعمال کر کون سکتا ہے۔ جو دربارِ خداوندی میں پیش کئے جاسکیں اس واسطے کہا ہے ؎

بندہ ہماں بہ کہ زتقصیر خویش — عذر بدرگاہِ خدا آورد

(بندہ اچھا وہی ہے جو حق تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار کرتا رہے اور اعتراف قصور کرتا رہے)

ورنہ سزاوار خداوندیش — کس نہ تواند کہ بجا آورد

(ورنہ حق تعالیٰ کی عظمت کے لائق کوئی شخص بھی عبادت نہیں کر سکتا ہے)

غرض اس نے کہا کہ مجاہدے ریاضت تو کچھ کام نہیں آئے مگر حکم ہوا جاؤ کہ تم نے ایک دن ایک بلی کے بچے پر رحم کیا تھا کہ وہ سردی سے کانپ رہا تھا تم نے اس کو لحاف میں لے لیا۔ جاؤ تم کو ہم نے اس کی عوض میں بخشا آدمی کبھی کسی ادنیٰ سے عمل کو بھی حقیر نہ سمجھے کیا خبر کس عمل کو حق تعالیٰ قبول فرمالیں اور بخش دیں۔ حدیث میں ہے یا عائشۃ لا تحقری طاعۃ ونحوہ یعنی اے عائشہ کسی نیک عمل کو حقیر نہ سمجھو الحاصل وہاں بات بات رحمت کا بہانہ ہوگی ہاں یہ نہ ہوگا

کہ بلا کچھ کئے کسی کو پکڑ لیا جاوے یہ معنی ہیں ۔ وھم لا یظلمون کے یعنی کسی کا حق مارا نہیں جاوے گا ۔ یہاں ایک طالبعلمانہ شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ حبط اعمال بالکفر ثابت ہے جا بجا نصوص میں وارد ہے اولئك حبطت اعمالھم وفی النار ھم خالدون ۔ ان ھؤلآء متبر ما ھم فیہ وباطل ما کانوا یعملون ۔ وقدمنا الیٰ ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباء منثورا ۔ وغیرہا من الآیات ۔ تو یہ کہاں صادق ہوا کہ کسی کی نیکی غارت نہ کی جاوے گی ۔ میں کہتا ہوں کہ اس نے دنیا ہی میں خود اپنی نیکی کو غارت کر دیا تھا قیامت کے دن اس کی نیکی غارت نہیں کی گئی اس نے خود دنیا میں اپنے اختیار سے وہ فعل کیا ہے جس کی خاصیت سے دوسرے اعمال غارت ہو جاتے ہیں تو قیامت کے دن وہ خود ہی اپنے اعمال کو غارت کر کے لایا ہے نہ یہ کہ یہاں تو اس کا عمل درست تھا اور وہاں پہنچکر غارت کیا گیا اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک کمہار نے برتن بنائے مگر بناتا گیا اور توڑتا گیا اور فرض کیجئے کہ اس کے واسطے ایک وقت مقرر تھا کہ اس وقت اس کا کام ختم کر دیا جاوے گا ۔ تو اس صورت میں جس وقت اس کا کام ختم کیا جاوے گا ظاہر ہے کہ ایک برتن بھی اس کے پاس نہ ہوگا گو اس نے برتن بنائے ضرور ہیں تو اس حالت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی نے برتن اس کے توڑ ڈالے یا چھین لئے اس واسطے یہ خالی ہاتھ ہے بلکہ یہ کہا جائیگا کہ اس نے خود ہی کوئی برتن باقی نہیں رکھا یہی حالت کافر کی ہے کہ قیامت میں وہ اس واسطے خالی ہاتھ نہ ہوگا کہ کسی نے اس کی نیکیاں چھین لیں بلکہ وہ دنیا میں ان کو خود ہی تباہ کر کے آیا ہے تو لا یظلمون بالکل صادق ہے ایک شبہ تو یہ رفع ہوا ایک شبہ اور ہے وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بھا ومن سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا من عمل بھا او کما قال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ انسان پر بلا کئے ہوئے بھی رکھے جائیں گے ۔ مثلاً قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا تھا ۔ تو حدیث میں آیا ہے کہ قیامت تک جو قتل بھی دنیا میں ہوتا ہے اس کا کچھ حصہ گناہ کا قابیل کو بھی پہنچتا ہے اسی طرح ہر اس

گناہ کا حال ہے جس کی اقتدار دوسروں نے کی ہو تو سوال یہ ہے کہ اس نے کیا کیا تھا۔ دوسروں کے عمل اس پر کیوں ڈالے جاتے ہیں یہ تو وھم لا یظلمون کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس نے کیا کیوں نہیں اس کی اقتدار سے جو گناہ بھی ہوتا ہے اس کا سلسلہ اس تک برابر ملا ہوا ہے اور اس کو ضرور اس گناہ میں دخل ہے اس کی مثال یہ ہے جیسے بچے اینٹوں کی ریل بنایا کرتے ہیں کہ پاس پاس دور تک اینٹیں کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں پھر ایک کو گراتے ہیں اس سے دوسری اینٹ گرتی ہے اور دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی۔ اسی طرح جہاں تک اینٹوں کا سلسلہ ہوتا ہے گرتی چلی جاتی ہیں۔ اب فرض کر لیجئے کہ اخیر اینٹ کے سامنے ایک شیشی رکھی ہوئی ہے وہ اس اخیر اینٹ کے گرنے سے ٹوٹ گئی تو آپ کیا کہیں گے کیا اس کا جرم اس شخص پر جس نے پہلی اینٹ گرائی ہے عائد کریں گے یا نہیں ظاہر ہے کہ ضرور عائد کریں گے حالانکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو وہ اینٹ نہیں گرائی جس سے شیشی ٹوٹی ہے۔ میں نے تو ایک وہ اینٹ گرائی تھی جو شیشی سے بہت دور تھی اس لئے شیشی توڑنے کا الزام میرے اوپر لگانا بلا وجہ ہے اور ظلم ہے کیونکہ جو کام میں نے نہیں کیا وہ میرے ذمہ لگایا جاتا ہے۔ اس کا جواب آپ یہی دیں گے کہ جب تجھے معلوم تھا کہ یہ اینٹیں اس طرح کھڑی ہیں کہ ایک کے گرانے سے یکے بعد دیگرے سب گر جائیں گی حتٰی کہ آخر اینٹ شیشی پر گرے گی پھر جب تو نے ایک اینٹ کو گرایا تو ضرور تو نے ہی شیشی کو قصداً توڑا اسی طرح جب ایک شخص نے گناہ کیا اور وہ جانتا تھا کہ یہ فعل مضر ہے اور دوسرے اس کی اقتدا کریں گے تو وہ قصداً اور ارادتاً ہوا اس گناہ کا جو اس کی اقتدار سے ہوگا سبب بنا تو اب اگر اس کے نامۂ اعمال میں دوسرے اقتدا کرنے والوں کی وجہ سے بھی گناہ لکھا گیا تو بے کئے نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا کیا ہوا گناہ لکھا گیا اس سے دوسرا شبہ بھی رفع ہو گیا یہ درمیان میں دو شبہوں کا ازالہ ہو گیا۔

اصل بیان یہ تھا کہ قیامت کے دن یہ تو ہوگا کہ بعض نیکی بد دن کئے ہوئے

نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی ملیں گی اور یہ نہ ہوگا کہ کوئی نیکی کی ہو اور وہ نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی نہ ملے یہ شانِ رحمت ہے کہ عدل کا معاملہ نہیں فرمایا بلکہ فضل کا معاملہ کیا جائے گا ورنہ یہ ہوتا کہ جیسے کی ہوئی نیکی نامۂ اعمال میں درج ہوتے سے نہ رہتی ایسے ہی کوئی نیکی بلا کئے ہوئے درج بھی نہ کی جاتی جس سے نہ نیکی بڑھتی نہ گھٹتی اور آیت اس معاملہ رحمت کی نفی نہیں کرتی اسی طرح نیکی کے مضاعف ہونے کی بھی نفی نہیں کرتی کیونکہ آیت میں لا یظلمون کا لفظ ہے اس سے یہ مدلول ہے کہ کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی اور اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ حسنات میں کچھ اضافہ بھی نہیں کیا جائے گا کیونکہ دلائل سے ثابت ہے کہ قیامت میں حسنات میں اضافہ ہوگا۔

بیان اس کا یہ ہے کہ معاملات جزا تین قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ظلم اور عدل اور رحمت۔ ظلم یہ ہے کہ کسی کا حق مار لیا جائے اور اس کی کی ہوئی نیکیوں کا اجر نہ دیا جائے اور عدل یہ ہے کہ گناہوں کی سزا دی جائے اور نیکیوں کا اجر برابر سرابر دیا جائے۔ اور رحمت یہ ہے کہ گناہوں کو نظر انداز کیا جائے اور نیکیوں کا اجر بڑھا دیا جائے حق تعالیٰ بندوں پر ظلم تو کیا کرتے عدل کا برتاؤ بھی نہیں کریں گے بلکہ بہت سے گناہوں کو عفو فرمائیں گے اور نیکیوں کا ثواب قانون سے بہت زیادہ دیں گے کہ ایک نیکی دس نیکی کی برابر تو ضرور ہی ہوگی بلکہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن مومنین کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا کہ ان کو بعض وہ نیکیاں نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی ملیں گی جو انھوں نے کی بھی نہیں تھیں اور گناہوں کی بعض کے ساتھ یہ حالت ہوگی کہ اول بندہ کے سامنے چھوٹے گناہ پیش کئے جائیں گے اور بڑے پیش بھی نہیں کئے جائیں گے پھر ان چھوٹوں کی نسبت بھی یہ حکم ہوگا کہ ان کو معاف کر دو اور ان کو نیکی سے بدل دو اب کیا ہے اس وقت یہ حالت ہوگی کہ یا تو ڈر رہا تھا کہ کہیں بڑے گناہ پیش نہ ہوں اور یا جب گناہوں کے عوض نیکیاں ملتی دیکھیں تو خود کہے گا کہ میں نے

تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کئے تھے وہ کہاں ہیں ان کو مجھے کیوں نہیں ظاہر کیا گیا اور اس سے غرض یہ ہوگی کہ جب چھوٹے چھوٹے گناہوں کی جگہ یہ نیکیاں ملی ہیں تو بڑے گناہوں پر ان سے بڑی نیکیاں ملیں گی اس امید میں بے ساختہ کہنے لگے کہ میرے بڑے گناہ کہاں گئے سبحان اللہ کچھ حد ہے رحمت کی اور یہ بھی ہوگا کہ بعضے گناہ وہ ہوں گے جو بندہ نے کئے تھے لیکن وہ نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے نہ ہوں گے۔ پہلی قسم تو وہ تھی کہ گناہ نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے تھے مگر پیش نہیں کئے گئے اور یہ قسم وہ ہے کہ گناہ نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے ہی نہیں ہیں یہ وہ گناہ ہیں جن سے توبہ کرلی گئی ہے اور اہل سنت کی تحقیق تو یہ ہے کہ بلا توبہ بھی عفو ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی گناہ سے توبہ بھی نہ کی ہو اور حق تعالےٰ نے محض اپنی طرف سے اس کو معاف کردیا ہو غرض کس قدر رحمت ہے کہ بہت سے گناہ جو کئے گئے تھے وہ نامۂ اعمال میں نہ ہوں گے اور بہت سی نیکیاں جن کو بندہ نے کیا بھی نہیں وہ نامۂ اعمال میں موجود ہوں گی یہ شانِ رحمت ہے جو عدل سے بالاتر ہے اور ظلم کا تو ذکر ہی کیا۔ آگے فرماتے ہیں ووفیت کل نفس ما عملت وھوا علم بما یفعلون قرآن کا کیا نظم ونسق ہے کہ ایک ہی آیت میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے اس جملہ کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا پوری پوری دی جائے گی اور حق تعالےٰ کو ہر ہر فعل کا علم ہے اس میں ذرا ڈرا بھی دیا گو ہم یہ برتاؤ بھی کریں گے کہ کسی کی حق تلفی نہیں کریں گے اور پورا پورا اجر دیں گے لیکن ہم کو علم سب اچھے بُرے اعمال کا ہے حاکم کا یہ کہنا کہ جو کچھ تم کررہے ہو ہم جانتے ہیں اس میں یہ اثر ہے کہ سننے والے اس سے کانپ اٹھتے ہیں۔ اور چونکہ ترغیب انتہا درجہ کی تھی اس وجہ سے ذرا سی ترہیب بھی شامل کردی تاکہ تعدیل ہوجائے اب سمجھئے کہ یہاں تک جزا و سزا کا بیان اجمالی تھا۔ اب اس تمام قصہ کا نتیجہ بطور تفصیل بیان فرماتے ہیں۔ وسیق الذین کفروا الی جھنم زمرًا۔ اس کا

ترجمہ یہ ہے کہ ہکائے جائیں گے کفار جہنم کی طرف جماعتیں کی جماعتیں سوق کے معنی ہیں زبردستی چلانا اس سے یہ معنی ادا ہوتے ہیں کہ کفار اپنے قصد و اختیار سے جہنم میں نہیں جائیں گے بلکہ جبراً ڈھکیل کے لیجائے جائیں گے جیسے جانوروں کو مار مار کے لے چلتے ہیں اسی طرح فرشتے ان کے پیچھے ہوں گے اور ڈھکیل ڈھکیل کے لے جاتے ہوں گے کہ چلو چلو۔ یہ معنی مفسرین نے لکھے ہیں زمرا کے معنی ہیں جماعت جماعت یعنی کفار کی جماعتیں ہوں گی بڑے کفار آگے ہوں گے اور ان سے چھوٹے ان کے پیچھے اور ان سے چھوٹے ان کے پیچھے دیکھئے شانِ عدل دوزخ میں بھی ظاہر ہوگی کہ کفار میں بھی بقدر مراتب کفر فرق رکھا جائیگا اس کا بیان دوسری آیت میں اس طرح ہے۔ ثم لننزعن من کل شیعۃ ایھم اشد علی الرحمن عتیا فرماتے ہیں کفار کی ہر جماعت سے بھی ہم ان کو الگ چھانٹ لیں گے جو کفر میں اشد تھے اس سے بھی معلوم ہوا کہ کفار کی جماعتیں ہوں گی اور یہ تفصیل بھی معلوم ہوئی کہ بڑے بڑے کفار الگ ہوں گے اور چھوٹے الگ یہی حاصل ہے زمرا کا اور کفار کی سزائیں بھی جو دوزخ کے اندر ہونگی علیٰ قدر مراتب متفاوت ہوں گی گو خلود سب کو ہوگا کیا شان ہے کہ کفر پر بھی سزا دیتے ہیں تو عدل سے دیتے ہیں۔ حتی اذا جاؤھا فتحت ابوابھا۔ ترجمہ یہاں تک کہ کفار جب دوزخ کے پاس پہونچ جاویں گے تو دوزخ کے دروازے کھولے جاویں گے لوگوں نے اس سے استنباط کر کے لکھا ہے کہ دوزخ کے دروازے بند رہتے ہیں اور اس وقت کھولے جاویں گے جب کفار اس کے پاس پہنچ جائیں گے اس میں نکتہ یہ لکھا ہے کہ اس کی گرمی قوی رہے تنور اگر ڈھک دیا جائے تو اس کی گرمی زیادہ ہوجاتی ہے بہ نسبت اس کے کہ کھلا رہے دوزخ مدتوں سے بند ہوگا تاکہ اس وقت دروازے کھلنے سے ایک دم بھپکا نکل کر جُھلس دے ایک گرمی آگ کی اور ایک حبس کی اور دونوں سے سزا مقصود ہے حق تعالیٰ کی یہاں کی چیز۔ بڑی ہے، عذاب بھی ہے تو ایسا ہے کہ اس میں کوئی کسر تعذیب میں نہیں

رہے گی یہ نکتہ تو لوگوں نے بیان کیا ہے اور دوزخ کے دروازے بند ہونے میں ایک نکتہ اور بھی ہو سکتا ہے اور جس سے اس کے متغائر معنے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیان ہے شانِ تعذیب کا اور اس نکتہ ثانیہ کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیان ہے شانِ رحمت کا وہ نکتہ ہے کہ دوزخ کے دروازے اس واسطے بند ہوں گے کہ یہ دکھلا دیا جاوے گا کہ دیکھو ہماری طرف سے اتنی گنجائش دی جاتی ہے کہ پاس پہنچنے تک بھی شاید کسی کو کوئی ٹوٹا پھوٹا ذریعہ نجات کامل جاوے ذرہ برابر ایمان بھی نکل آوے تو وہ بچ جاوے اور جب دروازہ تک پہونچنے پر بھی کوئی ذریعہ نجات کا بہم نہ پہونچا تو اب مجبوری ہے اتمامِ حجّت ہو چکا اور کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے دوزخ سے دور رکھا جہاں تک ہو سکتا تھا بچایا اور پھاٹک بند رکھا مگر کوئی ذریعہ رحمت کا ان کے پاس تھا ہی نہیں۔ اب پھاٹک کھولا جاتا ہے اور ان کو داخل کر دیا جاتا ہے وقال لهم خزنتها الم يأتكم رسل منكم يتلون عليكم ايات ربكم وينذرونكم لقاء يومكم هذا۔ ترجمہ۔ اور دوزخ میں جانے والوں سے خزنۂ جہنم کہیں گے کیا تمھارے پاس تمھارے ہی جنس کے رسول نہیں آئے تھے جو تمھارے سامنے حق تعالیٰ کی آئتیں پڑھتے تھے (یعنی احکامِ الٰہی سناتے تھے) اور اس دن کے دیکھنے سے ڈراتے تھے یہ بھی اتمامِ حجت ہے کہ ان سے اقرار بھی لے لیا جاوے تاکہ وہ نہ کہہ سکیں کہ ہم پر ظلم ہوا اور اس میں اول یا دولایا پیغمبروں کے آنے کو جس کا حاصل یہ ہوا کہ اسباب ہدایت مہیّا تھے مگر افسوس ہے کہ تم نے ان اسباب سے کام نہیں لیا پھر کہتے ہیں منکم یعنی وہ رسول کوئی غیر نہیں تھے تمھارے ہی بھائی بند تھے یعنی فرشتے یا جن نہیں تھے بلکہ از جنس انسان تھے جن سے بوجہ مجانست کے بہت نفع کی امید تھی یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہم ہی میں سے بھیجا کیونکہ مناسبت ہوتی ہے مجانست سے اور نفع موقوف ہے مناسبت پر تو اگر انبیاء علیہم السلام ہمارے مجانس نہ ہوتے تو ان سے اتنا نفع نہ ہوتا یہ عین رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہمارا ہم جنس پیدا کیا یہی وجہ ہے کہ ان کو ہم پر

غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اگرچہ اتمام حجت کے لئے یہ بھی کافی تھا کہ دنیا میں ایک فرشتے کو بھیجدیتے کہ وہ احکام الٰہی سنا دیتا بلکہ اتنا بھی کافی تھا کہ کتاب لکھی ہوئی اتار دیتے کہ لوگ اس میں احکام الٰہی دیکھ لیتے بس تبلیغ ہو جاتی اور اس پر دارو گیر ہو سکتی مگر ایسا نہیں کیا یہ کس قدر رحمت ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک طبیب تو مریض کو ضابطہ کی حد میں کیف ما تفق دوا بتا دیتا ہے اس کا لحاظ نہیں کرتا کہ کڑوی ہے یا میٹھی اور ایک طبیب ایسا شفیق ہے کہ دواؤں میں سے بھی وہ دوا بتاتا ہے جو بدمزہ نہ ہو بلکہ شربت بنا کر پلاتا ہے تو حق تعالیٰ نے اپنے احکام اسی طرح بھیجے ہیں گویا ہم کو شربت بنا کر پلایا ہے چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو جنس انسان ہی سے پیدا کیا جس کا اثر یہ ہے کہ انھوں نے صرف ضابطہ کی تبلیغ نہیں کی۔ تبلیغ بھی کی اور ہدایت کے لئے دعا بھی کی اور دل وجان سے توجہ بھی کی۔ انبیاء علیہم السلام محض منادی نہیں تھے بلکہ تربیت کنندہ اور اتالیق بھی تھے کہ احکام الٰہی کو پہونچایا اور ان پر خود عمل کر کے دکھایا اور نمونہ قائم کیا اور بات بات پر نگرانی کر کے درست کر دیا بلکہ اتالیق بھی نہیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ امت کے باپ تھے کہ ہر وقت ان کو امت کی اصلاح ہی کی فکر رہتی تھی جیسے باپ اولاد کے پیچھے کھپ جاتا ہے اور یہی چاہتا ہے کہ ان میں کوئی کسر نہ رہے۔ انبیاء علیہم السلام نے تبلیغ بھی کی، اصلاح کی تدبیریں بھی کیں اور دعائیں بھی کیں۔ یہ بات اُس صورت میں ہر گز نہ پیدا ہوتی کہ انبیاء علیہم السّلام غیر جنس ہوتے۔ غرض منکم کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ایسے پیغمبر آئے تھے جو تمھارے اوپر نہایت شفیق تھے اور انھوں نے کوئی دقیقہ تمھارے خیر خواہی میں اٹھا نہیں رکھا اب تمھارے پاس کیا عذر ہے۔ اور یتلون مضارع کا صیغہ لایا گیا ماضی کا صیغہ نہیں لایا گیا کیونکہ مضارع کا صیغہ تکرار پر دلالت کرتا ہے کیا معنی کہ انھوں نے صرف ایک دفعہ تبلیغ کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ بار بار تبلیغ کی ینذرونکم یعنی اس دن کی پیشی سے تم کو ڈراتے تھے کہ خدائے احکم الحاکمین کے سامنے جواب دہی کرنا ہوگی اور

اس وقت کوئی عذر وحیلہ نہ ہوگا اور الم یاتکم لبعینہ استفہام لایا گیا بجائے اتاکم کے کیونکہ اتاکم میں صرف اخبار ہوتا جو مقتضی جواب کو نہیں ہوتا اور استفہام مقتضی جواب کو ہوتا ہے ظاہر ہے کہ ایک تو یوں کہا جاوے کہ تمھارے پاس ہمارا پروانہ پہونچا تھا اور تم نے اس کی تعمیل نہیں کی اور ایک یوں کہا جاوے کہ کیا تمھارے پاس پروانہ نہیں پہونچا تھا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اول اس کا جواب دو جب وہ جواب دیگا کہ حضور پہونچا تھا اس کے بعد اس پر یہ الزام متوجہ ہوگا کہ باوجود پروانہ پہنچنے کے تم نے تعمیل حکم کیوں نہیں کی غرض استفہام مقتضی جواب کو ہوتا ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اعتراف کرلیں اور اقراری مجرم ہوجاویں اور یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم کو صرف شہادت سے سزا دی گئی چنانچہ اس استفہام کے جواب میں وہ اقرار کریں گے قالوا بلیٰ کہیں گے ہاں پیغمبر بیشک آئے تھے ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکفرین مگر ہماری قسمت ہی میں عذاب لکھا تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسئلہ جبر سے تمسک کریں گے اور اس طرح اپنی برأت کریں گے کہ ہمارا قصور نہیں کیونکہ ہماری قسمت میں ازل سے یہی لکھا گیا تھا جس کے آگے ہم مجبور محض تھے کیونکہ مسئلہ جبر جو خلاف واقع ہے اور وہ اس لفظ کو قیامت میں کہیں گے جہاں انکشاف حقائق ہوچکا ہوگا اصل یہ ہے کلمہ حسرت کا ہے گو عنوان جبر کا ہے اس کی مثال ہمارے محاورہ میں یہ ہے کہ کسی سے کوئی فاش غلطی ہوجاوے اور اس کی وجہ سے نقصان عظیم اٹھاوے تو وہ اس غلطی سے پچتاہے۔ اور جب لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تجھے کیا سوجھا تھا جو ایسا کام کر بیٹھا تو وہ نہایت درجہ ندامت اور حسرت سے کہتا ہے ، ارے میاں قسمت ہی پھوٹ گئی یہاں بھی ظاہر میں اس کے وقوع کو قسمت کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر مطلب یہ نہیں ہے کہ مسئلہ جبر سے تمسک کرتے ہیں ورنہ یوں کہتے ارے میاں مجھ سے کیا قصور ہوا قسمت میں یہی تھا میں کیا کرتا ان الفاظ کی بندش اور لہجہ بتاتا ہے کہ حسرت کا کلمہ ہے اسی طرح ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکفرین ہے کہ اُس سے مقصود اپنے فعل کو تقدیر پر حوالہ کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اظہار حسرت ہے

قیل ادخلوا ابواب جھنم خالدین فیھا کہا جائے گا یعنی فرشتے کہیں گے اچھا دوزخ میں چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ادخلوا صیغہ امر ہے۔ جو چاہتا ہے استقبال کو جس کے معنے یہ ہوئے کہ اس جواب کے بعد دخول ہوگا اور یہ حکم اس گفتگو کے بعد ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکالمہ اہلِ دوزخ اور فرشتوں میں جہنم کے دروازہ سے باہر ہوگا، گو آیت میں کوئی لفظ قطعی الدلالت ایسا نہیں ہے جس سے کہا جاوے کہ یقیناً اور قطعاً یہ مکالمہ خارج جہنم ہی ہوگا لیکن الفاظ اور ترتیب سے صراحۃً یہی معلوم ہوتا ہے اور کوئی قرینہ اس کے خلاف پر موجود نہیں لہٰذا یہی کہا جاوے گا کہ یہ مکالمہ خارج جہنم ہی ہوگا تو کیسا عدل ہے کہ سزا سے پہلے مجرم سے اقرار لے لیا اور کوئی حجت اس کی باقی نہیں رکھی ابواب جہنم کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جہنم کا دخول جہنم میں دروازوں سے ہوگا۔ یہاں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے اور یہ مضمون اسی آیت کے تحت میں لکھا ہے یا سورۃ حدید میں لکھا ہے کہ پل صراط پر کفار سے عبور نہیں کرایا جاوے گا بلکہ پل صراط پر صرف مومنین اور منافقین اتارے جاویں گے کیونکہ پل صراط کے بارہ میں وارد ہے کہ وہ ایک پل ہے جو جہنم کے اوپر بچھایا جاوے گا اور اس پر چلنے والے بعضے پار اتر جاویں گے (وہ مومنین ہوں گے) اور بعضے پار نہ اتر سکیں گے بلکہ کٹ کر دوزخ کے اندر گر پڑیں گے پس اگر کہا جاوے کہ وہ کٹ کر گرنے والے عام کفار ہوں گے تو ان کے متعلق یہ مضمون کہاں صادق ہوگا ادخلوا ابواب جھنم کیونکہ اوپر سے گرنے والے کو داخل من الوسط کہا جاسکتا ہے داخل من الابواب نہیں کہا جاسکتا ہاں ایک گروہ کفار کا بھی ایسا ہوگا جو صراط پر اتارا جاوے گا اور وہ منافقین کا گروہ ہے اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ صراط جنت کی سڑک ہے کہ اس سے عبور کر کے جنت میں جاسکیں گے تو اس پر چلنے کے مستحق وہی ہوسکتے ہیں جو جنت میں جانے کا ارادہ رکھیں اور وہ مومنین ہیں یا وہ جن میں شبہ ہے مومنین کا یعنی مشابہت ہے مومنین کے ساتھ اور وہ منافقین ہیں جو زبان سے مدعی ہیں مومن ہونے کے مومنین تو حقیقۃً جنت کے مستحق ہیں اور منافقین

صرف ظاہرًا وادعًا چنانچہ اس کا اثر یہ ہوگا کہ مومنین عبور کر جاویں گے اور منافقین کٹ کر جہنم میں گر جاویں گے یہ خلاصہ ہے شاہ صاحب کے تحقیق کا کہ کافر محض جس نے زبان سے بھی ایمان ظاہر نہیں کیا پل صراط پر نہیں چلایا جائے گا بلکہ یہ لوگ ابواب جہنم سے داخل کئے جائیں گے پل صراط پر صرف مومنین چلائے جائیں گے خواہ حقیقی مومن ہوں یا ادعائی

خالدین فیہا حال مقدرہ ہے ادخلوا کی ضمیر انتہٰی سے مطلب یہ ہے کہ جہنم میں جاؤ اس حال میں کہ خلود تمہارے واسطے تجویز شدہ ہے فبئس مثوی المتکبرین۔ ترجمہ۔ پس وہ بری ہے جگہ متکبرین کی۔ یہاں یہ بات قابل غور کرنے کے ہے کہ متکبرین سے مراد کون لوگ ہیں ظاہر ہے کہ وہی کفار مراد ہیں جن کو دروازہ جہنم سے داخل کیا جائے گا کیونکہ ان ہی سے خطاب ہو رہا ہے نیز سب جانتے ہیں کہ دوزخ کفار ہی کی مستقل جگہ ہے گنہگار مسلمانوں کے لئے جہنم مثوی نہیں ہے عارضی جیل خانہ ہے تو ان ہی کو اوپر کفار کہا گیا ہے۔ وسیق الذین کفروا میں اور ان ہی کو یہاں متکبرین کہا گیا اور ظاہر ہے کہ اگر چور کو سزا دی جائے اور یوں کہا جائے کہ چور کی یہ سزا ہے تو علت سزا کی چوری ہی ہوگی اسی طرح جب کہا گیا وسیق الذین کفروا الی جھنم زمرا یعنی کفار جہنم کی طرف ہنکائے جاویں گے تو جہنم میں جانے کی علت کفر ہی کو کہا جاوے گا اور جب کہا گیا فبئس مثوی المتکبرین تو اس برے ٹھکانے پانے کی علت تکبر ہی کو کہا جاؤ نگا اور دونوں جگہ مجرم ایک ہی گروہ ہے تو حاصل یہ نکلا کہ اس گروہ کی اس سزا کی یعنی دخول جہنم کی علتیں دو بیان ہوئیں کفر اور تکبر اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں ایک چیز ہیں یعنی ایک مفہوم کے دو نام ہیں جیسے اسد بھی شیر کو کہتے ہیں اور لیث بھی اُسی کو کہتے ہیں یا دونوں الگ الگ چیز ہیں اور ان میں سے ہر ایک علت ہے دخول جہنم کی غرض ان دونوں میں کیا علاقہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ دونوں مفہوم کے لحاظ سے تو ایک نہیں ہیں کیونکہ کفر اور تکبر کو کسی نے مرادف نہیں کہا باعتبار مفہوم لغوی کے دونوں علیحدہ چیزیں ہیں تو اب یہ کہا جاوے گا کہ دونوں علیحدہ علیحدہ علتیں ہیں دخول جہنم کی لیکن ان دونوں میں ہر ایک مستقل علت نہیں ہے بلکہ ایک علت ہے اور ایک علت العلت بیان اس کا یہ ہے

کہ علت جس سے مراد سبب ہے دو قسم پر ہے ایک سبب اور ایک سبب السبب جیسے امتلاء عروق بھی سبب ہے حمیٰ کا اور عفونت اختلاط بھی سبب ہے حمیٰ کا لیکن عفونت سبب ہے اور امتلا سبب السبب ہے امتلا سے عفونت پیدا ہوتی ہے اور عفونت سے حمیٰ پیدا ہوتا ہے پس امتلا اور عفونت دونوں کو سبب حمیٰ کہہ سکتے ہیں لیکن واقع میں سبب عفونت ہے اور امتلا رسبب السبب ہے اسی طرح کفر اور تکبر دونوں کو سبب کہہ سکتے ہیں دخول جہنم کا لیکن درحقیقت دخول جہنم کا سبب قریب کفر ہے اور تکبر سبب السبب ہے یعنی تکبر سبب ہے کفر کا جو سبب ہے دخولِ جہنم کا اس وجہ سے قرآن میں کہیں تکبر کو علت قرار دیا ہے دخولِ جہنم کے لئے اور کہیں کفر کو اور غور سے دیکھا جاوے تو یہ بالکل واقعی بات ہے کہ کفر اور تکبر میں اصل تکبر ہی ہے اور کفر تکبر کا نتیجہ اور فرع ہے اور کفار کو جہنم میں جو لیجاوے گا تو تکبر ہی لیجاوے گا اس لحاظ سے دخولِ جہنم کے محل میں بئس مثوی المتکبرین کہنا بالکل برمحل ہے جو لوگ کفر میں مبتلا ہیں وہ اس وجہ سے مبتلا رکفر نہیں ہیں کہ حق بات ان کو معلوم نہیں ہوتی اور غلطی سے اس بلا میں پڑجاتے ہیں بلکہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو حق بات کے قبول کرنے میں کسی سے چھوٹا بننا پڑتا ہے اس واسطے باوجود حق کو جاننے کے اس کو قبول نہیں کرتے حق بات اول تو عقل ہی سے معلوم ہوجاتی ہے لیکن اس کو اگر کافی نہ کہا جاوے تو حق تعالیٰ کی یہ بھی رحمت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھیجکر اس کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے ایسا کہ اس میں کوئی خفا باقی نہیں رہا اور انبیاء علیہم السلام کے بعد علماء کے ذریعہ سے اس کو بالکل آشکارا کردیا ہے موٹی بات ہے کہ حجت میں کوئی فریق اہل حق سے کبھی نہیں جیت سکا جب اہل حق ہمیشہ غالب رہتے ہیں تو اس کو قبول نہ کرنے کی کونسی وجہ اور اس کے مقابل باطل کو قبول کرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے بجز تکبر کے کچھ بھی وجہ نہیں کیونکہ اوپر کی تقریر سے جب صاف ظاہر ہوگیا کہ کفار کا باطل کو اختیار کرنا اس وجہ سے نہیں کہ حق بات میں کچھ خفا ہے تو معلوم ہوا کہ باوجود وضوح کے قبول حق سے کوئی اور ہی مانع

ہے وہ مانع سوائے عار کے کچھ نہیں ہے کسی کو اس سے عار آئی کہ آبا اجداد کے خلاف کیسے نیا دین قبول کریں کسی کو اس سے عار ہوئی کہ ایک معمولی اپنے ہی ہم جنس آدمی کے کہنے سے نئی بات کیسے مان لیں چنانچہ قرآن میں بعض کا قول نقل فرمایا گیا ہے ولئن اطعتم بشرا مثلکم انکم اذا لخاسرون اور بعض کو اس سے عار ہوئی کہ ہم معمولی لوگوں کی برابر کیسے بنیں۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قول حق تعالیٰ نے نقل کیا ہے قالوا انؤمن لك واتبعك الارذلون یعنی ہم تمہارا کہنا کیسے مان لیں حالانکہ تمہارے متبعین تو معمولی لوگ ہیں کوئی بڑے مالدار اور رؤسا تمہارے پیرو نہیں۔ یہ حماقت دیکھئے کہ تمول اور ریاست کو اتباع حق کا مدار قرار دیا حالانکہ غور کر کے دیکھئے تو جتنے شرور ہیں وہ ان ہی لوگوں سے شروع ہوتے ہیں جو مالدار ہیں اور امور خیر میں ہمیشہ غربا ہی سبقت کرتے ہیں اس قوم کو قبول حق سے یہ عار مانع ہوا کہ ہم معمولی لوگوں کی برابر کیوں بنیں اور اگر کوئی دلیل ان کے پاس ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام کے مقابلہ میں اس کو ضرور پیش کرتے معلوم ہوا کہ دلیل تو کچھ نہ تھی حق واضح ہو چکا تھا لیکن یہی عار مانع تھی اور کہاں تک حق واضح نہ ہوتا حضرت نوح علیہ السلام تقریبًا ایک ہزار برس اپنی قوم میں رہے اس طویل مدت میں انہوں نے کونسا دقیقہ اظہار حق میں چھوڑ دیا ہوگا۔ حق وہ چیز ہے جو کبھی چھپتا ہی نہیں۔

میں نے ایک مکتوب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا دیکھا ہے جو بیاور ضلع اجمیر کسی کو لکھا تھا اس مکتوب میں یہ الفاظ تھے کہ حق وہ ہے جو مدلول ہو نص کا بلا کلفت مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپس میں کسی بات میں جھگڑتے ہیں ایک فریق کہتا ہے کہ قرآن سے یہ ثابت ہے اور دوسرا فریق کہتا ہے کہ یہ ثابت ہے تو اس میں قول فیصل یہ ہے کہ اپنے اغراض اور خیالات کو الگ کر کے اور ان سے بالکل قطع نظر کر کے دیکھو کہ نص قرآنی کا مدلول بلا کلفت کیا ہے جس میں اینچ پینچ اور تکلف اور تاویل کی بالکل ضرورت نہ ہو بس وہی

حق ہے وہ اپنے خیال کے موافق ہو یا مخالف مطلب یہ ہے کہ حق تو چھپتا ہی نہیں اس کو قصدًا اعراض اور تاویلوں سے چھپایا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی کفر اختیار کرتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ حق اس سے پوشیدہ رہا حق تو پوشیدہ رہنے کی چیز ہی نہیں حق ضرور واضح ہو جاتا ہے لیکن عار سبب ہوتی ہے کفر کا اور عار کی حقیقت تکبر ہے تو تکبر سبب ہوا کفر کا اب تکبر اور کفر دونوں میں علاقہ معلوم ہو گیا وہ یہ کہ تکبر سبب ہے کفر کا اور کفر سبب ہے دخول جہنم کا تو تکبر بھی سبب ہوا دخول جہنم کا لیکن بواسطہ یعنی سبب السبب ہوا اور بنا بر تقریر مذکور متکبرین کے لفظ میں اشارہ ہے تمام عقائد اور اخلاق کی اصلاح کی ضرورت کی طرف کیونکہ استقراء سے تمام خرابی عقائد کی و اخلاق کی تکبر ہی سے پیدا ہوتی ہے اور یہی تکبر اصل ہے ہر ذمیمہ کی اور تکبر کا نتیجہ بیان کیا گیا دخول جہنم تو اس میں ہر بُرے عقیدے اور ہر ذمیمہ کی برائی آ گئی اس کی مثال یہ ہے کہ کہا جاوے کہ میٹھا کھانے سے خون میں گرمی پیدا ہوتی ہے تو اس میں گڑ بھی آ گیا جو جڑ ہے مٹھائیوں کی اور جلیبی بھی آ گئی اور قلاقند بھی چنانچہ سب جانتے ہیں کہ تکبر ہی سبب ہوا ہے ابلیس کے کفر کا اور اس کے ملعون ہونے کا تو خیال کرنے کی بات ہے کہ لوگ کفر سے تو بچتے ہیں اور اس کے نام سے بھی ڈرتے ہیں جو ایک شاخ ہے کبر کی اور کبر سے نہیں بچتے اور اس سے نہیں ڈرتے حالانکہ وہ اصل ہے کفر کی حیرت ہے کہ شاخ سے تو ڈر جائے اور جڑ سے نہ ڈرا جائے یہ ایسا ہوا جیسے کوئی جلیبی اور قلاقند سے تو بچے لیکن گڑ خوب کھا دے۔ کبر دلوں کے اندر ایک چنگاری ہے جو راکھ سے دبی ہوئی رکھی ہے اس کا انتظار نہ کیجئے کہ جب وہ ظاہر ہوگی اور آگ بھڑک اٹھے گی اس وقت بجھا لیں گے کیونکہ جس وقت آگ بھڑک اٹھتی ہے پھر کسی کے بس میں نہیں آتی مال اور اسباب کو تو جلاتی ہی ہے بجھانے والے کو بھی لپیٹ لیتی ہے۔ آگ سے زیادہ چنگاری سے حفاظت کیجئے کیونکہ آگ کی طرف تو التفات ہوتا بھی ہے اور آدمی اس سے ہوشیار

ہو ہی جاتا ہے مگر چنگاری کی طرف التفات کم ہوتا ہے اور وہ دبے ہی دبے اپنا کام کر جاتی ہے تو اس کا انتظار کیوں کیا جائے کہ جب کفر تک نوبت آئے گی اس وقت تکبر کا علاج کرلیں گے پہلے ہی سے اس کی تدبیر کیوں نہ کی جائے تاکہ کفر تک نوبت ہی نہ آئے۔ مولانا کہتے ہیں ؎

علت ابلیس انا خیر بداست   ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

(ابلیس کی بیماری اپنے کو بہتر سمجھنے کی تھی اور یہ مرض ہر مخلوق کے اندر موجود ہے)

اس سے مراد ابلیس کا وہ لفظ ہے جو اس نے اس وقت کہا تھا جب اس کو سجدہ کا حکم ہوا انا خیر منہ یعنی میں آدم سے بہتر ہوں تو اس کو کیوں سجدہ کروں دیکھئے اس کے دل میں ہمیشہ سے کبر تھا اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا جس سے آخر کار نوبت کفر تک آہی گئی چنانچہ خدا تعالیٰ کے حکم کے سامنے انکار سے پیش آیا اور ہمیشہ کے لئے ملعون اور جہنمی ہوگیا مولانا اس واقعہ کو بیان کر کے ہم کو ہوشیار کرتے ہیں۔ ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست۔ مطلب یہ ہے کہ ابلیس کا واقعہ سن کر ہنسو مت اپنی خبر لو۔ کیونکہ وہ مسالہ تمہارے اندر بھی موجود ہے اتنا فرق ہے کہ وہاں اس مسالہ میں رگڑ بھی لگ گئی تھی اور یہاں ابھی تک رگڑ نہیں لگی ہے دیا سلائی تیار موجود ہے رگڑ لگنے کی دیر ہے اور ایک مٹی کے تیل کا پیپہ بھی موجود ہے پھر جہاں دیا سلائی ہو وہاں تو ہر وقت ہی خطرہ ہے کہ خدا جانے کس وقت مسالہ میں رگڑ لگ جائے اور تیل میں آگ لگ کر بھڑک جائے اور سب گھر بار پھونک ڈالے مولانا آگاہ کرتے ہیں کہ تم کو کسی وقت بے فکر نہ ہونا چاہیئے کیونکہ تمہارے یہاں بھی ایک پیپہ مٹی کے تیل کا موجود ہے وہ کیا ہے نفس جس میں ہر وقت استعداد ہے شر کی۔ بس چنگاری پڑنے کی دیر ہے (تم ہو تو مٹی کے مگر تیل کے ساتھ ہو کہ آگ لگی بھڑکی) جب تک تکبر اندر موجود ہے ہرگز کوئی شخص مامون نہیں ہوسکتا۔

مگر عجیب بات ہے کہ یہی سب سے خطرناک چیز ہے اور اسی کا علاج

نہیں کیا جاتا اچھے اچھے نمازی اور پرہیز گار ہیں جن کے لوگ معتقد ہیں مگر ان کے اندر یہ بلا بھری ہوئی ہے اس کو کچھ گناہ اور عیب ہی نہیں سمجھا جاتا معمولی گناہوں سے بچتے ہیں اور کبر جیسے گناہ کی کچھ پرواہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دین نام رکھا گیا ہے صرف اعمال ظاہری کا اور اعمال باطنی کو دین کے اندر داخل ہی نہیں سمجھا جاتا بس نیچا کرتا پہن لیا اور پانچوں وقت کی نماز پڑھ لی اور پاجامہ شرعی پہن لیا اور اپنے آپ کو شبلی وقت سمجھنے لگے خواہ باطنی معاصی میں سر سے پیر تک آلودہ ہوں اور یہ حالت ہو جو ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

از بروں چوں گور کافر پرحلل　　　وا ندروں قہر خدائے عزوجل

(باہر سے مثل کافر کے قبر کے خوب زینت ہے اور اندر خدائے تعالے کا قہر ہو رہا ہے)

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　　وز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے تو ایسے صوفی کہ بایزید بسطامی کو بھی شرمندہ کر دیں اور باطنی حالت اس قدر خراب کہ یزید بھی شرمندہ ہو جائے)

یہ مرض ایسا عام ہوا ہے کہ کوئی بھی اس سے خالی نہیں الا ماشاء اللہ خصوصاً اہل علم کسی نے سچ کہا ہے "آفۃ العلم الخیلا" یعنی علم کی آفت تکبر ہے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ آفت جو علم سے پیدا ہوتی ہے اور ایک یہ کہ وہ آفت جو مانع ہے حصول علم سے کوئی معنی بھی لئے جادیں یہ بات ہر صورت میں صادق ہے کہ تکبر مضر علم ہے چنانچہ جس کے قلب میں تکبر ہے اس کے قلب میں نور علم نہیں ہو سکتا۔ غرض کبر بدترین امراض ہے اور یہ علما کے حصہ میں آیا ہے جاہل بیچاروں میں ایسا بڑا مرض پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اہل علم کا جیسا مرتبہ بڑا ہے ایسے ہی ان کا مرض بھی سب سے بڑا ہے۔ اس لئے ایسے علماء سے جو اس آفت میں مبتلا ہوں جہلا ہی اچھے کیونکہ ان میں اتنا بڑا مرض تو نہیں ہے اور ایسے علم سے جس کے ساتھ تکبر بھی ہو وہ جہل اچھا جس کے ساتھ تکبر نہ ہو اس کو سن کر لوگ کہیں گے کہ علم کی مذمت کر دی حالانکہ علم تو ہر حال میں اچھی

ہی چیز ہے علم ہی ایک روشنی ہے جس سے بھلے بُرے میں امتیاز کیا جا سکتا ہے میں کہتا ہوں کہ عینک اس غرض سے لگائی جاتی ہے کہ آنکھ کی روشنی بڑھے مگر اس سے یہ فائدہ جب ہی تو نکلے گا کہ طریقہ کے موافق استعمال کی جائے ورنہ اگر عینک کو کان پر رکھ لیا جائے تو کیا فائدہ یا اس کے شیشہ پر چونا لپیٹ دیا جائے یا کالک لگا دی جائے تو کیا کام دے سکتی ہے ایسی عینک کے ہونے سے تو نہ ہوتا اچھا کیونکہ وہ تو رہی سہی بصارت کو بھی کھوتی ہے اور خواہ مخواہ کا بوجھ بھی بندھتا ہے یہی حالت علم کی ہے کہ اگر اس کو طریقہ سے استعمال کیا جائے یعنی اس سے اپنے نفس کی اصلاح کا کام لیا جائے تو بہت کام کی چیز ہے اور سراپا نور ہی نور ہے۔ اور اگر اس سے یہ کام نہ لیا جائے بلکہ دوسروں سے لڑنے جھگڑنے بڑا بننے کے لئے استعمال کیا جائے تو بیکار بلکہ مضر ہے۔ تو یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوا کہ علم ہر حالت میں اچھی چیز نہیں بلکہ بعض حالتوں میں قابل مذمت بھی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ بعض ان پڑھ لوگ پڑھے ہوؤں سے اچھے ہیں۔ ان پڑھ لوگوں کے ذہن میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہیں آتا کہ ہم دوسروں سے اچھے ہیں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں ہر وقت یہی بات بھری رہتی ہے کہ ہم دوسروں سے اچھے ہیں ان پڑھ لوگ اتنی بصیرت تو رکھتے ہیں کہ اپنے عیبوں کو جانتے ہیں گو اجمالی ہی کے مرتبہ میں سہی۔ چنانچہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہم جاہل ہیں۔ اور یہ حضرات اتنی بصیرت بھی نہیں رکھتے کہ اپنے عیب کو دیکھ سکیں کہ ہم میں تکبر ہے، حسد ہے، عجب ہے وغیرہ وغیرہ۔

پس وہ اگر چندھے ہیں تو یہ اندھے ہیں، ہم دوسروں کو کیا کہیں خود اپنے ہی آپ کو کہتے ہیں کہ یہ مرض ہم میں موجود ہے۔ مرض کا وجود علامات سے پہچانا جاتا ہے ہم جب کسی سے ملتے ہیں تو ابتدا بالسلام کیوں نہیں کرتے طبیعت اس سے کیوں رکتی ہے کیا یہ اس کی علامت نہیں ہے کہ ہم کو دل میں اپنے بڑے ہونے کا خیال ہے۔ اگر اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھتے تو ابتدا بالسلام سے کیوں عار آتی ہے

پھر جب علامت سے ثابت ہوگیا کہ مرض موجود ہے اور مرض بھی کون سا بدین امراض تو پھر ہم کس بات پر بھولے بیٹھے ہیں اور وہ کونسی خوبی ہے جس کی بنا پر دوسرے سے اپنے آپ کو اچھا سمجھتے ہیں کیا یہ بات قابل اصلاح نہیں ہے ضرور ہے اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ یوں سوچنا چاہیئے کہ تم اگر اس دوسرے شخص سے بڑھے ہوئے ہو جس کو سلام کرنے سے عار آتی ہے تو کس بات میں بڑھے ہوئے ہو. بڑھنے اور گھٹنے کا معیار بھی ہے اگر معیار علم ہے اور وہ تم میں موجود ہے اور اس میں نہیں ہے تو خیال کرو کہ علم فی نفسہ مقصود چیز نہیں بلکہ علم صرف اس وجہ سے مقصود ہے کہ وہ عمل کا ذریعہ ہے تو جب تم دوسرے سے ملے تو اس وقت کا عمل سلام کرنا ہے اور وہ تم نے نہیں کیا تو تمہارا علم بیکار رہا کیونکہ موصل الی المقصود نہ ہوا جب بیکار رہا تو باعث فضیلت بھی نہ ہوا تو تم اس سے بڑھے ہوئے نہ ہوئے بلکہ گھٹے ہوئے ہوئے۔ اور اگر معیار فضیلت مال ہے تو اگر اس کے پاس مال تم سے کم ہے اور تمہارے پاس مال اس سے زیادہ ہے تب بھی تعلقات قائم رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ مال کی ترقی یا بقا تجارت سے ہوتی ہے اور تجارت گو روپیہ سے ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے تعلقات بڑھانے کی ضرورت ہے اور سلام ایک عمدہ ذریعہ ہے تعلق بڑھانے کا بس یہ بھی اسی بات کا مقتضی ہے کہ تم ہی اس کو سلام کرو غرض آدمی کو اگر اپنی اصلاح کا خیال ہو تو ہر حال میں کوئی نہ کوئی وجہ اور صورت نفس سے تکبر چھوڑانے کی نکال سکتا ہے یہ سب باتیں سمجھ دار آدمی کے لئے ہیں اور عمل کرنے والے کے لئے ورنہ مناقشہ اور جھگڑا کرنے کو تو بڑی گنجائش ہے۔

ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ راستہ میں ان کی ایک جاہل آدمی سے ملاقات ہوئی انھوں نے اُسے سلام نہیں کیا یہ مرض اہل علم میں ہوتا ہی ہے اس وقت اسی کا بیان ہو رہا ہے اس جاہل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیا آپ نے کتاب میں ابتدا بالسلام کرنے کی فضیلت نہیں پڑھی انھوں نے جواب دیا کہ ہاں پڑھی ہے مگر قاعدہ یہ ہے کہ چھوٹا آدمی بڑے کو سلام کرے تم جاہل ہو ہم عالم ہیں لہذا

تم چھوٹے اور ہم بڑے تم کو چاہیئے تھا کہ ہمیں سلام کرتے ان دونوں میں گفتگو بہت بڑھ گئی حتی کہ وہ شخص ان کو پکڑ کر ان کے استاد کے پاس لے گیا اور سارا قصہ سنایا استاد نے طالب علم صاحب سے کہا کہ بھائی یہ قضیہ مسلم سہی کہ چھوٹا آدمی بڑے کو سلام کرے مگر تم کو یہ سوچنا چاہیئے تھا کہ بڑا اور چھوٹا ہونا اپنے خیال کا معتبر نہیں ممکن ہے حق تعالیٰ کے نزدیک وہ بڑا ہو استاد نے یہ سچی بات کہی اور صحیح تعلیم دی مگر طالب علموں کی ذہانت دیکھئے آپ فرماتے ہیں کہ یہی بات تو اس جاہل کو بھی سمجھنا چاہیئے تھی کہ ممکن ہے عند اللہ میں بڑا ہوں لہذا اس کو ابتدا بالسلام کرنا چاہیئے تھی۔ دیکھئے کیا جواب دیا ہے کہ جاہل تو جاہل استاد کو بھی بند کر دیا حاصل یہ کہ قیل و قال اور بحث مباحثہ کو تو بہت گنجائش ہے اور کوئی بات ایسی نہیں جس کا جواب نہ ہو سکے مگر اس سے کام نہیں چلتا اور یہ طریقہ کچھ مفید نہیں یہ طریقہ دنیا کے تو کسی کام میں اختیار کر کے دیکھئے معلوم ہو جائے گا کہ اس سے کیسا کام چلتا ہے۔ مثلاً کھانا پکانا سیکھتا ہو اور کسی کو اس کام کے لئے استاد بنایا وہ کہتا ہے کہ شوربے میں اتنا مسالہ اور اتنا نمک اور اتنا پانی ڈالو آپ بجائے اس کی اطاعت کرنے کے قیل و قال شروع کر دیں اور ذہانت سے کام لینے لگیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ اتنا پانی اتنا ہی مسالہ اتنا ہی نمک چاہیئے ہم یوں کیوں نہ کریں کہ جتنا پانی بتایا ہے اتنا ہی نمک ڈالدیں تو اس قیل و قال سے جیسا کھانا پکے گا معلوم ہے گو استاد آپ کی ذہانت کے سامنے لاجواب ہو جاتے لیکن ہے یہی بات کہ یہ طریقہ مفید اور موصل الی المطلوب نہ ہوگا اس قیل و قال سے کچھ کام نہیں چل سکتا مفید طریقہ یہی ہے کہ استاد کے بتانے کو بے چون و چرا تسلیم کر لو اور ذہانت کو چھوڑ دو پھر دیکھو کہ کھانا پکانا کیسے جلدی آتا ہے اور کھانا کیسے مزیدار پکتا ہے۔

جو آدمی کام کرنے والا ہوتا ہے وہ قیل و قال میں کبھی نہیں پڑا کرتا اس کی نظر کام پر ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح تہذیب نفس میں مشغول ہونے والے کو دوسرے کو

الزام نہیں دینا چاہیے کیونکہ یہ طریقہ مفید نہیں اگر دوسرے کو الزام دے بھی دیا تو اسکا کام کیا ہوا یعنی اس کو تہذیب نفس کیا حاصل ہوئی یہ تو ایسی بات ہوئی جیسے ایک شخص بتلائے کہ تمھارے منہ پر کالک لگ گئی ہے اور یہ سننے والا بجائے اپنی کالک چھوڑانے کے اس کو الزام دینے لگے کہ تیری بھی تو ناک ٹیڑھی ہے یہ بات اگرچہ واقع میں سچی بھی ہو اور الزام بیجا نہ ہو تب بھی یہ دیکھو کہ تم کو اس الزام سے کیا نفع ہوا جو شخص نفس کی تربیت کرنا چاہتا ہے اسے دوسرے کو الزام دینے کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہیے۔ اگر دوسرا کسی بات میں گھٹا ہوا بھی ہے تب بھی اس کو اس کے مقابلہ میں اپنے نفس کو بڑھالے سے کیا فائدہ اس صورت میں اس نے نفس کی تربیت نہیں کی بلکہ ایک برائی زیادہ کرلی اور حاصل یہ ہوا کہ پہلے تو شاید اس دوسرے شخص سے کسی بات میں بڑھا ہوا بھی ہو لیکن اب یعنی جبکہ اپنے نفس کو اس سے بڑا سمجھا یقیناً اس سے گھٹ گیا دوسرے کو الزام دینے کا یہ نتیجہ ہوا اب بتلایئے یہ طریقہ مذکورہ صحیح ثابت ہوا یا یہ طریقہ آیندہ کہ ہر شخص ہر بات کو تحقیق کی نظر سے دیکھے اور دوسرے کو الزام دینے سے قطع نظر کرلے اگر کسی بات میں دوسرے کو گھٹا ہوا دیکھا ہے تو اس وقت یہ سوچے کہ ہم بھی کسی بات میں اس سے گھٹے ہوئے ہیں یا نہیں کیونکہ ہر شخص میں کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ برائیاں بھی اگر اس شخص میں ایک برائی ہے تو ممکن ہے کہ ہم میں بہت سی برائیاں ہوں یا ایک ہی برائی ہو لیکن اس کی برائی سے بدتر ہو پھر کس طرح اس کو ہم گھٹا ہوا سمجھتے ہیں اور کیوں دوسرے کو اپنے آپ سے کم درجہ سمجھ کر سلام میں ابتدا کرنے سے عار آتی ہے میں نے تدبیر بتادی اس رذیلہ کے نکالنے کی لیکن یہی مقدمات ہیں جن سے آدمی یہ مفید کام بھی لے سکتا ہے اور اچھا اور کارآمد نتیجہ نکال سکتا ہے اور یہی مفید مقدمات ہیں کہ اگر ان کو اس طالب علم کی طرح الٹی ترتیب دے دی جائے تو نتیجہ غیر مفید اور برا نکل سکتا ہے جیسا اس طالب علم نے کہا تھا کہ جیسا مجھے کہا جاتا ہے کہ یوں سمجھو کہ ممکن ہے واقع میں وہ جاہل اچھا ہو ایسے ہی اس جاہل سے بھی تو کہنا چاہیے کہ یوں سمجھ کہ ممکن ہے واقع میں ہر طرح مجھ سے میں بڑھا

ہوا ہوں لہٰذا وہ مجھے سلام کرے دیکھئے یہ وہی مقدمات ہیں جن کا حاصل یہ تھا کہ ہر شخص میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی ان سے ایک طرح تو مفید اور نہایت کارآمد نتیجہ نکلا تھا اور انہی سے اسی ترتیب کے ساتھ ایسا برا اور مضر نتیجہ نکلا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طالب علم نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غلط ہے غرض ہم لوگ دوسرے کو اپنے سے کم ثابت کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی برائی اس کی تلاش کر لیتے ہیں اور اس میں جو بھلائی ہوتی ہے اس پر نظر نہیں کرتے۔

بجائے اس کے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیبوں پر نظر ڈالو اور دوسروں کے ہنروں پر اپنے اندر ہزار ہنر ہوں تو ان کو مت دیکھو اور ایک بھی عیب ہو تو اس کو دیکھو اور دوسرے میں ہزار عیب بھی ہوں تو ان کو مت دیکھو اور ایک بھی ہنر ہو تو اس کو دیکھو نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو اس سے ہر حال میں کم سمجھو گے اور اس کو خود سلام کرو گے تو کبر تمہارے پاس بھی نہیں آئے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر تم میں ہزار ہنر ہیں اور ایک عیب ہے تو اس طریقہ سے اس ایک عیب سے بھی نظر نہ چوکے گی اور کبھی نہ کبھی وہ عیب بھی تم میں سے نکل جائے گا اور تم سراپا ہنر ہو جاؤ گے یہ طریقہ اچھا ہے یا وہ طریقہ اچھا ہے کہ دوسروں ہی کے عیبوں کو دیکھتے رہو اور اس میں پڑ کر اپنے عیب سے غافل رہو تاکہ دوسرے اور عیب بھی تم میں پیدا ہوتے جائیں اور رفتہ رفتہ سراپا عیب بن جاؤ سمجھدار اور عمل کرنے والے کے لئے ان ہی مقدمات میں سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے اور قیل و قال کرنے والے اور حجتیں چھانٹنے والے کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا کیونکہ یہی مقدمات وہ بھی پیش کرتا ہے بات یہ ہے کہ جس کو خود اصلاح منظور نہ ہو اس کو کیونکر سمجھایا جائے غرض یہ آفت اور کج روی سب میں ہے اہل علم بھی اس سے خالی نہیں بلکہ ان میں یہ مرض عوام سے زیادہ ہے ہم خود اپنے آپ ہی کو کہتے ہیں کہ ہم ابتداء بالسلام نہیں کرتے اس کا منشا وہی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے یا راستے میں علو چاہتے ہیں! جدھر کو نکلیں نظریں ہم پر اٹھ جائیں یہ سب بڑا

بنتا اور کبر ہی ہے اور بعض وقت راستے میں اس طرح دبے ہوئے اور جھکے ہوئے چلتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ بڑے متواضع ہیں حالانکہ دل میں یہ ہوتا ہے کہ اسی متواضعانہ ہیئت کو دیکھ کر لوگوں کی نظریں ہماری طرف اٹھیں یہ ایک کبر دقیق ہے اس کا پتہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مقولے سے چلا فرمایا تھا کہ بعض کبر بصورت تواضع ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض متقنعین میں دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی مجمع میں پہنچے تو صف نعال میں بیٹھ گئے اس کے سوا کوئی جگہ ہی نہیں اختیار کرتے لوگ جانتے ہیں کہ یہ فلاں شخص ہیں یا وضع قطع اور صورت وشکل سے بھی سفید پوش اور شریف پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے کی صورت چھپتی نہیں ہے اب لوگ اصرار کرتے ہیں کہ حضرت یہاں تشریف لایئے صدر مقام پر بیٹھئے، آپ کہاں بیٹھ گئے ہم سب کو شرمندہ کر دیا یہ جگہ آپ کے بیٹھنے کی نہیں ہے آپ کو خدا تعالےٰ نے بڑا رتبہ دیا ہے مگر یہ ہیں کہ جوں جوں اصرار ہوتا جاتا ہے اور اسی جگہ پر جمے جاتے ہیں اور نہایت عاجزی سے کہتے ہیں کہ بھائی میں تو اس جگہ کے بھی قابل نہیں من آنم کہ من دانم سفید کپڑوں کو یا ظاہری تقدس کو مت دیکھو اندر تو میرے سارے عیب ہی بھرے ہوئے ہیں (سچ کہتا ہے واقعی سارے عیب ہی بھرے ہوئے ہیں کیونکہ ام العیوب یعنی کبر موجود ہے) کتنا ہی کہیے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے بلکہ اور نیچے کو کھسکتے جاتے ہیں یہ وہی کبر ہے جس کو مولانا نے فرمایا کہ بعض کبر بصورت تواضع ہوتا ہے صورت تو ایسی کہ بالکل سراپا تواضع معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ ہم کو متواضع سمجھیں اور اس طرح ان کے دلوں میں ہماری وقعت اور بڑائی آجائے تو بڑائی مقصود ہوئی نہ تواضع یہ کبر بڑا خطرناک ہے یہ اس کبر سے اشد ہے۔ جو بعض دنیا داروں میں ہوتا ہے کہ کھٹ پٹ کرتے ہوئے آئے اور سب سے اونچی جگہ بیٹھ گئے۔ یہ بھی کبر ہے مگر دونوں میں فرق ہے اس سے نیچے بیٹھنے والے کا کبر اشد ہے کیونکہ وہ چھپا ہے اور یہ ظاہر ہے اور تپ دق اور پرکے بخار سے زیادہ خطرناک ہے دوسرے اس لئے اشد ہے

کہ یہ فعل یعنی صف نعال میں بیٹھ جانا اور تواضع کی صورت اختیار کرنا محمود عند الناس ہے اس سے زیادہ رفعت حاصل ہونے کی امید ہے اور اسی واسطے اس کو اختیار کیا جاتا ہے اور اس شخص کی وضع جو کہ خود آ کر اونچی جگہ پر بیٹھ گیا ہے لوگوں کے نزدیک بھی محمود نہیں اس سے اتنی رفعت حاصل ہونے کی امید نہیں جتنی اس میں تھی تو وہ کبر اہوا اس کے سے اور ایک وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی وضع قائم رکھنے کے لئے اپنے بھائی کا کہنا نہ مانا یہ صف نعال میں دوسروں کی دل شکنی کر کے اس لئے بیٹھتا ہے کہ اپنی وضع میں فرق نہ آجائے اور کوئی یوں نہ کہے کہ یہ تو فرش پر بیٹھے والے تھے کرسی پر کیوں بیٹھ گئے یہ شخص آن پرست بعض لوگوں کو وضعداری میں اس قدر غلو ہوتا ہے کہ اس کے لئے رقمیں خرچ کرتے اور دقتیں اٹھاتے ہیں مگر اپنی وضع میں فرق نہیں آنے دیتے حقیقت اس کی محض کبر ہے کہ ہم اتنے بڑے ہیں کہ کوئی ہم سے ہماری وضعداری نہیں چھڑا سکتا یہ سب شیطانی دھندے ہیں۔ وضع کیا چیز ہے اور قطع کیا چیز ہے اور آن کیا چیز ہے اپنے آپ کو اتنا بڑا ہی کیوں سمجھے کہ اس کے لئے کوئی خاص وضع مقرر ہو بندہ کا حق تو یہ ہے کہ جس وردی اور جس وضع میں سرکار رکھیں اسی میں رہے اپنی رائے اور ارادے کو بالکل فنا کر دے ادنیٰ حالت میں رکھیں تو ادنیٰ حالت میں رہیں اور اعلیٰ حالت میں رکھیں تو اعلیٰ حالت میں رہیں نہ اعلیٰ کو خود اختیار کرے نہ ادنے کو یہ ہے تواضع حقیقی ورنہ پھر یوں کہنا چاہیئے کہ بنی اسرائیل بڑے متواضع تھے کہ انھوں نے ایک اعلیٰ درجہ کے کھانے کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ کے کھانوں کو اختیار کیا تھا ان پر حق تعالٰے نے اپنے فضل سے من وسلوٰی اتارا تھا اور یہ وہ اعلیٰ درجہ کی غذا ہے کہ بڑے بڑے آدمیوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی ان کو شیرینی ترنجبین کی ملتی تھی اور نمکین غذاؤں کا گوشت ملتا تھا اور لطف یہ کہ یہ چیزیں خود بخود ان کے پاس آجاتی تھیں ان کو کچھ خرچ کرنے اور محنت ومشقت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ظاہر ہے کہ یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے بطور امتنان کے متعدد جگہ فرمایا ہے و انزلنا علیکم المن والسلوٰی مگر انھوں نے اس حالت کو پسند نہیں کیا اور یہ کہا لن نصبر

علیٰ طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلها وقثاء ها وفومها وعدسها وبصلها ط یعنی ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے خدا تعالیٰ سے کہیے کہ ہمارے واسطے کچھ سبزئیں زمین سے پیدا کرے جیسے ترکاریاں اور کھیرے اور گیہوں اور مسور اور پیاز تو ان کے اس فعل کو بھی تواضع کہنا چاہیے کیونکہ انھوں نے اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ کو اختیار کیا جیسے وہ صف نعال میں نعال میں بیٹھنے والا باوجود لوگوں کے اصرار کے ادنیٰ جگہ کو اختیار کرتا ہے مگر دیکھیے اس کی نسبت ان کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا فرماتے ہیں قال اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیرط یعنی فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا بدلتے ہو تم ایک اعلیٰ درجہ کی چیز کو ادنیٰ درجہ کی چیز سے یہ بطور انکار کے فرمایا معلوم ہوا کہ ان کا یہ فعل پسند نہیں ہوا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ تواضع یا زہد صفت محمود ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر انکار فرما رہے ہیں معلوم ہوا کہ ان کا یہ فعل تواضع اور زہد میں داخل نہ تھا ورنہ آپ اس پر کیوں انکار کرتے۔ پیغمبر سے زیادہ تو کوئی صاحب بصیرت نہیں ہو سکتا اس سے صاف معلوم ہوا کہ بعض وہ فعل بھی جو صورتاً تواضع ہوتے ہیں حقیقۃً نہیں ہوتے اس سے مولانا کے اس مقولہ کا ثبوت واضح ہو گیا کہ کبھی کبر بصورت تواضع بھی ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے اس سوال کے الفاظ ہی بتلا رہے ہیں کہ یہ زہد اور تواضع نہ تھا بلکہ ایک شرارت اور حق تعالیٰ کی نعمت سے اعراض تھا۔ دیکھیے پیغمبر کے سامنے کہتے ہیں لن نصبر علیٰ طعام واحد یعنی ہم سے یہ ہرگز نہ ہو گا کہ ایک ہی کھانے پر بس کریں اگر یہ تواضعاً کہا جاتا تو اس کے لئے ایسے الفاظ ہوتے کہ حضرت ہم اس قیمتی اور اعلیٰ غذا کے قابل نہیں ہیں۔ ہمارے نفس اس سے پھول جائیں گے اس لئے خدا تعالیٰ سے دعا فرما دیجئے کہ ہمیں کوئی اور چیز دیں جو ہماری حیثیت کے لائق ہو لیکن نہیں انھوں نے بجائے عاجزی کے کلمات کے ایک نہایت سخت لفظ کہا جس میں تمرد پایا جاتا ہے کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے کہ ایک ہی کھانا کھاتے رہیں۔ تواضع تو عبودیت کا شعبہ ہے جس کو عجز و نیاز لازم ہے عاجزانہ الفاظ ایسے نہیں ہوتے غرض یہ فعل تواضع نہ تھا اسی واسطے حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے اس فعل پر انکار کیا اور آگے دیکھیے حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر کیا انعام ملا فرماتے ہیں وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ یعنی ان کے لئے مقرر کردی گئی خواری اور محتاجی اور انھوں نے خدا تعالیٰ کا غضب اپنے اوپر لیا یہ اس تواضع کا انعام ملا حالانکہ تواضع تو بڑی چیز ہے جس کا صلہ یہ ہے من تواضع للہ رفعہ اللہ یعنی جو کوئی تواضع اختیار کرتا ہے اس کو حق تعالیٰ رفعت اور بلندی دیتے ہیں اور یہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو ذلت اور پستی دی گئی معلوم ہوا کہ یہ فعل ان کا تواضع تھا ہی نہیں لیجئے خود حق تعالیٰ کے قول سے اس مقولہ کی تصدیق ہوگئی کہ بعض تواضع حقیقت میں تکبر ہوتا ہے تکبر اور عبودیت دو متضاد چیزیں ہیں اگر عبد بنتا ہے تو اپنی رائے کو چھوڑ دینا چاہئے یہ بھی اپنی رائے ہے کہ ایک وضع اختیار کرلی ہے جس کو کوئی چھوڑا ہی نہیں سکتا یہ تواضع نہیں ہے علیٰ ہذا بعضوں نے زہد کو اپنی وضع بنایا ہے کہ کھانے کی کوئی چیز چھوڑ دی ہے۔

مثلاً اناج نہیں کھاتے یہ بھی صورتاً زہد ہے اور حقیقت میں وہی تکبر ہے جس سے صرف یہ مقصود ہے کہ شہرت ہو کہ شاہ صاحب ایسے کامل ہیں کہ دنیا سے کچھ تعلق ہی نہیں رکھتے حتیٰ کہ اناج نہیں کھاتے ایسی ضروری اور محبوب چیز کو خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ صاحبو غور سے دیکھیے تو شاہ صاحب نے اناج کو خدا تعالیٰ کے لئے نہیں چھوڑا بلکہ نفس کے لئے چھوڑا ہے تاکہ یوں کہا جائے کہ شاہ صاحب بڑے کامل زاہد ہیں یہ حب جاہ ہے جو امراض میں سے ہے یہ زہد نہیں ہے جو عملاً کمالات میں سے ہے زہد کے معنے یہ نہیں ہیں کہ خدا نعمت دے اور اس کو استعمال نہ کرے دیکھیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں خلق لکم مافی الارض جمیعًا یعنی خدا تعالیٰ نے تمہارے واسطے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں یہ کیسی عبودیت ہے کہ خدا تعالیٰ تو فرما دیں کہ یہ چیزیں تمہارے واسطے ہیں اور تم ان سے منہ پھیر لو ایسے شخص کو جو اناج نہیں کھاتا یہ چاہیئے کہ اس آیت کی تفسیر میں ایک استثنا بڑھا دے الا اناج کہ اور سب چیزیں تو پیدا کی ہیں ہمارے واسطے مگر اناج یہ اچھی عبودیت ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں بھی اصلاح کی نوبت آگئی۔ حضرت عبودیت کا خلاصہ اپنی رائے کو فنا کر دینا ہے اور اپنی رائے کو کچھ سمجھنا یہ عبودیت کی ضد اور تکبر ہے۔

بس بندہ کی شان تو یہ ہے کہ کسی بات میں بڑا بننے ہی نہیں جس چیز میں ذرا سا بھی تکبر پائے اس سے دور بھاگے۔ اگر ململ پہننے سے تکبر ہوتا ہے تو وہ نہ پہنے۔ اور گاڑھا پہننے سے تکبر ہوتا ہو تو وہ نہ پہنے۔ کبھی گاڑھا پہننے سے بھی تکبر ہوتا ہے اور وہ تکبر اس تکبر سے گاڑھا ہوتا ہے جو ململ سے ہوتا ہے جیسا ململ پتلا ہے ایسا ہی اس کا تکبر بھی پتلا ہوتا ہے جہاں گاڑھا پہننے سے مقصود یہ ہے لوگ یوں کہیں کہ شاہ صاحب بڑے متواضع ہیں بڑے زاہد ہیں اور اس سے شاہ صاحب کا نفس پھولنے لگے میں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت گاڑھے سے وہ ململ ہی اچھی ہے اس وقت یہ گاڑھا حق تعالیٰ کو پسند نہیں ململ پسند ہے۔
خلاصہ یہ کہ ایک کبر بشکل کبر ہوتا ہے اور ایک کبر بشکل تواضع ہوتا ہے اور یہ اہل علم میں زیادہ ہوتا ہے اور یہ ایسا مخفی کبر ہے کہ اس کا پتہ دوسروں کو تو کیا صاحب مرض کو بھی نہیں چلتا عوام تو علما کے ساتھ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں کہ علم کا نام آتے ہی ان کی ہر بات کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں اور یہ عالم صاحب حقیقت سے ناآشنا اپنے افعال کی صورت اچھی پاکر مطمئن ہیں کہ ہم عالم باعمل ہیں تواضع ہم میں موجود ہے زہد ہم میں موجود ہے حالانکہ تواضع ہے نہ زہد صرف تکبر ہی تکبر ہے اگر کسی حقیقت شناس کے پاس بیٹھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ کیا ہے کچھ تو یہ خود اس غلطی میں مبتلا ہیں اور کچھ لوگوں کے منہ سے تعریف سن سن کر ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ کوئی بات تو ہے جو ہماری تعریف کی جاتی ہے غرض سراپا مریض ہو گئے اور مرض کے ساتھ خدانخواستہ یعنی سُن کا مرض بھی ہو گیا کہ مرض کا حس باقی نہیں رہا بلکہ حس الٹا ہو گیا کہ مرض کو صحت سمجھنے لگے یہی وجہ ہے کہ آجکل اس بات کو علما کے کمالات میں سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی غلطی ہو جاوے تو اس سے علی الاعلان رجوع نہ کیا جاوے اس کی ہمت نہیں ہوتی بلکہ ایک تاویل سے اخفاء کی ضرورت ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ اگر علی الاعلان رجوع کیا جاوے گا تو عوام کے ذہن سے ہماری وقعت اٹھ جائے گی اور ان کے ذہن میں یہ بات آجائے گی کہ ان کو کچھ علم نہیں ہے اور آئندہ کے لئے ہمارے فتوے کا اعتبار نہ کریں گے پھر شریعت کا حکم ان کو کیسے معلوم ہوگا اور ہدایت کیسے ہو سکے گی گویا مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ ہیں کہ ان کو علم سے محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ

یہ مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں ہے بلکہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اپنے نفس کی خیر خواہی ہے فقط یہ منظور ہے کہ ہماری وقعت اور جاہ میں فرق نہ آوے اور ہم بڑے بنے رہیں اور اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اپنے ایک بزرگ سے غلطی ہوگئی ہو اور ان کو واضح بھی ہوگیا ہو کہ یہ غلطی ہوئی ہے لیکن معتقدین اس کو غلطی نہیں کہتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اس کا ثواب ہونا ثابت کردیں اور بات بنے یا نہ بنے مگر اس کی پرورش کئے جاویں گے اور اس غلطی کی پرورش کو بزرگوں کی نصرت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نصرت جائز نہیں کیونکہ نصرت حق کی چاہیے نہ کہ باطل کی یاد رکھو کہ ایک غلطی تو وہ ہوئی جو ان بزرگ سے ہوئی تھی اور دوسری غلطی یہ ہے کہ آپ اس کو نباہ رہے ہیں اور یہ آپ کی غلطی اشد ہے پہلی غلطی سے کیونکہ وہ تو نادانستگی سے ہوئی اور یہ دیدہ و دانستہ ہے یا یہ کہو کہ وہ خطا ہے اور یہ عمد اور غور کیا جاوے تو در حقیقت یہ ان بزرگ کی نصرت ہے ہی نہیں بلکہ ان پر کبر کی حمایت ہے حقیقت اس کی یہ ہے کہ نفس رائے دیتا ہے کہ اگر اپنے بزرگ کی غلطی تسلیم کرو گے تو اس سے اپنی حماقت ظاہر ہوگی کیونکہ سننے والے کہیں گے کہ یہ بھی اچھے شخص کے معتقد ہیں جس سے ایسی ایسی غلطیاں ہوتی ہیں بس یہ حقیقت ہے اس نصرت کی کہ نفس نسبت الی الحماقت سے بچنا چاہتا ہے مگر اس کے واسطے یہ مقدمات سوجھاتا ہے کہ وہ بزرگ ہیں ان کی نصرت خدام کے ذمہ ہے ایک ادنیٰ مسلمان کی نصرت بھی مسلمان کے ذمہ حق ہے چہ جائیکہ ایک بڑے بزرگ کی یہ دھوکہ ہے نفس کا کہ ایک بری بات کو ایسی اچھی صورت پہنا دی ہے مگر حقیقت اس کی وہی ہے کہ نفس نسبت الی الحماقت سے بچنا چاہتا ہے اور ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اس واسطے یہ الٹی سیدھی ہانکے جاتے ہیں کیا ٹھکانا ہے اس دھوکہ کا کہ بڑا گہرا دھوکہ ہے اور بہت سی تہوں میں لپٹا ہوا کبر ہے اسی واسطے کسی جاننے والے نے کہا ہے کہ سب سے بڑا مولوی نفس ہے کہ کیسی کیسی دور کی سوچتا ہے اور کتنی دور سے پکڑتا ہے یہ دو واقعے میں نے بطور مثال کے بیان کئے ہیں ورنہ سیکڑوں امور میں یہی بات ہے کہ ظاہر میں صورت اچھی ہے کہیں تواضع ہے کہیں زہد ہے کہیں نصرت ہے کہیں ایثار ہے کہیں نصیحت اور ہدایت ہے لیکن حقیقت ان کی کچھ بھی نہیں ہے سوائے کبر کے مگر افسوس کہ لوگوں میں حتیٰ کہ علماء میں

بھی حس نہیں رہا کیونکہ سر سے پیر تک اسی میں مبتلا ہیں اور کبر طبیعت ثانیہ بن گیا ہے جب اس کا حس ہی نہیں رہا تو علاج کیطرف توجہ کیسے ہو مگر میں پھر بھی بتائے دیتا ہوں کہ اس کا علاج کچھ نہیں ہے سوائے ایک بات کے اور وہ بات یہ ہے ؎

نفس نتواں کشت الاظل پیر　　　دامن آں نفس کش راسخت گیر

(نفس نہیں فنا ہوسکتا ہے جب تک پیر کا دامن نہ پکڑے اس نفس کو مارنے والے کا دامن خوب مضبوط پکڑے تاکہ جب اس پر ڈانٹ بھی پڑے تب بھی نہ چھوڑے)

مگر یہ بھی یاد رکھئے کہ سایہ میں آنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دھوپ میں سے ہٹ کر اس کے سایہ میں کھڑے ہوجاؤ بلکہ اس کے معنی ہیں اس سے تعلق پیدا کرنا اور اس کا اتباع کرنا تاکہ اس کے اخلاق کا اثر تم پر پڑے صاحبو صحبت اور تعلق کا اثر ضرور ہوتا ہے سائنس سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ نفس میں سارقت کا مادہ ہے یعنی دوسرے سے اثر لینے کا (سارقت سرقہ سے مشتق ہے سرقہ کے معنی ہیں چوری چوری کے نام سے نہ چونکئے گا چوری دو طرح کی ہوتی ہے۔ جائز اور ناجائز۔ جائز چوری میں کچھ حرج نہیں غرض نفس چوری کرتا ہے یعنی جس سے اس کو تعلق وارتباط اور محبت ہو دزدیدہ اس کے اخلاق اپنے اندر لے لیتا ہے اگر اچھے ہیں تو اچھے اور برے ہیں تو برے اور یہی راز ہے اس حدیث کا المرء علی دین خلیلہ فینظر من یخالہ یعنی آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تو چاہیئے کہ ہر شخص غور کرلیا کرے کہ میں کس سے دوستی کررہا ہوں اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوست کا اثر دوست کے دین پر ضرور پڑتا ہے اور یہ بات واقعات سے بھی ثابت ہوتی ہے کفار میں بہت سے آدمی ایسے بھی ہیں جو اسلام کو حق جانتے ہیں لیکن اپنے ملنے والوں اور دوستوں کے شرم ولحاظ سے مسلمان نہیں ہوتے دیکھئے ان کی دوستی نے ان کو دین سے باز رکھا تو یہ سچ ہوا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے ایسے واقعات بہت ہیں اور بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ ایک مسلمان کسی بددین کے پاس اٹھتا بیٹھتا رہا اور اس پر یہ اثر ہوگیا کہ نعوذ باللہ مرتد ہوگیا غرض یہ بالکل سچا مضمون ہے صحبت کے بارے میں بڑی احتیاط چاہیئے۔ آدمی کبھی یہ نہ سمجھے کہ میرے اوپر کیا اثر ہوسکتا ہے ضرور اثر ہوتا ہے اور اس طرح سے ہوتا ہے کہ خبر بھی نہیں

ہوتی اس پر ایک شخص نے ایک دفعہ اشکال کیا کہ جب صحبت میں یہ اثر ہے کہ ہر شخص میں دوسرے کے اخلاق آجاتے ہیں تو جب ایک نیک اور ایک بد کی باہم صحبت ہوگی تو بد کے اخلاق بھی نیک کی طرف متعدی ہوں گے اس لئے نیک کو بد سے بچنا ضروری ہوا اور بد کو صحبت نیک حاصل کرنے کا حکم ہے تو دونوں کا اجتماع کیونکر ہوگا حاصل یہ ہوا کہ نیک کو تو حکم ہے بد سے الگ رہنے کا اور بد کو حکم ہے صحبت نیک اختیار کرنے کا تو اس صحبت کے حاصل ہونے کی صورت کیا ہے میں نے کہا واقعی بیڈھب شبہ ہے مگر اسی وقت دل میں جواب آگیا جس سے شبہ حل ہوگیا اور یہ بات تجربہ اور واقعات کے دیکھنے سے ماخوذ ہے وہ یہ کہ صحبت کا اثر ہونے کے لئے تابعیت شرط ہے یعنی متبوع کا اثر ہوا کرتا ہے تابع پر نہ کہ تابع کا متبوع پر یہ ہے قاعدہ کلیہ اور یہی مدار ہے صحبت نیک کے حکم کا اور صحبت بد سے ممانعت کا حاصل یہ ہوا کہ بد کے پاس تابع ہو کر نہ جاؤ چنانچہ امراکی صحبت سے جو اہل اللہ نے بہت اہتمام کے ساتھ منع کیا ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان کو مقصود بنا کر ان کے پاس نہ جاؤ اور اگر اس طرح جاتا ہو کہ ان کو مقصود نہ بنایا جاوے اور ان کے تابع نہ بننا پڑے تو کچھ حرج نہیں مثلاً وعظ و نصیحت کے لئے یا کسی معاملہ کے لئے مثلاً اپنی کوئی چیز جیسے مکان یا جائداد وغیرہ بیچنا ہو اس کے لئے جانا ممنوع نہیں کیونکہ یہ ان کو مقصود بنانا نہیں ہے اس میں ضرر نہ ہوگا مگر میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ بھی جب ہے کہ وہاں جا کر کسی قسم کی بھی تابعیت پیدا ہو جانے کا خوف نہ ہو کیونکہ امراکی صحبت میں اکثر ایک زہریلا مادہ ہوتا ہے کہ وہاں جا کر ہر شخص کو تابع بننا پڑتا ہے۔ اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی ہے اگر ذرا بھی اس بات کا خوف ہو تو اس شخص کو جو اپنے قلب کی محافظت کرنے والا ہے ایسی جگہ نہ جانا ہی بہتر ہے یہ بات اہل علم کو خصوصاً خوب یاد رکھنی چاہیئے بعض وقت امرا اہل علم کو اس طرح بلاتے ہیں کہ علما کو تابع بنانا نہیں چاہتے بلکہ متبوع بنا کر بلاتے ہیں مثلاً وعظ کہنے کے لئے بلاتے ہیں یا دعوت کرتے ہیں اور ادب اور اکرام کے ساتھ بلاتے ہیں ظاہر ہے کہ اس میں آدمی تابع نہیں بنتا اور ظاہراً کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا لیکن میں اہل علم کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس معیار کو پیش نظر رکھیں اور خوب

غور سے کام لیں کہ وہاں جاکر ہم کو کسی بات میں دبنا تو نہ پڑے گا اور کسی بات میں ہاں میں ہاں تو ملانا نہ پڑے گی اور کسی بات میں مداہنت اور سکوت عن الحق تو کرنا نہ پڑے گا اگر ذرا بھی اس بات کا اندیشہ ہو خواہ اس امیر کے جبروت اور سطوف کی وجہ سے یا اپنے ضعف قلب کی وجہ سے تو ہرگز نہ جائیں اور اگر بالکل اطمینان ہو کر ان میں سے کوئی بات پیش نہ آئے گی تو مضائقہ نہیں مگر اس کے ساتھ اتنا میں پھر بھی کہے دیتا ہوں کہ گو ہر طرح کا اطمینان ہو لیکن پھر بھی امیر کی صحبت ان مفاسد سے خالی نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ غرض میری یہ ہے کہ اہل علم کو اس میں نرمی نہیں برتنا چاہیئے اور ہر قسم کے اطمینان کی صورت میں بھی امرا کی صحبت میں تقلیل ضرور چاہیئے کیونکہ امراء کی صحبت میں خاصیت ہے متبوعیت کی یعنی ہر شخص کو تابع بنا لینے کی اور جب آدمی تابع بن گیا تو حسب قاعدہ مذکورہ نفس مسارقت ضرور کرے گا اور اس کے اخلاق کا تعدیہ ضرور ہو گا بحمد اللہ اب وہ اشکال حل ہو گیا کہ صحبت نیک کیسے حاصل ہو جبکہ نیک کو بھی حکم ہے صحبت بد سے بچنے کا حاصل حل کا یہ ہوا کہ نیک آدمی بد کا تابع ہو کر نہ رہے تو صحبت بد اس کو مضر نہیں نہ اس سے بچنے کا حکم ہے بلکہ طالب اصلاح کو چاہیئے کہ خود تابع بنے اور اس کو متبوع بناوے یہ تو اشکال درمیان میں آ گیا تھا اصل بیان یہ تھا کہ صحبت ضرور مؤثر ہے اور یہ بات سائنس سے بھی ثابت ہے تو اگر اپنے اخلاق کی اصلاح کرنا ہے تو کسی ایسے شخص کی صحبت اختیار کیجئے جو اخلاق حمیدہ رکھتا ہو اور اس سے تعلق پیدا کیجئے اور اس کا اتباع کیجئے یہ ہے علاج جس سے برے اخلاق دور ہوتے ہیں اور اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور نرے پڑھنے پڑھانے سے یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا صحبت عجب چیز ہے صحبت جب شرائط کے ساتھ یعنی مع قصد تابعیت پائی جاوے تو ضرور مؤثر ہوتی ہے تجربہ کر لیجئے کہ ایک غصیلا آدمی جو بات بات پر لوگوں سے لڑتا ہو چندروز ایک حلیم اور بردبار آدمی کے پاس بیٹھے تو اس میں حلم پیدا ہو جائیگا یا اس کے برعکس ایک حلیم اور سرد مزاج آدمی کسی غصیلے آدمی کے یا کسی حکومت والے کے پاس چندروز بیٹھے تو اس میں ضرور کچھ نہ کچھ تیزی اور گرمی پیدا ہو جائے گی حیادار آدمی کے پاس بیٹھنے سے حیا اور بے حیا آدمی کے پاس بیٹھنے سے بے حیائی اور بک بک کرنے والے کے

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

پاس بیٹھنے سے بک بک کرنا اور فضول گوئی اور خاموشی اور باوقار آدمی کے پاس بیٹھنے سے سکوت اور وقار پیدا ہوتا ہے یہ آثار صحبت سے پیدا ہوتے ہیں اتنے لکھنے پڑھنے اور کتابوں کے دیکھنے سے نہیں ہوتے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب میں تو ایک مضمون دیکھا جو اس وقت ذہن میں آگیا پھر جاتا رہا اور صحبت میں واقعات پیش آتے ہیں جس سے اس کا استحضار بار بار ہوتا ہے مثلاً حلیم شخص کے پاس بیٹھو گے تو بار بار اس کو صبر و تحمل کرتے دیکھو گے اور اس کے فوائد بھی دیکھو گے اور متعدد مرتبہ اس کا استحضار ہوگا تو تم بھی صبر کرنے لگو گے یہ فرق ہے نرے صحبت اور علم میں یہاں وہ لفظ پھر یاد رکھئے کہ صحبت کا اثر جب ہی ہوتا ہے جبکہ اس شخص کو جس کی صحبت اختیار کی ہے متبوع بناؤ نرا پاس آنا جانا کافی نہیں اسی کو میں نے کہا تھا کہ پیر کے سایہ میں آنے کے معنی یہ نہیں کہ دھوپ سے اٹھ کر اس کی چھاں میں آجاتے بلکہ اس سے تعلق پیدا کرنا اور اس کے اتباع کا قصد کرنا مراد ہے یہ مطلب ہے ظل پیر کا اس کا اثر اس طرح ہوتا ہے کہ جب تم نے اس کو بڑا سمجھا اور متبوع بنایا اور اپنے آپ کو تابع بنایا اور وہ علوم میں بھی کامل ہے اور عمل میں بھی تو اس کے پاس رہنے سے علوم کان میں پڑیں گے مثلاً غصہ کا علاج معلوم ہوگا کہ جب غصہ آوے تو آدمی کو چاہیئے کہ وہاں سے ٹل جاوے اس سے جوش فرو ہو جاتا ہے یا یہ کہ غصہ کسی خطا پر آتا ہے اس وقت یہ سمجھے کہ جیسے وہ شخص میرا خطاوار ہے ایسے ہی میں بھی تو کسی کا خطاوار ہوں یہ خیال آتے ہی غصہ فرو ہو جائے گا یہ نکتے کان میں پڑ گئے اور وقت پر رہبری کریں گے جب بار بار یہ باتیں کان میں پڑیں گی تو کہاں تک اثر نہ ہوگا ایک وقت چوکو گے دو وقت چوکو گے تیسری دفعہ تو اصلاح ہو ہی جائے گی اور چند روز میں ان شاء اللہ غصہ کے روکنے کی قدرت حاصل ہو ہی جائے گی یہ سبب تو ظاہری ہے اہل اللہ کے پاس رہکر اصلاح ہونے کا کہ ان کی صحبت میں اچھی اچھی باتیں کان میں پڑتی رہیں گی اور کبھی نہ کبھی اثر کریں گی۔

ایک سبب باطنی بھی ہے وہ یہ ہے کہ جب تم ان کے پاس رہو گے اور تعلق بڑھا لو گے

تو ان کو تم سے محبت ہو جائے گی تو اس سے دو طرح اصلاح ہو گی ایک تو یہ کہ وہ دعا کریں گے اور ان کی دعا مقبول ہوتی ہے تو حق تعالیٰ تم پر فضل فرماویں گے اور اکثر یہ ہے کہ ان کی دعا باذن حق ہوتی ہے تو ان کے منہ سے دعا نکلنا اس بات کی علامت سمجھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کے فضل ہونے کا وقت ہی آگیا دوسری وجہ بڑی خفی ہے وہ یہ کہ تمہارے اعمال میں ان کی محبت سے برکت ہوگی اور جلد جلد ترقی ہوگی جو کام چار دن میں ہوا ایک دن میں ہوگا اور بہت جلد اصلاح ہو جائے گی یہ ایسی بات ہے جس کو سائنس والے نہیں سمجھ سکتے لیکن اگر وہ چاہیں تو بہت آسانی سے سمجھ بھی سکتے ہیں یہ لوگ ہر بات میں نظیر مانگا کرتے ہیں دلیل سے ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ اس کی نظیر بھی لیجئے وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مقناطیس میں ایک قوت جاذبہ ہے جس سے وہ لوہے کو کھینچ لیتا ہے ہم کو اس کی کنہ بتلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہم ایسے نظیر دیتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں بیان کر سکتے مگر اس قوت جاذبہ کا انکار نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے سامنے موجود ہے بس یہی قوت جاذبہ اہل اللہ کے قلب میں ہے جو طالب کو ان سے تعلق رکھنے والے کو ایسا ہی کھینچ لیتی ہے جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے اب باطنی برکت کا بیان اہل سائنس کی سمجھ کی موافق بھی ہو گیا یعنی ان کے قلب میں ایک قوت کشش ہے جو طالب کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان کا قلب حق تعالیٰ سے ملا ہوا ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ طالب کے قلب کو ان کی صحبت اور تعلق سے حق تعالیٰ کا قرب ہو جاتا ہے تو ان کی صحبت سے نفع ہونے کے چار سبب ہوئے ان کے پاس جا کر علوم نافعہ کا کان میں پڑنا ان کے افعال کی تقلید کرنا انکی دعا ان کی برکت جس کو میں نے سبب خفی کہا تھا اور جس کا بیان بحمد اللہ بقدر ضرورت ہو گیا اہل اللہ کے پاس رہنے سے ان چار صورتوں سے اثر ہوتا ہے یہ بات کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتی اسی واسطے کہا تھا ؎

نفس نتواں کشت الاظل پیر

مولانا نے حصر کر دیا ہے اصلاح کو صحبت شیخ میں اور یہ بالکل سچی اور واقعی بات

ہے کہ اصلاح بدون کسی کو بڑا بنائے ہوئے نہیں ہوسکتی۔ بہت سے پڑھے لکھے اور دیندار لوگ بھی اس بات میں غلطی پر ہیں یوں سمجھتے ہیں کہ بس کتابوں کا پڑھ لینا اور مطالعہ میں رکھنا اصلاح کے لئے کافی ہے یاد رکھو کہ اور کتابیں تو کیا وہ کتابیں بھی جو اسی فن اصلاح اخلاق کی ہیں جیسے احیاء العلوم وغیرہ ان سے بھی اصلاح نہیں ہوگی جب تک کسی کے ماتحت نہیں بنو گے اور جبتک کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہوگا اور جب تک کوئی یہ کہنے والا نہ ہوگا کہ تم بڑے نالائق ہو یہ حرکت کیوں کی یاد رکھو محض ایک بات کی برائی معلوم ہوجانے سے وہ بات چھوٹ نہیں جاتی۔ دیکھو شرابی شراب پیتا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ شراب بُری چیز ہے مگر اس جاننے سے شراب چھوٹتی نہیں ہاں اس سے چھوٹتی ہے کہ کوئی اس سے بڑا اس پر مسلط ہو اور جب یہ شراب پیئے تو تھوڑی گوشمالی کردیا کرے اس میں اثر ہے اور اس میں نہیں دیکھئے شراب جس کو پینے والا خود بھی برا جانتا ہے بدون کسی بڑے کے دباؤ کے نہیں چھوٹتی تو وہ برائیاں جن کی برائی خود فاعل کو بھی معلوم نہیں وہ بغیر دوسرے کی روک ٹوک کے کیسے چھوٹ سکتی ہیں اور وہ صفات جن کا اختیار کرنا نفس پر بہت شاق ہے نفس ان کا خوگر بدون دباؤ کے کیسے ہوسکتا ہے جیسے تواضع جس کا ذکر ہو رہا تھا کیونکہ تواضع کے معنے چھوٹا بننے کے ہیں۔ آدمی چھوٹا بننا کبھی گوارا نہیں کرتا تو جب تک کوئی بڑا اس پر مسلط نہ ہو اور یہی معنی ہیں ماتحت ہونے کے اس وقت تک تواضع پیدا نہیں ہوسکتی۔ غرض نرے علم سے اصلاح نہیں ہوسکتی بار بار نگرانی کرنے اور عادت ڈالنے سے ہوتی ہے اور عادت بدون دوسرے کو بڑا بنائے ہوئے نہیں ہوسکتی اور اصل الاصول[1] تمام اخلاق ذمیمہ کی کبر ہے اور اس کے شعبے اس قدر مخفی ہیں کہ بڑے بڑے علم والوں کو بھی پتہ نہیں چلتا جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ بہت سے لوگوں میں کبر بصورت

---

[1] اس وقت بیان میں بے حد لطف آرہا تھا مگر افسوس کہ دیر ہوجانے کی وجہ سے اہل مدرسہ کی طرف سے عرض کیا گیا کہ مدرسہ کی رپورٹ سنانے کا موقع لایا جاوے۔ فرمایا مجکو وقت بتادیجئے کہ اتنی دیر میں بیان کو ختم کردیا جاوے میں اتنی ہی دیر میں ختم کردونگا چنانچہ وقت مقرر کردیا گیا اور اس کی وجہ سے حضرت نے یہاں سے اختصار شروع کردیا ۱۲ من الجامع

تواضع ہوتا ہے اور اس وصف میں اہل علم زیادہ حصہ رکھتے ہیں۔ اور دیا سلائی کے مصالحہ کی طرح یہ مادہ سب میں موجود ہے کسی کو بے فکر نہ ہونا چاہیئے نہ معلوم کس وقت رگڑ لگ جاوے اور جل اٹھے اور سب عائنما کو پھونک دے۔ یہ کبر وہ چیز ہے جو سبب ہوا ہے ابلیس کے کافر ہونے اور رجیم ہونے کا حق تعالیٰ نے اس کے اور اس کے تمام شعبوں کی برائی بیان فرمائی ہے فبئس مثوی المتکبرین میں اور چونکہ تمام اخلاق ذمیمہ کبر ہی سے پیدا ہوتے ہیں جیساکہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے اور وقت وسیع ہوتا تو بقدر ضرورت بیان بھی کر دیتا تو اس سے اشارہ ہو گیا تمام اخلاق کے اصلاح کی ضرورت کے طرف یہاں تک بیان تھا کفار کی حالت کا قیامت میں اب آگے مومنین کی حالت کا بیان فرماتے ہیں وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے۔ اور ہنکائے جائیں گے وہ لوگ جو حق تعالیٰ سے ڈرتے تھے یعنی مومنین جنت کی طرف گروہ کے گروہ ہنکائے جاتے ہیں ایک معنی زبردستی کے پائے جاتے ہیں جو سوق کی تذلیل کو مستلزم ہے گویا یہ معنی ہوئے کہ زبردستی دھکے دیکر مومنین کو جنت کی طرف لیجایا جائے گا حالانکہ اہل جنت کی تذلیل خلاف واقع ہے عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ جنت محل اکرام ہے نہ محل تذلیل اور نقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ ایک آیت میں صاف آیا ہے اولئک فی جنت مکرمون اس واسطے وسیق الذین اتقوا کے تفسیر میں مفسرین نے یہ لفظ لکھا ہے اسے بلطف یعنی اہل جنت کو جنت کی طرف زبردستی لے جایا جائے گا مگر نہ تذلیل کے طور پر بلکہ لطف اور اکرام اور خوشی کے ساتھ جیسے کوئی اپنے بہت عزیز دوست کو بغل میں ہاتھ ڈال کر گھر کی طرف کھینچتا ہے کہ چلو جی جلدی کرو تم کو جانا پڑے گا ہم تم کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے اسی طرح اہل جنت کو فرشتے تقاضا کر کے جلدی جلدی بہشت کی طرف لے چلیں گے تو یہ

سوال۔ اس پر یہ شبہ ہوگا کہ جنت کے محل اکرام ہونے سے خارج جنت کا محل اکرام ہونا لازم نہیں اور سوق خارج جنت ہوگا نہ داخل جنت بقرینۃ الغایۃ فی قولہ تعالیٰ حتیٰ اذا جاؤھا ۱۲ ظ

جواب۔ مقدمات جنت بحکم جنت ہیں تو اہانت کا اجتماع مقدمات کے ساتھ بھی نہیں ہو سکتا ۱۲

سوق عزت کی بات ہے نہ ذلت کی اس کو سوق کیا گیا مشاکلۃ کیونکہ اول گروہ کے لئے سوق کا لفظ آچکا ہے گو دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اس میں اشارہ ہو گیا اس بات کی طرف کہ صورۃً دو چیزوں کا یکساں ہونا حقیقۃً یکساں ہونے کو مستلزم نہیں سوق اہل جنت کے لئے بھی ہو گیا اور اہل دوزخ کے لئے بھی مگر دونوں میں باہم کچھ نسبت نہیں اور یہ بات اخلاق میں بھی بہت مطرد ہے کہ خلق محمود و مذموم میں بہت تشابہ ہوتا ہے اسی واسطے میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ کسی مبصر کے سپرد کرو اپنے آپ کو اپنی رائے کے بھروسہ پر نہ رکھو بسا اوقات تواضع حقیقت میں تکبر ہوتا ہے غرض سوق دونوں گروہ کے لئے ہوگا مگر وہاں عذاب کی طرف ہوگا اور یہاں ثواب کی طرف زمرا کے معنی وہی ہیں جو پہلے گذرے یعنی جماعتیں کی جماعتیں حتی اذا جاؤھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین داؤ فتحت کا حالیہ ہے یا عاطفہ ہے اور دوسرے معطوفات اسی پر مترتب ہیں اور دونوں تقدیروں پر یہ سب جملے اذا کے تحت میں ہیں اور ترکیب میں شرط ہیں آگے جزا ان کی بیان نہیں کی گئی کہ جب یہ سب کچھ ہوگا تو کیا ہوگا یہ سب جنت کے باہر ہوگا جیسا کہ ادخلو اسے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ادخلوا صیغہ امر ہے جو چاہتا ہے استقبال کو اس کی تقریر پہلے فادخلوا ابواب جہنم میں ہو چکی ہے جزا کے بیان نہ کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ آگے ایک بات ہو تو بیان کی جاوے جانے کیا کیا ہے کہاں تک بیان کیا جاوے۔ نیز یہ کہ جو کچھ ہے وہ بات کہنے کی ہے ہی نہیں جب دیکھو گے تب ہی سمجھ میں آوے گی یہ مضمون اس حدیث میں صراحۃً موجود ہے اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل

ہ اور یہ جواب بھی ہو سکتا ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم دونوں اپنے محل کی طرف جلدی جلدی تیزی کے ساتھ چلیں گے لیکن کفار کو ملائکہ کے ہنکانے سے تیزی کریں گے وہاں تو سوق حقیقی ہوگا اور اہل جنت حکم دخول پاتے ہی خود بخود ایسے دوڑیں گے جیسے کسی نے زبردستی دوڑایا ہو تو وہاں حقیقی سوق نہ ہوگا بلکہ حکمی ہوگا۔ واللہ اعلم ۱۲ ظ

یں اس کا خیال آیا۔ پھر اگر و فتحت کا واؤ عاطفہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ جنت کے دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ اس وقت کھلیں گے جبکہ اہل جنت ان کے پاس آویں گے جیسے دوزخ کے دروازوں کے متعلق تھا کہ اس وقت کھولے جاویں گے جس وقت اہل جہنم ان کے پاس آویں گے سو جہنم کے دروازے پہلے سے کھلے نہ ہونے کے وجوہ تو اوپر معلوم ہوئے اور جنت کے بارہ میں بھی ہمارے استاد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ جنت کے دروازے بھی پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ بعد میں کھولے جاویں گے اور اس میں چند نکتے ہیں ایک تو یہ نکتہ کہ عادت ہے کہ دفعۃً نعمت پر نظر پڑنے سے حظ زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کو ایک لاکھ روپیہ ملنے والا ہے اول اس کو خبر ملی کہ کلکتہ میں میرا اتنا روپیہ ہے پھر وہاں سے اس کی روانگی کی خبر ملی کہ وہاں سے چلدیا پھر معلوم ہوا کہ الہ آباد بنک میں آگیا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ مراد آباد کے خزانہ میں آگیا ہے حتیٰ کہ لاکر سامنے رکھدیا گیا تو اس کو خوشی تو ضرور ہو گی مگر اتنی جتنی اس صورت میں ہو گی کہ ایک شخص کو مطلق خبر نہیں اور وہم و گمان میں بھی نہیں کہ میرا کہیں اتنا روپیہ ہے یکلخت کوئی سب روپیہ سامنے لاکر رکھدے کہ یہ تم کو ملا ہے اس صورت میں ایسا حظ ہو گا کہ عجب نہیں مارے خوشی کے شادی مرگ ہو جاوے ایسے واقعات ہوئے بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ کسی ملزم کو پھانسی کا حکم ہوا پھر اپیل میں رہائی کا حکم ہوا تو اس حکم کو یک لخت نہیں سنایا گیا اس وجہ سے کہ ناامیدی کے بعد ایک دم یہ خبر سن کر کہیں مارے خوشی کے مر نہ جائے اس کی وجہ زیادت حظ دوسری ہی ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک دم نعمت پر نظر پڑنے میں زیادہ حظ ہوتا ہے بہ نسبت نظر تدریجی کے اس واسطے جنت کے دروازے بند ہوں گے اور جب جنتی اس کے پاس پہونچ گئے تب ایک دم کھول دیئے جائیں گے۔ اور ایک نکتہ ہے اس کے سمجھنے کے لئے دو مقدمتوں کو ملانے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اہل جنت جنت میں جانے کے بعد باہر نہیں نکلیں گے ایسی جگہ میں سے کون نکلنا گوارا کرتا ہے۔ ہاں اہل دوزخ بعض بعض دوزخ میں سے

نکلیں گے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چند روز کے بعد نجات پاکر نکالے جائیں گے غرض اہلِ جنت اندر جانے کے بعد پھر باہر نہ نکلیں گے۔ ایک مقدمہ یہ ہوا اور ایک مقدمہ یہ ہے کہ جنت باہر سے بھی مزین ہے اگرچہ عادت یہ ہے کہ باغ کو باہر سے نہیں سجایا کرتے جیساکہ مشہور ہے۔

ع۔ بنقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

مگر وہاں ایسا نہیں وہاں اندر سے تو جنت ہے ہی جیسی ہے باہر سے بھی مزین اور مرصع ہے اور یہ ظاہر ہے کہ باہر کی زینت ایسی نہیں ہو سکتی جیسی اندر کی ہوگی کیونکہ اندر کی زینت مقصود اصلی ہے اور باہر کی بالتبع اور مقصود اور تابع میں فرق ہوتا ہے تو اگر دروازے جنت کے پہلے سے کھول دیئے جاویں تو اندر کی زینت کے سامنے باہر کی زینت کو کون دیکھے اس واسطے اول دروازے بند ہوں گے تاکہ باہر کی زینت کو بھی دیکھ لیں پھر کھولدیئے جاویں گے کیونکہ اندر سے باہر کون آوے گا نیز اس واسطے بھی جنت کے دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے کہ جہنم میں تو لوگ بجبر و اکراہ جاویں گے تو اگر دروازے کھلے ہوئے ہونے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو جہنم کے لئے ہو سکتی ہے کہ سب سامان عذاب کا تیار ہوگا صرف ڈھکیل دینے کی ضرورت ہوگی اگر دروازے بند ہوں تو شاید کچھ دیر لگے اور یہاں تو خوشی سے جاویں گے اور ہر قسم کا اطمینان ہوگا تو مزے لیتے ہوئے اور سیر کرتے ہنستے بولتے ہوئے جاویں گے تو کیا جلدی ہے کہ دروازہ پہلے سے کھلے ہوئے ہوں۔ باہر کی سیر کر کراکے جب اندر جانا چاہیں گے کھولدیئے جائیں گے۔ ان میں بعض نکتے حضرت استاذنا علیہ الرحمۃ کے ارشاد فرمائے ہوئے ہیں۔ یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ وفتحت کا واؤ عاطفہ لیا جاوے کیونکہ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دروازہ پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے اور اگر واؤ کو حالیہ لیا جاوے تو حال قید ہوتا ہے عامل کے لئے تو معنی یہ ہوں گے کہ آئیں گے جنت کے پاس اس حال میں کہ دروازے کھلے پڑے ہوں گے اس صورت میں اس کا یہ مدلول ہوگا کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوتے ہوں گے اس کے لئے دوسرا نکتہ ہوگا کہ وہ بھی لطف سے خالی نہیں وہ یہ ہے کہ جنت مشتاق ہوگی اہلِ جنت کی جیسے کوئی بڑا عزیز مہمان

گویا کسی کا بچہ مدت کے بعد دور دراز سے آوے تو اس کے لینے کے لئے ماں گود پھیلائے بیٹھی ہوتی ہے تو جیسے جنتی مشتاق ہیں جنت کے جنت بھی ان کی مشتاق ہے اور اس میں جو کچھ خدم وحشم حور وغلمان ہیں وہ سب بھی مشتاق ہیں۔ یہ مضمون حدیث سے بھی ثابت ہے یہ تو اہل جنت کے لئے لذت جسمانی ہوئی کہ ایک قول پر دروازے بند ہوں گے اور سیر کرتے ہوئے اور باہر کی آرائش دیکھتے ہوئے اطمینان کے ساتھ جاویں گے پھر ایک دم دروازے کھول دیئے جاویں گے یا دوسرے قول پر دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور جنت اور مافیہا ان کی مشتاق ہوں گی آگے لذت روحانی کا بیان ہے وقال لھم خزنتھا کہیں گے ان سے وہاں کے کارکن یعنی فرشتے سلام علیکم طبتم فادخلوھا خلدین ۔ یہ اکرام ہے ان کا اور اظہار عظمت ہے کہ فرشتے ان کو سلام کریں گے اور مبارک باد دیں گے کہ تم اچھے ہے اب چین کرو اور جنت میں چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیسی خوشی کا وقت ہے ، اہل جنت جوش میں آکر کہیں گے الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ حق تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا ایمان لانے پر ہم سے جنت کا وعدہ کیا تھا سو اس کو کر کے دکھا دیا یہاں ایک معقول شبہ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کا وعدہ پورا ہونا تو واجب اور ضروری ہے اس کے خلاف ہونا محال ہے پھر اس پر احسان ماننے اور شکر کرنے کے کیا معنی جو چیز ضروری اور یقینی ہے وہ تو ضرور ہی واقع ہوگی چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش اول تو یہ شبہ کسی نمک حرام ہی کو ہو سکتا ہے ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ وعدہ کے بعد اس کا پورا ہونا یقینی سہی لیکن شروع سے وعدہ ہی کیوں کیا گیا ہمارا خدا تعالیٰ کے ذمہ کیا آتا تھا جو ہم سے وعدہ کیا گیا خود ہی مہربانی فرمائی کہ ہم کو ایک وعدہ کا امیدوار بنایا یہ وعدہ بھی ایک فضل ہے اور اس کا ایفا بھی جو کہ اس وعدہ پر مرتب ہے دوسرا فضل ہے دوسرے یہ کہ وعدہ تو کیا تھا مگر کس شرط سے کیا تھا یعنی اس کے ساتھ کچھ شرط بھی تھی اس شرط کا پورا کر دینا یہ تو واجب نہ تھا اس کو محض اپنے فضل سے پورا کیا مان لیا جائے کہ ایمان لانا آپ کا فعل تھا مگر اس پر جزاء موعود کا مترتب ہونا موقوف تھا اس کے باقی رہنے پر اور یہ بقاء ایمان آپ سے نہیں ہو سکتا تھا یہ ادھر ہی سے فضل ہوا کہ اس کو باقی رکھا گیا ممکن تھا کہ حق تعالیٰ اس کو باقی نہ رکھتے تو اس صورت میں اس جزاء کے بھی آپ مستحق نہ ہوتے اور اس وعدہ کا پورا ہونا جو ایمان پر کیا گیا

تھا ضروری نہ ہوتا کیونکہ اس کی شرط نہ پائی گئی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس شرط کو موجود کیا گیا اور اس پر اس وعدہ کا ایفا کیا گیا یہ محض فضل سے ہوا یا نہیں تو اب یہ احسان ماننا کہ بالکل بجا ہوا کہ شکر ہے خدا کا جس نے اپنا وعدہ ہم سے پورا کیا اور یہی معنی ہیں اس سوال کے ربنا واتنا ما وعدتنا علی رسلک ولا تخزنا یوم القیمۃ انک لا تخلف المیعاد کیونکہ اس میں بھی یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب وعدہ کر لیا گیا تو پھر اس کے پورا کرنے کا سوال کیا معنے وہ تو خود ہی پورا ہوگا اس کے خلاف تو ہو ہی نہیں سکتا پھر مانگنے کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب بھی یہی ہے کہ وعدہ بیشک کیا گیا ہے لیکن وہ وعدہ مشروط ہے بقاء ایمان کے ساتھ تو سوال در حقیقت اس بات کا ہے کہ یا اللہ ہم کو رسولوں کے طریقوں پر قائم رکھنا تا کہ اس وعدہ کے ہم مستحق ہوں دوسرے ایفا رجو واجب ہے تو واجب علی اللہ نہیں ہے کہ موجب احسان نہ ہو واجب من اللہ ہے اور وہ موجب احسان ہو سکتا ہے واورثنا الارض اور وارث بنایا ہم کو زمین کا اس زمین سے مراد جنت کی زمین ہے کیونکہ جنت ہی کا بیان ہو رہا ہے نیز آگے اس کی تصریح نتبوأ من الجنۃ میں موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں بھی زمین ہے اور اس کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب زمین ہے تو آسمان بھی ہے اور یہ ثابت ہے کہ جنت کے لئے خلود ہے تو اس کے آسمان اور زمین کیلئے بھی خلود ہوا تو اس سے ایک اور آیت کا اشکال بھی رفع ہوتا ہے وہ آیت وہ ہے جس میں اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لئے یہ لفظ ہے خلدین فیھا ما دامت السموٰت والارض جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں اس وقت تک رہیں گے جس وقت تک زمین و آسمان رہیں گے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور نار دونوں میں قیام کیلئے ایک خاص مدت مقرر ہے جو کہ مدت ہے بقاء سماوات وارض کی اور جب کوئی مدت مقرر ہوئی تو خلود کہاں رہا اور یہ دوسری تصریحات کے خلاف ہے اس اشکال کے جواب کے لئے لوگوں نے تاویلیں کی ہیں ایک تاویل جو تفسیر مذکور کی بنا پر ہے یہ ہے کہ سماوات وارض سے مراد جنت کے آسمان اور زمین ہیں اور جنت کے لئے خلود ہے تو ان کے واسطے بھی خلود ہے تو گو دونوں فریق کے لئے مدت مقرر کی گئی مگر وہ مدت خود لا متناہی ہے تو ان کا رہنا بھی لا متناہی ہوا اور یہی معنی خلود کے ہیں تو یہ معنی ہوئے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ جنت اور دوزخ میں رہیں گے جب تک

دونوں کے آسمان اور زمین کا وجود ہے اور ان کا وجود کب تک ہے ہمیشہ کے لئے ہے اور ان کا رہنا بھی ہمیشہ کے لئے ہوا باقی اس آیت میں جو لفظ الا ماشاء ربك وارد ہے مختصراً اس کو بھی سمجھ لینا چاہیئے یہ استثناء ہے خلود سے معنی یہ ہیں کہ خلود ہوگا مگر ان کے لئے جن کو حق تعالیٰ نہ چاہیں تو اس سے ظاہراً سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی جنت سے نکالا بھی جاوے گا حالانکہ یہ خلاف واقع اور خلاف تصریحات نصوص ہے اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ استثناء کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک وہ جو بعض اہل نار کے لئے ہوگی بعض لوگ (یہ عصاۃ مومنین ہیں) گناہوں کی وجہ سے چند روز کے لئے جہنم میں جاویں گے پھر نکال لئے جاویں گے تو خلود نہ ہونے کی یہ صورت ہوگی کہ بعض گنہگار اولاً جہنم میں جاویں گے پھر جہنم سے نکالکر جنت میں جاویں گے اور جنت میں ہمیشہ بطور خلود کے رہیں گے اور کبھی نکللے نہ جاویں گے مگر یہ خلود ان کا ابتدا کی طرف سے ان لوگوں کے خلود سے کم ہے جو ابتداءً جنت میں جاویں گے تو خلود جنت بھی بعض کے لئے اسی طرح استثناء کا مصداق بن سکتا ہے یہ تاویل اکثر لوگوں نے لکھی ہے مادامت السمٰوٰت والارض کی اور بعض اہل زیغ اس قید کو دیکھ کر اس کے قائل ہوگئے کہ جنت اور نار فنا ہوجاویں گے اور خلود سے مراد مکث طویل لے لیا اور یہ کہا کہ گو جنت اور نار کا ہزاروں لاکھوں برس قیام رہے مگر اخیر میں فنا ہوجائیں گے لیکن یہ بالکل غلط ہے اور اہل حق کے عقیدہ کے خلاف ہے اہل حق سب خلود ہی کے قائل ہیں اور انھوں نے اس آیت مادامت السمٰوٰت والارض میں وہی تاویل کی ہے جو میں نے بیان کی اس تاویل سے معنی بن گئے اور اشکال رفع ہوگیا مگر ایک معنی اور بھی ہوسکتے ہیں (ابتدا میں میں نے کہا تھا کہ آج کے بیان میں میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہوں گا مگر عادت پڑی ہوئی ہے کہ جب کوئی مضمون قلب میں آجاتا ہے تو بلا بیان کئے طبیعت نہیں مانتی علت جاتے ہی جاتے جاویگی تو اس وقت میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے اس کو میں بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ تاویل مذکور بن تو گئی اور اشکال رفع ہوگیا لیکن اس عنوان سے فائدہ کیا نکلا خلدین فیھا کے بعد مادامت السمٰوٰت والارض کی ضرورت کیا تھی یہ کیوں فرمایا کہ ہمیشہ رہیں گے جب تک جنت کے آسمان زمین ہیں گے بیان خلود کے لئے تو خلدین فیھا بھی کافی تھا اس عنوان سے تو خواہ مخواہ ایک اشکال پیدا ہوگیا یہ جملہ نہ ہوتا تو کوئی بھی اشکال نہ ہوتا

یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تاکید ہے خلود کی یہ ایسا ہے جیسے کسی کو کہیں تمھیں گاؤں دیا پوچھا گیا کب تک کے لئے جواب دیا جب تک گاؤں ہے اس کے معنے یہ نہیں ہوتے کہ مدت کی تحدید کردی کہ جب تک گاؤں آباد ہے اس وقت تک یہ زمین اس کو دی اور جب گاؤں اجڑ جاوے تو واپس لے لی جاوے گی بلکہ یہ لفظ اس واسطے کہا گیا ہے کہ عادت یہ ہے کہ گاؤں مدتوں رہتا ہے آدمی کی عمر سے زیادہ گاؤں کی عمر ہوتی ہے تو یہ مراد ہے کہ تمھیں تمام عمر کے لئے اور ہمیشہ کے لئے دیا گیا اور کبھی واپس نہیں لیا جائے گا گاؤں ہے اس معنی میں آتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے دیا گیا اور کبھی واپس نہیں لیا جائیگا قرآن شریف میں محاورات کی رعایت بہت ہے تو ما دامت السموٰات والارض سے مراد تحدید نہیں بلکہ وہی معنی مراد ہیں جو اس لفظ سے مراد تھے کہ جب تک گاؤں ہے رہا یہ کہ ان دو ہی چیزوں کو کیوں بیان کیا یعنی سماوات اور ارض کو یوں کیوں نہ فرمایا دامت الجنت اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مکان میں فرش اور چھت اصل ہوتا ہے تو تمام اجزاء میں سے ان اجزاء کا نام لیا جو اصل ہیں تو اب یہ ایسا ہو گیا جیسے کسی کو گاؤں میں گھر دیں اور کہیں یہ گھر تمھیں دیا اس وقت تک کے لئے جب تک کہ یہ گاؤں ہے کہ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ ہمیشہ کے لئے اور گاؤں کا نام اس واسطے لیا گیا ہے کہ اگر گھر کا نام لیتے اور یوں کہتے کہ جب تک گھر ہے تو ہمیشگی پر دلالت نہ ہوگی کیونکہ گھر منہدم ہونے والا ہے اور گاؤں منہدم ہونے والا نہیں تو گاؤں کا نام لینے سے ہمیشگی پر دلالت ہوگی اسی طرح جنت کے ان اجزاء کا نام لیا جو اصل اور عمود ہیں اور بہ نسبت دیگر اجزاء کے عادتاً دیرپا ہو سکتے ہیں تو اس سے اور تاکید ہو گئی خلود کی یہ نکتہ ہوا ما دامت السموٰت والارض میں (واللہ اعلم) واورثنا الارض مالک بنا دیا ہم کو زمین کا یعنی جنت کی زمین کا جب کہ آگے تصریح موجود ہے اور کسی خاص حصہ کا مالک نہیں بنایا بلکہ نتبوا من الجنۃ حیث نشاء جنت میں سے جہاں ہم چاہیں جگہ لے سکتے ہیں یہ آزادی ہوگی کہ جہاں جس کا جی چاہیگا وہاں پہنچ جائیگا ایسا نہ ہوگا جیسے کوئی نظر بند ہوتا ہے کہ کسی ایک باغ میں یا ایک شہر میں رہتا ہے کہ اس سے باہر نہیں جا سکتا اہل جنت کے لئے کوئی حد نہ ہوگی بے قید کھلے آزاد ہوں گے جہاں چاہیں جائیں جو چاہیں کریں دوستوں سے ملیں نہ خانہ میں رہیں دیواروں سے لپٹیں

چھت پر چڑھیں غرض کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہوگی کسی بات سے دل مارنا نہ پڑے گا عجب
لطف ہوگا بقول مولانا محمد یعقوب صاحب کے چھوٹی سی خدائی ہوگی چھوٹی سی کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی
خدائی میں تو سب کچھ اختیار اور ارادہ سے ہوتا ہے اور اس میں ان کے اختیار سے تو کچھ نہ ہوگا مگر مرضی
کے موافق سب کچھ ہو جاوے گا یعنی جس چیز کو ان کا جی چاہے گا فوراً حق تعالیٰ اس کو حکم دیں گے
اور وہ ہو جائیگی یہی معنی ہیں اس آیت کے لکم فیھا ما تشتھیہ الانفس وتلذ الاعین. ترجمہ
تمہارے واسطے اے اہل جنت جنت میں وہ ہے جس کو تمہارا دل چاہے اور جس سے آنکھیں لذت پائیں
ما کا لفظ عام ہے تو جو کچھ کسی کا جی چاہے وہی ہوگا مثلاً چھت دار مکان میں بیٹھے ہیں اور دل
چاہا کہ چھت نہ رہے تو چھت فوراً ہٹ جائے گی یا میدان میں ہیں اور جی چاہا کہ اس جگہ
چھت دار مکان ہوتا تو فوراً خدائے تعالےٰ کے حکم سے ایک آن میں جیسا مکان خیال میں آیا
تھا ویسا ہی موجود ہو جاوے گا اور جی چاہا کہ سائبان نہ رہے تو فوراً ہٹ جائے گا ایک
پرند جو بصورت درخت پر بیٹھا ہے جی چاہا کہ اس کے کباب کھاتے بس یہ خیال آنا تھا
اور وہ کباب بن کر قاب میں تیار ہو کر سامنے آگیا مزے سے کھائیے لطف یہ کہ یہاں کباب
کھائے گئے اور ادھر دیکھتے ہیں کہ وہی پرند بزرگ دار بیٹھے چہچہا رہے ہیں جنت کی ہوا
میں حیات ہے جیسے کسی نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید — گر مرغ کباب ست کہ با بال و پر آید

(جو سوختہ جان کشمیر میں آجائے اگر مرغ کا کباب ہے تو بھی وہ مرغ بال و پر کے ساتھ زندہ ہو جاوے)
(یہ عرفی کا شعر ہے) یہ کشمیر کے بارہ میں تو مبالغہ ہے اور جنت کے بارہ میں حقیقت ہے قرآن شریف
میں اس کی تصریح موجود ہے اکلھا دائم یعنی اس کے میوے ہمیشہ رہنے والے اور غیر فانی
ہیں میوہ درخت سے ٹوٹ کر آنے کے بعد کھا لیا جائے گا اور درخت پر بجنسہٖ موجود رہے گا۔
اس پر ایک معقولی صاحب نے اعتراض کیا کہ جب وہ کھا لیا گیا تو فنا ہو گیا پھر دوام کہاں
رہا میں نے کہا دوام نوعی مراد ہے نہ کہ شخصی یعنی جس کو کھایا وہی نہیں رہیگا بلکہ اسی جنس کا
دوسرا اس کی جگہ فوراً پیدا ہو جائے گا تو دائم صحیح رہا. غرض جو چاہیں گے فوراً موجود ہو جائیگا
دھوپ چاہیں تو دھوپ ہو جائے گی سایہ ہٹ جائے گا اس سے مراد دنیا کی سی دھوپ

نہیں جس سے تکلیف ہو بلکہ وہاں کی سی دھوپ جو جنت کے لائق ہے جس سے تکلیف بالکل نہ ہو یہ اس واسطے کہہ دیا کہ شاید کوئی اعتراض کرے کہ قرآن میں تو صاف موجود ہے لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا یعنی اہل جنت جنت میں نہ دھوپ پائیں گے اور نہ سردی اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں دھوپ نہ ہوگی اور میں نے کہا کہ کوئی دھوپ کو چاہے گا تو جنت میں دھوپ بھی ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی دھوپ نہ ہوگی جس سے تکلیف ہو۔ زمہریر کے مقابلہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ زمہریر سخت سردی کو کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ وہاں نہ ایسی چھاؤں ہوگی جس سے سردی لگے اور نہ ایسی دھوپ ہوگی جس سے گرمی لگے پس ایسی دھوپ کا ہونا جو موجب تکلیف نہ ہو اس آیت کے خلاف نہ ہوا اور وہ بھی ہر وقت نہیں بلکہ اگر کسی کا جی دھوپ کو چاہے تو ہو جائے گی۔ بعضوں کا دل چاہے گا کہ ہمارے بیٹا ہوتا رہائے کوئی بے اولاد ہوگا یہ بھی ہو جائے گا۔ وہاں کیا دیر لگتی ہے فوراً تیار پلا پلایا برابر کا فرزند موجود۔ کسی کا کھیتی کو دل چاہے تو آناً فاناً میں کھیتی تیار اور غلہ اگھایا ہوا صاف شدہ سامنے آکر ڈھیر ہو گیا۔

یہی سوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو ایک شخص نے کہا کہ یہ کھیتی مانگنے والا کوئی انصاری ہوگا۔ یہ اس واسطے کہا کہ انصار اہل زراعت تھے۔ میں نے اپنے استاذ علیہ الرحمۃ سے سنا ہے ان کی نظر بہت وسیع ہے غالباً کسی روایت میں دیکھا ہوگا کہ جنت میں یہ بھی ہوگا کہ ایک پھل ہاتھ میں لیا کھانے کے لئے اور اس میں سے ایک دم ایک حور نکل آئی السلام علیکم پس دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی۔ بعض میں سے ایک جوڑا پوشاک کا نکل آیا یہ بھی ایک حظ ہے کہ ایک نامعلوم چیز دفعۃً پیدا ہو جاوے نعمت کے ملنے سے خوشی تو ہر طرح ہوتی ہے لیکن اگر اس طرح ملے کہ اس کا وہم و گمان بھی پہلے سے نہ ہو تو عجب حظ ہوتا ہے۔ ایک رئیس کا قصہ اپنے استاذ علیہ الرحمۃ سے سنا ہے کہ ان کے یہاں دو قصباتی مہمان آئے تو باورچی نے ان کے سامنے ناشتہ لاکر رکھا جس میں صرف ایک

دستر خوان ڈیڑھ بالشت کا اور ایک چھوٹا پیالہ قورمہ کا اور ایک تشتری میٹھے چاول کی اور چار پتلی پتلی چپاتیاں اس مختصر ناشتے کو دیکھ کر مہمانوں کا جی جل گیا کہ یہ رئیس لوگ جیسے خود کم کھاتے ہیں جس کی وجہ دودھ گھی کی کثرت ہے ایسے ہی دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں۔ خیر جبراً و قہراً وہ چاول اور چپاتیاں جھلا کر جلدی سے ختم کر دیں اور چپ ہو کر بیٹھ رہے خادم نے کہا حضرت نوش فرمائیے یہ اور چل گئے اور کہا کیا کھائیں اس نے پیالہ کو اٹھا کر توڑ کر سامنے رکھدیا یہ نمکین بالائی جمائی ہوئی تھی اس کے بعد اس تشتری کے بھی ٹکڑے کر کے آگے رکھدیئے وہ میٹھی بالائی تھی، پھر دستر خوان اٹھا کر ٹکڑے کر کے سامنے رکھدیا کہ جناب ابھی تو بہت کھانا موجود ہے آپ گھبر لیئے تہیں یہ دستر خوان با قر خوانی روٹی تھی پورا دستر خوان ان سے کھایا بھی نہ گیا اور پیٹ بھر گیا تب ان کی آنکھیں کھلی۔ دیکھئے اگر پہلے ان مہمان صاحب سے کہدیا جاتا کہ دستر خوان یہ ہے اور پیالہ یہ ہے تو اتنا حظ نہ آتا جتنا کہ دفعۃً معلوم ہونے کے بعد کھانے سے ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعمت کا ایک غیر متوقع صورت اور نئی طریق سے نمودار ہونا باعث زیادت حظ کا ہوتا ہے اس کے واسطے کوششیں کی جاتی ہیں اور روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔

ایک مسلمان راجہ نے ایک مرتبہ لفٹنٹ گورنر کے لئے کسی کاریگر سے ایک مٹھائی کا انار بنوایا جس کی صورت بالکل انار کی سی تھی، دانے بھی ویسے ہی تھے، چھلکا بھی ویسا ہی تھا مگر تھی سب مٹھائی۔ ایک انار کے بنوانے میں ڈیڑھ سو روپیہ خرچ ہوئے تھے رد یکھئے خدا تعالیٰ کی نعمتیں کہ ڈیڑھ سو روپیہ میں ایک انار تیار ہوا اور پھر بھی نقلی کا نقلی کہ نہ اس میں دانہ اصلی جیسا نہ گٹھلی اصلی جیسی بس صورت ہی صورت تھی۔ اور خدا کے بنائے ہوئے اصلی انار جن کی برابر یہ ڈیڑھ سو روپیہ کا انار کبھی نہیں ہو سکتا پیسے کے دو دو آتے ہیں سبحان اللہ) اور ایک شخص نے بیان کیا کہ کسی دعوت میں ایک قاب میں چنبیلی کے پھول لائے گئے کہ وہ حقیقت میں چاول پکے ہوئے تھے۔ کاریگر کی صنعت اور محنت دیکھئے کہ کوئی مصالحہ تیار کیا جس میں ایک ایک چاول کو آدھا آدھا ڈبو کر پکایا تھا

اس کے اثر سے وہ آدھا پھول کی طرح کھل گیا اور آدھا ڈنڈے کی طرح رہ گیا اور بالکل یہ معلوم ہوتا
تھا کہ قاب جنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی ہے پھول اٹھانے کے لئے ہاتھ ڈالا گیا تو معلوم ہوا
کہ چاول ہیں اور کھانے کی چیز ہے دیکھئے کتنا بکھیڑا کیا گیا صرف اس واسطے کہ نیا حظ حاصل ہو۔
اسی طرح جنت میں طرح طرح سے نئے حظ حاصل ہوں گے پھل میں سے کوئی پرند خوش الحان نکل آیا
یا کوئی حور نکل آئی تاکہ اہل جنت کو ایک جدید حظ حاصل ہو سبحان اللہ نتبوا من الجنۃ حیث نشاء
ترجمہ:۔ ہم جنت میں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اہل جنت سیر کرتے پھریں گے اور بالکل آزادی
ہوگی جہاں چاہیں پھریں اور جہاں چاہیں رہیں کہیں روک ٹوک نہ ہوگی بالکل مخلے بالطبع ہونگے
اس آزادی کا ترجمہ کسی مسخرہ نے آوارہ گردی کیا تھا۔ خیر لفظی ترجمہ تو بُرے عنوان سے یہ ہوسکتا ہے
مگر یہ وہ آوارہ گردی نہیں ہے جو دنیا میں بری سمجھی جاتی ہے کیونکہ آوارہ گردی دنیا میں اس وجہ
سے عیب ہے کہ مانع عن الکمالات ہے دنیا میں ضرورت ہے انسان کو بہت سے کمالات حاصل کرنیکی
پڑھنے لکھنے کی صنعت و حرفت حاصل کرنے کی روپیہ کمانیکی مکان بنانے کی اولاد حاصل کرنیکی
وغیرہ وغیرہ اوران سب کی تحصیل چاہتی ہے مشغولیت اور مصروفیت کو جس سے آوارہ گردی مانع ہوتی
ہے لہذا عیب سمجھی جاتی ہے اور جنت میں کوئی کمال حاصل کرنا نہیں ہے وہاں ہر چیز کا ذمہ حق تعالے
نے لیا ہے۔ ہم کو کسی مصروفیت اور مشغولیت کی ضرورت نہیں تو وہاں ادھر اُدھر آزاد پھرنا جس کو آوارہ
گردی سے تعبیر کیا تھا کسی کمال کی تحصیل میں مانع نہیں بلکہ تمام کمالات کے حصول کا ثمرہ ہے کہ ہم ایسے
فارغ ہیں کہ کسی کمال کی تحصیل باقی نہیں پھر آزادی سے کیوں نہ پھریں اس واسطے خوشی میں کہتے ہیں
نتبوا من الجنۃ حیث نشاء اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اہل جنت آپس میں احباب سے بھی مل سکیں گے
امام شافعیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے جنت کی اس وقت سے تمنا ہوگئی گویا جب سے سنا ہے کہ وہاں دوستوں
سے ملاقات ہو سکے گی اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں سے ملنا بڑی چیز ہے اور ایسی نعمت ہے جس کی
وجہ سے جنت کی تمنا ہوگئی گویا جنت ذریعہ ہے دوستوں سے ملنے کا تو دوستوں سے ملنا لذات جنت کا
مکمل ہوا مگر وہی دوست جو خدائی دوست ہیں فنعم اجر العاملین ؔ ترجمہ۔ پس کیسا اچھا اجر ہے عمل کرنے
والوں کا اس سے معلوم ہوا کہ یہ جنت اور مافیہا جو کچھ ملا ہے یہ سب عمل کی بدولت ملا ہے بڑی چیز عمل
ہے جس سے آجکل غفلت ہے عوام کی تو کیا شکایت کی جاوے اس واسطے کہ وہ علم ہی نہیں رکھتے جو شخص ایک

چیز کو جانتا ہی نہیں وہ اگر اس کے متعلق کوئی غلطی کرے تو چنداں تعجب کی بات نہیں تعجب اس شخص سے ہوتا ہے جو جانتا ہے اور پھر غلطی کرتا ہے ایک شخص وہ ہے کہ زہر کو پہچانتا اور جانتا نہیں وہ اگر کھالے تو کچھ تعجب نہیں اور اس شخص سے بہت تعجب ہوگا جو زہر کو پہچانتا اور جانتا ہے اور پھر کھاتا ہے گو اس پر چاندی کا ورق لپیٹ کر یا قند چڑھا کر اور کیوڑہ اور بید مشک کی خوشبو دیکھ کھاتا ہو اس کو کوئی معذور نہیں کہے گا آجکل خدا کا نام لینے والے اور طریق کو جاننے والے دو گروہ ہیں اہل علم اہل احوال بلفظ دیگر علماء اور فقراء ایک گروہ علم پر مرتا ہے اور ایک فریق احوال پر علماء اس میں مست ہیں کہ پڑھے جاؤ اور پڑھائے جاؤ فلانے کا قول اس میں یہ ہے اور فلا نیکا یہ ہے اور بڑی وڈران کی قیل وقال ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

علم ظاہر سربسر قیل ست وقال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

علم ظاہر سر بسر یعنی تمام تر قیل وقال ہے نہ اس سے کیفیت حاصل ہوتی ہے نہ حال حاصل ہوتا ہے) ان کا خیال اس طرف کبھی نہیں جاتا کہ کسی چیز کا علم مقصود بالذات بھی ہوتا ہے یا مقصود کسی خاص چیز سے تمتع ہے اور علم صرف اس کا ذریعہ ہے مثلاً مٹھائی ایک لذیذ چیز ہے اور قوی اور کثیر الغذا شے ہے تو کیا صرف اس کی ماہیت کا جان لینا یا اس کے خواص کا جان لینا مقصود ہے اور یہیں انتہا کر دینا چاہیئے۔ یا مقصود مٹھائی کا کھانا اور اس سے لذت اٹھانا اور بدن کو پرورش کرنا ہے اور ان کی ماہیت اور خواص کا علم ان اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے ظاہر بات ہے کہ مقصود اور کام کی بات ثانی ہے نہ کہ اول علماء اسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ علم دین کو مقصود سمجھ رکھا ہے اور تمتع بالدین کو نہیں ان دونوں میں فرق بتاتا ہوں اور وہ کچھ غامض بات نہیں فرق وہی ہے جو مٹھائی کی ماہیت اور خواص کے جاننے اور مٹھائی کے کھانے میں ہے اصل غلطی یہ ہے کہ دین نام رکھا ہے صرف احکام دین کے جاننے کا اور جب یہ حاصل ہے تو سمجھتے ہیں کہ ہم کو دین حاصل ہے حالانکہ دین نام ہے اس تعلق کے درست کرنیکا جو بندہ اور حق تعالیٰ کے درمیان میں ہے جس کے لئے مختصر اور جامع لفظ عبودیت ہے اس کے حاصل کرنے کا نام دین ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو بلا اہتمام حاصل ہو جائے بلکہ اس کے لئے کچھ طریقے ہیں جن کو خود خدائے تعالیٰ نے بتایا ہے اور وہ ایسے طول طویل اور غامض ہیں جنکے بتانے اور سمجھانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے کی ضرورت ہوئی وہ مدرک بالعقل نہیں

ان طریقوں کے جاننے کا نام علم دین ہے تو چونکہ یہ اچھی اور ضروری چیز کا علم ہے اس واسطے یہ بھی اچھا اور ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں بلکہ محض ذریعہ ہے تو ذریعہ میں مست ہو جانا مقصود سے رہ جانا ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک حلوائی کامل فن ہے اور بڑا استاد ہے تمام شہر اس کا شاگرد ہے کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ مٹھائی ایسی نہیں جس کا بنانا وہ نہ جانتا ہو اور ساری عمر اس نے یہی کام کیا کہ مٹھائی بنائی اور بیچی اور لوگوں کو کھلائی لیکن میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر اس نے مٹھائی کو منہ میں نہ رکھا ہو تو ساری عمر میں اس کا منہ میٹھا ایک دفعہ بھی نہ ہوا ہوگا۔ اس سے تو وہ شخص اچھا ہے جس کو مٹھائی بنانی تو ایک بھی نہیں آتی مگر لڈو اسی سے خرید کر یا مانگ کر یا جس طرح بھی ہو گود میں بھر رکھے ہیں اور کھا رہا ہے اور مزے لے رہا ہے اور مقصود اس کو حاصل ہے یہی حالت ان عالم صاحب کی ہے کہ ساری عمر علم دین کی خدمت میں صرف کی اور علم کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور تمام شہر ان کا شاگرد ہے ہزاروں کو ان سے فیض ہو رہا ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہ اس حلوائی کی طرح گدی پر چڑھے بیٹھے ہیں اور شاگردوں کو بھی بتلا رہے ہیں اور مٹھائی تمام شہر کو بھی کھلا رہے ہیں مگر خود کبھی نہیں کھائی تو واللہ باللہ ان کا منہ میٹھا نہیں ہونیکا ہزاروں آدمی ان کی بدولت دیندار ہو جاویں گے مگر ان کو دین کا ذائقہ بھی نہیں معلوم ہونے کا پس دین نام اس تعلق کا ہے جو حق تعالیٰ کے ساتھ ہے جس کا نام عبودیت ہے جس کی ضد تکبر ہے اہل علم اس کو غور کر لیں کہ ان میں عبودیت ہے یا اس کی ضد پس اس کی تفصیل میں زیادہ نہیں کرتا کیونکہ وہ علم رکھتے ہیں اور ان کی ماہیتوں کو وہ خود جانتے ہیں پس شکایت میں اس کی کرتا ہوں کہ اپنے احوال میں غور کیوں نہیں کرتے اور کیوں ہر وقت نگرانی نہیں رکھتے اور اگر خود سمجھ میں نہیں آتا تو کسی فن کے جاننے والے سے کیوں نہیں مشورہ کرتے اور کیوں اس کے سامنے اپنے حالات عرض نہیں کرتے تاکہ وہ بتلائے کہ اتنا حصہ اس میں عبودیت کا ہے اور اتنا تکبر کا علم کو منتہائے عروج کیوں قرار دے لیا ہے مگر جیسا کہ دوسروں کی اس سے اصلاح کرتے ہیں اپنی بھی تو کریں مٹھائی بیچ بیچ کر دوسروں کا منہ میٹھا کرتے ہیں اپنا بھی تو کریں اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ علم دین اور تمتع بالدین میں کیا فرق ہے تمتع بالدین مقصود ہے علم دین بالذات مقصود نہیں ہاں علم ذریعہ ہے تو ذریعہ کو حاصل کر کے بیٹھ نہ رہو ذریعہ کو مقصود نہ بناؤ بلکہ اس سے وہ چیز حاصل کرو

جس کا وہ ذریعہ ہے سیڑھی بناؤ چھت پر چڑھنے کے لئے بدون اس کے کام نہ چلے گا مگر سیڑھی بنانے ہی میں نہ رہ جاؤ بلکہ چھت پر بھی تو چڑھو اور سیڑھی بھی اتنی ہی بناؤ جتنی چھت پر چڑھنے کے لئے کافی ہو نہ یہ کہ ہزاروں گز لمبی بنائے جاؤ اور ساری عمر اس میں صرف ہو جاوئے چاہے چھت پر بارش ہوتی رہے اور ٹپک ٹپک کر گرہی پڑے اور سارے گھر کو لے بیٹھے غرضکہ علم ذریعہ ہے عبودیت حاصل کرنے کا اس کو خود مقصود مت بناؤ بلکہ اس کے ذریعہ سے عبودیت حاصل کرو اور اس کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ ساری عمر اس میں صرف ہو جاوے مقصود کی تکمیل رہ جاوے اور نفس و شیطان تمہارا کام تمام کر دیں اور ایسی حالت میں موت آجاوے بس مقصود پر نظر رکھو خوب سمجھو کہ اگر عالم اور محقق نہ ہوں گے تو کچھ حرج نہیں اور بندہ نہ ہو گے تو حرج ہے عبودیت حاصل کرو اور یہی سمجھو کہ عبودیت نام صرف نماز روزہ کا نہیں بلکہ اصلاح باطن اور تہذیب اخلاق بھی اس کا جزو ہے بلکہ جزو اعظم ہے تمام اجزاء دین کی تکمیل کا نام دین ہے عبادات معاملات معاشرات عادات اخلاق سب دین ہی ہیں صرف عبادات پر بھی بس نہ کرو نرے علم پر بس کرنا تو کیا یہ تو فرقہ علما کی کوتاہی کا بیان ہوا۔

اب لیجئے فقراء کو کہ وہ صرف کیفیت وحال میں مست ہیں علماء نے علم کو مقصود سمجھا تھا انھوں نے حال کو مقصود سمجھا ہے حالانکہ مقصود ابھی دور ہے اگر کسی کو کشف ہونے لگا یا رقت طاری ہونے لگی یا انوار نظر آنے لگے یا دست غیب یا اور کوئی کرامت حاصل ہوگئی تو بس دوڑ ختم ہوگئی اور حاصل ہوگئی اب ان کو اعمال کی ضرورت ہی نہیں ہی گو یا اعمال اس واسطے کئے جاتے تھے کہ یہ کیفیت حاصل ہو جاویں۔ صاحبو واقع میں اس کا عکس ہے کہ مقصود اعمال ہیں اور یہ کیفیات اس واسطے طاری ہوتے ہیں کہ اعمال کا شوق بڑھے اس کی مثال ایسی ہے کہ بخار کے لئے دوا دی جاتی ہے مگر بعض وقت وہ کڑوی ہوتی ہے تو اس سے مریض کو نفرت ہوتی ہے اس واسطے اس پر قند چڑھا دیتے ہیں تاکہ خوش ذائقہ معلوم ہو اور طبیعت قبول کرلے یا سونے چاندی کے ورق

لپیٹ دیتے ہیں تاکہ خوش منظر ہو جاوے اور مریض خوشی سے کھالے اب کوئی قند کو اور سونے چاندی کے ورق کو مقصود سمجھ لے اور اسی کا طالب اور خریدار رہے اور اسی کو طبیب سمجھے جو قند اور ورق دے تو یہ غلطی ہوگی یا نہیں۔ اصل مقصود بخار کی دوا ہے چاہے کیسی ہی کڑوی کیوں نہ ہو اور اسی سے بخار کو فائدہ ہوگا قند اور ورق اس پر ہوں تو خوش گواری کا باعث ہے اور نہ ہوں تو مقصود میں کچھ خلل نہیں قند اور ورق کی تلاش میں اتنا مت پڑو کہ اصل دوا ہی سے رہ جاؤ اور اسی کو طبیب کی قابلیت اور شفقت کا معیار مت سمجھو ایسا نہ ہو کہ اس دھوکہ میں بخار بڑھ جاوے اور ہڈیوں میں رچ جاوے اس وقت یہ قند اور ورق کام نہ آویں گے غرض کام کی چیز دوا ہے اور قند و ورق صرف حلق میں اتر جانے کے معین ہیں۔ اب سمجھو کہ حالات اور کیفیات قند اور ورق کے مثل ہیں کہ طالب کے لئے سلوک میں باعث ازدیاد شوق ہوتے ہیں یہ خود مقصود نہیں ہیں کہ ان کے حاصل ہونے کے بعد اصل چیز یعنی تقرب الی اللہ کی ضرورت نہ رہے اور تقرب الی اللہ عبودیت سے ہوتا ہے۔ عبودیت کا حاصل ابھی باقی ہے اور عبودیت نام ہے اعمال کا یعنی دین کے اجزاء خمسہ کی تکمیل کا جو کہ عبادات اور معاملات اور عادات اور معاشرات اور اخلاق کا مجموعہ ہے اصل دوا یہ ہے کہ اور کیفیات اور حالات قند و ورق ہیں ان پر مت بھولو ان کو ذریعہ اور معین سمجھو اور مقصود پر نظر رکھو تری کیفیات سے کچھ نہیں ہوتا۔ عرفی سچ کہہ گیا ہے ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

(اگر اے عرفی صرف رونے سے محبوب مل جاتا تو سو برس تک میں رونے کی تمنا کرتا)

یہاں تک تو دونوں فریق کی کوتاہی کا بیان ہو گیا سو یاد رکھو کہ جنت اور جو کچھ آخرت میں ملے گا وہ عمل سے ملے گا نہ علم اور حال سے اسی واسطے کہتے ہیں فنعم اجر العاملین وتری الملئکۃ حافین من حول العرش یسبحون بحمد ربھم اور دیکھو گے فرشتوں کو پرے کے پرے عرش کے آس پاس کہ تسبیح کرتے ہوں گے حق تعالیٰ کی اور حمد کرتے ہوں گے

تسبیح کہتے ہیں تنزیہ کو صفات رذیلہ سے اور تحمید کہتے ہیں اثبات صفات جمیلہ کو وقضی بینھم بالحق۔ ترجمہ اور بندوں کے درمیان یہ حکم اور فیصلہ بالکل صحیح طور پر کیا ہوا ہوگا یعنی ان کے اعمال کی یہ جزا ہوگی کسی کا حق مارا نہ جاوے گا قضی کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ ہوگا خدائے تعالیٰ کے حکم سے ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی حکومت اور الوہیت اور اہل جنت کی عبدیت اب بھی ختم نہ ہو جائے گی الوہیت تو کیا ختم ہوتی اس کا ظہور بھی ختم نہ ہوگا یہ اس کا ظہور ہی تو ہے کہ فرشتے تسبیح اور تحمید برابر کرتے ہوں گے جیسا کہ اب کرتے ہیں اور اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب فرشتے ذکر کرتے ہوں گے تو اہل جنت بھی ذکر کرتے ہوں گے کیونکہ ذکر تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ہے جب یہ فرشتوں کو نصیب ہے تو اہل جنت کو کیوں نصیب نہ ہوگی اصل مقصود تو جنت سے نعمتیں ہی دینا ہے اور مستقل نصوص سے بھی ان کا مشغول ذکر ہونا ثابت ہے لا یسمعون فیھا لغوا ولا تأثیما الا قیلا سلٰما سلٰما وقالوا الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن دعوٰھم فیھا سبحنک اللّٰھم اور خود اس مقام پر ہے وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ۔ ہاں اہل جنت اس کے مکلف نہ ہوں گے یعنی ایسا نہ ہوگا جیسا دنیا میں ہے کہ یہاں ذکر کرنے کا حکم ہے اور طبیعتوں میں تقاضے اس کے خلاف رکھے ہوئے ہیں جو ذکر سے مانع ہوتے اور ان کے وجہ سے ذکر کے لئے قصد و اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے اور ذکر سے یہاں تکان بھی ہوتا ہے مگر وہاں نہ قصد کی ضرورت ہوگی نہ اہتمام کی نہ ذکر سے کچھ تکان ہوگا بلکہ ذکر داخل طبیعت ہوگا اور اندر سے خود طبیعت کے فعل سے ذکر برابر ہوتا رہے گا جیسے یہاں سانس لینے کا حال ہے کہ یہ بھی ایک حرکت ہے اور بہت سے اعضاء کے فعل سے اس کا وجود ہوتا ہے مگر اس کے لئے قصد کی ضرورت ہے نہ کسی اہتمام کی حتیٰ کہ سوتے میں بھی خود بخود جاری رہتا ہے اور نہ اس سے کچھ تکان ہوتا ہے بلکہ قوت اور بقائے حیات سب اس پر موقوف ہے۔ اسی طرح جنت میں ذکر ہوگا کہ سانس کے ساتھ خود تسبیح اور

تحلیل سب جاری ہو گی ذاکرین کے لئے بڑے بڑے مزے کی بشارت ہے کہ وہاں پاس انفاس جاری ہو گا اور بے تکان ہر وقت مزے لیں گے اور دنیا کی طرح کسی وقت تھک کر بند کرنے کی ضرورت نہ ہو گی اور فرشتوں کے ذکر میں اہل جنت کو ایک لطف اور ہے جس کو عشاق جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ محبوب کا ذکر اپنی زبان سے تو لذیذ ہے ہی محبوب کے ذکر کا دوسرے سے سننا بھی لذیذ ہے اہل ذکر اور اہل قلب اسی واسطے تو سمع پر مرتے ہیں سماع سے مراد سمع مروج مع مزامیر نہیں لاحول ولا قوۃ یہ تو ایسا ہے جیسے فرینی میں غلیظ ملا دینا ذکر مامور بہ اور محمود شے ہے جیسے فرینی لطیف اور مرغوب چیز ہے اس میں مزامیر کو ملا دینا ایسا ہے جیسے فرینی میں غلیظ ملا دینا یہ کثیف اور نا مرغوب اور قابل نفرت چیز ہے سماع سے مراد اچھی آواز کے ساتھ دوسرے سے کوئی اچھا کلام سن لینا مثلاً قرآن شریف کسی خوش آواز قاری سے سننا یا کوئی شعر اشعار متعلق سلوک دوسرے سے سن لینا چونکہ ذاکر اپنی زبان سے ذکر کرتے کرتے اس سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ اس سے التذاذ باقی نہیں رہتا یعنی اس کی لذت کا حس نہیں رہتا اس وقت کان سے جو ذکر سنتا ہے اس سے زیادہ لذّت پاتا ہے حتیٰ کہ اضطرار کی سی حالت ہو جاتی ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا حقیقی سماع یہ ہے جس میں لوگوں نے اس قدر غلو کیا ہے کہ محتاج بیان نہیں اس کی اصل یہ ضرور ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے سے قرآن سُنا تھا بس اس کو بعض لوگوں نے آڑ بنا کر تمام لہو ولعب اور منہیات کا دروازہ کھول دیا۔ انصاف سے دیکھئے اس سے تو صرف اتنا ہی سماع ثابت ہوتا ہے جتنا میں نے بیان کیا اور اگر اس میں کوئی توسع کرے تو ایسا ہو گا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانا پینا بھی ثابت ہے تو کیا اس سے گندی چیزوں کے کھانے کا بھی ثبوت ہو جاوے گا۔ غرض محبوب کے ذکر کا سننا بھی لذیذ ہے اس واسطے فرشتے ذکر کرتے ہوں گے تا کہ یہ لذت بھی اہل جنت کو حاصل ہو۔

جنت میں حوروں کا گانا بجانا بھی ہو گا کیونکہ یہ بھی لذت سے خالی نہیں مگر

کہاں حوروں کا گانا بجانا کہاں ملائکہ کی تسبیح اور ذکر وہاں مذاق بالکل صحیح ہوں گے اس لئے جو لذت ذکر میں آوے گی وہ گانے بجانے میں نہیں آوے گی قضی بینہم کو ماقبل سے ربط یہ ہے کہ یہ بمنزلہ ذکر نتیجہ بعد القیاس کے ہے جیسے کہا جاتا ہے العالم حادث لانہ متغیر وکل متغیر حادث فالعالم حادث پہلے العالم حادث کو بصورت دعوے کے لایا جاتا ہے پھر اس پر دلیل قائم کی جاتی ہے جس کو قیاس کہتے ہیں اس سے وہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے۔ اب اس کو پھر دہراتے ہیں اور اب اس کو نتیجہ کہتے ہیں۔ ان آیات میں توحید کا اثبات تھا اور شرک کی نفی تھی قل افغیر اللہ تامرونی اعبد ایھا الجاھلون ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین میں یہ دونوں دعوےٰ مذکور ہیں اس کو آئندہ آیات کے ساتھ تعلق ہے جو دعویٰ کو دلیل کے ساتھ ہوتا ہے جیسے العالم حادث کو لانہ متغیر حادث کے ساتھ تعلق ہے آئندہ آیات میں معاد کا ذکر ہے اور یہ ذکر جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا تھا اسی مضمون توحید کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے تاکہ قدرت حق تعالیٰ کی ثابت ہو جاوے اور اس خیال کا موقع کسی کو نہ رہے کہ حق تعالیٰ کسی بات سے عاجز ہیں اور اس بات کے لئے دوسرے خدا کی ضرورت ہے جیسا کہ بعض مشرکین نے کہا تھا کہ سات معبود ہیں بڑے بڑے کاموں کے لئے خدا ہے جو آسمان میں ہے اور معمولی کاموں کے لئے اور ہیں۔

معاد کے تمام کارخانہ کے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ کمال بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے اور آثار کمال بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہیں کوئی تصرف کسی دوسرے کے لئے نہیں ہے اس سے ربوبیت کے آثار بھی ظاہر ہو گئے اور الوہیت کے بھی اور اس سے توحید کی تاکید ہو گئی اور ثابت ہو گیا کہ تکوین بھی حق تعالیٰ ہی کا حق ہے اور تشریع بھی تکوین اثر ربوبیت ہے اور تشریع اثر الوہیت مضمون معاد سے ان سب باتوں کی اچھی طرح تاکید ہو گئی اب ان

دونوں نقطوں میں پھر اسی توحید اور ربوبیت اور الوہیت کے مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے چنانچہ وقضٰی بینھم میں الوہیت کا بیان ہے اور الحمد للہ رب العلمین میں ربوبیت کا اور کلام کو ختم کیا مضمون ربوبیت پر اس سے کس قدر رافت و رحمت ٹپکتی ہے معاد کا بیان ختم ہوا۔

میں نے اول ہی میں کہدیا تھا کہ ان آیات سے مقصود اثبات توحید اور نفی شرک کا بیان کرنا ہے اور ساتھ ساتھ حق تعالے نے شکایت کی ہے اپنے حقوق نہ پہچاننے کی اور یہ حقوق بہت ہیں ان کے پہچاننے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور ایک قسم کے علم کی ضرورت نہیں بلکہ متعدد علوم کی ضرورت ہے علم عقائد کی اور علم احکام کی، عبادات کی، معاملات کی، عادات کی، اخلاق کی اور ان علوم کے لئے بعض ان علوم کی بھی ضرورت ہے جو از جنس مبادی ہیں جن کو علوم آلیہ کہتے ہیں جیسے صرف و نحو معقول فلسفہ ان سب کی تعلیم کے جو مجالس متکفل ہیں ان ہی کا نام مدارس ہے اس سے مدارس کی ضرورت ثابت ہوگئی۔ چنانچہ اس ضرورت کو محسوس کرکے جابجا مدارس قائم کئے گئے ہیں جو فیض ان سے ہورہا ہے وہ سب کو معلوم ہے ان مدارس کی ضرورت یاد دلانے اور شوق تازہ کرنے کے لئے ہر سال یہ علمی جلسے ہوتے ہیں ان سے ان مجالس کی بھی ضرورت ثابت ہوگئی غرض یہ ہے کہ کوئی کام بدون کئے نہیں ہوتا اہل مدارس جو کام کررہے ہیں اس میں دو وجہ سے ضرورت ہے سب کے شریک رہنے اور ہمدردی کرنے کی ایک تو یہ کہ یہ کام ایک کے کرنے کا نہیں ہے۔ علماء کا کام درس تدریس ہے تو دوسروں کا کام مالی امداد ہونا چاہیئے۔ اگر علماء دونوں کام کریں تو ایک بھی نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ کام صرف علما کی ضرورت سے نہیں کیا جاتا کیونکہ دین کی ضرورت صرف علما ہی کو نہیں ہے بلکہ ہر ہر فرد مسلمان کو اس کی ضرورت ہے تو کیا وجہ ہے کہ تمام کام علماء ہی کے ذمہ ڈال دیا جاوے انصاف سے دیکھئے تو انھوں نے ایسا بار اپنے ذمہ لے رکھا ہے جو آپ سے نہیں اٹھ سکتا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر وہ کام جو آپ کررہے ہیں علما کرنے لگیں تو خیر میں یہ تو

نہیں کہتا کہ آپ سے اچھا کریں گے۔ اگر اس دعوٰی کی بھی گنجائش ہے کیونکہ جس کام کو عوام کر سکتے ہیں اس کو اہل علم کیوں نہیں کر سکتے) تاہم برا بھلا تو کرہی لیں گے اور وہ کام جو علماء کر رہے ہیں اگر آپ کریں تو برا بھلا بھی نہیں کر سکتے لہٰذا آپ کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے اور غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ انھوں نے آپ کے ذمہ ہلکا کام رکھا ہے اور خود بھاری کام لے لیا ہے غرض آپ اپنا کام تن دہی سے کئے جائیے وہ اپنا کام کر رہے ہیں اس طرح اس دینی کام کی تکمیل ہو سکتی ہے اور سب کو دینی فیض پہنچ سکتا ہے یہ سب کا کام ہے تو سب کو بٹانا چاہیئے اور رہی نکتہ چینی سو یہ ان کا کام ہے جو خود بھی کام کرنا نہیں چاہتے اور دوسرے کو بھی کام کرنے نہیں دیتے ان کے دل میں دین کی ضرورت ہی نہیں ہے لہذا اس کے ذرائع کی بھی ضرورت نہیں ہے اسی لئے ان ذرائع کے نہ ہونے سے ان کے دلوں پر کچھ الم اور قلق کا اثر نہیں ہوتا۔ اس نکتہ چینی کے متعلق ذرا تفصیل سے بیان کیا جاتا اور میں بعض واضح مثالوں سے اس کی خرابی سمجھاتا مگر بعض مثالیں ایسی ہیں کہ موجب ناگواری ہو سکتی ہیں اس واسطے ایک لطیف مثال پر بس کرتا ہوں جس سے توضیح مطلب ہو جاوے گی اور ناگواری بھی نہ ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ یہ ان کی نکتہ چینی ایسی ہے جیسے فرشتوں نے کہا تھا جب ان کو خبر دی گئی کہ ہم زمین میں آدم کو خلیفہ بنانے والے ہیں تو انھوں نے کہا اتجعل فیھا من یفسد فیھا یعنی اے اللہ آپ اس کو خلیفہ بنائیں گے جو فساد کرے گا اس کا حاصل یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک مضرت ان کے خلیفہ ہونے کی بیان کر دی یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے کیا کیا ان کے کہنے کا اتباع نہیں کیا اور اس اشکال سے حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کو ملتوی نہیں کر دیا آپ کا مذاق اس وقت مدارس کے بارہ میں فرشتوں کے مذاق کے موافق ہے کہ آپ نے بھی ایک خرابی کی وجہ سے کام بند کر دینا مناسب سمجھا جیسے ملائکہ نے فساد کے اندیشہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت کو موقوف کر دینے کی رائے پیش کی تھی مگر حق تعالیٰ نے اس مضرت پر

نظر نہیں فرمائی بلکہ مصلحت کو مقدم رکھا اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کسی کو مدرسہ کے متعلق کوئی اشکال بھی ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ مدرسہ کو جڑ سے اڑا دینے کی کوشش کی جاوے۔ اس خرابی کی اصلاح کی کوشش کیوں نہ کی جاوے آخر جو منافع اور مصالح اور ضرورتیں مدرسہ کے ساتھ وابستہ ہیں وہ کیسے پوری ہوں آپ کا ذہن تو وہاں گیا جہاں فرشتوں کا گیا کہ مضرت کی وجہ سے کام کو جڑ سے اڑا دیا جاوے اس میں آپ پر اعتراض نہیں کیا جاتا بلکہ تعریف کی جاتی ہے کہ آپ کا مذاق فرشتوں کا سا مذاق ہے لیکن اس کے مقابلہ میں دوسرا مذاق اس سے بھی اعلیٰ موجود ہے وہ وہ ہے جس طرح حق تعالے کا ارادہ ہوا کہ مصلحت کا القا کیا جاوے اور خرابی کو رفع کیا جاوے یہ مذاق ظاہر ہے کہ اعلیٰ اور ارفع ہے ایسا ہی آپ بھی کیجئے کہ اصلاح کیجئے اور جڑ سے نہ اڑائیے جڑ سے اڑانے پر ایک افیمی کا قصہ یاد آیا کہ افیم کی پینک میں تھے ایک مکھی ان کی ناک پر بار بار آکر بیٹھتی تھی کئی دفعہ اڑایا مگر بعض مکھی ضدی ہوتی ہے کہ جہاں سے اڑاؤ وہیں آکر بیٹھتی ہے یہ بہت تنگ ہوئے اور ایک دفعہ غصہ میں آکر اپنی ناک کو استرے سے کاٹ ڈالا اور کہا لے حرام زادی اب بیٹھ کہاں بیٹھے گی ہم نے تیرا اڈا ہی نہیں رکھا۔ حضرت یہ جڑ سے اڑانا تو ایسا ہے کہ مکھی کا تو کچھ بھی نہ بگڑا ان حضرت کی ناک گئی اسی طرح آپ مدرسہ کو جڑ سے اڑا دیں گے تو علماء کا کیا بگڑے گا ابواب رزق بہت سے ہیں وہ اور کوئی مشغلہ تلاش کرلیں گے مگر آپ کی ناک جاتی رہے گی یعنی دینی فیض سے محروم ہو جاؤ گے۔ اس پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نکتہ چینی اور اعتراض نہیں کرتے بلکہ اصلاح ہی چاہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس سے مخالفت مقصود نہیں ہے اس کے متعلق ایک اصول عرض کرتا ہوں اس کو پیش نظر رکھ کر جو کچھ کرنا ہو کیجئے وہ یہ ہے کہ معاملہ خدا کے ساتھ درست کرو جو کچھ کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ اس میں ہماری غرض اور نفسانیت شامل ہے یا نہیں اور کسی کے کہنے سننے کی پرواہ مت کرو خدا کو حاضر ناظر جان کر بات کہو اگر تمہارا دل گواہی دیتا ہے کہ

ہمارا معاملہ حق تعالےٰ کے ساتھ صاف ہے اور اس میں کوئی غرض اور خواہش شامل نہیں ہے تو شوق سے کہو اس وقت وہ ضرور ایسی بات ہوگی جو اصلاح کے متعلق ہوگی مگر میں اس کی کچھ علامتیں بھی بتائے دیتا ہوں کیونکہ بعض وقت اپنے ہی فعل میں التباس ہو جاتا ہے اور آدمی سمجھتا ہے کہ یہ میرا فعل خالصاً لوجہ اللہ ہے حالانکہ اس میں بہت سی نفسانیتیں شامل ہوتی ہیں۔ ایک علامت تو یہ کہ جو بات لوجہ اللہ ہوتی ہے وہ دل آزار پیرایہ میں نہیں ہوتی نہ سخت لہجہ میں ہوتی ہے بلکہ ایسی شفقت اور ہمدردی کے ساتھ ہوتی ہے جیسے باپ بیٹے کا کوئی عیب دیکھتا ہے تو اس کو آہستہ سے علیحدگی میں سمجھاتا ہے اور کسی کے سامنے گاتا نہیں پھرتا نہ اخباروں میں شائع کرتا ہے حتیٰ کہ اگر دس برس بھی بیٹا اس کا کہنا نہ مانتے تب بھی اس کو یہ گوارا نہ ہوگا کہ کوئی دوسرا آدمی اس کے عیب کو سن لے اور جب سمجھائے گا علیحدگی میں سمجھائے گا ایسا نہ ہوگا کہ جیسے آجکل مدرسوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ذراسی بات خلاف طبع پائی اور جھٹ سے اشتہار مخالفت میں شائع کردیا اخباروں میں دھوم مچادی اور ساتھ کے ساتھ لکھتے جاتے ہیں کہ ہم کو اصلاح مقصود ہے ہم مدرسہ کے بدخواہ نہیں ہیں صاحبو اس علامت کو پیش نظر رکھ کر دیکھئے۔ کیا آپ کا برتاؤ اپنے بیٹے کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ ذراسا عیب اس میں دیکھیں اور اخبار میں شائع کردیں اور کیا اس کو بھی اس لہجہ میں سمجھاتے ہیں جس لہجہ میں مدرسہ والوں سے گفتگو کرتے ہیں اگر حق پسند آدمی ہے تو وہ اسی سے ہیئت اور نفسانیت کو پہچان سکتا ہے اور ایک علامت یہ ہے کہ آدمی غور کرکے دیکھے کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا جو مدرسہ میں ہیں اور وہ میری جگہ ہوتے اور وہ مجھ پر اعتراض کرتے تو کیا ان کے اعتراض کو میں ٹھنڈے دل سے سنتا یا مجھے اس سے ناگواری ہوتی۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر اس پر نظر کرے اگر دل میں دوسرے کے اعتراض سے ناگواری پائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ تم میں

اہلیت اور اصلاح کچھ نہیں صرف تعنت ہے اور یہ جتلانا چاہتے ہو کہ ہم بھی اہل رائے ہیں۔ اور ایک علامت اہلیت کی یہ ہے کہ اپنی بات پر بہت اصرار نہیں ہوتا صرف حق کو واضح کر دینا اور سمجھا دینا ہوتا ہے دیکھو حق تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جابجا فرمایا ہے لست علیہم بمصیطر۔ ولا تسئل عن اصحاب الجحیم۔ ولا تحزن علیہم۔ فان اعرضوا فما ارسلناک علیہم حفیظًا ان علیک الا البلاغ وغیرہ وغیرہ جب کفار کے ساتھ بھی یہ معاملہ تعلیم فرمایا گیا ہے تو اہل اسلام کے ساتھ تو کیا ہونا چاہئے پس جس کو مدرسہ کی اصلاح مقصود ہو گی وہ ایک بار اپنی رائے پیش کر کے اس پر اصرار نہ کرے گا نہ مدرسہ والوں کے درپے ہو گا یہ علامتیں ایسی ہیں جن سے للّٰہیت اور نفسانیت میں بخوبی فرق کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آدمی انصاف پسند ہو اور عناد نہ رکھتا ہو دین کے کام میں شیطانیت اور نفسانیت کو شامل نہ کرو حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھو اگر معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ درست ہے اور للّٰہیت کے ساتھ بات کہی گئی ہے تو بات دل کو لگ جاتی ہے اور ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے اور یہ بات ایک ہی فریق سے نہیں کہی جاتی ہے بلکہ دوسرے فریق سے بھی بلکہ ہر شخص سے کہی جاتی ہے کہ جو کام کرو خلوص اور للّٰہیت سے کرو نفسانیت سے نہ کرو ورنہ برکت جاتی رہتی ہے چاہے کیسا ہی نیک کام ہو اور چاہے ذرا سا کام ہو مگر خلوص کے ساتھ ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے چاہے اس کا کوئی بھی معاون نہ ہو دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جس وقت آپ نے تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا ہے کونسا مجمع تھا کیا امید کی جا سکتی تھی کہ یہ کام چلے گا مگر اس میں خلوص ہی خلوص تھا اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے کہ کام ایسا چلا کہ آج تمام عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام موجود ہیں کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں مسلمان نہ ہوں۔

میں تو اہل مدرسہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ مخالفین کے اعتراضات کے دفعیہ وغیرہ کی بھی کوشش نہ کریں یہ بھی ایک مشغلہ ہے اپنا کام خلوص سے کئے جاویں۔ سب شور و غل آپ ہی دب جاویں گے۔ اب دعا کیجئے۔ ختم ۱۰ بجکر ۵۵ منٹ پر

(ایک علم غیر منقول) بعد وعظ خواجہ عزیز الحسن صاحب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ حضور ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ جنت میں کسی کو کھیتی کی خواہش ہوگی تو فوراً کھیتی تیار ہو کر خرمن میں غلہ کا انبار موجود ہو جائے گا اس میں کیا حظ ہوگا حظ تو اس میں ہو سکتا ہے کہ زمین جوتی گئی کاشت ہوئی کھیتی ہری ہری پیدا ہوئی کاٹی گئی تب دانہ تیار ہوا ایک عرصہ تک مشغلہ رہا بہت سے لوگ جمع رہے ہنستا بولتا رہا علیٰ ہذا جنت میں اولاد کی خواہش کسی کو ہوگی تو فوراً برابر کا لڑکا پلا پلایا تیار ہو جاوے گا۔ اس میں کیا بھی کیا حظ ہوگا حظ تو بتدریج پرورش کرنے میں ہوتا ہے فرمایا وہاں مذاق بالکل صحیح ہوں گے اصل مقصود پر نظر ہوگی حصول مقصود سے حظ ہوگا یہ یہاں کی بدمذاقی ہے کہ ذرائع میں لطف آتا ہے حالانکہ اُن میں مصائب بھی ہیں کہیں بیل مرگیا کہیں پانی کم برسا کھیتی خراب ہوگئی علیٰ ہذا کہیں حمل کی تکلیف کہیں وضع کی کہیں بچہ کی بیماری کی دنیا میں طبیعتیں ان ہی بکھیڑوں کی خوگر ہوگئی ہیں اس واسطے حظ آتا ہے جیسے بھنگی کے دماغ میں غلیظ کی بو بس جاتی ہے تو اس سے اس کی طبیعت مانوس ہو جاتی ہے ورنہ یہ بکھیڑے کوئی حظ کی چیز نہیں اور یہ بھی عرض کیا کہ حوریں نہایت ہی حسین ہوں گی فرمایا جی ہاں اس کے حسن کا بیان نہیں ہو سکتا حور دراصل ایک دوسری ہی مخلوق ہے از جنس انسان نہیں ہے جنت کی مخلوق ہے عورتوں کے ساتھ اس کو اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ اور کوئی نظیر اس کی یہاں موجود نہیں تم بحمد اللہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

(التماس کاتب) یہ وعظ احقر نے اپنے عزیز بھائی مولوی حکیم محمد یوسف مرحوم کی طرف سے لکھا ہے عزیز مرحوم وعظ نویسی کے بہت دلدادہ تھے۔ پیشہ طبابت چھوڑ کر بے حد محنت اور جانفشانی کے ساتھ مختصر نویسی سیکھی اور تھانہ بھون میں حضرت والا کے قدموں میں جا پڑے اور وعظ لکھتے رہے۔ بہت سے وعظ ان کے لکھے ہوئے آپ کی نظر سے گذرے ہوں گے مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۳۳۹ھ میں انھوں نے انتقال کیا حضرت مدظلہ کو ان کے ساتھ اس قدر انس تھا کہ بعد انتقال بار بار فرمایا کہ بعض اپنے عزیزوں کا رنج میرے دل سے بھول گیا مگر مولوی

یوسف کا رنج نہیں بھولتا. ناظرین دعا فرماویں کہ حق تعالیٰ اس وعظ کا ثواب ان کو پہونچا دیں اور جنت الفردوس میں ان کو اعلیٰ درجہ عطا فرماویں اور جس کسی کو اس وعظ سے کتابت کا یا تصحیح کا یا طبع کا کوئی تعلق ہو سب پر نظر رحمت فرماویں اور حضرت مدظلہ کے فیض مواعظ کو تا بمدتہائے دراز قائم رکھیں" ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد" یہاں ایک خواب بھی لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو از جنس مبشرات ہے. بعد انتقال عزیز مولوی محمد یوسف مرحوم کے احقر محمد مصطفیٰ نے ایک روز بحالت اطمینان خواب میں دیکھا کہ عزیز موصوف سخت بیمار رہیں اور حضرت مولانا مدظلہٗ ان کے پاس تشریف لائے ہیں ایک شخص نے آکر کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی یوسف کی شان میں ایک قصیدہ آسمان سے اترا ہے وہ قصیدہ اس شخص نے سب کے سامنے پڑھا جس میں ایک مصرع یہ بھی تھا "آنکہ نامش یوسفِ جنت نشاں" اس قصیدہ کو سن کر حضرت مولانا نے فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ مولوی یوسف اس مرض سے جانبر نہیں ہوں گے اس کو سن کر مولوی یوسف پر رنج کا اثر ہوا لیکن طبیعت کو سنبھال کر کہا کہ میں حق تعالیٰ کے حکم پر بخوشی راضی ہوں اس کے بعد احقر کی آنکھ کھل گئی وہ قصیدہ پورا یاد تھا چاہا کہ فوراً اٹھ کر پنسل کاغذ لیکر لکھ لوں لیکن اٹھتے اٹھتے سب ذہن سے اتر گیا صرف مصرعہ مذکورہ یاد رہ گیا تعبیر اس کی بالکل ظاہر ہے حق تعالیٰ اس کو وقوع میں لائیں اور حضرت مولانا کا ان کے سامنے یہ لفظ کہنا کہ تعبیر یہ ہے کہ مولوی یوسف جانبر نہ ہوں گے اور ان کا صبر کرنا دلیل شہادت نصیب ہونے کی ہے خدا بچنیں کناد اور حضرت مولانا کا یہ دل شکن لفظ بحالت مرض ان کے سامنے کہنا خلاف رحم وشفقت نہیں ہے کیونکہ بجنسہ یہی واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حضور صلے اللہ علیہ وسلم بوقت وفات تشریف لائے اور آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ تم اس مرض سے جانبر نہیں ہو گی. انھوں نے عرض کیا میں حق تعالیٰ کے حکم کو بخوشی قبول کرتی ہوں اس کے بعد رحلت فرما گئیں ۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس واقعہ کو دیکھ ہی رہی تھیں کمال تعجب

ہوا کہ باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے خاص محبت تھی مرتے وقت ایسا دلشکن لفظ کیوں فرمایا آخر بعد ان کی وفات کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس میں کیا مصلحت تھی ارشاد فرمایا میں نے ان کا نامۂ اعمال دیکھا تو کوئی نیکی ایسی نہ تھی کہ اس میں نہ ہو سوائے شہادت کے۔ اس واسطے میں نے یہ تدبیر کی کہ ان کو ایک رنج پہونچایا جاوے اور وہ اس پہ صبر کریں اور شہادت سے بھی محروم نہ جائیں چونکہ اس وعظ میں زیادہ تر جنت ہی کا بیان ہے اور ایسا بیان ہے کہ شاید حضرت والا کے دوسرے کسی وعظ میں جنت کا ایسا بیان نہیں ہوا اس واسطے یوسف جنت نشاں کے ایصال ثواب کے لئے یہ وعظ انسب ہوا نیز یہ وعظ دوسرے وعظوں سے طریقہ بیان میں ممتاز اور نئی شان کا ہے جیسا کہ وعظ شروع میں تحریر کیا گیا ہے۔ اور یوسف مرحوم وعظ کے زیادہ دلدادہ تھے۔ اس واسطے بھی ان کے لئے مناسب ہوا۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم مرحوم نے ایک لڑکا خوردسال چھوڑا ہے اور ان کی تمنا تھی کہ خدائے تعالیٰ اس کو عالم باعمل کریں ناظرین اس کے لئے بھی دعا فرماویں۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین اٰمنوا ربنا انک رؤف رحیم۔ وصلی اللہ تعالیٰ علےٰ رسولہ النبی الامی الکریم۔ اٰمین۔

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو اٰیۃ

(رواہ البخاری)

سلسلۂ

التبلیغ کا وعظ

ملقب بہ

شکر النعمۃ بذکر رحمۃ الرحمۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم ۔ اے جناح روڈ

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ

ملقب بہ

شکر النّعمہ بذکر رحمۃ الرّحمہ

اَیْنَ	مَتٰے	کَمْ	کَیْفَ	لِمَ	من ای شان	مَنْ ضَبط	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَلْاَشْتَات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کس لئے ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی مقدار تخمینی	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۷ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ یوم جمعہ	۲ گھنٹے	بیٹھ کر	بشکریہ ایک نعمت خاص جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوئی جسکا ذکر ایک وعظ کے ایک حاشیہ میں ہے	رأفت ورحمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم برحال امت	مولوی ظفر احمد صاحب تھانوی سلمہم اللہ تعالیٰ	۱۰۰	عام امت کے لئے مفید تھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

امّا بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ ○

(ترجمہ) اے لوگو! تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو
تمھارے جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمھاری مضرت کی بات نہایت گراں
گذرتی ہے تمھاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (یہ حالت تو
سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایماندارو‌ں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں)

یہ ایک آیت ہے سورۂ براءت کے ختم کے قریب کی جس میں کچھ فضائل بیان فرمائے گئے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہرچند[1] کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مثل ذکر اللہ کے کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں ہر وقت ہونا چاہیئے کیونکہ حق تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت فرض فرمائی ہے اُسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض کی ہے مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (جس اطاعت کی رسول کی پس تحقیق اس نے اطاعت کی اللہ کی) وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ (اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی) تو جو شان اطاعت کی ہے وہی شان ذکر کی بھی ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض ہے اور جس طرح ذکر اللہ باعث ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں اسی طرح ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجب ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں بلکہ یہ بھی ہر وقت ہی ہونا چاہیئے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی حکایت اس پر مجھے یاد آگئی کسی نے مولانا سے دریافت کیا کہ میلاد شریف کرنا کیسا ہے آپ نے فرمایا کہ بھائی ہم تو ہر وقت میلاد شریف کیا کرتے ہیں کیونکہ ہم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) پڑھتے ہیں اسمیں ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ پس ہم تو ہمیشہ ذکر میلاد کرتے ہیں کیونکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوئے ہوتے تو ہم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونے کا ذکر کیسے کرتے

[1] اس ہرچند کا ربط آئندہ کی اس عبارت سے ہے کہ مگر اس وقت مضمون کو الخ میں نے وہاں بھی حاشیہ میں اس ربط پر تنبیہ کردی ہے ۱۲ منہ

واقعی خوب جواب دیا۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے مقصود تو رسالت ہی تھی ورنہ نفس پیدائش میں تو سب شریک ہیں تو جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ذکر کرتا ہے وہ پیدائش کا ذکر بالبلغ وجہ کرتا ہے کہ پیدائش کا بھی ذکر کرتا ہے اور جو اس سے مقصود تھا اُس کو بھی بیان کرتا ہے۔ اور جو لوگ صرف میلاد کا ذکر کرتے ہیں وہ ایسی چیز کا تذکرہ کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اور ہر فرد بشر میں مشترک ہے وہ مقصود کا ذکر نہیں کرتے جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی اور پھر ذکر بھی جب قیود کے ساتھ ہو تو یہ اُن کی کمی ذکر کو مستلزم ہے کیونکہ جب تک خاص مہینہ خاص مجمع کی صورت اور خاص طریقہ ذکر میلاد نہ ہو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے محروم رہتے ہیں اور یہ منطقی مسئلہ بھی ہے کہ عام کی ساتھ جس قدر تخصیصات زیادہ ہوں گی اُسی قدر اس کے افراد کم ہوں گے مثلاً مطلق جسم کا وجود بہت زیادہ ہے جسم نامی کا اس سے کم حیوان کا اس سے بھی کم انسان کا سب سے کم۔ غرض یہ بات مشاہد بھی ہے کہ قیود اور تخصیصات بڑھانے سے شئے کا وجود کم ہو جاتا ہے اور عقلی مسئلہ بھی ہے تو ہر طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو لوگ قیود کے پابند ہیں وہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت کم کرتے ہیں اور جو لوگ کسی قید کے پابند نہیں وہ ہر وقت ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ اگر ایک مقدمہ یہ بھی ملا لیا جاوے کہ مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ کہ جس کو کسی چیز سے محبت ہوا کرتی ہے وہ اس کو کثرت سے یاد کیا کرتا ہے تو آپ خود فیصلہ کریں گے کہ ذکر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں قیود کو لازم کر لینا یہ کمی محبت کی دلیل ہوئی یا نہیں۔ بخلاف اُن کے جو قیودات کے پابند نہیں کہ وہ ہر وقت ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں رہتے ہیں۔ ہاں ان کے نزدیک صرف ایک قید کی ضرورت ہے وہ کیا اخلاص کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خلوص دل سے ہونا چاہیئے کیونکہ بدون خلوص کے عمل مقبول نہیں ہوتا مگر یہ قید بھی قبولیت کے لئے ہے نفس عمل کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں بلکہ محققین ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ہی کیا خود مطلق ذکر کے لئے بھی یوں ہی فرماتے ہیں کہ خلوص قلب کا انتظار نہ کرنا چاہیئے بلکہ جس طرح ہو ذکر کرتا چاہیئے اس کی برکت سے شدہ شدہ خلوص بھی پیدا ہو جاویگا یہ سب باتیں حاجی صاحب قدس اللہ سرہم کے یہاں جا کر حل ہوئیں۔ چنانچہ حاجی صاحب ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ریا ہمیشہ ریا ہی نہیں رہتی۔ پہلے ریا ہوتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے پھر عبادت بن جاتی ہے غرض ریا ہمیشہ ریا نہیں رہا کرتی آخر کار مبدل بخلوص ہو جاتی ہے۔ پھر وہ خلوص موجب قرب ہو جاتا ہے تو اہل تربیت کے نزدیک ابتدا عمل کے لئے اخلاص کی قید بھی ضروری نہیں وہ تو یوں فرماتے ہیں کہ جس طرح ہو ذکر کرتا چاہیئے خلوص کا انتظار نہ کرنا چاہیئے دوسرے یہ کہ بعض اعمال سے دوسروں کو تو نفع پہونچ جاتا ہے پھر ان کی برکت سے اس عامل کا کام بن جاتا ہے فقیہ ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جب سے ریا کار مر گئے ابواب خیر بند ہو گئے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ریا بھی کوئی اچھا عمل ہے۔ نہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں بہت سے لوگ نام آوری کے لئے خانقاہیں اور سرائے مدرسے وغیرہ بنایا کرتے تھے مقصود ان کا صرف نام ہوتا تھا۔ مگر جب ان سے مخلوق کو نفع پہونچا تو کوئی ان میں خدا کا خاص بندہ بھی ہوتا تھا وہ بانی کے حق میں دعاء خیر کرتا تھا حق تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتے تھے۔ اس طرح وہ ریا بواسطہ نافع ہو جاتی تھی۔ شیخ شیرازی نے خوب کہا ہے ؎

خورش دہ بہ کنجشک وکبک وحمام کہ شاید ہمائے درافتد بدام
چو ہر گوشہ تیر نیاز افگنی بنا گاہ بینی کہ صیدے کنی

(چڑیا چکور اور کبوتر وغیرہ کے لئے دانہ ڈالو شاید ہما بھی جال میں پھنس جائے جب ہر طرف تیر نیاز ڈالے گا تو اچانک کسی دن دیکھیگا کہ کوئی شکار کر لے گا)

سو جب سے لوگوں نے نام آوری کے واسطے یہ کام کرنے چھوڑ دیئے تو ابواب خیر بند ہو گئے کیونکہ محض خدا کی رضا کے لئے کام کرنے والے ہر زمانہ میں بہت کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ غربا ہیں جن میں ان ابواب کی وسعت نہیں تو

اس طریقہ سے ابواب خیر گویا بند ہوگئے اور اس میں ریار کا اذن نہیں بلکہ تو ہم ریار کو مانع قرار دینے کا امر ہے۔

غرض جیسا ذکر اللہ کے لئے محققین کے نزدیک خلوص کی قید نہیں تو اسی طرح ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی خلوص کا منتظر نہ ہونا چاہیئے۔ جس طرح ہو اور جس قدر ہو سکے کام کرنا چاہیئے۔ اسی طرح یہ بھی نہ خیال کرنا چاہیئے کہ ہم ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قابل کہاں ہمارا ایسا منہ کہاں جو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کریں۔ اس خیال نے بہت آدمیوں کو افعال خیر سے روک رکھا ہے۔ ایک شخص نے مجھ سے دعا کے واسطے کہا کہ میرے ذمہ قرض بہت ہے دعا کیجئے میں نے کہا کہ بھائی میں دعا کروں گا تم بھی دعا کیا کرو ان شاء اللہ تعالیٰ حق تعالیٰ سے امید ہے کہ تمہارا قرض اتار دیں گے وہ صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جی ہمارا منہ اس قابل کہاں ہے جو ہم دعا کریں میں نے کہا کہ تمہارا منہ تو اس سے بھی بڑی چیز کے قابل ہے وہ کیا ہے اسلام ظاہر ہے کہ اسلام سے بڑھ کر کوئی عبادت اور طاعت نہیں ہو سکتی تمام عبادات کا رتبہ اس سے کم ہے اس کے لئے تمہاری زبان بھلی قابل ہوگئی اس وقت نہ یہ عذر کیا کہ میں کلمہ اپنی زبان سے کیونکر نکالوں میرا منہ اس قابل کہاں جب تمہارا منہ اسلام کے لئے قابل ہے تو دعا کے لئے کیوں قابل نہ ہوگا اس کا مرتبہ تو اس سے بہت کم ہے جاؤ فضول خیالات میں نہیں پڑا کرتے خدا سے خود بھی دعا کرنا چاہیئے۔ بلکہ صاحب ضرورت کی دعا میں زیادہ امید قبولیت ہے کیونکہ وہ پریشان ہو کر گھبرا کر دعا کرتا ہے اور حق تعالیٰ مصیبت زدہ کی دعا جلدی قبول فرماتے ہیں اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ الآیۃ (یا وہ ذات جو بیقرار آدمی کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے)

غرض یہ بھی ایک شیطانی دھوکہ ہے کہ ہم اس قابل کہاں جو ذکر اللہ یا ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کریں ہم اس لائق کہاں جو خدا سے دعا کریں اس دھوکہ میں پڑ کر

بہت لوگ خدا کی نعمت سے محروم پڑے ہوئے ہیں اور فی ذاتہ تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بیشک ایسی ہی چیز ہے کہ ؎

ہزار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

یعنی ہزاروں لاکھوں دفعہ منہ کو خوشبودار بنایا جائے جب بھی اس کے قابل نہیں ہوسکتا مگر بھی کام شروع ہی کر دینا چاہئے گو وہ کام ناقص ہوگا مگر رحمت حق سے وہی قبول ہوجاوے گا۔ مولانا خوب فرماتے ہیں ؎

ایں قبول ذکر تو از رحمت است
چوں نماز مستحاضہ رخصت است

خوب مثال دی کہ جیسے استحاضہ والی عورت جس کو ہر وقت خون جاری رہتا ہے شریعت اس کو حکم دیتی ہے کہ ایسی حالت میں تو نماز پڑھتی رہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمالیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا خون بہ رہا ہے تو وہ حقیقت میں ناپاک ہے مگر اس حالت میں بھی اس کی نماز قبول ہوجاتی ہے تو اسی طرح گو ہمارا منہ مثلاً خدا کی یاد کے قابل نہیں مگر شریعت کا حکم ہے کہ قابل ہو یا نہ ہو کام کرنا چاہئے حق تعالیٰ قبول فرمانے والے ہیں اور یہیں ایک راز غامض ہے وہ یہ کہ اگر کوئی بدون طہارت غیر مامور بہا کے اطاعت نہ کرے یا نہ ہوسکتی ہو اور یہی انتظار رکھے کہ جب تک ہم ذکر کے قابل نہ ہو جاویں ذکر شروع نہ کریں تو جس وقت بھی یہ شخص ذکر شروع کرے گا یا کوئی طاعت کرے گا تو اس وقت اپنے آپ کو طاہر اور اس کے قابل سمجھے گا حالانکہ حق تعالیٰ کی عظمت حقوق کے اعتبار سے کوئی بھی قابل اور طاہر نہیں ہوسکتا۔ اور کسی اور کی تو کیا مجال ہے جبکہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ کہ اے اللہ میں بھی آپ کی ثنا نہیں کرسکتا تو جب بھی ہم طاعت کریں گے وہ ناقص ہی ہوگی۔ تو جو لوگ اس انتظار میں پڑے ہوئے ہیں کہ جب ذکر کے قابل ہوں گے اس وقت شروع کریں گے وہ

عجب میں مبتلا ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کبھی قابل بھی ہو سکتے یہ کتنا بڑا مرض ہے ۔
صاحبو، ہم جب بھی عبادت کریں گے وہ خدا کی عظمت کی نسبت سے ناقص ہی رہے گی کبھی بھی اس کے لائق نہیں ہو سکتی اور جس درجہ کے تم متمنی ہو وہ تو مستحیل ہے تو یہ خیال باطل ہے اس کو دل سے نکال دینا چاہیے ورنہ اس خیال میں پڑ کر یا تو کام سے رہ جاؤ گے اگر ہمیشہ اپنی نا قابلیت پیش نظر رہی اور اگر کبھی شروع کرو گے تو دوسری بلا میں گرفتار ہو گے کہ اپنے آپ کو صاف العبادت کے قابل سمجھو گے یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اہل تربیت فرماتے ہیں کہ اپنے کو ریاکار ہی سمجھ کر تم کام شروع کر دو اور یہی سمجھتے رہو کہ تم کسی قابل نہیں اور نہ کبھی قابل ہو سکتے ہو حق تعالیٰ سب قبول فرمالیں گے اور اگر کچھ نقصان بھی رہے گا تو تمہارا اپنے آپ کو ناقص سمجھنا اس نقصان کی تلافی کر دے گا۔ واقعی عجیب دربار ہے کہ اپنے عمل کو ناقص سمجھنے سے اس کی تکمیل ہو جاتی ہے ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش	عذر بدرگاہ خدا آورد
ورنہ سزا وار خداوندیش	کس نتواند کہ بجا آورد

(بندہ وہی بہتر ہے کہ اپنی کوتاہی کا عذر دربار خداوندی میں لائے ورنہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس کی عظمت خداوندی کے لائق کوئی طاعت بجالائے)

اس انتظار کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسا کہ امثال میں مذکور ہے کہ ایک ناپاک شخص کا دریا پر گذر ہوا دریا نے اس کو پکارا کہ میرے پاس آجا میں تجھے پاک کر دوں اس نے کہا کہ میں کس منہ سے آؤں تو پاک صاف اور میں گندہ ناپاک۔ دریا نے کہا کہ تو چاہتا ہے کہ پاک ہو کر میرے پاس آئے اور بدون میرے پاس آئے تو پاک نہیں ہو سکتا تو ہمیشہ ناپاک ہی رہے گا بس تو اسی حالت میں ناپاک ہی میرے پاس چلا آ تجھے میں ہی پاک کر سکتا ہوں مجھ سے دور رہ کر تو پاک نہیں ہو سکتا۔

صاحبو! اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ اپنے گمان کے موافق پاک صاف ہو کر خدا کی طرف رخ کریں۔ حالانکہ بدون خدا کی طرف رُخ کئے تم پاک ہی نہیں ہو سکتے۔

بس اس کا تو یہی طریقہ ہے کہ تم جیسے بھی ہو چلے آؤ ؎

بازآ بازآ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

(واپس آ واپس آ جو کچھ بھی تو ہے واپس آجا اگرچہ کافر اور آتش پرست و
بت پرست بھی ہے تو واپس آ)

رحمت متوجہ ہو کر تم کو خود پاک کر دے گی۔ اسی طرح بعض لوگ خدا کی یاد کے لئے منتظر رہتے ہیں کہ دنیا کے جھگڑوں سے نجات ہو جائے تو پھر فارغ ہو کر اللہ اللہ کریں۔ کوئی کہتا ہے کہ بیٹے کا نکاح ہو جائے تو بے فکر ہو کر خدا کو یاد کریں فلاں زمین کے مقدمہ سے چھٹکارا ہو جائے تو آخرت کی فکر میں لگیں مگر میں بقسم کہتا ہوں کہ ان جھگڑوں سے نجات خدا کی یاد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ خدا سے لگاؤ پیدا کرو رفتہ رفتہ سب تعلقات خود ہی کم ہو جائیں گے اس کے بغیر کبھی تعلقات سے نجات نہیں ہو سکتی۔ اس طرح تو آپ روز یہی کہتے رہیں گے کہ آج یہ قصہ پیش آ گیا اس سے فراغت ہو جائے تو پھر کام میں لگوں پھر کوئی دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا تو آپ اُس سے فارغ ہونے کا انتظار کریں گے تو ہمیشہ یہی حال رہے گا ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(ہر رات کو ارادہ کرتا ہوں کہ کل یہ جنون چھوڑ دوں جب کل آتی ہے تو پھر اس کو کل پر ٹال دیتا ہوں)

دنیا کے قصوں سے کبھی نجات نہیں نصیب ہوگی کوئی شاعر دنیا کے بارہ میں خوب کہتا ہے

وَمَا قَضٰی اَحَدٌ مِّنْهَا لُبَانَتَهٗ
لَا یَنْتَهِیْ اَرَبٌ اِلَّا اِلٰی اَرَبٍ

(کوئی شخص اس کی حاجتوں کو پوری نہ کر سکا ایک حاجت سے فارغ ہوا دوسری حاجت پیش آ گئی)

۔ یہ لوگ وصل کے لئے منتظر ہیں فصل، موقوف ہے وصل پر تو ان کو کبھی خدا کے ساتھ لگاؤ پیدا کرنے کی توفیق نہیں ہو سکتی ہمیشہ انتظار ہی میں رہیں گے۔ یہاں تک کہ ایک دن موت آکر دبائے گی اور دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جائیں گے۔ بس اگر وصل خدا چاہتے ہو تو ان جھگڑوں کے ختم ہونے کا انتظار نہ کرو ایسی حالت میں خدا کی یاد میں لگ جاؤ پھر وہ خود ہی سب تعلقات کو ختم کر دے گا۔ اور رحمت حق متوجہ ہو کر تم کو اپنی ہی طرف کھینچ لے گی وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اس کے لئے کوئی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ رزق پہونچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا) مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمِ آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(اس راہ سلوک) میں ادھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو آخر دم تک بیکار نہ رہو آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی)

یہ مسئلہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حل ہوا۔ حاجی صاحب صاحب سے جب کوئی یہ کہتا کہ حضرت نوکری چھوڑ دوں تو آپ ارشاد فرماتے کہ نوکری مت چھوڑو تم کام میں لگے رہو کام کرتے کرتے پھر تم خود ہی چھوڑ دو گے کسی سے پوچھو گے بھی نہیں سبحان اللہ! بڑے محقق تھے۔ غرض یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو کام میں لگ جانا چاہیئے اور یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ ہم اس قابل کہاں جو ذکر خدا و ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کریں۔ تم کام شروع کر دو حق تعالیٰ شانہ سب قبول فرمالیں گے وہ فقط کاملین ہی کے خریدار نہیں وہ ناقص کے بھی خریدار ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ دیکھئے فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تمام مسلمانوں سے ان کی جان و مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں اس میں

مومنین کا لفظ ہے یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْکَامِلِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ نے کاملین کی جانوں اور مالوں کو (جنت کے بدلے) خرید لیا ہے) اور اس میں ایک راز ہے وہ یہ ہے کہ وہ بازار جس درجہ کا کھرا ہے اس کے قابل متاع تو کسی کے پاس بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ کاملین کو بھی جو جزا عطا ہوگی وہ اس قدر ہوگی کہ ان کے اعمال کی ان کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہ ہوگی وہ محض فضل ہی فضل ہوگا اس لئے اس بازار میں کھوٹے کھرے کی پوچھ ہی نہیں۔ سبحان اللہ! کیا عجیب بازار ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را
کہ بیک گل می خری گلزار را

(ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لو)

یعنی ایک پھول کے بدلے پر باغ عطا فرماتے ہیں اور باغ بھی کیسا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (ایسے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں) ایسا بازار کہیں دیکھا بھی ہے جس میں اس کا کچھ بھی خیال نہیں کہ یہ تو ایک پھول لے کر آیا ہے اتنے بڑے باغ کا یہ مستحق نہیں واقعی خود اپنے عمل سے اس کو کون پا سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اَحَدٌ بِعَمَلِهٖ کہ جنت میں اپنے عمل کی وجہ سے کوئی داخل نہیں ہوگا۔ سب رحمت خداوندی سے جنت میں جائیں گے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمایا وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِهٖ یعنی نہیں ہاں اگر خدا کی رحمت متوجہ ہو جائے تو میں بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں جاؤں گا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں تو اور تو کس شمار میں ہیں بالکل سچ فرمایا ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را　　　کہ بیک گل می خری گلزار را

(ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لو)

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　　انچہ در وہمت نیاید آں دہد

رفانی اور حقیقت جان لیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں باقی رہنے والی جان عطا کرتے ہیں جو وہم وگمان سے بلند و بالا ہے)

غرض ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ذکر خدا کی طرح ہر وقت ہونا چاہیئے اس کے لئے کسی قید کا پابند نہ ہونا چاہیئے ظاہر میں بس ایک قید ضروری معلوم ہوتی تھی اخلاص کی مگر محققین اسکو بھی ضروری نہیں سمجھتے یعنی اس میں مبالغہ کرلے تو تو ذرا غور کرو کہ جو شخص اتنا توسع کرے گا اس کو زیادہ توفیق ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی یا اس شخص کو جو اتنی قیود میں جکڑا ہوا ہے کہ مہینہ بھی خاص ہو مجمع بھی ہو لوبان بھی ہو کچھ غزل گانے والے بھی ہوں مٹھائی بھی ہو پھر یہ لوگ دعوی کرتے ہیں کہ ہم محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں میاں اگر محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو جس طرح بن پڑتا محبوب کو یاد کیا کرتے ان قیدوں کے پابند نہ ہوتے۔ بھلا کہیں عاشق بھی اپنے محبوب کی یاد میں کسی چیز کا پابند ہوا کرتا ہے محبت ہی دل میں نہیں جو اتنے قصوں کے منتظر ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان رسوم نے لوگوں کو خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے بہت روک رکھا ہے۔ میں نے ایک واقعہ خود دیکھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیعت کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ دوسرے وقت پر رکھو دوسرے وقت اور چند آدمی بیعت ہونے آئے۔ حاجی صاحب نے ان صاحب سے بھی فرمایا کہ بھائی آؤ تم بھی بیعت ہوجاؤ تو آپ فرماتے ہیں کہ حضرت میں نہیں ابھی بیعت ہوتا میں تو مٹھائی لاکر بیعت ہوں گا لاحول ولا قوۃ الا باللہ ان رسوم نے کیسا لوگوں کا راہ مار رکھا ہے۔ بھلا اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی تھی کہ شیخ خود بلائے کہ آؤ ہم تمہارے خریدار بنتے ہیں اور وہ عاشق صاحب ہیں کہ مٹھائی نہ ہونے کی وجہ سے رکے جاتے ہیں بس سوا اس کے کہ تعلق کی کمی ہے اور کیا کہا جا سکتا ہے تو بس اگر محبت ہے تو یہ قیود خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ کس قدر مانع ذکر ہیں اس لئے چاہیئے کہ جس طرح ذکر اللہ کے لئے کوئی قید نہیں اٹھتے بیٹھتے کھڑے ہوئے لیٹے ہوئے سب طرح کرسکتے ہیں اسی طرح ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی کوئی قید لازم نہ کریں۔ رہا نماز وغیرہ کے لئے جو قیود ہیں ان میں خاص مصالح و حکمتیں ہیں اور وہ قیدیں ایک

خاص طریق ذکر کے لئے ہیں مطلق ذکر اللہ کے لئے تو نہیں ہیں۔ اور پھر وہ بھی نص ہے۔ اور یہاں کونسی نص ہے۔ بعض لوگ اہل عرب کے دستور سے استناد کرتے ہیں کہ وہاں بھی تو قیود ہیں میں کہتا ہوں کہ بیشک وہاں بھی کچھ قیود ہیں تو پھر کیا ہوا۔ اہل عرب کے فعل سے کوئی شرعی حکم تو نہیں بدل سکتا اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہندوستان کے لوگوں کو اہلِ عرب کے فعل سے استناد کرنے کا کوئی حق بھی نہیں کیونکہ وہ لوگ ان قیود کے اس قدر پابند نہیں ہیں اگر اتفاق سے مجمع ہو گیا تو مجمع میں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو گیا اور کہیں مجمع کی بھی قید نہیں دو چار آدمی کھانا کھانے بیٹھے جی چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنیں ایک دوسرے سے کہتا ہے یا مولانا المولد الصغیر یعنی مختصر طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر میلاد تو سنا دو اس نے مولد مختصر سنا دیا پھر کھانا شروع کر دیا اگر کہیں مجمع میں میلاد کا ذکر ہوا تو مٹھائی وغیرہ کی وہ ایسے بہت پابند نہیں ایک شخص مٹھائی تقسیم کرنے اٹھتا ہے جہاں تک تقسیم ہو گئی بانٹ دی جب ختم ہو گئی صاف کہدیا خلاص کہ بس جاؤ ختم ہو گئی نہ صاحب خانہ کو اس کا خیال ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے میری ناک کٹے گی نہ ان لوگوں کو کچھ خیال ہوتا ہے جن کو مٹھائی نہیں ملی کہ دیکھو ہم مٹھائی سے رہ گئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع صرف ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اکٹھا ہوا تھا مگر خوش طبعی کے لئے مٹھائی بھی تقسیم ہو گئی یہ نہیں کہ مجمع کی علت غائی صرف مٹھائی ملنا ہو جیسا کہ ہندوستان میں ہے کہ صاحب خانہ جب دیکھتا ہے کہ لوگ بہت جمع ہو گئے اور مٹھائی کم ہے تو فوراً ایک آدمی کو مٹھائی کے لئے چلتا کرتا ہے اور مولود خواں سے اشارہ سے کہدیتے ہیں کہ ذرا کوئی غزل گانی شروع کر دو ابھی مٹھائی نہیں آئی۔ اب مولود تو ختم ہو چکا تھا مگر مٹھائی کے واسطے گلا پھاڑ پھاڑ کر مولود خواں صاحب غزلیں گا رہے ہیں جس سے سننے والے بھی سمجھ جاتے ہیں کہ یہ سارا جوش و خروش مٹھائی کے اشتیاق میں ہے اور جہاں وہ مٹھائی آئی سارا جوش ختم ہوا بھلا ان لوگوں کو اہلِ عرب کے فعل سے استناد کرتے ہوئے شرم نہیں آتی وہ اللہ کے بندے مٹھائی کے واسطے مجلس میں جمع نہیں ہوتے نہ صاحب خانہ ہی کو اس کا اہتمام ہوتا ہے نہ آنے والوں کو اس کا خیال ہوتا ہے۔ ہندوستان کے

مولود کی مثال تو شیعوں کی مجلس حسینؓ جیسی ہے۔ لکھنؤ میں محرم کے مہینے میں جا بجا مجلس حسینؓ ہوتی ہے۔ ایک شیعی شخص نے ایک سنی وکیل صاحب سے کہا کہ آپ مجلس حسینؓ میں شریک نہیں ہوتے انھوں نے کہا کہ مجلس حسینؓ تو میں نے آج تک یہاں کہیں ہوتے ہوئے سنی نہیں اس نے کہا واہ صاحب لکھنؤ میں خدا جھوٹ نہ بلوائے روزانہ پچاس جگہ تو مجلس حسینؓ آجکل محرم میں ہوتی ہے ان وکیل صاحب نے کہا کہ صاحب میں نے تو کہیں بھی مجلس حسین نہیں سنی اور اگر آپ کو میرا اعتبار نہ ہو تو تھوڑی دیر آپ یہاں تشریف رکھئے ابھی معلوم ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص دعوت دینے آیا کہ فلاں نواب صاحب کے یہاں آج مجلس ہے۔ وکیل صاحب نے پوچھا کہ بھائی کاہے کی اس نے کہا کہ فیرینی کی اس کے بعد دوسرا شخص آیا کہ فلاں رئیس صاحب کے یہاں رات کو مجلس ہے انھوں نے پوچھا کہ میاں کاہے کی مجلس ہے اس نے کہا کہ شیرمال کی۔ تیسرا آیا اس نے کہا شیرینی کی وکیل صاحب نے ان صاحب سے کہا کہ آپ نے سن لیا۔ امام حسینؓ کا تو کہیں بھی ذکر نہیں کہیں شیرمال کی مجلس ہے کہیں فیرینی کی ہے کہیں شیرینی کی ہے۔ امام حسینؓ کی مجلس ہوتی تو بھلا ایسی بات تھی کہ میں شریک نہ ہوتا وہ دوسرے صاحب کہنے لگے کہ میاں تم تو بڑے مذاقی آدمی ہو۔

غرض یہی حال آجکل ہماری مجالس میلاد کا ہے کہ اکثر مٹھائی کی بدولت مجمع ہو جاتا ہے۔ اگر مٹھائی تقسیم نہ ہو تو نہ کوئی پڑھے اور نہ کوئی سننے آوے۔ خدا کو بھی دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں اور اسی قبیل سے ہمارے یہ میانجی رمضان کے حافظ غضب دکھاتے ہیں سارے رمضان تو وہ تیز قرآن پڑھتے ہیں کہ یَعْلَمُوْنَ تَعْلَمُوْنَ کے سوا کچھ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا رکوع میں بمشکل تمام شاید ایک بار سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمُ کہتے ہوں ترویحہ تو گویا ہوتا ہی نہیں اور جب ختم کا دن ہوتا ہے اور ذرا مٹھائی کے آنے میں دیر ہو جائے تو اب کوئی حافظ صاحب کی قرارت دیکھے کیسے گا گا کر لحن کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں لمبے رکوع اور لمبے سجدے ترویحہ بھی خوب لمبا کریں گے اور پکار پکار کر سُبْحَانَ ذِي الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوْتِ سُبْحَانَ ذِي

الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰئِكَةِ وَالرُّوْحِ (پاک ہے وہ ذات جو زندہ جس کو موت نہیں آئے گی پاک ہے پاک ہے پروردگار ہے ملائکہ اور روح کا) اور بہت سی دعائیں پڑھیں گے کوئی پوچھے کہ آج یہ زور زور سے کس کو یاد کر رہے ہیں فقط مٹھائی کو کیونکہ آج حافظ جی صاحب کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ ہر ترویحہ کے اوپر ادھر اُدھر جھانک لیتے ہیں کہ مٹھائی آگئی یا نہیں اگر انھیں نماز شروع کرنے کے بعد بھی معلوم ہو جائے کہ مٹھائی آگئی ہے تو اسی وقت سے وہ قرارت اور لحن اور لمبے رکوع لمبی ترویح سب رخصت ہو جاتے ہیں واقعی ان میاں جیوں کی تو ساری قرارت اور ساری ترویح ختم کے دن مٹھائی ہی کے واسطے ہوتی ہیں گویا مٹھائی کیا ہے جنّت ہے کہ جس طرح جنت میں پہونچکر سارے اعمال معاف ہو جائیں گے اسی طرح اس مٹھائی کے آتے ہی وہ قرارت اور ترویح سب رخصت ہو جاتے ہیں اب خیال کیجیے کہ ان رسوم نے ہماری حالت کو کہاں تک پہنچا دیا اس پر اگر کوئی خدا کا بندہ اس سے منع کرے تو اس کو برا بھلا کہنے کو تیار ہوتے ہیں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ (میں استغفار کرتا ہوں اللہ عظیم سے) معلوم ہوا کہ محبت کی علامت یہ ہے کہ محبوب کے ذکر کے واسطے کسی وقت اور کسی قید کا پابند نہ ہو جیسا اس وقت بلا کسی قید و تخصیص کے بیان کے لئے یہ آیت اختیار کی گئی ہے جس میں حق سبحانہ تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان فرمائے ہیں ارشاد فرماتے ہیں لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ترجمہ آیت کا یہ ہے۔ کہ اے لوگو تمھارے پاس (ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آئے ہیں جو کہ تمھیں میں سے ہیں اُن پر تمھاری مشقت (اور تکلیف) بہت گراں ہوتی ہے وہ تم پر (تمھاری بہبودی کے لئے) بہت حریص ہیں مسلمانوں پر بہت زیادہ شفیق و مہربان ہیں۔) پس ہر چند[ے] کہ جیسا اس ذکر مبارک کا مقتضا ہے کہ اس میں کوئی قید نہ ہو اس وقت بھی کوئی قید نہیں جیسا

ے یہ ہر چند گویا تکرار ہے اُس ہر چند کی جو بالکل شروع وعظ میں ہے ۱۲ منہ

میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے لئے کوئی قید نہیں اور کسی وقت کی پابندی نہیں جس وقت چاہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرو۔ مگر تاہم کوئی خاص داعی دینی خاص وقت پر اس کا محرک ضرور ہوتا ہے چنانچہ اس وقت جو میں نے اس مضمون کو اختیار کیا ہے اس کا داعی[عہ] ایک خاص تازہ انعام ہے جو اس بندہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار مقدس سے ہوا ہے جس کے شکریہ میں متحیر تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں بعض احباب نے مشورہ دیا کہ اگر آج وعظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کر دیئے جائیں تو یہ بھی اس انعام کے شکریہ کی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ بیان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

عہ یہ عبارت مرتبط ہے وعظ کے شروع کی اس عبارت سے ہر چند الخ ۱۲ منہ

عہ جامع وعظ کہتا ہے کہ حضرت حکیم الامۃ نے اپنی زبانِ مبارک سے وعظ میں اس انعام خاص کو ذکر نہیں فرمایا مگر چونکہ بدون اس کے معلوم کئے ناظرین کو خلجان رہتا اس لئے احقر اس کو بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہے وہ انعام خاص یہ ہوا کہ ایک شخص صالح ذاکر شاغل جن کو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بیداری وخواب میں اکثر ہوتی ہے ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حکیم الامۃ مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب کو میرا سلام پہنچا دینا وہ صاحب متردد ہوئے کہ میں تو تھانہ بھون کبھی گیا بھی نہیں مولانا کو سلام کیسے پہنچاؤں گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ارشاد فرمایا کہ تمھارے مولوی صاحب (اس سے مراد یہ روسیاہ جامع وعظ احقر ظفر ہے) وہاں جب جائیں گے ان سے کہدینا وہ پہونچا دیں گے۔ جامع وعظ کہتا ہے کہ جب میں نے حضرت حکیم الامۃ کو یہ مضمون پہونچایا مولانا کی عجیب حالت ہو گئی تھی جس کو میں بیان نہیں کر سکتا جواب میں ارشاد فرمایا کہ میری سمجھ میں تو کوئی لفظ بھی ایسا نہیں آتا جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام مبارک کا جواب دوں پھر بعد میں فرمایا کہ یوں جی چاہتا ہے کہ آج درود شریف زیادہ پڑھوں وہ بھی ان الفاظ سے کہ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مولانا کی اس واقعہ سے جو حالت ہوئی وعظ کے وقت اس کا کسی قدر ظہور ہوتا تھا اگر حضرت مولانا ضبط کامل سے کام نہ لیتے تو واقعی سننے والوں پر قیامت آجاتی مَتَّعَ اللّٰہُ الْمُسْلِمِیْنَ بِطُوْلِ بَقَائِہٖ ۱۲ منہ

امت کو نفع پہونچ جانے کی امید ہے اس وقت وعظ لکھنے کا سامان بھی نہ تھا کیونکہ جمعہ کی نماز کے لئے آتے ہوئے رستہ ہی میں یہ مشورہ ہوا مگر خدا تعالےٰ کو چونکہ منظور تھا وقت کے وقت سب انتظام ہوگیا اس لئے میں نے اس آیت کو بیان کے لئے اختیار کیا تاکہ اس نعمت کے شکریہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل بیان ہونے سے کچھ تسلی ہو جاوے۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بے شمار ہیں اور مختلف قسم کے ہیں جن کا سب کا بیان کرنا تو اس وقت دشوار ہے بلکہ سب کے بیان کے لئے تو عمر بھی کفایت نہیں کر سکتی مگر میں اس وقت ایک خاص فضیلت کا بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو حق تعالےٰ نے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ الرَّحِيْمٌ میں بیان فرمایا ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت اور شفقت ورحمت کو بیان کروں گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے حال پر ہے کیونکہ وہ نعمت خاص بھی عنایت وشفقت ہی کے قبیل سے ہوئی ہے۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمارے حال پر یہ شفقت ہی تو ہے کہ ہم جیسے نالائقوں کے حال پر بھی توجہ فرماتے ہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہاں اور ہم کہاں تو اس ذکر کی ایک تو یہ وجہ ہے کہ انعام کے وقت ایک خاص جوش ہوا کرتا ہے منعم کے احسانات وفضائل کے تذکرہ کرنے کا دوسرے اس بیان کی آجکل امت کو ضرورت بھی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ذکر امت کے لئے بھی بہت نافع ہوگا کیونکہ میں اس وقت یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آجکل امت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں بہت کمی اور کوتاہی ہو رہی ہے چنانچہ بہت لوگ تو صرف یہی سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیغمبر تھے احکام الٰہی پہونچا دینا آپ کا فرض منصبی تھا آپ نے احکام پہنچا دیئے اب ہم کو ان پر عمل کر کے قرب الٰہی حاصل کرنا چاہیئے یہ لوگ بجز اعتقاد تبلیغ احکام اور ان میں آپ کی اطاعت کر لینے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تعلق پیدا کرنے ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ نصوص سے تصریحاً معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ شانہٗ نے اس اطاعت کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے خاص تعلقات پیدا کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے جن میں سے ایک حق تو آپ کی عظمت کرنا ہے یعنی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی تعظیم پوری طرح بجالاؤ چنانچہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (اے ایمان والو! اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت) سے پہلے تم سبقت مت کیا کرو) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیشقدمی مت کرو آپ کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہ کرو جس طرح آپس میں چیخ پکار کر باتیں کرتے ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح باتیں نہ کرو۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں) دیکھئے ایمان بالرسول پر اکتفا نہیں فرمایا عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ (ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں) کی بھی قید زیادہ فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ فلاح اور کامیابی آخرت کے لئے جس طرح آپ پر ایمان لانا شرط ہے آپ کی عظمت[عہ] کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ۔ (تاکہ تم ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حمایت کرو ان کی یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مدد کرو ان کی) دوسرا حق آپ کے ساتھ محبت کرنا ہے کہ وہ بھی بیحد ضروری ہے اور یہ بنص حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا حق ہے جس کے بدون ایمان کامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰی اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (تم میں سے کوئی مومن کامل نہ ہوگا جب تک میری محبت اس کو اپنے لڑکے اور اپنے باپ اور سب لوگوں سے زیادہ نہ ہوگی) دیکھئے کتنی صاف حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تک میرے ساتھ محبت

عہ اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے کھل کھلا کر بولا کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کھل کھلا کر بولا کرتے ہو) عہ فی روح المعانی عزروہ ای عظموہ ووقروہ کما قال ابن عباس و قال الراغب التعزیر النصرۃ مع التعظیم ۱۲ منہ

سب سے زیادہ نہ ہوگی کوئی شخص مومن (کامل) نہیں ہوسکتا۔ دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبت کو خدا کی محبت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے لَنْ یُّؤْمِنَ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا (ہرگز کوئی شخص تم میں سے مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ماسوا سے زیادہ نہ ہوجائے)

ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح حق تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ہے اسی طرح حق تعالیٰ کی عظمت و محبت کے ساتھ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کرنا بھی فرض ہے گو فرق مراتب کا لحاظ ان سب میں ضرور ہوگا حق تعالیٰ کی اطاعت و عظمت و محبت کی اور شان ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و عظمت و محبت کی دوسری شان ہے مگر ہیں سب فرض اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حقوق بہت سے ہیں مگر اس وقت کلی طور پر ان ہی تین حقوق کو بیان کرنا چاہتا ہوں جن کا ذکر اجمالاً ابھی کرچکا ہوں جب آپ دیکھیں گے کہ ان تین حقوق میں ہم نے کس قدر کوتاہیاں کر رکھی ہیں تو اس سے باقی حقوق میں کوتاہی کا خود ہی اندازہ ہوجائے گا۔ سو کلی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تین حقوق ہیں ایک اطاعت دوسری محبت تیسری عظمت۔ اب ان میں کوتاہی دیکھئے کہ بعض لوگ صرف اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ضروری سمجھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو نہ تعلق عظمت ہے نہ تعلق محبت مگر میں سچ کہتا ہوں کہ بدون محبت و عظمت کے اطاعت بھی پوری طرح نہیں ہوسکتی قدم قدم پر اتباع سنت وہی کرے گا جس کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت رچی ہوئی ہوگی۔ اس لئے گو وہ اپنے آپ کو مطیع رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عامل بالحدیث کہیں۔ مگر سوائے چند مسائل اختلافیہ کے جن کو وہ رات دن گایا کرتے ہیں باقی افعال و اعمال کو اُن کے کوئی دیکھے کہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے وہ اتباع حدیث کا کتنا خیال کرتے ہیں۔ رات دن آمین و رفع یدین کی حدیثیں تو تلاش کرتے ہیں کبھی یہ بھی فکر ہوئی کہ حدیث سے

معلوم کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کھانا کھاتے تھے کس طرح بیٹھتے تھے کس طرح معاملات و معاشرات میں برتاؤ کرتے تھے تقویٰ کے کن دقائق کی رعایت فرماتے تھے باطنی اخلاق میں آپ کا کیا رنگ تھا۔ ہم نے تو کبھی ان لوگوں کو سوائے چند اختلافی مسائل کے باقی اعمال میں اتباع سنت کا گرویدہ نہ پایا اور جن میں بزعم خود اتباع کرتے ہیں وہاں بھی اطاعت کا نام ہی نام ہے زیادہ محرک اس کا وہی نفسانیت و تعصب و گروہ بندی ہے جس کی وجہ وہی ہے کہ اطاعت پوری طرح بدون محبت کے ہو نہیں سکتی۔

اور بعض لوگ صرف محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ضروری سمجھتے ہیں تو انھوں نے فقط محبت کو لے لیا ہے مگر یہ بھی محض اُن کا دعوٰی ہی دعوٰی ہے اور ظاہر ہے دعوٰی بدون دلیل مسموع (سننے کے قابل) نہیں ہو سکتا اور دلیل مفقود بس ان کے نزدیک تو محبت اس کا نام ہے کہ کبھی مجلس میلاد منعقد کر لی۔ نعتیہ غزلیں پڑھ دیں یا سُن لیں اس کے سوا ان کو کچھ بھی خیال نہیں کہ ہم جو کچھ حرکتیں کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے راضی ہیں یا ناراض۔ ہم نے مدعیین محبت کو دیکھا ہے کہ شراب پیتے ہیں سود لیتے ہیں زنا میں مبتلا ہیں مگر سال میں ایک دو مرتبہ ربیع الاول میں میلاد کی مجلس منعقد کر کے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دم بھرتے ہیں کیا یہ لوگ ابن مبارکؒ کا قول بھول گئے ؎

تَعْصِی الرَّسُوْلَ وَاَنْتَ تُظْہِرُ حُبَّہٗ ہٰذَا الْعَمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٗ
لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَاَطَعْتَہٗ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٗ

(تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور آپ کی محبت اظہار کرتا ہے اپنی جان کی قسم یہ کاموں میں نادر بات ہے اگر تو آپ کی محبت میں صادق ہوتا تو آپ کے اطاعت کرتا اس لئے کہ محب محبوب کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے)

کیا غضب ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعوٰی ہے اور سر سے پیر تک مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں غرق ہیں بھلا یہ بھی کہیں عاشق کا طریقہ ہوا کرتا ہے۔ یہ عجیب محبت ہے کہ عاشق کو محبوب کے ناراض ہو جانے کی ذرا بھی پرواہ نہ ہو۔ میں بقسم

کہتا ہوں کہ جو برتاؤ یہ لوگ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کر کے احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے ہیں اگر کوئی ان کے ساتھ بھی برتاؤ کرے کہ اُن کی محبت کا دعویٰ کر کے مجلس میں بیٹھ کر ان کی مدح سرائی کر دیا کرے مگر ان کا حکم کوئی بجا نہ لاوے تو یہ لوگ خود اس کی محبت کو اس کے منہ پر دے ماریں گے پھر جائے افسوس ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی برتاؤ کر کے خوش ہیں اور نازاں ہیں اور ذرا بھی نہیں ڈرتے کہ یہ محبت تو اس قابل ہے کہ الٹی ہمارے منہ پر ماری جائے۔

اس جگہ ایک شبہ ہو سکتا ہے اس کو بھی سمجھ لینا چاہیئے وہ یہ کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک شخص نے شراب پی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر حد جاری فرمائی پھر ان سے یہ حرکت صادر ہوئی پھر آپ نے اُن پر حد جاری فرمائی جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو کسی دوسرے صحابی نے اُن پر لعنت کی کہ خدا اس پر لعنت کرے بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں اس پر حد جاری ہوتی ہے اور شراب پینے سے باز نہیں آتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو لعنت کرنے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اِنَّہٗ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ کہ اس کو برا بھلا مت کہو اس کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اس حدیث کو نقل کر کے شیخ عبدالحق نے اس سے یہ مسئلہ استنباط (کسی بات کا کسی بات میں سے نکالنا) کیا ہے کہ اس حدیث سے ایک عجیب بات معلوم ہوئی کہ معصیت کے ساتھ بھی محبت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم جمع ہو سکتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود شراب پینے کے ان شخص کو محب اللہ والرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خطاب دیا تو شاید آج کل کے مدعیان محبت بھی اس حدیث سے سہارا ڈھونڈھیں کہ گو ہم دوسرے گناہ کرتے ہیں مگر پھر بھی اس حدیث کے مطابق ہم اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محب ہو سکتے ہیں جواب یہ ہے کہ اس وقت نفس محبت میں گفتگو نہیں اور نہ میں نفس محبت کی آپ سے نفی کرتا ہوں جب کسی شخص نے کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھ لیا تو کسی قدر تو محبت اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو ہی گی گفتگو محبت مطلوبہ میں ہے جس کی تحصیل مامور بہ ہے اور

جس کے بعد دعویٰ محبت تسلیم کیا جا سکے چونکہ دعویٰ بدون قدر معتدبہ کے صحیح نہیں کیا کوئی شخص ایک پیسہ کا مالک بن کر اپنے کو مالدار کہہ سکتا ہے آپ کو اس حالت کے ساتھ اپنے آپ کو محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کا منہ نہیں شاید تم یہ کہو کہ پھر کیا ان صحابی میں محبت مطلوبہ نہیں تھی کیا اُن میں وہ درجہ محبت کا موجود نہ تھا جو شریعت کو مطلوب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قیاس آپ کا صحیح نہیں کیونکہ ہر شخص کی معصیت بھی برابر نہیں ہو سکتی دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس کو ہر وقت اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دُھن ہو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں جان و مال و آبرو قربان کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتا پھر کسی وقت شیطان نے دھوکہ دیدیا یا نفس کی شرارت غالب آگئی اور گناہ صادر ہو گیا۔ پھر گناہ کر کے بھی چین سے نہیں بیٹھتا جب گناہ سے فارغ ہوا اور آنکھیں کھلیں تڑپ گیا اور بے قرار ہو گیا کہ ہائے کیا کروں میرا خدا مجھ سے ناراض ہو گیا ہو گا اب خدا کو کس طرح راضی کروں ماعز اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ صحاح میں موجود ہے کہ ان سے زنا کی حرکت صادر ہو گئی تھی فوراً بیقرار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجمع عام میں آکر عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ طَھِّرْنِیْ فَقَدْ ھَلَکْتُ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تباہ ہو گیا مجھے پاک فرما دیجئے تنہائی میں بھی نہ کہا ایسے خدا کے خوف سے بے چین ہوئے کہ مجمع عام میں آکر زنا کا اقرار کیا نہ آبرو کا خیال کیا نہ بدنامی کا۔

مصرع۔ عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا

حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ان کی بات پر توجہ نہیں فرمائی ہر بار میں آپ نے ٹالنا چاہا اور یہ فرمایا کہ شاید تم نے چھو لیا ہو گا شاید تم نے بوسہ لے لیا ہو گا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اس پر حد قائم نہ ہو خدا سے توبہ استغفار کر لے کیونکہ اس طرح سے بھی گناہ معاف ہو سکتا ہے مگر ان کو تو خدا پر جان فدا کرنے کی دُھن لگی ہوئی تھی۔ صاف صاف لفظوں میں بیان کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے تو اس طرح کیا تب آپ نے مجبور ہو کر حکم دیا کہ

ان کو باہر میدان میں لے جا کر رجم کر دیعنی پتھر مار مار کر جان سے مار ڈالو اس وقت کسی صحابی کے بدن پر ان کے خون کی چھینٹ آپڑی تھی تو ان کی زبان سے کوئی سخت لفظ ماعز کی شان میں نکل گیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت غصہ ہوئے اور فرمایا کہ ماعز اسلمی نے ایسی کامل توبہ کی ہے کہ اگر سارے مدینہ والوں پر بھی اس کو تقسیم کیا جاوے تو سب کی مغفرت ہوجائے ظاہر ہے کہ ایک شخص کی توبہ کے جب اس قدر حصے کئے جائیں گے تو بظاہر ہر شخص کے کیا بانٹے آئے گا مگر ماعز کی توبہ اس قدر کامل توبہ تھی کہ اس کے ہزارہا حصے کرنے کے بعد بھی ہر حصہ ایک مسلمان کی مغفرت کے لئے کافی تھا تو ان کے لئے تو کیا کچھ ہوا ہوگا تو بھلا ایسی خطا کو کوئی خطا کہہ سکتا ہے جس سے ایسی توبہ کاملہ نصیب ہو؎ این خطا از صد صواب اولیٰ تر ست

(یہ خطا سو صواب سے بہتر ہے)

صحابہ کی معصیت پر کس کا منہ ہے جو اپنی معصیت کو قیاس کرے ان حضرات کی معصیت توبہ کاملہ کا سبب بن جاتی تھی جس سے ان کو مقام توبہ جو بڑا عالی مقام ہے نصیب ہوتا تھا. میرا یہ مطلب نہیں کہ معصیت سبب قریب خیر کا ہوسکتی ہے نہیں نہیں معصیت ہمیشہ موجب شر ہی ہوتی ہے کہ سبب سخط حق ہے مگر کبھی سبب بعید خیر کے لئے بن جاتی ہے اس طرح کہ معصیت سے خدا تعالےٰ ناراض ہوئے اور اس شخص کو اپنے دل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خدا تعالیٰ ناراض ہیں اس سے بے چین ہوگیا اور ایسی ندامت طاری ہوئی جو کبھی نہ ہوتی تھی اس وقت حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوجاتی ہے اور پہلے سے زیادہ مقامات عطا ہوجاتے ہیں تو اس طرح وہ معصیت سبب بعید کا بن گئی.

ایک دوسرا واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن العاصؓ یا اُن کے صاحبزادے عبداللہ زمین مصر میں اسلامی لشکر کے سردار بنے ہوئے تھے کہ لشکر میں سے چند آدمیوں نے شراب پی لی چونکہ اس وقت تک شراب کی حد مقرر نہ ہوئی تھی اس لئے سالار لشکر نے امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھ کر بھیجا کہ یہاں لشکر

میں بعض لوگوں نے شراب پی ہے ان کو کیا سزا دی جائے غور کیجئے کہ لشکر دشمن کی زمین میں موجود ہے اور ذرا بھی ان کی رعایت کا خیال نہیں بلکہ حکم سزا کے لئے امیر المؤمنین کی خدمت میں قاصد بھیجا جارہا ہے حالانکہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب لشکر دشمن کی زمین میں ہوتا ہے تو اس کی بہت رعایت اور خاطر کی جاتی ہے مگر حضرات صحابہ میں یہ مضمون تھا ہی نہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کے اجماع کے بعد ۸۰ کوڑے شراب پینے کی سزا لکھ کر بھیجدی۔ اب جس وقت یہ حکم پہنچا ہے تو یہ نہیں ہوا کہ سالار لشکر نے تفتیش کی ہو کہ شراب کس کس نے پی بلکہ آپ نے ایک اعلان فرما دیا کہ جس کسی نے شراب پی ہو وہ آکر اپنے آپ کو پاک کرالے بس اتنا اعلان ہونا تھا کہ لوگ آنے شروع ہوئے۔ ایک آتا ہے کہ حضرت میں نے شراب پی تھی، اس کے بعد دوسرا آتا ہے کہ میں نے بھی شراب پی تھی۔ اب غور کیجئے کہ ان لوگوں پر کوئی ثبوت تھا نہ گواہ تھے نہ تفتیش کی گئی خود ہی ان کے اقرار سے جرم کا ثبوت ہو رہا ہے اور ہر شخص پر ۸۰ کوڑے پڑ رہے ہیں اور یہ لوگ صحابہ بھی نہیں تھے بلکہ تابعین تھے ہر شخص خوشی کے ساتھ اپنی زبان سے شراب پینے کا اقرار کرتا ہے اور کوڑے کھا کر چلا جاتا ہے ایک تو گنہگار یہ تھے ایسے گنہگاروں کی نسبت ارشاد ہے اِنَّہٗ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ کہ ان کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اور یہ گناہ شیطانی دھوکہ سے صادر ہو گیا۔ ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کبھی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھتے بیٹھتے خیال بھی نہیں آتا شریعت کو دو پیسے میں بیچ ڈالتا اسے گوارا ہے جس وقت جو جی میں آتا ہے کر گزرتا ہے ہر کام میں بے باک ہے حلال و حرام کی تمیز ہی نہیں گناہ کرنے کے بعد بھی کچھ زیادہ پریشان و پشیمان نہیں ہوتا کیا ایسے شخص کو بھی اِنَّہٗ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (اسکو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے) میں داخل کیا جا سکتا ہے اور کیا ان لوگوں کو بھی یہ کہنے کا منہ ہے کہ ہم اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محب ہیں۔ بلکہ حضرت اگر سچ مچ محبت ہوتی تو کبھی زبان سے بھی یہ دعوے نکل سکتے سچے عاشقوں کی تو زبان

رس جاتی ہے زبان سے اظہار ہو ہی نہیں سکتا اب رہی یہ بات کہ جب وہ زبان سے نہیں دعویٰ کرتے تو دوسرے کیسے سمجھیں کہ ان کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ سو بات یہ ہے کہ وہ زبان سے اگرچہ ظاہر نہ کریں مگر عشق بھی کہیں چھپا رہا ہے کھل ہی جاتا ہے ؎

می تواں داشت نہاں عشق ز مردم لیکن
زردی رنگ رخ و خشکی لب راچہ علاج

شاعر کہتا ہے کہ تم آدمیوں سے عشق کے تذکرہ کو چھپا سکتے ہو مگر چہرہ کی زردی اور لبوں کی خشکی کو کس طرح چھپالو گے۔ غرض عشق ایسی بلا ہے کہ پوشیدہ رہ نہیں سکتا کہ عشق و مشک را نتواں نہفتن (عشق اور مشک کو نہیں چھپا سکتے) بلکہ مولانا تو فرماتے ہیں کہ عشق بے زبان عشق زبانی سے بھی زیادہ روشن ہوتا ہے کیونکہ زبانی محبت تو صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور عشق بے زبان کے ساتھ دلیل بھی موجود ہے فرماتے ہیں ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست
لیک عشق بے زباں روشن ترست

(اگرچہ زبان کا بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے کیونکہ ڈ رموز ذوقیہ سے ہے جس کو زبان سے اچھی طرح نہیں کہا جا سکتا)

اسی لئے محققین کاملین کا عشق اکثر بے زبان ہی ہوتا ہے اور وہ بے زبان رہ کر بھی سب کچھ کر گذرتا ہے ہاں کبھی کبھی کامل بھی بے قرار ہو کر بول اٹھتا ہے کہ ؎

دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

(ضبط انتہا کو پہونچنے کی وجہ صاحبدلوں! دل نکلا جاتا ہے وہ درد عشق جو پوشیدہ تھا افسوس ظاہر ہوا جاتا ہے)

یعنی جب ضبط انتہا کو پہونچ جاتا ہے اور تاب ضبط نہیں رہتا تو بے تاب ہو کر زبان سے بھی اظہار ہو جاتا ہے تو پھر

ایسے وقت میں یعنی جب کہ عشق نے زبان کو زبان لگتی ہے تو پھر قیامت کا سامنا ہے پھر اس کے سننے کے واسطے بڑا مضبوط کلیجہ چاہیئے اُس وقت اُس کی بالکل یہ حالت ہوتی ہے ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

(میرے دل میں ایسا درد عشق ہے کہ ظاہر کروں زبان جل جائے۔ اگر خاموش رہوں تو ڈرتا ہوں کہ ہڈیوں کا گودا جل جائے)

پھر اگر اس پر کوئی ملامت بھی کرنے لگے تو اس وقت تو اس کے جوش کا ٹھکانا ہی نہیں رہتا وہ بے تاب ہو کر پھر یوں کہتا ہے ؎

ساقیا برخیز د در دہ جام را — خاک بر سر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں — مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اے ساقی اٹھ اور جام محبت عطا کر اور ایام گذشتہ کے غم کے سر پر خاک ڈال)

غرض اس کا زبان سے ظاہر ہونا غضب ہے قیامت کا سامنا ہے اس کا پوشیدہ ہی رہنا بہتر ہے مگر وہ بے زبان ہو کر بھی سب کچھ کر ڈالتا ہے اس کے ظاہر ہونے کی ضرورت ہی نہیں وہ اخفا پر بھی مخفی نہیں رہا کرتا۔ سو ایسا عاشق اگر کوئی غلطی کر گذرے وہ بیشک یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے) کا مصداق رہتا ہے نہ یہ کہ بے باکی کرے اور مدعی محبّت بنا رہے۔ پس ایسے بے باک عاصی کی نسبت اِنَّہٗ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (بلاشک وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے) وارد نہیں ہوا وہ اُنھیں حضرات کی بابت ارشاد ہے جو اپنی جان و مال کو خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر چکے تھے ہر وقت رضا جوئی اور اتباع کے گرویدہ رہتے تھے۔ پھر کبھی نفس کی شرارت سے گناہ بھی صادر ہو گیا پس معیار یہ ہے

ؑ جامع وعظ کہتا ہے کہ اس وقت سامعین کی عجیب حالت تھی بعض پر بہت زیادہ وجد غالب ہوا اگر حضرت مولانا ضبط نہ فرماتے تو نہ معلوم کیا قیامت برپا ہوتی اللّٰھم متعنا بطول بقائہ ۱۲ منہ

کہ اگر نیکیاں زیادہ ہوں اور معاصی کم تو وہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا محب ہے اور اگر نیکیاں کم ہوں اور گناہ زیادہ اس کو محب نہیں کہیں گے اس کو ابن مبارک کا قول سنایا جائے گا کہ اگر تجھ کو محبت ہوتی تو زیادہ تو اطاعت کرتا خیر کبھی اتفاقاً معصیت کا بھی صدور ہو جاتا مگر جب سرکشی کا پلہ بھاری ہے تو اس کو محب کون مان لے گا۔ محبت ایسی سستی چیز نہیں محبت کے لئے بڑے امتحان کی ضرورت ہے ؎

وَجَائِزَةٌ دَعْوَى الْمَحَبَّةِ فِي الْهَوٰى
وَلٰكِنْ لَا يَخْفٰى كَلَامُ الْمُنَافِقِ

(عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے۔ لیکن منافق کا کلام پوشیدہ نہیں رہتا)

چنانچہ جس طرح اطاعت نہ ہونا ایک امتحان ہے دوسرا امتحان عظمت کا نہ ہونا ہے چنانچہ اس کا یہ حال ہے کہ اُن کے قلب میں عظمت کا نشان تک نہیں حالانکہ محب کے دل میں محبوب کی عظمت بھی لوازم محبت سے ہے۔ یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب کی ذرا بھی عظمت نہیں۔

عظمت کا حال سنئے یہ لوگ اپنے اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بہت بیہودہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہیں فتنہ کہتے ہیں کہیں لفظ ستم استعمال کرتے ہیں اور بعض تو اس سے بھی زیادہ غضب کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ک ف ر کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں۔ خدا کی پناہ یہ لوگ کس قدر بیباک ہیں۔ بعضے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح اس طرح کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے۔ بھلا خیال کیجئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ایسی مدح سے کیا خوشی ہو سکتی ہے غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص صاحب کمشنر کے سامنے پیشکار کی ایسی مدح کرے کہ حضور جو کچھ ہیں بس آپ ہی ہیں آپ ہی کے قبضے میں سارا اختیار ہے بدون آپ کے کوئی حاکم کچھ نہیں کر سکتا تو اس وقت پیشکار کا ناگواری و شرمندگی سے کیا حال ہوگا۔ آیا اس مدح سے اس کو کچھ خوشی ہوگی یا ندامت کے مارے سیروں اس پہ پانی پڑے گا۔ کہ حاکم بالا کے سامنے میں کیا چیز ہوں جو اس کی تنقیص کرکے یہ شخص میری مدح کرتا ہے۔ بعینہ یہ حال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی مدح سے ہوگا چنانچہ حدیث میں ایک مقام پر وارد ہے۔
لَا تُسَوِّدُوْا وَجْھِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ کہ قیامت کے روز تم میرا منہ کالا مت کر دینا۔ یہ ایسی مدح کی نسبت اور ایسے مداحین کی بابت بھی ارشاد ہے۔ اللہ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منور چہرۂ مبارک اور اس کی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ میرا منہ کالا مت کرنا تو بہ تو بہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور ایسا کیوں ہوتا (فِدَاہُ اَبِیْ وَاُمِّیْ) (میرے باپ اور ماں آپ پر قربان ہوں) ان مداحین ہی کا قیامت میں منہ کالا ہوگا۔ مگر اس کلمہ میں آپ اپنی سخت ناگواری کا کس قدر اظہار فرماتے ہیں۔ دیکھئے صاحبو! کیا یہ شعر بے ادبی کا نہیں ہے

پئے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسفؑ محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

استغفر اللہ العظیم اس شاعر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کا مضمون باندھا ہے اور اس میں کیا عجیب توجیہ اختیار کی ہے جس سے وہ اپنے دل ہی میں خوش ہولیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے یقیناً سخت ناراض ہوں گے یہ بات مشہور ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہیں تھا اب بجائے اس کے کہ یہ کہا جاتا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سرتاپا نور ہی نور تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ظلمت نام کو بھی نہ تھی اس لئے آپ کے سایہ نہ تھا کیونکہ سایہ کے لئے ظلمت لازمی ہے شاعر صاحب اس مضمون کو اس طرح باندھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا تو بیقرار ہوگئے کہ اب میرا محبوب مجھ سے جدا ہوتا ہے کہاں دیکھوں گا تو تسکین خاطر کے لئے آپ کا سایہ رکھ لیا کہ اسی کو دیکھ کر تسکین کر لیا کروں گا جیسا کہ یوسف علیہ السلام کو جب یعقوب علیہ السلام نے جدا کیا تو ان کو پیراہن یوسفی سے تسلی ہوتی تھی۔ الٰہی توبہ الٰہی توبہ دیکھئے اس مضمون میں حق سبحانہ تعالیٰ کی کس قدر بے ادبی کی گئی ہے اول تو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بیقرار ماننا کہ ان کے واسطے تسلی کی ضرورت ثابت کی حالانکہ خدا تعالےٰ اس سے بالکل منزّہ اور پاک ہیں جب خدا کو بھی بے قراری ہونے لگے اور تسکین خاطر کی ضرورت ہو تو پھر خدائی

کس طرح باقی رہے گی۔ دوسرے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے ایسے دور پڑ گئے کہ خدا تعالیٰ ان کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر تنقیص ہے کہ خدا تعالےٰ سے بعید مانا اور خدا پر کیسا دھبہ لگایا کہ دنیا میں بھیج کر وہ اپنے محبوب کو دیکھ بھی نہیں سکتے گویا بصیر کی صفت نہ رہی تھی کیا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی عظمت ہونی چاہیے۔

کبھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح میں انبیاء علیہم السّلام کی اہانت کی جاتی ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک بھائی کی مدح اس طرح کی جائے کہ اس کے دوسرے بھائی کو اس کے سامنے گالیاں دی جائیں کیا ایسی مدح سے کوئی شخص خوش ہو سکتا ہے جس میں اس کے دوسرے بھائی کو بُرا بھلا کہا جائے اور بھائی بھی کیسے دو قالب و یک جان، انبیاء علیہم السلام آپس میں سب بھائی بھائی ہیں اور ان میں ایسا اتفاق ہے کہ ہرگز دوسرے کی اہانت کو ایک گوارا نہیں کر سکتا اور انبیاء علیہم السلام کی یہ توہین کہیں تو تہذیب کے ساتھ ہوتی ہے کہیں بد تہذیبی سے چنانچہ بد تہذیبی کے ساتھ توہین کی یہ مثالیں ہیں کسی شاعر نے آپ کی نعت لکھنے کے لئے خیالی سیاہی تیار کی ہے تو اس میں کہا ہے " دیدۂ یعقوب کھرل الخ" استغفر اللہ یعقوب علیہ السلام کی شان میں کس قدر گستاخی ہے کسی دوسرے شاعر نے اس کا خوب جواب دیا ہے ؎

ابھی اُس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل ۔۔۔ نظر آتا ہے جسے دیدۂ یعقوب کھرل
تو ہے یوں ہو کہیں عین نبی مستعمل ۔۔۔ کوئی تشبیہ نہ تھی اور نصیب اجل

کبھی یوسف علیہ السّلام کی توہین کی جاتی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام تو بھلا تختۂ مشق ہیں ان کی شان میں تو بہت ہی گستاخی کی جاتی ہے۔ایک صاحب کہتے ہیں ؎

برآسمانِ چہارم مسیح بیمار است ۔۔۔ تبسّم تو برائے علاج درکار است

(چوتھے آسمان پر عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں آپ کا تبسم علاج کیلئے درکار ہے)

کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان چہارم پر بیمار ہیں ان کی شفاء کے لئے آپ کے تبسّم کی ضرورت ہے۔ بھلا جو نبی بیماروں کو اچھا کرتے ہوں ان کو محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسّم کو

شفا ثابت کرنے کے لئے بیمار مانا جائے یہ کتنی بڑی گستاخی ہے. کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسم کا شفا ہونا اس کے بدون بیان نہ ہوسکتا تھا پھر آسمان پر بیمار کیونکر ہوسکتے ہیں وہ تو ایسی جگہ ہیں جہاں ان کو نہ کھانے کی ضرورت نہ پینے کی نہ آب و ہوا وہاں کی خراب جو بیمار ہونے کا احتمال بھی ہو۔

اور یہ کرتے ہیں کہ امیر خسروؒ کی غزل جو کسی محبوب مجازی کی شان میں ہے تضمین کرکرا کے اس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نعت میں پڑھتے ہیں جس میں یہ مصرع بھی ہے۔

اے نرگس زیبائے تو آوردہ رسم کافری

(اے محبوب تیری نرگس زیبا رسم کافری لائی ہے)

اور اگر اس قسم کے مضامین کسی بزرگ کے کلام میں پائے جائیں تو اس کو غلبۂ حال پر محمول کیا جائے گا۔ مگر ان شاعروں کے کلام میں ہم کو تاویل کی کیا ضرورت. جن کو نہ محبت ہے نہ خاک محض تک بندی ہی چاہتے ہیں یہ تو بدتہذیبی کے ساتھ اہانت انبیاء علیہم السلام کی مثالیں تھیں. بعض لوگ تہذیب کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی توہین کرتے ہیں اور اس میں عوام کی تو کیا شکایت کی جائے خواص تک مبتلا ہیں گو میرے اس بیان سے بعض خشک علماء ناخوش ہوں گے مگر جو بات ناحق ہوگی اس کو تو بیان کیا ہی جائے گا بعض واعظین و مصنفین و مدرسین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت دیگر انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں اس طرح سے ثابت کرتے ہیں کہ اُس سے اُن کی تنقیص لازم آجاتی ہے گو ان کی نیت تنقیص کی نہ ہو مگر اس طرح مقابلہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بیان کرنا جس سے دوسرے انبیاء کی تنقیص کا وہم بھی ہو جائز نہیں اسی لئے میں نے یہ کہا تھا کہ بعض لوگ تہذیب کے ساتھ انبیاء کی توہین کرتے ہیں اُس کی ایک مثال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ مشہور ہے کہ ان کے پتھر پر عصا مارنے سے پانی کے چشمے جاری ہوگئے تھے اب بعض مدرسین اس کی کوشش کرتے ہیں کہ انبیاء سابقین کے ہر ہر معجزہ کے مقابلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو ان سے افضل و اکمل ثابت کریں۔ چنانچہ اس معجزۂ موسوی کے مقابلہ میں بھی یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بیان

کرتے ہیں کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھر سے چشمے جاری ہوگئے تو ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے غزوۂ حدیبیہ میں پانی جاری ہوگیا تھا جس سے تمام لشکر سیراب ہوگیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ کو معجزۂ موسوی سے افضل ثابت کرنے کے لئے اس طرح تقریر کرتے ہیں کہ پتھر سے پانی نکلنا کچھ زیادہ عجیب نہیں کیونکہ بعض پتھروں سے چشمے نکلتے ہیں مگر لحم وشحم سے پانی کا جاری ہوجانا یہ بہت عجیب ہے اس تقریر سے مفضول اور افضل دونوں کی تنقیص لازم آتی ہے مفضول کی تنقیص تو ظاہر ہے کہ اس تقریر میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی وجہ اعجاز کو کمزور کردیا گیا ہے کہ پتھر سے پانی کا نکلنا کچھ چنداں جائے تعجب نہیں گویا موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ کوئی بڑا بھاری معجزہ نہ تھا استغفر اللہ ایک ایسے معجزہ کو جسے حق سبحانہ تعالےٰ نے جابجا امتنان و اظہار قدرت کے لئے بیان فرمایا ہے اعجاز میں کمزور اور معمولی بتلانا کتنا بڑا غضب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص اس سے اس طرح لازم آتی ہے کہ ان حضرات نے اس واقعہ کے معجزہ ہونے کو اس پر موقوف کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے پانی نکلتا تھا حالانکہ اس کا کہیں ثبوت نہیں احادیث سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک پیالہ میں پانی منگا کر اپنا دست مبارک اس میں رکھ دیا تو وہ پانی اُبلنے لگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے درمیان سے ابلتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ لحم وشحم سے پانی نکلتا تھا بلکہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک رکھ دینے سے وہ پانی بڑھنے لگا اور جوش مارنے لگا اور انگلیوں کے درمیان سے اس کا اُبلنا نظر آتا تھا اب جن صاحب نے اس معجزہ کے اعجاز کو اس بات پر موقوف کیا ہے کہ پانی لحم وشحم نے نکلا تھا جس کا کچھ ثبوت نہیں تو گویا در پردہ وہ اس اعجاز کے معجزہ ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ لحم وشحم سے تو پانی کا نکلنا ثابت ہی نہ ہوا۔

ایک دوسرے صاحب کہتے ہیں ۔ ؎

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات　　تو عین ذات مے نگری در تبسمی

مطلب ان کا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تو ایک تجلی صفاتی سے بے ہوش ہو گئے اور آپ نے تجلی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسّم ہی فرماتے رہے۔ بھلا ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ کیا تم تجلی طور کے وقت موجود تھے جو تم نے قطعی فیصلہ کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلی صفاتی ہوئی تھی یا تم شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جو یقین کے ساتھ حکم لگاتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلی عین ذات ہوئی تھی یا محض تخمین اور قیاس سے جو جی چاہا حکم لگا دیا حالانکہ شب معراج کا حال کسی کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلّی کیسی ہوئی تھی۔

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کی کیا کیا باتیں ہوئیں؟ انھوں نے جواب میں یہ شعر فرمایا ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

(اب کس کی ہمت ہے کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا)

واقعی خوب ہی جواب دیا اس وقت کسی کی کیا طاقت جو ان اسرار کو یقینی طور پر معلوم کر سکے اگر قسمت میں ہے تو جنت میں جا کر معلوم کر لیں گے باقی یہاں اول تو کسی کو معلوم کس طرح ہو سکتا ہے اور جو کسی کو کشف سے کچھ معلوم بھی ہوتا ہے تو وہ ظنی ہے اس پر یقین کیونکر ہو سکتا ہے مگر یہ حضرت تو بڑی پختگی کے ساتھ بلا کھٹکے فرماتے ہیں۔

؎ تو عین ذات می نگری در تبسمی (آپ نے تجلی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسم ہی فرماتے رہے) گویا یہ بھی معراج کے وقت سارا معاملہ دیکھ رہے تھے پھر اس شعر میں جو فضیلت شاعر صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمائی ہے وہ فضیلت بھی تو نہیں بن سکتی۔ وہ فضیلت یہ بیان کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک تجلی صفاتی سے بے ہوش ہو گئے تھے اور آپ عین ذات کے مشاہدہ کے وقت بھی تبسم ہی میں رہے۔ اگر تھوڑی دیر کو ان کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلی صفاتی ہوئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلی ذاتی تو جو نقص

یہ موسیٰ علیہ السلام پر لگاتے ہیں اگر معاذ اللہ وہ کوئی نقص ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے زیادہ لازم آئے گا کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے ایک بار درخواست کی تھی کہ تم مجھے ایک دفعہ اپنی اصلی صورت دکھلا دو حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ دیکھ نہ سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے تو ایک دن حضرت جبریل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے نہایت حسین وجمیل صورت تمام آفاق آسمان کو ان کے پر گھیرے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جوان کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا تو آپ بیہوش ہو کر گر پڑے تو اگر کوئی یہودی اس واقعہ سے یہ اعتراض کرے کہ موسیٰ علیہ السلام تو خدا کی تجلّی سے بیہوش ہوئے تھے اور تمہارے نبی ایک فرشتہ کو دیکھ کر بیہوش ہو گئے اگر خدا کو دیکھ کر بیہوش ہو جانا کوئی نقص کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ فرشتہ کو دیکھ کر بے ہوش ہونا اُس سے بڑھ کر نقص ہو گا تو اس وقت یہ شاعر صاحب کہاں جائیں گے جو فرماتے ہیں ؎

موسیٰؑ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات

تو عین ذات می نگری در تبسمی

(موسیٰ علیہ السلام تو ایک تجلّی صفاتی سے بے ہوش ہو گئے اور آپ نے تجلّی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسم بھی فرماتے رہے)

بے سمجھے ایسی بات کہہ ڈالنا بھی غضب ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کرنے بیٹھے تھے مگر الٹا اعتراض لازم آ گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

ع "دوستی بے خرد چوں دشمنی است"

(بے عقل کی دوستی دشمنی کی طرح ہے)

اب اس کی حقیقت سنئے بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شب معراج میں بے ہوش نہ ہونا کوئی ایسا امر نہ تھا جس کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کے بے ہوش ہو جانے کو دلیل مفضولیت کی ٹھہرائی جاوے نہ موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر بے ہوش ہونا کوئی ایسی حالت تھی جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شب معراج میں بے ہوش نہ ہونے کو دلیل

افضلیت کہا جاوے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلی الٰہی عالم ناسوت میں ہوئی تھی اور اس عالم میں قویٰ انسانی کمزور ہوتے ہیں اس لئے وہ بے ہوش ہو گئے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اسی عالم میں تجلی ہوتی تو آپ بھی بے ہوش ہو جاتے چنانچہ جبریل علیہ السلام کو دیکھ کر آپ کا بے ہوش ہو جانا ثابت ہے آخر اس کی کیا وجہ تھی فقط یہی کہ عالم ناسوت میں آپ کے قویٰ کمزور تھے۔ اور شب معراج میں آپ اس لئے بیہوش نہ ہوئے کہ وہ عالم ملکوت ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ملکیت غالب تھی آپ کے قویٰ متحمل ہو گئے تھے عالم ملکوت میں اگر موسیٰ علیہ السلام پر بھی تجلی ہوتی تو وہ بھی بے ہوش نہ ہوتے۔

غرض یہ طریقہ ہرگز پسندیدہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل دیگر انبیاء کا مقابلہ کر کے اس طرح بیان کئے جائیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی اس سے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تنقیص لازم آجاتی ہے اور اگر یہ نہ بھی ہو تب بھی آخر دیگر انبیاء علیہم السلام کا ادب بھی تو لازمی ہے جب ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ادب کرتے تھے تو ہم کو ضرور ان کا ادب کرنا چاہیئے۔ پس اسلم یہ ہے کہ اس بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا اتباع کیا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ اَنْبِيَاءِ اللّٰهِ مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ تم انبیاء میں ایک کو دوسرے پر محض اپنی رائے سے کسی وجہ سے افضل نہ ثابت کرو۔ یہ مطلب نہیں کہ انبیاء سب برابر ہیں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں کیونکہ بعض مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کچھ اپنے فضائل ذکر فرمائے ہیں کیونکہ امت پر ان فضائل کا اعتقاد ضروری تھا۔ سو اُن فضائل منصوصہ کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ اَنْبِيَاءِ اللّٰهِ (انبیاء علیہم السلام کے درمیان ایک کو دوسرے پر اپنی رائے سے فضیلت مت دو) سے تفضیل بالرائے کی نفی مقصود ہے کہ تم خود اپنی رائے سے وجہ فضیلت تراش کر کے انبیاء میں تفضیل مت کرو کہ اس میں اندیشہ دیگر انبیاء کی تنقیص کا ہے اور فضائل منصوصہ کے بیان کرنے میں یہ اندیشہ نہیں کیونکہ وہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ارشاد فرمودہ ہیں ان میں سے کسی کی تنقیص نہیں۔

مثلاً فضائل منصوصہ یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما تے ہیں اَنَا خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ
میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اَنَا سَیِّدُ وَلَدِ اٰدَمَ میں تمام اولاد
آدم کا سردار ہوں۔ اَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ میں سب سے پہلے شفاعت کروں گا۔
اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اَنَا صَاحِبُ لِوَاءِ الْحَمْدِ وَاٰدَمُ وَمَنْ
بَعْدَہٗ تَحْتَ لِوَائِیْ میرے ہی ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا آدم علیہ السلام سے لیکر قیامت تک
کے تمام آدمی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا لَمَا وَسِعَہٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ
اگر اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو میرا ہی اتباع کرتے اور اُس کے سوا فضائل
منصوصہ بکثرت ہیں اگر کسی کو شوق ہو تو یہ فضائل بیان کرے مگر اپنی طرف سے تراش کر ناوجوہ
فضائل بیان کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ کیا کہوں علماء تک اس میں مبتلا ہیں ایک تفسیر کی
کتاب جو داخل درس ہے اور سب اُس کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اس تک میں ایسے
مضامین موجود ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب بنی اسرائیل
کو لیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے چلے تو طلوع شمس کے بعد فرعون نے ان کو جالیا
اس کا لشکر قریب پہونچ گیا تو بنی اسرائیل نے گھبرا کر کہا کہ بس ہم تو پکڑے گئے اس پر موسیٰ
علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ (بلا شک اللہ تعالیٰ میرے ساتھ
ہے وہ مجھ کو راہ پر پہونچا دے گا) اس پر وہ مفسر لکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس قول
سے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو ترجیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور
میں صدیق اکبرؓ سے فرمایا تھا جبکہ کفار غار کے قریب پہونچ گئے اور وہاں جاکر باتیں کرنے
لگے کہ یہاں تک تو نشان قدم کا پتہ چلتا ہے یہاں سے آگے نشان قدم نہیں معلوم ہوتے
نہ معلوم آسمان پر چڑھ گئے یا زمین میں غائب ہو گئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کیا
کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ لوگ اپنے پیروں کی طرف نگاہ کریں تو ہم کو دیکھ
لیں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (مت غمگین ہو
یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے) وہ مفسر فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے مَعِیَ فرمایا بصیغہ

ضروری اطلاع: خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔

واحد متکلم کہ خدا میرے ساتھ ہے اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مَعَنَا بصیغۂ جمع متکلم فرمایا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کے صیغہ سے دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک فرمایا دوسرے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ذکر کو خدا کے ذکر سے مقدم فرمایا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (بے شک اللہ میرے ساتھ ہے) پہلے مَعِیَ ہے پھر رَبِّیْ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالےٰ کے ذکر کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا میں کہتا ہوں کہ بلاغت کوئی کمالات نبوت سے نہیں نبوت کے کمالات دوسری قسم کے ہیں بلاغت کو اس میں کیا دخل اس کی تو بالکل ایسی مثال ہوئی کہ جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ یوسف علیہ السلام تمام انبیاء سے زیادہ حسین تھے اس لئے وہ سب سے افضل تھے ظاہر ہے کہ اس کا یہی جواب دیا جائے گا کہ حسن صورت کمالات نبوت سے نہیں اس لئے اس سے فضیلت ثابت نہیں ہو سکتی۔ بس اسی طرح بلاغت کلام بھی کوئی شرائط نبوت سے نہیں جس کی وجہ سے ایک نبی کی دوسرے کے اوپر فضیلت ثابت کی جا سکے ورنہ اگر فضیلت کے یہی معنی ہیں کہ ہر بات میں افضل ہو تو شاید یہ بھی دعویٰ کیا جائے گا کہ فلاں ولی سے رستم افضل ہے کیونکہ رستم کی قوت جسمانی اس ولی سے زیادہ تھی مگر ظاہر ہے کہ اس سے اس ولی کی طرف کوئی نقص عائد نہیں ہو سکتا کمالات ولایت میں قوت جسم کو کیا دخل ہاں قوت قلبیہ مقبولین کی سب اقویاء سے زیادہ ہوتی ہے جس کا اندازہ قوت فیضان سے ہو سکتا ہے یہ گفتگو تو تسلیم کے بعد تھی ورنہ ہم یہ ہی تسلیم نہیں کرتے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بلاغت میں کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے کم ہے کیونکہ بلاغت کلام کے معنی یہ ہیں کہ کلام مقتضی حال کے موافق ہو تو ان دونوں اقوال میں سے کسی کو دوسرے سے ابلغ اس وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ دونوں یکساں حال میں صادر ہوئے اور دونوں حال بالکل متحد تھے وہ یہ ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ حال مختلف تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک اکھڑ جاہل قوم تھی جس وقت لشکر فرعون کو اس نے آتے ہوئے دیکھ لیا تو موسیٰ علیہ السلام کے قول پر بھی ان کو اعتماد نہ رہا کہ

حق تعالیٰ میری مدد فرمائیں گے اور اس قوم ظالم سے مجھ کو نجات دیں گے انھوں نے بڑی پختگی اور یقین کے ساتھ یہ کہہ ڈالا کہ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ کہ اب تو ہم یقیناً پکڑے گئے جملہ اسمیہ اور اِنَّ و لَام تاکید ان کے کلام میں موجود ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے وعدوں سے بے اعتقاد ہو کر کہا تھا اب فرمایئے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ معیت حق کہاں باقی رہی تھی یہ حال اسی کو چاہتا ہے کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (یقیناً اللہ میرے ساتھ ہے) بصیغۂ واحد استعمال کیا جائے۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو دیکھئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اِنَّ اللہَ مَعَنَا بصیغۂ جمع ارشاد فرمایا وہاں کیا حال تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت فقط صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور یہ کہیں ثابت نہیں کہ نعوذ باللہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کوئی بے اعتقادی کی بات ظاہر کی ہو یا اُن کے کسی حال سے بے اعتقادی ظاہر ہوئی ہو بلکہ سچ پوچھئے تو حضرت صدیق اکبر کو جو اس وقت حزن تھا وہ اپنی جان کے اندیشہ کی وجہ سے نہ تھا ورنہ اپنے کو سانپ کے منہ میں نہ دیتے۔ بلکہ ان کا سارا حُزن فقط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہیں بال بیکا نہ ہو جائے۔ تو ایک تو وہ حال تھا کہ ساتھ میں بے اعتقاد قوم تھی جس نے دشمن کو آتے ہوئے دیکھ کر یقین کر لیا کہ بس ہم گرفتار ہو جائیں گے اور موسیٰ علیہ السلام کے وعدوں کے ہوتے ہوئے کیسے پختگی کے ساتھ زبان سے یہ لفظ نکال گئے اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (اب تو ہم یقیناً پکڑے گئے) یہ بھی نہ خیال کیا کہ ہم خدا کے حکم سے نکلے ہیں خدا تعالیٰ نے مدد کا وعدہ فرمایا ہے ایسی قوم کے لئے یہی جواب زیبا تھا جو موسیٰ علیہ السلام نے دیا كَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ کہ سب سے پہلے لفظ کَلَّا بڑھایا جو لغت عربی میں ڈانٹنے اور دھمکانے کے لئے بولا جاتا ہے گویا کہ کلے پر طمانچہ مار دیا کہ ہرگز نہیں خدا میرے ساتھ ہے وہ مجھ کو راہ پر پہونچائے گا۔

دوسری جگہ یہ حالت ہے کہ ساتھ میں ایک صدیق رضی اللہ عنہ ہے جس سے کبھی بے اعتقادی کا

وہم بھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ ہر بات کو سب سے پہلے ماننے والا ہے اور جان نثار ہے کہ اس کو اپنی جان کا غم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا غم تھا اس کو معیت حق میں کیونکر نہ شریک کیا جاتا اور کیونکر اس کی تسلی نہ کی جاتی اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا لَا تَحْزَنْ غم نہ کرو اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے۔

غرض کہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام اس حال کے مقتضی کے بالکل موافق تھا اگر وہ حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتا تو بقاعدہ بلاغت حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی غالباً اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (یقیناً میرا رب میرے ساتھ ہے) ہی فرماتے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس حال کے مقتضی کے موافق تھا اگر یہ حال موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوتا تو وہ بھی غالباً اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) ہی فرماتے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ اپنی طرف سے تراشی ہوئی وجہ فضیلت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کو ذرا سے تامل کے بعد ایک ادنیٰ طالب علم نے توڑ دیا۔ اب بھلا ان حضرت مفسر سے کوئی پوچھے کہ جیسا آپ نے دونوں اقوال کو تو دیکھا تھا احوال کو بھی تو دیکھا ہوتا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قول کس موقع پر صادر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کیسے موقع پر صادر ہوا۔ اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ذکر کو خدا کے ذکر سے مقدم کیا اور ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا کے ذکر کو اپنے ذکر سے مقدم کیا۔

اے صاحبو کیا اس تقریر میں موسیٰ علیہ السلام پر سخت اعتراض نہیں ہوا کہ معاذ اللہ ان کو بولنا بھی نہ آتا تھا اُن کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہ تھا کہ خدا کے ذکر سے اپنے ذکر کو مقدم کر دیا، میں یہ نہیں کہتا کہ مفسر کے دل میں بھی یہ اعتراض ہوگا مگر ان کی اس تقریر سے ہر سننے والے کو موسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہی بدگمانی پیدا ہوگی۔ استغفر اللہ العظیم مگر میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی موسیٰ علیہ السلام کا قول کسی طرح غیر ابلغ نہیں ہوسکتا۔

بات یہ ہے کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہیوں کے قول سے چونکہ بے اعتقادی اور عدم یقین بر وعدہ خداوندی کا ظہور ہو چکا تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام اس جواب میں ناراضی کے ساتھ یہ بات ظاہر فرماتے ہیں کہ

جب تمھارے اعتقاد و یقین کی یہ حالت ہے تو فقط میرے ہی ساتھ معیت حق شامل ہے تمھارے ساتھ معیّت حق نہیں تو آپ کا مقصود حصر بیان فرمانا ہے اور قاعدۂ بلاغت مشہور ہے۔ تَقْدِیْمُ مَاحَقُّهُ التَّاخِیْرُ یُفِیْدُ الْحَصْرَ (جس کا حق مؤخر کرنے کا اس کو مقدم کر دینا حصر کا فائدہ دیتا ہے) اس لئے آپ نے لفظ مَعِیَ کو رَبِّیْ سے مقدم فرمایا تو حصر کے لئے کسی لفظ متأخر کو مقدم کر دینا یہ تو عین بلاغت ہے اس سے موسیٰ علیہ السلام کے قول کی کامل بلاغت باقی رہی یا کم ہوئی اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ حصر مقصود نہ تھا اس لئے آپ نے اپنے ذکر کو مقدم نہ فرمایا چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود صدیق اکبر کو بھی معیت حق میں شامل کرنا تھا کیونکہ اُن سے جس جاں نثاری کا ظہور ہوا تھا اُس کی وجہ سے وہ اس قابل تھے کہ ان کو معیت حق میں شریک کیا جائے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حصر مقصود ہوتا تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی بقاعدۂ بلاغت اپنے ذکر کو مقدم فرماتے تو یہ غیر ابلغ کیا ہوا۔ غرض معلوم ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی آپ کے مقابلہ میں تنقیص کی جائے۔ ایسی عظمت سے نہ خدا تعالیٰ راضی ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہیں ایک بار اسی قسم کا واقعہ دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش ہوا کہ ایک صحابی کے ساتھ کسی یہودی کی گفتگو ہوئی مسلمان صحابی نے ضمن قسم میں یہ فرمایا تھا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ وہ یہودی قسم ہی کے ضمن میں کہتا تھا کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ صحابی نے غصہ میں آکر یہودی کے ایک طمانچہ مارا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی پر غصہ ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ لَا تُفَضِّلُوْا بَیْنَ اَنْبِیَاءِ اللّٰهِ (انبیاء علیہم السلام کے درمیان اپنی رائے سے ایک کو دوسرے پر فضیلت مت دو) اگرچہ اس یہودی کا قول حقیقت میں غلط تھا اور صحابی حق پر تھے جو بات وہ کہہ رہے تھے غلط نہ تھی فی الواقع حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام سے بھی افضل ہیں مگر اس وقت ان صحابی کے فعل سے حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تنقیص کا شبہ ہو سکتا تھا (اگرچہ ان کی نیت

یہ نہ تھی) اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی گفتگو سے منع فرمادیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ طرز جو بعض حضرات علماء نے اختیار فرمایا ہے اچھا نہیں اس میں بڑا خطرہ ہے اگرچہ ان کی نیت تنقیص کی نہ ہو مگر اس قسم کی تقریریں جو کہ مقابلہ کی صورت سے محض رائے سے ہوں تنقیص لازم آہی جاتی ہے۔

یہ گفتگو تھی حقیقی عظمت نہ کرنے والوں کے ایک گروہ کے باب میں اور ان حقیقی عظمت نہ کرنے والوں کا ایک گروہ اور بھی ہے یعنی آجکل کی نئی تعلیم یافتہ جماعت وہ یہ کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی عظمت کو جانتے ہی نہیں گو ظاہر میں عظمت کرتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بوجہ ملکیت اور سلطنت کے کرتے ہیں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات میں سے صرف انتظام مملکت اور تمدن وسیاست کو منتخب کرلیا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کریں گے تو اُن سب کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑے بیدار مغز بادشاہ اور ریفارمر تھے کہ آپ نے اپنی خداداد قابلیت سے عرب جیسی جاہل قوم کو مہذب بنادیا اور اُن کے باہمی اختلافات کو رفع کر کے سب کو متحد و متفق بنا کر حکمرانی اور سلطنت کے قابل اُن کو بنادیا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی کمالات وہ ہیں جو بحیثیت نبوت کے ہیں گو آپ میں اور شیون و کمالات بھی تھیں مگر وہ دوسرے کمالات اس کمال نبوت کے تابع ہیں ان میں سے ایک ملک وسلطان ہونا بھی ہے۔ مگر آجکل کی نئی تعلیم یافتہ جماعت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام فضائل میں صرف شان ملکیت وبادشاہت کی وجہ سے آپ کی عظمت کرتے ہیں آپ کی نبوت ورسالت کے کمالات سے بحث نہیں کرتے کہ آپکی معرفت وعلم کیسا تھا آپ سے معجزات وخوارق کیسے کیسے صادر ہوئے بلکہ اکثر تو مغربی تعلیم کے اثر سے مغلوب ہوکر معجزات کا انکار ہی کرتے ہیں چنانچہ آجکل ایک جدید سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپی ہے جس پر تمام نئی تعلیم یافتہ جماعت عش عش ہے مگر اس کو اول سے آخر تک دیکھنے سے جو خلاصہ نکلتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک بہت بڑے مدبر و بیدار مغز بادشاہ تھے یا ایک مصلح قوم ریفارمر تھے اور اس سیرت کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بادشاہ کی سیرت ہے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی اولوالعزم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے کیونکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات رسالت کی بحث ہی نہیں۔

میں جب ضلع فتحپور گیا تو ایک صاحب میرے ملنے والے ہیں انھوں نے ایک شخص کے ہاتھ وہ سیرت میرے پاس بھیجی کہ ذرا اس کو دیکھ لو اور یہ بتلا دو کہ یہ سیرت دیکھنے کے قابل ہے یا نہیں۔ میں نے یہ عذر کیا کہ بھائی میں اس وقت سفر میں ہوں اس وقت ساری کتاب کا دیکھنا دشوار ہے اور دو تین مواقع دیکھ کر میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس میں کیا خوبی ہے اور کیا خرابی ہے۔ جب میں وطن پہونچوں گا وہاں بھیجدی جائے تو میں وہاں دیکھ کر اس کا فیصلہ کر سکتا ہوں۔ اسی مجلس میں ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے کہا کہ آپ کو اس ساری کتاب کے دیکھنے کی ضرورت نہیں میں ایک موقع دکھاتا ہوں بس اسی کو دیکھ لینا کافی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک موقع نکال کر دکھایا اس جگہ مصنف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کمالات کو ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام میں انتظام سلطنت کی قابلیت نہ تھی۔ نوح علیہ السّلام میں رحمت و شفقت کا مضمون نہ تھا۔ میں نے کہا لو بھائی اس کتاب کا حال تو اسی موقع سے معلوم ہو گیا اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کی گئی ہے آپ کے بھائیوں کو عاری عن الفضائل (فضائل سے خالی) بتلا کر۔ اسی سے قیاس کر لو کہ جب مصنف کے دل میں انبیاء علیہم السلام کی یہ وقعت ہے تو اور کیا کچھ گل کھلائے ہوں گے۔

ع: قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا (میرے چمن ہی سے میری بہار کا اندازہ کر لو)

میرے نزدیک وہ سیرت ہرگز قابل دیکھنے کے نہیں جس میں انبیاء علیہم السلام کی تنقیص کی گئی ہو۔

(۱) جوا یہ کتنا بڑا غضب ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان میں سلیقہ ملکداری نہ تھا حالانکہ احادیث صحاح میں وارد ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں نزول فرمائیں گے اور اس وقت وہ بادشاہت بھی کریں گے اور انتظامِ سلطنت بہت خوبی کے ساتھ انجام دیں گے۔ تو جس شخص کے انتظام سلطنت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدح فرمائیں، اب کسی کا کیا منہ ہے جو ان پر یہ الزام لگائے کہ ان میں سلیقہ ملک داری نہ تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں چونکہ ساری عمر زہد و پارسائی کے ساتھ بسر کی اس لئے

اس سے یہ قیاس کرلیا گیا کہ ان کو انتظام سلطنت آتا ہی نہ تھا سو خود یہ قیاس کتنا غلط قیاس ہے۔ بھلا بادشاہت نہ کرنے سے یہ کیونکر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن میں قابلیت ہی نہ تھی۔ قابلیت نہ ہونا تو یوں معلوم ہو سکتا ہے کہ بادشاہت کرتے اور اچھے طریقے سے نہ کرتے۔ اس باب میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت موجود ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں نازل ہوں گے اور مسلمانوں پر بادشاہت کریں گے اور نہایت عدل و خوبی کے ساتھ بادشاہت کریں گے اور ان میں ایسی قابلیت ہو گی کہ ایک بہت بڑے قانون کا انتظام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے سپرد فرماتے ہیں وہ یہ کہ جزیہ کو موقوف کر دیں گے۔ جس پر بظاہر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تو شریعت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متبع ہو کر تشریف لائیں گے پھر وہ شریعت کے کسی حکم کو کیونکر منسوخ کریں گے مگر میری تقریر سے جواب نکل آیا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جزیہ کو موقوف کر دیں گے۔ اگرچہ صورتاً خبر ہے مگر معنًا انشاء ہے گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو امر فرما گئے ہیں کہ اپنے زمانہ میں آپ جزیہ کو موقوف فرما دیں۔ پس حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان کو اتنا بڑا مدبر تسلیم فرماتے ہیں کہ ان کے سپرد اتنا بڑا قانون فرماتے ہیں کسی دوسرے کو یہ اجازت نہیں دیتے بات یہ ہے کہ ان میں ملکہ سلطنت کامل ہے۔ مگر جب تک حق تعالےٰ نے اُس سے کام لینے کو نہیں فرمایا اس سے کام نہیں لیا اور جب اس سے کام لینے کا حکم ہوگا کام لیں گے۔

حضرت سیدنا نوح علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کہ ان میں ترحم کم تھا افسوس کہ یہ لوگ قرآن کو بھی تو نہیں دیکھتے۔ قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارہ میں ارشاد خداوندی موجود ہے وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ ترجمہ ان آیات کریمہ کا یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی طرف یہ وحی بھیجی گئی کہ بس اب آپ کی قوم میں سے بجز ان لوگوں کے جو کہ ایمان لا چکے ہیں اور کوئی بھی ایمان نہ لائیگا تو آپ اُن کے افعال سے رنجیدہ نہ ہوجئے۔ معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کو اپنی قوم کے

افعال سے رنج ہوتا تھا اور رنج ہونا شفقت کی دلیل ہے شفقت نہ ہوتی تو ان کے افعال کی کچھ بھی پرواہ نہ ہوتی یہی سمجھتے کہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے مگر نہیں ان کو بوجہ شفقت کے رنج ہوتا تھا ہاں جب تو حق تعالیٰ نے منع فرما دیا کہ بس اب مت رنج کرو تو پھر رنج نہیں کیا اور ان کی طرف سے دل کو خالی کر لیا اس کے بعد حکم ہوتا ہے کہ تم ایک کشتی ہمارے سامنے اور ہمارے حکم سے بناؤ اور ان ظالموں کی بابت اب کوئی بات ہم سے نہ کیجیو یہ بالیقین غرق ہوں گے۔

بھلا جب حق تعالیٰ نے صاف صاف منع فرما دیا کہ اب ان لوگوں کی بابت مجھ سے بات نہ کیجیو تو حضرت نوح علیہ السلام ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیسے ظاہر کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے پھر بھی جہاں ذرا سی گنجائش پائی شفقت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ حق تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم تمہارے اہل کو غرق نہ کریں گے جب نوح علیہ السلام کا بیٹا غرق ہونے لگا تو حق تعالیٰ سے اس کی سفارش کی وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝ یعنی نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی کہ یا اللہ میرا بیٹا بھی تو میرے اہل میں سے ہے اور آپ کا وعدہ سچا ہے یعنی آپ وعدہ فرما چکے ہیں کہ تمہارے اہل کو ہم غرق نہ کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نوح وہ تمہارے اہل میں سے نہیں تھا اس کے اعمال بُرے تھے اور تمہارے اہل سے مراد وہ لوگ تھے جو کہ آپ کے خاندان کے ہوں اور متبع بھی ہوں تو دیکھئے شفقت نہ ہوتی تو بیٹے کے واسطے عرض نہ کرتے۔ شائد آپ یہ کہیں کہ اپنے بیٹے کے لئے دعا کرنا اور سفارش کرنا یہ تو دلیل شفقت نہیں ہو سکتی کیونکہ اپنے بیٹے سے تو باپ کو شفقت ہوا ہی کرتی ہے جواب یہ ہے کہ اول تو نوح علیہ السلام پیغمبر تھے اور انبیاء علیہم السلام مثل اپنی اولاد کے دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں۔ مگر چونکہ دوسروں کی سفارش کے لئے کوئی گنجائش نہ رہی تھی اس لئے نہ کر سکے۔ اور بیٹے کے بارہ میں چونکہ عرض معروض کی گنجائش تھی بوجہ وعدۂ سابق کے اس لئے ذرا سی گنجائش پر بھی نہ چوکے اور فوراً عرض کر ہی دیا اس سے

ہم یہی سمجھیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو دوسروں پر بھی شفقت تھی مگر بوجہ گنجائش باقی نہ رہنے کے ان کے لئے عفو کی دعا نہ کر سکے۔

دوسرے یہ کہ یہ تو مسلم کہ باپ کو بیٹے کے ساتھ محبت و شفقت ہوا کرتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب بیٹا انتہا درجہ کا سرکش و نافرمان ہو تو وہ شفقت جاتی رہتی ہے۔ چنانچہ امتحان کے طور پر ان والدین کا حال دیکھ لیا جاوے جن کی اولاد نافرمان ہے کہ وہ کس قدر اپنی اولاد سے بیزار رہتے ہیں۔ خصوصاً مذہبی مخالفت یہ تو ایسی مخالفت ہے کہ اس کے بعد تو شفقت رہا ہی نہیں کرتی خصوصاً انبیاء علیہم السّلام کہ ان کی محبت و بغض تو سب فی اللہ ہوتا ہے۔ خیر! ابراہیم علیہ السلام کے والد ابراہیم علیہ السّلام کو مخالف فی الدین اور بتوں کی برائی کرتے ہوئے دیکھ کر غصے میں آکر کہتے ہیں قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ لَىٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِیْ مَلِیًّا کہ اے ابراہیم کیا تم میرے بتوں سے بے رُخ ہو اگر تم اس بے رُخی سے باز نہ آؤ گے تو میں تم کو پتھر مار مار کر قتل کر دوں گا۔ اور میرے پاس سے مدۃ العمر کے لئے دور ہو جاؤ۔ تو انبیاء کا تو مخالف فی الدین کے ساتھ کیا حال ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ نوح علیہ السّلام کا وہ بیٹا اُن کا نہایت نافرمان اور سرکش بیٹا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دین میں مخالف تھا۔ اس کے بعد بھی نوح علیہ السلام کی یہ شفقت کہ جب طوفان آیا تو اُس نافرمان سے آپ فرماتے ہیں کہ اے بیٹے ہمارے ساتھ تو بھی کشتی میں سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ مت رہ نہیں تو غرق ہو جائے گا۔ اس نے اس بات کو بھی منظور نہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کو بھی موج طوفان نے غرق کر دیا۔ اس قدر سرکشی کے بعد بھی جب وہ غرق ہو گیا تو نوح علیہ السلام پھر بھی حق تعالیٰ شانہٗ سے اس کی بابت عرض معروض کرتے ہیں۔ یہ نہیں خیال کرتے کہ کمبخت اپنے ہاتھوں تباہ ہوا۔ میں کیا کروں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السّلام میں شفقت بہت ہی زیادہ تھی ورنہ اس قدر سرکشی کے بعد کیسا ہی باپ ہو اس کو بھی شفقت نہیں رہا کرتی اس سے ثابت ہوا کہ اُن کی صفت شفقت و مرحمت میں ذرا کمی نہ تھی پس پھر جو قوم

کے لئے بد دعا کی معلوم ہوا کہ بامر حق تھی۔ تیسری بات یہ تھی کہ نوح علیہ السلام نے جو بد دعا اپنی قوم کے حق میں کی تھی اگر وہ دعا بے رحمی کی تھی تو حق تعالیٰ شانہٗ اس کو ہرگز قبول نہ فرماتے، مگر جب حق تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا تو معلوم ہوا کہ وہ بددعا بے رحمی کی نہ تھی اگر اس بد دعا کی وجہ سے نوح علیہ السلام بے رحم ہوئے تو پھر حق تعالیٰ کو بھی بے رحم کہو کہ انھوں نے ایسی بے رحمی کی بد دعا کو قبول فرمالیا۔ اور ایک نوح علیہ السلام ہی کی دعا کو نہیں۔ حق تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی بد دعا کو بھی اسی طرح قبول فرمایا تھا۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰی يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (ہمارے پروردگار ان کے اموال کو ہلاک کر اور ان کے دلوں پر سختی کر پس وہ ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ کے دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں)

تو اے خبطیو! یہ الزام تم نوح علیہ السلام کو کیا دیتے ہو کہ وہ بے رحم تھے صاف یوں ہی کہدو نا کہ خدا تعالیٰ بھی معاذ اللہ بے رحم ہیں۔ کیا خدا تعالےٰ کے دربار میں ممکن ہے کہ جا بیجا درخواستیں منظور ہو جایا کریں جس کا نہ کوئی ضابطہ ہے نہ کوئی قانون اگر یہ ہے تو حق تعالےٰ کا دربار کیا ہوا شاہانِ اودھ کی کچہری ہوئی کہ جو کسی نے کہہ دیا بس ہو گیا چاہے حق ہو چاہے ناحق تو کیا معاذ اللہ خدا کے دربار میں اندھیر کھاتہ ہے کہ کچھ قاعدہ ہی مقرر نہیں کہ کس دعا کو قبول کرنا چاہیئے کس دعا کو قبول نہ کرنا چاہیئے بس جس کی دعا چاہی منظور کرلی خواہ وہ کیسی ہی بے رحمی کی دعا ہو اور جس کی چاہے رد کردی خواہ وہ اچھی ہی ہو کیا نعوذ باللہ خدا کا دربار اُس آنریری مجسٹریٹ کے دربار جیسا ہو گا جس کو بوجہ ریاست کے آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا تھا مگر لیاقت خاک نہ تھی جب آپ کے پاس مقدمات آنے شروع ہوئے تو بڑی فکر ہوئی کہ کیا کروں مقدمات کس طرح فیصل کروں تو آپ ایک دوسرے آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے کہ دیکھوں وہ کس طرح مقدمات فیصل کرتا ہے تو اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک مقدمہ کی مسل آئی اس کے بارہ میں انھوں نے پڑھ کر کہا کہ منظور پھر ایک دوسری مسل آئی اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا کہ نامنظور۔ یہ اناڑی مجسٹریٹ بہت خوش ہوئے کہ بس ہم کو فیصلہ کرنا آگیا۔

اب آپ عدالت کرنے بیٹھے مقدمات کی مسلیں پیش ہوئیں بس جو اول ہاتھ میں آ گئی اسے کہدیا منجور جو اس کے بعد ہاتھ میں آگئی وہ نامنجور (نامنظور) بس اب کیا تھا دو منٹ میں مقدمات طے ہونے لگے منجور نامنجور دو لفظوں میں قصہ پاک ہوا۔ نہ مسل کا پڑھنا نہ سننا نہ یہ خبر کہ یہ قابل منظوری کے ہے یا نہیں۔ بس طاق سلسلہ میں آجانا چاہیئے وہ منظور ہو گئی کوئی جو جفت عدد کے سلسلہ میں پڑ گئی وہ نامنظور ہو گئی۔ تو کیا معاذ اللہ خدا کے دربار کو بھی ایسا ہی سمجھ رکھا ہے کہ وہاں بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ درخواست قابل منظوری کے ہے یا نہیں فقط منظور و نامنظور سے فیصلہ کیا جاتا ہے استغفر اللہ العظیم خدا کی کیا عظمت ہے اور اگر یہ احتمال نہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی بددعا بے رحمی کی وجہ سے ہرگز نہ تھی ورنہ حق تعالیٰ شانہ اس کو ہرگز قبول نہ فرماتے کیا حق تعالیٰ کے ذمہ رسول کی ہر بات ماننا ضروری ہے۔ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے انبیاء علیہم السلام کی دعا کو قبول نہیں فرمایا تو اگر نوح علیہ السّلام کی بددعا قابل قبول نہ ہوتی تو حق تعالیٰ اس کو بھی رد فرما دیتے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السّلام کی قوم اسی قابل تھی کہ ان کو بالکل تباہ کر دیا جائے وہ ہرگز قابل رحم نہ تھی یہاں تک کہ تنگ آکر نوح علیہ السلام نے اُن پر بددعا کی۔ ساڑھے نو سو برس تک تو ان کو سمجھایا نصیحت کی مگر وہ ہمیشہ ان پر سختیاں ہی کرتے رہے یہاں تک کہ اکثر وعظ و نصیحت کے وقت ان کو اس قدر تکلیف پہونچاتے تھے کہ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے جب نو سو برس تک ان کی یہی حالت رہی تب اُن کے حق میں بددعا کی اس قدر ایذا شاید ہی کسی نبی کو اپنی قوم سے پہونچی ہو پھر حق تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ اب یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے، ان کے بارے میں ہم سے بات نہ کیجئے نہ ان کے افعال سے رنج کیجئے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ رحم کے قابل ہی نہ تھے مگر ایک نئے مجتہد صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں لکھتے ہیں کہ نوح علیہ السّلام میں ترحم زیادہ نہ تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل بیان ہو رہے ہیں کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی اہانت کی جا رہی ہے اور پھر آپ کی بھی اگر تعظیم کی تو بحیثیت بادشاہ ہونے کے۔

غرض اس اس طرح لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی کر رہے ہیں کہ کوئی صرف اطاعت کو ضروری سمجھتا ہے محبت وعظمت سے ان کو تعلق نہیں کوئی محبت کا دم بھرتا ہے اطاعت وعظمت سے اس کو واسطہ نہیں کوئی آپ کی عظمت کرتا ہے تو اس طرح کہ محض بادشاہت کی حیثیت سے اور یا اس طرح کہ جس سے دیگر انبیاء کی توہین ہو جاتی ہو بلکہ بعض مرتبہ حق تعالے شانہٗ کی بے ادبی ہو جاتی ہے اس لئے اس کی تلافی کی ضرورت ہے اور تلافی ہوتی ہے کوتاہیوں کا سبب دریافت ہونے سے اور سبب ان سب کوتاہیوں کا یہ ہے کہ لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محض ضابطہ کا تعلق ہے۔ کوئی خصوصیت کا تعلق نہیں حالانکہ نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تعلق بھی ہونا چاہیئے اور خاص تعلق پیدا ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل وکمالات بیان کئے جائیں۔

دوسرے یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ انعامات واحسانات بیان کئے جائیں جو ہمارے حال پر آپ نے فرمائے ہیں تو یہ دو امر ضروری ہوئے پھر ان میں بھی باہم ایک تفاوت ہے وہ یہ کہ فضائل وکمالات سن کر خاص تعلق بہت کم لوگوں کو پیدا ہوتے ہیں اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ۔ انسان احسان کا غلام ہے جب کسی کے احسانات اپنے اوپر بہت دیکھتے ہیں اکثر خاص تعلق اُس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ جو خاص اہل معرفت ہیں اُن کا تو مذاق یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو کوئی بھی نفع نہ پہونچے جب بھی وہ جان ومال سے آپ پر فدا ہیں جیسا عارف شیرازی محب للنفس کا مذاق بقار محبت کے باب میں فرماتے ہیں ؎

ہر چند آزمودم از وے نبود سودم

مَنْ جَرَّبَ الْمُجَرَّبَ حَلَّتْ بِهِ النَّدَامَه

(میں نے ہر چند آزمایا مجھ کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا جو شخص تجربہ کار کا تجربہ کرتا ہے اس کو ندامت اٹھانی پڑتی ہے)

تو محب اللہ کا تو کیا پوچھنا اُن کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ان کو وحی قطعی سے بھی معلوم ہو جاوے کہ ہماری قسمت میں ابدالآباد کے لئے جہنم میں رہنا مقدر ہے تب بھی ان کی محبت میں ذرا کمی نہ ہوگی نفع نہ ہونے کی صورت میں جمیع عاشقین یہی کرتے ہیں کہ محبوب کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم کرتے ہیں اور اپنی محرومی پر بھی دل خوش رہتے ہیں ؎

میلِ من سوئے وصال و میلِ او سوئے فراق

ترک کامِ خود گرفتم تا برآید کامِ دوست

(میرا میلان وصل کی طرف ہے اور محبوب کا خیال فراق کی طرف میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تاکہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے)

مگر یہ خاص ہی عاشقین کا مذاق ہے سب کا یہ مذاق نہیں ہوتا۔ اسی لئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں عاشق ذاتی یا صفاتی نہیں (کیونکہ عاشق کی تین قسمیں ہیں ایک عاشق ذاتی، ایک عاشق صفاتی، ایک عاشق احسانی۔ عاشق ذاتی تو محض محبوب کی ذات ہی کو محبت کے قابل سمجھتا ہے چاہے اس میں کوئی بھی کمال نہ ہو۔ اور عاشق صفاتی محبوب سے بوجہ اس کے کمالات کے محبت کرتا ہے۔ اور عاشق احسانی وہ ہے جو بوجہ محبوب کے احسانات کے اُس سے محبت کرتا ہے) تو فرمایا کہ بھائی ہم لوگ عاشق احسانی ہیں جب تک راحت سے گذرتی رہے تو محبت قائم رہتی ہے اور اگر ذرا ادھر سے عطا میں کمی ہو جائے تو ہماری محبت کمزور ہو جاتی ہے۔ اسی لئے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ترک لذات امر نہ فرماتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ خوب کھاؤ پیو اور کام بھی خوب کرو۔ اس کا راز یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگوں میں قوت تھی اس لئے راحت و تکلیف دونوں حالت میں ان کو حق تعالےٰ سے تعلق یکساں رہتا تھا اور اب ضعف ہے اگر مزیدار نعمتیں ملتی رہیں تب تو حق تعالےٰ سے محبت بڑھتی رہتی ہے اور نہیں تو مشقت و تکلیف میں وہ حالت نہیں رہتی اور فرمایا کہ یہی راز ہے کہ شریعت نے حج کے واسطے زاد دراحلہ کی شرط لگائی کیونکہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں جب راحت کے ساتھ حج کریں گے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی اور اگر زاد دراحلہ

نہ ہوا اور سفر میں کلفت درپیش ہوئی تو بجائے محبت کے اور دل میں رکاوٹ پیدا ہو گی مگر یہ زاد و راحلہ کی قید اُن ہی ضعفاء کے لئے ہے جو کہ عاشق احسانی ہیں ورنہ اقویاء کی بابت تو خود نص میں ذکر ہے وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّأْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ہ حق تعالیٰ شانہٗ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا تھا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کردو لوگ آپ کے پاس پیدل اور دُبلی اونٹنیوں پر سوار ہو کر آویں گے معلوم ہوا کہ بعض لوگ پیدل بھی آویں گے جن کے پاس زاد و راحلہ نہ ہوگا اور ان کو پیدل جانے میں گناہ بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ اس مقام پر اُن آنے والوں کی مدح فرمارہے ہیں تو معلوم ہوا کہ پیدل آنے والے بھی حق تعالیٰ کے یہاں ممدوح ہوں گے تو یہ لوگ ضعفاء نہیں ہیں یہ لوگ اقویاء ہیں جن کے واسطے زاد و راحلہ کی کوئی قید نہیں اُن کو اس سفر کی کسی کلفت سے پریشانی نہیں ہوتی۔

ایک ایسے ہی عاشق کا قصہ یاد آگیا کہ وہ حج کے لئے چلے مگر بالکل آزاد تھے کہ وضع داری رسمی سے بھی آزاد کبھی گاتے کبھی دف بجاتے لوگ اُن کو مسخرہ سمجھتے تھے کسی کو بھی نہ معلوم تھا کہ یہ کوئی عاشق ہے جب مکہ پہنچے اور بیت اللہ کا طواف کرنے چلے تو دروازہ کے باہر ہی سے خانہ کعبہ نظر آیا مطوف نے کہا کہ یہ کعبہ ہے بس بیقرار ہو گئے اور بے ساختہ زبان پر جاری ہو گیا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جانِ مضطر
کہ مبادا بارِ دیگر نرسی بدیں تمنا

(در محبوب پر جب پہنچ جاؤ تو اپنی جان کو اس پر فدا کردو شاید پھر تمنائے دلی پورا کرنے کا موقع نہ ملے)

اور فوراً بیہوش ہو کر گر پڑے اور جاں بحق ہو گئے تو بھلا جو ایسے عاشق ہوں کہ وصال کی تاب بھی نہ لاسکیں سفر کی مشقت سے ان کی محبت میں کمی ہو سکتی ہے ان کی تو اگر بوٹی بوٹی بھی کردی جاوے تب بھی محبت میں زیادتی ہی ہوتی رہے مگر ہم لوگ زیادہ تر چونکہ عاشق احسانی ہیں اس لئے شریعت نے زاد و راحلہ کی شرط پر حج کو واجب کیا ہے۔ گو بعض وقت

ہم لوگوں کو بھی شبہ ہوجاتا ہے کہ ہم بھی عاشق ذاتی ہیں مگر بات یہ ہے کہ اس وقت احسانات خداوندی ذہن میں حاضر نہیں ہوتے اور محبت دل میں پاتے ہیں اس لئے یوں سمجھ جاتے ہیں کہ ہم عاشق ذات ہیں ورنہ واقع میں وہ محبت مسبب ان احسانات ہی سے ہوتی ہے البتہ عشق ذات جب ہوتا کہ اگر سچ مچ بھی تمام احسانات وانعامات بند ہوجاتے حتیٰ کہ باطن میں کچھ نور محسوس ہو نہ ظاہر میں کوئی راحت ہو تب بھی محبوب کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم کرکے اُس حال میں بھی محبت میں کمی نہ آنے دے اور زبان حال وقال سے یوں کہتا رہے ؎

روزہا گر رفت گورو باک نیست

تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیئے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے)

الغرض ہم لوگ چونکہ عاشق احسانی ہیں اس لئے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تعلق آپ کے وہ احسانات سن کر پیدا ہونے کی زیادہ توقع ہے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے اوپر فرمائے ہیں پس اس لئے ایک وجہ تو یہ ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات بیان کرنے کی جن کا ذکر اس آیت کے اخیر میں ہے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (ایمان داروں کے ساتھ بڑے شفیق اور مہربان ہیں) اور اس وقت اسی جزو کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے۔ دوسری وجہ اس کے اختیار کرنے کی ایک یہ بھی ہوئی کہ فضائل تو اکثر لوگ بیان کر دیتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا ذکر لوگ بہت کم کرتے ہیں تو یہ مضمون نیا مضمون ہوگا۔ نیز اس بیان کا جو اصل محرک ہے وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس بندہ پر ایک خاص عنایت اور انعام ہی ہے جس کا ذکر اجمالاً اوپر بھی آیا ہے اس لئے یہی جی چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات بیان کروں اسی واسطے اس وعظ کا نام (شُكْرُ النِّعْمَۃِ بِذِكْرِ رَحْمَۃِ الرَّحْمَۃِ) رکھتا ہوں جس کے یہ

عہ اور بندہ جامع وعظ نے اُسی جگہ حاشیہ میں اس مجمل کو مفصل بھی کر دیا ہے ۱۲ منہ

معنی ہیں کہ شکر ایک نعمت کا رحمت مجسم کی صفت رحمت کے ذکر کے ذریعہ سے پس، لفظ رحمت اول سے مراد معنی لغوی اور دوسری سے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ کا ایک نام مقدس رحمت بھی ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نسبت خود ارشاد فرمایا ہے اَنَا رَحْمَۃٌ مُّھْدَاۃٌ کہ میں ایک رحمت ہوں خدا تعالیٰ کی طرف سے بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے آپ کو رحمت فرمایا۔ دوسرے قرآن شریف میں حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہ ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ غرض حدیث و قرآن دونوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس مقام پر ایک شبہ بھی ہو سکتا ہے وہ یہ کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (ہم نے تمام جہان والوں پر آپ کو رحمت بنا کر بھیجا ہے) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام عالم کے لئے رحمت ہونا معلوم ہوتا ہے اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (مسلمانوں پر بڑے شفیق اور مہربان ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں پر رحمت فرماتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ میں رحمت خاص مراد ہے کہ وہ مسلمانوں کے سوا کسی پر نہیں اور وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ میں رحمت عامہ مراد ہے رحمت عامہ کفار کو بھی شامل ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام رحمت ایک تو یہ ہے کہ تمام عالم کا وجود آپ کی برکت سے ہوا کہ آپ کے نور کی شعاعوں کی برکت سے تمام عالم کا مادہ بنا۔ دوسری رحمت عامہ یہ ہے کہ یوم میثاق میں تمام جہان کو توحید کی تعلیم فرمائی۔ اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ جس وقت حق تعالیٰ نے تمام مخلوق کو پشت آدم علیہ السلام سے ظاہر فرما کر اُن سے یہ ارشاد فرمایا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) تو سب کے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی طرف تکنے لگے کہ آپ کیا جواب دیتے ہیں تو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بَلٰی ہاں (بیشک ہمارے رب ہیں) فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب نے بَلٰی کہا۔ تیسرے یہ کہ حضرت نوح علیہ السّلام کی کشتی نے آپ ہی برکت سے نجات

پائی یہ بھی تمام عالمین پر رحمت ہے۔ کیونکہ نوح علیہ السلام آدمِ ثانی ہیں کہ ان کے بعد سلسلہ بنی آدم انہیں کی اولاد سے جاری ہوا اس وقت جس قدر انسان ہیں وہ سب ان کے تین بیٹوں ہی کی نسل سے ہیں چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ کہ ہم نے نوح علیہ السلام ہی کی اولاد کو دنیا میں باقی رکھا رباقی سب کو ہلاک کر دیا!)

تو اُس وقت تمام عالم گویا اپنے آباء کی پشت میں تھا اور اس کشتی کو نجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہوئی تو یہ احسان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام عالم پر ہے کہ آپ ہی کی برکت سے سب فنا سے محفوظ رہے۔ حیوانات موجودہ بھی اُن ہی حیوانات کی نسل سے ہیں جو کشتی میں تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو نار سے نجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے ہوئی یہ بھی تمام عالم پر رحمت تھی کیونکہ انبیاء علیہم السّلام بکثرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہوئے اور اس وقت ان کی اولاد بھی بہت کثرت سے موجود ہے تو وہ ایک بڑے حصہ عالم کے یا پدر نسبی ہیں یا پدر روحانی تو اس طرح یہ فیض بھی ایک عالم کو پہنچا ان دونوں واقعات کو مع دیگر برکات کے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چند اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا تھا وہ اشعار اس وقت مجھے یاد نہیں ہیں "نشر الطیب" میں لکھے ہیں (جامع وعظ احقر ظفر عرض کرتا ہے کہ اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ اُن اشعار کو مع ترجمہ حضرت حکیم الامۃ نقل کردوں تاکہ ناظرین کے لئے زیادہ موجب لذت ہو)

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے مدینہ منورہ میں واپس تشریف لائے تو حضرت عباس بن عبدالمطلب نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیجئے کہ کچھ آپ کی مدح کروں (چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح خود طاعت ہے اس لئے) آپ نے ارشاد فرمایا کہ کہو اللہ تعالیٰ تمہارے مُنہ کو سالم رکھے اُنھوں نے یہ اشعار آپ کے سامنے پڑھے ؎

مِنْ قَبْلِهَا طِبْتَ فِي الظِّلَالِ وَفِي
مُسْتَوْدَعٍ حَيْثُ يُخْصَفُ الْوَرَقُ

ثُمَّ هَبَطْتَ الْبِلَادَ لَا بَشَرٌ
أَنْتَ وَلَا مُضْغَةٌ وَّلَا عَلَقُ

بَلْ نُطْفَةٌ تَرْكَبُ السَّفِيْنَ وَقَدْ
أَلْجَمَ نَسْرًا وَّ أَهْلَهَا الْغَرَقُ

تَنْقُلُ مِنْ صَالِبٍ إِلَى رَحِمٍ
إِذَا مَضٰى عَالَمٌ بَدَا طَبَقُ

وَرَدْتَ نَارَ الْخَلِيْلِ مُكْتَتِمًا
فِيْ صُلْبِهِ أَنْتَ كَيْفَ يَحْتَرِقُ

حَتّٰى احْتَوٰى بَيْتُكَ الْمُهَيْمِنُ مِنْ
خِنْدَفٍ عَلْيَاءَ تَحْتَهَا النُّطُقُ

وَأَنْتَ لَمَّا وُلِدْتَ أَشْرَقَتِ
الْأَرْضُ وَضَاءَتْ بِنُوْرِكَ الْأُفُقُ

فَنَحْنُ فِيْ ذٰلِكَ الضِّيَاءِ وَفِي النُّوْرِ سُبُلَ الرَّشَادِ نَخْتَرِقُ

ترجمہ: زمین پر آنے سے پہلے آپ جنت کے سایہ میں خوش حالی (اور راحت) میں تھے اور نیز (اُس) ودیعت گاہ میں تھے جہاں (جنت کے درختوں کے) پتے اوپر تلے جوڑے جاتے تھے (یعنی آپ صلب آدم علیہ السلام میں تھے سو زمین میں آنے سے پہلے جب آدم علیہ السلام جنت کے سایوں میں تھے آپ بھی تھے اور پتوں کا جوڑنا اشارہ ہے اس قصہ کی طرف کہ جب آدم علیہ السلام نے اس منع کئے ہوئے درخت سے کھا لیا اور جنت کا لباس اتر گیا تو درختوں کے پتے ملا ملا کر بدن ڈھانکتے تھے یعنی اس وقت بھی آپ اُن کی پشت میں تھے (اور آپ ہی کی برکت سے آدم علیہ السلام کی یہ خطا معاف ہوگئی اور حق تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی) اس کے بعد آپ نے بلاد (زمین) کی طرف نزول فرمایا اُس وقت آپ نہ بشر تھے نہ مضغہ نہ علقہ (کیونکہ یہ حالتیں پیدائش کے بہت قریب ہوا کرتی ہیں اور اس وقت آپ کی پیدائش قریب کہاں تھی اور یہ زمین کی طرف نزول فرمانا بواسطہ آدم علیہ السلام کے ہوا کہ جب وہ زمین پر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے ساتھ زمین پر نزول فرمایا مگر اس وقت آپ نہ بشر تھے اور نہ مضغہ نہ علقہ) بلکہ (پشت آبار میں محض ایک مادۂ مائیہ بصورت نطفہ تھے اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس طرح بصورت نطفہ تو تمام انبیاء بلکہ تمام عالم آدم علیہ السلام کی پشت میں تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں کونسی فضیلت ثابت ہوئی جواب

یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود دوسروں کے وجود سے ممتاز تھا کہ دوسرے تو محض بصورت نطفہ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کی پشت میں بصورت نطفہ تشریف فرما ہوتے تھے اس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو بھی کچھ تعلق ہوتا تھا کہ اس تعلق روحی کی برکتیں آپ کے اُن اجداد میں ظاہر ہوتی تھیں۔ چنانچہ حضرت عباسؓ نے اگلے شعر میں ابراہیم علیہ السلام کے سوزش نار سے بچ جانے کی نسبت یہ بات فرمائی ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پشت میں تھے وہ کیونکر جل سکتے تھے تو یہ برکتیں اُس تعلق روح ہی کی وجہ سے تو ظاہر ہوئیں) کبھی وہ مادہ کشتی نوح میں سوار تھا اور حالت یہ تھی کہ نسر بُت اور اس کے ماننے والوں کے لبوں تک طوفان غرق پہونچ رہا تھا مطلب یہ کہ بواسطہ نوح علیہ السلام کے وہ مادہ راکب کشتی تھا مولانا جامیؒ نے اسی مضمون کی طرف اشارہ فرمایا ہے

زجودش گر نگشتے راہ مفتوح ؎

بجودی کے رسیدے کشتیٔ نوح

یعنی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا سے راہ کشادہ نہ ہوتا تو سلامتی کے ساتھ کوہ جودی پر نوح علیہ السلام کی کشتی کس طرح پہونچتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے وہ کشتی پار ہوگئی اور وہ مادہ (اسی طرح واسطہ در واسطہ ایک صلب سے دوسرے رحم تک منتقل ہوتا رہا جب ایک طرح کا عالم گذر جاتا تھا دوسرا طبقہ شروع ہو جاتا تھا یہاں تک اسی سلسلہ میں آپ نے نار خلیل علیہ السلام میں ورود فرمایا چونکہ آپ اُن کی پشت میں مختفی تھے تو وہ کیسے جل سکتے تھے (پھر آگے اسی طرح آپ منتقل ہوتے رہے) یہاں تک کہ آپ کا خاندانی شرف جو کہ (آپ کی فضیلت پر) شاہد ظاہر ہے اولاد خندف میں سے ایک بلند چوٹی پر جاگزیں ہوا جس کے تحت کے اور حلقے (یعنی دوسرے خاندان مثل درمیانی حلقوں کے) تھے (خندف لقب ہے آپ کے جدّ بعید مدرکہ بن الیاس کی والدہ) اور آپ جب پیدا ہوئے تو زمین روشن ہوگئی اور آپ کے نور سے آفاق منور ہوگئے سو ہم اس ضیاء اور نور میں ہدایت کے رستوں کو قطع کر رہے ہیں (چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعار پر سکوت فرمایا اس لئے حدیث تقریری سے ان مضامین کا صحیح اور رحمت ہونا ثابت

ہوگیا) اِنْتَهٰی تَرْجُمَتُہٗ مَعَ بَعْضِ حَذْفٍ وَّزِیَادَۃٍ دَوْمًا لِلْاِخْتِصَارِ وَالْاِیْضَاحِ ۱۲ (پورا ہوگیا اس کا ترجمہ مع بعض حذف کرنے اور زیادہ کرنے کے ساتھ ایضاح اور اختصار کا قصد کرکے)۔

ایک رحمۃ عامہ حضور صلی اللہ کی یہ ہے کہ اس امت کے اوپر سے وہ سخت سخت عذاب ٹل گئے جو پہلی امتوں پر آئے تھے کہ بعض قومیں سور بندر بنادی گئیں کسی کا تختہ اُلٹ گیا کسی پر آسمان سے پتھر برسے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے کہ اس امت کے کفار پر ایسے عذاب نہیں آتے۔ اور اس رحمت کو عام اس لئے کہا گیا کہ کفار کو بھی شامل ہے جو کہ امت اجابت میں داخل ہیں ایک رحمت عامہ یہ ہے کہ آپ کی امت میں سے جو کوئی ایک نیک کام کرے اس کا ثواب کم از کم دس گنا ضرور ملے گا۔ اور اگر زیادہ خلوص ہو تو سات سو تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب ملتا ہے اس کا عام ہونا اس اعتبار سے ہے کہ حدیث اَسْلَمْتَ اَسْلَفْتَ مِنْ خَیْرٍ (اسلام لایا تو اپنی گذشتہ نیکوں کے ساتھ) سے ثابت ہے کہ کافر جب مسلمان ہوجاتا ہے تو اس کی گذشتہ نیکیاں بھی اس کو ملتی ہیں تو ان نیکیوں میں یہ مضاعف ہوگا تو اس طرح یہ رحمت بھی کفار کو شامل ہوئی ایک عام رحمت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس امت کے اوپر وہ سخت سخت احکام نازل نہیں فرمائے جو پہلی امتوں پر تھے مثلاً بعض معاصی سے توبہ کا طریقہ یہ تھا کہ مجرم اپنی جان دیدے اس کے بدون توبہ قبول نہیں ہوتی ناپاکی کپڑے میں لگ جائے تو کپڑا کاٹ دینے کا حکم تھا۔ اس شریعت میں نہ احکام نہ بہت سخت ہیں کہ عمل دشوار ہو نہ ایسے آسان کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے۔

اب یہاں یہ ایک سوال ہوسکتا ہے کہ دنیا میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے حق میں رحمت عامہ ہونا ثابت ہوگیا مگر آخرت میں کفار کے لئے آپ کی رحمت کیا ہوگی کیونکہ کفار تو ابدالآباد کے لئے جہنم میں رہیں گے ان کے حق میں آپ کی رحمت کا ظہور کس طرح ہوگا اسی طرح جن مومنین کی بعد سزا کے مغفرت ہوگی ان کے حق میں آپ کی رحمت کیا ظاہر ہوئی۔

اس کے جواب کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اس کے سمجھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ظہور کفار کے حق میں آخرت میں بھی ہوگا وہ مقدمہ یہ ہے کہ بھلا اگر کوئی شخص بڑا سخت جرم کرے جس کی سزا ایں وہ بیس سال کی سزائے قید کا مستحق ہو تو اگر حاکم اس میں سے دس سال کم کر دے تو یہ رحمت ہوگی یا نہیں اسی طرح اگر کوئی شخص بہت سخت سزا کا مستحق ہوا اور اس میں سے کچھ تخفیف کر دی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں رحمت میں داخل ہیں

اب سمجھئے کہ قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن گنہگار مسلمانوں کے لئے جو کہ جہنم میں جائیں گے سفارش فرمائیں گے اگر یہ شفاعت نہ ہوتی تو اُن کی میعاد اور زیادہ ہوتی تو میعاد کی کمی یہ رحمت ہوئی کوئی ہزار برس کے عذاب کا مستحق تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے اس میں کمی کر دی جائے مثلاً پانچسو برس کے بعد وہ جہنم سے نکال دیا جائے تو رحمت ہونا اس کا ظاہر ہے اور کفار کے حق میں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میعاد میں کمی کر دی جائے عذاب تو ان کو ابدالآباد تک ہوگا مگر بقول شیخ عبد الحق محدثؒ جو عنقریب آتا ہے عذاب میں تخفیف کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی شفاعت فرمائیں گے چنانچہ بعض کفار کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تخفیف عذاب کا ذکر تو صحاح میں بھی آتا ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کو کچھ آپ کی خدمت سے نفع بھی ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں نہ ہوتا تو ابو طالب سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوتے مگر میری وجہ سے یہ ہوا کہ ان کو صرف دو جوتیاں آگ کی پہنائی جائیں گی جس سے ان کا بھیجا مثل ہانڈی کے پکنے لگا اور اس پر بھی وہ سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں۔ ابولہب کے بارہ میں حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کی خوشی میں بشارت لانے والی باندی کو آزاد کر دیا تھا ہر پیر کے دن ذرا سا ٹھنڈا پانی پینے کو

مل جاتا ہے باقی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت مجھے کسی حدیث سے تو نہیں معلوم ہوئی مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک کتاب اشعۃ اللمعات میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دس طرح کی ہوگی اُن میں ایک شفاعت یہ بھی ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عام کفار کے لئے شفاعت فرمائیں گے کہ یہ لوگ جس سخت عذاب کے مستحق ہیں اس میں کچھ کمی کر دی جائے۔ چنانچہ آپ کی برکت سے اُن کے عذاب میں کمی کر دی جائے گی گو کم ہونے کے بعد بھی وہ اس قدر سخت ہوگا کہ وہ اس کو بھی بہت سمجھیں گے خدا محفوظ رکھے وہاں کا تو ذرا سا عذاب بھی ایسا ہوگا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ کسی کو عذاب نہیں۔

چنانچہ ابو طالب کو حالانکہ بہت ہی کم عذاب ہوگا مگر وہ یہی سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی عذاب نہیں تو گو کفار کو اس کمی کا احساس نہ ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تو رحمت ہونے میں شک نہیں رہا۔ آپ کی رحمت تو ان کے ساتھ بھی پائی گئی اور چونکہ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث ہیں اس لئے انھوں نے جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں کسی حدیث ہی سے معلوم کر کے لکھی ہوں گی گو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت وسیع ہے اس لئے انکا یہ قول قابل تسلیم ہے اور ایک ضروری بات استطراداً یاد آ گئی کہ جیسا کفار کو عذاب کی کمی کا احساس نہ ہوگا اسی طرح جنتیوں کو اپنے درجہ کی کمی کا احساس نہ ہوگا حالانکہ وہاں مدارج بہت مختلف ہوں گے کوئی اعلیٰ کوئی ادنیٰ مگر ہر شخص یہی سمجھے گا کہ میرے پاس جس قدر نعمتیں ہیں اتنی کسی کے پاس نہیں ہیں اور شیخ کے اس قول پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ یہ نص کے خلاف ہے قرآن میں تو کفار کے بارہ میں ارشاد ہے لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ○ (نہ ہلکا کیا جاوے گا ان سے عذاب اور وہ نہ ڈھیل دئے جائیں گے) کہ کفار سے عذاب کم نہ کیا جائے گا۔ اور شیخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی تخفیف عذاب کی شفاعت

فرمائیں گے دونوں میں تعارض ہوگیا بات یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب آخر میں ان کے لئے طے ہو جائے گا پھر اس سے کمی نہ کی جائے گی اور یہ اس لئے ارشاد فرمایا گیا تاکہ کوئی آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر قیاس نہ کرے کہ جس طرح دنیا کی آگ کا قاعدہ ہے کہ پہلے پہل بہت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہے پھر کم ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہوجاتی ہے ایسی ہی جہنم کی آگ بھی ہوگی کہ رفتہ رفتہ ہزار دو ہزار سال کے بعد اس کی تیزی کم ہوجائے گی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں کی آگ ایسی نہیں جیسی اول دن تیز ہوگی ہمیشہ ویسی ہی رہے گی۔ اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عذاب کے وہ قانوناً مستحق ہوں گے اس میں کسی کی شفاعت سے بھی کمی نہ ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب ان کے لئے طے ہوکر قرار پا جائے گا وہ ہمیشہ ایک حال پر رہے گا۔ زمانہ دراز گذر جانے سے اس میں کمی واقع نہ ہوگی واللہ اعلم تو نفی اس تخفیف کی ہے اور اگر کوئی اس تخفیف کی نفی پر یہ شبہ کرے کہ زمانہ دراز گذر جانے کے بعد اگرچہ عذاب کم نہ ہوگا مگر ان کا بدن تو سُن ہوجائیگا تو ان کو عذاب محسوس نہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ بدن جب ایک کیفیت کا عادی ہوجاتا ہے تو پھر اس کا احساس نہیں ہوتا جیسا کہ آجکل بعض جنٹلمین انگریزوں کی تقلید سے سخت سردی میں بھی ننگے سر رہتے ہیں مجھے بڑی حسرت تھی کہ یہ لوگ ننگے سر کس طرح رہتے ہیں ان کو تکلیف نہیں معلوم ہوتی تحقیق سے معلوم ہوا کہ پہلے پہل تو تکلیف ہوتی ہے پھر بدن سن ہوجاتا ہے سردی کا احساس ہی نہیں ہوتا تب سمجھ میں آیا کہ واقعی یہی ہوگا۔

اس انگریزی تقلید پر بطور جملہ معترضہ کے ایک مضمون ذہن میں آگیا کہ گو یہ لوگ قصد کرتے ہیں تقلید کا مگر تقلید بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ دونوں کے فعل کی وجہ الگ الگ ہیں چنانچہ انگریز لوگ ننگے سر رہنے کو شوقیہ اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ سخت سرد ملک کے رہنے والے ہیں ان کو ہندوستان کی سردی زیادہ نہیں ستاتی علاوہ ازیں وہ لوگ غذائیں بہت گرم کھاتے رہتے ہیں اس لئے

وہ اگر ننگے سر رہیں تو کچھ تعجب نہیں۔ مگر جو لوگ ہندوستان کے رہنے والے ہیں اُنکے لئے تو یہاں کی سردی بھی بہت کچھ ہے وہ خواہ مخواہ ان کی نقل کرتے ہیں۔

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ ان کے ساتھ ریل میں ایک جنٹلمین سوار تھے جو بوجہ کم وسعتی کے گردن کا کوٹ پتلون پہلے ہوئے اور ساتھ میں نہ رضائی نہ چادر اور سردی کا سخت موسم ایک اسٹیشن پر کسی انگریز نے برف منگا کر پیا جنٹلمین صاحب کو بھی تقلید سوجھی آپ نے بھی برف والے سے برف خرید کر پیا۔ انگریز لوگ تو چونکہ گرم غذاؤں کے عادی ہیں ان کو تو سردی کے موسم میں برف پینے سے تکلیف نہیں ہوتی اور وہ لوگ شراب بھی پیتے ہیں مگر جنٹلمین صاحب کی تو برف پی کر یہ حالت ہوئی کہ سر سے پیر تک لگے تھر تھر کانپنے وہ شخص بیان کرتے تھے کہ جب وہ بہت ہی کانپنے لگے تو میں نے اپنی رضائی اُن کو اڑھائی جب ذرا ان کی کانپنی بند ہوئی اس وقت ان کو معلوم ہوا ہوگا کہ رضائی کمبل وغیرہ ساتھ لینے میں یہ راحت ہے۔

اسی طرح گرمی کے زمانہ میں یہ لوگ لوٹہ وغیرہ تک ساتھ رکھنے کو بد تہذیبی سمجھتے ہیں ایک بزرگ جو کہ کالج بھاولپور میں پروفیسر ہیں بیان فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ گرمی کے زمانہ میں میرا بھاولپور سے سفر ہوا، میرے ساتھ ٹھنڈے پانی کی صراحی وغیرہ بھی تھی کیونکہ سفر لمبا تھا راستہ میں پانی کہیں ملتا ہے کہیں نہیں ملتا اُسی گاڑی میں ایک جنٹلمین بھی سوار تھے صراحی وغیرہ کو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن لیا ہے، میں نے کچھ جواب نہ دیا اور ایک تختہ پر لیٹ رہا وہ صاحب بھی ایک اوپر کے تختہ پر لیٹ گئے اب ان کو پیاس لگی اور شدت کی لگی، تھوڑی دیر صبر کیا آخر بے تاب ہو کر صراحی کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے جب دیکھا کہ ان کا پیاس سے برا حال ہے اور صراحی پر ان کی نیت ہے مگر عار کے مارے مانگتے نہیں تو میں قصداً لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ سمجھیں کہ یہ سو گیا ہے اور پانی پی لیں۔ چنانچہ جب ان کا خیال یہ ہوا کہ میں سو گیا ہوں تو وہ صاحب تختہ پر سے اُتر دبے پاؤں صراحی کے پاس آئے مگر بار بار مجھے دیکھتے بھی جاتے تھے کہ یہ کہیں جاگ نہ گیا ہو آخر کو صراحی منہ سے

لگائی جب خوب پانی پی چکے اور اٹھنے لگے میں نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن میں سے کیوں پانی پیا اے ہے اب نہ پوچھئے کہ اُن کا مارے ندامت کے کیا حال ہوا سیروں پانی ان کے اوپر پڑ گیا پھر میں نے خوب ہی ان کی خبر لی پھر ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ پروفیسر کالج بھاولپور رہیں تو بہت ہی معافی چاہی۔ مگر تعجب ہے کہ یہ لوگ سر کو تو کھلا رکھتے ہیں اور پیروں کی بہت حفاظت کرتے ہیں ہر وقت موزے چڑھے رہتے ہیں کسی وقت بھی نہیں اترتے خیر یہ لوگ پیر کی تعظیم کرتے ہیں اور ہم سر کی کہ عمامہ وغیرہ سے اس کی حفاظت کرتے ہیں ہم پیر کی اتنی تعظیم نہیں کرتے نہ اسکی حفاظت کرتے ہیں ہمکو تو موزے پہنکر اور زیادہ پریشانی ہوتی ہے اگر کبھی سخت سردی میں پہن بھی لیتے ہیں تو جہاں ذرا گرمی ہو گئی پھر بدون نکالے چین نہیں آتی اور سر کو بدون ڈھانکے ہم کو چین نہیں آتی یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ **اصل مضمون یہ تھا** کہ یہ بات معلوم ہو گئی کہ سردی یا گرمی کی جب عادت ہو جاتی ہے تو بدن سُن ہو جاتا ہے تو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگرچہ جہنم کا عذاب ہمیشہ ایک حال پر رہے مگر بدن سُن ہو جانے کے بعد جب اس کا احساس نہ ہو گا تو خود بخود عذاب میں کمی ہو جائے گی تو اس تخفیف کی نفی صحیح نہ ہوئی۔ اس کا جواب حق تعالیٰ شانہ نے قرآن میں خود ارشاد فرمایا ہے۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا۔ کہ جب ان کی ایک کھال گل جائے گی تو ہم ان کو دوسری کھال پہنا دیں گے۔ تاکہ اچھی طرح ہمیشہ عذاب کا احساس پورا ہوتا رہے تو اب یہ شبہ بھی زائل ہو گیا غرض بعد شفاعت جس قدر عذاب ان کے لئے طے ہو جائے گا اس میں تخفیف نہ ہو گی نہ ذاتاً نہ حساً۔

پس شیخ عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ (اُن سے عذاب کم نہ کیا جائے گا) کے مخالف نہیں۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لئے رحمت ہیں یہاں تک کہ کفار کے لئے بھی رحمت ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اب تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمناں نظر داری

(دوستوں کو کب محروم کروگے جبکہ دشمنوں پر آپ کی نظر عنایت ہے)

اور یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

نماند بعصیاں کسے درگرو　　که دارد چنیں سید پیشرو

(وہ شخص گناہوں کی وجہ سے جہنم میں نہ رہیگا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا پیشوا اور سردار رکھتا ہو)

اور ؎　　طُوْبیٰ لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اِنَّ لَنَا
مِنَ الْعِنَایَۃِ رُکْنًا غَیْرَ مُنْھَدِمِ

(مسلمانو! ہمارے لئے خوشخبری ہے کہ عنایت ربانی سے ایک ایسا مضبوط رکن جو منہدم ہونے والا نہیں ہے)

اس تمام تقریر سے رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ میں شبہ تعارض مرتفع ہوگیا پس رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ عامہ کا ذکر ہے اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ میں رحمت خاصہ کا جو مومنین کے ساتھ خاص ہے۔ جس کا ثمرہ ہے رضا حق و قرب حق و نجات ابدی کہ یہ صرف مسلمانوں کے لئے ہے کفار کو اس سے حصہ نہیں ملے گا۔ اے صاحبو اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آپ کو ہم ناکاروں سے کتنی محبت ہے تو اب تو طبعاً بھی آپؐ سے محبت کرنا لازم بلکہ آپ کے احسانات کا تو مقتضا یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آپ لوگوں سے محبت نہ ہوتی تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آپ کے ذمہ فرض تھی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو محسن ہیں سو محسن کے ذمہ محسن الیہ کی محبت ضرور نہیں ہوا کرتی لیکن محسن الیہ کے ذمہ محسن کی محبت بوجہ اس کے احسان کے ضروری ہوتی ہے۔ مگر با ایں ہمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے اس قدر محبت ہے کہ آپ لوگوں کو اُس قدر نہیں بلکہ ہماری محبت جسقدر بھی ہے یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی محبت کا پرتو ہے اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے محبت ہوئی پھر آپؐ کی کشش سے ہم کو آپ کے ساتھ محبت ہوئی چنانچہ مشہور مقولہ ہے ؎

عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود
(عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے)
اگر از جانب معشوق نباشد کششے ؛ طلب عاشق بیچارہ بجائے نہ رسد
(اگر معشوق کی جانب کچھ کشش نہ ہو تو بیچارہ کی طلب کمال کو نہیں پہونچ سکتی)

اور راز اس کا یہ ہے کہ محبت ہوتی ہے معرفت سے اور ہم کو آپ کی معرفت کامل نہیں اور آپ کو ہماری معرفت کامل ہے ہم نے تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ کمالات مجملاً سن لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو گئی مگر ان کمالات کی کنہ و حقیقت نہیں سمجھے ؎

وَكَيْفَ يُدْرِكُ فِي الدُّنْيَا حَقِيْقَتَهُ ۔۔۔ قَوْمٌ نِيَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ

یعنی وہ لوگ آپ کی کنہ حقیقت کیونکر سمجھ سکتے ہیں جو کہ خواب ہی میں زیارت سے مشرف ہونے کو تسلی کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات کی کنہ و حقیقت نہ سمجھنے کا راز یہ ہے کہ کمالات حقیقت میں وجدانی ہیں اور وجدانی ادراک وجدان ہی سے ہوتا ہے اور وجدان کا حصول موقوف ہے اتصاف بالوجدانی پر پس ادراک کمالات نبوت کا متصف بالنبوۃ ہی کو ہو سکتا ہے اور ہم میں نہیں۔ اس لئے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کاملہ حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ جن مقامات کو ہم نے دیکھا بھی نہیں ہم ان کی حقیقت کیونکر سمجھ سکتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری معرفت پوری طرح حاصل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری کنہ حقیقت معلوم ہے اس لئے جتنی محبت ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اور اس تقریر سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہو گئی ہو گی کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت غیر نبی کو نہیں ہو سکتی اس لئے ہم کو مقامات انبیاء علیہم السلام میں موازنہ کرنا بھی رائے سے جائز نہیں کیونکہ جب ہم کو مقامات انبیاء علیہم السلام کی معرفت نہیں تو ہم ان کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے تو ہم سے اس میں غلطی کا واقع ہونا بعید نہیں۔ شیخ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ امت میں بہت بڑے صاحب کشف ہیں اور کشف میں ان کا بڑا پایہ ہے مگر پھر بھی انھوں نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ مقامات انبیاء

علیہم السلام میں گفتگو کرنا نہ چاہیئے کیونکہ غیر نبی کو نبی کے مقامات کا علم نہیں ہو سکتا مثلاً آپ کا خوف و خشیت انبیا علیہم السلام کے خوف و خشیت کے ساتھ محض لفظی مناسبت رکھتا ہے باقی دونوں کی حقیقت یوں تعبید ہے وہ اور چیز ہے یہ اور چیز ہے۔ غرض جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہم کو کما حقہ حاصل نہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہماری معرفت پوری طرح ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی محبت ہمارے ساتھ زیادہ ہوئی یہ تو دلیل کلی سے اثبات تھا اس کے علاوہ واقعات بھی شاہد ہیں چنانچہ آپ دیکھ لیجیے اور بتلایئے آپ نے کتنی راتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں بیدار رہ کر گذاری ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی سفارش کے لئے ایک ایک آیت میں صبح کر دی چنانچہ آپ ایک مرتبہ رات کو تہجد میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (اگر آپ ان کو عذاب دیں آپ کے بندے ہیں اگر آپ ان کو بخشدیں تو آپ غالب اور حکمت والے ہیں) تو امت کو یاد کر کے بار بار اسی آیت کو دہراتے رہے یہاں تک صبح ہو گئی۔ اللہ اکبر امت کا کس قدر خیال تھا بتلایئے آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ کو یاد کر کے کتنے فاقے کئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر فقط آپ کی خاطر فاقہ سے گذار دی شاید کوئی یہ کہے کہ ہماری خاطر کیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روپیہ پیسہ ملتا ہی نہ ہو گا جو آپ لے فاقہ سے زندگی بسر کی میں کہتا ہوں کہ یہ بات غلط ہے کہ آپ کو ملتا نہ تھا حق تعالےٰ شانہ کے حکم سے ملائکہ نے حاضر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ فرمائیں تو آپ کے لئے پہاڑوں کو سونا بنا دیا جائے اور وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا کریں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول نہیں فرمایا اور حق تعالےٰ سے عرض کیا کہ الٰہی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھایا کروں تو آپ کا شکریہ ادا کروں دوسرے روز بھوکا رہوں تو صبر کروں تو یہ فاقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اختیار فرمایا یہ نہ تھا کہ آپ کو

دنیا نہ مل سکتی تھی اب رہی یہ بات کہ باوجود ملنے کے کیوں نہ لی سو اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ دنیا کی کثرت سے کچھ آپ کو باطنی ضرر پہنچتا۔ جس کی وجہ سے آپ نے فاقہ اختیار کیا۔ دنیا مردار آپ کے دل کو کیا مشغول کر سکتی تھی جب آپ کے غلامان غلام ایسے ہوئے ہیں کہ ان کے دل کو باوجود کثرت مال کے اس سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہوا نیز انبیاء علیہم السلام میں بعض نے سلطنت کی خواہش کی تھی تو کیا معاذ اللہ انھوں نے ایک مضر چیز کی درخواست کی تھی ہرگز نہیں انبیاء علیہم السلام کے دل میں دنیا کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہو سکتی تو پھر اگر آپ کے پاس مال و دولت بکثرت بھی جمع رہتا تب بھی آپ کو اس سے کچھ ضرر نہ تھا مگر پھر جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فاقہ کشی کو اختیار فرمایا تو اس کی کیا وجہ تھی صرف امت کا خیال کہ اگر میں ذرا بھی دنیا کی طرف ہاتھ بڑھاؤں گا تو میری امت اس کو بھی سنت سمجھے گی اور میری سنت سمجھ کر مال و دولت جمع کرنے کی طرف جھک جائے گی میرے واسطے تو اگرچہ مال و دولت مضر نہیں ہو سکتا مگر امت کو اس سے ضرر پہونچیگا تو محض ہماری خاطر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر فاقہ کی تکلیف برداشت کی حتی کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین برتن پیش کئے گئے ایک شہد کا ایک شراب کا ایک دودھ کا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دودھ کو اختیار فرمایا یہ بھی امت کے حال پر رحمت تھی حالانکہ اگر آپ شراب کو اختیار فرما لیتے تو چونکہ وہ دنیا کی شراب نہ تھی جنت کی شراب تھی حلال اور پاکیزہ تھی کچھ آپ کا ضرر نہ ہوتا۔ نہ آپکو گناہ ہوتا۔ اسی طرح اگر شہد کو لے لیتے مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم اگر ذرا بھی لذات کی طرف میلان فرماتے تو امت کو اس سے حصہ ملتا اور امت کے لئے وہ میلان مضر ہوتا اسی لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کو اختیار فرمایا تو جبریل علیہ السلام نے خوش ہو کر عرض کیا اِخْتَرْتَ الْفِطْرَةَ وَلَوْ اَخَذْتَ الْخَمْرَ لَغَوَتْ اُمَّتُكَ یعنی آپ نے دین کو اختیار فرمایا اور اگر آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ عالم برزخ میں دودھ دین کی صورت ہے۔ چنانچہ اگر کوئی خواب میں دودھ پیتے ہوئے یا پلاتے ہوئے دیکھے تو اس کی تعبیر دین ہو گی جیسا کہ خود حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے بھی تعبیر اپنے اس خواب کی ارشاد فرمائی جس میں خود دودھ نوش فرما کر بچا ہوا حضرت عمرؓ کو عطا فرمانا دیکھا تھا۔ اس کی مناسبت سے اپنا ایک خواب یاد آ گیا۔

میں نے ایک بار خواب میں دیکھا کہ ایک مجمع ہے جس میں لوگوں کو چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے میرے سامنے بھی پیش ہوئی تو میں نے انکار کر دیا میں نے نہیں پی۔ جب میں بیدار ہوا تو تعبیر خود بخود دل میں یہ آئی کہ جس طرح دودھ کے معنی عالم میں دین کے ہیں چھاچھ کی تعبیر صورت دین ہے جس میں معنی نہیں سو یہ مجمع بھی عمل بالحدیث کا مدعی ہے گویا اس خواب میں یہ بتلایا گیا تھا کہ ان لوگوں میں دین کی صورت ہی صورت ہے روح دین کی نہیں ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شب معراج میں دودھ کو اختیار فرمایا اس کی برکت یہ ہوئی کہ امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دین کا خیال بہت ہے۔ کاملین کے سامنے ناقصین چاہے کیسے ہی معلوم ہوتے ہوں مگر مجموعی طور پر امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیگر اقوام یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں دین کے اہتمام میں بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ امت محمدیہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ناقص بھی یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں دینداری میں کامل ہیں سو دیکھا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی کیا کیا رعایتیں اور ان پر کیا کیا عنائتیں فرمائی ہیں۔ اللہ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شفقت اور یہ محبت دیکھ کر تو ہم کو بدرجہ اولیٰ عاشق اور جان نثار ہو جانا چاہیئے اور یوں کہنا چاہیئے ؎

گر بر سر و چشم من نشینی ناز‌ت بکشم کہ نازنینی

(اگر تو میرے سر اور آنکھوں پر بیٹھے تو تیرا ناز اٹھاؤں اس لئے کہ تو نازنین ہے)

بلکہ اگر آپ قتل بھی کرنا چاہیں تو زبان قال و حال سے یہ کہنا چاہیئے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ ان پر آپ کا خنجر چلے)

اور ہم تو کیسے محبت نہ کریں آپ کی تو محبوبیت میں تو یہ شان ہے کہ جانوروں تک نے آپ کو سجدہ کیا ہے اور اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی تو سو اونٹ نحر فرمائے تھے ایسے غریب بھی کہیں نہ دیکھے ہونگے بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو بہت کچھ دیا تھا مگر آپ جمع نہیں فرماتے تھے آپ کا فقر اختیاری تھا۔ غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں سو اونٹ نحر فرمائے تھے۔ نحر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک پیر اونٹ کا ران سے ملا کر تسمہ سے باندھ دیا جاتا ہے اور اونٹ تین پیروں پر کھڑا رہتا ہے پھر گلے کے نیچے جو گڑھا ہے اس میں برچھا مارا جاتا ہے۔ اونٹ کو اسی طرح ذبح کیا جاتا ہے اس کا ذبح اسی طرح آسان ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سو میں سے تریسٹھ اونٹ خاص اپنے دستِ مبارک سے ذبح کئے تھے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماشاء اللہ بہت ہی قوی ہاتھ تھا جو تریسٹھ اونٹ کھڑے کھڑے ذبح کر دیئے۔ غرض احادیث میں یہ قصہ مذکور ہے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اونٹ نحر فرمائے ہیں تو ہر اونٹ آہستہ آہستہ باوجود پیر بندھا ہوا ہونے کے آپ کی طرف بڑھتا تھا یعنی پہلے مجھے ذبح کیجئے۔ حدیث میں یہ لفظ ہیں كُلُّهُنَّ يَزْدَلِفْنَ إِلَيْهِ (ہر ایک ان میں سے آپ کی طرف بڑھتا تھا) بالکل اس شعر کا مصداق تھا ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف   بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(صحرا کے تمام ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے اس امید میں کہ کسی دن شکار کو آئے گا)

پس ہم پر عقلاً نقلاً ہر طرح فرض ہوا کہ آپ سے محبت کریں اور محبت کا مقتضا ہے کثرت ذکر اور اس ذکر کی ایک بہت اچھی اور مقبول اور محبوب فرد درود شریف ہے بخصوص جبکہ اس میں بھی ہمارا ہی نفع زیادہ مقصود ہوا اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو درود شریف کی فضیلت بتلائی ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے امت کو بہت کچھ برکات و درجات عالیہ و ثواب عطا ہوں۔

(ان شاء اللہ تعالیٰ ...)

کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ درود تعلیم فرمانے کا نفع تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہوتا ہے کہ امت آپ کے لئے دعا کرتی ہے امت کو کیا نفع سو یہ شبہ غلط ہے کیونکہ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک آقا ہے اس کے ایک لڑکا ہے جس کو وہ بہت چاہتا ہے وہ لڑکا اپنے باپ کے نوکر سے کہتا ہے کہ ابا جان سے کہدو کہ آج عید ہے ہم کو ایک روپیہ دے دیں۔ وہ لڑکا جانتا ہے کہ باپ کو خود میرا خیال ہے وہ عیدی کا روپیہ خود ہی دیتے مگر پھر جو نوکر کے ذریعہ سے کہلواتا ہے اس میں اس کا خود کوئی نفع نہیں بلکہ اس وساطت سے وہ نوکر آقا کی نظر میں بلند مرتبہ ہو جائے گا۔ کہ یہ ہمارے بیٹے سے محبت کرتا ہے۔ اب اگر وہ نوکر بے وقوف یہ سمجھنے لگے کہ میں بیٹے سے بھی بڑھا ہوا ہوں کہ میں نے اس کو روپیہ دلوایا ورنہ اس کو نہ ملتا۔ یہ اس کی حماقت ہو گی یا نہیں بلکہ اس کو تو اس وساطت سے خود ایک شرف حاصل ہو گیا۔ بیٹے کو تو روپیہ ملتا ہی۔ بلا تشبیہ اسی طرح اس جگہ سمجھئے کہ آپ کے درود پڑھنے سے جو درجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوں گے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ آپ کی ضرورت نہیں وہ درجات تو حق تعالے خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا فرماتے ہی البتہ یہ رحمت ہے کہ ہم کو اس وساطت سے مشرف فرما دیا کہ اس واسطہ سے ہم کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ اور میرے پاس اس دعوے کی کہ ان مراتب کا عطا فرمانا تو حق تعالیٰ کو منظور ہی تھا دلیل موجود ہے حق تعالیٰ شانہ نے جس آیت میں ہم کو درود شریف کا امر فرمایا ہے اس میں امر سے پہلے یہ ارشاد فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ حق تعالیٰ اور ملائکہ علیہم السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں) صیغۂ تجدد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ درود بھیجتے رہتے ہیں چاہے کوئی درود بھیجے یا نہ

بھیجے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے بڑھ کر کس کا درود ہو سکتا ہے اور حق تعالےٰ
ہمیشہ درود نازل فرماتے رہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو درجات عالیہ عطا
ہونے والے ہیں وہ تو حق تعالےٰ خود ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور ہی عطا فرمائیں گے
اگر تم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے درود پڑھوگے تو اس سے تم کو بھی نفع ہوگا
باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور درود شریف میں علاوہ اس کے
کہ وہ ایک ذکر ہے جو مقتضا محبت کا ہے اور بھی فضائل ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں
مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا جو میرے اوپر ایک بار درود بھیجے گا حق
تعالیٰ اُس پر دس بار درود بھیجیں گے ایک فائدہ درود میں بہ نسبت حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کے ذکر شریف کے دوسرے طرق کے یہ ہے کہ ذکر بسیط ہے اور ذکر بسیط متفرق
اذکار سے زیادہ سہل و دلچسپ ہوتا ہے۔ پھر اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں
ذکر اللہ بھی ہے اور ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیونکہ درود شریف میں اللہ کا نام
بھی ضرور ہوتا ہے تو خلوت میں اس سے زیادہ دلچسپ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا
کوئی طریقہ نہیں۔ البتہ جلوت میں اگر مجمع مشتاق ہو تو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات
اخلاق وغیرہ کا بھی ذکر کر دیا جائے یہ ذکر ولادت سے بھی افضل ہے کیونکہ ولادت بھی
تو اسی کے واسطے ہوئی تھی یہ کمالات مقصود بالولادت ہیں ان کا ذکر اس کے ذکر سے
افضل ہوگا درود کی اور فضیلت بھی آئی ہے چنانچہ ایک صحابی نے چند اوراد حضور صلی
اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے کہ میں چند وظائف پڑھتا ہوں جن میں درود شریف
ربع کے قریب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَوْ زِدْتَ لَکَانَ خَیْرًا لَّکَ
(اگر اس سے زیادہ کرتا تو تیرے لئے یہ بہتر تھا) انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم نصف کے قریب درود شریف پڑھا کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے پھر یہی فرمایا کہ اگر اور بڑھاؤ گے تو بہتر ہوگا یہاں تک کہ انھوں نے عرض کیا
کہ میں سارا وظیفہ درود شریف ہی کا رکھوں گا اور کچھ نہ پڑھوں گا۔ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اِذًا یَکْفِیْ ھَمَّکَ وَیَغْفِرْ ذَنْبَکَ کہ اگر ایسا کروگے تو

تمہارا تمام فکر دور ہو جائے گا اور گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ ایسا ہی کریں کہ تمام اوراد چھوڑ کر درود شریف ہی کا وظیفہ اختیار کریں اس کے بارہ میں ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ بہت عمدہ ہے ان سے پوچھا گیا کہ استغفار افضل ہے یا درود شریف انھوں نے فرمایا کہ اُجلے کپڑوں میں تو عطر اچھا ہوا کرتا ہے اور میلے کپڑوں میں صابن غرض ہر ایک کی حالت کا جدا مقتضا ہے۔ اس لئے کوئی یہ نہ کرے کہ تمام اوراد چھوڑ دے اور صرف درود شریف کو اختیار کرلے یہ اپنے شیخ سے پوچھکر کرنا چاہیئے ایک حق آپ کی محبت کا یہ ہے کہ قبر شریف کی زیارت سے مشرف ہو بخصوص جو حالت حیات میں زیارت سے مشرف نہیں ہوئے وہ روضۂ اطہر ہی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے برکات حاصل کرلیں۔ کہ وہ برکات اگرچہ زیارت حیات کے برکات جیسے بالکل نہ ہوں مگر ان کے قریب قریب ضرور ہیں حدیث میں ارشاد موجود ہے مَنْ زَارَنِی بَعْدَ مَمَاتِیْ فَكَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ (جس شخص نے میرے مرنے کے بعد زیارت میری قبر کی کی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خود بھی قابل توجہ ہے اگر آپ تعلق صرف مبلغ ہی ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو زیارت قبر مسنون نہ ہوتی کیونکہ اس وقت تبلیغ کہاں ہے افسوس کہ بعض لوگ ایسے خشک ہیں کہ وہ زیارت قبر شریف کی فضیلت کو نہیں مانتے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ناجواز کے قائل ہیں

کانپور میں ایک مرتبہ ایک مترجم اربعین حدیث میں بچوں کا امتحان تھا جلسہ امتحان میں ایسے ہی ایک شخص تھے جو کہ زیارت قبر شریف کو ناجائز سمجھتے تھے ایک بچہ کا امتحان شروع ہوا اس نے اتفاق سے یہ حدیث پڑھی مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ (جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو اس نے مجھ پر ظلم کیا) ان صاحب نے اعتراض کیا کہ لم یزرنی فرمایا ہے تو یہ آپ کی حالت حیات کے ساتھ خاص ہے بعد وفات زیارت ثابت نہیں طالب علم بچہ تھا اشکال سمجھا بھی نہیں نہ اس کو جواب معلوم تھا وہ سادگی سے آگے بڑھنے لگا۔ خدا کی شان آگئے

جو حدیث موجود تھی وہ اس اعتراض ہی کا جواب تھی آگے یہ حدیث تھی کہ مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَمَاتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ (جس نے میرے مرنے کے بعد زیارت کی گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی) جتنے علماء اس وقت موجود تھے سب نے ان صاحب سے کہا لیجئے حضرت آپ کے اعتراض کا جواب منجانب اللہ ہوگیا۔ بس خاموش رہ گئے بعضے لوگ زیارت قبر شریف پر ایک شبہ کرتے ہیں کہ اب تو قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی کیونکہ قبر شریف نظر نہیں آتی اس کے گرد پتھر کی دیوار قائم ہے جس کا دروازہ بھی نہیں یہ عجیب لغو اشکال ہے میں کہتا ہوں کہ اگر زیارت قبر کے لئے قبر کا دیکھنا ضروری ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے بھی یہ شرط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جاوے حالانکہ بعض صحابہ نابینا تھے عبداللہ بن ام مکتوم صحابی ہیں یا نہیں۔ مستورات کے بارے میں کیا کہو گے جس طرح صحابیت کے لئے حکمی زیارت کافی مانی گئی ہے اسی طرح زیارت قبر شریف میں بھی حکمی زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا۔ یعنی ایسی جگہ پہونچ جانا کہ اگر کوئی حائل نہ ہو تو قبر شریف کو دیکھ لیتے یہ بھی حکماً زیارت قبر شریف ہے۔ تیسرا شبہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے کرتے ہیں کہ امام مالک کا قول ہے یُکْرَہُ قَوْلُ الرَّجُلِ زُرْتُ قَبْرَ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ یعنی امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات کہنی مکروہ ہے کہ میں نے قبر شریف کی زیارت کی تو جب زیارت قبر کا قول ہی مکروہ ہے تو فعل زیارت تو کیسے مکروہ نہ ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ امام مالک کا یہ قول اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت بھی ہو تو ان کا یہ مطلب نہیں جو تم کہتے ہو ورنہ ان کو اس قدر پھیر پھار کی کیا ضرورت تھی وہ صاف ہی نہ فرماتے کہ یُکْرَہُ زِیَارَۃُ قَبْرِ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت مکروہ ہے) یہ قول کی کراہت بیان کرنا اس سے زیارت کی کراہت نکالنا اس تکلف کی ان کو کیا ضرورت تھی بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں اس لئے زیارت کرنے والے کو یہ نہ کہنا چاہیئے کہ میں نے قبر کی زیارت کی کیونکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ میں نے حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں. غرض دنیا میں ایسے بھی خشک مذاق موجود ہیں جن کو زیارت قبر کا خود تو کیا شوق ہوتا اس کو حرام کہہ کے دوسروں کو بھی روکنا چاہتے ہیں مگر جو زیارت کر چکے ہیں ان سے پوچھو کہ کس قدر برکات حاصل ہوتے ہیں۔ پس اب بیان کو ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں جس سے زیارت قبر شریف کے برکات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا معلوم ہوگا۔ سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مزار شریف پر حاضر ہوئے عرض کیا اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا جَدِّیْ (دادا صاحب السلام علیک) جواب ہوا وَعَلَیْكَ السَّلَامُ یَا وَلَدِیْ (بیٹا وعلیک السلام) اس پر ان کو وجد ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوگئے

فِیْ حَالَةِ الْبُعْدِ رُوْحِیْ کُنْتُ اُرْسِلُهَا ۔۔۔ تُقَبِّلُ الْاَرْضَ عَنِّیْ وَهِیَ نَائِبَتِیْ

فَهٰذِهٖ دَوْلَةُ الْاَشْبَاحِ قَدْ حَضَرَتْ ۔۔۔ فَامْدُدْ یَمِیْنَكَ کَیْ تَحْظٰی بِهَا شَفَتِیْ

(یعنی دوری میں تو روح کو قدم بوسی کے لئے اپنا نائب بنا کر بھیجا کرتا تھا
اب جسم کی باری آئی ہے اب تو ذرا ہاتھ بڑھا دیجئے تاکہ میں اس کو
بوسہ دوں)

بس فوراً قبر شریف سے ایک منور ہاتھ جس کے روبرو آفتاب بھی ماند تھا باہر نکلا انھوں نے بے ساختہ دوڑ کر اس کا بوسہ لیا اور وہاں ہی گر گئے[1]۔

ایک بزرگ سے جو کہ اس واقعہ میں حاضر تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اس وقت کچھ رشک ہوا تھا۔ فرمایا ہم تو کیا تھے اس وقت ملائکہ کو رشک تھا۔ تتمہ قصہ کا یہ ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ لوگ مجھ کو نظر قبول سے دیکھ رہے ہیں آپ اٹھ کر ایک دروازہ میں جا پڑے اور حاضرین کو قسم دے کر کہا کہ سب میرے اوپر سے گزریں چنانچہ عوام تو گزرنے لگے اور اہل بصیرت دوسرے راستہ سے نکلے سبحان اللہ کیا نوازش ہے۔

اب اس بیان کو ایک نکتہ پر ختم کرتا ہوں کہ اس آیت میں جو حق تعالیٰ شانہ نے رَءُوْفٌ الرَّحِیْمٌ دو لفظ ارشاد فرمائے اس میں کیا نکتہ ہے مجھ کو اس وقت لغت سے

---

[1] جناب سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تصنیف کردہ کتاب بنیان المشید منگا کر ضرور پڑھیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کتاب کے پڑھنے کو فرمایا ہے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ تھانوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ملہ

رجوع کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ وعظ کا ہوتا جمعہ کی نماز کے لئے آتے ہوئے راستہ ہی میں طے ہوا پہلے سے خیال ہوتا تو میں کتب لغت دیکھ کر آتا مگر جو بات اس وقت ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ رؤف کا مصدر ہے رأفت جس کے معنی ہیں شدت رحمت اور شدت ایک کیفیت ہے تو اس میں مبالغہ کیفاً ہے اور رحیم میں بھی مبالغہ ہے اور بوجہ تقابل کے شاید اس میں مبالغہ ہو کماً پس مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ آپ کی رحمت کیفاً بھی زیادہ ہے اور کماً بھی اب دعا فرمایئے کہ حق تعالیٰ شانہ ہم کو ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق دیں اور آپ کی محبت و اطاعت و تعظیم ہی میں وفات دیں اور قیامت میں آپ کا قرب نصیب ہو آمین۔

(**التماس جامع**) اس وعظ کے جلد صاف کر دینے کا اکثر احباب کو بہت تقاضا تھا اور واقعی یہ انمول جواہر جو اس وعظ میں ہیں ایسے ہی اشتیاق کے قابل ہیں مگر کیا کہوں تعلیم کی مشغولی کی وجہ سے بہت دیر ہو گئی تاہم بحمد اللہ بہت جلد صاف ہو گیا۔ احباب سے تاخیر کی تکلیف کی معافی چاہتا ہوں اور اللہ واسطے درخواست کرتا ہوں کہ جو صاحب اس سے منتفع ہوں میرے واسطے بھی دعائے خیر فرمائیں کہ حق تعالیٰ اپنی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کامل اور اتباع کامل عطا فرمائیں اور بیت اللہ و بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بعافیت تامہ ظاہریہ و باطنیہ نصیب ہو آمین یا رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولٰنا محمد وعلیٰ الہ و اصحابہ و امتہ عدد خلقہ ورضی نفسہ و مداد کلماتہ صلوٰۃ لاغایۃ لہا ولا انتہا ولا امد لہا ولا انقضاء صلوٰۃ تدوم بدوامک و تبقی ببقائک صلوٰۃ ترضیک و ترضیہ و ترضی بہا عنا یا رب العالمین آمین فقط والسلام۔ احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ۔ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ

رسالہ الابقاء کی اشاعت کی ترقی کے لئے کوشش اور دعا کی بہت ضرورت ہے۔ اس سال بہت وی۔پی واپس آ گئے اور بہت نے انکار کر کے الابقاء بند کرا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ براہ کرم ضرور کوشش و دعا فرماویں۔ والسلام طالب دعا و کوشش محمد عبد المنان غفرلہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

ومضان فی رمضان

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی ملا

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمی بہ

ومضان فی رمضان

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	[illegible]	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تخمیناً	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون ضلع مظفر نگر	[illegible] شعبان [illegible] بروز جمعہ	.	کھڑے ہو کر	.	.	.	[illegible]	.	.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید:۔ پیشتر حضرت والا نے جمعہ کے دوسرے خطبہ کے ختم کے قریب رمضان المبارک کے متعلق ایک مختصر سی تقریر فرمائی جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔ اس کے بعد نماز سے فارغ ہو کر مستقل وعظ فرمایا۔ وہ مختصر تقریر اور مفصل وعظ بالترتیب نقل کئے جاتے ہیں۔

تقریر قبل وعظ

صاحبو! ہم لوگوں کو خوش ہونا چاہیئے کہ رمضان المبارک کا مہینہ آ رہا ہے سب جانتے ہیں کہ روزہ کتنی بڑی عبادت ہے اور یہ مہینہ کس قدر بابرکت ہے

ہمیں چاہیئے کہ روزہ کے حقوق ادا کرنے کا بہت اہتمام رکھیں اور ہمیشہ اس کے حقوق ادا کرتے رہیں۔ رمضان المبارک کے مہینہ کے ختم تک اس کا خاص طور سے خیال رکھیں کہ کوئی گناہ سرزد نہ ہونے پائے۔ بالخصوص غیبت، بری نگاہ، حرام روزی بالکل ہی چھوڑ دیں۔ گو یہ گناہ ہمیشہ ہی بُرے ہیں اور ان کو ہمیشہ ہی کیلئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر رمضان میں بالخصوص ان سے اور زیادہ بچنا چاہیئے۔ ایک عبادت رمضان المبارک کی تراویح ہے۔ اس میں پریشان نہ ہوں کہ صاحب گرمی میں کھڑا نہیں رہا جاتا ابھی تو بفضلہ راتوں کو ٹھنڈ رہتی ہے۔ اور اگر کچھ مشقت بھی ہو تو کیا ہے۔ یہ رمضان المبارک کی خاص عبادت ہے۔ آخر دنیا کے واسطے بھی تو کتنی کتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ صرف ایک گھنٹہ کا کام ہے۔ پھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد سلام پھیرتے رہتے ہیں اور ہر چار رکعت کے بعد آرام کے لئے وقفہ ملتا رہتا ہے اس میں پنکھا جھل لیا کریں۔ لیکن امام کے ساتھ فوراً نماز میں شامل ہو جانا چاہیئے یہ نہیں کہ جب امام رکوع میں جانے لگا تب شریک ہوئے۔ غرض اس مبارک مہینہ میں نہایت خوشی کے ساتھ اور نہایت رغبت اور شوق کے ساتھ عبادت کرنی چاہیئے اور جتنے گناہ ہیں سب کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ اجمالاً حقوق ہیں رمضان المبارک کے۔ باقی اُس سے قبل کا حق یہ ہے کہ چاند کی تحقیق کی جائے۔ سو اب تک جو تحقیق ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شعبان کی پہلی بُدھ کے روز تھی، تو بدھ بدھ ۲۹، لہذا بدھ کے روز چاند کی تلاش چاہیئے۔ بدھ کے دن چاند کو دیکھیں اگر نظر آجائے تو دوسرے دن سے روزے رکھیں اور تراویح اُسی دن سے شروع کر دیں ورنہ ۳۰ دن پورے کر کے شروع کریں یہ ہے حکم چاند کے متعلق۔ لیکن جو کوئی چاند دیکھے وہ مدرسہ میں اطلاع کر دے کیونکہ بہت سے مسائل ایسے باریک ہیں جن کو اہلِ علم ہی جانتے ہیں۔ لہذا خود اپنی تحقیق پر عمل نہیں چاہیئے کسی عالم کے فتوے کے موافق عمل کرنا چاہیئے۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ شعبان کی پہلی منگل کو تھی تو پھر چاند منگل کی شام کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ بہر حال یہ چاند کے احکام ہیں

اور وہ جو میں بیان کر چکا ہوں اجمالاً روزے کے حقوق تھے۔ میں نے اس واسطے اتنے جلے اس وقت کہہ دیئے ہیں کہ بعد نماز کے شاید بعضے بعضے بیچارے چلے جاویں۔ ورنہ اگر بعد نماز کے بھی ٹھہرنا ہو تو بیان کا بھی ارادہ ہے جس کا جی چاہے سننے کے لئے ٹھہر جائے۔ اور جو اس وقت حاضر نہیں ہیں ان کو بھی یہ احکام پہونچا دیں خصوص عورتوں کو غیبت سے بچنے کی اور نماز کی پابندی کی ذرا زیادہ تاکید کر دیں۔ یہ غیبتیں بہت کرتی ہیں اور اپنے روزوں کو تباہ کرتی ہیں۔ اور اکثر نماز کی بھی پابند کم ہوتی ہیں، خوب اچھی طرح سمجھا دیں کیونکہ مردوں کے ذمہ اُن کا حق ہے۔ سمجھا بھی دیں اور جب خلاف کریں ٹوک بھی دیں کہ دیکھو تم نے کیا کہا تھا اور اب تم کیا کر رہی ہو۔

اصل وعظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(خطبہ ماثورہ) فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

شھر رمضان الذی انزل فیہ القراٰن ھدی للناس وبینٰت من الھدٰی والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضًا او علٰی سفر فعدۃ من ایام اخر یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدۃ ولتکبروا اللہ علٰی ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون ط

یہ سب کو معلوم ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب ہے اس واسطے مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوا کہ رمضان المبارک کے متعلق کچھ حقوق اور کچھ ضروری مضامین بیان کر دیئے جاویں۔ (یہیں تک بیان فرمانے پائے تھے کہ حضرت کی خانقاہ کے مقیمین میں سے ایک اہل علم احقر کے لکھنے کی طرف جبکہ میں وعظ کو قلمبند

کر رہا تھا دیکھنے لگے۔ اس حرکت سے لکھنے والے کی توجہ بٹ جاتی ہے اور اسکو سخت خلجان ہونے لگتا ہے۔ حضرت نے ان کو ڈانٹا کہ لکھتے ہوئے کو کیوں دیکھتے ہو۔ یہ کیا لغو حرکت ہے۔ افسوس آپ نے یہ قدر کی بیان کی۔ کیا ایک وقت میں دو طرف یکساں توجہ ہو سکتی ہے۔ جب آپ لکھنا دیکھیں گے تو سنیں گے کیا، پتھر۔ اور یہ مسئلہ بھی معلوم ہے کہ وعظ میں بالکل نہ بیٹھے یہ تو جائز ہے لیکن بیٹھے اور پھر دوسری طرف متوجہ رہے یہ جائز کہاں ہے۔ کیا آپ نے یہ بات نہیں پڑھی اذا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فاستمعوا له وانصتوا کیا اس کی شان نزول نہیں معلوم مگر آپ لوگ تو محض صیغوں کی تحقیق کے لئے پڑھتے ہیں عمل کے لئے تھوڑا ہی پڑھتے ہیں۔ پھر حضرت نے اُن کو آگے کی صف سے اٹھا دیا اور فرمایا اس جگہ سے اٹھو اور پیچھے جا کر بیٹھو۔ پھر فرمایا میں آپ کو خصوصیت کے ساتھ کہتا ہوں کہ جب میں یہاں سے فارغ ہو کر خانقاہ میں واپس پہونچ جاؤں تو آپ اس واقعہ کو مجھے یاد دلایئے تاکہ آپ کے حق میں میں فیصلہ کروں۔ آپ خانقاہ میں رہنے کے قابل نہیں۔ اس پر وہ صاحب خاموش بیٹھے رہے فرمایا آپ سنتے ہیں یا نہیں۔ پھر بھی وہ صاحب کچھ نہ بولے۔ فرمایا ارے صاحب میں آپ سے کہتا ہوں۔ مولانا میں آپ سے کہہ رہا ہوں بولئے یاد دلایئے گا یا نہیں اتنے کہنے کے بعد انہوں نے جواب دیا کہ یاد دلاؤں گا۔ پھر حضرت نے فرمایا آخر یہ حرکت نالائق کی تھی کیوں۔ انھوں نے پھر سکوت اختیار کیا۔ حضرت نے فرمایا خیر نہ جواب دیجئے۔ میں آپ کے حق میں فیصلہ کرتا ہوں کہ آپ یہاں نہیں رہ سکتے پھر فرمایا یہ خدا کے طالب ہیں صاحب انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ فقط نفلیں پڑھنی اور وظیفے گھونٹنے ہی کو بزرگی سمجھتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے بھلا کیا فائدہ ہوا لکھتے ہوئے دیکھنے سے۔ کیا لکھے ہوئے وعظ گھر میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کیا وہاں آنکھیں نہیں تھیں۔ جو آپ نے یہ جمعہ کا دن اور یہ وعظ ہی کا وقت اس کے لئے تجویز کیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ خوامخواہ

ابتدا رِ بیان ہی میں پریشان کر دیا قلب کو۔ کچھ نہیں جی سے

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھوی ولکن لا یخفی کلام المنافق

(محبت میں دعوٰی جائز ہے مگر منافق کا کلام تو مخفی نہیں رہ سکتا)

طلب نہیں ہے۔ خلوص نہیں ہے۔ اگر طلب ہوتی خلوص ہوتا تو غنیمت سمجھتے کہ اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام سنائے جا رہے ہیں۔ کان لگا کر سننا چاہیے مگر وہ تو خناس نے یوں قلب میں ڈال رکھا ہے کہ ایک ہی وقت میں دونوں کام کر سکتے ہیں۔ سُن بھی سکتے ہیں، دیکھ بھی سکتے ہیں۔ حالانکہ ؎

ایں خیال ست و محال ست و جنوں۔ دو کام ایک وقت میں ہو نہیں سکتے۔

اب میں پھر از سر نو مضمون شروع کرتا ہوں پھر اس طرح فرمانا شروع کیا)

یہ سب کو معلوم ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آ پہنچا ہے۔ لہذا مناسب بلکہ واجب ہے کہ رمضان المبارک کے متعلق کچھ ضروری مضامین بیان کر دیئے جائیں۔ اور وہ مضامین مختلف ہیں ایک قسم تو اُن مضامین کی ہے فضائل رمضان المبارک کے ایک قسم ہے آداب رمضان المبارک کے ایک قسم ہے حقوق رمضان المبارک کے۔ حقوق اور آداب میں میں نے اپنی اصطلاح کے موافق یہ فرق رکھا ہے کہ حقوق تو وہ ہیں جو واجب ہوں اور آداب وہ ہیں جو غیر واجب ہوں یعنی تطوع ہوں۔ خلاصہ یہ کہ حقوق کی ہی دو قسمیں ہیں ایک واجب ایک غیر واجب۔ لیکن میں آسانی تعبیر کے واسطے ایک قسم کا نام آداب رکھتا ہوں اور ایک کا حقوق غرض یہ کہ رمضان المبارک کے متعلق مضامین مختلف ہیں۔ اب دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ کونسا مضمون زیادہ ضروری ہے اوس کو مقدم رکھا جائے اور اگر وقت ہے تو دوسرے مضامین کے متعلق بھی بیان کر دیا جائے ورنہ ضروری امر تو فوت نہ ہو۔ تو ان تینوں قسموں کی شان اور درجہ میں غور کرنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ سب سے زیادہ ضروری کونسی قسم ہے یعنی یہ ظاہر ہے کہ جو حقوق واجب ہیں وہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں لہذا

ان کے متعلق جو مضمون ہوگا وہی سب سے زیادہ ضروری ہوگا کیونکہ حقوق کے فوت ہونے سے مضرت ہے اور آداب کے فوت ہونے سے مضرت نہیں گو منفعت میں کمی واقع ہو جائے اور تمام عقلا کا اس پر اتفاق ہے کہ مضرت کا دفع کرنا زیادہ ضروری ہے بہ نسبت منفعت کے حاصل کرنے کے۔ تو حقوق کا آداب سے زیادہ ضروری اور زیادہ اہم ہونا اس طرح ثابت ہوا۔ رہا فضائل کا درجہ۔ سو وہ در اصل ترغیب کے لئے موضوع ہیں۔ تو یہ شعبہ علم کے باب میں سے ہے نہ کہ عمل کے اور حقیقت میں مقصود علم سے بھی عمل ہی ہے۔ عمل ہی کی اعانت کے واسطے فضائل کا علم ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ عمل کی رغبت پیدا ہو۔ کیونکہ طبیعتیں ضعیف ہیں۔ محض امر اور نہی عمل کے لئے محرک نہ ہوتے ان کی تاثیر میں قوت پیدا کرنے کے لئے شارع نے طریقہ اعانت کا یہ رکھا کہ ترغیب اور ترہیب سے بھی کام لیا یعنی رغبت دلا کر اوامر پر ابھارا اور خوف دلا کر نواہی سے روکا۔ تو حقیقتاً فضائل ترغیب کے لئے بیان کئے جاتے ہیں جن کا تعلق علم سے ہے اور اس علم سے بھی مقصود عمل ہے۔ پھر عمل میں بھی دو درجے ہیں۔ ایک درجہ کا تعلق تو آداب سے ہے اور ایک درجہ کا تعلق حقوق سے ہے۔

خلاصہ یہ کہ علم و عمل میں مقصود حقوق کا اہتمام ہے۔ لہذا تینوں قسموں میں اہم اور اقدام یہی ہوا یعنی حقوق کا اہتمام۔ لہذا میں اس وقت اسی مضمون پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ حقوق فی نفسہ بھی اہم ہیں۔ علاوہ اس کے ہم لوگ زیادہ کوتاہی انہی کے متعلق کرتے ہیں یعنی رمضان المبارک کے حقوق کی ہم کو پروا اور اہتمام نہیں۔ اس کے فضائل کا تو کم و بیش علم ہے بھی تفصیلاً نہیں تو اجمالاً تو ضرور ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ رمضان المبارک بہت فضائل کا مہینہ ہے بہت اجر کا مہینہ ہے۔ بہت عبادت کا مہینہ ہے۔ بہت برکت کا مہینہ ہے یہ سب جانتے ہیں۔ غرض بقدر ضرورت فضائل رمضان المبارک کا تو علم ہے بھی۔ رہے آداب سو اول تو یہ اس درجہ کا ضروری مضمون نہیں جس درجہ کا

حقوق کے متعلق مضمون ہے مگر خیر جس درجہ میں بھی مطلوب ہے اس پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی کسی قدر اہتمام ہے یا یوں کہئے کہ اگر اہتمام نہیں تو علم تو ضرور ہے۔ جہاں فضائل کا علم ہے آداب کا بھی کسی قدر علم ہے کیونکہ جب رمضان کے متبرک ہونے کا علم ہے اور متبرک چیز کے لئے ادب کا لحاظ عادۃً لازم ہے تو جب برکت کا اعتقاد ہوا تو ادب کی بھی ضرورت قلب میں پیدا ہوگئی۔ غرض اُس کا بھی کسی درجہ میں اہتمام اور علم ہے گو وہ اجمال کے درجہ میں ہے لیکن بقدر ضرورت اس کے ساتھ بھی علم متعلق ہے۔ باقی رہے حقوق سوان کے متعلق نہایت درجہ کا اخلال واقع ہو رہا ہے علماً بھی اور عملاً بھی یعنی اس طرف کبھی ذہن بھی نہیں جاتا کہ رمضان المبارک کے کچھ حقوق بھی ہیں اس واسطے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ رمضان آنے سے لوگ زوائد کا تو اہتمام کرتے ہیں مثلاً دودھ کا بندوبست کر لیا جاتا ہے، صفائی کرالی جاتی ہے کچھ برف کا انتظام سوچ لیا جاتا ہے۔ شکر کھجوریں تخم بالنگو وغیرہ جمع کر لیا جاتا ہے۔ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ گھر میں لکڑی بھی ہے، غسل وسل کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ یہ تو اہتمام ہوتے ہیں لیکن یہ کبھی ذہن میں بھی نہیں آتا کہ بھائی رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے۔ لاؤ غیبت سے بچنے کا کوئی انتظام کریں۔ یہ کہیں نہیں ہوتا کہ باہم مشورہ کر کے چند احباب نے یہ طے کر لیا ہو کہ اگر کوئی غیبت کرنے لگا کرے تو ایک دوسرے کو روک دیا کرے ٹوک دیا کرے۔ اکثر دنیا کے کاموں میں تو ایک دوسرے سے اعانت لی جاتی ہے۔ دین کا کام ایسا آسان سمجھ رکھا ہے کہ اس میں کسی کی اعانت کی حاجت ہی نہیں سمجھی جاتی اس کے لئے کبھی ذہن میں آتا ہی نہیں کہ آپس میں التزام کر لیں۔ کان پور میں ہم نے دیکھا کہ بعض محبین نے یہ التزام کر لیا تھا کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو ایک دو دن پہلے ایک دوسرے سے درخواست کرتے تھے اور آپس میں مشاورت کر لیتے تھے کہ جس کے منہ سے غیبت نکلے دوسرا فوراً روک دے کہ روزہ ہے۔ روزہ میں غیبت مت کرو۔ لیکن ایسا

التزام بہت ہی شاذ و نادر ہے۔ بس یہ دیکھ لیجئے کہ میں نے ساری عمر میں اس قسم کا یہ ایک ہی جلسہ دیکھا ہے۔ بہر حال ان لوگوں کو توجہ تو تھی۔

اسی طرح اس کا ذہن میں بھی کبھی خیال نہیں آتا کہ بھائی قرآن مجید سننے کا زمانہ آرہا ہے کوئی ایسا حافظ تلاش کرو جو اچھا اور صحیح پڑھتا ہو۔ بھائی اس کے پیچھے تراویح پڑھنا چاہیئے جو تجوید کے ساتھ قرآن مجید پڑھتا ہو۔ کلام مجید جس کو رمضان المبارک کے مہینہ کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے کیونکہ وہ نازل ہی اس ماہ مبارک میں ہوا ہے کبھی اس کے سننے میں بھی آپ کو اہتمام کی فکر ہوئی ہے بلکہ اہتمام تو ایسے سامان کا کیا جاتا ہے جس میں اور سستی بڑھے۔ اور اگر کوئی تجوید کے ساتھ پڑھنے والا حافظ تجویز کیا جاتا ہے تو مخالفت کی جاتی ہے کہ تراویح میں دیر لگے گی کھڑا نہیں رہا جائے گا۔ غرض رمضان المبارک کے لئے پہلے سے اور تو سب اہتمامات اور انتظامات کئے جاتے ہیں کہ سحری میں یہ ہو، افطاری میں یہ ہو لیکن ہم نے کہیں نہیں دیکھا کہ اپنے نفس کو آمادہ کیا ہو کسی نے کہ میں مطلق غیبت نہ کروں گا یا گناہوں کے ترک کا عزم کیا ہو کہ میں بالکل گناہ نہ کروں گا تو گویا رمضان المبارک کے حقوق کے باب میں بہت ہی زیادہ کوتاہی اور بہت ہی بے پرواہی ہے۔ عملاً بھی کوتاہی ہے اور علماً بھی کوتاہی ہے۔ اہتمام بھی حقوق کا کم ہے اور ان کا علم بھی کم ہے۔ اس واسطے یہ مضمون ضروری ہوا۔ تو میں اس وقت رمضان المبارک کے حقوق کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے اس میں ہر چند مضمون فضائل رمضان کا ہے۔ لیکن میں اسی آیت سے حقوق رمضان کو مستنبط کرنا چاہتا ہوں۔ بعض مقدمات کی تمہید کے بعد سو ایک مقدمہ تو اجمالاً میری تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ رمضان المبارک کے چند حقوق ہیں اُن کا خلاصہ کیا ہے یہ ہے کہ جملہ معاصی کو ترک کرنا چاہیئے خواہ وہ معاصی یوم کے متعلق ہوں یا لیل کے متعلق ہوں۔ عبادت کے متعلق ہوں یا عادت کے متعلق ہوں یا معاملات کے

متعلق ہوں۔ یہ گویا خلاصہ ہے حقوق رمضان کا کہ کل معاصی کو ترک کردے اس میں وہ امور بھی آگئے جن سے روزہ میں خلل آجاتا ہے یا تراویح میں خلل آجاتا ہے۔ غرض سب معاصی سے احتراز لازم ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہے جو خلاصہ ہے حقوق رمضان کا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ معصیت اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اور اپنے اثر کے اعتبار سے بھی ایک قسم کی ظلمت اور تاریکی ہے۔ حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے یعنی معصیت کے اُن آثار سے جو بیان کئے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔ اُن آثار کا حاصل یہ ہے کہ فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کوئی گناہ کرتا ہے ایک سیاہ دھبہ اُس کے قلب کے اوپر پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو حق تعالے اُس دھبّہ کو صاف کردیتا ہے اور اگر توبہ نہیں کرتا اور پھر عود کرتا ہے اس گناہ کی طرف اور اس پر اصرار کرتا ہے تو وہ دھبّہ پھیلتا ہے پھر پھیلتے پھیلتے وہ بہت بڑا ہوجاتا ہے یہاں تک کہ محیط ہوجاتا ہے سارے قلب کو۔ پھر استشہاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون ط اس کا ترجمہ مولانا نے کیا ہے ؎

ہر گنہ زنگے ست بر مرأت دل دل شود زیں زنگ ہا خوار خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی نفس دوں را بیش گردد خیرگی

(ہر گناہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے اور دل اس زنگ سے ذلیل اور بے وقعت ہوتا ہے)

(اور جب دل کی تاریکی زیادہ ہوجاتی ہے تو نفس ذلیل کی پریشانی اور حیرانی بڑھ جاتی ہے)

اور یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر انسان تھوڑا سا بھی اپنے قلب کی طرف رجوع کرے تو فقط یہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اس لئے بیشک سچ ہے۔

بلکہ خود بھی مشاہدہ کر لیجئے۔ اول تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر کے بعد ہم کو مشاہدہ کا انتظار ہی نہیں چاہیئے کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خبر دے دینا ہمارے لئے مشاہدہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ لیکن تا ہم کے واسطے عرض کرتا ہوں کہ اگر ذرا بھی وسوسہ ہو تو خود مشاہدہ کر لیجئے اور اپنے قلب کی طرف رجوع کر کے اور اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھ لیجئے کہ گناہ صادر ہو جانے کے بعد قلب میں ظلمت محسوس ہوتی ہے یا نہیں اور ممکن ہے اگر کوئی کہے کہ ہم تو رات دن گناہ کرتے ہیں ہمیں تو اپنے قلب میں کچھ بھی ظلمت محسوس نہیں ہوتی جیسے کسی سرحدی دیہاتی نے ایک وعظ میں یہ سن کر کہ بغیر وضو کے نماز ہی نہیں ہوتی یہ کہا تھا کہ بارہا کردیم و شد ہم نے تو بہت دفعہ بے وضو پڑھی اور ہو گئی۔ تو وہ جاہل حقیقت ہی نہ سمجھا تھا نماز کے ہونے کی۔ بس منہ میں جو آیا بک دیا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی یوں کہے کہ ہم تو ہمیشہ گناہ کرتے ہیں ہمیں تو کچھ بھی ظلمت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارا قلب تو اچھا خاصہ تروتازہ رہتا ہے۔ ویسا ہی خوش بخوش جیسے گناہ کرنے سے پہلے تھا۔ ذرا بھی میلا نہیں ہوتا۔ تو میں اس کی تکذیب تو نہیں کرتا لیکن یہ کہوں گا کہ وہ جھوٹ تو نہیں بولتا مگر دھوکہ میں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بے چارہ غریب نے ظلمت کے مقابل جو چیز ہے یعنی نور اس کا کبھی مشاہدہ ہی نہیں کیا۔ اسے کبھی احساس ہی نور کا نہیں ہوا۔ اور یہ مسلّم مسئلہ عقلیہ ہے کہ الاشیاء تعرف باضدادھا ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ جس نے کبھی نور نہ دیکھا ہو وہ بے چارہ کیا سمجھے کہ ظلمت کیا چیز ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے تنگ کوٹھری میں پرورش پائی ہو تو اس کو کوٹھری کے اندر تنگی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اسے خبر ہی نہیں کہ میدان فراخ کس کو کہتے ہیں اور فراخی کیسی ہوتی ہے ؎

چو آن کرمیکہ در سنگے نہان ست
زمین و آسمان دے ہمان ست

(مثل اس کیڑے کے کہ وہ پتھر میں پوشیدہ ہوتا ہے اس کے لئے زمین اور آسمان وہی پتھر کا

(باقی)

لیکن جس شخص نے میدان دیکھا ہوگا اگر اس کو کوٹھری میں قید کر دیا جائے تو اس کی وحشت کا کچھ ٹھکانا اور اس کی تنگی کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ اسی طرح جس نے انوار کا مشاہدہ کیا ہو اگر اس کو ظلمات میں لا کر ڈال دیں تو اس کی وحشت کی کچھ انتہا نہ ہوگی اور اگر کسی نے ظلمت ہی ظلمت دیکھی ہو نور کبھی نہ دیکھا ہو اسے ظلمت سے کیا وحشت ہو سکتی ہے جس نے عمر بھر ظلمت میں پرورش پائی ہو وہ کیا جانے کہ نور کیسا ہوتا ہے اور انوار کس کو کہتے ہیں جیسے گوہ کا کیڑا کہ چونکہ اس کو خوشبو کی خبر نہیں اس لئے بدبو کی بھی خبر نہیں۔ اس لئے وہ خوشبو اور بدبو کا نام سن کر سوچتا ہے کہ خوشبو کیا چیز ہوتی ہے پھول میں کیا بات ہے جو سب لوگ اس کی تمنا کرتے ہیں اگر اس کے سامنے پھول لائے جائیں تو وہ تو یہی کہدے کہ ان میں کیا رکھا ہے۔ ہم تو انہیں نہیں چاہتے۔ لوگ کہتے ہیں خوشبو خوشبو ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ خوشبو بھی کوئی چیز دنیا میں ہے۔ اور کہتے ہیں کہ پاخانہ میں بدبو ہوتی ہے صاحب ہم تو عمر بھر سے اسی میں رہتے ہیں ہمیں تو کبھی نہیں محسوس ہوئی۔ تو بھائی بات یہ ہے کہ بدبو کا احساس تو اسی کو ہو سکتا ہے جس کو خوشبو کا ادراک ہو چکا ہو۔ تم کیا جانو کہ بدبو کیا چیز ہے کاش خوشبو کا ادراک بھی کبھی نہیں ہوا ہوتا تو تم دیکھتے کہ پاخانہ میں زندگی بسر کرنا موت ہو جاتا۔ چونکہ ابتدا ہوش سے ہمیشہ خدا تعالے کے معاصی میں مبتلا رہے ہو۔ ابتدا سے ظلمت ہی ظلمت دیکھی ہے نور کبھی دیکھا ہی نہیں تو یہ وجہ ہے کہ ظلمت کا ادراک نہیں ہوتا۔ یعنی ظلمت کا تو ادراک ہوتا ہے لیکن اس کے ظلمت ہونے کا ادراک نہیں ہوتا اس واسطے کہ جو ظلمت میں ہوگا اُسے ظلمت مشاہدہ تو ہوگی لیکن یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ ظلمت ہے کیونکہ اس نے کبھی نور کو نہیں دیکھا۔ جس نے کبھی دھوپ نہ دیکھی ہو وہ سایہ کی حقیقت ہی نہیں جان سکتا اس واسطے کہ سایہ مقابل ہے دھوپ کے لہذا سایہ کی معرفت دھوپ سے ہو سکتی ہے اور دھوپ کی معرفت سایہ سے ہو سکتی ہے۔ ایک کی معرفت کا مدار دوسرے کی معرفت پر ہے دونوں لازم ملزوم ہیں اور حضرت یہاں تک

اس قاعدہ کا اثر ہے کہ بعضے اہل اللہ نے جن پر غلبۂ ذکر کا تھا قسم کھا کر مدتوں بعد کسی غافل کے واقعہ کو دیکھ کر کہا کہ واللہ ہم یہ نہ جانتے تھے کہ دنیا میں کوئی غافل بھی ہے۔ یہ گمان تھا کہ دنیا میں جتنے لوگ ہیں سب ذاکر ہیں۔ تو بات یہی ہے کہ چونکہ وہ ابتدا ہی سے ولی مادرزاد تھے ذکر ان کے لئے امر فطری ہو گیا تھا جیسے حدیث میں اہل جنت کی صفت یہ آئی ہے یلھمون التسبیح کما یلھمون النفس تسبیح کا انہیں الہام ہوگا جیسے سانس بلا اختیار آتا ہے اسی طرح سبحان اللہ سبحان اللہ یا اللہ اللہ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا کرے گا کسی وقت غفلت طاری نہ ہوگی بعض اولیاء کی شان دنیا میں بھی ایسی ہی رہی ہے کہ ان پر کبھی غفلت طاری نہیں ہوئی وہ ہمیشہ ذاکر ہی رہے۔ اور چونکہ خود ہر وقت ذکر میں مشغول رہے انہیں اہل دنیا کی غفلت کا احساس ہی نہیں ہوا اور خبر بھی نہ ہوئی کہ دنیا میں اہل غفلت بھی موجود ہیں۔ جب کسی کو معصیت میں مبتلا دیکھنے کا اتفاق ہوا اس وقت متنبہ ہوئے اور حیرت سے پوچھا کہ اللہ اکبر کیا ایسے بھی لوگ دنیا میں ہوا کرتے ہیں جو حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوں۔

غرض جب اہل نور نے اہل ظلمت کو نہ پہچانا تو اگر اہل ظلمت اہل نور کو نہ پہچانیں تو تعجب کیا۔ تو بہرحال معصیت کا ظلمت ہونا محسوس نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے کبھی طاعت کے نور کو نہیں دیکھا۔ اگر نور طاعت کو کبھی دیکھ لیتا تب معلوم ہوتا کہ معصیت میں کیسی ظلمت ہوتی ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو اسکو امتحان کر کے دیکھ لو۔ امتحان ہی کے طریقے سے تھوڑے دنوں طاعت کر کے دیکھو۔ زیادہ نہیں دو چار ہی دن سہی بلکہ ایک ہی دن سہی یا ایک ہی رات سہی۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خواب راہگذار امشب اے پسر　　　سبحان اللہ

خواب راہگذار امشب اے پسر　　　یک شبے در کوئے بے خواباں گذر[1]

([1] اے لڑکے خواب کو ایک روز ترک کر یعنی سونے کے بجائے کسی اللہ والے کے پاس ایک رات گذارئیے)

ایک دن تو ایسا کرو کہ رات کو سونا چھوڑ دو اور جاگنے والوں کے محلہ میں کو گذر جاؤ تب تمھیں معلوم ہو کہ جاگنا کتنی بڑی دولت ہے جس کے سامنے کی کوئی حقیقت نہیں۔ اب تک تو تم نے یہی دیکھا کہ سونا کیا ہے، ایک دن جاگنا بھی تو دیکھ آؤ کہ کیا ہے۔ تب معلوم ہو کہ ہم کتنے بڑے خسارہ میں ہیں اور کس قدر ٹوٹے میں ہیں۔ غرض ع یک شبے در کوئے بے خواباں گذر۔ صرف ایک شب جاگ کر بے خوابوں کو دیکھ لو۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ جاکر ان کے ساتھ عبادت کرلو نہیں بلکہ صرف ان کی حالت ہی دیکھ لو۔ ان کے پاس کو ہی جاکر گذر جاؤ ان کے انوار تم پر منعکس ہوں گے اس وقت منکشف ہوگا کہ ہم سراسر خواب میں ہیں، سراسر غفلت میں، سراپا ظلمت میں ہیں۔ بہرحال امتحان یہ ہے کہ تھوڑے دنوں طاعت اختیار کرکے دیکھ لو تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ طاعت میں کیسا نور ہے اور کیا کیفیت ہے اور اس کیفیت کو ذہن میں محفوظ رکھ کر پھر اس حالت کے اثر کو ذہن میں مستحضر کرو جو حالتِ غالبہ ہے ہماری یعنی معاصی۔ اس کے بعد جو کیفیت طاعت کی ذہن میں محفوظ ہے اس سے اس حالت غالبہ کے اثر کا موازنہ کرو اس وقت معلوم ہوگا هل تستوی الظلمات والنور کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وقت محسوس ہوگا کہ وہ نور تھا یہ ظلمت ہے۔ وہ اور چیز تھی یہ اور چیز ہے۔ تو عبادت اگر خلوص سے بھی نہ کرو محض امتحان ہی کے لئے کرو جب بھی ان شاء اللہ تعالیٰ یہ تفاوت محسوس ہونے لگے گا اور اگر خلوص سے کہیں نصیب ہوگئی عبادت تب تو کچھ انتہا ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں امتحان ہی کے لئے کچھ دن عبادت کرلو اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ اکابر کا ارشاد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امتحان کی نیت سے بھی عبادت کرلینا خالی نہیں حقیقت پر پہنچنے سے ایک درجہ میں۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دل خراش　　　　آزموں را یک زمانے خاک باش

(ایک عمر تو پتھر دلخراش رہا کچھ دن کے لئے تواضع اختیار کرکے تو دیکھ اور خاک ہوجا)

یوں نہیں فرمایا ع از خلوصے یک زمانے خاک باش ۔ بلکہ یوں فرمایا ہے۔
ع آزموں را یک زمانے خاک باش ۔ یعنی خلوص سے توفیق طاعت نہیں تو امتحان ہی کے لئے کچھ روز خاک بن کر دیکھ لو۔ پتھر تو بہت دنوں بن کر دیکھا لیکن کیا دیکھا کچھ بھی نہیں۔ اب کچھ روز خاک بن کر بھی دیکھو تب تفاوت معلوم ہوگا۔ کیا معلوم ہوگا۔ یہ معلوم ہوگا ؎

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ   خاک شو تا گل بروید رنگ برنگ

(موسم بہار میں کیا تجھے نظر نہیں آتا کہ سنگ یعنی پتھر پر سبزہ نہیں اُگتا اس لئے تو خاک ہو جا تاکہ اس تواضع کی برکت سے تیرے اندر اخلاق اور اعمال کے پھول پیدا ہوں)

تفاوت یہ معلوم ہوگا کہ مدتوں پتھر رہے تھے لیکن کبھی ایک پھول بھی نہ کھلا۔ لاکھ بارشیں ہوتی رہیں خاک بن کر دیکھا تو بس ایک بارش ہی کافی ہو گئی۔ طرح طرح کے پھول کھل گئے۔ تمام میدان معطر و معنبر ہوگیا۔ تو مولانا نے تصریح فرمائی ہے کہ ع آزموں را یک زمانے خاک باش ۔ امتحان ہی کے لئے کچھ روز خاک بن کر دیکھو۔ تو معلوم کیا آپ نے تفاوت معلوم کرنے کا طریقہ۔ اس طرح سے اگر امتحان کیا جائے گا تو ظلمت اور نور میں تفاوت معلوم ہو جائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ واقعی معصیت سخت ظلمت ہے۔ چنانچہ جن کو نور نصیب ہو گیا ہے ان کا خود مشاہدہ ہے کہ جن گناہوں سے پہلے مدتوں تک پریشانی تو کیا ہوتی حظ حاصل ہوتا رہا۔ اور جن گناہوں میں مدتوں مشغول رہنے سے بھی حس نہیں ہوتا تھا پریشانی کا آج عزم تو کیا ان کا حدیث النفس بھی ہونے لگتا ہے تو بے انتہا پریشان ہو جاتا ہے اور یہ حالت ہو جاتی ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود
گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے قلب پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاوے یعنی قرب میں ذرا بھی کمی ہونا عاشقوں کو برداشت نہیں)

ایک تنکا بھی اگر باغِ دل میں کم ہو جاتا ہے تو بس پوچھو مت کیا حالت ہوتی ہے لیکن یہ پریشانی اسی کو محسوس ہوتی ہے جو سالک ہو چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس کی عصر کی نماز جاتی رہی تکا نما وُتِرمالُہ واھلُہ وہ لٹ گیا اس کا سارا مال و دولت چھن گیا۔ تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اوروں کو تو علم الیقین کے ذریعہ سے صادق معلوم ہوتا ہے لیکن اہل اللہ اس ارشاد کو عین الیقین کے ذریعہ سے سچ جانتے ہیں۔ اور اہل اللہ کی تو بڑی شان ہے ہم لوگوں کو جن کو نہ کچھ علم ہے نہ ادراک ہے البتہ ضمومتھ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی کی برکت سے اُن حضرات کا ایک چھینٹا ہم پر بھی پڑ گیا ہے اور ایک حالت تمیز کی پیدا ہوگئی ہے۔ اس وقت ایک نظیر یاد آگئی۔ حدیث شریف میں عشا کے بعد بات چیت کرنے کی ممانعت اور کراہت آئی ہے۔ اس کا اعتقاد تو تھا طالب علمی کے زمانہ میں لیکن ذوقاً اس کا درجہ مضرت نہیں معلوم تھا۔ اس وقت اس فعل سے وحشت عقلی تھی طبعی نہ تھی اور اب یہ کیفیت ہے الحمد للہ کہ عشاء کے بعد اگر کوئی سامنے بھی آ کھڑا ہوتا ہے تو سچ جانئے اس قدر غصہ آتا ہے گولی ماردوں۔ کیوں غصہ آتا ہے۔ اب میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ بس اُن حضرات کی صحبت کا اثر ہے اور کچھ بھی نہیں۔ ؎ ولیکن مدتے با گُل نشستم۔ لیجئے اتنی تمیز تو اندھے ہونے پر بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہم اندھے ہیں لیکن اتنا حس تو ہمیں بھی ہونے لگا ہے۔ اور واقعی بعضے اندھوں کو دیکھا ہے کہ ٹٹولنے سے بیل کا رنگ بتا دیتے ہیں یعنی کمر پر ہاتھ پھیرا اور بتلا دیا کہ سفید ہے۔ گو باصرہ صحیح نہیں لیکن لمس کرتے کرتے لامسہ میں بھی باصرہ مودع ہو گیا اور ودیعت ہو گیا۔ گو آنکھیں درست نہیں لیکن چھوتے چھوتے تکرارِ اتصال کی برکت سے ہاتھوں ہی میں آنکھوں کی صفت پیدا ہو گئی کہ ٹٹولنے سے رنگ محسوس ہونے لگا۔ اسی طرح حضرات اہل اللہ کی صحبت میں رہتے رہتے ہمیں بھی کچھ محسوس ہونے لگا ہے

کہ ہاں واقعی عشاء کے بعد جاگنا بڑی وحشت اور کراہت کی چیز ہے۔ تو میں نے یہ ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ پس جب اہل اللہ کی صحبت سے کچھ تھوڑی بہت تمیز ہم لوگوں کو بھی ہونے لگی کہ پہلے جو علم الیقین تھا وہ پھر گویا آنکھوں سے نظر آنے لگا۔ تو جو پوری پوری اطاعت کرے گا وہ تو کیوں نہ دیکھ لے گا کہ واقعی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ و تراہلہ ومالہ وہ بالکل ٹھیک ہے ٹھیک تو پہلے بھی مانتے ہوئے تھا لیکن اب خود اپنی آنکھوں سے نظر آگیا اور اس کو مشاہدہ ہوگیا کہ واقعی میں لٹ گیا۔ اسی کو کہتے ہیں مولانا ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر ان کے قلب کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہوجاوے)

تو یہ گویا مضرت ہے معاصی کے درمیان میں اور یہ گویا ضرر ہے نافرمانی کے درمیان میں۔ لیکن یہ ضرر اُسے محسوس ہوتا ہے جو کبھی طاعت کے نفع کا مشاہدہ کرچکا ہو۔ تو گویا انعکاس سے انوار کے تھوڑا بہت احساس ظلمت کا ہونے لگتا ہے۔ تو بہرحال کیا اس کا امتحان ممکن نہیں ہے۔ اُس امتحان سے بھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعی معصیت کے درمیان میں پریشانی ہوتی ہے پریشانی اس کو اپنی آنکھوں سے نظر آنے لگتی ہے۔ تو اس کو میں بیان کررہا تھا کہ یا تو گناہوں میں مدتوں مشغول رہنے پر بھی پریشانی کا احساس نہ ہوتا تھا یا طاعت اختیار کرنے کے بعد آج حدیث النفس ہونے سے ہی بے حد غم اور پریشانی لاحق ہوجاتی ہے۔ اور جو ابتدا ہی سے طاعت میں مشغول ہیں ان کی حالت تو پوچھو ہی مت معصیت کے دیکھنے ہی سے پریشان ہوجاتے ہیں۔ خود ارتکاب بھی نہیں کیا دوسرے مرتکب ہی کو دیکھ کر یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک بزرگ تھے۔ انھوں نے کسی کو کہیں معصیت میں مبتلا دیکھ لیا۔ گھر جو گئے اور پیشاب جو کیا تو دیکھا کہ بجائے

پیشاب کے خون آتا ہے۔ اس قدر کلفت اور تکلیف انہیں ہوئی محض معصیت کے ارتکاب کو دیکھنے سے معصیت کے ارتکاب کو دیکھ کر ہی اس قدر دلگیر ہوئے کہ پریشانی میں پیشاب کی راہ سے خون آنے لگا۔ خود ارتکاب تو بڑی چیز ہے حضرات اہل اللہ تو دوسرے کو مرتکب دیکھکر بھی بے حد پریشان ہوتے ہیں اسی واسطے بھاگتے ہیں مخلوق سے کہ اہل ظلمت کے دیکھنے سے بھی انہیں تکلیف ہوتی ہے. بہرحال دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ معصیت کے درمیان میں ظلمت ہے۔ تو ایک مقدمہ تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رمضان المبارک کے حقوق کا حاصل ترکِ معصیت ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ معاصی جو ہیں وہ ظلمت ہیں اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے فرار کرتی ہے یہ قاعدہ عقلی ہے یعنی ظلمت نور سے بھاگتی ہے اور نور ظلمت سے مرتفع ہو جاتا ہے۔ اور ہر چند کہ ہر ضد میں احتمال ہے دوسری ضد کے رافع ہونے کا لیکن بعض اضداد میں بعض خارجی دلائل سے یہ خاصیت زیادہ پائی جاتی ہے اور یہ امر مشاہدہ سے متعین ہے کہ ایک ضد پر یہ خاصیت رافع ہونے کی زیادہ صادق آتی ہے اور ایک ضد پر کم یعنی مثلاً نور اور ظلمت ہے۔ محض تضاد کی بنا پر تو نور سے ظلمت رفع ہو جاتی اور ظلمت سے نور مرتفع ہو جاتا کیونکہ فی نفسہ دونوں میں صفت ارتفاع یکساں ہے لیکن اگر غور سے مشاہدہ کیا جائے تو نور میں زیادہ قوت رفع کی ہے اور ظلمت میں کم قوت ہے۔ نور میں تو اس قدر قوت ہے کہ ظلمتیں چاہے کتنی ہی جمع ہو جائیں نور ان کا رافع ہو جاتا ہے۔ ظلمت میں یہ خاصیت نہیں۔ البتہ ظلمت میں یہ خاصیت ہے کہ اگر اسباب ظلمت کے جمع ہو جائیں تو وہ نور کے ساتر ہو جاتے ہیں۔ مزیل نہیں ہوتے تو نور تو رافع ظلمت ہے اور ظلمت ساتر نور ہے اپنے اسباب کے اعتبار سے۔ دیکھئے چراغ جس وقت جلایا جاتا ہے تو اس کا نور تو مکان کی تاریکی کو رفع کر دیتا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مکان میں تاریکی گھس ہی نہیں سکتی۔ جبتک چراغ گھر میں موجود ہے تاریکی

کے آنے کی مجال نہیں۔ باقی ظلمت تو خاصیت فی نفسہ تو اس کی یہی ہے کہ وہ نور کو مرتفع کردیتی لیکن قضیہ شرطیہ کے درجہ میں رہی کہ اذا جاءت الظلمۃ ارتفع النّور لیکن مقدم ہی کا وجود نہیں اس لئے کہ یہی ممکن نہیں کہ نور کے ہوتے ہوئے ظلمت آوے البتہ اگر کسی تدبیر سے اور کسی طریق سے آسکے تو وہ حکم صحیح ہوگا مگر وہ براہ راست آتی ہی نہیں البتہ اگر اس کا کوئی سبب ایسا ہو جو نور کا ساتر بن جاوے تو ظلمت اپنے سبب کے واسطے سے نور کی ساتر ہو جاتی ہے جیسے کوئی چراغ روشن ہے۔ اس کے اوپر کسی نے آکر ہنڈیا رکھ دی تو ظلمت بواسطہ ظرف کے ظاہر ہوئی۔ اور اصل میں ظرف صرف ساتر ہو گیا نور کا۔ تو ظرف سبب ہے ظلمت کا۔ اس کے واسطے سے ظلمت نمودار ہوئی۔ یہ نہیں ہوا کہ ظلمت نے بالکل رفع کردیا ہو نور کو صرف ظرف ساتر بن گیا نور کا۔ اور جہاں تک احاطہ اُس ظرف کا ہے وہاں تک ساتر ہے حد سے اور جو حد سے خارج ہے۔ وہاں تک ساتر نہیں چنانچہ ہنڈیا دائرہ کی شکل ہے۔ تو ہنڈیا کے اِدھر اُدھر تو ستر ہے نور کا۔ لیکن دائرہ کے اندر اندر وہ ظرف حائل نہیں بلکہ اندر تو اور زیادہ نور بڑھ گیا ہے کیونکہ نور کا خاصہ ہے کہ جتنا اس کی شعاعوں کو محدود کرتے جایئے اتنی ہی اس کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ البتہ ہنڈیا کے باہر نور کو زائل کہئے یا مستور کہئے یا مضمحل کہئے وہاں البتہ وہ مضمحل ہو گیا ہے۔ باقی نور کو اس کی حاجت نہیں کہ کسی سبب کے واسطے سے پھیلے یہ نہیں ہے کہ خود نور کے علاوہ کوئی اور سبب نور ہو بہ خلاف ظلمت کے جو اپنے اثر رفع نور میں سبب کی محتاج ہے جیسا کہ ہنڈیا کی مثال سے واضح ہو چکا ہے یعنی چراغ پر جو ظرف کو رکھا گیا تو جس حد تک وہ ظرف مظلم تھا وہیں تک ظلمت پھیل سکی اور جو اُس کی حد سے باہر تھا وہاں ظلمت نہ پہونچ سکی۔

یوں سمجھئے کہ دو طرفین ہیں اُس کی حد کی۔ ایک تو باہر کی طرف اور ایک اندر کی طرف۔ باہر کی طرف جو حد ہے یعنی جو اس کی محیط ہے وہاں سے تو نور کو دفع کرسکا اور جو حد اندر کی طرف ہے وہاں سے نور کو زائل نہیں کرسکا۔ یہاں تو وہ ظرف

اُس کو ایک حدِ خاص تک دفع کر سکا باقی نور میں ایسی قوت ہے کہ وہ سارا ظلمت یا مزیل ظلمت حد کے اندر اندر تک نہیں۔ یہ نہیں کہ جہاں تک چراغ ہو وہاں تک تو وہ نور ہو اور جہاں تک چراغ نہ ہو وہاں تک نہ ہو۔ نہیں بلکہ نور اپنی شعاعوں سے نورانی کرتا ہے اور وہ خاص اس حد تک نہیں جس حد تک چراغ ہے۔ البتہ اگر کسی وجہ سے کہیں شعاع نہ پہونچی تو وہاں البتہ ظلمت رہے گی لیکن پھر بھی شعاعیں وہ چیز ہیں کہ جس حصہ میں ظلمت ہے وہاں بھی ظلمت محضہ نہیں ہے بلکہ ایسی ظلمت کہ مرکب ہے نور ظلمت سے جس سے وہ نور ضعیف ہو گیا جس کو ظل کہتے ہیں۔ چنانچہ سایہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ ایک کیفیت ہے۔ جو مرکب ہے ظلمت اور نور سے بہر حال یہ تو سائنس کا مسئلہ ہے جو تفنن کے طور پر ذہن میں آگیا۔ اس مضمون سے جو میں بیان کر رہا تھا اس کا کچھ زیادہ تعلق نہیں لیکن کچھ تعلق ضرور ہے کیونکہ طاعت جو نور ہے اور معصیت جو ظلمت ہے ان میں سے بھی ہر ایک کا دوسرے پر اثر ہوتا ہے۔ نور طاعت کا تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ ظلمتِ معصیت کو دور کر دیتا ہے اور ظلمت معصیت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر ظلمتِ معصیت ہو تو نور طاعت کا اثر کم ہوتا ہے۔ صرف اس قدر تعلق ہے اس مضمون سے مگر مقصود اصلی یہ فرع بیان کرنا نہیں بلکہ مقصود اصلی یہ ہے کہ ظلمت اور نور میں تضاد ہے یعنی نور جو ہے وہ ظلمت کا رافع ہوا کرتا ہے۔ یہ گویا تیسرا مقدمہ ہوا میں ان تینوں مقدمات کا مختصراً پھر اعادہ کرتا ہوں۔

پہلا مقدمہ تو یہ ہے کہ رمضان المبارک کے حقوق یہ ہیں کہ جملہ معاصی کو ترک کر دے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ معصیت ظلمت ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ نور دافع ظلمت ہے۔ ان تینوں مقدمات کے بعد سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اس آیت میں جو میں نے تلاوت کی ہے رمضان المبارک کے حقوق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان المبارک کی ایک خاص فضیلت فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مہینہ نورانی ہے چنانچہ نورانی ہونا اس کا بھی مذکور ہوگا۔

اب اُن مقدمات کو مستحضر کر لیجئے کہ نور کی خاصیت ہے دفع ظلمت جب نور کی خاصیت دفع ظلمت ٹھہری تو اس کا مقتضا یہ ہوا کہ ظلمت دفع ہوا اور وہ تھی معصیت تو معصیت کو ترک کرنا گویا حقوق رمضان میں سے ہوا۔ یہ دلالت ہوگئی ۔ اس طرح یہ مہینہ نورانی ہے وہ اس طرح کہ حق جل و علا شانہ فرماتے ہیں شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس و بینات من الھدی والفرقان ۔یعنی یہ ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے اور قرآن کی خاصیت ہے ھدی للناس وبینات من الھدی والفرقان یہ سب مادے دلالت کر رہے ہیں قرآن مجید کے نور ہونے پر ھدیٰ ۔بیّنات فرقان ہدیٰ وبینات تو ظاہر ہے رہا فرقان سو فرقان کسے کہتے ہیں۔ ممیز بین الحق والباطل کو یعنی قرآن مجید سے فرق ہوتا ہے حق اور باطل میں اور یہ حقیقت شناسی ہی نور ہے کیونکہ نور یہ تھوڑا ہی ہے کہ اس میں چمک اور دمک ہو۔ کہیں چمک اور دمک پر مغرور نہ ہو جانا کہ کچھ تارے سے نظر آنے لگے تو سمجھ لیا کہ ہمارے قلب میں نور پیدا ہو گیا۔ ارے وہ نور ہی کب ہے قلب میں تو وہ نور ہے کہ اس کے آگے نور شمس کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

شمس تبریزی کہ در نور مطلق است

آفتاب ست وزانوار حق ست

(حضرت شمس تبریزی کہ وہ سراپا ہدایت ہیں بلکہ آفتاب ہدایت ہیں اور حق تعالیٰ کے نور خاص کے حامل ہیں)

اب شمس تبریزی کوئی نور تھے ۔کیا ان سے کوئی لال ٹین روشن ہو جاتی تھی۔ حکما بھی نور کی حقیقت کو کچھ سمجھے ہیں مگر عوام وہاں تک نہیں پہونچے ۔ حکما علم کو کہتے ہیں کہ نور ہے حالانکہ علم آنکھوں سے نظر آنے والا نور نہیں مثلاً ہم کو علم ہے کہ زَیْدٌ قَائِمٌ تو کیا اس علم کی وجہ سے کوئی چمک نظر آنے لگی۔ اگر اندھیری کوٹھری میں بھی تصور کریں اور زید کا ادراک کریں تو کیا کوئی چمک محسوس ہوگی ۔ اس تصور سے کونسی

چمک پیدا ہو گئی۔ عوام نور کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ جب اللہ تعالیٰ کی یہ صفت سنتے ہیں کہ اللہ نور السموات والارض تو یہ سمجھتے ہیں کہ نور حق بھی کوئی چمکدار چیز ہو گی۔ اسے صاحبو چمک اس کے سامنے کیا چیز ہے وہ تو وہ نور ہے کہ چمک بھی ظلمت ہے اس کے سامنے۔ مگر جہلا یہی سمجھتے ہیں کہ اللہ کے نور میں بھی چمک ہوتی ہے چنانچہ اس وقت دو قصے بیساختہ یاد آگئے۔ ایک تو ہمارے ننہال ہی کا ہے۔ ہمارے ننہال میں ایک بزرگ تھے ذاکر شاغل۔ یہیں تھانہ بھون کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں دیا سلائی نئی نئی چلی تھی بہت سے لوگوں نے تو دیکھی بھی نہ تھی۔ ایک درویشی کا مدعی جاہل شخص کہیں سے آگیا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ میں تمہیں خدا کا نور دکھا دوں گا۔ یہ مشتاق تھے ہی انہیں باور آگیا۔ واقعی طلب وہ چیز ہے کہ بہت سے طالب دھوکوں میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں جب حقیقت نہ معلوم ہو۔ مقام وعدہ کا غوث گڈھ قرار پایا کہ وہاں چل کر دکھائیں گے۔ غوث گڈھ ایک چھوٹا سا گاؤں یہاں سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں بستی کے باہر ایک ویران مسجد ہے۔ اُس نے کہا کہ اس مسجد میں لیجا کر تمہیں اللہ کا نور دکھائیں گے کیا سب کے سامنے اللہ میاں کو اپنا جلوہ دکھلاتے ہوئے نعوذ باللہ شرم آتی تھی۔ کیا نعوذ باللہ ان میں عورتوں کی صفت ہے۔ مگر صاحب طلب عجیب چیز ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ طلب کے اندر ایک شان حیرت کی ہوتی ہے۔ جب علم پر طلب غالب ہو اسی واسطے یوں دعا کرنی چاہیے کہ حق تعالیٰ طلب اور علم دونوں عطا فرمائے۔ نرے عشق اور نرے طلب کے اندر عقل مغلوب ہو جاتی ہے۔ بہت لوگ عشق میں کہیں کے کہیں چلے گئے ہیں۔ عقل مغلوب ہونے پر یاد آیا۔ ایک بنیہ کی تھالی گم ہو گئی تھی۔ اُس نے سب جگہ تو دیکھا ہی مگر گھڑے کے اندر بھی دیکھا کسی نے کہا ارے بے وقوف تھالی اور گھڑے کے اندر یہ کیا حماقت ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ گھڑے کے اندر تھالی نہیں جا سکتی مگر احتیاطاً دیکھ لیا۔ تو وہ کیا بات تھی۔ حرص تھی۔ اجی کسی کو

عشق دنیا کا کسی کو عشق دین کا۔ اس بنیہ پر اس قدر عشق تعالیٰ کا غالب ہوا کہ جہاں ہونا عقل بھی جائز نہیں رکھتی وہاں بھی تلاش کر لیا۔

اس قصے سے بھی وہی مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ جب طلب کا غلبہ ہوتا ہے تو سمجھ جاتی رہتی ہے اور جب عشق غالب ہوتا ہے تو عقل برباد ہو جاتی ہے۔ لکھے پڑھے آدمی جاہل کے کہنے میں آ گئے۔ غوث گڑھ پہونچے۔ اس نے کہا کہ پہلے دو رکعت پڑھو پھر کچھ وظیفہ بتا دیا کہ ایسے آنکھیں بند کئے پڑھتے رہنا جس وقت میں کہوں فوراً آنکھ کھول دینا۔ پھر جو دیکھو گے وہ اللہ کا نور ہوگا۔ بے چاروں نے سارے جتن کئے۔ اول دو رکعتیں پڑھیں پھر بیٹھے غریب آنکھیں بند کر کے اور وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے سے آواز آئی ہوں۔ انھوں نے جو آنکھ کھولی تو دیکھا کہ تمام مسجد روشن ہے۔ تو ظالم نے کیا شرارت کی تھی کہ پس پشت کھڑے ہو کر ایک دیا سلائی جلا کر ہوں کر دیا۔ دیکھا تمام مسجد نور سے روشن ہے۔ مگر لکھے پڑھے آدمی تھے وہ یوں کہتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ میرا سایہ بھی پڑ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو خدا کا نور ہے اس میں ظلمت کیسی۔ یہ خدا کا نور کیسا ہے جس میں ظلمت کے دفع کرنے کی بھی قوت نہیں۔ مجھے اس پر ہوا شبہہ مڑ کر جو دیکھا تو آپ ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی لئے کھڑے ہیں۔ اُٹھ کر اور جوتہ نکال کر دہ جوتہ دہ جوتہ۔ پیر صاحب کی خوب ہی مرمت کی۔ کہا نالائق یہ خدا کا نور ہے۔ جب نجات ہوئی صاحب اس دھوکہ بازسے۔ تو غرض وہ کیا بات تھی۔ اس نے نور چمک کا نام سمجھا تھا اسی سے دھوکہ دینا چاہا۔ دیکھئے علم بھی کیا کام کی چیز ہے اور زیادہ دھوکہ تو جب ہوتا جب اس نور کے ساتھ ظلمت بھی نہ ہوتی۔ چنانچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس شعبدہ پر ایک حکایت اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاد آئی۔

مولانا فرماتے تھے کہ ہم نے بچپن میں سنا تھا کہ دیوالی کی رات کو جن بازاروں میں نکلتے ہیں اور ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کے سایہ نہیں ہوتا۔ دیوالی کی رات آئی ہم شوق

میں اور جنون میں بازار میں پہنچے۔ دیوالی کے چراغ جل رہے تھے۔ دیکھا کہ مجمع تو بہت ہے مگر کسی کے سایہ نہیں نہ اِدھر نہ اُدھر۔ بہت سے لوگ ان میں ایسے بھی تھے جنھیں اُسی دن اول بار دیکھا تھا۔ پہلے سے بالکل جان پہچان ہی نہیں تھی۔ ان پر تو جن ہونے کا گمان ہوسکتا تھا لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جن سے جان پہچان تھی ان کے بارہ میں یہ تاویل کرلی کہ ممکن ہے کہ جن ان کی صورت میں آگئے ہوں جن سے جان پہچان ہے۔ مگر پھر اپنے کو جو دیکھتے ہیں تو یہاں بھی سایہ نہیں۔ بڑے حیران کہ اے اللہ اپنا تو علم ہے کہ میں محمد یعقوب ہوں، میں کیسے جن ہوسکتا ہوں مولانا ذہین تھے یہ بعد بچپن کا قصہ ہے مگر ذہانت بچپن ہی سے غضب کی تھی سوچا تو فوراً سمجھ میں آگیا کہ میاں چاروں طرف تو چراغ ہیں آخر سایہ ہو کدھر۔ یہ وجہ ہے سایہ نہ پڑنے کی۔ جن دن کوئی نہیں تو اس شعبدہ باز کو سوجھی نہیں ورنہ وہ بھی کوئی ایسا پکھنڈ کرتا کہ مشتاق زیارت کو اپنا سایہ بھی نظر نہ آتا۔ مگر باطل کے پیر نہیں اللہ تعالیٰ کسی اور طریق سے اس کو رسوا فرما دیتے۔ تو غرض عوام کا یہ اعتقاد ہے کہ نور چمک کو کہتے ہیں۔

ایک اور شخص تھا۔ ہمارے یہاں کانپور میں آیا تھا۔ اس کی بھی تمنا یہ تھی کہ کسی طرح خدا کا نور دیکھ لوں۔ چنانچہ اسی تمنا میں میرے پاس بھی آیا تھا میں نے کہا کہ بھائی خدا کا نور تو خود میں نے بھی نہیں دیکھا۔ پھر میں تمھیں کیا دکھا سکتا ہوں اور میں کیا دیکھتا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی نہیں دیکھا تو ہماری تمہاری تو کیا حقیقت ہے۔ اور انھوں نے تمنا بھی کی لیکن تمنا پر بھی صاف جواب مل گیا۔ کہ لن ترانی اور لن فرمایا یعنی کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ لیکن یہ تابید بھی مؤبد نہیں بلکہ مقید ہے اور محدود ہے۔ تابید کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک دنیا کی تابید اور ایک آخرت کی تابید۔ آخرت کی تابید تو غیر محدود ہے لیکن دنیا کا جو ابد ہے وہ حقیقۃً ابد ہی نہیں کیونکہ ابد تو وہ ہے کہ لا آخر لہٗ جس کا اخیر نہ ہو۔ لیکن یہ بھی محاورات میں ابد ہی کہا جاتا ہے۔ اور جس طرح ابدیت کے صیغہ سے کبھی مدت محدودہ مراد ہوتی ہے

اسی طرح کبھی مدت محدودہ کے صیغہ سے بھی ابدیت مراد ہوتی ہے جیسے شیطان کے بارہ میں ارشاد ہے ان علیك لعنتی الیٰ یوم الدین یہاں الیٰ یوم الدین سے مراد ابدِ غیر محدود ہے مگر بعض کج فہم لوگ اس کو ابدیت غیر محدود سمجھ کر شیطان کی نجات کے قائل ہو گئے کہ صرف قیامت تک اس پر لعنت رہے گی پھر نہ رہے گی حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مراد تو ہوتی ہے ابدیت غیر محدود لیکن اس کو تعبیر اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ تابید محدود کو تعبیر کرتے ہیں اس واسطے کہ ہم لوگوں کی عقول ضعیفہ کی رعایت سے قرآن مجید ہمارے محاورات میں نازل ہوا ہے۔ سو ہم ابدیت غیر محدودہ کو بھی اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں کہ قیامت تک یہ بات نہ ہوگی یعنی کبھی نہ ہوگی دوسرے یہ کہ دنیا دار العمل ہے اور اس کا منتہا قیامت ہے پس جب ایک شخص دنیا کے ختم تک ملعون رہا اب دار الجزاء میں ناجی ہونے کا اس کے کیا احتمال ہے اس طرح بھی ابدیت غیر محدودہ لازم آگئی گو لفظ کو اس پر دال نہ مانا جائے اس واسطے میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے عربی کی صرف و نحو کے علاوہ محاورات سے علم کی بھی ضرورت ہے۔ محاورات نہ جاننے ہی کی وجہ سے یہ سمجھے کہ الیٰ یوم الدین میں غایتِ حقیقہ ہے پس شیطان قیامت تک تو مردود رہے گا بس قیامت میں مرحوم ہو جائے گا نعوذ باللہ بالکل غلط بلکہ عجب نہیں کفر ہو یہ اعتقاد اس واسطے کہ شیطان کے مردودِ ابدی ہونے پر سب کا اجماع بھی ہے اور منصوص بھی ہے اس آیت میں کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریٔ منك انی اخاف اللہ رب العالمین فکان عاقبتہما انہما فی النار خالدین فیہا وذلك جزاء الظالمین۔ بہرحال یہ ابدیت کبھی ختم نہ ہوگی۔ اور لن ترانی میں اس کا عکس ہے کہ لفظا بدیت کا ہے مگر مراد مدت محدود ہے سو بعض کو اس میں غلط فہمی ہوئی اور اسی غلط فہمی کی وجہ سے معتزلہ اس کے قائل ہو گئے کہ یہاں تابید دائمی مراد ہے۔ آخرت میں بھی رویت نہ ہوگی۔ مگر یہ غلط ہے یہی عقیدہ متواتر المعنی ہے کہ آخرت میں رویت باری تعالیٰ ہوگی اور وہ جب عوام مؤمنین کو بھی ہوگی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔

ان کو کیوں نہ ہوگی۔ اسی واسطے یہاں لن ترانی محمول ہے تابید محدود پر نہ کہ تابید دائم پر بہر حال میں نے اس شخص سے کہا کہ یہاں دنیا میں رویت شرعاً محال ہے۔ کہنے لگا میں چاہتا ہوں اور یہ میرا عقیدہ ہے مگر کیا کروں شوق ایسا ہے کہ میں اس تمنا سے باز نہیں آسکتا۔ میں تو طلب کروں ہی گا چاہے کامیابی نہ ہو۔ چنانچہ اس کی کیفیت یہ تھی کہ بے انتہا سوزش اور درد اور کرب میں مبتلا تھا رات بھر اس قدر بے چین رہتا تھا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ جانے کتنا زمانہ اسی حالت میں گذر چکا تھا۔ اس کے پاس بیٹھنے سے ایک درد اور سوزش سی محسوس ہوتی تھی۔ پہلے وہ ہندو تھا۔ کبھی کہتا تھا کہ میں مذہب بھی اسی تمنا میں بدل چکا ہوں۔ چنانچہ اسلام کے قبل بھی اسی طلب میں تھا یعنی ہندو ہونے کی حالت میں بھی کہنے لگا میں بڑے بڑے رشیوں جوگیوں اور منیوں سے ملا لیکن سب نے جواب دیدیا کہ یہاں تو یہی مالا جپنا ہے۔ بھائی ہم تمھیں خدا کا نور نہیں دکھا سکتے۔ البتہ ایک نے وعدہ کیا کہ پرمیشر کی جوت ہم تمھیں دکھائیں گے۔ پھر اس نے کیا کیا کہ مغرب اور عشاء کے درمیان مجھے جھونپڑی کے اندر لیجا کر باہر کی طرف اشارہ کیا دور ایک روشنی نظر آئی جو چل رہی تھی اور آہستہ آہستہ آگے کو اچھلتی ہوئی سرک رہی تھی۔ اس نے کہا دیکھ یہ ہے جوت پرمیشر کی۔ میں اس کی طرف دوڑا تو اس نے جھٹ میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ ہاں ہاں یہ کیا کرتا ہے ارے یہ پرمیشر کی جوت ہے جل جاوے گا۔ وہ جوت ایسی تھوڑا ہی ہے کہ اس کی کوئی تاب لا سکے۔ میں نے کہا میں تو مرنے ہی کو پھر رہا ہوں۔ اگر پرمیشر کی جوت میں جل کر مر جاؤں تو اس سے بڑھ کر کیا ہے۔ یہ تو میری عین تمنا ہے۔ غرض وہ بوڑھا تھا میں جوان۔ ہاتھ چھوڑا کر دوڑتا ہوا جو اس روشنی کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کچھوا ہے اس کے سر پر بہت سی مٹی جمی ہوئی ہے اور اس مٹی پر ایک چراغ رکھا ہوا ہے جس میں موٹی سی بتی پڑی ہوئی ہے۔ کہتا تھا کہ اول تو میں اس روشنی کو دیکھتے ہی دھوکہ میں آگیا کہ ہوگا نور اللہ میاں کا۔ جب میں نے اس روشنی کو اچھلتے ہوئے دیکھا تو اس پر مجھے شبہ ہوا۔ واقعی عقل بھی بڑی نعمت ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ نور اچھلتا کیوں ہے۔ آدمی بھی جو شریف ہوتا ہے اس میں بھی وقار ہوتا ہے۔ اچھلتا کودتا نہیں۔

(باقی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

یہ تو پرمیشر ہے یہ اُچھلتا کودتا بچوں کی طرح کیوں چلتا ہے اس سے مجھے شبہ ہوا اس لئے میں بھاگا کہ آخر دیکھوں تو کیا ماجرا ہے۔ اُس نے مجھے پکڑا بھی مگر میں ہاتھ چھڑا کر بھاگ ہی گیا۔ لوٹ کر اُسے کہا واہ باواجی اچھا پرمیشر دکھایا۔ وہ ہنسنے لگا کہ بچہ میرے پاس تو یہی ہے کہ جھونپڑی میں رہ اور بس پڑا موج کیا کر۔ یہاں تو بیٹھے پوری کچوری اور بالائی اور مٹھائی لیے جاؤ۔ بس بیٹھو اور بجو۔ لیکن ان کو بھلا ان چیزوں کی کب ہوس تھی یہاں تو طلب ہی اور تھی اور یہ خود بڑا شخص تھا مشہور جوگی تھا ریاضت مجاہدے بہت کیا کرتا تھا۔ اسی دوران میں خدا کے نور کی طلب دل میں پیدا ہوگئی۔ اس لئے کہا کہ باواجی یہ چیزیں مجھے درکار نہیں مجھے تو خود یہ سب حاصل تھا اب میں نے اس کو جو چھوڑا ہے تو اسی طلب کے اندر کہ کسی طرح خدا کو دیکھ لوں۔ اسی طلب کے اندر یہ نیازمندی اختیار کی ہے۔ مگر صاحبو طلب عجیب چیز ہے واقعی اگر اس نے خدا کو نہیں دیکھا تو اس طلب کا نتیجہ اتنا تو ہوا کہ اس وقت خدا کے دیکھنے کے قابل تو ہوگیا۔ یعنی مسلمان تو بنا۔ ہائے ؎

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدینسان
بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آوے گا تو مزار پر ضرور آوے گا)

طلب تو وہ چیز ہے کہ مطلوب کو دروازہ پر حاضر کر دیتی ہے۔ پھر طالب کو مطلوب کے دروازہ پر حاضر کر دیتا تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ وہ مضمون ہے جس سے حضرت صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک اعتراض کا جواب دیا تھا کیونکہ اس طرح کہ معراج شریف کے قصہ میں کفار حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انہیں اطلاع دی کہ تم نے سنا بھی تمہارے دوست نے ایک اور بھی

ضروری اطلاع: خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

دعویٰ منکر کیا ہے کہ مجھے آسمان پر بلایا گیا تھا مجھے معراج ہوئی ہے۔ میں سب آسمانوں بلکہ عرش تک کی سیر کر آیا ہوں تم نے سُنا بھی یہ ایک اور نئی بات ہوئی ہے۔ اب تک تو صرف نبوت ہی کا دعویٰ تھا۔ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہوئی آپ نے فرمایا بڑھ کر تو نہیں ہے بلکہ گھٹ کر ہے۔ جب میں اس کی تصدیق کر چکا ہوں کہ آسمان والے یعنی فرشتے ان کے پاس آتے ہیں تو اگر یہ آسمان والوں کے پاس پہنچا دیئے گئے تو عجب ہی کیا ہے۔ جس کے یہاں بادشاہ آتا ہو اگر اس کو دربار میں بلا لے تو واللہ کچھ بھی حیرت کی بات نہیں۔ میں جب جبریل (علیہ السلام) کی نسبت جو کہ سدرۃ المنتہیٰ کے بسنے والے ہیں اور عرش جن کا نشیمن یہ تصدیق کر چکا ہوں کہ وہ خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دروازہ پر حاضر ہوتے ہیں تو اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جبریل (علیہ السلام) کے نشیمن پر تشریف لیجانیکا دعویٰ فرمائیں تو کیا میں ان کی تکذیب کر دوں گا۔ تم لوگ بے وقوف ہو کہ ایسی بات میں مجھ کو دھوکہ دینے آئے ہو۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں تو مجھے ایمان لانے اور انھیں سچا سمجھنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ جواب ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کفار کے مقابلہ میں پیش کیا تھا۔ غرض عشق میں یہاں تک خاصیت ہے کہ ؎

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدینسان
بجنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد (اوپر ترجمہ ہے)

اس پر ایک لطیف نکتہ بعض اہلِ لطائف نے کیا ہے بعضے نکتے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ علوم تو نہیں ہوتے محض نکتے دل خوش کُن ہوتے ہیں لیکن اگر متایّد ہوں نصوص سے تو ان میں بھی ایک علم کی شان پیدا ہو جاتی ہے ۔ دعویٰ تو نہیں کیا جاتا احتمال کا درجہ ہے۔ ایک محل ہے یہ بھی جو حدیث میں ہے کہ جب مومن دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آکر تین سوال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی سوال ہوتا ہے ما تقول فی ھذا الرجل

یعنی یہ کون بزرگ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو ہمارے پیغمبر ہیں۔ جو ہماری ہدایت کے لئے حق کے یہاں سے بینات لائے اور آیات لائے۔ یہ ہے مضمون حدیث کا۔ یہاں یہ سوال کیا گیا ہے ہٰذا محسوس باشارۂ حسیہ کے لئے ہے۔ وہاں قبر میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہوں گے جو ہٰذا سے پوچھا جاوے گا۔ جمہور نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہر مومن کے ذہن میں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوں گے علم ضروری کے طور پر حق تعالیٰ کی تائید سے اس کی یہ صورت ہوگی کہ مومن کے قلب میں اس وقت علم ضروری کے طور پر یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پوچھ رہے ہیں یہ جواب بالکل کافی ہے۔ لیکن بعض اہل لطائف اس طرف بھی گئے ہیں۔ یہ تھا تو احتمال کے درجہ میں مگر عشاق نے محقق کرلیا ہے شوق میں۔ اس کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں تمنا اور شوق کے درجہ میں کیا حرج ہے اگر اس امید سے متلذذ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کیوں نہ کہہ دیا جاوے کہ اس کے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان میں جتنے حجاب ہیں وہ سب اٹھا دیئے جاویں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ نما ہوں گے۔ اب چونکہ یہ شخص مشرف بالزیارت ہے اور پہچانتا ہے کہ یہ آپ ہیں۔ اس لئے فرشتوں کے سوال کا جواب آسانی کے ساتھ دے رہا ہے۔ اور یہ رفع حجاب جو ہے اس میں بھی دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ پر رہیں، یہ اپنی جگہ پر رہے اور درمیان کے حجاب اٹھیں۔ اور ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرم فرمائیں بعض عشاق شدت شوق میں اس طرف چلے گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مومن کی قبر میں تشریف لائیں گے۔ بعضے عشاق نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر موت کی تمنا اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے شوق میں کرے تو جائز ہے کچھ حرج نہیں۔ شوقًا الی لقاء اللہ تو تمنا موت کی جائز ہے ہی شوقًا الی لقاء رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تمنا موت کی جائز ہے۔

استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت زندہ دل تھے۔ اُن پر شوق کی حالت غالب تھی۔ صاحب حال بزرگ تھے۔ اس حدیث کے متعلق کسی طالب علم نے سوال کیا تھا کہ قبر میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مشہور ہے اس کی کیا اصل ہے یہ سن کر مولانا پر حالت طاری ہو گئی۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

کشتۂ کہ عشق دارد نگذارد ت بدینسان
بہ جنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد (ترجمہ اوپر ہو چکا ہے)

اور فرمایا کہ مقتضیٰ تو اس تعلق کا جو ہم کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اتنی طویل ہوتی کہ آپ ہر امتی کے جنازہ پر خود تشریف لاکر نماز جنازہ پڑھتے مگر خدا کی حکمتیں ہیں آپ کی وفات ہی میں مصلحت تھی۔ خیر اگر یہ دولت حاصل نہ ہو سکی تو کیا عشق کی خاصیت خالی جا سکتی ہے۔ اگر جنازہ پر نہیں تو مزار ہی پر لاکر کھڑا کر دیا کہ دیکھ لو یہ وہی محبوب ہیں جن کے شوق اور محبت میں تم نے عمر گنوادی اور اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ مگر یہ سب مشتاقین کے نکات ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے گمان کے موافق ان کے اس شوق کو پورا بھی کر دیا جائے۔ کیا عجب ہے کہ گو یہ زیارت عام نہ ہو لیکن حق تعالیٰ بعض خاص خاص عشاق کی کشش شوق میں یہ خاصیت محقق کر دیں اور ان کے اس اُمنیہ کو انا عند ظن عبدی بی کی بنا پر پورا کر دیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔

بہر حال میں اس کو عرض کر رہا تھا کہ طلب وہ چیز ہے کہ خود مطلوب کو طالب کے دروازہ پر حاضر کر دیتی ہے تو اگر طالب کو مطلوب کے دروازہ پر حاضر کر دے تو کیا تعجب ہے۔ تو اس شخص کی طلب نے اس کو مطلوب کے دروازہ پر تو پہنچا ہی دیا جو اسلام ہے اور جو باب حقیقی ہے رویت باری تعالیٰ کا۔ خیر رویت نہیں ہوئی لو رویت کے قابل تو بنا دیا۔ ہوسناک کے لئے تو کم ہے مگر

طالب صادق اور عاشق کے لئے تو یہی بہت کچھ ہے ؎

مرا از زلف تو موئے بسند ست

ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست

(مجھے آپ کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس مجھے نہیں ہے)

یہ شعر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر لکھا ہے۔ اللہ اکبر کیا موقع پر لکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ایک صحابی لے ترا شے۔ پھر آپ کے حکم سے وہ سب لوگوں کو تقسیم کئے گئے۔ اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد شیخ لکھتے ہیں کہ بڑے خوش قسمت تھے وہ لوگ لیکن ہم بھی بدقسمت نہیں۔ خیر اگر بال ہم تک نہیں پہونچے تو ہم کو یہ بھی کم نہیں کہ اس واقعہ کی خبر تو پہونچ گئی۔ اور اس مقام پر انہوں نے یہ شعر لکھا ہے ؎

مرا از زلف تو موئے بسند ست

ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست (ترجمہ اوپر ہوچکا)

واقعی عاشق صادق کی یہی شان ہے کہ جس کو ہر چیز میں چاہے کسی درجہ کی ہو اپنے محبوب ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں نا ؎

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست

یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(جو کچھ جہان میں دیکھتا ہوں یا تو ہے یا تیری خوشبو ہے ...)

ہر درجہ پر قانع ہیں اس واسطے کہ محبوب سے کچھ تو تعلق ہے ؎

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(اوپر ترجمہ ہوچکا)

تو غرض شیخ کہتے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ہم تک نہیں پہونچے تو خیر یہی سہی خبر تو پہونچی۔ ع بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے + یعنی اگر محبوب کی

حکائیتیں بھی ہم تک نہ پہونچتیں تو کیا ہوتا۔ پھر کونسی تسلی تھی عاشق کے لئے اس سے زیادہ اگر ہو جائے عنایت ہے ورنہ ہمارا حق تو اتنا بھی نہیں۔ یہ نہایت تواضع کی بات ہے۔ عاشق صادق کو عبدیت لازم ہے اور عبدیت کا خاصہ ہے کہ بلند پروازی نہیں رہتی۔ جو کچھ بھی عطا ہو جائے اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھتا ہے وہ بزبانِ حال یا بزبان قال یہ کہتا ہے ؎

عطا حق محبت عنایتے ست زدوست
وگرنہ عاشق مسکین بہیچ خرسند ست

(دولت محبت بھی حق تعالیٰ کی عطا اور توفیق سے ہے وگرنہ عاشق مسکین
کس بات سے خوش ہے یعنی اسی توفیق سے)

عاشق مسکین کو تھوڑا سا بھی مل جائے تو وہ اس میں بھی راضی ہے۔ اور یہ مشرب الحمدللہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ایک زندہ بزرگ کا دیکھ لیا ورنہ کتابوں ہی میں پڑھے ہوتے تو یہ سمجھتے کہ لوگوں کی لطافتیں ہیں ذہانتیں ہیں توجیہیں ہیں اپنے بزرگ کے اقوال کی۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دیکھنے کے بعد اب کوئی شک نہیں رہا۔ حضرت کا بھی بالکل یہی مشرب تھا۔

؎ وگرنہ عاشق مسکین بہیچ خرسند ست

میں کہتا ہوں جس کا نام عبدیت ہے۔ بڑی مشکل ہے۔ سب کمالات کا حصول آسان ہے عبدیت ہی کا حاصل کرنا مشکل ہے۔ حضرت میں بفضلہ عبدیت کامل عطا فرمائی گئی تھی۔ گویا عبدیت اس زمانہ میں حضرت ہی کا حصہ ہے۔ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضرت کوئی ایسی ترکیب ارشاد فرمائیں کہ جس سے زیارت جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاصل ہو جائے۔ فرمایا آہا آپ کا بڑا حوصلہ ہے کہ آپ کا ذہن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت تک پہنچتا ہے۔ آپ کی نظر بہت دور پہونچی واللہ ہم تو اپنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبد شریف کی زیارت کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ اگر وہی نصیب ہو جائے تو بسا غنیمت ہے۔ اس سے آگے تو

ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا آپ بڑے لوگ ہیں کہ آپ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تمنا ہے۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے عبدیت کا اور یہی ہے وہ حالت جس کو حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود
کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے

(بخدا مجھے تو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے اور دل رکتا ہے کہ ان نظروں سے محبوب کو دیکھوں)

قسم کھاتے ہیں کہ میرا جی اس سے بھی جھجکتا ہے اور رکتا ہے کہ محبوب کو ان نظروں سے دیکھوں۔ دیکھئے عاشق اس سے بھی جھجکتا ہے کہ محبوب کو آنکھ اٹھا کر دیکھے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو بے عقلوں کا مذاق ہے۔ صحابہ سے زیادہ تو کوئی عقلمند نہ تھا۔ ایک صحابی سے کسی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک پوچھا تو آپ کہتے ہیں کہ ارے یہاں دیکھا تھا کس نے نظر بھر کر جو بیان کردوں بیٹھ کر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حلیہ تھا۔ ہمت ہی نظر بھر کر دیکھنے کی کبھی نہ ہوئی۔ ایک کافر رئیس کی شہادت جو حدیبیہ میں صحابہ کی حالت دیکھ کر اپنی قوم کے پاس گیا تھا انھوں نے پوچھا کہ کیا حالت ہے اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی۔ اس نے بہت سے واقعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب وعظمت بیان کرکے مختصراً یہ حالت بیان کردی کہ لا یحدون النظر الیہ یعنی گھور کر نہیں دیکھ سکتے۔ اور گھورنا کسے کہتے ہیں نظر بھر کر دیکھنے کو۔ غرض کسی کی ہمت نہیں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر بھر کر دیکھ لے۔ بس یہ حالت تھی صحابہ کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً صحابہ نظر بھر کر نہیں دیکھتے تھے اور یہ تو ہمت کس کی ہوسکتی تھی کہ نظر سے نظر ملا کر دیکھے۔ تو عشاق کی شان یہ ہوا کرتی ہے کہ تھوڑے سے پر بھی راضی ہوجاتے ہیں۔ وہی شیخ عبدالحق رحمہ اللہ کا مذاق ؎

مرا از زلف تو موئے بسند است ہوس را رہ مدہ بوئے بسند است

ترجمہ (مجھے تو آپ کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس ہونی چاہئیے)
تو میں کہتا ہوں کہ رویت کی قابلیت ہی عطا ہوجائے۔ گو فی الحال رویت حاصل نہیں لیکن وعدہ تو ہے گو ادھار ہی سہی۔ وہ بھی کافی ہے۔ ایک عاشق کہتا ہے

شعر

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم
کہ شاید دستِ من بارِ دگر جانانِ من گیرد

(اگرچہ دور پڑا ہوں لیکن اس امید پہ خوش ہوں کہ شاید ہمارا محبوبِ حقیقی از راہِ کرم ہمارا ہاتھ دوسری بار پکڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف جذب فرمالے)

امید بھی صرف اتنی کہ شاید ایسا ہوجائے۔ اور واقعی خرسندی امید پر بھی ہوتی ہے دلوکان توهمًا یہاں تک کہ اشعب طماع کی حکایت ہے۔ یہ معمولی شخص نہیں ہیں بڑے معتبر علماء میں سے گذرے ہیں مگر بیچارے مجبور تھے طمع کے ہاتھوں ان کی طمع کی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔ چنانچہ ایک بار انھیں بہت سے لڑکے چھیڑ چھاڑ رہے تھے۔ جو آدمی کسی بات میں مشہور ہوجاتا ہے قاعدہ ہے کہ اُسے لوگ چڑھایا کرتے ہیں۔ انہوں نے لونڈوں سے کہا کہ میاں فلانی جگہ کھانا بٹ رہا ہے۔ یونہی جھوٹ موٹ کہدیا۔ اپنا پیچھا چھڑایا۔ لونڈے دوڑ کر اس طرف کو چھپے انہیں دوڑے ہوئے جاتا دیکھ کر آپ کیا دل میں کہتے ہیں کہ اجی شاید بٹ ہی رہا ہو۔ اور خود بھی پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ حضرت کو طمع کے غلبہ میں یہ یاد نہ رہا کہ میں نے ہی تو ان کو بھگایا تھا۔ اور حضرت ہم ان پر تو ہنستے ہیں لیکن ہم سب مبتلا ہیں ایسے ہی عدم تدبر میں۔ ان کی طمع تو سب کو معلوم تھی ہمارا عدم تدبر کسی کو معلوم نہیں۔ ہمارے دھوکہ کا کسی کو پتہ نہیں۔ وہ کیا عدم تدبر ہے اور ہم کیونکر دھوکہ میں آجاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم اول تو لوگوں کو اپنے جھوٹے حالات اور وضع سے اپنا معتقد بناتے ہیں۔ جب لوگ معتقد ہوجاتے ہیں تو اب ان کے اعتقاد سے خود ہی استدلال کرتے ہیں کہ ہم کچھ تو ضرور ہوں گے تو جب تو لوگ اتنے معتقد ہیں

ہمارے۔ اگر ہم کچھ نہ ہوتے تو کیا سارے کے سارے بیوقوف ہی ہیں۔ اگر ہم واقع میں کچھ نہ ہوتے تو اتنے سارے لوگ ہمارے کیوں معتقد ہوجاتے معلوم ہوتا ہے ہم ضرور کچھ ہوگئے ہیں۔ اور یہ خبر نہیں احمق الناس کو ہمیں نے تو دھوکہ دے کر لوگوں کو اپنا معتقد بنایا ہے اگر ہم کوئی ترکیب نہ کرتے اور پھر بھی لوگوں کا ہمارے ساتھ اعتقاد ہوتا اس میں تو احتمال بھی ہوسکتا تھا لیکن یہاں ہمیں نے تو ترکیبیں کر کر کے لوگوں کو غلطیوں میں اور تلبیس میں ڈالا ہمیں نے تو سارا کارخانہ اور منصوبہ گانٹھا کہ کسی طرح لوگوں کو اپنا معتقد بنانا چاہیئے اور جب لوگ معتقد ہوگئے تو اب ہم اس منصوبہ کو بھول گئے اور اب خود ہمارا بنا ر اعتقاد ان کا اعتقاد ہے۔ ہم ان کے اعتقاد پر بنا رکرتے ہیں اپنے اعتقاد کی۔ تو گویا ہمارا اعتقاد ہماری ہی تلبیس پر مبنی ہے گویا ہم اپنی ہی تلبیس سے اپنے معتقد ہیں تو ہم اشعب طماع پر کیا ہنستے ہیں ہم خود ایسی ہی بیہودگیوں میں مبتلا ہیں۔ یہ تو محض تضریح اور تتمیم فائدہ کے لئے عرض کیا گیا باقی میرا اصل مقصود اس حکایت کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ طلب اور محبت وہ چیز ہے کہ امید موہوم پر بھی طالب مسرور رہتا ہے۔ اسی واسطے کہا گیا ہے ؎

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم

کہ شاید دستِ من بار دگر جانانِ من گیرد (ترجمہ ص۲۳۲ پر ہوچکا)

تو غرض یہ مذاق ہے عاشق کا کہ تھوڑا سا بھی اگر مل جاوے تب بھی اُسے کافی ہے کہتے ہیں نا۔ ع ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے۔ کہیں یہ سُنا تھا کہ ہمارا ذکر محبوب کی محفل میں ہورہا تھا تو بس اسی پر خوش ہو گئے کہ خیر اگر ہم اس محفل میں نہیں تھے تو ہمارا ذکر تو تھا۔ بس اسی پر بے چارہ خوش ہے کہ میرا ذکر تو اس محفل میں ہے۔ مشہور ہے نا کہ ایک دیہاتی عورت اپنے شوہر پر عاشق تھی لیکن وہ اس کی طرف التفات ہی نہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ شوہر گاجریں کھا رہا تھا پلیندی کاٹ کاٹ کر پھینکتا جاتا تھا کھاتے کھاتے آپ کو جو ذرا

ہوا تو بیوی کے پینڈی کھینچکر ماری منہ پر زور سے۔ اور وہ اس کی آنکھ پر جا کر لگی۔ اب آنکھ بند بھی اور آنکھ میں درد بھی لیکن اسی حالت میں اُس نے ڈومنی یا نائن کو بلایا اور اپنے باپ کے گھر یہ کہلا کر بھیجا کہ کھائی بھی گاجر ماری تھی پینڈی اماں سے کہیو کہ کچھ کچھ سہاگ بھوڑنے لگا ہے۔ اب آگئے ہیں بھلے دن۔ چھیڑ چھاڑ تو شروع ہو گئی ہے۔ میرے گاجر کی پینڈی تو ماری اگر نہ مارتے تو میں کیا کر لیتی۔ تو یہ کیا ہے۔ عشق ہے تو محبوب کے دربار میں اپنا بڑا درجہ ہرگز نہ چاہے گا اور عاشق کو تو شرم آتی ہے۔ درجے مانگتے ہوئے۔ کیونکہ وہ اپنی حقیقت خوب جانتا ہے کہ میں ہوں کیا۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ایک گونہ رویت ہی ہے کہ رویت کی قابلیت ہو جائے۔ اگر حقیقی رویت نہیں ہے تو حکمی تو ضرور ہے تو اس نو مسلم نے اپنا قصہ شوق رویت اور اسی شوق میں اسلام لانے کا جو مجھ سے بیان کیا تو مجھے شبہ ہوا کہ جب اس کی طلب کسی جگہ پوری نہ ہوگی تو عجب نہیں کہ یہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائی ہو جائے۔ کہیں کوئی پادری صاحب کہنے لگے کہ میں دکھلا دوں گا تمہیں خدا کا نور پھر وہ بھی کوئی دھوکہ دے۔ اور سائنس والوں کا دھوکہ شاید سمجھ میں بھی نہ آوے۔ میں نے صاف کہدیا کہ بھائی تمہارا کیا اعتبار۔ مجھے قوی شبہ ہوا ہے کہ کہیں تم اسلام ترک نہ کر دو کیونکہ تمہارا مقصود تو یہ ہے کہ میں خدا کو دیکھ لوں۔ جب تمہیں خدا یہاں نہ دکھائی دے گا تو پھر اسلام کو بھی چھوڑ سکتے ہو۔ جیسے کہ ہندوؤں کے مذہب کو چھوڑا اسی تمنا میں مسلمان ہو گئے ہو۔ کہنے لگا جی نہیں۔ اب اسلام کو نہیں چھوڑونگا چاہے کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔ بالکل گنوار اور لٹھ تھا لیکن اس نے ایسے علوم و معارف بیان کئے کہ میں دنگ رہ گیا۔ چنانچہ جب میں نے کہا کہ ہمیں کیسے اطمینان ہو کہ تم اسلام نہ چھوڑو گے۔ اس نے کہا کہ اسلام میں میں نے ایک ایسی خاصیت پائی ہے کہ نہ کسی مذاہب میں تھی نہ ہو۔ میں نے پوچھا کہ وہ کونسی خاصیت ہے۔ کہا اس مذہب میں توحید ایسی کامل ہے کہ کسی مذہب میں نہیں مجھے بڑی حیرت

ہوئی کہ یہ ابھی کیا جانے کہ توحید کیا چیز ہے۔ میں نے پوچھا مثلاً۔ کہا دیکھئے یہ کیا توحید نہیں ہے کہ ایک شخص بھنگی ہے یا چمار ہے۔ وہ مسلمان ہوگیا تو آج تمام مسلمان اس کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلاتے ہیں ورنہ ساری قومیں ایسے شخص کو اپنے سے گھٹا ہوا اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ شادی بیاہ نہ کریں یہ تو اپنی اپنی مصلحت ہے باقی حقیر کوئی نہیں سمجھتا۔ یہ توحید ہی کا اثر ہے کیا اچھی بات کہی اور استدلال بھی کیسے کھلے ہوئے واقعہ سے کیا۔ اللہ کے بندے اب بھی ایسے موجود ہیں جو مساوات کرتے ہیں اگر طوعاً نہیں تو کرہاً ہی۔ ایک حکایت اپنی کرہاً کی اور ایک حکایت دوسرے کی طوعاً کی سناتا ہوں۔ مجھے تو یہ حکایت پیش آئی کہ میں ایک دفعہ کالپی گیا۔ وہاں ایک شخص تھا نہایت صاف ستھرا اجلے کپڑے پہنے ہوئے جامع مسجد میں نماز کو آیا اس کے گاؤں والوں سے معلوم ہوا کہ یہ پہلے بھنگی تھا۔ اب مسلمان ہوگیا ہے لیکن وہاں کے چودھری ساتھ کھلانا پلانا تو درکنار اس کے ہاتھ کا برتن بھی نہیں لیتے تھے۔ وہاں جلسہ تھا اس میں وہ بھی موجود تھا اور وہاں کے رئیس بھی جمع تھے۔ بعض لوگوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس موقع پر ان لوگوں کو سمجھا دوں کہ ایسا پرہیز نہ کیا کریں۔ اس کی سخت دل شکنی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ نرے سمجھانے سے کچھ کام نہ نکلے گا سمجھانے سے تو اس وقت ہاں ہاں کہدیں گے پھر بعد کو کون پروا کرتا ہے۔ میں نے کہا ایک بدھنے میں پانی منگاؤ۔ جب پانی آگیا تو میں نے اس نومسلم سے کہا کہ پیو لوٹنے سے منہ لگا کر۔ اس نے پیا۔ پھر بدھنا اس کے ہاتھ سے لیکر میں نے بھی لوٹنے ہی سے منہ لگا کر اس کے بچے ہوئے پانی میں سے پیا۔ پھر میں نے سب سے کہا کہ پیو۔ حضرت سوا مان لینے کے کسی سے کوئی عذر نہ بن پڑا۔ سب نے جیسے تیسے پیا۔ پھر میں نے کہا کہ دیکھو بھائی اب اس سے پرہیز نہ کرنا۔ کہنے لگے اجی بس اب منہ ہی کیا رہا پرہیز کرنے کا تم نے ترکیب ہی ایسی کی کہ ہمارا سارا دھرم ہی لے لیا۔ اب اطمینان رکھو۔ اب ہم اسے اپنے

ساتھ کھلائیں پلائیں گے۔ اس سے پرہیز ہی کیا رہ گیا جب اس کا جھوٹا پانی ہی تم نے پلوا دیا۔ خیر سب کو بڑی خوشی ہوئی لیکن پیتے وقت جھجکتے سب تھے لیکن چونکہ میں خود پی چکا تھا اس لئے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انکار کر دے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں بھی۔ یاد ہے مجھے۔ پی تو گیا لیکن اندر سے جی رُکتا تھا۔ اللہ معاف کرے اور کچھ اسی کے ساتھ نہیں بلکہ کسی کا جھوٹا پانی یا جھوٹا کھانا ہو مجھ سے نہیں کھایا پیا جاتا۔ سخت رکاوٹ ہوتی ہے۔ اگر کبر اس کا سبب ہے تو اللہ معاف کرے اور اگر ضعف طبیعت ہے تو معذوری ہے یا کوئی معتقد یہ کہہ لے کہ لطافت و نظافت ہے نفس کی شرارت تو دیکھئے خود ہی ایک خوبصورت عنوان بھی بتلا دیا۔ کسی بزرگ کے سامنے کا بچا ہوا بھی مجھ سے نہیں کھایا پیا جاتا۔ میں کیا کروں طبیعت متلاتی ہے۔ اسی لئے میں خود جو کھاتا ہوں تو بالالتزام اس طرح کھاتا ہوں کہ دیکھنے والے کبھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی کے سامنے کا کھایا ہوا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بس اتنا ہی نکالا گیا ہے۔ اس قدر صاف کر کر کے اور ترتیب کیساتھ کھاتا ہوں کہ کسی کو دیکھ کر نفرت نہیں ہوسکتی۔ میں اور بھی لوگوں کو کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف آلودہ کر دیتے ہیں۔ جس کو دیکھ کر گھن آنے لگتی ہے۔ اور پانی میں یہ وہم ہوتا ہے کہ یہاں منہ لگا ہوگا یہاں تھوک لگا ہوگا۔ بس مجھ سے تو کسی کا نہ جھوٹا پانی پیا جائے نہ جھوٹا کھانا کھایا جائے۔ ہاں کسی کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لینے سے نفرت نہیں ہوتی اب میں اپنی اس طبیعت کو کیسے بدل دوں میں نے تو کبھی بزرگوں کا بھی جھوٹا کھانا نہیں کھایا نہ کبھی جھوٹا پانی پیا الا نادراً مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اُن حضرات کی برکت سے محروم نہیں رکھا۔ ان کے یہاں سچی چیزیں ہی اتنی تھیں کہ ان کی برکت ہی کافی ہوگئی جھوٹی چیزوں کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ بس سچی ہی چیزیں حصولِ برکت کے لئے کافی تھیں۔ خیر یہ تو نکتہ شاعرانہ ہے۔ شاعروں کی خاطر سے بیان کر دیا ہے ورنہ دراصل بزرگوں کے یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو جھوٹا کہہ سکیں اور جس کو جھوٹا کہتے ہیں وہ بھی سچی ہی چیز ہے۔

اس میں بھی سچ مچ برکت ہے۔ تو غرض یہ حکایت تو کرہاً کی تھی جو مجھ کو پیش آئی اور اس پر بھی حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ گو طبعاً کراہت ہوئی مگر الحمد للہ عقلاً اس کو نہایت خوشی کے ساتھ گوارا کیا۔ یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی توفیق تھی۔ اب دوسری حکایت طوعاً کی عرض کرتا ہوں۔

مولوی جمال الدین صاحب بھوپال میں مدار المہام تھے گویا وزیر ریاست تھے۔ وزارت اس وقت تو ضابطہ ہی کی رہ گئی ہے۔ اُس زمانہ میں تو واقعی سلطنت تھی کیونکہ پہلے اتنے ضابطے نہ تھے۔ اور پھر خود ایک بڑی رئیسہ نے اُن سے نکاح بھی کرلیا تھا۔ غرض ان کا بہت بڑا مرتبہ تھا۔ مگر تھے بڑے حق پرست یہاں تک کہ وہ رئیسہ بوجہ انتظاماتِ ریاست کے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ایک دفعہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے مولوی جمال الدین عالم تو تھے ہی نماز پڑھانے کے لئے لوگوں نے آگے کھڑا کردیا۔ اتفاق سے ایک ولائتی مولوی صاحب بھی موجود تھے انھوں نے ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹادیا کہ تم نماز نہیں پڑھا سکتے۔ تم اس قابل نہیں۔ اور کوئی پڑھائے۔ مگر مجال کس کی تھی کہ وزیر صاحب کے سامنے اور کوئی پڑھانے کیلئے بڑھے بالخصوص ایسے موقع پر۔ جب کوئی نہ بڑھا تو وہ آپ خود جاکر مصلے پر کھڑے ہوگئے کہ ہم پڑھائیں گے اور یہ کہا کہ تمھاری بیوی پردہ نہیں کرتی۔ اور تم اس کو گوارا کرتے ہو۔ لہٰذا تم دیّوث ہو اور دیّوث کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہ فقہ کا مسئلہ ہے۔ یہ کہا اور اللہ اکبر۔ وزیر صاحب جماعت میں شریک رہے۔ نماز پڑھ کر بھی کچھ نہیں بولے بلکہ وہیں سے سیدھے پہونچے رئیسہ کے پاس۔ وہ اس وقت اجلاس میں تھیں۔ آپ نے بے دھڑک سب کے سامنے علی الاعلان اس کو مخاطب کرکے کہا کہ تمہارے پردہ نہ کرنے کی وجہ سے میں بدنام ہوا۔ لوگ مجھے دیوث کہتے ہیں اور میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تم نے مجھے بھی ذلیل کیا۔ یا تو وعدہ کرو کہ میں پردہ میں بیٹھوں گی نہیں تو تین طلاق۔ حق پرستی اور ہمت تو دیکھئے برسرِ اجلاس یہ کہدیا۔ گویا سارا ملک ہاتھ سے دے دینا گوارا کرلیا

مگر اول تو حکومت پھر بڑھیا۔ تو مولوی جمال الدین ایسے حق پرست تھے۔ ایک بار ان کے یہاں کوئی تقریب تھی یا جلسہ تھا جس میں کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ باوجود اتنے اقتدار کے ان میں تواضع اس درجہ تھی کہ کھانا خود رکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک بھنگی آیا اس نے کہا میاں سلام میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مجھے مسلمان کرلو۔ مدارالمہام صاحب نے سب کام چھوڑ چھاڑ اسے بٹھلالیا اور مسلمان کرلیا پھر خدمت گار سے کہا کہ اسے حمام میں لیجا کر غسل کراؤ اور ہمارا جوڑا پہنا کر یہاں لاؤ۔ حیرت سب کو مگر اسی وقت جوڑا پہنا کر حاضر کر دیا گیا۔ حکم دیا کہ اسے بٹھلاؤ دسترخوان پر بڑے بڑے لوگ تھے۔ بڑے بڑے خان اور بیگ سب ہی کچھ تھے۔ بس لوگوں کی ناکیں چڑھ گئیں۔ منشی جی نے کہا۔ وہ تھے تو مولوی مگر منشی مشہور تھے۔ کہا آپ صاحبان منقبض نہ ہوں یہ شخص آپ کے ساتھ نہیں کھائیگا اس کے ساتھ میں کھاؤں گا کیونکہ یہ اسی وقت مسلمان ہوا ہے اس وقت اسکی ایسی حالت ہے جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ اس وقت اس کے ذمہ ایک بھی گناہ نہیں بالکل صاف اور پاک۔ یہ اس وقت ایسا پاک اور صاف ہے کہ یہاں ایک شخص بھی اتنا پاک صاف نہیں۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر میں کھاؤں گا۔ ہر ایک کو کہاں یہ دولت نصیب ہوسکتی ہے۔ یہ دولت تو میں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھی ہے۔ تمہاری قسمت کہاں کہ ایسے شخص کے ساتھ کھانے کا شرف حاصل کرسکو میں تم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میں اسے تمہارے ساتھ کھانے کے لئے نہیں بٹھلاؤں گا میں خود اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گا۔ تم مت گھبراؤ تم الگ کھاؤ۔ میں اپنے برتن میں اس کو شریک کرتا ہوں یہ کہکر کھانا منگوایا اور کہا آؤ بھائی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔ اب وہ جھجکے کہ میں مدارالمہام صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کیسے کھالوں۔ مگر انھوں نے زبردستی بٹھلالیا کہ بھائی تم اب بھنگی کہاں رہے تم تو اب ہمارے بھائی ہوگئے۔ غرض ایک برتن میں دونوں نے کھانا کھایا۔ واللہ حکایت تو یہ بڑی مزیدار ہے مگر ذرا عمل کرکے

دیکھئے کیسی بدمزہ ہے۔ مگر صرف اولاً بدمزہ ہے اور عمل کے بعد تو واللہ وہ حلاوت ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ مگر صاحب اولاً تو پورا جہاد اور بڑا سخت مجاہدہ ہے یہ انھیں کا حوصلہ تھا ورنہ ایسے شخص کے ساتھ تو بہت ہی برا برتاؤ کرتے ہیں یہ حالت تکبر کی ہے کہ اُسے خطاب بھی کرتے ہیں تو ان الفاظ سے ابے او بھنگی کے

ایک عبدالکریم تھا جو ہمارے یہاں مسلمان ہوگیا تھا اس کو لوگ بھنگی کہہ کہہ کے پکارتے تھے۔ بعد مسلمان ہوجانے کے بھی لوگ ایسوں کو بھنگی کا اور چمار کا کہنا نہیں چھوڑتے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ مگر خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ بڑھا دیا۔ بھنگی اور چمار نہ کہدیا۔ بھنگی کا اور چمار کا ہی کہا کیونکہ آخر اس کا باپ تو بھنگی ہی تھا۔ مگر یہ زیادہ خوشی کی بات اس لئے نہیں کہ محاورہ میں یہ اضافت مضاف مضاف الیہ میں تغایر کے لئے نہیں آتی بلکہ تحسین کلام کے لئے بطور زائد کے لائی جاتی ہے جیسے راہ ہے تو اضافت کے لئے موضوع مگر اکثر تحسین کلام کے لئے زائد بولا جاتا ہے۔ اور یہ کیونکر معلوم ہوا۔ یوں معلوم ہوا کہ یہیں تھانہ بھون میں ایک سید تھے مگر تھے بیچارے غریب انھوں نے اپنے یہاں ایک بہلی کرلی تھی غریب آدمی بیچارے کرایہ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ شریف آدمی ذات کے سید مگر اللہ بچاوے مفلسی بھی عجیب چیز ہے سب کچھ کرالیتی ہے وہ کہنے لگے کہ میں ایک گاؤں میں اپنی بہلی کرایہ پر لے گیا۔ وہاں رات کو ٹھہرنا پڑا۔ اول تو سب سے زیادہ ذلیل جگہ مجھے ٹھہرایا۔ مجھے اس قدر پیچ و تاب کہ بس کھا جاؤں کچوں کو مگر کہا کچھ نہیں کیونکہ یہ ظاہر کرتے ہوئے بھی شرم آئی کہ میں سید ہوں۔ بس اندر ہی اندر اونٹ کر رہ گیا۔ اتنے میں مکان والے کے لڑکے نے آواز دی کہ او بہلیان کے۔ بھُس لے لے۔ کہنے لگے کہ میں جلا ہوا تو بیٹھا ہی تھا یہ سن کر بس آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کہا کہ ابے گدھے یہ تو نے کیا کہا کہ بہلیان کے۔ ارے اگر ہم بہلی چلانے لگے ہیں تو کیا ہمارے باوا بھی بہلبان ہوگئے۔ بھُس لے لے بھُس لے لے۔ جا ہم بھُس نہیں لیتے۔ تیری بھی ایسی

اور تیرے بھس کی بھی ایسی تیسی۔ کہنے لگے ہیں۔ نے اسی وقت قسم خدا کی کھالی کہ گھر پہونچتے ہی چھوڑ دوں گا اس کمبخت پیشہ کو۔ چنانچہ آتے ہی ہیلی اور بیل بیچ ڈالے۔ تو میر صاحب کا ذہن خواہ مخواہ اس طرف گیا کہ یہاں اضافہ مقصود ہے واقع میں اس لڑکے سے پوچھو اس کا مطلب یہ نہ تھا اھل البیت ادری بمافیہ کے لفظ تو برائے بیت ہی تھا جیسے ایک میانجی سکندر نامہ پڑھا رہے تھے جب یہ شعر آیا ع بزرگا بزرگی دہا بیکسم۔ تو اس کا مطلب اس طرح بیان کیا بزرگی یہی بزرگا بزرگی یہی۔ بزرگی۔ دہا کے معنی لغت میں دیکھ کر بتائیں گے بیکسم برائے بیت ہے۔ آگے چل بھائی تو غرض کا جو ہے یہ برائے بیت ہے۔ لوگ اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ ان کا مقصود اس پکارنے سے کہ او بھنگی کے یہی ہے کہ او بھنگی یعنی تو ایسی ذلیل قوم سے ہے۔ اور صاحب اب بھی ایسے متکبر لوگ موجود ہیں۔ اپنے ایک عزیز ہی کا نہایت افسوس ناک واقعہ ہے۔ وہ ایک دوسرے قصبہ کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا یہ قصبہ بڑا متکبر مشہور ہے مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں یہاں تکبر اتنا نہیں البتہ تیزی ہے۔ اور قصبات میں بہت تکبر ہے چنانچہ یہاں سے ایک قصبہ میں جہاں وہ عزیز رہتے ہیں ہمارا ایک طالب علم کسی اپنے کام کو گیا۔ وہ نومسلم ہے وہ چمار کا لڑکا تھا مسلمان ہو گیا ہے۔ وہاں جا کر اس عزیز کو معلوم ہوا کہ یہ پہلے چمار تھا۔ پوچھا کیا پڑھتے ہو کہا قرآن مجید یہ سن کر انھوں نے اسے بہت گالیاں دیں اور کہا خبردار لبے چمار کے جو تونے قرآن پڑھا۔ تو اور قرآن کا پڑھنا ابے تو کہیں تو پٹے گا تو نہیں۔ تو یہ انہوں نے جناب نصیحت کی۔ بھلا کتنی دلیری اور گستاخی کی بات ہے۔ میں نے کہا خدا تعالیٰ کافر کو چاہیں تو مومن کر دیں اور مومن کو چاہیں تو نعوذ باللہ کافر کر دیں اس کی قدرت سے ڈرنا چاہیئے۔ اس کی وہ قدرت ہے

ے کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو
لاوے بتخانہ سے وہ صدیق کو

یہ گلزار ابراہیم کا شعر ہے۔ یہاں صدیق سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں

جیسا کہ قرآن مجید میں انہ کان صدیقاً نبیا وہ بت خانہ سے کعبہ میں آتے۔
بت خانہ کیا۔ آزر کی آغوش یا کسی بت خانہ میں پیدا ہوئے ہوں یا پرورش پائی ہو۔ مجھے تاریخ کی تحقیق نہیں۔ مگر آزر کا آغوش بت خانہ تو تھا ہی۔ بلکہ اس کے سامنے بت خانہ کی بھی کیا حقیقت تھی سیکڑوں بت خانے اُس آغوش اور اُس بالوہی سے تو وجود میں آگئے۔ بت خانہ تو کیا چیز ہے وہ تو بت گر تھا۔ مگر خدا تعالیٰ کی وہ قدرت ہے کہ اس بت خانہ میں صدیق کو پیدا کر دیا اور
ع "کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو"۔ کعبہ سے مراد مکہ مکرمہ ہے شعرا وغیرہ سارے شہر کو کعبہ کہدیتے ہیں کیونکہ کعبہ ہی کی وجہ سے تو وہ شہر ہوا ہے اور زندیق سے مراد ابوجہل ہے۔ یعنی مکہ مکرمہ میں ابوجہل جیسے کافر اکفر کو پیدا کر دیا اسی کو فرماتے ہیں۔ حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

(حضرت حسن بصریؒ کو بصرہ سے اور حضرت بلال رضؓ کو حبش سے اور حضرت صہیب رومی کو روم سے جذب فرمایا گیا اور خاک مکہ مکرمہ سے ابوجہل پیدا ہو یہ کس قدر عجیب قدرت ہے اور عجیب تصرف ہے)

کیا ملیا میٹ کیا ہے تکبر کو۔ فرماتے ہیں کہ حبش میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پیدا کر دیا۔ یہاں گمان بھی نہ تھا کہ ایسا بڑا شخص پیدا ہوگا۔ کسی کو خبر تھی کہ یہاں بلال پیدا ہوں گے جو محبوب اور مقبول ہوں گے۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ایسے کے جو خدا کے محبوب ہیں۔ اور ان کا اتنا بڑا درجہ ہوگا کہ ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرما دیں گے کہ اے بلال تم کونسا عمل کرتے ہو کہ جب میں شب معراج میں سیر کرتا ہوا جنت میں پہنچا تو میں نے اپنے آگے آگے تمہاری جوتیوں کی کھسکھساہٹ سنی۔ اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ نعوذ باللہ حضرت بلال رضؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ گئے

نہیں بلکہ آگے آگے جو جا رہے تھے تو خادم کی حیثیت سے جا رہے تھے۔ صورۃً آگے تھے معنیً آگے نہ تھے۔ جیسے ارجاع الضمیر قبل الذکر ہوتا ہے کہ وہاں گو مرجع موخر ہے ذکراً لیکن رتبۃً مقدم ہے تو بھائی نحو میں تو تائید بھی اسکی موجود ہے۔ اور دنیا میں بھی تو بہت سے امرار ایسے ہوتے ہیں جن کے آگے آگے خادم چلتے ہیں۔ اسی طرح حضرت بلال جنت میں گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے چل رہے تھے مگر تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہی۔ لیکن یہ رتبہ کیا کچھ کم ہے کہ خادم کی وہ قسم بنے جو مخدوم کے آگے آگے چلتی ہے۔ تو بھلا یہ کسی کو خبر تھی کہ حبشہ میں دو کالے کلوٹے لوگوں کے درمیان ایک اس درجہ کا شخص پیدا ہو جائے گا۔ اور کس کو خبر تھی کہ حسن بصری بصرہ میں اور صہیب رومی جیسے بزرگ دار النصاریٰ میں پیدا ہوں گے۔ بھلا کوئی سمجھ سکتا تھا کہ۔

ع حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم + اور ع۔ ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست ۔ حسن تو بصرہ میں پیدا ہوں اور بلال حبش میں اور صہیب روم میں ورنہ مکہ کی خاک میں کون پیدا ہو ابوجہل۔ ہاں تو حضرت خدا سے ڈرنا چاہیئے۔ اپنے ایمان پر کبھی مغرور نہ ہونا چاہیئے اور کسی کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے۔

ع۔ غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را۔ ہائے خوب ہی تعلیم ہے ؎

غافل مرو کہ مرکبِ مردانِ مرد را

درسنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

(غفلت سے مت چل کہ حق تعالیٰ کے راستے کے شیران طریق بڑے بڑے مجاہدات سے سلوک کو طے کیا ہے)۔ اور ؎

نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش

ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

(اس راہ میں ناامید مت ہو ناکہ بہت سے رندان بادہ خوار یعنی گنہگار ایک آہ اور ایک نالہ سے منزل کو بطریق جذب طے کر لیتے ہیں)

واقعی رندان بادہ نوش تاگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند۔ یہ ہوا بھی ہے۔ منشی محمد جان مارہرہ کے جو کانپور میں رہتے تھے خود مجھ سے ایک حکایت بیان کرتے تھے کہ مارہرہ میں ایک آزاد مشرب شخص تھا۔ کوئی عیب دنیا کا نہ تھا جو اس میں موجود نہ ہو۔ لوگ اس کی شرارتوں پر جب اُسے نصیحتیں کرتے کہ بھائی خدا سے ڈرو تو وہ یہی کہہ دیتا کہ میاں تمہیں کیا۔ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں جانیں۔ گویا ناز تھا اس کو حق تعالیٰ کی رحمت پر۔ بس حضرت لوگ تو سمجھاتے سمجھاتے مایوس ہو گئے کہ اب اس کی اصلاح نہ ہوگی لیکن ایک دن دفعۃً اس کے منہ سے یہ نکلا کہ خدا جانے میرا کیا ہوگا۔ بس یہ کہتے ہی اس پر ایک حالت طاری ہو گئی۔ خدا جانے میرا کیا حال ہوگا۔ یہ تو بولا پھر بولنا بھی چھٹا کھانا پینا بھی چھٹا عیش آرام بھی چھٹا۔ بس نماز کے وقت تو نماز پڑھ لیتا۔ پھر سوا رونے کے اسے اور کوئی کام نہ تھا۔ اس کے رونے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کلیجہ باہر نکل پڑے گا۔ ہر چند لوگ تسلی دیتے تھے مگر کسی طرح صبر ہی نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں تیسرے دن انتقال کیا۔ کوئی شخص کر سکتا ہے اس شخص کے شہید ہونے میں۔ تو اب دیکھئے یہ ٹھیک ہے یا نہیں ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید ۔۔۔ کہ مسلمان بودنش باشد امید

(کسی کافر کو ذلت کی نظر سے مت دیکھنا کیونکہ ابھی ممکن ہے کہ وہ کسی وقت میں اسلام قبول کر کے حسن خاتمہ سے مشرف ہو جائے)

کسی کافر کو بھی ذلیل نہ سمجھنا چاہیے کہ شاید مسلمان ہو جائے نہ کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی ذلیل سمجھا جائے یہ تو نعوذ باللہ خدا کا مقابلہ ہے۔ خدا جانے آئندہ کیا ہونے والا ہے اور ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ تو ان منشی جمال الدین کی حکایت میں نے بیان کی تھی اس نومسلم کے اس قول پر کہ اسلام میں توحید بہت کامل ہے تو اس نے مجھ سے یہ کہا کہ چونکہ مسلمانوں کی خاصیت توحید ہے اس لئے اب میں ان سے جدا نہ ہوں گا اب میں اسلام کو نہ چھوڑوں گا۔ خیر اس سے مجھے تسلی ہوئی اس پر یہ حکایت یاد آ گئی تھی کہ لوگ نور چمک کو سمجھتے ہیں حالانکہ نور کہتے ہیں اس کو

جو ظاہر لنفسہ ومظہر لغیرہ ہو یعنی جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے بس حقیقت یہ ہے نور کی۔ اب اللہ نور السموات کی تفسیر میں استعارہ کی تاویل کی حاجت ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ سموات اور ارض کو ظاہر بھی کر رہا ہے اور ان کے واسطے سے خود بھی ظاہر ہے۔ بہرحال نور اس کو کہتے ہیں جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے۔ تو اب وہ شبہ نہیں رہا کہ ہم نے نو نماز پڑھی تھی کوئی نور نہیں پیدا ہوا، ہم نو روزہ رکھتے ہیں کوئی نورانیت قلب میں محسوس نہیں ہوتی۔ طاعت میں کوئی نور نظر نہیں آتا۔ اب یہ شبہ رفع ہو گیا کیونکہ نور چمک دمک کا نام نہیں ہے بلکہ نور وہ ہے جس کی میں نے ماہیت عرض کی کہ ظاہر لنفسہ ومظہر لغیرہ ہو خیر عوام کیا سمجھیں اس کو لیکن اس کی علامتیں اور آثار ہیں جن سے وہ نور کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آگ نہیں دکھائی دیتی تو دھواں تو دکھائی دیتا ہے۔ دھوئیں سے تو پہچان سکتے ہیں کہ آگ موجود ہے۔ آثار کیا ہیں اُس نور کے۔

ترمذی کی حدیث ہے اس آیت کی تفسیر میں فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام کہ جب شرح صدر ہوتا ہے تو نور قلب میں داخل ہوتا ہے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما علامۃ نور کے داخل ہونے کی کیا علامت ہے۔ فرمایا التجافی عن دار الغرور والانابۃ الی دار الخلود۔ دنیا سے تعلق کم ہو جانا اور متوجہ ہو جانا آخرت کی طرف۔ یہ علامت ہے نور قلب کی۔ تو بھائی اس علامت ہی سے سمجھ لو کہ طاعت میں نور ہے یا نہیں۔ تو طاعت میں مشغول ہونے سے یہ علامتیں پاؤ گے اور معصیت کے بعد اس کے خلاف پاؤ گے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ معصیت میں ظلمت ہے اور طاعت میں نور ہے۔ اس طرح نور و ظلمت ہونا طاعت کا اور معصیت کا تم پر منکشف ہو جائے گا۔ اور اگر منکشف نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ کبھی خالص طاعت کو اختیار کر کے دیکھا نہیں۔ امتحان ہی کے طور پر چند روز خالص طاعتیں گذار لو۔

پھر معصیت کے بعد جو کیفیت ہو اُس کو یاد رکھو تو خود فرق معلوم ہو جاویگا وہی آیت صادق آویگی جو میں نے پڑھی تھی ھل تستوی الظلمات ظلمات اور نور کہیں مساوی ہو سکتے ہیں ۔ تو بہر حال اب یہاں سے معلوم ہو گیا کہ رمضان المبارک کا وہ مہینہ ہے جو مجمع النور ہے اس واسطے کہ اس مہینہ میں قرآن مجید نازل ہوا جس کی شان یہ ہے کہ ہُدیٰ ہے بینات ہے اور فرقان ہے اور اس میں سے ہر ایک صفت دلالت کرتی ہے قرآن مجید کے نور ہونے پر فرقان ہونا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ فرق بین الحق والباطل انکشاف پر ہے اور انکشاف نور سے ہوتا ہے جیسا اوپر بیان ہوا ہے ۔ اور ایک ہُدیٰ کا مادہ ہے وہ بھی دلالت کر رہا ہے قرآن مجید کے نور ہونے پر کیونکہ رستہ اسی چیز سے نظر آتا ہے جس کی شان ہو ظاہر بنفسہٖ و مظہر لغیرہٖ اس کو تو ہر شخص جانتا ہے ۔ اور ہر بینات جس کے معنی ہیں دلائل واضحات اس کا موضح ہونا یہ بھی کاسف ہوتا ہے جو مرادف ہے نور کا تو قرآن مجید کی سب صفتیں ایسی ہیں جن سے اس کا نور ہونا ثابت ہوتا ہے تو حاصل اس آیت کا یہ ہوا کہ رمضان المبارک ایسا مہینہ ہے جس میں ایسی نورانی چیز آئی تو گویا پُر انوار ہے یہ مہینہ اور ذات الانوار ہے یہ مہینہ ۔ اور جب ذات الانوار ہے تو اس کا رافع الظلمات ہونا لازم ہے ۔ اب رافع ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک تو رافع ہوتا ہے تکویناً اور ایک رافع ہوتا ہے تشریعی ۔ سو رفع تکوین تو باختیار عبد نہیں اس لئے تکویناً تو خود رافع بنایا کہ اس کو مجمع الفضائل بنایا اسباب ظلمت کو اس میں مفقود کیا چنانچہ شیاطین بھی اس میں قید ہو جاتے ہیں اور رفع تشریع باختیار عبد ہے اس لئے اس پر آگے تفریعاً فرمایا فمن شھد منکم الشھر یعنی جب ایسا مہینہ ہے تو اس کو ظلمات کے رفع کا آلہ تم بھی بناؤ اس طرح سے کہ اس میں خاص عبادت کرو یعنی روزہ رکھو اور اس کے انوار کو آلہ بناؤ رفع ظلمات کا جس کی صورت یہ ہے کہ طاعت اختیار کرو ۔ حاصل یہ کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک لالٹین رکھی ہو بڑی مسجد میں اور یہ کہا جاوے کہ اس سے کام لو اور جہاں جہاں ظلمتیں ہوں وہاں لے کر جاؤ تاکہ وہ رفع ہوں یہ تھوڑا ہی ہے کہ رکھی رکھی ساری دنیا کی ظلمات کے رفع کے لئے وہ کافی ہو جاوے اسی طرح تم کو بھی یہ مہینہ کیا ملا ہے گویا ایک لالٹین عطا ہوئی ہے ۔ مگر اس کو محل

ظلمت میں لے بھی تو جاؤ۔ اگر کہیں نہ لے جاؤ تو بیٹھے بیٹھے ظلمت کیسے رفع ہوتی۔ یوں چاہیے وہ نور ایسا ہی قوی ہو اس سے ظلمتیں بلا استعمال بھی رفع ہوسکتیں ہیں مگر حق تعالیٰ نے شعاعوں کے پہونچنے کی حد تک پردے قصداً ایسے رکھے ہیں جن سے نور بدون تصرف کے تہیں پہونچتا تاکہ مکلف کا مکلف ہونا بھی تو معلوم ہو ورنہ اگر اس مہینہ میں اعمال ظلمانیہ پر بھی قدرت نہ ہوتی اور طاعات بالاضطرار صادر ہوتیں بخلاف فرشتوں کے تو یہ بھی رفع تکوین میں داخل ہوجاتا اور اس صورت میں مکلف کا کیا کمال تھا اور اس کو کیا برکت حاصل ہوتی۔ اور یہی ظہور کمالات و عطاء برکات اس کی وجہ ہے کہ انسان کو مکلف طاعات کا بنایا کہ ان شاء فعل وان شاء لم یفعل کہ ان کا اختیار مشابہ اختیار رکھے ہے۔ وہ ترک طاعت پر قادر نہیں انسان کو ان پر خاص شرف دیتا تھا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا تو ملائکہ نے عرض کیا کہ وہ تو کھائیں گے بھی پئیں گے بھی فاجعل لھم الدنیا ولنا الآخرۃ ان کے حصہ میں دنیا کر دیجئے ہمارے حصہ میں آخرت۔ ارشاد ہوا کہ ہرگز نہیں بھلا جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے اور جس کو صرف کُن کہنے سے پیدا کیا ہے دونوں کو برابر کردوں یعنی تم کو کہ صرف کن کہکر پیدا کیا ہے اور انسان کو جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے کیسے برابر کردوں۔ اب رہا یہ کہ دونوں ہاتھوں سے پیدا کرنے کے کیا معنی ہیں، سو اس کا حقیقی علم تو حق تعالیٰ ہی کو ہے۔ باقی حاصل مطلب یہ ہے کہ انسان کو خاص توجہ اور عنایت اور اعتنار کے ساتھ پیدا کیا ہے یعنی خلاصہ ارشاد کا یہ ہے کہ ان کی نوع بلحاظ مجموعہ کے ملائکہ کی نوع سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر فرد ہر فرد سے افضل ہے۔ یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ انسان ملائکہ سے بھی افضل ہے دلو باعتبار بعض الافراد اور کیا یہ بات فضیلت ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ فرشتوں کو تو انسان کی خدمت سپرد کی گئی لیکن اس کو ان کی کوئی خدمت سپرد نہیں کی گئی۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ سارے کام انسان کے ملائکہ کے سپرد ہیں

یہاں تک کہ خود ان کی خدمت بھی اور ان کی چیزوں کی خدمت بھی۔ ان کی جس گھاس کو بیل کھاتے ہیں اُس کی بھی۔ کیونکہ قوتِ نامیہ سے کام لینے والے وہ ملائکہ ہیں جو مدبرات ہیں ارض و سمٰوات کے یہاں تک کہ نطفہ میں بھی ملائکہ ہی تصرف کرتے ہیں۔ جس وقت نطفہ قرار پایا اسی وقت ایک فرشتہ فوراً متعین کر دیا گیا ہے اس نے علقہ بنایا۔ پھر عرض کیا اب کیا کروں پھر مضغہ بنایا، پھر عرض کیا اب کیا کروں۔ غرض اسی طرح اخیر تک برابر فرشتہ تصرفات کرتا رہتا ہے۔ اطباء سمجھتے ہیں کہ قوت مولدہ کام کرتی ہے۔ چلو بیٹھو بھی قوت بیچاری کیا کام کر سکتی ہے جب تک کوئی قوت سے کام لینے والا نہ ہو۔ یہ صاحب حکماء کہلاتے ہیں۔ یہ علماء ہیں۔ حمقاء ہیں کہ طبیعت کو عدیمۃ الشعور بھی مانتے ہیں اور ایسے افعالِ بدیعہ بھی اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جب بہت لتاڑ پڑی کہ بھلا کوئی عدیمۃ الشعور ایسے افعال بھی کر سکتا ہے تو اخیر میں ذرا متاخرین کو ڈھیلا ہونا پڑا اور کہنا پڑا کہ ضعیفۃ الشعور ہے۔ مگر پھر بھی اعتراض باقی ہے یعنی ان کے قول کا حاصل تو یہ ہوا کہ طبیعت بے عقل تو نہیں کم عقل ہے۔ لیکن وہ اعتراض تو پھر بھی باقی ہے کہ کم عقل سے ایسے افعال بدیعہ کیسے صادر ہو سکتے ہیں، بلکہ اب اعتراض اور قوی ہو گیا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے عقل کا تصرف تو ایک نحو واحد پر چلتا رہتا ہے جیسے مشین کہ ایک مرتبہ گھما دینے سے کام کرتی رہتی ہے۔ تو جو عدیم الشعور ہے وہ کام کو اتنا نہ بگاڑے گا لیکن جو کم شعور ہے وہ بہت بگاڑے گا۔ مشین سے کام اتنا نہیں بگڑتا جتنا اناڑی سے، سو واقعی ان حکماء نے یہ کیا حماقت کی بات کہی۔ بس سیدھی بات یہ ہے کہ مسلمان ہو جاؤ۔ اور اس کے قائل ہو جاؤ کہ اللہ میاں فرشتوں سے یہ سب کام لیتے ہیں۔ پھر کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا۔ ان علماء نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں کہ کہیں پناہ نہیں ملتی، ہر جگہ اعتراض بخلاف اہلِ حق کے جو قائل ہیں خدا کے قادرِ مطلق اور مختارِ مطلق ہونے کے ان پر کوئی اشکال ہی نہیں واقع ہوتا البتہ حکماء کی طرف سے ان پر اخیر سوال یہ ہے کہ جس پر ان کو بڑا

ناز ہے کہ اختیار تو قدیم ہے پھر خاص وقت میں احد المقدورین کو ترجیح دینا ترجیح بلا مرجح ہے جواب یہ ہے کہ مرجح ارادہ ہے اس پر سوال کیا گیا ہے کہ کسی خاص وقت میں ارادہ کیوں مرجح ہوا جواب یہ ہے کہ ارادہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ ترجیح احد المقدورین من شاء جب یہ ترجیح اس کا ذاتی فعل ہے خواہ یوں کہئے کہ اس کا لازم ہے اور ذات اور ذاتی کے درمیان اسی طرح ملزوم و لازم کے درمیان تخلل جعل کا محال ہے اس لئے اس ترجیح کی علت کا سوال ہی لغو ہے۔ لبس بند ہو گیا ناطقہ۔ ایک اسلام نے سارے اشکالات کو حل کر دیا اور وہ اصولاً فروعاً ہر طرح سے بے غبار رہ گیا بہر حال تسخیر ملائکہ سے انسان کا کتنا بڑا شرف ثابت ہوا، البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ شرف اسی وقت تک ہے جب تک حق تعالیٰ سے اس کو تعلق ہے۔ دیکھو ہمارے یہاں کوئی مہمان آتا ہے تو اپنے بیٹوں سے اس کی خدامت کراتے ہیں۔ حالانکہ بیٹا نسبت ہیں اس شخص سے زیادہ قریب ہوتا ہے مگر مہمان ہونے کی وجہ سے وہ بیٹے سے زیادہ معزز ہے لیکن اسی وقت تک معزز ہے جب تک وہ مہمان ہونے کے تعلق کو قائم رکھے ورنہ اگر اپنی کسی حرکت سے اس تعلق کو منقطع کر دیا تو پھر اسی بیٹے کے ہاتھوں جس کو خدمت کرنے کا حکم تھا جوتیاں بھی لگوائی جاتی ہیں چنانچہ کانپور میں ایک شخص نے چند صلحاء کی دعوت کی تھی۔ میزبان کے لڑکے نے سب کے ہاتھ دھلائے۔ ان میں سے ایک صاحب جو مدعیان صلاح میں سے تھے آزاد سے تھے۔ انھوں نے اس قدر نالائق حرکت کی اس لڑکے کے رخسارہ پر محبت نفسانیہ سے ہاتھ پھیرا صاحب مکان نے دیکھ لیا۔ فوراً خدمتگار کو حکم دیا کہ ان سب نالائقوں کو کان پکڑ کر باہر نکال دو۔ ایک نالائق کی وجہ سے سبھی بے چارے نکالے گئے۔ لو صاحب یا تو مہمان تھے بیٹا خدمت کر رہا تھا۔ یا نوکروں سے کان پکڑ کر نکالے گئے۔

تو انسان کو حق تعالیٰ نے دنیا میں اپنا مہمان کر کے بھیجا اور فرشتوں کو اس کے کام میں لگا دیا (بقولِ ذوق ؎

دنیا میں ہے جو کچھ وہ سب انسان کیلئے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہمان کے لئے ہے

لیکن یہ خدمت اور مہمان داری اسی وقت تک ہے جب تک ہم مہمانی کے اہل ہیں اور اگر مہمانی کے خلاف ذرا کوئی حرکت کی تو کان پکڑ کر نکال دیئے جائیں گے اتنا فرق ہے کہ وہاں اسی وقت ذلیل کر کے نکال دیئے جاتے ہیں یہاں ایک میعاد مقرر ہے دسترخوان کے لئے اس میعاد تک گو ہم سے کیسی ہی نالائق حرکتیں سرزد ہوں ہم مہمان ہی قرار دیئے جاتے ہیں جیسے بعضے کریم النفس ہوتے ہیں کہ جب کسی نے دسترخوان پر کھانا شروع کر دیا تو کریم النفس میزبان اس کی نالائقیوں پر چشم پوشی کرتا ہے اور صبر کرتا ہے کہ اب میں کیسے اس کھاتے ہوئے کو اٹھا دوں۔ لیکن جب میعاد ختم ہو گئی اور گھر سے ہو گئے باہر پھر وہ جوتہ وہ جوتہ۔ انھیں کے ہاتھوں ذلیل کرائے جائیں گے جن سے کہ اب خدمت کرائی جا رہی ہے یعنی ملائکہ سے۔ بہرحال یہ ثابت ہوا کہ انسان کا کمال زیادہ تر اسی پر مبنی ہے کہ اس سے اضطراراً کام نہیں لیا جاتا۔ وہ اپنے اختیار سے مجاہدہ کرتا ہے۔ اس لئے رمضان کو اس کے لئے اضطراراً رافع ظلمات اعمالیہ نہیں بنایا گیا بلکہ اس کو خود حکم ہوا ہے کہ ان ظلمات کا رافع اس کو تم خود بناؤ یعنی اپنے اختیار سے مجاہدہ کر کے رمضان کو پورا انوار بناؤ اس طرح سے اُن انوار کو محل ظلمات میں پہنچاؤ اپنے عمل کے ذریعے سے اس لئے تدرج فرمایا فمن شهد منكم الشهر فليصمه تو اس طرح سے یہ آیت دلالت کرتی ہے حقوق رمضان کے وجوب پر جیسے کہ میں نے تقریر بیان کی بعد مقدمات اور اس مہینے میں علاوہ صوم کے اور بھی چند عبادتیں مشروع ہیں۔ اُن میں سے ہر عبادت کی حقیقت میں غور کرنے سے میرا یہ دعویٰ ثابت ہو جائے گا کہ واقع میں یہ مہینہ محل انوار ہے۔ چنانچہ مجموعہ میں سے ایک عبادت ہے اس کے اندر روزہ کی جو آیت میں صریح مذکور ہے۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر تراویح کی، جس کی طرف ذکر قرآن سے اشارہ ہے۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر اعتکاف کی

جس کا ذکر بعد میں ہے ۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر اختیار لیالی قدر کی جس کا ذکر دوسری آیتوں میں ہے ۔ ایک عبادت ہے اس کے اندر کثرتِ تلاوتِ قرآن مجید کی اس کی طرف بھی ذکر قرآن ہی میں اشارہ ہے یہ گویا اس وقت پانچ عبادتیں ذہن میں حاضر ہیں اب ہر ایک کی حقیقت میں اور ذات میں غور کرنے سے جو میں نے دعویٰ کیا ہے اس کی تائید ہو گی سب کو تھوڑا تھوڑا بیان کرتا ہوں چنانچہ ایک عبادت ہے تلاوت قرآن مجید کیونکہ حق جل علا شانہٗ کے ارشاد سے رمضان شریف کا محل نزول قرآن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مناسبت تلاوت قرآن مجید کی رمضان شریف کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ باقی خاص رمضان المبارک میں تلاوت کی کثرت کی حدیث قولی یا فعلی میں میری نظر سے نہیں گذری لیکن میری نظر وسیع نہیں ممکن ہے کہ کوئی روایت ہو جو میری نظر سے نہ گذری ہو۔ لیکن ایک سنت اس وقت میرے ذہن میں ہے اس سے استدلال کرنا کافی ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان المبارک کے مہینہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرمایا کرتے تھے اور جس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا اس کے رمضان میں جبرئیل علیہ السلام نے دو بار دَور کرایا۔ چنانچہ آپ نے اس سے قرب وفات پر استدلال فرمایا یعنی معلوم ہوتا ہے میرے لئے اگلا رمضان آنے والا نہیں ہے میں اس وقت تک زندہ نہیں رہوں گا۔ اسی لئے دو دفعہ دور کرایا گیا تاکہ اگلے رمضان کا دور بھی اسی رمضان میں ہو جائے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ یہ دور جو ہر سال رمضان المبارک میں ہوا کرتا تھا غیر تراویح میں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس سنت سے اور دوسرے اس حدیث سے رمضان شریف میں اور دونوں سے زیادہ آپ اجتہاد فرماتے تھے اور تلاوت ہمیشہ مطلوب ہے تو رمضان میں زیادہ مطلوب ہو گی ان دونوں سے مدعا ثابت ہو سکتا ہے۔ غرض اس سے معلوم ہوا کہ ایک عبادت رمضان المبارک کی مطلوب عبادات میں سے تلاوتِ قرآن مجید بھی ہے اور قرآن مجید کا نور ہونا ھدیً للنّاس وبیّنات من الھدیٰ والفرقان میں بیان فرما ہی دیا ہے

یہی دلیل کافی ہے۔ اس عبادت کے نور ہونے کی ایک جزو رمضان المبارک کی عبادات کا روزہ ہے جس کو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ۔ اب رہا روزہ کا نور ہونا سو غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ روزہ کس طرح سے نور ہے تو روزہ کی حقیقت دیکھنی چاہیئے کہ کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے لذات کا ترک کر دینا، شہوات کا ترک کر دینا، تو لذات کے ترک سے اور شہوات کے ترک سے خود مشاہدہ ہو سکتا ہے کہ قلب کے درمیان ایک کیفیت نور کی اور انشراح کی پیدا ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاصی میں دو درجے ہیں ایک تقاضا اور ایک اس تقاضے پر عمل اور بالفعل اور عمل کا ظلمت ہونا معلوم ہی ہے باقی تقاضا گو وہ بالفعل ظلمت نہیں مگر بالقوہ ظلمت ضرور ہے۔ اور بالقوہ شرط ہے بالفعل کی اور شرط کا فوت مستلزم ہے فوت مشروط کو اور روزہ سے تقاضے میں کمی آتی ہے تو فعل میں بھی کمی آوے گی تو دونوں درجے ظلمت کے اس سے منفی ہو گئے پھر نور ہونے میں کیا شبہ رہا روزہ اس طرح نور ہوا۔ لیکن یاد رکھنے کی بات ہے کہ قوت کے مرتفع و منفی ہونے کے معنی اصطلاح میں ضعیف ہو جانے کے ہیں نہ کہ بالکل معدوم ہو جانا۔ اور یہ بہت کام کی بات ہے جس کے نہ جاننے کی وجہ سے بہت غلطیاں واقع ہو رہی ہیں۔ چنانچہ عموماً اس وقت کے صوفیہ ترک لذات کی نسبت اور ترک تعلقات کی نسبت یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قطع کا حکم ہے حالانکہ یہ الفاظ اصطلاحی ہیں ان کو لغت پر محمول نہ کرنا چاہیئے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لذات کو بالکل فنا کر دینا چاہیئے اور اخلاق ذمیمہ بالکل معدوم ہو جانے چاہئیں۔ تو اس غلطی میں پڑنے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ بعد مجاہدہ کے جب دیکھتے ہیں کہ نفس میں ان چیزوں کا پھر تقاضا ہونے لگا ہے تو مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمارا سارا مجاہدہ ہی برباد گیا۔ اور مایوس ہونے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ پہلے جو تھوڑی بہت مجاہدہ کی توفیق تھی اس کو بھی ترک کر بیٹھتے ہیں۔ جب اس کو ترک کر دیتے ہیں تو اس کی وجہ سے جو مواد خبیثہ میں اضمحلال ہو گیا تھا وہ جاتا رہتا ہے اور پھر اس

موادِ خبیثہ میں جوش و خروش پیدا ہو کر معاصی کا صدور ہونے لگتا ہے دیکھئے کتنا ضرر ہوا ذرا سی اصطلاح کے نہ جاننے سے تو قوت کے مرتفع ہونے کے معنی قوت میں اضمحلال ہو جانے کے ہیں۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب مکرر سمجھئے کہ روزہ میں خاصیت ہے اضمحلال داعیۂ شہوت کی جس کا نام تھا قوت جب قوت کا درجہ ضعیف ہو گیا تو فعلیت کا درجہ بدرجہ اولیٰ ضعیف ہو جائے گا اور معاصی سے احتراز آسان ہو گا اور طاعت کی توفیق ہو گی۔ جب معاصی سے احتراز ہو گا جو سبب ظلمت ہیں اور طاعت کی توفیق ہو گی تو ظاہر بات ہے نور پیدا ہو ہی گا۔ اس اعتبار سے روزہ بھی نور ہوا۔ ایک عبادت تھی تراویح اس کا نور ہونا بھی ظاہر ہے۔ اول تو خود حدیث میں ہے الصلوٰۃ نور دوسرے نور ہونا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نور کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ظلمت کو رفع کرتا ہے اسی طرح نماز مرتفع کرتی منکرات اور شہوات کو جیسا کہ ارشاد ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء و المنکر اور منکرات و شہوات کا ظلمت ہونا ظاہر ہے غرض تراویح کا نور ہونا اس طرح سے معلوم ہوا ایک عبادت اعتکاف ہے اس کی حقیقت ہے خلوت اور خلوت میں جو نور پیدا ہوتا ہے ظاہر بات ہے کوئی شک و شبہ نہیں۔ ایک عبادت احیاء لیالی قدر رمضان ہے یہ احیاء تو سب راتوں میں عبادت ہے لیکن خود لیالی قدر کی عبادت کی فضیلت قرآن مجید میں مذکور ہے لیلۃ القدر خیر من الف شھر تنزل الملائکۃ و الروح فیھا باذن ربھم ملائکہ اہل نور ہیں اور ظاہر ہے کہ نور والوں کی صحبت سے نور پیدا ہوتا ہے اہلِ صلاح کی صحبت سے صلاح کا مادہ پیدا ہوتا ہے اہل فسق کی صحبت سے فسق کا مادہ پیدا ہوتا ہے اہل ظلمت کی صحبت میں ظلمت ہوتی ہے اہلِ نور کی صحبت میں نور ہوتا ہے۔ یہ خاصیت خاص ہے شب قدر کے ساتھ خلاصہ یہ کہ رمضان کیا ہوا مجمع الانوار ہوا۔ یوں تو سب طاعات انوار ہیں مگر یہ خاصیت رمضان المبارک ہی میں ہے کہ تمام انوار اس میں جمع ہو گئے ہیں۔ پھر اس میں جو عبادت بھی ہے اپنی کامل ہیئت کے ساتھ ہے۔ بخلاف دوسری عبادات جامعہ کے جن میں یہ بات نہیں۔

مثلاً اہل لطائف نے نماز کو جامع جمیع عبادات کہا ہے۔ اس طرح کہ نماز کے اندر نماز تو ہے ہی۔ تلاوت قرآن مجید بھی ہے کھانا پینا بھی نماز کے اندر ممنوع ہے وہ گویا روزہ کے معنی ہوئے۔ نمازی متوجہ ہوتا ہے خانۂ کعبہ کی طرف۔ وہ گویا حج کے معنی ہوئے کسی سے بولتا چالتا نہیں اور مسجد کے اندر ہی رہتا ہے تو گویا نماز میں معنی اعتکاف کے بھی ہوئے۔ کچھ نہ کچھ خرچ بھی کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً کپڑا ہی بنایا یا جانماز ہی خریدی تو گویا معنی زکوٰۃ اور انفاق کے بھی نماز کے اندر پائے گئے تو اس طرح سے بعض عبادات غیر رمضان میں بھی جامع الانوار ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ نماز کے اندر تو اور عبادات تو صرف معنی ہی پائے جاتے ہیں اور رمضان المبارک میں ہر عبادت اپنے کامل ہیئت پر موجود ہے۔ چنانچہ نماز کے اندر جو روزہ کی صفت پائی جاتی ہے وہ صرف ایک ساعت کے اعتبار سے ہے اور ایک ساعت کا روزہ اس کی صورت اصلی کے اعتبار سے کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح اعتکاف بخلاف رمضان المبارک کے کہ اس میں جتنی چیزیں ہیں سب مستقل طور پر موجود ہیں۔ صوم ہے وہ مستقل قرآن مجید کی تلاوت ہے وہ مستقل اعتکاف ہے وہ مستقل لیالی قدر کی بیداری ہے وہ مستقل یہ سب مستقل ہیں۔ یہ خاصیت کسی زمانہ میں یا کسی طاعت میں نہیں ہے۔ ایسی جامعیت ہے اس کے اندر۔ اس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ رمضان شریف کیا چیز ہے۔ جب یہ ایسی چیز ہے تو جو اس کے حقوق ہیں ان کو ادا کرنا ضروری ہوا وہ حقوق کیا ہیں۔ ایک تو وہ حقوق ہیں جو مشترک ہیں تمام طاعاتِ رمضان میں اور ایک حق ہے خاص خاص طاعات کے متعلق معاصی کا ترک کرنا۔ مثلاً روزہ کے متعلق اور معاصی ہیں نماز کے متعلق اور معاصی ہیں۔ یہاں نماز سے مراد وہ نماز ہے جو خاص ہے جس کو تراویح کہتے ہیں۔ جو نماز عام ہے وہ مراد نہیں ہے۔ غرض ہر ایک کے متعلق جدا معاصی ہیں مثلاً روزہ کے متعلق جو معاصی ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ قسم جس سے روزہ کی حقیقت میں فرق آجائے یعنی عدم امساک عن مفطرات الصوم یا جوان آدمی نے جس کو اندیشہ جماع کے ارتکاب کا ہو لمس اور تقبیل سے احتراز نہ کیا یہ بھی اس ہی کی

ساتھ حکماً ملحق ہے۔ اور ایک وہ قسم جن سے روزہ کی حقیقت میں تو فرق نہیں آتا لیکن کمال میں مخل ہیں جیسے بری نگاہ سے کسی کو دیکھنا کسی کی غیبت کرنا یا کوئی ناجائز کام ہاتھ سے کرنا یا پاؤں سے ناجائز موقع کی طرف چلنا شطرنج گنجفہ کھیلنا گانا بجانا یا سننا یا ناچ دیکھنا وغیرہ وغیرہ اور سب سے بڑھکر اقبح اور اشنع یہ ہے کہ روزہ ہی نہ رکھے۔ چنانچہ پارسال رمضان گرمی میں آیا تھا۔ اب ہر سال دس دس دن مقدم ہوتا چلا جائیگا یعنی اس سے پہلا رمضان پورے جون میں تھا مگر بہتیرے لوگوں نے جرئیں ہی ماریں بیٹھکر۔ اب کا رمضان جون کے مہینہ سے دن پہلے شروع ہوجائیگا۔ یعنی ۲۰ مئی سے۔ اگلے سال ان شاء اللہ تعالیٰ اور دس دن پہلے شروع ہوگا۔ پھر ان شاء اللہ تعالیٰ یکم مئی سے ہوگا۔ پھر اپریل میں پڑے گا۔ غرض اب ہر سال سردی ہی کی طرف ہٹتا چلا جائے گا پھر سردی کے زمانہ میں ہونے لگے گا۔ اور ہر چند یہ زمانہ گرمی کا ہے جس میں اب کے سال رمضان المبارک آرہے ہیں۔ مگر اب تک تو بفضلہ تعالیٰ گرمی پڑی نہیں بہت ڈر رہے تھے کہ خدا خیر کرے اب کے رمضان میں بڑی گرمی ہوگی مگر خبر بھی ہے خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے گرمی کو سردی سے بدل دیا۔ اولئك يبدل الله سيئاتهم حسنات کا نمونہ ہوگیا اور یہ عجیب بات ہے کہ یہ مہینے سب گرمی کے ہیں۔ اپریل مئی جون۔ اپنے مہینوں کے نام اس لئے نہیں لئے کہ وہ مختلف موسموں میں واقع ہوتے ہیں۔ اس لئے غیروں کے مہینوں کے نام لئے ہیں کہ حساب آسانی سے سمجھ میں آجائے تو یہ اپریل اور مئی اور جون سخت گرمی کے مہینے ہیں مگر چند سال سے میں دیکھتا ہوں کہ گرمی بھی بہت دنوں میں شروع ہوتی ہے یعنی ضابطہ سے جو زمانہ گرمی شروع ہوجانے کا ہے اس وقت بھی سردی ہوتی ہے۔ غرض گرمی کا زمانہ شروع ہوجانے کے بعد بھی بہت دنوں تک سردی ہی رہتی ہے۔ اب بھی راتوں کو دیکھئے ٹھنڈ ہوتی ہے۔ دن کو بھی اور صبح شام بھی ایسی گرمی پریشانی کی نہیں ہوتی۔ اب جب مئی سے کھسک کر اپریل کے اخیر عشرہ میں رمضان شروع ہوں گے تو اور سردی ہوگی۔ پھر ۱۱ اپریل کو اور سردی میں ہوں گے۔ پھر یکم

اپریل کو اور سردی میں ہوں گے پھر مارچ میں آجائیں گے تو اور سردی ہوگی غرض اب اپنے دل سے ڈر نکال دو۔ کیونکہ سردی ہی کی طرف جارہے ہیں اور جب تک گرمی میں ہیں گرمی سے بھی نہ ڈرنا چاہیئے کیونکہ وہ گرمی بھی اب رفتہ رفتہ سردی ہوتی جاتی ہے جیسا کہ مشاہدہ کرلیا۔ اور میرا خیال ہے کہ عجب نہیں کچھ زمانہ کے بعد گرمی ہی بالکل جاتی رہے مجھے خیال اس لئے ہوا کہ میں نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے متعلق ایک پیشین گوئی سنی ہے۔ وہ پیشین گوئی یا تو کشف ہے یا فراست ہے کیونکہ مولانا کا دماغ بہت صحیح تھا۔ بزرگوں کے جدا جدا حالات ہیں مولانا کو کشف سے بہت مناسبت تھی۔ گو کشف ہونا کوئی ایسے زیادہ کمال کی بات نہیں۔ لیکن صاحب فراست بھی غضب کے تھے۔ ایسے عالی دماغ اور صحیح المزاج تھے کہ میں نے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ پہلے یہ کیفیت تھی۔ بعد کو یہ کیفیت کم ہوگئی تھی کیونکہ ایک بار گھوڑے پر سے گر گئے تھے جس سے دماغ پر صدمہ پہنچا تھا کہ کوئی ایک دفعہ بھی چادر اوڑھ کر دیدیتا تھا تو اُسے سونگھ کر بتادیتے تھے کہ یہ مرد نے اوڑھا ہے یا عورت نے۔ اس قدر صحیح دماغ تھا ان کے صاحبزادے مولوی حکیم معین الدین صاحب موجود ہیں انھوں نے عجیب و غریب حکایتیں مولانا کی صحت دماغ کی سنائی تھیں۔ اب اس پیشین گوئی کو یا تو کشف کہئے یا فراست سمجھئے میں کم سن تھا یعنی اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی۔ اس وقت حضرت نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ بھائی چند روز میں ہندوستان میں بھی کشمیر ہوجائے گا۔ حالانکہ اس زمانہ میں بڑی سخت گرمی پڑتی تھی مگر ممکن ہے کہ مولانا کو خفیف فرق محسوس ہوچلا ہو صاحب چند سال تک تو کچھ فرق معلوم نہ ہوا البتہ مولانا کی وہ بات یاد رہی پھر تو میں بھی تھوڑا بہت فرق محسوس کرنے لگا۔ اور اب تو بہت ہی فرق ہوگیا ہے۔ جو سخت گرمی کا زمانہ ہونا چاہیئے اس میں بھی سردی ہوتی ہے۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ ڈرو مت جب گرمی میں سردی ہے تو سردی میں تو سردا ہوگا۔ یعنی بہت قوی سردی ہوگی۔ سردا جو میں نے اس وقت کہا اس پر یاد آگیا ایک قصہ لطیف۔ یہاں تھانہ بھون میں

کسی کے سامنے کسی نے نقل کیا کہ پورب میں دہی کو مذکر بولتے ہیں مطلب یہ تھا کہ یہاں تو بولتے ہیں مثلاً دہی میٹھی ہے لکھنؤ میں بولتے ہیں دہی میٹھا ہے۔ تو آپ سنکر بولے کہ پورب میں کیا دہی کو دہا کہتے ہیں۔ ایک اس سے بڑھ کر ہوئی۔ میرے ایک عزیز ایک بڑے عاقل صاحب سے یہ حکایت بیان کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس طرح تمہید اٹھائی کہ بعضے ایسے بیوقوف ہوتے ہیں کہ پوری بات تو سنتے نہیں بے سوچے سمجھے خوامخواہ بیچ میں ٹانگ اڑاکر ناحق دوسروں کے سامنے ذلیل اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے وطن کا واقعہ ہے۔ ایک صاحب نے ایسی ہی حماقت کی تھی۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص ایک صاحب کے سامنے یہ بیان کر رہے تھے کہ پورب میں دہی کو مذکر بولتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے پائے تھے کہ وہ مخاطب صاحب بڑے بوجھ بجھکڑ بن کر بولے کہ کیا دہا بولتے ہیں اب وہ عزیز چپ کہ آگے کیا کہوں۔ انھوں نے تو اب کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ رکھی۔ انھوں نے کہا کہ آپ بیچ میں چپ کیوں ہوگئے پورا واقعہ تو سنائیے۔ پھر کیا ہوا۔ عزیز نے کہا اب اس حکایت کا مزہ ہی نہ رہا میں اب آپ سے کیا کہوں کہ کیا ہوا۔ یہی ہوا جو اس وقت ہوا کہ انھوں نے بھی یہی کہا کہ کیا دہا بولتے ہیں پھر تو وہ صاحب اس قدر شرمندہ ہوئے جس کی حد نہیں کہ ناحق میں نے بیچ میں بول کر اپنی حماقت ظاہر کی۔ اس لئے میں نے یہ حکایت بیان کی کہ وہ دہی کا مذکر دہا سمجھا۔ اسی طرح میں نے سردی کا مذکر سردا بولا۔ تو سردا پر یہ حکایت یاد آگئی تھی۔ غرض ڈرو مت کہ ابکے رمضان گرمی میں آرہے ہیں۔ اطمینان رکھو ان شاء اللہ بہت آسان رہیں گے اور ابھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ نصف شعبان کو جو روزہ ابکے رکھا تھا وہ بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ آپ ان شاء اللہ تعالے دیکھ لیجئے گا کہ بہت ہی آسانی کے ساتھ روزے گذریں گے (چنانچہ بفضلہ ببرکت قول حضرت اب تک ۹ روزے نہایت سہولت کے ساتھ ہو چکے ہیں کیونکہ خلاف موسم بجائے گرمی کے اچھی خاصی سردی پڑ رہی ہے بالخصوص بوجہ بارش ہو جانے کے اتنی سردی بڑھ گئی ہے کہ تراویح میں اور نماز فجر میں جاڑہ کی شکایت ہوتی ہے اور دن بھر ابر رہتا ہے۔ امید ہے کہ ختم رمضان تک ان شاء اللہ یہی کیفیت رہیگی ۱۲ جامع)

(۱۲ رمضان المبارک)

اور یوں کوئی عہدی کہے کہ چاہے سردی ہو یا گرمی ہمیں تو روزہ میں تکلیف ہی ہوتی ہے تو اس کا کوئی علاج ہی نہیں کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوتے کہ روزہ ہی فرض نہ ہوتا۔ اور میں شکایت کرتا ہوں کہ جو یوں کہتے ہیں کہ گرمی کیوجہ سے روزہ نہیں رکھا جاتا تو اگر گرمی سبب ہوتا روزہ نہ رکھنے کا تو جس وقت غلبہ ہوتا گرمی کا اسوقت کہاتے پیتے۔ میرا معمول ہے کہ میں بعد نمازِ فجر منزل پڑھتا ہوا جنگل کو نکل جاتا ہوں میں نے پارسال رمضان میں دیکھا کہ صبح کا وقت ہے ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور ایک صاحب بیٹھے تربوز اڑا رہے ہیں۔ بھلا فرمائیے یہ کونسا وقت تھا تربوز کھانے کا کیا اس وقت گرمی ستا رہی تھی، کیا اس وقت پیاس کا غلبہ تھا۔ کچھ نہیں شرارت ہے بدمعاشی ہے غرض یہ روزہ نہ رکھنا تو پورا اتلافِ حق ہے۔ خلاصہ یہ کہ روزے کے تو یہ حقوق ہیں۔ دوسری عبادت ہے تراویح۔ اس کی ایسی گت بناتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اتنی بڑی تو نعمت اور سمجھتے ہیں کہ اب تو کمبختی آتی۔ ۲۰ رکعتیں پڑھنی پڑینگی۔ کوئی حد ہے اور جو کوئی حافظ ہوتے ذرا مُجوِّد پھر تو گویا قیامت کا سامنا ہے۔ اول تو ایسے حافظ کو کوئی تجویز ہی نہیں کرتا اور اگر کر بھی لیا تو جلدی پڑھنے کی فرمائش کر کر کے ایسا تنگ کرتے ہیں کہ آئندہ کیلئے وہ توبہ کرلیتا ہے کہ انہیں تو اب کبھی سناؤنگا نہیں، یعنی یوں چاہتے ہیں کہ صرف اٹھک بیٹھک ہو اور ۲۰ پوری ہو جائیں، کانپور میں ایک بیچارے حافظ تھے جو ذرا رکوع سجدہ اطمینان کیساتھ ادا کرتے تھے اور قومہ میں بھی کچھ دیر لگاتے تھے، حافظ عبداللہ مرحوم جامع مسجد نے خود سنا کہ لوگ بعد تراویح کے اس مسجد سے نکلتے ہوئے یوں کہہ رہے ہیں ارے میاں تراویح کیا ہیں قیدخانہ ہے بس جا کر پھنس جاتے ہیں، رکوع میں گئے تو رکوع ہی میں ہیں، سجدے میں چلے گئے تو اب سر ہی نہیں اٹھتا التحیات پڑھنے بیٹھے تو اب کسی طرح سلام ہی نہیں پھیرتے، جان مصیبت میں آجاتی ہے غرض یوں چاہتے ہیں مقتدی کہ امام بس التحیات پڑھکر ہی سلام پھیر دیا کرے اور اسکو بہت پسند کرتے ہیں جو حافظ ریل ہو، اور ریل بھی کونسی مال گاڑی نہیں پسنجر نہیں ڈاک نہیں اسپیشل ہو اور اب اللہ بھلا کرے

ایجاد کرنیوالوں کا ریل سے بھی بڑھکر ہوائی جہاز چل گئے ہیں اب تو لوگ یہ چاہیں گے کہ حافظ جہاز ہوں، لیکن لوگ ابھی ہوائی جہازوں پر سوار نہیں ہوتے ورنہ ان شاء اللہ تعالےٰ اسکی تمنا بھی کرنے لگیں گے، ایک حافظ تھے نابینا. مرگئے ہیں بیچارے. ان کے تیز پڑھنے کا حال کچھ نہ پوچھو بس گن گن گن گن گن گن گن عفورابن بن بن بن بن تسکورا تسکورا عفورا کے سوا کچھ خبر نہیں کہ کیا الفاظ منہ سے نکل رہے ہیں. اور یہ پتہ تو کیا چل سکتا تھا کہ کونسا رکوع پڑھ رہے ہیں یا کونسا پارہ ہے بس اندھا دھند آندھی کی طرح اڑے چلے جاتے تھے مگر مقتدی ان سے ایسے خوش تھے کہ سبحان اللہ کیا ہلکی پھلکی تراویح پڑھاتے ہیں اور میں تمہیں اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی ترکیب بتادوں، وہ یہ کہ بالکل نہ پڑھو، تو میں نے ترکیب ایسی بتادی ہے کہ اس سے زیادہ ہلکی پھلکی تراویح ممکن ہی نہیں کیونکہ ہلکی پھلکی ہونیکے بھی مراتب ہیں، جیسے جلدی کے مراتب ہیں، جلدی کی حکایت سُنئے. ایک نائی کو اس کے کسی مہمان نے کوئی ضروری خط دیا کہ فلاں شخص کو جاکر دے آوے خط اس سے کہیں کھو گیا، تھا بڑا چالاک، شریر نے کیا حرکت کی کہ سادہ کاغذ لیکر اور اسے ایک سادہ ہی لفافہ میں بند کر کے بس مکتوب الیہ کے پاس پہونچ گئے، اور اسکو دے کر کہا کہ میاں نے یہ لفافہ آپ کے نام بھیجا ہے. اس نے کہا اور اس پر کچھ پتہ تو لکھا ہی نہیں ہے، نائی نے کہا حضور جلدی بہت تھی. پتہ لکھنے کی فرصت ہی نہ ملی. خیر کھولکر دیکھا تو اندر بھی ایک سادہ کاغذ رکھا ہوا ملا جسپر کوئی تحریر نہ تھی. الٹ کر دیکھا کہ شاید دوسری طرف لکھا ہو مگر ادھر بھی کورا نظر آیا، اب تو بڑے چکرائے، پوچھا میاں کچھ کہو تو آخر یہ معمّا کیا ہے کہ نہ باہر کچھ لکھا ہے نہ اندر. یہ خط ہی کیا ہوا اس نے کہا حضور میں نے عرض تو کیا بہت جلدی تھی، کچھ لکھ ہی نہ سکے پوچھا کچھ زبانی کہہ دیا ہے، کہا حضور کہاں، بہت جلدی تھی، زبانی کہنے کی بھی فرصت نہیں ہوئی، تو یہ سوا مسخرہ پن کے کیا ہوا. یہ کوئی جلدی تھی. خیر یہ تو تمثیلی حکایت ہے جلدی کی ایک حکایت دیکھی ہوئی بھی ہے. حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے یہاں ایک ملازم تھا عبداللہ. بڑا ہی بیوقوف تھا (پھر مزاحًا فرمایا ۱۲ کاتب)

اور لوگ بھی اس نام کے اس وقت موجود ہیں، ان میں سے کوئی مراد نہیں کہیں کسی کو شبہ ہو، وہ تو بیچارے مر بھی گئے۔ یہاں جتنے اس نام کے ہیں تو وہ ماشاءاللہ زندہ ہیں (جلسہ وعظ میں ایک نوجوان صاحب اسی نام کے موجود تھے جو حضرت کے پرجوش خدام میں سے ہیں، انہیں کیطرف حضرت کا اشارہ تھا، انہوں نے اپنی عقلمندی کا اس طرح ثبوت دیا کہ بھرے مجمع میں آپ پکار کر فرماتے ہیں کہ نہیں میں بھی ایسا ہی ہوں پھر بعد کو بہت پچھتائے کہ واقعی مجھ سے حماقت ہوئی کیونکہ بہرصورت یہ حرکت آداب مجلس کے خلاف تھی ۱۲ کاتب) دنیا میں بعضے بڑے ہی کم عقل آدمی ہوتے ہیں، ایک دن آپ گھر کی طرف سے دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ اجی مولانا کے گھر میں سے یوں کہا ہے کوئی کام تھا جلدی کا، وہ گھر میں سے کہلا کر بھیجا تھا کہ جلدی جا کر کہہ آ۔ آپ دوڑے ہوئے پہنچے اور کہا مولانا یوں کہا ہے، مولانا نے جب پوچھا کیا کہا ہے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ اجی میں تو بھول گیا یعنی دوڑنے کیطرف توجہ زیادہ تھی۔ اہتمام یہ تھا کہ جلدی جا کر خبر دوں۔ اسی اہتمام میں دوسری طرف توجہ رہی نہیں اور اس خبر کو ہی بھول گئے جو پہنچانی تھی ہمارے یہاں بھی ایک طالبعلم تھے عید و شاہ مر گئے بیچارے۔ میں نے بلا کر ایکدن ان سے کہا کہ تم حافظ لطیف احمد کو جانتے ہو اس نے کہا جی ہاں جانتا ہوں، میں نے کہا وہاں جاؤ، آگے میں کہتا ہی کہ وہاں جا کر یہ کہو لیکن کون انتظار کرتا ہے، بس یہ سنتے ہی کہ وہاں جاؤ آپ چلدیئے۔ میں نے واپس بلا کر پوچھا کہ تم چل کہاں دیتے کہا حافظ لطیف کے یہاں میں نے پوچھا وہاں جا کر کیا کرو گے، کہا بس چلا جاؤنگا جو حکم ہوا تھا وہ کر دوں گا، وہ عجیب چیز تھے صاحب۔ تو جیسے ایک مرتبہ جلدی کا یہ بھی ہے اسیطرح ایک درجہ ہلکے پھلکے رہنے کا بھی یہ ہے کہ تراویح پڑھی ہی نہیں بالکل۔ چنانچہ بعضے ایسا بھی کرتے ہیں، ارے بندے خدا کے جب نام کیا تراویح کا اور ایک گھنٹہ کی مشقت اٹھائی تو پاؤ گھنٹہ کی مشقت اور سہی۔ اور زیادہ وقت تو اٹھنے بیٹھنے میں لگتا ہے، اچھی طرح ادا کر کے پڑھنے میں اور گھسیٹ کر پڑھنے میں

آزما کر اور گھڑی لیکر دیکھ لو۔ دس پندرہ منٹ سے زیادہ تفاوت نہیں نکلے گا۔ پھر افسوس ہے صرف دس پندرہ منٹ کیلئے قرآن کو بگاڑ کر پڑھا جائے اور تراویح کو خراب کیا جائے، پھر تراویح سے فارغ ہو کر کوئی کام بھی تو نہیں محض باتیں کرنے کے سوا۔ افسوس کی بات ہے کہ تراویح کو تو یوں خراب کرو اور کھانے کو خراب کرو بلکہ رمضان میں تو اور مہینوں سے زیادہ لذیذ کھانے کا اہتمام کرتے ہو کہ بھنا ہوا گوشت بھی ہو چٹنی کیلئے اچور بھی ہو دھی بڑے بھی ہوں، پھلکیاں بھی ہوں، گھونگھنیاں بھی ہوں شربت بھی ہو وغیرہ وغیرہ پھر شرم نہیں آتی کہ غذائے جسمانی تو اور دنوں سے اچھی ہو اور غذائے روحانی کو خراب کر کے کھاؤ۔ سبحان اللہ کیا اچھا فیصلہ ہے۔ اور نماز کی تحسین میں یہ بھی داخل ہے کہ اذان وقت سے پہلے نہ ہو۔ بعض مسجدوں میں رمضان میں یہ بھی ہوتا ہے کہ عشاء کی اذان وقت سے پہلے دیدیتے ہیں بس ملاجی نے کھانا کھایا اور اللہ اکبر پکار دیا، بلکہ بعض مسجدوں میں تو وقت سے پہلے نماز بھی شروع کر دیتے ہیں۔ زیادہ اہتمام اس کا ہوتا ہے کہ تراویح سے جلدی فارغ ہو کر لیٹ جائیں۔ اور لیٹنے کو یوں جی چاہتا ہے کہ پانی پیتے ہیں بیحد۔ یہ سخت غلطی ہے یعنی طباً بھی مضر ہے۔ ذرا پیاس کو روک کر پانی پیئیں تو تراویح بھی بشاشت سے ہوں، اور قرآن بھی اچھی طرح سن سکیں۔ ہمت والوں نے تو یہاں تک کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ٦١ قرآن شریف ہر رمضان میں ختم کرتے تھے ایک ختم تو روزانہ دن میں کرتے۔ اور ایک رات کو ایک وہ جو ہمیشہ تراویح میں پڑھتے کا معمول تھا، غرض اس ایک مہینہ میں ٦١ قرآن شریف پڑھتے تھے۔ تو دیکھو ایک اللہ کے بندے وہ بھی تو تھے۔ غرض تراویح کو جو کہ مخصوص عبادت رمضان المبارک کی ہے اور اس کے وہ حقوق ہیں جو میں نے عرض کیئے کہ ٹھیک وقت پر بھی ہوں رکوع سجود بھی اچھی طرح ہوں تشہد بھی اچھی طرح ہو جلدی مت کرو تلاوت جو اسمیں کیجاتے وہ بھی اچھی طرح ہو۔ اور ایک عبادت رمضان المبارک کی تلاوت قرآن ہے اس کے حقوق میں سے یہ ہے کہ تصحیح کے ساتھ پڑھا جائے۔ لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اول تو اس کا

اہتمام ہی نہیں ہے تصحیح کا طریقہ ہی نہیں سیکھتے اور اگر طریقہ بھی سیکھ لیا تو اس پر عمل نہیں کرتے۔ اور اگر عمل کرتے ہیں تو یارانِ طریقت پریشان کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ بھائی اچھی قرأت سیکھی قرآن پڑھتے ہو یا جھینکتے ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ قرآن پڑھتے ہو یا گاتے ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ الفاظ کو توڑ مروڑ کر کیوں ادا کرتے ہو بس فر فر پڑھتے چلے جاؤ۔ نہیں معلوم یہ فر فر کیا صیغہ ہے کیا فرّ ہے جو ماضی ہے اور جس کا مقصد فرار ہے بمعنی بھاگنے کے۔ محاورات میں تطابق بہت ہوتا ہے اُردو میں فر فر اس کو کہتے ہیں جہاں بھاگتا ہوا پڑھا جاتے۔ ایک ہمارے دوست ہیں حکیم صاحب انہوں نے تراویح میں قرآن سنانا چاہا مگر پڑھتے تھے صحیح چنانچہ والاالضالین کو جو صحیح مخرج سے ادا کیا مقتدی بگڑ گئے کہ ہم ان کے پیچھے تراویح نہ پڑھیں گے چنانچہ ان بیچاروں کو وہاں سے جدا ہونا پڑا۔ اب یہ مصیبت ہے کہ کوئی تصحیح کے ساتھ پڑھ کر تو لوگ پڑھنے نہیں دیتے، ایک مخلوق پریشان کرنے لگتی ہے تو یعنی بعضوں نے تو یہ سستا نسخہ یاد کر رکھا ہے کہ والاالضالین کو والاالظالین پڑھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہ ظا اور ض باہم متشابہ ہیں گویا دونوں متحد الصفات ہیں پھر دونوں میں مغائرت کیسی اسی طرح دوسروں نے یہ سستا نسخہ یاد کر لیا ہے کہ ولاالضالین کو والدّٰالین پڑھتے ہیں۔ اور دا اور ض کے فرق کیلئے ذراض کو موٹا سا پڑھ دیا۔ اور جہاں دال ہے وہاں باریک سا پڑھ دیا۔ اس موٹے باریک پر مجھے وہی حکایت یاد آتی ہے کہ لکھنؤ میں تھے ایک مولوی صاحب معقولی جو امامت بھی کرتے تھے۔ وہاں ایک مولوی مہدی تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ اُن معقولی مولوی صاحب کی یہ عادت تھی کہ قریب قریب ہر جہری نماز کے اندر پہلی رکعت میں تو تبت اور دوسری رکعت میں قل ہواللہ پڑھتے تھے۔ اور وہ تھے تو مولوی مگر قرآن پڑھتے تھے بہت غلط۔ صاحب بعضے تو بہت ہی غلط پڑھتے ہیں یعنی اکثر اہل علم کو بھی تصحیح کیجانب التفات نہیں، بریلی میں ایک صاحب من الجنۃ والناس کے بجائے من الجنات والنس پڑھتے تھے۔ آپ نے یہاں کا الف وہاں جا لگایا، یعنی والناس میں جو الف ہے اس کو گرا کر من الجنۃ میں پڑھا دیا

ایسا ناس کیا، بس ان سے یہی کہنا چاہیئے کہ ام برجنہ، عالموں نے بھی تو ایسا ہی ناس کیا ہے ان کا معمول ہے کہ اگر کسی کا ناس کرنا ہو تو سورۂ ناس اس طرح پڑھنے کو بتلاتے ہیں، قل اعوذ برب الناس ناس ناس ملک الناس ناس ناس غرض ناس کے لفظ کو ہر جگہ تین دفعہ پڑھنے کو کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے قرآن شریف اردو میں ہے کہ یہاں ناس کے وہی معنے ہیں جو اردو میں ناس کے ہوتے ہیں، جیسے کہتے ہیں کہ فلانے کا ناس جائے یعنی ستیاناس ہو۔ لاحول ولا قوۃ، تو بعض لوگ قرآن شریف کی اس طرح گت بناتے ہیں جیسے کسی بڑھیا نے باز کی گت بنائی تھی، تو اسی طرح لکھنؤ کے وہ معقولی صاحب بھی ابی لہب کے بجائے ابی لحب پڑھتے تھے، مولوی مہدی کہنے لگے کہ سنتے سنتے میرے کان پک گئے جب دیکھو تبت یدا ابی لحب و تب کہنے لگے کہ میں نے ایک روز جاکر خلوت میں کہا کہ مولانا آپکی اتنی بڑی تو شان ہے اور شہرت ہے اور آپ کلام مجید غلط پڑھتے ہیں یہ آپ کی شان کے خلاف ہے کہا کیا غلط پڑھتا ہوں، انہوں نے کہا آپ ابی لحب پڑھتے ہیں اور یہ غلط ہے انہوں نے کہا اور کیا پڑھوں کہا یوں پڑھا کیجیے۔ ابی لہب ادب کیوجہ سے ذرا پست آواز سے بتایا، یہ سُنکر مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں اچھا آہستہ سے پڑھا کروں گا پکار کر نہ پڑھا کرونگا سبحان اللہ کیا خوب سمجھے یہ مولوی ہیں آجکل کے، انہوں نے تو خود ادا کر کے ابی لہب کے صحیح تلفظ بتانا چاہتا تھا اور آہستہ سے اس لئے بتایا کہ بے ادبی نہ ہو۔ آپ یہ تو سمجھے نہیں کہ بجائے حاء حطی کے ہاء ہوز پڑھنے کو کہہ رہے ہیں اور سمجھے تو یہ سمجھے کہ شاید میں بہت بلند آواز سے پڑھا کرتا ہوں آہستہ پڑھنے کی ہدایت کر رہے ہیں انہوں نے کہا واہ حضرت خوب سمجھے۔ جب انہوں نے کھولکر کہا کہ بھائی ابی لہب میں حاء حطی نہیں ہے ہاتے ہوز پڑھا کرو تب کہیں ان کے سمجھ میں آیا۔ یہ مولوی آدمی ہیں، صاحب جو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے آج کل مولوی ہونا کیا مشکل ہے ایک آدھ کتاب صرف نحو کی پڑھ لی کچھ قرآن حدیث کا ترجمہ دیکھ لیا۔ بس مولوی بن گئے۔ چنانچہ ہمیں ایک ایسے ہی مولوی صاحب اب کے سفر میں ملے، کنڈا ایک مقام ہے ضلع اعظم گڈھ میں وہاں میرے ایک دوست ہیں،

تحصیلدار ہیں ان کا بلایا ہوا وہاں گیا تھا ایک صاحب مولوی صاحب کہلاتے تھے ملنے آئے جو سب کچھ گذار تھے یعنی تہجد گذار اور شاید مال گذار بھی ہوں، یعنی امیر بھی ہوں عمر بھی بہت تھی مگر عمر بھر کسی نے ان کو خرابی قرآن مجید کے ترجمہ دیکھنے کی نہ بتائی تھی حالانکہ بعضوں کیلئے ترجمہ دیکھنا حرام ہے اب لوگ ہمیں متعصب کہتے ہیں متشدد کہتے ہیں مگر ہم کیسے اجازت دیدیں، کیا ان تجربوں پر خاک ڈالدیں۔ اور ایک تجربہ نہیں بہت تجربے ہیں۔ ایک تجربہ مجھے اس وقت یاد آگیا، ہاں تو اُن صاحب نے پہلے یہ آیت پڑھی **یاایھاالذین امنوا لاتقولوا راعنا** اور اس کا ترجمہ پڑھا کہ اے ایمان والو راعنا مت کہو پھر آپ کیا کہتے ہیں کہ تلاوت کرتے وقت کیا راعنا کا لفظ چھوڑ دینا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مت کہو راعنا تو اس آیت کا یہ مطلب آپ سمجھے مجھے اس قدر حیرت ہوئی، کہ جس کی انتہا نہیں کیوں کہ اس سے پہلے ایسا عجیب مطلب میں نے کبھی نہیں سُنا تھا۔ میں نے کہا کہ جاؤ ہم نہیں بتاتے کہ کیا مطلب ہے بس مطلب یہ ہے کہ خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھ کر قرآن مجید پڑھا، بس سادی تلاوت کرتے رہو اور تم راعنا بھی پڑھتے رہو۔ باقی جو مطلب ہے اس آیت کا اُسے تم جیسے کوڑھ مغز ونکے آگے کیا بیان کیا جائے۔ اندھوں کے آگے روئے اپنی آنکھیں کھووے، بس خبردار جو کبھی ترجمہ دیکھا تو حضرت وہ جاہل سمجھا تھا کہ ابی لہب جو چپکے سے کہا ہے تو یہ مطلب ہے کہ آہستہ پڑھا کرو۔ انہوں نے کہا مولوی صاحب ڈوب جاؤ۔ کیا خوب مطلب سمجھے، تو حضرت یہ حالت ہو رہی ہے بے فہمی کی اور بے توجہی کی۔ جیسے چھوٹی ہ کو موٹا کر کے پڑھدیا تو بڑی ح ہو گئی ایسے بعض حروف کو سمجھتے ہیں کہ اگر باریک کر کے پڑھدیا تو دال ہو گئی۔ اور اگر موٹا کر کے پڑھدیا تو ضاد ہو گیا بس اس پر قناعت کر رکھی ہے غرض اوّل تو تصحیح مخارج کی طلب ہی نہیں اور اگر طلب بھی ہوئی کہ سیکھو تو یہ نہیں مشق کریں بلکہ علماء سے تحقیق کرنے بیٹھ جائیں کہ والاالضالین کو والاالظالین پڑھنا چاہیئے یا دالاالدالین، امدالفتاویٰ میں کوئی فتویٰ اس قدر مکرر نہ ہوگا جسقدر کہ یہ مسئلہ ہر شخص یہی ضالین دالین کا سوال کرتا ہے

حالانکہ ض کثرت سے کلام مجید میں موجود ہے مثلاً والضحیٰ میں ہے بحث جب ہوگی تو ولا الضالین ہی میں غرض اس قسم کی فضول تحقیق تو ہر شخص کرتا ہے مگر یہ توفیق کسی کو نہیں ہوتی کہ مشق کرے کیونکہ یہ فن تو مشق ہی سے آتا ہے نری تحقیق علمی سے کہیں کچھ حاصل ہوتا ہے ایک قاری صاحب سے کسی نے پوچھا کہ ض کی صفت کیا ہے کہا میاں اگر میں نے صفت بیان بھی کردی تو اس سے کیا ہوتا ہے ض کی ہیئت اور کیفیت جو ہے وہ نرے بیان سے کس طرح ظاہر ہو جائے گی۔ جبتک اس کو ادا کرکے بھی نہ بتایا جائے۔ پھر یہ شعر پڑھا نہایت برجستہ ؎

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

(اگر مُصوّر نے اس محبوب کی تصویر بنا بھی لی مگر اس بات سے حیران ہوں کہ اس کے ناز و ادا کی کس طرح تصویر بنائے گا۔)

سبحان اللہ وہ جو ایک آن ہے اور ادا ہے وہ صفات مخارج کے بیان کر دینے سے کیسے معلوم ہوگی۔ وہ جو ایک لوچ ہے وہ کیسے معلوم ہوگا وہ تو سماع کے متعلق ہے اب کسی نے توجہ کرکے خیر مشق بھی کرلی تو وہ اب نشانۂ ملامت ہے سب کا۔ مولانا فتح محمد صاحب اودئی تشریف لے گئے تھے فرماتے تھے کہ میں نے جو اول بار فجر کی نماز پڑھائی تو بس قیامت اُٹھ ہی رہ گئی، میں نے سورۂ قیامت پڑھی۔ یہ خبر نہ تھی کہ قیامت نازل ہو جائے گی، سلام پھیرتے ہی ایک صاحب نے اعتراض جڑا کہ وجوہ یومئذ ناضرۃ الیٰ ربہا ناظرۃ میں آپ نے دونوں جگہ ظ پڑھی ہے مولانا نے ہر چند فرمایا کہ نہیں بھائی میں نے ایک ظ پڑھی ہے ایک جگہ ض۔ مگر وہ نہیں مانا مولانا حیران کہ اب اُسے سمجھائیں کیسے۔ سمجھے تو وہ جو فن تجوید جانتا ہو مگر مولانا نے ایک عجیب طریقے سے اُسے سمجھایا۔ فرمایا کہ اچھا اب یہ بتاؤ کہ میں نے دونوں جگہ ایک سا پڑھا تھا یا کچھ فرق تھا کہا اتھا تو فرق۔ خیر وہ ہٹ دھرم نہیں تھا ورنہ اس کا بھی انکار کر دیتا، فرمایا بس اتنا ہی فرق ہے ظا اور ض میں۔ اور صاحب پڑھے لکھے لوگ بھی تو کثرت سے اس غلطی میں مبتلا ہیں اور اس قدر اسپر جمود ہے کہ

اگر کوئی اتباع کرنا چاہے تو اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں پھر جب اہل علم جو مصلح ہیں انکی یہ حالت ہے کہ تو عوام کو کیا کہا جائے اسی لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اے عزیز صحت کی کیا امید رکھ سکتے ہو جب تمہارے طبیب ہی بیمار ہیں سچ ہی ہے واللہ باستثنار بعض کے خود اطباء ہی بیمار ہیں، یہ میں نہیں کہتا کہ مولوی زنا کرتے ہیں یا شراب پیتے ہیں لاحول ولاقوۃ مگر ایک علت ہے وہ میں بھی اپنے اندر پاتا ہوں اس سے میں خود بھی بری نہیں، وہ علت کیا ہے غرض پرستی۔ اور غرض پرستی وہ چیز ہے کہ ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بہ سوئے دیدہ شد

چوں دہد قاضی بہ دل رشوت قرار کے شناسد ظالم از مظلوم زار

(جب غرض آتی ہنر پوشیدہ ہوا۔ اور سینکڑوں پردہ دل کی طرف سے آنکھوں پر آجاتا ہے)

(جب قاضی خود فیصلہ کے وقت رشوت سے دل کو خوش کر رہا ہو تو ظالم اور مظلوم کی پہچان کس طرح سے ممکن ہو سکتی ہے۔)

یہ غرض وہ چیز ہے کہ جب حاکم دل میں یہ ٹھان لے کہ فلانے سے ایک ہزار روپیہ لوں گا۔ پھر روداد مقدمہ کی اس کی آنکھوں میں الٹی ہی نظر آئے گی ؎ کے شناسد ظالم از مظلوم زار۔ پھر وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ کون تو ظالم ہے اور کون مظلوم، اس غرض نے ہم کو تباہ کر رکھا ہے وہ غرض مال ہے جاہ ہے شہرت اعتقاد ہے بس اس نے ناس کر دیا ہے الا ماشاء اللہ منہم۔ بس یہ ڈرتے ہیں کہ اگر حق کا اتباع کریں گے تو آمدنی کم ہو جائے گی معتقد کم ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اس حالت میں وہ ہمارے کیا معتقد ہیں خود اپنے معتقد ہوتے۔ جانچ تو یہی ہے کہ ہم اتباع حق کا کریں پھر دیکھیں کہ کون ہمارے معتقد رہتے ہیں کون نہیں، وہ تو علماء سے یہ پوچھتے ہیں کہ چہ می فرمایند علماء دین دریں مسئلہ اور یہ الٹے ان سے پوچھتے ہیں کہ چہ می فرمایند جہلاء دنیا کہ ما باید خواند یا دو اندریں

مستلاانذرین فتویٰ جب دیکھا کہ والاالضالین کے صحیح پڑھنے سے جہلاء ناراض ہوتے ہیں اور بداعتقاد ہوئے جاتے ہیں، بس غلط ہی پڑھنا شروع کردیا۔ دیکھیے علماء دین نے اپنے فتویٰ سے رجوع کرلیا۔ میں کہتا ہوں کہ فتویٰ بھی نہ ہو غیرت اور شرافت کے بھی تو خلاف ہے کہ عوام سے ڈر کر حق کے اتباع کو چھوڑا جائے۔ حق کے مقابلہ میں عوام کو جوتی پر مارنا چاہیئے۔ یہ خوب سمجھ لیجئے گا کہ حق کا اتباع اسی کو نصیب ہوسکتا ہے جسکی یہ شان ہو لایخافون فی اللہ لومۃ لائم۔ اجی خدا سے کام ہے مخلوق کو جھاڑ و مارے۔ بس آزاد ہو کر رہے۔ بزرگوں کو یہاں تک آزادی حاصل تھی اور یہی ہونی چاہیئے ؎

تلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند آرے آرے میکنم باخلق وعالم کارنیست

(مخلوق کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے یعنی پیر پرستی کرتا ہے ہاں ہاں میں ضرور کرتا ہوں مجھے مخلوق کی اس ملامت سے کچھ کام نہیں کیوں کہ میں توحید کامل کا اعتقاد رکھتا ہوں اور پیر سے صرف اللہ تعالےٰ کیلئے محبت رکھتا ہوں)

مخلوق اگر کہے کہ تم بت پرستی کرتے ہو تو جو آزاد نہیں ہیں وہ تو اس قول کی تردید کریں گے کہ نہیں صاحب میں بت پرستی نہیں کرتا، میرے ایسے عقیدے نہیں ہیں، اب بیٹھ کر للو پتو کرو جاہلوں کی، اور جو آزاد ہیں وہ کسی کے کہنے کی کچھ پرواہ نہیں کریں گے بلکہ صاف کہہ دیں گے کہ ع آرے آرے میکنم باخلق وعالم کارنیست۔ ہاں ہم بُت پرستی کرتے ہیں۔ جاؤ کر لو ہمارا کیا کرتے ہو کسی کے باپ کے غلام ہیں نوکر ہیں جو ڈریں۔ کسی نے کوئی تنخواہ مقرر کر رکھی ہے کہ خواہ تنخواہ دبیں۔ جاؤ ہم بُت پرست ہی سہی۔ سب کے سب چھوڑ دو ہمیں، اور حضرت میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حق میں وہ اثر ہے کہ اگر کوئی شخص حق کو قبول کر کے استغنا برتے اور یہ کہدے ؎

ہرکہ خواہد گو بیا و ہرکہ خواہد گو برو دار وگیر وحاجب ودربان دریں درگاہ نیست

(جس کا دل چاہے آوے، جس کا دل چاہے نہ آوے ہمارے پاس کوئی دربان تو

مقرر نہیں ہے۔)
تو بڑے بڑے سرکش اس کے دروازے پر ناک رگڑیں گے۔ مگر دل کے اندر رغدغہ نہ ہو کہ سب چھوڑ دیں گے تو ہائے کیا ہوگا۔ لاحول ولا قوۃ مخلوق سے ڈر کر حق کو چھوڑ دینا نہایت ہی اوچھی بات ہے اور خصوص آمدنی کیلئے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ع حیف باشد دلِ دانا کہ مشوش باشد۔ دانشمند کا قلب روٹیوں کیلئے مشوش ہو افسوس کی بات ہے اس کا تو یہ مشرب ہونا چاہیئے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی سرش چہ فولادِ ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس ہمین ست بنیادِ توحید و بس

(جو توحید والا ہے اگر اس کے پاؤں پر سونے کا ڈھیر لگا دیا جائے یا اس کے سر پہ تلوار رکھدو ان کو نہ تو کسی سے امید ہوتی ہے نہ کسی سے خوف ہوتا ہے اور یہی توحید کی بنیاد ہے)
اور حضرت یہ تو ایک خاص مسئلہ کے متعلق گفتگو تھی ایسے ہی تمام احکام و اعمال میں، ماہرین کو چاہیئے کہ مستقل رہیں جہلاء کی مرض کا حق کے خلاف کبھی اتباع نہ کریں۔ اگر سب ایسا کرنے لگیں تو جہلاء کا کبھی حوصلہ نہ بڑھے اور جہلا کو بھی چاہیئے کہ ان سے اپنے مرض کے اتباع کے منتظر نہ رہیں تو اے عوام اس مولوی کو چھوڑ دو جو تم سے ڈر کر تمہارا ہم خیال ہوگیا ہے وہ تو معلوم ہوتا ہے ٹٹو لے بھاڑے کا۔ اور میرے کہنے کی بھی حاجت نہیں وہ تمہاری نظر سے خود ہی گر جائے گا۔ یہ تو ان عوام کا ذکر تھا جو علماء سے تعلق رکھتے ہیں مگر اُن سے اپنے مذاق کے اتباع کا انتظار کرتے ہیں، اور علماء اُن سے ڈر کر انکی مرضی کا اتباع کرتے ہیں، بعضے عوام وہ ہیں کہ علماء سے تعلق ہی نہیں رکھتے یہ لوگ کتابیں اور ترجمے دیکھکر اپنے کو علماء سے مستغنی سمجھنے لگے ہیں، سو حضرت خوب سمجھ لو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسی ایسی باریک باتیں ہر فن میں موجود ہیں کہ بدون ماہر کے بتائے ان تک کسی کی نظر پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اس واسطے ہر امر میں شیخ اور ماہر کے اتباع کی حاجت ہے کیونکہ ایک چیز بظاہر خیر

مخفی نظر آتی ہے لیکن ماہر اس سے منع کر دیتا ہے کیوں۔ اسلئے کہ وہ مفضی ہے الی الشر۔ اور اس شر تک غیر ماہر کی نظر فی الحال پہنچنے سے قاصر ہے پرسوں ہی کا واقعہ ہے۔ ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ ایک استفتا میرے پاس آیا، وہ مثال ایک مسئلہ کی تحقیق کے ضمن میں مجھے پیش آتی۔ وہ مسئلہ خیر سب کو معلوم ہی ہے لیکن مجھے اس کی مثال عرض کرنا ہے کہ ہر فن میں بہت سی باریک باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ماہر ہی سمجھتا ہے غیر ماہر نہیں سمجھ سکتا، چنانچہ جوابات میں عرض کروں گا وہ اس سے پہلے شاید کسی کے ذہن میں کبھی نہ آئی ہوگی۔ ایک شخص نے استفتا کیا کہ میرے گھر میں کچھ ایسا سلسلہ ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ قریب آتا ہے تو بچہ پیدا ہوجاتا ہے اور روزہ دو وہ چلہ چھٹی میں قضا ہو جاتے ہیں پھر سال بھر تک ضعیف رہتی ہے پھر دہی بچہ غرض قضا روزوں کے رکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اب کیا کرے جب قضا روزے نہیں رکھ سکتی تو کیا فدیہ دیدے میرے ذہن میں یہ آیا کہ مسئلہ تو یہ ہے کہ جب تک امید ہے عود قوت اور عود صحت کی روزہ ہی رکھے فدیہ نہ دے خیر یہ مسئلہ تو ہے ہی مگر میرے جی میں یوں آیا کہ یوں لکھدوں کہ بالفعل چاہے فدیہ بھی دیدو لیکن اگر کبھی صحت اور قوت عود کر آئے تو فدیہ کو کافی نہ سمجھے بلکہ ان روزوں کی قضا بھی کرے۔ یہ آیا ذہن میں، میں نے اپنی نزدیک اسمیں یہ احتیاط سمجھی کہ اگر صحت اور قوت نے عود نہ کیا تو یہ فدیہ ہی دینا کافی ہوجائے گا۔ اور سال کے سال دیتے رہنے میں سہولت رہے گی۔ ورنہ بہت سا جمع ہوگیا تو شاید پھر نہ دے سکے۔ اسمیں دونوں رعایتیں ہوجاویں گی کہ نفع تو بہت اور نقصان کچھ نہیں۔ نفع تو یہ کہ اگر صحت اور قوت نے عود نہ کیا تو تھوڑا تھوڑا کرکے دینے میں فدیہ آسانی کیساتھ ادا ہوجائے گا۔ ورنہ جمع ہوکر کثیر رقم ہوجائے گی۔ جسکا ادا کرنا بھی دشوار ہوگا اور اگر صحت اور قوت نے عود کیا تو روزے رکھ لئے جائیں گے اور وہ فدیہ جو دیا جاچکا ہے تطوع ہو جائے گا وہ گویا نفل خیرات ہوجائے گی۔ جسکا ثواب الگ ملیگا۔ بس قریب تھا کہ یہی لکھدوں لیکن اللہ تعالٰی نے سنبھالا۔ دستگیری فرمائی۔ معاً شرح صدر ہوا کہ حالت عوام کی یہ ہے کہ فدیہ کو بدل سمجھتے

ہیں روزہ کا۔ اگر فدیہ دیدیا تو پھر بے فکر ہو جائیں گے۔ اور قلب میں تقاضائے قضائے صوم کا پیدا نہ ہو گا کہیں گے کہ فدیہ تو دے ہی چکے ہیں لہذا مجھے یہ لکھنا پڑا کہ جائز نہیں فدیہ دینا جبتک صحت وقوت سے ناامیدی نہ ہو جائے تو دیکھئے یہاں فدیہ ظاہراً اہل علم کے نزدیک بھی خیر ہے، لیکن کتنے بڑے شرعظیم کو مستلزم تھا۔ تو میں نے یہ واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا، بہرحال عوام کی خواہ کوئی قسم ہو سب کے ذمہ حق یہ ہے کہ اپنے کو علمائے تابع بنا دیں نہ ان سے موافقت کی توقع رکھیں نہ انسے مستغنی ہوں اور نہ کسی حال میں اُنسے مزاحمت کریں بس انکا ادب یہ ہے کہ وہ مزاحمت نہ کریں اور تمہارا ادب یہ ہے کہ اگر وہ مزاحمت کریں تو تم متاثر نہ ہو تم تو نائب ہو جناب رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے، کیا تھوڑی دیر کیلئے۔ وجدان کی طرف نظر کر کے دیکھو اگر جناب رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی عوام مزاحمت کرتے تو کیا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی ان کی خاطر سے موافقت کر لیتے پھر یا تو نائب ہونے کے حیثیت سے تم بھی وہی کرو جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کرتے ورنہ نیابت کا کام چھوڑ دو ۔

یا مکن با پیل بانان دوستی   یا بنا کن خانہ بر انداز پیل (دوبار)

(یا تو فیل بان یعنی ہاتھی وان، سے دوستی مت کرو یا پھر اس کیلئے دروازہ بہت بڑا بناؤ تاکہ مع ہاتھی کے آجاوے)

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی   یا فروشو جامۂ تقوی بہ نیل (دوبار)

(یا تو اپنے چہرہ پر عاشقوں، کی ملامت نہ لگاؤ یا پھر جامۂ تقویٰ کو دریائے عشق میں ترکرو یعنی زاہد خشک کے بجائے عاشق حق بنو۔)

تو اس پر یہ سب گفتگو بڑھ گئی تھی کہ ماہرین سے مزاحمت کرتے ہیں، غیر ماہرین سوائے ماہرین تم انکی مزاحمت کی کچھ پرواہ نہ کرو، حق بات پر عمل کرو، اللہ پر توکل کر کے یہ سب کلام داور وضاد پر بڑھ گیا تھا، تو غرض تلاوت قرآن مجید میں تو یہ کوتاہیاں ہیں، اور بعض کوہیاں قرآن مجید کے متعلق اور قسم کی ہیں، چنانچہ بعضے لوگ قرآن مجید کو بے وضو چھوتے ہیں یہ حرام ہے۔ بعضے رحل قرآن یا کتاب پر رکھ دیتے ہیں۔ یہ اکثر میں

دیکھتا ہوں کہ طالبعلموں کو کہ اسکی کچھ پرواہ ہی نہیں کرتے فقہاء نے تو یہاں تک لحاظ رکھا ہے کہ روٹیوں پر برتن رکھنے کی بھی ممانعت کی ہے کہتے ہیں کہ روٹی کے اوپر برتن رکھنا نہیں چاہیئے، کیونکہ یہ رزق کی بے ادبی ہے۔ جب روٹی کا یہ ادب ہے تو قرآن مجید کا تو بہت ہی بڑا ادب چاہیے۔ اب رہ گیا اعتکاف سو اسکی روح ہے خلوت اور خلوت کی حقیقت یہ ہے کہ ترک تعلقات، خود نفس رمضان میں مقتضٰی موجود ہے ترک تعلقات کا لیکن ترک تعلقات کے معنے ابھی سمجھ لیجئے ترک سے مراد تقلیل ہے یعنی جو تعلق غیر ضروری ہو یعنی جس کا ترک مضر نہ ہو اس تعلق کو ترک کردے چاہے وہ ضرر دنیا کا ہو چاہے آخرت کا، اور جو تعلق ضروری ہو اس کو ترک نہ کرے کیوں کہ جو تعلق ایسا ہے وہ مُضر نہیں۔ مثلاً اپنے کمانے کھانے کیلئے دنیا میں مشغول ہونا اور اپنی ہی دنیا کا تعلق نہیں بلکہ جو تعلق دوسرے کی دنیا کا بھی ہو جسکا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے وہ بھی تعلق مضر نہیں، میں نے بارہا کہا ہے اور اب پھر بانگ دُہل کیساتھ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کنجڑا ہو اور وہ صبح سے شام تک پکارتا رہے لیلو کدو لیلو ترکاری یا کوئی پھیری والا دن بھر لیلو سوئی اور لیلو تاگا کہتا پھرے اس کے قلب کے اندر ذرہ برابر ظلمت پیدا نہ ہوگی۔ اتنے بڑے اور لمبے چوڑے کلام اور اتنی صداؤں اور نداؤں سے بھی اس کو مطلق ضرر نہ ہوگا۔ اور ایک شخص ہے جس کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے بالکل فارغ بیٹھا ہے وہ کسی سے صرف اتنا پوچھ لے کہ تمہیں خبر ہے کہ زید کہاں ہے جبکہ زید سے اسکو کچھ تعلق نہ ہو یا بلا ضرورت یہ دریافت کرے کہ زید کب آئے گا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو اس سے ظلمت پیدا ہوگی وہ اس سے نہیں ہوگی۔ اب اس سے زیادہ میں کیا دلیل پیش کر سکتا ہوں کہ قسم کھا رہا ہوں۔ اگر یقین نہ ہو خود تمیز پیدا کر کے دیکھ لو واللہ آنکھوں سے نظر آجائے گا۔ کہ قلب کا ناس ہو گیا ظلمت نے احاطہ کر لیا نورانیت برباد ہو گئی، انشراح غارت ہو گیا۔ وہ جو ایک تعلق مع اللہ پیدا ہو گیا تھا اسکے درمیان ایک حجاب قائم ہو گیا اس واسطے کہ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ

جب ترک مالا یعنیہ حسنِ اسلام ہے تو مالا یعنیہ ضرور مُخل حُسنِ اسلام ہوگا، اس شخص کے ایک فضول جملہ نے اسلام کی رونق کو اسلام کی زینت کو اسلام کے نور کو برباد کر دیا تو وجہ کیا کہ اس شخص کو ضرورت نہ تھی۔ اور اس کنجڑے کو ضرورت تھی کہ لیلو کدو لیلو ترکاری، بس اب اس میں فرق یہ ہے کہ زاہدان خشک تو ضروریات کو ترک کرتے ہیں اور محققین صوفیہ غیر ضروریات کو، ہم نے دیکھا ہے کہ ایک صاحب وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ اب ان سے کوئی ضروری بات پوچھنا چاہتا ہے تو ہوں ہوں کرتے ہیں چاروں طرف اشارے کرتے ہیں سر ہلاتے ہیں، ہاتھ چلاتے ہیں، آنکھوں سے گھورتے ہیں اب چاہے کوئی دوسرا سمجھے یا نہ سمجھے یا جو چاہے سمجھ لے مگر بولنے کے نہیں، کیونکہ جیسے عمل بتایا ہے اس نے درمیان میں بولنے سے منع کر دیا ہے ارے اُوضرورت کے موقع پر نماز تک میں بولنا جائز ہے گو نماز باطل ہو جائے گی بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے یہ تیرا وظیفہ کہاں کا نکلا ہے جو نماز سے بھی بڑھ گیا۔ حماقت اور جہالت اور کچھ بھی نہیں، حضرت یہاں سے ثابت ہوتی ہے ضرورت فقہ۔ حضرت جریج ایک عابد تھے امم سابقہ کے ان کا قصہ جناب رسولِ مقبول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے نقل فرمایا ہے کہ وہ کسی صومعہ میں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دن انکی ماں آئی اور صومعہ کے باہر سے پکارنے لگی ارے جریج ارے جریج۔ جریج ان بزرگ کا نام تھا، وہ اس وقت نفلیں پڑھ رہے تھے۔ بیچارے بڑے گھبرائے کہ اللہ کیا کروں کیا نہ کروں اُدھر تو ماں ہے اگر جواب نہیں دیتا تو ماں کی دلشکنی ہوتی ہے اور ماں کا دل توڑنا گناہ ہے اِدھر نماز ہے اگر بولتا ہوں تو نماز جاتی ہے اور نماز کا توڑنا بھی گناہ ہے۔ بیچارے فقیہ نہ تھے ورنہ پریشان نہ ہوتے۔ خود حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے فقیہ نہ تھے ارشاد ہے۔ لوکان فقیھا لاجاب امہ بالآخر انکی سمجھ میں یہی آیا کہ ماں کا حق اللہ کے برابر نہیں ہو سکتا ماں کا دل توڑنا اتنا بُرا نہیں جتنا خدا کی نماز کا توڑنا، لہٰذا وہ نہ بولے اور نماز میں مشغول رہے جب دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو ماں غصہ میں یہ بددُعا دیکر چلی گئی کہ اے اللہ جیسا کہ یہ میرے پکارنے سے نہیں بولا اور مجھے پریشان کیا کہ میں تو

اتنی دور سے اس کے دیکھنے کے اشتیاق میں آئی تھی اور اس نے میری بات بھی نہ پوچھی اسی طرح تو اسے پریشان کیجو۔ اور یہ بددعا دی کہ اے اللہ اسے موت نہ آوے جب تک یہ رنڈیوں کا منہ دیکھ لے۔ بھلی مانس نے کوسا بھی غضب کا، آخر تجربہ کار تھی۔ سمجھتی تھی کہ تقدس ہی کیوجہ سے اس نے میرے سے بے رخی کی ہے خدا کرے تقدس ہی اس کا ملیا میٹ ہو۔ جس پر اسے بڑا ناز ہے۔ بس حضرت چونکہ ماں کا حق تھا اس وقت واقع میں نماز میں بھی بولنا بس اسکی دُعا قبول ہو گئی۔ وہاں ایک عورت تھی۔ قریب کے گاؤں میں رہتی تھی۔ دیہاتن تھی۔ آوارہ ہو گئی تھی۔ اس کے ایک بچہ پیدا ہوا حرام کا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کس کا ہے۔ اُسنے سمجھا کہ اگر اور کسی کا نام لیتی ہوں تو جھگڑا بڑھتا ہے پوچھ گچھ۔ گواہ لاؤ۔ شہادت دو۔ یہ۔ وہ۔ سو بکھیڑے۔ ایسے کا نام کیوں نہ لے دوں جو کوئی جھگڑا ہی نہ بچلے جو سب سے الگ تھلگ رہتا ہو اور جسکا کوئی حامی اور مددگار ہی نہ ہو۔ تا کہ جلدی سے معاملہ دب جائے زیادہ فضیحتی نہ ہو۔ بس جناب اس گدھی نے کیا کیا بیچارے جریج کا نام لے دیا بس لوگ نام سُنتے ہی بھڑک اٹھے کہ افوہ اس کے یہ کرتوت لوگوں کی یہ عادت تو ہے ہی کہ بلا تحقیق روایات کو معتبر سمجھ لیتے ہیں، چنانچہ اب بھی دیکھ لیجئے بالخصوص اس معاملہ میں تو تحقیق جانتے ہی نہیں، بس جناب لوگ اس عورت کو لیکر اس بیچارے عابد کے اوپر جا چڑھے کہ توڑ ڈالو اس کا عبادت خانہ اسنے ہمیں اتنے دنوں دھوکہ ہی میں رکھا خلوت خانہ توڑ پھوڑ زبردستی اس کو نکالا اور کہنے لگے کیوں نالائق تیری یہ حرکتیں تجھے ہم سمجھتے تھے کہ بڑا عابد ہے بڑا زاہد ہے۔ تیرے یہ اعمال، وہ سمجھ گیا کہ ماں کی بددعا قبول ہو گئی۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ مگر حضرت آخر مقبول بندہ تھا۔ بس فضل الٰہی کے ناز پر کیونکہ اس طریق میں اگر کوئی گرتا بھی ہے اپنے درجہ سے تب بھی بالکل نہیں گر جاتا۔ گو بادشاہ بادشاہی سے معزول ہو کر وزارت پر آجاتے مگر وہ ناز اور دماغ شاہی کا پھر بھی رہتا ہے لڑکے سے پوچھا بتلا رے تیرا باپ کون ہے اسنے کہا کہ فلاں چرواہا ہے جو جنگل میں فلاں جگہ رہتا ہے اب تو لوگ بڑے معتقد ہوئے اور بڑے گھبرائے۔ قدم چومنے لگے کہ للہ حضور ہماری خطا معاف فرما دیں۔ لایئے ہم

ہم آپ کا عبادت خانہ سونیکا بنادیں چاندی کا بنادیں انہوں نے کہا بھائی میرا تو وہی گوندے کا جھونپڑا اچھا ہے مجھے سونے چاندی کا مکان نہیں چاہیئے۔ مجھے تو اپنے اسی جھونپڑے میں پڑا رہنے دو۔ اس کو فرما کر حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لوکان فقیہا لاجاب امہ اگر وہ فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کو جواب دیتا اور نماز کو توڑ دیتا۔ اب یہ کہ آیا حکم عام ہے خواہ فرض نماز ہو یا نفل یا خاص ہے نفل ہی کے ساتھ اس کا فقہاء نے فیصلہ کیا ہے۔ جیسا اس واقعہ میں ایک غیر فقیہ سے یہ حرکت صادر ہوئی ایسے ہی اس حدیث کو سنکر اگر کوئی غیر فقیہ ہر جگہ بولنے لگے پٹر پٹر خواہ فرض نماز ہو یا نفل تو یہ کام فقہاء کا تھا کہ انہوں نے اس کو طے کر دیا کہ یہ حکم خاص ہے نوافل کے ساتھ اس شرط سے کہ ماں باپ کو خبر نہ ہو کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے فرض نماز کے دوران اگر ماں بھی بولے تب بھی جواب نہ دے۔ رہا اضطراری احوال اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے کوئی اندھا کوئیں میں گرتا ہو سبحان اللہ مجھے تو فقہاء کی قوتِ اجتہادیہ پر یہ شعر یاد آجاتے ہیں۔ واقعی حضرت دنیا کی سمجھ اور ہے دین کی اور ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(جس نے اپنا چہرہ روشن کیا حسن کا نکھار کیا ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو اور جو شخص آئینہ رکھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ سکندری یعنی آداب شاہی بھی جانتا ہو)

ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(ہزار نکتہ بال سے زیادہ باریک ہے اس راہ میں ہر سر کے منڈانے والے کیلئے ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو)

حقیقت میں یہ تھوڑا ہی ہے کہ کتابیں پڑھ لیں اور فقیہ ہو گئے۔ کتابیں پڑھنے سے کیا ہوتا ہے فقیہ وہ شخص ہے جسمیں خداداد ملکہ اجتہاد کا ہو۔ جو شخص ایک مسئلہ بھی نہ جانتا ہو وہ فقیہ ہو سکتا ہے اور جو شخص ایک لاکھ مسئلے جانتا ہو وہ فقیہ نہیں ہو سکتا تفقہ اور چیز ہے اور ضبط جزئیات اور چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے فیصلہ کر دیا ہے

اور علماء نے کیا فیصلہ کیا ہے خود حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمادیا ہے
کہ وعظ کہنے کا اہل ہر شخص نہیں ہے کیوں کہ ہر منصب کا وہی اہل ہو سکتا ہے جو اس
منصب کے شرائط کا جامع ہو۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ ایک آدھ کتاب دیکھی۔ اور واعظ بن
گئے (اور جاکر منبر سنبھال لیا۔ حضرت) اس ممبری کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں
ہے۔ یہ منصب نبوت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے سچے وارث ہیں وہی اس کے اہل
ہیں (اکاتب) عبدالرحمن خانصاحب مرحوم مالک مطبع نظامی کے مطبع میں ایک۔ ایسے
ہی صاحب کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ میرے پاس شرح وقایہ اردو کی تو ہے اس سے فتویٰ
لکھ لیتا ہوں یہ شرح وقایہ کی خرابی ہے۔ اور تلافی کتاب خلاں فن کی ہے جسکی وجہ سے
لوگوں کو بہت فیض پہنچ رہا ہے مگر ہاں لوگ ایک فیض سے محروم ہیں، یعنی طب سے
اب اس کو بھی جاری کرنا چاہتا ہوں، کئی فیض جاری تھے ایک یہ بھی جاری کرنا جاری
کرنا چاہتے تھے۔ لکھا تھا کہ طب احسانی اردو کی بھیجدو تاکہ یہ فیض بھی جاری کر دوں۔
اب یہ تھوڑا ہی ہے کہ کتاب دیکھی اور وعظ کہنے لگے۔ کتاب دیکھی اور نسخہ لکھنے لگے
اس واسطے حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمادیا ہے کہ **لا یقص الا امیر**
او مامور او مختال یعنی وعظ تین شخص کہتے ہیں۔ ایک حاکم دوسرے وہ جو مامور ہو۔
یعنی جس کو حاکم اسلام نے (اس) کام کیلئے مقرر کیا ہو یا اہل حل وعقد نے جو حاکم کو بھی
حاکم بناتے ہیں۔ یہ اہل علم کے سمجھنے کی بات ہے کہ اہل حل وعقد اصل ہیں اور حاکم
ان کا نائب ہے یعنی جو اہل الرائے ہوں مثلاً علماء و مشائخ کیونکہ یہی دین کے سمجھدار
لوگ ہیں۔ وہ جس کو وعظ کہنے کی اجازت دیدیں یا اُن کا نائب۔ جو امیر المؤمنین ہے۔
وہ کسی کو مامور کر دے۔ تو یا خود حاکم یا جسکو حاکم یا ایسے علماء (متفق ہو کر) مامور کر دیں
وہی وعظ کہہ سکتا ہے۔ تیسرا اگر کہے تو وہ متکبر ہے۔ معلوم ہوتا ہے دنیا کا طالب ہے
چاہتا ہے کہ کچھ روپیہ کوئی رقم ہاتھ آجائے۔ اُسے جائز نہیں وعظ کہنا۔ اسی طرح
فتویٰ لکھنا ہر شخص کا کام نہیں چاہے کتابیں بھی ختم ہو چکی ہوں۔ ہاں اپنے بزرگوں
کے سامنے کسی نے یہ کام کیا ہو اور ان بزرگوں نے پسند بھی کیا ہو اُسکو البتہ جائز

ہے یوں پھر بھی کوئی لغزش یا غلطی ہو جائے کبھی کبھار وہ اور بات ہے وہ بشریت ہے تو یہ شخص ہے اہل فتویٰ لکھنے کا جیسے مطب کرنیکا وہی اہل ہوتا ہے جس نے کسی ماہر اور تجربہ کار طبیب کے مطب میں نسخے لکھ کر مریضوں کا علاج کیا ہو اور اس کے علاج کو اس طبیب نے پسند کیا ہو۔ اس کے نسخے جواب دکھلائے جاتے ہیں۔ طبیبوں کو تو اگر کوئی معاند نہ ہوگا تو وہ کہے گا کہ با قاعدہ نسخہ ہے تو جناب محض کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ نری کتابوں بینی کا تو یہ اثر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک مولوی صاحب عظیم آباد پٹنہ کے حج کو آئے تھے اُن کے پاس ایک کتاب تھی جسمیں حجاج کیلئے ہدایات تھیں۔ اُسے دیکھ دیکھ کر سارے کام کرتے تھے وہاں ایک شخص تھا جعفر آفندی۔ آگرہ کا رہنے والا تھا اُسے ہندوستانیوں سے بہت محبت تھی۔ جس ہندوستانی کو دیکھتا اس سے ملتا چنانچہ ان مولوی صاحب سے بھی ملا۔ علیک سلیک کی۔ مولوی صاحب نے اس کتاب میں کہیں یہ لکھا دیکھا تھا کہ ذرا مانگنے والوں سے بچے رہنا بہت لوگ جبہ قبہ پہنے ہوئے پھرتے ہیں مگر ہوتے ہیں سائل بڑے بڑے شان دار لوگ گداگری کا پیشہ کرتے ہیں مولوی صاحب کو بدگمانی ہوگئی کہ یہ بھی کوئی سائل معلوم ہوتا ہے ضرور کچھ مانگے گا آپ نے بہت بے رخی کے ساتھ پوچھا کچھ کہنا ہے یہ شخص جعفر بڑا مسخرہ تھا سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے سائل سمجھا۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا حضور کچھ عنایت ہو جائے۔ بہت حاجتمند ہوں۔ بہت غریب ہوں حضور چار وقت کا فاقہ ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب نے ڈانٹ کر کہا بیحیا بے شرم ایسا عمدہ لباس اور اتنا لمبا چوغہ پہنکر بھیک مانگتے شرم نہیں آتی۔ کہتا ہے چار وقت کے فاقہ سے ہوں، جھوٹا کہیں کا۔ دور ہو جا یہاں سے بیحیا کہیں کا۔ غرض خوب ہی ڈانٹا، مگر اس نے برا نہیں مانا۔ اور چلا گیا۔ بڑا ہی خوش مزاج تھا۔ مولوی صاحب بڑے خوش کہ کیسی اچھی کتاب ہے۔ اور کیسے کیسے موقعوں پر کام دیتی ہے بڑے مسرور کہ کیا موقع پر کتاب کام آئی۔ سبحان اللہ ایک دفعہ مولوی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ جعفر آفندی جو وہاں ہو کر گذرے تو میں انکی تعظیم کیلئے کھڑا ہو گیا۔ اب تو

مولوی صاحب بڑے پریشان کہ یہ تو کوئی بڑا شخص معلوم ہوتا ہے وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئے کہنے لگے صاحب مجھے ان مولوی صاحب سے بڑی شکایت ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے چار وقت کا فاقہ ہے۔ اس وقت انکی جیب میں روپے بھی بول رہے تھے۔ اگر یہ کہہ مجھے دیدیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ مجھے ان سے بڑی شکایت ہے۔ مولوی صاحب بیچارے ذلت کے مارے دبے جاویں۔ شرم کے مارے کٹے جاویں کہنے لگے للّٰہ معاف فرمادیجئے میں نے سخت گستاخی کی میں نے پہچانا نہیں تھا۔ واللہ میں نے آپ کو سائل سمجھا تھا۔ وہ بولے کہ مولوی صاحب یہ تو بتایئے کہ آپ نے مجھے سائل کیسے سمجھ لیا۔ آخر کیا آپ نے علامت مجھ میں سائل ہونیکی دیکھی۔ کہا صاحب میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ بڑے بڑے شاندار لوگ مکہ میں بھیک مانگتے ہیں۔ وہ بولے مولوی صاحب کچھ عقل سے بھی تو کام لیا ہوتا۔ صاحب نری کتاب کے بھروسہ تو نہیں رہنا چاہیئے۔ کہا کتاب میں بھی میں نے دیکھا تھا اور جب حج پر گیا بڑے بڑے عبا اور قبا والے یہاں پر بھیک مانگتے ہوئے خود بھی دیکھ لیے تھے۔ انہوں نے پوچھا مولوی صاحب یہ تو بتاؤ تم نے جن کو بھیک مانگتے دیکھا وہ عمامہ والے تھے یا کسی ترکی ٹوپی والے کو بھی کہیں بھیک مانگتے ہوئے تم نے دیکھا۔ کہا ہاں صاحب واقعی سب عمامہ والے ہی تھے ترکی ٹوپی والا تو ان بھیک مانگنے والوں میں کوئی نہیں تھا۔ جعفر نے کہا کہ میں تو ترکی ٹوپی پہنے تھا سو بتلائیے کتاب میں یہ کہاں تھا لکھا کہ صرف عمامہ والے ہی بھیک مانگتے ہیں ترکی ٹوپی والے نہیں مانگتے تو حضرت نری کتاب سے فن حاصل کرنیکا تو یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ بھائی کتاب تو اعانت کیلئے ہوتی ہے۔ اہلِ مہارت کی صحبت کے بغیر بخدا اور بخدا اور بخدا جسکو فن کا حاصل ہونا کہتے ہیں ہرگز میسر نہیں ہوسکتا چاہے جتنی کتابیں پڑھ چکا ہو۔ اور اگر کچھ بھی نہ پڑھا ہو لیکن اہلِ مہارت کی صحبت اٹھائے ہوئے ہو تو فن کا حصول ممکن ہے بلکہ بکثرت واقع ہے آخر حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کیا بات تھی کہ بعد کے بڑے بڑے عارف اور عالم انکی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ کیا وہ سب کے سب

لکھے پڑھے تھے بہت کم ایسے تھے جو اصطلاحی عالم ہوں ورنہ زیادہ تر تو امی محض ہی تھے چنانچہ خود حضور صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نحن امیۃ لا نکتب ولا نحسب ہم لوگ تو ایک امی جماعت ہیں نہ ہم حساب جانیں نہ کتاب جانیں۔ دیکھئے حضور صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم فخر کرتے ہیں اپنی امت کی امیت پر۔ تو گویا اس امت کی خاص فضیلت امی ہونا ہے۔ پھر باوجود امی ہونیکے صحابہ جو بے نظیر تھے کہ نہ ابوحنیفہ انکی برابر نہ اویس قرنی ان کی برابر نہ جنید انکی برابر نہ کوئی غوث انکی برابر نہ کوئی قطب انکی برابر تو وہ کیا عیب نہ تھے اور وہ کیا دولت تھی جس نے انکو سب سے بڑھا دیا تھا بس یہ یہ دولت تھی ؎ جمال ہمنشیں در من اثر کرد ؎

گلے خوشبوئے درحمام روزے ؛ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری ؛ کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گل ناچیز بودم ؛ ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشیں در من اثر کرد ؛ وگرنہ ہم ہما خاکم کہ ہستم

(حمام خانہ کی خوشبودار مٹی ایک دن میرے محبوب کے ہاتھ سے مجھے ملی میں نے کہا کہ تو مشک ہے یا عنبر ہے کہ تیری خوشبو سے میں مست ہو رہا ہوں کہا کہ میں ایک ناچیز مٹی ہوں، لیکن کچھ مدت تک پھول کی صحبت میں رہی ہوں میرے ہمنشین پھول نے میرے اندر اپنا اثر ڈال دیا ورنہ میں تو وہی خاک اب بھی ہوں جو پہلے تھی) بس یہ تھی صحابہ رضی اللہ تعالٰے عنہم کے پاس دولت۔ کسی کی طویل صحبت تھی کسی کی کم مگر کمال سے کوئی بھی نہیں رہا البتہ اکملیت کے مراتب میں تفاوت تھا۔ چاہے زبان حاصل کی ہو یا نہ کی ہو کمال تو ہر شخص نے حاصل کر لیا تھا۔ زبان اور چیز ہے۔ کمال اور چیز ہے۔ اب کتابیں تو بہت سی پڑھ لیتے ہیں لیکن اہل مہارت کی صحبت میں رہنے کا بالکل اہتمام نہیں جہاں تم نے کتابیں پڑھی تھیں اگر کسی مربی کی صحبت بھی اٹھائے ہوتے تو اپنے کو کبھی اہل مہارت میں سے نہ سمجھتے۔ بھائی تم تو پہلے مربا بنو پھر مربی بننا چند روز کیلئے اپنے آپ کو کسی مربی کی سپردگی میں دے دو

وہ تمہیں تاؤ دے جیکو مربا بنائے گا۔ جب خوب گھل جاؤ گے اور مربہ بنانے والے بھی تصدیق کر دیں گے کہ ہاں اب مربہ بن گئے تب مربہ بنو گے۔ تمہارا خود ہی یہ سمجھ لینا کہ ہم اب مربہ ہو گئے ہرگز کافی نہیں کیونکہ اے مربہ! تیرے پاس کوئی ایسی محک اور کوئی ایسا معیار نہیں جس سے تو یہ جانچ لے کہ میں مربہ ہو گیا جب تیرے پاس کوئی محک اور معیار نہیں تو تُو اپنی ذات کو بلا آلہ کے دیکھے گا تو تُو اپنے نفس کو دیکھے گا اپنے نفس سے جو ناقص ہے اور مربی تیرے نفس کو دیکھے گا اپنے نفس سے اور وہ ہے کامل لہٰذا اس کی جانچ معتبر ہو گی اور تیری جانچ ہرگز معتبر نہ ہو گی۔ کیونکہ اس کے پاس تو آلہ شناخت ہے اور تیرے پاس کوئی آلہ شناخت نہیں جیسے کوئی سیب کا مربہ بنا کر رکھے تو خود سیب یہ جانچ نہیں کر سکتا کہ میں مربہ ہو گیا یا نہیں۔ اس کے کیا دانت ہیں۔ جو کچل کر بتا دے گا البتہ جو مربہ بنانے والا ہے اسکے دانت ہیں وہ دانت تلے دبا کر فوراً بتا دے گا کہ ہاں ہو گیا۔ تو تم کو ابھی کسی نے دانت تلے یا پیر تلے دبایا نہیں۔ کہیں سڑ نہ گئے ہو کہیں کچے نہ پڑ گئے ہو۔ غرض اصل چیز تو حقیقت کمال ہے مگر زعم کمال دعویٰ کمال اس نے خراب کر رکھا ہے۔ فرخ آباد میں ایک واعظ صاحب مدعی کمال کے ملے مجھ سے بیعت کی درخواست کی میں نے کہا میرے یہاں بیعت کی چند شرطیں ہیں اُن میں سے ایک شرط تمہارے لئے یہ ہے کہ وعظ کہنا چھوڑ دو۔ کیوں کہ تم عالم نہیں ہو۔ کہنے لگے صاحب میں تو بہت ہی احتیاط کے ساتھ مضامین بیان کرتا ہوں مجھے اجازت دیدی جائے۔ میں نے کہا اگر احتیاط سے بھی بیان کرتے ہو تب بھی تمہارے نفس کا علاج یہی ہے کہ تم وعظ کہنا چھوڑ دو پھر بھی بعد اصرار کہ مجھے تو اجازت دے ہی دو۔ میں نے کہا اچھا مجھے ابھی اس میں بھی شبہ ہے کہ تم احتیاط کیساتھ بیان کرتے ہو گے کہنے لگے میں تو آپ ہی کی کتابیں یا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں دیکھا کرتا ہوں بس اُنہی کتابوں کے مضامین میرے بیان میں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا ممکن ہے تم ارتباط میں کچھ گڑبڑ

کرتے ہو یا سلسلہ ممکن ہے غلط بتاتے ہو یا ایسے عنوان سے ان مضامین کو نقل کرتے ہو کہ سننے والوں کو غلط فہمی ہوتی ہو اس لئے اگر تمہارا ایسا ہی اصرار ہے وعظ کہنے کی اجازت دیدینے پر تو یہ کرو کہ مجھے پہلے اپنا ایک وعظ نمونہ کے طور سنا دو تاکہ میں یہ اندازہ کرلوں کہ تم کہاں تک احتیاط برتتے ہو۔ حضرت انہیں اپنے اوپر یہاں تک عقیدہ اور دلیرا تنے کہ اسپر راضی ہو گئے اور جھٹ وعظ کہنے بیٹھ گئے کہ اچھا سن لیں۔ اول ہی میں آپ نے قصہ نقل کیا کہ ایک دن چاروں صحابہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یہاں جمع ہو گئے۔ حضرت علیؓ دعوت کے واسطے ہدیہ کے طور پر گھر میں سے شہد لائے اس شہد میں ایک بال پڑا ہوا تھا۔ چاروں صحابہ نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ جو بال ہے اس کی کوئی مثال سوچو کہ یہ کس چیز کی مثال ہے۔ چنانچہ کسی نے کچھ مثال دی کسی نے کچھ مثال پیش کی اب مجھے تو یاد نہیں کہ کس نے کیا مثال دی۔ غلط مضامین کیا یاد رہتے۔ کسی نے کہا مومن کی فلاں حالت کے مشابہ ہے کسی نے کہا فلاں حالت کے مشابہ ہے میں نے کہا جب وعظ ختم کر چکے کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ قصہ جو تم نے نقل کیا وہ کونسی کتاب میں ہے۔ میری کتاب میں ہے یا مولانا محمد قاسم صاحب کی کتاب میں ہے۔ کہنے لگے یہ تو یاد نہیں رہا کہ کس کتاب میں ہے مگر ہاں دیکھا ہے کہیں۔ میں نے کہا یہ آپکی احتیاط ہے کہ ایسا مہمل قصہ جو کسی اہل حق کی کتاب میں نہیں ہے اُس کو بیان کر دیا۔ اب تو سمجھ گئے کہ تم کو وعظ کہنے کی اجازت نہیں دیجا سکتی۔ مگر حضرت انہوں نے نہیں مانا۔ برابر وعظ کہتے ہیں۔ یہ تو گوارا کر لیا کہ مجھ سے تعلق نہیں رکھا اور یہ گوارا نہ ہو سکا کہ وعظ کہنا چھوڑ دیں۔ اب کیا علاج ایسے جہل مرکب کا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جہل وہ چیز ہے کہ اگر کسی کو اپنے جہل کی خبر ہو جائے تو میں اسکو علماء میں شمار کرتا ہوں یعنی اول درجہ علم کا اپنے جہل پر مطلع ہو جانا ہے جیسے صحت کا اول درجہ مرض کی اطلاع ہے موٹا مسئلہ عقل کا ہے کہ جسکو اپنے مرض کی اطلاع نہ ہو گی وہ علاج ہی نہیں کرے گا۔ خدا بچائے یہ خود بینی ایسی بری چیز ہے کہ حضرت

حافظ اس کو کفر سے تعبیر کر رہے ہیں اور واقعی یہ ہے ہی ایسی بڑی چیز فرماتے ہیں ؎

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست کفرست دریں مذہب خود بینی وخود رائی

(عشق و محبت کے راستے میں اپنی فکر اپنی رائے نہیں چلتی یہاں تو بس محبوب کی چلتی ہے اس مذہب عشق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے یعنی نہایت ہی قبیح ہے)

تو دیکھا آپ نے یہ آفت نازل ہو رہی ہے۔ حق جلّ علا شانہٗ صاف فرماتے ہیں۔ ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون کہیں عالم اور جاہل بھی برابر ہو سکتے ہیں۔ اب اس وقت عوام الناس نے ایک عجیب وغریب مستی اور شورش برپا کر رکھی ہے اور علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی شریک ہوں۔ خیر عوام الناس پر تو حیرت نہیں مگر حیرت ہے علماء پر جو اُن سے مغلوب ہو کر اُن کے تابع ہو گئے ہیں، میں کہتا ہوں کہ عوام الناس کے دبانے سے اور ان سے دبکر جو علماء تابع ہو گئے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی کچھ قدر ہے وہ بھی تو جانتے ہیں کہ یہ علماء ایسے ہمارے موافق نہیں ہیں ہم ہو دبکر تابع ہو گئے ہیں۔ اگر یہی حال ہے تو پھر اور کسی بات میں تابع بنائیں گے پھر اور کسی میں خلاصہ یہ کہ اُن کے مرید ہو جاؤ کسقدر شرم کی بات ہے جو کاریگر یعنی مادیات اور حسیات تک کا کاریگر بھی جو اپنے کام میں ماہر ہو اُس سے کوئی خلاف قاعدہ کام تو لے لو۔ ہمارے یہاں تعمیر کا کام جاری ہے ایک معمار نے ایک کام کو ایک طریقہ سے بنانا چاہا مگر ہم غلط سمجھے ہم نے دوسرا انداز تجویز کیا کہ نہیں اس طرح بناؤ۔ اس نے کہا صاحب یوں نہیں بن سکتا۔ ہم نے کہا تمہیں اس سے کیا بحث جس طرح ہم کہہ رہے ہیں اسی طرح بنا دو۔ ایک دوسرا استاد تھا اس نے بھی کہا ارے جس طرح مالک کہیں اسی طرح بنا دے تجھے کیا۔ بس جناب ہم سے تو بیچارہ بول نہ سکا اس پر بہت تیز ہوا اور کھڑا ہو گیا کہ تو بڑا کاریگر ہے آ تو ہی بنا جو قیامت تک بھی نہ بن سکے، نہایت تیز لہجے میں اس نے کہا۔ حالانکہ یہ تھوڑا ہی تھا کہ بن ہی نہ سکتا۔ بن تو جاتا اس طرح بھی جس طرح ہم لوگ کہہ رہے تھے مگر بے کینڈے بنتا۔ اسے اس تصور سے بھی شرم آتی کہ جو

دیکھے گا پاگل کہے گا بنانیوالے کو۔ گو بڑا کہنے والے متعین نہ ہوں معلوم نہ ہوں پھر بھی اہل کمال کو غیرت آتی ہے کہ اس کے ہاتھ سے ایسا کام ہو جس کو دیکھ کر لوگ کہیں کہ یہ کسی اناڑی کا کام ہے غرض جب اس نے پوری تقریر کی تب ہمیں اپنی تجویز کی غلطی معلوم ہوتی کہ واقعی وہی ٹھیک کہتا تھا۔ ہم نے کہا بیوقوف تو نے پہلے ہی پوری بات کیوں نہ کہہ دی تھی۔ تو میں کہتا ہوں کہ معماروں کو اتنی غیرت ہو اور مولویوں کو اتنی غیرت بھی نہ ہو۔ بس وہ کیا۔ غرض نے ساری خرابی ڈال رکھی ہے ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد　　　صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

(جب غرض دل میں آتی ہنر پوشیدہ ہوا سیکڑوں پردے حق بینی سے مانع بن جاتے ہیں جو دل سے نکال کر آنکھوں پر چھا جاتے ہیں۔)

اس لئے میں کہتا ہوں۔ اعتکاف کے تعلق سے یہ تقریر شروع ہوئی تھی غرض خلوت اور ترک تعلقات کی حقیقت محققین ہی جانتے ہیں غیر محققین کو ان کا اتباع چاہئے۔ اسی طرح ہر فن میں جو محققین ہیں وہ عوام کو اپنا تابع بنائیں۔ خود اُن کے ہر گز نہ بنیں۔ اگر اس عزم میں پختگی ہوگی تو عوام خود ان کے سامنے گردن جھکادیں گے۔ اور ان کا اتباع کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالٰے اور اگر نہ کریں گے تو تمہیں کیا لست علیہم بمصیطر ایک عبادت احیاء لیالی قدر ہے اس احیاء کا موجب نورانیت ہونا مشہور و معلوم ہے خلاصہ یہ کہ رمضان المبارک کے حقوق کو جو کہ مجمع الانوار ہے پورا ادا کرو۔ اور خلاصہ ان حقوق کا کیا ٹھہرا کہ جو احکام واجبہ ہیں انکی پوری پابندی کرو اور جو امور منکر اور مکروہ ہیں خواہ وہ کبائر ہوں یا صغائر ہوں بالکل چھوڑ دو۔ خواہ فضائل میں کمی رہے مضائقہ نہیں، غرض رمضان المبارک کی اصل عبادت تو روزہ و تراویح اور ان کی تنزیہ ہے اور کثرت تلاوت و اعتکاف و شب بیداری اس کے متعلقات ان سب کی اصل یعنی اصل الاصول وہ احکام واجبہ کی پابندی اور امورِ منکر و مکروہ سے اجتناب ہے اس سے آگے اپنی اپنی

ہمت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے مہمان کے سامنے جو چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ ان میں اصل چیز تو گوشت روٹی ہے باقی مربہ اچار چٹنی یہ زینت ہیں دسترخوان کی اور معین بھی ہیں ہضم غذا میں اور لطف افزا ہیں اور کھانوں کی۔ اگر کوئی شخص اپنے مہمان کے سامنے یہ زائد چیزیں تو رکھدے مثلاً چٹنی بھی کئی قسم کی اور اچار بھی طرح طرح کے رکھدے۔ مربے بھی مگر ان کے سوا اور کچھ نہیں نہ خشکہ ہے نہ روٹی ہے نہ گوشت ہے جو اصلی غذا ہے اب وہ مہمان کیا کہے گا۔ یہی کہے گا کہ کیا کھاؤں۔ مربہ کھاؤں۔ اچار کھاؤں، کھانے کی چیز تو ایک بھی نہیں۔ یہ تو سب لگانے کی چیزیں ہیں۔ اگر اسی طرح تم نے اپنا رمضان اس حالت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا کہ اس میں اصل چیز تو ہے نہیں مگر زوائد تو وہ کیا قبول ہوگا۔ اور اگر تمہارے پاس اصل چیز تو ہے مگر زوائد نہیں ہیں۔ یعنی اگر دن بھر بری تو گناہ سے غیبت سے اور جتنے گناہ ہیں سب سے بچے رہو اپنی آمد فی حلال رکھو۔ پھر چاہے رات کو اچھی طرح پڑھکر سو رہو تہجد بھی نہ پڑھو وظیفے بھی نہ پڑھو مگر یہ کہ گناہ کے پاس نہ پھٹکو تو تمہارا رمضان بخدا اس شخص سے اچھا ہے کہ تہجد بھی ہے چاشت بھی ہے۔ وظیفے بھی ہیں تلاوت بھی ہے سب کچھ ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ غیبتیں بھی کر رہا ہے۔ برائی بھی کر رہا ہے عورتوں کو بھی تک رہا ہے لہو ولعب میں بھی مبتلا ہے لڑنا جھگڑنا بھی ہے بغض وحسد بھی ہے اس سے تمہارا رمضان ہزار درجہ اچھا ہے اگر ہمت نہ ہو بہت سے سیپارے ختم نہ کرو سو تو خوب پڑ پڑ کر بس فرض سنت نمازیں تو اٹھ کر پڑھ لیا کرو۔ باقی آرام سے مہینہ بھر گذارو مگر خدا کے واسطے گناہ کوئی نہ کرو تو یہ اچھا ہے۔ اور اگر ہمت ہو تو گناہ کو بھی چھوڑ دو اور طاعات کو بھی کرو۔ یہ تو پھر سبحان اللہ نورٌ علی نور ہے اور یہ مہینہ قابل تو اسی کے ہے کہ اس میں ایسا ہی کیا جائے یعنی واجبات وفضائل سب کو جمع کیا جاوے حدیث میں ہے کان رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم

جود من الریح المرسلۃ یعنی رمضان شریف آنے ہی اس قدر طاعت میں مشغول ہوتے تھے۔ جیسے ہوا چھوٹ نکلتی ہے کہ اڑی چلی جاتی ہے۔ حلاست کے ساتھ غرض رمضان کا جو مہینہ ہے اصل میں ترک دنیا کے واسطے ہے گیارہ مہینے خوب عیش و آرام میں گذارے ہیں۔ ایک مہینہ تو بندۂ خدا تھوڑی بہت مشقت اٹھالو جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

خواب را بگذار مشب اے پدر یک شبے در کوئے بیخواباں گذر

(ایک رات خواب کو اے پدر ترک کر دے اور کسی اللہ کے عاشق کے پاس اپنی رات گذار لے پھر دیکھ کہ ان بے خوابوں کی گلی میں کیا لطف ہے جو رشک ہفت اقلیم ہے)

گیارہ مہینے تو سب کچھ کام کئے ایک مہینہ خدا کے کام میں رہ لوگے تو کونسا ایسا بڑا حرج ہو جائے گا۔ پھر وہ بھی اس طرح کہ اس میں صحت کی بھی رعایت رکھی گئی ہے غرض یہ مہینہ تو خاص ہو جائے عبادت کیلئے اور اخیر درجہ یہ کہ اگر عبادت نہ ہوسکے تو گناہوں کو تو چھوڑ دو۔ اتنا تو کرو۔ یہ مقصود تھا میرا جس کو میں بیان کر چکا۔ اور مضامین بھی ذہن میں ہیں۔ مگر وقت بہت ہو چکا ہے اگر موقع ہوا تو میں یا اور اور احباب ان شاء اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے جمعوں میں عرض کرتے رہیں گے اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو ہمت اور توفیق دیں اعمال صالحہ کی اور ناپسندیدہ اعمال اور منکرات سے بچنے کی۔ اور ایک بات اور عرض کرنے سے رہ گئی کہ رمضان کے دن آنے سے پہلے آپس میں مل جل لو اور دلوں سے رنجشوں کو دور کر لو۔ کیونکہ معاصی سے روزہ کا اثر اور نور جاتا تو نہیں رہتا مگر بہت مضمحل ہو جاتا ہے (اب دعا کیجئے۔ اسے یہاں تک کی تقریر ہاتھ اٹھائے ہوئے فرماتے رہے ۱۲ کاتب) غالباً بعد ختم دعا یا دوران دعا ہی میں فرمایا کہ چونکہ اس بیان میں انوار رمضان کا ذکر ہے۔ اس لئے اس کا نام ومضان فی رمضان مناسب معلوم ہوتا ہے ومضان جمع ہے ومیض کی جس کے معنے ہیں چمک دمک کذا فی القاموس۔ تم بحمد اللہ الذی

بنعمتہ تتم الصالحات ۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ ببرکت دعاء توجہات حضرت اقدس اس وعظ کی تبییض ۲۵ ر شعبان المعظم ۱۳۴۸ھ یوم شنبہ بوقت چاشت شروع ہو کر آج پندرہ دن کی مدت میں ۱۱ ر رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ یوم یک شنبہ عین اذان ظہر کے وقت حق تعالیٰ نے اس ناکارہ کے ہاتھوں پوری کرا دی ، حق تعالیٰ اس کو مقبول و نافع فرمائیں اور صاحب وعظ کو مدت مدید تک اسی طرح فیض گستر رکھیں ۔ آمین ؛ بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و آلہ و اصحابہ وازواجہ اجمعین ط

تمت

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

الرفع والوضع

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر:- محمد عبدالمنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی - دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم ۔ اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الرفع والوضع

این	کہاں ہوا	مسجد خانقاہ امدادیہ۔ تھانہ بھون
متی	کب ہوا	۹ رجب ۱۳۴۲ھ بعد نماز جمعہ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ
کیف	کیونکر ہوا	بیٹھ کر.........
لم	کیوں ہوا	اہل خانہ کی درخواست پر کیونکہ عرصہ سے تھانہ بھون میں بیان نہ ہوا تھا
ماذا	کیا مضمون تھا	ہمکو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہر فعل و حال میں اتباع لازم ہے پھر یہ بتلایا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے واقعہ معراج سے امت کو کیا نفع ہوا۔
من الانتفاع	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	رجب کرنیوالوں کو خصوصاً اور سالکین کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ
السامعون	سامعین کی تخمینی مقدار	۱۰۰ تقریباً
الاشتات	متفرقات	حضرت مدظلہم اس وقت قریب ہی سفر لکھنؤ سے تشریف لائے تھے اثناء سفر میں زکام بخار کی شکایت ہوگئی تھی جو بیان کے وقت بھی کسی قدر موجود تھی مگر بعض مخلصین کی درخواست پر بیان کا ارادہ فرمایا اور بحمد اللہ ایسا ہی بیان ہوا جیسا بحالت تندرستی ہوا کرتا ہے بلکہ اس وعظ میں بہت سے جدید و عجیب مضامین بیان ہوئے جنکی قدر دیکھنے سے معلوم ہوگی

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہٖ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ و رسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ و صحبہٖ و بارک وسلم۔

امّا بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم
یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۔ اے نبی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہم نے بیشک آپکو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں۔ اور اللہ کی طرف۔ اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالےٰ نے اپنے رسول کریم (علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم) کی بہت سی صفات بیان فرمائی ہیں۔ جن میں سے اس وقت مقصود البیان اخیر کی صفت ہے اور اسی سے مجھکو وہ مضمون مستنبط کرنا ہے جس کے بیان کا اس وقت ارادہ ہے اور وہ صفت سِرَاجًا مُّنِیْرًا ہے روشن چراغ وجہ بیان کی یہ ہے کہ بعض حضرات نے خلوص کے ساتھ بیان کی درخواست کی تھی کیوں کہ عرصے سے یہاں پہ بیان نہ ہوا تھا۔ گو ابھی تک سفر کا تکان نہ اُترا تھا رات بھی سر میں درد تھا اور اب بھی موجود ہے اور بیان کے لئے جس انشراح کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے یہ مانع کافی تھا مگر درخواست خلوص سے تھی اس لئے انکار کو جی نہ چاہا یہ خیال ہوا کہ اس درخواست کو پورا ہی کر دوں گو مختصر ہی بیان ہو۔ مگر ہکان کی وجہ سے پختہ وعدہ بھی نہ کیا تھا یہ کہدیا تھا کہ وقت پر جیسی رائے ہو گی اطلاع کر دوں گا۔ پھر میں نے سوچا کہ اگر بیان کروں تو کیا بیان کروں، بڑی دیر تک کوئی مضمون ذہن میں نہ آیا اور یہ عادت نہیں کہ کَیْفَمَا اتَّفَقَ (جیسا اتفاق ہو) کوئی سا مضمون بیان کر دیا جائے بلکہ ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ ضرورت اور وقت کے مناسب مضمون بیان کیا جائے جب وقت کے وقت بھی کوئی مضمون خاص ذہن میں نہ آیا تو ایک مانع یہ موجود ہو گیا مگر دفعۃً نماز میں ایک مضمون کی طرف ذہن منتقل ہوا وہ یہ کہ مہینہ رجب کا ہے جس میں باتفاق مؤرخین واہل سیر حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا ایک خاص کمال ظاہر ہوا ہے یعنی معراج پھر اس طرف ذہن منتقل ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے تمام کمالات متعدی

ہیں لازمی نہیں ہیں (یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمالات سے صرف آپ ہی کو نفع نہیں ہوا بلکہ آپؐ کے ہر کمال سے دوسروں کو نفع بھی ہوا ہے اسلئے واقعۂ معراج میں بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو کمال ظاہر ہوا ہے وہ سبھی متعدی ہونا چاہیئے لازمی نہ ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد عنوان بیان متعین ہوگیا کہ آج یہ مضمون بیان کیا جائے کہ واقعۂ معراج سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کمال تو ظاہر ہوا ہی اُمت کو بھی اس سے نفع پہونچا ہے اور آپکا یہ کمال بھی دوسرے کمالات کیطرح متعدی ہے لازمی نہیں، اسی طرح پر یہ مضمون ہماری ضرورت کا ہوگیا گو ہمارے واسطے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیواسطے کمالات کا مطلقاً بیان بھی سبب سعادت ہے خواہ اُن کے تعدیہ پر نظر ہو یا نہ ہو مگر اَلْاَھَمُّ فَالْاَھَمُّ (اول اہم پھر اس کے بعد اہم ہو) کے قاعدہ سے چونکہ ابھی ہم اپنی اصلاح سے فارغ نہیں ہوئے ہم کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمالات میں بھی یہ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم کو اس سے کیا نفع حاصل ہوا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمالات کو محض اس نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ آپ کا خاص واقعہ ہے بلکہ سب سے سبق لینا چاہیئے اس کی شہادت قرآن سے ملتی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (ہم نے کسی رسول کو بھی نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ خدا کے اذن سے اس کی اطاعت کیجائے) حالانکہ رسول کیلئے رسالت بہت بڑا کمال ہے مگر حق تعالیٰ نے لِیُطَاعَ (چاہیئے کہ اسکی اطاعت کیجائے) میں ہم کو متنبہ فرمادیا ہے کہ تم رسالت پر محض اس حیثیت سے نظر نہ کرو کہ وہ رسول کا ایک کمال ہے بلکہ تم اپنے فائدہ پر بھی نظر رکھو کہ رسالت ایسا کمال ہے جسکی اطاعت وموافقت سے مخلوق کے نزدیک مقبول ومقرب ہوجاتی ہے دوسرے مقام پر ارشاد ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ (یعنی حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار ہماری اولاد میں ایسا رسول مبعوث فرمائیے

جو ان پر آپ کی آیات کی تلاوت کرے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے) یہ آیت خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شان میں ہے۔ کیونکہ یہ دعاء ایسے نبی کے حق میں ہے جو دونوں حضرات کی اولاد میں ہوں اور ایسا رسول جو ابراہیم علیہ السلام و اسمعیل علیہ السلام دونوں کی اولاد ہو بجز حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کوئی نہیں پس ثابت ہوا کہ اس دعاء کا مصداق حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی ہیں اور اس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جن کمالات کا بیان ہے انکے متعدی ہونے کا بھی ساتھ ساتھ بیان ہے کہ وہ ایسے رسول ہوں جو محض کمالِ رسالت ہی سے متصف نہ ہوں بلکہ ان کا یہ کمال متعدی بھی ہو کہ مخلوق کو ان سے فیض پہنچے اس میں خاص حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمالات کے متعلق دو پیغمبروں کے صیغۂ دعاء میں اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ لوگوں کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمالات میں اپنے فائدہ پر بھی نظر رکھنی چاہیئے ایک مقام پر حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے ہمارے اوپر امتنان فرمایا ہے تو وہاں بھی اس کے متعدی ہونیکا بیان فرمایا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ الآیہ۔

(حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں انہی میں سے ایسے رسول کو بھیجا کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں)

غرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں سے اس دعویٰ کی دلیل موجود ہے کہ ہم کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہر کمال سے سبق لینا چاہیئے اور ان پر اس جہت سے نظر کرنی چاہیئے کہ ہم کو اس کمال سے کیا فائدہ ہوا۔ جنہیں سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بڑا کمال معراج بھی ہے تو اس سے بھی ہم کو سبق لینا چاہیئے۔ اب اس اعتبار خاص سے اس مضمون کو رجب کے مہینے سے کوئی خاص خصوصیت

بھی نہیں رہی کیوں کہ میں واقعہ معراج بیان نہ کروں گا بلکہ یہ تبلاؤں گا کہ اُمت کو اس واقعہ سے کیا فیض پہنچا اور ظاہر ہے کہ اس ماہ سے واقعہ کو تو کچھ خصوصیت ہے بھی مگر جو فیض امت کو اس واقعہ سے پہنچا ہے وہ اس مہینے کے ساتھ خاص نہیں اس لئے یہ احتمال بھی نہ رہے گا کہ میں اس ماہ کی خصوصیت کیوجہ سے یہ مضمون بیان کر رہا ہوں جیسا اس مہینے میں بعض لوگ رجبی کرتے ہیں مگر وہ صرف قصہ معراج بیان کر دیتے ہیں یہ کوئی نہیں بیان کرتا کہ امت کو اس سے کیا نفع ہوا گو نفس واقعہ کا بیان بھی باعث برکت ہے بشرطیکہ منکرات سے خالی ہو جس میں تخصیص والتزام بھی داخل ہے (وَالْحَالُ خِلَافُہٗ) (حالانکہ حالت خلاف ہے) اب میں وہ مضمون بیان کرتا ہوں کہ اُمت کو واقعہ معراج سے کیا نفع حاصل ہوا جس کے لئے میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے جس میں میرے ذوق میں سِرَاجًا مُّنِیْرًا (روشن چراغ) سے اس مضمون کو مناسبت ہے گو اس پر استدلال موقوف نہیں اس پر دوسرے مستقل دلائل ہیں مگر مناسبت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس آیت میں حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو روشن چراغ فرمایا گیا ہے اور یہ بطور تشبیہ کے ہے جیسے زَیْدٌ اَسَدٌ (زید شیر ہے) کہا جاتا ہے کہ بوجہ شجاعت کے اسی طرح حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو ایک خاص صفت میں چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تشبیہ میں مشبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ واکمل ہونا لازم نہیں البتہ واضح واشہر ہونا ضروری ہے اس لئے حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو چراغ سے تشبیہ دینے میں بھی یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اس صفت میں چراغ آپ سے افضل ہے بلکہ اس کا معنی بھی وہی ہے کہ چراغ اس صفت میں بوجہ محسوس ہونیکے مشہور ہے۔ اور یہاں سے یہ اشکال بھی مرتفع ہو گیا جو بہت لوگوں کو صیغہ صلوٰۃ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ (اے اللہ درود بھیج محمد پر اور انکی آل پر جیسا کہ درود بھیجا تو نے ابراہیم اور ان کی آل پر)

میں پیش آیا کرتا ہے اس میں حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر صلوٰۃ کو ابراہیم علیہ السلام کے صلوۃ سے تشبیہ دی گئی ہے جس سے ابراہیم علیہ السلام کی صلوٰۃ کی افضلیت لازم آتی ہے اس اشکال کا منشایہ ہے کہ تشبیہ کیلئے مشبہ بہ کا افضل ہونا لازم سمجھا جاتا ہے مگر یہ بناءُ الفاسِدِ عَلَی الفَاسِدِ (فاسد کی بنیاد فاسد پر) تشبیہ کیلئے افضلیت مشبہ بہ کا لزوم ہی غلط ہے بلکہ اس کے لیے محض مشبہ بہ کا اشہر و واضح ہونا لازم ہے افضل ہونا لازم نہیں۔ تتبع موارد و استعمال سے اس کی تائید ہوتی ہے چنانچہ حق تعالےٰ نے ایک مقام پر خود اپنے نور کو نور مصباح سے تشبیہ دی ہے حالانکہ یہاں مشبہ بہ کی افضلیت کا وہم بھی نہیں ہو سکتا فرماتے ہیں اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط (اللہ تعالےٰ نور دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اس کے نور کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے اس میں ایک طاق ہے اس میں ایک چراغ ہے وہ چراغ ایک قندیل میں ہے وہ قندیل ایسا ہے جیسے ایک چمکدار ستارہ ہو وہ چراغ ایک مفید درخت سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون ہے جو نہ پورب رُخ ہے نہ پچھم رُخ ہے اس کا تیل اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا نور علی نور ہے)

گو یہاں نور مصباح کی بہت کچھ تقویت کی گئی ہے کہ چراغ شیشہ کے (گلاس کے) اندر ہے اور وہ ایسا چمکدار ہے جیسے روشن ستارہ اور اس چراغ میں تیل بھی زیتون کا ہے اتنا عمدہ کہ آگ لگنے سے پہلے ہی بھڑکنا چاہتا ہے لیکن گو وہ کتنا ہی قوی ہو حق تعالےٰ کے نور سے اس کو کیا نسبت اس سے ثابت ہو گیا کہ مشبہ بہ کیلئے مشبہ سے افضل ہونا ضروری نہیں گو اتفاق سے زَیْدٌ اَسَدٌ (زید شیر ہے) اسد زید سے زیادہ ہی بہادر ہو اور واقعی اس جانور کو خدا تعالےٰ نے قوت و شجاعت بہت

زیادہ دی ہے اور عجب نہیں ایسی ہی جزئیات سے لوگوں کو یہ غلطی واقع ہوگئی ہو کہ مشبہ بہ کو مشبہ سے افضل ہونا چاہیئے مگر حقیقت میں یہ لازم نہیں ورنہ نور مصباح کو نور خداوندی سے افضل کہنا پڑے گا حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہوسکتا بلکہ تحقیق یہ ہے کہ مشبہ بہ کا صرف اشہر و اوضح ہونا ضرور ہے افضلیت ضروری نہیں چونکہ حق تعالےٰ غائب از نظر ہیں کوئی شخص انکو آنکھوں سے دنیا میں اسکو نہیں دیکھ سکتا اس لئے خدا کا نور اشہر نہیں اور نور مصباح اشہر ہے اس وجہ سے اس کو نور مصباح سے تشبیہ دیدی گئی ہے اور خدا کے نور کی تو بڑی شان ہے لوگ کسی عالم کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ حضرت تو روشن چراغ ہیں اس میں بھی انکو یہ وہم نہیں ہوتا کہ چراغ نور میں ان سے افضل ہے مگر چونکہ چراغ کوئی بھی خالی از نور نہیں دیکھا گیا اس لئے اس کا نور اشہر ہے اور بشر بعض ظلماتی ہیں بعض نورانی اس لئے اس کا منور ہونا محتاج دلیل ہے تو اس کا منور ہونا اشہر نہیں اس تفصیل سے یہ مسئلہ طے ہوگیا کہ مشبہ بہ کیلئے مشبہ سے افضل ہونا لازم نہیں صرف اشہر و اوضح ہونا ضروری ہے پس حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو سراج منیر فرمانے سے افضلیت سراج کا شبہ نہیں ہوسکتا الغرض اس آیت میں حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو تشبیہاً روشن چراغ فرمایا گیا ہے تو بنا بر اصول تشبیہ جو خاص وصف چراغ میں ہے وہ آپ میں ہونا لازم ہے اور اسی سے یہ شبہ بھی دفع ہو جاوے گا کہ آفتاب یا ماہتاب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہ تشبیہ دی گئی حالانکہ آفتاب تمام منیرات میں روشن تر ہے اس کے سامنے نہ چاند کی کوئی حقیقت ہے نہ چراغ کی اور اگر یہ کہا جائے کہ آفتاب کی روشنی میں حرارت اور تیزی زیادہ ہے جس کی وجہ سے کوئی اس پر نگاہ نہیں جما سکتا اس لئے اس سے تشبیہ نہیں دی گئی تو پھر چاند سے تشبیہ دیدی جاتی چراغ سے تو وہ بدرجہا زیادہ ہے وجہ دفع یہ ہے کہ چراغ میں ایک خاص صفت ایسی ہے جو نہ آفتاب میں ہے نہ ماہتاب میں اس لئے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو چراغ روشن فرمایا گیا بات یہ ہے کہ چراغ

میں تین صفتیں ہیں۔ ایک اس کا خود روشن ہونا دوسرے اپنے غیر کو روشنی دینا کہ چراغ کی وجہ سے دوسری چیزیں ظلمت سے نور میں آجاتی ہیں ان دو صفتوں میں تو چراغ اور آفتاب و ماہتاب سب شریک ہیں اور یہ دو وصف آفتاب و ماہتاب میں بیشک چراغ سے زیادہ ہیں۔ تیسری صفت چراغ میں یہ ہے اس سے دوسرا چراغ اسی کے مثل روشن ہو سکتا ہے چنانچہ ایک چراغ سے سیکڑوں چراغ روشن کر لئے جاتے ہیں۔ یہ صفت خاص چراغ ہی میں ایسی ہے کہ آفتاب و ماہتاب میں نہیں ہے کیونکہ آفتاب سے دوسرا آفتاب اور ماہتاب سے دوسرا ماہتاب روشن نہیں ہو سکتا خلاصہ یہ کہ آفتاب و ماہتاب دوسری چیزوں کو منوّر (باسم المفعول) تو کر دیتے ہیں مگر منوِّر (باسم الفاعل) نہیں کرتے اور چراغ دوسری اشیاء کو منوّر بھی کرتا ہے اور منوِّر بھی کر دیتا ہے اس لئے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو آفتاب و ماہتاب سے تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ چراغ روشن فرمایا گیا تو چراغ کی طرح آپ میں بھی علاوہ خود نورانی ہونے کے دو صفتیں ہوئیں ایک یہ کہ آپ دوسروں کو منوّر کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ آپ بعضوں کو منوِّر بنانے والے ہیں۔ پہلا کمال آپ کا امت میں ظاہر ہوا اور دوسرا کمال انبیاء علیہم السلام میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام آپ سے فیض حاصل کر کے بمنزلہ مستقل چراغ کے ہو گئے۔ جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن کر لیا جاوے تو بجائے خود مستقل منوّر ہو جاتا ہے یہی شان انبیاء علیہم السلام کی ہے امت کی یہ حالت نہیں کیونکہ امتی کے اندر جو نور آپ کے واسطے سے آتا ہے وہ اس میں مستقل نہیں۔

پس آپ انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے لئے بمنزلہ واسطہ فی الثبوت کے ہیں کہ ذی واسطہ بھی اس کمال کے ساتھ موصوف حقیقۃً ہو جاتا ہے اور واقعہ میں وہاں دو صفتیں ہوتی ہیں ایک واسطہ کی ایک ذی واسطہ کی اور امتیوں کے لئے بمنزلہ واسطہ فی العروض کے ہیں کہ ذی واسطہ حقیقۃً اس کمال کے ساتھ موصوف ہی نہیں ہوتا محض مجازاً متصف ہوتا ہے کیونکہ وہاں واقع میں ایک ہی صفت ہوتی ہے صرف

واسطہ میں اور ذی واسطہ میں کوئی صفت ہوتی ہی نہیں اسیطرح اپتیوں میں واقع میں صفت تنویر کی ہے ہی نہیں وہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی کی صفت ہے کہ اپتیوں کی طرف مجازاً منسوب کردی جاتی ہے بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ واقع میں بھی اُن میں تنویر کی صفت ہوجاتی ہے گو آپ کی ہی برکت سے تھی۔ رہا یہ کہ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے جمیع کمالات میں انبیاء علیہم السلام کو فیض پہونچنے کی کیا دلیل تو ہم کو اس کے دلائل بتلانے کی گو کچھ حاجت نہیں کیونکہ یہ مسئلہ اہل تحقیق کا اجماعی ہے مگر تقریب فہم کے طور پر بتلانے کا کچھ حرج بھی نہیں سو ایک مقدمہ اول سمجھنا چاہیئے کہ آپ جمیع کمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اور اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ حدیث صحیح میں آتا ہے کہ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم انبیاء کے فضائل میں گفتگو کر رہے تھے کسی نے کہا کہ حق تعالےٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ بنایا کسی نے کہا کہ اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ بنایا کسی نے کہا کہ حق تعالےٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ وکلمۃ اللہ بنایا وعلی ہذا۔ اور اس گفتگو سے صحابہ کا یہ مقصود نہ تھا کہ انبیاء کو آپ پر فضیلت دیں بلکہ غالباً وہ یہ چاہ رہے تھے کہ جس طرح ہم کو ان انبیاء کے خاص اوصاف معلوم ہیں۔ اسی طرح یہ بھی معلوم کریں کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں خاص صفت کیا ہے جس کی وجہ سے آپ سب انبیاء سے افضل ہیں صحابہ اسی گفتگو میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے تمہاری سب گفتگو سنی واقعی حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ وکلمۃ اللہ ہیں اَلَا اِنَّ صَاحِبَکُمْ حَبِیْبُ اللّٰہِ (یاد رکھو تمہارا ساتھی حبیب اللہ ہے)

اس واقعہ میں یہ تو ضرور ہے کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اپنی یہ خاص صفت اپنی فضیلت ظاہر کرنے کیلئے بیان فرمائی ہے۔

چنانچہ سیاق کلام اس کو مقتضی ہے مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ لغت میں تتبع کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت وخلت میں خلت کا درجہ بڑھا ہوا ہے کیونکہ محبت

کا اطلاق تو تھوڑی سی محبت پر بھی ہوسکتا ہے مگر خلت کا اطلاق جبھی ہوتا ہے جبکہ محبت خلل قلب یعنی اندرون قلب میں پہنچ جائے جس کو تبنی نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے ؎

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِ التَّائِہٖ وَهَوَى الْاَحِبَّةِ مِنْہُ فِیْ سَوْدَائِہٖ

(ملامت گروں کی ملامت قلب کے گرداگرد ہے اور دوستوں کی محبت سودائے قلب یعنی قلب کے اندر ہے)

پس خلت اس درجہ کی محبت کا نام ہے جو سودائے قلب میں پیوستہ ہوجائے تو اب حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ میں حبیب اللہ ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام پر آپ کی فضیلت کو ثابت نہیں کرتا کیوں کہ وہ خلیل اللہ ہیں اور خلت کا درجہ محبت سے بڑھا ہوا ہے۔ اس اشکال کے جواب میں لوگوں نے مختلف تقریریں کی ہیں مگر سہل جواب یہ ہے کہ اس جگہ آپ نے محبت کا اطلاق معنے لغوی کے اعتبار سے نہیں فرمایا بلکہ محاورات کے اعتبار سے فرمایا ہے پس لغۃً گو خلت محبت سے بڑھی ہوتی ہے لیکن استعمال و اطلاق محاورات میں گو محبت تو خلت سے بڑھی ہوئی نہ ہو مگر حبیب کا صیغہ خلیل سے بڑھا ہوا ہے چنانچہ خلیل تو جس طرح معشوق کو کہتے ہیں اسی طرح اس کا اطلاق عاشق پر بھی آتا ہے بخلاف حبیب کے کہ اس کا اطلاق محض معشوق پر ہوتا ہے عاشق پر حبیب کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ اس کو محب کہتے ہیں۔ پس خلیل اللہ و حبیب اللہ میں یہ فرق ہوا کہ خلیل اللہ خدا کے عاشق کو بھی کہہ سکتے ہیں اور معشوق کو بھی اور حبیب اللہ صرف محبوب ہی کو کہیں گے (گو جو خدا کا محبوب ہوگا وہ محب بھی ضرور ہوگا مگر) مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں محبوبیت کی شان ابراہیم علیہ السلام سے بڑھی ہوئی ہے جب یہ ثابت ہوگیا کہ حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں شان محبوبیت سب سے زیادہ ہے تو اب عادات پر نظر کی جائے عادت یہ ہے کہ جب کوئی کسی کا محبوب ہوتا ہے تو محب کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو چیز بھی عمدہ ہو اور محبوب

کو دیجا سکتی ہے وہ اس کو ضرور دیا کرتا ہے۔ دی جا سکتی ہو گی قید میں نے اس لئے بڑھائی تاکہ کوئی صاحب اس دلیل سے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے لئے علم غیب وخواص الوہیت کو ثابت کرنے لگیں اگر کوئی ایسا کرے گا تو ہم کہدیں گے کہ گفتگو ان امور میں ہے جو محبوب کو دیئے جا سکتے ہیں اور خواص الوہیت کا اعطا بشر کو محال ہے (ورنہ یہ بھی ممکن ہوگا کہ حق تعالےٰ کسی کو خدا بنا دیں، حالانکہ اسکے امکان کا کوئی بھی قائل نہیں) اور یقیناً جتنے کمالات انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے ہیں وہ سب عمدہ ہیں اور قابل عطاء ہیں تو قاعدہ عادیہ کی بنا پر جو کہ بمنزلہ لازم عقلی کے ہے حق تعالےٰ نے وہ سب کمالات حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو ضرور عطا فرمائے ہوں گے پس ثابت ہو گیا کہ جو کمالات جملہ انبیاء میں منفرداً منفرداً موجود ہیں وہ سب حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم میں مجتمعاً موجود ہیں۔ اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

حسن یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا داری ۔۔۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(آپ حسن یوسف، دم عیسیٰ ید بیضاء رکھتے ہیں جو تمام اوصاف انبیاء رکھتے ہیں وہ سب اوصاف تنہا آپ میں موجود ہیں)

اور چونکہ یہ مقدمات اقناعیہ ہیں اس لئے اگر ان پر کچھ عقلی اشکال واقع ہوں تو مضر نہیں کیونکہ مقدمات اقناعیہ سے سامع کی تسلی کر دینا مقصود ہوتا ہے اسکات والزام مقصود نہیں ہوتا لہذا اس مقصود پر مقدمات عادیہ سے استدلال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور چونکہ اصل مقصود ان مقدمات پر موقوف نہیں لہذا ان کا اقناعی ہونا اصل مقصود کو بھی مضر نہیں۔ شاید اس شعر پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنان مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم میں یہ بات کہاں تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن کی انواع ہیں حسن کی ایک نوع یہ ہے کہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کر دے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے یوسف علیہ السلام کا حسن

ایسا ہی تھا چنانچہ زلیخا کو آپ کے حسن کی سہار ہو گئی تھی انہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے۔ اور ایک نوع حسن کی یہ ہے کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے تحمل سے باہر ہوتا جائے جس قدر غور کیا جائے اسی قدر دل میں گھستا جائے اسکو ایک شاعر بیان کرتا ہے ؎

یزیدک وجہہ حسنا ۔۔۔ اذا ما زدتہ نظرا

حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا حسن ایسا ہی تھا کہ اس میں دفعۃً متحیر کر دینے کی شان ظاہر نہ تھی (کیونکہ آپ میں خداداد عظمت و جلال کی ایک شان ایسی تھی کہ دیکھنے والے پر سب سے پہلے اس کا ایسا اثر پڑتا تھا جس کی وجہ سے دیکھتے ہی نیا آدمی مرعوب ہو جاتا تھا اس کو حسن صورت پر آنکھ بھر کر نگاہ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی تا کہ تحیر کی نوبت آوے کما فی حدیث علی من راٰہ بداھۃً ھابہ اخرجہ الترمذی فی الشمائل جامع)
(جیسا حدیث شریف علی میں ہے جو شخص آپ کو اچانک دیکھتا آپ سے مرعوب ہو جاتا اس کو ترمذی نے شمائل میں نقل کیا ہے)

البتہ جتنا کوئی پاس رہتا اتنا ہی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حسن اس پر منکشف ہوتا تھا اور دن بدن دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا (کما فی حدیث علی المذکور ومن خالطہ معرفۃً احبہ ۱۲)
(جیسا کہ حدیث علی مذکور میں ہے اور جو شخص آپ سے ملتا تو آپ سے محبت کرنے لگتا)

یوسف علیہ السلام کے حسن پر عورتوں کا عاشق ہو جانا منقول ہے مگر فی نفسہ یہ زیادہ بعید نہیں بلکہ فطری امر ہے جو عادت کے مطابق ہے گو کسی درجہ خاص میں خارق عادت بھی ہے اور حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر مرد عاشق تھے جن میں بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی تھے مردوں کا عاشق ہونا وہ بھی (بچوں اور بوڑھوں

ع جیسا کہ حدیث میں دو نوجوان بچوں کا حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی محبت میں ابوجہل پر حملہ آور ہونا مذکور ہے انہوں نے یہ سن لیا تھا کہ ابوجہل حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا بہت دشمن ہے اس لئے دونوں اس کو قتل کیلئے بیتاب تھے جب معرکہ بدر میں ابوجہل کی صورت نظر پڑی فوراً دونوں ابھر دوڑے اور ذرا سی دیر میں اس کو تہ تیغ کر دیا ۱۲

کا یہ فی نفسہ بھی بہت عجیب ہے ایک عاشق صحابی فرماتے ہیں۔ رَاَیْتُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃً فِیْ حُلَّۃٍ حَمْرَآءَ وَالْقَمَرُ طَالِعٌ فَکُنْتُ اَرٰی اِلَی الْقَمَرِ مَرَّۃً وَاِلٰی وَجْھِہٖ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّۃً فَوَاللّٰہِ کَانَ وَجْھُہٗ اَحْسَنَ مِنْہُ ۱ا(وکما قال) یعنی ایک رات میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو سُرخ (دھارے دار) جوڑے میں دیکھا اس وقت چاند نکلا ہوا تھا تو میں کبھی آپ کے چہرہ پر نظر کرتا کبھی چاند کو دیکھتا بخدا آپ کا چہرۂ مبارک چاند سے زیادہ خوبصورت تھا اسیکو کسی شاعر نے عجیب لطیف عنوان سے تعبیر کیا ہے ؎

گہے بروئے تو گاہے بسوئے مہ نگرم　　　کند مقابلہ چوں کس کتاب را تنہا

یعنی کتاب کے مقابلہ کیلئے تو دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے میں تنہا کیونکر مقابلہ کروں ایک مرتبہ حضرت طلحہ صحابی رضی اللہ عنہ نے لڑائی میں اپنے ہاتھوں کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سپر بنایا تھا کفار کے جتنے تیر آتے وہ سب کو اپنے ہاتھ پر روکتے تھے تاکہ حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تیر نہ لگنے پائے یہ عشق نہ تھا تو کیا تھا اس کے علاوہ صحابہ کی محبت کے واقعات کتابوں میں کثرت سے موجود ہیں۔

بہت صحابہ نے آپ کی محبت میں گھر چھوڑا با ہر چھوڑا بیوی بچے چھوڑے اپنے عزیزوں کو جبکہ وہ حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف ہوتے بے دریغ قتل کیا حتیٰ کہ خود اپنی جانیں حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نثار کر دیں اور سر کٹوا دیئے

اسی حسن کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ؎

لَوَاحِیْ زُلَیْخَا لَوْ رَاَیْنَ جَبِیْنَہٗ　　　لَاٰثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَی الْیَدِ

یعنی حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حسن دل میں گھستا تھا اگر آپ کو زنانِ مصر دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھوں کے دلوں کو چیر پھاڑ دیتیں پس اجمالاً حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حُسن کے متعلق میں اتنی گفتگو پر کفایت کرتا ہوں اور حقیقت میں اتنا بھی میرے مذاق کے خلاف ہے۔ باقی اس باب میں تفصیلی گفتگو کرنا تو میرے مذاق کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں ایہام تنقیص کا ہوجاتا ہے۔

دوسری دلیل اس مدعی کی کہ آپ کی جامعیت بجمیع کمالات الانبیاء علیہم السلام ہے وہ ہے جو مولانا رومی (قدس اللہ سرہ) نے خاتم النبیین سے مستنبط کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خاتمیت جس طرح زمانی ہے اسی طرح آپ کو خاتمیت رتبی بھی حاصل ہے کہ کمالات انبیاء کے تمام مراتب آپ پر ختم ہو گئے ہیں یعنی آپ میں تمام کمالات سب سے اعلیٰ درجہ کے مجتمع ہیں مولانا نے اس مضمون کو بہت اشعار میں بیان فرمایا ہے وعظ الظہور میں وہ سب اشعار مفصل مذکور ہیں، اور اس سے مولانا کا یہ مقصود نہیں ہے کہ نعوذ باللہ آپ خاتم زمانی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ خاتم زمانی ہونے کے ساتھ خاتم رتبی بھی ہیں یعنی تمام مراتب کمالات آپ پر ختم ہو گئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس تفسیر پر آپ کی خاتمیت اور زیادہ اکمل ہو گی کہ ختم زمانی وختم رتبی دونوں آپ کے لئے ثابت ہوں گے اور یہی وہ مضمون ہے جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ظاہر فرمایا تھا۔ تو لوگوں نے اس پر بہت شور مچایا مگر مولانا رومی کو کوئی کچھ نہیں کہتا کیونکہ لوگ ان کو درویش سمجھتے ہیں اور درویش بھی مجذوب اس لئے ان سے ڈرتے ہیں لوگ درویشوں کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ یہ زبان سے کہدیں گے وہی ہو جائے گا، بلکہ انکی مخالفت سے وبال آجانے کا خوف کرتے ہیں اس لئے ان پر زبان درازی نہیں کرتے خصوصًا مجذوبوں پر کیونکہ سالک تو پھر کچھ سوچ سمجھکر کہتا ہے اور مجذوب تو بیباک ہوتا ہے جو جی میں آتا ہے بیدھڑک کہہ ڈالتا ہے خواہ بددعا سے کوئی ھلاک ہی ہو جائے۔

چنانچہ مولانا رومی نے مثنوی میں ایک جگہ اپنے کشف سے اُن لوگوں کا حال بھی بیان فرمایا ہے جو مثنوی کے مضامین پر انکار کرتے تھے کہ اے حسام الدین تم دیکھ رہے ہو کہ یہ لوگ انکار کیوجہ سے جہنم میں کس طرح گر رہے ہیں اشعار میں تو صراحتًا یہ مذکور نہیں کہ مولانا کن لوگوں کی نسبت یہ ارشاد فرما رہے ہیں مگر شراح نے اسکی تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ مولانا نے منکرین مثنوی

کے بارے میں یہ اشعار فرمائے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ مثنوی عام تصانیف کی طرح نہیں لکھی گئی بلکہ بطور املاء کے لکھی گئی ہے کہ مولانا رومی پر کسی وقت خاص حالت ہوتی تھی اسی میں مولانا کی زبان پر اشعار جاری ہوتے تھے اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے تھے۔ اسی طرح پوری مثنوی لکھی گئی۔ تو اس حالت میں منکرین کا واقعہ بھی منکشف ہوگیا اس کو بھی بیان فرمادیا واللہ اعلم۔ تو ان اشعار کو مع شرح کے دیکھ کر مولانا پر اعتراض کرنے کی لوگوں کو اور بھی جرأت نہیں ہوتی۔ ڈرتے ہیں کہیں ہمارا بھی وہی حشر نہ ہو جو منکران مثنوی کا مولانا کے زمانہ میں ہوا تھا اس لیے ان اشعار پر کوئی اعتراض نہیں کرتا مگر اسی مضمون کو مولانا محمد قاسم صاحب نے جو بیان فرمایا تو لگے فتوے نکلنے بات یہ ہے کہ لوگ علماء کے زیادہ معتقد نہیں ہوتے نہ ان سے ڈرتے ہیں اور ہمارے حضرات کو لوگ علماء ہی سمجھتے ہیں صوفی اور شیخ نہیں سمجھتے حالانکہ مولانا محمد قاسم صاحب عالم متبحر ہونے کے ساتھ بہت بڑے شیخ کامل بھی تھے مگر اچھا ہے کہ لوگ

ع۵ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو تحذیر الناس میں مضمون خاتمیت لکھتے ہوئے مثنوی کے یہ اشعار نہیں ملے ورنہ سہولت کے ساتھ فرما دیتے کہ خاتمیت کے یہ معنی بیان کرنے میں میں تنہا نہیں ہوں بلکہ مولانا رومی بھی اسی طرف گئے ہیں اب جی چاہتا ہے کہ اشارہ کے طور دو تین شعر مثنوی کے وعظ الظہور سے نقل کر کے اس جگہ بیان کردوں تاکہ ناظرین کو اس مضمون کا اجمالاً پتہ چل جاوے جسکی تفصیل کو حضرت مولانا نے وعظ مذکور پر حوالہ فرمایا ہے ؎ ختمہائے کانبیا بگذاشتند ٭ آن بدین احمدی برداشتند یعنی وہ مہریں (نقصان استعداد کی) جو انبیاء چھوڑ گئے تھے آپ کا دین ایسا کامل ہے کہ اسکی برکت نے وہ سب نقصان اٹھادیئے ؎ قفلہائے ناکشادہ ماندہ بود ٭ از کف انا فتحنا برکشود۔ یعنی استعداد کے بہت سے قفل بے کھلے رہ گئے تھے انا فتحنا یعنی صاحب انا فتحنا کے دست مبارک سے کھل گئے۔ مراد حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم ہیں۔ باقی صفحہ ۳۰۱ پر

ان حضرات کو عالم ہی سمجھیں شیخ نہ سمجھیں کیونکہ عوام جس کو شیخ سمجھتے ہیں اس کو بہت لپٹنے لگتے ہیں اس کے پاس دینوی قصے جھگڑے لیجاتے ہیں جس میں عارف کا وقت بہت ضائع ہوتا ہے کیمیا گو کا تو مذاق بھی ہوتا ہے کہ کوئی اس کو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۰ ؎ بہر ایں خاتم شد است او کہ بجود ؛ مثل او نے بود و نے خواہند بود۔

آپ اس سبب سے خاتم ہوئے ہیں کہ فیوض و علوم کے جود و عطا میں آپکا مثل نہ ہوا نہ ہوگا۔ کمالات کے تمام مراتب آپ پر ختم ہوگئے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ خاتم زمانی نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ خاتم مطلق ہیں زماناً بھی کمالاً بھی ؎ چونکہ در صنعت برد استاد دست ؛ نے تو گوئی ختم صنعت بر تو است۔ تمثیل کے طور پر فرماتے ہیں کہ دیکھو جب کوئی استاد کسی صنعت میں سبقت لیجاتا ہے تو کیا تم اس کو یہ نہیں کہتے کہ یہ صنعت تجھ پر ختم ہے یعنی ضرور کہتے ہو اسی طرح خاتم النبیین میں ختم کمالات پر بھی اشارہ بعید نہیں کہ آپ پر کمالات نبوت ختم ہیں یعنی ان میں آپ کا کوئی مثل نہیں پس یہ معنے ہیں خاتمیت کے اور مطلب وہی ہے کہ ختم زمانہ کے ساتھ آپ اس طرح بھی خاتم ہیں ؎

در کشاد ختمہا تو خاتمی ؛ در جہان روح بخشا خاتمی

اول تو قوت فیضان کے اندر آپ کا خاتم ہونا بیان فرمایا تھا اس شعر میں نقصان استعداد کی مہریں کھولنے کے اعتبار سے آپ کا خاتم ہونا ظاہر فرماتے ہیں۔ کہ آپ ان مہروں کے کھولنے میں بھی خاتم ہیں اور روح عطا کرنے والے حضرات (یعنی انبیاء علیہم السلام) کے عالم میں آپ بمنزلہ خاتم کے ہیں ۱۲ من الجامع

کیمیا گر نہ سمجھے اگر لوگ اس کو کیمیا گر نہ سمجھیں گے تو اس کا کیا نقصان ہے اگر کچھ نقصان ہے تو انہی کا ہے کہ اس کے فیوض و برکات سے محروم رہ گئے عارف تو خود چاہا کرتا ہے کہ نا اہلوں کو میرے کمال کی اطلاع نہ ہوے

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار عشق و مستی کے نہ بیان رنج اور خود پرستی میں اس کو مرنے دو)

غرض جو تفسیر مولانا رومی نے بیان فرمائی ہے اس پر کسی نے کلام نہیں کیا اور جن لوگوں نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ پر اعتراض کیا ہے اگر ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ مضمون مثنوی میں بھی ہے تو ہرگز کلام نہ کرتے اس لئے ہمیں اپنے مدعی کے اثبات میں مولانا رومی کے کلام سے استدلال کا حق ہے۔

جب حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے لئے خاتمیت زمانیہ کے ساتھ خاتمیت رتبیہ بھی ثابت ہے تو معلوم ہوا کہ تمام کمالات حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر ختم ہیں اور دوسرے انبیاء ان میں آپ سے مستفید ہیں جب ان دلیلوں سے یہ مقدمہ ثابت ہو گیا کہ آپ جمیع کمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اب میں اس دعوے کو ثابت کرتا ہوں کہ ان جمیع کمالات کا فیض حضرات انبیاء علیہم السلام کو حضور اقدس صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی سے پہونچا ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ مصنف عبدالرزاق میں ایک حدیث ہے یَاجَابِرُ عـہ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ قَبْلَ الْاَشْیَاءِ نُوْرَ نَبِیِّکَ مِنْ نُّوْرِہٖ الحدیث الطویل اے جابر حق تعالےٰ نے سب سے پہلے تمہارے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا پھر جب اللہ تعالےٰ نے اور مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو اس نور کے چار حصے کئے اور ایک حصہ سے قلم

عـہ قلت ذکرہ فی المواہب (ص ۹ ج ۱) بلفظ یا جابر ان اللہ تعالےٰ خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نورہ الحدیث بطولہ ولم یذکر سندہ حتی ینظر فیہ ۱۲ جامع قلت لکن لایضر عدم ذکر السند لان الاستدلال لمحض التائید والمدعی ثابت باجماع اہل التحقیق ۱۲

پیدا کیا اور دوسرے سے لوح اور تیسرے سے عرش آگے طویل حدیث ہے اب یہ حدیث ان الفاظ سے مشہور ہو گئی ہے اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ (پہلے اللہ تعالٰے نے میرا نور پیدا کیا) مضمون تو صحیح ہے مگر حدیث کے الفاظ یہ نہیں ہیں سو اول تو اس حدیث جابر میں تنصیص ہے کہ بقیہ سب مخلوقات کی تکوین میں جن میں حضرات انبیاء اور ان کے کمالات بھی آگئے آپ کو دخل ہے اور یہی حاصل ہے استفادہ کا آپ سے دوسرے یہاں بھی جس طرح مولانا اردمی نے خاتمیت کی دو قسمیں کی ہیں اولیت انبیاء کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں ایک اولیت زمانیہ کہ حضور صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم زماناً سب سے مقدم ہیں ایک اولیت ذاتیہ کہ آپ ذاتاً سب سے مقدم ہیں کہ تمام مخلوقات اپنے وجود اور کمالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج ہیں جنمیں انبیاء بھی داخل ہیں مگر اولیت ذاتیہ کے وہ معنی مراد نہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے جس میں مقدم کی ذات مستلزم ہے متاخر کے وجود کو بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ میں اولیت زمانیہ کے ساتھ اولیت علیت بھی ہے کہ آپ دوسری مخلوق کے لئے علت ثبوت کمالات ہیں مگر نہ علت بمعنی مؤثر بالاضطرار بلکہ علت بمعنے توسط کے غرض یہ کہ ہم آپ کیلئے نہ باری تعالٰے سے صدور میں ویسی اولیت ذاتیہ کے قائل ہیں جیسے فلاسفہ باری تعالٰے کو عقل اول کے اعتبار سے مقدم بالذات کہتے ہیں کہ عقل کو مخلوق بالاختیار نہیں کہتے بلکہ مجعول بالاضطرار کہتے ہیں کہ وہ حق تعالٰے سے بالاضطرار موجود ہو گئی پھر وہ اپنے ماتحت کے کیلئے اسی طرح علت موثرہ ہے بلکہ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلے اللہ تعالٰے علیہ وسلم اول مخلوق بالاختیار ہیں جس سے آپ کا حدوث لازم ہے اور پھر آپ دیگر مخلوق کے وجود وکمالات میں بھی اس طرح مؤثر نہیں ہیں محض باختیار حق واسطہ ہیں غرض اس حدیث سے آپ کے دو کمال ظاہر ہوئے ایک اولیت زمانیہ دوسرے اولیت بالعلیۃ آپ کا زماناً سب سے اول ہونا تو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ میں استفادہ فیض وجود وکمالات وجود کی قابلیت تمام مخلوق سے

زیادہ ہے اور اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ وہ قابلیت آپ کے اندر از خود بلا جعل حق تھی بلکہ وہ قابلیت بھی آپ کے اندر مشیت آلٰہی وعطاء خداوندی سے آئی ہے قابلیت بھی آپ کے لئے بالاضطرار ثابت نہیں بلکہ بالقصد والاختیار ثابت ہوتی ہے یہاں سے اس شعر کا اگر اس میں تاویل ہو جاوے غلط ہونا واضح ہو گیا ؎

نقصان ز قابل است وگرنہ علی الدوام فیض سعادتش ہمہ کس را برابر است

(نقصان قبول کرنے والے میں ہے ورنہ آپ کا فیض سعادت سب پر برابر ہے)

اس کا مدلول یہ ہے کہ مخلوق میں جو بعض کامل اور بعض ناقص ہیں اس اختلاف کا منشا قابل کی استعداد کا ناقص و کامل ہونا ہے ورنہ حق تعالےٰ کا فیض سعادت سب کے لئے یکساں ہے گویا فیض آلٰہی کی مثال نور آفتاب جیسی ہے کہ وہ تو اپنی طرف سے نور افشانی سب پر یکساں کرتا ہے کسی پر کم زاید نہیں کرتا مگر قابل کے اختلاف سے آثار تنویر مختلف ہو جاتے ہیں کہ سیاہ توے میں تنویر کی قابلیت کم ہے اس لئے وہ زیادہ روشن نہ ہو سکا اور آئینہ میں قابلیت زیادہ ہے وہ زیادہ منور ہو گیا) یہ ہے مدلول اس شعر کا سو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ ہر شخص میں جو قابلیت مختلف ہے وہ حق تعالےٰ کی طرف سے بالاضطرار ثابت ہے بالاختیار ثابت نہیں اور اسی وجہ سے باوجودیکہ سب کو فیض برابر پہونچاتے ہیں مگر کہیں زیادہ پہنچتا ہے کہیں کم اور یہ لازم بالکل باطل ہے کیونکہ وہ قابلیت فی نفسہٖ امر ممکن ہے تو بعض ممکنات کا قدیم و مستغنی عن الجاعل ہونا لازم آئے گا۔ جو بالکل غلط ہے۔ ممکن ہے کوئی ایسا نہیں جو جاعل سے مستغنی ہو یا حق تعالےٰ سے بطریق ایجاب واضطرار کے صادر ہوا ہو یہ مذہب فلاسفہ کا ہے جو مادہ کو اور اس کی استعداد کو قدیم صادر بالاضطرار کہتے ہیں اہل اسلام کا یہ مذہب نہیں ہے اور فلاسفہ کے قول کا غلط ہونا متکلمین نے خوب ثابت کر دیا ہے پس یہ کہنا غلط ہے کہ نقصان کا منشاء استعداد کا نقص ہے بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ حق تعالےٰ ہی نے کسی کی استعداد کامل

اور کسی کی ناقص بنائی ہے اور وہی خود سبکو یکساں فیض پہونچانا نہیں چاہتے۔ اگر وہ سب کو یکساں فیض پہنچانا چاہیں تو استعداد ناقص کی کیا مجال ہے کہ جو اس کو قبول نہ کرے اسی لئے صحیح مضمون اس شعر کا ہے ؎

دادِ او را قابلیت شرط نیست بلکہ شرطِ قابلیت دادِ اوست

(اسکی عطا کیلئے قابلیت شرط نہیں ہے بلکہ اس کی عطا و داد قابلیت کی شرط ہے)

یعنی حق تعالیٰ کی عطاء قابلیت پر موقوف نہیں بلکہ قابلیت خود عطا پر موقوف ہے اگر حق تعالیٰ کسیکو کمالات عطا کرنا چاہیں تو اس میں قابلیت بھی پیدا کر دیتے ہیں یہ مضمون نصوص پر منطبق ہے آیات و احادیث اس کی تائید کرتی ہے۔

(وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا وغیر ذلک)

(اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو تمام وہ لوگ جو زمین پر ہیں ایمان لے آتے)

اور پہلا شعر غلط ہے وہ شریعت[عہ] پر منطبق نہیں ہوتا مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحؒ نے اسی بنا پر عرفی کے اس شعر کی بھی تغلیط کی ہے اور سنا ہے کہ تکفیر بھی کی ہے ؎

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل سلمائے حدوثِ تو و لیلائے قدم را

(تقدیر نے ایک ناقہ پر دو محمل رکھدیئے ایک سلمائے حدوث کا دوسرا لیلائے قدم کا یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حدوث اور قدم کی دونوں صفتیں موجود ہیں۔)

اس شعر میں حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے حدوث و قدم کی دونوں

عہ قلت و یمکن تاویلہ بحملہ علیٰ لغت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیصح ۱۲ جامع

صفتیں ثابت کی ہیں۔ یہ مذہب فلاسفہ کا ہے کہ حدوث ذاتی کے ساتھ قدم زمانی ممکن کے لئے بھی ثابت ہوسکتا ہے اہلِ اسلام کا یہ مذہب نہیں ہمارے نزدیک تعدد ذوات قدیمہ محال ہے کوئی ممکن قدیم نہیں ہوسکتا نہ بالذات نہ بالزمان ہاں اگر عرفی کے اسی شعر میں قدم سے معنی مصطلح مراد نہ ہوں بلکہ معنے لغوی یعنی کہیں گے مراد لیجائے تو اس صورت میں تکفیر کی ضرورت نہیں بلکہ اب اس کے وہی معنی ہوں گے جو اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ کے معنے ہیں غرض آپ کا اوّل مخلوق ہونا آپ کی کمال قابلیت کی دلیل ہے کہ اول فیض حق تعالےٰ کا آپ کو پہنچا گو وہ قابلیت بھی بمشیت الٰہیہ ہے مگر حق تعالےٰ کا آپ میں ایسی قابلیت کاملہ پیدا کرنا کیا تھوڑی بات ہے بہت بڑی بات ہے اور اولیت زمانیہ سے زیادہ کمال یہ ہے کہ آپ اس کی ساتھ تقدم بالعلیت سے بھی موصوف ہیں نہ بمعنی تاثیر بالذات کے بلکہ بمعنے توسط کے عـــه نیز نشر الطیب کے فصل ثانی کی پہلی اور دوسری روایت میں حاکم و بیہقی و طبرانی کی تخریج سے حدیث قدسی مذکور ہے کہ اے آدم اگر محمد نہ ہوتے تو میں تم کو بھی پیدا نہ کرتا اور رسالہ

عـه قلت ويؤيد اولية صلى الله تعالے عليه وسلم بهذا المعنى حديث جابر المذكور لما فيه من قوله فجعل ذلك النور يدور بالقدرة حيث شاء الله تعالے ولم يكن في ذلك الوقت لوح ولا قلم ولا جنة ولا نار ولا ملك ولا سماء ولا ارض ولا شمس ولا قمر ولا جني ولا انس فلما اراد الله ان يخلق الخلق قسم ذلك النور اربعة اجزاء (الى ان قال) ثم قسم الرابع اربعة اجزاء فخلق من الاول نور ابصار المومنين ومن الثاني نور قلوبهم وهي المعرفة بالله ومن الثالث نور انسهم وهو التوحيد الحديث بطوله والله اعلم بصحته ١٢ جامع۔

راحت القلوب میں حاکم کی روایت اور تصحیح سے اور شیخ سبکی اور بیہقی کی اس روایت کی تقریر و تثبیت سے نقل کیا ہے کہ اگر نہ پیدا کرتا میں محمد صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کو نہ پیدا کرتا میں آدم کو نہ بہشت اور دوزخ کو الحدیث ان سب روایات کے آپ کا واسطہ فیوض و کمالات ہونا جمیع مخلوقات کیلئے ثابت ہوا امت کے لئے تو واسطہ فی العروض کے طور پر اور انبیاء کے لئے واسطہ فی الثبوت کے طور پر کیونکہ واسطہ فی العروض میں موصوف بالشئی حقیقت میں واسطہ ہوتا ہے ذی واسطہ مجازاً موصوف ہوتا ہے جیسے حرکت جالس فی السفینہ (کشتی میں بیٹھنے والے کی حرکت) کی بواسطہ سفینہ کے کہ حرکت کے ساتھ حقیقت میں صرف سفینہ موصوف ہے جالس دراصل ساکن ہے مگر بواسطہ حرکت سفینہ کے جالس کو بھی مجازاً متحرک کہہ دیتے ہیں اور واسطہ فی الثبوت کی ایک قسم میں کہ وہی مراد ہے اس مقام پر موصوف بالشئی ذی واسطہ دو واسطہ دونوں حقیقۃً ہوتے ہیں جیسے ید و مفتاح (ہاتھ اور کنجی) دونوں متحرک ہوتے ہیں۔

پس فیوض اُمت کیلئے تو حضور صلی اللہ تعالے علیہ وسلم اس قسم کے واسطہ ہیں جیسے سفینہ واسطہ ہے حرکت جالس کے لئے اور فیوض انبیاء میں آپ اس طرح واسطہ ہیں جیسے حرکت ید واسطہ ہے حرکت مفتاح کے لئے خوب سمجھ لو۔ یہی بات مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی بیان فرمائی تھی جس پر لوگوں نے اعتراض کیا اور حیرت ہے کہ اپنی جماعت کے بعض اکابر کو بھی اشکال تھا اور وجہ اشکال یہ ہے کہ مولانا نے کمالات انبیاء میں بھی واسطہ فی العروض کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور اسی کو کہیں بالذات و بالعرض سے تعبیر فرماتے ہیں بعض اکابر نے مجھ سے بھی اپنا یہی اشکال بیان فرمایا کہ اس سے تو دوسرے انبیاء کا کمالات کے ساتھ حقیقۃً موصوف نہ ہونا لازم آتا ہے میں نے عرض کیا کہ یہ مولانا کی خاص اصطلاح ہے کہ وہ واسطہ فی الثبوت کی جگہ بھی واسطہ فی العروض کا استعمال فرماتے ہیں اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور دعا دی۔

بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی جدا اصطلاح قائم کر لینے کا حق ہے لَا مُشَاحَۃَ فِی الْاِصْطِلَاحِ (اصطلاح مقرر کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں) مولانا کے ذمہ شیخ بوعلی سینا کی اصطلاحات کا اتباع لازم نہیں اُنکی یہ ذاتی اصطلاح ہے کہ واسطہ فی الثبوت کی ایک خاص قسم کو واسطہ فی العروض سے تعبیر فرماتے ہیں اور صوفیہ پر اکثر اعتراض اسی لئے ہوتا ہے کہ لوگ اُن کی خاص اصطلاحات سے ناواقف ہوتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

اصطلاحا نیست مر ابدال را

(ابدال کی خاص اصطلاحات ہوتی ہیں)

مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی میں اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید میں تحریری مناظرہ ہوا کرتا تھا۔ زبانی مناظرہ کی کبھی نوبت نہیں آئی تو ایک دفعہ مولوی فضل حق صاحب نے اپنے طلبہ سے پوچھا کہ بھلا اگر مولوی اسمٰعیل صاحب سے میرا زبانی مناظرہ ہوتا تو میں کس فن میں مناظرہ کرتا طلبہ نے کہا معقول میں کیونکہ مولوی فضل حق صاحب معقول کے امام مشہور تھے اور واقعی اس فن میں ان کو کمال حاصل تھا اسلئے طلبہ نے بھی یہی کہا کہ آپ معقول میں مناظرہ کرتے۔ فرمایا سبحان اللہ کیا میں پاگل تھا کہ معقول میں ان سے مناظرہ کرتا کبھی میں اپنے قول کی تائید میں کہتا کہ شیخ نے یوں کہا ہے وہ جواب دیتے کہ شیخ نے جھک مارا ہم اس کا قول نہیں مانتے طلبہ نے پوچھا کہ پھر کس فن میں آپ مناظرہ کرتے فرمایا میں ادب میں گفتگو کرتا کیونکہ یہ علم منقول محض ہے اس میں ذہانت سے کام نہیں چل سکتا اور مولانا اسمٰعیل صاحب کو اس فن میں ویسا توغل نہ تھا جیسا مولوی فضل حق کو تھا۔ واقعی عجیب فن چھانٹا جس میں وہی چل سکتا ہے جو حافظ اشعار ولغات ہو اس میں اپنی طرف سے ایک بات بھی نہیں چل سکتی ہر دعوے کیلئے نقل کی ضرورت ہے ہمارے استاد ملا محمود صاحب ادب سے بہت گھبراتے تھے اور سب فنون پڑھاتے تھے اور بہت اچھا پڑھاتے تھے مگر ادب کی کتاب جہاں کوئی لایا صاف فرما دیتے تھے کہ میں نہیں جانتا تو بات وہی تھی کہ اس فن

میں حفظ ونقل کی بہت ضرورت ہے مگر دیکھئے یہ بھی ان کی بے نفسی تھی کہ صاف کہدیتے تھے کہ مجھے یہ فن نہیں آتا میں نہیں جانتا بھلا آج تو کوئی اپنے طالب سے ایسا کہدے۔ نہیں کہہ سکتا مولانا بڑے بے نفس تھے پان بہت کھایا کرتے تھے سبق پڑھاتے میں بھی پان منہ میں رہتا تھا اسی لئے تقریر خود کم کرتے تھے بس طالبعلم نے تقریر کی اور آپ نے ہوں کردیا۔ بعض دفعہ کوئی شریر طالب علم ایک بار صحیح تقریر کرکے دوبارہ غلط مطلب بیان کرتا تو آپ غلط پر ہوں کردیا کرتے تھے چنانچہ ایک بار آپ مدرسہ سے گھر جارہے تھے ایک کاشغری طالب علم کوئی بات پوچھنے کے لئے ساتھ ہولیا اس نے تقریر کی آپ نے ہوں کردیا۔ اسنے شرارت کرکے پھر دوبارہ غلط تقریر کی آپ نے اس پر بھی ہوں کردیا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا ہوں ہوں کرتا ہے بتلاتا نہیں اس وقت آپ کو ہنسی آگئی اور پان تھوک کر فرمایا کہ گدھے کے بچے تو ہی تو خود تقریر کررہا تھا تو نے مجھ سے کب کہا تھا کہ تم تقریر کرو اب تو نے کہا ہے تو میں تقریر کردوں گا پھر آپ نے صحیح مطلب بیان فرمادیا، مولانا صاحب کسی پر غصے ہوتے تو گدھے کا بچہ فرمایا کرتے تھے طلبہ کہتے کہ حضرت گدھے کے بچے کہیں پلا ہوتا ہے بلا تو کتے کا ہوتا ہے۔ بہت ہی بے نفس اور بھولے تھے مگر علوم میں بہت خوب استحضار تھا غرض دیکھئے مولوی فضل حق صاحب نے منطق کی حقیقت ظاہر کردی کہ اگر میں مولوی اسمٰعیل صاحب سے منطق میں مناظرہ کرتا تو وہ ایک بات کہہ کر میرے تمام دلائل کو اڑادیتے کہ شیخ نے جھک مارا۔ ارسطو نے غلط کہا اسیطرح مولانا محمد قاسم صاحبؒ اصطلاح فلاسفہ کے پابند نہ تھے انکی یہ الگ اصطلاح تھی کہ وہ واسطہ فی الثبوت کو واسطہ فی العروض فرماتے ہیں پس حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کمالات انبیاء میں واسطہ فی الثبوت ہیں اس لئے جتنے کمالات انبیاء میں موجود ہیں وہ سب آپ میں مجتمع ہیں اور آپ ہی سے انبیاء کو حاصل ہوئے ہیں اس کی مزید تائید نشر الطیب کی چھٹی روایت منقول من المواہب سے ہوتی ہے کہ

امام محمد باقرؒ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ نے عالم میثاق میں یہ اقرار لیا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں) سب سے اوّل آپ ہی نے فرمایا بلیٰ گویا اور حضرات نے اس جواب کو آپ سے تلقی کی اور رسالہ مذکورہ کی ساتویں روایت میں بروایت مواہب سے حضرت عباسؓ کی اشعار میں کہ تقریر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل حجت ہیں سفینہ نوح علیہ السلام کی سلامتی اور نار نمرود میں حضرت ابراہیمؑ کی حفاظت کا آپ کی برکت سے ہونا مذکور ہے اسی کا خلاصہ صاحب قصیدہ بردہ نے اس شعر میں کہا ہے ؎

وَکُلُّ اٰیٍ اَتَی الرُّسُلُ الْکِرَامُ بِھَا فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِہٖ بِھِمْ

(اور ہر معجزہ جس کو رسولانِ کرام لائے سوائے اس کے نہیں کہ وہ معجزہ صرف بدولت حضور پرنور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے پہونچا ہے) ان سب دلائل سے آپ کی ذات مقدسہ میں جمیع کمالات انبیاء کا اجتماع اور دوسرے حضرات میں آپ کے واسطہ سے پہنچنا اچھی طرح ثابت ہو گیا، شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم میں معجزہ عصا کہاں تھا اس کا جواب یہ ہے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے قرب و مجاورات سے ایک سوکھی لکڑی میں حیوۃ پیدا ہو گئی تھی۔ جس سے ٹیک لگا کر آپ خطبہ پڑھا کرتے تھے جب ممبر نبوی م تیار ہو گیا اور آپ پہلی جگہ سے ہٹ کر ممبر پر تشریف فرما ہوئے تو اثنار خطبہ میں اس سوکھی لکڑی کے اندر سے بہت زور سے رونے کی آواز نکلنے لگی۔ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ممبر سے اتر کر اس کے پاس تشریف لائے اور اس کی تسلی فرمائی تو وہ آواز آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ جیسے بچہ روتے ہوئے سبکتا ہے اور کمال یہ کہ اس واقعہ میں اُستن حنانہ میں بصورت جمادیت ہی حیاۃ و صوت پیدا ہو گئی صورت حی میں منقلب ہونے کے بعد آثار حیوۃ کا ظہور نہیں ہوا اور یہ معجزہ عصا سے زیادہ عجیب ہے کیونکہ عصائے موسوی میں آثار حیاۃ کا ظہور بعد انقلاب صورت شکل اژدہا ہوتا تھا اور یہ بھی گو بڑا خرق عادت ہے مگر

واقعہ استن حنانہ اس سے زیادہ عجیب ہے پس حضور صلے اللہ تعالےٰ
علیہ وسلم میں معجزہ عصار کا وجود واقعۂ استن حنانہ سے ثابت ہو گیا۔ اور پھر میں
وہی کہتا ہوں کہ اس باب میں تفصیلاً گفتگو نہ کرنا چاہیئے مگر اتنے پتے کے طور
پر میں نے ایک مثال بیان کر دی ہے جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اگر غور
کیا جائے گا تو حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم میں وہ سب کمالات مجتمعاً معلوم ہو
جائیں گے۔ جو حضرات انبیاءؑ میں منفرداً منفرداً موجود تھے اور انکو حضور صلی اللہ
تعالےٰ علیہ وسلم ہی کے واسطہ سے وہ کمالات حاصل ہوئے ہیں اور گویا کمالاتِ
انبیاء علیہم السلام میں بھی حقیقی ہیں مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ آپ میں وہ کمالات
اوروں سے قوی واکمل ہیں اور اجمالاً اتنا کہنے کا ہمیں حق حاصل ہے کیونکہ حضور
صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا افضل الانبیاء ہونا مجمع علیہ ہے، باقی کمالات امت
کے واسطے تو حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم واسطہ فی العروض ہیں اس لئے یہاں وہ مثال نہیں ہے جیسے
ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو کر مستقل ہو جاتا ہے بلکہ یہاں وہ مثال
ہے جیسے گھر میں چراغ روشن ہونے سے در و دیوار منور ہو جاتے ہیں ظاہر
ہے کہ در و دیوار میں روشنی کوئی مستقل نہیں ہے وہی ہے جو چراغ میں ہے۔
چنانچہ اگر وہاں سے چراغ کو اٹھا لیا جاوے تو در و دیوار سب تاریک رہ جائیں
گے اسی طرح امتی کے اندر جو کمالات ہیں وہ محض آپ کے فیوض کا عکس ہے
کوئی مستقل کمال نہیں اگر وہ اپنے . . کو صاحب کمال مستقل سمجھنے لگے تو
کورا رہ جاتے گا۔ جیسا کہ ایک کاتب وحی کا قصہ ہے جس کا نام عبداللہ بن
بن سعد بن ابی سرح تھا۔ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی برکت صحبت سے
اس میں یہ بات پیدا ہو گئی کہ ایک مرتبہ آپ نے اس کو قرآن شریف کی یہ آیت
لکھنے کا امر فرمایا جو اسی وقت نازل ہوتی تھی۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ
سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ
عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عظما فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ

لَحۡمًا ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ (ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا پھر ہم نے اسکو نطفہ سے بنایا جو کہ ایک محفوظ مقام میں رہا پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا ایک لوتھڑا بنایا پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو بوٹی بنادیا پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنادیا پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھادیا پھر ہم نے اسکو ایک دوسری مخلوق بنادیا)

حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم یہاں تک پڑھنے پائے تھے کہ اس کا اخیر جزو بیساختہ کاتب کی زبان پر جاری ہوگیا فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ۔ (سو کیسی نورانی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے) حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا لکھو یہی وحی میں بھی ہے تو یہ کیا تھا حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے فیوض قلب کا عکس تھا کہ اس شخص کے دل پر حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے قلب کا عکس پڑ گیا اور فی الجملہ وحی سے مناسبت ہوگئی کہ اس کے دل میں بھی از خود آیت کا اخیر لفظ آگیا۔ مگر وہ شخص سمجھا کہ بس میں بھی پیغمبر ہوگیا مجھ پر بھی وحی آنے لگے کم ظرف اور کم حوصلہ تھا کہ اتنی بات پر آپے سے باہر ہوگیا اور مدعی نبوت بن کر مرتد ہوگیا اور حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے اپنا تعلق قطع کر لیا یہ نہ سمجھا کہ یہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا ورنہ مرتد ہونے کے بعد اسنے قرآن کی مثل کوئی جملہ کیوں نہ بنا لیا بس آپ سے تعلق قطع کرتے ہی کورا ہوگیا اسیکے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ قَالَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ وَلَمۡ یُوۡحَ اِلَیۡهِ شَیۡءٌ وَّمَنۡ قَالَ سَاُنۡزِلُ مِثۡلَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ۔ (اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالےٰ پر جھوٹ لگایا کہے جیسا کلام اللہ تعالےٰ نے نازل کیا اسی طرح کا میں بھی لاتا ہوں)

یہ شخص ایک ہی جملہ کے توارد پر آپے سے باہر ہوگیا کیونکہ کم ظرف تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بارہا ایسا قصہ پیش آیا کہ وحی سے انکو

توافق ہوگیا بعض دفعہ تو وحی ان کی رائے کے موافق نازل ہوتی اور بعض دفعہ بلفظ توافق ہوا ۔ کہ وحی انہی الفاظ میں نازل ہوئی جو حضرت عمرؓ کی زبان سے نکلے تھے مگر ان کو ایک دفعہ بھی یہ خیال نہ ہوا کہ میں کچھ ہوں اور مجھ پر بھی وحی آتی ہے بلکہ وہ اس کی حقیقت کو سمجھتے تھے کہ یہ محض حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت ہے جو ہمارے قلب میں تھوڑی سی نورانیت حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے طفیل سے پیدا ہوگئی ہے کہ بعض دفعہ وہی بات دل میں آجاتی ہے جس کے موافق وحی نازل ہونے والی ہے بلکہ حضرت عمرؓ کو اس پر ناز تو کیا ہوتا بعض دفعہ کسی واقعہ میں جب ان کی رائے میں اور حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی رائے میں اختلاف ہوتا اور وحی حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق نازل ہوتی تو حضرت عمرؓ بجائے خوش ہونے کے شرمندہ ہوتے اور کئی کئی دن تک شرمندہ رہتے۔ چنانچہ عبد اللہ بن ابی رئیس المنافقین کے قصہ موت میں حضرت عمرؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی تھی کہ آپ اس منافق کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں کیونکہ حق تعالےٰ نے فرمادیا ہے کہ ان منافقوں کی بابت آپ کتنا ہی استغفار کریں ہم انکی مغفرت ہرگز نہ کریں گے (اور نماز جنازہ کی حقیقت دعا رد استغفار ہی ہے تو اُن کے لئے دعا نہ کرنا چاہیے) حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ (آپ خواہ ان کے لئے استغفار کریں یا ان کیلئے استغفار نہ کریں اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں تب بھی اللہ تعالےٰ انکو نہ بخشے گا۔)

حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر اللہ تعالےٰ نے مجھے اختیار دیا ہے کہ صراحۃً ان کے لئے استغفار کرنے سے منع نہیں فرمایا اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے ستر سے زیادہ استغفار کرنے سے حق تعالےٰ بخش دیں گے تو میں ستر سے زیادہ استغفار کرلوں گا اس گفتگو کے بعد آپ

نے نماز پڑھادی وہاں سے ہٹنے نہ بھی نہ پائے تھے کہ وحی نازل ہوئی وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (اور ان میں سے کوئی مرجائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوجیے انھوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ کفر کیا ہے اور وہ حالت کفر ہی مرے ہیں)

جس میں حضرت عمرؓ کی رائے کی پوری موافقت تھی جضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اے عمرؓ حق تعالےٰ نے تمہاری رائے کو قبول فرمایا۔ حضرت عمرؓ بہت ہی شرمندہ ہوئے کہ یہ کیا ہوا میں نے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے کیوں اختلاف کیا تھا روایات میں حضرت عمرؓ کا قول آتا ہے فَعَجِبْتُ مِنْ جُرْءَتِيْ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رواہ البخاری (میں رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر اپنی جرأت کرنے پر متعجب ہوں)

بلکہ اگر غور کرکے دیکھا جائے تو عبداللہ بن ابی سرح کے واقعہ میں توافق بالوحی نہ تھا کیونکہ وہاں وحی نازل ہوچکی تھی صرف اتنی بات تھا کہ آپ کے دل میں جو الفاظ منزلہ موجود تھے ان میں سے ایک جملہ اس کے قلب میں بھی آگیا (اور یہ کچھ زیادہ عجیب بات نہیں بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے دل میں جو بات ہوتی ہے پاس بیٹھنے والے کے دل پر اس کا عکس پڑجاتا ہے اور اس کی زبان سے وہی بات نکل جاتی ہے جو پہلے شخص کے دل میں تھی چنانچہ ایسے موقعہ میں کہا کرتے ہیں کہ میاں تم نے تو میرے دل کی بات ہی کہدی ۱۲ جامع) اور حضرت عمرؓ کے واقعہ میں وحی اب تک نازل بھی نہ ہوئی تھی واقعہ اختلاف کے بعد وحی نازل ہوئی جو انکی رائے کے مطابق تھی اور بعض دفعہ تو الفاظ بھی وہی ہوتے تھے جو حضرت عمرؓ کی زبان نکلے تھے مگر ان کو ایک دفعہ بھی اس پر ناز نہ ہوا بلکہ اس کو حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی کی صحبت

کی برکت سمجھے غرض اُمتی اپنے کو مستقل سمجھنے سے بالکل کورا رہ جائیگا سارے کمالات سلب ہوجائیں گے جیسا ابن ابی سرح کے واقعہ میں ہوا پس کمالات اُمت کے لئے آپ واسطہ فی العروض ہی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے لئے واسطہ فی الثبوت مقصود تو اس سے حاصل ہوگیا مگر یہاں ایک اشکال طالبعلمانہ رہ گیا۔ ساتھ کے ساتھ میں اس کو بھی کو حل کئے دیتا ہوں۔ اشکال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ کو تخییر پر محمول فرمایا حالانکہ سیاق کلام سے یہ جملہ تسویہ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ چاہے آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ استغفار کریں، اگر آپ ستر دفعہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرۃ کبھی نہ کریں گے۔ یعنی دونوں باتیں اُن کے حق میں مساوی ہیں۔ چنانچہ اہل محاورات اس کو خوب سمجھتے ہیں۔

نیز اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (اگر ستر مرتبہ بھی استغفار کرو) میں عدد سبعین سے کثرت مراد ہیں۔ عدد خاص مراد نہیں اور مطلب یہ ہے کہ چاہے آپ کتنا ہی استغفار کریں انکی مغفرت نہ ہوگی۔ مگر حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ میں ستر سے زیادہ استغفار کرلوں گا اسکی کیا وجہ ہے آپ تو افصح العرب ہیں آپ نے آیت کو تخییر پر اور عدد کو تحدید پر کیوں محمول فرمایا اس اشکال کا جواب شافی میں نے کہیں منقول تو دیکھا نہیں اور نہ کتابوں پر میری نظر زیادہ ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے میں نے جو جواب سنا ہے۔ وہ بیان کرتا ہوں ممکن ہے کہ نقل سے بھی اس کی تائید ہوجائے اور اگر نقل سے ... تائید نہ ہو تو حضرت مولانا کو حق تعالیٰ نے فن تفسیر سے خاص ذوق عطا فرمایا تھا ان کے جواب کو ہم حجت سمجھتے ہیں مولانا نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ بیشک اسلوب کلام تو تسویہ ہی کیلئے ہے اور عدد سبعین سے بھی خصوصیت عدد مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے مگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر اس وقت رحمت کا حال غالب تھا غلبہ رحمت سے آپ نے صورت کلام سے تمسک فرمایا تو اس جواب سے اشکال تو رفع ہوگیا مگر اس سے صوفیہ

کے ایک قول کو مقید کرنا پڑے گا وہ یہ کہ صوفیہ کا قول ہے کہ کاملین پر غلبہ حال نہیں ہوتا تو اس میں یہ قید لگانی پڑے گی یعنی اکثر نہیں ہوتا کبھی کبھی ضرور ہوجاتا ہے اور یہ تقیید محض مولانا کے جواب کی وجہ سے نہیں بلکہ احادیث صحیحہ اس کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ واقعۂ بدر میں جب مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہونے والا تھا حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم عریش مبارک میں نہایت الحاح کے ساتھ دعا فرما رہے تھے کہ اے اللہ اپنے وعدۂ نصر کو پورا فرمائیے اور مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمائیے حتیٰ کہ جوش میں یہ بھی فرمایا اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ اے اللہ اگر یہ تھوڑی سی جماعت مسلمانوں کی ہلاک ہوگئی تو پھر زمین میں آپ کی عبادت نہ ہوگی۔ اللہ اکبر۔ خدا تعالےٰ سے یہ کہا جارہا ہے کہ اگر مسلمان اس واقعہ میں مغلوب ہوگئے تو پھر کوئی آپ کا نام نہ لیگا۔ صاحبو! آخر یہ کیا تھا علماء ظاہر تو تھک جائیں گے تاویلیں کرتے کرتے مگر اُن سے کچھ جواب نہ آئے گا، ہاں صوفیہ اس کا جواب نہایت سہولت سے دیدیں گے کہ اس وقت آپ پر غلبۂ حال تھا مقام ناز کی کیفیت غالب تھی لیجئے سارا اشکال مرتفع ہوگیا مگر یہ جواب اس کو مقتضی ہے کہ صوفیہ کے اس قول مشہور کو مقید کیا جائے۔ اب ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ ہم نے تسلیم کیا کہ آیت کی صورت تخییر کو محتمل تھی مگر اس سے محض جواز معلوم ہوا وجوب تو نہیں معلوم ہوا تخییر سے جس طرح منافقین کی نماز پڑھنے کا جواز نکلتا ہے ترک صلوٰۃ کا جواز بھی تو نکلتا ہے پھر حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کو ترک صلوٰۃ پر کیوں ترجیح دی آپ نے نماز پڑھی کیوں اس کے لئے کوئی مرجح بتلانا چاہیئے ورنہ آپ کے فعل کا عبث ہونا لازم آئے گا اس کا جواب ایک تو مورخین نے دیا ہے کہ اس دن حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی اپنے سخت ترین دشمن پر یہ رحمت وشفقت دیکھ کر بہت لوگ مسلمان ہوگئے تھے تو گویا آپ

کے فعل میں یہ فائدہ اور یہ حکمت تھی اور دشمنوں کو یہ دکھلانا منظور تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو اپنے نفس کے لئے کسی سے بھی عداوت نہیں ہے بلکہ وہ دل سے اپنے دشمنوں کے لئے بھی رحمت و مغفرت کے خواہاں ہیں (جبتک حق تعالےٰ ممانعت نفرمادیں) اگر نفس کے لئے کسی سے آپ کو دشمنی ہوتی تو عبد اللہ بن ابی کے کفن میں اپنا قمیص مبارک ہرگز نہ دیتے نہ اس کی نماز پڑھتے نہ دفن میں شریک ہوتے کیونکہ شرعاً آپ کے ذمہ ان میں سے ایک کام بھی واجب نہ تھا مگر آپ نے شفقت ورحمت سے سب کچھ کیا اور اس کی دشمنی پر کچھ بھی التفات نہیں فرمایا اور ایک جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے دیا ہے کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی کے واقعہ میں اس مسئلہ کو حل فرمادیا ہے کہ تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے بدون ایمان کے سب بیکار ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو کہ ابن ابی کے پاس کتنے تبرکات جمع ہو گئے حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اپنا قمیص مبارک اس کے کفن میں دیا بھلا یہ بات کس کو نصیب ہوتی ہے آج کل کوئی بہت کرے گا۔ غلاف کعبہ کا ٹکڑا رکھدے گا مگر غلاف کعبہ کو حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے قمیص سے کیا نسبت حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا جسد اطہر عرش وکعبہ سب سے افضل ہے اور اگر غلاف کعبہ کو قمیص نبوی صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے برابر مان بھی لیا جاتے تو یہ دولت کس کو نصیب ہوسکتی ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑے عبد اللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ نے اپنا لعاب بھی اس کے منہ میں ڈالدیا تھا وہ تو آپ کا جزو تھا جس کی برکت لباس سے بھی زیادہ ہے۔ پھر آپ نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی گویا اس کے لئے دعاء مغفرت فرمائی بھلا یہ شرف آج کس کو نصیب ہوسکتا ہے کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے عبد اللہ بن ابی کو ان تبرکات

سے کچھ بھی نفع نہ ہوا کیونکہ وہ ایمان سے محروم تھا حق تعالےٰ نے صاف فرمادیا۔ اِنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَبِرَسُوْلِہٖ وَمَاتُوْا وَھُمْ فَاسِقُوْنَ (انہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا ہے۔ اور وہ حالتِ کفر ہی میں مرے ہیں)

غرض حضرت عمرؓ کے قصہ پر یہ سارا بیان چل پڑا تھا اس کے قبل میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے جدا اور مستقل ہو کر رہنے سے امتی تمام کمالات سے کورا ہوجاتا ہے اور آپ کی تو بڑی شان ہے حضرات اولیاء اللہ سے بھی گستاخی کے ساتھ تعلق قطع کرنا سلب فیوض و برکات و سلب نسبت بلکہ بعض دفعہ سلب ایمان کا سبب ہوجاتا ہے کیونکہ وہ بھی اپنے مستفیدین کے لئے واسطہ فی الفیوض ہوتے ہیں اور واسطہ کے ساتھ گستاخی عادت الٰہی کے موافق گستاخ کو تمام فیوض سے کورا کر دیتی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ اولیاء کے کمالات جیسا کہ اوپر مذکور ہوا بعینہ حضور اقدس صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی کے کمالات ہیں، چنانچہ علماء نے لکھا بھی ہے کہ اولیاء کے کرامات حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے معجزات ہیں جو ان اولیاء میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پس جس شخص نے اس ولی کو جزماً یا احتمالاً صاحب کمال مان لیا اس کے کمال کو نبی صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا کمال مان لیا۔ پس اس کمال کی بے ادبی کرنا حضور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ بے ادبی کرنا ہے ہاں اگر کسی وجہ شرعی سے اس کو صاحب کمال ہی نہ مانے تو وہاں یہ علت جاری نہیں ہوگی۔

چنانچہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ اپنی جوانی میں ایک بزرگ کی زیارت کو جارہے تھے ساتھ میں دو آدمی اور تھے آپس میں گفتگو ہوتی جس طرح راستہ طے کرنیوالے رفیقوں میں ہوا کرتی ہے کہ بھائی تم ان بزرگ کے پاس کس غرض سے جارہے ہو ایک شخص نے تو کچھ دنیوی غرض بتلائی کہ میں اپنے لئے فراخیٔ رزق وغیرہ کی دعاء کراؤں گا دوسرے

شخص نے جو کہ عالم تھا اور اس کا نام ابن السقا تھا کہا میں تو ان بزرگ کا امتحان کرنے جارہا تھا کہ دیکھو یہ خالی بزرگ ہی ہیں یا کچھ علم سے بھی تعلق رہے ہیں ان سے ایسے پیچیدہ سوالات کروں گا جن کا جواب نہ بن پڑے۔ پھر حضرت شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ سے اُن دونوں نے پوچھا کہ صاحبزادے تم کس کام کیلئے جارہے ہو فرمایا کہ میں تو صرف اس لئے جارہا ہوں کہ یہ بزرگ اللہ کے مقبول بندے ہیں شاید ان کی زیارت سے ہمارے نفس کی اصلاح ہو جائے اور اللہ تعالے کا ہمارے حال پر بھی فضل ہو جائے۔ غرض تینوں ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے اُنکو کشف سے ان تینوں کی نیت کا حال پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ ابھی یہ لوگ کچھ عرض کرنے بھی نہ پائے تھے کہ شیخ نے خود ہی سب کے سوالات کا جواب دیدیا۔ جو شخص دینوی غرض کے لئے آیا تھا اس سے فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سونے چاندی کے ڈھیر تیرے پیروں کے نیچے ہوں گے (گویا اس کا مقصود پورا ہو گیا) ابن السقا سے فرمایا کہ تیرا ایک سوال یہ ہے اور اس کا یہ جواب اور دوسرا سوال یہ ہے اور اس کا یہ جواب سوالوں کے جواب تو یہ ہیں مگر مجھے تیرے چہرہ پر آثار کفر نظر آرہے ہیں اور میں وہ حالت دیکھ رہا ہوں جبکہ تو اسلام سے مرتد ہو جائے گا۔

چنانچہ یہ شخص ایک مرتبہ خلیفۂ وقت کی طرف سے ہرقل کے پاس کوئی پیام لے کر گیا تھا بہت بڑا عالم تھا خلیفہ نے سفارت کے لئے اس کو منتخب کر رکھا تھا مگر اس نے ان بزرگ کے ساتھ گستاخی کی نیت کی تھی اس کے وبال میں ہرقل کے پاس جا کر اس کی کسی لڑکی پر فریفتہ ہو کر اس کے عشق میں نصرانی ہو گیا اور اسی حالت میں مرا نعوذ باللہ منہ اور حضرت شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ سے فرمایا کہ مجھکو یہ بات نظر آرہی ہے کہ تم ممبر بغداد پر بیٹھے ہوئے یہ کہتے ہو قَدَمِی هٰذِهٖ عَلٰی رِقَابِ کُلِّ اَوْلِیَاءِ اللّٰهِ (یہ میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن

پر ہے)

اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اولیاء اللہ کی گردنیں اس وقت جھک رہی ہیں۔

کتنا صحیح کشف تھا کیونکہ یہ بات انہوں نے ایسے وقت میں فرمائی تھی کہ اس وقت حضرت شیخ عبدالقادر رحمہ بالکل بچے نوجوان تھے۔ اس کا کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کسی وقت اس درجہ کو پہونچیں گے مگر کشف بالکل صحیح تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا جس کا واقعہ مشہور ہے کہ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ ممبر بغداد پر بیٹھے ہوئے ایک دن وعظ فرما رہے تھے اثناء وعظ میں جوش آیا اور فرمایا قَدَمِیْ هٰذِهٖ عَلٰی رِقَابِ كُلِّ اَوْلِیَاءِ اللّٰهِ (یہ میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے)

اس وقت جتنے اولیاء زمین پر تھے سب نے اس آواز کو سنا اور گردنیں جھکا دیں بلکہ بعض نے گردن جھکا کر یہ بھی کہا۔ بَلْ عَلٰی رَاْسِیْ وَعَیْنِیْ (بلکہ ہمارے سر اور ہماری آنکھوں پر)

یہ ویسا ہی قصہ ہوا جیسا کہ حضرت خلیل اللہ کی آواز کو حق تعالیٰ نے تمام عالم میں پہونچا دیا تھا حتیٰ کہ ارواح نے اپنے باپ ماں کے پشت اور رحم میں سے جواب دیا لبیک لبیک اسی طرح حضرت شیخ عبدالقادر رحمہ کی وہ آواز خلیل الٰہی آواز تھی جس کو تمام عالم کے اولیاء وقت نے سنا خدا تعالیٰ نے سب کو آواز پہونچا دی۔

پس جب اولیاء سے قطع تعلق کا یہ اثر ہے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قطع تعلق کرنیوالا کیونکر کمالات سے کورا نہ رہ جائے گا مگر اتنا فرق ہے کہ اولیاء سے تو قطع تعلق مطلقاً سلب کمالات کا سبب نہیں جب گستاخی کے ساتھ قطع تعلق کرے اس وقت وبال پڑتا ہے۔ اور حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قطع تعلق کرنا مطلقاً سلب فیوض و کمالات کا سبب ہے اگرچہ گستاخی بھی نہ کرے یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو محض توحید کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں

تصدیق رسالت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ افسوس مسلمانوں میں بھی بعض لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تعلیم کے لئے آئے تھے تو جو شخص توحید کا اقرار کرلے وہ نجات پائے گا گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہ کرے یاد رکھو یہ قول بالکل باطل ہے نجات بدون تصدیق رسالت ہرگز نہیں ہو سکتی جس طرح توحید رکن ایمان ہے اسی طرح تصدیق رسالت بھی رکن ایمان ہے۔ ان لوگوں نے اس آیت سے دھوکہ دینا چاہا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ الآیۃ (ترجمہ) جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی اور نصرانی ہیں اور جو صابی ہیں (ان میں سے) جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے (قانون شریعت کے موافق) ایسوں کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس حق الخدمت بھی ہے اور (وہاں) اُن پر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے) اس آیت میں تصدیق رسالت کا ذکر (ظاہراً) نہیں ہے بلکہ سب فرقوں کی نجات کا مدار صرف ایمان باللہ و ایمان بالآخرۃ کو قرار دیا گیا ہے اس سے بعض لوگوں نے اس غلطی میں ڈالنا چاہا کہ نجات کے لئے تصدیق رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضرورت نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ایمان باللہ بغیر تصدیق رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے محقق ہی نہیں ہو سکتا پس یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تصدیق رسالت کا ذکر نہیں۔ تفصیل اس جواب کی وہ ہے جو میں نے ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کہلا کر بھیجی تھی وہ بندۂ خدا بھی اسی غلطی میں مبتلا تھے ویسے بڑے نیک پابند صوم و صلوٰۃ تھے مگر شیطان نے ان کے دل میں یہ وسوسہ ڈال رکھا تھا کہ نجات کے لئے صرف ایمان باللہ کافی ہے تصدیق رسالت کی ضرورت نہیں۔ واقعی بدون علم دین کے کامل اصلاح نہیں ہوتی، عقائد بھی درست نہیں ہوتے افسوس آجکل لوگوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم سمجھ لیا ہے۔ بس وہ ایسا ہی علم ہے جس سے روپیہ پیسہ معلوم ہو جاتا ہے خدا اس سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں نے ان ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کہلا کر بھیجا کہ ایمان باللہ کے صرف یہی معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو موجود مان لے کیونکہ وجود کا انکار تو مشرکین بھی نہیں کرتے

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

بلکہ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالٰے کو صفات کمال سے متصف اور صفات نقص سے منزہ سمجھے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ صفات کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے جس کی ساتھ خدا تعالیٰ کو موصوف ماننا توحید کے لئے ضروری ہے اور صفات نقص میں سے ایک صفت کذب بھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازم ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ کہ حق تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالٰے کے رسول ہیں (اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے) تو اس خبر کو بھی سچا سمجھنا واجب ہے پس جو آپ کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں مانتا وہ خدا تعالیٰ کو کاذب کہتا ہے جب کاذب کہا تو پھر اللہ پر کہاں ایمان لایا۔ پس ثابت ہو گیا کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانا بدون تصدیق رسالت کے ممکن نہیں۔ میں نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ جواب کے لئے دس سال کی مہلت ہے۔

اس دلیل کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا پھر خدا نے کیا ان کی اصلاح ہو گئی بعد میں مجھ سے ملے بھی تھے اس وقت ان کا شبہ رفع ہو چکا تھا بے چاروں کا خاتمہ اچھا ہوا۔ پس خوب سمجھ لو کہ بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے نجات ہرگز نہیں ہو سکتی ایک فلسفی کی بابت ایک شخص نے خواب دیکھا تھا میں اس فلسفی کا نام بتلانا نہیں چاہتا خواہ مخواہ ایک مسلمان سے خواب کی بنا پر کفر کی بدگمانی ہو جائے گی مگر اس شخص کے خیالات تھے فلسفیانہ گو ظاہر میں مسلمان کہلاتا تھا۔ خواب یہ تھا کہ ایک شخص کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تو اس نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فلاں شخص کا کیا حال ہوا آپ نے فرمایا کہ وہ بدون میرے توسط کے جنت میں جانا چاہتا تھا اور جنت کے قریب بھی پہنچ گیا تھا مگر میں نے ہاتھ پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا کہ دور ہو کمبخت جنت میں بغیر میرے تعلق کے کوئی نہیں جا سکتا۔ غرض آپ امت کے لئے واسطہ فی العروض ہیں تمام کمالات و فیوض میں بدون آپ کے واسطے کے کوئی شخص بھی کمالات بلکہ ایمان سے بھی موصوف نہیں ہو سکتا۔ اسی کو حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

میندار سعدی کہ راہ صفا | توان رفت جز بر پئے مصطفا صلی اللہ علیہ وسلم

خلاف پیمبر کسے رہ گزید ... کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
(سعدی یہ گمان نہ کرو کہ صاف راستہ سوائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی
پیروی کے چل سکو گے جس شخص نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کیا
ہرگز منزل مقصود کو نہ پہونچے گا۔)

یہ تو ان کے واسطے ہیں جو بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے اس راستہ کو قطع کرنا چاہیں
اور تعلق والوں کے واسطے ان شاء اللہ یہ ہوگا ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو ... کہ دارد چنیں سید پیش رو
(دوزخ میں گناہوں کی وجہ سے کوئی شخص نہ رہے گا جو آپ جیسا سردار پیشوا رکھتا ہو)
اور یہ ہوگا ؎

طُوْبٰی لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اِنَّ لَنَا ... مِنَ الْعِنَایَةِ رُکْنًا غَیْرَ مُنْهَدِمِ
(اے گروہ اسلام ہمارے لئے خوشخبری ہو عنایت الٰہی ہمارے لئے ایسا ستون ہے جو منہدم نہ ہوگا)
ہمارے پاس خدا کے فضل سے ایک مضبوط رکن ہے ان شاء اللہ ہم بے کھٹکے پار ہو جائیں گے
اور جن کے پاس یہ واسطہ نہیں ہے ان کی محرومی پر افسوس ہے۔

پس یہ مسئلہ خوب محقق ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے واسطہ فی العروض ہیں اور امتی کے اندر اسی وقت تک کچھ فیوض و برکات ہیں جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق توسط ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ باقی انبیاء علیہم السلام کے لئے آپ واسطہ فی النبوت ہیں کہ وہ آپ سے فیوض حاصل کر کے استقلال کی ایسی شان اپنے اندر رکھتے ہیں جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو کر مستقل ہو جاتا ہے اور بظاہر اس کا مقتضا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو آپ سے تعلق رکھنے کی ضرورت نہ ہو وہ آپ سے تعلق قطع کر کے بھی منور و منور رہ سکتے ہیں۔ مگر ایک دوسری دلیل سے ان کے لئے بھی آپ سے تعلق رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ۔ یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا ہے کہ اگر ہم تم کو کتاب و حکمت دیں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو تمہاری کتاب کا مصدق ہو

تو تم اس کی تصدیق و نصرت ضرور کرنا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جو مفسر القرآن ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا بھی فرمائی ہے اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ (اے اللہ ان کو کتاب اللہ کا علم عطا فرمائیں) اس لئے ان کی تفسیر حجت ہے وہ فرماتے ہیں یہاں رسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ عہد جملہ انبیاء علیہم السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لیا گیا ہے کہ جو نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پائے اُس کے ذمہ ضروری ہے کہ آپ کی تصدیق و نصرت کرے پھر یہ بات ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نے بھی آپ کا زمانہ نہیں پایا تو یہ عہد ان سے کیوں لیا گیا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہر وقت اور ہر زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و تصدیق کے لئے تیار رہنا چاہیے خواہ وہ آپ کا زمانہ پائیں یا نہ پائیں مگر اپنی طرف سے ہر وقت اس کے لئے آمادہ رہیں اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی وقت اپنے تعلق کو قطع نہیں کر سکتے۔

دوسرے اگر یہ عہد بھی نہ لیا جاتا جب بھی انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق قطع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مسئلہ شرعیہ اصولیہ ہے مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ جس نے (اُن) لوگوں کا شکر نہیں کیا (جو واسطۂ نعمت ہیں) اُس نے خدا تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کیا۔ اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام کے لئے واسطہ فی الکمالات ہیں گو فی النبوت نہ ہی تو اس قاعدہ کے موافق انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی تعلق قطع نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے شکر الٰہی میں نقصان لازم آتا ہے جس سے وہ حضرات مبرا ہیں اور انبیاء علیہم السلام پر آپ کے تعلق کا وجوب بالقوہ تو اس حدیث سے ظاہر ہے لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا لَمَا وَسِعَہٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ (اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی بجز میری اتباع گنجائش نہ ہوتی) اور بالفعل اس سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد نزول الی الارض کے وجوباً آپ کا اتباع فرما دیں گے اور کسی کو اِتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا (آپ ملت حنیف ابراہیم کا اتباع کیجیے) سے اس کے خلاف کا شبہ نہ ہو کیونکہ ملت ابراہیم خود

آپ کی ملت کا بوجہ تناسب لقب ہے جس میں حکمت ترغیب ہے تمام اہل ملل کی اس ملت کے اختیار کرنے پر کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی جلالت متفق علیہ تھی اس لئے اتباع ابراہیم نہیں فرمایا اسی طرح بعد ذکر انبیاء علیہم السلام کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب کیا گیا ہے فبھداھم اقتدہ (پس آپ بھی ان کے طریق پر چلئے) یوں نہیں فرمایا فبھم اقتدہ (آپ ان کی اقتداء کیجئے) پس ھدٰھم سے مراد ھدی اللہ ہے۔ اس کو ملابست کے سبب ھداھم فرمادیا یہ سب تمہید تھی مقصود کی اور خلاف امید تمہید میں زیادہ وقت گذر گیا اب میں مقصود کو بیان کرنا چاہتا ہوں مقصود یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج سے کیا سبق ہم کو حاصل کرنا چاہیئے تو سمجھئے کہ معراج کی حقیقت کیا ہے۔ لوگ معراج اس کو سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زمین سے آسمان پر تشریف لے گئے۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ عروج آسمانی حقیقت معراج نہیں بلکہ صورت معراج ہے اور اُس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ صورت آپ کے کمالات میں سے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت معراج اسی صورت پر موقوف نہیں بلکہ اس کا تحقق دوسری صورتوں سے بھی ہو سکتا تھا گو جو صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے متحقق ہوئی ہے وہ سب سے افضل واکمل ہے اور آپ معراج کی حقیقت صورت دونوں کے جامع ہیں اور یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج صوری یعنی عروج آسمانی کا انکار کرتے ہیں اور اس معراج کو مناحی یا کشفی بتلاتے ہیں سو یہ بالکل نصوص کے خلاف ہے بلکہ احادیث مشہورہ سے آپ کا آسمانوں پر تشریف لیجانا ثابت ہے اور بیت المقدس تک تشریف لیجانا تو نص قرآنی سے ثابت ہے جس کا انکار بلا تاویل کفر ہے اور بتاویل بدعت۔ ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں کچھ نقلی۔ عقلی دلائل تو یہ ہیں کہ اس سے افلاک میں خرق والتیام لازم آتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق والتیام کے امتناع پر کوئی دلیل نہیں اور جب وہ دلائل پیش کریں گے اس وقت ان شاء اللہ ہم اُن سب کا لغو و باطل ہونا ظاہر کر دیں گے چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنے جلدی سیر سماوات سے فارغ ہو کر

واپس آگئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک آپ سیر کر آئیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے سے حصہ میں ہو جائے ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ کی کیا بات ہے ہاں استبعاد ہو سکتا ہے سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے۔ چنانچہ رات اور دن کا آنا طلوع و غروب کا ہونا یہ سب حرکت فلک سے مرتبط ہے اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہو گا وہی رہیگا اگر رات موجود ہو گی رات ہی رہے گی، دن موجود ہو گا دن ہی رہے گا تو ممکن ہے کہ حق تعالےٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کے لئے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب نہیں معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے ہم جب حیدر آباد گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی لوگوں کو سڑک پر چلنے سے روک رہے ہیں اس وقت سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے۔ اسی طرح حق تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اُس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے وہیں رہے۔

پس آفتاب جس جگہ تھا اسی جگہ رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے کوئی بھی اپنی جگہ سے ملنے نہ پایا اس میں کیا استبعاد ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہو گی تو آپ کی سیر میں چاہے کتنا ہی وقت صرف ہوا ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا کیونکہ حرکت زمانہ اس وقت موقوف ہو چکی تھی اب اگر کوئی دوام حرکت فلک کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے لزوم کو ثابت کرے ان شاء اللہ ایک دلیل بھی قائم نہ کر سکے گا۔ دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامی نے دیا ہے سے

تن او کہ صافی تراز جان ماست　　اگر آمد و شد بیک دم رواست

(آپ کا جسم ہماری روح سے صاف تر ہے ایک گھڑی میں آمد ورفت صحیح ہے)

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسانی ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے، چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہونچ جائے گا۔ خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے وہ مادیات کی طرح کثیف نہیں اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجت ومانع نہیں ہوتا تو مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے جب خیال ذراسی دیر میں کہیں سے کہیں پہونچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اطہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذراسی دیر میں آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ایک دلیل عقلی فلاسفہ جدید پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلا ہے اس میں ہوا نہ ہونے کے سبب کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا تو آپ اس میں سے اگر گذرتے زندہ کیسے رہتے مگر انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس التزام کے یہ اس وقت ہے جب متنفس کو اس میں کچھ مکث بھی ہو چنانچہ آگ کے اندر سے اگر جلدی جلدی ہاتھ کو نکالا جاوے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔

پس آپ اگر نہایت سرعت کی ساتھ اس خلا میں سے گذر جائیں تو وہ عدم تنفس میں موثر نہ ہوگا اور دلیل نقلی ان منکرین کے پاس حضرت عائشہؓ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے وَاللّٰہِ مَا فُقِدَ جَسَدُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی لَیْلَۃِ الْاِسْرَاءِ کہ بخدا شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ اس وقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کہاں تھیں (نیز اس وقت ان کی عمر بہت ہی کم تھی شاید چار پانچ سال کی ہوں اور اگر معراج سنہ نبوت میں ہوئی ہو جیسا کہ زہری کا قول ہے تو وہ اسی سال پیدا ہوئی ہوں گی ۱۲ جامع)

اس لئے اجلۂ صحابہ کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے۔

مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے بے تحقیق ایک بات فرمادی ہم حضرت صدیقہ پر یہ گمان نہیں کر سکتے نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرأت ہوسکتی ہے۔ یہ مانا کہ وہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کم سن بھی تھیں مگر جو بات وہ فرمارہی ہیں وہ تو عقل و بلوغ کے زمانہ میں ان سے صادر ہوئی ہے اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرماسکتیں یقیناً تحقیق کے بعد فرمارہی ہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرماتی ہوں کیونکہ معراج میں تعدد ہے تو پھر کچھ بھی مضر نہیں۔

میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے وہ بہت لطیف ہے وہ یہ کہ فقدان کے دو معنی ہیں، ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہو جانا ہٹ جانا دوسرے تلاش کرنا چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُوْنَ یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہو کر ندا کرنے والوں سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کو تلاش کرتے ہو یہاں فقدان کے معنی طلب ہی کے ساتھ زیادہ ظاہر ہیں۔

پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ کی تلاش کی جاتی۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری رات میں اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے۔ تاکہ اس سے معراج منامی یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب[۲] یہ ہے کہ آپ گھر سے جدا تو ہوئے مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس میں گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔

---

[۱] قلت نص البغوی فی تفسیرہ ماذا تفقدون ما الذی ضل عنکم والفقدان ضد الوجدان اھ وکذا نص فی الخازن بان الفقدان ضد الوجود اھ (ص ۲۴۶ ج ۳) وکذا نص فی القاموس فقدہ یفقدہ فقدا وفقودا عدمہ فھو فقید ومفقود اھ (ص ۳۰۱ ج ۱) ولم اجد الفقود بمعنی التفقد بعد ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔ ۱۲ جامع۔ احقر اشرف علی کے ذہن میں اس حاشیہ کو دیکھ کر ایک تاویل آئی تھی جس کو حاشیہ آئندہ میں ظاہر کر دیا گیا ۱۲

[۲] اور اگر فقدان کے وہی معنی لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شب

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

غرض اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی اور آپ اس جسم سے آسمانوں پر تشریف لے گئے اس کا انکار ہرگز نہیں ہو سکتا اور یقیناً یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۷) معراج میں گم نہیں ہوا۔ تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منافی ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا ہی نہیں ہوئے کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کہ لازم اُس کے معنی غیبت وانفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے ایک کا فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور یہ درست ہے کیونکہ آپ سب گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے تھے اور معراج ایسے وقت ہوئی جو کہ عادۃً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جاگنے کے وقت سے پہلے آپ واپس تشریف لے آئے بلکہ خود آکر گھر والوں کو نماز صبح کے لئے جگایا تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو اور اتنی بات مفقود ہونے کے لئے ضروری ہے قلت ولعل هذا هو مراد الشيخ فعبره بالتفتيش والا فالفقد ان هذا الفقد نعم هو يستدعى فاقد اكما لايخفى ۱۲ جامع۔ احقر اشرف علی کے ذہن میں پہلا حاشیہ دیکھ کر ہی یہ تاویل آگئی تھی مگر دوسرے عنوان سے پھر یہ دوسرا حاشیہ دیکھا اب اس تاویل کی اُس دوسرے عنوان سے ذرا واضح تقریر کرتا ہوں وہ یہ کہ فقدان کے معنی تو گم ہی کرنے کے ہیں مگر اس کے دو درجے ہیں ایک مطلق گم کرنا اور ایک ایسا گم کرنا جس کے بعد اس کے تلاش میں لگ جاوے پس پہلا درجہ فقد مطلق ہوا دوسرا درجہ فقد مقید۔

پس اس حدیث میں دوسرا درجہ مراد ہے یعنی آپ کا جسد ایسا مفقود نہیں ہوا جس سے تلاش کی نوبت آئی ہو کیونکہ زمانہ فقد کا اتنا قلیل تھا کہ کسی کو اس فقد کی اطلاع بھی نہیں ہوئی پس متن میں میری عبارت میں ہٹ جانے کو پہلے درجہ پر اور تلاش کرنے کو دوسرے درجہ پر محمول کیا جاوے تو اب معنی لغوی کے خلاف نہیں ہوا، اور بنا بر قواعد تصوف یہ بھی ممکن ہے کہ جسم عنصری ملکوت میں پہونچا ہو اور جسم مثالی ناسوت میں رہا ہو اُس کے دیکھتے ہوئے نے اسکو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۰)

صورتِ عروج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا کمال ہے مگر معراج کو ایسی صورت میں منحصر نہ سمجھنا چاہیئے اور نہ محض عروج آسمانی کے ساتھ حقیقت معراج کو مخصوص

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۹) جسم عنصری سمجھ کر ما فقد کا حکم کرایا ہو اور موٹی بات ہے کہ اگر معراج جسد عنصری سے نہ ہوتی تو اتنا انکار اس پر نہ ہوتا اور اگر غلط فہمی سے ہوتا تو آپ بھی جواب دیدیتے کہ میں جسد عنصری سے دعویٰ نہیں کرتا کہ اس پر اس قدر استبعاد کیا جاوے ۱۲ احقر ظفر احمد عرض کرتا ہے کہ بعد میں تفسیر تنویر المقیاس میں جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے۔ ماذا تفقدون اور نفقد کی تفسیر ماذا تطلبون اور نطلب کے ساتھ میری نظر سے گذری اور یہ تفسیر بالکل اُس معنی کے مطابق ہے جو حضرت حکیم الامۃ نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں کیونکہ طلب کے معنی تلاش کرنے اور ڈھونڈنے ہی کے ہیں اور بظاہر ابن عباس کی یہ تفسیر بالازم ہے کیونکہ فقدان اکثر طلب کو مستلزم ہوتا ہے لہذا ملزوم کی تفسیر لازم سے فرمادی لیکن اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ گاہے فقدان سے طلب و تفتیش بھی مراد ہوا کرتی ہے پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول میں بھی اس معنی کا احتمال ہے جیسا کہ حضرت مولانا نے فرمایا ہے واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال اور ہر چند کہ تفسیر تنویر المقیاس اکثر محدثین کے نزدیک معتبر نہیں کیونکہ اس کے راوی کلبی اور ان کے شاگرد محمد بن مروان سدی صغیر مجروح ہیں مگر سیوطی نے اتقان میں ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہے لکن قال ابن عدی فی الکامل للکلبی احادیث صالحۃ وخاصۃ عن ابی صالح وھو معروف بالتفسیر ولیس لاحد تفسیرا طول منہ ولا اشبع ۱ھ ص ۱۹۶ ج ۲) جس سے فی الجملہ اس کی تقویت ہوتی ہے دوسرے یہ مسئلہ کوئی احکام کی قبیل سے نہیں جس میں راوی کا مجروح ہونا مضر ہو بلکہ از قبیل نقل لغت ہے جس میں بہت وسعت ہے فافہم واللہ اعلم وانما اطلنا الکلام فی ھذا المقام لیظھر لک نعمۃ اللہ علی جماعتنا ولہ الحمد انہا لا تقبل اقوال اکابرھا فی تفسیر معانی القرآن الا بعد ظھور مطابقتھا لاقوال السلف وان اکابرھا لا یتکلمون لا یرادا لاصاغر علیھم اذا کان بالادب لاجل الطلب ولیظھر لک حسن ذوق حضرۃ حکیم الامۃ فی التفسیر بحیث لا یتخطی عن الصواب ولو قال شیئا بغیر مطالعۃ کتاب ۱۲۔

کرنا چاہیئے بلکہ اس کی حقیقت اس عروج کے علاوہ دوسری چیز ہے اور وہ قرب الٰہی ہے جس کی ایک صورت یہ بھی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی ہے اور یہ اکمل صورت ہے مگر اس صورت کے علاوہ ایک دوسری صورت سے بھی اس حقیقت کا تحقق ہو سکتا ہے کیونکہ قرب الٰہی جو حقیقت معراج ہے کسی خاص صورت میں منحصر نہیں پس سمجھنا چاہیئے کہ قرب الٰہی کبھی بصورت عروج ہوتا ہے اور کبھی بصورت نزول اور کبھی دونوں طرح مجتمع ہو جاتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج عروجی اور نزولی دونوں ہوئی ہیں اس لئے کہ قرب الٰہی جیسا کہ بوقت عروج آپ کو حاصل ہوا ہے نزول کے وقت بھی حاصل تھا بلکہ یہ یہ قرب پہلے سے زیادہ تھا جیسا عنقریب آتا ہے اور بعض انبیاء علیہم السلام کو صرف عروجی معراج ہوئی ہے جیسا ادریس علیہ السلام کے متعلق وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (ہم نے ان کو ایک بلند مقام پر اٹھا لیا) کی تفسیر میں بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ زندہ دنیا سے آسمان کی طرف اٹھائے گئے اسی کو ایک عارف نے کہا ہے ؎

بمیر اے دوست پیش از مرگ اگر می زندگی خواہی ؛ کہ ادریس از چنیں مردن بہشتی گشت پیش از ما

(اگر تو اے دوست زندگی چاہتا ہے تو مرنے سے فنا حاصل کر کہ ادریس علیہ السلام ایسے مرے فنا سے پہلے ہم سے پہلے جنتی ہو گئے)

پھر اُس کے بعد ان کو نزولی معراج نہیں ہوئی اور جیسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اسی طرح معراج ہوئی ہے اور اس کے بعد ابھی تک نزول نہیں ہوا مگر آخر زمانہ میں نزول ہوگا اور یونس علیہ السلام کو نزول معراج ہوئی ہے اُس کو مولانا رومی نے سمجھا ہے واقعی بڑے محقق ہے بیان اس کا یہ ہے کہ مولانا نے مثنوی دفتر سوم میں ایک مقام پر حدیث لَا تُفَضِّلُونِي عَلَى يُونُسَ بْنِ مَتّٰى مجھے یونس بن متی پر فضیلت مت دو) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ؎

گفت پیغمبر کہ معراج مرا ؛ نیست از معراج یونس اجتبا
آن من بالا و آن او بشیب ؛ زانکہ قرب حق برونست از حسیب
قرب نزپائیں ببالا جستن ست ؛ قرب حق از حبس ہستی رستن ست

(پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ میری معراج یونس علیہ السلام کی معراج سے برگزیدہ

نہیں ہے میری معراج عروجی تھی اور ان کی نزولی اس لئے کہ قرب حق حساب سے باہر ہے
قرب حق کی حقیقت ارتفاع مکانی نہیں ہے بلکہ قرب حق قید ہستی سے چھوٹنا ہے)

اس تفسیر میں اشارہ اس طرف ہے کہ حدیث عام ہے جس میں وہ سب امور داخل ہیں جنمیں تفصیل سے وہم تنقیص ہوسکتا ہے پس مطلب حدیث کا یہ ہوا کہ جن باتوں میں تمکو میری فضیلت اور یونس علیہ السلام کے نقص کا شبہ ہوا اس میں مجکو یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو جن میں قصہ معراج بھی داخل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ساتوں آسمانوں پر تشریف لے گئے آپ کو اس طرح معراج ہوئی اور یونس علیہ السلام عرصہ تک مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ ظاہر بینوں کو اُن کی یہ حالت ناقص معلوم ہوتی ہے مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی یہ حالت ناقص نہ تھی بلکہ یہ یونس علیہ السلام کی معراج تھی جو بصورت نزول واقع ہوئی پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو (یعنی ایسی فضیلت جس سے وہم ان کے نقص کا ہو) اور یہ مت سمجھو کہ معراج صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہوئی ہے یونس علیہ السلام کو نہیں ہوئی۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اُن کو بھی ہوئی مچھلی کے پیٹ میں ان کا جانا یہ بھی معراج ہی تھی کیونکہ معراج کی حقیقت ہے قرب حق اور وہ دونوں جگہ موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرب حق اور صورت سے ہوا عروجاً بھی نزولاً بھی اور یونس علیہ السلام کو قرب حق اور صورت سے حاصل ہوا کہ وہ دریا میں غرق ہوئے اور مچھلی کے پیٹ میں رہے جس کا قصہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈرایا اور فرمایا کہ ایمان لے آؤ ورنہ اتنی مدت میں عذاب نازل ہوگا۔ جب وہ مدت قریب آئی تو آپ اس خیال سے کہ یہاں عذاب نازل ہوگا وہاں سے چل پڑے مگر حق تعالیٰ سے صریح اذن نہیں لیا اور یہاں یہ قصہ ہوا کہ جب وہ تاریخ آئی عذاب کی آمد شروع ہوئی یہ آثار دیکھ کر لوگ گھبرائے اور ایمان پر آمادہ ہوئے اور یونس علیہ السلام کو تلاش کیا کہ ان کے ہاتھ پر ایمان لادیں، یہ نہ ملے تو انھوں نے کہا کہ اگر یونس علیہ السلام نہیں ہیں تو کیا ہوا ان پر اور حق تعالیٰ پر ایمان لانا تو ممکن ہے چنانچہ ایمان لے آئے اور عذاب ٹل گیا یونس علیہ السلام لوگوں سے اُس بستی کا حال پوچھتے رہتے تھے جب کسی نے عذاب کی خبر نہ سنائی اور پورا واقعہ معلوم نہ ہوا تو آپ کو خیال ہوا کہ اب اگر واپس بستی میں جاؤں گا تو وہ لوگ جھٹلائیں گے کہ تمھارے قول کے موافق عذاب تو نہ آیا اس شرمندگی

کی وجہ سے واپس نہ ہوئے بڑھے چلے گئے راستہ میں دریا پڑا اور آپ کشتی میں سوار ہوئے چلتے چلتے وہ کشتی چکر کھانے لگی۔ ملاح نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا سوار ہے، اُس وقت یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں بھائی میں اپنے آقا سے بدون پوچھے بھاگ آیا ہوں مجھے دریا میں ڈال دو لوگوں نے اُن کی صورت سے نیکی اور بزرگی کے آثار دیکھ کر اس کلام میں شبہ کیا بالآخر قرعہ اندازی ہوئی جس میں یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا۔

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ یونس علیہ السلام نے قرعہ اندازی کی تو وہی ہارے پس لوگوں نے ان کو دریا میں ڈال دیا وہاں ایک بہت بڑی مچھلی تھی اس نے بحکم حق آپ کو نگل لیا اور قعر دریا میں پہونچی چالیس دن اُس کے پیٹ میں رہے مگر ہضم نہیں ہوئے حق تعالیٰ نے حفاظت فرمائی مولانا نے اس کو معراج قرار دیکر فرماتے ہیں ؎

قرب نے پستی بہ بالا رفتن است قرب حق از حبس ہستی رستن است

یعنی حق تعالیٰ کے قرب کی حقیقت مکانی ارتفاع نہیں بلکہ یہ ہے کہ بندہ اپنی ہستی کی قید سے چھوٹ جائے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ زہر کھالے یہ تو بڑا سستا قرب ہے جو ایک پیسہ کے سنکھیے سے حاصل ہو سکتا ہے سو یہ قید ہستی سے چھوٹنا نہیں بلکہ اس میں تو قید ہستی کے موجود ہونے کی دلیل ہے کیونکہ خودکشی حرام ہے اور خلاف مرضی حق پر پیش قدمی کرنا قید ہستی یعنی دعویٰ و زعم استقلال ہستی کی علامت ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعویٰ ہستی کو چھوڑ دے اپنے کمالات سے نظر اٹھ جائے اپنے ارادہ کو ارادۂ حق میں فنا کر دے پس یہ ہے قرب کی حقیقت جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے اوپر نظر نہ رہے حاصل یہ کہ تم خود ہی قرب حق سے اپنے حاجب ہو اس کو مرتفع کر دو اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

میاں عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق اور معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہو رہی ہے حافظ خودی کو درمیان سے اٹھا)

اور اسی کو حضرت بوعلی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرۂ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اسکی باتیں (سننے نہ دوں))

بلکہ ہمہ تن مشاہدہ حق میں فنا ہو جائے کہ نہ اپنے کان کو اپنا کان سمجھے نہ اپنی آنکھ کو اپنی آنکھ سمجھے بس وہ حال ہو جائے بِیْ یُبْصِرُ وَبِیْ یَسْمَعُ (میری وجہ سے دیکھے میری وجہ سے سنے) حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا۔

یَارَبِّ دُلَّنِیْ اِلٰی اَقْرَبِ الطُّرُقِ اِلَیْکَ اے اللہ مجھے اپنے تک پہونچنے کا نزدیک راستہ بتلا دیجئے جواب میں ارشاد ہوا یَا اَبَا یَزِیْدَ دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالَ یعنی اے بایزید بس اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ (یعنی اتباع نفس کو) سبحان اللہ کیا نزدیک راستہ بتلایا گیا ہے اور یہی مراد ہے صوفیہ کے اس قول میں کہ مرید کو چاہیئے کہ شیخ کے ہاتھ میں اپنے آپ کو ایسا سپرد کر دے کہ کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِ الْغُسَّالِ یعنی جیسے مردہ غسال کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جس طرف چاہتا ہے اس کو پلٹ لیتا ہے وہ کچھ نہیں کہتا اسی طرح مرید کو ہونا چاہیے کہ شیخ کے ارادہ میں اپنی رائے واختیار اور قصد کو فنا کر دے وہ اگر جگادے تو جاگے سُلا دے تو سو رہے نفلوں کا حکم کرے تو نفلیں پڑھے منع کر دے تو چھوڑ دے بشرطیکہ وہ خلاف شرع کا امر نہ کرے اگر شیخ کامل ہے تو وہ ایسا کرنے ہی کیوں لگا اور اگر ناقص ہے تو ایسے شیخ ہی کو سلام کرنا چاہیئے جب مرید شیخ کے ہاتھ میں اپنے کو اس طرح سپرد کر دیتا ہے تو پھر اس کو خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی یہی تسلیم نصیب ہو جائے گی اور ایک وہ وقت آئے گا کہ یہ آسانی کے ساتھ اپنی ارادہ واختیار کو ارادہ خداوندی میں فنا کر دے یہی ہے قرب حق اور یہی قرب حق حقیقت ہے معراج کی اور ظاہر ہے کہ قرب حق تمام انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھا تو حقیقی معراج سب کو حاصل تھی گو بعض کو صوری نہ ہوئی ہو اور ادریس علیہ السلام کو تو ایک قول پر صوری بھی ہوئی ہے اور مولانا رومی کی تحقیق کے موافق یونس علیہ السلام کو نزولی معراج ہوئی ہے پس ان کو اس طرح قرب ہوا کہ اوپر سے نیچے بلائے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح قرب ہوا کہ نیچے سے اوپر بلائے گئے اور یہ ضروری نہیں کہ معراج بصورت نزول ناقص ہوا کرے تاکہ اس بنا پر معراج یونسی کو معراج محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے مفضول کہا جاوے گو دوسرے دلائل سے آپ کی معراج سب معراجوں سے افضل ہے مگر محض نزول کو ناقص ماننا اس کی بنا نہیں ہے بلکہ صوفیہ کا

تو مقولہ یہ ہے کہ عروج سے نزول افضل ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج میں ایک تو آپ کی حالت عروج تھی جبکہ آپ نیچے سے اوپر کو جارہے تھے اور ایک حالتِ نزول بھی جبکہ آپ اوپر سے نیچے کو آرہے تھے صوفیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نزولی حالت آپ کی پہلی حالت سے اکمل تھی اور اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں یونس علیہ السلام کے نزول کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج پر ترجیح دے رہا ہوں ہرگز نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کبھی نزول اور کبھی عروج ہوا ہے تو ان دونوں میں آپ کے عروج سے آپ کا نزول افضل تھا باقی آپ کا عروج دوسرے دلائل سے ایسا اکمل ہے کہ وہ دوسروں کے نزول سے بھی افضل ہے مگر اس سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ نزول فی نفسہ نقص نہیں۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج عروجی تو کامل ہے اور آپ کی معراج نزولی اکمل ہے سو ان میں فرق کامل اکمل کا ہے ناقص کامل کا نہیں کیونکہ آپ کی جو حالت بھی ہے وہ کمال سے خالی نہیں گو بعض حالتیں بعض سے زیادہ کامل ہوں مگر ناقص کوئی نہیں۔ اور آپ کی معراج نزولی کا معراج عروجی سے افضل ہونا صرف صوفیہ کے قول ہی سے ثابت نہیں بلکہ اُس پر دلائل موجود ہیں۔ ایک دلیل تو یہ ہے کہ معراج کی غایت حق تعالیٰ نے رویتِ آیات بیان فرمائی ہے چنانچہ سورہ نجم میں تو فرمایا ہے لَقَدْ رَاٰیٰ مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی (البتہ دیکھے آپ نے اپنے رب کے عظیم عجائب قدرت) اور سورۃ الاسراء میں فرمایا ہے لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (تاکہ دکھائیں ہم آپ کو اپنے عجائب قدرت) اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آیات دکھلانے سے دو فائدے ہوسکتے ہیں ایک تو یہ کہ آپ کی معرفت زیادہ ہو دوسرے یہ کہ آپ خود دیکھ کر دوسروں کو بتلادیں۔

خلاصہ یہ کہ معراج سے دو مقصود تھے ایک یہ کہ رویت آیات و ازدیاد علوم سے آپ کی تکمیل ہو دوسرے یہ کہ ان علوم سے آپ دوسروں کی تکمیل کریں۔ پہلا فائدہ لازمی ہے اور دوسرا فائدہ متعدی ہے اور ظاہر ہے کہ جو وقت فائدہ متعدیہ کے ظہور کا ہوگا وہ فائدہ لازمیہ کے وقت سے افضل ہوگا کیونکہ بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اصل مقصود افادۂ خلائق ہی ہے۔ نیز دوسروں کی تکمیل سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات میں بھی ترقی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ فائدۂ متعدیہ

کا ظہور بعد نزول کے ہوا تو نزول کا عروج کا سے افضل ہونا ثابت ہو گیا۔ دوسری دلیل یہ آیت ہے وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی اُس کا بیان یہ ہے کہ ایک مرتبہ کچھ دنوں نزول وحی میں توقف ہو گیا اور کفار نے طعن کیا تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رنج و غم کا اثر ہوا اور آپ پر حالت قبض طاری ہو گئی تو بعد میں حق تعالیٰ نے آپ کی تسلی فرمائی اور سورہ ضحیٰ نازل ہوئی جس میں اول اُن آیات کی قسم کھائی گئی ہے جن کو اُس حالت سے خاص مناسبت ہے فرماتے ہیں وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَاوَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی قسم ہے دن کی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑلے (نہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہے) اس جگہ رات اور دن کی قسم بہت ہی مناسب ہے کیونکہ دن مشابہ ہے حالت بسط کے اور رات مشابہ ہے حالت قبض کے وجہ تشبیہ ایک تو یہ ہے کہ حالت بسط میں انوار کا توارد ہوتا ہے اور دن بھی محل نور ہے اور حالت قبض میں وہ انوار نہیں رہتے تو وہ رات کے مشابہ ہے دوسرے یہ کہ جس طرح دن میں کاروبار زیادہ ہوتے ہیں اس طرح حالت بسط میں سالک سے کام زیادہ ہوتا ہے اور حالتِ قبض میں کسی کام کو جی نہیں چاہتا نہ نماز میں دل لگتا ہے نہ ذکر میں نہ تلاوت میں تو قبض میں کام کم ہو جاتا ہے وہ رات کے مشابہ ہے کہ اس میں بھی کاروبار بند ہو جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس جگہ رات اور دن کی قسم سے مقام کی یعنی جواب قسم مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی (آپ کے پروردگار نے آپ کو نہیں چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہوا البتہ آپ کی پچھلی حالت آپ کے لئے پہلی حالت سے بہتر ہے) کی حقیقت بتلادی جس کا حاصل یہ ہے کہ سالک پر ان دونوں حالتوں کا آنا ایسا ہے جیسے لیل و نہار کا تعاقب پس جس طرح دن کے بعد رات آجانا غیر مقبول ہونے کی علامت نہیں اسی طرح بسط کے بعد کہ توارد وحی ہے قبض کا آنا کہ توقف وحی ہے غیر مقبول ہونے کی دلیل نہیں بلکہ جس طرح ہم نے عالم میں لیل و نہار کا اختلاف حکمت کے لئے رکھا ہے یوں ہی سالک پر بسط و قبض کا تعاقب حکمت کے لئے مقرر کیا ہے۔

پس قبض سے پریشان نہ ہونا چاہیئے نیز اس میں قبض کی ایک حکمت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جس طرح دن میں اگرچہ کاروبار زیادہ ہوتا ہے مگر مخلوق کی راحت

وآرام کے واسطے رات کا آنا بھی ضروری ہے اگر رات نہ آوے تو کار وبار کا تعب زائل نہ ہوسکے گا راحت وآرام کے لئے دن موضوع نہیں اس کے واسطے رات ہی کا وقت مناسب ہے اسی طرح گو بسط میں سالک سے کام زیادہ ہوتا ہے مگر اس کام کے دوام کے لئے قبض کی بھی ضرورت ہے اگر ہمیشہ بسط ہی رہے تو ایک نہ ایک دن کام کرتے کرتے اکتا جائے گا۔ اس لئے ہم قبض کی حالت مسلط کر دیتے ہیں تاکہ یہ زیادہ کام نہ کرے تھوڑے ہی پر اکتفا کرے اور قدرے آرام مل جائے پھر قبض رفع ہونے کے بعد جو بسط آئے گا تو اس کو پہلے سے زیادہ نشاط عمل میں ہوگا اسی طرح پر قبض وبسط کے تعاقب سے یہ ہمیشہ کام کرتا رہے گا اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم — گر نیست غیبتے تدہد لذتے حضور

(میں ہجر کی شکایت نہیں کرتا کیونکہ اگر ہجر نہ ہوتا تو قرب میں لذت نہ معلوم ہوتی)

اس معنی خیز قسم کے بعد جواب ارشاد فرماتے ہیں مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہے آپ بے فکر رہیں۔ اس میں تسلی تو ہوگئی مگر یہاں ایک شبہ آپ کو ہوسکتا تھا وہ یہ کہ گو قبض وبسط لیل ونہار کی طرح تعاقب ہیں اور قبض سے مجھے کچھ تنزل نہیں ہوا مگر بظاہر بسط اس سے افضل ہے کیونکہ لو فق للطبع ہے اس میں کام بھی زیادہ ہوتا ہے توجہ بھی اس میں عالم بالا کی طرف زیادہ رہتی ہے تو بسط میں ترقی زیادہ ہوتی ہوگی گو قبض میں بھی خود قبض کے سبب سے تنزل نہ ہوتا ہو مگر ترقی بھی تو بسط کی برابر نہیں ہوتی ہوگی آگے اس شبہ کا جواب دیتے ہیں۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى یعنی کُلُّ حَالَةٍ اٰخِرَۃٌ لَكَ خَيْرٌ مِنَ الْحَالَةِ الْاُوْلٰى۔

یعنی آپ کی ہر پچھلی حالت ہر پہلی حالت سے افضل ہے اسس لئے زمانہ قبض کی حالت آپ کی اس بسط کی حالت سے افضل تھی جو اس سے پہلے تھی اور جب وہ پہلی حالت سے افضل تھی تو اس میں بھی ترقی بشد

نہیں ہوئی بلکہ برابر آپ کو ترقی ہورہی ہے اور یہ جواب ایسا ہے جیسا کہ واقعہ تحویل قبلہ میں حق تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ وَمَاكَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (اللہ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان یعنی نمازوں کو ضائع کردیں) جب بیت المقدس سے پھر کعبہ کی طرف قبلہ تحویل کیا گیا تو بعض صحابہ کو شبہ ہوا کہ جتنے دنوں ہم نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے شاید اُن میں ثواب کم ملا ہوگا کیونکہ تحویل سے معلوم ہوا کہ اصلی قبلہ تو کعبہ تھا اور وہ قبلہ عارضی تھا اور اصلی قبلہ میں اور عارضی میں فرق ضرور ہے تو جو نمازیں عارضی قبلہ کی طرف ہم نے پڑھی ہیں ان میں کم ثواب ہوا ہوگا۔ حق تعالےٰ نے اس شبہ کا جواب دیا کہ ہم ایسے نہیں ہیں کہ تمہاری طاعات سابقہ کا ثواب کم کردیں یا ضائع کردیں کیونکہ تم نے تو بہرحال ہمارے حکم کی اطاعت کی ہے تم کو تو عارضی و اصلی ہونا معلوم نہ تھا اس لئے ثواب بھی تم کو کم نہیں ملا بلکہ ان نمازوں میں بھی پورا ہی ثواب ملا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ قبض و بسط جیسے ہماری طرف سے ہے اور آپ کے فعل کو اس میں کچھ دخل نہیں تو آپ کو حالتِ قبض میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے ترقی میں کمی نہیں خصوصاً جبکہ ہم نے آپ کو قُلْ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (آپ کہئے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو علم زیادہ دیجئے) کی تعلیم دی ہے اور ہمارا یہ دعا تعلیم کرنا علامتِ اجابت ہے) تو آپ کو ہر وقت ترقی ہوتی رہتی ہے اور آپکی ہر پچھلی حالت ہر پہلی حالت سے افضل ہوتی ہے۔ پس جب بسط کے بعد قبض آیا ہے یہ قبض پہلے بسط سے افضل ہے اور اس قبض کے بعد جو بسط آئے گا وہ اس قبض سے افضل ہوگا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے۔ حضراتِ صوفیہ نے ہر عارف کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ عارف کی ہر حالت آئندہ حالت گذشتہ سے افضل ہوتی ہے کیونکہ وہ ہر دم ترقی کرتا رہتا ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

سیر زاہد در مہے یک سالہ راہ — سیر عارف ہر دمے تا تختِ شاہ

(زاہد ایک مہینہ میں ایک سال کی راہ طے کرتا ہے اور عارف ذرا سی دیر میں تختِ شاہ تک پہونچ جاتا ہے)

بیزارم ازاں کہنہ خدائے کہ تو داری ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

(تمہارے پرانے خدا سے بیزار ہوں ہر دم مجھے دوسرے تازہ خدا کی ضرورت ہے)

یہ عنوان ظاہر میں بہت موحش ہے مگر مطلب معلوم کرنے کے بعد استبعاد نہ رہے گا بات یہ ہے کہ ہر شخص کا حق تعالیٰ کے متعلق کچھ نہ کچھ خیال ضرور ہوتا ہے گو حق تعالیٰ ہمارے خیالات سے وَرَاءُ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ ہم کو جب تصور ہوتا ہے تو کسی خاص کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے اب سمجھئے کہ غیر عارف کو تو چونکہ ترقی معرفت میں ہوتی نہیں اس لئے جو خیال اس نے حق تعالیٰ کے متعلق ایک دفعہ قائم کر لیا ہے ہمیشہ بس وہی خیال رہتا ہے کہ حق تعالیٰ ایسے ہوں گے اس طرح ہوں گے اسی کو شعر میں کہنہ خدا کہا ہے اور عارف کو چونکہ ہمیشہ ترقی ہوتی اور تجلی الٰہی قلب میں تازہ ہوتی رہتی ہے اور روزانہ معرفت بڑھتی جاتی ہے اس لئے جو خیال اس کو حق تعالیٰ کے متعلق آج تھا وہ کل نہ رہے گا اور جو کل ہوگا وہ اس کے بعد نہ رہے گا وہ ہمیشہ اپنے گذشتہ خیالات سے توبہ کرتا رہتا ہے کیونکہ ہر وقت حق تعالیٰ کی عظمت اس شان سے منکشف ہوتی ہے کہ پہلا خیال اس کے سامنے غلط معلوم ہوتا ہے۔ اسی کو ان حضرت نے تازہ خدا کہا ہے یعنی تازہ تجلّی معرفت خدا۔ اب مطلب تو صاف ہو گیا مگر عنوان کے مواحش ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن ان لوگوں کو اپنے غلبۂ حال میں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ کسی کا ایمان رہے گا یا جائے گا ہمارے اوپر کفر کے فتوے لگیں گے۔ غرض جب عارف کو ہر دم ترقی ہوتی رہتی ہے تو اس کو قبض سے پریشان نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کو حالت نزول پر محمول کرنا چاہیے اور یہ سمجھ لے کہ یہ نزول پہلے عروج سے افضل ہے اور اس کے بعد جو عروج ہوگا یعنی بسط وہ اس نزول سے افضل ہوگا۔

تو اب واقعہ معراج سے جو سبق ہم کو حاصل ہوا وہ دو باتیں ہیں ایک یہ کہ معراج کی حقیقت قرب الٰہی ہے اور وہ سب انبیاء کو حاصل ہے تو یہ نہ کہنا چاہیے کہ معراج صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہوئی ہے اور کسی نبی کو نہیں ہوئی نہیں بلکہ معراج

سب کو ہوئی ہے۔ ہاں اجمالاً اس کہنے کا مضائقہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج اوروں کی معراج سے افضل واکمل ہے وہ بھی اس طرح سے کہا جاوے جس میں دوسرے انبیاء کی معراج کی تنقیص نہ ہو بلکہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت واکملیت کا بیان ہو اور معراج ہی کی کچھ تخصیص نہیں مطلقاً تمام احوال ومقامات انبیاء میں تفصیلی فضیلت جب تک منصوص نہ ہو بیان نہ کرنا چاہیئے جیسا عام لوگوں کی عادت ہے اور غضب یہ ہے کہ بعض مصنفین بھی جن پر معقول کا غلبہ ہے اس مرض میں مبتلا ہیں میرا تو ایسی باتوں سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک مصنف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح فضیلت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں صدیق اکبر کو جب وہ کفار کے آجانے سے پریشان ہوئے یوں تسلی دی تھی لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (غمگین مت ہو تحقیق اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) جس میں اول لَا تَحْزَنْ (غمگین مت ہو) فرما کر غم کو ہلکا کر دیا پھر اپنی ساتھ معیت حق کو بیان فرمایا جس میں خدا تعالیٰ کے ذکر کو مقدم فرمایا اور معیت میں حضرت صدیق اکبر کو بھی شریک فرمایا کہ صیغۂ جمع مَعَنَا استعمال فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو جب فرعون اور لشکر فرعون کے آجانے سے پریشانی ہوئی اور انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس پریشانی کو ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ (ہرگز ایسا نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھ کو ابھی سیدھا رستہ بتلا دے گا) جس میں سب سے پہلے لفظ کَلَّا استعمال فرمایا جو دھمکی کے واسطے موضوع ہے عربی میں لفظ کلّا ایسے ہی موقعہ میں استعمال ہوتا ہے جہاں اردو کا کلا بھی استعمال ہوتا ہے گویا کلّے پر طمانچہ مار دیا پھر اپنی ساتھ معیت حق کو جو بیان فرمایا تو اپنے ذکر کو خدا تعالیٰ کے ذکر سے مقدم فرمایا یعنی لفظ مَعِیَ کو رَبِّیْ سے پہلے ذکر کیا گویا یہ حضرت مصنف سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بولنا سکھاتے ہیں کہ حضرت آپ کو خدا کا ذکر اپنے ذکر سے پہلے کرنا چاہیئے تھا۔ گویا ان کو آداب کلام بھی نعوذ باللہ معلوم نہ تھے۔ پھر یہ بھی وجہ فضیلت بیان کی کہ موسیٰ علیہ السلام نے معیَ بصیغہ مفرد فرمایا جس میں معیت الٰہیہ کو اپنی ساتھ خاص کیا قوم کو اپنی ساتھ اس دولت میں شریک نہ کیا مجھے ان مصنف صاحب پر تعجب ہوتا ہے کہ اُن کے قلم سے

یہ مضمون نکلا کیونکر بس میں تو یہ کہوں گا کہ ؎

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجا ست

(دوست خطا یہی ہے کہ تو سخن شناس نہیں ہے)

اول تو ان کو ان جزئیات میں کلام کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل کلیہ منصوصہ کیا کچھ کم ہیں جو جزئیات غیر منصوصہ سے آپ کا افضل ہونا ثابت کیا جائے اور اگر اُن کو ایسا ہی شوق تھا تو یہ غور کرنا چاہئے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطب کون ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخاطب کون کیونکہ بلاغت کا مسئلہ ہے کہ ہر حال اور ہر موقع ومحل کے لئے ایک ہی طرز کلام نہیں ہوتا بلکہ ہر موقعہ کے لئے جُدا طرز ہوا کرتا ہے ؎

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد

(ہر کلام میں باریکی ہے ہر باریکی کا ایک مقام ہے)

میں بطور احتمال کے کہتا ہوں اور مانع کے لئے بمقابلہ مستدل کے احتمال کافی ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب حضرت صدیق جیسے لوگ ہوتے تو وہ بھی وہی فرماتے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور اگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے تعویل اس کی یہ ہے کہ آپ کی ساتھ غار ثور میں حضرت صدیق اکبر تھے جن کی جاں نثاری کی یہ حالت تھی کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم غار ثور پر پہونچے ہیں تو حضرت صدیق نے اپنے چادرہ یا لنگی کو پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کئے تاکہ کوئی موذی جانور نکل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہ دے سارے سوراخ تو بند ہوگئے مگر ایک رہ گیا اس کے لئے کپڑا نہ رہا تھا اس پر حضرت صدیق نے اپنا پیر لگا لیا کہ اگر کچھ نکلے گا تو میرے ہی پیر میں کاٹ لے گا حضور صلے اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچ سکے گا اس حالت میں جو حضرت صدیق کو کفار کے آجانے سے پریشانی ہوئی ظاہر ہے کہ وہ

پریشانی اپنی جان کے خوف سے نہ تھی بلکہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے پریشانی ہوئی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ دشمن آپ کو دیکھ پائیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہونچائیں جو شخص اتنا عاشق ہو جس نے سانپ کے بل میں اپنے پیر رکھدیئے جس میں سانپ نے کاٹ بھی لیا تھا اس کو بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے اپنی جان کا خیال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں ان کو جو کچھ خطرہ تھا وہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کا تھا اور اس خطرہ کا منشا بھی محض یہ تھا ؎

عشق است و ہزار بد گمانی

(عشق ہزار بدگمانیاں ہیں ۔)

ورنہ حضرت صدیق دولت توکل سے پوری طرح مالامال تھے ایسے شخص کی تسلی کے لئے وہی کلام مناسب تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا کہ اول ان کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے لَا تَحْزَنْ فرمایا پھر معیت حق میں ان کو بھی شریک کیا اور چونکہ آپ کو حصر مقصود نہ تھا اس لئے موافق اصل وضع کے ذکر اللہ کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ حضرت صدیق کی برابر متوکل تھے نہ ایسے جان نثار تھے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ بالکل نہ تھا محض موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا خطرہ تھا بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ انھوں نے اُس کو جزم ویقین کے ساتھ ظاہر کیا قَالَ اَصْحَابُ مُوْسٰی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے) جس میں ان اور جملہ اسمیہ اور لام تاکید تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے حالانکہ بارہا دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابلہ میں کس طرح مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدۂ نصر کو سن کر چلے تھے ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا ایسا جزم ہو گیا صاف ان کو غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے دھمکا کر فرمایا کَلَّا گویا ایک چپت رگادیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تاکید سے ان لوگوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا اس کا جواب ایسی ہی تاکید سے ہو سکتا تھا جو لفظ کَلَّا میں ہے

پھر چونکہ یہ لوگ بوجہ کامل الیقین نہ ہونے کے معیت حق سے محروم تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے حصر کے لئے مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا کیونکہ قاعدہ ہے تَقْدِیْمُ مَا حَقُّہُ التَّاخِیْرُ یُفِیْدُ الْحَصْرَ (جس کو مقدم کرنے کا حق تھا اس کے مؤخر کرنے حصر کا فائدہ دیتا ہے) اور اسی وجہ سے معی بصیغۂ مفرد فرمایا صیغۂ جمع استعمال نہیں فرمایا مطلب یہ تھا کہ میری ہی ساتھ میرا پروردگار ہے تم لوگ بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو اب بتلایئے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصود کو ادا فرمانا چاہتے جو موسیٰ علیہ السلام نے ادا فرمایا کیا اس وقت بھی آپ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (مت غمگین ہو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں) ہی فرماتے۔ جو لوگ بلاغت سے کچھ ذوق رکھتے ہیں وہ کبھی اس کے قائل نہ ہوں گے بلکہ وہ اس کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس مقصود کے ادا کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی طرز اختیار فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے اختیار فرمایا لیجئے تفصیلی جزئیات میں کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس کو ایک ادنیٰ طالب علم بھی احتمال نکال کر باطل کر سکتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں ہمیشہ اجمالی گفتگو کرنا چاہیے تفصیلی کلام کبھی نہ کرنا چاہیے مثلاً معراج ہی کے بارہ میں اجمالاً یہ کہنے کا مضائقہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج دیگر انبیاء کی معراج سے اکمل و افضل ہے کیونکہ آپ سید الانبیاء ہیں آپ کو حق تعالیٰ سے جس درجہ قرب ہے وہ سب کے قرب سے بڑھا ہوا ہے اور معراج کی حقیقت قرب ہی ہے۔ اور تفصیل کر کے یوں مت کہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج یونس علیہ السلام کی معراج سے اس لئے افضل ہے کہ آپ نیچے سے اوپر بلائے گئے اور وہ اوپر سے نیچے بلائے گئے کیونکہ میں بتلا چکا ہوں کہ نزول بنفسہ وجہ نقص نہیں بلکہ نزول تو ہر صاحب عروج کا اس کے عروج سے افضل ہوتا ہے گو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یونس علیہ السلام کا نزول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج سے افضل ہو مگر تاہم یہ تو معلوم ہو گیا کہ نزول فی نفسہ سبب نقص نہیں اور اگر نزول کو علی الاطلاق نقص کہا جائے تو نعوذ باللہ آپ حق تعالیٰ کے لئے بھی نقص کو ثابت کریں گے کیونکہ وہاں بھی نزول ثابت ہے۔

حدیث میں ہے یَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی كُلَّ لَيْلَةٍ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا

(اللہ تعالٰے سماء الدنیا کی طرف ہر رات نزول فرماتے ہیں)

پس نہ عروج علی الاطلاق افضل ہوا نہ نزول بلکہ جس کو جو عطا ہو جائے وہی افضل ہے ایک سبق تو یہ ہوا اور اس مقام پر چند شبہات ہیں اول او پر سے نیچے آنے کو جو معراج نزولی کہا گیا ہے نہ صرف مکان کے اعتبار سے بلکہ حقیقت نزول کے اعتبار سے مگر اتفاق سے وہ حقیقت اس صورت کے ساتھ مقرون ہو گئی۔

دوم کسی نبی یا ولی کے کسی عروج کو جو اس کے کسی نزول سے افضل کہا گیا ہے اس سے اُس کلیہ میں شبہ نہ کیا جاوے کہ نزول افضل ہوتا ہے کیونکہ یہ عروج کا افضل ہونا باعتبار بعض خصوصیات مقصودہ کے ہوتا ہے۔

سوم۔ یونس علیہ السلام کا نیچے جانا نزول کہا گیا ہے اور نزول کی افضلیت باعتبار توجہ الی الخلق للافادہ کے قرار دی گئی ہے سو اس وقت یہ افادہ کہاں تھا۔ جواب یہ ہے کہ ایک وجہ نزول کے افضل ہونے کی غلبۂ انکسار و افتقار بھی ہے سو یہ حاصل تھی اور قبض کا انفع ہونا بسط سے اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

دوسرا سبق اس واقعہ معراج سے سالکین کو یہ حاصل ہوا کہ وہ اپنے حالات کا فیصلہ خود کر لیا کرتے ہیں یہ اُن کی غلطی ہے مثلاً پہلے ذکر میں جی لگتا تھا خطرات نہ آتے تھے انوار کی کثرت تھی اس کو وہ افضل حالت سمجھتے ہیں، پھر خطرات آنے لگے انوار میں کمی ہو گئی تو اب سمجھتے ہیں کہ ہم مردود ہو گئے۔ خیر یہ بھی ہے کہ وہ عروج کی حالت تھی اور یہ نزول کی حالت ہے۔ اور معراج کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے کہ معراج کبھی عروج سے ہوتی ہے کبھی نزول سے ہوتی ہے اور دونوں حالتیں مقبول ہیں پھر تم نزول کو ادون کیوں سمجھتے ہو بس سالک کی تو یہ حالت ہونا چاہیئے ؎

---

۵ ای بترجہ علی الخلق فسمی توجیھہ الی الحوادث نزولا ومقتضاہ ان یصح اطلاق العروج علی توجھہ تعالیٰ علی ذاتہ وصفاتہ ولعل ذلک ھو الماخذ لتسمیۃ الصوفیۃ توجہ السالک الی اللہ تعالیٰ وصفاتہ عروجا وتوجھہ الی الخلق نزولا واللہ اعلم ۱۲ جامع

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن | کہ خواجہ خود روشن بندہ پروری داند

(تو گداگروں کی طرح مزدوری کی شرط پر بندگی مت کر اس لئے آقا خود بندہ پروری کا طریقہ جانتا ہے)

چاہے قبض ہو یا بسط ہر حال میں خدا سے راضی رہے اور اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہ کرے اگر قبض کسی معصیت کی وجہ سے نہ ہو تو پھر اس کو نزول پر محمول کرنا چاہیئے جو کہ صوفیہ کے نزدیک عروج سے افضل ہے مگر اپنے لئے تجویز اس کو بھی نہ کرے بلکہ جب بسط عطا ہو تو اسی میں خوش رہے حق تعالیٰ نے قبض و بسط و نزول و عروج تمہاری مصلحت کے لئے عطا فرمایا ہے وہی مصلحت کو خوب جانتے ہیں ایک عارف فرماتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است | بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

(گل سے کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ نالاں ہے)

گل سے صاحب بسط مراد ہے اور عندلیب سے صاحب قبض مطلب یہ ہے کہ سب اسی کے باغ کے پرورده ہیں گل بھی اور عندلیب بھی کسی کو خندہ ان کو پسند ہے اس کو بسط عطا فرمادیا کسی کا نالہ وگریہ پسند ہے اس کو قبض عطا فرمادیا۔ تم کو تجویز کا کوئی حق نہیں ہر حال میں راضی رہنا چاہیئے اصل مقصود معیت ہے اور وہ ان سب احوال میں حاصل ہے صرف لون مختلف ہے اسی کو مولانا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو) تفسیر میں فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست | ور بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب آئیم مستان ویئم | ور بہ بیداری بدستان ویئم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ ان ہی کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے تصرف سے عطا ہوا اور اگر ہم جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سو رہیں تو ان ہی کے بے ہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو انہیں کی گفتگو میں ہیں یعنی یہ قوت بیانیہ بھی ان ہی کی عطا کی ہوئی ہے)

اور جہل سے مراد جہل غیر مضر ہے اور بعض دفعہ سالک پر ایسی حالت پیش آتی ہے کہ نہ اس کا قبض ہونا معلوم ہوتا ہے نہ بسط ہونا اس میں سالک حیران ہوتا ہے کہ میں اپنی اس

حالت کو کیسا سمجھوں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ حالت کیسی ہے مولانا اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

؎ در تردد ہر کہ او آشفتہ است حق بگوش او معما گفتہ است

(جو شخص کسی تردد میں پریشان ہو رہا ہو گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہدیا ہے)

یعنی پریشان نہ ہو محبوب نے تمہارے کان میں معما کہدیا ہے جس کا مطلب حل نہ ہونے سے پریشانی ہو رہی ہے کبھی وہ عاشق کے امتحان کے لئے ایسی بات فرمادیا کرتے ہیں جس سے وہ چکر میں پڑ جائے حیرت کی ایک قسم یہ بھی ہے۔ مولانا نے حیرت کے اقسام بیان فرمائے ہیں کہ ایک تو حیرت محمودہ ہے اور ایک حیرت مذمومہ۔ حیرت مذمومہ وہ ہے جس کا منشا جہل محض کہ اس کو محبوب کا رستہ ہی نہیں ملا بلکہ رستہ سے الٹا جا رہا ہے اس کی حیرت تو حیرت مذمومہ ہے اور ایک حیرت وہ ہے جس کا منشا کثرت علوم ہو کہ محبوب کا پتہ تو لگا لیا ہے رستہ پر چل رہا ہے مگر کسی تجلی کے تواتر سے حیران ہو گیا ہے اُسی کو فرماتے ہیں ؎

گر چنیں بنماید و گہ ضد ایں جز کہ حیرانی نباشد کار دین

(کبھی یہ دکھلاتے ہیں۔ کبھی اس کی ضد سوائے حیرانی تجلیات میں کچھ نہیں ہے)

آگے بعض دوسری اقسام کی طرف اشارہ فرماتے ہیں ؎

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوئے دوست بل چنیں حیراں کہ رویش روئے دوست

آں یکے حیراں کہ رویش سوئے دوست واں دگر حیراں کہ رویش روئے دوست

(نہ ایسے حیران کہ دوست کی طرف پیٹھ کئے ہوئے ہوں بلکہ ایسے حیران ہیں تو جان کی محبوب کی طرف ہے وہ ایک ایسا حیران ہے کہ مُنہ اس کا دوست کی طرف ہے وہ دوسرا ایسا حیران ہے اس کا مُنہ دوست کے چہرہ کی طرف ہے)

خلاصہ مجموعہ اشعار کا یہ کہ جس کے کان میں حق تعالےٰ معما فرماتے ہیں اس کو ایسی حیرت ہو جاتی ہے جیسے کوئی عاشق محبوب کا چہرہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے اور غیر سالک کو یا اُس سالک کو جو شریعت کے خلاف سلوک طے کر رہا ہے جو پریشانی پیش آتی ہے وہ حیرت مذمومہ ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ پشتش ہوئے دوست۔ کہ محبوب کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے پریشان ہے۔ پس جو سالک

شریعت کے موافق چل رہا ہو اُس کو کسی حالت سے پریشان نہ ہونا چاہیے
عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست　　بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(جو کچھ طریق عشق میں سالک پیش آئے وہی اس کے لئے بہتر ہے صراطِ مستقیم اے دل کوئی گمراہ نہیں ہے)

صراطِ مستقیم سے شریعت مراد ہے اگر سالک کسی معصیت میں مبتلا نہ ہو تو پھر قبض ہو یا بسط ہر حال میں راضی رہے پریشان نہ ہو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو　　آن صلاح تست آلیس دل مشو

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں　　تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

(جب تجھ کو اے سالک حالت قبض پیش آئے وہ تیری اصلاح ہی کے لئے ہے۔ جب تجھ پر حالتِ قبض طاری ہو تو اس میں بسط کا ملاحظہ کر خوش و خرم رہو پیشانی پر جھری مت ڈال یعنی رنجیدہ نہ ہو)

ہاں احتیاطاً کثرت استغفار قبض کی حالت میں کر لینی چاہیے۔ ممکن ہے کہ یہ قبض کسی ظاہری یا باطنی گناہ سے آیا ہو تو استغفار سے اس کا تدارک ہو جاوے گا۔

ہر چہ بر تو آید از ظلمات و غم　　آں ز بیباکی و گستاخی ست ہم

غم چو بینی زود استغفار کن　　غم بامر خالق آمد کار کن

(جو کچھ تجھ کو ظلمات اور غم والم پیش آتے ہیں وہ تیری بے باکی اور گستاخی سے آتے ہیں جب کوئی غم پیش آئے تو فوراً استغفار غم حق تعالےٰ شانہ سے کارکن ہو کر آیا ہے)

مولانا تو محقق ہیں اس لئے ذرا دھیمی طرح تسلی فرماتے ہیں مگر جو آزاد ہیں وہ کان کھول کر دو ٹوک بات کہتے ہیں چنانچہ سرمد آزاد اُن لوگوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں جو قبض و بسط کے تعاقب سے پریشان ہوتے اور اپنے لئے ہمیشہ بسط ہی رہنا تجویز کرتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازین دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد
(سرمد گلہ شکوہ کم کرو دو کاموں میں سے ایک کام کرو یا تو جان و تن
محبوب کی رضا میں دیدو یا دوست سے قطع تعلق کرلو)

یعنی یہ کیا روز روز کی شکائتیں لئے پھرتے ہو بس سُن لو کہ یہ محبوب تو ایسا ہی ہے جو کبھی تم کو خوش کرے گا اور کبھی رُلائے گا اب دو باتوں میں سے ایک بات کرو یا تو جان و تن اس پر نثار کردو اور جس حال میں وہ رکھے اس پر راضی رہو ورنہ پھر ایسے محبوب ہی کو چھوڑ دو کیونکہ وہ تمہاری مرضی کا تابع نہ ہوگا اپنی مرضی کا تابع بنانا چاہتا ہے اگر اُس کی محبت کا دعوےٰ ہے تو بس چپکے چپکے پڑے رہو کان نہ ہلاؤ ورنہ جاؤ اُس کو چھوڑ کر کسی دوسرے محبوب کو تلاش کرلو۔ واقعی سُنار کی کھُٹ کھُٹ لوہار کی ایک پورا علاج ان لوگوں کا حضرت سرمد نے کیا ہے۔ مولانا کے سمجھانے سے تو سیدھے نہ ہوئے تھے اب سب درست ہوگئے بس طالب کا مذاق تو وہ ہونا چاہیئے جیسا حضرت سعدی نے ایک بزرگ کا قصہ بیان فرمایا ہے۔

کہ ایک رات وہ تہجد کے لئے اٹھے تو ندا آئی کہ تو کچھ بھی کرتا رہ یہاں کچھ قبول نہیں۔ اور ندا بھی اُس زور سے آئی کہ ان بزرگ کے ایک مرید نے بھی سُن لی خیر اُس رات تو نماز پڑھ کر لیٹ رہے اگلی رات ہوئی تو پھر وہ اپنا بوریہ بدھنا لے کر اٹھے مرید نے کہا کہ حضرت ایسی بھی کیا بے غیرتی ہے کہ وہاں تو کچھ قبول نہیں ہوتا اور آپ پھر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ شیخ نے جواب دیا کہ برخوردار یہ تو سب کچھ ہے کہ میرا عمل وہاں قبول نہیں مگر تم مجھے یہ بتلادو کہ پھر اس در کو چھوڑ کر جاؤں کہاں کوئی اور در بھی تو نہیں جہاں چلا جاؤں۔ میں تو اسی در پر پڑا رہوں گا قبول یا ناقبول سے مجھے کیا بحث ؎

توانی ازان دل بپرداختن کہ دانی کہ بے او تواں ساختن
(اس سے دل اٹھا سکتا ہے کہ بغیر اس کے کسی دوسرے سے موافقت کرلیگا)

اس جواب پر جس میں عبدیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی رحمت کو جوش ہوا اور ندا آئی ؎

قبول است گرچہ ہنر نیستت　　　　کہ جز ما پناہے دگر نیستت

کہ جاؤ قبول کر لیا گو ہنر تو کچھ نہ تھا مگر یہ دیکھ کر رحم آگیا کہ ہمارے سوا تیری پناہ کسی جگہ نہیں بس عاشق کو تو ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ سچ مچ بھی رد کر دیں جب بھی لپٹا ہی رہے سعدی فرماتے ہیں ؎

اگر دعوتم رد کنی در قبول　　　　من و دست و دامانِ آلِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

(اگر مری دعاء رد کر دیا قبول کر و میں ہوں اور میرا ہاتھ اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن)

پھر کیا ایسے کو قبول نہ کریں گے جو رد پر بھی راضی ہو ضرور قبول کریں گے مگر وہ کبھی اپنے عشاق کا امتحان لیا کرتے ہیں کہ دیکھیں ان کا عشق کس درجہ کا ہے یہ ہمارے رد کرنے پر بھی لپٹے رہتے ہیں یا چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ امتحان بھی نہ کریں عاشق کو اس چاہنے کا کوئی حق نہیں۔

صاحبو! عشاق تو رد کرنے پر بھی نہیں گھبرائے آپ صرف قبض و بسط ہی سے گھبرا گئے تعجب ہے بس اگر طالب ہو تو کام میں لگے رہو اس کی پرواہ نہ کرو کہ ذکر میں دل لگتا ہے یا نہیں لگتا ہمارے حاجی صاحب سے جو کوئی کہتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو آپ جوش کے ساتھ فرماتے کہ کیا یہ نفع کچھ کم ہے کہ تم ذکر تو کرتے ہو پھر فرماتے ؎

یابم او را یا نہ یابم جستجوئے می کنم　　　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو کرتا ہوں ملے یا نہ ملے آرزو کرتا ہوں)

غرض سالک کو ہر حال میں راضی رہنا چاہیئے (اس موقع پر عصر کی اذان ہو گئی تو فرمایا کہ) بس اب میں اس بیان کا خلاصہ کر کے ختم ہی کرنے والا ہوں۔

خلاصہ سارے بیان کا یہ ہوا کہ واقعہ معراج سے ہماری دو غلطیوں کا ازالہ ہوا ایک تو یہ کہ ہم لوگ مقامات انبیاء میں کلام کرتے ہیں سو ہم کو ایسا نہ کرنا چاہیئے تم کبھی اپنے قیاس سے یہ نہ کہو کہ فلاں نبی کا یہ مقام تھا اور یہ مقام دوسرے نبی کو حاصل نہ تھا تم کو انبیاء کے مقامات کی کیا خبر جو تم یہ فیصلے کرنے چلے ہو اس کی وہی مثال ہے کہ لومڑی

شیروں کا فیصلہ کرے اور اسی کا ضمیمہ یہ بھی ہے کہ اولیاء کے مقامات میں بھی گفتگو نہ کرو کیونکہ انبیاء کی طرح اولیاء کے مقامات بھی مختلف ہوتے ہیں آجکل لوگ اس مرض میں بہت مبتلا ہیں ایک کہتا ہے کہ میرے پیر کا تہجد کبھی ناغہ نہیں ہوتا جاڑے ہوں یا گرمی سفر ہو یا حضر ہمیشہ اپنے معمولات کو بخوبی پورا کرتے رہتے ہیں دوسرے کے پیر میں یہ کمال نہیں اُس کے معمولات کبھی ناغہ بھی ہو جاتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ میرے حضرت کو خدا تعالیٰ کی طرف ایسی توجہ دائم رہتی ہے کہ اس میں کبھی فرق نہیں آتا ان کو معمولات ظاہری سے معمولات قلبیہ کا زیادہ اہتمام ہے غرض کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے یہ سب خرافات ہے بس جس سے جس کو نفع ہو رہا ہو اس سے لگا لپٹا رہے تم کو تفضیل کے لئے کس نے کہا ہے سالکین کو مقامات اولیاء میں بھی کلام نہ کرنا چاہیئے۔ دوسرا سبق یہ حاصل ہوا کہ سالک اپنے کسی غیر اختیاری حال کو برا نہ سمجھے بشرطیکہ شریعت پر مستقیم ہو شریعت پر استقامت کے ساتھ جو حال بھی پیش آئے اس پر راضی رہے اور سب کو عروج و نزول پر محمول کرتا رہے یعنی کوئی حال عروج ہے کوئی نزول ہے اور دونوں نعمت ہیں۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا نام الرفع والوضع تجویز کرتا ہوں کیونکہ اس میں معراج کی حقیقت عروج و نزول ہی بتلائی گئی ہے اور وضع و رفع کے بھی یہی معنی ہیں۔ اس کے بعد دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی توفیق دیں آمین۔ والحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد خیر خلقہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

نوٹ

ممبر سے اتر کر حضرت مولانا نے فرمایا کہ یہ وعظ جلدی صاف ہو جاوے تو اچھا ہے بحمد اللہ حسب ارشاد آج ۲۴ رجب ۱۳۴۲ھ کو اس کی تسوید تفصیلی تمام ہوئی۔ اے اللہ اس ناکارہ کو بھی ان برکات سے متمتع فرما جن کا ذکر اس بیان میں ہوا ہے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین و اولیاء امتہ اجمعین ۱۲ جامع

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

سلسلۂ التبلیغ کا

وعظ مسمیٰ بہ

اَلْمُرَادُ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی ــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم۔ اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلمُرادُ

مُلقّب بہ

تمییز المرغوبۃ من المرہوبۃ

این	متےٰ	کم	کیف	لم	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں	کب	کس قدر	کس طرح	کیوں	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی مقدار	متفرقات
جامع مسجد مراد آباد	۵ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۳ھ جمعہ	۲ گھنٹہ ۵ منٹ	کھڑے ہو کر	.	ارادہ کا بیان تھا	ظفر احمد تھانوی	۵۰۰ تقریباً	کچھ بیان نماز جمعہ کے قبل ہوا اور کچھ بعد میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اَمّا بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۞ قَالَ اللہُ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَۃَ عَجَّلْنَا لَہٗ

؎ یہ نام تو مناسبت نام شہر کے اور خصوصیت مضمون کے ہے کہ اس میں ذکر ہے دنیا کے مراد بنانے اور آخرت کے مراد بنانے کے آثار واحکام کا اور لقب مناسبت ایک لڑکی کے نام کے ہے جس کے نکاح کی تقریب میں اُس وقت مراد آباد جانا ہوا تھا گویا لقب اس عقد کی تاریخی یادگار بھی ہے ۱۲ منہ

(پرنٹنگ محل کراچی)

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

فِيهَا مَا نَشَآءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُۥ جَهَنَّمَ يَصْلَىٰهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا ۝ وَمَنْ أَرَادَ ٱلْءَاخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُو۟لَٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هَٰٓؤُلَآءِ وَهَٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۝ ٱنظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلَلْءَاخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَٰتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ۝

(جو شخص دنیا کے لفع) کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے پھر ہم اس کے لئے جہنم تجویز کریں گے وہ اس میں بدحال راندہ درگاہ ہوکر داخل ہوگا اور جو شخص آخرت کے ثواب کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنی چاہیے سعی بھی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی آپ کے رب کی اس عطا دنیوی میں سے تو ہم ان کی بھی امداد کرتے رہتے ہیں اور آپ کے رب کی یہ عطار دنیوی کسی پر بند نہیں۔ آپ دیکھ لیجئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے اور البتہ آخرت درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔

یہ تو سب صاحبوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کچھ حصہ وعظ کا نماز سے پہلے ہوگا اور کچھ بعد میں وجہ اس کی یہ ہوئی کہ جامع مسجد میں نماز جمعہ دیر سے ہوتی ہے اگر بعد نماز بیان شروع کیا جاتا تو وقت میں گنجائش کم ہوتی کیونکہ مجھے آج ہی ۵ بجے کی ریل سے جانا بھی ہے بعض دوستوں کی یہ رائے بھی ہوئی کہ نماز کا وقت مقدم کر دیا جائے مگر میں نے اس کو مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس صورت میں بعض لوگوں کی نماز فوت ہونے کا اندیشہ تھا چنانچہ اب تک بھی نمازی سب نہیں آئے اس لئے یہی مناسب معلوم ہوا کہ وعظ کا وقت متجزی کر دیا جائے کچھ بیان نماز سے پہلے ہو جائے اور بقیہ نماز کے بعد پورا کر دیا جائے۔ اس وقت جو آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں سب کا بیان کرنا مد نظر بھی نہیں مقصود صرف اول کی دو آیتوں کی بابت کچھ عرض کرنا ہے ان دونوں آیتوں میں حق تعالیٰ شانہ نے دو ارادوں کا ذکر فرمایا ہے ایک ارادہ دنیا دوسرے ارادہ آخرت اور تثنیا ساتھ دونوں کے ثمرات بھی مذکور ہیں یہ مضمون اگرچہ بارہا کانوں میں پڑا ہوگا مگر اب تک اس کو سرسری طور سے سنا گیا اور یہی وجہ ہے اس کے مؤثر نہ ہونے کی کیونکہ اگر مؤثر ہوا ہوتا تو اس کے علامات و آثار موجود ہوتے اس

ضروری اطلاع، خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ بدلتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

وقت اس مضمون کو اسی لئے اختیار کیا گیا ہے کہ جو اثر اس کا ہونا چاہیئے تھا وہ ابھی تک نہیں ہوا اور اس کے ضروری ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اس لئے اس کو بیان کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی جاتی ہے کہ اس کو سرسری نہ سمجھا جاوے اور مثل سابق بیانات کے اس کو بے توجہی سے نہ سنا جائے کیونکہ اس طرح سننا نہ سننا برابر ہے کسی مضمون کا کانوں میں پہنچنا اس کا نام نہیں ہے کہ اس کو بے توجہی کے ساتھ سن لیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں کفار کے بارہ میں جا بجا ارشاد ہے کہ یہ قرآن کو سنتے نہیں بہرے ہیں حالانکہ آواز تو ان کے بھی کانوں میں بھی پہونچتی تھی بلکہ سننا اس کا نام ہے کہ مضمون سن کر اس میں تدبر کیا جائے پھر عمل کیا جائے سورہ ص میں صاف صاف مذکور ہے کہ ہم نے قرآن تدبر و تذکر ہی کے واسطے نازل کیا ہے قَالَ تَعَالیٰ کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَیْکَ مُبَارَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (یہ کتاب بابرکت ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں) اور بھی جا بجا قرآن شریف میں تدبر نہ کرنے کی شکایت ہے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (یہ لوگ قرآن پاک میں کیوں تدبر نہیں کرتے) ہم لوگوں میں بڑی کمی یہ ہے کہ قرآن شریف میں تدبر نہیں کرتے اس کا مطلب لوگ یہ سمجھے ہوں گے کہ ترجمہ قرآن دیکھنا چاہیئے مگر صرف اتنا کافی نہیں کیونکہ جو لوگ ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں ان میں بھی یہ کمی موجود ہے کہ وہ تدبر نہیں کرتے اور محض سرسری طور پر اس کو پڑھ جاتے ہیں اب آپ کہیں گے کہ پھر کیا مطلب ہے کیا سب مسلمانوں کو مولوی بن جانا چاہیئے نہیں صاحبو! میں آپ کو مولوی بننے کی صلاح نہیں دیتا بلکہ مقصود یہ ہے کہ قرآن میں سے جو ضروری حصہ عمل کے لئے علماء نے مدون کر دیا ہے جس کا نام علم عقائد و علم اخلاق و علم فقہ ہے آپ لوگ اس میں توجہ نہیں کرتے قرآن میں تدبیر کرنے کے یہی معنی نہیں کہ قرآن سامنے رکھ کر ہی اس میں غور کیا جائے بلکہ یہ بھی تدبیر فی القرآن میں داخل ہے کہ جن کتابوں میں مضامین قرآن مذکور ہیں اُن میں غور و محنت سے کام لیا جائے اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں میں ترجمہ نہ جاننا کوئی کمی نہیں کیونکہ ترجمہ قرآن ہر شخص نہیں جان سکتا اس لئے کہ ہر شخص کو مولوی بننا تو دشوار ہے اور جو طریقہ مشہور ترجمہ دیکھنے کا ہے کہ قرآن مترجم لے کر دیکھ لیا اس کو میں خود ہی سے کہتا ہوں کہ یہ طریقہ ناکافی ہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ ترجمہ اردو کا مطالعہ بھی میں سچ کہتا

ہوں کہ بجز عالم کے کسی کا کام نہیں بہت سے واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ ترجمہ دیکھنے والوں کو بہت سے مضامین کا سمجھنا دشوار ہو گیا۔ کیونکہ بہت سے مضامین کا سمجھنا مبادی پر موقوف ہوتا ہے اور مبادی قرآن صرف و نحو و بلاغت و ناسخ و منسوخ و اصول و فقہ وغیرہ ہیں جب تک کوئی شخص مبادی سے جاہل ہے وہ ان مضامین کو کس طرح سمجھ لے گا جو کہ اُن پر موقوف ہیں۔

پھر مصیبت یہ ہے کہ آجکل پوچھنے کی عادت بھی لوگوں میں کم ہے اگر کہیں شبہ پڑتا ہے تو اکثر تو اپنی رائے سے اس کا مطلب تراش لیتے ہیں جس سے اکثر عقیدے فاسد ہو جاتے ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ عوام کو مضامین قرآن سے فیضیاب ہونے کا کوئی طریقہ نہ رہا اس کا جواب ایک تو میں پہلے دے چکا ہوں کہ جو کتابیں سلیس مضامین میں لکھی گئی ہیں ان کا مطالعہ تدبر کے ساتھ کیا جائے نیز جو لوگ مضامین قرآن اور علوم حقہ اپنے وعظ میں بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کا وعظ غور کے ساتھ سنا جائے۔ علاوہ ازیں نفس ترجمہ قرآن سے منتفع ہونے کا بھی ایک طریقہ ہے وہ یہ کہ آج کل دو قسم کے آدمی ہیں ایک وہ جن کو تحصیل علوم کے لئے فراغت مل سکتی ہے ان کو تو چاہیئے کہ بنام خدا اول مبادی قرآن محنت سے حاصل کریں پھر ترجمہ قرآن دیکھیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو اس قدر فراغت نہیں میسر ہو سکتی ان کو چاہیئے کہ پہلے کسی معتبر عالم سے مشورہ کریں کہ مجھے ترجمہ قرآن کون سا لینا چاہیئے کون سا ترجمہ قرآن صحیح اور معتبر ہے اپنی رائے سے خود تعین نہ کریں لوگوں نے آج کل تراجم کے لئے خود ہی ایک معیار مقرر کر لیا ہے مگر اس معیار کا غلط ہونا میں ابھی ثابت کر دوں گا۔

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ٹکسالی ترجمہ ہے کہ بالکل صحیح اور معتبر ہے مگر بوجہ زبان بدل جانے کے اور نیز بعض میں محاورات زبان کی رعایت نہ کرنے کے وہ پھیکے معلوم ہوتے ہیں خیر پھیکے ہوا کریں مگر جو مقبولیت ان کو حاصل ہے وہ دوسرے ترجموں کو حاصل نہیں یہ اُن حضرات کے خلوص کی برکت ہے۔ آج کل لوگوں نے عمدہ ترجمہ کا معیار یہ قرار دے رکھا ہے کہ رنگین عبارت ہو کیوں صاحبو! اگر دو حکیم ہوں جن میں سے ایک تو ماہر ہے مگر وہ نسخہ پھیکا لکھتا ہیں اور دوسرا حکیم بڑی رنگین عبارت میں لکھتا ہے مگر ماہر نہیں ہے انصاف سے بتلایئے

کہ کس کے نسخہ کی آپ قدر کریں گے ظاہر ہے کہ ماہر فن کے نسخہ کی ہر شخص قدر کریگا اور اس کے مقابلہ میں اس غیر ماہر کے رنگین نسخہ کو کوئی بھی نہ پوچھے گا اور یہی کہا جائے گا کہ ہم کو تو مقصود علاج کرنا اور دوا کا استعمال کرنا ہے اس رنگینی کو لے کر کیا پھونکیں۔

صاحبو! اگر ہم قرآن کو کتاب علاج روحانی سمجھتے تو تراجم کے اندر بھی اسی بات کو ملحوظ رکھتے کہ کونسا ترجمہ ماہر فن کا ہے کہ اس کو معتبر جان کر اس پر عمل کیا جائے اور کونسا غیر ماہر کا ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے اگرچہ وہ کیسا ہی رنگین کیوں نہ ہو کیونکہ مقصود تو عمل ہے اور اس میں رنگینی عبارت کو کوئی بھی دخل نہیں مگر ہم لوگ قرآن کو قصہ کہانی کی کتاب سمجھ کر دیکھتے ہیں جب ہی تو رنگین ترجموں کی قدر ہوتی ہے اگر ترجموں کے مطالعہ سے مقصود عمل ہوتا تو رنگینی پر نظر نہ ہوتی بلکہ مقصود پر نظر ہوتی۔ اگر رنگین عبارت دیکھنے کا شوق ہے تو اس کے لئے ترجمۂ قرآن کو کیوں انتخاب کیا جاتا ہے عمدہ زبان تو قصہ چار درویش کی ہے اس کا مطالعہ کر لیا کیجئے ترجمہ قرآن کو خوامخواہ کیوں تکلیف دی غرض صحیح معیار عمدہ ترجمۂ قرآن کا یہ نہیں جو آج کل عوام کا مذاق ہو گیا بلکہ صحیح معیار وہ ہے جو میں نے بیان کیا کہ معتبر ماہر فن کا ترجمہ لیا جاوے پھر اس کو بھی معتبر عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جائے بدون اس کے ترجمہ دیکھنا کافی نہیں اسی طرح ترجمہ سمجھنے کے لئے محض ادب دانی بھی کافی نہیں آجکل لوگوں میں یہ بھی بڑی کوتاہی ہے کہ ان لوگوں کی بڑی قدر کرتے ہیں جو عربی میں تقریر و تحریر کر لیا کریں اور اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں مگر قرآن سمجھنے کے لئے محض ادب دانی کافی نہیں اور میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں اگر قانون کی کتاب ایک شاعر سے پڑھی جائے جس کی زبان بہت عمدہ ہے مگر قانون سے اس کو مس نہیں اور ایک دوسرا شخص ہے جو زبان دانی میں حصہ کم رکھتا ہے مگر قانون سے پورا واقف ہے اب اگر کتاب قانون کی کسی عبارت میں دونوں کا اختلاف ہو شاعر کچھ مطلب بیان کرے اور قانون داں وکیل کچھ اور کہے عقلائے زمانہ انصاف سے بتلائیں کہ اس صورت میں کس کا قول قابل ہوگا ظاہر ہے کہ قانون داں وکیل کے سامنے زبان داں شاعر کا قول ایک کوڑی کو بھی نہ پوچھا جائیگا زبان آجانے سے فن سہل نہیں ہو سکتا اس لئے ترجمہ پڑھنے کیلئے کسی قانون شریعت جاننے والے مولوی کو منتخب کیا جائے اور اس سے تمام ترجمہ پڑھ لیا جاوے اور یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جب قرآن کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے تو اب اس کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو خود ہماری زبان ہی ہے بات یہ ہے کہ ترجمہ سے صرف عربی ترکیب اور لغات حل ہو جائیں گے مگر قرآن کوئی مقامات حریری تو نہیں کہ صرف حل

ترکیب ولغات اس کے معنے سمجھنے کے لئے کافی ہو جائے قرآن میں تو بڑے بڑے علوم یعنی عقائد وتزکیہ اخلاق وفقہ مذکور ہیں جب تک ان کو نہ بیان کیا جائے اس کا مطلب حل نہیں ہو سکتا اور جو شخص ان علوم سے خود ہی واقف نہیں اور نہ کسی واقف سے پڑھتا ہے وہ اگر خالی ترجمہ دیکھے گا تو اندیشہ ہے کہ وہ مترجمہ وقدریہ کا ہم عقیدہ ہو جائیگا کیونکہ ہر فن و ہر کتاب کی خاص اصطلاحیں ہوتی ہیں جو محض ترجمہ سے بدون استاد کے بتلائے حل نہیں ہو سکتیں۔ یہ شخص قرآن کا مطلب ویسے ہی سمجھے گا جیسا کہ کسی شخص نے گلستاں کے اس شعر کا مطلب سمجھا تھا ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست در پریشاں حالی و درماندگی

اس شخص نے بھی اس شعر کا محض ترجمہ دیکھا تھا کہ دوست وہ ہے کہ پریشان حالت و خستگی میں دوست کا ہاتھ پکڑے اس نے ترجمہ ہی پر عمل کیا کہ ایک روز کسی موقع پر اپنے ایک دوست کو پٹتے ہوئے دیکھا تو اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے دشمن نے اور جی کھول کر اسے پیٹا اس نے ہر چند ہاتھ چھڑائے مگر اس نے نہیں چھوڑے جب وہ خوب پٹ چکے اور مارنے والے نے بھی ہار کر چھوڑ دیا تو اس دوست کو اس پر بڑا غصہ آیا اور اس نے اسے بہت برا بھلا کہا کہ ایسے وقت میں امداد تو نہ ہو سکی اور الٹا دوستی کا یہ حق ادا کیا کہ میرے ہاتھ بھی پکڑ لئے اب یہ حیران ہے کہ میں نے تو شیخ سعدی کے کہنے کے موافق دوستی کا حق ادا کیا تھا یہ خفا کیوں ہوتا ہے اور اس سے کہا کہ بھائی میں نے تو دوستی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی میں نے تو وہی کیا جو گلستاں میں شیخ فرماتے ہیں دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست الخ (دوست وہی ہے جو دوست کا ہاتھ پکڑے) تو صاحبو! اس شخص نے ترجمہ میں کوئی غلطی نہیں کی تھی البتہ ایک کمی تھی کہ جائے استاد خالی ست (استاد کی جگہ خالی ہے) اس نے ترجمہ خود ہی دیکھا تھا کسی سے پڑھا نہیں تھا پس جب گلستاں سمجھنے کے لئے باوجودیکہ وہ کوئی بڑی علمی کتاب نہیں محض ترجمہ دیکھنا بعض عقلاء کو غلطی میں ڈالدیتا ہے تو قرآن کا ترجمہ دیکھنا کیونکر کافی ہو جائے گا اور اس میں غلطی کا کیوں احتمال نہ ہوگا۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب ترجمۂ قرآن بھی بدون پڑھے نہیں آ سکتا تو ترجمہ کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی اس سے کیا نفع ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ ترجمہ سے نفع یہ ہوا کہ آپ کو عربی صرف ونحو لغت پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی کیا یہ تھوڑا نفع ہے اگر ترجمہ نہ ہوتا تو پہلے صرف ونحو میں دماغ صرف کرنا پڑتا پھر کہیں برسوں کے بعد اس قابل ہوتے کہ ترجمہ قرآن سمجھ سکیں اب اتنی آسانی ہے کہ جیسا چاہو ترجمہ کسی مولوی سے شروع کر سکتے ہو یہ تھوڑا نفع ہے باقی ترجمہ کرنے والوں کا یہ ہرگز مقصود نہیں

کہ کسی سے اس کے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں. صاحبو! ذرا دنیا کے کاموں پر نظر کرو کہ ذرا ذرا سا کام بھی بدون استاد کے بتلائے نہیں آتا. تجاری یعنی بڑھئی کا کام ذرا کوئی بدون سیکھے کرتے لے یقیناً اپنے ہاتھ پیر کاٹ لے گا. حالانکہ بارہا بڑھئی کو کاٹتے چھیلتے دیکھا ہوگا وہاں کوئی نہیں کہتا کہ بس ہم نے طریقہ دیکھ لیا ہم بھی ایسے ہی کیا کریں گے. ان باتوں میں ساری دنیا کا اتفاق ہے کہ بھائی صرف دیکھ لینا کافی نہیں جب تک کہ باقاعدہ استاد سے نہ سیکھا جائے افسوس قرآن کو ایسا معمولی کلام سمجھا جاتا ہے کہ اس کا ترجمہ خود دیکھ لینا کافی ہو گیا. صاحبو! آپ کو اس سے تعجب ہوگا کہ میری عمر پچاس سال سے تجاوز ہو گئی اور لکھنے پڑھنے کا اس عرصہ میں بہت ہی کام رہا مگر آج تک قلم بنانا مجھے نہیں آیا کیونکہ کسی سے سیکھا نہیں یونہی اُلٹا سیدھا کاٹ چھیل کر کام چلا لیتا ہوں جب خسیس سے خسیس فن بدون استاد سے سیکھے نہیں آسکتا تو ترجمۂ قرآن کی بابت کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں بدون استاد کے سمجھ لیتا ہوں. اور جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں وہ اس کا امتحان اس طرح کر لیں کہ پہلے خود سارا ترجمۂ قرآن دیکھ جائیں اس کے بعد کسی عالم سے پڑھیں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد خود ہی اپنے کو جاہل کہیں گے اور معلوم کر لیں گے کہ محض ذہین ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تدبر قرآن کے لئے سب کو مولوی بننا ضروری نہیں بلکہ قرآن میں تدبر کی اور بھی سہل صورتیں ہیں جو بدون مولوی بنے حاصل ہو سکتی ہیں. مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جب بدون ترجمہ پڑھے تدبر نہیں ہو سکتا تو قرآن کا تلاوت کرنا بھی فضول ہوا بات یہ ہے کہ فضول اور بیکار وہ ہے جس میں کوئی نفع نہ ہو اور قرآن میں منافع بہت سے ہیں ایک نفع تو بعد فہم کے اس پر عمل کرنے کا ہے دوسرا فائدہ ثواب ہے تو بدون معنی سمجھے پڑھنا فضول اس وقت ہو جب کہ اس کو ثواب بھی نہ ملے اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرو آپ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے کو ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے تو الم میں تین حرف ہوئے اس کی تیس نیکیاں ہوئیں اور بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ میں الف اور لام اور میم میں سے ہر ایک کو ایک حرف نہیں کہتا بلکہ لفظ الف میں جو اول الف آیا ہے وہ ایک حرف ہے اور لفظ لام میں جو اول لام بولا گیا وہ ایک حرف ہے اور لفظ میم میں جو اول میم بولا گیا وہ ایک حرف ہے تو گویا آپ نے ہر حرف کے سرے کو بیان کیا ہے اور باقی کو قیاس کر

چھوڑ دیا اس حساب سے الٓمٓ میں نو حرف ہوتے اور اس میں نوے ۹۰ نیکیاں ہوئیں تو یہ قرآن کا تھوڑا نفع ہے کہ بے سمجھے پڑھنے سے بھی ایک لفظ میں نوے نیکیاں مل گئیں اور ہمارا کچھ خرچ بھی نہیں ہوا اور یہ ثواب کوئی حرف مقطعات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ تو ایک تمثیل تھی قرآن کے ہر لفظ کا یہی ثواب ہے سورۂ فاتحہ ہم پڑھتے ہیں جہاں زبان سے الحمد نکلا تو اس میں پانچ حروف ہیں معاً پچاس نیکیاں لکھی گئی مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ اس کو نفع نہیں سمجھتے مگر مر کر اس کی قدر معلوم ہوگی اس کی بعینہ ایسی مثال ہے کہ دو شخص مکہ جانے والے ہیں اور معلوم ہے کہ یہ تانبے کا پیسہ وہاں بالکل نہیں چلتا ایک نے تو تانبے کے پیسوں سے دوسرا سکہ چاندی کا جو کہ وہاں رائج ہے خرید لیا دوسرا شخص جو کہ مکہ کرمہ کی حالت سے جاہل ہے اور اس کو خبر نہیں کہ وہاں کس سکہ کی ضرورت ہوگی اس پر ہنستا ہے اور اس کو بے وقوف بناتا ہے اور کہتا ہے کہ جب یہ پیسہ یہاں کارآمد ہے تو وہاں بھی ضرور کام دیگا اس نے صرف پیسے ہی پیسے ساتھ باندھ لئے مگر ایک تیسرا شخص جو کہ مکہ مکرمہ ہو آیا ہے فیصلہ کرے گا کہ پہلا شخص بیوقوف نہیں بلکہ وہ عاقل ہے بلکہ دوسرا شخص بیوقوف ہے اُس کو اتنی بھی خبر نہیں کہ میں جہاں جا رہا ہوں وہاں کا کیا دستور ہے مگر ابھی تک اس ثالث کے فیصلہ کی کسی کو قدر نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ دونوں شخص مکہ کرمہ پہونچے اب دونوں کی حالت میں کھلا ہوا فرق نظر آئے گا پہلا شخص جو کہ مکہ کرمہ میں چلنے والا سکہ ساتھ لا یا ہے وہ تو ہر دکان پر جاتا ہے اور بے تکلف ہر ضرورت کی چیز لے آتا ہے اور دوسرا جس کی تھیلی میں تانبے کے پیسے ہی پیسے ہیں ہر ضرورت کے وقت دوسروں کا منہ تکتا ہے اور اب اپنی حماقت پر روتا ہے کہ افسوس میں نے عقلاء کے مشورہ پر عمل نہ کیا اب یہ پیسے تو یہاں بالکل فضول ہیں میں کس طرح کھانا خریدوں کہاں سے پانی خریدوں کس طرح یہاں کے دن کٹیں گے۔ اسی طرح ان نیکیوں کی قدر ہم کو آخرت میں ہوگی کیونکہ یہی وہاں کا سکہ ہے وہاں آپ کے یہ روپے پیسے کام نہ دیں گے اور وہاں سب کو جانا ہے اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہوسکتا۔ جب بازار قیامت قائم ہوگا وہاں بھی دو قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ جو کہ وہاں کا سکہ یعنی نیکیاں پلے باندھ کر لائے ہیں وہ تو بے تکلف ہر قسم کی راحت حاصل کریں گے دوسرے وہ لوگ جو اپنی غفلت کی وجہ سے آخرت کو بھولے ہوئے تھے اور اس وجہ سے کچھ نیکیوں کا ذخیرہ ساتھ باندھ کر نہیں لائے اُن کا یہ حال ہوگا ؎

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر تہیدست را دل پراگندہ تر

(بازار جس قدر رونق پر ہوتا ہے تہی دست کا دل بہت پریشان ہوتا ہے)

اس وقت آپ اُن لوگوں کی قدر کریں گے جن کو آج مولویوں کا بگاڑا ہوا کہا جاتا ہے اس دن وہ احمق جن کی حماقت پر آجکل کی نئی روشنی نے رجسٹری کر دی ہے عاقل کہلائیں گے اس وقت حیرت ہوگی کہ یہ لوگ جن کو ہم لوگ ذلیل سمجھتے تھے بڑے باشوکت ہیں اور آج ہم ان کے آگے ذلیل ہیں صاحبو! وہاں بجز اعمال صالحہ کے اور کچھ کام نہ آویگا۔ اور یہ بھروسہ نہ کرنا کہ ہمارے ماں باپ بہت نیک تھے ان سے کچھ نیکیاں بٹوالیں گے وہاں کوئی کسی کے کام نہ آویگا۔ حدیث شریف میں ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی اور وہاں کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر نیکیاں زیادہ ہوں تو جنتی ہے اور بدیاں زیادہ ہوں تو دوزخی ہے اور دونوں برابر ہوں تو چندے اعراف میں رکھا جائیگا اس قاعدہ کے موافق اس شخص سے ارشاد ہوگا کہ اگر ایک نیکی کہیں سے تم کو مل جائے تو جنت میں بھیجدیا جائیگا وہ شخص خوش ہوگا کہ میرے تو ماں باپ بیوی بچے دوست احباب بہت سے ہیں کسی سے ایک نیکی کا ملجانا کیا دشوار ہے چنانچہ وہ جائے گا اور جاکر باپ سے اپنی حالت عرض کریگا کہ مجھے ایک نیکی کی ضرورت ہے تم میرے باپ ہو میرے حال پر رحم کرو ایک نیکی دیدو وہ صاف جواب دیدیگا کہ یہاں ہم کو اپنی جان کی پڑی ہے تجھے ایک نیکی کیسے دیدوں ماں بھی اسی طرح جواب دیدیگی اولاد بھی ٹکا سا جواب دیدے گی دوست احباب بھی دور کی سنائیں گے آخر نہایت مایوس ہوکر لوٹیگا راستہ میں ایک شخص سخی ملیگا جس کے پاس صرف ایک ہی نیکی ہوگی وہ اس کو پوچھے گا کہ میاں پریشان کیوں ہو رہے ہو کیا بات ہے وہ جواب دیگا کہ اگر میری پریشانی کا علاج ہوسکتا تو میں ظاہر بھی کرتا مگر اس کا علاج کسی سے نہیں ہوسکتا ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی ہے ظاہر کرنے سے کیا فائدہ ماں باپ اولاد اقارب دوست احباب سب جواب دے چکے تم ہی کیا کرلو گے وہ کہیگا کہ تم اپنا حال تو کہو شاید میں اس میں کچھ ساتھ دے سکوں غرض بعد کلام بسیار یہ اپنا حال کہیگا کہ مجھے ایک نیکی کی ضرورت تھی وہ شخص جواب دے گا کہ میرے پاس کل ایک نیکی ہے تو وہ میرے وہ کسی کام کی بھی تھیں کیونکہ گناہ بہت زیادہ ہیں تو جہنم میں جاؤں گا یہ نیکی ہوئی تو کیا نہ ہوئی تو کیا لے یہ نیکی تو ہی لیجا تیرے ہی کام آجائے گی یہ

شخص حیران ہوگا کہ یا اللہ یہ کون سخی ہے جو اس طرح بے خطر اپنی نیکی دے رہا ہے صاحبو! وہاں بھی یہ اہل دل ہی سخاوت کریں گے اور یہی مخلوق پر رحم کریں گے ماں باپ کچھ کام نہ آویں گے غرض یہ شخص خوش ہو کر وہ نیکی لیکر لوٹے گا اور دربار الٰہی میں پیش کردے گا وہ تو بموجب اُس قاعدہ کے بخشدیا جائے گا کیونکہ نیکیاں غالب ہوگئیں۔ اس کے بعد ان سخی صاحب کو بلایا جائیگا کہ تم نے یہ کیا کیا اپنی نیکی دوسرے کو دیدی کیا تم کو اپنی نجات کی فکر نہیں۔ وہ عرض کریگا کہ الٰہی میرے پاس صرف ایک ہی نیکی تھی میں جانتا تھا کہ قاعدہ کے موافق تو میں جہنمی ہوں اور یہ نیکی میرے کارآمد نہیں ہوسکتی البتہ اگر حق تعالیٰ اپنے فضل سے بخشدیں تو اور بات ہے مگر جب میری بخشش صرف فضل حق پر موقوف ہے اور میں اپنے عمل سے نہیں بخشا جاسکتا تو اس غریب کی بھی کیوں امید توڑی میں نے وہ نیکی اس مسلمان بھائی کو دیدی کہ اُس کی تو مغفرت ہوجائے گی میرا معاملہ رحمت حق کے سپرد ہے۔ وہ شخص اس سخاوت پر بخشدیا جائے گا۔

صاحبو! وہ عجیب دربار ہے وہاں ذرا ذرا سی بات پر بخشش ہوجاتی ہے ایک اور شخص کا قصہ حدیث میں آیا ہے کہ اس کے پاس کوئی نیکی نہ تھی صرف ایک یہ نیکی تھی کہ اس نے ایک دن راستہ میں سے کانٹا ہٹا دیا تھا جو ظاہر ہے کہ بہت ہی ذرا سی بات ہے مگر حق تعالیٰ کے یہاں اس کی بھی قدر ہوئی اور اُس کو اسی بات پر بخشدیا گیا۔ صاحبو! نیک کام کو چاہے کتنا ہی ذرا سا ہو حقیر نہ سمجھو بعض دفعہ ذرا سی بات قبول ہوجاتی ہے اور بڑے بڑے عمل جن پر ناز تھا رکھے رہجاتے ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب اُن کا انتقال ہوا تو کسی دوسرے بزرگ کو کشف ہوا یا خواب میں دیکھا کہ اُن سے سوال ہو رہا ہے کہ ہمارے واسطے کیا عمل لے کر آئے ہو انھوں نے جواب دیا کہ اور تو کچھ نہیں توحید لیکر آیا ہوں ارشاد ہوا جھوٹا ہے توحید بھی تیری درست نہیں اُذکُرلَیۡلَۃَ اللَّبَنِ دودھ والی رات کا قصہ یاد کرو دودھ والی رات کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک روز دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہوگیا تھا تو انھوں نے کسی سے یہ کہا کہ دودھ سے درد ہوگیا تو یہ باز پرس ہوئی کہ تم نے دودھ کو موثر قرار دیا حالانکہ موثر ہم ہیں یہ کیسی توحید ہے جب توحید بھی غلط ثابت ہوئی تو وہ بزرگ بہت پریشان ہوئے پھر ارشاد ہوا کہ تم اپنے قول کے مطابق دوزخ کے مستحق ہوچکے کیونکہ تمھارے اقرار میں تمھارے پاس صرف ایک نیکی تھی اور وہ بھی غلط ثابت ہوئی اب سنو ہم تم کو کس بات پر بخشتے ہیں ایک رات کو تم نے ایک بلی کے بچہ کو سردی میں کانپتا دیکھا تھا اور تم نے اس پر رحم کھا کر لحاف ڈالدیا تھا جس پر اس نے تمکو دعا دی وہ دعا اُس بلی کے بچے کی ہم نے

قبول کرلی اور رحم کو اس کی دعا پر بخشا جاتا ہے یہ بھی ایک عمل تھا مگر کبھی حق تعالیٰ بدون عمل کے صرف ظاہری صورت پر بخش دیتے ہیں چنانچہ ایک بزرگ ہیں قاضی یحییٰ بن اکثم جو بخاریؒ کے شیخ ہیں ان کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ ان سے سوال ہورہا ہے اور عتاب آمیز سوال ہورہا ہے اور وہ چپ خاموش کھڑے ہیں جب عتاب ہوچکا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں تو حدیث میں پڑھا کرتا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ یَسْتَحْیِیْ مِنْ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ کہ حق تعالیٰ شانہ بوڑھے مسلمان سے حیا فرماتے ہیں اور اس کو بخش دیتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے اس پر ارشاد ہوا کہ جاؤ اگرچہ نیکی کچھ نہیں مگر تمہارے بڑھاپے پر رحم کرکے تم کو بخشا جاتا ہے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا ہے بیشک ہم کو بوڑھے آدمی پر رحم آتا ہے اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

دلم میدہد وقت وقت ایں امید کہ حق شرم دارد ز موئے سفید

(دل میرا ہر وقت امید دلاتا ہے کہ حق تعالےٰ شانہ سفید بالوں سے شرم رکھتے ہیں)

اس سے زیادہ حیرت انگیز دوسری حکایت ہے کہ یہاں تو قاضی یحییٰ بن اکثم واقعی بوڑھے تھے ایک مسخرہ جوان کی حکایت ہے کہ جب مرنے لگا تو اس کو اپنی حالت پر خوف تھا کیونکہ عمل صالح کچھ نہ کیا تھا اس نے یہ وصیت کی کہ جب مجھ کو غسل و کفن دے چکو تو میری داڑھی پر ذرا سا آٹا چھڑک دینا چنانچہ ورثہ نے وصیت پوری کی اس کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ اس سے سوال ہوا کہ تو نے یہ وصیت کیوں کی تھی اس نے عرض کیا کہ یا اللہ میرے پاس عمل تو کچھ تھا نہیں اس لئے اپنی حالت پر اندیشہ تھا اور یہ حدیث میں نے سنی تھی اِنَّ اللّٰہَ یَسْتَحْیِیْ مِنْ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ کہ خدا بوڑھے مسلمان سے شرماتا ہے قسمت سے میں بوڑھا بھی نہ تھا اور نہ بوڑھا بننا اپنے اختیار میں تھا۔ تو میں نے یہ وصیت کی کہ میرے بالوں میں آٹا لگا دینا کہ بوڑھوں کی سی صورت تو ہو جاوے بس اتنی بات پر وہ شخص بخش دیا گیا۔ سچ کہا ہے ع رحمت حق بہانہ می جوید۔ (اللہ تعالیٰ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے) یہ تو حکایتیں اہل کشف کی ہیں جو خود حجت شرعیہ نہیں مگر حدیث میں بھی تو ان کی اصل موجود ہے۔ چنانچہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص کو صرف راستہ میں سے کانٹا ہٹا دینے پر بخش دیا گیا جب ان کی اصل حدیث میں موجود ہے تو پھر ان کشفیات کو بھی تائید میں بیان کرنا صحیح ہوگیا کیونکہ کشف کا بھی حکم ہے کہ اگر حدیث و قرآن کے موافق ہو تو قبول ہے ورنہ رد ہے۔

(یہاں تک بیان نماز جمعہ سے پہلے ہوا اس کے بعد حضرت مولانا نے نماز جمعہ پڑھائی بعد نماز کے پھر منبر

پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا (۱۲ جامع) الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد میں اس بات کو بیان کر رہا تھا کہ نیکیوں کی قدر ہم کو وہاں جا کر ہوگی اس لئے کہ یہ آخرت ہی کا سکہ ہے وہیں اس کا کارآمد ہونا معلوم ہوگا یہاں تو نیکیوں پر کوئی رقم نہیں ملتی اس لئے لوگوں کو اس کی قدر نہیں ہوتی مگر مرنے کے بعد سب کو قدر معلوم ہو جائے گی اور میں احادیث سے اس بات کو ثابت کر دیا تھا کہ وہاں ذرا ذرا سی نیکی بھی کارآمد ہے جس کی آج ہم کو قدر نہیں ہوتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کا بے سمجھے ہوئے پڑھنا بھی بیکار نہیں کیونکہ اس کے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو ایسی چیز بیکار کیونکر ہو سکتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف تلاوت کر لینا کافی ہے فہم معنی کی ضرورت نہیں ورنہ شاید کوئی حافظ صاحب خوش ہو جاتے کہ بس ہم مولویوں سے بھی بڑھ گئے سو یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ اگرچہ الفاظ قرآن پر اس قدر ثواب ملتا ہے مگر ظاہر ہے کہ مقصود صرف یہی ثواب الفاظ کا تو نہیں بڑا مقصود یہی ہے کہ معنے کو سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ صرف ترجمہ بھی کافی نہیں جب تک کہ اس میں تدبر نہ ہو کیونکہ سمجھنا یہی ہے جس پر اصل مقصود یعنی عمل موقوف ہے اسی طرح ان آیتوں کا مضمون بھی اگرچہ کان میں پڑا ہوا ہے مگر جب تک کہ تدبر نہ ہو دہ سننا مفید نہیں ترجمہ قرآن تو کفار بھی سمجھ جاتے تھے اور ہم سے زیادہ سمجھتے تھے مگر ان کو کچھ نفع ہوا کچھ بھی نہیں کیونکہ اس میں تدبر نہیں کیا تھا جس پر عمل مرتب ہوتا سرسری طور پر سنا گیا تھا اس لئے اس مضمون کو اہتمام سے دوبارہ اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں تدبر کیا جاوے اور اس کے موافق عمل کرنے کی کوشش کی جاوے۔ اب وہ مضمون سنئے ان آیتوں میں جن کو میں نے تلاوت کیا تھا ایک بہت بڑی چیز کا ذکر ہے اگرچہ وہ بظاہر چھوٹی معلوم ہو یعنی اس میں دنیا اور آخرت کے ساتھ ارادہ کو متعلق کر کے ان کا ثمرہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا کا ارادہ کیا جاتے تو اس کا کیا ثمرہ ہے اور آخرت کا ارادہ کیا جاتے تو اس کا کیا نفع ہے ہر ایک کو الگ الگ حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے غرض ان آیتوں میں ارادہ کا ذکر ہے اس امر کی تعیین کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ واقعی یہ ایسی چیز ہے جس کو ہم بہت ہی معمولی اور سرسری سمجھتے ہیں مگر یہ سرسری چیز۔ ایسی ہے جیسے گھڑی کی بال کمانی کہ دیکھنے میں تو ذرا سی چیز ہے مگر گھڑی

کے چلنے کا دارومدار اسی پر ہے اور وجہ اس بے قدری کی یہ ہے کہ ارادہ ایک وجود غیر حسی ہے اس لئے ہم کو اس کی قدر نہیں مگر واقع میں فکر وارادہ وہ چیز ہے جس کے ترک کر دینے سے ہمارے سب حال بگڑ گئے اور بہت سے اللہ والوں کے حالات ومقامات اس کی بدولت درست ہو گئے۔ صاحبو! ارادہ بہت بڑی چیز ہے اس کو حقیر نہ سمجھا جاوے دنیا کے بھی سارے کام اس کی بدولت چلتے ہیں یہ بہت بڑی قوت ہے جو انسان میں رکھی ہوئی ہے ایک مثال سے آپ اس کو واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں فرض کیجئے کہ ایک شخص کو جاڑے کے موسم میں اس حالت میں کہ بارش بھی ہو رہی ہے اور سردی بہت ہو رہی ہے گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے پیاس معلوم ہوئی اور پیاس بہت شدید معلوم ہوئی مگر بوجہ تند ہوا کے باہر آنے کی ہمت نہیں ہوتی اس درمیان میں اس کے پاس حاکم کا حکم پہونچا کہ اسی وقت فلاں جگہ جو کہ شہر سے بہت فاصلہ پر ہے ہم سے آکر ملو اب غور کیجئے کہ یا تو یہ شخص اس سردی کی حالت میں اندر سے صحن تک بھی نہیں آسکتا تھا اب وہ کون چیز ہے جو اس کو گھر کے اندر سے صحن تک اور صحن سے گھر کے باہر اور وہاں سے شہر کے باہر کئی میل تک بارش اور سردی میں لے جاتی ہے وہ صرف قوت ارادہ ہی ہے کہ پہلے ارادہ نہ ہوا تھا کیونکہ پیاس کوئی قوی محرک نہ تھی اور اب ارادہ ہو گیا کیونکہ حکم حاکم بوجہ کسی قسم کی رغبت کے یا رھبت کے قوی محرک ہے جس نے اس کی قوت ارادہ کو حرکت دیدی ہے اور یہ کمل لیکر تمام مصائب کو برداشت کرتا ہوا حاکم تک جا پہنچتا ہے۔ اب ارادہ کی قوت معلوم کر کے جانو کہ ارادہ فی نفسہ نہ کوئی بری شے ہے نہ اچھی یہ اپنے حسن وقبح میں موقوف ہے اپنے مضاف الیہ پر یعنی مراد پر اگر اچھے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ عمدہ ہے اور برے کام کا قصد کیا جائے تو وہ ارادہ برا ہے اچھے ارادہ پر ثواب ملے گا اور برے ارادہ پر اگر پختہ ارادہ ہو جاویگا گناہ لکھا جائیگا اس سے بھی ارادہ کی عظمت معلوم ہوگئی کیونکہ کسی عمل پر جزا وسزا بدون ارادہ کے مرتب نہیں ہوتی اور ارادہ پر بدون عمل کے بھی گناہ وثواب لکھا جاتا ہے اگر بدون ارادہ کے کوئی گناہ بھول چوک سے ہو گیا تو وہ معاف ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا یعنی بندوں کو تعلیم فرماتے ہیں کہ اس طرح دعا کیا کرو یا اللہ اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہم سے مؤاخذہ نہ کیا جائے اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ اواخر سورہ بقرہ کی دعا مقبول ہو گئیں یعنی بھول چوک پر مؤاخذہ نہ ہوگا ایک حدیث میں اس کو صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیْ الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ کہ میری امت سے

خطا ونسیان معاف کر دیا گیا۔ اور بعض اعمال میں تو سب لوگ جانتے ہیں کہ بدون ارادہ کے عمل معتبر نہیں ہوتا مثلاً نماز بدون نیت کے صحیح نہیں ہوتی نیت کا نام ہی تو ارادہ ہے اگر بدون اس ارادہ کے کوئی تمام دن نمازیں پڑھتا رہے تو سب فضول ہیں اور اگر نیت کر کے دو رکعت بھی پڑھ لے وہ صحیح ہیں ارادہ ہی کی وجہ سے قتل خطا وعمد میں شریعت نے فرق کیا ہے اگر قصداً کسی کو قتل کیا گیا تو اس میں گناہ بھی بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ بعض صحابہ کا خیال تھا کہ قتل عمد کیلئے توبہ بھی نہیں اگرچہ جمہور نے اس کو رد کیا ہے اور اس صورت میں قاتل پر قصاص بھی آیا ہے کہ مقتول کے عوض اس کو قتل کر دیا جائے اور اگر خطا بھول چوک سے قتل ہو گیا اور قتل کا ارادہ نہ تھا مثلاً تیر شکار پر چلایا تھا کسی آدمی کے لگ گیا اور وہ مر گیا تو اس صورت میں گناہ بھی نہیں ہوتا نہ قصاص آتا ہے صرف دیت آتی ہے نیز اگر کسی معصیت کا پختہ عزم ہو جائے تو گناہ فوراً لکھا جاتا ہے اور اگر بدون اردہ کے غلطی اور خطا سے واقعی بھی گناہ ہو گیا تو کچھ بھی گناہ نہیں ہوتا وہ معاف ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ ارادہ سبب غالب ہے اس عمل کے ہو جانیکا اور ایسے سبب کے لئے حکم مسبب کا ہوا کرتا ہے مثلاً سنکھیا سبب غالب ہے ہلاکت کا تو اگر کوئی شخص بے قاعدہ بلا مشورہ طبیب خودکشی کی نیت سے سنکھیا تولہ بھر کھالے تو چاہے بعد میں دست وقے کرا کر اس کی جان بچ بھی جاوے تب بھی اس کو گناہ خودکشی کا ہو گیا کیونکہ اس نے کوئی کسر جان ہلاک کرنے میں نہ رکھی تھی یہ اتفاقی بات تھی کہ وہ اس کے بعد بھی بچ گیا۔ اسی طرح جب کسی شخص نے پختہ ارادہ کر لیا کسی گناہ کا تو گویا اس نے اس کے کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی کیونکہ عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ پختہ ارادہ کے بعد عمل ہو ہی جایا کرتا ہے یوں کبھی اتفاقاً نہ ہوا تو یہ نادر ہے والنادر کالمعدوم (نادر مثل معدوم کے ہے) اس لئے یہ شخص ارادہ پختہ کر لینے سے ایسے سبب کا مرتکب ہو گیا جو اکثر مفضی الی السبب (سبب کی طرف پہنچانے والا) ہو جاتا ہے اس لئے گناہ کا مستحق ہو گیا۔ اسی طرح کسی شخص نے نیک کام کا قصد کیا تو وہ ثواب کا مستحق ہو گیا کیونکہ سبب کے بعد اکثر کام ہو جاتا ہے کبھی نہ ہونا اتفاقی بات ہے لہذا وہ مثل کرنے والے کے سمجھا جائے گا اور اس کو اس عمل کا ثواب مل جائیگا۔ اب معلوم ہوا کہ ارادہ کتنی بڑی چیز ہے جو کہ عمل کے وجود کے لئے سبب غالب ہے جس کے بعد اکثر کام ہو جاتا ہے یہاں تک کہ شریعت میں اس کو عمل ہی کے مثل شمار کیا گیا ہے سو اس کی مسلمانوں میں آجکل بہت ہی کمی ہے کہتے ہیں کہ فلاں کام ہم نے بہت ہی کرنا چاہا مگر نہیں ہوا۔ مگر میں بقسم کہتا ہوں

کہ ان لوگوں نے اس کا ارادہ ہی نہیں کیا صرف تمنا ہی تمنا کی ارادہ اس کا نام ہے کہ جس اختیاری کام کا خیال کرے بس اُسی کی دھن لگ جائے اور اپنی پوری کوشش اس میں صرف کر دے ایسا کر کے پھر کوئی بتلائے کہ کام نہیں ہوا۔ اور اس کے بعد بھی کام نہ ہوا کرے تو دنیا کا کام کیونکر چلے اس لئے جو شخص یوں کہے کہ میں نے ارادہ کیا اور پھر بھی کام نہیں ہوا میں اس کو کبھی تسلیم نہ کروں گا بلکہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تم نے اس کام کی تمنا تو کی ارادہ نہیں کیا۔ ایک شخص میرے پاس آئے جو بوڑھے ہو گئے تھے مگر نظر بد کے مرض میں مبتلا تھے آجکل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جوانی میں گناہ نہیں چھوٹتے تو بڑھاپے میں جا کر چھوٹ جائیں گے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو گناہ جوانی میں نہیں چھوٹا وہ بڑھاپے میں کبھی نہ چھوٹے گا۔

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے — بہ نیروئے شخصے برآید زجائے
اگر ہمچناں روزگارے ہلی — بہ گردونش از بیخ بر نگسلی

(جس درخت نے ابھی جڑ پکڑی ہے ایک آدمی کی قوت سے جڑ سے اکھڑ سکتا ہے اور اگر کچھ زمانہ تک ایسے ہی چھوڑ دیا جائے تو گردوں سے بھی جڑ سے نہیں اکھڑ سکتا۔)

سو جو گناہ اب جوانی میں نہ چھوٹا حالانکہ ابھی اس کی جڑ کمزور ہے تو بڑھاپے میں کیا خاک چھوٹے گا جبکہ جڑیں مضبوط ہو جائیں گی اور چاروں طرف پھیل جائیں گی۔ نیز ایک بات تجربہ کی یہ ہے کہ ہمیشہ عفت جوان آدمی کی قوی ہوتی ہے کیونکہ جس طرح جوانی میں تقاضا زیادہ ہوتا ہے اس کے روکنے کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور بڑھاپے میں یاد رکھئے کہ تقاضا کم نہیں ہوتا اگرچہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا مگر تقاضے میں کمی نہیں آتی اور اس تقاضے کو روکنے والی قوت کم ہو جاتی ہے تو اور بھی کچھ نہ ہو نظر بد میں تو یہ شخص مبتلا رہے ہی گا خصوصاً جبکہ عورتیں اس کی نظر سے احتراض بھی نہیں کرتیں چنانچہ بوڑھے آدمی سے پردہ بھی کم کرتی ہیں بہت سے بہت وہ فعل نہ کر سکے گا مگر میں کہہ چکا ہوں کہ مدار معصیت ارادہ پر ہے جب ایک شخص نے معصیت کا پختہ ارادہ کر لیا اور پھر بوجہ ناکارہ ہونے کے اُسے پورا نہ کر سکا تو گناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا گیا۔ غرض وہ بوڑھے شخص مجھ سے ملے کہ اس کی کوئی سہل تدبیر بتلاؤ کہ میں اس مرض سے نجات پاؤں میں نے کہا سہل کی قید سے تو یہ سلسلہ غیر متناہی چلے گا آج آپ مرض کے ازالہ کی سہل تدبیر پوچھتے ہیں کل کو اس تدبیر کو سہل کرنے کے لئے اگر وہ سہل نہ معلوم ہوئی دوسری

تدبیر پوچھیں گے اس میں کچھ دشواری پیش آئی تو پھر اس کی سہولت کے لئے اور تدبیر پوچھیں گے اس طرح تو مرض کا علاج نہیں ہو سکتا بس سہولت کی فکر نہ کیجئے بجز ہمت کے اس کا کوئی علاج نہیں ایک دفعہ پختہ عزم کر لیجئے کہ چاہے کتنی ہی تکلیف ہو ہرگز نگاہ اوپر کو نہ اٹھاؤں گا اور جو کبھی اٹھ جائے تو فوراً نیچی کر لیجئے اس ترکیب سے ان شاء اللہ مرض زائل ہو جائیگا اس کے بدون زوال ممکن نہیں۔ ڈ کہنے لگے کہ میں چھوڑنے پر قادر ہی نہیں ہمت کیسے کر سکتا ہوں میں نے کہا کہ یہ آپ غلط کہتے ہیں آپ یقیناً چھوڑنے پر قادر ہیں اور دلیل سے میں نے ان کو سمجھا دیا کہ آپ قادر ہیں وہ دلیل یہ تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کا ایک طرف تو یہ ارشاد ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کہ حق تعالیٰ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ دوسری طرف ارشاد ہے وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ کہ مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور شرمگاہوں کو محفوظ رکھیں ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ نگاہ نیچی کرنے پر بندہ قادر ہے اس لئے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ کا حکم ہے اور ان کا کوئی حکم طاقت سے زیادہ نہیں ہوتا میرے سامنے تو وہ اس دلیل میں تاویلیں نکالتے رہے مگر گھر جا کر جو انھوں نے اس میں غور کیا تو خط آیا کہ واقعی میں غلطی پر تھا انسان ہر گناہ سے بچنے پر قادر ہے البتہ پہلے پہل کلفت ضرور ہوتی ہے مگر صرف پہلی ہی بار ہوتی ہے اس کے بعد وہ کلفت کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ پھر عادت ہو جاتی ہے۔ صاحبو! انسان میں ارادہ وہ قوت ہے کہ اس کی ساتھ وہ تمام مخلوق پر غالب آسکتا ہے صاحبو! تمہارے ساتھ دو لشکر ہیں ایک ملائکہ کا اور ایک شیاطین کا اور ان دونوں میں مقابلہ رہتا ہے ایک چاہتا ہے کہ تم کو بدی سے بچائے دوسرا چاہتا ہے کہ تم کو گناہ میں پھنسائے اور ان دونوں لشکروں کی ہار جیت تمہارے ارادہ پر موقوف ہے جس کی طرف تمہارا ارادہ ہو جاوے وہی غالب ہو جاویگا اگر آپ نے گناہ کا ارادہ کر لیا تو لشکر ملائکہ پسپا ہو گیا اب وہ غالب نہیں ہو سکتا اور اگر گناہ سے بچنے کا ارادہ کر لیا تو لشکر شیطان مغلوب ہو گیا اب وہ کبھی غلبہ نہیں کر سکتا افسوس آپ میں اتنی بڑی قوت موجود ہے اور پھر آپ یوں کہتے ہیں کہ ہم گناہ چھوڑنے سے عاجز ہیں صاحبو! آپ عاجز ہرگز نہیں ہاں یوں کہئے کہ ابھی تک چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور ارادہ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کی عظمت اور اس کا خوف دل میں نہیں گناہ کو ایک معمولی چیز سمجھ رکھا ہے اور جس گناہ کی عظمت دل میں ہے اس میں کسی

طرح کی بھی کوئی تاویل مُنہ سے نہیں نکلتی کیونکہ دیکھئے گناہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو کہ صرف شریعت مقدسہ میں حرام ہیں دوسرے وہ جو کہ قانون اور شریعت دونوں کے اعتبار سے ناجائز ہیں بتلایئے اُن گناہوں میں آپ کیا برتاؤ کررہے ہیں جو کہ قانون کی رو سے بھی ناجائز ہیں اور موجب سزا ہیں ظاہر ہے کہ سب اس سے اجتناب کریں گے ڈاکہ کوئی نہیں مارتا چوری شریف آدمی بالکل نہیں کرتے یہاں تک کہ راستوں میں پیشاب تک نہیں کرتے کیونکہ قانوناً جرم ہے۔ کیوں صاحب اگر کوئی ڈاکو کہنے لگے کہ میں اپنے عیال کو بدون ڈاکہ کے پال نہیں سکتا تھا اس لئے کہ آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے تو کیا حاکم اُس کا یہ عذر قبول کرے گا اور کیا اس کو سزا نہ دے گا یا چور یہی عذر کہنے لگے تو کیا اسکو رہا کردیا جائے گا ہرگز نہیں۔ حاکم صاف کہدیتا ہے کہ ہم یہ باتیں نہیں سننا چاہتے تم نے خلاف قانون کام کیا ہے تم کو پھانسی دی جائے گی۔ اے اللہ ایک جواب حاکم دنیا کے سامنے نہیں چل سکتا وہ خدا کے سامنے پیش کرتے ہوئے کچھ تو شرمانا چاہیئے۔ آج کل لوگ بہت بیباک ہوکر کہدیتے ہیں کہ صاحب کیا کریں مجبور ہیں بدون سود اور رشوت کے خرچ نہیں چلتا اور علماء کو تنگ کرتے ہیں کہ اس مجبوری پر نظر کریں ان کو بھی یہ حق ہے کہ ایک حاکم سلطنت کی طرح وہ بھی صاف جواب دے دیں کہ ہم نہیں جانتے خرچ چلے یا نہ چلے شریعت مقدسہ نے اس کو حرام کیا ہے چھوڑنا پڑے گا ورنہ گناہ گار ہوگے اور فاسق فاجر کے خطاب کے مستحق ہوگے۔ آجکل لوگ علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ سود کے جواز کے فتوے دو اور یہ نہیں جانتے کہ اگر وہ جواز کے فتوے دے بھی دیں گے تو وہ بھی آپ ہی کے شمار میں ہوجاویں گے بلکہ اُن کی آپ سے بھی زیادہ گردن نپے گی بھلا کسی مولوی کے جائز کرنے سے کوئی حرام کام حلال ہوسکتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ عوام مسلمان جن کو ذرا شریعت کا پاس ہے اُن مولوی صاحب ہی کو چھوڑدیں گے۔ صاحبو اول تو علماء اس کے ذمہ دار نہیں کہ آپ کا خرچ چلتا ہے یا نہیں خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جو حکم ہے اس کو ماننا پڑیگا۔ دوسرے یہ عذر بھی بالکل غلط ہے کہ ہم سے گذر نہیں ہوسکتا۔ گذر ہوسکتا ہے مگر فضولیات کو حذف کردو فلٹن نہ رکھو نوکر زیادہ نہ رکھو کپڑا سستا پہنو غرض جائز آمدنی کے موافق خرچ رکھو دیکھو گذر ہوتا ہے یا نہیں مگر یہ فضولیات تو چھوڑتے نہیں پھر کہتے ہیں کہ

گذر نہیں ہو سکتا یوں کہئے کہ سود اور رشوت کے بغیر عیش پرستی نہیں ہو سکتی اس کو ہم بھی تسلیم کریں گے مگر عیش پرستی کی فکر کی شریعت میں خود ممانعت ہے اس کی ذمہ دار شریعت کیونکر ہو سکتی ہے اور جس کو گذر کرنا ہو وہ حلال روزی میں یقیناً گذر کر سکتا ہے البتہ ظاہراً اس میں لوگوں کی نگاہوں میں قدرے سبکی ہو گی سو اول تو یہ بھی خیال غلط ہے ایسے شخص کی قلوب میں بڑی وقعت ہوتی ہے حکام بھی ایسے شخص کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہم نے فرض کیا کہ سبکی ہی ہوتی ہے مگر اس کو گوارا کرنا چاہیئے اور خیال کرنا چاہیئے کہ اگر ہم سود یا رشوت لیں گے تو آخرت میں سبکی ہو گی جب حشر کی سبکی کا خوف دل میں ہو گا اس سبکی پر نظر نہ جائے گی اور اس کی پرواہ بھی نہ ہو گی واللہ ہم لوگ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں ورنہ یہ عذر کبھی زبان پر نہ آتے اچھا صاحبو! یہ عذر آپ کا کہ بدون اس کے گذر نہیں ہو سکتا اگر مان بھی لیا جائے تو یہ بھی صرف انہیں گناہوں میں چل سکتا ہے جن کے چھوڑنے میں آمدنی کا نقصان ہوتا ہے جیسے سود یا رشوت مگر پھر سوال یہ ہے کہ جن گناہوں کے چھوڑنے میں آمدنی کا نقصان بھی نہیں ہوتا وہ کیوں کئے جاتے ہیں جیسے جھوٹ، غیبت، مسلمان آدمی کو خوامخواہ ستانا اور نظر بد کیا نگاہ بد سے بھی کچھ غلہ بڑھ جاتا ہے جس کے چھوڑنے سے وہ مقدار غلہ کی کم ہو جائے گی آخر ان گناہوں کے کرنے میں آپ کو کونسی مجبوری ہے اور ان سے بچنے میں کونسا نقصان ہے ان کو چھوڑنے میں آپ کیا عذر کریں گے بلکہ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں سے روزی کم ہو جاتی ہے ابن ماجہ میں ہے اِنَّ الْعَبْدَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِخَطِيئَةٍ يَعْمَلُهَا یقیناً بندہ گناہ سے جس کو وہ کرتا ہے رزق سے محروم ہو جاتا ہے گناہ سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے گناہ کرنے والے سے راحت کوسوں دور ہے۔ کھانے پینے کی فراغت کا نام عیش نہیں ہے اصلی عیش دل کی راحت اور چین ہے جو گنہگار کو نصیب بھی نہیں اور اہل طاعت کے دل میں بے چینی کا نام نہیں ہوتا جب دنیا ہی میں گناہوں سے یہ عذاب ہو رہا ہے پھر نہ معلوم گناہ کرنے میں کیا مصلحت ہے واللہ مسلمان کو تو گناہ کچھ بھی مزہ نہیں دیتا کافر تو بیفکر ہو کر گناہ کرتا ہے کیونکہ اسے آخرت کا یقین نہیں مگر مسلمان کو تو گناہ

کرتے وقت بھی مزہ نہیں آتا۔ بار بار دل میں خوف خدا سے خطرہ پیدا ہوتا ہے پھر یہ شخص غفور رحیم کے مضمون کو آڑ بنا کر اس خطرہ کو ٹالتا ہے غرض ایک کشمکش میں دل پڑ جاتا ہے پھر ایسی حالت میں گناہ کا کیا لطف کمبخت کو آئیگا وہی مثل ہے گناہ اور بے لذت۔ اور اس مقدمہ کے کہ اللہ غفور رحیم ہے آجکل بالکل غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ سے جو ضرر ہوتا ہے وہ ضرر بھی نہ پایا جائے اگر غفور رحیم ہونے کے یہ معنی ہیں تو کوئی صاحب ہمت کرکے سنکھیا تو کھالیں اگر غفور رحیم ہونے کے یہی معنی ہیں کہ مضر شے کا ضرر زائل ہوجاتا ہے تو چاہئے کہ سنکھیا کھالیں تو وہ بھی ضرر نہ کرے حالانکہ وہ ضرر ضرور کرتا ہے معلوم ہوا کہ یہ معنی اس کے نہیں پس نہ معلوم کہ گناہوں کی بابت یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ اس اعتقاد کے بعد وہ ضرر بھی نہیں کریں گے صاحبو! گناہ کی ظلمت تو ضرور پیدا ہوگی اور اس ظلمت کے ساتھ دخول جنت مشکل پس یا تو خدا بعد میں سچی توبہ کی توفیق دے اور یہ توبہ ایسی جرأت کرنے والوں کو بہت کم نصیب ہوتی ہے ورنہ اُس ظلمت کے دور کرنے کے لئے عذاب جہنم موجود ہے اِلَّآ اَنْ یَّرْحَمَ بِفَضْلِہٖ (مگر یہ کہ اللہ اپنے فضل سے رحم کریں) جب اعتقاد غفور رحیم سے دنیا کا ضرر رفع نہیں ہوتا تو یہ بڑی سخت غلطی ہے کہ اس اعتقاد سے آخرت کا ضرر مرتب نہ ہونا سمجھ لیا جائے خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں ارادہ کا بیان ہے اور متعلق کے اعتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں محمودہ و مذمومہ ان دونوں کے احکام اس آیت میں مذکور ہیں اور اس وقت میں انہیں کو بیان کرنا چاہتا ہوں غور سے سنئے۔ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا. وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا یعنی جو کوئی عاجلہ کا یعنی دنیا کا ارادہ کرتا ہے اس کو ہم جلدی اسی جگہ جو چاہیں اور جس کے لئے چاہیں دیدیتے ہیں ذرا تھوڑی دیر غور کیجئے کہ دنیا کے طالب کو دنیا عطا فرمانے کا پختہ وعدہ نہیں فرماتے بلکہ اتنی قیدیں ہیں کہ مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ کہ جتنا ہم چاہیں اور جس کیلئے چاہیں عطا کردیں گے معلوم ہوا کہ ہر طالب دنیا کا مراد کو پہنچنا لازم اور ضروری نہیں اور اگر دنیا کے دینے کا پختہ وعدہ بھی ہوتا جب بھی وہ تو لینے کے قابل نہ تھی اور میں اس کو دلیل سے بتلاتا ہوں دیکھئے اگر ایک شخص کسی کو دو مکان دکھلائے ایک خستہ و خراب دوسرا نہایت

عمدہ اور یہ کہدے کہ خراب تو اسی وقت تم کو مل سکتا ہے اور بعد ایک ماہ کے واپس لے لیا جائیگا اور دوسرا اس وقت نہیں مل سکتا بعد ایک ماہ کے ملیگا اور وہ واپس نہیں کیا جائیگا اور دونوں ساتھ مل نہیں سکتے تو بتلایئے اس صورت میں کیا کیا جائیگا ظاہر ہے کہ کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی اس ویران کو اختیار نکریگا اس فیصلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ عمدہ ہی گھر لینا چاہیئے گو بعد مدت ملے صاحبو! اس شخص کو تو آپ جج بنکر بھی فیصلہ سنائیں گے کہ ویران گھر کو ہرگز اختیار نہ کرے مگر جب یہی معاملہ آپکے ساتھ ہوا تو اپنے اس فیصلہ کو بھول گئے صاحبو! حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے سامنے دو گھر پیش کردیئے ہیں ایک دنیا جو کہ اسی وقت مل سکتی ہے مگر بعد چندے چھین لیجائیگی اور خراب وخستہ وفانی بھی ہے دوسرا گھر آخرت ہے جو عمدہ ہے اور باقی رہنے والا ہے یہاں آپنے آخرت کو کیوں اختیار نہیں کیا گذشتہ مثال میں تو ایک ماہ کی بھی مہلت تھی اور یہاں تو کچھ بھی میعاد نہیں شاید ہمیں نفس نفس واپسی بود (شاید سانس واپسی سانس ہو) زندگی کا کیا اعتبار ہے ایک منٹ کا بھی بھروسہ نہیں طاعون کا حال معلوم ہے کہ کس طرح دفعۃً مخلوق کا صفایا کر دیتا ہے کل کا مرنے والا آج کیا جانے کہ میں کب مروں گا وہ تو آج بہت کچھ امیدیں اپنے دل میں کرتا ہوگا مگر اسے موت کی کچھ بھی خبر نہیں کہ سر پر آچکی ہے تو یہاں دنیا کی میعاد تو ایک مہینہ کیا ایک ہفتہ ایک دن بھی نہیں ہے ہر سکنڈ میں خطرہ ہے کہ اسی وقت ختم ہوجائے تو کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایسا گھر جس کی اتنی کم میعاد اور فنا ہونیوالا اور جس کی کوئی راحت بھی تکلیف سے خالی نہیں آپنے اختیار کیا اور آخرت کو جس کے ملنے کے لئے ایک سانس کی دیر ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا اور اس میں راحت ہی راحت ہے تکلیف کا نام بھی نہیں آپنے چھوڑ دی حالانکہ اگر ایسی صورت کوئی دوسرا شخص آپ سے پوچھنے آئے تو آپ اس کو یہی رائے دیں گے کہ خراب خستہ فانی چیز ہرگز لینے کے قابل نہیں میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دنیا کو بالکل چھوڑ دیجئے شکایت اور افسوس تو اس کا ہے کہ اس کو آخرت پر ترجیح دے رکھی ہے۔ غرض یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ دنیا کے ملنے کا اگرچہ وعدہ بھی ہوتا تب بھی وہ لینے کے قابل نہ تھی چہ جائیکہ اس کے دینے کا پورا وعدہ بھی نہیں پھر حالت یہ ہے کہ دنیائے فانی کو اختیار کرنے سے تو بعض اوقات آخرت کا حصہ بالکل نہیں ملتا جیسے کہ کفار کو اور آخرت اختیار کرنے سے یہ نہیں ہوتا کہ دنیا بالکل نہ ملے بلکہ آخرت اختیار کرنے والے کو دنیا بھی ملتی ہے اگرچہ اتنا فرق ہے کہ آخرت والیکو دنیا کم ملتی ہے اور دوسروں کو زیادہ اور یہ فرق بھی صرف ظاہر ہی میں ہے ورنہ غریب لوگ جتنا لطف دنیا کا اٹھاتے ہیں امیروں کو وہ نصیب بھی۔ غریب لوگ امیروں سے زیادہ

کھاتے ہیں اور سب ہضم کر لیتے ہیں صحت اچھی رہتی ہے خوش وخرم رہتے ہیں درد سر اور زکام وغیرہ کو جانتے بھی نہیں امیروں کو آئے دن مسہل لینے پڑتے ہیں۔ ایک غریب آدمی کی کسی رئیس سے دوستی تھی۔ غریب آدمی بہت موٹا تازہ تھا اور رئیس صاحب دُبلے پتلے بیمار سے رہتے تھے ایک دن ان رئیس صاحب نے اپنے غریب دوست سے کہا کہ یار یوں تو تم غریب ہو مگر دیکھنے میں مجھ سے زیادہ موٹے ہو ایسی تم کیا غذا کھاتے ہو اس نے کہا کہ میں تم سے زیادہ لذیذ کھانا کھاتا ہوں اور ہر مہینے نیا نکاح کرتا ہوں امیر نے اس کا مذاق اڑایا اس نے کہا مذاق کی کیا بات ہے کل کو تمہاری دعوت ہے امیر نے قبول کر لیا اور بڑی حیرت ہوئی دوسرے دن جب کھانے کا وقت ہوا وہ امیر صاحب غریب دوست کے گھر پہونچے تو اس نے باتیں شروع کیں باتوں باتوں میں بہت دیر ہو گئی اُن رئیس صاحب نے کھانے کا تقاضا کیا اس نے ٹال دیا کہ ابھی تیار نہیں ہوا ذرا سی دیر ہے اور پھر باتوں میں لگا لیا یہاں تک کہ رئیس صاحب کا مارے بھوک کے بُرا حال ہو گیا اور بار بار تقاضا کیا جب اس نے بُرا حال دیکھا تو یہ کہا کہ تازہ کھانا تو ابھی تیار نہیں ہوا باسی روٹی رکھی ہے اور ساگ ہے کہو تو لاؤں اس نے کہا جو کچھ ہو لے آؤ باتیں نہ کرو چنانچہ وہ باسی روٹی اور ساگ لے آیا اور ان رئیس صاحب نے اندھے باؤلوں کی طرح اُسے کھانا شروع کیا ہر لقمہ پر سبحان اللہ کہتے جاتے جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکے تو نفیس کھانے بھی اُس نے پیش کئے مگر چونکہ وہ خوب سیر ہو کر کھا چکے تھے اب عذر کر دیا اس نے کہا کہ کھایئے یہ بہت لذیذ ہیں امیر بولا بس جی اس سے زیادہ لذیذ نہیں غریب دوست بولا کہ جناب وہ لذیذ کھانا یہی ہے بھوک میں باسی کھانا جو ہم کھاتے ہیں تو یہ تمہارے پلاؤں سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ تم تو ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے ہی رہتے ہو بھوک سے نہیں کھاتے ہو میرا یہی مطلب تھا وہ رئیس مان گئے کہ واقعی تم لوگ ہم سے زیادہ اچھا کھانا کھاتے ہو پھر پوچھا کہ لذیذ کھانے کا مطلب تو معلوم ہو گیا اب یہ بتلاؤ کہ ہر مہینہ نکاح تم کیسے کرتے ہو اس نے کہا کہ میں اپنی بیوی کے پاس مہینہ میں ایک بار جاتا ہوں جبکہ طبیعت میں پوری رغبت ہوتی ہے اور شہوت جوش میں ہوتی ہے تم لوگوں کی طرح روزانہ یا دوسرے تیسرے نہیں جاتا پس مجھے ہر مہینے ایسا ہی لطف آتا ہے جیسا کہ نئے نکاح میں آتا ہے اور تم کو تو سوچ فکر سے شہوت کو برانگیختہ کرنا پڑتا ہے اس سے تمھیں کچھ لطف نہیں آتا۔

وہ رئیس صاحب مان گئے کہ واقعی تمہاری دونوں باتیں سچی تھیں اور تم لوگ ہم سے زیادہ لطف میں ہو تو غریبوں کو جتنا ملتا ہے حلاوت کے ساتھ وہ اُسے کھاتے ہیں ہاں خدا اس سے تو بچائے کہ کھانے ہی کو نہ ملے اور حاکم کی نوبت آئیگی جب ضرورت ملنے کے بعد غریب آدمی زیادہ حلاوت سے کھاتا ہے کام کاج

کر کے بھوکا تھکا ماندہ شوق و رغبت سے کھاتا ہے اور امیر لوگ تو کمیٹی اور مشورہ کے بعد کھانا کھاتے ہیں کہ پہلے خادم آیا کہ میاں کھانا تیار ہے جواب دیدیا بھوک نہیں پھر ایک دوسرا آیا کہ حضور فاقہ اچھا نہیں کچھ تو نوش جان فرمالیجئے یار دوستوں کے کہنے سننے کے بعد وہ کچھ زہر مار کرتے ہیں کیونکہ بے بھوک کھایا ہوا تو زہر ہی ہو کر لگے گا۔ صاحبو! اگر تم کو امیروں کی تکلیف کا حال معلوم ہو جائے تو تم امیری سے پناہ مانگو اور اگر امیروں کو تمہاری راحت کا حال معلوم ہو جائے تو وہ غریبی کی تمنا کرنے لگیں مگر پہلے وہ بات پیدا کر لو جس سے غریبی میں لطف آئے یعنی قناعت وکفایت علی الضروریات آپ کو تو کھو رکھا ہے تکلف نے اور وضع نے جس کی وجہ سے خوامخواہ قرض کی نوبت آتی ہے اور پریشانی رہتی ہے اگر تکلف اور پابندی وضع نہ ہو بلکہ جیسا جس وقت حال ہو اسی کے موافق چال چلن ہو تو کبھی پریشانی پاس نہ آئے۔ بے تکلفی کا ایک عجیب واقعہ میں سناتا ہوں ہمارے قصبہ کے قریب ایک قصبہ ہے اس میں ایک حکیم صاحب رہتے ہیں جو ہمارے حضرات ہی کی اولاد میں ہیں ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ان کے یہاں مہمان ہوئے تو انھوں نے بے تکلف چپکے سے آکر مولانا سے عرض کیا کہ یہاں آپ کے بہت معتقد ہیں اگر آپ فرمائیں تو کہیں دعوت کا ڈھنگ ڈالوں کیونکہ میرے یہاں تو آج فاقہ ہے دیکھئے ذرا بھی تو ان پر مولانا کی تشریف آوری کا اتنا بار نہ ہوا کہ کہیں سے ادھار لیکر دعوت کرنے کا خیال کرتے جب اپنے گھر میں فاقہ تھا تو مہمان سے صاف کہدیا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی کیا اچھے مہمان تھے فرمایا بھائی میں تو تیرا مہمان ہوں جب تیرے گھر فاقہ ہے تو میں بھی فاقہ ہی سے رہونگا خبردار کسی سے دعوت کا تذکرہ نہ کیجو صبح سے شام ہو گئی اور سارا گھر فاقہ سے بیفکر رہا یہاں تک کہ مغرب کے وقت ایک مریض آیا اور حکیم صاحب کو گیارہ روپے دے گیا اس وقت حکیم صاحب نے آکر مولانا سے عرض کیا کہ حضرت جی آپ کی دعوت کیلئے خدا نے گیارہ روپے بھیجدیئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی کھانے میں تکلف نہ کرنا۔ انہوں نے کہا حضرت یہ مجھ سے نہ ہوگا جب نہیں تھا تو میں نے آپ سے فاقہ تک کرالیا اور اب جبکہ خدا نے آپ کی برکت سے یہ روپے بھیجدیئے تو اب میں کھانا عمدہ پکواؤں گا۔ چنانچہ پلاؤ وغیرہ تیار کرایا اور خوب مزہ سے کھایا۔ ایک شخص نے ایک اور عجیب حکایت بیان کی کہ میں اپنے ایک دوست کے یہاں الہ آباد میں مہمان ہوا تو ایک روز اس کے بچے بڑی خوشیاں کر رہے تھے کہ ابا جی ہمارے یہاں شیخ جی آئے وہ شخص کہتے تھے کہ میں سمجھا کہ شاید کوئی بزرگ آئے ہوں گے دیر تک میں اسی کا منتظر رہا کہ ان بزرگ کی میں بھی زیارت کروں مگر جب دیر ہوگئی اور نہ کوئی بزرگ آئے اور نہ ان کا سامان آتا نظر آیا اور کھانا

وقت بھی گذر گیا تو میں نے دریافت کیا کہ یہ بچے شیخ جی کسے کہہ رہے ہیں لوگوں نے کہا کہ آج اس گھر میں فاقہ ہے ان لوگوں نے فاقہ کا نام شیخ جی رکھا ہے جب فاقہ ہوتا ہے تو بچوں کو بہلا دیتے ہیں کہ آج شیخ جی آئے ہیں روٹی نہیں ملے گی بچے ایسی خوشی سے رہتے ہیں کہ ان کو فاقہ سے رنج ہی نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے صبر و استقلال کا کہ بڑے تو بڑے بچے تک بھی پریشان نہ ہوتے تھے غرض یہ بات واضح ہو گئی کہ آخرت کے لئے کوشش کرنے والوں کو دنیا میں بھی بقدر ضرورت آسائش ملتی ہے گو زیادہ نہ ملے مگر وہ اس تھوڑی ہی دنیا سے وہ لطف حاصل کرتے ہیں کہ طالبان دنیا کو باوجود کثرت مال کے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا۔ مگر طلب دنیا کے ساتھ آخرت اس طرح نہیں مل سکتی تو اب بتلایئے کہ طالب دنیا ہونا عقلمندی ہے یا طالب آخرت ہونا حالانکہ آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ایسی حقیر ہے کہ اگر آخرت سے محرومی کی صورت میں اس کے ملنے کا پورا بھروسہ بھی ہوتا جب بھی وہ لینے کے قابل نہ تھی چہ جائیکہ آخرت چھوڑ کر دنیا کے ملنے کا پورا بھروسہ بھی نہ ہو کیونکہ ارشاد فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۔ یعنی جو کوئی دنیائے عاجلہ کا ارادہ (و طلب) کرے ہم اس کو دنیا ہی میں فی الحال جس قدر چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں پھر اس کے لئے جہنم مقرر کر دیتے ہیں جس میں وہ برائی اور ذلت کے ساتھ داخل ہوگا اور جو لوگ کہ آخرت کا ارادہ کریں اور اسکے لئے سعی کریں جو اس کے لئے ہوا کرتی ہے درانحالیکہ وہ مومن بھی ہوں تو ان لوگوں کی کوشش کی قدر کیجائیگی اب ذرا دونوں مضمونوں میں غور کر لیا جائے کہ طلب دنیا و طلب آخرت دونوں کے ثمرات کو کس طرح بیان کیا گیا ہے طالب دنیا کی بابت تو ارشاد ہے عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ یعنی ہم طالبان دنیا میں سے جس کو چاہتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں دیدیتے ہیں معلوم ہوا کہ نہ سب کا کامیاب ہونا ضروری اور نہ یہ ضروری کہ جو وہ چاہا کریں وہی مل جایا کرے بلکہ جو حق تعالیٰ چاہیں گے دیدیں گے ۔ اور طالبان آخرت کے متعلق ارشاد ہے أُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا کہ جو آخرت کی طلب کوشش عملی اور ایمان کے ساتھ کرتے ہیں ان کی کوشش کی قدر کیجائیگی ایمان اور سعی کی قید۔ واقعی ہے احترازی نہیں اور یہ دراصل بیان ہے مَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ کا کہ ارادہ آخرت کہتے ہی ہیں ایمان اور

عمل صالح میں سعی کرنے کو کیونکہ اس کے بدون طلب آخرت متحقق ہی نہیں ہوسکتی ہے اور یہاں سے رد ہوگیا ان لوگوں کا جو کہ اپنے کو طالب آخرت سمجھتے ہیں مگر عمل صالح نہیں کرتے کہ دراصل یہ لوگ طالب آخرت ہی نہیں طلب کے لئے علامت بھی چاہیئے طلب آخرت کی علامت یہی ہے کہ ایمان اور عمل صالح اختیار کیا جائے اور میں نے یہ مضمون کہ سَعٰی لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ (اس کے لئے سعی کریں جو اس کے لئے ہوا کرتی ہے درانحالیکہ وہ مومن بھی ہوں) قید واقعی ہے اسی لئے بیان کیا تاکہ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس آیت میں جو ثمرۂ ارادۂ آخرت کے متعلق مذکور ہے وہ صرف ارادہ کا ثمرہ کہاں ہے بلکہ سعی اور ایمان اور ارادہ اس سب مجموعہ کا ثمرہ ہے اور دعویٰ تمہارا ارادۂ آخرت کے ثمر کا ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ زائل ہوگیا کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ یہ قید واقعی ہے اور آرادہ کا بیان اور اس کی شرح ہے رہا یہ سوال کہ پھر اس کے مقابل ارادۂ عاجلہ کی تفسیر کیوں نہ بیان کی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ ارادۂ آخرت کی اس تفسیر سے مقصود یہ ہے تاکہ ارادۂ آخرت کا سہل ہونا معلوم ہوجائے کہ اس میں معمولی سعی اور ایمان کی ضرورت ہے تاکہ اس کے بعد آخرت کی طلب کے لئے رغبت دل میں پیدا ہو بخلاف ارادۂ دنیا کے کہ اس کی ترغیب مقصود نہیں اس لئے اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی علاوہ ازیں یہ کہ ارادۂ آخرت کی تفسیر کے متعلق تو لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کوئی کسی طریقہ کو طلب آخرت سمجھتا ہے کوئی کسی طریقہ کو اس لئے اسکی تفسیر کی ضرورت تھی اور ارادۂ دنیا کو تو ہر شخص سمجھتا ہے اس کے بیان کی حاجت نہ تھی بس ارادۂ دنیا و آخرت میں ایک تو فرق یہاں یہ بتلایا گیا کہ طلب دنیا سے یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ مطلوب حاصل ہی ہوجائے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر اک کو حاصل ہوجائے اور طلب آخرت کا ہمیشہ قدر ہوتی ہے وہ ضائع نہیں سکتی۔ دوسرا ایک لطیف اشارہ ایک خاص فرق کی طرف اس آیت میں اور بھی ہے جو اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور ابھی تک اس آیۃ کی تفسیر میں نظر سے نہیں گذرا ممکن ہے کسی نے لکھا بھی ہو وہ یہ کہ اس جگہ دو جملے شرطیہ ہیں اور ہر ایک میں تعلق شرط کا جزا کے ساتھ مختلف عنوان سے بیان کیا گیا ہے ارادہ دنیا کی بابت تو ارشاد ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ یہ صیغہ استمرار کا ہے۔ ترجمہ یہ ہوا کہ جو کوئی دنیا کو طلب کرتا رہے اور ہمیشہ طلب میں منہمک رہے تب کچھ ملتا ہے اور ارادہ آخرت کے متعلق مَنْ اَرَادَ بدون لفظ کان کے ارشاد فرمایا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوا کہ ثمرۂ اخروی حاصل ہونے کے لئے طلب میں مرنا کھپنا نہیں پڑتا بلکہ کچھ ارادہ کرنے سے بھی وہ ثمرہ حاصل ہوجاتا ہے اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ طالب آخرت کا ارادہ اور طلب مستمر نہیں ہوتا کچھ دنوں کے بعد ارادہ

و طلب زائل ہو جاتا ہے نہیں حقیقت میں تو وہ بھی مستمر رہتا ہے مگر تھوڑی سی سعی و طلب کے بعد وہ حکم میں غیر مستمر کے ہو جاتا ہے کیونکہ محبت الٰہی پیدا ہو جانے کے بعد وہ ارادہ اتنا سہل ہو جاتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے کے لئے اہتمام کرنا نہیں پڑتا وہ ارادہ خود بخود پیدا ہوتا رہتا ہے اگرچہ پیدا اختیار سے ہوتا ہے مگر بوجہ اعانت غیبی کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود بدون اختیار کے پیدا ہو رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آخرت کی طلب محبوب سرکار ہے اس میں سعی کرنے والے کی اس طرف سے امداد ہوتی ہے جس سے وہ بالکل سہل ہو جاتی ہے حدیث شریف میں ہے مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا جِئْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً اور دنیا مردود بارگاہ الٰہی ہے اس میں ہمیشہ دقت و تعب ہی رہتا ہے اس کے لئے ہمیشہ اہتمام و اہتمام از خود کرنا پڑتا ہے اور یہ طلب ہمیشہ بتکلف از سر نو پیدا کرنی پڑتی ہے پس حقیقۃً تو دونوں ارادے مستمر ہوتے ہیں مگر بوجہ سہولت و اعانت غیبی کے ارادۂ آخرت گویا مستمر نہیں رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا خود بخود اس کے دل میں اُن اعمال کا تقاضا پیدا کر دیتا ہے اور ارادۂ دنیا حقیقۃً اور حکماً دونوں کے اعتبار سے مستمر ہے اسی لئے اس کے ساتھ کان استمرار کے لئے بڑھایا گیا اور ارادۂ آخرت کے بیان میں کان نہیں بڑھایا گیا اور شرح اس سہولت و اعانت کی یہ ہے کہ طلب آخرت میں قدرے سعی کرنے سے جب نسبۃ مع اللہ پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے ایک کیف اور حال ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے اسی کو عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(طریق زہد خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے مجھے تو طریق عشق میں چلائیے)

رہ قلندر سے یہی طریق عشق و نسبت مع اللہ مراد ہے اور رسم پارسائی سے وہ طریق عبادت جو بدون نسبت و محبت ہو مراد ہے جس میں اعمال کی یہ حالت ہوتی ہے جو بعد میں مذکور ہے ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

(کعبہ کے طواف کو گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا تو نے حرم سے باہر کیا کیا ہے جو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے

ریا کا سجدہ کر کے مجھ کو بھی خراب کیا)

وہ کیف نسبت مع اللہ کا ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کام نہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کام کرنا کچھ دشوار نہیں رہتا اور اس طریق میں کچھ باطنی مشقت بھی پیش آتی ہے مگر وہ اس سے بددل نہیں ہوتے بلکہ اس میں بھی اُن کو بڑا لطف آتا ہے اسی کی بابت ارشاد ہے

؎ از محبت تلخہا شیریں بود

اور ارشاد ہے ؎

ناخوشِ تو خوش بود برجان من — دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو طبیعت ناگوار ہی کیوں نہ ہو میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

اور کہا گیا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

اور کہا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو — دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہو دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں)

اور اس نسبت مع اللہ سے اور سب کام تو آسان ہو ہی جاتے ہیں جو سب سے بڑی خوفناک چیز ہے جس سے سب لوگ ڈرتے ہیں یعنی موت وہ بھی ان کے لئے ایسی خوشگوار ہوجاتی ہے کہ اس کی یہ لوگ تمنائیں کرتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جان طلب کروں

اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے

تو دیار محبوب کے در تک خوش و خرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)

شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ یہ سب باتیں موت کی تمنا کی پہلے ہی ہوں گی جب موت آئی ہو گی اس وقت حقیقت معلوم ہوئی ہو گی تو یہ خیال غلط ہے ابن فارض رحمۃ اللہ علیہ نے عین موت کے وقت دکھلا دیا کہ اہل نسبت تم وقت کیسے مطمئن ہوتے ہیں اُن کا واقعہ ہے کہ جب مرنے لگے تو آٹھوں جنتیں اُن کے سامنے پیش کر دی گئیں تو انہوں نے جنتوں سے منہ پھیر لیا اور یہ شعر اسی وقت پڑھا ؎ اِنْ کَانَ مَنْزِلَتِیْ فِی الْحُبِّ عِنْدَ کُمْ مَاقَدْ رَأَیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِیْ

کہ اگر میری اس محبت کی یہی قدر تھی جو میں دیکھ رہا ہوں کہ جنتیں میرے سامنے کر دی گئیں تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کئے یعنی میں نے تو محبت اس کے واسطے نہیں کی تھی میں تو کسی اور چیز کا طالب ہوں یہ کہتے ہی آٹھوں جنتیں چھپا دی گئیں اور ایک خاص تجلی حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہوئی اُسی کے ساتھ جان پرواز کر گئی اسی مضمون کو قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

مجھے آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

؎ گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

(اگر ملک الموت میری جان لینے کو آئے تو میں جب تک آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں جان نہ دوں گا)

یعنی اگر ملک الموت میری جان قبض کرنے آئیں تو جب تک تجلی خاص نہ دیکھ لوں گا جان نہ نکلنے نہ دوں گا حق تعالیٰ رحم فرمائے ابن فارض پر انہوں نے اس حالت کو کر کے دکھلا دیا کہ بدون تجلی خاص کے چلنے پر راضی نہ ہوئے اسی لئے میں کہتا تھا کہ طالب آخرت کا ارادہ اگرچہ مستمر ضرور ہوتا ہے مگر بوجہ سہولت و اعانت غیبی کے گویا وہ بالکل ارادہ ہی نہیں کرتا سب کام بدون اس کے ارادہ کے ہوتا رہتا ہے کیونکہ میرا مطلب یہ نہیں کہ ان سے کبھی گناہ نہیں ہوتا یا یہ معصوم ہیں نہیں بلکہ تقاضا معصیت کا ان کو بھی ہوتا ہے کیونکہ نفس ان کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے مگر ان کے تقاضے کی اور دوسروں کے تقاضے کی ایسی مثال ہے

جیسے کہ ایک تو شائستہ گھوڑا شرارت کرے کہ اس کو ذرا سی چمکار میں سیدھا کر لیتے ہیں اور ایک غیر شائستہ گھوڑا شرارت کرے کہ وہ نہ مارنے سے سیدھا ہوتا ہے نہ چمکارنے سے وہ جب شرارت کرتا ہے سوار کو پٹک دیتا اور زین کو بھی پھینک دیتا ہے تو اب یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ گھوڑا شائستہ ہونے کے بعد بھی کبھی شرارت کرنے پر آتا ہے مگر وہ بہت جلد سیدھا ہو جاتا ہے۔ اہل نسبت کی ایسی ہی مثال ہے یہی لوگ ہیں جو پلصراط پر برق کی طرح جائیں گے کیونکہ پلصراط جیسا کہ اہل کشف نے لکھا ہے شریعت کی صورت مثالی ہے جو لوگ دنیا میں شریعت پر بسہولت چلتے تھے اور شریعت پر چلنا ان کو ایسا آسان اور خوشگوار ہو گیا تھا جیسا کہ دوسروں کو کھانا پینا سونا یہ لوگ پلصراط پر بھی بآسانی گذر جائیں گے بس مضمون مقصود ختم ہو چکا اب اس آیت میں چند نکات سمجھئے جو اس وقت ذہن میں ہیں ان کو بیان کر کے بس بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ایک نکتہ یہ ہے کہ طالبین دنیا کے بارے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے عجلنا لہ فیہا ما نشاء لمن نرید کہ طالبین دنیا میں سے ہم جس کو چاہیں گے جس قدر چاہیں گے عطا کر دیتے ہیں۔ اس کا مقتضا تھا کہ اس کے مقابلہ میں طالبین آخرت کے لئے یہ فرمایا جاتا اعطیناہ ما یشاء کہ ہم طالب آخرت کو جو کچھ وہ چاہے گا وہی دیں گے کیونکہ جب دنیا والوں کے لئے یہ فرمایا گیا کہ ان کو جو ہم چاہیں گے وہ دیں گے تو بظاہر اس کے مقابل طالبین آخرت کے لئے فضیلت پوری اس طرح معلوم ہوگی کہ اُن کو اُن کی طلب کے موافق سب کچھ دیا جائے مگر بخلاف اس کے اس آیت میں ما یشاء نہیں فرمایا گیا بلکہ بجائے اُس کے اُولٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا فرمایا گیا تو بات یہ ہے کہ اگر اس جگہ حق تعالیٰ اہل آخرت کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے کہ ان کو جو کچھ وہ چاہیں گے وہی دیا جائیگا تو اس میں درحقیقت کچھ زیادتی نہ ہوتی بلکہ وعدہ گھٹ جاتا کیونکہ نعمائے آخرت کی شان یہ ہے ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر یعنی نہ ان کو آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سُنا نہ کسی بشر کے قلب پر ان کا خیال گذرا تو بتلایئے کہ جب وہاں کی نعمتوں کا یہ حال ہے تو اگر یہ فرمایا جاتا کہ طالبین آخرت کو جو کچھ وہ چاہیں گے دیا جائے گا اس سے زیادتی ہوتی یا کمی بہت کمی ہو جاتی کیونکہ وہاں کی نعمتوں کا ہم کو وہم بھی نہیں ہو سکتا پھر ہماری خواہش کے موافق جو ہم کو ملتا وہ تو بہت ہی کم ہوتا۔ حق تعالیٰ شانہ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہمارے واسطے انھوں نے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کا ہم کو خطرہ بھی نہیں ہو سکتا اور وہاں کا ثواب ہماری خواہش پر

موقوف نہیں فرمایا بلکہ اپنی رحمت سے بہت زیادہ عطا فرمائیں گے۔ اسی کے بارے میں مولانا کا ارشاد ہے ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل میخری گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد — آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لے ضعیف وحقیر وفانی جان لیتے ہیں۔ جان باقی دیتے ہیں۔ جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا وہ عطا کرتے ہیں)

اب آپ نے سمجھا کہ ما یشاء نہ فرمانا ہی ہمارے لئے رحمت ہے اس وجہ سے حق تعالیٰ شانہ نے اجمالاً فرمادیا اولئك كان سعيهم مشكورا یعنی ان لوگوں کی کوشش کی اس دربار میں قدر ہوگی اسی سے سمجھ جاؤ کہ جن کی کوشش کی قدردانی ایسے عظیم الشان قدردان بادشاہ کے دربار میں ہو ان کو کیا کچھ ملے گا اس کا اندازہ اس سے کرلو کہ بادشاہانِ دنیا جب کسی کی قدردانی کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں وہ یہ نہیں کیا کرتے کہ خدمت کی حیثیت پر انعام واکرام کریں بلکہ وہ اپنی حیثیت کے موافق انعام واکرام کیا کرتے ہیں جس کا اس کو وہم بھی نہیں ہوتا پھر جس کی قدردانی حق تعالیٰ شانہ اپنی عظمت کے موافق فرمائیں گے اندازہ کرلو اسے کیا کچھ ملے گا اس وقت اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دوسرا اشارہ وسعیٰ لها سعيها میں ہے کہ یہ کلام اس سعی کے سہل ہونے پر دال ہے جیسا کہ اردو محاورہ میں بھی بولا جاتا ہے کہ اس کام کے لئے جو تدبیر ہے وہ کرنی چاہیئے اُس تدبیر کو بیان نہ کرنا اور اجمالاً یہ کہدینا کہ جو تدبیر اس کی ہے وہ کرنی چاہیئے اس سے اُس تدبیر کا معلوم اور سہل ہونا معلوم ہوجاتا ہے اسی طرح یہ کلام یہاں پر وارد ہوا ہے کہ جو لوگ طالب آخرت ہیں اور اس کے لئے وہ سعی کرتے ہیں جو اس کی سعی ہے ان کی کوشش کی قدر ہوگی اس طرز کلام سے اس سعی کا معلوم ہونا اور سہل ہونا سمجھا جاتا ہے مطلب یہ کہ وہ سعی مختصر اور مشہور ہے بیان کی ضرورت نہیں۔ تیسرا اشارہ مشکورا میں اس بات کی طرف ہے کہ جو کچھ آخرت میں ملیگا وہ محض قدردانی ہے عمل کو اس میں دخل نہیں اس سے ناز کرنے والوں کو تنبیہ مقصود ہے کہ اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہیئے جو کچھ وہاں ملے گا محض انعام ہوگا ورنہ تم عمل سے اُس کے مستحق نہیں ہوسکتے

وجہ یہ کہ طاعت ادائے حق خداوندی ہے اور اس کے حقوق غیر متناہی ہیں اور حقوق غیر متناہی کا ادا کرنا موقوف ہے عمل غیر متناہی پر اور ہم بوجہ حادث (یا پیدا ہونیوالا) و متناہی ہونے کے عمل غیر متناہی سے عاجز ہیں تو عقلاً انسان ادائے حق خداوندی سے عاجز ہے تو اب جو کچھ بھی اسے ملے وہ محض قدر دانی نہیں تو اور کیا ہے یہاں سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا ہوگا جو بعض رحمدل لوگوں کے دلوں میں آیا کرتا ہے کہ کافر کے واسطے ہمیشہ کے لئے خلود فی النار کیوں مقرر ہوا۔ کفر تو اس نے کیا تھوڑی مدت تک یعنی دنیا کی زندگی میں اور سزا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم یہ تو بظاہر عدل کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ کافر نے حق تعالیٰ کے ساتھ جب شرک و کفر کیا تو اس نے حق تعالیٰ شانہ کے حقوق غیر متناہیہ کو ضائع کیا اور حقوق غیر متناہیہ پر سزا غیر متناہی موافق قاعدۂ عقل کے ہے غرض عمل صالح سے تو حقوق غیر متناہیہ ادا نہیں ہوتے اور کفر سے حقوق غیر متناہیہ ضائع ہو جاتے پس عمل متناہی کے بدلے جزا غیر متناہی جو مومنین کو عطا ہو گی یہ البتہ عقل سے آگے ہے عقل یوں کہتی ہے کہ جب عمل متناہی ہے تو جزا بھی متناہی ہونی چاہیئے ۔ لوگ آج کل عقل عقل گاتے پھرتے ہیں مگر یہ عقل ان کی خیر خواہ نہیں دشمن ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را

بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزما لیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا)

یہ لوگ ہمیں بے عقل بتلاتے ہیں مگر ہمیں ایسی عقل کی ضرورت نہیں اس سے ہم بے عقل ہی اچھے مگر خیر بھی ہے یہ بے عقلی کس کے لئے ہے ؎

ما اگر قلاش دگر دیوانہ ایم

مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور دیوانہ ہیں کیا پرواہ کی بات ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی ان کی محبت کے متوالے ہیں)

خدا کا دیوانہ ہزار عاقلوں سے بہتر ہے۔ ع "اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد"

پس مشکورا فرمانے سے بتلا دیا کہ عقل تو چاہتی ہے کہ تمہارا اجر کم ہوتا مگر یہ ہماری قدر دانی ہے ایک حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں اپنے عمل سے کوئی نہ جائے گا ہاں رحمتِ الٰہی ہو جائے تو اور بات ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا اور اس سوال کی ہمت بھی انہیں کو تھی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا انت کیا آپ بھی اپنے عمل سے جنت میں تشریف نہ لے جاویں گے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے اس سوال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف غالب ہو گیا اور آپ نے سر مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ کہ میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا مگر یہ کہ خدا کی رحمت میری دستگیری کرے۔ صاحبو! اب کس کی ہمت ہے جو اپنے عمل کو کچھ سمجھے ہماری تو وہ مثال ہے جو کسی بزرگ نے بیان فرمائی ہے ؎

چو آں کرمے کہ در سنگے نہانست
زمین و آسمان وے ہمانست

مولانا نے اس کی مثال میں ایک اور حکایت بیان فرمائی ہے ایک بدوی کی جس نے بجز اپنے گاؤں کے گڑھوں کے کبھی پانی نہ دیکھا تھا اور قحط میں ان کے خشک ہو جانے سے دنیا سے پانی کو ناپید سمجھتا تھا کہ وہ کسی خلیفہ بغدادی کے پاس زمانہ خشک سالی میں ایک گھڑا شیریں پانی کا لے گیا تھا بڑی دور دراز مسافت سے وہ گھڑا سر پر رکھے ہوئے جب پہنچا تو خلیفہ کے دربار میں اسکو پہنچا دیا گیا خلیفہ نے پوچھا اس نے کہا کہ اے امیر المؤمنین یہ جنت کا پانی ہے خلیفہ نے بہت قدردانی سے وہ گھڑا لے لیا اور حکم کیا کہ سونے سے پُر کر کے اس گھڑے کو واپس کر دیا جائے اور حکم دیا کہ اس کو نہر دجلہ کی طرف کو واپس کیا جائے تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ یہ ہم نے محض اُس کی محبت کی قدر کی ہے ورنہ آبِ شیریں کی ہمارے یہاں کمی نہیں۔ اسی طرح قیامت میں جب ہم اپنے اعمال کی جزا دیکھیں گے کہ اس قدر بے شمار نعمت ہے تو معلوم ہو گا کہ یہ سب محض قدردانی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہ اپنے مومن بندے کا حساب چھپا لیں گے اور فرمائیں گے کہ ہم نے تم پر یہ یہ انعام فرمائے تھے تم نے پھر بھی نافرمانی کی فلاں گناہ کو یاد کرو تم نے فلاں دن یہ کام کیا تھا اُس دن یہ کام کیا تھا غرض گناہوں کی فہرست شمار

فرمائیں گے یہاں تک کہ مومن یہ سمجھے گا کہ بس میں ہلاک ہوا اور ہر طرف سے اپنے کو جہنم کے قریب دیکھے گا اس وقت حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی یہاں بھی ہم پردہ پوشی کرتے ہیں پھر اس کے نامۂ اعمال میں سے گناہوں کو محو فرمادیں گے اور ان کی جگہ اعمال حسنہ درج فرمادیں گے۔ یہ ہے اولٰئك يبدل الله سيئاتهم حسنات کا مضمون کچھ ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ مسلمانوں کو اپنی رحمت سے دوسروں کے سامنے ذلیل نہ فرمائیں گے بلکہ دوسروں کے سامنے اُس کی عزت بڑھائی جائیگی اور یوں ظاہر کیا جائیگا کہ گویا اُس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ صاحبو! ایسے خدا کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو کیا اس کا حق تمہارے اوپر کچھ بھی نہیں جو یوں نافرمانی پر کمر بستہ ہوتے ہو۔ ایسے رحیم کریم خدا کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا کرو اور اُس کی محبت میں کوشش کرو۔ بس اب میں وہ ترکیب بتلاکر جس سے حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا ہو بیان ختم کرنا چاہتا ہوں اُس کی ترکیب یہ ہے کہ سب سے پہلے علمِ دین بقدر ضرورت حاصل کرو کہ بدون اس کے خدا تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کا پتہ چلے گا اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے پکا عہد کرو کہ آئندہ گناہ نہ کریں گے اور گذشتہ گناہوں سے سچی توبہ کرو اور سچی توبہ یہی ہے کہ آئندہ کے لئے پختہ عہد کر لیا جائے کہ اب گناہ نہ کریں گے توبہ کے وقت عہد پختہ کرنا چاہیئے اس کے بعد اگر غلطی سے عہد ٹوٹ جائے تو توبہ پھر ایسی پختگی کے ساتھ کی جائے اور اس پختہ عہد کے بعد اگر پھر گناہ ہو جائے تو صلوٰۃ التوبہ کے ساتھ توبہ کرنی چاہئے خالی زبانی توبہ پر اکتفا نہ کیا جاوے کہ یہ علاج ہے نفس کا جس کی اب زیادہ ضرورت ہوگئی ذرا چند روز اس کا التزام کر کے تو دیکھو کہ پھر گناہوں سے طبعی نفرت ہوتی ہے یا نہیں بڑا مجرب نسخہ ہے اور نہایت سہل کہ جب گناہ ہو جائے تو وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھ کے توبہ کی جائے ہر گناہ پر ایسا ہی کیا جائے آخر کار گناہ سے طبعی نفرت اور طاعت کی طبعی رغبت پیدا ہو جائے گی۔ اور اس کے ساتھ ہی کسی کامل کی صحبت کو تلاش کرو اہل اللہ سے ملتے رہو اُن سے اپنا حال کہو دین میں اُن سے مدد لو کہ صحبت کامل اکسیر اعظم ہے۔ یہ صحبت بجلی کی طرح اثر کرتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دنیا سے دل یکسو اور آخرت

کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور سونے کے وقت دن بھر کے تمام کاموں کا حساب کیا کرو جتنے گناہ ہو گئے ہیں اُن پر نادم ہو کر استغفار کر کے سوؤ اور کچھ وقت تنہائی کا اللہ کی یاد کے واسطے نکالو یہ پانچ باتیں ہوئیں ان پر عمل کر کے دیکھئے ان شاء اللہ حق تعالیٰ کے ساتھ دل کو پورا لگاؤ ہو جائیگا اور اتنی سہولت کے بعد بھی کوئی نہ کرے تو ایسے ناقدرے کو خدا تعالیٰ ہی ہدایت فرمائیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں توفیق عطا فرمائیں۔ والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد النبی الامی وعلی الہ واصحابہ وسلم۔

تمت بالخیر

اعلان ختم سال

اس دسمبر ۱۹۸۱ء کے رسالہ الابقاء پر آپ کا زرِ سالانہ ختم ہو گیا سالِ جدید ۱۹۸۲ء کے لئے الابقاء اگر آپ کو جاری رکھنا ہے تو بیس ۲۰ روپے آج ہی روانہ فرمادیں۔

وی پی رجسٹری کا خرچہ دو ۲ روپے زائد خرچ ہوتا ہے آپ کو اگر دو ۲ روپیہ کا نقصان سے بچنا ہے تو آج ہی اولین فرصت میں بیس ۲۰ روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں والسلام۔

افسوس ناک اعلان

ایک بہت ہی نیک اور نیک کام کی طرف دوڑ کر چلنے والے نے کراچی کے چند امام اور خطیب مسجد کے نام یہ رسالہ الابقاء اپنی طرف سے زرِ سالانہ ۱۹۸۱ء کا ادا کر کے اس ۱۹۸۱ء کے پورے سال بھر کے لئے جاری کرایا تھا۔ وہ تو جاری کرا کر اللہ تعالیٰ کے یہاں چلے گئے اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اب نیا سال ۱۹۸۲ء شروع ہونے والا ہے اگر آپ کو یہ رسالہ پسند ہے تو نئے سال ۱۹۸۲ء کیلئے بیس ۲۰ روپے ارسال فرمادیں۔ اگر ناپسند ہے تو ایک خط سے مطلع فرمادیں۔ وی پی کا انتظار کراچی کے امام صاحب اور خطیب مسجد نہ فرمادیں بلکہ زرِ سالانہ بیس روپیہ کا منی آرڈر بھیجدیں۔

منی آرڈر بھیجنے کا پتہ۔ محمد عبدالمنّان غفرلہٗ مکتبہ تھانوی مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ۱

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

الوعظ المسمّٰی بہ

خَیرُ الارشَاد لحقوق العبَاد

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمّد عبد المنّان غُفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ——— دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی ١

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

خیرالارشاد لحقوق العباد

این	کہاں ہوا	جلال آباد مکان تحصیلدار صاحب ضلع مظفر نگر
متٰی	کب ہوا	۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ بروز دوشنبہ بوقت چاشت
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹے ۵۰ منٹ
کیف	کیونکر ہوا	تخت پر کرسی رکھوا کر کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا
لم	کیوں ہوا	تحصیلدار صاحب کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	حقوق العباد کے اہتمام کی تاکید اور یہ کہ حق العبد کے فوت کرنے میں حق اللہ بھی فوت ہوتا ہے نیز حقوق العباد میں کوتاہی کا سبب بیان فرما کر اس کا ازالہ کیا گیا۔
لمن ای شان	کن کو زیادہ مفید تھا	تمام مسلمانوں کو عموماً اور اہل حکومت کو خصوصاً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	الاحقر ظفر احمد عفا عنہ ووفقہ لما یحب ویرضیٰ
المستمعون	سامعین کی تعداد کتنی تھی	مجمع رجال تقریباً ۵۰ اور پردہ میں مجمع مستورات ان کے علاوہ تھا
الاشتات	متفرقات	اس وعظ کی تسوید تفصیلی ۲۱ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ بروز شنبہ کو شروع ہوکر یکم رجب ۱۳۴۳ھ بروز سہ شنبہ تمام ہوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا و

مولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلےٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۝ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۝

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ پس الزام تو انہی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین پر ناحق تکبر کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہ ایک آیت ہے سورہ شوریٰ کی اس میں حق تعالےٰ نے حقوق العباد کے متعلق ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے گو سباق وسیاق کے لحاظ سے ایک خاص حق العباد کے متعلق واردؔ ہے۔ مگر عموم الفاظ سے مطلقاً حقوق العباد کے متعلق بھی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ عبارۃ النص سے تو اس کی دلالت معنی مسوق لہ پر ہے جو کہ ایک خاص حق العبد ہے اور اشارۃ النص سے مطلق حقوق العباد پر دلالت ہے یعنی مطلق حقوق العباد پر اس کی دلالت اشارۃً ہے نہ کہ قصداً مگر دلالت خفی نہیں بلکہ صریح ہے اور اس کو میں لے اس لئے اختیار کیا ہے کہ جی یوں چاہا کرتا ہے کہ ہر موقع پر خواہ موقع زمانی ہو یا مکانی مضمون ضرورت کے موافق بیان ہوا ور یوں تو شریعت کے سارے مضامین ہی ضروری ہیں مگر ان میں سے بھی جن کی شدید ضرورت ہو اس کا

ے کیونکہ اس سے اوپر یہ آیت ہے وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْھِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ط اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ الآیہ اور اس کے بعد یہ آیت ہے وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ اس ماقبل ومابعد کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ فی الوعظ میں ظلم سے مراد انتقام کے وقت ظلم کرنا ہے مگر الفاظ آیت خود عام ہیں نیز جب ظلم بوقت انتقام کی یہ حالت اور اس پر یہ وعید ہے تو ابتدا رکلام تو اس سے اشد ہے اس پر بدرجہ اولیٰ یہ وعید ہوگی۔

بیان کیا جائے اور یہ شدت ہماری غفلت اور بے التفاتی سے بڑھ جاتی ہے کہ ایک حکم ضروری العمل ہو اور اس سے غفلت اور بے التفاتی برتی جا رہی ہو چنانچہ اس وقت میرے خیال میں اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی زیادہ ضرورت ہے بلکہ جب مجھ سے کئی ہفتہ پہلے بیان کے لئے کہا گیا تھا تو اسی وقت دل میں یہ بات آئی تھی کہ اس جگہ حقوق العباد کے متعلق بیان کی ضرورت ہے مگر اس وقت باحتمال بارش کے یہاں آنے کی ہمت نہ ہوئی اور میں نے کہدیا تھا کہ جس دن بادل نہ ہوا اس دن چلوں گا چنانچہ اس جمعہ کو جو مجھ سے تاریخ پوچھی گئی تو میں نے پیر کا دن اسی شرط کے ساتھ معین کر دیا تھا گو آج بھی بادل گھرا ہوا تھا اور ہمت آنے کی نہ ہوتی تھی مگر جب سواری آگئی تو میں نے بار بار سواری واپس کرنا گوارا نہ کیا اور خدا کے نام پر چلا آیا (اور بحمد اللہ بادل کے وقت گئے تھے اور کھلے میں واپس آئے لوٹتے وقت بادل نہ رہا تھا ۱۲ ظ) تو اس مضمون کا خیال مجھے درخواست کے ساتھ ہی آگیا تھا چنانچہ آج اس کو بیان کرنے کا موقع ملا ہے تو بیان کرتا ہوں اور شروع ہی سے میں نے اطلاع بھی کر دی کہ میں یہ بیان کروں گا۔ میری عادت ہے کہ جس مضمون کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے میں اس کو پہلے ہی صاف صاف کہدیتا ہوں تاکہ روح بیان اور خلاصہ کے علم سے باقی مضمون سہولت سے سمجھ میں آجائے۔ نیز اس میں چونکہ تفصیل بعد الاجمال ہوتی ہے اس لئے وہ اوقع فی النفس (دل میں زیادہ اترنے والا) بھی ہوتی ہے بخلاف عام مقرروں کے کہ ان میں بعض دفعہ بیان کرنے والا مقصود کو توطیہ و تمہید کے بعد ادا کرتا ہے اور اس میں بھی ایک حکمت ہے وہ یہ کہ اس میں دیر تک سامعین کو مضمون مقصود کا اشتیاق رہتا ہے اور اشتیاق کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے اس کی وقعت ہوتی ہے اور دوسرے یہ بھی حکمت ہے کہ اگر وہ مضمون ایسا ہو

ؔ اس وقت بھی جبکہ میں یہ مقام لکھ رہا ہوں اتفاق سے بادل گھرا ہوا ہے اور بارش کی ضرورت ہے حق تعالیٰ شانہ امن وامان وعافیت ورحمت کی بارش نازل فرمائیں ۱۲ ظ

جس سے طبائع پر گرانی ہوتی ہو تو پہلے ہی سے اس مضمون کو سن کر لوگوں پر گرانی نہ ہو اور بعض سامعین اٹھ اٹھ کر نہ چلدیں جیسا کہ چندہ کے متعلق بیان کرنے والے پہلے ہی سے یہ نہیں کہتے کہ آج چندہ کا بیان ہوگا بلکہ اول مذہب کے حقوق اور علم کے فضائل بیان کرتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں کہ حفاظت اسلام کی بہتر صورت مدارس وغیرہ کا قیام ہے پھر کہتے ہیں کہ ان کا قیام سب مسلمانوں کی توجہ و ہمت سے ہوسکتا ہے۔ اب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کرتا۔ اول تو میں چندہ کے متعلق بیان ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا ہوں تو اول ہی کہدیتا ہوں کہ آج چندہ کا بیان ہوگا جس کا جی چاہے بیٹھے اور جس کا جی نہ چاہے اٹھ کر چلا جائے میں چندہ کے مضمون کو تو طیہ و تمہید کے بعد اس لئے نہیں کہتا کہ اس سے سننے والوں کو دھوکا ہوتا ہے کیونکہ وہ تو یہ سمجھ کر بیٹھتے ہیں کہ ہم سے کچھ مانگا نہ جائے گا اور جب اخیر میں ان سے چندہ کو کہا گیا تو بعض کو ناگوار ہوتا ہے اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ ہم کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ اخیر میں ہم سے چندہ مانگا جائے گا تو ہم اتنی دیر تک اپنا وقت نہ ضائع کرتے۔ دوسرے اس طرز سے تمہیدی مضامین کی ساری وقعت سامعین کے دل سے نکل جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس یہ سارا زور شور اس لئے تھا کہ ہمیں چندہ دو۔ سو میں مسلمانوں کو دھوکہ دینا نہیں چاہتا اور نہ احکام علوم شرعیہ کی وقعت کھونا چاہتا ہوں جس مضمون کے متعلق مجھ کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس سے بعض سامعین پر گرانی ہوگی میں پہلے ہی اس کو ظاہر کر دیتا ہوں اس کے بعد جو کوئی بیٹھے گا مطمئن ہوکر بیٹھے گا اور مجھ پر اس کے بیٹھے رہنے کا کچھ احسان نہ ہوگا اور نہ وہ میرے اجمال وابہام کی وجہ سے بندھے گا۔ ان وجوہ سے میں ابہام کو پسند نہیں کرتا اور اگر کسی کو تو طیہ و تمہید سے صرف دفع وحشت عن المضمون مقصود ہو اور کوئی نیت نہ ہو تو تمہید کے بعد مقصود کے بیان کرنے کا بھی مضائقہ نہیں کیونکہ دفع وحشت سامع بھی مطلوب ہے مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں اس پیشہ والوں کی نیت تو طیہ و تمہید سے یہ نہیں ہوتی کہ سامعین کی وحشت مضمون سے دفع ہو بلکہ زیادہ تر اپنی مصلحت مدنظر رکھتے ہیں۔

کہ کہیں لوگوں کو ہم سے وحشت نہ ہوجائے اس لئے وہ چندہ کے مضمون کو ایسی رنگ آمیزی اور تمہید کے بعد زبان پر لاتے ہیں کہ لوگوں کو ان حضرت واعظ سے وحشت نہ ہو مگر میں اس کو خیانت سمجھتا ہوں کہ واعظ اپنے مصالح کا لحاظ کرکے وعظ کہے۔ اس کو تو مخاطبین کی مصلحت کا لحاظ کرنا چاہیے کہ ان کی اصلاح کس طرز پر زیادہ ہے چاہے اپنی مصلحت رہے یا جائے مجھ کو تو اس سے غیرت آتی ہے کہ اپنی مصالح کا لحاظ کرکے بیان کروں۔

ایک بار میں جودھپور گیا اور مجھ سے اہل شہر نے وعظ کی درخواست کی تو ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ وعظ میں امام ابوحنیفہؒ کے فضائل زیادہ بیان کیجئے گا کیونکہ یہاں کے لوگ آپ کو اور آپ کی جماعت کو ضعیف فی الحنفیہ سمجھتے ہیں (یعنی غیر مقلدی کی طرف مائل سمجھتے ہیں ۱۲) میں نے کہا اب تو میں ہرگز یہ مضمون بیان نہیں کروں گا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ میں لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے وعظ کہوں کہ بھائیو ہمیں حنفیت میں ضعیف نہ سمجھو کیونکہ دیکھو ہم امام صاحب کے ایسے معتقد ہیں تو یہ تو محض اپنی مصلحت ہوئی سامعین کی اس میں کیا مصلحت ہوئی۔ البتہ اگر سامعین میں کوئی امام صاحبؒ سے غیر معتقد ہوتا تو اس صورت میں امام صاحبؒ کے فضائل بیان کرنے میں بیشک مخاطبین کی مصلحت تھی کہ ایک امام صاحب کے ساتھ بدگمانی کرنے سے لوگوں کو رکاوٹ ہوجاتی۔ مگر جب سامعین میں امام صاحبؒ سے غیر معتقد کوئی نہیں تو اب مضمون ان کی مصلحت سے نہ ہوا بلکہ اس میں محض اپنی مصلحت رہ گئی اور مجھ کو اس سے غیرت آتی ہے کہ لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے کوئی مضمون بیان کروں چنانچہ میں نے یہ مضمون (فضائل امام کا) نہیں بیان کیا بلکہ میرے نزدیک سامعین کی اصلاح کے لئے جس مضمون کی ضرورت تھی وہ بیان کیا اور شروع میں یہ بھی کہدیا کہ بعض خیرخواہوں کی یہ رائے تھی کہ آج فضائل امام ابوحنیفہ بیان کئے جائیں اور اس میں مصلحت یہ بتلائی گئی کہ مجھے یہاں پر کر بعض لوگ ضعیف فی الحنفیہ سمجھتے ہیں تو ان کے اس خیال کی اصلاح ہوجائے گی۔ مگر میں اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنی نصرت

ومصلحت کے لئے مریضوں کی مصلحت کو فوت کروں فضائل امام کے بیان سے آپ لوگوں کو کچھ نفع نہ ہوگا کیونکہ آپ میں امام صاحب سے غیر معتقد کوئی نہیں ہاں بظاہر میرا ایک نفع تھا سو میں اپنے نفع کے واسطے بیان کرنا نہیں چاہتا وہ طبیب طبیب نہیں جو نسخہ لکھتے ہوئے اپنی مصالح کی رعایت رکھے (مثلاً ایسی دوائیں لکھے جو اسی کے پاس ملتی ہوں ۱۲) اور مریض کی مصلح کو نظر انداز کر دے اس لئے میں اس مضمون کو چھوڑ کر وہ مضمون اختیار کرتا ہوں جو آپ کے لئے نافع ہے اور جو کچھ بیان کروں گا قرآن وحدیث سے بیان کروں گا جس پر ہر مسلمان عمل کرنے کا طالب ہے اس لئے آپ مضمون پر نظر رکھیں اس کو نہ دیکھیں کہ بیان کرنے والا کیسا ہے۔ میرے اندر ہزاروں عیوب سہی لیکن ان شاء اللہ آپ کو وہی راستہ بتلاؤں گا جو آپ کے واسطے نافع ہے اور اس کو نافع میرے ہی کہنے سے نہ سمجھو خالی الذہن ہو کر سن لو پھر خود غور کرو یا جس سے عقیدت ہو اس سے تحقیق کر لو اس کے بعد بھی اگر غلطی ہو گی معذور رہو اس کے بعد پھر جو بیان ہوا تو سامعین پر بہت بڑا اثر ہوا۔

تجربہ یہ ہے کہ جب مخاطب کی مصلحت کا لحاظ کر کے بیان کیا جائے گا تو اس کا ضرور اثر ہوگا اس لئے میں ہمیشہ مخاطبین کی مصلحت و ضرورت کا لحاظ رکھتا ہوں اور خلاف ضرورت بیان نہیں کرتا۔ اسی لئے میں نے اس وقت یہ مضمون "حقوق العباد" کا اختیار کیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں اس مقام پر یہ سامعین کی مصلحت وضرورت کا مضمون ہے شاید کسی کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ یہ تو پھیکا مضمون ہوگا، تو صاحب بیان تو علاج ہے اور علاج و دوا میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ دوا پھیکی ہے یا میٹھی بلکہ ضرورت اور نفع کو دیکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی دوا پھیکی ہی ہو یا اس سے بڑھ کر یہ کہ کڑوی ہو مگر ضرورت کے موافق کہ اس سے زیادہ نافع کوئی دوا نہ ہو تو بتلایئے اس وقت اس کو ترجیح ہو گی یا اس میٹھی دوا کو جو نہ ضرورت کے موافق ہے نہ زیادہ نافع ہے اس لئے اس کو مت دیکھو کہ یہ مضمون

پھیکا ہے یا جوشیلا بلکہ اس کو دیکھئے کہ یہ آپ کی ضرورت کا بھی ہے یا نہیں سو ضرورت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ دیندار لوگ بھی عبادات میں تو فرائض و واجبات بلکہ مستحبات تک کا اہتمام کرتے ہیں یعنی جو لوگ کام کرنے والے ہیں اگرچہ بعض ایسے بھی ہیں کہ سب ہی اعمال میں کوتاہی کرتے ہیں مگر جو کام کرنے والے ہیں وہ عبادات میں تو فرائض و واجبات کے لئے بھی کوشش کرتے ہیں مستحبات کی بھی پابندی کرتے ہیں درود شریف اور تسبیحات حتیٰ کہ دلائل الخیرات اور وظائف تک کا اہتمام کرتے ہیں اور گو یہ دلائل و حزب برکت کی چیزیں ہیں اور ان میں ثواب بھی ہے مگر دلائل الخیرات اور حزب البحر وغیرہ یہ جتنے وظائف آجکل معمول بہا ہیں حدیث کے اوراد کے برابر ہرگز نہیں ہیں غرض بعض لوگ ان زوائد کے پابند ہیں مگر حقوق العباد کا ان کو بھی خیال نہیں۔ بس آجکل لوگوں نے محض نوافل و تسبیحات پڑھنے کو دین داری سمجھ لیا ہے۔

حالانکہ اصل دینداری معاملات سے معلوم ہوتی ہے چنانچہ سلف کے نزدیک دینداری کا معیار زیادہ تر معاملات ہی تھے۔ صرف نماز و روزہ کرتے ہوئے دیکھ کر کسی کے دیندار ہونے کا حکم نہ لگاتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربار میں ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں مدعی کے پاس دو گواہ تھے۔ ایک گواہ کی عدالت تو حضرت عمرؓ کو معلوم تھی۔ دوسرے گواہ کی عدالت کا ان کو علم نہ تھا تو آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا کہ اس گواہ کی عدالت کے متعلق تم سے کوئی گواہی دیتا ہے ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ میں اس کے عادل ہونے پر گواہ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تجھ کو اس کا عادل ہونا کیسے معلوم ہوا "هَلْ جَاوَرْتَهُ اَمْ صَحِبْتَ مَعَهُ فِي السَّفَرِ الَّذِيْ يُسْفِرُ عَنِ الْحَقِيْقَةِ الْمَرْءِ وَعَقَدْتَ مَعَهُ عَقْدًا" کیا تو اس کے پڑوس میں کبھی رہا ہے یا سفر میں کبھی تیرا اور اس کا ساتھ ہوا ہے جس سے انسان کی مخفی حقیقت ظاہر ہوتی ہے یا تو نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ بیع و شرا کا کیا ہے اس نے کہا نہیں قَالَ فَعَلَّكَ

رَأَیْتُهٗ خَارِجًا مِنَ الْمَسْجِدِ بَعْدَ الصَّلٰوۃِ" فرمایا تو شاید تم نے اس کو نماز پڑھ کر مسجد سے نکلتا ہوا دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے کہا جی ہاں۔ فرمایا "فَاَنْتَ لَا تَعْرِفُہٗ" تم اس کو نہیں پہچانتے محض اتنی بات سے کسی کا دیندار اور عادل ہونا معلوم نہیں ہو سکتا تو دیکھئے حضرت عمرؓ نے محض نماز اور تسبیحات کو دینداری کے لئے کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ساتھ معاملات کی درستی کو بھی ضروری سمجھا مگر آج کل ہم لوگوں نے اس کو دین سے بالکل خارج سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ دین کا ایسا ضروری جزو ہے کہ اس کے بدون آدمی گواہی دینے کے قابل نہیں ہوتا اس سے آپ کو اس مضمون کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی کیونکہ جس بات سے اتنی غفلت ہو کہ باوجود ضرورت کے لوگ اس کو ضروری نہ سمجھتے ہوں وہ بہت زیادہ اہتمام کے قابل ہوگا، اس لئے غور سے اس مضمون کو سننا چاہیئے گو اس میں لطف نہ آئے اور وہ مضمون یہ ہے کہ ہم لوگوں نے "حقوق العباد" کو بالکل ہی پس پشت ڈال رکھا ہے اور اس مرض کا ایک سبب ہے پہلے اس کو معلوم کرلینا چاہیئے اور سبب کے علم سے ایک گونہ ایک لوگوں کا عذر بھی معلوم ہو جائے گا۔ جن کی میں شکایت کر رہا ہوں اور عذر کے بعد ان کا جرم بھی ہلکا ہوجائے گا گو ان لوگوں کو اپنا عذر خود بھی معلوم نہیں مگر میں تبرعاً خود ان کا عذر بتلائے دیتا ہوں کیونکہ عذر کا جواب دے دینے سے پھر حجت تام ہوجاتی ہے اس لئے میں اتمام حجت کیلئے ان کا عذر بیان کر کے ان کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ دوسرے سبب مرض کے جاننے سے مرض کا ازالہ بھی سہل ہو جائے گا کیونکہ ع

اِنَّمَا الْاِصْلَاحُ تَبْدِیْلُ الْمِزَاجِ

اصلاح کا طریقہ یہی ہے کہ مریض کے مزاج کو بدل دیا جائے جس کی حقیقت یہ ہے کہ جو سبب ہے اس کے مرض کا اس کو زائل کر دیا جائے تو سنئے کہ تاکدِ حق کے دو سبب ہوتے ہیں کبھی تو عظمت حق کی وجہ سے حق کا تاکد ہوتا ہے اور کبھی حاجت کی وجہ سے عظمت حق کی وجہ سے حق کا موکد ہونا تو ایسا ہے

جیسے باپ کسی کام کو کہے کہ یہ کر اور پڑوسی کہے کہ مت کر یہاں عقلاً اور شرعاً باپ کی اطاعت واجب ہے۔ کیونکہ اس کی عظمت پڑوسی کی عظمت سے زیادہ ہے اس لئے پڑوسی کی بات پر عمل نہ کیا جائے گا بلکہ باپ کی بات پر عمل کیا جائیگا خواہ اس کام میں باپ کا ذاتی نفع بھی نہ ہو لیکن عظمت کی وجہ سے اس کی اطاعت پڑوسی کی اطاعت پر مقدم ہوگی۔ اور خواہ اس کا کچھ نفع ہو جیسے باپ کہے کہ میرا بدن دبا اور پڑوسی کہے کہ میرا بدن دبا تو بتلایئے اس صورت میں پڑوسی کا حق زیادہ ہوگا یا باپ کا۔ سب عقلاء یہاں متفق ہیں کہ باپ کا حق زیادہ ہے اور حاجت کی وجہ سے تاکد کی مثال یہ ہے جیسے ایک سائل آکر آپ سے روپیہ مانگے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو میں برف کی قفلیاں کھاؤں گا (جیسا کہ بعض بھنگڑ رئیسوں سے ایسی فرمائش کیا کرتے ہیں اور وہ ان کو مجذوب سمجھ کر سب کچھ کھلاتے ہیں ۱۲) اور ایک سائل آکر یہ کہے کہ مجھے ایک روپیہ دیدو میرے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں۔ تو بتلایئے اس صورت میں کس کا حق زیادہ ہے آیا اس شخص کا جو برف کی قفلیاں کھانے کو روپیہ مانگتا ہے یا اس غریب کا جس کے یہاں آٹھ دن کا فاقہ ہے یقیناً اس غریب فاقہ زدہ کا حق زیادہ ہے ایسے ہی ایک رئیس کے یہاں شادی ہو جس میں سو روپیہ نیوتہ میں دینے کے لئے آپ لے جا رہے ہوں حالانکہ اس کو آپ کے سو روپیہ کی کچھ بھی ضرورت نہیں اور اسی وقت ایک غریب آدمی پر جو شریف خاندان کا ہے کوئی مقدمہ قائم ہوگیا جس میں ضمانت نہ داخل کی گئی تو اس شریف آدمی کی آبرو جاتی رہے گی تو بتلایئے اس وقت نیوتہ میں امیر کو سو روپیہ دینا چاہیئے جس کو کچھ بھی اس کی پرواہ نہیں یا اس غریب کی آبرو بچانی چاہیئے۔ تو جس کو حس ہوگا وہ سمجھے گا کہ اس صورت میں نیوتہ دینے سے زیادہ ضروری اس غریب کی آبرو کا بچانا ہے یہاں بھی حاجت کی وجہ سے حق کا تاکد ہوگیا غرض آپ دنیا کے معاملات میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تاکد حق کا سبب کبھی عظمت ہے کبھی حاجت مگر دین کے بارے میں اس قاعدہ پر کوئی بھی

خیال نہیں کرتا یہاں سب لوگوں نے تاکدِ حق کو صرف عظمت میں منحصر کرلیا ہے جس کی عظمت قلب میں ہے اسی کے حقوق ادا کیئے ہیں حاجت کو تاکدِ حق کا سبب نہیں سمجھتے اور اگر حاجت کی وجہ سے کسی کا حق ادا بھی کرتے ہیں تو وہ بھی جب کہ اپنے ملنے والوں میں سے کسی امیر کو حاجت پیش آپڑے۔ باقی غریب کی حاجت تو کوئی چیز ہی نہیں کیونکہ آجکل غریب ہونا بھی ایک جرم ہے۔ خصوصاً اس چودھویں صدی میں چنانچہ ایک شخص کہتے تھے کہ آجکل غریبوں کی ایسی حقارت ہے کہ کسی امیر کی ریح صادر ہوجاوے تو تبارک سلامت ہوتی ہے کہ صحت ہوئی۔ اور غریب کی ریح صادر ہو تو کہا جاتا ہے کہ دماغ سڑادیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ غریبوں کی روح کی بھی وہ قیمت نہیں جو امیروں کی ریح کی ہے۔ چنانچہ غریب کے مرنے کا لوگوں کو اتنا رنج نہیں ہوتا جتنا کسی امیر کی ریح بند ہوجانے کا ہوتا ہے۔

کسی شہر میں ایک بیگم صاحبہ نے اپنے محلہ میں سے کسی کے رونے چلانے کی آواز سنی تو ماما سے کہا دیکھنا کیا بات ہے اس نے کہا کہ محلہ میں فلاں غریب آدمی مرگیا ہے۔ اس کے بیوی بچے رو رہے ہیں تو بیگم صاحبہ کہتی ہیں اوئی میں تو یہ سمجھی تھی کوئی آدمی بیمار ہوگیا ہے (یعنی کوئی رئیس ۱۲) گویا ان کے نزدیک وہ غریب تو آدمی ہی نہیں۔ غربا تو ان کے نزدیک گدھے ہی ہیں۔ بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ امیروں کے بیمار ہونے سے بھی رنج ہوتا ہے اور غریبوں کے مرنے کی بھی پروا نہیں یہی وجہ ہے کہ امیروں کو زکام بھی ہوجائے تو سو آدمی ان کی عیادت کو آتے ہیں اور کوئی غریب مرجاوے تو اس کی بیوی بچوں کی تعزیت کو بھی کوئی نہیں جاتا الاقلیل ۱۲) اور بعض لوگ تھوڑے سے غریبوں کی بھی کچھ ہمدردی کرتے ہیں بشرطیکہ مسلمان ہو اور اگر مسلمان نہ ہو بلکہ ہندو ہو جیسے چمار بھنگی تو اس کے حقوق تو سمجھتے ہی نہیں وہ تو گویا بہائم ہیں کہ جو چاہا انھیں کہدیا اور جس طرح چاہا مار پیٹ لیا۔ اور صاحبو! اس وقت کیا ہوگا جبکہ یہ ثابت ہوجائے کہ بہائم کے بھی حقوق ہیں میرا ارادہ ہوا تھا کہ اس وقت حقوق العباد کے بجائے حقوق الخلق بیان کروں جس میں

تمام مخلوق کے حقوق کا بیان ہو جائے کافروں کے بھی اور جانوروں کے بھی مگر سارا قاعدہ بغدادی آج ہی کیونکر ختم کرا دوں اس لئے میں حقوق بہائم کی تفصیل کرنا نہیں چاہتا مگر اجمالاً کہے دیتا ہوں کہ شریعت میں جانوروں کے بھی حقوق ہیں ان انسانوں کے حقوق کیوں نہ ہوں گے جن کو آپ جانور سمجھتے ہیں۔

پس خوب سمجھ لو کہ غریب اگر کافر بھی ہو اس کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ایسے ہی اگر کوئی مسلمان فاسق و فاجر ہو تو اس کے بھی حقوق ہیں۔ گناہ کرنے سے یا کفر کرنے سے وہ وقف نہیں ہو گیا کہ آپ جو چاہیں اس کے ساتھ معاملہ کریں ایک بزرگ نے کسی شخص کو حجاج بن یوسف کی غیبت کرتے ہوئے دیکھا تھا تو فرمایا جس طرح حق تعالیٰ حجاج سے ان لوگوں کا بدلہ لے گا جن پر اس نے ظلم کیا تھا ایسے ہی حجاج کا بدلہ ان لوگوں سے لے گا جنھوں نے اس کی غیبت وغیرہ کی ہوگی۔ حجاج خدا کی نافرمانی کرنے کے سبب کے لئے وقف نہیں ہو گیا کہ جو بھی چاہے اس کو برا بھلا کہے۔

سبحان اللہ ایسا کون قانون ہے جس میں باغیوں کے بھی حقوق ہوں۔ یہ خدا ہی کا قانون ہے جس میں باغیوں تک کے حقوق ہیں حتیٰ کہ کافروں کے بھی حقوق ہیں چنانچہ بیٹے کو جائز نہیں کہ وہ جہاد میں اپنے کافر باپ کو قتل کرے گو وہ خدا کا باغی ہے مگر خدا تعالیٰ نے بیٹے پر اُس کا یہ حق رکھا ہے۔ غرض ہم لوگوں نے تاکد حق کا سبب محض عظمت کو سمجھ لیا ہے۔ اور یہ مرض دینداروں میں بھی ہے کہ وہ بھی اہل عظمت ہی کے حقوق کو زیادہ ادا کرتے ہیں میں نے ایک دفعہ دیوبند کے مدرسہ میں طلبہ سے کہا تھا کہ تم لوگ اساتذہ کی عظمت نہیں کرتے نہ ان کے حقوق کی رعایت کرتے ہو پھر میں نے کہا کہ شاید آپ اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ ہم تو حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی بہت عظمت کرتے ہیں اور ان کی خدمت بھی کرتے ہیں تو ذرا دل میں غور کر لو کہ مولانا کی یہ عظمت و خدمت محض استاد ہونے کی وجہ سے ہے یا ان کی شہرت و عظمت کی وجہ سے ہے ظاہر ہے کہ محض حق استادی کی وجہ سے تم مولانا کی عظمت نہیں کرتے ورنہ اس کی کیا وجہ کہ اور استادوں کی

عظمت و وقعت نہیں کی جاتی آخر وہ بھی تو استاد ہیں معلوم ہوا کہ مولانا
کی عظمت بوجہ شہرت کے کرتے ہو کہ وہ سب سے زیادہ بزرگی وغیرہ میں مشہور
ہیں تو جب اہل علم میں بھی یہ مرض ہے کہ وہ مشاہیر اہل عظمت ہی کے حقوق ادا
کرتے ہیں پھر دوسروں کا تو کیا کہنا غرض اس غلطی میں قریب قریب سب ہی
مبتلا ہیں کہ لوگوں نے تاکد حق کے مدار کو عظمت ہی میں منحصر سمجھ لیا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ حقوق اللہ کی تو کچھ رعایت کی بھی جاتی ہے اور حقوق العباد کی رعایت
بالکل نہیں کی جاتی۔ کیونکہ عظمت کے لحاظ سے بندہ خدا کے سامنے کچھ بھی نہیں
حق تعالیٰ کی وہ عظمت ہے کہ اس کے سامنے بندہ مِنْ حَيْثُ هُوَ بندہ (یعنی اس
حیثیت سے کہ وہ بندہ ہے) کچھ عظمت نہیں رکھتا بندہ چاہے کیسا ہی عظیم ہو
حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اس کی عظمت مٹ جاتی ہے جیسے آفتاب
کے سامنے چاند اور ستاروں کی روشنی مٹ جاتی ہے حالانکہ اس وقت آفتاب
پر بادل بھی آرہا ہے مگر چاند ستاروں کے مٹانے کے لئے وہ اب بھی کافی ہے

چو سلطان عزت علم بر کشد ۔
جہاں سر بجیب عدم در کشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہوجاتی ہیں)

دیکھئے جگنو رات کو تو چمکتا ہے مگر دن کو نہیں چمکتا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تو
دن میں کہاں رہتا ہے جو نظر نہیں آتا کہا میں تو دن میں اسی جگہ رہتا ہوں
جہاں رات کو سوتا ہوں مگر دن میں آفتاب کے سامنے چمک نہیں سکتا
شیخ سعدی اسی کو فرماتے ہیں ۔

نگہ دیدہ باشی کہ در باغ و راغ ۔ بتابد ہمی کرمکے چوں چراغ
کسے گفتش اے کرمک شب فروز ۔ چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز
نہ بینی کہ آں کرمک پاک زاد ۔ جواب از سر روشنائی چہ داد
کہ من روز و شب جز بصحرا نیم ۔ ولے پیش خورشید پیدا نیم

(ترجمہ) (شاید تم نے دیکھا ہوگا کہ باغ وصحرا میں رات کے وقت جگنو مثل چراغ کے چمکتا ہے تو اس سے کسی نے پوچھا تو دن میں کیوں نہیں نکلتا دیکھو اس خاک نژاد کیڑے نے کیسا بصیرت افروز جواب دیا کہ میں رات دن یہیں صحرا میں رہتا ہوں مگر آفتاب کے سامنے گم ہو جاتا ہوں)

اسی لئے حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا کہ عزت وعظمت بتمامہا حق تعالیٰ کے لئے ہے اس کی عظمت کے سامنے کسی کی کچھ عظمت نہیں اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری جگہ تو حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ کہ عزت اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور مومنین کے لئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لئے بھی عظمت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں عزت بالذات کا ذکر ہے اور دوسری جگہ عام ہے۔ بالذات اور بالواسطہ کو پس حاصل یہ ہوا کہ عزت بالذات تو بتمامہا اللہ ہی کے لئے ہے اور عزت بواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے بھی ہے غرض بالذات اور بالعرض کا فرق ہے بالذات کے درجہ میں سوائے حق تعالیٰ کے کسی کے لئے بھی عظمت نہیں انسان چاہے کتنا ہی بڑا عظیم ہو اس کی عظمت بالذات نہیں بلکہ بالعرض ہے جو کہ عظمت الٰہی کے سامنے سلب ہو جاتی ہے۔ یہی تو وہ بات ہے جس کو مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا تھا جس پر آج اعتراض ہو رہے ہیں انھوں نے بھی وہی کہا ہے جو فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا (عزت بتمامہا اللہ ہی کے لئے ہے) سے مفہوم ہو رہا ہے اتنا فرق ہے کہ حق تعالیٰ نے فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا عربی میں فرمایا ہے اور مولانا شہیدؒ نے اسی مضمون کو اردو میں کہدیا ہے باقی بات ایک ہی ہے زبان بدلنے سے حکم نہیں بدل جاتا زبان تو وہ چیز ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس کا کچھ بھی اعتبار نہیں ان کی نظر تو حقیقت پر رہتی ہے، اور یہی حال اہل اللہ کا ہے ہمارے حاجی صاحب قدس سرہ کے پاس ایک رومی شیخ آئے تھے اس وقت حاجی صاحب

مثنوی کا درس دے رہے تھے اور حاجی صاحبؒ کی عادت تھی کہ تقریر اردو میں فرمایا کرتے تھے گو حضرت کو فارسی پر بھی پوری قدرت تھی اور وہ شیخ فارسی سمجھ بھی لیتے مگر بے تکلف زبان اردو ہی تھی اس لئے اپنی ہی زبان میں تقریر فرمارہے تھے مگر با ایں ہمہ وہ شیخ رومی درس سے محظوظ ہورہے تھے۔ حالانکہ وہ اردو بالکل نہ سمجھتے تھے درس کے وقت کسی خادم نے حضرت سے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے تو انھیں کتنا لطف آتا جو بغیر سمجھے بھی اس قدر محظوظ ہورہے تھے۔ حاجی صاحب نے فرمایا میاں ان مضامین کے لئے اس زبان کی قید نہیں وہاں تو کوئی دوسری ہی زبان ہے۔ پھر مولانا کے یہ شعر پڑھے ؂

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است — عشق را خود صد زبان دیگر است

بوئے آں دیر چو پراں می شود — ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

(فارسی میں کہو اگرچہ عربی بہتر ہے عشق کی خود سیکڑوں زبانیں دوسری ہیں اس دیر کی بوجب اڑتی ہے یہ تمام زبانیں حیران ہوتی ہیں۔)

بلکہ بعض اوقات بے زبانی میں وہ اثر ہوتا ہے جو زبان دانی میں نہیں ہوتا میں نے ابھی (وعظ سے پہلے) مجمع احباب میں کہا تھا کہ ریل کے سفر میں ایک ڈپٹی صاحب مجھ سے ملے اور بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں میں اخلاق کے ساتھ کھل کر ان سے باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں مغرب کی نماز کا وقت آگیا تو میں اور خواجہ صاحب اور چند رفقاء نماز کے اہتمام میں مشغول ہوگئے۔ وہ ڈپٹی صاحب نماز نہ پڑھتے تھے ویسے ہی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ خواجہ صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ ان ڈپٹی صاحب کو نماز کے لئے کہنا چاہئے کیونکہ یہ آپ سے محبت ظاہر کرتے ہیں آپکا کہنا ان کو ناگوار بھی نہ ہوگا اور امید ہے کہ اثر بھی زیادہ ہوگا اور باوجود قدرت کے امر بالمعروف کو ترک کرنا شاید نامناسب ہو۔ میں نے کہا کہ امر بالمعروف اس موقعہ میں واجب نہیں کیونکہ ان کو نماز کا فرض ہونا معلوم ہے اور یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ چند آدمی نماز کو اٹھے ہیں اب بھی اگر ان کو توفیق نہ ہو تو یہ ان کی کوتاہی ہے

باقی میں تو زبان سے کچھ نہ کہوں گا کیونکہ میرے کہنے سے اگر انھوں نے نماز پڑھ بھی لی تو پڑھیں گے اپنے واسطے اور احسان ہو گا میری گردن پر سو مجھے تو اس سے غیرت آتی ہے کہ دین کے کام میں ان کا احسان اپنے سر لوں اگر آپ کو امر بالمعروف کا ایسا ہی جوش ہے تو آپ خود کیوں نہیں کہتے؟ باقی میں اتنا کہے دیتا ہوں کہ اس وقت نماز کیلئے کہنے کا ان پر وہ اثر نہ ہو گا جو نہ کہنے کا اثر ہو گا۔

غیر خواجہ صاحب نے بھی ان سے کچھ نہ کہا اور میں نماز پڑھ کر ان کے پاس آبیٹھا اور جس بشاشت سے پہلے باتیں کر رہا تھا اسی بشاشت سے اب بھی کرنے لگا میں نے ظاہری برتاؤ سے یہ بات بالکل ان پر ظاہر نہیں ہونے دی کہ مجھے آپ کے نماز نہ پڑھنے سے انقباض ہوا یا آپ کی حقارت میرے دل میں ہے ہرگز نہیں اس کے بعد دوسری نماز کا وقت آیا اور ہم اسی طرح نماز کو اٹھے اور بعد نماز کے میں پھر انھیں ڈپٹی صاحب کے پاس آبیٹھا اور اسی نشاط سے پھر باتیں کرنے لگا اس کا ان کے دل پر بے حد اثر ہوا' اور وہ نماز کے سخت پابند ہو گئے۔ اور ایک صاحب سے کہتے تھے کہ صاحب ریل کے سفر میں جب مولانا نماز کو اٹھے اور میں نہیں اٹھا تو مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا میرے سر پر جوتیاں پڑ رہی ہیں۔ اور غضب یہ کہ مولانا نے مجھ سے ایک دفعہ بھی زبان سے یہ نہ فرمایا کہ آؤ تم بھی نماز پڑھ لو (اگر یہ فرما دیتے تو میں کچھ عذر ہی کر دیتا جس سے شرمندگی کم ہو جاتی ۱۲) اور اس وقت میں یہ خیال کرتا تھا کہ شاید اب نماز پڑھ کر جو مولانا آئیں گے تو نہ میرے پاس بیٹھیں گے نہ مجھ سے بات کریں گے مگر جب وہ نماز سے فارغ ہو کر بدستور میرے پاس آبیٹھے اور اسی بشاشت سے گفتگو کرنے لگے جیسے پہلے کر رہے تھے تو واللہ اس ادا نے تو مجھے ذبح ہی کر ڈالا۔ بھائی اس روز سے میں نماز کا پورا پابند ہو گیا ہوں۔

راوی نے جب ان کا یہ قول مجھ سے نقل کیا تو میں نے لوگوں سے کہا بتلاؤ اس وقت امر بالمعروف کا زیادہ اثر ہوتا یا خاموش رہنے کا زیادہ اثر ہوا۔ امر بالمعروف سے اتنا ہو جاتا کہ وہ صرف اس وقت نماز پڑھ لیتے مگر یہ جو اثر ہوا کہ وہ شرمندگی سے ذبح

ہو ہو گئے اور عمر بھر کے لئے نمازی بن گئے یہ بے زبانی ہی کا اثر تھا تو دیکھئے اس وقت ان کو کچھ نہ کہنے کا وہ اثر ہوا جو کہنے سے نہ ہوتا۔ یہاں بے زبانی سے زیادہ اثر ہوا اور واقعی گو میں نے اُن کو زبان سے نماز کے لئے نہ کہا تھا مگر دل میں یہی نیت تھی کہ ان شاء اللہ میرے سکوت سے ان پر زیادہ اثر ہوگا (چنانچہ ایسا ہی ہوا واقعی حکیم ہر کام کا موقعہ خوب سمجھتا ہے۔ سیاست اسی کا نام ہے کہ ہر شخص کی تربیت اس کے مناسب طریق سے کی جائے اور یہ بات حضرت اقدس میں باکمل وجوہ بحمداللہ نمایاں ہے فللہ درہ من حکیم ۱۲ جامع)

غرض کبھی بے زبانی بھی زبان سے زیادہ کام دیتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ زبان پر اثر کا مدار نہیں پس محض زبان کے بدلنے سے دوسرا اثر لے لینا عجیب بات ہے جو لوگوں کی کم فہمی پر دال ہے۔

ہمارے ملنے والوں میں ایک بزرگ تھے امیر شاہ خاں صاحب وہ پُرانے بزرگوں کے دیکھنے والے تھے تحریکات حاضرہ میں ان کی رائے وہی تھی جو میری رائے ہے۔ ان کا قیام مینڈھو میں رہتا تھا جہاں کچھ دنوں سے مولوی جبیب احمد صاحب کیرانوی بھی مدرس ہو کر پہنچ گئے ہیں ان کی رائے بھی تحریکات حاضرہ میں میرے موافق ہے (بلکہ وہ ہم سے بھی زیادہ پختہ ہیں ۱۲ جامع) مگر لوگوں کی یہ حالت تھی کہ مولوی جبیب احمد صاحب کی باتوں پر تو اعتراض کرتے تھے اور امیر شاہ خاں صاحب سے خوش تھے۔ ایک مرتبہ امیر شاہ خاں صاحب نے مجھے لکھا کہ میرا مسلک بھی وہی ہے جو مولوی جبیب احمد صاحب کا ہے جو وہ کہتے ہیں وہی میں کہتا ہوں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ اردو میں کہتے ہیں اور میں فارسی میں کہتا ہوں اس لئے لوگ میری باتوں سے متوحش نہیں ہوتے اور ان پر اعتراض وطعن کرتے اور بُرا بھلا کہتے ہیں۔ تو حقیقت میں یہ عوام کی کم فہمی ہے ورنہ خدا تعالٰی کے یہاں زبان کی کچھ قید نہیں اس لئے زبان کے بدلنے سے شرعاً حکم نہیں بدل جاتا۔ چنانچہ مولانا شہیدؒ بھی حقیقت میں وہی کہتے تھے جو حق تعالٰی نے فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا

(تمام کی تمام عزت اللہ ہی کے لئے ہے) میں فرمایا ہے۔ مگر انھوں نے اس کو اردو میں کہدیا اس سے لوگ متوحش ہونے لگے اور بے چاروں پر فتویٰ لگانے لگے بہرحال چونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے بندہ کی عظمت کچھ بھی نہیں اس لئے لوگوں کو حقوق العباد کا اہتمام نہیں کہ وہ صاحب عظمت نہیں مگر میں نے بتلادیا ہے کہ تاکد حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر نہیں بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے پس حقوق اللہ کا تاکد تو عظمت کی وجہ سے ہے اور حقوق العبد کا تاکد حاجت کی وجہ سے ہے فقہار نے اس کو سمجھا ہے اور واقعی فقہا حکمائے امت ہیں اسی طرح صوفیہ بھی اور فقہ کی تعریف تصوف کو بھی شامل ہے۔ سلف میں فقہ فقط احکام ظاہرہ کے علم کا نام نہ تھا بلکہ مجموعہ احکام ظاہرہ وباطنہ کے علم کو فقہ کہتے تھے چنانچہ امام صاحب نے فقہ کی تعریف یوں فرمائی ہے "مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا (نفس کا پہچاننا نفع اور نقصان کی باتوں کو) جس میں تصوف بھی داخل ہے تو فقہا جا بجا فرماتے ہیں "حَقُّ الْعَبْدِ مُقَدَّمٌ عَلٰى حَقِّ اللهِ" کہ بندہ کا حق اللہ تعالیٰ کے حق پر مقدم ہے ان کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ عظمت کی وجہ سے ایسا ہے بلکہ احتیاج کی وجہ سے حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہا گیا ہے کیونکہ بندہ محتاج ہے اور حق تعالیٰ احتیاج سے بری ہیں مگر فقہار کا یہ جملہ ظاہر میں ایسا وحشت ناک ہے کہ اگر کوئی صوفی ایسا کہدیتا تو کفر کے فتوے لگ جاتے مگر فقہا نے کے دھڑ

ے میں کہتا ہوں کہ حفظ الایمان کی عبارت دربارہ مسئلہ علم غیب پر جو اہل بدعت نے شور مچایا ہے اسکی بھی یہی اصل ہے کہ مضمون حفظ الایمان کا وہی ہے جو شرح مقاصد وشرح مواقف وغیرہ میں سلف نے بیان فرمایا ہے بلکہ ان کے الفاظ سے حفظ الایمان کے الفاظ بہت کم ہیں مگر سلف نے عربی میں کہا تھا اس لئے ان پر کچھ اعتراض نہ ہوا اور حفظ الایمان میں وہی مسئلہ اردو میں ظاہر کیا گیا تو شور وشغب ہونے لگا۔ اسی طرح بہشتی زیور کا مسئلہ سب کتب فقہ میں مصرح ہے عالمگیری اور درمختار ملاحظہ ہو مگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کیونکہ انھوں نے عربی میں لکھا ہے اور بہشتی زیور پر بعض علمار کالجہلا نے خوامخواہ زبان طعن دراز کی ہے۔ خدا ان کو ہدایت دے ۱۲ جامع

فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے کیونکہ وہ منتظم ہیں ان کو حقوق کا انتظام کرنا ہے اور واقعی حقوق العباد کا اہتمام بدون اس طرح صاف صاف کہے نہیں ہوسکتا تھا مگر ان پر کوئی فتویٰ نہیں لگاتا لوگ ان کو قانونی سمجھتے ہیں اس لئے ان سے ڈرتے ہیں جانتے ہیں کہ اگر ان پر اعتراض کیا گیا تو جھاڑ کی طرح پیچھے لگ جائیں گے اور ایک مسئلہ کے ثابت کرنے کو رسالے کے رسالے تصنیف کر دیں گے اور صوفیہ بیچارے غریب ہیں کسی سے بحث مباحثہ نہیں کرتے اس لئے ان کو سب دباتے ہیں۔ اور ان کی بات بات پر فتوے لگائے جاتے ہیں وہ تو ایسے غریب ہیں کہ کوئی ان کو غریب کہہ بھی دے تب بھی برا نہیں مانتے۔ اور ذرا اہل ظاہر کو تو غریب کہہ دو دیکھو کیسے چڑتے ہیں۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک نواب نے کسی مصلحت سے ایک گنوار کو مجسٹریٹ بنا دیا تھا وہ مقدمات کا فیصلہ کرنے لگا ایک دفعہ کسی نے عرضی پیش کی تو اس میں لکھا تھا غریب پرور سلامت تو آپ بہت برہم ہوئے اور کہا نواب صاحب تو ہم کو مسفق (بسین مہملہ) مہربان لکھتے ہیں اور یہ نالائق ہم کو گریب (یعنی غریب ۱۲) لکھتا ہے۔ اچھا پانچ روپیہ جرمانہ اُس اُلو کی سمجھ میں غریب ہی آیا پرور کو وہ سمجھا ہی نہیں اور شاید یہ خیال کیا ہو کہ پرور بھی کوئی تحقیر کا لفظ ہوگا جبھی تو غریب کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ غرض آجکل غریب کہنے سے بھی لوگ چڑتے ہیں مگر صوفیہ اس سے بھی برا نہیں مانتے بلکہ اگر کوئی ان کو جاہل بھی کہہ دے جب بھی بُرا نہیں مانتے کیمیاگر کو اگر کوئی یوں کہہ دے کہ اسے کیمیا نہیں آتی ویسے ہی جھوٹ موٹ کیمیاگر بنا ہوا ہے تو وہ کبھی ناخوش نہ ہوگا بلکہ خوش ہوگا کہ اچھا ہے لوگ یوں ہی سمجھتے رہیں تاکہ میں پولیس کی دست برد سے بچا رہوں اسی طرح کسی صوفی کو کوئی جاہل کہہ دے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا میں رجوع خلائق سے بچا ورنہ لوگ ہجوم کر کے خلوت مع المحبوب سے روک دیتے اور اگر کبھی ان کو جواب کا جوش بھی ہوتا ہے تو اندر سے کوئی یوں کہتا ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق مستی ۔ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کرو اس کو خود پرستی اور تکبر میں مرنے دو)

غرض صوفیہ حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کہدیتے ہیں تو ان پر فتویٰ لگ جاتا مگر فقہاء کو کوئی کچھ نہیں کہتا وہ صاف کہتے ہیں کہ حق العبد مقدم علی حق اللہ اور منشا اس کا صرف یہی ہے کہ بندہ محتاج ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج سے حقوق اللہ کو ترک کر کے حقوق العباد ہی کو لیلو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جہاں دونوں میں تعارض ہو وہاں حق العبد مقدم ہے اور یہ بھی شریعت کا حکم اور حق اللہ ہی ہے اور جہاں تعارض نہ ہو وہاں ہر ایک کو اپنے اپنے موقعہ پر ادا کرنا چاہیئے۔

دیکھو اگر باپ بیٹے سے یوں کہے کہ کھانا کھالے اور ماں کہے کہ پانی پی لے تو اس وقت ان دونوں باتوں پر عمل کیا جائے گا کیونکہ دونوں میں تعارض کچھ نہیں دونوں کا جمع ممکن ہے اور اگر باپ کہے کہ پہلے نمکین کھاؤ اور ماں کہے کہ پہلے میٹھا کھاؤ تو یہاں البتہ سوال ہوگا کہ دونوں میں سے کس کا حق ادا کیا جائے۔ غرض مقدم و موخر کو وہیں دیکھا جاتا ہے جہاں تعارض ہو اور عدم تعارض کے وقت دونوں کو اختیار کیا جاتا ہے بس اب بتلاؤ کہ نماز پڑھنے اور قرض ادا کرنے میں کیا تعارض ہے کچھ بھی نہیں۔ پس دونوں کو بجالاؤ نماز بھی پڑھو اور قرض بھی دو تعارض کی صورت یہی ہے کہ مثلاً ایک شخص کے پاس سو روپے ہیں جن پر سال بھی گذر گیا ہے تو قاعدہ سے اس میں دو روپے آٹھ آنے زکوٰۃ کے واجب ہونے چاہئیں مگر اس شخص پر کسی کا دین بھی ہے تو اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم پر کسی کا دین ہے تو پہلے بندہ کا حق ادا کرو زکوٰۃ ساقط ہے یہاں فقہا فرماتے ہیں کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے اور یہ بھی حقیقت میں حق اللہ ہی ہے کیونکہ بندوں کے حقوق کا ادا کرنا حق تعالیٰ ہی کے حکم کی وجہ سے تو لازم ہے حق تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے کہ بندوں کے حقوق ادا کرو اس بنا پر یوں کہنا چاہیئے کہ اس وقت ایک حق اللہ دوسرے حق اللہ پر مقدم ہو گیا اس لئے حق اللہ و حق العبد میں تعارض بھی نہیں مگر چونکہ ظاہر میں وہ حق العبد معلوم ہوتا ہے اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ حق العبد حق اللہ پر مقدم ہے مگر یہ محض ظاہری تقدیم ہے اور ایک حقیقت کی بنا پر

یہ ظاہری تقدیم بھی رفع ہوجاتی ہے اور وہ حقیقت حق تعالیٰ نے میرے قلب پر وارد فرمائی ہیں میں نے منقول کہیں نہیں دیکھا وہ یہ کہ حق اللہ سے مراد حق النفس ہے کیونکہ جن امور کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ طاعات وعبادات ہیں اور ظاہر ہے کہ بندہ کے افعال سے حق تعالیٰ کا نہ کوئی نفع ہے نہ ضرر ہے بلکہ نفع یا ضرر جو کچھ ہے بندہ ہی کا ہے۔ تو یقیناً حق اللہ میں جو اضافت ہے یہ اضافت نفع یا ضرر کی نہیں ہوسکتی جیساکہ حق العبد میں اضافت نفع یا ضرر کے لئے ہے کہ وہ ایسا حق ہے جس کا ادا کرنا بندہ کو نافع اور تلف کرنا بندہ کو مضر ہے اس طرح یہاں نہیں کہہ سکتے کہ یہ طاعات وعبادات ایسا حق اللہ ہیں کہ ان کا ادا کرنا خدا کو نافع اور تلف کرنا ان کو مضر ہے (نعوذ باللہ) پس میرے نزدیک حق اللہ سے مراد حق النفس ہے اور حق العبد سے مراد حق الغیر ہے اس تفسیر پر دونوں جگہ اضافت یکساں ہوگی۔ یعنی ہر جگہ اضافت نفع وضرر ہے پس حق اللہ یعنی حق النفس تو وہ ہے جس کا ادا کرنا اپنے آپ کو نافع اور ضائع کرنا اپنے آپ کو مضر ہے اور حق العبد یعنی حق الغیر وہ ہے جس کا ادا کرنا دوسروں کو نافع اور تلف کرنا دوسروں کو مضر ہے۔

پس اس تفسیر پر حق اللہ وحق العبد میں کہیں تعارض نہیں ہوا اور جو اشکال حق العبد کو حق اللہ پر مقدم کرنے میں ہوتا تھا وہ بھی نہ رہا کیونکہ اس تفسیر پر جس کو حق اللہ کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں حق النفس ہے پس جہاں حق اللہ پر حق العبد کو مقدم کیا جاتا ہے وہاں درحقیقت حق الغیر کو حق النفس پر مقدم کیا گیا ہے اور اس میں کچھ بھی اشکال نہیں بلکہ یہ تو ایثار ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے " ویؤثرون علیٰ انفسھم ولوکان بھم خصاصۃ۔ (وہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود بھوکے رہیں) اس میں حق تعالےٰ نے بعض صحابہ کی (یعنی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی) مدح فرمائی ہے کہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوکے رہیں۔

ان کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک بار یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کو اپنے

گھر لے آئے تھے اور انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں ان سے کوئی چیز بچانا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے گھر تو آج اتنا ہی کھانا ہے جو صرف بچوں کو کافی ہوسکتا ہے۔ تو حضرت ابو طلحہؓ نے فرمایا کہ پھر تم بچوں کو تو بہلا پھسلا کر سلا دینا اور ہم دونوں بھی کھائیں گے نہیں جو کچھ کھانا تیار ہے سب مہمانوں کے سامنے رکھدینا مگر وہ مہمان ایسے ہیں کہ بدون ہمارے کھائے کچھ کھائیں گے نہیں، تو تم یہ کام کرنا کہ جس وقت مہمان گھر میں آئیں اسی وقت چراغ گل کر دینا پھر میں کہدوں گا کہ چراغ گل ہوگیا ہے اور روشن کرنے کا سامان اس وقت دشوار ہے (کیونکہ اس زمانہ میں دیا سلائی کہاں تھی چقماق وغیرہ سے کام کرتے تھے ۱۲) اس لئے اندھیرے ہی میں کھانا کھا لیجئے ہم بھی ان کے دکھلانے کو ساتھ بیٹھ جائیں گے اور منہ چلاتے رہیں گے تاکہ وہ سمجھیں کہ یہ بھی کھا رہے ہیں چنانچہ ایسا ہی کیا کہ دونوں میاں بیوی خود بھوکے رہے اور مہمانوں کو کھلا دیا۔ یہ ایثار ہے جس پر حق تعالےٰ نے ان کی مدح فرمائی ہے صوفیہ کو اس کا بہت اہتمام رہتا ہے وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کریں اور اپنے متعلقین کو بھی اس کی تعلیم دیتے ہیں مگر اس واقعہ مذکورہ پر ایک اشکال ہے میں اس کو بھی رفع کئے دیتا ہوں ان علماء وطلباء کی بڑی مشکل ہے ان کو ہر جگہ شبہے پڑتے ہیں اور ہمیں صوفیہ کی بھی رعایت کرنی پڑتی ہے کیونکہ ہم ان کو بھی مجتہد وفقیہ سمجھتے ہیں اس لئے اس کا بھی خیال رہتا ہے کہ ان کا فعل خلاف شرع نہ ہو۔ چنانچہ ایثار کرنا صوفیہ کا طرز ہے اور اس لئے وہ اس آیت سے استدلال کرتے تھے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ان صحابی نے (جن کا واقعہ شان نزول میں مذکور ہوا ہے) مہمانوں کو اپنے نفس پر اور بچوں پر جو مقدم کیا تو یہ جائز کہاں تھا کیوں کہ اپنے نفس کے بھی تو کچھ حقوق ہیں اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے) اس کا جواب علماء اہل ظاہری نے بہت اچھا دیا ہے کہ ان کو اس درجہ کی بھوک نہ تھی جیسی

مہمانوں کو بھی (یعنی انھوں نے اپنے نفس کے حق کو ضائع نہیں کیا بلکہ یوں کہو کہ اپنے کو زیادہ راحت نہیں دی کہ اس میں کچھ اشکال نہیں کہ دوسرے کی کلفت رفع کرنے کو اپنی راحت میں کچھ کمی کر دی جائے (۴) اب یہ شبہ رہا کہ پھر بچوں پر مہمانوں کو کیسے مقدم کیا۔ ان کی تو اجازت بھی معتبر نہ تھی اس کا جواب دیا گیا ہے کہ بچوں کو بھوک نہ تھی وہ تمھارے بچوں کی طرح نہ تھے جن کا پیٹ بھرتا ہی نہیں اور اس بات کو ماں باپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بچہ کو بھوک ہے یا محض کھانا دیکھ کر حرص کرنے لگے گا۔ تو حضرت ابو طلحہؓ کو قرائن سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بچوں کو بھوک نہیں ہے۔ وقت پر اچھی طرح کھا چکے ہیں اور رات کو نہ کھانے سے انھیں کلفت نہ ہو گی۔ اس لئے بہلا پھسلا کر سُلوا دیا۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ حضرت طلحہؓ کے نزدیک بچے بھوکے نہ تھے محض حرص ہی کا درجہ باقی تھا اس کا جواب یہ ہے کہ معقول پڑھ کر آؤ تو معلوم ہو گا دلیل مستدل کے ذمہ ہے یا مانع کے ظاہر ہے کہ مانع کے ذمہ دلیل نہیں بلکہ منع کے لئے ابدار احتمال کافی ہے اب مستدل کا فرض یہ ہے کہ اگر اس کو یہ احتمال تسلیم نہ ہو تو دلیل سے اس کو باطل کرے غرض فقہار نے جو یہ فرمایا ہے کہ "حق العبد مقدم علی حق اللہ" درحقیقت اس میں ایثار کی تعلیم ہے اور مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کے حقوق پر غیر (۱) کے حقوق کو مقدم کرنا چاہیئے فقہار اس کو اس عنوان سے تعبیر فرماتے ہیں اور صوفیہ اس کو ایثار سے تعبیر کرتے ہیں حاصل دونوں کا ایک ہی ہے اتنا فرق ہے کہ فقہار نے صرف معاملات میں اس کا اہتمام کیا ہے اور صوفیہ نے ہر امر میں اس کی سعی کی ہے حتیٰ کہ عبادات میں بھی فرائض و واجبات کے اندر تو نہیں مگر مستحبات و فضائل میں وہ ایثار کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر کبھی کوئی صوفی صف اول میں کھڑا ہو جائے اس کے بعد کوئی بزرگ آجائیں استاد یا شیخ تو وہ پیچھے ہٹ کر اپنے بزرگ کو صف اول میں جگہ دیدیتے ہیں۔ اسی طرح یہ حضرات خاص حالات میں صف اول میں دائیں جانب کھڑا ہونے کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے بلکہ بائیں جانب کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

اور عام عادت یہ ہے کہ لوگ صف اول میں دائیں طرف کا بہت اہتمام کرتے ہیں حتیٰ کہ بائیں طرف بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں اور اس کو افضل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے دائیں طرف کو بائیں طرف سے مطلقاً فضیلت نہیں بلکہ مدار قرب امام پر ہے پس سب سے افضل تو وہ شخص ہے جو امام کے پیچھے ہے اس کے بعد وہ افضل ہے جو اس کے دائیں طرف ہو پھر وہ جو اس کے بائیں طرف ہو۔ اسی طرح جب اس کے بعد ایک آدمی دائیں طرف اور آجاوے تو اب دوسرے کو بائیں طرف کھڑا ہونا چاہئے اس وقت اس کا بائیں طرف ہونا دائیں طرف کھڑے ہونے سے افضل ہے کیونکہ اس صورت میں بائیں طرف ہو کر یہ امام سے زیادہ قریب ہوگا اور دائیں طرف کھڑا ہونے سے بعد ہو جائے گا۔ غرض بائیں طرف کھڑا ہونے سے اگر امام کے اور اس کے درمیان میں چار آدمی کا واسطہ ہو اور بائیں طرف ہونے سے پانچ کا واسطہ ہو تو اس وقت بائیں جانب کھڑا ہونا افضل ہوگا وعلیٰ ہذا القیاس پس صف کو اس طرح بھرنا چاہیئے کہ ایک آدمی امام کے بالکل پیچھے ہو پھر ایک اس کے دائیں اور ایک بائیں کھڑا ہوتا چلا جاوے۔ مگر عوام یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے دائیں جانب کو بھرنا چاہیئے جب اس طرف جگہ نہ رہے پھر بائیں طرف آنا چاہیئے یہ غلط ہے بلکہ دونوں طرف برابر آدمی ہونے چاہئیں۔ مگر صوفیہ کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ خاص حالات میں زیادہ کوشش بائیں طرف[۹]

[۹] قلت قال العلامۃ الشعرانی فی العہود المحمدیۃ اخذ علینا العہد العام من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آینا یسرۃ المسجد قد عطلت من صلوٰۃ الناس فیہا ان نکرمہا بالصلوٰۃ فیہا جبرالہا قال وقد روی ابن ماجۃ وغیرہ عن ابن عمر قال قیل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میسرۃ المسجد قد تعطلت فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من عمر میسرۃ المسجد کتب اللہ لہ کفلین من الاجر وفی روایۃ للطبرانی مرفوعاً من عمر جانب المسجد الایسر لقلۃ اہلہ فلہ اجران اھ (ص۳۵) قلت وہذا ہو السر فی اہتمام الصوفیہ بالجانب الایسر ای لقلۃ رغبۃ الناس فیہ وامام اہتمامہم بالصف المؤخر مع کونہ خلافاً للحدیث خیر صفوف الرجال اولہا وشرہا آخرہا فالسر فیہ ما قالہ الشعرانی ایضا اخذ علینا العہد العام من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صفت سرائرنا من جمیع ما یسخط اللہ عز وجل بحیث لم یبق فی سرائرنا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

کھڑا ہونے کی کرتے ہیں اور دائیں طرف کے لئے دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح صف اول پر بھی مزاحمت نہیں کرتے بلکہ خاص حالات میں دوسروں کو صف اول میں جگہ دیدیتے ہیں اور خود صف ثانی یا ثالث میں کھڑے ہوجاتے ہیں اور جنازہ کی نماز میں بھی وہ ایسا ہی کرتے ہیں کہ اکثر پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اس کی ایک وجہ تو منقول ہے وہ یہ کہ صف مؤخر میں کھڑا ہوتے والا اکمل صفوف زوائد ہے اور حدیث میں ہے کہ جس میت پر مسلمانوں کی تین صفیں نماز کی ہوجائیں اس کی مغفرت ہوجاتی ہے تو صف ثالث میں کھڑا ہونے والا علت تامہ کا جزو اخیر ہے جو کہ سبب مغفرت ہے اور ایک وجہ میرے قلب میں آئی ہے وہ یہ کہ صف اول والے بلاواسطہ میت کے لئے دعا کرتے ہیں اور صف اخیر والا اگلی صف کے مسلمانوں کو بھی واسطہ بناتا ہے وہ سب کے واسطہ سے دعا کرتا ہے اس لئے صوفیہ پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تاکہ اگلوں کو واسطہ بنا کر دعا کریں۔ خیر جماعت جنازہ کا ذکر تو تبعاً تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ صوفیہ جماعت صلوٰۃ مفروضہ میں بھی صف اول میں ایثار کرتے ہیں اگر

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) وظواہرنا الاما یرضی ربنا ان نواظب علی الصلوٰۃ فی الصف الاول عملاً بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی ای العقل ولا یکون العبد عاقلاً الا اذا کان لہذا الوصف الذی ذکرناہ فمن کان فی ظاہرہ اوباطنہ صفۃ یکرہہا اللہ تعالیٰ فلیس بعاقل کامل رای ولیس اہلا للقرب من الامام ایضا بدلالۃ الحدیث ۱۲) ولا یتقدم للصف الاول بین یدی اللہ فی المواکب الالہیۃ الا الانبیاء والملائکۃ ومن کان علی اخلاقہم واما من تخلف عن اخلاقہم فیقف فی اخریات الناس خیر لہ اھ (ص۳۵) قال واما حدیث خیر صفوف الرجال ولہا فالمراد بالرجال الکمل اھ (ص۳۶) ای الکاملون فی الاحلام والنہی کیلا تتضاد الآثار فان حدیث لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی کما یفید الدنو من ہولاء یفید طلب التاخر عمن لیس علی مرتبتہم ایضاً اویقال خیر صفوف الرجال اولہا خبر بمعنی الانشاء ای لیجعل الامام خیر الرجال فی اول الصف واللہ اعلم فاذا رای احد غیرہ افضل منہ فتاخر لہ من الصف الاول وقدمہ فقد عمل بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی فای یوم علیہ اذا قدم من کان احق بالصف الاول منہ فافہم ولا تعجل بالانکار علی القوم فتندم ۱۲ جامع)

کوئی ان کا بزرگ آجائے تو وہ اس کو مقدم کر دیتے ہیں اس پر فقہا خشک اعتراض کرتے ہیں کہ تم نے صف اول کے ثواب کو چھوڑ دیا جس میں استغناء عن الثواب ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ ایک ثواب تو صف اول میں کھڑے ہونے کا ہے اور دوسرا ثواب تعظیم اہل اللہ کا ہے جو اس سے بھی بڑھا ہوا ہے تو ہم ظاہر میں گو ایک ثواب کے تارک ہوئے مگر باطن میں دوسرے بڑے ثواب کے جامع ہوئے تو استغناء عن الثواب

---

۵ قلت وقد علمت مما ذکرناہ سابقا ان فی ذلک عملاً بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلینی منکم اولوا الاحلام والنہی رواہ مسلم فی صحیحہ وقال فی رد المختار وفی حاشیۃ الاشباہ للحموی عن المضمرات عن النصاب وان سبق احد الی الصف الاول فدخل رجل اکبر منہ سنا او اہل علم ینبغی ان یتاخر ویقدمہ تعظیما لہ اھ فہذا یفید جواز الایثار بالقرب بلا کراہۃ خلافا للشافعیۃ وقال فی الاشباہ لم ارہ لاصحابنا ونقل العلامۃ البیری فروعا تدل علی عدم الکراہۃ ویدل علیہ قولہ تعالیٰ یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ وما فی صحیح مسلم من انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اتی بشراب فشرب منہ وعن یمینہ اصغر القوم وہو ابن عباس وعن یسارہ الاشیاخ فقال صلی اللہ علیہ وسلم للغلام اتاذن لی فی ان اعطی ہولاء فقال الغلام لا واللہ فما عطاہ الغلام۔ اذ لاریب ان مقتضا طلب الاذن مشروعیۃ ذلک بلا کراہۃ وان کان غیرہ افضل اھ (ای لو کان آثر الغلام غیرہ بحقہ کان ذلک جائزا لہ) اقول وینبغی تقیید المسئلۃ (ای مسئلۃ جواز الایثار) بما اذا عارض تلک القربۃ ما ہو افضل منہا کاحترام اہل العلم والاشیاخ کما افادہ الفرع السابق والحدیث فانہما یدلان علی انہ افضل من القیام فی الصف الاول او من عطاء الاناء لمن لاحق فیکون الایثار بالقربۃ انتقالاً من قربۃ الی ما ہو افضل منہا وہو الاحترام المذکور اما لو آثر علی مکانہ فی الصف مثلاً من لیس کذلک یکون اعراضا عن القربۃ بلا داع وہو خلاف المطلوب شرعا اھ (ص۵۹۹ ج ۱) قلت وکون الرجل لیس کذلک یختلف باختلاف الذوق فمن ذاق کونہ احسن الخلق کلہ وان کل مسلم افضل منہ فلہ تقدیم کل مسلم علی نفسہ ویکون فی ذلک عاملا بقولہ علیہ السلام لیلینی منکم الخ بتقدیم الافضل منہ عندہ فافہم واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ جامع

کہاں ہوا اس میں بھی تو طلب ثواب ہی ہے پھر شرعی قاعدہ ہے الدال علی الخیر کفاعلہ (نیکی کا بتلانے والا مثل اس کے کرنے والے کے ہے) اس بنا پر جس کو ہم نے صف اول میں کھڑا کیا ہے اس کو جو صف اول کی فضیلت ہماری وجہ سے حاصل ہوگی اس کا ثواب بھی ہم کو ملے گا تو ہم ثواب صف اول سے بھی محروم نہ ہوئے اور اس کے ساتھ دوسرے ثواب کے جامع ہو گئے۔ ہمیں اس صورت میں دوہرا ثواب ملا۔

غرض ایثار حضرات صوفیہ کا بہت بڑا معمول ہے بھلا بزرگوں کے ساتھ تو وہ کیونکر ایثار نہ کرتے ان کا تو مذاق یہ ہے کہ وہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کرتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ہیں یہ بڑے بزرگ صاحب باطن ہیں اور اس کے ساتھ ہی بڑے عالم اور محدث بھی ہیں ہندوستان میں علم حدیث یہی لائے گو شہرت شاہ ولی اللہ صاحب کی زیادہ ہے مگر اصل حدیث کے لانے والے یہاں پر یہی ہیں یہ علامہ ابوطاہر محدث مدنی کے شاگرد ہیں۔ ان کی ایک حکایت ایثار کے متعلق ہے مگر اس سے پہلے میں ایک دوسرا واقعہ بیان کردوں (کیونکہ دونوں میں ارتباط ہے ۱۲) سو ایک واقعہ تو ان کا یہ ہے۔ کہ وہ ایک دفعہ بہت قیمتی اور عمدہ لباس پہنے ہوئے دربارشاہی میں جا رہے تھے صوفیہ ناقصین تو ہر حالت میں تقشف سے رہتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ ہم تو ظاہر میں جیسے اپنے گھر رہا کرتے ہیں ویسے ہی بادشاہوں کے سامنے رہیں گے ہم سلاطین کی عظمت کے لئے لباس کیوں تغیر کریں اور ایسے صوفیوں کی عوام کی نظر میں زیادہ وقعت ہوتی ہے مگر کامل کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین
نیستم در صف طاعت بین بین

(میں قلم کی طرح دو انگلیوں میں ہوں صف طاعت میں بین بین نہیں ہوں)

وہ اپنے لئے کوئی خاص وضع اور ہیئت تجویز نہیں کرتا وہ ہر حالت میں حکم کا تابع ہوتا ہے اسی لئے کبھی خستہ حال رہتا ہے کبھی بنا ٹھنا رہتا ہے یہ لوگ سلاطین کی

ملاقات کے لئے قیمتی لباس بھی پہن لیتے ہیں کیونکہ اس میں مزورلہ کا اکرام ہے اور اکرام مزورلہ مطلوب ہے اس لئے وہ ان کی خاطر اپنی وضع کو چھوڑ کر اس وقت شاہی وضع اختیار کر لیتے ہیں عوام ان کی اس حالت پر طعن کرتے ہیں کہ یہ بادشاہوں کی ملاقات کے لئے کیسے بنے ٹھنے جا رہے ہیں مگر ان کو کیا خبر وہ کس حال میں ہیں اسی لئے کامل کا پہچاننا دشوار ہے کیونکہ وہ کسی حالت و وضع کا پابند نہیں ہوتا تو عوام کو اس میں ظاہرا دوسروں سے وہ خاص امتیاز نظر نہیں آتا ہے

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

(ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو تاہ کرنا چاہیئے اسی میں سلامتی ہے)

ایک بزرگ بی بی کا قصہ ہے کہ وہ ہر رات کو بعد عشاء کے خوب زینت کرتیں عمدہ لباس پہنتیں زیور سے آراستہ ہو کر کنگھی سرمہ لگاتیں اور اس حالت سے شوہر کے پاس آکر ان سے دریافت کرتیں کہ تم کو میری حاجت ہے اگر وہ کہتے ہاں تو ان کے پاس کچھ دیر لیٹ جاتیں اور اگر وہ کہتے کہ مجھے حاجت نہیں تو پھر کہتیں کہ اچھا اب مجھے اجازت دو کہ میں اپنے خدا کے ساتھ مشغول ہوں چنانچہ شوہر کی اجازت کے بعد وہ اپنا لباس اور زیور وغیرہ اتار کر رکھ دیتیں اور کمبل اور ٹاٹ کا لباس پہن کر تمام رات عبادت کرتیں ۔ تو دیکھئے یہ بزرگ بی بی ایک وقت میں کیسی زینت کرتیں اور دوسرے وقت کمبل اور ٹاٹ میں رہتیں اب اگر کوئی زینت کے وقت ان کو دیکھتا تو یہی کہتا کہ یہ کیسی بزرگ ہیں جو اس قدر زیب و زینت کا اہتمام کرتی ہیں مگر کسی کو کیا خبر کہ وہ کس لئے زینت کرتی تھیں وہ نفس کی خواہش کے لئے ایسا نہ کرتی تھیں بلکہ حکم شریعت کی وجہ سے زینت کرتی تھیں کیونکہ شریعت کا حکم ہے کہ عورت کو شوہر کے لئے خوب زیب و زینت کرنا چاہیئے ۔ اس صورت میں اس کو زینت کرنے سے ثواب ملتا ہے مگر آجکل عورتوں کی یہ حالت ہے کہ شوہر کے سامنے تو بھنگیوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں برادری میں جاتی ہیں تو سر سے پیر تک آراستہ ہوتی ہیں اور اگر کوئی بیچاری شوہر کی خاطر

زینت کرلے تو اس کو نکّو بناتی ہیں کہ ہائے اسے حیا و شرم ذرا نہیں یہ اپنے میاں کے واسطے کیسے کیسے چوچلے کرتی ہے افسوس جس جگہ زینت کا حکم تھا وہاں تو اس پر طعن ہوتا ہے اور جہاں ممانعت ہے وہاں اہتمام کیا جاتا ہے تو وہ بزرگ بی بی ایسی تھیں وہ تو حکم کے تابع تھیں جہاں شریعت کا حکم تھا وہاں خوب زینت کرتیں کیونکہ جب شوہر زینت کو کہے دولہن کو خراب وخستہ رہنے کا کیا حق ہے مگر جب شوہر کو کچھ غرض نہ ہوتی تو وہ اپنے نفس کے لئے زینت کا اہتمام نہ کرتی تھیں۔ بلکہ وہی کمبل اور ٹاٹ پہن لیتی تھیں اسی طرح کاملین زینت اور ترک زینت میں حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نفس کے لئے کچھ نہیں کرتے۔

چنانچہ شاہ عبدالرحیمؒ صاحب دربار میں جانے کے لئے عمدہ بیش قیمت لباس پہن کر جارہے تھے، اس حالت سے تو ظاہر بینوں کو کچھ کچھ شبہات ہوئے ہوں گے اب دوسری حالت دیکھئے کہ راستہ میں آپ نے ایک کتے کے بچہ کو دیکھا جو نالی میں سردی کے مارے جاڑے میں سکڑ رہا تھا آپ سے یہ حالت دیکھ کر نہ رہا گیا فوراً کھڑے ہوگئے اور خادم سے فرمایا کہ اس کو نالی سے نکال لو اس نے کچھ ناک منھ چڑھایا تو آپ نے آستین چڑھا کر اُسے خود نکالا اور ایک حمام قریب تھا وہاں لیجاکر گرم پانی سے اس کو غسل دیا پھر آگ میں تاپا یہاں تک اس کی سردی کم ہوگئی اور اچھی طرح چلنے پھرنے لگا پھر آپ نے اہل محلہ سے فرمایا کہ اگر تم اس کی راحت کا انتظام کرسکو اور نگہداشت کا وعدہ کرو تو میں اس کو یہیں چھوڑ دوں ورنہ اس کو اپنے ساتھ لیجاؤں اور میں خود اس کا انتظام کروں گا۔ اہل محلہ نے وعدہ کیا تو آپ نے اس کو چھوڑ دیا اور پھر دربار میں تشریف لے گئے (بھلا جو شخص فخر وتکبر کے لئے زینت کرتا ہو کیا اس سے یہ ہوسکتا ہے کہ ایک کتے کے بچہ کو اپنے ہاتھ سے اس طرح دھوئے اور یوں اس کو راحت پہنچائے ہرگز نہیں۔ مگر حضرت شاہ صاحب نے بے تکلف اس کی خدمت کی، خادم نے بھی ناک منھ چڑھا لیا مگر آپ کو ذرا بھی اس سے انقباض نہ ہوا یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے نفس کے لئے زیب و زینت نہ کرتے تھے ۱۲)

یہ قصہ تمہید ہے دوسرے قصہ کی اور دوسرا قصہ جو مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ایک بار آپ بٹیا پر جا رہے تھے ایک موقع ایسا آیا کہ بٹیا کے دونوں طرف پانی اور کیچڑ تھا صرف بٹیا ہی کا راستہ سوکھا ہوا تھا سامنے سے ایک کتا بھی اسی بٹیا پر آگیا اب وہاں اس کی ضرورت تھی کہ دونوں میں سے ایک کیچڑ میں اترے تو دوسرا بٹیا کے راستہ سے نکلے کیونکہ بٹیا پتلی تھی اس میں اتنی وسعت نہ تھی کہ دونوں برابر کو نکل جائیں چنانچہ شاہ صاحب کھڑے ہو گئے اور وہ کتا بھی سامنے کھڑا ہو گیا پھر اشارات میں گفتگو شروع ہوئی (بعض اہل اللہ جمادات وحیوانات سب کی گفتگو سمجھ لیتے ہیں ۱۲) چنانچہ شاہ صاحب نے کتے سے کہا کہ بھائی تم پانی میں اترو، اس نے کہا کیوں مجھ میں اور آپ میں کیا فرق ہے آپ کیوں نہیں اترتے اور یہ کہا کہ افسوس پہلے بزرگوں کا مذہب ایثار تھا اور اس وقت کے بزرگوں کا مذہب اختیار ہے۔ فرمایا نہیں تم نے بدگمانی کی بلکہ میں تجھ سے اترنے کو اس لئے کہتا ہوں کہ تو مکلف نہیں ہے اور میں مکلف ہوں اگر تو اس پانی اور کیچڑ سے ناپاک بھی ہو جائے گا تو تھوڑی دیر میں خشک ہو کر پھر پاک ہو جائے گا پھر تیرے ذمہ نہ وضو ہے نہ نماز ہے، اور میں اتروں گا تو مجھے اپنے سارے کپڑے اور بدن کا دھونا اور پاک کرنا لازم ہو گا جس میں بہت دیر لگے گی ممکن ہے کہ نماز میں دیر ہو جائے۔ اُس نے جواب دیا کہ بہت اچھا میرا تو کچھ حرج نہیں میں پانی میں اُترتا ہوں مگر یہ یاد رکھو کہ تمہارے کپڑے ناپاک ہو جائیں تو ایک دو لوٹے پانی سے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر میں اس وقت پانی میں اترا اور تمہارے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں تو اس سے تمہارا قلب ایسا ناپاک ہو گا جس کی ناپاکی ہفت قلزم سے بھی نہ دُھل سکے گی۔ یہ سُن کر شاہ صاحب پر ایک حالت طاری ہو گئی اور فوراً پانی میں اُتر کر راستے سے ہٹ گئے اور کتا بٹیا پر سے چلا گیا اور آپ اس کے بڑے احسان مند ہوئے کہ اس کے ذریعہ سے ایک علم عظیم عطا ہوا۔

اب شاہ صاحب پر غیب سے الہام ہوا کہ عبدالرحیم خبر بھی ہے کہ ہم نے تم کو

یہ علم عظیم کتے کے ذریعہ سے کیوں دیا یاد کرو تم نے ایک دن ایک کتے کے بچہ پر احسان کیا تھا کہ اس کو پانی میں سے نکال کر گرم پانی سے دھویا اور آگ سے تاپا تھا تو ہم نے اس احسان کا آج بدلہ کر دیا کہ اسی کی ابن النوع کے ذریعہ سے تم کو یہ علم عظیم عطا کیا تاکہ اس کتے کے بچہ پر اپنا احسان نہ سمجھیں اور ان علوم کی قدر صوفیہ ہی سمجھتے ہیں انکو ان میں ایسا مزا آتا ہے کہ واللہ جب کوئی علم جدید عطا ہوتا ہے تو اس سے ایسا حظ آتا ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس کے سامنے گرد ہوتی ہے غرض صوفیہ نے ایثار سے یہاں تک کام لیا ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی ایثار کیا صوفیہ نے ہر مقام پر اس کی رعایت کی ہے اور بعض مواقع پر شریعت نے بھی اس کو واجب کیا ہے۔ چنانچہ حقوق نفس پر حقوق غیر کو مقدم کیا گیا ہے بشرطیکہ اپنی ہلاکت اور اپنے اہل بیت کی پریشانی کا اندیشہ نہ ہو پس جہاں ایثار واجب ہے صوفیہ وہاں تو کیوں نہ کرتے وہ تو جہاں واجب بھی نہیں وہاں بھی اس کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اور اس سے ان کو علوم حاصل ہوتے ہیں، اور ان کو تو بڑا مزا ان علوم ہی میں آتا ہے مگر اب لوگ چاہتے ہیں ان سے دنیوی ترقی کرانا بھلا یہ اس کام کے کہاں ؎

تا بدانی ہر کہ را یزداں بخواند	از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالےٰ اپنا بنالیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں)

صاحبو! جس کو ان علوم کا مزا حاصل ہو گیا ہے وہ واقعی دنیا کے کام کا نہیں رہتا ہاں جو ایسے باہمت ہوں کہ دونوں کو جمع کر سکیں جیسے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما وہ البتہ دونوں میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کو دنیا کے مشاغل ان علوم سے مانع نہیں ہوتے بلکہ دنیا بھی ان کے ہاتھ میں دین بن جاتی ہے مگر ایسے بہت کم ہیں زیادہ تو ایسے باہمت نہیں ہوتے۔ ان کا تو وہی حال ہوتا ہے ؎

تا بدانی ہر کہ را یزداں بخواند	از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالےٰ اپنا بنالیتے ہیں اس کو دنیا کے تمام کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں)

بہر حال لوگوں نے حقوق العباد سے بہت ہی غفلت کر رکھی ہے۔ حالانکہ حق العبد کا تقدم معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حق اللہ پر حق العبد کا تقدم بوجہ عظمت کے نہیں ہے بلکہ محتاج و حقیر کے حق کو کریم غنی نے اپنے حق پر مقدم کر دیا ہے کہ جب دونوں میں تعارض ہوتا ہے تو وہ فرما دیتے ہیں کہ یہاں ہمارے حق کو چھوڑ دو ہمیں کچھ ضرورت نہیں اور بندہ کے حق کو ادا کرو وہ محتاج ہے اگر اس کا حق ادا نہ ہوگا تو پیٹ پھاڑ کر مر رہے گا یہ وجہ ہے تقدم کی۔ پس لوگوں کا تاکد حق کے سبب کو صرف عظمت میں منحصر کر دینا صحیح نہیں بلکہ حاجت بھی تاکد حق کا ایک سبب ہے جب سبب مرض کا میں نے ازالہ کر دیا تو اب مرض کا علاج سہل ہو گیا۔ پس بندہ کے حقوق کو اس کے حاجت کی وجہ سے ادا کرو اور جب میں آپ کے عذر کا جواب دے چکا تو حجت تام ہو گئی۔ اب کسی کے پاس حقوق العباد سے غفلت کرنے کا کوئی عذر نہیں رہا یہ تو ان لوگوں کی غفلت کا علاج تھا جو حقوق العباد کا بالکل ہی اہتمام نہیں کرتے۔ اب دوسری غلطی بعض لوگوں میں یہ ہے کہ وہ حق العبد کو صرف مال میں منحصر کرتے ہیں کہ چوری کرنا غصب کرنا قرض لے کر انکار کر دینا کسی کی امانت رکھ کر مکر جانا بس یہی جرم ہے ان کے علاوہ حق العباد میں اور کوئی جرم نہیں حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حق العبد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ اور بھی حقوق ہیں اور وہ بھی حقوق مالیہ کے برابر بلکہ ان سے بھی معظم تھیں۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے صحابہ نے ادب کی وجہ سے عرض کیا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ (اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جاننے والے ہیں) فرمایا اَلَیْسَ یَوْمُ عَرَفَۃَ کیا یہ عرفہ کا دن نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا بَلٰی بیشک یہ عرفہ کا دن ہے۔ پھر پوچھا یہ کونسا مہینہ ہے صحابہ نے ادب سے وہی جواب دیا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ آپ نے فرمایا اَلَیْسَ ذِی الْحِجَّۃِ کیا یہ حج کا مہینہ نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا بیشک یہ حج کا مہینہ ہے پھر دریافت فرمایا کہ یہ کونسا شہر ہے اس پر بھی صحابہ نے ادب سے اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ہی کہا آپ نے فرمایا اَلَیْسَ بِالْبَلَدِ الْحَرَامِ کیا یہ بلد حرام نہیں ہے، صحابہ نے عرض کیا بیشک یہ بلد حرام ہے۔

اس تمہید کے بعد آپ نے فرمایا۔ اَلَا اِنَّ اَمْوَالَکُمْ وَدِمَائَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا اِلٰی یَوْمِکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ (اَوْ کَمَا قَالَ) سن لو تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آج سے قیامت تک ویسی ہی حرام ہیں جیسے اس یوم معظم شہر معظم اور بلد معظم میں حرام ہیں ہمیشہ کے لئے ان کی حرمت ویسی ہی ہے جیسی آج ہے اس سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک حقوق نفس، دوسرے حقوق مال، تیسرے حقوق عرض۔ جب شریعت سے تین حقوق معلوم ہوتے ہیں تو آپ کو صرف مال میں حق العبد کو منحصر کرنے کا کیا حق ہے۔ صاحبو جان کا بھی حق ہے، آبرو کا بھی حق ہے، مال کا بھی حق ہے۔ جان کا حق تو یہ ہے کہ کسی کو ناحق قتل نہ کرو مگر قتل تو یہاں اس بادشاہت میں بکثرت کون کر سکتا ہے اس کی طاقت تو یہاں کسی کو نہیں ہے گو شاذونادر کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے مگر وہ چھپ نہیں سکتا فوراً مقدمہ قائم ہو کر پھانسی ہو جاتی ہے اس لئے اس سے سب ڈرتے ہیں۔ ہاں یہ حق البتہ باقی ہے کہ کسی غریب کے دو چار ڈنڈے لگا دیئے گو ہمارے قصبہ میں یہ حق بھی باقی نہیں رہا وہاں کسی کی مجال نہیں جو کسی بھنگی کو بھی مار سکے یا بیگار میں کام لے سکے ہمارے بھائی کے ایک کارندہ ہیں حاجی جی اب تو انھوں نے کارندگی سے استعفا دیدیا ہے مگر جس زمانہ میں وہ کارندہ تھے اس زمانہ کا قصہ بیان کرتے تھے۔ ایک دن میں نے سڑک صاف کرنے والے بھنگی سے کہا کہ جب تو سڑک پر جھاڑو دیا کرے تو ذرا ہمارے دروازہ میں بھی جھاڑو دے دیا کر تو وہ کیا کہتا ہے کہ حاجی جی کنون[1] تو ہے نہیں۔ خیر تمہاری خاطر سے دیدیا کروں گا تو وہاں کے بھنگی بھی قانونی ہیں، ہر شخص بجائے خود رئیس ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کوئی رئیس نہیں (ہر شخص رئیس وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی رئیس نہ ہو ۱۲) میں تو اس حالت سے بڑا خوش ہوں گو اپنی قوم کی حالت تنزل سے افسوس بھی ہوتا ہے کہ ان کی وقعت بھنگیوں کے

[1] قانون۔

دلوں میں بھی نہیں رہی مگر اس سے خوش ہوں کہ ان کے ہاتھ سے اب ظلم نہیں ہو سکتا ریاست تو وہی اچھی ہے جس میں ظلم نہ ہو اور جس ریاست کا یہ نتیجہ ہو کہ غریبوں پر ظلم کیا جائے اس کے ہونے سے نہ ہونا اچھا۔ چنانچہ اب ہمارے قصبہ میں زوال ریاست سے یہ بات تو ہو گئی کہ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا اور جو کوئی کسی کو کچھ کہتا ہے تو جواب میں دس باتیں وہ ان کو سنا لیتا ہے پس ظالمانہ ریاست سے ان کی یہی حالت اچھی ہے ان کو اگر تھوڑی سی بھی ریاست ملتی ہے تو چوگنا ظلم کرتے ہیں۔

کانپور کے ضلع میں ایک قصبہ ہے بارہ وہ پٹھانوں کی بستی ہے وہاں کے پٹھان بہت شریف ہیں مگر آخر تو رئیس ہیں کبھی کسی غریب کو کچھ کہہ بھی لیتے ہیں تو وہاں کے ایک پٹھان نے کسی جلاہے سے تمسخراً پوچھا کہ میاں جی کس حال میں ہو۔ کہا خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں کہ خدا نے مجھ کو جلاہا بنا دیا جس سے مجھ کو کوئی کچھ کہہ لیتا ہے کوئی کوئی دو چار ڈنڈے لگا دیتا ہے تو قیامت میں مجھے کسی کی نماز ملے گی کسی کے روزے ملیں گے پٹھان نہیں بنایا۔ اگر پٹھان ہوتا تو قیامت میں دوسرے لوگ میرے سب اعمال لے جاتے اور میں مفلس بن کر کھڑا رہ جاتا تو میں اس بات پر خدا تعالےٰ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پٹھان نہ بنایا یہ جواب سن کر کوئی دوسرا ہوتا تو نہ معلوم اس جلاہے کی کیا گت بناتا مگر وہاں کے پٹھان شریف ہیں انھوں نے کچھ نہیں کہا نہ برا مانا۔ ان لوگوں کی شرافت کا ایک اور اس سے بھی زیادہ عجیب قصہ ہے، وہ یہ کہ میں کئی سال ہوئے ایک دفعہ کانپور گیا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ نواح کانپور میں بعض دیہات کے نو مسلم راجپوت مرتد ہونے والے ہیں، آریہ اُن کو بہکا رہے ہیں تو میں نے اپنے احباب میں سے کچھ علماء اور روساء کو ساتھ لیا اور موضع گجنیر میں قیام کیا جو سب دیہات میں بڑا گاؤں تھا پھر وہاں سے دو دو تین تین عالموں کو متفرق دیہات میں تبلیغ کے لئے بھیجا گیا اور ان کے چودھریوں کو بلایا اور کہا کہ بھائی ہم نے یہ سُنا ہے کہ تم آریہ ہونے والے ہو۔ اگر کوئی شبہ اسلام میں ہو رفع کر لو۔ ایک نے جواب دیا کہ ہم آریہ کیوں ہوتے ان کے یہاں تو

نیوگ کا بڑا فحش طریقہ ہے جس کو کوئی شریف ہرگز گوارا نہیں کر سکتا پھر ہم نے کہا کہ ہاں بھائی بس تم مسلمان ہی رہنا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم مسلمان بھی نہیں ہوتے ہم تو نومسلم ہی رہیں گے۔ میں نے کہا اچھا تم نومسلم ہی رہو۔ پھر باتوں باتوں میں ان سے پوچھا گیا تم ہماری طرح مسلمان کیوں نہیں ہوتے تو کہنے لگے کہ اصلی بات یہ ہے کہ ہم تمہاری طرح مسلمان ہو جائیں تو ڈر یہ ہے کہ ہمیں تم میں سے کوئی اپنی لڑکی نہ دے گا نہ ہماری لڑکی لے گا اس لئے ہم تمہارے ساتھ بھی نہیں مل سکتے اور نہ آریوں کے ساتھ ملیں گے۔ اس جواب پر میں ذرا خاموش ہوا تھا کیونکہ اس کا وعدہ میرے اختیار سے باہر تھا۔ خدا بھلا کرے قصبہ بارہ کے پٹھانوں کا کہ وہ بھی خبر سن کر آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک رئیس کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ صاحبو! تم بیفکر رہو تم کو ہم اپنی بیٹیاں دیں گے اور تمہاری لڑکیاں لیں گے گو اس سے برادری میں ہماری ذلت ہو گی مگر اسلام کی وقعت و خدمت کے لئے ہماری جان و آبرو سب فدا ہیں میں اس جواب سے بڑا خوش ہوا اور ان کو بہت دعا دی کہ شاباش۔

ع این کار از تو آمد و مرداں چنیں کنند (یہ کام تم سے ہوا اور مردانِ خدا ایسا ہی کرتے ہیں)

مگر یہاں آکر چودھری لاجواب تو ہو گیا۔ لیکن اپنی حالت کے بدلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ معلوم ہو گیا کہ یہ بات اس نے محض شرارت کی راہ سے کہی تھی جس سے صرف ہم کو لاجواب کرنا مقصود تھا۔ اور حقیقت میں ان لوگوں کو اپنی حالت کا بدلنا منظور نہیں وہ اپنے اسی طرز میں خوش ہیں در اصل وہ مسلمان بھی برائے نام ہی ہیں حالت ان کی یہ ہے کہ ان کے نام ہندوؤں جیسے ہیں چنانچہ ایک چودھری کا نام ننو سنگھ تھا اور دوسرے چودھری کا نام ادھار سنگھ تھا یہ بہ نسبت پہلے کے ذرا سمجھدار تھا بڑے چودھری سے کہا گیا کہ تجھے کلمہ بھی آتا ہے کہنے لگا ہاں آتا ہے کہا گیا سناؤ تو کہنے لگا کہ بس سنو مت گانوں کے لوگ مجھے یوں کہیں گے کہ بڈھا سٹھیا گیا جو کلمہ پڑھت ہے ان کو کلمہ پڑھنے سے بھی رکاوٹ تھی وہ ایسے مسلمان تھے بس چند باتیں ان میں اسلام کی موجود تھیں ایک تو وہ ختنہ کراتے تھے، دوسرے مردوں کو دفن کرتے تھے، تیسرے نکاح قاضی سے پڑھواتے تھے

مگر ساتھ ہی ہندوؤں کی طرح پھیرے بھی کرتے تھے۔ اور ایک یہ بات ان میں اسلام کی تھی کہ محرم میں تعزیہ بناتے تھے اور اس کو اتنا بڑا شعار سمجھتے تھے کہ ادھار سنگھ نے یوں کہا تھا کہ ہم آریہ کیسے بنت ہمارے یہاں تو تاجیہ (تعزیہ) بنت ہے۔ میں نے یہ سن کر کہا کہ دیکھو تعزیہ مت چھوڑنا کہنے لگے اجی بھلا اسے ہم کب چھوڑنے لگے بعض علماء کو میری اس بات پر خیال ہوا کہ اس نے ایک بدعت کی مسلمانوں کو اجازت دی میں نے کہا بس چپکے بیٹھے رہو یہ کانپور اور لکھنؤ میں ہی شرک و بدعت ہے مگر یہاں فرض ہے کیونکہ اس جگہ تعزیہ ہی ان لوگوں کے دین کا وقایہ ہے ابھی تو ان لوگوں کا تعزیہ بناتے رہنا ہی ان کے اسلام کا محافظ ہے۔ پھر جب رفتہ رفتہ یہ پکے مسلمان ہوجائیں گے اس وقت بدعت وسنت کی تعلیم دے دینا۔

ہمارے ایک دوست نے عجیب بات کہی میں نے اُسے کہا کہ کالج علیگڈھ میں مولود شریف، ہوا کرتا ہے جو کہ بدعت ہے وہ دوست فرمانے لگے کہ یہ مولود شریف (بہیئۃ معروفہ) اور جگہ تو بدعت مگر کالج میں جائز بلکہ واجب ہے کیونکہ اس بہانہ سے وہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اور آپ کے فضائل و معجزات سُن لیتے ہیں تو اچھا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں قائم رہے ورنہ وہ تو سال بھر ایسی خرافات میں مبتلا رہتے ہیں کہ بھول کر بھی خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان کی زبان پر نہیں آتا مجھے ان کی یہ بات پسند آئی کیونکہ واقعی اگر کسی جگہ بدعت ہی لوگوں کے دین کی حفاظت کا ذریعہ ہوجاوے تو وہاں اس بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے جبتک کہ ان کی پوری اصلاح نہ ہو۔ غرض بارہ کے پٹھان بڑے شریف ہیں اور یہ ان کی شرافت ہی ہے کہ اس جُلاہے کا جواب ناگوار نہ ہوا ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو خوب مرمت کرتا۔ مگر واقعی بڈھے نے بات سچی کہی کہ اللہ کا شکر ہے جو میں جولاہا ہوگیا پٹھان نہ ہوا ورنہ پھر میں ظلم کرتا اور لوگ میرے نیک اعمال چھین لیتے۔ سو ہمارے قصبہ میں تو یہ ریاست اب نہیں رہی کہ کوئی کسی کے ڈنڈے لگا سکے گو تھوڑا سا کہیں ہو بھی جاتا ہے مگر پھر کم ہے جس سے میں خوش ہوں

لیکن اور قصبات میں جہاں تھوڑی بہت ریاست ہے وہاں اس قسم کا ظلم زیادہ ہوتا ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس سے غربا بھی بچے ہوئے نہیں ان میں بھی تکبر بہت ہوتا ہے گو امیروں کی برابر قدرت نہ ہو مگر اینٹھ مروڑ ان میں بھی ہے۔ چنانچہ خود اقرار کرتے ہیں کہ کوئی مال مست ہے کوئی کھال مست ہے۔ اور یہ بہت سخت بات ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تین شخصوں سے بہت زیادہ بغض و نفرت ہے ایک ملک کذاب بادشاہ جھوٹ بولنے والا کیونکہ آدمی اس لئے جھوٹ بولا کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اپنا کام نکالے اور اس کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی اپنے سے زیادہ زبردست ہو جس کے سامنے سچ بولنے سے کچھ اندیشہ ہوتا ہے تو بادشاہ سے اوپر تو کوئی نہیں ہوتا اس کو جھوٹ بولنے کی کیا مار آئی دوسرے "شیخ زانی" یعنی بڈھا زناکار کیونکہ جوان میں تو ایک داعی زنا کا موجود ہے جس کا روکنا ہمت کی بات ہے مگر بڈھے میں تو وہ داعی بھی موجود نہیں یہ تو زبردستی اپنے نفس کو سوچ سوچ کر آمادہ کرے گا تو اس کا زنا کرنا محض حرص اور خباثت و شرارت ہی ہے۔ تیسری عائل متکبر یعنی غریب تکبر کرنے والا کیونکہ امیر کے پاس تو تکبر کا کچھ سامان بھی ہے اور یہ خواہ مخواہ فرعون بے سامان بنا ہوا ہے۔ غرض جس شخص میں جس گناہ کا سبب اور داعی موجود ہو اس کا جرم اس شخص سے کم درجہ کا ہے جس میں کوئی سبب اور داعی موجود نہیں اس لئے غریبوں کا تکبر امیروں کے تکبر سے اشد ہے مگر حالت یہ ہے کہ غریب بھی اپنی کھال میں مست ہیں کہ جہاں ان کا بس چلتا ہے وہاں یہ بھی دوسروں کی ایذا رسانی سے نہیں چوکتے۔

ہمارے قصبہ میں ایک رئیس کے یہاں تقریب ہوئی تھی جس میں بہت کچھ سامان کیا گیا تو برادری کے ایک غریب شریف زادہ نے اس کی آبرو ہی بہانا چاہی اور سوچتے رہے کہ کسی بات پر موقع ملے تو اس کی خوشی میں کھنڈت ڈالوں مگر وہاں ایسا عمدہ انتظام تھا کہ کسی بات میں ان کو بولنے کا موقع نہ ملا۔ اتفاق سے سقہ پانی کی مشک لئے ہوئے ان کے پاس سے گذرا اور مشک کی ایک باریک دھار سے کچھ چھینٹے ان کے کپڑوں پر پڑ گئے بس یہ کہاں تھے فوراً بھلا کہہ کر کھڑے ہو گئے اور رئیس کو برا بھلا کہنا شروع کیا

کہ نو آموز دولت ہے انتظام کا سلیقہ نہیں ہے برادری کے بھائیوں کے سامنے سے سقوں کو نکالا جاتا ہے جس سے سب کے کپڑوں پر چھینٹے پڑتے ہیں اور ان کو ذلیل کیا جاتا ہے ہم ایسے اوچھے کی تقریب میں شریک نہیں ہو سکتے یہ کہکر چلتے ہو گئے پھر اس رئیس بیچارہ نے خوشامد کی ٹوپی پیروں میں ڈالی جب آپ تشریف لائے کیونکہ مقصود یہی تھا کہ ذرا اس کو ذلیل کر دیں اور اپنے پیروں میں اس کی ٹوپی ڈلوالیں مگر یہ اینٹھ مروڑ بھی اسی کی بدولت تھا کہ جانتے تھے وہ ہماری خوشامد کریگا آگے ہاتھ جوڑے گا اس لئے اس پر ناز تھا اور اس رئیس کی یہ تواضع بھی ریاست ہی کی بدولت تھی کیونکہ رؤسا جانتے ہیں کہ ہماری شان اتنی بڑی ہے جو ایسی باتوں سے نہیں گھٹتی۔ پس غربا، میں بھی تکبر اور ایذا رسانی کا مرض موجود ہے اس لئے اب میں اہل دولت کا لفظ چھوڑ کر "اہل قدرت" کہوں گا تو جس کو جتنی بھی قدرت حاصل ہے اس میں وہ دوسرے کی جان پر دست اندازی کرنے سے پاک نہیں کرتا گو زیادہ دست اندازی رؤسا ہی کے ہاتھ سے ہوتی ہے کیونکہ ان کو قدرت زیادہ ہے غریب آدمی کسی پر زیادتی کرتا ہے تو دوسرا اس کا بدلہ لے سکتا ہے اور امرا کی دل تو غربا نالش نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں۔ اور اگر نالش کریں بھی تو کامیابی دشوار ہے کیونکہ حکام بھی امرا کی رعایت کرتے ہیں (بس وہی حال ہو جاتا ہے) ؎

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کرینگے فریاد
وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا۔

خصوصاً حکومت غیر عادلہ میں تو امرا کی بہت ہی رعایت ہوتی ہے۔ ہاں حکومت عادلہ ہو تو وہاں کسی کی پروانہ ہو گی چاہے کوئی کتنا ہی امیر اور مالدار ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبلہ الایہم شاہ غسان اسلام لایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کے اسلام سے خوشی ہوئی تھی کیونکہ بادشاہ کے مسلمان ہونے سے اس کی رعیت کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں

دوسرے اس سے مخالفین پر بھی رعب پڑتا ہے مگر اس خوشی کا یہ اثر نہ تھا کہ جبلہ کی ایسی رعایت کی جاتی کہ وہ جس پر چاہے ظلم کرنے لگے اور کچھ بازپرس نہ ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ جبلہ لنگی باندھے ہوئے خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ لنگی باندھنا اہل عرب کا عام شعار تھا بادشاہ اور غریب سب لنگی باندھتے تھے۔ تو اس وقت اتفاق سے کسی غریب کے پیر سے جبلہ کی لنگی کا کونہ دب گیا جبلہ نے جو قدم آگے بڑھایا دفعۃً لنگی کھل گئی، غصہ سے سرخ ہو گیا اور اس غریب مسلمان کے بڑی زور سے طمانچہ مارا اس کا دانت ٹوٹ گیا۔ اس نے جبلہ کو تو کچھ نہ کہا سیدھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجلاس میں جا کر دعویٰ دائر کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کو بلایا اور پوچھا کہ تو نے اس مسلمان کو طمانچہ مارا ہے اس نے اقرار کیا۔ آپ نے مدعی سے فرمایا کہ تم جبلہ سے قصاص لے سکتے ہو۔ جبلہ نے کہا اے امیر المؤمنین اس بازاری کو مجھ جیسے بادشاہ کی برابر کس چیز نے کر دیا جو اس کو مجھ سے قصاص لینے کا حق حاصل ہو گیا۔ آپ نے فرمایا اسلام نے تم دونوں کو برابر کر دیا۔ جبلہ نے کہا اچھا مجھے کل تک کی مہلت دی جاوے میں کل قصاص دیدوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں مہلت نہیں دے سکتا یہ مدعی کا حق ہے اگر وہ چاہے مہلت دے یا نہ دے۔ بے چارہ غریب آدمی ذراسی بات پر پسیج جاتا ہے مدعی نے کہا کہ مجھے کل تک کی مہلت دینا منظور ہے۔ پھر رات کو وہ کمبخت چپکے سے نکل کر بھاگ گیا اور مرتد ہو کر نصرانیوں میں جا ملا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی ذرا بھی پرواہ نہ ہوئی اور نہ اسلام کو جبلہ کے ارتداد سے کچھ نقصان پہنچا بلکہ اگر حضرت عمرؓ اس کی رعایت کرتے تو اس سے بیشک اسلام کو ضرر پہنچتا۔ کیونکہ عقلاء کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ اسلام میں ضعیف کا قوی سے تہیہ لایا جاتا بلکہ زبردستوں کی رعایت کی جاتی ہے اور یہ خلاف عدل ہے اور اب گو ظاہر میں ایک جبلہ اسلام سے نکل گیا مگر عدل اسلامی کی نظیر تمام دنیا کے سامنے قائم ہوگئی اور سب کو معلوم ہو گیا کہ قانون اسلام میں کوئی زبردست کسی کمزور کا حق نہیں دبا سکتا جس سے ہزاروں لاکھوں آدمی عدل اسلامی کے شیدا بن گئے ۱۲ جامع)

اور تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں جبلہ بھی اپنے ارتداد پر بہت پچھتاتا تھا۔ اور باوجودیکہ نصرانیوں میں اس کی بڑی عزت اور آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اور ہر قسم کے سامان عیش اس کے لئے مہیا تھے مگر بعض دفعہ وہ رو کر یہ کہتا تھا اے کاش میں اس دن قصاص کو گوارا کر لیتا تو وہ میرے لئے اس عزت سے ہزار درجہ بہتر ہوتا۔ اسلام واقعی ایسی چیز ہے کہ اس کو چھوڑ کر کبھی چین نہیں مل سکتا۔

تو جہاں حکومت مسلمہ عمریہ ہو وہاں البتہ کسی رئیس یا بادشاہ کی کسی غریب کے مقابلہ میں کچھ رعایت نہ ہوگی اور میں مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر کوئی بڑا ہندو یا عیسائی مسلمان ہو جایا کرے تو اس کو نچاتے نہ پھرا کرو۔ ہاں اس کی خدمت اور خاطر کرو باقی ایسی دھوم دھام نہ کیا کرو جس سے کسی کو عجیب بات معلوم ہو کیونکہ کوئی رئیس ہو یا بادشاہ جو کوئی بھی اسلام لاتا ہے اپنی نجات اور اپنی فلاح کے لئے لاتا ہے۔ مسلمانوں پر کیا احسان کرتا ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا، میں کہہ رہا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی حکومت ہو تو خیر ورنہ غیر عادل حکومتوں کی یہی حالت ہے کہ ان میں رؤسا اور امراء کی غریبوں کے مقابلہ میں بہت رعایت کی جاتی ہے تو غرباء نالش کر کے بھی مالداروں سے انتقام نہیں لے سکتے اس لئے مالداروں کے ہاتھ سے مخلوق کی جان پر زیادہ ظلم ہوتا ہے۔ اور ایک ظلم حکام کے ہاتھ سے ہوتا ہے کہ کسی کے دو چار بیدیں بلا وجہ لگوا دیں ان کی تو کون نالش کرتا ہے اور بعضے اس طرح ظلم نہیں کرتے تو یوں کرتے ہیں کہ مقدمہ میں ایک فریق سے رشوت لے کر کسی کا حق ضائع کر دیا ایک ڈپٹی صاحب کی یہ حالت تھی کہ وہ دونوں فریق سے رشوت لے لیا کرتے تھے مگر ان سے سب خوش تھے بلکہ ایماندار مشہور تھے کیونکہ جس فریق کے خلاف وہ فیصلہ کرتے تھے ان کی رشوت واپس کر دیا کرتے تھے۔ اور بعضے یہ کیا کرتے ہیں کہ جس نے زیادہ رشوت دیدی اس کے موافق فیصلہ کر دیا اور دوسرے کی رقم بھی ہضم کر لی۔ مقدمہ تو حاکم کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے چاہے موافق کر دے حاکم کو مقدمہ کا بدلنا کیا مشکل ہے ہیر پھیر کر وہ جس طرح چاہے بنا دے اسی وسعت اختیار پر نظر کر کے میں مسلمانوں سے

کہا کرتا ہوں کہ تم حکام وقت کو ناراض نہ کرو یہ طریقہ بہت مضر ہے اس پر بعض نوجوان کہا کرتے ہیں کہ ہم تو کچھ کرتے ہیں قانون کے اندر رکھتے ہیں خلاف قانون کچھ نہیں کرتے پھر حکام کیا کر سکتے ہیں میں نے کہا کہ حکام کو تمہاری نیت تو معلوم ہے جب وہ یہ جانیں گے کہ یہ لوگ ہم کو ناراض اور تنگ کرنے کے لئے یہ حرکت کر رہے ہیں تو قانون اُن کے ہاتھ میں ہے جس بات کو تم خلاف قانون نہیں سمجھتے ہو وہ اس کو بھی کسی ترکیب سے خلاف قانون کر دیں گے اور شریعت کا امر ہے لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو تو ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس سے حاکم کی ناراضی ہو کیونکہ اس کا انجام قریب یہ ہلاکت ہے اور مدت دراز تک مسلمانوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسے خطرات سے حفاظت نفس شرعاً مطلوب ہے مگر اتنا فرق ہے کہ عوام تو اپنی جان سمجھ کر اپنے نفس کی حفاظت کرتے ہیں اور اہل اللہ خدا کی امانت سمجھ کر حفاظت کرتے ہیں کہ اس کو خلاف منشا حق صرف نہ کیا جاوے (اس لئے عارف ایسے موقع میں جہاں شریعت نے حفاظت نفس کا حکم دیا ہو اپنی جان کی بہت حفاظت کرتا ہے گو عوام اس کو بزدل و ڈرپوک کہیں اور جہاں شریعت نے بذل نفس کا حکم دیا ہو وہاں اہل اللہ سے زیادہ جانبازی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ۱۲ جامع) تو دو طبقے تو یہ ہیں جو ظلم میں زیادہ بدنام ہیں یعنی رؤسا اور حکام۔ اور ایک طبقہ اور ہے میانجیوں کا یہ بچوں کے ساتھ بہت ظلم کرتے ہیں۔ اُن کو جب کسی بچہ پر غصہ آتا ہے تو قہر عام کی طرح سب پر برستا ہے کہ ایک طرف سے سب کی خبر لیتے چلے جاتے ہیں اس سے میانجی بہت کم بچے ہوئے ہیں ہاں اگر کوئی ایسا ہو جیسے حافظ علی حسن صاحب کیرانوی مقیم گنگوہ تھے تو بے شک وہ اس ظلم سے بچ سکتا ہے مگر ان میں افراط نہ تھا تو یہ تفریط تھی کہ بچوں کو مار کر ان سے کہتے تھے کہ تم مجھ سے بدلہ لے لو اور بعضے لڑکے ایسے شریر تھے کہ بدلہ بھی لے لیتے اور حافظ جی کو قمچی سے سڑا سڑ مارتے تھے اور وہ ایسے سیدھے تھے کہ بچوں کے ہاتھ سے مار کھا لیتے تھے ان کے سیدھے پن کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ سقے کہیں بارات میں چلے گئے اور کئی روز تک محلہ والوں کو پانی کی

تکلیف رہی تو آپ اپنے لڑکے سے فرماتے ہیں کہ ارے سعید تو ہی ایک مشک بنا لے اور گھروں میں پانی بھر دیا کر۔ حافظ جی تو پرانے زمانہ کے آدمی تھے ان کو تو باوجود سید زادے اور شریف ہونے کے ایسے کاموں سے عار نہ تھا مگر ان کے صاحبزادے بڑے خفا ہوئے کہ لو ابا جان ہمیں سقا بنانا چاہتے ہیں۔ غرض وہ بڑے سید ھے تھے اور نیک بھی بہت ہی تھے، نماز تو ایسی اچھی پڑھتے تھے کہ سبحان اللہ! بڑی لمبی نماز پڑھتے تھے اور ہر رکن کو اعتدال و اطمینان سے ادا کرتے تھے مگر عدم علم کی وجہ سے وہ جماعت میں بھی ایسی ہی تطویل کرتے تھے جس سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ بہر حال وہ تو ایک میاں جی ہم نے ایسے دیکھے ہیں جو بچوں پر ظلم نہ کرتے تھے اور کبھی ذرا سی زیادتی ہو گئی تو اس کی تلافی اس طرز سے کرتے تھے گو یہ طریقہ اچھا نہیں اس سے لڑکوں کی شرارت اور بد دماغی اور بد خلقی بڑھ جاتی ہے اور معلم کو اس کی رعایت بھی ضروری ہے بچوں کے اخلاق خراب نہ ہوں تو اب اگر کوئی اپنی زیادتی کی تلافی کرنا چاہے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ سزا کے بعد بچوں کے ساتھ شفقت کرو اور جس پر زیادتی کی ہے اس کے ساتھ احسان کر دو یہاں تک کہ وہ خوش ہو جاوے۔ جیسے میرٹھ کے ایک رئیس نے ایک غریب نوکر کے طمانچہ مار دیا تھا پھر اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اس کو ایک روپیہ دیا پھر دوسرے نوکر سے کہا کہ اس سے پوچھتا اب کیا حال ہے کہنے لگا میں تو دعا کر رہا ہوں کہ ایسا طمانچہ روز لگ جایا کرے۔ بس یہ طریقہ تلافی کا بہت اچھا ہے اس سے بچوں کے اخلاق پر بھی برا اثر نہ ہوگا اور ظلم کا دفعیہ بھی ہو جائے گا اور جب میاں جی کا ایک دو دفعہ کرنے میں کچھ خرچ ہوگا تو آئندہ کو وہ خود بھی ذرا سنبھل کر مارا کریں گے نیز سزا کے بعد بچوں کو خوش کرنے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ان کے دل میں معلم سے بغض و عداوت نہ پیدا ہو جاوے جو علم سے محرومی کا سبب ہے۔ اس راز کو ایک رئیس نے سمجھا تھا۔

قصہ ان کا یہ ہے کہ جب میں کانپور میں تھا تو ہمارے مدرسہ میں ان رئیس کا بھانجا پڑھتا تھا جو بہت ہی شریر تھا اس کی یہ حالت تھی کہ پاخانہ کی دیواروں پر اساتذہ مدرسہ

کے نام لکھتا تھا لوگوں کو فکر ہوئی کہ کون نالائق ہے آخر لوگوں نے خفیہ طور پر تفتیش کی اور پہلا لکھا ہوا سب مٹا کر یہ انتظام کیا کہ جو شخص پاخانہ سے نکلتا اس کے نکلنے کے بعد فوراً دیکھا جاتا کہ کچھ لکھا ہوا تو نہیں ہے۔ آخر وہ لڑکا جو ایک دفعہ نکلا تو دیوار پر نام لکھے ہوئے پائے گئے اور اس کو پکڑ کر مدرسین کے پاس لایا گیا تو ایک مدرس نے اس کو سخت سزا دی حتیٰ کہ مارتے مارتے بے ہوش کر دیا اور اس کی جان کا خطرہ ہو گیا بعض لوگوں نے اس کے ماموں کو اطلاع دی وہ فوراً کانپور آئے تو واقعی لڑکے کی حالت نازک تھی مگر علاج معالجہ سے افاقہ ہوا اور بچنے کی امید ہو گئی شہر کے لوگوں نے ان کو بہت بہکایا کہ پولیس میں رپٹ لکھوا دو مگر وہ سمجھدار آدمی تھے انہوں نے گوارا نہ کیا کہ ایک دینی مدرسہ کی شکایت غیروں کے پاس لے جاؤں بالآخر وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ صاحب میری عدالت تو آپ ہیں۔ میں آپ کے یہاں استغاثہ کرتا ہوں۔ میں نے چپکے سے ان مدرس صاحب کے پاس رقعہ لکھا کہ تم اسی وقت اپنا استعفاء داخل کر دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر میں نے رئیس صاحب سے کہا کہ میرے پاس ان صاحب کا استعفاء ملازمت سے آ گیا ہے اور وہ آپ کے سامنے ہے اب ہم کو ان پر کوئی حق مواخذہ کا نہیں رہا کیونکہ وہ مدرسہ کے ملازم ہی نہ رہے اس لئے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کا جہاں جی چاہے استغاثہ دائر کر کے انتقام لیجئے وہ کہنے لگے کہ کیا آپ نے ان کا استعفا منظور کر لیا ہے۔ میں نے کہا اور رد کرنے کا ہم کو کیا اختیار ہے۔ وہ بیچارے بہت بڑے اہل آدمی تھے کہنے لگے یہ تو میری بڑی نحوست ہوئی کہ میری وجہ سے ایک عالم مدرسہ سے الگ ہوتے ہیں اور ان کا فیض مدرسہ سے بند ہوتا ہے میں اپنا استغاثہ واپس لیتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کہیں استغاثہ نہ کروں گا میں نے اپنا حق معاف کیا آپ ان کا استعفاء واپس کر دیں ان کی اس اہلیت سے میں بڑا خوش ہوا کہ شاباش مسلمان کو دین سے ایسی ہی محبت ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ان کی عجیب خوش فہمی یہ تھی کہ مجھ سے کہنے لگے کہ میرا خیال یہ تھا کہ اس لڑکے کو اپنے ہمراہ لے جاؤں اور گھر پر اس کی تعلیم کا انتظام کروں

مگراب میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کو کچھ دنوں مدرسہ ہی میں رکھوں کیونکہ ابھی اگر میں اسکو گھرلے گیا تو یہ اس حالت میں جائے گا کہ اس کے دل میں ایک عالم سے کینہ اور بغض ہوگا اور یہ اس کی آخرت کو مضر ہوگا۔ اس لئے چندروز اس کو مدرسہ ہی میں رکھا جائے اور انہیں حضرت کے سپرد کیا جائے جنہوں نے اس کو مارا تھا اور ان سے کہدیا جائے کہ اب اس کے ساتھ شفقت اور ملاطفت کا ایسا برتاؤ کریں جس سے اس کے دل کا غبار نکل جائے اور ان سے اس کو محبت ہو جائے پھر میں اس کو گھر بلالوں گا واقعی اس شخص کی سلامت فطرت پر میں حیران رہ گیا اور بے ساختہ میرے دل سے ان کے لئے دعا نکلی اور اس وقت ہی سے میری سمجھ میں یہ تدبیر آئی کہ بچوں پر زیادتی ہو جائے تو اس کی تلافی اس طرح کرنا چاہیئے (دیکھئے بعضے دنیا دار بھی کیسی سمجھ کے ہوتے ہیں ۱۲)

بعضے میانجی بچوں پر مار کا تو ظلم نہیں کرتے مگر اور طرح ظلم کرتے ہیں وہ یہ کہ ان سے اپنے گھر کی خدمت لیتے ہیں کہیں پانی بھرواتے ہیں کبھی آٹا پسواتے ہیں، کبھی مٹی ڈھواتے ہیں. یاد رکھو والدین کی اجازت کے بغیر نابالغ بچوں سے ایسی خدمت لینا جائز نہیں، بعضے میانجی یہ کرتے ہیں کہ گرمیوں کی دوپہر میں خود تو سو رہتے ہیں اور بچوں سے پنکھا جھلواتے ہیں یہ کتنا بڑا ظلم ہے آخر جس طرح تم کو نیند آتی ہے ان کو بھی تو آتی ہے مگر بعضے لڑکے ان کے بھی چچا ہوتے ہیں۔ لوہاری میں ایک میانجی تھے ان کے پاس جہاں سے کچھ مٹھائی آتی اور وہ حفاظت کے ساتھ رکھتے لڑکے سب کھا جاتے اور کوئی ثبوت ہوتا نہ تھا. ایک مرتبہ کہیں سے بتاشے آئے تو انہوں نے بتاشوں کو لوٹے میں رکھ کر اوپر سے آٹا لگا کر منہ بند کر دیا جو سوکھنے کے بعد بچوں سے دقت کے ساتھ کھلتا اور راز ظاہر ہو جاتا۔ اب لڑکے آئے اور سوچنے لگے کہ آج تو میانجی نے بڑا انتظام کیا ہے۔ اگر منہ کھولتے ہیں تو پتہ چل جائے گا۔ ایک لڑکے نے کہا میں اس کی ترکیب بتاتا ہوں اس کی ٹونٹی میں پانی ڈالو اس سے بتاشے گھل جائیں گے پھر شربت کو سب پی جاؤ۔ چنانچہ ایسے ہی کیا اور لوٹا بند کا بند

رہا اب جو میاںجی نے کسی دن خوش خوش اس کے منہ کو کھولا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا تو بعض لڑکے ان میاںجیوں کی بھی خوب گت بنا دیتے ہیں۔ مگر اکثر یہی زیادتی کرتے ہیں بعضے میاںجی دوسروں کا کام بھی بچوں سے لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی مر گیا تو اس کا تیجہ بچوں سے پڑھواتے ہیں اور بعضے میت کے گھروں پر بھی بھیجدیتے ہیں۔ کانپور میں بھی یہ رواج تھا کہ بچوں کو تیجے کے لئے لے جاتے تھے۔ میں نے روک دیا کہ بچے مدرسہ میں تیجے کے واسطے نہیں آتے بلکہ نتیجہ کے واسطے آتے ہیں یہاں سے اس کام کے لئے کوئی نہ جائے گا۔ تب یہ سلسلہ بند ہوا غرض بچوں سے ایسا خدمت لینا جائز نہیں جس میں والدین کی رضا نہ ہو اور اگر رضا بھی ہو تو جو خدمت بچوں کی طاقت سے باہر ہو یا خدمت خلاف سنت ہو (جیسے تیجہ کے دلانے پڑھوانا ۱۲) وہ بھی جائز نہیں میاںجیوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔

ایک طبقہ اور ہے جو بچوں کی جان و مال پر ظلم کرتا ہے وہ رسمی مشائخ کا طبقہ ہے یہ تو مریدوں کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اور ان سے آئے دن فرمائشیں کرتے ہیں۔ کبھی پاؤں دبواتے ہیں کبھی پنکھا جھلواتے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ اب کے آؤ تو انگور لانا، بعضے گھوڑے کے لئے گھاس منگواتے ہیں اور ایسی خدمتیں لیتے ہیں جو اکثر ان پر بار ہوتی ہیں یاد رکھو یہ بھی جائز نہیں ہے کیسا ہی مخلص مرید ہو از خود اس سے کوئی فرمائش نہ کرنا چاہیئے ورنہ تمہاری وہ حالت ہوگی جیسے ایک مرید نے کہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری انگلیاں پاخانہ میں وہ بڑے خوش ہوئے کہنے لگے کیوں نہ ہو بحمداللہ ہم پاک صاف ہیں اور تم دنیا دار گندگیوں کے بھرے ہوئے ہو۔ کہنے لگے حضور یہ تو سچ ہے مگر ابھی خواب پورا نہیں ہوا۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ آپ کی انگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں۔ اب تو وہ بڑے جھلائے کہ نالائق ہے مردود ہے کہنے لگا حضور میں نے تو خواب بیان کیا ہے جو دیکھا تھا وہ عرض کر دیا واقعی اگر یہ خواب تھا تو اس کی تعبیر ظاہر ہے کہ مرید تو شیخ سے دین حاصل کرتا تھا اور شیخ مرید سے

دنیا وصول کرتا تھا اور اگر اس نے گڑھا تھا تو بہت ہی موقع کے مناسب گڑھا۔ اس لئے مشائخ کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ مریدوں کی دنیا پر نظر نہ کریں اور از خود کسی سے کچھ فرمائش نہ کریں ہاں کسی سے بہت ہی بے تکلفی ہو جہاں بار ہونے کا مطلق احتمال نہ ہو اس سے کوئی بہت ہی ہلکی فرمائش کا مضائقہ نہیں مگر ایسے مخلص ہزار میں ایک ہی دو ہوتے ہیں عالم حالت یہی ہے کہ لوگوں کو فرمائش سے گرانی ہوتی ہے بلکہ خود ہدایا میں بھی جن کی خود فرمائش بھی نہیں کی جاتی خلوص و محبت کی رعایت سخت ضروری ہے ہر وقت ہدیہ قبول کرنے کو تیار نہ بیٹھے رہا کریں کیونکہ بعض لوگ محض اس خیال سے ہدیہ دیتے ہیں کہ اگر نہ دیں گے تو شیخ کو یہ خیال ہوگا کہ اس کو ہم سے محبت نہیں یا دوسرے یہ سمجھیں گے کہ اس کو تعلق نہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں خلوص کہاں (خلوص و محبت کے تو معنی یہ ہیں کہ ہدیہ دینے والے کو دنیا کی غرض تو کیا آخرت کی بھی غرض مقصود نہ ہو یعنی ثواب کا بھی قصد نہ ہو کیونکہ ثواب کے لئے کچھ دینا صدقہ ہے ہدیہ نہیں ہے ہدیہ وہ ہے جو محض تطییب قلب مہدی لہ کے لئے دیا جائے گو تطییب قلب مسلم بھی ثواب کا موجب ہے اور اس سے ثواب کی نیت مذموم نہیں مگر ثواب اعطاء کا قصد نہ ہونا چاہیئے کذا قالہ الشیخ ۱۲) اور فکر کے بعد خلوص و محبت کی پہچان ہو جاتی ہے پھر دھوکہ کم ہوتا ہے۔ چنانچہ بحمداللہ مجھے اس کی پہچان میں ملکہ ہو گیا ہے بہت کم دھوکہ ہوتا ہے کیونکہ ہمیشہ سے اس کی فکر ہے گو کبھی دھوکہ بھی ہو جاتا ہے کیونکہ آخر بشر ہوں اور وہ بھی بار جارہ کے ساتھ نہ کہ فاعل کے ساتھ مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے میرے پاس آجکل ہی میں تین خط آئے اور تینوں ساتھ ہی آئے اور ایک ہی جگہ سے چلے ہوئے تھے غالباً بہار کی طرف سے آئے تھے اور تینوں کا طرز خط بھی یکساں تھا ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ڈیڑھ سو روپیہ ہدیۃً بھیجنا چاہتا ہوں جس کے لئے اجازت کا طالب ہوں۔ دوسرے میں ایک سو اٹھارہ روپے لکھے تھے اور تیسرے میں شاید صرف اٹھارہ تھے مجھے ایک ہی دن میں تین خطوں کے آنے سے شبہ ہوا پھر مضمون اور رسم الخط یکساں دیکھ کر یہ شبہ قوی ہو گیا کہ شاید ان سب میں کچھ مشورہ ہوا ہے یا ایک ہی شخص نے نام

بدل کر تین خط بھیجے ہیں۔ اب میں بڑا پریشان ہوا کہ کیا جواب دوں اگر منظور کر لوں کہ ہاں بھیجدو تو اس کے ساتھ یہ شبہ لگا ہوا تھا کہ شاید یہ محض باہمی مشورہ اور ان لوگوں کو امتحان مقصود ہو تو اس جواب سے دین کی سُبکی ہوگی اور اگر انکار کر دوں تو شبہ تھا کہ شاید ان لوگوں نے خلوص سے لکھا ہو سو محض اپنے گمان پر میں مخلصین کی دلشکنی کیسے کر دوں پھر گمان بھی اتنا ہی ہوا تھا کہ شاید باہم مشورہ ہوا ہے سو مشورہ میں بھی خلوص ہو سکتا ہے ممکن ہے یہاں کسی طالب علم کو یہ شبہ پیدا ہوا ہو کہ جب عدم خلوص کا علم نہ تھا تو قبول کرنا حلال تھا ہاں بیشک یہ صحیح ہے مگر جب تھوڑی سی کوشش سے علم ہو سکے تو پھر سستی کیونکر جائز ہوگی بات یہ ہے کہ باہم مشورہ میں گو خلوص ہو سکتا ہے مگر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کی رائے ہوتی ہے ایک کی نہیں ہوتی وہ محض شرما شرمی سے شریک ہو جاتا ہے اور یہی اغلب واکثر ہے مشورہ میں سب کا خلوص نادر ہے تو اس احتمال قوی کے ہوتے ہوئے ان ہدایات کا مطلقاً قبول کر لینا کیونکر جائز ہوتا اور ترجیح کے لئے کسی مرجح کی ضرورت تھی یہاں مرجح کوئی تھا نہیں کیونکہ میں ان کاتبین میں سے کسی سے بھی واقف نہ تھا اس لئے میں نے اس شبہ کے زائل کرنے کی تدبیر سوچی اور جو شخص اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا چاہتا ہے حق تعالیٰ اس کی امداد فرماتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری امداد فرمائی اور یہ دل میں آیا کہ ابھی نہ اقرار کرنا چاہیئے نہ انکار بلکہ ان لوگوں سے استفسار کرنا چاہیئے کہ مجھ کو یہ شبہ ہوا ہے آیا یہ صحیح ہے یا نہیں اس کے بعد جو کچھ جواب آئیگا اس سے اصل حقیقت معلوم ہو جائیگی چنانچہ میں نے ہر شخص کو یہی لکھدیا کہ آپ کا خط آیا اور تعجب ہے کہ اس کے ساتھ اسی دن کی ڈاک میں دو خط اسی مضمون کے اور آئے جن کا رسم الخط بھی اسی خط سے ملتا ہوا تھا اس اتفاقی اجتماع سے مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید باہم کچھ مشورہ ہوا ہے آیا میرا یہ خیال صحیح ہے یا غلط۔ اس جواب کو لکھے ہوئے تقریباً دس بارہ دن ہو گئے مگر آج تک بھی ان کا خط نہیں آیا۔ بس سب خاموش ہو کر بیٹھ رہے میں نے خدا تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا کہ اس نے دنیا داروں کی چالاکی و تحقیر سے بچا لیا۔ اور صاحب ہماری عزت

تو کیا چیز ہے مگر اہلِ علم کی حرص وغیرہ سے لوگ دین اور علم کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں پس مشائخ کو اس میں بہت احتیاط کرنا چاہیئے اور بدون سوچے سمجھے ہر ایک کا ہدیہ قبول نہ کیا کریں نیز اپنے مریدوں کو اس کا عادی کرنا چاہیئے کہ وہ بالالتزام ہدیہ لے کر نہ آیا کریں کیونکہ التزام میں خلوص نہیں رہتا اور یہ جو مشہور ہے کہ خالی جاوے خالی آوے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو خلوص سے خالی جاوے وہ فیوض سے خالی آوے یہ مطلب نہیں کہ جو فلوس سے خالی جاوے وہ بھی محروم ہی آتا ہے ہرگز نہیں۔ اور اگر کسی کو ایسا ہی التزام کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس کا اہتمام نہ کرے کہ ہر دفعہ بڑھیا چیز ہی لے جاوے بلکہ کبھی کبھی معمولی چیزیں بھی لیجایا کرے (مثلاً مسواک لے گئے یا ایک دو پیسہ کی روشنائی ہی لے گئے یا ایک دو قلم لے گئے۔ کبھی دو چار خوشبودار پھول لے آئے وغیرہ وغیرہ ۱۲) بزرگانِ سلف ایسا ہی کرتے تھے کہ جب ہدیہ کا شوق ہوا تو جو چیز بھی ملی خواہ وہ کیسی ہی معمولی ہو وہی لے گئے اس کے لئے اہتمام اور تکلف نہ کرتے تھے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے ملنے گئے راستہ میں خیال ہوا کہ کچھ ہدیہ لے چلنا چاہیئے کوئی دوسرا ہوتا تو گھر واپس آتا مگر انھوں نے یہ کیا کہ جنگل میں سے کچھ سوکھی ہوئی لکڑیاں اٹھالیں اور لاکر ان بزرگ کے سامنے رکھ دیا کہ یہ لکڑیاں حضرت کے لئے پانی گرم کرنے کو لایا ہوں وہ بزرگ اس ہدیہ سے بڑے خوش ہوئے اور اس کی ایسی قدر کی کہ فوراً اپنے خادم کو بلایا اور کہا کہ لکڑیاں بہت حفاظت سے رکھو جب ہم مرجائیں تو ہمارے غسل کے لئے اس سے پانی گرم کیا جاوے۔ امید ہے کہ حق تعالیٰ اس ہدیہ حلال وخالص کی برکت سے میری مغفرت فرمادیں گے، سبحان اللہ کیسے قدردان لوگ تھے۔ لو اس طرح اگر التزام بھی کرو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اگر گھاس پھوس نہ ملے تو کم ازکم دو چار مٹی کے ڈھیلے ہی استنجا کے لئے لیجاؤ اور اگر یہ خیال ہو کہ ایسے حقیر ہدیہ سے شیخ ناخوش ہوں گے اور اس کی قدر نہ کریں گے تو یاد رکھو ایسا شخص شیخ بنانے کے قابل نہیں جس کو خلوص کی قدر نہ ہو فلوس ہی کی قدر ہو۔ صاحب تم کر کے تو دیکھو محبت کی قدر ضرور ہوتی ہے چاہے ہدیہ ظاہر میں

قلیل ہی ہو اور دنیا قدر نہ ہو تو خدا کے یہاں تو ضرور قدر ہوگی۔

حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم (فَدَاکَ آبَائُنَا وَاُمَّھَاتُنَا وَاَزْوَاجُنَا وَمَابِاَیْدِیْنَا ۱۲) یہ ہمارے باپ مائیں اور ازواج اور جو کچھ ہمارے پاس ہے سب آپ پر قربان ہے) کی روح پر فتوح کو ثواب پہنچانے کے لئے کھانا پکوایا تھا ماشاء اللہ سلطان جی کے یہاں شاہانہ انتظام تھا بڑے عمدہ عمدہ کھانے پکوائے تھے۔ (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدیہ ثواب سے زیادہ اور کس چیز میں وہ خرچ کرتے ۱۲) کھانا تیار ہو گیا تو خدام نے اجازت چاہی کہ اس کو اٹھا کر تقسیم کر دیا جائے۔ سلطان جی نے فرمایا کہ ابھی ذرا ٹھہرو پھر کچھ دیر کے بعد پوچھا تو فرمایا ابھی ٹھہرو کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ اب تقسیم کرو کسی خادم نے وجہ پوچھی کہ آپ کو کس کا انتظار تھا پہلے بار بار انکار کیوں تھا اور اب اجازت کیسے دیدی۔ فرمایا اس وقت میرے بھائی علی احمد صابر نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح کو ثواب کے لئے بھنے ہوئے چنے تقسیم کئے تھے۔ تو میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ تن ادھر متوجہ ہیں تو ایسی حالت میں میں نے اپنا کھانا تقسیم کرنا نہیں چاہا بلکہ میں نے یہ چاہا کہ ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادھر متوجہ ہوں تو پھر کھانا اٹھاؤں تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت صابر کے چنے اس قدر محبوب تھے کہ آپ ہمہ تن اس طرف متوجہ تھے۔ حالانکہ حضرت سلطان جی کے کھانے ظاہر میں ان سے بہت بڑھے ہوئے مگر چونکہ حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس زیادہ سامان نہ تھا انھوں نے ساری عمر گولر اور درخت کے پتے کھا کر ہی گذار دی حتیٰ کہ چند سیر سے زیادہ اناج عمر بھر میں بھی ان کے پیٹ میں نہیں پہنچا واقعی بڑے صابر تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا قلیل ہدیہ ہی دوسروں کے ساز و سامان سے زیادہ عزیز تھا مگر آجکل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسا ہدیہ ہوگا ویسا ہی ثواب ہوگا۔ اگر ہدیہ قلیل ہو تو ثواب بھی قلیل ہوگا۔ صاحبو یہ صحیح نہیں بلکہ وہاں تو خلوص کو دیکھا جاتا ہے اگر ہدیہ قلیل ہو مگر خلوص زیادہ ہو تو ثواب زیادہ ملے گا اور ہدیہ زیادہ ہو اور خلوص کم ہو تو ثواب کم ہوگا (البتہ اگر دونوں زیادہ ہوں خلوص بھی اور ہدیہ بھی تو بیشک یہ تو

نورٌ علیٰ نور ہوگا۔ ہاں اس کے بعد پھر اس کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ جس نے زیادہ دیا ہے وہ صاحب وسعت ہے اور جس نے کم دیا ہے وہ صاحب وسعت نہیں تو باوجود خلوص میں برابر ہونے کے بھی کم وسعت والے کا ہدیہ صاحب وسعت کے ہدیہ سے بڑھ جائیگا) بعض لوگوں میں ایک غلطی اعتقادی یہ بھی ہے کہ ثواب کو نوعیت میں بھی کھانے کے موافق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شیر خوار بچوں کے لئے ایصال ثواب میں دودھ دیتے ہیں گوشت نہیں دیتے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے دانت کہاں ہیں جو گوشت کھائیں اسی طرح شہداء کو سبیل میں شربت کا ثواب پہنچاتے ہیں کیونکہ وہ پیاسے شہید ہوئے تھے۔ اس میں علاوہ اس اعتقادی غلطی کے دوسری غلطی یہ بھی ہے کہ گویا ان کے نزدیک شہداء اب تک پیاسے ہی ہیں نعوذ باللہ لے صاحب انھوں نے تو مرتے ہی جنت کا ایسا شربت پیا ہوگا جس سے عمر بھر بھی پیاس نہ لگے اس کے متعلق خیر آباد کے ایک بزرگ کا قصہ مشہور ہے کہ ان کے نزدیک مرید نے زندگی ہی میں ان کی فاتحہ کی تھی جب وہ فاتحہ دلاکر ان سے ملنے آیا تو فرمانے لگے کہ بھائی ذرا فاتحہ دیتے ہوئے گرم ٹھنڈے کا تو خیال کرلیا کرو تم نے فاتحہ میں فیرنی ایسی جلتی ہوئی دی کہ اب تک میری زبان میں چھالے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ مرید نے اپنے گھر پر فاتحہ دی تھی مگر وہ جلتی جلتی ہی فقیروں کے منہ میں سے پیر صاحب کے منہ میں پہونچ گئی۔ ہمیں یہ قصہ گڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ واہیات بھلا ایصال ثواب سے دوسرے کو ثواب پہنچتا ہے یا وہی کھانا پہنچتا ہے یقیناً ثواب پہنچتا ہے اور ثواب گرم ٹھنڈا ہوتا نہیں بلکہ وہ نیکیاں ہیں جو مہدی لہ کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں جس کا صلہ جنت کے درجات ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ قصہ محض لغو ہے۔ ثواب کے لئے تو نص قطعی ہے لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ کہ خدا کے یہاں قربانی کے جانوروں کا نہ گوشت پہنچتا ہے نہ خون بلکہ وہاں تو تقوی (اور خلوص) پہنچتا ہے اس نص سے عوام کی غلطی ظاہر ہوگئی جو ثواب کو کھانے کے موافق سمجھتے ہیں اور اسی نص کے موافق

اہل اللہ کے یہاں بھی خلوص کی قدر ہوتی ہے۔ گو ظاہر میں ہدیہ قلیل ہو چنانچہ ان بزرگ نے لکڑیوں کے گٹھر کی یہ قدر کی کہ اس کو اپنے جنازہ کے غسل کے لئے احتیاط سے رکھوایا بعض دفعہ اہل اللہ تو کسی کے ہدیہ کی تحقیر نہیں کرتے مگر ان کے خدام تحقیر کرتے ہیں تو خدام کی رعایت نہ کرنا چاہیئے۔ اور مشائخ کو چاہیئے کہ کسی کو اپنا خادم خاص نہ بنائیں جس کو ان کے کاموں میں زیادہ دخل ہو بعض دفعہ یہ حواشی غضب کرتے ہیں کہ مریدوں کے ہدایا کی تحقیر کرتے اور بعض مریدوں کی شکایتیں شیخ سے کرتے رہتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بڑھا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں گرا دیتے ہیں پھر شیخ بھی آخر بشر ہے سنتے سنتے کچھ اثر اس کے قلب پر بھی ہو ہی جاتا ہے اس لئے میں تو بجائے حواشی کے ان کو مواشی کہتا ہوں غرض ظلم سے بہت کم لوگ بچے ہوئے ہیں مشائخ تو مریدوں کی جان میں تصرف کرتے ہیں اور میاں جی بچوں کی جان میں اور رؤسا غریبوں کی جان میں بعض جگہ عوام رؤسا میں یہ دستور ہے کہ چوپال میں بیٹھے ہوئے ہیں اور سامنے سے کوئی غریب مزدور سر پر بوجھ رکھے ہوئے گذرا تو اس کو بلا کر کہدیا کہ بوجھ تو یہاں رکھ دے اور فلاں جگہ جا کر یہ کام کر آ یہ صریح ظلم ہے کیونکہ اس سے لوگوں پر عموماً ناگواری ہوتی ہے۔ وہ غریب بیچارہ رئیس کے ڈر سے کچھ نہیں کہتا مگر اس کا دل ہی جانتا ہے کہ اس کا وقت کیسا کھوٹا ہوا اگر کام ہی لیتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے یہ کہو کہ ہم کو فلاں جگہ ایک آدمی بھیجنے کی ضرورت ہے اور اتنی مزدوری دیں گے اگر تجھے مزدوری لینا ہو تو بوجھ رکھ کر یہ کام کر لے۔ غرض غریب کا دل خوش کر کے پھر کام لو اور غریب کا خوش کر دینا ہی کیا مشکل ہے دو چار آنے کے پیسوں میں بیچارہ خوش ہو جاتا ہے مگر تراضی طرفین سے ہو۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ ٹمٹم اور گاڑی کا کرایہ طے نہیں کرتے نہ قلی کی مزدوری چکاتے ہیں۔ بس بے کہے سنے سوار ہو گئے یا مزدور کے سر پر بوجھ لاد دیا اور بعد میں سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دیتے ہیں تو یاد رکھو یہ جائز نہیں بلکہ کرایہ اول چکانا چاہیئے اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوگا کہ لیجئے حکومت نے تو ٹمٹم والوں

اور قلیوں کی زیادتی سے مسافروں کو محفوظ کرنے کے لئے ایک نرخ مقرر کیا تھا۔ شریعت نے اس کو بھی ناجائز کر دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ بس جتنا بھی کوئی مانگے وہی دو چاہے لُٹ ہی جائے اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ظلم کو روکنا چاہا نیز اس سے بھی بچانا چاہا کہ بعد میں نزاع نہ ہو سو ظاہر ہے کہ مزدور سے بلا رضامندی کام لینے کا کسی کو کیا حق ہے اسی طرح کسی کی گاڑی میں بدون اس کی خوشی کے سوار ہونے کا کسی کو کیا حق ہے۔ باقی حکومت نے جس مصلحت سے نرخ نامے مقرر کئے ہیں شریعت اس کو فضول نہیں کہتی مگر اس کی صورت شریعت کے موافق یہ ہے کہ ٹمٹم والے سے یا قلی سے کام لینے کے پہلے صاف کہدو کہ ہم سرکاری نرخ نامے کے موافق تم کو کرایہ یا مزدوری دیں گے اس سے زیادہ نہ دیں گے اگر خوشی ہو قبول کرلو اگر وہ اس پر بھی آپ کو بٹھلالے یا سامان اٹھالے تو پھر سرکاری نرخ کے موافق کرایہ دینا جائز ہے۔ کیونکہ اب آپ نے معاملہ صاف کرلیا اور دوسرے نے بخوشی اسکو منظور کرلیا ہے پس تم سرکاری نرخ نامہ کے موافق ہی دو مگر پہلے کہکر دو یہ نہیں کہ اول تو خاموش سوار ہو جاؤ اور بعد میں سرکاری نرخ کے حساب سے دو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ٹمٹم والے نے اس مزدوری کے خیال سے آپ کو نہ بٹھایا ہو۔ بلکہ ٹمٹم والوں کے عام رواج کے موافق مزدوری لینا چاہتا ہو پھر بعد میں نزاع ہوگا۔ چنانچہ ہم نے اکثر لوگوں سے جھگڑا ہوتے ہوئے دیکھا ہے (اگر انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت ہو تو وہ بعد کے نزاع کو ہرگز گوارہ نہ کرے گا یہی شریعت کی تعلیم ہے کہ مزدوری اور کرایہ اول طے کرلو چاہے سرکاری نرخ ہی کے موافق طے کرلو بدون صفائی کے کسی چیز سے منتفع نہ ہو ۱۲) اسی طرح بعض حکام یہ ظلم کرتے ہیں کہ دورہ کے وقت کہیں سے بلا قیمت دودھ منگاتے ہیں، کہیں سے پھل منگاتے ہیں اور بعض جگہ قصبات کے رؤسا ان کے لئے یہ چیزیں بھیجتے ہیں۔ پہلی صورت تو صریح ظلم ہے اور دوسری صورت رشوت میں داخل ہے اور اس میں بھی اکثر ظلم ہی ہوتا ہے کیونکہ زمیندار اور رئیس اپنے گھر سے یہ سامان نہیں بھیجتے بلکہ بستی کے دکانداروں پر ظلم کرکے ان سے

لیتے ہیں اور حکام کے ڈیرہ پر پہنچاتے ہیں جب حکومت کی طرف سے دورہ کرنے والوں کو ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور دورہ کا بھتہ بھی ملتا ہے پھر ان کو بستی والوں سے یہ چیزیں لینے کا کیا حق ہے مسلمانوں کو اس طریقہ سے بچنا چاہیئے بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ حاکم خود تو منتظم ہوتا ہے کسی سے رشوت نہیں لیتا نہ کسی پر ظلم کرتا ہے مگر ان کے متعلقین چپراسی وغیرہ ظلم کرتے ہیں اس لئے حاکم تنہا اپنی احتیاط سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ اس کا انتظام بھی اس کے ذمہ ہے کہ متعلقین بھی ظلم نہ کرنے پائیں جس کی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اشتہار دیدے کہ میرے یہاں رشوت کا بالکل کام نہیں اس لئے اگر میرے عملہ میں کوئی شخص کسی سے رشوت مانگے تو ہرگز کوئی نہ دے بلکہ ہم سے اس کی اطلاع کرے پھر اطلاع کے بعد جس نے ایسی حرکت کی ہو اس سے رقم واپس کرائے اور کافی سزا دے نیز جو شخص حاکم سے ملنے آئے اس کو خود جاکر دروازہ سے باہر تک پہنچائے تاکہ نکلتے ہوئے کوئی چپراسی وغیرہ اس کو تنگ نہ کرے قرآن میں نص ہے وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ۔ علت سے اس کے عموم میں یہ صورت بھی قیاساً داخل ہے نیز حکام کو یہ بھی چاہیئے کہ لوگوں کے تعلقات براہ راست اپنے سے رکھیں کسی شخص کو واسطہ نہ بنائیں کیونکہ یہ واسطے بہت ستم ڈھاتے ہیں اگر یہ کہو کہ صاحب یہ تو بڑا مشکل ہے تو میں کہوں گا ہاں بیشک مشکل ہے مگر حکومت کرنا آسان نہیں یہ منہ کا نوالہ نہیں حاکم ہر وقت جہنم کے کنارہ پر ہے اگر جہنم کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہی ہے اور تم نے تو یہ بلا خود اپنے سر لی ہے تم نے کوششیں کرکے سفارشیں کرا کے حکومت حاصل کی ہے پھر اس کے حقوق ادا کرنے سے کیوں جان چراتے ہو جو بلا خود تم نے اپنے سر لی ہے اس کا مزہ چکھو۔

صاحبو! حکومت وہ چیز ہے کہ حضرات سلف تو اس سے بھاگتے تھے۔ ماریں کھاتے تھے اور قبول نہ کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے آپ مقلد کہلاتے ہیں اسی پر شہید کئے گئے۔ خلیفہ وقت نے کئی دفعہ ان کو عہدۂ قضا پر مامور کیا مگر انکار کردیا کیونکہ ان کو یہ حدیث یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

"مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّيْنٍ" یعنی جو شخص قاضی بنا دیا گیا وہ بدون چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ اس لئے امام صاحب عذر کرتے تھے آخر اسی بات پر امام صاحب قید کئے گئے اور قید خانہ ہی میں زہر دیکر شہید کئے گئے یہ سب کچھ گوارا تھا مگر حکومت منظور نہ تھی۔

صاحبو! سلف کی یہ حالت تھی کہ جب خلفا کسی عالم کو قاضی بنانا چاہتے اور وہ قضا کی مذمت اور وعیدیں ان کو احادیث سناتے تو سلاطین ان کی خوشامد کرتے تھے کہ اچھا ہم تم کو چھوڑے دیتے ہیں مگر للہ یہ باتیں دوسروں سے نہ کہنا ورنہ سب لوگ قضا کو چھوڑ دیں گے لیکن یہ وعیدیں اسی حاکم کے لئے ہیں جو حکومت کے حقوق ادا نہ کرے اور جو عدل وانصاف کا اہتمام کر کے اس کے حقوق ادا کرے تو اس کے لئے قیامت میں عرش کا سایہ بھی ہے مگر اب دیکھئے کہ جن لوگوں نے اس کے حقوق ادا کئے ہیں ان کی کیا حالت تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ نے جب شام کا دورہ کیا ہے تو آپ کے ساتھ کل یہ سامان تھا کہ ایک غلام تھا اور ایک اونٹ اسی پر آقا اور غلام دونوں باری باری سوار ہوتے تھے اور کھانے کے لئے ستو کا ایک تھیلا تھا اور ایک کھجوروں کا بس سارے راستہ اسی کو گھول کر پی لیا اور چار کھجوریں کھالیں نہ ساتھ میں خیمہ تھا نہ گھوڑے تھے۔ نہ بہت لاؤ لشکر تھا پھر راستہ میں جہاں ٹھہرتے تھے وہاں استقبال کرنے کی ممانعت تھی نہ کسی کا ہدیہ لیتے تھے نہ کسی گاؤں سے دودھ اور جنس منگاتے تھے یہ تو خلیفہ کی حالت تھی۔ اب سردار لشکر کی حالت سنئے۔ جس وقت حضرت عمرؓ ملک شام میں پہنچے اور حضرت امیر عبیدہؓ امیر العساکر اسلامیہ کے خیمہ میں داخل ہوئے تو دیکھا نہ وہاں فرش وفروش ہیں نہ کچھ زیب وزینت ہے۔ بس چمڑہ کا بستر تھا اور خیمہ کی چوب میں ایک تھیلہ لٹکا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا اے ابو عبیدہؓ اس تھیلہ میں کیا ہے فرمایا اس میں روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑے ہیں افطار کے وقت ان کو بھگو کر کھا لیتا ہوں۔ فرمایا اے ابو عبیدہؓ تم اس وقت

ملک شام میں ہو جہاں قسم قسم کی نعمتیں ہیں ہر چیز ارزاں ہے تم یہ سوکھے ٹکڑے کس لئے کھاتے ہو اپنے کو راحت کیوں نہیں دیتے، کہا اے امیر المؤمنین کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیشت یاد نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح زندگی بسر کی ہے بس میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح زندگی گذار دوں، اے امیر المومنین! زندگی ایک دن ختم ہونے والی ہے چاہے اس کو راحت سے گذار دو یا مشقت سے اس وقت متنعم اور غیر متنعم برابر یکساں ہونگے یہ باتیں سن کر حضرت عمرؓ بھی رونے لگے اور وہ بھی روتے رہے۔ اس مضمون میں ایک بزرگ کا قطعہ عجیب ہے جو انھوں نے ایک رئیس کے جواب میں لکھا ہے غالبًا رئیس نے ان کی تکلیف کا حال سن کر لکھا تھا کہ آپ میرے پاس آجائیں تو یہاں آپ کو خوب راحت ملے گی وہ جواب میں لکھتے ہیں ؎

خوردنِ تو مرغ مسمّیٰ ومی خوردنِ ما نانک جوین ما
پوششِ تو اطلس و دیبا حریر بخیہ زدہ خرقہ پشمین ما

(تمہارا فربہ مرغ کھانا اور ہماری جو کی روٹی کھانا ایک دم کے لئے ہے تیرا لباس ریشم واطلس کا ہے اور ہمارا خرقہ پشمیں بخیہ زدہ ہے)

اسی طرح سب چیزوں کا موازنہ کر کے فرماتے ہیں ؎

نیک ہمین است کہ می بگذرد
راحت تو محنت دوشین ما

(یہی حالت جو گذر رہی ہے اچھی ہے یعنی تمہاری راحت اور ہماری کل کے لئے محنت)

فرماتے ہیں کہ ہاں بلاشک اس وقت تیرا کھانا ہمارے کھانے سے اچھا اور لباس ہمارے لباس سے اچھا ہے مگر یہی حالت اچھی ہے جو گذر رہی ہے ؎

باش کہ تا طبل قیامت زنند
آں تو نیک آمد و یا این ما

(یعنی ذرا صبر کرو کہ قیامت میں معلوم ہو جائیگا کہ وہ تمہاری راحت اچھی تھی یا ہماری محنت)

قیامت آنے دو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ کس کی حالت اچھی ہے (اہل اللہ کو خدا پر بھروسہ ہوتا ہے اس لئے یہ فرمادیا فخر کی نیت نہ تھی کیونکہ وہ آپ سے زیادہ ترساں ولرزاں رہتے ہیں ان کو فخر کی کہاں مہلت ہے کبھی تحدث بالنعمہ کے طور پر کچھ کہہ دیتے ہیں جو صورت دعویٰ میں ہوتا ہے مگر واقع میں دعویٰ نہیں ہوتا) سرمد اسی مضمون کو اس طرح فرماتے ہیں ؎

منعم کہ کباب می خورد می گذرد

در بادۂ ناب میخورد میگذرد

یعنی کباب وشراب کھانے والے بھی مریں گے اور فاقہ کرنے والے بھی مرینگے جس کا آگے ذکر ہے ؎

سرمد کہ بکاسۂ گدائی ناں را

تر کردہ بآب میخورد می گذرد

(سرمد فقیری کے پیالہ میں روٹی کو پانی میں تر کر کے کھاتا ہے اور ایام گذارتا ہے)

غرض سلف کے پیش نظر یہ باتیں تھیں ان کو حکومت میں مزا کہاں تھا۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم

جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

(منزل محبوب میں امن وسکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو)

واقعی جس کو یہ فکر ہو کہ یہاں سے ایک دن جانا ہے وہ کس طرح چین سے بیٹھ سکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ دوپہر کو سخت گرمی میں سر پر چادر ڈالے ہوئے ایک اونٹ کی تلاش میں جارہے تھے۔ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے

بالاخانہ پر بیٹھے تھے دور سے دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید امیر المومنین جارہے ہیں جب قریب آئے تو پکارا اے امیر المومنین آپ اس دھوپ اور لو میں کہاں جارہے ہیں فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ گم ہوگیا ہے اس کی تلاش میں جارہا ہوں عرض کیا کہ تھوڑی دیر کے بعد بھی تلاش ممکن تھی اس دھوپ میں کیوں تکلیف کی فرمایا جہنم کی آگ اس سے بھی سخت ہے حضرت عثمان رضؓ نے عرض کیا کہ اچھا میں اپنے غلام کو بھیجے دیتا ہوں آپ یہاں آرام کیجئے۔ فرمایا کہ قیامت میں تم سے یا تمہارے غلام سے باز پرس نہ ہوگی بیت المال کے متعلق باز پرس تو مجھی سے ہوگی اس لئے میں اپنی رہائی کی فکر خود ہی کرنا چاہتا ہوں یہ فرما کر تشریف لے گئے اور دوپہر کی دھوپ ہی میں اس کو تلاش کیا عرب کی گرمی اور دھوپ مشہور ہے اندازہ کر لیجئے کیسی سخت دھوپ ہوگی مگر امیر المؤمنین اس وقت خود تلاش کے واسطے نکلے دوسروں پر بھی بھروسہ نہ کیا تو حضرت جن کو حکومت میں جہنم سے بچنے کا خیال ہے وہ ایسی ایسی تکالیف برداشت کر کے حکومت کرتے ہیں آپ نے اس کو منہ کا نوالہ سمجھا ہے اور باوجودیکہ حضرت عمرؓ کے عدل وانصاف وجفاکشی کی یہ حالت تھی کہ دنیا میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے اور خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فخر تھا کہ میں نے ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے چنانچہ جب حضرت صدیقؓ نے ان کو خلیفہ بنایا ہے تو ایک شخص نے کہا اے ابوبکر تم نے مسلمانوں پر ایک سخت مزاج شخص کو خلیفہ بنادیا خدا کو اس کا کیا جواب دوگے تو حضرت صدیقؓ نے فخر کے ساتھ فرمایا کہ تو مجھے کیا ڈراتا ہے اگر مجھ سے سوال ہوا تو میں حق تعالیٰ سے عرض کردوں گا کہ میں نے ایسے شخص کو خلیفہ بنایا تھا کہ روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی نہ تھا۔

صاحبو! خدا کے یہاں ایسی ویسی بات تو نہیں چل سکتی خدائے تعالیٰ کے سامنے پکی ہی بات کوئی کہہ سکتا ہے۔ پس حضرت صدیقؓ کو کوئی وثوق تھا جو وہ حضرت عمرؓ کے متعلق حق تعالیٰ کے سامنے شہادت دینے کو تیار تھے مگر اس پر بھی کسی صحابی نے حضرت عمرؓ کو وصال سے دس یا پندرہ سال بعد خواب میں دیکھا کہ پیشانی سے پسینہ

پوچھتے ہوئے آرہے ہیں پوچھا اے امیرالمومنین آپ کا کیا حال ہے فرمایا عمر قریب بہلاکت ہوگیا تھا۔ مرنے کے بعد سے جو حساب شروع ہوا ہے تو آج حساب سے فراغت ہوئی ہے۔ الحمدللہ کہ خدا تعالیٰ نے مجھے بخش دیا تو حضرت حکومت کوئی مزہ کی چیز نہیں ہے جس کو جتنی بھی حکومت حاصل ہے اسی قدر اس کے ذمہ حقوق ہیں جن کا ادا کرنا اس کے ذمہ لازم ہے پس حکام پر لازم ہے کہ جو شخص ان سے ملنے آئے اس کو جائے امن تک خود پہونچائیں تاکہ عملہ والے اس کو پریشان نہ کریں یہ تو جان و مال کے حقوق تھے۔ ا

ایک حق آبرو کا ہے یہ بھی حق العباد کی ایک فرد ہے جس کے ضائع کرنے میں ہم لوگ بہت مبتلا ہیں خصوصاً علماء و مشائخ کیونکہ عوام تو عوام ہی کی آبروریزی اور غیبت کرتے ہیں اور یہ لوگ اولیاء اللہ اور مشائخ کی غیبت اور آبروریزی کرتے ہیں تاکہ لوگ ادھر سے ہٹ کر ان کی طرف آویں یاد رکھو یہ خلوص کے بالکل خلاف ہے خلوص کی پہچان تو یہ ہے جو شیخ علی خواص رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بستی میں دین کا ایک کام کر رہا ہو پھر اس سے اچھا کام کرنے والا آجاوے تو اس کام کو چھوڑ کر اُس دوسرے ہی شخص کے سپرد کردے اور اپنے متعلقین کو خود اس کے یہاں بھیجدے اور آپ کسی دوسرے کام میں لگے اور اس سے خوش ہو کہ الحمدللہ دین کا کام کرنے والا اس بستی میں دوسرا آگیا جس سے میرا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اب مجھے خلوت ذکر کا خوب موقع ملے گا ہائے عارفین اہل اللہ تو ہر وقت اس کو ترستے ہیں کہ کوئی وقت فراغت اور خلوت کا ملے جس میں یہ محبوب حقیقی کے ساتھ مشغول ہوں ان کا تو مذاق یہ ہے کہ ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

اسی کو عارف جامی فرماتے ہیں ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی عاشق اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو)

حضرت گو شغل علمی بھی دین ہے اور ثواب کا کام ہے مگر پھر بھی عارفین خلوت کے لئے تڑپتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے مشاغل میں کوئی نہ کوئی بات دین کے خلاف سرزد ہو ہی جاتی ہے تو ان سے قلب کی پوری اصلاح نہیں ہوتی اصلاح قلب کے لئے ایک وقت خلوص کا ضرور ہونا چاہیئے اس لئے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

از قیل وقال مدرسہ حالے دلم گرفت
یک چند نیز خدمت معشوق میکنم

(مدرسہ کی قیل وقال سے میرے دل کا حال گرفتہ ہو گیا کچھ زمانہ خدمت محبوب بھی کرتا ہوں)

بھلا اور عارفین تو کس شمار میں ہیں جب سید العارفین سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حق تعالیٰ خلوت کا امر فرمارہے ہیں " فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ (تو جب آپ فارغ ہو جایا کریں تو محنت کیا کیجئے اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھئے) جن لوگوں کو خلوت کا لطف حاصل ہو چکا ہے ان کے دل سے اس کی قدر پوچھو حضرت نواب شیفتہ کا ایک شعر اس کے متعلق مجھے بہت ہی پسند آیا ہے ؎

چہ خوش ست باتو بزمے بنہفتہ ساز کردن
درخانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیا اچھا ہو کہ تو محفل میں اکیلا ہو گھر کا دروازہ ہو اور شراب کا شیشہ کھلا ہوا ہو)

اس میں بنہفتہ ساز کردن عجیب تعبیر ہے (ایسے ہی سر شیشہ باز کردن میں حضور قلب کی کیفیت کا فوٹو کھینچ دیا ہے ۱۲) غرض مخلص کی شان یہ ہے کہ وہ محض ضرورت دینی کی وجہ سے کسی منصب کو ادا کرتا ہے خواہ وہ درس وتدریس ہو یا تعلیم وتربیت باطن ہو یا وعظ وامامت ہو اپنے نفس کی بڑائی کے لئے کسی منصب پر پیش قدمی نہیں کرتا

اور اس کی علامت یہ ہے کہ جب کوئی دوسرا اس کام کا کرنے والا آجاتا ہے اور یہ دیکھ لیتا ہے کہ دینی ضرورت اس سے پوری ہوگئی تو اب وہ اپنے کو اس منصب سے علیحدہ کر لیتا ہے اور خود خلوت وذکر میں مشغول ہو جاتا یا دین کا کوئی دوسرا کام لے لیتا ہے جس کا کرنے والا اس بستی میں کوئی دوسرا نہیں ہے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ جو شخص کسی جگہ پڑھا جاتا ہے وہاں دوسرا پڑھانے والا آجائے تو یہ اس سے جلتا ہے کوئی واعظ ہے اور اس کی بستی میں کوئی دوسرا واعظ آجائے تو یہ اس سے حسد کرتا ہے۔ کسی جگہ ایک مدرسہ ہے وہاں دوسرا مدرسہ ہو جائے تو پہلے مدرسہ والے اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی شیخ ایک مقام میں تربیت باطن کر رہا ہے وہاں دوسرا شیخ آجاوے تو اس کو گراں گذرتا ہے پھر ایک دوسرے کی آبروریزی اور غیبت میں مشغول ہوتے ہیں وہ چاہتا ہے کہ یہ نہ رہے یہ چاہتا ہے کہ وہ نہ رہے۔ صاحبو! کیا اسی کا نام دین ہے کیا اسی کو خلوص کہتے ہیں۔ پھر تماشا ہے کہ باوجود اس بد دینی کے ہر اک بجائے خود نازاں ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں دنیا سے الگ ہوں اور دین کا کام کر رہا ہوں حالانکہ اس کے دل میں سراسر دنیا بھری ہوئی ہے اور اس کا مصداق بنا ہوا ہے اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کری کرائی محنت سب گئی گذری ہوئی اور وہ اس خیال میں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں) غرض کیا خاص کیا عوام سبھی نے آبرو کے حق سے غفلت کر رکھی ہے اور غیبت وشکایت کو کچھ گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ اس تقریر سے صاف واضح ہو گیا ہوگا کہ حقوق العباد صرف اموال ہی میں منحصر نہیں بلکہ مال کا بھی حق ہے آبرو کا بھی حق ہے پس باہم ایک دوسرے کا بھی حق ہے پس باہم ایک دوسرں کی اتلاف جان اتلاف مال اتلاف آبرو سے بچو۔

اور ایک چوتھی چیز اور ہے جو ان تینوں سے بھی اہم ہے مگر لوگ اس کو بہت کمتر اور معمولی بات سمجھتے ہیں وہ کیا چیز ہے اتلاف دین ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ بھی حق ہے کہ اس کی دین کی ضرر نہ کرے یعنی اپنی وجہ سے کسی کا دین ضائع نہ کرے

یہ سب سے مقدم ہے اس کے بعد آبرو کا درجہ ہے پھر جان کا پھر مال کا کیونکہ شریف آدمی جان کو مال سے مقدم سمجھتا ہے اور جان بچانے کے لئے مال کو خرچ کر دیتا ہے مگر آبرو کو جان سے بھی مقدم سمجھتا ہے، چنانچہ شریف آدمی آبرو کے لئے جان پر کھیل جاتا ہے اور جو شریف دیندار ہوگا اور مسلمان سب ہی دیندار ہیں وہ آبرو اور جان سے زیادہ دین کو سمجھتا ہے۔ چنانچہ دین دار آدمی حفاظت دین کے لئے آبرو کی پروا نہیں کیا کرتا۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت (مجدد زماں) سید احمد صاحب بریلوی قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے ہیں ایک مرتبہ لشکر کے ساتھ جا رہے تھے اور خود امیر عسکر تھے کہ راستہ میں نماز کا وقت آگیا تو آپ نے اپنی بی بی صاحبہ کو برقعہ اڑھا کر نماز کے لئے سب کے سامنے بہلی سے اُتارا اور بلند آواز سے فرمایا کہ صاحبو! دیکھ لو یہ عبدالحیؒ کی بیوی ہے جو نماز کے واسطے سب کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ حضرت دیندار کی تو یہی حالت ہوگی کہ وہ عزتی آبرو کو دین کے لئے فدا کر دیگا مگر اب لوگ یہ کرتے ہیں کہ آبرو کو دین سے زیادہ سمجھتے ہیں، اسی واسطے تقریبات میں محض اپنی آبرو کے لئے دین کے خلاف بہت سے کام کرتے ہیں حالانکہ آبرو سے دین مقدم ہے اور آبرو جان و مال پر مقدم ہے مگر بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کو آبرو سے مقدم کرتے ہیں جیسے بعضے رذیل بھیک مانگ کر مال جمع کرتے ہیں اور آبرو کی پروا نہیں کرتے، بعضوں نے مسجد اور مدرسہ کے چندہ کی آڑ پکڑ لی ہے کیونکہ ویسے بھیک مانگنے میں تو کون دیتا ہے مسجد اور مدرسہ کے نام سے کچھ مل ہی جاتا ہے پھر جو کچھ ملتا ہے وہ اسی مانگنے والے کے پیٹ کو لگ جاتا ہے نہ مسجد کو لگتا ہے نہ مدرسہ کو۔ کسی مقام میں ایک صاحب تھے وہ مسجد کے لئے چندہ کیا کرتے تھے اور چند روز کے بعد پھر آدھمکتے۔ اور قسمیں کھاتے کہ میں سارا چندہ مسجد ہی کو لگا آیا ہوں، ایک شخص اس کے حال سے واقف تھا اس نے کہا کمبخت جھوٹی قسم تو نہ کھایا کر تو مسجد کو کہاں لگاتا ہے سارا خود ہی کھا لیتا ہے کہنے لگا کہ واللہ میں سب مسجد کو لگا دیتا ہوں آؤ تم کو دکھا دوں۔ چنانچہ روپیوں کی تھیلی کو مسجد کی

دیوار سے رگڑ کر دکھا دیا کہ میں اس طرح لگایا کرتا ہوں اس لئے میری قسم جھوٹ نہیں ہوتی یہ ویسی ہی تاویل ہے جیسی ایک دودھ والے نے کی تھی وہ بھی قسم کھایا کرتا تھا کہ واللہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا ایک شخص نے کہا کمبخت تو نے میرے سامنے پانی ملایا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے دودھ میں پانی نہیں ملایا پانی میں دودھ ملایا تھا۔ وہ یہ کرتا تھا کہ ایک برتن میں پانی پہلے سے بھر لیا اور اس میں دودھ ڈال دیا تو اس صورت میں پانی میں دودھ ملایا گیا نہ کہ دودھ میں پانی اس لئے اپنے نزدیک وہ اس قسم میں سچا تھا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا آجکل لوگ ایسی ایسی استادیاں کرتے ہیں اور چندہ والے اس میں زیادہ مبتلا ہیں مگر ان کو تو مال سے غرض ہے چاہے دین اور آبرو ضائع ہو یا رہے۔ ایک محصل چندہ سفر کانپور میں مجھ سے ملے اور شکایت کرنے لگے کہ فلاں رئیس نے مدرسہ کے لئے چندہ مانگنے پر مجھے بہت مارا اب میں کیا کروں۔ میں نے کہا تم اس نوکری پر لعنت بھیجو کوئی اور کام کرو کہنے لگے یہ تو دین کا کام ہے اسے کیونکر چھوڑ دوں میں نے کہا پھر جاؤ ایسی تیسی میں اگر یہ دین کا کام ہے تو شکایت کیوں کرتے ہو ماریں کھاتے رہو اور صبر کرو۔ کوئی قسم لے کر ان سے پوچھے کہ وہ دین ہی کے لئے تو محصل چندہ بنے ہوئے تھے یہ بھی محض ایک بہانہ ہے ورنہ اصل مقصود تنخواہ ہے اگر پچاس ساٹھ روپے ان کو گھر بیٹھے مل جایا کریں تو پھر ہم دیکھیں کہ وہ پھر بھی دینی خدمت کے لئے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں مگر اب کیا کریں پیٹ کو بھی کسی طرح دیں اس واسطے یہ ساری ذلت گوارا ہے۔ دین کی حالت تو یہ تھی کہ وہی محصل چندہ اس رئیس کے یہاں بھی آئے تھے جہاں میں مقیم تھا ان سے چندہ مانگا تو انھوں نے دس روپے دیدیئے تو محصل صاحب کہتے ہیں کہ جناب آپ تو ہر سال بیس روپے دیا کرتے تھے اب کے دس کیوں دیئے۔ یہ طریقہ تھا ان کے چندہ کا جس میں سب کے سامنے وہ دینے والے کو ذلیل کرتے تھے، بس کسی رئیس کے ساتھ یہی حرکت کی ہوگی اس نے مار بیٹھا ہوگا ورنہ محض مانگنے پر کون مارتا ہے۔ ہاں ان کے مارنے کے بعد اگر دوسرا عذر کر دے یا تھوڑا سا دیدے اور اس پر اس کو ذلیل کیا جاوے تو بیشک کوئی دل جلا مار بھی دیتا ہے۔ چندہ کا یہ طریقہ بالکل خلاف شریعت ہے اور

حرام ہے اور آجکل زیادہ تر چندہ کے طریقے حرام ہی ہیں مگر مخلصین چندہ اس کو دین سمجھتے ہیں کچھ نہیں اس کا نام تو بے حسی ہے کہ مال کے واسطے نہ آبرو کی پرواہ ہے نہ دین کی ہاں چندہ کا ایک طریقہ جائز بھی ہے کہ مسلمانوں کو اطلاع کردو کہ فلاں جگہ مدرسہ ہے اور فلاں شخص کے پاس اس کے لئے چندہ جمع ہورہا ہے جس کا جی چاہے وہاں اپنی رقم جمع کردے پھر دیکھیں کتنے آدمی دینے آتے ہیں غرض بعضے ایسے بے حس بھی ہیں جو آبرو کو مال کے واسطے ضائع کردیتے ہیں، بعضے ایسے بھی ہیں جو مال کے واسطے جان بھی دیدیتے ہیں۔

تھانہ بھون کا قصہ ہے کہ ایک میاں جی کے پاس دو سو روپے جمع ہوگئے تھے جن کو ایک لوٹے میں رکھ کر زمین کے اندر گاڑ رکھا تھا مگر محبت مال کی حالت یہ تھی کہ روزان کو گنا کرتا تھا، کسی دن لڑکوں نے بھانپ لیا وہ موقع کے منتظر رہے آخر ایک دن ملاجی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے پیچھے لڑکوں نے وہ روپیہ نکال لئے اور خوب عمدہ عمدہ کھانے پکوائے اور ملاجی کے حال پر اتنا رحم کیا کہ ان کی بھی دعوت کردی ملاجی خالی الذہن تھے خوشی خوشی دعوت کو چلے گئے انھیں ایسے عمدہ کھانے کب ملے تھے بڑے خوش ہوئے کھاتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ بھائی آج کیا تقریب تھی جو ایسے کھانے پکوائے گئے لڑکوں نے کہا حضور یہ سب آپ ہی کی جوتیوں کا طفیل ہے تھوڑی دیر کے بعد ملاجی نے پھر کہا کہ آج کیا بات ہے کون مہمان آگیا ہے جس کے لئے یہ اہتمام ہوا ہے، پھر بھی لڑکوں نے وہی جواب دیا کہ سب حضور ہی کا طفیل ہے اس پر ایک لڑکے کو ہنسی آگئی تو ملاجی کھٹک گئے کہ شاید میرے روپیوں پر ہاتھ پڑ گیا ہے جبھی یہ بار بار اس کو میرا طفیل بتلاتے ہیں بس اب تو کھانا پینا سب بھول گئے اندھے باؤلوں کی طرح سیدھے حجرے میں آئے اور کھودا تو روپے ندارد بس فوراً ہی جان نکل گئی، لوگ دوڑے کہ یہ قصہ کیا ہے معلوم ہوا کہ روپے گم ہونے کا اتنا صدمہ ہوا۔ یہ قصہ بستی میں مشہور ہوا تو اس وقت تھانہ بھون میں ایک عالم مولانا سعید الدین علی صاحب موجود تھے انھوں نے فرمایا کہ یہ روپیہ منحوس ہے جس نے ایک مسلمان کی جان لے لی اس کو کوئی ہاتھ نہ لگائے بلکہ جنازہ کے ساتھ ہی قبر میں دفن کردیا جائے۔ چنانچہ اہل محلہ نے اس کی تعمیل کی اور کسی نے ان روپیوں کو

ہاتھ نہیں لگایا بلکہ سب کو ایک تھیلی میں باندھ کر قبر میں میاں جی کے ساتھ دفن کر دیا کفن چوروں کو خبر لگ گئی۔ انھوں نے کہا مولوی کی تو عقل جاتی رہی خواہ مخواہ اتنا روپیہ زمین میں گاڑ دیا چلو اس کو نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ رات کو ایک شخص نے قبر کھودی تو دیکھا کہ سب روپئے کفن سے باہر سینے کے اوپر ترتیب وار رکھے ہوئے ہیں اور خوب چمک رہے ہیں یہ خوش ہوا کہ اب تو اور آسانی ہوگئی اوپر ہی سے سب سمیٹ لوں گا پس انگلی ہی روپیوں سے لگی تھی کہ چیخ مارتا ہوا بھاگا وہ روپئے عالم برزخ کی آگ سے دہک رہے تھے جن سے میت کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ پھر اس کفن چور کی عمر بھر یہ حالت رہی کہ ہر وقت ایک آبخورہ ہاتھ میں لئے پھرتا تھا جس میں وہ انگلی ہر وقت ڈوبی رہتی تھی اس طرح کچھ تسکین رہتی اور جہاں پانی بدلنے کو انگلی آبخورہ سے نکالی فوراً چیخیں مارتا تھا۔ کہ ہائے میں جلا، ہائے مرا تو بعض ایسے بے حس بھی ہیں جو مال کے واسطے جان دیدیتے ہیں مگر ایسے کم ہیں۔ زیادہ حالت تو یہی ہے کہ مال سے جان کو زیادہ سمجھتے ہیں اور جان سے زیادہ آبرو کو سمجھتے ہیں مگر دین کو سب سے کمتر کر رکھا ہے۔ اسی لئے کسی کے اضرار دین سے کچھ باک نہیں کسی کو خوشامد میں آکر غلط فتویٰ دیدیا جیسا ہمارے یہاں ایک جاہل نے دنیوی خوشامد میں مطلقۃ الثلاث کو حلال کر دیا دنیا دار مولوی اس مرض میں بہت مبتلا ہیں اور ان کے غلط فتوے سے عوام کے لئے حرام چیز حلال نہیں ہوجاتی کیونکہ فتوی کی غلطی چھپی نہیں رہا کرتی۔ ایک اضرار دین یہ ہے کہ کسی کو دین کا راستہ معلوم نہیں تربیت کا طریقہ جانتا نہیں اور خواہ مخواہ شیخ و مرشد بن کر بیٹھ گیا ہے اور لوگوں کی راہ مارتا ہے ایک اضرار دین یہ ہے جس میں اہل مدارس مبتلا ہیں کہ کسی طالب علم نے کسی سے مشورہ لیا کہ میں کونسے مدرسہ میں پڑھوں تو ہر مدرسہ والا اپنے ہی مدرسہ کا مشورہ دیتا ہے گو جانتے ہیں کہ اس کا نفع دوسرے مدرسہ میں زیادہ ہے۔ افسوس آجکل اہل علم بھی غلط مشورہ دینے لگے ہیں اور پہلے زمانہ میں کفار بھی غلط مشورہ نہ دیتے تھے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے ایک لڑکی تھی جس کے شادی کے پیام جابجا سے آرہے تھے، تو انھوں نے اپنے ایک پڑوسی سے جو کہ یہودی تھا مشورہ کیا کہ میری لڑکی

فلاں فلاں جگہ سے پیام آرہے ہیں تمہاری نزدیک کونسی جگہ اچھی ہے اس نے
اول تو عذر کیا کہ آپ کو مجھ سے مشورہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ میں دین میں آپ کا مخالف ہوں
مخالف کے مشورہ کا کیا اعتبار تو بزرگ نے فرمایا کہ شریف تو ہو گو مسلم نہیں ہو اس
لئے غلط مشورہ نہیں دو گے۔ اس لئے تم بے تکلف مشورہ دو تو وہ یہودی کہنے لگا
میں نے سنا ہے کہ آپ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ
لِمَالِهَا وَجَمَالِهَا وَحَسَبِهَا وَدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ عورت
سے نکاح کرنے میں چار باتوں کو دیکھا جاتا ہے مال کو اور جمال کو اور حسب کو اور
دین کو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم دیندار سے نکاح کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے
معلوم ہوا کہ آپ کے مذہب اسلام میں سب سے زیادہ دیکھنے کی چیز دین ہے
تو میرے خیال میں جتنے لوگوں نے بھی پیام بھیجا ہے دین پورا پورا کسی میں بھی نہیں ہے
میرے نزدیک تو ایک طالب علم جو آپ کی مسجد میں رہتا ہے وہ بڑا دیندار ہے
ہر وقت خدا کے کام میں لگا رہتا ہے۔ پس آپ اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دیں
ان شاء اللہ تعالے بہت برکت ہو گی۔ چنانچہ ان بزرگ نے ایسا ہی کیا اور عمر
بھر ان کی لڑکی راحت سے رہی۔

حدیث میں آتا ہے "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" جس سے مشورہ لیا جاتا ہے اسکو
امانت دار سمجھا جاتا ہے، پس مشورہ غلط دینا خیانت ہے اس سے بہت احتراز
کرنا چاہیئے۔ ہماری بستی میں ایک صاحب اپنا گھر فروخت کرنا چاہتے تھے۔ پہلے
مجھے بھی اس کے خریدنے کا خیال تھا۔ مگر بعد میں ان کی رائے بدل گئی پھر کچھ ایسے
واقعات بستی میں ان کے ساتھ پیش آئے جن سے گھبرا کر انہوں نے باہر ملازمت
کر لی اور گھر بیچنے کا پھر ارادہ کر لیا۔ اس وقت بھی میرا خیال تھا کہ اگر یہ فروخت
کریں گے تو میں ضرور لے لوں گا کیونکہ اس مکان کے نہ لینے سے مجھے گونہ تکلیف
ہے لیکن اس دفعہ انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ میں گھر بیچنا چاہتا ہوں اس میں
آپ کی کیا رائے ہے۔ اس وقت اگر میں اپنی غرض کا لحاظ کرکے ان کو یہ مشورہ دیدیتا کہ

ہاں فروخت کردو تو وہ فوراً بیچ دیتے کیونکہ ان کی زیادہ رائے اسی طرف مائل تھی مگر جب مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے اپنی مصلحت پر نظر کرنا اور ان کی مصلحت کو نظر انداز کر دینا خیانت سمجھا اور وہی رائے دی جو ان کے لئے مناسب تھی میں نے کہا کہ آپ گھر کو ہرگز فروخت نہ کریں کیونکہ دوسری جگہ چاہے کیسی ہی راحت ہو مگر کسی وقت پھر وطن یاد آتا ہے اور جب باہر جاکر ٹھوکریں لگتی ہیں تو اس وقت اپنے وطن سے زیادہ کوئی جگہ نہیں ہوتی چنانچہ اس رائے کی وجہ سے انھوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اس پر بعض لوگوں نے مجھے بیوقوف بھی بنایا کہ تم نے یہ رائے دیکر سارے عمر کی مصیبت پھر اپنے سر لی میں نے کہا کچھ بھی ہو یہ تو مجھ سے کبھی نہ ہوگا کہ ایک شخص ایمن سمجھ کر مجھ سے مشورہ کرے اور میں اس کی مصلحت کے خلاف مشورہ دوں مجھے دین سب سے مقدم ہے اب چاہے مجھے راحت ہو یا کلفت ہو اور ان شاء اللہ اس نیت کی برکت سے راحت ہی ہوگی ۱۲ جامع) مگر عموماً آجکل مشیروں کی یہ حالت ہے کہ جان جان کر غلط مشورہ دیتے ہیں جس میں ان کے نزدیک صراحۃً دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔

بگھرہ[ف] میں ایک شخص ملازمت سے گھر آیا اور ساتھ میں بہت کچھ نقد اور سامان وغیرہ بھی لایا پھر اس کی لڑکی کا بیاہ ہونے لگا تو بستی کے بھائیوں نے اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا شروع کیا اور یہ رائے دی کہ ذرا شادی میں خوب دھوم دھام کرو تاکہ لوگوں کی نگاہ میں تمہاری عزت ہو اور خاندان کا نام ہو چنانچہ اس نے ایسی دھوم دھام کی کہ جو کچھ باہر سے کما کر ساتھ لایا تھا سب غارت کر دیا بعد میں ان مشیروں میں سے ایک نے فخراً کہا کہ یہ بہت بڑھ گیا تھا یہ رائے دیکر ہم نے اس کو اپنے برابر کر لیا آجکل برادری کے بھائیوں کی عام حالت یہی ہے کہ کسی کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھ نہیں سکتے۔

بس جہاں کوئی بڑھا اور انھوں نے اس کو ایسی پٹیاں پڑھانی شروع کیں جس سے چار دن میں وہ ان کے برابر بلکہ کم ہو جائے اور برابر دو غرض سے کرتے ہیں کبھی حسد سے اور کبھی اس لئے کہ وہ ہم کو گھٹانے کی فکر نہ کرے کیونکہ آجکل جہاں کوئی ذرا بڑھتا ہے وہ دوسروں کو گھٹانا شروع کر دیتا ہے اس لئے اپنی جان بچانے کو وہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح یہ ہم سے بڑھا ہوا نہ رہے جیسے ایک گانوں کا آدمی باہر جاکر چار پانچسو روپیہ کا ملازم ہو گیا تھا اس کے گھر پر ایک میانجی بچوں کو پڑھانے کو نوکر تھے وہی سارے گانوں میں خط پڑھنا جانتے تھے اس شخص کا خط آیا کہ میں اتنے کا ملازم ہو گیا ہوں تو گھر والوں نے میانجی کے پاس خط بھیجا کہ ذرا اس کو پڑھ دو کیا لکھا ہے میانجی خط کو دیکھ کر رونے لگے

[ف] یہ ایک قصبہ ہے ضلع مظفر نگر میں جو تھانہ بھون سے تقریباً ۱۵ میل پر ہے ۱۲ منہ

تو خط لانے والا گھبرا گیا کہا میاں جی خیر تو ہے کیا لکھا ہے کہا ایسی ہی بات لکھی ہے جس پر مجھے رونا چاہئے اس نے دوڑ کر گھر میں خبر کی تو اس کی بیوی نے دروازہ پر بلا کر پوچھا کہ کیا بات ہے خیر تو ہے میاں جی نے کہا بتلاؤں گا مگر تو بھی رو وہ بھی رونے لگی اتنے میں محلہ والے آگئے کہ یہ کیا معاملہ ہے میاں جی نے کہا کہ تم بھی رو وہ بھی رونے لگے پھر پوچھا کہ میاں جی آخر بتاؤ تو سہی کیا لکھا ہے کوئی مر گیا ہے یا بیمار ہو گیا ہے کہا نہیں اس میں یہ لکھا ہے کہ میں پانچسو روپیہ کا نوکر ہو گیا ہوں لوگوں نے کہا لاحول ولا قوۃ پھر یہ رونے کی کیا بات ہے یا خوشی کی میاں جی نے کہا یہ رونے ہی کی بات ہے مجھے تو اس لئے رونا چاہئے کہ اب یہ مجھے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کیوں نوکر رکھے گا کسی انگریزی جاننے والے ماسٹر کو بلا دے گا اور بیوی کو اس واسطے رونا چاہیئے کہ اب وہ اس گانوں کی عورت کو کیوں اپنے نکاح میں رکھے گا بس اسے طلاق دیکر کوئی شہر کی تعلیمیافتہ عورت لائیگا اور گانوں والوں کو اس لئے رونا چاہیئے کہ اب وہ سال بھر کے بعد آتے ہی اپنا گھر بہت عالی شان بنائیگا جن میں غریبوں کے مکانات جبراً معمولی داموں میں خرید خرید کر ملائے جائیں گے پھر زمین جائداد بہت سی خریدے گا جس میں غریبوں کے حصے دبائے جائیں گے واقعی بات تو میاں جی نے سب معقول کہیں آجکل زیادہ مال و دولت حاصل کر کے لوگ یہی حرکتیں کرتے ہیں اس واسطے بھی دوسروں کو فکر ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ کم ہو۔ بڑھا ہوا نہ رہے خیر یہ تو وہ ظلم ہے جو انسان اپنی غرض کیواسطے دوسروں پر کیا کرتا ہے اور بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنی غرض سے بھی نہیں محض دوسروں کے آرام کیواسطے مخلوق کا گلا دبایا کرتے ہیں جیسے بعض زمیندار حکام کو خوش کرنے کے واسطے گانوں والوں سے چندہ جبراً وصول کرتے ہیں اور خوشامد کے لئے چندہ کی رقم سے ان کے سامنے ڈالی پیش کرتے ہیں اور اسی طرح بہت سے قصے کئے جاتے ہیں فروع کو کہاں تک بیان کروں میں نے بطور قاعدہ کلی کے یہ حقوق بیان کر دیئے ہیں فروع انہی سے سمجھ میں آسکتی ہے اب یہ سمجھئے کہ جو کچھ حقوق میں نے ابتک بیان کئے ہیں یہ تو حقوق عامہ ہیں ان کے بعد کچھ حقوق خاصہ ہیں جب کسی صاحب حق میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی ہے تو اس کے کچھ خاص حقوق ان حقوق عامہ پر بڑھ جاتے ہیں یہ حقوق مذکورہ تو ہر انسان کے دوسرے انسان پر بحیثیت عبد ہونیکے ہیں اب اگر کوئی شخص مسلمان بھی ہے تو اسلام کی وجہ سے اس کا حق اور بڑھ جائیگا مثلاً مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق ہے کہ بیمار ہو تو عیادت کرو جب ملے تو سلام کرو، اس کو چھینک آوے اور الحمد للہ کہے تو یرحمک اللہ کہو مرجاوے تو جنازہ کی نماز پڑھو دفن کفن میں شریک ہو

وغیرہ وغیرہ ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی شخص ہمارا پڑوسی ہے جوار کی وجہ سے اس کا حق بڑھ جائیگا ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی ہمارا محسن بھی ہے جیسے استاد یا پیر یا کوئی دوست وغیرہ سو احسان کیوجہ سے ان کے حقوق عام مسلمانوں کے حقوق سے زیادہ ہوں گے محسن ہونے میں باپ ماں کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے ان کے حقوق سب سے زیادہ ہیں اسی طرح بعض اور رشتے بھی بواسطہ احسان میں داخل ہیں مثلاً سسرالی رشتہ جیسے بیوی کی ماں اس کا باپ وغیرہ کہ وہ بیوی کے محسن ہیں اور بیوی سے دوستی کا رشتہ ہے تو دوست کے محسن گویا اپنے ہی محسن ہیں ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے زیادہ ہیں غرضکہ خصوصیا کی وجہ سے حقوق عامہ پر حقوق خاصہ کا اضافہ ہو جاتا ہے اس وقت نہ میں اس کی تفصیل کر سکتا ہوں نہ اتنا وقت ہے علماء کی کتابیں موجود ہیں جن میں سب کے حقوق لکھے ہوئے ہیں اہل قرابت واہل خصوصیت کے حقوق تو سب جانتے ہی ہیں احکام کی کتابوں میں رعایا اور حکام کے حقوق بھی لکھے ہوئے ہیں غرض اسلام میں سب انسانوں کے لئے کچھ نہ کچھ حقوق ہیں۔ میری ایک کتاب مختصر اس بارہ میں طبع ہو چکی ہے جس کا نام حقوق الاسلام ہے اس کو دیکھو اس میں مختصراً سب کے حقوق لکھے گئے ہیں ایک مسلمان ڈپٹی نے وہ کتاب ایک انگریز کو دکھائی تھی اس نے جو دیکھا تو اس میں رعایا اور حکام کے بھی حقوق تھے کہ رعایا کو حکام کے ساتھ اس طرح رہنا چاہیئے اور حکام کو رعایا کے ساتھ یوں برتاؤ کرنا چاہیئے۔ ایک حق تو حاکم مسلم کا ہے وہ الگ ہے اسلام میں مطلق حاکم کا بھی بوجہ معاہدہ کے نیز بوجہ احسان انتظام راحت کے ایک حق ہے چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم تو وہ انگریز بڑا متعجب ہوا کہ اسلام میں حکام کے بھی حقوق ہیں اس کو اسی پر تعجب ہوا اُسے یہ خبر نہ ہوئی کہ اسلام میں بہائم کے بھی حقوق ہیں تو اور زیادہ تعجب ہوتا صاحبو قانون خداوندی ہی کی خصوصیت ہے جس میں باغیوں کے بھی حقوق ہیں۔ کفار حالانکہ خدا تعالیٰ کے باغی ہیں اور ان کے بارہ میں ارشاد ہے اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (نہیں ہیں یہ لوگ مگر چوپایوں کیطرح بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں) مگر اس کے ساتھ ان کے کچھ حقوق بھی رکھے ہیں۔ بہر حال خصوصیت محل وغیرہ سے یہ حقوق بڑھ جاتے ہیں اور مخصوص ان انسانوں کے حقوق بہت زیادہ ہیں جو کسی سے کچھ نہ کہہ سکیں وہ کون ہیں وہ بیویاں ہیں یہ بیچاری عموماً ایسی بے کس اور بے بس ہوتی ہیں کہ کسی سے کچھ شکایت کر ہی نہیں سکتیں اور اگر کسی کے ماں باپ زندہ بھی ہوں جب بھی شریف

ف موقعہ بیان پر اس کی سخت حالت محسوس ہوتی تھی ۱۲

ہو رتیں اپنے خاوند کی شکایت کسی سے نہیں کرتیں پھر مردوں کی یہ حالت ہے کہ اپنی بیوی کے سوا اور جگہ بھی ان کی نظر اُٹھ جاتی ہے اور بعضے ایسی ایسی جگہ پھنس جاتے ہیں مگر ہندوستان کی عورتیں عموماً اپنے شوہروں کی عاشق ہوتی ہیں گو شوہر کیسا ہی ہو ہم نے دیکھا ہے کہ بعض مرد بدصورت بھی ہوتے ہیں مگر ان کی بیویاں بجز شوہر کے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں واقعی ہندوستان کی عورتیں تو اس صفت میں حوریں ہیں حق تعالیٰ نے حوروں کی تعریف میں جہاں حسن و جمال کو بیان فرمایا ہے وہاں قاصرات الطرف بھی فرمایا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو شوہر ہی پر منحصر کرنے والی ہوں گی کسی غیر پر نظر نہ ڈالیں گی واقعی ہندوستان کی عورتیں اس صفت میں تمام ممالک کی عورتوں سے ممتاز ہیں یہ تو نکاح کر کے شوہر کے ساتھ ایسی وابستہ ہو جاتی ہیں کہ اپنے باپ ماں کو بھی بعض دفعہ چھوڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ اگر اس کے باپ ماں یا اور کسی عزیز کے ساتھ کبھی شوہر کی اَن بن ہو جائے تو عورت عموماً شوہر کا ساتھ دیتی ہے باپ ماں کا ساتھ نہیں دیتی مگر اس پر بھی بعضے مردان پر بہت زیادتی کرتے ہیں باوجودیکہ وہ ان پر ایسی فدا ہیں مگر بعض لوگ ان کے ساتھ جوتے ہی سے بات کرتے ہیں باندی اور غلام سے بھی ان کی اوقات بدتر رکھتے ہیں بعضے ایسے بے مروت ہیں کہ ان کی آمدنی ہزاروں کی ہے مگر بیوی کو دس ہی روپیہ کا روزینہ دیتے ہیں اور بعضے تو کھانے کپڑے کی بھی خبر نہیں لیتے۔ نہ ہوا عرب یا بعض ہندوستانی ریاستیں کہ وہاں عورت فوراً قاضی کے یہاں جا کر نالش کر دیتی ہے۔ اب یا تو قاضی کی تجویز کے موافق نان ونفقہ دینا پڑتا ہے ورنہ جبراً طلاق دلوائی جاتی ہے جس کے بعد فوراً عورت کی طرف سے مہر کی نالش ہو جاتی ہے۔ اور بعض ممالک میں مہر نکاح کے وقت ہی پیشگی دھروا لیتے ہیں۔ یہ بیچاری ہندوستان ہی کی عورتیں ہیں کہ جو مہر بھی معاف کر دیتی ہیں اور عمر بھر نان نفقہ کی تکلیف بھی سہتی ہیں خیر کسی کے پاس ہو ہی نہیں تو اس کی شکایت نہیں۔ اس صورت میں تو عورتیں خود محنت مزدوری کر کے شوہر کو بھی کھلاتی ہیں لیکن جس کو خدا تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہو وہ بیوی کو تنگ رکھے یہ نہایت بے غیرتی اور بے حمیتی ہے سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

یہ بیں آں بے حمیت را کہ ھرگز	نخواہد دید روے نیک بختی
تن آسانی گزیند خویشتن را	زن و فرزند بگذارد بہ سختی

(اس بے غیرت کو دیکھو کہ وہ نیک بختی کا منہ نہ دیکھے گا اپنے تن آسانی اختیار کر کے بی بی

بچوں کو سختی میں ڈالے)

حالانکہ عورتوں کا ایک حق تو اس واسطے ہے کہ وہ بے کس بے بس ہیں دوسرے اس واسطے بھی حق ہے کہ وہ تمہاری دوست ہیں اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ دوستی کی وجہ سے حق بڑھ جاتا ہے پھر وہ تمہاری دین کی محافظ بھی ہیں اسی لئے صوفیہ نے تقلیل وقاع کو مجاہدہ میں داخل نہیں کیا باوجودیکہ وہ تمام لذات میں الذ ہے مگر صوفیہ نے اس کی تقلیل کو مجاہدہ میں شمار نہیں کیا اور نہ کثرت وقاع سے منع کیا ہے گو اور وجہ سے منع کیا ہے مگر مجاہدہ کی حیثیت سے منع نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ محض ترک لذات نہیں کراتے بلکہ اصلاح قوت بہیمیہ کراتے ہیں اگر ان کا مقصود ترک لذات ہوتا تو کثرت وقاع سے پہلے منع کرتے غرض بیوی اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اس سے دین کی حفاظت اور خیالات فاسدہ کی روک ہوتی ہے اس درجہ میں وہ بڑی محسن ہے۔ جو لوگ دیندار ہیں وہ اس احسان کی قدر کرتے ہیں۔

مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس مظاہر العلوم کی یہ حالت تھی کہ ان کی بیوی بوڑھی ہو گئی تھیں مگر مولانا کو ان سے ایسا تعلق تھا کہ جب وہ ذرا بیمار ہوتیں تو مولانا فوراً مدرسہ سے رخصت لیکر خود اپنے ہاتھ سے ان کی خدمت کرتے تھے آجکل تو بعض لوگ بوڑھی بیوی سے نفرت کرنے لگتے ہیں حالانکہ تم نے ہی تو اس کو بوڑھی کیا ہے۔ مگر مولانا کی یہ حالت تھی کہ نوکروں اور ماماؤں پر اپنی بیوی کی خدمت کو نہ ڈالتے تھے بلکہ مدرسہ سے رخصت لے کر خود خدمت کرتے تھے۔ اسی لئے تو علماء کو لوگ بیوی کا مرید کہتے ہیں۔ مگر جی ہاں ان کا مرید ہونا تمہاری طرح پیر ہونے سے اچھا ہے تم بیویوں کے پیر ہو مگر ڈاکو پیر ہو اور اصل یہ ہے کہ مولوی بیویوں کے مرید نہیں ہیں بلکہ ان کے دل میں خدا کا خوف ہے وہ حقوق العباد کو ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بیوی کے حقوق نصوص میں ان کی نظر سے گذرے ہوئے ہیں۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کا حال انھوں نے پڑھا ہے اس لئے وہ بیوی کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کرتے ہیں ان کو راحت پہنچاتے ہیں۔ بلکہ جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے اتنا تو کوئی مولوی کر بھی نہیں سکتا اور اگر کوئی ویسا کرنے لگے تو نہ معلوم لوگ اس کو زن مرید سے بڑھ کر اور کیا خطاب دینے لگیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے

ساتھ ایک بار دوڑے تو اس وقت وہ ہلکی پھلکی تھیں آپ سے وہ آگے نکل گئیں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ میں دوبارہ پھر آپ ان کے ساتھ دوڑے اس وقت حضرت عائشہؓ بھاری پڑ گئی تھیں تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے تو آپ نے فرمایا تِلْكَ بِتِلْكَ یہ پہلی بار کا بدلہ ہے۔ میں نے ایک مولوی سے جو بڑے وقار و تمکنت سے رہتے تھے کہا تھا کہ تم نے جس چیز کا نام وقار رکھا ہے یہ تکبر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے جیسے وقار سے نہ رہتے تھے بتلاؤ کیا تم بھی کبھی اپنی بیوی کی ساتھ دوڑے ہو۔ بس چپ ہو گئے اس کا کچھ جواب نہ تھا میں نے کہا بس رہو وقار وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کے موافق ہو اور جو اس کے خلاف ہو وہ وقار نہیں بلکہ تکبر ہے غرض مولوی اس واسطے اپنی بیویوں کی خاطر زیادہ کرتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت ہے پھر بیوی کی خاطر کرنے میں دنیا کی بھی تو بڑی مصلحت ہے اول بات تو یہ ہے کہ اسکی زندگی لطف سے گذرتی ہے ایک دوسرے کی راحت و رنج کا شریک ہوتا ہے اور اگر میاں بی بی میں موافقت اور بے تکلفی اور انشراح ہو تو پھر زندگی کا کیا لطف ہے جہاں ہر وقت جوتی پیزار ہو وہاں کوئی خوشی نہیں ؎

در خرمی بر سرائے بہ بند — کہ بانگ زن از وے برآید بلند

(اس گھر پر خوشی کا دروازہ بند کہ کہ اس سے عورت کی آواز بلند آئے)

لطف تو اسی میں ہے کہ آدمی دن بھر کا تھکا ماندہ گھر میں جائے تو گھر والوں کی باتوں سے جی خوش کرے وہ اس کو راحت دیں یہ ان کی راحت کا خیال کرے اور یہ کیا زندگی ہے کہ دن بھر تو کام میں تھکے اب شام کو گھر جا کر بھی رنج و غم ہی کی باتیں کی جائیں مگر آجکل لوگوں کے مذاق بگڑ گئے ہیں بے حسی چھا گئی ہیں وہ اسی حالت میں رہنا پسند کرتے ہیں مگر جن کو ذرا بھی حس ہے وہ تو اس کو دنیا ہی میں دوزخ سمجھتے ہیں اور جن کی معاشرت گھر والوں کے ساتھ عمدہ ہے واقعی ان کو دنیا ہی میں جنت نصیب ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد — کسے را باکسے کارے نباشد

(وہ جگہ بہشت ہے جہاں کوئی تکلیف نہ کسی کو کسی سے کوئی کام نہ ہو) (یعنی کار ایذا نباشد[۱۲]) (تکلیف کا کام نہ ہو) اور سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

زن خوب فرماں برد پارسا — کند مرد درویش را بادشاہ

ہمہ روز اگر غم خوری غم مدار　　چو شب غمگسارت بود در کنار

(اچھی عورت فرما نبردار پارسا فقیر کو بھی بادشاہ کر دیتی ہے تمام روز اگر تکلیف اٹھائے غم کر جبکہ رات میں تیرا غم گسار بغل میں ہو)

صاحبو! یہ راز ہے اہل اللہ کی دلجوئی میں وہ اس لئے اپنے گھر والوں کو راحت پہنچاتے ہیں تاکہ زندگی لطف کے ساتھ گذرے اور واقعی خدا تعالیٰ نے یہ تعلق ہی ایسا بنایا ہے کہ بیوی سے زیادہ کوئی بھی انسان کو راحت نہیں دے سکتا۔ بیماری میں بعض دفعہ سارے عزیز الگ ہو کر ناک منہ چڑھانے لگتے ہیں خصوصاً اگر کسی کو دستوں کی بیماری ہو جائے مگر بیوی سے یہ کہیں نہیں ہو سکتا کہ وہ شوہر کو اس حال میں بھی چھوڑ دے وہ بیماری میں سب سے زیادہ راحت پہنچاتی ہے۔

شاہجہانپور میں ایک رئیس نے بڑھاپے میں شادی کی تھی اُن کے لڑکوں نے اعتراض کیا کہ تمکو اس عمر میں شادی کی کیا ضرورت تھی خدمت کے لئے تو آپ کی اولاد بہت تھی کہا تم نہیں جانتے بیوی کے برابر مجھے کوئی راحت نہیں دے سکتا۔ اتفاق سے ایک بار وہ بیمار ہوئے اور دست لگ گئے تو سارے لڑکے اور بہو بیٹیاں چھوڑ کر الگ ہو گئے اور بدبو کی وجہ سے کوئی بھی پاس نہ آتا تھا مگر بیوی اس وقت بھی خدمت گذار تھی وہ بیچاری ہر وقت سہارا لگا کر بٹھلاتی کپڑوں کو دھوتی صاف کرتی تھی پھر وہ بیماری سے شفایاب ہوئے تو لڑکوں کو بلایا اور کہا تم نے اپنی خدمت کا حال دیکھ لیا اسی کے بھروسہ پر مجھے کہتے تھے کہ تمہیں شادی کی کیا ضرورت ہے۔ اب تم نے ضرورت دیکھ لی اگر اس وقت میری بیوی نہ ہوتی تو تم چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے میں اکیلا پڑا سڑتا رہتا حقیقت میں بیماری کے اندر بہو بیٹیاں ہرگز وہ کام نہیں دے سکتیں جو بیوی دے سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ راحت اسی تعلق میں رکھی ہے۔ اسی لئے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب نے پہلی بیوی کے انتقال پر اخیر عمر میں پھر شادی کی تھی حالانکہ اس وقت مولانا کی عمر سو برس سے اوپر تھی یہ تو بیوی سے دنیا کی راحت پہنچتی ہے۔ اور دین کی راحت یہ ہے کہ گھر کے انتظام سے بے فکری ہو جاتی ہے جس سے قلب کو فراغ واطمینان حاصل ہوتا ہے تجربہ ہے کہ بدون بیوی کے گھر کا انتظام درست نہیں ہو سکتا بس مرد کا کام تو اتنا ہے کہ یہ مادہ جمع کر دیتا ہے پھر ہیئت عورتوں ہی سے بنتی ہے۔ میں نے بعض رؤسا کو دیکھا ہے کہ مال و دولت ان کے پاس بہت کچھ تھا مگر بیوی نہ تھی تو ان کے گھر کا کچھ بھی ڈھنگ نہ تھا

لاکھ باورچی رکھو نوکر رکھو وہ راحت کہاں جو بیوی سے ہوتی ہے باورچی تو تنخواہ کا ملازم ہے ذرا ایک دن تم نے کوئی سخت بات اس سے کہدی اور وہ ہاتھ جھاڑ کر الگ ہوا پھر مصیبت کا سامنا ہے پکاؤ روٹی اپنے ہاتھ سے اور چولھا جھونکو برتن دھوا اور بیوی سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ مرد کو اپنے ہاتھ سے پکانے دے پھر تجربہ ہے کہ اگر بیوی کے سامنے بھی نوکروں سے کام لیا جائے اور بغیر بیوی کے بھی ان سے کام لیا جائے تو دونوں صورتوں میں آسمان زمین کا فرق ہو گا گھر کی مالک کے سامنے مامائیں اور نوکر زیادہ چوری نہیں کر سکتی اور اس کے بغیر تو گھر کا پٹرا ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی مرد گھر کا کام خود بھی جانتا ہو تو اس سے نوکر ذرا دبتے ہیں گو عورت جیسا تو انتظام تو پھر بھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی زیادہ سرکشی نہیں کر سکتے۔ اس پر مجھے اپنے والد صاحب کا قصہ یاد آ گیا کہ جب میرٹھ میں والد صاحب ملازم تھے تو ایک بار سفر میں باورچی کو کھانا پکانے کے لئے ساتھ لے گئے ایک دفعہ والد صاحب اس پر کچھ خفا ہوئے اور کھانا پکانے والے کو جواب دیدیا وہ بھی بیچ میں کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ لیجئے میں جاتا ہوں اپنے نزدیک تو اس نے یہ سوچا تھا کہ اب منشی جی میری خوشامد کریں گے اور کم از کم اس وقت کے لئے کھانا پکا دینے کو تو ضرور کہیں گے مگر والد صاحب نے اسی وقت اس کا حساب کر دیا اور کہا جاؤ رخصت وہ باورچی تھوڑی دیر کھڑا رہا کہ دیکھوں یہ کھانا پکانے کا اس وقت کیا انتظام کرتے ہیں والد صاحب نے اسی وقت آستین چڑھا اور ہاتھ دھو چولھے پر جا بیٹھے اور روٹیاں پکانی شروع کیں تو بہت عمدہ پکائیں نہ معلوم کہاں سیکھ لیا تھا بس یہ دیکھ کر تو باورچی قدموں میں گر پڑا کہ میری خطا معاف ہو والد صاحب نے فرمایا کہ نالائق تو نے یہ سمجھا ہو گا کہ اب میں تیری خوشامد کروں گا خدا کا شکر ہے مجھے سارے کام آتے ہیں میں صرف آسانی کے لئے دوسروں سے کام لیتا ہوں نہ اس لئے کہ مجھے کچھ آتا نہیں۔ والد صاحب کو بقدر ضرورت سینا پرونا بھی آتا تھا اور اپنے سب کام خود کر لیا کرتے تھے کسی بات سے عار نہ تھا۔ ایک بار والد صاحب تھانہ بھون میں تشریف لائے تو برسات کی وجہ سے گھر کے چھتوں پر گھاس بہت کھڑا تھا والد صاحب نے گھر بلا اپنے ہاتھ میں لیا اور کوٹھے پر تشریف لے گئے اور مجھ سے بھی کہا کہ آؤ میاں اشرف علی ہم خود گھاس اکھاڑیں گے۔ غرض تھوڑی دیر میں سب چھتیں صاف کر دیں تو کوئی شخص ایسا صاحب ہمت

ہو جو سب کام کر سکتا ہو وہ تو شاید بیوی بغیر پریشان نہ ہو مگر ایسے بہت کم ہیں زیادہ وہی ہیں جو نوکروں کے جواب دینے پر پریشان ہو جاتے ہیں اس لئے بیوی کی قدر کرنا چاہیئے کہ وہ دنیا اور دین دونوں کی معین ہے اور اس کے حقوق کی رعایت بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس میں چند در چند خصوصیات ہیں جن میں سے ہر ایک کے بہت سے حقوق ہیں چونکہ آج کل لوگ عورتوں پر بہت ظلم کرتے ہیں اس لئے میں نے اس پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔ اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔

بس الزام تو ان ہی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔ عبارۃ النص اور مسوق لہ الکلام تو اس آیت میں انتقام کے وقت ظلم کی وعید کا بیان کرنا ہے مگر اشارۃً ابتدا ظلم کو بھی شامل ہے خواہ انتقام میں ہو یا نہ ہو کیونکہ الفاظ آیت میں عموم ہے اور اسی لئے میں نے اپنی تفسیر میں تعمیم پر تنبیہ کر دی ہے بلکہ اشارہ کے ساتھ دلالۃً بھی تحریم ظلم پر دال ہے اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ انتقاماً ظلم کا حرام ہونا ابتدا ظلم کی حرمت کو بدرجہ اولیٰ مستلزم ہے کیونکہ انتقام کے وقت انسان کو جوش غضب ہوتا ہے اس لئے کہ پہلے دوسرے کی طرف سے ظلم ہو چکا ہے اور جوش میں حد سے بڑھ جانا مستبعد نہیں بلکہ حد پر قائم رہنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے تو جب مقام عذر میں بھی ظلم کی اجازت نہیں تو جہاں کوئی سبب اور عذر بھی نہ ہو وہاں تو ظلم کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے لہذا دلالۃ النص سے بھی یہ آیت ابتدا ظلم کو شامل ہے اس کے بعد فرماتے ہیں وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ اور سرکشی و تکبر کرتے ہیں زمین میں یہ اس لئے بڑھایا کہ بتلا دیا کہ ظلم کا منشا اور سبب تکبر ہے چنانچہ میں نے کہا تھا کہ حقوق العباد کے عدم اہتمام کا ایک سبب ہے وہ یہ کہ لوگوں نے تاکد حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر کر لیا ہے جس کی عظمت دل میں ہے اس کے حقوق تو ادا کرتے ہیں اور جس کی عظمت قلب میں نہیں اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے اور کسی کی عظمت نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اس کو اپنے سے حقیر سمجھا جاتا ہے اور یہی حاصل ہے تکبر کا اسی کو حق تعالیٰ نے يَبْغُوْنَ میں بیان فرمایا ہے اور چونکہ تکبر کا مذموم ہونا عقلاً و نقلاً سب کو مسلم ہے

لہذا اس کا علاج بھی ضروری ہوا آگے حق تعالیٰ نے فی الارض میں اس کا علاج بتلایا ہے حق تعالیٰ کی بھی عجیب تعلیم ہے کہ بیماری کے ساتھ ساتھ دوا بھی بتلاتے ہیں۔ تمام قرآن کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں کسی مرض کو بیان فرمایا ہے وہاں ساتھ ساتھ علاج بھی بتلا دیا ہے بس وہ شان ہے کہ ؎

درد از یار است و درماں نیز ہم — دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(مرض بھی دوست کی طرف سے اور اس کا علاج بھی دل بھی اس پر فدا ہے اور جان بھی)

حق تعالیٰ نے کائنات میں بھی یہی طرز رکھا ہے کہ جو چیز کسی بات کو مضر ہے اس کے پاس ہی مصلح بھی موجود ہے، ایک سیاح کہتے تھے کہ ایک گھاس سخت زہریلی ہے جس کا نام بچھو ہے اگر کسی کو لگ جائے تو بچھو کے کاٹے کی سی لہر دوڑ جاتی ہے مگر اس کے پاس ایک دوسری گھاس بھی پیدا ہوتی ہے وہ اس کا تریاق ہے کہ جہاں اس کو ملا فوراً تکلیف زائل ہوگئی اسی طرح یہاں فی الارض میں علاج کبر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ زمین پر رہ کر اور مٹی سے پیدا ہو کر تکبر کرتے ہو ذرا سوچو تو کہ تمہاری اصل کیا ہے یہی زمین تمہاری اصل ہے جس پر آدمی اور جانور چلتے پھرتے ہگتے موتتے ہیں یہ تمہاری ماں ہے پس تم کو تو خاک بن کر رہنا چاہیئے۔ ایک دوسرے مقام پر بھی حق تعالیٰ نے اس بات پر تنبیہ کی ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى (اس سے ہم نے تمکو پیدا کیا اور اسی میں تمکو پھر لوٹائیں گے اور اسی میں سے دوبارہ تم کو نکالیں گے) اس میں بھی مراقبہ ارض کی تعلیم ہے کہ ہم نے تم کو زمین ہی سے پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے کہ مر کر سب خاک ہو جاؤ گے سارا بدن گل سڑ جائے گا پھر کس بات پر تکبر کرتے ہو واقعی تکبر کا یہ عجیب علاج ہے پس ہم کو اس سے کام لینا چاہیئے اور زمین کی حالت میں تفکر کرنا چاہیئے اسی کو سعدیؒ نے کہا ہے ؎

زخاک آفریدت خداوند پاک — پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

(خداوند تعالیٰ نے تجھ کو خاک سے پیدا کیا پس اے بندہ مثل خاک فروتنی کر)

افسوس ہماری ماں کی تو یہ حالت ہے کہ وہ سب کے پاؤں کے تلے ہے اور ہماری یہ حالت کہ

آسمان پر سب چڑھے جاتے ہیں۔ صاحب یہ سارا ناز اسی وقت تک ہے جب تک خدا کی نعمتیں ہمارے پاس ہیں اگر ایک نعمت بھی چھن جائے تو سارا ناز خاک میں مل جائے آخر مجنون میں کس بات کی کمی ہو جاتی ہے جو اس کو جانور سے بدتر سمجھنے لگتے ہو بس دماغ میں کمی ہو جاتی ہے مگر دیکھ لیجئے پھر کیا حشر ہوتا ہے ہمارے ایک دوست کو فالج ہو گیا تھا حالانکہ وہ بہت بڑے عالم تھے مگر دماغ پر فالج پڑنے سے سارا علم خبط ہو گیا الحمد تک بھول گئے تھے افاقہ کے بعد بچوں کی طرح ان کو الحمد یاد کرائی گئی تو ان کے بھائی کو بڑی خوشی ہوئی اور مٹھائی بانٹی گئی جیسے بچوں کی بسم اللہ میں مٹھائی بانٹی جاتی ہے پھر انسان کا ہے پر تکبر کرتا ہے یہ سب چیزیں خاک میں ملنے والی ہیں۔ فی الارض میں اسی پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ہیں زمین پر رہ کر تکبر کرتے ہو تم کو شرم نہیں آتی۔ اس کے بعد بغیر الحق دونوں کے لئے واقعی قید ہے۔ ظلم کے لئے بھی اور بغی کے لئے بھی کیونکہ ظلم اور تکبر دونوں بغیر الحق اور ناحق ہی ہوتے ہیں اس میں تصریحاً یہ بات بتلا دی کہ تم کو تکبر اور ظلم کا کچھ حق نہیں ہے پھر ناحق کیوں ظلم کرتے ہو اور گو اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی مگر اس کی تصریح اس لئے کر دی کہ بعض لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تکبر کا حق ہے کیونکہ خدا نے ہم کو بڑا بنایا ہے اس لئے تصریحاً بتلا دیا کہ خدا نے تو تم کو زمین سے پیدا کیا اور زمین میں رہنے کا حکم دیا ہے تم کو آسمان پر چڑھنے کا کیا حق ہے آگے اس سبیل کی تعیین فرماتے ہیں کہ ظلم کرنے والوں پر جو الزام ہے اس کی صورت کیا ہو گی فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ صاحبو! یہ ظلم کا معاملہ ایسا سخت ہے کہ جب تک بندہ اپنے حق نہ معاف کر دے اس وقت تک خدا بھی نہ معاف کرے گا۔ خدا تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف کر دیتے ہیں مگر بندہ کے حقوق جب تک وہ معاف نہ کرے معاف نہیں کرتے یہ بہت سخت بات ہے۔ سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عادل اور غازی بادشاہ تھے ایک دفعہ انہوں نے خواب میں ایک بڑا عالیشان خوبصورت جنت کا محل دیکھا فرشتوں سے پوچھا کہ یہ محل کس کے واسطے ہے کہا محمود غزنوی کے لئے ہے۔ انہوں نے کہا پھر مجھے اندر جانے دو میں اپنے محل کو دیکھوں فرشتوں نے کہا ابھی آپ کو اندر جانے کی

اجازت نہیں آپ کے ذمہ ایک مقدمہ ہے اس کا فیصلہ ہو جائے تو پھر اجازت ہوگی پوچھا کیا مواخذہ ہے تو انہوں نے ایک چابک جو دیوار میں لٹکا ہوا تھا کہ تم نے اس کوڑے سے ناحق ایک ملازم کو مارا ہے جب تک اس کا حق ادا نہ ہو جائے آپ جنت میں نہیں جا سکتے۔ بس یہ سن کر محمود رحمۃ اللہ علیہ کانپ ہی تو گئے اور گھبراہٹ سے آنکھ کھل گئی صبح تک بے تابی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہے جب صبح ہوئی تو اس ملازم کو بلایا اور چابک اس کے سامنے ڈال دیا کہ تیرا جتنا جی چاہے مجھے اس سے مار لے اور آگے ہاتھ جوڑے کہ للہ تو اپنا بدلہ لے لے ورنہ میں جنت سے محروم ہو جاؤں گا۔ اس نے کہا حضور مجھ پر ایک تو وہ ظلم ہوا تھا اس سے بڑھ کر آپ دوسرا ظلم یہ کرتے ہیں کہ مجھ سے انتقام کو فرماتے ہیں وہ قدموں میں گر پڑا اور کہا کہ میں نے جہاں پناہ کو معاف کیا آپ بالکل بیفکر رہیں مگر محمود کی اس سے تسلی نہ ہوئی اس کو بہت سا انعام واکرام دیا جس سے وہ خوش ہوا تب چین پڑا۔ تو صاحب یہ ظلم ہلکی چیز نہیں ساری عبادتیں اس وقت تک ناکافی ہیں جبتک ظلم سے برآت نہ ہوگی درمختار میں ہے کہ ایک دانگ کے بدلے میں جو درہم کا چھٹا حصہ ہے جس کو تین پیسے سمجھ لیجئے سات سو مقبول نمازیں حقدار کو دلائی جائیں گی مجھے اس روایت کی صحت و ضعف کی تحقیق نہیں ممکن ہے فقہا کو تحقیق ہوئی ہو۔ پھر دوسرے نصوص بھی تو اس بارہ میں موجود ہیں۔ غرض ہر حال میں کتنی سخت مصیبت ہوگی اول تو ہماری نمازیں مقبول ہی کتنی ہیں پھر تین تین پیسے کے بدلہ میں وہ بھی جاتی رہیں تو تبلایئے قیامت میں کیسی حسرت ہوگی حدیث مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا مَنِ الْمُفْلِسُ فِیكُمْ تم مفلس کس کو سمجھتے ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم و دینار نہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر مفلس وہ ہے جس نے نمازیں بھی بہت پڑھی تھیں روزے بھی بہت رکھے تھے، حج بھی کیا تھا، زکوٰۃ بھی دی اور صدقات بھی کئے تھے۔ "وَلٰكِنْ قَذَفَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا وَاَخَذَ مَالَ هٰذَا فَجَاءَ رَجُلٌ فَذَهَبَ بِصَلٰوتِهٖ وَجَاءَ اٰخَرُ فَذَهَبَ بِصِيَامِهٖ" (لیکن تہمت زنا کی اس پر لگائی، اس کو مارا، اس کا مال لے لیا پس آیا ایک شخص تو اس نے

اس کی نمازیں لے لیں دوسرا آیا اس نے اس کے روزے لے لئے) الحدیث "۔
مگر اس کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی تھی کسی کو مارا پیٹا تھا کسی کا مال لے لیا تھا۔ اب قیامت میں ایک آیا وہ اس کی نمازیں لے گیا، دوسرا آیا وہ روزے لے گیا، تیسرا آیا وہ حج لے گیا چوتھا آیا زکوٰۃ اور صدقات لے گیا پھر بھی کچھ حقدار بچ گئے اور انکے دینے کو نیکیاں نہ بچیں تو ان کے گناہ اس کے اوپر ڈالدیئے گئے اور یہ طاعات سے خالی ہو کر گناہوں میں لاکر جہنم میں داخل ہوا یہ ہے سب سے بڑا مفلس پہلی روایت میں اگر کچھ کلام ہو تو یہ حدیث تو بالکل صحیح ہے تو کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ذرا ذرا سے حقوق العباد کے بدلہ میں ساری کی کرائی محنت دوسروں کو مل جاگی۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ حقوق العباد من وجہ نماز روزہ سے بھی مقدم ہیں ان کا بہت اہتمام کرنا چاہیئے مگر افسوس آجکل لوگوں کو ان کا بالکل ہی اہتمام نہیں اب یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ ایک شخص نے کسی پر ظلم کیا ہو اور کسی سے رشوت لی ہو کسی کی غیبت کی ہو اور اب وہ مرچکے ہیں یا لاپتہ ہیں تو ان کے حقوق کیونکر ادا کئے جائیں اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت میں کوئی صورت لا علاج نہیں ہے کہنے والا ہونا چاہیئے۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ اول تو پوری کوشش کرے ان لوگوں کے پتہ لگانے میں اگر ان کا پتہ لگ جائے تب تو ان کو حق پہنچائے۔
اگر معلوم ہوا کہ وہ مرگئے ہیں تو مالی حقوق ان کے ورثہ کو پہنچائے اگر ورثاء کا بھی پتہ نہ لگے تو جتنی رقم تم نے ظلم ورشوت سے لی ہے اتنی رقم خیرات کردو اور نیت کرلو کہ یہ ہم ان کیطرف سے دے رہے ہیں یہ تو حقوق مالیہ کا حکم ہے۔ اور غیبت شکایت اور جانی ظلم کی تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ اگر مظلوم مرگیا ہو یا لاپتہ ہوگیا ہو تو اس کے حق میں دعا کرو نماز اور قرآن پڑھ کر اس کو ثواب بخشو اور عمر بھر اسکے لئے دعا کرتے رہو ان شاء اللہ حق تعالیٰ ان کو تم سے راضی کردیں گے جس کی صورت قاضی ثناء اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ قیامت میں مسلمانوں کو بڑے بڑے خوبصورت عالی شان محل دکھلائے جائیں گے اور حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ان محلات کا خریدار کوئی ہے اور ارشاد ہوگا کہ ان کی قیمت یہ ہے کہ جس کا جو حق کسی کے ذمہ ہو اسے معاف کردے اس وقت کثرت سے اہل حقوق اپنے حق معاف کردیں گے۔ پھر سرکار کی طرف سے مثل داخل دفتر ہوجائے گی۔

قاضی صاحب اپنے زمانہ کے محدث اور محقق تھے انہوں نے تحقیق کر کے یہ روایت کہیں سے لکھی ہوگی ہم کو ان پر اعتماد ہے۔ غرض معذرت کرنے والوں کی وہاں بڑی قدر ہے ان کے حقوق اللہ تعالٰی خود ادا کردیں گے۔ وہاں تو اینٹھ مروڑ پر گرفت ہوتی ہے کہ باوجود ظلم و تعدی کے پھر بھی فکر نہ ہوا اور ادائے حقوق کا اہتمام نہ ہوا اب ایک سوال اور رہ گیا وہ یہ کہ کسی نے مثلاً دس ہزار روپئے سود یا رشوت میں لئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ کس سے لئے ہیں اب وہ چاہتا ہے کہ اس کا حق ادا کرے تو کیونکر کرے اس لئے کہ اس وقت اس کے پاس دس ہزار روپے نہیں ہیں ساری عمر میں جو حرام مال کھایا تھا آج ایک دن میں سب کیسے ادا کر دے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالٰی کے یہاں کام کا شروع کر دینا اور ادا کا عزم کر لینا بھی مقبول ہے۔ تم اول تو صاحب حق سے معافی کی درخواست کرو۔ اگر وہ خوشی سے معاف کر دے تب تو جلدی ہلکے ہوئے۔ اور اگر معاف نہ کرے یا خوشی سے معاف نہ کرے تو تھوڑا تھوڑا جتنا ہوسکے اس کا حق ادا کرتے رہو مگر یہ ضروری ہے کہ اپنے فضول اخراجات کو موقوف کر دو، بس ضروری ضروری خرچ میں اپنی آمدنی خرچ کرو اور اس سے جتنا بھی بچے وہ حقداروں کو ادا کرو اور اگر وہ مرگئے ہوں تو ان کے ورثار کو دو اور اگر ورثار بھی نہ معلوم ہوں تو ان کی نیت سے خیرات کرتے رہو۔ ان شاء اللہ اول تو امید ہے کہ دنیا ہی میں سارا حق ادا ہو جائیگا اور اگر کچھ ادا ہوا اور کچھ رہ گیا تو اس کو حق تعالٰی ادا کر دیں گے۔ حق تعالٰی کے یہاں نیت کو زیادہ دیکھا جاتا ہے جس کی نیت پختہ ہو کہ میں حق ادا کروں گا پھر اس پر عمل بھی شروع کر دے حق تعالٰی اس کو بالکل بری کر دیتے ہیں اور صاف نیت وہ چیز ہے کہ جنت میں جو آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ معلوم بھی ہے یہ کس چیز کی برکت ہے یہ نیت ہی کی تو برکت ہے کیونکہ عمل تو انسان زندگی بھر کرتا ہے اس کا صلہ بہت سے بہت یہ تھا کہ ہزار دو ہزار سال تک بہشت میں رہنا ہو جاتا

عمل محدود کی جزا عقلاً محدود ہوتی ہے مگر یہ غیر محدود جزا آپ کی نیت ہی کی وجہ سے ہے کہ مسلمان گو عمل کرتا ہے محدود زمانہ میں مگر اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر میں ابدالاباد تک بھی زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام و اعمال صالحہ پر جما رہوں گا اس لئے ان کی جزا بھی دائمی ہے۔ اور یہی راز ہے کفار کے عذاب دائمی کا کیونکہ وہ بھی گو زمانہ محدود تک کفر کرتے ہیں مگر نیت ان کی یہی ہوتی ہے کہ ابدالآباد تک بھی زندہ رہیں گے تو اسی طریقہ پر جمے رہیں گے۔

پس نیت کو آپ حقیر نہ سمجھیں۔ ثواب ابدی کے مستحق آپ اسی کی وجہ سے ہیں لہذا اسی وقت سے ادا حقوق کا اہتمام شروع کردو اور نیت پختہ کرلو کہ ادا کرکے رہیں گے۔ اور تھوڑا تھوڑا ادا کرتے رہو ان شاء اللہ تعالیٰ پھر آپ اس بوجھ سے ہلکے ہو جائیں گے ورنہ یاد رکھیے کہ حق دار قیامت میں آپ کی بوٹیاں کھالیں گے اور ساری نیکیاں چھین لیں گے۔

نیز حدیث میں آتا ہے " اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ " کہ ظلم کے لئے قیامت میں بہت ظلمتیں ہیں خدا اس سے محفوظ رکھے۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ بحمداللہ اس وقت حقوق العباد کی تفصیل اور توضیح کافی ہو چکی ہے اور اشکالات کا حل بھی ہو گیا ہے۔ اب کسی کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔

ع "جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے"

حدیث میں ہے کہ حقوق کو دنیا ہی میں ادا کردو یا معاف کرالو پہلے اس دن کے جس میں نہ زر پیسہ کچھ نہ ہوگا۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں

وصلے اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علےٰ آلہ واصحابہ وسلم

تم بحمد اللہ و بنعمتہ وجلالہ تتم الصالحات و آخر دعوانا

ان الحمد للہ رب العالمین

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً"
(رواہ البخاری)

سلسلہ

التبلیغ کا

وعظ مسمّٰی بہ

اَسْبَابُ الْفِتْنَۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

ورحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم اے جناح روڈ

سلسلۂ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

اسبابُ الفتنہ

این	کہاں ہوا	موضع سیولی ضلع گڑگانواں
متی	کب ہوا	۲۰ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ روز شنبہ بوقت شب
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹہ ۵۰ منٹ
کیف	کس طرح ہوا	غالباً بیٹھ کر کیونکہ بیان طویل ہوا
لم	کیوں ہوا	اہل موضع کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	محبت اموال و اولاد میں اعتدال کی تعلیم اور تجاوز حدود سے ممانعت
من اوشان	کن کو زیادہ مفید تھا	عوام کو خصوصاً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	مولانا سعید احمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسودہ اجمالی لکھا اور ان کے برادر خورد ظفر احمد عفا اللہ عنہ نے تفصیل کی۔
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مسودہ اجمالی میں تعداد نہیں لکھی۔
الاشتات	متفرقات	مجمع رجال کے علاوہ مستورات کا مجمع بھی پردہ میں تھا اور عجیب اتفاق ہے کہ اس مسودہ کی تسوید بھی ۲۰ ربیع الثانی کو شروع ہوئی مگر ۴۳ھ میں مکمل ہوئی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ اِنَّمَآ اَمۡوَالُکُمۡ وَ

اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَۃِ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ (تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو اور مانو اور خرچ کیا کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اگر تم اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے تو وہ اسکو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جاوے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا قدردان ہے بڑا بردبار ہے پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے زبردست حکمت والا ہے)

یہ چند آیات ہیں سورۂ تغابن کے اخیر کی جن میں حق تعالٰے شانہ نے اپنے ایمان والے بندوں کو دو چیزوں کے نقصان پر اطلاع دی ہے اور یہ حق تعالیٰ کی نہایت شفقت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایسا چاہتے ہیں جیسے ماں باپ اولاد کو چاہتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ماں باپ کو بھی اپنے بچہ کے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوتی جتنی حق تعالٰے کو اپنے بندوں کے ساتھ ہے کیونکہ ماں باپ کو اولاد کے ساتھ جو کچھ محبت ہے وہ بھی خدا ہی کی دی ہوئی ہے اور جب وہ بھی خدا کی دی ہوئی ہے تو اس سے سمجھ لیجئے کہ خود خدا تعالٰے کے پاس کتنی محبت ہوگی کیونکہ جو کوئی ایک چیز کو بانٹا کرتا ہے اس کے پاس وہ چیز دوسروں سے زیادہ ہوا کرتی ہے اور اگر وہ چیز صفت کمال ہو تو ایک درجہ میں اتصاف بھی ہوگا اور دوسروں کی تو یہ حالت ہے کہ کسی چیز کے بانٹنے اور دینے دلانے سے ان کے پاس سے وہ چیز کم ہو جاتی ہے مگر خدا تعالٰے کے ہاں کمی نہیں ہوتی وہاں کمی کا احتمال ہی نہیں کیونکہ ان کے پاس ہر چیز کا غیر متناہی خزانہ ہے اور غیر متناہی میں کمی نہیں ہو سکتی تو خدا تعالٰے نے جو اپنے بندوں میں ماں باپ کو محبت دی ہے اس سے خدا کے یہاں یہ صفت کچھ کم نہیں ہوئی کیونکہ اول تو صفت میں کمی کا احتمال نہیں (دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کے اخلاق کا دوسرے پر اثر

اثر ہوتا ہے مثلاً شاگرد میں استاد کی صفت کا کا اثر پہنچتا ہے نیز دوسرے اخلاق حمیدہ بھی صحبت کے اثر سے اس میں پیدا ہو جاتے ہیں مگر اس سے استاد کی صفت میں کمی نہیں ہوتی حالانکہ استاد کی صفات حادث اور ممکن ہیں جب صفت حادثہ ممکنہ میں بھی دوسرے کے افادہ سے کمی نہیں آتی تو حق تعالےٰ کی صفات میں جو کہ قدیمہ اور واجبہ ہیں یہ احتمال کیونکر ہوسکتا ہے ۱۲) دوسرے میں ابھی کہہ چکا کہ حق تعالےٰ کے یہاں ہر چیز کے خزانے بے انتہا اور غیر متناہی ہیں پس اگر بفرض محال صفت میں افادہ سے کمی کا احتمال بھی ہوتا تو لامتناہی کی وجہ سے وہ احتمال مرتفع ہے بہرحال خدا تعالےٰ کی محبت جتنی بندوں کے ساتھ تھی دوسروں کو اس میں سے کچھ حصہ دینے سے اس میں کمی نہیں آئی۔ اور جب ماں باپ کی محبت کا یہ حال ہے جو رات دن مشاہد ہے اور وہ خدا ہی کی دی ہوئی ہے تو خود خدا تعالےٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ کیسی کچھ محبت ہوگی اس کا تو اندازہ بھی نہیں ہوسکتا بہرحال اسی محبت کا مقتضا یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے ہم کو ہر قسم کے نفع و ضرر پر مطلع فرمادیا جو کام کی بات تھی وہ بھی بتلادی اور جو نقصان کی چیز تھی اس پر بھی مطلع فرمادیا۔ چنانچہ اس آیت میں دو چیزوں کا بیان ہے جو انسان کو پیاری تھیں اور ان میں انسان کا کچھ نقصان بھی ہے مگر نقصان کے ساتھ ان میں کچھ نفع بھی ہے اس لئے یہاں ایسا لفظ استعمال فرمایا[ف] ہے جو لغۃً نفع کیلئے بھی بولا جاسکتا ہے اور نقصان کے لئے بھی گو عرفاً اس کا استعمال ضرر میں زیادہ ہے پس یا تو یہ کہئے کہ اس جگہ دو محبوب چیزوں کے نفع و ضرر دونوں پر مطلع کیا ہے یا عرف کے اعتبار سے یوں کہئے کہ صرف ان کے ضرر پر مطلع کیا ہے اور ایسی چیزوں کے نقصان پر مطلع کرنے کی ضرورت بھی زیادہ تھی جو محبوب ہیں کیونکہ مکروہ اور ناگوار چیزوں کے نقصانات سے تو انسان خود ہی بچا کرتا ہے اور گو کبھی مکروہات میں بھی ابتلا ہو جاتا ہے مگر محبوب چیزوں میں ابتلا زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے طبیب بیمار کو ایسی چیزوں سے زیادہ روکتا ہے

[ف] اس لفظ کی تصریح اخیر میں کی گئی ہے یعنی فتنۃ کما فی القاموس الفتنۃ اعجابک بالشئ والضلال والمحنۃ والمشترکۃ بین النفع والضر ۱۲

جو مرغوب ہیں اور ان میں مریض کا نقصان ہے اب سمجھئے کہ وہ چیزیں کیا ہیں جن کا بیان اس آیت میں ہے سو وہ دو چیزیں ایک مال اور ایک اولاد۔ اور ان میں دو باتیں ہیں۔ایک تو ان کا مرغوب و محبوب ہونا یہ تو بہت ظاہر ہے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں مرغوب انسان مال و اولاد کے واسطے کیا کیا کرتا ہے اور ان کے لئے کیسی کوشش کرتا ہے سب کو معلوم ہے جس سے ان دونوں کا محبوب ہونا ایسا ظاہر ہوگیا ہے کہ اس میں کچھ بھی خفا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دنیا میں جتنے محبوب مشاغل اور جس قدر دھندے ہیں سب انہی دو کے واسطے ہیں (درمیان وعظ میں حضرت نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ وہ روشنی کا زیادہ اہتمام کرنے میں مشغول ہیں تو اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ) بقدر ضرورت روشنی کافی ہے زیادہ کی کیا ضرورت ہے اس میں علاوہ اسراف کے ایک کھلا ہوا نقصان یہ ہے کہ سامعین کا دل وعظ میں پوری طرح نہیں لگتا ہر ایک کی نظر اس پر رہتی ہے کہ اب وہ چراغ گل ہوا اور وہ بھڑکا اسی لئے تراویح کے ختم قرآن میں ہم لوگ زیادہ روشنی سے منع کرتے ہیں اس میں بھی علاوہ اسراف کے اتنا حرج تو کھلا ہوا ہے کہ کسی کا دل نماز میں اور قرآن میں نہیں رہتا خصوصاً ان لوگوں کا جو روشنی کے مہتمم ہوتے ہیں وہ تو بس یہی دیکھتے رہتے ہیں کہ اب فلاں فانوس بھڑک اٹھا اُسے کم کرنا چاہیئے۔ اب دوسرا گل ہوگیا اُسے جلانا چاہیئے اور جو چیز اصل مقصود ہیں یعنی قرآن سننے میں حارج ہو جس پر ختم قرآن موقوف ہے تو بتلایئے وہ قابل ترک ہے یا نہیں یقیناً یہ سب چیزیں قابل ترک ہیں مگر آجکل رسم پرستی کا طبائع پر اتنا اثر غالب ہے کہ باوجود اُن کے کھلے نقصانات کے پھر بھی ان کو کیا جاتا ہے اور جو شخص منع کرے اس سے خفا ہوتے ہیں۔اسی طرح مٹھائی کے تقسیم سے منع کرنا بھی لوگوں کو ناگوار ہوتا ہے۔ مگر ہم اس لئے منع کرتے ہیں کہ اس سے اصل کام میں حرج ہوتا ہے یعنی عقائد کا قصہ تو الگ رہا (کہ لوگوں نے اس کو لازم اور ضروری سمجھ رکھا ہے چنانچہ بدون مٹھائی کے ختم قرآن اُن کے نزدیک معیوب ہوگیا ہے اور مباح کا اتنا التزام جو فساد عقیدہ کو مستلزم ہو جائے ناجائز و بدعت ہے مگر) اس سے قطع نظر کر کے میں

ــه اس کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا اس کے بعد پھر مضمون مقصود کی طرف عود ہوا من قولہ تو میں اسکو بیان کر رہا تھا کہ اس مقام پر الخ وہاں بھی حاشیہ میں یہاں کا حوالہ دیا جاویگا۔

یہ کہتا ہوں کہ اس سے اصل کام میں بھی حرج ہوتا ہے (چنانچہ بارہا دیکھا ہوگا کہ کسی مسجد میں نمازیوں کی تعداد کے موافق مٹھائی گئی مگر درمیان میں نمازی بڑھ گئے اور مٹھائی تھوڑی معلوم ہوئی تو اس وقت ایک دو آدمیوں کو بازار بھیجا جاتا ہے کہ ایک دو روپیوں کی مٹھائی اور لے آؤ پھر یہ آدمی تو جماعت سے بالکل محروم رہے اور جو جماعت میں شریک رہے وہ بھی ہر دو رکعت پر سلام پھیر کر دیکھتے رہتے ہیں کہ وہ آگئے یا نہیں اگر ان کو کسی وجہ سے دیر ہوگئی تو اب امام صاحب سے کہا جاتا ہے کہ ذرا نماز ٹھہر ٹھہر کر سکون سے پڑھیں جلدی نہ کریں تاکہ ختم تک مٹھائی لانے والے پہنچ جاویں ان کی نماز بھی ساری مٹھائی کے مراقبہ میں ختم ہوتی ہے آخر یہ حرکت خرافات ہے یا نہیں)

ایک دفعہ کانپور میں میرے وعظ کے بعد بعض لوگوں نے مٹھائی تقسیم کرنے کا ارادہ کیا وعظ مغرب کے بعد سے عشا تک ہوا تھا۔ تجویز یہ ہوئی کہ نماز عشا کے بعد تقسیم کی جائے پھر یہ فکر ہوئی کہ مٹھائی تو ہے تھوڑی سی اگر عشا کے بعد تقسیم کی گئی تو آدمی زیادہ ہوجائیں گے (کیونکہ مٹھائی کی خبر سنکر دوسری مسجدوں کے نمازی بھی یہاں آکر نماز میں شریک ہوجائیں گے) تو اس کی یہ تدبیر کی کہ کنڈی تو بند کردی اور ایک آدمی کو پہرہ پر کھڑا کیا کہ جو شخص آوے اس سے پوچھ لو اگر وہ پُرانا نمازی ہے تو کھول دو ورنہ بند رکھو وہ پہرہ دار تو جماعت سے محروم رہا (اور کنڈی بند کرنے کی وجہ سے نہ معلوم کتنے آدمی جماعت سے محروم رہے ہوں گے) نماز کے بعد مجھے اطلاع ہوئی میں نے کہا کہ تم لوگ بدعات سے رد کنے پر ہم لوگوں کو بُرا بھلا کہتے ہو مگر تم نے ان کا نتیجہ دیکھ لیا کہ محض مٹھائی کے انتظام کی وجہ سے ایک مسلمان کو تم نے جماعت سے محروم کیا جس کی حالت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تارکین جماعت کے گھر جلادوں اسی وعید کی بنا پر اکثر محققین نے جماعت کو واجب کہا ہے گو بعض نے سنت موکدہ بھی کہا ہے اور وہ بھی کوئی تھوڑی بات نہیں۔ سنت موکدہ بھی ایسی چیز ہے جس کی بابت بعض کتبؒ فقہ میں ایک حدیث لکھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

عہ اس کو شامی میں تلویح سے نقل کیا ہے واللہ اعلم بحال صحتہ ۱۲ ظ

کہ اس کے تارک کو میری شفاعت نصیب نہ ہو گی اور صحیحین میں گو یہ لفظ نہیں مگر ایسی ہی سخت وعید وارد ہے فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ (جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میرے طریق سے نہیں ہے) غرض ان تکلفات میں وہ اصلی کام رہ جاتا ہے جس کے شکریہ میں یہ تکلفات برتے جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ بہت آراستگی کرتے ہیں کہ کہیں قندیل لگاتے ہیں کہیں جھاڑ فانوس کہیں کچھ کہیں کچھ وہ اکثر بیان سننے سے محروم رہتے ہیں جیسا کہ یہاں بھی اسی قسم کا کچھ سامان ہوا ہے چنانچہ نظر آرہا ہے مگر خیر جو حد سے زائد تھا اس کو موقوف کر دیا گیا اور لڑکوں کے خیال سے کچھ تھوڑا بہت رہنے دیا گیا (غالباً یہ تکلفات نوجوان لڑکوں نے کئے تھے اس لئے اُن کی خاطر سے کسی قدر رہنے دیا گیا اور جو حد سے زائد تھے وہ حذف کر دیئے گئے ۱۲ ظ) گو یہ سب کچھ محبت سے کیا گیا ہے مگر یہ محبت ماں کی سی ہے جس کے ساتھ کچھ نادانی بھی ہے (باپ کو تو اولاد کے ساتھ عاقلانہ محبت ہوتی ہے جس پر کوئی بُرا نتیجہ مرتب نہیں ہوتا بلکہ اس سے اولاد کی اصلاح ہوتی رہتی ہے اور ماں کی محبت نادانی کے ساتھ ہوتی ہے جس سے اولاد کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو یہاں پر جو محبت ان تکلفات کا سبب ہوئی ہے وہ ماں کی محبت سے مشابہ ہے اس لئے اس میں کچھ نادانی بھی شامل تھی ۱۲) اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ زیب و زینت کرنے والے یاد کر لیں کہ اس انتظام کے درمیان میں اگر جماعت ہونے لگی ہوگی تو بعض نے جماعت کو ترک کر دیا ہوگا اور بعض نے نماز ہی نہ پڑھی ہوگی اور جس نے تنہا پڑھی بھی ہوگی اس کا بھی ترک جماعت سے جی تو بُرا نہ ہوا ہوگا۔ یہ ہے اصلی بات جس کی وجہ سے ان امور کو ہم منع کرتے ہیں اور ہم کیا منع کرتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع فرمایا ہے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی زندگی کو دیکھو کہ وہاں کیسی سادگی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کی یہ حالت تھی کہ وضع میں لباس میں مکان میں اٹھنے بیٹھنے میں غرض ہر چیز میں سادگی تھی مجلس میں کسی بات سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان میں بزرگ اور سردار کون ہے حتیٰ کہ اجنبی آدمی کو مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آکر پوچھنا پڑتا تھا مَنْ مُحَمَّدٌ فِیْکُمْ کہ تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں کیونکہ آپ کے

سر پر کوئی بڑا بھاری عمامہ نہ ہوتا تھا نہ لباس دوسروں سے ممتاز ہوتا تھا نہ کوئی بڑا تخت تھا جس پر آپ بیٹھتے ہوں سب کی وضع اور نشست یکساں ہوتی تھی ہاں وعظ کے لئے البتہ آپ ممبر پر بیٹھتے تھے وہ بھی امتیاز کے لئے نہیں بلکہ دینی مصلحت کی وجہ سے۔ کیونکہ زمین پر بیٹھ کر تقریر کرنے سے مجمع کثیر کو برابر آواز نہیں پہنچ سکتی (اور آواز بھی پہنچ جائے جیساکہ آپ کی آواز میں یہ معجزہ تھا کہ قریب و بعید سب کو یکساں پہنچتی تھی تو تمام سامعین آپ کے چہرۂ مبارک پر تو یکساں نظر نہ کر سکتے تھے اور تقریر کے وقت متکلم کے لب و لہجہ کے مشاہدہ سے سامعین پر ایک خاص اثر ہوتا ہے ۱۲) اور کھڑے ہو کر تقریر کرنا بعض دفعہ تعب و مشقت کا سبب ہوتا ہے خصوصاً جبکہ دیر تک بیان کرنا ہو ان وجوہ سے وعظ کے وقت آپ ممبر پر بیٹھتے تھے باقی عام مجالس میں آپ سب کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے کہ کسی وضع سے امتیاز ظاہر نہ ہوتا تھا اس لئے لوگ آ کر پوچھتے تھے کہ تم میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کون ہیں جس کا جواب یہ ملتا تھا کہ هٰذَا الْمُتَّكِئُ الْاَبْيَضُ یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم یہ ہیں گورے چٹے جو رہا تھ یا دیوار کا سہارا لگائے بیٹھے ہیں آپ کا حسن تو عجیب و غریب تھا جو ہزاروں لاکھوں میں نہ چھپتا تھا اگر یہاں کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب آپ کا حسن ایسا تھا تو پھر نو واردوں کو پوچھنے کی کیوں نوبت آتی تھی حسن تو سب کو معلوم ہو جاتا ہے تو بات یہ ہے کہ حسن بیشک چھپ نہیں سکتا مگر اُس سے اتنا ہی تو معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ شخص سب سے زیادہ خوبصورت اور جمال میں بے نظیر ہے لیکن جو نو وارد آپ کو سلطان سمجھ کر آتا تھا اُسے سامان سلطنت و اسباب امتیاز نہ دیکھ کر بلکہ آپ کو سب کے ساتھ ملا جلا دیکھ کر تو حیرت ہوتی ہی تھی کہ میں ان میں سے کس کو بادشاہ سمجھوں کیونکہ حسن و جمال بدون سامان سلطنت کے کسی کو سلطان سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا (دوسرے یہ کہ) آپ کا حسن ایسا لطیف تھا کہ دیکھنے والے کو فوراً اس کے تمام کمالات کا احاطہ نہ ہوتا تھا بلکہ آپ کے حسن کی یہ شان تھی ؎

يَزِيْدُكَ وَجْهُهٗ حُسْنًا
اِذَا مَا زِدْتَهٗ نَظَرًا

(تیرے چہرہ میں حسن زیادہ ہی ہوتا ہے جس قدر اس پر نظر زیادہ ڈالتا ہوں)
یہ تو نشست و برخاست کی کیفیت تھی۔ چلنے پھرنے میں آپ کی یہ عادت تھی کہ نہ سب سے آگے چلتے تھے نہ سب کے پیچھے بلکہ ملے جُلے بیچ میں چلتے تھے اور بیچ میں اس طرح کہ کبھی دائیں کبھی بائیں غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ سادگی تھی حالانکہ آپ کی شان یہ ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
(قصہ مختصر آپ کا رتبہ خدا کے بعد بزرگ تر ہے)

اور یہ بزرگی ہی تو وجہ تھی اس حالت کی کیونکہ اہلِ کمال کو تصنع کی ضرورت نہیں ہوتی تصنع اور تکلف وہ کرتا ہے جس میں ذاتی کمال نہ ہو اور جس میں ذاتی کمال ہوتا ہے وہ اسباب کمال سے مستغنی ہو جاتا ہے آپ کا ذاتی کمال خدا کی معرفت و محبت ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی تصنع کی آپ کو ضرورت نہ تھی اور یہ کمال آپ کی برکت سے بحمد اللہ ہر مسلمان کو حاصل ہے اور جس پر اس کی عظمت منکشف ہو گئی ہے وہ بھی آپ کی طرح سب چیزوں سے مستغنی ہو جاتا ہے چنانچہ ایک کابلی کہا کرتا تھا کہ ہم بڑے امیر ہیں ہم سے بڑھکر دولت کسی کے پاس بھی نہیں ہے ہمارے پاس لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی دولت ہے مگر ہم نے اس دولت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اس کے اثر کو دیکھا نہیں اس کی قدر کو جانا نہیں اس لئے ہم تکلف اور تصنع میں مبتلا ہیں واللہ یہ وہ دولت ہے کہ جس کے پاس یہ ہے اس کو کسی سامان کی ضرورت نہیں مگر ہماری وہ حالت ہے ؎

یک سبد پُر ناں ترا بر فرق سر — تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تا بزانوئی میان قعر آب — وز عطش و ز جوع گشتی خراب

(تمہارے سر پر ایک ٹوکرا روٹیوں کا دھرا ہوا ہے اور تم روٹی کے ٹکڑے کو دربدر مارے پھرتے ہو تم دریا میں زانو تک پانی میں کھڑے اور بھوک اور پیاس سے مر رہے ہو)

سر پر روٹیوں کا ٹوکرا بھرا ہوا رکھا ہے اور تم بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ دوسری قوموں کے طرز اختیار کرکے دولت کے متمنی ہو حالانکہ خود تمہارے پاس اتنی بڑی دولت ہے جس کی قیمت تمام دنیا بھی نہیں ہوسکتی ہمارے پاس واللہ سب کچھ ہے مگر خبر نہیں اور اسی بے خبری کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر کوئی اس دولت کو جو ہمارے پاس ہے چھیننا چاہے تو بعض نادان اس سے بھی دریغ نہیں کرتے اور دنیا کے چار ٹھیکروں کے بدلے اسے دیدے ناگوار اکر لیتے ہیں اور جو کوئی ان سے چار پیسے چھین لے تو لڑنے مرنے کو تیار ہوجاتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک نادان بچہ کے جیب میں پندرہ روپیہ کی گنی پڑی ہوا ور کوئی ایک لڈو کے بدلے میں اُسے نکال لے تو وہ اس پر نہ لڑے گا لیکن ایک کانچ کے شیشہ پر لڑے گا اور روئے گا جس کی قیمت ایک پیسہ بھی نہیں تو راز کیا ہے راز یہ ہے کہ اس نادان کو گنی کی قدر و حقیقت معلوم نہیں اور کانچ کے شیشہ کی ظاہری بھڑک اس کو محبوب ہے یہی حال آجکل کے مسلمانوں کا ہے کہ ان کو ایمان کی قدر نہیں اس لئے اُن کاموں سے باک نہیں جو ایمان کو زائل یا ضعیف کرنے والے ہیں ہاں روپے پیسے کی قدر ہے اس لئے نقصان مال کے ذرائع سے ڈرتے ہیں اگر ان کو متاع ایمان کی قدر معلوم ہوجائے تو پھر ان کا بھی وہی حال ہو جو اس کابلی کا حال تھا کہ اپنے کو سب سے زیادہ امیر سمجھنے لگیں غرض ہر مسلمان حقیقت میں صاحب کمال ہے اور کمال کے لئے بے تکلفی وسادگی لازم ہے بناوٹ تو وہ کرے جس میں عیب ہو اسی واسطے گنجا آدمی اپنا سر چھپایا کرتا ہے کبھی سر کھولنا پسند نہیں کرتا اور طرح طرح سے اپنا عیب ڈھانپتا ہے کہیں عمدہ ٹوپی پہنتا ہے کبھی بھڑک دار عمامہ باندھتا ہے اور جو تندرست ہو وہ تو ننگا سر ہونا زیادہ پسند کرتا ہے تاکہ اس کے بالوں کی خوبصورت ظاہر ہو اس کو بناوٹ کی کیا ضرورت ہے ؎

یاآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

(خوبصورت چہرہ کے لئے آب ورنگ خط وخال کی حاجت نہیں ہے)

غرض صاحب کمال زیادہ زیب وزینت نہیں کیا کرتا ہاں جس میں خود کوئی کمال

نہ ہو وہ زوائد سے اپنا عیب چھپایا کرتا ہے اسی لئے آپ علماء محققین کو ہمیشہ سادہ لباس
میں دیکھیں گے ہاں ناقص علماء کو جبہ و دستار کے اہتمام میں مشغول پائیں گے کیونکہ
ان میں خود کمال نہیں ہے وہ لباس ہی سے بڑا بننا چاہتے ہیں ۱۲) میں یہ نہیں کہتا کہ میلے
کچیلے رہا کرو سادگی سے میرا یہ مطلب نہیں میں نظافت اور صفائی سے نہیں منع کرتا بلکہ
تکلف اور تصنع سے منع کرتا ہوں اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے نظافت اور چیز ہے
بناوٹ اور چیز ہے نظافت تو شریعت میں مطلوب ہے اور اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے اتنا اہتمام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں نَظِّفُوْا اَفْنِیَاتِکُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْیَهُوْدِ
(اَوْکَمَا قَالَ) اپنے گھروں کے سامنے کا میدان بھی صاف رکھا کرو اور یہود کی مشابہت
مت کرو کیونکہ یہود صفائی نہیں رکھتے تھے تو جب گھر کے سامنے کے میدان کی بھی صفائی کا حکم ہے تو خود
گھر کی صفائی کا کتنا حکم ہوگا پھر لباس اور بدن کی صفائی کا کس درجہ کا حکم ہوگا اور جب ظاہر کی بھی صفائی
مطلوب ہے تو دل کی صفائی تو کیا کچھ مطلوب ہوگی (جس کی صفائی پر آدمی کا آدمی
بننا موقوف ہے کیونکہ انسان تو دل ہی سے انسان ہے ۱۲) غرض صفائی تو بڑی اچھی
چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بہت اہتمام تھا آپ بہت صاف رہتے تھے اور
مسلمانوں کو بھی صفائی کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جمعہ کے دن کپڑے
بدل کر آیا کرو مگر حکم نظافت کے ساتھ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے اَلْبَذَاذَۃُ مِنَ الْاِیْمَانِ
کہ سادگی ایمان میں سے ہے اس سے معلوم ہوا کہ سادگی اور نظافت دونوں جمع ہو سکتے
ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تصنع اور تکلف شان ایمان کے خلاف ہے۔ مگر آجکل دونوں
طرف افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے بعض لوگ جو صفائی پسند ہیں وہ تو حد تکلف
تک پہنچ جاتے ہیں کہ ہر وقت بناؤ سنگار ہی میں رہتے ہیں کپڑا بھی ان کے واسطے قیمتی
بھڑکدار ہونا چاہیے سر میں کنگھی بھی ناغہ نہ ہونا چاہیے۔ کپڑوں پر استری کلف بھی
دوسرے تیسرے دن ضرور ہونا چاہیئے اور جو سادگی پسند ہیں وہ میلے کچیلے رہتے ہیں
غرض اعتدال نہیں ہے۔ سادگی اور صفائی یہ ہے کہ لباس چاہے گھٹیا ہی ہو مگر داغ
و دھبہ سے منزہ ہو اگر دھبہ لگ جائے فوراً اس کو چھڑا دو اگر کپڑا میلا ہو جائے اس کو

صابون سے دھوڈالو کلف اور استری کے انتظار میں نہ رہو اس کا انتظار تکلف ہے
اسی طرح قیمتی بھڑکدار کپڑے کا اہتمام بھی تکلف ہے اور کپڑے پر داغ و دھبہ لگا رہنا
یا ویسا ہی میلا کچیلا پہنے رہنا بھی بُرا ہے کہ یہ صفائی اور نظافت کے خلاف ہے اس
سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ سادگی اور صفائی کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔ پس سادگی
کے ساتھ صفائی کا اہتمام بھی کرنا اعتدال ہے۔ ہمارے بزرگانِ دین نے کبھی کسی قسم کا
تکلف نہیں کیا ہمیشہ سادگی اور اعتدال کو ملحوظ رکھا ہم کو بھی اپنی معاشرت ایسی ہی سادہ
رکھنا چاہیئے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسجد میں بھی تکلف کو گوارا نہیں فرمایا چنانچہ
نقش و نگار کی ممانعت فرمائی حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بنا رمسجد کے وقت معمار
سے فرمایا تھا اَكِنِّ النَّاسَ مِنَ الْحَرِّ وَالْبَرْدِ وَاِيَّاكَ اَنْ تُحَمِّرَ اَوْ تُصَفِّرَ فَتَفْتِنَ النَّاسَ
(لوگوں کو گرمی سردی سے بچا سرخ اور زرد رنگ کرنے سے بچ لوگوں کو اس سے فتنہ میں
مت ڈال) نقش و نگار کی اس واسطے ممانعت ہے کہ یہ فتنہ ہیں اس تکلف و بناوٹ
سے آدمی اصل کام سے رہ جاتا ہے۔ بس انہی کے دیکھنے بھالنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔
نماز میں یکسوئی نصیب نہیں ہوتی۔ دیکھئے تاج بی بی کے روضہ پر جاکر فاتحہ اور قل ہو اللہ
تو شاید ہی کسی کو یاد رہتی ہو بس یہی ہوتا ہے کہ یہ بیل کیا عمدہ ہے یہ پھول پتیاں کیسے
خوبصورت ہیں کاریگر نے تراش میں کیسی خوبی رکھی ہے اور ایک جامع مسجد دہلی ہے
کہ اس میں خوبصورتی کے ساتھ سادگی بھی ہے دیکھنے میں سیدھی سادی عمارت ہے
ہاں اس کی خوبیاں غور کرنے سے معلوم ہوتی ہیں اور تاج بی بی کے روضہ میں خوبیاں
کھلی ہوئی ہیں اس کا حسن بہت کھلم کھلا ہے جو اصل مقصود سے مانع ہو جاتا ہے اسی لئے
ہمارے فقہا نے مساجد میں ایسے نقش و نگار اور ظاہری بھڑک کو مکروہ قرار دیا ہے
جس سے نمازیوں کا دل بٹنے لگے حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ہے کہ ایک وہ وقت آوے گا کہ لوگ مسجد بنانے پر باہم فخر کریں گے ایک اپنی مسجد
کو اچھا کہے گا تو دوسرا اس سے اچھی بنانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ آجکل اس کا
ظہور ہو رہا ہے کہ مسجدیں بھی نام کے واسطے بنائی جاتی ہیں حتیٰ کہ جب کوئی مسجد بنا تے

تو نئی بناتا ہے گو نئی مسجد کی ضرورت نہ ہو پرانی مسجد کی تعمیر میں رقم لگانے کو پسند نہیں کرتے کیونکہ نام نہ ہوگا یوں سمجھتے ہیں کہ پرانی مسجد کی عمارت سے نام تو اصل بانی کا ہوگا پھر ہم کیوں اس میں رقم لگائیں۔ مگر خوب سمجھ لو کہ شہرت کی طلب سے شہرت نہیں ہوتی شہرت بھی اپنے کو مٹانے ہی سے ہوتی ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو

کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

(اگر شہرت کی ہوس ہے گوشہ نشینی اختیار کرو گوشہ گیری سے عنقا کا نام مشہور ہے)

دیکھو عنقا پوشیدہ ہو گیا تو اس کا کس قدر نام ہوا کہ ہر شخص کی زبان پر اس کا نام ہے ہر غائب ہونے والے کو عنقا ہی سے تشبیہ دیتے ہیں ایسی ہی حضرات اہل اللہ کو دیکھو کہ وہ اپنے کو مٹاتے ہیں تو ان کا کتنا نام ہوتا ہے حتیٰ کہ مرنے کے بعد ان کی جوتیاں بھی تبرکات میں رکھی جاتی ہیں اور بادشاہوں کے عمدہ عمدہ تخت کی بھی کسی کو خبر نہیں غرض اول تو نام کی طلب ہی فضول ہے نام تو خدا ہی کا ہے اگر ہمارا نام مٹ ہی گیا تو کیا ہوا مٹنے کے لئے تو پیدا ہی ہوئے ہیں اور اگر کسی کو طلب ہی ہو تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ شہرت کے سامان جمع کرے بلکہ اس کا طریقہ بھی اپنے کو مٹانا ہی ہے افسوس تو یہ ہے کہ آجکل لوگوں نے موت کو بھی تفاخر کا موقع بنا رکھا ہے چنانچہ کہیں تیجہ ہوتا ہے کہیں دسواں کہیں چالیسواں اور ان میں بڑا سامان اور تکلف کیا جاتا ہے یہ مسئلہ تو الگ رہا کہ یہ رسوم سنت کے خلاف ہے یا موافق مگر میں اس وقت ایک موٹی سی بات بتلاتا ہوں جس سے ان کا قبح بہت سہولت سے واضح ہو جائیگا وہ یہ کہ حدیث میں ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى یعنی اعمال کا اعتبار نیت سے ہے (ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے اس کی نیت کی ہے) تو اب یہ دیکھئے کہ تیجہ، دسواں کرنے والوں کی نیت کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ اور امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ اگر کسی نے اپنے ماں کے ایصال ثواب کے لئے پچاس روپے تجویز کئے ہوں اور ان کا پلاؤ پکوا کر مسجدوں میں یا غریبوں کے گھر بھیجنا چاہتا ہو تو ہم یا آپ اس کو یہ مشورہ دیں کہ

اس رقم کی پلاؤ نہ کھلاوے بلکہ اس کو کسی وقتی ضرورت میں خرچ کردے کیونکہ وقتی ضرورت مقدم ہوا کرتی ہے اور اس میں خرچ کرنے کا ثواب غیر وقتی کاموں میں خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے مثلاً اس وقت ترکوں کی مدد کرنا (اور مجروحین جنگ بلقان کے لئے چندہ دینا) ایک وقتی ضرورت ہے اور اس میں رقم خرچ کرنا پلاؤ پکا کر بانٹنے سے زیادہ نافع ہے علیٰ ہذا اور کوئی ضرورت وقتی ہو تو وہ مقدم ہوگی اب اگر کوئی اس کو یہ مشورہ دینے لگے کہ بجائے پلاؤ کھلانے کے یہ رقم اس مد میں دیدیا فلاں شریف آدمی کی آبرو جاتی ہے اس کو خفیہ طور پر دیدو اور اس طرح رقم خرچ کرکے اپنے باپ ماں کو ثواب بخش دو تو واللہ اس شخص کے دل میں فوراً یہ بات آئے گی کہ واہ میرا اتنا روپیہ خرچ بھی ہوا اور نام کچھ نہ ہوا یہ عجب رائے ہے کہ چپکے سے دیدو اگر وہ مہذب نہیں ہے تو دل کی بات صاف کہدے گا اور اگر مہذب ہے تو صاف تو نہ کہے گا مگر کسی نہ کسی تاویل سے ہیر پھیر کر توجیہات بیان کرکے پلاؤ کھلانے کو ترجیح دے گا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تیجہ دسویں سے باپ ماں کو ثواب پہنچانا مقصود نہیں بلکہ محض تفاخر ہی تفاخر اس کا منشا ہے چنانچہ کیرانہ میں ایک گوجر بیمار ہو گیا اس کا لڑکا حکیم کے پاس آکر کہنے لگا کہ حکیم جی اب کی دفعہ تو کسی طرح میرے باپ کو اچھا ہی کردو، جاہلوں کے محاورات اکثر بے تکے ہی ہوتے ہیں اس قسم کے الفاظ وہ اکثر کہدیتے ہیں (جن سے مخلوق کے مؤثر ہونے کا ایہام ہوتا ہے مگر چونکہ وہ مسلمان تھا اس لئے اس کے کلام کو اسناد مجازی پر محمول کرنا چاہیئے چنانچہ اہل بلاغت نے لکھا ہے کہ موحد کے کلام میں اَنْبَتَ الرَّبِیْعُ الْبَقْلَ (ربیع نے ترکاری اگائی) میں اسناد مجازی ہے اور ملحد کے قول میں اسناد حقیقی ۱۲) جس کا منشا قلت مبالات ہے کہ لوگ الفاظ کو معمولی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ الفاظ بڑی چیز ہیں انہی سے نکاح ہوجاتا ہے اور انہیں سے ٹوٹ جاتا ہے الفاظ ہی سے آدمی مسلمان سمجھا جاتا ہے اور الفاظ ہی سے کافر ہوجاتا ہے شریعت میں الفاظ کا اس درجہ اہتمام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا یَقُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ خَبُثَتْ نَفْسِیْ وَلْیَقُلْ لَقِسَتْ نَفْسِیْ یعنی اگر کسی کو متلی ہو تو وہ یوں نہ کہے

کہ میری طبیعت بری ہے بلکہ یوں کہے کہ میری طبیعت مالش کرتی ہے یا مجھے متلی ہو رہی ہے کیونکہ مسلمان کی طبیعت بُری نہیں ہو سکتی جس کے پاس ایمان کی دولت ہے وہ کسی حال میں بُرا نہیں ہے۔ تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی معمولی باتوں میں بھی رعایت الفاظ کی تاکید فرمائی ہے تو الفاظ بہت بڑی چیز ہیں اور یہاں سے ایک بات یاد آگئی میں اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہم لوگوں کو اپنے روزمرہ میں عربی مہینوں کا استعمال کرنا چاہیئے، ہاں ضرورت کے موقعہ میں دوسرے مہینوں کے استعمال کا مضائقہ نہیں (مثلاً منی آرڈر پر دستخط کرتا ہو یا کوئی عدالتی کاغذ ہو وغیرہ وغیرہ) باقی روزمرہ کی بول چال اور باہمی خط وکتابت میں عربی مہینوں ہی کا استعمال چاہیئے کیونکہ اس میں دوسرے مہینوں کے استعمال کی کچھ ضرورت نہیں پھر بلا ضرورت اور بلا وجہ اسلامی طریقہ کو چھوڑ کر دوسروں کا طریقہ کیوں لیا جائے مگر آجکل اس کی ذرا پروا نہیں کی جاتی اور اکثر نوجوانوں نے عربی مہینوں کا استعمال ترک کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ رمضان کب آگیا اور جو کسی کو خبر بھی ہوتی ہے تو وہ بھی انگریزی مہینوں کے ذریعے چنانچہ ایک صاحب کہنے لگے کہ اب کی بیسویں جولائی کو عید ہوگی حالانکہ عید ایک اسلامی چیز ہے مگر ان حضرات کو اس کا وقت بھی انگریزی ہی مہینوں سے معلوم ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ میرے ایک دوست کہتے تھے کہ ایک مسلمان صاحب انگلستان سے کچھ پاس کر کے آئے تھے ان کے والد صاحب نے ان دوست کو لکھ دیا کہ وہ فلاں وقت فلاں اسٹیشن پر پہونچیں گے تم اُن سے مل لینا چنانچہ یہ ملے اس وقت رمضان کا مہینہ تھا مگر صاحب بہادر بے روزے تھے اور کھانے پینے میں مشغول تھے انہوں نے کہا کہ تم نے روزہ نہیں رکھا تو وہ حیرت سے پوچھتے ہیں کیسا روزہ انہوں نے کہا رمضان کا روزہ کیونکہ آج کل رمضان ہے تو وہ پوچھتے رمضان کیا چیز ہے ان دوست نے کہا ایک مہینہ ہے جس کا روزہ مسلمانوں پر فرض ہے تو وہ انگریزی مہینوں کو گننے لگے جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی الخ اور ان میں رمضان کا مہینہ تو کوئی بھی نہیں۔ انہوں نے کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط یہ تو بالکل ہی بیدین ہو کر

آیا ہے کہ اسلامی مہینوں کی بھی خبر نہیں (بس انگلستان سے پاس کیا ہوئے تھے کہ اسلام سے دور ہو گئے") حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن تعلیم کو ملاحظہ فرمایئے کہ آپ فرماتے ہیں لَا یَغْلِبَنَّکُمُ الْاَعْرَابُ عَلٰی اِسْمِ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَۃِ وَکَانُوْا یُسَمُّوْنَهَا الْعَتَمَةَ (اَوْ کَمَا قَالَ) مطلب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عشاء کے وقت کو عتمہ کہا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جہلاء عرب اس لفظ میں تم پر غلبہ نہ کرنے پائیں کہ تم بھی ان کی طرح عشا کو عتمہ کہنے لگو۔ اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ شریعت نے جن الفاظ میں اپنی کوئی خاص اصطلاح مقرر کی ہے مسلمانوں کو اسی کا استعمال کرنا چاہیئے اس کو چھوڑ کر کفار کی اصطلاح نہ برتنی چاہیئے ظاہر میں تو یہ معمولی بات ہے کہ بول چال میں اپنے اسلامی الفاظ بولے جائیں مگر اس کے چھوڑنے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر اس تعلیم کی قدر معلوم ہوتی ہے واقعی اگر سب مسلمان الفاظ کو معمولی چیز سمجھ کر دوسری زبان کے مہینے استعمال کرنے لگیں تو رمضان اور عید اور حج وغیرہ کا کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ یہ کب آئے تھے اور کب چلے گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایت الفاظ کی تعلیم فرما کر حقیقت میں محض الفاظ کو نہیں سنبھالا بلکہ دین کو سنبھالا ہے مگر آج کل لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں چنانچہ اسی کا اثر یہ ہے کہ وہ گنوار حکیم صاحب سے کہنے لگا کہ اب کے تو میرے باپ کو بچا ہی لو کیونکہ چاول بہت گراں ہیں اگر یہ مر گیا تو برادری کو تیجہ دسویں میں کھانا کھلانا پڑے گا جس کی مجھ میں ہمت نہیں اُس غریب کو باپ کے مرنے کا اس قدر فکر نہ تھا جس قدر کہ اس بات کا فکر تھا کہ اب کے مر گیا تو خرچ بہت ہوگا۔ یہ قصہ تو قصبہ کیرانہ کا ہے اور خود ہمارے قصبہ میں بھی ایک قصہ یہ ہوا کہ ایک دن کوئی بڑھیا عورت ہمارے گھر میں آ کر کہنے لگی کہ میں فلانی کے گھر گئی تھی اس کی ساس مر گئی ہے وہ بہت رو رہی تھی اور یوں کہتی تھی کہ مجھے اس کے کفن دفن کا تو زیادہ فکر نہیں مجھے تو زیادہ غم اس بات کا ہے کہ اس وقت گھر میں کچھ بھی نہیں ہے اور مرنے کی خبر سُن کر ساری برادری جمع ہو جاوے گی ان کے کھلانے پلانے کا سامان تو بھلا کس سے ہو مگر کہیں سے آٹھ آنہ پیدا ہو جاتے تو میں پان چھالیا منگا لیتی آنے والیوں کے سامنے پان ہی رکھے جاتے اور کفن تو ہو ہی رہے گا۔

اس کا انتظام تو برادری کے مرد خود کریں گے یہ سن کر میں نے اپنے گھر میں کہا کہ یہ کام تمہارے کرنے کا ہے کیونکہ وعظ کہاں تک اثر کرے گا تم اس رسم کو توڑو اور عورتوں کو سمجھاؤ کہ میت کے گھر جا کر کھانا پینا بہت بڑی بات ہے۔ ایک تو ان غریبوں پر موت کا صدمہ ہوا اور دوسرا صدمہ ان پر یہ ڈالا جاوے کہ وہ آنے والیوں کے کھانے پینے اور پان چھالیہ کا انتظام کریں بہت شرم کی بات ہے میرے گھر میں اس سے پہلے کسی شادی غمی میں نہیں جاتی تھیں کیونکہ اکثر جگہ منکرات ہوتے ہیں مگر میں نے اس ضرورت سے ان کو غمی کے مواقع میں جانے کی اجازت دے دی اور یہ کہا کہ دین کا کام ہے اس لئے تم کو شرکت کرنی چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا کرنا شروع کیا اور عورتوں کو میت کے گھر جا کر کھانے پینے حتیٰ کہ پان کھانے سے بھی روکا زیادہ اثر اس کا ہوا کہ انھوں نے خود اس پر عمل کیا کہ جس کے گھر گئیں اس کے یہاں پان تک نہ کھایا اول اول تو بہتوں نے ناک منہ چڑھایا کہ کیا ہم ایسے گرے پڑے اور مفلس غریب ہیں جو آنے والیوں کے پان چھالیہ کی بھی ہمیں مقدور نہ ہو لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں سب مستورات نے اس پر عمل شروع کر دیا اور اب کوئی میت کے گھر پر پان تک نہیں کھاتی مرد تو بعض دفعہ چوک بھی جاتے ہیں مگر عورتیں بالکل بچتی ہیں غرض رسوم کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان سے تفاخر کے سوا کچھ مقصود نہیں حتیٰ کہ موت کو بھی مایہ فخر بنا رکھا ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ شریعت میں اعمال کا اعتبار نیت پر ہے جب ان میں لوگوں کی یہ نیتیں ہیں تو بتلایئے ان کو کس طرح جائز کہا جاوے میں نے بعض شہروں میں دیکھا ہے کہ میت کے اوپر دوشالہ ڈالتے ہیں مگر وہ غریبوں کو نہیں دیا جاتا بلکہ تھوڑی دیر کے بعد اتار کر گھر میں دھر لیا جاتا ہے اور رمز یہ کہ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مردہ کی ہر چیز منحوس ہو جاتی ہے مگر ہمارا نفس بڑا شریر ہے کہ اپنا نفع کہیں نہیں چھوڑتا چنانچہ گاڑھے اور لٹھے کے کپڑے تو منحوس ہو جاتے ہیں مگر دوشالہ اور روپیہ اور مردہ کا گھر اور جائداد وغیرہ

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

قیمتی اشیا منحوس نہیں ہوتیں وہ تو ایسا مبارک ہے کہ بے مانگے نہ ملے تو اس کا غصب بھی عوام کے نزدیک جائز ہے چنانچہ میت کے روپے میں اکثر غبن ہوتا ہے جس کے جو ہاتھ لگا دبا لیا دوسروں کو پتہ ہی نہیں دیتے علی ہذا مکان اور جائداد میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اکیلا میں ہی سب کا مالک بن بیٹھوں کاش اگر یہ گانوں بھی منحوس ہو جاتے تو آج ہمیں ترکوں کے چندے ہی میں مل جاتے مگر نفس بڑا عقلمند ہے یہ انہی چیزوں کو منحوس بتاتا ہے جو گھٹیا قیمت کی ہوں (اگر کسی عورت نے اطلس وکمخواب کے کپڑے چھوڑے ہوں تو انہیں کوئی منحوس نہیں سمجھتا گو وہ اس کے ایک دو دفعہ استعمال کئے ہوئے بھی ہوں ۱۲) غرض مردہ پر دوشالہ ڈالنا محض تفاخر کے لئے ہوتا ہے تو کیا ٹھکانا ہے ہماری غفلت کا کہ ہم نے موت کو بھی مایۂ فخر بنا لیا ہے (سچ ہے ؎

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

میت تو بیچارہ جان سے گیا اور آپ کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا کہ اس وقت بھی دل کے حوصلے نکالے جاتے اور فخر و نمود کے سامان کئے جاتے ہیں ۱۲) حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند خصوصاً میت کے لئے سفید کپڑا تھا مگر ہم لوگ خلاف سنت رنگ برنگ کے دوشالے ڈالتے ہیں جو محض فخر کے لئے ڈالے جاتے ہیں غریبوں کے دینے کو نہیں ڈالتے اور اگر کسی نے غریبوں ہی کو دے دیا تو یہ دینا بھی فخر ہی کے لئے ہے تاکہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں شخص بڑا عالی حوصلہ ہے جس نے اپنے باپ کے اوپر پچاس روپیہ کا دوشالہ ڈالا تھا اور اتار کر اللہ واسطے دے دیا بلکہ غور کر کے دیکھا جائے تو سفید کپڑا بھی جو کفن کے علاوہ مردہ کے اوپر ڈالا جاتا ہے وہ بھی فخر ہی کے لئے ہوتا ہے کیونکہ اوپر کی چادر کفن سے خارج ہے بس کفن تو اسی قدر ہے جس میں مردہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ یہ زائد چادر کفن میں داخل نہیں (اس کا منشا کہیں تو اکرام میت ہے اور اکثر محض فخر ہے ۱۲)

اور یہاں سے یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ اکثر لوگ اس کی پروا نہیں کرتے کہ اوپر کا چادرہ ترکہ میں سے نہ ہو حالانکہ یہ بہت ضروری بات ہے مگر عام دستور یہ ہے کہ چادرہ

بھی ترکہ ہی میں سے منگائی جاتی ہے کیونکہ یہ بات ٹھہری ہوئی ہے کہ تجہیز و تکفین کا خرچ ترکہ میں سب سے مقدم ہے یہ مقدمہ تو صحیح ہے مگر غلطی یہ ہے کہ اوپر کے کپڑے کو کفن میں داخل سمجھ کر اس کو بھی سب سے مقدم کرتے ہیں حالانکہ وہ کفن میں داخل نہیں اور اس کی قیمت ترکہ سے دینا بدون تمام وارثوں کی اجازت کے حلال نہیں اور زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ ورثہ متعدد ہوتے ہیں اور سب سے اس کی اجازت نہیں لی جاتی اور جو ایک دو سے لے لی بھی تو بعض کی اجازت معتبر نہیں سب کی اجازت ہونی چاہیئے بشرط بلوغ ۔ اس لئے اول تو اس چادرہ کی مرد کے لئے ضرورت ہی نہیں اور اگر کسی کا ایسا ہی دل چاہے تو اس کی قیمت اپنے پاس سے دینا چاہیئے ترکہ میں سے نہ دینا چاہیئے ۱۲

ترکہ کے مال میں لوگ بالکل احتیاط نہیں کرتے جو لوگ میت کے گھر جاتے ہیں وہ بے تکلف اس کی چیزیں استعمال کرتے رہتے ہیں حالانکہ مرنے کے بعد فوراً وہ تمام چیزیں میت کی ملکیت سے نکل کر ورثہ کی ملک میں داخل ہو گئی ہیں اب ان کا استعمال بدون تمام ورثہ کی اجازت کے جائز نہیں ۔ اہلِ تقوٰی نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ ایک بزرگ رات کے وقت اپنے دوست کی عیادت کو گئے اور ان کے سامنے اس کا انتقال ہو گیا تو آپ نے فوراً چراغ گل کر دیا اور ایک شخص کو اپنے پاس سے پیسے دیئے کہ بازار سے تیل لے آؤ کیونکہ اس چراغ کا تیل میت کے مرتے ہی ورثہ کی ملک ہو گیا ہے جن میں بعض حاضر اور بعض غائب ہیں (اور ممکن ہے کوئی نابالغ بھی ہو) اس سے انتفاع اب درست نہیں، حضرت یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہو گی مگر تعجب کا منشا یہ ہے کہ آپ کو ان امور کا اہتمام نہیں اگر آپ کو بھی حلال حرام کا خیال ہو جائے تو پھر آپ کا بھی یہی معمول ہو گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ اُن سے ملنے کو آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو اندر بلا لیا اور اُن کے آتے ہی چراغ گل کر دیا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کہ میرے آتے ہی آپ نے چراغ کیوں گل کر دیا فرمایا کہ اس میں بیت المال کا تیل ہے اور میں اس وقت بیت المال ہی کا کام کر رہا تھا اب چونکہ ہم اور آپ باتیں کریں گے اور یہ کام بیت المال کا نہیں ہے اس لئے اس تیل سے

بات چیت میں انتفاع نہیں کرسکتے حضرت آپ کو اس پر بھی تعجب ہوگا مگر اس کی وجہ وہی ہے کہ آپ کو شریعت کے اصول وقواعد معلوم نہیں اور جو معلوم بھی ہیں تو ان پر عمل کا اہتمام نہیں ہے، شاید یہاں کسی کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ اتنی احتیاط کس سے ہوسکتی ہے یہ تو قدرت سے باہر ہے تو سن لیجئے کہ قدرت سے باہر تو نہیں ہاں دشوار ضرور ہے مگر دشواری اسی وقت تک ہے جب تک آپ نے ہمت نہیں کی ذرا ہمت کرکے عمل شروع کیجئے ان شاء اللہ قدم قدم پر غیب سے اعانت ہوگی چنانچہ میں اپنا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ ہمت وارادہ کے بعد حق تعالیٰ کیسی امداد فرماتے ہیں۔

بارہ اکبر پور ایک مقام ہے اس کے قریب ایک چھوٹا سا اسٹیشن لالپور ہے ایک دفعہ میں بارہ سے وہاں پہونچا اور بارش کے سبب وقت سے بہت پہلے پہنچا اتفاق سے جس وقت میں پہونچا بارش ہونے لگی اور اسٹیشن کا سائبان بوچھار سے نہ بچا سکتا تھا۔ اکبر پور میں ایک منصف صاحب میرے جاننے والے تھے ان کو اطلاع ہوگئی تو انہوں نے اسٹیشن ماسٹر کو لکھدیا کہ یہ ہمارے دوست ہیں ان کی راحت کا کافی انتظام کیا جائے۔ اس غریب نے ہمارے واسطے ایک بڑا کمرہ کھلوادیا شام ہوئی تو چوکیدار سے کہا کہ کمرہ میں روشنی کردو اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ غالباً اس وقت ہمارے واسطے سرکاری تیل جلا کر روشنی کی جاوے گی جو شرعاً جائز نہیں کیونکہ سرکاری تیل سرکاری کاموں کے واسطے دیا جاتا ہے نہ کہ بخ کے طور پر مسافروں کی خاطر رات بھر جلانے کے واسطے اب اگر اسٹیشن ماسٹر مسلمان ہوتا تو میں بے تکلف اس سے کہدیتا کہ ہمارے واسطے سرکاری تیل کا جلانا جائز نہیں مگر وہ ہندو تھا میں نے سوچا کہ اس کے سامنے شرعی مسئلہ بیان کردوں تو یہ کیا سمجھے گا بلکہ عجب نہیں کہ تمسخر کرنے لگے غرض جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو میں نے خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ اس وقت آپ ہی مجھ کو گناہ سے بچائیے میری کوشش تو بیکار ہے۔ میں دل دل ہی میں دعا ہی کررہا تھا کہ دفعۃً اسٹیشن ماسٹر نے ملازم سے کہا کہ دیکھو سرکاری تیل نہ جلانا ہماری ذاتی لالٹین

رکھ دینا۔ اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگر انسان ہمت وارادہ کرے تو خدا تعالیٰ مدد کرتے ہیں اس لئے آپ گھبرائیں نہیں بلکہ ہمت سے کام لینا چاہئے۔ دنیا کے کاموں میں تو آپ کبھی ہمت نہیں ہارتے بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل کام شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ (میرا کام کوشش کرنا ہے پورا کرنا اللہ کا کام ہے) چنانچہ اس نیت کی برکت سے کامیاب بھی ہوتے ہیں مگر دین کے کاموں میں ہمت نہیں کرتے۔ صاحبو! ہمت وہ چیز ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو اس مکان کے ساتوں دروازوں پر قفل ڈال رکھے تھے جب حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کا ارادہ معلوم کیا اور وہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہا تو یہ دیکھ کر سخت گھبرائے کہ میرے سامنے سات دروازے ہیں اور ہر ایک پر مضبوط قفل لگا ہوا ہے اب دیکھئے اس وقت ہماری ہمت کہاں تک بڑھ سکتی تھی اگر ہم ہوتے تو بھاگنے کا کبھی خیال ہی نہ کر سکتے مگر نبی کی ہمت ہمت ہی ہے یوسف علیہ السلام نے یہ سوچا کہ مجھے قفل تک تو بھاگنا چاہئے اس کے بعد جو چاہے سو ہو مجھے اپنی ہمت کے موافق کام کرنا چاہیئے آگے خدا کا کام ہے چنانچہ وہ زلیخا کے پاس سے بھاگے اور زلیخا ان کے پیچھے پیچھے پکڑنے کو دوڑی پھر اس ہمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے امداد فرمائی اور جس دروازہ پر یوسف علیہ السلام پہونچتے تھے اس کا قفل خود بخود گر جاتا اور کواڑ چوپٹ کھلتے جاتے تھے۔ لوگ یوسف علیہ السلام کے اس فعل کو (ابتداً میں) خلاف عقل کہتے ہوں گے کہ بھلا جب دروازے مقفل تھے اور کنجی اپنے پاس نہ تھی تو بھاگنا فضول حرکت تھی اس وقت بھاگنے سے کہیں دروازے کھل سکتے تھے مگر صاحبو! ؎

عقل در اسباب می دارد نظر
عشق میگوید مسبب را نگر

(عقل اسباب کو دیکھتی ہے عشق مسبب کی طرف دیکھتا ہے)

عارف کی نظر اسباب پر نہیں ہوتی وہ مسبب الاسباب کو دیکھتا ہے اور اس پر بھروسہ کر کے وہ کام شروع کر دیتا ہے جو بظاہر قدرت سے باہر ہوتا ہے مگر حق تعالےٰ کی امداد سے ان کو کامیابی ہوتی ہے ہماری اور اہلِ عرفان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گنوار نے کبھی یہ دیکھا تھا کہ لال جھنڈی کے ہلنے سے ریل رُک گئی تھی وہ یہ سمجھا کہ اس لال جھنڈی میں کچھ خاصیت ہے اس نے ڈریور کو نہیں دیکھا مگر اس وقت ایک عاقل بھی کھڑا تھا اس نے لال جھنڈی کے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ اس میں تو ریل کے روکنے کی طاقت نہیں اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ جھنڈی دکھائی کس کو گئی ہے۔ چنانچہ ڈریور پر اس کی نظر پہنچی اور اس نے تاڑ لیا کہ لال جھنڈی کو دیکھ کر یہ شخص ریل کو روک دیتا ہے اب وہ اس گنوار سے کہتا ہے کہ لال جھنڈی ریل کو نہیں روکتی بلکہ اس کو دیکھ کر ڈریور روک دیتا ہے تو وہ اس کو خلاف عقل سمجھے گا اور یہ کہے گا کہ اگر ڈریور روکتا تو ہم کو بھی تو نظر آتا اس سے معلوم ہوتا ہے جھنڈی ہی روکنے والی ہے یہی حالت ہماری ہے کہ ہم نے آگ سے بہت سی چیز، دل کو جلتے ہوئے دیکھا ہے پانی سے ٹھنڈک پہنچنے کا احساس کیا تو بس انہی کو فاعل سمجھنے لگے مگر عارف کی نظر مسبب پر ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ ان اسباب کے اختیار کرنے پر جب حق تعالےٰ کا حکم بھی ہوتا ہے اس وقت اثر ہوتا ہے ورنہ کچھ نہیں ہوتا اس لئے وہ خدا تعالےٰ کو فاعل سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ آب و آتش میں کچھ نہیں رکھا بلکہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے مگر ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں　　　یار بیروں فتنہ او در جہاں

(یار تو جہاں سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہاں کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا)

وہ نظر نہیں آتے اس لئے تم نے ظاہری اسباب کو مؤثر سمجھ لیا ہے (اور گو آنکھوں سے تو عارف کو بھی نظر نہیں آتے مگر وہ دل کی نگاہ سے ان کو دیکھتا ہے) بس ہمارا یہ کہنا کہ بدون کنجی کے خود بخود قفل نہیں کھل سکتا ایسا ہی ہے جیسے وہ گنوار کہتا تھا کہ بدون لال جھنڈی کے ریل کبھی نہیں رُک سکتی مگر یہاں ہر شخص اس کو بیوقوف بناتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ روکنے والا تو

ڈر لیور ہے وہ بدون جھنڈی کے بھی رک سکتا ہے اسی طرح عارفین اس بات میں ہم کو بیوقوف کہتے ہیں کہ قفل خود بخود نہیں کھل سکتا وہ فرماتے ہیں کہ کنجی کے بعد بھی کھولنے والے حق تعالیٰ ہی ہیں وہ اگر چاہیں تو بدون کنجی کے بھی کھول سکتے ہیں اسی خیال سے یوسف علیہ السلام قفل کی طرف دوڑے گو آپ اس کو خلاف عقل کہیں مگر ان کی نظر خدا پر تھی وہ جانتے تھے کہ لوہے کی نرمی اور آگ کی گرمی سب خدا کے اختیار میں ہے اگر وہ چاہیں تو آگ سے بھی لوہے کو نرم نہ کریں اور اگر چاہیں تو بدون آگ کے نرم کر دیں باقی یہ اس کا فضل ہے کہ اس نے ایک خاصیت کو معتاد غالب کر دیا ہے کہ لوہے میں سختی غالب ہے اور آگ میں گرمی غالب ہے۔ چنانچہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ بدون آگ پر گرم کئے لوہا نرم نہیں ہوتا تاکہ آپ دنیا کے کام کر سکیں اگر ہمیشہ خود بخود لوہا نرم ہو جایا کرتا تو سارے اوزار اور تمام تالے بیکار ہو جاتے مگر اس سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا اگر حق تعالیٰ چاہیں تو اس کے خلاف بھی کر سکتے ہیں مگر وہ ایسا کبھی کبھی کیا کرتے ہیں ہمیشہ نہیں کرتے اس لئے خرقِ عادت کو معجزہ کہا جاتا ہے اور اسی واسطے یوسف علیہ السلام کے دوڑنے سے تالوں کا گر جانا ان کا معجزہ شمار کیا جاتا ہے اور اگر کسی مسلمان کے لئے ایسا واقعہ ہو جائے تو اس کو کرامت کہا جائیگا جب حق تعالےٰ اسباب کے خلاف بھی کام کر سکتے ہیں تو پھر آپ ہمت کیوں ہارتے ہیں جو کام آپ کو مشکل نظر آتا ہے وہ خدا کو تو مشکل نہیں آپ خدا پر نظر کر کے کام شروع کیجئے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید

خیرہ یوسف وار می باید دوید

یعنی گو اس جہان میں خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا مگر تم (یوسف علیہ السلام کی طرح) دوڑ دو تو سہی ان شاء اللہ تمہارے دوڑتے ہی رستہ نکل آئے گا جیسے یوسف علیہ السلام کے دوڑنے سے پہلے راستہ بند تھا اور ان کے دوڑتے ہی فوراً رستہ کھل گیا اور اگر بالفرض تمہاری کوشش کے بعد بھی رستہ نہ ملا تو تم پر ملامت تو نہ ہوگی یہ نفع کیا کچھ کم ہے کہ تم الزام سے سبکدوش ہو جاؤ گے باقی کام شروع کرنے سے پہلے ہی باتیں

بنانا اور یہ کہنا کہ یہ تو بڑا مشکل ہے کیونکر کریں یہ سب کم ہمتی کے بہانے ہیں مجھے اس مقام پر ایک حکایت خوب یاد آئی جب حضرت شاہ غلام رسول صاحب کانپوری اپنے شیخ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوتے تو انھوں نے استخارہ کے لئے فرمایا تھوڑی دیر مسجد میں بیٹھ کر پھر حاضر ہو گئے پوچھا استخارہ کر لیا کہا جی ہاں کر لیا فرمایا تم تو بہت جلدی آگئے تم نے کیونکر استخارہ کیا تھا۔ عرض کیا حضرت میں نے اپنے نفس سے کہا تھا کہ تو جو بیعت ہوتا ہے یہ غلامی ہے تو خوامخواہ آزادی کو چھوڑ کر غلامی کی قید میں کیوں پھنستا ہے میرے نفس نے جواب دیا کہ اس قید سے مجھے خدا مل جائے گا۔ میں نے کہا تیرا کیا اجارہ کہ تجھے خدا مل ہی جائے گا۔ اگر نہ ملا تو اس نے جواب دیا کہ اگر خدا نہ بھی ملا تو ان کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے مجھ کو طلب کیا تھا بس مجھے یہی کافی ہے ؎

ہمینم بس اگر کاسد قماشم — کہ من نیز از خریداران یاشم
ہمینم بس کہ داند ماہرویم — کہ من نیز از خریداران اویم

(مجھ کو یہی کافی ہے اگرچہ میرے پاس کھوٹی پونجی ہے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں یہی مجھ کو کافی ہے کہ میرے محبوب کو علم ہو جائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں سے ہوں)

سبحان اللہ ! یہ وہ مقصود ہے جس میں وسوسہ کا احتمال ہی نہیں کیونکہ حق تعالٰے کو طلب کی اطلاع تو یقیناً ہوتی ہے اس میں کچھ شبہہ ہی نہیں ہو سکتا اور یہی مقصود ہے تو اب شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا کوئی رستہ نہیں مل سکتا پس ہم کو بھی ذکر و طاعات سے اسی ثمرہ کا قصد کرنا چاہیئے کہ حق تعالٰے کو ہماری طلب کی خبر ہو جاوے اب آگے ملنے نہ ملنے کا انہیں اختیار ہے۔ خوب فرماتے ہیں ؎

کار خود کن کار بیگانہ مکن

(اپنا کام کرو دوسرے کے کام کی فکر میں نہ پڑو)

تم اپنا کام کرو یعنی طلب ظاہر کرو آگے وصال وعدم وصال یہ خدا کا کام ہے تم اس کے پیچھے نہ پڑو۔ شیخ نے یہ عجیب استخارہ سن کر فرمایا کہ بھائی تمہارا استخارہ سب سے بڑھا ہوا ہے

آؤ بیعت ہو جاؤ (واقعی جس کو طلب ہوتی ہے اسے حق تعالیٰ خود ہی پڑھا دیتے ہیں ۱۲) مجھے اس استخارہ پر ایک اور حکایت یاد آئی۔ ہمارے اطراف میں ایک بزرگ تھے مولانا مظفر حسین صاحب ورع اور تقوے میں بے مثل تھے ان کے سامنے ایک صاحب باطل نے اہل حق کی جماعت پر ایک خاص مقصود کے متعلق کوشش کرنے پر جس میں ناکامی ہوئی تھی اعتراض کیا کہ آپ لوگوں کو بھلا کیا ملا۔ مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کچھ نہیں ملا مگر ؎

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

خلاصہ یہ کہ مقصود کے لئے ہمت اور سعی کو صرف کر دینا ہی بڑی کامیابی ہے تو میں کہتا ہوں کہ جو احکام آپ کو دشوار معلوم ہوتے ہیں ان کے بجا لانے میں آپ کو ہمت تو کرنا چاہیئے اگر اس کے بعد بھی آپ کامیاب نہ ہوں تو آپ پر ملامت نہ ہوگی۔ صاحبو! دنیا کے کاموں میں آپ کا یہی طرز عمل ہے کہ ہمت وسعی کا صرف کر دینا ہی بڑی کامیابی شمار ہوتی ہے دیکھئے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا کوئی عزیز بیمار ہوا اور طبیب کے کہنے سے اس کی صحت سے مایوسی ہو گئی لیکن باوجود اس مایوسی کے کیا آپ نے کبھی علاج معالجہ کو ترک کیا ہے کبھی نہیں گو بعضے بخیل ایسے بھی ہیں چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک شخص بیمار رہوئے اُن کے سالے صاحب ان کے مال پر قابض ہونے والے تھے اس لئے ان کا معالجہ نہ کرتے تھے کہ ان کا جلدی خاتمہ ہو تو ہم رئیس بنیں۔

مگر ایسی نظیریں بہت کم ہیں اور جو ایسے ہیں بھی ان کی سب بُرا بھلا بھی کہتے ہیں عام دستور یہی ہے کہ باوجود مایوسی کے بھی سعی کو موقوف نہیں کیا جاتا آپ خود غور کریں کہ ایسے وقت طبیعت نے یہ کبھی گوارا نہ کیا ہوگا کہ کچھ نہ کرو بلکہ جی میں یہ آیا ہوگا کہ علاج معالجہ سے اس کے تندرست ہونے کی امید نہیں مگر کچھ نہ کرنے سے بعد میں ارمان آئے گا کہ شاید ہم ایسا کرتے تو اچھا ہو ہی جاتا اور علاج میں پوری سعی کرنے کے بعد کچھ ارمان نہ رہے گا تو جب دوسروں کے لئے باوجود مقصود سے مایوسی کے

آپ محض اس لئے سعی کرتے ہیں کہ دل میں ارمان نہ رہے تو کیا اپنے واسطے آپ کو اتنا بھی نہ کرنا چاہیئے تو چلئے میں آپ کے کہنے کو تسلیم کئے لیتا ہوں کہ بعض احکام پر عمل میں کامیابی نہیں ہوسکتی مگر آپ محض ارمان نکالنے کے واسطے ہی ان پر عمل کرنے کی ہمت کر لیجیے ان شاء اللہ ہمت کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ سب باتیں آسان ہیں کیونکہ اس وقت آپ کو خدا تعالیٰ کی امداد کھلی آنکھوں نظر آئے گی وہ قدم قدم پر آپ کا ساتھ دیں گے۔ اسی پر مجھے اپنا وہ قصہ یاد آیا تھا کہ اس وقت جو مجھ میں ہمت کا ایک چھوٹا سا شعبہ پیدا ہوا کہ میرے دل میں یہ اضطراب ہوا کہ اس وقت میرے واسطے ایک امر خلاف شریعت کیا جائے گا اور بابو ہندو ہے اس سے شرعی مسئلہ بیان کرنا بیکار ہے اس لئے میں نے حق تعالیٰ سے دعا کی اس ہمت کا یہ اثر ہوا کہ حق تعالےٰ نے فوراً امداد فرمائی اور اس ہندو کے منہ سے یہ بات نکلوادی کہ سرکاری تیل نہ جلانا۔ تو صاحبو! کوئی عمل کر کے تو دیکھو اور یہ قصہ میں نے اس پر کہا تھا کہ شاید لوگوں کو ان بزرگ کے واقعہ پر جنھوں نے اپنے دوست کے مرتے ہی چراغ گل کر دیا تھا یہ خیال ہوا ہو کہ ایسا تقویٰ کس سے ہوسکتا ہے یہ تو بہت مشکل ہے میں نے اس کا جواب دیا تھا کہ یہ مشکل عمل سے پہلے ہی ہے عمل کے بعد سب آسان ہو جاتا ہے ؎

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گلدستہ گردد

(جس کام کے لئے ہمت باندھ لی جائے اگر کانٹا بھی ہو گلدستہ ہو جائے گا)

غرض اموال میت میں سلف نے بڑی احتیاط کی ہے جب ایک پیسہ کے تیل میں اتنی احتیاط کی گئی تو یہ چادر کفن کے اوپر ڈالنا اور وہ بھی رسم کے طور پر ڈالنا ترکہ میں سے کیونکر جائز ہوگی (بس یا تو ان کو موقوف کر دیا سب ورثہ سے اجازت لے کر ڈالو بشرطیکہ ان میں کوئی نابالغ نہ ہو یا اپنے پاس سے ڈالو ۱۲) اور یہی حکم جنازہ کی جانماز کا ہے کہ وہ بھی کفن سے خارج ہے وہ بھی ترکہ میں سے نہ ہونی چاہیئے۔ ان رسوم کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ان سے اموال میت میں بہت بے احتیاطی ہو جاتی ہے

جس کا گناہ بہت سخت ہے اور تفاخر کا گناہ الگ رہا جو ان سب کا منشا ہے۔ایک برا نتیجہ ان کا یہ بھی ہوا جو قوم کو بھگتنا پڑا کہ جن لوگوں کو یہ کفن کی چادر اور جا نماز دی جاتی ہے اور جن کو تیجہ دسویں کا کھانا کھلایا جاتا ہے ان کی ہمت پست ہو گئی اور ان میں ذلت اور دنائت پیدا ہو گئی یعنی ان کا یہی پیشہ ہو گیا کہ وہ دن رات اسی خیال میں رہتے ہیں کہ دیکھئے آج کون مرتا ہے جو ہمیں کھانا کپڑا ملے۔ ان رسوم کا قدم نامبارک دنا مسعود ایسا آیا جس نے دینے والوں کا بھی بیڑا غرق کر دیا اور لینے والوں کو بھی تباہ کر دیا۔ دینے والوں کا ضرر تو اوپر معلوم ہو چکا، لینے والوں کا یہ ضرر ہوا کہ وہ بالکل کم حوصلہ پست ہمت ہو گئے۔ اب یہ لوگ بجائے اس کے کہ کسی کے اچھے ہونے سے خوش ہوں مرنے سے خوش ہوتے ہیں۔ جیسے ایک طبیب نے مجھ سے دعا کی درخواست کی تھی کہ دعا کر دیجئے میرا کام چل جائے۔ میں نے کہا بھائی تمہارے کام چلنے کی دعا کروں تو مخلوق کے واسطے بددعا کروں کہ لوگ خوب بیمار ہوں تاکہ تمہاری پوچھ ہو وہ کہنے لگے کہ بیماروں سے تو دنیا کبھی خالی نہیں رہتی میرا کام چلنے کے لئے وبا پھیلنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ دعا کر دیجئے کہ لوگوں کو میری طرف توجہ ہو جائے۔میں نے کہا بہت اچھا دعا کروں گا۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا مگر میں کہتا ہوں کہ جن کا یہی پیشہ ہے مردہ کی چادر لینا جانماز لینا تیجہ دسویں کی دعوت کھانا ان کی تو یہ حالت ہے کہ جب کوئی مؤذن سے کہتا ہے کہ میاں جی فلانا بیمار ہے اس کے اچھے ہونے کی نمازیوں سے دعا کرانا تو وہ ظاہر میں تو کہہ دیتا ہے کہ ہاں دعا کراؤں گا مگر دل میں خدا جانے کیا کہتا ہوگا۔

ہمارے یہاں ایک قوم چارج ہے وہ ہندؤں کے مردے اٹھایا کرتے ہیں ایک دفعہ طاعون کے زمانہ میں ہمارے ایک ملازم ملے اس قوم کے ایک آدمی سے پوچھا کہو جی آجکل کیا حالت ہے، کہا خوب موج آ رہی ہے۔ دنیا تو تباہ ہو رہی تھی مگر اس کمبخت کے یہاں موج آ رہی تھی۔ اسی قوم کے ایک شخص کا قصہ ہے اس سے کسی نے اپنا قرض مانگا اس نے وعدہ کیا کہ پرسوں کو ادا کر دوں گا۔اس نے پوچھا کہ پرسوں کو

تیرے پاس روپیہ کہاں سے آجائے گا تو کہنے لگا کہ فلانا مہاجن سخت بیمار ہے، بس آج ہی کل کا مہمان ہے پرسوں تک تو ضرور مر جائے گا اس وقت میری آمدنی ہو گی تجھے لاکر روپیہ دیدوں گا تو بھلا ایسا شخص جو کسی کے مرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہو وہ اس کے اچھے ہونے کی کیا خاک دعا کرے گا۔ مردوں کا مال کھا کھا کر ان لوگوں کی طبیعتیں بے حس اور لالچی ہو گئی ہیں۔
اسی لئے تو مولویوں کو یہ مسجد کے موذن وغیرہ بُرا بھلا کہتے ہیں کیونکہ مولوی رسموں سے منع کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ہماری روزی ماردی حالانکہ مولوی دینے دلانے اور ثواب پہنچانے سے نہیں روکتے بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ایصال ثواب کے لئے جمعرات کی تخصیص نہ کرو بلکہ بدھ کو بھی دو اور تیجہ دسویں کی تخصیص نہ کرو بلکہ جب ہمت ہو کھلادو۔ (اب یہ لوگوں کا قصور ہے کہ انہوں نے تخصیص کا چھوڑ کر ایصال ثواب ہی کو بند کر دیا)
ان لوگوں کی یہاں تک نیت بگڑ جاتی ہے کہ کیرانہ کا قصہ ہے کہ وہاں ایک مردہ کی چادر تکیہ دار کے سوا کسی دوسرے کو دینے لگے تکیہ دار نے کہا یہ تو میرا حق ہے لوگوں نے کہا ہاں بھائی حق تو تمہارا ہی ہے مگر اب کے تم ان کو لینے دو تم تو ہمیشہ ہی لیتے ہو تو وہ بے ساختہ کہتا ہے کہ واہ جی خدا خدا کرکے تو یہ دن آتا ہے اسی میں دوسرے کو میں اپنا حق دیدوں لوگوں نے اس کو بُرا بھلا کہا کہ کمبخت تو اس دن کی تمنا میں رہتا ہے کہ کوئی مرے تو مجھے چادرہ ملے وہ عذر و معذرت کرنے لگا مگر جو بات دل میں تھی وہ بے ساختہ اُس کے مُنہ سے نکل ہی گئی میں کہتا ہوں کہ اس میں اُس کی خطا نہیں بلکہ خطا ان کی ہے جنہوں نے اسکو حریص بنایا لوگوں کو چاہیئے کہ اماموں اور موذنوں کی معقول تنخواہیں مقرر کیا کریں اور ان کو عزت کے ساتھ رکھا کریں تاکہ مُردوں کے کپڑے کھانے کا ان کو انتظار نہ رہے (بلکہ مردوں کے ثواب کا کھانا کپڑا کسی خاص جماعت کے لیے مخصوص نہ کرنا چاہیئے بس کیفما اتفق جو غریب سامنے آجائے اس کو دیدیا جائے۔ اس طرح کسی کو اس موقعہ کا انتظار نہ ہوگا۔
افسوس یہ ہے کہ عوام نے علماء کو بھی ملّانوں میں داخل کر لیا ہے اور وہ ان کو بھی مسجدوں کے ملّانوں کی طرح پست ہمت اور لالچی حریص سمجھتے ہیں۔ صاحبو! واللہ آپ نے علماء کو دیکھا نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کو دین کی ضرورت نہیں رہی اور ان کو آپ کی دنیا کی ضرورت نہیں ہے

پھر ملاقات کیسے ہو ۔ بس آپ نے مسجدوں کے ملاتوں کو دیکھ لیا ہے چند سیاح واعظوں کو دیکھ لیا ہے جن کو اپنی روٹیوں سے کام ہے اور آپ نے انہی کو علماء سمجھ لیا حقیقی علماء کو انہی پر قیاس کر لیا ۔ یاد رکھو جو سچ مچ عالم ہے وہ تمہارے در پر روٹیوں کے واسطے کبھی نہ آئے گا (اور ویسے بھی کسی کام کے لئے بے بلائے نہ آئے گا ہاں محض اصلاح اور تبلیغ کے لئے بے بلائے آ سکتا ہے مگر اس صورت میں وہ آپ سے روٹی نہ مانگے گا)[۱]

دیکھئے میں ایک موٹی سی بات کہتا ہوں کہ علم ایک کمال ہے اور ہر کمال کا خاصہ ہے کہ اس سے غیرت و استغناء کی شان پیدا ہوتی ہے چنانچہ بڑھئی اور معمار کو ایک ادنیٰ سا کمال حاصل ہے گو ان کا کمال خسیس درجہ میں ہے لیکن وہ بھی کچھ غیرت اور استغناء رکھتے ہیں وہ کبھی خیرات کا مال نہ لیں گے نہ مُردوں کی چادرہ اور جانماز پر نظر کریں گے اُن کی غیرت ہرگز اس کو گوارا نہ کرے گی تو کیوں صاحب کیا علمی کمال میں جو سب سے اعلیٰ کمال ہے کچھ غیرت نہ ہوگی ضرور ہوگی بلکہ تمام اہلِ کمال سے زیادہ ہوگی یہ ایک ایسی موٹی بات ہے جس کو ادنیٰ سمجھ والا بھی سمجھ سکتا ہے بس خوب سمجھ لو کہ علمی کمال جس میں ہوگا وہ ایسے ذلیل کام کبھی نہ کرے گا اس کی تو یہ حالت ہوگی کہ اگر وہ صاحب احتیاج بھی ہو تب بھی سوال پر اپنی غیرت و عزت کو ترجیح دے گا اور ہرگز کسی سے اپنی احتیاج ظاہر نہ کرے گا ۔

اہلِ کمال فقر و فاقہ کی حالت میں بھی مستغنی رہا کرتے ہیں ۔

چنانچہ ایران کا ایک شاہزادہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو کر ہندوستان میں آگیا ۔ اتفاق سے لکھنؤ میں وارد ہوا وہاں اتفاق سے علاقہ پنجاب کے ایک نواب بھی وارد تھے ۔ شاہزادہ نے ان کی دعوت کی اُنہوں نے مکافات کی نیت سے کہا کہ آپ بھی کبھی میری ریاست میں ضرور آویں اتفاق سے ان اطراف میں بھی اُس کا جانا ہو گیا مگر ایسی حالت میں کہ کچھ نہ رہا تھا وہ دعوت یاد آئی اور اسی ریاست کی طرف رُخ کیا اور باحال خستہ ایک ٹٹو پر سوار وہاں پہنچا نواب صاحب نے شاہزادہ کو

اس حال سے آتا ہوا دیکھ کر براہ تاسف یہ شعر پڑھا ؎

آنکہ شیراں راکند روبہ مزاج

احتیاج ست احتیاج است احتیاج

(جو چیز شیروں کو لومڑی مزاج بنادیتی ہے وہ احتیاج ہے)

شاہزادہ آگ بگولہ ہوگیا اور فی البدیہہ جواب دیا ؎

شیر نر کے میشود روبہ مزاج

می زند بر کفش خود صد احتیاج

(بہادر شیر کب لومڑی مزاج ہوسکتا ہے سیکڑوں احتیاج کو اپنے جوتے پر مارتا ہے)

اور فوراً لوٹ گیا۔ رئیس نے ہرچند معذرت کی مگر ہرگز نہ ٹھہرا اور کہا تم اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارے یہاں آئے۔ تو حضرت غیرت وہ چیز ہے کہ شریف آدمی مرنا گوارا کرتا ہے مگر احتیاج کسی کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ اس شاہزادہ میں صرف شرافت خاندانی کا کمال تھا اس کا یہ اثر تھا کہ اس میں اس درجہ غیرت تھی، تو جن میں علمی کمال ہوگا ان کی غیرت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ کس درجہ ہوگی۔ پس علماء کو ملانوں کے عموم میں داخل کرنا زیبا نہیں۔ ہاں جن کا یہ پیشہ ہے وہ البتہ اس کے مصداق ہیں مگر میں ان کی طرف سے بھی کہتا ہوں کہ ان کی زیادہ خطا نہیں ہے بلکہ قوم کی بھی اس میں کچھ خطا ہے مثلاً دیکھئے امام کا اصل رتبہ کیا ہے وہ حقیقت میں سب نمازیوں کی طرف سے باری تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض معروض کرنے کے لئے نائب ہے سو چاہئے تھا کہ اس کام کے لئے ایسے شخص کو تجویز کیا جاتا جو علم وفضل و عزت میں سب سے بڑھا ہوا ہوتا اور اس کی تعظیم و تکریم سب سے زیادہ کرتے اور اس کی خدمت ایسی معقول کرتے جس سے وہ بے فکری کے ساتھ گذر کرلیتا مگر اب اس خدمت کے لئے اس شخص کو تجویز کیا جاتا ہے جو اندھا ہو اپاہج ہو اور تنخواہ اتنی دی جاتی ہے کہ جس میں ایک آدمی کا بھی گذر نہ ہوسکے اور کام اتنا لیا جاتا ہے کہ امام صاحب کے ذمہ امامت کے علاوہ یہ کام بھی ہے کہ مسجد کی ہر چیز کی حفاظت کریں، صفائی کریں، روشنی کریں اور جو کوئی

مرجاوے تو تین رات تک اس کی قبر پر سویا کریں اور دن میں قرآن پڑھ کر بخشا کریں اور محلہ والوں کا گوشت ترکاری بھی لا دیا کریں اور پانی کے گھڑے بھی بھرا کریں غرض سارا کام امام صاحب کے ذمہ ہوتا ہے البتہ اگر کوئی تنخواہ دار امام نہ ہو بلکہ متوکل ہو تو وہ تو شاہی ملازم ہے وہ شاہی تعلق کی وجہ سے معزز ہوگا مگر اس میں آپ کا کیا دخل ہے میں تو اس کو دکھلانا چاہتا ہوں کہ جن اماموں کو آپ تنخواہ پر مقرر کرتے ہیں ان کی آپ کیا گت بناتے ہیں۔ افسوس اگر انگریزی کا ماسٹر رکھا جائے تو اس کے لئے تو کم از کم چالیس پچاس روپے تجویز کئے جاتے ہیں اور قرآن پڑھانے کے لئے کسی کو رکھا جائے تو اس کے لئے روپیہ آٹھ آنہ ماہوار تجویز ہوتا ہے مگر خیر سے وہ معلم بھی روپے آٹھ آنے ہی کے ہوتے ہیں چنانچہ ایسے ہی ایک میاں جی مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ کو مِنَ الْجِنَّاتِ وَالنَّسُ پڑھتے تھے حالانکہ قرآن غلط پڑھنے پر سخت وعید ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ وعید کے خوف سے قرآن پڑھنا ہی چھوڑ دو بلکہ یہ مطلب ہے کہ درست کر کے پڑھنا روپیہ آٹھ آنہ کے معلموں سے نہیں آسکتا بلکہ اس کے لئے کسی مجود اور قاری کو تجویز کرنا چاہئے۔ اور ایسا شخص تو کچھ رقم خرچ کرنے سے ہی ملیگا۔ اور جو لوگ انگریزی ماسٹروں کو معقول تنخواہیں دے سکتے ہیں وہ مجود اور قاری کی تنخواہ بھی ضرور دے سکتے ہیں اس لئے عدم وسعت کا عذر ہر جگہ نہیں چل سکتا مگر آج کل دین سے ایسی بے پروائی ہے کہ امام ہمیشہ ایسا ڈھونڈا جاتا ہے جو سستا ہو چاہے وہ سب کی نمازیں غارت کرتا ہو کیونکہ یہ جاہل میاں جی بعض جگہ ایسی غلطیاں کرجاتے ہیں جن سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور تجوید کی غلطیاں تو بکثرت ہوتی ہیں اور تجوید کی یہاں تک ضرورت ہے کہ بعض دفعہ اس کی مخالفت سے عربیت جاتی رہتی ہے اور جب لفظ عربیت ہی سے نکل گیا تو قرآن ہی نہ رہا جب نماز میں قرآن نہ پڑھا گیا تو نماز کیسے صحیح ہوئی شاید آپ کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہو کہ تجوید کے نہ ہونے سے عربیت نہیں رہتی مگر میں دلیل سے اس کو ثابت کرتا ہوں سب کو معلوم ہے کہ عربی فارسی اردو جدا جدا زبانیں ہیں اور ہر ایک کے خواص الگ الگ ہیں پس جس طرح کسی لفظ کے

فارسی یا اردو ہونے کے لئے تلفظ کی صحت شرط ہے اسی طرح لفظ کے عربی ہونے کے لئے بھی تلفظ کا صحیح ہونا شرط ہے رمثلاً آپ ایک کپڑے کو گاڑھا کہتے ہیں اس میں ڑے کا ہونا اور ہائے مخفی کا ہونا ضروری ہے اگر کوئی شخص اس کے بجائے گارا کہے تو آپ اس کو غلط کہیں گے کیونکہ گارا تو مٹی کا ہوا کرتا ہے کپڑے کی کوئی قسم گارا نہیں ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ عربی میں جو لفظ ثا سے مرکب ہے وہاں سین یا صاد پڑھ دینے سے یا حا کی جگہ ہا پڑھنے سے تلفظ غلط اور معنی بدل جائیں گے اس سے تو صحت الفاظ کی ضرورت معلوم ہوئی ۱۲)

اب صفات کی بابت میں کہتا ہوں کہ اردو میں ایک لفظ پنکھا ہے جس میں نون کو اخفاء کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ اسی طرح رنگ اور سنگ اور جنگ میں جو فارسی الفاظ ہیں نون کو ظاہر کر کے نہیں پڑھا جاتا۔ اب اگر کوئی شخص پنکھا کو باظہار نون پن کھا یا رنگ کو رن گ کہے تو آپ کہیں گے کہ یہ اردو فارسی نہیں رہی مہمل لفظ ہو گیا لیکن اس کہنے سے آپ بندھ گئے اس طرح کہ جب اس لفظ میں اظہار نون سے آپ نے اس کا غلط ہونا اور اردو زبان سے نکل جانا مان لیا تو جن لفظوں میں عربی زبان میں اخفاء ہے وہاں بھی ماننا پڑے گا کہ اظہار نون سے وہ لفظ عربی نہیں رہتا تو کیا اب بھی تجوید کی ضرورت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ تجوید کا سیکھنا فرض ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا عربی میں پڑھنا فرض ہے اور عربیت کے موافق صحیح تلفظ بدون تجوید کے نہیں آسکتا تو تجوید کا سیکھنا فرض ہوا۔ صاحبو! چاہے آپ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ادھر متوجہ نہ ہوں مگر تجوید کی فی نفسہ بہت ضرورت ہے اور افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف اس لئے توجہ نہیں کہ اس میں دنیا کا بظاہر کوئی نفع نہیں۔ اگر آج ملازمت کے لئے یہ قانون ہو جائے کہ جس کا قرآن باقاعدہ صحیح ہو گا اس کو ملازمت دی جائے گی تو آج یہ سارے بی۔ اے۔ ایم۔ اے قاری ہو جاویں ہم لوگ متاع دنیا کے لئے سب کچھ کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ سارے عذر جو بیان کئے جاتے ہیں

محض بہانے ہیں اور تجوید کی ضرورت تو بھلا کیا ہی مانی جاوے گی۔ آج کل تو بہت سے لوگ خود قرآن پڑھانے ہی کو فضول سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب معنی نہ سمجھے تو محض الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ۔ میں کہتا ہوں کہ بہت لوگ اقلیدس میں امتحان دیتے ہیں حالانکہ سمجھتے خاک بھی نہیں مگر امتحان دینے کے لئے الفاظ کو رٹ لیتے ہیں اور پرچے صحیح لکھ کر پاس ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض دفعہ نرے الفاظ کا یاد ہونا بھی کام آجاتا ہے جیسے یہاں اقلیدس کے الفاظ رٹ لینے سے ملازمت مل جاتی ہے اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ یاد کر لینے سے جنت کے درجے ملتے ہیں تو بیکار کیونکر ہوئے مگر دنیا کی وقعت ہے اس لئے اقلیدس کے الفاظ رٹنے کو بیکار نہیں سمجھا جاتا اور دین کی وقعت نہ ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ معلموں اور موذنوں کی تنخواہ بھی کم تجویز کی جاتی ہے مگر یاد رکھئے وہ آپ کو قرآن کا علم بھی ایسا ہی دیں گے جیسی آپ تنخواہ دیں گے۔

ارزاں بعلت گراں بحکمت۔ (ارزاں کی علت ہے اور گراں حکمت سے ہوتا ہے)

اور زیادہ تنخواہ دینے میں بھی وہ قرآن کے دام نہ ہوں گے بلکہ یہ تو ان معلموں کے عمل کے دام ہیں ورنہ قرآن کے دام کون دے سکتا ہے۔ قرآن کی تو یہ شان ہے ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(اپنی قیمت دونوں جہان بتلائی ہے۔ نرخ بڑھاؤ ابھی ارزانی ہے)

قرآن کی قیمت تو دو جہان بھی نہیں ہو سکتے اور کیوں نہ ہو قرآن ہے کیا چیز ؎

چیست قرآن اے کلام حق شناس

رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

(اے کلام حق کو پہچاننے والے قرآن پاک کیا ہے وہ لوگوں کی رب کی طرف سے رب کا رونما ہے)

وہ بندوں کو خدا تعالیٰ کا جمال دکھلانے والا ہے یہ تو الفاظ کا رتبہ ہے اور معانی کا

رتبہ یہ ہے ؎

حرف حرفش راست در بر معنے
معنے در معنے در معنے

(اس کا حرف حرف معنی میں درست ہے معنی در معنی اندر معنی کے ہے)

قرآن مجید وہ چیز ہے کہ جب کوئی مسلمان اس کی تلاوت کرتا ہے تو خداوند عالم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ بھی خداوند عالم کی طرف متوجہ ہوتا ہے دنیا میں اتنا ہی مشاہدہ بس ہے کیونکہ اس سے زیادہ کا تحمل نہیں ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آدمی آفتاب پر نظر کرنے سے تو چکا چوند ہو جاتی ہے مگر اس کی شعاعوں کو دیکھ سکتا ہے اسی طرح ذاتِ حق تعالےٰ کو تو ہم دنیا میں بوجہ ضعف قوی کے نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں اس کی طرف متوجہ ہو کر انوار و تجلیات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں تو قرآن مجید مظہر صفات الٰہی ہے جس کی تلاوت سے انوار و تجلیات صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں حق تعالےٰ غائب ہیں اور وہ خود نظر نہیں آسکتے بلکہ حق تعالیٰ یہاں بھی ہم سے قریب ہیں اور نظر آسکتے ہیں ان کی طرف سے کوئی مانع نہیں ہے مانع ہماری طرف سے ہے کہ ہم میں یہاں دیکھنے کی طاقت نہیں ہے اسی واسطے حق تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے لَنْ تَرَانِیْ (مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا) فرمایا تھا لَنْ اُرٰی (میں ہرگز دیکھا نہیں جاتا) نہیں فرمایا چنانچہ جتنے مشاہدہ کی ہم میں یہاں طاقت ہے وہ قرآن کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے جب قرآن مجید کی یہ شان ہے تو اس کی کیا قیمت ہو سکتی ہے اور معلموں کو جو کچھ دیا جاتا ہے یہ خود ان کی محنت کی قیمت ہے قرآن کی قیمت نہیں ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اگر ہمارے اندر دین کی عظمت و وقعت ہوتی تو حاملان قرآن کی مشقت کی قیمت بھی بڑی ہی تجویز کرتے ہیں لیکن ہم نے دین کی بے وقعتی کر رکھی ہے اس کے معلموں اور موذنوں اور اماموں کی یہ بیقدری کر رکھی ہے کہ ان کی تنخواہیں بہت قلیل مقرر کیجاتی ہیں اور مردوں کے کھانے کپڑے سے ان کی امداد کرتے ہیں ان کے واسطے کفن کی چادر اور جانماز اور تیجہ دسویں کا کھانا مقرر کر لیا ہے اس لئے اُن کی نیتیں بگڑ گئیں لالچ اور

حرص پیدا ہوگئی اب وہ کسی کے اچھا ہونے سے اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا کسی کے مرنے سے خوش ہوتے ہیں گو زبان سے وہ کسی کو نہ کوستے ہوں مگر دل سے ضرور تمنا کرتے ہونگے کہ کوئی مرے تو ہماری آمدنی ہو پس اس میں جس طرح ان کا قصور ہے خود قوم کا بھی قصور ہے کہ ان کو ایسا تنگ کیوں رکھا جس سے ان کی نیت بگڑ گئی۔ پس دیکھ لیجئے کہ ان رسموں سے دینے والوں کو بھی ضرر پہنچا اور لینے والوں کو بھی نقصان پہنچا اور دونوں کو یہ ضرر اس لئے پہنچا کہ یہ طریقہ غیر مشروع تھا اور محض تفاخر کے لئے تھا خلاف شریعت کاموں میں ظلمت ضرور ہوتی ہے گناہ کے علاوہ ان سے دنیا کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ یہ ساری گفتگو اس پر چلی تھی کہ آج کل لوگوں نے موت کو بھی آلہ فخر بنا رکھا ہے یہ تو اور پر والوں کا حال تھا غضب یہ ہے کہ بعض دفعہ خود میت بھی فخر و مباہات کی وصیت کرتا اور یہ فرمائش کرتا ہے کہ ہماری قبر ایسی پختہ ہو جو کبھی شکستہ نہ ہو سکے شاید اس سے یہ مقصود ہو کہ قیامت میں بھی یہ قبر محفوظ رہے اور وہ حساب کتاب سے بچا رہے مگر قیامت میں تو پہاڑ بھی اڑجائینگے بیچاری قبر کی تو کیا ہستی ہے اس روز تو ہر شخص خود ہی گھبرا کر نکل آئے گا۔

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے، ناگہ ایک رئیس زادے اور غریب زادے میں گفتگو ہوئی رئیس زادے نے کہا کہ دیکھو ہمارے باپ کی قبر کیسی عمدہ اور مضبوط ہے جس پر شان و شوکت برستی ہے اور تمہارے باپ کی قبر کچی اور شکستہ ہے جس پر بے کسی برستی ہے۔ غریب زادہ نے کہا بیشک، یہ فرق تو ہے، لیکن قیامت کے دن میرا باپ تو قبر میں سے آسانی سے نکل آئے گا اور تمہارا باپ پتھر ہی ہٹانے میں رہے گا وہ اتنے چٹانوں اور پتھروں کو ہی ہٹاتا رہے گا میرا باپ جنت میں جا پہونچے گا۔ کچھ ٹھکانا ہے اس تفاخر کا کہ قبروں کی پختگی پر بھی فخر کیا جاتا ہے۔ اسی کو تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (ترجمہ) (اے لوگو تم کو تفاخر نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہونچ گئے) زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کے یا تو یہ معنے ہیں کہ تم اس تفاخر ہی کی حالت میں قبروں میں پہنچ گئے یعنی مر گئے یا یہ کہ تم تفاخر کے لئے قبروں کو دیکھنے گئے۔ جاہلیت میں عرب کی عجیب حالت تھی بعض دفعہ جب دو قبیلے باہم فخر کرتے ایک کہتا کہ ہماری قوم زیادہ ہے دوسرا

کہتا کہ ہمارا جتھا زیادہ ہے اور اس کے بعد مردم شماری ہوتی اور ان میں سے کوئی ایک قبیلہ شمار میں کم ہو جاتا تو وہ کہتا کہ ہمارے آدمی لڑائی میں زیادہ کام آئے ہیں اس لئے ہم کم ہو گئے ورنہ ہماری شمار زیادہ تھی دوسرا قبیلہ کہتا کہ یہ بھی غلط ہے تمہارے مُردے ہمارے مُردوں سے زیادہ نہیں ہیں اس کے فیصلے کے لئے قبروں کی شمار کی جاتی تھی۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ تو کفار کی حالت تھی مگر افسوس آجکل مسلمانوں میں بھی یہ مرض پیدا ہو گیا ہے تو وہ قبروں کی شمار تو نہیں کرتے مگر ان کی پختگی اور خوبصورتی پر فخر کرتے ہیں چنانچہ اس لئے بعض لوگ خود اپنی قبر کے پختہ کرنے کی وصیت کر جاتے ہیں۔

اس تفاخر ہی کی وجہ سے یہ تمام تکلفات پیدا ہوئے ہیں کہیں زیادہ روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے کہیں جھاڑ فانوس اور قندیل لٹکائے جاتے ہیں۔ مسلمانو! ان تکلفات کو چھوڑو اور اپنے سلف کی طرح سادگی اختیار کرو۔ ہمارے سلف کی زندگی ایسی سادہ تھی کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں تو پہلی سادگی تو یہ تھی کہ آپ کے ساتھ کوئی لاؤ لشکر نہ تھا بس ایک اونٹنی تھی اور ساتھ میں ایک غلام اور سواری کا طریقہ یہ تھا کہ کچھ دور تک آپ سوار ہوتے اور غلام مہار پکڑ کر چلتا تھا اور کچھ دور تک غلام سوار ہوتا تھا اور خلیفہ اپنے ہاتھ سے مہار پکڑ کر پیدل چلتے تھے کیا اس مساوات اور سادگی کی نظیر کوئی قوم دکھلا سکتی ہے ہرگز نہیں۔ اور دوسری سادگی یہ تھی کہ جب آپ بیت المقدس کے قریب اس شان سے پہونچے ہیں تو حضرات صحابہ و امرار لشکر استقبال کے لئے حاضر ہوئے اور سب نے عرض کیا کہ آپ غیر قوموں کے سامنے پیش ہونے والے ہیں مناسب یہ ہے کہ سفر کا لباس اتار کر کوئی عمدہ لباس پہن لیا جائے کیونکہ اس لباس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے اور پیوند بھی کہیں کپڑے کا تھا کہیں چمڑے کا۔ اور یہ بھی عرض کیا کہ اس وقت اونٹنی کے بجائے گھوڑے پر سوار ہونا مناسب ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اول تو اس سے انکار کیا اور فرمایا نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰہُ بِالْاِسْلَامِ ہم وہ لوگ ہیں کہ خدا نے ہم کو اسلام سے عزت دی ہے۔ ہماری عزت لباس یا سواری سے نہیں ہے۔ یہاں سے ہم لوگوں کو اپنے خیالات کی اصلاح کرنا چاہیئے ہم عزت و

شوکت کی حقیقت نہیں سمجھی ہم لباس کے عمدہ ہونے اور سواری کے قیمتی ہونے کو عزت وشوکت سمجھتے ہیں یہ بالکل غلط ہے بلکہ اصلی عزت کمال سے ہوتی ہے یہ کیا عزت ہے جو تھوڑی دیر میں اتر جائے کہ اتنے کپڑے بدن پر رہے معزز رہیں اور جہاں کپڑے اتار دیئے ذلیل ہوگئے عزت وہ ہے جو ہر دم انسان کے ساتھ رہے اور وہ کمال سے ہوتی ہے اور مسلمان کا بڑا کمال اسلام ہے آپ اسلام کامل حاصل کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ بدون کسی سامان کے معزز ہو جاؤ گے۔ دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لباس کیسا تھا مگر عزت وشوکت کی یہ حالت تھی کہ جب آپ مدینہ منورہ سے بیت المقدس کو روانہ ہوئے ہیں تو تمام دنیا کے اندر زلزلہ پڑ گیا کہ خلیفۂ اسلام پائے تخت سے شام کی طرف روانہ ہوئے ہیں، تمام سلاطین کانپتے (کہ دیکھئے اب کس طرف کو لشکر روانہ فرماتے ہیں سب کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں خود ہی لشکر کی کمان نہ کریں ۱۲) آخر یہ شوکت ورعب کس چیز کا تھا کیا لباس کا رعب تھا ہرگز نہیں، لباس کی کیفیت تو یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے طواف میں حضرت عمر کو دیکھا اس وقت جو کرتہ آپ کے بدن پر تھا اس میں اکیس پیوند تھے۔ آج لوگ شکایت کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں افلاس زیادہ ہے اس لئے ذلیل ہو رہے ہیں، مسلمانوں میں اس وقت افلاس کا ہونا سچ بھی ہے اور غلط بھی۔ سچ تو اس معنی کر ہے کہ کفار سے ان کے پاس دولت کم ہے اور غلط اس لئے ہے کہ سلف کے اعتبار سے ان کے پاس دولت کم نہیں جس زمانہ میں مسلمانوں نے ترقی کی ہے اس وقت وہ آج کل کے مسلمانوں سے زیادہ صاحب افلاس تھے اگر افلاس ہی ذلت کا سبب ہے تو ان حضرات نے عین افلاس کی حالت میں کیونکر عزت وشوکت حاصل کرلی۔ خوب سمجھ لو کہ عزت لباس یا دولت سے نہیں ہے مسلمان کی عزت اسلام سے ہے۔ پہلے مسلمان پورے مسلمان ہوتے تھے اس لئے معزز تھے اور ہم برائے نام مسلمان ہیں اس لئے ذلیل ہیں ورنہ آجکل کچھ پہلے سے زیادہ افلاس نہیں۔ حضرات صحابہ کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ملک شام میں پہونچے تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے خیمہ میں اترے کیونکہ وہ عساکر اسلامیہ کے افسر تھے

اوران سے پوچھا کہ اے ابو عبیدہ تمہارے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے انہوں نے روٹی کے سوکھے ٹکڑے سامنے رکھدیئے اور پانی لاکر رکھدیا۔ اس وقت حضرت سرمد کا کلام یاد آگیا فرماتے ہیں ؎

منعم کہ کباب میخورد میگذرد — در بادۂ تاب میخورد میگذرد

سرمد کہ بکاسۂ گدائی نان را — ترکردہ بآب میخورد میگذرد

(منعم کہ کباب کھاتا ہے گذر جاتا ہے خالص شراب پیتا ہے گذر جاتا ہے

سرمد پیالۂ گدائی میں پانی میں سوکھی روٹی ترکرکے کھاتا ہے وہ گذرجاتاہے)

یہ حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ رونے لگے اور فرمایا اے ابو عبیدہ اب تو اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر فتوحات سے وسعت کردی ہے پھر تم ملک شام میں ہوا ب تم اتنی تنگی کیوں کرتے ہو انھوں نے عرض کیا اے امیرالمؤمنین دنیا تو محض زاد ہے۔ آخرت میں پہونچنے کے لئے جس کے لئے یہ بھی کافی ہے تو زیادہ کو لے کر کیا کریں گے خود حضرت عمر رضہ سے عرض کیا گیا تھا کہ اب فتوحات میں وسعت ہوگئی ہے آپ اتنی تنگی کیوں فرماتے ہیں انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہمارے بہت سے بھائی اسی فقر کی حالت میں شہید ہوگئے انہوں نے خدا کے راستہ میں عمل زیادہ کیا اور دنیا سے تمتع حاصل نہیں کیا ان کا سارا ثواب آخرت میں ذخیرہ رہا اور ہم لوگوں نے فتوحات حاصل کرکے بہت کچھ مال و دولت حاصل کرلی ہے اور ہماری محنت کا کچھ ثمرہ یہاں مل گیا ہے۔ اب مجھے اس مال و دولت سے منتفع ہوتے ہوئے یہ ڈر لگتا ہے کہ قیامت میں کہیں یہ نہ کہدیا جائے اِذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ کہ تم نے حیات دنیا میں مزے اڑالئے ہیں اور طیبات سے تمتع حاصل کرلیا ہے اب یہاں (تمہارے واسطے کچھ نہیں بس) تم کو عذاب ذات کی سزادی جائے گی اس لئے کہ تم بڑا بننا چاہتے تھے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ہمارے سلف کا فقر اختیاری تھا اضطراری نہ تھا ان کے افلاس کا سبب یہ نہ تھا کہ ان کو کچھ ملتا نہ تھا حق تعالےٰ نے حضرات صحابہ کو بہت کچھ

مال و دولت دیا تھا مگر وہ اپنے پاس رکھتے نہ تھے بلکہ غرباء کو دیدیتے تھے اور خود فقر کی حالت میں رہتے تھے تو کیا اس فقر سے کچھ ان کی عزت کم ہوگئی تھی خدا نے ان کو وہ عزت دی تھی کہ آج مسلمان اس کی تمنا کرتے ہیں پس فقر کی ذلت سمجھنا بڑی غلطی ہے یہ تو بڑی عزت کی چیز ہے اگر کمال کے ساتھ ہو۔ چنانچہ جیب میں کانپور میں درس دیتا تھا عین حالت درس میں ایک شخص جامع مسجد میں آئے حالت یہ تھی ؎

لنگکے زیرو لنگکے بالا

نے غم دزد ونے غم کالا

(ایک لنگی اوپر ایک لنگی نیچے، نہ اسباب کا غم نہ چور کا کھٹکا)

طالب علموں نے اول اول ان کو معمولی آدمی سمجھا اور حقارت سے دیکھا انھوں نے مسجد کی جانماز پر اعتراض کیا کہ یہ منقش کیوں ہے نماز کی جگہ نقش و نگار نہ ہونا چاہیئے اس سے نماز میں یکسوئی کامل نہیں ہوتی بار بار پھول بوٹوں پر نظر جاتی ہے طلبہ نے اس مسئلہ پر گفتگو کرنا شروع کردی تب معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے عالم ہیں اب ان کی سادہ وضع اور خستہ لباس کی بھی قدر ہوئی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اگر لباس معمولی ہو اور کمال زیادہ ہو تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور اگر کپڑے عمدہ ہیں اور لیاقت کچھ نہیں تو علی حزین کا سا قصہ ہو جاوے گا کہ اس کے پاس ایک شخص نہایت شان و تکلف کا لباس پہنے ہوئے آیا اس نے ادب سے اپنا پاؤں سمیٹ لیا اور نام پوچھا تو آپ نام بتلاتے ہیں الیسف (یوسف) علی حزین نے پاؤں بدستور پھیلا دیئے اور کہا بابا اگر تو الیسف ہستی پس چرا من پلئے خود را کشم (اگر تو الیسف ہے تو پھر میں اپنا پاؤں کیوں سمیٹوں) میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو انگریزی بالکل نہ جانتے تھے اور وضع بالکل انگریزوں جیسی تھی ایسے لوگ اکثر ذلیل ہو جاتے ہیں جب کوئی شخص ان کو انگریزی داں سمجھکر انگریزی کا خط یا تار ان کے پاس لاتا ہے اور پڑھوانا چاہتا ہے تو اس وقت وہ بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ اب کیسے پڑھیں اور انکار کریں تو اپنی حماقت ظاہر ہوتی ہے اور جہالت کا اقرار ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی انگریز ان کو تعلیم یافتہ سمجھ کر انگریزی میں ان سے باتیں

کرنے لگتا ہے اس وقت یہ لوگ بغلیں جھانکتے ہیں۔ ایک انگریز نے ایسے ہی ایک شخص کو بہت ٹھونکا جو وضع انگریزوں کی بنائے ہوئے تھا اور انگریزی بالکل نہ جانتا تھا، بات یہ ہے کہ ہر وضع کے لئے اس کی قابلیت بھی ضروری ہے ؎

نازرا روئے بباید ہمچو ورد
چوں نہ داری گرد بدخوئی مگرد

(ناز کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی مت اختیار کرو)

اور انسانیت کی بات تو یہ ہے کہ آدمی انگریزی پڑھ کر بھی اپنی ہی وضع پر قائم رہے واللہ ایسے شخص کی زیادہ عزت ہوتی ہے مگر آج کل مسلمانوں کی ایسی حالت ہو گئی ہے کہ سب کے سب وضع اور فیشن کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور اس کو سرمایۂ عزت سمجھتے ہیں حالانکہ اس سے خاک بھی عزت نہیں ہوتی یہ لوگ خود ان کی نگاہوں میں بھی ذلیل ہو جاتے ہیں جن کی وضع اختیار کرتے ہیں اور اگر مان بھی لیا جائے کہ اس سے عزت ہوتی ہے تو یہ برائے نام عارضی عزت ہے اصلی عزت کمال اسلام سے ہے مسلمانوں کو اس کی کوشش کرنی چاہئے میں یہ نہیں کہتا کہ تم ایسے خراب خستہ رہو کہ بدن پر چیتھڑے لگا لو نہیں لباس صحیح سالم پہنو مگر یہ کیا ضرور ہے کہ قیمتی بھی ہو وضع اور فیشن بھی ہو یہ سب تکلفات ہیں۔

دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صحابہ نے یہ رائے دی تھی کہ عمدہ کپڑے پہن لیجئے تاکہ ظاہری شان و شوکت بھی ہو جاوے تو انہوں نے اس سے صاف انکار فرما دیا کہ ہمارے لئے اسلامی عزت کافی ہے اور کسی عزت کی ضرورت نہیں شاید آپ یہ کہیں کہ حضرات صحابہ کی تو بات ہی اور ہے ان جیسا کون ہو سکتا ہے تو لیجئے میں آپ کو اسی زمانہ کی نظیر دکھاتا ہوں۔

ابھی کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ زندہ تھے آپ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مولانا کی وضع کس درجہ سادی تھی مگر اس سادگی ہی میں ان کی وہ عزت تھی کہ بڑے بڑے نواب اور رؤسا وزراء مولانا سے

ملنے آتے تھے اور مولانا جس کو جو جی میں آیا کہہ ڈالتے تھے مگر ان کی باتوں سے برا کوئی نہ مانتا تھا بلکہ ان کی وہ غصہ کی باتیں بھی بھلی معلوم ہوتی تھیں جس کی وجہ وہی سادگی تھی ان کی طبیعت بالکل سادہ بچوں کی سی تھی اس لئے کسی کو کوئی بات ان کی ناگوار نہ ہوتی تھی جیسے بچوں کی حرکات ناگوار نہیں ہوتیں کیونکہ وہ بھی جو کچھ کرتے ہیں سادگی سے کرتے ہیں بناوٹ سے نہیں کرتے۔ تھانہ بھون میں ایک شخص گالیاں بہت دیا کرتے تھے ایک تقریب کے موقعہ پر انہوں نے برادری کو جمع کرنا چاہا تو لوگوں نے جانے سے انکار کر دیا کہ یہ ہم کو گالیاں دیتا تھا ہم اس کے یہاں نہ جائیں گے۔ جب معلوم ہوا کہ برادری والے اس وجہ سے نہیں آتے تو انھوں نے معذرت کی کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔ اب تو خطا معاف کرو لوگوں نے کہا کہ شاہ ولایت صاحب کے مزار پر چل کر عہد کرو وہ راضی ہوگئے اور عہد کو چلے وہاں جا کر کہتے ہیں کہ شاہ ولایت صاحب یہ برادری کے ایسے ویسے لوگ (گالی دے کر ۱۲) مجھ سے عہد کرلیتے ہیں کہ کسی کو گالی مت دینا میں آپ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ اب سے کسی ان ایسے ویسے لوگوں کو (گالی دے کر ۱۲) گالی نہ دوں گا سب لوگ ہنس پڑے کہ ظالم سے عہد کرتے ہوئے تو گالیاں چھوٹی نہیں آئندہ کیا چھوڑے گا یہ بیچارہ معذور ہے آخر برادری کے سب آدمی ان کے یہاں آگئے اور پھر کسی نے ان کی گالی سے برا نہ مانا کیونکہ سمجھ گئے کہ یہ سادگی سے گالی دیتا ہے قصداً بناوٹ کر کے نہیں دیتا۔ اس حکایت سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے اس فعل کا اچھا ہونا ثابت کرتا ہوں بلکہ میں اس سے ایک نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں اور کبھی برے فعل سے بھی اچھا نتیجہ نکال لیا جاتا ہے جیسے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چور کو پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھا پوچھا اس کو پھانسی کیوں دی گئی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ بڑا پکا چور تھا ایک بار گرفتار ہوا تو اس کا داہنا ہاتھ کاٹا گیا پھر بایاں پیر کاٹا گیا پھر بھی چوری سے باز نہ آیا تو خلیفہ نے پھانسی کا حکم دیا حضرت جنید نے یہ سن کر اس کے پیر چوم لئے لوگوں نے عرض کیا حضرت آپ چور کے پیر چومتے ہیں فرمایا میں نے چوری کی وجہ سے اس کے پیر نہیں چومے بلکہ اس کے استقلال کے قدم

چوے ہیں کہ یہ اپنے محبوب پر گو وہ مذموم ہی تھا ایسے استقلال کے ساتھ جما رہا کہ اسی میں جان دے دی افسوس ہم اپنے محبوب محمود کے ساتھ بھی یہ معاملہ نہیں کرتے تو جیسے حضرت جنید رح نے برے فعل سے نتیجہ اچھا نکال لیا۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ گو اس شخص کا گالیاں دینا برا فعل تھا مگر سادگی کے ساتھ تھا یہ اس میں خوبی تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ لوگ اس کی باتوں کا برا نہ مانتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ سادگی اور بے تصنعی عجب چیز ہے جو تلخ کو شیریں کر دیتی ہے۔ یہی بات مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب میں تھی کہ ان کا غصہ اور تیزی سادگی کے ساتھ تھی اس لئے کسی کو ناگواری نہ ہوتی تھی بعض دفعہ وہ بڑے بڑے عہدہ داروں کو ایسی تیز تیز باتیں فرما دیا کرتے تھے کہ ہم ویسی باتیں کہیں تو ایک دن میں بدنام ہو جائیں۔

ایک مرتبہ وزیر حیدر آباد مولانا کے یہاں حاضر ہوئے تو آپ فرماتے ہیں ارے نکالو ارے نکالو، صاحبزادے نے عرض کیا حضرت حیدر آباد کے وزیر ہیں فرمایا ارے تو میں کیا کروں میں کیا ان سے تنخواہ پاتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا اچھا رات کے دو بجے تک رہنے کی اجازت ہے اس کے بعد چلے جائیں بیچارے وزیر نے اسی کو غنیمت سمجھا اور اس کی تہذیب دیکھئے کہ رات کے ۲ بجے فوراً چلا گیا خدام نے کہا بھی کہ صبح کو چلے جائیگا۔ اب تو مولانا سو رہے ہیں انہیں کیا خبر ہو گی کہا نہیں یہ بے ادبی ہے بزرگوں کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا چاہئے، اب حضرت کی اجازت نہیں ہے میں نہ ٹھہروں گا تو مولانا بڑے سے بڑے کو ایسی تیز تیز کہدیتے تھے اور کچھ ناگوار نہ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ لفٹننٹ گورنر نے آپ کی زیارت کو آنا چاہا اور اپنے سکرٹری کے ذریعہ سے باقاعدہ اجازت حاصل کی مولانا نے اجازت دے دی اور لوگوں سے فرمایا وہ ہکو کیا جانیں لوگوں نے عرض کیا حضرت آپ کو تو سارا زمانہ جانتا ہے پھر فرمایا کہ وہ بیٹھیں گے کہاں ہمارے یہاں تو سونے کی کرسی بھی نہیں۔ خدام نے عرض کیا کہ حضرت وہ لکڑی کی کرسی پر بھی بیٹھ جاویں گے فرمایا اچھا۔ پھر فرمایا کہ کیا ہم لفٹننٹ گورنر کو دروازہ تک لینے جاویں۔ عرض کیا گیا کہ اگر مزاج چاہے تو مضائقہ بھی نہیں یہ باتیں ان کے آنے سے

پہلے ہو رہی تھیں مگر کچھ دیر کے بعد مولانا بھول بھال گئے اور جب وہ تاریخ آئی جس میں لفٹنٹ گورنر آنے والے تھے تو حضرت نے نہ کچھ سامان کیا نہ استقبال کیا بلکہ اپنی جگہ سے اٹھے تک نہیں جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی بیٹھے رہے لفٹنٹ گورنر تو بیٹھ گئے باقی سب انگریز جوان کے ساتھ تھے کھڑے رہے ایک میم بھی کھڑی رہ گئی تو مولانا نے ایک او لئے گھڑے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ بی تو اس پر بیٹھ جا وہ اس پر بیٹھ گئی پھر لفٹنٹ گورنر نے عرض کیا کہ حضرت ہمیں کچھ وصیت فرمائیے فرمایا تم کو اللہ تعالٰے نے حکومت دی ہے دیکھو ظلم مت کرنا ورنہ تم سے حکومت چھن جائے گی۔ پھر اس نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ تبرک عطا فرمایا جائے آپ نے فرمایا مجھ غریب کے پاس تمہارے دینے کو کیا رکھا ہے پھر خادم سے پکار کر فرمایا ارے مٹھائی کی ہنڈیا میں کچھ چورا پڑا ہو تو ان کو دیدے یہ مانگ رہے ہیں چنانچہ وہ چورا تھوڑا تھوڑا سب کو بانٹا گیا اور سب نے نہایت ادب سے اس کو لیا میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ لفٹنٹ گورنر کو مولانا کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی کیا مولانا حاکم تھے یا نواب اور رئیس تھے کچھ بھی نہیں پھر آخر یہ دل کشی کس چیز کی تھی کہ مسلم اور غیر مسلم ان کے دروازے پر آتے تھے۔ صاحبو! یہ سادگی ہی کی دل کشی تھی تکلف اور تصنع سے یہ بات پیدا نہیں ہوا کرتی اسی کو فرماتے ہیں ؎

دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند — دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد
زیر بارند درختاں کہ ثمر ہا دارند — اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(دل فریبان نباتی زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خدا داد ہے جو درخت پھلدار ہیں وہ زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے)

حضرت بس آزادی یہ ہے جو ان حضرات میں تھی یہ آزادی نہیں ہے کہ ایسا لباس پہنیں کہ بدون کرسی کے بیٹھ ہی نہ سکیں یہ تو پوری قید ہے بعض وضع ایسی ہوتی ہے کہ اگر وہ مکمل ہی ہو تو اچھی معلوم ہوتی ہے اور ادھوری ہو تو بری معلوم ہوتی ہے (مثلاً کوٹ پتلون کے ساتھ دہلی کا جوتہ برا معلوم ہوتا ہے نیز دو پلی ٹوپی بھی اس پر بھدی لگتی ہے اب کوٹ پتلون ہو تو اس کے ساتھ جوتہ اور ٹوپی بھی اس کے مناسب ہونا چاہیئے) تو بتلائیے

یہ قید ہوئی یا نہیں اور ایک لباس ہی میں کیا میں تو ہر تکلف کو قید سمجھتا ہوں۔ بس آزادی یہ ہے کہ انسان ایک شریعت کی قید کے سوا کسی قید کا پابند نہ ہو۔ یہ قید تو ضروری ہے اس کا باقی رہنا تو مطلوب ہے مگر میں اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ قید گراں نہیں ہے واللہ اس میں وہ لذت ہے کہ جو اس کا پابند ہے وہ کبھی اس سے خلاصی نہیں چاہتا کیونکہ ؎

اسیرت نخواہد رہائی ز بند
شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا ہے تیرا شکار کمند سے خلاصی نہیں ڈھونڈتا)

یہ تو زلف یار کی قید ہے اور زلف یار کی قید سے کون رہائی چاہتا ہے ہاں جو اس قید کا پابند ہے وہ باقی تمام قیود سے آزاد ہو جاتا ہے ان کے متعلق تو وہ یوں کہتا ہے ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر دو سو زنجیر بھی لاؤ میں توڑ ڈالوں گا سوائے اپنے محبوب کی زلف کے زنجیر کے)

وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے خواہ لباس میں پیوند لگے ہوں یا جوتا ٹوٹا ہوا ہو کیونکہ وہ ان سب کو محبوب کی طرف سے سمجھتا ہے اور ہر چہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ محبوب کی طرف سے پہونچے وہی بہتر ہے) پس آپ اس قید زلف سے نہ گھبرائیں کیونکہ یہ واللہ یہی عزت کا ذریعہ ہے باقی سب قیدیں توڑنے کے قابل ہیں (اس قید سے آدمی خدا کا غلام بنتا ہے اور باقی قیود سے نفس و شیطان کا غلام بنتا ہے اور خدا کا غلام سب کا بادشاہ ہوتا ہے اور نفس و شیطان کا غلام سب کا غلام ہے وہ ہر جگہ ذلیل ہی ہوتا ہے ۱۲) تو ہماری زندگی ایسی سادہ ہونی چاہیئے جیسی سلف کی زندگی تھی چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب لباس تبدیل کرنے کے لئے عرض کیا گیا تو اول آپ نے اپنے مذاق کے موافق انکار کیا اور فرمایا کہ ہم کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے بس یہی عزت ہمارے واسطے کافی ہے، لباس کی عزت ہم کو نہیں چاہیئے۔ بعض

صحابہ نے عرض کیا کہ حضرت مسلمانوں کی دلجوئی ہی کے لئے لباس بدل لیجئے یہ بھی اسلام کا عجیب مسئلہ ہے کہ اگر کوئی بات اپنی وضع اور مذاق کے خلاف ہو اور شریعت سے ممنوع نہ ہو تو احباب کے اصرار پر ان کی دلجوئی کے لئے کرلینا چاہیئے دلجوئی شرعاً مطلوب ہے بشرطیکہ حد جواز تک ہو افسوس آج ہم میں یہ بات نہیں رہی حالانکہ یہ خاص مسلمانوں کا وصف ہے اور اشاعت اسلام زیادہ تر اسی دلجوئی سے ہوئی ہے لوگ کہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب دیا کرتے تھے کہ شمشیر کے لئے شمشیر زن بھی تو چاہیئں تو وہ شمشیر زن کہاں سے جمع ہوگئے تھے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہی نے جمع کیا تھا پس ثابت ہوا کہ در اصل اشاعت اسلام اخلاق اسلامیہ سے ہوئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و رحمت کا یہ عالم تھا کہ جب آپ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ سے طائف تشریف لے گئے ہیں تو وہاں کے رؤسا نے آپ کو سخت جواب دیا اور قبول اسلام سے انکار کر دیا، اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بستی کے شہدوں کو بھڑکا دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈھیلے پتھر پھینکیں اس وقت غیرت خداوندی کو جوش ہوا اور بحکم الٰہی حضرت جبرئیل علیہ السلام ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) کو ساتھ لے کر آئے اور عرض کیا کہ حق تعالےٰ نے سلام کے بعد فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کی قوم کا برتاؤ آپ کے ساتھ دیکھا اور ملک الجبال کو حکم دیدیا ہے کہ آپ جو کچھ اس سے فرمائیں اس کی تعمیل کرے۔ اگر آپ حکم دیں تو یہ اسی وقت طائف کے دونوں پہاڑوں کو باہم ملا دے جس سے ساری آبادی پس کر رہ جائے مگر اللہ رے آپ کی رحمت آپ نے فرمایا کہ چھوڑ دو مجھ کو اور میری قوم کو میں ان کی تباہی نہیں چاہتا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ان کی آنکھیں کھل جائیں اور اگر یہ اسلام نہ لائیں تو مجھے امید ہے کہ شاید ان کی اولاد میں سے کوئی شخص خدا کی توحید کا اقرار کرلے۔ آپ کی دلجوئی کی یہ حالت تھی کہ جب بنو ثقیف کے کفار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اتارا کہ پاس کے پاس ان کی خاطر مدارات اچھی طرح ہو سکے اور یہ بھی مصلحت تھی کہ وہ مسلمانوں کی عبادات اور نماز وغیرہ کو اچھی طرح دیکھ لیں چنانچہ ان پر اس کا

اثر ہوا اور وہ اسلام لانے پر آمادہ ہو گئے) پھر یہ بھی دلجوئی کی کہ بعض نے اسلام لاتے کے لئے یہ شرط پیش کی تھی کہ ہم زکوٰۃ نہ دیں گے بعض نے کہا کہ ہم جہاد نہ کریں گے آپ نے فرمایا اچھا بہتر ہے تم زکوٰۃ نہ دینا نہ جہاد کرنا۔ صحابہ کو اس شرط کی منظوری پر حیرت ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ جب یہ اسلام لے آئیں گے تو سب کچھ کریں گے کیونکہ جب اسلام دل میں آجاتا ہے تو یہ حالت ہو جاتی ہے ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

(جس شخص نے تجھکو پہچان لیا وہ جان کو کیا کریگا اہل و عیال مال و اسباب کو لیکر کیا کرے گا)

اسلام کے بعد نہ مال کی محبت رہتی ہے نہ جان کی، اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حسین کسی سے کہے کہ مجھے دیکھو اور دیکھنے والا کہے کہ اس شرط سے دیکھتا ہوں کہ بیوی کو نہ چھوڑوں گا اور وہ اس شرط کو منظور کر لے تو حقیقت میں یہ منظوری محض ظاہری ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھ کو دیکھنے کے بعد یہ خود ہی سب کو چھوڑ دے گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری بھی محض ظاہری تھی جو حقیقت میں نامنظوری تھی آپ جانتے تھے کہ یہ سب شرطیں اسلام لانے سے پہلے ہی ہیں اسلام کے بعد یہ خود ہی سب کچھ کریں گے چنانچہ یہی ہوا کہ اسلام کے بعد ان لوگوں نے جہاد بھی کیا اور زکوٰۃ بھی دی۔ اس دلجوئی ہی سے لوگ کھینچے چلے آتے تھے اس لئے ہمارے اکثر بزرگوں نے نرمی اور دلجوئی سے بہت کام لیا ہے (مجھے حضرت حاتم اصم کی حکایت یاد آئی کہ ایک شخص نے مجمع میں ان کے سامنے ہدیہ پیش کیا اول تو انھوں نے قبول سے انکار کیا اس نے اصرار کیا تو آپ نے لے لیا۔ لوگوں نے بعد میں پوچھا کہ حضرت اگر آپ کو لینا ہی تھا تو پہلے انکار کیوں کیا اور جو نہ لینا مقصود تھا تو بعد میں کیوں لے لیا۔ آپ نے فرمایا کہ اصل میں تو مجھ کو لینا مقصود نہ تھا اس لئے انکار کر دیا تھا مگر پھر میں نے دیکھا کہ اس وقت مجمع میں ہدیہ رد کر دینے سے اس شخص کی ذلت ہو گی اور میری عزت

اور لے لینے سے میری ذلت ہوگی کہ انکار کے بعد لے لیا اور اس کی عزت ہوگی تو میں نے اپنے بھائی کی عزت کو اپنی عزت پر ترجیح دی اب ہماری یہ حالت ہے کہ دلجوئی کریں گے تو ایسی کہ حرص میں مبتلا ہو جائیں گے پس جو آیا لے لیا چاہے حرام ہو یا حلال واپس کرنا جانتے ہی نہیں یا استغنا برتتے ہیں تو ایسا جو کبر تک پہونچ جاتا ہے استغنا میں چونکہ اپنی عزت ہوتی اور ایک قسم کا حظ حاصل ہوتا ہے اس لئے اس میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں کہ پھر کسی کا دل توڑنے کی بھی پروا نہیں کرتے غرض ہماری کوئی بات اعتدال کی نہیں بس یہ حالت ہے ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی
چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

(جب بھوکا ہوتا ہے تو کتا جیسا ہو جاتا ہے اور جب شکم سیر ہوتا ہے تو مغرور و متکبر بن جاتا ہے)

مجھے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی، بلکہ دو حکایتیں یاد آئیں ایک سے حضرت کی شان استغنار کا پتہ چلے گا، دوسری سے تواضع کا۔ تواضع تو اس سے ظاہر ہے کہ حضرت جب ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو اول اول ایک رباط میں قیام فرمایا ایک دن کوئی شخص رباط میں رہنے والوں کو ایک ایک دوانی تقسیم کرتا پھر رہا تھا جب وہ حضرت کے حجرہ پر پہونچا تو یہاں شاہانہ دربار تھا۔ حق تعالٰے نے حضرت کو لطیف طبیعت عطا فرمائی تھی اس لئے سب صاف ستھرا سامان رہتا تھا، وہ یہ دیکھ کر رکا اور حضرت کو دونی نہ دی تو آپ خود فرماتے ہیں کہ بھائی تم نے ہمارا حصہ نہ دیا وہ کہنے لگا حضرت آپ کی خدمت میں ایسی حقیر چیز پیش کرنا خلاف ادب ہے۔ فرمایا سبحان اللہ اگر شخص یہی سمجھتا تو پھر یہ سامان کہاں سے ہوتا کیا تم مجھے زمرۂ فقراء سے خارج سمجھتے ہو بھائی میں تو فقیر ہی ہوں اور فقیر سمجھ کر ہی لوگ کچھ دے دلا جاتے ہیں اُسی سے یہ سامان اکٹھا ہو گیا جو تم دیکھ رہے ہو لاؤ تم میرا حصہ لاؤ یہ سن کر تو وہ شخص باغ باغ ہو گیا کہ اللہ اکبر میرے ایسے کہاں نصیب کہ حضرت خود مانگیں اور خوشی خوشی ایک دونی پیش کردی

یہ تو شان تواضع تھی کہ ایک دونی کے لئے بھی اپنی احتیاج ظاہر فرمائی اور شان استغنا یہ تھی کہ ایک دفعہ حضرت پر کئی دن کا فاقہ تھا ایک میمن نے صورت سے پہچان لیا کہ حضرت فاقے سے ہیں وہ حضرت کی لنگی مانگ کر لے گیا اور اس میں دو سو ریال باندھ کر لایا۔

اس وقت حضرت نماز یا ذکر میں مشغول تھے وہ پاس رکھ کر چلا گیا۔ اب استغنار کی یہ کیفیت دیکھئے کہ حضرت نے جب لنگی اٹھائی تو اس کا وہم بھی نہ ہوا کہ یہ ریال اس نے مجھے دیئے ہیں بلکہ یہ سمجھے کہ امانت رکھ گیا ہے، اٹھا کر احتیاط سے امانت کی جگہ رکھدیا دوسرے وقت پھر فاقے سے رہے۔ اس میمن نے جب دوسرے وقت بھی اسی حال سے دیکھا تو آکر عرض کیا کہ آپ نے وہ ریال خرچ کیوں نہ کر لئے۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی امانت کو کیسے خرچ کر لوں کہا حضرت وہ امانت نہ تھی بلکہ وہ تو میں ہدیہ دے گیا تھا۔ فرمایا ہدیہ اس طرح دیا کرتے ہیں کہ پاس رکھ کر چلے گئے کچھ کہا نہ سُنا اُس نے غلطی کی معافی چاہی تب آپ نے ان کو خرچ کیا تو شان استغنا یہ تھی کہ دو سو ریال پر (جو کہ دو سو روپے سے زیادہ ہوتے ہیں) ضرورت و حاجت کے وقت بھی ہدیہ کا گمان نہ ہوا بلکہ امانت ہی سمجھتے رہے ہم سوال ہوتے تو نہ معلوم کتنی تاویلیں کر کے اس کو ہدیہ بنا لیتے اور کوئی دونی لا کر ہم کو دیتا تو اس کو سو سناتے کہ ہم کیا غریب محتاج ہیں تجھ کو آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ بس دوانیاں بانٹتے چلے تو جو سامنے آیا اس کو غریب سمجھ کر ایک دوانی دیدی یہ کوئی آدمیت ہے۔ ان حضرات میں استغنار بھی تواضع کے ساتھ تھا اس لئے اگر کسی وقت استغنار سے دوسرے کی ذلت ہوتی تو وہاں یہ حضرات صورت استغنار کو چھوڑ کر تواضع کی صورت اختیار کر لیتے تھے جیسا حضرت حاتم اصمؒ نے کیا کہ اپنی عزت کو مسلمان کی عزت پر نثار کر کے انکار کے بعد بھی اس کا ہدیہ قبول کر لیا۔ صاحبو! یہ برتاؤ تھا ہمارے بزرگوں کا وہ استغنا اور دلجوئی دونوں کو جمع کرتے تھے۔ ہمارے حضرات عاقل عالم شیریں دلجو خلیق اور مستغنی سب کچھ ہوتے تھے ان کی وشان تھی ؎

حسن یوسف دم عیسٰی ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(حسن یوسف دم عیسٰی ید بیضا رکھتے ہو جو تمام محبوب رکھتے ہیں وہ تنہا تمہارے اندر ہیں)

(ماخوذ از ...)

مگر اب یہ حالت ہے کہ ایک طبقہ نے ایک بات لے لی دوسرے نے دوسری بات لے لی کوئی حد سے زیادہ خلیق بن گیا کوئی مستغنی بن گیا اور افسوس ہے کہ باہم اہل حق کے اندر الگ الگ پارٹیاں ہوگئیں۔ جدا جدا طبقے ہوگئے ہماری یہ حالت افسوسناک ہے میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اختلاف حد شرع سے متجاوز ہے تو جس نے تجاوز کیا ہو وہ اپنی اصلاح کرے اور اگر حدود شرعیہ کے اندر ہے تو یہ پارٹی بندی کیسی سب کو یہ تفریق قطع کر کے ایک ہو جانا چاہیئے۔ آخر اختلاف مذاق حد شریعت کے اندر اندر تو سلف میں بھی ہوا ہے مگر وہاں تفریق نہ تھی کوئی ایک دوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا مگر اب یہ حالت ہے کہ ہر ایک کو دوسرے پر اعتراض کرتا ہے نہ ادھر تہذیب رہی نہ اُدھر۔ ہم کو اپنے سلف کے حالات میں غور کرنا چاہیئے۔ ہمارے بزرگان دین کی حکائتیں بھی ایسی ہیں کہ ان سے اصلاح ہو جاتی ہے۔ سلف کی حکایات کو اصلاح میں بڑا دخل ہے اس لئے حکایات سلف کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ وہ کس طرح نرمی اور دلجوئی کرتے تھے۔ مولانا شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے وعظ میں ایک شخص آیا جس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچا تھا جب وعظ ختم ہوچکا تو آپ نے اس شخص کو ٹھہرالیا وہ ڈرا کہ اب میری خبر لی جاوے گی مگر مولانا تو ایسے پردہ پوش تھے کہ ایک بار آپ کے درس حدیث میں ایک معمولی طالب علم جنابت کی حالت میں بدون نہائے چلا آیا آپ کو کشف سے معلوم ہوگیا کہ یہ جنبی ہے فوراً آپ نے درس بند کر کے اس سے فرمایا کہ بھائی وہاں ہی ٹھہرو آج تو جمنا کی سیر کو دل چاہتا ہے آپ اور سب طلبہ تیار ہوگئے اور وہاں جا کر غسل کیا اس نے بھی غسل کیا۔ پھر فرمایا لاؤ کچھ پڑھ لو ناغہ کیوں کیا جاوے۔ تو مولانا کسی کی کیا خبر لیتے۔ چنانچہ اس شخص کو ٹھہرا کر فرمایا کہ بھائی مجھ میں ایک عیب ہے کہ میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچا لٹک جاتا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ٹخنوں سے نیچا پائجامہ پہنے وہ جہنم میں جائیگا تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں اس عذاب میں گرفتار نہ ہوں ذرا دیکھنا میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے تو نہیں۔ وہ شخص قدموں میں گر پڑا کہ حضرت خدانخواستہ

آپ میں یہ عیب کیوں ہوتا یہ عیب تو میرے اندر ہے میں آج سے توبہ کرتا ہوں پھر ایسا کبھی نہ کروں گا یہ تھی ہمارے بزرگوں کی نرمی اور دلجوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو کیوں چھوڑتے چنانچہ آپ نے احباب کی دلجوئی کے لئے لباس کا بدلنا منظور فرمایا۔ اب دوسرے جوڑے کی تلاش ہوئی اور امیر المؤمنین کی گٹھری دیکھی گئی تو اس میں دوسرا جوڑا کہاں تھا وہ روپیہ پیسہ رو پیہ جمع کرتے تھے نہ جوڑے اور کپڑے بس آپ کے پاس تو وہی ایک جوڑا تھا جو تن پر تھا۔ سید احمد دحلان نے غالباً فتوحات اسلامیہ میں آپ کے زہد کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب انتقال کے وقت عزرائیل علیہ السلام آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر کو دیکھ کر بولے سبحان اللہ امیر المؤمنین کا گھر ہے جہاں کچھ بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا جس گھر میں تم آنے والے ہو اس کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ غرض کسی مسلمان نے ایک جوڑا مانگا دیدیا جس کو پہنکر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے مگر دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً اتر پڑے اور فرمایا کہ تم نے تو اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کر دیا تھا یہ کپڑے پہن کر اور اس سواری پر سوار ہو کر تو میری حالت بدل گئی لاؤ میرے وہی کپڑے اور وہی اونٹنی (واقعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شیطان بالکل عاجز تھا اور عاجز کیا معنے ڈر کر دور بھاگتا تھا اُن پر شیطان کا کبھی قابو نہیں چلا ۱۲) چنانچہ اس حالت سے نصاریٰ کے سامنے پیش ہوئے اور یہی ہیئت سبب ہوئی فتح بیت المقدس کی کیونکہ ان کی کتابوں میں آپ کی یہی شان لکھی گئی تھی۔ غرض ہمارے بزرگان دین کا یہ طرز تھا کہ تکلف اور تصنع سے بہت احتراز کرتے تھے سادگی اور بے تکلفی ان کا شعار تھا مسلمانوں کو اپنی معاشرت ایسی ہی رکھنا چاہیئے اور میں بالخصوص اہل علم کو بھی ایک بات کہتا ہوں گو ان کو کسی کے کہنے سننے کی ضرورت نہیں مگر خیر بے ضرورت بھی تو بعض باتوں کر لی جاتی ہیں وہ یہ کہ علماء کی سادگی صرف اسی بات میں نہیں کہ وہ کسی خاص موقعہ پر جوڑا نہ بدلیں بلکہ ہماری اصلی سادگی اور بے تکلفی یہ ہے کہ اگر کوئی بات ہم کو معلوم نہ ہو یا کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آئے تو پچاس آدمیوں کے سامنے کہدیں کہ ہم کو معلوم نہیں یا ہماری سمجھ میں نہیں آیا مدرس کی بے تکلفی یہ ہے کہ اگر اس سے کسی مقام کی تقریر میں غلطی ہو جائے اور شاگرد متنبہ کرے تو

فوراً اپنی غلطی کا اقرار کرلے۔ آج ہم اس صفت کو مفقود پاتے ہیں۔ مگر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دس مرتبہ کی حکایت ہے کہ جہاں آپ سے تقریر میں کچھ فرو گذاشت ہوا اور کسی طالب علم نے عرض کردیا تو فوراً فرما دیتے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی اور صحیح تقریر یہی ہے جو تم نے کی اور مولانا کا اس حالت کا ایسا غلبہ ہوتا تھا کہ اس کو ایک ہی مجلس میں بار بار فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور ہم میں یہ مرض ہے کہ طلبہ کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے اگر وہ صحیح بھی کہتا ہوگا تو گھونٹ گھانٹ کر اسے بند کردیں گے پھر یہ مرض متعدی ہوا کہ ان طالب علموں نے بھی اپنے شاگردوں کو گھونٹنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ سب میں تکلف اور تصنع کا مرض اچھی طرح سرایت کر گیا اور جہل مرکب میں مبتلا رہے سو الگ۔ میں نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت اپنے دو بزرگوں سے سنی ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک بزرگ عالم قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے اس طرح کہ پہلے آیت پڑھتے اس کے متعلقات ہر فن کے مسائل بیان کرتے۔ حضرت شاہ صاحب بھی ان کے حلقہ میں کبھی کبھی جا بیٹھتے تھے۔ ایک دن شیخ نے کسی مقام پر ایک فقہی مسئلہ میں غلطی کی اس وقت تو شاہ صاحب خاموش رہے جب درس ختم ہو چکا اس وقت پاس جا کر چپکے سے متنبہ کیا کہ یہ مسئلہ مجھ کو اس طرح یاد ہے۔ ان بزرگ نے فوراً تمام طلبہ کو واپس بلایا سب جمع ہو گئے تو کہا قَدْ غَلَطْنَا فِیْ هٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ وَ نَبَّهَنَا عَلَیْهِ هٰذَا الشَّیْخُ وَالصَّحِیْحُ هٰكَذَا۔ یعنی ہم نے اس مسئلہ میں غلطی کی جس پر ہم کو اس شیخ (ہندی یعنی شاہ صاحب) نے متنبہ کیا اور صحیح تقریر اس کی یوں ہے پھر شاہ صاحب کی بیان کردہ تقریر کا اعادہ کیا دیکھئے علماء یہ حضرات ہیں کہ ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی رکاوٹ نہیں ہوئی کہ ہم سے یہاں غلطی ہوگئی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ یوں بھی کہہ دیا کہ اس شیخ نے ہم کو متنبہ کیا حالانکہ حضرت شاہ صاحب نے خفیہ اسی لئے متنبہ کیا تھا کہ اگلے دن یہ اس مقام کی صحیح تقریر اپنی طرف سے کردیں مگر ان کو اتنا صبر کہاں تھا اسی وقت سب کو

بلاکر صاف اپنی غلطی کا اقرار کیا اور اپنے محسن کو بھی ظاہر کر دیا جس نے غلطی پر متنبہ کیا تھا اگر ہم سوال ہوتے تو اول تو اپنی غلطی ہی کو تسلیم نہ کرتے اُسی میں بحث شروع کر دیتے اور جو تسلیم بھی کرتے تو اس طرح صاف صاف اقرار نہ کرتے اور جو کرتے بھی تو یہ ظاہر نہ کرتے کہ اس غلطی پر ہم کو کسی دوسرے نے متنبہ کیا ہے بلکہ اگلے دن اس طرح تقریر کرتے کہ طلبہ پر یہ ظاہر ہوتا کہ شیخ کو خود ہی تنبہ ہوا ہے۔ آخر یہ کبر اور تصنع نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔

صاحبو! کسی بات کے متعلق لاعلمی ظاہر کر دینا کوئی نقص نہیں نہ کوئی عیب ہے ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سوال پر لَا اَدْرِی (میں نہیں جانتا) فرمایا ہے چنانچہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ سب سے اچھی جگہ کونسی ہے اور سب سے بُری جگہ کونسی ہے۔ آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھ کر بتلاؤں گا۔ چنانچہ حضرت جبرئیل سے پوچھا انہوں نے کہا مجھے بھی معلوم نہیں، حق تعالیٰ سے پوچھ کر بتلاؤں گا حق تعالیٰ سے پوچھا تو ارشاد ہوا خَیْرُ الْبِقَاعِ الْمَسَاجِدُ وَشَرُّ الْبِقَاعِ السُّوْقُ۔ سب سے اچھی جگہ مسجد ہے اور سب سے بدتر بازار ہے۔ دیکھئے بعض دفعہ انبیاء اور ملائکہ نے بھی لَا اَدْرِی (مجھے معلوم نہیں) فرمایا ہے تو پھر آپ کی اس میں آپ کی کیا شان گھٹتی ہے مگر افسوس ہم سے کبھی یہ نہیں ہو سکا۔ پس اگر کسی عالم میں یہ وصف موجود ہو تو بیشک فخر کی بات ہے اور واقعی اس میں تصنع و تکلف نہیں ہے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو اس کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے باقی یہ کوئی فخر نہیں کہ ہم نے عمامہ نہیں باندھا جبہ نہیں پہنا ننگے پیر چل لئے کیونکہ ان باتوں سے تو تعریف ہوتی ہے لوگ کہتے ہیں کہ فلانا بہت بے نفس اور متواضع ہے اور جس بات سے تعریف ہوتی ہو اس کا اختیار کرنا بڑا کمال نہیں اور اگر یہ کہو کہ لَا اَدْرِی (مجھے معلوم نہیں) کہنے میں بھی تو تعریف ہوتی ہے۔ تو یہ سچ ہے مگر اس وقت تو ذلت ہی ہوتی ہے گو بعد میں تعریف ہو۔ یہ ساری گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے بعض صاحبوں کو

روشنی زیادہ کرمے کے اہتمام میں دیکھا تھا اس پر میں نے یہ سب باتیں عرض کی ہیں کہ ہم میں بے تکلفی اور سادگی ہونا چاہیئے گو اس مضمون آیت سے کوئی تعلق نہ تھا ویسے ہی درمیان میں ایک ضروری بات پر متنبہ کرنا چاہا تھا۔ اور دیر تک اس کو ممتد کرنے کا قصد نہ تھا یہ خدا ساز بات ہے کہ اس پر گفتگو بڑھ گئی ممکن ہے کہ اس میں کوئی مصلحت ہو اپنی طرف سے تو میں بیان میں ارتباط کا لحاظ رکھتا ہوں لیکن جب حق تعالیٰ کسی خاص مضمون کو بیان کرانا چاہتے ہیں تو پھر ربط وغیرہ کا خیال نہیں رہتا اس وقت وہی کہنا پڑتا ہے جو وہ کہلواتے ہیں جیسا کہ مولانا رومی نے بیان فرمایا ہے ؎

قافیہ اندیشم و دلدار من گویدم مندیش جز دیدار من

(میں قافیہ سوچتا ہوں اور میرا محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ میرے دیدار کے سوا کچھ مت سوچ)

مثنوی پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ اس میں بعض مقامات پر قافیہ کی رعایت نہیں ہے کوئی کوئی شعر بے قافیہ ہو گیا ہے تو مولانا نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ میں تو قافیہ کی رعایت کرنا چاہتا ہوں مگر دلدار کا یہ اشارہ ہے کہ میرے دیدار کے سوا کسی چیز کی طرف توجہ مت کرو اس لئے جہاں بے تکلف قافیہ بن جاتا ہے بنا دیا جاتا ہے اور جہاں سوچنا پڑتا ہے وہاں سوچتا نہیں ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعر میں قافیہ کی ضرورت نہیں۔ شاعری میں قافیہ ہونا چاہیئے مگر یہ بھی نہیں کہ اس کا ایسا پابند ہو کہ مضمون کو قافیہ کے تابع کیا جائے جیسا کہ اکثر شعراء کی عادت ہے کہ وہ بعض اشعار محض قافیہ کی رعایت سے تصنیف کرتے ہیں بلکہ بلاغت اس کا نام ہے کہ قافیہ کو مضمون کے تابع کیا جائے اور جہاں مضمون کے موافق قافیہ نہ ملے وہاں مضمون کی رعایت کرنا چاہئے نہ کہ قافیہ کی کیونکہ یہ بھی تکلف میں داخل ہے مگر ایسا بھی بے تکلف نہ ہو جیسا ہمارے ایک دوست نے جو خورجہ کے رہنے والے ہیں ظرافت میں ایسا کیا وہ ایک عربی خواں بد دماغ نیچری سے ملے جن کو انہوں نے ایک دیوان کسی استاد کا پیش کیا تھا اُس نے غایت بد دماغی سے یہ بھی نہ دیکھا کہ کس کا دیوان ہے۔ پوچھتے ہیں یہ کس کا دیوان ہے انھوں نے کہا میرا دہ بولے آپ

شاعر بھی ہیں انہوں نے کہا جی ہاں ۔ بولے آپ کوئی شعر فی البدیہہ کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں بولے کہ اچھا کوئی شعر کہیے انہوں نے یہ شعر پڑھا ؎

گر مصور تیری تصویر اینچے اُس کے اس کام کو دو مہینے چاہئیں

انہوں نے کہا یہ شعر کیسا جس میں نہ وزن نہ قافیہ تو کہنے لگے حضور میں نے آپ کی ایک تحریر میں پرانے فیشن کی مذمت دیکھی تھی جب سے سب پرانی چیزیں چھوڑ دیں اور یہ بھی پرانا فیشن ہے کہ وزن بھی ہو بحر بھی ہو قافیہ بھی ہو اس لئے میں نے اس کو بھی حذف کر دیا۔ ہمارے قصبہ میں ایک شاعر تھے وہ ناپ کر شعر کہا کرتے تھے۔ یعنی شعر کہہ کر ہر مصرع کو تاگے یا تنکے سے ناپ لیا۔ اگر دونوں برابر ہو گئے تو بس شعر بن گیا اور اگر کوئی مصرع بڑھنے لگا تو اس کو باریک قلم سے لکھ کر برابر کر دیا۔ جب ان کا دیوان چھپنے لگا تو لوگوں نے کہا اس میں ردیف ضاد تو ہے ہی نہیں آپ نے پوچھا کہ کسی ردیف میں کئی غزلیں بھی ہیں لوگوں نے بتلایا کہ ہاں فلاں ردیف میں کئی غزلیں ہیں تو آپ نے کہا کہ ان میں سے ایک غزل کے ہر شعر کے اخیر میں مقراض بڑھا دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ضاد کی ردیف تیار ہو گئی جس میں ہر شعر کے ختم پر مقراض ہے واہیات چاہے تُک ہو یا نہ ہو مگر مقراض موجود ہے (واقعی وہ سارا دیوان ہی مقراض سے کترنے کے قابل ہے) تو میں ایسی بےتکلفی کو نہیں کہتا۔ اس پر مجھے غالب کی حکایت یاد آئی کہ اس نے اپنے ایک دوست کی دعوت کرنا چاہی تو اس نے انکار کیا اور کہا تم تکلف بہت کرتے ہو، غالب نے کہا اس مرتبہ تکلف نہ کروں گا اس نے اس وعدہ پر دعوت قبول کی اب آپ نے بےتکلفی کا یہ ڈھنگ اختیار کیا کہ بھنگی سے کہہ دیا کہ محلہ بھر کا کوڑا ہمارے گھر میں جمع کر دینا وہ کمبخت ایک ٹیلہ سا ہو گیا اس پر آپ ایک لنگوٹہ باندھ کر اور حقہ سامنے رکھ کر بیٹھ گئے جب وہ دوست کھانے کو آئے تو غالب کو اس حلیہ سے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، کہا کچھ نہیں آج میں نے تکلف نہیں کیا۔

تو مولانا کے کلام میں بےتکلفی ضرور ہے مگر خدا نہ کرے وہ ایسی نہیں ہے مولانا کا کلام شاعری کے اعتبار سے بھی بہت بلند پایہ ہے ہاں کہیں کہیں تسامحات بھی ہیں

(اور اتنے طویل کلام میں اگر دو چار جگہ تسامحات ہو جائیں تو یہ کوئی نقص نہیں آخر چھے دفتر کچھ تھوڑے نہیں ہیں ۱۲) پھر ان کی وجہ بھی مولانا نے بیان فرمادی ہے کہ ؎

قافیہ اندیشم و دلدار من ... گویدم مندیش جز دیدار من

(میں قافیہ کو سوچتا ہوں اور میرا محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ میرے دیدار کے علاوہ اور کچھ مت سوچ)

اسی طرح گو بیان میں بھی ربط کا ہونا ضروری ہے مگر درمیان میں جب کوئی دوسرا ضروری مضمون ذہن میں آجاتا ہے تو میں اس کو چھوڑتا نہیں ربط کی ایسی پابندی بھی نہ چاہئے کہ ضرورت کا بھی لحاظ نہ کیا جائے اس لئے درمیان میں تکلف اور بے تکلفی پر یہ مضمون ایک ضرورت سے بیان ہوگیا گو ظاہر میں یہ اجنبی کلام تھا مگر بحمداللہ یہاں تو بے ربطی میں بھی ربط باقی ہے کہ درمیان میں ایک ضرورت سے دوسری بات آگئی تھی اس کو ختم کرکے پھر اپنے اصل کلام کی طرف عود کر آیا ہوں تو میں اسکو بیان کر رہا تھا کہ اس مقام پر حق تعالےٰ نے ہماری دو محبوب چیزوں کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے بعض مفاسد پر ہم کو مطلع فرمایا ہے جن میں اکثر لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ مضمون اس وجہ سے بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہماری بدحالیوں کا زیادہ سبب انہی دو چیزوں کی محبت ہے چنانچہ محبت مال کی بدولت باہم بغض و عداوت ہو جاتی ہے مسلمانوں میں جو آئے دن مقدمہ بازی ہوتی ہے اس کا منشا یہی محبت مال ہے نیز محبت مال ہی کی وجہ سے دوسروں کا حق دبایا جاتا ہے۔

صاحبو! آپ اپنے امراض کو اچھی طرح جانتے ہیں میں کوئی دقیق بات نہیں بیان کر رہا ہوں یہ تو کھلی ہوئی باتیں ہیں جن کو ہر شخص اپنے اندر غور کرکے جان سکتا ہے۔ صاحبو! کیا آپ اس کا انکار کر سکتے ہیں کہ ہم لوگ اکثر بیٹیوں کو حصہ نہیں دیتے زیادہ تو یہ ہے کہ خود باپ ہی ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے سامنے ہی سب جائداد لڑکوں کو دے جاتے ہیں اور اگر باپ نے ایسا نہ کیا تو بعد کو بھائی ایسا کرتے ہیں کہ بہنوں کو حصہ

ے ربط کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۸ سطر ۸ قولہ جس قدر دھندے ہیں سب ان ہی دو کیواسطے ہیں ۱۲

نہیں دیتے۔ دنیادار تو ان کا حق ہی نہیں سمجھتے مگر وہ اس میں یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ بہنوں نے ہم کو معاف کر دیا۔ میں کہتا ہوں اول معافی کی حقیقت تو سمجھ لیجئے پھر میں پوچھوں گا کہ کیا بہنیں اسی طرح معاف کرتی ہیں۔

معافی کی حقیقت یہ ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا۔ حق تعالےٰ مردوں کو خطاب فرماتے ہیں کہ اگر عورتیں اپنے مہر میں سے کچھ حصہ دل کی خوشی سے تم کو دیدیں تو اُسے کھاؤ خوش گواری اور لذت کے ساتھ اس سے معلوم ہوا کہ معافی یا عطا کے لئے خوش دلی ضروری ہے مگر یہاں اس کی ذرا پرواہ نہیں کی جاتی کہ بہن نے خوشی سے دیا ہے یا اوپرے دل سے۔ پس جہاں اس کی زبان سے اتنا نکلا کہ میں نہیں لیتی اور بھائی جان نے اس کو معافی سمجھ لیا۔ پھر الٹ کر اس سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ تو یہ بات دل سے کہہ رہی ہے یا محض زبان سے۔ اور یہیں سے میں اس پر بھی متنبہ کرتا ہوں کہ آجکل جو چندہ لیا جاتا ہے اس میں بھی اکثر خوش دلی کا اہتمام نہیں کیا جاتا گو اس میں دینے والوں پر بھی ملامت ہے کہ وہ دین کے کاموں میں خوشی سے کیوں نہیں خرچ کرتے لیکن اگر وہ یہ کوتاہی کرتے ہیں تو اس سے لینے والوں کو وہ چندہ حلال نہ ہو جائے گا حدیث میں صاف حکم موجود ہے اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ (یاد رکھو کسی مسلمان آدمی کا مال بدون اس کی خوش دلی کے حلال نہیں ہوتا) اگر کسی نے محض شرم ولحاظ سے چندہ دیا ہو تو اس کا لینا ہرگز جائز نہیں اگر یہ کہا جائے کہ صاحب اتنی احتیاط کی جائے تو چندہ بہت کم آئے گا جس سے کام نہیں چل سکتا تو اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ کام نہیں چل سکتا آپ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ ضروری کام میں تو اتنا ہی روپیہ صرف ہوتا ہے جو حدود شریعت کے موافق آتا ہو اور جو ایسا ویسا چندہ ہوتا ہے وہ کام میں صرف نہیں ہوتا بلکہ بے ترکا خرچ ہوتا ہے کہیں بے ضرورت عمارات میں کہیں مہمانوں کی فضول خاطر مدارت میں وغیرہ وغیرہ اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ قلیل چندہ سے کام نہیں چل سکتا تو میں پوچھتا ہوں کہ کام چلانے سے غرض کیا ہے ظاہر ہے کہ یہی غرض ہے کہ حق تعالیٰ راضی ہوں تو اگر وہ راضی نہ ہوئے تو بتلایئے کام

چلا کر کیا کیجئے گا بس سہل صورت یہ ہے کہ حدود شریعت کے موافق چندہ لو اور جتنا کام اس میں چل سکے اتنا چلاؤ زیادہ کا قصد ہی نہ کرو اگر کسی وقت زیادہ چندہ آجاوے اس وقت اور کام بڑھا دو اور اگر پھر کم ہو جائے تو تم کام کو بھی کم کر دو کیونکہ آپ اتنے ہی کام کے مکلف ہیں جتنا کر سکتے ہیں اس سے زیادہ کے مکلف نہیں تو جتنا کام حلال چندہ میں آپ کر سکیں اس سے زیادہ ہرگز نہ کریں تاکہ حرام چندہ کی ضرورت ہی نہ ہو مگر اب تو یہ حالت ہے کہ ابتدا ہی سے بڑے پیمانہ پر کام شروع کیا جاتا ہے اور اس کیلئے حلال چندہ کافی نہیں ہوتا تو پھر حدود سے آگے بڑھتے ہیں اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ کون خوشی سے دے رہا ہے اور کون دباؤ یا لحاظ سے یہی معاملہ بہنوں کے حق میں ہو رہا ہے کہ اہل علم نے تاویل کر لی ہے کہ اس نے تو اپنا حق معاف کر دیا میں پوچھتا ہوں کہ ذرا انصاف سے کہنا کیا بہنوں نے خوشی سے اپنا حق چھوڑا ہے ہرگز نہیں بلکہ محض بدنامی کے خوف سے کیونکہ بہنوں کے لئے یہ بات عیب شمار کی جاتی ہے کہ وہ باپ کی جائداد حصہ لیں۔ نیز وہ اس خیال سے بھی نہیں لیتیں کہ اگر ہم حصہ لے لیں گے تو پھر شادی بیاہ کے موقعہ پر بھائی ہمیں پوچھیں گے نہیں اور نہ چھوٹ چھٹاؤ ہو جائے گا تو یہ دینا کچھ خوشی کا دینا نہ ہوا۔ دوسرے دینا اس شخص کا معتبر ہوتا ہے جسے شئے موہوب کی حقیقت بھی معلوم ہو یعنی جس چیز کو دے رہا ہے وہ اس کی حقیقت بھی سمجھتا ہو اور جسے اپنے فعل کی حقیقت بھی معلوم نہ ہو اس کا دینا معتبر نہیں یہی وجہ ہے کہ نابالغ اور معتوہ پر حجر کیا جاتا ہے یعنی اس کو تصرفات سے روک دیا جاتا ہے اور اس کی جائداد کورٹ ہو جاتی ہے کہ اس میں وہ کچھ بیع و شرا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنے تصرفات کی حقیقت سے بے خبر اور نفع و ضرر سے ناواقف ہے اب دیکھئے کہ بہنیں جو اپنا حق چھوڑ دیتی ہیں کیا ان کو اپنے اس فعل کی حقیقت معلوم ہوتی ہے، ہرگز نہیں لڑکیوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ جائداد کیا چیز ہوتی ہے اور وہ کیسی قیمتی چیز کو چھوڑ رہی ہیں اس لئے بدون تجربہ کے ان کی معافی معتبر نہ ہوگی بلکہ اس بارہ میں وہ مثل معتوہ کے شمار ہوں گی سچی معافی کی صورت یہ ہے کہ وہ تین چار برس تک اپنی جائداد پر قابض رہیں، ہر فصل کی پوری

آمدنی وصول کرتی رہیں جب اس عرصہ میں ان کو جائداد کی حقیقت اور اس کا نفع اور لذت خوب معلوم ہو جائے اس کے بعد بھی اگر وہ نہ لیں تو بیشک یہ دینا کچھ شمار کے قابل ہوگا۔ بعض لوگ یہ کہدیتے ہیں کہ صاحب ہم نے بیاہ شادی اور میلا لے رکھنے میں بہنوں کو اتنا دیدیا ہے جس سے ان کا حق ان کے پاس پہنچ گیا سو یہ دینا بالکل قابل اعتبار نہیں کیونکہ اس کو جائداد کی قیمت کہکر نہیں دیا جاتا اور نہ بہنیں اس کو قیمت سمجھ کر لیتی ہیں بلکہ یہ تو محبت کا برتاؤ سمجھ کر دیا جاتا ہے عقد بیع کے لئے ایجاب وقبول اور بدل کی تعیین اور اس پر تراضی طرفین ضروری ہے، یہاں ان میں سے ایک بات بھی نہیں ہوتی۔ پھر تمہاری ان سب باتوں کے مان لینے کے بعد بھی یہ بات ہے کہ بہن جو یہ کہدیتی ہے کہ میں نے اپنا حق معاف کر دیا اس سے تو کسی طرح بھی بھائی کے لئے بہن کا حق حلال نہیں ہو سکتا چاہے وہ خوشی ہی سے معاف کرتی ہو کیونکہ معافی کی حقیقت ابراء ہے اور ابراء دیون سے ہوتا ہے نہ کہ اعیان سے اور اگر اس کو ہبہ کہا جائے تو اول تو اس لفظ کے یہ معنی نہیں اور اگر ہوں بھی تو ہبہ کے لئے موہوب کا مقسوم ومفرز ہونا شرط ہے مشاع کا ہبہ درست نہیں اور عموماً بہنوں کی یہ معافی تقسیم وقبضہ سے پہلے ہوتی ہے۔ اس لئے کسی حال میں اس لفظ سے بہن کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اگر کسی بہن کو اپنا حق خوشی سے دینا ہی منظور ہو تو اس کی بے خلجان صورت یہ ہے کہ معافی کا لفظ نہ کہے بلکہ بھائی سے یوں کہے کہ میں نے اپنا حصہ تمہارے ہاتھ اتنے روپیہ میں بیع کیا اور وہ کہے میں نے قبول کیا اب زمین بہن کی ملک سے نکل گئی اور بھائی کے ذمہ زرثمن واجب ہو گیا اس زرثمن کو یہ بہن اگر چاہے معاف کر دے۔ اب بتلایئے اس طرح کون کرتا ہے اور افسوس یہ ہے کہ طریقہ معلوم ہونے کے بعد بھی کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ بہن کی گذشتہ معافی معتبر نہ تھی لاؤ اب اس سے دو بول پھر کہہ لیں ذرا سی سستی اور غفلت میں عمر بھر حرام کھاتے ہیں بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ زبان ہلانے میں کیا خرچ ہوتا ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہوتا ہے مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر کہ وہ معاملات میں قانونی رعایات تو بہت جلدی کر لیتے ہیں مگر شرعی رعایات نہیں کرتے اس کی پرواہ ہی نہیں کہ اس معاملہ میں شرعاً سقم ہے لاؤ اس کی اصلاح کر لیں اگر کوئی یہ عذر کرے کہ

بہن سے زبانی کہتے ہوئے شرم آتی ہے تو خط میں لکھ بھیجو اور اگر اتنا بھی نہیں ہوسکتا تو آپ کی وہی مثال ہوگی جو واجد علی شاہ کے احدیوں کی تھی کہ دو احدی ایک جگہ جمع تھے ایک لیٹا ہوا ایک بیٹھا ہوا سامنے سے ایک سوار گذرا تو لیٹے ہوئے احدی نے اس کو پکارا بھائی سوار ذرا یہاں آنا وہ آیا پوچھا کیا کہتا ہے کہا یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہے اٹھا کر میرے منہ میں ڈالدے اس نے کہا کمبخت تو نے اتنے ذرا سے کام کے واسطے میرا راستہ کھوٹا کیا اتنا کام تو خود نہیں کرسکتا کہنے لگا اللہ کے واسطے تو ہی منہ میں ڈالدے اب میں کہاں ہاتھ ہلاؤں پھر سینہ پر لاؤں پھر منہ تک لیجاؤں سوار نے اس کے دوسرے ساتھی سے کہا ابے تو اس کے پاس بیٹھا ہے تو نے ہی ڈالدیا ہوتا اس نے کہا بس جناب ایسی بات نہ کہئے گا میں کھلاؤں گا اسے بیر سنو کل میں لیٹا تھا اور یہ بیٹھا تھا میں نے جمائی لی تو اس وقت کتا میرے منہ کے اندر موتنے لگا تو اس سے اتنا نہ ہوا کہ اس کو ہٹا دیتا تو میں اسے بیر ضرور کھلاؤں گا۔

مجھے اس پر اپنے طبقہ کی بھی ایک حکایت یاد آئی کہ ہماری جماعت میں بھی ایک طبقہ اس قسم کا ہوتا ہے یعنی طالبعلموں کا طبقہ چنانچہ ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم کے حجرے میں چوہے نے بہت سی مٹی نکال کر ایک ڈھیر جمع کر دیا اور وہ حضرت روز اس کو دیکھتے تھے مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ باہر اٹھا کر پھینکدیتے یا سوراخ بند کر کے وہیں دبا دیتے بس جیسی چوہے نے نکالی تھی اسی طرح ڈھیر لگا رہا۔ ایک دن ہمارے بھائی صاحب کے کارندے جو حاجی بھی ہیں ان کے حجرہ میں آگئے تو ان کو ڈھیر لگا ہوا برا معلوم ہوا انہوں نے مٹی سوراخ میں بھر کر درست کر دیا اور حجرہ کی صفائی کر دی اس کے بعد پھر چوہے نے مٹی نکالدی کسی نے کہا میاں اس کو درست کر دیا ہوتا تو آپ فرماتے ہیں کہ حاجی جی آکر کریں گے۔ بس حاجی جی نے ایک دن صفائی کر کے ایسی خطا کر دی تھی کہ عمر بھر کے لئے وہی اس کام کے ملازم ہوگئے۔ خیر طلبہ کی اس کاہلی سے کوئی دینی ضرر تو ہوتا نہیں مگر نظافت کے خلاف ضرور ہے اور اس میں ان کو کچھ عذر بھی ہے کہ وہ پڑھنے میں ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ دوسرے کاموں پر توجہ نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے اکثر مولویوں کا

خط بھی صاف نہیں ہوتا کیونکہ وہ مقصود میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ زوائد پر توجہ نہیں ہوتی۔ ملا جیون کے طالب علموں کا قصہ مشہور ہے کہ ایک دن ان کی بیوی نے کہا کہ طالب علم بڑے کاہل ہوتے ہیں۔ ملا جی نے کہا نہیں تم غلط کہتی ہو اس کا ثبوت دو تو اس نے شوربے کے پیالہ میں ایک تنکا ڈالدیا اور کہا کہ دو طالب علموں کو اس میں شریک کر دینا۔ چنانچہ دو طالب علموں نے کھانا شروع کیا اور جس کے سامنے وہ تنکا جاتا تھا وہ اپنے سامنے سے دوسرے کی طرف کھسکا دیتا تھا بالآخر کھانے سے فراغت ہوگئی اور تنکا پیالہ ہی میں رہا، تب ملا جی کی بیوی نے ان کو دکھایا کہ دیکھو تمہارے طالب علم ایسے کاہل ہیں کہ ایک تنکے کو نکال کر نہ پھینکا گیا سالن کھا لیا اور تنکا پیالہ ہی میں رہا ممکن ہے کہ یہ قصہ گھڑا ہوا ہو مگر ایسی نظیریں اب بھی موجود ہیں گو طالب علم کسی درجہ میں معذور بھی ہوں مگر مجھے یہ طریقہ پسند نہیں۔ انسان کو اتنا اپاہج بھی نہ ہونا چاہئے بلکہ ایسا ہونا چاہیے ؎

چو باز باش کہ صیدے کنی و لقمہ دہی　　طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پر و بال

(باز کی مانند ہو کہ شکار کر کے خود بھی کھاؤ اور دوسرے کو بھی کھلاؤ جنگلی کوے کی طرح بے پروبال کے طفیلی خوارہ مت ہو)

خیر یہ تو احدیوں کی حکایت پر ایک تفریع تھی آپ نے طالب علموں کے اپاہج پنا تو سن لیا اب دنیاداروں کا سنئے مگر دونوں میں اتنا فرق ہے کہ طالب علم دنیا کے کاموں میں اپاہج ہیں دین میں سست نہیں ہوتے اور دنیا کے کاموں میں اپاہج ہونا گناہ یا عذاب کا سبب نہیں اور دین دار دین کے کاموں میں اپاہج ہیں جس سے گناہ اور عذاب کو اپنے سر مول لیتے ہیں چنانچہ ان سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ بہنوں سے شریعت کے موافق زبانی بیع و شراء کے الفاظ کہہ لیں یا خط ہی میں لکھ بھیجیں۔ اور آجکل کے مناسب میں ایک نظیر بتلاتا ہوں وہ یہ کہ اب آم کی فصل آوے گی اور اکثر مسلمان پھل آنے سے پہلے ان کی بیع کر دیتے ہیں شرعاً یہ بیع حرام ہے اور اس پھل کا کھانا دوسروں کو بھی حرام ہے۔ باغ والوں کی ذرا سی کاہلی سے ساری دنیا حرام کھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے قلوب میں نور نہیں پیدا

ہوتا اور جو کچھ نماز وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے وہ اس حرام غذا کی ظلمت سے زائل ہو جاتا ہے۔ میں نے اس کی اصلاح کا ایک آسان طریقہ بتلایا تھا۔ اصل طریقہ تو وہی ہے کہ ایسے وقت میں پھل فروخت ہی نہ کیا جائے بلکہ جب اچھی طرح پھل نمودار ہو جائے اس وقت بیع کیا جائے اس میں باغ والے یہ عذر نکالتے ہیں کہ صاحب اس وقت تک کون حفاظت کرے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے گورنمنٹ کا یہ قانون ہو جاوے کہ پھل خوب نمودار ہونے سے پہلے کوئی بیع نہ کرے تو اس وقت کوئی عذر نہ کرے گا بلکہ سب کو حفاظت کے طریقے خود بخود سوجھ جائیں گے اور اس وقت اگر کوئی کہے بھی کہ تم میرے ہاتھ پھل آنے سے پہلے باغ کی بیع کردو تو مالک کہے گا کیا تم مجھے مجرم بنانا چاہتے ہو یہاں کے مجرم بننے کا تو اتنا ڈر ہے لیکن آخرت کے مجرم بننے کو سب کے سب تیار ہوئے بیٹھے ہیں۔ خیر یہ طریقہ تو لوگ کیا ہی اختیار کرتے مگر ایک آسان ترکیب بتلائی گئی تھی جس سے دنیا حرام کھانے سے محفوظ ہو جاتی مگر افسوس وہ بھی نہ ہو سکی۔ میں نے کہا تھا کہ جو لوگ پھل آنے سے پہلے بیع کر چکے ہوں وہ پھل آنے کے بعد دوبارہ بیع کر لیا کریں۔ بائع خریدار سے یہ کہے کہ بھائی ہم نے جو پہلے بیع کی تھی وہ شرعاً درست نہ تھی اب ہم اسی قیمت پر اس پھل کی بیع تمہارے ہاتھ دوبارہ کرتے ہیں۔ خریدار کہدے میں قبول کرتا ہوں اب اس پھل کا کھانا سب کو حلال ہو جائے گا۔ بتلائیے اس میں کیا مشکل تھی صرف زبان ہلتی تھی مگر بات یہ ہے کہ اس کی کوئی قانونی ضرورت نہ تھی قانون سے ایسی بیع جرم نہ تھی صرف خدا نے منع کیا تھا اس لئے پرواہ نہیں اور اس کے لئے ذرا سی آسان بات بھی گوارا نہیں بعبارت دیگر یوں کہیے کہ نعوذ باللہ ہم کو خدا ہی کی ضرورت نہیں۔ تو اے صاحبو! خدا تو بڑی چیز ہے ہم کو تو بیوی بچوں کی بھی ضرورت ہے۔ بیوی بچوں کے بدون تو صبر نہیں آتا خدا کو چھوڑ کر کیسے صبر آ گیا ؎

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن	صبر چوں داری ز رب ذوالمنن
اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں	صبر چوں داری ز نعم الماہدوں

(اے شخص تجھ کو بیوی بچوں سے صبر نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے کیونکر تجھ کو صبر آگیا
اور اے تجھ کو ذلیل دنیا سے صبر نہیں ہے تو خدا تعالیٰ سے کیونکہ صبر رکھتا ہے)

اے صاحبو! ہمارا کیسا مذاق بگڑا ہے کہ جو چیز قانوناً ضروری نہیں بس اس کی فکر ہی نہیں تو میں کہتا ہوں گو میرے منہ سے یہ کہنا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ (ڈالو جو کچھ ڈالنا چاہتے ہو) اور امر مقصود نہ تھا بلکہ جانتے تھے کہ القار تو ہو ہی گا اسی طرح میں بھی کہتا ہوں عدم مبالاۃ سے نہیں کہتا کہ اگر آپ کو پھل آنے سے پہلے ہی بیع کرنا ہے تو خیر ایسا کرلیا کرو مگر بعد میں پھل آنے پر تو عقد دوبارہ کرلیا کرو اور زبان ہلا کر ایجاب و قبول کا اعادہ کرلیا کرو مگر مجھے اس کی بھی امید نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ کی وقعت ہی دل میں بسی ہوئی نہیں اور دل میں بسی ہوئی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ ایمان نہیں ہے۔ ایمان تو ہے مگر دل پر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ پردے اُٹھ جائیں تو ہر حکم کی وقعت ہونے لگے۔ اس لئے سب سے پہلے اُن پردوں کو اٹھانا چاہئے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنا دستور العمل یہ رکھئے کہ اول تو بقدر ضرورت احکام کا علم حاصل کیجئے جس کی آسان صورت یہ ہے کہ جو دینی رسائل محققین کی تصنیف سے ہیں ان کو مطالعہ میں رکھئے مگر ہر زید و عمر کی تصنیف کا مطالعہ نہ کیجئے کیونکہ آجکل آزادی کا زمانہ ہے ہر شخص کا جو جی چاہتا ہے لکھ مارتا ہے آجکل ایسے ایسے مصنف بھی ہیں کہ میں نے ایک رسالہ میں یہ مضمون لکھا ہوا دیکھا کہ ربوا حرام نہیں ہے مسلمانوں کو سود کے ذریعہ سے ترقی حاصل کرنا چاہیئے اور قرآن میں جو آیا ہے وحرم الربوا (ربوٰ حرام ہے) تو وہ رُبا (بضم راء) ربودن سے ہے مطلب یہ ہے کہ خدا نے غصب کو حرام کیا ہے اور راء کو جو کسرہ پڑھا جاتا ہے یہ اعراب بعد میں مولویوں نے لگائے ہیں جو حجت نہیں ہیں۔ اس احمق نے یہ بھی نہ دیکھا کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور ربودن فارسی مصدر ہے اس سے کوئی لفظ مشتق ہو کر قرآن میں کیونکر آسکتا ہے۔ پھر یہ لفظ رُبا مفرداً تو فارسی میں بھی مہمل ہے کسی نے اس کو استعمال نہیں کیا۔ تو صاحبو آجکل یہ بھی تحقیقات ہیں۔ بس میں تو ایسے

مجددوں کی نسبت یہ شعر پڑھا کرتا ہوں ؎

گربہ میر وسگ وزیر موش را دیوان کنند　　این چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(بلی امیر کتا وزیر چوہے کو دیوان جی بنا دیں یہ اراکین سلطنت ملک کو برباد ہی کر دیں گے)

اگر یہی تحقیقات ہیں اور ایسے ہی محقق ہیں اور یوں ہی اسلام کے پُر توڑے جائیں گے تو پھر اسلام کی خیر نہیں بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہر کتاب کے دیکھنے میں کیا حرج ہے اگر ہم اپنے مسلک پر جمے رہیں تو کسی کی کتاب کے دیکھنے کا کیا مضائقہ ہے۔ سو بات یہ ہے کہ میں ہر شخص کی تصنیف کا مطالعہ سے نہ روکتا اگر اس کا بُرا اثر نہ دیکھتا مگر جب میں لوگوں کو متاثر ہوتا ہوا دیکھتا ہوں تو منع کرتا ہوں بس آپ کی خیر اسی میں ہے کہ صرف محققین کے رسالے دیکھئے اور نئے نئے خودرو مصنفوں کے رسالے ہرگز نہ دیکھئے اور میں عنقریب محققین کو بھی بتلادوں گا کہ وہ کون لوگ ہیں غرض جو پڑھے لکھے ہیں وہ تو یہ رسائل دیکھیں اور پورا نصاب دیکھیں ایک دو رسالہ کا مطالعہ کافی نہیں اور وہ نصاب بھی کوئی محقق ہی بتلادے گا اور اثنا مطالعہ میں جہاں شبہ رہے اس پر وہاں نشان بناتے رہیں اور بعد میں ان مشتبہ مقامات کو کسی محقق سے زبانی حل کرلیں اور جو اَن پڑھ ہیں وہ ان رسالوں کو سن لیا کریں اگر تم کو طلب ہوگی تو ان شاء اللہ کوئی سنانے والا بھی مل جائے گا۔ ایک تو اس کا التزام کرلیں دوسری بات یہ کرو کہ جو کام کرنا ہو خواہ نوکری یا ملازمت یا تجارت یا شادی یا غمی سب کے متعلق پہلے کسی محقق سے حکم شرعی دریافت کرلو اگرچہ عمل کی بھی توفیق نہ ہو دریافت کرلینے میں کم ازکم یہ فائدہ ہوگا کہ اس کے جائز ناجائز ہونے کا تو علم ہوجائے گا ممکن ہے کہ یہ علم کسی وقت اس سے بچنے کی ہمت پیدا کردے اور جو مبتلا ہی رہے تو حرام کو حلال سمجھ کر تو نہ کروگے اب آج کل یہ حالت ہے کہ لوگ ضروری باتیں تو دریافت کرتے نہیں وہ مسائل پوچھتے ہیں جن سے کبھی واسطہ نہ پڑے یا وہ مسائل پوچھتے ہیں جو پہلے سے معلوم ہیں تاکہ مولوی صاحب کا امتحان ہوسکے چنانچہ رامپور میں ایک صاحب نے مجھ سے اختلافی مسائل پوچھے جن میں میرا مسلک ان کو معلوم بھی تھا میں سمجھ گیا کہ اس سوال سے میرا امتحان مقصود ہے میں نے کہا کہ آپ امتحان کے لئے پوچھتے ہیں یا عمل کے لئے۔ اگر عمل کے لئے پوچھتے ہیں تو

اس کے لئے مسؤل سے اعتقاد کا ہونا شرط ہے اور آپ مجھے جانتے بھی نہیں تو میرے معتقد کیسے ہوگئے اور محض نام سننا کافی نہیں نام تو نہ معلوم کتنوں کا سنا ہوگا اور جو امتحان کے لئے پوچھتے ہیں تو آپ کو میرے امتحان کا کیا حق ہے بس وہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے میں ایسا روگ نہیں پالتا کہ ہر شخص کے سوال کا اُس کی مرضی کے موافق جواب دیا کروں جہاں میں دیکھتا ہوں کہ سوال سے مقصود عمل نہیں وہاں کبھی جواب نہیں دیتا غرض آجکل لوگ اس قسم کے مسائل دریافت کرتے ہیں حالانکہ اس طرح کام نہیں چل سکتا ہر کام قاعدے سے ہوا کرتا ہے۔ پس سب سے پہلے کسی شخص کی حالت کو جانچ لو خوب امتحان کرلو جب اس کے علم و عمل پر کافی اطمینان ہوجائے اب اُس سے پوچھ پوچھ کر عمل کرو اور فضول باتیں نہ پوچھو یہ یاد رکھو کہ بدوں اچھی طرح جانچے ہوئے کسی کو اپنا بڑا نہ بناؤ کیونکہ دین بڑی قدر کے قابل چیز ہے۔ اس لئے ہر کس و ناکس کو رہنما نہ بناؤ لیکن جب کسی کا محقق ہونا ثابت ہوجائے تو پھر اس سے حجت نہ کرو جو بتلادے تو اس پر عمل کرو اور ایک اس کا التزام کرو کہ جب کبھی فرصت و مہلت ہوا کرے تو ایسے بزرگوں سے ملتے رہا کرو اور ان سے ڈرو نہیں کہ ہمارے افعال پر لتاڑیں گے۔ ہرگز نہیں وہ تمہارے سامنے منہ توڑ کر کوئی بات نہ کہیں گے (مگر ہاتھ جوڑ کر بھی نہ کہیں گے ۱۲) ایسے بزرگوں کی برکت صحبت سے تمہاری حالت ان شاء اللہ تعالیٰ خود بخود درست ہوتی چلی جائے گی یہ ہے وہ دستور العمل جو دل پر سے پردے اٹھاتا ہے جس کے چند اجزاء ہیں ایک تو کتابیں دیکھنا یا سننا۔ دوسرے مسائل دریافت کرتے رہنا تیسرے اہل اللہ کے پاس آنا جانا اور اگر ان کی خدمت میں آمد و رفت نہ ہوسکے تو بجائے ان کی صحبت کے ایسے بزرگوں کی حکایات و ملفوظات ہی کا مطالعہ کرو یا سُن لیا کرو اور اگر کچھ تھوڑی دیر ذکر اللہ بھی کرلیا کرو تو یہ تو اصلاح قلب میں بہت ہی معین ہے اور اسی ذکر کے وقت میں سے کچھ وقت محاسبہ کے لئے نکال لو جس میں اپنے نفس سے اس طرح باتیں کرو کہ اے نفس ایک دن دنیا سے جانا ہے موت بھی آنے والی ہے اس وقت یہ سب مال و دولت یہیں رہجاویگا بیوی بچے سب تجھے چھوڑ دیں گے اور خدا تعالیٰ سے واسطہ پڑے گا اگر تیرے پاس نیک اعمال

زیادہ ہوئے تو بخشا جائے گا اور گناہ زیادہ ہوئے تو جہنم کا عذاب بھگتنا پڑے گا جو برداشت کے قابل نہیں ہے اس لئے تو اپنے انجام کو سوچ اور آخرت کے لئے کچھ سامان کر یہ عمر بڑی قیمتی دولت ہے اس کو فضول رائگاں مت برباد کر مرنے کے بعد تو اس کی تمنا کرے گا کہ کاش میں کچھ نیک عمل کر لوں جس سے مغفرت ہو جائے مگر اس وقت تجھے یہ حسرت مفید نہ ہوگی پس زندگی کو غنیمت سمجھ کر اس وقت اپنی مغفرت کا سامان کر لے۔ اگر ذکر بھی نہ ہو سکے تو دستور العمل سابق کے ساتھ یہ محاسبہ تو روزانہ ضرور کر لیا کرو۔ نہ میں آپ سے نوکری چھوڑاتا ہوں نہ بیوی بچوں کو چھوڑاتا ہوں آپ دنیا کے سارے دھندے کیجئے اور گناہ در گناہ رہیئے مگر یہ کام بھی ساتھ ساتھ کئے جائیے ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ ہوگا کہ یہ عمل آپ کی دنیا اور دین دونوں کو سنوار دے گا۔ دنیا کو تو اس طرح کہ دنیا سے جو مقصود ہے یعنی راحت قلب بخدائے لایزال وہ بڑھ جاوے گی اس وقت تو آپ کی یہ حالت ہے کہ آپ روٹی کو نہیں کھاتے بلکہ روٹی آپ کو کھاتی ہے۔ دنیا کی حالت یہ ہے کہ یہ کسی کے پاس سے جاتی ہے تب بھی پریشانی کرتی ہے اور آتی ہے تب بھی پریشان کرتی ہے۔ اگر روپیہ پاس نہیں تب تو فکر ظاہر ہے کہ ہر وقت اسی کی ادھیڑ بن رہتی ہے آج کہاں سے کھاؤں گا، کہاں سے پہنوں گا۔ اور جو روپیہ پاس ہے تو اس کی حفاظت کی فکر ہے کہ اسے کہاں رکھوں کہاں ڈالوں کہیں چور نہ لے جائیں کسی کو خبر نہ ہو جائے۔ بعض دفعہ اس پریشانی میں بہت لوگوں کو نیند نہیں آتی۔ سچ کہا ہے ؎

وَمَنْ يَحْمَدِ الدُّنْيَا لِعَيْشٍ يَسُرُّهُ ۔۔۔ فَسَوْفَ لَعَمْرِي عَنْ قَلِيلٍ يَلُومُهَا

إِذَا أَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً ۔۔۔ وَإِنْ أَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيرًا هُمُومُهَا

(جو شخص تھوڑے سے عیش کی وجہ سے دنیا کی تعریف کرتا ہے مجھے قسم ہے اپنی جان کی کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی ملامت کرے گا جب دنیا پیٹھ پھیرتی ہے تو آدمی کو حسرت ہوتی ہے اور جب آتی ہے تو بہت غموں کو لاتی ہے)

یعنی جب دنیا نہ ہو تو حسرت ہوتی ہے اور جب آتی ہے تو ہزاروں غموں کو ساتھ لاتی ہے

تواس وقت دنیا آپ کے لئے باعث راحت نہیں بلکہ آلۂ تعذیب ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (تم کو ان کے اموال واولاد تعجب میں نہ ڈالے اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی ہی میں ان کو عذاب دیں) واقعی دنیا داروں کے لئے دنیا کا جمع ہونا عذاب ہی ہے ان کو تو چین کی نیند بھی میسر نہیں ہوتی۔ صاحبو! خدا کی طرف متوجہ ہو کر دیکھو اس وقت یہ دنیا آپ کے لئے راحت کا ذریعہ ہوگی۔ اب آپ کو قورمہ میں وہ مزہ نہیں آتا جو اس وقت خالی چٹنی میں آئے گا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر آپ کسی پر عاشق ہو جاویں اور وہ اپنے ہاتھ سے کوئی ایسی چیز کھانے کو دے جو آپ کو مرغوب نہیں تو ذرا سوچ کر بتلایئے کہ آپ کو اس میں لذت آئے گی یا نہیں یقیناً اس وقت وہ نامرغوب چیز آپ کو تمام مرغوبات سے زیادہ لذیذ معلوم ہوگی کیوں اس لئے کہ وہ محبوب کے ہاتھ سے ملی ہے۔ بس اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ اس وقت جو آپ قورمہ کھاتے ہیں اس میں اس لئے مزا نہیں آتا کہ آپ کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ خدا کا دیا ہوا ہے اور اگر اعتقاداً علم بھی ہے تو خدا کی ساتھ آپکے پوری محبت نہیں ہے اس لئے پورا مزا نہیں آتا اور اس دستور العمل پر عمل کر کے آپ پر حقیقت منکشف ہو جائے گی اس وقت آپ ہر چیز کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھیں گے اور یوں کہیں گے

مصرع :۔ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ دوست کی جانب آئے وہ بہتر ہی ہے)

اس وقت اس انتساب سے اس میں وہ لذت ہوگی جس کے سامنے تمام لذتیں گرد ہوں گی پھر آپ کو ہر حالت میں راحت ہوگی کبھی بے چینی نہ ہوگی۔ اور یہی بات تو ہے جس کو ایک بزرگ نے ایک بادشاہ کے جواب میں کہا تھا ؎

پوشش تو اطلس و دیبا حریر بخیہ زدہ خرقۂ پشمین ما

(تیرا لباس ریشم و اطلس کا ہے اور ہمارا خرقہ پشمین بخیہ زدہ ہے)

اسی طرح بہت چیزیں دل میں موازنہ کر کے اخیر میں کہتے ہیں ؎

باش کہ تا طبل قیامت زنند آں تو نیک آید دیا این ما

(ذرا صبر کرو قیامت میں معلوم ہو جائیگا کہ وہ تمہاری راحت اچھی تھی یا یہ ہماری محنت)

یعنی اس وقت تو تو ہر چیز میں خوش حال ہے اور ہم خستہ حال ہیں مگر ٹھہر ارہ ابھی قیامت آنے والی ہے اُس وقت تجھے معلوم ہوگا کہ بادشاہ کون ہے اور مفلس کون ہے صاحب خدا کے تعلق سے قلب میں ایسی راحت اور چین ہوتی ہے جس سے انسان فقر میں بھی بادشاہ ہوتا ہے۔ حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کو ملک سنجر نے لکھا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک حصہ آپ کی خانقاہ کے لئے مقرر کرنا چاہتا ہوں تو آپ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد (چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو)

اس زمانہ میں چتر شاہی سیاہ ہوا کرتا تھا اس لئے فرماتے ہیں ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب من ملکِ نیمروز بیک جو نمی خرم

(چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو مجھے جب سے نیم شب کی سلطنت حاصل ہوئی ہے میری نظر ملک نیمروز کی سلطنت ایک جو کی برابر نہیں ہے)

فرماتے ہیں کہ جب سے مجھ کو ملک نیم شب کی خبر ملی ہے یعنی جب سے آدھی رات کی مناجات و عبادات میں لذت حاصل ہوئی ہے اس وقت سے مجھے ملک نیم روز کی جو برابر بھی قدر نہیں ہے تو صاحبو! یہ حلاوت ہوتی ہے خدا کے تعلق میں اور یہ لذت ہوتی ہے اس انتساب میں جو دنیا بھر سے مستغنی کر دیتی ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس دستور العمل سے آپ کی دنیا بھی باحلاوت ہو جائے گی اور کھانے پینے میں بھی وہ لذت آئے گی جو اس وقت خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔ اس وقت آپ کو تنبہ ہوگا اور خدا کی ناراضی کسی طرح گوارا نہ ہوگی اور سب گناہ ایک ایک کر کے چھوٹ جائیں گے تو دین بھی درست ہو جا دے گا اور اس وقت آپ ہمارے پیچھے پیچھے پھریں گے اب ایک بات قابل بیان رہی وہ یہ کہ اس دستور العمل کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ محققین کے رسائل دیکھو اور محققین سے مسائل پوچھو اور اُن کے پاس آمد و رفت رکھو اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ محققین کون لوگ ہیں یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ

علماء میں باہم سخت اختلاف ہے کوئی ایک بات کو حرام کہتا ہے تو دوسرا اس کو جائز کہتا ہے کوئی ایک بات کو سنّت کہتا ہے تو دوسرا اس کو بدعت بتلاتا ہے اب کس کی مانیں کس کی نہ مانیں یا تو سب پر عمل کریں یہ تو غیر ممکن ہے یا ایک کو دوسرے پر تو ترجیح کی وجہ کیا۔ لہٰذا بعض نے تو یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! مجھے اس فیصلہ کی تو شکایت نہیں مگر رونا اس کا ہے کہ جب یہی صورتِ اختلاف فنونِ دنیا کے ماہروں میں پیش آئی تو وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا وہاں کسی ایک کو ترجیح دے کر کیوں پکڑا یعنی بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے کوئی کچھ مرض کی تشخیص کرتا ہے کوئی کچھ اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا ہے اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مریض کے لئے مہلک بتلاتا ہے وہاں آپ نے سب حکیموں کو کیوں نہیں چھوڑا اور یہ کیوں نہیں کہا کہ افسوس اطباء میں اتفاق ہی نہیں اب ہم کس کا علاج کریں بس جاؤ مریض کو مرنے دو ہم کسی کا بھی علاج نہیں کرتے وہاں آپ ایک حکیم کو ترجیح دے کر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا اپنے وکلاء کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کیا جو علماء کے ساتھ کیا گیا ہے کیا وکلاء میں باہم اختلاف نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر ترجیح کیوں دی جاتی ہے اور سب کو کیوں نہیں چھوڑا جاتا اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے۔ لیجئے میں ہی اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں جو ایک گہری بات ہے وہ یہ کہ دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جائے دوسرے وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ جن باتوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے ان کو تو کسی اختلاف کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلاف کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لیتا ہے اور جن باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ان کو اختلاف وغیرہ کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہاں تدبیر و تامل سے ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی یہ قاعدہ ہے طبیعت انسانیہ کا۔ اسی کے موافق یہاں عمل کیا گیا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں

جان اور ایمان ہے۔ جان چونکہ عزیز ہے اس لئے اس کی صحت و حفاظت کے اسباب میں اختلاف ہونے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے اس سے گھبرانا نہ چاہیئے ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیر خواہوں سے دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ڈاکٹروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے بس اس کا علاج اختیار کرلیں گے۔ اور ایمان عزیز نہیں اس لئے علماء کے اختلاف میں عقل سے کلام لینا اور غور و تامل کی محنت برداشت کرنا گوارا نہیں۔

تو اے صاحبو! اگر آپ ایمان کو بھی عزیز سمجھتے تو علماء میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے جس طرح حکماء میں کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس آپ کو ایمان عزیز نہیں اس لئے صاف سب کو چھوڑ دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں ہے بلکہ ضرور ہے اور آگے میں یہ بھی بتلا دوں گا کہ اُن میں سے خطا کن کی ہے، مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کروں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا یہ بے ترتیب اور غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے بعض لوگ اس اختلاف کو دیکھ کر علماء کو رائے دیتے ہیں کہ سب مولویوں کو متفق ہو جانا چاہیئے نااتفاقی بری چیز ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے یا اس کے لئے کوئی قید بھی ہے اگر نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہو جاتا ہے تو عدالت کو چاہیئے کہ جب اس کے پاس کوئی مدعی دعوے پیش کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ دعوے اور انکار سے دونوں میں نااتفاقی کا ہونا ثابت ہوگیا اور نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے تو مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں مجرم ہوئے اگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دنیا بھر میں شور و غل مچادیں گے کہ یہ کونسا انصاف ہے کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنا دیا گیا اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہیئے تھا تو آپ عاقل بن کر یہ رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہیئے تھا کہ مدعی اور مدعیٰ علیہ میں جو باہم مخالفت و

نا اتفاقی ہے تو ان میں سے حق پر کون ہے اور ناحق پر کون ہے جو حق پر ہوتا اور اس کی حمایت کی جاتی اور جو ناحق پر ہوتا اس کو سزا دی جاتی۔ لیجئے آپ ہی کے فیصلہ سے ثابت ہو گیا کہ نا اتفاقی علی الاطلاق جرم نہیں بلکہ نا اتفاقی وہ جرم ہے جو ناحق ہو اور جو نا اتفاقی بحق ہو وہ جرم نہیں اور اگر کسی معاملہ میں دو فریق ہو جائیں تو ہر فریق کو مجرم نہیں کہا جا سکتا بلکہ جس کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے اور جو بحق ہو وہ مجرم نہیں۔ پس علماء کی باہم نا اتفاقی اور اختلاف سے آپ کا سب کو مجرم بنانا اور ہر فریق سے یہ کہنا کہ دوسرے سے اتفاق کر لو غلط رائے ہے بلکہ اول آپ کو تحقیق کرنا چاہیئے کہ حق پر کون ہے ناحق پر کون ہے پھر جو ناحق پر ہو اسے مجرم بنائے اور اس کو اہل حق کے ساتھ اتفاق کر لینے پر مجبور کیجئے ورنہ اہل حق کو دوسروں کے ساتھ اتفاق پر مجبور کرنے کے تو یہ معنے ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کر لیں اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا تو اتنی شکایت آپ کی رہ گئی کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہو جانے کی رائے دیتے ہیں۔ اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ صاحب دوسرا فریق بھی اتفاق سے مجبور ہے کیونکہ ان کی سمجھ میں یوں ہی آیا وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آیا ہے، تو جناب ایسا اختلاف تو اختلاف رحمت ہے اس اختلاف سے فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آیا کرتی۔ دیکھئے ائمہ اربعہ میں سمجھ ہی کا اختلاف ہے۔ مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق ہیں کوئی ایک دوسرے پر ملامت و طعن نہیں کرتا بلکہ ہر ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے اگر ایسا اختلاف ہوتا تو مسلمانوں کو آج یہ پریشانی نہ ہوتی جو آنکھوں سے نظر آ رہی ہے بلکہ یہ اختلاف تو روٹیوں کا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہل حق کے پاس کافی روپیہ ہوا اور وہ ان سب فرقوں کی تنخواہ مقرر کر دیں تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے یہ سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے ہے کہ کوئی مولود پر زور دیتا ہے کوئی فاتحہ پر کوئی تیجہ دسویں پر ایک عالم سے جو بدعات کے بڑے حامی ہیں کسی نے سوال کیا کہ تم تو مولود و فاتحہ کو سنت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو اور جو اُن سے منع کرے اس کو برا بھلا کہتے ہو پھر یہ کیا وجہ ہے کہ تمہاری مستورات بہشتی زیور پڑھتی ہیں (اللہ کی شان ہے

کہ اس کتاب کو سب مسلمان اپنی مستورات کے لئے تجویز کرتے ہیں خواہ وہ کسی خیال کے ہوں، چنانچہ ان عالم صاحب کی مستورات بھی بہشتی زیور پڑھتی تھیں" تو انہوں نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ سارا اختلاف تو اس کی خرابی ہے ورنہ حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے۔ میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا کہ ہر کھانے پر الگ الگ فاتحہ دی جارہی ہے پھر وہاں بیان کی فرمائش ہوئی تو میں نے اس بیان میں کہا کہ فاتحہ و مولود کے سنت اور بدعت ہونے کا امتحان بہت آسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ جو مولوی صاحب مولود پڑھیں یا فاتحہ دیں ان کو کچھ دیا نہ جائے اُن سے خوب مولود پڑھواؤ اور الگ الگ ہر رکابی پر فاتحہ دلواؤ مگر نذرانہ کچھ نہ دو نہ مٹھائی کا دُہرا حصہ دو پھر دیکھنا وہ خود ہی اس کو فضول اور بدعت کہنے لگیں گے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اس پر عمل کیا تو اسی روز شام کو آکر ایک فاتحہ خواں صاحب کہنے لگے کہ واقعی یہ تو ایک فضول سا قصہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ فاتحہ ہو ایک ہی کافی ہے میں نے جی میں کہا کہ اب تو معلوم ہوہی گا صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ ان کی آمدنی بند کردو تو وہ خود ہی کہنے لگیں گے کہ سب فضول قصہ ہے یہ ساری باتیں روٹیاں کھانے کی ہیں۔ جب ایک سال طاعون بہت زور کا ہوا تو میں دیکھ رہا تھا کہ چنے پڑھوانا اور فاتحہ دلوانا اور تیجہ دسواں سب موقوف ہے۔ میں دیکھتا رہا جب طاعون کا زور ختم ہوگیا تو میں نے لوگوں سے کہا کہ کیوں جناب وہ چنے اور فاتحہ کہاں گئے اور اب وہ تیجے دسویں کیوں نہیں ہوئے۔ کہنے لگے اجی ان باتوں کی کسے فرصت تھی۔ میں نے کہا بھلا اس عدیم الفرصتی میں کسی نے جنازہ کی نماز بھی چھوڑی اور کفن دفن بھی چھوڑا کہا نہیں۔ میں نے کہا بس سمجھ لو جو کام حذف ہوگئے وہ دین کے کام نہ تھے بلکہ فرصت کی باتیں تھیں اور یہ دین کے کام تھے اس لئے یہ کم فرصتی میں بھی ترک نہ ہوئے۔ بس خاموش ہی تو ہوگئے۔ اسی طرح گانوں کے ایک صاحب کہنے لگے کہ فاتحہ میں حرج کیا ہے بلکہ فائدہ ہے کہ اس میں سورتوں کا ثواب بھی مردوں کو پہونچ جاتا ہے، میں نے کہا یہ فائدہ تو کھانے کے ساتھ مخصوص نہیں روپے پیسے اور کپڑے میں بھی ہوسکتا ہے پھر کبھی اللہ نام کے روپئے پیسے اور کپڑے پر بھی فاتحہ پڑھی کہنے لگے

کبھی نہیں میں نے کہا کیوں نہیں پڑھی مردہ کو فائدہ ہی ہوتا سورتوں کا بھی ثواب پہنچ جاتا کہنے لگے۔ اجی بس سمجھ میں آگیا تم سچ کہتے ہو۔ صاحبو! یہ بالکل کھلی ہوئی باتیں ہیں یہ سارے قصے محض آمدنی کے واسطے نکالے گئے ہیں اگر ان فاتحہ مولود پڑھنے والوں کی آمدنی بند کردی جائے تو پھر دیکھئے وہ بھی وہی کہنے لگیں گے جو ہم کہتے ہیں اس مجلس میں میں نے سنت و بدعت کی تحقیق بیان نہیں کی بلکہ وہ باتیں بیان کردی ہیں جو بہت موٹی ہیں جن سے ہر شخص کو باسانی حق کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگرچہ بحمد اللہ سنت و بدعت کی شناخت کے حقیقی اصول بھی اپنے پاس موجود ہیں مگر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ عارفین کی مجلس میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہ ہو)

ہاں اگر کوئی طلب ظاہر کرے اور ہمارے پاس آکر رہے تو اس کو وہ اصول بھی بتلا دیں گے۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اختلاف علی الاطلاق محل شکایت نہیں ہو سکتا بلکہ پہلے آپ حق کو متعین کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء مختلفین میں سے حق پر کون لوگ ہیں اور ناحق پر کون اس طرح محقق اور غیر محقق کی پہچان ہو جائے گی جس کی میں ایک آسان ترکیب بتلاتا ہوں وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ ہیں بعض تو لکھے پڑھے ہیں خواہ اردو ہی میں لکھے پڑھے ہوں اور بعض ان پڑھ ہیں پہلے طبقہ کے لئے تو تحقیق حق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب علماء کی کتابیں دیکھیں مگر دونوں طرف کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہو کر انصاف کے ساتھ دیکھیں پہلے سے کسی کی طرف داری اور حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں کیونکہ اعتقاد کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوگی اور عیب نظر نہ آئے گا سو تحقیق حق کا یہ طریقہ نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے خالی الذہن ہو کر دونوں کی کتابوں کا مطالعہ انصاف کے ساتھ کیا جائے خدا کے ساتھ معاملہ ہے اس کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیئے ان شاء اللہ تعالیٰ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن میں خود بخود حق واضح ہو جائے گا۔ جب ایک کا حق پر ہونا معلوم ہو جائے تو بس اسی سے تعلق رکھو اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو مگر دوسرے کو بھی برا نہ کہو کیونکہ کسی کو برا بھلا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو جائیگا۔ بس تم اپنی یہ حالت رکھو ؎

ہمہ شہر پر ز خوبان منم و خیال ماہے　　　　چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

(تمام شہر محبوبوں سے بھرا ہوا میں ہوں اور خیال ایک محبوب کا ہے کیا کروں کہ چشم بدخو کسی کی طرف دیکھتی ہی نہیں ہے)

دیکھو اگر کوئی شخص کسی حسین پر عاشق ہو جائے تو وہ دوسرے حسینوں کو گالیاں بھی نہیں دیا کرتا بس یہ کہتا ہے کہ کوئی اور بھی حسین ہو مگر میں تو اپنے محبوب ہی کا عاشق ہوں اور یہ حال ہونا چاہیئے ؎

دل آرامیکہ داری دل دروبند　　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام (محبوب سے) تمہارا دل گرفتار ہے تو پھر تمام عالم سے آنکھ بند کر لو)

اگر کوئی بُرا بھی ہو تو تم اس کو بُرا نہ کہو وہ اگر بُرا ہے تو تم کو کیا اور اگر دوسرا تم کو بُرا کہے جب بھی تم اُسے کچھ نہ کہو ذوق نے خوب کہا ہے ؎

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا لے ذوق　　　ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے

اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے　　　پھر بُرا کہنے سے کیوں اُس کے بُرا مانتا ہے

کان پور میں ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید کو بُرا کہنا جائز ہے کہ نہیں میں نے کہا جائز ہے اگر یہ اطمینان ہو کہ تم اس سے اچھی حالت میں مروگے اور ظاہر ہے کہ مرنے سے پہلے یہ اطمینان ہو ہی نہیں سکتا پس اپنا انجام دیکھنے سے پہلے اس کو بُرا نہ کہنا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یزید ہی ہم پر ملامت کرے کہ تم مجھے کس منہ سے بُرا کہتے تھے ذرا اپنی حالت تو دیکھو اور ظاہر ہے کہ زندگی میں خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ اب تو یہ حالت ہے ؎

گہ رشک برد فرشتہ برپاکی ما　　　گہ خندہ زند دیو زناپاکی ما

ایمان چو سلامت بلب گور بریم　　　احسنت بریں چستی و چالاکی ما

(کبھی فرشتہ ہماری پاکی پر رشک کرتا ہے کبھی ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے۔ ایمان جب گور کے کنارے پر سلامت لیجائیں تو ہماری چستی و چالاکی پر آفریں ہے)

جب یہ حالت ہے تو کیوں کسی کو بُرا کہے۔ کیا تبرّا کرنے سے کچھ ثواب ملتا ہے میاں اپنی خیر مناؤ کسی سے تم کو کیا لینا اور یاد رکھو کہ کسی کو بُرا بھلا وہی کہے گا جسے کوئی کام نہ ہو اور جو کام میں لگا ہوتا ہے اس کو اس کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ ایک حکیم نے کسی درویش کو ایک آدمی سے لڑتے ہوئے دیکھا اور فیصلہ کیا ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو جو بگذشت بر عارف جنگ جو
گر این مدعی دوست بشناختے بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ عارف جنگ جو پر گذرے
اگر اسی مدعی کو اللہ تعالےٰ کی معرفت ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا)

حکیم نے کہا کہ اگر اس درویش کو خدا تعالےٰ کی معرفت حاصل ہوتی تو اسے لڑنے کی فرصت کہاں ہوتی۔ دیکھو اگر ہم اپنے کسی مجازی محبوب کو دیکھ لیں تو اس وقت اس کی صورت دیکھیں گے اور خدمت میں مشغول ہوں گے یا لوگوں سے کشتم کشتا ہوں گے۔ غرض محقق کا پتہ لگانے کے بعد اتباع تو اسی کا کرو مگر بُرا بھلا دوسروں کو بھی نہ کہو یہ طریقہ تو پڑھے لکھوں کے واسطے ہے اور جو بے پڑھے ہوں وہ یہ کریں کہ دو مولویوں کے پاس جا کر ایک ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت اُن کی فرصت کا ہو (دریافت کرنے سے معلوم ہو جائے گا) اس میں اُن کے پاس بیٹھیں اور اُن کی باتیں سنیں اور دیکھیں کہ جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے اور نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی طرف رغبت پیدا ہو، عبادتِ الٰہی کا شوق بڑھے اور خدا کی نافرمانی سے دل میں نفرت اور خوف پیدا ہو اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو بس اس کو اختیار کر لیں اسی سے ہر بات پوچھا کریں اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جایا کریں (اور یہ طریقہ پڑھے لکھے کو بھی بہت مفید ہے محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت ایسی نہیں معلوم ہوتی جیسی پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے اس لئے وہ بھی اگر یہ طریقہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہے ۱۲) ان کی صحبت سے آپ کو اموال و اولاد کے حقوق معلوم ہوں گے اس وقت آپ کو بھی میت کے مال میں بدون ورثہ کی اجازت کے تصرف کرنا گوارا نہ ہوگا اور ان بزرگ کی حکایت پر تعجب نہ ہوگا جنہوں نے اپنے دوست کے مرتے ہی چراغ گل کر کے بازار سے ایک پیسہ کا تیل منگایا تھا بلکہ آپ خود بھی ایسی ہی احتیاط کیا کریں گے اور پھر آپ کو آم وغیرہ کی بیع میں

بھی اس طریقہ کی ضرورت معلوم ہو گی۔ جو میں نے بیان کیا ہے غرض ہماری حالت کی خرابی کا زیادہ تر سبب یہ حُبِّ مال ہی ہے جس سے دلوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں بزرگوں کی صحبت سے ان شاء اللہ یہ پردے اُٹھ جائیں گے۔ صاحبو ایک تو ہمارا مرض حبِّ مال ہے جس سے ہمارے اندر اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور حبِّ مال ہی سے بعض لوگ دوسروں کی آبرو کے درپے ہوتے ہیں اور حبِّ مال ہی کی وجہ سے انسان رشوت لیتا ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارے دلوں میں خدا کی محبت پیدا نہیں ہوتی اور دوسرا مرض حبِّ اولاد ہے یہ بھی بہت سے گناہوں کا سبب ہے کہیں اولاد کی صحت و تندرستی کے لئے ٹوٹکے کئے جاتے ہیں جو شرک میں داخل ہیں۔ کہیں اولاد ہونے کے لئے قبروں پر نذر لانے چڑھائے جاتے ہیں، غیر اللہ کی منت مانی جاتی ہے اور اولاد ہی کے لئے مال کا ذخیرہ جمع کیا جاتا ہے۔ جائدادیں خریدی جاتی ہیں پھر اس میں حلال و حرام کی بھی تمیز نہیں کی جاتی۔ کبھی مال بڑھانے کے لئے سود لیا جاتا ہے، کبھی کسی کا حق بلا وجہ دبا لیا جاتا ہے جس سے مقدمہ بازی کی نوبت آتی ہے۔ غرض یہ امراض ہمارے اندر پھیلے ہوئے ہیں جن کا منشا ان دو چیزوں کی محبت ہے۔ مال کی اور اولاد کی۔ اسی کو حق تعالےٰ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ کہ تمہارے اموال و اولاد محض فتنہ ہیں اس میں فتنہ کا لفظ ایسا عجیب ہے جس سے نفع کی طرف بھی اشارہ ہے اور ضرر کی طرف بھی۔ کیونکہ فتنہ کا لفظ محاورات میں ضرر کے موقعہ پر بولا جاتا ہے اور شریعت میں بھی ایسے مواقع پر اس کا استعمال موجود ہے۔ چنانچہ احادیث میں اَبْوَابُ الْفِتَنِ کے نام سے ایک باب منعقد کیا گیا ہے جس میں آخر زمانہ کے فتنوں کا بیان ہے اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آخر زمانہ میں ایسے ایسے فتنے ہوں گے اور ظہور الفتن علامت قرب ساعت کی ہے۔ ان احادیث میں فتنہ سے پریشان کن واقعات اور بُرے حالات ہی مراد ہیں ۱۲) اس معنے کے اعتبار سے تو اموال و اولاد کو فتنہ کہنا اُن کے مضرت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کو مضرت میں مبتلا کرنے

والے ہیں اور لغت کے اعتبار سے فتنہ کے معنے آزمائش اور امتحان کے ہیں جس کا نتیجہ کبھی نفع بھی ہوتا ہے اس لحاظ سے اموال واولاد کی منفعت کی طرف بھی اشارہ ہوگا کہ یہ چیزیں تم کو خدا تعالیٰ نے اس لئے دی ہیں تاکہ تمہارا امتحان ہو کہ مال کو طاعات میں خرچ کرتے ہو اور اس صورت میں نافع ہو یا معاصی میں اور اس صورت میں مضر ہو اور ان کے حاصل کرنے میں حلال وحرام کی پرواکرتے ہو یا نہیں۔ اسی طرح اولاد کی پرورش وتربیت میں حدود شرعیہ کا لحاظ کرتے ہو یا نہیں اور ان کی وجہ سے احکام الٰہیہ میں کوتاہی نہیں کرتے چنانچہ مال فی نفسہ بُری چیز نہیں بلکہ اس میں بعض فوائد بھی ہیں مثلاً اگر مال اپنے پاس ہو تو اس سے فراغ قلب حاصل ہوتا ہے۔ قلب مطمئن رہتا ہے اور اس صورت میں طاعات بھی اطمینان وفراغ کی ساتھ ادا ہوتی ہیں اور مال نہ ہو تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

شب چو عقد نماز بربندم چہ خورد بامداد فرزندم

کہ رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں تو یہ خیالات اور وسوسے دل میں آتے ہیں کہ کل کو بچے کہاں سے کھائیں گے۔ کیونکر ہوگا۔ ایک ایرانی نے اس شعر کی شرح یہ کی کہ شب چو عقد نماز بربندم بجائے تکبیر تحریمہ میگویم چہ خورد بامداد فرزندم کہ رات کو نماز کی نیت میں اس طرح باندھتا ہوں کہ کل کو بچے کہاں سے کھائیں گے گویا یہ الفاظ بجائے نیت وتحریمہ کے کہے جاتے ہیں واقعی اہل زبان اپنی زبان کو خوب سمجھتے ہیں مطلب تو اچھا بیان کیا۔ غرض خواہ یہی نیت کے قائم مقام ہو یا نیت کے بعد یہ خیال آوے تنگی اور پریشانی میں عبادات بھی اچھی طرح ادا نہیں ہوتیں تو مال کا یہ بڑا نفع ہے کہ اس سے فراغ حاصل ہوتا ہے۔ نیز مال ہو تو دوسروں کی مدد بھی کرسکتا ہے۔ مثلاً اس وقت ترکوں کے معاملہ میں مالدار ہی زیادہ مدد کرسکتے ہیں یہ تو فوائد ہیں اور مضرتیں وہ ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں اس لئے مال امتحان کی چیز ہے کہ اس کو حاصل کرکے احکام شرعیہ پر قائم رہنا بڑے مرد کا کام ہے اور اگر ذرا ہمت سے کام لیا جائے تو کچھ زیادہ دشواری نہیں پس مال میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ آمد قاعدہ کے موافق ہو دوسرے خرچ قاعدہ کے موافق ہو بعض لوگ آمد میں تو احتیاط کا خیال رکھتے ہیں مگر خرچ میں

اس کی رعایت نہیں کرتے بس یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارا مال ہے جس طرح چاہیں خرچ کریں حالانکہ تم تو خود بھی اپنے نہیں ہو بلکہ خدا کے ہو پھر مال تمہارا کدھر سے ہوا بلکہ تم محض امین ہو اور یہ مال تمہارے ہاتھ میں امانت ہے اور امانت میں خیانت کرنا جرم ہے لہذا مال میں تم خلاف مرضیٔ حق کسی تصرف کے مجاز نہیں ہو بس چونکہ مال میں مضرت کی ساتھ نفع بھی ہے اس لئے اسکو فتنہ فرمایا یعنی آزمائش کی چیز۔ اسی طرح اولاد میں منافع بھی ہیں مضار بھی مضرتوں کا بیان تو اوپر ہو چکا اور منافع یہ ہیں کہ اولاد کے نیک اعمال سے والدین کو نفع ہوتا ہے اور وہ مرنے کے بعد دعا یا ایصال ثواب سے والدین کو یاد رکھیں تو ان کے درجات بلند ہوتے ہیں اس لئے وہ بھی فی نفسہٖ بری چیز نہیں بلکہ امتحان کی چیز ہے اگر آدمی اس امتحان میں کامیاب ہو تو مالدار ہوتا اور صاحب اولاد ہونا کمال ہے نقص نہیں۔ ایک صاحب نے یہاں فتنہ کے مشہور معنے سمجھ کر اعتراض کیا کہ حق تعالیٰ نے اولاد کو فتنہ فرمایا ہے اور احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ترغیب دی ہے جو اولاد کے لئے موضوع ہے اور خود ازواج کا نافع ہونا بھی اس سے ثابت ہوتا ہے تو ان دونوں میں اجتماع کیسے ہوگا اور اس سے انہوں نے نتیجہ یہ نکلا تھا کہ نکاح ہی نہ کرے۔ میں نے کہا جناب آپ کو نکاح تو یاد رہا مال یاد نہ رہا اس پر بھی تو یہی اشکال ہے کہ حق تعالیٰ نے اموال کو فتنہ فرمایا ہے اور حدیث میں کسب مال کی ترغیب ہے بلکہ امر ہے چنانچہ ارشاد ہے کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ (حلال مال کمانا فرض ہے بعد اور فرائض کے) تو مال کے نہ کمانے کا بھی نتیجہ نکالنا چاہیئے اور نوکری چھوڑ دینا چاہیئے (اور یہ شخص نوکر تھے مگر پہلی بیوی کے مرنے پر دوسرا نکاح نہ کرتے تھے) پھر میں نے کہا کہ حق تعالیٰ نے جو اموال و اولاد کو فتنہ فرمایا ہے تو اس میں ان کی مذمت نہیں کی بلکہ ان کو امتحان کی چیز فرمایا ہے اور اگر مذمت ہی تسلیم کی جائے تو علی الاطلاق نہیں بلکہ بعض افراد کے اعتبار سے ہے کیونکہ اسی جگہ اوپر کی آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ (تمہارے بعض ازواج اور اولاد تمہارے دشمن ہیں) جس میں مِنْ تبعیضیہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب افراد ضرر رساں نہیں بلکہ بعض ان میں سے معین اور مفید بھی ہیں۔ پس ترغیب نکاح انہی افراد کے لحاظ سے ہے (اسی لئے جس شخص کو نکاح سے ابتلاء بالمعاصی

(گناہوں میں مبتلا ہونے کا) اندیشہ ہو اس کے لئے نکاح مسنون نہیں کما صرّح بہ الفقہاءُ (جیساکہ فقہا رنے اس کی تصریح کی ہے) بہرحال مجرد ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں اور مفلس ہونا بھی کوئی خوبی کی بات نہیں۔ کمال تو یہی ہے کہ سب کچھ ہو مال بھی اولاد بھی بیوی اسباب بھی اور پھر احکام الٰہیہ کی مخالفت نہ ہو دیکھو سب انبیا علیہم السلام صاحب ازواج تھے بجز عیسیٰ علیہ السلام کے (اور وہ بھی اخیر میں نکاح کریں گے ۱۲) اسی طرح انبیاء علیہم السلام مفلس نہ ہوتے تھے ہاں زاہد ہوتے تھے کہ حق تعالےٰ نے ان کو دیا سب کچھ مگر جمع نہیں کیا بلکہ حاجتمند لوگوں کو بانٹ دیا کرتے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے اور اگر کسی کو اس کی ہمت ہو تو یہ بہت بڑا کمال ہے مگر میں آجکل مسلمانوں کو خالی ہاتھ رہنے کی رائے نہیں دیتا بلکہ وہ رائے دیتا ہوں جو حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ والوں کو دی تھی وہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل اگر کسی کے پاس کچھ دینار ہوں تو ان کی قدر کرے۔ کیونکہ پہلے تو ایسا زمانہ تھا کہ روپیہ پاس ہونے سے دین پر اندیشہ ہوتا تھا اور اب وہ زمانہ ہے کہ روپیہ پاس نہ ہونے سے دین پر اندیشہ ہے اور روپیہ پاس ہو تو دین کی حفاظت رہتی ہے۔ جب حضرت سفیان ثوریؒ کے زمانہ میں یہ حالت ہو چلی تھی تو اب تو اس کی زیادہ ضرورت ہے، اس لئے ہمارے حضرات اپنے متعلقین کو ترک اسباب کی رائے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں ایک خانصاحب کسی جائداد کے مقدمہ میں دعا کرانے آیا کرتے تھے ایک بار آئے اور عرض کیا حضرت۔ اب تو فلاں بنئے نے میری زمین دبا ہی لی حضرت نے فرمایا بھائی جانے دو اور اللہ پر نظر کر کے صبر کرو خدا کچھ اور سامان کر دے گا۔ حضرت حافظ محمد ضامنؒ صاحب نے اپنے حجرہ میں سن لیا اور باہر نکل آئے اور خانصاحب سے فرمایا ہرگز صبر نہ کرنا جاؤ مقدمہ کرو عدالت میں دعویٰ کرو ہم دعا کریں گے۔ اور حضرت حاجی صاحب سے فرمایا کہ سبحان اللہ آپ اپنی طرح سار مخلوق سے صبر کرانا چاہتے ہیں چاہے کسی کو ہمت ہو یا نہ ہو۔ آپ کے تو بیوی ہے نہ بچہ ہے۔ اکیلے تھے صبر کر کے بیٹھ گئے۔ اس غریب کے پیچھے بیوی بچے لگے ہوئے ہیں وہ ان کے فقرو فاقہ پر کیسے صبر کرے گا۔ انجام یہ ہو گا کہ پریشان ہو گا اور توکل کی ہمت نہیں ہے

تو کسی کسی کے مال پر نظر دوڑائے گا۔ اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مولوی ترک دنیا نہیں کراتے بلکہ ترکِ بغاوت کراتے ہیں۔ صاحبو! دنیا کماؤ مگر خدا کے حکم کے موافق کماؤ بغاوت کے ساتھ نہ کماؤ آخر دنیا کمانے میں حکام دنیا کے قوانین کی بھی تو تم رعایت کرتے ہو اور گورنمنٹ کی بغاوت سے بچتے ہو اسی طرح خدا کی بغاوت سے بھی بچتے رہو اور اگر پابندی احکام شرعیہ ترقی دنیا کے لئے مانع ہے تو پابندی احکام گورنمنٹ اس سے کیوں مانع نہیں دیکھئے بغاوت میں تو بہت ترقی ہوتی ہے کہ بدون کچھ کمال حاصل کئے سہولت سے روپیہ مل جاتا ہے چوری اور ڈاکہ زنی کر کے دولت خوب حاصل ہوتی ہے اور نوکری میں اول تو کمال کی ضرورت ہے پھر نوکری ملتی مشکل سے ہے اور ملے بھی تو تنخواہ سے زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے تحصیلدار اور ڈپٹی کو گھوڑا اور سائیس رکھنا بھی ضروری ہے ذرا لباس بھی اچھا رکھنا ہوتا ہے آنے جانے والوں کی دعوت ضیافت بھی کرنا ہوتی ہے اس لئے میں تو چندوں کے موقعہ پر کہا کرتا ہوں کہ ان امراء کو مت ستاؤ جیسے ان کی آمدنی زیادہ ہے ویسے ہی ان کا خرچ بھی بہت زیادہ ہے۔ غرض بظاہر ترقی کا سب سے اچھا ذریعہ ڈکیتی اور چوری ہے جس کو گورنمنٹ نے جرم قرار دیا ہے۔ لیکن گورنمنٹ سے کوئی نہیں کہتا کہ آپ نے ترقی کے ذرائع بند کر دیئے ہیں۔ اللہ میاں ہی مفت کے مل گئے ہیں کہ وہ کسی بات کو جرم قرار دیں تو کہا جاتا ہے کہ شریعت نے ترقی کا راستہ بند کر دیا کہ سود بھی حرام رشوت بھی حرام، فصل سے پہلے آموں کی بیع بھی حرام میں کہتا ہوں ذرا گورنمنٹ سے بھی تو پوچھو کہ آپ نے ڈکیتی کو بھی ممنوع، چوری اور رشوت کو بھی ممنوع کر دیا اور ترقی کا ذریعہ کیا نکالا نوکری اور تجارت، سو تجارت کے لئے تو سب کے پاس روپیہ نہیں ہے اور نوکری میں خرچ زیادہ ہے۔ سب سے آسان ذریعہ ترقی کا چوری اور ڈکیتی اور رشوت تھی انہیں کو آپ نے منع کر دیا کیا کسی کو ہمت ہے کہ گورنمنٹ سے یہ سوال کرے ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو سب یہ کہتے ہیں کہ گورنمنٹ نے ذرائع ترقی کو بند نہیں کیا بلکہ ناجائز وسائل سے روکا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اسی طرح شرع نے بھی ذرائع ترقی کو بند نہیں کیا بلکہ ناجائز وسائل سے منع کیا اور ترک بغاوت

کی تعلیم کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرکے دنیا نہ کماؤ خواہ ایک ہی جزو میں نافرمانی ہو پس شریعت کے تابع ہو کر رہو پھر چاہے رئیس ہو جاؤ یا نواب یا ہفت اقلیم کے بادشاہ بن جاؤ ترقی مبارک ہے اور اس سے کوئی نہیں روکتا اور اگر دین کھو کر دنیا کمائی تو میں یوں کہوں گا ؎

مبادا دل آں فرومایہ شاد | کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(اس کمینہ کا دل کبھی خوش نہ ہو جو دنیا کے پیچھے دین برباد کر دے)

تو یہ ہے فتنہ کہنے کی وجہ کہ مال و اولاد میں نفع بھی ہے اور ضرر بھی ہے اور ان سے ہماری آزمائش کی گئی ہے اگر امتحان میں کامیاب ہو گئے تو یہ دونوں مفید ہیں اور اگر ناکام ہو گئے تو دونوں مضر ہیں آگے ارشاد فرماتے ہیں وَاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (اور اللہ ہی اجر عظیم ہے) اوپر یہ فرمایا تھا کہ تمہارے اموال و اولاد تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہیں کہ دیکھیں کون ان میں پڑ کر خدا کے احکام کو بھول جاتا ہے اور کون یاد رکھتا ہے اب فرماتے ہیں کہ جو شخص ان میں پڑ کر اللہ کو یاد رکھیگا تو اللہ کے پاس اُن کے لئے بڑا اجر ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم کو عمل میں کچھ کوتاہی معلوم ہو یا عمل کچھ کم ہوتا نظر آوے تو گھبراؤ نہیں اور یہ مت سمجھو کہ اس عمل قلیل سے کیا فائدہ کیونکہ خدا تعالیٰ کے پاس بڑا اجر ہے وہ تھوڑے سے عمل پر بہت اجرت دے سکتے ہیں اس لئے خدا کی ذرا سی اطاعت کو بھی حقیر نہ سمجھو اللہ اکبر کیسی بشارت اور کتنا بڑا وعدہ ہے۔

پس اب میں ختم کرتا ہوں تو میں لے آئیں تو کئی پڑھی تھیں اور بیان سب کا نہیں ہو سکا بلکہ صرف ایک آیت کا بیان ہوا ہے مگر اصولاً بحمد اللہ سب کے مضامین قریب قریب اسی میں آگئے ہیں اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ حق تعالیٰ عمل خیر کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

تمت

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۂ

التبلیغ کا

وعظ مسمّٰی بہ

تعمیم التعلیم

(منجملہ ارشادات)

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

ضروری اطلاع: خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر کیا کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعمیم التعلیم

این	کہاں ہوا	سرورٹ مظفر نگر مدرسہ محمودیہ
متیٰ	کب ہوا	۲۱ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ
کم	کتنا ہوا	۴ ½ گھنٹے
کیف	کیسے ہوا	بیٹھ کر
لِمَ	کیوں ہوا	بدرخواست اہل مدرسہ بوجہ غلبہ اشتیاق کہ عرصہ سے وعظ کا سلسلہ بند تھا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	تعلیم کو عام اور وسیع کرنا چاہیئے محض عربی کے ساتھ مخصوص نہ کرنا چاہیئے۔
من ای شان	کس طبقہ کے لئے زیادہ مفید تھا	طبقۂ علماء وطلبہ و نو تعلیم یافتہ حضرات کو زیادہ مفید تھا۔
من ضبط	کس نے لکھا	ظفر احمد عثمانی تھانوی عفا اللہ عنہ
المستمعون	تعداد سامعین	تقریباً ۶۰۰ مرد تھے
اشتات	متفرقات	مستورات کا مجمع بھی تھا جن کی تعداد معلوم نہ ہو سکی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

ویتعلمون مایضرھم ولا ینفعھم ولقد علموا لمن اشترٰہ مالہٗ فی الاٰخرۃ من خلاق ولبئس ما شروا بہٖ انفسھم لو کانوا یعلمون ولو انھم اٰمنوا واتقوا لمثوبۃ من عند اللہ خیر لو کانوا یعلمون۔ (ترجمہ) یہ لوگ ایسی چیزیں سیکھ

لیتے ہیں جو ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں اور ضرور یہ بھی اتنا جانتے ہیں
کہ جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بلا شک
بری ہے وہ چیز جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں کاش ان کو عقل ہوتی
اور اگر وہ لوگ ایمان و تقویٰ کرتے تو خدا کے یہاں کا معاوضہ بہتر تھا کاش
ان کو عقل ہوتی)

ان آیتوں میں کا جزو اول ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں ایک قصہ مذکور ہے پوری آیت میں نے اس لئے نہیں پڑھی کہ جو مقصود اس وقت قابل بیان ہے وہ اُس میں مذکور نہیں بلکہ وہ صرف اُسی جزو میں مذکور ہے جس کو میں نے تلاوت کیا ہے اگرچہ وہ قصہ بھی جو پوری آیت میں ذکر کیا گیا ہے ضروری ہے اور قرآن کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جو ضروری نہ ہو مگر خاص وقت اور خاص محل کی وجہ سے کسی ایک جزو کو بیان کے لئے اختیار کر لیا جاتا ہے اسی لئے میں نے پوری آیت کی تلاوت نہیں کی بلکہ اخیر جزو پر اکتفا کیا۔ اور تبلیغ کے موقعہ پر ایسا کرنا جائز ہے (چنانچہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض دفعہ موقع استشہاد میں جزو آیت کے تلاوت پر کفایت فرمائی ہے ۱۲ من الجامع) لیکن نماز میں ایسا نہ کرنا چاہیئے کہ ایک آیت کو بیچ میں سے پڑھنا شروع کر دیے یا وسط میں سے قطع کر دے نماز میں پوری آیت بلکہ پوری سورت پڑھنی چاہیئے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ لمبی لمبی سورتیں پوری پڑھا کرے جس سے مقتدیوں کو تکلیف ہو بلکہ ہر وقت کے مناسب جتنی مقدار فقہاء نے بتلائی ہے اس کے موافق سورتیں پڑھنا چاہئیں۔ نماز کا تو یہی حکم ہے مگر تبلیغ میں اس کا مضائقہ نہیں کہ ایک آیت کو وسط میں سے شروع کرے یا وسط میں قطع کر دے یہ تو وجہ تھی جزو آیت پر اکتفا کرنے کی رہا یہ کہ میں نے اس جزو کو اس وقت کیوں اختیار کیا سو ہر چند کہ مضامین قرآن سب ہی ضروری ہیں اور اسی بنا پر وہ قصہ بھی ضروری ہے جو پوری آیت میں مذکور ہے لیکن اس وقت یہ بیان ایک علمی مدرسہ میں ہو رہا ہے جو کہ علم دین کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا ہے اس لئے مناسب ہوا کہ علم کے متعلق کچھ بیان اور بحث کی جائے اور طلبہ کو علم کے حقوق سے

آگاہ کیا جائے اور اس میں جو کچھ کمی کی جارہی ہے اس کی اصلاح کردی جائے اور علم کا بیان جس خاص طریق پر ہیں اس وقت کرنا چاہتا ہوں وہ اسی جزو اخیر میں مذکور ہے جس کو میں نے پڑھا ہے چنانچہ ترجمہ سے یہ بات واضح ہوجائے گی، حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ اور یہ لوگ سیکھتے ہیں اُس علم کو جو ان کے لئے مضر ہے اور نفع نہیں دیتا۔ ان لوگوں سے مراد یہود ہیں اور اس علم سے مراد سحر ہے۔ اوپر سے یہود کی مذمت مختلف طریقوں سے مذکور ہوتی آرہی ہے، چنانچہ اسی ضمن میں ان لوگوں کی بھی مذمت بیان کی گئی ہے جو سحر میں مبتلا تھے اور اس کے متعلق ہاروت ماروت کا قصہ بھی بیان کیا گیا ہے ہرچند کہ اس قصہ کو مقصود وعظ کے ساتھ زیادہ تعلق نہیں مگر ربط کے لئے اس کا ذکر کردینا مناسب ہے۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

(اور انہوں نے ایسی چیز کا اتباع کیا جس کا چرچا شیاطین سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں کیا کرتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا مگر شیاطین کفر کیا کرتے تھے۔ اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے اور اس کا بھی جو کہ ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا بابل میں جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا اور وہ دونوں کسی کو نہ بتلاتے جب تک یہ کہدیتے کہ ہمارا وجود بھی ایک امتحان ہے سو تو کہیں کافر مت بن جائیو سو لوگ ان دونوں سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعے سے کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفریق پیدا کردیا کرتے تھے اور یہ لوگ اس کے ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے حکم سے)

اس کے بعد آیت کا وہی حصہ ہے جو میں نے تلاوت کیا تھا۔ مقصود ان آیتوں سے یہود کی مذمت بیان کرنا ہے کیونکہ ان میں سحر کا بہت چرچا تھا اور وہ اس میں بڑے ماہر تھے۔

چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی سحر کیا تھا جس کا اثر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوگیا تھا پھر وحی کے ذریعہ سے آپ کو مطلع کیا گیا کہ آپ پر فلاں شخص نے سحر کیا ہے چنانچہ سورۃ الفلق میں اس کی طرف اشارہ ہے وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ اور (آپ کہئے کہ) میں پناہ مانگتا ہوں بدی سے ان عورتوں کی جو گرھوں پر (پڑھ پڑھ کر) پھونک مارنے والی ہیں۔ گرھوں پر پھونک مارنے کی تخصیص اس لئے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سحر ہوا تھا وہ اسی قسم کا تھا کہ ایک تانت کے ٹکڑے میں گیارہ گرھیں دی گئی تھیں اور ہر گرہ پر کلمات سحر کو دم کیا گیا تھا اور عورتوں کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس واقعہ میں عورتوں ہی نے یہ سحر کیا تھا دوسری کچھ تجربہ سے اور نیز علم طبعی کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا سحر بہ نسبت مردوں کے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ کیونکہ سحر میں قوت خیالی کو زیادہ دخل ہے خواہ وہ سحر حلال ہو یا سحر حرام یعنی سحر کی دو قسمیں ہیں ایک سحر حرام کہ محاورات میں اکثر اسی پر سحر کا اطلاق ہوتا ہے، دوسرے سحر حلال جیسے عملیات اور عزائم اور تعاویذ وغیرہ کہ لغۃً یہ بھی سحر کی قسم میں داخل ہیں اور ان کو سحر حلال کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعویذ و عزائم وغیرہ مطلقاً مباح نہیں بلکہ اس میں بھی تفصیل ہے کہ اگر اس میں اسماء الٰہی سے استعانت ہو اور مقصود بھی جائز ہو تو جائز ہے اور اگر مقصود ناجائز ہو تو حرام ہے اور اگر شیاطین سے استعانت ہو تو مطلقاً حرام ہے خواہ مقصود اچھا ہو یا برا۔ بعض لوگوں کا یہ گمان ہے کہ جب مقصود اچھا ہو تو شیاطین کے نام سے بھی استعانت جائز ہے یہ بالکل غلط ہے خوب سمجھ لو اور یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے) کا حکم مطلق نہیں ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اچھی نیت سے حرام کام بھی جائز ہو جائیں امور محرمہ کسی نیت سے بھی کئے جائیں وہ حرام ہی رہیں گے۔ بلکہ یہ حدیث امور مباحہ اور طاعات کے ساتھ مخصوص ہے یعنی اگر جائز کام کو اچھی نیت سے کیا جائے تو اس پر ثواب ملتا ہے اور بری نیت سے کیا جائے تو گناہ ہوتا ہے، نیز بعض فرائض و واجبات بدون نیت کے صحیح نہیں ہوتے خلاصہ یہ کہ

مقصود سے پہلے ذریعہ کو دیکھ لینا ضروری ہے اگر ذریعہ جائز ہے مثلاً اسمار الٰہی سے استعانت ہو تو پھر مقصود کو دیکھا جائے۔ اگر مقصود بھی محمود ہے تو اس صورت میں تعویذ و عملیات کو جائز کہا جائے گا اور اگر مقصود ناجائز ہے تو ان کو حرام کہا جائے گا اور اگر ذریعہ ہی حرام ہو جیسے استعانت بالشیاطین تو اب مقصود چاہے کیسا ہی ہو وہ حرام ہی رہیگا اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص نماز کے لئے لوگوں کو جمع کرنا چاہے اور اس غرض کے لئے ناچ کرائے تاکہ ناچ کے شوق میں سب آجائیں اور نماز پڑھ لیں تو مقصود اگرچہ بہت محمود ہے مگر چونکہ اس کے لئے حرام کو ذریعہ بنایا گیا ہے اس لئے اس صورت کو حرام ہی کہا جاوے گا۔ سو آپ نے دیکھا کہ نماز باوجودیکہ حق تعالیٰ کو محمود ہے مگر اس کے لئے بھی جب حرام کو ذریعہ بنایا گیا اس کو شریعت حرام ہی کہے گی یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو تعویذ و عملیات کو نفع رسانی کے موقعہ میں مطلقاً جائز سمجھتے ہیں گو اس میں شیاطین ہی سے استعانت ہو اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ صاحب ہم نے تو مخلوق کو نفع پہونچانے کے لئے کیا ہے پھر اس میں کیا خرابی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نماز کے مقابلہ میں دنیوی نفع کوئی چیز نہیں ہے دنیا حق تعالےٰ کے نزدیک مبغوض ہے اور نماز محبوب ہے جب نماز کے لئے حرام کو ذریعہ بنانا جائز نہیں تو دنیوی نفع کے لئے شیاطین سے استعانت کیونکر جائز ہوگی مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہیئے کہ ہر کام میں سب سے پہلے یہ دیکھے کہ اس سے خدا تعالیٰ راضی ہیں یا نہیں جس کام سے خدا تعالیٰ ناراض ہوں وہ بالکل ہیچ ہے چاہے اس میں دنیوی نفع کتنا ہی ہو مسلمان کے واسطے خدا کی رضا سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے۔ غور کیجئے اگر کوئی محبوب اپنے محبوں کے دھولیں مارتا اور نافرمانوں کو روپئے دیتا ہو تو اس وقت عاشق کیا چاہے گا، یقیناً عاشق محبوب کی نافرمانی روپئے حاصل کرنے کے لئے کبھی گوارا نہ کرے گا بلکہ وہ نہایت خوشی سے دھولیں کھانا پسند کرے گا کیونکہ محبوب کی رضا اسی میں ہے اسی طرح خدا کا محبوب دنیوی نفع و نقصان کی پروا خدا کی رضا کے سامنے کبھی نہیں کرسکتا بلکہ اس کا مذاق یہ ہوتا ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود برجانِ من | دل فدائے یار دل رنجان من
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں | فوق گردون ست نے قعر زمیں
ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ | جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے محبوب پر جو میری جان کو تکلیف دینے والا ہے فدا ہوں جہاں محبوب ہو خوش وخرم بیٹھو وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند ہے نہ پست جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو)

یہاں تک کہ عشاق تو رضائے الٰہی کے سامنے جہنم کی بھی پروا نہیں کرتے اگر خدا تعالےٰ اسی میں راضی ہوں کہ ان کو جہنم میں بھیجدیا جاوے تو اس پر بھی خوش ہیں اور اُس وقت وہ دوزخ ہی اُن کے واسطے جنت بن جاوے گی۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا
با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے محبوب بغیر آپ کے جنت بھی دوزخ ہے اور آپ کے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ شاعرانہ مبالغہ ہے ورنہ اگر دوزخ میں ان کو بھیجدیا جائے تو ساری بہادری کرکری ہوجائے گی سو خوب سمجھ لو کہ یہ مبالغہ نہیں بلکہ سچی بات ہے اور اس وقت بھی اللہ کی ایک مخلوق ایسی ہے جو خدا کی رضا کے سامنے جہنم کی پرواہ نہیں کرتے دیکھو ملائکہ جو خدا کے مطیع و فرمانبردار اور طالب رضا ہیں ان میں ایک جماعت زبانیۂ جہنم کی بھی ہے جو دوزخ کی داروغہ اور کارکن ہے اور وہ ہر وقت دوزخ ہی میں رہتے ہیں ، اگرچہ دوزخ میں ان پر عذاب نہیں ہے مگر ظاہر ہے کہ ان کے سامنے ہر وقت آگ اور دھواں ہے ، خون اور پیپ کا منظر ہے ، بڑی بری ڈراوتی صورتیں ہیں ، سانپ اور بچھو اور اژدہا وغیرہ ہیں اور ایک جماعت جنت کی کارکن ہے جہاں ہر وقت اُن کے سامنے مناظر حسنہ ہیں باغ اور پھول پھلواری ہے ، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں حسین جمیل صورتیں ہیں پھر جنتیوں کی صحبت ہے جو سب کے سب مہذب اور شائستہ ہیں

اور زبانیۂ جہنم کو دوزخیوں سے پالا پڑتا ہے جن کی باتوں سے بھی لہنا نہیں ہر وقت لعن طعن گالم گلوج ہی ہو گی کلما دخلت امۃ لعنت اختہا تو کیا دوزخ اور جنت کے محافظوں کے ان خارجی حالات میں کچھ بھی تفاوت نہیں ہے ضرور ہے پھر کیا زبانیۂ جہنم کو وہاں کچھ کلفت ہے ہرگز نہیں اگر ان سے یہ کہا جاوے کہ خدا کی مرضی تو نہیں لیکن اگر تم چاہو تو تم کو جنت کا محافظ بنا دیا جاوے جہاں ایسے ایسے مناظر حسنہ ہیں باغات اور نہریں ہیں مہذب آدمیوں کی صحبت ہے لیکن مرضی خدا کی اسی میں ہے کہ تم دوزخ میں رہو جہاں ایسے مناظر کریہہ ہیں تو وہ بھی کہیں گے ؎

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے محبوب بغیر تمہاری رضا کے جنت بھی دوزخ ہے اور آپ کی رضا کے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

پھر جب ملائکہ میں ایک جماعت ایسی موجود ہے جو دوزخ میں رہنے پر ویسے ہی راضی ہے جیسا کہ جنت کے محافظ جنت میں رہنے پر تو اگر انسانوں میں عشاق کی جماعت اس شان کی ہو تو اس پر تعجب کیا ہے کیونکہ انسان میں تو عشق و محبت کا مادہ سب سے زیادہ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ عشق و محبت انسان ہی میں ہے، الغرض یہ مبالغہ شاعرانہ نہیں ہے سچا کلام ہے اور محقق کا کلام ہمیشہ محقق ہی ہوتا ہے مبالغہ شاعرانہ پر مجھے اپنی ایک حکایت یاد آئی۔

جب میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا تو اس وقت ہم لوگ مثنوی حضرت سے پڑھا کرتے تھے ایک مرتبہ مطالعہ میں یہ شعر آیا جس میں توحید کا مضمون ہے ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد

انچہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(ان کا حملہ نظر آتا ہے اور ہوا تصرف حق نظر نہیں آتی یعنی موثریت حق وہ ہمارے دل

سے کم نہ ہو)

اس شعر پر میں بہت چکرایا کیونکہ اینچہ ناپیداست سے مراد اس میں حق تعالےٰ ہیں چنانچہ پہلے اشعار سے یہ بات واضح ہوجائے گی مولانا نے اس سے پہلے یہ بیان فرمایا ہے کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے فاعل حقیقت میں حق تعالےٰ ہیں اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے علم پر شیر کی تصویر بنی ہوئی ہوتی ہے جب ہوا سے جھنڈا ہلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کررہا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ شیر نہ حرکت کرسکتا ہے نہ حملہ بلکہ ہوا کی وجہ سے اس کو حرکت ہوتی ہے اور حرکت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کررہا ہے لیکن ہوا ہم کو نظر نہیں آتی بلکہ ظاہر میں وہ تصویر ہی متحرک معلوم ہوتی ہے۔ یہی مثال ہماری ہے کہ ہم حقیقت میں محض ہیچ ہیں مگر حق تعالےٰ کے فعل کی وجہ سے ظاہر میں ہم فاعل معلوم ہوتے ہیں ؎

ما ہمہ شیراں ولے شیرِ علم

حملہ شاں از باد باشد دمبدم

(ہماری مثال ایسی ہے جیسا پرچم کا شیر ہوتا ہے کہ اس کا حملہ ہوا چلنے سے معلوم ہوتا ہے یعنی ہمارا تصرف تصرفِ حق کی وجہ سے ہے)

اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد

اینچہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(حملہ تصرف ہمارا ان کا نظر آتا ہے اور ہوا یعنی تصرفِ حق نظر نہیں آتا جو چیز نظر نہیں آتی یعنی موثریت حق وہ ہمارے دل سے کم نہ ہو)

یعنی شیروں کا حملہ کرنا تو ظاہر ہے مگر ہوا جو اُن کو حرکت دے رہی ہے ناپیدا ہے یعنی مخفی ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ جو چیز مخفی ہے خدا کرے وہ کم نہ ہو۔ تو اس میں ناپیدا سے مراد حق تعالےٰ ہیں، اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ کے لئے یہ دعا کیونکر صحیح ہوسکتی ہے کہ ہرگز کم مباد تو میں یہ سمجھا کہ مولانا نے محبت کے جوش میں

محض شاعرانہ طریقہ پر یہ دعا کی ہے جیسے شبان موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ایسے ہی مضامین مذکور ہیں کہ وہ محض غلبۂ محبت میں حق تعالیٰ کی شان میں ایسی باتیں کر رہا تھا جو محبوبانِ مجازی کے مناسب ہوتی ہیں اور حق تعالیٰ اُن سے پاک ہیں اسی طرح حق تعالیٰ اس دعا سے بھی مستغنی ہیں مگر محض غلبۂ محبت میں مولانا نے یہ فرمادیا کہ جو چیز مخفی ہے خدا کرے وہ کم نہ ہو یعنی اللہ میاں ہمیشہ سلامت رہیں۔ غرض میں اس شعر میں تاویلیں کرتا تھا لیکن کوئی بات دل کو نہ لگتی تھی۔ کیونکہ یہ سب تاویلیں مولانا کے مرتبہ سے بعید تھیں، مولانا اگرچہ بہت بڑے صاحب حال ہیں مگر شبان موسیٰ کی طرح ایسے مغلوب الحال بھی نہیں ہیں۔ جب حضرت حاجی صاحبؒ کے سامنے درس شروع ہوا تو آپ نے اس شعر کو سن کر بطور تفسیر کے ایک کلمہ ایسا فرمادیا جس سے سارے اشکالات ختم ہوگئے۔ اور معلوم ہوا کہ یہ مضمون شاعرانہ نہیں ہے بلکہ سچی بات ہے ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد
انچہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(حملہ ان کا نظر میں آتا ہے تصرف حق نظر نہیں آتا جو نظر نہیں آتا وہ ہمارے دل سے کم نہ ہو)

حضرت حاجی صاحب فرماتے ہیں اے دل ما (ہمارے دل سے) سبحان اللہ اس کلمہ سے شعر میں جان پڑگئی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ شعر میں تو جان پڑی ہوئی تھی مگر ہم نہ سمجھے تھے۔ حاجی صاحب کے ارشاد سے حقیقت ظاہر ہوگئی، یعنی مطلب یہ ہے کہ جو چیز مخفی ہے خدا کرے وہ ہمارے دلوں سے کم نہ ہو۔ اب کوئی اشکال نہ رہا اور معلوم ہوگیا کہ محقق کا کلام محقق ہی ہوتا ہے۔ البتہ اس کے سمجھنے کے لئے بھی محقق ہونا ضروری ہے اسی طرح اس شعر میں بھی مبالغہ نہیں ہے ؎

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا
با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے بغیر آپ کی رضا کے جنت بھی دوزخ ہے اور آپ کی رضا کے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

کیونکہ بہادری تو جب ہو کہ دوزخ میں اس کو عذاب بھی ہو اور اس شخص کے لئے رضائے الٰہی کے ساتھ دوزخ میں عذاب بھی نہیں کیونکہ اس کے نزدیک۔ تو عذاب نام فراق کا ہے اور جب خدا تعالیٰ کی رضا اس کو دوزخ میں بھی حاصل ہے تو فراق کہاں یہ تو عین وصل ہے غرض عاشق کے نزدیک ظاہری تکالیف کا نام عذاب ہی نہیں وہ تو صرف فراق اور ناراضی محبوب کو عذاب سمجھتا ہے۔ حضرت عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت — فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر — کنایتیست کہ از روزگار ہجراں گفت

(میں نے سنا ہے کہ پیر کنعان یعنی یعقوبؑ نے کیا عمدہ بات کہی کہ محبوب کی جدائی وہ حالت پیدا نہیں کرتی جس کو بیان کیا جا سکے واعظ شہر نے جو ڈراؤ نے حالات قیامت کے بیان کئے ہیں وہ روزگار ہجر سے ایک اشارہ ہے)

اور راز اس میں یہ ہے کہ رضا و تفویض محبت و معیت کی لذت میں وہ آلام و تکالیف ایسے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ان کا اثر معتد بہ محسوس نہیں ہوتا۔ پس اگر فرشتوں کو جہنم میں عذاب ظاہری بھی ہوتا تب بھی وہ اس پر راضی ہوتے کیونکہ خدا تعالیٰ کی رضا اسی میں ہوتی اور وہ مقبول بندے رضا کے طالب ہیں مگر ان پر تو عذاب بھی نہیں ہے غرض ان کے نزدیک جہنم میں رہنا ویسا ہی ہے جیسا کہ جنت میں رہنا۔ مقصود میرا اس بیان سے یہ تھا کہ اصل مضرات خدا تعالیٰ کی ناراضی ہے اس کے سامنے دنیا کا نفع و نقصان کوئی چیز نہیں بس بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر نیت اچھی ہو اور کسی کا نفع ہو تو سفلی عمل بھی جائز ہے جس میں شیاطین سے استعانت ہوتی ہے یہ خیال بالکل غلط ہے اسی طرح آجکل یہ مرض پیدا ہوا ہے کہ بعض لوگ گناہوں کے متعلق وجہ دریافت کیا کرتے ہیں کہ سود کیوں حرام ہوا، اس میں کیا خرابی ہے، جان بیمہ کیوں ناجائز ہے اس میں تو بڑا نفع ہے، سو یاد رکھو کہ اس سوال کا کسی مسلمان کو حق نہیں مسلمان کے لئے اتنی وجہ کافی ہے کہ حق تعالیٰ اس فعل سے ناراض ہیں۔ عاشق کو اتنی بات

معلوم کر لینے کے بعد کہ محبوب اس بات سے ناراض ہوتا ہے کسی اور وجہ کا انتظار نہیں ہوتا پھر مسلمانوں کو گناہوں کے متعلق علل اور اسباب کی تلاش کا انتظار کیوں ہے اور اگر تم عاشق نہیں بنتے تو خدا کے غلام تو ہو اب خود ہی انصاف کر لو کہ اگر تمہارا کوئی لوکر یا غلام تم سے یہ دریافت کرنے لگے کہ آپ فلاں کام سے کیوں ناراض ہوتے ہیں، اس کی وجہ پہلے بتلا دیجئے تب میں اس کام سے باز آؤں گا ورنہ میں اپنی رائے پر عمل کروں گا تو آپ اس کی ساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ افسوس تم تو اس غلام سے بھی گئے گذرے جس کو ایک شخص نے خریدکیا اور پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے اس نے کہا کہ اب تک خواہ کچھ ہی نام تھا لیکن اب سے تو وہی نام ہے جس سے آپ پکاریں آقا نے پوچھا کہ تو کیا کھاتا ہے کہنے لگا کہ حضور کھلائیں گے وہی کھاؤں گا جو آپ پہنائیں گے وہی پہنوں گا۔ افسوس ہم خدا کی ساتھ اتنا بھی برتاؤ نہیں کرتے اور اس کے احکام میں علتیں ڈھونڈھتے ہیں آجکل اکثر تو تعلیم یافتہ اس میں مبتلا ہیں کہ ان کو یہ جواب کافی نہیں ہوتا کہ سود اس واسطے حرام ہے کہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہیں بلکہ وہ اس کی عقلی علت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور جب تک علت نہ معلوم ہو اس وقت تک ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ میں تو سود کے مذموم ہونے کی علت یہ نہیں تسلیم کرتا کہ اس سے دوزخ میں جانا ہوگا بلکہ میں تو اس واسطے اسے حرام سمجھتا ہوں کہ اس میں بے مروتی بہت زیادہ ہے کہ اپنے ایک بھائی کو دیئے تو تھے سو روپئے اور لے لئے دو سو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ علت ایسی ہے جس کو ذرا سے تامل کے بعد ہر عاقل توڑ سکتا ہے کیونکہ ذہین آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسی بے مروتی تو ہر تجارت میں ہے مثلاً ہم نے ایک کپڑا خریدا تو دس روپے میں اور اس کو فروخت کرنے لگے بیس روپے میں یہ بھی بے مروتی ہے۔ ایک مکان ہم نے تیار کیا دو ہزار میں اور بیچنے لگے دس ہزار میں یہ بھی بے مروتی ہے اسی طرح ایک جائداد ہم نے خریدی تھی ہزار میں اور فروخت کرنے لگے پندرہ ہزار میں اب وہ شخص جو سود کو محض بے مروتی کی وجہ سے مذموم سمجھتا ہے ان صورتوں میں اور سود کی صورت میں کوئی فرق عقلی بیان کرے سو ہرگز وہ کوئی فرق . . . .

عقلی نہ بیان کر سکے گا۔ چنانچہ کفارِ مکہ کو بھی یہی شبہ پیش آیا تھا ان کو بھی یہی حیرت تھی وہ کہتے تھے (اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔ (بیع بھی سود کی طرح ہے) کہ ربوا اور بیع میں کیا فرق ہے دونوں ظاہر میں یکساں معلوم ہوتے ہیں تو اب وہ علت کہاں رہی۔ قرآن میں اس کا جواب جو دیا گیا ہے وہ سننے کے قابل ہے حق تعالیٰ نے عقلی وجہ فرق کوئی نہیں بیان فرمائی بلکہ یہ فرق بیان فرمایا۔ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے) کہ دونوں کو یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں بلکہ دونوں میں بڑا فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بیع و تجارت کو تو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے اور حق تعالیٰ مالک ہیں انہیں اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس کو چاہیں حرام کر دیں کسی کو وجہ دریافت کرنے کا کوئی حق نہیں، علماء کو چاہیے کہ ایسے سوالات کے جواب میں قرآن کا طرز اختیار کیا کریں۔ عوام کا مذاق علماء نے بھی خراب کر دیا ہے کہ جب اُن سے ایسے سوالات کئے جاتے ہیں تو وہ عوام کی مرضی کے موافق جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں سو یاد رکھو جو لوگ علتیں گھڑ کر بتلاتے ہیں وہ شریعت کی جڑ کھوکلی کرتے ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ جو علت وہ بتلا دیں اس کو کوئی ذہین آدمی مخدوش کر دے اور جب آپ نے حرمت کا مدار اسی علت پر رکھا تھا تو اس کے مخدوش ہونے کے بعد حکم بھی مخدوش ہو جائے گا۔ میں علماء کو وصیت کرتا ہوں کہ عوام کا ایسا اتباع نہ کریں کہ اس میں عوام کا بھی نقصان ہے اور علماء کا بھی اور شریعت کی بنیاد بھی کمزور ہوتی ہے بلکہ جب کوئی ان سے یہ پوچھے کہ فلاں کام کے حرام ہونے کی علت کیا ہے تو صرف اتنا جواب دے دیا کریں کہ حق تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے یا حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ بعض لوگ سوال میں یہ قید لگا دیتے ہیں کہ اس کا ثبوت قرآن سے دیا جاوے اور علماء بھی خواہ مخواہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کو قرآن ہی سے ثابت کیا جاوے حالانکہ جب اصول شریعت چار ہیں کتاب و سنت و اجماع امت و قیاس تو ہر عالم کو حق ہے کہ وہ کسی مسئلہ کو قرآن سے ثابت کر دے یا حدیث سے یا اجماع سے یا قیاس مجتہد سے آخر تمام مسائل کو قرآن سے آپ کہاں

تک ثابت کریں گے۔ اگر تمام مسائل قرآن سے معلوم ہو سکتے تو پھر دوسرے حجج شرعیہ کی ہی ضرورت کیوں ہوتی بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں ہر چیز ہے یہاں تک کہ وہ ریل اور تار وغیرہ کا ثبوت بھی قرآن سے دینے لگے حالانکہ قرآن میں ہر چیز کے بیان ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ورنہ پھر کپڑا بننے کی ترکیب مشینیں اور کلیں بنانے کا طریقہ بھی قرآن میں ہونا چاہیئے تو پھر قرآن کیا ہوا وہ تو صنعتوں کی کتاب ہوئی۔ بھلا اگر کوئی شخص طب اکبر میں جوتا سینے کی ترکیب ڈھونڈھنے لگے وہ احمق ہے یا نہیں اور اگر طب اکبر میں ایسی ترکیبیں بھی لکھی ہوتیں تو اس کو طب کی کتاب ہرگز نہ کہتے طب اکبر میں ایسی باتوں کا ہونا اس کے لئے عیب ہے اسی طرح قرآن میں جو کہ طب روحانی کی کتاب ہے ایسی فضولیات کا ہونا اس کے لئے کمال نہ ہوگا بلکہ عیب ہوگا۔ قرآن میں دین کی سب باتیں مذکور ہیں مگر یہ ضرور نہیں کہ سب صراحۃً مذکور ہوں بلکہ اس میں قواعد کلیہ مذکور ہیں جس سے مجتہدین مسائل جزئیہ استنباط کرلیں۔ چنانچہ ایک قاعدہ قرآن میں یہ بھی مذکور ہیں مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو کچھ (حکم) دیں اس کو لے لو اور جس بات سے منع کردیں اس سے باز رہو تو اب جتنے احکام احادیث نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ثابت ہیں وہ سب اس قاعدہ کی جزئیات ہیں، لہٰذا ہم کو حق ہے کہ بعض احکام کا ثبوت احادیث سے دیدیں نیز قرآن میں ایک قاعدہ یہ بھی مذکور ہے فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ اے بصیرت والو! اعتبار حاصل کرو۔ اور اعتبار کہتے ہیں ایک نظیر کو دوسری نظیر پر قیاس کرنے کو اس سے معلوم ہوا کہ بعض احکام قیاس سے بھی ثابت ہوتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس پھر ہم کو اس پابندی کی کیا ضرورت ہے کہ ہر مسئلہ کا جواب قرآن ہی سے دیں۔

آجکل ایک فرقہ قرآنیہ پیدا ہوا ہے جو قرآن کے سوا کچھ نہیں مانتے یہ غیر مقلدوں سے بھی بڑھ گئے وہ تو قیاس ہی کو نہ مانتے تھے انھوں نے حدیث کو بھی اڑا دیا اس فرقہ کے ایک عالم سے یہ پوچھا گیا کہ عدد رکعات کا ثبوت قرآن سے دو کیونکہ قرآن میں تو مطلق نماز کا حکم ہے اور بعض آیات میں نماز کے اوقات بھی اشارۃً مذکور ہیں لیکن

عدد رکعات کہ صبح کی دو رکعتیں فرض ہیں اور ظہر کی چار اس کا بیان قرآن میں کہیں بھی نہیں تو تم لوگ یہ عدد کہاں سے سمجھے ہو اگر احادیث سے سمجھے ہو تو احادیث کا حجت ہونا مسلم ہوگیا ورنہ قرآن میں دکھلاؤ کہ یہ اعداد کہاں مذکور ہیں اُس نے ایک دن کی مہلت مانگی۔ اسی سے ان کے مذہب کا لچر ہونا معلوم ہوگیا کہ ابھی تک عدد رکعات کی دلیل بھی معلوم نہیں اور عمل پہلے ہی سے شروع کردیا۔ غرض اگلے دن انہوں نے بہت سوچ ساچ کر یہ آیت پڑھی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ تمام حمد اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے فرشتوں کو بازوؤں والا بنانے والا ہے دو دو اور تین تین اور چار چار۔ یہ دلیل بھی نماز کی رکعتوں کے اثبات کی۔ سبحان اللہ وہی مثال ہوئی ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ بھلا اس آیت میں فرشتوں کے بازوؤں کی شمار کا ذکر ہے یا رکعات صلوٰۃ کے عدد کا۔ اگر محض عدد کا ذکر ہی اس کے لئے کافی ہے تو ایک یہی آیت کیا اور بھی آیتیں ایسی مل جائیں گی۔ چنانچہ ارشاد ہے فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (پس اور عورتوں جو تم کو پسند ہوں نکاح کرلو دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے) یہاں بھی وہ عدد مذکور ہے جو پہلی آیت میں ہے۔ باقی اس سے تو کوئی غرض ہے ہی نہیں کہ یہ عدد کس چیز کا ہے، نماز کا ہے یا فرشتوں کے بازوؤں کا یا منکوحہ عورتوں کا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ۔ غرض علماء کو یہ طرز اختیار نہ کرنا چاہیئے کہ ہر مسئلہ کا قرآن سے ثبوت دینے کی کوشش کریں یا ہر مسئلہ کی عقلی علت بیان کریں کیونکہ بعض جگہ آپ کو علت ہی نہ ملیگی یا ملے گی مگر کمزور ہوگی تو اس طرز سے گویا آپ شریعت کی جڑ کو کھوکلی کرنا چاہتے ہیں ایک صاحب نے مجھ سے اپنا واقعہ بیان کیا کہ ایک جنٹلمین کو میں نے نصیحت کی کہ تم داڑھی کیوں منڈاتے ہو یہ گناہ ہے اس سے توبہ کرنی چاہیئے، وہ کہنے لگے کہ داڑھی کا ثبوت تم قرآن سے اگر دیدو تو میں ابھی توبہ کرلوں گا، میں نے کہا کہ قرآن سے داڑھی کا ثبوت میں دے سکتا ہوں چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی قَالَ یَا بْنَ اُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ

وَلَا بِرَأْسِیْ۔ ہارون علیہ السلام نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا کہ اے میرے ماں جائے میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے داڑھی تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام اسے کس طرح پکڑتے۔ میں نے ان حضرت سے یہ کہا کہ اگر وہ شخص تم سے یہ سوال کرتا کہ اس آیت سے تو داڑھی کا وجود ثابت ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے داڑھی تھی وجوب تو ثابت نہ ہوا کہ اس کا رکھنا واجب ہے تو تم کیا جواب دیتے اور وجود ثابت کرنے کے لئے تم نے قرآن کو کیوں تکلیف دی اپنی ہی داڑھی دکھلا دی ہوتی کہ لو میری داڑھی دیکھ لو اس سے وجود ثابت ہو گیا وہ کہنے لگے کہ اجی اس کو اتنی عقل تھوڑا ہی تھی کہ وہ یہ سوال کر سکتا میں نے تو اس کو ڈرا بڑا ہی لیا۔ میں نے کہا کہ بس یہی فرق ہے ہم طالبعلموں میں اور آپ میں ہم ایسی دلیل کبھی نہیں بیان کر سکتے جو خود ہمارے نزدیک بھی مخدوش ہو۔ ہماری زبان ہی ایسی دلیل پر نہیں چلتی ہم تو حتی الامکان وہی بات منہ سے نکالتے ہیں جو دنیا بھر کے عقلاء سے نہ ٹوٹ سکے گو مخاطب کے مذاق کے موافق نہ ہو۔ پس خوب سمجھ لیجئے کہ یہ طرز شریعت کے لئے بہت ہی ضرر رساں ہے یہ لوگ اپنے دل ہی میں خوش ہوتے ہوں گے کہ ہم نے شریعت کے ساتھ دوستی کی مگر ان کی یہ دوستی ویسی ہی ہے جیسے ریچھ کی دوستی مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک ریچھ پالا تھا اور اسے پنکھا جھلنا سکھایا تھا کہ جب آقا سو جاتا وہ کھڑا ہو کر اسے پنکھا جھلا کرتا تھا، بعض دوستوں نے اسے منع بھی کیا کہ جانور کا اعتبار نہیں اس سے ایسی خدمت نہ لینی چاہئے کہ خود سو جاؤ اور اسے آزاد چھوڑ دو، کہنے لگا کہ نہیں صاحب یہ تعلیم یافتہ ہے (یعنی اب یہ مہذب اور شائستہ ہو گیا ہے وحشی نہیں رہا) اب اس سے کچھ خطرہ نہیں۔ ایک دن یہ آقا صاحب پڑے سو رہے تھے اور ریچھ حسب معمول پنکھا جھل رہا تھا کہ ایک مکھی اس کی ناک پر آ کر بیٹھی ریچھ نے اس کو اڑا دیا وہ پھر آ کر بیٹھی بعض مکھی ایسی لیچڑ ہوتی ہے کہ جتنا اس کو اڑاؤ وہ باز ہی نہیں آتی بار بار آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس مکھی نے ریچھ کو تنگ کر دیا وہ اڑاتا اڑاتا تھک گیا مگر وہ پھر آ موجود ہوتی تھی یہاں تک کہ ریچھ کو غصہ آ گیا اور اس نے پنکھا ڈال کر ایک بڑا سا پتھر تلاش کیا کہ اب کے اگر یہ مکھی آوے گی تو

میں اس پتھر سے اس کو مار ڈالوں گا چنانچہ وہ مکھی پھر آئی اور ریچھ نے تاک کر ایک بڑا سا پتھر آقا کی ناک پر مارا مکھی تو نہ معلوم مری یا نہیں مگر آقا کے دماغ کا بھرتہ ہو گیا تو جس طرح اس ریچھ نے اپنے نزدیک تو آقا کی خدمت ہی کی تھی اور اس کا ارادہ موذی کو مارنے کا تھا اس نے آقا کو ہلاک کرنا نہ چاہا تھا مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ دوستی حقیقت میں آقا کی ساتھ دشمنی تھی اسی طرح آج کل ہمارے یہ نادان بھائی شریعت کے ساتھ ریچھ کی سی دوستی کر رہے ہیں۔ اور اصل راز ایسے گستاخانہ سوالات کا یہ ہے کہ لوگوں میں آجکل عُجب و کبر غالب ہے انقیاد کا مادہ مفقود ہوتا جاتا ہے اسی لئے احکام شرعیہ کو عبدیت کے طور پر ماننے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی اور ایک احکام شرعیہ ہی میں کیا اس عدم انقیاد اور عُجب و کبر کا مذاق ہر معاملہ میں جھلک رہا ہے حتیٰ کہ اگر کسی امر میں اپنی کوئی غلطی بھی محسوس ہو جاوے اور اس غلطی کے اعتراف کے لئے آمادہ بھی ہو جادیں تو اس کا طرز بھی ایسا تجویز کیا ہے جس سے ذرہ برابر ندامت و تواضع نہیں معلوم ہوتی بس چند الفاظ ضابطہ کے دُھرا لینا کافی سمجھتے ہیں اور شان کی اس میں بھی حفاظت رکھی جاتی ہے چنانچہ آجکل کی تہذیب میں معافی چاہنے کا ایسا ہی عجیب طریقہ مشاہدہ ہے کسی کمبخت کا ان کے ہاتھ سے کیسا ہی نقصان ہو جائے بس یہ اتنا کہہ کر چھوٹ گئے کہ میں نہایت افسوس کرتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کا نقصان ہو گیا۔ سبحان اللہ کسی کے جوتے مار لئے اور یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ میں افسوس کرتا ہوں۔

مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی ایک شخص کی ڈاڑھ میں درد تھا وہ ڈاکٹر کے پاس گئے کہ اس ڈاڑھ کو نکال دو۔ نہ معلوم ڈاکٹر سے کیا غلطی ہوئی کہ اس نے وہ ڈاڑھ تو نہ نکالی اس کے بجائے ایک اچھی ڈاڑھ نکال دی جس کے نکلتے ہی یہ شخص فوراً اندھا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ کیا کیا۔ وہ بولے کہ میں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس غریب کی تو آنکھ گئی اور انہوں نے افسوس کر کے بزعم خود اس کی تلافی کر دی۔ پھر غضب یہ کہ افسوس بھی دل سے نہیں کرتے ان کا لہجہ افسوس میں بھی ایسا ہوتا ہے جس سے فرعونیت ٹپکتی ہے۔

کانپور میں ایک طالب علم نے ایک مدرس کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مقدمہ میرے پاس آیا میں نے اس سے کہا کہ استاد سے معافی مانگو ورنہ تم کو مدرسہ سے نکال دیا جائے گا۔ وہ معافی چاہنے پر راضی ہوا مگر معافی چاہنے کی صورت یہ تھی کہ آپ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کر کے تن کر کھڑے ہو گئے اور زبان سے کہا کہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، مجھے یہ صورت دیکھ کر غصہ آگیا میں نے دو تین طمانچے لگائے کہ گستاخ یہ طریقہ ہوتا ہے معافی چاہنے کا آگے ہاتھ جوڑ پیر پکڑ ورنہ ابھی مدرسہ سے نکال دوں گا یہ آجکل کی تہذیب کا اثر ہے جو افسوس ہے کہ طلبا اور علماء میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ معافی اس طرح چاہتے ہیں جس میں ندامت نام کو بھی نہیں ہوتی۔ خیر یہ تو استطراداً ذکر آگیا تھا۔ میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ آج کل لوگوں میں یہ خبط ہے کہ ہر چیز کو قرآن میں ٹھونسنا چاہتے ہیں۔

ایک قصہ یاد آیا اہلِ سائنس نے یہ تحقیق کیا ہے کہ انسان کی منی میں ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے اس سے حمل قرار پاتا ہے۔ ایک صاحب کو اس کی فکر ہوئی کہ قرآن سے اس مسئلہ کو ثابت کیا جائے۔ کیونکہ سائنس والوں کی تحقیق تو غلط ہو ہی نہیں سکتی وہ تو یقیناً صحیح ہے ہی بس کسی طرح اس کو قرآن میں ٹھونسنا چاہئے استغفر اللہ العظیم غرض انہوں نے کھینچ تان کر اس کو قرآن سے ثابت کیا اب سنئے کیا خوبصورت استدلال ہے۔ آپ نے اس آیت سے ثبوت دیا اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (اللہ تعالیٰ کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو خون بستہ سے) عَلَق کے معنے لغت میں خون بستہ بھی ہیں اور جونک کو بھی علق کہتے ہیں۔ آپ نے یہ تفسیر کی کہ خدا نے پیدا کیا انسان کو جونک سے۔ کیا واہیات ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اس تفسیر سے سائنس کا مسئلہ کیونکر ثابت ہو گیا کیونکہ وہ لوگ تو اسی کے قائل نہیں ہیں کہ انسان کی منی میں جونک ہوتی ہے، ہاں اس پر ایک حاشیہ اور لگانا چاہیئے کہ جونک سے مراد وہ نہیں ہے جسے عام لوگ جونک کہتے ہیں بلکہ مطلق کیڑا مراد ہے۔ بس یہ تفسیر کر کے وہ صاحب خود ہی اپنے جی میں خوش ہو لئے ہوں گے۔ تو آپ نے دیکھا کہ اس طرز میں

شریعت کی کس قدر تحریف لازم آتی ہے اور اس سے احتراز کس قدر ضروری ہے اگر کوئی ایسے مسائل کا ثبوت قرآن سے مانگے تو اس سے صاف کہدینا چاہیئے کہ قرآن علمِ تشریح کی کتاب نہیں ہے۔ اسی طرح جب کسی چیز کے حرام ہونے کی وجہ دریافت کی جائے تو بس یہی جواب دیا جائے کہ خدا نے اس کو منع کیا ہے۔ خوامخواہ اپنی طرف سے علتیں نہ گھڑنا چاہئیں بعض لوگ کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ (لوگوں سے ان کی عقلوں کے اندازہ سے کلام کرو) سے استدلال کرتے ہیں کہ حدیث میں اس کا امر ہے کہ لوگوں کی عقل کے اندازہ سے کلام کیا کرو۔ اور جب آج کل طبائع کا حال یہ ہے کہ بدون عقلی علت معلوم کئے انکو تسلی نہیں ہوتی تو ہم کو اسی طرز سے کلام کرنا چاہیئے میں کہتا ہوں کہ آپ نے حدیث کا مطلب صحیح نہیں سمجھا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کے سامنے ایسی تدقیقات اور باریک باریک مضامین نہ بیان کرو جو ان کی سمجھ میں نہ آسکیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان کے مذاق فاسد کی رعایت کیا کرو اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ امور محرمہ کی علت واضح اور سہل کونسی ہے اور باریک اور دقیق کونسی ہے۔ ظاہر ہے کہ جواب سب سے زیادہ سہل یہی ہے کہ خدا تعالےٰ نے اس سے منع کیا ہے اس لئے یہ حرام ہے۔ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے اس لئے ایسا کرنا گناہ ہے اور جو علتیں اور حکمتیں آپ اپنی طرف سے گھڑتے ہیں درحقیقت وہی عوام کی عقول سے باہر ہیں تو اس حدیث سے بھی میری ہی تائید ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ عوام کی اس جواب سے تسلی نہیں ہوتی تو آپ اس کی تسلی کے ذمہ دار نہیں ہیں آپ کو وہی جواب دینا چاہیئے جو اصلی اور حقیقی جواب ہے کہ خدا نے ہم کو اس سے منع کیا ہے یہ ایسا جواب ہے کہ قیامت تک اس پر کوئی جرح نہیں ہوسکتی اور اگر عقلی جواب دینے کا ایسا ہی شوق ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس حقیقی جواب کو بیان کردو اور کہدو کہ جواب اصلی تو یہی ہے پھر اس کے بعد تبرعاً عقلی جواب بھی بیان کردو تاکہ اگر اس پر کوئی جرح کردے تو پہلا جواب تو جرح سے سالم رہے گا اور حکم شرعی کا مدار آپ کی بیان کردہ علت پر تو نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا اتفاق سے ایک جنٹلمین صاحب بھی گاڑی میں اسی درجہ میں رونق افروز تھے ایک اسٹیشن پر پہنچکر ان کا ایک ملازم ایک کتا ان کے سپرد کر گیا جس کو انہوں نے ایک سینچہ سے باندھ دیا جب گاڑی چلی تو میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ شریعت نے کتا پالنے سے کیوں منع کیا ہے حالانکہ اس میں ایسے ایسے کمالات ہیں انہوں نے اس کے وہ کمالات بیان کئے جو خود آقا صاحب میں بھی نہ تھے میں نے کہا کہ اس کے دو جواب ہیں ایک جواب عام ایک جواب خاص جواب عام تو یہ ہے کہ نَهَانَا عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے زیادہ جاننے والے تھے اس لئے ہم کو اس کی تلاش کی ضرورت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں منع کیا اس جواب کو سن کر وہ ساکت ہو گئے مگر ان کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اس جواب سے اُن کی تسلی نہیں ہوئی پھر کہنے لگے کہ میں خاص جواب سننے کا بھی مشتاق ہوں۔ میں نے کہا کہ خاص جواب یہ ہے کہ کتے میں جہاں بہت سے کمالات ہیں وہاں میں ایک عیب بھی اتنا بڑا ہے جس نے اس کے سارے کمالات کو دھو دیا ہے، وہ یہ کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں ہے اپنے آقا کی ساتھ چاہے کیسا ہی وفادار ہو مگر اپنی قوم سے اس کو ایسی نفرت ہے کہ جہاں دوسرا کتا اس کو نظر پڑا اور یہ اس کو پھاڑ کھانے کو دوڑا بس جس میں قومی ہمدردی نہیں وہ پاس رکھنے کے قابل نہیں۔ یہ جواب چونکہ ان کے مذاق کے موافق تھا، کیونکہ یہ لوگ قومی ہمدردی کا سبق رات دن رٹا کرتے ہیں گو اس پر عمل کی توفیق نہ ہو، اس جواب سے پھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ بس جواب یہ ہے حالانکہ یہ جواب کچھ بھی نہیں محض لطیفہ ہے۔

پھر بریلی میں میں نے ایک تحصیلدار صاحب سے سنا کہ کالج علیگڈھ میں اس جواب کا بڑا چرچا ہے اور طلبہ کہتے ہیں کہ واقعی امت کو ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ایسی تحقیقات بیان کر سکیں، ڈلے، پتھر۔ میں کہتا ہوں کہ وہی لوگ اس جواب سے خوش

ہوں گے ورنہ ہمارے نزدیک یہ جواب خاک بھی نہیں ہیں اس جواب پر خود جرح کرتا ہوں وہ یہ کہ ایک کتا جو دوسرے کو دیکھ کر بھونکتا ہے تو غور کرنا چاہیئے اس کا منشا کیا ہے آیا اس کا سبب اپنی قوم سے بے وفائی ہے یا آقا کی وفاداری۔ سو بظاہر آقا کی وفاداری اس کا سبب ہے وہ یہ سمجھ کر اس پر بھونکتا ہے کہ یہ میرے آقا کا دشمن ہے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کے گھر میں دس کتے پلے ہوئے ہوں تو وہ آپس میں ایک دوسرے پر نہیں بھونکتے بلکہ وہ ہمیشہ اجنبی کتے پر بھونکتا ہے اور وہ بھی اس وقت تک جبتک کہ مالک اس کو روک نہ دے اور جہاں اس نے روکا فوراً خاموش ہوجاتا ہے کیونکہ اب سمجھ جاتا ہے کہ یہ میرے مالک کا دشمن نہیں اسے اس سے کچھ خوف نہیں پھر اس کے بعد مالک کے پیروں کو آکر لپٹ جاتا ہے اور ایسی خوشامدیں کرتا ہے جیسے کوئی بہت ہی بڑا عاشق ہوحتیٰ کہ اس کی اس محبت سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے، کتے کی دشمنی بھی بُری اور زیادہ دوستی بھی بُری۔ لیجئے جس جواب پر یہ لوگ اتنے خوش ہوئے تھے اس کو میں نے خود ہی مجروح کر دیا۔ بخلاف پہلے جواب کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس کے پالنے سے منع کیا ہے کہ اس جواب پر کوئی جرح ہو ہی نہیں سکتی۔ اب اگر کوئی ہم سے یہ پوچھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں منع فرمایا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو ہم سے اس سوال کا کوئی حق نہیں یہ سوال اگر تمہارے اندر ہمت ہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر لینا ایک جج کے سامنے مقدمہ پیش ہوتا ہے اور وہ قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اس سے یہ سوال کرنے کا کسی کو حق نہیں کہ یہ قانون کیوں وضع ہوا۔ اور اگر کوئی ایسا بے ہودہ سوال کرے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں عالم قانون ہوں واضع قانون نہیں ہوں۔ یہ سوال تم کو پارلیمنٹ یا مجلس واضعان قانون سے کرنا چاہیئے اور جج کے اس جواب کو تمام عقلاء معقول سمجھتے ہیں، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ یہی جواب اگر علماء دیں تو وہ معقول نہ ہو۔ ان پر جرح قدح کیوں کی جاتی ہے۔ علماء نے اس کا کب دعویٰ کیا ہے کہ ہم واضع قانون ہیں۔ بلکہ وہ تو صاف کہتے ہیں کہ ہم صرف قانون کے

جاننے والے ہیں ہم سے یہ سوال تم کر سکتے ہو کہ یہ قانون کہاں ہے ہم تم کو قرآن یا حدیث یا فقہ میں وہ قانون دکھلا دیں گے باقی وضع قانون کی علت کو ہم نہیں جانتے یہ سوال واضع قانون سے کرو۔ اور واضع قانون حق تعالیٰ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی واضع نہیں ہیں آپ بھی صرف مبلغ ہیں آپ کی تو یہ شان ہے

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(آپ کا فرمان فرمودہ خدا ہے اگرچہ وہ فرمان ایک اللہ کے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے نکلا ہے۔)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے علماء کی یہ حالت ہے ؎

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

(پس پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھا دیا ہے جو حکم استاد ازل سے ملا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

اور اس کے یہ معنی نہیں کہ ان احکام میں حکمت نہیں ہے۔ حکمت ہے اور ضرور ہے اور بعض کو علما جانتے بھی ہیں مگر یہ کیا ضرور ہے کہ تم کو بتلا بھی دیں۔ ہمارے پاس گنی ہے مگر ہم تم کو نہیں دیتے کسی کا کیا اجارہ ہے۔ غرض ہم واضع قانون نہیں ہیں جو قانون کی علتیں بتلانا ہمارے ذمہ ضروری ہو، ہم تو اتنی بات جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے سود کو حرام کیا ہے اس لئے وہ حرام ہے اگر یہ سوال کرو کہ کہاں حرام کیا ہے اس کا جواب البتہ ہمارے ذمہ ہے ہم کہہ دیں گے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (اللہ تعالیٰ نے بیع حلال کیا اور سود کو حرام کیا) میں اوپر یہ بیان کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے سود کے حرام ہونے کی علت یہ سمجھی تھی کہ اس میں بے مروتی ہے سو یہ علت علت نہیں، کیونکہ اس طرح تو ہر تجارت میں بے مروتی ثابت کی جا سکتی ہے بلکہ اصل علت وہی ہے جو میں نے بتلائی بعض لوگ اپنی طرف سے احکام کی علتیں تراش کر غلہ کی تجارت کو حرام

سمجھنے لگے سو یہ بالکل غلط ہے۔ غلہ کی تجارت ویسی ہی ہے جیسے اور چیزوں کی تجارت اس میں کچھ حرج نہیں رہا یہ کہ اس میں گرانی کا انتظار ہوتا ہے سو میں کہتا ہوں کہ گرانی کا طبعی انتظار ہونے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ ہاں زیادہ گرانی کی دعا مانگنا یا تمنا کرنا بُرا ہے باقی اپنے نفع کی دعا کرنا یہ جائز ہے گو اس میں گرانی کی تمنا بھی لازم آتی ہے اور فقہائے جو احتکار کو منع کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قحط کے زمانہ میں غلہ کا روکنا جبکہ بستی میں غلہ ملتا ہی نہ ہو اور لوگوں کو تکلیف ہونے لگے اس وقت حرام ہے اور اگر دکانوں پر غلہ ملتا ہو تو روکنا حرام نہیں ہے۔ غرض یہ جو مشہور ہے کہ نفع کی امید میں بھی غلہ کا روکنا حرام ہے یہ صحیح نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہم نے اپنی طرف سے علتیں گھڑ گھڑ کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر رکھا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے غلہ کی تجارت بالکل نکل گئی اور صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ گئی۔ ہے، اگر آج وہ مسلمانوں کے ہاتھ غلہ بیچنا موقوف کر دیں تو وہ نہایت پریشان ہو جائیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر شہر اور گاؤں اور قصبہ میں غلہ کی تجارت کرنے والے مسلمان بھی ہونے چاہئیں تاکہ کسی وقت مسلمانوں کو پریشانی لاحق نہ ہو۔ غرض اسی حکمت و حلت کا اول تو علماء ہی کو معلوم ہونا ضرور نہیں پھر اگر معلوم بھی ہو تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نہیں بتلاتے بھلا اگر تم ڈاکخانہ میں جا کر بابو سے یہ پوچھو کہ ایک تولہ کا محصول کیا ہے اور وہ تم کو بتلادے کہ تین پیسے محصول ہے پھر تم اس سے یہ سوال کرو کہ تین پیسے محصول ہونے کی کیا وجہ تو وہ اس کے جواب میں کیا کہے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا کہ صاحب میں قانون کے مطابق کام کرنے والا ہوں اگر تم تین پیسے سے کم کا ٹکٹ لگاؤ گے میں لفافہ کو بیرنگ کر دوں گا، آگے میں کچھ نہیں جانتا کہ اس کی وجہ کیا ہے اور کیا نہیں ہاں اگر تم کو میرے کہنے کا اعتبار نہ ہو تو میں تم کو قواعد ڈاک کی کتاب میں دکھلا سکتا ہوں کہ ایک تولہ کا محصول وہی ہے جو میں نے بتلایا اس سے زیادہ تم مجھ سے سوال نہیں کر سکتے۔ افسوس ہے کہ ڈاکخانہ کا بابو یہ جواب دیدے تو سب اس کو تسلیم کر لیں اور علماء کے ایسے ہی جواب کو تسلیم نہ کیا جاوے۔ آخر دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے

مگر آج کل تو ہر شخص دین کے بارہ میں اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے کہ اپنی عقل سے علتیں گھڑ کر اُن پر احکام کا مدار سمجھتے ہیں چنانچہ بعض کا مقولہ سنا گیا ہے کہ نماز کے لئے وضو اس لئے فرض کیا گیا تھا کہ اہل عرب اونٹوں کے چرانے والے وحشی لوگ تھے ان کے منہ پر غبار اور ہاتھ پیر پر پیشاب کی چھینٹیں بھی پڑتی تھیں اس لئے ان کو حکم کیا گیا کہ نماز سے پہلے وضو کیا کرو چنانچہ وضو میں انہی اعضاء کا دھونا فرض بھی کیا گیا جو اکثر کام کاج میں ملوث ہو جاتے ہیں باقی ہم لوگ تو مہذب ہیں اکثر اوقات دستانہ اور موزے چڑھائے رہتے ہیں پھر شیشہ دار مکانوں میں بیٹھے رہتے ہیں ہمارے ہاتھ پیروں کو گرد بھی نہیں پہونچتی اس لئے ہم پر وضو فرض نہیں۔ یہ دلیل ویسی ہی ہے جیسے ایک سرحدی پٹھان نے بیان کی تھی۔ ایک سرحدی ریل سے اترا تو اس کی بغل میں دو من کا ایک بورا بھی تھا جس کی بلٹی وغیرہ اس نے کچھ نہ کرائی تھی جب ٹکٹ دینے لگا تو بابو نے کہا کہ اس بورے کی بلٹی لاؤ کہنے لگا کہ بلٹی کیا ہوتا ہے بابو نے کہا کہ اس سامان کا ٹکٹ اس نے پھر وہی ٹکٹ دکھا دیا جو پہلے دکھایا تھا۔ بابو نے کہا یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے اس کا ٹکٹ لاؤ وہ کہنے لگا کہ نہیں یہی ٹکٹ ہمارا ہے اور یہی ٹکٹ اس کا ہے بابو نے کہا کہ پندرہ سیر سے زیادہ سامان کے لئے دوسرا ٹکٹ ہونا چاہیئے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہی پندرہ سیر ہے ریلوے نے پندرہ سیر کا جو قانون مقرر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر سامان آدمی بلا تکلف خود اٹھا سکے وہ معاف ہے اور ہندوستانی آدمی پندرہ سیر ہی اٹھا سکتا ہے اس لئے اس نے پندرہ سیر لکھدیا اور ہم دو من اٹھا سکتے ہیں اس لئے ہمارا یہی پندرہ سیر ہے تو کیا اس جواب کو ریل بابو تسلیم کر سکتا ہے ہرگز نہیں وہ یہی کہے گا کہ ہم قانون کا راز کچھ نہیں جانتے ہمارے پاس کتاب میں یہی قانون لکھا ہوا ہے کہ پندرہ سیر سے جو زیادہ ہو اس کی بلٹی ہونی چاہیئے جس میں ہندوستانی اور کابلی کی کوئی تخصیص یا استثناء نہیں ہے۔ اور اس کے اس جواب کو تمام مہذب لوگ صحیح مانیں گے اسی طرح ہم اس دلیل کے جواب میں کہتے ہیں کہ حق تعالےٰ نے وضو کو فرض کیا ہے جس میں مہذب اور دیہاتی کا کوئی فرق نہیں ہے اس لئے

وضو ہر شخص پر فرض ہے، ہم تم کو قرآن میں عام حکم دکھلا سکتے ہیں اس سے آگے ہم کچھ نہیں جانتے ہم کو خبر نہیں کہ اس حکم کی علت کیا ہے۔ یہ مضمون اس پر بیان ہوا تھا کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ضرر سے بچنے کے لئے یا کسی دنیوی منفعت کے لئے تعویذ وغیرہ کرنا مطلقاً جائز ہے خواہ اس میں شیاطین ہی سے استعانت ہو یہ بالکل غلط ہے۔ اور میں نے یہ بیان کیا تھا کہ دنیوی مضرت کا اعتبار نہیں اصل مضرت حق تعالیٰ کی ناراضی ہے۔ مگر اس کو لوگ ہلکا سمجھتے ہیں یہ خیال کر لیا ہے کہ ابھی حق تعالیٰ سے ملاقات تھوڑا ہی ہو رہی ہے گناہ کر کے توبہ کر لیں گے پھر پاک صاف ہو کر حق تعالیٰ سے مل لیں گے میں کہتا ہوں کہ اول تو حق تعالیٰ سے ملنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود (یہی سانس آخری سانس ہو) اور اگر تم کو ایسا ہی زندگی پہ بھروسہ ہے تو یہ کونسی عقلمندی ہے کہ توبہ کے سہارے گناہ کا ارتکاب کیا جائے اسکی تو بعینہ وہ مثال ہے جیسے کوئی تریاق کے بھروسہ سنکھیا کھاتا چاہے یا منتر جاننے کی وجہ سے سانپ سے کٹوانا چاہے کہ زہر کھا کر تریاق کھا لوں گا یا سانپ کے کاٹنے کے بعد منتر سے جھاڑ لوں گا۔ تو کیا جو لوگ توبہ کے بھروسہ گناہ کرتے ہیں وہ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ ہر گز نہیں۔ علاوہ اس کے حق تعالیٰ کے ساتھ محبت کا تعلق بھی تو ہے تو کیا اس کا مقتضا یہی ہے۔ صاحبو! اگر کسی عاشق کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا محبوب فلاں کام سے ناراض ہے تو کیا اس کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ابھی تو محبوب کی ملاقات میں دیر ہے لاؤ اس کام کو کر لوں۔ صاحبو! عاشق سے کبھی یہ نہیں ہو سکتا اس کی محبت ہر گز محبوب کے خلاف رضا کام کرنے کی اجازت نہ دے گی گو ملاقات میں کتنی ہی دیر ہو بلکہ گو ملاقات بھی ہونے والی نہ ہو پھر افسوس ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہم اس کے خلاف برتاؤ کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پوری محبت ہی نہیں ہے تو اس صورت میں شکایت اور زیادہ ہو گئی کہ ہم کو بیوی اور بال بچوں سے تو کیسی محبت ہے۔ ایک ادنیٰ حسین صورت سے ہم کو کیسا تعلق ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ سے ہم کو اس درجہ کی محبت نہ ہو جو کہ جلال و جمال و کمال و نوال میں سب سے زیادہ کامل ہے اور جو کچھ دوسروں میں ہے

سب اسی کا عطا کیا ہوا ہے ؎

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن — صبر چوں داری زرب ذو المنن
اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں — صبر چوں داری زنعم الماہدون

(اے شخص تجھ کو بیوی بچوں سے صبر نہیں ہے تو حق تعالیٰ شانہ سے تجھ کو کیسے صبر آگیا جب تجھ کو دنیائے حقیر سے صبر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ سے تجھ کو کیسے صبر آگیا)

اور گو نفس محبت تو ہے مگر دوسروں کی محبت نے اسے مغلوب کر رکھا ہے اس لئے ناراضئ حق کی گرانی کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ جب آدمی کو سانپ ڈس لیتا ہے تو اُس کو نیم کے پتے تلخ نہیں معلوم ہوتے۔ اسی طرح ہم کو دنیا کے سانپ نے ڈس رکھا ہے اس لئے ناراضی خداوندی کی تلخی ہم کو محسوس نہیں ہوتی، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہم کو رضائے الٰہی کی حلاوت ہی کا ادراک نہیں ہوا اس لئے ناراضی کی تلخی کا بھی احساس نہیں ہوتا اَلْاَشْیَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِھَا یعنی ہر چیز کی حقیقت اس کی ضد سے معلوم ہوا کرتی ہے۔ حضرات اہل اللہ کو رضاء الٰہی کی حلاوت معلوم ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ ناراضی کی تلخی کو بھی محسوس کرتے ہیں سالک کے دل میں تعلق مع اللہ کی ایک حلاوت ہوتی ہے نسبت مع اللہ کی وجہ سے ایک نور ان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے جس کے فقدان سے اُن کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(عارف کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے)

جب ان کی قلبی کیفیت میں ذرا سی بھی کمی ہوتی ہے تو اُن کے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے دوسروں کو ناراضئ الٰہی کا احساس کیونکر ہو دل تو پہلے ہی سے کالا توا ہو رہا ہے دل میں تعلق مع اللہ کا نور پیدا کرو اس وقت سمجھوگے کہ ناراضئ حق کی تلخی کیسی ہوتی ہے

پھر خود بخود یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے گا کہ واقعی اصلی مضرت خدا کی ناراضی ہے۔ اُس کے سامنے دنیا کے منافع اور مضرتوں کی کچھ حقیقت نہیں چنانچہ اس مسئلہ کو قرآن شریف میں بہت صاف طور پر حل کر دیا گیا ہے: ارشاد فرماتے ہیں یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۔ لوگ آپ سے شراب اور جوئے کی بابت سوال کرتے ہیں (کہ یہ حلال ہیں یا حرام) آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں ایک گناہ (ہے مگر وہ) بڑا (گناہ) ہے اور لوگوں کے لئے منافع متعدد ہیں۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ طرز کا جواب ہے یعنی لوگوں کو شراب اور جوئے کی حرمت میں یہ وسوسہ ہو سکتا تھا کہ ان میں منافع دنیویہ بہت ہیں اس لئے ان کو حرام نہ کرنا چاہیئے تو حق تعالےٰ اس شبہ کا اصل سے انکار نہیں فرماتے بلکہ اس کو تسلیم فرماتے ہیں کہ واقعی ان میں لوگوں کے لئے نفع بھی ہے اور ایک ہی نفع نہیں بلکہ ہم صیغۂ واحد کے بجائے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں کہ ان میں بہت سے منافع ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان میں ایک گناہ بھی ہے اس جگہ یہ بات قابل غور ہے کہ حق تعالےٰ نے منفعت کے بیان میں تو جمع کا صیغہ استعمال فرمایا یعنی منافع للناس اور مضرت کے بیان میں صیغۂ واحد لایا گیا یعنی اثمٌ اگر یہ کلام بشر کا ہوتا تو مقابلہ کے لئے یہاں بھی جمع کا صیغہ اٰثامٌ ہوتا مگر نہیں حق تعالےٰ نے اس جگہ صیغۂ واحد ہی اختیار فرمایا جس سے اس حقیقت پر متنبہ فرمانا منظور ہے کہ اگر کسی چیز میں ہزاروں منفعتیں ہوں مگر اس میں ایک گناہ بھی ہو یعنی ادنیٰ شائبہ ناراضی حق کا ہو تو وہ ہزاروں منفعتیں ایک گناہ کے سامنے ہیچ ہیں کیونکہ جس طرح خدا کی رضا خواہ ذرا ہی سی ہو بڑی دولت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اللہ تعالیٰ کی رضا بہت بڑی چیز ہے) اسی طرح خدا تعالیٰ کی ناراضی بھی بڑی وبال کی چیز ہے خواہ اس ناراضی کا سبب ایک ہی گناہ کیوں نہ ہو اسی لئے گو اس جگہ اثمٌ بصیغۂ واحد لایا گیا مگر اس کو کبیرٌ کی ساتھ موصوف کر دیا گیا ہے حاصل یہ ہوا کہ شراب اور جوئے میں منافع تو بہت ہیں مگر ایک گناہ بھی ہے اور وہ ایک ہی گناہ اتنا بڑا ہے جس نے

ان سب منافع کو گاؤ خورد کر دیا ہے اسی لئے آگے منافع کا لفظ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ نفع کا لفظ اختیار فرمایا وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کہ ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے یہاں صیغہ واحد اختیار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ پہلے کلام سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ ان منافع کے مقابلہ میں ایک گناہ بھی ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر ایک من مٹھائی میں تولہ بھر زہر ملا ہوا ہو تو وہ ساری مٹھائی اس ایک تولہ زہر کی وجہ سے خاک میں مل جاتی ہے، اسی طرح جب وہ منافع ایک گناہ کی وجہ سے خاک میں مل گئے تو اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا جاوے۔ اس لئے فرماتے ہیں وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (ان دونوں کا گناہ ان کے منافع سے زیادہ ہے) اس آیت نے فیصلہ کر دیا کہ کسی چیز کے حرام ہونے اور گناہ ہونے کا مدار دنیا کے نفع و نقصان پر نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھے ہوئے ہیں اور بعض دفعہ زبان سے بھی کہہ دیتے ہیں کہ اس کام میں کیا حرج ہے یہ تو نفع کی چیز ہے چنانچہ تعویذ و عملیات میں بہت لوگ اسی دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ جس عمل سے کسی کو نفع ہوتا ہو وہ جائز ہے، خواہ اس میں شیاطین سے استعانت ہو یا کیسے ہی بیہودہ کلمات استعمال کرنے پڑتے ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ شراب اور جوئے کی نسبت حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ان میں لوگوں کے لئے ایک نفع نہیں بلکہ بہت سے منافع ہیں مگر پھر بھی یہ حرام ہیں کیوں محض اس لئے کہ خدا ان کو پسند نہیں فرماتے وہ ان سے ناراض ہوتے ہیں۔ اب یہ مسئلہ بالکل حل ہو گیا کہ حرمت کا مدار خدا تعالیٰ کی ناراضی پر ہے پس معلوم ہو گیا کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال کا ثواب نیتوں پر ہے) کا حکم گناہوں میں نہیں گناہ کسی نیت سے بھی ہو جائز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ بعض اعمال نیت کے بغیر موجب ثواب نہیں ہوتے جیسے مباحات اور بعض بغیر نیت کے صحیح ہی نہیں ہوتے جیسے نماز روزہ وغیرہ چنانچہ اگر کوئی شخص نماز کی صورت بنالے لیکن نماز کی نیت نہ کرے تو وہ نماز نہیں ہے۔ یہاں سے میں آپ کو ایک بات بتلاتا ہوں اگرچہ اس کے بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن صرف اس لئے بیان

کرتا ہوں تاکہ تنگی کے وقت لوگ اپنے ایمان کو محفوظ کرلیا کریں اور کفر سے بچ جاویں وہ بات یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسی صورت پیش آتی ہے کہ کوئی بے نمازی نمازیوں میں جا پھنستا ہے نماز کا وقت آگیا اور سب لوگ نماز کے لئے تیار ہوگئے اب یہ بے نمازی آدمی بڑا پریشان ہوتا ہے نماز نہ پڑھے تو سب اُس کو ملامت کرتے ہیں بُرا بھلا کہتے ہیں اور نماز پڑھتا ہے تو یہ مصیبت ہے کہ اس کو غسل جنابت کی ضرورت ہے سب کے سامنے غسل کرے تو زیادہ بدنامی ہوتی ہے اب ایسی صورت میں یہ بے نمازی بدنامی سے بچنے کے لئے نماز میں شریک ہوجاتا ہے، اور فقہاء نے لکھا ہے کہ بے وضو نماز پڑھنا کفر ہے تو میں کہتا ہوں کہ ایسی حالت میں اگر کوئی ایسا شخص نماز پڑھے تو اُس کو چاہیئے کہ نماز کی نیت نہ کرے بلکہ بدون نیت کے نماز کی نقل کرتا رہے اس طرح یہ شخص کفر سے بچ جاوے گا اگرچہ ترک نماز کے گناہ کی ساتھ دھوکا دینے کا بھی گناہ ہوگا کہ لوگ اس کو نمازی سمجھیں گے اور ہے بے نمازی مگر کفر سے تو بچ جاویگا دیکھئے شریعت میں کس قدر رعایت ہے کہ مجرم بھی اس سے محروم نہیں ہے پھر بھی افسوس ہے کہ لوگ شریعت کو تنگ بتلاتے ہیں مگر خدا کے واسطے اس ترکیب سے ہمیشہ کام نہ لینا اور نہ اس حالت میں امامت کرنا، ورنہ سارے نمازیوں کی نماز کا وبال تمہاری گردن پر ہوگا۔ غرض عیب کرنے کے لئے بھی ہنر چاہیئے، اگر کوئی شخص بدنامی سے بچنے کے لئے بے وضو ہی نماز میں شریک ہو تو اس کو کفر سے بچنے کیلئے نماز کی نیت نہ کرنا چاہیئے۔ آج کل بہت آدمی ایسے ہیں جو ظاہر میں نمازی معلوم ہوتے ہیں مگر وہ بے وضو ہی پڑھا تے ہیں، یا بلا عذر ارکان کو اڑا دیتے ہیں اور افسوس یہ کہ ایسے لوگ مقتدا اور لیڈر بھی ہوجاتے ہیں چنانچہ آجکل ایک لیڈر ہیں جو پہلے تو بے نمازی ہی تھے مگر اب چند روز سے نمازی ہوگئے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ ایک مرتبہ اسٹیشن پر اُتر کر موٹر میں سوار ہوئے نماز کا وقت تھا تو موٹر ہی میں بیٹھے بیٹھے آپ نے نماز شروع کردی حالانکہ موٹر کھڑا ہوا تھا، پاس زمین موجود تھی اتر کر نماز پڑھ سکتے تھے مگر اُن کی بلا اُترے انہوں نے موٹر ہی میں نماز شروع کردی۔ انہیں لیڈر کا ایک قصہ یہ ہے

کہ ایک مرتبہ نماز کا وقت آیا پانی موجود نہ تھا تیمم کی ضرورت ہوئی آپ کو تیمم کا طریقہ تو معلوم نہ تھا اور کسی سے پوچھا اس لئے نہیں کہ لیڈر اور مقتدا ہو کر کسی سے پوچھنا عیب کی بات ہے لوگ کہیں گے کہ یہ اچھا لیڈر ہے جسے تیمم کا قاعدہ بھی معلوم نہیں۔ غرض خود ہی تیمم شروع کر دیا سب سے پہلی حرکت تو آپ نے یہ کی کہ مٹی لیکر ہاتھ کو ملی جس طرح پانی کو ملا کرتے ہیں حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ مٹی پر ہاتھ مار کر مٹی کو جھاڑ کر پھر ملنا چاہیئے شریعت نے بدن کو بھبوت ملنے سے منع کیا ہے کیونکہ یہ مسئلہ ہے جس سے انسان کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ سبحان اللہ کس قدر رعایت ہے کہ تمہاری صورت بھی بگاڑنا نہیں چاہتے تو ان لیڈر صاحب نے اول تو مٹی کو پانی کی طرح ہاتھ پر بہایا پھر منہ میں بھی مٹی دی گویا آپ نے مٹی سے کلی کرنا چاہا۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور سب کو اُن کی جہالت معلوم ہو گئی اس سے تو یہی اچھا ہوتا کہ وہ پہلے چپکے سے ایک آدمی سے پوچھ لیتے کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے اگر جہالت ظاہر ہوتی تو ایک ہی آدمی پر ظاہر ہوتی یا دوسروں کے تیمم کو دیکھ لیتے مگر آپ نے اجتہاد سے کام لیا جس سے سب کو معلوم ہو گیا کہ بالکل ہی جاہل ہے اس پر بھی وہ مسلمانوں کے پیشوا اور لیڈر بنے ہوئے ہیں۔ ایک اور صاحب کی حکایت ہے کہ انھوں نے سفر میں مغرب کی نماز پڑھائی تو دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت کی؟ کہنے لگے کہ میں مسافر ہوں اس لئے میں نے قصر کیا ہے۔ ایک صاحب نے سفر میں مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھی جب امام تیسری رکعت کے لئے اٹھنے لگا تو یہ حضرت سلام پھیر کر بیٹھ گئے بعد میں لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ فرماتے ہیں کہ میں مسافر ہوں اس لئے میں نے قصر کیا ہے۔ غرض آجکل کثرت سے اس قسم کے بھی نمازی ہیں کہ ظاہر میں نمازی معلوم ہوتے ہیں مگر نہ معلوم وہ کیا کیا گڑبڑ کرتے ہیں ہر شخص اپنے اجتہاد سے کام لیتا ہے مسائل سیکھنے سے عار آتی ہے ساری خرابی تکبر کی ہے۔ اگر کسی ملا سے چند اردو ہی کے رسائل پڑھ لیا کریں تو یہ رسوائی نہ ہو، اور یہ شکایت عوام ہی کی نہیں بلکہ بعض مولوی بھی جو معقول وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں ایک مولوی صاحب جو آجکل بڑے لیڈر مشہور ہیں ابتدا میں وہ ایک عربی مدرسہ میں ملازم ہوئے تھے۔ معقول میں تو بڑی مہارت تھی مگر دین سے ایسے ناآشنا کہ اسی زمانہ میں اُن کی شادی ہوئی

جب گھر سے مدرسہ میں آئے تو آپ کے ہاتھوں کو مہندی لگی ہوئی تھی۔ غرض بعضے مولوی بھی جاہل ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بعض جاہل مولوی مشہور ہو جاتے ہیں کیونکہ مولوی اصل میں وہ ہے جو اللہ والا ہو اور اللہ والا آدمی شریعت سے جاہل نہیں ہو سکتا مگر آجکل جہاں کسی نے عربی کی دو چار کتابیں پڑھ لیں اسے مولوی کہنے لگتے ہیں چاہے اُسنے محض معقول و ادب ہی پڑھا ہو اور دینیات کا ایک سبق بھی نہ پڑھا ہو حالانکہ یہ شخص حقیقت میں مولوی ہی نہیں۔ اگر معقول پڑھنے سے آدمی مولوی ہو جایا کرے تو ارسطو و جالینوس سب سے بڑے مولوی ہونے چاہئیں کیونکہ یہ لوگ معقول کے امام ہیں حالانکہ ان کے موحد ہونے میں بھی کلام ہے اور اگر ادب پڑھنے اور عربی میں گفتگو کر لینے اور تحریر لکھ لینے سے مولوی ہو جایا کرے تو ابولہب اور ابوجہل سب سے بڑے مولوی ہونے چاہئیں کیونکہ یہ لوگ بہت بڑے عربی دان اور فصیح و بلیغ تھے تو محض معقول و ادب سے انسان مولوی نہیں ہو سکتا مگر آج کل ان کو بھی مولوی مشہور کر دیتے ہیں اور یہ مرض اوپر ہی سے چلا آتا ہے چنانچہ ملا محمود جونپوری اپنے زمانہ میں بڑا فاضل مشہور تھا حالانکہ وہ محض ایک فلسفی آدمی تھا علوم شریعت میں اُسے مہارت نہ تھی مگر مشہور بہت ہو گیا تھا حتیٰ کہ شاہ دہلی نے اس کو طلب فرمایا اور بہت اعزاز و اکرام کیا، ایک ملا بادشاہ کے یہاں پہلے سے مقرب تھے اُن کو فکر ہوئی کہ اگر ملا محمود کی دال گل گئی تو پھر ہماری پوچھ کم ہو جائے گی اس لئے وہ اس فکر میں تھے کہ کسی موقعہ پر ملا محمود کا جاہل ہونا بادشاہ پر ظاہر کیا جائے۔ خشک مولویوں میں یہ مرض حسد وغیرہ کا ہوا کرتا ہے چنانچہ ایک دن کوئی جنازہ آیا اور لوگوں نے ملا سے کہا کہ جنازہ کی نماز پڑھا دو انہوں نے ملا محمود سے کہا کہ آپ کے ہوتے ہوئے میں نماز نہیں پڑھا سکتا آپ پڑھا دیں، ملا محمود نے انکار کیا مگر اصرار کے بعد مجبور ہو کر آگے بڑھے اُن ملا نے کان میں کہہ دیا مجمع زیادہ ہے ذرا قرأت بلند آواز سے پڑھے اَللّٰہُ اَکْبَر کہکر انہوں نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ باواز بلند پڑھنا شروع کر دی لوگوں نے نماز توڑ دی اور ایک شور مچ گیا کہ یہ کون جاہل ہے جسے جنازہ کی نماز بھی نہیں آتی بغرض

مصلے پر سے پیچھے ہٹائے گئے اور سب لوگوں میں ان کی جہالت کا چرچا مشہور ہو گیا ہیں یہ بیان کر رہا تھا کہ اگر کوئی بے نمازی نمازیوں میں پھنس جاوے تو اس کو نماز کی نیت نکرنا چاہیئے کیونکہ بے وضو نماز پڑھنا کفر ہے اسی طرح فقہا نے لکھا ہے کہ حرام مال پر بسم اللہ کہنا کفر ہے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ایک مفسر نیچری نے ایک تفسیر لکھی ہے جس کی اس جماعت میں بڑی شہرت ہے مگر اللہ کے بندہ نے اپنی تمہید میں بسم اللہ تک نہیں لکھی بس جہاں سے قرآن شروع ہوا ہے وہیں بسم اللہ ہے مفسر کی تمہید بسم اللہ سے شروع نہیں ہوئی اس تفسیر کا ایک جواب البرہان ہے بہت ہی عمدہ جواب ہے اس میں بطور لطیفہ کے اس کی ایک عجیب وجہ بیان کی ہے لکھا ہے کہ ہمارے احباب میں اس کی توجیہ میں اختلاف ہے، بعض کی یہ رائے ہے کہ تقلید ملاحدۂ یورپ اس کا سبب ہے بعض کی یہ رائے ہے کہ مخالفت اہل اسلام اس کا باعث ہے مگر ہمارے نزدیک ان دونوں توجیہوں کی ساتھ ایک تیسری وجہ بھی ہے وہ یہ کہ مفسر کو پہلے سے یہ معلوم ہے کہ میں اس تفسیر میں جو کچھ لکھوں گا سب شریعت کے خلاف ہوگا اور فعل حرام پر بسم اللہ کہنا کفر ہے اس لئے مفسر نے اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے تمہید میں بسم اللہ نہیں لکھی خوب لطیفہ ہے گو مفسر کو خود بھی نہ سوجھا ہو غرض شریعت نے حرام مال کھانے حرام مال سے صدقہ کرنے میں بسم اللہ پڑھنے سے اور امید ثواب رکھنے سے منع کیا ہے اس مسئلہ کو سن کر بعض لوگ گھبرائے ہوں گے کہ ہمارے تو اکثر مال مشتبہ ہوتے ہیں پھر ان کو استعمال کرتے ہوئے بسم اللہ کہنے سے اگر ایمان جاتا رہا تو سارے بے ایمان ہی ہوئے میں کہتا ہوں کہ وہم مت کرو اس مسئلہ کا مطلب یہ ہے کہ جو مال یقینی حرام ہو اس میں بسم اللہ کہنا منع ہے جیسے کوئی شخص رشوت کا روپیہ لیتے ہوئے بسم اللہ کہے یہ کفر ہے باقی جس مال میں حرام و حلال دونوں ملے ہوئے ہوں اور حلال غالب ہو وہ یقینی حرام نہیں وہ مشتبہ ہو گیا اس میں بسم اللہ کہنا حرام نہیں مگر بسم اللہ کہنے سے اس کی کراہت زائل نہ ہو گی جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے اسی طرح بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رشوت اور سود کے روپے میں سے کچھ خیرات کر دیا جاوے تو باقی حلال ہو جاتا ہے یہ بھی بالکل غلط ہے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

بلکہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ حرام مال کے صدقہ کر لینے میں کفر کا خوف ہے غرض کوئی حرام کام کسی نیت سے یا بسم اللہ کہنے سے جائز نہیں ہو جاتا بلکہ ایسے کاموں سے خدا کا نام لینے سے ایمان پر اندیشہ ہے کیونکہ اس میں خدا کے نام کی بے تعظیمی ہے جیسے کوئی شخص پاخانہ جانے کے وقت بسم اللہ کہنے لگے فقہاء نے اس کو کفر لکھا ہے۔ اور وہ جو حدیث میں آتا ہے کہ پاخانہ میں جاتے ہوئے بسم اللہ کہو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاخانہ کی حد سے باہر بسم اللہ کہو یہ مطلب نہیں کہ اندر جا کر کہو خوب یاد رکھو۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ پاخانہ میں خبیث شیاطین ہوتے ہیں جب آدمی ننگا ہوتا ہے تو وہ اس کے بدن کو دیکھتے ہیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے ستر کو شیاطین سے چھپانے کے لئے ان کو یہ تعلیم فرمائی کہ پاخانہ میں جانے سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ (یا اللہ میں پناہ پکڑتا ہوں آپ کی گندے مردوں سے اور گندی عورتوں سے) کہہ لیا کرو۔ اس کے بعد وہ تمہارے بدن کو دیکھ سکیں گے نہ ایذا دے سکیں گے یہ سب مضمون نماز کو بلا وضو یا بلا نیت پڑھنے کے متعلق استطراداً آگیا تھا اس سے اوپر اصل مضمون یہ تھا کہ جس نفع میں حق تعالیٰ کی ناخوشی ہو وہ نفع ہی نہیں۔

دیکھو اگر کسی عاشق کے پاس سونا چاندی بھرا ہوا ہو مگر محبوب کی نظر میں نہ آتا ہو تو کیا عاشق اس کو نفع کی چیز سمجھے گا۔ نفع کی چیز وہی ہے جو محبوب کو بھا جاوے۔

چو در چشم شاہد نیاید زرت
زر و خاک یکساں نماید برت

(جب تمہارے محبوب کی نظر میں تمہارا زر نہیں آتا۔ تو تمہارے نزدیک زر و خاک برابر ہے)

اسی طرح مسلمان کے لئے نفع کی چیز وہی ہے جس سے خدا راضی ہو۔ اور جس چیز سے خدا راضی نہ ہو وہ ہرگز نفع کی چیز نہیں اگر تمہارے پاس سلطنت بھی ہو مگر خدا راضی نہ ہوا تو وہ کچھ بھی نہیں تم خدا کو راضی رکھو اس کے احکام کا اتباع کرو خواہ سلطنت ہو یا نہ ہو رضائے الٰہی سے اگر تم کو یہاں سلطنت نصیب بھی نہ ہوئی تو آخرت میں تمہاری ہی سلطنت ہوگی

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

اور وہ ایسی مستحکم ہوگی جس کو کوئی دشمن تم سے چھین نہیں سکتا، ہاں اگر خدا کو راضی رکھ کر تم کو دنیوی منفعت بھی حاصل ہو جاوے تو وہ خدا کی نعمت ہے، اسی طرح باطنی احوال اگر ذاکر کو پیش نہ آویں مگر حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو وہ نفع میں ہے اور اگر حالات و کیفیات کسی درجہ کی پیش آویں مگر اعمال مرضیٔ حق کے خلاف ہوں تو وہ سب ہیچ ہیں۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا مقولہ ہے بر ہوا پری مگسے باشی بر آب روی خسے باشی۔ دل بدست آر کہ کسے باشی۔ یہ نظم نہیں بلکہ نثر ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم ہوا میں اڑنے لگے تو کیا ہوا ایک مکھی کے برابر ہوئے کیونکہ مکھی بھی ہوا میں اڑتی ہے اور اگر پانی پر چلنے لگے تو ایک تنکے کے برابر ہو گئے۔ پس یہ امور کوئی کمال نہیں۔ اب کمال یہ ہے۔ دل بدست آر کہ کسے باشی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ محبوب کو راضی رکھو اس وقت تم آدمی ہو گے۔ یہاں سے سالکین کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جن خوارق و کیفیات کے وہ دل دادہ ہوتے ہیں یہ کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود رضائے محبوب ہے اگر رضائے حق حاصل ہے تو کشف و کرامت گو نہ ہو تو کیا ہے اور اگر یہ نہیں تو ہزار کشف و کرامات گو ہو تو کیا ہے اور رضا حاصل ہوتی ہے اتباع احکام سے۔ پس اصل مقصود اس کو سمجھو اسی لئے مجھ کو احوال سے زیادہ اعمال کا اہتمام ہے میں اس کو نہیں دیکھتا کہ ذاکر پر حالات و کیفیات وارد ہوتے ہیں یا نہیں۔ میری نظر زیادہ اس پر ہوتی ہے کہ اس کو اعمال کا بھی اہتمام ہے یا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ منافع چاہے ظاہری ہوں یا باطنی سب غیر مقصود ہیں اصل مقصود رضائے حق ہے اس کا طالب ہونا چاہیئے۔ میں یہ مضمون سحر کے متعلق بیان کر رہا تھا کہ نفع کی نیت سے حرام عمل جائز نہیں ہو جاتا پس سفلی عمل تو اپنی حقیقت ہی کے اعتبار سے گناہ ہے گو نیت کیسی ہی اچھی ہو مگر علوی عمل بھی مطلقاً جائز نہیں اگر کوئی علوی عمل پڑھے تو اس کو دیکھنا چاہیئے کہ نیت کیا ہے، اگر مباح کام کے واسطے پڑھا ہے تو جائز ہے جیسے حلال نوکری کے واسطے پڑھے یا کوئی شخص مقروض ہو وہ ادائے قرض کے واسطے عمل پڑھے اور اگر مثلاً

کسی اجنبی عورت کو مسخر کرنے کے واسطے پڑھتا ہے تو حرام ہے۔ اگر بلا نکاح ہی مسخر کرنا مقصود ہے تب تو حرام ہے اور اگر نکاح کے لئے مسخر کرنا ہے تب چونکہ اس سے نکاح کرنا اس کے ذمہ واجب نہیں ہے وہ بھی جائز نہیں ہے ہاں اگر کسی کی بیوی نافرمان ہو اس کے مسخر کرنے کے واسطے عمل پڑھے تو جائز ہے۔ اسی طرح کسی عورت کا شوہر ظالم ہو اس کا مسخر کرنا بھی۔ لیکن بعض افراد اس کے بہت نازک ہیں اکثر لوگ ان کو علی الاطلاق جائز سمجھتے ہیں مگر فقہاء نے ان کو بھی حرام لکھا ہے۔ مثلاً کوئی عورت اپنے شوہر کو تابعدار بنانے کے واسطے عمل پڑھے تو اس میں تفصیل ہے اگر وہ ادائے حقوق میں کمی کرتا ہو تو اس درجہ کے حاصل کرنے کے واسطے جائز ہے اور اگر حقوق ادا کرتا ہے تو محض عاشق و مفتوں بنانے کے واسطے عمل کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح کسی امیر آدمی کے واسطے عمل پڑھنا کہ وہ ہم کو پچاس روپے دیدے ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی امیر پر ہمارے روپے آتے ہوں اور وہ ٹالتا ہو اس وقت اگر علوی عمل اس غرض سے پڑھا جائے کہ وہ ہمارا قرض ادا کردے تو جائز ہے لیکن محض اس واسطے عمل پڑھنا کہ وہ ہمارا مسخر ہو جائے کہ جب ہم ملا کریں وہ ہم کو پچاس روپے دیدے یہ بالکل حرام ہے خواہ اس کے لئے عمل کیا جائے یا تصرف کے طور پر توجہ کیجائے دونوں حرام ہیں مگر اس کو لوگ عموماً حرام نہیں سمجھتے بلکہ اس کو تو مشائخ کے کمالات میں بیان کیا کرتے ہیں کہ ہمارے حضرت نے ایک عمارت بنانا شروع کی تھی اس میں ہزار روپے کی ضرورت تھی بس ایک رئیس حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت نے ذرا سی توجہ اس کے اوپر ڈالی فوراً ہزار روپئے کا نوٹ نذر کر دیا بڑے ہی صاحب تصرف ہیں۔ یاد رکھو کہ جو شیخ ایسا ہو وہ راہزن ہے ڈاکو ہے۔ توجہ ڈال کر کسی سے روپئے وصول کرنا ایسا ہی ہے جیسے ڈرا دھمکا کر چھین لینا کیونکہ توجہ دینے سے وہ شخص بالکل مجبور ہو جاتا ہے اور محض توجہ کے دباؤ سے نذر پیش کرتا ہے اور مسلمانوں کا مال بدون طیب قلب کے لینا ہرگز جائز نہیں اس مقام پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ توجہ کی حقیقت اور مسمریزم کی حقیقت ایک ہی ہے بس اتنا فرق ہے کہ اگر کوئی بزرگ اپنی

نفسانی سے کام لینے لگے اس کو اصطلاح میں توجہ کہتے ہیں ۔ اور ایک آوارہ آدمی قوت نفسانی سے کام لے اسے مسمریزم کہتے ہیں باقی حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے کہ دونوں میں نفسانی قوت اور خیال سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض لوگ توجہ کو بڑا کمال سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں یہ کچھ بھی نہیں۔ ایک فاسق فاجر بلکہ کافر شخص بھی توجہ سے اثر ڈال سکتا ہے اس کا مشق پر مدار ہے۔ اور بعض لوگ فطری طور پر بدون مشق ہی کے صاحب تصرف ہوتے ہیں یہ کچھ کمال نہیں کیونکہ جو کام کافر بھی کر سکے وہ مسلمان کے واسطے کمال کیونکر ہو جائے گا۔ مجھے ساری عمر میں ایک شخص ایسے ملے ہیں جو اس حقیقت کو بخوبی سمجھے۔

شاہجہاں پور میں ایک شیخ صاحب سمع تھے بہت مخلص آدمی تھے عقائد بھی عمدہ تھے صرف اتنی کسر تھی کہ صاحب سمع تھے لیکن دوکان دار نہ تھے صاحب دل آدمی تھے۔
ایک بار میرے پاس اُن کا خط آیا کہ ایک شخص میرا دشمن تھا مجھے بہت ستاتا تھا ایک دن میرے مُنہ سے اُس کے حق میں بددعا نکل گئی کہ الٰہی اس کو ہلاک کر دے۔ اسی عرصہ میں وہ ہلاک ہو گیا۔ بے شک سچ ہے ؎

بس بجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دُردکشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

(اس دنیا میں ہم نے بہت تجربہ کیا ہے کہ جس شخص نے کسی اہل اللہ کا دل دکھایا وہ ہلاک ہوا)

اہل اللہ کا دل دکھانا بڑے وبال کا سبب ہے غیرتِ حق ایک دن ضرور اس کو تباہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں بھی آیا ہے مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ جو میرے دلی سے عداوت کرے اس کو میں اپنی طرف سے اعلانِ جنگ دیتا ہوں پھر جس کو حق تعالےٰ الٹی میٹم دیں اس کا کہاں ٹھکانا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیقِ ادب　　بے ادب محروم ماند از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد　　بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　　میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

(خدا تعالیٰ سے ہم ادب کی توفیق کی درخواست کرتے ہیں۔ بے ادب فضل ربی سے محروم ہوتا ہے بے ادب تنہا خود ہی اپنے ساتھ برائی نہیں کرتا بلکہ اور لوگ بھی اس کی بُرائی سے رنج اور تکلیف اٹھاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ جب کسی کی پردہ دری کرتے ہیں تو اس کا میلان نیک لوگوں کی طعنہ زنی پر کرتے ہیں)

غرض ان بزرگ نے لکھا کہ میں نے بد دعا کی تھی جس کے بعد وہ شخص ہلاک ہوگیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ واقعہ اگر کسی دوسرے کو پیش آتا تو وہ اپنے مریدوں میں بیٹھ کر ڈینگیں مارتا کہ دیکھو ہماری بد دعا سے ہلاک ہوگیا۔ بھلا ہماری بد دعا خالی جاسکتی تھی اگر ان بزرگ میں اس کے بجائے دوسری حالت پیدا ہوئی انھوں نے لکھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہیں مجھے قتل کا گناہ نہ ہوا ہو۔ سبحان اللہ خوف خدا کی یہی شان ہوتی ہے میرے اوپر اس خط کا بہت اثر ہوا اور اس سوال سے مجھے سائل کی بہت قدر ہوئی کیونکہ ایسا سوال عمر بھر مجھ سے کسی نے نہ کیا تھا اور سوال بھی ایسے واقعہ کا جو ظاہر میں منشأ کرامت کے معلوم ہوتا ہے۔ میں نے جواب لکھا کہ واقعی آپ کا اندیشہ درست ہے مگر اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ بد دعا کے وقت دو حالتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ محض سرسری طور پر حق تعالیٰ سے درخواست کردی اور اپنے دل کو اور خیال کو اس کے ہلاک کرنے کی طرف متوجہ نہیں کیا اس صورت میں اگر وہ شخص ہلاک ہوجائے تو یہ بد دعا کرنے والا قاتل تو نہ ہوگا کیونکہ بد دعا سے ہلاک ہونے میں اس کا دخل نہیں بلکہ اس میں محض حق تعالیٰ سے درخواست ہے اور حق تعالیٰ اپنی مشیت سے اس کو ہلاک کرنے والے ہیں پس یہ شخص قاتل تو نہیں البتہ وہ شخص اگر بد دعا کے قابل تھا تب تو گناہ بھی نہیں ہوا اور اگر بد دعا کے قابل نہ تھا تو قتل کا تو گناہ نہیں ہوا مگر بد دعا کرنے کا گناہ ہوا اس سے توبہ و استغفار کرنا لازم ہے۔ اور ایک صورت بد دعا کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے درخواست کرنے کے ساتھ اپنے دل کو بھی اُس کے ہلاک کرنے کی طرف متوجہ کیا اور اپنے تصرف سے کام لیا، اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر

اس شخص کو تجربہ سے اپنا صاحب تصرف نہ ہونا معلوم ہے مثلاً بارہا تصرف کا قصد کیا مگر کچھ نہیں ہوا اس وقت بھی قتل کا گناہ نہیں ہوا۔ البتہ اگر وہ شرعاً قابلِ قتل نہ تھا تو اس کی ہلاکت کی تمنا کا گناہ ہوگا اور اگر تجربہ سے اپنا صاحب تصرف ہونا معلوم ہے تو یہ شخص قاتل ہے کیونکہ تلوار سے قتل کرنا اور تصرف سے قتل کرنا برابر ہے صرف اتنا فرق ہے کہ وہ قتل عمد ہے اور یہ قتل شبہ عمد اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ شخص جس کے ہلاک کرنے کے واسطے تصرف کیا گیا ہے قتل کا مستحق تھا یا نہیں۔ اگر مستحق قتل تھا تو صاحب تصرف قاتل تو ہوا مگر گناہ نہیں ہوا کیونکہ تصرف کا استعمال اپنے محل میں ہوا۔ اور اگر مستحق قتل نہ تھا تو صاحب تصرف کو قتل کا گناہ ضرور ہوا۔ اس صورت میں اس کو علاوہ دیت کے ایک غلام کا آزاد کرنا اور اگر اس کی وسعت نہ ہو تو دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں اور توبہ و استغفار کرنا چاہیئے۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ توجہ کی کیا حقیقت ہے یاد رکھو کسی کو توجہ سے ہلاک کرنا یا ضرر پہونچانا علی الاطلاق جائز نہیں بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو میں نے بیان کی مگر آجکل تو اس کو کمال سمجھا جاتا ہے کسی کو بھی اس طرف التفات نہیں ہوتا کہ اس میں بعض دفعہ گناہ بھی ہوتا ہے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے تو محض توجہ کی تھی ہم نے قتل کہاں کیا سو خوب سمجھ لو کہ توجہ سے قتل کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسے تلوار سے قتل کرنا اسی لئے ایسے مواقع میں توجہ سے بچنا چاہیئے اگر کوئی شخص توجہ کا مشاق بھی نہ ہو اسے بھی ایسے مواقع میں توجہ سے کام نہ لینا چاہیئے کیونکہ بعض لوگ فطرۃً صاحب تصرف ہوتے ہیں گو اس کو خبر نہ ہو تو ممکن ہے کہ تم اپنے آپ کو صاحب تصرف نہ سمجھتے ہو مگر واقع میں تم صاحب تصرف ہو تو اگر اس حالت میں تم نے کسی کو ضرر پہونچانے کا قصد کیا اور وہ اس کا مستحق نہ ہوا اور ضرر پہونچ گیا تو تم کو گناہ ہوگا اور یہی حکم عملیات سے ہلاک کرنے کا ہے۔ چنانچہ ایک عمل کچی اینٹ کا ہے کہ جس کو ہلاک کرنا منظور ہوتا ہے اس کے واسطے ایک کچی اینٹ پر عمل پڑھتے ہیں پھر اس کو کفن وغیرہ دے کر اس پر نماز جنازہ پڑھ کر ندی میں ڈال دیتے ہیں۔ پانی سے وہ اینٹ گھلنا شروع ہوتی ہے جوں جوں وہ گھلتی ہے اسی قدر یہ شخص گھلنا شروع ہوتا ہے

یہاں تک کہ جب وہ اینٹ بالکل گھل جاتی ہے یہ شخص بھی گھل گھل کر ہلاک ہو جاتا ہے یہ بہت ہی سخت عمل ہے سو خوب سمجھ لو کہ اگر وہ شخص مستحق قتل نہ ہو گا تو تم کو قتل کا گناہ ضرور ہو گا۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم نے تو قرآن سے مارا ہے پھر ہمیں گناہ کیوں ہو گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تم ایک بڑا بھاری قرآن کسی کے سر پہ مار دو جس سے اس کا سر پھٹ جاوے اور مر جاوے تو کیا تم کو گناہ نہ ہو گا ضرور ہو گا۔ پس علوی عملیات میں ایک بات تو یہ دیکھنے کے قابل ہے کہ مقصود جائز ہے یا نہیں دوسرے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کلمات طیب ہیں یا نہیں اگر علوی عمل میں خبیث الفاظ نہ ہوں مگر طیب بھی نہ ہوں وہ بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے موکلوں کے عجیب عجیب نام گھڑ لیے ہیں کلکائیل، دردائیل اور اسی طرح اس کے قافیہ پر بہت سے نام ہیں اور غضب یہ کہ ان ناموں کو سورۂ فیل کے اندر ٹھونسا ہے اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ یَا کَلْکَائِیْلُ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ یَا دَرْدَائِیْلُ وَعَلٰی ھٰذَا الْقِیَاس۔ یہ سخت واہیات ہے اول تو یہ نام ہی بیڈھنگے ہیں نہ معلوم کلکائیل کہاں سے ان لوگوں نے گھڑا ہے۔ پس یہ لوگ رات دن کل کل ہی میں رہتے ہوں گے پھر ان کو قرآن کی سورتوں میں ٹھونسنا یہ دوسرا بیڈھنگا پن ہے اور نہ معلوم یہ مؤکل ان لوگوں نے کہاں سے تجویز کیے ہیں۔ محض خیالات ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اس کا مصداق معلوم ہوتے ہیں اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ (یہ نرے نام ہی نام ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ٹھیر الیا ہے خدا تعالےٰ نے تو ان کی کوئی دلیل نہیں بھیجی)

موکل پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک وکیل صاحب گھر میں اپنی والدہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ باہر سے ایک شخص نے ان کو آواز دی وکیل نے پوچھا کہ کون ہے وہ کوئی دیہاتی آدمی تھا جس نے ان کو اپنے مقدمہ میں وکیل بنایا تھا اس نے کہا اجی میں تھا تمہارا مؤکل یہ سنکر وکیل صاحب باہر جانے لگے۔ اُن کی والدہ نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کہاں جاتے ہو وہ تو مؤکل ہے تم کو مار ڈالے گا۔ انہوں نے سمجھایا کہ

یہ عملیات کا موکل نہیں بلکہ اس نے مجھے وکیل بنایا ہے اُسے بھی موکل کہتے ہیں بغرض بڑے اصرار کے بعد والدہ نے اجازت دی اور کہا اچھا جاؤ خدا حافظ۔

اسی طرح ایک عمل بچھو کا ہے۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْ یہاں تک پڑھ کر پانی پیتے ہیں پھر حَرُ کہتے ہیں پھر دم کرتے ہیں نہ معلوم یہ کونسا طریقہ ہے۔ بچپن میں ہم نے بھی ان عملیات کو لکھ لیا تھا مگر کبھی ان پر عمل نہیں کیا صرف بچھو کا عمل ایک آدھ بار غلطی سے کیا اللہ تعالےٰ معاف فرمادے۔ سو اس کا بہت لحاظ رکھنا چاہیئے کہ عملیات علویہ میں الفاظ طیب ہوں قرآن کے الفاظ کو لگا ڑا نہ گیا ہو۔ ایک بات عملیات میں قابل لحاظ یہ ہے کہ جو عملیات دنیا کے واسطے ہوتے ہیں وہ موجب ثواب نہیں ہوتے ان میں ثواب کا اعتقاد رکھنا بدعت ہے۔ اسی طرح ایسے عملیات کو مسجد میں بیٹھ کر نہ پڑھنا چاہیئے اور نہ اس قسم کے تعویذ مسجد میں بیٹھ کر لکھنے چاہئیں کیونکہ یہ یا تو تجارت ہے اگر تعویذ پر اجرت لی جائے جس کو مسجد سے باہر ہی کرنا چاہیئے۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جو مدرس اور ملاّ بچوں کو تنخواہ لے کر پڑھاتا ہو اس کو مسجد میں نہ بیٹھنا چاہیئے کیونکہ مسجد میں اجرت کا کام کرنا بیع وشرار میں داخل ہے۔ اسی طرح جو شخص اجرت پر کتابت کرتا ہو یا جو درزی اجرت پر کپڑے سیتا ہو یہ سب لوگ مسجد میں بیٹھ کر یہ کام نہ کریں۔ (قُلْتُ اِلَّا اَنْ یَّكُوْنَ مُعْتَكِفًا فَیَجُوْزُ لَهٗ ذٰلِكَ كَمَا هُوَ مُقْتَضٰی قَوَاعِدِهِمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ ۱۲ جامع) (ترجمہ: معتکف کے پس معتکف کے لئے مسجد میں یہ کام جائز ہیں جیسا کہ فقہاء کے قواعد کا مقتضیٰ ہے) اور اگر اپنے لئے عمل پڑھا جاوے تو تجارت تو نہیں مگر ہے دنیا کا کام وہ بھی مسجد میں نہ چاہیئے اس نکتہ پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے متنبہ ہوا۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے کہ مسجد میں پاخانہ پھر رہا ہوں حاجی صاحب نے فوراً ارشاد فرمایا کہ تم مسجد میں کوئی عمل دنیا کے واسطے پڑھتے ہوگے اس نے اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا کے واسطے مسجد میں وظیفے نہ پڑھنا چاہئیں تو علوی عملیات

کے جائز ہونے کے لئے اتنے شرائط ہیں یہ مسائل آپ نے کبھی نہ سُنے ہوں گے اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ کسی محقق عالم کو لپیٹ جاؤ اور اس سے پوچھ پوچھ کر کام کیا کرو اس کی بہت ضرورت ہے اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا بغرض ان شرائط کے ساتھ تعویذ و عملیات وغیرہ سحر حلال ہیں یہ چیزیں مطلقاً سحر حلال میں داخل نہیں ہیں جیساکہ عوام کا خیال ہے۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ یہود میں سحر کا بہت چرچا تھا اس پر سحر حلال و سحر حرام کی تقسیم کا بیان یہاں تک طویل ہو گیا لیکن یہ سب مضامین ضروری تھے۔ ان کا بیان فائدہ سے خالی نہیں۔ اب میں پھر اصل قصہ کی طرف لوٹتا ہوں یہود میں سحر کا بہت چرچا تھا اور وہ لوگ سحر حرام ہی میں مبتلا تھے جس کا ذکر وَالنَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ میں کیا گیا ہے اس میں عورتوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ عورتوں کا سحر زیادہ قوی اور مؤثر ہوتا ہے اور اس میں ایک راز ہے جو کہ فلسفی مسئلہ پر مبنی ہے وہ راز یہ ہے کہ سحر و عملیات وغیرہ کی تاثیر کا مدار توجہ اور قوت خیال پر ہے الفاظ و کلمات کا اس میں زیادہ دخل نہیں۔ مگر چونکہ بدون قیود کے خیال میں قوت اور یکسوئی نہیں پیدا ہوتی اس لئے کچھ کمالات والفاظ اس کے لئے مقرر کر لئے جاتے ہیں اور عامل کے ذہن میں یہ بات جما دی جاتی ہے کہ ان الفاظ ہی میں یہ اثر ہے جس سے اس کا خیال مضبوط ہو جاتا ہے کہ جب میں یہ الفاظ پڑھوں گا فوراً اثر ہوگا۔ چنانچہ اثر ہو جاتا ہے لیکن در اصل وہ خیال کا اثر ہوتا ہے الفاظ کا نہیں ہوتا لیکن یہ اعتقاد مقصود عامل کو مضر ہوتا ہے اگر عامل یہ سمجھنے لگے کہ ان الفاظ میں کچھ تاثیر نہیں تو اس کے عمل کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا کیونکہ اس اعتقاد کے بعد اس کا خیال کمزور ہو جائے گا کہ نہ معلوم اثر ہوگا یا نہیں اس لئے عامل کے واسطے یہ جہل مرکب ہی مفید ہوتا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ الفاظ میں اثر نہیں بلکہ اس کا مدار توجہ پر ہے۔ پھر بعضے آدمی تو فطری طور پر متصرف ہوتے ہیں ان کو اپنے خیال میں یکسوئی حاصل کرنے کے لئے خاص اہتمام اور زیادہ مشق کی ضرورت نہیں ہوتی اور بعضے مشق سے صاحب تصرف ہو جاتے ہیں،

چنانچہ ایک مرتبہ ایک طلسمی انگوٹھی ہندوستان میں بہت شائع ہوئی تھی جس میں غائب غائب اور مردہ آدمیوں کی تصویریں نظر آتی تھیں اس کا مدار بھی محض خیال پر تھا اسی لئے اس میں یہ شرط تھی کہ اُس انگوٹھی کو کوئی عورت یا بچہ دیکھتا رہے تو اس کو صورتیں نظر آویں گی تو اس میں راز یہی تھا کہ تم نے کسی آدمی کا تصور کیا اور اس کا خیال جمایا تمہارے تخیل کا اثر انگوٹھی دیکھنے والے کے خیال پر پڑا اس کو وہی صورتیں نظر آنے لگیں اور اگر تم کسی کا تصور نہ کرو بلکہ یہ خیال جمالو کہ اس کو کوئی صورت نظر نہ آوے تو اس کو ہرگز ایک صورت بھی نظر نہ آئے گی۔ کانپور میں ایک مولوی صاحب نے کچھ مشق کی تھی جس سے غائب لوگوں کی صورتیں دکھادیا کرتے تھے۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی آدمی آیا اور اس نے درخواست کی مجھے فلاں شخص کی صورت دکھادو۔ انہوں نے اس سے کہا کہ جاؤ وضو کر کے حجرہ میں جا بیٹھو ادھر انہوں نے گردن جھکا کر توجہ کی تھوڑی دیر میں اسے کچھ بادل وغیرہ نظر آتے تھے پھر اس شخص کی صورت نظر آجاتی تھی۔ اس کی بھی یہی حقیقت تھی کہ وہ مولوی صاحب توجہ سے دوسرے کے خیال پر اثر ڈالتے تھے جس کی وجہ سے اس کے متخیلہ میں وہ صورت پیدا ہوجاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان مولوی صاحب کی مجلس میں ایک طالب علم بیٹھے تھے ایک شخص آیا اور اس نے درخواست کی کہ مجھ کو فلاں بزرگ کی صورت دکھلا دیجئے وہ حسب معمول ادھر متوجہ ہوگئے اس طالب علم نے چپکے چپکے یہ آیت پڑھنی شروع کی قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (اور کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل گیا گذرا ہوا اور واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے) تو اس شخص کو پہلے پہل کچھ مقدمات نظر آنے لگے تھے جب اس طالب علم نے یہ آیت پڑھنی شروع کی تو وہ بھی سب غائب ہوگئے۔ اب وہ بزرگ پوچھتے ہیں کہ کچھ نظر آیا اس نے کہا کہ جو کچھ نظر آیا تھا وہ بھی سب غائب ہوگیا اور صورت تو کیا نظر آتی غرض انہوں نے بڑا ہی زور لگایا مگر خاک بھی نظر نہ آیا اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ تو بات کیا تھی کہ اس طالب علم نے جب ان کے خلاف خیال جمایا دونوں میں تصادم ہوگیا اور کچھ

بھی اثر نہ ہوا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ان عملیات اور سحر وغیرہ کا مدار محض خیال پر ہے اسی لئے معمول کسی بچہ یا عورت کو بناتے ہیں کیونکہ ان میں عقل کم ہوتی ہے ان کو جو کچھ سمجھا دیا جاتا ہے وہ ان کے خیال میں جم جاتا ہے اور اسی خیال کے مطابق صورتیں نظر آنے لگتی ہیں عاقل پر اثر کم ہوتا ہے کیونکہ اُسے وہم آتے رہتے ہیں کہ دیکھئے ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ کم عقل ذاکر پر احوال وکیفیات کا ورود زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس کو یکسوئی زیادہ ہوجاتی ہے اور احوال وکیفیات کا ورود یکسوئی کی حالت میں زیادہ ہوتا ہے۔ عاقل پر ورود وکیفیات کم ہوتا ہے کیونکہ اس کا دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے جس ذاکر کو کیفیات پیش نہ آدیں وہ غمگین نہ ہو بلکہ خوش ہو کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عاقل ہے۔ دوسرے جو لوگ کشف وغیرہ کے زیادہ معتقد ہوتے ہیں ان کی ساتھ شیطان تمسخر بھی کیا کرتا ہے۔ بعض اکابر نے لکھا ہے کہ شیطان کو تخیل میں تصرف کرنے کی بڑی قدرت حاصل ہے وہ خیالی آسمان ذاکر کو دکھلا دیتا ہے اس میں نور اور تجلی اور فرشتے سب کچھ نظر آتے ہیں جس کو یہ ذاکر جو کیفیات وکشف وغیرہ کا معتقد ہے حقیقی آسمان اور سچ مچ کے فرشتے سمجھنے لگتا ہے اس لئے محققین نے لکھا ہے کہ کشف کا راستہ بہت خطرناک ہے اس میں شیطان کو دھوکہ دینے کا بہت موقع ملتا ہے۔ اسی کو عارف شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؂

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است
ہشدار گوش را بہ پیام سروش دار

(عشق کے راستے میں شیطان کے بہت سے وساوس ہیں ہوشیار رہو اور وحی کی طرف کان لگاؤ)

بعض لوگ حافظ کو رندہ بتلاتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے آنکھیں ہی نہیں حافظ کے کلام میں سلوک کے مسائل بکثرت ہیں اور یہ نہیں کہ یہ مسائل محض اعتقاد کی وجہ سے ہم نے کلام سے نکال لئے بلکہ واقعی ان کا کلام تصوف سے بھرا ہوا ہے۔

ورنہ کسی دوسرے کے کلام سے تو کوئی یہ مسائل نکال دے بات یہ ہے کہ جب تک اللہ کچھ نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی نکال بھی نہیں سکتا۔ تو حافظ فرماتے ہیں کہ اس راستہ میں شیطان کے وسوسے بہت ہیں۔ بس سالک کو ہوشیار رہو کر پیام سروش کی طرف کان لگائے رہنا چاہیے۔ پیام سروش سے مراد ہاتف نہیں ہے ممکن ہے بعض لوگ یہی سمجھے ہوں اور اپنے دل میں خوش ہوں کہ اس سے تو کشف پر اعتماد کرنے کی تعلیم حاصل ہوئی نہیں بلکہ یہاں سروش سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور پیام سروش سے مراد وحی ہے جو کہ جبریل علیہ السلام کے ذریعہ سے نازل ہوتی تھی مطلب یہ ہوا کہ وحی کا اتباع کرنا چاہیے پھر شیطان کے وساوس کارگر نہ ہوں گے۔ غرض کشف میں یہ خطرے ہیں اور جس کو کشف ہی نہ ہوتا ہو اس کو شیطان کیا دھوکے دیگا

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ سحر وغیرہ کا مدار تخیل پر ہے تو اب سمجھئے کہ عورتوں کا تخیل مردوں سے بڑھا ہوا ہوتا ہے کیونکہ اول تو ان کو عقل کم ہوتی ہے اور کم عقل آدمی کو جو کچھ بتلا دو وہ اس کے خیال میں جلدی جم جاتا ہے اسے جانب مخالف کا وہم ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے ان کی معلومات بھی بہ نسبت مردوں کے کم ہوتی ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ جس کی معلومات کم ہوتی ہیں اس کا خیال زیادہ منتشر نہیں ہوتا مگر آجکل نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی بھی کوشش ہے کہ عورتوں کے معلومات وسیع کئے جائیں اور ان کو علوم و فنون کی تعلیم دی جائے۔ میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں مگر اس تعلیم کا ضرور مخالف ہوں جو یہ لوگ عورتوں کو دیتے ہیں، بھلا عورتوں کو جغرافیہ اور تاریخ پڑھانے سے کیا فائدہ۔ میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ عورتوں کو ابتک یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ہمارے شہر میں کتنے محلے ہیں اور ضلع میں کتنے شہر ہیں اور کون راستہ کدھر کو جاتا ہے اسی لئے اب تک وہ اپنے گھر میں مقید رہنا پسند کرتی تھیں لیکن آپ ان کو دنیا بھر کے نقشے اور راستے بتلائے جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بھاگنے کا طریقہ بتلایا جاتا ہے سو واقعی میری سمجھ میں اس کی حکمت نہیں آئی کہ عورتوں کو جغرافیہ پڑھانے میں کیا فائدہ ہے۔ ان کا تو کمال یہی ہے کہ اپنے شہر

اور اپنے گھر کے سوا انہیں کچھ نہ معلوم ہو۔ عورتوں کی تعلیم کے لئے دینی مسائل سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں۔ اگر تاریخ پڑھائی جائے تو محض بزرگوں کے حالات پڑھانے چاہئیں جس کا اثر ان کے اخلاق پر بھی اچھا ہو مگر آج کل تو ان کو دنیا بھر کے قصے پڑھائے جاتے ہیں جس کا بہت ہی برا نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں نیک عورتوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ غافل ہوں چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ جو لوگ پاکدامن بھولی مسلمان عورتوں کو متہم کرتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں لعنت ہے۔ غافلات کا مطلب یہ ہے کہ وہ چالاک نہیں ہیں نشیب و فراز سے بے خبر ہیں تو صاحبو! عورتوں کا تو کمال یہی ہے کہ وہ اپنے گھر اور اپنے شوہر کے سوا تمام دنیا سے بے خبر ہوں اور یہ وصف عورتوں میں فطری ہوتا ہے مگر لوگ اس کو بگاڑ دیتے ہیں۔ ایک شخص مجھ سے ایک بزرگ کی حکایت بیان کرتے تھے کہ وہ ایک مرتبہ بہلی میں سفر کر رہے تھے اور وہ خود نہایت حسین تھے اور گاڑی بان ایسا بدشکل اور بدصورت تھا کہ خدا کی پناہ راستہ میں اس گاڑی بان کا گھر آ گیا اور اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ اس کی بیوی آواز سنتے ہی آئی جس وقت دفعۃً اس بزرگ کی نگاہ پڑی ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ چاند نکل آیا نہایت ہی حسین تھی۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ یہ عورت تو ایسی حسین و جمیل اور اس کا مرد ایسا بدصورت یہ اس کو منہ بھی لگاتی ہے یا نہیں۔ ان کو اپنے حسن پر بہت ناز تھا انہوں نے سوچا کہ دیکھوں یہ عورت میری طرف بھی نظر کرتی ہے یا نہیں مگر اس اللہ کی بندی نے ایک نگاہ بھر کر بھی یہ نہ دیکھا کہ گاڑی میں کون ہے کون نہیں اس کی ساری توجہ اپنے شوہر ہی کی طرف تھی اور اسی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی یہاں تک کہ بہلی آگے بڑھ گئی اور وہ اپنے گھر میں چلی گئی۔ وہ صاحب کہتے تھے کہ اس کی یہ عفت دیکھ کر بہت ہی دل خوش ہوا کہ پاک دامن ایسی ہونی چاہیئے جو ایسے بدصورت خاوند سے بھی خوش ہو اور دوسروں کو مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ سو میں کہتا ہوں کہ عورتوں میں یہ وصف فطری ہے مگر ہم لوگ اس کو بگاڑ دیتے ہیں افسوس اس جوہر کی نگہبانی نہیں کی جاتی۔

پس عورتوں کو اگر تعلیم دی جائے تو سب سے پہلے ناولوں اور خراب قصوں کا داخلہ اپنے گھر میں بند کرو ان ناولوں کی بدولت شریف گھرانوں میں بڑے بڑے قصے ہو چکے ہیں۔ دوسرے عورتوں کو لکھنا مت سکھاؤ اور اگر بقدر ضرورت سکھاؤ تو اس کا بہت اہتمام رکھو کہ وہ نامحرموں کے نام خط نہ لکھیں بعض عورتیں اپنے بہنوئی اور چچا زاد بھائی اور ماموں زاد بھائی کے نام خطوط روانہ کرتی ہیں اس کی پوری بندش کرنی چاہیئے اور بعضی عورتیں محلہ والیوں کے خطوط لکھدیا کرتی ہیں اس سے بعض دفعہ مرد کو لکھنے والی سے تعلق ہوجاتا ہے جس سے بہت فتنہ پھیلتا ہے۔ اس لئے عورتوں کو خوب تاکید کردو کہ محلہ بھر کے خطوط نہ لکھا کریں اور ایک اس کا اہتمام کرو کہ اپنے محارم کے نام بھی خطوط لکھیں تو کارڈ اور لفافہ پر پتہ اپنے ہاتھ سے نہ لکھیں بلکہ پتہ اپنے گھر کے مردوں سے لکھانا چاہیئے۔ ایک جگہ ایسا قصہ پیش آیا کہ ایک عورت نے پتہ اپنے ہاتھ سے لکھا وہ خراب ہوگیا تو لفافہ کو دھویا جس سے مہر مشتبہ ہوگئی اور ڈاکخانہ والوں نے اس پر مقدمہ قائم کردیا اس وقت بڑی دقت پیش آئی کہ پردہ نشین عورت کو عدالت میں کھچنا پڑے گا آخر اس کے ایک عزیز نے اپنے اوپر بات لی اور عدالت میں کہا کہ یہ خط میں نے بھیجا تھا اور پتہ میں نے لکھا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اگر مقدمہ قائم ہو تو میرے اوپر قائم ہو میں قید بھگت لوں گا مگر پردہ نشین عورت کی تو بے عزتی نہ ہو۔ اس لئے میں اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ عورتیں اپنے ہاتھ سے پتہ ہرگز نہ لکھیں تو اگر کسی کو عورتوں کی تعلیم کا بہت ہی شوق ہو تو اس کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ غرض چونکہ عورتوں کی معلومات عموماً وسیع نہیں ہوتی اس لئے ان کا تخیل صحیح اور کامل ہوتا ہے اور سحر کا مدار تخیل ہی پر ہے۔ اس لئے عورتوں کا سحر زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اس لئے والنفثٰت فی العقد (یعنی اور بالخصوص گنڈے کی گرھوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والوں کے شر سے) میں عورتوں کی تخصیص کی گئی تو یہود سحر حرام میں بہت مبتلا تھے ان کی عورتیں بھی سحر جانتی تھیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لبید کی بیٹیوں نے سحر کیا تھا جہلا ر یہود تو سحر میں مبتلا تھے ہی مگر علماء نے بجائے

اس کے کہ اس کو حرام اور کفر کہتے اور عوام کو اس سے منع کرتے الٹا اس کو ہاروت و ماروت کا علم بتا کر ایک آسمانی علم اسے بنا دیا۔ یہ قاعدہ ہے کہ عالم جب بگڑتا ہے تو بہت دور جاتا ہے عالم ہر چیز کو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہنچا کر رہتا ہے چنانچہ اب بھی لوگ کہتے ہیں کہ دین تو علماء کے ہاتھ میں ہے جس طرف چاہیں موڑ دیں جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس کو چاہیں حلال گویا ان کے قبضہ کی بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عوام اگر ایسا کہیں تو ان کا کچھ قصور نہیں۔ واقعی بعض اہل علم ایسا ہی کرتے ہیں تو یہود کے علماء کی یہی حالت تھی کہ انہوں نے سحر کو ہاروت و ماروت کا علم بتایا اور اس کے متعلق ایک عجیب قصہ زہرہ کا انہوں نے گھڑ لیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی عجائب پرست تھے۔ لوگوں کو حیرت میں ڈالنے کے لئے نئے نئے انداز سے قصے گھڑتے تھے تاکہ ذرا مجلس میں رنگ آجاوے چنانچہ آجکل یہی مذاق ہمارے واعظین کا ہے یہ لوگ ایسا غضب کرتے ہیں کہ وعظ کا رنگ جمانے کے لئے بہت ہی بعید از عقل حکایات بیان کرتے ہیں چونکہ عوام آجکل عجائب پرست زیادہ ہیں اس لئے ایسے وعظوں کو پسند کرتے ہیں بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب وعظ میں نئی نئی باتیں ہونی چاہئیں جو کبھی سنی بھی نہ ہوں۔ پرانی باتوں کو دہرانے سے لطف نہیں آتا میں کہتا ہوں کہ بالکل غلط ہے۔ لطف پرانی ہی باتوں میں ہے۔ چاہے ان کو کتنی ہی بار بیان کیا جاوے مگر اس کا لطف اہل سلامت ہی کو حاصل ہوتا ہے جو تحقیق حق کے طالب ہیں اور عجائب پرست نہیں ہیں اور جن کی فطرت سلیمہ نہیں ان کو تو طلسم ہوش ربا میں لطف آئے گا پرانی باتوں میں کیا لطف آئے گا۔ دیکھئے قرآن کا طرز یہی ہے کہ اس میں بعض مضامین کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن میں متعدد جگہ مذکور ہوا ہے مگر ہر جگہ نئے انداز اور نئے طرز سے بیان ہوا ہے تو یہی طریقہ وعظ کا ہونا چاہیے کہ وہی پرانی باتیں مختلف طرز سے بیان کی جائیں موقع کے مناسب مضامین ذکر کئے جائیں ان پرانی باتوں میں وہ لطف ہے جیسے کہا گیا ہے ؎

ہر چند پیر و خستہ دل بس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(ترجمہ: اگرچہ میں بوڑھا اور کمزور و ناتواں ہو گیا ہوں لیکن تیری صورت دیکھتے ہی جوان ہو جاتا ہوں)

ان سے دل میں نور اور تازگی پیدا ہوتی ہے اور ان نئی نئی حکایات سے ظلمت بڑھتی ہے۔ وعظ تو وہی ہے جس میں بدعت نہ ہو اور یہ نئی باتیں تو بدعت ہیں چنانچہ حلال روزی طلب کرنے کے متعلق واعظین ایک قصہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ایک شخص کو حلال کی طلب تھی لوگوں نے اس سے کہا کہ آج کل حلال روزی ایک شخص کے پاس ہے جو بصرہ میں رہتا ہے اس کے سوا حلال روزی یقینی طور پر کسی کی نہیں چنانچہ وہ بصرہ پہنچا اور اُن بزرگ سے ملا اور اُن سے اپنا قصہ بیان کیا کہ میں حلال کی طلب میں آپ کے پاس آیا ہوں میں نے سُنا ہے کہ آپ کی روزی بالکل حلال ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ بزرگ یہ سن کر رونے لگے اور کہا کہ اب تک تو میری روزی بلا شبہ حلال تھی لیکن اب نہیں رہی کیونکہ میرے بیل ایک شخص کے کھیت میں گھس گئے تھے اس کے کھیت کی مٹی اُن کے پیروں کو لگ گئی اور وہ مٹی میرے کھیت میں مل گئی اب مجھے شبہ پیدا ہو گیا۔ سو یہ حکایت قواعد شریعت کے بالکل ہی خلاف ہے کیونکہ جتنی مٹی بیلوں کے پیروں کو لگی ہوگی وہ کوئی متقوم چیز نہیں جس سے شبہ پیدا ہو سکے یہ محض غلو فی الدین ہے۔ فقہار نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک دانہ گیہوں کی تعریف کرے یعنی لوگوں سے پوچھتا پھرے کہ یہ دانہ کس کا تو حاکم وقت کو چاہیئے کہ اس شخص کو سزائے تعزیر دے کیونکہ ایک دانہ متقوم نہیں ہے جس کی تعریف کی جائے تو یہ شخص حدود شریعت سے تجاوز کرتا ہے۔ غرض یہ حکایت سراسر خلاف شریعت ہے مگر واعظین اس کو بڑے زور شور کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور سننے والے بھی اس پر سبحان اللہ کہتے اور وجد کرتے ہیں مگر ان حکایات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ حلال روزی بہت دشوار ہے جو ہم کو نصیب نہیں ہو سکتی اس لئے وہ طلب حلال سے ہمت ہار دیتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے ایک خادم تھے۔ مولانا ان کے لئے

کوئی کھانا بھیجدیتے توانہوں نے ایک بار عرض کیا کہ حضرت آپ تحقیق بھی کرلیتے ہیں کہ حلال ہے یا حرام۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ارے بھوکوں مرجائے گا بڑا حلال کھانے والا آیا جا کھالیا کر جب ہمیں ایک مسلمان نے ہدیہ دیا اور ہم کو اس کی آمدنی کا حال معلوم نہیں تو مسلمان پر ہم کو اس بدگمانی کی کیا ضرورت ہے کہ اس کی آمدنی حرام ہوگی۔

گنگوہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شاہ صاحب مہمان ہوئے جو حلال روزی کھانے کا دعوٰے کرتے تھے اور بہت تفتیش کرتے تھے۔ حضرت کے یہاں سے ان کے لئے کھانا آیا تو واپس کر دیا اور کہا میں خالص حلال کھاتا ہوں مشتبہ مال نہیں کھاتا اور مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ کھانا کیسا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے دل میں اس کے منتظر ہوئے ہوں گے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ خود آکر اس کھانے کی حقیقت بیان کریں گے کہ یہ کھانا اس قسم کی آمدنی سے تیار ہوا ہے جس میں کوئی شبہ نہیں تب کھاؤں گا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایسے روگ نہیں پالتے تھے جب کھانا واپس گیا تو آپ نے فرمادیا کہ کھانا تو گھر میں رکھ لیا جاوے اور ان شاہ صاحب سے کہدیا جائے کہ خانقاہ میں جو گولر کھڑا ہے اس کے پھل بالکل حلال ہیں جس میں کوئی شبہ شبہ نہیں پس گولر توڑیں اور کھا دیں۔ خوب علاج کیا۔ اگر وہ شخص سچا طالبِ حلال ہوتا تو ایسا ہی کرتا مگر اس کو تو محض تنگ کرنا اور اپنا نام کرنا مقصود تھا چنانچہ جاہلوں کو بہت تنگ کیا کرتا تھا اور وہ اس کی خوشامدیں کرتے اور تلاش کر کر کے اس کے لئے حلال کھانا لایا کرتے تھے مگر حضرت کے یہاں سے جب صاف جواب مل گیا تو آپ بہت خفا ہوئے اور دوسرے ہی وقت وہاں سے چلدیئے۔

تو صاحبو! یہ تقویٰ نہیں بلکہ تقوے کا ہیضہ ہے۔ شریعت نے اس قدر غلو سے منع کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ دردہ ہوجاؤ۔ حلال و حرام کی کچھ پرواہ نہ کرو۔ بلکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب تم کو بدون تجسس کے معلوم ہوجائے کہ فلاں شخص کے یہاں بالکل حرام آمدنی ہے تو اس کے گھر کا کھانا مت کھاؤ اور اگر یہ

یہ معلوم ہو کہ اس کی کچھ آمدنی حرام ہے اور کچھ حلال تو اس کے گھر کا کھانا مشتبہ ہے جو فتوے کے اعتبار سے کھانا جائز ہے مگر احتیاط کرنا التقویٰ ہے اور اگر کسی کا حال کچھ بھی معلوم نہ ہو تو تم کو یہ بدگمانی کی کچھ ضرورت نہیں اُس کو حلال ہی سمجھو مگر آجکل عوام کی نظر میں اس شخص کی ہیبت و قعت ہوتی ہے جو شریعت میں غلو کرے اور راز اس کا یہ ہے کہ غلو فی الدین سے امتیازی شان پیدا ہوتی ہے اور اگر اعتدال سے کام لیا جائے تو اس سے کچھ امتیاز نہیں ہوتا شہرت اسی کام سے ہوتی ہے جو نیا ہو۔

گڑھی میں ایک شاہ صاحب آئے اُن کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی ان کی دعوت کرتا تو پہلے آپ مراقبہ کرتے۔ کبھی تو مراقبہ کر کے کہدیتے کہ تیرے یہاں آمدنی حلال نہیں اس لئے میں دعوت قبول نہیں کرتا۔ اور کبھی کہدیتے کہ ہاں تیری آمدنی حلال ہے تیری دعوت منظور ہے۔ لوگوں میں بڑی شہرت ہوئی کہ واقعی شاہ صاحب بڑے بزرگ ہیں۔ حرام آمدنی کبھی کھاتے ہی نہیں مراقبہ کر کے معلوم کر لیتے ہیں کہ آمدنی کیسی ہے مگر چند لوگ ہوشیار بھی تھے، انہوں نے کہا کہ شاہ صاحب کے مراقبہ کا امتحان کرنا چاہیئے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ محض ظاہری آثار سے سمجھ لیتے ہوں کہ یہ شخص امیر ہے اور امیروں کے یہاں ایسی ہی گڑبڑ آمدنی ہوتی ہے اور فلاں شخص مزدور خستہ حال ہے اور غریبوں کے یہاں اکثر مزدوری کی آمدنی ہوتی ہے جس میں شبہ کم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا امتحان کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ لوگ ایک کسبی کے یہاں گئے کہ تیرے پاس کوئی تازہ آمدنی کا روپیہ ہو تو ذرا ایک دور روز کے واسطے ہمیں دیدے چنانچہ اس نے تازہ آمدنی کا ایک روپیہ دیدیا وہ روپیہ ان لوگوں نے ایک مزدور غریب آدمی کو دیا کہ اس روپیہ سے تو شاہ صاحب کی دعوت کر چنانچہ وہ گیا اور شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضور آج میرے یہاں دعوت قبول کر لیجیے۔ شاہ صاحب نے حسب معمول مراقبہ کیا اور سر اٹھا کر کہا کہ سبحان اللہ تمہاری آمدنی میں بڑا نور ہے بالکل حلال ہے تمہاری دعوت منظور ہے۔ لوگ سمجھ گئے کہ شاہ صاحب کا مراقبہ

محض ڈھونگ ہی ہے جب وہ اس کے گھر پر گئے اور کھانا کھا چکے تو ان لوگوں نے کہا کہ شاہ صاحب ذرا پھر مراقبہ کر لیجئے کہ آپ نے جو کھانا کھایا ہے وہ حرام ہے یا حلال۔ آپ نے پھر مراقبہ کیا اور کہا ماشاء اللہ اس کھانے میں بہت ہی انوار ہیں جس سے دل منور ہو گیا لوگوں نے جوتہ نکال کر شاہ صاحب کی خوب مرمت کی کہ جھوٹے مکار بس تیرے مراقبہ کا حال معلوم ہو گیا تو مخلوق کو دھوکہ دیتا اور پریشان کرتا ہے یہ کھانا جو تو نے کھایا ہے ایک کسبی کی آمدنی سے تیار ہوا ہے جس میں تجھے انوار نظر آتے ہیں۔ واقعی خوب امتحان کیا۔ مگر ایسے امتحان کرنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں، اکثر تو ان مکاروں کے دھوکہ ہی میں آجاتے ہیں اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ عوام کی مدح و ثنا سے کسی کا معتقد نہ ہونا چاہیئے یہ لوگ ہر اک کے معتقد ہو جاتے ہیں اور نہ خود مشائخ کو بھی عوام کی تعریف سے اپنا معتقد نہ ہونا چاہیئے جب تک کوئی صاحب نظر شہادت نہ دے کہ تمہاری اچھی حالت ہے صائب کہتے ہیں ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنے جوہر صاحب نظر کو دکھلاؤ عیسیٰ چند احمقوں کی تصدیق کرنے سے عیسیٰ نہیں ہوتے ہیں)

آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ جہاں چند لوگوں نے ہاتھ پیر چومنے شروع کر دیئے تو ہم خود بھی اپنے معتقد ہو جاتے ہیں کہ واقعی میں کچھ تو ہوں جو یہ لوگ میرے ہاتھ پیر چومتے ہیں۔ عوام کے اعتقاد کی بھی ایک ہی رہی ان کے اعتقاد کی تو یہ حالت ہے کہ گنگوہ میں ایک واعظ آیا جس کا شین قاف بھی درست نہ تھا، جہنم کو جہندم کہتا تھا مگر عوام کے اعتقاد کی یہ حالت تھی کہ بعض لوگ یوں کہتے تھے کہ یہ شخص بہت ہی بڑا عالم ہے مولوی رشید کو بارہ برس پڑھا دے۔ واقعی سچ کہا مولانا کو تو بارہ برس کے بعد بھی یہ لغات معلوم نہ ہوتے کہ وہ جہنم کو جہندم کہتے۔ پس عوام کی تو حالت یہ ہے کہ جو شخص واہی تباہی قصے بیان کرتا ہو اس کے معتقد ہو جاتے ہیں چاہے اُسے خاک بھی

نہ آتا ہو۔

کانپور میں ایک واعظ آئے منبر پر بیٹھتے ہی انہوں نے یہ دعوےٰ کیا کہ آج میں ایسی بات کہوں گا جو کسی نے نہ کہی ہوگی وہ یہ کہ خدا عالم الغیب نہیں ہے۔ اس پر چاروں طرف سے لوگ لاحول پڑھنے لگے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہ کر آپ نے یہ کہا کہ صاحبو! یہ بات سن کر آپ نے مجھے اپنے دل میں کافر و زندیق کہا ہوگا، مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے بعد آپ کہیں گے کہ میری بات سچی ہے۔ بات یہ ہے کہ غیب کہتے ہیں پوشیدہ کو اور خدا تعالےٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں تو خدا تعالےٰ عالم الغیب کیونکر ہوسکتے ہیں۔ ان کو تو جس چیز کا بھی علم ہے وہ اُن کے سامنے ہے آپ نے یہ نکتہ بیان کیا اور اپنے دل میں بڑے خوش ہوئے کہ میری بات سچی ہوگئی مگر یہ نہ سمجھے کہ اس سے قرآن کے ایک لفظ کو اس نے بیکار اور لغو بنا دیا۔ جب قرآن میں خدا تعالیٰ کی صفت عالم الغیب موجود ہے تو اس کا انکار کرنا کیونکر جائز ہوگا۔ اُسے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ خدا تعالیٰ کی صفت جو عالم الغیب ہے وہ مخلوق کے اعتبار سے ہے کہ جو چیزیں مخلوق سے غائب ہے خدا تعالےٰ کو ان کا بھی علم ہے اور ذات خداوندی کے اعتبار سے علم کی ایک ہی قسم ہے یعنی علم حضوری۔ غرض آجکل واعظین کا مذاق وہی ہے جو یہود کا مذاق تھا کہ ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو عوام کو حیرت میں ڈالدیں۔ اسی طرح آجکل کے واعظین شہادت نامہ خوب پڑھتے ہیں تاکہ لوگ روئیں اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ روایات صحیح ہوں یا غلط بس جو جی میں آیا بیان کر دیا کیونکہ ان کا مقصود تو محض رُلانا ہے۔ ایک شخص نے قل ہو اللہ کی تفسیر میں شہادت نامہ بیان کیا آپ کو حیرت ہوئی ہوگی کہ قل ہو اللہ کی تفسیر میں شہادت نامہ کا کیا جوڑ تھا۔ سُنیئے ان حضرت نے اس طرح جوڑ لگایا تھا کہ یہ وہ سورت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی جن کے نواسے میدانِ کربلا میں امت ہی کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ بس پھر سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر بعضے سننے والے کہنے لگے کہ واہ کیا ربط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ربط نہیں بلکہ خبط ہے جس کی وجہ سے یہ ساری تقریر

قابلِ ضبط ہے۔ مگر ضبط کے معنے وہ نہیں کہ قلمبند کی جائے بلکہ مشہور معنے مراد ہیں یعنے یہ اس قابل ہے کہ اس کو ردی میں ڈال دیا جائے اشاعت بند کی جائے بھلا اگر اس کا نام ربط ہے تو ایک قتل ہوا اللہ کیا ہر سورت کی تفسیر میں تم شہادت نامہ کو بلکہ ہزاروں واقعات کو ٹھونس سکتے ہو۔ پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود کا بھی یہی مذاق تھا جو آجکل ان واعظوں کا ہے اس لئے انہوں نے عوام کو خوش کرنے کے لئے عجیب وغریب قصّے گھڑ لئے تھے چنانچہ انہی میں سے ہاروت وماروت و زہرہ کا قصہ بھی ہے جس کو آجکل بھی بہت لوگ صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ بعض مفسرین نے یہ غضب کیا ہے کہ اس قصہ کو تفسیروں میں ٹھونس دیا ہے۔ مگر محدثین نقادنے اس کو موضوع کہا ہے۔ وہ قصہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں بنی آدم کے اندر معاصی کی کثرت ہوئی تو فرشتوں نے طعن کیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو خلیفۃ اللہ بنائے گئے ہیں کہ گناہ کر کر کے خدا تعالیٰ کو ناراض کرتے ہیں اور ہم خدا کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے ہمیشہ اس کی اطاعت ہی کرتے ہیں۔ حق تعالےٰ نے فرمایا کہ انسان میں جو شہوت کا مادہ رکھا گیا ہے اگر وہ تمہارے اندر پیدا کر دیا جاوے تو تم بھی گناہ کرنے لگو گے۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم ہرگز گناہ نہ کریں گے بلکہ اس وقت بھی ہم اطاعت ہی کریں گے۔ حق تعالےٰ نے فرمایا کہ اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرو جو سب سے زیادہ عبادت گذار ہوں چنانچہ ہاروت وماروت کو منتخب کیا گیا۔ خدا تعالےٰ نے ان دونوں میں شہوت کا مادہ رکھدیا اور زمین پر اُن کو اتارا اور حکم دیا کہ انسانوں کے مقدمات کا فیصلہ کیا کرو اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا نہ شراب پینا اور نہ زنا کرنا نہ کسی آدمی کو ناحق قتل کرنا چنانچہ وہ دونوں دن بھر مقدمات کا فیصلہ کرتے اور شام کو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلے جاتے۔ اسی طرح ایک زمانہ گذر گیا۔ ایک دن ان کے پاس ایک عورت کا مقدمہ آیا جو کہ نہایت ہی حسین جمیل تھی یہ دونوں اس پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے موافق فیصلہ کر دیا۔ پھر اس سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے کہا کہ ایک شرط سے میں راضی ہو سکتی ہوں

یا تو تم شراب پیو یا میرے شوہر کو قتل کر دو یا اس بت کو سجدہ کرو جو تمہارے سامنے ہے یا مجھ کو وہ اسم اعظم بتلا دو جس سے تم آسمان پر جاتے ہو اول تو انہوں نے انکار کیا مگر پھر نہ رہا گیا تو انہوں نے شراب پینے کو منظور کیا اور یہ سمجھا کہ یہ سب سے سہل گناہ ہے اس سے توبہ کر لیں گے چنانچہ شراب پی کر اس سے زنا کیا اور اسی مدہوشی کی حالت میں شوہر کو بھی قتل کر دیا اور بت کو سجدہ بھی کیا اور بے خبری کی حالت میں اس عورت کو اسم اعظم بھی بتلا دیا۔ وہ عورت تو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی۔ خدا تعالیٰ نے اُسے ستارہ کی صورت میں مسخ کر دیا چنانچہ زہرہ ستارہ وہی ہے اور یہ دونوں فرشتے جب مستی سے ہوش میں آئے تو بڑے پریشان ہوئے شام کو آسمان پر جانے لگے تو ان کو روک دیا گیا اور اُن سے کہا گیا کہ یا تو دنیا کا عذاب اختیار کرو یا آخرت کا انہوں نے دنیا کے عذاب کو آسان سمجھ کر اختیار کیا۔ چنانچہ وہ دونوں بابل کے کنویں میں اوندھے منہ لٹکے ہوئے ہیں جہاں ان کو عذاب ہو رہا ہے۔ اور یہ دونوں فرشتے سحر بھی تعلیم کرتے تھے جس کی تعلیم کا ان کو حکم ہوا تھا تو یہ سحر انہی سے منقول چلا آتا ہے۔

اس قصہ کو سنکر وہ شخص جس کو حدیث سے ذرا بھی مس ہے فوراً موضوع کہے گا۔ اس کا طرز بتلا رہا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں ہو سکتی۔ یقیناً اسرائیلیات میں سے ہے۔ دوسرے شرعی حیثیت سے اس میں بہت سے اشکالات ہیں ایک اشکال تو یہی ہے کہ فرشتے خدا تعالیٰ کے سامنے اس طرح گفتگو نہیں کر سکتے کہ حق تعالیٰ تو یہ فرمائیں کہ اگر تم میں شہوت پیدا کر دی جائے تو تم بھی انسانوں کی طرح گناہ کرنے لگو گے اور وہ خدا تعالیٰ کی بات کو رد کریں کہ نہیں ہم اس حال میں بھی گناہ نہیں کر سکتے۔ فرشتے ہرگز اس طرح خدا کی بات کو رد نہیں کر سکتے۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ جس زنا کی وجہ سے یہ فرشتے معذوب ہوئے وہ عورت کیوں نہ معذوب ہوئی وہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر کیوں کر چلی گئی اور ایسی مقرب کیونکر ہو گئی۔ اور بہت سے اشکالات ہیں جن کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں

مگر بعض مفسرین نے تفاسیر میں اس واقعہ کو لکھ دیا ہے اس لئے بہت لوگ اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ہر کتاب دیکھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ کسی عالم کو تجویز کرو اس کو کتاب دکھلا کر جب وہ کہدے کہ یہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے بعد مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جن کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے وہ معتبر کتابیں نہیں ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ ہر معتبر کتاب کا ہر جزء معتبر نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک کتاب معتبر ہو لیکن اس میں کوئی بات غیر معتبر بھی ہو ایک دو مضمون کے غیر معتبر ہونے سے ساری کتاب کو غیر معتبر نہیں کہہ سکتے لیکن اس کا امتیاز عالم محقق ہی کر سکتا ہے کہ اس کتاب میں کونسی بات غیر معتبر ہے۔ غرض یہ قصہ محض غیر معتبر ہے۔

صرف ہاروت و ماروت کے قصہ کی مختصر حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانہ میں دنیا میں بالخصوص بابل میں جادو کا بہت چرچا ہوگیا تھا حتیٰ کہ اس کے عجیب آثار دیکھ کر جہلا کو انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں اور سحر میں اشتباہ ہونے لگا کیونکہ سحر سے بھی بعض باتیں خرق عادت کے طور پر ظاہر ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ سحر اور معجزہ میں بہت کھلا فرق ہے۔ ایک فرق تو یہی ہے کہ سحر میں اسباب طبعیہ خفیہ کو دخل ہوتا ہے۔ اور زیادہ تر اس کا مدار تخیل پر ہوتا ہے بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسباب طبعیہ کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا۔ محض حق تعالیٰ کے حکم سے بدون اسباب کے خلاف عادت امور ظاہر ہو جاتے ہیں۔ دوسرے صاحب معجزہ کے اخلاق و عادات و اطوار و اعمال میں اور ساحر کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ نبی کی صحبت سے خدا تعالیٰ کی محبت و معرفت اور آخرت کی رغبت دنیا سے نفرت پیدا ہوتی ہے اس کے پاس بیٹھنے سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے۔ اور ساحر کی صحبت میں اس کے خلاف اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس فرق کو وہی دریافت کر سکتا ہے جس کی طبیعت سلیم ہو عقل صحیح ہو عوام اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے تو نبوت کی دلیل معجزہ ہوتا ہے اور ظاہر میں معجزہ اور سحر دونوں یکساں نظر آتے تھے اس لئے حق تعالیٰ نے

اس اشتباہ کو دور کرنے کے لئے بابل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت نام نازل کئے تاکہ وہ لوگوں کو سحر کی حقیقت پر مطلع کردیں کہ اس میں فلاں فلاں اسباب کو دخل ہے اس لئے یہ منجانب اللہ ساحر کی مقبولیت کی دلیل نہیں ان اسباب کے ذریعہ سے ہر شخص وہ کام کرسکتا ہے جو ساحر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ سحر تو حرام اور کفر ہے اس کی تعلیم کے لئے فرشتے کیوں نازل کئے گئے اس کا جواب یہ ہے کہ سحر پر عمل کرنا حرام اور کفر ہے باقی اس کا جاننا اور بضرورت شرعی سیکھنا جبکہ اس پر عمل مطلق نہ ہو حرام نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے سور اور کتے کا گوشت کھانا حرام ہے لیکن اس کے گوشت کی خاصیت معلوم کرلینا اور اس کو بیان کردینا حرام نہیں کیونکہ خاصیت جاننے اور بتلانے کو گوشت کھانا نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح شراب پینا حرام ہے لیکن اگر طبی کتاب میں شراب کی خاصیتیں لکھی ہوئی ہوں تو ان کو پڑھنا اور پڑھانا حرام نہیں کیونکہ اس کو شراب پینا نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح کلماتِ کفریہ کا عمداً زبان سے نکالنا کفر ہے لیکن اگر کوئی شخص کلمات کفریہ سے بچنے کے لئے ان کو جاننا چاہے کہ کن کلمات سے ایمان جاتا رہتا ہے تاکہ میں ان سے بچتا رہوں یہ کفر نہیں بلکہ جائز ہے۔ چنانچہ فقہاء نے کتابوں میں کلمات کفر کے لئے مستقل باب منعقد کیا ہے جس میں ایسی باتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ایمان جاتا رہتا ہے ان کے جاننے اور پڑھنے کو کوئی حرام نہیں کہتا کیونکہ نقل کفر کفر نہیں۔

اسی طرح فلسفہ کے مسائل بہت سے کفر میں داخل ہیں لیکن لوگوں کو اس کی حقیقت پر مطلع کرنے کے لئے فلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور ساتھ میں اس کا رد بھی کردیا جاتا ہے جس سے مقصود صرف یہی ہے کہ فلسفہ کی حقیقت اور اس کا بطلان معلوم کرلینے کے بعد کوئی شخص اس کے دلائل سے متاثر نہ ہو اور ضرورت کے وقت ان کے دلائل کا جواب دے سکے پس یہ اشتباہ جاتا رہا کہ تعلیم سحر کا اہتمام کیوں کیا گیا۔ رہا یہ اشکال کہ پھر اس کی تعلیم کے لئے فرشتے کیوں نازل ہوئے۔ انبیاء علیہم السلام ہی سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء ہدایت محضہ

کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور تعلیم سحر میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ کوئی شخص اُس کو سیکھنے کے بعد اسی میں مشغول و مبتلا ہو جاتے تو اس طرح انبیاء علیہم السلام ضلالت و گمراہی کا سبب بعید بن جاتے جو اُن کی شان ہدایت محضہ کے منافی ہے اس لئے حق تعالےٰ نے ان کو ضلالت کا سبب بعید بنانا بھی گوارا نہیں کیا بخلاف فرشتوں کے کہ ان سے تشریع اور تکوین دونوں قسم کے کام لئے جاتے ہیں اور تکوین میں جس طرح وہ مسلمانوں کی پرورش کرتے ہیں اسی طرح کفار کی بھی کرتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ رحم کے اندر نطفہ کی پرورش کے لئے مد [illegible] مقرر ہیں تو وہ مسلمان اور کافر ہر شخص کی صورت رحم میں بناتے ہیں اور نشو و نما میں دونوں کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح ہر شخص کے ساتھ کچھ فرشتے اس کی نگہبانی کے لئے مقرر ہیں جو خبیث جنوں سے اس کو بچاتے ہیں اور موذی جانوروں سے اُس کی حفاظت کرتے ہیں جب تک کہ اس کے مقدر میں حفاظت ہے اسی طرح لڑائی میں دشمن کے حملہ سے انسان کو بچاتے ہیں خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان۔ ایسے ہی نباتات کی نشو و نما کے لئے کچھ ملائکہ مقرر ہیں جو کافروں اور مسلمانوں کے کھیتوں اور باغات کی نشو و نما کرتے رہتے ہیں۔ غرض امور تکوینیہ میں مسلمان اور کافر دونوں برابر ہیں اور فرشتے دونوں کی حفاظت کرتے ہیں حالانکہ شرعاً کافر کی امداد و اعانت اس طریقہ سے جائز نہیں مگر ہمارے واسطے جائز نہیں ملائکہ کے واسطے جائز ہے کیونکہ ان کے سپرد یہ کام کئے گئے ہیں وہ اسی کے مامور ہیں اور یہی شان ہوتی ہے اقطاب اہلِ خدمت کی کہ امور تکوینیہ ان کے بھی سپرد ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعض دفعہ وہ کسی کافر سلطنت کی حمایت کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی سلطنت مغلوب اور کافر سلطنت غالب ہو جاتی ہے مگر ایسے اقطاب مجذوبین ہوتے ہیں سالک ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ سالک شریعت کا مکلف ہے اور شرعاً کفار کی حمایت و اعانت مسلمانوں کے مقابلہ میں بالکل حرام ہے اور مجذوبین مکلف نہیں ہوتے مگر رتبہ میں افضل سالکین ہی ہیں۔ مجذوبوں کی مثال ایسی ہے جیسے سپاہی اور کوتوال کہ ان کے سپرد شہر کا انتظام ہوتا ہے شہر کے

تمام حالات کی ان کو اطلاع ہوتی رہتی ہے اور سالک کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ کا محبوب کہ اسے شہر کے حالات کی کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہو رہا ہے ہاں بادشاہ کا مزاج شناس اس درجہ ہوتا ہے کہ کوتوال کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی۔ سلطان محمود کو ایاز سے خاص محبت تھی۔ حالانکہ اس کی معلومات سلطنت کے متعلق وزیر کی برابر ہرگز نہ تھیں بلکہ نظام سلطنت کے متعلق ہزاروں آدمی اس سے زیادہ باخبر تھے اسی لئے لوگوں کو حیرت تھی کہ سلطان ایاز کو اتنا کیوں چاہتے ہیں مگر ایاز میں ایک بات ایسی تھی کہ وزیر کو بھی اس کی ہوا نہ لگی تھی وہ یہ کہ سلطان کا مزاج شناس تھا اگر اس سے شہر کے حالات دریافت کرو تو اسے کچھ بھی علم نہ تھا لیکن محمود کا مزاج پوچھو تو اس سے زیادہ اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات ایاز ہی محمود سے بات کر سکتا تھا اور کسی کی مجال نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح سالکین خدا تعالےٰ کے گویا مزاج شناس ہیں یعنی اللہ تعالےٰ کو راضی کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔ قرب حاصل کرنے کا راستہ بتلا سکتے ہیں اور اگر ان سے یہ پوچھو کہ فلاں مقدمہ میں نتیجہ کیا ہوگا، فلاں واقعہ کس طرح ہوگا تو اس کا جواب ان کے پاس یہ ہوتا ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر اور دارا کے قصے نہیں پڑھے ہم سے محبت اور عشق کی باتوں کے سوا کچھ نہ پوچھو)

نہ ان کے یہاں کشف ہے نہ وہ خوابوں کی تعبیر جانتے ہیں نہ وہ عملیات اور تعویذ گنڈے کا شغل رکھتے ہیں وہ تو صرف رضائے خدا اور وصول الی اللہ کا طریقہ جانتے ہیں اور اس کی تعلیم و تبلیغ کے لئے وہ ہر وقت حاضر ہیں اگر کوئی ان سے خواب کی تعبیر پوچھتا ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں ؎

نہ شبنم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(میں نہ شب ہوں نہ شب پرست کہ خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا غلام ہوں محبوب ہی کی باتوں کو مجھ سے سنو)

یہی وجہ ہے کہ عوام ان سالکین کے کم معتقد ہوتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں ظاہری سامان کچھ نہیں ہوتا نہ کشف ہے نہ کرامت۔ نہ رات دن الہام کا تذکرہ نہ ہائے اور ہو نہ شور وغل۔ اور مجذوبین کے یہاں یہ سامان بہت ہوتا ہے ہاں سالکین کے پاس محبت و معرفت الٰہی کا ایک مخفی خزانہ ہوتا ہے جس کو اہل بصیرت دیکھ لیتے ہیں۔ عوام کی نظر وہاں تک کم پہنچتی ہے اسی طرح کاملین کی کیفیات ممتاز نہیں ہوتیں بلکہ ان میں ایسی شیرینی ہوتی ہے جیسی فیرینی میں کہ نہایت لطیف مٹھاس ہوتا ہے جس کو اگر کوئی دیہاتی چکھے تو بالکل پھیکا بتادے اور مجذوبین کی کیفیات میں ایسی شیرینی ہوتی ہے جیسی گڑ میں کہ دیہات کے لوگ اسی کو میٹھا سمجھتے ہیں مگر نازک مزاج لطیف الطبع لوگ اس کی ایک ڈلی بھی نہیں کھا سکتے مجھے فیرینی پر ایک حکایت یاد آئی کہ دیوبند میں ایک رئیس کے یہاں تقریب تھی جس میں زردہ پلاؤ اور فیرینی وغیرہ پکائی گئی تھی گانوں سے ان کی رعیت کے چمار بھی آگئے تو ان کو بھی انہوں نے یہی کھانا دلوایا۔ گانوں والوں کی سمجھ میں یہ لطیف کھانے کیوں آنے لگے تھے پلاؤ زردہ کو تو بہت ہی ناک منہ چڑھا کر انہوں نے کھایا جب فیرینی کا نمبر آیا تو ان سے نہ رہا گیا' آخر ایک بول ہی اٹھا۔ اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا کہ یہ تھوک سا کئے ہے (کیا ہے) دیکھئے اتنی لطیف چیز جو دل و دماغ کو تفریح دیتی چلی جاوے مگر اس چمار نے یہ قدر کی اس کو تھوک سے تشبیہ دی۔ اسی طرح جو لوگ دیہاتی طبیعت کے ہوتے ہیں ان کو سالکین کی لطیف کیفیات کی قدر نہیں ہوتی ان کو تو ایسی کی قدر ہوتی ہے کہ ذرا کودپھاند ہو ہو حق ہو کشف و کرامت ہو تب اس کو بزرگ سمجھتے ہیں۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شخص آیا اور دس برس تک رہا

دس سال کے بعد کہنے لگا کہ حضرت میں اتنے عرصہ سے آپ کی خدمت میں ہوں مگر میں نے کوئی کرامت نہیں دیکھی واقعی یہ شخص بھی کوئی بڑا ہی کوڑ مغز تھا جس کو اتنے عرصہ میں بھی حضرت جنید کے کمالات نظر نہ آئے ورنہ ان کمالات کے سامنے کرامت کی کیا حقیقت تھی۔ حضرت جنید رح کو جوش آگیا فرمایا کہ اے شخص اس دس برس کے عرصہ میں تو نے کوئی کام خلاف سنت جنید سے ہوتا ہوا دیکھا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت خلاف سنت تو میں نے کوئی کام آپ کا نہیں دیکھا فرمایا کہ پھر اس سے زیادہ تو جنید کی کرامت اور کیا چاہتا ہے کہ دس برس میں اس سے ایک کام بھی خلاف سنت صادر نہیں ہوا۔ اس پر اس شخص کی آنکھیں کھل گئیں۔ واقعی یہ کرامت اتنی بڑی ہے کہ حسی کرامتیں اس کی باندیاں ہیں اور حضرت جنید کے اس دعوی کی وجہ یہ ہے کہ اہل اللہ بعض دفعہ تحدث بالنعمۃ (نعمت کو ظاہر کرنے کے لیے) کے طور پر یا سالکین کی اصلاح کے لئے اپنے بعض کمالات بیان کر دیا کرتے ہیں تاکہ ان کو شیخ کی حالت معلوم کر کے اعتقاد زیادہ ہو، کیونکہ اس طریق میں شیخ پر اعتماد اور اعتقاد نہایت ضروری ہے کامیابی اسی پر موقوف ہوتی ہے۔ اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کاملین کے کمالات کس قدر غامض (باریک) ہوتے ہیں کہ معمولی آدمی کی نظر وہاں تک نہیں پہونچتی۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے کمالات سالکین سے بھی زیادہ غامض ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کفار انبیاء علیہم السلام کی نسبت یہی کہتے تھے کہ ہمارے میں اور ان میں کیا فرق ہے یہ بھی آدمی ہیں کھاتے پیتے ہیں بازاروں میں پھرتے ہیں ہم بھی ایسے ہی آدمی ہیں اور مجذوبین کو عوام اہل اسلام کے علاوہ کفار نے بھی بہت مانا ہے کیونکہ ان کی حالت دوسروں سے کھلم کھلا ممتاز ہوتی ہے پس سالکین کی شان انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہوتی ہے اور مجذوبین ملائکہ سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں اسی لئے ان کے سپرد تکوینی امور زیادہ ہوتے ہیں اور سالکین کے سپرد تشریعی انتظام ہوتا ہے غرض ملائکہ تکوین کے کام بھی بہت کرتے ہیں اس لئے تعلیم سحر کی خدمت انہی کے سپرد

ہوئی کہ اگر اس میں وہ ضلالت کا سبب بعید بن جائیں تو ان کی شان کے خلاف نہ ہوگا وہ تو اس سے زیادہ کام لیتے ہیں چنانچہ بعض دفعہ وہ لڑائی کے موقعہ میں کفار کی حفاظت بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں پر کفار کو غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام ضلالت کا سبب بعید بھی نہیں بن سکتے ان کی یہاں تک حفاظت کی گئی ہے کہ شیطان کو نبی کے ساتھ تمثیل پر قدرت نہیں دی گئی یعنے شیطان کسی نبی کی صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتا حالانکہ جنات کو مختلف اشکال پر تشکل کی قدرت ہے مگر نبی کی صورت کوئی نہیں بنا سکتا کیونکہ اس میں دین کا انتظام مختل ہو جاتا ہے اور بیداری میں تو کیا شیطان خواب میں بھی کسی کو نبی کی شکل میں نظر نہیں آسکتا۔ بلکہ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی شکل میں ظاہر ہو کر یہ دعوے کرے کہ میں نبی ہوں ہاں یہ ممکن ہے کہ خواب میں شیطان کسی کو نظر آوے اور یہ دعوے کرے کہ میں خدا ہوں کیونکہ حق تعالےٰ کی شان یہ ہے يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وہ ہدایت بھی کرتے ہیں اور گمراہ بھی کرتے ہیں یعنی گمراہی بھی انہی کی پیدا کی ہوئی ہے گو وہ اس سے راضی نہیں ہیں مگر جب کوئی غلط راستہ پر چلنا چاہتا ہے تو گمراہی کی صفت اس میں پیدا کر دیتے ہیں اور اس میں کچھ اشکال نہیں کیونکہ گمراہی کا ارتکاب نقص ہے اس کا پیدا کرنا اور خالق ہونا نقص نہیں ہے بدصورت ہونا تو عیب ہے لیکن بدصورتوں کو پیدا کرنا عیب نہیں بلکہ یہ تو عین کمال ہے جس سے خالق کی قدرت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر قسم کی صورت بنانے پر قادر ہے۔ انسان گناہ کرتا ہے کفر کرتا ہے یہ اس کے لئے عیب ہے کیونکہ اس کی نافرمانی میں کوئی حکمت نہیں ہے اور خدا تعالیٰ نے گناہ اور کفر کو جو پیدا کیا ہے اس میں کوئی نقص نہیں کیونکہ اس کے پیدا کرنے میں ہزاروں حکمتیں ہیں چنانچہ ایک حکمت تو یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ گناہ اور کفر کو پیدا نہ فرماتے تو کوئی شخص ان کا ارتکاب نہ کر سکتا بلکہ سب کے سب ایمان اور اعمال صالحہ پر مجبور ہو جاتے اس صورت میں مخلوق کا امتحان نہ ہو سکتا۔ پس افعال سیئہ اور کفر کے پیدا کرنے میں ایک حکمت تو یہی ہے کہ اس میں مخلوق کا

امتحان ہے کہ دیکھیں کون اپنے اختیار سے ایمان اور اعمال صالحہ کا ارتکاب کرتا ہے اور کون گناہ اور کفر کو اختیار کرتا ہے۔ انسان جس قسم کے افعال کا قصد کرتا ہے حق تعالیٰ سب کو پیدا کر دیتے ہیں اور ایک حکمت جس کو صوفیہ کرام سمجھے ہیں یہ ہے کہ اس سے اسمار کا ظہور ہوتا ہے ایمان اور اعمال صالحہ سے اسم ہادی کا ظہور ہوتا ہے اور کفر و اعمال سیئہ سے اسم مضل کا ظہور ہوتا ہے اور حق تعالےٰ کی یہ دونوں صفتیں ہیں ہادی بھی اور مضل بھی، اب تو آپ کی سمجھ میں آگیا کہ خالق کفر و خالق سیئات ہونا نقص نہیں۔ صاحبو! آفتاب کے لئے یہ کمال ہے کہ وہ چاند کو بھی روشنی دیتا ہے اور آئینہ کو بھی اور گھورے کو بھی اس کی روشنی پہونچتی ہے۔ لیکن گھورے کی بدبو اور نجاست آفتاب تک نہیں پہونچتی وہ اسی طرح پاکیزہ اور شفاف ہے ناپاکی خود اسی کی ذات تک رہتی ہے آفتاب تک اس کا کوئی اثر نہیں جاتا اسی طرح خدا نے گناہ اور کفر کو بھی وجود دیا ہے لیکن ان کی نجاست کا وہاں کوئی اثر نہیں پہونچتا اس کے لئے یہ بھی کمال ہے کہ اس نے جہاں ایمان و اعمال صالحہ کو پیدا کیا ہے وہاں کفر و اعمال سیئہ کو بھی پیدا کر دیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

کفر ہم نسبت بخالق حکمت ست
در بما نسبت کنی کفر آفت ست

(خالق تعالیٰ کی نسبت سے تخلیقاً کفر میں بھی حکمت ہے اور اگر اس کو ہماری طرف نسبت سے دیکھو تو فعلاً ایک سخت آفت ہے)

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر ست
آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

(عشق کے کارخانہ میں کفر کا ہونا ضروری ہے۔ دوزخ میں کون جلتا اگر ابولہب نہ ہوتا)

مطلب یہ ہے کہ اگر ابولہب وغیرہ نہ ہوں تو صفت قہر کا ظہور کس پر ہوتا اور کارخانۂ عشق

سے مراد دنیا ہے کیونکہ منشا اس عالم کے ظہور کا عشق ہی ہے جس کی طرف اس جملہ میں اشارہ ہے کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (میں مخفی خزانہ تھا پس پسند کیا میں نے کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا) بعض لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عشق میں کفر کرنا بھی بعض دفعہ ضروری ہوتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے بعض لوگ خلاف شرع کلمات زبان سے نکال دیتے ہیں اور محرمات کا ارتکاب کر لیتے ہیں سو یہ مطلب بالکل غلط ہے اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں ان کو طریق سے ذرا بھی مس نہیں بلکہ اس کا صحیح مطلب وہی ہے جو میں نے بیان کیا کہ کارخانہ عشق سے عالم مراد ہے حاصل یہ ہوا کہ عالم چونکہ اسماء الٰہیہ کے ظہور کا محل ہے اور خدا کی ایک صفت قہار و مضل بھی ہے اس لئے عالم میں کفر کا وجود بھی ضروری ہے ورنہ ظہور اسماء کامل طور پر نہ ہوگا یہ حکمت تو صوفیہ سمجھے اور ایک حکمت علماء ظاہر نے سمجھی ہے وہ یہ کہ اَلْاَشْیَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِهَا ہر چیز کی حقیقت اس کی ضد کے مطالعہ سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے پس دنیا میں کفر وغیرہ کو اس لئے پیدا کیا گیا تاکہ اس کے ذریعہ سے ایمان کی حقیقت کامل طور پر منکشف ہو جائے دیکھئے جس شخص نے اندھے کو نہ دیکھا ہو وہ سوانکھے کی حقیقت کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح اگر کسی نے ظلمت اور اندھیرے کو نہ دیکھا ہو وہ روشنی کی قدر نہیں جان سکتا یہ تو وہ حکمتیں ہیں جو عارفین اور علماء نے بیان کر دی ہیں ان کے علاوہ اور بھی حکمتیں ہوں گی جو حق تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں غرض اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ تکوینا کفر و معاصی کی بھی ضرورت ہے اس عالم کو پس تکوینا تعلیم سحر میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے اس کام کے لئے فرشتوں کو بھیجا گیا چنانچہ انہوں نے دنیا میں آکر سحر کی حقیقت ظاہر کی اور صلحاء نے ان سے تعلیم حاصل کر کے سحر کے اترے پترے کھول دیئے جس سے ساحروں کی ساری بزرگی خاک میں مل گئی اور لوگوں کو معجزات اور سحر میں جو اشتباہ پیدا ہو گیا تھا وہ رفع ہو گیا پھر وہ فرشتے غالباً آسمان ہی پر چلے گئے نہ وہ کسی کنویں میں ہیں نہ کھائی میں اب

آیت کا ترجمہ سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّیَاطِیْنُ الآیۃ
(یعنی یہودی ایسے بے عقل ہیں کہ کتاب اللہ کا اتباع تو کرتے نہیں) اور ایسی چیز کا
اتباع انہوں نے کرلیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے خبیث جن (حضرت) سلیمان
علیہ السلام کے زمانہ سلطنت میں (یعنی سحر کا اتباع کرتے ہیں جو کہ خبیث جنوں
سے متوارث چلا آرہا ہے) اور (بعضے بے وقوف یہودی جو حضرت سلیمان علیہ
السلام کو نعوذ باللہ ساحر کہتے ہیں یہ بالکل ہی لغو اور جھوٹی بات ہے کیونکہ سحر تو اعتقاداً
یا عملاً کفر ہے اور (حضرت سلیمان علیہ السلام نے (نعوذ باللہ کبھی) کفر نہیں کیا
مگر (ہاں) خبیث جن بیشک کفر کی باتیں اور کفر کا کام یعنی سحر) کیا کرتے تھے اور
حالت یہ تھی کہ (خود تو کرتے ہی تھے مگر دوسرے) آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے
تھے (چنانچہ انہی سے وراثۃً یہ سحر چلا آرہا ہے جس کا یہودی اتباع کرتے ہیں) اور
(اسی طرح) اُس سحر کا بھی (اتباع کرتے ہیں) جو نازل کیا گیا تھا اُن دو فرشتوں پر
بابل میں جن کا نام ہاروت و ماروت تھا اور وہ دونوں (سحر کی) تعلیم کسی کو نہیں دیتے
تھے جب تک (احتیاطاً) پہلے یہ نہ کہدیتے کہ ہمارا وجود بھی (مخلوق کے لئے ایک
امتحان (و آزمائش) ہے (کہ ہماری زبان سے سحر پر مطلع ہو کر کون اُس میں پھنستا
ہے اور کون اس سے بچتا ہے) سو تو (اس پر مطلع ہو کر) کہیں کافر مت بن جائیو
(کہ سحر میں پھنس جاوے) سو (بعضے) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے اس قسم کا
سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے مرد اور بی بی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے (آگے
مسلمانوں کو تسلی ہے کہ وہ ساحروں سے خوف نہ کریں کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ)
یہ ساحر لوگ سحر کے ذریعہ سے کسی کو (ذرہ برابر) بھی ضرر بدون خدا تعالیٰ کی مشیت
کے نہیں پہونچا سکتے (تو تم کو خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور اگر کسی پر سحر کا اثر
ہو جاوے تو وہ یہ سمجھے کہ میرے لئے خدا تعالیٰ کی یہی مشیت تھی ساحر نے کچھ
نہیں کیا بلکہ یہ کلفت دوست نے پہونچائی ہے اور ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

ے یہ حاصل ہے نبذ فریق من الذین اوتوا الکتاب کتٰب اللہ الآیہ کا ۱۲ منہ

اب میں مقصود پر آگیا۔ اس وقت تک جس قدر بیان ہوا وہ تمہید تھی مگر تمہید میں خلاف امید بہت طول ہوگیا (پھر دریافت فرمایا کہ وقت کیا ہے معلوم ہوا کہ گیارہ بجے ہیں۔ فرمایا کہ بہت دیر ہوگئی ۱۲ جامع) اب میں مقصود کو مختصر طور پر بیان کردوں گا تاکہ زیادہ دیر نہ ہو (اس پر چاروں طرف سے آواز آئی کہ حضرت مختصر نہ کیجئے جب تک چاہیں بیان کرتے رہیں۔ ۱۲ جامع فرمایا کہ) لیکن میرا مطلب مختصر کرنے سے یہ ہے کہ تمہید کی نسبت آئندہ بیان مختصر ہوگا یہ مطلب نہیں کہ فی نفسہ بھی مختصر ہوگا ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود
گرچہ بس عالی ست پیش خاک تود

(آسمان اگرچہ عرش کی نسبت سے پست ہے مگر ایک خاک کے ٹیلہ کے سامنے تو بہت بلند ہے)

آسمان عرش و کرسی کے سامنے چھوٹا معلوم ہوتا ہے باقی زمین سے تو وہ پھر بھی بہت بڑا ہے۔ غرض میں یہ چاہتا ہوں کہ اس وقت یہ بیان ایک مدرسہ میں ہو رہا ہے جو کہ بیت العلم ہے اس لئے ضروری ہے کہ علم کے متعلق ایک منضبط بحث بیان کردوں تاکہ طلبہ کو اس سے فائدہ ہو نیز علماء اور عوام نے علم کے متعلق جو کچھ غلطیاں کی ہیں ان کو واضح کر کے اصلاح کا طریقہ بتلا دوں چنانچہ اگلی آیتوں میں میرا مقصود صراحۃً مذکور ہے فرماتے ہیں وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ (اور یہ لوگ ایسی چیز سیکھ لیتے ہیں جو ان کو ضرر رساں ہیں) اگرچہ یہاں یہود کی حالت کا بیان ہو رہا ہے کہ وہ ایسی چیز کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو ان کو مضر ہے لیکن یہ قاعدہ ہے کہ خصوص سبب سے حکم خاص نہیں ہوا کرتا عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے اس لئے یہ حکم جو اس جگہ مذکور ہوا ہے عام ہے وہ یہ کہ علم مضر کو حاصل نہ کرنا چاہیئے اس سے معلوم ہوا کہ ہر علم محمود نہیں بلکہ بعضے مضر بھی ہیں جن کے سیکھنے پر اس آیت میں ملامت کی گئی ہے۔ پھر مضر کی دو قسمیں ہیں بعضے بالذات مضر ہیں اور بعضے بالغیر۔ مضر بالذات وہ علوم ہیں جو اصل سے ممنوع اور ناجائز ہیں کیونکہ اُن کے

مضامین خلاف شریعت ہیں جیسے سحر اور نجوم وغیرہ شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ پہلے تو سحر کی تعلیم کو اور اس کے سیکھنے کو جائز کہا تھا اور اب اس کو ناجائز کہدیا اس کا جواب یہ ہے کہ اوپر سحر سیکھنے کو اور سکھانے کو جائز نہیں کہا تھا بلکہ اس کی حقیقت جاننے اور بتلانے کو جائز کہا تھا اور اس میں بھی یہ شرط ہے کہ ضرورت شرعیہ کی وجہ سے اس کی حقیقت کو معلوم کیا جائے تو اس وقت چونکہ سحر اور معجزہ میں اشتباہ ہونے لگا تھا اس لئے اس کا جاننا اور بتلانا جائز تھا وہ بھی ان لوگوں کے لئے جن کو اپنے نفس پر یہ اعتماد ہو کہ وہ اس کو جان کر اس میں مبتلا نہ ہوں گے اور اب اس کی حقیقت جاننے کی ضرورت نہیں رہی نیز مفسدہ کا اندیشہ غالب ہے اس لئے اس سے بھی منع کیا جائیگا۔ رہا سحر کو سحر کے طور پر اور مقصود کر کے سیکھنا اور سکھانا اس کو میں نے جائز نہیں کہا تھا۔ خوب سمجھ لو۔

اور مضر بالغیر وہ علوم ہیں جو فی نفسہ جائز ہیں مگر کسی عارض کی وجہ سے اُن کو ممنوع کیا گیا ہے جیسے علم مناظرہ کہ فی نفسہ جائز ہے لیکن بعض لوگ اس طرز سے اس کی تعلیم دیتے ہیں جو کہ مضر فی الدین ہے۔ اس لئے اس طرز سے تعلیم و تعلم کو ممنوع کہا جائیگا جیسے بعض جگہ طلبہ کو مناظرہ کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ ایک جماعت فرضی عیسائی بنتی ہے اور ایک مسلمان پھر وہ جماعت جو عیسائیوں کی طرف سے وکالت کرتی ہے وہ بالکل اس طرح گفتگو کرتی ہے جیسے سچ مچ کوئی عیسائی بول رہا ہے مثلاً وہ اپنی مقابل جماعت سے اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ آپ کے قرآن میں یہ لکھا ہے اس سے ہماری تائید ہوتی ہے اور ہماری انجیل میں یہ مسئلہ اس طرح بیان کیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے۔

ایک مدرسہ کے مہتمم نے مجھے طلبہ کا مناظرہ دکھلا دیا تھا وہاں میں نے یہ طرز دیکھا واللہ ان طلبہ کی اس گفتگو سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب وہ مناظرہ ختم ہو گیا تو مہتمم صاحب کہنے لگے کہ اس میں کوئی بات قابل اصلاح ہو تو فرما دیجئے، میں نے کہا کہ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم (بدن پر داغ ہی داغ ہیں کہاں کہاں پھایہ رکھا جائے) یہ تو سر سے پاؤں تک ہی بگڑا ہوا ہے میں کس بات کی اصلاح کروں سوا اس

طرز میں ایک ضرر تو یہی ہے کہ مسلمان سے عیسائی بن گئے دوسرے یہ کہ مناظرہ میں ہر فریق کو اپنی بات کا اونچا رہنا اور دوسرے فریق کی بات کا نیچا رکھنا مدنظر ہوتا ہے تو یہ صورت مطلقاً بھی اور خصوص ایسے طور پر نہایت سخت ہے کہ ایک فریق اسلام کی جانب کو کمزور کر لے کی کوشش کرے جس سے بعض دفعہ سلب ایمان کا اندیشہ ہو جاتا ہے کیونکہ آج کل طبائع میں سلامتی نہیں ہے نیتیں درست نہیں ہیں پس ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اس طرز میں نیت کو درست رکھ سکیں ممکن ہے کسی وقت کوئی شخص محض اپنی بات کی پچ کرنے لگے اور نفسانیت کی وجہ سے اسلام کی جانب کو کمزور کرنے لگے تاکہ سننے والے یہ کہیں کہ فلاں شخص نے بڑی زوردار تقریر کی اور اس کا انجام جو کچھ ہے ظاہر ہے۔ تیسرے یہ غضب ہے کہ اس قسم کے مناظرہ میں بعض دفعہ عوام بھی شریک ہو جاتے ہیں جس میں بڑا اندیشہ یہ ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں فریق باطل کے دلائل بیٹھ جائیں اور اہلِ حق کی طرف سے جو اس کا جواب بیان کیا جائے وہ اس کی سمجھ میں نہ آوے یا جس طالب علم نے اہلِ اسلام کی طرف سے جواب دیا ہے اس کی تقریر اچھی نہ ہو تو اس عامی شخص کا ایمان اس صورت میں برباد ہو جائے گا اس لئے میرے نزدیک یہ طرز بالکل قابل ترک ہے بلکہ میرے نزدیک تو مناظرہ کے لئے تعلیم و تعلم ہی کی ضرورت نہیں فطرت سلیم ہو تو انسان ہر باطل مذہب کا رد بہت آسانی سے کر سکتا ہے۔

الہ آباد میں ایک رئیس تھے بالکل ان پڑھ جو اپنے دستخط بھی نہ کر سکتے تھے بس ایک مہر بنوالی تھی جب دستخط کرنا چاہتے مہر کر دیتے تھے ایک دفعہ وہ سواری پر سوار ہو کر جا رہے تھے راستہ میں ایک عیسائی کھڑا ہوا اپنے مذہب کی حقانیت بیان کر رہا تھا اپنے حق ہونے پر ایک دلیل اس نے یہ بھی بیان کی کہ دنیا میں عیسائی سب سے زیادہ ہیں انجیل کے ترجمے بہت زبانوں میں ہو چکے ہیں معلوم ہوا کہ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ مقبول ہیں جو ان کی اس قدر کثرت اور ترقی ہے اُن رئیس صاحب نے اپنی سواری روک کر پادری سے کہا کہ یہ تو کوئی دلیل حقانیت کی نہیں

آؤ ہم تم کو اسٹیشن پر چل کر دکھائے دیتے ہیں کہ ریل گاڑی میں فسٹ کلاس کا درجہ ایک ہی ہوتا ہے اور تھرڈ کلاس بہت ہوتے ہیں پس ہم مسلمان فسٹ کلاس ہیں اور تم عیسائی لوگ تھرڈ کلاس ہو یہ جواب سن کر پادری مبہوت ہوگیا اور اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو دیکھئے ایک ان پڑھ آدمی نے پادری کو خاموش کر دیا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ مناظرہ کے لئے سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت نہیں البتہ طبیعت سلیم ہونی چاہئے پھر ہر اعتراض کا جواب دے لینا آسان ہے پھر آجکل جس طرح مناظرہ کیا جاتا ہے سلف کا یہ طریقہ نہ تھا قرآن میں جا بجا کفار سے مناظرہ کیا گیا ہے مگر اس کا عجیب طرز ہے آجکل کی طرح تو تو میں میں نہیں ہے احادیث میں حضرت صحابہ کے مناظرے مذکور ہیں ان کا طرز یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بات کو بار بار دہرائے جاتا تھا آخر دونوں میں سے ایک کہدیتا تھا کہ بس مجھے انشراح ہوگیا اور میری سمجھ میں آگیا۔ دلائل اور ردّ و قدح زیادہ نہ ہوتے تھے اور یہی طرز قرآن کا ہے۔ آجکل کے مناظرہ میں ایک ضرر یہ بھی ہے کہ یہ لوگ مخالف کے جواب میں انبیاء کی توہین کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ایک مناظرہ میں عیسائی نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کے رسول رسیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ زاہد تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بھی نکاح نہیں کیا ساری عمر زہد کی حالت میں گذار دی اور مسلمانوں کے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ایک چھوڑ نو شادیاں کیں۔ تو اس کے جواب میں ایک صاحب کیا فرماتے ہیں کہ پہلے تم یہ تو ثابت کر دو کہ عیسیٰ علیہ السلام میں قوت رجولیت (مردانگی) بھی تھی۔ لیجئے صحیح جواب کو چھوڑ کر ان حضرات نے ایسا جواب دیا جس میں نعوذ باللہ عیسیٰ علیہ السلام پر نامردی کا عیب لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام جس طرح باطنی کمالات کے جامع ہوتے ہیں اسی طرح ظاہری کمالات بھی ان میں کامل طور پر موجود ہوتے ہیں اُن کے قویٰ بشریہ بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ صحیح جواب یہ تھا کہ زاہد ہونا نکاح نہ کرنے پر موقوف نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا جتنے پیغمبر ہیں وہ سب زاہد نہ تھے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وابراھیم و داؤد علیہ السلام وسلیمان علیہ السلام

سب کے سب صاحب اہل وعیال تھے بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تو تین سو اور بعض روایات کے موافق ہزار بیبیاں تھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زہد کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ تعلقات سے یکسو ہو کر زاہد بنے دوسرے یہ کہ تعلقات میں مشغول ہو کر زاہد رہے کہ بی بی اور بچے اور گھر بار سب کچھ ہو مگر دل کسی چیز میں نہ لگا ہوا ہو بلکہ دل میں خدا ہی کے ساتھ لگاؤ ہو دوسروں سے محض حقوق ادا کرنے کے واسطے تعلق ہو سو عیسیٰ علیہ السلام کا زہد پہلی قسم کا تھا اور دوسرے انبیاء میں دوسری قسم کا زہد تھا۔ آجکل یہ مرض بہت پھیل گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اس طرح ثابت کرتے ہیں جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانہ میں بہت شائع ہو رہی ہے اور لوگ اس پر بہت فریفتہ ہیں لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کرتے ہوئے اس میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جو کمالات تھے وہ کسی نبی میں نہ تھے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام میں شفقت ورحمت کا مادہ نہ تھا کیونکہ انھوں نے یہ دعا کی تھی یَارَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکَافِرِیْنَ دَیَّارًا (اے میرے پروردگار کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ) اور عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن وسلطنت کا سلیقہ نہ تھا۔ استغفراللہ۔

دیکھئے اس ظالم نے نوح علیہ السلام کو شفقت ورحمت سے اور عیسیٰ علیہ السلام کو تمدن وسلطنت کے سلیقہ سے خالی بتا دیا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے نوح علیہ السلام کی دعوت کا حال جو سورۂ نوح میں مذکور ہے وہی اُن کی شفقت ورحمت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے چنانچہ فرماتے ہیں قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا۔ نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو (دین حق کی طرف) رات کو بھی بلایا اور دن کو بھی سو میرے بلانے پر وہ اور زیادہ بھاگتے رہے۔ آگے ارشاد ہے ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا یعنی پھر بھی میں ان کو مختلف طریقوں سے نصیحت

کرتا رہا چنانچہ) میں نے ان کو بآواز بلند (حق کی طرف) بلایا (اس سے مراد خطاب عام ہے وعظ کے طور پر) پھر میں نے ان کو (خطاب خاص کے طور پر) علانیہ بھی سمجھایا اور بالکل خفیہ بھی سمجھایا۔ (غرض جتنے طریقوں سے نفع کی امید ہو سکتی ہے سب ہی طرح سمجھایا) تو اگر نوح علیہ السلام میں شفقت و رحمت نہ ہوتی تو اس کاوش کی انھیں کون ضرورت تھی پھر یہ طرز کوئی ایک دو دن یا ایک دو مہینہ تک نہیں رہا بلکہ ساڑھے نو سو برس تک اسی طرح سمجھاتے رہے اور قوم کی سرکشی کی یہ حالت تھی کہ اس عرصہ میں غالباً صرف اسی آدمی ایمان لائے باقی سب اسی حالت پر رہے اور طرح طرح سے نوح علیہ السلام کو ستاتے رہے مگر وہ اس پر بھی مایوس نہیں ہوئے۔ برابر دعوت کرتے رہے حتیٰ کہ جب خود اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے ان کو اطلاع دی کہ اب کوئی ایمان نہ لاوے گا تب وہ مایوس ہوئے جیسا کہ اس آیت میں ذکر ہے وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ اور نوح علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی گئی کہ آپ کی قوم میں سے جتنے لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب اور کوئی ہرگز ایمان نہ لاوے گا پس ان باتوں پر رنج نہ کیجئے جو وہ کیا کرتے تھے۔ جب وحی سے ان کو معلوم ہو گیا کہ اب کسی کی قسمت میں ایمان نہیں ہے تب انھوں نے کفار کی ہلاکت کے لئے بددعا کی جس کی حکمت کو انھوں نے خود بھی ظاہر کر دیا ہے اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا یَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا۔ اگر (اب) آپ ان کو روئے زمین پر رہنے دیں گے تو یہ لوگ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے اور (آگے بھی) ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہو گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کو وحی وغیرہ سے اس کی خبر بھی ہو گئی تھی کہ اگر یہ لوگ زندہ رہے تو ان کی اولاد میں بھی کوئی مسلمان نہ ہو گا۔ اب بتلایئے ایسی حالت میں ان کی بددعا خلاف شفقت کیونکر تھی بلکہ یہ تو مسلمانوں کے حق میں عین رحمت تھی ورنہ اگر وہ زندہ رہتے تو ان کی اولاد بھی کافر ہوتی تو دنیا میں مسلمانوں کا جینا محال ہو جاتا پھر نوح علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا تھا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ

متنبہ کیونکہ ان ظالموں کی بابت تم مجھ سے رشفاعت کے طور پر) کچھ مت کہنا کیونکہ یہ سب غرق کئے جائیں گے اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام میں شفقت و رحمت بہت زیادہ تھی کہ اگر ان کو ممانعت نہ کی جاتی تو وہ شفاعت وغیرہ کرتے چنانچہ اپنے لڑکے کے بارے میں اُن کو کچھ کہنے کا موقع مل گیا تو انھوں نے عرض کر ہی دیا کہ اے پروردگار آپ کا وعدہ تھا کہ تیری اہل وعیال کو نجات دوں گا اور میرا لڑکا بھی تو میری اہل وعیال میں داخل ہے وہ کیوں ہلاک ہوگیا، وہاں سے ارشاد ہوا کہ وہ آپ کی اہل میں داخل نہیں کیونکہ اس کے اعمال اچھے نہ تھے۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کی بابت حدیث میں آتا ہے کہ وہ آخر زمانہ میں نازل ہوں گے اور مسلمانوں کی سلطنت کا انتظام فرمادیں گے اور جزیہ کو موقوف کردیں گے اگر ان میں سلیقہ سلطنت نہیں تو وہ آخر زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کی سلطنت نہایت کمزور ہوگی اسکا انتظام کیسے کرلیں گے۔

الغرض انبیاء علیہم السلام میں تمام کمالات مجتمع ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ایک جوہر سے کسی وقت وہ کام نہ لیں لیکن کسی کمال سے ان کو خالی بتا دینا یہ سخت غلطی ہے۔ حق تعالیٰ جس صفت سے کام لینے کا ان کو حکم فرماتے ہیں اس سے کام لیتے ہیں اور جس صفت سے جس وقت کام لینے کا حکم نہیں ہوتا اس سے کام نہیں لیتے ان کی حالت یہ ہوتی ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں دل آپ پر مبتلا ہے جو کچھ کریں میں آپ سے راضی ہوں)

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان او ست — ور بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب آئیم مستان ویئم — ور بہ بیداری بدستان ویئم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ ان ہی کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے تصرف سے ہوا ہے اور اگر ہم جہل ہی مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ ہی تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اور اگر سو رہیں تو ان ہی کے بے ہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں یعنی قوت بیانیہ بھی ان کی ہی عطا کی ہوئی ہے)

من چو کلکم درمیان اصبعین　　　نیستم در صف طاعت بین بین
بنگر اے دل تو اجلا لیستی　　　درمیان اصبعین کیستی

(میں قلم کی طرح انگلیوں میں ہوں صف طاعت میں بین بین نہیں ہوں اے دل غور کر اگر تو اجلا نہیں ہے تو درمیان انگلیوں کے کیوں ہے)

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کر دیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں)

انبیاء علیہم السلام بدون حکم کے کچھ نہیں کرتے جس کو جو حکم ہوتا ہے وہی بجالاتے ہیں اسی لئے ان کی شانیں مختلف ہوتی ہیں مگر ہر شان محبوب ہے کیونکہ محبوب کی رضا کے موافق ہے ایک عارف فرماتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خندان است
بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان ست

(گل سے کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہو رہا ہے اور بلبل سے کیا فرما دیا کہ نالاں ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ہم کو وہی بیان کرنے چاہئیں جو احادیث میں مذکور ہیں وہ کیا کچھ کم فضائل ہیں اور یہاں سے اس کی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل خود کیوں بیان فرمائے وجہ یہ ہے کہ اگر خود حضور

صلی اللہ علیہ وسلم بیان نہ فرماتے تو امت اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر کمالات بیان کرتی، کیونکہ محبت و اعتقاد اس پر مجبور کیا کرتا ہے کہ محبوب کے فضائل بیان کئے جائیں اور ہمارے بیان کردہ فضائل میں یہ اندیشہ غالب تھا کہ دوسرے انبیاء کی تحقیر و توہین لازم آجائے جیساکہ آجکل مشاہدہ ہورہا ہے۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سچے اور واقعی کمالات خود ہی بیان فرمادیئے تاکہ اگر کسی کو محبت و عشق کے غلبہ میں آپ کے فضائل بیان کرنے کا شوق ہو وہ ان صحیح فضائل کو بیان کرکے اپنا شوق پورا کرلے اور ان فضائل کے بیان کرنے میں کسی نبی کی توہین کا شائبہ بھی نہیں الغرض آج کل مناظرہ کی تعلیم جس طرز سے کی جاتی ہے وہ قابل ترک ہے چنانچہ اس شخص مذکور نے عیسیٰ علیہ السلام کو معاذ اللہ نامرد بنانا چاہا یہ تو مہذب لوگوں کا مناظرہ ہے اور گنواروں کا مناظرہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

روڑکی میں ایک عیسائی بیان کررہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں ایک گنوار نے کہا خدا کے اور بھی کوئی بیٹا ہے یا نہیں پادری نے کہا نہیں گنوار بولا کہ بس تیرے خدا کے اتنے زمانہ میں ایک ہی بیٹا ہوا میرے نکاح کو اتنا عرصہ ہوا ہے اس وقت میرے گیارہ بیٹے ہیں اور آگے کو اور بھی ہوں گے تو تیرے خدا سے تو میں ہی اچھا رہا۔ اس گنوار کا جواب اگرچہ فی نفسہ ایک معقول بات تھی واقعی اگر خدا کے لئے بیٹا ہونا ممکن ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ اس کے ایک ہی بیٹا ہو حالانکہ اس کی مخلوق میں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے بہت اولاد ہوتی ہے لیکن طرز نہایت بیہودہ ہے۔ غرض جو علوم مضر ہوں ان کا سیکھنا حرام ہے وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ (یہ لوگ ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں) سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب بعض علوم مضر ہیں تو کوئی نافع بھی ضرور ہے تو اس سے دو حکم معلوم ہوئے ایک یہ کہ علوم مضرہ سے بچنا چاہیئے دوسرے یہ کہ علوم نافعہ کو سیکھنا چاہیئے۔ رہا یہ کہ مضر کون ہے اور نافع کون ہے اس کی تعیین بھی خود اسی آیت میں موجود ہے وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَالَهُ

فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ (جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں) اس سے معلوم ہوا کہ علم مضر وہ ہے جو آخرت میں کام نہ آوے تو اس کے مقابلہ میں نافع وہ ہوا جو آخرت میں کام آوے اور ان دونوں کے مجموعہ سے دو غلطیاں معلوم ہوئیں۔ ایک علماء کی ایک عوام کی۔ علماء کی تو غلطی یہ ہے کہ اُن میں سے بعضے ساری عمر علوم غیر نافعہ ہی میں صرف کر دیتے ہیں یعنی صرف معقول ہی پڑھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معقول آخرت میں کام آنے والی نہیں البتہ اگر علم دین کے ساتھ معقول کو اس غرض سے پڑھا جاوے کہ اس سے فہم و استدلال میں سہولت ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کا وہی حکم ہے جو نحو و صرف و بلاغت وغیرہ کا حکم ہے کہ یہ سب علوم الٰہیہ ہیں اگر ان سے علم دین میں مدد لی جائے تو طبعًا اُن سے بھی تواب مل جاتا ہے لیکن ساری عمر علوم الٰہیہ ہی میں گنوانا یہ سراسر حماقت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ساری عمر ہتھیار کی درستی اور صفائی میں گذار دے اور ان سے کام ایک دن بھی نہ لے تو ہر شخص اس کو بیوقوف بتلائے گا اور بعضے صرف معقول تو نہیں پڑھتے مگر علوم دینیہ پر اس کی تقدیم کرتے ہیں یہ بھی غلطی ہے اس میں ایک ضرر تو یہ ہے کہ اگر اس حالت میں موت آگئی تو معقولیوں ہی میں اس کا حشر ہوگا۔ دوسرا ضرر یہ ہے کہ اس شخص کی عقل پر معقول رچ جاتی ہے پھر یہ حدیث و قرآن کو معقول ہی کے طرز پر سمجھنا چاہتا ہے اور ہر جگہ اسی کو چلاتا ہے اس لئے حدیث و قرآن کا اثر اس کی طبیعت پر نہیں جمتا۔

گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہٗ کے پاس ایک معقولی طالب علم حدیث پڑھنے آئے۔ ایک دن سبق میں یہ حدیث آئی لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ صَلٰوۃً بِغَیْرِ طُھُوْرٍ وَّلَا صَدَقَۃً مِّنْ غُلُوْلٍ یعنی نماز بدون طہارت (اور وضو) کے قبول نہیں ہوتی الخ مولانا نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وضو کے بغیر نماز فاسد ہے۔ معقولی صاحب نے اعتراض کیا کہ اس سے تو قبول نہ ہونا معلوم ہوتا ہے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ بغیر وضو کے نماز صحیح بھی نہیں ہوتی ممکن ہے کہ صحت تو بدون وضو کے بھی ہو جاتی ہو لیکن قبول بدون

وضو کے نہ ہو پس اگر کوئی بدون وضو کے نماز پڑھ لے پھر وضو کر لے تو احتمال ہے کہ اب قبول بھی ہو جاوے۔ اس پر سب کو ہنسی آگئی سو معقول پہلے پڑھنے کا یہ ضرر ہوتا ہے کہ حدیث کا ذوق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ نماز کے بعد وضو کر لینے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک افیونی کا لوٹا کچھ ٹوٹا ہوا تھا۔ جب وہ پاخانہ جاتا اور وہاں دیر لگتی جیسا کہ افیونی کی عادت ہے کہ پاخانہ میں جا کر بہت دیر لگاتے ہیں اس عرصہ میں لوٹا بالکل خالی ہو جاتا ہے ایک دن افیونی صاحب نے کہا کہ آج میں تیرا علاج کروں گا تو روز خالی ہو جاتا ہے آپ نے کیا کیا کہ پاخانہ میں جا کر پہلے آبدست کر لی اور اپنے جی میں بڑے خوش ہوئے کہ ہم نے خوب تدبیر کی کہ لوٹا خالی نہ ہو سکا مگر اس کی خبر نہ تھی کہ جس غرض سے پانی لائے تھے اس کا کہیں پتہ ہی نہیں غرض وہ روز یہی حرکت کرتا کہ پہلے آبدست لیتا پھر پاخانہ پھرتا۔ مولانا محمد یعقوبؒ بڑے ظریف تھے میں نے کہدیا کہ یہ بڑا بیوقوف تھا اول آب دست کرتا تھا پھر پاخانہ پھرتا فرمایا نہیں تم سمجھے نہیں وہ آبدست گذشتہ دن کے پائخانہ کی کرتا تھا تو آبدست ہو رہی ہوئی البتہ صرف اول دن کی آبدست بیکار ہوئی۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا تو ان معقولی صاحب کا وضو بھی اسی کے مشابہ تھا ان ہی طالب علم صاحب نے ایک اور اعتراض کیا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جنت میں ہر شخص اپنے اپنے درجہ میں خوش رہے گا ادنیٰ درجہ والوں کو بڑے رتبہ کے لوگوں کو دیکھ کر رنج نہ ہوگا کیونکہ جنت میں رنج وغم کا نام بھی نہیں ہوگا ہر شخص اپنی حالت کو دوسرے سے اچھی سمجھے گا۔ وہ معقولی صاحب بولے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ سب جنتی جہل مرکب میں مبتلا ہوں گے غرض ان کو حدیث میں بھی وہی معقولی اصطلاحیں یاد آتی تھیں جہل مرکب اور جہل بسیط ہی میں رہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اپنی حالت پر خوش رہنا اور چیز ہے اور حالت کا نہ جاننا اور چیز ہے ایک دوسرے کے متلازم نہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم یہ جانتے ہوں کہ ہمارا درجہ فلاں شخص سے کم ہے مگر پھر بھی ہم اپنی حالت پر خوش ہوں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کو ماش کی دال ایسی مرغوب ہے

کہ مرغ کا گوشت بھی اس کے آگے پسند نہیں آتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی رغبت اور پسند ہے اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ شخص ماش کی دال ہی میں ایسا خوش ہے جیسا کہ دوسرا شخص مرغ کے گوشت میں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو دال اور گوشت میں فرق بھی نہ معلوم ہو دونوں میں فرق ہر ایک جانتا ہے اسی طرح جنت میں ادنیٰ درجہ والوں کو اپنا درجہ ہی پسند ہوگا وہ اسی میں خوش و خرم ہوں گے اگرچہ وہ یہ بھی جانیں گے کہ ہمارا درجہ فلاں شخص سے کم ہے پس جہل مرکب میں ہونا کیونکر لازم آیا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ معقول کا علوم دینیہ پر مقدم کرنا مضر ہے مگر بعض لوگ معقول کے ایسے فریفتہ ہوتے ہیں کہ پہلے اسی کو پڑھتے ہیں بلکہ بعض تو حدیث وغیرہ کے پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ حدیث کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے اس میں کونسی مشکل بات بات ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ حدیث پڑھ لینے کے بعد بھی اگر سمجھ میں آجاوے تو بسا غنیمت ہے اور بدون پڑھے ہوئے تو سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ایک معقول صاحب کی حکایت ہے کہ انھوں نے حدیث پڑھی نہ تھی مگر پڑھانے کو تیار ہو گئے۔

ایک حدیث میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا قصہ آیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر اطلاع کئے نکاح کر لیا تھا جب وہ شادی سے اگلے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان پر زردی کا اثر دیکھا یہ دلہن کے زعفرانی کپڑوں کا نشان لگ گیا تھا۔ فرمایا مَهْيَمْ هٰذِهِ الصُّفْرَةُ انھوں نے کہا تَزَوَّجْتُ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی میں نے شادی کر لی ہے۔ آپ نے فرمایا اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ ولیمہ کرو اگرچہ ایک ہی بکری کا ولیمہ ہو۔ یہ تو حدیث تھی۔ کسی طالب علم نے سوال کیا کہ یہ زردی کیسی تھی مدرس صاحب نے حدیث پڑھی تو تھی نہیں جو اس کی حقیقت سمجھتے آپ نے اجتہاد کیا کہنے لگے کہ بات یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف جوان آدمی تھے ایک زمانہ سے رکے ہوئے تھے جب شادی ہوئی تو انھوں نے مقاربت میں کثرت کی اس لئے چہرہ پر زردی آگئی۔ ظالم نے کیا حدیث کا ناس مارا ہے۔ آپ نے رای علیہ اثر الصفرة (آپ نے اس پر زردی کا نشان دیکھا) کے یہ معنے سمجھے کہ چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ طالب علم بے چارہ یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا مگر اس کے دل کو یہ بات نہ لگی اس نے ایک دوسرے عالم سے اس کا مطلب پوچھا انھوں نے صحیح مطلب بیان کر دیا کہ شادی کے دن دلہن کے کپڑوں کو خوشبو اور عطر لگایا جاتا ہے عرب میں جو خوشبو اس وقت استعمال کی جاتی تھی اس میں زعفران وغیرہ پڑتی تھی دلہن کے پاس جانے سے وہ رنگ عبدالرحمن بن عوف کے کپڑوں پر بھی لگ گیا۔ چونکہ اس خوشبو کا استعمال مرد نہیں کرتے تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا کہ یہ رنگ دلہن کی خوشبو کا ہے اس حقیقت کے معلوم ہو جانے پر طالب علم کا اطمینان ہو گیا۔ تو صاحبو! یہ فرق ہوتا ہے حدیث پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے میں۔ حدیث میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا سمجھنا واقعات کے جاننے پر موقوف ہوتا ہے ان میں معقول کچھ کام نہیں دے سکتی اور اگر ان میں صرف عقل سے کام لیا جائے تو بس ایسے ہی مطلب بیان کئے جائیں گے جیسا ان حضرت نے رَاٰیْ عَلَیْہِ اَثَرُ الصُّفْرَۃِ (آپ نے اس پر زردی کا نشان دیکھا) کا مطلب بیان کیا تھا پس معقول کو علوم دینیہ کے بعد پڑھنا چاہیئے ورنہ وہی عقل پر پرچ جائے گی اور حدیث میں وہی معقولی اشکالات جاری ہونگے ایک دفعہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا ایک معقولی صاحب پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہو میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں کہنے لگے کہ شیخ بو علی سینا تو ان کے ذہن میں ہر وقت شیخ بو علی سینا ہی جما ہوا تھا کہ تصور شیخ میں بھی وہی یاد آیا گویا ان کے نزدیک بس وہی ایک شیخ رہ گیا ہے۔ یہ تو علما کی غلطی تھی کہ علم مضر میں مشغول ہو گئے اور عوام کی غلطی یہ ہے کہ وہ علم نافع کو بھی حاصل نہیں کرتے وہ اگر معقول سے بچے ہوئے ہیں تو دینیات سے بھی بے خبر ہیں اور یہ غلطی جو عوام کرتے ہیں وہ بھی درحقیقت علما رہی کی ذات مقدس سے نکلی ہے۔ کیونکہ ہر فتنہ ہمارے ہی سے نکلتا ہے عوام کا فساد اکثر کسی عالم کے فساد سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں جس قدر بدعات و منکرات پھیلی ہوئی ہیں کسی عالم کا ہاتھ ان میں پہلے شریک ہوا ہے۔ بنا ر اس غلطی کی یہ ہے کہ عوام نے علم دین کو عربی ہی کی ساتھ مخصوص سمجھ لیا ہے اور عربی پڑھنے کی ہر ایک کو فرصت نہ تھی

تو اب انھوں نے اردو میں بھی مسائل نہ سیکھے کیونکہ اردو میں مسائل پڑھ لینے کو وہ علم ہی نہیں سمجھتے۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ جب اردو میں پڑھ لینے کے بعد بھی ہم جاہل رہیں گے تو اس کی بھی کیا ضرورت ہے اور یہ غلطی ہماری پیدا کی ہوئی اس لئے ہے کہ آجکل واعظین جب علم کی فضیلت بیان کرتے ہیں اور جتنی حدیثیں پڑھتے ہیں اس کی ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ عربی پڑھنی چاہیے اور جتنے عربی مدارس ہیں ان کی امداد کرنی چاہیئے پس اگرچہ یہ لوگ صاف صاف یہ نہیں کہتے کہ علم دین عربی کے ساتھ مخصوص ہے مگر ان سب فضائل پر عربی کی تعلیم کو متفرع کرنا اور مدارس عربیہ کی امداد پر توجہ دلانا لازمی طور پر عوام کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ بس جتنے فضائل علم کے بیان کئے گئے ہیں یہ سب عربی ہی کے ساتھ خاص ہیں بدون عربی میں علم حاصل کئے یہ فضائل حاصل نہ ہوں گے۔

واعظوں کا مقصود تو محض مدارس کی امداد پر توجہ دلانا تھا مگر عوام اس سے یہ سمجھ گئے کہ یہ فضائل جبھی حاصل ہوں گے جبکہ عربی میں اس علم کو حاصل کیا جائے۔ شاید یوں سمجھے ہوں کہ عربی خدا تعالیٰ کی بولی ہے اور اردو ہماری بولی تو علم دین تو خدا تعالیٰ ہی کی بولی میں ہونا چاہیئے اور یہ مذاق صرف عوام ہی کا نہیں بگڑا بلکہ بعض طالبعلم بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں جیسے ایک طالب علم مولوی مغیث الدین تھے انھوں نے منیہ میں یہ مسئلہ پڑھا تھا کہ نماز کلام الناس سے باطل ہو جاتی ہے وہ اس کا یہ مطلب سمجھے کہ اردو میں بات کرنے سے نماز فاسد ہوتی ہے۔ ایک دفعہ وہ کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ امام نے مغرب کی دوسری رکعت میں اتنا لمبا قعدہ کیا کہ مقتدیوں کو شبہ ہو گیا کہ بس اب سلام پھیر دیں گے تو مولوی مغیث الدین نے پیچھے سے آواز دی قُم یعنی کھڑے ہو جاؤ۔ امام کو یاد آگیا کہ یہ رکعت دوسری ہے وہ کھڑے ہو گئے۔ مولوی مغیث الدین اپنے دل میں بڑے خوش ہوئے کہ آج عربی نے بڑا کام دیا کہ ہم نے امام کی غلطی بھی دور کر دی اور ہماری نماز بھی فاسد نہیں ہوئی امام نے سلام پھیر کر پوچھا کہ یہ قُم کہنے والے کون صاحب تھے آپ آگے بڑھے کہ میں تھا انھوں نے کہا کہ آپ اپنی نماز دہرا لیجئے آپ کی نماز نہیں ہوئی کیونکہ کلام الناس سے

نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے تو عربی میں کلام کیا تھا۔ امام نے کہا اچھا تو آپ کے نزدیک عربی کلام الناس نہیں ہے۔ جاؤ نماز کا اعادہ کرو۔ جب معلوم ہوا کہ عربی بھی بندوں کی زبان ہے۔ غرض اس غلطی میں لوگ بہت مبتلا ہیں اسی واسطے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نماز اردو یا فارسی میں دعا کرنے سے فاسد ہو جاتی ہے اگرچہ وہ اُسی درجہ کا ترجمہ ہو جو عربی میں پڑھی جاتی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی اگرچہ غیر عربی میں دعا پڑھنا نماز کے اندر حرام ہے مگر حرمت سے فساد تو لازم نہیں آتا۔ پس اصل مدار تو مضمون پر ہے۔ جس مضمون کی دعا عربی میں پڑھنے سے نماز باطل نہیں ہوتی اسی مضمون کی دعا اردو فارسی میں پڑھنے سے بھی فاسد نہ ہوگی صرف ممانعت ہوگی وہ بھی اس وقت جبکہ قصداً ایسا کیا ہو اور اگر بھولے سے یا غلبۂ حال میں ایسا ہو جائے کہ اردو یا فارسی کی دعا زبان سے نکل جائے تو کراہت بھی نہ ہوگی بشرطیکہ مضمون مفسد نہ ہو ہمارے حاجی صاحبؒ کے ایک خادم تھے جن کا نام مولوی تجمل حسین ہے جب وہ مکہ معظمہ گئے تو ایک دن صبح کی نماز شافعی امام کے پیچھے پڑھ رہے تھے۔ شافعیہ صبح کی نماز میں قنوت پڑھتے ہیں حنفیہ اس وقت خاموش رہتے ہیں مولوی تجمل حسین پر قنوت سننے سے ایک حالت طاری ہوئی کہ سب تو خدا سے مانگ رہے ہیں اور میں بت کی طرح خاموش کھڑا ہوں ان سے نہ رہا گیا اور انھوں نے پند نامہ کے یہ اشعار شروع کر دیئے ؎

بادشاہا جرم ما را درگذار ۔۔۔ ما گنہگاریم و تو آمرزگار

تو نکوکاری و ما بد کردہ ایم ۔۔۔ جرم بے اندازہ بیحد کردہ ایم

بر درآمد بندۂ بگریختہ ۔۔۔ آبروئے خود بعصیاں ریختہ

(اے بادشاہ حقیقی ہمارے جرم کو بخش دے ہم گنہگار ہیں تو گناہ کا بخشنے والا ہے تو نکوکار ہے اور ہم نے بُرے کام کئے ہیں ہم نے جرم بے اندازہ بے حد کئے ہیں۔ دروازہ پر حاضر ہوا بندہ بھاگا ہوا اپنی آبرو کو گناہ سے کھوئے ہوئے)

انھوں نے یہ پوری نظم پڑھ ڈالی اور لوگ چاروں طرف سے متوحش ہو گئے کہ نماز میں

یہ کیا ہونے لگا۔ بعد نماز کے لوگوں نے کہا کہ ان کی نماز باطل ہوگئی دوبارہ پڑھنی چاہیے۔ یہ خبر حاجی صاحب کو پہونچی حاجی صاحب پر نہ معلوم کیا کیا حالتیں گذری تھیں وہ سمجھ گئے کہ انھوں نے غلبۂ حال میں ایسا کیا ہے۔ فرمایا کہ نہیں نماز باطل نہیں ہوئی۔ واقعی صاحب حال کی حالت کو وہی سمجھ سکتا ہے جس پر گذری ہو اور جس پر یہ حالتیں نہ گذری ہوں وہ کیا سمجھ سکتا ہے ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہ لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

(اندھیری رات موجوں کا خوف اور ایسا بھنور ہائل ہمارا حال کنارہ دریا پر آرام سے کھڑے ہونے والوں کو کیا معلوم ہوسکتا ہے)

یعنی جو شخص ساحل پر آرام سے کھڑا ہے وہ اس شخص کی حالت کو کیا جانے جو دریا میں غوطے لگا رہا ہے کہ ان کو کن کن مصائب کا سامنا ہو رہا ہے اس شعر کے متعلق ایک لطیفہ ابھی قلب پر وارد ہوا ہے وہ یہ کہ ساحل دو ہوتے ہیں ایک ادھر کا ساحل اور ایک اُدھر کا ساحل جس پر دریا کو عبور کرکے پہونچتے ہیں تو اس شعر میں ادھر کا ساحل مراد ہے اُدھر کا ساحل مراد نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو شخص ابھی تک ادھر کے ساحل ہی پہ کھڑا ہے اور دریا میں اس نے قدم بھی نہیں رکھا اس کو دریا میں غوطہ لگانے والے کا حال کچھ معلوم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس کو اُس پر اعتراض کا حق حاصل نہیں اور جو شخص دریا میں گھس کر تیرتا ڈوبتا دوسرے ساحل پر پہونچ چکا ہو یعنی سلوک کو طے کرچکا ہو اس کو دریا میں چلنے والے کا حال معلوم ہوسکتا ہے کیونکہ اس پر بھی ایک

وقت ایسا گذرا ہے جبکہ وہ دریا میں تیرتا اور ڈبتا ہوا چل رہا تھا اگرچہ اس وقت دوسرے ساحل پر پہنچ جانے کی وجہ سے وہ چین میں ہے پس اس کو سالکین پر اعتراض کا حق بھی حاصل ہے پس اہل ساحل دو قسم کے ہیں ایک وہ جو دریا میں گھسے ہی نہیں یہ تو دریا کی حالت سے بالکل ناواقف ہیں دوسرے وہ جو دریا کو عبور کر کے ساحل پر پہونچا ہے ظاہر میں اس کی حالت بھی پہلے اہل ساحل کے مشابہ ہے دونوں چین میں نظر آتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ اس کو مصائب جھیلنے کے بعد چین نصیب ہوا ہے اور پہلے ساحل والوں کو مصائب کا سامنا ہی نہیں ہوا تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اس لئے اس کو اعتراض کا حق ہے مگر کورے اندھوں کو صاحب حال پر اعتراض کا کچھ حق نہیں۔ اسی واسطے حاجی صاحب اس شخص پر جو اعتراض کرتے ان کو اس کا حق حاصل تھا مگر اس لئے اعتراض نہیں کیا کہ وہ اس حالت کی حقیقت سے واقف تھے اور جنھوں نے اعتراض کیا ان کو یہ حق حاصل نہ تھا غرض عام لوگ سمجھے تھے کہ اس صورت میں نماز باطل ہوگئی کیونکہ فارسی و اردو میں مطلقاً کچھ پڑھنا عوام کے نزدیک مفسد صلوٰۃ ہے تو اس غلطی کا منشا وہی ہے کہ یہ لوگ عربی کو تو خدا کی زبان سمجھتے ہیں اور اردو فارسی کو بندوں کی زبان۔ حالانکہ اگر کوئی مضمون فی نفسہ مفسد ہو تو اگرچہ وہ عربی ہی میں کیوں نہ ہو مفسد ہوگا۔ جیسے مولوی مغیث الدین نے ذکر کہا تھا اور اس سے نماز فاسد ہوگئی تھی۔ تو اس غلطی کا منشا زیادہ تر علماء کی کوتاہی ہے کہ انھوں نے کبھی صاف صاف یہ نہیں کہا کہ اردو میں علم دین پڑھ لینے سے بھی وہ فضائل حاصل ہو سکتے ہیں جو احادیث و قرآن میں علم کے لئے وارد ہیں۔ حالانکہ حدیث و قرآن میں کہیں عربی کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم مضر وہ ہے جو آخرت میں کام نہ آوے اور نافع وہ ہے جو آخرت میں کام آوے۔ اس میں کہیں یہ قید نہیں کہ وہ عربی میں ہونا چاہیئے۔ مگر شاید علماء نے یہ بات صاف صاف اس لئے نہیں کہی کہ ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم یہ کہدیں گے کہ اردو میں مسائل جان لینے سے بھی علم کی یہ فضیلتیں حاصل ہو سکتی ہیں تو پھر ہماری قدر نہ رہے گی پھر تو سارے ہی عالم ہو جاویں گے مگر میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں بھی علماء کو نقصان ہوا بلکہ دو نقصان ہوئے ایک عوام کو

ایک علماء کو۔ عوام کو تو یہ نقصان ہوا کہ انھوں نے جب علم کو عربی کے ساتھ مخصوص سمجھا اور عربی پڑھنے کی سب کو فرصت یا ہمت نہ ہوئی اور اردو میں پڑھنے کو وہ علم ہی نہ سمجھے تو مسائل شریعت سے بالکل بے خبر رہ گئے اور علم ہی سے محروم ہو گئے۔ علماء کا یہ ضرر ہوا کہ جب عوام علم سے بالکل محروم ہو گئے تو وہ علماء کی قدر و منزلت سے بھی اندھے ہو گئے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی قدر وہی کر سکتا ہے جس کو کچھ تو اس سے مناسبت ہو۔ دیکھو اگر کوئی زمیندار ایک گانوں کے اندر بہت بڑے حصہ کا مالک ہو تو اس کی قدر و عظمت وہی شخص کر سکتا ہے جس کا کچھ تھوڑا بہت حصہ اس گانوں میں ہو وہ جان سکتا ہے کہ یہ بڑا ہے اور میں چھوٹا ہوں اور جس شخص کا اس گانوں میں کچھ بھی حصہ نہ ہو وہ اس زمیندار کی قدر پوری طرح نہیں جان سکتا۔ اسی طرح جوہر کی قدر وہی کر سکتا ہے جس نے عمر بھر میں کبھی جواہر کو پرکھا ہو۔ ناواقف کی نظر میں تو ایک معمولی لال پتھر اور یاقوت دونوں یکساں ہیں ؎

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوھری
(گوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری)

تو اے صاحبو! اگر تم عوام کو بادشاہ بنانا نہیں گوارا کرتے تو کم از کم ان کو جوہری تو بنا دیا ہوتا تاکہ ان کو اس جوہر کی قدر ہوتی جو آپ کے پاس ہے اور اب جبکہ وہ دین سے بالکل ہی محروم ہو گئے وہ جانتے ہی نہیں کہ عربی پڑھنے والے کے پاس کیا جوہر ہے تو وہ آپ کی قدر کیا خاک سمجھیں گے۔ ہاں اگر وہ کچھ عقائد اور احکام اردو میں پڑھ لیتے پھر ان ہی عقائد و احکام کی تحقیق آپ کی زبان سے سنتے اس وقت ان کو معلوم ہوتا کہ علماء کے پاس یہ جواہرات ہیں اس وقت البتہ ان کو علماء کی قدر ہوتی مگر خدا کے واسطے کوئی صاحب اسی نیت سے عوام کو تعلیم نہ دینے لگیں یہ تو میں نے اس لئے بیان کر دیا ہے کہ اگر کسی کو اردو میں علم پڑھانے سے اس لئے رکاوٹ ہو کہ ہماری قدر کون کرے گا تو وہ یہ سمجھ لے کہ اردو میں اگر عوام کو دین کا علم حاصل ہو گیا تو وہ اس وقت سے زیادہ آپ کی قدر کریں گے یعنی یہ میں بطور تنزل کے کہتا ہوں کہ

بیقدری کا اندیشہ مت کرو ورنہ حقیقت میں عوام کی قدر و بیقدری ہی کیا جس کی پروا کی جائے عوام کی رضا اور اعتقاد ہے کیا چیز جس کا خیال کیا جاوے علما کا مذاق تو یہ ہونا چاہیئے ؎

دلا را مے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(اے دل جس کو تو دوست رکھتا ہے اسی میں دل لگا اور تمام جہان سے آنکھیں بند کرے) عوام قدر کر کے تم کو کیا دیں گے صرف دنیا کے چند ٹھیکرے تو اس کی اُس کمال کے سامنے ہستی کیا ہے جو علم سے آپ کو حاصل ہے ؎

خلیل آسا درِ ملک یقین زن
نوائے لا احب الآفلین زن

(یعنی ابراہیم علیہ السلام کی طرح یقین حاصل کرے لا احب الآفلین (میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا) کی صدا لگاؤ)

؎ زر و نقرہ چیست تا مجنوں شوی
چیست صورت تا چنیں مفتوں شوی

(زر و نقرہ کیا چیز ہے کہ ان کے مفتون ہوتے ہو اور یہ عالم صورت (دنیا) کیا چیز ہے کہ اس پر ایسے مجنوں بنے ہوئے ہو)

مگر افسوس آجکل علماء میں یہ مذاق بہت ہی کم رہ گیا ہے آجکل اکثر لوگ علم کے بعد بھی عوام کی نظروں میں جاہ اور قدر و منزلت کے طالب ہیں یہی وجہ ہے کہ عوام کی خاطر وہ بعض دفعہ ایسے کاموں میں پڑ جاتے ہیں جن کو اندر سے ان کا دل قبول نہیں کرتا۔ بعض لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں جگہ رہ کر عوام کی نظروں میں ہماری وقعت نہ ہوگی یا کم ہوگی تو اس جگہ کو چھوڑنا چاہتے ہیں اور ایسی جگہ کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں ان کی وقعت زیادہ ہو بعض لوگوں کو اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ جب ہم بازار میں یا کسی اور جگہ جاویں تو دو چار آدمی ہمارے ساتھ چلنے والے ہوں

تنہا چلنا انھیں گوارا نہیں ہوتا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ جب آپ کی ساتھ راستہ میں کچھ صحابہ ہو جاتے تو آپ بعض کو آگے کر دیتے اور بعض کو پیچھے آپ سب کے آگے نہ چلتے تھے اسی طرح مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جگہ پاتے وہیں بیٹھ جاتے آپ کی نشست کے لئے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی حتیٰ کہ باہر سے آنے والوں کو یہی نہ معلوم ہوتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مجمع میں کون سے ہیں جبتک کہ وہ خود یہ سوال نہ کرتا مَنْ مُحَمَّدٌ (صلے اللہ علیہ وسلم) مِنْكُمْ کہ تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون سے ہیں صحابہؓ اس کے جواب میں فرماتے هٰذَا الْاَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں۔ گورے چٹے جو سہارا لگائے بیٹھے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ پہونچے تو مدینہ منورہ والے شہر سے باہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کیلئے حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی بھی آپ کے ساتھ تھے اور حضرت ابوبکرؓ کی عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ڈھائی برس ہی کم تھی مگر ان کے قویٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نہ تھے۔ اسی لئے وہ باوجود چھوٹے ہونے کے دیکھنے میں بڑے معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے بال زیادہ سفید ہو گئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قویٰ نہایت اچھے تھے اس وقت آپ کا ایک بال بھی غالباً سفید نہ ہوگا کیونکہ وصال کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم چند گنتی کے بال سفید تھے اور ہجرت کا واقعہ وصال سے دس برس پہلے ہوا ہے تو اس وقت تو ایک بال بھی شاید آپ کا سفید نہ ہوگا۔ اس لئے اکثر لوگ حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھے بس سب لوگ حضرت ابوبکرؓ ہی سے آکر مصافحہ کرتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مصافحہ نہ کرتا۔ مگر اللہ رے تواضع کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے خود یہ فرمایا کہ مجھ سے مصافحہ کرو میں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور حضرت ابوبکرؓ کی یہ سادگی کہ انھوں نے مصافحہ سے انکار نہ کیا جو کوئی ان سے مصافحہ کرتا بے تکلف ہاتھ بڑھا دیتے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت کا خیال کیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی بھی تکلیف کیوں دی۔ الغرض دیر تک لوگ حضرت ابوبکر ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے رہے۔ تھوڑی

دیر میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ آنے لگی اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اپنے چادر ہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کرنے لگے جب سب کو معلوم ہوا کہ یہ خادم ہیں جن سے پہلے مصافحہ کیا تھا اور دوسرے مخدوم ہیں۔ بھلا کچھ حد ہے اس تواضع اور سادگی کی۔ مگر آجکل تو لوگ خود بڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کوئی کوشش بھی نہ کرے تو عوام کے مصافحہ اور ہاتھ پیر چومنے سے اس کو شبہ ہو جاتا ہے کہ میں ضرور کچھ ہوں جبھی تو یہ لوگ میری اس قدر تعظیم کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ انسان کو اپنے عیوب حالانکہ خوب معلوم ہوتے ہیں جن کو دوسرے نہیں جانتے تو گویا دوسرے لوگ اس کے عیوب سے جاہل ہیں مگر یہ شخص اُن جاہلوں کی تعظیم و تکریم سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں واقع میں اسی قابل ہوں اور جو عیوب اُسے یقیناً اپنے اندر معلوم ہوتے ہیں ان سے قطع نظر کر لیتا ہے بلکہ ان کو بھول جاتا ہے جیسے حکایت ہے کہ ایک نائن نے ایک بی بی کو نتھ اُتار کر منہ دھوتے دیکھا۔ نتھ اوتارنے سے سمجھی کہ بیوہ ہو گئی۔ دوڑی ہوئی اپنے شوہر کے پاس آئی کہ کیا بیٹھا ہے فلانے کے پاس (یعنی اس بی بی کے شوہر کے پاس) دوڑ اور خبر کر کہ تمہاری بی بی بیوہ ہو گئی وہ نائی بھی ایسا ہی احمق تھا پہونچا وہ شخص بھی بیوقوف ہی تھا۔ نائی سے پوچھا کہ گھر میں خیریت ہے۔ نائی نے کہا کہ حضور اور تو سب خیریت ہے مگر آپ کی بیوی بیوہ ہو گئی۔ بس یہ خبر سنکر آپ نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ ایک دوست اُن سے ملنے آئے پوچھا خیر تو ہے یہ رونا پیٹنا کیوں ہو رہا ہے کہنے لگے کہ میری بیوی بیوہ ہو گئی ہے۔ اُس نے کہا کہ خدا کے بندے ہوش سے کام لے۔ جب تو زندہ سلامت موجود ہے تو بیوی کیونکر بیوہ ہو گئی۔ تو تو آپ جواب میں کہتے ہیں کہ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں مگر گھر سے آیا ہے معتبر نائی۔

بس یہی حالت آجکل اکثر لوگوں کی ہو رہی ہے کہ وہ اپنے عیوب کو اچھی طرح جانتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ ہم کسی قابل نہیں مگر لوگوں کی تعظیم و تکریم سے یہ خیال کرتے ہیں کہ معتبر لوگ میرے معتقد ہیں کہ شاید ان لوگوں کو میری حالت مجھ سے زیادہ معلوم ہو اور میرے اندر وہ عیوب بھی شاید نہ ہوں جو مجکو معلوم ہوتے ہیں

بس وہی قصہ ہو رہا ہے کہ گھر سے آیا ہے معتبر نائی۔

ایک میاں جی لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن لڑکوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ آج کسی طرح چھٹی لینی چاہیئے سب کے اتفاق سے یہ بات قرار پائی کہ جب میاں جی آویں تو ایک لڑکا غمگین صورت بنا کر ان سے یہ کہے کہ حضور خیر تو ہے آج آپ کا چہرہ کچھ اُترا ہوا ہے پھر سب لڑکے ایک ایک کر کے یہی کہیں۔ چنانچہ میاں جی آئے اور ایک لڑکا منہ بنا کر اُن کے پاس گیا اور کہا حضور آج مزاج کیسا ہے خیر تو ہے کچھ چہرا اُترا اُترا معلوم ہوتا ہے میاں جی نے اُس کو تو ڈانٹ دیا کہ جا بیٹھ کام میں لگ میں تو اچھا خاصا ہوں ابھی پیٹ بھر کے کھانا کھا کر آیا ہوں وہ تو بیٹھ گیا دوسرا پہونچا میاں جی نے اس کو بھی دھتکار دیا۔ تیسرا پہونچا اب میاں جی کو وہم ہونا شروع ہوا اسے بھی ٹال دیا مگر نرمی سے اب وہ تیزی نہ رہی۔ چوتھا پہونچا اب تو میاں جی کو قوی شبہ ہو گیا کہ واقعی میرا چہرہ اتر رہا ہوگا جبھی تو یہ سب کے سب مزاج پرسی کر رہے ہیں اس کے بعد ایک اور آیا بس اب تو ان کو خاصا بخار ہو گیا اور کپڑا اوڑھ کر گھر چلدیئے اور مکتب بند کر دیا لڑکوں کو چھٹی مل گئی۔ اب ملا جی گھر میں پہونچے آہ آہ کرتے ہوئے بیوی نے کہا کہ کیا ہوا ابھی تو یہاں سے اچھے خاصے گئے تھے ملا جی کہاں تھے ڈنڈا لے کر اس کے سر ہو گئے کہ تو تو یہی چاہتی ہے کہ میں مرجاؤں اور تو دوسرا نکاح کر لے۔ یوں کہتی ہے کہ تم تو ابھی اچھے خاصے گئے تھے میں اچھا خاصا گیا تھا۔ اسی وقت میرا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ لڑکوں کو معلوم ہو گیا اور تجھے نہ معلوم ہوا کہ میں بیمار ہوں۔ غرض اس قصہ میں آس پاس کے لوگ بھی آ گئے اور پوچھنے لگے کہ ملا جی کیوں غصے ہو رہے ہو ملا جی نے بیوی کی شکایت کی۔ جب ایک شخص نے کہا کہ میاں جی تمہاری عقل کہاں ہے یہ تو لڑکوں کی ایک شرارت تھی وہ تم سے چھٹی لینا چاہتے تھے اور وہ ابھی راستہ میں کہتے جا رہے تھے کہ آج ہم نے خوب چھٹی لی تم بیوقوف تھے اُن کے بہکانے میں آ گئے۔ تب ذرا ملا جی کے حواس درست ہوئے۔

صاحبو! اس حکایت میں تو ہر شخص اس ملا کو بیوقوف بتانے کو تیار ہوگا مگر

اس کی خبر نہیں کہ اس بیوقوفی میں ہم سب مبتلا ہیں کہ جہاں چار آدمیوں نے ہمارے ہاتھ پیر چومنے شروع کئے اور ہم کو سچ مچ اپنی بزرگی کا وہم ہونے لگا۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں ہمی گوید کہ نے منم انباز تو آں ہمی گوید کہ نے منم ہمراز تو

او چو بیند خلق را سرمست خویش از تکبر می رود از دست خویش

(ایک کہہ رہا ہے میں آپ کا ہم راز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا شریک حال ہوں۔ وہ شخص جب ایک مخلوق کو اپنا سرمست اور عاشق دیکھتا ہے تکبر کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے)

؎ اشتہار خلق بند محکم ست بند او از بند آہن کے کم ست

(مخلوق کی شہرت اللہ تعالیٰ اور ان کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کیا کم ہے)

؎ خویش را رنجور ساز و زار زار تا ترا بیروں کنند از اشتہار

(اپنے آپ کو رنجور اور گمنام رکھو تاکہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں)

یہ تو باطنی ضرر ہے عوام کی تعظیم و تکریم میں اور ظاہری ضرر دنیا کا یہ ہوا کہ ؎

خشمہا و چشمہا و رشکہا

بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

(غصے اور آنکھیں اور رشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

کہ جہاں عوام نے کسی کی تعظیم و تکریم زیادہ شروع کی اور لوگوں کو اس کی ساتھ حسد ہوا اور بہت سے دشمن اُس کے پیدا ہو جاتے ہیں جو اس تعظیم و تکریم کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے رات دن اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اس کو عوام کی نظروں سے گرادیں۔ بس عافیت میں وہ لوگ ہیں جو گمنام ہیں جن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں نہ اُن سے کسی کو حسد ہے نہ عداوت ؎

آنانکہ بکنج عافیت بنشستند　　دندان سگ و دہان مردم بستند
(جن لوگوں نے گوشۂ عافیت اختیار کی کتوں کے دانتوں اور لوگوں کی زبان کو بند کر دیا۔)

کاغذ بدریدند و قلم بشکستند　　وز دست و زبان حرف گیراں رستند
(کاغذ پھاڑے قلم توڑے عیب پکڑنے والوں کی زبان اور ہاتھ سے چھوٹ گئے)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ عوام کی قدر اور تعظیم و تکریم اور ان کی نظروں میں عزت وجاہ ایسی چیز نہیں ہے جس کی طلب کی جائے ایسی تیسی عوام کی رضا کی انسان کو خصوصی علم کو رضائے حق کا طالب ہونا چاہیئے کیونکہ عوام کے اعتقاد کی مضرتیں میں آپ کو بتلا چکا ہوں کہ اس سے باطن و ظاہر دونوں کا ضرر ہوتا ہے اِلَّا مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ (مگر جس کو اللہ تعالیٰ بچائیں) پس علماء کو علم کی فضیلت عربی ہی کے ساتھ خاص نہ کرنا چاہیئے اور نہ یہ خیال کرنا چاہیئے کہ اگر اردو پڑھنے والا بھی عالم کی برابر فضیلت میں ہو گیا تو ہم کو کون پوچھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تم اس خیال کو دل سے نکال دو اور اپنے کو مٹا دو دیکھو پھر تمہاری ہی قدر ہو گی کچھ خاصیت ہے مٹانے میں کہ اس سے زیادہ شہرت ہوتی ہے۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ جو لوگ طالب جاہ ہیں ان کو جاہ حاصل کرنے کا طریقہ ہی نہیں آتا۔ جاہ بھی ترک جاہ ہی سے حاصل ہوتی ہے طلب سے حاصل نہیں ہوتی۔ مگر اس نیت سے اگر کوئی ترک جاہ کرے تو وہ یاد رکھے کہ ثواب کچھ نہ ہوگا تواضع اس نیت سے کرنا کہ ہم متواضع مشہور ہو جائیں گے تکبر ہی میں داخل ہے۔ پس مٹانے میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے شہرت ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

(اگر شہرت کی خواہش ہے تو گوشہ گمنامی اختیار کرو کہ عنقا گوشہ گمنامی اختیار کرنے سے مشہور ہے)

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تم سارے عالم کو عالم بنادوگے جب بھی بڑے تم ہی ہوگے۔ کیونکہ تم پھر بھی استاد ہوگے اور سب لوگ تمہارے شاگرد ہوں گے۔ شاگرد چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے آخر تو رتبہ میں استاد سے کم ہی ہے گو ظاہر میں بڑا معلوم ہو جیسے کوئی شخص اپنے چھوٹے بھائی کو خوب دودھ گھی کھلاوے تاکہ موٹا تازہ ہو جاوے اور چند سال میں وہ ایسا تیار ہو جائے کہ بڑا بھائی اُس سے چھوٹا معلوم ہونے لگے تو کیا رتبہ میں بھی وہ چھوٹا ہو جائے گا ہرگز نہیں بڑا بھائی پھر بھی بڑا ہی رہے گا۔ اور جب سب لوگ تمہارے شاگرد ہو جاویں گے اُس وقت تمہاری اِس وقت سے زیادہ قدر ہوگی کیونکہ وہ جانیں گے کہ ان کے پاس علمی جوہر ہے۔ میزان پڑھنے والا شرح ملا جامی پڑھنے والے کی اس لئے قدر کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ اس درجہ کا طالب علم ہے اور جس نے کچھ بھی نہ پڑھا ہو اس کے نزدیک میزان اور شرح جامی پڑھنے والا یکساں ہے۔ الغرض علماء کو چاہیئے کہ نصاب تعلیم کو وسیع کریں۔ پس ایک نصاب تو مکمل ہونا چاہیئے ان لوگوں کے لئے جن کو عربی پڑھنے کے لئے فراغت اور فرصت ہے۔ دوسرا نصاب عربی میں ان لوگوں کے لئے ہونا چاہیئے جن کو عربی پڑھنے کا شوق ہے مگر فرصت کم ہے۔ تیسرا نصاب اردو میں ان لوگوں کے لئے ہونا چاہیئے جو عربی نہیں پڑھ سکتے ان کو اردو میں ضروریاتِ دین پڑھا کر عقائد و احکام معاملات سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔ اور ایک چوتھا نصاب اُن بوڑھے طوطوں کے لئے مقرر کرنا چاہیئے جو اردو بھی نہیں پڑھ سکتے کیونکہ ان بوڑھے آدمیوں کو اب مکتب میں جا کر پڑھنا دشوار ہے ان کے لئے یہ تدبیر ہونی چاہیے کہ ایک عالم ہر ہفتہ میں کتاب ہاتھ میں لیکر ان کو مسائل سنا دیا کرے اور اچھی طرح سمجھا دیا کرے۔ اس طریقہ سے گاؤں والے بھی تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں۔ گانوں والوں کو چاہیئے کہ ایک عالم کو اپنے گانوں میں رکھ لیا کریں دس پندرہ روپے ماہوار میں ایسا عالم ان کو مل جائیگا جو ضروری ضروری مسائل ان کو بتلا دیا کرے گا۔ اور علماء کو بھی چاہیئے کہ دیہات والوں کی تعلیم کی طرف توجہ کریں اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر تم ان کو تعلیم یافتہ بنادوگے

تو وہ کسی کے دھوکہ میں نہ آئیں گے ورنہ کوئی دوسرا جاہل واعظ ان کو بہکا دے گا پھر جو وقعت آج تمہاری گانوں میں ہو رہی ہے وہ سب جاتی رہے گی چنانچہ ایسے قصے بہت پیش آتے ہیں ایک شخص گانوں میں گیا اور اس کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح ان ملاؤں کو یہاں سے نکلوانا چاہیے اس لئے یہ تدبیر کی ملاؤں کا امتحان لینا شروع کیا سب سے پوچھتا کہ نمی دانم کے کیا معنی ہیں اگر اس کو معنی معلوم نہ ہوئے تب تو وہ ذلیل ہوتا ہی تھا اور اگر معنے معلوم ہوئے تب بھی وہ یہی کہتا تھا کہ میں نہیں جانتا کیونکہ نمی دانم کے معنے یہی ہیں اس پر وہ کہدیتا کہ دیکھو خود اقرار کرلیا کہ میں نہیں جانتا اپنی جہالت کا خود معترف ہے پس گانوں والے سمجھ جاتے کہ واقعی یہ ملا جاہل ہے اس کو نکالنا چاہئے ایک اور شخص گانوں میں گیا اور وہاں کے ملا سے پوچھا کہ بتلاؤ ایمان نقطہ دار ہے یا بے نقطہ دار۔ ظاہر میں تو اس کے جواب میں یہی کہا جاتا کہ منقوط ہے کیونکہ ایمان میں ی اور ن منقوط ہیں مگر اس کا یہ مقصود ہی نہ تھا وہ ملا بڑا ہوشیار تھا اس نے کہا کہ ایمان غیر منقوط ہے ممتحن نے پوچھا کیسے اس نے کہا دیکھو ایمان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا نام ہے اور اس کلمہ میں کسی حرف پر نقطہ نہیں اس پر وہ ممتحن بولا کہ تم نے جواب تو صحیح دیا مگر وجہ غلط بیان کی اس نے کہا اچھا تم صحیح وجہ بتلاؤ کہنے لگا کہ ایمان اس واسطے غیر منقوط ہے کہ جب تم کسی سے پوچھتے ہو کہ تم مسلمان ہو تو وہ جواب میں کہتا ہے الحمد للہ اور دیکھو اس میں نقطہ نہیں اس ملا کو فکر ہوئی کہ کسی طرح اس بات کو گانوں والوں کے سامنے غلط کرنا چاہیے کہنے لگا کہ یہ وجہ بالکل صحیح نہیں کیونکہ لوگ اس سوال کے جواب میں الحمد للہ نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں شکر الحمد للہ اور اس جواب میں شین پر نقطے ہیں اس لئے وجہ وہی صحیح ہے جو میں نے بیان کی بس اتنی بات پر ملا جیت گیا اور گانوں میں شہرت ہو گئی کہ ہمارا ملا بڑا پڑھا ہوا ہے غرض گانوں والوں کو پڑھا دینے میں یہ بھی نفع ہے کہ تم گانوں میں جمے رہو گے کوئی ان کو بہکا نہ سکے گا، یہ تو ہنسی کی بات تھی اگر تم جم بھی نہ سکو تو تمہارا اجر خدا کے ذمہ ہے ثواب تو کہیں نہیں گیا یہ کیا تھوڑی بات ہے اس لئے تم روٹیوں کی

فکر نہ کرو خدا کو راضی رکھنے کا قصد کرو۔ عالم کو روزی کا فکر نہ کرنا چاہیئے اس کی تو یہ شان ہونی چاہیئے ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی — بے زر و گنج بصد حشمت قارون باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں — شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل وہ بہتر ہے کہ سرخ شراب (عشق الہٰی) سے تو مست رہے بغیر چاندی سونے کے خزانوں کے تو دولت ہو جائے لیلیٰ (محبوب حقیقی کی منزل میں جان کو سینکڑوں خطرے ہیں پہلی شرط اس راہ کے لئے مجنون بن جانا ہے)

اور عالم کو اپنی فاقہ مستی پر نازاں ہونا چاہیئے۔ مخلوق کے روپے پر نظر نہ کرنی چاہیئے اور یہ کہنا چاہیئے ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم
مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی اور ان کی محبت کے متوالے ہیں)

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد
مرعسس را دید و در خانہ نہ شد

(جو دیوانہ نہیں وہ ہی دیوانہ ہے جس طرح جو شخص کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے اسی طرح جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل رفو چکر ہو جاتی ہے)

میں سچ کہتا ہوں کہ علم میں خود وہ لذت ہے جس کے سامنے تمام لذتیں ہیچ ہیں عالم ہو کر پھر دنیا کی طمع ہو تعجب ہے دنیا ہے کیا چیز علم کے سامنے اس کی حقیقت ہی کیا ہے۔ رہا روٹی کپڑا سو اس سے بیفکر رہو جس کے پاس علم ہو وہ بھوکا نہیں رہا کرتا اور اس سے زیادہ کی تم کو ضرورت نہیں پس اہل علم کو استغنا کے ساتھ رہنا چاہیئے کہ اہل دنیا کو ہرگز یہ وسوسہ بھی نہ آسکے کہ علماء کو ہماری طرف احتیاج ہے۔

صاحبو! کیاتم کیمیاگر سے بھی گئے گذرے کہ وہ ذرا بھی بے حقیقت چیز پر ایسا مستغنی ہو جاتا ہے کہ نوابوں اور بادشاہوں کی بھی اپنے سامنے کچھ حقیقت نہیں سمجھتا تو تمھارے پاس اتنی بڑی کیمیا ہے جس کے سامنے ہزار کیمیا گرد ہیں یہ علم کی کیمیا وہ چیز ہے جس سے جنت اور رضائے حق نصیب ہوتی ہے جس کے آگے واللہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی ہیچ ہے پھر حیرت ہے کہ تم اتنے بڑے کیمیاگر ہو کر اہل دنیا کی خوشامد کرو اُن کے روپے پیسے پر نظر کرو۔ پس تم کو اس کی فکر نہ کرنی چاہیئے کہ سب لوگوں کو عالم بنانے کے بعد ہم کو کون پوچھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تم کو خدا پوچھے گا جس کے ہاتھ میں زمین آسمان کے خزانے ہیں اور جب خدا تم کو پوچھے گا تو وہ ہرگز تم کو بھوکا نہ مارے گا پھر تم کو کیا فکر لہٰذا علم دین کی تعلیم بہت عام ہونی چاہیئے جس کا طریقہ میں بتلا چکا ہوں۔ اب صرف عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ رہ گیا سو عورتوں کو ان کے مرد پڑھا دیا کریں اور جب ایک عورت تعلیم یافتہ ہو جائے تو پھر وہ بہت سی عورتوں کو تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے۔ لیجئے میں نے ایسا طریقہ بتلا دیا جس سے تھوڑے ہی عرصہ میں سب مسلمان عالم بن سکتے ہیں مگر اس طریقہ پر عمل کرنا شرط ہے اور وہ بھی استقلال کے ساتھ مگر افسوس یہی ہے کہ مسلمانوں میں استقلال نہیں کسی کام کو نباہ کر نہیں کرتے اور علم نباہنے کی چیز ہے کیونکہ اس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ساری عمر کا کام ہے ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش — تادمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمے آخر دمے آخر بود — کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخر دم تک ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو آخر وقت تک تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہم راز اور رفیق بن جائے گی)

جیسا کہ ایک ظریف بزرگ نے ایک لڑکے کی بابت پوچھا تھا کہ یہ کیا پڑھتا ہے باپ نے کہا کہ حضرت قرآن حفظ کرتا ہے فرمایا ارے بھائی کیوں جنم روگ لگایا۔ انھوں نے قرآن حفظ کرنے کو جنم روگ کہا۔ کیونکہ واقعی قرآن کا حفظ کرنا تو ایک دو

سال کا کام ہے مگر اس کی نگہداشت ساری عمر کا کام ہے جہاں ذرا غفلت کی اور یہ ذہن سے نکلا اس لئے ہر سال اس کا دور اور تکرار کرنا اور محراب سنانا اور روزانہ منزل پڑھتے رہنا ضروری ہے اسی لئے اس کو جنم روگ کہا۔ مگر ایسا روگ مبارک ہے جس سے خدا راضی ہو اسی طرح سمجھ لو کہ یہ علم بھی جنم روگ ہے اس کا سلسلہ ساری عمر باقی رکھنا چاہیئے۔ حدیث میں ہے مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ طَالِبُ الدُّنْيَا وَطَالِبُ الْعِلْمِ یعنی دو حریص کبھی سیر نہیں ہوتے ایک طالب دنیا کہ دنیا سے اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا دوسرے طالب علم کہ جب علم کا چسکہ اس کو لگ جاتا ہے تو پھر اس کا پیٹ بھی علم سے نہیں بھرتا اور وجہ یہ ہے کہ علم کا سلسلہ غیر متناہی ہے تو اس کی طلب بھی غیر متناہی ہوتی ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہرچہ بروے میرسی بروے الیست

(اے برادر بے نہایت درگاہ ہے جس درجہ پر پہونچو اس پر مت ٹھیرو بلکہ آگے کو ترقی کرو)

اگر آپ یہ کہیں کہ ساری عمر کا سلسلہ تو ہم سے نہیں ہو سکتا ایک دو دن کا کام ہو تو کرلیا جائے میں کہتا ہوں کہ پھر کھانا بھی چھوڑ دیجئے اور کہہ دیجئے کہ ہم سے یہ دو وقت کی روٹی کا دھندا نہیں ہو سکتا آخر اس دھندے کو ساری عمر کے لئے آپ نے کیونکر گوارا کرلیا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ وہ تو غذا ہے جس پر زندگی موقوف ہے میں کہتا ہوں کہ وہ جسمانی غذا ہے اور علم روحانی غذا ہے۔ روحانی زندگی علم ہی پر موقوف ہے اور جس طرح روٹی کھانا آپ کو روزانہ سہل ہے اسی طرح آپ علم میں مشغول ہو کر دیکھیں پھر وہ بھی آپ کے لئے سہل ہو جائے گا اور جب علم کا چسکا لگ جائے گا تو پھر آپ کو اس کے بغیر چین نہ آئے گا۔ پھر اس میں ایک بڑا نفع یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رضا اس سے حاصل ہوتی ہے جو شخص طلب علم میں مرتا ہے اس کو شہید کا ثواب ملتا ہے۔

صاحبو! حق تعالیٰ اپنے بندوں سے راضی ہونے کے واسطے بہانہ ڈھونڈھتے ہیں امام محمدؒ کو کسی نے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کیا حال ہے۔ فرمایا کہ مجھ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا حکم ہوا کہ اے محمد مانگو کیا مانگتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت کر دی جائے ارشاد ہوا کہ اگر ہم تم کو عذاب کرنا چاہتے تو علم عطا نہ کرتے تم کو ہم نے اپنا علم اسی لئے عطا کیا تھا کہ ہم تم کو بخشنا چاہتے تھے لہذا مغفرت تو ہے ہی کچھ اور مانگو۔ سبحان اللہ دیکھئے علم دین کی کیسی فضیلت ہے واقعی حق تعالیٰ بخشنے کے واسطے بہانہ ڈھونڈھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ خود ارشاد فرماتے ہیں مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا یعنی اگر تم خدا کی نعمتوں کا شکر کرو جس کی تفسیر یہ ہے کہ ایمان لے آؤ یہ واؤ عطف تفسیری کے لئے ہے تو حق تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے یعنی تمہاری عذاب کرنے میں خدا کا کونسا نفع ہے اور حق تعالیٰ بڑے قدر دان ہیں جاننے والے ہیں ان کو سب خبر ہے کہ کون ایمان دار ہے کون نہیں اور وہ ہر مسلمان کے ایمان کی قدر فرمائیں۔ اس آیت میں کیسی بلاغت ہے یہ نہیں فرمایا کہ اگر تم ایمان لے آؤ تو ہم تم کو عذاب نہ کریں گے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ہم تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے اس عنوان میں جس قدر بلاغت ہے اہل لسان و اہل ذوق اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ واقعی حق تعالیٰ کا ہمارے عذاب میں کیا نفع ہے وہ تو ہر وقت بخشنے کے لئے تیار ہیں کوئی اپنے کو بخشوانا بھی چاہے ایک بت پرست ہمیشہ بت کو پوجتا تھا اور نوے سال تک صنم صنم کا ورد کرتا رہا۔ ایک دن بھولے سے اُس کی زبان سے بجائے صنم کے صمد نکل گیا فوراً آواز آئی لَبَّيْكَ يَا عَبْدِيْ لَبَّيْكَ کہ اے میرے بندے میں موجود ہوں اس آواز پر وہ رونے لگا اور بت کو اٹھا کر پھینکدیا کہ کمبخت تجھ کو نوے سال تک میں پکارتا رہا اور تو نے ایک دن بھی میری بات کا جواب نہ دیا میں قربان جاؤں اس خدا کے جس سے نوے سال تک میں بے رخی کرتا رہا اور ایک بار بھولے سے اس کا نام زبان سے نکل گیا تو اس نے فوراً مجھ پر توجہ کی۔

صاحبو! جب ایک بت پرست کے بھولے سے یاد کر لینے پر اتنی توجہ ہوتی ہے تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ خدا تعالےٰ مسلمانوں پر متوجہ نہ ہوں گے اگر وہ خدا کو راضی کرنا چاہیں ضرور متوجہ ہوں گے۔ ذرا آپ خدا کو راضی کرنے کا قصد تو کیجیے وہ تو یوں فرماتے ہیں ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(لوٹ تو لوٹ تو جو کچھ بھی ہے لوٹ اگر کافر اور آتش پرست اور بت پرست ہے تو بھی ہے تو بھی ہماری طرف لوٹ۔ یہ ہمارا دربار ناامیدی کا دربار نہیں ہے اگر سو بار توبہ تو نے توڑی ہے تو بھی ہماری طرف جھک) تو علم میں یہ کتنا بڑا نفع ہے کہ اس سے رضائے حق نصیب ہوتی ہے اس لئے اس کے سلسلہ کو بند نہ کرنا چاہیے اور اگر کبھی سلسلہ ٹوٹ جاوے تو اس کو پھر جوڑ لینا چاہیئے اگر کسی سے پابندی کے ساتھ نہ ہو سکے تو بدون پابندی ہی کے علم حاصل کرتا رہے نہ ہونے سے ہونا پھر بھی غنیمت ہے۔ اسی طرح کرتے کرتے ان شاء اللہ تعالےٰ ایک دن نظام بھی پیدا ہو جائے گا۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

دوست دارد دوست ایں آشفتگی
کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

(محبوب حقیقی اس آشفتگی یعنی طلب کو پسند فرماتے ہیں سعی اگرچہ بے ثمر ہو مگر تعطل سے بہتر ہے۔)

واقعی مولانا بڑے حکیم ہیں کسی حال میں سالک کو مایوس نہیں کرتے فرماتے ہیں کہ اگر ذکر و شغل میں پابندی اور انتظام نہ ہو تو اسی طرح بغیر پابندی اور بے ڈھنگے پن ہی سے کرتے رہو دوست کو یہ بھی محبوب ہے۔ آگے دلیل کیا عمدہ بیان فرمائی ہے کہ بے ڈھنگی کوشش سو رہنے سے تو بہتر ہی ہے۔ کیونکہ یہ شخص کوشش تو کر رہا ہے۔

اور جو بالکل ہی چھوڑ کر الگ ہوگیا وہ تو اتنی کوشش بھی نہیں کرتا اور اگر کسی سے تعلیم و تعلم کا مشغلہ بالکل ہی نہ ہو سکے اس کو چاہیئے کہ کم از کم علما ء سے ملتا جلتا رہے اور ان سے دین کے مسائل پوچھتا رہے اور ان کی صحبت میں کچھ عرصہ تک مقیم رہے بلکہ یہ ایسی چیز ہے کہ علم میں مشغول ہونے کے ساتھ بھی اس کو اختیار کرنا چاہیئے۔

فقط کتابیں پڑھ لینے پر کفایت نہ کرنی چاہیئے کیونکہ ایک چیز ایسی ہے جو بدون صحبت کے حاصل نہیں ہوتی وہ دین کی مناسبت ہے۔ دین کے ساتھ تعلق اور مناسبت بدون صحبت کے نہیں ہوتی۔ صحبت کا وہ اثر ہے جس کو شیخ سعدی رح نے بیان فرمایا ہے ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عنبری — کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگلفتا من گلِ ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہما خاکم کہ ہستم

(حمام میں ایک خوشبو دار مٹی ایک محبوب کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں پہونچی میں نے اس سے کہا کہ تو مشک ہے یا عنبر کہ تیری دلآویز بو سے میں مست ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ میں وہی ناچیز مٹی ہوں جو تھی لیکن ایک عرصہ تک گلاب کے ساتھ بیٹھی ہوں ہمنشیں کے جمال نے مجھ پر اثر کیا ورنہ میں وہی خاک ہوں کہ ہوں میں)

دیکھئے گلاب کے پاس رہنے سے مٹی میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اہل محبت کے پاس رہنے سے خدا کی محبت اور دین کے ساتھ مناسبت حاصل ہو جاتی ہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت صحبت ہی کی وجہ سے ہوئی کہ آج کوئی امام اور فقیہ اور کوئی بڑے سے بڑا ولی ادنیٰ صحابی کے رتبہ کو نہیں پہونچ سکتا حالانکہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے بلکہ بہت سے علوم تو صحابہ کے بعد پیدا ہوئے ان کے زمانہ میں ان علوم کا پتہ بھی نہ تھا جو آجکل کثرت سے موجود ہیں اُن کا یہی کمال تھا کہ

وہ ان علوم میں مشغول نہ ہوئے تھے کیونکہ ؎

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند　　دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد
زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند　　اے خوشا سرو کہ از بندِ غم آزاد آمد

(دل فریبان نباتی یعنی خود رو محبوب زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے پھلدار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا کہ ہر غم سے آزاد ہے)

بس صحابہ کا بڑا کمال یہ تھا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا آپ کی صحبت ان کو نصیب تھی پس یاد رکھو کہ صحبت بدون علم متعارف کے مفید ہو سکتی ہے مگر علم متعارف بدون صحبت کے بہت کم مفید ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آجکل بہت سے علماء نظر آتے ہیں مگر ان میں کام کے علما دو چار ہی ہیں جن کو کسی کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔ الغرض میں نے ثابت کر دیا کہ علم سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے اور کسی کے پاس جاہل رہنے کے لئے کوئی عذر نہیں گو عربی میں اور درس کے طور پر نہ سہی البتہ یہ جو طبقہ متمول مال داروں کا ہے جن کو خدا نے ہر طرح سے دنیا کی فراغت عطا کی ہے کہ نہ ان کو ملازمت کی ضرورت ہے نہ کھانے پینے کا فکر ہے خدا کا دیا ہوا ان کے پاس سب کچھ ہے اور اتنا ہے کہ کئی پشتوں کے لئے کافی ہے ان کے ذمہ ضرور یہ حق ہے کہ یہ لوگ متبحر عالم بنیں کیونکہ آجکل جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں ان کو بہت جلد اہل وعیال کے نفقہ کی فکر ہو جاتی ہے اس لئے وہ کمال تبحر حاصل نہیں کر سکتے مگر نہایت افسوس ہے کہ ان لوگوں کو کچھ بھی فکر نہیں یہ لوگ اگر ساری عمر علم میں گذار دیں تو ان کو بہت آسان ہے مگر سب سے زیادہ بے توجہ یہی طبقہ ہے اور اگر کچھ توجہ ہے بھی تو انگریزی کی طرف میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لوگ انگریزی نہ پڑھیں نہیں اپنی دنیوی ضروریات کے لئے ضرور پڑھیں مگر ان کو ڈگری اور پاس حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ یہ لوگ ملازمت سے مستغنی ہیں جب ان کو ملازمت کی ضرورت نہیں تو بس بقدر ضرورت اپنے گھر پر کسی ماسٹر کو ملازم رکھ کر

انگریزی سیکھ لیں جس سے اپنی ریاست و تجارت کا کام چلاسکیں اور بقدر ضرورت انگریزی بہت جلد آسکتی ہے زیادہ عرصہ تو اس ڈگری اور پاس میں لگتا ہے تو ان لوگوں کو انگریزی پڑھنے سے میں منع نہیں کرتا ہاں یہ کہتا ہوں کہ بہت پاس نہ جائیں دور ہی دور رہیں اور اتنی انگریزی تو عربی سے فارغ ہوکر نے کے بعد بھی یہ لوگ سیکھ سکتے ہیں مگر یہ لوگ تو زیادہ مال وجاہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اس لئے انگریزی میں ڈگریاں حاصل کر کے ملازمت کرتے ہیں۔ اس حرص کی وجہ سے یہ طبقہ سب سے زیادہ دین سے محروم ہے حالانکہ ان کو تو مولانا نظامی کے قول پر عمل کرنا چاہیئے تھا ؎

خوشا روزگارے کہ دارد کسے　　کہ بازار حرصش نباشد بسے

بقدر ضرورت یسارے بود　　کند کارے از مرد کارے بود

(فراغت عجیب چیز ہے اگر کسی کو حاصل ہو زیادہ کی اس کو طمع نہ ہو ضرورت کے موافق اس کے پاس مال بھی ہو تو اس کو کچھ کرنا چاہیئے اپنے اوقات ضائع نہ کرنا چاہیئے۔)

ان لوگوں کو چاہیئے تھا کہ جب خدا نے ان کو فراغت دی تھی تو بے فکر ہو کر دین کی خدمت میں لگتے اور ساری عمر اسی میں ختم کر دیتے پھر آپ دیکھتے کہ علماء میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوتے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ علم میں مشغول ہوکر ان کو وہ لذت آتی کہ کبھی سیری نہ ہوتی۔ یہ تو خدا کا راستہ ہے کہ قطع کرنے سے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس کی طلب کبھی کم نہیں ہوتی وہ حال ہو جاتا ہے ؎

نگویم کہ بر آب قادر نیند
کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(یہ ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ دریائے نیل کے کنارے پر جلندہر کے بیمار کی طرح ہیں)

بخدا بعض دفعہ جو کوئی نیا علم قلب پر وارد ہوتا ہے اس کا لطف ایسا ہوتا ہے کہ

اگر کوئی مجھے اس کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی دینا چاہے تو میں ہرگز گوارا نہ کروں ۔ اگر قدر شناسی ہو تو ایک نکتہ علم کا ایسا ہوتا ہے جس کے سامنے ساری دنیا گرد ہے ۔ چنانچہ شعراء جب کوئی عمدہ شعر کہتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ یہ شعر ہزار روپیہ کا ہے ، لاکھ روپیہ کا ہے ۔

ایک شاعر تھا ایک لڑکا اس سے شعر سیکھتا تھا اس نے ایک بیاض بنا رکھی تھی اس میں استاد کا کلام جمع کرتا رہتا تھا کبھی استاد اس سے یہ کہتا کہ یہ شعر پانچ سو روپیہ کا ہے ۔ کبھی یہ کہتا کہ یہ شعر ہزار روپے کا ہے وہ لڑکا خوش ہو کر سب شعروں کو لکھتا جاتا ۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا کہ تو کیا کرتا ہے نہ کچھ کماتا ہے نہ لاتا ہے اس نے کہا کہ میرے پاس اس وقت لاکھوں روپے کے اشعار جمع ہیں کوئی شعر پانچ سو کا ہے کوئی ہزار کا ہے اس کی ماں نے کہا کہ اچھا آج تو ہمیں ایک پیسہ کی ترکاری لا دے اس نے کہا بہت اچھا آپ کنجڑن کے پاس گئے کہ مجھے ایک پیسہ کی ترکاری دیدے اس نے کہا لاؤ پیسہ تو آپ نے ایک شعر اس کو سنا دیا کہ ہمارے پاس پیسہ تو نہیں البتہ یہ شعر تم لے لو یہ پانسو روپیہ کا ہے اس نے کہا کہ مجھے ان پانچسو روپے کی ضرورت نہیں مجھے تو آپ ایک پیسہ لا دیجئے جب ترکاری ملے گی ۔ لڑکے کو بہت غصہ آیا اور استاد سے جا کر کہا کہ لیجئے اپنی بیاض آپ نے مجھے بہت دھوکہ دیا یہ اشعار تو ایک پیسہ کے بھی نہیں اور آپ کہا کرتے تھے کہ یہ ہزار کا ہے یہ دو ہزار کا ہے اس نے پوچھا کہ صاحبزادے تم ان اشعار کو کس کے پاس لے گئے تھے کہا میں نے ایک کنجڑن کو ایک شعر دینا چاہا تھا اس نے ایک پیسہ کو بھی نہ لیا استاد نے کہا کہ تم نے بڑی غلطی کی ان جواہرات کے فروخت کرنے کے لئے وہ بازار نہ تھا جہاں تم ان کو لے گئے ان کا بازار دوسرا ہے وہاں ان کی قیمت معلوم ہوگی اچھا اب تم ہمارا فلاں قصیدہ بادشاہ کے دربار میں جا کر پڑھو اور کہدینا کہ یہ قصیدہ میں نے خود لکھا ہے پھر تم کو ان کی قدر معلوم ہوگی چنانچہ لڑکا دربار شاہی گیا اور وہاں جا کر وہی قصیدہ بادشاہ کو سنایا پھر تو

ہزاروں روپے انعام میں ملے اور خلعت وغیرہ بھی دیا گیا اس وقت لڑکے کو معلوم ہوا کہ واقع میں استاد سچا تھا میں نے ہی غلطی کی کہ ان جواہرات کو دوسرے بازار میں لے گیا اگر قدر نہ ہو تو واقعی علمی نکات ایک پیسہ کے بھی نہیں جیسے اس کنجڑن نے کہا تھا اور اگر قدر ہو تو پھر ان کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

دہلی میں ایک شاعر کی زبان سے بے ساختہ ایک مصرع نکل گیا۔ ع

لختے بردا ز دل گذرد ہر کہ ز پیشم

(جو حسین) بھی میرے سامنے گذرتا ہے وہ ایک ٹکڑا دل کا لے جاتا ہے)

اب آگے دوسرا مصرع نہیں آتا تھا بہت پریشان ہوا مگر اگلا مصرع ہی نہ آیا ایک دن وہ اسی فکر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک خربوزہ بیچنے والا گذرا جس نے کسی شاعر سے ایک مصرع بنوالیا تھا یا خود اسی نے بنالیا تھا اور وہی مصرع صدا کے بجائے کہتا جارہا تھا یعنی ع

من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

(میں اپنے دل صد پارہ کی ایک پھانک بیچتا ہوں)

شاعر اس مصرع کو سنتے ہی پھڑک اٹھا اور دوڑا ہوا اس کنجڑہ کے پاس گیا کہ بھائی یہ مصرع تو تو مجھ کو دیدے اور جتنے روپے تو کہے مجھ سے لے لے کیونکہ میرا ایک مصرع ناتمام پڑا ہوا ہے اس کا جوڑ یہی مصرع ہو سکتا ہے غرض پانچ سو روپے میں یہ بات طے ہوئی اور شاعر پانچ سو روپے میں ایک مصرع خرید لایا اب اس کے پاس پورا شعر ہو گیا ؎

لختے بردا ز دل گذرد ہر کہ ز پیشم
من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

(جو حسین میرے سامنے گذرتا ہے وہ ایک ٹکڑا دل کا لیجاتا ہے میں اپنے صد پارہ دل کی ایک پھانک بیچتا ہوں)

شاید آپ کی سمجھ میں مصرع خریدنے کا مطلب نہ آیا ہو گا اس کا مطلب یہ تھا کہ

یہ مصرع تو میری طرف منسوب کر دیا کرنا اپنی طرف منسوب مت کرنا۔ بس اتنی بات کے اس نے پانچسو روپے دیئے تھے سوچ کیا تھی وہی قدردانی۔ کیونکہ شاعر ہی اس کی قدر جان سکتا ہے۔ تو صاحبو! قدر وہ چیز ہے کہ اس کے ہوئے ایک علمی نکتہ ہزار مال و دولت سے بہتر ہوتا ہے۔ اس پر مجھے ایک اور حکایت یاد آئی۔ دہلی میں احمد مرزا فوٹو گرافر ہیں فوٹو اتارنے میں یہ اپنے فن میں ماہر ہیں مگر حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کے بعد انھوں نے زندہ کی تصویر بنانے سے توبہ کر لی ہے وہ اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک جنٹلمین میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ کے پاس مہدی علی خاں کا فوٹو ہے یا نہیں وہ کہتے تھے کہ میں نے اس سے کہدیا کہ بھائی اب تو میں نے اس سے توبہ کر لی ہے اور سب فوٹو تلف کر دئے ہیں کہنے لگا شاید کوئی پڑا ہوا نکل آدے انھوں نے کہا تم اس ردّی میں تلاش کر لو شاید اس میں ہو اس نے ردی میں تلاش کیا تو وہ فوٹو مل گیا جو نہایت صحیح فوٹو تھا۔ اس نے پوچھا کہ اس کی قیمت کیا ہے احمد مرزا نے کہدیا کہ اب تو کچھ بھی نہیں۔ اُس نے کہا کہ میں اس شخص کا فوٹو مفت نہیں لے سکتا کیونکہ یہ اس شخص کی نہایت توہین ہے۔ یہ ایسا شخص نہیں جس کا فوٹو بلا قیمت لیا جائے احمد مرزا نے کہا کہ مجھے تو اس کی قیمت لینا جائز نہیں کیونکہ شرعًا یہ مال متقوم نہیں اس نے کہا پھر میں تو مفت نہ لوں گا آپ اس کو قیمت نہ سمجھیں میری طرف سے ہدیہ سمجھ لیں اور یہ کہکر جیب میں ہاتھ ڈالا تو تیرہ روپے نکلے اس نے وہ سب ان کو دیدیئے اور کہا افسوس ہے کہ اس وقت میری جیب میں اتنے ہی روپیے تھے ورنہ میری نیت پچاس روپے دینے کی تھی اس وقت تو آپ اسی رقم کو ہدیۃً قبول کر لیجیے غرض بہت اصرار سے وہ شخص تیرہ روپیے ایسے مال کے دے گیا جو مالک کے نزدیک ایک کوڑی کا بھی نہ تھا۔ غرض ہر فن کی قدر کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ یہ کیسی قابل قدر چیز ہے پھر یہ تو دنیا کا علم تھا اس علم کا کیا پوچھنا جو کہ دین کا علم ہے جو کہ آخرت کا ساتھی اور رضائے حق کا دسیلہ ہے ؎

علم چوں بر دل زنی یارے شود　　علم چوں بر تن زنی مارے شود

(علم جب قلب پر اثر کرے کہ خشیت وخلوص پیدا ہو جائے تو وہ وصول الی اللہ میں معین ہوگا۔ اور اگر تن پر اثر کرے یعنی زبان پر تقریر رہی یا اس کو تن پروری کا ذریعہ بنایا تو نرا بوجھ اور وبال ہے)

میں بیان کر رہا تھا کہ سب سے زیادہ علم سے بے فکر بڑے طبقے کے لوگ ہیں حالانکہ خدا نے جو ان کو نعمتیں دی ہیں اس کا شکر یہی تھا کہ یہ لوگ فارغ ہو کر علم دین میں تبحر حاصل کرتے اور اپنی اولاد کو عربی پڑھاتے۔ صاحبو! جس طرح مال میں زکوٰۃ ہے اسی طرح اولاد میں بھی زکوٰۃ ہے پس اولاد کی بھی زکوٰۃ نکالو مگر یہاں چالیس کا عدد نہیں ہے۔ آپ زکوٰۃ کا نام سن کر خوش ہوئے ہوں گے کہ بس جب چالیس لڑکے ہو جائیں گے اس وقت زکوٰۃ نکال دیں گے نہیں یہاں دو میں سے ایک کو زکوٰۃ میں نکالو اُسے عربی پڑھاؤ۔ مگر نہایت التجا کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ خدا کے لئے چھانٹ چھانٹ کر بیوقوفوں کو عربی کے لئے انتخاب نہ کرنا۔ آجکل رؤسا اول تو اپنی اولاد کو عربی پڑھاتے ہی نہیں اور جو کوئی پڑھاتا بھی ہے تو لڑکوں میں جو سب سے زیادہ نکما بیوقوف ہو اُسے عربی کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے اور ہوشیار لڑکوں کو انگریزی پڑھائی جاتی ہے جب کوئی دوست اُن کے گھر آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ آپ کے لڑکے کیا کیا پڑھتے ہیں تو سب سے پہلے انگریزی پڑھنے والوں کو پیش کیا جاتا ہے کہ یہ بی۔ اے پڑھتا ہے یہ انٹرینس کے درجہ میں ہے یہ مڈل پاس کرنے والا ہے۔ اخیر میں عربی والے کو پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ذرا ملانی طبیعت کا احمق سا ہے اس کو عربی پڑھا دی ہے۔ سبحان اللہ! آپ نے دین کی خوب قدر کی کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی یہی قدر ہے خدا تعالیٰ کے کلام کی یہی عظمت ہے بھلا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو سمجھنے والے یہی بیوقوف ہو سکتے ہیں جن کو آپ انتخاب کرتے ہیں اسی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ علماء کے اندر وہ بات آج نہیں ہے جو ان میں ہونی چاہیے تھی پھر اس پر لوگ کہتے ہیں کہ آجکل غزالی اور رازی پیدا نہیں ہوتے میں کہتا ہوں کہ تم یہ الزام کس کو دیتے ہو

ان بیوقوفوں کو غزالی اور رازی کون بنادے تم اپنی اولاد میں سے ذہین ذہین لڑکوں کو عربی پڑھاؤ دیکھو وہ غزالی اور رازی بنتے ہیں یا نہیں۔ خدا کی قسم غزالی اور رازی اب بھی ہو سکتے ہیں۔ کیا مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ غزالی اور رازی سے کچھ کم تھے واللہ بعض تحقیقات میں حضرت ان سے بھی بڑھے ہوئے تھے مگر جب تم احمقوں کو دین کے واسطے منتخب کروگے تو ظاہر ہے کہ تمہارے مقتدا بھی احمق بنیں گے ان میں عقل ہم کہاں سے پیدا کر دیں ؎

شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسے
ناکس بتربیت نشود اے حکیم کس

(عمدہ تلوار بُرے لوہے سے کیونکر کوئی شخص بنائے نااہل تربیت سے لے عقلمند آدمی نہیں ہو سکتا)

مگر ان احمقوں کو تو ان کی حماقت ہی مبارک ہوگئی اگر وہ احمق نہ ہوتے تو ان کو بھی انگریزی میں ٹھونس کر آپ جہنم کا کندہ بنادیتے اب وہ دین میں لگ گئے خدا کو راضی کرنے کا طریقہ ان کو معلوم ہوگیا اور ان شاء اللہ تعالیٰ وہ جنت کے مالک ہوں گے۔ قیامت کے دن اُن کی حماقت کام آئے گی اور دنیا میں بھی وہ علمِ دین کی برکت سے تمہارے مقتدا ہو گئے۔ اس حماقت کے مبارک ہونے پر مجھے عارف شیرازی کا قصہ یاد آگیا وہ یہ کہ بالہام غیبی حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کو حافظ کی تربیت کا حکم کیا گیا اور پتہ بتلا دیا گیا کہ حافظ فلاں رئیس شخص کے بیٹے فلاں جگہ کے رہنے والے اور ایسے ایسے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ منازل طے کرتے ہوئے شیراز پہونچے اور حافظ صاحب کے والد کے یہاں مہمان ہوئے انھوں نے بہت تعظیم اور خاطرداری کی اور پوچھا کہ حضرت نے کیسے تکلیف فرمائی۔ فرمایا کہ ہم تمہارے بیٹوں کو دیکھنا چاہتے ہیں تم اپنی اولاد کو ہمارے سامنے پیش کرو انھوں نے اپنے لڑکوں کو پیش کر دیا جو موجود تھے۔ شیخ نجم الدین کبریٰ نے سب لڑکوں کو دیکھا مگر جس کی تلاش تھی وہ ان میں نہ ملا۔ فرمایا کہ تمہارے اور کوئی لڑکا نہیں انھوں نے کہا

کوئی نہیں وہ حافظ کو کالعدم سمجھتے تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ ضرور ہے۔ حضرت حافظ صاحب کے والد نے فرمایا کہ ہاں حضور ایک لڑکا دیوانہ سا ہے میں نے اس کو اسی لئے پیش نہیں کیا کہ وہ تو پاگل ہے اس کا ہوا نہ ہوا برابر ہے۔ دیکھئے انھوں نے حضرت حافظ کو ایسا کالعدم سمجھا کہ ایک بار تو انکار ہی کر دیا کہ میرے اور لڑکا ہی نہیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ مجھے اسی دیوانہ کی ضرورت ہے اسی کو بلاؤ حافظ صاحبؒ کے والد نے نوکر سے کہا کہ ارے اس باؤلے کو ذرا تلاش کر لا کہیں جنگل میں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔ چنانچہ نوکر گیا تو واقعی جنگل میں پھر رہے تھے اور اس حلیہ سے تشریف لائے کہ پنڈلیوں تک کیچڑ لگا ہوا تھا بال کھلے ہوئے لباس بھی خراب وخستہ جوں ہی حضرت حافظ نے قدم رکھا اور شیخ نجم الدین کبریٰ رح پر نظر پڑی تو فوراً پہچان گئے کہ یہ شیخ کامل اور میرے مربّی ہیں اسی وقت بے ساختہ یہ شعر پڑھا ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

(وہ لوگ جو نظر سے خاک کو کیمیا بنا دیتے ہیں کیا وہ ہم پر ایک نظر کریں گے)

حضرت نجم الدین کبریٰ رح نے کھڑے ہو کر حافظ رح کو سینہ سے لگا لیا اور فرمایا بتو نظر کردم بتو نظر کردم (میں نے تم پر نظر کی میں نے تم پر نظر کی) اور جو کچھ ان کو دینا تھا اسی وقت عطا فرما دیا اور تشریف لے گئے۔

تو حضرت بعضے احمق ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے عقلمندوں سے اچھے پڑ رہتے ہیں۔ غرض ان لوگوں کو تو ان کی حماقت مبارک ہوگئی مگر تم نے تو اس خیر خواہی کا قصد نہ کیا تھا تم تو ان کو عربی میں نکما اور ناکارہ سمجھ کر ہی ڈالتے ہو سو یہ کس قدر بے ہودہ بات ہے تم کو چاہئے کہ علم دین کے واسطے ذہین ذہین لڑکوں کو انتخاب کرو۔ اور جب خدا نے تم کو فراغت دی ہے تو بے فکری کے ساتھ ان کو مکمل نصاب کی تعلیم دو اور اگر پوری تعلیم نہیں دے سکتے تو عربی کا مختصر نصاب ہی ان کو ضرور پڑھا دو کہ بقدر ضرورت وہ بھی کافی ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اردو میں تو ضرور اُن کو

دین سے آگاہ کردو اور چند روز کے لئے کسی کامل کی صحبت میں ان کو چھوڑ دو تاکہ وہ مسلمان تو بن جائیں۔ شاید تم یہ کہو کہ جب اردو میں مسائل معلوم ہو سکتے ہیں اور اس طرح بھی دین سے واقف ہو سکتے ہیں تو پھر عربی پڑھانے ہی کی کیا ضرورت ہے۔ سو خوب سمجھ لو کہ تعلیم دین کے عام ہونے سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عربی کی ضرورت نہیں۔ عربی تعلیم سے استغنا کبھی نہیں ہو سکتا میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ اگر تم عربی نہ پڑھانا چاہو تو کم از کم اردو ہی میں دین سے واقف کر دو باقی اردو پڑھنے والا عربی پڑھنے والے کی برابر کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ ایک بچہ نے بتلائی اور واقعی غضب ہی کر دیا کہ اس نے ذرا سی عمر میں ایسی گہری بات کہی۔ میرا ایک عزیز ہے اس کے والد نے بچپن ہی سے اس کو انگریزی تعلیم میں ڈال دیا تھا ایک مرتبہ وہ شوخی کرتا پھرتا تھا میں نے بلایا کہ ادھر آؤ باتیں کریں وہ آیا میں نے کہا بتلاؤ کہ عربی اچھی یا انگریزی بے ساختہ بولا کہ عربی۔ میں نے پوچھا کیوں کہنے لگا کلام اللہ عربی میں ہے عربی پڑھنے سے کلام اللہ خوب سمجھ میں آتا ہے۔ مجھے اُس کے اس جواب پر حیرت ہوگئی۔ پھر میں نے کہا کہ یہ تو صحیح ہے مگر اس سے دنیا نہیں ملتی نہ اس سے بڑی بڑی نوکریاں ملتی ہیں اور انگریزی پڑھنے سے بڑے بڑے عہدے ملتے ہیں تو عربی پڑھ کے کھائے کہاں سے۔ اس کا جواب بھی کس قدر گہرا دیا کہنے لگا کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے تو وہ اللہ کا ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ اس کی خدمت کرو لوگ اس کی خدمت کرتے ہیں۔ اس لئے وہ پریشان نہیں ہوتا۔ میں نے کہا یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر یہ ذلت کی صورت ہے کہ لوگوں کے نذرانوں پر پڑا رہتا ہے۔ کہنے لگا کہ ذلت تو خود مانگنے میں ہے اور اس میں کیا ذلت ہے کہ لوگ اس کو خوشامد کر کر کے دیں۔ میں نے کہا واقعی تم خوب سمجھے۔ پھر میں نے کہا کہ تم کیوں انگریزی پڑھتے ہو۔ کہنے لگا ہم کیا کریں ابا ہی پڑھواتے ہیں۔ میں نے اس کے والد سے کہا کہ تم نے ناحق اس لڑکے کو انگریزی میں ڈالا اس کو تو عربی ہی سے مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ واقعہ میں نے اُن کو

سنا یا وہ بھی آخر اسی کے باپ تھے کہنے لگے کہ اس کو عربی سے تو خود ہی مناسبت ہے اس لئے اس کو تو وہ خود حاصل کرلے گا اور انگریزی سے اس کو مناسبت ہے نہیں وہ میں نے پڑھا دی کیونکہ اس کو وہ خود حاصل نہ کرتا اور آجکل اس کی بھی ضرورت ہے میں نے کہا کہ اُس کو عربی سے آج تو مناسبت ہے مگر مدت تک انگریزی پڑھنے کے بعد یہ حالت نہیں رہے گی۔ مگر انھوں نے اُس کو انگریزی ہی میں رکھا چنانچہ اب تک وہ انگریزی پڑھ رہا ہے۔ لیکن اب بھی اس میں ایک رگ ملّانوں کی ہے جس سے امید ہے کہ ان شاء اللہ ایک دن وہ ادھر ہی کھینچے گا۔ تو صاحبو! عربی پڑھنے میں یہ بات ہے جو اس بچہ نے بتلائی کہ قرآن حدیث کی پوری سمجھ عربی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اگر کوئی یہ کہے کہ ہم ترجمے دیکھ کر سب سمجھ لیں گے سو یاد رکھو کہ ترجموں سے کلام کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ علم ذوق کا نام ہے اور ذوق جبھی حاصل ہوگا جبکہ قرآن و حدیث کی زبان میں اس کو پڑھا جاتے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اہل علم کو جو لطف قرآن میں آتا ہے وہ ترجمہ دیکھنے والے کو نہیں آسکتا اور قاعدہ یہی ہے کہ جو کتاب جس زبان کی ہو اس کا لطف جبھی آسکتا ہے جبکہ اُس زبان کو آپ جانتے ہوں۔

بہت سے اشکالات ترجمہ دیکھنے سے قرآن میں پیدا ہو جاتے ہیں جس کا جواب ذوق لسان ہی سے ہوسکتا ہے بہت سے اشکالات نحو و صرف کے نہ جاننے سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے ان علوم الیہ کی بھی ضرورت ہے۔ بلکہ کچھ منطق و کلام کی بھی ضرورت ہے کیونکہ بعض اشکالات ان ہی علوم کے جاننے سے رفع ہو جاتے ہیں۔ بعض اشکالات سے ان علوم کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی اور اس کے نظائر بہت ہیں مگر میں نمونہ کے لئے چند مثالیں بیان کرتا ہوں جو طالب علموں کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔

ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھ کو کچھ پوچھنا ہے مگر اول اس آیت کا ترجمہ کردو وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰی۔ میں سمجھ گیا اور میں نے ترجمہ اس طرح کیا کہ پایا آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا۔ یہ ترجمہ سنکر وہ میرے منہ کو تکنے لگے میں نے کہا اب پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ کہنے لگے کہ اب تو وہ اشکال ہی نہ رہا۔ میں نے کہا تو کیا

آپ کا یہ خیال تھا کہ اس جگہ ضالاً کا ترجمہ گمراہ سے کروں گا اور وہ ترجمہ بھی غلط نہیں ہے مگر غلط بھی زبان نہ جاننے سے ہوتی ہے وجہ یہ ہے کہ اردو میں تو گمراہ کا مفہوم صرف یہی ہے کہ باوجود وضوح حق کے اس کو قبول نہ کرے اور عربی میں ضلال اور فارسی میں گمراہی کا اطلاق عام ہے۔ اس معنے کو بھی اور عدم وضوح کو بھی پس ضال کے معنے گمراہ کے بھی ہیں اور بے خبری اور ناواقفی کے بھی ہیں۔

ایک اشکال ترجمہ پڑھنے والوں کو اس آیت پر ہوتا ہے وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝ (ترجمہ) اور ہرگز نہیں دیں گے حق تعالےٰ کافروں کو مسلمانوں پر کوئی راہ یعنی غلبہ۔

اشکال یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بارہا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہو جاتے ہیں۔ اس کے بہت سے جواب علماء نے دیئے ہیں لیکن اگر قرآن کے ساتھ ذوق و مناسبت ہو تو یہ ضرور یہ سمجھے گا کہ کلام اللہ غیر مرتبط نہیں ہے پھر جب اس کو مرتبط سمجھے گا تو ہر مقام پر سیاق وسباق کو بھی دیکھے گا چنانچہ اس آیت پر اشکال اس لئے ہوا کہ لوگوں نے لَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝ (حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ دینگے) کے سباق کو نہ دیکھا اس میں یہ حکم آخرت کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہے فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ط حق تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے یعنی قیامت میں کفار و مسلمین کا فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا کون ناحق پر اس کے بعد فرماتے ہیں وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝ اور اللہ تعالیٰ کفار کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے۔ یعنی اس فیصلہ میں جو آخرت میں ہوگا اب کوئی اشکال نہ رہا۔ بعض دفعہ قاعدۂ صرف کے نہ جاننے سے اشکال پڑتا ہے چنانچہ ایک مرتبہ اخباروں میں یہ خبر مشہور ہوئی تھی کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل ہیں۔

اس سے بعض لوگوں کو اشکال ہوا کہ یہ تو قرآن کے منافی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لرجل مِّن قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ ط یعنی خدا تعالےٰ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے۔ اس کا ایک جواب تو یہی ہے کہ اہل اخبار کی خبر کا اعتبار ہی کیا

کسی نے اس کے پیٹ کو چیر کر تو نہیں دیکھا محض قیاس اور گمان سے یہ حکم لگا دیا ہے کہ اس شخص کے دو دل ہیں سو ممکن ہے کہ اس شخص کا دل بہت زیادہ قوی ہو اس لئے دو دل ہونے کا شبہ ہو گیا ہو یہ جواب تو بطور منع کے ہے اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ قرآن میں مَاجَعَلَ صیغہ ماضی کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت تک خدا نے کسی کے دو دل نہیں بنائے اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ آئندہ بھی کسی کے دو دل نہ بنائیں گے۔ پس اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تب بھی قرآن پر کوئی اشکال نہیں اور بعض اشکالات کا جواب نحوی قاعدہ سے دیا جاتا ہے۔

چنانچہ میرے پاس ایک ملاجی آئے اور کہنے لگے کہ وضو میں پاؤں دھونا جو فرض ہے اس کی دلیل کیا ہے۔ قرآن میں تو پیروں کے واسطے مسح کا حکم ہے۔ میں نے کہا قرآن میں کہاں ہے کہنے لگے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے پھر وہ مترجم قرآن میرے پاس لائے اور یہ آیت دکھائی فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔

ترجمہ یہ لکھا ہوا تھا (پس دھوؤ اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور ملو اپنے سروں کو اور پیروں کو دو ٹخنوں تک) شاہ صاحب نے یہاں فعل مقدر کو ظاہر نہ کیا تھا اور مسح کا ترجمہ محاورہ کے موافق کر دیا۔ ورنہ بعضے تراجم میں تقدیر فعل کو ظاہر کر کے اس طرح ترجمہ کیا ہے۔ اور دھوؤ اپنے پیروں کو دونوں ٹخنوں تک اور بعض ترجموں میں مسح کا ترجمہ مسح ہی سے کیا ہے۔ اس طرح کہ مسح کرو اپنے سروں کا تو اس میں لفظ نہیں آیا۔ اس ترجمہ پر کچھ اشکال نہیں ہو سکتا مگر شاہ صاحب کے ترجمہ میں ملاجی کو یہ شبہ ہوا کہ پیروں کے لئے بھی مسح کا حکم ہے۔ میں بہت پریشان ہوا کہ اس اشکال کا جواب تو نحوی قاعدہ پر موقوف ٹھرا۔ اب اگر میں ان کو نحوی قاعدہ سے جواب دوں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے سامنے عطف اور تقدیر کی تحقیق بیان کروں جس کو یہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ آخر میں نے ان سے کہا کہ جس کلام کا یہ ترجمہ ہے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کلام اللہ ہے۔ بولے کہ علماء کے کہنے سے معلوم ہوا میں نے کہا افسوس

یا تو علماء اتنے ایماندار ہیں کہ اگر وہ ایک عربی عبارت کو کلام اللہ کہدیں تو سچے اور یا
اتنے بے ایمان ہیں کہ اگر وہ ایک فعل کو فرض کہیں تو جھوٹے۔ اس پر چپ ہوئے میں نے
کہا خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھا ایسوں کو ترجمہ دیکھنا بیشک ناجائز ہے۔ اسی طرح
بہت سے اشکالات ہیں جن کے جواب علوم آلیہ پر موقوف ہیں۔ اسی لئے میں کہا کرتا
ہوں کہ عوام کو ترجمہ خود نہ دیکھنا چاہیئے بلکہ اگر شوق ہو تو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھنا
چاہیئے۔ غرض اس اشکال کا جواب یہ تھا کہ یہاں اَرْجُلَکُمْ کا عطف وُجُوْھَکُمْ پر ہے
خیر یہ اشکال تو کچھ نہیں بڑا اشکال اس جگہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قرارت متواترہ میں وَاَرْجُلِکُمْ
بالجر بھی آیا ہے اور اس صورت میں بظاہر اس کا عطف رُؤُسِکُمْ کے اوپر اور فَامْسَحُوْا
کے تحت میں ہے اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اس میں جر جوار ہے ورنہ حقیقت میں
اس کا عطف فَاغْسِلُوْا کے تحت میں ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا عطف
فَامْسَحُوْا کے تحت میں ہے جب بھی پیروں کے لئے مسح کا حکم لازم نہیں آتا کیونکہ
محاورات میں بعض دفعہ دو ایسی چیزوں کو جن کی ساتھ دو فعل متعلق ہوتے ہیں اختصار
کے لئے ایک ہی فعل کے تحت میں بیان کر دیتے ہیں مثلاً دعوت کے موقعہ پر کہا کرتے ہیں
کہ کچھ دانا پانی، ہمارے یہاں بھی کھا لیجئے گا۔ حالانکہ پانی تو پینے کی چیز ہے کھانے کی
چیز نہیں۔ اصل کلام اس طرح تھا کہ کچھ دانہ کھا لیجئے گا۔ پانی پی لیجئے گا۔ مگر اختصار
کے لئے ایک فعل کو حذف کر کے دونوں چیزوں کو ایک فعل کے تحت میں ذکر کر دیتے ہیں
اسی طرح اگر کوئی پوچھے کہ تم نے دعوت میں کیا کھایا تھا تو جواب میں کہا کرتے ہیں پلاؤ
زردہ دودھ دہی گوشت کھایا تھا۔ حالانکہ دودھ پینے کی چیز ہے یوں کہنا چاہیئے تھا
کہ دودھ[1] پیا تھا باقی چیزیں کھائی تھیں جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ
اَرْجُلِکُمْ کا عطف اگر فَامْسَحُوْا کے تحت میں بھی مان لیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ
پیروں کے لئے مسح کا حکم ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ رُؤُس و اَرْجُل کا تعلق اصل میں

---

[1] یعنی ایسے مقام پر جہاں دودھ پینا بولا جاتا ہے دودھ کھانا نہ بولا جائے ۱۲ منہ

دو فعلوں سے تھا ایجازاً ایک فعل کو حذف کر دیا گیا اور ظاہر میں دونوں کو فامسحوا کے متعلق کر دیا گیا۔ اور مطلب وہی ہے کہ سر کا مسح کرو اور پیروں کو دھوؤ۔ عربی میں اس کی نظیر یہ کلام ہے عَلَفْتُهُ تِبْنًا وَمَاءً بَارِدًا۔ (میں اس کو گھاس اور ٹھنڈا پانی چرایا) اور اگر وامسحوا کے حکم کو بھی اَرْجُلَكُمْ کے متعلق مان لیا جائے تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ دو قراتیں بمنزلہ دو آیتوں کے ہوا کرتی ہیں جس طرح دو آیتیں اپنے اپنے حکم کو مستقلاً ثابت کرتی ہیں اور دونوں پر عمل ضروری ہے اسی طرح دو قراتیں بھی معمول بہا ہوتی ہیں پس ارجلکم میں قرات بالجر ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ پیروں کے لئے مسح کا بھی حکم ہے رہا یہ کہ غسل کا حکم نہیں ہے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کیونکہ قرات نصب غسل کو لازم کر رہی ہے تو مجموع قراتین سے یہ ثابت ہوا کہ پیروں کے لئے مسح اور غسل دونوں کا حکم ہے اس طرح کہ قرات جر بحالت لبس خف (موزہ پہنے) ہے اور قرات نصب بحالت عدم خف ہے یہ تاویل بھی بہت عمدہ ہے۔ اور ایک توجیہ میرے ذہن میں ایک سوال کے وقت آئی وہ یہ کہ مسح کے معنے ملنے کے ہیں خواہ بدون غسل کے یا مع غسل کے پس دھونا تو ایک قرات سے اور حدیث متواتر سے فرض ہوا اور ملنا قرات جر سے مامور بہ ہوا بمعنے مستحب جس کی وجہ یہ ہے کہ پیروں کی کھال سخت ہوتی ہے تو عادةً اکثر اس پر پانی بہانا کافی نہیں ہوتا ملنے سے پانی پہنچتا ہے چنانچہ فقہاء نے اسی اہتمام کے لئے اس کو بھی مندوب کہا ہے کہ وضو کے قبل پاؤں کو تر کر لیا جاوے پھر آخر وضو میں دھویا جاوے۔

غرض آپ نے معلوم کر لیا کہ نحو کی کس قدر ضرورت ہے کیونکہ بعض اشکالات اسی سے رفع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک نیچری مفسر نے دعوی کیا تھا کہ قرآن میں غلامی کے مسئلہ کا ثبوت نہیں ہے بلکہ ایک آیت سے تو اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ آیت یہ ہے فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً ط اس سے پہلے جہاد کا ذکر ہے ارشاد فرماتے ہیں فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط پس جب تم کفار کے مقابل ہو تو ان کی گردنیں مارو (یعنے قتل کرو) یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خونریزی کر چکو

تو (تم کو دو اختیار ہیں) یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا جو کہ احسان ہے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا۔ اس سے اُس نئے مفسر نے یہ استدلال کیا کہ اس آیت میں بطور حصر کے دو باتیں مذکور ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ تیسری صورت (یعنی غلام بنانا) جائز نہیں اس تقریر سے ایک عالم کو شبہ پڑ گیا اس کا جواب ایک دوسرے عالم نے ان کو یہ دیا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ یہ قضیہ کونسا ہے حملیہ یا شرطیہ اور شرطیہ ہے تو متصلہ یا منفصلہ اور منفصلہ ہے تو حقیقیہ یا مانعۃ الجمع یا مانعۃ الخلو۔ بس اتنی بات میں سارے اشکال کو درہم برہم کر دیا۔ کیونکہ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ یہ قضیہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو یعنی ان دونوں کا جمع کرنا ممتنع ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں صورتیں مرتفع ہوں اور تیسری کوئی اور صورت ہو کیونکہ مانعۃ الجمع کا حکم یہی ہے کہ ان کا اجتماع جائز نہیں ہوتا اور دونوں کا ارتفاع ممکن ہے مثلاً دور سے کسی چیز کو دیکھ کر ہم یوں کہیں کہ یہ چیز یا تو درخت ہے یا آدمی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان دونوں کا اجتماع تو ناممکن ہے ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ نہ درخت ہو نہ آدمی ہو بلکہ کوئی تیسری چیز ہو گھوڑا بیل وغیرہ اسی طرح اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے کہ من و فدار دونوں کا جمع کرنا ممتنع ہے البتہ دونوں سے خلو ممکن ہے تو اب اس سے غلامی کی نفی کیونکر ہوئی سو دیکھئے جو شخص مانعۃ الجمع و مانعۃ الخلو کی حقیقت نہ جانتا ہو وہ نہ اس اشکال کو دور کر سکتا ہے اور نہ جواب کو سمجھ سکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں دوسرا اشکال ہے آیت یہ ہے۔ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُونَ بظاہر اس آیت میں شکل اول کی صورت معلوم ہوتی ہے۔

ترجمہ یہ ہے۔ کہ اگر حق تعالیٰ ان (کفار) میں کچھ بھلائی اور خیر دیکھتے تو ان کو (دین کی باتیں) سنا دیتے اور اگر اُن کو سنا دیتے تو وہ اعراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ دیتے شکل اول کے قاعدہ پر اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے

لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ یعنی اگر حق تعالےٰ ان میں بھلائی دیکھتے تو وہ پیٹھ موڑ دیتے حالانکہ یہ نتیجہ محال کو مستلزم ہے کیونکہ جس صورت میں حق تعالےٰ کو ان کے اندر بھلائی معلوم ہوتی اُس صورت میں تو وہ بات کو قبول کرتے اس حالت میں اعراض کیونکر ممکن تھا کیونکہ اعراض تو شر ہے خیر کے ساتھ اس کا اجتماع نہیں ہوسکتا ورنہ لازم آئے گا کہ ان میں خیر ہی نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں شکل اول ہی نہیں کیونکہ یہاں حد اوسط مکرر نہیں لَاَسْمَعَهُمْ اول سے مراد تو یہ ہے لَاَسْمَعَهُمْ فِیْ حَالَۃِ عِلْمِ الْخَیْرِ فِیْهِمْ اور ثانی سے مراد یہ ہے کہ لَوْ اَسْمَعَهُمْ فِیْ حَالِ عَدَمِ علم اللّٰہِ فِیْهِمْ خَیْرًا حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اگر خدا تعالےٰ کو ان میں بھلائی کا ہونا معلوم ہوتا تو وہ ضرور ان کو دین کی باتیں سنا دیتے اور وہ ان کو قبول بھی کر لیتے اور اگر اس حالت میں کہ خدا کو معلوم ہے کہ ان میں بھلائی نہیں ہے سرسری طور پر ان کو دین کی باتیں سنا دی جائیں تو وہ اعراض ہی کریں گے اب وہ اشکال رفع ہو گیا۔ اس سے آپ کو منطق کی ضرورت معلوم ہو گئی ہو گی اسی طرح علم کلام کی بھی ضرورت ہے کیونکہ قرآن میں بعض مضامین ایسے مذکور ہیں جس کا ظاہری مضمون جو عام طور پر سمجھ میں آتا ہے مراد نہیں مثلاً فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ یَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِهٖ ط یعنی کسی جگہ کہا گیا ہے کہ جدھر تم مُنہ کرو خدا کا رُخ ادھر ہی ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ خدا کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں کہیں فرمایا ہے کہ خدا عرش پر مستوی ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ آسمان خدا کے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔ تو اس سے بعض جاہلوں کو یہ شبہ ہوگا کہ خدا کے بھی ہماری طرح منہ اور ہاتھ اور پیر ہیں مگر علم کلام کے دلائل سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالےٰ جوارح اور مکان و زبان سے پاک ہے اس کے لئے ان چیزوں کا ثابت ہونا حقیقۃً ممکن نہیں ہاں مجازاً

کوئی دوسرے معنے مراد لئے جاویں تو ممکن ہے۔ چنانچہ علماء نے ان آیات کے معانی خدا کی شان کے لائق بیان بھی کئے ہیں اور سلف کا طرز اس بارہ میں سکوت ہے۔ تو علم کلام سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالےٰ کے لئے کس صفت کا ثابت ہونا ضروری ہے اور کن کن باتوں سے اس کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اس لئے دوسرے علوم کی بھی ضرورت ہے اور وہ علوم عربی میں مدون ہیں لہذا عربی کی سخت ضرورت ہے شریعت کا علم کامل بغیر علوم عربیہ کے حاصل نہیں ہو سکتا لیکن اگر کسی کو علم کامل کی فرصت نہ ہو وہ ناقص ہی سے تو محروم نہ رہے۔

مَا لَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ (جو کل کو حاصل نہیں کر سکتے کل کو ترک بھی مت کرو)

پس عوام نے یہ غلطی کی کہ انھوں نے اردو میں بھی علم نہ سیکھا اور علماء نے یہ غلطی کی عربی تو سیکھی مگر بعضے علوم غیر نافعہ میں مشغول ہو گئے۔ ان دونوں غلطیوں پر اس آیت میں تنبیہ ہے۔

وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ط لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ

(یہ لوگ ایسی چیزیں سیکھتے ہیں جو ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں اور ضرور یہ بھی جانتے ہیں کہ جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے کاش کہ ان کو عقل ہوتی)

اس آیت میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ حق تعالےٰ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو معلوم ہے کہ جو شخص علم مضر کو اختیار کرے آخرت میں اس کے لئے (اس علم کی وجہ سے) کچھ حصہ نہیں آگے فرماتے ہیں۔

لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۔ (کاش وہ جاننے والے ہوتے) اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ جانتے تھے تو پھر اس کا کیا مطلب کہ کاش وہ جانتے ہوتے

اس میں نکتہ یہ ہے کہ حق تعالے نے اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ جس علم پر عمل نہ ہو وہ بمنزل جہل کے ہے اس لئے یہودیوں کا وہ جاننا تو نہ جاننے کے برابر ہو گیا اب آئندہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ کاش اب بھی جان لیں یعنی اپنے علم پر عمل کرنے لگیں اور یہاں سے میں ایک اور غلطی پر آپ کو متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ اس آیت سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ علوم نافعہ وہ ہیں جو آخرت میں کام آئیں مطلق علوم مراد نہیں اب آجکل بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ علم کی فضیلت میں آیات واحادیث لکھتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ شریعت میں علم حاصل کرنے کی بہت تاکید ہے اور اس کے بعد ان تمام فضائل کو انگریزی تعلیم پر چسپاں کرتے ہیں اس تمام تمہید کے بعد وہ انگریزی پڑھنے کی ضرورت ثابت کرتے اور اس کی ترغیب دیتے ہیں جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گویا انگریزی پڑھنے سے یہ تمام فضائل حاصل ہو جائیں گے سو خوب سمجھ لو کہ یہ لوگ سخت دھوکہ دیتے ہیں شریعت میں جتنے فضائل علم کے مذکور ہیں ان سے مراد وہ علم ہے جو آخرت میں مفید ہو یعنی علم شرائع واحکام انگریزی تعلیم اس سے مراد نہیں ہاں اگر انگریزی میں دینی مسائل کا ترجمہ ہو جائے تو پھر ان انگریزی کتابوں کا پڑھنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ اردو میں دینی رسائل کا پڑھنا مگر شرط یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا محض انگریزی داں نہ ہو بلکہ محقق عالم ہو یا کسی انگریزی داں محقق عالم نے اس کی اصلاح اور تصدیق کر دی ہو ایسا ترجمہ نہ ہو جیسا کہ ایک صاحب نے انگریزی میں شرع محمدی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ تعجب کی حالت میں طلاق نہیں پڑتی مجھے اس کی خبر اس طرح ہوئی کہ ایک مقام پر ایک واقعہ طلاق کا پیش آیا تھا اس میں طلاق دینے والے کے بعض خیر خواہوں کو فکر ہوئی کہ کسی طرح کچھ گنجائش نکل آوے تو چھپا چھپی کر دیں چنانچہ مختلف کتابیں دیکھی گئیں ان میں وہ شرع محمدی بھی نکالی گئی اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ تعجب کی صورت میں طلاق نہیں ہوتی جس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ مثلاً کسی کی بیوی نے خلاف عادت ایک دن خوب

زینت و آرائش کی شوہر کو یہ حالت دیکھ کر تعجب پیدا ہوا اس نے تعجب میں کہدیا کہ تجھے تین طلاق اب یہ انگریزی مفتی فرماتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی کیونکہ تعجب میں دی گئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ اِلاّ باللہ۔ جب میرے پاس یہ کتاب لائی گئی میں نے کہا کہ یہ مسئلہ تو بالکل غلط ہے اس کی کچھ بھی اصل نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مدہوش کی طلاق نہیں ہوتی مدہوش عربی لفظ ہے جس کے معنے ہیں از عقل رفتہ یعنی غصہ وغیرہ میں اگر کوئی شخص ایسا حواس باختہ ہوجائے کہ اس سے مجنونانہ حرکتیں صادر ہونے لگیں مثلاً دیواریں سر مارنے لگے یا اپنے ہاتھ میں کاٹنے لگے غرض ایسا بے تاب ہو کہ عقل زائل ہوجاوے تو اس کی طلاق نہیں ہوتی اُن حضرت نے لفظ تو عربی دیکھا اور ترجمہ کیا اردو محاورہ کے موافق اردو میں مدہوش حیرت زدہ کو بھی کہدیتے ہیں۔ پس شاید مدش کا ترجمہ متحیر کا کیا ہوگا پھر متحیر کا ترجمہ متعجب کردیا ہوگا۔ یا نہ معلوم انھوں نے انگریزی کا کونسا لفظ مدہوش کے ترجمہ میں اختیار کیا ہوگا پھر اس کا ترجمہ اردو میں ہوا تو وہ کچھ سے کچھ ہوگیا یعنی ٹیڑھی کھیر ہوگئی۔ ٹیڑھی کھیر کی حکایت شاید آپ نے نہ سنی ہوگی۔

ایک لڑکے نے اپنے اندھے میاں جی سے کہا کہ آج آپ کی ہمارے یہاں دعوت ہے۔ کہا کیا کھلاوے گا اس نے کہا کھیر۔ کہنے لگے کہ کھیر کیا ہوتی ہے لڑکے نے کہا کہ چاولوں میں مٹھائی ڈال کر پکاتے ہیں۔ حافظ جی نے پوچھا وہ کیسی ہوتی ہے اس نے کہا کہ سفید ہوتی ہے۔ اندھے میاں نے سیاہ وسپید کبھی دیکھا تھا کہنے لگے سفید کیسا ہوتا ہے لڑکے نے کہا جیسے بگلا انھوں نے بگلا بھی نہ دیکھا تھا بولے کہ بگلا کیسا ہوتا ہے۔ لڑکے نے بگلے کی صورت اپنے ہاتھ پر بنا کر اس پر حافظ جی کا ہاتھ پھیرا کہ بگلا ایسا ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھے کہ بس کھیر بھی اسی شکل کی ہوتی ہوگی۔ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے گلے سے بھی نہ اترے گی۔ تو دیکھئے بات کیا تھی اور کہاں پہونچ گئی۔ اسی طرح مدہوش کا مسئلہ

ترجمہ در ترجمہ ہم نے سے یہاں تک پہونچ گیا کہ تعجب میں طلاق نہیں پڑتی۔ پھر غضب یہ ہے کہ وہ کتاب قانون میں داخل ہے اسی کے موافق فیصلے ہوتے ہونگے نہ معلوم کس کس کو اس مسئلہ کے موافق طلاق سے بری کر دیا گیا ہوگا۔ پس یہ مترجم رہ گئے ہیں اور ان کی کتابیں قانون میں داخل ہیں جن کو شریعت سے ذرا بھی مس نہیں۔ بس وہی حال ہو رہا ہے ؎

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(بلی حاکم کتا وزیر اور چوہے کو دیوان بنا دیں تو ایسے اراکین سلطنت ملک کو ویران کر دیں یعنی نا اہلوں سے ملک برباد ہو جاتا ہے)

اذا کَانَ الغُرَابُ دَلِیلَ قَومٍ
سَیَھدِیْھِم طَرِیْقَ الھَالِکِیْنَا

(یعنی جب نا اہل کسی قوم کا رہبر ہو تو اس کو ہلاک ہونے والوں کے راہ پر چلائے گا)

صاحبو! اس کے متعلق گورنمنٹ سے درخواست کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ اس غلطی کی بہت جلد اصلاح کی جاوے یہ مسئلہ بالکل غلط ہے اور جس قدر ترجمے قانون میں داخل ہیں ان کو دو چار محقق عالموں کو دکھا کر پاس کیا جائے محض ایک شخص کے ترجمہ کر دینے سے اس کے موافق فیصلے نہ کئے جائیں دیکھئے یہ کام کرنے کا ہے مگر مسلمان ایسے کام نہیں کرتے جن کی ضرورت دینی اعتبار سے فوری ضرورت ہے کہ نہ معلوم اس غلط مسئلہ کی وجہ سے کتنی بدکاریاں مسلمانوں میں ہوتی ہوں گی۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ اگر مسلمان گورنمنٹ سے اس کی اصلاح کی درخواست کریں۔ تو وہ فوراً اس پر توجہ کرے گی۔ مگر آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جو کام ہو سکتا ہو جس کی تدابیر ان کے اختیار میں ہوں جس میں کامیابی کی پوری امید ہو وہ کام تو کرتے نہیں اور جو کام اختیار سے باہر ہو جو

ان سے نہ ہو سکے اُس کے پیچھے پڑتے ہیں جیساکہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں

؎ آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ　　برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

(آرزو کی خواہش کرو لیکن اپنے اندازہ کے موافق خواہش کرو ایک گھاس کا پتہ پہاڑ کو نہیں اٹھا سکتا)

اور یہ مذاق بھی اسی جہالت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اگر لوگ دین سے واقف ہوتے تو الاہم فالاہم پر عمل کرتے غرض ہر کام کے لئے علم دین کی سخت ضرورت ہے علم دین کے بغیر یہی نہیں کہ معلوم ہو تا کہ ضروری کونسی چیز ہے اور غیر ضروری کونسی چیز ہے۔ پس اگر انگریزی میں کسی محقق نے دینی مسائل لکھ دیئے ہوں تو پھر ان انگریزی کتابوں کا پڑھنا بھی ثواب میں داخل ہے۔ باقی عام لوگوں کی انگریزی کتابیں خواہ وہ دین ہی کی طرف منسوب ہوں قابل اعتبار نہیں اور جن میں دین کا نام بھی نہ ہو وہ تو محض دنیا ہے ایسی کتابوں کی تعلیم و تعلم پر علمی فضیلت کی احادیث و آیات کو منطبق کرنا تو نری جہالت ہے۔ اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بہت دیر ہو گئی ہے نماز ظہر کا بھی وقت آگیا ہے۔ بس میں خلاصۂ وعظ بیان کرکے ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تعلیم علم دین کو وسیع کرنا چاہیئے۔ علم دین کو عربی ہی کے ساتھ مخصوص نہ کرنا چاہیئے اور اس کے ضمن میں میں نے ہر طبقہ کی تعلیم کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے لیکن اسی کے ساتھ عربی کو فضول نہ سمجھیں جو لوگ معاش سے فارغ ہوں ان پر عربی پڑھنا اور اولاد کو پڑھانا سب سے زیادہ ضروری ہے لیکن معلمین کو بھی میں ہدایت کرتا ہوں کہ وہ اپنا طرز تعلیم بدلیں طالب علم کی حیثیت کے موافق تقریر کیا کریں۔ میزان الصرف میں شرح ملا جامی نہ پڑھایا کریں۔ میں نے ایک مدرس کو دیکھا کہ وہ اللہ کے بندے میزان میں یہ بیان کر رہے تھے کہ الحمد میں جو الف لام ہے یہ استغراق کا ہے الف لام کی چار قسمیں ہیں ایک جنسی ایک عہد خارجی ایک عہد ذہنی ایک استغراقی۔ بھلا یہ مضامین میزان میں بیان کرنے کے ہیں۔ بس وہ ملا مدرس صاحب بیان کر رہے تھے اور طالب علم

ان کا منہ تک رہا تھا میں نے کہا کہ اس بیچارہ کے نزدیک تو الف لام استغراق ہی کا ہوتا ہے اور کہیں کا نہیں ہوتا کیونکہ اس الف لام نے اس کو تو مستغرق بنا دیا ہے۔ اسی طرح مدرسوں کو چاہیئے کہ ہر طالب علم کو پوری عربی پڑھانا ضروری نہ سمجھیں جس کے اندر مناسبت دیکھیں اور فہم سلیم پاویں اس کو سب کتابیں پڑھاویں اور جس کو مناسبت نہ ہو یا جس کی فہم سلیم نہ ہو اس کو بقدر ضرورت مسائل پڑھا کر کہدیں کہ جاؤ دنیا کے دھندے میں لگو۔ تجارت و حرفت کرو۔ کیونکہ ہر شخص مقتدا بننے کے لائق نہیں ہوتا بعضے نالائق بھی ہوتے ہیں ایسوں کو فارغ التحصیل بنا کر مقتدا بنا دینا خیانت ہے ؎

بد گہر را علم و فن آموختن
دادن تیغ ست دست راہزن

(بدذات اور نااہل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے)

مگر آجکل مدرسین و مہتممین اس کا بالکل خیال نہیں کرتے کیا جتنے طلبہ ان کے مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں سب ہی کو علم سے پوری مناسبت ہوتی ہے اور سبھی کی فہم سلیم ہوتی ہے ہرگز نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ طلبہ کا انتخاب نہیں کرتے ایسے لوگوں کے لئے ایک مقدار معین کر لینا چاہیئے کہ اس سے آگے ان کو نہ پڑھایا جائے اور وہ مقدار ایسی ہو جو دین کے ضروری ضروری مسائل جاننے کے لئے کافی ہو اور عام لوگوں کے واسطے اردو کا نصاب مقرر کرنا چاہیئے۔ الحمد للہ کہ ضرورت کے موافق علم کے متعلق اس وقت کافی بیان ہو گیا اب حجت ختم ہو گئی ہے اب بھی اگر کوئی علم دین حاصل نہ کرے تو اس کے پاس کوئی عذر نہیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالےٰ ہم کو عمل کی توفیق دے۔ وصلے اللہ علے سیدنا و مولانا محمد

وعلے آلہ واصحابہ وسلم
وشرف وکرم آمین والحمد للہ رب العلمین

بالخیر
تمت

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

التبلیغ کا وعظ مسمیٰ بہ

ذم النسیان

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

ورحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ـــــ دفتر الابقار

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔اے جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الواعظ المسمّٰی بہ

ذم النسیان

اين	متى	كم	كيف	لم	ماذا	من انتفع	من ضبط	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس کو زیادہ نفع ہوا	کس نے ضبط کیا	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	عہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ بعد نماز عشاء	دو گھنٹہ ۱۸ منٹ	بیٹھ کر بیان فرمایا	اکثر جمعہ کے دن بیان ہوا کرتا تھا۔	معاصی کا سبب نسیان ہے اور اس کا علاج ذکر اللہ ہے اور ذکر اللہ کے اقسام چند ہیں۔	سب مسلمانوں کو عموماً اور طبقہ ذاکرین کو خصوصاً	مسودہ اجمالی مولانا مولوی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا اور اس کی تفصیل آں کے برادر خورد ظفر احمد عفا اللہ عنہ نے کی۔	غالباً یہ وعظ برادرم مرحوم کا آخری قلمبند کیا ہوا ہے کیونکہ شروع جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ میں ان کا انتقال ہو گیا ناظرین ان کو دعاء خیر میں یاد رکھیں حقیقت میں ضبط مواعظ کا کام وہ سب سے اچھا کرتے تھے اور یہ فیض ان کا ان شاء اللہ تعالیٰ تا ابد جاری رہیگا۔ اللہ تعالیٰ ان کو درجات عالیہ جنت میں عطا فرمائیں۔ ورضی عنہ وارضاہ اور ہم پسماندگان کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔ ظفر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا

عہ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وعظ کی تسوید تفصیلی بھی ماہ ربیع الثانی میں ہوا ہے مگر بجائے ۲۰ تاریخ کے آج ۱۹ تاریخ ہے اور بجائے جمعہ کے پیر کا دن ہے اور بجائے ۱۳۳۱ھ کے ۱۳۴۳ھ ہے ۱۲ ظفر

محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم
اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ط
(اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنھوں نے اللہ سے بے پروائی کی تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پرواہ بنا دیا یہی لوگ نافرمان ہیں)

یہ ایک مختصر سی آیت ہے سورۂ حشر کے آخر کی جس میں مثل دوسری آیتوں کے ایک نہایت ضروری مضمون مذکور ہے۔ اور میں نے تشبیہ کا صیغہ اس لئے استعمال کر دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ کچھ اسی آیت کی تخصیص نہیں بلکہ قرآن کی تمام آیات کی یہی شان ہے کہ ہر آیت میں ضروری ہی مضمون ہے اگر میں تشبیہ کا ذکر نہ کرتا تو ممکن تھا کسی کو یہ شبہ ہوتا کہ شاید دوسری آیتوں میں ضروری مضمون نہیں بس خاص اسی آیت میں یہ بات ہے۔ گو اس شبہ کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ کیونکہ تخصیص ذکری سے تخصیص حکمی لازم نہیں آتی مگر شاید کسی کو بلا وجہ ہی شبہ پڑتا۔ اس لئے میں نے تشبیہ کے صیغہ سے پہلے ہی دفع دخل مقدر کر دیا۔ کہ اس آیت میں بھی ایک نہایت ضروری مضمون ہے جیساکہ دوسری آیتوں کی بھی یہی شان ہے قرآن کا تو ہر ہر جزو ضروری ہے اس میں غیر ضروری کوئی بات بھی نہیں ہے حتیٰ کہ جن آیات میں واجبات و فرائض کا بھی ذکر نہیں محض مستحبات ہی کا ذکر ہے مضمون ان کا بھی ضروری ہے۔ گو آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عمل کے درجے میں وہ واجبات و فرائض کے برابر ضروری ہیں بھی نہیں مگر تعلیم ان کی بھی ضروری ہے (دو وجہ سے ایک اس لئے کہ لوگوں کو ان کا مستحب ہونا معلوم ہو جائے گا تو کوئی ان کو ناجائز نہ سمجھے گا یا فرض و واجب نہ خیال کرے گا یہ تو اصلاح اعتقاد کے لحاظ سے ضرورت ہے۔ اور اس درجے میں مباحات کی تعلیم بھی ضروری ہے دوسرے اس لئے کہ ان کی برکات اور ثمرات بے شمار ہیں جن پر مطلع نہ ہونا ہی ان سے بے رغبتی کا باعث ہے

اگر ان برکات و ثمرات کی اطلاع ہو جائے جو ادنےٰ ادنےٰ مستحبات سے حاصل ہوتے ہیں تو آپ خود کہیں گے کہ افسوس ہم اب تک بڑے خسارہ میں تھے جو ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبر رہے (یہ ضرورت تکمیل عمل کے درجے میں ہے) غرض مستحبات کا ذکر بھی قرآن میں بے ضرورت نہیں بلکہ تعلیم کے درجے میں ان کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے اگر محبت ہو تو اس کی قدر ہو۔

عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی خوشی کی ذرا ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی کر لوں وہ بھی کر لوں اور کوئی بات اس کے خوش کرنے کی مجھ سے رہ نہ جائے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ مذاق عاشقانہ نصیب ہو جائے تو اس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو اور ان کے بیان کو خداوند تعالےٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں گے۔ کہ اللہ و رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے کس تفصیل سے ان باتوں کو بتلا دیا جو اللہ تعالےٰ کو خوش کرنے والی ہیں اور اگر شریعت میں صرف ضروریات ہی کا بیان ہوتا مستحبات کا ذکر نہ ہوتا تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے کہ عاشق محض ضروریات پر اکتفا نہیں کیا کرتا اُن کو تو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ فرض منصبی کے علاوہ بھی میں کچھ ایسا کام کروں جس سے محبوب کو مجھ پر زیادہ توجہ ہو۔ (دیکھئے ایک نوکر تو وہ ہے جو محض تنخواہ کے لئے کسی خاص کام پر آپ کا ملازم ہے۔ وہ تو یہ چاہے گا کہ فرض منصبی کو ادا کرتا رہوں۔ اس سے زیادہ کی اس کو خواہش نہ ہوگی اور ایک وہ نوکر ہے جس کو بچپن سے آپ نے پالا پرورش کیا ہے اور اس کو آپ کے ساتھ جان نثاری کا تعلق ہے وہ ہرگز فرض منصبی پر

اکتفا نہ کرے گا بلکہ وہ اس کی کوشش کرے گا کہ آقا کے خوش کرنے کا جو کام بھی ہو وہ میرے ہاتھ سے ہو جائے۔ وہ اپنے خاص کام کے علاوہ رات کو آپ کے پیر بھی دبائے گا پنکھا بھی جھلے گا۔ اور آپ کے جاگنے سے پہلے تمام ضروریات کے مہیا کرنے کا سامان کرے گا اور یہ کبھی خیال نہ کرے گا کہ یہ کام تو میرے فرض منصبی سے زیادہ ہیں انھیں کیوں کروں بلکہ اس کی محبت اور جان نثاری مجبور کرے گی کہ جس کام سے بھی آقا خوش ہو وہ ضرور کرنا چاہیئے)

صاحبو! ہمارا علاقہ حق تعالےٰ شانہٗ کے ساتھ ہمارے خیال فاسد میں محض قانونی رہ گیا ہے۔ اسی لئے ہم واجبات و فرائض کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اگر ہم کو حق تعالےٰ کے ساتھ محبت اور جان نثاری کا علاقہ ہوتا تو فرائض و واجبات پر ہم کبھی اکتفا نہ کرسکتے۔ بلکہ مستحبات کی تلاش میں خود بخود رہتے اور جس بات کے متعلق بھی یہ معلوم ہوجاتا کہ حق تعالےٰ کو یہ بات پسند ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اس کی طرف شوق سے سبقت کرتے اور جس بات کے متعلق یہ معلوم ہوجاتا کہ یہ حق تعالےٰ کو ناپسند ہے۔ اس سے کوسوں دور بھاگتے اور اس کی تحقیق نہ کرتے کہ یہ زیادہ ناپسند ہے یا کم۔ عاشق کو اتنا جان لینا کسی کام سے رکنے کے لئے کافی ہے کہ یہ محبوب کو ناپسند ہے وہ یہ کبھی تفتیش نہیں کرتا کہ یہ ایسا ناپسند ہے کہ اس کی سزا میں ضرب و حبس کی جاتی ہے یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ خاطر ہوجاتا ہے۔ اور رُخ پھیر لیتا ہے اس کے نزدیک دونوں کام برابر ہیں وہ اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ محبوب اس سے کچھ بھی کبیدہ خاطر یا بے رُخ ہوجائے اور جس کام میں کبیدگی کے علاوہ سزائے ضرب و حبس بھی ہو وہ تو بھلا کیوں ہی کرنے لگا۔

مگر آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کسی کام کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے تو سوال ہوتا ہے کہ کیا بڑا گناہ ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر چھوٹا گناہ ہو تو کرلیں گے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ گو پوری بے تعلقی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ سوال ہی تعلق کی دلیل ہے میں ان لوگوں کی طرفداری کرتا ہوں کہ ان کو خدا تعالےٰ سے بالکل بے تعلق نہ سمجھا جائے کیونکہ ان کو اتنا تعلق تو ہے کہ وہ حق تعالےٰ کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں کرتے اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کیا ضرورت تھی کہ یہ کیا بڑا گناہ ہے۔ معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے خدا تعالےٰ بہت ناراض ہوتے ہیں لیکن زیادہ تعلق نہیں ہے اس لئے تھوڑا سا ناراض کر دینا گوارا ہے۔ غرض یہی سوال تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعف تعلق کی بھی اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہوں گے جو گناہ کے متعلق بڑا چھوٹا ہونے کا سوال کرتے ہیں کہ حق تعالےٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہو گیا اور یہ بات ایک درجہ میں ہے بھی خوش ہونے کی کیونکہ بلا بود ے اگر ایں ہم نبود ے (مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتا) مگر وہ یاد رکھیں کہ نفس تعلق پر قناعت نہیں ہو سکتی آخر آپس میں جو ایک دوسرے سے ہم تعلقات رکھتے ہیں کیا ان میں نفس تعلق پر کوئی شخص قناعت کر سکتا ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر تعلق کا درجہ کمال ہر شخص کو مطلوب ہے۔

دیکھئے بیوی کے ساتھ جو ارتباط ہے۔ حالانکہ وہ ایک نہایت ہی ضعیف تعلق ہے جو صرف دو لفظوں سے جڑ جاتا ہے اور ایک لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے مگر اس میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو نفس تعلق پر قناعت کرتا ہو بلکہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیوی کو میرے ساتھ کامل تعلق ہو اسی لئے محض حقوق ضروریہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خوش کرنے کے لئے

وہ کام کئے جاتے ہیں اور وہ زیور اور لباس تیار کئے جاتے ہیں جو اس کا حق نہیں مگر محض اپنے مصالح کی وجہ سے ان کاموں کو کیا جاتا ہے تاکہ یہ تعلق بڑھے اور مستحکم ہو۔ اگر مرد بیوی کے ساتھ یا بیوی مرد کے ساتھ قانونی علاقہ رکھے اور حقوق ضروریہ سے زیادہ کچھ نہ کرے تو گو نفس تعلق باقی رہ سکتا ہے۔ مگر تعلق کا لطف حاصل نہیں ہوتا اور اس صورت میں ہر وقت قطع تعلق کا اندیشہ رہتا ہے۔ تعلق کو بقا جب ہی ہوتی ہے کہ اس کے استحکام کی تدبیر کی جائے چنانچہ مرد کے ذمے بیوی کا محض کھانا کپڑا ضروری ہے۔ زیور اور ریشمی لباس لازم نہیں نہ اس کی دوا دارو لازم ہے۔ نہ اس کے کنبے والوں کی دعوت ضیافت ضروری ہے۔ مگر محض تعلق بڑھانے کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے اور اس کے جی خوش کرنے کو ہر کام میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے۔ مگر باوجود اس ضعف کے اس کا منقطع ہو جانا ہر شخص کو ناگوار ہے۔ اور اگر کبھی منقطع ہو جاتا ہے تو کتنا رنج ہوتا ہے اور انقطاع سے بچنے ہی کے لئے اس کے استحکام کے اسباب اختیار کئے جاتے ہیں پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم کو ایک ضعیف تعلق میں تو نفس تعلق پر قناعت نہ ہو بلکہ خوف انقطاع سے اس کے استحکام کی فکر ہو۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا ہو حالانکہ خدا تعالیٰ سے ہمارا ایسا قوی علاقہ ہے کہ اس کی برابر کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ استحکام کی ہم کو فکر نہیں اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے اور یہاں وہ خیال کیوں نہیں کیا جاتا۔

تعلق کا بقاء استحکام پر موقوف ہے نفس تعلق بقا کے لئے کافی نہیں بلکہ اس میں زوال و انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے تو کیا کوئی اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو اس کا علاقہ ہے وہ منقطع ہو جائے

ہرگز نہیں پھر اس کے استحکام کا کیوں خیال نہیں کیا جاتا۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

ایکہ صبرت نیست از فرزند وزن　　صبر چوں داری ز رب ذو المنن

ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں　　صبر چوں داری ز نعم الماہدون

(اے شخص بیوی بچوں سے تجکو صبر نہیں ہے خدا تعالیٰ سے تجھ کو صبر کیونکر آگیا حقیر اور ذلیل دنیا سے تجھ کو صبر نہیں ہے تو حق تعالیٰ شانہٗ سے تو نے کیونکر صبر کر لیا۔)

ہائے ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو صبر نہیں ہو سکتا۔ مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ سے لوگوں کو کیسے صبر آگیا۔ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق ضعیف ہونے پر ذرا جی نہیں دکھتا بس گو حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے۔ مگر ضعف تعلق پر قناعت کر لینا بھی بڑا ظلم ہے۔ بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں یہ تو کفار ہیں ان سے اس وقت خطاب نہیں اور بعض لوگ ضعف تعلق پر راضی ہیں۔ یہ ہم آجکل کے مسلمان ہیں حیرت ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعف تعلق رکھنے پر صبر کیسے آتا ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ آجکل ہم کو مستحب کی خبر نہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

میں اپنی کہتا ہوں کہ بچپن میں بہت سے نوافل کا پابند تھا مگر منیۃ المصلی پڑھتے ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں اسی وقت سے نوافل کو چھوڑ دیا۔ اس وقت تو تنبیہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت بہت بری تھی۔ اس کا تو یہی حاصل ہوا کہ ہم حق تعالیٰ کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں کہ ضروریات کو بجا لائیں اور ان کے علاوہ جو باتیں خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی ہیں ان کو نہ بجا لائیں۔ تو کیا ہم دنیا میں اپنے مربیوں کے ساتھ

بھی یہ برتاؤ کر سکتے ہیں کہ خدمت واجبہ کے سوا کچھ نہ کریں ہرگز نہیں دیکھئے بعض اوقات کسی طمع کی وجہ سے یا محبت کی وجہ سے ہم اپنے مربیوں کی خدمت غیر واجبہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں تو کیا خدا تعالےٰ کا اتنا بھی حق نہیں جتنا مربیوں اور بزرگوں کا حق ہوا کرتا ہے۔ ذرا کچھ تو انصاف سے کام لینا چاہیئے پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم حق تعالےٰ کی اطاعت میں اسی قدر اکتفا کرتے ہیں جو فرض و واجب ہے۔ اور طاعت غیر واجبہ کو کسی درجے میں بھی ضروری نہیں سمجھتے یہ ضرور ہے کہ خدا تعالےٰ کی شان کے لائق ہم سے اس کی طاعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور ہم جتنا بھی کچھ کریں وہ اس حق کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور یہ بھی ایک سبب ہے مستحباب میں ہماری کوتاہی کا کیونکہ اس سے ہم کو یہ دھوکہ ہو گیا ہے کہ جب حق ادا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کس لئے زیادہ کوشش کریں مگر یہ سخت غلطی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم اس کی شان کے موافق عمل نہیں کر سکتے مگر اپنے مقتضائے حال کے موافق تو کر سکتے ہیں۔ دنیا میں رات دن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سلاطین کے سامنے ہدایا و تحائف لے جاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بادشاہ کی شان کے موافق ہمارا ہدیہ نہیں ہو سکتا مگر اس کا یہ اثر کبھی نہیں ہوتا کہ ہدیہ دینا ہی موقوف کر دیں بلکہ جتنا اپنے سے بن پڑتا ہے کوشش کر کے عمدہ سے عمدہ ہدیہ پیش ہی کرتے ہیں۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ ہدیہ تو دوسرے کی شان کے موافق ہو یا کم از کم اپنی ہی شان کے موافق ہو" پس ہم کو اپنی ہمت اور طاقت کے موافق تو عمل کرنا چاہیئے اور میں اطمینان دلاتا ہوں کہ حق تعالےٰ کو راضی کرنے کے لئے اتنا ہی عمل کافی ہے جتنا آپ کر سکتے ہیں۔ آپ اپنی طاقت سے زیادہ نہ کیجیے۔ حق تعالےٰ نے بندہ کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق عمل کرے بلکہ اسی قدر کا مکلف کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق عمل کرے تو اب یہ کیسی بڑی غلطی ہے کہ ہم مستحبات کو اس لئے ترک کر دیں کہ حق تعالےٰ کا حق تو ادا

ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی وقت مستحب کو کسی مصلحت شرعی کی وجہ سے ترک کر دیا جائے (مثلاً لوگوں کو یہ بتلانے کے لئے یہ فعل واجب نہیں یا سفر میں رفقار کی رعایت سے نوافل وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انتظار سے پریشان نہ ہوں ۱۲) یا کسی وقت تعب کی وجہ سے اپنی راحت کے لئے ترک کر دیا جائے کہ شرعاً اس وقت ترک مستحبات پر ملامت نہیں۔ چنانچہ راحت حاصل کرنے کے لئے تو حدیث میں وارد ہے۔

اِنَّ نَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ اِنَّ لعينك حقا الخ

(یعنی تمہارے جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے)

مگر بلا وجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آئی ہے کیونکہ یہ سستی اور کاہلی ہے جس کے متعلق حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ (خدایا! عجز اور سستی سے آپ سے پناہ مانگتا ہوں)

خوب سمجھ لیجئے کہ طلب راحت اور چیز ہے اور سستی اور چیز ہے دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ طلب راحت کا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا ہے اور اس کے لئے بعض صحابہ کو ترک مستحبات و تقلیل نوافل کی ترغیب دی ہے اور سستی سے آپ نے پناہ مانگی ہے (اب سمجھئے کہ طلب راحت اور سستی میں کیا فرق ہے۔ طلب راحت اس وقت ہوا کرتی ہے جب آدمی اپنی طاقت کے موافق کام کر چکا ہو اس کو حکم ہے کہ بس طاقت سے زیادہ نہ کرو جا کر آرام کرو اور سستی یہ ہے کہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق بھی کام نہ کرے بلکہ تھوڑا سا کر کے عمل کو چھوڑ دے اس سے پناہ آئی ہے ۱۲)

غرض خدا تعالےٰ کے ساتھ ہمارا بڑا تعلق ہے اس کے لحاظ سے مستحبات بھی ضروری ہیں۔ یہ میں اس شبہ کا جواب دے رہا ہوں جو میرے اس قول پر ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ کے کام کا ہر ہر جزو ضروری ہے۔ چونکہ قرآن میں مستحبات کا بھی ذکر ہے اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے تو میں نے بتلا دیا کہ تعلیم ان کی بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے برکات و

چنانچہ ایک برکت تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستحبات معصیت سے مانع ہو جاتے ہیں (کیونکہ جو شخص تہجد و اشراق کا پابند ہوگا وہ بہ نسبت اس شخص کے معاصی سے زیادہ بچے گا جو محض پانچ وقت کے فرائض ہی ادا کرتا ہے اور اس میں علاوہ خاصیت کے ایک طبعی راز یہ ہے کہ مستحبات کی پابندی سے یہ شخص دیندار تہجد گزار مشہور ہو جاتا ہے تو اس لقب کے ساتھ گناہوں کے ارتکاب سے وہ خود بھی شرمانے لگتا ہے ۱۲) اور بعض اوقات کوئی فعل مستحب حق تعالیٰ کو ایسا پسند آجاتا ہے کہ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

چنانچہ سیبویہ ایک نحوی ہے۔ جو عقیدے کے لحاظ سے معتزلی ہے۔ اور عقائد فاسدہ پر سخت عذاب نار کا استحقاق ہوتا ہے مگر مرنے کے بعد ان کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، کہا مجھے بخشدیا پوچھا کس بات پر بخشدیا کہا ایک نحو کے مسئلہ پر میری نجات ہوگئی وہ مسئلہ یہ ہے کہ معرفہ کی بحث میں نحاۃ نے اختلاف کیا ہے کہ اعرف المعارف کون ہے۔ کسی نے ضمیر متکلم کو اعرف المعارف کہا کسی نے ضمیر مخاطب کو میں نے یہ کہا کہ لفظ اللہ اعرف المعارف ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی معرفہ متعین نہیں کیونکہ لفظ اللہ میں بجز ذات حق کے کسی کا احتمال ہی نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس بات پر فرمایا کہ تم نے ہمارے نام کی بہت تعظیم کی جاؤ تم کو بخشا گیا۔ دیکھئے اس نحوی کی مغفرت ایسے عمل مستحب پر کی گئی جو اس نے نیت ثواب بھی نہ کیا تھا بلکہ مسئلہ نحو کے طور پر ایک بات کہی تھی۔ مگر اسی پر فضل ہوگیا۔ اور باوجود فساد عقیدہ اور استحقاق نار کے بخشدیا گیا۔

اسی طرح ایک بزرگ جاڑے کی رات میں چلے جا رہے تھے راستے میں ایک بلی کا بچہ دیکھا جو سردی میں ٹھٹھر رہا تھا ان کو رحم آیا اور اسے گود میں اٹھا کر گھر لائے اور لحاف میں چھپا لیا۔ جب انتقال ہو گیا تو پوچھا گیا بتلاؤ ہمارے واسطے کیا لائے۔ انھوں نے بہت سوچ ساچ کر یہ خیال کیا کہ

ضروری اطلاع: خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر کریں۔

اور اعمال تو میرے کسی قابل ہیں نہیں ان کو کیا پیش کروں لیکن الحمد للہ مجھے ایمان کی دولت حاصل ہے اس میں ریا وغیرہ بھی کچھ نہیں ہو سکتا بس ایمان کو پیش کرنا چاہیے۔ اس لئے عرض کیا کہ میں توحید لایا ہوں، وہاں سے اعتراض ہوا اَتَذْکُرُ لَیْلَۃَ اللَّبَنِ ۔یعنی وہ دودھ والی رات بھی یاد ہے اس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک رات ان بزرگ نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا صبح کو ان کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ رات دودھ پیا تھا اس سے پیٹ میں درد ہو گیا۔ حق تعالےٰ نے اس واقعہ کو یاد دلا کر توحید پر گرفت فرمائی کہ یہی توحید کا دعوےٰ ہے کہ ہم کو چھوڑ کر تم نے دودھ کو موثر کہا اور درد کے فعل کو اس کی طرف منسوب کیا۔ اب تو یہ بیچارے تھرا اٹھے۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم نے اپنے دعوے کی حقیقت کو دیکھ لی لو اب ہم تم کو ایک ایسے عمل پر بخشتے ہیں جس کی بابت تم کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ یہ موجب نجات ہو جائے گا۔ تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو جو سردی میں مر رہا تھا اپنے لحاف میں سلایا تھا اس نے تمہارے حق میں دعا کی تھی۔ جو ہم نے قبول کر لی۔ جاؤ آج اس بلی کے بچے کی دعا پر تم کو بخشتے ہیں تم نے ہماری ایک مخلوق پر رحم کیا تھا تو ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم پر رحم کریں۔

تو صاحبو! مستحبات میں یہ عنایات و برکات ہوتی ہیں احادیث میں ایسے بہت واقعات آئے ہیں کہ بعض لوگوں کی ایک ادنیٰ فعل مستحب پر مغفرت ہو گئی چنانچہ ایک فاحشہ عورت کا قصہ حدیث میں آتا ہے کہ اس نے گرمی کے دوپہر میں ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کے مارے زمین کی تر مٹی چاٹ رہا تھا۔ اس کو رحم آیا اور پاس ہی ایک کنواں تھا اس سے پانی نکال کر کتے کو پلانا چاہا مگر دیکھا تو کنویں پر ڈول ہے نہ رسی، اب وہ سوچنے لگی کہ پانی کیونکر نکالوں مثل مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ آخر اس نے ایک ترکیب نکالی وہ یہ کہ اپنی اوڑھنی کو تو رسی بنایا اور پیر میں چمڑے کا موزہ تھا اسے ڈول بنایا

اس طرح پانی نکال کر کتے کو پلایا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اس فاحشہ کی مغفرت اس عمل پر ہو گئی۔ لیجئے ساری عمر تو سیہ کاری میں گزاری اور ایک ذرا سے عمل مستحب پر مغفرت ہو گئی (واقعی سچ ہے ؎

رحمت حق بہانہ می جوید
رحمت حق بہا نمی جوید

(اللہ تعالیٰ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے رحمت حق قیمت نہیں مانگتی)
اس لئے عمل کو حقیر نہ سمجھو نہ معلوم کونسا کام اس کو پسند آجائے ۱۲)
مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رحمت پر بھروسہ کر کے عمل ہی چھوڑ دو۔ آجکل اس مذاق کے لوگ بھی ہیں جن پر واقعات رحمت کے سننے سے یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ عمل کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے بات یہ ہے کہ ان حکایات کی مثال بارش جیسی ہے اور یہی کیا جتنی بھی نصوص ہیں سب کی یہی مثال ہے تو بارش فی نفسہ نہایت لطیف اور روح پرور ہے مگر اس کا اثر ہر محل کی قابلیت وعام قابلیت کے مناسب جدا ہوتا ہے۔ اگر عمدہ زمین ہے تو بارش سے اس میں پھول پھلواری اور عمدہ پھل پیدا ہوں گے اور اگر شور زمین ہے تو اس میں جتنی بارش ہوگی اتنے ہی کانٹے اور جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہوں گے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

(بارش کہ اس کی لطافت طبع میں اختلاف نہیں بلکہ زمین کی قابلیت میں اختلاف ہے باغ لالہ اگتا ہے اور بنجر زمین جھونڈ جھنکاڑ)
اسی طرح واقعات رحمت کو سن کر دو اثر ہوتے ہیں جو لوگ علیل المزاج ہیں وہ تو سمجھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ ایک ذرا سے نکتہ پر بخش دیتے ہیں تو عمل صالح کی کیا ضرورت ہے اور جو شریف المزاج ہیں وہ اس کو سن کر پہلے سے زیادہ اطاعت پر گرتے ہیں اور

کہتے ہیں ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا
ادھر سے ایسے گناہ پیہم اُدھر سے وہ دمبدم عنایت

بلکہ میں ایک نئی بات کہتا ہوں کہ بعض اوقات بدون سزا کے معافی دیدینے پر اہل دل اس قدر شرمندہ ہوتے ہیں کہ کچھ سزا مل جاتی تو اتنے شرمندہ نہ ہوتے سزا مل جانے پر تو کچھ شرمندگی کم ہو جاتی مگر سنگین جرم کو ویسے ہی معاف کر دینا تو گویا ان کو ذبح کر دینا ہے۔ اب تو مارے ندامت کے وہ زمین میں گڑے جاتے ہیں یہ ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے وہی اس کو سمجھ سکتا ہے اور جس نے اس حالت کو سمجھا ہوگا وہ اس آیت کی تفسیر بے تکلف سمجھ لے گا فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ (سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ تم مغموم نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے)

اس کا قصہ یہ ہے کہ جنگ احد میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایک غلطی ہوگئی تھی وہ یہ کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے جب لشکر کی صف بندی فرمائی تو پچاس آدمیوں کو پہاڑ کی ایک گھاٹی پر متعین فرمایا اور ان سے ارشاد فرمایا کہ تم یہاں سے بدون میری اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا خواہ ہمارے اوپر کچھ ہی حالت گزر جائے۔ اس گھاٹی کی اس قدر حفاظت کی یہ ضرورت تھی کہ اس راستے سے دشمن کے آجانے کا اندیشہ تھا اور یہ گھاٹی لشکر اسلام کی پشت پر تھی اگر دشمن کی فوج کا ایک دستہ ادھر سے آجاتا اور ایک دستہ مقابل ہو کر لڑتا تو مسلمان بیچ میں گھر جاتے اور ظاہر ہے کہ آگے پیچھے دونوں طرف سے لشکر کا گھر جانا سخت خطرناک ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صف بندی کرتے ہوئے اس گھاٹی پر ایک جماعت کو تاکید کے ساتھ متعین فرمایا۔ خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قوت انتظام بھی ایسی عطا فرمائی تھی کہ غیر اقوام بھی اس کو تسلیم

کرتی ہیں حتیٰ کہ وہ تو اشاعت اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو وہ ہم سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ کے معتقد ہوئے کہ جس چیز کو ہم امداد غیبی کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ اس کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ پر محمول کرتے ہیں اس انتظام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو حملے کی اجازت دی اور الحمد للہ تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں کو کھلی فتح حاصل ہوئی کہ ابوسفیان بن حرب جو اس وقت لشکر کفار کے سردار تھے مع لشکر کے بھاگ پڑے (اور جھنڈا بھی گر پڑا) حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بھی بھاگیں اور بھاگتے ہوئے ان کے خلخال اور پنڈلیاں تک کھل گئیں غرض کفار کو شکست فاش ہوئی اور مسلمان ان کے تعاقب میں دوڑے۔ اب ان پچاس آدمیوں میں اختلاف ہوا جو گھاٹی پر متعین تھے۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہو گئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لئے ہم کو یہاں متعین فرمایا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی اس لئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہو گی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ نہیں کیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیے۔ ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہیے بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا اس لئے ہم کو بدون آپ کی اجازت کے ہرگز کچھ نہ کرنا چاہیے مگر پہلی رائے[۵] والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک ان کے افسر رہ گئے۔

حضرت خالد بن ولید اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اور اس جنگ

[۵] لطیفہ اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی۔ جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ ۱۲ ظ

میں وہ لشکر کفار کی طرف تھے یہ ہمیشہ سے بڑے مدبر اور جنگ آزمودہ ہیں۔ انھوں نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے تاکہ اس گھاٹی کی خبر وقتاً فوقتاً ان کو پہونچاتے رہیں۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ حضرت خالد مع تمام لشکر کفار کے بھاگے جا رہے تھے ان کے جاسوس نے اطلاع دی کہ اب وہ مورچہ خالی ہے اور بجز دس گیارہ آدمیوں کے وہاں کوئی نہیں ہے۔ حضرت خالد نے بھاگتے بھاگتے اپنا رخ پلٹا اور پانچسو جوانوں کو ساتھ لے کر اس گھاٹی پر پہونچ گئے۔ دس گیارہ صحابی جو وہاں باقی رہ گئے تھے ان سے مقابل ہوئے مگر تھوڑی ہی دیر میں سب شہید ہو گئے اور حضرت خالد نے مسلمانوں کے پیچھے سے آ کر ان پر حملہ کر دیا یہ رنگ دیکھ کر کفار کا باقی لشکر بھی لوٹ پڑا اور مسلمان آگے پیچھے دونوں طرف سے نرغے میں آگئے اور جس خطرے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظت فرمائی تھی بعض صحابہ کی اجتہادی غلطی سے اس خطرے کا سامنا ہو گیا۔ چنانچہ ستر کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور شیطان کی اس جھوٹی آواز پر کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل ہو گئے۔ بہت سوں کے پیر اکھڑ گئے اور جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ گیا (یہ سب کچھ ہوا مگر بایں ہمہ مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی کیونکہ شکست کے معنے یہ ہیں کہ لشکر مع سردار کے بھاگ جائے۔ اور یہاں ایسا نہیں ہوا کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع چند جان نثاروں کے میدان میں برابر جمے رہے آپ کبھی نہیں بھاگے اور تھوڑی دیر کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ بھاگے والوں کو پکارے تو فوراً میدان میں سب مسلمان آموجود ہوئے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو نمایاں فتح حاصل نہیں ہوئی ۱۲ ظ)

حق تعالیٰ نے اس واقعہ میں مسلمانوں پر مصیبت آنے کا سبب ان صحابہ کی غلطی اجتہادی کو قرار دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت بغیر گھاٹی سے ہٹ گئے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَّا تُحِبُّونَ (اور تم کہنے پر

نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دلخواہ بات دکھادی گئی تھی)
اس کے بعد بطور عتاب کے فرماتے ہیں فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ یعنی پھر خدا تعالیٰ نے تم کو بھی غم دیا بدلہ (اس) غم کے (جو تم نے نافرمانی کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا) اس کے بعد اس انتقام کی حکمت ارشاد فرماتے ہیں لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ تاکہ تم کو (انتقام لینے کے بعد) اس بات پر زیادہ رنج نہ ہو جو تم سے فوت ہوگئی تھی یہ وہی بات ہے جو میں نے ابھی بیان کی تھی کہ بعض شریف طبیعتوں پر خطا کا انتقام نہ لینے سے ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے اور انتقام لے لینے سے ندامت کم ہو جاتی ہے۔
اسی بنا پر ارشاد ہے کہ ہم نے تم کو تھوڑی سی مصیبت اس لئے دیدی تاکہ بدون سزا کے معافی دینے سے تم پر ندامت و رنج کا زیادہ غلبہ نہ ہو۔ بعض مفسرین نے اس جگہ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا (تاکہ تم مغموم نہ ہو) میں لا نافیہ کو زائد مانا ہے۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ موقع عتاب کا ہے اور سزا تو رنج دینے ہی کے لئے دی جاتی ہے پھر اس کا کیا مطلب کہ تم کو اس لئے غم دیا تاکہ تم مافات پر رنج نہ کرو ان کے نزدیک لا کو اپنے معنے پر رکھ کر مطلب نہ بن سکا اس لئے انھوں نے لا کو زائد کہہ کر یہ مطلب بیان کیا کہ تم کو غم دیا تاکہ تم کو مافات پر رنج ہو۔ مگر جس نے اس حالت کو سمجھا ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے وہ سمجھے گا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے اگر ان کی خطا بدون کسی انتقام کے معاف کر دی جاتی تو عمر بھر مارے ندامت کے آنکھ نہ اٹھا سکتے اس لئے ان کو تھوڑی سی مصیبت دیدی گئی۔ تاکہ زیادہ رنج غالب نہ ہو پس یہ کہنا غلط ہے کہ سزا ہمیشہ رنج دینے ہی کے لئے ہوا کرتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ رنج کو کم کرنے کے لئے بھی سزا دی جایا کرتی ہے۔ اس حالت پر نظر کر کے تفسیر نہایت صاف ہے۔ اور لا کو زائد کہنے کی کچھ ضرورت نہیں اب بتلایئے جس شخص کی یہ حالت ہو کہ خطا کر کے بدون سزا کے اسے چین ہی نہ پڑے وہ واقعات رحمت سنکر گناہوں

پردلیر ہوگا یا غیرت سے زمین میں گڑ جائے گا۔ یقیناً جو لوگ صحیح المزاج ہیں اور جن کو خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق ہے وہ تو واقعات رحمت سن کر پہلے سے زیادہ اطاعت پر گریں گے۔ نمک حرام ہے وہ نوکر جس کی خطا بدون سزا کے معاف کر دی جائے۔ تو ناز کرنے لگے اور نافرمانی پر دلیر ہو جائے شریف وہ ہے جو آقا کی اس عنایت کو دیکھ کر عمر بھر کے لئے گڑ جائے اس لئے میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو واقعات رحمت سننے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ عمل میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں ان میں مرض ہے ان کو اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اور حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق محبت پیدا کرنا چاہیئے پھر ان پر مستحبات کے یہ برکات و منافع سن کر الٹا اثر نہ ہوگا۔ غرض بعض مستحبات کی بدولت عمر بھر کا دلدر دھل جاتا ہے تو یہ کتنی بڑی رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو مستحبات کی تعلیم فرمائی۔ اب وہ شبہ بالکل جاتا رہا کہ قرآن کا ہر جزو ضروری کہاں ہے بلکہ بعض مستحبات بھی ہیں جو غیر ضروری ہیں۔

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مستحبات بھی تعلیم کے درجے میں تو نہایت ہی ضروری ہیں اور باعتبار ثمرات کے عمل میں بھی ایک گونہ ضروری ہیں اب وہ دعویٰ صحیح رہا کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا ہر جزو ضروری ہے۔ اور میرا کہنا بھی صحیح ہو گیا کہ اس آیت میں مثل دوسری آیات کے ایک نہایت ضروری مضمون ہے۔ رہی یہ بات کہ پھر اسی کو کیوں اختیار کیا گیا تو اصل یہ ہے کہ ضروری تو سب ہیں مگر کسی وقت کسی خاص مضمون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لئے موقع اور وقت کے لحاظ سے کسی خاص مضمون کو ترجیح ہو جاتی ہے۔ کبھی ایک تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے کبھی دوسری تعلیم کی اور اس کے لئے خدا تعالیٰ ہر ضرورت کے موقعہ پر اپنے بندوں کے دل میں القاء کر دیتے ہیں کہ اس وقت اس مضمون کو بیان کرنا چاہیئے یہ کام بھی وہ خود ہی

کرتے ہیں ورنہ بیان کرنے والے کو کیا معلوم ہوسکتا ہے کہ اس وقت سامعین کو کس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں خود اپنی حالت دیکھتا ہوں کہ بعض دفعہ سوچنے سے کوئی مضمون ذہن میں نہیں آتا بلکہ اکثر خود بخود القا ہوجاتا ہے سفر میں جہاں کہیں بیان ہوتا ہے تو اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہدی ہے۔ کیونکہ بیان ان کی حالت کے مناسب ہوتا ہے۔ مگر الحمد للہ میری یہ عادت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی حالت کا تجسس کروں نہ مجھ سے فرمائشی مضمون کبھی بیان ہوسکے۔ بلکہ توکل علی اللہ بیان شروع کردیتا ہوں اور جو باتیں اللہ تعالےٰ دل میں ڈال دیتے ہیں بیان کردیتا ہوں اور وہ اکثر سامعین کی ضرورت و حالت کے مطابق ہوتی ہیں اس سے لوگوں کو شبہ ہوجاتا ہے کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہدی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کو کشف سمجھیں مگر مجھے تو عمر[ل] بھر بھی کشف نہیں ہوا اور اس میں کشف کی کیا بات ہے بس حق تعالےٰ جس سے کام لینا چاہتے ہیں لے لیتے ہیں اتنی بات تو ہے کہ بحمد اللہ بیان کے وقت یہ نیت ضرور ہوتی ہے کہ اے اللہ ایسا مضمون بیان ہو جو ان لوگوں کی ضرورت کا ہو جس سے ان کی اصلاح ہوجائے۔ خدا تعالےٰ کو تو علم غیب ہے وہ سب کی حالت جانتے ہیں وہ اس نیت کے بعد ضرورت و حالت کے مطابق مضمون دل میں ڈال دیتے ہیں کہ آج یہ بیان کرو۔

یہی وجہ ہے کہ بعض ہفتوں میں کوئی بات ذہن میں نہیں آتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج یہ آیت بیان کے لئے ذہن میں آئی تو میں سمجھتا کہ اس مضمون کی دوسرے مضامین سے

[ل] میں کہتا ہوں کہ کشف نہ سہی تو الہام ہونے میں تو شک نہیں ۱۲ ظ

ضرورت زیادہ ہے اس لئے اس کو اختیار کیا۔

بہرحال اس آیت میں ایک ضروری مضمون ہے جس میں حق تعالےٰ نے ہماری بدحالی کا ایک نہایت سہل علاج بیان فرمایا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ ہم لوگ بدحال ہیں کوئی شخص بھی اس سے بری نہیں ہاں اتنا فرق ہے کہ کسی کی تباہی کم ہے کسی کی زیادہ باقی بدحالی میں سب مبتلا ہیں الا ماشاء اللہ اور جن کی تباہی کم ہے وہ بہ نسبت ان لوگوں کے زیادہ پریشان ہیں جن کی تباہی زیادہ ہے اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مضمون کی ضرورت انہی لوگوں کو ہے جو بہت تباہ حال ہیں۔ اور جو کم تباہ حال ہیں ان کو ضرورت ہی نہیں یا کم ضرورت ہے۔ بلکہ برعکس حالت یہ ہے کہ جن کی تباہی کم ہے ان کو اس کی ضرورت زیادہ ہے کیونکہ وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پریشان ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم نے اپنے بعض دوستوں کو دیکھا ہے جن پر قرض بہت زیادہ ہے کہ وہ بہ نسبت ان لوگوں کے زیادہ بےفکر ہیں جن پر قرض تھوڑا سا ہے۔ بس ان کو تو قرض کی عادت ہوگئی اور اس کے بار کا حس ہی نہیں رہا اب وہ قرض لینے میں بڑے دلیر ہوگئے ہیں اور جس کو قرض کی عادت نہیں اور اسکے ذمہ تھوڑا سا قرض ہوگیا ہے جس کے ادا ہونے کی توقع بھی ہے وہ زیادہ پریشان ہے بعض دفعہ اس کو راتوں کی نیند نہیں آتی اور وہ ان لوگوں کی حالت پر تعجب کرتا ہے جو ہزاروں کے مقروض ہو کر بھی رات کو چین سے سوتے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ مصیبت کی فکر اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس کے زوال کی امید ہو۔ اور جب زوال کی امید نہ رہے تو اب فکر نہیں رہتی بلکہ وہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے جیسے دائمی مرض طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح جو لوگ کم گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ مغموم و پریشان ہیں اور جو زیادہ گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ پریشان نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تو بے حس ہو جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات انسان کثرت گناہ کے سبب مایوس ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب میری مغفرت تو ہو ہی نہیں سکتی پھر لذات میں بھی کیوں کمی کروں پھر وہ دل کھول کر گناہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ جب مرنے کا وقت آتا ہے تو وہ اس وقت بھی توبہ و استغفار نہیں کرتا اور اگر اس سے توبہ کو کہا جائے تو صاف انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اتنے گناہوں کو ایک توبہ کیا کافی ہو گی۔

چنانچہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کو مرتے وقت کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ ایک کلمہ سے کیا ہو گا۔ میرے تو گناہ اس قدر ہیں کہ ان کو ہزار کلمے بھی نہیں دھو سکتے یہ مایوسی تھی اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

تو بعض دفعہ کثرت گناہ انسان کو مایوس بنا کر کفر تک پہونچا دیتی ہے (خدا ہر مسلمان کو اس سے بچائے۔ آمین) کثرت گناہ میں تو یہ اثر ہے ہی مگر آپ حیرت کریں گے کہ بعض دفعہ یہی اثر اطاعت میں بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بات کسی کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ مگر قربان جایئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے اس کو سمجھا ہے۔ اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گا کہ واقعی ہم کو کیسے کامل و اکمل رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عطا ہوئے ہیں کہ آپ کی نظر کہاں تک پہنچی ہے اور یہی چیز ہے جو صرف انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوئی ہے۔ اسی سے انبیاء علیہم السلام حکماء سے ممتاز ہیں حکماء کے پاس صرف محسوسات کا علم ہے اور وہ محسوسات ہی کے خواص کو جانتے ہیں۔ انہی کی ترکیب و تحلیل کیمیاوی طریقہ سے کر سکتے ہیں بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ وہ معانی معقولہ کے خواص کو جانتے ہیں

اور جو چیز نظر نہیں آتی بلکہ محض اعتباری و عقلی شے ہے اس کے آثار کو انھوں نے ایسا صحیح سمجھا ہے کہ کیا کوئی کیمیاوی طریقے سے ان کی تحلیل کر کے سمجھیگا اور یہیں سے آپ کو فقہا کی بھی قدر ہو گی۔ کیونکہ یہ حضرات علوم انبیاء ہی کے حامل ہیں اور معانی معقولہ ہی کی ترکیب و تحلیل و بیان خواص میں مشغول ہیں۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باریک بینی دیکھئے کہ اعمال شر پر بُرا اثر مرتب ہوتا تو کسی کی سمجھ میں آسکتا تھا مگر آپ کی نظر دور پہنچی کہ بعض دفعہ اعمال خیر پر بھی بُرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو آپ کی شان تو یہ ہے عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَ اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ۔ (میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی پس بہت اچھی ہوئی میری تعلیم اور اللہ تعالےٰ نے مجھ ادب دیا پس اچھی ہوئی میری تادیب) جس کو خدا تعالےٰ نے لکھایا پڑھایا ہو اس کی نظر جتنی دور بھی پہونچے کم ہے۔

بظاہر تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ طاعت جتنی بھی ہو اچھی ہے طاعت کے لئے کوئی حد نہ ہونا چاہیئے۔ مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا کہ طاعت کے لئے بھی ایک حد ہے اور اسی حد تک وہ محمود ہے اس سے آگے بڑھنا اچھا نہیں ورنہ اثر بُرا پیدا ہو گا اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے مریض کو دوا کرنا اچھا ہے۔ اور ترک دوا بُرا ہے۔ لیکن دوا کرنے کی بھی ایک حد ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ دوا اچھی شے ہے تو اس کے لئے کوئی حد ہی نہ ہو بلکہ اگر کوئی مقدار ضرورت سے زیادہ دوا کھائے گا تو اس پر نتیجہ بُرا مرتب ہو گا یہی حال طاعات کا ہے کہ ان کے لئے بھی ایک حد ہے۔ گو وہ فی نفسہٖ اچھی چیزیں ہیں اس کو انبیاء علیہم السلام ہی نے سمجھا ہے۔ جو اطبار روحانی ہیں انھوں نے بتلادیا کہ طاعات بھی دوا کی طرح ہیں جیسے ہر دوا کے لئے مقدار اکل و شرب

متعلق ہوتی ہے طاعات کے لئے بھی درجات معین ہیں۔ چنانچہ خوف الٰہی ایک بڑی طاعت ہے جس کا جابجا نصوص میں حکم ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ایک حد بیان فرمائی ہے۔

ایک دعا میں آپ فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ یعنی اے اللہ میں آپ سے آپ کا اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھ میں اور معاصی میں حائل ہو جائے۔ اس میں آپ نے بتلا دیا کہ خوف (طبعی) کا ہر درجہ مطلوب نہیں بلکہ وہ اسی قدر مطلوب ہے کہ خدا کی نافرمانی سے روک دے۔ کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خوف (طبعی) کا زیادہ بڑھ جانا مضر ہے کیونکہ ایسے شخص کو ہر وقت حق تعالےٰ کے قہر ہی پر نظر ہوگی۔ تو کوئی عمل بد قابل معافی نہ ہوگا۔ اور عظمت پر نظر کر کے اپنا کوئی عمل قابل قبول نظر نہ آئے گا اور اس کو نجات کی توقع نہ رہے گی۔ نتیجہ یہ کہ رحمت حق سے مایوس ہو جائے گا۔ اور مایوسی کفر ہے۔ تو کیا ٹھکانا ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی رازدانی کا۔ بھلا کون عاقل اس کو تجویز کر سکتا ہے کہ طاعت بھی سبب کفر ہو سکتی ہے مگر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا کہ غلبۂ خوف بعض دفعہ سبب یاس ہو جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یاس کفر فَاِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (اللہ تعالےٰ کی رحمت سے سوائے کافروں کو مایوس نہیں ہونا)

اس لئے آپ نے خوف کے سوال میں یہ قید لگا دی مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ کہ میں اتنا خوف مانگتا ہوں جو معاصی سے روک دے اور بس یہی وہ علوم ہیں جن کو دیکھ کر حکماء بھی دنگ رہ جاتے تھے اور اسی لئے انھوں نے نبوت کی حقیقت کو اپنی کتابوں میں مانا ہے کہ بعض افراد ایسے ہو سکتے ہیں جن پر بلا واسطہ مبدا ر فیاض کی طرف سے

علوم فائض ہوں اور اسی لئے وہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ کسی حکیم نے اپنے زمانہ کے نبی کی نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ ان کا اصحاب قوت قدسیہ ہونا تسلیم کیا وہ ان کے علوم کو دیکھ کر یہ کہہ اٹھے کہ اتنا بڑا علم کسی ریاضت یا تعلیم سے حاصل نہیں ہوسکتا تو معلوم ہوتا ہے کہ مبداء فیاض سے ان کو علم عطا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ حکماء نے ایک غلطی بھی کی وہ یہ کہ نبوت کو تسلیم کرکے یہ کہا کہ یہ امیین کے واسطے نبی ہیں (یعنی جاہلوں کے واسطے) ہمارے واسطے نبی نہیں ہیں اور نہ ہم کو ان کے اتباع کی ضرورت ہے۔ لانا قوم قد ہذبنا نفوسنا بالعلم کیونکہ ہم نے علوم سے اپنے نفوس کو مہذب بنا لیا ہے اب ہم کو کسی مصلح کی ضرورت نہیں قرآن میں بقول بعض مفسرین فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (اپنے علم سے جو ان کو حاصل ہے خوش ہیں) ایسے ہی حکما کے بارے میں ہے۔

ان کا یہ قول ایسا تھا جیسے بعض یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرکے یہ کہتے تھے کہ آپ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہیں مگر اہل عرب کے واسطے ہیں۔ ہمارے واسطے نہیں ہیں کیونکہ ہم خود صاحب کتاب ہیں اور وہ کتاب ہمارے لئے موید ہے۔ اس کا جواب علماء نے خوب دیا کہ تمہارے نزدیک وہ نبی تو ہیں اور نبی کے لئے صادق ہونا ضروری ہے اور وہی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرماتے ہیں کہ میں تمام عالم کی طرف مبعوث ہوا ہوں اور سب پر میرا اتباع لازم ہے بدون میرے اتباع کے کسی کی نجات نہیں ہوسکتی تم ان کے اس قول کو کیوں نہیں تسلیم کرتے حالانکہ یہ تسلیم کرتے ہو کہ نبی کی بات جھوٹی نہیں ہوسکتی تو ان کو اس بات میں بھی سچا ماننا پڑے گا۔ اور اس بات کا سچا ماننا تمہارے اس قول کے کذب کو مستلزم ہے کہ وہ خاص اہل عرب کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں ہمارے واسطے نہیں ہیں۔ پس اس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ تو جس طرح

یہود نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو خاص اہل عرب کا رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کہا تھا اسی حکمار بھی انبیار علیہم السلام کی نبوت کو تسلیم کرکے انھیں خاص عوام کے لئے نبی کہتے تھے اپنے واسطے نبی نہ کہتے تھے۔ خیر یہ غلطی تو ان سے ہوئی مگر انبیار کے علوم عالیہ کی وجہ سے نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کی حقیقت کو تسلیم کرکے اپنی کتابوں میں علم النوامیس کے عنوان سے اس کو ذکر کیا ہے اور آجکل کے حکمار جو حقیقت نبوت ہی کا انکار کرتے ہیں تو حقیقت میں یہ حکمار نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ واقع میں صناع ہیں کہ عجیب و غریب صنائع کے موجد ہیں گو صنعت بھی مفید چیز ہے۔ مگر اس سے آدمی حکیم نہیں بن سکتا حکمت علوم معانی سے حاصل ہوتی ہے اور حکمار عصر کے پاس معانی خاک نہیں ہیں بس ان کے پاس جو کچھ ہے مشاہدہ ہے ان سے بہتر حکمار تو وہی تھے۔ یعنی حکمار یونانیین کیونکہ وہ لوگ اہل معانی تھے۔ گو معانی میں انھوں نے غلطیاں کی ہیں اور ایسی غلطیاں کی ہیں کہ علوم نبوت ظاہر ہونے کے بعد مسلمانوں کا ایک بچہ بھی ان غلطی پکڑ سکتا ہے مگر پھر بھی ان کے پاس کچھ معانی عقلیہ کا ذخیرہ تھا تو سہی۔ اسی لئے وہ حقیقت نبوت کا انکار نہ کرسکے حکمار عصر کے پاس تو علوم عقلیہ ہیں ہی نہیں۔ اس لئے وہ انبیار علیہم السلام کے علوم کی قدر نہیں جان سکتے۔ یہی وجہ ہے اُن کے انکار نبوت کی۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ بعض دفعہ زیادہ گناہوں کی وجہ سے انسان کو مایوسی ہو جاتی ہے تو وہ دل کھول کر گناہ پر دلیر ہو جاتا ہے۔ اب اس کو گناہوں سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی (کیونکہ مثل مشہور ہے اَلْیَاسُ اِحْدَی الرَّاحَتَیْنِ کہ نا امیدی سے بھی گونہ راحت ہو جاتی ہے ۱۲ ظ) اور جس نے تھوڑے گناہ کئے ہیں وہ رحمت و مغفرت

سے مایوس نہیں ہے۔ بلکہ اس کو امید ہے اور امید کی وجہ سے معافی کی فکر بھی ہے تو وہ زیادہ پریشان ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ جو لوگ کم تباہ حال ہیں ان کو اس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ وہ زیادہ پریشان ہیں۔

ظاہر میں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ گناہوں کی کثرت سے غم زیادہ ہوتا ہوگا مگر واقع میں اس کا عکس ہے کہ تھوڑے گناہ والے کو زیادہ غم ہوتا ہے۔ اور ان میں سے جو خاص لوگ ہیں ان کی تو یہ حالت ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں۔ اگر اس کی باطنی حالت میں ایک تنکا کم ہو جاتا ہے)

یعنی گناہ تو گناہ اگر اس کی قلبی حالت میں ذرا سا بھی تغیر ہو جاتا یا ایک دار بھی کم ہو جاتا ہے تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے اگر اس وقت کوئی شیخ محقق مل گیا تو اس کی تسلی سے سنبھل جاتا ہے ورنہ بعض دفعہ ہلاکت تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ چونکہ مولانا محقق ہیں اس لئے دوسری جگہ تسلی بھی فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو — آں صلاح تست آئیں دل شو
چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں — تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

(اے سالک جب تجھ پہ قبض کی حالت پیش آئے تو نا امید مت ہو وہ تیری اصلاح کے لئے ہے جب کہ قبض پیش آئے تو اس میں بسط دیکھ خوش خرم ہو پیشانی پہ بل نہ ڈال)

اس کا یہ مطلب کوئی صاحب نہ سمجھیں کہ قبض سے تنگ آنا اور پریشان ہونا زیبا

حرکت اور بری حالت ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ قبض سے پریشانی کا ہونا تو طبعی اور لازمی امر ہے ہاں شیخ کی تسلی کے بعد عقلاً پریشان رہنا یہ برا ہے۔ اور اگر غور کرکے دیکھا جائے تو تسلی قبض پر نہیں ہوتی یعنی شیخ کی تسلی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خود قبض کی ذات سے راضی رہو اور یہ بالذات مطلوب حالت ہے۔ اس پر خوش رہو بلکہ تسلی ان مصالح اور منافع پر ہوتی ہے جو اکثر قبض پر مرتب ہو جاتے ہیں (اس کی ایسی مثال ہے جیسے بیمار کی تسلی کی جاتی ہے کہ میاں بخار آگیا تو کیا حرج ہے بدن کا تنقیہ ہو گیا یا گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ تو مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بیماری مطلوب شے ہے۔ اس پر راضی رہو۔ بلکہ بیماری سے جو بدن کا تنقیہ ہو گیا ہے یا اور بعض فوائد حاصل ہو گئے ہیں ان پر تسلی کی جاتی ہے۔ کہ ان منافع کا خیال کرکے پریشانی کو کم کرنا چاہیئے۔ ورنہ جس طرح بیماری خود بذاتہ تسلی کے قابل نہیں ہے اسی طرح قبض اپنی ذات سے تسلی کی شے نہیں ہے ۱۲ ظ)

ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اول وحی نازل ہوئی ہے تو اس کا قصہ حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ پہلے دن ثقل وحی سے یا خوف عظمت الٰہی سے آپ کو بخار آگیا۔ آپ گھبرائے ہوئے دولت خانہ پر تشریف لائے اور کمل اوڑھ کر لیٹ گئے جب کچھ افاقہ ہوا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے آپ نے یہ واقعہ بیان فرمایا وہ آپ کو حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو توراۃ وانجیل کے بڑے عالم تھے۔ انھوں نے وحی کا قصہ سن کر آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور یہ بھی کہا کہ افسوس آپ کی قوم آپ کو مکہ مکرمہ سے ایک دن نکالے گی۔ اگر میں زندہ رہا تو آپ کی پوری مدد کروں گا۔

غرض ہر طرح آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) ہوا ہوں اس کے بعد تین سال تک وحی منقطع ہو گئی اس وقت آپ اس قدر پریشان

تھے۔ کہ بعض دفعہ پہاڑ پر چڑھ کر ارادہ کرتے کہ یہاں سے گرا کر اپنے کو ہلاک کر دوں۔ یہ قبض ہی کی حالت تھی۔ اسی کو مولانا نے فرمایا ہے ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر اپنی قلبی حالت میں ذرہ بھر بھی کمی پاتا ہے)

آپ اشتیاق وحی میں بے چین تھے اور اس بے چینی میں کسی وقت اپنے کو ہلاک کرنے کا قصد فرماتے تھے کہ فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام ظاہر ہوتے اور آپ کی تسلی فرماتے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم اَبَدًا اَفْضَلُ مَا صَلّٰی عَلٰی اَحَدٍ مِنْ خَلْقِہٖ ۱۲ رحمت بھیجے اللہ تعالیٰ آپ پر ہمیشہ افضل اس رحمت جو اللہ تعالیٰ کسی پر اپنی مخلوق بھیجتے ہیں)

آپ اس امت کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں خدا تعالےٰ نے آپ کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بنایا ہے۔ تو جب قبض میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی تو دوسرا کون ہے جو اس پر راضی ہو اور ذرا بھی پریشان نہ ہو، ہاں اس پر رضا اس طرح ہو جاتی ہے کہ اس کے مصالح و منافع کے استحضار سے کسی قدر قلب کو شگفتگی ہو جاتی ہے۔ پھر ان مصالح کا علم کبھی تو اجمالی ہوتا ہے جس کو مولانا نے ان اشعار میں بیان فرمایا ہے ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو
آں صلاح تست آیس دل شو

(جب تجھ کو قبض پیش آئے ناامید مت ہو وہ تیری مصلحت کے لئے ہے)

محقق کے ارشاد سے اجمالاً معلوم ہو گیا کہ قبض میں بھی مصالح ہوتی ہیں۔ یہ کوئی بری حالت نہیں جس سے سالک خواہ مخواہ اپنے کو مردود سمجھنے لگے۔ اور فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بیں
تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں
(جب تجھ کو قبض پیش آئے تو اس میں بسط کا مشاہدہ کرکے
خوش و خرم ہو اور پیشانی پر بل نہ ڈال)

اس میں یہ بتلا دیا کہ قبض کے بعد بہت قوی ہوتا ہے۔ یہ کلمہ دراصل ایسا ہے جیسے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (یقیناً دشواری کے بعد آسانی) میں کلمہ مع بمعنی بعد تم اس کا خیال کرکے شاداں و فرحاں رہو پریشان نہ ہو۔ یہ تو اجمالی مصالح ہیں اور کبھی بعض مصالح کا تفصیلی علم بھی ہو جاتا ہے۔ تو اس سے پوری تسلی ہو جاتی ہے۔ مثلاً کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ بعض اوقات سالک پر بسط کی حالت میں کسی وارد کے عطا ہونے سے ایک نازکی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس وقت اگر حق تعالیٰ دستگیری نہ فرمائیں تو یہ کبر و عجب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو جاوے حق تعالیٰ نے اس کی یوں دستگیری فرمائی کہ قبض طاری کر دیا اور ساری کیفیات و واردات کو سلب فرما لیا۔ اب اس کی یہ حالت ہے کہ بجائے ناز و انداز کے یوں دیکھتا ہے کہ میں ساری دنیا سے زیادہ ذلیل ہوں اس وقت سچ مچ اس کو اپنے سے زیادہ ذلیل و حقیر کوئی نظر نہیں آتا چنانچہ ایک سالک نے قبض کی حالت میں مجھ سے یہ بیان کیا کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں فرعون و ہامان سے بھی بدتر ہوں یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور جب تک انسان ایسا ہی نہ بن جائے اس وقت تک اہل دل کا کلام سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا۔

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف اس وقت تک عارف نہیں ہوتا جب تک اپنے کو کافر فرنگ سے بدتر نہ سمجھے صاحب سالک پر واقعی ایسی حالت گزرتی ہے کہ وہ سچ مچ تمام مخلوق سے اپنے کو بدتر سمجھتا ہے۔ خیر اگر کسی پر یہ حالت نہ گزری ہو تو وہ اس کلام کو انجام ہی کے اعتبار سے

سمجھ لے کہ نہ معلوم میرا انجام کیسا ہو ممکن ہے کہ کافر فرنگ کا انجام مجھ سے اچھا ہو جائے کیونکہ حالت یہ ہے کہ ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما   گہ خندہ زند دیولہ ناپاکی ما
ایماں چو سلامت بہ گور بریم   تحقیق شود پاکی وناپاکی ما

(کبھی فرشتہ ہماری پاکی پر رشک کرتا ہے اور کبھی ہماری ناپاکی پر شیطان بھی ہنستا ہے ایمان اگر قبر تک سالم لے جائیں تو ہماری پاکی اور ناپاکی کی تحقیق ہو)

تو اپنے دل کو یہی سمجھانا چاہیئے کہ انجام معلوم ہونے سے پہلے مجھے کیا حق ہے کہ اپنے کو کسی سے افضل اور اچھا سمجھوں (اور گو سب سے بدتر ہونا بھی متیقن نہیں مگر محتمل تو ہے اور احتمال کی بنا پر اپنے کو اچھا سمجھنا مضر اور بُرا سمجھنا مفید ہے بشرطیکہ یاس کا درجہ نہ ہو اس لئے اپنے کو سب سے بُرا ہی سمجھنا چاہیئے ۱۲ ظ)

ایک شخص نے مجھ سے یہ پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے۔ میں نے کہا جائز ہے۔ اگر یہ اطمینان ہو کہ ہم اس سے اچھی حالت میں مریں گے۔ تو واقعی ہمیں کسی سے اپنے کو اچھا سمجھنے کا کیا حق ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ انجام کی کچھ خبر ہی نہیں ہے کہ کیا ہوگا۔ خوب کہا ہے ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را   در سنگلاخ بادیہ پیما بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش   ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل مت چل مرکب مردان خدا نے سنگلاخ جنگل میں راستہ قطع کیا ہے اور ناامید مت ہو کہ رندان بادہ نوش اچانک ایک ہی نالہ میں منزل مقصود کو پہنچ گئے)

تو صوفیہ کے اس کلام کی ایک موٹی سی توجیہ تو یہی ہے کہ خاتمہ کا خیال کر کے اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھتا رہے لیکن یہ تو عقل کے سمجھنے کے واسطے توجیہ ہے اور اہل

حال تو خاتمہ کے خیال سے قطع نظر کر کے بھی حالت موجودہ ہی میں اپنے کو سب سے بدتر سمجھتے ہیں۔ باقی اس کو میں سمجھا نہیں سکتا۔ بس ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم کہ چوما شوی بدانی

(کسی نے کہا کہ عاشقی کس کو کہتے ہیں میں نے جواب دیا کہ جب تو ہم جیسا ہو جائے گا اس کو جان لے گا)

بس اس وقت تو تقلیداً مان لیا جائے کہ سالکین پر ایسی حالت گزرتی ہے جیسا ہمارے ایک دوست نے کہا تھا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں فرعون وہامان سے بھی بدتر ہوں تو جب بسط میں غلبۂ واردات سے ناز کی سی کیفیت سالک میں پیدا ہونے لگتی ہے اس وقت حق تعالیٰ اس پر قبض طاری کر دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی عبدیت کا مشاہدہ کرے اور اپنے کو سب سے ذلیل وحقیر سمجھنے لگے اور دعوے اور ناز نہ کرے۔ تو دیکھئے یہ کتنی بڑی رحمت ہے۔ اگر اس وقت قبض وارد نہ کیا جاتا تو بسط میں تو یہ تباہ ہو جاتا کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ سالک کے لئے انوار حجاب راہ بنے ہوئے تھے ذکر میں جو اس پر تجلیات وانوار کا انکشاف ہوتا تھا یہ انہی کی سیر میں مشغول ہو گیا اور انہی پر اکتفا کرنے لگا حالانکہ مقصود توجہ الی الحق ہے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حجاب دو قسم کے ہیں ایک حجاب ظلمانی، ایک حجاب نورانی۔ حجاب ظلمانی تو یہی وساوس و خطرات ہیں جو ذکر کے وقت دنیوی امور کے متعلق قلب میں آیا کرتے ہیں۔ ان پر توجہ کرنا تو ظاہر ہے کہ مضر ہے۔ اور حجاب نورانی یہ ہے کہ عالم ملکوت کے انوار و تجلیات منکشف ہوں وہ بھی ایک عالم ہے جو کہ غیر خدا ہے اس لئے اس کی کیفیات پر بھی توجہ نہ کرنا چاہیئے۔ حضرت حاجی صاحب

یہ بھی فرماتے تھے کہ حجاب نورانی ظلمانی سے اشد ہے۔ کیونکہ اس میں بوجہ نورانی ہیئت کے زیادہ مشغولیت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ ایک نئی سی چیز ہے اس کو دیکھ کر سالک سمجھتا ہے کہ میں کامل ہوگیا حالانکہ وہ ہنوز غیر حق کے ساتھ الجھا ہوا ہے کیونکہ وہ انوار و تجلیات بھی اس کے شاغل عن الحق (حق سے پھیرنے والے) ہیں اور اس کو ان میں ایک لذت بھی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی وقت محجوب ہو جاتے ہیں تو بڑا رنج ہوتا ہے تو یہ میاں اب تک اپنی لذت ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں مقصود تک رسائی کہاں اس وقت حق تعالیٰ قبض طاری کرکے ان انوار و تجلیات کو سلب کر لیتے ہیں تاکہ سالک غیر حق سے ہٹ کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اس میں بندہ کی بڑی مصلحت ہوتی ہے ورنہ مقصود سے رہ جاتا پس اگر کسی وقت تمام انوار کو چھپا دیا جائے۔ تو یہ حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے ایسے وقت گھبرانا نہ چاہیئے غرض یہ چند مثالیں ہیں تفصیلی حکمتوں کی ان کے سوا اور بھی مصلحتیں قبض میں ہوتی ہیں جو اکثر سالک کو وقت پر خود ہی معلوم ہو جاتی ہیں تو ان اجمالی یا تفصیلی حکمتوں کے استحضار سے قبض میں تسلی ہو جاتی اور کچھ شگفتگی قلب میں آجاتی ہے ورنہ درحقیقت قبض تسلی کی چیز نہیں وہ تو موجب غم ہی ہوتا ہے۔ دراصل تسلی تو جب ہی ہوتی ہے جب کسی قسم کا بسط ہو رمعلومات دنیا میں بھی تو یہ بات ظاہر ہے کہ مال و متاع کا چوری ہو جاتا یا لُٹ جاتا تو موجب رنج ہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ثواب آخرت کو سوچ کر یا مال جانے کے بعد جو حفاظت و نگہداشت سے بے فکری ہوگئی۔ اس راحت کو مستحضر کرکے دل کو سمجھا لیا جائے مگر نفس مال کا چوری جانا ایسی چیز نہیں کہ انسان خود اس پر طبعاً راضی ہو جائے اُس سے تو ایک دفعہ کو صدمہ ہو ہی گا۔ اور اس کا تصور قائم کر لینا بھی موجب الم ہوگا۔ ہاں اس کے تصور کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں دل کو لگایا جائے تو کچھ تسلی ہو سکتی ہے

اسی طرح قبض بھی بظاہر متاع باطن کا لٹ جانا اس سے صدمہ اور پریشانی کا ہونا لازمی و طبعی امر ہے گو اس کے مصالح و منافع کی طرف قلب کو متوجہ کر کے تسلی حاصل ہو جائے۔ مگر خود نفس قبض پر دل راضی نہیں ہوتا نہ اپنی ذات سے تسلی کی شے ہے بلکہ جس طرح دنیا کے معاملات میں اصل تسلی کی چیز یہ ہے کہ روزانہ نئی آمدنی ہوتی رہے اور ہر دن چھنا چھن روپے ہاتھ میں آتے رہیں اسی طرح باطن میں اصل تسلی کی چیز بسط ہی ہے جس میں وقتاً فوقتاً یوماً فیوماً متاع باطن کو ترقی ہوتی رہتی اور جدید و لذیذ واردات ہر دم وارد ہوتے رہیں (۱۲ ظ)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کم گناہ کرنے والوں میں جو خاص لوگ ہیں انکی حالت یہ ہے کہ گناہ پر تو وہ کیا ہی صبر کر سکتے ہیں ایک ذرا سے قلبی تغیر اور وارد کے فوت ہونے پر ہی اُن کو قرار نہیں آتا اسی سے تو وہ بے چین اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے سن لیا کہ سالکین کی قبض میں کیا حالت ہوتی ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ تھوڑے گناہ والا بہ نسبت بہت گناہ والوں کے زیادہ پریشان ہوتا ہے اور جس کے پاس بالکل گناہ نہیں وہ اُس سے بھی زیادہ پریشان ہے۔ جس کے پاس تھوڑے سے گناہ ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے قرض لینا تو کبھی جانا ہی نہ ہو بلکہ اس سے بڑھ کر وہ ہمیشہ سے اس بات کا عادی ہو کہ اپنے پاس سو۱۰۰ پچاس روپے ہر وقت جمع رکھتا ہے کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتا اور ضرورت والوں کو ضرورت کے وقت دیتا دلاتا رہتا ہے۔ ایسے شخص کا اگر کبھی اتفاق سے ہاتھ خالی ہو جائے تو سمجھ لیجئے اس کو کتنی پریشانی ہوگی تھوڑے سے مقروض کو قلیل قرض سے وہ پریشانی نہ ہوگی جو اس شخص کو محض اپنا ہاتھ خالی ہو جانے سے ہوگی کیونکہ جس نے ہمیشہ دوسروں کو دیا ہو کبھی کسی سے ایک پیسہ کا ادھار نہ لیا ہو اس کو تو اس حالت کے

تصور سے بھی لرزہ آوے گا۔ کہ آج میرا ہاتھ خالی ہے اور شاید مجھے دوسروں سے مانگنا پڑے۔ اہل اللہ کی یہی حالت ہے۔ کہ گناہ تو کیا وہ تو احتمال گناہ سے کانپتے ہیں۔ واردات کے کم ہو جانے سے ہی گھبرا جاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے کسی قدر تنزل اور بُعد کا وہم سا ہو جاتا ہے ۱۲)

یہ سلسلۂ کلام اس پر شروع ہوا تھا کہ تھوڑے گناہ میں غم زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ابھی اس کو گناہ کے نشتر سے تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور جو لوگ واردات کی کمی سے بھی پریشان ہو جاتے ہیں وہ بھلا گناہ سے تو کیوں پریشان نہ ہوں گے یہی پریشانی ہے جو سب میں مشترک ہے کسی کو اس کا زیادہ احساس ہے کسی کو کم اور جو کسی کو اپنی اس حالت پر نظر اور تاسف بھی نہ ہو تو اس کی یہ حالت خود قابل تاسف ہے اول تو اپنے گناہوں پر نظر کر کے ہم کو خود رونا چاہیئے اور جو کسی کو رونا نہ آوے تو اس رونا نہ آنے پر رونا چاہیئے کہ افسوس میں ایسا سنگدل ہوں کہ مجھے اپنی بدحالی پر رونا بھی نہیں آتا اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اس کو کسی بات پر رونا نہیں آتا تو اسی پر کیوں آئے گا تو سمجھ لیجئے کہ اس رونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر رونے کی کوشش کرنی چاہیئے چاہے رونا آئے یا نہ آئے تو رونے کی صورت بنانی چاہیئے اس کی دلیل حدیث ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکَوْا (اگر رو نہ سکو تو رونے کی صورت ہی بنالو) اور اکثر قاعدہ تو یہ ہے کہ رونے کی کوشش کرنے سے رونا آہی جاتا ہے چنانچہ بہت دفعہ ایسا ہو جاتا ہے۔ اور اگر رونا بھی نہ آئے تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے تباکی ہی کو بکا کا بدل قرار دے دیا ہے اور جب کسی چیز کے لئے کوئی بدل ہوتا ہے تو وہاں مقصود کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو اصل و بدل میں مشترک ہو۔ تو معلوم ہوا کہ رونے سے جو مقصود ہے وہ رونے کی کوشش کرنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طبیب جب کوئی

دوا لکھ کر اس کا بدل بتلاتا ہے تو وہاں اس کا مقصود ایک ایسا اثر ہوتا ہے جو دونوں دواؤں میں مشترک ہے۔ پس جب تباکی بکائے عین کا بدل ہے تو معلوم ہوا کہ بکائے عین خود مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ چیز ہے جو اس میں اور تباکی میں مشترک ہے وہ کیا چیز ہے وہ بکار قلب ہے جس کو دل کا رونا کہتے ہیں پس تباکی میں گو آنکھ سے رونے کی صورت نہ پائی جائے مگر رونے کی حقیقت موجود ہے یعنی دل کا رونا اور دل کا رونا کیا ہے۔ اس کی حقیقت ہے فکر اور رنج وملال تو جو شخص رونے کی کوشش کرے گا ظاہر ہے کہ وہ اس سے خالی نہ ہوگا اس لئے اس تقریر پر شبہ نہ رہا۔

ایک دوست مجھ سے کہنے لگے کہ حج سے آ کر مجھے رونا ہی نہیں آتا گویا وہ اپنی اس حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ رونا نہ آنے پر رنج کرنا یہ بھی رونا ہی ہے۔ پہلے آپ کی آنکھ روتی تھی اس وقت ایک مصرع کے مصداق تھے۔

ع اے خوشا چشمیکہ آں گریان اوست

(وہ آنکھیں بہت اچھی ہیں جو اس کی محبت میں رونے والی ہیں)

اور اب دل روتا ہے اس وقت آپ دوسرے مصرعہ کے مصداق ہیں۔

ع اے خوشا آں دل کہ آں بریان اوست

(وہ دل بہت اچھا ہے جو اس کی محبت میں سوختہ ہے)

اور اصل مقصود دل کا رونا ہے آنکھ کا رونا مقصود نہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بار وعظ فرمایا تو لوگوں نے کپڑے پھاڑ دیئے۔ آپ نے فرمایا لَا تَشُقُّوْا جُيُوْبَكُمْ بَلْ شُقُّوْا قُلُوْبَكُمْ یعنی گریبان چاک نہ کرو بلکہ دلوں کو چاک کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں گریبان چاک کرنے والے قابل ملامت ہیں بلکہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ اصل

مقصود دل کا چاک کرنا ہے اس میں سعی کرنا چاہیئے۔ اور یہ حالت جس کی وجہ سے کپڑے چاک کئے جا رہے ہیں مقصود نہیں نہ یہ کچھ کمال ہے پس ایسے لوگ کامل نہیں ان کو اہل کمال تو نہ سمجھے مگر طعن بھی نہ کرے کیونکہ بعضے معذور بھی ہوتے ہیں چنانچہ اسی لئے شیخ سعدی شیرازیؒ جن کا لقب تاج الاولیاء ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مکن عیب درویش حیران و مست
کہ غرق ست ازاں می زند پا و دست

(درویش حیران و مست پر طعن تشنیع مت کرو کہ عشق میں غرق ہے اس وجہ سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے)

اس میں تو یہ تعلیم ہے کہ ان پر اعتراض نہ کرو آگے ان کی حالت بتا کر عذر ظاہر کرتے ہیں ؎

بہ تسلیم سر در گریباں برند
چو طاقت نماند گریباں درند

(تسلیم کے ساتھ سر جھکا لیتے ہیں جب طاقت نہیں رہتی گریبان پھاڑتے ہیں)

پس یہ لوگ معذور تو ہیں مگر صاحب کمال نہیں ہیں۔ ان کپڑے پھاڑنے والوں کی حکومت صرف ظاہر پر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے ظاہر ہی میں جو تصرف چاہتے ہیں کر ڈالتے ہیں باطن پر ان کی حکومت نہیں ہوتی۔ اور اہل کمال وہ ہیں جن کی حکومت ظاہر و باطن دونوں پر ہوتی ہے کہ وہ کسی قلبی حالت سے از جارفتہ نہیں ہو جاتے۔ وہ حالت ان پر غالب نہیں ہوتی بلکہ وہ خود حالت پر غالب ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں تشریف فرما تھے کسی نے کوئی عجیب شعر پڑھا اس پر ایک صوفی کو سخت وجد ہوا کہ قریب بہلاک ہو گیا

اور سارے مجمع پر ایک کیفیت طاری ہوگئی مگر حضرت جنید ویسے ہی وقار سے بیٹھے رہے جیسے تھے ان کو ذرا تغیر نہ ہوا تو کسی نے سوال کیا کہ اے جنید کیا تم کو اس شعر سے لطف نہیں آیا جو ذرا بھی وجد نہ ہوا تو آپ نے جواب دیا وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ یعنی پہاڑوں کو تم (قیامت میں) ایک جگہ پر ٹھہرا ہوا دیکھو گے حالانکہ وہ ایسے تیز چلتے ہوں گے جیسے بادل چلا کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ ہلکے ظرف تھے۔ ان کی حرکت سب کو نظر آگئی اور کامل پہاڑ کی طرح ہے کہ اس کی حرکت نظر نہیں آتی ظاہر میں وہ ساکن معلوم ہوتا ہے اور نہ درحقیقت وہ بہت تیز جا رہا تھا اور ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ صاحب کمال اور انوار باطنیہ سے مالا مال کون ہوا ہوگا مگر بجز ایک آدھ قصہ کے مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیکر بیہوش ہوگئے تھے۔ باقی صحابہ سے عموماً یہ بات ثابت نہیں ہے کہ کسی نے جوش و ولولہ میں کپڑے پھاڑ دیئے ہوں یا بیہوش ہوگئے ہوں یا ناچنے لگے ہوں اور اگر ایک آدھ سے کبھی اتفاقیہ بیہوش ہو جانا ثابت بھی ہے تو کون سے جو حضرت ابوبکر نہ تھے حضرت عمر فاروق نہ تھے۔ حضرت عثمان نہ تھے۔ حضرت علی نہ تھے رضی اللہ عنہم حالانکہ یہ حضرات اکمل الصحابہ ہیں تو ان کے سامنے موجود نہ تھے۔ ان میں ایک آدھ قصہ شاذ و نادر ایسا ہو گیا عموماً ان کی بھی یہ حالت نہ تھی۔ حضرات صحابہ میں جو سب سے زیادہ کامل ہیں وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل مزاج ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حادثہ وصال مسلمانوں کے لئے کچھ کم جانکاہ نہ تھا حضرات صحابہ اس پر جس قدر بھی روتے تھوڑا تھا۔ اور نہ معلوم ہمارے سامنے یہ حادثہ ہوتا تو ہم لوگ کیا سے کیا کر ڈالتے مگر حضرات صحابہ نے بجز آنسو بہا لینے اور تنہا بیٹھ کر رو لینے کے کچھ نہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بظاہر صحابہ میں سب سے زیادہ مضبوط اور دلیر و مستقل مزاج نظر آتے تھے مگر اس وقت ان کی بھی یہی حالت تھی کہ حواس باختہ ہوگئے اور تلوار ہاتھ میں لیکر پکارتے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا۔ اس کی گردن اڑا دوں گا۔ آپ زندہ ہیں اور ابھی منافقین کی خبر لیں گے۔ یہ خبر سن کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دوڑے ہوئے عوالی سے تشریف لائے اور سیدھے حضرت عائشہ کے گھر میں جا پہنچے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا

وصال ہو ہی چکا تھا۔ حضرت صدیقؓ نے چادر چہرہ مبارک سے ہٹائی اور بے اختیار پیشانی انور کا بوسہ لیا۔ اس وقت حضرت صدیقؓ سب سے زیادہ مضبوط نکلے ان کی زبان سے وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یقین ہو جانے کے بعد کوئی بات نہیں نکلی سوا اس کے کہ ایک دو دفعہ اتنا کہا وَاخَلِیْلَاہُ وَاحَبِیْبَاہُ لَقَدْ طِبْتَ حَیًّا وَمَیِّتًا وَلَانْتَ اَکْرَمُ عَلَی اللّٰہِ مِنْ اَنْ یُّذِیْقَکَ الْمَوْتَ مَرَّتَیْنِ (رواہ کما قال) (ہائے خلیل ہائے محبوب آپ زندگی میں خوشبودار تھے موت میں بھی خوشبودار ہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرم اس بات سے کہ دو مرتبہ موت کا ذائقہ چکھیں) اس کے بعد غایت ضبط کے ساتھ حجرہ سے باہر آئے صحابہ تمام کے تمام حضرت صدیق کے منہ کو تک رہے تھے کہ دیکھئے ان کے منہ سے کیا نکلتا ہے اور یہ کیا خبر سناتے ہیں۔ حضرت صدیقؓ نے اول تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا عَلٰی رِسْلِکَ یَارَجُلُ۔ اے شخص بس ٹھہر جا مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور برابر اسی بات کو پکارتے رہے۔ اس کے بعد حضرت صدیق سیدھے ممبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر تشریف لے گئے اور خطبہ ماثورہ کے بعد فرمایا اَیُّھَا النَّاسُ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا ط وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ ۔ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عِنْدَ رَبِّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ یعنی اے لوگو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معبود سمجھتا ہو تو وہ سن لے کہ آپ کا تو وصال ہو گیا۔ اور جو خدا تعالیٰ کو معبود سمجھتا ہو اس کی عبادت کرتا ہو تو وہ سن لے کہ خدا حی لایموت ہے وہ کبھی نہ مریگا اس کے بعد یہ آیت پڑھی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مرجائیں یا قتل ہو جائیں تو تم دین حق سے اُلٹے پاؤں ہٹ جاؤ گے۔ اور جو اس طرح ہٹے گا وہ خدا تعالےٰ کو کچھ بھی نقصان نہ دیگا (اپنا نقصان کرے گا) اور حق تعالیٰ (ایسے وقت میں) شکر و حمد کرنے والوں کو جزا دیں گے اور یہ آیت بھی پڑھی اِنَّکَ مَیِّتٌ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں کہ آپ بھی ایک دن مرنے والے ہیں اور یہ کفار بھی پھر تم سب قیامت کے دن اپنا جھگڑا خدا کے پاس لیجاؤ گے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو یہ مضمون اور یہ آیتیں سنیں تو سمجھ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا۔ اب ان سے کھڑا بھی نہ ہوا گیا۔

مارے غم کے تلوار ٹیک کے بیٹھ گئے اور رونے لگے صحابہ فرماتے ہیں کہ یہ آیات ہمارے ذہن سے اس وقت بالکل غائب ہو گئی تھیں جس وقت حضرت صدیق ؓ نے منبر پر ان کو پڑھا ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی اتر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوا مگر تھوڑی ہی دیر میں سب صحابہ سنبھل گئے اور دین کے کاموں میں مشغول ہو گئے مگر جیسے حضرت صدیق ؓ افضل الصحابہ تھے ویسے ہی اس وقت سب سے زیادہ صاحب ضبط و استقلال بھی نکلے۔

ایک واقعہ حضرت صدیق ؓ کے استقلال کا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ قبائل عرب مرتد ہو گئے تھے۔ جن میں بعض تو مسیلمہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہو گئے اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے توحید و رسالت کے مقر رہے کعبہ کو قبلہ مانتے رہے۔ نماز کی فرضیت کے قائل رہے مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے مخصوص تھی اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا اس لئے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی اس لئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آجکل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں پہلی جماعت کے بارے میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے۔ مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جائے ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے۔ حضرت صدیق ؓ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کریگا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہو سکتا ہے۔ اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت صدیق ؓ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں کہ نماز کو تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے۔ تو یہ لوگ فرض

قطعی کے منکر ہیں۔ اور) ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ (جو شخص آپ کے دین کو بدل دے پس اس کو قتل کر دو) اس لئے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے۔ حضرت صدیقؓ نے فرمایا اَجَبَّارٌ فِی الْجَاهِلِیَّةِ خَوَّارٌ فِی الْاِسْلَامِ وَاللّٰہِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ وَفِیْ رِوَایَةٍ عِنَاقًا وَّعِقَالًا کَانُوْا یُؤَدُّوْنَہٗ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاُقَاتِلَنَّھُمْ عَلَیْہِ اے عمر یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے ہو گئے بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا ایک بکری کے بچے کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہونگا تو خدا میرے ساتھ ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے اس وقت قلب کی چنانچہ پھر سب صحابہؓ حضرت صدیقؓ کی رائے پر متفق ہو گئے۔ اور بعد میں اقرار کیا کہ اس وقت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ہم لوگوں کو سنبھالا ورنہ ہم گمراہی میں پڑ چکے تھے کہ ان[1] لوگوں کو مسلمان سمجھتے تھے ۱۲ ظ) اس واقعہ سے حضرت صدیقؓ کے استقلال و قوت قلب کا

[1] کتب احادیث و تاریخ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے۔ کہ مانعین زکوٰۃ کے مرتد ہونے پر حضرات صحابہؓ نے اجماع کر لیا تھا باوجودیکہ وہ اپنے کو مسلمان کہتے اور نماز پڑھتے تھے اور جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ ملے تھے تو یہاں ایک بڑی معتد بہا ایسے اہل حدیث کی غلطی واضح ہو گئی جو اس زمانہ میں جماعت قادیانی کے متعلق اپنی کی ہے تو وہ کہتا ہے کہ شریعت میں مرتد وہ ہے جو جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار میں جا ملے۔ اور جو ایسا نہ کرے بلکہ اپنے کو مسلمان کہے وہ مرتد نہیں اس لئے قادیانی جماعت مرتد نہیں کیونکہ وہ اپنے کو حلقہ بگوش اسلام کہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ یہ جماعت بہت سے ضروریات اسلام کا صریح انکار کرتی ہے اس لئے اس کی وہی شان ہے جو مرتدین مانعین زکوٰۃ کی تھی۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ قادیانی کو نبی کہتے ہیں۔ تو اب اس کی وہ شان ہے جو مسیلمہ کذاب کے متبعین کی تھی۔ کیونکہ مسیلمہ کذاب اور اس کے متبعین بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے منکر نہ تھے اور بعض لوگ قادیانی کو نبی نہیں مگر ولی اور مجدد کہتے ہیں حالانکہ وہ صریح کافر ہے۔ بیشمار کفریات اس کے اقوال میں موجود ہیں اور کافر کو ولی یا مجدد کہنا بھی کفر ہے اس لئے جماعت قادیانی کے سب فرقے مرتد ہیں ۱۲ ظ۔

بخوبی پتہ چلتا ہے کہ تمام صحابہ کے اختلاف کرنے پر بھی وہ تنہا اس جماعت کے مقابلہ پر آمادہ ہے غرض صحابہ میں جو سب سے افضل تھے وہ سب سے زیادہ مستقل اور قوی القلب تھے اور یہ بات تو تمام صحابہ میں تھی کہ وہ غلبہ حالات وکیفیات سے کبھی مغلوب نہ ہوتے تھے اسی لئے نہ وہ کبھی وجد میں رقص کرتے تھے نہ کپڑے پھاڑتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ یہ کپڑے پھاڑنے والے گو معذور ہوں مگر صاحب کمال نہیں کامل کو ضبط کیفیت پر پوری قدرت ہوتی ہے۔ ہمارے مشائخ میں سے حضرت شیخ عبد الحق رودلوی قدس اللہ سرہٗ کا ارشاد ہے۔ "منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد۔ ایں جا مرد انند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند" یعنی منصور طریق سلوک میں بچے تھے کہ ایک قطرہ پی کر فریاد کرنے لگے اور جوش میں آکر انا الحق کہہ بیٹھے اور یہاں مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جائیں اور ڈکار تک نہ لیں ان حضرات کا دریا وجد یا رقص یا شطح کی صورت سے نہیں بہتا البتہ ان کا دریا دوسری راہ سے نکلتا ہے یعنی افادات و نفع رسانی کی راہ سے کہ وہ اپنے جوش وخروش کو طالبین کی توجہ میں صرف کرتے ہیں جس سے ہزارہا مخلوق درجۂ ولایت پر پہنچ جاتی ہے یا اگر کبھی بہت ہی غلبہ ہوا تو ان کا دریا آنسوؤں کی راہ سے بھی کسی وقت بہہ نکلتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں — یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

(اے اللہ چشمہ محبت کیسا چشمہ ہے کہ اس کا میں نے ایک قطرہ پیا اور آنسوؤں کا دریا ہوگیا)

یہ حضرات بڑے عالی ظرف ہوتے ہیں بہت ضبط کرتے ہیں ہاں کبھی ضبط پورا نہ ہوسکا تو آنکھوں سے آنسو بہا لیتے ہیں اور یہ نقص نہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ نماز میں بعض دفعہ آپ روتے تھے تو سینے سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے ہنڈیا پکتی ہو۔ الغرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو لوگ چلاتے چیختے اور کپڑے پھاڑتے ہیں وہ اہل کمال نہیں ہیں اسی لئے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا لَا تَشُقُّوْا جُیُوْبَکُمْ بَلْ تَشُقُّوْا قُلُوْبَکُمْ (اپنے دامنوں کو نہ پھاڑو اپنے دلوں کو چیرو)

ہاں صاحب حال ہیں اسی واسطے شیخ سعدی ان پر ملامت وطعن سے منع فرماتے ہیں ؎

مکن عیب درویش حیران ومست — کہ غرق است ازاں می زند پا و دست

(درویش حیران ومست یعنی صاحب حال پر طعن مت کرو۔ اس لئے کہ وہ محبت میں غرق ہے اس وجہ سے ہاتھ پیر مارتا ہے)

کیونکہ صاحب حال معذور ہوتا ہے۔ مگر آجکل لوگ اسی کو کمال سمجھتے ہیں کہ بات بات پر وجد آئے رقت طاری ہو کپڑے پھاڑنے لگیں تو خوب سمجھ لو کہ یہ کمالات نہیں ہاں حالات ہیں اور یہ حالات بھی ایسے جو مطلوب ہیں نہ مذموم کیونکہ حالات مطلوبہ تو وہی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے مشابہ ہوں جتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشابہت ہوگی اتنا ہی زیادہ کمال ہوگا۔ باقی کیفیات نہ ضروری ہیں نہ کمال ہیں (گو مضر بھی نہیں بلکہ ان کا وجود علامت ہے تاثیر ذکر کی) اسی لئے میں نے کہا تھا کہ اصل مقصود دل کا رونا ہے آنکھ کا رونا نہیں اصل مقصود نہیں۔ کیونکہ حدیث میں آچکا ہے فَإِنْ لَمْ تَبْكُوا فَتَبَاكَوْا (اگر رونا نہ آتا ہو تو رونے کی کوشش کرو) اگر بکا ہی مقصود ہوتا تو رونے کی کوشش کرنا اس کا قائم مقام نہ ہوتا بہرحال ہم لوگوں کی حالت قابل اصلاح ضرور ہے اور جو لوگ گناہوں میں کم بھی مبتلا ہیں ان کو بھی اس حالت پر تاسف ہونا چاہیئے اور جس کو تاسف نہ ہو اس کو اس تاسف نہ ہونے پر تاسف ہونا چاہیئے۔ خاصکر جب یاد دہانی کیجائے کیونکہ بعض دفعہ خود اپنی کسی حالت پر تاسف نہیں ہوتا مگر دوسرے کی تنبیہ سے خیال پیدا ہو جاتا ہے مگر خیر غنیمت ہے کہ جن لوگوں کو اپنی بدحالی پر تاسف بھی نہیں ہے وہ بھی اپنی بدحالی کے مقر تو ضرور ہیں کیونکہ گنہگار ہونے کا ہر شخص کو اقرار ہے تو مرض کا احساس تو سب کو ہے مگر کوتاہی یہ ہے کہ علاج کی فکر نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مرض کا علاج نہ کرنا سخت خطرناک ہے تو علاج ڈھونڈنا ضروری ہوا۔ سو اس آیت میں جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس مرض عام کا علاج موجود ہے۔ اسی لئے اس کو بیان کیلئے اختیار کیا گیا ہے میں اول ترجمہ کرتا ہوں اس کے بعد مقصود کی توضیح کروں گا حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کا کیسا لحاظ فرماتے ہیں کہ یوں نہیں فرمایا وَلَا تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ جس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں کیونکہ آیت کے مخاطب مسلمان ہیں (اور خدا کے بھولنے والے کافر ہیں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس طرح خطاب کرنا گوارا نہیں فرمایا کہ تم خدا کے بھولنے والے نہ بن جانا بلکہ یہ فرمایا کہ دیکھو بھولنے والوں کے مشابہ نہ ہو جانا اس میں جس قدر عنایت و لطف ہے ظاہر ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کو بھول جانا تو تمہاری محبت سے بعید ہے۔ ہاں بھولنے والوں کی طرح ہو سکتے ہو تو ہم تم سے کہتے ہیں کہ تم ایسے بھی نہ ہونا اس لئے لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ (تم ان لوگوں کے مشابہ نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں) فرمایا۔

دوسرے یہ بھی اس میں نکتہ ہو سکتا ہے کہ خدا کا بالکل بھولنے والا کافر ہے۔ اور آیت کے مخاطب مسلمان ہیں اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا اس لئے مسلمانوں کو لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ (ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں) کے ساتھ خطاب ہو بھی نہیں سکتا۔ بلکہ ان کو تو لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ (تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول گئے ہیں) ہی سے خطاب ہو سکتا ہے۔ اس پر مجھے حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد آئی مولانا فرماتے تھے کہ جو مسلمان ہو گیا وہ کافر کبھی نہیں ہو سکتا ہے اور یہ جو بعضے مسلمان آریہ وغیرہ ہو جاتے ہیں وہ حقیقت میں مسلمان ہی نہ تھے ان کو ایمان نصیب ہی نہیں ہوا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتا ہو اور اس کے دل میں ایمان نہ ہو کیونکہ زبانی دعوے سے دل میں ایمان کا ہونا لازم نہیں تو ممکن ہے کہ ایک مدعی اسلام عند اللہ مسلمان نہ ہو بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جو لوگ مرتد ہوتے ہیں وہ عند الناس بھی مسلمان نہیں تھے اور ہم لوگوں کا ان کو مسلمان سمجھنا محض حسن ظن پر مبنی تھا کہ نیک گمان کی وجہ سے ہم نے ان کی حالت میں غور نہیں کیا۔ اور اگر دعویٰ اسلام کی حالت ہی میں اُن کے اقوال و افعال کو غور سے دیکھا جاتا تو ہم کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ان کو ایمان نصیب نہیں ہوا چنانچہ میں آپ کو ایک عجیب عبرت انگیز حکایت سناتا ہوں جو میں نے مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی تھی مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ دہان (تاجر روغن) نے جو مکہ مکرمہ کے ایک بڑے عالم تھے فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں ایک عالم کا انتقال ہوا اور ان کو دفن کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کسی دوسرے شخص کا انتقال ہوا تو اس کے وارثوں نے ان عالم صاحب کی قبر میں ان کو دفن کرنا چاہا مکہ مکرمہ میں یہ دستور ہے کہ ایک قبر میں کئی کئی مردوں کو دفن کر دیتے ہیں چنانچہ ان عالم صاحب کی قبر کھودی گئی تو دیکھا کہ ان کی لاش کے بجائے ایک نہایت حسین لڑکی کی لاش رکھی ہوئی ہے اور صورت دیکھنے سے وہ لڑکی یورپین معلوم ہوتی تھی۔ سب کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اتفاق سے اس مجمع میں یورپ سے آنے والا ایک شخص بھی موجود تھا اس نے جو لڑکی کی صورت دیکھی تو کہا میں اس کو پہچانتا ہوں یہ لڑکی فرانس کی رہنے والی اور ایک

عیسائی کی بیٹی ہے یہ مجھ سے اردو پڑھتی تھی۔ اور در پردہ مسلمان ہوگئی تھی میں نے اس کو دینیات کے چند رسالے بھی پڑھائے تھے۔ اتفاق سے بیمار ہو کر انتقال کر گئی اور میں دل برداشتہ ہو کر نوکری چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کے یہاں منتقل ہونے کی وجہ تو معلوم ہوگئی کہ مسلمان اور نیک تھی لیکن اب یہ بات دریافت طلب ہے کہ ان عالم صاحب کی لاش کہاں گئی بعض لوگوں نے کہا کہ شاید عالم کی لاش اس اس لڑکی کی قبر میں منتقل کر دی گئی اس پر لوگوں نے اس سیاح سے کہا کہ تم حج سے واپس ہو کر یورپ جاؤ تو اس لڑکی کی قبر کھود کر ذرا دیکھنا کہ اس میں مسلمان عالم کی لاش ہے یا نہیں اور کوئی صورت شناس بھی ساتھ کر دیا چنانچہ وہ شخص یورپ واپس گیا اور لڑکی کے والدین سے اس کا یہ حال بیان کیا اس پر ان کو بڑی حیرت ہوئی کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی کو دفن تو کیا جائے فرانس میں اور تم اس کی نعش مکہ میں دیکھ لو آخر رائے یہ قرار پائی کہ اس لڑکی کی قبر کو کھود و۔ چنانچہ اس کے والدین اور چند لوگ اس حیرت انگیز معاملہ کی تفتیش کے لئے قبرستان چلے اور لڑکی کی قبر کھودی گئی تو واقعی اس کے تابوت میں اس کی لاش نہ تھی بلکہ اس کے بجائے وہ مسلمان عالم مقطع صورت وہاں دھرے ہوئے تھے جن کو مکہ میں دفن کیا گیا تھا۔ شیخ دہان نے فرمایا کہ اس سیاح نے کسی ذریعہ سے ہم کو اطلاع دی کہ اس عالم کی لاش یہاں فرانس میں موجود ہے۔ اب مکہ والوں کو فکر ہوئی کہ لڑکی کا مکہ پہنچ جانا تو اس کے مقبول ہونے کی علامت ہے اور اس کے مقبول ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی مگر اس عالم کا مکہ سے کفرستان میں پہنچ جانا کس بنا پر ہوا اس کے مردود ہونے کی کیا وجہ ہے۔ سب نے کہا کہ انسان کی اصلی حالت گھر والوں کو معلوم ہوا کرتی ہے۔ اس کی بی بی سے پوچھنا چاہیئے چنانچہ لوگ اس کے گھر گئے اور دریافت کیا کہ تیرے شوہر میں اسلام کے خلاف کوئی بات تھی اس نے کہا کچھ بھی نہیں وہ تو بڑا نمازی اور قرآن کا پڑھنے والا تہجد گزار تھا۔ لوگوں نے کہا سوچ کر بتلاؤ کیونکہ اس کی لاش دفن کے بعد مکہ سے کفرستان میں پہونچ گئی ہے کوئی بات اسلام کے خلاف اس میں ضرور تھی اس پر بی بی نے کہا ہاں میں اس کی ایک بات پر ہمیشہ کھٹکتی تھی وہ یہ کہ جب وہ مجھ سے مشغول ہوتا اور فراغت کے بعد غسل کا ارادہ کرتا تو یوں کہا کرتا تھا کہ نصاریٰ کے مذہب میں یہ بات بڑی اچھی ہے کہ ان کے یہاں غسل جنابت فرض نہیں لوگوں نے کہا بس یہی بات ہے جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اس کی لاش کو مکہ سے اسی قوم کی جگہ پھینک دیا جن کے طریقہ کو وہ پسند کرتا تھا۔ حضرات آپ نے دیکھا کہ یہ شخص ظاہر میں عالم متقی اور پورا مسلمان تھا مگر تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں

ایک بات کفر کی موجود تھی کہ وہ کفار کے ایک طریقے کو اسلامی حکم پر ترجیح دیتا تھا اور استحسان کفر کفر ہے۔ اس لئے وہ شخص پہلے ہی سے مسلمان نہ تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ لاش منتقل ہو جایا کرے۔ مگر خدا تعالیٰ کہیں ایسا بھی کر کے دکھلا دیتے ہیں تاکہ لوگوں کو عبرت ہو کہ بدحالی کا نتیجہ یہ ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ جو کافر ہوتا ہے اس میں اول ہی سے کوئی بات کفر کی ہوتی ہے جو تفتیش اور غور کے بعد ہم کو بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر ہم غور نہیں کرتے اس لئے کہہ دیتے ہیں کہ مسلمان آریہ ہو گیا حالانکہ وہ پہلے ہی سے آریہ تھا اس میں اسلام تھا ہی نہیں مگر ہم کو اس کی بدحالی کا علم نہ تھا ورنہ جو مسلمان ہو گا وہ کبھی کافر نہیں ہو سکتا اسی لئے شیطان کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ کہ وہ پہلے ہی کافروں میں سے تھا سجدۂ آدم علیہ السلام سے انکار کرنے کے وقت ہی کافر نہیں ہوا جس کا راز اہلِ تحقیق نے اس طرح فرمایا ہے کہ ؎

در لوح بُد نوشتہ کہ ملعوں شود یکے — بردم گماں بہر کس و برخود گماں نبود
آدم ز خاک بود و من از نور پاک او — گفتم منم یگانہ و او خود یگانہ بود

یعنی لوح محفوظ میں پہلے ہی سے لکھا ہوا تھا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ایک شخص کافر ہوگا یعنی اس وقت اس کا کفر ظاہر ہوگا ۱۲) اور شیطان لوح محفوظ کو پڑھ کر اس واقعہ سے باخبر تھا کہ ایک شخص کافر ہونے والا ہے۔ مگر اس کو کبھی اپنے متعلق یہ احتمال نہ ہوا کہ شاید وہ میں ہی ہوں وہ اپنی طاعت و عبادت کی وجہ سے بےفکر تھا کہ بھلا اتنا بڑا عابد کبھی کافر ہو سکتا ہوں ہرگز نہیں یہ کوئی اور شخص ہوگا اس تکبر اور بےفکری ہی نے اسکو تباہ کیا (ورنہ ملائکہ کی یہ حالت تھی کہ اس خبر کو دیکھ کر سب کے سب تھرا گئے تھے کہ دیکھئے کس کی کمبختی آنے والی ہے اس تواضع اور خشیت ہی سے وہ مقبول و مکرم رہے ۱۲) حاصل راز کا یہ ہوا کہ اس کا عجب و پندار اساس تھی کفر کی اور وہ اس میں پہلے ہی سے تھا جس کے لئے مردودیت لازم ہے۔ غرض شیطان پہلے ہی سے مقبول نہ تھا اس لئے مردود ہو گیا ورنہ جو مقبول ہو جاتا ہے وہ کبھی مردود نہیں ہوتا جیسے بالغ کبھی نابالغ نہیں ہوتا مگر یہ بھی خبر ہے کہ بالغ کون ہے۔ ہر زبان سے دعویٰ اسلام کرنے والا بالغ نہیں بلکہ بالغ وہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

خلق اطفال اند جز مست خدا — نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(بجز مست (عشق) الٰہی کے تمام مخلوق (گویا) اطفال ہیں پس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا) یعنی جس نے اسلام کے بعد حکم الٰہی کے سامنے اپنی ہوا و ہوس کو فنا کر دیا ہو وہ بالغ ہے باقی سب نابالغ

ہیں پس جو شخص اسلام سے مرتد ہو کر اپنا نابالغ ہونا ظاہر کرتا ہے وہ ابھی تک بالغ ہوا ہی نہ تھا بلکہ اس وقت تک نابالغ تھا۔ حدیث میں بھی تو ہے کہ ہرقل نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ان کے اسلام لانے سے پہلے دریافت کیا تھا کہ کیا اس دین کو اختیار کر کے کوئی شخص کراہت کے ساتھ اس کو چھوڑتا بھی ہے حضرت ابوسفیان نے کہا نہیں ہرقل نے اس پر کہا وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَتَهُ الْقُلُوْبُ یعنی ایمان کی یہی حالت ہوتی ہے کہ جب وہ قلوب میں پیوستہ ہو جاتا ہے پھر نہیں نکلتا کیونکہ ایمان ایک عشق ہے اور عشق اگر سچا ہو تو کبھی دل سے نہیں نکلتا حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی نہیں نکلتا جیسے کہ اگر کسی کو غیر اللہ سے محبت ہو جائے تو وہ بھی مر کر نہیں جاتی۔ اسی کو کہا ہے ؎

رفتم اندر تہ خاک و انس بتانم باقی ست (میں تہ خاک ہو گیا اپنے معشوقوں کی محبت باقی ہے)

اسی لئے اہل اللہ اپنے دل میں کسی ناجائز محبت کو بھی جمنے نہیں دیتے کیونکہ مرنے کے وقت اس محبوب کا خیال آوے گا اور ان کا اصل مدعا یہ ہے کہ جب دنیا سے جاویں تو اس وقت کسی کی محبت بجز خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں نہ ہو اہل اللہ نے تو جنت کی بھی رغبت نہیں کی۔ حضرت عمر بن الفارض رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کر دی گئیں انہوں نے منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا ؎

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِيْ فِي الْحُبِّ عِنْدَكُمْ مَا قَدْ رَاَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِيْ

اگر آپ کے نزدیک میری محبت کی یہی قدر ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کئے ساری عمر یوں ہی برباد گئی فَحُجِبَتِ الْجِنَانُ وَتَجَلّٰى لَهُ الرَّبُّ تَعَالٰى وَطَارَ رُوْحُهُ فَرَحًا بِهٖ پس اسی وقت جنتیں چھپا دی گئیں اور حق تعالیٰ کی خاص تجلی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جان نکل گئی اور بالکل وہ حالت ہوگئی ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما

(اگر منکر نکیر آ کر مجھ سے سوال کریں کہو تمہارا رب کون ہے تو میں جواب دوں گا وہی ہے جو ہمارے دل دیوانہ کو لے گیا)

اور جان نکلنے کے قریب یہ حالت تھی ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

(اگر ملک الموت میری جان لینے کو آجائے تو جب تک رخ انور نہ دیکھ لوں جان نکلنے نہ دوں گا)

واقعی عمر بن الفارضؒ نے تو یہ کر کے دکھلا دیا کہ بدون تجلی الٰہی کے جان ہی نہ دی جیلان حضرات

کو جنت پر بھی توجہ نہیں ہوتی تو دوسروں کی طرف تو کیا التفات ہوگا مگر یہ تو صاحب حال تھے ان کو جنت سے منہ پھیرنے کا حق تھا۔ ہم کو بدون اس حال کے ایسا دعویٰ نہ چاہیئے ہم کو تو اگر وہاں دنیا کی روٹی بھی مل جائے تو غنیمت ہے بعض لوگ اکثر ڈینگیں مارا کرتے ہیں کہ ہم کو جنت کی کیا پرواہ ہے۔ ہم کو حوروں کی کیا پرواہ ہے۔ یہ نہایت سخت بات ہے ہر شخص کا منہ اس بات کے قابل نہیں ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد   چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد روے نازیبا و ناز   عیب باشد چشم نابینا و باز

(ناز کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس مت جاؤ بدصورت کو ناز کرنا برا ہے آنکھ اندھی ہو اور کھلی ہو عیب میں شمار ہوتی ہے)

اور ؎ پیش یوسف نازش و خوبی مکن   جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

(یوسفؑ کے سامنے ناز اور اپنی مت بیان کرو سوائے نیاز اور آہ یعقوبی مت بیان کرو)

چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش   ہمچو او با گریہ و آشوب باش

(جب تم یوسفؑ نہیں ہو یعقوبؑ جیسے بنو ان کی طرح سے گریہ وزاری کرو)

غرض ہم لوگ اہل نیاز ہیں ہم کو ناز نہ چاہیئے بلکہ احتیاج ظاہر کرنا چاہیئے جو لوگ جنت سے لاپروائی کی ڈینگیں مارتے ہیں ان کو چار دن روٹی نہ ملے تو حقیقت کھل جائے اسی وقت لوگوں سے قرض ادھار یا خیرات مانگنے لگیں تو جس کو چار روٹیوں سے بھی استغنا نہ ہو اس کو جنت سے لاپروائی کا دعویٰ کب زیبا ہے۔ خیر وہ تو صاحب حال تھے۔ مگر یہی بات کہ محبت مرتے دم تک بلکہ مرنے کے بعد بھی دل سے نہیں نکلتی اس لئے اہل اللہ ناجائز محبت سے بھی بچتے ہیں ہم اگر ایسا نہ کر سکیں تو کم از کم حرام محبت سے تو بچنا چاہیئے اس واقعہ سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ حق تعالیٰ کے چاہنے والوں کی یہ حالت ہوا کرتی ہے کہ وہ مرتے وقت بجز جمال محبوب کے اور کسی خیال میں نہیں ہوتے واقعی جینا اور مرنا اُن ہی کا ہے اور اگر ہم بھی ان کے ساتھ وابستہ ہو جائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ یہ دولت ہم کو بھی حاصل ہو جائیگی اور ہم بھی مرتے وقت ایسے ہی ہوں گے لیکن اگر یہ بات نہ ہو تو ایسا تو ہونا چاہیئے کہ اس وقت کوئی ناجائز محبت دل میں نہ ہو۔ اور اسکا طریقہ یہی ہے کہ زندگی میں محبت حرام سے بچو اگر زندگی میں اس میں مبتلا ہو گیا تو مرتے وقت بھی وہ ستا رہے گی غرض عشق خواہ حلال ہو یا حرام دل سے کبھی نہیں نکل سکتا اسی لئے ہرقل نے کہا تھا کہ ایمان دل میں رچ جانے کے بعد نہیں نکلا کرتا کیونکہ ایمان نام ہے عشق خداوندی کا

چنانچہ نص وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (اور مومن اللہ کی محبت میں سخت تر ہیں) اس کی کافی دلیل ہے پس حاصل یہ ہے آیت میں تشبیہ کے اختیار کرنے کے دوسرے نکتہ کا یعنی چونکہ مخاطب مسلمان ہیں اس لئے وہ خطاب وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ (تم ان لوگوں سے نہ ہونا جو خدا کو بھول گئے ہیں) کے محل نہیں ہو سکتے یعنی وہ کبھی خدا کو دل سے بالکل بھلا نہیں سکتے اس واسطے حق تعالیٰ نے وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ (تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اللہ کو بھول گئے ہیں) فرمایا اور اس میں بہ نسبت نکتہ اولیٰ کے زیادہ مبالغہ ہوا کیونکہ اس نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ تھا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا بعید ہے لیکن بھول سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے پھر بھی عنایت وشفقت کی بنا پر یہ نہیں فرمایا کہ تم ہم کو بھولنا بلکہ یہ فرمایا کہ بھولنے والوں کی طرح نہ ہونا اور دوسرے نکتہ کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا ممکن ہی نہیں کیونکہ بالکل بھول جانا کافر کا کام ہے اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا)

آگے ارشاد ہے فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ کہ جب وہ خدا کو بھول گئے تو خدا تعالیٰ نے ان کے نفسوں کو بھی ان کو بھلا دیا یہاں ایک نکتہ ہے گو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر خیر دل میں آئی ہوئی بات کو کیوں روکوں شاید کسی کو نفع ہو جائے. وہ نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کہ ہم انسان کی جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں تو جو شخص جان سے زیادہ قریب کو بھول جائے تو ممکن نہیں کہ وہ اپنے کو یاد رکھے حقیقت میں خدا کو بھولنے والا اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا ہے. اگر کوئی یہ کہے کہ جو اپنے آپ کو بھی بھول گیا اس کو تو مقام فنا حاصل ہوا تو جواب یہ ہے کہ لعنت ہے ایسی فنا پر فنا کے معنے یہ ہیں کہ خدا کی یاد میں تمام مستغرق ہو کہ اپنے کو بھول جائے نہ یہ کہ خدا کو بھلا کر اپنے آپ کو بھولے. اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو بھول کر ہم اپنے کو کہاں بھولتے ہیں اپنی یاد تو پھر بھی رہتی ہے. تو پہلے یہ سمجھو کہ یاد کے معنے کیا ہیں یاد مطلوب وہ ہے جو نافع ہو اور جو محبت کے ساتھ ہو چنانچہ یہ محاورہ بھی تو ہے کہ دوستوں سے کہا کرتے ہیں کہ بھائی ہم کو یاد رکھنا اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ محبت کے ساتھ یاد رکھنا یہ کسی کا مطلب نہیں ہوتا کہ بس جس طرح سے بھی ہو یاد رکھنا خواہ روزانہ دو چار لپڑ ہی لگا دیا کرنا اور اگر وہ آ کر دو چار لپڑ لگا دیا کرے اور یہ کہے کہ تم نے یاد کرنے کو کہا تھا میں یاد ہی تو کرتا ہوں تو اس کو ہرگز یاد نہیں کہا جا سکتا غرض محاورہ میں بھی محبت ہی کی یاد کو یاد کہتے ہیں دشمنی اور ضرر رسانی کی یاد کو یاد نہیں کہا کرتے. اب سمجھئے کہ جس وقت کسی نے اپنے خدا کو بھلا دیا تو اس نے اپنے تمام مصالح کو فوت

؎ اور درحقیقت خدا کی یاد میں اپنے کو بھولنے والا واقع میں بھولنے والا نہیں ہے بلکہ اپنے کو یاد رکھنے والا ہے گو درجہ التفات میں بھولا ہوا ہے. چنانچہ یاد کے معنے معلوم کر کے ابھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی ۱۲ ظ

کر دیا اب اس کو یہ یاد نہیں رہا کہ میرے نفس کی فلاح کا طریقہ کیا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے کو بھول گیا اور اب اس کو اپنی یاد ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کے روزانہ دو چار جوتے مار کر یہ کہے کہ میں تجھ کو یاد کرتا ہوں غرض جو شخص خدا تعالیٰ کو بھولیگا وہ اپنے کو بھی ضرور بھول جاویگا اسی طرح جو خدا کو یاد رکھے گا وہ اپنے کو بھی یاد رکھیگا مگر مستقلاً نہیں بلکہ اس طرح کہ میں خدا کی چیز ہوں خدا تعالیٰ کے ساتھ مجھے تعلق ہے اور جو کچھ میرے پاس ہے سب خدا کی امانت ہے وہ کسی چیز کو بلا واسطہ خدا تعالیٰ کے یاد نہ کریگا بلکہ جیسے عاشق کو محبوب کی سب چیزیں یاد رہتی ہیں اور ان کی یاد حقیقت میں محبوب ہی کی یاد ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنے کو بھی اور اپنی متعلقات کو بھی اسی حیثیت سے یاد کرتا ہے کہ یہ محبوب ہی کی چیزیں ہیں یہ ایسی بات ہے جیسے ہل پالتا تھا اور بیل کی حفاظت ایک تو مالک کرتا ہے وہ تو اپنی چیز سمجھ کر ان کی حفاظت کرتا ہے اور ایک نوکر حفاظت کرتا ہے وہ اپنی چیز سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ دوسرے کی چیز سمجھکر ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اہل اللہ اپنی ذات یا اپنے ہاتھ پاؤں اور تمام متعلقات کی حفاظت نوکر کی طرح کرتے ہیں مالک کی طرح نہیں کرتے ہم تو کھاتے ہیں اپنا پیٹ بھرنے کیلئے اور وہ سرکاری مشین کی حفاظت کے لئے کھاتے ہیں اور یہاں سے لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو) کا راز بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے قتل نفس سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ یہ آپ کی جان انہی کی ملک ہے تمہاری ملک نہیں ہم سب خدا ہی کی چیزیں ہیں اسلئے انھوں نے اپنی چیز میں بدون اجازت کے تصرف کرنے سے منع فرما دیا اسی مرتبہ میں حکم ہے اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (بلاشک جسم کا تجھ پر حق اور تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے) پس کسی کو یہ حق نہیں کہ کوئی دوا ریا بارد کھا کر نامرد ہو جائے یا آنکھوں میں گرم سلائی لگا کر اندھا ہو جائے۔ عارفین پر چونکہ یہ راز منکشف ہو گیا ہے اس لئے وہ اپنی جان کو سرکاری چیز سمجھ کر اس کی خوب حفاظت کرتے ہیں اور اسی نیت سے بعض دفعہ عمدہ غذا اور عمدہ لباس بھی استعمال کرتے ہیں لوگ اس کو تن پروری سمجھتے ہیں مگر نہیں وہ اس سے بہت دور ہیں لیکن ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام بس سخن کوتاہ باید والسلام

(ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہئے)

ایک دفعہ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پینا کہ ہر بُن مو سے الحمد للہ نکلے گا۔ اور گرم پانی پینے میں زبان سے تو الحمد للہ کہو گے مگر دل شریک نہ ہوگا (آپ نے دیکھا کہ لذائذ کے استعمال میں عارفین کی کیا نیت ہوتی ہے۔ عام لوگ تو ٹھنڈا پانی اس غرض سے

پیتے ہیں کہ مزا آئیگا پیاس کو تسکین ہوگی اور عارف اس لئے پیتا ہے کہ ہر بُن مُنہ سے حق تعالیٰ کی حمد نکلے گی
بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا ، (دیکھ تو راستہ کا فرق کہاں سے کہاں تک ہے) اور اسی راز کے منکشف ہونے پر ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است ۔۔۔ افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ۔۔۔ تو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(میں اپنی آنکھوں پر ناز کرتا ہوں کہ تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پر فدا ہوں کہ تیری گلی تک پہونچے ہیں ہر دم اپنے ہاتھوں پر ہزاروں بوسہ دیتا ہوں کہ تیرے دامن کو پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

اپنی آنکھوں پر ناز کرتے ہیں کیونکہ اس نے سرکاری کام کیا ہے اس نے محبوب کے جمال کو دیکھا ہے اور اسی سے محبوب کے کلام کو دیکھکر تلاوت کی توفیق ہوئی ہے اپنے ہاتھ پاؤں کو کو دیتے ہیں مگر اسی سرکاری تعلق کی وجہ سے ان کی شان بڑھی۔ خدا کے رستہ میں چلنا نصیب اور بہت سے کام رضائے محبوب کے واسطے ان سے لئے گئے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ میں اپنے ان اعضاء پر جان دیتا ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ میں مکہ معظمہ میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا لوگ ان کے منہ پر ان کی تعریف کر رہے تھے اور وہ خوش ہو رہے تھے میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو اپنی تعریف سے مزے لے رہے ہیں ان کو اس خطرہ کی اطلاع ہوگئی فوراً جواب دیا کہ یہ میری تعریف تھوڑی ہی ہے میرے محبوب کی تعریف ہے کیونکہ ہمارا کمال سب ادھر ہی سے ہے مصنوع کی تعریف حقیقت میں صانع کی تعریف ہے کہ اس نے کس خوبی سے اس چیز کو بنایا ہے اس لئے میں اپنے محبوب کی تعریف پر خوش ہو رہا ہوں وہ کہنے لگے کہ مجھے پھر خطرہ ہوا کہ جب یہی بات ہے تو میرا یہ خطرہ بھی محبوب ہی کی طرف سے تھا اس پر اتنی ناگواری کیوں ہوئی ان کو اس پر بھی اطلاع ہوگئی فرمایا محبوب کی طرف بری باتوں کی نسبت کرنا بے ادبی ہے اب تو میں بہت گھبرایا کہ یہاں تو دل کو سنبھال کر بیٹھنا چاہئے یہ تو ہر خطرے پر مطلع ہو جاتے ہیں۔ واقعی اہل اللہ کے پاس بیٹھ کر برے خیالات سے دل کی حفاظت کرنا چاہئے کیونکہ ان کو گاہے خطرات پر بھی اطلاع ہو جاتی ہے جس سے ان کو ایذا ہوتی ہے ؎

پیش اہل دل نگہدارید دل ۔۔۔ تا نباشید از گمانِ بد خجل

(اہل دل کے رو برو دل کی نگہداشت کرو تاکہ بدگمانی سے شرمندہ نہ ہو)

اس پر یہ شبہ ہوگا کہ بعضے خطرات تو بے اختیار آتے ہیں ان سے کیونکر حفاظت کی جائے بس اس کا تو یہ

مطلب ہوا کہ اہل اللہ کے پاس بیٹھنا ہی نہ چاہیے تو سمجھ لیجئے کہ جن کو خطرات کی اطلاع ہوتی ہے
ان کو اللہ تعالیٰ یہ بھی معلوم کرا دیتا ہے کہ یہ اختیاری ہے اور یہ غیر اختیاری ہے اور وہ ایسے نہیں ہوتے
کہ غیر اختیاری امور پر مواخذہ کریں اور نہ غیر اختیاری خطرات سے اُن کو ایذا ہوتی ہے پس نگہداشت
دل کے معنی ہیں کہ اختیاری خطرات سے ان کے پاس بیٹھ کر دل کی حفاظت کرو۔ غرض واقع میں ہم اپنے
نہیں ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہیں تو جو خدا کو یاد کریگا وہ اپنے کو اس طرح یاد کریگا کہ اس کی نظر اول خدا پر
پڑے گی پھر اپنے پر اور یہ التفات الی الغیر نہیں ہے) اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حسین شخص
کے گھر میں آئینہ رکھا ہو جس میں اس کی صورت نظر آرہی ہو اور ایک عاشق بھی وہاں بیٹھا ہوا ہے جو
محبوب کی طرف رعب جمال کی وجہ سے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا اس لئے وہ آئینے میں اس کی صورت دیکھ
رہا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو عاشق نہیں وہ بھی اس آئینہ کو دیکھ رہا ہے مگر اس نیت سے کہ دیکھوں
یہ آئینہ جلبی ہے یا چینی ہے تو یہ دونوں شخص آئینے کے دیکھنے سے شریک ہیں مگر دونوں کے دیکھنے میں
زمین آسمان کا فرق ہے ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں ۔۔۔ درمیاں شان برزخ لایبغیان

(بحر تلخ اور بحر شیریں برابر دونوں جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ باہم مختلط
اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے)

ظاہر میں دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں الگ الگ ہیں عاشق کی نظر اول محبوب کی
تصویر پر پڑے گی۔ تو تبعاً آئینہ پر بھی نظر ہے اور غیر عاشق کی نظر اول آئینہ پر پڑے گی گو تبعاً حسین کی
تصویر بھی نظر پڑ جائے مگر اس کا مقصود حسین کی تصویر دیکھنا نہیں ہے بلکہ صرف آئینہ کی خوبی
دیکھنا مدنظر ہے اسی طرح عارف بھی مخلوقات کو دیکھتا ہے اور ہم بھی دیکھتے ہیں مگر بڑا فرق ہے۔
اسکی نظر اول خدا تعالیٰ پر پڑتی ہے پھر تبعاً مخلوق بھی اس کے سامنے ہے اور ہماری نظر اول مخلوق پر پڑتی ہے۔ گو
تبعاً حق تعالیٰ کی قدرت وصنعت کا بھی خیال آجائے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا رتبہ تو یہاں تک ہے کہ ان سے پوچھا
گیا هَلْ عَرَفْتَ رَبَّكَ بِمُحَمَّدٍ اَمْ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا بِرَبِّكَ کہ آپ نے حق تعالیٰ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے
پہچانا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے سے پہچانا تو فرمایا عَرَفْتُ مُحَمَّدًا بِرَبِّی کہ میں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو
خدا کے واسطے سے پہچانا اگر آج کوئی شخص یہ بات کہدے تو بس کفر ہو گیا بجائے قدر کرنے کے غریب پر چار طرف سے کفر کے

نستو رے لگیں گے کیونکہ حقیقت شناس دنیا سے اٹھ گئے چنانچہ ایک شخص نے میرے ایک دوست سے کہا کہ تم جو توحید کے مضامین زیادہ بیان کرتے ہو (کہ حق تعالیٰ کے افعال میں نہ کسی ولی کو دخل ہے نہ نبی کو وہاں کوئی دخیل کار نہیں ہے وغیرہ وغیرہ) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیمی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا توبہ توبہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم سے تھوڑا ہی رُکتے ہیں بلکہ خدا کی توہین سے روکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ حق تعالیٰ کو گھٹا دو۔ غور کرکے دیکھا جائے تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صفات الوہیت ثابت کرتے ہیں حقیقت میں وہ آپ کی بے تعظیمی کرتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ صفات الوہیت درجہ کمال میں تو آپ کیلئے ثابت کر نہیں سکتے لا محالہ درجہ نقصان میں ثابت کریں گے تو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقص قرار دیا اور ہم آپ کے لئے صفات الٰہی کو ثابت نہیں کرتے بلکہ ان کی نفی کرکے صرف صفات بشریہ اور کمالات نبوت کو آپ کے لئے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ہر صفت کو درجہ کمال میں ثابت کرتے ہیں تو ہم آپ کو بشر کامل و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کامل کہتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہوگے تو ناقص خدا کہوگے۔ اور ہم انسان کہتے ہیں مگر کامل انسان تو بتلاؤ بے تعظیمی کس نے کی بے ادب وہ ہے جو آپ کو ناقص کہے یا وہ جو کامل کہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے گھٹانا بھی بے ادبی ہے تو پھر حضرت صدیق اکبر کو کیا کہئے گا جو یوں کہتے ہیں کہ میں نے اول خدا کو جانا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خدا کو نہیں پہچانا۔ غرض یہ ثابت ہوگیا کہ عارف کی نظر اول خدا پر پڑتی ہے۔ پھر اپنے پر تو معلوم ہوا کہ خدا قریب ہے اور نفس دور ہے (اگر خدا تعالیٰ نفس سے قریب تر نہ ہوتے تو کسی کی نظر بھی اول ان پر نہ پڑ سکتی ۱۲) تو لازم آگیا کہ جو خدا کو بھول گیا وہ اپنے نفس کو بھی بھول گیا اسی کا بیان ہے فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (پس وہ اپنے نفسوں کو بھول گیا) آگے فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ یہ ہے جز و مقصود جس سے مجھ کو بدحالی مذکور سابقًا کا علاج مستنبط کرنا ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں حکم سے نکل جانے والے اس میں اولٰئک اسم اشارہ ہے جس کے لئے فاسقون کا حکم ثابت کیا گیا ہے اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ اسم اشارہ میں مشار الیہ کا مع صفات مذکورہ کے اعادہ ہوتا ہے اور حکم کی بنا ر الٰہی صفات پر ہوتی ہے جو پہلے مذکور تھیں (اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (یہی لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کو اللہ کی جانب سے ملی اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے) کی تفسیر میں مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے کہ اسم اشارہ سے اس جگہ یہ بات بتلائی گئی ہے کہ ہدایت و فلاح کا حکم صفات مذکورہ ایمان بالغیب و اقامۃ الصلوٰۃ و تصدیق کتب منزلہ و انفاق مال وغیرہ پر مبنی ہے۔ اور ان صفات کو

حکم فلاح میں داخل ہے ۱۲) اس قاعدے کی بنا پر یہاں بھی اُولٰئِکَ میں صفت نسیان کا اعادہ ہوگا جو پہلے اَلَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ (جو لوگ اللہ کو بھول گئے ہیں) میں مذکور ہو چکی ہے اور حکم فسق کی بنا اسی صفت پر ہوگی خلاصہ یہ کہ آیت میں نسیان خدا پر فسق کو مرتب کیا گیا ہے تو یہ سبب ہوا فسق کا یعنی حکم سے نکل جانے کا اور حکم سے نکل جانا یہی حقیقت ہے معصیت کی جس میں ہم مبتلا ہیں تو الحمد للہ آیت سے صاف طور پر سبب مرض کی تشخیص ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ ہماری بدحالی کا سبب یہ ہے کہ ہم خدا کو بھول گئے ہیں اور طبی قاعدہ ہے العلاج بالضد (علاج ضد کے ساتھ ہوتا ہے) (جو کہ عقل و شرع سے بھی مؤید ہے) چنانچہ سب جانتے ہیں کہ مرض حرارت سے ہو تو علاج برودت سے کیا جاتا ہے۔ برودت سے ہو تو حرارت سے علاج کیا جاتا ہے تو اسی طرح یہاں بھی علاج بالضد ہونا چاہیئے اور نسیان کی ضد ذکر ہے تو معصیت کا علاج ذکر اللہ ہوا یا یوں کہیئے کہ ہر مرض کا علاج رفع سبب سے ہوتا ہے (خواہ ضد کے ذریعہ سے رفع کیا جائے یا مثل کے ذریعہ سے مگر ازالہ مرض کے لئے رفع سبب سب کے نزدیک ضروری ہے ۱۲) اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرض عصیان کا سبب نسیان ہے تو اس کا علاج یہ ہوا کہ نسیان کو اٹھا دو اور رفع نسیان مستلزم ہے وجود ذکر کو (کیونکہ ارتفاع نقیضین محال ہے ۱۲) تو حاصل پھر وہی ہوا کہ معصیت کا علاج خدا کو یاد رکھنا ہے۔ اب میں بیان کو مختصر کرتا ہوں اور ایک بہت بڑے مضمون کو تھوڑے لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔ گو جی نہ بھرے مگر ان شاء اللہ تعالیٰ بقدر کفایت تسلی ہو جائے گی۔ ایک دوست کا خط آیا تھا کہ تمہارے جوابات سے جی نہیں بھرتا کیونکہ میں لمبے لمبے مضامین کا جواب دو چار سطروں میں دیدیتا ہوں تو میں نے لکھا کہ گو جی نہیں بھرتا مگر تسلی تو ہو جاتی ہے اور چند جملوں میں آپ کی سب باتوں کا کافی جواب تو ہو جاتا ہے۔ اس کا انھوں نے اقرار کیا میں نے کہا بس یہی کافی ہے جی بھرنے کی ضرورت نہیں (جس کو جی بھرنا ہو وہ پاس آکر رہے اگر میں خطوط میں مخاطب کے جی بھرنے کی کوشش کروں تو بس دن بھر میں دو چار خطوں کا جواب ہوا کرے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ روزانہ کی ڈاک اسی دن پوری ہو جائے آج کا کام کل پر نہ رہے کیونکہ اگلے دن پھر دوسری ڈاک آجاتی ہے اور یہ صورت تو مختصر ہی جوابات میں ہو سکتی لیکن الحمد للہ میرے جوابات باوجود اختصار کے کافی ہوتے ہیں کسی جزو سوال کا جواب رہ نہیں جاتا ۱۲) اسی طرح اس وقت گو مضمون بڑا ہے اور مختصر بیان سے شاید جی نہ بھرے لیکن ان شاء اللہ تعالیٰ تسلی ہو جائے گی۔ یہ تو معلوم ہو چکا کہ

گناہ سے بچنے کا طریقہ خدا کو یاد کرتا ہے۔ اب یہ بات رہی کہ یاد کیسے کرے تو سنئے یاد کے طریقے مختلف ہیں۔ ایک یاد ہوتی ہے محبت سے اور ایک ہوتی ہے خوف سے اور ایک ہوتی ہے حیا سے اور ان میں بھی پھر چند قسمیں ہیں کہ محبت ذات سے ہے یا ثواب سے اور خوف ذات کا ہے یا عقاب کا (اور حیا ذات سے ہے یا محسن کے احسان سے ۱۲) اس میں لوگوں کے طبائع اور مذاق مختلف ہیں بعضے تو وہ ہیں جن پر محبت ذات غالب ہے اور صرف ذاتِ حق کا عشق ان کے لئے ذکر پر باعث ہے وہ نہ جنت کے لئے ذکر کرتے ہیں نہ دوزخ سے بچنے کے لئے بلکہ محض رضائے محبوب کے لئے ذکر کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تم بندگی مثل فقیروں کے مزدوری کی شرط سے مت کرو آقا خود بندہ پروری کی روش سے واقف ہے)
یہ تو خواص عارفین کی حالت ہے اور بعضے وہ ہیں جن کو ذکر کا ولولہ اسی سے اٹھتا ہے کہ ہم کو اس عمل سے جنت ملے گی ان کے ذکر کا منشا محبت ثواب ہے سو اس کا بھی کچھ مضائقہ نہیں گو بعض عارفین نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ یہ لوگ خواہش پرست ہیں مزدوروں کی طرح کام کرتے ہیں کہ عمل سے پہلے اجرت ٹھہرا لیتے ہیں گویا خدا سے کہتے ہیں کہ ہم اس شرط پر ذکر کرتے ہیں کہ اس صلے میں ہم کو جنت دی جائے مگر یہ معترض محقق نہیں ہے میاں مقصود تو ذکر ہے وہ ہونا چاہیئے کسی طرح ہو اگر اس شخص کو طلب ثواب کی نیت سے روکا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ذکر ہی سے رہ جائے گا اور اگر یہ اسی نیت سے ذکر کرتا رہا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ اس کو ذاتِ حق سے عشق ہو جائے گا۔ پھر اس کو بھی رضائے محبوب کے سوا کچھ مطلوب نہ رہے گا۔ پس یہ حالت بھی اچھی ہے بری نہیں دیکھو گلستاں کے پڑھنے والے دو طرح کے لڑکے ہیں ایک تو وہ ہے جس کو خود گلستان میں لطف آتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو محض باپ کے اس کہنے سے پڑھتا ہے کہ گلستاں پڑھتے رہو گے تو ہم تم کو روزانہ ایک آنہ دیا کریں گے ہر چند کہ اس کی حالت پہلے سے کم درجہ کی ہے مگر کیا کوئی عاقل اس سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میاں اگر گلستاں پڑھو تو خود ذاتی شوق سے پڑھو ورنہ ایک آنہ کے لالچ سے پڑھنا فضول ہے اس میں کیا فائدہ۔ ہرگز نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ بجز محرومی علم کے کچھ نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہیگا کہ جس طرح بھی ہو پڑھنا چاہیئے۔ اسی طرح ایک دن تم کو خود مزا آنے لگے گا پھر اس وقت یہ حالت ہو جاوے گی کہ اگر باپ کچھ بھی نہ دے بلکہ یہ کہے کہ گلستاں پڑھنا چھوڑ دے تو تم ہرگز اس کی بات نہ مانو گے پھر یہ قاعدہ ذکر میں کیوں نہیں جاری کیا جاتا

اور جو لوگ ثواب کیلئے عمل کرتے ہیں ان پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے جب خدا تعالیٰ نے خود جنت کی رغبت دلائی ہے (اور اس میں رغبت کرنے کا امر بھی کیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (اس میں چاہیئے کہ رغبت کرنے والے رغبت کریں) تو اس کی رغبت سے ذکر کرنے میں کیا حرج ہے اور جو معترض گھٹیا حالت بتلاتا ہے وہ گویا خدا تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے کہ انھوں نے گھٹیا حالت کی رغبت دلائی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے حق تعالیٰ نے جتنے طریقے بتلائے ہیں سب بڑھیا ہیں ان میں گھٹیا کوئی نہیں (یہ اور بات ہے کہ ایک رفیع ہو دوسرا ارفع پس ہر چند کہ محض رضائے محبوب کے لئے ذکر کرنا مقام ارفع ہے مگر طلب جنت کے لئے ذکر کرنا بھی رفیع حالت ہے گھٹیا اور ادنیٰ حالت نہیں خوب سمجھ لو ۱۲) یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ (ترجمہ) اے اللہ میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہو جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو قول ہو یا عمل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حالت تھی تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کیلئے عمل کیا جائے رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے پس آپ کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا ہے ہم تو جنت اس لئے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملیگا، حوریں ملیں گی خوب مزے اڑیں گے غرض ہم کو حظ نفس مطلوب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بنا پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کے مانگنے کا امر فرمایا ہے جب محبوب خود یہ چاہے کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے اس وقت استغنا مناسب نہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں   خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(اگر سلطان دیں مجھ سے طمع کی فرمائش کرے تو اس کے بعد قناعت کے سر پہ خاک ڈال دوں گا)

اس لئے آپ نے جنت مانگی اور اس سے استغنا نہیں برتا عارف کامل خدا تعالیٰ کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغنا ظاہر نہیں کر سکتا چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اجل النعم ہے ہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحب حال ہو تو وہ بلا سے استغنا ظاہر کر دے اور ایسے لوگ غلبۂ حال سے معذور ہوں گے ورنہ معرفت کا مقتضا یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے اسی طرح اور جس چیز کا مانگنا اسے پسند ہو وہ بھی مانگ

اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے کسی دوسری چیز کی طلب نہیں دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بنا پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا بلکہ دیدار محبوب کا سوال تھا اسی کو کہتے ہیں ؎

"عاشقان جنت برائے دوست می دارند دوست (عاشقین جنت کو محبوب کی وجہ سے دوست رکھتے ہیں)

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے کہ ہماری یہ شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ لوگ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبہ خضرا ہی ہمیں نظر آجائے ؎

مرا از زلف تو موئے بسند است ہوس را رہ مدہ بوئے بسند است

(اگر محبوب ملے تو اس کا ایک بال ہی کافی ہے اور اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو ہی بہت ہے)

تو بعض دفعہ غلبہ تواضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو وصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا اس لئے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کو دیکھنے کے تو لائق نہیں کاش اس کے گھر ہی میں جا رہوں اور کبھی اپنی احتیاج و افتقار ظاہر کرنے کے لئے جنت کی تمنا کی جاتی ہے کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج تو کیوں نہ ہونگا میں تو جنت تک کا بھی محتاج ہوں اس لئے بطور اظہار احتیاج کے دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ جنت دیدے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیش نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ غَیْرَ مُوَدَّعٍ وَلَا مَکْفُوْرٍ وَلَا مُسْتَغْنًی عَنْہُ رَبَّنَا یعنی اے اللہ اس وقت پیٹ بھر گیا اس لئے کھانے کو ہٹا دیا ہے ہم اس کو ہمیشہ کے لئے وداع نہیں کرتے نہ اس کی ناقدری کرتے ہیں اور نہ اے اللہ ہمیں اس سے استغناء ہے۔ حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اس کے حسن سے ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے)

آپ کی جس ادا کو بھی دیکھو اُس میں غضب کی دلربائی ہے۔ پھر کمال یہ کہ اس میں نہ تصنع نہ تکلف بلکہ ایک بے ساختہ حال ہے ؎

دلفریبان بناتی ہمہ زیور بستند　　　　دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد

(بناتی دلفریب زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خدا داد ہے)

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپ کی سچائی کی شہادت دی اور ان کو ماننا پڑا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی تھے تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا غرض ایک معنی طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے یعنی اظہار احتیاج پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں (اور آپ کے سوال جنت کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہیئے بلکہ اس کا جو منشار آپ کی شان کے مناسب تھا وہ اپنے علم کے موافق کر دیا گیا ۱۲) لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے تو وہ بھی راہ صواب پر ہے غلط راستے پر نہیں خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیئے خواہ بلا واسطہ براہ راست ہو یا جنت کے واسطے سے ہو سب ٹھیک ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف　　　　گر بکشد زہے شرف ور بکشم زہے طرب

(نصیبہ اگر مدد کرے تو محبوب کا دامن پکڑ لوں اگر وہ کھینچے بہت شرف ہے اور اگر میں کھینچوں بڑی خوشی) یعنی مقصود قرب ہے پس قرب ہونا چاہیئے خواہ میں انھیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مقصود تو کام چلنا ہے کہ بندہ کو خدا کی اطاعت و ذکر کی توفیق ہو جائے اب وہ براہ راست خدا کی محبت سے ہو تو کیا اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا دونوں راستے ٹھیک ہیں اور دونوں بڑھیا ہیں گو ایک رفیع ہے اور ایک ارفع ۱۲) یہ تو محبت کی قسمیں تھیں عظمت وجلالت شان کے اور کسی کو عذاب کا خوف ہے یہ دونوں راستے بھی ٹھیک ہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنے عذاب وعقاب سے بندوں کو ڈرایا ہے اور اس کی تشدید جا بجا اسی لئے بیان فرمائی ہے کہ بعض طبائع پر جلالت وعظمت حق کا انکشاف نہیں ہوتا ان کیلئے خوف عذاب ہی گناہوں سے زاجر ہوتا ہے پس جو لوگ خوف عذاب سے عمل کرتے ہیں ان پر بھی اعتراض نہ چاہیئے ان کی حالت بھی گھٹیا نہیں (بلکہ رفیع حالت ہے گو اس سے ارفع یہ حالت ہے کہ عظمت وجلالت شان خالق منکشف ہو کر گناہوں سے زاجر ہو ۱۲) یاد کی دو قسمیں تو یہ ہوئیں ایک یاد محبت۔ ایک یاد خوف۔ ایک تیسری قسم اور ہے یاد حیا بعض وہ طبائع ہیں جو ذکر اللہ اور اعمال صالحہ

محض حیا کی وجہ سے کرتے ہیں ان کو اپنے خالق محبوب کی یاد سے غافل ہوتے ہوئے شرم وحیا آتی ہے خوف یا محبت ان کے لئے ذکر وطاعت کا قوی باعث نہیں ہوتا بلکہ وہ محض حیا کی وجہ سے سب کچھ کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حضرات خوف ومحبت سے خالی ہوتے ہیں یہ نہیں بلکہ ان کا غلبہ نہیں ہوتا غلبہ حیا کو ہوتا ہے باقی خوف ومحبت وحیا کسی سے بھی کوئی مسلمان خالی نہیں ہو سکتا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہر مسلمان میں ان کا موجود ہے ہاں غلبہ کسی پر خوف کا ہے کسی پر محبت کا کسی پر حیا کا اور جس صفت کا جس میں غلبہ ہے وہی اس کے لئے اعمال کی طرف داعی ہوتی ہے کسی میں حیا غالب ہے تو یہی حیا اس کے لئے ذکر اللہ کا باعث ہوتی ہے یہ راستہ بھی ٹھیک ہے (خدا تعالیٰ نے جس کے لئے جو راستہ مناسب سمجھا مقرر کر دیا بندگی کے معنے یہ ہیں کہ اسی پر راضی رہے اور اس کے خلاف کی تمنا نہ کرے امور غیر اختیاریہ موہوبہ غیر مکتسبہ میں خلاف کی تمنا مذموم ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط" (مت تمنا کرو اس چیز کی جس سے اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) پس اے سالکین جب تم کو معلوم ہو گیا کہ ذکر کی اتنی صورتیں ہیں اور یہ سب وصول الی المقصود کے لئے کافی ہیں تو ذکر وشغل کر کے اس کے متمنی نہ ہوا کرو کہ کاش ہم کو خوف حاصل ہو جاتا اور جب عرصہ تک ذکر کے وہ حاصل نہ ہوا تو افسوس کرنے لگے کہ ہائے ہم پر خوف غالب کیوں نہیں ہوتا۔ صاحب تم کو کیا خبر ہے کہ تمہارے لئے خوف کا راستہ مناسب ہے یا محبت وحیا کا۔ یہ تو سرکاری تقسیم ہے جس کے مناسب جو راستہ معلوم ہوا اسی کے اسباب اس میں پیدا کر دیئے وہ کسی کو ہنسا کر پہونچاتے ہیں کسی کو رولا کر۔ اور کسی کو نہ ہنساتے ہیں نہ رولاتے ہیں اس کو حیرت و پریشانی میں رکھ کر پہنچاتے ہیں خوب کہا ہے

؎ بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں است ۔۔۔ بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان است

(گل سے کیا کہہ دیا ہے کہ خنداں ہو رہا ہے اور بلبل سے کیا فرما دیا ہے کہ نالاں ہے)

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست ۔۔۔ ور بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب آئیم مستان وئیم ۔۔۔ ور بہ بیداری بدستان وئیم

(یعنی اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ بھی ان کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے تصرف سے عطا ہوا اور اگر جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سو رہیں تو ان ہی کے بیہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو ہیں)

اور حیرت کا بیان فرماتے ہیں ؎

در تردد ہر کہ او آشفتہ است حق بگوش او معما گفتہ است

(یعنی جو شخص تردد میں پریشان ہو رہا ہے گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہدیا ہے)

کہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

غرض کسی کو کچھ دیا کسی کو کچھ دیا جس کو محبوب کے ہاتھ سے جو بھی مل گیا اسی کو سب سے اچھا سمجھنا چاہئے۔

اور اس پر راضی رہ کر یہ شان ہونی چاہیئے ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین نیستم در صفت طاعت بین بین

(میں قلم کی طرح دو انگلیوں میں ہوں صفت طاعت میں بین بین نہیں ہوں)

یعنی جس طرح قلم کاتب کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہے وہی لکھا جاتا ہے اگر عربی لکھنا چاہے تو قلم سے عربی ہی لکھی جاتی ہے اگر اردو لکھنی چاہے تو اردو ہی لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی خدا تعالیٰ کے تقسیم کے سامنے مطیع و منقاد ہو جاؤ۔ چنانچہ جنھوں نے اس کو سمجھ لیا ہے وہ ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔ اگر ان پر محبت کا غلبہ ہے تو غلبۂ خوف کے طالب نہیں ہوتے۔ اگر خوف کا غلبہ ہے تو غلبہ محبت کے طالب نہیں ہوتے وہ تو ہر حال میں یہ کہتے ہیں ؎

بدُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش کہ انچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

(تجھ کو صاف اور گدلے مطلب نہیں خاموش رہ کیونکہ جو کچھ ہمارے ساقی نے پیالہ میں ڈالدیا ہے عین اس کی مہربانی ہے)

یہ بات ذاکرین کے کام کی ہے کیونکہ ان کو بڑی حرصیں ہوتی ہیں ان میں حالات و کیفیات و مقامات کی تمنا کا مرض بہت ہے یاد رکھو یہ خلاف عبدیت ہے بعض ذاکرین ذکر کر کے یہ شکایت کرتے ہیں کہ مزا نہیں آتا ہائے یہ ساری عمر نفس کے مزے ہی میں پڑے رہیں گے محبوب کی طرف کب متوجہ ہوں گے حضرت منصور نے ایک سالک سے پوچھا کہ آجکل کس کام میں ہو انہوں نے کہا کہ مقام توکل طے کر رہا ہوں منصور نے کہا افسوس تم ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہے گے محبوب کے کب مشغول ہو گے کیونکہ یہی توکل تو اکثر کھانے پینے اور پہننے ہی کے فکر سے چھوٹ جانے کیلئے کیا جاتا ہے تو یہ بھی پیٹ ہی کا دھندا ہوا (۱۲) یاد رکھو عاشق کا مذہب یہ ہونا چاہیئے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لا در قتل غیر حق براند در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت　　مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے لا الہ الا اللہ کی تیغ غیر اللہ کے ہلاک کرنے میں چلاؤ لا الہ الا اللہ کے بعد دیکھو کیا رہ گیا یعنی الا اللہ باقی رہ گیا باقی تمام فنا ہو گئے اے عشق شرکت سوز تجھ پہ آفریں کہ سوائے محبوب حقیقی کے تو نے سب کو فنا کر دیا)

جب لا الہ الا اللہ کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ کے سوا سب منفی ہو گئے پس اب نہ کسی خاص کیفیت کے طالب بنو نہ کسی خاص مقام کے بلکہ خدا کے طالب بنو اور اگر کچھ بھی نہ ملے تب بھی راضی رہو ؎

گر مرادت را مذاق شکر است
بے مرادی نے مراد دلبر است

یعنی ہم نے مانا کہ تمہاری مراد بہت عمدہ ہے مگر یہ تو سوچو کہ اگر دلبر کی مراد یہ ہے کہ تم نامراد رہو تو کیا اس کی مراد تمہاری مراد سے افضل نہ ہوگی۔ یقیناً ہوگی اس جگہ نامرادی کا مطلب اور کچھ نہ ملنے کے معنے یہ ہیں کہ تمہاری مخترعات اور متخیلات نہ ملیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ بالکل کچھ نہ ملے کچھ تو ضرور ملتا ہے اگر تمہارے مخترعات نہ ملیں گی تو وہ خود تم کو ملیں گے۔ اور جب وہ مل گئے پھر تو سب کچھ مل گیا ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

(جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہو گئی اس کو جان فرزند و اسباب کی پرواہ نہیں)

پس بندے کا کام یہ ہے کہ خدا کی یاد میں لگے اور ذکر و فکر ہی کو مقصود سمجھے اور کسی کیفیت پر نظر نہ رکھے کیونکہ میں نے بتلا دیا ہے کہ ذکر کی مختلف صورتیں ہیں اور ذکر ان سب کو عام ہے۔ اب میں گناہوں سے بچنے کی ایک بہت آسان تدبیر بتلاتا ہوں جس پر ہر شخص کو عمل کرنا آسان ہو وہ یہ کہ گناہ تو خیر ہم سے بہت ہوتے ہی ہیں اور سب کا

دفعتہً چھوٹ جانا ہر شخص سے آسان بھی نہیں مگر تم یہ کیا کرو کہ ایک وقت تنہائی کا مقرر کرلو اور اس میں خدا کی یاد کیا کرو مگر یاد ایسی ہو کہ زبان و دل دونوں اس میں شریک ہوں ورنہ وہ حالت ہوگی ؂

سبحہ برکف توبہ برلب دل پراز ذوق گنا
معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

(تسبیح ہاتھ میں اور لب پر توبہ اور دل گناہوں سے بھرا ہوا ہمارے استغفار گناہ کو ہنسی آتی ہے)

اور ایسی زبانی یاد جلدی موثر نہیں ہوتی یادِ خدا وہی جلدی رنگ لاتی ہے جو دل و زبان دونوں سے ہو تو صاحب میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ دن بھر کوئی گناہ نہ کرو میں کہتا ہوں کہ اگر تم سے گناہ چھوٹ ہی نہیں سکتے تو خدا کے لئے اتنا تو کرو کہ ایک وقت گھنٹہ آدھ گھنٹہ یادِ خدا کے واسطے مقرر کرلو لیکن جب اللہ کا نام لینے بیٹھو تو قصداً دل میں کچھ نہ لاؤ اور جو خود آجاوے اُسے آنے دو وہ تم کو کچھ مضر نہیں دیکھو اگر ایک سرکاری آدمی پہرہ پر کھڑا کیا گیا ہو کہ دربار میں کسی باغی کو نہ آنے دے تو اگر وہ سنتری خود ہی باغی کو اندر لیلے تو مجرم ہوگا۔ لیکن اگر وہ خود اندر نہ لے بلکہ باغی اس کو مجبور کرکے اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زبردستی اندر چلا آوے تو سنتری مجرم نہ ہوگا۔ اسی طرح نماز یا ذکر میں خود وساوس کا لانا یا ادھر مشغول ہوجانا بُرا ہے۔ اور اگر خود نہ لاؤ اور نہ اُدھر متوجہ ہو تو کچھ ضرر نہیں پس تم اپنے مایہ و متاع کو خود ذہن میں نہ لاؤ بلکہ اپنی طرف سے تو اس کی کوشش کرو

؂ بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ۔۔۔ بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

(ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دارو گیر شاہی سے بہتر ہے)

صاحبو ایک گھنٹہ تو ایسا نکال لو جس میں اس طرح خدا کی یاد کیا کرو۔ آگے ایک تجربے کی بات ہے کہ اس وقت جتنا مفرد اور بسیط ذکر ہوگا اتنا ہی یکسوئی زیادہ ہوگی اور وہی زیادہ مفید ہوگا۔ پس اس ایک گھنٹہ میں دل لگا کر لا الہ الا اللہ کا ذکر کرو یا اللہ اللہ کا اور اسی وقت اپنی طرف سے خدا کی طرف متوجہ رہنے کی پوری کوشش کرو پس تم اس طرح روزانہ ایک گھنٹہ پورا کردیا کرو اس کے بعد چاہے جس طرح حال میں بھی تمہاری گرنے میں دکھلادونگا

کہ چند روز کے بعد عین گناہ کے وقت شرم آوے گی اور گناہ کرتے ہوتے اندیسے کوئی چیز تم کو روکے گی اگر اس وقت تم نے اس شرم وحیا سے کام لیا اور فائدہ اٹھایا تو مدعا حاصل ہوا اور اگر نفس وشیطان سے مغلوب ہو کر گناہ کر بھی لیا تو فوراً دل کے نور میں کمی معلوم ہوگی جس سے گھبرا کر معاً توبہ کی طرف جھکو گے اور اگلے دن اس حرکت کے بعد حق تعالیٰ کا نام لیتے ہوئے بہت شرم آویگی اور سخت صدمہ ہوگا اور کیا کہوں کہ کیا پیش آئیگا آپ ورد کو پورا کرنا چاہیں گے اور گناہ کا خیال آپ کی زبان پکڑلے گا۔ بس وہ حال ہوگا ؎

اُحِبُّ مُنَاجَاۃَ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُہٖ وَلٰکِنَّ لِسَانَ الْمُذْنِبِیْنَ کَلِیْلُ

(محبوب کی پسندیدہ تر مناجات کے بہت سے طریقے ہیں لیکن گناہ گاروں کی زبان بیان کرنے سے قاصر ہے)

حضرات میں آپ کو عجیب بات بتلا رہا ہوں بخدا ذکر کی پابندی کے ساتھ اول تو آپ سے گناہ ہی نہیں صادر ہو سکتے اور اگر ہو گئے بھی تو اس حالت سے ہوں گے کہ بعد میں دلیر آپ سے چلیں گے جس آن شاء اللہ تعالیٰ یہ اثر ہوگا کہ ایک ایک کر کے سب گناہ چھوٹ جائیں گے اور جس وقت کوئی لغزش ہو گی فوراً دل پر نشتر سا لگیگا اور توبہ کی توفیق ہو گی بدون توبہ کے چین ہی نہ آئے گا۔ جائیے میں نے اتنا سہل نسخہ بتلایا جس سے زیادہ آسان کوئی نسخہ ہو ہی نہیں سکتا اگر کسی سے یہ تدبیر نہ ہو سکے تو انا للہ وانا الیہ راجعون " بس اس کے لئے یہ کہا جاوے گا ؎

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

خلاصہ وعظ کا یہ ہوا کہ اس آیت میں اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ نَسُوا اللّٰہَ پر مرتب کیا گیا ہے جس سے اس نسیان کا سبب فسق ومعصیت ہونا ظاہر ہوا اور مرض کا سبب سبب کے ازالہ سے ہوتا ہے تو معصیت کا علاج ازالہ نسیان ہوا اور ازالہ نسیان ذکر سے ہوتا ہے اس لئے گناہوں سے بچنے کے واسطے ذکر اللہ لازم ہوا جس کی سہل تدبیریں نے بتلا دی الحمد للہ اس آیت سے یہ عجیب مسئلہ نہایت آسانی سے مستنبط ہو گیا۔

اب میں ختم کرتا ہوں خدا تعالےٰ اس کو مقبول فرمادیں اور آپ کو اس کا نفع عنایت فرمائیں آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔ فقط

تمت

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

اَلسُّرُوْر

بظہور النور ملقب بہ

اِرْشَادُ الْعِبَادِ فِیْ عِیْدِ الْمِیْلَاد

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی

ایم اے جناح روڈ

السرور
بظہور النور
ملقب بہ
ارشاد العباد فی عید المیلاد

این	متیٰ	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید ہے	کس نے لکھا	سامعین کی تخمیناً تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ	۳ گھنٹے بعد نماز جمعہ سے قریب مغرب تک اور درمیان میں نماز عصر بھی ہوگئی	بیٹھ کر		حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ پر فرح کا مامور ہونا اور عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مفصل کلام۔	عموماً خصوصاً عاملین اہل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو	مولوی محمد عبد اللہ گنگوہی	۱۵۰	اہل علم کا مجمع کم اور متوسلین وعوام کا زیادہ تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ صرف اللہ کے فضل ورحمت ہی کے ساتھ چاہئے کہ خوش ہوں اس لئے وہ بہتر ہے اس شے سے کہ جس کو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں) قبل اس کے کہ اس آیت کے متعلق میں کچھ بیان کروں اول بطور تمہید یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ چند سال سے میرا معمول ہے کہ ماہ ربیع الاول کے شروع میں ایک وعظ

اس ماہ میں افراط وتفریط کرنے والوں کی اصلاح کے متعلق کہا کرتا ہوں اور اس میں تبعاً و استطراداً
اور فوائد علمیہ و نکات وحقائق کا بیان بھی آجاتا ہے امسال بھی ایسا ہی خیال تھا کہ ابتداء ربیع الاول میں
ایسا وعظ ہو جائے لیکن وجہ التوار یہ ہوئی کہ ہمارے مدرسہ کے متعلق ایک مکان طلبہ کے لئے بنا ہے خیال تھا
کہ اس مکان میں اس کے افتتاح کے ساتھ وعظ ہوتا کہ اس مکان میں برکت ہو لیکن اس کے افتتاح
میں بعض امور کا انتظار تھا اتفاق سے وہ جملہ امور دوشنبہ کے روز ختم ہوئے چنانچہ اس روز ارادہ بیان کا
ہوا لیکن بعض احباب کی رائے ہوئی کہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں یہ بیان ہوتا کہ اور لوگ بھی منتفع ہوں
اس وجہ سے اس بیان میں دیر ہوئی اور عجیب اتفاق ہے کہ آج ۱۲ ربیع الاول ہی ہے اسی تاریخ میں
لوگ افراط تفریط کرتے ہیں۔ اس تاریخ کا بالتخصیص ارادہ نہیں کیا گیا اور نہ نعوذ باللہ اس تاریخ سے ضد ہے بلکہ
الحمد للہ ہم اس میں برکت کے قائل ہیں مگر یہ اتفاقی بات ہے کہ اس بیان کا اس تاریخ سے اقتران ہو گیا اور یہ
حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ متبع سنت کو اللہ تعالیٰ بلا قصد وہ برکات عنایت فرما دیتے ہیں کہ جن کا متبع رسوم و
بدعات ارتکاب بدعات کے ساتھ قصد کرتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جو شئے دائر بین السنت والبدعت
(سنت اور بدعت کے درمیان) ہو تو اس سنت کو ترک کر دینا چاہیے پس یہ تاریخ اگرچہ بابرکت ہے اور حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اس میں باعث مزید برکت کا ہے لیکن چونکہ تخصیص اس کی اور اس میں ذکر کا التزام
کرنا چونکہ بدعت ہے اس لئے اس تاریخ کی تخصیص کو ترک کر دیا گیا ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس تخصیص کے مفسدہ سے بھی
محفوظ رکھا اور اس تاریخ کی برکات سے بھی محروم نہیں رکھا اور عجیب بات ہے کہ اگر دوشنبہ کے روز بیان ہوتا
تو ہم کو اس دن بھی یہی برکت حاصل ہوتی اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اس یوم میں ہوئی
ہے اور نیز بعض محققین اس طرف گئے ہیں کہ ولادت شریفہ ۸ ربیع الاول کو ہوئی ہے اور دوشنبہ کو آٹھویں
ہی تاریخ تھی پس اس قول کے موافق ہم کو یوم البرکت اور تاریخ البرکت دونوں سے حصہ مل جاتا اور جمہور
کے قول کے موافق ۱۲ ربیع الاول تاریخ ولادت شریفہ ہے اس لئے اب بھی اس تاریخ کی برکت سے محرومی نہ رہی
بلکہ اب دو برکتیں حاصل ہو گئیں یوم کی بھی اور تاریخ کی بھی اس لئے کہ دوشنبہ کے روز نیت بیان کی تھی اور
مومن کی نیت پر بھی ثواب کا وعدہ ہے یوم کی برکت یوں حاصل ہو گئی اور آج کہ ۱۲ تاریخ ہے اس کا وقوع
ہو گیا تاریخ کی برکت اس طرح حاصل ہو گئی یہ برکت ہے اتباع سنت کی اور ہر چند کہ اس یوم میں افراط تفریط کے
متعلق بیان کرنا زائد معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ جو افراط تفریط کرنا تھا آج ان لوگوں نے کر لیا ہوگا۔

پس اب اس بیان سے کیا فائدہ مگر یہ ایام چونکہ پھر بھی ان شاء اللہ تعالیٰ آنے والے ہیں اور نیز علاوہ ربیع الاول کے اور دنوں میں بھی لوگ ایسی مجالس منعقد کرتے ہیں اور اس میں حدود شرعیہ سے تجاوز ہوتے ہیں اس لئے اس کے متعلق بیان کر دینا خالی از نفع نہیں یہ مضمون تو بطور تمہید کے تھا۔ اب آیت شریفہ کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ جاننا چاہئے کہ اس میں کسی مسلمان کو شک و شبہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کی ہر نعمت قابل شکر ہے خاص کر جو بڑی نعمت ہو پھر خصوص دینی نعمت اور دینی نعمتوں میں سے بھی خاص کر جو بڑی نعمت ہو پھر ان میں بھی خصوص وہ نعمت جو اصل ہے تمام دینی و دنیوی نعمتوں کی اور وہ نعمت کیا ہے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی نعمتوں کے تو فیوض دنیا میں فائض ہوئے ہی ہیں دنیوی نعمتوں کے سرچشمہ بھی آپ ہی ہیں اور صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کے لئے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ یعنی نہیں بھیجا ہم نے آپ کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر جہانوں کی رحمت کیواسطے دیکھئے عالمین میں کوئی تخصیص انسان یا غیر انسان یا مسلمان وغیر مسلمان کی نہیں ہے پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود ہر شے کیلئے باعث رحمت ہے خواہ وہ جنس بشر سے ہو یا غیر جنس بشر سے اور خواہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زماناً متاخر ہو یا متقدم متاخرین کے لئے رحمت ہونا تو بعید نہیں لیکن پہلوں پر رحمت ہونے کیلئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک وجود سب سے پہلے پیدا فرمایا اور وہ وجود نور کا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وجود نوری سے سب سے پہلے مخلوق ہوئے ہیں اور عالم ارواح میں اس نور کی تکمیل و تربیت ہوتی رہی آخر زمانہ میں اس امت کی خوش قسمتی سے اس نور نے جسد عنصری میں جلوہ گر و تاباں ہو کر تمام عالم کو منور فرمایا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم اولاً و آخراً تمام عالم کے لئے باعث رحمت ہیں۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تمام نعمتوں کی اصل ہونا عقلاً و نقلاً ثابت ہوا تو ایسا کون مسلمان ہوگا کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود پر خوش نہ ہو یا شکر نہ کرے پس ہم پر یہ خالص تہمت اور محض افترا اور نرا بہتان ہے کہ توبہ توبہ نعوذ باللہ کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف یا اس پر خوش ہونے سے روکتے ہیں حاشا و کلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تو ہمارا جزو ایمان ہے۔ ہاں جو شئے خلاف ان قوانین کے ہوگی جن کی پابندی کا ہم کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے اس سے البتہ ہم روکیں گے اگرچہ فی نفسہ وہ شئے مستحسن ہو اور شریعت میں اس کے نظائر بکثرت موجود ہیں دیکھو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ قبلہ سے منہ پھیر کر نماز پڑھنا ممنوع ہے اور یہ بھی سب کے نزدیک مسلم ہے کہ یوم النحر اور یوم الفطر میں روزہ رکھنا حرام ہے اور یہ بھی سب جانتے ہیں

کہ ایام تشریق میں افطار ضروری ہے اور یہ بھی تمام امت کا مسئلہ مسلمہ ہے کہ ماہ محرم میں حج نہیں ہو سکتا اور نیز محل حج مکہ مکرمہ ہی ہے بمبئی میں حج ممکن نہیں دیکھئے نماز روزہ حج فرض ہیں لیکن خلاف قاعدہ و قانون شریعت چونکہ کئے گئے اس لئے وہ بھی منہی عنہا ہو گئے اور ان کے ممنوع ہونے کو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں پس اگر کوئی ایسے نماز روزہ حج کو منع کرے تو اس کو کوئی عاقل یوں نہ کہے گا اور یہ تہمت اس پر نہ لگائیگا کہ یہ شخص نماز روزہ حج سے روکتا ہے اگر نماز روزہ سے روکتا تو خود ہی ان پر کیوں عامل ہوتا اسی طرح مسئلہ متنازعہ فیہا کے اندر سمجھو کہ ہمارے حضرات کی نسبت یہ کہنا کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کے ذکر یا اس پر خوش ہونے کو منع کرتے ہیں یہ نری تہمت اور افترا ہے سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (پاک ہے تو یہ بہتان عظیم ہے) حاشا اللہ ہم ہرگز منع نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہر شے کا ایک طریق ہوتا ہے جب وہ شے اس طریق سے کیجاوے تو وہ پسندیدہ ہے ورنہ ناپسند اور قابل منع کرنے کے ہے دیکھئے تجارت ہے اس کے لئے گورنمنٹ نے خاص خاص قوانین مقرر کردیئے ہیں اگر کوئی شخص ان قوانین کے خلاف تجارت کرے گا تو وہ ضرور قوانین کی خلاف ورزی میں ماخوذ ہوگا۔ چھرہ بارود کی تجارت وہی کرسکتا ہے جس نے لیسنس حاصل کرلیا ہو اسی طرح شریعت میں بھی ہر شے کا قاعدہ اور قانون ہے جب اس کے خلاف کیا جاوے گا تو وہ ناپسند اور منہی عنہ ہو جائیگی پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر مبارک عبادت ہے لیکن دیکھنا چاہیئے کہ قانون داں حضرات یعنی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم جن کے اقتدا کا ہم کو حکم ہے انہوں نے اس عبادت کو کس طرز اور کس طریق سے کیا ہے اگر آپ لوگ اسی طریق سے کریں تو سبحان اللہ کون اس سے روکتا ہے اور اگر اس طریق سے نہ کیا جاوے تو بیشک و بیشبہ وہ قابل رکنے کے ہے۔ اب فرمایئے کہ کیا ہم لوگ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رکنے والے ہیں۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی چھرہ بارود کی تجارت کو لیسنس ہونے کی وجہ سے منع کرے اور اس کو یہ کہا جاوے کہ یہ تو تجارت کو منع کرتے ہیں پس نفس فرح و سرور علی ذکر رسول م (ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خوشی) کو کوئی منع نہیں کرتا کہ وہ تو عبادت ہے، ہاں جب اس کے ساتھ اقتران منہی عنہ کا ہوگا تو وہ بیشک قابل ممانعت ہے۔ فرح اور سرور ہی کو دیکھ لیجئے کہ اس کی نسبت قرآن مجید میں ایک مقام پر تو ہے لَا تَفْرَحْ (خوش مت ہو) اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے فَلْيَفْرَحُوْا (پس چاہیئے کہ خوش ہوں) جیسا اس آیت میں ہے معلوم ہوا کہ بعض فرح کے افراد مادون فیہ (کم درجہ کے ہیں) ہیں اور بعض منہی عنہا اور ظاہر ہے کہ اعمال اخرویہ میں ہمارے لئے معیار شریعت ہے پس شریعت کے قواعد سے جو فرحت جائز ہے اس کی تو اجازت ہے اور جو ناجائز ہے وہ ممنوع ہے چنانچہ جس جگہ لَا تَفْرَحْ (مت خوش ہو) ہے

وہاں دنیوی فرحت مراد ہے مگر وہی فرحت جو حدود سے تجاوز ہو ورنہ نفس فرح نعمت دنیویہ پر بھی لوازم شکر سے ہے اور جہاں امر کا صیغہ ہے وہاں نعمت دینی پر فرحت مقصود ہے لیکن وہی فرح جس میں قواعد شریعت سے تجاوز نہ ہو مثلاً اگر کوئی نماز پر کہ وہ نعمت دینی ہے خوش ہو اور خوشی میں آکر یہ کرے کہ بجائے چار رکعت کے پانچ رکعت پڑھنے لگے تو بجائے اس کے کہ ثواب ہو الٹا گناہ ہوگا اس لئے کہ اس نے شریعت کے قواعد سے تجاوز کیا خود ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ جس میں اختلاف ہے اسی کو لے لیجئے کہ مسئلہ متفق علیہا ہے کہ جو شخص چار رکعت والی نماز میں قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ پڑھ دے تو نماز ناقص ہوگی حتیٰ کہ سجدہ سہو سے وہ نقصان منجبر ہوگا اگر سہواً ایسا کیا دیکھئے درود شریف کہ جس کی نسبت ارشاد ہے مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ مَرَّۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا اَوْ کَمَا قَالَ یعنی جو شخص درود بھیجے مجھ پر ایک مرتبہ اس پر اللہ تعالیٰ دس مرتبہ رحمت فرماویں گے اور پھر موقع کونسا نماز لیکن حکم شرعی یہ کہ نماز میں نقصان آجائیگا تو اس کی آخر کیا وجہ ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید ۰۰ میندار سعدی کہ راہ صفا ۰۰ تواں رفت جز برپئے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (زہد و ورع اور صدق و صفا میں سعی کرو لیکن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے خلاف جس نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہرگز منزل مقصود کو نہ پہنچے گا سعدی یہ گمان نہ کرو کہ سیدھا راستہ ہے بجز پیروی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں چل سکتا) پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو موقع درود شریف کا نماز میں مقرر فرما دیا ہے چونکہ اس سے تجاوز ہوا ہے اس لئے نماز میں نقصان آیا اگرچہ درود شریف فی نفسہ عبادت ہے اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر اہل بدعات کا بھی اتفاق ہے اس لئے کہ وہ بھی حنفی ہیں پس ان کو چاہیئے کہ امام صاحب پر اعتراض کریں اور ان پر بھی یہ تہمت لگائیں کہ وہ تو یہ تو بہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہیں اور وہ بھی وہابی تھے۔ پس لے حضرات خدا سے ڈریئے اور اس مادۂ فاسدہ کو اپنے دماغ سے نکالئے ورنہ اس کا اثر دور دور تک سرایت کریگا اور احکام میں نظر انصاف اور حق طلبی سے غور فرمایئے پھر اگر شبہات رہیں تو شائستگی اور تہذیب سے ان کو رفع فرمایئے اور خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جب قرآن مجید میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کی نسبت کَمَا سَیَجِیْءُ فِیْ تَفْسِیْرِ الْاٰیَۃِ مُفَصَّلًا (جیسا کہ آیت کی تفسیر میں عنقریب مفصل آئیگا) صیغہ امر فَلْیَفْرَحُوْا (پس خوش ہونا چاہیئے) موجود ہے تو اس فرحت کو کون منع کر سکتا ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ پر فرحت اور سرور کو

کوئی منع نہیں کر سکتا اور یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ لیکن میں نے اس میں اس لئے تطویل کی کہ ہم پر یہ افترا ہے کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو منع کرتے ہیں سو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک تو وہ شے ہے کہ اگر اس پر اجر کا بھی وعدہ نہ ہوتا تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مقتضا ہے مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ (جو شخص کسی چیز سے محبت رکھتا ہے وہ اس کا ذکر اکثر کرتا ہے) اس کو مقتضی ہے کہ آپ کا ہر وقت ذکر کیا کرے اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر عین عبادت ہے اسی واسطے حق تعالےٰ نے خود اس قدر مواقع آپ کے ذکر کے مقرر فرمائے ہیں کہ مسلمان سے لامحالہ ذکر ہو ہی جاوے دیکھئے نماز کے اندر ہر قعدہ میں اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم پر سلام ہو) موجود ہے اور قعدہ ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا میں دو دو ہیں اور فجر میں ایک تو کل نو قعدے ہوئے اور سنن موکدہ اور وتر میں لیجئے ظہر میں تین مغرب میں ایک عشا میں تین اور صبح میں ایک تو کل سترہ قعدے ہوئے پس یہ سترہ مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہوا پھر پانچوں وقت فرائض اور سنن اور وتر کے قعدے اخیرہ میں کل گیارہ مرتبہ درود شریف بھی پڑھا جاتا ہے پس سترہ اور گیارہ کل اٹھائیس بار تو لامحالہ ہر مسلمان کو آپ کا ذکر مبارک کرنا روزانہ ایسا ضروری ہے کہ اس سے کسی طرح مفر ہی نہیں پھر پانچوں وقت اذان اور تکبیر ہوتی ہے اس میں اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں) موجود ہے جس کو مؤذن اور سننے والا دونوں کہتے ہیں پھر ہر نماز کے بعد دعا بھی سب ہی مانگتے ہیں اور دعا کے آداب میں سے کر دیا گیا ہے کہ اس کے اول و آخر درود شریف ہو غرض اس حساب سے اٹھائیس سے بھی زیادہ تعداد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کی ہوگی اور یہ تو وہ مواقع ہیں کہ ان میں پڑھے بے پڑھے سب شامل ہیں اور جو طالب علم حدیث شریف پڑھتے ہیں وہ تو ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذکر میں رہتے ہیں اس لئے کہ ہر حدیث کے شروع میں آپ کے نام مبارک کے ساتھ درود شریف موجود ہے چنانچہ احادیث کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے اور ان میں جابجا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالےٰ ان پر درود و سلام بھیجے) اور قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ ان پر درود و سلام بھیجے) اور عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے، اللہ تعالےٰ ان پر درود و سلام بھیجے) واقع ہے اور درمیان میں بھی جہاں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک آیا ہے وہاں بھی درود شریف موجود ہے گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو ایسا گوندھ دیا ہے کہ بغیر ذکر کے مسلمان کو چارہ نہیں۔ مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ

سے کسی نے پوچھا تھا کہ ذکر ولادت آپ کے نزدیک جائز ہے یا ناجائز انھوں نے فرمایا کہ ہم تو ہر وقت ذکر ولادت کرتے ہیں اس لئے کہ ہر وقت کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے رسول ہیں) پڑھتے ہیں اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو ہم یہ کلمہ کہاں پڑھتے۔ پس محبت کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ آپ کا ہر وقت ذکر ہوا ور اس کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ اس کے لئے مجالس منعقد کی جاویں اور مٹھائی منگائی جاوے تب ذکر ہو عاشق اور محب کو اتنی دیر کیسے صبر آسکتا ہے۔ دیکھو اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو محب کی کیا حالت ہوتی ہے کہ ہر وقت اس کی یاد میں بے قرار رہتا ہے اگر اس سے کوئی کہے کہ میاں ذرا ٹھہر جاؤ ہم مجلس آرائی کرلیں اور مٹھائی منگالیں اس وقت ذکر کیجیو وہ کہے گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری محبت کا ؤ ہے کہ جو اتنی دیر تم ذکر محبوب سے صبر کرتے ہو محبت تو وہ شئے ہے جیسے مجنوں کی حالت تھی ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد

ریگ کاغذ بود و انگشتان قلم — می نمودے بہر کس نامہ رقم

گفت اے مجنون شیدا چیست این — می نویسی نامہ بہر کیست این

گفت مشق نام لیلیٰ میکنم — خاطر خود را تسلی میکنم

(کسی نے مجنون کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے ریت پر انگلیوں سے کچھ لکھ رہا پوچھا اس نے اے مجنون کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں)

بتلائے اگر مجنون کو اس حالت میں کوئی یہ کہتا کہ ذرا ٹھہر جاؤ ہم مجلس بنالیں اور مٹھائی منگالیں اس وقت لیلیٰ کا ذکر کرنا تو وہ یہ جواب دیگا کہ سلام ہے ایسی مجلس کو اور ایسی مٹھائی کو جو میرے اور میرے محبوب کے درمیان میں حجاب ہوا ور ہم نے تو اکثر مجالس میلاد والوں کو یہی دیکھا ہے کہ یہ محبت سے بالکل خالی ہوتے ہیں اس لئے کہ بڑا معیار محبت کا محبوب کی اطاعت ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

تَعْصِی الرَّسُوْلَ وَاَنْتَ تُظْہِرُ حُبَّہٗ — ھٰذَا لَعَمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ

لَوْکَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَاَطَعْتَہٗ — اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

یعنی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور ان کی محبت کو ظاہر کرتا ہے اپنی جان کی قسم یہ امر افعال عجیبہ میں سے ہے اگر تیری محبت صادق ہوتی تو ضرور تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا

اس لئے کہ محب محبوب کا مطیع ہوتا ہے اوران مولد پرستوں کو دیکھا ہے کہ مجلس میلاد کا اہتمام کرتے ہیں تنس کھڑے کررہے ہیں ان پرکپڑے مڈھ رہے ہیں اور سامان روشنی کا فراہم کررہے ہیں اوراس درمیان میں جونمازوں کے وقت آتے ہیں تو نماز نہیں پڑھتے اور ڈاڑھی کا صفایا کرتے ہیں کیوں صاحب کیا محبین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ہی صورتیں اور یہی ان کی حالت ہوتی ہے کیا بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا ہی حق ہے کہ پانچ روپیہ کی مٹھائی منگائی تقسیم کردی اور سمجھ لیا کہ ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کردیا کیا آپ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ کوئی پیلنشہ ور پیرزادہ سمجھا ہے کہ تھوڑی سی مٹھائی پرخوش ہوجاویں تھوڑے سے نذرانہ پر راضی ہوجاویں توبہ توبہ نعوذ باللہ یادرکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے محبین سے خوش نہیں ہیں سچے محب وہ ہیں جو اقوال وافعال وضع انداز ہر شئے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور اطاعت کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست حافظ اشفاق رسول نامی ہیں وہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فریفتہ ہیں وہ کبھی کبھی محبت کی وجہ سے ذکر ولادت مروج طریق سے کیا کرتے تھے انھوں نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ ہم اس کی شفاعت نہ کریں گے جو ہماری بہت تعریف کرے ہم اس کی شفاعت کریں گے جو ہماری اطاعت کرے مطلب اس کا یہی ہے کہ جو شخص نرا دعویٰ کرتا ہوا ور نعتیہ اشعار بہت پڑھتا ہو لیکن اطاعت کرتا نہ ہو تو اس کی شفاعت نہ کریں گے۔ میں نے جو اصلاح الرسوم کتاب لکھی ہے اس میں ایک فصل ذکر میلاد کے متعلق بھی ہے چنانچہ وہ فصل طریقہ مولد کے نام سے علیحدہ بھی طبع ہوگئی ہے تو جب یہ کتاب لکھی گئی تو مجلس میلاد کے متعلق کانپور میں لوگوں نے بہت شور کیا اسی اثنا میں ایک شخص صالح نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اوراس اختلاف کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس میں صحیح کیا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اشرف علی نے جو لکھا ہے وہ سب صحیح ہے۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں جو کتاب نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم لکھی ہے اس کے آخر میں ان دونوں خوابوں کو مفصلاً درج کردیا ہے لیکن میری غرض ان خوابوں کے ذکر کرنے سے مدعا کا اثبات نہیں ہے اثبات مدعا کے لئے تو مستقل دلائل ہیں یہ تو محض تائید اور مزید اطمینان کے لئے لکھ دیا ہے۔ الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود اصل ہے تمام نعمتوں کی اوراس پر شکر اور فرحت مامور بہ ہے چنانچہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں اسی نعمت کا ذکر اور اس فرح کا امر ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس آیت کریمہ سے پہلے قرآن مجید کی شان حق تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے یَا اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ

لِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت اور دل کے امراض کے لئے شفا اور مومنین کے لئے ہدایت و رحمت آئی ہے اس میں حق تعالیٰ نے قرآن مجید کی چار صفتیں بیان فرمائی ہیں موعظۃ۔ شفا۔ ہدیٰ۔ رحمت۔ موعظۃ کہتے ہیں وہ کلام جو بری باتوں سے روکنے والا ہے اور شفا اسکی صفت بطور ثمرہ کے فرمائی ہے یعنی نتیجہ اور ثمرہ اس موعظت پر عمل کرنے کا یہ ہے کہ دلوں کے اندر جو روگ ہیں اُن سے شفا حاصل ہو گی۔ یہاں سے ایک تصوف کا مسئلہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے یہ تو ظاہر ہے کہ ہم لوگ گناہ میں مبتلا ہیں اور شب و روز ہم سے لغزشیں ہوتی ہیں لیکن اس ابتلا کے ساتھ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ گناہ کرتے ہیں اور ان کو اس کا کچھ احساس نہیں ہوتا اور ایک وہ جن کو احساس ہوتا ہے سو الحمد للہ کہ ہم گو پھسلتے ہیں اور گناہ ہم سے صادر ہوتے ہیں لیکن اندھے نہیں ہیں کہ اس کی خبر ہی نہ ہو کہ راستہ کدھر ہے الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں عطا فرمائی ہیں گو بعض وقت نفس کے غلبہ و شرارت سے ان سے کام نہ لیں پس اُن آنکھوں سے ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ جب کوئی کبھی گناہ ہوا ہے اس سے قلب میں ایک روگ پیدا ہو گیا اسی روگ کی نسبت حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ یعنی بلکہ ان کے دلوں پر اُن کے اعمال کے رنگ کا غلبہ ہو گیا ہے اور اسی کی نسبت حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب آدمی کوئی گناہ کرتا ہے تو قلب پر ایک داغ لگ جاتا ہے اگر توبہ کر لے تو وہ مٹ جاتا ہے ورنہ بڑھتا ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

ہر گناہ زنگے است بر مرآۃ دل　　دل شود زین زنگہا خوار و خجل

چوں زیادت گشت دل را تیرگی　　نفس دون را بیش گردد خیرگی

(ہر گناہ دل کے آئینہ پر ایک زنگ ہے کہ دل ان رنگوں سے خوار و شرمندہ ہوتا ہے جب دل کی تاریکی زیادہ بڑھ جاتی ہے تو نفس کمینہ کو اس سے خیرگی ہوتی ہے۔)

غرض گناہ کے اندر خاصہ ہے کہ قلب میں اس سے ایک روگ پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو وہ روگ اور بڑھ جاتا ہے یہاں پر بعض اہل سلوک کو ایک عجیب دھوکا ہوا ہے اور ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شیطان ان کو گناہ کی رغبت دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے قوت نور ایمان گناہ سے روکتی ہے جس سے وہ رُک جاتا ہے لیکن شیطان تو اس سے بہت زیادہ پڑھا ہوا ہے وہ جب دیکھتا ہے کہ اس طور سے میرا قابو نہیں چلتا تو وہ گناہ کے اندر ایک دینی مصلحت بتاتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے یہ گناہ نہ کیا تو ہمیشہ تمہارے دل میں یہ کانٹا سا کھٹکتا رہے گا۔

اور اگر ایک دفعہ دل بھر کر کرلو گے تو دل میں سے اس کا وسوسہ جاتا رہیگا بس اس سے فراغت ہوجائے گی اس میں بڑے بڑے سمجھدار لوگ مبتلا ہوجاتے ہیں لیکن مومن کامل کو اللہ تعالیٰ نے ایک نور عطا فرمایا ہے کہ وہ اس کے لاکھوں تار و پود کو اُس نور کے ذریعہ سے توڑ پھوڑ دیتا ہے (چنانچہ عنقریب اس مغالطہ کا حل آتا ہے) اسی واسطے تو حدیث شریف میں آیا ہے فَقِيهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ گراں ہے کسی نے اس مضمون کو نظم بھی کردیا ہے ؎ فَاِنَّ فَقِيهًا وَّاحِدًا مُتَوَرِّعًا ٭ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ یعنی

(بلاشبہ ایک پرہیزگار فقیہ شیطان ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے)

یہ غلطی ہے جو اہل سلوک کو ہوتی ہے اور اہل سلوک کو جو غلطی ہوتی ہے دراصل غلطی وہی ہے اور وہ بہت سخت ہوتی ہے اسی واسطے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ تم کو تو گناہ سے اندیشہ ہے اور ہم کو کفر سے اندیشہ ہے بڑا خطرناک راستہ ہے بس عافیت اس میں ہے کہ اس میں اپنی رائے کو دخل نہ دے اور کَالْمَيِّتِ بَيْنَ يَدَيِ الْغَسَّالِ (مثل مردہ کے غسال کے ہاتھ میں) بدست محقق ہو کر رہے شیخ شیرازی اسی مضمون کو فرماتے ہیں ؎ اگر مرد عشقی کم خویش گیر ٭ وگرنہ رہ عافیت پیش گیر۔ یعنی اگر مرد عشق ہو تو اپنے کو گم کردو یعنی اپنی رائے کو دخل نہ دو بلکہ یہ مشرب اختیار کرو ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست ٭ کفرست درین مذہب خود بینی و خود رائی

(عالم عاشقی میں اپنی فکر و رائے بالکل بیکار ہے اس مذہب میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

جیسے اس شخص نے خود رائی کی کہ شریعت تو حکم کررہی ہے لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا (زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو) یہ اپنی رائے سے کہتا ہے کہ میں زنا سے جب بچ سکوں گا جب جی کھول کر پانچ چھ مرتبہ زنا کر لوں گا اور اس احمق کو اتنی خبر نہیں کہ مرض کو اس سے اور زیادہ قوت ہوگی جیسے کسی شاعر کا شعر ہے ؎ کنارو بوس سے دونا ہوا عشق ٭ مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی ٭ یہ بیوقوف تو سمجھتا ہے کہ درخت میں پانی دینے سے اس کی جڑ نرم اور کمزور ہوجائے گی پھر اس کو سہولت سے باہر نکال لوں گا مگر وہ پانی دینے سے اور زیادہ نیچے کو دھنستی اور زور پکڑتی جاتی ہے گناہ کرنے کے بعد اس کو قلب خالی معلوم ہوتا ہے اور خبر نہیں کہ وہ گناہ پہلے حوالی قلب میں تھا اس لئے اس کو محسوس ہوتا تھا اور اب عروق کے اندر پیوست ہوگیا اس وجہ سے اس کو محسوس نہیں ہوتا اور وقت پر بہ نسبت سابق کے بہت زور کے ساتھ برآمد ہوگا اور یہ نہیں سمجھتا کہ اب تو اس کا استیصال سہل ہے اور پھر مشکل ہوگا بقول شیخ شیرازی ؎

سر چشمہ شاید گرفتن بمیل ٭ چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

درختے کہ اکنوں گرفتست پائے — بہ نیروئے شخصے برآید زجائے
وگر ہمچناں روزگارے ہلی — بگردونش از بیخ برنگلی

(چشمے کے سوراخ کو ایک کیل سے بند کرسکتے جب پُر ہوجائے تو ہاتھی بھی اس میں نہیں گذر سکتا جس درخت نے ابھی جڑ پکڑی ہے ایک آدمی کی طاقت سے اکھڑ سکتا ہے اگر کچھ زمانہ تک اس کو اسی طرح چھوڑ دو تو اس کو جڑ سے آلہ گردوں سے بھی نہیں اکھاڑ سکتے)

الحاصل گناہ ایسی شئے ہے خواہ بڑا ہو یا چھوٹا اس سے قلب میں ایک روگ پیدا ہوجاتا ہے پس ارشاد ہے کہ قرآن مجید ایسی موعظت ہے کہ اگر اس پر عمل کروگے تو وہ دلوں کے روگ کیلئے باعث شفا ہوگا۔ اور تیسری صفت قرآن مجید کی ھدیٰ ارشاد فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نیک راہ کو بتلانیوالا ہے اور جو بھی صفت رحمت بطور ثمرہ ہدیٰ کے فرمائی ہے یعنی نتیجہ اور ثمرہ اس پر عمل کرنے کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوگی پس قرآن میں مذکورہ بالا صفات کو جمع کردیا ہے اور لِلْمُؤْمِنِیْنَ (مومنین کیلئے) کی قید اس لئے لگائی کہ گو مخاطب تو اس کے سب ہیں لیکن منتفع اس سے مومنین ہی ہوتے ہیں۔ اب اس آیت کے بعد بطور تفریع ارشاد ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیجئے کہ اللہ کے فضل اور رحمت ہی کے ساتھ پس صرف چاہیئے کہ خوش ہوں (اس لئے کہ) وہ بہتر ہے اس شے سے کہ جس کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں یعنی متاع دنیا سے یہ بہتر ہے اور عجیب بلاغت ہے کہ پہلے مضمون کا تو حق تعالےٰ نے خود اپنی طرف سے خطاب فرمایا چنانچہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ (اے لوگو!) اور اس دوسرے مضمون کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ کہیئے اس میں ایک عجیب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ طبعی بات ہے کہ احکام یعنی امر و نہی انسان کو ناگوار اور گراں ہوتے ہیں اس لئے احکام تو خود ارشاد فرمائے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت محفوظ رہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ فرحت کے امر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور زیادہ محبت مخلوق کو بڑھے باقی اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ بہت جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی احکام پہونچانے کا حکم ہے اس لئے کہ یہ نکتہ اس مقام کے متعلق ہے اور دوسری جگہ دوسرا نکتہ اور حکمت ہوسکتی ہے بہرحال دو چیز پر خوش ہونے کا حکم ہے فضل اور رحمت اور یہ فضل بھی رحمت ہی کے افراد میں سے ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ فضل کے اندر معنی زیادتی کے ہیں۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

خلاصہ یہ ہے کہ رحمت بمعنی مہربانی کے دو مرتبے ہیں ایک نفس مہربانی اور ایک زائد یا یوں کہو کہ ایک وہ مرتبہ جس کا بندہ بحیثیت جزا ر کے اپنے کو مستحق سمجھتا ہے اور ایک زائد اگرچہ پہلے مرتبہ رحمت کا اپنے کو مستحق سمجھنا بندہ کی جہالت ہے اور وجہ اس زعم استحقاق کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ پر ہر شخص کو ایک ناز ہوتا ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو ہم لوگوں میں ناز ہی کی شان رہ گئی ہے نیاز بالکل نہیں رہا اس لئے کہ اگر نیاز ہوتا تو ہم سے نافرمانی نہ ہوتی دیکھ لیجیے کہ حکام دنیا کے ساتھ نیاز ہے اس لئے ان کی نافرمانی نہیں کرتے نہ ان پر نخرے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ بالعکس ہے جس کا زیادہ سبب یہ ہے کہ رحمت ہی بے انتہا ہے حتیٰ کہ فوری سزا انہیں دی جاتی سو جس قدر رحمت بڑھتی جاتی ہے اس رحمت و عنایت کو معلوم کر کے اسی قدر اعراض ان حضرت کا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گدھا ہمیشہ کسی کے کھیت میں گھس جایا کرتا تھا ایک روز کھیت والے نے اس کے کان میں کہہ دیا کہ مجھ کو تجھ سے محبت ہے اس روز سے اس نے وہاں آنا چھوڑ دیا پس اسی طرح حق تعالیٰ کی اس قدر عطایا اور بے انتہا رحمتیں ہیں کہ ہم لوگوں کو ناز ہو گیا اور اپنی جہالت سے یہ سمجھ گئے کہ ہم بھی محبوب ہیں بس لگے نخرے بھگارنے مگر چونکہ ناز کی لیاقت نہیں ایسے ناز کا انجام بجز ہلاکت کے کیا ہوگا۔ جیسے کسی بیوقوف نے ایک سپاہی کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا ہے اور وہ گھوڑا کبھی ادھر منہ کر لیتا ہے کبھی اُدھر منہ پھیرتا ہے اور یہ شخص جس طرف وہ منہ کرتا ہے اسی طرف دانہ لیجاتا ہے اور کبھی اس کی پیٹھ سہلاتا ہے اور کبھی منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ بیٹا کھا اس بیوقوف نے جب یہ دیکھا تو اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے تو یہ گھوڑا ہی بہتر ہے میری بیوی تو مجھ کو بڑی ذلت سے روٹی دیتی ہے آج سے گھوڑا بننا چاہیئے یہ سوچ کر گھر پہنچے اور بیوی سے کہا کہ آج تو ہم گھوڑا بنیں گے وہ بھی بڑی شوخ تھی اس نے کہا کہ میری بلا سے آپ گھوڑا بنیں یا گدھا اس شخص نے کہا کہ میں گھوڑا بنتا ہوں تم میری پیٹھ سہلانا اور دانہ میرے سامنے لانا اور یہ کہنا کہ بیٹا کھاؤ میں ادھر اُدھر منہ پھیروں گا۔ غرض یہ الّو کی دُم گھوڑے کی طرح کھڑا ہوا۔ بیوی صاحبہ بھی عقلمند تھیں ایک چادر جھول کی بجائے اس پر ڈالی اور اگاڑی پچھاڑی اس کی باندھ دی اور دم کی جگہ جھاڑو لگائی اور دانہ سامنے لائی اور کہا بیٹا کھاؤ۔ رات کا وقت تھا اور اتفاق سے چراغ پیچھے رکھا تھا جب اس نے ادھر ادھر منہ پھیرا اور دولتیاں چلائیں

چراغ کی لو جھاڑو میں لگ گئی اور آگ بھڑک اٹھی بدحواسی میں یہ تو خیال نہ رہا کہ رسیاں کھول دے شور مچا دیا کہ لوگو دوڑو میرا گھوڑا جل گیا محلہ والوں نے جانا کہ یہ پاگل یا مسخرہ ہے اس کے یہاں گھوڑا کہاں یہ یوں ہی بیہودہ بکتی ہے غرض وہ گھوڑے صاحب وہیں جل بھنکر خاک سیاہ ہو گئے یہ انجام ہوتا ہے ایسے نخرے اور ناز کا صاحبو! ناز کے لئے صورت بھی تو بنوالو جب ناز زیبا ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد روئے نازیبا و ناز　　　عیب باشد چشم نابینا و باز

(ناز کرنے کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس بھی نہ جاؤ بدصورتی پر ناز برا ہے آنکھ نابینا کا کھلا ہونا عیب ہے)

ہمارا کیا ناز ہم کو تو نیاز چاہیے لیکن حق تعالیٰ کے کرم اور رحمت بے انتہا سے ہم لوگوں کی عادتیں بگڑ گئی ہیں چاہیے تو یہ تھا کہ جس قدر رحمت ہوتی شرماتے اور تضرع و نیاز زیادہ ہوتی مگر یہاں بالعکس ہے۔ اس لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر مجکو یہ کہا جاوے مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ یعنی کس شے نے دھوکہ میں ڈالا تجکو اپنے رب کریم کے ساتھ تو میں جواب دونگا قَدْ غَرَّنِیْ كَرَمُكَ یعنی آپ کے کرم نے مغرور کر دیا یعنی میں خلاف مقتضائے کرم اس کرم پر مغرور ہو گیا مقصود تیہ ہے اور اس کو عذر گردانا مقصود نہیں پس یہ سارا ناز اس وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ کی عطایا زائد ہیں اور مواخذات کم ہیں اور اگر یہ ہوتا کہ جب گناہ کرتے تو غیب سے ایک چپت لگتا[1] تو تمام ناز ایک طرف رکھا رہ جاتا اور کبھی گناہ نہ ہوتا چنانچہ بعض بزرگوں کے ساتھ ایسا معاملہ ہوا بھی ہے۔ ایک بزرگ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور نہایت خوف زدہ تھے اور یہ کہتے جاتے تھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْكَ (اے اللہ میں تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں) کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کی کیا حالت ہے انہوں نے فرمایا کہ طواف کرتے ہوئے میں نے ایک لڑکے کو نظر بد سے دیکھ لیا تھا غیب سے میری آنکھ پر ایک ایسا آزور دار چپت لگا کہ میری آنکھ پھوٹ گئی اور یہ ارشاد ہوا اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا یعنی اگر تم پھر کرو گے تو ہم پھر بھی

[1] مطلب یہ ہے کہ سزا کا ہمکو صاف علم ہوتا کہ یہ گناہ کی سزا ہے اور اسباب ظاہرہ کے ساتھ اس کا تعلق نہ جانتے ورنہ گناہوں پر تو مصائب وحوادث آفاقی وانفسی سے نہایت لطیف انداز سے سزا ہوتی ہے اور بہت سے معاف بھی ہو جاتے ہیں لیکن ہم کو اپنی جہالت اور اسباب پرستی کی وجہ سے اس کا احساس نہیں ہے اور اگر تھوڑے غور و فکر سے کام لیں تو اس کا ادراک کالشمس فی نصف النہار (مثل سورج کے دن میں) ہونے لگے اور یہ سزا ہونا بھی عین رحمت ہے ۱۲ (جامع عفی عنہ)

سزا دیں گے۔ غرض حق تعالیٰ پر ایسا ناز ہے کہ اس کی وجہ سے ہر شخص اپنے کو کسی نہ کسی رحمت کے حصہ کا مستحق سمجھتا ہے۔ چنانچہ اتنا تو ضروری جانتا ہے کہ مجکو کھانے پہننے کو ملے اور اگر اس میں کچھ کمی ہوتی ہے تو شکایت کرتا ہے اگر یہ شخص اپنے کو مستحق نہ جانتا تو شکایت نہ کرتا اس لئے کہ شکایت اسی کی کیا کرتے ہیں جس پر حق سمجھتے ہیں۔ ایک گنوار کا بیٹا مر گیا تھا تو آپ کہتے ہیں کہ میرے بیٹے کو تو مار دیا اور عیسیٰ (علیہ السلام) جو ذرا نام لگ گیا تھا اس کو گود میں اٹھا لیا۔ مگر اللہ اکبر کیا رحمت ہے سب کچھ سنتے ہیں اور کچھ سزا نہیں دیتے اور دوسری مثال لیجئے دیکھئے اگر کسی کو دس روپیہ ماہوار ملتے ہیں تو اُن پر تو شکر نہیں کرتا اور اگر کہیں سے زائد مل جائے تو اس کو رحمت حق تعالیٰ کی جانتا ہے اس پر شکر کرتا ہے یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ ان دس روپیہ کا اپنے کو مستحق جانتا ہے۔ ایک جاہل اکھڑ کے سامنے کسی نے دال روٹی کھائی اور کھا کر کہا کہ الحمد للہ اے اللہ تیرا شکر ہے تو بیوقوف کہتا ہے کہ تو یہ تو یہ ایسے ہی لوگوں نے اللہ میاں کی عادت بگاڑ دی کہ دال روٹی کھا کر شکر کرتے ہیں بس وہ ان کو دال روٹی ہی دیدیتے ہیں ہم تو بدون بکرے کے کبھی شکر نہیں کرتے بس ہم کو وہ بکرے دیتے ہیں نعوذ باللہ بہر حال ہر شخص اپنے کو کسی نہ کسی حصہ رحمت کا مستحق سمجھتا ہے حالانکہ یہ غلطی ہے اگر کوئی شخص ایسا جانتا ہو جیسا کہ طرز معاملہ سے معلوم ہوتا ہے تو اس کو اس غلطی کی اصلاح کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ معتزلہ کو بھی اس مسئلہ میں غلطی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہمارا حق ہے اور ان کو یہ دھوکہ ہوا ہے قرآن شریف کی بعض آیتوں کے نہ سمجھنے سے چنانچہ ارشاد ہے وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی مومنین کی نصرت ہم پر حق ہے اس آیت اور اس کے ہم معنی اور آیات سے معتزلہ نے یہ سمجھا کہ حق تعالیٰ کے ذمہ بندوں کا حق ہے لیکن اہل سنت سمجھ گئے کہ یہ دھوکہ ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ غنی بالذات اور لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جا سکتا) اُن کی صفت ہے اُن پر کسی کا حق نہیں ہو سکتا جس کے ساتھ جو معاملہ چاہیں کریں وہ سب مستحسن ہے اور معنی ان آیات کے یہ ہیں کہ اس صیغہ سے ہم کو نصرت وغیرہا کا یقین دلایا گیا ہے اسکو وعدہ تفضل کہتے ہیں جیسے کوئی حاکم کسی امیدوار سے کہے کہ اب تم یقین رکھو اب ہم نے تمہارا یہ کام ضروری سمجھ لیا ہے تو وہ امیدوار و سائل جانتا ہے کہ یہ حاکم کی مہربانی ہے ورنہ کرنا نہ کرنا دونوں قانوناً ان کے اختیار میں ہے ان کے ذمہ لازم نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ رحمت کے دو درجہ ہیں ایک کا تعلق تو اس کی ضروریات سے ہے جن کا اپنے کو مستحق سمجھتا ہے اس درجہ کو تو رحمۃ فرمایا اور دوسرا زائد اس کو فضل سے تعبیر

فرمایا اور آیت کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد رحمت وفضل سے قرآن مجید ہے اور اس میں بھی یہی دو درجہ ہیں ایک وہ درجہ جو مدار ہماری نجات کا ہے وہ تو ضرورت کا مرتبہ ہے اور ایک وہ جو اس سے زائد ہے۔ بہر حال دونوں سے مراد قرآن مجید ہے اور اس پر خوش ہونے کا امر ہے یہ تفسیر اور گفتگو تو الفاظ آیت کے خصوصیت میں نظر کرنے کے اعتبار سے تھی اب قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر دیکھنا چاہیے کہ ان دونوں لفظوں سے کیا مراد ہے تو جاننا چاہیے کہ قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ بکثرت آئے ہیں کہیں دونوں سے ایک ہی معنی مراد ہیں کہیں جدا جدا چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو البتہ تم ٹوٹا پانے والوں میں سے ہو جاتے) یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک فضل اور رحمت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود مراد ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بجز تھوڑے لوگوں کے تم شیطان کی پیروی کرتے) یہاں بھی بقول اکثر مفسرین حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں ایک مقام پر ارشاد ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ (سو اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو البتہ ان میں سے ایک گروہ نے تجھ کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا) یہاں مراد فضل اور رحمت سے قرآن مجید ہے اور بعض آیات میں فضل سے مراد رحمت دنیوی اور رحمت سے رحمت دینی مراد ہے چنانچہ فضل بمعنی رزق نفع دنیوی قرآن مجید میں آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ یہاں فضل سے مراد تجارت ہے اس لئے کہ یہ آیت حج کے موقع کی ہے بعض لوگ مال تجارت حج کے سفر میں ساتھ لیجانے کو مکروہ جانتے تھے ان کو ارشاد ہے کہ اس میں کچھ گناہ نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل طلب کرو۔ حدیث شریف میں بھی رحمۃ سے رحمت دینی اور فضل سے رحمت دنیوی یعنی رزق یا اسباب رزق مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ جب مسجد میں داخل ہو تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ (اے اللہ ہمارے لئے رحمت کے دروازے کھول دے) یہاں رحمت سے رحمت دینی مراد ہے اس لئے کہ مسجد میں وہی مطلوب ہے۔ اور جب مسجد سے نکلو تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا اَبْوَابَ فَضْلِكَ (اے اللہ ہمارے لئے رزق کے دروازے کھول دے) اس لئے کہ مسجد سے باہر جا کر تحصیل معاش میں مشغول ہو جاتے ہیں تو وہاں اس کی طلب ہے اور لیجئے سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (پس جبکہ نماز ادا ہو جائے تو تم زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ سے روزی تلاش کرو) یہاں فضل سے مراد رزق ہے پس مجموعہ تمام تفاسیر کا دنیوی رحمتیں اور دینی رحمتیں ہوا اس مقام پر ہر چند کہ آیت کے سیاق پر نظر کرنے کے اعتبار سے قرآن مجید مراد ہے لیکن اگر ایسے معنی عام مراد لئے جاویں تو قرآن مجید بھی اس کا ایک فرد رہے تو یہ زیادہ بہتر ہے وہ یہ ہے کہ فضل اور رحمت سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدوم مبارک لیا جاوے اس تفسیر کے موافق جتنی نعمتیں اور رحمتیں ہیں خواہ وہ دنیوی ہوں یا دینی اور اس میں قرآن بھی ہے سب اس میں داخل ہو جائیں گی اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود اصل ہے تمام نعمتوں کی اور مادہ ہے تمام رحمتوں اور فضل کا پس یہ تفسیر اجمع التفاسیر ہو جائے گی پس اس تفسیر کی بنا پر حاصل آیت کا یہ ہو گا کہ ہم کو حق تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود پر خواہ وجود نوری ہو یا ولادت ظاہری اس پر خوش ہونا چاہئے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے تمام نعمتوں کے واسطہ ہیں حتیٰ کہ ہم کو جو روٹیاں دو وقتہ مل رہی ہیں اور عافیت و تندرستی اور ہمارے علوم یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت ہیں اور یہ نعمتیں تو وہ ہیں جو عام ہیں اور سب سے بڑی دولت ایمان ہے جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو پہونچنا بالکل ظاہر ہے غرض اصل الاصول تمام مواد فضل ورحمت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہوئی پس ایسی ذات بابرکات کے وجود پر جس قدر بھی خوشی اور فرح ہو کم ہے۔ بہرحال اس آیت سے عموماً یا خصوصاً یہ ثابت ہوا کہ اس نعمت عظیمہ پر خوش ہونا چاہئے اور ثابت بھی ہوا نہایت ابلغ طرز سے اس لئے کہ اول تو جار مجرور بِفَضْلِ اللّٰہِ کو مقدم لائے کہ جو مفید حصر کو ہے اس کے بعد رحمت پر پھر جار کا اعادہ فرمایا کہ جس سے اس میں استقلال کا حکم پیدا ہو گیا پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کو مزید تاکید کے لئے فَبِذٰلِكَ مکرر ذکر فرمایا اور ذٰلِك پر جار اور فاء عاطفہ کو لائے تا کہ اس میں اور زیادہ اہتمام ہو جائے پھر نہایت اہتمام در اہتمام کی غرض سے فَلْیَفْرَحُوْا (پس چاہئے کہ خوش ہوں) پر فاء لائے کہ جو مشیر ہے ایک شرط مقدر کی طرف اور وہ اِنْ فَرِحُوْا بِشَیْءٍ (اگر کسی چیز سے خوش ہوں) ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شئے کے ساتھ خوش ہوں تو اللہ ہی کے فضل ورحمت کے ساتھ پھر اسی کے ساتھ خوش ہوں یعنی اگر دنیا میں کوئی شئے خوشی کی ہے تو بھی نعمت ہے اور اس کے سوا کوئی شئے قابل خوشی کے نہیں ہے اور اس سے بدلالۃ النص یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ نعمت تمام نعمتوں سے بہتر ہے لیکن چونکہ ہم لوگوں کی نظروں میں

دنیا اور دنیا ہی کی نعمتیں ہیں اور اسی میں ہمکو انہماک ہے اس لئے اس پر بس نہیں فرمایا آگے اور نعمتوں پر اس کی تفصیل کے لئے صراحتاً ارشاد ہوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ یعنی یہ نعمت ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کو لوگ جمع کرتے ہیں یعنی دنیا بھر کی نعمتوں سے یہ نعمت افضل و بہتر ہے پس جس نعمت پر حق تعالیٰ اس شد و مد کے ساتھ خوش ہونے کا حکم فرما دیں وہ کس طرح خوش ہونے کے قابل نہ ہوگی یہ حاصل ہوا اس آیت کا جو مبنی ہے اس پر کہ فضل اور رحمت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مراد لئے جاویں اور دوسرے مقام پر اس سے بھی صاف ارشاد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی خوشی کی شئے دنیا میں اگر ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور اس میں ما بہ الفرح یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود پر جو خوشی کا امر ہے وہ کس بنا پر ہے اور حیثیت و جہت فرح کی کیا ہے یہ بھی مذکور ہے وہ آیۃ یہ ہے ارشاد ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ یعنی حق تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان میں ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے جنس سے بھیجا کہ وہ ان پر ان کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور ان کو (ظاہری و باطنی نجاستوں و گندگیوں سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت سکھلاتے ہیں اور بیشک وہ اس سے پہلے ایک کھلی گمراہی میں تھے اس آیت میں يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ الخ (وہ ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصلی شئے خوشی کی اور ما بہ الفرح والمنت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے سرمایہ ہدایت ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خوش ہونے کی بہت سی چیزیں ہیں مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر تمام حالات مثلاً معراج وغیرہ یہ سب حالات واقعی خوش ہونے کے ہیں لیکن اس حیثیت سے کہ ہمارے لئے یہ مقدمات ہیں ہدایت وسعادت ابدی کے چنانچہ اس آیت سے صاف ظاہر ہے اس لئے کہ بعثت کے ساتھ یہ صفات بھی بڑھائی ہیں يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ الخ (وہ ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں)

ف یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصلی شئے خوشی کی اور قابل اعتماد اللہ تعالیٰ کا کہ ایمان عطا فرماتا ہے کہ جو محض فضل ہے پس ذالک خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (اور تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کو لوگ جمع کرتے ہیں) یہی فضل اور رحمت مراد ہے اور ما یجمعون اپنے عموم سے تمام احوال باطنہ کو بھی شامل ہے کہ ان پر بھی سالک کو اگر خوشی ہو تو اسی حیثیت سے ہونا چاہیئے کہ فضل ہے اپنے کسب کو مطلق دخیل نہ سمجھے ۱۲ جامع عفی عنہ

پس بقاعدہ بلاغت ثابت ہوتا ہے کہ اصل مابہ المنت یہ صفات ہیں باقی ولادت شریفہ فی نفسہا یا معراج وہ بھی باعث خوشی زیادہ اسی لئے ہیں کہ مقدمہ ہیں اس دولت عظمٰی کے اس لئے کہ اگر ولادت شریفہ نہ ہوتی تو ہم کو یہ نعمت کیسے ملتی اور اسی فرق کی وجہ سے اس آیت میں تو اس مقصود کا ذکر تصریحاً اور قصداً فرمایا اور دوسری آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کا ذکر اشارۃً اور ضمناً فرمایا چنانچہ ارشاد ہے لعمرك انهم لفي سكرتهم يعمهون (آپ کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش ہے) اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بقا اور وجود کو مقسم بہ بنایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قسم میں جواب قسم مقصود ہوتا ہے اور مقسم بہ کو تبعاً ذکر کیا جاتا ہے اور ایک مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کو بھی اسی طرح ذکر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں لا اقسم بهذا البلد وانت حل بهذا البلد ووالد وما ولد (میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے قسم ہے باپ کی اور دادا کی) چنانچہ ما ولد کی تفسیر میں بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس کے مصداق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے مگر اس اہتمام سے نہیں جیسا آیۃ لقد من اللہ الخ (اللہ تعالٰی نے احسان کیا) میں نبوت اور بعثت اور ہدایت اور تزکیہ کو بیان فرمایا ہے اور اسی فرق کی وجہ سے فرحت میں بھی تفاوت ہوگا کہ جس قدر ولادت شریفہ پر فرحت ہونا چاہیئے اس سے زائد نبوت شریفہ پر ہونا چاہیئے اگر ذکر ولادت شریفہ کے لئے مجلس منعقد کی جاوے تو ذکر نبوۃ مبارکہ کیلئے بطریق اولٰی کی جاوے اور اسی طرح ان اہل مجالس کو چاہیئے کہ معراج شریف اور فتح مکہ معظمہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات مبارکہ اور ہجرۃ کی بھی مجالس منعقد کیا کریں اس لئے کہ جیسے ولادت شریفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حال ہے اسی طرح یہ بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حالات ہیں بلکہ بعض ان میں سے ولادت شریفہ سے بڑھ کر ہیں اگر کوئی کہے کہ آجکل مجلس ولادت شریفہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب حالات کا اور احکام کا بھی ذکر کیا جاتا ہے حضرت بس رہنے دیجئے اور حالات کا ذکر محض بطور خانہ پری کے یا صرف بالا سا چھونے کے طور پر ہوتا ہے بخلاف ذکر متعلق ولادت شریفہ کے کہ وہ ذکر نور سے لیکر وقت وضع و رضاع وغیرہ تک کیا جاتا ہے اور اگر کوئی کچھ نماز روزہ کے احکام مجلس مولود میں بیان کر دیتا ہے تو میں نے اہل مولد میں سے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ یہ کہتے تھے کہ لوگوں نے آجکل یہ نئی رسم نکالی ہے کہ وعظ کہتے ہیں نماز روزہ کا اور نام کہتے ہیں ذکر ولادت کا یہ خیالات ہیں اہل مولد کے حالانکہ حق تعالٰی کے کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ فرحت کے قابل یہی شے ہے جیسا میں نے پہلی آیۃ لقد من اللہ الخ (اللہ تعالٰی نے احسان کیا) کے ذیل میں بیان کیا ہے اب بتلایئے

اس پر فرحت کون کرتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ذکر ولادت میں بوجہ اس کے کہ لڑکے خوش الحان گاتے ہیں اور مضامین و روایات بھی اکثر موضوع اور عجیب ہوتی ہیں اور اگر روایات صحیحہ بھی ہوں تو وہ ایک واقعہ اور قصہ ہے جو طبعاً دلکش ہے اس لئے اُس کے سننے میں نفس کو حظ ہوتا ہے اور احکام میں کوئی خاص مزہ نہیں اس لئے کہ اس میں تو یہی ہوگا کہ یہ کرو وہ نہ کرو تو اس میں کیا مزہ آیا حالانکہ اصل سب مزوں کی احکام ہی ہیں ایک مدت تک ان پر التزام کیجئے اور نفس کو خوگر بنایئے پھر اس میں روحانی لطف دیکھئے لیکن اس میں تو لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں اور زہر کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں اس لئے اس سے نفس بھاگتا ہے اور واقعات مولد شریف کے ذکر میں صرف سنالینا ہوتا ہے اس لئے اس میں نفس کو مزا آتا ہے اسی لئے اس کا اہتمام کرتے ہیں اسی طرح تصوف کے رنگین مضامین اور عاشقانہ اشعار کی کیفیت ہے چونکہ اس میں افعل لا تفعل نہیں ہے اس لئے خوب مزا آتا ہے سر ہلاتے ہیں بلکہ یہاں تک دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ ان اشعار و مضامین کو سمجھتے بھی نہیں ان کو بھی وجد آتا ہے۔ ایک قوال یہ شعر گا رہا تھا۔ بگزید مار عشقت جگر کباب کردمارا۔ (تیرے مار عشق نے ہمارے جگر کو کاٹ کر کباب کر دیا) ایک گنوار کو وجد آگیا اس سے پوچھا کہ تو نے کیا سمجھا جو تجھ کو وجد آیا اس نے کہا کہ یہ یوں کہتا ہے ڈکرے کا باپ مارا ڈگرا کہتے ہیں ہندی میں نفس کو ہم نے یہاں تک دیکھا ہے کہ ہندوؤں کے یہاں اور رنڈیوں کے یہاں مروج مولد شریف ہوتا ہے کہ اس میں حظ نفس ہے ورنہ ہندوؤں کو اس سے کیا تعلق غرض قرآن مجید سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ زیادہ اہتمام کے قابل نبوت اور بعثت کا ذکر ہے اور ذکر ولادت اگر کہیں آیا ہے تو اشارۃً یا اجمالاً آیا ہے اگر کوئی کہے کہ حق تعالٰی نے سورۂ مریم میں یحییٰ علیہ السلام اور عیسٰی علیہ السلام کی ولادت کا قصہ مفصلاً بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ مولد عیسٰی و یحییٰ علیہما السلام کی تفصیل بیان کرنا بھی قابل خاص اہتمام کے ہے پس اس پر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر ولادت کو بھی قیاس کرتے ہیں بات یہ ہے کہ ؎

حَفِظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ أَشْيَاءُ (ایک چیز تو نے یاد کرلی بہت چیزیں غائب ہوگئیں)

آپ نے یہ تو دیکھ لیا کہ ان حضرات کی ولادت کا قصہ اہتمام سے بیان فرمایا ہے مگر یہ نہیں دیکھا کہ کیوں اور کس حیثیت سے ذکر فرمایا ان کے قصہ ولادت کے اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی ولادت ایک عجیب طریقہ سے خرق عادت کے طور پر ہوئی ہے یحییٰ علیہ السلام کے ماں باپ تو بوڑھے بہت تھے کہ اسباب ظاہرہ کے اعتبار سے ان میں صلاحیت ہی توالد و تناسل کی نہ تھی چنانچہ ارشاد ہے

وَاَصْلَحْنَالَہٗ زَوْجَہٗ اس لئے ان کی ولادت عجیب تھی اور عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے ہوئے اس لئے انکی ولادت اس سے بھی زیادہ عجیب تھی پس حق تعالیٰ نے ان دونوں قصوں سے قدرت اور توحید پر استدلال فرمایا ہے یہ وجہ ہے ان قصوں کے بالاہتمام ذکر کرنے کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ عادت کے موافق ہوئی ہے پس اس سے مطلقاً ذکر مولد شریف کی تفصیل کا ذکر نبوت و ہجرت کی برابر محل اہتمام ہونا ثابت نہیں ہوتا مگر آجکل بعض لوگوں نے خود اس مقدمہ میں بھی کلام شروع کیا ہے کہ آپ کی ولادت شریفہ بطریق متعارف ہوئی ہے چنانچہ ایک شخص کا میرے پاس خط آیا تھا اس میں پوچھا تھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی والدہ شریفہ کے بطن سے اسی طرح پیدا ہوتے جیسے اور آدمی ہوتے ہیں اور کسی کا قول نقل کیا تھا کہ ران سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس سے ارفع ہے کہ محل غیر طاہر سے پیدا ہوں اور پوچھا تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ طریق معہود سے پیدا ہوئے ہیں میں کہتا ہوں کہ ان سائلوں کو ایسے امور کے پوچھنے سے شرم نہیں آتی بہت بے حیائی اور بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے میرا جی تو چاہتا نہ تھا کہ اس خط کا جواب لکھوں لیکن طوعاً وکرہاً لکھا تاکہ ان مخالفین کو یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ اہل حق کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ میں نے جواب میں یہ لکھا کہ روایات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں وُلِدَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور یہ مقدمہ مسلمہ ہے کہ جب تک مجاز کے قرائن نہ ہوں تو الفاظ اپنے حقائق پر محمول ہوتے ہیں یعنی جب تک معنی حقیقی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے گا اور یہ بھی مسلم ہے کہ علامت حقیقت کی تَبَادُرْ اِلَی الْفَھْمِ عِنْدَ الْخُلُوْعَنِ الْقَرَائِنِ (قرائن سے خالی ہونے پر فہم طرف سبقت کرتی ہے) ہے پس ان سب مقدمات سے وُلِدَ میں ولادت سے طریق معہود ہی سے پیدا ہونا مراد لیا جاوے گا یہ دلیل ہے اس کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طریق سے دنیا میں تشریف لائے ہیں اب لوگ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کو عجیب طریق سے ثابت کریں اور عادت معروفہ کے موافق پیدا ہونے کو قدح جانتے ہیں حالانکہ اَقْرَبُ اِلَی الْحِکْمَۃِ (حکمت کی طرف نزدیک تر) آپ کی شان کے اعتبار سے یہی ہے کہ جس طرح عادۃ اللہ جاری ہے آپ اسی طرح پیدا ہوں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ امر مسلم ہے کہ آدمی کو زیادہ اُنس اس شئے سے ہوتا ہے جس سے کچھ مناسبت ہو اور جس قدر مناسبت زیادہ ہوگی اُنس زیادہ ہوگا اور جس قدر مناسبت کم ہوگی اسی قدر اس سے توحش بڑھے گا اسی واسطے آدمی کو اپنے ہم جنس کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے اور جانوروں کی

طرف کم ہے اور جنوں سے اور بھی کم بلکہ توحش ہے اور اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام سب آدمی ہوئے ہیں فرشتوں کو نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے اس لئے کہ اُن سے آدمیوں کو توحش ہوتا اور جب توحش ہوتا تو افادہ اور استفادہ ممکن نہیں اس لئے سب رسول آدمی ہوئے ہیں جب یہ امر سمجھ میں آگیا تو اس کے بعد سمجھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوبیت کاملہ عطا فرمادیں اور کسی کو ذرہ برابر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے توحش نہ ہو پس اس لئے بجز معجزات کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور کوئی حالت ولادۃ وغیرہ بھی معمول کے خلاف نہیں بنائی اس لئے کہ اگر عادۃ جاریہ کے ذرا خلاف بھی کوئی بات ہوتی تو مناسبت میں اور پھر اس کے سبب اُنس میں کمی ضرور ہو جاتی پس ولادت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نئے طرز سے نہیں ہوتی اور یہی آپکی شان محبوبیت وافادہ کے لئے مناسب ہے، اور اس کے خلاف کو ثابت کرنا اس حکمت کو نظر انداز کرنا ہے۔

بلکہ یہ حکمت یہاں تک مرعی رکھی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر کمالات بھی کہ ان میں معجزات بھی داخل ہیں نہایت لطیف ہیں جن کا عجیب ہونا امعان نظر کو مقتضی ہے حتیٰ کہ قرآن مجید جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا معجزہ ہے وہ بھی سرسری نظر میں عجیب اور اعجاز کی شان اس میں معلوم نہیں ہوتی اسی واسطے کفار نے کہا تھا لو نشاء لقلنا مثل ھذا یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام کہہ دیں لیکن ان لوگوں نے جب غور کیا اور اپنی انتہائی قوت اس کے مقابلہ میں صرف کر دی تو دانت کھٹے ہو گئے حالانکہ بڑے فصیح اور بلیغ تھے لیکن ایک سورت بھی ایسی نہ لا سکے باوجود اس کے کہ حق تعالیٰ نے ان کو جوش دلانے کے لئے علی الاعلان فرمایا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یعنی لے آؤ کوئی سورت اس جیسی اس کے بعد اُن کے عجز کو بھی خود فرمایا وَلَنْ تَفْعَلُوْا یعنی تم ہرگز ایسی سورۃ نہ لا سکو گے اس کو سن کر اہل عرب کو کیسا کچھ جوش آیا ہوگا اور کس قدر بل کھائے ہوں گے لیکن مقابلہ نہیں کر سکے اور اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ آگے ارشاد ہے فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ یعنی اگر تم اس کا مثل نہ لا سکو تو اُس آگ سے بچتے رہو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے غرض یہ معجزہ بھی نہایت غامض اور لطیف ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر شان اور کمال ایسا ہی لطیف ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ؎ یَزِیْدُكَ وَجْهُهٗ حُسْنًا ؛ اِذَا مَا زِدْتَهٗ نَظَرًا۔ یعنی محبوب کا چہرہ تیرے لئے حسن کو بڑھا دیتا۔ جب تو اس پر نظر زیادہ کرتا ہے چنانچہ بعضوں کا حسن تو ایسا ہوتا ہے کہ دور سے وہ اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن پاس سے دیکھو تو کچھ بھی نہیں جیسے شیخ شیرازی فرماتے ہیں

؎ بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد ؛ چوں باز کنی مادر مادر باشد

(بہت خوش قامت چادر کے اندر ہوتی ہیں - جب تم چادر ہٹاؤ تو نا ٹی معلوم ہوتی ہیں)

اور بعضے دور سے اور سرسری نظر میں معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن جس قدر غور کرو خوبیاں معلوم ہوتی جاتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بھی ایسے ہی ہیں کہ ان میں سادگی تو اس درجہ ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ؎ دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند ؛؛ دلبر ما است کہ با حُسن خداداد آمد

(تمام دلفریبان بناتی زیور سے آراستہ و پیراستہ ہیں ہمارے محبوب کا حُسن خداداد ہے)

اور نظر تامل کے بعد دلربائی کی یہ حالت ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اسکا وہ حسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے) پس ولادت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی عجیب طریقہ سے نہیں ہوئی اور ولادت عیسویہ نہایت عجیب طریقہ سے ہوئی اور چونکہ اس سے توحید پر استدلال مقصود ہے اس لئے اس کو اہتمام سے بیان بھی فرمایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدار منت و فرحت کا شان يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ الخ (وہ ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں) کی ہے اور ولادت شریفہ اور نشو ونما کے واقعات کی خوشی بھی اسی واسطے ہے کہ وہ واسطہ ہے اس دولت کی تحصیل کا خوب کہا ہے ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی — کانگشت نمائے عالمے خواہی شد

(وہ دن کہ تو چاند ہوا نہیں جانتا تھا کہ ایک عالم کا انگشت نما ہوگا)

پس اصل میں تو جو مقصود حالت بدریت کی ہے لیکن ہلالیت کی خوشی بھی اسی واسطے ہے کہ وہ ذریعہ بدریت کا ہے پس اصل سرور تو اس کا ہے کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی نعمت عطا فرمائی باقی اس کے جس قدر اسباب ہیں وہ چونکہ اس کے وسائط ہیں اس لئے ان سے بھی خوشی ہے اسی طرح کو مولانا رومی اپنی مثنوی شریف میں چند ابیات کے اندر بیان فرماتے ہیں جو گویا حاصل ہے ان آیات کے مفہوم کا ان ابیات کو مع مختصر شرح کے یہاں بیان کیا جاتا ہے پس فرماتے ہیں ؎

اَيُّهَا الْعُشَّاقُ اِقْبَالٌ جَدِيْدٌ — از جہان کہنہ نو در رسید

یعنی اے عشاق مژدہ ہو کہ نیا اقبال چمکا ہے جو ایک پرانے اور نئے جہان سے پہونچا ہے اقبال جدید سے مراد قرآن مجید ہے اور جدید اس کو کلام لفظی کے اعتبار سے کہا ہے ورنہ کلام نفسی اور صفت الٰہیہ کے مرتبہ میں تو وہ قدیم ہے باقی رہی یہ بات کہ کلام لفظی کے اعتبار سے تو اس کی ایک صفت کو ذکر فرمایا اور کلام

نفسی کے اعتبار سے کوئی صفت ذکر نہیں کی تو وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمکو جو خطاب ہوا ہے اور ہم کو جو یہ دولت ملی ہے تو اسی لباس یعنی کلام لفظی کے ساتھ ملی ہے پس ہمارے نفع میں یہ شان جدید ہی زیادہ دخیل اور سبب قریب ہوئی گو فی نفسہ قدیم ہے اور اسی صفت کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے ما یاتیھم من ذکر من ربھم محدث الا استمعوہ وھم یلعبون اور فرمایا وما یاتیھم من ذکر من الرحمن محدث الا کانوا عنہ معرضین اور جہان سے مراد عالم غیب ہے، اور کہنہ اس کو اس لئے کہا کہ بہت پرانا ہے اور نو اس لئے کہ اس میں تغیر نہیں ہوا الآن کما کان (جیسا کہ پہلے تھا اب بھی ایسا ہی ہے) اس کی شان ہے اور عالم غیب کی تو یہ شان ہے ہی آسمان جو عالم شہادت سے ہے مگر بوجہ منتہائے عالم شہادت ہونے کے اس کو عالم غیب سے کچھ قرب ہے خود اس کی بھی حالت ہے کہ باوجود اس کے کہ کس قدر پرانا ہے لیکن اس میں کچھ تغیر نہیں ہے چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ یعنی اے مخاطب تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی شے میں (آسمان مراد ہے) کوئی تفاوت نہ دیکھے گا (اگر کچھ شک ہے) پس نگاہ اٹھا کر دیکھ کیا کہیں کوئی رخنہ دیکھتے ہو آگے مکرر تاکید کے لئے اور نیز اس لئے کہ شاید ہماری خاطر سے کہد و کہ نہیں کہیں کوئی فرق نہیں اس لئے ارشاد ہے ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ یعنی پھر بار بار نظر دوڑاؤ آگے اس کا نتیجہ ارشاد ہے کہ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ یعنی ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تمہاری نگاہ پھر پھرا کر تمہارے پاس تھکی تھکائی واپس آجائے گی اور کہیں کوئی عیب نہ پائیگی خلاصہ یہ ہے کہ مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ اے حق تعالیٰ کے طالبو اے حق کے شیدائیو اے مدتوں سے وادی ضلال میں بھٹکنے والو خوش ہو جاؤ تمہارے اقبال کا ستارہ چمکا ہے یعنی عالم غیب سے قرآن مجید نازل ہوا ہے کہ راہ حق کی طرف ہادی ہے آگے فرماتے ہیں ؎

زاں جہان کو چارہ بیچارہ جوست　　　صد ہزاران نادرہ عالم در وست

زاں جہان بدل ہے جہان کہنہ سے جو شعر بالا میں ہے یعنی وہ اقبال جدید اس جہان سے آیا ہے کہ وہ لا علاج کا چارہ جو ہے اور لاکھوں عجائبات عالم کے اس میں ہیں یعنی جو شخص امراض کفر و شرک و گناہ میں مبتلا ہو کر لاعلاج ہو گیا ہو اور اس جہان کے اطبا نے اس کو جواب دیدیا ہو تو اس کا علاج اس جہان سے ہوتا ہے چنانچہ قبل از بعثت مشرکین اور کفار ایسے امراض میں مبتلا تھے کہ وہ لا علاج ہو چکے تھے قلوب مسخ ہو گئے تھے شر کو خیر اور خیر کو شر جانتے تھے ہزاروں رسوم جہالت کی ان میں وبا عام کی طرح

پھیلی ہوئی تھیں کہ دفعۃً اقبال جدید کا ستارہ چمکا اور اس نے ایسا نور ڈالا کہ سب کا علاج ہوگیا۔ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰہُ (مگر جس کو چاہے اللہ) اور اگر ایسی زبردست روشنی ان پر نور افشاں نہ ہوتی تو ان کی درستی کی بالکل امید نہ تھی چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ یعنی کفار اہل کتاب ومشرکین اپنی گمراہی سے جدا ہونے والے نہ تھے جبتک ان کے پاس ایک روشن دلیل نہ آجاوے وہ دلیل ایک ایسا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جو اللہ کی جانب سے ہے جو پاکیزہ صحیفے پڑھے جس میں راست راست مضامین لکھے ہوئے ہوں دوسرے مصرعہ کا حاصل یہ ہے کہ اس جہان میں عالم کے بے شمار عجائب ہیں چنانچہ دوزخ وہاں موجود ہے جس کے ہولناک اور عجائبات اور واقعات کی کسی قدر حکایت احادیث میں آئی ہے اور جنت وہاں موجود ہے جس کے بیشمار اور بیرون از عقل وقیاس نعمتوں کی خبر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اسی طرح عالم ارواح اور صراط اور میزان وہاں موجود ہیں اور ان چیزوں کے عجیب ہونے میں کوئی شک نہیں چنانچہ اسی وجہ سے ملاحدہ اور فلاسفہ نے ان کے وجود ہی سے انکار کردیا ہے آگے ارشاد ہے ؎ اِبْشِرُوْا یَا قَوْمُ اِذْ جَاءَ الْفَرَجْ اِصْبِرُوْا یَا قَوْمُ اِذْ زَالَ الْحَرَجْ یعنی اے میری قوم خوش ہوجاؤ اس لئے کہ کشادگی آگئی اور اے قوم خوش ہوجاؤ اس لئے کہ تنگی جاتی رہی مطلب ظاہر ہے قال ؎ آفتاب رفت درکازہ ہلال ؛ در تقاضا کہ اَرِحْنَا یا بلال ۔ ہلال صحابی ہیں مولانا نے ان کی حکایت بیان کی ہے کہ وہ ایک اصطبل میں سائیس تھے وہ بیمار ہوگئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو وہاں ہی تشریف لے گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض رسانی کو مولانا بیان فرماتے ہیں کہ اور فیض رساں تو ایسے ہوتے ہیں کہ طالبین ان کے دروازہ پر آتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ایسے تھے کہ ظاہر حال کے اعتبار سے ایک شکستہ حال کے یہاں آپ خود تشریف لے گئے حافظ شیرازیؒ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم ؛ شہان بے کمر وخسروان بے کلہ اند (مگر وہاں عشق کو حقارت سے نہ دیکھو اس لئے یہ بے پٹکے اور تاج کے بادشاہ ہیں) ایسے ہی حضرات کے بارہ میں حدیث شریف میں وارد ہوا ہے رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ یعنی بہت سے پراگندہ بال غبار آلودہ دروازوں سے دھکے دیئے ہوئے اور حالت ان کی یہ ہے کہ اگر اللہ پر کسی بات کے متعلق قسم

کھا بیٹھیں یعنی قسم کھا کر یہ کہدیں کہ اللہ ایسا ہی کریں گے تو اللہ تعالےٰ ان کو قسم میں سچا کردیں اسی شان کو فرمایا ہے حافظ شیرازیؒ نے ؎

گدائے میکدہ ام لیکن وقت مستی بین　　　　که ناز بر فلک و حکم بر ستاره کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں) اور فلک اور ستارہ پر ناز کرنا کیا تعجب ہے جب وہ حضرات خالق فلک وستارہ پر ناز کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سطوت وشوکت جو قلوب پر تھی اس کو تو سب جانتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی عناصر پر بھی آپ کی حکومت گاہے بطور کرامت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ زمین کو زلزلہ آیا تو آپنے فرمایا اُسْکُنِیْ یَا اَرْضُ یعنی اے زمین ساکن ہوجا زمین فوراً ٹھہر گئی اور سُنئے دریائے نیل کی کبھی یہ حالت ہوتی کہ اس کا پانی دفعۃً ٹھہر جاتا تھا اور اس قدر نہ بڑھتا تھا جس سے زراعت کی آب پاشی ہوسکے۔ وہاں کے لوگ یہ کرتے تھے کہ ایک کنواری حسین لڑکی کو اس میں چھوڑ دیتے تھے اس وقت اس کا پانی چڑھ آتا تھا جب مصر فتح ہوا تو لوگوں نے یہ قصہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے جو امیر لشکر تھے بیان کیا انھوں نے فرمایا کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا میں اس کی اطلاع امیرالمؤمنین کو کرتا ہوں وہ ضرور اس کا انتظام فرمادیں گے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ سب قصہ لکھا آپنے اسی وقت ایک فرمان دریائے نیل کے نام صادر فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ اے نیل تو اگر خدا کے حکم سے چلتا ہے تو کسی شیطان کے اثر سے مت رُک اور حضرت عبداللہ کو لکھا کہ یہ پرچہ دریا میں ڈال دینا۔ چنانچہ حسب الارشاد وہ رقعہ دریا میں ڈالدیا دریا اس زور شور سے چڑھا کہ کبھی اس زور سے نہ بہا تھا۔ الغرض حاصل مصرعہ اولیٰ کا یہ ہوا کہ آفتاب فیض یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی عیادت کے واسطے ان کے مکان پر یعنی اصطبل میں تشریف لے گئے یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض باعتبار تربیت جسم کے ہوا آگے فیض روحانی وفیض باطنی کا بیان ہے کہ بلال جو کہ ایک عبد حبشی تھے اُن سے آپ نہایت لطف وشفقت سے باتیں کرتے تھے چنانچہ ان سے بتقاضا ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اے بلال ہم کو راحت دو یعنی اذان کہدو تاکہ نماز سے راحت ہو اور نماز و اذان کی تعلیم فرمانا ظاہر ہے کہ روحانی فیض رسانی ہے قالؒ ؎

زیر لب میگفتی از بیم عدو　　　　بر مناره رو بگو کوری او

لے بلالؓ تم مکہ مکرمہ میں زیر لب آہستہ سے دشمن کے خوف سے اللہ کا نام لیتے تھے یعنی کلمہ توحید کبھی کبھی خفیہ کہتے تھے اب مدینہ منورہ میں منارہ پر جاکر پکار کر اللہ کا نام لو یعنی اذان کہو اور دشمن کو نامراد بناؤ اور خفیہ کہنے میں کبھی کبھی کی قید اس لئے لگائی کہ ان کی تو یہ حالت منقول ہے کہ یہ ایک یہودی کافر کے غلام تھے اور وہ ان کو تمام دن دھوپ میں گرم پتھر پر لٹایا کرتا تھا اس حالت میں بھی ان کی زبان سے توحید کے کلمات جاری رہتے تھے اتفاقاً ایک روز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اس طرف گذر ہوا جہاں یہ حضرت بلال مبتلائے تکلیف تھے حضرت صدیق رضؓ ان کے مولیٰ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے پاس ایک غلام نصرانی عداس نامی تھا جو بہت روپیہ کماتا تھا اس کو دیکر حضرت بلالؓ کو چھڑا لیا۔ اس کافر نے کہا کہ ابو بکرؓ بہت خسارہ میں رہے کہ ایسا اچھا غلام دیکر ان کو لیا ہے۔ حضرت ابو بکر رضؓ نے فرمایا کہ ایک غلام کیا اگر تو ان کے عوض میں میرا سارا گھر بھی مانگتا تو میں وہ بھی دیدیتا تو کیا جانتا ہے یہ کیا چیز ہیں اور حق تعالیٰ نے اس کافر کے کہنے کا یہ جواب دیا وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ یعنی قسم ہے زمانہ کی بیشک انسان (کافر) خسارہ میں ہے مگر وہ مومن جو اعمال صالح کرتے ہیں وہ خسارہ میں نہیں ہیں اسی قصہ کی طرف حضرت عمرؓ نے اس نظم میں اشارہ کیا ہے؎

لَقَدْ وَاسَی النَّبِیَّ بِکُلِّ فَضْلٍ ۞ وَاَسْرَعَ فِیْ اِجَابَتِہٖ بِلَا لَا
ابو بکر حَبَانِی اللہِ مَالًا ۞ وَاَعْتَقَ مِنْ ذَخَائِرِہٖ بِلَالًا

پہلے بلالا سے جو ل ایک کلمہ ہے مراد حضرت بلال ہیں اور دوسرے بلالا سے جو کہ دو کلمے ہیں مراد بدون لا کے ہے معنی اشعار کے یہ ہیں کہ ابو بکرؓ نے اللہ کی راہ میں مال دیا۔ اور اپنے ذخائر سے حضرت بلال کو آزاد کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر مال کے ساتھ غمخواری اور ہمدردی کی اور بدون انکار کے ان کی اجابت میں جلدی کی ان ہی حضرت بلال کی شان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضؓ کی مدح کرتے ہوئے فرماتے ہیں اَبُوْبَکْرٍ سَیِّدُنَا وَاَعْتَقَ سَیِّدَنَا یعنی ابو بکرؓ ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار یعنی بلال کو آزاد کیا ہے اللہ اکبر کہاں حضرت عمرؓ اور کہاں حضرت بلال۔ حضرت عمرؓ کی تو وہ شان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ یعنی اگر کوئی میرے بعد نبی ہوتا تو عمر ہوتے باوجود اس مرتبہ کے بلال رضی اللہ عنہ کو سیدنا فرماتے ہیں لیکن کسی کو کیا خبر ہے کہ بلال کی کس شئے کو انہوں نے سید فرمایا ہے اگرچہ اس شئے میں بھی حضرت عمرؓ ہی بڑھے ہوئے تھے لیکن ان حضرات نے اپنے کو ایسا مٹایا تھا کہ ہر ایک کو اپنے سے افضل جانتے تھے آجکل دیکھا جاتا ہے کہ تھوڑا سا پڑھ لکھ کر یا کسی ادنیٰ بات سے

ایسا ناز ہو جاتا ہے کہ دماغ صحیح نہیں رہتا اور جو نسب میں گھٹا ہوا ہو اگرچہ زہد و تقویٰ میں بڑھ کر ہو اس میں عیب نکال لیتے ہیں یاد رکھو حق تعالیٰ کے یہاں نسب حسب کوئی شے نہیں جس پر چاہتے ہیں فضل فرما دیتے ہیں دیکھو ابوجہل شریف ہو کر مطرود ہوا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ باوجود عبد حبشی ہونے کے مقبول ہو گئے۔ عجیب شان ہے ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم — ز خاک مکہ بوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

(حسن بصری بصرہ کی خاک سے اور حضرت بلالؓ حبش سے اور صہیبؓ خاک روم سے ہوں اور ابوجہل مکہ کی خاک سے ہو کیا بوالعجبی ہے)
غرض حضرت بلالؓ تو بڑے علی الاعلان توحید کو ظاہر کرنے والے ہیں شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس مصلحت سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف نہ پہونچائے کسی خاص موقع پر اس توحید کا اخفا فرمایا ہو اس لئے ارشاد ہے کہ اب کوئی احتمال نہیں رہا پکار کر منارہ پر جا کر اذان کہو اور دشمن کا دل جلاؤ۔ قال مولانا رومیؒ

؎ می دمد در گوش ہر غمگین بشیر — خیز اے مدبر رہ اقبال گیر

یعنی اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہر طالب دردناک اور غمگین جو درد طلب سے بیقرار ہے اس کے کان میں بشیر یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھونک رہے ہیں کہ اے بدبخت اٹھ اقبال کا راستہ لے یعنی ہدایت کے ابواب مفتوح ہو گئے ہیں اس کو اختیار کر تمام ہو گئے اشعار مثنوی کے ان اشعار میں مولانا نے فیض وحی اور فیض نبوت اول بیان کیا ہے اس پر فرحت ظاہر کی ہے پھر صحابہ کی طرف فیض رسانی کے لئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ تھی اس کو بیان کیا گویا یہ اشعار ان آیات کے متقارب المعنیٰ ہیں یہ تمام تر تقریر بطور تمہید کے تھی اور اس تقریر سے مقصود مجکو شبہات کا زائل کرنا تھا کہ جو ہم لوگوں کی نسبت ہیں ورنہ اصل مقصود یہ تھا کہ اس نعمت عظیمہ پر فرحت مامور بہا کا طریقہ بیان کیا جاوے اور اس میں جو لوگوں نے افراط تفریط کی ہے ان کی اصلاح کی جاوے اور مخالفین کے دلائل کا جواب دیا جاوے لیکن تمہید ہی میں بہت تطویل ہو گئی لیکن کچھ حرج نہیں اس لئے کہ بہت سے فوائد اس سے معلوم ہو گئے (یہاں پہونچکر نماز عصر کے لئے اٹھے پھر بعد نماز آگے بیان ہوا)

اب میں مقصود شروع کرتا ہوں تقریر سابق سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود پر فرحت مامور بہا ہے اب یہ سمجھنا چاہیے کہ اس فرحت کا طریقہ صحیحہ مقبولہ کونسا ہے سو اس کے طریقے دو ہیں ایک تو وہ طریقہ جس پر خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

عمل فرمایا ہو اس لئے کہ جیسا امت پر اس آیت کا امتثال واجب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی واجب ہے جیسا نبی کو نبی ماننا فی البدیہہ جس طرح امت کے ذمہ ضروری ہے اسی طرح بلا فرق اس نبی کو بھی اپنی نبوۃ کا اعتقاد فرض ہے اس لئے یہ بات دیکھنا ضروری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرحت کو کس طریق سے ظاہر فرمایا ہے اور دوسرا طریقہ وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کلیاً یا جزئیاً منقول نہ ہو بلکہ کسی نے ایجاد کیا ہو جس طرح سے آجکل بہت سے محبت کا دم بھرنے والے لوگ مجالس منعقد کرتے ہیں اور ان میں سے بعض تو نرے مدعی ہی ہیں ہاں جو کچھ روپیہ خرچ کرنے والے ہیں ان میں سے اکثر کی نیت بری نہیں وہ محبت سے ہی کرتے ہیں مگر غلطی میں ہیں اس لئے کہ محبت میں غلطی بھی تو ہو جاتی ہے یہ تو ضروری نہیں کہ جس فعل کا منشا محبت ہو اس میں غلطی نہ ہو جیسے کوئی اللہ تعالیٰ کی محبت کے جوش میں مثلاً ٹھیک دوپہر کو نماز پڑھنے لگے باقی جن کا کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا بلکہ اُن کو آمدنی ہوتی ہے یعنی مولود خواں مولوی ان میں سے تو اکثر کی نیت بھی اچھی نہیں ان کا مقصود صرف روپیہ ہی ہے بلکہ کچھ عجب نہیں کہ بعض کو ان میں سے حق واضح بھی ہو گیا ہو لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ہم یہ طریقہ جاری نہ رکھیں گے تو ہم کو جو روپیہ اور نذرانے اور جوڑے ملتے ہیں وہ نہ ملیں گے اس لئے وہ چھوڑتے نہیں۔ میرے پاس ضلع رہتک سے ایک صاحب کا خط آیا اس میں لکھا تھا کہ یہاں ایک بی بی ہیں جن کا نام لولو ہے ان کے یا بابا بننے کی کسر ہے ورنہ سب حرف علت جمع ہو جاتے (لطیفہ کے طور پر ہے) جیسا ایک عربی کے شعر میں کسی نے یہ حروف جمع کئے ہیں ؎

رَأَیتُ صَبِیًّا عَلٰی کُثَیبٍ یُجَمِّلُ الْبَدْرَ وَالْهِلَالَا — فَقُلْتُ مَا اسْمُكَ فَقَالَ لُؤْلُؤٌ فَقُلْتُ لِی لِی فَقَالَ لَا لَا

شاعر نے کمال کیا ہے لولو اور لی لی اور لا لا کو خوب جمع کیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ میں نے ایک حسین لڑکے کو ایک ٹیلہ پر دیکھا اور نام پوچھا اس نے کہا لولو میں نے کہا تو میرا ہے اس نے کہا نہیں اور یہ لولو بمعنی موتی کے ہے وہ لولو نہیں جس سے بچوں کو ڈراتے ہیں۔ اس پر ایک اور حکایت یاد آئی نصیر شاعر کا ایک لڑکا بچہ تھا ایک بار چند شعراء نصیر سے ملنے آئے نصیر موجود نہ تھا یہ بچہ تھا شعراء نے اس سے فرمائش کی کہ کوئی شعر فی البدیہہ بنا کر سناؤ اس نے عجیب شعر اپنے بچپن کی شان کے موافق بے ساختہ کہا ؎

اے بتو مجکو ڈر گوش دکھاتے کیوں ہو — میں ہوں بالا مجھے لولو سے ڈراتے کیوں ہو

غرض ان صاحب نے لکھا تھا کہ یہاں وہ بی بی مولد شریف پڑھتی ہیں اور ان کا کچھ نذرانہ بھی مقرر ہے اور ایک نئی بات یہ ہے کہ عید بقر عید کی نماز بھی عورتوں کو پڑھاتی ہیں اور ان سب قصوں کی جڑ وہی نذرانہ ہے اسی واسطے میں تو اپنے دوستوں سے یہ کہا کرتا ہوں کہ یہ بدعات کرنے والوں کو منع نہ کرو لیکن ان کو دینا چھوڑ دو جب مفت محنت کرنا پڑے گی وہ خود ہی تنگ ہو کر ان بدعات کو چھوڑ دیں گے اس لئے کہ کام تو پورا کرنا پڑے گا اور ملے گا کچھ بھی نہیں تو خواہ مخواہ کی مشقت بھی ہوگی اور وصول کچھ نہ ہوگا تو خود ہی چھوڑ دیں گے بہرحال ہر عمل کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک منقول اور دوسرا تراشا ہو گفتگو اس میں ہے کہ اس فرحت کا طریق مروج کس قسم میں داخل ہے اس کے لئے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتا ہوں اس سے یہ واضح ہو جائیگا کہ جتنی چیزیں بعد خیر القرون کے ایجاد ہوتی ہیں ان میں کونسی بدعت ہے اور کونسی مستحب اور مندوب اور ثابت بالشریعۃ ہیں اور اسی سے یہ بھی واضح ہوگا کہ اس فرحت کے ظاہر کرنیکا آیا کوئی طریقہ مقبولہ ہے یا نہیں اور نیز طریقہ مروجہ بدعت ہے یا نہیں پس جاننا چاہیئے کہ بعد خیر القرون کے جو چیزیں ایجاد کی گئیں ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ کہ ان کا سبب داعی بھی جدید ہے اور وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ کی ہیں کہ بغیر ان کے اس مامور بہ پر عمل نہیں ہو سکتا جیسے کتب دینیہ کی تصنیف اور تدوین مدرسوں اور خانقاہوں کی بنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی شئے نہ تھی اور سبب داعی ان کا جدید ہے اور نیز یہ چیزیں موقوف علیہ ایک مامور بہ کی ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دین کی حفاظت سب کے ذمہ ضروری ہے اس کے بعد سمجھئے کہ زمانہ خیر بت نشانہ میں دین کی حفاظت کے لئے وسائط محدثہ میں کسی شے کی ضرورت نہ تھی تعلق مع اللہ یا بلفظ آخر نسبت مسلسلہ سے بہ برکت حضرت نبوۃ سب مشرف تھے قوت حافظ اس قدر قوی تھی کہ جو کچھ سنتے تھے وہ سب نقش کالحجر ہو جاتا تھا فہم ایسی عالی پائی تھی کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ سبق کی طرح ان کے سامنے تقریر کریں ورع و تدین بھی غالب تھا بعد اس زمانہ کے دوسرا زمانہ آیا غفلتیں بڑھ گئیں قوی کمزور ہوگئے ادھر اہل اہوا اور عقل پرستوں کا غلبہ ہوا تدین مغلوب ہونے لگا پس علماء امت کو قوی اندیشہ دین کے ضائع ہونے کا ہوا پس ضرورت اس کی واقع ہوئی کہ دین کی بجمیع اجزائہ تدوین کی جائے چنانچہ کتب دینیہ حدیث اصول حدیث فقہ عقائد میں تصنیف ہوئیں اور ان کی تدریس کے لئے مدارس تعمیر کئے گئے اسی طرح نسبت مسلسلہ کے اسباب تقویت وابقاء کے لئے بوجہ عام رغبت نہ رہنے کے مشائخ نے خانقاہیں بنائیں اس لئے کہ بغیر ان چیزوں کے دین کی حفاظت کی کوئی صورت نہ تھی پس یہ چیزیں وہ ہوئیں کہ سبب ان کا جدید ہے کہ وہ

سبب خیر القرون میں نہ تھا اور موقوف علیہ حفاظت دین ماموربہ کی ہیں پس یہ اعمال گو صورۃً بدعت ہیں لیکن واقع میں بدعت نہیں بلکہ حسب قاعدہ مُقَدَّمَۃُ الْوَاجِبِ وَاجِبٌ (واجب کا مقدمہ واجب ہے) واجب ہیں اور دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جن کا سبب قدیم ہے جیسے مجالس میلاد مروجہ اور تیجہ دسواں چہلم وغیرہا من البدعات کہ ان کا سبب قدیم ہے مثلاً مجلس میلاد کے منعقد کرنے کا سبب فَرْحٌ عَلَى الْوِلَادَةِ النَّبَوِيَّۃ (ولادت نبویہ پر خوشی) ہے اور یہ سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی موجود تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابؓ نے یہ مجالس منعقد نہیں کی کیا نعوذ باللہ صحابہ کا فہم یہاں تک نہیں پہونچا اگر سبب اس کا اس وقت نہ ہوتا تو البتہ یہ کہہ سکتے تھے کہ منشا ان کا موجود نہ تھا لیکن جبکہ باعث اور بنا اور مدار موجود تھا پھر کیا وجہ ہے کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجلس میلاد منعقد کی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسی شئے کا حکم یہ ہے کہ وہ بدعت ہیں صورۃً بھی اور معنیً بھی اور حدیث من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ (جس شخص نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز پیدا کی جو اس میں سے نہیں ہے) میں داخل ہو کر واجب الرد ہیں اور پہلی قسم ما منہ (جو اس دین میں سے ہے) میں داخل ہو کر مقبول ہے یہ قاعدہ کلیہ ہے بدعت اور سنت کے پہچاننے کا اس سے تمام جزئیات کا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور ان دو قسموں میں ایک اور فرق عجیب ہے وہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے تجویز کرنے والے خواص یعنی علماء ہوتے ہیں اور اس میں عوام تصرف نہیں کرتے اور دوسری قسم کے تجویز کنندہ عوام کالانعام ہوتے ہیں اور وہی اس میں ہمیشہ تصرفات کیا کرتے ہیں چنانچہ مولد شریف کی مجلس کو ایجاد بھی ایک بادشاہ نے کیا ہے کہ اس کا شمار عوام ہی میں ہے اور عوام ہی اب تک اس میں تصرف بھی کر رہے ہیں چنانچہ چند روز سے اس میں ایک اور ترقی ہوئی ہے کہ اس دن عید منانے لگے ہیں اور اس کا نام رکھا ہے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پرانی رسم مولد کے متعلق تو علماء نے مستقل رسائل لکھے ہیں جیسے براہین قاطعہ وغیرہ اور احقر نے بھی اصلاح الرسوم میں مفصل بحث لکھی ہے لیکن اس نئی رسم کے متعلق جس کا نام عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم رکھا گیا ہے اب تک کوئی رسالہ نظر سے نہیں گذرا اگرچہ اجمالاً میں نے گذشتہ دو سال کے دو وعظ میں اس کا کچھ بیان کیا ہے جو طبع ہو گیا ہے لیکن مفصل بحث اس کے متعلق نہیں کی گئی آج اسی کے متعلق بیان کرنے کا ارادہ ہے لیکن تمہید میں دیر ہو گئی خیر مقصود اکثر مختصر ہی ہوتا ہے اس لئے اس میں زیادہ دیر نہ ہوگی لیکن اتنا مختصر بھی نہ ہوگا کہ کوئی پہلو رہ جائے۔ جاننا چاہیے کہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے جو ایک رسم شائع ہوئی اس کے متعلق دو کلام ہیں ایک تو اس کے نام مشروع ہونے کے متعلق دلائل دوسرے مخالفین کے دلائل کا جواب اس کے بعد سمجھئے کہ

شریعت کے دلائل چار ہیں کتابؑ، سنتؑ۔ اجماعؑ۔ قیاسؑ ان شاء اللہ تعالیٰ چاروں سے گفتگو کی جاوے گی اول کتاب اللہ کو لیجئے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اَمْ لَھُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَھُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَالَمْ یَاْذَنْ بِہِ اللّٰہُ یعنی کیا ان کے لئے شرکا ہیں کہ انہوں نے ان کے لئے دین کی وہ بات مقرر کردی جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ دین کی بات بدون اذن الٰہی یعنی بدون دلیل شرعی کسی کو مقرر کرنا مذموم و مستنکر ہے یہ تو کبریٰ ہے اور صغریٰ یہ ہے کہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم دین بھی کی بات سمجھ کر بلا دلیل مقرر کی گئی ہے اور دلیل نہ ہونا جزءً بیّناً تو ظاہر ہے کہ یہ امر شریعت میں نہیں ہے امر مستحدث ہے اگر احتمال ہے تو اس کا ہے کہ کسی کلیہ میں داخل کرتے ہوں گے مفصل گفتگو تو ان کلیات کی جس میں یہ داخل ہو سکتی ہے آگے آوے گی باقی مجملاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سبب داعی اس کا قدیم ہے خواہ وہ فرح ہو یا اظہار شوکت اسلام ہو کہ وہ بھی قدیم ہے بہر حال ان میں سے جو بھی سبب ہو تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جبکہ یہ سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ خیر القرون کے زمانہ میں بھی موجود تھا اور وہ حضرات قرآن و حدیث کو خوب سمجھنے والے تھے اور ایسا سمجھتے تھے کہ اس کو دیکھ کر اب اجتہاد کو جائز نہیں رکھا گیا پس جب مسلم ہو چکا کہ وہ کتاب و سنت کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے تھے اور یہ سبب بھی اس وقت موجود تھے یعنی اظہار فرح اور شوکت اسلام کی اس وقت بھی ضرورت تھی بلکہ اس وقت سے زیادہ ضرورت تھی مگر ان حضرات نے اس پر عمل نہیں کیا پس معلوم ہوا کہ کسی کلیہ میں داخل کرنا اس کا صحیح نہیں اور یہ بالکل امر مستحدث اور جدید ہے کہ جس کی کچھ اصل نہیں اور بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ غیر دین کو دین سمجھ کر کیا جاوے اور اس کو یہ لوگ دین سمجھتے ہیں پس یہ بدعت واجب الترک ہے یہ تو قرآن مجید سے اس کے متعلق کلام تھا۔ اب حدیث لیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ یعنی جو شخص ہمارے اس دین میں وہ شے نکالے جو اس میں سے نہیں پس وہ واجب الرد ہے جو تقریباً آیت کے ذیل میں کی گئی ہے وہی یہاں بھی ہے اور مراد تی شے سے وہ ہے جس کا سبب قدیم ہوا اور پھر اس وقت معمول بہ نہ ہوئی ہو باقی جس کا سبب جدید ہوا اور نیز وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ کی ہو وہ مَامِنْہُ (وہ جو اس دین میں سے ہے) میں داخل ہو کر واجب ہے۔ اور دوسری حدیث لیجئے مسلم کی روایت ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَخْتَصُّوْا لَیْلَۃَ الْجُمُعَۃِ بِقِیَامٍ مِّنْ بَیْنِ اللَّیَالِیْ وَلَا تَخُصُّوْا یَوْمَ الْجُمُعَۃِ بِصِیَامٍ مِّنْ بَیْنِ الْاَیَّامِ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ فِیْ صَوْمٍ یَّصُوْمُہٗ اَحَدُکُمْ یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

نے فرمایا ہے کہ شب جمعہ کو اور راتوں میں سے شب بیداری کے ساتھ خاص مت کرو اور یوم جمعہ کو ایام میں سے روزہ کے ساتھ خاص مت کرو مگر یہ کہ اس دن میں کوئی تم میں پہلے سے روزہ رکھتا ہو اس حدیث سے یہ قاعدہ کلیہ نکلا کہ جو تخصیص منقول نہ ہو وہ منہی عنہ ہے یہ دوسری بات ہے کہ جمعہ کے روز روزہ رکھنا کیسا ہے ہمارے علماء نے دوسری دلیل مستقل سے جواز کا حکم دیا ہے اور نہی کو عارضی کہا ہے اس وجہ سے کہ روزہ رکھ کر وظائف جمعہ سے ضعیف نہ ہو جاوے یہ فروعی گفتگو ہے یہاں تو صرف اس قاعدہ کلیہ کا مستنبط کرنا مقصود ہے سو اس قاعدہ کی صحت میں مجوزین صوم جمعہ کو بھی کلام نہیں ہے غرض یہ قاعدہ کلیہ کہ تخصیص غیر منقول دین کے اندر جائز نہیں صحیح ہے یہ تو کبریٰ ہے اب خاص یوم ولادت کو عید منانے کی تخصیص دیکھئے کہ یہ تخصیص کیسی ہے ظاہر ہے کہ منقول نہیں ہے اور نہ تخصیص عادی ہے بلکہ اس کو دین کی بات سمجھتے ہیں چنانچہ اس کے تارک کو ملامت کرتے ہیں اور بد دین سمجھتے ہیں اگر تخصیص عادی ہوتی تو ملامت نہ کرتے اور نہ اسکو بد دین جانتے جیسے کسی کی عادت ململ پہننے کی ہو تو اس کے تارک کو ملامت نہیں کرتے بہرحال اس کو دین سمجھتے پس یہ تخصیص دین میں ہوئی اور غیر منقول ہوئی یہ صغریٰ ہوا اور کبریٰ اول آچکا ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ تخصیص ناجائز ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو مقیس علیہ یعنی یوم جمعہ سے بھی یہ بڑھ کر ہے اس لئے کہ یوم جمعہ کے فضائل تو احادیث میں صراحۃً وارد بھی ہیں اور یوم ولادت کی فضیلت صراحۃً وارد نہیں گو قواعد سے فی نفسہ یوم ولادت میں برکت اور فضیلت کے سب ہی مسلمان قائل ہیں ایسا کون ہوگا جو اس دن بلکہ اس ماہ کی برکت کا قائل نہ ہو چنانچہ سیوطیؒ یا علی قاریؒ اس ماہ کی فضیلت میں فرماتے ہیں ؎

لِهٰذَا الشَّهْرِ فِي الْإِسْلَامِ فَضْلٌ ۔۔۔ وَمَنْقَبَةٌ تَفُوقُ عَلَى الشُّهُورِ

رَبِيعٌ فِي رَبِيعٍ فِي رَبِيعٍ ۔۔۔ وَنُورٌ فَوْقَ نُورٍ فَوْقَ نُورٍ

(اس مہینہ کے لئے اسلام میں بزرگی ہے اور ایسی منقبت ہے جو تمام مہینوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ربیع ہے ربیع میں ربیع میں نور ہے نور پر نور پر)

اور میں اس پر اضافہ کر کے کہتا ہوں ؎ ظہور فی ظہور فی ظہور ؛ سرور فی سرور فی سرور (ظہور ہے ظہور در ظہور۔ سرور ہے سرور در سرور) اور اس میں دو پچھلے وعظوں کا نام بھی آگیا النور اور الظہور۔ اور آج کے بیان کا نام السرور رکھتا ہوں۔ اس میں وہ بھی آگیا پس فی نفسہ برکت اور فضیلت کا انکار نہیں گفتگو اس میں ہے کہ جیسے جمعہ کے فضائل تصریحاً وارد ہیں ایسے یوم

ولادت کے نہیں پس جس کے فضائل منصوص ہیں زیر بحث۔ اس کی تخصیص تو کیسے ناجائز نہ ہوگی بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یوم فضیلت کی فضیلت بھی حدیث میں آتی ہے چنانچہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے روز روزہ رکھا کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس دن روزہ کیوں رکھتے ہیں فرمایا وَلِدْتُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ یعنی میں پیر کے دن پیدا ہوا ہوں تو اس کا جواب ان شاء اللہ مخالفین کے دلائل کے ذیل میں آویگا۔ اور تیسری حدیث سنئے نسائی نے روایت کیا ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا وَصَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلٰوتَکُمْ تَبْلُغُنِیْ حَیْثُ کُنْتُمْ ترجمہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید مت بناؤ اور مجھ پر درود بھیجو کیونکہ تمہارا درود میرے پاس پہونچے گا جہاں کہیں تم ہوگے اس حدیث میں غیر عید کو عید منانے کی بالتخصیص ممانعت ہے شاید کوئی اس میں شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر تو سب جمع ہوتے ہیں جواب یہ ہے کہ جانا تو جائز ہے لیکن عید کے طرز پر جمع ہونا منہی عنہ ہے مطلب یہ ہے کہ عید میں جیسے جمع ہوتے ہیں اس طرح میری قبر پر جمع مت ہو اور عید میں اس طرح جمع ہوتے ہیں کہ اس کی تاریخ معین ہوتی ہے اور نیز اس میں تداعی یعنی اس کا ایک اہتمام ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو وہاں جمع ہونے کے لئے بلاتا ہے پس اس طرح جمع ہونے کی ممانعت ہے اور اتفاقی اجتماع سے ممانعت نہیں ہے چنانچہ روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے جو جاتے ہیں تو اس میں یہ دونوں امر نہیں ہیں اس کی کوئی تاریخ خاص معین نہیں ہے بلکہ آگے پیچھے کیفما اتفق قافلے جاتے ہیں اور زیارت کر کے چلے آتے ہیں اور نہ کچھ اہتمام ہے کہ سب کا اجتماع ضروری سمجھا جاتا ہو۔ بہرحال اس حدیث سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ قبر شریف پر بطور عید کے جمع ہونا ناجائز ہے پس جس طرح عید مکانی ممنوع عنہ ہے اسی طرح عید زمانی بھی منہی عنہ ہوگی اب رہ گئی یہ بات کہ اس کے بعد صَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلَاتَکُمْ تَبْلُغُنِیْ حَیْثُ کُنْتُمْ (مجھ پر درود بھیجو اس لئے تمہارا درود جہاں بھی تم ہو مجھ پر پہونچے گا) بڑھانے سے تو اجتماع کا عدم جواز بھی مفہوم ہوتا ہے جیسا علت فَاِنَّ صَلٰوتَکُمْ ظاہراً اس پر دال ہے سو شراح نے مختلف توجیہات اس کی کی ہیں میرے ذہن میں سب سے اقرب توجیہ اس کی یہ آتی ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس نہی لَا تَجْعَلُوْا میں اہل بدعات یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم تو صلوٰۃ یعنی درود شریف پڑھنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر جمع ہوتے ہیں اور صلوٰۃ مامور بہ ہے تو ہمارا اجتماع جائز ہوگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شبہ کا جواب دیتے ہیں اور اس احتمال کا استیصال فرماتے ہیں کہ درود شریف

یہاں آنے پر موقوف نہیں ہے جہاں کہیں تم ہوگے درود شریف میرے پاس پہنچتا ہے اس لئے یہ عذر غیر موجہ ہے اور اس سے ایک بہت بڑی بات مستنبط ہوتی ہے کہ صلوۃ جس کے بعض افراد مندوب اور بعض واجب اور بعض فرض ہیں جب اس کے لئے عید کے طرز پہ جمع ہونا جائز نہیں ہے تو کسی اور غرض مخترع کے لئے جمع ہونا تو کیسے جائز ہوگا لیکن اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خود زیارت کے لئے جانا بھی جائز نہیں اس لئے کہ وہاں جو جاتے ہیں تو مقصود اصلی صلوۃ نہیں ہے بلکہ زیارت مقصود ہے اور وہ بدون حضور قبر ہر جگہ ممکن نہیں اور زیارت کا مندوب ہونا دوسری روایات سے ثابت ہوتا ہے بلکہ قرآن شریف سے بھی اس کا استحباب معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ترجمہ یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا یعنی معاصی ان سے سرزد ہوئے تھے اگر اس وقت یہ لوگ آپ کی خدمت میں آتے اور وہاں آکر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ بھی ان کے لئے دعائے مغفرت فرماتے تو بیشک اللہ تعالیٰ کو توبہ کا قبول کرنیوالا اور رحم فرمانیوالا پاتے اور جَآءُوْكَ (آپ کے پاس آتے) یہ عام ہے خواہ حیات میں ہو یا بعد الممات ہو اس سے زیارت کا مندوب ہونا بلکہ تاکد معلوم ہوتا ہے اور اس پر بشارت ہے کہ وہاں حاضر ہو کر توبہ کرنے سے توبہ قبول ہوتی ہے۔ ایک لطیفہ یاد آیا کہ کانپور کے ایک مدرسہ میں بچوں کا امتحان ہو رہا تھا ان کو چہل حدیث یاد کرائی گئی تھی ممتحنین میں ایک صاحب اہل ظاہر[1] بھی تھے حدیث یہ آئی مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِيْ فَقَدْ جَفَانِيْ یعنی جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو اس نے میرے ساتھ بے مروتی کی وہ صاحب کہنے لگے کہ یہ حدیث تو حیات کے ساتھ مخصوص ہے بچہ کیا جواب دیتا وہ آگے پڑھنے لگا اتفاق سے اس کے بعد یہ حدیث تھی مَنْ زَارَنِيْ بَعْدَ مَمَاتِيْ فَكَاَنَّمَا زَارَنِيْ فِيْ حَيَاتِيْ یعنی جس نے میری زیارت میری وفات کے بعد کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ایک مولوی صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے انہوں نے فوراً کہا کہ مولانا آپ کا جواب ہو گیا دیکھئے اس میں صاف ارشاد ہے کہ جو بعد ممات کے زیارت کرے وہ ایسا ہی ہے جیسے حیات میں زیارت کی اور زیارت فی الحیوۃ کی مشروعیہ کو آپ بھی مانتے ہیں۔ بہر حال وہاں زیارت کے لئے جاتے ہیں صلوۃ سفر سے مقصود بالذات نہیں اور زیارت کی کوئی تاریخ معین نہیں ہے اور نہ اہتمام عید کا سا ہے پس اس کی ممانعت نہیں

[1] اہل ظاہر کہتے ہیں کہ زیارت قبر نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے سفر کرنا ناجائز ہے ۱۲

اسی طرح اور بھی جن حدیثوں سے بعض لوگوں نے اس کی ممانعت سمجھی ہے ان کو غلط فہمی ہوئی ہے زیادہ تر ایسے لوگ اس حدیث کو پیش کیا کرتے ہیں لَاتُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ وَمَسْجِدِیْ هٰذَا وَالْمَسْجِدُ الْاَقْصٰی الخ یعنی کجاوے مت باندھو مگر تین مسجدوں کی طرف مسجد حرام و مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسجد اقصیٰ تقریر ان کے استدلال کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی ممانعت فرمائی ہے مگر ان تین مسجدوں کی جانب پس معلوم ہوا کہ مدینہ طیبہ اگر سفر کرکے جاوے تو مسجد کی نیت سے جاوے روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد نہ کرے کہ وہ ان ثلثہ کا غیر ہے یہ ہے تقریر ان کے استدلال کی۔ جواب یہ ہے کہ اصل یہ ہے کہ مستثنیٰ جنس مستثنیٰ عنہ سے ہو یہاں مستثنیٰ مساجد ہیں پس مستثنیٰ عنہ بھی مسجد ہی ہونا اصل ہے کہ وہی جنس قریب ہے پس تقریر کلام کی ہوگی لَاتُشَدُّ الرِّحَالُ اِلٰی مَسْجِدٍ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ یعنی کسی مسجد کی طرف سفر کرکے مت جاؤ مگر ان تین مسجدوں کی طرف پس قبر شریف سے اس حدیث میں کوئی تعرض ہی نہیں اس کی زیارت کا تاکد بحالہ دوسری احادیث سے ثابت ہے اور ان تین مسجدوں کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ ان میں مضاعفت اجر کی منصوص ہے اور کسی مسجد کے لئے منصوص نہیں ہے پس حاصل حدیث کا یہ ہے کہ ثواب کی زیادتی کے اعتقاد سے کسی مسجد کی طرف سفر نہ کرو اس لئے کہ کسی مسجد کے لئے زیادتی ثواب کی منقول نہیں ہے۔ بہر حال خاص زیارت قبر شریف کے قصد سے بھی سفر کرنا مندوب ہے۔ چوتھی حدیث یہ ہے کہ عید کے روز کچھ لڑکیاں کھیل رہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انھوں نے ان لڑکیوں کو ڈانٹا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ لِکُلِّ قَوْمٍ عِیْدًا وَّهٰذَا عِیْدُنَا یعنی اے عمر منع نہ کرو ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے اس حدیث میں علت ان کے کھیلنے کے اباحت کی یہ فرمائی کہ یہ ہماری عید ہے اس میں جواز لعب کو یوم عید ہونے سے معلل فرمایا گیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم عید کے ساتھ خاص ہے سو اگر ہر شخص کو عید بنانا جائز ہو تو ہر روز ایسا لعب جائز ہو جاوے گا اور تخصیص منصوص باطل ہو جاوے گی جس سے کلام شارع کا الغاء لازم آویگا یہ تو قرآن و حدیث سے ممانعت اس عید مخترع کی ثابت ہوئی اب رہا اجماع سو اس سے بھی ثابت ہے تقریر اس کی یہ ہے کہ قاعدہ اصولیہ ہے کہ تمام امت کا کسی امر کے ترک پر متفق ہونا یہ اجماع ہوتا ہے اس کے عدم جواز پر چنانچہ فقہاء نے جابجا اس قاعدہ سے استدلال کیا ہے جس طرح سے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی

فعل کو ہمیشہ ترک کرنے سے استدلال کرتے تھے مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھی لیکن اس میں اذان اور تکبیر نہیں تھی اسی طرح جس شے کو تمام امت نے ترک کر دیا ہو وہ واجب الترک ہے اسی بنا پر فقہاء نے صلوٰۃ عیدین میں بلا اذان و تکبیر کہا ہے پس اگر یہ قاعدہ مسلم نہ ہوتا تو آج سے عیدین میں اذان اور تکبیر کا بھی اضافہ کر دینا چاہیئے اور اگر مسلم ہے تو اس قاعدہ سے اور جگہ بھی کام لو اس پر ایک یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تمام امت نے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک نہیں کیا اس لئے کہ امتی تو آخر ہم بھی ہیں سو ہم اس کو کرتے ہیں پس اجماع کہاں رہا جواب اس کا یہ ہے کہ اصول فقہ کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ اختلاف متاخر اتفاق متقدم کا رافع نہیں ہے یعنی جس امر پر تمام امت کا اتفاق زمان سابق میں متحقق ہو چکا ہو اب اس اتفاق کو بعد کا اختلاف نہ اٹھاوے گا پس جب تک تم لوگوں نے اس کو ایجاد نہیں کیا تھا اس وقت تک تو امت کا اس کے ترک پر اتفاق تھا اب وہ اتفاق مرتفع نہیں ہو سکتا اس قاعدہ کی ایک جزئی اور ہے کہ علماء حنفیہ نے نماز جنازہ کا تکرار جائز نہیں رکھا اور دلیل بھی لکھی ہے کہ صحابہ اور تابعین سے ثابت نہیں غرض یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ امت کا کسی امر کو ترک کرنا اسکے عدم جواز کی دلیل ہے پس بفضلہ تعالیٰ اجماع امت سے بھی ثابت ہو گیا کہ یہ عید بدعت اور امر مخترع واجب الترک ہے۔ اب رہا قیاس تو قیاس کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ قیاس جو مجتہد سے منقول ہوا اور ایک وہ جو مجتہد سے منقول نہ ہوا اور یہ قاعدہ کہ غیر مجتہد کا قیاس منقول نہیں ہے یہ ان واقعات میں ہے کہ جو مجتہدین کے زمانہ میں پائے گئے ہیں اور جو نئے واقعات پیش آویں ان میں قیاس غیر مجتہد کا معتبر ہے چنانچہ جس قدر نئی تجارتیں اور ایجادات اس زمانہ میں ہوئی ہیں سب کا حکم قیاس سے ہی ثابت ہوتا ہے مع ہذا ہم خود قیاس نہیں کرتے اس لئے ہم کو قیاس کرنے کی ضرورت تو جب تھی جبکہ سلف کے کلام میں اس سے تعرض نہ ہوتا اس لئے کہ ان حضرات کا قیاس ہمارے قیاس پر مقدم ہے اور ان کے کلام میں اس سے تعرض ہے چنانچہ تبعید الشیطان و صراط مستقیم میں بہت زور شور سے اس پر گفتگو کی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ کسی زمان یا مکان کو عید بنانا ممنوع ہے اس میں کی کچھ ضروری عبارات اشاعت کے وقت آخر میں ملحق کر دی جاوے گی (چنانچہ اب ایسا ہی کیا گیا) پس قیاس سے بھی اس عید کا ناجائز ہونا ثابت ہوا۔ یہ تو ہمارے دلائل تھے۔ اب موجدین عید کے دلائل کی تقریر اور ان کا جواب سنئے اور ان کی طرف نسبت دلائل کی میں نے اس احتمال سے کر دی ہے کہ شاید ان میں سے کبھی کوئی ان سے استدلال کرنے لگے ورنہ میں نے یہ دلائل ان سے منقول نہیں دیکھے بلکہ وہ تو اگر برسوں بھی کوشش کریں تو ان کو ایک دلیل بھی میسر نہ ہو اسی واسطے جی تو نہ چاہتا تھا کہ ان کو دلائل دیئے جاویں لیکن صرف اس وجہ سے کہ کسی کو کوئی گنجائش

نظر ہے اس لئے میں ان دلائل کو بھی مع جواب نقل کئے دیتا ہوں اول وہ آیت قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے چاہیئے کہ خوش ہوں اس سے استدلال کر سکتے ہیں کہ اس آیت سے فرحت کا مامور بہ ہونا ثابت ہوا اور یہ عید بھی اظہار فرحت ہے لہذا جائز ہے جواب ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا نکلا اور گفتگو اس ہیئت خاص میں ہے لہذا اس آیت سے اس کو کوئی مس نہیں اور اگر اس کلیہ میں داخل کرنا اس کا صحیح ہو تو فقہاء نے کتب فقہ میں جن بدعات کو رد کیا ہے وہ بھی کسی نہ کسی ایسے ہی کلیہ میں داخل ہو سکتی ہیں چاہیئے کہ وہ بھی جائز ہو جاویں حالانکہ کتب فقہ جو مسلم عند الفریقین ہیں ان میں ان کی ممانعت مصرحًا مذکور ہے اور ان اہل زیغ کو ہمیشہ یہ دھوکا ہوتا ہے اور یا تجاہل ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور اہل حق کے قضیہ کا موضوع ایک ہے اسی بنا پر اہل حق پر اعتراض کر دیتے ہیں چنانچہ یہاں بھی مغالطہ ہے ہم جس بات کو ناجائز کہتے ہیں وہ ہیئت خاصہ ہے اور جو فرحت آیت فَلْیَفْرَحُوْا سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت مطلقہ ہے پس یہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ فرحت کو منع کرتے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں بلکہ اگر غور سے کام لیا جاوے تو ہم اس فرحت پر زیادہ عمل کرتے ہیں اس لئے کہ یہ موجدین تو سال بھر میں ایک ہی مرتبہ خوش ہوتے ہیں اور درمیان میں ان کی فرحت منقطع ہو جاتی ہے اور ہم ہر وقت خوش ہیں[ع] پس جو فرح کو منقطع کر دیں وہ آیت کے تارک ہیں ہم تو کسی وقت بھی قطع نہیں کرتے پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی ہر وقت عمل کرتے ہیں اور دلائل منع بدعات پر بھی عامل ہیں اور اہل بدعات کو دونوں امر نصیب نہیں ہیں خلاصہ یہ ہوا کہ فرح مامور بہ کے تین درجے ہیں افراط۔ تفریط۔ اعتدال۔ تفریط تو یہ ہے کہ تحدید بالحاء المہملہ (حاء مہملہ کے ساتھ) کر دیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح ختم ہو گئی جیسا بعض خشک مزاجوں کے کلام سے مترشح ہو گیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو جاری رکھیں مگر حدود شرعیہ سے تجاوز کریں جیسا اہل تجدید بالجیم المعجمہ[ع] کا طریق متعارف ہو گیا اور اعتدال ادامۃ میں ہے پس ہم نہ محدد ہیں نہ مجدد بلکہ مدیم ہیں وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ (اس پر خدا تعالیٰ کا شکر ہے) دوسرا استدلال موجدین کا اس حدیث سے ہو سکتا ہے کہ جب ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سنی تو خوشی میں آکر ایک باندی آزاد کر دی تھی اور اس پر عقوبت میں تخفیف ہو گئی پس معلوم ہوا

ع اس لئے کہ اہل نسبت ایمان کی بشاشت اور اس کے ذوق سے ہر وقت مخمور رہتے ہیں اور نہ اہل حق میں ہی بہت سے افراد اس دولت سے مشرف ہیں وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَھٰذَا ھُوَ الْفَرَحُ الْمَامُوْرُ بِہٖ کَمَا مَرَّ فِیْ تَفْسِیْرِ الْاٰیَۃِ ۱۲ جامع (یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہیں عطا کریں یہ فرح مامور بہ ہے جیسا کہ آیت کی تفسیر میں گذرا) ع جیم منقوط کے ساتھ

کہ ولادت پر فرح جائز و موجب برکت ہے جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں ہیں بلکہ اُس پر بہر وقت عامل ہیں گفتگو تو اس ہیئت کذائیہ میں ہے تیسرا استدلال اس آیت سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَاِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ اِلٰی قولہٖ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰیَةً مِّنْكَ یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما دیں عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعا تک کہ اے اللہ ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے عید بن جاوے ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہو چکا ہے کہ امم سابقہ کے شرائع اگر حق تعالےٰ ہم پر نقل فرما کر ان پر انکار نہ فرما دیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہیں اور یہاں کوئی انکار نہیں پس معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمت عظمیٰ ہے پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار اسی جگہ ہو جہاں وہ منقول ہے دیکھئے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (جبکہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو) میں سجدہ تحیۃ منقول ہے اور سجدہ تحیۃ و سجدہ تعظیمی ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکا لیکن یہاں اس پر انکار منقول نہیں اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیت و احادیث ہم نے عید بنانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں وہ اس پر انکار کے لئے کافی ہیں یہ جواب تو اس تقدیر پر ہے جبکہ آیت کے معنی یہی ہوں جو مستدل نے بیان کئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول مائدہ کی تاریخ کو عید بنا دیں اس لئے کہ تَكُوْنُ میں ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے پس اس سے یوم نزول المائدہ لینا مجاز ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے گا۔ پس معنی یہ ہیں تَكُوْنُ الْمَآئِدَةُ سُرُوْرًا لَّنَا یعنی وہ مائدہ ہمارے لئے سرور کا باعث ہو جائے عید کے معنی متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے یہ کیسا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہو جیسے

حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م۔ت۔ع آتا ہے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں ان کے نزدیک گویا شیخ سعدی کے شعر تمتع زہر گوشہ یافتم (ہر گوشہ سے میں متمتع ہوا) سے بھی متعہ نکلتا ہے اور آیت رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ کے بھی یہی معنی ہیں کہ اے رب ہمارے ہمارے بعض نے بعض سے متعہ کیا ہے ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع۔ی۔د آوے اس سے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ چوتھا استدلال اس قصہ سے ہوسکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ (آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا) نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے ہی دن نازل ہوئی ہے یعنی یوم جمعہ اور یوم عرفہ کو نازل ہوئی ہے۔ اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے نُزِلَتْ فِيْ يَوْمِ جُمُعَةٍ وَيَوْمِ عَرَفَةَ (یہ آیت جمعہ کے دن یا عرفہ کے دن نازل ہوئی) یہ حدیث کا مضمون ہے تقریر استدلال کی اس حدیث سے یہ ہے کہ حضرت عمر و ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا معلوم ہوا کہ عطاءِ نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اگرچہ یہ استدلال ان کو قیامت تک بھی نہ سوجھتا لیکن ہم نے تبرعاً نقل کیا ہے کہ ان کو اس میں بھی گنجائش ہوسکتی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو چنانچہ ہمارے فقہا نے تعریف یعنی یوم عرفہ میں حجاج کے مشابہت سے جمع ہونے پر انکار فرمایا ہے یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں نیز حضرت ابن عباس نے تحصیب کو لَيْسَ بِشَيْءٍ (وہ کوئی چیز نہیں) کہا ہے حالانکہ وہ منقول بھی ہے مگر صرف عادت کو عبادت سمجھنے سے انھوں نے یہ انکار فرمایا تو غیر منقول کو قربت سمجھنا تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انکار اجتماع علی شجرۃ الحدیبیہ پر مشہور ہی ہے۔ پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہوگیا گو ہر ہر مقام پر منقول نہ ہو دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا یہودی تھا اس کو خاص طور پر الزامی جواب دیا کہ ہمارے یہاں تو پہلے سے عید ہے بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنانا

جائز نہیں یعنی مطلب حضرت عمرؓ کا یہ ہے کہ ہماری شریعت میں چونکہ تعید جائز نہیں ہے اس لئے ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے تھے مگر خدا تعالےٰ نے پہلے ہی سے اُس یوم کو عید بنا دیا۔

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ کرسکتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن روزہ رکھا کسی نے وجہ پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ وُلِدْتُ فِيْهِ یعنی میں اس دن پیدا ہوا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم الولادۃ عبادت اور قربت کا دن ہے اور فرحت و سرور علی الولادۃ قربت ہے لہذا یہ جائز ہے اس کے بھی دو جواب ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یوم ولادۃ ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے اس لئے کہ دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعرات اور پیر کو نامہ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش ہوں اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت صوم کی عرض اعمال ہے پس جب یہ علت ہوئی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت ہوگا اور مدار حکم کا علت ہوتی ہے اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہو تو تم نے حکمت کو اصل علت ٹھہرا دیا حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علت حکم کی یہی ہے لیکن علت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علت جو اپنے مورد کے ساتھ خاص ہو۔ اور ایک وہ جس کا تعدیہ دوسری جگہ بھی ہو اگر یہ علت متعدیہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہ ہا کیوں منقول نہیں اور نیز مثل صوم یوم الاثنین کے کہ یوم ولادت ہے تاریخ ولادت میں بھی کہ ۱۲ ربیع الاول ہے روزہ رکھنا چاہیئے دوسرے یہ کہ نعمتیں اور بھی ہیں مثلاً ہجرت فتح مکہ معراج وغیرہا آپ نے ان کی علت سے کوئی عبادت کیوں نہ فرمائی پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام ہے بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے۔ اور اصل مدار روزہ رکھنے کا وہی ہے باقی حکمت کے طور پر ولادۃ کو ذکر فرمایا ورنہ دوسری نعمتوں کے دن بھی روزہ و تعید چاہیئے اور اگر اس پر کہا جاوے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے تمام نعمتوں کی پس ولادۃ اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص

کی گئی تو ہم کہتے ہیں کہ حل اس کی بھی اصل ہے اس کو اصل ٹھہرانا چاہیئے پھر حیرت ہے کہ یوم الولادت
دوشنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تاریخ الولادت یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید مناویں یوم اثنین میں تو
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عبادت بھی کی ہے اور تاریخ ولادت میں تو کچھ بھی منقول نہیں ہے پس اس
دلیل کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہر پیر کو عید کیا کریں غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجدین کا ثابت نہیں تا
یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے۔ اب ہم اس بات میں عقلی گفتگو کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں میں
بعضے عقل پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے ہیں جو راجع ہیں ملک اور
قوم کی طرف اس لئے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کئے دیتے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ جس قدر عبادات
شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہیں ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس اعتبار سے ماموربہ
کی چند قسمیں نکلتی ہیں اول تو یہ کہ سبب میں تکرار ہو یعنی سبب بار بار پایا جاتا ہو تو سبب کے مکرر ہونے سے
مسبب بھی مکرر پایا جاوے گا مثلاً وقت صلوٰۃ کے لئے سبب ہے پس جب وقت آویگا صلوٰۃ بھی واجب
ہو گی اسی طرح صیام رمضان کے لئے شہود شہر سبب ہے، جب شہود شہر ہوگا صوم واجب ہوگا اور عید کیلئے
فطر اور اضحیہ کے لئے یوم اضحیہ بھی اسی باب سے ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ مسبب بھی ایک اور سبب بھی ایک جیسے
بیت اللہ شریف حج کے لئے چونکہ سبب ایک ہے اس لئے ماموربہ یعنی حج بھی عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے یہ دونوں
قسمیں تو مدرک بالعقل ہیں اس لئے کہ عقل بھی اسی کو مقتضی ہے کہ سبب کے تکرار اور توحد سے مسبب متکرر اور
متوحد ہو۔ تیسری قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور مسبب کے اندر تکرار ہو جیسے حج کے طواف میں رمل کا سبب
ارارۂ قوت تھی اب وہ ارارۂ قوت تو ہے نہیں اس لئے کہ قصہ اس کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان
حج کے لئے مکہ معظمہ آئے تو مشرکین نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو یثرب کے بخار نے ضعیف اور بودا کر دیا ہے
تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں یعنی شانے ہلاتے ہوئے اکڑ کر طواف
کرو تاکہ ان کو قوت مسلمین کی مشاہد ہو اب وہ سبب تو نہیں لیکن ماموربہ یعنی رمل فی الطواف بحالہ باقی ہے
یہ امر غیر مدرک بالعقل ہے اور جو امر خلاف قیاس ہوتا ہے اس کے لئے نقل اور وحی کی ضرورت
ہوتی ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سبب کیا ہے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت
کی تاریخ ہونا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گذر گئی یا بار بار آتی ہے ظاہر ہے کہ وہ ختم ہو گئی کیونکہ
اب جو ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ آتی ہے وہ اس خاص یوم الولادۃ کی مثل ہوتی ہے نہ کہ عین اور یہ ظاہر ہے پس

مثل کے لئے وہی حکم ثابت ہوتا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا بوجہ غیر مدرک بالعقل ہونے کے قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا لیکن یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الاثنین میں روزہ رکھنے کی وجہ وُلِدْتُّ فِیْہِ (اس دن میں میری ولادت ہوئی ہے) سے فرمائی ہے تو اس میں بھی یہ کلام ہو سکتا ہے کہ یوم الولادۃ تو گذر گیا ہے اب یہ اس کا مثل ہے اس کو حکم اصل کا کیوں ہوا جواب یہ ہے کہ یہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے اس لئے اس پر قیاس نہیں ہو سکتا۔ اب ہم تبرعاً ان حضرات کی بھی ایک عقلی دلیل لکھ کر اور اس کا جواب دیکر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ مقابلہ ہے اہل کتاب کا کہ وہ ولادت مسیح کے دن عید کرتے ہیں ہم مقابلہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت میں عید کرتے ہیں تاکہ اسلامی شوکت ظاہر ہو جواب یہ ہے کہ یہ تو اس وقت کسی درجہ میں صحیح ہوتا کہ جب ہمارے یہاں اظہار شوکت کے لئے کوئی شئے نہ ہو ہمارے یہاں جمعہ عیدین سب اظہار شعائر اسلام کے لئے ہیں دوسرے یہ کہ اگر ان کا مقابلہ ہی کرنا مقصود ہے تو ان کے یہاں اور دنوں میں بھی عیدیں اور میلے ہوتے ہیں تم کو بھی چاہیے کہ ہر ہر دن کے مقابلہ میں تم بھی عید کیا کرو اسی طرح عاشوراء کے دن تعزیہ داری بھی کیا کرو تاکہ اہل تشیع کا مقابلہ ہو چنانچہ بعض جاہل محض مقابلہ کے لئے ایسا کرتے بھی ہیں اور اگر جناب یہی مصلحت ہے تو ہندوؤں کے یہاں ہولی دوالی ہوتی ہے تم بھی ان کے مقابلہ کے لئے ہولی دوالی کیا کرو۔ میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اصل اور قاعدہ آپ کا بالکل بے اصل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کفار نے ایک درخت بنا رکھا تھا اس پر ہتھیار لٹکاتے تھے اور اس کا نام ذات انواط رکھا تھا بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اجْعَلْ لَنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ یعنی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے بھی آپ ایک ذات انواط مقرر فرما دیجئے یعنی کوئی ایسا درخت ہمارے لئے بھی آپ مقرر فرما دیجئے کہ اس پر ہم ہتھیار کپڑے وغیرہ لٹکا دیا کریں دیکھئے بظاہر اس میں کچھ حرج معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ کسی درخت پر کپڑے یا ہتھیار لٹکا دینا ایک امر مباح ہے اس میں تشبہ بھی کچھ نہیں لیکن چونکہ صورۃً ان کی مشابہت تھی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہوگیا اور فرمایا سبحان اللہ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے قوم موسیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ (اے موسیٰ ہمارے لئے ایک ایسا ہی معبود مقرر کر دیجئے جیسا کہ ان کے لئے یہ معبود ہیں) پس جب ہی مشابہت کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا تو جس صورت میں ان کی پوری شکل بنائی جاوے یہ تو

بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا یہ اس بات میں گفتگو تھی جو اختصار کے ساتھ بیان کی گئی غرض عقل سے نقل سے ہر طرح بحمد اللہ ثابت ہوگیا کہ یہ عید مخترع ناجائز اور بدعت واجب الترک ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو فرحت کا حکم ہوا ہے اور اس کی تحدید یا تجدید کا حکم نہیں بلکہ فرح دائم اور مسرت دائمی کا حکم ہے اس لئے کسی خاص دن کو اس کے لئے مخصوص نہ کریں اور ہر وقت اس آیت پر عمل کریں چونکہ یہ باب سرور اور فرحت کے مامور بہ ہونے کے باب میں ہے اس لئے میں اس کا نام السرور رکھتا ہوں اور عید المیلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ اس میں مفصل کلام ہے اس لئے اس کو ارشاد العباد فی عید المیلاد کے ملقب کرتا ہوں اب اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرماویں اور بدعات اور تمام نامرضیات سے محفوظ رکھیں آمین یارب العالمین۔

ضروری معروضہ

الحمد للہ تعالیٰ۔ ثم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۱۹۸۲ء کے رسالہ الابقاء پر آپ کا زرِ سالانہ ختم ہوگیا۔

۱ جدید سال ۱۹۸۳ء کے لئے بیس ۲۰ روپیہ براہِ کرم آج ہی ارسال فرمادیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

۲ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک جدید خریدار کا بھی زرِ سالانہ ارسال فرمادیں تو اس خالص دینی تبلیغی۔ اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو بھی مل جاوے گا۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ثم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یہ دونوں عرضیں قبول فرماویں گے

جزاکم اللہ تعالیٰ والسلام

طالبِ دعا محمد عبد المنان غفرلہ مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی ۱

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا

وعظ مسمّٰی بہ

اَلْکَمَال فِی الدِّیْن (لِلنِّسَاء)

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی - دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی ۱

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الکمال فی الدین

(للنساء)

این	کہاں ہوا	دہلی بر مکان محمد رفیع صاحب
متی	کب ہوا	۲۷ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۱ھ بعد ظہر بروز سہ شنبہ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ ½ گھنٹہ
کیف	کیونکر ہوا	بیٹھ کر
لم	کیوں ہوا	مستورات کی درخواست تھی کہ ہم کو بھی اصلاح کا طریق بتایا جائے۔
ماذا	کیا مضمون تھا	عورتوں کیلئے کمال دین حاصل کرنیکا طریقہ اور کاملین کی صحبت کا فیض ان کو کیونکر پہونچ سکتا ہے
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	طبقہ اناث کو خصوصاً اور جو لوگ دنیوی مشاغل سے فراغت نہیں پاتے ان سب کو عموماً۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مرد تقریباً ۲۰۰ اور مستورات کی تعداد معلوم نہ ہوسکی۔
الاشتات	متفرقات	اس وعظ میں وہی آیت تلاوت کی گئی جو اس سے پہلے وعظ میں تلاوت کیگئی تھی لیکن مضامین اکثر غیر مکرر تھے اور بعض بالکل جدید۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ

وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ؕ (اے ایمان والو تقویٰ حاصل کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) بیان کرنے سے پہلے اتنا کہدینا مناسب ہے کہ اگر مردوں کو آواز کم پہونچے یا مضامین ان کے مناسب کم ہوں تو وہ مجھ کو معذور سمجھیں کیونکہ یہ بیان خاص عورتوں کے لئے ہے۔ اول تو اس بیان سے مقصود وہی ہیں مردوں میں اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے عورتوں کو مواعظ کے سننے کا بھی موقع کم ملتا ہے اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ گاہے گاہے خاص ان کے مناسب مضامین بیان کئے جائیں تاکہ ان کو بھی اپنی اصلاح کا طریقہ معلوم ہو۔ مردوں کو مواعظ کے سننے کا بہت موقع ملتا رہتا۔ ہے دوسرے ان کو وقتاً فوقتاً علماء سے ملنے کا بھی موقع ملتا رہتا ہے اگر مواعظ بھی نہ سنیں تو ضروری باتیں وہ زبانی دریافت کر سکتے ہیں لیکن بیچاری مستورات کو اس کا بھی موقع نہیں ملتا اس لئے ان کی اصلاح کے لئے خاص طور پر اہتمام کی ضرورت ہے کہ ایک بیان ایسا ہو جس میں انہی کے مناسب مضامین ذکر کئے جائیں۔ پھر عورتوں کے متعلق بچوں کی بھی تربیت ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ بچہ ابتدائے عمر میں جس کے پاس زیادہ رہتا ہے اسی کے اخلاق و اعمال اختیار کرتا ہے اور بچے زیادہ تر ابتدائے عمر میں اپنی ماؤں کے پاس زیادہ رہتے ہیں باپ کے پاس کم رہتے ہیں اس لئے بچوں کی تربیت اسی طرح عمدہ ہو سکتی ہے کہ مستورات کی اصلاح ہو جاتے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں بچوں کو سمجھ ہی کیا ہوتی ہے جو وہ اچھی یا بری بات سے اثر لیں بچپن میں ان کا تربیت کرنے والا خواہ کیسا ہی ہو سمجھ آنے کے بعد کسی نیک آدمی کے پاس ان کو رکھنے کی ضرورت ہونی چاہیئے سو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ خیال غلط ہے بچپن میں جبکہ بچہ دودھ پیتا ہے اس وقت بھی اس کے دماغ میں اخذ کا مادہ ہوتا ہے گو وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے اور اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے فوٹو گراف کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ سب اس میں جا کر محفوظ و منقش ہو جاتا ہے گو اس وقت آواز نہ نکلے لیکن جس وقت ان نقوش پر سوئی چلے گی وہ سب باتیں اس میں سے بعینہٖ نکلیں گی۔ یہی حال بچوں کے دماغ کا ہے کہ ابتدائے عمر میں بھی وہ سب باتوں کو اخذ کر کے محفوظ کر لیتا ہے گو اس وقت ان پر عمل نہ کر سکے یا زبان سے ظاہر نہ کر سکے پھر جب اس میں قوتِ عمل و نطق کامل ہو جاتی ہیں تو پہلی باتوں کے آثار اس سے

ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ایک تجربہ کار کا مقولہ ہے کہ بچوں کی اصلاح کا وقت پانچ سال تک ہے۔ اس عرصہ میں جتنے اخلاق اس میں پختہ ہو لیے ہوتے ہیں پختہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس میں پھر کوئی عادت پختہ نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم جس زمانہ کو ناسمجھی کا زمانہ خیال کرتے ہیں وہی وقت بچوں کی اصلاح کا ہے اور بچے اُسی زمانہ میں سب کچھ اخذ کر لیتے ہیں۔

ایک مساۃ نے بیان کیا کہ بچوں کی اصلاح کا سہل طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے بچے کی کامل طور پر تربیت کر دی جائے پھر سارے بچے اسی جیسے اٹھیں گے جیسے کام کرتا ہوا اس کو دیکھیں گے اگلے بچے بھی وہی کام کریں گے اور اسی کی عادتیں خصلتیں سیکھ لیں گے غرض بچوں کی تربیت چونکہ زیادہ تر عورتوں کے ہاتھ میں ہے اس لئے ان کی اصلاح سے مردوں کی بھی اصلاح متوقع ہے کیونکہ یہ بچے ایک وقت میں مرد بھی بنیں گے ان وجوہ سے اس وقت کا بیان زیادہ تر مستورات کے لئے مخصوص ہوگا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مردوں کے لئے یہ بیان کسی درجہ میں بھی مفید نہ ہوگا کیونکہ اس میں بھی آخر احکام شرعیہ ہی کا بیان ہوگا اور احکام اکثر مردوں اور عورتوں میں مشترک ہی ہیں البتہ طرز بیان میں مردوں کی دلچسپی کا لحاظ نہ کیا جائے گا بلکہ زیادہ تر عورتوں کی دلچسپی کے مضامین ہوں گے سو دلچسپی اگر نہ ہوئی بلا سے نہ ہو یہ مقصود تھوڑا ہی ہے اور جو مشترک نہ ہوں گے یہ بھی ایک نفع تو یقیناً سب کو ہے وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب کہیں اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو فرشتوں کی ایک جماعت وہاں مجتمع ہو جاتی ہے پھر وہ ذاکرین کے اوپر سکینہ نازل کرتے ہیں پھر جب وہ حق تعالیٰ کے پاس جاتے ہیں تو وہاں سوال ہوتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا، وہ عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ ہم نے اُن کو آپ کا ذکر کرتے ہوئے چھوڑا حق تعالیٰ سوال فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے ہم کو دیکھا ہے وہ عرض کرتے ہیں کہ نہیں یا اللہ انہوں نے آپ کو دیکھا نہیں اگر دیکھ لیتے تو اس سے بھی زیادہ کوشش کرتے۔ پھر سوال ہوتا ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ وہ آپ سے جنت اور آپ کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور آپ کی ناراضی

اور جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ گواہ رہو ہم نے ان سب کو بخش دیا۔ اس پر بعض فرشتے کہتے ہیں کہ یا اللہ فلاں شخص تو ذکر کے قصد سے نہ آیا تھا ویسے ہی آکر ان کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اس کو بھی بخش دیا۔ یہ جماعت ایسی نہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا محروم ہو۔

یہ تو حدیث کا مختصر مضمون ہے اور ظاہر ہے کہ وعظ کی مجلس بھی مجلس ذکر ہے۔ اس میں خدا تعالے کے احکام کا ذکر ہوتا ہے اور یہ بھی ذکر اللہ ہی ہے ذکر اللہ فقط تسبیح و تہلیل وغیرہ میں منحصر نہیں۔ صاحب حصن حصین نے اس مسئلہ پر متنبہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں بَلْ کُلُّ مُطِیْعٍ لِلّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ کہ ہر شخص جو خدا کی اطاعت میں مشغول ہو وہ ذاکر ہی ہے۔ تو اگر مردوں کو اس بیان سے دلچسپی بھی نہ ہوئی تو یہ نفع کیا تھوڑا ہے کہ وہ جتنی دیر مجلس وعظ میں بیٹھے رہیں گے اتنی دیر تک وہ ملائکہ کی صحبت سے مستفید ہونگے اور ذاکر شمار ہوں گے اور رحمت و مغفرت کے مورد ہوں گے (اس وقت کچھ مستورات کی باتوں کی آواز آئی حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ بھائی اس وقت باتیں نہ کرو بلکہ غور سے ہماری باتوں کو سنو یہ کیا انصاف ہے کہ ہم تو تمہارے لئے اپنا وقت اور دماغ صرف کریں اور تم اس کی بے قدری کرو اور تھوڑی دیر کے لئے بھی تم اپنی باتیں قطع نہ کرو۔ اول تو یہ تہذیب کے بھی خلاف ہے۔ دوسرے شریعت کے بھی خلاف ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جس طرح خطبہ جمعہ کا سننا فرض ہے اور اس وقت باتیں کرنا حرام ہے اسی طرح جس مجلس میں بھی احکام شرعیہ بیان ہو رہے ہوں وہاں خاموش رہنا اہل مجلس کے ذمہ لازم ہے باتیں کرنے سے گناہ ہوتا ہے پس جن مستورات کو باتیں کرنا ہوں یہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جائیں تاکہ گناہ سے بھی محفوظ رہیں اور دوسری سننے والیوں کے سننے میں خلل انداز بھی نہ ہوں۔ تیسرے باتیں کرنے سے بیان بھی خبط ہو جاتا ہے۔ بیان کرنے والے کے ذہن میں مضامین کی آمد بند ہو جاتی ہے کیونکہ مضامین کی آمد نشاط و انشراح قلب پر موقوف ہے اور سامعین کی بے توجہی دیکھ کر بیان کرنے والے کی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے بعض دفعہ جو رات کو مجھے بیان کرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بعض لوگ اس وقت اونگھتے

ہوئے نظر آتے ہیں اونگھنے والی کی صورت دیکھ کر مجھے مضمون کی آمد بند ہوجاتی ہے پس یہ سخت نا انصافی ہے کہ میں تو اپنا دماغ صرف کروں آپ کے لئے اپنا وقت خرچ کروں اور تم اس کی یہ قدر کرو کہ اپنی اپنی باتوں میں لگی رہو۔ باتوں کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔ جب میں چلا جاؤں گا پھر جتنی چاہے باتیں کر لینا۔)

اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے یہ وہی آیت ہے جو پرسوں مردوں کے سامنے تلاوت کی گئی تھی اس وقت اسی آیت کو اختیار کرنے کی چند وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ بعض مضامین اس آیت کے متعلق اس روز بیان سے رہ گئے تھے۔ دوسرے یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح مردوں کو کمال دین حاصل کرنے اور اپنی اصلاح کا حکم فرمایا ہے وہ حکم عورتوں میں بھی مشترک ہے گو خطاب صیغہ کے اعتبار سے بظاہر مردوں کو ہے لیکن حکم مشترک ہے۔ پس کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ حق تعالیٰ کو مردوں ہی کی طرف توجہ ہے عورتوں کا اعتبار نہیں ہے یہ وہم پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اور منشاء اس وہم کا محبت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں دیکھتی ہوں کہ حق تعالیٰ احکام میں مردوں ہی کا ذکر فرماتے ہیں ہمارا (یعنی عورتوں کا) ذکر نہیں فرماتے۔ ازواج مطہرات کو یہ خیال اس لئے بھی ہوا کہ وہ صاحب زبان تھیں عربی زبان کو خوب سمجھتی تھیں اور عربی میں مذکر و مؤنث کے لئے جدا جدا صیغے استعمال کئے جاتے ہیں تو ان کو تمام احکام میں مذکر صیغے دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ حق تعالیٰ ہم کو خطاب نہیں فرماتے، نہ ہمارا ذکر فرماتے ہیں۔ اور ہماری مستورات تو عربی زبان حاصل ہی نہیں کرتیں اور یہ بھی ایک بڑی کمی ہے جس کا افسوس ہوتا ہے کیونکہ پہلے زمانہ میں عورتیں بھی مثل مردوں کے عربی کی تحصیل کرتی تھیں تو عربی زبان سے ناواقف ہونے کے سبب مذکر و مؤنث کے صیغوں کا فرق وہ نہیں سمجھ سکتیں اور اگر ترجمہ پڑھیں گی تو اس میں ان صیغوں کا ترجمہ نظر سے گذرے گا اور اردو میں خطاب کا صیغہ مردوں و عورتوں میں مشترک ہے دونوں کے لئے الگ الگ صیغہ موضوع نہیں مثلاً وَاتَّقِينَ اللهَ ط

وَاتَّقُوا اللہ کا ترجمہ یکساں ہوگا دونوں جگہ اردو میں یہی بولتے ہیں کہ خدا سے ڈرو۔ خواہ اس کے مخاطب مرد ہوں یا عورتیں۔ اس لئے اوامر و نواہی کے صیغوں میں وہ ترجمہ دیکھ کر یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ یہ خطاب خاص مردوں کو ہے لیکن پھر بھی بعض جگہ اردو ترجمہ سے بھی مردوں کی تخصیص سمجھ میں آسکتی ہے۔ مثلاً یاایُّھَا النَّاسُ کا ترجمہ ہے اے لوگو! اور یاایُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا ترجمہ اے ایمان والو! یہ لفظ اردو میں بھی مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ عورتوں کو اے لوگو یا اے ایمان والو کہہ کر ندا نہیں کر سکتے بلکہ ان کو اگر ان کو خطاب خاص ہوگا تو اے عورتو! یا اے ایمان والیو! کہا جائے گا۔ پس ہر چند کہ اوامر و نواہی کے صیغوں میں ترجمہ دیکھ کر ان کو تخصیص رجال کا وہم نہیں ہو سکتا۔ مگر ندا کے صیغوں میں ان کو بھی وہم ہو سکتا ہے۔ اور ازواج مطہرات تو اس فرق کو خطاب کے مواقع میں بھی سمجھتی تھیں اس لئے اُن کو غایت محبت کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہائے اللہ تعالٰے ہم کو خاص طور پر خطاب نہیں فرماتے جیسا مردوں کو خطاب فرماتے ہیں۔ دیکھئے وہ عورتیں کیسی تھیں اللہ اکبر! ان کا کیسا مذاق تھا اگر آجکل کی عورتوں جیسی وہ سُست اور کم ہمت اور کام چور ہوتیں تو یوں سمجھتیں کہ اچھا ہوا ہم ان احکام سے بچ گئے کیونکہ ان میں تو خاص مردوں کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ مگر اس زمانہ میں مستورات کو اس کا وہم بھی نہیں ہوا کہ یہ احکام ہمارے لئے نہیں ہیں بلکہ وہ خوب سمجھتی تھیں کہ احکام سب کو عام ہیں (بجز چند مخصوص باتوں کے جن کا مردوں کے ساتھ خاص ہونا۔ دوسرے دلائل سے اُن کو معلوم ہو گیا تھا اور ایسی خصوصیت عورتوں کے لئے بھی ہے کیونکہ بعض احکام صرف عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہیں مردوں کے لئے نہیں ہیں ان کے علاوہ بقیہ احکام میں جن کا کسی کے لئے خاص ہونا دلائل سے معلوم نہ ہوا تھا اُنہوں نے یہی سمجھا کہ مردوں اور عورتوں سب کے لئے مشترک ہیں گو لفظاً خطاب خاص مردوں کو کیا گیا ہے ۱۲) اور عموم احکام پر نظر کر کے پھر ان کو یہ تمنا ہوئی کہ جب یہ احکام سب کو عام ہیں تو ان میں ہمارا بھی تذکرہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اُن کے دل نے اس کو گوارا نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ تمام احکام میں مردوں کے واسطہ ہی سے ان کو خطاب فرمادیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ کبھی کبھی ہم کو

مردوں سے جدا کر کے بھی خطاب فرمایا کریں اور وجہ اس تمنا کی یہ تھی کہ ان کو خدا تعالیٰ سے محبت تھی (اور عاشق کا دل چاہا کرتا ہے کہ اس کا تذکرہ کبھی تو محبوب کی زبان پر آجایا کرے ؎

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے ۱۲ جامع)

خدا تعالیٰ کا کسی کو اپنے احکام کا مخاطب بنانا ایک بڑا شرف ہے جو مردوں کو حاصل تھا. تو ازواج مطہرات کو اس کی تمنا ہوئی کہ اس شرف سے ہم بھی محروم نہ رہیں۔ (اس وقت پردہ کے پیچھے سے پھر عورتوں کی کچھ آواز آئی. حضرت حکیم الامت نے پھر فرمایا کہ بھائی باتیں کرنے سے طبیعت اچاٹ ہوئی جاتی ہے مضمون گڑبڑ ہو جاتا ہے اگر تم اپنی باتیں بند نہیں کرتیں تو پھر ہم سے کہدو ہم اپنی باتوں کو بند کر دیں ورنہ اس کی احتیاط کرو اول تو اس وقت باتیں کرنا جائز نہیں جیسا کہ ابھی میں نے حکم بتلایا تھا اور اگر کسی کی طبیعت باتوں سے نہیں رکتی تو بلند آواز سے تو نہ کرو آہستہ ہی کر لو ۱۲) غرض وہ عورتیں دین کی عاشق تھیں وہ اپنے اوپر بوجھ لادنا چاہتی تھیں وہ یہ نہ چاہتی تھیں کہ ہم احکام کے مخاطب نہ بنیں تو اچھا ہے کیونکہ ان کو دین کے ثمرات پر اطلاع تھی اور وہ جانتی تھیں کہ دین کے ثمرات ایسے ہیں کہ ان کے لئے محنت کرنا کوئی چیز نہیں اسی پر یہ آیت نازل ہوئی فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ طیعنی احکام میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں جو کوئی بھی عمل کرے مرد ہو یا عورت سب کو اجر ملے گا. اور کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ باقی رہی خصوصیت خطاب کی وجہ سو وہ یہ ہے بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ط کہ تم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو پس حکم بھی دونوں کا یکساں ہے اس لئے ضرورت جدا خطاب کرنے کی نہیں اس کے بعد بعض جگہ خاص عورتوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جیسے یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ الخ (اے نبی کی بیبیو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقوی اختیار کرو) میں دور تک ازواج مطہرات کو خطاب ہے اور وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (اور مسلمان عورتوں سے کہدیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت

کریں) میں سب مسلمان عورتوں کو ایک خاص حکم کا مخاطب بنایا گیا ہے اس سے اس وہم کا ازالہ مِنْ کُلِّ الْوُجُوْہ ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ مردوں کی طرح حق تعالیٰ کو عورتوں پر بھی عنایت ہے اور بعض جگہ مذکر و مؤنث کے دونوں صیغے مخلوط لائے گئے ہیں چنانچہ اس آیت میں اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتَاتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقَاتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِیْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ٥ (ترجمہ) بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتین اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ تعالےٰ نے مغفرت اور اجرعظیم تیار کر رکھا ہے۔ اس آیت میں مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر دوش بدوش کیا گیا ہے (اور گو عورتوں کی تمنا کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس جگہ صرف عورتوں ہی کا ذکر ہوتا مردوں کا ذکر ان کی ساتھ مخلوط نہ کیا جاتا مگر اس غلط میں اشارہ ہوگیا جواب کی طرف کہ چونکہ اکثر احکام مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں چنانچہ یہی احکام دیکھ لو کہ ان میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں اس لئے عورتوں کا ذکر جدا کرنے کی ضرورت نہیں جو احکام مردوں کے لئے ہیں وہی عورتوں کے لئے ہیں ۱۲ جامع)

رہی یہ بات کہ ہر جگہ ایسا ہی کیوں نہ کیا گیا جیسا اس آیت میں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک وجہ تصحیح کی۔ اور ایک وجہ ترجیح کی تو تصحیح کی وجہ تغلیب ہے (تغلیب کے معنی یہ ہیں کہ ایک نوع کو دوسری نوع پر غلبہ دے کر ایک کو

ذکر کرکے دونوں کا ارادہ کرلیا جائے " جامع) مثلاً باپ ماں کو والدین یا ابوین کہا کرتے ہیں اسی طرح اہل عرب چاند اور سورج کو قمرین کہدیتے ہیں حالانکہ ابوین کا لفظی ترجمہ ہے دو باپ اور قمرین کا ترجمہ ہے دو چاند۔ ظاہر میں ماں باپ کو ابوین کہنا غلط معلوم ہوتا ہے ان کو اب وام کہنا چاہیئے اسی طرح چاند اور سورج کو قمرین کہنا بھی بظاہر غلط ہے ان کو شمسٌ و قمرٌ کہنا چاہیئے لیکن چونکہ اس طرح عبارت طویل ہو جاتی ہے اس لئے اہل زبان اب وام کی جگہ تغلیباً بغرض اختصار ابوین اور شمس و قمر کی جگہ قمرین کہدیتے ہیں۔ اسی طرح اگر قرآن میں مردوں اور عورتوں کے لئے جدا جدا صیغہ استعمال کیا جاتا تو کلام میں طول ہو جاتا اس لئے تغلیباً صیغۂ مذکورہی میں مؤنث کو بھی داخل کرلیا گیا جس سے کلام میں اختصار پیدا ہو گیا۔ البتہ ایک دو جگہ عورتوں کے وہم مذکور کو دفع کرنے کے لئے اُن کے واسطے جدا صیغے بھی استعمال کئے گئے تاکہ ان کی تسلی ہو جائے اور اتنی مقدار سے ایجاز کلام بھی فوت نہیں ہوتا۔ اور ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں تابع ہیں مردوں کی ہر طرح سے خلقت کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کے ایک جزو سے حوّا علیہا السلام کی پیدائش ہوئی ہے یعنی حق تعالٰے نے ان کی بائیں پسلی میں سے کوئی مادہ نکالا پھر اس مادہ سے حوّا علیہا السلام کو پیدا کیا جس کا اثر یہ ہے کہ عورتیں عموماً مردوں سے خلقۃً کمزور ہوتی ہیں ان کے تمام قویٰ جسمانی اور دماغی مردوں کی برابر نہیں ہوتے۔ نیز ترتیب کے اعتبار سے بھی وہ مردوں کے تابع ہیں۔ چنانچہ کمانا اور کھیتی کرنا، تجارت کرنا، محنت و مشقت کے کام کرنا مردوں کے متعلق ہے اور پکانا کھانا عورتوں کے متعلق ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی اصل یہ ہے کہ وہ پردہ دار ہوں اور تعلقات انتظامیہ کے لئے پردہ مانع ہے اس لئے امور انتظامیہ ان کے متعلق نہیں ہوسکتے۔ انتظام کا تعلق مردوں ہی سے ہوسکتا ہے اس وجہ سے تمام تر تعلق انتظام کا مردوں کے سپرد کیا گیا پس جہاں دیگر انتظامات ان کے متعلق ہیں وہاں عورتوں کی اصلاح کا انتظام بھی مردوں کے سپرد کیا گیا اور جب مردوں کے متعلق عورتوں کی اصلاح کا انتظام ہے تو وہ اس کے سردار ہوئے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ سلطنت کی طرف سے جو احکام

صادر ہوا کرتے ہیں ان کے مخاطب سردار ہوتے ہیں رعایا کو مخاطب نہیں کیا جاتا نہ اس کی کچھ ضرورت سمجھی جاتی ہے کیونکہ لوگ خود سمجھ لیں گے کہ جب سرداران احکام کے مخاطب ہیں تو چھوٹے بھی ان کی ساتھ ضرور شریک ہیں پھر سردار اپنے ماتحت لوگوں کو ان احکام کی اطلاع بھی کر دیتے ہیں اور ان سے کام بھی لیتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں اکثر مردوں کو احکام کا مخاطب بنایا گیا ہے چونکہ وہ عورتوں پر سردار ہیں تو ان کے مخاطب ہونے سے عورتوں کا ان احکام میں شریک ہونا خود سمجھ میں آجاتا ہے۔ پھر مردوں کے ذمہ ہے کہ وہ عورتوں کو احکام سے بھی اطلاع کریں اور ان سے کام بھی لیں۔ کیونکہ سرداروں کے ذمہ یہ کام ہمیشہ ہوتا ہے کہ اپنے ماتحت لوگوں کو احکام سلطنت سے مطلع کرتے رہیں اور ان سے کام لیں اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو ان سے بھی باز پرس ہوگی۔ افسوس ہے کہ آجکل مردوں نے یہ بات تو یاد کر لی ہے کہ ہم عورتوں کے سردار ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ سردار کے ذالفض کیا ہوتے ہیں وہ نہ تو عورتوں کو احکام سے مطلع کریں اور مطلع کریں کس طرح سردار صاحب کو خود ہی خبر نہیں اور نہ ان سے کام لیں یعنی جن کو احکام معلوم بھی ہیں اور وہ عورتوں کو احکام سے مطلع بھی کرتے ہیں وہ اس کی نگہداشت نہیں کرتے کہ ہمارے گھروں میں ان احکام پر عمل بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔ غرض جو احکام ایسے ہیں جن میں اشتراک کی خاصیت ہے جیسے نماز روزہ وغیرہ ان میں مردوں کو خطاب کافی ہے اس تمہید کے بعد یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اس آیت میں جو کہ میں نے اس وقت تلاوت کی تھی جس طرح حق تعالیٰ نے مردوں کو تکمیلِ دین کا حکم فرمایا ہے اسی طرح وہ حکم عورتوں کے لئے بھی ہے اور جو طریق کمالِ دین کے حاصل کرنے کا مردوں کے لئے اس میں مذکور ہے وہ طریق عورتوں کے لئے بھی ہے۔ پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (ترجمہ) اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو (خدا سے ڈرو) اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ یہ تو اس آیت کا ترجمہ ہے۔ اور پہلے بیان میں اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ تقویٰ اور صدق سے کمالِ دین مراد ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ اے مسلمانو! دین میں کمال حاصل

کرو اور کاملین کے ساتھ رہو پس اس میں اولاً حق تعالیٰ نے تکمیل دین کا حکم فرمایا ہے پھر اس کا طریق بتلایا ہے کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ رَّاسِخُ فِی الدِّیْن (دین میں پختہ) ہیں ان کی صحبت حاصل کرو کیونکہ کاملین کی صحبت سے اعمال میں سہولت بھی ہوتی ہے اس طرح سے کہ ان کی برکت سے تقاضائے نفس مضمحل ہو جاتا ہے جو کہ اکثر اعمال میں مزاحم ہوتا ہے۔ نیز ان کی صحبت سے طریق عمل بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس عمل کو کس طرح ادا کرنا چاہیئے۔ یہ بات محض مسائل جاننے سے حاصل نہیں ہوتی جب تک کسی کو عمل کرتے ہوئے نہ دیکھا جاوے۔ اور یہ بات کچھ دین ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیوی کاموں میں بھی طریق عمل معلوم کرنے کے لئے اہل کمال کی صحبت ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص یوں چاہے کہ محض کتاب دیکھ کر قسم قسم کے کھانے پکانے سیکھ لے تو ایسا نہیں ہو سکتا جب تک وہ کسی ماہر فن سے ہر کھانے کی ترکیب عملی نہ سیکھے گا، اس وقت تک کبھی اس کو کھانا پکانے کا طریقہ معلوم نہ ہوگا۔ اور اگر کسی نے کتاب دیکھ کر عمل شروع بھی کر دیا تو اس کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں گی چنانچہ جب چاہے اس کا تجربہ کر لیا جائے۔ اور یہی حال ہر عمل کا ہے کہ محض ترکیب جان لینے سے کسی عمل میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ استاد سے سیکھنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے پس دین میں بھی کمال حاصل کرنا صحبت کاملین پر موقوف ہے عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے۔ پس میں نے اسی آیت کو عورتوں میں اس لئے پڑھا ہے تاکہ دو شبہے مرتفع ہو جائیں

لے احقر جامع عرض کرتا ہے کہ اس آیت سے اشارۃً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جب تک دنیا میں قرآن اور اسلام کا وجود ہے اس وقت تک ہر زمانہ میں کاملین کا بھی وجود ضرور رہے گا کیونکہ جب تک دنیا میں قرآن ہے اس وقت تک ہر شخص اس آیت کا مخاطب ہے اور اس آیت میں کمال دین کا طریقہ صحبت کاملین بتلایا گیا ہے بصورت امر جس کا امتثال بدون تحقق کاملین کے نہیں ہو سکتا اور اوامر شرعیہ کے لئے متعذر الامتثال (فرمانبرداری کا دشوار ہونا) ہونا خلاف اصل ہے اس لئے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ ہر زمانہ میں کاملین کا وجود ضرور رہے گا گو وہ قلیل ہی ہوں پس جو لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب آجکل اہل کمال کہاں ہیں اب تو کمال کا حاصل ہونا دشوار ہے یہ آیت اشارۃً ان پر رد کر رہی ہے۔ فافہم ۱۲ جامع

ایک آرام طلب عورتوں کا شبہ کہ وہ یوں نہ سمجھیں کہ یہ حکم مردوں ہی کے لئے مخصوص ہے کیونکہ وہی اس کے مخاطب ہیں اور ہم اس سے بچے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اکثر عورتوں کا یہ خیال ہے کہ بس خدا نے ہم کو تو کھانا پکانے اور سینے پرونے ہی کے لئے پیدا کیا ہے دین کا کمال حاصل کرنا ہمارا کام نہیں بلکہ مردوں کا کام ہے۔ دوسرے خدا طلب عورتوں کا شبہ کہ وہ اپنے دل میں یوں نہ کہیں کہ بس خدا تعالیٰ کو مردوں ہی پر عنایت ہے ہم کو منہ بھی نہ لگایا۔ ان دونوں شبہوں کا جواب میں تے دیدیا ہے کہ مردوں کو خطاب کرنا اس وجہ سے نہیں کہ عورتیں ان احکام سے مستثنیٰ ہیں اور نہ اس واسطے ہے کہ حق تعالیٰ کو عورتوں پر عنایت نہیں بلکہ خصوصیت خطاب کا منشا کچھ اور ہے جس کو میں مفصلاً بیان کر چکا ہوں۔ پس عورتوں کو جان لینا چاہیئے کہ ان کو بھی حق تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ اپنا دین کامل کرو ہر چند کہ مقصود اتنے ہی بیان سے پورا ہو گیا کیونکہ آیت کا مطلب ظاہر ہے کہ اس میں دین کے کامل کرنے کا حکم ہے اب ہر شخص دیکھ لے کہ دین کیا ہے اور اس کے کیا کیا اجزاء ہیں اس کے بعد سب کاموں کو طریقہ شرعیہ کے موافق بجالانا شروع کر دے بس دین کامل ہو جائے گا۔ مثلاً نماز دین کا کام ہے اس کا کمال یہ ہے کہ اچھی طرح پڑھو دنت پر پڑھو جلدی جلدی ادا نہ کرو اطمینان وسکون کے ساتھ پڑھو۔ ایسے ہی زکوٰۃ دین کا کام ہے اور اس کے کمال کا طریقہ یہ ہے کہ سال پورا ہونے کے بعد فوراً ادا کرو اور خوشی سے ادا کرو بیگار مت سمجھو۔ نیز ریا ونمود سے بچو محض رضا حق کو مقصود سمجھو۔ پس دین کے کام اکثر لوگوں کو معلوم ہیں اور ان کے کمال کا طریقہ مسائل پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے اگر میں اس وقت اجزاء دین کی تفصیل بیان کروں اور ہر اک کے کمال کا طریقہ جدا جدا بتلاؤں تو اس کے لئے عمر طویل بھی کافی نہیں لیکن مقصود کی تعیین تفصیل پر موقوف نہیں اجمالاً سب کو دین کے کاموں کا علم ہے اور ان کے کمال کا طریقہ دریافت کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن اب مجھ کو عورتوں کی غفلت کی شکایت کرنا باقی ہے کہ افسوس ان کو دنیا کی تکمیل کا تو خیال ہے دین کی تکمیل کا مطلق خیال نہیں میرا مقصود یہ ہے کہ عورتوں کو دین کی تکمیل سے بھی غافل نہ ہونا چاہیئے جیسا کہ ان کو اپنے زیور

کپڑے اور مکان کی ضرورت کی تکمیل سے کسی وقت بھی غفلت نہیں ہوتی اور وقتاً فوقتاً مردوں سے اس کے متعلق فرمائشیں کرتی رہتی ہیں اور اگر مرد کسی وقت کسی فرمائش کو غیر ضروری بتلاتے ہیں برتنوں اور مکان کی ضرورتوں کے متعلق اختلاف ہونے لگتا ہے کہ مرد یوں کہتے ہوں کہ ان چیزوں کی ضرورت نہیں اور مستورات کے نزدیک ان کی ضرورت ہو تو ایسے موقع پر عورتیں کہہ دیا کرتی ہیں کہ تم کو ان چیزوں کی کیا خبر تم کو گھر میں رہنا تھوڑا ہی ہے اس کو تو ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں اور بعض دفعہ تو عورتوں کا یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کیونکہ واقعی مردوں کو ان ضرورتوں کا علم پوری طرح نہیں ہوتا اور بعض دفعہ اس اختلاف کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مردوں میں قناعت کا مادہ عورتوں سے زیادہ ہے مرد تھوڑے سے سامان میں بھی گذر کر لیتا ہے اور عورتوں میں قناعت کا مادہ ہے ہی نہیں ان کی طبیعت میں بکھیڑا بہت ہے اُن سے تھوڑے سامان میں گذر ہوتا ہی نہیں جب تک سارا گھر سامان سے بھرا بھرا نظر نہ آوے۔ مردوں کے نزدیک تو ضرورت کا درجہ یہ ہے کہ جس کے بغیر تکلیف ہو سو اتنا سامان تو اکثر متوسط الحال لوگوں کے گھروں میں بحمداللہ موجود ہوتا ہی ہے اس لئے مردوں کو اُس سے زیادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں اگر خدا وسعت دے تو اس کا بھی مضائقہ نہیں کہ اتنا سامان جمع کر لیا جاوے جس سے زیادہ راحت نصیب ہو۔ یہ درجہ مردوں کے نزدیک کمال کا مرتبہ ہے مگر عورتوں کے نزدیک ضرورت کا درجہ تو کوئی چیز ہی نہیں مرد جس کو ضرورت کا درجہ سمجھتے ہیں وہ عورتوں کے نزدیک قلت اور تنگی کا درجہ ہے ان کے نزدیک ضرورت کا درجہ وہ ہے جس کو مرد کمال کا درجہ سمجھتے ہیں اور کمال کا درجہ وہ ہے جو حقیقت میں ہوس کا درجہ ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ عورتوں میں ناشکری کا مادہ زیادہ ہے۔ اگر خدا تعالیٰ ان کو ضرورت کے موافق سامان عطا فرما دیں تو یہ اس کو غنیمت نہیں سمجھتیں نہ اس پر خدا کا شکر کرتی ہیں بلکہ ناشکری کرتی رہتی ہیں کہ ہائے ہمارے پاس کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ حدیث میں بھی ان کی اس صفت کا تذکرہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناشکری کا مادہ عورتوں میں ہمیشہ سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم فرماتے ہیں لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰی اِحْدٰاھُنَّ الدَّھْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَیْئًا قَالَتْ مَا رَأَیْتُ مِنْكَ خَیْرًا قَطُّ۔ کہ اگر تم کسی عورت کے ساتھ عمر بھر اچھا برتاؤ کرتے رہو پھر کبھی ایک دفعہ کوئی خلاف مزاج بات دیکھ لے تو وہ یوں کہے گی کہ میں نے تجھ سے کبھی بھلائی نہیں دیکھی بس ذرا سی بات میں ساری عمر کے احسانات فراموش کر جاتی ہیں۔ جہاں کسی دن ان کو شوہر کے گھر میں کھانے پہننے کی تنگی ہوئی اور انہوں نے اس کو منہ پر لانا شروع کیا کہ اس نگوڑے گھر میں آکر تو میں نے سدا تنگی ہی دیکھی۔ باپ ماں نے مجھے جان بوجھ کر کنوئیں میں دھکا دیدیا میں نے اس منحوس گھر میں کیا آرام دیکھا۔ غرض جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتی ہیں اور اس کا ذرا خیال نہیں کرتیں کہ آخر اسی گھر میں ساری عمر میں نے عیش برتا ہے مجھے اس کو نہ بھولنا چاہئے۔ اور خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ اس نے کلفت آج ہی دکھلائی اور زیادہ زمانہ عیش میں گذارا۔ سو عورتوں میں چونکہ ناشکری کا مادہ زیادہ ہے اس لئے ان کو تھوڑے سامان پر قناعت نہیں ہوتی چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض عورتوں کے پاس سال بھر کے کپڑے موجود ہوتے ہیں جو صندوق میں بھرے رکھے ہیں لیکن پھر بھی کیا مجال ہے کہ پھیری والا بزاز ان کے گھر کے سامنے سے خالی گذر جائے جہاں بزاز کی آواز سنیں گی فوراً اس کو دروازہ پر بٹھلا کر اور کپڑا پھڑوالیں گی۔ برتن گھر میں ضرورت سے زیادہ موجود ہوں گے مگر پھر بھی ان کی فرمائشوں کا سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ واعظوں کا بیان بڑا اچھے دالہ ہوتا ہے۔ دہلی میں مولانا عبدالرب صاحبؒ ایک واعظ تھے وہ عورتوں کی اس صفت کو بڑے اچھے دار فقروں میں بیان کیا کرتے تھے کہ ان عورتوں کی یہ عادت ہے کہ ان کے پاس چاہے کتنے ہی کپڑے ہوں مگر جب پوچھئے کہ تمہارے پاس کتنے کپڑے ہیں تو یوں ہی کہیں گی کہ میرے پاس کیا ہیں دو چیتھڑے اور جوتوں کے چاہے کتنے ہی جوڑے ہوں مگر جب پوچھو یوں ہی کہیں گی کیا ہیں دو لیترے اور برتن چاہے کتنے ہی ضرورت سے زیادہ ہوں مگر جب پوچھو یوں ہی کہیں گی کیا ہیں دو ٹھیکرے تیر یہ تو مولوی صاحب کا لطیفہ ہے مگر حقیقت میں عورتوں کی عادت کا فوٹو انہوں نے خوب کھینچا غرض ان کو دنیا کی تکمیل کی بہت زیادہ فکر ہے ہر وقت اسی دھن میں رہتی ہیں۔

ان کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوتی۔ زیور کی ہوس کا یہ حال ہے کہ بعض عورتیں سر سے پیر تک لدی پھدی رہتی ہیں مگر پھر بھی بس نہیں اگر نیا زیور نہ بنوائیں گی تو پہلے ہی زیور کی توڑ پھوڑ میں روپیہ برباد کرتی رہیں گی، آج ایک زیور بڑے شوق سے بنوایا تھا کل کو کسی عورت کے پاس وہی زیور دوسرے نمونہ کا دیکھ لیا تو اب ان کو توڑ پھوڑ کی بیکلی لگتی ہے کہ میں بھی اسی نمونہ کا بنواؤں گی مگر آج کل کچھ دنوں سے نوعمر لڑکیوں میں زیور کا شوق کم ہوگیا ہے۔ یہ نیا فیشن چلا ہے کہ نوعمر لڑکیاں آجکل کان وغیرہ ننگے رکھتی ہیں یہاں بھی یہ اثر ضرور ہوگا یہاں کی مجھ کو زیادہ تحقیق نہیں مگر جب قصبات میں یہ اثر پہونچ گیا ہے تو شہروں میں بھی ضرور ہوگا۔ چاندی کا زیور تو آجکل عیب شمار ہونے لگا یہ تو نیچوں جلاہیوں کا زیور رہ گیا۔ شرفا کی لڑکیاں صرف سونے کا زیور پہنتی ہیں وہ بھی صرف کانوں میں دو ہلکے ہلکے بندے ہیں اور سارا بدن زیور سے ننگا ہے۔ ہاں پیروں میں کچھ چاندی بھی ڈال لیتی ہیں کیونکہ وہ حقیر چیز ہے پیروں ہی میں رہنی چاہیئے تو آجکل زیور میں لڑکیوں نے اختصار کرلیا ہے اور اس مذاق کی ابتدا میموں کے اتباع سے ہوئی ہے میمیں زیور نہیں پہنتیں کیونکہ ان کی قوم میں اس کا رواج نہیں۔ حکمران قوم ہے ان کو دیکھ دیکھ کر ہندوستانی عورتوں میں بھی یہ مذاق پیدا ہوگیا اور ان کو میموں کا طرز اس طرح معلوم ہوا کہ آجکل جابجا شفاخانے کھلے ہوئے ہیں جن میں زنانے شفاخانے بھی ہیں ہندوستانی عورتیں وہاں جاکر میموں سے علاج کراتی ہیں اس ذریعے سے ان کے پاس آمد و رفت ہوتی ہے اور جو زیادہ وسعت والے ہیں وہ میموں کو اپنے گھروں پر بلاتے ہیں۔ دوسرے آجکل ریلوں میں بھی عورتیں سفر کرتی ہیں اسٹیشنوں پر میمیں نظر پڑجاتی ہیں علم اجمالی تو اس طرح حاصل ہوا۔ پھر تفصیلی علم شفاخانوں میں جاکر یا ان کو گھر پر بلانے سے ہوگیا۔ پھر بعض عورتوں پر تو میموں کا اثر بلا واسطہ ہوا اور بعض پر بواسطہ ہوا کہ ایک نے تو میموں کو دیکھ کر ان کا طرز اختیار کیا پھر اس کو دیکھ دیکھ کر دوسریوں نے اپنا رنگ بدلا۔ لوگ اس میں احتیاط نہیں کرتے اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ عورتیں ہیں ان سے کیا احتیاط اس لئے بے تکلف میموں سے علاج کراتے ہیں حالانکہ میمیں مردوں سے زیادہ قابل احتیاط ہیں کیونکہ مردوں سے تو مردوں کو

سابقہ پڑتا ہے اور مردوں میں تاثر کا مادہ کم ہے وہ ان کی باتوں سے متاثر بہت کم ہوتے ہیں اور میموں سے عورتوں کو سابقہ پڑتا ہے اور ان میں تاثر کا مادہ زیادہ ہے یہ ہر نئی چیز سے بہت جلد متاثر ہوتی ہیں پھر میموں کی طرز تقریر میں ایک خاص بات ہوتی ہے جو ہندوستانی عورتوں میں نہیں ہوتی اس لئے وہ میموں کی باتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک دیندار عورت نے اس حقیقت کو خوب سمجھا۔ اس کی آنکھ میں کچھ نقصان تھا ڈاکٹر کو آنکھ دکھانے سے وہ انکار کرتی تھی اور یہ کہتی تھی کہ آنکھ ہی کی تو شرم ہے جب غیر مرد کے سامنے آنکھ ہوگئی پھر پردہ کا ہے کا رہا۔ پھر اس نے ایک میم کو اپنی آنکھ دکھائی اس نے دیکھ کر کہا کہ میں اس علاج میں ماہر نہیں ہوں تم کو ڈاکٹر صاحب کو آنکھ دکھانا چاہیے اس نے ڈاکٹر کو دکھانے سے انکار کیا اس پر میم نے ایسی تقریر کی کہ ان کی رائے فوراً بدل گئی اور ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے تیار ہوگئیں پھر ان کو تنبہ ہوا اور عہد کیا کہ اب ساری عمر بھی ان میموں کا منہ کبھی نہ دیکھوں گی کہ اس ساحرہ نے تو میری عمر بھر کی غیرت و حیا کو ایک منٹ میں اپنی تقریر سے مغلوب کر دیا کہ اس وقت مجھے ڈاکٹر کے سامنے آنے سے بھی غیرت مانع نہ ہوتی تھی ان کا کیا اعتبار یہ ظالم تو اپنی تقریر سے کسی کا دین بھی بدل دیں تو تعجب نہیں۔ صاحبو! اس بات کو معمولی نہ سمجھو اس کی بہت احتیاط ضروری ہے خصوصاً یہ جو مشن کی میمیں ہیں ان سے تو بہت ہی احتیاط لازم ہے یہ اپنے مذہب کی تبلیغ بڑی باریکی سے کر دیتی ہیں کہ سننے والے کو پتہ بھی نہیں چلتا مگر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے ذہن میں ان کے مذہب سے نفرت نہیں رہتی اور بعض دفعہ تو علاج کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی گفتگو بھی صاف صاف کرتی رہتی ہیں۔ میں نے بہت واقعات ایسے سُنے ہیں کہ بعض عورتوں نے میموں کا علاج شروع کیا پھر ان پر ایسا اثر پڑا کہ کمبختوں نے دین بدل دیا۔ بعض نے دین نہیں بدلا تو پردہ کرنا چھوڑ دیا اور بعض نے لباس اور زیور وغیرہ میں ان کا طرز اختیار کر لیا ہے یہ تو سب سے ادنیٰ اثر ہے اور اب روز بروز اس کی زیادتی ہے۔ علاج کرانے کا کافر عورت سے مضائقہ نہیں مگر اس میں چند باتوں کا خیال رکھیں۔

(۱) ان سے بجز علاج معالجہ کے اور کوئی بات نہ کریں۔ (۲) ضرورت کے سوا

زیادہ میل جول نہ بڑھادیں ان سے بہناپا نہ کریں آجکل تو غضب یہ ہے کہ جس گھر میں ایک دفعہ میم صاحب کا قدم آجاتا ہے پھر وہ روز کے روز اسی میں کھڑی نظر آتی ہیں اگر وہ خود بھی نہ آئی تو گھر والیاں بلاتی ہیں اس کی بہت سختی کے ساتھ بندش کرنی چاہیئے۔ (۳) اگر وہ مذہبی باتیں شروع کرے تو فوراً روک دینا چاہیئے یا کم از کم سننا نہ چاہیئے اور اگر وہ کسی بات کا جواب مانگے تو صاف کہدو کہ شہر میں علماء موجود ہیں تم ان سے جاکر کہو وہ تم کو ہر بات کا جواب دیں گے۔ (۴) اور ایک بات کا خاص ایسی ہے جس کی طرف اکثر عورتیں تو کیا خاص خاص مرد بھی توجہ نہیں کرتے وہ یہ کہ جن مواضع جسم کا چھپانا نامحرم مرد سے فرض ہے کافر عورتوں سے بھی ان کا چھپانا فرض ہے۔ مثلاً سر کا کھولنا یا گلا کھولنا نامحرموں کے سامنے جائز نہیں۔ ان مواضع کا کھولنا کافر عورت کے سامنے بھی بلا ضرورت معالجہ کے حرام ہے البتہ اگر ان مواضع کو علاج کی غرض سے کھولنا پڑے تو جائز ہے لیکن بلا ضرورت ہرگز نہ کھولنا چاہیئے جس کی دلیل حق تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے۔ اَوْ نِسَآءِهِنَّ اس سے پہلے حق تعالےٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کے سامنے عورتوں کو آنا جائز ہے چنانچہ ارشاد ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ (پیغمبر کی بیبیوں پر اپنے باپوں کے بارے میں کوئی گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں کے اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی عورتوں کے اور نہ اپنی لونڈیوں کے اور خدا سے ڈرتی رہو بے شک اللہ ہر چیز پر حاضر ناظر ہے)

اور سورہ نور میں ارشاد ہے۔ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ الآیۃ (ترجمہ اور اپنی زینت (کے مواقع) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر (خواہ حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی اور چچا زاد، ماموں زاد بھائی وغیرہ مراد نہیں) یا

اپنے بھائیوں کی اولاد پر یا اپنی بہنوں کی اولاد پر (یہاں بھی حقیقی و علاتی و اخیافی بہنیں مراد ہیں۔ چچازاد و ماموں زاد بہنیں مراد نہیں) یا اپنی عورتوں پر (مراد مسلمان عورتیں ہیں کیونکہ وہی اپنی کہلاتی ہیں) یا اپنی باندیوں پر (مطلقاً خواہ کافر ہوں یا مسلمان) الآیۃ تو ان آیتوں میں یہ نہیں فرمایا اَوِالنِّسَاءِ اگر اس طرح فرماتے تو یہ مطلب ہوتا کہ مسلمان عورتوں کو سب عورتوں کے سامنے آنا اور اپنے مواقع زینت کا کھولنا جائز ہے بلکہ حق تعالیٰ نے اَوْ نِسَاءِ هِنَّ فرمایا ہے جس کا ترجمہ ہے اپنی عورتیں اور باتفاق مفسرین اپنی عورتیں وہی ہیں جو مسلمان ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ مسلمان عورتوں کو مسلمان کے سامنے اپنی زینت کے مواقع کا کھولنا جائز ہے کافر عورتوں کے سامنے گلا اور سر اور کلائیاں اور پنڈلیاں کھولنا جائز نہیں اس میں بکثرت مستورات مبتلا ہیں وہ یہ سمجھتی ہیں کہ عورتوں سے کیا پردہ حالانکہ شریعت میں کافر عورتوں کا حکم مثل اجنبی مرد کے ہے۔ میموں سے تو ان کو کبھی کبھار ہی واسطہ پڑتا ہے مگر اکثر بھنگنوں، چماریوں یا کنجڑیوں یا پٹولوں سے بہت واسطہ پڑتا ہے یہ عورتیں رات دن گھروں میں گھسی رہتی ہیں ان سے بہت کم احتیاط کی جاتی ہے سو خوب سمجھ لو کہ یہ عورتیں مثل اجنبی مرد کے ہیں ان کے سامنے بدن کا کھولنا ایسا ہی ہے جیسا کہ غیر مردوں کے سامنے بدن کھولنا پس ان سے تمام بدن کو احتیاط کے ساتھ چھپاؤ۔ صرف منہ اور قدم اور گٹے تک ہاتھ کھولنا ان کے سامنے جائز ہے باقی تمام بدن کا چھپانا فرض ہے خصوصاً سر کھول کر گھر میں پھرنے کا عورتوں کو زیادہ مرض ہے تو ان عورتوں کو آنے کے وقت تمام سر کو چھپا لینا چاہیئے کہ بال تک بھی ان کو نظر نہ آویں اس کی طرف عورتوں کو بالکل التفات نہیں جس کا سبب یہ ہے کہ ان کو احکام کی طرف توجہ کم ہے دنیا ہی میں ہر وقت لگی رہتی ہیں ان کو اپنے زیور کپڑے سے اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ تھوڑی دیر کے لئے کوئی کتاب مسائل کی پڑھ لیا کریں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان میموں وغیرہ سے عورتوں کو بچنا چاہیئے بلا ضرورت ان سے ہرگز نہ ملیں نہ اپنے گھر پر بلاویں اور اس کا پورا انتظام مردوں کو کرنا چاہیئے ان عورتوں کے اختلاط کا بہت بُرا نتیجہ ہے مستورات کو ان کی اوضاع و اطوار سے بچنا چاہیئے۔ چنانچہ انہی کے اوضاع میں سے ایک اثر یہ بھی ہے کہ نو عمر لڑکیوں کو زیور کا خیال کم ہو گیا ہے۔

اس کا منشا کفایت شعاری ہرگز نہیں کیونکہ پہلی ساری کفایت شعاری زیور ہی میں رہ گئی۔ اچھا کپڑوں میں کفایت شعاری کیوں نہیں کی جاتی۔ جو لڑکیاں زیور کم پہنتی ہیں وہ کپڑوں میں بڑی رقم صرف کرتی ہیں اسی طرح گھر کی آرائش اور زینت میں بھی خرچ کی پروا نہیں کرتیں اس سے معلوم ہوا کہ ان کا مقصود محض میموں کا اتباع ہے جس چیز میں وہ رقم صرف نہیں کرتیں اس میں یہ بھی صرف نہیں کرتیں اور جس میں ان کو زیادہ غلو ہے اس میں یہ بھی خرچ کی پروا نہیں کرتیں بلکہ یہ مذاق اس درجہ غالب ہوا ہے کہ جن عورتوں میں مالی وسعت زیادہ بھی نہیں ہے وہ معمولی کپڑوں اور معمولی زیوروں ہی میں ایسی تراش خراش کرتی ہیں اور ایسی وضع سے ان کو بناتی ہیں جس سے وہ میم کی طرح نظر آنے لگیں۔ پس ایسی حالت میں ان کو زیور کا خیال کم ہونا کچھ باعث مسرت نہیں بلکہ یہ تو اس کا مصداق ہو گیا ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اگر یہ اپنی پرانی وضع پر قائم رہیں پھر زیور کا شوق کم کر دیں اس وقت البتہ خوشی کی بات ہے اور جن لڑکیوں میں یہ مذاق نہیں آیا ان کی حالت یہ ہے کہ زیور سے کسی وقت ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا کانوں میں بالے بھی ہیں بالیاں بھی ہیں پتے بھی ہیں ان کو کچھ حس ہی نہیں کہ اس سے کان ٹوٹیں گے یا کیا ہو گا۔ چاہے کان جھک پڑیں مگر ان کو سب زیور لادنا فرض ہے۔ ناک میں نتھ بھی ہے اور لونگ بھی ہے پھر چاہے لونگ سے ناک میں آگ ہی لگ جائے مگر کیا مجال جو کسی وقت اتر لے۔ پھر اس زیور کے شوق میں ان کو ساری مصیبتیں آسان ہو جاتے ہیں۔ یعنی کان چھدوانے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے مگر لڑکیاں ہنسی خوشی سب کام کر لیتی ہیں بلکہ اگر کوئی ان سے یہ کہے کہ کان چھدوا کر کیا لو گی خواہ مخواہ تکلیف اپنے سر مول لیتی ہو کان مت چھدواؤ تو اس سے لڑنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔

میرے ایک دوست ہیں ان کو اپنی لڑکی سے بہت محبت تھی ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اگر میں اس بچّی کے کان نہ چھدواؤں تو کچھ حرج تو نہیں۔ مجھے اس کی تکلیف سے بہت تکلیف ہوتی ہے میں نے کہہ دیا کہ نہیں حرج کیا ہوتا۔ یہ خبر کہیں اس لڑکی کو ہو گئی

مجھ پر بڑی خفا ہوئی کہ اپنی بیوی اور ماں بہن کو نہیں دیکھتے بھلا یہ مسئلہ میرے ہی واسطے نکالا پہلے اپنے گھر والوں کو اس کی تعلیم دی ہوتی میں تو ضرور کان چھدواؤں گی۔ وہ دوست میرے پاس آئے کہ صاحب اس لڑکی نے وہ بات سن لی تو آپ پر بڑی خفا ہوئی۔ میں نے کہا بھائی تم اُس کے ایک ایک کی جگہ دو دو سوراخ کرا دو۔

ایک بنئے کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ ذرا سل کا باٹ اٹھا لا اس نے کہا مجھ سے سل کا باٹ کیونکر اٹھے گا بھاری پتھر ہے کہیں میری کمر میں لچک نہ آجاوے اُس نے پتھر تو خود اٹھا لیا لیکن سل کو کسی بہانہ سے باہر لے گیا اور ایک سنار کو بلا کر کہا کہ اس سل کے اوپر سونے کے پتر خوبصورتی کے ساتھ جڑ دے اور اس میں ایک مضبوط زنجیر ڈال دے جب وہ تیار ہو کر آگئی تو اُسی بیوی کو لا کر دی کہ لو ہم نے تمہارے واسطے ایک ہیکل بنوایا ہے اسے پہن لو تو اُسے خوش ہو کر اسے گلے میں ڈال لیا اور گلے میں لٹکائے پھرنے لگی گردن بوجھ سے جھکی جاتی تھی مگر زیور کے شوق میں سب تکلیف گوارا تھی اس کے بعد بنئے نے نکال جو یہ خوب خبر لی کہ کمبخت اُس روز تو تجھ سے سل کا باٹ بھی نہ اوٹھتا تھا اور آج تو اسی سل کو گلے میں لٹکائے پھرتی ہے آج تیری کمر میں کچھ نہیں ہوتا۔ خیر یہ قصہ تو گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر جس نے تصنیف کیا ہے اُس نے عورتوں کے مذاق کو خوب سمجھا ہے۔ حقیقت میں ان کو زیور کی حرص ایسی ہی ہے کہ اگر سونے کا زیور بہت بھاری بھی ہو تو یہ کبھی اس کے پہننے سے انکار نہ کریں گو گردن اور گلا کیسا ہی دکھتا رہے اور یوں تو عورتوں میں زیور کپڑے کی حرص طبعی طور پر ہوتی ہی ہے لیکن آپس میں ملنے ملانے سے یہ حرص اور بڑھ جاتی ہے اُن کا آپس میں ملنا جلنا بڑا غضب ہے ایک دوسری کو دیکھ کر رنگ پلٹتی ہے اگر کسی کو خدا تعالےٰ نے زیور اور کپڑا حیثیت کے موافق دے رکھا ہو تو وہ اسی وقت تک خوش ہے جب تک برادری کی بہنوں میں نہ جائے اور جہاں برادری میں نکلنا ہوا پھر ان کی نظر میں اپنا زیور اور کپڑا حقیر معلوم ہونے لگتا ہے دوسروں کا زیور دیکھ کر ان کا دل للچاتا ہے کہ ہمارے پاس بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے اور اس میں اپنی حیثیت پر بھی ان کو نظر نہیں ہوتی کہ جس کے پاس ہم سے زیادہ زیور ہے اس کی حیثیت کیا ہے جس کے مرد کی آمدنی پچاس روپے ماہوار ہے

وہ بھی برابری کرتی ہے اس کی جس کے مرد کی آمدنی ہزار روپیہ ماہوار ہے۔ عورتوں پر ملنے جلنے کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ سہارنپور میں ایک کورٹ انسپکٹر تھے جن کی تنخواہ چارسو یا پانچسو روپے ماہوار تھی مگران کی عادت یہ تھی کہ ساری تنخواہ اپنے غریب رشتہ داروں میں خرچ کرتے تھے گھر میں کم رکھتے تھے۔ ان کی بیوی کے پاس زیور کا ایک چھلا بھی نہ تھا گھر میں نہ کوئی خادمہ تھی بیچاری اپنے ہاتھ سے آٹا پیستی تھی اور خود ہی پکاتی تھی اور اسی حالت میں خوش تھی۔ میرے ایک عزیز بھی اس زمانہ میں سہارنپور میں ملازم تھے اور ان کا مکان کورٹ انسپکٹر صاحب کے مکان سے متصل ہی تھا وہ اپنی بیوی کو کسی کے یہاں بھیجتے نہ تھے مگر ایک دفعہ ان عزیز کے گھر والوں کے اسرار پر انہوں نے ملنے کی اجازت دی۔ وہ جو یہاں آئی تو اس لے یہاں باندیوں کو بھی اپنے سے اچھا پایا ان کے پاس بھی کچھ زیور تھوڑا بہت تھا اور کورٹ انسپکٹر کی بیوی کے پاس چھلا تک نہ تھا بس یہاں سے جاکر اس نے اپنے میاں کی خوب خبر لی کہ واہ سرشتہ دار صاحب کی تنخواہ بھی تم سے کم ہے پھر بھی ان کے گھر والے زیور میں لدے پھدے ہیں اور میں بالکل ننگی ہوں اور ان کی بیوی اپنے ہاتھ سے ایک کام بھی نہیں کرتی ایک چھوڑ کئی کئی باندیاں ہیں سارا کام وہی کرتی ہیں اور میں سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں۔ اب تو مجھ سے اس طرح نہیں رہا جاتا تم مجھے بھی زیور بنا کر دو اور عمدہ لباس بنا کر دو اور گھر میں خادمہ نوکر رکھو۔ وہ کورٹ انسپکٹر پھر مجھ سے الہ آباد میں ملے تھے بے چارے کہتے تھے کہ شیخ کامل کی صحبت کا اثر ایک منٹ میں ایسا ہوا کہ میرا ساری عمر کا اثر فوراً زائل ہو گیا۔ اب میرے گھر میں رات دن زیور کی فرمائش کرتی ہے اور کوئی کام خود نہیں کرتی۔ زیور بناتا بناتا تھک گیا مگر سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا اور میری ساری خیر خیرات بند ہو گئی۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ان کا آپس میں ملنا جلنا بڑا غضب ہے۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ مستورات کا آپس میں ملنا جلنا بالکل بند کر دو۔ میرا مطلب یہ ہے عورتوں کو اپنے اس مرض کی اصلاح کرنی چاہیئے اگر کسی کا دل دوسروں کے زیور، کپڑے دیکھ کر نہ للچائے اس کو ملنے جلنے کا مضائقہ نہیں مگر جس پر دوسروں کو دیکھ کر برا اثر ہو اُس کو ضرور نہ ملنا چاہئے۔ قرآن شریف میں عورتوں کو حکم ہے وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ کہ تم اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی ہو

اس میں تقسیم اَلْآحَادُ عَلَی الْآحَادِ (اکائی کی تقسیم اکائی پر) ہے جس سے یہ مطلب حاصل ہوا کہ ہر عورت اپنے گھر میں جم کر بیٹھی رہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لئے اصلی حکم یہی ہے کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلیں نہ عورتوں سے ملنے کے لئے نہ مردوں سے ملنے کے لئے۔ پھر آخر کچھ تو بات ہے جو حق تعالیٰ نے عورتوں کو گھر میں رہنے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر سے باہر نکلنا ان کے لئے مضر ہے (لیکن مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ ہیں ۱۲) پس جس کو ملنے چلنے سے یہ ضرر ہوتا ہو اس کے لئے یہی حکم ہوگا کہ وہ کسی سے نہ ملے اپنے گھر ہی میں بیٹھی رہے ہاں جس کو ضرر نہ ہوتا ہو وہ اپنے خاوند کی اجازت سے دوسروں کے گھر جا سکتی ہے۔

بیبیو! آخر تم کھجلی والوں سے تو بچتی ہو اور ان کے پاس بیٹھنا اور اُن سے ملنا جُلنا تم کو گوارا نہیں ہوتا کہ کہیں ہم کو بھی کھُجلی نہ ہو جاوے اور یہ حالت تو کھجلی سے بھی بدتر ہے کھجلی کا ضرر تو محض جسمانی ہے اور اس کا ضرر جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی۔ جسمانی ضرر تو یہ ہے کہ جب تم دوسری عورتوں کو اپنے سے اچھی حالت میں دیکھو گی اور ان جیسا بننا چاہو گی اور تمہاری حیثیت اُن کی برابر نہیں ہے تو تم کو خواہ مخواہ اس سے اُلجھن اور پریشانی ہوگی اور رات دن تم اسی فکر میں گھلو گی کہ ہائے میرے پاس بھی یہ چیز ہوتی وہ ہوتی پھر بعض دفعہ تم مردوں سے بھی اس قسم کی فرمائش کرو گی جو ان کی حیثیت سے زیادہ ہے اُن کو یہ فرمائش ناگوار ہوگی جس سے خواہ مخواہ دلوں میں کدورت پیدا ہوگی جس سے بعض اوقات بہت دور تک نوبت پہونچ جاتی ہے اور روحانی ضرر یہ ہے کہ اس سے ناشکری کا مرض بڑھتا ہے۔ جب تم دوسروں کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھو گی تو اُن نعمتوں کی قدر نہ کرو گی جو خدا تعالیٰ نے تم کو عطا فرمائی ہیں۔ ہمیشہ یہی سمجھو گی کہ میرے پاس کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ اس لئے جس پر ملنے کا ایسا اثر پڑتا ہو اس کو یہی حکم دیا جائے گا کہ وہ کسی سے نہ ملے اور اگر ملے تو غریب نادار عورتوں سے ملے کیونکہ غریبوں سے مل کر تمہارا جی خوش ہوگا اور خدا کا شکر کرو گی کہ الحمد للہ میں بہت سی عورتوں سے اچھی حالت میں ہوں اور یہی نکتہ ہے اس حدیث میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا یَا عَائِشَۃُ قَرِّبِی الْمَسَاکِیْنَ وَجَالِسِیْهُمْ

کہ اسے عائشہؓ مساکین کے پاس بیٹھا کرو اور ان کو اپنے سے نزدیک کیا کرو۔ مساکین کے پاس بیٹھنے سے خدا کی نعمتوں کی قدر ہوتی ہے اور دل خوش رہتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ امراء کے پاس بیٹھنے سے دن بدن میری پریشانی بڑھتی رہی اور میں یہ سمجھتا تھا کہ میرے اوپر خدا کی کچھ بھی نعمت نہیں پھر میں نے غرباء کے پاس بیٹھنا شروع کیا تو میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا بادشاہ ہوں اور میری ساری پریشانی دور ہوگئی اور خوشی بڑھ گئی۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ دین کے باب میں انسان کو اپنے سے اونچے کو دیکھنا چاہیئے جو اس سے زیادہ دیندار ہو اور دنیا کے باب میں اپنے سے نیچے کو دیکھنا چاہیئے مگر آج کل معاملہ برعکس ہے لوگ دین کے باب میں تو ان لوگوں پر نظر کرتے ہیں جو زیادہ کام نہیں کرتے پھر اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ اگر ہم رات کو نہیں اٹھتے تو کیا ہوا فلاں مولوی صاحب بھی تو رات کو نہیں اٹھتے اگر ہم عمدہ عمدہ کپڑے پہنتے ہیں تو کیا ہوا فلاں شاہ صاحب بھی تو بڑا عمدہ لباس پہنتے ہیں۔ دین کے باب میں لوگ اُن بزرگوں کو نہیں دیکھتے جن کا تہجد کبھی قضا نہیں ہوتا اور بیچارے معمولی حیثیت میں رہتے ہیں اور دنیا کے بارہ میں ہمیشہ اپنے سے زیادہ پر نظر کرتے ہیں کہ ہائے میں فلاں رئیس کے برابر نہ ہوگیا، فلاں سوداگر کے برابر نہ ہوا جس سے بجز پریشانی بڑھنے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ عورتوں کو بھی چاہیئے کہ دنیا کے بارہ میں اپنے سے گھٹیا کو دیکھیں مثلاً تمہارا گھر کسی رئیس زادی کے گھر سے کم ہے تو تم ان لوگوں پر نظر کرو جن کے گھر تم سے بھی گھٹیا ہیں کہ نہایت تنگ ہیں پلنگ بچھنے کے بعد چلنے کو بھی راستہ نہیں رہتا۔ وہاں ہوا کا تو کہاں گذر بارش کا بھی بچاؤ نہیں اور تم ہوادار صحن میں ایسے آرام سے سوتی ہو کہ صبح کی نماز بھی قضا ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے مکانات دیکھ کر تم کو اپنے مکان کی قدر ہوگی کہ بلا سے اس میں جھاڑ فانوس نہیں ہیں تو کیا ہوا بارش کا بچاؤ تو ہے ہوا کا گذر تو ہے

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے پاس جوتہ نہ تھا تو میں رنجیدہ تھا کہ اچانک میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جس کے پیر ہی نہ تھے۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ میرے پیر تو ہیں بلا سے جوتہ نہیں تو کیا ہوا۔ تو حقیقت میں دُنیا کے باب میں اپنے سے کمتر حیثیت والوں کو دیکھنے سے بڑی راحت دل کو ہوتی ہے۔ مگر اب ایسا

مذاق بدلا ہے کہ دنیا میں جہاں ذرا کمی ہوئی اس کا تو قلق ہوتا ہے اور اس پر کبھی نظر نہیں جاتی کہ اللہ کی بہت سی مخلوق ہم سے بھی ابتر حالت میں ہے ہم پھر ان سے بہت اچھے ہیں اور دین میں ایسا استغنا برتا جاتا ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہی پر اکتفا کر لیا ہے اگر کوئی ان سے تہجد و اشراق کو کہدے تو جواب میں یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم مر جائیں بہت تو کام کرتے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لیتے ہیں گویا انہوں نے نماز کیا پڑھی ساری جنت ہی خرید لی۔ جیسے ایک گنوار کا لڑکا کسی ملّا کے پاس پڑھتا تھا تو ایک دن وہ گنوار ملاجی سے کہنے لگا کہ میرے بیٹے کو بہت نہ پڑھا دیجو کہیں لوٹ پوٹ پگمبر نہ ہو جاوے (یعنی پیغمبر نہ ہو جاوے) تو جس طرح اس جاہل کا خیال تھا کہ زیادہ پڑھنے سے آدمی پیغمبر ہو جاتا ہے اسی طرح آجکل لوگوں کا خیال ہے کہ بس پانچ وقت کی نماز پڑھ لینے سے آدمی جنید و شبلی ہو جاتا ہے پھر اسے اور کسی کام کی ضرورت نہیں رہتی۔

اسی طرح ایک گنوار کے سر میں درد تھا۔ ایک دوسرے گنوار نے کہا کہ آمیں تیرا سر جھاڑ دوں مجھے سر کے درد کی جھاڑ آتی ہے وہ سر کھول کے اس کے آگے بیٹھ گیا تو آپنے کُلْ بِاللہِ ھَدْ پڑھ کر اس کے سر کو جھاڑا (یہ قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ کو بگاڑا تھا) تو وہ دوسرا گنوار کہتا ہے جس کے سر میں درد تھا کہ جا ساڑے کے ساڑے تو تو ھافج ہی ہو گیا (ساڑے کے ساڑے یہ خرابی ہے سالے کی جو گالی کا لفظ ہے اور ھافج خرابی ہے حافظ کی) سو دیکھئے اس کے نزدیک کُلْ بِاللہِ ھَدْ ہی سے آدمی حافظ ہو جاتا ہے جس میں پوری قُلْ ھُوَ اللہُ بھی یاد ہونا شرط نہیں اور اس کا صحیح پڑھنا بھی شرط نہیں۔ یہی حال آج کل عام لوگوں کا ہو رہا ہے کہ ان کے نزدیک جنید و شبلی بننے کے لئے پانچ وقت کی نماز سے زیادہ اور کچھ ضرورت نہیں اور ان نمازوں کا اچھی طرح ادا کرنا بھی ضروری نہیں بس اُلٹی پلٹی نماز پانچ وقت پڑھ لینا کافی ہے۔ جیسا ایک جُلاہے کا قصہ ہے کہ اس کا لڑکا انگریزی پڑھتا تھا کسی نے پوچھا کہ تمہارا لڑکا انگریزی پڑھتا ہے اب کتنی لیاقت ہو گئی۔ کہنے لگا کہ کھڑا کھڑا تو موتنے لگا ہے اب ذرا سی کسر رہ گئی ہے۔ اس کے نزدیک بس کھڑے ہو کر موتنے لگنا بڑی لیاقت تھی کہ اس کے بعد کامل لیاقت میں ذرا ہی سی کسر رہ جاتی ہے شاید وہ کسر یہ ہو کہ

کھڑا کھڑا بکنے بھی لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوچھا آدمی ذرا سی بات میں اترانے لگتا ہے کہ جو بات کسی درجہ میں بھی قابل فخر نہیں ہوتی وہ اسی پر ناز کرنے لگتا ہے اور یہ ساری خرابی جہل کی ہے ان لوگوں کو اصلی کمالات کی خبر ہی نہیں اسی لئے ان کی نظر میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کمالات معلوم ہوتی ہیں۔

مولانا نے اس کی خوب مثال دی ہے کہ جیسے ایک مچھر ایک تنکے پر بیٹھا ہوا تھا اس کے قریب بیل بندھا ہوا تھا بیل نے جو پیشاب کیا تو وہ تنکا اس میں تیرنے لگا مچھر اپنے دل میں بڑا خوش ہوا کہ آج میں نے سمندر کے اندر کشتی پر سواری لے لی۔ وہ بیوقوف بیل کے پیشاب کو سمندر اور گھاس کے تنکے کو کشتی سمجھ گیا کیونکہ اس نے اصلی سمندر کو دیکھا نہ تھا یہی حال ہم لوگوں کا ہے کہ ہم نے اصلی کمالات تو دیکھے نہیں ذرا ذرا سی باتوں کو کمالات سمجھنے لگے۔

مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک بوڑھے میاں پڑھتے تھے اور قسمت سے بیٹے میاں بھی ابا جان کے ساتھ پڑھتے تھے۔ باپ اور بیٹے دونوں ایک ہی سبق میں شریک تھے مگر ان کو عقل کم تھی سبق کے وقت میں بڑے اینڈے بینڈے سوالات کرتے مولانا بڑے میاں کے سوالات کا جواب کم دیتے تھے۔ جماعت میں ایک ذہین نوجوان طالب علم بھی تھے۔ مولانا ان کے سوالات کے جوابات نہایت شوق سے دیتے تھے ایک دن وہ بڑے میاں ان نوجوان طالب علم سے کہنے لگے کہ مولانا تمہارے سوالات کے جوابات خوب دیتے ہیں اور ہمارے سوالات کا جواب نہیں دیتے حالانکہ ہم اتنے بڑے آدمی ہیں اس کی کیا وجہ۔ وہ طالبعلم ہنسنے لگے اور کہا کہ اس کی وجہ تم مولانا ہی سے پوچھو میں کیا بتلاؤں وہ ان کو پکڑ کر مولانا کے پاس لے گئے اور پکڑ کر اس واسطے لے گئے تاکہ مولانا کے سامنے ان کی طرف اشارہ کر کے بتلا دیں کہ آپ ان کے سوالات کے جواب کیوں دیتے ہیں۔ جیسے ایک وہمی آدمی نے نیت اقتدار کرتے ہوئے امام کی کمر میں انگلی ماری تھی کہ نماز پڑھتا ہوں پیچھے اس امام کے۔ اس بندہ خدا کو بدون انگلی لگائے تسلی نہ ہوتی تھی۔ اور جیسے فاتحہ دینے والے کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ دیتے ہیں تاکہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کو ثواب دینے میں غلطی

نہ ہو جائے کبھی ایسا نہ ہو کہ پلاؤ کی جگہ کسی دوسری چیز کا ثواب مردہ کو پہونچ جائے۔ اس لیئے وہ کھانا سامنے رکھ کر نام بنام ثواب بخشتے ہیں۔

ایک گنوار نے مجھ سے پوچھا کہ کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ دینا کیسا ہے، میں نے کہا بدعت ہے کہنے لگا کہ اس میں کیا حرج ہے میں نے کہا کہ سامنے رکھنے کی کیا ضرورت ہے آخر تم روپیہ اور کپڑا بھی تو اللہ کے نام پر دیا کرتے ہو کیا اس پر بھی فاتحہ دیا کرتے ہو۔ کہنے لگا جی نہیں۔ میں نے کہا پھر کھانے پر فاتحہ دینے کی کیا ضرورت ہے جیسا روپیہ کپڑے کا ثواب بدون فاتحہ کے پہونچ سکتا ہے اسی طرح کھانے کا ثواب بھی بدون فاتحہ کے پہونچ سکتا ہے دونوں میں کیا فرق ہے۔ بے چارہ تھا سمجھدار۔ فوراً سمجھ گیا اور کہنے لگا جی بات تو یہی ہے یہ سارے ڈھونگ ہیں تم سچ کہتے ہو۔ بعضے گنوار بہت سمجھدار ہوتے ہیں کیونکہ ان کی طبیعت میں اینچ پینچ نہیں ہوتا سیدھی بات کو جلدی قبول کر لیتے ہیں مگر بعضے گنوار اکھڑ بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک گنوار نے فاتحہ کے ثبوت میں یہ دلیل بیان کی تھی کہ قرآن میں تو اس کے لئے ایک خاص سورت اُتری ہے جس کا نام ہی سورہ فاتحہ ہے۔ بیوقوف۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ یہ دلیل کیسی ہوئی کیونکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے اس بدعت کو ایجاد کر کے اس کا نام سورۂ فاتحہ کے نام پر رکھ دیا ہو۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ نزول قرآن کے وقت اس رسم کا کہیں پتہ بھی نہ تھا اس طرح ثواب بخشنے کو کوئی فاتحہ کہتا تھا تو بعضے گنوار ایسے کوڑ مغز بھی ہوتے ہیں غرض وہ بڑے میاں ان طالبعلم کو پکڑ کر مولانا قدس سرہٗ کے پاس لائے اور کہا کہ حضرت اس کی کیا وجہ کہ آپ ان کے سوالات کا تو جواب دیتے ہیں اور ہمارے سوالات کا جواب نہیں دیتے حالانکہ ہم اتنے بڑے آدمی ہیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات بہت مختصر اور چبھتے ہوئے ہوا کرتے تھے۔ فرمایا کہ وجہ تو تم نے خود بیان کر دی۔ بس یہی تو وجہ ہے کہ تم اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہو۔ ہائے یہ تکبر بڑا سدراہ ہے یہ کمبخت انسان کو تمام فیوض و برکات سے محروم کر دیتا ہے۔ یہی تو وہ بلا ہے جس سے شیطان مردود ہوا۔ صاحبو! ہمارے اندر یہ تکبر گھسا ہوا ہے اسی واسطے ہم کمال دین سے محروم ہیں۔ اسی کا ایک اثر یہ ہے کہ ہم نے جہاں تھوڑا سا کام کر لیا پانچ وقت کی نماز پڑھ لی اور اپنے آپ کو کچھ سے کچھ سمجھنے لگے۔

عورتوں میں بھی یہ مرض بہت ہے۔ اول تو ان میں دیندار بہت ہی کم ہیں اور جو دو چار دیندار ہیں بھی وہ اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھتی ہیں جس کا منشا یہ ہے کہ عورتیں کم حوصلہ ہوتی ہیں اور ذرا سی بات میں تکبر اور بڑائی کرنا کم حوصلہ آدمی کا کام ہے۔

ایک عورت بڑی نمازن تھی اتفاق سے اس کی شادی کسی ڈاڑھی منڈے بے نمازی سے ہوگئی تو وہ کیا کہتی ہے کہ اللہ رے تیری شان ایسی پارسا ایسے بیدین سے بیاہی گئی۔ گویا نعوذباللہ اسے خدا پر بھی اعتراض تھا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کچھ ضابطہ نہیں ہے جوڑ بے جوڑ کچھ نہیں دیکھتے استغفراللہ۔ ارے تم کو کیا خبر ہے کہ خاتمہ کس کا اچھا ہو۔ اور خدا تعالیٰ کس کو بخشے کس کو جہنم میں بھیجدے کیا تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ اس بے نمازی کو کسی ادا پر بخشدے اور تم کو اس تکبر کی وجہ سے دوزخ میں ڈالدے۔ اول تو خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ دوسرے جن اعمال پر تم کو ناز ہے کیا خبر ہے وہ قبول بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ گو امید تو یہی رکھنی چاہئے کہ قبول ہوتے ہیں مگر کوئی وحی بھی نہیں آگئی اس لئے ڈرتے بھی رہنا چاہئے اور کبھی اپنے اعمال پر ناز نہ کرنا چاہئے نہ دوسروں کو حقیر سمجھنا چاہئے کہ اس سے اندیشہ ہے حبطِ نورِ اعمال کا۔ اسی طرح بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں ذرا ان کے قلب میں حرارت پیدا ہوئی اور وہ سمجھنے لگے کہ میں صاحب نسبت ہوگیا۔

مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی (شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے والد بزرگ) کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میرا دل جاری ہوگیا شاہ صاحب ہنسنے لگے فرمایا کہ لوگوں کو کبھی حرارت ذکر سے خفقان (اختلاج قلب) ہوجاتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ذکر جاری ہوگیا۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ قلب جاری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دل کو حرکت ہو کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دیتی ہو۔ یاد رکھو یہ اختلاج قلب ہے جو کہ سخت مرض ہے۔ اس کا نام دل کا جاری ہونا نہیں ہے۔ مکہ معظمہ سے جب ہم غار ثور پر گئے اور پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا تو سب لوگوں کے سانس پھول گئے اس وقت بے تکلف دل کی حرکت صاف محسوس ہوتی تھی اور کھٹ کھٹ کی آواز آرہی تھی۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ لو آج سب کے دل جاری ہوگئے سب صاحب نسبت ہوگئے۔ اگر یہی نسبت ہے تو بس روزانہ ایک میل دوڑ لیا کرو دل جاری ہوجایا کرے گا یہ محض غلط خیال ہے۔ ذکر جاری ہونے کے لئے آواز کھٹکا

کچھ ضروری نہیں بلکہ ذکر جاری ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سالک کو اکثر اوقات حق تعالےٰ سے ذہول و غفلت نہ ہوتی ہو زیادہ اوقات میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ رہے اسی کا نام ملکۂ یادداشت ہے لیکن یہ بھی نسبت مطلوبہ نہیں ہے بعض لوگ ملکۂ یادداشت ہی کو نسبت سمجھتے ہیں یہ بھی غلطی ہے اور اس سے ایک بڑا دھوکہ سالکین کو پیش آتا ہے وہ یہ کہ صوفیۂ کرام نے فرمایا ہے کہ معصیت سے نسبت سلب ہو جاتی ہے اور ملکۂ یادداشت معصیت سے زائل ہوتا نہیں تو جو شخص اسی کو نسبت سمجھتا ہے وہ ائمہ فن کے خلاف یہ سمجھنے لگتا ہے کہ معاصی مجھ کو مضر نہیں بعض تو معاصی کو حلال سمجھنے لگتے ہیں وہ تو زندیق ہیں بعض حلال تو نہیں سمجھتے مگر یوں خیال کر لیتے ہیں کہ ہم کو نسبت حاصل ہو گئی ہے جس سے ہر وقت ہم ذکر میں رہتے ہیں اور ذکر حسنہ ہے اور حق تعالےٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ کہ حسنات سیئات کو زائل کرتی رہتی ہیں پس یہ نسبت ایسا حسنہ ہے جس سے تمام گناہ دُھلتے رہتے ہیں اور کوئی گناہ ہم کو مضر نہیں ہوتا وہ نسبت سب گناہوں کا کفارہ ہوتی رہتی ہے یہ بڑی گمراہی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ان لوگوں نے ملکۂ یادداشت کو جو کہ مشق ذکر سے پیدا ہو جاتا ہے نسبت مقصودہ سمجھ رکھا ہے خوب سمجھ لو کہ نسبت اس کا نام نہیں ہے نسبت مقصودہ کے لئے گناہ اور معصیت سخت مضر بلکہ سم قاتل ہے۔ نسبت کی حقیقت و احکام کی تفصیل زیادہ ہے (جس کو میں کسی قدر پرسوں کے وعظ میں بیان کر چکا ہوں) مگر اجمالاً ایک حکایت سے اس کی حقیقت سمجھ میں آ جائے گی۔ وہ حکایت یہ ہے کہ ایک طالب علم سے ان کے کسی مہمان نے پوچھا تھا کہ میاں آج کل کیا شغل ہے۔ کہنے لگے کہ شاہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں۔ اس نے پوچھا کہ پھر کچھ سامان کر لیا ہے۔ کہنے لگے کہ آدھا سامان تو ہو گیا آدھا باقی ہے۔ اس نے کہا یہ کیونکر کہا میں تو راضی ہوں گو وہ راضی نہیں اور نکاح طرفین کی رضا سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک کا راضی ہونا آدھا نکاح ہے۔

تو جو لوگ ملکۂ یادداشت حاصل کر کے معاصی سے اجتناب نہیں کرتے اور اپنے کو

صاحب نسبت سمجھتے ہیں اُن کی نسبت ایسی ہی ہے جیسے اس طالب علم کا آدھا نکاح۔ کہ یہ لوگ تو خدا سے یادداشت کا تعلق رکھتے ہیں مگر خدا کو ان سے کچھ علاقہ نہیں۔ یاد رکھو نسبت اس تعلق کو کہتے ہیں جو طرفین سے ہو یعنی بندہ کو خدا سے تعلق ہوا اور خدا کو بندہ سے تعلق ہوا اور نصوص سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ عاصی سے خدا کو رضا کا تعلق نہیں ہوتا لہٰذا معصیت کے ساتھ نسبت مطلوبہ کبھی جمع نہیں ہو سکتی مگر افسوس ہے کہ لوگ اس غلطی میں بہت مبتلا ہیں کہ وہ ملکۂ یادداشت ہی کو نسبت سمجھتے ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہے کہ جہاں ذرا نماز پڑھنے لگیں اپنے آپ کو رابعہ سمجھنے لگیں اوچھے آدمی بہت جلدی اپنے معتقد ہو جاتے ہیں مثل مشہور ہے۔ اَلْحَائِكُ اِذَا صَلّٰى يَوْمَيْنِ اِنْتَظَرَ الْوَحْيَ۔ جلاہا دو دن نماز پڑھ کر تیسرے دن وحی کا منتظر ہو جاتا ہے۔

بہت لوگ اپنے کمالات کے معتقد ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ ہم دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو امام غزالی رح کی احیاء میں کتاب الغرور دیکھنی چاہیے (غرور بمعنے تکبر نہیں یہ اردو کا محاورہ ہے۔ عربی میں غرور کے معنے دھوکہ کے ہیں۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ط (ان کو اللہ نے دھوکہ میں ڈال دیا) یہاں دھوکہ میں ڈالنا ہی مراد ہے) یہ وہ کتاب ہے جس نے امام غزالی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ پر کفر کے فتوے لگوائے کیونکہ اس میں انھوں نے ہر فرقہ کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور ان دھوکوں پر متنبہ کیا ہے جن میں وہ مبتلا ہیں تو چونکہ اس سے دنیا بھر کے اترے پترے کھلتے تھے اس لئے سب لوگ ان کے درپے ہو گئے۔ پھر کافر بنانے کو موقع مل ہی جاتا ہے ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

(بدخواہ کی آنکھ پھوٹ جائے کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب دکھائی دیتا ہے)

جب آدمی کسی کے درپے ہو جاتا ہے تو اس کو کمالات بھی عیوب نظر آتے ہیں۔ وہ کتاب دعوے پلیت کر لے کرنے والی ہے جو لوگ اپنے کمالات کے معتقد ہیں اُس کو دیکھیں پھر

غور کریں کہ وہ کس دھوکہ میں مبتلا تھے۔ بعض لوگ اپنے اعمال پر ناز کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں مگر ہماری طاعات کی ایسی مثال ہے جیسے بعض دفعہ نوکر آقا کو پنکھا جھلتا ہے کبھی اتنے زور سے کہ ٹوپی بھی اس کے سر سے اڑجاتی ہے کبھی اتنے آہستہ کہ اس کو ہوا بھی نہ لگے آقا کو ایسا پنکھا جھلنے سے تکلیف ہوتی ہے مگر وہ خوش اخلاقی کی وجہ سے کچھ نہیں بولتا تو اگر وہ نوکر ایسی خدمت کرکے ناز کرے کہ میں نے آج دو گھنٹے آقا کی خدمت کی تو اس کا یہ ناز بجا ہے یا بیجا۔ یقیناً ہر شخص اس کو احمق بتائے گا کہ تو ناز کس بات پر کرتا ہے جتنی دیر تو نے خدمت کی ہے آقا کو تکلیف پہونچائی ہے تو اسی کو غنیمت سمجھ کہ اس نے تجھ کو سزا نہیں دی نہ کہ تو الٹا ناز کرتا اور اپنے کو انعام کا مستحق سمجھتا ہے۔

صاحبو! یہی حالت ہماری طاعات کی ہے کہ حق تعالےٰ ان طاعات پر ہم سے مواخذہ ہی نہ فرمائیں تو بسا غنیمت ہے یہ اُلٹا ناز کیسا۔ آخر کیا ہم کو اپنی طاعات کی حقیقت معلوم نہیں کہ ہم اُن کو کس طرح بے سروپا ادا کرتے ہیں۔

مولانا نے مثنوی میں ایک بہرہ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ اپنے ایک دوست کی عیادت کرنے گیا تھا راستہ میں سوچنے لگا کہ میں تو بہرہ ہوں مجھے دوسرے کی خصوصاً ضعیف مریض کی بات سنائی نہ دے گی اس لئے ابھی سے حساب لگا لینا چاہیئے کہ میں جاکر پہلے کیا کہونگا وہ اس کا کیا جواب دے گا پھر مجھ کو اس کے جواب میں کیا کہنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے حساب لگایا کہ پہلے میں اس سے پوچھوں گا کہ مزاج کیسا ہے وہ کہے گا شکر ہے پہلے سے افاقہ ہے میں کہوں گا الحمد للہ حق تعالےٰ اور زیادہ کرے۔ پھر میں کہوں گا کہ معالجہ کونسے طبیب کا ہے وہ کہے گا فلاں حکیم صاحب کا میں کہوں گا سبحان اللہ بہت ہی لائق طبیب ہیں، بڑی شفقت فرماتے ہیں ان کا علاج ترک نہ کرنا چاہیئے۔ پھر پوچھوں گا کونسی دوا استعمال میں ہے وہ کسی دوا کا نام لے گا میں کہوں گا خدا اُس کو آپ کی رگ و پے میں پیوستہ کرے اور خوش گوار فرمائے یہ حساب لگا کر وہ پہونچے۔ بیمار نے جو بہرہ کی صورت دیکھی گھبرا گیا کہ یہ کمبخت کہاں سے آگیا اب یہ میرا دماغ کھائے گا اپنی سب کچھ کہہ لیگا میری بات سنے گا نہیں۔ اب بہرہ میاں آگے بڑھے اور مزاج پوچھا کہ اب طبیعت کیسی ہے بیمار نے

جھلا کر کہا حال کیا ہوتا مر رہا ہوں۔ آپ نے کہا الحمد للہ خدا اور زیادہ کرے۔ بیمار اور بھی جھلا گیا۔ پھر پوچھا کون سے حکیم صاحب کا علاج ہے اس نے کہا ملک الموت علیہ السلام کا آپ نے کہا سبحان اللہ بڑے ہی لائق طبیب ہیں ان کا علاج کبھی نہ چھوڑیئے ماشاء اللہ بڑے ہی شفیق ہیں اللہ تعالیٰ ان کا قدم مبارک فرمادے پھر پوچھا کہ آج کل کونسی دوا استعمال میں ہے اس نے کہا زہر پی رہا ہوں۔ آپ بولے ماشاء اللہ انگبین ہے خدا اس کو آپ کی رگ رگ میں پیوستہ کرے اور خوشگوار فرمائے۔ تو اب آپ غور کیجئے کہ ایسی عیادت سے کیا کسی کا جی خوش ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں مگر وہ بہرہ اپنے دل میں خوش تھا کہ میں نے اپنے دوست کا حق ادا کر دیا اس کی عیادت کر لی اور اس کا جی خوش کر دیا۔ ڈلے پتھر جی خوش کر دیا وہ تو اسکی جان کو کوستا ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ایسی ہی عبادت کرتے ہیں جیسی اس شخص نے عیادت کی تھی اور ان کا اپنی عبادت پر خوش ہونا ایسا ہی ہے جیسا وہ بہرہ اپنی عیادت پر خوش تھا۔

صاحبو! یہ حال ہے ہماری ان عبادات کا جن پر ہم ناز کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ عبادت ٹوٹی پھوٹی ہم کر رہے ہیں اس کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ بعضے ایسے احمق بھی ہیں جو یہی مطلب سمجھے ہوں گے کہ جب ہماری عبادت کسی کام کی نہیں تو پھر کیوں سر مارا۔ ارے وہ ایسے کریم ہیں کہ اکثر ٹوٹی پھوٹی عبادت کو بھی قبول کر لیتے ہیں نقل کو اصل کی جگہ کر دیتے ہیں۔ جیسا آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعضے کاریگر مٹی کا خربوزہ بنا کر رؤسا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ ان کو انعام دیدیتے ہیں حالانکہ اس میں سوا مٹی کے اور کچھ نہیں ہوتا مگر چونکہ خربوزہ کی شکل ہوتی ہے اس لئے وہ اُس کی وہی قدر کرتے ہیں جو اصلی خربوزہ کی کرتے ہیں بلکہ اصلی خربوزہ سے بھی بعض دفعہ زیادہ قیمت دیدیتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ نقل پوری ہو۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے اعمال میں تو نقل بھی صحیح نہیں ہوتی۔ اب یہ کیا نماز ہے کہ قیام میں ہاتھ زانوں پر پڑے ہوئے ہیں، ہاتھ بھی ڈھنگ سے نہیں باندھے جاتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی کچھ بھی عظمت دل میں نہیں۔ عورتیں الحمد کو الھمد پڑھتی ہیں الفاظ بھی درست نہیں خشوع خضوع کا تو کیا ذکر۔ یاد رکھو قرآن کا صحیح پڑھنا واجب ہے۔

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

کم از کم جتنا قرآن نماز میں پڑھو اس کو تو ضرور صحیح کر لو اس کی کوشش کرنا ہر ایک کے ذمہ واجب ہے کوشش کے بعد بھی درست نہ ہو تو معذور ہے تو دیکھئے ہم تو نماز کی نقل بھی صحیح طور پر نہیں کرتے باقی امید تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس مکروہ نماز کو بھی قبول فرما لیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ مہمل ہیں ان کے پاس یہی ہے یہی کیا۔ اس مہمل نماز کو بھی رد کر دیا جائے تو یہ بالکل ہی محروم رہ جائیں گے اس لئے اکثر تو وہ ہماری بے ڈھنگی طاعت کو بھی قبول ہی فرما لیتے ہیں۔

حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ بھائی جس عبادت کے بعد پھر اس کی توفیق دوبارہ ہو جائے تو یہ اس کے قبول ہونے کی علامت ہے اگر پہلی عبادت قبول نہ ہوئی ہوتی تو دوبارہ اس کی توفیق نہ ہوتی کیونکہ بادشاہ کو جس شخص کا اپنے دربار میں آنا ناگوار ہوتا ہے تو ایک بار کے بعد دوبارہ اس کو اپنے دربار میں گھسنے نہیں دیا کرتا۔ یہ دلیل امید کے واسطے بہت ہے گو قطعی دلیل نہیں ہاں انا عند ظن عبدی بی (میں اپنے بندہ کے گمان کے نزدیک ہوں جو اس کو میرے ساتھ ہے) کو اس کی ساتھ ملا لو تو پھر کافی ہے۔ غرض میرا یہ مطلب نہیں کہ اگر اس وقت تم کو کامل عبادت کی توفیق نہیں تو ناقص کو چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسی پر بس نہ کرو بلکہ اس کی تکمیل کی کوشش کرو۔ دین کا طریقہ معلوم کرو اور دین میں کامل بننے کی سعی کرو جس کا طریقہ کتب دینیہ کا پڑھنا سننا ہے خصوصاً عورتوں کے لئے تو یہی ایک طریقہ ہے کیونکہ ان کو علماء سے ملنے اور ان سے مسائل دریافت کرنے اور اُن کے مواعظ و بیانات سننے کا موقع ہی نہیں ملتا لہذا ان کو کتب دینیہ کے پڑھنے اور سننے کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیئے مگر افسوس یہ ہے کہ اول تو عورتیں پڑھتی ہی نہیں ہیں اور جو لکھنا پڑھنا جانتی ہیں وہ دین کی کتابیں نہیں دیکھتیں۔ اب ان کے پڑھنے کی کیا کتابیں رہ گئی ہیں۔ سا ین نامہ۔ معجزۂ آل نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جس میں حضرت علیؓ کا ایک جھوٹا قصہ ہے۔ اور وفات نامہ جس غلط روایات ہیں۔ اور ہرنی نامہ یہ قصہ صحیح ہے مگر اس سے بھی کچھ احکام معلوم نہیں ہوتے اور منظوم تفسیر سورۂ یوسف اس میں بھی بعض روایات صحیح نہیں ہیں۔ پھر اس میں زلیخا کے عشق کو بہت صاف صاف بیان کیا گیا ہے جس کا اثر

اخلاق پر بہت بڑا پڑتا ہے۔ بس یہ ہے عورتوں کی انتہائی تعلیم جس نے یہ کتابیں پڑھ لیں وہ گویا سب سے زیادہ پڑھی ہوئی ہے جیسے سہارنپور میں ایک جاہل آیا تھا اس نے یہی کتابیں پڑھی تھیں اور اس کو ناز تھا کہ میں بھی عالم ہوں چنانچہ جمعہ کی نماز کے بعد اس نے خود ہی اعلان کیا بھائیو اُواج (وعظ) ہوگی آپ کی لیاقت کا حال تو لوگوں کو ان دو لفظوں ہی سے معلوم ہوگیا مگر تماشا دیکھنے کے لئے لوگ بیٹھ گئے کہ دیکھیں بھائی اُواج کیسی ہوتی ہے وعظ تو بہت سنے مگر اواج کبھی نہ سنی تھی تھوڑی دیر میں وعظ صاحب منبر پر پہونچے اور یٰس تین مرتبہ یَسْنَ یَسْنَ یَسْنَ پڑھ کر اس کی تفسیر بیان کی اے محمد اے محمد اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر میں تجھے نہ پیدا کرتا تو نہ عرش کو پیدا کرتا نہ کرسی کو نہ آسمان کو نہ زمین کو۔ بھائیو آدھی اوج آج ہوگئی آدھی کل کو ہوگی۔ ہارے تھکے ہیں خرچ پاس نہیں ہے کچھ ہماری امداد کرو۔ بس واعظ ختم ہوا۔ اول تو احمق نے یٰسٓ کو شین سے پڑھا پھر اس کی تفسیر کیسی خوبصورت کی اس مجمع میں ایک نابینا عالم بھی جن کا نام مولانا سعید الدین صاحب تھا موجود تھے اور لوگ ان کے علم و فضل کے معتقد تھے انہوں نے لوگوں سے فرمایا کہ ذرا ان مولانا کو میرے پاس لانا چنانچہ لایا گیا آپ نے فرمایا کہ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدو (کہیں بھاگ نہ جائیں) غرض اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آپ نے دریافت فرمایا کہ مولانا آپ کی تحصیل کہاں تک ہے تو واعظ صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری تحصیل ہاپوڑ۔ مولانا سعید الدین صاحب سمجھ گئے کہ بیچارہ بالکل جاہل ہی ہے اس کو تحصیل کے معنے بھی معلوم نہیں۔ پھر آپ نے اردو الفاظ میں کہا کہ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے کہنے لگا کہ ہم نے پڑھا ہے ہرنی نامہ، وفات نامہ، معجزہ آل نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ سائن نامہ اور تو کیا جانے اندھے مولانا سعید الدین صاحب نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لوگوں سے فرمایا کہ اس کو کچھ نہ کہو جانے دو بےچارہ معذور ہے۔ تو جیسے اس جاہل کو ان کتابوں کے پڑھنے پر ناز تھا کہ اس نے ایک فاضل شخص کو بھی منہ نہ لگایا اور صاف کہدیا کہ تو کیا جانے اندھے۔ اسی طرح آجکل جو عورتیں یہ کتابیں پڑھ لیتی ہیں وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگتی ہیں کہ بس اب ہم سے زیادہ پڑھا ہوا کون ہوگا پھر غضب یہ ہے کہ عورتیں چونکہ عموماً ان پڑھ ہیں اس لئے ان میں سے جو کچھ پڑھی

ہیں ان کی قدر خوب ہونے لگتی ہے کیونکہ دوسری عورتیں اتنا بھی پڑھنا نہیں جانتیں جب ان کی قدر ہونے لگی تو اب ان کو آگے پڑھنے کی کیا ضرورت رہی۔

گنگوہ میں ایک جاہل واعظ آیا تھا جو جہنم کو جہندم کہتا تھا۔ اس کے وعظ عورتوں میں ہوا کرتے تھے اور عورتیں اس کی بہت معتقد تھیں بلکہ بعضے مرد بھی معتقد تھے۔ اور یوں کہتے تھے کہ یہ ایسا بڑا عالم ہے کہ مولوی رسید کو تو بارہ برس پڑھاوے۔ میں نے کہا واقعی مولانا رشید احمد صاحب کو تو بارہ برس میں بھی یہ علوم نہ حاصل ہونگے بارہ برس تو کیا وہ تو ساری عمر میں بھی جہنم کو جہندم نہ کہہ سکیں گے۔ تو یہ عورتیں ہر اک کی بہت جلدی معتقد ہو جاتی ہیں چاہے اس نے الف بے تے ہی پڑھی ہو اور یہ سب جہل کی خرابی ہے جو ان میں پڑھی لکھی کہلاتی ہیں وہ بھی جاہل ہی ہیں۔ کیونکہ ان کے درس میں ایسے ایسے فضول قصے رہ گئے ہیں جن سے احکام کا علم بالکل نہیں ہوتا۔ آجکل ایک مناجات پڑھی جاتی ہے جس کو عورتیں اور مرد بڑے شوق سے سنتے ہیں جس میں ہر دو شعر کے بعد یہ مصرع پڑھا جاتا ہے۔ "مری بار کیوں دیر اتنی کری" اس کا مضمون بالکل خلاف شرع ہے۔ مگر جہل ایسا عام ہوا ہے کہ کسی کو بھی ادھر التفات نہیں ہوتا۔ اس نظم میں اول تو خدا تعالیٰ کی شکایت ہے کہ سب کو تو یہ یہ نعمتیں دیدیں اور میری بار میں کیوں دیر کر رکھی ہے۔ اس میں علاوہ شکایت کے حق تعالیٰ کی طرف نعوذ باللہ ظلم کی بھی نسبت ہے کہ عجیب کارخانہ ہے جس میں کچھ ضابطہ ہی نہیں کہ ایک بندے کو سب کچھ دیدیا اور مجھے ٹال رکھا ہے اب تک میرا مقصود پورا نہیں ہوتا۔ نیز اس میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی مساوات کا بھی دعویٰ ہے اور ان پر حسد بھی ہے کیونکہ اس میں تمام انبیاء مشہورین کا ذکر کیا گیا ہے کہ آدمؑ کو یہ دیا اور نوحؑ کو دی پیغمبری اور سلیمان (علیہم السلام) کو دی سروری اور ہر ایک کے بعد یہ مصرع بھی ہے کہ مری بار کیوں دیر اتنی کری۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شاعر کو ان حضرات پر حسد ہے کہ ان کو تو سب کچھ مل گیا اور مجھے کچھ بھی نہ ملا مری بار میں دیر ہو رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ناظم کی نیت بھی یہی تھی مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ مطلب ان اشعار کا

مدلول ضرور ہے اور قاعدہ ہے کہ جس بات میں ایہام خلاف بھی ہو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ آخر حق تعالےٰ نے صحابہ کو رَاعِنَا کہنے سے کیوں منع فرمایا کیا معاذ اللہ صحابہ کرام کے ذہن میں اس کے معنے کچھ بُرے تھے۔ ہرگز نہیں بلکہ محض اس لئے کہ یہ لفظ موہم ہوتا ہے برے معنے کو اور دشمنوں کو موقع ملتا ہے کہ وہ اس کو بُرے معنے کا قصد کر کے استعمال کریں۔ اس قاعدہ کے تحت میں یہ نظم بھی داخل ہے گو قائل کا قصد برا نہ ہو پس اس کا پڑھنا اور سننا اور پڑھوانا سب ناجائز ہے۔ پس یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ عورتوں کے نصاب تعلیم میں تمام فضول اور خرافات قصے ہی رہ گئے اور یہاں تک بھی بس تھی اب تو غضب یہ ہے کہ عورتیں ناول پڑھتی ہیں جس سے اخلاق بہت ہی خراب ہو جاتے ہیں۔ ان ناولوں کی بدولت شرفا کے گھروں میں بھی بڑے بڑے واقعات شرمناک وقوع میں آچکے ہیں مگر اب بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں میں کہتا ہوں کہ ان ناولوں سے تو وہ پرانی کتابیں قصہ گل بکاؤلی و چہار درویش و طلسم ہوشربا ہی غنیمت ہیں اگرچہ میں ان کے دیکھنے سے بھی عورتوں کو سختی کے ساتھ منع کرتا ہوں مگر واللہ ان ناولوں سے وہ ہزار درجہ بہتر ہیں ان کی برابر وہ اخلاق کو خراب نہیں کرتیں قصے گو ان میں بھی خرافات ہی ہیں مگر تدابیر اختلاط و حیلہائے وصول الی المقصود (مقصود تک پہونچنے کے حیلے) میں ایسے بتلائے ہیں جو نہایت متعذر الحصول (جن کا حاصل ہونا دشوار ہے) اور دشوار ہیں۔ مثلاً شاہزادہ کا گل بکاولی کے باغ میں پہونچنا کیسے ہوا کہ راستہ میں ایک دیو ملا اس کو اس نے ماموں بنایا اسے اس پر رحم آیا اور اس نے باغ میں پہونچا دیا۔ اسی طرح چہار درویش کے قصے میں بھی تمام صورتیں حصول مقصود کی ایسی ہیں جو انسان کے قبضہ کی نہیں ہیں خدا ہی چاہے تو ان طریقوں سے مقصود میسر آسکتا ہے۔ اور ان کمبخت ناولوں میں تو ایسی سہل سہل ترکیبیں لکھی ہیں جن سے ہر شخص کام لے سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عاشق نے کسی نین کو یا جُلاہی کو لالچ دلایا کہ میں تجھ کو اتنے روپے دوں گا تو فلاں لڑکی سے مجھ کو ملا دے۔ اب یہ ترکیب ایسی آسان ہے کہ جس کے پاس روپیہ ہو وہ اس سے باآسانی کام نکال سکتا ہے کیونکہ ایسی عورتیں بہت جلد لالچ میں

آجاتی ہیں نہ ان میں دین ہے نہ حیا نہ کسی کی آبرو کا ان کو خیال ان کے ذریعہ سے گھروں میں کچھ سے کچھ واقعات ہو جاتا بڑی بات نہیں۔ اس لئے میں ان ناولوں کو گل بکاولی وغیرہ سے بھی بدتر جانتا ہوں۔

صاحبو! خدا کے واسطے اپنی عورتوں کو ان ناپاک کتابوں سے بچاؤ اور ناول کو ہرگز اپنے گھر میں نہ گھسنے دو اگر کہیں نظر بھی پڑ جائے تو فوراً جلا دو اور عورتوں کے پاس ایسی کتابیں پہونچاؤ جن میں دین کے پورے اجزاء سے کافی بحث ہو۔ عقائد کا بھی مختصر بیان ہو۔ وضو اور پاکی ناپاکی کے بھی مسائل ہوں۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ نکاح بیع وشرا کے بھی مسائل ہوں اصلاح اخلاق کا طریقہ بھی مذکور ہو۔ آداب اور سلیقہ کی باتیں بھی بیان کی گئی ہوں یہ بات مردوں کے ذمہ ہے اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو ان سے بھی مواخذہ ہوگا کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا ط اے مسلمانوں اپنی جانوں کو بھی جہنم سے بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی۔ اگر کوئی مرد خود متقی بن جائے اور اپنے گھر والوں کے دین کی خبر نہ لے تو خدا تعالیٰ اس کی عورتوں کے ساتھ اس کو بھی جہنم میں بھیج دیں گے۔ تنہا اس کا متقی بن جانا قیامت میں عذاب سے نجات کے لئے کافی نہ ہوگا۔

پس مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں کے پاس ایسی کتابیں پہونچائیں اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مردوں سے یہ کتابیں پڑھیں اور ان پر عمل کریں۔ خود بھی دیکھیں اور اپنی لڑکیوں کو بھی پڑھائیں اور جو ان پڑھ عورتیں ہیں ان کو بھی احکام سنائیں اور ہمت کر کے ان پر عمل کا اہتمام کریں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دین بہت جلد مکمل ہو جائے گا۔ اجمالاً میں نے دین کامل کرنے کا طریقہ بتلا دیا اب مجھے تفصیل کی ضرورت نہیں رہی لیکن جس طرح بعض ضروری فروع پر مردوں کے وعظ میں تنبیہ کی گئی تھی اسی طرح بعض فروع یہاں بھی بیان کرتا ہوں جن میں اکثر عورتیں کوتاہی کرتی ہیں تاکہ ان پر قیاس کر کے وہ دوسرے اجزاء دین سے بھی غفلت نہ کریں کیونکہ اس وقت

یں اُن فروع کا ذکر کروں گا جو بہت ظاہر ہیں جب ان میں بھی کوتاہیاں کی جاتی ہیں تو دوسرے فروع کا کیا حال ہوگا۔ اس کو خود سمجھ لینا چاہیئے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نماز کا بیان شروع کرتا ہوں جس کا فرض ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے مگر افسوس ہے کہ عورتیں نمازی بہت کم ہیں حالانکہ قرآن کی ایک آیت میں نماز ترک کرنے کو شرک میں داخل کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ وَاتَّقُوْہُ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (ترجمہ) یہ ہے کہ نماز کو قائم کرو اور مشرکین میں سے مت بنو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز نہ پڑھنا مشرک بنتا ہے۔ اور حدیث میں تو یہ مضمون بہت صاف ہے مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ جس نے نماز کو قصداً ترک کر دیا وہ کافر ہو گیا۔ گو جمہور علماء نے ان آیات و احادیث میں تاویل کی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ نماز کا چھوڑنا کافروں کا سا کام کرنا ہے۔

مگر صاحبو! اللہ تعالیٰ نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ظاہر الفاظ میں ایسے شخص کو کافر کہہ دیا ہے گو علماء تاویل کرتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ تاویل غلط ہے لیکن ہم کو اس تاویل کے بھروسہ پر بے فکر نہ ہونا چاہیئے کیونکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس بات کو کفر فرما رہے ہیں اگر وہ واقع میں کفر بھی نہیں تو یقیناً کفر سے بہت قریب ہے۔ اور کفر کا انجام جو کچھ ہے سب کو معلوم ہے کہ ابدالآباد کے لئے جہنم کی سزا ہے تو جو کام اس سے قریب کرنے والا ہو مسلمان کو اس سے کوسوں دور بھاگنا چاہیئے۔ بعضی عورتیں نماز پڑھتی ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ وہ رکوع و سجدے ٹھیک نہیں کرتیں۔ بڑی جلدی کرتی ہیں۔ حالانکہ تعدیل ارکان واجب ہے بلکہ بعض علماء کے نزدیک فرض ہے تعدیل ارکان کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے ہر رکن کو اطمینان و سکون کے ساتھ ادا کیا جاوے مثلاً رکوع کے بعد سر اٹھا کر تھوڑی دیر سیدھا کھڑا ہو جانا چاہیئے۔ اور سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ۔ سیدھا کھڑا ہو کر کہے اس کے بعد اطمینان سے سجدہ میں جاوے اس کو قومہ کہتے ہیں۔ عورتیں قومہ بالکل نہیں کرتیں اور بعض مرد بھی نہیں کرتے بس رکوع سے فارغ ہو کر ذرا سر کا اشارہ کر کے فوراً سجدہ میں چلے جاتے ہیں اس طرح نماز نہیں

ہوتی۔ رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہو جانا ضروری ہے اسی طرح اکثر عورتیں دونوں سجدوں کے بیچ میں جلسہ نہیں کرتیں بس ایک سجدہ کر کے ذرا سا سر کا اشارہ کر کے فوراً دوسرا سجدہ کر دیتی ہیں اس طرح بھی نماز نہیں ہوتی۔ اس کا خوب خیال رکھو اور قومہ و جلسہ اطمینان سے ادا کرو بعضی عورتیں قرآن غلط پڑھتی ہیں اس کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ بعض دفعہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے چند صورتیں نماز کے لئے کم از کم ضرور صحیح کر لو۔ بعض عورتیں نماز وقت سے ٹال دیتی ہیں۔ نماز کا وقت آگیا اور بیٹھی باتیں بنا رہی ہیں جب وقت قریب الختم ہوتا ہے اس وقت پیشاب پیخانہ کے لئے لوٹا ہاتھ میں لیا جاتا ہے حتیٰ کہ ان مقدمات ہی میں وقت نکل جاتا ہے۔ یاد رکھو بدون کسی عذر کے نماز کا وقت سے ٹالنا سخت گناہ ہے (عورتوں کو سب نمازیں اول وقت میں پڑھنی چاہئیں ان کے لئے یہی افضل ہے ۱۲ جامع)

بعض دفعہ ایام سے پاک ہونے کے بعد جلدی نماز شروع نہیں کرتیں دو تین وقت ٹال دیتی ہیں کہ کل کو سر دھو کر بال درست کر کے نہا دیں گے پھر نماز شروع کریں گے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تین دن پورے ہونے سے پہلے پاک ہو جائے تب تو آخر وقت مستحب تک انتظار کرنا واجب ہے اگر آخر وقت تک پاک ہی رہی تو غسل کر کے نماز پڑھنا واجب ہے اور اگر تین دن کے بعد مگر عادت سے پہلے پاک ہوئی تو آخر وقت تک انتظار کرنا مستحب ہے۔ پھر غسل کر کے نماز پڑھنا واجب ہے غرض پاکی نظر آنے کے بعد ایک وقت کی نماز قضا کرنا بھی جائز نہیں اور یہی حکم روزہ کا ہے خوب سمجھ لو (عورتوں کو اپنے ایام عادت کا یاد رکھنا واجب ہے اس میں غفلت جائز نہیں۔ ایام عادت کے بھول جانے سے بڑی پریشانی ہوگی اور اس کے لئے مسئلہ بہت پیچ در پیچ ہو جائے گا۔ جب کوئی عورت کسی معمول سے پاک ہو فوراً اس کے دن لکھ لیوے یا اچھی طرح یاد کر لیوے ۱۲ جامع)

پاکی ناپاکی کے مسائل معلوم کرنا بھی عورتوں کے ذمہ لازم ہے۔ بقدر ضرورت بہشتی زیور میں اس کے مسائل موجود ہیں کسی سمجھدار عورت سے یا اپنے شوہروں سے سمجھ کر پڑھ لیں۔ بعضی عورتیں اگر خود نماز کی پابندی کرتی ہیں تو وہ اپنے بچوں اور

ماماؤں کو نماز کے واسطے نہیں کہتیں۔ بچوں کی پرورش زیادہ تر ماؤں کی آغوش میں ہوتی ہے لہٰذا ان کو اخلاق حسنہ سکھلانا اور نماز وغیرہ کی تعلیم دینا عورتوں کے ذمہ ہے اس میں ہرگز غفلت نہ کریں۔ جب بچہ سات برس کا ہو جاوے اس وقت سے نماز کی تاکید شروع کریں اور جب دس سال کا ہو جاوے تو مار پیٹ کر نماز پڑھاویں۔ اطباء نے لکھا ہے کہ اخلاق حسنہ و اعمال صالحہ کا اثر صحت پر بھی اچھا ہوتا ہے۔ جس بچے کو نیک کاموں کی عادت ہوگی اس کی صحت بھی عمدہ ہوگی عورتوں کو بچوں کی صحت کا بہت خیال ہوتا ہے اس لئے میں نے یہ فائدہ بھی بتلا دیا کہ اگر کسی کو دین کا خیال نہ ہو تو صحت ہی کا خیال کر کے بچوں کو نماز وغیرہ کی تاکید کرتی رہے۔ اسی طرح ماماؤں کو بھی نماز کی تاکید کرنی چاہیے چونکہ وہ تمہاری ماتحت ہیں اگر تم ان کو دھمکاؤ گی تو ضرور اثر ہوگا اور اس میں سستی کرنے سے تم پر بھی مواخذہ رہے گا کہ تم نے قدرت ہوتے ہوئے کیوں سستی کی بلکہ جس ماما کو مقرر کرو اس سے یہ شرط کر لیا کرو کہ تم کو پانچوں وقت کی نماز پڑھنا ہوگی۔ جس گھر میں ایک شخص بھی بے نمازی ہوتا ہے اس گھر میں نحوست برستی ہے۔ عورتوں کو اس طرف تو بالکل ہی توجہ نہیں۔

یہ تو عورتوں کی نماز کے متعلق چند کوتاہیاں ہیں۔ روزہ کو میں اس واسطے نہیں کہتا کہ عورتوں کو روزہ زیادہ دشوار نہیں اس میں وہ ماشاء اللہ مردوں سے بھی زیادہ شیر ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عورتیں روزے بہت رکھ لیتی ہیں مگر نماز سے ان کی جان نکلتی ہے۔ اور روزہ رکھنا کچھ عورتوں کا زیادہ کمال بھی نہیں بلکہ اس میں ایک طبی راز ہے وہ یہ کہ ان میں رطوبت و برودت کا غلبہ ہے۔ سرد مزاج والے کو بھوک پیاس کم لگتی ہے۔ اس لئے ان کو روزہ آسان ہے۔ دوسرے ان کو کھانے کے اندر مشغولی رہتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے سب چیزیں پکاتی ہیں۔ خوشبو سونگھتی رہتی ہیں اس سے بھوک تو فوراً کم ہو جاتی ہے صرف پیاس کی تکلیف رہ گئی اس کی سہار بھی ان کو مشکل نہیں کیونکہ اول تو وہی برودت و رطوبت مانع عطش بھی ہے۔ دوسرے یہ دن بھر گھر ہی میں رہتی ہیں کہیں دھوپ میں آنے جانے کا ان کو کام نہیں پڑتا رہا یہ کہ کھانا پکانے میں آگ کے سامنے بیٹھنا پڑتا ہے تو

اکثر جو عورتیں روزہ دار ہیں وہ اپنے ہاتھ سے کم پکاتی ہیں ان کے آگے خدمت کرنے کو ماماًیں موجود ہوتی ہیں اور جن کو خود کام کرنا پڑے وہ یہ ترکیب کرتی ہیں کہ پہلے سالن کی ہانڈیاں تیار کرلیتی ہیں۔ سالن پکانے میں آگ کے سامنے جم کر نہیں بیٹھنا پڑتا۔ ایک دفعہ آگ جلادی ہانڈی رکھدی اور چلتے پھرتے پکالی۔ پھر جب عصر کا وقت ہو گیا گرمی کم ہو گئی جلدی جلدی پندرہ بیس منٹ میں روٹی پکالی اس لئے ان کو کھانا پکانے میں بھی کچھ زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ تیسری وجہ سہولت روزہ کی یہ ہے کہ عموماً عورتوں کو کھانے کی حرص کم ہوتی ہے ان کو عمدہ کھانا مرغوب نہیں ہوتا بس اُن کی ہانڈی محض مردوں کی خاطر سے پکتی ہے اگر کبھی مرد گھر پر نہ ہو تو یہ چٹنی پیس کر ہی گذر کرلیتی ہیں۔ شریف عورتیں عمدہ غذائیں کھانے سے بہت بچتی ہیں۔ آپس میں کہا کرتی ہیں کہ اگر ہم اچھی غذائیں کھائیں گے تو لوگ یوں کہیں گے کہ بڑی چٹوری ہے۔ ہائے یہ کیسی بُری بات ہے جب یہ اس طرح اپنے نفس کو مارتی ہیں تو رفتہ رفتہ ان کی بھوک بھی مرجاتی ہے۔ اس لئے روزہ میں انکا کمال نہیں بلکہ اس میں مردوں کا کمال ہے کہ ہاؤ ھپ ہیں اور پھر روزہ رکھتے ہیں۔ مگر افسوس اب مردوں نے روزہ رکھنے میں ہمت بہت ہاردی ہے آجکل مردوں میں روزہ دار بہت کم ہیں۔ پس میں عورتوں سے یہ تو نہیں کہتا کہ وہ روزہ نہیں رکھتیں ہاں روزہ میں غیبت سے بچنے کو ضرور کہونگا کیونکہ ان کا روزہ غیبت سے بہت کم پاک ہوتا ہے جب ان کو روزہ میں کھانا پکانے کا دھندا کم ہوتا ہے تو آپس میں محفل جما کر بیٹھتی ہیں اور تیری میری غیبت شکایت میں روزہ برباد کرتی ہیں۔ یوں تو غیبت ہر حال میں حرام ہے مگر روزہ کی حالت میں اس کا گناہ زیادہ ہے جیسے زنا کرنا ہر جگہ حرام ہے اور مکہ معظمہ میں کرنا سخت گناہ ہے کیونکہ شرف مکان و شرف زمان سے جس طرح طاعات کا ثواب بڑھتا ہے اسی طرح معاصی کا گناہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ نیز روزہ میں پان کھانے والیاں یہ بھی کوتاہی کرتی ہیں کہ سحری میں منہ کے اندر پان دبا کر سو رہتی ہیں اگر صبح تک منہ میں پان رہا تو روزہ نہیں ہوتا اس کی احتیاط بہت ضروری ہے۔

زکوٰۃ میں بھی عورتیں بہت سستی کرتی ہیں کہ اپنے زیوروں لچکوں کی زکوٰۃ نہیں دیتیں۔ یاد رکھو جتنا زیور عورت کو جہیز میں ملتا ہے وہ اس کی ملک ہے اس کی زکوٰۃ دینا اس پر واجب ہے اور جو زیور شوہر کے گھر سے ملتا ہے اگر وہ اس نے ان کی ملک کر دیا ہے تو اس کی زکوٰۃ بھی ان پر واجب ہے اور اگر ملک نہیں کیا محض پہننے کے واسطے دیا ہے تو اس کی زکوٰۃ مردوں کے ذمہ واجب ہے۔ ہر سال اپنے زیور کا حساب کر کے جتنی زکوٰۃ اپنے ذمہ ہو فوراً ادا کر دینی چاہیئے۔ اس میں سستی کرنے سے گناہ ہوتا ہے دیکھو خدا تعالیٰ نے بہت سے غریبوں کو مال نہیں دیا حالانکہ تم ان سے کچھ زیادہ نہیں ہو اکثر غربا کمالات میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں کہ وہ نمازی بھی ہیں دین دار بھی ہیں پھر بھی جو ان کو خدا نے مال نہیں دیا اور تم کو دیا ہے تو اس کی کیا وجہ۔ خدا نے امیروں کو اسی واسطے مال دیا ہے کہ وہ غریبوں کو دیا کریں۔ کیونکہ ہر شخص اتنے ہی مال کا حقدار ہے جتنے کی اس کو ضرورت ہے پھر جس کو خدا نے حاجت سے زیادہ مال دیا ہے وہ جمع کرنے کے واسطے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کو دینے کے واسطے ہے جن کو حاجت کے موافق بھی نہیں ملا اور اس میں خدا تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں ہیں کہ وہ غریبوں کو امیروں کے ہاتھ سے دلوانا چاہتے ہیں اس قاعدہ کا تو یہ مقتضا تھا کہ امیروں کو یہ حکم دیا جاتا کہ جتنا مال ان کی ضرورت سے زیادہ ہو سب غریبوں کو دیدیا کریں کیونکہ عقلاً وہ انہی کا حق ہے لیکن یہ خدا کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس نے سارا مال دینے کا حکم نہیں کیا بلکہ صرف چالیسواں حصہ واجب کیا ہے پھر اس میں بھی کوتاہی کرنا بڑا ظلم ہے۔

ایک کوتاہی عورتوں میں یہ ہے کہ ان میں پردہ کا اہتمام کم ہے۔ اپنے عزیزوں میں جو نامحرم ہیں ان کے سامنے بے تکلف آتی ہیں۔ ماموں زاد، چچا زاد، خالہ زاد بھائیوں سے بالکل پردہ نہیں کرتی ہیں اور غضب یہ کہ ان کے سامنے بناؤ سنگار کر کے بھی آتی ہیں پھر بدن چھپانے کا ذرا اہتمام نہیں کرتیں۔ گلا اور سر کھلا ہوا ہے اور ان کے سامنے آجاتی ہیں اور اگر کسی کا سارا بدن ڈھکا ہوا بھی ہے تو کپڑے ایسے باریک ہوتے ہیں جن میں سارا بدن جھلکتا ہے۔ حالانکہ باریک کپڑے پہن کر محارم کے سامنے آنا بھی جائز نہیں۔

کیونکہ محارم سے علاوہ ماتحت الازار کے پیٹ اور کمر اور پہلو اور پسلیوں کا چھپانا بھی فرض ہے پس ایسا باریک کرتہ پہن کر محارم کے سامنے آنا بھی جائز نہیں جس سے پیٹ یا کمر یا پہلو یا پسلیاں ظاہر ہوں یا ان کا کوئی حصہ نظر آتا ہو شریعت نے تو محارم کے سامنے آنے میں بھی اتنی قیدیں لگائی ہیں اور آج کل کی عورتیں نامحرموں کے سامنے بھی بے باکانہ آتی ہیں گویا شریعت کا پورا مقابلہ ہے۔

بی بیو! پردہ کا اہتمام کرو اور نامحرم عزیزوں کے سامنے قطعاً نہ آؤ اور محارم کے سامنے احتیاط سے آؤ۔ اس جگہ مجھکو ایک بات یاد آئی جس پر اہل علم کو تنبیہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ متون میں تو صرف یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ محارم کے سامنے ماتحت الازار کے علاوہ ظہر و بطن کا چھپانا ضروری ہے اور شروح میں اس پر اتنی زیادت اور مذکور ہے مع الجَنبَین یعنی پہلوؤں کا چھپانا بھی ضروری ہے اس کو ایک بہت بڑے عالم نے مع الجبین پڑھ کر ترجمہ یہ کر دیا کہ محارم سے پیشانی کا بھی چھپانا فرض ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے اور حیرتناک غلطی ہے کیونکہ جَبِین داخل وجہ ہے اور ستر وجہ فرض نہیں کیونکہ وجہ و کفین و قدمین عورۃ نہیں ہیں گو بوجہ خوف فتنہ کے غیر محارم کے سامنے کشفِ وجہ سے وجوباً منع کیا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے اس سے وجہ کا داخل عورت ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لئے یہ مسئلہ اگر کسی کی نظر سے گذرے تو دھوکہ نہ کھاوے اس میں ان عالم سے غلطی ہوگئی ہے مگر اس سے ان کے عالم فاضل ہونے میں کچھ نقص نہیں آگیا کیونکہ عالم سے کسی مقام پر لغزش بھی ہو جاتی ہے اور اس سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں بجز انبیاء علیہم السلام کے دگو لغزش ان سے بھی ہو جاتی ہے مگر وہ خطا پر مستمر نہیں رہ سکتے وحی سے فوراً ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے ۱۲ جامع)

الغرض عورتوں کو نامحرم عزیزوں سے گہرا پردہ کرنا چاہیئے ہاں جس گھر میں بہت سے آدمی رہتے ہوں جن میں بعض نامحرم ہوں اور بعضے محرم اور گھر تنگ ہو اور پردہ کرنے کی حالت میں گذر مشکل ہو۔ ایسی حالت میں نامحرم عزیزوں سے گہرا پردہ کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ایک گھر میں اس طرح نباہ ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں نامحرموں کے

سامنے بقدر ضرورت چہرہ کا کھولنا جائز ہے۔ مگر باقی تمام بدن سر سے پیر تک لپٹا ہوا ہونا چاہئیے کفوں کے چاک سے ہاتھ نہ جھلکیں۔ گریبان کھلا ہوا نہ رہے بٹن اچھی طرح لگے ہوئے ہوں تاکہ گلا اور سینہ نہ جھلکے۔ دوپٹے سے تمام سر لپٹا ہوا ہو کہ ایک بال بھی باہر نہ رہے۔ اس طرح بدن کو چھپا کر انکے سامنے منہ کھولکر گھر کا کام کاج کر سکتی ہیں (اور بہتر یہ ہے کہ ایسی حالت میں بھی گھونگھٹ کی عادت رکھیں کھلم کھلا ان کے سامنے چہرہ ظاہر نہ کریں " جامع) اور یہی حکم کافر عورتوں کا ہے کہ ان کے سامنے صرف چہرہ اور ہاتھ اور پیر کھولنا جائز ہے باقی تمام بدن کا ان سے چھپانا واجب ہے کہ سر کا بال بھی ان کے سامنے نہ کھلے۔ عورتیں بھنگنوں اور چماریوں سے بالکل احتیاط نہیں کرتیں حالانکہ ان سے بھی بجز وجہ اور کفین اور قدمین کے باقی بدن کا شرعاً ویسا ہی پردہ ہے جیسے نامحرم مردوں سے لیکن گھبراؤ نہیں کہ اتنی احتیاط ہم سے کس طرح ہو سکتی ہے۔ تم احتیاط کرنا تو شروع کرو ان شاء اللہ تعالیٰ ذرا دقت نہ ہوگی۔ یاد رکھو اس نفس کی مثال بچہ جیسی ہے کہ بچہ کا اگر دودھ نہ چھڑایا جاوے تو وہ بارہ برس تک بھی دودھ ہی پیتا رہیگا اور خود کبھی نہ چھوڑیگا۔ اور اگر دو برس کے بعد دودھ چھڑا دیا جاوے تو دو چار روز کیلئے تو دقت ہوتی ہے مگر پھر بچہ کو روٹی کی ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ اس کو ماں کے دودھ سے نفرت ہو جاتی ہے اور اب اگر کوئی اس سے دودھ پینے کو کہے تو وہ ہرگز راضی نہ ہو یہی حال نفس کا ہے اگر گناہوں کے کام اس سے نہ چھڑائے جائیں تب تو یہ کبھی اپنے آپ اُن سے نہیں رُک سکتا اور اگر ہمت کر کے قصد کر لیا جا کہ بس آج سے پیچھے یہ گناہ نہ کریں گے تو اول اول دو چار روز تک تو تکلیف ہوتی ہے پھر آسانی ہو جاتی ہے بلکہ کچھ دنوں کے بعد اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ پھر جیسے بچہ کا اگر دودھ نہ چھڑایا جاوے تو اس کا معدہ کمزور رہتا ہے کہ عمدہ اور نفیس غذائیں ہضم نہیں کر سکتا اور دودھ چھڑانے کے بعد وہ دنیا بھر کی نعمتیں کھانے لگتا ہے ان کا مزہ چکھ کر باپ ماں کو دعا دیتا ہے کہ خدا ان کا بھلا کرے کہ انھوں نے میرا دودھ چھڑا کر ان نعمتوں کے قابل مجھے بنا دیا اسی طرح گناہوں کو چھوڑ کر آپ کا دل انوار طاعات کے قابل ہو جائے گا پھر جب طاعات کے انوار قلب پر فائض ہوں گے تو آپ بھی دعا دیں گے کہ خدا اس شخص کا بھلا کرے جس نے گناہوں کو ہم سے چھڑا کر ہم کو ان انوار کے قابل بنا دیا پھر آپ کو ان گناہوں کی طرف التفات بھی نہ ہوگا البتہ چند روز ہمت کرنا پڑیگی

مصرع : چند روزے جہد کن باقی بخند

(چند روز کوشش کرو پھر خوش رہوگے)

اور چند روز کے لئے ہمت کرنا کچھ مشکل بھی نہیں کیا آپ بچے سے بھی گئے گذرے کہ وہ تو دودھ چھڑائی کی کلفت برداشت کرلیتا ہے اور آپ سے ایک ذراسی کلفت برداشت نہ ہو۔ ایک کوتاہی عورتوں کی یہ ہے کہ وہ شوہروں کی تعظیم اوران کاادب نہیں کرتیں اور یہ سخت بے حیائی ہے بعض عورتیں مردوں سے ایسا برابری کا برتاؤ کرتی ہیں گویا شوہر ان کا برابر کا بھائی ہے اور یہ بھی غنیمت ہیں بعض جگہ تو عورتیں مردوں پر حکومت کرتی ہیں۔ حالانکہ شریعت میں شوہروں کی تعظیم کے متعلق سخت تاکید ہے۔ حدیث میں صاف آیا ہے کہ اگر میں خدا کے سوا کسی کے لئے سجدہ کو جائز کرتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں۔ لیکن سجدہ تو خدا کے سوا کسی کو جائز نہیں مگر اس سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ شوہر کی کس درجہ تعظیم عورتوں کے ذمہ واجب ہے (کہ جو چیز خدا کے لئے مخصوص ہے اگر اس کا مستحق کوئی غیر ہوسکتا تو شوہر اس کا مستحق ہوتا ۱۲) بعض جگہ تو عورتیں مردوں کو ذلیل کرتی ہیں اور بعض جگہ مرد بھی ظالم ہوتے ہیں کہ وہ عورتوں کو بہت ذلیل رکھتے ہیں اور بعض جگہ دونوں طرف سے یہ برتاؤ ہوتا ہے قیامت میں ان سب کا حساب ہوگا اور جس نے جس کی حق تلفی کی ہوگی اس سے انتقام لیا جائیگا۔ پس مردوں کو چاہیئے کہ وہ عورتوں کے حقوق کی رعایت رکھیں اور عورتوں کو مردوں کی تعظیم کرنی چاہیئے ان کی اطاعت وفرمانبرداری کا خیال کرنا چاہیئے۔

ایک کوتاہی عورتوں کی یہ ہے کہ یہ اسراف بہت کرتی ہیں روپیہ کو احتیاط سے خرچ نہیں کرتیں۔ بس یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم کو تو کمانا پڑتا نہیں ہم جس طرح چاہیں خرچ کریں مرد اپنے آپ کما کر لائے گا۔ بعض جگہ مامائیں خوب گھر لوٹتی ہیں اور یہ ذرا خبر نہیں لیتیں۔ یاد رکھو! شوہر کے مال کی نگہبانی عورتوں کے ذمہ واجب ہے اس کو اس طرح رائیگاں کرنا ان کو جائز نہیں قیامت میں عورتوں سے اس کا بھی حساب ہوگا۔ خصوصاً شادیوں میں تو بہت ہی فضول خرچی کرتی ہیں۔ اُن میں تو عورتیں ہی مفتی اعظم ہوتی ہیں۔ سارے کام انہی سے پوچھ پوچھ کر کئے جاتے ہیں۔ مرد جانتے ہی نہیں کہ شادیوں میں کہاں خرچ کی ضرورت ہے کہاں نہیں بس جس جگہ عورتیں خرچ کرنے کا حکم دیتی ہیں وہاں بلا چون وچرا خرچ کیا جاتا ہے اور

اوران عورتوں نے ایسے بیڈھنگے خرچ نکال رکھے ہیں جن میں فضول روپیہ برباد ہوتا ہے۔
ان شادیوں کی بدولت بہت سے بڑے بڑے گھر تباہ و برباد ہوگئے ہیں۔ لیکن اب بھی
لوگوں کو عقل نہیں آتی اور وہ ان رسوم وغیرہ میں عورتوں کا اتباع نہیں چھوڑتے۔ حتیٰ کہ
ایک صاحب یہ کہتے تھے کہ خدا بھلا کرے اصلاح الرسوم کے مصنف کا کہ ہم کو رسموں کی
تفصیل یاد نہ رہی تھی اس میں ہم عورتوں کے محتاج تھے۔ اصلاح الرسوم میں بہت تفصیل
کے ساتھ تمام رسموں کو لکھدیا ہے۔ بس اب ہم اُسی کو دیکھ دیکھ کر سب کام کرتے ہیں
اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس بندۂ خدا نے اصلاح الرسوم سے یہ کام لیا
حالانکہ اس میں تو رسموں کی خرابیاں ظاہر کی گئی ہیں اور ہر رسم کا گناہ ہونا بتلایا
گیا ہے مگر اس ظالم نے اس مضمون کو تو چھوڑ دیا اور صرف رسموں کا بیان دیکھ لیا کہ
فلاں وقت یوں ہوتا ہے اس کے بعد یہ ہوتا ہے۔ تو اب بھی لوگوں کی آنکھیں نہیں
کھلیں۔ جب سارا گھر باہر نیلام ہو جائے گا اس وقت شریعت کے موافق شادی کرنے
کی سوجھے گی۔

صاحبو! شادیوں میں بہت اختصار کرنا چاہیئے تاکہ بعد میں افسوس نہ ہو کہ ہائے
ہم نے یہ کیا کیا۔ اگر کسی کے پاس بہت زیادہ ہی رقم ہو تو اس کو اس طرح برباد کرنا مناسب
نہیں بلکہ دنیا دار کو کچھ رقم جمع کرنا بھی چاہیئے اس سے دل کو اطمینان رہتا ہے۔
حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ صاحب اسباب کو کچھ رقم اپنے پاس
نفس کے بہلاوے کے لئے جمع رکھنی چاہیئے اس سے دل مطمئن رہتا ہے اور طاعات میں
یکسوئی نصیب ہوتی ہے۔ صاحب اسباب کے پاس اگر رقم جمع نہ ہو تو اس کا دل
پریشان رہتا ہے جس سے دین کے کاموں میں بھی خلل پڑتا ہے۔ ہاں جس کو توکل کی
قوت نصیب ہو وہ جمع نہ کرے بلکہ خوب اللہ کے نام پر لٹائے تاکہ ثواب بھی ملے مگر
فضول روپیہ برباد نہ کرو۔ ایک کوتاہی عورتوں میں یہ ہے کہ یہ غمی میں بھی بہت اسراف کرتی
ہیں بھلا وہاں خرچ کا کیا موقع وہ تو کوئی افتخار کا وقت نہیں بلکہ عبرت کا موقع ہے مگر ان کے
یہاں غمی میں بھی خاصی بارات کا اہتمام ہوتا ہے پھر حیرت تو ان جانے والیوں پر ہے کہ جہاں

کسی کے گھر موت ہوئی اور یہ گاڑیاں لے کر اس کے گھر پہونچ گئیں. اب اس غریب پر ایک تو موت کا صدمہ تھا ہی دوسرا یہ وبال سر پر آ کھڑا ہوا کہ آنے والیوں کے کھانے کی فکر کرے، پان چھالیہ کا انتظام کرے، گاڑی کے گھاس دانہ کا اہتمام کرے پھر اگر ذرا بھی کسی بات میں کوتاہی ہوگئی تو آنے والیاں طعنے دیتی ہیں کہ ہم گئے تھے ہمیں پان بھی نصیب نہ ہوا بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ یہ وقت تمہارے ناز نخرے پورا کرنے کا تھا یا اس بیچاری پر مصیبت کا وقت تھا مگر ان کی بلا سے ان کے ناز نخرے کسی وقت کم نہیں ہوتے. حالانکہ اس وقت تو یہ مناسب تھا کہ آنے والیاں اپنا دال آٹا ساتھ باندھ کر لاتیں اور گھر والوں سے کہہ دیتیں کہ اس وقت تم ہماری فکر نہ کرو تم خود مبتلائے رنج ہو جب بھی خوشی کا موقع ہوگا ہماری خاطر مدارات کر لینا باقی اس وقت تو ہم اپنا انتظام خود ہی کریں گے اور یہ تو بہت ہی سخت بے حیائی ہے کہ وہاں جا کر بھی اپنے سارے معمولات پورے کریں کہ نہ پان میں فرق آوے نہ چائے میں۔

بلند شہر میں ایک رئیس زادے کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا. ان کے اعزہ چاروں طرف سے جمع ہو گئے اور ایک بارات سی ان کے گھر پر آ گئی. رئیس زادے نے سب کے لئے عمدہ عمدہ کھانے پکوائے جب کھانا چُنا گیا تو اس نے مہمانوں سے کہا کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے پہلے میری بات سن لیجئے پھر کھانا شروع کیجئے گا سب لوگ ہاتھ روک کر بیٹھ گئے. اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ اس وقت مجھ پر کیسا سانحہ گذرا ہے. اس وقت میرے والد ماجد کا سایہ میرے سر پر سے اٹھ گیا ہے اور سب جانتے ہیں کہ باپ کا سایہ اٹھ جانے سے کیسا صدمہ ہوتا ہے تو کیا یہی انصاف ہے کہ مجھ پر تو یہ مصیبت گذرے اور تم آستین چڑھائے مرغن کھانا کھانے کو تیار ہو گئے. کیوں صاحب یہی ہمدردی ہے بس مجھ کو جو کہنا تھا کہہ چکا اب کھانا شروع کیجئے. بھلا اب کون کھاتا جب سر پر جوتیاں پہلے ہی پڑ گئیں سب لوگ دستر خوان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور رئیس زادے نے غربا کو بلا بھیجا کہ بیٹھو کھاؤ تمہارے کھانے سے میرے باپ کی روح کو ثواب بھی پہونچے گا اور یہ برادری کے کھاتے پیتے لوگ آستین چڑھا کر بیٹھ گئے ان کے کھانے سے ان کو کیا ثواب ملتا اور میری رقم برباد ہو جاتی. غرض غریبوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

اور دعا دیتے ہوئے چلے گئے۔ اس کے بعد برادری کے چند معزز لوگ اس طرف جاکر بیٹھے اور غمی کی رسوم میں مشورہ کرنے لگے سب نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ واقعی یہ رسمیں بالکل عقل کے خلاف ہیں اور شریعت کے خلاف تو ہیں ہی ان سب کو یک لخت موقوف کردینا چاہئے کسی نے اُن رئیس زادے سے کہا کہ میاں جب تم کو کھلانا منظور نہ تھا تو پہلے ہی سے یہ بات کہدی ہوتی اتنا انتظام ہی تم نے کیوں کیا تھا اس نے جواب دیا کہ اگر میں یہ انتظام نہ کرتا اور کھانا تیار کرنے سے پہلے یہ بات کہتا تو لوگ یوں سمجھتے کہ اپنی بچت کیلئے یہ بات نکالی ہے۔ اب کسی کا یہ منہ نہیں رہا کہ مجھے یہ الزام دے سکے کیونکہ میں نے کھانے عمدہ سے عمدہ تیار کرادیئے تھے جس سے معلوم ہوگیا کہ مجھے اپنی بچت منظور نہ تھی بلکہ محض اس بے ہودہ رسم کا بے ہودہ ہونا ظاہر کرنا تھا۔

واقعی اس شخص نے خوب کیا اگر دو چار آدمی اسی طرح کریں تو یہ سب رسمیں موقوت ہوجاویں۔ مگر ایسا کرنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے ہر اک کی ایسی ہمت نہیں ہوتی۔ جب کسی کے گھر پر آدمی پہونچ جاتے ہیں تو وہ شرما شرمی ان کا انتظام کرتا ہی ہے۔ مگر جانے والوں کو خود اس کا خیال کرنا چاہیئے۔ یہ تو نمونہ ہے عورتوں کی کوتاہیوں کا ان سے بچنے کا اُن کو اہتمام کرنا چاہیئے یہاں تک تو گویا وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو) کا بیان ہوا کیونکہ تقویٰ کے معنے معاصی سے بچنے ہی کے ہیں نمونہ کے طور پر میں نے چند معاصی کی فہرست گنادی ہے اور یہ تو وہ باتیں ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں بے تکلف آگئیں اسی پر دوسرے اعمال کو قیاس کرلیں۔ کیونکہ ہمارے اکثر اعمال کوتاہی سے خالی نہیں۔ اگر کوئی عورت یہ سوال کرے کہ اس آیت میں تو تقوے کا امر اول مردوں کو ہے اور ان کے واسطہ سے ہم کو ہے مگر کہیں خاص ہمکو بھی حکم ہوا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں خاص عورتوں کو بھی اس کا حکم ہوا ہے۔ حق تعالےٰ سورۂ احزاب میں فرماتے ہیں وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ جو کہ صیغہ جمع مؤنث حاضر کا ہے اس میں خاص عورتوں ہی کو خطاب ہے اب تو سوال نہیں رہا۔

اب میں دوسرے جزو وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کے متعلق کچھ مختصر بیان کرتا ہوں۔ (کیونکہ وقت کم رہ گیا ہے نماز عصر قریب ہے) اس جزو کا حاصل تو یہی ہے کہ اس میں کمال

ے اور سچوں کے ساتھ ہوجاؤ۔

دین حاصل کرنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ تم کاملین اور راسخین فی الدین کی ساتھ ہو جاؤ۔ مردوں کو تو اس طریقہ پر عمل کرنا آسان ہے اب قابل غور یہ ہے کہ عورتوں کے لئے اس کا طریقہ کیا ہے اور یہ سوال واقعی بہت ضروری ہے۔ سو جواب یہ ہے کہ اس کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ عورتیں بھی ان ہی بزرگوں سے فیض حاصل کریں جن سے مرد فیض حاصل کرتے ہیں مگر یہ ذرا دشوار ہے کیونکہ اول تو مردوں اور عورتوں کا ساتھ کیا دوسرے پردہ کی وجہ سے شیخ کو ان سے مناسبت کامل نہیں ہو سکتی اور بدون مناسبت کے نفع کامل نہیں ہوتا اور بزرگوں کے سامنے آنا اور ان سے پردہ نہ کرنا جائز نہیں ہاں جن عورتوں کا باپ یا خاوند کامل ہو وہ ان سے فیض حاصل کر سکتی ہیں۔ مگر سب کے تو باپ اور شوہر کامل نہیں اس لئے یہ طریقہ کافی نہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مرد کامل مردوں سے فیض لیں اور عورتیں کامل عورتوں سے اور اصل قیاس کا مقتضی بھی یہی ہے کہ جس طرح مردوں کو حکم ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) اسی طرح عورتوں کو حکم دیا جاوے کُنَّ مَعَ الصّٰدِقَاتِ (اے عورتو تم سچی عورتوں کے ساتھ ہو جاؤ) مگر اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا عورتیں بھی کامل ہو سکتی ہیں جواب یہ ہے کہ ہاں قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی کامل ہو سکتی ہیں کیونکہ جس طرح حق تعالیٰ نے مردوں کو صادقین فرمایا ہے اسی طرح عورتوں کو صادقات فرمایا ہے چنانچہ سورۂ احزاب کی ایک آیت اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ الآیۃ (مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں) میں نے ذرا دیر ہوئی پڑھی تھی اس میں یہ بھی ہے وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقَاتِ (سچے مرد اور سچی عورتیں) اور صادقین کے معنے کاملین کے ہیں تو صادقات بمعنے کاملات ہوا اس سے عورتوں کے بھی کامل ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور واقعی عورتوں کی اصلاح کا طریق سب سے اچھا یہی ہے کہ جو عورتیں کامل ہوں یہ ان کی صحبت میں رہیں مگر افسوس ہے ہمارے طبقۂ اناث پر کہ آجکل ان میں کامل بہت کم ہیں۔

• جب میں نے جزاء الاعمال لکھی ہے تو اس میں میں نے چند بزرگوں کے نام کی فہرست لکھی تھی کہ عام لوگ ان میں سے کسی کے ساتھ وابستہ ہو جاویں اس وقت میرا جی چاہا کہ چند عورتوں کے نام بھی لکھوں تاکہ عورتیں ان سے فیض حاصل کریں۔ مگر عورتوں میں کوئی ایسی

نظر ہی نہ پڑی جس کا نام میں اطمینان کے ساتھ لکھ دیتا اور بعضی ایسی بھی تھیں جن کے کمال کی خبریں میں سنتا تھا اور اس وقت تک ان کے متعلق کوئی بات بے اطمینانی کی نہ تھی مگر ان کا نام لکھنے سے چند وجوہ سے رُکا۔

(۱) یہ کہ ان کے کمالات عورتوں ہی کی زبانی سنے تھے خود مجھ کو ان کے کمال کی تحقیق نہ تھی اور نہ تحقیق کی کوئی صورت تھی بخلاف ان بزرگوں کے جن کے نام شائع کئے گئے تھے کہ ان سب سے میں خود مل چکا تھا اور عورتوں کے بیانات پر مجھے وثوق نہ ہوا کہ نہ معلوم یہ اپنے ذہن میں کمال کسے سمجھتی ہوں گی اور کس کو کامل کہتی ہوں گی ان سے یہ بھی بعید نہیں کہ ناقص کو کامل سمجھتی ہوں۔

(۲) اگر عورتوں کا نام کاملات کی فہرست میں شائع ہوا تو ایسا نہ ہو کہ مردوں کو بھی ان سے اعتقاد ہو جاوے اور بعضے مردان سے فیض حاصل کرنے جاویں۔

(۳) ممکن ہے کہ عورتیں دور دراز سے ان کی ملاقات و زیارت کے لئے سفر کریں اور ایسا ضرور ہوتا اور میں عورتوں کے لئے سفر کو پسند نہیں کرتا اور جب عورتیں سفر کر کے ان کے پاس آتیں تو ان بیچاری کاملات کو آنے والیوں کی خاطر مدارات اور مہمانی کرنی پڑتی جس سے ان پر بار ہوتا۔

(۴) پھر آنے والیوں کی خاطر مدارات کے متعلق ان کاملات میں اور ان کے شوہروں میں نزاع ہوتا شوہر چہلاّتا کہ میرے گھر روز روز یہ گاڑیاں کیسی آنے لگیں مردوں کو روز روز عورتوں کے آنے سے پردہ وغیرہ کی تکلیف ہوتی اُن کی آزادی میں خلل پڑتا۔

(۵) اس قدر رجوعات سے کہیں ان کاملات کا دماغ نہ بڑھ جاتا کیونکہ یہ تعظیم و تکریم وہ بلا ہے کہ اس کی ساتھ کامل سے کامل مرد کو بھی سنبھلنا دشوار ہوتا ہے۔ عورتوں کا دماغ تو بہت ہی بڑھ جاتا کہ ہاں ہم بھی کچھ ہیں تو ان بیچاریوں کا تھوڑا بہت جو کچھ کمال تھا وہ بھی اس تکبر کی بدولت زائل ہو جاتا۔ غرض وجوہ تو میرے ذہن میں بہت سی آئیں مگر سب سے زیادہ مانع یہ پہلی وجہ تھی کہ ان کے کمالات عورتوں ہی کی زبانی سنے ہوئے تھے اس لئے پوری طرح وثوق نہ ہوا۔ اور حقیقت میں میرا خیال صحیح نکلا کیونکہ میں نے جن مردوں کو کاملین میں شمار کیا تھا

الحمدللہ اس وقت تک قریب قریب میں ان سب کے کمال کا معتقد ہوں اور بجز ایک دو کے باقی سب ایسے ہیں کہ ان کی بابت کوئی بات خلاف کمال مجھے معلوم نہیں ہوئی اور جن عورتوں کے متعلق میں نے کامل ہونے کی خبریں سنی تھیں قریب قریب اس وقت میں ان سے کسی کا معتقد نہیں رہا کیونکہ ہر اک میں کچھ نہ کچھ بات بعد میں معلوم ہوئی اس لئے میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس وقت میں نے ان کے نام شائع نہ کئے ورنہ شائع ہو جانے کے بعد اب بڑی دقت ہوتی۔ چنانچہ انہی میں سے ایک مسماۃ ایک قصبہ کی رہنے والی بھی تھیں جنکو میں نے کاملات میں شمار کرنے کا قصد کیا تھا ان کا نام جنت تھا شاید اب تو وہ مرگئی ہیں اس وقت ان کی حالت بہت اچھی سننے میں آ رہی تھی کہ بہت نیک ہیں سوائے نماز روزہ اور تسبیح کے ان کو اور کوئی کام نہیں تھا لڑکیوں کو پڑھایا بھی کرتی تھیں مگر اخیر میں وہ بجائے جنت کے دوزخ بن گئیں۔ اسی قصبہ میں کچھ زمانہ سے ایک بے نکاحی عورت نے فتنہ برپا کر رکھا ہے اپنے آپ کو ولی اور بزرگ ظاہر کرتی ہے مردوں عورتوں کو مرید کرتی ہے اور کسی سے شادی نہیں کرتی۔ اس کمبخت کے ایک بچہ بھی بدون خاوند کے ہوا جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ جس طرح مریم علیہا السلام کے عیسیٰ علیہ السلام بدون باپ کے ہوئے تھے اسی طرح میرے بھی بدون باپ کے بچہ ہو گیا نعوذ باللہ مگر عورتوں کی جہالت دیکھئے کہ باوجود ایسی بے حیائی اور بدکاری کے پھر بھی اس کی معتقد ہیں اور اس کو پیرانی کا لقب دے رکھا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ بعضے مردوں کی عقل پر بھی پتھر پڑ گئے کہ پڑھ لکھ کر ڈوب گئے اور اس کے معتقد بن گئے اور ان تمام بدکاریوں اور بیحیائیوں کی تاویل کرنے لگے (خدا ان کو غارت کرے قاتلهم الله انى يؤفكون ۱۲ جامع) (اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرے کہاں جا رہے ہیں) وہ بی جنت بھی اخیر عمر میں ایسی بے حیا عورت کی معتقد ہو گئی تھیں اور اس کی مرید بن گئی تھیں اور ان کے سامنے جو کوئی اس کی برائی کرتا اور ان کو بیوقوف بناتا کہ تم اس کی مرید کیوں ہو گئیں تو وہ الٹا کہنے والے کو بیوقوف بناتیں اور اسے کوسنے دیا کرتیں۔ غرض اخیر میں وہ بالکل مسخ ہو گئیں تھیں (خدا مغفرت کرے ۱۲) تو جن عورتوں کو میں نے کامل سنا تھا کچھ دنوں کے بعد اکثروں کا ناقص ہونا معلوم ہو گیا۔ تو اب یہ صورت تو عورتوں کی اصلاح کی ہو نہیں سکتی کہ وہ آپس ہی اپنی ہم جنس عورت سے فیض حاصل کریں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ جن کے محارم میں سے کوئی

کامل ہو وہ اس سے مستفیض ہوں جس کا خاوند کامل ہو وہ اپنے خاوند سے فیض حاصل کرے مگر اس میں یہ مشکل ہے کہ شوہر تو بعض جگہ غلام ہے ورنہ برابر کا دوست تو ہے ہی۔ شوہر کی تعظیم و تکریم عورتیں اس درجہ نہیں کرتیں جتنی مربی کی تعظیم ہونی چاہیئے اور بدون اس کے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے بیوی کو شوہر سے ویسا اعتقاد بھی نہیں ہوتا جیسا دوسروں سے اعتقاد ہوتا ہے گو اپنا شوہر کتنا ہی بڑا کامل ہو۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے گھر میں جو پہلی بیوی تھیں باوجودیکہ حضرت کی بہت فرمانبردار تھیں مگر بیعت ہونے کو وہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے کہتی تھیں۔ مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ آپ حضرت حاجی صاحب سے کیوں نہیں بیعت ہو جاتیں، بھلا حضرت کے ہوتے ہوئے مجھ سے بیعت ہونا کیا مناسب ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حاجی صاحب کے کمال میں شبہ نہیں مگر میں ان سے بیعت نہیں ہوتی۔ میں تو آپ سے ہی بیعت ہونا چاہتی ہوں (پھر معلوم نہیں کہ حضرت مولانا گنگوہی نے ان کو بیعت کیا یا نہیں مگر دیکھ لیجئے کہ ان کو حاجی صاحب سے بیعت ہونا منظور نہ تھا بلکہ ان کے خلفاء سے بیعت کی درخواست کرتی تھیں)

اور حضرت حاجی صاحب کی دوسری بیوی تو سنا ہے کہ بہت ہی نیک تھیں جن عورتوں نے ان کو دیکھا ہے وہ کہتی ہیں کہ حاجی صاحب میں اور ان میں صرف اتنا فرق تھا کہ حضرت مرد تھے اور وہ عورت تھیں اور کچھ فرق نہ تھا۔ سنا ہے کہ وہ مثنوی کو بھی خوب سمجھتی تھیں۔ اور یہ دوسری بیوی حضرت حاجی صاحب کی منگیتر تھیں پہلے ان سے حضرت کی منگنی ہوئی تھی مگر حضرت کے انکار کی وجہ سے نکاح نہ ہوا تھا۔ کسی دوسرے سے نکاح ہو گیا تھا۔ پھر شوہر اول کے انتقال کے بعد حاجی صاحب نے ان سے دوسرا نکاح کر لیا تھا تو اگر خاوند سے بھی فیض حاصل نہ کر سکیں اور اپنے محارم میں بھی کوئی کامل نہ ہو تو اب دوسری صورت یہ ہے کہ بزرگوں کی کتابوں اور ان کے ملفوظات و مواعظ کا مطالعہ کیا جائے بزرگوں کی تصانیف اور ان کے ملفوظات میں بھی وہی اثر ہوتا ہے جو ان کی صحبت میں اثر ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں کہ گل رفت و گلستاں شد خراب	بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

چونکہ خورشید و مارا کرد داغ — چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی جب پھولوں کی موسم چلی جائے تو اب اس کی خوشبو گلاب سے حاصل کرنی چاہئے گلاب میں بھی پھول کی خوشبو مل سکتی ہے اسی طرح آفتاب چھپ جائے تو اب چراغ سے روشنی حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ اہل اللہ کے کلام میں نور ہوتا ہے اور ملحدوں کے کلام میں ظلمت ہوتی ہے۔ گو بزرگوں کی کتابوں کی عبارت سادی ہوتی ہے ان میں عبارت آرائی نہیں ہوتی مگر ان کے مطالعہ سے نور قلب میں پیدا ہوتا ہے اور جو لوگ متبع شریعت نہیں ہیں ان کی کتابوں کی عبارت گو کیسی ہی شستہ ہو مگر باطن میں اس سے ظلمت پیدا ہوتی ہے گو ان میں تمام باتیں دین ہی کی ہوں مگر الفاظ چونکہ ان کے اپنے ہیں اس لئے وہ ظلمت سے خالی نہیں ہوتے جس کے دل میں کچھ بھی ادراک ہے وہ اس فرق کو ضرور محسوس کرے گا۔ اسی طرح اہل اللہ کی تقریر میں بھی ایک نور ہوتا ہے جو غیر اہل اللہ کے کلام میں نہیں ہوتا۔

ایک بزرگ کے صاحبزادے تحصیل علم کے لئے کہیں باہر گئے تھے جب وہ فارغ ہو کر واپس ہوئے اور پورے عالم ہو گئے تو اپنے والد صاحب کے پاس آئے انہوں نے ان سے فرمایا کہ تم وعظ کہو چنانچہ صاحبزادے نے وعظ کہا اور بڑے بڑے عالی مضامین بیان کئے مگر کسی پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ جب وہ وعظ کہہ چکے تو ان کے والد صاحب ممبر پر تشریف لائے اور وعظ سے پہلے انہوں نے اپنا واقعہ اسی رات کا بیان فرمایا کہ رات ہم نے روزہ کی نیت کی تھی سحری کے لئے کچھ دودھ رکھ دیا تھا مگر بلی آئی اور سارا دودھ پی گئی۔ بس اتنا ہی بیان فرمایا تھا کہ ساری مجلس تڑپنے لگی اس کے بعد اُن بزرگ نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا کہ صاحبزادے سننے والے پر قلب کا اثر پڑا کرتا ہے الفاظ کا اثر نہیں ہوتا۔ تم نے اب تک علم الفاظ حاصل کیا ہے اب قلب کے اندر بھی اس علم کو پہنچانا چاہیئے۔ اہل اللہ کے کلام سے یہ ضرور نہیں کہ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگیں بلکہ اہل دل کے کلام سے سامعین کے دل آنسوؤں سے بھر جاتے ہیں۔ غرض تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ بزرگوں کی تصانیف سے بھی قریب قریب وہی فائدہ ہوتا ہے جو ان کے پاس رہنے سے ہوتا ہے گو بالکل اس کے برابر نہ ہوگا مگر اس کے قریب ضرور ہوگا۔ تو اگر عورتوں کو بزرگوں کی صحبت میسر نہ آسکے تو ان کے ملفوظات اور احوال موجود ہیں

ان کو دیکھتی رہا کریں ان شاء اللہ تعالیٰ کمال ضرور حاصل ہوگا اور مردوں کو بھی بزرگوں کی تصانیف اور ان کے ملفوظات و احوال کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیئے کیونکہ ہر شخص کو اتنی مہلت نہیں ملتی جو ان کے پاس جاکر رہے۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ گویا اسی زمانہ کے واسطے یہ فرما گئے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است　　صراحی مئے ناب و سفینہ غزل است

(اس زمانہ جو رفیق خلل سے خالی ہے وہ کتاب ذکر و شغل طاعت و عبادت اور بزرگوں کے ملفوظات ہیں)

صراحی مئے ناب سے مراد ذکر و شغل اور طاعات و عبادات ہیں اور سفینۂ غزل سے مراد اہلِ عشق کے ملفوظات ہیں۔ اس میں حضرت حافظ نے کتاب کو رفیق بتلایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو فائدہ رفیق سے ہوتا ہے وہ اس سے بھی ہوتا ہے اور شیخ بھی رفیق طریق ہوتا ہے تو جس کو شیخ میسر نہ ہو وہ کتابوں کو رفیق بنالے۔ پس الحمدللہ کہ اس سوال کا جواب ہر پہلو سے مکمل ہو گیا کہ عورتوں کے لئے معیت صادقین کی کیا صورت ہوگی۔ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ جن کے محارم میں کوئی کامل موجود ہو وہ تو اس کی صحبت اختیار کریں اور جن کے محارم میں کوئی کامل نہ ہو وہ اس کی تلاش کریں کہ کوئی عورت کامل فی الدین ملے تو اس کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں اور جس کو دونوں باتیں میسر نہ آئیں وہ بزرگوں کے کلام اور ملفوظات اور قصص و احوال کا مطالعہ کریں۔ پس اب عورتوں کے لئے بھی اس آیت کا بیان مکمل ہو گیا اور میں نے ان کو بھی کمال دین حاصل کرنے کا آسان سے آسان طریق بتلا دیا اب آگے ان کی ہمت ہے کہ عمل کریں یا نہ کریں۔ پس مضمون تو ختم ہو گیا اب اُس ایک دُنابہ رہ گیا اس کو بیان کرکے میں اپنی تقریر ختم کردوں گا وہ دُنابہ ایک طالبعلمانہ اشکال و جواب ہے جس کو طلبۂ اہل علم خوب سمجھ لیں گے اشکال یہ ہے کہ قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں کامل ہو سکتی ہیں چنانچہ اَلصَّادِقِیْنَ وَالصَّادِقَاتِ اس پر دلالت کر رہا ہے اور ایک حدیث میں بھی ہے کَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ کَثِیْرٌ وَلَمْ یَکمل من النساء اِلَّا مَرْیَمُ بنت عمران وآسیہ اِمْرَأَۃُ فِرْعَوْنَ وَفَضْلُ عَائِشَۃَ عَلَی النِّسَاءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلٰی سَائِرِ الطَّعَامِ جس کا حاصل یہ ہے کہ مردوں میں تو بہت لوگ کامل ہوئے

لیکن عورتوں میں بجز مریم علیہا السلام اور آسیہ فرعون کی بیوی کے اور کوئی کامل نہیں ہوئی اور حضرت عائشہ کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت ہے تمام کھانوں پر۔ اس سے علماء نے حضرت عائشہ کا کمال بھی سمجھا ہے کہ وہ بھی کامل ہیں۔ بہرحال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتیں کامل ہو بھی سکتی ہیں اور اس کا وقوع بھی ہوا ہے گو ان میں کامل افراد بہ نسبت مردوں کے کم ہیں۔ مگر ایک حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عورتیں کامل ہو ہی نہیں سکتیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ آپ نے ایک بار عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِيْنٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ کہ میں نے عورتوں سے بڑھ کر کوئی ناقص العقل اور ناقص الدین ایسا نہیں دیکھا جو ہوشیار مرد کی عقل کو جلدی زائل کر دیتا ہو۔ اس پر عورتوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری عقل اور دین میں کیا نقصان ہے آپ نے فرمایا کیا عورتوں کی گواہی مردوں کی آدھی گواہی کے برابر نہیں ہے۔ انہوں نے کہا بیشک۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو ان کی عقل کا نقصان ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی برابر شمار کی گئی ہے۔ اور کیا جب تم کو حیض آتا ہے تو تم نماز روزہ چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتیں۔ انہوں نے کہا بیشک۔ فرمایا کہ یہ تمہارے دین کا نقصان ہے۔ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ناقص ہونے کا جو سبب بیان فرمایا ہے وہ ایسا سبب ہے جس سے کوئی عورت بھی خالی نہیں لہٰذا لازم آتا ہے کہ عورتوں میں کوئی بھی کامل نہ ہو سکے حالانکہ قرآن اور دیگر احادیث سے ان میں بھی کاملات کا وجود معلوم ہوتا ہے۔ یہ اشکال عرصہ سے میرے ذہن میں تھا مگر اس کا کوئی شافی جواب اب تک ذہن میں نہ آیا تھا اسی لئے اس اشکال کو اب تک میں نے کہیں بیان نہ کیا کہ خواہ مخواہ دوسروں کو بھی کیوں پریشانی میں ڈالا۔ الحمد للہ اس وقت جواب ذہن میں آ گیا اس لئے میں نے اشکال کو بھی بیان کر دیا اور جواب بھی عرض کرتا ہوں اس کا حاصل یہ ہے کہ کمال کی دو قسمیں ہیں ایک کمال اختیاری ایک کمال غیر اختیاری۔ اسی طرح نقصان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری ایک غیر اختیاری اور انسان مکلف ہے تحصیل کمال اختیاری کا جو کہ امر مکتسب ہے اور مکلف ہے ازالہ نقصان اختیاری کا جو اس کی قدرت میں داخل ہے اور کمال غیر اختیاری کی تحصیل اور نقصان غیر اختیاری سے اجتناب کا انسان مکلف نہیں لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔

(اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) لیکن یہ ضرور ہے کہ کمال غیر اختیاری کے حاصل نہ ہونے سے عورتوں کو گناہ نہ ہوگا لیکن گناہ نہ ہونے سے اس کا موجب نقصان نہ ہونا لازم نہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے نہ ہونے سے گناہ نہیں ہوتا لیکن نقصان ضرور ہے (مثلاً ایک آدمی میں طبعاً بزدلی اور خوف بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے وہ جہاد نہیں کرسکتا اس صورت میں اس کو گناہ تو نہیں ہوگا لیکن یہ نقصان ضرور ہے اور مجاہدین کی برابر وہ شخص نہیں ہوسکتا ۱۲) پس قرآن میں جو عورتوں کو کامل کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کمال مکتسب کا درجہ ان کو حاصل ہوسکتا ہے اور حدیث میں جو ان کو ناقصات الدین کہا گیا ہے اس میں نقصان غیر اختیاری کو بیان کیا گیا ہے اور کمال مکتسب و نقصانِ غیر اختیاری کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔ اب یہ سوال رہا کہ دوسری حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ مردوں میں تو بہت لوگ کامل ہوئے اور عورتوں میں بجز مریم علیہا السلام و حضرت آسیہ کے اور کوئی کامل نہیں ہوا۔ اس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کمال کا وہی درجہ تھا جو مردوں میں تھا (کیونکہ جس کمال کو مردوں کے لئے ثابت کرکے عورتوں سے اس کی نفی کی گئی ہے حدیث میں صیغۂ استثناء کے ساتھ اسی کمال کو ان دونوں کے لئے ثابت کیا گیا ہے۔ اگر یہ مطلب نہ ہو تو ان کے استثناء کرنے کے کچھ معنی نہ ہوں گے ۱۲) اور جب یہ مطلب ہوا کہ ان دونوں کو کامل مردوں کی برابر کمال حاصل تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں نقصانِ عقل و نقصانِ دین کا وہ سبب غیر اختیاری موجود نہ تھا جو دوسری عورتوں میں موجود ہے اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ممکن ہے ان میں وہ نقصان غیر اختیاری موجود نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں دوسرے ممکن ہے کہ ان میں بھی نقصان غیر اختیاری موجود ہو لیکن ان میں کوئی کمال ایسا ہو جس سے اس نقصان غیر اختیاری کی تلافی ہوگئی ہو۔ اب میں اس مضمون کی زیادہ تفصیل نہیں کرتا بعض لوگ سمجھ گئے ہیں بس اتنا ہی کافی ہے جن کی سمجھ میں نہ آیا ہو وہ ان سے سمجھ لیں۔ حضرت حاجی صاحب بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے کہ کسی دقیق مضمون کی تقریر ایک بار فرما دیا کرتے اس کے بعد اگر کوئی اس کے متعلق سوال کرتا تو آپ فرما دیتے کہ فلاں شخص اس کو خوب سمجھ گیا ہے اس سے سمجھ لو۔ البتہ یہاں ایک سوال اور رہ گیا میں اس کو بھی حل

کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس تقریر سے تو یہ معلوم ہوا کہ نقصان غیر اختیاری بھی موجب نقص ہے حالانکہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نقصان غیر اختیاری موجب نقص نہیں چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی شخص کا کوئی ورد ہو اور وہ سفر کرے یا بیمار ہو جائے اور سفر یا بیماری کی وجہ سے ورد ناغہ ہو جاوے تو حق تعالیٰ ملئکہ سے فرماتے ہیں کہ اس کا ثواب پورا ہی لکھو یعنی سفر اور بیماری میں گو ورد ناغہ ہو جاتا ہے مگر ثواب ان دنوں کے برابر ہی ملتا ہے جن میں ورد ناغہ نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ غیر اختیاری عذر کی وجہ سے اگر اعمال میں کمی آوے تو ثواب کم نہیں ہوتا پھر اس کی کیا وجہ کہ حیض وغیرہ میں عورتوں کی نماز ناغہ ہوتی ہے تو اس کو نقصان کا سبب شمار کیا گیا وہ بھی تو اعذار غیر اختیاری ہیں بلکہ بظاہر ان کا غیر اختیاری ہونا سفر سے زیادہ ہے کیونکہ سفر من وجہ اختیاری ہے اور من وجہ غیر اختیاری یعنی سفر شروع کرنے کے بعد تو اوقات پر قبضہ نہیں رہتا اور مجبوراً اوراد ناغہ ہو جاتے ہیں لیکن سفر کا شروع کرنا تو اختیاری امر ہے۔ اگر ہم سفر ہی نہ کرتے تو اس کی نوبت نہ آتی پس سفر انتہاءً غیر اختیاری ہے اور ابتداءً اختیاری ہے یہ سوال میرے ذہن میں ابھی آیا ہے اور جواب بھی اسی وقت ذہن میں آگیا ہے وہ یہ کہ عذر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عذر اتفاقی۔ دوسرے عذر مستمر۔ قانون شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عذر اتفاقی و عذر مستمر میں فرق ہے۔ عذر اتفاقی سے ثواب کم نہیں ہوتا اور عذر مستمر موجب نقصان اجر ہوتا ہے۔ چنانچہ موت سے بڑھ کر عذر غیر اختیاری کونسا ہوگا لیکن نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ موت سے اجر و ثواب منقطع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ دو شخص ایک ساتھ اسلام لائے تھے اور دونوں کے اعمال بھی برابر تھے۔ ان میں سے ایک صاحب تو کسی غزوہ میں شہید ہو گئے اور دوسرے ان کے بعد ایک ہفتہ کے فاصلہ سے انتقال کر گئے صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ پہلا شخص شہید ہو کر مرا ہے اور یہ بستر پر مرا ہے اس لئے شاید اس کا درجہ اس سے کم ہے تو انہوں نے دوسرے کے حق میں یہ دعا کی اَللّٰهُمَّ اَلْحِقْهُ بِصَاحِبِهٖ کہ اے اللہ اس کو بھی اس کے ساتھی کے درجہ میں پہونچا دیجئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وَاَیْنَ صَلٰوتُهٗ وَصِیَامُهٗ وَقِیَامُهٗ بَعْدَهٗ اَوْکَمَا قَالَ کہ اس نے جو اس کے بعد ہفتہ بھر نمازیں پڑھی ہیں اور روزے رکھے ہیں اور تہجد کی نماز پڑھی ہے یہ اعمال کہاں چلے گئے یعنی تم نے اس کے لئے پہلے شخص کے برابر ہونے کی کیوں

دعا کی۔ اس نے جو اس کے بعد اعمال کئے ہیں ان کا ثواب بھی تو اس کے نامۂ اعمال میں لکھا گیا ہے تو یہ اس سے بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس شخص کے بارہ میں تصریحاً بھی فرمایا کہ واللہ دونوں کے درجہ میں ایسا تفاوت ہے جیسا زمین و آسمان کے درمیان میں رہ رہی یہ بات کہ پہلا شہید تھا اور یہ شہید نہیں ہوا تو اس سے اس کا درجہ کم ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ شہادت کے لئے یہ بھی تیار تھا جہاد میں دونوں شریک ہوئے تھے اب یہ اور بات ہے کہ اس کا وقت آگیا تھا وہ شہید ہو گیا اس کا وقت نہ آیا تھا یہ قتل نہ ہوا۔ مگر نیت دونوں کی برابر تھی اس لئے شہادت کا اجر اس کے لئے بھی ہے ۱۲) اس سے صاف معلوم ہوا کہ موت سے اجر منقطع ہو جاتا ہے اور ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تصریح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یَنْقَطِعُ اَجْرُ الْمُؤْمِنِ بِمَوْتِہٖ اِلَّا مِنْ ثَلٰثٍ الخ (مومن کا اجر موت سے منقطع ہو جاتا ہے بجز تین کے) پس مرض اور سفر اتفاقی عذر ہیں ان سے اجر کم نہیں ہوتا اور حیض و نفاس وغیرہ عذر مستمر ہیں اور عذر مستمر سے اجر کم ہو جاتا ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ عذر اتفاقی ابتداء عمل کے وقت ذہن میں نہیں ہوتا جب آدمی کوئی عمل بہ نیت مداومت شروع کرتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ بات ہرگز نہیں ہوتی کہ اگر میں سفر میں جاؤں گا یا بیمار ہو جاؤں گا تو یہ عمل نہ کروں گا کیونکہ سفر اور مرض عارضی امور ہیں اصل حالت یہی ہے کہ انسان تندرست رہے اور اپنے گھر میں رہے اس لئے نیت دوام کی باقی رہتی ہے پھر جب اتفاقاً عذر پیش آتا ہے تو اس کو ثواب پورا ملتا ہے دوسرے یہ کہ سفر اور مرض کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا ممکن ہے کہ آدمی برسوں بھی سفر نہ کرے نہ بیمار ہو اس لئے ایام سفر و مرض کو عمل سے مستثنیٰ کرنے کی طرف التفات نہیں ہو سکتا پس وہ دن بھی اس کے ذہن میں عمل ہی کے لئے مقرر تھے مگر اتفاق سے ناغہ ہو گیا بخلاف حیض و نفاس وغیرہ کے کہ یہ اعذار مستمرہ ہیں نیز اکثر ان کے اوقات بھی معین ہوتے ہیں پس عورتیں جب نماز پڑھنا شروع کریں گی ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ حیض و نفاس کے وقت نماز کو چھوڑ دیں گے تو ان کی نیت دوام کی نہیں ہوتی۔ یہ نیت کسی عورت کی نہیں ہوتی کہ میں ان دنوں میں بھی نماز پڑھوں گی۔ ایسے ہی موت کا آنا یقینی ہے گو وقت معلوم نہیں مگر ہر شخص جس کام کو شروع کرتا ہے اس کی نیت یہی ہوتی ہے کہ جب تک زندہ ہوں یہ کام کرتا رہوں گا یہ نیت کوئی نہیں کرتا کہ موت کے بعد بھی عمل کرتا رہوں گا اور اگر کوئی ایسی نیت کرے کہ تو وہ معتبر نہیں کیونکہ وہ محض الفاظ

ہی الفاظ ہیں نیت اور عزم کا درجہ اس میں کبھی نہیں ہوسکتا اور اس نیت کی ایسی مثال ہوگی جیسے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا تھا کہ مجلس املا میں سب لوگ سوال کرتے ہیں تم کچھ سوال نہیں کرتے اس نے کہا ان شاء اللہ تعالیٰ اب سے سوال کیا کروں گا چنانچہ ایک دن حضرت امام نے یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ روزہ غروب کے ساتھ فوراً افطار کرنا چاہیے تو وہ طالب علم صاحب پوچھتے ہیں کہ حضرت اگر کسی دن غروب ہی نہ ہو تو الخ امام ابو یوسف نے فرمایا کہ بس آپ خاموش ہی رہیں آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں جیسے کسی کے یہاں بہو آئی تھی وہ بولتی نہ تھی ساس کو بہت رنج تھا کہ ہائے بہو گونگی آئی بولتی ہی نہیں جب ساس نے اس کو بہت سمجھایا بجھایا کہ لڑکیاں تو بولتی ہوئی اچھی لگا کرتی ہیں تو بولتی کیوں نہیں تو ایک دن آپ یہ بولیں کہ ساس سے کہنے لگیں کہ میں تم سے یوں پوچھوں ہوں کہ اگر تمہارا بیٹا مرگیا تو تم میرا دوسرا نکاح بھی کردو گی یا یوں ہی ساری عمر بٹھائے رکھو گی ساس نے کہا کہ بس بی تو چپ ہی رہا کر مہینوں میں بولی تھی تو یہ پھول جھڑے آگ کو نہ معلوم کیا تم ڈھاؤ گی ایسے ہی وہ طالب علم صاحب تھے کہ یا تو سوال ہی نہ کرتے تھے اور سوال کیا تو یہ کہ حضرت بھلا اگر آفتاب غروب ہی نہ ہو تو جیسے یہ قضیہ شرطیہ مہمل ہے جس میں مقدم کا وجود ہی نہیں ہوسکتا جبتک کہ عالم کا بقاء ہے اسی طرح اگر کوئی عورت یہ نیت کرے کہ مجھ کو اگر حیض و نفاس نہ آیا تو میں ساری عمر نماز پڑھتی رہوں گی یا کوئی یہ نیت کرے کہ اگر میں نہ مرا تو ساری عمر نماز پڑھتا رہوں گا یہ قضیہ بھی مہمل ہے جس کا شریعت میں اعتبار نہیں شرط وہی معتبر ہوسکتی ہے جس کا وقوع بھی عادۃً ہوتا ہو پس یہ عذر نیت دوام کو مانع ہے اور سفر و مرض نیت دوام کو مانع نہیں اس لئے جب وہاں دوام کی نیت ہوسکتی ہے تو ثواب بھی مرض و سفر میں اس نیت کی وجہ سے ملے گا اور عذر نسوانی اور موت قاطع نیتِ دوام ہیں اس لئے وہاں ان اعذار کے وجود سے ثواب منقطع ہو جائے گا یہ وجہ ہے حیض و نفاس کے سبب نقصان ہونے کی اور سفر و مرض کے سبب نقصان نہ ہونے کی خوب سمجھ لو۔

بحمد للہ اب یہ مبحث مکمل ہوگیا اور تمام شبہات زائل ہوگئے اور دلائل سے معلوم ہوگیا کہ عورتیں بھی کامل ہوسکتی ہیں یعنی کمال مکتسب ان کو حاصل ہوسکتا ہے گو اس کی ساتھ ایک نقصان غیر اختیاری بھی رہے اور ان کے لئے کمال کا طریقہ یہ ہے کہ اول تو وہ کتابیں دیکھیں جن میں مسائل و احکام شرعیہ کا ذکر ہے اُن کو دیکھ کر ہر عمل کے کامل کرنے کا طریقہ

معلوم کریں اور جن اعمال میں کوتاہی ہو رہی ہے اس کی اصلاح کریں یہ تو اصل طریق ہے اور اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے یہ طریق ہے کہ اگر کوئی کامل مرد اپنے محارم میں مل جائے تو اس کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں اس سے اپنے اخلاق وعادات کی اصلاح کا طریقہ پوچھ کر دل کی اصلاح کریں اور اگر کوئی مرد ایسا نہ ملے تو کسی کاملہ کی صحبت میں رہیں اگر کوئی کاملہ بھی نہ ملے تو اپنے گھر کے مردوں کی اطلاع اور اجازت سے کسی دوسرے بزرگ سے بذریعہ خط وکتابت کے اپنی اصلاح کا تعلق رکھیں اور اس کو اپنے حالات سے اطلاع دیتی رہیں جو کچھ وہ لکھے اس پر عمل کریں اور اپنے گھر ہی میں رہیں اس کے پاس جانے کی زحمت نہ اٹھادیں ہاں اپنے گھر پر بزرگوں کے قصے ان کے حالات اور ملفوظات اور ان کی تصانیف کا مطالعہ جاری رکھیں اس سے بھی وہی نفع ہوگا جو پاس رہنے سے ہوا کرتا ہے اور اگر مردوں میں سے بھی کسی کو بزرگوں کے پاس جانے کی فرصت نہ ہو وہ بھی اسی طریقہ پر عمل کریں جو میں نے عورتوں کو بتلایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس طرح ان کا بھی دین کامل ہو جائے گا۔

پس اصل طریقہ کمال فی الدین کا تحصیل تقویٰ ہے اور اس کی تیسیر وتسہیل کا طریقہ معیت کاملین ہے۔ یہ خلاصہ ہے تمام بیان کا اب میں ختم کرتا ہوں کیونکہ عصر کی نماز قریب ہے گو بعضے مضامین اب بھی ذہن میں باقی ہیں مگر اول تو وقت نہیں دوسرے ضروری باتیں بیان ہی ہو چکی ہیں اس لئے ان مضامین کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر کسی موقع پر دیکھا جائے گا۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔ آمین

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین
وصلی اللہ تعالٰی علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلی
الہ واصحابہ اجمعین

تمت بالخیر

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً"
(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا

وعظ ملقب بہ

نفی الحرج

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ــــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ ملقب بہ

نفی الحرج

این	متی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کیسے ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد	۹ محرم سنہ ۱۳۳۰ھ یوم یکشنبہ	تین گھنٹے			مولانا سعید احمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ		نو تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے ۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی اٰلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُؕ (ترجمہ:۔ اس نے تم کو مخصوص فرمایا اور اس نے تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی تم اپنے

باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اور اس اللہ نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے پہلے بھی اور بعد کو بھی تاکہ تمہارے رسولؐ گواہ ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہ تمہارا کارساز ہے، سو کیا اچھا کارساز ہے اور کیا اچھا مددگار ہے)

یہ آیت جو میں نے پڑھی ہے اس میں سے صرف جزو اول کا بیان کرنا مقصود ہے اور اس کا تعلق جمعہ کے مضمون سے ہے چنانچہ عنقریب معلوم ہو جائے گا اور یہی وجہ ہوئی اس کے اختیار کرنے کی کیونکہ کوئی نیا مضمون اس وقت ذہن میں نہیں آیا دو وجہ سے ایک تو اس لئے کہ کوئی مقام نہیں بدلا۔ نیز زمانہ بھی دوسرے وعظ کا پہلے کے قریب ہے تو زمان و مکان دونوں متحد ہیں اور ایسے موقع پر مجمع بھی اکثر ایک ہی ہوتا ہے تو سامعین بھی متحد ہیں اور اس خاص موقعہ کے اعتبار سے سامعین کے مناسب حال جو مضمون تھا وہ پہلے بیان ہو چکا اب کسی دوسرے مضمون کی ضرورت ذہن میں نہیں آئی لہذا اسی گذشتہ مضمون کے متعلق ایک مضمون کو بیان کرتا ہوں اور میں نے بانیٔ جلسہ سے عرض کیا تھا کہ ایک ہی جگہ دو بیان سے کیا فائدہ ہوگا مگر کوئی فائدہ بتلایا نہیں گیا میں نے یہ بھی پوچھا کہ آخر کیا بیان کروں تو یہ کہا گیا کہ اُسی مضمون کے متعلق بیان کر دیا جاوے جو جمعہ کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر اس کی بھی تعیین نہ بتلائی گئی مگر خود ہی اس کے مناسب مضمون میرے ذہن میں آگیا۔ اور ہر چند کہ ارتباط مضمون کے لحاظ سے مناسب یہ تھا کہ اُسی آیت کی تلاوت اس وقت بھی کی جاتی جو کہ جمعہ کو پڑھی گئی تھی اور اس میں سے یہ مضمون نکل بھی سکتا تھا جو آج بیان ہوگا۔ مگر اس میں استنباط کرنا پڑتا اور استنباط اس طور سے ہوتا کہ اس آیت کے اخیر میں ہے۔ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (اور بہت درگذر کر دیتے ہیں) اور عفو اثر ہے رحمت کا اور سہولت بھی رحمت ہی کا اثر ہے تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ سہولت کی رعایت کرتے ہیں اور کسی خاص جزو دین کے ساتھ خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں تو معلوم ہوا کہ دین کی ہر بات میں سہولت مرعی ہے تو استنباط اس طرح ہو سکتا مگر اس آیت میں استنباط کی ضرورت تھی اور یہاں صریح ہے پھر چونکہ قرآن سب ایک ہی ہے اس لئے اس آیت کو بھی یہی سمجھا جاوے گا کہ وہی ہے اس لئے تلاوت کے لئے اس آیت کو ترجیح دی۔

مضمون کا حاصل یہ ہے اور اسی سے تعلق بھی معلوم ہو جاوے گا دونوں ....

مضمونوں میں کہ جمعہ کے روز میں نے بیان کیا تھا کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے ہمارے اعمال کی خرابی سے آتی ہے اور اس کا علاج اعمال کی درستی ہے یا یوں کہیئے کہ ہمارے اوپر یہ مصائب دینی سستی کی وجہ سے ہیں۔

پس دین کو درست کیا جائے اس پر ایک اشکال بعض لوگوں کے دل میں وارد ہوا کرتا ہے وہ یہ کہ مرض کا سبب اور اس کا علاج دونوں معلوم ہوگئے مگر اتنی بات رہ گئی کہ تدبیر کبھی آسان ہوتی ہے کبھی دشوار تو جو تدبیر بتلائی گئی ہے اس میں قابل غور بات ہے کہ وہ آسان ہے یا دشوار ہم تو دیکھتے ہیں کہ سخت دشوار ہے۔ پس دوا تو بتلائی مگر ایسی جو امریکہ سے ملے گی اس تجویز کی تو وہی مثل ہوگئی کہ تاتریاق از عراق آوردہ شود مارگزیدہ مردہ شود۔ (جب تک تریاق عراق سے لایا جائے سانپ کا کاٹا ہوا مرجائے) دین کی اب بلاشبہ ایسی حالت ہوگئی کہ بالکل تباہ ہو رہا ہے مگر ساتھ ہی دیندار بننا بھی سخت دشوار ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اس کا مشاہدہ بھی ہو رہا ہے چنانچہ دیندار کو سخت دقتیں پیش آتی ہیں مال میں تو یہ کہ سود حرام ہے قمار (یعنی جوا) حرام ہے۔ رشوت حرام ہے یہاں تک تو زیادہ وحشت نہیں ہوتی کیونکہ بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سود بھی نہیں لیتے رشوت کا مال بھی نہیں کھاتے تو ان چیزوں سے اپنے دین کو بہت لوگ محفوظ سمجھتے ہیں لیکن ان میں وسعت اتنی ہے کہ بہت دور تک ان کا اثر پہونچتا ہے۔ اکثر لوگ سود صرف اس کو سمجھتے ہیں کہ روپیہ دے کر سوا روپیہ لے لیں، رشوت اس کو سمجھتے ہیں کہ ظلم کر کے کام کے عوض میں لیں۔ قمار اس کو سمجھتے ہیں کہ چت پٹ ہو جائے۔ مگر حقیقت میں یہ ابواب بہت وسیع ہیں پس جو لوگ ناواقف ہیں اُن سے یہ تو کہا ہی جائے گا کہ واقفیت پیدا کر لو اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ ہر معاملہ فاسدہ ربوا ہے علیٰ ہذا رشوت نام ہے ہر غیر متقوم چیز پر عوض لینے کا اور یہ بات جلدی سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ یہ تو ابواب فقہ کے متعلق ہے مگر میں ایک مختصر سا رسالہ بتلاتا ہوں جس میں رشوت کے متعلق اچھی تقریر آپ کو معلوم ہوگی اور اس رسالہ کا نام "ازالۃ الغشوۃ" جو تحذیر الاخوان کا ایک جزو ہے۔ یہ ایک رسالہ سود کے متعلق ہے۔ علیٰ ہذا قمار میں بھی بڑی وسعت ہے تو جان کا بیمہ وغیرہ یہ سب قمار میں داخل ہیں تو آمدنی کی اکثر صورتیں آج کل سود یا رشوت یا قمار میں داخل ہیں۔ (بقیہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

توجو دیندار بننا چاہے اس کو ہر جگہ دقت اور رکاوٹ پیش آتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے اپنے ورثہ کے لئے کچھ روپیہ جمع کرنا چاہا کہ پس دس روپیہ سالانہ یا ماہوار کسی کمپنی میں داخل کرتا ہے تاکہ ورثہ کو دو ہزار روپے اس کے بعد مل جائیں اتفاق سے ایک مولوی صاحب سے جو پوچھا تو انہوں نے ناجائز کہدیا یا دوسری صورت نکالی کہ پرامیسری نوٹ خریدے تھے ایک دوسرے مولوی صاحب نے اس کو بھی ناجائز بتلادیا گویا مولویوں نے عہد کرلیا ہے کہ ہر ایک بات کو ناجائز ہی کہو اسی سے لوگ متوحش ہیں علیٰ ہذا اور ابواب آمدنی کے کہ بکثرت حرام ہیں یہ تو مال میں دشواریاں تھیں۔ اب جاہ کی کیفیت سنئے کسی مولوی صاحب کی زبانی سن لیا تھا کہ من تشبہ بقوم فھو منھم (جس نے کسی قوم کا تشبہ اختیار کیا وہ اسی میں شمار ہوگا) اس پر کسی نے عمل بھی کرلیا اور کوٹ پتلون پہننا چھوڑ دیا مگر اب حالت یہ ہے کہ کوئی عزت نہیں کرتا نہ پلیٹ فارم پر نہ کہیں اب افسوس ہوتا ہے کہ اچھی دینداری اختیار کی کہ عزت وجاہ ہی جاتی رہی سقوں جولاہوں تک اس شخص کے مقابلہ کی جرات ہوگئی یہ جاہ پر اثر پڑا علیٰ ہذا ہر امر میں دیندار کو دقت ہی پیش آتی ہے اور ایک یہ اثر ہوا کہ دینداری اختیار کرنے سے پہلے تو سارے جاڑے تندرست رہتے تھے اب جو صبح کے وقت اٹھے اور وضو کرنا پڑا تو ساری سردی چھینکیں ہی آتی رہتی ہیں۔ ایک مولوی صاحب ہمارے دوست للت پور میں تھے ایک رئیس کے یہاں لڑکوں کو پڑھاتے تھے اور نماز بھی پڑھایا کرتے اتفاق سے ان لڑکوں کو زکام ہوگیا تو ان لڑکوں کی ماں مولوی صاحب کو کوسا کرتی تھی کہ اچھی نماز پڑھوائی کہ بچے بیمار ہی ہوگئے۔ اسی طرح روزہ ہے کہ بعض موسموں میں نہایت سخت ہوتا ہے کہ بجز پکے دین دار شخص کے ہر شخص رکھ نہیں سکتا اگر ایسا روزہ دوسری قوموں میں ہوتا تو ضرور وہ اس کو دوسرے موسم میں بدل دیتے۔ چنانچہ ایک مسلمان رئیس کسی بڑے انگریز حاکم سے ملنے کے لئے گئے تو اس انگریز حاکم نے پوچھا کہ نواب صاحب ہم آپ کو دُبلا پاتے ہیں اس کی کیا وجہ مسلمان رئیس نے جواب دیا کہ گرمی کا موسم ہے اور آجکل ہمارے یہاں رمضان کا مہینہ ہے ہم روزہ رکھتے ہیں، تو وہ کہتا ہے کہ آپ اپنے علماء سے کیوں نہیں درخواست کرتے کہ کمیٹی کرکے دوسرے موسم میں منتقل کردیں انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا دین کمیٹی پر نہیں تو روزہ میں یہ دقت پیش آئی کہ گرمی کے دن پہاڑ ہوتے ہیں پیاس کے مارے ہونٹ خشک ہیں

مگر کھانا پینا بند ہے یہ بھی کوئی مولوی صاحب فتویٰ نہیں دیتے کہ بجائے گرمی کے جاڑوں میں روزہ رکھ لینا۔ اب حج کی سنئے حج کرنے کے لئے جو گئے تھے وہاں کہیں آب و ہوا کے اختلاف سے بیمار ہو گئے کہیں کسی کو بدوؤں نے کوٹا پیٹا اب جو واپس آئے تو سب سے کہتے ہیں کہ حج کرنے مت جاؤ بڑی مصیبت کا سفر ہے۔ ان سب دشواریوں کو دیکھ کر اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے کہ علاج تو ٹھیک ہے مگر تلخ اتنا ہے کہ مرجانا سہل ہے تو وہ مثل ہوئی کہ پنچوں کا کہنا سر پر مگر پرنالہ ادھر ہی کو اترے گا۔ ایسے ہی مولویوں کا کہنا سر پر مگر ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

جب یہ اشکال ہے تو ہم دیندار کیسے بنیں یہ تو عقلاء کو اشکالات پیش آتے ہیں ایک جہلاء کو اشکال پیش آتا ہے کہ جب نماز وغیرہ دینداری کے کام شروع کئے مالی نقصان ہونا شروع ہو گیا۔ آج بھینس مر گئی کل بیل مر گیا دو چار دن کے بعد بیٹا مر گیا۔ ایک بڈھا دیہاتی تھا کہ بیٹے اس کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک مولوی صاحب نے اس سے کہا کہ کمبخت نماز تو پڑھ لیا کر پہلے ہی دن نماز پڑھی تھی کہ بھینس مر گئی۔ اس کے بیٹوں نے کہا باوا نماز مت پڑھا کرو۔ اس نے کہا تو پھر میری خوب خدمت کرو۔ انہوں نے وعدہ کیا اب جب ذرا خدمت میں کوتاہی کرتے وہ دھمکاتا کہ میں پھر نماز شروع کر دوں گا وہ ڈر جاتے اور خدمت شروع کر دیتے۔ مدرسہ جامع العلوم میں بعض خیرخواہوں نے یہ تجویز کی تھی کہ لوگوں کے گھروں میں مدرسہ کے نام سے گھڑے رکھ دیئے جائیں کہ اس میں روزانہ ایک چٹکی آٹے کی ڈال دیا کریں چند روز میں بآسانی طلبہ کے لئے بہت سا آٹا جمع ہو جائے گا۔ ان ہی گھروں میں سے ایک گھر میں اتفاق سے ایک لڑکا مر گیا انہوں نے مدرسہ کا گھڑا پھینک دیا کہ اس کی نحوست سے لڑکا جاتا رہا۔ اس پر مجھے ایک حکایت حیدر آباد کی یاد آئی کہ ایک بزرگ سے پیر پر پیر رکھ کر لیٹنے کی نسبت ایک شخص نے پوچھا کہ سُنا ہے کہ یہ طریقہ منحوس ہے حالانکہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اس طرح بھی لیٹتے تھے اور بعض احادیث میں اس طریقہ سے ممانعت بھی آئی ہے مگر ممانعت اس ہیئت کی ہے کہ جس میں بے پردگی ہو جاوے۔ اُن بزرگ نے جواب دیا کہ ہاں بھائی منحوس تو ہے ہی اور ایک یہی کیا ساری سنتیں اور

احکام شرعیہ منحوس ہیں رشوت کو حرام کر دیا یہ ایک کھلی نحوست ہے کہ مال نہ بڑھ سکا. زکوٰۃ واجب کردی یہ بہت ہی بڑی نحوست ہے کہ جو جمع کیا تھا اسے فضول خرچ کرا دیا نیز کبھی احکام شرعیہ کے ماننے والے کا امتحان بھی ہوتا ہے کہ یہ محبت سے احکام مانتا ہے یا محض دنیوی نفع کے لئے نیز کبھی حق تعالیٰ کو اس فرمانبردار پر یہ رحمت کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ دنیائے مضر سے اس کو بچاتے ہیں اس کے متعلق مجھے ایک حدیث یاد آئی کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں حاضر ہوا اور کہا اِنِّیْ اُحِبُّكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے آپؐ سے محبت ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا اِعْلَمْ مَا تَقُوْلُ کہ جو کہہ رہے ہو سمجھ کر کہو (مطلب یہ کہ میری محبت آسان چیز نہیں اس میں بڑی آزمائش ہوتی ہے) اس نے عرض کیا کہ واقعی محبت ہے آپؐ نے فرمایا کہ فَاَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا (یعنی فقر و فاقہ کے لئے اپنے پاکھر کو تیار کرلے) اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے اس کی طرف فقر و فاقہ اس طرح آتا ہے جیسا کہ سیلاب نشیب کی طرف دوڑ کر آتا ہے جو میری حالت ہے وہی تمہاری ہوگی اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی جس سے محبت کرتا ہے اسی کے ساتھ ہوتا ہے) اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی حالت کسی کو نہ بھی پیش آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محب کو اس حالت سے محبت تو ضرور ہوگی تو وہ اس کے آنے پر ہر وقت تیار تو رہے ہی گا. نیز جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں جب یہ شخص خدا تعالیٰ کا محبوب ہوگا تو وہ اس کو مضرات سے ضرور بچائیں گے. اور حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے خاص بندوں کو دنیا سے اس طرح بچاتے ہیں جیسے تم اپنے استسقاء کے مریض کو پانی سے بچاتے ہو اس لئے دین دار کو ایک بددین کی برابر تمول تو ہرگز نہیں ہوگا مگر اس کو ایک دوسری دولت ایسی ملیگی کہ یہ تمول اس کے سامنے گرد ہے اور وہ وہی دولت ہے جس نے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے تخت سلطنت چھڑا دیا مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ تخت چھوڑ دینا دولت باطنی کے ساتھ ہر ایک کو ضروری ہے. بات یہ ہے کہ اہل باطن دل سے تو ہمیشہ اس کو چھوڑ ہی دیتے ہیں یعنی اس کی طرف ان کو رغبت نہیں ہوتی پھر جو منتہی ہوتے ہیں وہ ظاہر میں اس کو نہیں چھوڑتے کیونکہ وہ متحمل ہوتے ہیں چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کے متحمل تھے مگر اب عموماً طبائع اس کے متحمل نہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی کی جیب کمزور ہو اور اس میں دس اشرفیاں اور دس روپے بھرے

ہوئے ہوں تو روپے کو نکال کر جیب سے الگ کر دیں گے اور اگر کسی کی جیب مضبوط ہے اس کو نکالنے کی ضرورت نہیں اسی طرح ایسے بتدی کو بھی اسباب ظاہرہ کا ترک کرنا زیبا نہیں جس سے آثار ترک کا تحمل نہ ہو سکے ایسے ہی موقع پر عالمگیر کا شعر ہے ؎

شنیدم ترک منصب کرد عاقل خاں بنادانی　　چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

(میں نے سنا کہ عاقل خاں نے نادانی سے ترک منصب کر دیا عاقل ایسا کام کس واسطے کرے کہ پشیمانی سے واپس آئے)

اسی وجہ سے ہمارے حضرت اقدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ نوکری خود نہ چھوڑو جب توکل غالب آجائے گا تو سارے اسباب خود بخود چھوٹ جائیں گے مگر چھوڑنے میں جلدی نہ کرے کہ پھر ندامت ہوتی ہے۔ غرض باطنی دولت والے کو تمول سے کبھی رغبت نہیں رہتی۔ لہٰذا وہ معنے تارک ہی ہوتا ہے مگر بعض اوقات ترک صوری میں بھی مصلحت ہوتی ہے اور چونکہ رغبت نہیں ہوتی اس لئے یہ شخص چھوڑ کر پچھتاتا بھی نہیں۔ بلکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر پھر ملتی تو اور نفرت زیادہ ہوتی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کے پاس سلطنت چھوڑنے کے بعد ایک وزیر آیا کہ آپ کے سلطنت چھوڑ دینے سے لوگوں کو قلق ہے۔ فرمایا الحمد للہ مجھے قلق نہیں فقیری میں بہت راحت ہے۔ اس نے پوچھا کہ فقیری میں کیا راحت ہے میں تو دیکھتا ہوں کہ سارا کام آپ کو خود ہی کرنا پڑتا ہے نہ کوئی نوکر نہ خادم اس میں تو سخت تکلیف ہے۔ جب اس نے بہت ہی اصرار کیا تو آپ نے اپنا ایک ظاہری تصرف دکھلایا کہ سمندر کے قریب جا کر ایک سوئی اس میں پھینک دی اور فرمایا کہ اے سمندر کی مچھلیو میری سوئی سمندر میں گری ہے نکال کے دیدو صدہا مچھلیاں چاندی سونے کی سوئیاں منہ میں لئے ہوئے کھڑی ہوگئیں آپ نے فرمایا وہی سوئی لوہے کی میری لادو۔ ایک مچھلی آئی اور وہی سوئی لیکر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت وزیر کو معلوم ہوا کہ اس فقیری سے حضرت ابراہیم کو اتنی عظیم الشان سلطنت حاصل ہو گئی ہے کہ ہر چیز ان کے کہنے میں ہے۔ اور یہ اس کے مذاق کے موافق آپ نے ایک مثال دکھلا دی ورنہ اصل دولت کے سامنے یہ کیا چیز ہے۔

ایک دوسرا واقعہ اور ہے وہ یہ کہ آپ نے وضو کے لئے پانی لینے کے لئے ڈول کنوئیں میں

ڈالا تو ڈول چاندی سے بھرا ہوا آیا' دوسری مرتبہ سونے سے بھرا ہوا آیا تیسری مرتبہ جواہرات سے تو آپ نے آسمان کی طرف منہ کر کے عرض کیا کہ میری تو نماز کا وقت جا رہا ہے اس وقت امتحان نہ لیجیے مجھے پانی کی ضرورت ہے اس سونے چاندی کو لیکر میں کیا کروں گا۔ تو ان دونوں حکایتوں سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ یہ حضرات دنیا کو چھوڑ کر پچھتائے نہیں بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا جتنی زیادہ ہوتی ہے اسی قدر زیادہ کوفت ہوتی ہے آخر کار چھوڑنی پڑتی ہے تو اصل تارک تو اہل تمول ہی ہیں اور تارکین میں سے کوئی بھی تارک نہیں کیونکہ ان کی اول سے یہی رائے ہوتی ہے کہ دنیا اس قدر جمع نہ کی جائے جس کو چھوڑنا پڑے تو عاقل کی آخری رائے یہی ہوتی ہے کہ اس کو چھوڑ کر ہلکا ہونا چاہیئے گو بعض کے لئے خدا تعالے کو منظور ہی یہ ہوتا ہے کہ دنیاوی تعلقات میں بھی پھنسے رہیں تاکہ مخلوق کو نفع پہونچے اور ان کی ظاہری و باطنی حالت کو درست کیا جائے جیسے کہ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم مگر یہ حضرات باوجود ان تعلقات کے بھی دنیا کی طرف دل سے مشغول نہیں ہوتے حضرات خلفاء کی یہ حالت تھی کہ پھٹے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور رعب تھا کسریٰ و قیصر پر تو اس قسم کا تعلق جو ان حضرات کو دنیا سے ہوتا ہے وہ تو عین عبادت ہے اس سے چنداں کلفت نہیں ہوتی۔ موجب کلفت و باعث خسارہ تعلق دنیاوی ہوتا ہے خیر یہ گفتگو تو استطرادی تھی اصل گفتگو یہ تھی کہ علاج تو مصائب کا دینداری ہے مگر اس علاج اور تدبیر پر یہ اشکال پیش آتا ہے کہ یہ تو سخت دشوار ہے کوئی آسان طریقہ بتلاؤ۔ اور اسی پر ایک دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ وہ آسان تدبیر بتلا دے کون۔ کیونکہ ہم شارع تو ہیں نہیں جو اس کو بدل دیں اور اگر بدلیں بھی تو ہمارے بدلنے سے ہوتا کیا ہے حق تعالے اس دین کے خود محافظ ہیں اگر ہم بدل بھی دیں گے تو مسلمان خود اس کو نہیں مانیں گے اور اگر کہو کہ خیر تم بھی مجبور ہو خدا تعالیٰ ہی کو آسان علاج بتلانا چاہیئے تھا تو اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ جس کو جرأت ہو جا کر خدا تعالے سے عرض کرے ہمیں اس کے جواب کی ضرورت نہیں مگر چونکہ ہم خدا تعالے کے غلام ہیں اور غلام سے آقا پر اعتراض سنا نہیں جاتا اس لئے ہم بھی جواب بتلاتے ہیں۔ مگر پہلے ایک سوال ہم آپ سے کرنا چاہتے ہیں پھر تمہارے اس سوال کا جواب خود بخود معلوم ہو جائیگا۔ اگر کسی مریض کیلئے

طبیب نے ایک نسخہ تجویز کیا ہو کہ اس کے مرض کے لئے وہی مناسب ہوا ور مریض یہ کہے کہ حکیم صاحب یہ تو بہت دشوار اور سخت علاج ہے کوئی آسان تدبیر بتلایئے غور کرکے فرمایئے کہ حکیم صاحب اس کو کیا جواب دیں گے ظاہر ہے کہ نسخہ چاک کرکے پھینک دیں گے اور کہیں گے معلوم ہوتا ہے تجھ کو مریض ہی رہنا پسند ہے جو ذراسی دشواری سے گھبراتا ہے۔ حکیم صاحب کو معالج ہونے کے لحاظ سے مرض کے مناسب تجویز کرنی چاہیئے سہل ہو یا سخت اور مریض کو اگر اپنا مرض زائل کرنا مقصود ہے تو اس مناسب تجویز پر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر سہولت و سختی پر اس کی نظر ہوگی تو حکیم بجز اس کے کہ اپنا نسخہ واپس لے لیگا اور کیا کرے گا۔ یہ تو حق تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ انہوں نے آپ کی اصلاح میں دریغ نہیں کیا ورنہ ان کو کیا غرض پڑی تھی جو کوئی دین دیدیتے اپنے لئے بے دین بنے تو اپنے لئے۔ جو اعمال تجویز کئے گئے ہیں وہ بالخاصہ ہمارے امراض کے لئے مفید ہیں اب کسی کو شفا ہی کی ضرورت نہ ہو تو اس کا کیا علاج۔ اور طالب شفا کو اس پر نظر کرنی کب زیبا ہے کہ یہ سہل ہے یا دشوار اس کو تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ میرے مرض کے لئے بھی یہ مفید ہے یا نہیں۔ تو اب عقلاء کو تو شک رہا نہ ہوگا کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ذاتی ہوتی ہے کہ اس کی جگہ دوسری چیز وہ نفع نہیں دے سکتی تو ان اعمال کا بھی ایک خاصہ ہے جو بدون ان کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور اگرچہ یہ بناء فاسد ہے کیونکہ متدین خوش عقیدہ خود خواص اشیاء ہی کا اس درجہ میں قائل نہیں کہ وہ اس کی خاصیت ذاتی ہو جس کا انفکاک نہ ہوسکے یا عموم نہ ہوسکے لیکن مدعیان عقل فلسفی طبع لوگوں پر تو یہ حجت ہے اس لئے الزام کے طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ جب یہ عذر علاج جسمانی میں کبھی نہیں کیا جاتا تو علاج روحانی میں سہولت و دشواری پر کیوں نظر ہوتی ہے البتہ متدین لوگوں کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ تو اعمال کی خاصیت بدلنے پر قادر ہیں ایک دشوار سے دشوار عمل کی خاصیت ایک آسان عمل میں پیدا کرسکتے ہیں طبیب ظاہری چونکہ تبدیل خاصیت سے مجبور ہے اس لئے وہ بجز اس کے کہ مریض طالب سہولت کو جواب دیدے اور کیا کرسکتا ہے مگر حق تعالےٰ تو قادر ہے اس لئے وہ سوال باقی ہے سو اُس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ بیشک خاصیت کے بدلنے پر قادر ہیں مگر جن حکمتوں کی وجہ سے وہ خواص ایک عمل میں رکھے ہیں بدلنے کی صورت میں وہ خاص حکمتیں باقی نہ رہتیں۔ اس سے آگے سرحد ملی ہوئی ہے قدرکی

اس میں ہم زیادہ گفتگو نہیں کر سکتے مگر ایک نظیر سے آپ اس کو کسی قدر سمجھ سکتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفۃ الارض بنانے کے لئے پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے عرض کیا تھا کہ یَسْفِكُ الدِّمَاءَ (خونریزی کرے گا) تو حق تعالیٰ نے فرشتوں کو دو جواب دیئے ایک تو حاکمانہ جواب دیا کہ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میرے معاملات کی تمہیں کیا خبر۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند (سلطنت کے رموز کو بادشاہ ہی جانتے ہیں) میں اپنے معاملات کا تم لوگوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ اور دوسرا جواب حکیمانہ دیا کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا الآیۃ کہ تمام اوصاف اور اسماء اور خواص اشیاء کے جن سے کہ ان کو کام پڑنے والا تھا تعلیم فرما دیئے تاکہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوں۔ خواہ وہ تصرف کسی قسم کا ہو کیونکہ تصرف ایک تو جمادات وغیرہ میں کرے گا اور ایک تصرف کرے گا خود انسان میں کہ اس کی اصلاح کریگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اصلاح وہی کر سکتا ہے جو خوب اچھی طرح محل اصلاح کے اوصاف وخواص سے واقف ہو۔ غرض سب سکھلا کر پھر فرشتوں پر پیش کیا اور پھر فرشتوں سے فرمایا کہ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَاءِ هٰۤؤُلَاۤءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ؕ اگر تم سچے ہو ان کے نام بتلاؤ اور اسماء کی تخصیص محض ذکری ہے مقصود مع اوصاف وخواص بتلانا ہے۔ پھر فرشتوں نے حق تعالیٰ سے اپنے عجز کا اقرار کیا اور کہا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا الآیۃ۔ پھر حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم ان کے نام بتلاؤ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (اے آدم تم بتلاؤ ان کے اسماء کو) پس آدم علیہ السلام نے سب بتلا دیا فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ جب آدم علیہ السلام نے نام بتلا دیئے تو قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ الآیۃ حق تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں تو خلاصہ یہ ہوا کہ خلافت کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ان کو تعلیم فرمائی۔ اب اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جو چیزیں آدم علیہ السلام کو بتلائیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے تھے یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو امتحان میں اس طرح شریک کریں کہ ایک کو تو اول بند رہویں مقالہ کی شکل اول خلوت میں سکھلا دیں اور دوسرے سے اسی شکل میں بغیر سکھلائے ہوئے امتحان لیں اس شبہ کا جواب سننے کے قابل ہے کہ یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تنہائی میں اسماء وغیرہ بتلائے تھے اور جب ثابت نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے

سامنے ہی بتلایا ہوا اور یہی احتمال خدا تعالےٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہوسکتی بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہوگئی کہ پندرھویں مقالہ کی شکل اول دونوں طلبہ کے سامنے بیان کی گئی اور امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت بتلا سکا اور دوسرا نہیں بتلا سکا تو اعتراض جو وارد ہوتا ہے اول صورت میں ہوتا ہے اس پر منع کافی ہے اور اگر وہ احتمال بالفرض راجح نہ بھی مگر احتمال تو ہے ہی کہ فہرست سب کے سامنے پیش ہوئی ہو اور نہ پھر بھی حضرت آدم علیہ السلام نے تو بتلا دیا اور فرشتے نہ بتلا سکے کیونکہ ہر علم کے واسطے استعداد کی ضرورت ہے اور اُن علوم کی استعداد بشر ہی میں تھی۔ مثلاً بھوک کی حقیقت کہ جبرئیل علیہ السلام نہیں سمجھ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی بوجہ عدم استعداد اس کی حقیقت نہ بتلا سکے تو حق تعالےٰ نے اس امتحان سے یہ بتلا دیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور وہی شرط تھی خلافت کی اب ایک شبہ اور رہا کہ جب آدم علیہ السلام نے ان کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھ سکے ہوں گے تو ان میں بھی استعداد ثابت ہوگئی مگر یہ محض لغو اعتراض ہے کیونکہ بتلانے کے لئے مخاطب کا سمجھ لینا لازم نہیں اور اسی لئے انبئهم فرمایا علمهم نہیں فرمایا تعلیم کے معنی ہیں سمجھا دینے کے اور انبار کے معنی ہیں اخبار کے یعنی تقریر کر دی گو مخاطب نہ سمجھا ہو۔ بہرحال استعداد کی ہر علم کے لئے ضرورت ہوتی ہے تو اس تقریر پر یہی اعتراض پڑتا ہے کہ اگر خدا تعالےٰ خاصیت ہی بدل دیتے اور وہ استعداد ملائکہ ہی میں پیدا کر دیتے تو وہ بھی تو سمجھ لیتے۔ جواب یہ ہے کہ خاصہ اس کو کہتے ہیں کہ اس ذات کے علاوہ کسی اور ذات میں نہ پایا جاوے۔ ورنہ خاصہ نہ رہے گا تو استعداد جو خاصہ بشر ہے ملائکہ میں کیسے پائی جاسکتی ہے اور اگر کہو کہ اون ہی فرشتوں کو بشر کر کے خلیفہ کر دیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے اس میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کو بشر کیوں نہیں کیا اس کی نسبت صرف یہی کہا جاوے گا کہ ؂

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ۔۔۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

(یعنی عشق و محبت کی باتیں کرو اور زمانہ کے بھید و اسرار کی ٹوہ میں مت لگو کیونکہ یہ عقدہ نہ کسی سے حل ہوا نہ کوئی حل کر سکے گا)

؂ بصیغۂ ماضی ۱۲

اور یہیں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شفقت ہے کہ مسئلہ قدر میں گفتگو کرنے سے منع فرمادیا کیونکہ اس میں سوالات کا انقطاع نہیں ہوتا۔ تو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول ہی میں فرمادیا (ع) اول ما آخر ہر منتہی ست (ہمارا شروع ہی ہر منتہی کا آخر ہے) غرض جو کام بڑے بڑے عقلاء ٹھوکریں کھاکر کرتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول ہی میں بتلادیا۔ پس اسی طرح اس سوال کا جواب ہم نہیں دے سکتے کہ خاصیت اعمال کی بدل دیتے جیسے وہاں فرشتوں کو بشر کردینے کا اعتراض تھا تو غرض یہ ہے کہ ہر گناہ کی ایک خاص خاصیت حق تعالے نے پیدا کردی اور اس کا ایک علاج مقرر کردیا تو اب یہ اعتراض لغو ہے کہ جو خاصہ نماز کا ہے وہ بدون نماز ہی کے کردیتے تو یہ اشکال بھی مندفع ہوگیا پس اب معلوم ہوا کہ اُن امراض کا علاج انہیں اعمال میں ہے اب وہ مثال توضیح کے لئے طبیب کی کافی ہوگئی کہ جیسے طبیب علاج کو خاص دوا میں منحصر کرتا ہے اور اس پر اعتراض کرنا لغو ہے اسی طرح خداتعالے پر یہ شبہ کرنا لغو ہے تو یہ اعتراض کہ خداتعالی نے اصلاح کو ان ہی موجودہ احکام میں منحصر کیوں کیا نہ خدا پر ہوسکتا ہے نہ مولوں پر کیونکہ اول تو مولوی احکام کو مشروع ہی کیوں کرتے اور اگر کرتے تو ان کے کرنے سے ہوتا ہی کیوں۔ بلکہ ایسا ہوتا جیسا کہ ایک رند نے کسی واعظ سے یہ سن کر کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی، کہا تھا کہ بارہا کردیم شد (ہم نے بارہا کیا ہے اور ہوگئی) اعمال کی صورت تو ہوجاتی۔ مگر واقع میں ان کی روح تو نہ ہوتی البتہ اس کا خدا کو بے شک اختیار تھا مگر اب تو وحی بھی منقطع ہوگئی، اب تو احتمال ہی نہیں اور وحی کے وقت بھی کیوں ہوتا۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ (اور اگر حق ان کی خواہشوں کے تابع ہوتا تو زمین و آسمان فاسد ہوجاتے) وہ قانون ایسا ہوتا جیسے بہت سے ڈاکو جمع ہوکر کہیں کہ ہم سے مشورہ کرکے قانون بناؤ کہ ڈکیتی کو جائز کہدو تو مجلس وضع قانون کی یہ کہے گی کہ اگر قانون تمہاری خواہش کے تابع ہو تو تمام عالم میں فساد ہوجادے گا۔ اسی طرح خداتعالے فرماتے ہیں تو معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ میں تبدل تو ہو نہیں سکتا تو یہ ہوس تو گئی مگر صرف یہ اشکال رہا کہ یہ دشوار تو ہے یہ ہے اشکال جو بہت بڑا عقبہ ہے

اور بھی مانع ہے مسلمانوں کو اتباع شریعت سے مسلمان دلائل سے مان تو ضرور جاتے ہیں خصوصاً انقلاب عالم کو دیکھ کر اکثر عقلاء اقرار بھی کرنے لگتے ہیں کہ شریعت کے چھوڑنے کی ساری خرابی ہے۔ مگر اقرار بھی اسی وقت تک ہے جب تک کہ الفاظ ہی الفاظ ہیں کچھ کرنا نہیں پڑا کیونکہ الفاظ تو شیریں ہی ہیں باقی کرنے کے نام صفر۔

مجھے الفاظ پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص مرا اس کا ایک بیوقوف بیٹا تھا جب وہ باپ مرنے لگا تو اس نے سوچا کہ یہ ہے بیوقوف اور آئیں گے تعزیت کرنے والے خدا جانے اون کی ساتھ کس بے تمیزی سے پیش آوے گا اس لئے ان کو مناسب دستور العمل سکھلا دینا مناسب ہے۔ پس اس نے وصیت کی کہ جو شخص آئے اس کو اونچی جگہ بٹھلانا اور اس سے نرم و شیریں باتیں کرنا اور اس کو قیمتی کھانا کھلانا اور بھاری کپڑے پہنکر اس سے ملنا اتفاقاً ایک شخص آپہونچا آپ نے حکم دیا کہ ان کو اونچی مچان پر بٹھلاؤ اور خود جوڑہ بدلنے گئے بھاری بھاری قالین اور دریاں لپیٹ کر تشریف لائے اب مہمان جو بات کرتا ہے اس کے جواب میں گڑ اور روئی ارشاد ہوتا ہے پھر کھانے کے وقت گوشت آیا ذرا سخت تھا مہمان نے شکایت کی تو آپ فرماتے ہیں میاں کے لئے پچاس روپیہ کا کتا کاٹ ڈالا آپ کو پسند ہی نہیں آیا۔ مہمان حیران ہے فعل عجیب ہے وجہ پوچھنے پر سب کی توجیہ فرمائی چنانچہ گڑ اور روئی کی وجہ نرم اور شیریں الفاظ کی وصیت بتلائی تو جیسے اس نے معنی سے قطع نظر کر کے صرف نرمی اور شیرینی پر دلالت کرنے والے الفاظ یاد کر لئے تھے ایسے ہی ہمارے بھائیوں نے محض الفاظ یاد کر لئے کہ مذہب ضروری چیز ہے اس میں پختگی کرنی چاہیئے۔ مگر میں ڈرتا ہوں کہ جب ان کو عمل کے لئے کہا جاوے گا اس وقت خامی ظاہر ہو اور پھر وہی سوال دشواری کا پیش کریں اس لئے ضروری ہے کہ عمل کے وقت کی دشواری کے متعلق ان کو بتلا یا جاوے کہ آیا دین دشوار ہے یا نہیں سو ایک جواب تو معروض ہو چکا ہے اگر دشوار بھی ہو تو خواص مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل کے لئے قبول کرنا چاہیئے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ واقع میں دین میں دشواری ہی نہیں۔ یہاں اسی جواب کو فرماتے ہیں کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اللہ تعالے نے تم پر دین میں تنگی نہیں کی ہے) اور کیسی بے فکری سے کہتے ہیں آخر

خدا ہیں تا اگر کوئی بندہ ہوتا تو ایسے موقع پر کہ ایک عالم دشواری کا مدعی ہو خدا جانے کتنی تمہیدوں کے بعد جواب دیتا۔ یہاں ایک دم سے نہایت پرزور لہجہ میں حرج کی نفی فرمادی اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بڑا انجینئر جرثقیل سے ایک بڑے بھاری بوجھ کو اٹھا رہا ہو اور ایک گنوار کہے کہ اس کو یہیں رہنے دو کہ مصلحت ہے تو وہ نہایت لاپروائی سے کہے گا کہ نہیں یہ وہیں جاوے گا۔ اور خدا کی تو بڑی شان ہے ان کو وجہ بتلانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب اہل تحقیق اپنی خاص شان میں ہوتے ہیں تو محض عوام کے نہ ماننے کی ضرورت سے اسرار و نکات و وجوہ نہیں بتلایا کرتے۔ ہاں کبھی اس کے پر پرزے بھی بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالے نے بھی کہیں کہیں بیان کئے ہیں۔ اس لئے محققین نے کہا ہے کہ ؎

با مدعی مگوید اسرار عشق مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے عشق و مستی کے اسرار نہ کہو اس کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو)

بخلاف غیر محقق کے کہ اس پر جب اعتراض ہوتا ہے وہ بھڑک اٹھتا ہے اور زور شور کی تقریر شروع کر دیتا ہے اور محقق بھڑکتا نہیں بلکہ سارے جوابوں کو طے کر کے اوپر پہونچتا ہے اس لئے بعض اوقات جواب ہی نہیں دیتا پس جواب نہ دینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو جواب سے نیچے ہو کر جواب تک نہ پہونچا یا اوپر ہو کہ اس سے بھی عبور کر گیا ہو محقق کی یہی شان ہوتی ہے۔ پس خدا تعالے کا کلام کہیں تو حکیمانہ ہے اور کہیں حاکمانہ اور یہ حاکمانہ طرز زیادہ شفقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ حکیمانہ جواب میں ذرا اجنبیت ہوتی ہے جیسے ایک تو طبیب کہے کہ فلاں وجہ سے مضر ہے اس کو نہ کھاؤ اور ایک باپ کہے کہ خبردار اس کو مت کھاؤ اور اگر وہ وجہ پوچھے تو کہے گا کہ بکو مت بس مت کھاؤ۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ بڑا سخت باپ ہے تو غلطی ہے بلکہ وہ بڑا شفیق باپ ہے تو حاکمانہ انداز بڑی شفقت کی دلیل ہے تو حق تعالے حاکمانہ فرماتے ہیں مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (اور اس نے تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) تو اصل میں تو مجھے اس کا بیان کرنا ہے مگر اس سے پہلے ایک ایسا جملہ حق تعالیٰ نے

فرمایا ہے کہ اگر اس کو ذہن میں رکھ لیں تو پھر جواب میں تفصیل ہی کی ضرورت نہ رہے وہ جملہ یہ ہے هُوَ اجْتَبٰكُمْ کہ اس نے تم کو مخصوص بنا لیا ہے مقصود یہ کہ کیا ہمارے خاص ہو کر تم ہماری بات نہ مانو گے ایک تو مخصوص کہنے میں یہ اثر ہوتا ہے دوسرے خود مخصوص ہونے میں ایک خاص مناسبت بھی ہو جاتی ہے جس سے خود بھی وہیں پہونچنے لگتا ہے جہاں پہونچنا مقصود ہے جیسے ایک نوکر کہ وہ گھر کا کام کرتا تھا اور پوچھ پوچھ کر کرتا تھا اس کے بعد آپ نے اس کو خاص کر لیا کہ وہ آپ کے گھر کے مشورے بھی سنتا ہے تو اس کو احکام کے اسرار بھی معلوم ہونے لگے ہیں تو خصوصیت میں یہ خاصہ ہے خاصکر جو کہ خدا کا مخصوص ہے اس کی تو علوم میں یہ حالت ہو جاتی ہے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (اور ایسی جگہ سے روزی دیتے ہیں جہاں گمان بھی نہیں ہوتا) اور علوم باطنہ میں یہ حالت ہو جاتی ہے ؎

بینی اندر خود علوم انبیا بے کتاب و بے معید و اوستا

(تم کو بے مددگار اور بغیر استاد و کتاب کے انبیاء جیسے علوم حاصل ہوں گے)

اور یہ تفسیر نہیں ہے مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کی محض مثال ہے لیکن اگر کوئی اس لطیفہ کو آیت کے عموم کی تفسیر بھی کہے تو گنجائش ہے چنانچہ بعض مفسرین نے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں) میں اُس کے عموم سے رزق سے فیض علمی مراد لیا ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی رزق کو دنیا کے رزق سے عام لیا ہے يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ (رزق دیا جاتا ہے ان کو اس حال میں وہ خوش ہیں) تو اسی طرح اگر کوئی اس آیت میں بھی رزق سے علم مراد لے لے تو جائز ہے۔ نیز مشاہدہ بھی ہے کہ حق تعالے کے مخصوصین علوم میں خود وہاں تک پہونچتے ہیں جہاں اہل نظر نہیں پہونچتے۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں بلکہ پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا مگر مولانا کا علم اُن کے رسائل سے ملاحظہ فرمالیجئے۔

ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک مضمون نیا بیان کیا کسی نے حاضرین

یں سے کہا کہ یہ مضمون تو ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی بیان فرمایا تھا ارشاد فرمایا جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں ہی سے وہ بھی فرماتے تھے مگر اتنا فرق ہے کہ اُن کے لئے سمندر کی برابر کھلتا تھا، ہمارے لئے سوئی کے ناکہ کی برابر کھلتا ہے۔ تو جب یہ بات ہے تو اب ایسے شخص کو دلائل کی کیا ضرورت ہے مجھے علم مکسوب اور علم موہوب پر ایک مثال یاد آئی۔ ایک سیاح امیر عبدالرحمٰن کی فراست کی حالت بیان کرتے تھے کہ میں نے ایک رقعہ چند مشوروں پر مشتمل تنہائی میں لکھ کر پیش کرنے کے ارادہ سے جیب میں رکھ لیا۔ قبل اس کے کہ میں پیش کرتا انہوں نے خود ہی سب مضامین کا جواب دے دیا کہ بعض خیر خواہوں کی ایسی ایسی رائے ہے مگر اس کا یہ جواب ہے مجھ کو حیرت ہوئی۔ جب دربار برخواست ہوا تو میں نے کہا کہ امیر صاحب کیا آپ کو کشف ہوتا ہے، انہوں نے فرمایا کہ نہیں میں کیا صاحب باطن ہوں جو کشف ہوگا عقل سے ادراک ہوجاتا ہے اور عقل اور کشف میں تھوڑا ہی فرق ہے کہ کشف مشابہ ٹیلیفون کے ہے کہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے اور عقل مشابہ ٹیلیگراف کے کہ ذرا غور سے معلوم ہوتا ہے۔ واقعی عجب مثال ہے۔ کلام الملوک ملوک الکلام تو حق تعالٰے ان کو گویا ٹیلیفون سے بتلا دیتے ہیں فرق یہ ہے کہ ٹیلیفون میں تو خاص متکلم کی آواز ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ آواز سے پاک ہیں تو علم بالکنہ کا جو نتیجہ ہوتا وہ اس کو حاصل ہوجاتا ہے۔ پس هُوَ اجْتَبٰكُمْ (اس نے تم کو مخصوص بنالیا ہے) کو اس طرف اشارہ کرنے کے لئے مقدم فرمایا۔ اور اس میں یہ بتلا دیا کہ اگر اسرار شریعت جاننا چاہتے ہو تو خدا کے برگزیدہ بنو اور خدا کا برگزیدہ ہونا تو بڑی بات ہے۔ بزرگوں کے پاس بیٹھے بلکہ ان کا چہرہ دیکھنے سے بہت شبہات کا حل ہوجاتا ہے۔ مولانا رومی نے سچ فرمایا ہے ؎

اے لقار تو جواب ہر سوال — مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

(آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے بلا شبہ آپ سے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے)

میرے ایک ہم وطن جو کہ اس وقت انگلستان میں ہیں وہ مجھ سے نقل کرتے تھے کہ میں

یس ایک وقت باندہ میں تھا وہ انگریزی میں بڑے ذی استعداد ہیں اور نوکری میں ایسے خوش اقبال کہ جب کوشش کی فوراً ہی چار سو پانچسو کے نوکر ہو گئے مگر بے استقلالی کے سبب ان کو کبھی نوکری سے انتفاع نہیں ہوا۔ غرض ذکی بہت ہیں مگر علم دین سے واقف نہیں اس لئے یہ واقعہ ہوا کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام کی تاریخ دیکھ رہے تھے اور رمضان کا روزہ بھی تھا اس میں تھا کہ ایک جگہ گئے اور کسی کافر بادشاہ کے پاس پیام بھیجا کہ یا اسلام لاؤ یا جزیہ دو ورنہ قتال ہے ان کو شبہ ہوا کہ بس اسلام کی یہ قیمت ہے کہ بجائے اسلام کے جزیہ پر راضی ہو گئے حالانکہ اسلام کی تو وہ قیمت ہے کہ ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(اپنی قیمت دونوں جہان بتلائی ہے نرخ بڑھاؤ ابھی تک ارزانی ہے)

یہ محض شریعت کی رحمت عامہ ہے کہ اسلام پر جبر نہ کر کے جزیہ قبول کر لیا اور ان لوگوں کے حقوق برابر رکھے اور یہ شبہ ایسا بڑھا کہ اسلام کی حقانیت ہی کا انکار دل میں جم گیا۔ پھر خیال آیا کہ جب اسلام ہی کچھ نہیں ہے تو روزہ کیا چیز ہے آخر پانی پی لیا اس کے بعد رنج ہوا کیونکہ اسلام بہت مدت کا رفیق تھا۔ شام کو حسب معمول ایک دوست کے پاس پہنچے انہوں نے افطار میں شرکت کے لئے بلایا تو انہوں نے کہا کہ میری ایسی حالت ہے کہ اگر تم کو معلوم ہو جاوے تو پاس بھی نہ بٹھلاؤ انہوں نے کہا کہ بیش بریں نیست (اس سے زیادہ نہیں ہے) کہ تم کافر ہو گئے ہو گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے باقی اس کا اثر باہمی دوستی پر کیوں ہو یہ حکمت تالیف کیلئے کہا جب کھا پی چکے انہوں نے حقیقت پوچھی معلوم ہونے پر کہا ہماری خاطر سے تم مولانا فضل الرحمن صاحب سے مل لو یہ ہنسے کہ مولوی صاحب بجز قرآن و حدیث کے ان حقائق فلسفیہ کو کیا جانیں اور میرے شبہات کا کیا جواب دیں گے۔ مگر جس چیز کے نہ جاننے کو یہ نقص سمجھ رہے ہیں وہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار کہ تکرار میکنیم

(جو کچھ ہم نے پڑھا سب کو فراموش کر دیا بجز محبوب حقیقی کی باتوں کے ان ہی کا تکرار کرتے ہیں)

یہ شعر میں نے خود مولانا کی زبان سے سنا ہے۔ حقیقت میں علم تو وہی ہے ایک صوفی فرماتے ہیں ؎

علم نبود غیر علم عاشقی مابقی تلبیس ابلیس شقی

(ترجمہ: علم عاشقی کے علاوہ جو بھی علم ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے)
اور وہی کہتے ہیں ؎

اَیُّھَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَہ کُلَّمَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَہ

(جو کچھ مدرسہ میں علم حاصل کیا وہ وسوسہ تھا)

پس یہ تو اپنے علم پر فخر کرتے ہیں مگر عام لوگ اس کو ذلیل کہتے ہیں کہ یہ کیا جانیں سوائے قرآن و حدیث کے۔ حالانکہ تمام دنیا کے فلسفی قرآن و حدیث کے آگے گرد ہیں آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بڑے بڑے فلسفی آئے مگر سب ساکت تھے غرض انہوں نے غایت تحقیر سے کہا کہ مولانا کیا جانیں' انہوں نے کہا تم میری ہی خاطر سے جاؤ تو سہی انہوں نے کہا کہ خیر تمہاری خاطر چلا جاؤں گا' آخر گئے اور ادب کے سبب زیادہ رستہ پیدل قطع کیا اور اسی حالت ہجوم اعتراضات میں پہونچے اور خوب منصوبے سوچ رکھے تھے کہ یہ کہوں گا وہ کہوں گا۔ جاکر کہا السلام علیکم مولانا نے سلام لیکر فرمایا بولو کیا شبہ ہے بیان کرتے تھے کہ اب جو اعتراض سوچتا ہوں اس کا جواب ذہن میں موجود اب مولانا تو تقاضا فرمارہے ہیں اور یہ گم سم حیران۔ خلاصہ یہ کہ کچھ بھی نہ رہا قلب صاف ہوگیا آخر میں انہوں نے عرض کیا کہ مجھ کو بیعت کر لیجئے کہتے تھے کہ مجھ سے عمل میں تو بڑی بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں لیکن عقاید کے متعلق کبھی کوئی وسوسہ تک اس روز سے نہیں آیا۔ مجھ کو یہ حکایت اس پر یاد آگئی کہ ؎

اے لقار تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے۔ بلاشبہ آپ سے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے)

یہ برکت ہے اہل اللہ سے تعلق رکھنے کی خود بھی اس کا اہتمام کیجئے اور اپنی اولاد کے لئے اس کا انتظام کیجئے اور اگر عذر ہو کہ وہ انگریزی پڑھتے ہیں ان کو اتنی فرصت کہاں تو میں اس کی ایک سہل اور مختصر صورت بتلاتا ہوں کہ صرف تعطیلات میں اپنے بچوں کو کسی بزرگ کے پاس بھیجدیا کیجئے اور خود بھی رہ لیا کیجئے۔ اور میں اس کا اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ تعلیم انگریزی یا نوکری نہ چھڑا دیں گے۔ بلکہ اگر آپ خود بھی چھوڑنا چاہیں گے تو وہ نہ چھوڑنے دینگے

کیونکہ وہ حکیم ہیں سمجھتے ہیں کہ ضعفاء کے لئے نوکری چھوڑنے میں زیادہ مفاسد ہیں۔ غرض تمام ترو جہ آپ کے شبہوں کی یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت معلوم نہیں تو جب بزرگوں کے قرب میں انکشاف حقیقت کا اثر ہے تو خدا کے قرب میں تو یہ اثر کیسے نہ ہوگا۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ تم مجتبیٰ (مخصوص) بنو اگر کہو کہ خدا تعالیٰ نے تو مجتبیٰ بنا لیا چنانچہ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ کا یہی ترجمہ ہے پھر ہم کو کیا ضرورت ہے تو سبحان اللہ اگر کوئی کہے کہ شام کو فلاں شخص نے تمہاری دعوت کی ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہی خود تمہارے منہ میں بھی دے گا اس نے تو تمہارے لئے سامان کیا ہے باقی کھاؤ تم خود اسی طرح اجتباء کا سامان تمہارے لئے کر دیا ہے باقی اس کو حاصل کرو تم۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک گوجر کے یہاں ایک موٹو تی پیر آیا گوجر بولا اب کے تو بہت ہی دُبلے ہو رہے ہو پیر صاحب بولے تم نماز نہیں پڑھتے تمہارے بدلے میں پڑھتا ہوں تم روزہ نہیں رکھتے میں ہی رکھتا ہوں علیٰ ہذا سب اعمال۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پلصراط پر جو کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے تمہارے عوض چلنا پڑتا ہے تو کہاں تک دُبلا نہ ہوں گوجر بولا بہت ہی کام کرنا پڑتا ہے جاؤ میں نے فلاں کھیت تجھے دیدیا پیر خوش ہوئے کہا کہ قبضہ کرا دے وہ ساتھ چلا۔ دھانوں کی پتلی پتلی ڈولیں ہوتی ہیں ایک جگہ پیر پھسل کر گر گئے گوجر نے ایک لات دی کہ تو پلصراط پر کیا چلتا ہوگا جھوٹا ہے میں ایسے جھوٹے کو کھیت نہیں دیتا۔ اب وہ کھیت بھی چھین لیا اور چوٹ بھی لگی۔ تو اسی طرح اب اگر کوئی چاہے کہ مجتبیٰ تو ہم ہوں مگر کام سارے کوئی دوسرا کرلے۔ نہیں بلکہ طریقہ بتلا دیا اب تم کرو۔ یہ سب ھُوَ اجْتَبٰکُمْ (اس نے تم کو مخصوص بنالیا) کے متعلق بیان تھا اب اس مقصود یعنی نفی حرج کے متعلق عرض کرتا ہوں وہ عرض یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ دین میں دشواری ہے اس کے معنی کیا ہیں کیونکہ اس کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہے تو اسلام میں کونسی دشواری ہے آیا یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔ مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا وقت دس بجے سے ہے تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی چھوڑ نہ دیا۔ تو جب قانون کی پابندی

ہو گی اس میں دشواری ضرور ہو گی تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں لَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى (خواہش کا اتباع مت کرو) اور اس سے صاف اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (بلا شبہ وہ (نماز) دشوار ہے بجز خدا سے ڈرنے والوں پر) غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے یہ تو سب ہی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے احدیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے۔ مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا۔ ایک سوار ادھر سے گذرا لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوار ذرا یہ بیر جو میرے سینے پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈال دو اس آرام طلبی سے سخت حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ یہ حیرت ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے، وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی آپ کو کیا خبر یہ میری ساتھ کیسا ہے۔ کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا مجھ کو جو جمائی آئی اُس سے منہ کھل گیا ایک کتا آ کر منہ میں موتنے لگا یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے۔ میں سر د راس کے منہ میں بیر دوں گا۔ سوار حیرت میں غرق ہو گیا اور لاحول پڑھتا ہوا چلدیا۔ تو حضرت اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو تو کھانا بھی مشکل ہے ہمارے ایک عزیز دو بھائی ہیں ایک چھوٹے ایک بڑے۔ بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھے جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا۔ تو ایسی نظیریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے۔ اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو مگر اس کو کسی نے نہ کہا کہ بڑا سخت قانون ہے وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے اس لئے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جو ڈکیتی پیشہ ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک جماعت بیہودوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے مگر یہ ان کو گراں ہے۔ تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں تو محض پابندی سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔

پھر اسلام ہی پر کیوں اعتراض ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت تو تسلیم اور یہ سختی نہیں مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے تو واقعی یہ دشواری دشواری ہے مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوئی ہے قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے مثلاً یہ قانون ہو جاوے کہ اگر چھٹانک بھر سے زیادہ کوئی کھاوے تو پھر پھانسی ہوگی یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی سب کو تکلیف ہو۔ اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجاوے وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو اُن کو دوسروں کی وجہ سے ضرور تنگی ہوگی کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشاء اُن باغیوں کی بغاوت مثلاً کوئی اگر ایسی جگہ پہونچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں اور یہ شخص وہاں پہنچکر کوئی چیز خریدے اور دام دیدے پھر اس سے کہا جائے کہ گو قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لیکر پوری چیز دو مگر ہم اس قانون تو نہیں مانتے اس لئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہئے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا ان بدمعاشوں کی بدمعاشی قانون کا منشاء تو یہ ہے کہ سیر بھر کی سیر بھر دو مگر ان بدمعاش لوگوں نے بدمعاشی کی اور سیر بھر کی آدھ سیر دی تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے۔ اگر پچاس قیامتیں بھی آجاویں جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی آپ جن کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دیتا اور اپنے کئے کو اسلام پر تھوپتا ایسا ہے کہ

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(اے بیوقوف اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

مثنوی میں شیر کی ایک حکایت لمبی چوڑی لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا میں تمہارے راتب کے لئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا رستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا شیر کو غصہ آیا کہ بتلا وہ کہاں ہے اس نے ایک کنویں پر لیجا کر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا بس شیر اس کنویں میں جا کودا اندر پہونچکر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔ ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے بیوقوف اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا)

اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔ اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے ایک آئینہ دیکھا اس میں اپنی صورت نظر پڑی آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بدشکل تھا تب تو کوئی مجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔ ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا لوٹہ میں ایک ٹکڑا گر پڑا۔ جھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے۔ باپ سے کہا ابّا اس نے میرا ٹکڑا لے لیا۔ باپ چھینٹے اوٹھے جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل۔ بولے کہ لعنت خدا کی بڈھا ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا تُف ہے تیری اوقات پر سو وہ کس کو تف کہہ رہے تھے اپنے کو اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا اور وہ تنگی اپنی صفت تھی اس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت سختی کی اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر سب کی اجازت دیدے ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جاویں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی ممانعت ہوگی۔ اتفاق سے ایک دیہاتی پہنچا کہ صاحب کھاؤں کیا جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک وہ بولا یہ تو ملتا نہیں کہا مونگ کی دال، کہا یہ بھی نہیں ملتی، کہا فیرینی، کہنے لگا یہ بھی نہیں ہے پھر خود پوچھا بیگن کھا لوں کہا ہرگز نہ کھانا، کریلہ کو پوچھا اس کو بھی منع کیا آلو سے بھی روکدیا تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا یوں ہی ہے۔ دیہاتی نے باہر آکر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ وہ بھی نہ کھاؤ تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے یا یہ کہا جاوے گا

کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں کی سب کی اجازت دیدی لیکن وہ مقام ایسا کوردہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں تو یہ طب کی تنگی تو نہیں اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری سبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت یجوز (جائز ہے) کہیگی اور پانچ کو لایجوز (ناجائز ہے) لیکن اگر آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور بیس کو متروک کر دیں تو یہ تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانون شریعت کی۔ پس یہ الزام تو بحمداللہ بوجہ احسن واکمل رفع ہوگیا اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو علم دین پڑھئے اس سے معلوم ہوگا کہ شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسع کیا ہے۔ اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آگیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں مگر حالت موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے عارضی دشواری تو ہوگئی تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہونچ گیا' البتہ اعتقاد درست ہوگیا کہ شریعت میں دشواری نہیں۔ مگر عمل کس طرح کریں کیا لین دین چھوڑ دیں کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز معاملات اکثر ناجائز تجارت اکثر ناجائز تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے سو اس کے متعلق بھی سن لیجئے اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے غیر مسلم ہے سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے اور ایک وہ کہ ان کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے نماز روزہ رکھے حج کرے تکبر نہ کرے، باجا گاجا چھوڑ دے تو بتلایئے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے۔ تو اس میں تو آپ آج ہی سے اصلاح کر لیجئے۔ پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جاویں گے کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں کہ خواہ مخواہ آپ نے ان کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جاویں گے اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمال صالحہ کا موجود ہو چکا ہے اس لئے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قلیل ہیں درست فرمادیں گے جیسے ایک شعلہ جوالہ کو دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی مگر جب نور و ظلمت

جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے۔ اور اس درستی میں گو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید ہے پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے۔ ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں جاتا مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں خوب کہا ہے ؎

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(ہر چند بوڑھا اور بہت ناتواں ہو گیا ہوں جس وقت تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں)

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے، غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی مگر جب قوت ہوگی تو تمام موانع مضمحل ہو جاویں گے اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جاوے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے جیسے کسی نے یہ سنکر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے۔ غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ضعف جاتا رہتا ہے۔ یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی نہ ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جاوے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمتی چلی جاوے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جاوے گی اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی۔ اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹیں گے۔ اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو ٹل سکتے ہیں مگر ایک نہیں ٹل سکتا۔ تو کیا کوئی یہ کہے گا کہ

چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست (جب پانی سر سے گذرے کیا ایک نیزہ کیا ایک ہاتھ)

ہر گز نہیں بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے۔ تو اسی طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے۔ اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو اول تو چونکہ آپ کو شریعت کے احکام نہیں معلوم ہیں اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے سے تغیر سے

وہ ناجائز جائز ہو جاوے گا۔ مسئلہ اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اب اگر کہئے کہ صاحب اچھا مسئلہ سنا کہ نرخ کے حساب سے تو سو روپیہ کی چاندی ایک سو بیس بھر آتی مگر اب سو روپیہ کی سو ہی روپیہ بھر لی اچھا عمل کیا کہ بیس روپیہ کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کے لئے مولویوں کو خیرباد کہہ دیں گے تو سنئے بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ ان روپیوں میں ایک گنی بھی ملا لو تو ایک سو بیس بھر چاندی جو آدے گی تو بچاسی روپیہ بھر تو بچاسی روپیہ کی آدے گی اور باقی کو اس گنی میں شریعت محسوب کر دے گی۔ تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے۔ تو اب بتلائیے کیا نقصان ہوا اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں صاحبو پوچھتے تو رہو اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہہ دیں گے۔ کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے جائز کر دیں جیسا کہ ایک مطوف سے.... ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی سعی میں تھک کر کہا تھا کہ مولوی صاحب اب تو معاف کر دو۔ اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء ہند مثل بعض علماء مصر کے کر دیں ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز۔ تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں علماء سے جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اس کی تصدیق کر کے توجیہ کر دیا کرو چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے نکلا کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اس کے سم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سم اور ماتھے کا کیا جوڑ۔ نوکر بولا سچ ہے حضور وہ اس وقت سم سے پیشانی کھجلا رہا تھا۔ تو حضور علماء سے تو ایسی نوکری ہوتی نہیں نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کے کہ ہوں۔ تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہہ دیں۔ مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جاوے گا۔ تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا اس طرح ختم ہو جائے گا۔ ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جائیں گے کہ وہ بالکل

ناجائز ہوں گے مگر اس میں بھی دو درجے ہیں ایک تو وہ کہ اُس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں پس اس کو تو چھوڑ دیا جاوے کیونکہ اس کا چھوڑنا مضر حوائج ضرورتہ نہیں اور ایک درجہ وہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ دوسرے کام اس کے حوائج ضروریہ کو کافی نہیں تو بادلِ ناخواستہ اس کو کیے تے رہو اور گو یہ جائز تو نہ ہوں گے مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہوجاویں گے وہ یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنا چاہیئے ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کیا کرے۔ اب تو غضب یہ ہے کہ لوگ توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پچھتائے اور دعا کیجیئے کہ اے اللہ مجھے معاف فرمائیے مواخذہ نہ کیجیئے تو یہ کیوں نہیں کرتے کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہوجاؤ گے ہرگز نہیں بلکہ تم نوکر ہی رہو گے دوسرے یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ کوئی دوسری سبیل میرے لئے نکال دیجیئے تو اس میں یا تو کوئی سبیل نکلے گی اور جو کوئی دوسری سبیل نہ نکلی تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو لکھا جاوے گا۔ جری گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاوے گا اور یہ توسع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور اس توسع میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جاوے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہوجائے۔ مثلاً یہی کہ چلو آریہ بنیں تو یہ توسع ایں بلا دفع بلاہائے بزرگ (یہ بلا بری بلاؤں کو دفع کرنے والی ہے) کا مصداق ہے تو میں کفر سے بچا رہا ہوں کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اس کو سوجھتا ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے حضرت دعا فرما دیتے۔ ایک بار آ کر کہنے لگے کہ اب تو اس نے حد ہی کر دی اور جائداد غصب ہی کر لی ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کرو اس نے کہا بہت اچھا دفعۃً حافظ محمد ضامن صاحبؒ حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا ہرگز صبر مت کرنا جاؤ نالش کرو اور ہم دعا کریں گے اور حضرت سے

ہ واعظوا المفسد تیان ما بینہ توبیاً فی قولہ والحکمۃ فی اذنہ ثوابطالہ ان یکون ابلغ فی قطع عادتھم فی ذلک وزجرھم عن مثلہ ام ۔

فرمایا آپ تو صابر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے اس میں تو اتنی قوت نہیں یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستا وے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا، چوری کرے گا تو الیسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے تو یہ ہے اصل راز توسع کا تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ سنیں گے مگر یہ اس لئے ظاہر کردیا گیا کہ یہ کفر سے بچانا ہے لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معاصی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ چیز تو بہت اچھا ہاتھ آیا۔ بات یہ ہے کہ اول تو بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاصی میں اس کا توڑ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے اس میں یہ قید بھی تو لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو جیسے کوئی پائخانہ میں بیٹھا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انہوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے آخر ضرورت سے پائخانہ میں گئے تو چٹخنی لگ گئی اور ان کے کھولے نہ کھلی بڑا پریشان لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کردیا۔ آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم کھلائی یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پائخانہ ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں تو جس طرح وہ پائخانہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو کیا کوئی پائخانہ میں جاکر فخر کرتا ہے بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں بس اس کی یہ حالت ہوگی کہ ؎

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش　　　چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب وہ باندھ دیں بندھ جاؤ　　　جب کھولدیں چابک اور برجستہ ہوجاؤ)

تو نکلنے کی فکر تو کرو کوشش تو کرو گو کچھ امید نہ بھی ہو، اسی کو فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وارمی باید دوید

(اگرچہ عالم رخنہ نظر نہیں آتا لیکن یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے)

یوسف علیہ السلام کا قصہ یہ ہوا کہ جب زلیخا نے دروازہ بند اور مقفل کرلیا اور آپ نکلنے کے لئے دوڑے ہیں عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے اس کو فرماتے ہیں کہ ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وارمی باید دوید

(اگرچہ عالم میں کوئی رخنہ نظر نہیں آتا لیکن یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے)

اور اگر یہ بھی کہے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دو ڑا تکر بھی لگ گئی اتنے پر بھی فضل ہو جاوے گا اب بتلا ہے اس میں کونسی مشکل چیز ہے میں تو نوکری نہیں چھڑاتا مگر نفور رہیں سو یہ کیا مشکل ہے اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر نازہے بے باکی ہے سو یہ فخر کیسا اور تکبر کیسا اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے سو اہل اسباب کا علمار کی ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہوسکتی ہے تو اب کونسا مرتبہ اختلاف کا رہگیا۔ نرا قانون تو دشوار ہے نہیں اور قانون سخت نہیں صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہو جاتی ہے تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں محل ہی نہیں اور جو محل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہو سکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہو سکے وہ اولاً بہت مختصر تا نیا اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پچھتا تا اور تو بہ کرتے رہتا تو اب وہ کونسا جز ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہو گیا کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ الآیہ (اس نے تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) اس کے بعد ایک عملی مرحلہ دشواری کا اور رہ گیا مگر وہ بہت ہی معمولی۔ ہے وہ یہ کہ تدبیرات مذکورہ کے لئے جو ہمت کی ضرورت ہے اور لوگ ہمت سے کام نہیں لیتے حتیٰ کہ کم ہمتی کے سبب تو بہ تک کا ارادہ نہیں کرتے یا کرکے توڑ دیتے ہیں۔

ع۔ بہ شب تو بہ کردو سحر گہ شکست۔ (رات کو تو بہ کرلی صبح کو توڑ دی)

ایسے بہت سے لوگ ہیں تو اس کا صرف ایک علاج ہے وہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے اور کچھ علاج نہیں اب چاہے آپ مجاہدہ کریں یا وظیفہ پڑھیں اس سے فائدہ مطلوبہ حاصل نہیں مگر مشائخ کے یہاں آجکل وظیفہ بہت سستا ہے۔ نماز کی پابندی کے لئے ایک وظیفہ پھر اس وظیفہ کے دوام کے لئے ایک اور وظیفہ مگر بالکل بے جوڑ علاج بھلا وظیفوں کو ترک گناہ میں کیا دخل ہر چیز کا علاج الگ ہے وظیفہ صرف ذریعہ ہے غلبۂ ذکر علی القلب کے لئے بشرطیکہ دنیا کے لئے نہو باقی اگر ایک شخص کو عادت ہے لڑکوں کو دیکھنے کی تو یہ روزہ یا وظیفہ سے نہیں جاتی اگرچہ روزہ میں کمی شہوت کی ہوتی ہے مگر مجھ سے ایک ستر برس کے بوڑھے نے جو ایک اسلامی ریاست میں کلکٹر تھے شکایت امرد پرستی کی کی اور روتے تھے بھلا ستر برس کے بوڑھے میں کیا شہوت ہوتی تو وظیفہ سے

اس میں کیا ہوتا پس اس کا علاج یہی ہے کہ کسی اہل اللہ کے پاس چلا جاوے کہ ؎

گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

(اگر تو سخت پتھر اور سنگ مرمر ہو جب صاحب دل کے پاس پہونچے گوہر ہو جائیگا)

نفس نتواں کشت الا ظل پیری دامن آں نفس کش را سخت گیر

(نفس بلا پیر کی صحبت کے نہیں مرتا اس نفس مارنے والے دامن کو مضبوط پکڑو)

غرض اس کا علاج اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ کسی اہل اللہ کے پاس رہے مگر اس کے پاس رہنے کے کچھ آداب بھی ہیں وہ یہ کہ اس طرح سے رہے کہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ و حال پیدا کرو یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں گر پڑ جاؤ)

نیز اس کے ساتھ رہنے میں یہ ضرور ہے کہ جو کہے وہ کرو۔ اور اطمینان رکھو کہ وہ کہیگا ایسا کہ جو آسان ہو مگر نیت یہی رکھو کہ اگر سخت بھی کہیگا تو ہرگز خلاف نہ کریں گے۔ نیز اس کے زجر سے برا نہ مانو کیونکہ بعض امراض کا علاج یہی ہے۔ ایک صاحب نے میرے پاس ایک دفتر سوالات کا بھیجا میں نے لکھا کہ یہاں آؤ اور سمجھ لو۔ انہوں نے لکھا کہ آؤں گا مگر دو شرط سے ایک یہ کہ گفتگو کے وقت چلانا نہیں۔ دوسرے یہ کہ تمہارے گھر کا کھانا نہ کھاؤں گا۔ میں نے لکھ دیا کہ آؤ دونوں شرطیں منظور ہیں۔ آئے ملے میں نے کہا صاحب ایک شرط سے رجوع کرتا ہوں۔ یعنی یہ کہ چلانا نہیں میں ضرور چلاؤں گا کیونکہ بعض مرض کا علاج چلانا ہی ہے اور اس میں بڑی برکت ہے اور اگر یہ کہئے کہ دھوکہ دیکر بلایا تو اگر منظور نہیں آمد و رفت کا کرایہ لیجیے اور چلیئے آخر سیدھے ہو گئے میں نے کہا کھانے کی نسبت کیا رائے ہے کہنے لگے وہی پہلی شرط ہے میں نے کہا بہتر پھر میں اٹھکر گھر چلا آیا تو پیچھے سے انہوں نے ایک لڑکا بھیجا کہ میں نے اس شرط کو بھی چھوڑ دیا کھانا بھی کھاؤں گا پھر ان سے گفتگو کی اور تسلی ہو گئی اور میں نے ان کو نصیحت بھی کی کہ مختلف کتابیں نہ دیکھو۔ زیادہ خرابی اسی سے ہوئی ہے۔ غرض یہ ضرور ہے کہ اگر وہ ڈانٹیں تو برا نہ مانو ؎

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی پس کجا صیقل چو آئینہ شوی

(اگر ہر زخم یعنی مصلح کی ہر تنبیہ پر پر کینہ یعنی ناک بھوں چڑھاؤ تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہو سکتا ہے)

مولانا نے ایک حکایت بڑی عجیب لکھی ہے کہ ایک قزوینی کسی کے پاس گیا کہ میری کمر پر شیر کی تصویر

گود دے وہ گودنے بیٹھا۔ ایک جگہ سوئی چبھوئی چلایا کہ یہ کیا کرتا ہے اس نے کہا تیری فرمائش پوری کرتا ہوں۔ کہنے لگا کہاں سے شروع کیا ہے بولا دم سے کہنے لگا شیر بے دم سہی اس نے دوسری جگہ سوئی رکھی پھر چلایا کہ اب کیا بناتا ہے اس نے کہا شکم بولا شکم کیا ہوگا اس نے تیسری جگہ سوئی لگائی پھر چلایا کہ یہ کیا ہے بولا کہ کان کہنے لگا کہ کان بھی نہ سہی وہ گودنے والا بڑا پریشان ہوا سوئی پھینک دی اور کہا ے

شیر بے گوش وسرو اشکم کہ دید   ایں چنیں شیرے خدا ہم نا مرید

(شیر بغیر کان وسر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا)

یعنی خدا نے بھی تو ایسا شیر پیدا نہیں کیا اس پر مولانا فرماتے ہیں ے

چوں نداری طاقت سوزن زدن   پس تو از شیر ژیاں دم کم بزن

(جب سوئی چبھنے کی تم میں طاقت نہیں ہے تو شیر ہونے کا دعویٰ نہ کرو)

اور اسی مقام پر فرماتے ہیں ے

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی   پس کجا صیقل چو آئینہ شوی

(اگر ہر زخم پر تم پر کینہ ہو یعنی مرشد کی تنبیہ پر ناک بھوں چڑھاؤ تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہو سکتا ہے)

آخر نوکری کی خوشامد میں حکام کی ڈانٹ سہتے ہو اگر اصلاح باطن کے لئے شیخ کا زجر سہ لیا تو کیا بڑی بات ہے تو ان کے پاس رہنے سے اعمال صالحہ کا عزم قوی ہو جاتا ہے اور بری چیز دل سے نفرت ہو جاتی ہے اور پھر بڑے بڑے کام آسان ہو جاتے ہیں اور یہی مراد ہے ہمت سے اور راز اس کا یہ ہے کہ ان کے پاس رہنے سے یہ شخص صاحب محبت ہو جاتا ہے اور محبت کی خاصیت ہے کہ

ع: از محبت تلخہا شیریں شود (محبت میں سختیاں بھی گوارا ہوتی ہیں)

محبت وہ چیز ہے کہ میں نے ایک نوجوان کو اسی سفر میں دیکھا کہ وہ کسی رنڈی پر عاشق ہو گیا۔ کہتا تھا کہ راتوں کا جاگنا اور نماز کو جانا سہل ہو گیا اور پہلے فرض نماز کے لئے اٹھنا بھی دشوار تھا۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ یہ نفع عارضی ہے اور چونکہ نفع سے زیادہ اس میں مفاسد ہیں تو یہ ایسا ہے کہ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (ان دونوں (کے استعمال) میں بڑے گناہ ہیں اگرچہ لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں)

اس پر ایک اور واقعہ یاد آیا کہ میں ایک بار کاندھلہ گیا نماز عشاء کے بعد سونے کے متعلق یہ تجربہ

ٹھیری کہ مسجد کی سمت شمال کی طرف ایک سہ دری تھی وہاں سوئیں گے۔ اتنے میں محلہ میں سے ایک قاصہ کی آواز گانے کی آئی میں نے کہا اب یہاں نہیں رہوں گا کسی مردانے مکان میں سونے کا انتظام کیا جاوے میری ساتھ ایک صوفی آزاد تھے وہ وہاں ہی رہے اور صبح کو کہنے لگے کہ اس کی آواز سے آج نماز میں خوب یکسوئی ہوئی خطرات بالکل نہیں آئے۔ میں نے کہا کہ خیال کا نہ آنا کافی نہیں بلکہ دوسری طرف کا خیال آنا چاہیئے یعنی خدا کی طرف کا سو اس کی آواز اس سے بھی مانع تھی تو یہ مفسدہ اس منفعت سے بدرجہا زیادہ ہے مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی ایک ترک کی کہ اس کی مجلس میں مطرب نے اس قسم کی غزل گائی ؎

گلے یا سوسنے یا سرو یا ماہی نمیدانم — ازیں آشفتہ بیدل چہ میخواہی نمیدانم

(پھول ہے تو یا سوسن ہے یا سرو یا چاند۔ اس عاشق شفتہ سے تو کیا چاہتا ہے میں نہیں جانتا ہوں)

اور اسی طرح نمیدانم نمیدانم کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ اس ترک کو غصہ آیا اس نے ایک گھونسہ دیا اور کہا کمبخت کب تک نمیدانم نمیدانم بکے گا جو جانتا ہے وہ کہہ۔ تو مولانا اس مقام پر فرماتے ہیں کہ مقصود اثبات ہے نفی نہیں تو اس نفی خطرات سے چونکہ مفسدہ پیدا ہوا کہ اثبات اس مردار کا ہوا نہ کہ خدا کا اس لئے یہ نفی مقصود نہیں خدا کا اثبات مطلوب ہے جو کہ یہاں مقصود ہے تو جو حکایت اوپر بیان کی گئی کہ وہ عاشق ہوگئے اور نمازیں جانے لگے تو یہ کچھ بھی نہیں معصیت اگر ذریعہ بن جاوے عبادت کا تب بھی وہ معصیت ہی رہے گی چنانچہ اگر کوئی مسجد کے قرب میں ناچ کرانے لگے کہ اس بہانہ سے لوگ جمع ہوجاویں گے پھر ان کو مسجد میں لے چلیں گے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ جس کو صبح کو بھی اٹھنا مشکل تھا اب وہ عشق کی بدولت رات کو جاگتا ہے تو ؎

عشق مولےٰ کے کم از لیلےٰ بود — گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

(خدا کا عشق کیا لیلیٰ سے بھی کم ہو اس کے لئے تو کوچہ گردی کرنا زیادہ بہتر ہے)

اور سنو ؎

ترا عشق ہم چون خودی ز آب و گل — رباید ہمہ صبر و آرام دل

اور یہ حالت ہوتی ہے ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت — زر و خاک یکساں نماید برت

(ترجمہ: جب محبوب کی نظر میں تیرا تر رومال نہیں آتا تو تیرے نزدیک مال و زر اور خاک یکساں ہیں)
تو اس حالت پر نظر کرتے ہوئے ؎

عجب داری از سالکان طریق   کہ باشند در بحر معنی غریق

(تو سالکین طریق سے تعجب کرتا ہے جو کہ معنی اور حقیقت کے دریا میں غرق ہیں)

غرض محبت کا یہ خاصہ ہے اور اہل اللہ کے پاس بیٹھ کر خدا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے ہمت پیدا ہو جاتی ہے پس یہ تدبیر ہے ہمت کی اور ظاہر ہے کہ اس میں کچھ دشواری نہیں تو اب سارے مرحلے طے ہو گئے اور یہ صحبت اگر کسی سے متصل نہ ہو سکے تو مختلف زمانوں میں سہی یعنی جب کسی کو جتنا موقع اس کا ملے دریغ نہ کرے حق تعالیٰ مدد فرما دیں گے۔ اور مصاحبت کی دو صورتیں ہیں ایک تو زندوں کے پاس بیٹھنا اور ایک قبروں پر یہ بھی بزرگوں کا طرز ہے اور ہر چند کہ اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی مگر اب لوگوں نے اس میں غلطی کی ہے کہ انہوں نے قبروں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ دولت باطنی کا بھی اور ظاہری کا بھی مدار قبروں ہی پر سمجھ لیا ہے اور سب زندوں کو چھوڑ دیا اس لئے اس تقسیم کی تصریح کی تاکہ زندوں سے استغناء نہ ہو جاوے بلکہ اصل تو یہی ہے بلکہ اہل قبور سے مستفید ہونے کی شرط خود زندوں سے مستفید ہونا ہے اور ان کے مقابل بعضے وہ لوگ ہیں جو اولیاء ہی کے منکر ہیں اور بعضے فیوض قبور ہی کے منکر ہیں۔ میں نے ایک رسالہ دیکھا ہے ایک اہل ظاہر کا کہ اس نے استفادہ عن اہل القبور (اہل قبور سے استفادہ کی) کی نہی پر اس سے استدلال کیا ہے لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ (قبروں پر مت بیٹھو) تو جلوس سے مراد جلوس الاستفادہ لیا ہے حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں[1] میں نے ایک رسالہ لکھا ہے اس میں میں نے حدیث سے ثابت کر دیا ہے کہ اہل قبور سے فیض ہوتا ہے اور ہمارے بعض بیانوں سے شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ بزرگوں کے قائل نہیں کیا کہا جاوے یہ محض تہمت ہے آپ چاہتے ہیں کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بزرگوں کے بندے ہو جاویں سو یہ تو ہوگا نہیں۔ صاحبو میں تو آپ کو خود بزرگ بنانا چاہتا ہوں تو دیکھو بزرگ کاہے سے ہوئے ہیں صراحتاً سے میں اس کی تعلیم کر رہا ہوں۔ ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ملفوظات کے یاد کرنے سے چنداں نفع نہیں تم خود ایسے ہی کیوں نہ ہو جاؤ کہ تم سے ویسے ہی ملفوظات صادر ہونے لگیں۔ تو اس رسالے سے ہم لوگوں پر

[1] بلکہ اس کے معنی تغوط قبر پر ہے یا اس پر بیٹھنا جس سے اس کی اہانت ہے ۱۲

یہ شبہ بھی بزرگوں کے انکار کا رفع و زائل ہو جاوے گا اور بحمد اللہ وہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ ایک غیر مقلد نے مطبع میں وہ کتاب دیکھ کر ناظم مطبع سے کہا کہ مصنف کو لکھ دو کہ اس میں اختصار نہ کیجئے۔ اور ایک شخص میرے پاس آئے جو کہ بیعت کے منکر تھے وہ اس کو دیکھ کر خود بیعت ہو گئے اس میں ساڑھے تین سو حدیثیں ہیں اور ہر حدیث سے کم سے کم ایک مسئلہ تو ضرور ہی ثابت ہے اور بعض سے کئی کئی اس کتاب کا نام ہے تکشف اس کا منگانا ضروری ہے اور ایک رسالہ میرالقاسم میں نکلتا ہے اصلاح انقلاب اس سے ظاہری اعمال کی اصلاح ہوگی وہ بھی ضروری ہے۔

غرض اس کتاب تکشف میں یہ ثابت کیا ہے کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی پوچھے کہ حلوا کھانا جائز ہے یا نہیں تو ایک تو قانونی جواب ہے کہ جائز ہے اور ایک شفیق کا جواب ہے کہ مریض کو جائز نہ کہے اسی کو شیخ کہتے ہیں ؎

سماع اے برادر بگویم کہ چیست　　مگر مستمع را بدانم کہ کیست

(برادر سمع سننا میں بتلاؤں کیسا ہے مگر سمع سننے والے کو جان لوں کہ کون ہے)

اگر مرد لہوست و بازی و لاغ　　قوی ترشود دیوش اندر دماغ

(اگر مرد راہی اور لہو و لعب و بازی میں مبتلا ہے تو اس کی شیطانیت دماغ اور قوی ہو جاتی ہے)

اگر از برج معنی بود طیر او　　فرشتہ فرو ماند از سیر او

(اگر برج حقیقت سے ہے اس کی پرواز تو فرشتہ بھی اس کی سیر سے عاجز ہے)

چنانچہ ضلع بارہ بنکی کی حکایت ہے کہ ایک شخص کہتے تھے کہ ایک شخص نے عورت سے سماع سنا اور مجلس ہی میں سے اس کو ایک کوٹھری میں لیجا کر منہ کالا کیا۔ اور باہر آکر اپنی اس حرکت کی توجیہ کی کہ جب آگیا جوس نہ رہا ہوس۔ یہ دونوں لفظ چھوٹے سین سے فرمائے اور شیخ اس تفصیل کے بعد صاحب حال پر اعتراض کرنے والوں کو دفع کرتے ہیں ؎

مکن عیب درویش حیران و مست　　کہ غرق ست از آن میزند پا و دست

(بزرگوں کی ظاہری برائی دیکھ کر حیران نہ ہو خدا کی محبت میں غرق ہونے کی وجہ سے ہاتھ پیر مارتے ہیں)

یعنی اس پر اعتراض نہ کرو ایسی ہی تفصیل حضرت جامی فرماتے ہیں ؎

زندہ دلاں مردہ تناں را رواست　　مردہ دلاں زندہ تناں را خطاست

ترجمہ (زندہ دل مرد تنوں کے لئے روا ہے۔ مردہ دل زندہ تنوں کے لئے گناہ ہے)
تو غرض محققین کی عادت ہے کہ وہ ایک ہی فتویٰ سب کو نہیں دیتے۔ اس لئے طبیب سے جب حلوا کھانے کی نسبت پوچھا جاوے تو اس کو پوچھنا چاہیے کہ حلوا کون کھائیگا اگر معلوم ہو کہ مریض کھادیگا ناجائز کہدے اگر معلوم ہو کہ تندرست کھادیگا جائز کہدے۔ یہ ممانعت مریض کی سنکر اگر کوئی کہے کہ یہ تو حلوہ کے منکر ہیں کو کیسی بیوقوفی ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک نو عمر مولوی نے پوچھا کہ قبر والے سے فیض حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ کون فیض لینا چاہتا ہے انہوں نے کہا کہ میں مولانا نے فرمایا کہ نہیں ہوتا تو یہ ہے محققین کی شان۔ غرض فیض تو شرائط خاصہ سے ہوتا ہے لیکن ان کو کارفرما سمجھنا یہ تو صریح شرک ہے۔ رام پور کی ایک حکایت سنی ہے مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی کی کہ ایک پٹھان ملنے آئے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ خانصاحب کیسے فرصت ہوگئی آجکل تو آپ کو دیہات میں بہت انتظام کرنا ہوگا۔ تو خانصاحب بولے کہ انتظام تو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر آیا ہوں مولوی صاحب نے فرمایا آہا ہم تو ان کو دلی سمجھتے تھے مگر معلوم ہوا کہ پدھان ہیں۔ خانصاحب کو بہت ناگوار ہوا کہ انہوں نے بے ادبی کی مگر واقع میں بے ادبی تو خود انہوں نے کی تو بعضے آدمی سب کام اولیاء اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ میں نے مکہ مکرمہ میں دیکھا کہ ایک شاہ صاحب نے آکر حضرت کے بھتیجے حافظ احمد حسین صاحب کو کچھ روپیہ امانت کا سپرد کیا حافظ صاحب نے کہا اللہ کی سپردگی میں رکھ جاؤ تو آپ کیا کہتے ہیں کہ اللہ کے سپرد تو کرنا چاہیئے نہیں اور اس پر ایک مہمل حکایت بیان کی کہ کسی شخص کی ایک دوکان تھی وہ جب جاتا دوکان حضرت غوث اعظمؒ کے سپرد کرکے جاتا اس کا ایک بھائی تھا وہ ہمیشہ دل میں اس پر نکیر کرتا ایک بار یہ بھائی دوکان پر تھا یہ جب جانے لگا تو خدا تعالیٰ کے سپرد کر گیا۔ اسی دن چوری ہوگئی۔ دوسرے بھائی کو خبر ہوئی کہنے لگا تونے نادانی کی کہ اللہ میاں کے سپرد کی اللہ میاں کا تو کام یہی ہے کہ اس سے لیا اس کو دیدیا اور حضرت غوث اعظم تو محکوم ہیں یہ خلاف امانت کر نہیں سکتے۔ یہ حکایت ان شاہ صاحب نے حافظ احمد حسین صاحب کے سامنے بیان کی وہ بہت جھلائے کہ کوئی بڑا مردود ہوگا ایک مشکل ہم لوگوں کی ہے کہ ہم نہ وہابی نہ بدعتی ہمارا مشرب یہ ہے کہ اعمال ظاہرہ میں فقہاء کی تقلید کرتے ہیں اور اعمال باطنہ میں صوفیہ کی اور اعمال ظاہرہ میں صوفیہ کی تقلید نہیں کرتے مثلاً سماع وغیرہ کہ ان کو باطن میں کچھ دخل نہیں خواہ یہ جائز ہو یا ناجائز و ناجائز دونوں سے مرکب تو اس میں تو ہم فقہاء کے مقلد ہیں اور جو اعمال باطنہ ہیں اس میں ہم صوفیہ کے

مقلد ہیں۔ مثلاً ذکر جہر کو فقہاء مکروہ کہتے ہیں۔ اور صوفیہ جائز اور اس کو باطن میں دخل ہے تو اس میں ہم صوفیہ کے مقلد ہیں تو ہمارے بزرگوں کا مشرب حنفی صوفی ہے تو ایسے شخص کی کمبختی دونوں طرف سے آتی ہے۔ اب عرس میں شریک نہ ہوئے تو وہابی اور ذکر جہر کیا تو بدعتی ہونیکا اعتراض۔ اسی طرح فیض قبور میں نہ تو ہم ایسے قائل کہ سب کام وہی کرتے ہیں اور نہ اس کے قائل کہ اس سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ ضرور ہوتا ہے مگر فیض دو ہیں ایک تعلیم کا اور ایک تقویت نسبت کا تو تعلیم کا فیض تو قبور سے تو نہیں ہوتا یہ تو زندہ بزرگوں سے ہوتا ہے اس لئے کہا ہے کہ گربہ زندہ بہ از شیر مردہ (زندہ بلی مردہ شیر سے بہتر ہے) اور ایک درجہ ہے تقویت نسبت کا کہ کسی زندہ کی بدولت نسبت حاصل ہو گئی۔ اب اس کو بڑھانا چاہتا ہے تو یہ قبور سے ہو جاتا ہے تو جو صاحب نسبت نہ ہو اس کو تو چاہیئے کہ زندہ پیروں سے لے قبور سے لینے کی کوشش کرنا اس کو بے کار۔

ایک موضع ہے ضلع انبالہ میں "ہراس" وہاں مولانا رفیع الدین صاحب تشریف لے گئے وہاں کے متعلق بعض بزرگوں کو مکشوف ہوا ہے کہ بعض انبیاء کی قبور ہیں تو مولانا رفیع الدین صاحب گردن جھکا کر بیٹھے تھے بعضے طالب علم بھی اسی طرح بیٹھے میں نے کہا کہ اُدھر سے تو اندھے ہو ہی ادھر کی آنکھیں بھی کیوں بند کیں۔ تو زندہ بزرگوں کی خدمت میں رہ کر جب وہاں سے قابلیت دیکھ کر اجازت ہو تو اس وقت اس غرض سے قبور پر جائیں اور غیر صاحب نسبت تو فاتحہ پڑھ آوے کیونکہ یہ بھی ثواب ہے کہ کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھ کر چلا آوے۔ اور جو صاحب نسبت ہے اُس کا دوسرا حال ہے تو جس مرتبہ کا کوئی شخص ہو جو اس کو مناسب ہو اس کا التزام رکھے۔ یہ کلام تھا صحبت اموات میں باقی اصل طریق صحبت ہے احیاء کی اسی سے علم صحیح حاصل ہوتا ہے اُسی سے رغبت میں قوت ہوتی ہے جو شرط اعظم ہے سہولت اعمال کی جس کا راز وہی ہے جو عرض کیا گیا کہ اس صحبت سے محبت بڑھتی ہے اور محبت سے سہولت ہوتی ہے۔

الحمد للہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں تنگی نہیں کی) پر ہر پہلو سے کلام کافی ہو گیا اب ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ علم و عمل و توفیق ہو (پھر دعا کے بعد جلسہ ختم کیا گیا)

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

الباب

لاولی الالباب

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ناشر:- محمد عبدالمنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم اے جناح روڈ

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔

سلسلہ التبلیغ کا واعظ مسمّٰی بہ

الباب

لِاُولِی الْاَلْبَابْ

این	متی	کم	کیف	لِم	ماذا	من ذی شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کس مضمون کا تھا	کس نے فرمایا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
[illegible]	[illegible]	۲ گھنٹے	کھڑے ہو کر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	تقریباً ۵۰۰	[illegible]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ امابعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ــــ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَأْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥

(یہ کوئی نیک کام نہیں کہ تم گھروں کے پچھواڑے آیا کرو لیکن نیک کام یہ ہے کہ آدمی تقویٰ اختیار کرے

اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو)

یہ ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے اس میں ایک خاص واقعہ کے متعلق حق تعالےٰ نے خاص حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اس سے مجھ کو ایک ضروری مضمون مستنبط کرنا ہے جس کی ضرورت عنقریب واضح ہو جائے گی وہ مضمون ایک تفسیر پر تو آیت کا مدلول بھی ہے۔ بوجہ عموم الفاظ کے اور ایک تفسیر پر مستنبط ہے۔ پہلے واقعہ سن لیجئے تاکہ فہم مطلب میں سہولت ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بعض لوگوں کی عادت تھی کہ وہ حالت احرام میں اپنے گھروں کے اندر دروازہ سے نہیں داخل ہوتے تھے بلکہ دیوار پھاند کر یا دیوار میں سوراخ کر کے آتے تھے۔ اُن کا گمان یہ تھا کہ احرام تمتعات سے مانع ہے چنانچہ شریعت اسلامیہ نے بھی بعض تمتعات سے حالتِ احرام میں منع کر دیا ہے کہ خوشبو لگانا، سلے ہوئے کپڑے پہننا، سر ڈھانکنا، بال مونڈنا، خط بنانا، بیوی کے پاس جانا مُحرِم کو ناجائز ہے۔ اہل جاہلیت نے بطور غلو کے یہ سمجھا کہ جب احرام تمتعات سے مانع ہے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ گھر میں بھی نہ جائے بلکہ کھلے میدان میں رہے۔ کیونکہ گھر میں جانا اور محفوظ جگہ رہنا بھی ایک تمتع ہے۔ اور اگر کسی کو بہت ہی ضرورت گھر میں جانے کی ہو تو عادت کے خلاف کسی اور طریقہ سے جائے خواہ دیوار پھاند کر یا دیوار میں نقب دے کر۔ تاکہ اگر ترک کامل نہ ہو تو ہیئت معتادہ کا تو ترک ہو جائے کہ یہ بھی فی الجملہ ترک تمتع ہے۔ جاہلیت کے افعال کی وجہ بیان کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ اگر ان کے افعال کے لئے وجوہ معقولہ ہوا کرتے تو وہ افعال جاہلیت ہی کیوں کہلاتے لیکن اگر کسی فعل کی وجہ معلوم ہو جاتی جو ان کے ذہن میں وجہ تھی گو واقعہ میں وجہ بننے کے قابل نہ ہو تو اس کا بیان کر دینا مناسب ہے کیونکہ وجہ بتلا دینے سے اس کا جاہلیت ہونا زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ وجہ نہ بیان کرنے سے مخاطب کے ذہن میں اُس فعل کی وقعت رہ سکتی ہے کہ نہ معلوم اس فعل کی کیا وجہ ہو گی شاید کوئی معقول وجہ ہو اور بیان کر دینے کے بعد وہ وقعت زائل ہو جاتی ہے اور ہر شخص کو وجہ نامعقول ہو جانے کے بعد اس کا جاہلیت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ بہر حال ان کا خیال یہ تھا کہ دروازہ سے گھر میں آنا حالتِ احرام میں خلاف بِر اور خلاف تعبد و تقرب ہے اور جب یہ صورت خلاف بر ہے تو اس کی خلاف صورت

داخل بر ہوئی اور اگر بر نہ ہو تو احتمال بر تو ہے۔ پس اس مسئلہ میں ان لوگوں نے دو غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ ایک یہ کہ بحالت احرام دروازہ سے گھر میں آنا جائز تھا اس کو حرام سمجھا۔ دوسرے یہ کہ دیوار پھاند کر یا نقب دے کر آنا باعث ثواب نہ تھا اس کو ان لوگوں نے باعث ثواب سمجھا۔ اس لئے حق تعالےٰ نے اس کی نفی اس آیت میں فرمائی وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى۔ یعنی یہ کوئی نیک کام نہیں کہ تم گھروں میں پچھواڑے سے آیا کرو۔ ہاں لیکن نیک کام یہ ہے کہ آدمی ناجائز امور سے) تقویٰ اختیار کرے (اور دروازہ سے آنا ناجائز نہیں تو اس سے بچنا تقویٰ میں داخل نہیں،) وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى (لیکن نیک کام یہ ہے کہ آدمی تقویٰ اختیار کرے) دو توجیہیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ جانب خبر میں مضاف مقدر مانا جاوے یعنی لٰكِنَّ الْبِرَّ مِنْ اتَّقٰى (کہ نیکی اس شخص کی نیکی کو کہہ سکتے ہیں جو تقویٰ اختیار کرے) دوسرے یہ کہ جانب اسم میں مضاف مقدر ہو یعنی وَلٰكِنْ ذَا الْبِرِّ مَنِ اتَّقٰى اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا۔ لیکن نیک کام کرنے والا وہ ہے جو متقی ہو۔ اور حذف مضاف میں اس جگہ نکتہ یہ ہے کہ بطور مبالغہ کے یہ بتلانا ہے کہ بر اور متقی گویا متحد ہیں جیسے زَيْدٌ عدلٌ اور یہ محاورہ ہماری زبان میں بھی ہے چنانچہ بولتے ہیں کہ فلاں شخص سراپا اخلاق ہے، سراپا کرم ہے۔ اسی طرح محاورہ عرب میں بھی اطلاق مصدر کا ذات پر مبالغۃً ہوتا ہے جیسا اس آیت میں ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى یعنی سراپا بر وہ ہے جو متقی ہو۔ آگے بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ جب تقویٰ بر ہے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ بدعات جاہلیت سے بچا جائے اور اہل جاہلیت کی طرح اپنی طرف سے کسی کام کو طاعت یا معصیت نہ قرار دیا جائے۔ وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اور خدا سے ڈرتے رہو (یعنی تقویٰ اختیار کرو۔) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ سے ڈرتے رہو) میں تقویٰ عملی و اعتقادی دونوں کا امر ہے یعنی نہ اپنے عمل سے کسی جائز کام کو ناجائز اور مباح کو طاعت ظاہر کرو نہ اعتقاداً ایسا سمجھو بلکہ عمل اور اعتقاد دونوں کو حکم الٰہی کا تابع بناؤ۔ کہ حرام اسی کو سمجھو جس کو خدا نے حرام کیا ہے اور طاعت بھی اسی کو سمجھو جس کو خدا نے طاعت کہا ہے اپنی طرف سے طاعات و محرمات ایجاد نہ کرو۔ اس آیت سے ایک بات کام کی معلوم ہوئی وہ یہ کہ گو گھر میں دروازہ سے

جانا یا پشت کی طرف سے آنا عبادات میں سے نہیں ہے بلکہ گھر میں دروازہ سے آنا محض عادات میں سے ہے اور پشت کی طرف سے آنا عادت کے خلاف ہے لیکن اس آیت میں حق تعالےٰ نے اس عادت سے بھی تعرض فرمایا ہے کیونکہ لوگوں نے حالتِ احرام میں عادت قدیمہ کو ناجائز اور اس کی مخالفت کو ثواب سمجھ لیا تھا حق تعالےٰ نے اس سے منع فرمایا جس کا حاصل یہ کہ تم بلا دلیل شرعی کے کسی عادت کو حرام اور اس کی مخالفت کو ثواب کا کام نہ سمجھو اس سے معلوم ہوا کہ دین کا تعلق عادات و عبادات دونوں سے ہے اور شریعت دونوں میں تصرف کرتی ہے خواہ یہی حکم دیدے کہ یہ عادت جائز ہے کیونکہ مباح کا مباح ہونا یہ بھی ایک حکم شرعی ہے اور کسی امر کو مباح کرنا بھی ایک قسم کا تصرف ہے۔

چنانچہ جو لوگ کسی سلطنت کی رعایا بن کر رہتے ہیں وہ اس راز کو خوب سمجھتے ہیں کہ سلطنت بعض امور سے منع کرتی ہے اور بعض امور کی اجازت دیتی ہے۔ جس طرح کسی امر سے منع کرنا تصرف ہے اسی طرح یہ بھی تصرف اور دست اندازی ہے کہ اس نے بعض چیزوں کی اجازت دی ہے اب اگر کوئی شخص کسی کو ایسے کام سے روکنے لگے جس کی قانوناً اجازت ہے تو وہ اس پر دعوےٰ کر سکتا ہے۔ یا اگر کوئی شخص قانون میں ایک دفعہ زیادہ کر کے ان امور مباحہ کو ممنوع قرار دیدے تو خود سلطنت اس سے مواخذہ کرتی ہے کہ جس چیز کی ہم نے اجازت دی ہے تم نے اس کو ممنوع کیوں قرار دیا۔

بعض دفعہ پولیس کسی کی تلاشی لیتی ہے تو بعض کو تو سزا ہو جاتی ہے اور بعض کو چھوڑ دیتی ہے تو جس طرح سزا کرنا ایک تصرف ہے اسی طرح چھوڑ دینا بھی تصرف ہے۔ جب دنیوی سلطنت کا یہ حال ہے کہ اس کو تصرف اباحت کا بھی حق ہے تو حق تعالےٰ کو تصرف اباحت کا کیوں حق نہ ہوگا ضرور ہونا چاہیئے۔

پس دین کا تعلق عبادات و عادات دونوں سے ہے اب چاہے وہ بعض عادات کو مباح ہی کر دے یہ بھی اس کا ایک تصرف ہے۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت کو امور دنیوی سے اور عادات الناس سے کیا تعلق، شریعت کو محض عبادات سے بحث کرنی چاہیئے مگر یہ خیال غلط ہے کیونکہ اس میں در پردہ حق تعالیٰ کے وسعتِ اختیارات پر

اعتراض ہے کہ خدا تعالےٰ کے اختیارات اتنے وسیع نہ ہونے چاہیں کہ ہماری عادات میں بھی دخل دیں اور اس کا زندقہ ہونا بدیہی ہے۔ ان لوگوں نے ایک حدیث یاد کر رکھی ہے اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ سے فرمایا کہ دنیوی امور کو تم خود زیادہ جانتے ہو) اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی کاموں سے رسول کو کچھ واسطہ نہیں ہم ان کو خود زیادہ جانتے ہیں، میں اس دلیل کا بھی جواب دینا چاہتا ہوں اور وہ جواب خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے مگر لوگ حدیث کے الفاظ میں غور نہیں کرتے اس لئے اشکال پڑ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ یہی تو فرمایا ہے کہ تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔ یہ تو نہیں فرمایا کہ تم دنیوی امور میں خود مختار ہو کہ جو چاہو کرو۔ پس ثبوت علم سے ثبوت اختیار کیونکر لازم آگیا ذرا اس کی دلیل تو بیان کیجئے۔

دیکھئے اگر کوئی حاکم کسی کاریگر لوہار سے یہ کہے کہ بھائی ہتھیار بنانا تم ہم سے زیادہ جانتے ہو تو کیا اس کا یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ تم ہتھیاروں کے بارہ میں بالکل آزاد ہو کہ جس کو چاہو ہتھیار بنا کر دیدیا کرو۔ خواہ اس کے پاس لیسنس ہو یا نہ ہو یا جو ہتھیار چاہو بنا لیا کرو۔ چاہے قانوناً اس کی اجازت ہو یا نہ ہو۔ ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ حاکم کے اس قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا اسی طرح اس حدیث میں صرف اتنی بات ہے کہ دنیوی کاموں کا طریقہ اور ان کے آثار و خواص لوگوں کو زیادہ معلوم ہیں اور یہ بات اس حدیث میں کہاں ہے کہ دنیوی کاموں میں لوگ بالکل آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں کسی کام سے ان کو نہ روکا جائے گا کہاں اعلمیت اور کہاں تخییر علم سے اختیار کیونکر نکل آیا بلکہ اختیار کی نفی دوسری نصوص میں صراحۃً مذکور ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ جو چاہیں کیا کریں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ (اور آپ کا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے اختیار کرتا ہے) یعنی جس طرح صفتِ خلق میں کوئی اس کا شریک نہیں اسی طرح صفت اختیار میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہاں اختیار تکوینی مراد ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ (جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے) سے اختیار تکوینی خود ظاہر ہے۔ اگر يَخْتَارُ سے بھی اختیار تکوینی مراد ہوتا تو يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ کے بعد اس کی ضرورۃ

ہی کیا تھی معلوم ہوا کہ اختیار تشریعی مراد ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں مَا کَانَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ کہ بندوں کے لئے کچھ اختیار نہیں چونکہ اوپر یَخْتَارُ میں اختیار شرعی کا مراد ہونا متعین ہو چکا ہے اس لئے مَا کَانَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ (ان کو کچھ اختیار نہیں ہے) میں بھی اسی کی نفی مراد ہونی چاہیئے۔ اس صورت میں لام تعریف عہد کے لئے ہوگا۔ اور اگر لام جنس کے لئے مانا جاوے تو عموم کی وجہ سے ہر اختیار کی نفی ہو جاوے گی معنی یہ ہوں گے کہ اختیار تکوینی اور تشریعی دونوں خدا کے لئے مخصوص ہیں کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں نہ تشریعی نہ تکوینی۔ آگے فرماتے ہیں سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ یعنی خدا تعالٰی شرک تکوینی اور تشریعی دونوں سے پاک ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ یعنی خدا ہی کے لئے ہے خالقیت و آمریت۔ یہ آیت تو بہت زیادہ صریح ہے کیونکہ اس میں اختیار تکوینی کا احتمال بھی نہیں کیونکہ امر کا اطلاق جبکہ خلق کے مقابلہ میں ہے شریعت میں امر تشریعی ہی پر ہوا کرتا ہے۔ امر کے معنی حکم کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالٰی کے سوا حکم کرنے والا اور احکام مقرر کرنے والا کوئی نہیں خلق سے اختیار تکوین اور آمر سے اختیار تشریعی مراد ہے اور ان دونوں کو بصورت حصر خدا کے لئے ثابت کیا گیا ہے جس سے دونوں کی نفی ماسوا سے لازم آگئی۔ اور یہاں میں ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں نے اس آیت سے عالم مجردات کے وجود پر دلیل قائم کی ہے۔ عالم مجردات کو صوفیہ کی اصلاح میں عالم امر بھی کہا جاتا ہے اس لئے اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (خدا ہی کے لئے خالقیت و آمریت ہے) سے لوگوں کو دھوکہ ہوا اور انہوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ خدا ہی کے لئے ہے عالم خلق و عالم امر۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ قرآن کے مخاطب اول اہل عرب تھے اور وہ عالم امر کو جانتے بھی نہ تھے۔ یہ اصطلاح بعد میں حادث ہوئی۔ نزول قرآن کے وقت عالم امر کو کوئی جانتا بھی نہ تھا مگر لوگوں کی عادت ہے کہ اصطلاحات علمیہ کو یاد کر کے ہر جگہ انہی کو چلایا کرتے ہیں اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ علوم قرآنیہ کو علوم درسیہ سے مقدم کرنا چاہیئے بلکہ پہلے بھی علوم قرآنیہ کو پڑھیں اور خاتمہ بھی انہی پر کریں۔ نہ تو یہ کریں کہ علوم درسیہ کو سب سے پہلے پڑھیں نہ یہ کریں کہ علوم دینیہ سے بالکل فارغ ہو کر پھر علوم درسیہ میں مشغول ہوں کیونکہ پہلی صورت میں یہ اصطلاحات ذہن میں رچ جائیں گی۔

پھر ہر جگہ قرآن و حدیث میں وہی سوجھیں گی۔ حالانکہ قرآن و حدیث میں یہ اصطلاحات اور علوم درسیہ کام نہیں دیتے۔ اور دوسری صورت میں یہ خرابی ہے کہ جو علم اخیر میں پڑھا جاتا ہے دل پر اسی کا اثر رہ جاتا ہے پس معقول و فلسفہ کو سب سے اخیر میں پڑھنا بھی بُرا ہے بلکہ ان علوم کو وسط میں رکھنا چاہیئے ورنہ کم از کم دوش بدوش تو ضرور ہوں۔ اصطلاحات کے رچ جانے کا ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں۔

دیوبند میں جب میں پڑھتا تھا تو حضرت استاد (مولانا محمد یعقوب صاحب) علیہ الرحمۃ نے مجھے مسئلہ تصور شیخ لکھ کر نقل کے لئے دیا، میں اس کو نقل کر رہا تھا کہ ایک نو وارد طالب علم آئے جو اب تک معقول ہی میں منہمک رہے تھے مجھ سے پوچھنے لگے کیا لکھ رہے ہو۔ میں نے کہا مسئلہ تصور شیخ وہ بولے کیا شیخ بو علی سینا۔ بس ان کے نزدیک بو علی سینا ہی ایک شیخ تھا۔ کیونکہ معقول پڑھنے کی وجہ سے وہی دل میں رچ گیا تھا۔ پس ایسے ہی لوگوں نے جن کے قلوب پر اصطلاحات علمیہ رچی ہوئی ہیں اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اسی کے لئے ہے خالقیت اور آمریت) سے عالم امر و عالم مجردات کو ثابت کیا ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں عالم مجردات کا منکر ہوں بلکہ میرا مقصود یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں اس کو بیان کرنا غلط ہے باقی ویسے میں اس کا منکر نہیں ہیں اس کو مانتا ہوں کہ عالم مجردات موجود ہے لیکن اس کی دلیل نصوص قرآنیہ میں کہیں نہیں بلکہ مکاشفہ اس کی دلیل ہے یہ کوئی مسئلہ شرعیہ نہیں ہے جس کے لئے نصوص کی ضرورت ہو بلکہ اس کا تعلق مکاشفہ سے ہے جیسے امریکہ کا وجود شرعی مسئلہ نہیں ہے اسی طرح اس کو سمجھنا چاہیئے۔ پس جن لوگوں کے آنکھیں ہیں انہوں نے عالم مجردات کو دیکھا ہے چنانچہ صوفیہ کرام میں بعضے اصحاب کشف ہیں ان کو عالم مجردات منکشف ہوا ہے اور چونکہ ہم ان کو سچا سمجھتے ہیں اس لئے ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں باقی جو چیز مشاہدہ کے متعلق ہو اس کے لئے دلائل بیان کرنا غلطی ہے بس اس کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اگر کسی کے آنکھیں ہوں وہ خود دیکھ لے۔ رہا یہ کہ فلاسفہ نے تو اس پر دلائل قائم کئے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دلائل محض لچر ہیں سب بِنَاءُ الْفَاسِدِ عَلَى الْفَاسِدِ (فاسد کی بنا فاسد پر) چنانچہ طلبہ خوب جانتے ہیں۔ مگر وہ مجردات قدیم نہیں ہیں بلکہ حادث ہیں اور حادث بھی بالزمان جس کی دلیل

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ (اس کے لئے خالقیت ہے) ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام چیزیں مخلوق ہیں اس میں مثال بھی داخل ہے۔ اگر کوئی اس استدلال پر یہ شبہ کرے کہ اس آیت میں تو خلق مقابل امر کا ہے اس لئے یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ عالم کی دو قسمیں ہیں ایک حادث بالزمان جو عالم خلق ہے ایک غیر حادث بالزمان جس کا نام عالم امر ہے تو یہ احتمال اگرچہ غلط ہے مگر میں اس سے قطع نظر کر کے دوسری دلیل بیان کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (اللہ تعالیٰ ہر چیز کے خالق ہیں) دیکھو کل شئے میں مجردات بھی آگئے۔ اگر کہا جاوے کہ خلق ایجاد من العدم کے ساتھ خاص نہیں تو دوسری آیت لیجئے بَدِیْعُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ (آسمانوں اور زمینوں کے نمونہ پیدا کرنے والا ہے) ابداع اخراج من العدم ہی کے ساتھ خاص ہے اور فلاسفہ عالم مجردات و افلاک دونوں کو غیر حادث بالزمان کہتے ہیں اور فرق کا کوئی قایل نہیں۔ پس ایک کے ابداع سے دوسرے کے ابداع کا بھی قایل ہونا پڑے گا۔ پس فلاسفہ اور صوفیہ کے قول میں اتحاد نہیں۔ فلاسفہ عالم مجردات کو قدیم مانتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک کوئی مجرد حادث نہیں اور صوفیہ مجردات کے قایل ہیں مگر ان کو حادث بالزمان مانتے ہیں البتہ متکلمین تجرد کو اخص صفات باری تعالیٰ قرار دے کر ان کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا تمام چیزیں حادث ہیں اس کے قائل ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا مجرد ہی کوئی نہیں لہذا وہ عالم مجردات کے منکر ہو گئے مگر صوفیہ نے چونکہ عالم مجردات کو دیکھا ہے اس لئے وہ اس کے وجود کے قائل ہو گئے لیکن وہ اس کو حادث مانتے ہیں۔ فلاسفہ کی طرح قدیم نہیں مانتے۔ پس ان کے نزدیک تجرد حق تعالیٰ کے لئے اخص صفات سے نہیں بلکہ وجوب و قدم اس کے اخص صفات سے ہے پس مجرد تو غیر خدا بھی ہوسکتا ہے۔ مگر مجرد قدیم خدا کے سوا کوئی نہیں۔ اور یہاں سے بعض لوگ یہ سمجھ گئے کہ صوفیہ فلسفی ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ صوفیہ فلسفہ کی کچھ بھی وقعت نہیں سمجھتے وہ تو ہمہ تن شریعت کے متبع ہیں۔ البتہ جن امور سے شریعت نے سکوت کیا ہے ان کے متعلق بعض دفعہ وہ اپنے مکاشفات بیان کر دیتے ہیں چنانچہ عالم مجردات کا مسئلہ بھی محض کشفی ہے جو اتفاقاً فلاسفہ کے قول سے من وجہ موافق ہو گیا لیکن ہر عاقل جانتا ہے کہ توافق اور چیز ہے اخذ اور چیز ہے۔ صوفیہ نے اس مسئلہ کو فلاسفہ سے نہیں لیا بلکہ خود اپنے کشف سے معلوم کیا ہے جو لوگ اس

حقیقت سے نا واقف ہیں وہ صوفیہ پر فلسفی ہونے کا گمان کرنے لگے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے قرآن میں بعض باتیں تورات و انجیل کے موافق دیکھ کر یہ گمان کر لیا ہے کہ قرآن تورات و انجیل سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ توافق اور چیز ہے اور اخذ اور چیز ہے توافق سے اخذ کیونکر لازم آگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات و انجیل کو کبھی دیکھا بھی نہیں نہ آپ عبرانی اور نہ سریانی زبان کو جانتے تھے نہ اہلِ کتاب سے اختلاط کی آپ کو نوبت آئی پھر قرآن تورات و انجیل سے ماخوذ کیونکر ہو گیا۔ علاوہ ازیں بعض واقعات میں اہل کتاب نے تحریف و تبدیل بھی کر دی تھی جن کو قرآن میں صحیح طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اگر قرآن ان کتابوں سے ماخوذ ہوتا تو یہ واقعات قرآن میں بھی اسی طرح ہوتے جس طرح انجیل و تورات میں تھے حالانکہ عیسٰی علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کے واقعات قرآن میں ایسے طرز پر مذکور ہیں جن سے ان حضرات انبیاء علیہم السلام کی نزاہت و عصمت ثابت ہوتی ہے اور تورات و انجیل میں لوگوں نے نہ معلوم کیا گڑ بڑ کر رکھی ہے ان سے ہرگز ان حضرات کی عصمت و نزاہت ثابت نہیں ہوتی۔ پس جس طرح قرآن مجید کی نسبت یہ خیال غلط ہے اسی طرح صوفیہ پر بھی فلسفی ہونے کا گمان بالکل غلط ہے۔ غرض عالم مجردات کا وجود فی نفسہ صحیح ہے جس کے قائل بعض صوفیہ ہوئے ہیں اور متکلمین اس کے بالکل منکر ہیں مگر کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ اس کا قائل ہونا شرعاً لازم نہیں جیسے امریکہ کا قائل ہونا ضروری نہیں اور متکلمین کے منکر ہونے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اسی کے لئے خالقیت اور آمریت ہے) سے عالم امر مراد ہونا ثابت نہیں ورنہ وہ ہرگز انکار نہ کرتے۔ نص قرآنی کے ہوتے ہوئے متکلمین کبھی کسی مسئلہ کا انکار نہیں کر سکتے۔ خیر یہ توبیچ میں ایک جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ سے خالقیت و آمریت دونوں کا خدا کے لئے مخصوص ہونا معلوم ہو گیا۔ پس مخلوق کو نہ اختیار تکوینی حاصل ہے نہ اختیار تشریعی۔ بلکہ یہ دونوں اختیارات خدا تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں اور اسی کی فرع یہ بھی ہے کہ مباحات میں بھی تصرفِ شرعی کا اجرا ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ قاعدہ فقہیہ ہے اَلْاَصْلُ فِی الْاَشْیَاءِ الْاِبَاحَۃُ (اصل اشیاء میں اباحت ہے) جس سے معلوم ہوا کہ قبل شریعت کے بھی اباحت موجود تھی۔

پس اباحت کا وجود شریعت پر موقوف نہیں اِسکا جواب یہ ہے کہ اَلْاَصْلُ فِی الْاَشْیَاءِ الْاِبَاحَۃُ (اشیاء میں اصل اباحت ہے) یہ قاعدہ بھی تو شریعت ہی سے معلوم ہوا۔ تو اباحتِ اصلیہ کا ظہور بھی شریعت کے بتلانے پر موقوف ہوا۔ اگر شریعت یہ قاعدہ نہ بتلاتی تو اباحت اصلیہ کا ظہور کبھی نہ ہوتا۔ تو گویا قبل ورود شرع کے اباحت کا وجود اشیاء میں تھا مگر ظہور نہ تھا۔ شریعت نے اُس کو ظاہر کیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ظہور کے بغیر وجود بمنزلہ عدم کے ہے۔ پس یہ کہنا صحیح ہے کہ اباحت بھی شریعت ہی پر موقوف ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ اس دوا کو طبیب سے پوچھ کر استعمال کرنا چاہیئے نہ معلوم مُضر ہے یا نافع ظاہر ہے کہ نفع یا ضرر جو کچھ بھی ہے دوا میں پہلے سے موجود ہے طبیب اُس میں ضرر یا نفع پیدا نہ کرے گا مگر پھر بھی اس کا استعمال طبیب کی رائے پر موقوف ہے کیونکہ وہ مظہر نفع و ضرر ہے۔ اور یہاں تو خالق و مظہر دونوں حق تعالیٰ ہی ہیں پہلے خدا تعالیٰ نے اشیاء میں اباحت و حرمت پیدا کی پھر اس کو ظاہر کیا چنانچہ اس ظاہر کرنے ہی کا نام ورود شرع ہے پس یہ مسئلہ ثابت ہوگیا کہ حلال و حرام کرنا حق تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ چنانچہ ایک جگہ نہایت تصریح کے ساتھ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ط یعنی کسی چیز کے بارہ میں بدون علم کے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کیونکہ اس میں خدا تعالیٰ پر افترا باندھنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کسی چیز کو حرام کرنا خدا کا کام ہے جب ہی تو بلا دلیل حرام کہنا افتراء ہوگا۔ اسی طرح حلال کرنا بھی خدا ہی کا کام ہے پس وہ دعویٰ بخوبی ثابت ہوگیا جس کو میں نے شروع میں بیان کیا تھا کہ مباح کو مباح کرنا بھی ایک تصرف ہے اور دین کا تصرف جس طرح فرائض و واجبات و محرمات میں ہوتا ہے اسی طرح مباحات میں بھی ہوتا ہے اور لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (تاکہ کذب کا اللہ تعالےٰ پر افترا کرو) سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کو بدون علم کے حرام و حلال کہنا خدا پر افترا کرنا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں اگر حلال و حرام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عنداللہ حلال یا حرام ہے حالانکہ حکم شرعی ہم کو معلوم نہیں تب تو افترا ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ

مطلب ہے کہ یہ چیزیں خود بخود حلال وحرام ہیں بدون خدا کے حلال وحرام کئے تب بھی جھوٹ ہے کیونکہ خود بخود کوئی چیز حلال وحرام نہیں ہوسکتی چنانچہ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ کفار بھی اس خیال کے قایل نہ تھے وہ بھی جن چیزوں کو حلال وحرام کہتے تھے ان کے متعلق یوں کہا کرتے تھے وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا کہ خدا نے ہم کو اس کا حکم کیا ہے تو اتنی بات وہ بھی جانتے تھے کہ بدون خدا کے حکم کے حلت وحرمت کا ثبوت نہیں ہوسکتا. مگر افسوس آج کل بعض مسلمان اس خیال کے ہوگئے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کو دنیوی کاموں سے کیا تعلق ان میں ہم خود مختار ہیں جو چاہیں کریں گویا وہ امور دنیویہ کو خود بخود حلال سمجھتے ہیں. اس عقیدہ میں یہ لوگ کفار سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے. جیسے بعض کفار کی یہ حالت قرآن میں بیان کی گئی ہے کہ دریا میں سوار ہوکر جب طوفان میں مبتلا ہوتے ہیں تو خدا ہی کو پکارتے ہیں خدا تعالےٰ کے سوا کسی کو نہیں پکارتے اپنے سب معبودوں کو اس وقت بھول جاتے ہیں مگر ہم نے بعض مسلمانوں کو جہاز میں دیکھا ہے کہ وہ طوفان کے وقت یا غوثِ اعظم یا علی وغیرہ کہتے ہیں ان ظالموں کا شرک اس وقت بھی دور نہ ہوا جبکہ مشرکین کا شرک زائل ہوجاتا ہے تو یہ ان سے بھی بڑھ گئے. اسی طرح جو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ بعض چیزیں خود بخود حرام وحلال ہیں یا اپنی طرف سے ان کو حلال وحرام کہتے ہیں تو یہ خدا پر افترا وکذب کرتے ہیں کیونکہ قاعدہ ہے اَلشَّیْءُ اِذَا ثَبَتَ ثَبَتَ بِلَوَازِمِهٖ (کوئی چیز جب ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے) اور کسی چیز کے حلال وحرام ہونے کے لئے لازم ہے کہ خدا تعالےٰ اس کو حلال وحرام کریں اس لئے کہ حلت وحرمت حق تعالےٰ کا حق ہے تو جب اس نے خود کسی چیز کو بدون حکم خداوندی کے حلال وحرام کہا تو یہ شخص اس حق کو اپنے واسطے ثابت کرنا چاہتا ہے اور یہ بہت بڑا افترا ہے کہ اپنے کو خدا کا شریک بنا رہا ہے اس میں جھوٹ کے ساتھ بے حیائی اور بے شرمی بھی ہے جیسے ایک شخص کسی نواب یا رئیس کا مال چرا لادے اور یہ کہے کہ فلاں نواب صاحب نے یہ مجھ کو عطا کیا ہے اس نے جھوٹ تو بولا مگر نمک حرامی نہیں کی اس چیز کو نواب صاحب ہی کی طرف منسوب کیا کہ یہ اُن کی ہے مگر انہوں نے مجھے دے دی، اور ایک شخص چرا کر یہ کہے کہ یہ چیز میری ہے. یہ چور بھی ہے اور نمک حرام بھی

پس آجکل جو مسلمان خود بخود بعض چیزوں کو حلال وحرام کرتے رہتے ہیں وہ دوسری صورت میں داخل ہیں جس سے پہلے زمانہ کے کافر بھی بچتے تھے وہ کسی چیز کو از خود حلال وحرام نہ کہتے تھے بلکہ تحلیل وتحریم کا حق خدا ہی کے لئے مانتے تھے، ہاں ایک دعویٰ جھوٹا کیا کرتے تھے کہ اَللّٰہُ اَمَرَنَا بِهَا (خدا نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے) جس کا جواب حق تعالےٰ نے یہ دیا قُلْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ط کہ خدا تعالےٰ فحش وبے حیائی کا امر نہیں کیا کرتا اور جو کام تم کرتے ہو یہ فحش اور بے حیائی کے کام ہیں یہ ہرگز خدا کی طرف سے ماموروماذون بہا نہیں ہوسکتے۔ غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ تحلیل وتحریم خدا کا کام ہے بدون خدا کے بتلائے ہم کسی مباح کو مباح بھی نہیں کہہ سکتے خواہ وہ عبادات میں سے ہو یا عادات میں سے۔ پس لوگوں کا یہ کہنا کہ آجکل مولویوں کا ڈاڑھی رکھنے کو فرض کہنا تجارات ومعاملات میں دخل دینا کہ ناجائز اور حرام ہے جائز اور مباح ہے صحیح نہیں بالکل غلط ہے کیونکہ دین کا تعلق محض عبادات ہی سے نہیں ہے بلکہ وہ عادات میں بھی تصرف کرتا ہے اور اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم اپنی دنیا کے کاموں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو) سے استدلال کا جواب ہوچکا ہے کہ علم اور تخییر میں فرق ہے اور تفسیر حدیث کی آگے آتی ہے سو اس حدیث میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ امورِ دنیا میں تم خود مختار ہو۔ بلکہ اس کے خلاف دلائل صحیحہ سے ثابت ہے کہ امور دنیا میں بھی ہم لوگ خود مختار نہیں ہیں بلکہ حکم شرعی کے پابند ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کا پیغام نکاح زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے بھیجا۔ چونکہ حضرت زید لوگوں کی زبانوں پر غلام مشہور تھے واقع میں وہ غلام نہ تھے بلکہ شریف الاصل آزاد تھے لیکن بددوں نے ان کو کسی قافلہ سے پکڑ کر زبردستی غلام بنالیا اور بیع کردیا تھا اس لئے وہ غلام کے لقب کے ساتھ بدنام ہوگئے۔ جیسے بعض قصبات میں بعض شریف قوموں کے کچھ القاب مشہور ہوجاتے ہیں پھر لوگ ان کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح حضرت زید بھی بدنام ہوگئے تھے اس لئے حضرت زینب نے اور ان کے بھائی نے اس پیغام کی منظوری میں تامل کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ اور کسی مسلمان مرد یا عورت کو یہ اختیار نہیں کہ جب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کسی بات کا فیصلہ فرما چکیں تو پھران کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار نہ رہے۔ صاحبو! ظاہر ہے کہ پیغام نکاح کا منظور کرنا یا نہ کرنا عبادات میں سے نہیں ہے بلکہ یہ ضروریاتِ زندگی میں سے ایک امر ہے جیسے کھانا پینا۔ پھر اس میں عورت اور اس کے اولیاء کی رضا مندی بھی شرعاً وعرفاً ضروری ہے چنانچہ کفارت کا اعتبار خود شریعت نے کیا ہے لیکن با ایں ہمہ اس واقعہ میں عتاب نازل ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قطعی مرضی معلوم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو کچھ اختیار نہیں کہ وہ دنیوی امور میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کی مخالفت کریں۔ اگر دنیوی امور میں تخییر ہے تو یہ عتاب کیوں ہوا۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب شریعت نے کفارت کا لحاظ خود ضروری سمجھا ہے تو حضرت زینب اور ان کے بھائی پر اس لے لحاظ سے عتاب کیوں ہوا جواب یہ ہے کہ حضرت زیدؓ واقع میں کفو تھے لیکن انہوں نے محض ظاہری شہرت کی بناء پر ان کو کفو نہیں سمجھا۔ نیز یہ بھی نہ شبہ کیا جائے کہ حضرت بریرہؓ کے واقعہ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کچھ عتاب نہیں کیا حالانکہ انہوں نے مشورۂ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کی تھی۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ کے خلاف کرنے پر حضرت زینب اور ان کے بھائی پر کیوں عتاب ہوا۔ بات یہ ہے کہ واقعہ بریرہؓ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فیصلہ نہیں فرمایا تھا محض مشورہ کا درجہ تھا۔ اور یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دل میں یہ بات طے فرما چکے تھے کہ زید کا نکاح زینب سے ہو جائے اور اُن صحابیوں کو بھی قرائن سے اس کا علم ہو گیا تھا لہٰذا بعد معاملہ طے فرما دینے کے ان کو مخالفت کا حق نہ تھا اور اس کی دلیل خود قرآن کے الفاظ میں موجود ہے اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا (جب اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی بات کا فیصلہ کر دیں) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے اس معاملہ کو طے فرما چکے تھے۔ بہرحال اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ دنیوی امور میں بھی شریعت کا تصرف جاری ہے اور مسلمانوں کو اس کی مخالفت کا حق نہیں۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ ناتمام علم کافی نہیں۔ محض دو چار کتابیں پڑھنے سے انسان عالم نہیں ہو جاتا۔ آپ نے اس ناقص علم کی حالت دیکھ بھی لی کہ یہ لوگ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو) سے دنیوی امور میں

تخییر کے قائل ہوگئے یہ نہ دیکھا کہ دوسری نصوص سے اس کی نفی ہو رہی ہے اس لئے یہ مطلب صحیح نہیں۔ آجکل ہر شخص اپنے کو عالم اور مجتہد سمجھتا ہے مگر جب محقق کے سامنے وہ جاتے ہیں اس وقت ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارا علم سراسر جہل تھا اس لئے اپنے علم کو کسی محقق کو سامنے پیش کرو اگر وہ تصدیق کر دے تب اس کو صحیح سمجھو ورنہ وہ محض جہل ہے۔ صائب کہتے ہیں ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنے جوہر کسی صاحب نظر کو دکھلاؤ چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں بن سکتا)

چند احمقوں کے مولانا کہنے سے کوئی عالم اور مولانا نہیں ہو جاتا اس کے لئے کسی صاحب نظر کے پاس رہنے کی اور تصدیق کی ضرورت ہے۔ صاحب نظر کون لوگ ہیں یہ وہ کاملین ہیں جو شریعت و طریقت کے جامع ہیں ان کے پاس رہ کر دین سے ایک خاص ذوق حاصل ہوتا ہے۔ یہ ذوق محض کتابوں کے ترجمہ سے نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس کا طریقہ صحبت کاملین ہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو   پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو یہ اس وقت ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑ جاؤ)

صاحبو! علماء کے اندر بھی سب محقق نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے کوئی کوئی محقق ہوتا ہے ورنہ اکثر محض کتابی عالم ہوتے ہیں جن کو عبارتوں کا ترجمہ کرنا آتا ہے اور اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ میزان پڑھنے والے کو بھی مولوی سمجھتے ہیں اور جو درسیات سے فارغ ہو جائے وہ تو گویا رجسٹری شدہ مولوی ہے حالانکہ علم صرف اسی کا نام نہیں بلکہ اس کے بعد ایک علم اور ہے اس کے بعد آدمی محقق ہوتا ہے علم اور دین کا ذوق اسی کو عطا ہوتا ہے۔ عارف فرماتے ہیں ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتہ باریکتر زمو اینجا ست   نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(دلبری ہر وہ شخص نہیں جانتا جو چہرہ کو چمکالے نہ ہر وہ شخص سکندری جانتا ہے جو اپنے پاس آئینہ رکھتا ہو یہاں بال سے بھی زیادہ باریک ہزاروں نکتے ہیں قلندری ہر وہ شخص نہیں جانتا جو اپنا سر منڈا لے)

تعجب ہے کہ ہر فن میں تجربہ کی ضرورت مسلّم ہے ہر علم میں نو تعلیم یافتہ اور تجربہ کار میں فرق کیا جاتا ہے مثلاً نجار اور معمار اور طبیب وغیرہ جتنے پرانے تجربہ کار ہوں اسی قدر ان کی قدر زیادہ ہوتی ہے اور نو تعلیمیافتہ کو ان کی برابر ہرگز نہیں سمجھا جاتا حالانکہ کتابیں جتنی نئے طبیب نے پڑھی ہیں اتنی ہی پرانے طبیب نے پڑھی ہیں اور جو مسائل نجاری کے نئے نجار نے سیکھے ہیں وہی پرانے نے سیکھے ہیں مگر اس میں ایک بات زیادہ ہے یعنی تجربہ اس لئے اس کی قدر و منزلت زیادہ ہے مگر علمِ دین میں جو لوگ تجربہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے سب کو ایک ہی لکڑی ہانکتے ہیں ۔ تو کیا ان کے نزدیک علوم خسیسہ کے مسائل تو باریک باریک ہیں اور شریعت ہی کے مسئلے موٹے موٹے ہیں افسوس ان لوگوں کو شریعت کی حقیقت معلوم نہیں ۔ دیکھیے طب کی کتابوں میں ہر مرض کی دوا لکھی ہوئی ہے جن کو دیکھ کر ہر شخص بتلا سکتا ہے کہ اس مرض کی یہ دوا ہے مگر طبیب کی ضرورت پھر بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ تشخیص کون کرے گا کہ اس شخص کو فلاں مرض ہے فلاں مرض نہیں اسی کی تشخیص کے لئے اطبا کی خوشامد کی جاتی ہے ورنہ علاج کر دینا کیا مشکل ہے اسی طرح شریعت میں بھی تمام امراض روحانیہ کا علاج موجود ہے مگر طبیب روحانی کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ یہ تشخیص ہو کہ آپ کے اندر مرض کیا ہے نیز جس طرح اطبا کو پہلے زمانہ کے نسخوں میں اجتہاد کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ آجکل کے مزاجوں کے موافق نہیں ہیں اسی طرح اطبا روحانی کو بھی اس کی ضرورت پیش آتی ہے تو یہ کام ہر عالم تو نہیں کر سکتا یہ تو بڑا ہی تجربہ کار کر سکتا ہے ۔ اگر ناتجربہ کار یہ کام کرنے لگے تو وہ ضرور مخلوق کو تباہ کرے گا ۔

چنانچہ ہماری طرف ایک طبیب ہیں جو باقاعدہ طب پڑھے ہوئے نہیں ہیں نہ کسی کے پاس رہ کر مطب کیا ہے لیکن وہ علاج کرتے ہیں اور علاج کا طریقہ یہ ہے کہ مریض سے

کہدیتے ہیں کہ پہلے کسی ہوشیار طبیب سے مرض کی تشخیص کرالاؤ علاج میں کردوں گا۔ جب مریض کسی حکیم سے تشخیص کرالاتا ہے تو وہ کتاب دیکھ کر علاج کردیتے ہیں اگر کہیں مریض کو نقصان ہوا تو وہ یہ کہکر الگ ہوجاتے ہیں کہ صاحب فلاں حکیم نے تشخیص میں غلطی کی ہوگی باقی ہیں تے تو اسی مرض کا علاج باقاعدہ کیا ہے جو انہوں نے تشخیص کیا تھا بھلا یہ بھی کوئی جواب ہے۔ جو شخص مرض کی تشخیص نہیں کرسکتا وہ علاج کیسے کرسکتا ہے دوسرے کی تشخیص سے آپ کو مزاج کا درجہ اور تغیر اخلاط کی کیفیت کیسے معلوم ہوجائے گی اور جب یہ معلوم نہیں تو آپ نسخہ میں اس کی رعایت کیسے کریں گے جب اس کی رعایت نہ ہوگی تو مریض کو نفع کیسے ہوگا مگر آجکل ہر شخص مجتہد بنا ہوا ہے جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں ذرا وہ صاحب مجھ سے ملیں تو میں ان کی خبر لوں گا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور محبت تو بلا ہے۔ جو اس کا دعویٰ کرے گا اس کی ساتھ تو ایسا ہی برتاؤ کیا جائے گا۔ ہاں کوئی محبت کا دعویٰ نہ کرے تو میں اس سے خاص خطاب نہیں کرتا عام خطاب میں سب کچھ کہدیتا ہوں۔

غرض آجکل ہر شخص مفسر و مترجم ہے اور ہر ایک شریعت میں رائے دیتا ہے۔ گویا شریعت کا سمجھنا تمام فنوں سے آسان ہے حالانکہ یہ تو قانونِ الٰہی ہے جب دنیوی سلاطین کے قوانین کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ خاص وکلاء اور بیرسٹر اور ہائی کورٹ کے جج ہی اس کو سمجھتے ہیں تو خدائی قانون کو ایسا کیا آسان سمجھ لیا ہے۔

یہاں دلیپور میں ایک شخص نے قرآن کا ترجمہ یاد کررکھا تھا اور اس کو بڑا ناز تھا کہ میں ترجمہ قرآن کو خوب جانتا ہوں ایک مرتبہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے اس سے پوچھا کہ بتلاؤ مُدْهَامَّتَانِ کا کیا ترجمہ ہے، کہنے لگے بہت سیاہ، مولانا نے پوچھا بہت کا ہے کے معنی اور سیاہ کاہے کے معنی تو آپ فرماتے ہیں مُدہام کے معنی بہت اور متان کے معنے سیاہ پس کتابیں پڑھنا اور ہے اور علم سے مناسبت اور ہے چنانچہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو) کے معنے میں بھی غلطی اسی وجہ سے کی گئی کہ محض ترجمہ حدیث کا یاد کررکھا ہے فن سے مناسبت اور دین کا ذوق نہیں پیدا ہوا۔ دیکھئے خزانچی کو خزانہ کا حال بادشاہ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ سلاطین خزانہ کا

حساب وکتاب خود نہیں کیا کرتے پس اگر بادشاہ خزانچی سے کسی وقت یہ کہدے کہ بھائی خزانہ کا حال تم کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تم اس میں خود مختار بھی ہو کہ جس کو چاہو بانٹ دو، ہرگز نہیں۔ زیادہ جاننے سے خود مختار ہونا کیسے لازم آیا پس جس طرح خزانچی کو خزانہ کا حال بادشاہ سے زیادہ معلوم ہے مگر اسے خرچ کرنے کا اختیار نہیں وہ بدون اجازت شاہی کے کسی کو ایک حبہ بھی نہیں دے سکتا اسی طرح دنیا کے کاموں کو ہم انبیا سے زیادہ جانتے ہیں کہ زراعت کیونکر ہوا کرتی ہے باغبانی کس طرح کیا کرتے ہیں، کپڑے کیسے بُنا کرتے ہیں مگر ہم ان کاموں میں خود مختار نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں کرلیں بلکہ جس کام کو انبیا علیہم السلام جائز کریں گے ہم اس کو کر سکتے ہیں اور جس سے منع کر دیں اس کو چھوڑ دینا واجب ہے۔ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ اس حدیث میں تو لفظ اعلم مطلق ہے جس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَحْکَامِ اُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم دنیاوی کاموں کے احکام کو زیادہ جانتے ہو) اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِتَدَابِیْرِ اُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم دنیوی کاموں کے طریقے خوب جانتے ہو) پس تم نے دوسرے معنی کو کس دلیل سے ترجیح دی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے دوسرے معنی کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ دوسری احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ ہم لوگ دنیوی کاموں کے احکام کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہیں جانتے۔

چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت احادیث اس قسم کی ملیں گی۔ دوسرے خود اس حدیث کے واقعہ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو مطلب میں نے بیان کیا ہے وہی صحیح ہے۔ آپ نے فقط انہی الفاظ کو دیکھا ہے اس لئے اشکال پیدا ہوا اگر پوری حدیث کو دیکھتے تو شبہ نہ ہوتا۔ اور اکثر آیات واحادیث میں جہاں کسی کو اشکال ہوتا ہے اس کا سبب زیادہ یہی ہوتا ہے کہ اس کے سیاق وسیاق میں غور نہیں کیا گیا اس لئے طلبہ کو چاہیئے کہ ہر آیت کو منفرداً نہ دیکھا کریں بلکہ اُس کی ساتھ اُس کے سیاق وسباق میں بھی غور

کیا کریں تب ان شاء اللہ تعالےٰ کوئی اشکال نہ ہوگا۔

چنانچہ اس وقت مجھ کو ایک آیت یاد آئی اس میں اکثر طلبہ کو اشکال ہوا کرتا ہے لیکن اس کا منشا بھی سیاق میں نظر نہ کرنا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ترجمہ آیت کا یہ ہے۔ اور حق تعالےٰ کافروں کو ہرگز مسلمانوں پر راہ نہ دے گا یعنی غالب نہ کرے گا۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہوجاتا ہے مگر ان صاحبوں نے اس سے پہلے جملے کو نہیں دیکھا، پوری آیت اس طرح ہے۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا پس خدا مسلمانوں میں اور کافروں میں قیامت کے دن فیصلہ فرمادیں گے اور خدا تعالےٰ کافروں کو ہرگز مسلمانوں پر راہ نہ دے گا یعنی قیامت کے فیصلہ میں ہرگز ان کو غلبہ نہ ہوگا کیونکہ وہ ظہور حقائق کا وقت ہے اس وقت حق و باطل میں پورا امتیاز ہوجائے گا، اس لئے وہاں حق ہی کو غلبہ ہوگا۔ باطل کو ہرگز غلبہ نہ ہوگا اور دنیا دار العمل ہے یہاں بطور امتحان کے کبھی باطل کو حق پر غلبہ ظاہر میں ہوسکتا ہے تو یہاں دنیوی سلطنت و حکومت سے کیا بحث جو یہ اشکال وارد ہو۔ دنیا میں کفار کے غلبہ کی نفی اس آیت سے کہاں مفہوم ہوتی ہے۔ پس قرآن و حدیث کو جب دیکھو پورے مضمون کو دیکھو ادھورا مضمون مت دیکھو، اشکال اسی سے وارد ہوتا ہے۔ پس سب سے پہلے اس حدیث کا واقعہ دیکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اہلِ مدینہ کو آپ نے دیکھا کہ وہ کھجوروں کی تابیر کرتے ہیں۔ تابیر اسے کہتے ہیں کہ نر کھجور کے پھولوں کو مادہ سے چھوا دیا جائے۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ کھجوریں ایک نر ہوتا ہے ایک مادہ۔ نر کے اوپر صرف پھول آتے ہیں پھل نہیں آتا، مادہ پر پھل بھی آتا ہے تو نر کے پھولوں کو مادہ کے اوپر سے چھوا کر گرا دیا جاتا ہے اس سے مادہ پر بہت پھل آتا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھل کم آتا ہے، عجیب خدا کی قدرت ہے۔ جب ایک مسِ گل میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے مادہ بار آور ہوجاتی ہے تو اگر نفخ جبریل سے حضرت مریم علیہا السلام کو حمل ہوگیا تو

کیا تعجب کی بات ہے ملحدوں کی عقل میں یہ بات نہیں آتی اس لئے وہ اس واقعہ کے منکر ہیں اور انہوں نے یوسف بخار کو حضرت مریم علیہا السلام کا شوہر نکالا خیر ملحدوں پر تو تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرت خداوندی کے قائل نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمانان مدعی مفسریت نے بھی جن کو مفسر کہنا ہرگز جائز نہیں اس واقعہ نفخ جبریل کا انکار کیا ہے اور یوسف بخار کو حضرت مریم کا شوہر مانا ہے جو نصوص قرآنیہ کے صریح خلاف ہے۔ ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جبریل علیہ السلام کی پھونک سے حمل کیونکر رہ گیا' ان لوگوں کو تابیر سے سبق لینا چاہیئے کہ نر کے پھول چھوانے سے مادہ کھجور کیونکر بار آور ہو جاتی ہے۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تابیر سے نرم عنوان سے منع فرمایا کہ اگر تم یہ کام نہ کرو تو بہتر ہے۔ غالباً آپ کو ٹوٹکہ اور شگون کا احتمال ہوا کہ کہیں یہ عمل بطور شگون کے نہ کیا جاتا ہو۔ آپ کو یہ نہ معلوم تھا کہ اس میں یہ خاصیت فطرۃً رکھی ہوئی ہے اور کھجور پر زیادہ پھل آنے کا یہی طریقہ ہے۔ شاید کوئی یہاں یہ شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی بات معلوم نہ تھی۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں ہم فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تابیر کی خاصیت معلوم نہ تھی کیونکہ آپ سائنس داں نہ تھے کہ جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں اور باغبانی کا فن بھی جانتے۔ آپ محض رسول و نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) تھے آپ کے لئے یہی فخر ہے کہ آپ احکام الٰہی اور طرق وصول الی اللہ کے جاننے والے تھے اور دنیا کی صنعتوں کو نہ جانتے تھے۔

سائنس کی حقیقت علوم شرعیہ کے سامنے ایسی ہے جیسے پاخانہ کمانے کا فن کسی فن شریف کے سامنے ہے اب اگر ایک شخص کسی نواب کی تعریف میں یہ کہے کہ فلاں رئیس پاخانہ کمانے کے فن سے بھی ماہر ہیں اور دوسرا یہ کہے کہ وہ اس کام کو جانتے بھی نہیں ان کو اس سے مَس بھی نہیں تو بتلایئے ان دونوں میں ادب والا کون ہے۔ پس جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یہ کہتے ہیں کہ آپ بڑے سائنس داں تھے وہ ایسے ہی گستاخ ہیں جیسے وہ شخص سائنس کو آپ سے ایسی ہی نسبت ہے جیسے اُس فن کو کسی نواب سے پس حقیقت میں آپ کا ادب اور آپ کی تعظیم اسی میں ہے کہ ہم صاف صاف کہدیں کہ ہمارے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم محض رسول و نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے سائنس داں نہ تھے انبیاء تو ان کاموں سے منع کرتے ہیں کہ بلا ضرورت حقائق و خواص اشیاء عالم کے دریافت کرنے میں مشغول ہوں بلکہ اپنی آخرت کی اصلاح میں مشغول ہونا چاہیئے ؎

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

(عشق و محبت الٰہی کی باتیں کرو زمانہ کے اسرار کی جستجو ترک کرو کہ کسی نے بھی اس معمہ کو حکمت سے حل نہیں کیا نہ آئندہ کر سکے گا۔)

راز دہر سے مراد زمانہ کے واقعات اور فنون طبعیہ ہیں جن میں خواص اشیاء و حقائق اجزاء عالم سے بحث کی جاتی ہے۔ فلاسفہ یونان خود اقرار کرتے ہیں کہ علوم طبعیہ تمام علوم میں ادنیٰ ہیں اور اشرف العلوم علم الٰہی ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام اشرف العلوم میں مشغول ہوتے ہیں ادنیٰ علم کے پیچھے نہیں پڑتے جس کو اصلاح آخرت میں کچھ بھی دخل نہیں۔ غور کیجئے ایک شخص محبوب سے ملنے گیا اس کے محبوب نے اپنی ملاقات کے لئے ایک خاص میعاد مقرر کر رکھی ہے کہ جو شخص اسی میعاد میں میرے پاس آئے گا میں اس سے ملوں گا اور جو میعاد کے بعد آئے گا اس سے نہ ملوں گا۔ راستہ میں محبوب کا شہر اور قلعہ پڑا اس نے نہ شہر کے بازاروں کی سیر کی نہ قلعہ کے محلات کی سیدھا محبوب کے پاس چلا گیا اور دوسرا شخص بھی اسی کی ملاقات کو گھر سے نکلا لیکن جب محبوب کے شہر میں پہنچا تو بازاروں کا بھاؤ تاؤ معلوم کرنے اور قلعہ کے پتھروں کی قیمت دریافت کرنے لگا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں، کیونکر آئے ہیں کس نے تراشے ہیں پورے مکان کی کیا لاگت ہے یہاں تک کہ اسی حساب و کتاب میں ملاقات محبوب کی میعاد نکل گئی جب وقت گذر گیا تو آپ محبوب کے سامنے پہنچے اس نے فوراً کان پکڑوا کر دربار سے باہر نکال دیا بتلایئے ان دونوں میں آپ کسے عاقل کہیں گے یقیناً اسی شخص کو عاقل کہیں گے جس نے کسی چیز کی طرف لقاء محبوب سے پہلے توجہ نہیں کی۔

اے صاحبو! اسی طرح حق تعالیٰ نے آپ کے لئے ایک میعاد مقرر کی ہے یعنی یہ عمر عزیز

پس جو شخص موت کے وقت تک حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرلے اس سے تو وہ ملتے ہیں اور جو ساری عمر خرافات میں گنذار دے اس سے وہ کبھی نہ ملیں گے پس جو عاشق ہو گا وہ خرافات میں ہرگز نہ پڑے گا اسی لئے انبیاء علیہم السلام کبھی حقائق اشیاء عالم کے درپے نہیں ہوئے نہ انہوں نے اپنی امت کو اس کی تعلیم دی ہے بلکہ اس میں انہماک سے منع فرمایا ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ، تابیر کو نہ جاننا کوئی نقص نہیں ہے غرض آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تم یہ نہ کرو تو اچھا ہے۔ صحابہؓ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے فوراً چھوڑ دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے جاں نثار تھے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کسی امر کے متعلق ان کو معلوم ہو جاتی فوراً اس کی تعمیل کرتے تھے نفع و نقصان کی ذرا پروا نہ کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی کے مکان کی طرف گذرے حدیث میں آتا ہے فَرَأَىٰ قُبَّةً مُشْرِفَةً کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کوئی قبہ بلند دیکھا، دریافت فرمایا کہ یہ مکان کس کا ہے صحابہؓ نے بتلا دیا کہ فلاں صحابی کا ہے۔ بس اتنی بات ہوئی تھوڑی دیر میں وہ صحابی حاضر خدمت ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا، انہیں یہ کہاں گوارا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رُخ پھرا ہوا دیکھیں بس بے تاب ہو گئے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

از فراق تلخ مے گوئی سخن
ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

(فراق کی باتیں کرتے ہو اور جو چاہو سو کرو مگر یہ نہ کرو)

صحابہ سے دریافت کیا کہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رُخ مجھ سے پھرا ہوا کیوں ہے کہ ہم کو اور تو کچھ معلوم نہیں البتہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مکان کی طرف گذرے تھے بلند قبہ دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ کس کا گھر ہے۔ بس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بلند قبہ ناگوار ہوا ہو تو ممکن ہے۔ باقی اور کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی وہ بھی ایسے عاشق تھے کہ یہ بھی تحقیق نہ کیا کہ یہ سبب واقعی ہے یا محض احتمال ہی احتمال ہے اس وہم پر کہ اس قبہ ہی سے شاید آپ کو ناگواری ہوئی ہو فوراً جا کر اُسے

ڈہا دیا ہے

بہرچہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف چہ ایماں
بہرچہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو)
اس کے چند روز بعد پھر آپ کا گذر اُس مکان کی طرف ہوا تو آپؐ نے وہ قبہ نہ دیکھا دریافت فرمایا کہ یہاں ایک بلند قبہ تھا اب کیا ہوا صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس کے مالک کو آپؐ کی ناگواری کا احتمال ہوا اس لئے ڈھا دیا، سبحان اللہ خلوص اس کا نام ہے کہ مکان کو ڈہا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع بھی نہیں کی کہ میں نے آپ کی رضا کے لئے یہ کام کیا ہے آجکل لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر شیخ ان کو کسی ایسی بات کا حکم کرے جس میں بظاہر اُن کا دنیوی ضرر ہوتا ہو گو آخرت کا نفع ہی نفع ہو تو اول تو دنیوی ضرر کو گوارا کرنے والے ہی کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ دسؔ مرتبہ شیخ کو آکر سُناتے ہیں کہ ہم نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کر دی جس میں در پردہ شیخ پر احسان رکھنا ہوتا ہے۔ غرض صحابہ نے تابیر کو اس سال چھوڑ دیا تو اُس مرتبہ پھل کم آئے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس سال پھل کم کیوں آئے معلوم ہوا کہ تابیر نہ کرنے سے ایسا ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تابیر کر لیا کرو۔ اس وقت آپ نے یہ بھی فرمایا اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو) اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ دنیوی کاموں کا طریقہ اور اسباب کے خواص تم زیادہ جانتے ہو یعنی مجھے اس خاصیت کی اطلاع نہ تھی۔ اور یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ دنیوی کاموں کے احکام میں تم خود مختار ہو۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو آپ پہلے ہی سے منع کیوں فرماتے آپ نے ممانعت اس لئے کی ٹوٹکہ اور شگون کا آپ کو شبہ ہوا تھا جب یہ احتمال رفع ہو گیا اور معلوم ہوا کہ تابیر میں یہ خاصیت فطری ہے اس وقت آپ نے اجازت دیدی۔ باقی اس ارشاد کی حکمت کیا ہے سو میرے دل میں یہ بات القا ہوئی ہے کہ اس خاصیت کے معلوم نہ ہونے سے شاید کسی کو نبوت میں شبہ ہو جاتا کہ آپ کو اتنی بھی خبر نہیں اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلا دیا کہ یہ نہ جاننا کوئی نقص نہیں ہے کیونکہ ہم دین کے

واسطے آئے ہیں، دنیا کے کاموں کا طریقہ جاننا نبوت کے لئے ضروری نہیں اور اُن کا نہ جاننا نبوت میں نقص نہیں۔ آجکل تو پیری کے واسطے بھی لوگ علمِ محیط کو لازم سمجھتے ہیں اور بعض لوگ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطے علمِ محیط کے قائل ہو گئے ہیں اب وہ لوگ دیکھیں کہ یہ حدیث کیا بتلا رہی ہے اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نبوت کے لئے علم محیط ضروری نہیں۔ البتہ جو علوم لوازم نبوت سے ہیں یعنی علوم ضروریہ دینیہ ان کا حصول لازم ہے غرض یہ ثابت ہو گیا کہ مباحات میں بھی شریعت کو تصرف کا اختیار ہے چنانچہ اسی بنا پر ارشاد ہے وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا کہ گھروں میں دروازے سے آیا کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ امر عبادات کے متعلق نہیں بلکہ عادات کے متعلق ہے اور اُس میں یہ تصرف کیا کہ بدون حکم شرعی کے کسی عادت کو ناجائز اور کسی کو باعثِ ثواب نہ سمجھو۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انتظام بھی مطلوب شرعی ہے ہر کام میں خواہ دینی کام ہو یا دنیوی۔ چنانچہ گھر میں پیچھے سے آنا خلافِ انتظام ہے اس سے منع کیا گیا اور دروازہ سے آنے کا امر فرمایا گیا۔ اس میں رعایت انتظام کی تاکید ہے مگر ایک تاویل پر تو قاعدۂ کلیہ کے طور پر یہ تعلیم کی گئی ہے وہ تاویل یہ کہ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا۔ (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) میں بیوت عام ہو مقاصد کو اور ابواب عام ہو اُن طرق کو جو ہر کام کے لئے مقرر ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ سب کاموں کو ان کے طریقوں سے کیا کرو۔ اس میں گھروں میں دروازوں سے آنا بھی داخل ہے۔ اور ایک تاویل پر بطور قیاس کے اس پر دلالت ہو گی کہ جس طرح بیت میں باب سے داخل ہونا ایک انتظام ہے اسی طرح ہر مقصود میں اس کے طریق سے داخل ہونا ایک انتظام ہے۔

ایک بزرگ نے اس مضمون کو وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ (کڑیوں کے جوڑنے اندازے کا لحاظ رکھا کرو) سے اخذ کیا ہے۔

حق تعالےٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم فرمایا تھا کہ تم زرہ بنایا کرو مگر اس کی ساتھ یہ بھی تعلیم فرمائی وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ یعنی کڑیوں کے جوڑنے میں اندازہ کا لحاظ رکھو کہ سب متناسب اور متناسق ہوں یہ نہ ہو کہ ایک بڑی اور ایک چھوٹی ہو جاوے۔ اس سے

معلوم ہوا کہ انتظام مطلوب ہے ہر امر میں حتیٰ کہ دنیا کے کاموں میں بھی۔ مگر اتنا فرق ہے کہ دنیا کے کاموں میں انتظام مطلوب بالذات نہیں ہے کہیں آپ دنیا ہی کو قبلہ وکعبہ بنا لیں بلکہ مقصود بالذات دین کے کاموں میں انتظام ہے لیکن جب تک ہر کام میں انتظام کی عادت نہیں ہوتی اس وقت تک دین کے کاموں میں بھی انتظام نہیں ہوتا اس لئے دنیا کے کاموں میں اس واسطے سے انتظام مطلوب ہو گیا۔ بعض لوگ تو فطرتاً منتظم ہوتے ہیں وہ دنیا اور دین دونوں کے کام انتظام اور اصول کے ساتھ کرتے ہیں اور بعض لوگ فطرۃً غیر منتظم ہوتے ہیں ان کو بتکلف انتظام کا عادی بننا چاہیئے ہر کام کے لئے وقت مقرر کر لینا چاہیئے اور وقت پر ایک کام سے فارغ ہو کر دوسرا کام کرنا چاہیئے۔ جب آدمی اعتدال سے ہر کام کرتا ہے تو شدہ شدہ انتظام پیدا ہو جاتا ہے پھر اس کا دین بھی منتظم ہوتا ہے۔ پس دنیا کے کاموں میں اس کی ضرورت ہے کہ جس کی طبیعت میں انتظام نہیں ہوتا وہ دین کے کام میں بھی بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ حضرات صوفیہ کو اس کا بڑا اہتمام ہے حضرت سلطان نظام الدینؒ کے یہاں دو شخص بیعت کے واسطے آئے آپس میں کہنے لگے کہ ہمارے یہاں کا حوض اس مسجد کے حوض سے بہت بڑا ہے سلطان جی نے سن لیا، پوچھا کتنا بڑا ہے۔ کہنے لگے یہ تو معلوم نہیں، سلطان جی نے فرمایا کہ جاؤ ناپ کر آؤ۔ بے چارے مرتے کھپتے گئے اور جا کر اُسے ناپا تو ایک بالشت بڑا نکلا۔ بڑے خوش ہوئے کہ ہماری بات سچی رہی۔ مہینہ بھر کے بعد حاضر خدمت ہوئے تو سلطان جی نے پوچھا کہ حوض کو ناپ آئے کہا حضور ہاں، فرمایا کتنا بڑا ہے بتلایا کہ ایک بالشت بڑا ہے۔ سلطان جی نے فرمایا کہ تم تو یوں کہتے تھے کہ ہمارا حوض بہت بڑا ہے ایک بالشت بڑے کو بہت بڑا نہیں کہہ سکتے۔ تم میں تحقیق و انتظام کا مادہ نہیں ہے جاؤ تمہاری ہم سے موافقت نہ ہو گی ہم بیعت نہ کریں گے۔ اسی طرح ایک بزرگ کا معمول تھا کہ جب کوئی طالب ان کے یہاں آتا تو روٹی اور سالن معمولی خوراک سے مگر باہمی تناسب کی رعایت سے اس کے آگے بھیجتے کھانا بچنے کے بعد پھر دیکھتے سو اگر وہ مناسب انداز سے روٹی سالن چھوڑتا تب تو بیعت کر لیتے اور اگر سالن ختم کر دیا روٹی چھوڑ دی یا روٹی ختم کر گیا اور سالن چھوڑ دیا یا دونوں چیزیں چھوڑیں مگر مناسب انداز سے نہیں

بلکہ روٹیاں دو ہیں تو سالن ایک ہی روٹی کا ہے یا برعکس تو اسے بیعت نہ فرماتے تھے اور کہہ دیتے کہ تمہارے اندر سلیقہ اور انتظام نہیں ہمارا تمہارا نباہ نہ ہوگا۔ اگر آج کل کوئی شیخ ایسا برتاؤ کرے تو اس کو بدمزاج کہتے ہیں۔ بھلا ان ناقدروں سے کیا توقع کی جائے۔

ایک بزرگ سے ایک شخص نے اسم اعظم کی درخواست کی تھی، انہوں نے کہا کہ تمہارے اندر چھچھوراپن ہے تم سے ضبط نہ ہوگا ظاہر کردوگے اس لئے تم اس کے قابل نہیں وہ کہنے لگا کہ حضور اب سے میں ضبط سے کام لیا کروں گا اور چھچھوراپن چھوڑ دوں گا۔ خاموش ہوگئے ایک دن انہوں نے ایک پیالہ سرپوش سے ڈھک کر دیا کہ فلاں بزرگ کو دے آؤ مگر راستہ میں کھول کر مت دیکھنا وہ لے کر چلا تھوڑی دیر تو اپنے نفس کو دبایا بہت ضبط کیا مگر پھر یہ خیال غالب ہوا کہ ایک نظر سے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ معلوم تو کرنا چاہیئے کہ اس میں کیا ہے آخر نہ رہا گیا اور سرپوش کھول کر دیکھا پیالہ میں سے ایک چوہا پھدک کر نکلا اور بھاگ گیا۔ اب یہ بڑے پریشان کہ اب کیا جواب دوں گا، مگر ساتھ ہی یہ حیرت کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ کیا شیخ نے میری ساتھ ہنسی کی ہے یا اُن بزرگ کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ آخر کار خالی پیالہ لیکر بزرگ صاحب کے پاس پہونچے کہ مجھے فلاں صاحب نے یہ پیالہ دے کر بھیجا تھا اور سارا واقعہ بیان کیا کہ مجھے حضرت نے منع کر دیا تھا کہ پیالہ کو کھولنا مت۔ میں نے اسے راستہ میں کھولکر دیکھ لیا مجھ سے رہا نہ گیا تو اس میں سے ایک چوہا نکل کر بھاگ گیا، اب میں شرمندہ بھی ہوں اور متحیر بھی۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے شیخ سے کوئی درخواست کی تھی۔ کہا ہاں میں نے اسم اعظم کی درخواست کی تھی، مگر انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ تمہارے اندر چھچھوراپن ہے میں نے وعدہ کیا تھا کہ اب ضبط سے کام لیا کروں گا۔ اُن بزرگ نے فرمایا کہ یہ واقعہ تمہارے اسی دعوے کا جواب ہے کہ تم سے ایک چوہے کی نگہبانی تو ہو نہ سکی تم اسم اعظم کی نگہداشت اور اس کے حقوق کی رعایت کیسے کروگے۔ وہ بیچارہ اپنا سا مُنھ لے کر رہ گیا۔

صاحبو! یہ حضرات اہل اللہ بڑے سمجھدار ہوتے ہیں اور نازک مزاج بھی بہت ہوتے ہیں لوگوں نے بعض سلاطین کو نازک مزاج سمجھ رکھا ہے مگر وہ اہل اللہ کے سامنے کیا چیز ہیں ہم نے بزرگوں کا مشاہدہ کیا ہے تم نے مشاہدہ نہ کیا ہو تو تکذیب کرسکتے ہو۔ اہل اللہ

یں ذکر کی وجہ سے بہت لطافت آجاتی ہے اس لئے ان کا مزاج بہت لطیف و نازک ہو جاتا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ ایک مرتبہ صبح کو سو کر اٹھے تو آنکھوں میں سرخی تھی لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ رات سردی لگی اس لئے نیند نہ آئی، ایک مریدنی ضعیفہ حاضر تھی حاضرین سے کہا کہ کوئی صاحب فکر نہ کریں اس کا اہتمام میں کروں گی۔ چنانچہ اٹھ کر گئی اور دن بھر میں ایک دولائی تیار کر کے رات کو لائی آپ اس وقت لیٹ گئے تھے۔ فرمایا میرے اوپر ڈال دو وہ ڈال کر چلی گئی۔ صبح کو پھر آنکھیں سُرخ تھیں۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی، فرمایا رات سردی تو نہیں لگی مگر نیند پھر بھی نہ آئی کیونکہ دولائی میں تگندے ٹیڑھے پڑے ہوئے تھے اس سے طبیعت کو بار بار الجھن ہوتی تھی۔ بھلا ایسا ادراک کہیں سلاطین کا بھی ہوا ہے کہ دُولائی اوڑھ کر اندھیرے میں تگندوں کا ٹیڑھا ہونا معلوم ہو جاوے۔

ہمارے استاد علیہ الرحمۃ (مولانا محمد یعقوب صاحب) کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نانوتہ سے کہیں جانے والے تھے۔ مولانا کی سواری کے لئے چھکڑا لایا گیا یہ تو سادگی تھی یہ حضرات لطیف المزاج ہونے کی ساتھ سادے بھی ہوتے ہیں۔ تصنع اور تکلف کا نام لطافت نہیں ہے۔ یہ حضرات سادے تو غریبوں سے زیادہ تھے اور لطیف المزاج بادشاہوں سے زیادہ۔ چنانچہ یہ تو سادگی تھی کہ سواری کے لئے چھکڑا آیا اس کے بعد جو مولانا کا اسباب آیا تو رزائی اس طرح تہ کی ہوئی تھی کہ ابرہ اوپر اور استر اندر کسی نے یہ سمجھ کر کہ غلطی سے اس طرح طے ہو گئی ہو گی استر اوپر کر دیا اور ابرہ اندر۔ کیونکہ عموماً ابرہ کی حفاظت زیادہ کی جاتی ہے کہیں میلا نہ ہو جائے۔ مولانا نے جو آکر دیکھا فرمایا یہ کون عقلمند ہیں جنہوں نے استر اوپر کر دیا، اُن متصرف صاحب نے عرض کیا حضرت طریقہ اس کا یہی ہے تاکہ ابرہ گرد آلود نہ ہو جاوے۔ فرمایا خوب سمجھے جب سارا گرد و غبار استر پر پڑیگا تو رات کو اوڑھتے وقت وہ ہمارے دماغ میں نہ پہنچے گا ابرہ کو اوپر کرو۔ اس پر اگر گرد پڑے گی تو بہت سے بہت دیکھنے میں بُرا معلوم ہو گا مگر ہمارا دماغ تو گرد سے محفوظ رہے گا تم نے ہمارے دماغ سے زیادہ ابرہ کی حفاظت کی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ حقیقت

میں حکما یہ لوگ ہیں اور لطافت ان کے اندر ہے رؤسا اور نوابوں کو تو محض دعوے ہی دعوے ہے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ اہل اللہ سے زیادہ سلیقہ دنیا والوں کو بھی نہیں ہوتا گو ان حضرات کو تجربہ نہ ہو۔ تجربہ اور چیز ہے سلیقہ اور چیز ہے۔ میں نے یہ اس واسطے کہدیا کہ کہیں آپ چارپائی بننے کے لئے ان کو نہ دیدیں کہ ہم نے سُنا تھا کہ اہل اللہ کو دنیا والوں سے زیادہ سلیقہ ہر کام کا ہوتا ہے۔ پس آپ چارپائی خوب بنیں گے۔ تو صاحبو! اہل اللہ کو سلیقہ تو ہوتا ہے مگر تجربہ نہیں ہوتا اور بعض کاموں کے لئے سلیقہ کافی نہیں ہوتا بلکہ تجربہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

بجنور میں ایک شخص نے ایک عالم کا رد لکھا لوگوں نے اس سے کہا کہ تم تو جاہل ہو تم نے مولوی صاحب کا رد کیا خاک لکھا ہوگا وہ کہنے لگا کہ میں نے فارسی پڑھی ہے اور اس سے سب کچھ آجاتا ہے تو اس شخص نے چارپائی اس کے حوالہ کی کہ ذرا اس کو بھی بُن دو اس نے کہا کہ یہ کام تو مجھے نہیں آتا، وہ بولا کہ بس اس برتہ پر دعویٰ کرتے ہو کہ فارسی سے سب کچھ آجاتا ہے۔ تو مجھے ڈر ہے کہ میرے کلام کے بھی کہیں یہی معنے نہ سمجھے جائیں اس لئے میں نے بتلا دیا کہ تجربہ اور چیز ہے سلیقہ اور ہے۔ علماء و طلبہ کو واقعی تجربہ دنیا کے کاموں کا نہیں ہوتا جس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کو ان کاموں کی نوبت کم آتی ہے۔

کانپور میں ایک عربی خواں طالب علم سے ایک انگریزی خواں نے سوال کیا کہ بتلاؤ ثوابت کی شمار کیا ہے انہوں نے کہا کہ مرصودہ کا عدد تو لکھا ہے کہ ایک ہزار بائیس ہیں مگر غیر مرصودہ معلوم نہیں وہ بولا بس یہی ریاضی پڑھی ہے اُس نے سائل سے یہ سوال کیا کہ اچھا آپ بتلادیں کہ سمندر میں مچھلیاں کتنی ہیں اور یہ سوال زمین کا ہے اور آپ کا سوال آسمان کا ہے پہلے آپ زمین کا حال بتلا دیں تو میں بھی آسمان کا حال بتلا دوں گا۔ اب وہ خاموش ہیں طالب علم نے کہا بس یہی جغرافیہ پڑھا ہے آج کل یہ بھی ایک مرض ہے کہ مولویوں سے اینڈے بینڈے سوالات کرتے ہیں اور اگر ان سے جواب نہ آئے تو ان کے علم پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے کیا خاک پڑھا ہے اتنی بات کا تو جواب نہ دے سکے۔ سبحان اللہ اسی لئے تو علماء نے پڑھا لکھا ہے کہ آپ کے واہیات سوالات کو حل کیا کریں اُن سے احادیث و آیات کا مطلب

پوچھو مسائل واحکام واقعات کا جواب لو الغرض دنیا کے کاموں کا تجربہ تو ان کو ضروری نہیں مگر سلیقہ اور تہذیب اور انتظام ان میں اس قدر ہوتا ہے کہ واللہ اہل دنیا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی جس کا امتحان اس طرح ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص ان کے پاس تھوڑے دن رہ کر دیکھ لے اور وہ شخص ایسا ہو جس کو اپنے مہذب اور سلیقہ دار اور منتظم ہونے کا دعویٰ ہو اور اپنے کو بڑا عاقل سمجھتا ہو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ اپنے کو بے وقوف کہکر نہ اٹھے تو کوئی بات نہیں تھوڑے ہی عرصہ میں اس کو اپنی تہذیب کا بدتہذیبی ہونا اور اپنے انتظام کا غلط ہونا مشاہد ہوجائے گا۔

تمہید میں وقت زیادہ گذر گیا اب میں مقصود کی طرف عود کرتا ہوں میں نے شروع میں کہا تھا اور پھر عنقریب ہی ضمناً بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اس آیت کے دو محل ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ اس کا تعلق خاص رسم جاہلیت سے ہو جو حج کے متعلق تھی اور اس صورت میں ماقبل سے اس کا ارتباط ظاہر ہے کہ اوپر فوائد ہلال میں حج کا ذکر تھا اور اس رسم کا تعلق بھی حج سے ہے۔ دوسرا محل یہ کہ بطریق استعارہ کے اس میں مطلقاً ہر فعل کو صحیح طریق سے کرنے کی تعلیم ہو اور اس صورت میں ربط کے متعلق سوال ہوتا ہے کہ اس سے پہلے يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط (لوگ آپ سے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اس کا گھٹنا بڑھنا لوگوں کے کاروبار اور حج کے اوقات کے لئے ہے) مذکور ہے تو اس سے وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ (یہ کوئی نیک کام نہیں ہے گھروں میں تم پچھواڑوں سے آؤ) کو کیا ربط ہے۔ سو وہ ربط یہ ہے کہ ماقبل میں چاند کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کی کیا وجہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں وجہ اور علت نہیں بیان کی گئی بلکہ حکمت بتلادی گئی۔ اس سے سائنس دانی کا فضول ہونا یقیناً ثابت ہوگیا۔ پہلے حافظؒ کے شعر سے اس کا فضول ہونا معلوم ہوا تھا اب خود قرآن سے معلوم ہوگیا۔ فرماتے ہیں کہ لوگ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اس کی علت کیا ہے تو آپ اُن سے کہدیجئے کہ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ چنانچہ

اس سے لوگوں کو اپنے کاروبار کے لئے وقت کا اندازہ ہوتا ہے (یہ تو دنیوی نفع ہے) اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے ہیں یہ دینی نفع ہے۔ تو علت کو چھوڑ کر حکمت بتلانے میں اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ علت کا دریافت کرنا فضول ہے حکمت کو معلوم کرنا چاہیئے اس کے بعد ارشاد ہے وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (اور گھروں میں پشت کی طرف سے آنا کچھ نیک کام نہیں بلکہ نیک کام تقوے کا اختیار کرنا ہے) پس اس کا تعلق سابق سے یہ ہوا کہ سوال برمحل اور بے محل کی مثال ایسی ہے جیسے گھر میں دروازہ سے داخل ہونا اور پشت کی طرف سے داخل ہونا۔ پس جس طرح گھر میں بغیر دروازہ کے آنا بُرا ہے اسی طرح سوال بے محل بھی بُرا ہے آگے فرماتے ہیں۔ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا اور گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ یعنی سوالات بھی برمحل کیا کرو بے محل سوال نہ کیا کرو۔ پس اس صورت میں وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) حکم عام ہوگا اس کو خاص اُس واقعہ ہی سے تعلق نہیں ہوگا جو اہلِ جاہلیت میں رائج تھا کہ وہ حالت احرام میں دروازہ سے گھر میں آنا بُرا سمجھتے تھے بلکہ ایک عام قاعدہ کا بیان ہوگا کہ ہر کام کو اُس کے طریقہ سے کیا کرو جس میں وہ واقعہ بھی داخل ہو گیا اور تبعًا اس کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ احرام میں غیر دروازہ سے آنا نیک کام نہیں پس پہلی تفسیر پر تو وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازہ سے داخل ہوا کرو) میں اہلِ جاہلیت کے خاص فعل کا حکم مذکور تھا اور دوسری تفسیر پر یہ حکم عام ہوگا اور میرا مقصود جس کو اس وقت بیان کرنا منظور ہے اس دوسری تفسیر پر تو آیت کا مدلول بلا واسطہ ہے اور پہلے تفسیر پر چونکہ بواسطہ قیاس اس سے مستنبط ہوتا ہے اس لئے مدلول بواسطہ ہے اور وجہ قیاس ظاہر ہے کہ اِتْيَانُ بُيُوْتٍ مِنَ الظُّهُوْرِ (مکانوں میں پشت سے آنا) ایک بے موقع فعل ہے اور اس لئے مذموم ہے پس ہر فعل بے موقع مذموم ہوگا اب مستدل کو اختیار ہے کہ جس تفسیر سے چاہے مقصود کو ثابت کر دے۔ ایک گدام بھرا ہوا ہے ہم کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں کھانا شروع کر دیں مصری کی ڈلی ہے جدھر سے چاہو مُنھ مار لو۔ الغرض دونوں صورتوں میں باختلاف توجیہ

آیت سے مستفاد ہوا کہ بے طریقہ اور بے محل اور خلاف قاعدہ کام مت کرو بلکہ ہر کام کو اس کے طریقہ سے کرو اور دنیا کے معاملات میں تو سب لوگ اس قاعدہ کو تسلیم کرتے ہیں مگر مجھ کو یہ بتلانا ہے کہ دین کے بارہ میں لوگ اس قاعدہ کو بالکل چھوڑے ہوئے ہیں چنانچہ آجکل دیکھا جاتا ہے کہ اول تو لوگوں کو دین پر توجہ ہی نہیں حتیٰ کہ بعض لوگ تو دین کو مانع ترقی سمجھتے ہیں اس لئے اس سے آزاد ہونے کی رائے دیتے ہیں ان لوگوں سے تو مجھ کو خطاب نہیں نہ یہ قابل خطاب ہیں کیونکہ اس وقت مسلمانوں کو خطاب ہو رہا ہے بد دینوں کو خطاب نہیں ہو رہا اور یہ لوگ مسلمان نہیں بد دین ہیں اس لئے ان لوگوں کی میں شکایت نہیں کرتا کیونکہ شکایت اپنوں کی ہوا کرتی ہے غیروں سے کیا شکایت مجھے اصلی شکایت ان لوگوں سے ہے جو واقع میں مسلمان ہیں اور ان کو دین پر توجہ بھی ہے۔ اور وہ دین پر توجہ کرنے کو ضروری بھی سمجھتے ہیں ان کی یہ شکایت ہے کہ یہ لوگ بھی دین کو اس کے طریقہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتے بے قاعدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ دین پر دنیا کے لئے توجہ کرتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں، تہجد کو اٹھتے ہیں وظیفے پڑھتے ہیں اور مقصود یہ ہے کہ اسی ذریعہ سے ہمارے مقدمات میں آسانی ہو جائے ہم کو رزق میں فراخی حاصل ہو کیونکہ کسی مولوی سے سُن لیا تھا کہ گناہوں سے روزی میں تنگی ہو جاتی ہے، مصائب نازل ہوتے ہیں تو یہ لوگ محض اسی غرض سے دین دار بنے ہوئے ہیں کہ دنیا کے کام چلتے رہیں۔ جیسے ایک گنوار سے کسی مولوی صاحب نے کہا تھا کہ تو نماز کیوں نہیں پڑھتا۔ اس نے کہا کہ نماز سے مجھے کیا ملے گا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ چالیس دن کے بعد تجھے ایک بھینس دوں گا اس نے نماز شروع کر دی اور دن گننے لگا گویا بھینس ہی میں فنا ہو گیا اسی سے اس کی حالت معلوم ہو گئی کہ اس کو نماز مقصود نہ تھی۔ جب چالیس دن پورے ہو گئے تو مولوی صاحب کے پاس گیا کہ لاؤ وعدہ پورا کرو انہوں نے کہا کہ جا کیسی بھینس لئے پھرتا ہے میں نے تو اس واسطے کہدیا تھا کہ جو شخص چالیس دن تک نماز پڑھتا رہتا ہے اُسے شوق ہو جاتا ہے میں نے سوچا کہ اس بہانہ سے تجھے نماز کا شوق ہو جاوے گا یہ جواب سن کر وہ گنوار کیا کہتا ہے کہ جاؤ پھر یاروں نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی بس پھر نماز چھوڑ دی۔ اور چونکہ اس ظالم نے بے وضو ہی ٹرخائی تھی اسی لئے اس کو شوق بھی نہ ہوا بھلا ایسی نماز کیا اثر کرتی اس حکایت پر تو لوگ ہنسے مگر صاحبو! ہم جیسے

بھی سب اسی میں مبتلا ہیں ہمارے اس ہنسنے کی ایسی مثال ہے ؎

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد   ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(بے وقوف اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیساکہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

غور کرکے ایسا شخص دیکھ لے کہ اس کو دین کے کاموں میں دنیا مقصود ہے یا نہیں بعض لوگ جب تک تنگئ معاش میں مبتلا رہتے ہیں اس وقت تک نمازی اور روزہ دار رہتے ہیں پھر جہاں فراخی میسر ہوئی اور انہوں نے ان کاموں کو بالائے طاق رکھا گویا دین کو محض دنیا کے لئے اختیار کیا تھا جب وہ حاصل ہوگئی پھر دین کی کیا ضرورت رہی۔ بعض لوگ دین کو اس لئے اختیار کئے ہوئے ہیں کہ ان کو اس کے ذریعے سے جاہ وعزت حاصل ہے لوگ دیندار اور مقتدا سمجھتے ہیں تعظیم وتکریم کرتے ہیں اگر وہ دینداری کے کام چھوڑ دیں تو یہ منافع فوت ہو جاویں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور تماشا ہے وہ یہ کہ بعض لوگ دنیا کے قصد سے دین کا وہ جزو اختیار کرتے ہیں جس کو خود بھی دین نہیں سمجھتے، جانتے ہیں کہ یہ دین کے کام نہیں سراسر دنیا ہے مگر اپنی اغراض حاصل کرنے کے لئے دوسروں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ دین ہے۔ یہ صورت پہلی صورت سے بھی بدتر ہے کیونکہ گو دونوں جگہ مقصود دنیا ہی ہے اور اس کے لئے دین کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔ مگر پہلی صورت میں تو ایسے دین کو ذریعہ بنایا گیا تھا جس کو دین تو سمجھتے تھے تو نیت ہی میں فساد ہوا دین میں تو تغیر نہیں کی اور دوسری صورت میں ایسے دین کو ذریعہ بنایا گیا ہے جس کو خود بھی دین نہیں سمجھتے مگر مخلوق کو دھوکہ دینے کے لئے اُسے دین میں ٹھونسنا چاہتے ہیں تو اس میں فساد نیت اور تغیر دین دونوں ہیں۔ چنانچہ آجکل ایسے بہت کام کئے جاتے ہیں جن کو دین سے کچھ تعلق نہیں ایسے علماء خوب جانتے ہیں کہ یہ محض دنیا ہے مگر نہایت بے باکی کے ساتھ ان کو دین بنایا جاتا ہے۔

اب میں ان دنیاداروں کی شکایت چھوڑتا ہوں صرف مخلص دینداروں کی ایک حالت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آجکل بعضے لوگ جو دیندار ہیں ان میں یہ مرض ہے کہ وہ دین کے کام کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا طریقہ معلوم نہیں کرتے۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

تو ان کی ایسی مثال ہے کہ مکان بنانا چاہتے ہیں مگر گارے اینٹ کی فکر نہیں۔ کاشت کرنا چاہتے ہیں مگر تخم وغیرہ سامان جمع کرنے کی تدبیر نہیں۔ یوں چاہتے ہیں کہ بے گارے اینٹ کے مکان بن جائے اور بدون تخم کے کاشت ہو جائے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایسا بے ڈھنگا طریقہ اختیار کرتے ہیں جس سے پہلا جمع کیا ہوا ذخیرہ بھی برباد ہو جائے۔ خدا تعالیٰ سے اگر ان کو کچھ تعلق ہوا بھی تھا وہ ان کی خرافات سے زائل ہو جاتا ہے ان کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے قرض لیکر مکان بنایا تھا جب قرض خواہ نے تقاضا کیا تو اُس نے غصہ میں آکر سارا مکان ہی ڈہا دیا کہ جاؤ ہم نے تمہارے قرض کا مکان ہی نہیں رکھا اب لیلو کہاں سے لوگے قرضخواہ نے اس کی نالش کردی روپیہ بھی دینا پڑا اور گھر بھی برباد ہوا۔ غرض کام کا طریقہ نہ اختیار کرنے سے یہ لوگ اپنا پہلا سرمایہ بھی برباد کر رہے ہیں صاحبو! دنیا میں جو شخص ایسی بے اصولی کرتا ہے اس کو سب احمق کہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ دین میں ایسی بے اصولی کرنے والے کو نہ کوئی دوسرا احمق کہتا ہے نہ وہ خود اپنے کو احمق سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کا مصداق ہے کہ ؎

دماغ بیہودہ پخت وخیال باطل بست (دماغ بیہودہ پکایا خیال باطل باندھا)

افسوس کھیتی کی امید اور اسباب سے غفلت یہ کونسی عقلمندی ہے دنیا میں اگر کوئی کھیتی کی امید کرتا ہے تو وہ اسباب کو اختیار کرتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ ؎

رزق ہرچند بیگماں برسد لیک شرط است جستن اندرہا

(رزق بیشک ملے گا لیکن اس کو اسباب سے تلاش کرنا شرط ہے)

کہ رزق ہرچند بیگماں پہونچتا ہے مگر اس کا دروازوں پر تلاش کرنا شرط ہے۔ جستن از درہا سے بھیک مانگنا مراد نہیں بلکہ یہ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آؤ) کا ترجمہ ہے کہ اسباب عادیہ کا اختیار کرنا اور طریقہ سے کام کرنا شرط ہے یہ مطلب گلستاں پڑھانے والوں کے ذہن میں بھی نہ آیا ہوگا اور میری سمجھ میں بھی آج ہی آیا ہے مولانا بھی اسی مضمون کو فرماتے ہیں ؎

اُطْلُبُوا الْأَرْزَاقَ مِنْ أَسْبَابِهَا وَادْخُلُوا الْأَبْيَاتَ مِنْ أَبْوَابِهَا

(روزی کو اس کے اسباب سے طلب کرو اور گھروں میں دروازوں سے داخل ہو)

اطلاع ضروری۔ خط و کتابت کرنے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرانے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔

یعنی جس طرح روزی کو اسباب سے تلاش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر کام کو اس کے قاعدہ سے کرنا چاہیئے۔ افسوس آج کل اکثر دینداروں کی حالت یہ ہے کہ وہ دین کو دین کے قاعدہ سے نہیں حاصل کرتے ہر شخص اپنے اجتہاد پر عمل کر رہا ہے حالانکہ جب کام خلاف قاعدہ ہوتا ہے تو اس کے ثمرات حاصل نہیں ہوسکتے۔ دیکھئے اگر کھیتی کا قصد ہو اور اسباب اس کے اختیار نہ کئے جائیں تو ثمرہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور اس حالت میں اس کا امیدوار ہونا کہ مجھے پیداوار ملے گی سراسر بیوقوفی ہے یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو دین کے اسباب اختیار نہیں کرتے اور ثمرات کے امیدوار ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں رجاء و غرور میں بھی فرق بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جب اعمال کی اصلاح کر کے اور اعمال صالحہ پر مداومت کر کے خدا تعالیٰ سے امید رکھی جاوے تو یہ رجاء ہے اور جو شخص بدون اکتساب اعمال کے بلکہ باوجود ارتکاب معاصی کے امیدوار ثواب کا ہو وہ غرور میں مبتلا ہے۔ پس رجاء صحیح وہ ہے جس کے ساتھ اعمال پر مداومت بھی ہو مگر افسوس ہے کہ لوگوں نے دین میں توکل و تقدیر بمعنی تعطل کا نام رجاء رکھ لیا ہے کہ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ اعمال صالحہ کی فکر کرتے ہیں نہ اُن کے بجا لانے کا طریقہ دریافت کرتے ہیں نہ معاشرت و معاملات کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور دعویٰ کرتے ہیں توکل کا کہ ہم کو خدا پر بھروسہ ہے اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں خدا تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ بخش دیں گے۔ اور دنیا کے کاموں میں جب ان سے توکل کو کہا جاتا ہے تو وہاں یوں کہتے ہیں کہ توکل برحق لیکن پہلے اسباب کو اختیار کر لینا چاہیئے اسباب کو اختیار کر کے پھر خدا پر توکل کرنا چاہیئے دنیا کے کاموں میں تو یہ شعر یاد کر رکھا ہے ؎

گفت پیغمبر بآواز بلند	بر توکل زانوئے اشتر ببند

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بآواز بلند فرمایا ہے توکل پر اونٹ کا پاؤں باندھ دو)

گر توکل میکنی در کار کن	کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

(اگر تم توکل کرتے ہو تو کاموں میں توکل کرو کسب کرو اور بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کرو)

چنانچہ کوئی شخص بدون بیل خریدے اور ہل چلائے کھیتی نہیں کرتا یہاں ہر شخص اسباب کو اختیار کرنے کی رائے دیتا ہے اور جو اس کے بغیر ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے کھیتی کا

طالب ہو اُسے سب بیوقوف بناتے ہیں مگر اے اللہ! دین کے بارے میں یہ ساری عقلیں کیوں مسخ ہوگئیں وہاں توکل بمعنی تعطل کیوں سوجھتا ہے بلکہ دنیا کے بارہ میں تو بعض لوگ اسباب کی ضرورت کے ایسے معتقد ہیں کہ اُن کے بعد خدا تعالیٰ کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے ہمارے یہاں ایک شخص زمیندار ہے اس کا بیٹا نیک ہے نماز روزہ کا پابند ہے ایک دن وہ لڑکا نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کر رہا تھا تو اُس کا تایا کہنے لگا کہ یہ لڑکا نماز کے بعد ہاتھ پھیلا پھیلا کر خدا سے کیا مانگتا ہے اس کو کس چیز کی کمی ہے۔ اناج اُس کے گھر میں بھر رہا ہے، بیل اس کے یہاں ہیں، روپے کی اسے کمی نہیں پھر خدا سے کیا مانگتا ہے۔ تو یہ تو یہ اس شخص کے نزدیک بس ان چیزوں کے بعد خدا کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ بھلا اگر خدا تعالیٰ غلہ میں آگ لگا دے اور بیلوں کو مار دے اور رقم چوری ہو جائے تو یہ شخص کیا کر لے گا۔ اسی طرح ایک ہمارے ملنے والے ایک جنٹلمین کی حکایت بیان کرتے تھے کہ انہوں نے ایک شخص کو کسی کام کے لئے کہا اس نے کہا کہ یہ کام کل کو ان شاء اللہ تعالیٰ ہو جائے گا تو وہ جنٹلمین کہتے ہیں کہ اس میں خدا کے چاہنے کا (یہ انگریزی طرز کی تقلید ہے) کیا بات ہے بس تم کل کو یہ کام ضرور کر دینا۔ بخدا ان لوگوں کی عقلیں بالکل مسخ ہوگئی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آج ہی کوئی دشمن کسی نزاع کی وجہ سے ایک گولی میں اس کا کام تمام کر دے اور ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں چنانچہ ان صاحب کا یہی انجام ہوا اور سب سامان حفاظت رکھا رہ گیا تو اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ ان شاء اللہ کہنے کی کیسی ضرورت ہے۔ پھر تو شاید وہ ہر بات میں ان شاء اللہ کہیں گے۔ یا دفعۃً پیٹ میں درد ہوا اور ہیضہ سے رات ہی کو جان نکل جاوے یا سانس گھُٹ کر مرجاوے تو کیا ہو۔ بھلا انسان کی ہستی ہی کیا ہے جس پر یہ غرور کرتا ہے میاں کی ساری زندگی کا مدار ذرا سے سانس پر ہے جہاں سانس بند ہوئی اور قصہ ختم۔ اور سانس بند ہونے کے لئے کھانا پانی ہی کافی ہے۔ بعض لوگ کھانا کھاتے ہوئے لقمہ اٹک جانے سے مرگئے ہیں اگر ان جنٹلمین صاحب کو ایسا واقعہ پیش آجاوے تو پھر وہ ہر بات میں ان شاء اللہ کہنے لگیں گے۔ جیسے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ گھوڑا خریدنے جارہا تھا کسی

دوست سے راستہ میں ملاقات ہوئی پوچھا کہاں جا رہے ہو کہا گھوڑا خریدوں گا اس نے کہا ان شاء اللہ کہہ لو وہ بولا کہ اس میں ان شاء اللہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھوڑا بازار میں ہے اور روپئے جیب میں ہے اب جاؤں گا اور تھوڑی دیر میں خرید لاؤں گا۔ چنانچہ آپ چلے تو راستہ میں کسی جیب کٹ نے جیب میں سے روپئے اڑا لئے۔ اب جو آپ گھوڑا خریدنے کے لئے دام نکالتے ہیں تو وہاں صفایا ہے نادم و پشیمان ہو کر واپس ہوا۔ راستہ میں پھر اسی دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا کہو گھوڑا خرید لائے تو آپ کہتے ہیں کہ ہم گھوڑا خریدنے گئے تھے ان شاء اللہ۔ جیب میں اتنے روپئے تھے ان شاء اللہ چور نے جیب کاٹ لی ان شاء اللہ۔ روپیہ چرا لیا ان شاء اللہ۔ اب ہم خالی ہاتھ لوٹ رہے ہیں ان شاء اللہ۔ اب آپ چوڑے جوڑ ہر بات میں ان شاء اللہ ہی کہنے لگے۔ اور یہ جو ان جنٹلمین صاحب نے کہا تھا کہ اس میں خدا کے چاہنے کا کیا بات ہے یہ اثر سائنس کا ہے۔

آج کل مسلمانوں نے سائنس والوں کی کاسہ لیسی کی ہے کہ جس طرح وہ محض اسباب پر نظر کرتے ہیں یہ بھی اسباب پر نظر کرتے ہیں۔ مگر تھوڑا سا فرق ہے اسی لئے میں نے یہ کہا کہ ان لوگوں نے سائنس والوں کی کاسہ لیسی کی ہے وہ فرق یہ ہے کہ اہل سائنس تو خدا کے بھی منکر ہیں اور یہ لوگ خدا تعالیٰ کو خالق و مؤثر مانتے ہیں۔ اہل سائنس فطرۃً اور طبیعت کو مؤثر حقیقی جانتے ہیں یہ لوگ فطرۃ کو مؤثر حقیقی نہیں مانتے بلکہ فطرت کو خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں مگر یوں کہتے ہیں کہ بس خدا نے فطرت کو پیدا کر کے اس میں تاثیر رکھدی ہے اب خدا کے تصرف کی کچھ ضرورت نہیں جو کچھ ہوتا ہے فطرت اور اسباب کے ذریعہ سے ہوتا ہے جیسے گھڑی کا چلنا کوکنے والے کا محتاج ہے مگر کوک بھر دینے کے بعد اب اس کو چوبیس گھنٹہ تک کوکنے والے کی ضرورت نہیں وہ خود بخود چلتی رہے گی بلکہ کوک بھر دینے کے بعد اگر تم اس کو روکنا بھی چاہو تو وہ رک نہیں سکتی اسی طرح یہ لوگ خدا کی ضرورت محض کوکنے کے واسطے سمجھتے ہیں اور کوکنے کے بعد خدا کی ضرورت نہیں سمجھتے ان کا خیال یہ ہے کہ خدا نے فطرت اور اسباب کو پیدا کر کے ان میں تاثیر رکھدی اب سارے کام اسباب ہی سے ہوتے ہیں خدا کے تصرف کی کچھ ضرورت نہیں مگر یہ خیال

بالکل باطل ہے مشاہدہ اس کی تکذیب کرتا ہے اگر اسباب میں ایسی تاثیر ہوتی کہ خدا کے چاہنے کو اس میں کچھ دخل نہ رہتا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ دوا سے بعض دفعہ نفع نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا ضرر ہونے لگتا ہے۔ مولانا ایک حکایت میں فرماتے ہیں ؎

از قضا سر کنگبیں صفرا فزود — روغن بادام خشکی مے نمود

از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت — آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

(قضا سے شہد نے صفرا بڑھایا اور روغن بادام خشکی کرتا تھا اور ہلیلہ سے قبض ہوا پانی مثل تارکول کے آگ کو تیز کرتا تھا)

اطباء رات دن اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک دوا ایک مرض کے لئے نافع ہے مگر بعض دفعہ وہی دوا اس مرض کو بڑھانے لگتی ہے نیز اس کی کیا وجہ کہ بعض لوگوں کو کسب سے معاش نہیں ملتی۔ دو شخص برابر سرمایہ سے تجارت کرتے ہیں اور ان میں ایک عاقل ہوتا ہے ایک بیوقوف مگر مشاہدہ ہے کہ بعض دفعہ عاقل کی تجارت نہیں چلتی بیوقوف کی چل جاتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسباب محض برائے نام بہانہ ہیں ورنہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مشیت سے ہوتا ہے۔

میں نے ایک شہر میں ایک رئیس کو دیکھا ہے کہ پہلے وہ چھ پیسے کے مزدور تھے پھر ریلوے میں نوکر ہو گئے۔ پھر ریلوے کے ٹھیکے لینے لگے حتیٰ کہ ترقی کرتے کرتے ہزاروں لاکھوں کے آدمی ہو گئے کہ بڑے بڑے بی۔ اے، ایم اے کی ڈگری پاس کرنے والے ان کے یہاں ملازم تھے اور وہ خود اپنے دستخط بھی نہ کر سکتے تھے اگر ترقی کا مدار محض اسباب پر ہے تو ذرا تم کسی دوسرے کو تو چھ پیسہ کی مزدوری سے لاکھوں ہزاروں کا آدمی بنا دو۔ اور جس طرح اس رئیس نے ترقی کی ہے اس کو بھی وہی ذرائع بتلا دو۔ یقینی بات ہے کہ ہر شخص اُن ذرائع سے ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ہر شخص رات دن مشاہدہ کرتا ہے کہ آج وہ ایک کام کا ارادہ کرتا ہے جو پورا ہو جاتا ہے کل کو پھر اُسی کام کا ارادہ کرتا ہے اور پورا نہیں ہوتا۔ اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ کہ میں نے خدا تعالےٰ کو ارادوں کے ٹوٹنے اور ناکام رہنے

سے بچانا کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ارادہ سے کچھ نہیں ہوتا کوئی دوسرا کام کرنے والا ہے

الغرض یہ خیال جو بعض مسلمانوں میں سائنس والوں کی صحبت سے پیدا ہوا ہے کہ اسباب ہی سے سب کچھ ہوتا ہے غلط اور بالکل غلط ہے مگر مجھ کو یہ بتلانا ہے کہ یہ لوگ باوجودیکہ اسباب کے ایسے معتقد ہیں مگر دین کے بارہ میں یہ بھی اسباب کو اختیار نہیں کرتے پس صحیح راستہ یہ ہے کہ نہ اسباب کو مؤثر سمجھے نہ ان کو فضول خیال کرے عادۃ اللہ یہ ہے کہ اسباب گو مؤثر نہیں مگر جو ان کو اختیار کرتا ہے حق تعالیٰ اس کی امداد فرما دیتے ہیں اور جو شخص اسباب کو اختیار نہیں کرتا اس کی ناکامی کا یہ سبب نہیں کہ اسباب مؤثر تھے اور وہ نہیں پائے گئے بلکہ ناکامی کا راز یہ ہے کہ اکثر خدا کی اعانت اسباب اختیار کرنے کے بعد ہوا کرتی ہے اور بدون اس کے نہیں ہوتی۔ پس اس نے خدا کی اعانت کو حاصل نہیں کیا۔ خوب سمجھ لو۔ پس اسباب کو جمع کر کے ثمرات کی امید کرنا رجاء ہے اور بدون اسباب اختیار کئے امید رکھنا غرور ہے۔ جیسے ایک شخص کو اولاد کی خواہش ہو مگر نکاح کا قصد نہ ہو یا کنواں کھودنا چاہے اور ہاتھ نہ ہلائے یہ لوگ احمق کہلائیں گے۔ ان کے دماغ میں مالیخولیا سمجھا جائے گا۔ ہاں نکاح کر کے اولاد کی امید رکھنا، پھاوڑا چلا کر کنویں کے پانی کا انتظار کرنا رجاء ہے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ دین کے بارہ میں ایسے لوگ کتنے ہیں جو اسباب کو جمع کر کے امیدوار ہوئے ہیں، ایسے بہت ہی کم ہیں اکثر تو محض غرور میں مبتلا ہیں۔ سالکین کی حالت یہ ہے کہ بعض لوگ دین کے طالب بن کر شیخ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت گناہوں سے نفرت نہیں ہوتی کچھ توجہ فرما دیجئے غنیمت ہے کہ یہ لوگ عمل کو کچھ تو ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لئے گناہوں سے نفرت کا اہتمام بھی ہے مگر یوں چاہتے ہیں کہ ہمیں خود کچھ نہ کرنا پڑے سارا کام توجہ سے چل جائے۔ اگر توجہ سے اس طرح کام چلا کریں تو پھر نکاح بھی نہ کیا ہوتا بس توجہ کرالی ہوتی اسی سے پلا پلایا بچہ تم کو مل جاتا۔ واہیات۔ خوب سمجھ لو کہ

کام قاعدہ ہی سے ہوتا ہے نری توجہ سے کام نہیں چلا کرتا۔ سو قاعدہ کی رو سے گناہوں سے بچنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے، چند دنوں ہمت کر کے دیکھو ان شاء اللہ گناہ خود ہی کم ہو جائیں گے اور جب تم ہی ہمت نہ کرو تو توجہ کیا کرے گی اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ ہمت بھی کی اور گناہوں سے اس وقت بچ بھی گئے مگر گناہوں سے نفرت نہیں ہوتی تو ہمت بھی اس کی تدبیر نہ نکلی تو اس کی حقیقت سمجھ لو وہ یہ کہ ہمت کے لئے گناہوں سے نفرتِ عقلی لازم ہے نفرتِ طبعی لازم نہیں اس غلطی میں بہت سے سالکین مبتلا ہیں کہ وہ گناہوں سے نفرت طبعی کو لازم سمجھتے ہیں کہ بس کبھی دل پر وسوسہ بھی نہ آئے اسی لئے ہمت کے بعد اپنے کو ناکام سمجھتے ہیں سو یہ بالکل غلط خیال ہے وسوسۂ گناہ کے مقتضا پر عمل نہ کرنا ضروری ہے۔ بلا قصد وسوسہ کا آنا یا میلان ہونا کچھ مضر نہیں اگر مقتضا پر عمل نہ ہو تو چاہے لاکھ خطرات آتے ہوں اور کیسے ہی گندے وسوسے آتے ہوں واللہ وہ شخص ولی کامل ہے۔ البتہ اگر وسوسہ کے ساتھ اس کے مقتضا پر عمل بھی ہوتا ہو تو یہ اس کی دلیل ہے کہ اس شخص کو گناہوں سے نفرت عقلی بھی نہیں اس کے علاج کی بیشک ضرورت ہے اور وہ ہمت ہے جس کی تقویت کا طریقہ یہ ہے کہ آیات عذاب و وعید میں غور کرے اور وقت موت اور عذابِ قبر اور میدان حشر کا تصور کیا کرے پھر سوچے کہ گناہوں سے موت کے وقت سخت پریشانی ہوگی۔ قبر میں عذاب ہوگا۔ قیامت میں سب کے سامنے ذلت و رسوائی ہوگی اور دوزخ کا عذاب الگ بھگتنا ہوگا روزانہ ایک وقت میں یہ مراقبہ اور تصور کیا کرے اور روزانہ کے اعمال کا محاسبہ کر کے گناہوں سے بچّی توبہ کیا کرے اس سے چند روز میں، ہمت میں قوت ہو کر نفس کی مخالفت سہل ہو جائے گی۔ اب تم اس کی فکر میں نہ پڑو کہ وسوسہ تو اب بھی آتے ہیں۔ وساوس کا آنا کچھ مضر نہیں اور ان کا قطع کرنا تمہارے اختیار سے باہر ہے تم اس کے مکلّف نہیں ہو۔ رہا یہ سوال کہ یہ وساوس گو مضر نہیں مگر نہ آتے تو اچھا تھا یہ کیوں آتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس

واسطے آتے ہیں کہ حق تعالےٰ تم کو اجرِ عظیم دینا چاہتے ہیں اگر تم کو گناہوں کا خطرہ بھی نہ آیا کرتا تو پھر اُن سے بچنے میں تمہارا کیا کمال تھا۔ نامرد اگر زنا نہ کرے تو کیا کمال ہے اور اب گناہوں سے بچنے میں تمہارا کمال ظاہر ہوتا ہے کہ وسوسے آتے ہیں خیالات تنگ کرتے ہیں اور تم سب کی مخالفت کرتے ہو اور اسی لئے انسان فرشتوں سے افضل ہے اگر اس میں گناہوں کا تقاضا بھی نہ ہوتا تو پھر اس میں اور فرشتوں میں فرق ہی کیا ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است

کہ ازد حمام تقویٰ روشن است

(شہوت دنیا مثل کوڑے کرکٹ کے ہے کہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

سبحان اللہ کیا عجیب تعلیم ہے فرماتے ہیں کہ شہوت دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے حمام کے لئے خس و خاشاک کہ اگر خس و خاشاک کو حمام جلانے کے کام میں لگایا جاوے تو اُس سے حمام روشن ہوتا ہے اور اگر حمام کے کام میں نہ لگایا جاوے تو ظاہر ہے کہ اس سے گھر خراب ہونے کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔ تو خدا تعالےٰ نے یہ تقاضا اور یہ وساوس تمہارے اندر اس لئے پیدا کئے ہیں تاکہ تم اس سے تقوے کے حمام کو روشن کرو یعنی ان کی مخالفت کر کے ہمت سے ان کے مقتضی پر عمل نہ کرو اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا تقویٰ نہایت لذیذ ہوگا اور اس واسطے یہ تقاضا تم کو نہیں دیا گیا کہ تم اسی سے اپنا گھر بھر لو کہ اس حالت میں تمہارے دل کی وہی حالت ہو جائیگی جو کوڑے کباڑ سے گھر کی حالت ہوتی ہے۔ بس تم کو چاہیئے کہ ان وساوس کے آنے سے دلگیر مت ہو اور ساتھ کے ساتھ تقوے کے حمام میں ان کو جلاتے رہو گھر میں جمع نہ کرو۔ دوسرا نفع یہ ہے کہ تقویٰ میں نشاط و سرور روحانی ان خطرات و وساوس کے بعد حاصل ہوتا ہے اگر تم بازار میں جاؤ اور کوئی عورت تمہارے سامنے سے نہ گذرے تو تم کو نہ گناہ ہوا نہ کچھ خاص نشاط روحانی حاصل ہوا۔ اور اگر کوئی عورت سامنے سے جاتی ہوئی ملی مگر تم نے اس کی طرف نظر نہ کی تو اس وقت اگرچہ تم کو ایک

کلفت ہوگی مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک خاص سرور ونشاط حاصل ہوگا جب چاہے تجربہ کرکے دیکھ لو اس وقت تم بزبان حال یوں کہو گے ؎

للہ الحمد نمردیم و رسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

(خدا کا شکر ہے کہ ہم نہ مرے اور دوست تک پہونچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفریں ہو جیو)

اس تقاضے کی مثال ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک مگر تم اس سے ایسے گھبراتے ہو جیسے مثل مشہور ہے کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے کہا میری آنکھیں ہی پھوڑ دیں تو جس طرح نمک کھانے میں اعتدال کے ساتھ ہو تو کھانا لذیذ ہوتا ہے اسی طرح اس تقاضے سے بھی تقویٰ لذیذ ہو جاتا ہے بشرطیکہ اعتدال کے ساتھ ہو ورنہ زیادہ نمک سے کھانا کڑوا بھی ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے جوان کا تقویٰ بوڑھے کے تقویٰ سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے جوان کو تقویٰ میں بوڑھے سے زیادہ نشاط و سرور روحانی حاصل ہوتا ہے، کیونکہ بوڑھے کو نہ خطرات آتے ہیں نہ وساوس تو اس کو تقوے کی لذت کی کیا خبر ہو اور جوان بیچارہ ہزاروں خطرات و وساوس کا مقابلہ کرکے ان سے بچتا ہے تو اس کو تقوے کا مزہ معلوم ہوتا ہے جیسے ایک تو وہ شخص ہے جو دریا کے کنارہ پر کھڑا ہے کبھی دریا میں گرنے کی اسے نوبت ہی نہیں آئی اُسے کنارہ کی سلامتی کی کیا قدر ہو۔ اور ایک وہ شخص ہے جو دریا میں گر پڑا تھا۔ ڈوبنے کو ہو گیا تھا پھر وہاں سے ہاتھ پیر مار کر غوطے کھا کر نکل آیا تو اس کی لذت کا حال اب نہ پوچھو عارف شیرازی اسی کو فرماتے ہیں ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

(حیرت میں ہماری حالت ایسی ہے جیسے اندھیری رات ہو اور موج کا خوف ہو اور ہولناک بھنور میں کشتی آگئی ہو ہمارے اس حال کی ان لوگوں کو کب خبر ہو سکتی ہے جو ہلکے پھلکے کنارے پر کھڑے ہیں دریا میں قدم نہیں رکھا)

پھر جب ایک شخص دریا سے نجات پاکر باہر آتا ہے تو یہ اپنے ہاتھ پیروں کو بوسہ دیتا ہے اور ان کی قدر کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے میں ہلاکت سے بچ گیا۔

اسی طرح جب سالک مجاہدہ کرکے تقویٰ اختیار کرتا اور مقصود میں کامیاب ہوجاتا ہے تو بعد میں اس کو بھی اپنے جسم وجان سے محبت ہوجاتی ہے اور وہ ان کی بڑی قدر کرتا ہے کہ میں انہی کے ذریعہ سے محبوب تک پہونچا ہوں اب ان کی خدمت کرنی چاہیئے کیونکہ مجاہدات وریاضات میں یہ سب چکنا چور ہوگئے ہیں۔ پس وہ بزبانِ حال یوں کہتا ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است ‌‌‌ ‌ اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ‌ ‌ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انھوں نے تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پر رشک ہے کہ تیرے کوچہ میں پہونچے ہیں ہردم اپنے ہاتھوں کو ہزاروں بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

یہی وجہ ہے کہ مسلمان جنت میں پہونچکر کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم سے مشقت ورنج کو دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے جس نے ہم کو (ہمیشہ رہنے کے گھر میں پہونچا دیا (محض) اپنے فضل سے جہاں ہم کو نہ مشقت چھو سکتی ہے نہ خستگی۔ تو بات یہ ہے کہ مسلمان کو تو پوری راحت جنت میں ہی جاکر نصیب ہوگی دنیا میں تو وہ ہر وقت معصیت سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں کوئی کام خلاف مرضئ حق نہ ہوجائے جب یہ مصائب جھیل کر وہ جنت میں پہونچیں گے تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہ ثنا نکلے گی۔ اس وقت ان کو اپنے تمام اعضا کی پوری قدر ہوگی اور ان کو خوب راحت پہونچائیں گے کہ لو تم نے دنیا میں بہت مجاہدات وریاضات کئے ہیں اب آرام حاصل کرو۔ اور جس نے غم ہی نہ دیکھا ہو وہ جنت کی کیا قدر کرسکتا ہے حدیث میں آتا ہے کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہونچ جائیں گے تو جنت ودوزخ دونوں حق تعالےٰ سے شکایت کریں گی کہ ہم تو خالی رہ گئے ہم کو پُر کیجئے تو اس وقت دوزخ

کو تو حق تعالیٰ اپنی قدرت سے ویسے ہی بھر دیں گے عجب نہیں کہ اس کے اجزا ر سمٹ جائیں اور جنت کے لئے ایک نئی مخلوق پیدا کریں گے تو میں نے اس حدیث کو پڑھ کر حضرت استاد سے عرض کیا کہ حضرت وہ بڑے مزے میں ہوں گے کہ نہ کچھ کیا نہ کرایا مفت میں جنت لے لی مولانا نے فرمایا کہ وہ کیا خاک مزہ میں ہوں گے وہ تو یہ سمجھیں گے کہ جس طرح کی راحت میں ہم ہیں راحت ایسی ہوتی ہوگی اس لئے بس اُن کو جنت کی کیا قدر ہوگی۔ اور ہم لوگ دنیا کے مصائب جھیل کر جب جنت میں جائیں گے تو ہم کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ؕ (اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے مشقت و رنج کو دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بہت بخشنے والا قدر دان ہے) یہ بات ان کو کہاں نصیب۔

ایک مرتبہ مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری کی دعوت دہلی کے ایک شہزادے نے کی ایسے ایسے کھانے پکائے جن کا نام بھی مولانا نے نہ سنا تھا پھر کھانے کے بعد وہ شہزادے مولوی صاحب سے پوچھنے لگے کہ مولانا یہ کھانے کیسے پکے مولانا نے فرمایا کہ ہم کو کیا خبر کیسے پکے ہم نے تو یہ کھانے آج ہی کھائے ہیں ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اسی طرح پکتے ہوں گے، ہاں کئی بار دعوت کرو اور یہی کھانے کھلاؤ تو اس وقت فرق معلوم ہو کہ پہلی بار ایسے پکے تھے دوسری بار ایسے پکے۔ شاہزادے نے کہا اچھا آیندہ بھی دعوت کی جائے گی بہتر ہے پھر بھی کھلاؤں گا۔ حقیقت میں راحت کی قدر مصیبت والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ مزہ میں ہیں جن کو خطرات و وساوس پیش آتے ہیں۔ ان کو جب دولت تمکین عطا ہوتی ہے تو ان کو اُس دولت کی قدر ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن کو خطرات پیش نہیں آئے اور ان کو اُس وقت لذت و سرور روحانی بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ غرض گنا ہوں سے نفرت عقلی مطلوب ہے طبعی نفرت مطلوب نہیں اگر عقلاً تو نفرت ہوا در طبعاً رغبت ہو جس کی علامت یہ ہے کہ تقاضہ کا ورود ہو لیکن مقتضی پر عمل نہ ہو تو یہ وسوسہ کا درجہ ہے اس سے پریشان نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس سے اجر بڑھتا ہے۔ حدیث میں یہ مضمون موجود ہے کہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بعض دفعہ ہمارے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہو جانا پسند کرتے ہیں حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذالک صریح الایمان یہ تو خالص ایمان کی علامت ہے۔ مگر آج کل لوگ درخواست کرتے ہیں کہ ہم سے وساوس قطع ہو جائیں اور ہم کو گناہوں سے طبعی نفرت ہو جائے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو صریح الایمان فرمارہے ہیں۔ اس میں ہزاروں سالک مبتلائے غم ہیں ۔ بعض لوگ مشائخ کے پاس آتے ہیں کہ حضور دعا کیجئے ہم مقبول ہو جائیں مگر خود مقبول بننے کے کام نہیں کرتے تو بڑی غلطی ہے اور دین دار بکثرت اس مرض میں پھنسے ہوئے ہیں۔ صاحبو ! پہلے تم بھی تو مقبول ہونے کی کوشش کرو اور ایسے کام کرو جو مقبولیت کا ذریعہ ہیں پھر شیخ کی دعا سے بھی نفع ہوگا مگر اب تو یہ اندھیر ہے کہ صرف دعا سے مقبول بننا چاہتے ہیں۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو جنت کا طالب نہ ہو قرب خدا وندی کا طالب نہ ہو خدا کی محبت و معرفت کا خواہش مند نہ ہو مگر اس کے طرق کو اختیار نہیں کرتے۔ حق تعالٰی نے اس غلطی پر اس آیت میں تو بطریق عموم متنبہ فرمایا ہے وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آؤ) اور دوسری جگہ بطریق خصوص بھی متنبہ فرمایا ہے یعنی خاص دخول جنت کے بارہ میں صراحۃً ارشاد ہے کہ تری تمنا اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا تم کو عمل کا اہتمام چاہیئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝

شانِ نزول آیت کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہود اور اہلِ اسلام میں قبلہ کے تقدم و تاخر پر تفاخر ہو رہا تھا۔ یہود کہتے تھے کہ ہمارا قبلہ مقدم ہے۔ مسلمان کہتے تھے ہمارا قبلہ مقدم ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ خدا کا قرب اور دخولِ جنت نہ تمہاری تمناؤں سے حاصل ہو سکتا ہے نہ اہلِ کتاب کی تمناؤں سے بلکہ ہمارے یہاں تو یہ قانون ہے کہ جو کوئی برا کام کرے گا اس کو اس کی سزا بھگتنی

پڑے گی اور جو نیک کام کرے گا اس کو جنت ملے گی تو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے عمل کا اہتمام کرو۔

اس آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ نری تمنّا سے کام نہیں چل سکتا اور نری تمنا کا درجہ وہی ہے جس کی ساتھ عمل کا اہتمام نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ مقصود اعمال ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیئے اس کے بعد جو تمنّا ہو گی وہ رجار کا درجہ ہو گا۔ خلاصہ یہ کہ جب عمل کا مقصود ہونا ثابت ہو گیا تو اس کا اہتمام سب مسلمانوں کو کرنا چاہیئے۔ رہا اس کا طریق تو اس کے لئے ساری شریعت موجود ہے شریعت سے پوچھ پوچھ کر عمل کرو۔ اور اعمال پر مداومت و استقامت کی سہولت اور ان کی اصلاح و تکمیل یہ موقوف ہے اہل اللہ کی صحبت پر چنانچہ اسی آیت لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ الیٰ آخرھا کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ط اور اس شخص سے اچھا کون ہے جو اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دے دراں حالیکہ وہ صاحب اخلاص ہو اور ملّۃ ابراھیم کا متبع ہو۔ جو کہ حنیف تھے یعنی ماسوائے اللہ سے یکسو تھے۔ یہاں اسلام وجہ سے مراد فنا ہے کیونکہ کامل سپردگی اسی سے ہوتی ہے۔ جس کے بعد نسبت احسان عطا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وَهُوَ مُحْسِنٌ میں نسبت احسان ہی کی طرف اشارہ ہے۔ مقام اخلاص جب کامل ہو جاتا ہے تو اُسی کو نسبت احسان سے صوفیہ کی اصطلاح میں تعبیر کیا جاتا ہے۔

آگے بتلاتے ہیں کہ یہ دولت کس طرح حاصل ہو گی ارشاد ہے وَاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ط یعنی جو شخص مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ کا اتباع کرے گا اُسے یہ دولت عطا ہو گی۔ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اتباع ابراھیم علیہ السلام سے یہ نعمت عطا ہو گی حتیٰ کہ یہ شبہ ہو کہ بس جو لوگ ابراہیم علیہ السلام کی امت میں نہیں اُن کو یہ دولت نہ ملے گی بلکہ اتباع ملۃ ابراھیم پر اس نعمت کو موقوف کیا گیا ہے

جس سے مراد ان کے مذاق کا اتباع ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کا مذاق فنا تھا۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(ملتِ ابراہیم سے وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کرلیا ہے اور اسی کی بدولت وہ آخرت میں بڑے لوگوں میں سے شمار کئے جاتے ہیں اور جب ان سے ان کے رب نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے رب العالمین کی اطاعت اختیار کی)

اور یہ دولت ہر نبی کو عطا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا ظہور سب سے زیادہ کامل تھا پس ہمارے لئے ملتِ ابراہیمیہ کے اتباع کا تحقق اتباع محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صورت میں ہوگا۔ حاصل یہ ہوا کہ یہ دولت کسی فانی کے اتباع سے حاصل ہوگی۔ بدون کسی فانی کے اتباع کے تکمیل اعمال نہیں ہوسکتی۔ رہا یہ کہ پھر اتباع فانی کے بعد کیا ہوگا آیا صرف استقامت ہی عطا ہوجائیگی یا اس سے بھی زیادہ کچھ ملے گا۔ اس کی بابت ارشاد ہے وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝ کہ حق تعالےٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو مذاق فنا کی بدولت خلیل بنالیا تھا تو سمجھ جاؤ کہ جو شخص کسی فانی کا متبع ہوگا اُسے دولت خُلّت عطا ہوگی میرے ذوق میں اس جملہ کے اندر اتباع فانی کی جزا کا ذکر ہے مگر صراحۃً نہیں بلکہ اشاروں میں بیان کیا ہے کیونکہ ؎

خوشتر آن باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

(محبوب کے ایسے راز کا دوسروں کی حکایات اور تمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے)

حاصل یہ ہوا کہ جس کو مقاصد دینیہ کی طلب ہو وہ عمل کا اہتمام کریں اور تکمیل عمل کے لئے صحبت اہل اللہ کو لازم سمجھے یہ طریقہ ہے کامیابی کا ہیں نے قاعدہ کلیہ بتلادیا ہے۔ جزئیات کی تفصیل مجالس عرفاء میں ہوتی رہتی ہے اگر صحبت عارفین میسر ہوجائے تو بسا غنیمت ہے ؎

مقام امن ومی بیغش و رفیق شفیق

گرت مدام میسر شود زہے توفیق

(مقام امن اور خالص شراب محبت اور شفیق رفیق اگر تم کو ہمیشہ میسر ہوجائیں تو بہت ہی اچھی توفیق ہے)

در مطالعہ ملفوظات کے متعلق فرماتے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است

صراحئ مے ناب وسفینۂ غزل است

(جو زمانہ شیخ سے خالی ہو اس میں اس کے مکتوبات اور ملفوظات سے مستفید ہو)

دیکھئے حضرت حافظ رح کتاب کو بھی رفیق فرمارہے ہیں اور شیخ کا رفیق ہونا اوپر کے شعر سے معلوم ہوچکا ہے نیز اس کا رفیق ہونا ہر اک کو معلوم ہے کہ وہ مُعین آخرت ہوتا ہے اور حضرت حافظ کے کلام سے کتاب کا بھی رفیق ہونا معلوم ہوگیا۔ باقی فضول مجلس آرائیوں کو چھوڑنا چاہیئے اس سے آخرت کا بہت ضرر ہوتا ہے اور اگر کسی شخص کو کسی موقع پر کسی عارف کی خدمت نصیب نہ ہو نیز اوراد وکتب بینی سے گھبرا جاوے اور کچھ دیر اپنا دل بہلانا چاہے تو بجائے چوپال اور مجالس میں بیٹھنے کے اس کو اپنے بیوی بچوں میں دل بہلانا چاہیئے اس میں باطن کا ضرر نہیں ہوتا کیونکہ اہل وعیال کی دلجوئی بھی سنت ہے۔ ایک عارف کہتے ہیں ؎

بجدے کن وبا مردم دانا بنشیں + باصدق وصفا

یا باصنم لطیف ورعنا بنشیں + باشرم وحیا

اس سے مراد زوجہ ہے یعنی یا تو شیخ کی صحبت میں رہو اگر شیخ میسر نہ ہو تو بیوی کے پاس بیٹھو اس سے بھی حفاظت رہتی ہے ؎

زیں ہر دو گر ت یکے میسر نشود + از طالع خویش

اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں + در یادِ خدا

(اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی میسر نہ ہو تو تنہا یادِ خدا میں بیٹھو)

یہ طریقہ ہے آجکل سلامتی کا اور اس کے سوا اور جو تدبیریں سلامتی کی جاتی ہیں سب میں فتنہ ہے ؎

گر گریزی بر امید راحتے

ہم از انجا پیشت آید آفتے

(اگر کسی راحت یا آرام کی امید پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

واقعی آجکل جن لوگوں کو دوست سمجھا جاتا ہے ان ہی میں سے دشمن نکل آتے ہیں اس لئے اب مخلوق سے ملنے ملانے اور مجلس آرائی کرنے کا زمانہ نہیں رہا انسان اپنے کام میں لگا رہے دنیا کے یا دین کے اور اس کے بعد جو وقت بچے اُسے خدا کی یاد میں گذارے۔ کچھ دیر بال بچوں میں دل بہلائے۔ کچھ وقت کتب بینی کے واسطے نکال لے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دو و بے دام نیست

جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے خلوت گاہ حق کے سوا کسی جگہ آرام نہیں ہے)

پس دنیا و آخرت کی راحت و چین کا طریقہ میں نے آپ کو بتلا دیا ہے۔ میں اس وقت حجت اللہ ختم کر چکا ہوں آگے عمل کرنا نہ کرنا سامعین کے اختیار میں ہے۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کیونکہ بدون ان کی امداد کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ ہم کو ظاہری و باطنی بیماریوں سے شفا دے اور ہماری اصلاح فرمائے اور ہم کو عمل کی توفیق دے آمین۔ والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علے سید المرسلین سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین :

تمت

قال اللہ تعالیٰ

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ

سلسلۂ البشریٰ کا وعظ

الجلاء للابتلاء

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبدالمنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی ——— دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم-اے- جناح روڈ

سلسلۂ البشریٰ کا

وعظ

الجلاء لِلابتلاء

این	متٰی	کیف	کم	من ضبط	لم	من ای شان	المستمعون
کہاں	کب	کیسے	کس قدر	کس نے لکھا	کس لئے ہوا	کیا مضمون تھا	سننے والوں کی تعداد
جامع مسجد تھانہ بھون	جمعہ ۲۲ محرم ۱۳۳۷ھ	جالساً	۲ گھنٹہ	ظفر احمد عفا اللہ عنہ	بوجہ عموم مرض و بلیات	اکثر مصیبتیں گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں	۱۰۰ تقریباً

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمد اعبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد

اس وقت مجھ کو تین مضمونوں کا بیان کرنا مقصود ہے چونکہ ان تینوں کی جمع کرنے والی کوئی حدیث یا آیت اس وقت میرے ذہن میں نہیں آئی اس لئے کوئی آیت وغیرہ نہیں پڑھی۔ اُن میں سے ایک مضمون تو یہ ہے کہ جس قدر مصیبتیں ہمارے

اد پر آتی ہیں وہ اکثر ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں مصرح ہے۔ وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ (جو کچھ تم کو مصیبت پہونچتی ہے وہ تمہارے گناہوں سے پہنچتی ہے) اس لئے ہم کو ایسے وقت میں توبہ و استغفار سے کام لینا چاہیئے اور اپنے اعمال کی اصلاح کا خیال کرنا چاہیئے اور یہ مضمون گو آپ حضرات بارہا سُن چکے ہیں مگر سننا اور چیز ہے اور گُننا اور چیز ہے۔ سو یہ بات کانوں میں اگرچہ پڑ چکی ہے مگر اب تک گُننا نہیں اور اس گُننے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی جو حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ سے سُنی ہے وہ یہ کہ ایک عالم ہدایہ کے حافظ تھے ایک دوسرے عالم ہدایہ کے تو حافظ نہ تھے مگر اس کو سمجھے ہوئے زیادہ تھے۔ ایک مسئلہ انہوں نے بیان کیا اور یہ کہا کہ یہ مسئلہ ہدایہ میں ہے۔ وہ حافظ ہدایہ بولے کہ ہدایہ میں یہ مسئلہ نہیں ہے۔ ان کو اپنے حفظ پر ناز تھا مگر دوسرے عالم نے ہدایہ کھول کر دکھلا دیا کہ فلاں جگہ سے یہ مسئلہ نکلتا ہے۔ وہ مقام ان حافظ ہدایہ کو بھی یاد تھا مگر وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ اس مقام سے ایک دوسرا مسئلہ بھی نکلتا ہے۔ جب ان کو مسئلہ سمجھا دیا گیا تو وہ حافظ ہدایہ یہ دیکھ کر رو پڑے۔

اس حکایت کے بعد مولانا نے فرمایا کہ اُن دونوں میں سے ایک تو ہدایہ کے صرف پڑھے ہوئے تھے اور ایک ہدایہ کو گُنے ہوئے تھے۔ سو دیکھو پڑھنے میں اور گُننے میں کتنا بڑا فرق ہے، اور یہی فرق ہے درمیان علماء حنفیہ کے اور دیگر علماء کے خصوصاً شافعیہ و حنبلیہ کے کہ شافعیہ اگرچہ کثیر الروایات ہیں اور حنبلیہ تو اس صفت میں شافعیہ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں مگر فہم حنفیہ کو خدا نے ایسی دی ہے کہ دوسرے علماء اُن کی برابری نہیں کر سکتے۔ یہ بات میں سے بات ایسی نکالتے ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہے گو ان کی نسبت سے قلیل الروایات ضرور ہیں اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ کمی ان میں ضرور رہ گئی مگر معانی کی خدمت لذت میں وہ الفاظ حدیث کی زیادہ خدمت کرنے میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے اور یہ بات میں کوئی اعتقاداً نہیں کہتا بلکہ مخالفین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر مِنْ حَیْثُ لَا یَدْرُوْنَ (اس اعتبار سے کہ وہ نہیں جانتے) چنانچہ ابن خلکان کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ

انہوں نے امام ابو حنیفہ کی نسبت لکھا ہے کہ امام صاحب کو کل سترہ حدیثیں پہونچی ہیں یہ قول اگرچہ کسی درجہ میں بھی صحیح ماننے کے قابل نہیں کیونکہ امام صاحب کے واسطہ سے جس قدر روایات موطا محمد و آثار محمد وغیرہ میں اس وقت موجود ہیں اگر ان سب کو ہی جمع کرلیا جائے تو وہ اس سے بدرجہا زیادہ نکلیں گی اور یہ ظاہر ہے کہ ان حضرات نے مسندات ابو حنیفہ کے احاطہ کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ طبعاً و ضمناً امام صاحب کی روایات کو بھی دیگر شیوخ کی روایات کے ساتھ ذکر کردیا تو اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام صاحب کی روایات کس قدر ہوں گی۔ سترہ کا غلط ہونا تو بالکل بدیہی ہے مگر میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم ابن خلکان کے اس قول کی تردید کیوں کرتے ہو اس سے تو ہمارے امام کی منقبت نکلتی ہے منقصت نہیں نکلتی کیونکہ امام صاحب کا مجتہد ہونا تو سب کو مسلم ہے اس کا تو کسی کو انکار نہیں اور انکار ہو کیونکر سکتا ہے جبکہ ہر باب میں امام صاحب کے اقوال موجود ہیں اور ہر مسئلہ میں وہ دخل دیتے ہیں اور مخالفین بھی اکثر مسائل میں امام صاحب کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ مخالفین گو امام صاحب کو محدث نہ تسلیم کریں مگر مجتہد ضرور مانتے ہیں علاوہ ازیں صراحت کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ائمہ محدثین نے ابو حنیفہ کے فقیہ و مجتہد ہونے کا اقرار کیا ہے اور نہ صرف مجتہد ہونا بلکہ تمام فقہاء کا فقہ میں عیال ابو حنیفہ ہونا تسلیم کیا ہے تو ایک مقدمہ تو یہ لے لیا جائے اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملا لیا جائے کہ امام صاحب کو حدیثیں کل سترہ ہی پہونچی تھیں۔ اب دونوں مقدموں کو ملا کر دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے، وہ نتیجہ یہی ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فہم بہت ہی عالی تھی کہ صرف سترہ حدیثوں سے اس قدر مسائل استنباط کئے کہ دوسرے ائمہ باوجود لاکھوں احادیث کے حافظ ہونے کے بھی ان کے برابر مسائل مستنبط نہ کر سکے اس سے زیادہ فہم کی کیا دلیل ہو گی معلوم ہوا کہ بہت ہی بڑے مجتہد تھے ہمارے احباب حنفیہ ابن خلکان کے اس قول سے فضول چیں بجبیں ہوتے ہیں، اس پردہ میں تو وہ امام صاحب کی اتنی بڑی مدح کر گئے جس کی کوئی حد نہیں، خواہ مخواہ ہم اس قول کی تردید کے درپے کیوں ہوں ہمیں مان لینا چاہیئے کہ اچھا صاحب امام صاحب کو سترہ

ہی حدیثیں ملی تھیں۔ مگر کس قدر عالی فہم تھے کہ چند حدیثوں سے لاکھوں جزئیہ اور مسائل سمجھ لئے۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا اس قول کے غلط ہونے کا تو خود محدثین کو بھی اقرار ہے مگر اس میں شک نہیں کہ روایت میں حنفیہ کا پلہ دوسرے ائمہ و محدثین کے برابر نہیں مگر درایت میں ہر اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حدیث و قرآن کو پڑھایا تو سب نے مگر گنا حنفیہ ہی نے ایک عالم بالحدیث کا قصہ ہے کہ وہ مجھ سے اکثر معاملات کے متعلق مسائل پوچھا کرتے تھے میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے علماء سے یہ مسائل کیوں نہیں پوچھتے۔ مجھ سے کس لئے پوچھتے ہو تو حالانکہ وہ اپنے مسلک میں بہت ہی پختہ ہیں مگر انصاف کی بات چھپی نہیں رہا کرتی زبان سے بے ساختہ یہی نکلا کہ ہمارے علماء تو آمین و رفع یدین کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ یہ مسائل ان کو نہیں آتے آپ ہی سے پوچھ کر تسلی ہوتی ہے۔ غرض معلوم ہو گیا کہ کسی بات کا پڑھنا سننا اور ہے گننا اور ہے۔ بس اسی طرح مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (جو کچھ تم پر مصیبت آتی ہے وہ تمہارے گناہوں سے آتی ہے) کو سنا تو سب نے ہے مگر گنا نہیں۔ یعنی سمجھا نہیں۔ اس لئے اس وقت پھر اس کے بیان کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ آج کل ہر طرف بیماری کا زور ہے اور جا بجا لوگوں میں اس وقت اسی کا چرچا ہے مگر جو اس کی اصل تدبیر ہے اس سے سب غافل ہیں۔ اِلَّا ماشاءاللہ۔ تو اس وقت میں اس مضمون کو مختصر طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ اب تک جو نہیں سمجھے تھے وہ اس وقت سمجھ لیں۔ اور یہ مضمون تو ایسا ہے کہ اکثر کانوں میں پڑ بھی چکا ہے مگر دوسرا تیسرا مضمون جو اس کے بعد مجھے بیان کرنا ہے اور وہ اس دعوے کے متعلق شبہات کے جواب ہیں وہ جس طرح آج بیان ہو گا اس طرح شاید کبھی کانوں میں نہ پڑا ہو گا۔

سو اول اصل مضمون سنئے حق تعالیٰ صاف فرماتے ہیں کہ جو کچھ مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (جو مصیبت تم کو پہنچتی تمہارے

گناہوں سے پہونچتی ہے اور اللہ تعالےٰ بہت سے گناہوں کو درگذر فرما دیتے ہیں)
معلوم ہوا کہ ہماری خطا پر مواخذہ نہیں فرماتے بلکہ بہت سے گناہوں سے درگذر بھی فرمادیتے ہیں۔ مگر جب ہم بہت ہی گناہوں میں منہمک ہوجاتے ہیں اس وقت مصائب کا نزول ہوتا ہے تاکہ ہم کچھ اپنی حالت پر توجہ کریں اور سنبھل جائیں مگر ہم اتنے غافل ہیں کہ تنبیہ سے بھی متنبہ نہیں ہوتے اور جب مصیبت آتی ہے تو سوچتے ہیں کہ ہم سے ایسا کیا قصور ہوگیا کہ یہ بلائیں ہمارے اوپر نازل ہوئیں مگر حق تعالیٰ کے ارشاد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بلائیں ہمارے گناہوں ہی کی بدولت ہیں۔
اس آیت میں تو سب کو خطاب ہے۔ دوسرے مقام پر خاص صحابہؓ کو ارشاد ہوتا ہے اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ کیا جس وقت تم کو ایسی ایک مصیبت پہنچی کہ جس سے دو چند تم کفار کو پہنچا چکے ہو تو (اُن جان بنکر) تم یوں کہنے لگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی۔ آپؐ اُن سے کہہ دیجئے کہ یہ تمہارے ہی پاس سے آئی ہے۔
تو یہ ایک آیت میں بطور قاعدہ کلیہ کے یہ بات معلوم ہوچکی کہ سب مصائب بوجہ گناہوں کے نازل ہوتے ہیں۔ دوسری آیت میں خاص حضرات صحابہ کو ارشاد ہوتا ہے کہ تم کو جو اس مصیبت کے آنے کے وقت یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ یہ کہاں سے آگئی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمہارے ہی سبب سے یعنی تمہارے اعمال کے سبب سے آئی جن کا منشاخود تمہاری ذات ہے اس دوسری آیت کے پڑھنے سے میرا مقصود آپ کا ایک عذر بھی بیان کرنا ہے اور یہ بات نذرانہ لے کر بیان کرنا چاہیئے تھی، کیونکہ عذر کا اثر تخفیف جرم ہے۔ سو اس سے آپ کو کتنا بڑا نفع پہونچا جس کی آپ کو خبر بھی نہ تھی سو خبر کرنا نذرانہ کا کام ہے یا نہیں؟ مگر لیجئے میں مفت ہی بتلائے دیتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین امت میں سب سے زیادہ اعمق علماً ہیں اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر صحابی ہر امتی سے باعتبار علم کے اعمق ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فقہاء صحابہ کا علم تمام فقہاء امت سے عمیق ہے اور عوام صحابہ کا علم عوام امت کے

علم سے عمیق تر ہے، ورنہ یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحابی بدوی جنھوں نے مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آکر پیشاب کر دیا تھا ان کا علم امام ابو حنیفہؒ کے علم سے زیادہ عمیق تھا. ظاہر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا علم ان سے بڑھا ہوا تھا ان کے علم کا حال تو اسی واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ ایک نہ دو اکٹھے تین کام فقہ کے خلاف کئے اول تو پیشاب سب کے سامنے کیا بدن برہنہ ہوا پھر پیشاب بھی مسجد میں کیا اگر ان کو امام ابو حنیفہ سے زیادہ اعمق علماً کہا جائے تو اس میں امام ابو حنیفہ کی بھی تنقیص ہو گی اور خود ان کی بھی تنقیص ہو گی، شاید آپ تعجب کریں گے کہ ان صحابی کی تنقیص کس طرح لازم آئے گی سنئے ان صحابی کی تنقیص اس وجہ سے ہو گی کہ جس شخص میں جو کمال واقع میں نہیں اس کی طرف اس کمال کو منسوب کرنا اس کے ساتھ مسخرا پن کرنا ہے ایک شخص جس میں حسن ظاہری نہیں ہے اگر آپ اس کو یوسف ثانی کہنے لگیں تو یہ مسخرا پن ہو گا یا نہیں. کسی ان پڑھ دیہاتی آدمی کو اگر کوئی مولانا یا مولوی صاحب کہکر پکارنے لگے تو یہ اس کا مذاق اڑانا ہے یا نہیں ؟

اسی طرح اس کو بھی سمجھ لیجئے کہ ایک اعرابی صحابی کو افقہ الناس کہنا ان کی شان میں گستاخی کرنا ہے مگر اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ امام ابو حنیفہؒ ان صحابی سے افضل ہو گئے. نہیں ہرگز نہیں. امام ابو حنیفہ ان سے افضل کبھی نہیں ہو سکتے اور وہ اس حالت میں بھی امام ابو حنیفہؒ سے بدرجہا افضل ہیں، اگرچہ ابو حنیفہ فقہ میں ان سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں مگر مرتبہ اور فضیلت میں وہ صحابی تمام فقہ سے بڑھ کر ہیں کیونکہ امام صاحب کا علم اور فقہ ان کے لئے کمال تھا. مگر ان صحابی کا کمال فقہ میں نہ تھا ان کا کمال اس سادگی ہی میں تھا. ہر چیز کی ایک ادا ہوتی ہے جو اسی میں پھبتی ہے. دوسری جگہ وہ نہیں پھب سکتی.

دیکھو زیور عورتوں کے لئے باعث زیب و زینت ہے بھلا اگر کوئی مرد سر سے پیر تک زیور میں لد جائے تو اس میں کہیں وہ شان پیدا ہو سکتی ہے. اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بیوقوف شخص نے کسی ولایتی کو دیکھا کہ وہ گھوڑے کو توبڑے میں دانہ کھلا رہا تھا اور گھوڑا شوخی میں آکر کبھی ادھر کو منہ مارتا تھا کبھی ادھر کو وہ ولایتی خوش

ہوکر اس کو چمکارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ بیٹا کھاؤ اور وہ شوخی میں مُنہ مارتا تھا ان حضرت کو خیال پیدا ہوا کہ یہ شخص اپنے گھوڑے کو بہت ہی چاہتا ہے کہ اس طرح اس کو دانہ کھلا رہا ہے، میری بیوی میری بہت ہی بے قدری کرتی ہے کہ میرے سامنے کھانا رکھ کر چلی جاتی ہے تو ہم سے گھوڑا ہی اچھا۔ اب ہم بھی گھوڑا بنیں گے، چنانچہ گھر پہونچے اور بیوی سے کہا کہ آج ہم گھوڑا بنیں گے۔ ہمارے لئے دانہ تو بڑے میں لاؤ اور ایک اگاڑی اور ایک پچھاڑی ہمارے باندھو اور دم کی جگہ ایک جھاڑو باندھو اور ہم کو دانہ کھلاؤ۔ اور جب ہم انکار اور اعراض کریں تو کہنا کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ چنانچہ اس غریب نے ان کے سب حکموں کو تعمیل کی شام ہوئی تو وہ خود گھوڑے کی طرح جھک کر کھڑے ہوئے منہ میں توبڑہ اگاڑی پچھاڑی بندھی ہوئی تھی کبھی ادھر کو منہ مار دیا کبھی اُدھر کو منہ مار دیا اور وہ اسی طرح بیٹا کھاؤ بیٹا کھاؤ کہتی ہوئی کھلا رہی تھی وہ جو بہت اوچھلے کودے اور پیچھے تھا چراغ وہ جھاڑو میں لگ گیا اب لگے جلنے خود تو اس لئے نہ بجھا سکے کہ ہاتھ پاؤں سب بندھے ہوئے تھے آخر وہ عورت محلہ کے مردوں کو چلاتی ہوئی پکارنے گئی کہ ارے دوڑیو میرا گھوڑا جلا، میرا گھوڑا جلا لوگ سمجھے کہ کمبخت جھوٹ بولتی ہے کھانے کو پیٹ بھر روٹی ملتی نہیں اس کو گھوڑا کب میسر ہوا تھا اتنی دیر میں وہ گھوڑے صاحب جل بھنکر سرد بھی ہو گئے۔ تو اس بیوقوف کو اتنی عقل نہ تھی کہ ہر چیز اپنی جگہ ہی بھلی معلوم ہوا کرتی ہے ہر جگہ نہیں گھوڑے کا دانہ کھاتے ہوئے منہ مارنا اچھا معلوم ہوا کرتا ہے ہر شخص کا تھوڑا ہی اچھا معلوم ہو سکتا ہے۔ سچ ہے ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد ۔۔۔ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

عیب باشد چشم نابینا و باز ۔۔۔ زشت باشد روئے نازیبا و ناز

(ناز کرنے کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس نہ جاؤ۔ چشم نابینا کا کھلا ہونا عیب ہے بدصورت کے لئے ناز بُرا ہے۔)

یہ تو ایک ہنسی کی بات تھی مگر یہ بات ہے بالکل صحیح کہ جس چیز کی جو ادا ہے وہ اسی میں

پیاری معلوم ہوتی ہے دوسری چیز میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی تو اب آپ سمجھئے کہ ہر شخص کے لئے فقیہ ہونے ہی میں کمال نہیں بعضوں کی یہی ادا پیاری ہوتی ہے کہ وہ اَن پڑھ ہیں۔ دیکھئے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم نہ تھے مگر ان میں بدون پڑھے ہی ایک ایسی ادا تھی جس نے ہزاروں پڑھے لکھوں کو ان کے سامنے جھکا دیا تھا خوب فرماتے ہیں عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ؎

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد

بندۂ طلعت آں باش کہ آں نے دارد

(معشوق وہ نہیں کہ اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو)

غرض صحابہ کا کمال یہ نہیں تھا کہ وہ امام ابوحنیفہ کی طرح اصول و فروع کی تحقیق کرتے ان کا تو کمال ہی دوسرا تھا اس کے سامنے یہ سارے علوم و فنون ہیچ ہیں ان کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے ان آنکھوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم (رُوْحِیْ فِدَاہُ) (میری روح ان پر قربان ہو) کے جمال جہاں آرا کی زیارت کی تھی یہ وہ کمال ہے کہ اس میں اُن کی کوئی برابری نہیں کر سکتا۔ نہ عمر بن عبدالعزیز جو کہ اپنے زمانہ کے مجدد اور قطب وقت تھے اور بوجہ عدل کامل و اتباع سنت کے خَامِسُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ (خلفاء راشدین میں پانچویں شخص) شمار کیے جاتے ہیں نہ اویس قرنی جو افضل التابعین ہیں جن کے بارے میں علماء امت کا خیال یہ ہے کہ وہ گو صحابی نہیں مگر ثواب میں صحابہ کے قریب قریب ہیں مگر پھر بھی ان جیسے نہیں کیونکہ حضرت اویس قرنی کے پاس وہ دو آنکھیں کہاں تھیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی زیارت کی ہو، اگرچہ اُن کے فضائل بے شمار ہیں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ و دیگر صحابہ کو ارشاد فرمایا تھا کہ ایک شخص یمن کا رہنے والا اویس قرنی نام آئے گا اگر ان سے ملو تو میرا سلام پہونچا دیجیو اور اُن سے اپنے لئے دعا کرائیو، اللہ اکبر اتنے بڑے درجے کے شخص ہیں مگر صحابہ کے برابر پھر بھی نہیں۔ بس افضل التابعین ہیں۔

حضرت غوثِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرت معاویہ کیسے ہیں، حضرت غوثِ اعظم کو اس سوال سے بہت جوش آیا، فرمایا کہ اگر امیر معاویہؓ گھوڑے پر سوار ہوں اور ایڑ مار کر اللہ کے راستے میں اس کو دوڑائیں تو جو خاک معاویہ کے گھوڑے کی ناک میں رینٹ سے ملی ہوئی ہوگی عمر بن عبدالعزیز اور اویس قرنی جیسے ہزاروں سے وہ خاک بھی افضل ہے۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نے صحابہ کو وہ رتبہ بخشا ہے کہ بڑے سے بڑے ولی بھی حتیٰ کہ امام مہدی علیہ السلام بھی ایک ادنیٰ صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے اور یہ حق تعالیٰ شانہٗ کا بہت ہی بڑا فضل و احسان امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حال پر ہے کہ ہمارے خلف پر صحابہ کی فضیلت کو پوری طرح منکشف کر دیا کہ سب نے اس پر اجماع و اتفاق کر لیا کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ وَ اَفْضَلُ الْخَلْقِ بَعْدَ الْاَنْبِیَاءِ۔ اَصْحَابُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ یعنی صحابہ سب کے سب معتبر اور ثقہ ان میں کوئی شخص غیر معتبر نہیں اور تمام مخلوق میں بعد انبیاء علیہم السلام کے سب سے زیادہ افضل صحابہ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مسئلہ کا انکشاف ہمارے حق میں بہت ہی بڑی رحمت ہے اور وہ رحمت یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حق تعالیٰ شانہٗ کو اس دین کی حفاظت ہی منظور ہے اگر حضرات صحابہؓ کے متعلق ہمارا یہ اعتقاد نہ ہوتا بلکہ خدانخواستہ ان کے غیر معتبر ہونے کا یا ان کی نسبت خیانت کرنے کا کچھ بھی شبہ ہوتا تو شریعت کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا قرآن و احادیث کی بابت طرح طرح کے خیالات و شبہات پیدا ہوتے اور کسی طرح دل کو اطمینان نصیب نہ ہوتا اور صحابہ کی نسبت حضرات سلف صالحین کا یہ اجماع محض حسنِ اعتقاد ہی کی بنا پر نہیں بلکہ خود ان کے احوال و اعمال سے ان کی دیانت اور راست بازی و پرہیزگاری ایسی کھلی ہوئی نظر آتی ہے کہ موافق تو موافق مخالف تک اس کا اقرار کئے ہوئے ہیں جس پر تاریخ گواہ ہے جس کے بعد اس قول میں کچھ بھی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ (صحابہ سب کے سب عادل اور معتبر ہیں) حضرات صحابہ کی اس فضیلت کے انکشاف سے صرف یہی نہیں کہ دین کی حفاظت ہو گئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ

ان کی فضیلت کے اقرار کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بڑھ گئی جس قدر صحابہؓ کے ساتھ اعتقاد بڑھتا ہے اسی قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بڑھتی ہے اور جس قدر صحابہ سے کسی کو بے اعتقادی ہوتی ہے اسی قدر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت میں کمی ہو جاتی ہے. کیونکہ ظاہر ہے کہ جس مدرسہ کے سارے طلبہ بد استعداد ہوں وہاں مدرسین کی بد استعدادی کا بھی شبہ کیا جاتا ہے. سو اگر ہمارے اعتقاد صحابہؓ کے ساتھ اچھے نہ ہوں گے تو معاذاللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بھی اچھا خیال نہ ہو سکے گا' بلکہ یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ بس جی جیسی روح ویسے ہی فرشتے اور یہ حالت ہماری بہت ہی خراب و ناگفتہ بہ ہوتی چنانچہ اس زمانہ میں بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جن کو صحابہؓ کے ساتھ بے اعتقادی و بدگمانی ہے، سو ان کی دینی حالت دیکھ لی جائے کہ کس قدر کمزور ہو رہی ہے۔ تو حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس سائل کو کیسا دنداں شکن جواب دیا کہ تو معاویہؓ کی بابت سوال کرتا ہے عمر بن عبدالعزیز و اویس کو حضرت معاویہ رضؓ کے گھوڑے کی ناک کی خاک سے بھی تو نسبت نہیں. آج کل بھی بعض لوگوں کو اس قسم کے سوالات کا خبط سوار ہوا کرتا ہے۔

چنانچہ ایک عالم سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالے عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے کون حق پر تھے. انہوں نے خوب جواب دیا کہ میں بقسم کہتا ہوں کہ قیامت کے روز یہ مقدمہ تمہارے اجلاس میں نہیں بھیجا جائے گا، اور اگر بھیجا گیا تو میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ مقدمہ خارج کر دینا اور کہہ دینا کہ مقدمہ میرے حدود اختیار سے باہر ہے۔ پھر میں واقعات سے بھی بے بہرہ ہوں اور میں نے علماء سے اس کی تحقیق بھی کرنی چاہی تھی مگر انہوں نے مجھ کو جواب نہیں دیا۔ تمہاری گردن تو اس جواب سے چھوٹ جائے گی۔ پھر اگر ہم سے سوال ہوا کہ تم نے اسے کیوں نہیں بتلایا تو ہم خود نپٹ لیں گے، واقعی اچھا جواب دیا بھلا اپنے حوصلہ سے زیادہ بڑھنا حماقت ہے یا نہیں؟ پہلے ہم اپنے گھر کا تو فیصلہ کر لیں

پیچھے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کے جھگڑے میں پڑیں۔ دنیا میں اس کی نظیر دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی مقدمہ والسرائے کی عدالت کے متعلق ہو جس کی بابت یقین ہے کہ تحصیلدار صاحب کی کچہری میں کبھی نہ آئے گا اور تحصیلدار اس کے فیصلہ و قوانین معلوم کرنے کے درپے ہو اور نہ معلوم ہونے سے پریشان ہو تو یہ حماقت ہے یا نہیں، ہر شخص یہی کہے گا کہ آپ کو اپنی تحصیل کے قواعد معلوم کرنے چاہئیں اُن میں اگر کوتاہی ہوگئی تو آپ سے باز پرس ہوگی۔ آپ سے یہ سوال کوئی نہ کرے گا کہ تم نے والیسرائے کے اجلاس کے قوانین کیوں نہیں یاد کئے۔

غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حضرات صحابہ کا کمال ان علوم و فنون سے نہیں تھا بلکہ ان کا کمال ایک دوسری چیز سے تھا تو فقہ میں امام ابو حنیفہ گو ان صحابی سے بڑھے ہوئے ہوں جنہوں نے مسجد میں پیشاب کر دیا، مگر درجہ میں اور مقبولیت عند اللہ میں وہ صحابی ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ اور یہ عجیب قصہ ہے کہ بعض باتوں میں ایک تابعی صحابی سے بڑھا ہوا ہے اور اس سے اُن کی تنقیص بھی لازم نہیں آتی بعضے لوگ یہ بات سن کر گھبرا جاتے ہیں مگر اس سے وحشت کرنا بڑی بے عقلی کی بات ہے۔ دیکھئے اگر بادشاہ کی طرف سے والیسرائے کو حکم ہو کہ تم اپنے ہاتھ سے ہمارے واسطے انڈوں کا حلوا پکاؤ اور ظاہر ہے کہ والیسرائے بہادر کو اس کا کب اتفاق ہوا تھا تو اب اگر وہ انڈوں کے حلوے کی ترکیب کسی باورچی سے پوچھیں اور اس کام میں اس کی شاگردی اختیار کریں تو اس سے کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ باورچی والیسرائے سے افضل ہو گیا۔ نہیں بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ والیسرائے کا کمال انڈوں کا حلوا پکانے سے تھوڑا ہی ہے اُس کے کمالات دوسرے ہیں جن کی باورچی کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اسی طرح اس کو سمجھ لیجئے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن صحابی سے فقہ میں بڑھے ہوئے ہیں اگر وہ امام صاحب کے زمانہ میں موجود ہوتے تو ان کے ذمہ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے فتوے پر عمل کرنا واجب ہوتا اور امام صاحب کو ان سے یہ کہنے کا حق حاصل ہوتا کہ گو درجہ میں آپ مجھ سے بڑے ہیں مگر چونکہ آپ فقیہ نہیں ہیں اس لئے آپ کو میرے فتوے کی مخالفت جائز نہیں

اور اگر میرے کہنے کے خلاف کریں گے تو آپ کو گناہ ہوگا۔ امام صاحب کو یہ سب کچھ کہنے کا حق حاصل ہوتا۔ مگر بایں ہمہ فضیلت میں وہ صحابی ہی بڑھے ہوئے رہتے۔ تو کسی بات میں چھوٹوں کا بڑوں سے بڑھ جانا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مرتبہ کے اندر بھی ان سے بڑھ جائیں۔ اس اخیر زمانہ میں جن لوگوں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ اور حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہم کو دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب مسائل میں مولانا سے پوچھ پوچھ کر عمل کرتے تھے۔ اور علوم باطنیہ میں مولانا حاجی صاحب کے محتاج تھے۔ مگر کیا اس سے مولانا حاجی صاحب کے مرید نہیں رہے، حاجی صاحب جب بھی شیخ ہی تھے اور مولانا مرید تھے۔ بعض مسائل میں حاجی صاحب کا عمل مولانا کے فتوے کے خلاف تھا جس سے بعض لوگوں کو مولانا پر اعتراض تھا کہ یہ اپنے پیر کے خلاف فتوے دیتے ہیں۔ مگر مولانا صاف فرمادیا کرتے تھے کہ ان مسائل جزئیہ میں حاجی صاحب کو ہمارے فتویٰ پر عمل کرنا واجب تھا، ہم کو ان کی تقلید جائز نہیں تھی ہم ان مسائل کی وجہ سے حاجی صاحب کے تھوڑا ہی مرید ہوئے ہیں وہ دوسرے کمالات ہیں جن کی وجہ سے ہم نے حاجی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کہ خلافت صدیقیہ و خلافت عمریہ کہ بعض ظاہر بیں لوگ خلافت عمریہ کو بوجہ کثرت فتوحات کے خلافت صدیقیہ سے افضل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے زمانۂ خلافت میں جدید فتوحات کچھ زیادہ نہ ہوئی تھیں بلکہ ان کی خلافت کا زیادہ زمانہ خود مسلمانوں کے سنبھالنے میں صرف ہوا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض قبائل مرتد ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا تو حضرت صدیق اکبرؓ کا زمانۂ خلافت اس فتنۂ ارتداد کے فرو کرنے اور مسلمانوں کی حالت سنبھالنے میں صرف ہوا مخالفین کے ملک فتح کرنے کی زیادہ نوبت نہ آئی اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانۂ خلافت میں شاید کوئی دن بھی جدید فتوحات سے خالی نہیں رہا۔ روزانہ یہی خبریں آتی تھیں کہ آج فلاں شہر فتح ہوگیا اور کل فلاں شہر پر حملہ ہے یہاں تک

کہ دس سال کے عرصہ میں حکومت اسلامیہ شرقاً و غرباً پھیل گئی اس لئے بعض کم فہم خلافت عمریہ کو خلافت صدیقیہ سے افضل شمار کرتے ہیں مگر عقلاء خوب جانتے ہیں کہ مکان کی خوبصورتی میں زیادہ کمال اس شخص کا ہے جس نے کہ اول نقشہ تیار کیا تھا اور بنیادیں قائم کی تھیں کیونکہ اس کو بہت دماغ سوزی سے کام کرنا پڑا ہے۔ مکان کا خوبصورت نقشہ بنانا اور بنیاد کا مستحکم کرنا یہ بڑا کام ہے، دیواریں قائم کرنے والے کا اتنا بڑا کمال نہیں کیونکہ وہ تو اینٹ پر اینٹ رکھتا چلا گیا ہے اس کو کونسی دماغ سوزی کرنی پڑی، ظاہر بین لوگ دوسرے معمار کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ مکان کو اسی نے مکمل کیا مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ اس مکان کی خوبصوتی میں بڑا کمال نقشہ بنانے والے اور بنیاد قائم کرنے والے کا ہے۔ اسی طرح جو اسرار شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ خلافت صدیقیہ سے خلافت عمریہ کو کوئی بھی نسبت نہیں کیونکہ حضرت صدیق اکبرؓ کو حکومت اسلامیہ اور خلافت کی بنیاد قائم کرنے میں جو تعب برداشت کرنا پڑا ہے اس کا عشر عشیر بھی حضرت عمرؓ کو نہیں پیش آیا یہ کام اسی عالی حوصلہ خلیفہ کا تھا کہ ایسے فتنے کے زمانہ میں جبکہ خود اپنی ہی جماعت قبضہ سے باہر ہوا چاہتی تھی تمام فتنوں کا مقابلہ کرکے اور ان کو ایک دم نیست و نابود کرکے ڈھائی سال کے عرصہ میں خلافت اسلامیہ کے کھونٹے گاڑ دیئے اور نظام حکومت کو ایسے مستحکم اصول پر قائم کردیا کہ بعد کے خلیفہ کو کوئی پریشانی ہی پیش نہ آسکے حضرت عمرؓ کی خلافت میں وہ اصول جاری ہوگئے اور وہ نظام صدیقی شائع ہوگیا تو بڑا کمال حضرت صدیقؓ کا ہے اور جس قدر فتوحات حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی ہیں ان سب کا ثواب حضرت صدیقؓ کے صحیفۂ اعمال میں داخل ہوگا، اہل تمدن و سیاست اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ قانون جاری کرنے سے زیادہ مشکل قانون بنانا ہے۔ قانون بنانے والے کو جس مشقت کا سامنا ہوتا ہے جاری کرنے والے کو اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں آتا اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ جو ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ بعد چار سو برس کے اجتہاد نہیں رہا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چار سو برس کے بعد کسی کو اجتہاد کے قابل دماغ نہیں ملا کیونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں۔

علاوہ ازیں یہ مطلقاً صحیح بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر زمانہ میں ہزاروں ایسی جزئیات نئی نئی پیش آتی ہیں جن کا کوئی حکم ائمہ مجتہدین سے منقول نہیں اور علماء خود اجتہاد کر کے ان کا جواب بتلاتے ہیں پس اگر اجتہاد کا باب بالکل بند ہو گیا ہے اور اب کسی کا دماغ اجتہاد کے قابل نہیں ہو سکتا تو کیا ایسے نئے نئے مسائل کا جواب شریعت سے نہیں ملے گا یا ان مسائل کے جواب کے لئے کوئی نیا نبی آسمان سے اترے گا، اگر یہی بات ہے تو خدا خیر کرے کہیں قادیان والے نہ سن لیں کہیں یہ بات ان کے کانوں میں پڑ گئی تو مسیح موعود کی دلائل نبوت کی فہرست میں ایک اور دلیل کا اضافہ کر لیں گے۔ پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تکمیل ہو چکی سو دروازۂ اجتہاد اگر بالکل بند کر دیا جائے تو پھر شریعت کی تکمیل کس طرح مانی جائے گی کیونکہ ظاہر ہے کہ بہت سے ایسے مسائل ہیں کہ ان کا جواب کتب فقہ میں مذکور نہیں، نہ ائمہ مجتہدین سے کہیں منقول پچھلے دنوں میں ایک سوال آیا تھا کہ ہوائی جہاز میں نماز ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اب بتلائیے اگر اجتہاد بعد چار سو برس کے بالکل جائز نہیں تو اس مسئلہ کا شریعت میں کوئی بھی جواب نہیں، پہلے زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا نہ فقہاء اس کو جانتے تھے نہ کوئی حکم لکھا اب ہم لوگ خود اجتہاد کرتے ہیں اور ایسے نئے مسائل کا جواب دیدیتے ہیں تو فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہو گیا اور اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا اگر اجتہاد فی الفروع بھی اب نہ ہو سکے تو شریعت کے نامکمل ہونے کا شبہ ہو گا جو کہ بالکل غلط ہے شریعت میں کسی قسم کی کمی نہیں۔ قیامت تک جس قدر صورتیں پیش آتی رہیں گی سب کا جواب علماء ہر زمانہ کے شریعت سے نکالتے رہیں گے کیونکہ یہ جزئیات اگر کتب فقہ میں نہیں تو اصول و قواعد تو سب پہلے مجتہدین بیان کر چکے جن سے قیامت تک کے واقعات کا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔ البتہ قرآن و حدیث سے اصول استنباط کرنا یہ اب نہیں ہو سکتا۔

یہ خاص اجتہاد فی الاصول بعد چار سو برس کے ختم ہوگیا کیونکہ اول تو جس قدر اصول وقواعد شریعت کے تھے وہ سب ائمہ مجتہدین بیان کر چکے، انہوں نے کوئی قاعدہ چھوڑ نہیں دیا۔ دوسرے ان کے بعد اگر کسی نے اصول مستنبط بھی کئے تو وہ مستحکم نہیں۔ کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد فی الاصول کے لئے اب دماغ قابل ہی نہیں رہے۔ یہ حضرات مجتہدین ہی کا خاص حصہ تھا کہ انہوں نے نصوص سے اس خوبی سے اصول مستنبط کئے جو کہیں نہیں ٹوٹ سکتے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ہدایہ کے اصول مسلم نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہدایہ غیر معتبر کتاب ہے اس میں اصول غلط نقل کر دیئے گئے ہیں بلکہ شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے بعض اصول خود شریعت سے مستنبط کئے ہیں جن میں وہ ناقل نہیں ہیں سو وہ معتبر نہیں۔ باقی جزئیات اس کی سب معتبر ہیں تو اب دیکھئے کہ صاحب ہدایہ باوجودیکہ بہت ہی بڑے شخص ہیں۔ ان کی علمی شان ہدایہ ہی سے معلوم ہوسکتی ہے، واقعی اس کتاب میں بھی انہوں نے کمال کر دیا۔ ہر مسئلہ کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں ایک عقلی ایک نقلی کیا ٹھکانا ہے وسعتِ نظر کا کہ جزئیات تک کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں پھر حدیثیں گو بلا سند بیان کرتے ہیں مگر تفتیش کرنے سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہیں چاہے سند بزار میں ہوں یا مسند عبدالرزاق میں بیہقی میں ہوں یا مصنف ابن ابی شیبہ میں کہیں ضرور ملیں گی ایک دو اگر نہ ملیں تو ممکن ہے مگر جس شخص کی نظر اتنی وسیع ہو تو ایک دو حدیث جو ہم کو نہ ملی ہو اس سے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اُس کی اصل ہی نہیں یہ تو وسعت نظر کا حال ہے فہم کا تو کیا ٹھکانا ہے مخالفین کے دلائل کو بیان کرنا ان کا جواب دینا پھر اپنے مذہب کی دلیل بیان کرنا یہ ان کا خاص حصہ ہے مگر بایں ہمہ جو اصول کہ وہ خود حدیث و قرآن سے نکالتے ہیں ان کی بابت شاہ ولی اللہ صاحب نے فیصلہ فرمادیا کہ وہ معتبر اور مسلم نہیں ہیں کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں تو آجکل جن لوگوں کی وسعت نظر و فہم کو صاحب ہدایہ سے کچھ بھی مناسبت نہیں وہ کیا حدیث و قرآن سے اصول مستنبط کریں گے۔ ہاں البتہ اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آسکتا کہ ہم بھی امام ابوحنیفہ وامام شافعی کی طرح مجتہد ہوگئے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

کیونکہ اصحاب سیاست خوب جانتے ہیں کہ قانون بنانا قانون جاری کرنے سے بہت زیادہ دشوار ہے، ہم لوگ سوا اس کے کہ اُن حضرات کے استنباط کردہ اصول کو حوادث الفتاویٰ میں جاری کر دیں اور کیا کر سکتے ہیں کمال انہیں حضرات کا تھا کہ انہوں نے حدیث و قرآن میں سے غور کرکے ایسے اصول و قواعد سمجھے جو قیامت تک کے جزئیات کے لئے کافی ہیں۔ کوئی مسئلہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس کا حکم جواز و عدم جواز اُن اصول سے نہ نکلتا ہو بلکہ اُن حضرات نے صرف اصول و قواعد ہی پر اکتفا نہیں کیا جزئیات بھی اس قدر نکال کر بیان کر گئے کہ بہت ہی کم کوئی مسئلہ ایسا ہوتا ہے جس کو وہ صراحۃً یا دلالۃً بیان نہ کر گئے ہوں اور اگر کوئی شاذ و نادر ایسا مسئلہ معلوم ہوتا ہے جو فقہا نے نہیں بیان کیا تو کبھی تو مفتی کی نظر کی کوتاہی ہوتی ہے کہ اس کو سب مواقع پر عبور نہیں ہوتا یا فہم کی کمی ہوتی ہے کہ وہ مسئلہ عبارت سے نکل سکتا ہے مگر مفتی صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا اور اگر بالفرض جزئیہ انہوں نے نہیں بیان کیا تو اصول سے تو وہ ضرور ہی مستنبط ہوتا ہوگا پس آجکل یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے کو ائمہ مجتہدین کے برابر کہہ سکے جو فرق کہ خلافت صدیقی و خلافت عمری میں ہے وہی فرق ائمہ مجتہدین و فقہاء متاخرین میں سمجھنا چاہیئے۔ قانون کا جاری کرنا اور چیز ہے قانون کا بنانا کچھ اور ہی ہے اور ہم لوگوں کو تو اُن سے خاک بھی نسبت نہیں ہو سکتی۔ غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حضرات صحابہ کا کمال علوم و فنون کی تکمیل میں نہ تھا اُن کا بڑا کمال تو یہ تھا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا جس کی وجہ سے کہ ان کے قلوب ہمارے قلوب سے زیادہ منور اور ان کا علم ہمارے علم سے اعمق تھا۔ تو اس تقریر سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ صحابہؓ کا علم ہمارے علم سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔

اب آگے وہ عذر سنئے پہلی آیت میں تو عام خطاب تھا اور اس آیت میں خاص حضرات صحابہ کو خطاب ہے، فرماتے ہیں اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا تبدیل کراتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور تحریر کریں۔

اَصَبْتُمْ مِثْلَیْھَا قُلْتُمْ اَنّٰی ھٰذَا قُلْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ الآیۃ۔

(کیا تم کو جس وقت ایک ایسی مصیبت پہونچی کہ جس سے دو چند تم کفار کو پہونچا چکے ہو تو تم (انجان بن کر) یوں کہنے لگے ہو یہ مصیبت کہاں سے آگئی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن سے یہ کہہ دیجئے یہ تمہارے ہی پاس سے آئی ہے)

شانِ نزول اس کا یہ ہے کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوگئی تھی اور شکست بعد میں ہوئی پہلے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا۔ قصہ اس کا یہ ہوا کہ غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ) نے پچاس صحابہ کی جماعت کو جو کہ تیر انداز تھے ایک درۂ کوہ پر یعنی گھاٹی پر مقرر کیا تھا اور ان سے یہ فرما دیا تھا کہ تم یہاں سے ہرگز نہ ہٹیو چاہے ہم کو فتح نصیب ہو یا خدانخواستہ شکست ہو چاہے ہماری بوٹی بوٹی الگ ہو جائے مگر تم یہیں جمے رہیو۔ اس انتظام کے بعد جو مسلمانوں نے کفار پر حملہ کیا تو کفار کو شکست ہوگئی اور وہ ایسے بے تحاشا بھاگے کہ ان کی عورتوں کی پنڈلیاں بھاگتے ہوئے نظر آتی تھیں اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی کفار کی طرف تھے وہ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اس وقت تک وہ رضی اللہ عنہ بھی نہ تھے مگر ہم تو اس واقعہ کے تذکرہ کے وقت بھی رضی اللہ عنہ کہیں گے کیونکہ بعد میں بڑے جلیل القدر صحابی ہوئے سیف اللہ کا لقب پایا، غرض وہ اس وقت لشکر کفار کی کمان کر رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے اُن کے جاسوس نے ان کو اطلاع دی کہ گھاٹی خالی ہے۔ یہاں یہ قصہ ہوا کہ جب کفار کو شکست ہوگئی تو بعض نوجوان صحابہؓ نے اپنے افسر سے کہا کہ اب تو مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگیا اور سب غنیمت کا مال لوٹ رہے ہیں ہم کو بھی لوٹنا چاہیئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد تھا وہ مبالغہ کے طور پر تھا اور مقصود صرف یہ تھا کہ جب تک ہم کو فتح حاصل نہ ہو اس وقت تک تم یہاں سے نہ ہٹنا، کچھ صحابہ نے ان کی رائے کے خلاف کیا کہ تمہیں مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ بھی ہو مگر ہم کو صریح ممانعت کے بعد یہاں سے نہ ہٹنا چاہیئے غرض دو فریق ہو گئے کچھ تو لوٹنے میں مشغول ہوگئے اور کچھ دس پانچ اسی جگہ جمے رہے

جب گھاٹی پر تھوڑے سے آدمی رہ گئے تو خالد بن ولید نے اپنے بھاگنے کا رُخ گھاٹی کی طرف بدل دیا اور چند مسلمان جو وہاں جمے ہوئے تھے ان کو تہ تیغ کر کے پشت کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے، انہوں نے پشت کی طرف سے حملہ کیا اُس کے بعد جو کفار بھاگ رہے تھے وہ بھی پلٹ پڑے اور سامنے کی طرف سے اُنہوں نے مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ مسلمان بیچ میں آگئے بہت آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کو شکست ہو گئی بہت سے صحابہ بھاگ گئے۔ تو یہ شکست اس وجہ سے ہوئی کہ گھاٹی والوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی مخالفت کی اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ترجمہ یہ ہے کہ کیا جب تم پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جس سے دو چند تم (غزوۂ بدر میں کفار کو) مصیبت پہونچا چکے ہو تو تم یوں کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی۔ آپؐ فرما دیجئے کہ یہ تمہارے ہی نفسوں کی وجہ سے آئی۔ یعنی تم نے اپنے آپ اپنے سر مصیبت لی کہ ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کی مخالفت کی اور مال لوٹنے کی طمع کی یہ تمہید تھی۔ اب وہ غدر سنئے اس آیت میں جو حضرات صحابہ کا قول ہے انّٰی ھٰذا (یہ کہاں سے آئی) سے معلوم ہوا کہ کبھی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ایسا موقعہ پڑا ہے کہ ان کو یہ کہنے کی نوبت آئی کہ یہ بلا کہاں سے آگئی، حالانکہ ان کی بصیرت ہماری بصیرت سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی جیسا کہ اوپر مفصلاً ثابت ہوا۔ مگر اس کے باوجود وہ بھی کبھی اپنی کوتاہی کو بھول جاتے تھے اور یہ خیال ان کو بھی نہ ہوا کہ یہ مصیبت ہمارے فلاں فعل کی وجہ سے آئی تو اب اگر آپ لوگ بھی اپنی خطاؤں کو بھول جائیں تو کچھ زیادہ تعجب نہیں، لیجئے میں نے آپ کا عذر بھی بیان کر دیا۔ معلوم ہوا کہ مصیبت کے وقت علی التعیین کسی خطا پر نظر نہ ہونا طبعی بات ہے جو صحابہ کو بھی پیش آئی کہ وہ بھی نہ سمجھے کہ ہماری کونسی خطا پر یہ سزا مرتب ہوئی مگر پھر بھی صحابہ مطلقاً نفس مسئلہ سے غافل نہ تھے اور آپ کو تو خود مسئلہ ہی کی خبر نہیں کہ گناہ کو بھی مصیبت میں کچھ دخل ہے یہ تو دلیل نقلی تھی اس بات کی کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے وہ گناہ کی وجہ سے آتی ہے۔

دوسری بات عقلی ہے گرچہ دلیل نقلی کے بعد اس کی حاجت نہیں رہی مگر آجکل عقل کا ہیضہ بہت پھیل رہا ہے اس لئے بعض لوگوں کو بدون دلیل عقلی کے تسلی نہیں ہوتی عورتوں کو حیض آتا ہی تھا مگر آجکل مردوں کو بھی ہیضہ ہوگیا عورتوں سے بھی بڑھ گئے۔ مگر اتنا فرق اب بھی کہ وہاں بڑی حار ہے اور یہاں چھوٹی ہا۔ وہ دلیل یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ حق تعالےٰ شانہٗ بہت بڑے رحیم ہیں ان کی رحمت ورافت اپنی مخلوق کے ساتھ اس درجہ ہے کہ نہ کسی باپ کو اپنی اولاد سے ہوسکتی ہے نہ کسی ماں کو شاید آپ کہیں کہ یہ بھی تو دلیل نقلی ہوئی کیونکہ حق تعالیٰ کا اس درجہ رحیم وکریم ہونا یہ بھی تو نصوص ہی سے معلوم ہوا ہے تو لیجئے میں اس کو بھی عقل سے ثابت کئے دیتا ہوں میں کہتا ہوں کہ اگر خدا کی رحمت آپ کو محسوس نہیں ہوتی تو یہ تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ ماں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے۔ جانور تک اپنے بچوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں خود آپ کو بھی کسی سے ضرور محبت ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہ ہماری ایک صفت جو کہ وجود کی فرع ہے۔ وجود ہی اگر نہ ہوتا تو یہ محبت کہاں سے پیدا ہوتی اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ وجود ہمارا اپنے گھر کا نہیں خدا کا دیا ہوا ہے تو یہ تمام صفات بھی اُسی کی عطا کردہ ہیں۔ اس کے بعد دوسرا مقدمہ یہ ملا لیجئے کہ یہ باتفاق عقلاء کے ایک کمال ہے۔ اور حق تعالیٰ کسی کمال سے خالی نہیں تو ان میں صفت محبت کا ہونا عقلاً ثابت ہوگیا۔ تو جب وہ اتنے بڑے رحیم ہیں اور پھر بندوں پر مصیبتیں بھیجتے ہیں تو یہ کب خیال ہوسکتا ہے کہ اتنا بڑا چاہنے والا خواہ مخواہ اپنی مخلوق کو پریشان کرتا ہوگا، بلکہ ضرور کوئی قصور آپ کی طرف سے بھی ہوا جبھی تو اس رحیم وکریم نے یہ مصیبتیں آپ پر نازل کی ہیں۔ غرض عقلاً و نقلاً یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے اس کے بعد تعجب ہے کہ اب بھی بعض لوگ ایسے وقت میں یوں کہتے کہ اے اللہ کس گناہ میں پکڑے گئے۔ میں کہتا ہوں کہ اے اللہ کیا اب بھی آپ کو اپنے تقدس کا اعتقاد ہے، جو لوگ نماز روزہ کرتے رہتے ہیں اور گناہوں سے بچتے ہیں وہ اگر یہ بات کہیں تو ان کو

تو اس کہنے کا کچھ منہ بھی ہے مگر بے نمازی بھی تو یوں کہتے ہیں کہ ہائے کس گناہ میں پکڑے گئے۔ اب یا تو یہ لوگ اپنے گناہوں کو گناہ ہی نہیں سمجھتے مگر مسلمان کی نسبت یہ خیال تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا کیونکہ یہ تو کفر ہے مگر میں اس کا منشاء آپ کو بتلانا چاہتا ہوں۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور اکثر باتوں میں جاہل لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا کرتے ہیں جیسا کہ ایک بوڑھیا نے کہا تھا کہ جب سارے آدمی اور جانور مرجائیں گے قیامت کو تو اللہ میاں کا اکیلے جی نہیں گھبرائے گا اور بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا خاصہ ہے کہ وہ حق تعالےٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ کہ رات دن گناہوں میں مبتلا ہیں وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہیں کہ پہلے پہل گناہ جب صادر ہوتا ہے تو دل کڑھتا ہے پھر کرتے کرتے عادت سی ہوجاتی ہے کہ اس سے دل بھی نہیں بُرا ہوتا تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جن گناہوں کی ہم کو عادت ہوگئی ہے خدا تعالےٰ کو بھی نعوذ باللہ اُن کی تو عادت ہوگئی ہوگی۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ پہلی مرتبہ خطا پر زیادہ غصہ آیا کرتا ہے جب اس وقت سزا نہیں دی تو دوسری مرتبہ پر غصہ کم آیا کرتا ہے اور پھر جب بار بار ایک کام خلاف منشاء ہوتا ہے ایک مساوات سی ہوجاتی ہے جس طرح کسی کی بیوی بدمزاج ہو تو پہلے پہل تو اس کی باتوں پر غصہ آیا کرتا ہے جب دیکھتے ہیں کہ اس کی عادت ہی اس طرح کی ہے تو اچھے اچھے دنیا داروں کو بھی مساوات ہوجاتی ہے اور بے چارے اللہ والے تو پہلے ہی سے صبر کرلیتے ہیں مگر دنیا داروں سے صبر دشوار ہے وہ خوب مرمت کرتے ہیں اور انہی سے عورتیں سیدھی بھی ہوتی ہیں سچ کہا ہے کسی نے یَغْلِبْنَ الْحَازِمَ وَ یَغْلِبُهُنَّ الْجَاهِلُ (ہوشیار مرد پر غالب ہوجاتی ہیں اور جاہل ان پر غالب ہوتا ہے)

لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مولوی بیویوں سے دبتے ہیں خیر کوئی یوں ہی سمجھ لے مگر وہ حقیقت میں دبتے نہیں بلکہ کمزور پر بہادری ظاہر کرتے ہوئے غیرت کرتے ہیں جس طرح دنیادار اپنی بیویوں کو کوٹتے ہیں اُن سے یہ نہیں ہوسکتا تو بعض تو غیرت کی وجہ سے اُس کی

کج خلقی کو نباہتے ہیں اور بعضے اللہ کے بندے اس سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں ایک بزرگ کی بیوی بہت کج خلق تھیں اور ان کو اس کے ہاتھ سے بہت اذیت تھی۔ ایک مرتبہ کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت اس کا رستہ کیوں نہیں کاٹ دیتے جب یہ باز نہیں آتی تو طلاق دے کر الگ کر دیجئے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاں بھائی سچ کہتے ہو واقعی خیال تو مجھے بھی ہوا تھا کہ اس کو طلاق دیدوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ اگر میں نے اس کو طلاق دیدی تو یا تو یہ دوسرا نکاح نہ کرے گی تو اس صورت میں اس کو تکلیف ہوگی اس کے نان نفقہ کی کون خبر لے گا۔ اور اگر اس نے دوسرا نکاح کسی سے کر لیا تو اس کے ساتھ بھی یہ اسی طرح رہے گی جس کے سر پڑے گی اس کے لئے وبالِ جان ہو جائے گی۔ اس لئے میں ہی سب مسلمانوں کی طرف سے تکلیف برداشت کرنا گوارا کرتا ہوں، دوسرے مسلمانوں کو اس سے تکلیف نہ پہونچے تو میں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ میں مسلمانوں کے لئے وقایہ بنا ہوا ہوں کہ امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سے کسی شخص کے پیچھے یہ بلا نہ پڑے۔ ماشاء اللہ ان حضرات کی کیسی نیتیں تھیں۔ دنیا داروں سے اول تو صبر نہیں ہوتا خوب مرمت کرتے ہیں اور جو اس سے باز نہ آئے کھانا کپڑا بند کر دیتے ہیں اور بعضے طلاق ہی دے ڈالتے ہیں مگر اللہ والوں سے تو یہ نہیں ہو سکتا اس لئے سب ان کو یہ کہتے ہیں کہ بیویوں سے دبتے ہیں کوئی کچھ ہی کہے مگر وہ تو اس تحمل و برداشت میں ثواب کی امید کرتے ہیں حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی نازک مزاج تھے ان کا ایسا شاہانہ مزاج تھا کہ ایک مرتبہ آپ کو رات بھر نیند نہ آئی صبح کو جو تشریف لائے تو آنکھوں میں نیند نہ آنے کا اثر تھا سرخی ہوگی۔ خدام نے دریافت کیا کہ آج کیسا مزاج ہے۔ فرمایا رات بھر نیند نہیں آئی۔ لحاف میں نگندے ٹیڑھے پڑے ہوئے تھے اس سے رات بھر الجھن رہی۔ نہ معلوم رات کو لحاف میں منہ لپیٹ کر نگندوں کا ٹیڑھا ہونا کیسے معلوم ہو گیا ہوگا۔ نہایت لطیف المزاج تھے۔ آپ کی بیوی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا بہت ہی ٹیڑھے مزاج کی تھیں۔ مرزا صاحب کو کوری کوری سناتی تھیں۔ آپ کو

کشف میں بتلایا گیا تھا کہ فلاں عورت سے نکاح کر لو تمہارے درجے بلند ہوں گے اس لئے آپ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ساری نزاکت کی کسر نکال دی تھی ۔۱۲جامع اور آپ نے ساری عمر ان کو نباہا اور کبھی ان کے کہنے کا برا نہیں مانا جب مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال قریب آیا تو آپ نے ان کو فرمایا کہ میرے بعد تم پانی پت قاضی ثناء اللہ صاحب کے پاس چلی جانا وہ تمہاری ناز برداری کریں گے اور کوئی تمہاری خدمت نہیں کرے گا چنانچہ وہ پانی پت چلی آئیں اور قاضی صاحب نے اُن کی ہمیشہ خدمت کی اور اپنے وصیت نامہ میں جہاں اور وصیتیں لکھی تھیں ان کے واسطے بھی کچھ زمین کی وصیت کر دی تھی کہ اس کی آمدنی میرے بعد ان کو دی جائے غرض وہ بہت ہی سخت مزاج تھیں۔ مگر مرزا صاحب کا معمول تھا کہ روزانہ صبح کے وقت ایک خادم کو ڈیوڑھی پر بھیجتے تھے کہ بیگم صاحبہ کا مزاج پوچھ کر آؤ جب خادم مزاج پوچھنے جاتا وہ اس کو بھی اور مرزا صاحب کو بھی خوب سخت سخت سنائیں۔

ایک دفعہ آپ نے کسی ولایتی مرید کو مزاج پرسی کے لئے بھیجا انہوں نے پھر ویسی ہی سنانا شروع کیں اس ولایتی کو بہت ناگوار ہوا اور انتقام لینا چاہا مگر یاد آ گیا کہ مرزا صاحب کی متعلقہ ہیں خاموش ہو کر منہ بنا کر آ بیٹھے۔ مرزا صاحب سمجھ گئے ہنس کر فرمانے لگے کیا ہوا، ایسے کیوں ہو رہے ہو۔ انہوں نے عرض کیا حضرت کچھ پوچھئے نہیں اور سب قصہ بیان کیا اور اپنی ناگواری اور رنج کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا بھائی بُرا نہیں ماننا چاہیئے وہ ہماری محسن ہے اس سے نفس کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔

غرض وہ ایسی تھیں۔ باقی ہماری تو وہ مخدومہ ہی ہیں ہم تو ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہا ہی کہیں گے کیونکہ وہ ایک بزرگ کی بیوی ہیں۔ ان شاء اللہ حضرت کی برکت صحبت سے وہ بخش ہی دی جائیں گی۔ اگر کسی بزرگ کی اہل کا برتاؤ اُن بزرگ کے ساتھ اچھا نہ ہو تو چھوٹوں کو ان کی شان میں گستاخی نہ کرنا چاہیئے۔ تمہاری تو وہ بہر حال مخدومہ ہی ہیں۔ یاد رکھئے جس طرح آپ کو ان بی بی صاحبہ کی گستاخیاں ان بزرگ کے ساتھ ناگوار ہوتی ہیں اسی طرح ان بزرگ کو آپ کی گستاخی

ان کی بی بی کی شان میں ناگوار ہوتی ہے اور بزرگوں کو تکلیف پہنچانا تھوڑی بات نہیں اس لئے بزرگوں کی اہل کے ساتھ بھی گستاخی نہ چاہیئے یہ بزرگ اپنے متعلقین کو چھوڑیں گے نہیں ان شاء اللہ سفارش کر کے بخشوا ہی لیں گے کیونکہ اہل اللہ کے حوصلے بڑے ہوتے ہیں اگر اپنی بیوی سے یا کسی عزیز وغیرہ سے ان کو تکلیف پہونچی ہوگی تو وہ اس کا اثر دل میں نہ رکھیں گے فوراً سب معاف کر دیں گے اور آخرت میں حق تعالےٰ سے ان کے واسطے سفارش بھی کریں گے۔

ایک کفن چور کا قصہ ہے اس کی ایک بزرگ سے دوستی تھی ایک دفعہ ان بزرگ نے اس سے کہا کہ بھائی ہم کو اندیشہ ہے کہ تم ہمارا کفن بھی چراؤ گے اس نے کہا توبہ توبہ آپ سے ایسی گستاخی کبھی نہیں کروں گا۔ انہوں نے فرمایا ہم کو اطمینان نہیں۔ البتہ ایک صورت اطمینان کی ہے کہ ہم سے تم کفن کی قیمت لے لو اور وعدہ کر لو اس نے اس سے انکار کیا۔ انہوں نے اصرار کر کے قیمت سپرد کر دی اور فرمایا بس اصل مقصود تمہارا یہی روپیہ ہے سو تم کو یہ حاصل ہی ہو گیا، اب مت چرانا اس نے کہا اول تو اس کی حاجت نہ تھی مگر خیر اب تو کوئی احتمال ہی نہیں رہا۔ اتفاق سے ان بزرگ کا انتقال ہو گیا یہ صاحب وہاں پہونچے اور وہی حرکت شروع کی۔ ان بزرگ کی کرامت ظاہر ہوئی کہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب یہی ٹھہری تھی، یہ خوف سے وہاں ہی گر گیا اور دم نکل گیا۔ کسی خلیفہ نے ان بزرگ کو خواب میں دیکھا، فرماتے ہیں کہ ہم نے تو ہنسی میں اس سے یہ کہا تھا ورنہ کفن چرانے سے ہمارا کیا ضرر تھا مگر وہ ایسا بزدل نکلا کہ مر ہی گیا گو وہ فاسق ہے مگر ہم نے اس کا بازو پکڑ لیا ہے اس کی لاج آتی ہے اب میں اس کی سفارش کر کے بخشوانے کی کوشش کرتا ہوں اور تم اس کی تجہیز و تکفین کرو۔

غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ عوام کا خیال یہ ہے کہ جس طرح ہم کو گناہ کرتے کرتے عادت ہو جاتی ہے اسی طرح معاذ اللہ حق تعالےٰ کو بھی ایک گناہ کو بار بار دیکھتے دیکھتے عادت سی ہو جاتی ہوگی، اس پر زیادہ غصہ نہ آتا ہوگا، ہاں جب کوئی نیا گناہ ہوتا ہوگا تب حق تعالےٰ کو غصہ آتا ہوگا۔ اسی لئے جب مصیبت آتی ہے تو عوام یہی کہتے ہیں کہ نہ معلوم

ہم سے کونسا گناہ ہوگیا تھا افسوس مہلت اور ڈھیل دینے کا یہ مطلب نکالا گیا کہ وہ گناہ گناہ ہی نہ رہا چاہیئے تو یہ تھا کہ یوں سمجھتے کہ ہم ہر وقت زمین میں گاڑ دیئے جانے کے قابل ہیں اور جو گھڑی سلامتی کے ساتھ گذر جاتی ہے خدا کی عنایت ہے کہ توبہ و استغفار کی مہلت اور ڈھیل دیدی مگر جب اُس مہلت کی یہ قدر کی گئی کہ اس کی وجہ سے وہ گناہ گویا گناہ ہی نہ رہے تو اب اُدھر سے جو کچھ بھی ہو تھوڑا ہے۔

صاحبو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم مصیبت کے آنے پر کیا تعجب کرتے ہو یہ تو کچھ تعجب کے قابل بات نہیں اگر ہم کو سزا ملے یہ تو قاعدہ کے موافق ہے مجرم کو سزا ملا ہی کرتی ہے اور ہم نے اپنے اوپر نہ معلوم تعزیرات الٰہی کی کتنی دفعات قائم کر رکھی ہیں تو مصیبت کا آنا کوئی تعجب خیز نہیں بلکہ خدا کی قسم ہم کو ذرا سی راحت اگر مل جائے تو وہ تعجب کی بات ہے۔ آپ مصیبت آنے پر حیرت کرتے ہیں کہ یہ بلا کس گناہ کا بدلہ ہے میں کہتا ہوں کہ تم کھانا کھاتے ہوئے یہ سوچا کرو کہ آج ہم نے کون سی طاعت اور کون سا نیک کام کیا ہے جو یہ کھانا ہم کو مل گیا۔ عشاق کا مذاق پیدا ہو جائے تو پھر منہ سے کبھی یہ بات نہ نکل سکے کہ یہ بلا کس گناہ کی وجہ سے آئی۔ اُن کا تو مذاق یہ ہے ؎

وُجُوْدُكَ ذَنْبٌ لَا يُقَاسُ بِهٖ ذَنْبٌ

(تیرا وجود ہی گناہ اس پر اور گناہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا)

کہ خود ہمارا موجود ہونا ہی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی برابر کوئی گناہ نہیں موجود حقیقی کے سامنے ممکن معدوم کی ہستی کیا ہے کہ یہ بھی وجود میں اس کے ساتھ شریک ہو۔ یہ تو ہر وقت نیست و نابود کر دیئے جانے کے قابل ہے۔ لیجئے عارفین تو آپ کے وجود ہی کو گناہ بتلا رہے ہیں جس سے آپ بچ ہی نہیں سکتے، اس شعر کا یہ مطلب نہیں کہ وجود فی نفسہ گناہ ہے کیونکہ وجود فی نفسہ ہمارے اختیار میں کب ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو موجود سمجھنا اور اپنی ہستی پر نظر کرنا گناہ ہے سو واقعی جس کی نظر موجود حقیقی کی ہستی پر ہے وہ تو اس کے سامنے اپنے آپ کو موجود کہتے ہوئے

بھی شرمائے گا۔

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمترند
کہ باہستیش نام ہستی برند
(تمام چیزیں جو موجود ہیں اس موجود حقیقی کے سامنے کمتر ہیں کہ اس کے
وجود کے سامنے اپنے وجود کا نام لے سکیں)

وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو شیخ نے کتنی دو مختصر اور آسان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ جتنی چیزیں ہست نظر آتی ہیں گو ہست تو ہیں مگر پھر بھی یہ سب موجود حقیقی کے سامنے اس سے بھی کمتر ہیں کہ ہستی کا نام بھی لے سکیں یعنی اس قابل بھی نہیں ہیں ان کا وجود اُس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ جب ان کے نزدیک وجود بھی گناہ ہے تو سارے نیک اعمال بھی ان کے نزدیک حسنات نہیں بلکہ ان کی نظر میں وہ بھی سئیات ہیں اور جو واقعی سئیات ہیں انکو تو نہ معلوم وہ کس درجہ میں شمار کرتے ہوں گے۔ اب آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کہتا کہ ہم کس گناہ میں مارے گئے یہ اپنے کو مقدس سمجھنا ہے۔ یہی خود بہت بڑا گناہ ہے اور گناہوں کو تو کیا پوچھتے ہو پہلے اسی کی خبر لو کہ خود اسی وقت عجب و دعوے کے گناہ میں مبتلا ہو رہا ہے۔

صاحبو! سچ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہماری پردہ پوشی فرماتے رہتے ہیں ورنہ پہلی امتوں کی طرح اگر گھر کے دروازے پر گناہ لکھ دیئے جایا کرتے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا کہ رات کے گناہ دن میں دروازہ پر لکھے ہوتے تھے اور دن کے گناہ تو سب دیکھتے ہی تھے اس وقت معلوم ہوتا کہ ہم کس قدر گناہ کرتے ہیں کتنے رسوا اور ذلیل ہوتے ہیں مگر اس نعمت کی ہم نے یہ قدر کی ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو ہمارے گناہ چھپائے تو، ہم خود بھی اپنے کو مقدس سمجھنے لگے۔ اے صاحبو! دوسروں ہی سے تو ہمارے گناہ چھپے ہوئے ہیں خود ہم سے تو نہیں چھپا دگئے۔ پس یہ کتنی حماقت ہے کہ دوسروں کے حسن ظن سے ہم نے خود بھی اپنے ساتھ حسن ظن کر لیا۔ ہم کو چاہیئے کہ جب طاعت کریں تو اس کو دیکھیں کہ ہم نے اس کو کس طرح ادا کیا پھر یہ سوچیں کہ ہم سے کیسی طاعت مطلوب تھی

اور ہم نے ادا کیسی کی ہے۔ ایسی ہی طاعت ہم سے مطلوب ہے جیسی ہم ادا کرتے ہیں ایک نماز ہی کو لے لو کہ ہم اس کی کیسی بری گت بناتے ہیں نہ طریقہ کے ساتھ وضو کیا جاتا ہے نہ قاعدہ کے موافق قرات ہے نہ اطمینان سے رکوع اور سجدہ ہے ایسی ٹکریں مارتے ہیں جیسے کوئی بیگار سر سے ٹالتا ہو اور خشوع و خضوع کا تو پتہ ہی کہیں نہیں ہوتا نہ معلوم دل کہاں کہاں ٹکریں مارتا پھرتا ہے پھر اس پر سمجھتے ہیں کہ ہم نمازی ہیں، نماز کے پابند ہیں اور اس طرح ہر کام کو دیکھئے اور سوچئے واللہ اگر ہم اس طرح کسی دنیا کے آقا کا کام کریں تو ہمارے سر پر سَو جوتے روز آپڑا کریں یہی وجہ ہے کہ عارفین اپنی طاعات کو طاعات نہیں سمجھتے وہ تو یوں کہتے ہیں ؎

خود ثنا گفتن زمن ترک ثنا ست
کیں دلیل ہستی و ہستی خطا ست

(میرا تعریف کرنا خود ترکِ تعریف ہے کیونکہ یہ ہستی کی دلیل ہے اور ہستی گناہ ہے)

اور طاعات بھی ایک قسم کی ثنا ہے، فرماتے ہیں کہ میرا ثنا کرنا یعنی طاعت بجالانا یہ خود ترک طاعت ہے یعنی وہ بھی ایک گناہ ہے کیونکہ ہم اس پر نظر عجب سے نگاہ کرتے ہیں۔ خشوع کے اوپر مجھے امام غزالی کا اور ان کے بھائی کا قصہ یاد آیا امام ابو حامد غزالی کے چھوٹے بھائی احمد غزالی جماعت سے نماز نہ پڑھتے تھے مغلوب الحال زیادہ تھے۔ ایک مرتبہ امام غزالی نے والدہ سے اس کی شکایت کی انہوں نے ان کو سمجھایا بجھایا خیر جماعت میں آکر کھڑے ہوئے۔ امام غزالی نے نماز پڑھنی شروع کی بس تھوڑی ہی دیر میں ان کے بھائی صاحب نیت توڑ جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ امام غزالی کو جو معلوم ہوا کہ نیت توڑ کر چلے گئے بہت ناگوار ہوا، آکر والدہ صاحبہ سے اس کی شکایت کی۔ والدہ نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی وہ کہنے لگے کہ اگر کسی کے کپڑے میں حیض کا خون لگ جاوے تو نماز نہیں ہوتی، ان کے قلب میں حیض کا خون لگ رہا تھا بس میں اقتدار سے جدا ہو گیا۔ اور ہوا یہ کہ یہ اس زمانہ میں ایک فقہ کی کتاب لکھ رہے تھے تو اس وقت ایک خاص جزء یہ اس باب کا ان کے قلب میں گذرا ان کو مکشوف ہو گیا اب دیکھئے ان کی والدہ صاحبہ کیا فیصلہ فرماتی ہیں آپ نے فرمایا کہ محمد (امام غزالی کا

نام ہے) واقعی تم نے نماز کا حق ادا نہ کیا. مسائل کے حل کے لئے دوسرا وقت ہے. نماز میں کیوں ادھر التفات کیا۔ اور دوسرے سے فرمایا کہ احمد تم نے بھی خطا کی تمہارا حضور بھی کامل نہ تھا تم کو حق تعالیٰ سے توجہ ہٹا کر ادھر کیوں التفات ہوا کہ امام کیا کر رہا ہے کیا سوچ رہا ہے۔ دونوں کے حضور میں نقصان ہے۔ واقعی کیا اچھا فیصلہ کیا گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ نماز میں ایسی حالت ہونی چاہیئے

دلا آرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دلارام سے تمہارے دل کو بستگی ہو جائے تو پھر تمام جہان سے آنکھیں بند کر لو)

اے صاحبو! اگر ہم کو ہر وقت یہ حالت نصیب نہیں تو کم از کم نماز میں تو ایسا ہو جانا چاہیئے کہ تمام عالم سے آنکھیں بند کر لیں۔ جس نے نماز میں بھی عالم سے آنکھیں بند نہیں کیں وہ پھر اور کس وقت خدا کی طرف لگے گا۔ تب احمد سمجھے کہ واقعی ہم کچھ نہیں ہیں۔ خشوع وخضوع کا ہمارا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ والدہ صاحبہ ہم سے بھی بڑھی ہوئی ہیں کتنی بڑی غلطی پر متنبہ کیا جس کو ہم غلطی بھی نہ سمجھتے تھے۔ ہم تو بھائی صاحب ہی کو الزام دیتے تھے کہ وہ نماز میں خشوع نہیں کرتے، اب معلوم ہوا کہ ہم خود بھی خشوع سے خالی ہیں۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس وقت امام غزالی کے خشوع میں پھر بھی بہت زیادہ نقصان نہ تھا کیونکہ ان کو تو ایک شرعی مسئلہ ہی کا خیال آیا تھا اور مسائل شرعیہ اگرچہ غیر خدا ہیں مگر پھر ان کو خدا کے ساتھ ایک گونہ تعلق ہے تو خدا کی طرف سے اگر دھیان ہٹا تھا تو اسی کے احکام میں لگا ہوا بھی تھا اور شیخ احمد کا دھیان خدا کی طرف سے ہٹکر امام کی حالت پر متوجہ ہوا اور ایک خاص واقعہ کا ان کو انکشاف ہو گیا، تو خدا کی طرف خیال رہا نہ خدا کے احکام کی طرف تو یہ تشتت ان کے تشتت سے اُدون رکم تھا، اب اس واقعہ کو سنکر فرمایئے کہ ہم میں خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے والے کے آدمی ہیں غرض نماز ہی کو دیکھ لو تو معلوم ہو جائے کہ ہماری کوئی طاعت طاعت کہنے کے قابل نہیں۔ اس جگہ بظاہر یہ ایک شبہ ہوتا ہے میں اس کو بھی دفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اُجَهِّزُ جَيْشِيْ وَ اَنَا فِي الصَّلٰوةِ کہ میں نماز کے اندر لشکر بھیجنے کا سامان کیا کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے دل میں نماز کے اندر لشکر کا خیال آتا تھا اور ایک آن میں دو چیزوں کی طرف التفات نفس محال ہے تو یقیناً لشکر کے خیال کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف خیال نہ رہتا ہوگا یا کم رہتا ہوگا تو اب یا تو یہ مانا جائے کہ حضرت عمرؓ نماز میں خشوع نہ کرتے تھے یا یہ کہا جائے کہ خدا کے سوا دوسرے خیالات میں مشغول ہونا خشوع کے منافی نہیں اشکال ہے ظاہر میں سخت اسی لئے ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پاس دو عالم جھگڑتے آئے تھے ایک تو خطرات آنے کو خشوع کے منافی سمجھتے تھے دوسرے اس کو خشوع کے منافی نہ سمجھتے تھے اور اس قصہ سے استدلال کرتے تھے۔ پہلے شخص کو اس کی حقیقت نہ معلوم ہونے سے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا اس لئے بعضے لوگ اس واقعہ سے خشوع کے عدم وجوب کے قائل ہوئے ہیں۔ کیونکہ اُن پر حضرت عمرؓ کے اس واقعہ کی حقیقت واضح نہیں ہوئی حضرت حاجی صاحب نے اس کی حقیقت کو منکشف فرمایا۔ آپ نے جواب دیا کہ حضرت عمرؓ کی تجہیز جیش خشوع کے منافی نہیں کیونکہ وزیر جب بادشاہ کے دربار میں آتا ہے تو اس کا خشوع یہی ہے کہ سرکاری کاغذات کو دیکھے اور بادشاہ کے سامنے پیش کرے اس سے احکام دریافت کرے اور اس کے موافق فرمان شائع کرے۔ تو ایک شخص تو وہ ہے جو بادشاہ کے دربار میں محض حاضری دینے آتا ہے اس کا کام یہ ہے کہ بادشاہ کی عظمت و جلال ظاہر کرنے کے لئے دست بستہ اس کے سامنے کھڑا رہے۔ چنانچہ دربار شاہی میں بہت سے خدمتگار صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہیں دوسرا کوئی کام ان کے ذمہ نہیں ہوتا سو اس کا خشوع تو یہی ہے کہ ہاتھ باندھے سر جھکائے بادشاہ کے سامنے کھڑا رہے کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور ایک وزیر ہے جس کا کام یہ ہے کہ سلطنت کا انتظام کرے اور بادشاہ کے حکم کے موافق فرمان نافذ کرے اس کا خشوع یہی ہے کہ تمام کاغذات کو دیکھے بھالے، ڈاک کو پڑھے اُن کے جواب کو لکھ کر بادشاہ کو

سنائے پس ظاہر میں اگرچہ پہلے شخص کا خشوع بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظر بادشاہ کے سوا کسی چیز میں نہیں اور وزیر بظاہر دوسری چیزوں کی طرف متوجہ معلوم ہوتا ہے وہ دست بستہ بادشاہ کے سامنے یکسو ہو کر نہیں کھڑا ہوتا مگر کون نہیں جانتا کہ وزیر کا مرتبہ پہلے شخص سے کس قدر بڑھا ہوا ہے اور اس کی اطاعت اور خشوع یہی ہے کہ دوسرے کاموں میں مشغول ہو جو بادشاہ نے اس کے سپرد کئے ہیں، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے جن کے سپرد انتظام عام کا کام کیا گیا تھا اُن کا خشوع یہی تھا کہ نماز میں کھڑے ہو کر حق تعالیٰ سے لشکر وغیرہ کی بابت احکام دریافت کریں اور نماز میں جو بات ان کے دل پر القار ہو اس کے موافق عمل کریں اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ نماز میں جو کچھ القار ہوتا ہے وہ اکثر صحیح ہوتا ہے۔ پس حضرت عمرؓ کی تجہیز جیش کی وہی مثال ہے جو وزیر کی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر حالت ہوتی ہے، حضرت عمرؓ کو تجہیز جیش میں بھی حضور حق ہی حاصل ہوتا تھا اس لئے اُن کی یہ حالت کسی طرح خشوع کے منافی نہ تھی بلکہ عین خشوع تھی بلکہ مثال سے

ؔ جامع عرض کرتا ہے کہ اس تقریر سے یہ لازم آتا ہے کہ امام غزالی کے واقعہ میں ان کا نماز میں مسائل فقہ کو عمل کرنا بھی خشوع کے منافی نہ ہو کیونکہ وہ عالم تھے اور شرعاً عالم کے ذمہ استنباط مسائل لازم کیا گیا ہے تو وہ بھی نماز میں داخل ہو کر اپنا فرض منصبی انجام دیتے تھے ہاں یہ فرق کیا جائے تو ممکن ہے کہ حضرت عمر نماز میں داخل ہو کر خود تو ہمہ تن حق تعالےٰ کی طرف متوجہ رہتے ہوں اور عمداً تجہیز جیش کا خیال دل میں نہ لاتے ہوں پھر خود بخود غیب سے تجہیز جیش کے متعلق ان کے قلب پر واردات القار ہوتے ہوں اور امام غزالی سے اس واقعہ میں عمداً مسائل فقہ کی طرف التفات ہوا ہوگا اس لئے ان کی والدہ نے ان کے خشوع کو ناقص کہا اور غالباً حضرت عمر کے تجہیز جیش فی الصلوٰۃ کی صورت یہی تھی کہ وہ اپنی توجہ بالقصد حق تعالیٰ کی طرف رکھتے تھے پھر خود بخود اُدھر سے احکام متعلقہ جیش قلب پر وارد ہوتے تھے اسی کو حضرت عمرؓ نے اُجَهِّزُ جَيْشِي وَاَنَا فِي الصَّلٰوةِ (میں نماز کے اندر لشکر بھیجنے کا انتظام کرتا ہوں) سے تعبیر فرمایا اور نماز کی واردات کے صحیح ہونے کا بھی یہی مطلب ہے کہ جو اس صورت سے فائض ہوتے ہوں وہ واردات صحیح ہیں ورنہ از خود از یں کسی چیز کی طرف توجہ کرنا خشوع کے ضرور منافی ہوگا۔ واللہ اعلم ۱۲ ظفر

واضح ہوگیا کہ دوسروں کے خشوع سے آپ کا خشوع اس حالت میں بھی بڑھا ہوا تھا غرض معلوم ہوگیا کہ یہ حالت حضرت عمرؓ کے خشوع کی منافی کسی طرح نہیں اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہوگئی جو اس واقعہ سے خشوع کی عدم وجوب کے قائل ہوئے ہیں اور خشوع ضروری کیونکر نہ ہو جبکہ حق تعالیٰ خشوع نہ کرنے پر بہت زور کے ساتھ شکایت کے طور پر فرماتے ہیں "اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ" "کیا مسلمانوں کے لئے (ابھی) اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب خدا کی نصیحت کے سامنے اور جو دین حق (منجانب اللہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جاویں، خشوع اگرچہ صحت صلوٰۃ کا موقوف علیہ نہ ہو یعنی نماز کی صحت اگرچہ خشوع پر موقوف نہیں اس کے بدون بھی نماز درست ہے اور فرض ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے مگر صاحب روح المعانی نے علماء کا اس پر اجماع لکھا ہے کہ خشوع قبول صلوٰۃ کا موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے نماز قبول نہیں ہوتی۔ اب آپ خود غور فرمالیں کہ نماز سے مقصود کیا ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ قبول ہی مقصود ہوتا ہے جو طاعت قبول نہ ہوئی وہ طاعت ہی کیا ہے اس سے آپ کو خشوع کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی، رہا فرض کا ذمہ سے ساقط ہوجانا یہ کوئی چنداں قناعت کی بات نہیں۔ دیکھئے دو شخص بادشاہ کی خدمت کرتے ہوں ایک تو اچھی طرح اس کی مرضی کے موافق کرتا ہو کہ بادشاہ اس کی خدمت سے خوش ہوتا ہو اور دوسرا بُری طرح کرتا ہو جس سے بادشاہ کو غصہ آتا ہو تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ دربار میں حاضر ہوجانا اور غیر حاضر نہ ہونا ہی کافی ہے ہرگز نہیں سب عقلاً اتفاق کے ساتھ یہی کہیں گے کہ ایسی خدمت سے کچھ نفع نہیں بلکہ ہر روز چونکہ وہ بادشاہ کو ناراض کرتا ہے اندیشہ ہے کہ کہیں ایک دن دربار سے بالکل ہی نہ نکال دیا جائے۔ افسوس کہ بادشاہوں کی خدمت میں تو سب کا اس پر اتفاق ہے کہ بے ڈھنگی طرح کرنا بالکل فضول ہے اور خدا تعالیٰ کی عبادت میں آکر سب کی عقلیں مسخ ہوگئیں کہ بدون خشوع خضوع کے نماز پڑھ کر بھی خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے بڑا کام مارلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری طاعت تو سزا کے قابل ہے اس کی بالکل وہی مثال ہے

جیسے کوئی غلام زور زور سے بادشاہ کو پنکھا جھلتا ہو کہ کبھی کان پر لگ جاتا ہے کبھی سر پر کبھی ٹوپی اڑ جاتی ہے کبھی ماتھے پر لگ جاتا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے، یہ خدمت نہیں یقیناً بے ادبی ہے۔ پھر اس طرح پنکھا جھلنے پر اگر وہ غلام ناز کرے کہ میں نے بڑی جانفشانی اور محنت سے بادشاہ کو پنکھا جھلا ہے میں انعام کا مستحق ہوں وہ احمق ہی نہیں وہ انعام کا مستحق تو کیا ہوتا اُنعام میں باندھے جانے کے قابل ہے یعنی اس لائق ہے کہ چوپاؤں اور جانوروں کے ساتھ باندھا جاوے کہ اس کو خدمت شاہی کا کچھ بھی سلیقہ نہیں نہ آداب شاہی کا خیال ہے مگر اس کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ جب خشوع کے بغیر نماز کوئی چیز نہیں تو اس سے فائدہ ہی کیا لاؤ آج سے نماز ہی کو طلاق دو یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ مطلب میرا یہ ہے کہ نماز پڑھتے رہو مگر ساتھ ساتھ خشوع حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتے رہو پھر اگر خشوع نصیب ہو گیا اور ان شاء اللہ کوشش کرتے سے حاصل ہو ہی جاوے گا ایسا ہوتا ہی نہیں کہ کوئی خدا کی طلب کر کے محروم رہ جاوے تب تو مقصود حاصل ہو گیا اور اگر فرض کر لو کہ تم نے خشوع حاصل کرنے کی باقاعدہ پوری کوشش کی پھر بھی حاصل نہ ہوا تو آپ بے فکر رہیں ان شاء اللہ قیامت میں یہ خشوع کے نہ ہونے پر آپ سے مواخذہ نہ ہوگا. کیونکہ جو کام آپ کا تھا یعنی کوشش اور طلب وہ آپ کر چکے اب آگے کامیابی ہونا یا نہ ہونا یہ خدا کے قبضہ میں ہے۔ کوشش کے بعد ناکام رہنے سے مواخذہ نہیں ہوتا مواخذہ اسی پر ہوتا ہے کہ تم نے کوشش کیوں نہیں کی، مگر یہ بات میں نے فرض کے طور پر کہی ہے ورنہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ طلب اور کوشش کے بعد انسان ناکام نہیں رہتا اور جو ناکام رہتے ہیں وہ کوشش ہی نہیں کرتے یا کم کرتے ہیں۔ پس جب تک خشوع نہ حاصل ہو آپ بلا خشوع ہی کے نماز پڑھتے رہیں اور خشوع حاصل ہونے کی طلب اور کوشش میں لگے رہیں اور ہر نماز کے بعد حق تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرتے رہیں اور دل سے یہ بھی دعا کرتے رہیں کہ یا اللہ ہم کو خشوع کامل عطا فرما دے۔ اس توبہ و استغفار کی برکت سے امید ہے کہ نماز میں خشوع نہ ہونے سے

جو کمی رہ گئی تھی حق تعالٰے اس کو بھی پورا کر دیں گے۔ اب تو آپ کو شریعت کی قدر ہوئی ہو گی دیکھئے کس قدر آسانی ہے کہ اول تو خشوع سے نماز پڑھو اگر خشوع حاصل نہ ہو تو بلا خشوع ہی پڑھو اور ہر نماز کے بعد دعا و استغفار کرتے رہو اگر ساری عمر کوشش کرنے سے بھی خشوع حاصل نہ ہو تو بلا خشوع ہی پڑھتے رہو مگر استغفار ضرور کرتے رہو ان شاء اللہ خشوع والوں کے برابر ہو جاؤ گے، یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے۔ غرض یہ کہ جب ہماری طاعات کی یہ حالت ہے تو پھر مصیبت آنے کے وقت یہ کہنا کہ ہائے کس گناہ میں پکڑے گئے سخت بے حیائی ہے گناہ سے ہمارا کون سا وقت خالی ہے ہم تو سر تا پا گناہ ہو رہے ہیں، ہم کو تو اس پر تعجب ہونا چاہئے کہ اب تک صحیح سالم کیسے بیٹھے ہیں جب یہ معلوم ہو گیا کہ مصائب کا سبب ہمارے گناہ ہیں۔ تو اب اس کا علاج کیا ہونا چاہئے اس لئے کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا نہ ہو گناہوں کا علاج بھی ہے۔ حدیث میں ہے کُلُّکُمْ خَطَّاؤُنَ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ اَلتَّوَّابُوْنَ (تم سب خطا کار ہو اور خطا کاروں میں بہتر وہ ہے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں) کیا تسلی آمیز علاج فرماتے ہیں کہ گناہوں کی وجہ سے نا امید نہ ہو مایوس نہ ہو خطا ہو جانا انسان سے کچھ بعید نہیں خطا وار تم سب ہو ملائکہ انبیاء علیہم السلام کے سوا گناہوں سے معصوم کوئی نہیں اپنے اپنے درجے کے موافق گناہ ہر شخص سے ہوتے ہیں مگر خَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ یعنی خطا کاروں میں اچھے وہ ہیں جو بہت توبہ کرتے رہیں، خطا ہو جانا کچھ زیادہ تعجب نہیں مگر اس کے بعد ندامت اور انفعال بھی نہ ہو اپنی اصلاح کی فکر بھی نہ ہو یہ زیادہ محل شکایت ہے اگر خطا کے بعد ندامت اور انفعال ہوتا رہے اور اصلاح کی کوشش جاری رہے تو پھر دن میں سو بار بھی خطا ہو تو حق تعالیٰ معاف فرما دیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاؤں کے مقابلہ میں تَوَّابُوْنَ فرمایا جس میں باعتبار صیغہ کے اشارہ اس طرف ہے کہ جتنی بار خطائیں کرتے ہیں اتنی ہی بار توبہ کرتے ہیں غرض جو ہر گناہ سے توبہ کرتے رہتے ہیں وہ دوسرے خطا کاروں سے اچھے ہیں۔ مگر توبہ کے یہ معنی نہیں کہ صرف زبان سے توبہ توبہ کہہ لیا جائے نہیں توبہ یہ ہے کہ دل میں شرمندگی اور ندامت

ہو اور آئندہ کے لئے اصلاح کا عزم ہو اور پچھلے حقوق کے ادا کرنے کا اہتمام شروع کر دیں ورنہ زبانی توبہ سے کیا ہوتا ہے۔ اس تقریر پر یہ شبہ ہوگا کہ جب مصائب گناہوں کے سبب سے آتے ہیں تو ہم تو بعضے اولیاء اللہ کو بھی مصائب میں مبتلا ہوتے دیکھتے ہیں تو کیا وہ بھی گناہ گار ہیں۔ اس کے چند جواب ہیں، اول تو یہ کہ اولیاء اللہ ہی کہاں کے معصوم ہیں ان کے درجہ کے موافق گناہ ان سے بھی ہوتے ہیں۔ یوں کہیے کہ وہ بھی اندھوں میں کانے راجہ ہیں، وہ دوسروں کے اعتبار سے نیک ہیں ولی ہیں سب کچھ ہیں مگر خدا کے عظمت و جلال کے سامنے تو وہ بھی خطاکار ہیں خدا کے لائق اطاعت کوئی نہیں کر سکتا ان کی بھی کشتی استغفار اور توبہ ہی سے پار ہو سکتی ہے۔ حضرت شیخ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش عذر بدرگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش کس نتواند کہ بجا آورد

(بندہ وہی بہتر ہے جو اپنی کوتاہی کا عذر درگاہ الٰہی پیش کرے جو شخص درگاہِ الٰہی میں اپنا عذر پیش نہ کر سکے وہ اس کی خداوندی کے لائق نہیں ہے)

اگر کوئی یہ چاہے کہ دین کا پورا حق ادا کر دے اور سرمو شریعت سے تجاوز کسی بات میں بھی نہ ہو تو یہ عادۃً ہرگز نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے ولی خطا سے معصوم نہیں کبھی نہ کبھی کوئی لغزش خطا سے یا سستی سے ہو ہی جاتی ہے۔ حدیث میں ہے لَنْ یُّشَادَّ الدِّیْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَہٗ اِسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا کہ کوئی شخص کبھی دین کا مقابلہ نہ کرے گا مگر وہ مغلوب ہو جاوے گا اور دین ہی غالب رہے گا۔ پس سیدھی راہ پر چلتے رہو اور تم ہرگز پورا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ جب احصار نہیں ہو سکتا تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم استقامت کا حکم کس لئے فرماتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ استقامت کا حق تو ادا نہیں ہو سکتا مگر جس قدر ہو سکے اور جتنا اپنی وسعت میں ہے استقامت کی کوشش کرنی چاہیے مگر کسی وقت یہ مت سمجھو کہ استقامت کا حق ہم سے ادا ہوگیا۔ رہی یہ بات کہ ہماری ہمت میں کتنی

استقامت ہے اس کو فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد　　یک کار ازیں دو کار می باید کرد

(سرمد گلہ شکایت کم کرو　　دو کاموں سے ایک کام کرو)

یا تن برضائے دوست می باید داد　　یا قطع نظر ز یار می باید کرد

(یا تن و بدن محبوب کی رضا مندی میں دیدو یا محبوب سے بالکل تعلق قطع کرلو)

فرماتے ہیں کہ گلہ اور شکایت چھوڑو بس دو کام میں سے ایک کام کرو یا تو دوست کی رضا میں جان و تن کھپا دو یا محبوب سے قطع نظر کرلو۔ اگر جان و تن عزیز ہے اور اس کا کھپانا منظور نہیں تو اور کہیں جاؤ یہ خدا تو ایسے ہی ہیں وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ بس اپنے کو مٹا دو۔ ان اقتلوا انفسکم (کہ اپنے کو قتل کردو) کا یہی مدلول ہے[عہ] بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی مطلب ہے کہ اپنی جان کھپا دو خدا کے راضی کرنے میں مگر پھر بھی یہ مت سمجھو کہ تم نے حق ادا کر دیا۔ بس اسی طرح چلتے رہو تم حق ادا نہیں کرسکتے اپنی سی کوشش میں لگے رہو، اس کے بعد اپنا معاملہ خدا کے حوالہ کرو کہ یا اللہ جتنا مجھ سے ہوسکتا تھا وہ میں نے کیا اب آپ میرے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمایئے میری کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمایئے پھر میں کہتا ہوں کہ خدا کو چھوڑ کر کوئی کہاں جاسکتا ہے، کوئی دوسرا در ہو تو کہیں جائے ان کی تو یہ شان ہے ؎

عزیزیکہ از درگہش سر بتافت

بہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت

(حق تعالیٰ ایسے غالب ہیں کہ جس شخص نے ان کی درگاہ سے منہ پھیرا جس دروازہ پر گیا کچھ عزت نہ پائی۔)

عہ اس آیت میں لو انا کتبنا علیہم سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل نفس مطلوب نہیں پھر یہ دلالت مذکورہ فی المتن کیسی جواب یہ ہے کہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل امر تو یہی تھا مگر رعایت کے سبب تخفیف فرما دی گئی کہ اس کی ہمت نہ کریں گے ورنہ اگر مکلفین میں اس کی ہمت دیکھی جاتی تو اس کو ضرور مشروع فرماتے کیونکہ قابل مشروعیت کے ہے تو اس طرح مطلوب ہونا اس کا مدلول آیت ہوا ۱۲ اشرف

خدا کا دروازہ چھوڑ کر کہیں عزت حاصل نہیں ہو سکتی اس پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی۔

حضرت شیخ شیرازیؒ نے گلستان میں لکھا ہے کہ ایک شیخ رات کو ہمیشہ تہجد کے لئے اٹھتے تھے۔ ایک رات غیب سے آواز آئی کہ یہاں کچھ قبول نہیں کچھ بھی کرتے رہو اور یہ آواز ایک مرید نے بھی سُنی، دوسری رات کو اس نے دیکھا کہ شیخ پھر لوٹا بدھنا لے کر نماز کو اٹھے اور جانماز پر کھڑے ہوگئے۔ مرید نے عرض کیا کہ جب وہاں کچھ قبول نہیں تو آپ ہی کیوں سر مارتے ہیں پڑ کے سورہیئے اس محنت سے کیا فائدہ۔ شیخ نے جواب دیا کہ بھائی یہ تو سچ ہے کہ وہاں قبول نہیں مگر کوئی دوسرا دروازہ تم بتلادو جہاں قبول ہو، میرا تو ایک ہی دروازہ ہے چاہے وہ قبول کریں یا نہ کریں میں تو اس در کو نہیں چھوڑ سکتا اپنی سی کرتا رہوں گا اور کہا ؎

تو دانی ازاں دل بپرداختن
کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

(تو اس سے دل اٹھا سکتا کہ اس کے موافقت کسی سے موافقت کرلیگا)

پس یہ کرنا تھا کہ دریائے رحمت جوش میں آیا اور غیب سے دوسری آواز آئی ؎

قبول است گرچہ ہنر نیستت
کہ جز ما پناہے دگر نیستت

یعنی اگرچہ عبادت قابل قبول تو نہیں تھی مگر چونکہ کوئی دوسری پناہ بھی نہیں اس لئے سب قبول ہے کیئے جاؤ۔ دیکھئے یہ مذاق ہوتا ہے عشاق کا کہ ان کو طلب سے کام ہوتا ہے اپنی طرف سے طلب میں کمی نہیں کرتے اور قبول و نا قبول کی کچھ پروا نہیں کرتے بادشاہ کے دروازہ پر بھیک مانگنے جانا چاہیئے، ہر دن جاتا رہے اگر سو بار دھکے ملیں گے کسی دن تو رحم آجاوے گا کہ اس غریب کے واسطے یہی ایک دروازہ ہے، آخر اسے چھوڑ کر کہاں جائے لاؤ اس کی مراد پوری کردیں۔ چنانچہ خسرو فرماتے ہیں ؎

خسرو غریب است و گدا افتادہ در کوئے شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب و گدا آپ کے کوچہ میں پڑا ہوا ہے خدا کے لئے غریبوں کی طرف بھی نظر فرمائیے)
اور اگر ایک دن بھی کچھ نہ ملے تو ہمارا کوئی حرج تو نہیں عبادت کرنے میں طلب کرنے میں دروازہ
پر ناک رگڑنے میں کیا نقصان ہے۔ اجی جب وہ پوچھتے ہی نہیں کرو جب اور نہ کرو جب
دونوں حالتوں میں محرومی ہے تو کرتے رہنا اور محروم رہنا یہ اس سے اچھا ہے
کہ سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ جاؤ پھر محروم رہو کیونکہ چھوڑ کر بیٹھ جانے میں ہماری طرف سے
بے رخی ہوگی اور عاشق کی شان سے بیرخی مستبعد ہے اور نہ محبوب بے رخی کرے یہ اس کا
ناز ہے اگر ہم کو بھیک نہ ملے تو ہمارا کوئی قرض تو نہیں تھا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے کمی نہ کرو۔ جان کھپا دو اور پھر یہی سمجھتے رہو کہ ہم سے
کچھ حق ادا نہیں ہو سکتا اپنے کو قبول اور قرب کے لائق ہرگز مت سمجھو آخر تم کو
حضرت حق سے مناسبت ہی کیا ہے۔ جو تم اس کے قرب کے لائق ہو وہ بالکل مبرّا اور
منزہ اور تم سراپا عیوب و نقصان پھر جب اتنا بعد ہے تو تم کسی حال میں قرب
کے لائق نہیں ہو سکتے۔ اور اگر وہ اپنا قرب عطا فرمادیں یہ محض ان کی عنایت و
رحمت اور فضل ہے اسی کو ایک مجذوب فرماتے ہیں، خدا وہ ہے جو سمجھ میں نہ آوے
اور سمجھ وہ ہے جو خدا کو پاوے۔ یہ مجذوب ایسے ہی آزاد ہوتے ہیں ان کے الفاظ
ظاہر میں بے ربط ہوتے ہیں، ان کے مطلب کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اور چونکہ ہدایت
کا کام ان کے سپرد نہیں ہوتا اس لئے ان کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی کہ ہماری بات کا
مطلب کوئی سمجھا یا نہیں۔ مطلب ان مجذوب صاحب کا یہ ہے کہ خدا وہ ہے جس کی
کنہ ذات تک کسی کی سمجھ نہیں پہنچ سکتی، اس کی حقیقت کا ادراک کوئی نہیں کر سکتا اس
مضمون کو حدیث میں ان الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ
لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَىٰ نَفْسِكَ یا اللہ ہم نے آپ کو
پوری طرح (جیسا کہ آپ کے شایانِ شان ہے) نہیں پہچانا ہم آپ کی پوری طرح
تعریف نہیں کر سکتے آپ ویسے ہی ہیں جیسی کہ آپ نے خود اپنی تعریف فرمائی ہے۔
اسی لئے عارفین فرماتے ہیں کہ خدا کے متعلق جس قدر علم ہم کو حاصل ہوتا ہے خدا

اس سے بھی بالا و برتر ہے۔ اس کو کسی کا علم احاطہ نہیں کر سکتا اور یہاں سے بھی معلوم ہوا
کہ جب ہم کو خدا تعالیٰ کا علم بھی کامل طور پر حاصل نہیں ہو سکتا تو ہم قرب خداوندی کے خود
کیسے لائق ہو سکتے ہیں ہمارے میں اور خدا تعالیٰ میں بہت زیادہ بعد ہے بس انسان کی
بڑی معرفت اور منتہائے قرب یہ ہے کہ اس کو یہ بات منکشف ہو جائے کہ ہم خدا کے علم
و ادراک سے عاجز ہیں یہ بات عقیدہ کے طور پر ہر شخص جانتا ہے مگر اس کا انکشاف ہر
شخص کو نہیں ہوتا جب عارفین کو حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کا حسب قابلیت مشاہدہ
ہوتا ہے اس وقت ان کو اپنا عجز۔ اور ضعف اور اپنی عبدیت کا انکشاف ہوتا ہے اسی
مطلب کو ان حضرت مجذوب صاحب نے ان لفظوں سے ظاہر کیا ہے کہ خدا وہ ہے
جو سمجھ میں نہ آوے اور جو تمہاری سمجھ میں آجائے وہ خدا نہیں۔ خدا اس سے پاک اور بالا برتر
ہے۔ مگر باوجود اس کے عقل سے کام یہ لینا چاہیے کہ خدا کو معلوم کرے پس اس جملہ میں اور
پہلے جملہ میں بظاہر تعارض ہے کیونکہ جب خدا تعالیٰ تک عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی تو پھر
اس کے کیا معنی کہ سمجھ وہ ہے جو خدا کو پاوے اس سے لازم آتا ہے کہ سمجھ سے خدا کو پا سکتے
ہیں سو اس جملہ کا یہ مطلب ہے کہ سمجھ وہ ہے جو خدا کو پانے کی کوشش کرے جیسا کہ ہم کہا
کرتے ہیں کہ چاند دیکھا تھا اس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ چاند دیکھا تھا اور اس
کو دیکھ بھی لیا دوسرے یہ کہ چاند دیکھا تھا مگر نظر نہیں آیا۔ اس وقت چاند دیکھنے کے معنی
یہ ہیں کہ دیکھنے کی کوشش کی تھی اسی طرح پانے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ پا لیا دوسرے
یہ کہ پانے کی کوشش کی پس مطلب مجذوب کا یہ ہے کہ سمجھ وہ ہے جو خدا کی طلب
میں رہے اگرچہ اس کی ذات تک رسائی نہیں ہو سکتی پس حدیث میں جو آتا ہے
اِسْتَقِيْمُوْا لَنْ تُحْصُوْا (پس سیدھی راہ چلتے رہو اور اس کا پورا حق ادا نہیں کر سکتے)
اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اپنی سی کوشش کرتے رہو اگرچہ تم سے پورا حق ادا نہیں
ہو سکتا اور یہ مسئلہ عقلاً بالکل سچ ہے کیونکہ خدا کی عظمت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے
کمالات کا حق ادا کیا جائے اور کمالات الٰہی غیر متناہی ہیں تو ہم سے ان کا حق کیونکر
ادا ہو سکتا ہے متناہی غیر متناہی کے حقوق کو کب ادا کر سکتا ہے کیونکہ ہماری زندگی

اگر ہزار سال کی بھی ہو تب بھی محدود ہے اگر ہزار سال تک کوئی شخص ہر دم عبادت کرتا رہے کسی وقت راحت و آرام میں مصروف نہ ہو جب بھی وہ ایک محدود زمانہ ہے جس میں غیر متناہی کمالات کے حقوق ادا نہیں ہو سکتے اور جس صورت سے ہم لوگ عبادت کرتے ہیں کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے تین چار گھنٹے عبادت میں اور باقی دنیوی مشاغل یا راحت و آرام میں صرف ہوتے ہیں اس صورت سے تو ہمارا کیا منہ ہے کہ ادائے حقوق الٰہی کا دعویٰ کریں۔ غرض جب حق تعالیٰ کے حقوق کا ادا ہونا محال ہے تو کوئی ولی چاہے کتنا ہی بڑا ولی ہو اس سے بھی اپنے درجہ کے موافق گناہ ہوتے ہیں اس لئے اگر نیک لوگوں پر بھی مصائب آئیں تو اشکال کیا ہے۔ پس یہ مسئلہ کہ بیماری گناہوں سے آتی ہے یہ تو صاف تھا کیونکہ بار بار بیان ہو چکا ہے اور جن تین مضمونوں کا میں بیان کرنا چاہتا ہوں ان میں کا یہ ایک ہے اب میں دو مسئلے اور بیان کرتا ہوں جو کہ درحقیقت اسی تقریر کے متعلق شبہات کے جوابات ہیں اور وہ دوسرا تیسرا مضمون بھی ہے۔ ایک تو یہی شبہ ہے جو ابھی مذکور ہوا تھا کہ نیک لوگوں کو بیماری وغیرہ کیوں آتی ہے حالانکہ آیت سے اور بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماری گناہوں سے آتی ہے اور اس کا جواب میں ابھی دے چکا ہوں اور اس وقت اسی کے متعلق ذرا کسی قدر تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔ اور ایک دوسرا سوال ہے جو اس سے بھی سخت ہے اس کو میں بعد میں حل کروں گا تو پہلے شبہ کا جواب تو یہ ہے جو ابھی گذرا کہ گناہ ان سے بھی ہوتے ہیں گناہوں سے خالی کوئی نہیں اور قاعدہ یہ کہ علاج بالضد ہوتا ہے۔ جب بیماری اور وبا اور تمام مصائب گناہوں کے سبب سے ہیں تو ان کا علاج بھی بس یہی ہے کہ آئندہ کے لئے تو گناہوں کو چھوڑ دو۔ اور پہلے گناہوں کی توبہ و استغفار اور معافی حقوق وغیرہ سے تلافی کرو۔ مگر آجکل ہماری عجب حالت ہے کہ بجائے اپنی اصلاح کے اس بیماری اور مصیبت کو بھی ایک مشغلہ بنالیا ہے۔ چنانچہ بعضے لوگ اموات گنتے پھرتے ہیں اور اس میں آپس میں جھگڑتے بھی ہیں کوئی کہتا ہے کہ آج دس اموات ہوئی ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میاں کو خبر تو ہے ہی نہیں بارہ تو میں نے گنی ہیں اور بھی دو ایک ہوگئی ہوں گی کیونکہ فلانے کی حالت بھی خطرناک تھی۔ فلانے کا سانس چل رہا تھا۔

صاحبو! یہ حالت اور بھی زیادہ خطرناک ہے کہ گناہوں کی سزا دی جائے اور اس کو سزا نہ سمجھا جاوے بلکہ اس کو ایک تفریح کا مشغلہ بنایا جائے۔ اپنی اصلاح کرو۔ دنیا بھر کی فہرست گننے سے کیا نفع۔ میرے پاس بھی بعض خطوط اس مضمون کے آتے ہیں کہ یہاں بیماری کا بہت زور ہے۔ آپ کے وطن میں کیا حال ہے تو میں سب کے جواب میں ایک شعر لکھدیا کرتا ہوں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر اور دارا کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم مہر و وفا کی باتوں کے علاوہ اور کچھ نہ دریافت کرو)

کہ ہمیں ان قصوں کی خبر نہیں اور واقعی مجھے بعض دفعہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ آجکل بیماری کم ہے یا زیادہ، کیونکہ اپنے مشاغل سے ہی فرصت نہیں اس کی تحقیق و تفتیش کون کرے اس لئے میں لکھدیتا ہوں کہ بستی کے حالات کسی نامہ نگار سے پوچھو مجھ سے تو شریعت کی اور خدا کی باتیں دریافت کرو۔ بعض لوگوں کو فضول سوالات کرنے کا مرض ہوتا ہے بھلا ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ تمہیں ساری دنیا کی خبروں سے کیا لینا کہ وہاں بھی بیماری ہے یا نہیں جو کام تمہارے ذمہ ضروری ہے پہلے اس کو تو انجام دو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر لوگوں کو ضروریات کا اہتمام ہو جائے تو ان فضولیات کیلئے وقت ہی نہ ملے۔ چنانچہ میں نے ابھی یہ قصہ بیان کیا ہے کہ ایک عالم کے پاس ایک شخص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت سوال کرنے آیا کہ دونوں میں سے کون حق پر تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ بھائی میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ قیامت کے دن حق تعالٰے تم سے اس کی بابت کچھ دریافت نہ فرمائیں گے اور نہ اس پر مواخذہ فرمائیں گے کہ تم نے اس کی تحقیق کیوں نہیں کی کہ ان دونوں میں سے کون حق پر ہے نہ یہ مقدمہ فیصلہ کے لئے تمہارے پاس آئے گا اور اگر بالفرض آئے بھی تو میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ مقدمہ خارج کر دینا اور کہدیتا کہ مجھے کچھ تحقیق نہیں اور اگر کسی نے وہاں تم سے یہ سوال کیا کہ تم نے تحقیق کیوں

نہ کیا تو صاف کہدینا کہ میں نے علماء سے پوچھا تھا انہوں نے نہیں بتلایا پھر ہم جانیں اور خدا تعالٰے تم تو یہ کہکر چھوٹ جاؤ گے پھر اگر ہم سے سوال ہوا ہم جو چاہیں گے جواب دیدیں گے۔ واقعی خوب جواب دیا۔ مجیب کو چاہیئے کہ سائل کا تابع نہ ہو بلکہ اس کو اپنا تابع بنائے اول تو ہر شخص ہر بات کا جواب نہیں سمجھ سکتا دوسرے جواب دینا اُسی بات کا ضروری ہے جس پر کوئی دین کا کام اٹکا ہوا ہو اور جس بات پر دین کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں اس کا جواب دینا وقت کا ضائع کرنا ہے اور وقت ایسی چیز نہیں کہ اس کو اس طرح فضول کھویا جائے انسان کو اپنے اندر غور کرنا چاہیئے اگر کوئی اپنے اندر غور و فکر کیا کرے تو اس کو معلوم ہو کہ انسان خود ایک عالم ہے۔ ایک پوری اقلیم ہے جس میں کچھ زندہ ہوتے ہیں کچھ مرتے ہیں، کچھ بیمار ہوتے ہیں، کچھ تندرست ہیں کہیں بہار ہے کہیں خزاں ہے غرض ایک عجیب دنیا آپ کے اندر بسی ہوئی ہے جس کے عجائبات کے سامنے اس عالم کے عجائبات ہیچ ہیں اگر ایسا ہی سیر اور تفریح کا شوق ہے تو اپنے دل کی سیر کیجیے۔

ایک صوفی موسم بہار میں جنگل کی سیر کرنے آئے اور سر جھکا کر مراقب بیٹھ گئے۔ ایک شخص نے کہا فَانْظُرُوْا اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ یعنی گردن جھکائے کیا بیٹھے ہو ذرا آنکھیں اوپر اٹھا کر خدا کی قدرت و رحمت کے آثار کا مشاہدہ کرو۔ اُن صوفی نے جواب دیا کہ میں آثارِ رحمت ہی کو دیکھ رہا ہوں اور جن کو تم آثارِ رحمت سمجھتے ہو وہ آثار الآثار ہیں آثار رحمت وہ نہیں ہیں کیونکہ در اصل رحمت کا منشا ایمان ہے اور غضب کا منشا کفر ہے اور ایمان و کفر کا تعلق قلب سے ہے۔ پس اصل مقام رحمت کا قلب ہے پھر مومن کو ایمان کے صلہ میں جنت دی جائے گی جو کہ ایمان کا ثمرہ ہے اور دنیا کی نعمتیں اور لذتیں جنت کا نمونہ ہیں اس لئے ان کو بھی آثار رحمت کہدیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ آثار الآثار اصل آثار رحمت تو باطن میں ہیں جس کو سنائیؒ فرماتے ہیں ؎

آسمانہا ست در ولایت جاں　　　کار فرمائے آسمان جہاں

(ولایت جان بہت سے آسمان ہیں جو اس ظاہری آسمان کا رفرما ہیں)

مولانا فرماتے ہیں ؎

غیب را ابرے و آبے دیگرست
آسمانے آفتابے دیگرست

عالم غیب کا بادل اور پانی دوسرا ہے اس کا آسمان بھی جدا ہے آفتاب بھی جدا ہے جب قلب پر سکینہ نازل ہوتا ہے اور انوار و تجلیات چمکتی ہیں اس وقت اس بادل کا اور بارش کا اور آسمان و آفتاب کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں جب جی چاہے سیر کرلو)

ایک اور صاحب فرماتے ہیں ؎

خلوت گزیدہ را بتماشا چہ حاجت است
چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجتست

(خلوت نشین کو تماشہ کی کیا حاجت ہے جب محبوب کے دربار ہے تو جنگل کی کیا ضرورت ہے)

محبوب کے ہوتے ہوئے جنگل کے سیر کی کیا ضرورت ہے خلوت میں بیٹھ کر اس کا تماشا دیکھو۔ کوئے دوست سے مراد قلب ہے کہ وہ محل نزول انوار الٰہیہ ہے۔ اسی کو کہتے ہیں۔

اے برادر عقل یک دم باخود آر
دمبدم در تو خزاں ست و بہار

(اے بھائی تھوڑی دیر کے لئے ذرا عقل کو درست کر کے دیکھو خود تمہارے اندر دمبدم خزاں و بہار موجود ہے)

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ لوگ طائف جاتے ہیں کہ وہاں ذرا سبزی اور سردی ہے مگر طائف میں کیا رکھا ہے ذرا قلب سے زمہریر کی طرف توجہ کرو سردی معلوم ہونے لگے گی لو طائف آگیا۔ ذرا قلب سے حرارت کا تصور کرو گرمی

معلوم ہونے لگے گی اور یہ کلام حضرت کا تنزل کے طور پر تھا کہ اگر کسی کو ایسا ہی سردی گرمی کا شوق ہو تو جب چیزیں اس کے اندر موجود ہیں۔ ورنہ کیا رکھا ہے زمہریر کے تصورین جتنی دیر زمہریر کا تصور کیا جائے محبوب کا تصور کیوں نہ کیا جائے اسی لئے محققین نے تصور شیخ کو بھی منع کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ تصور شیخ میں کیا رکھا ہے ہمہ تن شیخ کے تصور میں مشغول ہونا ان کو غیرت کے خلاف معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایسا تصور حق تعالے کا حق ہے غیر کی طرف کیوں توجہ کی جائے اتنی دیر محبوب ہی کا تصور کیوں نہ کیا جائے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ تصور شیخ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِيْ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ (کیا یہ مورتیں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو) گویا تصور شیخ کو بتوں کے ساتھ تشبیہ دیتے تھے اور وجہ اس کی یہ تھی کہ اول تو عوام اس میں حد سے بڑھنے لگے تھے وہ شیخ کو حاضر و ناظر سمجھنے لگے تھے جو کہ عقیدہ شرک ہے۔ دوسرے بالکل مشابہ مورت پرستی کے ہے اس لئے آپ نے اس کو بتوں کے ساتھ تشبیہ دی۔ بس محققین کا مسلک یہ ہے کہ از خود تکلف کے ساتھ شیخ کا تصور کرنا نہ چاہیئے۔ البتہ شیخ کے ساتھ محبت و عشق کامل ہونا چاہیئے۔ جب محبت ہوگی تو بلا تکلف خود بخود اس کا خیال دل پر جم جائے گا تو جس طرح محبوب کا حال خود بخود بارہا دل میں آتا ہے اسی طرح شیخ کا خیال دل میں آنے لگے گا۔ یہ حالت اگر نصیب ہو جائے تو یہ مفتاح طریق ہے کیونکہ مربی کی محبت سے جلدی کامیابی ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی کو خود بخود یہ حالت پیدا نہ ہو تو کوشش کر کے اس کا پیدا کرنا اور تکلف کے ساتھ تصور جمانا کچھ ضرور نہیں البتہ بعض دفعہ مگر بہت کم اس کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے جبکہ مرید کی طبیعت پلید ہے کہ اس کو ترقی نہ ہوتی ہو خیالات پریشان رہتے ہوں یکسوئی حاصل نہ ہوتی ہو تو اس کے لئے یکسوئی پیدا کرنے کے لئے تصور شیخ کی تعلیم کی جاتی ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ مبتدی کو ابتداء میں حق تعالیٰ کا تصور آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ان کو دیکھا نہیں ہے اور شیخ کو چونکہ دیکھا ہے اور اس کے ساتھ محبت بھی ہے اس کا

تصور آسانی سے جم جاتا ہے اور اس سے یکسوئی جلدی نصیب ہوجاتی ہے پھر جب یکسوئی قلب کو حاصل ہوجائے گی اس کے بعد پھر اس کا امالہ تصور حق کی طرف آسان ہوگا۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ یہ حالت ہوجائے گی۔

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود ہی نہیں ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

پس اصل مقصود تو یہی ہے کہ تصور حق میں یکسوئی حاصل ہوجائے اس کے لئے بعض اوقات تصور شیخ کو آلہ بنایا جاتا ہے ورنہ غیر کی طرف توجہ کرنا خود کوئی مقصود نہیں نہ اس پر مقصود موقوف ہے اگر کوئی شخص عمر بھر بھی تصور شیخ نہ کرے اس کو ذرا بھی نقصان نہ ہوگا بلکہ بعض طبائع کو اس سے نقصان ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے تصور شیخ کی مگر بعد میں لوگوں نے اس میں بہت غلو کردیا کہ اس کو مقصود سمجھنے لگے چنانچہ اب بھی بعض اہل سلسلہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ بدون رابطہ یعنی تصور شیخ کے مقصود حاصل نہیں ہوسکتا بس جو ان کے یہاں پہنچتا ہے اول اس کو رابطہ کی تعلیم ہوتی ہے یہ نہیں دیکھتے کہ اس کو ضرورت بھی ہے یا نہیں فہم سلیم بھی ہے یا نہیں ہر کس و ناکس کو اس کی تعلیم کردیتے ہیں جس سے بعض لوگوں میں گمراہی پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے بعد میں محققین کو پیدا کیا اور ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی محقق ایسا پیدا ہوتا ہے جو طریق کی اصلاح کرتا ہے۔ چنانچہ مولانا رومی نے اپنے زمانہ میں طریق کی بہت اصلاح کی اور میں تحدثاً بنعمۃ اللہ (اللہ تعالیٰ کی نعمت بیان کرنے کے طور پر) کہتا ہوں کہ اس اخیر زمانہ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں مجدد تھے ہم لوگ ان کے دیکھنے والے تھے اس لئے یہ جو کچھ علوم ہم بیان کرتے ہیں سب حاجی صاحب کا صدقہ ہے یہ بھی حاجی صاحب ہی کے علوم کی برکت ہے کہ ہم ان چیزوں کو کچھ نہیں سمجھتے ورنہ اور لوگ تو اس کو کمالات میں شمار کرتے ہیں۔ حاجی صاحب کی تحقیق ہے کہ تصور

شیخ اور وحدۃ الوجود کا شغل آجکل اکثر طبائع کو مضر ہوتا ہے تصور شیخ میں تو اکثر نا سمجھ اسکو حاضر و ناظر سمجھنے لگتے ہیں اور وحدۃ الوجود کے تصور میں جب اس کا انکشاف ہوتا ہے کہ تمام خیر و شر اور مصیبت اور راحت حق تعالیٰ کی طرف سے ہے حقیقت میں وجود ایک ہی ہے دوسری چیزوں کا وجود محض مضمحل اور فانی ہے تو جب اسباب ظاہری سے نظر اٹھ جاتی ہے اور ہر چیز میں بلاواسطہ حق تعالیٰ کا فعل نظر آتا ہے تو اگر حق تعالیٰ کی محبت کم ہو چنانچہ اکثر قلوب میں کم ہے تو اس سے حق تعالیٰ کی جانب سے ناگوار واقعات میں انقباض پیدا ہو جاتا ہے اور یہ حالت سخت مضر ہے اس لئے حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ محققان حال نے وحدۃ الوجود کے شغل کو منع فرمادیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ حاجی صاحب اس فن کے امام تھے ہر چیز کی حقیقت خوب سمجھتے تھے اور اس زمانہ کے قلوب کی کیفیت کا حال اچھی طرح جانتے تھے اس لئے ان چیزوں کو چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ یہ تو محض وسائل ہیں مقصود نہیں اگر ایک وسیلہ مضر ہونے لگے اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے الغرض ان صوفی صاحب نے فرمایا کہ یہ سبزہ اور بہار درحقیقت آثار رحمت نہیں ہیں بلکہ آثار الآثار ہیں حقیقی آثار رحمت قلب کے اندر ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

رو بر سلطان و کار و بار بیں　　　　حسن تجری تحتہا الانہار بیں

یعنی اپنے اندر نظر کرو باغ اور نہریں نظر آئیں گی اور فرماتے ہیں ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو)

موسیٰ و فرعون در ہستی تست

یعنی جیسے ظاہر میں ایک موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مقابلہ تھا اسی طرح تمہارے باطن میں بھی ایک موسیٰ (یعنی روح) اور ایک فرعون (یعنی نفس) موجود ہے اور ان دونوں میں جنگ رہتی ہے ان کا تماشا دیکھو۔ صاحبو! تم بھی اس مضمون سے کام لو، دنیا بھر کی لڑائیوں کو کیا دیکھتے ہو ذرا اپنے اندر بھی نظر کرو دیکھو کتنا قتال عظیم ہو رہا ہے نفس چاہتا ہے کہ روح کو مغلوب کردے۔

اس مضمون میں ہمارے حاجی صاحب کا بھی ایک رسالہ ہے جس کا نام جہاد اکبر ہے کمال کر دیا ہے آپ نے باطن میں ایک جنگ قائم کی ہے روح اور نفس کو دو بادشاہ مانا ہے اور ہر ایک کے لئے ایک ایک وزیر اور لشکر تیار کیا ہے یہ رسالہ نظم میں ہے۔ مگر بہت ہی عجیب ہے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض شاعری مضمون ہے کسی شاعر کی کیا طاقت ہے کہ ایسے مضامین سوچ بھی سکے۔ نہیں اس کا مضمون بالکل سچا مضمون ہے اس سے کام لو۔ پھر اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ جب آپ کو اپنے اندر ایک معرکہ عظیم نظر آئیگا تو دنیا کی لڑائیوں اور بیماریوں کے قصوں میں آپ نہ پڑیں گے آپ کو خود اپنی ہی بیماری سے فرصت نہ ہوگی نفس اور روح کی جنگ میں وہ لطف آئے گا کہ روم و روس کی جنگی کہانیوں میں بھی نہ آیا تھا۔ غرض اس میں کیا فائدہ کہ یہاں بیماری ہے یا وہاں بیماری ہے آج کتنے مرے کل کتنے مرے بلکہ ان خبروں کی وحشت سے تو بعض آدمی بیمار ہو گئے تو ان باتوں سے کچھ نفع نہیں بلکہ دوسرے معنی کر یہ لوگ چھری مار ہیں کہ ان خبروں سے لوگوں کو پریشان کرتے ہیں حتیٰ کہ بہت سے انہی خبروں سے بیمار بھی ہو جاتے ہیں اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ بیماری شہر میں ہو اور اس کا تذکرہ نہ ہو، نہ مرنے والوں کا حال معلوم کیا جائے۔ یہ تو اس وقت ہو سکتا ہے جب ان واقعات کا نہ خوف ہو نہ غم حالانکہ یہ امور طبعی ہیں پھر جس چیز کا خوف ہوگا اس کا تذکرہ بھی ضرور ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ کو ایک دوسرا خوف اور غم ایسا ہے جس کی آپ کو ہوا بھی نہیں لگی ان کے دل پر ہر وقت آرے چلتے رہتے ہیں جن کی آپ کو خبر بھی نہیں پھر ان کو اتنی مہلت کہاں جو وہ ان باتوں میں پڑیں ان کو اس غم سے فرصت ہو تو یہ غم لے کر بیٹھیں ؎

اے ترا خارے بپا نہ شکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں کو تو کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا و مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

اور اگر آپ کو وہ غم نصیب ہو جائے تو واللہ سارے قصوں سے چھوٹ جاؤ وہ غم کیا ہے۔

فراق محبوب یعنی حق تعالیٰ کی جدائی یہ وہ غم ہے جس نے ان کو موت کا مشتاق بنا دیا ہے۔ پھر ان کو بیماری یا موت سے خوف یا غم کیوں ہوگا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں رہ کر حق تعالیٰ کا دیدار نصیب نہیں ہوسکتا۔ اس عالم میں وہ حق تعالیٰ کو بے حجاب نہیں دیکھ سکتے اس حجاب کا ان کو وہ صدمہ ہے جس کے سامنے تمام تکالیف ہیچ ہیں اب آپ سمجھے ہوں گے کہ وہ کس قدر رنج و غم میں مبتلا ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بے فکر ہیں مگر ان کے دل کا حال معلوم ہو تب پتہ لگے کہ بے فکر کون ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من　　　　می نہ گنجم با صنم در پیرہن

(کہا کہ کھول کر اور کھلم کھلا بیان کر وہ میں محبوب کے ساتھ پیرہن نہیں سما سکتا)

انسان جب تک اس ہیکل ہیولانی میں ہے حجاب میں ہے غرض یہاں حجاب نہیں ہوسکتا اور وہ جو کہا جاتا ہے ؎

بے حجابانہ درآ از درِ کاشانۂ ما
کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما

(بے دھڑک اندر آجا میرے اس کاشانہ (دل) میں تیرے سوا کوئی موجود نہیں ہے)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل بے حجاب ہوکر یہاں دیدارِ حق کی تمنا کرتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لاکھوں حجابات میں سے کسی قدر حجابات کم ہونے کی وہ تمنا کرتے ہیں ورنہ یہاں بالکل بے حجاب ہونا دشوار ہے اس کی تائید جبرئیل علیہ السلام کے واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک بار جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان سے ایک مسئلہ کی تحقیق فرمائی وہ واپس ہوگئے کہ حضرت حق سے تحقیق کرکے بیان کروں گا دوبارہ آئے تو بہت خوش تھے کہ آج مجھ کو حق تعالیٰ سے جس قدر قرب عطا ہوا کہ اتنا قرب کبھی نصیب نہ ہوا تھا، آج صرف ستر ہزار پردے باقی رہ گئے لیجئے ستر ہزار پردے باقی رہ جانے پر وہ خوش تھے کہ بہت قرب نصیب ہوگیا بس اسی کو اس شعر میں کہا ہے ؎

بے حجابانہ درآ از درِ کاشانۂ ما

(ہمارے کاشانہ (دل) بے دھڑک آجا)

یعنی تمنا یہ کرتے ہیں کہ کسی قدر حجابات کم ہو جائیں یہ مقصود نہیں کہ اس عالم میں بالکل بے حجاب ہونا ممکن ہے بالکل بے حجاب دیدار تو آخرت ہی میں نصیب ہوگا تو اہل اللہ اور عشاق موت سے نہیں ڈرتے وہ تو اس کے مشتاق اور متمنی ہوتے ہیں اور موت کی تمنا اشتیاق لقاء اللہ میں جائز ہے بلکہ عین ولایت ہے پھر وہ بے فکر کیونکر ہو سکتے ہیں ان کو تو وہ فکر ہے جس نے موت جیسی چیز کو جس کو آپ تلخ زہر سمجھتے ہیں ان کے لئے خوشگوار بنا دیا ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم | راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے | تا در میکدہ شاداں وغزلخواں بروم

(وہ دن مبارک ہے جس روز میں اس دنیائے فانی سے کوچ کروں راحت جان طلب کروں محبوب حقیقی کی طرف جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش وخرم اور شعر پڑھتا ہوا جاؤں)

دیکھیے غم حجابات کے ختم ہونے کے لئے وہ نذریں مانتے ہیں کہتے ہیں کہ اگر کسی دن یہ غم ختم ہو تو میں نذر کرتا ہوں کہ دربار محبوب کی طرف خوش وخرم غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا چنانچہ ایک بزرگ نے مرتے ہوئے وصیت بھی کی ہے کہ ہمارے جنازہ کے ساتھ یہ شعر پڑھتے ہوئے چلیں ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو | شیئا للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما | آفریں بر دست و بربازوئے تو

(آپ کے دربار میں مفلس ہو کر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقہ میں کچھ عنایت کیجئے ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھائیے آپ کے دست و بازو پر آفریں ہے)

وہ قبر کی طرف کیا جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی عید میں جا رہا ہو۔ گویا موت کیا آئی تمنائے دلی پوری ہو گئی جیسے ساری عمر اسی کے اشتیاق میں بیٹھے تھے۔ صاحبو! یہ مستیاں اہل اللہ ہی کو سوجھ سکتی ہیں اگر آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ موت آسان ہو جائے اور اس سے وحشت نہ رہے اس کا اشتیاق ہو جائے تو خدا کی محبت اور اطاعت حاصل کیجئے بھلا کسی مجرم کو یہ مستیاں سوجھ سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں!

ان کو لقاء اللہ کا اشتیاق ہوتا ہے اس لئے ان کو موت خوشگوار ہو گئی تو بدون محبت واطاعت کے یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی اکثر طبائع پر تو موت کا خوف ہی غالب ہے اس سے طبعاً وحشت ہوتی ہے اور اس طبعی وحشت میں کوئی گناہ بھی نہیں مگر اس کی ضرور کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ طبعی وحشت موت کے وقت نہ رہے اس وقت اشتیاق کی کیفیت غالب ہو جائے اس وقت اگر شوق غالب ہا تو موت کی ذرا بھی تکلیف نہ ہوگی غرض اہل اللہ بے فکر نہیں ہیں ان کے دلوں پر فکر و غم کا ایک پہاڑ ہے جس نے ان کو تمام افکار سے جدا کر دیا ہے اور دوسرے تعلقات سے گھبراتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں

خود چہ جائے جنگ و جدل نیک و بد ؎

کایں دلم از صلحہا ہم می رمد

(جنگ و جدل اچھا برا تو کیا میرا دل تو صلح سے بھی گھبراتا ہے)

یعنی عداوت اور دشمنی اختلاف سے تو ہر شخص گھبراتا ہی ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ میرا دل تو صلح سے بھی گھبراتا ہے یعنی اس سے بھی وحشت ہوتی ہے کہ ہمارے احباب اتنے ہیں وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ بس دنیا میں اس طرح بسر کر جائیں کہ نہ کوئی ان کو ان کو جانتا ہو نہ پوچھتا ہو ایک گوشہ میں پڑ کر محبوب کے خیال میں ختم ہو جائیں۔ یہاں اس سے بھی طبیعت گھبراتی ہے کہ فلاں آپ کا معتقد ہے لوگ اس کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ معتقدوں کی جماعت بڑھے اور بعض لوگ فخر کیا کرتے ہیں کہ ہمارے اتنے مرید ہیں۔ بعض جگہ مریدوں کی فہرست اور رجسٹر بنے ہوئے ہیں جس میں سب کے نام لکھے جاتے ہیں مگر یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کے دل میں حضرت حق کی طلب اور اس کی دھن نہیں ہے ورنہ ان جھگڑوں سے وحشت ہوتی۔ ہمارے ایک دوست ہیں عالم ہیں مگر یکمن علم را دہ من عقل باید (ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہیئے) انہوں نے ایک خط میں کچھ بے عنوانی کی تھی میں نے اس پر دارو گیر کی تو آپ دوسرے خط میں اپنا اعتقاد و محبت جتانے بیٹھے کہ ہم تو آپ کے

معتقد ہیں آپ سے محبت رکھتے ہیں محبین و معتقدین کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہونا چاہیے میں نے ان کو لکھدیا کہ اگر آپ کو محبت و اعتقاد اپنی کسی مصلحت سے ہے تو پھر مجھ پر کیا احسان اور اس کے جتلانے کی کیا ضرورت تھی مصلحت تو اپنی اور اپنا فائدہ بدنظر اور دباؤ ڈالا جائے میرے اوپر اور اگر میری مصلحت کے واسطے اعتقاد و محبت پیدا کی ہے تو چھوڑ دو کیونکہ میری اس میں کوئی مصلحت نہیں بلکہ مجھے تو اور اس سے وحشت ہوتی ہے۔ اس پر ان کا دوسرا خط معافی کا آیا۔ اس پر میں نے ایک چرکہ یہ لگا دیا کہ ان کو لکھا کہ معاف تو کر دیا مگر دل میں دکھن باقی ہے اس کو میں اپنے اختیار سے دور نہیں کر سکتا کچھ دنوں تہذیب سیکھو جب تمہاری تہذیب سے دل کو خوشی اور راحت پہونچے گی اس وقت یہ دکھن خود بخود جاتی رہے گی۔ باقی جتنا میرے اختیار میں ہے میں نے پہلے ہی معاف کر دیا تھا میں دل میں کسی کی بات نہیں رکھتا اور دل میں وہ رکھے جو زبان سے نہ کہے میں تو زبان سے بہت کچھ کہہ لیتا ہوں دل میں کچھ نہیں رکھتا ؎

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

(ہمارے طریق میں کسی سے کینہ رکھنا کفر ہے سینہ کو آئینہ کی طرح حسد و کینہ سے صاف رکھنا ہمارا دستور ہے۔)

تو واللہ ہم تو ان قصوں سے گھبراتے ہیں کیسا اعتقاد کیسی محبت حق تعالیٰ نے پردہ پوشی کر رکھی ہے کہ لوگوں کو ہمارے عیوب نظر نہیں آتے جو محبت و اعتقاد رکھتے ہیں اگر اصلی حالت دیکھ لیں تو ہزار کوس دور بھاگیں۔ اس لئے بس جی یہ چاہتا ہے کہ سب سے الگ ہو کر حق تعالیٰ کے ساتھ لو لگائی جائے اور سب جھگڑوں کو حذف کیا جائے۔

ایک مرتبہ کانپور میں ایک قصہ ہوا کہ ابتدا ابتدا میں قانون طاعون کا جاری ہوا اس وقت چند آدمی میرے پاس جمع ہو کر آتے اور کہا کہ اس کے متعلق ہم جلسہ کرنیوالے ہیں تم بھی چلو میں نے انکار کیا کہ ہم طالب علموں کو جلسہ سے کیا تعلق لوگوں نے زیادہ اصرار کیا میں نے کہا اچھا ذرا ٹھہر جاؤ میں حضرت حافظ کا دیوان کھولتا ہوں دیکھئے وہ کیا فرماتے

ہیں بسم اللہ کہکر جو دیوان کھولا تو سرورق پر یہ شعر نکلا ؎

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

(حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے شور و شغب مت کر سلطنت کے اسرار کو بادشاہی جانتے ہیں)
میں نے کہا لو بھائی یہ تو یوں کہتے ہیں کہ شور نہ مچاؤ گوشہ میں بیٹھے رہو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ عجب مضمون مناسب وقت نکلا۔ میں نے کہا کہ صاحبو! میں تو ان قصوں سے پہلے ہی گھبراتا ہوں۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ آپ لوگ بھی اس قصہ میں نہ پڑیں بلکہ اس مصیبت کی تدبیر دوسری کریں ابن ابی الدنیا نے روایت کی ہے کہ بادشاہوں کو بُرا مت کہو فَاَنَا مَالِكُ الْمُلُوْكِ وَبِيَدِيْ قُلُوْبُهُمْ (میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں ان کے دل میرے قبضہ میں ہیں) اوکما قال۔ بادشاہوں کے دل خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے راضی کرو میں سب کو ٹھیک کر دوں گا سب سے بڑے بادشاہ وہ ہیں ان چھوٹے بادشاہوں کے پیچھے کیوں پڑتے ہو یہ سب اس کے مقرر کئے ہوئے ہیں، ہم نے خدا کو ناراض کر رکھا ہے تو اس نے بادشاہوں کے دل بدل دیئے اس کو راضی کر لو وہ ان کے دل کو درست کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کارخانہ ظاہری کو ایک باطنی کارخانہ کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک مرتبہ انتظام خراب ہو گیا تھا لوگوں نے حضرت سے اس کی وجہ دریافت کی آپ نے فرمایا کہ آجکل صاحب خدمت ایسے ہی ایک حضرت ہیں جو بالکل ڈھیلے ہیں اور جن کے یہاں کچھ ڈھنگ نہیں لوگوں نے پوچھا وہ کون ہیں فرمایا کہ ایک کنجڑا ہے جو جامع مسجد کے نیچے بیٹھتا ہے۔ ایک شخص ان کا امتحان کرنے گئے وہ خربوزے بیچ رہے تھے، انہوں نے بھاؤ کیا اور کہا کہ کاٹ کر چکھ کر لیں گے بولے بہت اچھا۔ انہوں نے قصداً سب خربوزے کاٹ ڈالے اور چکھ چکھ کر کہدیا سب خراب ہیں ہم نہیں لیتے کہنے لگے بہت اچھا۔ یہ منظر دیکھ کر چلے آئے پھر ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ انتظام بہت عمدہ ہو گیا تمام عملہ ٹھیک چل رہا تھا۔ ہر شخص

ڈرتا تھا کہ کام میں خرابی نہ آنے پائے سب لوگ ٹھیک ٹھیک خدمتیں انجام دیتے تھے۔
پھر اس شخص نے حضرت شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ آجکل تو انتظام بہت عمدہ ہے آپ نے فرمایا کہ جی ہاں آجکل صاحب خدمت دوسرے مقرر ہوئے ہیں وہ بڑے تیز اور منتظم ہیں دریافت کرنے پر فرمایا کہ ایک سقہ ہے چاندنی چوک میں پانی پلاتا پھرتا ہے۔ وہ صاحب اُن کا بھی امتحان کرنے چلے شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک دمڑی ساتھ لیجانا ایک دمڑی کا پیالہ دیتے ہیں۔ یہ دمڑی لے کر گئے دیکھا کہ کٹورا بجاتے ہوئے سبیل سبیل پکار رہے ہیں یہ بھی پہونچے اور ایک پیالہ پانی کا مانگا انہوں نے پوچھا کہ دمڑی بھی ساتھ لایا ہے انہوں نے دمڑی پیش کردی انہوں نے ایک پیالہ دیدیا، اس نے پانی پھینک دیا کہ یہ تو خراب تھا۔ ایک پیالہ اور دو، انہوں نے کہا کہ دمڑی اور ہے کہا نہیں انہوں نے ایک طمانچہ رسید کیا کہ کنجڑا سمجھا ہوگا جا ایک دمڑی اور لا تب پیالہ ملے گا۔ یہ بڑے گھبرائے کہ واقعی ابھی حضرت نے سارے عملے کو بیچار کھلا ہے تو صاحبو احکام کے دل اہل خدمت کے تابع ہوتے ہیں، یہ ظاہری حکام بھی درست ہو سکتے ہیں جب وہ ان کی درستی کی طرف متوجہ ہوں اور وہ بالکل مثل سکہ کے مشیت الٰہی کے تابع ہیں بس خدا کو خوش کرلو وہ اصحاب خدمت کو متوجہ فرما دے گا پھر یہ سارا ظاہری عملہ درست ہو جائیگا۔
تو میں نے ان لوگوں سے کہا کہ توبہ و استغفار کرو اور ہر روز پانچسو مرتبہ کم از کم لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کا وظیفہ مقرر کرلو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک ہفتہ میں سب مصیبت دور ہو جائے گی۔ یہ میں نے کوئی کشف سے نہیں کہا تھا بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ كَنْزٌ مِّنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ وَهُوَ دَوَاءٌ لِّسَبْعِيْنَ دَاءً اَيْسَرُهَا الْهَمُّ کہ یہ جنت کا ایک خزانہ ہے اور ستر بلاؤں کی دوا ہے جن میں سے ادنیٰ فکر و غم ہے (رواہ فی الحصن جامع ۱۲)

اس بھروسہ پر میں نے کہہ دیا ہے اور عدد کی تعیین اتفاق سے میرے منہ سے نکل گئی ان لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور عمل شروع کیا واقعی ایک ہفتہ گذرنے نہ پایا تھا کہ وہ حکم منسوخ ہوگیا اور امن چین ہوگئی پھر ان لوگوں کو اس عمل سے

ایسا اعتقاد ہوا کہ کانپور کی جامع مسجد میں اب تک نماز عصر کے بعد اس کا ورد چلا جا رہا ہے۔ غرض مصائب سے نجات چاہتے ہو تو ایک ذات سے تعلق پیدا کرو وہ کون ہے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند وخم طرۂ یارے گیرند

(سارے جہان کی مصلحتوں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں)

یعنی حق تعالیٰ شانہٗ سے تعلق پیدا کرو اُس کے سوا سب سے نظر قطع کرو کیونکہ راحت و کلفت سب اسی کے ہاتھ میں ہے اس کو راضی کرو ان شاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرما دینگے۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ ہاں وہ کون ہے جو کہ مضطر کی دعا قبول کرتا ہے اور مصیبت کو

سلہ جامع عرض کرتا ہے کہ اس وقت جو مسلمانوں کو مصائب پیش آرہے ہیں جن کے دفع کرنے کے لئے بہت لوگ خلافت کی حمایت میں سرگرم ہیں ان کو چاہیئے کہ سب سے پہلے خدا کو راضی کرنے کی فکر کریں پھر اور کوئی تدبیر کریں بدون خدا کو راضی کئے اور اس کے ساتھ تعلق پیدا کئے کامیابی دشوار ہے مگر افسوس اب بھی مسلمانوں کو ہوش نہیں آیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ گناہوں ہی کی وجہ سے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا ہے تو اس کا علاج خدا کی اطاعت سے کرنا چاہیئے وہ اب بھی ایسی تدابیر کر رہے ہیں جو خدا کی ناراضی کا پہلے سے زیادہ سبب ہو رہی ہیں۔ ہندوؤں کے جوش اتحاد میں مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں پر قشقے لگانے شروع کر دیئے جو کہ سراسر کفر ہے قربانی گاؤ کو جو کہ شعار اسلامی ہے بند کرنا چاہتے ہیں، ہندوؤں کی دوستی میں ان پر آیات و احادیث کو نثار کرتے ہیں افسوس جس بات کی وجہ سے یہ مصائب پیش آرہے ہیں اسی کو کامیابی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ یعنی خدا کی نافرمانی سے یہ بلائیں آئی ہیں تو نافرمانی ہی کے ذریعہ سے ان کو دفع کرنا چاہتے ہیں۔ ایں خیال است و محال است و جنوں (یہ خیال محال ہے اور جنون ہے)

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

(مجھے خوف ہے اے اعرابی کہ تو کعبہ نہ پہونچے گا جو راستہ تو نے اختیار کیا وہ ترکستان کا ہے)

(ظفر احمد عفا اللہ عنہ)

دور کرتا ہے اور تم کو زمین میں یکے بعد دیگرے قائم مقام بناتا ہے (وہ صرف خدائے عز و جل ہے) کیا (اب بھی) خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (ہرگز نہیں مگر پھر جو بعض لوگ خدا کی طرف نہیں جھکتے اس کا یہ سبب نہیں کہ وہ اس مضمون کو جانتے نہیں بلکہ (وہ لوگ (محض کورانہ تقلید سے) خدا کے ساتھ دوسروں کو برابر کرتے ہیں، صاحبو! خدا کے ساتھ تعلق ہو جائے تو اول تو مصیبت آوے ہی گی نہیں اور اگر آوے گی تو وہ مصیبت مصیبت نہ رہے گی حتیٰ کہ جس موت سے آپ کو اب وحشت ہے اس وقت اس سے محبت ہو جائے گی اور معلوم ہو جاوے گا کہ موت وحشت کی چیز نہیں پھر وحشت ایک تو موت سے ہوتی ہے خیر یہ تو کسی قدر ظاہراً معقول بھی ہے کہ مرنے والا تمتعات سے محروم ہو جاوے گا۔ دوسرے اس سے وحشت ہوتا کہ ایک دم سے بہت سے آدمی مرجاویں گے یہ تو بڑی ہی بیوقوفی کی بات ہے کیونکہ ایک مرنے والے پر دوسروں کے مرنے کا کیا اثر ہوگا۔ غرض اول تو خود موت ہی کوئی بری چیز نہیں خدا کے وصال کا ذریعہ ہے اس کے بغیر خدا سے ملنا نصیب نہیں ہو سکتا۔ پس حیرت ہے کہ ایک شخص کو فراق کی مصیبت سے چھوٹ کر وصال حبیب سے مشرف ہوتا ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ یہ ہمارے ہی پاس رہتا اسی رنج فراق میں گرفتار رہتا جس میں تم گرفتار ہو۔ سچ ہے اگر سلاست فہم نہ ہو تو یہی ہوتا ہے کہ جب قید خانہ میں سے کسی قیدی کو رہائی ہوتی ہے تو دوسرے قیدیوں کو رنج ہوا کرتا ہے کہ یہ کیوں چھوٹ گیا۔ یہ بھی ہماری طرح یہیں رہتا۔ گنجا یہ چاہتا ہے کہ سارا جہان گنجا ہو جائے مگر کوئی اس چھوٹنے والے کے دل سے پوچھے واللہ جو لوگ مر گئے ہیں ان کو دوبارہ اگر دنیا میں جانے کو کہا جاوے تو وہ کبھی اس کو منظور نہ کریں جیسا کہ قیدی چھوٹ جانے کے بعد پھر قید خانہ میں جانا خوشی کے ساتھ کبھی نہیں چاہا کرتا۔ دوسرے یہ کہ جب ان کو مرنا ہی ہے تو اکٹھے مرے تو کیا منفرق مرے تو کیا بلکہ یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ بہت سے ساتھ مل کر جاویں۔ مرگ انبوہ جشنے دارد (گروہ کا مرنا جشن رکھتا ہے) یہ تو حدیث میں بھی آیا ہے کہ مرنے کے بعد روحیں آپس میں جمع ہوتی ہیں تو اچھا ہے کہ یہیں سے سب مل کر جائیں لوگ سمجھتے ہیں کہ مردہ یہاں سے جا کر

قبر میں اکیلا گھبراتا ہوگا۔ تو صاحبو! یہ قبر تو لغوی قبر ہے ورنہ حقیقی قبر تو عجیب چیز ہے یعنی عالم برزخ وہ اتنا تنگ اور چھوٹا نہیں وہ خود ایک مستقل عالم ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی مرتا ہے اور اس کی روح آسمان پر جاتی ہے تو اس سے ملنے کو اس کے اعزا و اقربا دوست احباب کی روحیں آتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں اور دنیا کی باتیں پوچھتی ہیں کہ فلاں شخص کس حال میں ہے وہ کیسا ہے، پھر ایک کہتا ہے کہ بس ابھی اس کو زیادہ بات چیت میں نہ لگاؤ یہ تھکا ہوا آیا ہے ذرا راحت لینے دو، غرض وہاں وحشت نہیں نہ وہاں تنہائی ہے گو لوگ اس کو وحشت کدہ گمان کرتے ہیں مگر خلاف گمان وہ ایسا نہیں جیسے مولانا آگ کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اندر آ اسرار ابراہیم بیں
کو در آتش یافت درد و یاسمیں

(تو بھی اندر چلی آ اور دیکھ تو یہ آگ نہیں گلزار ابراہیمی ہے تو اس میں
گلاب اور چنبیلی پائے گی)

یہ ایک قصہ میں مولانا فرما رہے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ایک کافر بادشاہ نے بہت سی آگ جلا کر مسلمانوں کو مجبور کیا کہ بت کو سجدہ کریں ورنہ آگ میں ڈال دیئے جائیں گے چنانچہ انہیں مسلمانوں میں ایک عورت بھی تھی جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا اس کو بت کے آگے سجدہ کرنے کے لئے کہا گیا اور انکار کرنے پر ظالموں نے اس کی گود میں سے بچہ کو چھین کر آگ میں ڈال دیا اس وقت قریب تھا کہ اس کی ماں کا قدم لڑکھڑا جائے کہ حق تعالیٰ نے اس کی امداد کی اور بچہ کو گویائی دی اس نے اپنی ماں کو پکارا کہ ؎

اندر آ اسرار ابراہیم بیں کو در آتش یافت درد و یاسمیں
(تو اندر آ اور گلزار ابراہیمی دیکھ کہ آگ میں گلاب و چنبیلی پائے گی)

یعنی اندر آ کر دیکھ یہ آگ نہیں ہے گلزار ہے۔ اسی طرح عالم برزخ بہت دلچسپی کا مقام ہے۔

؎ روبرو سلطان و کاروبار بیں حسن تجری تحتہا الانہار بیں
(جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں)

یعنی بادشاہ کے پاس جا کر کاروبار دیکھو۔ تجری تحتہا الانہار کا حسن دیکھو۔

خواہرانت ساکن چرخ سنی
تو برادارے چہ سلطانی کنی

تو موت سے وحشت اس واسطے ہے کہ لوگوں نے اس گڑھے کو قبر سمجھ لیا ہے وہ عالم برزخ کے عجائبات سے ناواقف ہیں۔ شوق وطن میرا ایک رسالہ ہے اس کو دیکھو موت کا شوق ہوجائے گا۔ بیماری اور مصائب کے وقت اس رسالہ سے بہت سکون ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس کی کوشش نہیں کرتا کہ ایک دن میں یہ کیفیت پیدا ہوجائے اور نہ یہ ایک دن میں پیدا ہوسکتی ہے ؎

صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامی
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرلے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

پختہ ہونے کے لئے تو بہت خاک چھاننی پڑتی ہے میرا مقصود اس وقت یہ ہے کہ آپ اس کیفیت کے حاصل کرنے کی کوشش کریں جس دن یہ کیفیت نصیب ہوجائیگی آپ کی زندگی اور موت (دونوں پُرلطف ہوجاویں گی) واللہ ثم واللہ ثم باللہ یہ سب باتیں بنائی ہوئی نہیں ہیں یہ سب حقائق ہیں لیکن اگر عنین مادرزاد کو جماع کی لذت نہ آوے تو کیا سارے ہی نامرد ہوجاویں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ اُسی کو کہا جاوے گا کہ قوت مردانگی سے محروم ہے سارا جہان نامرد نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر آپ کو یہ حقائق نہ معلوم ہوں تو کیا یہ ساری باتیں بنی ہوئی ہوجاویں گی۔ اگر آپ بے خبر ہوں تو کیا خبر کہنے والے بھی ان حقائق کو نہ کہیں وہ بھی اپنی آنکھیں پھوڑ لیں اہل اللہ کے سامنے عوام کی وہی حالت ہے جو عنین کی مرد کے سامنے ہوتی ہے۔ اگر نامرد کسی مرد کے سامنے لذت جماع کا انکار کرنے لگے تو اس کو جوش نہ آئے گا، بُرا نہ مانے گا بلکہ اس کے حال پر اُسے ترس آئے گا کہ یہ غریب اس لذت سے کیسا بے خبر ہے۔ اسی طرح اہل اللہ کے علوم کو اگر کوئی ناسمجھ

بنی ہوئی باتیں کہنے لگے تو اس سے وہ برا نہیں مانتے۔ ان کی مثال تو کیمیا گر جیسی ہے اگر تمام دنیا کیمیا گر سے کہنے لگے کہ تجھے خاک نہیں آتا، تو کچھ نہیں جانتا یہ کیمیا کی باتیں ہی باتیں ہیں تو وہ اس سے برا نہیں مانے گا بلکہ یہی کہے گا کہ تم مجھے ایسا ہی سمجھتے رہو تم خود ہی محروم رہو گے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

یا مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد از رنج خود پرستی

فرماتے ہیں کہ مدعی سے اسرار عشق بیان نہ کرو اس کو خود رائی اور خود پرستی ہی کے رنج میں رہنے دو، آنکھوں پر پردہ پڑا ہے اس لئے یہ حقائق نظر نہیں آتیں لیکن اگر یہ باتیں محض بنائی ہوئی ہیں تو پھر اہل اللہ کے کلام میں اثر اور درد کہاں سے آگیا۔ جھوٹی باتوں میں بھی کہیں اثر ہوا کرتا ہے آخر کوئی تو بات ہے جس نے اہل اللہ کو تمام لذات و شہوات سے الگ کر دیا کہ جن چیزوں کے لئے عام لوگ مرتے کھپتے ہیں وہ ان سے بالکل بیزار اور مستغنی ہیں۔ نہ ان کو طلب مال کی ہے نہ لباس کی فکر ہے نہ عزت و جاہ کی خواہش ہے، آخر کوئی چیز تو ان کے پاس ہے جس کی لذت میں وہ ان چیزوں کو چھوڑ کر الگ ہو گئے کوئی تو آگ ان کے سینے میں ہے جو پاس بیٹھنے والوں کو بھی بے قرار کر دیتی ہے۔ یہ خود اس کی دلیل ہے کہ ان کے یقیناً وہ حقائق ہیں جن کی مخلوق کو خبر نہیں، اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر نہ بودے نالہ نے را اثر
نے جہاں را پُر نہ کردے از شکر

(اگر نالہ نے میں اثر نہ ہوتا تو نے جہاں کو شکر سے نہ بھرتا)

عارفین کے یہ علوم قرآن و حدیث میں موجود ہیں مگر کوئی سمجھنے والا بھی ہو نمونہ کے طور پر سنئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ کہ ہر چیز حق تعالیٰ

کی تسبیح و حمد کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ لوگ قرآن و حدیث کو سمجھے نہیں بس تاویل کرنے لگے کہ مراد تسبیح حالی ہے۔ عارفین کہتے ہیں کہ یہ حقیقت پر محمول ہے کیونکہ وہ کھلی آنکھوں ہر چیز کو تسبیح کرتے دیکھتے ہیں اور کانوں سے ان کی تسبیح سنتے ہیں لیکن اہلِ ظاہر کی آنکھیں چونکہ بند ہیں وہ اس میں تاویل کرنے لگے۔ مولانا اس کی شکایت کرتے ہیں ؎

بر ہوا تاویل قرآں می کنی
پست و کج شد از تو معنی سنی

(ہوا پر قرآن میں تاویل کرتے ہو جس سے اس کے روشن معنی پست و کج ہو جاتے ہیں)

چوں نہ دارد جاں تو قندیل ہا	بہر بینش می کنی تاویل ہا
کردہ تاویل لفظ بکر را	خویش را تاویل کن نے ذکر را

(یعنی تمہارے اندر قرآن سمجھنے کا فہم ہی نہیں اس لئے تاویلات کرتے ہو قرآن کے سمجھنے کا فہم پیدا کرو اور تاویلات کو چھوڑو)

عارفین اپنی رائے سے تاویل نہیں کرتے وہ قرآن و حدیث کی تمام باتوں کو حقیقی سمجھتے ہیں ان کا تو یہ مذہب ہے ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے و فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں ہے اس طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

اگر آنکھیں ہوں تو سارا جہاں ذکر اللہ سے پُر نظر آتا ہے پس اگر آپ بھی ان حقائق کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اہل اللہ کا دامن پکڑ لیجیے وہ بخیل نہیں ہیں البتہ مستغنی ضرور ہیں جو ان سے اعراض کرتا ہے وہ ہزار بار اُس سے اعراض کرتے ہیں اور جو اُن کی طرف آتا ہے وہ اس کے نفس سے زیادہ اس پر شفیق ہیں بشرطیکہ طلب صادق ہو کیونکہ بدون سچی طلب کے کامیابی مشکل ہے دوا وہیں اثر کرتی ہے جہاں بیماری ہو، پانی وہیں جاتا ہے جہاں پستی ہو اونچے پہاڑ پر پانی نہیں چڑھا کرتا ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود	ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود　　ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

ریانی وہیں جاتا ہے جہاں پستی ہو جواب اسی جگہ دیا جاتا ہے جہاں اشکال پیش آئے۔ دوا اسی جگہ اثر کرتی ہے جہاں بیماری ہو شفا وہیں پہونچتی جہاں تکلیف ہو) تو پہلے طلب کا درد اپنے اندر پیدا کیجئے۔ اس کے بعد اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیجئے اور خود رائی اور خود بینی کو طاق پر رکھئے جس طرح وہ چلائیں اس طرح چلئے اپنی عقل کو دخل نہ دیجئے محض عقل سے مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے فلاسفہ یونان کیسے کیسے عقلاء تھے مگر مقصود تک نہ پہونچ سکے ہزاروں ٹھوکریں کھائیں عقل نے ان کو مقصود سے بہت ہی دور ڈال دیا اس طریق میں صرف عقل سے کام نہیں چلتا حال کی بھی ضرورت ہے۔ جب حال نہ ہو تو تنہا عقل سے قساوت بڑھ جاتی ہے دل کا قفل نہیں کھل سکتا۔ فلاسفہ یونان کو عقل ہی کا ہیضہ ہو گیا تھا اسی لئے ان میں سے بعضوں نے انبیا کو بھی پایا مگر اتباع نہ کیا یہ کہدیا کہ بیشک یہ نبی ہیں مگر جاہلوں کے واسطے ہیں ہم عقلاء ہیں ہم کو نبی کی ضرورت نہیں تو بات کیا تھی کہ ان میں حال نہ تھا اگر حال ہوتا تو مقصود کا پتہ چل جاتا اور سمجھ جاتے کہ اس مقصود کو ہم اپنی عقل سے نہیں پا سکتے اس کے لئے کسی مقبول بندہ کی دستگیری بھی شرط ہے پھر انبیا کی حقانیت اور مقبولیت دیکھ کر ضرور ان کا اتباع کرتے مگر ان کے دل میں محبت کی آگ نہ تھی عشق کا حال غالب نہ تھا اس لئے وصال محبوب کی خواہش نہ ہوئی ورنہ ایسا کہیں ہو سکتا ہے کہ محبوب کے وصال کی طلب ہو اور ایک پہونچانے والا سامنے ہو اور وہ خود بلا رہا ہو کہ آؤ میں تم کو محبوب سے ملا دوں اور پھر بھی عاشق کو اس کی رہبری کی اتباع سے انکار رہو ہاں عشق ہی نہ ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔ غرض بدون طلب کے کام نہیں چل سکتا ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(راہ سلوک میں فہم و خاطر کا تیز کرنا مقصود نہیں شکستگی اور خاکساری کی ضرورت ہے۔

بغیر شکستہ دلی کے فضل الٰہی نہیں ہوتا)
اور شکستگی عشق و طلب ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے اگر شکستگی پیدا ہو جائے تو مطلوب بہت نزدیک ہے۔ حدیث میں ہے اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ کہ میں دل شکستہ لوگوں کے پاس ہوں۔ اس لئے اگر وصال محبوب کی تمنا ہے تو اول یہ شکستگی پیدا کیجئے پھر کسی کے ہاتھ میں اپنے آپ کو سپرد کر دیجئے بتلایئے آخر صحابہ کس چیز سے راہ پر لگے ہیں اسی سپرد کر دینے سے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں اپنے کو سپرد کر دیا تھا اسی سے ان کا کام بن گیا علم عقل سے ان کا کام نہیں بنتا چنانچہ بعض متاخرین فقہ وغیرہ میں صحابہ سے بہت آگے ہیں مگر کیا وہ اس سے صحابہ پر فوق ہو گئے ہرگز نہیں صحابہ میں ایک ایسی بات ہے جو کسی امتی کو نصیب نہیں وہ یہ کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں اپنے آپکو سپرد کر دیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے وہ وہاں پہونچے جہاں ہزار برس کے مجاہدوں سے بھی کوئی نہیں پہونچ سکتا اور سپردگی بھی ایسی کامل تھی کہ ایک بار ابی بن کعب رضی اللہ تعالٰے عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارا وہ نماز پڑھ رہے تھے اس لئے نہ بولے نماز سے فارغ ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا عذر بیان کیا کہ میں نماز میں تھا آپؐ نے فرمایا اَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالٰى اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ کیا تم نے حق تعالٰی کا ارشاد نہیں سنا کہ جب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو پکاریں فوراً جواب دو تو صحابہؓ کے ذمہ نماز میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینا ضروری تھا۔ آگے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینے سے نماز فاسد ہو جاتی تھی یا نہیں، بعضوں نے کہا ہے کہ فاسد نہ ہوتی تھی۔ خیر نماز کا جو بھی حکم ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دینا نماز میں بھی ان کے ذمہ فرض تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے لئے اس میں تفصیل ہے کہ فرض نماز کا توڑنا تو کسی حال میں جائز نہیں بجز اس صورت کے کہ کسی مسلمان پر جان کا خطرہ ہو تو لازم ہے کہ نماز توڑ کر اس کی امداد کرے یا اپنا نقصان ایک درہم سے زیادہ کا ہوتا ہو تو جب بھی نماز توڑ دینا

جائز ہے، باقی اگر جان کا خطرہ نہ ہو تو فرض نماز نہ توڑے۔ رہی نفل نماز تو اس کا توڑنا غیر والدین کے لئے تو جائز نہیں اور والدین کے لئے اس وقت جائز ہے کہ ان کو یہ معلوم نہ ہو کہ نماز پڑھ رہا ہے اور اگر یہ معلوم ہوگیا پھر بھی پکاریں تو نماز توڑنا جائز نہیں کیونکہ اب وہ پکارنے والا خود گنہگار ہے اس کی بات نہ مانی جائے گی۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے بیان کر دی کہ بعض لوگ پیروں کے پکارنے پر اب بھی نماز کا توڑنا مطلقاً جائز سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے پیر کا درجہ شرعاً باپ سے زیادہ نہیں، غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے کو کسی عارف محقق کے ہاتھ میں سپرد کرو اور اپنی رائے اور عقل کو بالائے طاق رکھو اور اس سے مت ڈرو کہ وہ بڑے بڑے مجاہدے کرائیں گے کیونکہ محقق ہر شخص کے مناسب دستور العمل تجویز کرتا ہے سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکتا، جو لوگ ضعیف ہیں مجاہدات کے متحمل نہیں ہیں ان کی پرورش جمال سے کرتے ہیں کہ خوب کھاؤ خوب پیو، اچھا پہنو راتوں کو سوؤ اور مختصر کام بتلا دیتے ہیں جس کا وہ تحمل کر سکیں اور کسی کی تربیت جلال سے کرتے ہیں کہ تمام شہوات و لذات جو ضروریات سے زیادہ ہوں چھوڑ دیتے حضرت عارف شیرازیؒ ان مشائخ کی شکایت کرتے ہیں جو ضعفاء کے حال پر رحم نہیں کھاتے ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود
گر تو بیداد کنی شرط مروت نہ بود

(کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو اگر قوت سے زیادہ کام تو ظلم ہے مروت کے خلاف ہے)

یعنی مروت اور شفقت سے یہ بات دور ہے کہ ضعیف و ناتواں لوگ جن میں طلب ہے اور قوت نہیں ان کو بھی تم محنت و مشقت کے طریق سے پرورش کرو۔ مولانا فرماتے ہیں

چار پا را قدر طاقت بار نہ — بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ
طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر — طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

(چوپاؤں پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہ رکھو، کمزوروں سے ہمت سے زیادہ کام نہ لو

شیرخوار بچہ کو بجائے دودھ کے روٹی دو تو بیچارہ بچہ اس روٹی سے مرجائے گا۔)

ظاہر ہے کہ شیرخوار بچہ کو اگر دودھ کے بجائے روٹی کھلانے لگو تو چار دن میں اس کا خاتمہ ہے. آج ضعیف کو اگر وہ کام بتلا دیا جائے جو اقویا کے مناسب ہے تو دو چار دن میں تمام ہو جائے گا پس اہل اللہ ہر شخص سے اس کے مناسب معاملہ کرتے ہیں ضعیف کے حال پر وہ بہت شفقت کرتے ہیں، ہاں مگر حرمزدگی کے وہ ساتھی نہیں کہ ایک شخص اچھا خاصہ ہو اور پھر کم ہمت بن جائے تو اس کے لئے وہ سخت بھی بہت ہیں۔ پس اگر اہل اللہ پر اعتماد ہے تو ان کو اپنے سے زیادہ واقف طریق اور خیرخواہ سمجھ کر ان کے قدموں سے لگ جاؤ، ہاں اگر ان کی تشخیص پر اعتماد نہ ہو تو چھوڑ دو مگر جب ایک بار کسی کو محقق سمجھ کر اپنے اوپر اختیار دیدیا تو پھر اس کی رائے میں دخل نہ دو کہ یہ خود رائی سدراہ ہے. اس طریق میں اعتماد بہت ضروری ہے بلکہ اسی طریق میں کیا ہر علم میں اعتماد کے بغیر کام نہیں چل سکتا پھر اس تفویض میں آپ ہی کا نفع ہے کیونکہ اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر دینے سے بڑی راحت ہوتی ہے اور دوسرے کو پوری توجہ ہوتی ہے۔ اور بدون تفویض کے نہ اپنے آپ کو جمعیت نصیب ہوتی ہے نہ دوسرے کو توجہ ہوتی ہے غرض جب آپ صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی طرح اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دیں گے اس وقت معلوم ہوگا کہ یہ باتیں بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ حقائق ہیں پھر آپ کو موت سے وحشت نہ ہوگی بلکہ اس کا اشتیاق پیدا ہو جائے گا اور یہی حسن خاتمہ کی دلیل ہے کہ خدا سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو جائے گا۔

عارفین کی موت کے قصے سن کر معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ان لوگوں کی موت پر ہزار زندگی قربان ہے۔

ایک مرتبہ شیخ نجم الدین کبریٰ کے سامنے کسی نے ایک غزل گائی جس کے ایک شعر کے آخیر میں یہ تھا۔

جاں بدہ وجاں بدہ وجاں بدہ (جان دے جان دے جان دے)

آپ کے اوپر کیفیت شوق کا غلبہ ہوا فرمایا کہ محبوب جان مانگ رہا ہے اور کوئی اپنی جان نہیں دیتا اس کے بعد فرمایا کہ

جاں دادم وجاں دادم جاں دادم (میں نے جان دی میں نے جان دی میں نے جان دی)

پس یہ کہہ کر ختم ہو گئے۔

ایک اور صوفی کا قصہ ہے کہ وہ حج کو جا رہے تھے شوق میں ناچتے کودتے اشعار پڑھتے جاتے تھے کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس درجہ کا عاشق ہے لوگ اُن کو معمولی آدمی بلکہ مسخرہ سمجھتے تھے مگر جس وقت مکہ کرمہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ پر نظر پڑی ہے اور مطوف نے کہا کہ یہی بیت اللہ ہے بس ان پر ایک حالت طاری ہو گئی اور بے ساختہ زبان سے نکلا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر
کہ مبادہ بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(جب محبوب کے کوچہ پہونچ جاؤ تو جان مضطر کو فدا کردو شاید پھر اس تمنا کے حصول کا موقع نہ ملے)

پھر گرتے ہی جان دیدی۔ صاحبو! کیا ایسی موت تمنا کے قابل نہیں کیا اس کے لئے کوشش نہ ہونی چاہیئے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ صاحب یہ تو حکایات ہی حکایات ہیں پہلے زمانہ میں موت کا ایسا اشتیاق ہوتا ہوگا آج کل ایسا نہیں ہو سکتا تو میں کہتا ہوں کہ نہیں صاحب اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور نہ ہونے کی کیا وجہ جس طریقہ سے ان کو یہ حالت نصیب ہوتی تھی وہی طریقہ اب بھی اگر اختیار کیا جائے تو یہ حالت پیدا ہو جائے گی اور وہ طریقہ کیا ہے کثرت ذکر اور کثرت طاعت اور اجتناب معصیت بس ان تین چیز دل کو اختیار کر لیجئے۔ ان شاء اللہ موت کا اشتیاق اور خدا سے ملنے کی تمنا پیدا ہو جائے گی۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایسے نمونے دکھلا دوں تو لیجئے میں بتلاتا ہوں کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ ہمارے مدرسہ میں دو شخصوں کا انتقال ہوا جو کہ ذاکر و شاغل تھے، ایک بوڑھے تھے ایک جوان تھے۔ بوڑھے کا قصہ تو یہ ہوا

کہ وہ رات کو حسب معمول تہجد کے لئے اٹھے اور مٹی کا لوٹہ تیمم یا وضو کے لئے لینا چاہتے ہوں گے پس لوٹے پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے اسی طرح ختم ہو گئے۔ دوسرے صاحب کا یہ قصہ ہوا کہ ان کو بخار میں سرسام ہو گیا تھا کیونکہ جوان آدمی تھے حرارت غالب تھی اور سرسام میں عقل نہیں رہا کرتی مگر ذکر اثر دیکھئے کہ موت کیسی اچھی ہوئی رات کو وہ بھی خود ہی اکیلے ختم ہو گئے کسی کو خبر نہیں ہوئی جب صبح کے قریب ان کو دیکھا گیا تو ہاتھ پر تسبیح لپیٹے ہوئے مراقبہ کی شکل میں گردن جھکائے بیٹھے ہیں لوگ سمجھے کہ زندہ ہیں مگر وہ کہاں تھے، نہ معلوم کب کے ختم ہو چکے تھے تو دیکھئے یہ ثمرہ ہے ذکر کا جو دنیا ہی میں نصیب ہوتا ہے کہ موت کے وقت خدا کا اشتیاق ہو جاتا ہے اس کی یاد کو جی چاہتا ہے آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو اخیر وقت میں بھی جس میں انسان بالکل عاجز اور کمزور ہو جاتا ہے تسبیح اٹھانے اور مراقبہ کرنے کی ہمت دیدی اور دوسرے صاحب کو اخیر وقت تک تہجد کا خیال رہا اس کے لئے اپنی ہمت کے موافق کوشش بھی کی اور نماز ہی کے اہتمام میں ختم ہو گئے وہ محض اشتیاق لقاء اللہ کی کیفیت تھی جو اخیر وقت میں ان پر غالب ہو گئی تھی، لیجئے اب تو میں نے بالکل پتہ بتلا دیا اب تو آنکھیں کھولو اور اس حالت کے حاصل کرنے کی کوشش کرو، سچ بات یہ ہے کہ ایسی موت قابل رشک ہے اس پر ہزار زندگی قربان ہے۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(جس شخص کو عشق حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہو گئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کے کہ لذت قرب کامل درجہ کی حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہیئے۔)

جس کا دل عشق سے زندہ ہو وہ مرا نہیں کرتا جریدہ عالم پر ہمارا دوام لکھا ہوا ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کا مرنا صرف ظاہری ہے حقیقت میں ان کو بہت اعلیٰ درجہ کی

حیات نصیب ہوگئی اور اسی حیات کا ایک اثر یہ ہے کہ اہل اللہ کا تذکرہ بعد موت کے بھی باقی رہتا ہے ورنہ ہزاروں مرتے ہیں کوئی چند دن کے بعد نام بھی نہیں لیتا اور یہ حیات برزخیہ اگرچہ ہر شخص کو مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے مگر اہل اللہ کی حیات دوسروں کی حیات سے قوی ہوتی ہے اسی کو فرماتے ہیں "ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما" (جریدہ عالم پر ہمارا دوام ثابت ہے) اور اس میں ایک راز ہے اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ کی صفات ہمیشہ باقی رہتی ہیں اور یہ حضرات مظہر صفات الٰہی ہیں اس لئے ان کو بھی کسی قدر دوام و بقاء سے حصہ ملتا ہے اور حق تعالیٰ کی صفات پر مجھے ایک بات یاد آئی جو بہت ہی کام کی بات ہے۔ ایک علم عظیم ہے جو حق تعالیٰ نے آج عطا فرمایا ہے اس کی قدر وہ جانے جس پر گذرتی ہے۔ مجھ سے اگر پوچھئے تو لاکھوں کی بات ہے وہ یہ کہ بعض سالکوں کو یہ بات پیش آتی ہے کہ ان میں تاثر کم ہوتا ہے نہ خوف نہ غلبہ شوق نہ زیادہ غلبہ محبت بس ان کی طبیعت خالی خالی معلوم ہوتی ہے اور بعضوں پر احوال و مواجید کا بہت غلبہ ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رقت اور خوف طاری ہوجاتا ہے، گریہ غالب ہوجاتا ہے کبھی شوق و محبت میں سکر کی سی کیفیت رہتی ہے تو جن سالکوں پر ان احوال کا غلبہ نہیں ہوتا وہ پریشان رہتے ہیں کہ ہم کو ذکر سے کچھ فائدہ نہیں ہوا لیجئے آج میں اس کی حقیقت بتلاتا ہوں اور وہ علم ایک نیک بی بی کے خط کے آنے سے حاصل ہوا۔

انہوں نے لکھا ہے کہ یہاں موت کثرت سے ہورہی ہے جس سے یہ تمام آپ کاموں کو طبیعت چاہتی ہیں، مگر مجھے خوف نہیں معلوم ہوتا نہ کچھ رقت طاری ہوتی ہے یہ حالت کیسی ہے۔ ان کو تو میں نے یہی لکھدیا کہ حالات مقصود نہیں ہیں بلکہ اعمال مقصود ہیں اگر اعمال میں کوتاہی نہ ہو تو ان حالات کے ہونے یا نہ ہونے کی کچھ بھی پروا نہ کرنی چاہیئے۔ مگر اس کی حقیقت جو اسی وقت میرے دل پر منکشف ہوئی وہ ان کو نہیں لکھی کیونکہ وہ بات ان کی فہم سے زیادہ تھی۔ اور اس حقیقت کے سمجھنے سے پہلے دو مقدمے سمجھ لیجئے ایک یہ کہ تمام سلوک کا

مقصود حضرت حق میں فنا ہے یعنی اپنی صفات کو صفات حق میں فنا کر دینا اور متخلق باخلاق اللہ ہونا یہ مقصود ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حضرت حق میں جو صفات ہیں ان سے مراد غایات ہیں مبادی نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہماری صفات کے دو درجے ہیں ایک مبدا ایک منتہا۔ مبدا انفعال ہوتا ہے مثلاً ہمارے اندر رحمت وشفقت کا مادہ ہے تو اس کا ایک مبدا ہے ایک منتہا ہے۔ مبدا یہ کہ کسی کی حالت اور مصیبت کو دیکھ کر دل دکھتا ہے دل پر اثر ہوتا ہے یہ انفعال ہے اور منتہا یہ کہ ہے کہ دل دکھنے کے بعد ہم نے اس شخص کے ساتھ ہمدردی کی اس کی اعانت کی یہ فعل ہے، اور یہی مقصود بھی ہے صفت رحمت سے۔ اسی طرح حیا اور علم و رغبت وغیرہ تو حق تعالیٰ چونکہ انفعال اور تاثر سے پاک ہیں اس لئے ان کو جو رحمن الرحیم عفو غفور وغیرہ کہا جاتا ہے تو ان کی صفات میں صرف غایات مراد ہیں مبادی مراد نہیں ایک مقدمہ یہ ہوا۔ اب سمجھئے کہ خوف اور محبت وغیرہ جو صفات ہیں ان کے اندر بھی دو درجے ہیں ایک مبدا منتہا مبدا وہی تاثر اور انفعال ہے کہ خدا کی عظمت وجلال کے خیال سے دل پر اثر ہوا رقت طاری ہوئی اور منتہا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے رک گئے یہ فعل ہے محبت کا مبدا یہ ہے کہ دل میں عشق کی دھن پیدا ہو اور محبوب کے خیال میں محو ہو جائے یہ انفعال ہے اور منتہا یہ ہے کہ محبوب کی رضا جوئی اور خوشنودی کی طلب میں لگ جائے تو جس شخص کے اوپر خوف اور محبت کی کیفیت غالب نہ ہو مگر استقامت حاصل ہو کہ معاصی سے پوری طرح بچنے والا اور طاعات کا بجا لانے والا ہو اس میں صفات کے مبادی نہیں پائے گئے بلکہ صرف غایات پائے گئے تو یہ شخص اصل متخلق باخلاق اللہ ہے اور جس پر ان کیفیات کا غلبہ ہو اس میں اول مبادی پائے گئے پھر غایات پائے گئے تو یہ شخص اس درجہ کا متخلق باخلاق اللہ نہیں ہے۔ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد سالکین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جن احوال وکیفیات کے فقدان سے وہ پریشان ہوتے ہیں ان کا فقدان کوئی نقص نہیں بلکہ کمال یہی ہے کہ بدون غلبہ

احوال کے استقامت حاصل ہو جو کہ مقصود ہے اس لئے اب ان چیزوں کی خواہش اور تمنا میں نہ پڑنا چاہیئے بلکہ جس حال میں محبوب نے رکھا ہے اسی میں خوش رہنا چاہیئے اس میں حق تعالے کی حکمت ہے کہ کسی کو غلبۂ احوال عطا فرمایا اور کسی کو بدون اس کے ہی استقامت عطا فرما دی، کسی پر خوف کا غلبہ ہے وہ رو رہا ہے، کسی پر رجا کا غلبہ ہے وہ ہنس رہا ہے کسی پر طرب اور شوق کا غلبہ ہے وہ بے چین ہے اور کسی پر کوئی حال غالب نہیں وہ سادگی کے ساتھ اعمال مقصودہ میں لگا ہوا ہے۔ یہ سب خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں ایک کو دوسرے کے حال کی طلب نہ کرنا چاہیئے

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(گل سے کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہو رہا ہے اور بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ نالاں ہے)

اگر حق تعالےٰ نے صاحب اضطراب بنایا ہے تو سکون کے طالب نہ بنو اور صاحب سکون بنایا ہے تو اضطراب کے طالب نہ بنو اب جو لوگ کام کرتے ہیں اُن سے پوچھو کہ یہ علم کس قدر عظیم ہے اس سے اُن کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی اور پریشانی اور غم کا پہاڑ دل سے ہٹ گیا ہوگا کیونکہ سالکین کو ذرا ذرا سی بات سے رنج و غم ہونے لگتا ہے اگر کچھ بھی شبہ اس کا ہو جائے کہ ان کی محبت میں یا طلب میں کمی ہے تو بس ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغ دل خلالے کم بود

(عارف کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکہ بھی کم ہو جاتا ہے)

یہ علوم اور حقائق وہ چیزیں ہیں کہ سالکین ان کے سامنے ہفت اقلیم کی بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اب میں غور کرتا ہوں اگر میرے پاس ہزار گاؤں ہوتے تب بھی جو مسرت اس وقت مجھ کو اس علم کے حاصل ہونے سے ہوئی

میں سچ کہتا ہوں کہ ہزار گناؤں کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ اگر کسی پر خوف و شوق کا غلبہ نہ ہو مگر استقامت اعمال نصیب ہوگئی ہے اس کو بے فکر رہنا چاہیئے مگر سامان کرنے کے بعد کیونکہ اگر اعمال کے اہتمام کا سامان نہ کیا تو پھر استقامت فوت ہوجائے گی۔ مثلاً ایک شخص کی یہ کیفیت ہے کہ اس کی آنکھ تہجد کے وقت بلا ناغہ کھل جاتی ہے اس کے دل میں کیفیت شوقیہ ایسی ہے کہ وقت پر مجبوراً اٹھا کر بٹھا دیتی ہے اور دوسرے شخص پر یہ کیفیت غالب نہیں مگر وہ ہر روز تہجد کا سامان کر کے لیٹتا ہے لوٹا و جا نماز پاس رکھ لیتا ہے، شام کو کھانا بھی کم کھاتا ہے تاکہ اٹھنے میں اعانت ہو، عشا کے بعد فوراً ہی سو بھی رہتا ہے، اذکار ادعیہ پڑھ کر سوتا ہے اگر اس کی نماز تہجد کی کسی دن قضا بھی ہوجائے تو یہ استقامت کے خلاف نہیں اور نہ یہ شخص پہلے شخص سے کچھ ثواب میں کم ہے کیونکہ ہمیشہ بلا ناغہ اٹھنا اس کے اختیار سے نہیں ایک۔ کیفیت شوقیہ اس پر مسلط ہے۔ وہ اٹھا دیتی ہے۔ اور یہ شخص کیفیت سے خالی ہے مگر جتنا سامان کرنا اس کے قبضہ میں تھا وہ سب کر لیتا ہے پھر بھی اگر کسی دن تہجد اس کا ناغہ ہوجاوے تو یہ اس کے اختیار سے باہر ہے امید یہ ہے کہ اس کو اس دن بھی تہجد کا ثواب ملے گا اور کبھی کبھی تہجد کا ناغہ ہوجانا بشرطیکہ سامان اٹھنے کا ہمیشہ کرتا ہو استقامت کے منافی نہیں بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر ایک شخص جاگنے کا سامان کر کے سوجائے یا اس کی فرض نماز بھی قضا ہوجائے تب بھی اس پر ملامت نہیں نہ یہ بات استقامت کے خلاف ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون صاحب استقامت ہوگا لیلۃ التعریس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فجر کی نماز قضا ہوگئی تھی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار آپ رات کو چل رہا تھا اور گرمیوں کے موسم میں اہل عرب اکثر رات کو سفر کرتے ہیں، اخیر شب میں آپ منزل پر پہنچے اور اس وقت تک صبح ہونے میں ذرا دیر تھی۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص ایسا ہے جو صبح کی نماز کے لئے ہم کو

جگادے اور ہم سورہیں۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالٰے عنہ نے وعدہ کیا آپ جاگنے کا پورا سامان کرکے بے فکر سورہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالٰے عنہ اپنے کجاوہ سے پشت لگاکر مشرق کی طرف منہ کرکے بیٹھے رہے کہ صبح ہوتے ہی اذان دوں گا کہ حق تعالٰے نے ان پر بھی نیند غالب کردی وہ بھی بیٹھے بیٹھے ہی سوگئے۔ یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا اور کوئی نہ جاگا۔

سب سے پہلے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی آپؐ نے سب کو جگایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو صبح کی نماز قضا ہونے کا قلق ہوا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قلق نہیں ہوا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جتنا کام ہمارے قبضہ کا تھا وہ ہم کرچکے تھے کہ ایک معتبر شخص کو جگانے کے لئے مقرر کردیا اس پر بھی اگر نماز قضا ہوگئی اور اتفاق سے وہ شخص بھی سوگیا تو یہ محض تقدیری امر ہے، اب اس پر قلق کرنا مشیت الٰہی کا مقابلہ کرنا ہے، ہاں اگر طبعی قلق ہے تو مضائقہ نہیں تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ فرماکر تسلّی کی لَا تَفْرِیْطَ فِی النَّوْمِ اِنَّمَا التَّفْرِیْطُ فِی الْیَقْظَۃِ کہ نیند میں اگر کچھ کوتاہی ہوجائے وہ کچھ کوتاہی نہیں، کوتاہی وہی ہے جوکہ بیداری میں ہو اور یہ نماز تمہاری بیداری میں قضا نہیں ہوئی سوتے ہوئے ہیں قضا ہوئی اس پر کوئی ملامت نہیں کیونکہ سونے کی حالت میں انسان بے اختیار ہوجاتا ہے البتہ سونے سے پہلے جاگنے کا سامان اپنی وسعت کے موافق کرنا ضرور تھا سو وہ تم کرچکے تھے سامان کرنے کے بعد بھی جب نماز قضا ہوگئی تو اس پر قلق کی ضرورت نہیں یہ تقدیری امر تھا۔

شاید کسی کو شبہ ہو کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نیند تو اونگھ کے مشابہ تھی آپ کو گہری نیند نہ آتی تھی حتّٰی کہ آپ کا وضو بھی سونے سے نہ ٹوٹتا تھا کیونکہ آپ کی آنکھیں سوتی تھیں اور دل جاگتا تھا، تو پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نماز کیسے قضا ہوگئی۔

جواب یہ ہے کہ ممکن ہے اس روز حق تعالےٰ نے قضا نماز کے احکام مشروع فرمانے کے لئے آپؐ کے اوپر کوئی کیفیت استغراقیہ غالب فرمادی ہو کر مشاہدۂ جمال حق میں وقت کی خبر نہ ہوئی اور آپؐ کی نماز قضا ہو جانے میں بہت سی حکمتیں تھیں۔ ایک تو یہی حکمت ہوئی کہ آپ نے قضا نماز کے احکام مقرر فرمادیئے دوسرے بعد والوں کو تسلی ہو گئی کہ اگر کسی کو اتفاقی طور پر امت میں ایسی صورت پیش آجائے تو وہ غم سے ہلاک نہ ہو جائیں، اس واقعہ سے ان کو تسلی ہو جاوےگی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسا اتفاق پیش آیا ہے۔

غرض اس طریق میں ناامیدی اور مایوسی کا نام نہیں۔ قدم قدم پر تسلی موجود ہے۔ اور مولانا تو دل کھول کر فرماتے ہیں ؎

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست
سوئے تاریکی مرد خورشیدہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالےٰ سے ناامید مت ہو بہت سی امیدیں رکھو)

بار جہل کا کچھ علاج نہیں کہ کوئی خواہ مخواہ اس غم میں پڑے کہ ہائے میرے اندر خوف کا غلبہ نہیں، شوق اور اضطراب نہیں۔ بس مقصود یہ ہے کہ اعمال میں مشغول ہونا چاہیئے ان میں کمی نہ کرو پھر اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ رونا آتا ہے یا نہیں، خوف کا غلبہ ہے یا نہیں۔ بس کام میں لگو اور زیادہ کاوش مت کرو۔ اب لوگ یہ تو کرتے نہیں فضول کاوشیں کرتے ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اور پریشانی بڑھتی ہے

اب میں اصل اشکال کے جواب کی طرف عود کرتا ہوں۔ اشکال یہ تھا کہ گناہ نہ کرنے والوں کو بھی بلاء اور مصیبت پیش آتی ہے اور آیت مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (جو کچھ تم کو مصیبت پہونچتی ہے تمہارے گناہوں سے پہونچتی ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت گناہوں سے آتی ہے۔ اس کا ایک جواب تو میرے پہلے بیان سے معلوم ہو چکا کہ گناہ سب کرتے

ہیں جن کو تم بے گناہ سمجھتے ہو ان سے بھی ان کے درجہ کے موافق گناہ ہوتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جو گناہ بھی نہیں کرتے وہ مداہنت کرتے ہیں کہ دوسروں کو گناہ کرتے دیکھتے ہیں اور ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے اگر ان سے اور کوئی گناہ نہیں ہوا تو مداہنت بھی ایک گناہ ہے جس میں نیک لوگ اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں الا ماشاء اللہ نصیحت اور صاف گوئی کا مادہ آجکل نیک لوگوں میں بھی بہت کم ہو گیا ہے، اور جو ایسے بھی نہ ہوں تو ان کے لئے تیسرا جواب یہ ہے کہ وہ مَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ میں داخل ہی نہیں ہیں جس کو آپ مصیبت سمجھتے ہیں، وہ اس کو مصیبت ہی نہیں سمجھتے اس میں ان کو وہ لذت آتی ہے کہ انہی کا دل جانتا ہے بس ان کیلئے صورت مصیبت ہوتی ہے حقیقت مصیبت نہیں ہوتی کیونکہ مصیبت کی حقیقت یہ ہے کہ دل میں الجھن اور پریشانی ہو اور ایسے لوگوں کو تکلیف میں بھی سکون و اطمینان اور روحانی لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر محبوب چٹکی لے تو عاشق کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے وہ تو اس کی چٹکی کی لذت میں ایسا مست ہوگا کہ یوں چاہے گا یہ بار بار چٹکی لئے جائے تو اہل اللہ کو دیکھ لو کہ ان کو مصائب میں ذرا بھی پریشانی نہیں ہوتی وہ تو زبانِ حال سے کہتے ہیں۔

درد از یارست و درماں نیز ہم
دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(بیماری بھی دوست کی طرف سے اور اس کا علاج بھی اسی کی طرف سے ہے دل و جان میری اس پر فدا ہے)

پس اس آیت کے مخاطب گنہگار لوگ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جہاں مصیبت ہے وہاں گناہوں کی وجہ سے ہے اور جہاں گناہ نہیں وہاں مصیبت بھی نہیں گو ظاہر میں دیکھنے والوں کو مصیبت نظر آوے مگر خود اس شخص کو وہ نعمت اور لذت معلوم ہوگی اس اعتراض کا جواب تو بخوبی ہو گیا اور یہ دوسرا مضمون تھا۔ اب ایک اور اعتراض کا جواب دینا چاہتا ہوں اور وہ تیسرا مضمون ہے اور یہ

اعتراض بلفظ ہر سخت ہے وہ یہ کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ بیماری و مصیبت گناہوں سے آتی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر مسلمانوں میں بیماری زیادہ کیوں ہے کیونکہ سنا جاتا ہے کہ اس سال مسلمانوں میں بیماری زیادہ ہے ہندوؤں میں کم ہے۔ ہمیں تو خبر نہیں مگر سُنا ہے ممکن ہے کسی نے شمار کیا ہو کہ مسلمانوں میں زیادہ ہے، اس کا جواب اگرچہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ثبوت بیان کرو اور جس نے شمار کیا ہو اس سے پوچھو کہ کیا تو نے تمام شہروں میں جا کر شمار کیا ہے کہ مسلمان اس بیماری میں زیادہ مرے ہیں مگر ہم ایسا جواب دیتے ہیں جس کے لئے شمار کی ہم کو ضرورت ہی نہیں ہے مگر جواب سے پہلے میں یہ ضرور کہوں گا کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ان کو خدا کے معاملات کی تو کیا خبر ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے معاملات کی بھی خبر نہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک شخص تو وکیل ہے اگر وہ کچہری میں پیشاب کر دے تو سخت معتوب ہوگا کچھ بعید نہیں کہ وکالت سے معزول کر دیا جائے اور ایک عامی شخص ہے وہ اگر پیشاب کر دے تو بہت سے بہت حاکم دو روپیہ جرمانہ کر دے گا مگر وکیل کی برابر معتوب نہ ہوگا آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی فعل وکیل نے بھی کیا اور اجنبی شخص نے بھی کیا مگر وکیل پر اس درجہ عتاب اور اجنبی پر اس کا آدھا بھی نہیں، فرق یہ ہے کہ وہ حاکم کا مقرب اور خاص تھا یہ حرکت اس کی شان سے بہت نازیبا تھی وہ حاکم کے مزاج سے اور قوانین سے بخوبی واقف تھا اور دوسرا ایک اجنبی بیچارہ ناواقف تھا وہ تو رات دن میں اس قسم کی بدتہذیبی دن میں بیسیوں دفعہ کرتا رہتا ہے اور اس پر اتنا عتاب نہیں ہوتا تو اس سے اگر کوئی یہ سمجھنے لگے کہ وکیل بہت بڑا مجرم ہے اور دیہاتی مجرم نہیں تو یہ سراسر حماقت ہے۔ مجرم تو وہ دیہاتی وکیل سے بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کمبخت کو حاکم کی عظمت و وقعت کا حال کچھ معلوم نہیں یہی اس کی بڑی خطا ہے اور اس معرفت و تعظیم کے وصف میں وکیل اس سے افضل ہے مگر خصوصیت کی وجہ سے اس پر عتاب زیادہ ہوا اسی طرح یہاں سمجھئے کہ اگر بیماری اور مصیبت مسلمانوں میں زیادہ بھی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آسکتا کہ مسلمان ان سے زیادہ گنہگار ہیں ہرگز نہیں کفار کا سب سے بڑا جرم ایک یہی ہے کہ ان کو حق تعالیٰ کی عظمت کی خبر نہیں مگر بیماری اور

مصیبت مسلمانوں پر اس لئے زیادہ آئی کہ یہ خدا کے خاص بندے ہیں پھر خاص ہو کر اگر کوئی کام خلاف مرضی کریں گے تو ان پر عتاب زیادہ ہو گا لیکن مسلمانوں کی اس خصوصیت سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان کو یا ان کے بزرگوں کو خدائی کارخانہ میں بھی کچھ تصرف کرنے کا حق ہو گا جیسا کہ دنیاوی حکام کے خاص دوستوں کو ان کے مزاج میں دخل ہوا کرتا ہے کہ وہ حاکم سے بعض دفعہ کہہ سن کر جو چاہے کرا لیتے ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت اور عنایت سب اختیار سے ہے اضطرار سے نہیں ہے اس لئے ان پر کسی کی خصوصیت اور تقرب کا اثر نہیں ہو سکتا کہ وہ جو چاہیں تصرف کرالیں اور دنیوی حکام کو بعض دفعہ اپنے مخصوصین سے اضطراری تعلق ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ مزاج میں دخیل ہو جاتے ہیں پس یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہو گئی جو بعض بزرگوں کو یوں سمجھتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ سے کہکر جو چاہے کرا لیتے ہیں اور معاذ اللہ اولاد یا رزق وغیرہ ان کے اختیار میں ہے یہ بالکل غلط ہے خدا پر کسی کو کچھ اختیار نہیں یہ بھی حق تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ کسی کو اپنا مقرب بنالیں۔ ورنہ اس امر میں بھی کسی کا کچھ زور نہیں۔

انبیاء سے زیادہ کون مقبول و مقرب ہو گا حق تعالیٰ نے بعض دفعہ ان کی بھی دعا قبول نہیں فرمائی۔ ایک جواب اس کا اور بھی ہے کہ کفار کے لئے بہت سخت مصیبت تجویز کی گئی ہے مگر ان کو مہلت دیدی گئی ہے یہاں ان کو راحت و آرام میں چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ اچھی طرح پیٹ بھر کے نافرمانی اور گناہ کرلیں پھر اکٹھی سزا ہو گی مگر مسلمانوں کو مہلت نہ دینا اور کفار کو مہلت دیدینا بھی اس کی دلیل نہیں کہ کفار مسلمانوں سے اچھے ہیں دیکھئے ایک بچہ سے استاد کو محبت ہوتی ہے اس کی ذرا ذرا سی بات پر تنبیہ اور روک ٹوک کرتا رہتا ہے اور جس سے محبت نہیں ہوتی اس کی ہر بات پر روک ٹوک نہیں کرتا غصہ آتا ہے مگر خاموش رہتا ہے کہ کسی دن اکٹھی خبر لے لوں گا۔ اب اگر یہ بے وقوف یوں سمجھے کہ میاں جی فلاں کو تو روز دھمکاتے رہتے ہیں اور میں اتنی خطائیں کرتا ہوں مجھے کچھ نہیں کہتے تو مجھ سے ان کو زیادہ محبت ہے یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ جب یہ اس سے زیادہ جرم

کررہا ہے تو زیادہ مجذوب لیسے ہو سکتا ہے یقیناً اسے کچھ نہ کہنا اس کی دلیل سمجھی جائے گی کہ اس سے میاں جی کو محبت نہیں اس لئے ہر بات پر روک ٹوک نہیں کرتے تاکہ عین وقت پر اس کے جرائم زیادہ ثابت ہوں اور اس کی پوری خبر لیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان کی ایسی مثال ہے جیسے گیہوں وغیرہ کا درخت کہ وہ اول اول کمزور ہوتا ہے پھر بڑھتا ہے تو باریک تنہ پر کھڑا ہو جاتا ہے ہواؤں کے جھونکے سے کبھی گر بھی جاتا ہے پھر سیدھا ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمان پر طرح طرح کے مصائب آتے رہتے ہیں جن سے اس کو تنبیہ ہوتی رہتی ہے تاکہ وہ توبہ واستغفار کرکے پھر سیدھا ہو جائے اور کافر کی مثال درخت صنوبر جیسی ہے کہ وہ جب سے پیدا ہوتا ہے مضبوطی کے ساتھ سیدھا رہتا ہے یہاں تک کہ لمبا ہو جاتا ہے مگر جب کبھی گرتا ہے تو جڑ تک اکھڑ جاتی ہے پھر نہیں اٹھ سکتا اسی طرح کافر کو دنیا میں مصائب کم پیش آتے ہیں اس لئے اس کو توبہ واستغفار کی نوبت نہیں آتی پھر جب آتی ہے تو ایسی آتی ہے کہ اٹھنا نصیب نہیں ہوتا اوندھے منہ جہنم میں پہونچتا ہے۔

اہل سیر نے لکھا ہے کہ فرعون کو چار سو برس کی عمر میں ایک دن درد سر بھی نہیں ہوا ہمیشہ راحت و آرام میں رہا کمبخت کو خدا کی یاد کا ایک دن بھی خیال نہ آیا کیونکہ اکثر خدا کو مصیبت ہی میں یاد کیا جاتا ہے۔ پھر حق تعالےٰ نے اس کو ایک دم سے پکڑا اور تمام قوم کو مع فرعون کے دریا برد کر دیا۔ اس کو فرماتے ہیں :-

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۔ تمہارے پروردگار کی پکڑ جب کہ وہ کافر بستیوں کو پکڑتا ہے ایسے ہی دفعۃً ہوتی ہے بیشک خدا کی پکڑ بہت دردناک اور سخت ہوتی ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ تیرے رب کی پکڑ سخت ہے۔ تو مسلمانوں کے اوپر جو زیادہ مصیبتیں آتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ ان کو دفعۃً پکڑنا نہیں چاہتے، بلکہ منظور یہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں پر بار بار متنبہ ہو کر اپنی اصلاح پوری کرلیں اور کافروں کو ایک دم سے پکڑنا منظور ہے اس لئے ان پر مصائب

کم آتے ہیں ایک راز کفار پر کم مصیبتیں آنے کا یہ بھی ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کفر کی وجہ سے دائمی عذاب جہنم کا تیار ہے تو ان کے واسطے کفر ہی کی سزا اتنی سخت ہے کہ اب ان کی دوسری خطاؤں پر سزا دینے کی ضرورت نہیں دیکھئے ایک شخص سرکاری باغی ہو جس کے لئے پھانسی کا حکم تجویز ہو گیا ہو اور کسی مصلحت سے چند روز کے لئے اس کو قید خانہ میں بھیجدیا جائے اور وہاں جا کر وہ قیدیوں سے لڑے کسی کو گالی دے کسی کو مارے پیٹے تو اس کو جس وقت پھانسی دی جائے گی اس وقت قیدیوں سے لڑنے کی الگ سزا نہ دی جائے گی اور نہ جرم اس پر قائم کیا جائے گا کیونکہ اس کے اوپر بغاوت ہی کا جرم اتنا سنگین قائم ہے کہ اس کی سزا میں جان لی جاوے گی تو اس کے ان چھوٹے چھوٹے جرائم پر نظر نہیں کی جاتی اسی لئے اکثر باغی لوگ قید خانہ میں جا کر بڑے فرعون بے سامان ہو جاتے ہیں اور یہی راز ہے علماء حنفیہ کے اس قول کا کہ کفار مخاطب بالفروع نہیں یعنی کفار کو آخرت میں نماز نہ پڑھنے اور زکوٰۃ نہ دینے اور زنا وغیرہ کرنے کے سبب سے مستقل عذاب نہ ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا ان کے زنا وغیرہ سے راضی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کی ساری خطائیں کفر کے اندر داخل ہیں۔ ایک کفر ہی کا عذاب اتنا سخت ہے کہ اسی میں سب خطاؤں کی سزا ہو جائے گی ان کے عوض میں جداگانہ سزا نہ ہوگی۔

اور مسلمانوں کے لئے چونکہ ایمان کی وجہ سے آخرت میں ہمیشہ کے لئے جنت اور راحت لکھی ہوئی ہے اس لئے دوسرے احکام میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے ان کو دنیا ہی میں سزا دیدی جاتی ہے تاکہ ان سے توبہ کر کے پاک صاف ہو کر جنت میں چلا جاوے اور اگر کسی مسلمان کو باوجود گناہوں کے دنیا میں مصیبت پیش نہ آئے تو یہ حالت اندیشہ ناک ہے اس کے واسطے خوف ہے کہ کچھ عذاب جہنم کا بھی ہو لیجئے اب تو آپ تمنا کرتے ہوں گے کہ جو کچھ سزا ہونی ہو دنیا ہی میں مصیبتیں آجاویں آخرت میں جہنم کا عذاب نہ ہو۔

حدیث میں ہے کہ آخرت میں جب مصیبت والوں کو بڑے بڑے درجے ملیں گے تو اس وقت راحت و آرام والے تمنا کریں گے کاش دنیا میں ہماری کھال قینچیوں سے کاٹی جاتی تاکہ آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے۔ الحمدللہ کہ سب اشکالات کا جواب کافی طور پر ہوگیا اب میں بیان ختم کرنے والا ہوں اور چند باتیں خلاصے کے طور پر بیان کرتا ہوں سارے بیان کا خلاصہ یہ باتیں ہیں۔

نمبر۱ گناہوں کی وجہ سے مصائب آتے ہیں جس کا بیان اس آیت میں کیا گیا ہے مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے تمہارے گناہوں سے آتی ہے) جس سے میں نے بیان شروع کیا تھا۔ نمبر۲ گناہوں کا علاج توبہ و استغفار ہے مگر ہر گناہ کا طریقہ استغفار جدا ہے جو فوت شدہ طاعات ہیں ان کی قضا کریں جیسے کسی کے ذمہ قضا نماز یا قضا روزے ہوں یا پچھلے سالوں کی زکوٰۃ ذمہ ہو ان کو ادا کریں اور جو ذنوب ہیں ان سے خالص توبہ کریں اور آئندہ کے لئے چھوڑ دینے کا پختہ ارادہ کریں اور حقوق العباد اگر ضائع ہوئے ہوں تو ان کو ادا کریں یا اہل حق سے معافی چاہیں اور خدا سے بھی ان کے بار[illegible] سچی توبہ کریں اور یہ پہلا مضمون تھا۔ نمبر۳ گناہوں سے مصیبت آنے پر دو شبہات تھے ان کے جواب دیئے گئے تھے۔ ایک شبہ یہ تھا کہ نیک لوگوں پر کیوں مصائب آتے ہیں اس کے چند جواب دیئے گئے۔ ایک یہ کہ گناہ ان سے بھی ہوتے ہیں، دوسرے اگر گناہ بھی نہ ہوں تو ان سے مداہنت ہو جاتی ہے۔ تیسرے اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر وہ مصیبت ان کے حق میں صورۃً مصیبت ہوتی ہے حقیقت میں مصیبت نہیں ہوتی کیونکہ اس سے ان کو پریشانی لاحق نہیں ہوتی جسم کو گو تکلیف محسوس ہو مگر روح کو لذت اور دل کو سکون ہوتا ہے اور یہ دوسرا مضمون تھا۔ نمبر۴۔ ایک شبہ یہ تھا کہ کفار کو مصیبت کیوں نہیں آتی یا کم کیوں آتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ان کے لئے ایک سخت مصیبت تیار ہے مگر یہاں ان کو مہلت دی گئی ہے اور یہ تیسرا مضمون تھا۔ اب حق تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ مسلمانوں کے اوپر سے سب بلاؤں اور مصیبتوں کو دفع فرمائیں اور ہم کو پچھلے گناہوں سے توبہ و استغفار کی توفیق عطا ہو اور آئندہ کے لئے اتباع احکام اور ترک معاصی کی ہمت نصیب ہو آمین ثم آمین

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تُنْجِیْنَا بِھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَھْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَا بِھَا جَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَھِّرُنَا بِھَا مِنْ جَمِیْعِ السَّیِّاٰتِ وَتَرْفَعُنَا بِھَا عِنْدَکَ اَعْلَی الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِھَا اَقْصَی الْغَایَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ کَمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی رَبُّنَا اٰمِیْن۔

جامع وعظ ہذا احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ یہ وعظ جن ایام میں بیان ہوا تھا اس وقت موسمی بخار بلائے عام کی طرح تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا اور جس ہفتہ میں یہ بیان ہوا اسی ہفتہ میں حضرت حکیم الامۃ دامت برکاتہم کی بھتیجی محترمہ زبیدہ خاتون مرحومہ کا انتقال ہو گیا تھا اس وقت حضرت کے دل پر بھی ایک خاص صدمہ تھا اس لئے سامعین پر بھی اس بیان کا بہت گہرا اور اچھا اثر ہوا گویا موت کا سب کو اشتیاق معلوم ہوتا تھا بعض احباب نے اسی وقت تقاضا کیا تھا کہ یہ وعظ جلد صاف ہو جائے تو اس مصیبت عام میں مسلمانوں کے لئے باعث سکون ہو چنانچہ میں نے اسی وقت اس کو صاف کرنا شروع کر دیا تھا اور قریب نصف کے صاف بھی کر لیا تھا مگر بعض عوارض کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ پھر میں ہمشیرہ مرحومہ مذکورۃ الصدر کا حج بدل کرنے چلا گیا خدا اس کو ان کے لئے قبول فرمائے۔ اس لئے زیادہ تاخیر ہو گئی۔ چنانچہ اب ذالحجہ ۱۳۳۸ھ میں اس کو پورا کیا اور اتفاقی بات کہ اس وقت بھی مسلمانوں کو عام مصائب کا سامنا ہو رہا ہے اس لئے امید ہے کہ موجودہ مصائب میں بھی ان شاء اللہ یہ وعظ مسلمانوں کے لئے بہت کچھ سکون و اطمینان کا باعث ہوگا اور جو طریقہ مصائب کے دفع ہونے اور بلیات سے بچنے کا اس میں بتایا گیا ہے امید ہے کہ سب مسلمان اس کو اپنا نصب العین بنائیں گے اور اس پر کاربند ہوں گے کیونکہ جو تدبیر اس میں بتلائی گئی ہے وہ ہمارے اختیار میں ہے اور دوسری جن تدابیر میں مسلمان اس وقت مشغول ہو رہے ہیں وہ ان کے اختیار سے باہر ہیں۔ اور حدیث میں آیا ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ یُذِلُّ نَفْسَہٗ قَالَ یَتَحَمَّلُ مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَا یُطِیْقُہٗ فَیُذِلُّ نَفْسَہٗ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو یہ نہ چاہیئے کہ اپنے آپ کو (خوامخواہ) ذلیل کرے صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آدمی اپنے آپ کو (خود) کیونکر ذلیل کیا کرے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ (بعض دفعہ) ایسی بڑی بلا اپنے اوپر لا دیتا ہے جس کی برداشت کی اس میں طاقت نہیں ہوتی تو (خوامخواہ) اپنے آپ کو ذلیل کر دیتا ہے پس جو تدابیر آجکل عام مسلمان مصائب کے دفع کرنے کے لئے کر رہے ہیں ذرا غور کر لیا کریں کہ یہ باتیں ان کے اختیار میں بھی ہیں جو وہ تجویز کر رہے ہیں اور جن بلاؤں کو اپنے اوپر لا رہے ہیں ذرا سوچ لیں کہ ان کے تحمل کی بھی طاقت ہے یا نہیں اگر تحمل کی طاقت نہ ہو تو خوامخواہ اپنے آپ کو ذلت میں نہ ڈالیں اور اس وعظ کی تدابیر کو جو کہ اختیاری ہیں حرز جان بنائیں اخیر میں یہ درخواست ہے کہ حضرت حکیم الامۃ کی بھتیجی مرحومہ کے لئے سب ناظرین دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ انکی مغفرت کاملہ فرمائیں اور درجات بلند فرمائیں۔

مغفرت ہو اور حسب خواہ ہو — قرب ازواج رسول اللہ ہو

وہ ہوں اور نعمائے جنت بالدوام — وہ ہوں اور آغوش رحمت و السلام

اور اس احقر کے لئے بھی دعا حسن خاتمہ و تاحیات توفیق مرضیات و استقامت علے الطاعات و اجتناب معاصی کی دعا فرمائیں اور نیز یہ کہ حق تعالےٰ ہم سب کو اپنی کامل محبت اور کامل اتباع شریعت اور شرور و فتن سے حفاظت دنیا میں اور سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کی معیت آخرت میں اور حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی اور تمام مشائخ کرام کا سایہ عاطفت ہمارے سروں پر ہمیشہ رہے۔ آمین

والحمد للہ رب العالمین والسلام علے

المرسلین

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

مراقبۃ الارض

حکیم الاُمّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب

تھانوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ——— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ الملقب بہ

مراقبۃ الارض

این	کہاں ہوا	تھانہ بھون بر مکان حاجی محمد عمر نجار
متٰی	کب ہوا	۶ر جمادی الاول ۱۳۲۳ھ
کم	کتنی دیر ہوا	دو گھنٹہ
کیف	کس طرح ہوا	تخت پر بیٹھ کر
لم	کیوں ہوا	صاحب خانہ کے یہاں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے انہوں نے وعظ کی تمنا ظاہر کی
ماذا	کیا مضمون تھا	انسان کی غفلت کا سبب مبدأ معاد سے بے خبری ہے اس کا علاج کرنا چاہیئے جس کی سہل تدبیر یہ ہے کہ زمین پر چلتے پھرتے یہ سوچے کہ ایک دن اس کے اندر رکھا جاؤں گا۔
من ای شئ	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	سب مسلمانوں کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ وکان لہ
المستمعین	سامعین کی تخمینی تعداد	مرد تقریباً ہم اور مجمع مستورات پردہ میں اس کے علاوہ تھا
الاشتات	متفرقات	تسوید تفصیلی ۱۰ر رجب روز پنجشنبہ ۴۷ھ سے شروع ہو کر ۲۰ر رجب روز یکشنبہ تمام ہوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۔ یہ ایک آیت ہے سورہ طٰہٰ کی۔ اس میں

ذ برنٹنگ محل کراچی۔

حق تعالیٰ نے مخاطبین کی بعض حالتیں یاد دلا کر ان کو متنبہ فرمایا ہے اور وہ تین حالتیں ہیں جو اس آیت میں یاد دلائی گئی ہیں۔

(۱) مبدأ کی حالت ہے۔ (۲) معاد کی حالت ہے (یعنی معاد اول کی جس کو موت کہتے ہیں۔ (۳) ایک حالت معاد اول کے بعد اور ہونے والی ہے جو معاد حقیقی ہے۔ چنانچہ ترجمہ سے یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس زمین سے نکالا ہے اور اسی زمین میں تم کو لوٹا دیں گے۔ اور اسی زمین سے دوبارہ تم کو نکالیں گے۔ پس مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ میں تو مبدأ کو یاد دلایا ہے۔ کہ تم کو اسی زمین کی اجزاء خاک وغیرہ سے پیدا کیا گیا ہے اور فِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ میں معاد اول کو یاد دلایا ہے کہ ایک وقت میں تم کو پھر اسی زمین کا پیوند کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ انسان مرنے کے بعد زمین میں ہی مل جاتا ہے (خواہ دفن کیا جائے یا جلا یا جائے دونوں صورتوں میں خاک ہو کر یا راکھ ہو کر زمین ہی کا پیوند ہو جاتا ہے ۱۲) اور مِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى میں معاد حقیقی کو یاد دلایا گیا ہے کہ جس طرح پہلے زمین سے تمہارا مادہ نکالا تھا۔ اسی طرح دوبارہ نکلے گا۔ گو دونوں کی کیفیت میں فرق ہے (کہ پہلی مرتبہ عناصر اربعہ سے بواسطہ غذا اور ہضم کے مادہ منویہ کو اول نکالا گیا پھر اس کو رحم میں پرورش کر کے تدریجاً بڑھایا گیا حتیٰ کہ ایک دن جیتا جاگتا انسان ہو گیا۔ اور دوسری دفعہ یہ تدریجی کیفیت نہ ہوگی بلکہ دفعۃً سب اجزاء سمٹ کر جمع ہو جائیں گے اور پورا انسان بنکر کھڑا ہو جائے گا۔ اس وقت یہ نہ ہوگا کہ پہلے نطفہ ہو پھر رحم میں پرورش ہو پھر ماں کے پیٹ سے پیدا ہو بلکہ حکم ہوتے ہی دفعۃً کامل انسان بن جائیگا ۱۲) اس کے بعد پھر دوام و بقاء ہے اس کے بعد پھر کوئی اور حالت نہ ہوگی بلکہ یہی وجود ہمیشہ کے لئے باقی رہے گا اسی لئے یہاں کوئی اور حالت ذکر نہیں کی گئی اگر اس کے بعد بھی کچھ تغیر حال ہوتا تو اس کو بھی بیان کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بس معاد حقیقی کے بعد پھر تغیر نہ ہوگا اور میں اسی اشارہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسری نصوص اور

بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد ثانی کے بعد پھر دوام و بقاء ہی ہے چنانچہ اہل جنت کے متعلق ارشاد ہے وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ اور کفار کے بارہ میں ہے وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ غرض دونوں کے لئے خلود ہے یعنی فنا نہیں بلکہ بقاء ہے اور بعض آیات میں دونوں فریق کے متعلق خالدین کے ساتھ ابداً بھی مذکور ہے جس میں دوام کی زیادہ تصریح ہوگئی۔ بہرحال یہ تین حالتیں ہیں جو اس جگہ ہم کو یاد دلائی گئی ہیں۔ اس مضمون کے اختیار کرنے کی یہ وجہ ہے کہ انسان جو بعض دفعہ خدا کی نافرمانی کرنے لگتا ہے تو اس کا زیادہ سبب یہی ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت سے اور اس حالت سے جو اس کو آئندہ پیش آنے والی ہے غافل ہے۔ غفلت ہی تمام نافرمانیوں کی جڑ ہے اور غفلت اس لئے ہے کہ وہ ان حالات سے یا تو ناواقف ہے اور یا اس کا استحضار نہیں کہ میں پہلے کیا تھا اور ایک دن کیا سے کیا ہو جاؤں گا۔ خیر مستقبل کا استحضار نہ ہونا تو چنداں عجیب نہیں کیونکہ اس کو ابھی دیکھا ہی نہیں چکھا ہی نہیں گو دوسروں کا انجام تو روزانہ نہیں تو مہینہ میں یا سال میں آنکھ کے سامنے سے ضرور گذر جاتا ہے اور اس کا سب کو یقین ہے کہ ایک دن ہمارا بھی یہی انجام ہوتا ہے مگر خیر پھر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تو دوسروں کا انجام دیکھا تھا ہم پر تو ابھی نہیں گذرا اس لئے اس سے غفلت ہو جاتی ہے مگر میں اس سے بڑھ کر ایک اور بات کہتا ہوں وہ یہ کہ انسان کی عادت ہے کہ وہ ماضی کو بھی بھول جاتا ہے یعنی جو حالت اس پر گذر چکی ہے اس کو بھی یاد نہیں رکھتا بتلایئے یہاں کیا عذر ہے۔ صاحبو! ماضی کو تو ہر شخص دیکھ چکا ہے اور چکھ چکا کیا آپ جیسے اس وقت بیٹھے ہیں ہمیشہ سے ایسے ہی تھے ہرگز نہیں بلکہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ آپ میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ بستر ہی پر ہگتے موتتے تھے۔ کسی نے اٹھا دیا تو اٹھ گئے بٹھا دیا تو بیٹھ گئے کہیں رال بہہ رہی تھی کبھی سنک چاٹ رہے تھے خیر اس کو بھی جانے دیجئے کیونکہ آپ کہیں گے اس وقت ہم کو ہوش ہی نہ تھا اس لئے یہ باتیں کس کو یاد ہیں۔ گو یہ عذر اس لئے قابل قبول نہیں کہ دوسرے خبر دینے والے بکثرت موجود ہیں جو آپ کے سارے اترے پترے کھول سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچوں کی حالت کا روزانہ آپ خود مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ کیونکر پیدا ہوتے اور کس طرح

بڑھتے ہیں اور ابتداء میں ان کی کیسی قابلِ رحم حالت ہوتی ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ آپ بھی ماں کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوئے تھے اور یوں ہی گودوں میں پالے گئے تھے پھر اس کا استحضار دشوار کیوں ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اچھا سات آٹھ برس کی عمر کے واقعات تو اکثر لوگوں کو یاد ہوتے ہیں اور اس دس گیارہ سال کے حالات تو ضروری یاد ہوتے ہیں۔ اور ان ہی کو یاد کر لیجئے کہ اس وقت آپ کی حالت تھی اور اب کیا حالت ہے اس وقت کھانے ہگنے کے سوا کسی بات کی بھی حس نہ تھی۔ لڑکوں میں واہی تباہی پھرا کرتے تھے کہیں اینٹوں کا گھر بناتے تھے کبھی گلی ڈنڈے سے کھیلتے تھے۔ نہ سر کی خبر تھی نہ پیر کی۔ جانوروں کی طرح پھرتے تھے بھلا آج ہر شخص کی جو حالت ہے کہ کوئی ڈپٹی ہے کوئی تحصیلدار ہے کوئی رئیس ہے کوئی زمیندار ہے کوئی شیخ ہے کوئی مدرس کوئی واعظ ہے کوئی مفتی کوئی کاریگر ہے کوئی انجینیر کوئی فلسفی ہے کوئی معقولی کیا اس وقت کسی کو یا خود اس کو یہ گمان وخیال ہو سکتا تھا کہ میری ایک دن یہ حالت ہو جائے گی۔ ہرگز نہیں حضرت اس حالت میں اور اس حالت میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا مگر انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ مستقبل سے تو غافل ہے ہی زمانہ ماضی کو بھی بھول جاتا ہے اگر یہ ماضی کو بھی یاد رکھتا تو اس کی اصلاح کے لئے یہ بھی کافی تھا مگر یہ تو ابن الحال ہے۔ صرف حال ہی کو یاد رکھتا ہے اور اسی میں مست ہو جاتا ہے شاید آپ کہیں کہ یہ تو اچھی حالت ہے کہ ماضی ومستقبل دونوں کو الگ کر کے ابن الحال ہو گیا اور ابن الحال تو صوفی کو کہتے ہیں۔ صاحب میں نے یہاں ابن الحال لغت کے اعتبار سے کہا ہے اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نہیں کہا جو صوفیہ کی عبارت میں مستعمل ہے اگر ہم ویسے ابن الحال ہوتے تو قسمت ہی اچھی ہو جاتی صوفیہ تو ابن الحال اسے کہتے ہیں حقوق وقت کو ادا کرتا ہو اور یہ ہم ابن الحال ایسے ہیں جو وقت کو ضائع کرتے ہیں۔ گویا ابن تو ہیں مگر عاق ونافرمان مگر میں اس ایہام ہی کو قطع کئے دیتا ہوں اور ابن الحال کے بجائے عبد الحال کہتا ہوں کہ انسان ماضی ومستقبل سب کو بھلا کر بندۂ حال ہو گیا ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ اس وقت اگر راحت ہے تو اسی میں مست ہے اور اگر کلفت ہے تو خدا سے شکایت ہے ذرا سی بات میں وہ ان تمام انعامات کو بھول جاتا ہے جو زمانہ ماضی سے اب تک ان پر ہو چکے ہیں بھی

نہیں دیکھتا کہ پہلے میں کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہوں۔ خدا کا کتنا بڑا انعام ہے کہ اس نے مجھے جانور سے آدمی کیا اور آدمی بھی عاقل سمجھدار ہوشیار اور اس نے مجھے اب تک کیسی راحت سے رکھا ایک دن اگر کلفت بھی ہو گئی تو کیا ہوا ساری عمر تو آرام سے گذاری ہے مگر تو بران گذشتہ واقعات کا تو خطرہ بھی نہیں آتا اس کی نظر تو صرف حال پر رہتی ہے۔ اگر کھانے کو مل گیا تو خوش ہے مست ہے ورنہ گویا ان تلوں تیل ہی نہ تھا بس یہ شان ہے ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی　　　چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

(جب بھوکا ہوتا ہے تو کتا ہو جاتا ہے اور جب پیٹ بھرا ہوتا ہے بد خو اور ظالم ہو جاتا ہے)

بھوک میں کتے کی طرح بھونکتا ہے اور پیٹ بھر کے کتے کی طرح غراتا ہے کسی حال میں راہ پر نہیں آتا اسی کو حق تعالےٰ فرماتے ہیں اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا۔ انسان بڑا ہی کم ہمت ہے اگر اس کو کلفت پہونچے تو ہائے واویلا مچادے اور مال مل جائے راحت نصیب ہو جائے تو بخل کرنے لگے اس وقت بھی چین نہیں اب یہ سمجھتا ہے کہ نہ معلوم پھر بھی ملے گا یا نہیں لاؤ اس کو جمع کر لو۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ۔ یعنی انسان کی یہ حالت ہے کہ جب حق تعالےٰ اس کو (نعمت سے) آزماتے ہیں اس پر بخشش و انعام فرماتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میری خاطر کی مجھ پر کرم کیا اور جب (تکلیف سے) آزماتے ہیں پھر اس پر روزی کی کھینچ کر دیں۔ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ذرا سی پریشانی میں پچھلے سارے انعامات بھول جاتا ہے اور روزی ہی کے ملنے پر مقبولیت و قدر کا مدار سمجھتا ہے کہ خدا تعالےٰ کو میرے حال پر توجہ نہیں روز و شب اسی دھندے میں رہتا ہے کہ کسی طرح کھانے کو ملے چاہے کسی طرح ملے پھر جو کچھ اس کو ملتا ہے اس کو خدا پر اپنا حق سمجھتا ہے حالانکہ حق تعالےٰ نے اس کو محض اپنے فضل سے عدم محض سے اس کو ہست کیا اور ایسے وقت میں اس پر احسان کیا جبکہ یہ کچھ بھی نہ تھا ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود   لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

(ہم پیدا بھی نہ ہوئے تھے اور سوال بھی نہ کر سکتے تھے مگر بدون سوال ہی ان کی رحمت نے ہماری فریاد سُن لی اور ایمان کی دولت عطا فرمادی وہ اس طرح کہ مسلمان گھرانے میں پیدا کر دیا۔)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ (انسان پر ایک ایسا وقت آچکا۔ ہے جس میں یہ کچھ بھی قابل ذکر نہ تھا ۱۲) پھر اس کو اس حال میں پرورش کیا کہ یہ بالکل عاجز و کمزور تھا چلنے پھرنے کے قابل نہ تھا جانوروں سے بھی عاجز تھا وہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی اپنے پیروں سے چلنے پھرنے لگتے اور منہ مارنے لگتے ہیں، یہ اتنا بھی نہ تھا۔ پھر ایسے کمزور و عاجز کو خدا نے اتنا پالا ایسا پالا کہ آج بزعم خود خدا کے مقابلہ کے قابل ہو گیا اب کھا کھا کر معصیت پر کمربستہ ہو گیا گویا خدا کوئی چیز ہی نہیں گو اعتقاداً ایسا نہ سہی مگر حالاً تو ہے ہی اور بعض نے تو اعتقاداً وقولاً بھی ایسا ہی کر دکھایا اپنی ہستی کو انھوں نے ایسا برقرار کیا کہ ہستی خدا کی نفی کر دی۔ چنانچہ نمرود اور فرعون خدا کی ہستی کی نفی کرتے تھے۔ اسی لئے فرعون کہتا ہے مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ۔ کہ اپنے سوا میں کسی کو تمہارا معبود نہیں سمجھتا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا قائل ہی نہ تھا کیونکہ یہ تو کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی نہیں کر سکتا کہ خدا کو موجود مان کر پھر اپنے کو اس سے بڑا سمجھے اور اس نے جو اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کہا ہے اس سے شبہ نہ کیا جائے کہ وہ تو اپنے کو بڑا خدا کہتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا قائل تھا پھر اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہتا تھا۔ بلکہ منشا اس قول کا یہ ہے جو قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ

فرعون دہری تھا وہ کہتا تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں بس جو جس کو تربیت کرتا ہے وہی اس کا رب ہے۔ اولاد کو ماں باپ پالتے ہیں تو والدین ان کے رب ہیں، حاکم رعایا کی تربیت کرتا ہے وہ رعایا کا رب ہے اور بادشاہ سب سے بڑا حاکم ہے تو وہ سب سے بڑا رب ہے۔ اس لئے وہ اپنے کو ربِّ اعلیٰ کہتا تھا یعنی میں دنیا میں سب تربیت کرنے والوں سے

بڑا ہوں تو میں سب۔۔۔ سے بڑا رب ہوں، یہ مطلب تھا اس کے قول کا یہ نہیں کہ وہ خدا کا قائل تھا اور پھر اپنے کو خدا سے بڑا سمجھتا تھا بلکہ وہ تو سرے سے خدا ہی کا منکر تھا اسی لئے اس نے موسیٰؑ سے کہا تھا و ما رب العالمین (رب العالمین کیا چیز ہے خدا کون ہوتا ہے) وہ کمبخت خدا کی کنہ پوچھتا تھا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ منکر صانع تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کا جواب قابل دید ہے۔ آپ چونکہ عارف تھے بلکہ عارف کہنا بھی آپ کی کسر شان ہے۔ اعرف العارفین تھے (بلکہ یہ بھی کسر شان ہے رسولؐ اور نبی تھے جو منتہائے کمالات بشریہ ہے ۱۲) آپ نے جواب دیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ۝ خدا وہ ہے جو آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا تربیت کرنے والا ہے۔ اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو تو علم باری کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے) آپ نے اس جواب میں اس مسئلہ پر متنبہ کر دیا کہ کنہ ذات باری مدرک نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا ادراک ہمیشہ بالوجہ ہوگا پس تیرا کنہ سے سوال کرنا حماقت ہے اور یہ تنبیہ اس طرح ہوئی کہ اگر کنہ ذات کا ادراک ہو سکتا تو موسیٰ علیہ السلام جواب میں کنہ ہی کو بیان فرماتے کیونکہ سوال اسی سے تھا۔ اور جواب کا مطابق سوال ہونا ضروری ہے۔ اگر سوال صحیح ہو خصوصاً ایسے موقع میں جہاں غیر مطابق جواب دینے سے مجیب کا عجز سمجھا جائے اور حق پر تمسخر کیا جائے جیسا کہ یہاں ہوا کہ فرعون نے جواب بالوجہ کو سن کر تمسخر کیا اور قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۔ اپنے پاس والوں سے کہنے لگا کہ تم سنتے بھی ہو کیسا جواب دیا یعنی میں تو کنہ پوچھتا ہوں آپ وجہ بیان کر رہے ہیں۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بھی کنہ بیان نہیں کی بلکہ ایک وجہ اور بیان کر دی۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ۔ فرمایا خدا وہ ہے جو تمہارا رب ہے اور تمہارے گذشتہ باپ دادوں کا بھی رب ہے۔ فرعون اس پر جھلا کر کہنے لگا۔ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ کہ اے لوگو! تمہاری طرف جو رسول بھیجا گیا ہے وہ تو دیوانہ ہے (کیونکہ ان کو سوال کے مطابق جواب دینا بھی نہیں آتا) میرا سوال کچھ ہے ان کا جواب کچھ ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ کنہ باری کا ادراک ممتنع ہے ورنہ موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ پر ضرور بیان فرماتے مگر آپ نے بار بار وجہ ہی بیان کی اور ایسی وجہ بیان کی جو

اثبات وجود صانع کے لئے بالکل کافی تھی چنانچہ اول تو یہ فرمایا کہ وہ آسمان و زمین اور ان کے مابین جو اشیاء ہیں سب کا رب ہے اس پر فرعون پر اس خیال کی غلطی نمایاں کر دی کہ بس جو جس کی تربیت کرے وہی اس کا رب ہے کیونکہ اگر یہی بات ہے کہ تربیت علت ہے الوہیت کی تو بتلاؤ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا، آسمان میں سورج اور چاند اور ستارے اور زمین میں پانی، ہوا، آگ وغیرہ کس نے پیدا کی ظاہر ہے کہ تو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان چیزوں کا خالق ہوں کیونکہ یہ چیزیں کسی کے تابع نہیں ہیں اور مخلوق کا خالق کے لئے تابع ہونا ضروری ہے جب ان کا رب نہیں اور کسی نہ کسی رب کا ہونا ضروری ہے اور ضرور کوئی اور ہی رب ہے۔ علیٰ ہذا زمین میں جو درخت اور نباتات پیدا ہوتے ہیں یہ کون پیدا کرتا ہے۔ اگر کہو کاشتکار پیدا کرتے ہیں تو یہ بداہتہ غلط ہے اور کاشتکار کا زمین کے درست کرنے اور پانی دینے اور بیج ڈالنے کے سوا کسی بات میں دخل نہیں اگر دخل ہے تو چاہیے کہ جتنا وہ چاہے اور جب چاہے فوراً پیداوار ہو جایا کرے حالانکہ اس کی مرضی کے موافق پیدا وار پیداوار نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جس کے قبضہ میں یہ تمام چیزیں ہیں اور وہی سب کا خالق ہے۔ جب فرعون اس سے لاجواب ہو کر تمسخر کرنے لگا تو آپ نے دوسری وجہ بیان کی جس میں صراحۃً اس کے قول سابق کا ابطال تھا فرمایا کہ وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا اس میں بتلا دیا کہ تو جو ماں باپ کو اولاد کا رب اور حاکم کو رعیت کا رب کہتا ہے تو بتلا کہ باپ ماں کے مرنے کے بعد اولاد کیونکر زندہ رہتی ہے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ رب تو مر جائے اور مربوب زندہ رہے۔ اسی طرح حاکم بھی مرتے رہتے ہیں تو ان کے مرنے سے رعایا کیوں نہیں مر جاتی خالق کے بغیر مخلوق کیونکر زندہ رہتی ہے۔ پھر اگر باپ ماں اولاد کے خالق ہیں تو جو سب سے پہلا باپ تھا اس کا خالق کون تھا اگر وہ خود اپنا خالق تھا تو مر کیوں گیا اس نے اپنے باپ کو زندہ کیوں نہ رکھا جب وجود اس کے اختیار میں تھا تو اس نے اپنے وجود کو باقی کیوں نہ رکھا کیونکہ موت کسی کو مرغوب نہیں طبعاً ہر شخص کو اس سے کراہت ہے اور اگر پہلا باپ کوئی نہیں تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا۔ علاوہ ازیں یہی گفتگو ہر باپ کے متعلق ہے کہ اگر وہ اولاد کے

خالق ہیں اور وجود ان کے اختیار میں ہے جس کو چاہیں دیدیں تو خود کیوں فنا ہو جاتے ہیں پس معلوم ہوا کہ جب تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا وجود اپنے قبضہ میں نہیں تو یہ نہ اپنے خالق ہوسکتے ہیں نہ کسی غیر کے تو ضرور تمہارا سب کا رب کوئی اور ہے۔ وہی رب العلمین ہے) جب فرعون اس پر بھی لاجواب ہوا اور وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتا رہا کہ یہ تو جواب بالکل نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے تیسری وجہ اور بیان فرمائی۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۔ فرمایا (تربیت کرنے والا ہر مشرق کی اور مغرب کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کی بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے سمجھ لو کہ کیونکہ یقیناً طلوع شمس و غروب شمس پر اور تبدل و تغیر مواسم و فصول پر کسی انسان کی قدرت نہیں۔ انسان تو چاہتا ہے کہ بارہ مہینہ ایسی حالت رہے نہ گرمی زیادہ ہو نہ سردی اور بہت دفعہ جب کوئی کام پورا نہیں ہوتا تو چاہا کرتا ہے کہ ابھی رات نہ آئے تو اچھا ہے مگر ان باتوں میں اس کے اختیار کو کوئی دخل نہیں معلوم ہوا کہ ان کا کوئی رب ضرور ہے وہی رب العلمین ہے ۱۲) غرض موسیٰ علیہ السلام دبے نہیں کیونکہ صاحب حق دبا نہیں کرتا۔ ان پر علم کا رعب تو کیا ہوتا سلطنت کا رعب بھی نہ ہوا صاحب حق اظہار حق میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے آپ نے اسی جواب بالوجہ کو مختلف پہلوؤں سے اعادہ کیا (اور ہر دفعہ ایسی چبھتی ہوئی بات کہی جس کا فرعون کے پاس کچھ جواب نہ تھا ۱۲) یہاں سے معلوم ہوا کہ صاحب حق کو کسی مخاطب سے مرعوب ہو کر اپنا طرز نہ بدلنا چاہیے بلکہ حق بات ہی کو بار بار کہنا چاہیے یہ آجکل ہی کا طرز ہے کہ مجیب سائل کا اتباع کر کے اپنا طرز بدل دیتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا بلکہ اخیر تک اپنی بات پر جمے رہے کہ جتنی دفعہ لو لوگے جواب وہی سے ملے گا پھر ؎

چو حجت نماند جفا جوئے را   بہ پرخاش در ہم کشد روئے را

(جب ظالم کو ظلم کرنے کے لئے کوئی وجہ معقول نہیں ملتی ہے تو عداوت سے چہرہ ہی بغض والا بنا لیتا ہے)

جب کوئی بات نہ چلی تو اب اس نے قوت سلطنت سے کام نکالنا چاہا۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ

الٰها غیری لاجعلنك من المسجونین۔ کہنے لگا کہ بس بس زیادہ نہ بولو۔ اگر میرے سوا کسی کو خدا بتاؤ گے تو میں تم کو جیل خانہ بھیجدوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام یہاں بھی نہیں دبے قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ۔ فرمایا کیا اگر میں کوئی صریح دلیل پیش کردوں (جس سے رب العٰلمین کی قدرت اور میری رسالت کی حقانیت علانیہ ظاہر ہوجاۓ) تب بھی (تو نہ مانے گا اور خواہ مخواہ ہی اپنی بات پر اڑا رہے گا) اس کے بعد اس نے معجزات ظاہر کرنے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے معجزات دکھلاۓ۔ عصا کو زمین پر ڈالدیا وہ نمایاں اژدہا بن گیا جس کو دیکھ کر فرعون ڈر کر بھاگنے لگا اور ساری خدائی ڈھیلی ہوگئی۔ غرض فرعون کی ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہری تھا۔ خدا کو مانتا ہی نہ تھا۔ اسی طرح نمرود بھی منکر صانع تھا۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کیا تھا کہ تم جو خدا کی ہستی کے مدعی ہو بتلاؤ خدا کیسا ہے۔ قَالَ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب ایسا ہے کہ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی مارنا اور جلانا اس کے خاص کمالات میں سے ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں کرسکتا اور عالم میں ان دونوں فعلوں کا وقوع مشاہد ہے پس خدا کا وجود بھی ضروری التسلیم ہے) وہ کوڑھ مغز جلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھا نہیں کہنے لگا کہ یہ کام تو میں کرسکتا ہوں یہ کوئی خدا کی خاص صفت نہیں جس کے وجود سے خدا کا وجود تسلیم کرنا لازم آجاۓ کیونکہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں چنانچہ جس کو چاہوں قتل کردوں یہ تو مارنا ہے اور جس واجب القتل کو چاہوں چھوڑدوں یہ جلانا ہے۔ پھر جیل خانہ میں سے دو واجب القتل قیدیوں کو بلا کر ایک کو رہا کردیا اور ایک کو مار ڈالا۔ ابراھیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو بالکل ہی بھدی عقل کا ہے اسے جلانے اور مارنے کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ حالانکہ جلانے کی حقیقت یہ ہے کہ بے جان چیز میں جان ڈالے نہ یہ کہ جان دار کو چھوڑد اسی طرح مارنا یہ ہے کہ زندہ کی جان اپنے اختیار سے نکالے اور گردن کاٹنے میں قاتل کے اختیار سے جان نہیں نکلتی اس کا کام تو صرف گردن کاٹنا ہے۔ اس کے بعد بدون اس کے اختیار کے جان نکلتی ہے ورنہ پھر یہ بھی اختیار ہونا چاہیئے کہ گردن الگ کردے اور جان نہ

نکلنے دے اور یہ گفتگو حضرت ابراہیم نے اس لئے نہ چھیڑی کہ قرائن سے معلوم ہوگیا کہ یہ جلاتے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھے گا نہیں یا سمجھ بھی گیا تو تسلیم نہ کریگا اور خوامخواہ بحث میں اُلجھے گا اس ضرورت سے دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اچھا اللہ تعالےٰ آفتاب کو روز کے روز مشرق سے نکالتا ہے تو (اگر بزعم خود خالق ہے تو ایک ہی دن) مغرب سے نکال کر دکھلا) دے۔ فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ۔ اس پر وہ کافر اُن کا مُنہ تکنے لگا اور کچھ جواب بن نہ آیا پھر اس نے بھی وہی کیا جو فرعون نے کیا تھا کہ سلطنت کے زور سے کام لینے لگا اور حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈلوا دیا جس کی گرندسے خدا تعالےٰ نے ان کو بچا لیا اور آگ کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس جگہ دو سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ نمرود کو یہ کہنے کی تو گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی سورج کو مغرب سے نکال دے۔ پھر اس نے یہ کیوں نہ کہا جواب اس کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سے بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے اور یہ مشرق سے نکالنا اُسی کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے۔ اور یہ بھی بے اختیار اس کے دل میں آگیا کہ یہ شخص پیغمبر ہے اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا۔ اور ایسا ہونے سے جہان میں انقلاب عظیم پیدا ہوگا۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہ یہ لوگ اس خارق عادت کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ان کی راہ پر ہولیں اور ذرا سی حجت میں سلطنت ہاتھ سے جاتی رہے۔ یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور کوئی دوسرا جواب تو تھا نہیں اس لئے حیران ہو کر منہ دیکھتا رہ گیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی حجت کیوں بدلی یہ تو آداب مناظرہ کے خلاف ہے کیونکہ اس طرح تو گفتگو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ بس جہاں مدعی کی دلیل پر نقص وارد ہوا وہ اس دلیل کو چھوڑ کر دوسری بیان کرنے لگے گا پھر اس پر نقص وارد ہوگا تو تیسری دلیل پیش کر دے گا وعلیٰ ہٰذا القیاس یوں تو سلسلہ غیر متناہی ہو جائے گا۔ اسی لئے اہل مناظرہ نے مدعی کے لئے تبدیل حجت کو منع کیا ہے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اہلِ مناظرہ کے لئے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ مدعی کو اپنی مصلحت سے

تبدیل دلیل کی اجازت نہیں باقی خصم کی مصلحت سے کہ مثلاً وہ غبی ہے اور دلیل اول کو غموض کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتا۔ حجت کا بدلنا اور دوسری صحیح دلیل بیان کرنا جائز ہے بلکہ جہاں سمجھانا مقصود ہو وہاں ایسا کرنا واجب ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھانا ہی مقصود تھا وہاں ایسا کرنا دلیل غامض کو بدل کر سہل دلیل اختیار کی اور گو اہلِ مناظرہ نے اس کی تصریح نہیں کی مگر ان کے قول کو اس پر محمول کرنا ضروری ہے کیونکہ جس طرح ایک مصلحت عقلیہ تبدیل کی عدم جواز کو مقتضی ہے اسی طرح ایک مصلحت عقلیہ بھی تفہیم مخاطب اس کے جواز کو مقتضی اور ظاہر ہے کہ ہم نے پہلے قاعدہ کو محض اقتضاء عقل کی وجہ سے تسلیم کیا ہے ورنہ محض اہل مناظرہ پر کوئی وحی تھوڑا ہی نازل ہوئی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اقتضاء عقل کی وجہ سے اس قاعدہ میں استثناء کا قائل نہ ہو جائے یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق تھی اب میں یہاں سے ایک فائدہ جدیدہ پر متنبہ کرتا ہوں جو طلبہ کے کام کی بات ہے وہ یہ کہ ابھی قریب زمانہ میں حیدر آباد سے ایک عالم نے جو میرے دوست بھی ہیں مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ایک رسالہ میں یہ مضمون لکھنا چاہتا ہوں کہ وجود صانع کا اعتقاد فطری ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید پر دلائل قائم کئے ہیں مگر اثبات وجود صانع پر براہین و دلائل نہیں قائم کئے جیسا کہ قرآن کے مضامین سے واضح ہے جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل توحید کی تعلیم کی گئی ہے کہ ان میں اثبات صانع پر کوئی دلیل نہیں ہے پھر مجھ سے دریافت کیا تھا کہ اس مضمون کے متعلق تیری کیا رائے ہے میں نے لکھا کہ اس مدعیٰ پر اس دلیل سے استدلال کرنا غلط ہے کیونکہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات صانع پر دلائل قائم نہیں کئے مگر دوسرے انبیاء نے تو قائم کئے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام طبیب کے مثل ہیں کہ مرض کو دیکھ کر دوا دیتے ہیں سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب دہری نہ تھے بلکہ مشرک تھے۔ اس لئے آپ نے اثبات صانع پر دلائل قائم نہیں کئے کیونکہ مخاطبین کو اس سے انکار نہ تھا ہاں توحید سے منکر تھے تو آپ نے اس پر دلائل قائم کئے اور دیگر انبیاء کو بعض دہریوں سے بھی سابقہ پڑا ہے اس لئے

انھوں نے توحید کے ساتھ اثبات صانع پر بھی دلائل قائم کئے بس گو یہ مسئلہ فی نفسہ صحیح ہے کہ وجود صانع کا اعتقاد فطری ہے مگر اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عدم استدلال سے استدلال کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس پر خصم یہ کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ضرورت نہیں پڑی اگر ضرورت پڑتی تو آپ اس پر بھی دلائل قائم کرتے جیسا کہ اور انبیاء نے کئے ہیں مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے مقابلہ میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے مقابلہ میں اثبات صانع پر ادلہ قائم کئے جیسا کہ اوپر یہ تفصیل کے ساتھ میں نے ابھی بیان کیا ہے اور گو اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ بطور دلیل علی الظنی کے ہوں اور استدلال کے لئے احتمال بھی قادح۔ اس لئے میں نے لکھا کہ اس مضمون کو رسالہ میں تو آپ شائع نہ کریں گو اپنے خیال میں صحیح سمجھتے رہیں (یہ تنبیہ اس لئے کر دی گئی کہ شاید کسی کو دیگر انبیاء کے دلائل میں جو قرآن کے اندر مذکور ہیں اثبات صانع پر دلیل دیکھ کر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل میں نہ دیکھ کر یہ شبہ ہو کہ اگر اثبات صانع پر دلیل کرنا ضروری تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہیں قائم کی اور غیر ضروری تھا تو اور انبیاء نے کیوں قائم کی پھر وہ ایک دوسرے کی ترجیح اور مزیت ثابت کرتا اس لئے یہ بتلا دیا گیا کہ یہ اختلاف دلائل مخاطبین کے اختلاف پر مبنی ہے پس اب کچھ شبہ نہ رہا ۱۲) غرض انسان کی غفلت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ بعضے منکر صانع بھی تھے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک بزرگ نے جو صاحب ادلال تھے اور ادلال کے معنے ناز کے ہیں یہ بھی یہ ایک مقام ہے ولایت کا جو بعض اہل اللہ کو نصیب ہوتا ہے وہ صاحب ادلال ہوتے ہیں یعنی بطور ناز کے حق تعالےٰ سے ایسی باتیں عرض کر دیتے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا گو بعض دفعہ وہ ادلال دوسروں کے لئے اضلال مضاد کے ساتھ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ موٹی عقل کے ہوتے ہیں۔ ان کو دال سے مناسبت نہیں ہوتی ضاد ہی سے مناسبت ہوتی ہے تو وہ بزرگوں کی ایسی باتوں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

خیر ایک ایسے ہی بزرگ نے حق تعالےٰ سے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ منصور نے بھی انا الحق کہا تھا اور فرعون نے بھی انا الحق کہا تھا (کیونکہ انا ربکم

الاعلیٰ کا بھی وہی حاصل ہے جو انا الحق کا ہے ۱۲) تو بات ایک ہی تھی مگر منصور تو مقبول ہو گیا اور فرعون مردود ہو گیا۔ وہاں سے جواب عطا ہوا کہ تم سمجھتے نہیں دونوں میں بڑا فرق تھا۔ منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر انا الحق کہا تھا۔ یعنی منصور نے ایسی حالت میں انا الحق کہا تھا کہ اپنی ہستی ان کی نظر سے غائب تھی اور ہستی خداوندی کے سوا کسی پر اُن کی نظر نہ تھی تو وہ اپنی نفی کر کے انا الحق کہتے تھے اور فرعون نے ایسی حالت میں انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا کہ اس وقت خدا کی ہستی اس کی نظر سے غائب تھی محض اپنی ہی ہستی پیشِ نظر تھی تو وہ ہستی خداوندی کی نفی کر کے اپنی ہستی کو ثابت کر رہا تھا۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ منصور کے انا الحق کے یہ معنی تھے کہ میں اور تمام عالم کچھ نہیں صرف خدا ہی کا وجود ہے اور فرعون کے انا الحق کا یہ مطلب تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں۔ واقعی یہ جواب ایسا عجیب ہے کہ حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت فرعونے انا الحق گشت پست　　　گفت منصورے انا الحق گشت مست

(فرعون نے انا الحق کہا اور ذلیل ہوا اور حضرت منصورؒ نے انا الحق کہا اور عاشق حق ہوئے)

فرعون تو اس بات سے مردود اور پست ہو گیا اور منصور مجذوب اور مست شمار ہوئے

؎ لعنت اللہ آں انا را در قفا　　　رحمت اللہ ایں انا را در وفا

(اللہ تعالیٰ کی لعنت فرعون کے انا پر غداری سے ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت حضرت منصورؒ کے انا پر ہوئی بسبب وفاداری کے)

اس انا کے عقب میں تو لعنت ہے جو فرعون نے کہا تھا اور اس انا پر رحمت ہے جو منصور نے کہا تھا کیونکہ اس کا منشا وفا تھی وہ خدا کی ہستی کا حق ادا کر کے کہہ رہے تھے۔ اور یہ گفتگو بہت طویل ہو گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان کی عادت یہ ہے کہ وہ ماضی کو بھول جاتا ہے اور اپنے اس ضعف دیگر کو یاد نہیں رکھتا جو ایک زمانہ میں اس پر گذر چکا ہے گویا حالاً یوں سمجھتا ہے کہ (نعوذ باللہ) حق تعالیٰ کو ماضی پر اب قدرت نہیں رہی جو حالت گذر گئی اب دوبارہ مجھے پیش نہیں آسکتی چنانچہ ایک

مقام پر حق تعالیٰ نے انسان کی اسی عادت پر کہ وہ ماضی کو بھول جاتا ہے، متنبہ فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ انہ کان بکم رحیما ہ تمہارا رب (ایسا منعم) ہے کہ تمہارے (نفع کے) لئے کشتی کو دریا میں لے چلتا ہے تاکہ تم اس کے رزق کو تلاش کرو۔ بیشک وہ تمہارے حال پر بہت مہربان ہے۔ واقعی دریا میں جہازوں اور کشتیوں کا چلنا بڑی رحمت ہے۔ اس سے سفر میں کتنی آسانی ہوگئی ورنہ بس ہندوستان والے تو حج سے محروم ہی رہتے یہ تو دینی ضرر تھا اور دنیوی ضرر یہ تھا کہ دوسرے ممالک کی چیزوں سے محروم رہتے یہ جہازوں ہی کی تو برکت ہے کہ آج قسم قسم کی چیزیں اور راحت کے سامان دوسری ولایتوں سے یہاں آتے ہیں اور یہاں کی چیزیں باہر جاتی ہیں جس سے تجارت کو ترقی ہوگئی اور سمندر پر جہازوں کا چلنا محض خدا کی رحمت ہی ہے ورنہ بڑے سے بڑا جہاز پانی میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تنکا بہہ رہا ہو۔ سمندر کی ایک موج بھی اس کے ڈبونے کے لئے کافی ہے اور اس وقت ساری مشینیں بیکار ہوجاتی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے حفاظت فرماتے ہیں۔ ہاں کبھی بطور تنبیہ وامتحان کے طوفان میں بھی مبتلا کردیتے ہیں جیسے خشکی میں بعض دفعہ اسی حکمت سے مصائب بھیجدیتے ہیں آگے اس امتحان کے متعلق ارشاد ہے وَاِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاہُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰکُمْ اِلَی الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَکَانَ الْاِنْسَانُ کَفُوْرًا ط اور جب تم کو دریا میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے (جیسے موج اور ہوا کا طوفان) تو اس وقت بجز خدا کے اور جن جن کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہوجاتے ہیں۔ طوفان کے وقت کافر ملحد بھی خدا کا قائل ہوجاتا ہے۔ جہاز کے کپتان بھی کہنے لگتے ہیں کہ حاجی بابا خدا سے دعا کرو۔ واقعی خدا کا وجود ایسا فطری ہے کہ طوفان کے وقت اضطراری طور پر ملحد کو بھی اس کا قائل ہونا پڑتا ہے اور کافر مشرک موحد ہوجاتا ہے۔ اس وقت سارے دیوتا اور مہادیو وغیرہ دل سے نکل جاتے ہیں اور خدا ہی خدا رہ جاتا ہے اور مسلمانوں کو اس وقت توبہ اور

انابت الی اللہ نصیب ہو جاتی ہے۔ ہر شخص گنا ہوں سے استغفار کرنے لگتا اور آیندہ کے لئے متقی بننے کا قصد کر لیتا ہے آگے فرماتے ہیں۔ پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم پھر خدا سے پھر جاتے ہو بس جہاں جہاز سے کنارہ پر اترے پھر بدستور سابق وہی حالت ہو جاتی ہے۔ مشرک شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ملحد خدا کا منکر ہو جاتا اور مسلمان گناہوں کا ارتکاب کرنے لگتا ہے حق تعالے اس کی شکایت فرماتے ہیں۔ وکان الانسان کفوراً کہ واقعی انسان ہے بڑا نا شکرا کہ ایسی جلدی منعم کا انعام اور اپنا عجز و نیاز سب بھول جاتا ہے۔ یہی ہے ماضی سے غفلت کہ ایک مصیبت سے بچنے کے بعد انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ بس اب میں ہمیشہ کو بچ گیا۔ دریا ہی تک مصیبت تھی اب گھر پہونچکر سلامتی ہی سلامتی ہے۔ حق تعالے آگے اس خیال کی غلطی ظاہر فرماتے ہیں۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ وَکِیْلًا ۝ (یعنی دریا سے نکل کر) کیا تم اس بات سے بھی بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ اللہ تعالے تم کو خشکی کی جانب میں لا کر زمین میں دھنسا دے یا کوئی تند ہوا تم پر بھیجدے پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔ چنانچہ قارون کو خشکی ہی میں دھنسایا گیا تھا اور اب بھی ایسے واقعات ہو جاتے ہیں، کہیں زلزلہ سے آدمی زمین میں دھنس گئے کہیں ریلیں ٹکرا گئیں کہیں گھر کی دیواریں گر پڑیں اور دب کر مر گئے۔ بعض دفعہ ایسی سخت ہوا آئی جس سے درخت اکھڑ گئے آدمی تلف ہو گئے کبھی ندی اور نالے چڑھ گئے جیسے خشکی ہی میں طوفان آگیا ہو۔ چنانچہ ابھی ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔ گنگا اور جمنا کے طوفان سے ہزاروں گاؤں تباہ و برباد اور سیکڑوں جانیں تلف ہو گئیں، پھر کس بات سے بے فکری ہے ارے جو خدا سمندر میں ڈبو سکتا ہے وہ ہر جگہ تم کو ہلاک کر سکتا ہے۔ آگے بڑے مزے کی بات فرماتے ہیں اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْکُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَکُمْ بِمَا کَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ

عَلَیۡنَا بِہٖ تبیعًا۔ یا تم اس سے بے فکر ہو گئے ہو کہ خدا تعالےٰ پھر تم کو دریا ہی میں ڈبا نہ لے جاوے (جس کا مزہ ایک بار چکھ چکے ہو) اور یہ کچھ دشوار نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ضروری کام ایسا نکال دیں جس کی وجہ سے دریا کا سفر پھر کرنا پڑ جائے۔ انسان کے ارادہ کا بدلنا خدا کو کیا مشکل ہے رات دن مشاہدہ ہوتا ہے کہ آج ہم ارادہ کرتے ہیں اور پھر اس کے خلاف کرنا پڑتا ہے۔ میں خود اپنی حالت کہتا ہوں کہ ابھی قریب زمانہ میں جب ریلوں کے بند ہونے کا قصہ میں نے سنا تو یہ قصد کر لیا تھا کہ اس سال کہیں سفر نہ کروں گا مگر جناب پھر جانا ہی پڑا اور اسی حال میں جانا پڑا کہ ابھی تک بعض اطراف کی ریلیں رکی ہوئی تھیں صورت ہی ایسی پیش آئی کہ میں رک نہ سکا۔ وہ یہ کہ الہ آباد میں میرے ایک دوست سخت بیمار تھے ان کے بچنے کی امید نہ رہی تھی انہوں نے ایک صاحب کو یہاں بھیجا اور ان کی زبانی یہ پیام دیا کہ میری حالت نازک ہے اور تم سے ملنے کو جی بے اختیار چاہتا ہے جس طرح جانو فوراً چلے آؤ نہ معلوم پھر ملنا ہو یا نہ ہو۔ قاصد نے ان کا اشتیاق کچھ اس طرح ظاہر کیا کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور سفر کرنا ہی پڑا۔ پھر خدا نے ایسا کیا کہ میں نے جا کر مریض زندہ ہی پایا اور مجھ سے مل کر ان کو بہت ہی خوشی ہوئی یہاں تک کہ طبیب نے بھی یہ کہہ دیا کہ ان کا آدھا مرض جاتا رہا (پھر واپسی کے چند روز بعد بیچارے کا انتقال ہو گیا، خدا تعالیٰ مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی رحمت سے نوازے آمین) ۱۲

اور میں اس کو رحمت سمجھتا ہوں کہ حق تعالےٰ ہمارے ارادے توڑتے رہتے ہیں۔ جس سے بار بار اپنا عجز اور ضعف مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ عرفت ربی بفسخ العزائم۔ کہ میں نے اپنے خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا کہ ہم لاکھ ارادے کرتے ہیں اور پختہ قصد کرتے ہیں مگر ایک قدرت ہے جو ان کو توڑ دیتی ہے واقعی وجود صانع کے لئے یہ کافی دلیل ہے مگر انسان ایسا غافل ہے کہ پہلی حالت کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ چنانچہ میں اپنی ہی کہتا ہوں کہ ایک بار فسخ

ارادہ کا نمونہ دیکھ چکا ہوں۔ مگر سفر سے واپس آکر پھر بھی قصد کر لیا ہے کہ اب نہ جاؤں گا
استغفر اللہ بلکہ یہ خیال ہے کہ اگر مجبوری پیش نہ آئی تو نہ جاؤں گا اور جو مجبوری پیش
آئی تو میں سمجھوں گا کہ اب خدا تعالیٰ ہی کو سفر منظور ہے اس وقت ضرور جاؤں گا بلکہ
اب تو میں ارادہ کرنے سے بھی ڈرتا ہوں پس خدا کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ جیسے چاہیں
تصرف فرمائیں۔ بندہ کا کام تفویض ہی ہے اور اسی میں راحت ہے۔ غرض حق تعالیٰ کو یہ
کیا دشوار ہے کہ تم کو پھر دریا ہی میں بھیج دیں اور پہلے کی طرح پھر ہوا کا طوفان آجائے
جو غرق ہی کر کے چھوڑے بس یہ نادانی ہے کہ انسان ایک بلا کے ٹلنے سے بے فکر ہو جائے
مگر کچھ غفلت کا پردہ ایسا پڑا ہوا ہے کہ ماضی کو انسان بہت جلد بھول جاتا ہے اور
یہ سمجھتا ہے کہ بس وہ تو رفت وگذشت ہوا اسی لئے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ الماضی
لایذکر حق تعالیٰ اس پر بھی قادر ہیں کہ حالت ماضیہ کو پھر لوٹا دیں اور ان کو ترکیب
کی بھی ضرورت نہیں جس میں کچھ دیر لگے ترکیب کی ضرورت ہو تو اس کو ہو جسے قدرت نہ
ہو وہ تو پورے قادر ہیں جب چاہیں پہلی ہی سی حالت کر دیں مگر آدمی اپنی غفلت سے
ایسا بے فکر ہو جاتا ہے کہ گویا خدا کو ماضی پر قدرت ہی نہیں رہی (نعوذ باللہ منہ)
لیکن اگر انسان ماضی کے ساتھ انسان کو اپنے مستقبل کا ہی خیال رہے تو بھی اتنی غفلت
نہ ہو مگر یہ تو ماضی اور مستقبل دونوں سے آنکھیں بند کر کے عبد الحال ہو گیا ہے پھر مستقبل
میں بھی صرف موت کا خیال کافی نہیں کیونکہ اس کے قائل تو دہری اور مشرک بھی ہیں مگر
اس سے تو ان کو کچھ نفع نہیں ہوا کیونکہ وہ موت کے بعد حیات ثانیہ کے قائل نہیں بس
یوں سمجھتے ہیں کہ مر کر مٹی میں مل جائیں گے پھر نہ ثواب ہے نہ عذاب تو اس حالت میں
خیال موت سے کیا نفع ہو سکتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے مبدأ اور معاد اول کے بعد
معاد ثانی کو یاد دلایا ہے۔ چنانچہ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ میں مبدأ کا ذکر ہے اور
وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ میں معاد اول کا اور وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ میں معاد ثانی کا
اور تینوں کا اس لئے جمع فرمایا کہ ملحدین تو مبدأ کا یعنی خدا کے خالق ہونے ہی کا انکار
کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تو موت و حیات کا مدار زمانہ کی گردش پر ہے۔ چنانچہ

قرآن میں بھی دہریوں کا یہ خیال نقل کیا گیا ہے مگر دہریوں کہتے ہیں وما یھلکنا الا الدھر کہ ہم کو زمانہ کی گردش ہلاک کرتی ہے۔ سو مبدا کا ذکر تو اس لئے فرمایا کہ ان کی اصلاح ہو اگرچہ یہ ضروری ہے کہ قرآن میں دہریوں سے تو زیادہ تعرض نہیں کیا گیا کیونکہ مخاطبین اس خیال کے بہت کم لوگ تھے زیادہ تر مشرکین ہی تھے۔ اور یہ مشرکین مبدا کے قائل ہیں مگر حیات ثانیہ کے قائل نہیں وہ موت و حیات میں خدا کا دخل تو مانتے ہیں مگر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے قائل نہ تھے اور اس کو مستبعد و محال سمجھتے تھے۔ معاد ثانی کا اس لئے ذکر فرمایا اور اس مقام کے علاوہ بھی حق تعالے نے قرآن میں جابجا ان کے استبعاد کا جواب دیا ہے اور بہت اہتمام سے معاد ثانی کو ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ کہ معاد ثانی خدا تعالیٰ کو پہلی بار زندہ کرنے سے زیادہ آسان ہے کیونکہ پہلے تو یہ اجسام بقابلیت قریبہ قابل حیات نہ تھے اور اب تو ان میں حیات کی قابلیت قریبہ ہو گئی ہے کیونکہ زمانہ دراز تک اس سے تلبس ہو چکا ہے۔ پس دوبارہ زندہ کر دینا پہلی بار زندہ کرنے سے زیادہ عجیب نہیں اگر غور سے کام لیا جائے تو انسان کی حیات اولیٰ ایسی عجیب ہے کہ اگر ہر روز اس کا مشاہدہ نہ ہوا کرتا تو لوگ اس کو نہایت مستبعد سمجھتے واقعی انسان کی پیدائش کا جو طریقہ رکھا گیا ہے وہ ایسا عجیب و غریب ہے کہ اگر کسی حکیم و فلسفی دماغ والے کو بچپن سے کسی تہ خانہ میں بند رکھا جائے اور وہاں اس کو ہر قسم کے علوم و فنون میں ماہر کر دیا جائے مگر یہ مسئلہ نہ پڑھایا جائے کہ انسان کیونکر پیدا ہوتا ہے نہ کوئی اس سے یہ تذکرہ کرے نہ وہ آنکھ سے اس منظر کو دیکھنے پائے پھر وہ جب تمام علوم و فنون میں کامل و ماہر ہو جائے اس وقت اس سے کہا جائے کہ خبر بھی ہے کہ تم کس طرح پیدا ہوئے تھے پھر اس کے سامنے یہ صورت پیدائش بیان کی جاوے کہ تم پہلے نطفہ کی شکل میں باپ کی پشت کے اندر تھے پھر وہ اس طرح تمہاری ماں سے ملا اور وہ نطفہ مایۂ رحم مادر میں پہنچا جہاں علقہ اور مضغہ بنا پھر اس کے اندر جان پڑی اور خون حیض سے پرورش پاتا رہا پھر نو ماہ کے بعد جیتا

جاتا ماں کے پیٹ سے نکلا پھر خدا نے خون کو بشکل دودھ ماں کے پستان میں پہونچادیا وہ تم کو پلایا گیا۔ دو سال تک تم کو دودھ سے غذا دی گئی پھر دودھ چھوڑا کر تدریجاً روٹی کا عادی کیا گیا اس طرح بڑھتے بڑھتے تم جوانی کے قریب پہونچے اس وقت تم کو خدا نے ایسی عقل دی جو پہلے نہ تھی واللہ وہ فلسفی اور حکیم اس صورت کو سنکر فوراً رد کر دے گا اور قسمیں کھائے گا کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ بھلا چند قطرات مائیہ سے کہیں ایسا انسان بن سکتا ہے جس میں گوشت پوست، ہڈیاں اور آنکھیں اور حواس ظاہرہ و حواس باطنہ ایسے ایسے موجود ہیں۔ نیز جان پڑجانے کے بعد ایک ذی روح کا پیٹ کے اندر پرورش پانا کیونکر ممکن ہے۔ جہاں نہ ہوا کا گذر ہے نہ ایسی جگہ ہے جو حفظ صحت کے لئے کافی ہو ذی روح کا رحم مادر میں زندہ رہنا محالات سے ہے۔

حضرت میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ہم لوگوں نے پیدائش کا طریقہ جانوروں میں اور بعض انسانوں میں دیکھا نہ ہوتا تو محض سن کر ہرگز یقین نہ آتا۔ سو حیات اولیٰ اس قدر عجیب ہے بخلاف حیات ثانیہ کے کہ وہ اس قدر مستبعد نہیں کیونکہ آجکل بعض ڈاکٹروں نے تحقیق کیا ہے کہ موت کے بعد کچھ دیر تک جسم میں حیات کا اثر باقی رہتا ہے اور اس مدت کے اندر اندر کوئی مقوی دوا مردہ کے جسم میں داخل کر دی جائے تو حیات کا اثر پیدا ہو جاتا ہے اور مردہ کو حرکت ہونے لگتی ہے اور بعض دفعہ ایک دو گھنٹے کے لئے وہ بات چیت بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر ڈاکٹروں کو کامیابی بھی ہوئی ہے تو وہ تہ خانہ والا حکیم اس پر زیادہ حیرت نہ کرے گا اور نہ ہم اور آپ اس پر حیرت کرتے ہیں یہ تحقیق عجیب ضروری مگر ایسی موجب حیرت و استبعاد نہیں جیسے حیات اولیٰ ہے۔ اب تو آپ کو مشاہدہ ہوگیا "هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ" کا کیونکہ جب ڈاکٹروں کو جن کی قدرت وحکمت خدا تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے سامنے کچھ بھی نہیں اس میں کامیاب ہوگئی کہ جس انسان کو عام طور پر سب لوگ مردہ سمجھ چکے تھے وہ خاص

میعاد کے اندر مقوی دواسے اس کو مثل زندہ کے کر دیتے ہیں تو حق تعالیٰ اگر ہزار دو ہزار برس کے بعد زندہ کر دیں تو کیا عجیب ہے۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹروں کو جتنی دیر تک جسم میں اثر حیات کا ہونا معلوم ہوا ہے اس کے بعد بھی حیات کا اثر جسم میں رہتا ہو مگر وہ نہایت ضعیف و قلیل اثر ہو جو آلات سے مدرک نہیں ہو سکتا۔ پس حق تعالیٰ اسی ضعیف اثر کو کسی بے حد مقوی شے سے بڑھا دیں اور مردہ ہزاروں برس کے بعد زندہ ہو جائے تو کیا عجب ہے اور یہ بھی تقریب الی الفہم کے لئے کہہ دیا گیا ورنہ حق تعالیٰ کو ان ترکیبوں کی کیا ضرورت ہے ان کا تو حکم دینا اور ارادہ کرنا ہی کافی ہے۔ بہرحال حق تعالیٰ نے معاد ثانی کے بیان میں بہت اہتمام فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف موت کا علم اصلاح حال کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کے لئے علم معاد ثانی کی بھی ضرورت ہے اور انسان کی غفلت کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس سے غافل ہے اگر اس کا استحضار ہو تو غفلت نہ رہے ہم گو اعتقاداً معاد کے قائل ہیں مگر پھر غفلت اس لئے ہے کہ ہم کو معاد کا استحضار نہیں کسی وقت اس کو سوچتے نہیں بلکہ اگر کبھی خود بخود اس کی طرف خیال چلا بھی جاتا ہے تو جلدی سے دھکے دیدیتے ہیں اس کے خیال سے بھاگتے اور گھبراتے ہیں۔ اور ہر چند کہ پوری اصلاح تو حیات ثانیہ ہی کے استحضار سے ہوتی ہے لیکن اگر انسان معاد اول (یعنی موت) کو بھی یاد رکھے تو زیادہ غافل نہیں ہو سکتا بلکہ کچھ نہ کچھ اصلاح ضرور ہو جائے کیونکہ جس گھر سے نکلنا اور جانا مستحضر ہو اس میں دل نہیں لگ سکتا۔ دیکھو ملازمت کی حالت میں پردیس میں آدمی کرایہ پر مکان لے کر رہتا ہے تو اس مکان سے اس کو زیادہ دلبستگی نہیں ہوتی بس بقدر ضرورت اس کی مرمت کر لیتا ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ سارا سرمایہ اسی کی زینت و آرائش میں لگا دے کیونکہ ایک دن اس سے نکلنے کا ہر وقت خیال لگا ہوا ہے کہ نہ معلوم کس وقت تبدیلی کا حکم ہو جائے اور اس کو چھوڑ کر کہیں اور جانا پڑے تو خواہ مخواہ اس کے اندر ساری رقم کیوں

لگائے۔ ہاں ملازمت کے وقت اپنے وطن کے مکان کا ضرور خیال رہتا ہے، اس کی مرمت واستحکام کے لئے ہر سال روپیہ صرف کرتے ہیں اور تعطیل میں آکر اس کی تعمیر شروع کرتے ہیں۔

اب اگر کسی شخص کو ہر دم موت کا دھیان رہے کہ ایک دن وطن کا گھر بھی ہم سے چھوٹنے والا ہے۔ تو یقیناً وہ اس گھر سے بھی زیادہ دل نہ لگائے گا اور یہ بھی انسان کی اصلاح کے لئے کافی ہے کیونکہ اصل ضرر دنیا سے دل لگانے کا ہے طبعی طور پر احتیاج کے سبب اس کی طرف میلان پر چنداں ضرر نہیں۔ چنانچہ حیات دنیا سے اس درجہ میں خوش ہونے پر حق تعالیٰ نے ملامت نہیں کی بلکہ اس پر مطمئن ہونے اور دل لگانے پر ملامت فرمائی ہے۔ اسی لئے ایک مقام پر کفار کے بارہ میں فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ" کہ وہ لوگ حیات دنیا سے راضی اور اسی کے ساتھ مطمئن ہیں تو یہاں حق تعالیٰ نے "رضوا بالحیٰوۃ الدنیا" پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ "واطمأنوا بھا" بھی فرمایا معلوم ہوا کہ صرف رضا بالحیٰوۃ سبب غفلت نہیں بلکہ اس سے دل بستگی ہو جانا سبب غفلت ہے نیز سورۃ توبہ کی آیت میں ارشاد ہے وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ جس میں صاف دلالت ہے کہ مساکن مرضی ہونا مذموم نہیں اس کی احبیت مذموم ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے۔ پس موت کے استحضار سے گو "رضا بالحیٰوۃ" کا ازالہ نہ ہو مگر اطمینان و دل بستگی تو ضرور زائل ہو جائے گی. اور جب زندگی سے دل بستگی نہ رہے گی تو کسی وقت تو غفلت میں کمی آئے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ موت کا دھیان رہتے ہوئے آدمی بالکل ہی غافل رہے اور اتنا بھی اصلاح کے لئے کافی ہے۔

صاحبو! اس پر ملامت نہیں ہے کہ ہم کو بیوی بچوں سے یا اپنے گھر سے محبت کیوں ہے اس کا تو مضائقہ نہیں میں آپ سے بیوی بچوں کو اور گھر بار کو نہیں چھڑاتا

بلکہ ملامت اس پر ہے کہ ہم کو انہوں سے ساری محبت کیوں ہے خدا کے ساتھ تعلق کیوں نہیں دیکھئے حق تعالیٰ ایک مقام پر فرماتے ہیں قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بیویاں اور برادری اور وہ مال جن کو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو خطرہ رہتا ہے اور وہ گھر جن کو پسند کرتے ہیں تم کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی حکم (تمہاری سزا کے متعلق) بھیجیں اور اس میں بیوی بچوں اور مال ودولت کی مطلق محبت پر وعید نہیں فرمائی بلکہ احبیت پر وعید ہے کہ یہ چیزیں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں اور ان کی محبت اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے مانع نہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ "مَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا" فرمانے کے بعد اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فرمانا اس کا صریح قرینہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ رضا بالمسکن پر وعید نہیں بلکہ اس کے بعد احبیت من اللہ ورسولہ پر ملامت ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں "رضا بالحیوۃ الدنیا" پر وعید نہ تھی بلکہ اطمینان ودل بستگی پر وعید تھی اور اس اطمینان واحبیت کا منشا وہی موت سے غفلت ہے اگر موت کا خیال رہے تو ان چیزوں کے ساتھ اطمینان اور دل بستگی اور احبیت کا درجہ تو ہرگز نہ پیدا ہوگا اسی لئے اہل طریق فرماتے ہیں کہ معاد اول کا حاضر فی الذہن ہونا بھی دنیا سے دل برداشتہ ہو جانے اور کسی قدر اصلاح پر متوجہ کر دینے کے لئے کافی ہے مگر ستم یہ ہے کہ انسان اس سے بھی غافل ہے اور موت کے ساتھ مابعد الموت یعنی قیامت کا استحضار بھی ہو اور دوبارہ زندہ ہونے اور ثواب وعذاب اور حساب وکتاب ہونے کا بھی خیال ہو پھر تو کیا کہنا

ورنہ کم از کم موت کا دھیان تو ضرور ہونا چاہیئے جس سے کوئی ملحد یا دہری اور منکر بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے موت کو یقین سے تعبیر فرمایا ہے۔ واعبد ربک حتی یاتیک الیقین واقعی یہ ایسی یقینی ہے کہ اس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ پس لذات کو مکدر کرنے اور غفلت کو کم کرنے کے لئے اس کا استحضار بہت مفید ہے اور اس کے استحضار میں کچھ دشواری بھی نہیں کیونکہ اس کا روزمرہ بھی اور مشاہدہ ہے اور اس وقت کی بے بسی اور بیکسی کی حالت بہت دفعہ آنکھوں کے سامنے سے گزرتی رہتی ہے تو اس کا سوچنا بہت آسان ہے کہ جس طرح دوسرا شخص مر کر بیکس و بے بس ہو گیا اور اس کا سارا مال و دولت دوسرا لے گیا اور بیوی بچے جائداد و مکانات سب اس سے چھوٹ گئے اسی طرح ایک دن ہم کو بھی یہ سانحہ پیش آئے گا اور یہ خیال ایسا نہیں جو انسان کو بے فکر بیٹھنے دے۔

دیکھئے فلاسفہ یونان معاد ثانی کے قائل نہ تھے اور جس معاد کا بدلے کے تمام ان کو عقیدہ تھا وہ کالعدم ہے کیونکہ ان کی معاد کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علوم حقہ کو حاصل کر لے اور وہ علوم کیا ہیں حق یہ ہیں کہ افلاک نو ہیں اور وہ کروی ہیں اور ان کی ترتیب یہ ہے کہ سب کرات میں اسفل کرۂ ارض ہے اس کے اوپر کرۂ ماء اور اس کے اوپر کرۂ ہوا پھر کرۂ نار ہے اور ان سب کو نو افلاک محیط ہیں جو ہر وقت متحرک ہیں پس جس کو یہ ترتیب عالم صحیح معلوم ہو اور اخلاق اچھے ہوں اس کے دل کو مرنے کے بعد راحت ہوگی یہ تو جنت ہے اور جس کو اس ترتیب سے جہل ہو اور اخلاق برے ہوں اس کو اپنے اصل سے مرنے کے بعد تکلیف ہوگی یہ دوزخ ہے۔ سبحان اللہ علوم کیا عالی ہیں جن کے جاننے اور نہ جاننے پر مدار راحت والم کا رکھا ہے۔ بس وہی مثال ہے

چوں کرمے کہ در سنگے نہاں است   زمین و آسمان وے ہماں است

(مثل اس کیڑے کے جو پتھر کے اندر پوشیدہ ہے اس کا زمین و آسمان وہی پتھر کا

ح چھوٹا سا سوراخ ہے)

جو کیڑا ابھی تک پتھر کے اندر رہا اس کا تو وہی آسمان ہے اور وہی زمین جیسے ماں کے پیٹ میں جب بچہ ہوتا ہے تو اسی کو بڑا مکان سمجھتا ہے اور وہاں سے دنیا میں آتے ہوئے روتا ہے یہی حال ان فلاسفہ کے علوم کا ہے کہ بس ان کے یہاں ترتیب عالم کے جان لینے پر راحت کی انتہا اور اس کے نہ جاننے پر الم کا مدار ہے نہ کمالات حقیقیہ سے بحث ہے نہ علوم مقصودہ سے اس حقیقت معاد پر خود حکما رہی کی جماعت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وہاں تو سب کو حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ مرنے کے بعد تو کوئی بھی جاہل نہ رہے گا پھر صاحب جہل کو رنج و تکلیف کیوں ہوگی اس کا کچھ جواب نہیں دیا سکا غرض یا اسہمہ کہ یہ لوگ معاد ثانی کے صحیح طور پر قائل نہ تھے اور جس معاد کے قائل تھے وہ محض مہمل تھی مگر موت کے قائل تھے اور تھے عاقل تو اسی کے استحضار سے ان کی یہ حالت تھی کہ حکماء کے ایسے ایسے واقعات منقول ہیں جیسے ہمارے اہل اللہ کے۔ چنانچہ یہ لوگ خلوت نشین عزلت گزین رہتے تھے۔ ریاضات اور مجاہدات بہت کرتے تھے۔ لذات دنیا و سامان عیش و عشرت سے بہت بچتے تھے۔ یہ آجکل ہی کی نئی حکمت ہے جس میں خلوت نشینی پر اعتراض کیا جاتا ہے اس کا نام حکمت نہیں بلکہ حکومت ہے۔ آج کل ساری حکمت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ہو تمام دنیا کو مسخر کر لیا جائے چنانچہ بعضے کرہ مریخ تک پہونچنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہاں کی مخلوق کو بھی مسخر کیا جائے۔ چنانچہ جس قدر ترقی صنعتوں میں ہو رہی ہے سب کا یہی خلاصہ ہے بس مادہ پرستی غالب ہے، روحانیت کا پتہ بھی نہیں تو اس کو حکمت کہنا حکمت کے نام کو بدنام کرنا ہے جس کو حکمت و دانائی سے ذرا بھی مس ہوگا وہ موت کا خیال کر کے دنیا سے ضرور دل برداشتہ ہوگا اور ترقی روحانیت کا ساعی ہوگا چنانچہ حکمائے یونان کو گو صحیح حکمت تو حاصل نہ تھی مگر خیر وہ آجکل کی جدید حکمت سے بدرجہا اچھی تھی اس کا یہ اثر تھا کہ وہ لوگ تزکیہ روح اور صفائی نفس کی بہت کوشش کرتے تھے۔ اس کے لئے خلوت نشینی

اختیار کرتے تھے۔ دنیا سے ان کا دل بجھ گیا تھا لذات کو ترک کرتے تھے۔

افلاطون کی حکایت ہے کہ سالہا سال ایک پہاڑ پر رہا کرتا تھا کسی سے ملنا نہ تھا خدمت کے لئے صرف ایک شاگرد پاس رہتا تھا۔ جب کوئی افلاطون سے ملنا چاہتا تو اسی شاگرد کو حکم دیتا کہ اس شخص کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرو ظالم کو علم قیافہ میں ایسا صحیح حاصل تھا کہ تصویر سے پہچان لیتا تھا کہ اس شخص کے اخلاق و عادات کیسے ہیں یہ ملنے کے قابل ہے یا نہیں اگر ملنے کے لائق ہوتا تھا تو اندر آنے کی اجازت دیتا ورنہ صاف کہدیتا کہ تم ملنے کے قابل نہیں ہو چاہے کوئی بادشاہ ہوتا یا وزیر مالدار ہوتا یا رئیس کسی کی پرواہ نہ کرتا تھا حکماء کے استغنا کے واقعات بکثرت، ویسے ہی ہیں جیسے ہمارے اہل اللہ کے ہیں حتی کہ اگر وہ واقعات لکھ کر نام نہ ظاہر کیا جائے تو دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ یہ کسی ولی اللہ اور بڑے بزرگ کے واقعات ہیں۔ تو بات کیا تھی کہ موت کے خیال نے ان عقلاء کے دل کو دنیا سے سرد کر دیا تھا۔ دنیا کی طمع و حرص ان کے دل میں نہ رہی تھی اسی کا یہ اثر تھا کہ اہل دنیا سے ان کو پورا استغنا تھا وہ کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔

صاحبو! قاعدہ کی بات ہے کہ جب دنیا سے دل خالی ہو جاتا ہے تو پھر آخرت ہی ذہن میں آئے گی کیونکہ دل کا بالکل خالی رہنا تو ممکن نہیں کچھ نہ کچھ اس میں ضرور رہیگا تو موت کے استحضار سے جب دنیا دل سے نکل جائے گی تو آخرت کا خیال ضرور پیدا ہوگا۔ اس لئے اہل طریق کا قول صحیح ہے کہ فی الجملہ اصلاح کے لئے استحضار معاد اول بھی کافی ہے۔ اس پر شاید کسی کو یہ سوال ہو کہ حکماء کو تو ان کے دل سے تو دنیا نکل گئی تھی پھر ان کے ذہن میں آخرت کیوں نہ آئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آئی تھی مگر نا تمام کیونکہ صرف عقل سے تو آخرت کا علم ناقص ہی ہو سکتا ہے بس جو ٹوٹی پھوٹی معاد عقل سے معلوم ہوگئی تھی اسی پر جمے رہے علم تام و صحیح کے لئے انبیاء کے اتباع کی ضرورت تھی اور ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کا اتباع نہیں کیا گو تکذیب بھی نہیں کی بلکہ یہ کہتے تھے کہ "نحن قوم قد ہذبنا نفوسنا فلا حاجۃ لنا الی نبی یہذبنا" یعنی ہم لوگ اپنے نفوس کو مہذب بنا چکے ہیں۔

اس لئے ہم کو کسی بتانے والے کی ضرورت نہیں) ان لوگوں نے انبیاء کو محض جہلاء کے واسطے مانا تھا جیسا کہ یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کہا تھا کہ آپ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہیں مگر امیین کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں (یعنی جہلا عرب کے) ہمارے واسطے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں ہیں ہم تو خود صاحب کتاب ہیں، ہم کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے علماء نے اس کا خوب جواب دیا ہے کہ تم کو یہ تو تسلیم ہے کہ آپ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صدور کذب محال ہے تو اب جس کو خود اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی سے پوچھ لو نا کہ آپ فقط امیوں کے واسطے مبعوث ہوئے ہیں یا تمام عالم کے واسطے بس جو وہ فرمادیں اسی پر فیصلہ ہے۔ اس کا جواب یہود کے پاس کچھ نہیں تو ایسے ہی بعض حکماء نے انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کی ہے اور چونکہ عاقل تھے اس لئے تکذیب نہیں کی بلکہ ان کی نبوت کو تسلیم کیا۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے اور وہ آپ سے ملا بھی ہے اور کچھ سوالات بھی کئے ہیں منجملہ ان کے ایک سوال یہ مشہور ہے کہ بتلایئے کہ اگر اللہ تعالے تیر انداز ہوں اور فلک کمان ہو اور حوادث تیر ہوں تو ان سے بچ کر کہاں جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جا کھڑا ہو کیونکہ تیر اسی کے لگتا ہے جو تیر انداز سے دور ہو اور جو اس کے پہلو میں کھڑا ہو اس کے نہیں لگ سکتا۔ اس جواب پر افلاطون حیران ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ جواب نبی (علیہ السلام) کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ آپ بیشک نبی (علیہ السلام) ہیں مگر عوام کے واسطے ہمارے واسطے نہیں کیونکہ ہم نے تو اخلاق و علوم سے اپنے کو مہذب بنالیا ہے اب ہم کو اس سے زیادہ تہذیب کی ضرورت نہیں ہاں ان لوگوں نے انبیاء کی تہذیب کو دیکھا نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ جس کو ہم تہذیب سمجھے ہوئے ہیں وہ محض تعذیب ہے اور اصل تہذیب انبیاء علیہم السلام ہی کے پاس ہے۔ نیز انہوں نے انبیاء کے علوم کو حاصل ہی

نہیں کیا ہے ورنہ معلوم ہو جاتا کہ جن علوم پر ہم نازاں ہیں ان پر ناز کرنے کی حقیقت یہ ہے۔

چو آں کرمے کہ در سنگے نہاں است زمین و آسمان دے ہماں است

(مثل اس کیڑے کے جو پتھر میں پوشیدہ ہے اس کا آسمان اور زمین وہی پتھر کا سوراخ ہے)

ایسے لوگوں کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ کہ جو ذرا سا علم ان کے پاس ہے اسی پر اتراتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اس کے عموم میں حکماء بھی داخل ہیں بہر حال معلوم ہو گیا کہ حکماء کے دل سے بھی جب دنیا نکل گئی تھی تو آخرت ہی ان کے ذہن میں آئی تھی مگر جیسی ٹوٹی پھوٹی حقیقت ان کے پاس تھی ویسی ہی آئی اور ہم چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں تو ہمارے ذہن سے جب دنیا نکلے گی پھر آخرت کما حقہ صحیح طور پر ہمارے ذہن میں آئے گی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے آخرت کی صحیح اور تمام حالت ہم کو معلوم ہو چکی ہے۔ غرض نسخے متعدد ہیں چاہے معاد ثانی کا استحضار کر دیا معاد اول کا کسی کا تو خیال کر و مگر افسوس ہم کسی نسخہ سے بھی کام نہیں لیتے۔ اور اگر کسی کو موت کا استحضار بھی اس وجہ سے دشوار معلوم ہوتا ہو کہ وہ مستقبل ہے ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا اور معدوم کا تصور مشکل ہے تو میں آپ کو ایسے موجود کا تصور بتلاتا ہوں جس سے اس مستقبل کا تصور سہل ہو جاوے آپ اسی سے کام لیجئے وہ یہ کہ اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم، ایک روح ان میں سے ایک سفلی ہے ایک علوی ہے اور ہر ایک کا مبدا و معاد الگ ہے جسم تو سفلی ہے اور اس کا مبدا و معاد تو زمین ہی ہے چنانچہ یہ آیت بھی جو کہ میں نے تلاوت کی ہے اس کی دلیل ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ اور روح علوی ہے اس کا مبدا و معاد آسمان ہے وہ آسمان ہی سے آئی ہے اور مرنے کے بعد آسمان ہی پر چلی جاتی ہے کیونکہ روح سے مراد روح انسانی ہے جس سے ادراک معقولات ہوتا ہے۔ روح طبی مراد نہیں جو کہ دم سے متولد ہے۔

روح انسانی کو سفلی کوئی نہیں کہتا سب نے علوی مانا ہے یہ الگ اختلاف ہے کہ وہ مجرد ہے یا مادی۔ اگر مجرد ہے جیساکہ حکماء نے بھی کہا ہے کیونکہ جس چیز کو وہ نفس ناطقہ کہتے ہیں وہی روح انسانی ہے اور نفس ناطقہ کو ان لوگوں نے بھی مادی نہیں مانا بلکہ مجرد کہا ہے اور یہی صوفیہ کی بھی تحقیق ہے کہ روح مجرد ہے تب تو علوی بایں معنی ہے کہ فوق الاجسام ہے اور یہی محمل ہوگا صوفیہ کے نزدیک روح کے فی السماء ہونے کا جیساکہ یہی محمل ہے علماء ظاہر کے نزدیک بھی احادیث کون اللہ فی السماء کا۔ اور اگر مادی ہے جیساکہ متکلمین کا قول ہے کہ انہوں نے اسے جسم مانا ہے مگر جسم علوی لطیف۔ تب وہ علوی بایں معنی کہ اس کا جز عالی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ روح کے علوی ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور ہم کو سب سے کیا لینا کوئی بھی نہ مانے تو کیا جب کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ روح کا مبداء و معاد آسمان ہے معاد ہونا تو صراحۃً اور مبداء ہونا قیاساً چنانچہ حدیث میں روح کی حالت وارد ہے۔

"حتی تخرج ثم یعرج الی السماء فیفتح لها الی قوله حتی تنتھی الی السماء التی فیھا۔ الحدیث (مشکوٰۃ عن ابن ماجہ) یعنی جب آدمی مرتا ہے تو فرشتے اس کی روح کو آسمان پر لے جاتے ہیں اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ روح کا معاد آسمان ہے اور مبداء ہونا اس طرح معلوم ہوا کہ موت کے بعد جسم کے لئے دفن کا حکم دیا گیا ہے جس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو اصل کی طرف لوٹادینا مقصود ہے۔ جب جسم کا مبداء زمین تھی اور اس کو جسم کا معاد بنایا گیا اور روح کے لئے آسمان پر لے جانا بتلایا جس سے معلوم ہوا کہ آسمان معاد روح ہے اور یہ بھی معلوم ہوچکا کہ معاد اسی کو بنایا ہے جو مبداء تھا تو معلوم ہوا کہ آسمان ہی روح کا مبداء بھی ہے پس جسم کا مبداء و معاد تو زمین ہوئی اور روح کا مبداء و معاد آسمان ہوا۔ اور موت کے بعد روح کا آسمان کی

طرف جانا جس طرح حدیث مذکور سے ثابت ہے اسی طرح قرآن سے بھی مفہوم ہوتا ہے
چنانچہ کفار کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ
الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ یعنی ان کے لئے آسمان کے دروازے
نہ کھولے جائیں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں ان کی بھی آسمان پر جانا چاہتی ہیں
مگر ان کو دھکے دیدیئے جائیں گے پس یہ دعویٰ بھی ثابت ہو گیا کہ آسمان روح کا مبداء و معاد
ہے اور آسمان و زمین دونوں اس وقت سامنے موجود ہیں تو ان کو اس نظر سے دیکھتے رہنا
معاد مستقبل کے استحضار کو سہل کر دیتا ہے اور اب مناسبت مقام سے استطراداً ایک
تو اس پر شیخ اکبر نے یہ تفریع کی ہے کہ عالم آخرت اس وقت موجود ہے تفصیل اس کی یہ ہے
کہ عالم آخرت کے دو جزء ہیں ایک زمان آخرت جس میں جزا سزا شروع ہو جاوے اور
اعمال کا صلہ مل جاوے وہ تو بعد میں آئے گا اور ایک مکان آخرت وہ اس وقت بھی
موجود ہے یعنی آسمان اور عالم بالا چنانچہ آسمان کا موجود ہونا تو مشاہد ہے اور احادیث
سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ساتویں آسمان پر ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ جنت موجود
ہے تو معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت موجود ہے اس تحقیق سے بہت سے اشکالات
سہولت کے ساتھ حل ہو گئے مثلاً ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کو شب معراج میں رویت حق کیونکر ہوئی جبکہ دنیا میں رویت حق محال عادی ہے
اس تحقیق کے بعد جواب آسان ہو گیا کہ آپ کی رویت دنیا میں نہ تھی بلکہ عالم آخرت
میں تھی کیونکہ مکان آخرت اب بھی موجود ہے اس پر شاید یہ اشکال ہو کہ گو آپ
اس وقت مکان آخرت میں تھے مگر آپ کی حیات تو دنیوی تھی پھر حیات دنیویہ
رویت کی کیسے متحمل ہوئی اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ جیسے زمان آخرت میں یہ خاصیت
ہے کہ اس وقت تحمل رویت ہو جائے گا ایسے ہی مکان آخرت میں بھی یہ خاصیت ہے
کہ جو وہاں پہنچ جائے اس میں تحمل رویت پیدا ہو جاتا ہے گو وہ حیات دنیویہ ہی سے
متلبس ہو آخرت کے مکان و زمان دونوں کی خاصیت دنیا سے الگ ہے اور
یہاں سے زنادقہ یا بیدینوں کے بیہودہ تمسخر کا بھی جواب ہو گیا جو وہ اہل سنت کے اس عقیدہ پر

کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود بتایا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر وہ آسمان پر زندہ ہیں تو کھاتے کہاں سے ہیں اور ہگتے موتتے کہاں ہیں اسی قسم کی بے ہودہ باتیں بکتے رہتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ عالم آخرت کی خاصیت سے دنیا کی خاصیت بدل ہے، وہاں کھانا پینا ایسا ہضم ہو جاتا ہے کہ فضلہ بالکل نہیں رہتا جیسا کہ اہل جنت کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ وہ ہگنے موتنے سے پاک ہوں گے بس کھانا کھا کر ان کو مشک جیسا خوشبودار پسینہ آئے گا اور کچھ نہ ہوگا گویا فضلہ اتنا کم ہوگا کہ پسینہ ہی کی راہ سے نکل جائے گا ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کو صرف پسینہ آجاتا ہوگا اور کچھ ضرورت نہ ہوتی ہوگی۔ رہا یہ کہ کھاتے کہاں سے ہیں اس کا جواب ظاہر ہے کہ جنت آسمان ہی پر ہے ممکن ہے کہ وہاں سے فرشتہ کے ذریعہ سے ان کے لئے غذا پہنچتی ہو اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ عیسیٰؑ کو بھوک پیاس ہی نہ لگتی ہو خدا تعالیٰ بدون غذا کے بھی تو زندہ رکھ سکتے ہیں کیونکہ جس نے غذا میں قوت ابقاء رکھی ہے وہ بدون غذا کے بھی اس قوت کو پیدا کر سکتا ہے اگر قوت ابقاء کے لئے غذا کا واسطہ ضروری ہے تو خود غذا میں جو قوت ابقاء ہے کیا اس کے لئے بھی غذا کا واسطہ ہے تو پھر غذا کے لئے غذا لازم آئے گی پھر اس میں بھی ہم کلام کریں گے اسی طرح سلسلہ چلتا رہا کہ ہر غذا کے لئے دوسری غذا کا واسطہ بنایا گیا تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا پس لامحالہ کسی جگہ یہ کہنا پڑے گا کہ اس غذا میں قوت ابقاء بلا واسطہ پیدا ہوئی ہے معلوم ہوا کہ اس قوت کے لئے غذا کا واسطہ لازم نہیں، حق تعالیٰ بلا واسطہ غذا بھی اس قوت کو پیدا کر سکتے ہیں پھر اگر عیسیٰ علیہ السلام میں اسی طرح یہ قوت پیدا کر دی گئی ہو تو کیا استحالہ ہے پھر دنیا میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ بعض لوگوں کو بدون غذا کے ہفتوں اور مہینوں زندہ رکھتے ہیں چنانچہ مریض بعض دفعہ مہینہ بھر تک کچھ نہیں کھاتا اور زندہ رہتا ہے۔ اب یہاں تاویل کی جاتی ہے کہ اس مریض کے جسم میں رطوبات فضلیہ بہت پیدا ہو گئے ہیں سو وہ ان کے تحلیل میں مشغول ہے اس لئے بھوک نہیں لگتی اور نہ حیات پر کچھ اثر پڑتا ہے۔ مگر یہ محض بات کا بنانا اور تاویل گھڑنا ہے میں کہتا ہوں کہ تندرست آدمی تو مریض سے زیادہ مرطوب

ہوتا ہے ۔غریب بیمار جس کا چہرہ بھی زرد اور ہاتھ پیر بھی لاغر ہو جاتے ہیں جو قلت دوران خون کی علامت ہے کیا ہٹے کٹے سرخ و سپید رنگ والے سے زیادہ مرطوب ہو سکتا ہے ۔ ہرگز نہیں پھر ذرا کوئی تندرست تو مہینہ بھر بھوکا رہے کہ غذا کا دانہ بھی اس کے حلق میں نہ جانے پائے جس طرح بیماروں کو اس طرح کئی ہفتہ اور مہینہ بھر گذر جاتا ہے ۔ تندرست تو یقیناً ہلاک ہو جائے مگر بیماروں کو حق تعالیٰ اپنی قدرت سے بدون غذا کے زندہ رکھتے ہیں تو کیا جس نے مہینہ بھر بدون غذا کے زندہ رکھا وہ اس سے زیادہ مدت تک بغیر غذا کے زندہ رکھنے پر قادر نہیں ضرور قادر ہے ۔

اور اگر یہ بھی سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھو کہ غذا کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری ایک باطنی ، جس طرح غذا ظاہری سے قوت و حیات باقی رہتی ہے اسی طرح کبھی غذائے باطنی بھی اس کی قائم مقام ہو جاتی ہے ۔

چنانچہ دنیا میں صوفیہ کے واقعات بکثرت اس قسم کے منقول ہیں کہ وہ مہینوں محض ذکر اللہ پر اکتفا کرتے تھے ۔ اور بہت دنوں کے بعد کھانا کھاتے تھے ۔

حضرت شیخ علی صابر کلیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حکایت متواتر اور مشہور ہے کہ زندگی بھر میں ان کے پیٹ کے اندر چند سیر سے زیادہ غذا نہیں پہنچی اور اس پر قوت کی یہ حالت کہ حضرات صوفیہ کی عمریں عام آدمیوں سے طویل ہوتی ہیں آخر یہ کس چیز کی طاقت تھی محض ذکر الٰہی کی کہ وہ ان کے لئے غذا کا قائم مقام بن گیا تھا اس لئے ان کو غذا کی بہت کم ضرورت ہوتی تھی اور باوجود تقلیل غذا کے ان کی قوت میں کمی نہ آتی تھی تو ممکن ہے کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے لئے یہی غذائے باطنی ظاہری غذا کے قائم مقام بن گئی ہو اور چونکہ عالم آخرت کی خاصیت دنیا کی خاصیت سے الگ ہے تو ممکن ہے کہ یہاں اگر غذائے باطنی مہینہ بھر یا چالیس دن تک غذائے

ظاہری کی قائم مقام ہوتی ہے تو وہاں برسوں اور مدت دراز تک اس کے دائم معدام ہو جاتی ہو۔ آخر اس میں استحالہ کیا ہے۔

بہر حال شیخ کی اس تحقیق نفیس سے بہت سے اشکالات کا حل ہو گیا اور اس عالم آخرت کا تصور بالفعل بھی آسان ہو گیا کیونکہ عالم آخرت باعتبار مکان کے اس وقت بھی موجود ہے۔ پس یہاں دو تصور ہوئے ایک روح کے مبدأ و معاد یعنی آسمان کا کہ وہ آخرت ہے، دوسرے جسم کے مبدأ و معاد کا کہ وہ زمین ہے اور یہ دونوں ہر وقت پیش نظر ہیں جس سے تصور میں کوئی تکلف ہی نہیں کرنا پڑتا۔ پس اسی طرح تصور لیں گے کہ روح کا مبدأ و معاد سر کے اوپر ہے ایک دن روح جسم سے الگ ہو کر اوپر چلی جائے گی اور جسم کا مبدأ و معاد زمین ہے ایک دن یہ روح سے الگ ہو کر مٹی میں مل جائے گا۔ اور زمین کا جسم کے لئے مبدأ و معاد ہونا قرآن کا جس طرح مدلول ہے اسی طرح مشاہد بھی ہے۔

چنانچہ معاد ہونا تو بہت ہی ظاہر ہے، رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے کہ بہت سے بدن مرنے کے بعد پیوند زمین ہو گئے ہیں۔ باقی مبدأ ہونا اس طرح ہے کہ جسم انسان کی ترکیب عناصر اربعہ سے ہے جس میں غلبہ تراب کو ہے اور تراب کا جزء ارض ہونا ظاہر ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل مادہ جسم انسانی کا ارض ہی ہے۔ اسی طرح سے اس کا مبدأ زمین ہے۔

دوسرے انسان کا جو مادہ ہے یعنی نطفہ وہ ابھی غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ باپ ماں قسم قسم کی غذائیں کھاتے ہیں جن سے ان کے بدن میں خون پیدا ہوتا ہے اور اس خون کے جوہر سے نطفہ بنتا ہے۔ پھر نطفہ سے اولاد ہوتی ہے پس یہ کہنا صحیح ہے کہ انسان کا مبدأ زمین ہے کیونکہ یہ غذائیں سب زمین ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جس طرح زمین میں نباتات کا تخم موجود ہے اسی طرح حیوانات اور انسان کا تخم بھی زمین ہی کے اندر موجود ہے۔ دیکھئے زمین کے بعض اجزاء سے درختوں کے پتے بنتے ہیں اور اسی کے بعض اجزاء سے لکڑی بنتی ہے۔

اور بعض اجزاء لطیف سے انار کا دانہ اور انگور اور سیب اور مٹھائی کھٹائی اور تمام اقسام کے مزے بھی بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان سب کی اصل زمین کے اندر ہے۔ جبھی تو ثمرات میں ان کا ظہور ہوتا ہے اسی طرح زمین کے اندر ایسا تخم بھی ہے جس سے نطفہ بنتا ہے جو انسان کی اصل ہے تو زمین کے اندر انسان کا بھی تخم موجود ہوا۔ اسی طرح زمین میں چاندی سونے کی بھی اصل موجود ہے، یاقوت اور عقیق وغیرہ کی اصل بھی موجود ہے۔ مگر چاندی پھلوں کی ایسی اصل کو نکال کر اور ان کو ترکیب دے کر پھل ظاہر کر دیتے ہیں پس وہ زمین کے اجزار میں سے انار کی اصل کو الگ نکال لیتے ہیں وہ انار ہی میں پہنچتی ہے اور انگور وغیرہ کی اصل کو جدا نکال لیتے ہیں اس کا انگور بن جاتا ہے ایسے ہی وہ زمین کے اجزار میں سے انسان کی اصل کو جدا نکال کر نطفہ بنا دیتے ہیں جس سے دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ غرض زمین ہی کے اندر تمام اشیار کی اصل ہے جن کو حق تعالیٰ ترکیب خاص سے الگ الگ نکال لیتے رہتے ہیں کہیں خوشبو کی اصل کو نکال کر چنبیلی بیلا گلاب میں ظاہر کر دیتے ہیں کبھی مٹھاس کی اصل کو الگ کر کے گنے اور انگور سیب وغیرہ میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہاں سے اس حدیث کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی ہو گی جس میں وارد ہے کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کو جنت میں جانے کے ساتھ ہی پہلے زمین کی روٹی کھلائیں گے۔ اس پر ملاحدہ نے اعتراض کیا ہے کہ زمین کی روٹی کیسی ہو گی کیا مسلمانوں کو ڈلے پتھر کھلائے جائیں گے۔ صاحب ڈلے پتھر تو ان کو ہی ملیں گے ہم کو تو جوہر ارضی ملیگا یعنی یہ تو معلوم ہو گیا کہ تمام لذائذ اور ہر قسم کے مزے زمین ہی کے اندر موجود ہیں سو جس طرح اس وقت حق تعالیٰ ہر مزے کو الگ الگ پھلوں میں نکال کر دیتے ہیں اس وقت تمام مزے دار چیزوں کی اصل نکال کر اس کا مزہ بنایا جائے گا وہ جوہر ارض ہو گا اس میں گیہوں، چنا، انگور، بادام، انار، سیب اور ہر قسم کی لذیذ چیزوں کا مزا موجود ہو گا۔ اس کی روٹی بنا کر مسلمانوں کو کھلائی جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس وقت آپ جو گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں یہ کس چیز کی روٹی ہے صاحب یہ بھی تو زمین ہی کی روٹی ہے۔ آٹا بھی تو زمین ہی کے اجزار سے بنتا ہے۔

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں

جس کو گیہوں میں الگ کر کے کھاتے ہیں، اور گیہوں یہ کہاں سے آیا تھا اسی مٹی میں سے چنانچہ ایک دانہ زمین میں ڈالتے ہو وہ زمین کی مٹی اور پانی کے بہت اجزا کو کھینچکر پرورش پاتا ہے اور اسی ایک دانہ کے ہزاروں دانے ہو جاتے ہیں مگر چونکہ اس وقت وہ مٹی کی شکل میں نہیں رہی بلکہ صورت بدل گئی ہے اسی لئے یہ نہیں کہا جاتا کہ مٹی کھا رہے ہیں مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو آپ رات دن مٹی ہی کھاتے ہیں کیونکہ وہی رنگ بدل بدل کر ہر غلہ اور ترکاری اور پھل پھلواری میں ظاہر ہوتی ہے پس سمجھ لو کہ حق تعالیٰ قیامت میں زمین کے انہی عمدہ اجزا کو جنہیں آجکل تم بہت شوق سے کھاتے ہو یکجا جمع کر کے مسلمانوں کو کھلائیں گے پھر اس کو ڈلے پتھر اور مٹی کہنا کیونکر صحیح ہے اور حقیقت کے اعتبار سے کہو تو آجکل جتنی بھی چیزیں تم کھاتے ہو وہ سب بھی مٹی ہی ہیں، اور صورت کے اعتبار سے جیسے یہ مٹی نہیں اسی طرح وہ بھی مٹی نہ ہوگی بلکہ صورت اور مزے میں آجکل کی غذاؤں سے وہ بہت زیادہ خوشنما اور الذ ہوگی۔ کیونکہ اس میں تمام لذائذ کے مزے اور سب کے رنگ موجود ہونگے۔ اب یہ سوال رہا کہ یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ روٹی ڈلے پتھروں اور مٹی کی نہ ہوں گی بلکہ زمین کے ماکول اجزا کا جوہر اور ست ہوگا لیکن مسلمانوں کو جوہر کھلایا جائے گا اس میں حکمت کیا ہے اور جنت کے اغذیا کے ہوتے ہوئے اجزا ارضیہ جو اس سے بدرجہا کم درجہ ہے کھلانے کی مصلحت کیا ہے سو حکمت بھی سنئے اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد چونکہ دنیا کی لذیذ چیزوں کے مزے کچھ تو طول مدت کی وجہ سے اور کچھ ہول محشر کی وجہ سے لوگوں کو یاد نہ رہے ہوں گے تو اس وقت مسلمانوں کو تمام ماکول اجزا کا جوہر کھلا کر جو کہ ہر ماکول کے الگ الگ کھانے سے زیادہ لذیذ ہوگا یہ بتلا دیا جائیگا کہ دیکھو دنیا کی لذائذ کا تو یہ منتہی اور خلاصہ ہے جس میں سب قسم کے مزے موجود ہیں اگر بھول گئے ہو تو ان کو چکھ لو اور دنیا کی لذتوں کو یاد کر لو۔ اس کے بعد جنتوں کی نعمتوں کے مزے چکھو کہ وہ کس درجہ لذیذ اور لذائذ دنیا سے کتنی بڑھی ہوئی ہیں پس خلاصہ لذائذ دنیا کھا کر اور سب کے مزے یاد کر کے جب وہ جنت کی چیزیں کھائیں گے اور ان میں اُن میں زمین آسمان کا فرق دیکھیں گے اس وقت ان کو نعمائے جنت کی پوری قدر ہوگی تو یہ حکمت ہوگی اس جوہر کے کھلانے میں تاکہ

نعمائے جنت کی پوری قدر ہو دوسرے یہ حکمت بھی ہوگی کہ دنیا میں بعض اللہ کے بندوں نے یا تو بوجہ غربت و افلاس کے یا بوجہ ترک لذات اور مجاہدات کے سب قسم کے مزے نہیں چکھے بعضوں نے عمر بھر بھی انگور و سیب نہیں کھایا ہوگا چنانچہ میرے ایک مخدوم نے مجھ کو خربزہ کی ایک قاش دی اور خود بھی کھائی اور کہنے لگے آج سترہ برس کے بعد خربزہ کھا رہا ہوں یہ تو معمولی لذائذ کا حال ہے اور جو لذتیں بادشاہوں اور امیروں کو عجیب و غریب نصیب ہوتی ہیں وہ تو ان بیچاروں کو کہاں نصیب۔ تو حق تعالیٰ ان مقبول بندوں کو اول زمین کا جوہر کھلائیں گے تاکہ جنت میں جانے سے ہر قسم کی لذائذ کا مزہ ان کو معلوم ہو جائے۔ پھر جنت کی نعمتوں کو چکھ کر اندازہ کریں کہ یہ دنیا کی لذتیں ان کے سامنے کیا ہیں کچھ بھی نہیں اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ جنت میں جاکر ان کو یہ وسوسہ نہ آسکے گا کہ دنیا کی لذات سے ہم محروم ہیں یا جن کے ہم تارک رہے تھے معلوم نہیں وہ کیسی ہوں گی تو پہلے سب چیزیں انہیں کھلادی جائیں گی تاکہ یہاں کی ہر لذّت کا خوب ادراک ہو جائے تو پھر ان کے متعلق نعمائے جنت کی مساوات کا وسوسہ نہ آسکے گا۔ تو اصل دعوت تو ان خاص بندوں کی ہوگی مگر کریموں کی عادت ہے کہ مہمانوں کے طفیل میں نوکروں اور دربانوں کو بھی دعوت کے دن پلاؤ زردہ جو کچھ پکتا ہے دیدیتے ہیں اس طرح طفیل میں ہم کو بھی وہ جوہر کھلا دیا جائے گا خیر یہ تو درمیان میں ایک حدیث کے رفع اشکال کے طور پر گفتگو ہوگئی تھی۔

اصل میں یہ مضمون بیان کر رہا تھا کہ زمین جسم انسانی کا میدا بھی ہے۔ جیسا کہ اس تقریر سے معلوم ہو گیا اور معاد تو ہے ہی اور آسمان روح انسانی کا میدا و معاد ہے اور یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ انسان بیچارہ کیسی کشاکشی میں ہے کہ اس کی ایک ٹانگ تو زمین میں ہے اور ایک آسمان پر ہے۔ روح تو اس کی سماوی ہے اور جسم ارضی ہے ایک جزو تو آسمان پر جاتا چاہتا ہے اور ایک جزو زمین پر رہنا چاہتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا ایک جزو اسی وقت آسمان پر اور دوسرا زمین پر ہے کیونکہ روح حقیقی اب بھی آسمان ہی پر ہے وہ بدن میں حلول کئے ہوئے نہیں ہے بلکہ اوپر ہی سے بدن کی تدبیر کر رہی ہے اور جو روح انسان کے اندر ہے وہ روح اصلی نہیں ہے بلکہ نسمہ ہے جو بدن انسانی

میں حلول کئے ہوئے ہے صوفیہ نے اس کو نسمہ کہا ہے اور انہوں نے کشف سے معلوم کیا ہے کہ یہ روح حقیقی نہیں بلکہ ایک جسم لطیف ہے جو اس جسم کثیف میں حلول سریانی کئے ہوئے ہے جیسے جسم تعلیمی جسم طبعی میں حال ہوتا ہے گو جوہریت وعرضیت کا تفاوت ہے طلبہ اس کو سہولت سے سمجھ لیں گے اور یہ بھی کشف سے معلوم کیا ہے کہ وہ اسی جسم کی صورت پر ہے (غالباً مرنے کے بعد وہی آسمان کی طرف لیجائی جاتی ہے) اور روح حقیقی حال فی الجسم نہیں ہے بلکہ وہ جوہر مجرد عن المادہ ہے جس کو مادی سے حلول کا کچھ علاقہ نہیں صرف تدبیر وتصرف کا علاقہ ہے وہ آسمان سے بھی فوق ہے۔ اور اس کو سماوی بمعنی علوی کہا جاوے گا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے۔ اور اس فوق السماء ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آسمان سے اوپر کسی مکان میں ہے کیونکہ مجرد کے لئے مکان نہیں ہوسکتا بلکہ صوفیہ کا اسے فوق السمٰوات کہنا یہ اس کے لامکانی ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ فوق السمٰوات مکان نہیں ہے تو فوق السماء ہونا لامکانی ہونا ہے اسی لئے استوار علی العرش کی ایک تفسیر یہ بھی کی ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کے لامکانی ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عرش منتہائے امکنہ ہے تو حق تعالیٰ کا عرش فوق ہونا لامکانی ہونا ہے (پس اس تفسیر پر استویٰ علی العرش کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ مکان اور مکانیات کو پیدا کر کے ان میں مقید نہیں ہوا بلکہ لامکانی ہی رہا اور یہ مراد نہیں کہ پیدا کرنے کے وقت مکان یا مکانیات سے کچھ تلبس ہو گیا تھا پھر تنزہ عن المکان ہو گیا جیسا کہ لفظ "ثم استویٰ" میں ثم سے ظاہراً شبہ ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس طرح پہلے استوی علی العرش سے موصوف تھے اسی طرح بعد میں بھی رہے ثم کے یہ معنی ہیں یعنی پھر بھی وہ استویٰ ہی رہا۔ (واللہ اعلم۔ جامع) اور متکلمین نے روح حقیقی کو نہیں سمجھا وہ نسمہ ہی کو روح حقیقی کہتے ہیں اور صوفیہ نے جو روح حقیقی کو مجرد کہا ہے اس پر بعض متکلمین نے ان کی تکفیر کی ہے حالانکہ اس میں کوئی بھی تکفیر کی بات نہیں صوفیہ کو ایک چیز نسمہ کے سوا کشف سے معلوم ہوئی وہ اس کے قائل ہو گئے متکلمین کی نظر وہاں تک نہیں پہونچی وہ قائل نہ ہوئے مگر اس کے کیا معنی کہ وہ صاحب مشاہدہ کو کافر کہیں گے متکلمین کے اس حکم کی بنا یہ ہے کہ انھوں نے تجرد کو حق تعالیٰ کے لئے

کی خاص صفت مانا ہے پس مجرد سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں ہو سکتا اور صوفیہ ارواح کو بھی مجرد مانتے ہیں لہذا وہ شریک باری کے قائل ہوئے اور یہ کفر ہے مگر یہ دلیل نہایت مخدوش ہے اس لئے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ تجرد اخص صفات واجب ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ واجب کے اخص صفات کی تحقیق تو بہت دور ہے خود ممکنات کی صفات کے حقائق بھی جو کچھ کسی نے بیان کئے ہیں وہ قطعی نہیں ہیں حکما اور منطقین خود اقرار کرتے ہیں کہ جنس کو عرض عام سے اور فصل کو خاصہ سے بہت اشتباہ ہے پس ممکن ہے کہ جس کو ہم نے فصل سمجھا ہے وہ حقیقت میں خاصہ ہو اور جس کو ہم جنس کہتے ہیں واقع میں وہ عرض عام ہو جب ہمارے علم کی ممکنات کے بارہ میں یہ حالت ہے تو صفات واجب میں اس کا نقص ظاہر ہے پس کسی کو حق نہیں کہ واجب کے لئے کسی خاص صفت کو مابہ الامتیاز قرار دیکر دوسروں کی تکفیر کرنے لگے چنانچہ صوفیہ نے متکلمین کی اس رائے کو تسلیم نہیں کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ تجرد کا واجب کے لئے نقص صفات ہونا مسلم نہیں بلکہ اقرب یہ ہے کہ وجوب بالذات یہ اخص صفات واجب ہے پس غیر واجب کو مجرد ماننے سے شرک و کفر لازم نہیں آتا البتہ کفر اس وقت لازم آتا ہے جبکہ روح کو مجرد مان کر اس وقت کو واجب و قدیم بھی مانا جاوے اور یہاں ایسا نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک مجرد بھی حادث ہو سکتا ہے ہمارے نزدیک ارواح مجرد بھی ہیں اور حادث بھی ہیں واجب اور قدیم نہیں ہیں۔

بہر حال صوفیہ کے قول پر تو انسان کی ایک ٹانگ آسمان پر اور ایک زمین پر ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ تو روح حقیقی کو حال فی الجسم نہیں مانتے بلکہ فوق السموات کہتے ہیں اور متکلمین کے قول پر بھی ظاہر ہے کیونکہ گو ان کے نزدیک روح بدن میں حلول کئے ہوئے ہے مگر اس کا علوی ہونا اور طالب سموات ہونا ان کو بھی مسلم ہے کیونکہ وہ روح کو مثل ملائکہ کے جوہر کے مادی لطیف کہتے ہیں جس کا مبدا و معاد عالم ناسوت نہیں بلکہ عالم ملکوت ہے۔ پس انسان عجیب کشمکش میں ہے کبھی جسمیت کا غلبہ اس پر ظاہر ہوتا ہے کبھی روحانیت کا غلبہ جسمیت کے وقت اس سے اعمال سفلیہ صادر ہوتے ہیں۔ (معاصی وغیرہ) اور غلبہ روحانیت کے وقت اعمال علویہ ظاہر ہوتے ہیں (یعنی طاعات

وغیرہ) اور یہاں سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ سالک کو کسی وقت مطمئن اور بے فکر ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ جب تک جسم و روح کا تعلق باقی ہے اس وقت تک دونوں میں کشاکشی ضرور باقی ہے گو مجاہدہ کے بعد سخت کشاکشی تو نہیں رہتی مگر بالکل زوال بھی نہیں ہوتا اس لئے مجاہدہ کی ہر وقت ضرورت ہے گو مجاہدہ کاملہ کے بعد پہلی جیسی ضرورت تو نہیں رہتی مگر استغنا بھی نہیں ہو جاتا کیونکہ جب تک ضدین کا اجتماع باقی ہے اور ہر ضد دوسرے پر غالب ہونا چاہتی ہے اس وقت تک مجاہدہ کی ضرورت ناگزیر ہے۔ بس زندگی میں تو انسان کی یہ حالت ہے ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما

(کبھی تو فرشتہ رشک کرتا ہے ہماری پاکی پر کبھی شیطان ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے)

ایماں چو سلامت بلب گور بریم احسنت بریں چستی و چالاکی ما

(جب ایمان سلامتی سے ہم قبر میں لیجائیں گے تو اپنی دینی ہمت اور چستی پر شاباشی دیں گے)

واقعی ایمان پر خاتمہ ہو گیا تو اس دن بیفکری ہو گی۔ اور اس دن مجاہدہ کی کامیابی ظاہر ہو گی ورنہ زندگی بھر تو یہی کشاکش لیل و نہار باقی ہے۔ یہ بیچ میں چند لطیفے استطراداً میں نے بیان کر دیئے ہیں اب اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم ایک روح اور ہر ایک کا ایک مبدا و معاد ہے جس کے استحضار سے غفلت کم ہو جاتی ہے اور غفلت ہی ہمارے امراض کی جڑ ہے تو حق تعالیٰ نے ہم کو اس جگہ بتلایا ہے کہ تمہارے اندر جو ایک جزء جسم کا ہے اس کا مبدا و معاد زمین ہے جس کا مشاہدہ آسمان کے مشاہدہ سے اکثر و ایسر ہے تم اسی میں غور کر لو تو تمہارے دن بھلے ہو جائیں گے۔ یہ بھی کتنی شفقت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو آسمان کا مراقبہ تعلیم نہیں کیا کیونکہ وہ ہم سے دور ہے پھر ہر وقت آسمان کی طرف نظر کرنا اور غور کرنا بھی دشوار ہے اور زمین ہر وقت ہم سے قریب ہے اور اس پر ہر دم نگاہ پڑتی ہے تو بتلا دیا کہ تم زمین پر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے لیٹتے اس کا تصور کیا کرو کہ ہم زمین ہی سے پیدا ہوئے ہیں تو ہماری اصل خاک ہے لہذا ہم کو خاک بن کر رہنا چاہیئے مٹی ہو کر تکبر کرنا نہایت ہی نازیبا ہے۔ پھر آخر میں بھی ہم مٹی ہی میں ملنے والے ہیں۔ یہ جسم سب خاک خوردہ ہو جائے گا اور ایک دن ہم زمین کے اوپر سے اس کے اندر

پہونچ جائیں گے تو اس کے لئے ہم کو ایسے اعمال کرنا چاہئیں جو اس وقت کارآمد ہوں حقیقت میں اس مراقبہ کو اصلاح حال میں بہت ہی تاثیر ہے۔ اس جگہ بجائے مراقبہ سمٰوات کے (جو کہ روح کا مبدا و معاد ہے) مراقبہ زمین کی تعلیم فرمانے کا ایک نکتہ تو یہ تھا کہ زمین ہم سے بہ نسبت آسمان کے اقرب ہے۔ اور ایک نکتہ اس میں اور ہے وہ یہ کہ اس جگہ اوپر سے موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا ذکر ہے جو فرعون کے ساتھ ہوئی تھی چنانچہ اوپر ارشاد ہے۔" قال فمن ربکما یا موسیٰ "یعنی فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ تم دونوں کا یعنی موسیٰ و ہارون علیہ السلام کا رب کون ہے اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ربنا الذی اعطیٰ کل شئی خلقہ ثم ھدی یہاں بھی ایک عجیب لطیفہ ہے وہ یہ کہ فمن ربکما کے بعد مقتضیٰ ظاہر یہ تھا کہ یا موسیٰ و ہارون کہا جاتا جب فمن ربکما الخ میں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے تو ندا میں بھی دونوں کو خطاب ہونا چاہیئے مگر حق تعالےٰ نے صرف "یا موسیٰ" فرمایا ہے اس کی کیا وجہ ہے یہ وہ باتیں ہیں کہ ان کا کشف ہونے لگے تو آدمی قرآن کے لفظ پر ناچنے لگے لوگ ڈھولکی اور ستار پر کیا ناچتے ہیں واللہ قرآن کا لفظ لفظ نچا دینے والا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ فرعون کا اصل روئے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی طرف تھا انہی کی طرف متوجہ ہو کر بات کر رہا تھا ہارون علیہ السلام سے تبعاً خطاب تھا نہ کہ اصالتاً اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے موسیٰؑ کو تربیت کیا تھا جس کا عجیب قصہ ہے اور اس سے خدا تعالےٰ کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے واقعہ یہ ہے کہ فرعون سے نجومیوں نے بطور پیشین گوئی کے کہدیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کے زوال کا سبب ہوگا۔ فرعون نے اس حکم کے بعد حکم کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا بھی پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ ان سے خطرہ نہ تھا دوسرے خدمتگاری کے واسطے ان کو ماما بنا کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ بہرحال بنی اسرائیل کے بچے قتل ہونے لگے اسی زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے ان کی والدہ کو فکر ہوئی کہ اب یہ بھی قتل ہوں گے حق تعالےٰ نے ان کو الہام کیا کہ ایک صندوق میں بند کر کے اُن کو دریا میں

ڈال دو ہم ان کو بچالیں گے پھر ان کو تمہارے پاس ہی پہنچا دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور زیادت احتیاط کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے فرمایا کہ تو کنارہ کنارہ صندوق کو دیکھتی ہوئی چلی جا اور معلوم کر کہ یہ کہاں پہنچتا ہے اور اسے کون اٹھاتا ہے وہ دور سے دیکھتی ہوئی چلتی رہی تھیں کہ صندوق فرعون کے محل سے نیچے کو گذرا کیونکہ وہ دریا اس کے محل سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس وقت فرعون معہ اپنی بی بی کے محل کے نیچے کنارۂ دریا پر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے صندوق بہتا ہوا آیا تو اس نے اس کے نکالنے کا حکم دیا۔ جب صندوق اس کے سامنے لاکر رکھا گیا اور اس نے کھولا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نظر پڑی جو اپنا انگوٹھا چوس رہے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے ایسا حسین بنایا تھا کہ ہر شخص کو صورت دیکھنے سے اُن پر محبت آتی تھی چنانچہ ارشاد بھی ہے "وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ" اور تجلی طور کے بعد تو یہ کیفیت ہوئی کہ کسی کو نگاہ بھر کر آپ کا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ تھی اور جو دیکھ لیتا اس کی بینائی زائل ہو جاتی غرض آپ اس درجہ حسین تھے کہ بس دیکھتے ہی فرعون کو بے اختیار محبت آئی اور ان کو نکال کر گود میں لے لیا اور چومنے لگا۔ اس کے بعد پھر نجومیوں کی پیشین گوئی کا خیال آیا اور کھٹکا پیدا ہوا کہ یہ بچہ کہیں وہی نہ ہو اور قتل کا ارادہ کیا مگر اس کی بی بی حضرت آسیہ نے سفارش کی کہ اس سے کیا خطرہ اول تو یہی معلوم نہیں کہ یہ بنی اسرائیل سے ہے یا نہیں اور ہو بھی تو ہم اپنی حفاظت میں پرورش کریں گے، ہاتھ تلے رہے گا تو کیا خوف ہے۔ پھر ایسے خوبصورت بچہ کا قتل کرنا بھی دل کو گوارا نہیں فرعون کو خود بھی محبت آ ہی چکی تھی اس لئے ذرا سی سفارش پر اپنے خیال سے رک گیا اور موسیٰ علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنا کر پالنا شروع کیا اب وہ شاہی فرزند کہلانے لگے اور دشمن کے ہاتھوں سے پلنے لگے خدا تعالےٰ نے کیسی اپنی قدرت ظاہر کی کہ لے کمبخت تو کہاں تک تدبیریں کرے گا ہم تیرے ہی ہاتھ سے دشمن کو پلوائیں گے۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

در ببست و دشمن اندر خانہ بود — حیلۂ فرعون زیں افسانہ بود

(دروازہ بند کرلیا اور دشمن گھر کے اندر پرورش پا رہا ہے اس طرح سے فرعون کی تمام حیلہ سازی خاک میں ملگئی)

واقعی فرعون کی تدبیر ایسی ہی تھی کہ باہر تو ناحق بچوں کو مروا رہا تھا اور گھر کی خبر نہ تھی کہ جس کے لئے یہ سامان کر رہا ہوں وہ میرے ہی ہاتھ سے پل رہا ہے غرض جب وہ شاہی بیٹے ہو گئے تو دودھ پلانے کے لئے اناؤں کو بلایا گیا اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی محل شاہی میں پہونچ گئیں حق تعالیٰ نے یہ تدبیر کی کہ جس عورت کا پستان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منہ میں دیا جاتا وہ اس کو منہ ہی میں نہ لیتے اور ہرگز دودھ نہ پیتے، اس پر فرعون کو بڑی پریشانی ہوئی کہ یہ کسی کا دودھ کیوں نہیں پیتا اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا "هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَیْتٍ یَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ کیا میں تم کو ایسی بی بی کا پتہ بتلاؤں جو تمہاری خاطر اس بچہ کو اچھی طرح پرورش کر دیں اور وہ اس کی خیر خواہ بھی ہیں۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ ان کے اس قول پر " وھولہ ناصِحُوْن" فرعون کھٹک گیا اور کہا کہ یقیناً تجکو معلوم ہے کہ یہ بچہ کس کا ہے جبھی تو یہ کہتی ہے کہ وہ اس کی خیر خواہ بھی ہیں ورنہ تجکو یہ کیا معلوم ہوتا کہ اس کا خیر خواہ کون ہے کون نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن بڑی سمجھدار اور فہیم تھیں کیوں نہ ہو آخر کس خاندان کی تھیں فوراً جواب دیا کہ لہ کی ضمیر اس بچہ کی طرف عائد نہیں بلکہ فرعون کی طرف عائد ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ سرکاری خیر خواہ بھی ہیں (کانت فھیمۃ اللہ درہا ۱۲) خیر اس جواب سے اطمینان سا ہوا تو فرعون نے کہا اچھا ان بی بی کو بلا کر لاؤ چنانچہ وہ اپنی والدہ کو بلا لائیں ان کا پستان منہ میں جاتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اچھی طرح دودھ پینے لگے۔ فرعون نے آپ کی والدہ سے کہا کہ یہ بچہ تمہارا ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کی کیا وجہ کہ تمہارے سوا اس نے کسی کا دودھ بھی نہ پیا۔ انہوں نے فرمایا کہ حضور لتنے سے بچہ کو ماں باپ کی کیا سمجھ لائیے آپ جس عورت کا چاہیے بچہ لے آیئے وہ بھی ضرور میرا دودھ پی لے گا وجہ یہ ہے کہ بعض عورتوں کا دودھ خراب ہوتا ہے اس لئے بعضا بچہ ایسی عورتوں کا دودھ نہیں پیتا، میرا دودھ نہایت عمدہ ہے اس لئے اس نے خوشی سے لے لیا اور ہر بچہ اسی طرح پی لے گا۔ یہاں بھی وہ لاجواب ہوا اور آپ کی والدہ

کو معقول تنخواہ پر اپنے محل میں رکھا کہ تم ہی اس بچہ کو دودھ پلاؤ چنانچہ خدا تعالے نے اس طرح آپ کی ماں کو بھی ان سے ملا دیا اور پرورش ہوتی رہی حتیٰ کہ بڑے ہوئے اور جوان ہوئے اور شاہی فرزند کہلانے کی وجہ سے سب کی نگاہ میں معظم و محترم رہے۔ پھر ایک قبطی کا خون آپ کے ہاتھ سے ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے روپوش ہو کر مدین پہونچ گئے دس سال کے بعد وہاں سے واپس ہوئے اور راستہ میں نبوت سے مشرف ہو کر فرعون کو تبلیغ کرنے کے لئے مصر میں تشریف لائے۔ اس وقت ہارون علیہ السلام آپ کے ساتھ تھے کیونکہ وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر نبی بنا دیئے گئے تھے دونوں صاحبوں نے آکر اس سے کہا اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى إِنَّا قَدْ أُوْحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى

چونکہ فرعون موسیٰ علیہ السلام سے اچھی طرح واقف تھا اور ان پر ایک قسم کا ناز بھی تھا اس لئے اسی کی طرف روئے سخن کیا ہارون علیہ السلام کی طرف اصل خطاب نہ تھا اس واسطے فَمَنْ رَّبُّكُمَا کے بعد یا موسیٰ کہا گیا۔ یا ہارون دموسیٰ نہیں کہا گیا۔ اس سوال کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو وجود عطا کیا پھر اسباب بقا کی طرف ہر شے کو رہنمائی کی (چنانچہ ہر مخلوق اپنے بقا کا ذریعہ پیدا ہوتے ہی ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ مرغی کا بچہ زمین پر چونچ مارتا ہے اور انسان کا بچہ پستان کو ڈھونڈھنے لگتا ہے وغیرہ وغیرہ) اس کے بعد فرعون نے یہ سوال کیا قال فما بال القرون الاولیٰ کہ پہلے لوگوں کا کیا حال ہے (جو مر چکے ہیں) اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں یہ حکم تھا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى جس سے مقصود تکذیب پر وعید سنانا تھا۔ اس پر یہ سوال کیا کہ الوہیت و رسالت کے مکذبین بہت گذرے ہیں ان کی حالت عذاب میں کیا ہوئی قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسٰى موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا علم خدا ہی کے پاس ہے ایک کتاب میں ہے اس نے سب محفوظ کر رکھا ہے محض علم پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اتمام حجت کے لئے سب لکھ بھی دیا ہے) میرے پروردگار کو غلطی اور بھول نہیں ہوتی پس

لکھنا اس غرض ۔ نہیں ہے کہ یاد رہے بلکہ اور حکمتوں کی بنا پر ہے، پس حالت تو ان کی علم الٰہی میں منضبط ہے۔ اب رہ انتظار وقت موعود آنے کا ہے اس وقت، عذاب اکبر کا ظہور ہو جاوے گا آگے حق تعالیٰ کے کمال علم و حکمت کو چند واقعات مشاہدہ سے ثابت کیا ہے تاکہ ان کا قادر ہونا بھی ثابت ہو جاوے اور ایقاع وعید کے لئے اسی علم و قدرت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً جس نے زمین کو تمہارے لئے بستر بنایا (جو نہ بہت سخت ہے لوہے کے مانند جس پر لیٹنے بیٹھنے سے جسم کو تکلیف ہو نہ بہت نرم ہے گارے کے مانند جس میں پاؤں دھنسنے لگے اور یہ کمال حکمت ہے) اور اس میں تمہارے لئے راستے چلائے ہیں (اگر زمین بہت سخت یا بہت نرم ہوتی تو اس پر راستوں کے نشانات یا تو ہی نہ ہوتے یا باقی نہ رہتے تو چلنے والے کو پتہ نہ چلتا کہ اب راستہ کدھر کو ہے یہ بھی کمال حکمت ہے کہ زمین کو ایسا بنایا ہے جس پر مختلف راستے الگ الگ محفوظ رہتے ہیں) اور آسمان سے پانی اتارا (یہ بھی کمال حکمت پر مبنی ہے) اس کے بعد ارشاد ہے فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى۔ پھر ہم نے پانی کے ذریعے سے قسم قسم کی نباتات پیدا کیں ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ اس میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں (کمال قدرت الٰہیہ غیر متناہیہ پر)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر تو حق تعالیٰ کا ذکر غیبت کے صیغوں سے تھا یہاں تکلم کے ساتھ ہونے لگا۔ اہل ظاہر نے تو اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ تک موسیٰ علیہ السلام کا کلام تھا انھوں نے تو بارش کے نازل ہونے پر گفتگو کو ختم کر دیا تھا آگے حق تعالیٰ نے پیدائش نباتات کا ذکر تتمیم کلام کے لئے بڑھا دیا اور بتلا دیا کہ پانی سے نباتات کا پیدا ہونا نہایت عجیب حکمت پر مبنی ہے اور بعض مغلوبین اہل حال نے کہا ہے کہ نہیں یہ بھی موسیٰ علیہ السلام ہی کا کلام ہے اس وقت ان پر وحدت الوجود کا غلبہ ہو گیا تو غائبانہ ذکر چھوڑ کر تکلم کے ساتھ فرمانے لگے کہ پھر ہم نے پانی سے نباتات کو نکالا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا " فاخرجنا " فرمانا ایسا ہی تھا جیسا کہ

شجرۂ طور نے کہا تھا "اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" یہ اہلِ حال بڑی دور کی بات کہتے ہیں ان کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا طلبہ تو وہی جواب سمجھ لیں جو اہلِ ظاہر نے دیا ہے وہ اہل حال کی باتوں میں غور نہ کریں مگر ان پر انکار بھی نہ کریں (کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ جو بات تمہارے سمجھ میں نہ آئے وہ غلط ہی ہو)

بہر حال چاہے موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہو یا حق تعالیٰ نے ان کے کلام کو پورا کیا ہو یہ مضمون اسی گفتگو کے متعلق ہے جو فرعون سے ہو رہی تھی اس لئے یہاں حق تعالیٰ نے مراقبۂ ارض ہی کی تعلیم فرمائی کیونکہ فرعونی "مراقبۂ ارض" ہی کے قابل تھے "مراقبۂ سمار" کے قابل نہ تھے۔ یہ بھی اس مقام پر ایک نکتہ ہے جس میں ہم پر بھی یہ چھینٹا ہے کہ تم فرعون اور اس کی قوم کی طرح غبی ہو اس لئے تم کو بھی مراقبہ ارض کی تعلیم کی جاتی ہے (یہ تیسرا نکتہ ہے ۱۲) مگر حق تعالیٰ کے یہاں ایسے اغبیا کی بھی دوا موجود ہے وہ اذکیا کو مراقبۂ سمار تعلیم فرماتے ہیں (جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہے وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وقدم فیہ السموات لان المقام مقام مدح لولی الالباب[۱۲] جامع) اور اغبیا کو مراقبہ ارض بتلاتے ہیں وہ زمین ہی کا مراقبہ کرلیں تو ان کے دن بھلے ہو جائیں۔ اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ زمین پر چلتے ہوئے یہ سوچو کہ اس وقت ہم اوپر چل رہے ہیں اور عنقریب زمین کے نیچے اتریں گے۔ موت کا خیال بھی نہ ہو تو صرف اتنا ہی سوچ لینا بھی کافی ہے پھر اس سے یہ سوچ پیدا ہوگی کہ جب ہم کو زیر زمین جانا ہے تو اس وقت کے لئے کیا کرنا چاہئیے اس وقت اعمال ہی کام دیں گے اور کوئی چیز ساتھ نہ جائے گی۔ صاحبو! یہ بات تو ذرا سی ہے مگر اس پر عمل کر کے دیکھو چند دن میں حالت بدل جائے گی۔ دوا کا نفع نام بتانے سے نہیں ہوا کرتا استعمال کرنے سے ہوتا ہے آپ اس پر عمل کیجئے نفع خود معلوم ہوگا کہ کام تین قسم کے ہیں ایک وہ جو زیر زمین نافع ہیں دوسرے وہ جو مضر ہیں تیسرے وہ جو نہ نافع ہیں نہ مضر ہیں ان کو تو فوراً چھوڑ دو گے۔ رہی وہ جو نہ نافع ہیں نہ مضر ہیں وہ بھی قابل ترک ہیں کیونکہ آدمی جب اپنے گھر میں آتا ہے تو ترکاری، دال، گوشت، آٹا، اناج وغیرہ

لیکر داخل ہوتا ہے جو معاش کے لئے ضروری اور مفید ہیں، سانپ بچھو لیکر گھر میں کوئی نہیں گھستا جو کہ مضر ہیں۔ اور جیسے سانپ بچھو لیکر گھر میں نہیں آتے اسی طرح ڈلے پتھر لے کر بھی نہیں گھستے۔ آخر کیوں محض اس واسطے کہ فضول ہیں ان میں نفع کیا اور جو کوئی ڈلے پتھر لائے بھی تو بیوی سے بحث ہوگی وہ کہے گی کہ ان چیزوں کا گھر میں کیا کام تھا، آپ کہیں گے کہ ضرر بھی تو کچھ نہیں اس پر وہ آپ کو بیوقوف بتائے گی کہ میاں پھر ساری بستی کا کوڑا گھر ہی میں لاکر جمع کردو کیونکہ اس میں فائدہ نہیں تو ضرر بھی کچھ نہیں غرض بیوی سے خوب بحث ہوگی۔ اور ان شاء اللہ وہی جیتے گی تو جب دنیا کے گھر میں تم فضولیات جمع نہیں کرتے گو مضر بھی نہ ہو تو آخرت میں فضول اعمال کیوں لے جاتے ہو بس وہی کام کرو جو آخرت کے لئے ضروری اور مفید ہوں اور جو مضر یا فضول ہوں ان سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! اس مراقبہ کا نافع ہونا تجربہ میں آگیا ہے اول یہ مضمون بے ساختہ میرے قلب میں آیا تھا اس وقت کسی آیت سے استنباط کر کے میں نے اس کو نہ سوچا تھا بلکہ ویسے ہی گھر جا رہا تھا کہ دفعتہً چلتے ہوئے خیال آیا کہ اس وقت تو ہم زمین کے اوپر چل رہے ہیں اور ایک دن اس کے اندر ہوں گے اس خیال کے آتے ہی حالت بدل گئی اور قلب پر خاص اثر ہوا اور کئی دن تک اس کا غلبہ رہا پھر آیات قرآنیہ میں بھی اس کی تعلیم نظر آئی اور میری عادت ہے کہ جو مضمون مجھے نافع معلوم ہوتا ہے جی چاہا کرتا ہے کہ اپنے بھائیوں کو اس سے مطلع کردوں کیونکہ مثل مشہور ہے۔ ؏

کہ حلوا بہ تنہا نہ بایست خورد

(حلوا تنہا نہ کھانا چاہیئے)

اس لئے میں نے یہ مضمون بیان کیا اور اسی لئے اس آیت کو اختیار کیا "کیفما اتفق" اختیار نہیں کیا میں نے اپنے بعض دوستوں کو بھی یہ مراقبہ تعلیم کیا ہے بہت ہی نفع ہوا غرض اس کا نافع ہونا محقق ہو چکا ہے اس لئے میں سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ چلتے پھرتے اس کا مراقبہ رکھا کرو کہ ایک دن ہم زیر زمین ہوں گے یہ مراقبہ سہل بھی بہت ہے

اس میں کچھ دقت نہیں حق تعالےٰ نے ہم کو نزدیک کی چیزوں میں غور کرنے کی تعلیم فرمائی ہے تاکہ کچھ دشواری نہ ہو۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ط وَاِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ط وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ط کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کیونکر پیدا کیا گیا ہے اس میں سب سے پہلے اونٹ کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اہل عرب کثرت سے اسی پر سوار ہوتے ہیں اور راکب جمل کو زیادہ تلبس اونٹ ہی سے ہوتا ہے پھر اہل عرب کو اونٹ سے محبت بھی بہت ہے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنے محبوب کے خال رخسار کی تشبیہ میں کہتا ہے کہ رخسارہ پر تل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالو کے میدان میں اونٹ کی مینگنی پڑی ہو اس سے اونٹ کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے ؎

"اجبہا و تجبنی و یحبُّ ناقتہا بعیری"

(ترجمہ) میں محبوبہ سے محبت رکھتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے اونٹ کو اس کی اونٹنی سے محبت ہے۔ اس لئے حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ ہمارے دلائل قدرت کو اونٹ میں نہیں دیکھتے کہ اس کو کیسا عجیب الخلقت بنایا ہے اور کیسا جفاکش اور صابر و بردبار کر دیا ہے پھر اونٹ پر سوار ہوتے ہی آدمی اونچا ہو جاتا ہے تو سامنے آسمان نظر آتا ہے اس لئے اس کے بعد فرماتے ہیں " وَاِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیونکر بلند کیا گیا ہے پھر سفر شروع کرنے کے بعد دائیں بائیں پہاڑ نظر آتے ہیں تو آگے فرماتے ہیں و الی الجبالِ کیف نصبت اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کس طرح زمین میں نصب کئے گئے ہیں پھر گاہے گاہے سواری کی حالت میں زمین پر بھی نظر پڑ جاتی ہے سامنے بڑے بڑے میدان آتے ہیں جن کو سوار طے کرتا جاتا ہے تو فرماتے ہیں وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی جو شخص کبھی اونٹ پر سوار ہوا ہو یا اس نے راکب جمل کی حالت میں تامل کیا ہو وہ اس ترتیب کی خوبی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ پہلے اونٹ کا ذکر کیا پھر آسمان کا پھر پہاڑوں کا پھر زمین کا کیونکہ

رکوب کی حالت میں اکثر نظر اسی ترتیب سے واقع ہوتی ہے بہر حال جن چیزوں سے ہم کو زیادہ قرب، اور زیادہ تلبس ہوتا ہے حق تعالے نے انہی میں تامل کی تعلیم فرمائی ہے اور یہاں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ حق تعالےٰ نے دلائل قدرت معلوم کرنے کے لئے اونٹ اور پہاڑ اور آسمان و زمین کا مراقبہ تو بتلایا ہے مگر امارد و نسواں کی طرف کہیں متوجہ نہیں فرمایا کیونکہ ان میں توجہ کرنے سے دلائل قدرت پر نظر نہیں رہتی بلکہ خواہش نفس پر نظر رہ جاتی ہے آگے نہیں بڑھتی معلوم ہوا کہ دلائل قدرت کا مشاہدہ انہی چیزوں میں ہوسکتا ہے جہاں خواہش نفس کا موقع نہ ہو ورنہ دلائل قدرت تو نظر قلب سے غائب ہوجائیں گے اور محض خواہش ہی خواہش رہ جائے گی۔ پس اب جو لوگ یہ دعویٰ کرتے کہ ہم امارد و نسواں کو قدرت خدا دیکھنے کے لئے گھورتے ہیں ان کا جھوٹا ہونا ظاہر ہوگیا اگر واقعی ان کو دلائل قدرت کا مطالعہ مقصود ہوتا تو وہ ان چیزوں میں نظر کرتے جن کا مراقبہ حق تعالےٰ نے تعلیم فرمایا ہے، طالب کو تو ان میں بھی وہی قدرت نظر آتی ہے جو خوبصورت لڑکوں اور عورتوں میں نظر آتی ہے بلکہ ان سے زیادہ کیونکہ ان کے مطالعہ میں محض دلائل قدرت ہی پر نظر ہوتی ہے اور کسی بات کا خیال نہیں آتا شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل
که در خوبرویان چین و چگل

(محقق وہی ہوتا ہے جو اونٹ میں وہی جمال محسوس کرے جو عام لوگ حسینوں میں دیکھتے ہیں چین اور چگل ایک شہر کا نام ہے جو ترکستان میں ہے، وہاں کا حسن مشہور ہے)

صاحبو! امارد و نسواں کو وہی گھورتا ہے جس کو خدا مطلوب نہیں بلکہ مخلوق ہی مطلوب ہے۔ شیخ اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ندادند صاحبدلاں دل بر پوست
وگر ابلہے داد بے مغز اوست

(اہل دل لوگ اپنے دل کو پوست اور کھال کو نہیں دیا کرتے اور اگر کوئی بیوقوف دل انکو دیتا ہے

یعنی عقلمند کبھی پوست اور کھال کو دل نہیں دیا کرتا اور اگر کوئی دے تو وہی بیوقوف ہے اس لئے ان چیزوں سے نظر کو بچانا چاہیئے ان سے اصلاح نہ ہوگی فساد بڑھے گا۔ قدرت کے دلائل دیکھنے کے لئے زمین ہی کو دیکھ لو جو سب کی ماں ہے کہ تم کیونکر گیہوں اور میووں اور شلجم مولی میں سے نکلکر نطفہ کی شکل میں آئے پھر اس سے کس حکمت کے ساتھ اس خوبصورت جسم کی طرف منتقل کئے گئے اور کیونکر پیدا ہوئے پھر کیسے پلے بڑھے جوان ہوئے، پھر یہ بھی سوچ لو کہ ایک دن زمین کے نیچے بھی جانا ہے اور زمین میں جانے سے پہلے نزع کی حالت ہوگی بیماری ہی میں مال و دولت جائداد وغیرہ سے آپ کا تعلق کم ہوجائیگا اس وقت اپنے لئے کچھ نہ کر سکوگے نہ کسی کو خیرات دے سکوگے نہ فوت شدہ نماز روزہ کی تلافی کر سکوگے پس ثلث مال میں جو چاہو کر لو اس سے زیادہ حق نہ ہوگا پھر دفن کے بعد فرشتے آدیں گے نہ معلوم سوال وجواب کیسے ہوں کیسے نہ ہوں اس کو سوچو تو پھر حالت کی اصلاح ہوگی اور فکر پیدا ہوگی۔ کہ وہ کون کون سے اعمال ہیں جن سے وہاں بیڑا پار ہو اس کے لئے آپ کو دو چیزوں کی ضرورت ہوگی ایک۔ بقدر ضرورت علم کی دوسرے عمل کی اور اگر کسی سے تحصیل علم نہ ہوسکے تو وہ اہل اللہ کی صحبت اور ان سے ملنا ملانا اختیار کرے اور ان سے پوچھ پوچھ کر عمل کرے اس کو لوگوں نے بالکل ہی ترک کر دیا حالانکہ یہ سب کی اصل ہے اور کم وبیش اس کی ضرورت سب کو ہے بخدا اصلاح حال میں اس سے بڑھ کر کوئی چیز بھی فائدہ مند نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر تو سنگ خارہ ؤ مرمر شوی　　　چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

(اگر تو پتھر کی طرح دل رکھتا ہے تو بھی مایوس مت ہو کسی اللہ والے کی صحبت میں جا اس کی برکت سے تو موتی بن جائے گا۔)

صحبت اہل اللہ کا سب کو اہتمام کرنا چاہیئے اور جن کو علم کا حاصل کرنا مطالعہ سے دشوار ہو وہ تو ضرور اس کا اہتمام کریں کہ اس کے ذریعہ سے علم وعمل دونوں سہولت سے حاصل ہوجائیں گے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہماری اصلاح فرمائیں۔ آمین وصلے اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العٰلمین۔

تمت بالخیر

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

الاسعاد والابعاد

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ ایم اے جناح روڈ کراچی

التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

الاسعاد والابعاد

این	کہاں ہوا	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
متٰی	کب ہوا	۴؍شعبان ۱۳۴۲ھ بعد نماز جمعہ (شروع) ایک بجکر ۳۰ منٹ پر ختم ہوا)
کم	کتنی دیر ہوا	تین گھنٹہ ۲ ۱/۲ پر ختم ہوا
کیف	کیونکر ہوا	بیٹھ کر
لِمَ	کیوں ہوا	مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں ایک طالب علم فارغ شدہ کی دستار بندی تھی اس لئے حضرت نے طلبہ و علماء کو مناسب وقت نصائح سے سرفراز فرمایا نیز ایک وارد جدید بھی اس کی طرف داعی ہوا جو اسی عرصہ میں حضرت مولانا کی قلب مبارک پر تابش ہوا تھا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	ہر کام میں اس بات کو سوچنا چاہیئے کہ یہ آخرت کیلئے مفید ہے یا مضر بعد میں مختصراً جلسہ کے متعلق بھی کچھ بیان تھا۔
من استفاد	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا۔	عموماً سب مسلمانوں کو اور خصوصاً سالکین و علماء کو۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ و وفقہ لما یرضیٰ
المستمعون	سامعین کی تعداد	۷۰ تقریباً
الاشتات	متفرقات	اہل جلسہ پر بیان کا خاص اثر تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (اور یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی)۔ یہ ایک آیت ہے سورۂ انعام کی اخیر کے قریب کی اس کا مضمون ایسا عام اور کلی ہے کہ اس کی تفصیل اگر ساری عمر کی جائے اور وہ عمر بھی ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک

جماعت متعاقبہ کی عمر جو خود فی نفسہ متناہی ہو لیکن بمعنی لَاتَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ (کسی حد پر نہ ٹھہرے) غیر متناہی ہو اور اس کا ہر فرد اس کی تفصیل بیان کرنا شروع کرے پھر جہاں سے ایک نے چھوڑا ہو اس سے آگے دوسرا بیان کرے اسی طرح سب افراد بیان کرتے چلے جائیں جب بھی اس کی تفصیل ختم نہیں ہو سکتی کوئی حالت اور کوئی جزئی حادثہ اس آیت سے خارج نہیں بلکہ یہ سب کو مشتمل ہے اور حوادث کے احاطہ سے باہر ہونا ظاہر ہے۔ اس مضمون کے اختیار کرنے کی ضرورت ایک تو یہی ہے کہ مضمون علم ہے اور عام مضمون کا ضروری ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ سب کی ضرورت کا ہوا کرتا ہے تمام مخاطب اس میں بدرجۂ مساوی شریک ہوتے ہیں۔ مگر عام ضرورت کے علاوہ ایک خاص سبب بھی اس کے اختیار کرنے کا ہے جس کو تحدث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کیونکہ نعمت کا چھپانا ناشکری ہے اور نعمت کا ظاہر کرنا مامور بہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (اور اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہا کرو) دوسرے وہ نعمت سب کے نفع کی ہے تو اس کا چھپانا بے مروتی بھی ہے۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ حلوا بہ تنہا نبایست خورد (تنہا حلوہ نہ کھانا چاہیئے) اس بنا پر جی چاہا کہ اس نعمت سے اپنے دوستوں کو بھی خبر کر دی جائے تاکہ وہ بھی اس علم عظیم سے نفع حاصل کریں۔ مگر جس طرح اظہار نعمت میں یہ مصلحت ہے اسی طرح اس میں کید نفس کا مفسدہ بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ ہم نعمت الٰہی کو تحدث بالنعمۃ سمجھ کر اس خیال سے بیان کرتے ہیں کہ اظہار نعمت کا نص میں امر ہے مگر اس میں نفس کا کید بھی مخفی ہوتا ہے کہ اس طریقے سے وہ اپنا کمال ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اور نعمت سے عجب و کبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اس طریق باطن میں اشتباہ اور تلبیس بیحد ہے۔ اخلاق حمیدہ اور اخلاق رذیلہ دونوں دوش بدوش چلتے ہیں ظاہر میں تحدث بالنعمۃ اور دعویٰ کی صورت یکساں ہوتی ہے۔ (تواضع و ناشکری میں خلط ہے تادیب و تعنیف میں اشتباہ ہے۔ سیاست اور تحکم کی صورت یکساں ہوتی ہے لطافت اس تن آرائی میں خلط ہے انتظام اور بخل کی صورت یکساں ہے غیرت غضب ایک صورت سے ظاہر ہوتے ہیں استغناء اور تکبر میں بظاہر فرق نہیں معلوم ہوتا وغیرہ وغیرہ ۱۲ جامع) اسی لئے بعض دفعہ سالک پریشان ہو کر کہتا ہے ؎

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا ‏ ‏ ‏ ماچو مرغانِ حریص بے نوا
دمبدم پا بستۂ دام نویم ‏ ‏ ‏ گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم

میرہائی ہر دمے مارا و باز   سوے دامے میرویم اے بے نیاز

(اے ہزاروں دام و دانہ ہیں اور ہم مثل مرغ حریص بے نوا ہیں دمبدم آپ کے دام میں پابستہ ہیں اگرچہ ہم سب شہباز اور سیمرغ ہیں ہر دم آپ ہم کو رہائی دیتے ہیں لیکن پھر بھی دام کی

مگر یہ نہیں ہے کہ واقع میں بھی فرق نہیں یا ایسا دقیق فرق ہے جس کو غور سے بھی نہ سمجھ سکے بلکہ دونوں میں قوی فاصل موجود ہے مگر اس فرق کے ادراک کے لئے اہتمام وفکر کی ضرورت ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں

ؐ بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں   درمیاں شاں برزخ لا یبغیاں

(بحر تلخ اور بحر شیریں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے)

بحر تلخ سے اخلاق رذیلہ مراد ہیں اور بحر شیریں سے اخلاق حمیدہ مولانا فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں ایک فاصل قوی ایسا موجود ہے جس کی وجہ سے ایک کی مجال نہیں کہ دوسرے میں مختلط ہو سکے جیسے کلکتہ وغیرہ میں سنا ہے کہ بحر تلخ و بحر شیریں کا اجتماع ہوا ہے اور میلوں تک دونوں میں اختلاط نہیں ہوا ایک طرف شیریں پانی ہے دوسری طرف شور ایک سے کھا تا یک سکتا ہے اور دوسرے سے کسی کی دال نہیں گلتی ایسے ہی یہاں اخلاق حمیدہ ورذیلہ میں گو بظاہر اختلاط ہے مگر واقع میں ہر ایک جدا ہے۔ دونوں میں قوی فاصل موجود ہے جو حقیقی اختلاط سے مانع ہے مگر بعض اوقات صاحب معاملہ کو اس فاصل کا ادراک نہیں ہوتا اس کے لئے مبصر شیخ کی ضرورت ہے پس مولانا کا پہلا ارشاد یعنی ؎ صد ہزاران دام و دانہ است الخ (لاکھوں جال و دانہ ہیں) صاحب واقعہ کے اعتبار سے ہے اور یہ ارشاد یعنی ؎ درمیاں شاں برزخ لا یبغیان (درمیان میں ان کے ایسا پردہ حائل ہے کہ باہم مختلط نہیں ہونے پاتے) واقع کے اعتبار سے ہے خلاصہ یہ ہوا کہ اخلاق حمیدہ ورذیلہ میں واقع میں تو فرق ہے اور ایسا قوی فرق ہے کہ واقعیت کے لحاظ سے دونوں میں خلط کی گنجائش نہیں مگر صاحب واقعہ کو بعض دفعہ اس فاصل کا ادراک نہیں ہوتا اس لئے اس طریق میں خلط و اشتباہ بہت واقع ہو جاتا ہے۔ اور صاحب واقعہ کو بھی یہ اشتباہ قلت اہتمام کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور اہتمام وفکر کے بعد اس کو بھی اشتباہ نہیں ہوتا کیونکہ اہتمام پر حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ رہبری کا چنانچہ ارشاد ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے خود دکھلا دیں گے) مجاہدہ کی حقیقت اہتمام ہی ہے جس پر حق تعالیٰ خود رہبری کا وعدہ فرمارہے ہیں۔ تو اب ان کی دستگیری کے بعد کون چیز مانع ہوسکتی ہے۔ کوئی نہیں پس یہ مسئلہ تو مسلم ہے کہ اہتمام و مجاہدہ کے بعد غلط نہیں ہوسکتا مگر ہم میں تو اہتمام ہی کی کمی ہے۔ اسی لیے ہم کو اخلاق رذیلہ و حمیدہ میں غلط ہو جاتا ہے ہمارا التحدث بالنعمۃ ریاء و عجب سے مخلوط ہماری تواضع ناشکری سے مشتبہ ہمارا استغناء و توکل تکبر سے ملتبس ہے۔ اس لیے میں حق تعالیٰ سے مدد لیکر اس نعمت کو بیان کرتا ہوں حق تعالیٰ غلط سے محفوظ رکھے اور اگر غلط ہو جائے تو حق تعالیٰ معاف فرمائیں کیونکہ ہم بہ نسبت حفاظت کے معافی و مغفرت کے محتاج زیادہ ہیں کیونکہ حفاظت کے اہل وہ حضرات ہیں جو گناہوں سے معصوم ہیں اور ہم گناہوں سے محفوظ نہیں ہیں اس لیے مغفرت کے زیادہ محتاج ہیں دوسرے طلب مغفرت میں اپنا ایک عجز و نیاز و ضعف ظاہر ہوتا ہے۔ جو طلب حفاظت میں حاصل نہیں ہے۔ اور بندہ سے عجز و نیاز ہی مطلوب ہے۔ اس لیے ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اپنے کو گنہگار سمجھ کر مغفرت طلب کرتے رہیں۔ اس وقت مجھے یاد آگیا قصہ حضرت ابراہیم بن ادہم کا کہ ایک مرتبہ انہوں نے دعا کی اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِیْ کہ اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) ارشاد ہوا کہ اگر سب یہی دعا کرنے لگیں تو رحمت و مغفرت کا ظہور کہاں ہوگا۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ میری مغفرت کر) کیوں نہیں کہتے وہ اس میں بتلا دیا گیا ہے کہ جس طرح حفاظت مطلوب ہے مغفرت بھی مطلوب ہے، یہی مطلب ہے اس حدیث کا لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَجَاءَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ فَیَغْفِرُ لَهُمْ۔ ترجمہ (اگر تم گناہ نہ کرو تو حق تعالیٰ ایسی جماعت کو پیدا کریں گے جو گناہ کریں پھر استغفار کریں اور ان کی مغفرت کی جائے ۱۲) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ ہم سے مقصود ہے اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہم گناہ کیا کریں۔ بلکہ گناہ سے جو ضعف و عجز ظاہر ہوتا ہے وہ مقصود ہے پس اگر کہیں بدون صدور گناہ ہی کے یہ ضعف و عجز پیدا ہو جائے جیسے انبیاء علیہ السلام باوجود عصمت کے جس قدر اپنے کو گنہگار خطاوار سمجھتے ہیں ہم گنہگار ہو کر بھی اپنے کو اتنا گنہگار نہیں سمجھتے اور جس قدر وہ حق تعالیٰ سے خوف و خشیت رکھتے ہیں ہم مجرم ہو کر بھی اتنا تو کیا اس کا ہزارواں حصہ بھی خوف نہیں رکھتے۔

تو اگر ہم لوگ گناہوں میں مبتلا نہ کئے جاتے تو نہ معلوم ہماری کیا حالت ہوتی جب ہم گنہگار ہو کر بھی اپنے کو کچھ زیادہ گنہگار نہیں سمجھتے تو معصوم ہو کر نہ معلوم ہم اپنے کو کیسا کچھ مقدس سمجھتے اور ہمارے عجب کی کیا حالت ہوتی۔ اس لئے کبھی کبھی ہم کو گناہ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے جس سے ہمارا وہ عجب توڑ دیا جاتا ہے۔ جو طاعات و اذکار سے کبھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور وہ خیال تقدس پارہ پارہ ہو جاتا ہے جو کچھ دنوں تہجد اور مراقبات کی پابندی سے دل پر گذرنے لگتا ہے۔ تو جیسے ہم کو حفاظت حق کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مغفرت کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم بن ادہم کو تنبیہ کی گئی کہ محض عصمت کی دعا کیوں کرتے ہو۔ اس کی ساتھ دعائے مغفرت کیوں نہیں ملاتے۔ اس کے علاوہ اَللّٰھُمَّ اعْصِمْنِیْ (اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) کے ساتھ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے رب مجھے بخش دیجئے) ملانے میں ایک اور بھی حکمت ہے جس پر نظر کر کے اس کا ملانا بہت ہی ضروری ہو گیا وہ یہ کہ سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے حق تعالیٰ مجیب الدعوات ہیں۔ چنانچہ جو لوگ دعا قبول نہ ہونے کے شاکی بھی ہوتے ہیں وہ یہ تو کہا کرتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی مگر یہ کسی کو کہتے ہوئے نہیں سنا گیا کہ دعا قبول ہونے کا وعدہ کہاں ہے بلکہ اس کا سب کو اعتقاد ہے کہ دعا قبول کرنے کا وعدہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اور اس کا انکار کسی کو کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ قرآن میں صریح ارشاد موجود ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری اجابت کروں گا) رہا یہ اشکال کہ جب اجابت دعا کا صریح وعدہ ہے تو پھر اس میں تخلف کیوں ہوتا ہے اس کے جواب بہت سے ہیں مگر ان کی گنجائش کہاں سہل بات وہ ہے جس کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ دعا کو قبول فرماتے ہیں پھر کبھی تو جلدی وہی مطلوب عطا فرما دیتے ہیں جو مانگا گیا ہے اور کبھی دیر سے عطا فرماتے ہیں کہ اس میں مصلحت ہوتی ہے اگر اس مطلوب کا دنیا میں دینا مصلحت نہیں ہوتا تو اس کو آخرت کے لئے ذخیرہ کے طور پر جمع

۔ قلت ولویدہ حدیث اخرجہ البیہقی فی الشعب (وقد التزم ان لایخرج موضوعاً) من انس رفعہ لو لم تکونوا تذنبوا لخشیت علیکم ما ہو اکبر من ذلک العجب العجب اھ کذا فی العزیزی قال المناوی وذلک ان العجب بعلمہ مغرور راض عن نفسہ فہلک من حیث لایشعر والعاصی معترف بالتقصیر فیرجی لہ التوبۃ والخجر ولا ینبغی الوقوع فی الذنوب اتکالا علی ذلک بل المطلوب التباعد جدا فلو فرض انہ وقع فلا یاس بل یتوب فیحصل لہ الغفران اھ مع تقدیم و تاخیر (ص ۲۰۴ ج ۳ جامع)

رکھتے ہیں، جب بندہ قیامت میں حاضر ہوگا سب دعاؤں کا ثواب اس کے سامنے کر دیا جائیگا
بہر حال اجابت دعا، امر ضروری ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کی ساتھ ایک اور دوسرا مقدمہ یہ ملایا
جائے کہ دعا کیوقت اس اعتقاد کا بھی حکم ہے میری یہ دعا ضرور قبول ہو گی حدیث میں ہے
اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ (اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور تم قبولیت دعا کا یقین بھی رکھو)
اب بتلاؤ کہ اگر اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِیْ کے ساتھ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ نہ بڑھایا جائے تو یہ شخص تو اس دعا
کے بعد اپنے تقدس کا معتقد ہوگا کیونکہ وہ کہے گا کہ میں نے اپنے لئے عصمت کی دعا کی اور دعا
ضرور قبول ہوتی ہے اور مجھے اعتقاد اجابت کا امر بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ میں اپنے کو معصوم
مقدس نہ سمجھوں حق تعالیٰ نے اس الہام میں اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ بڑھا کر اس اشکال کو رفع فرمادیا
اور بڑا علم عظیم عطا فرمایا کہ تم دعائے عصمت کے ساتھ دعائے مغفرت بھی کیا کرو جس کا مطلب
یہ ہوگا کہ اے اللہ اول تو مجھے گناہوں سے بچایئے اور اگر ابتلا ہی مقدر ہے تو مغفرت فرمایئے
اس مجموعہ کے اعتقاد میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اب خیال تقدس کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا
سبحان اللہ ایک لفظ بڑھا کر کتنے بڑے پہاڑ کو گرا دیا یہ ہیں وہ الہامات جن کو الہام کہنا چاہیے
یہ مضمون کچھ اس الہام ہی پر موقوف نہیں الہام کیسا خود نص میں بھی اس کی تعلیم موجود ہے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں یہ دعا فرمائی ہے اَللّٰهُمَّ قِنِیْ شَرَّ نَفْسِیْ (اے اللہ مجھ کو میرے
نفس کے شر سے بچایئے) وہیں یہ دعا بھی موجود ہے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ (اے اللہ میرے
گناہ معاف کر دیجئے) بلکہ نص میں ایک بات اور زیادہ ہے جس کا اس الہام میں پتہ نہیں وہ
یہ کہ آپ نے دعائے مغفرت میں یہ قید بھی زیادہ فرمائی ہے مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ اَعْلَمْ۔
اے اللہ میرے سب گناہ بخشدے وہ بھی جن کو میں جانتا ہوں اور وہ بھی جن کو نہیں جانتا
اس میں ان لوگوں کا دعویٰ توڑ دیا گیا جو چند موٹے موٹے گناہوں سے محفوظ ہو کر تقدس کے
مدعی ہیں۔ اس جملہ نے بتلا دیا کہ عدم علم عدم کو مستلزم نہیں پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ
تمہارے علم میں تمہارے سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تو یہ کیا ضرور ہے کہ واقع میں بھی سرزد
نہ ہوا ہو اور اس کی ضرورت تو تنزل کے بعد ہے ورنہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ انسان کو اپنے
اندر گناہ نظر نہ آئیں ادنیٰ تامل سے انسان اپنی خطاؤں کو سمجھ سکتا ہے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی

نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گو اپنے حیلے پیش لاوے) ہاں کوئی آنکھیں ہی بند کرلے تو اس کا علاج نہیں اس کے لیے بسبیل تنزل وہ جواب ہے جو حدیث کے اس جملہ میں دیا گیا ہے مَا عَلِمْتُ مِنْہُ وَمَا لَمْ اَعْلَمْ (وہ بھی جس کو میں جانتا ہوں اور وہ بھی جس کو میں نہیں جانتا) یعنی تمہارا عدم علم علم عدم کو تو مستلزم نہیں پس یہی سمجھ کر اپنے کو گناہ گار جانتے رہو کہ شاید تجھ سے کوئی ایسا گناہ ہوا ہو جس کی مجھے خبر نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ حدیث میں اس کی ایک واضح نظیر بھی مذکور ہے حدیث میں آتا ہے یَتَکَلَّمُ اَحَدُکُمْ بِکَلِمَۃٍ لَا یُلْقِیْ لَھَا بَالًا یَحُطُّہُ اللّٰہُ بِھَا اِلَی النَّارِ سَبْعِیْنَ خَرِیْفًا وَیَتَکَلَّمُ اَحَدُکُمْ بِکَلِمَۃٍ لَا یَعُدُّ ھَا شَیْئًا یَرْفَعُ اللّٰہُ بِھَا لَہٗ دَرَجَاتٍ فِی الْجَنَّۃِ اَوْ کَمَا قَالَ۔ بعض تم میں سے ایک بات کہتا ہے جس کی طرف قلب کو التفات بھی نہیں ہوتا مگر حق تعالیٰ اس ایک بات کی وجہ سے اس کو جہنم میں بہت دور پھینک دیتے ہیں اور بعض آدمی ایک بات کہتا ہے جس کی کچھ وقعت اس کے نزدیک نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ اس کی وجہ سے بہت درجے جنت میں اس کے بلند کردیتے ہیں (غور کیجیے دوسرے گناہوں کا یاد نہ رہنا تو شاید محل کلام بھی ہو مگر زبان کے گناہوں میں ایسا ہوجانا تو کچھ بھی بعید نہیں کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگ روانی کلام میں بہت سی باتیں بلا قصد و ارادہ کے کہہ جاتے ہیں جن پر اصلا التفات نہیں ہوتا کہ ان کا اثر کیا ہوا ہوگا تو ذنوب لسان کا ہم کو یاد نہ رہنا کیا بعید ہے۔ کچھ بھی نہیں پس اب کسی کو بھی دعوے تقدس کا منہ نہیں رہا ۱۲ یہاں سے اہل علم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ احادیث دعا میں بھی بہت علوم ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ علوم سلوک تو اکثر احادیث دعا ہی میں بھرے ہوئے ہیں مگر ان احادیث کو اہل علم ایسی بے توجہی سے پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس کی کچھ حد نہیں اس لئے ہم لوگ بہت سے علوم سے محروم ہیں۔ الغرض چونکہ دعویٰ کبھی بصورت تحدث بالنعمۃ بھی ہوتا ہے اس لئے میں نے دعائے حفاظت کے ساتھ دعائے مغفرت کو بھی منضم کرلیا کہ اگر خدانخواستہ مجھ سے غلط ہوجائے تو حق تعالیٰ اس گناہ کو معاف فرمائیں اس تمہید کے بعد میں حق تعالیٰ پر توکل کرکے اور ان کی امداد طلب کرکے اس نعمت کو بیان کرتا ہوں۔ وہ نعمت یوں تو نئی نہیں ہے بلکہ پرانی ہے اور ہر مسلمان کو حاصل ہے مگر بعض دفعہ ایک وارد کسی خاص حالت سے آتا ہے تو نیا معلوم

ہوا کرتا ہے جیسے آج جمعہ کا دن ہے سب لوگ نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو گو اس جدت لباس سے یہ لوگ بدل نہیں گئے بلکہ سب وہی ہیں جو ایک گھنٹہ پہلے تھے مگر پھر بھی ہر شخص میں ایک جدت ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اور یوں خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص ہی بدل گیا ہے۔ اور قاعدہ ہے کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس لئے گو وہ نعمت فی نفسہ پرانی ہے مگر اس زمانہ قریب میں وہ جس شدت وجدت کے ساتھ قلب پر وارد ہوئی ہے اس طرح پہلے وارد نہ ہوئی تھی اس لئے وہ مجھے نئی نعمت معلوم ہوتی ہے۔ اور اسی لئے جو لذت وحظ اور جو اثر میرے قلب پر اس وقت ہے وہ ویسا ہی ہے جو نعمت جدیدہ سے ہوا کرتا ہے۔ جمعہ کے دن کپڑے بدلنے سے اشخاص میں جدت معلوم ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہماری یہاں خانقاہ میں ایک صاحب رہتے تھے جو منتظم بھی تھے ایک دن میں نے ایک مہمان کو دکھلا کر ان سے کہا کہ میں ان کا کھانا گھر سے بھیجتا ہوں تم ان کو کھلا دینا اور بتلا دیا کہ وہ مہمان یہ ہیں ان کو پہچان لو اس وقت وہ مہمان اتفاق سے ایک چادرہ اوڑھے ہوئے تھے میں مکان کو چلا آگیا کچھ دیر کے بعد ان صاحب کا کھانا آیا منتظم صاحب کھانا لیکر خانقاہ میں ان مہمان کو تلاش کرنے لگے جب وہ نہ ملے تو میرے پاس آئے کہ مہمان تو نہ معلوم کہاں چلے گئے ملتے نہیں حالانکہ اس وقت وہ مہمان میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا بندہ خدا یہ تو بیٹھے ہیں تو وہ کیا کہتے ہیں کہ یہ چادرہ تو اوڑھے ہوئے ہیں یہ نہیں (اس وقت مہمان نے گرمی کی وجہ سے چادرہ اتار دیا تھا) میں نے ان مہمان سے کہا کہ حضرت جب آپ کہیں جایا کریں تو اول سے آخر تک ایک ہی لباس میں رہا کریں یا کم از کم کھانے کے وقت تو وہی لباس پہن لیا کریں جس میں اول آپ وارد ہوا کریں ورنہ بھوکے مر جاؤ گے۔ کیونکہ دنیا میں ایسے بھی عقلاء ہیں جن کے نزدیک چادرہ اتار دینے سے آدمی بدل جاتا ہے تو ہمارے ان دوست نے چادرہ کے نہ ہونے سے مہمان کو نیا آدمی سمجھا اور اس کا یہ خیال گو ہمارے نزدیک حماقت ہو مگر فلاسفہ کی تحقیق پر منطبق ہے کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک اعراض کے بدلنے سے شخص بدل جاتا ہے اور اعراض میں ایک عرض مقولہ ملک اور ایک عرض مقولہ جدہ بھی ہے

جن کے تبدل سے تشخص معروض بدل جاتا ہے خیر تو یہ ایک لطیفہ تھا، مقصود میرا یہ ہے کہ جدت حال سے ذوالحال میں بھی گونہ جدت آجاتی ہے (گواس درجہ کی جدت نہ ہو جیسی ہمارے ان دوست نے سمجھی تھی کہ چادرہ اتار دینے سے مہمان کے وجود ہی کی نفی کردی ۱۲) اور قاعدہ ہے کُلُّ جَدِیۡدٍ لَذِیۡذٌ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس لئے مجھے اس نعمت سے وہی حظ حاصل ہو رہا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے کُلُّ جَدِیۡدٍ لَذِیۡذٌ پر مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا ایک لطیفہ مجھے یاد آگیا.... مولانا کی عادت تھی کہ غریبوں کو تو مہمانی میں پلاؤ قورمے کھلاتے تھے اور امیروں کو دال، ساگ ۔ مولانا کا مقصود تو اس سے اور ہی کچھ تھا. وہ یہ کہ مولانا کی نظر میں اغنیا کی قدر نہ تھی غریبوں کی قدر تھی اس لئے غریبوں کی خاطر مدارات امیروں سے زیادہ کرتے تھے اور یہ سنت اللہ ہے. حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ فقراء مہاجرین کو اغنیاء سے پانچسو برس پہلے جنت میں داخل کریں گے تو خدا کے نزدیک غرباء کی اتنی قدر ہے مگر اب یہ رنگ ہے کہ ایک غریب مجھ سے کہتے تھے کہ آجکل تو غریبوں کی بہت ہی مٹی پلید ہے اب تو اگر کسی امیر سے ریح صادر ہو جائے تو کہتے ہیں مبارک ہو صحت ہوئی اور غریب سے صادر ہو جائے تو اس کو دھکیلنے اور مجلس سے نکال دیتے ہیں کہ کمبخت نے سڑا دیا' دماغ پاش پاش کر دیا حالانکہ غریبوں سے امیروں کی ریح زیادہ سڑی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ وہ مرغن غذا اور مختلف قسم کے کھانے کھاتے ہیں جس سے معدہ سخت متعفن ہو جاتا ہے غریبوں کے معدے ایسے متعفن نہیں ہوتے کیونکہ اول تو وہ سادہ غذا کھاتے ہیں پھر وہ بھی معدہ میں باقی نہیں رہتی دو چار دفعہ ہل یا نہی سے سب ہضم ہو جاتی ہے مگر بایں ہمہ امیروں کی ریح سے کسی کا دماغ نہیں پھٹتا اور غریبوں سے پاش پاش ہو جاتا ہے یہ زمانہ کا اثر ہے کہ آجکل غریبوں کی بیقدری بہت ہے مجھے اس مبارک اور صحت ہونے پر ایک حکایت یاد آئی ایک دفعہ میں ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا. وہاں ایک صاحب نے زور سے ریح صادر کی لوگوں کو ناگوار ہوا تو انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

چو باد اندر شکم پیچد فرو ہل کہ باد اندر شکم بارلیست بر دل

(جب ریح پیٹ میں گھومے چھوڑ دے کہ ریح پیٹ کے اندر ایک بوجھ ہے دل پر)

کہنے لگے دیکھئے شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ جب پیٹ میں گڑبڑ ہو تو ہوا چھوڑ دینی چاہئے میں نے اس پر

عمل کیا ہے پھر ناگواری کی کیا وجہ. میں نے کہا کہ شیخ نے اس شعر میں یہ کہاں فرمایا ہے کہ زور سے چھوڑا کرو کہنے لگے کہ اس شعر میں گو اظہار و اخفاء کی تصریح نہیں مگر جس قصہ میں یہ شعر ہے اس میں وقوع اعلان ہی کی ساتھ ہوا تھا جبھی تو ان کو اس معذرت کی ضرورت ہوئی آہستہ صدور ہوا ہوتا تو اہل مجلس سے عذر خواہی کی ان کو کیا ضرورت تھی اس وقت تو مجھے ان کی بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور میں ہار گیا اور وہ دونوں راستوں سے جیت گئے اوپر کے راستہ سے بھی اور نیچے کے راستہ سے بھی اوپر کے راستہ سے حجت و دلیل کے ساتھ جیتے اور نیچے کے راستہ سے تو جیتے ہوئے تھے ہی کہ سب کو بدبو سے دبا دیا ۱۲) بعد میں ان کی دلیل کا جواب میری سمجھ میں آیا کہ وہاں تو زور سے اتفاقاً ہوا تھا اور یہاں ان صاحب نے قصداً زور سے کیا تھا یہ فرق ہے اس قصہ میں اور ان کے فعل میں اور واقعی قصداً زور سے ریح صادر کرنا خصوصاً مجمع میں بہت ہی نازیبا حرکت اور آدمیت کے خلاف ہے ہمارے یہاں ایک میاں جی تھے جو لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے لڑکے بے تمیز تو ہوتے ہی ہیں وہ مکتب ہی میں ریح صادر کر دیتے میاں جی نے کہا بہت نالائق حرکت ہے سارا مکتب اس سے سڑ جاتا ہے اب سے جس کی ریح آئے وہ باہر جا کر چھوڑا کرے۔ پھر یہ فکر ہوئی کہ اس کے لئے کس لفظ سے اجازت لی جائے تو میاں جی نے یہ تجویز کیا کہ جب اس کام کے لئے کوئی جایا کرے تو وہ یوں کہا کرے کہ میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں یہ میاں جی بھی ایسی باتوں میں مجتہد ہوتے ہیں کیا لفظ با معنی نکالا ہے بس اب کیا تھا. لڑکوں کے ایک کھیل ہاتھ آ گیا تھوڑی دیر میں ایک اٹھتا دوسرا اٹھتا تیسرا آتا کہ میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں، میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں میاں جی، چڑیا چھوڑ آؤں آخر میاں جی تنگ آ گئے اور جھلا کر کہنے لگے کہ بس یہیں چھوڑ دیا کرو۔ یہ قصہ اس پر چلا تھا کہ آجکل غریبوں کی بہت بے قدری ہے مگر خدا کے یہاں ان کی قدر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں یہ قدر تھی کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو وصیت فرماتے ہیں یَا عَائِشَۃُ جَالِسِی الْمَسَاکِیْنَ وَقَرِّبِیْھِمْ اے عائشہ مساکین کے پاس بیٹھا کرو اور ان کو اپنے سے قریب کرو نیز آپ دعا میں فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ اے اللہ مجھے زندگی بھی مسکین رکھئے اور موت بھی مسکینی کی حالت میں دیجئے قیامت میں بھی مساکین کی جماعت میں اٹھائیے سبحان اللہ کس قدر آپ کو مساکین سے محبت تھی کہ اپنے لئے انہی کے ساتھ پسند فرماتے تھے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ نکتہ بھی

نکلا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا میں مساکین کو اپنے اوپر بھی ترجیح دی۔ ہے کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا حشر میرے ساتھ کیجئے بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کے ساتھ کیجئے جس میں اپنے کو تابع اور مساکین کو متبوع قرار دیا گیا ہے مگر میرے جی کو یہ نکتہ نہیں لگا کیونکہ گو آپ نے دعا میں لفظ سے فرمائی ہے مگر حقیقت میں مساکین ہی کا حشر آپ کے ساتھ ہوگا، وہی تابع ہوں گے اور آپ متبوع ہوں گے مساکین کی تبعیت کا کسی درجہ میں بھی وہم نہیں باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان الفاظ سے دعا فرمانا تواضع کی بنا پر ہے اسی سنت اللہ و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ پر تھا کہ آپ کی نظر میں غربا کی قدر زیادہ تھی اس لئے آپ ان کو پلاؤ زردہ اور قورمہ کھلاتے تھے اور امرا کی قدر نہ تھی اس لئے ان کو ساگ اور دال کھلاتے اصل وجہ تو یہ تھی مگر جب لوگوں نے آپ سے اس نرالے برتاؤ کی وجہ دریافت کی تو آپ نے اصل بات نہیں بتلائی کیونکہ اس کے اظہار میں امرا کی دل شکنی (اور غربا کے اعجاب) کا خطرہ تھا آپ نے اس کی دوسری وجہ بتلائی فرمایا کہ قاعدہ ہے کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ ہر نئی چیز لذیذ ہوا کرتی ہے اس لئے میں اپنے مہمانوں کو جدید چیز کھلاتا ہوں تاکہ ان کو لذت حاصل ہو غریبوں کیلئے تو پلاؤ زردہ قورمے جدید ہیں جو ان بیچاروں کے خواب میں بھی کبھی نہیں آتے ان کو تو یہ کھلاتا ہوں امیروں کو چٹنی، ساگ، دال کھلاتا ہوں کیونکہ ان کے حق میں یہی جدید ہیں جو عمر بھر ان کے کھانے میں نہیں آتے ان کو انہیں میں لذت حاصل ہوتی ہے۔ پلاؤ زردہ تو روز کھاتے رہتے ہیں وہ ان کے لئے جدید نہیں، سبحان اللہ اب یہ ایک علمی مضمون ہو گیا حالانکہ ظاہر میں معمولی بات تھی اہل لطائف کے یہاں معمولی سے معمولی باتیں بھی علمی مضامین بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس پر مولانا ہی کا ایک اور قصہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ مولانا کی مجلس میں احباب مجتمع تھے اور سنا ہے کہ جب ان حضرات کا اجتماع ہوا کرتا تھا تو اکثر مٹھائی کی فرمائش ہوا کرتی تھی کہ بھائی مٹھائی کھلاؤ چنانچہ اس وقت بھی اس کی فرمائش ہوئی اور راز اس میں یہ ہے کہ حضرات اہل اللہ میں ذکر کے انوار سے نشاط کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے وہ اسباب نشاط کو اہل دنیا سے زیادہ برتتے ہیں دنیا داروں کو اس قدر اسباب نشاط میسر نہیں ہوتے جو ان حضرات کو میسر رہتے ہیں دنیا داروں کو اپنے افکار ہی سے فرصت نہیں ملتی اور اگر کبھی یہ لوگ اسباب نشاط اختیار کرتے ہیں تو بھی ایسے رہتے ہیں جو فکر سے خالی نہیں ہوتے مثلاً گانا بجانا، شطرنج اور گنجفہ کھیلنا جو خلاف شریعت ہیں اور گناہ کو مستلزم۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمان کو گناہ کرتے ہوئے خدا کا خوف ضرور ہوتا ہے

خواہ کسی درجہ کا خوف ہو پھر خوف کے ساتھ لذت کہاں اور حضرات اہل اللہ کے یہاں اسباب نشاط سب شریعت کے موافق ہوتے ہیں جن میں گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اُدھر ان کا دل افکار دنیا سے خالی ہوتا ہے اس لئے ان کو دنیا والوں سے زیادہ نشاط میسر ہوتا ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ اہل اللہ کو آخرت کا تو غم ہوتا ہے پھر وہ بھی فکر سے خالی نہ ہوئے تو ان کا نشاط بھی کامل نہ ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ فکر آخرت لذیذ فکر ہے جس سے نشاط بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے عاشق کو محبوب کی رضا کی فکر ہوا کرتی ہے رات دن وہ اسی طرح سوچ میں رہتا ہے کہ ایسا کونسا کام کروں جس سے محبوب راضی ہو مگر یہ فکر لذیذ ہوتا ہے جس کی لذت عشاق کے دل سے پوچھو۔ عاشق اس فکر سے کبھی خلاصی کا طالب نہیں ہوتا مجنوں کہتا ہے ؎

یَا رَبِّ لَا تَسْلُبَنِّیْ حُبَّهَا اَبَدًا ۔۔۔ وَیَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِیْنَا

(اے اللہ لیلیٰ کی محبت ہمیشہ مجھ سے سلب نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو شخص آمین کہے)

اور کہتا ہے ؎

اِلٰهِیْ تُبْتُ مِنْ كُلِّ الْمَعَاصِیْ ۔۔۔ وَلٰكِنْ حُبَّ لَیْلٰی لَا اَتُوْبُ

(اے اللہ میں گناہوں سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا)

حالانکہ محبت لیلیٰ نے اس کے دل کو جلا پھونک دیا تھا مگر اس پر بھی وہ اس کے زوال کا طالب نہیں بلکہ ترقی کا خواہاں ہے اور یہ مثال بہت ہی ناقص ہے کیونکہ مجنوں کا یہ عشق خطرہ آخرت سے خالی نہ تھا اس پر اُس عشق کو کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے جس میں لذت ہی لذت ہے خطرہ کا نام نہیں مگر سمجھانے کے لئے ایک مثال ناقص بھی کافی ہے ۱۲) ہم نے ثقات سے سنا ہے کہ جب حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ تھانہ بھون تشریف رکھتے تھے تو صبح کو اشراق وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے حجرہ میں سے مٹھائی کی ہنڈیا نکال لیتے اور حضرت حافظ ضامن صاحب شہید قدس سرہٗ اور مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرات سب مل کر مٹھائی کھایا کرتے پھر اس میں باہم چھینا جھپٹی بھی ہوتی تھی کوئی ہنڈیا اٹھا کر بھاگ جاتے، دوسرے حضرات ان کے پیچھے دوڑتے حالانکہ یہ حضرات اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت مشائخ تھے مگر ان کی معاشرت ایسی سادہ تھی جس میں تصنع و تکلف کا نام نہ تھا بھلا آج کل تو مشائخ ایسا کر کے دکھلائیں تو یہ ان کی تو شان گھٹ جائے گی متانت و وقار کے خلاف ہو جائیگا۔

چنانچہ ہمارے یہاں ایک شخص تھا وہ کہا کرتا تھا کہ علماء و مشائخ کو متانت و وقار سے رہنا چاہیئے میں کہتا ہوں کہ اسکا وقار اسی کو مبارک ہو ہم تو اس کو تکبر سمجھتے ہیں ہمیں چھچھورے پن ہی میں رہنے دو اور جو کوئی ہمیں چھچھورا کہے کہو ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　ما نمی خواہم ننگ و نام را اور

(اگرچہ عاقلوں کے نزدیک، بدنامی ہے ہم ننگ و نام کے خواہاں نہیں ہیں)

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار　　کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل و تدبیر کرنا چاہیئے)

جس کو مریدوں اور مقتدوں کی فوج جمع کرنا ہو وہ اس متانت و وقار کو اختیار کرے اور جس کو جلانا پھونکنا اور جلنا مرنا منظور ہو اس کو ان اسباب وقار کی ضرورت نہیں بس اس کو ضرورت ہے کہ خلاف رضاء محبوب کوئی کام نہ ہو جو کام ہو شریعت کی حد کے اندر ہو اس کے بعد اس کو کسی کی فکر نہیں چاہے کوئی اس کی ساتھ رہے یا نہ رہے اور میاں جس کو حق تعالیٰ عظمت دیتے ہیں اس کی عزت ان باتوں سے کم نہیں ہوا کرتی کہ ذرا ہنسی کی باتیں کرلیں دوستوں سے چھینا جھپٹی کرلی بھاگ دوڑ لئے، ہاں جس کی عزت موہوب نہ ہو مکسوب ہو وہ بیشک متانت و وقار ہی سے بنتی ہے تو لعنت ہے ایسی عزت پر جس کے لئے انسان کو کوشش و سعی کرنا پڑے۔ غرض مولانا محمد قاسم صاحب سے احباب نے فرمائش کی کہ مٹھائی کھلایئے مولانا نے ایک روپیہ کی مٹھائی منگوائی اور اپنے ایک مقرب خادم کو جن کا نام مولوی فاضل تھا تقسیم کے لئے فرمایا چنانچہ وہ تقسیم کر چکے تو مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک لطیفہ فرمایا۔ اَلْفَاضِلُ لِلْقَاسِمِ۔ یہ جملہ ذو معانی ہے اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جو بچ جائے وہ تقسیم کرنے والے کا ہے (یعنی مولوی فاضل کا) یہی معنی مولانا کا نام قاسم تھا۔ اس صورت میں فاضل بمعنی لغوی ہے۔ اور قاسم بمعنی عرفی۔ اور تیسرے معنی یہ ہیں کہ فاضل (یعنی مسمی بہ فاضل قاسم کے ہیں یعنی تم میرے ہو اس صورت میں فاضل و قاسم دونوں بمعنی عرفی مستعمل ہوں گے۔ مولوی صاحب نے موقعہ اور اجازت دیکھ کر جواب دیا اَلْفَاضِلُ لِلْفَاضِلِ وَالْقَاسِمُ مَحْرُوْمٌ یہ جملہ بھی ذو معنیین ہیں اس میں اگر فاضل و قاسم دونوں معنی لغوی لئے جائیں تو معنی یہ ہیں کہ بچا ہوا اس

شخص کا ہے جو فاضل ہے (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب کیونکہ صاحب فضیلت وہی تھے) اور تقسیم کرنے والا محروم ہے (یعنی مولوی فاضل محروم ہیں کیونکہ وہی تقسیم کر رہے تھے) اور یہ مثل بھی ہے اَلْقَاسِمُ مَحْرُوْمٌ تو جس میں قاسم بمعنی لغوی مستعمل ہے اور یہی معنی مولوی فاضل صاحب کے مراد تھے لیکن مزاح کے طور پر ایک معنی بھی اس جملہ کے ہو سکتے ہیں جبکہ فاضل و قاسم کو بمعنی عرفی لیا جاوے وہ یہ کہ بچا ہوا فاضل ہے۔ (یعنی مسمی بہ فاضل کا) اور قاسم محروم ہیں (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) اہل اللہ کے خدام مودب ہوتے ہیں بے ادب نہیں ہوتے مگر بے ادبی اسے کہتے ہیں جس سے مخدوم کو تکلیف ہو چونکہ مولوی فاضل صاحب جانتے تھے کہ اس وقت حضرت مولانا کی طبیعت مزاح کو چاہ رہی ہے اس لئے انہوں نے اجازت پاکر ذو معنیین جملہ استعمال کر دیا سو اس کا مضائقہ نہیں نہ یہ بے ادبی میں داخل ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کی مراد ادب کے خلاف نہ تھی گو ایہام خلاف کا ہوتا ہے سو مزاح میں ایسے ایہام کی اجازت ہے جبکہ شیخ کی طبیعت مزاح پر مائل ہو یہ نہیں کہ ہر وقت موقعہ بے موقعہ ایسے جملے استعمال کیا کرو۔ سو دیکھئے اہل لطائف کے یہاں مٹھائی میں بھی علمی نکات ہوا کرتے ہیں ان کا کوئی کام اور کوئی قول بھی علمی مضامین سے خالی نہیں ہوتا یہ قصہ تو تبعاً یاد آ گیا تھا اصل مقصود یہ تھا کہ مولانا نے کل جدید لذیذ کے قاعدہ سے اپنے اس فعل کی وجہ بتلائی کہ میں غریبوں کو عمدہ کھانے اور امیروں کو معمولی کھانے کیوں کھلاتا ہوں۔ اس لئے کہ ہر ایک کو جدید کھانوں سے لذت حاصل ہوا کرتی ہے۔ تو جس کے حق میں جو جدید ہوا اس کو وہی کھلانا چاہیئے۔ اسی بنا پر میرا جی چاہا کہ اس جدید نعمت سے جو فی نفسہ قدیم ہے مگر مجھ پر بہیئت مخصوصہ وارد ہونے کی وجہ سے مجھے جدید معلوم ہوئی ہے۔ اور اس سے مجھ پر ایسا خاص اثر ہوا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے احباب کو بھی مطلع کروں وہ نعمت یہ ہے کہ ایک مرتبہ بار ہا تھا یا بیٹھا ہوا تھا کہ قلب پر خود بخود یہ بات آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں اتنا ہی ہم آخرت کی طرف مسافت طے کر رہے ہیں یہاں تک کہ ایک دن موت آجائیگی اور یہ مسافت قطع ہو جائے گی جس کے بعد ہم آخرت تک پہونچ جائیں گے یہ مضمون ایسا ظاہر ہے کہ حدیث وغیرہ سے اس کے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں، مگر حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے اَلدُّنْيَا مُدْبِرَةٌ وَّ الْاٰخِرَةُ مُقْبِلَةٌ اَوْ كَمَا قَالَ یعنی دنیا جارہی ہے اور آخرت آرہی ہے اس کا وہی حاصل ہے

خواہ اس کو یوں تعبیر کیا جائے کہ ہم آخرت کی طرف جارہے ہیں خواہ یوں تعبیر کیا جاوے کہ آخرت ہماری طرف آرہی ہے۔ دوسری تعبیر مجاز ہے پہلی حقیقت جیسا اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کے لئے اقبال ثابت فرمایا ہے جسکی حقیقت یہ ہے کہ واقع میں زمانہ خود حرکت کررہا ہے، اور ہماری حرکت فی الزمان مجازی ہے۔ البتہ مکان میں ہماری حرکت حقیقی ہے چنانچہ ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف ہم خود حرکت کرتے ہیں مکان خود ہماری طرف نہیں آتا بخلاف حرکت فی الزمان کے کہ اس کے اعتبار سے ہم متحرک مجازی ہیں کیونکہ ہم کو ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ کی طرف خود جانا نہیں پڑتا بلکہ زمانہ خود بخود حرکت کرکے آتا ہے چنانچہ ہم سوتے رہتے ہیں اور زمانہ ہمارے اوپر گذرتا رہتا ہے کہ اس سے ظاہر ہوگیا کہ حرکت فی الزمان میں ہمارے قصد و اختیار کو اصلاً دخل نہیں حقیقت میں زمانہ خود متحرک ہے اور ہم متحرک فی الزمان حقیقۃً نہیں۔ پس زمانیت کے لئے حرکت فی الزمان مجازی ہے اور بنا بر اس تحقیق کے لطیفہ تفسیریہ پر بھی تنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ قرآن میں یہ ہے اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جب ان کی میعاد (معلوم یعنی موت) آجائے گی تو اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے جس کا حاصل یہ ہوا کہ موت کے وقت سے نہ کوئی آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ موت کے آنے کے بعد اُس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اب یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ آیت سے جو مضمون مقصود ہے یعنی موت سے محفوظ نہ ہوسکنا اس سے لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً کا دخل تو ظاہر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موت کا وقت آنے کے بعد اس سے بچ نہیں سکتے اور بچنے میں تاخر کو دخل ہوسکتا ہے مگر لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ کو اس میں کیا دخل ہے یہ جملہ کیوں بڑھایا گیا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت سے پہلے کوئی بھی نہیں مرسکتا۔ سو یہ حکم تو صحیح ہے جو مقصود ہے اس میں کیا دخل کیونکہ تقویم میں نافع ہونے کا کیا احتمال ہے وہ تو اور الٹا مضر ہوگا پھر خصوص مجئ اجل (مدت آنے) کے بعد تو عقلاً بھی اس کا احتمال نہیں ہاں تاخیر کا احتمال ہوسکتا تھا اس لئے اس کی نفی بے شک مفید ہے تو یہ جملہ بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں مگر حضرت استاد رحمہ اللہ نے ایک عجیب جواب دیا تھا جو میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا ممکن ہے کسی نے لکھا ہو مگر میری نظر سے نہیں گذرا اور نہ مجھ کو اس تلاش کا اہتمام ہے ہیں تو خدا تعالے نے

مشائخ ہی ایسے دیئے تھے جن کی باتوں سے ایسی تسلی ہو جاتی تھی جس سے کتب بینی سے استغنا ہو گیا مولانا نے فرمایا کہ اس اشکال کا مبنی تو یہی ہے کہ تقدیم نافع نہیں ہو سکتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تقدیم ممکن ہوتی تو وہ بھی نافع ہو سکتی اس طرح موت سے بچنے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یہ کہ وقت موت سے مقدم وقت میں چلا جائے مثلاً جمعہ کا دن موت کے لئے مقرر ہوا وہ وقت آیا اور یہ شخص جمعرات کے دن میں داخل ہو جائے، دوسرے یہ کہ وقت موت سے موخر وقت میں چلا جاوے مثلاً جمعہ کا دن آنے کے بعد موت کے آثار دیکھ کر سنیچر کے دن میں پہونچ جائے تو دونوں صورتوں میں موت نہ آئے گی کیونکہ وقت مقررہ تو جمعہ کا تھا اور جمعہ سے دونوں صورتوں میں فرار ہو گیا تو حق تعالیٰ نے اس طرح اشارہ کر دیا ہے کہ دونوں صورتیں نافع ہو سکتی تھیں مگر چونکہ حرکت من الزمان ممکن نہیں اس لئے کسی صورت کا وقوع نہیں ہوتا خیر یہ تو لطائف ہیں جو ضمناً بیان کر دیئے ورنہ اصل مقصود آیت کا صرف یہ ہے کہ موت آنے کے بعد اس سے بچنا ناممکن ہے جس کو محاورہ میں اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ وَلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (جیسے وَمَا یُبْدِئُ وَمَا یُعِیْدُ (وہی دوسری بار بھی پیدا کرے گا) جیسے وَمَا یُبْدِئُ وَمَا یُعِیْدُ میں ابداء و اعادہ کے معنی حقیقی مراد نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ باطل کارآمد نہیں ہوتا اس مقصود کو اس عبارت میں محاورہ کے موافق بیان کر دیا گیا اسی طرح یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تاخر و تقدم کی حقیقۃً نفی مراد نہیں بلکہ حاصل مراد ہے اور محاورات میں کسی شے سے نہ بچ سکنے کو اسی طرح بیان کیا کرتے ہیں)، اس تقدیر پر آیت کو حرکت زمانی فی الزمان کی بحث سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ یہ محض ایک لطیفہ ہوگا مگر قرآن میں ایسی جامعیت ہے کہ ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد ۔۔۔ برنگ اصحاب صورت را ببو اصحاب معنی را

(اس کے حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن صوری سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن معنوی سے تر و تازہ رکھتی ہے)

قرآن میں لطائف عقلیہ کی بہت گنجائش ہے گو وہ لطائف مسوق لہا الکلام نہ ہوں اس بنا پر ایسے نکات جو قواعد شرعیہ و عربیہ کے خلاف نہ ہوں قرآن میں بیان کرنے کا مضائقہ نہیں۔ الغرض

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

یہ بات میرے دل پر آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور ہر وقت ہر ساعت ادھر چل رہے ہیں یا یوں کہدیا جائے کہ آخرت برابر ہماری طرف چلی آرہی ہے، یہی مضمون قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ (ان لوگوں سے ان کا حساب نزدیک آپہونچا اور یہ غفلت میں ہیں) اور ایک تفسیر یہ بھی ہے حافظؒ کے اس شعر کی ؎

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم　　جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

(مجھ کو منزل محبوب میں امن وسکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو)

اس کی ایک تفسیر یہی کی گئی ہے کہ دنیا میں امن وعیش کہاں جبکہ ہر دم دنیا کی حالت یہ پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسباب باندھ لو اور چلنے کی تیاری کرو کیونکہ واقعی ہمارا ہر سانس جو گذر رہا ہے وہ اس کی خبر دے رہا ہے کہ تم آخرت کی طرف اتنے نزدیک ہو گئے ہو جس کی عمر بیس سال کی ہے اس نے آخرت کی طرف بیس سال کی مسافت طے کر کے قرب حاصل کر لیا جس کی زیادہ عمر ہے اس نے زیادہ قرب حاصل کر لیا ہے (سچ کہا ہے کسی نے) ؎

نَسُرُّ الْمَرْءُ مَا ذَهَبَ اللَّيَالِي　　وَكَانَ ذِهَابُهُنَّ لَهُ ذِهَابًا

(دلی خوش ہوتا ہے کہ اتنے ایام گذر گئے حالانکہ دنوں کا گذر اس کی عمر کا گذر نا ہے)

انسان کو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ میرے بچہ کی عمر دس سال یا بیس سال کی ہو گئی اور یہ خبر نہیں کہ وہ اسی قدر موت سے قریب ہو گیا ہے ۱۲ جامع۔ اسی مضمون کو حافظ رحمہ اللہ نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے۔ اور جرس کا لفظ اس بنا پر اختیار فرمایا کہ اس زمانہ میں قافلہ کے ساتھ جرس رہنے کی عادت تھی جیسے آجکل اسٹیشن پر گھنٹی بجا کرتی ہے یہ بھی جرس کی یادگار ہے مگر آج کل بدوؤں میں جرس کی جگہ حی لولنے کا دستور ہے بس ان کی حی کہتے ہی دوسرے میت ہو جاتے ہیں کیا مجال ہے جو اس آواز کے بعد قافلہ کے چلنے میں ذرا بھی توقف ہو سکے ریل کی سیٹی کے بعد دیر ہو سکتی ہے مگر ان کی حی کے بعد دیر نہیں ہوتی یہ تفسیر تو اس شعر کی اہل زہد نے کی ہے۔ اور عارفین کے نزدیک اس کی اور تفسیر ہے۔ کہ مجھے منزل محبوب میں امن وعیش کہاں کیونکہ یہاں تو ہر وقت جرس کی فریاد ہے کہ اس منزل پر نہ ٹھہرو اسباب باندھ کے آگے چلو

آگے چلے تو وہاں بھی قیام نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی تاکید ہے خلاصہ یہ کہ سلوک میں ترقی کرتے رہو کسی ایک حال پر قناعت نہ کرو ایک مقام پر ٹھہرو نہیں تو جب سالک کو ہر دم ترقی کی فکر ہے تو اس کو امن وعیش کہاں اس مضمون کو دوسرے عارف نے اس طرح بیان فرمایا ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے طے نہیں ہوتا جس طرح درخت انگور جتنا قطع کرو اور بڑھتا ہے)

کہ یہ راستہ دوڑنے سے قطع نہیں ہوسکتا جتنا چلتے ہیں اتنا ہی راستہ نکلتا چلا آتا ہے جیسے پہاڑوں کے بیچ میں راستہ ہوتا ہے کہ دور سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے دونوں پہاڑ ملے ہوئے ہیں بس اس کے بعد راستہ ختم مگر جوں جوں قریب پہونچتے ہیں راستہ نکلتا آتا ہے، یہی حال طریق سلوک کا ہے کہ اس کا منتہیٰ کسی جگہ نہیں مگر حافظ نے اس مضمون کو مبہم فرمایا ہے جس سے صاف یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ طریق سلوک کے متعلق فرمارہے ہیں اسی لئے لوگ ان کو کبابی شرابی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا کلام مختلف محامل پر محمول ہوسکتا ہے۔ مولانا رومی نے اس کو صاف صاف بیان فرمایا ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست　　　　ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

(بھائی محبوب کی درگاہ کی انتہا نہیں ہے جس مقام پر پہونچو مت ٹھہرو آگے چلو)

اور دنیا میں تو سلوک کی انتہا ہے ہی نہیں بعض عارفین کا ارشاد ہے کہ آخرت میں بھی ترقی بند نہ ہوگی بلکہ وہاں بھی ہر دم ترقی ہوتی رہے گی کیا عجب ہے کہ خلود اسی واسطے ہو کیونکہ جب راستہ بے نہایت ہے تو اس کے طے کرنے کے لئے سالک کو بھی عمر بے نہایت تک زندہ رہنا چاہیئے اور جب آخرت میں بھی ترقی بند نہ ہوگی تو ممکن ہے کہ جس طرح بعض لوگ وہاں پر جنت وحور میں مشغول ہوں گے بعض ان سے بڑھ کر ہوں جو محض دیدار الٰہی میں مشغول ہوں اور ان کو تجلیات میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہتی ہو۔ اسی لئے بعض کا قول ہے اِنَّ فِی الْجِنَانِ جَنَّۃً لَیْسَ فِیْھَا حُوْرٌ وَّلَا قُصُوْرٌ وَّلٰکِنْ اَرِنِیْ اَرِنِیْ یعنی جنتوں میں ایک جنت ایسی بھی ہے کہ جہاں حور ہے نہ قصور بلکہ صرف تمنائے دیدار ہوگی اور وہاں کے رہنے والے ہر وقت یہی پکاریں گے اَرِنِیْ اَرِنِیْ (مجھکو دیدار دکھائے مجھ کو دیدار دکھایئے) مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا

کہ جو لوگ حور و قصور میں ہوں گے وعلی الاطلاق ان سے کم درجہ والے ہوں گے۔ مجموعہ تین قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن کو حور و قصور ہی کا مشاہدہ ہے اور ان کو اس میں جمال حق نظر نہیں آتا اور خاص خاص مدت میں تجلی حق سے مشرف ہوتے ہیں، دوسرے وہ جو صرف جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق ہیں اُن کو کسی طرف التفات نہیں، تیسرے وہ جو جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق رہ کر اس درجہ پر پہنچ گئے کہ ہر چیز میں ان کو جمال حق کا ہی مشاہدہ ہوتا ہے اور ظاہر میں حور و قصور سے بھی متمتع ہو رہے ہیں تو یہ اوُنیٰ والے پہلے درجہ والوں سے تو بڑھے ہوئے ہوں گے مگر تیسرے طبقہ سے افضل نہ ہوں گے بلکہ تیسرا طبقہ ان سے بھی بڑھا ہوا ہے اور اس مذاق کے لوگ دنیا میں بھی نظر سے گزرے ہیں جن کو جمال حق کے سامنے حور و قصور کی پروا نہ تھی۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی فرماتے تھے کہ جب ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں آویں گی "یہ بات اس طرح فرمائی گویا یہ طے شدہ بات ہے کہ جنت میں تو ضرور ہی جائیں گے یہ غلبۂ رجا تھا" تو ہم حوروں سے کہیں گے کہ بی قرآن پڑھو تو یہاں بیٹھو ورنہ چلتی بنو۔ مگر اس وقت مولانا پر غلبۂ حال تھا عشق کا حال غالب تھا کبھی عارف پر عشق کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے، اور جب معرفت کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت اس کو کوئی چیز مشاہدۂ جمال حق سے مانع نہیں ہوتی جملہ اشیاء مرآۃ جمال محبوب بن جاتی ہیں اس وقت وہ یوں کہتا ہے ؎

ماچو چنگیم و تو زخمہ می زنی   زاری از ما نے تو زاری میکنی

(ہم مثل چنگ کے ہیں اور آپ مضراب مارتے ہیں گو یہ وزاری ہماری طرف سے ہے نہ آپ زاری کرتے ہیں)

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرات اکابر صوفیہ جیسے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ عمدہ لباس اور عمدہ غذائیں اس لئے استعمال کرتے تھے کہ ان کو ان چیزوں میں نعمائے جنت کے اظلال نظر آتے تھے تو عارف کو بعض دفعہ ہر چیز میں ظل جمال حق نظر آتا ہے اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ وہ حور کو بھی حاجب نہیں سمجھتا بلکہ وہ اس کے لئے ایسی بن جاتی ہے جیسے آئینہ میں صورت محبوب نظر آیا کرتی ہے اور جس وقت معرفت کا غلبہ نہ ہو بلکہ عشق کا غلبہ ہو تو وہ اس سے زیادہ کہتا ہے یعنی اپنے کو بھی حجاب سمجھتا ہے حور کو تو کیوں

نہ سمجھے گا حضرت قلندرؒ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں سننے دوں)

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد　　　تا نہ بینم رُخ تو روح رمیدن نہ دہم

(اگر ملک الموت میری جان لینے کو آئے تو میں جب تک آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں جان نہ دوں گا)

اور عارف اپنے کو بھی مرآۃ سمجھتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن در آ　　　تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن در آ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کر لو)

چنانچہ صوفیہ نے قلب میں تمام عالم ناسوت و ملکوت کو مندرج مانا ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ تم کو چمن اور سرو و سمن کی سیر کی ضرورت نہیں اپنے دل کا دروازہ کھول کر اس کی سیر کرو اس میں سب کچھ موجود ہے اور دوسرے آثار کو بھی جیسا مولانا نے ایک صوفی کا قصہ لکھا ہے ؎

صوفئ در باغ از بہر کشاد　　　صوفیانہ روئے بر زانو نہاد

یعنی وہ سر جھکائے باغ میں مراقب بیٹھا تھا کسی نے کہا فَانْظُرْ اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ۔ (آثار رحمت الٰہی کی طرف دیکھ) صوفی نے جواب دیا کہ میں تو آثار رحمت ہی کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور تم آثار الآثار کو دیکھ رہے ہو۔ اس صوفی نے تفسیر میں تغیر نہیں کیا بلکہ استدلال کیا ہے کہ جب ان آثار رحمت کے مشاہدہ کا امر ہے جو ظل آثار رحمت ہیں تو اصل آثار کے مشاہدہ کا امر کیوں نہ ہوگا جو مومن کے قلب میں ہیں تو مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کو غلبۂ عشق میں یہ یاد نہ رہا کہ وہاں حور بھی حجاب نہ ہو گی یعنی مشاہدہ جمال حق سے مانع نہ ہو گی اس لئے یہ فرمایا کہ حوریں آئیں گی تو ہم ان سے کہیں گے کہ بی قرآن سناؤ تو بیٹھو ورنہ چلی جاؤ۔ ورنہ وہاں حوروں سے باتیں کرنے میں بھی وہی قرب ہوگا جو تلاوت قرآن میں حاصل ہوتا ہے تو غالباً وہ جنت میں ارنی ارنی کی صدا ہو گی وہاں ایسے ہی عشاق کا مجمع ہوگا عارفین کاملین ان سے بھی اونچے درجہ میں ہوں گے جہاں حور و قصور سب کچھ ہوں گے اور کوئی چیز مانع مشاہدۂ حق سے نہ ہو گی مگر جنت میں کسی ایسی جنت کا ہونا صرف اس صوفی کے قول سے معلوم

ہو رہا ہے احادیث سے اس کا کہیں ثبوت نہیں ملا پس یا تو اس کو کشف پر محمول کر کے سکوت کیا جائے یا تاویل کر کے احادیث پر منطبق کر لیا جائے تاویل یہ کہ صوفی کا مطلب یہ نہیں کہ ایسی جنت کوئی مستقل ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حور و قصور والی جنت میں ایک حالت ایسی ہوگی جس میں غیر کی اصلا گنجائش نہ ہوگی بلکہ اس وقت مشاہدہ جمال حق میں بجز ارنی کے اور کوئی تمنا نہ ہوگی نہ کسی کی طرف التفات ہوگا چنانچہ یہ مضمون دو حدیثوں کے مجموعہ میں ہے ایک یہ کہ جب اہل جنت جنت میں پہونچ جائیں گے تو حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے جنت والو تم اور کچھ چاہتے ہو وہ کہیں گے خداوندا آپ نے ہم کو بہت کچھ عطا فرمادیا ہے ارشاد ہوگا کہ لو ہم تم کو اس سے بھی افضل نعمت عطا کرتے ہیں اور اس کے بعد حق تعالیٰ تجلی فرمائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس نعمت سے زیادہ لذیذ اہل جنت کے نزدیک کوئی نعمت نہ ہوگی رواہ مسلم، اور جب تک اس تجلی میں مشغول رہیں گے کسی نعمت کی طرف التفات نہ کریں گے' رواہ ابن ماجہ۔ ان حدیثوں سے اس صوفی کے قول کی مناسب تاویل ہو سکتی ہے۔ پس اس بنا پر جنت میں بھی ترقی مظنون ہوئی تو بعض نے ترقی سلوک کو اس شعر حافظ کا محمل ٹھہرایا ہے اور بعض نے دنیا سے آخرت کی طرف سفر کرنے کو محمل کہا ہے اور میں اسی کو کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ آخرت کی طرف چل رہے ہیں ہم کو ہر وقت یہ مراقبہ پیش نظر رکھنا چاہیئے اور جس طرح سفر قطع کرنے میں ہر وقت اس پر نظر رہتی ہے کہ کون امر اس سفر میں معین ہے تو اس کی تحصیل کرتا ہے اور کون امر مانع ہے اس سے دور رہتا ہے۔ اسی طرح اس سفر الی الآخرت میں بھی ہر دم ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا کریں کہ یہ آخرت کی منزل میں مفید ہوگا یا مضر اب بعض امور تو معین آخرت ہونگے جیسے ذکر اللہ۔ امر بالمعروف تلاوت قرآن۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہا یہ تو معین ہیں مقصود میں یعنی حصول نجات میں اور یہی منزل پر پہونچنا اور بعض امور مانع عن الوصول ہیں جیسے معاصی ظاہرہ و باطنہ اور بعض امور ظاہر میں نہ معین ہیں نہ مانع جیسے امور مباحہ۔ کہ ان کے کرنے میں ثواب نہیں (الا بِنِيَّةٍ مَخْصُوْصَةٍ ۱۲) (مگر نیت مخصوصہ سے) اور ترک میں گناہ نہیں اس کو عام لوگ مستقل قسم ثالث سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں اثر کے اعتبار سے یہ تیسری قسم نہیں بلکہ ان دونوں

قسموں میں سے کسی ایک قسم کی طرف راجع ہے کیونکہ مباح بھی اثر محمود و اثر مذموم سے خالی نہیں ہوتا فعل مباح کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے یا محمود یا مذموم گو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے نہ محمود ہے نہ مذموم مگر ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا اثر بھی غیر محمود و غیر مذموم ہی ہے بلکہ اثر یا محمود ہوتا ہے یا مذموم پس اگر اس کا اثر محمود ہے تو وہ قسم اول اعمال مفید آخرت میں داخل ہے اور اگر اثر مذموم ہے تو قسم دوم مضرت آخرت میں داخل ہے اس تقریر کے بعد ایک حدیث کا اشکال رفع ہو گیا حدیث یہ ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ (مسلمان کے اسلام کی خوبی میں سے یہ بات ہے کہ وہ لایعنی اور فضول کاموں کو ترک کر دے ۱۲) اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ لایعنی سے امور محرمہ تو مراد ہو نہیں سکتے کیونکہ ان کا ترک تو واجب ولازم ہے اور سیاق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وجوب ترک مراد نہیں بلکہ محض ترغیب ترک دی جا رہی ہے تو یقیناً لایعنی سے مراد امور مباحہ ہیں تو اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ امور لایعنی مانع عن الوصول اور مضر آخرت نہیں ہیں تو اُن کے ترک کی ضرورت کیا ہے تقریر گذشتہ سے معلوم ہو گیا کہ امور مباحہ کو لایعنی کہنا یہ محض درجۂ ذات کے اعتبار سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی درجہ کے اعتبار سے ان پر لایعنی کا اطلاق فرمایا ہے ورنہ آثار کے اعتبار سے یہ امور مایضر ہیں یعنی مضر اور اسی درجہ آثار کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ترک کا امر فرما رہے ہیں اور اس کو کمال اسلام کی خوبی بتلا رہے ہیں پس اگر کوئی مباح مفید آخرت ہو تو اس وقت وہ لایعنی نہ ہو گا مثلاً مزاح کرنا بچوں سے یا دوستوں سے یہ فی نفسہ مباح ہے جس نہ ثواب نہ گناہ مگر اثر کے اعتبار سے یا مفید آخرت ہے یا مضر اگر مفید ہوا تو لایعنی نہ رہے گا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مزاح فرمایا ہے حالانکہ یقیناً آپ امور لایعنی سے بری تھے اس کا معیار یہ ہے کہ اپنی نیت کو دیکھو کہ مزاح سے مقصود کیا ہے۔ ہمارے یہاں تو کچھ بھی مقصود نہیں ہوتا ہم لوگ اکثر کام بدون کسی خاص ارادہ اور نیت کے کرتے ہیں محض عادت کی بنا پر اکثر کام ہوتے ہیں اور اگر کسی مقصود کا ارادہ بھی ہوتا ہے تو وہ نفس کی کوئی غرض ہوتی ہے بلکہ ہم کیا کہیں ہماری تو نماز بھی نفس ہی کے لئے ہے اس میں بھی کوئی نیت خالص آخرت کے لئے نہیں ہوتی اسی لئے نماز پڑھ کر ہمیں تو ڈر لگتا ہے کہ یہ

کس منہ سے کہیں کہ اے اللہ قبول فرمالے بلکہ یوں دعا کہتے ہیں کہ خدا معاف کرے تو ہمارے یہاں مزاح میں تو کیا نیت ہوتی امور واجبہ و مفروضہ میں بھی کوئی خاص نیت نہیں ہوتی بلکہ اکثر افعال عادت کی وجہ سے خود بخود صادر ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی نیت ہوتی بھی ہے تو وہ نفس کی غرض سے خالی نہیں ہوتی خیر یہ تو ہمارا حال ہے اس کو تو رہنے دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں تو یقیناً کچھ مصالح ضرور ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں تو مصالح کیوں نہ ہوتیں عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاح میں اختیار کی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے جس میں ایک کام تو آپ کا تھا پہونچا دینا اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خداداد ہیبت کس قدر مانع ہو سکتی تھی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لئے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت ہے جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا بس یہ حال ہو جاتا ہے ؎

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے
تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ کر آتا ہے کہ یوں کہوں گا یہ پوچھوں گا صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا۔ ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں ؎

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے گاہے گاہے مزاح فرمایا کرتے تھے تاکہ ان کا دل کھل جائے اور بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت تو بھلا کیسی کچھ ہوگی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ دفعۃً آپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب مارے ہیبت کے

گھٹنوں کے بل گر پڑے حالانکہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرید نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پیر بھائی تھے جن میں گو نہ مساوات ہوا کرتی ہے مگر ان پر بھی آپ کا اس قدر رعب تھا مگر شاید اس میں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات معتقد تو تھے تو سنئے کہ غیر معتقدین پر آپ کے رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان و شوکت کے ساتھ مدینہ منورہ میں آپ کی خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہو کر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے ؂

گفت کو قصر خلیفہ اے حشم　　　تا من اسپ و رخت را آنجا کشم

قوم گفتندش کہ او را قصر نیست　　　مر عمر را قصر جان روشنے ست

(کہنے لگا اے لوگو! خلیفہ کا محل کہاں ہے تاکہ میں وہاں حاضر ہوں لوگوں نے کہا کہ ان کا کوئی محل ظاہری نہیں ہے ان کا محل ان کا قلب روشن ہے۔)

(اس موقعہ پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہو گیا مگر بہت ضبط سے کام لیا ۱۲) لوگوں نے کہا کہ عمر کے لئے نہ قصر ہے نہ ایوان ہے بس ان کا تو دل ہی قصر و ایوان ہے۔ قاصد کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کانپتے ہیں اس کے محل نہ قصر یہ کیا معاملہ ہے پھر اس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں لوگوں نے کہا مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں تلاش کر لو کہیں مل جائیں گے۔ اب وہ آپ کی تلاش میں چلا معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے ہیں سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے، نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں نہ پولیس آخر وہ جنگل کی طرف چلا جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پڑے سو رہے تھے قدم رکھتے ہی اس کے دل پر ہیبت و رعب نے غلبہ کیا کیونکہ جنگل میں ایک خدا کا شیر پڑا ہوا تھا اور قاعدہ ہے کہ جہاں شیر پڑا ہوتا ہے اس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ چوکی ہے نہ جاہ حشم ہے نہ ساز و سامان ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب قریب پہونچا تو دیکھا کہ ایک

خدا کا شیر جنگل میں تن تنہا پڑا سو رہا ہے نہ اُسے کسی دشمن کا خوف ہے نہ جاسوس کا ڈر سر کے نیچے ایک اینٹ تکیہ کے بجائے رکھی ہے نہ کوئی فرش ہے نہ بستر بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بے فکر سو رہے ہیں۔ اس حالت کا مقتضا یہ تھا کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بے وقعتی ہوتی مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر روم لرزنے لگا جونہی نظر پڑی ہے پیر اٹھانے کی ہمت نہ رہی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ میں نے تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جن کے دربار میں رعب و داب کے ہزار سامان ہوتے تھے مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہ ہوا آج کیا بات ہے کہ اس بے سر و سامان شخص کے رعب سے میرا پتّہ پانی ہوا جاتا ہے آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزا پیدا ہو گیا بیشک ؎

ہیبت حق است وایں از خلق نیست ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست

(یہ ہیبت حقیقت میں حق تعالیٰ کی ہوتی ہے اس مخلوق یا اس گدڑی والے کی نہیں ہوتی)

یہ خدائی رعب و جلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا بالآخر سفیر روم کی ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو خود جگائے وہ تو اپنی جگہ دیر تک کھڑا کانپتا رہا کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ایک پردیسی اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے۔ آپ نے اس کو پاس بلایا اور تسلی دی جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سفیروں کو مرعوب دیکھ کر فرمایا تھا کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو میں تو اس غریب عورت کا بچہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ کی باتیں سننے کے بعد ہیبت مبدل بہ محبت ہو گئی اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا کہ واقعی مذہب اسلام حق ہے پھر وہ اسلام سے مشرف ہو گیا یہ تو حضرات صحابہ کرام کی حالت تھی ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کی ان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے رعب و ہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولانا سے بے تکلف باتیں نہ کر سکتے تھے، حضرت کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رکتے

اد جھکتے تھے اور ڈرتے تھے اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ غصیار ہوتے ہیں بات بات میں ان کو غصہ آجاتا ہے اس لئے ان کے پاس جاتے ہوئے لوگ کانپتے ہیں جیسے مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب تھے یا آجکل بھی ایک بدنام ہے (ہائے سو ہزار نام فدا لئے تو و بدنامی تو ۔ تجھ پر اور تیری بدنامی پر ہزار نام فدا ہیں ۱۲ جامع) مگر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا، میں نے تو کبھی بھی مولانا کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا مگر اس پر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کے لئے مانع فیض ہو جاتی ہے اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام اپنے اصحاب و احباب سے گاہے مزاح کر لیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت و محبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہو جائے، اسی لئے اہل آداب نے لکھا ہے کہ مہمان کے سامنے اپنے بلا زمین پر بھی غصہ نہ ہو کیونکہ اس سے مہمان کو وحشت ہوگی اور وہ گھبرائے گا کہ نہ معلوم اس شخص کا میرے ساتھ کیسا معاملہ ہو اور شاید اس وحشت کی وجہ سے وہ کھانا بھی کم کھائے کہ نہ معلوم یہ کیسے مزاج کے ہوں گے ان کو زیادہ کھانا کہیں ناگوار نہ ہو۔ واقعی یہ ہیں آداب اور ہم نے تو اخلاق کا محض نام سن لیا ہے مگر بھائی کیا کریں کھٹے ہیں یا میٹھے سب اسی باغ کے پودے ہیں جب کوئی باغ لگاتا ہے تو سارے درخت میٹھے ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ کوئی میٹھا ہوتا ہے کوئی کھٹا اور اس میں بھی حکمت ہے وہ یہ کہ سب میٹھے ہی پھل ہوں تو ان کے کھانے سے تخمہ اور ہیضہ کا اندیشہ ہوتا ہے جب میٹھے پھلوں کے ساتھ کوئی کھٹا بھی مل جائے تو سب ہضم ہوتے ہیں اسی لئے اکثر لوگ دیسی آموں کو پسند کرتے ہیں کہ ان میں کھٹے میٹھے ملے ہوئے ہوتے ہیں تو یہ ساتھ کے ساتھ ہضم ہوتے رہتے ہیں اور مالدہ آم سب میٹھے ہوتے ہیں ان کو زیادہ کھالو تو ہیضہ ہو جائے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے باطنی باغ میں بھی کوئی درخت میٹھا رکھا ہے کوئی کھٹا باقی ہیں سب اسی باغ کے درخت اس لئے اعتراض کی کوئی وجہ نہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب حالانکہ بہت بڑے ولی و عارف تھے مگر فطرتی طور پر تیز مزاج تھے ان کی تیزی تکبر یا بناوٹ سے نہ تھی بلکہ طبعی تھی اور مشاہدہ سے یہ بات خود معلوم ہو جاتی ہے کہ کس میں طبعی تیزی ہے اور کون تکبر کی

وجہ سے تیزی کرتا ہے چنانچہ شاہ صاحب کے یہاں ایک مرتبہ ایک شخص آیا اس نے مسجد میں آکر اپنا سامان رکھا۔ مولانا نے دیکھتے ہی فرمایا ارے نکالو وہ تھا کوئی دلیر۔ کہنے لگا دیکھوں تو وہ کون ہے جو مجھے نکالے گا۔ اب کسی خادم کی ہمت نہ ہوئی جو اُسے نکالے اور مولانا بار بار فرمارہے ہیں کہ ارے نکالو اس کو مگر کوئی نہ اٹھا آخر کو مولانا خود اٹھے اور اس کا سامان اٹھا کر مسجد سے باہر پھینکدیا اس نے اتنا ادب کیا کہ مولانا کو اسباب اٹھاتے ہوئے کچھ نہیں کہا جب وہ اسباب لیکر چلے خود بھی ساتھ ہولیا جب مولانا نے اسباب کو مسجد سے باہر رکھا اس نے اٹھا کر پھر مسجد میں اپنی جگہ لا رکھا۔ مولانا کو پھر غصہ آیا اور دوسری مرتبہ آپ نے پھر اسباب اٹھا کر مسجد سے باہر پھینکدیا مسافر نے اٹھا کر پھر اندر رکھ لیا غرض چند مرتبہ ایسا ہی ہوا، آخر کو مولانا تھک گئے تو اپنی جگہ پر آبیٹھے اور وہ مسافر اپنی جگہ جما ہوا بیٹھا رہا۔ ان حضرات کے غصہ کی ادا ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا منشا تکبر نہیں اگر مولانا کے غصہ کا منشا تکبر ہوتا تو خود اٹھ کر اس کا اسباب لا دکر باہر نہ نکالتے متکبرین ایسا کبھی نہیں کر سکتے وہ جو کچھ کرتے ہیں خدام کے واسطے سے کرتے ہیں خود ایسا کام کبھی نہیں کرتے مگر مولانا نے اس کی پروا بھی نہ کی جب کوئی خادم نہ اٹھا تو خود اسے نکالنے چلے یہ تو ہولیا اور لیجئے کھانے کا وقت آیا تو مولانا نے اس مسافر کے لئے گھر سے کھانا بھجوایا اب اس نے نخرے شروع کئے کہ جاؤ میں نہیں کھاتا یہ رڈیوں ہی کی وجہ سے مسافروں کو دھکے دیئے جاتے ہیں کیونکہ گھر سے کھلانا پڑتا ہے تو میں ایسی روٹیوں سے باز آیا خادم نے جاکر اطلاع کی کہ حضرت مہمان نے کھانا نہیں کھایا اور یوں یوں کہتا ہے کوئی متکبر ہوتا تو یہ جواب سن کر خاموش بیٹھ جاتا مگر مولانا کی طبیعت نے مسافر کا بھوکا رہنا گوارا نہ کیا خود کھانا لے کر آئے اور اس کی خوشامد کی کہ بھائی تو میرے کہنے کا برا نہ مان، میرے یہاں اکثر لوگ دنیا کے قصے لاتے ہیں کوئی مقدمہ کی باتیں لاتا ہے کوئی اولاد کے لئے دعا کراتا ہے دین کے طالب کم آتے ہیں اس لئے مجھے غصہ آجاتا ہے غرض اس کو کھانا کھلایا مگر یاد رہے کہ یہ معاملہ لطف کا ان لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو صرف مہمان بن کر آئیں کہ ان کو خوشامد کر کے کھانا کھلایا جاتا ہے اور جو شخص مہمان بن کر نہ آئے بلکہ اپنی اصلاح کے لئے آئے اُس کا یہ حق نہیں کہ

شیخ اس کی خوشامدیں کر کے کھانا کھلائے بلکہ اس کے ذمہ ہے کہ اپنے کھانے کا خود انتظام کرے وہ اگر نخرے کریگا تو دماغ کی اصلاح کی جائے گی اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص تو تحصیلدار کے گھر مہمان ہو کر جائے اس کو تو تحصیلدار خاطر مدارات کے ساتھ کھانا کھلائے گا اور ایک شخص تحصیلدار کے یہاں مقدمہ لیکر جائے اس کا یہ حق نہیں ہے کہ تحصیلدار اسے کھانا کھلائے بلکہ اس کے ساتھ ضابطہ کا برتاؤ ہوگا اسے اپنے کھانے کا خود انتظام کرنا پڑے گا اور اوقات مخصوصہ پر عدالت کے اندر گفتگو کا موقعہ ملے گا ہر وقت بات چیت کرنے کی بھی اسے اجازت نہ ہوگی نہ اس کی ساتھ حاکم مزاح و دل لگی کرے گا کیونکہ وہ مہمان نہیں ہے بلکہ صاحب غرض ہے آجکل یہ بھی ایک وجہ ہے۔ بزرگوں کو بدنام کرنے کی کہ وہ مہمان اور طالب سب کے ساتھ یکساں برتاؤ چاہتے ہیں حالانکہ مہمان کا اور حق ہے طالب کا اور حق ہے۔ مہمان تو اگر فاسق بھی ہو بلکہ کافر بھی ہو تب بھی اس کی ساتھ خاطر مدارات کا معاملہ کیا جائے گا اور طالب کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوگا کیونکہ طالب سے مہمانوں کی طرح معاملہ کرنے سے اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی غرض بزرگوں نے جو گاہے اپنے متعلقین سے مزاح کیا ہے اس کی حکمت یہ تھی کہ اس سے طالب کا دل کھل جاتا ہے تو وہ استفادہ بخوبی کرسکتا ہے مگر یہ حکمت ان بزرگوں کے مزاح میں ہے جن کے ذمہ تبلیغ و اصلاح کا کام ہے اور بعضے ایسے بھی ہیں جو آزاد طبع ہیں وہ تبلیغ وارشاد سے گھبراتے ہیں اُن کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار　　　دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام عاشق رہے سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

وہ حضرات اس قاعدہ کے پابند نہیں ان کے مزاح میں ایک دوسری حکمت ہوتی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ وہ اپنی وضع کو خاک میں ملانا چاہتے ہیں اس لئے مزاح و دل لگی کرتے رہتے ہیں تاکہ چھچھورا پن ظاہر ہو ان کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی ہم کو چھچھورا سمجھ کر چھوڑ دے گا معتقد نہ رہے گا ان کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار　　　کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل اور تدبیر کرنی چاہئے)

مگر یہ رند وضع سوز ہوتے ہیں شرع سوز نہیں ہوتے وضع و ناموس کو جلا پھونک دیتے ہیں مگر

شریعت کے پابند ہوتے ہیں اور جو وضع سوز ہونے کے ساتھ شرع سوز بھی ہو وہ یا تو فاسق ہے یا مجذوب ہے ان دونوں کے مزاح کی حکمت بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں فاسق تو ولی ہی نہیں اور مجذوب گو ولی ہوتا ہے مگر اس کے افعال میں حکمت کا قصد نہیں ہوتا گو واقع میں حکمت ہوا کرے۔ سو ان دونوں سے یہاں بحث نہیں یہاں گفتگو ان بزرگوں کے مزاح میں ہے جو اپنے افعال میں حکمت کا قصد کرتے ہیں تو ان میں جو آزاد ہوتے ہیں میں نے ان کے مزاح کی حکمت بتلا دی کہ وہ اپنی وضع کو جلانے کے لئے اور ناموس کو خاک میں ملانے کے لئے مزاح کیا کرتے ہیں وہ ان مصالح پر نظر نہیں کیا کرتے جن پر اہل سلسلہ کو نظر ہوتی ہے کار ملک است الخ میں اہل سلسلہ ہی مراد ہیں کہ وہ انتظام سلطنت کرتے ہیں ان کو مصالح کی رعایت کرنا پڑتی ہے سو وہ کریں رند کو اس کی ضرورت نہیں وہ تو ہر وقت اپنے مٹانے کی کوشش کرتا ہے اور بعض دفعہ یہ صفت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ یوں کہنے لگتا ہے ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن   پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(روشن ہونا اور جلنا اور کپڑے پھاڑنا پروانہ ہم سے شمع نے ہم سے گل نے ہم سے سیکھا ہے)

اور یوں کہتا ہے ؎

جوش عشق است کاندرمے فتاد
آتش عشق است کاندر نے فتاد

(جوش عشق ہے جو شراب میں ہے اور آتش عشق ہے جو بانسری میں ہے)

اس وقت جوش میں کوئی اس کے برابر نہیں ہوتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ میرے ہی عشق کا اثر پروانہ اور شمع میں ہے اور میرے ہی جوش کا ظہور مے اور نے میں ہے۔ اور یہ بات محض مبالغہ کے طور پر نہیں بلکہ حقیقت کے بھی موافق ہے کیونکہ انسان عالم اکبر ہے اور عالم ناسوت عالم اصغر ہے اور عالم اصغر عالم اکبر سے مستفید ہے اس لئے جن چیزوں کا عالم ظاہر میں ظہور ہو رہا ہے سب قلب عارف کے آثار ہیں اگر اس طرح نہ سمجھو تو یوں سمجھو کہ خلق عالم سے انسان مقصود ہے تو انسان سب کی اصل ہے اور یہ عالم انسان کی فرع ہے اس لئے عارف کا یہ کہنا

درست ہے کہ میرے ہی سے تمام چیزوں نے جوش ومستی کا سبق سیکھا ہے یعنی میری ہی وجہ سے ان کا ظہور ہوا ہے جس کے بعد یہ صفات ان میں پیدا ہوئیں اگر میں نہ ہوتا تو کسی چیز کا ظہور نہ ہوتا نہ کسی میں جوش ومستی کا اثر ہوتا یہاں پر کسی کو لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (بالیقین آسمان اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کی پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے) سے شبہ نہ پیدا ہو کہ اس آیت میں سموات وارض کی خلقت کو انسان کی پیدائش سے بڑا بتلایا گیا ہے تو پھر انسان کو عالم اکبر اور عالم ناسوت کو عالم اصغر کہنا کیونکر صحیح ہوگا اور یہ انسان سے مستفید یا اس کی فرع کیونکر ہو سکتا ہے جواب یہ ہے کہ اس جگہ اکبریت مادہ کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے یہاں معنی کے اعتبار سے اکبریت مقصود نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے معاد کو ثابت فرمایا ہے جس پر کفار کو اشکال تھا کہ انسان مرکر دوبارہ کیسے زندہ ہوگا اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں کو اور زمین وغیرہ کو پیدا کر دیا تو ایک مشت خاک انسان کا دوبارہ زندہ کر دینا اُس پر کیا دشوار ہے کفار کو اعادۂ جسم ہی پر اشکال تھا اس کو ایسی چیزوں کی خلقت سے دفع کیا گیا جو مادہ میں انسان سے بڑھی ہوئی ہیں سو اس درجہ میں عالم ناسوت کے لئے اکبریت مسلم ہے گفتگو معنی اور مقصودیت میں ہے اور اس میں انسان سب سے اشرف واکمل ہے چنانچہ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے فرماتے ہیں ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ (بھلا کیا تمہارا پیدا کرنا سخت ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بنایا اس کی سقف کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا) یہاں اشدیت محض خلقت ظاہری میں مراد ہے اور مقصودیت کے اعتبار سے دوسری جگہ ارشاد ہے۔ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ (وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف تو درست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان۔) جس سے معلوم ہوا کہ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے سب

انسان ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور ارشاد ہے وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (اور جتنی چیزیں آسمانوں میں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا تمہارے لئے) اور وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں) اور وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ (اور تمہارے نفع کے واسطے رات دن کو مسخر بنایا اور جو چیزیں تم نے مانگی تم کو ہر چیز دی) اس کے علاوہ بہت سی آیات میں بتلایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام چیزوں کو انسان کے لئے کسی نہ کسی کام میں لگا رکھا ہے پس اس درجہ میں انسان کا عالم اکبر ہونا نصوص کے خلاف نہیں (باقی یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انسان اگر سب کی اصل ہے تو جسامت میں چھوٹا کیوں ہے کیونکہ اصل کے لئے جسامت میں فرع کے برابر یا بڑا ہونا لازم نہیں، دیکھو درخت کی اصل ایک گٹھلی ہے جو جسامت میں درخت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی مگر سارا درخت اُسی ذرا سی گٹھلی کی فرع ہے ۱۲ جامع) پس ایک کسی رند کے اس قول پر کچھ اشکال نہیں ؎

افروختن وسوختن و جامہ دریدن ۔۔۔ پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(روشن ہونا شمع نے اور جلنا پروانہ نے اور کپڑے پھاڑنا گل نے ہم سے سیکھا ہے)

اس پر مجھے ایک ایسے ہی رند کی حکایت یاد آئی وہ حج کو جارہے تھے اور حالت یہ تھی کہ ایک ڈھپلی ہاتھ میں ناچتے کودتے ڈھپلی بجاتے جارہے تھے، لوگوں نے کہا میاں تم حج کو جارہے ہو یہ کیا حرکت ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں تم کون ہو، واقعی حق تعالیٰ سے اس کے بندوں کو ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اس جواب کے بعد کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں۔ غرض وہ اس طرح حج کو جارہے تھے یہاں تک کہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور مطوف کے ساتھ طواف کے لئے چلے جس وقت دروازہ حرم پر پہنچے تو مطوف نے کہا دیکھو وہ بیت اللہ ہے (بیت اللہ دروازہ کے باہر ہی سے نظر آجاتا ہے) پس بیت اللہ پر نظر کا پڑنا تھا کہ اس عاشق کو وجد طاری ہوا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور زبان پر یہ شعر تھا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر کہ مباد بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا

(اب تو محبوب کے در پر پہونچ گئے ہو اب اپنی جان فدا کردو شاید پھر اس تمنا کے حصول کا موقع نہ ملے)

بس یہ شعر پڑھتے پڑھتے دروازہ ہی پر گر پڑے اور جان دیدی ہائے وصل کی بھی تاب نہ ہوئی بس صورت دیکھتے ہی ختم ہو گیا، عاشق کی بھی عجیب حالت ہوتی ہے نہ اسے وصل میں چین ہے نہ فصل میں قرار ہے۔ بس وہ حال ہوتا ہے ؎

من شمع جاں گدازم و تو صبح دل کشائی سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی

نزدیک آں چنانم دور آں چناں کہ گفتم نے تاب وصل دارم و نے طاقت جدائی

(میں شمع ہوں تو صبح ہے اگر تجھے دیکھ تو تب بھی موت ہے کہ لوگ بجھا دیں گے اگر دیکھوں تب بھی ہلاکت ہے کہ جل جاؤں گا اس محبوب کی نزدیکی ایسی ہے اور جدائی ایسی ہے جیسا کہ اوپر شعر میں ذکر کیا نہ جدائی کی طاقت نہ وصل کی تاب)

وصل کی تاب نہ تھی جب ہی تو دیکھتے ہی ختم ہو گیا اے صاحب! اگر وہ بیت کے پاس ہی پہنچ جاتا تو کیا ہوتا وہ بیت سے پہلے رب البیت سے جا ملا۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ جسکو ہم رند لاابالی سمجھ رہے تھے یہ عاشق عارف تھا پس اپنی حالت چھپانے کے لئے اس نے یہ صورت بنا رکھی تھی تمام مصالح کو خاک میں ملا دیا تھا اس کی پرواہ نہ تھی کہ کوئی کیا کہے گا مگر حالت یہ ہوتی ہے کہ اوپر کا مصالحہ تو جلانے سے خاک ہو گیا اور یہ گرم مصالحہ جو اندر اندر پھونکتا ہے باقی رہ گیا اُس نے خود اسی کو جلا پھونک دیا۔ تو ان رندوں کے مزاح و دل لگی میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے تمام مصالح کو مسالہ کی طرح پیس دیتے ہیں اور اپنی وضع و ناموس کو مٹا کر اپنی باطنی حالت کو پردہ میں رکھتے ہیں مگر اس غرض کے لئے ناجائز امور کا ارتکاب جائز نہیں ورنہ پھر وہ وضع سوز ہی نہ رہے گا شرع سوز بھی ہو جائے گا جس کے افعال قابلِ اعتبار نہیں نہ ان میں کوئی حکمت ہے۔ تو اب ان حکمتوں پر نظر کر کے مزاح بھی لایعنی نہ رہا بلکہ مالیعنی میں داخل ہو گیا اسی طرح تمام مباحات کو دیکھ لو کہ وہ اپنے اثر کے اعتبار سے یا مفید ہوتے ہیں یا مضر تو اب ایسی کوئی قسم نہ رہی جو نہ مفید ہو

نہ مضر پس مباحات کو تیسری قسم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ بھی پہلی ہی دو قسموں میں داخل ہے یا محمود یا مذموم تو اب دو ہی قسم کے افعال ہوئے ایک وہ جو معین آخرت ہیں دوسرے وہ جو مضر آخرت ہیں۔ اس کے بعد پھر ایک مراقبہ کی تعلیم کی گئی القا کے طور پر توجی چاہا کہ اپنے بھائیوں کو بھی بتلا دیا جائے اس وقت جو حالت میرے اوپر غالب تھی ویسی تو اب نہیں رہی مگر خدا تعالیٰ کی ناشکری کیوں کروں بحمداللہ اب بھی بہت بڑا اثر قلب پر ہے، وہ مراقبہ یہ ہے کہ ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا جائے کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں (یا کرنے والے ہیں) یہ آخرت میں مضر ہے یا مفید ہے۔ اس مراقبہ کے لئے کوئی وقت معین نہیں بلکہ یہ ایسا مراقبہ ہے کہ ہر وقت اس کا وقت ہے، چلتے پھرتے بھی اس کو سوچتے رہو اور کھاتے پیتے بھی اور باتیں کرتے ہوئے بھی اور رنج و غصہ میں بھی کوئی حرکت اور کوئی سکون اس مراقبہ سے خالی نہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد آپ سے ان شاء اللہ تعالیٰ اول تو گناہ صادر ہی نہ ہوگا اور اگر بالفرض صادر ہوا بھی تو آپ اس وقت بیدار گنہگار ہوں گے سرکش و غافل گنہگار نہ ہوں گے اور یہ بھی ایک بڑی دولت ہے کہ انسان کو گناہ کے وقت تنبہ ہو جائے کہ میں نے یہ کام گناہ کا کیا اس سے دل پر ایک ایسا جرکہ لگتا ہے جس کے بعد معاً توبہ و استغفار کو دل چاہتا ہے۔ شاید یہاں کوئی ذہین بیٹھے ہوں اور وہ اپنے دل میں یوں کہتے ہوں کہ یہ تو اور بھی برا ہوا کہ جان کر گناہ کیا تو اس وقت یہ شخص وَيْلٌ لِّلْجَاهِلِ مَرَّةً وَّلِلْعَالِمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (جاہل کے لئے ایک خرابی جاننے والے کے لئے ستر خرابیاں) کا مصداق ہو جائے گا تو بات یہ ہے کہ جان کر گناہ کرنا یہ کس نے کہا ہے کہ مطلقاً اشد ہے بلکہ علم کے ساتھ وہ گناہ اشد ہے جس کے ساتھ جرات بھی ہو ورنہ اگر جرات نہ ہو تو جان کر گناہ کرنا غفلت کے گناہ سے اشد نہیں اور اس مراقبہ کے ساتھ جرات تو کبھی ہو سکتی ہی نہیں تو اب یہ شخص بیدار گنہگار ہوگا کہ معصیت کو معصیت جانے گا غافل نہ ہوگا کہ یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں نے کوئی گناہ کا بھی کام کیا ہے یا نہیں اور اس بیداری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معصیت کے ساتھ خشیت بھی ملی ہوئی ہوگی اور حضرت خشیت اور معصیت اگر دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو گو وہ خشیت کامل نہ ہوگی

مگر اس کے ساتھ معصیت بھی کامل نہ رہے گی یہ خشیت ایسی چیز ہے کہ معصیت اس کی ساتھ کامل نہیں ہوسکتی اگر کامل خشیت ہے جب تو گناہ کا صدور ہی نہیں ہوتا اور اگر ناقص خشیت ہے تو اس کی وجہ سے معصیت بھی ناقص ہو جاتی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے گرم پانی میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ملا دو تو گو اس سے ٹھنڈا نہ ہو جائیگا مگر ویسا گرم بھی نہ رہے گا تو خشیت کے ساتھ معصیت کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس وقت آپ اگر غیبت بھی کریں گے تو دل کو حظ حاصل نہ ہوگا زبان سے غیبت کریں گے اور دل میں جوتے پڑتے ہوں گے کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا تو یہ تھوڑا النفع ہے اس مراقبہ کا اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ اس مراقبہ کے بعد آپ سے گناہ کا صدور ہی نہ ہوگا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر صدور ہوگا تو خشیت کے ساتھ ہوگا اور اس مضمون کے اظہار میں یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر کسی کو تجربہ ہوا ہو کہ خشیت کے ساتھ بھی گناہ ہو جاتا ہے اور وہ اس وقت مولویوں کو جھوٹا کہتا ہو کہ یہ مولوی بھی بے پرکی باتیں اڑایا کرتے ہیں کہ خشیت وخوف دل میں پیدا ہو جانے سے گناہ نہیں ہوتے حالانکہ ہم نے تو آیات وعید واحادیث عقاب کا بہت مطالعہ کیا اور ان سے خوف بھی پیدا ہوا مگر پھر بھی گناہ موقوف نہیں ہوتے تو وہ اس مضمون کو سن کر مولویوں کو جھوٹا نہ کہیں گے کیونکہ جیسا ان کو خشیت کے ساتھ گناہ صادر ہونے کا تجربہ ہوا ہوگا اس کے ساتھ یہ بھی تجربہ ہوا ہوگا کہ گناہ کے وقت دل میں ایک خلش بھی ساتھ ساتھ موجود تھی جس نے معصیت کو بھی ضعیف بنا کر گناہ بے لذت میں داخل کر دیا تھا تو صاحب جیسی خشیت آپ کو حاصل ہوئی تھی ویسا ہی اس نے اثر بھی کیا وہ بیکار تو نہ ہوئی پھر اب مولویوں کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں بات یہ ہے کہ خشیت کے تین درجے ہیں۔ ایک خشیت اعتقادی یہ تو ہر مسلمان کو حاصل ہے کیونکہ ایمان نام ہی ہے خوف ورجا کا پس اس درجہ سے تو کوئی مسلمان خالی نہیں مگر اعتقادی خشیت گناہوں سے روکنے میں کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ استحضار خشیت کی بھی ضرورت ہے یہ دوسری قسم ہے پھر استحضار کے دو درجے ہیں ایک استحضار کامل دوسرے استحضار ناقص استحضار کامل کے ساتھ معصیت ہرگز نہیں ہوسکتی مگر ہم لوگوں کو استحضار کامل حاصل نہیں اور اسی کی ضرورت ہے لیکن استحضار کامل ایک دو دن میں حاصل نہیں ہوا کرتا اس کے لئے مشق کی ضرورت ہے پہلے آپ استحضار ناقص ہی کیجئے اس سے گو معصیت کا انعدام نہ ہوگا مگر تقلیل ضرور ہو جائے گی اور وہی کیفیت

ہو گی جو ہیں۔ نے ابھی بیان کی ہے کہ خشیت ناقصہ کے ساتھ معصیت بھی ناقص ہی ہو گی اور معاً توبہ و استغفار کی توفیق ہو گی وہ حالت نہ رہے گی جو پہلے تھی کہ گناہ کر کے دل پہ جوں بھی نہ رینگتی تھی پھر اسی حالت پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ استحضار ناقص سے استحضار کامل کی طرف ترقی کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ آپ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے یہ میں نے اس لئے کہا کہ شاید کوئی شخص اس مراقبہ پر عمل کرے اور ترک معاصی میں پوری کامیابی نہ ہو تو مایوس ہو جائے۔ تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ان حضرات کو سمجھ لینا چاہیئے کہ دو چار روز کی مشق سے استاد مشاق نہیں بنا کرتے بلکہ استاد بننے کے لئے عرصہ تک مشق کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسے خوشنویسی حاصل ہو جاتی ہے چند روز کی کوشش سے مگر استاد بننے کے لئے عرصہ دراز کی ضرورت ہے اسی طرح قرآن حفظ کر لینا تو چند روز کا کام ہے مگر اس کا قابو میں آجانا ایک مدت چاہتا ہے پھر ان کاموں میں کمال حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے سب کو معلوم ہے کہ کام میں لگا رہنا اور مشق کا جاری رکھنا ہی اس کا طریقہ ہے پس یہی طریق عمل اس مراقبہ میں بھی جاری رکھئے چند روز میں کامیابی نہ ہو تو گھبراؤ نہیں ناامید نہ ہو ؎ ناامیدی را خدا گردن زدہ است (ناامیدی کی خدا نے گردن ماردی ہے) مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

کوئے نومیدی مرو کامیدہا ست . سوئے تاریکی مرو خورشیدہا ست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ امیدیں رکھو)

اور ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ میتراش و می خراش . تادم آخر دمے فارغ مباش

(اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخری وقت ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو) یعنی یہ ایک دن کا کام نہیں ساری عمر کا کام ہے لگے رہو کوشش کرتے رہو ان شاء اللہ ایک دن کامیاب ہو گے اور یہ حال ہو گا ؎

تا دمے آخر دمے آخر بود . کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(آخر وقت تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز و رفیق بن جائے گی۔)

اور یہ حال ہوگا ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

(یوسف گم شدہ کنعان میں واپس آجائے غم مت کھا غموں کا تنگ وتاریک گھر کسی دن گل ستاں ہوجائے گا غم مت کر)

ان شاء اللہ ایک دن یہ غم ختم ہوجاوے گا اور کامیابی سے دل مسرور ہوگا (رَزَقَنَا اللّٰہُ تَعَالٰی وَاِیَّاکُمُ الْوُصُوْلَ اِلَیْہِ اٰمِین ۱۲ جامع) (اللہ تعالیٰ ہم اور تم کو وصول الی اللہ نصیب فرمائیں) میں دعوے سے نہیں کہتا خدا کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ اس مراقبہ کو جاری رکھو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن ضرور کامیاب ہوگے (وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہماری راہ میں ہمیشہ مشقتیں برداشت کرتے ہیں ان کو اپنے راستے ضرور دکھادیں گے وعدہ الٰہی ہے ۱۲ جامع) پس ہر کام پر اس حیثیت سے نظر کرو کہ یہ معین فی المقصود ہے یا مضر پھر جو معین ہو اس کو اختیار کرو اور جو مضر ہو اس کو ترک کردو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جو بات میرے دل میں ہے وہ سامعین کے دل میں ڈال دوں، مگر کیونکر ڈال دوں یہ میرے اختیار سے باہر ہے اور الفاظ اس کے لئے کافی نہیں اور یہ ان لوگوں کے اعتبار سے کہتا ہوں جن کے دل میں یہ وارد پہلے سے نہ ہو اور جو پہلے سے اس کا ذوق رکھتے ہیں وہ تو اشارہ ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر جو بات دل میں نہ پہونچائی جاسکے کم از کم اس کو کانوں میں تو ڈال دیا جاوے شاید کسی وقت ذوق حاصل ہو تو یہ کان میں پڑی ہوئی بات کام آئے گی اور چونکہ طویل مضمون یاد نہیں رہا کرتا اس لئے میں خلاصہ بیان کرتا ہوں کہ بس ہر کام سے پہلے اتنا سوچ لیا کرو کہ یہ نجاتِ آخرت میں معین ہے یا نجات سے مانع ہے اور اس کا استحضار ہر کام میں رکھو خواہ مباح ہو یا فرض و واجب یا اور کچھ۔ اور اسی غرض کے لئے میں نے اس وعظ کا نام (الاسعاد والابعاد) تجویز کیا ہے اسعاد کے معنی ہیں اعانت اور ابعاد کے معنی ہیں تنحیہ یعنی دور کرنا کذا فی القاموس) تو یہ نام آپ کو اس مراقبہ کی یاد دہانی کرے گا کیونکہ وہ مراقبہ بھی اسی بات کا ہے کہ کونسا کام مقصود آخرت میں معین ہے اور کونسا مقصود سے دور کرنے والا ہے تو اب آپ کو لمبا مضمون

یاد کرنا نہ پڑے گا بلکہ محض اس وعظ کا نام تصور معانی کے ساتھ اس مراقبہ کی یاددہانی میں کافی ہو جائے گا اور یہ محض دو لفظ ہیں جن کا یاد کرنا دشوار نہیں یہ تجربہ ہے کہ الفاظ مختصرہ سے بڑے بڑے مضامین مستحضر ہو جاتے ہیں، میں نے تو مختصر الفاظ سے طالب علمی کے وقت میں بہت علوم حاصل کئے ہیں مجھے ابتداء سے اختصار محبوب ہے۔ کچھ طبیعت ہی اختصار پسند واقع ہوئی ہے جس کا سبب میری کاہلی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ مجھے طول طویل کاموں کی ہمت نہیں خیر کچھ ہی سبب ہو باقی یہ تجربہ بالکل صحیح ہے کہ بعض دفعہ مختصر الفاظ سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں اور میں نے تو اس سے بہت ہی کام لیا ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں میں جلالین پڑھتا تھا تو اس وقت میں نے یہ چاہا کہ جلالین کے جو دو حصے دو مصنفوں کے ہیں اس کو یاد رکھوں کہ پہلا کس کا ہے اور دوسرا کس کا۔ کیونکہ جلالین ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ سورۂ کہف سے اخیر تک جلال الدین محلی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے اور انہوں نے اول حصہ کی بھی تفسیر شروع کی تھی، چنانچہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھ بھی چکے تھے کہ عمر نے وفا نہ کی اور انتقال ہو گیا تو سورۂ بقرہ سے سورۂ اسراء تک علامہ جلال الدین سیوطی نے تکمل کی۔ چونکہ دونوں کا نام جلال الدین ہے اس لئے یہ یاد نہ رہتا تھا کہ پہلا حصہ کس کا ہے اور دوسرا کس کا تو میں نے دونوں کے لقب سے اول حرف لے لیا چنانچہ سیوطی کے اول میں سین ہے اور محلی کے شروع میں میم ہے اور سین حروف ہجا میں میم سے مقدم ہے تو میں نے یہ جملہ یاد کر لیا اَلْاَوَّلُ لِلْاَوَّلِ وَالْاٰخِرُ لِلْاٰخِرِ یعنی پہلا حصہ اس کا ہے جس کے لقب کا پہلا حرف ترتیب ہجا ریں مقدم ہے اور دوسرا اس کا۔ ہے جس کے لقب کا پہلا حرف ترتیب میں موخر ہے۔ اس طرح سے یہ مضمون ہمیشہ یاد رہا۔ اسی طرح حدیث معراج میں یہ آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر آسمان میں خاص خاص انبیاء سے ملاقات کی ہے اور اس کی ترتیب بھی احادیث میں مذکور ہے کہ پہلے آسمان میں آپ نے آدم علیہ السلام سے ملاقات کی اور دوسرے میں حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات کی اور تیسرے میں یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے میں ادریس علیہ السلام سے اور پانچویں میں ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے میں موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں میں حضرت ابراہیم علیہ

السلام سے۔ مگر یہ ترتیب یاد نہ رہتی تھی تو میں نے اس کے یاد کرنے کے لئے ایک مختصر لفظ بنالیا یعنے اعیاھو جس میں ہمزہ آدم علیہ السلام کے لئے اور عین عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے اسی طرح ہر نبی کے نام میں جو حرف اول تھا وہ اس جملہ میں لے لیا گیا ہے اور ہر ایک سے ملاقات کی ترتیب وہی ہے جو ترتیب حروف کی اس جملہ میں ہے مگر اس میں دو باتیں قابل تنبیہ ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کا کوئی حرف اس میں نہ آسکا اس جملہ میں صرف چھ حرف ہیں جس سے چھٹے آسمان تک کی ترتیب معلوم ہوسکتی ہے ساتواں حرف ایک اور ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام کی ترتیب پر بھی دلالت ہو جاتی اور اس کے لئے صرف یہ ممکن تھا کہ آخر میں الف بڑھا کر اَعْیَاھُمَا کردیا جاتا مگر اس کے معنے کچھ موزوں نہ ہوئے کیونکہ اَعْیَاھُم کے معنی تو یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب انبیا کو سبقت سے عاجز کردیا اور یہ ایک عمدہ معنی ہیں اور اعیاھما میں ضمیر تثنیہ لانے سے یہ معنے ہوتے ہیں کہ آپ نے دو کو عاجز کردیا سو یہ معنے کچھ موزوں نہ معلوم ہوئے کیونکہ اس میں دو کی تخصیص بلا وجہ کرنی پڑتی ہے۔ سو اتنی بات خود یاد رکھ لی جائے کہ اس میں ساتویں نبی کا نام مذکور نہیں جن سے ساتویں آسمان پر ملاقات ہوئی تھی اور یہ بھی یاد رکھ لیا جائے کہ ان کا نام ابراہیم علیہ السلام ہے۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھ لی جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یحییٰ علیہ السلام بھی ہیں کہ وہ بھی دوسرے ہی آسمان پر ہیں ان کے لئے کوئی لفظ مستقل نہ آسکا اور اس جملہ میں جو تیسرا حرف یا ہے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے نام کی علامت ہے جو ترتیب میں تیسرا حرف ہے وہ تیسرے ہی آسمان پر ہیں سو حرف عین سے ایک نبی کی طرف اشارہ ہوگیا اور دوسرے کو زبانی یاد رکھا اور یہاں سے معلوم ہوگیا کہ یہ جو مشہور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فلک چہارم پر ہیں یہ غلط ہے نہ معلوم یہ کس طرح بے اصل مشہور ہوگیا۔ زیادہ تر یہ بات شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے جن میں بعض وہ شعرا بھی ہیں جو محقق ہیں مگر انہوں نے اس غلطی میں عوام کا اتباع کرلیا ہے اس لئے ہمیں ان کے کلام میں تاویل کی ضرورت نہیں بلکہ صاف بات یہ ہے کہ بعض دفعہ شاعری میں محقق بھی مذاق عوام کی رعایت کرکے غیر محقق بات استعمال کرلیتا ہے مگر بحر العلوم نے ان کی رعایت کرکے یہ تاویل کی ہے کہ فلک

چہارم سے مراد آسمان چہارم مراد نہیں بلکہ کرۂ چہارم مراد ہے اور آسمان دوم عدد کرات علویہ میں چوتھے نمبر پر ہے کیونکہ اس سے نیچے آسمان اول ہے اور اس کے نیچے کرۃ النار ہے اور اس کے نیچے کرۃ الہوار ہے اس طرح آسمان دوم چوتھا کرہ ہوا اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہوار کے نیچے کرۃ الماء اور اس کے نیچے کرۃ الارض بھی ہے تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ کرات سفلیہ ہیں اور گفتگو کرات علویہ میں ہے اس لئے ان دونوں سے نقض وارد نہیں ہوتا۔ دوسرے متکلم خود دو کرہ کے اوپر ہے اور اس کے اوپر صرف عناصر کے دو ہی کرے ہیں ہوا و نار۔ خیر کسی کو یہ تاویل پسند ہو تو وہ یہ تاویل کر کے مولانا رومی وغیرہ کے کلام کو درست کرلے جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان چہارم پر مانا ہے۔ بعض شعرار تو ایسا غضب کرتے ہیں کہ ایک شاعر نے عیسیٰ علیہ السلام کو فلک چہارم پر مان کر انہیں بیمار بھی مانا ہے کہتا ہے ؎

بر آسمانِ چہارم مسیح بیمار است تبسّم تو برائے علاج درکار است

(چوتھے آسمان پر نعوذ باللہ عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں تیرا تبسم ان کے علاج کیلئے درکار ہے)

یعنی وہ اپنے معشوق چرمی سے کہتا ہے کہ آسمان چہارم پر مسیح بیمار ہیں۔ بھلا مسیح اور بیمار۔ وہ تو مردوں کو زندہ کرتے اور اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے وہ بیمار ہوں گے۔ اور خیر زمین پر رہتے ہوئے تو بیمار ہونا کچھ تعجب خیز نہ تھا یہ تو ان کو آسمان پر بیمار مانتا ہے بھلا وہاں بیماری کا کیا گذر۔ جب وہاں عیسیٰ علیہ السلام نہ زمین کی غذائیں کھاتے ہیں نہ وہاں ان کو بول و براز کی حاجت ہوتی ہے۔ نہ وہاں کسی قسم کا تعفن ہے تو وہاں بیمار ہونا کیسا۔ پھر بیماری کا علاج بھی ان کے معشوق چرمی کا تبسم ہی میسر ہوا۔ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ ایک نبی (علیہ السلام) کا علاج اپنے محبوب کے تبسم کو بتلاتا ہے مگر شعرار کو اس کی کچھ پروا نہیں بس انہیں تو یہ چاہیے کہ شعر بن جائے چاہے عقل و شعور پر اس سے پردہ ہی پڑ جائے اور غضب یہ کہ اس مرض میں بعض عارفین بھی مبتلا ہیں وہ کسی معشوق چرمی کے مقابلہ میں تو انبیار کی توہین نہیں کرتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں بعض دفعہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے دوسرے انبیار کی توہین ہو جاتی ہے۔

چنانچہ جامی فرماتے ہیں ؎

"غلامے بود یوسف زر خریدہ" (یوسف زر خریدہ ایک غلام ہے)

خدا معاف کرے ان حضرات کو میرا تو رونگٹا کھڑا ہوتا ہے اس معنی کے تصور سے بھی بھلا یوسف علیہ السلام کو غلام کہنا اور زرخرید کہنا کیا یہ تھوڑی بات ہے۔ بہت سخت بات ہے مگر شعرا اس کی پروا نہیں کرتے۔ میں ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ انبیاء کی شان میں کونسی بات کہنے کی ہے اور کونسی بات کہنے کی نہیں، وہ یہ کہ یہ تصور کر لیا جائے کہ اگر کسی مجمع میں وہ نبی موجود ہوں جن کی شان میں ہم نے یہ بات کہی ہے تو کیا اس مجمع میں ان کے سامنے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں۔ یا کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کے بھائیوں کے متعلق ہم یہ مضمون پڑھ سکتے ہیں۔ بس جو بات ایسی ہو جس کے متعلق دل گواہی دے کہ اس کو ہم ان پیغمبر کے سامنے کہہ سکتے ہیں وہ تو کہو اور جس میں کھٹکا پیدا ہو کہ سامنے یہ بات نہیں کہہ سکتے اس کو اپنے کلام میں سے نکال دینا چاہیے۔ یہ بہت بڑا معیار میں نے آپ کے ہاتھ میں دیدیا ہے اس کو مستحضر رکھ کر شعراء اپنے کلام میں اصلاح کر سکتے ہیں۔ الغرض میں نے لفظ اعیاہم سے اس ترتیب کو یاد کیا تھا جس ترتیب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں حضرات انبیاء سے آسمانوں پر ملاقات فرمائی ہے تو میں نے مختصر الفاظ سے بہت کام لیا ہے۔ اسی بناء پر میں نے اس وعظ کا نام ایسا تجویز کیا جو اختصار کے ساتھ آپ کو اس مراقبہ کی یاد دہانی کرے گا میں نے بہت دیر میں اُس بات کو کہا جو مجھے اس وقت کہنی تھی اور بات بھی مختصر ہی تھی جس کے لئے اتنی دیر کی ضرورت نہ تھی نہ اتنی دیر کی نیت تھی مگر خود بخود دیر ہو گئی لیکن حرج ہی کیا ہے یہ وہ باتیں نہیں ہیں جن کے زیادہ ہونے سے ہیضہ ہو جب ماکولات میں بھی بعض ایسی چیزیں ہیں جن کے زیادہ کھانے سے ہیضہ نہیں ہوتا جیسے خربوزہ کو لوگ بتلاتے ہیں تو کیا معقولات میں ایسا ہونا کچھ دشوار ہے۔

اب میں اس مضمون کا انطباق آیت متلوہ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں حق تعالٰی

فرماتے ہیں وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو) یہ معنی معطوف ہے تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ (آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے) پر جو قُلْ کے تحت میں ہے تقدیر یہ ہوئی قل تعالوا الخ وَقُلْ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا الخ (آپ کہہ دیجیے یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس جگہ ان مکسورہ ہوتا کیونکہ قول کے تحت میں ان مکسورہ ہی آیا کرتا ہے اور ایک قرارت میں مکسورہ ہے بھی مگر ہماری قرارت میں اَنَّ مفتوحہ ہے جس کی وجہ صحت یہ ہے کہ اس قرارت میں یہاں اَخْبِرْ (خبر دیجیے) مقدر ہے جس کے ملانے کے بعد لفظاً یہ قُلْ کے اوپر معطوف ہے اس لئے منصوب ہو گیا گو معنا تَعَالَوْا پر عطف ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ (لوگوں کو) بتلا دیجیے کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا اس کا اتباع کرو۔ ہذا سے مذکور سابق کی طرف اشارہ ہے اور پر تقریباً دس احکام اوامر و نواہی کا مجموعہ مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ۚ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِیَّاهُمْ ۚ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا الی آخرہ۔ ترجمہ یہ ہے۔ کہ آپ (ان سے) کہیے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں یہ ہیں ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (پس شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور (دوسرے یہ کہ) ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس ان سے بری طرح رہنا حرام ہوا) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو (زمانۂ جاہلیت میں اس کی عادت تھی کہ اولاد کو زندہ درگور کر دیتے تھے) (کیونکہ) ہم تم کو اور ان کو (دونوں کو) رزق (مقدم

دیں گے (وہ تمہارے رزق مقدر میں شریک نہیں ہیں پھر کیوں قتل کرتے ہو پس قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں اُن کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہو یا پوشیدہ اور (پانچویں یہ) جس کا خون کرنا اللہ تعالےٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق (شرعی) پر قتل جائز ہے مثلاً قصاص یا رجم میں پس قتل ناحق حرام ہوا) اس (سب) کا تم کو اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے تاکہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہے) جو شرعاً مستحسن ہے (مثلاً اس کے کام میں لگانا اُس کی حفاظت کرنا اور بعض اولیاء و اوصیا کو اس میں یتیم کے لئے تجارت کرنے کی بھی اجازت ہے جس کا حکم فقہ میں مذکور ہے) یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہونچ جاوے (اس کے بعد اس کا مال اس کو دیدیا جائے گا بشرطیکہ سفیہ یعنی بے وقوف نہ ہو پس تصرف غیر مشروع مال یتیم میں حرام ہوا) اور (ساتویں یہ کہ) ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے اور نہ آوے پس آپس میں دغا کرنا حرام ہوا۔ اور آگے بتلاتے ہیں کہ یہ احکام کچھ دشوار نہیں جن پر عمل دشوار ہو کیونکہ) ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی کی کیا وجہ) اور (آٹھویں یہ کہ) جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق) کوئی بات کیا کرو تو (اس میں) انصاف (کا خیال) رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہہ رہے ہو) قرابت دار ہی ہو (پس خلاف عدل حرام ہوا) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالےٰ سے جو عہد کیا کرو (جیسے قسم یا نذر) اس کو پورا کیا کرو (بشرطیکہ وہ نذر و قسم خلاف شرع نہ ہو پس اس کا عدم ایفاء حرام ہوا) اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس کا اتباع کرو پس گو ھٰذَا کا مرجع یہ امور مذکورہ ہیں لیکن یہ اشارہ علی سبیل التخصیص نہیں بلکہ علی سبیل التعمیم ہے یعنی وہ دین جس کے یہ احکام بطور نمونہ کے ہیں سب کا سب واجب الاتباع ہے اور اشارہ میں تعمیم کی وجہ ظاہر ہے کہ وجوب اتباع کچھ انہی احکام میں منحصر نہیں ورنہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ انہی کے ساتھ مخصوص پس ھٰذَا کے بعد صِرَاطِیْ فرمانا خود تعمیم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس صراط کا دیگر احکام پر مشتمل ہوتا سب کو معلوم ہے خود قرآن میں ان کے علاوہ اور بہت سے احکام مذکور ہیں اور احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ لوگوں سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ کچھ انہی احکام کی تخصیص نہیں بلکہ دین اسلام اور اس کے سب احکام جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئے ہیں میرا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو پس ہذا سے حقیقت میں دین اسلام کی طرف اشارہ ہے جو احکام مذکورہ کے ضمن اجمالاً مفہوم ہو چکا ہے اور ان احکام تسعہ مذکورہ کے ذکر کے بعد ھٰذا سے مجموعہ دین کی طرف اشارہ کی وجہ صحت یہ بھی ہے کہ یہ احکام مذکورہ گو ظاہر میں چند احکام ہیں مگر حقیقت میں یہ سارے اسلام کا خلاصہ ہے کیونکہ ان میں عقائد و معاملات و معاشرات و عبادات کے مہتم بالشان امور سب مذکور ہیں اور اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ یہ احکام سب محکوم ہیں جو کسی شریعت میں کبھی منسوخ نہیں ہوئے اس طرح یہ گویا تمام شریعت کا خلاصہ ہے پھر اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ (یہ دین میرا راستہ ہے) میں صراحۃً تعمیم کر دی گئی جس سے بقیہ احکام غیر محکمہ بھی اجمالاً سب مذکور ہو گئے اور صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حق تعالیٰ نہیں ہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہو رہا ہے کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ یہ آیت معنیً تعالوا پر معطوف ہے جو قُلْ کے تحت میں ہے اور لفظاً یہاں اَخْبِرْ محذوف ہے پس خطاب قُلْ وَ اَخْبِرْ (آپ کہہ دیں اور خبر دیدیں) کے بعد ضمیر متکلم کا مرجع قائل ہی ہو سکتا ہے اور قائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو اس ضمیر کا مرجع بھی آپ ہی ہیں چنانچہ اس کی نظیر دوسری جگہ بھی مذکور ہے کہ وہاں بھی دین اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کہا گیا ہے۔

قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (آپ فرما دیجئے یہ میرا طریق ہے میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی) اور اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کہنا بطور دعوت کے ہے کہ آپ اس طریق کے داعی ہیں ورنہ حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے چنانچہ بعض جگہ حقیقت کے موافق ارشاد ہے اِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ صِرَاطِ اللہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایک سیدھے راستہ کی

ہدایت کر رہے ہیں یعنی اس خدا کے راستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)
اس پر یہ سوال وارد ہوگا کہ جب حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے تو پھر ہر جگہ حقیقت کے موافق کلام کیوں نہ فرمایا بعض جگہ مجازاً اس کو صراط رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بعض جگہ حقیقت کے موافق صراط اللہ کیوں فرمایا تو جواب اس کا یہ ہے کہ بعض جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس صراط کو اس لئے مضاف کر دیا گیا تاکہ سامعین کو اس پر عمل کرنے کی ہمت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں اگر پہلے ہی یہ فرما دیا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے اس پر چلو تو لوگ یہ سن کر گھبرا جاتے کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات تک ذہن کی رسائی اولاً دشوار ہے تو ان کی تو یہ شان ہے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ✿ وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ✿ ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(اے اللہ آپ وہم و گمان خیال و قیاس سے بالاتر ہیں جو کچھ بزرگوں نے کہا تھا اور ہم نے سنا اور پڑھا اس سے بھی بالاتر ہیں۔ دفتر تمام ہو گیا اور عمر اختتام کو پہنچی ایک وصف بھی آپ کا بیان نہ کر سکے)
خدا تعالیٰ کی ذات تک وہم بھی نہیں پہونچ سکتا۔ جو کچھ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے خدا تعالیٰ اس سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

در تصور ذات او را گنج کو ✿ تا در آید در تصور مثل او

(اس کی ذات کے تصور میں کہاں گنجائش ہے تاکہ اس کا مثل تصور میں آجائے)
یہ لفظ سارے نسخوں میں گنج ہے۔ مثنوی کو جس کنج (اور جس گوشہ) سے نکالو گے سب میں یہی نکلے گا کسی کے پاس اس کی کنجی نہ تھی صرف حضرت حاجی صاحب ہی کے پاس اس کی کنجی تھی حضرت ہی نے اس کا قفل کھولا۔ حضرت نے مکہ مکرمہ میں ایک دفعہ ایک شیخ کو گنج پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے معنے بنانے وہ بہت تاویلیں کر رہے تھے مگر کوئی بات نہ بنتی تھی حضرت نے اصلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے بمعنی گنجائش کے بس اس کو سنکر وہ شیخ پھڑک ہی تو گئے۔ اب شعر کے معنے بے تکلف ظاہر ہو گئے مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کی کسی کے تصور میں گنجائش نہیں یعنی تصور بالکنہ کی گنجائش نہیں حق تعالیٰ کا بالکنہ ذہن میں آنا محال ہے جس کی تفصیل کتب معقول میں مذکور ہے جب حق تعالیٰ کی ذات تک کسی کی رسائی نہیں تو اگر ابتداءً ہی اسلام کو صراط اللہ کہدیا جاتا یعنی حق تعالےٰ کی

طرف اس کی نسبت کی جاتی تو لوگ گھبرا جاتے اور اس سوچ میں پڑ جاتے کہ حق تعالیٰ کو ذہن سے بہت دور ہیں پس اسی طرح ان کا رستہ بھی نہ معلوم کتنا دور دراز ہوگا اس لئے پہلے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا گیا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ تو میرا راستہ ہے اس پر چلو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی رسائی ممکن ہے آپ عیاناً سب کے سامنے ہیں پھر بشریت میں سب کے شریک ہیں اس لئے یہ سن کر ہمت بندھی کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور آپ ذہن سے بہت دور نہیں ہیں تو آپ کا راستہ بھی دور نہ ہوگا بلکہ نزدیک ہوگا یہ فائدہ ہوا آپ کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ کا نزدیک و سہل ہونا معلوم ہو گیا پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی ہوگئی اور اس راستہ پر چلنا شروع ہوا اب حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ تو حقیقت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف داعی ہیں آپ خود بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں یہ دیکھ کر ڈھارس بندھ گئی کہ حق تعالیٰ اس کے طے کرنے میں بندوں کی امداد فرماتے ہیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راستہ کو طے کر لیا ہے معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں تو ہم بھی اس کو طے کر سکتے ہیں خصوصاً جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (جو واقف طریق ہیں) ہمارے معین و رفیق ہیں۔ واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہ ہو تو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ خدائی راستہ ہے جس کو وہی طے کر سکتا ہے جس کو حق تعالیٰ طے کرانا چاہیں اسی لئے سالک کو جب اس پر نظر ہوتی ہے کہ یہ راستہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اس وقت وہ بڑا پریشان ہوتا ہے اور اس کے طول و لاتناہی کے خیال سے گھبراتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

(دریائے عشق ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اس جگہ جان سونپنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے) اور جب اس پر نظر کرتا ہے کہ یہ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے جس پر آپ چل رہے ہیں تو اس کی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے ؎

تو دستگیر شوائے خضر پے خجستہ کہ من پیادہ می روم و ہمرہاں سوار انند

(اے خضر راہ تو ہی میرا ہاتھ پکڑ کہ میں پیدل ہوں میرے ہمراہی سوار ہیں۔)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت و رفاقت سے اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کر لیتا ہے

یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جن کی رسائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہو چکی ہے اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں ان کو اس کی ضرورت ہے کہ ان مشائخ کا دامن پکڑیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی حاصل کر چکے ہیں (جیسے بادشاہ تک پہونچنے کیلئے وزیر کا واسطہ ضروری ہے مگر جو وزیر تک بھی نہ پہونچا ہو اس کو چاہیئے کہ ان لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں ۱۲ جامع)

شیخ فرید فرماتے ہیں ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

(بے پیر اور رہبر کامل کے جو شخص اس عشق کے راستہ میں چلا عمر گذر گئی مگر عشق سے باخبر نہ ہوا)

گر ہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیر و پس بر آ

(اے دل اگر اس سفر محبت کے طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو رہبر کامل کا دامن پکڑ اور پیچھے آ)

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

یار باید راہ را تنہا مرو بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

قلاؤز سے مراد قل اعوذ یا مولوی نہیں بلکہ قلاؤز کہتے ہیں رہنما کو یہ ترکی لغت ہے گو وہ قلاؤز ہوگا قل اعوذ یا ہی۔ مطلب یہ ہے کہ اس راستہ کو رہنما کے بغیر طے نہ کرو ورنہ بہت پریشان ہوگے اور راستہ طے نہ ہو سکے گا۔ آگے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اگر کسی نے شاذ و نادر اس راہ سلوک کو تنہا بے صحبت پیر قطع کر بھی لیا ہے تو وہ بھی غائبانہ پیروں کی توجہ سے پہونچا ہے)

اس میں جواب ہے اس سوال کا کہ ہم تو بعض اولیاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ بدون رہنما کے واصل ہوگئے ظاہر میں ان کا کوئی شیخ نہ تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اول تو یہ نادر ہے وَالنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ (نادر مثل معدوم کے ہوتا ہے) اس لئے تو ادر سے نقض وارد نہیں ہو سکتا۔ دوسرے

یہ کہ جس کو تم ظاہر میں بدون کسی رہنما کے واصل دیکھتے ہو وہ حقیقت میں ایسا نہیں واقع میں وہ بھی کسی رہنما کے واسطہ سے واصل ہوا ہے گو ظاہر میں اس کا کوئی شیخ نہیں مگر وصول اس کو بھی عون ہمت مردان طریق سے ہوا ہے یعنی اہل اللہ میں سے کسی نے اس پر نظر کی ہے جس کی برکت سے وہ واصل ہوگیا ہے گو اس شخص کو اس کی خبر بھی نہ ہو کہ مجھ پر کس نے نظر کی ہے۔ حضرات اہل اللہ کے احسان کی یہ شان ہوتی ہے کہ بہت لوگوں کو ان کے احسان کی خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ اُن کے لئے دعائیں کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہٗ کا واقعہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے جن سے بہت فیض جاری تھا مگر حضرت مجدد صاحب کو ان کی بات مکشوف ہوا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا۔ پس حضرت مجدد صاحب یہ دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے آپ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ایک شخص شقی ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض پہنچ رہا ہے۔ آپ نے اس کے لئے دعا کرنی چاہی مگر ڈرے کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہ ہو کہ تقدیر مکشوف ہونے کے بعد اس کے خلاف کی دعا کرتا ہے۔ مگر پھر حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالٰی سے کہہ کر میں شقی کو سعید کرا سکتا ہوں۔ اس پر مجدد صاحب کی بھی ہمت ہوئی۔ معلوم ہو گیا کہ ایسی دعا کرنا خلاف ادب نہیں چنانچہ پھر تو آپ نے اس کے لئے بہت دعائیں کیں اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو مبدل بہ سعادت کر دیا جائے حتیٰ کہ آپ کو مکشوف ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اس کو سعید کر دیا تب آپ کو چین آیا تو دیکھئے مجدد صاحب نے اس شخص کے حق میں در پردہ کتنا بڑا احسان فرمایا مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی اُسے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گذر رہی ہے راتوں کی نیند اس کی اڑ گئی ہے۔ خیر یہ واقعہ تو ہو گیا مگر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی جس کے متعلق ارشاد ہے مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (میرے نزدیک قول نہیں بدلتا)

(ان شاء اللہ بقیہ آئندہ)

حضرت مجدد صاحب نے اس شبہ کا جواب بھی خود ہی دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے اور واقع میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الٰہی میں ہوتی ہے تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا مگر علم الٰہی میں اس کے ساتھ ایک قید تھی یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کے لئے دعا نہ کرے سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا کیونکہ تقدیر اصل میں علم الٰہی کا نام ہے۔ اسی لئے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الٰہی سے کرتے ہیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل کبھی نہیں ہو سکتا۔ پس در اصل ام الکتاب وہی ہے گو لوح محفوظ بھی کتاب المحو والاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے کیونکہ لوح محفوظ میں اتنا تغیر و تبدل نہیں ہوتا جتنا کتاب المحو والاثبات میں ہوتا رہتا ہے مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے۔ اور جو تقدیر علم الٰہی کے درجہ میں ہے اُس میں اس کا اصلا احتمال نہیں۔ پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے۔ اور اس تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجہ میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنَّہٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے یہ غایت قرب لدیّ کا مدلول ہے اور غایت قرب ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں علی ہے حکیم ہے اور قرآن جو درجہ صفت ہے وہی کلام نفسی ہے اور اسی لئے اس کو علی حکیم کہا گیا اور علی حکیم کا اطلاق قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا تو لدینا اور علی حکیم دونوں کی دلالت اس کے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی اور اس کے قبل جو ارشاد ہوا ہے اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا (ہم نے اس کو قرآن عربی کر دیا) اس کا جعل کا مفعول ہونا اور عربیت کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اسی سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے تو دونوں آیتوں میں دونوں درجوں کا بیان نہایت وضاحت سے ہو گیا خیر یہ توضیح میں ایک علمی لطیفہ تھا مقصود میرا یہ تھا کہ اہل اللہ بعض دفعہ اس طریقہ سے بعض لوگوں پر احسان فرماتے ہیں کہ ان کو خبر نہیں ہوتی بھلا اگر مجدد صاحب بیان نہ فرماتے تو ان بزرگ کو اس احسان کی اطلاع کیسے ہوتی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگ حضرت مجدد صاحب کے

ضروری اطلاع: خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

معتقد ہوں گے اگر معتقد نہ ہوتے تو اس احسان کو تسلیم کرنے کے بجائے مجدد صاحب پر معلوم کیا کیا اعتراض کرتے یہ ہے ہم بعونِ ہمتِ مردان رسید (مردان خدا کی توجہ سے پہونچے) اور یہ بھی ان بزرگ کی سعادت کی علامت تھی کہ انھوں نے مجدد صاحب پر اعتراض نہیں کیا بلکہ تسلیم سے کام لیا ان حضرات پر انکار نہ کرنا بھی بڑی دولت ہے اہل اللہ کے ساتھ انکار سے پیش آنا بڑا وبال ہے بلکہ کام کی بات تو یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں پر بھی حقیر سمجھ کر انکار نہ کرو کیونکہ کیا خبر ہے کہ خدا کے یہاں کون عزیز ہے اور کون حقیر بعض دفعہ جن کو ہم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں خدا کے نزدیک بڑے ہوتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تربیت و تعلیم بھی نہ کرو کیونکہ تعلیم میں تحقیر و بے ادبی نہیں بلکہ تعلیم تو ادب ہی ہے کیونکہ ہر چیز کا ادب اس کے مناسب ہوتا ہے چھوٹوں کا ادب یہی ہے کہ ان کی تربیت و تعلیم کی جائے۔ یہاں تک تو لفظ صراطِ کے متعلق بیان تھا آگے فرماتے ہیں مُسْتَقِيمًا یعنی یہ راستہ مستقیم ہے۔ لفظ مستقیم کے معنی ایک تو لغوی ہیں یعنی اَقْصَرُ الْخُطُوطِ الْوَاصِلَةِ بَيْنَ النُّقْطَتَيْنِ (دو نقطوں کے درمیان میں جو خطوط واصل ہو سکیں ان میں جو سب سے چھوٹا ہو وہ مستقیم لغوی ہے) اور ایک معنی عرفی ہیں یعنی بے خوف و خطر راستہ۔ عرف میں اس راستہ کو کہتے ہیں جس میں کوئی خطرہ نہ ہو چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں گاؤں کا سیدھا راستہ یہ ہے اس کو چلے جاؤ حالانکہ اس میں موڑ بھی آتے ہیں مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ راستہ بے خطر ہے اس میں تم کو غلطی پیش نہ آئے گی صاف سڑک پڑی ہوئی ہے اور یہی عرفی معنی اس شعر میں مراد ہیں۔ ؎ "راہ راست برو اگرچہ دور است" (بے خطر راستہ پر چلو اگرچہ دور ہو) اگر راہ راست کے معنی عرفی نہ لئے جائیں تو لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ دور است (اگرچہ دور ہو) نہیں بن سکتا کیونکہ جو راستہ لغۃً مستقیم ہو گا وہ اوروں سے دور کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے اقصر الطرق ہونا لازم ہے جن لوگوں کو مستقیم کے لغوی اور عرفی معنی میں فرق معلوم نہیں وہ اس شعر کو حل نہیں کر سکتے مگر اس تحقیق کے بعد مطلب صاف ہے کہ بے خطر راستہ کو اختیار کرو اگرچہ وہ دور ہی کیوں نہ ہو یہ تو لفظ کی تحقیق تھی اب میں کہتا ہوں کہ صراطِ حق یعنی اسلام کے متعلق یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ صراطِ حق بے خطر بھی ہے اور وصول الی اللہ میں وہ تمام طرق سے اقرب و اقصر بھی ہے تو آپ کو اختیار ہے کہ چاہے مستقیم کو لغوی معنی پر محمول کیجئے یا عرفی پر (یا دونوں پر ۱۲) یہاں سب کی گنجائش ہے

اس کے بعد ارشاد ہے وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ یعنی اس راستہ اسلام کا اتباع کرو اور دوسرے مختلف راستوں کا اتباع نہ کرو ورنہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا اور دور کردیں گے اور دور ہونا اس طرح کا نہیں ہے کیونکہ وہ موصل تو ہوتے ہیں نقطہ مقصود سے دور تو نہیں کرتے بلکہ اس طرح کی دوری ہے جیسے مثلث کی ایک ساق کو چھوڑ کر اگر دوسری ساق پر چلنے لگے تو ساق اول سے وقتاً فوقتاً بُعد ہی بڑھتا جاتا ہے جیسے اقصر الخطوط کے سوا تمام خطوط واصلہ دور دراز ہوا کرتے ہیں اور جدا ہونا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ بے خطر راستہ کو چھوڑ کر خطرناک راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مقصود تک وصول میسر نہیں ہوتا بیچ ہی میں ہلاک ہو جاتا ہے اور ایک بات یہاں اور قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پہلے تو صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے جس میں اس راستہ کی طرف اضافت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھی اور یہاں عن سبیلہ بضمیر غائب فرمایا گیا ہے اس کا مرجع حق تعالیٰ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں ورنہ سبیلی بیاء متکلم فرماتے سو اس کی توجیہ کی اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ یہ اضافت تو حقیقت کے موافق ہے۔ توجیہ کی ضرورت تو صراطی میں تھی جس کا نکتہ میں بیان کر چکا ہوں اس کے بعد ارشاد ہے ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اس کی خدا تعالیٰ نے تم کو وصیت فرمائی ہے تاکہ تم تقویٰ حاصل کرسکو۔ وصیت کرنے سے مراد تاکیدی حکم دینا ہے کیونکہ وصیت اصل میں اس بات کو کہتے ہیں جو انسان اپنے مرنے کے وقت عزیزوں اور وارثوں سے کہا کرتا ہے چونکہ وہ انسان کا آخری وقت ہوتا ہے اس لئے اس وقت جو بات کہتا ہے وہ خاص ضرورت کی باتیں ہوتی ہیں جن کی تعمیل کو وہ بہت مؤکد و لازم کیا کرتا ہے چونکہ حق تعالیٰ عدم و فنا سے پاک ہیں اس لئے یہاں پر وصیت کے معنی متعارف تو ہو نہیں سکتے بلکہ اس کا لازم مراد ہے یعنی حکم تاکیدی لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یہ نتیجہ ہے اتباع صراط مذکور کا مطلب یہ ہے کہ تم اس راستہ پر چلو تو امید ہے کہ تم کو وصال مقصود حاصل ہو جائے گا اس طرح سے تم نجات آخرت سے کامیاب ہو جاؤ گے کیونکہ تقویٰ کے معنے لغت میں بچنے کے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ تم عذاب سے بچے رہو گے اور یہی خلاصہ ہے نجات کا اور شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کمال دین کو کہتے ہیں چنانچہ موارد نصوص میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائیگی

اس تفسیر پر مطلب یہ ہوا کہ اس راستہ پر چلنے سے تم کو کمال دین حاصل ہو جائے گا اور یہی حاصل ہے مقصود پر پہونچنے اور منزل پر وصول ہو جانے کا اس کے بعد میں اس آیت کو مضمون پر منطبق کرنا چاہتا ہوں گو اس تفصیل کے بعد تقریر انطباق کی ضرورت نہیں رہی مگر میں تبرعاً اس کو بھی بیان کئے دیتا ہوں تاکہ پوری تسلی ہو جائے کہ آیت مضمون مقصود پر بسہولت منطبق ہے۔ سو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ھٰذَا صِرَاطِیْ سے دین اسلام کی طرف اشارہ ہے اور اسلام گو نام لغۃً ہے مجموعہ اعمال کا اور عقائد اس میں مجازاً داخل ہیں اور حقیقۃً عقائد ایمان کا مدلول ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایمان فعل قلب ہے اور اسلام فعل جوارح اور یہ اطلاق لغوی ہے کیونکہ ایمان کے معنے تصدیق کے ہیں جو اولاً بالذات قلب سے صادر ہوتی ہے اور اسلام کے معنے گردن نہادن بطاعت ہیں جس کا محل جوارح ہیں اور بعض نصوص میں بھی اسلام و ایمان کا اطلاق اس حقیقت کے موافق وارد ہے قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا (اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے آپ کہدیجئے تم ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لائے) لیکن یہ حقیقت لغویہ ہے اصطلاح شرعی میں اسلام نام ہے مجموعہ عقائد و اعمال کا اور ایمان نام ہے مجموعہ عقائد کا تو شرعاً اسلام عام ہے اور ایمان خاص اور یہاں پر ھٰذَا صِرَاطِیْ سے جو اسلام کی طرف اشارہ ہے اس سے یہی اسلام شرعی مراد ہے جو عقائد و اعمال سب کو شامل ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ اوپر قُلْ تَعَالَوْا (آپ کہیے کہ آؤ) میں عقائد و اعمال دونوں کا ذکر ہے اُس کے بعد وَ اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) فرمایا گیا ہے تو اس میں مجموعہ عقائد و اعمال کی طرف اشارہ ہونا مناسب ہے اور ان اعمال و عقائد کو جو صراط فرمایا گیا تو تخصیص ان ہی اعمال و عقائد کی مقصود نہیں یہ تو بطور تمثیل کے فرمایا ہے مقصود اتباع صراط اسلام کا ہے جو تمام اصول و فروع کو شامل ہے البتہ ایک تحقیق سمجھنے کی یہاں ضرورت ہوگی وہ یہ کہ اوپر بعض نواہی کا ذکر ہے جیسے لَا تُشْرِكُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلَا تَقْرَبُوْا (مت شریک کرو اور مت قتل کرو اور نہ قریب جاؤ اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو) اور بعض مامورات کا ذکر ہے جیسے بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (والدین کے

ساتھ احسان کرو ناپ تول پوری کرو)، اور ان سب کو صراطی فرمایا۔ اس کے اتباع کا امر فرمایا تو صراط کہیں فعل ہوگا کہیں ترک اور اتباع فعل سے ہوگا کہیں ترک سے غرض ھٰذَا صِرَاطِیْ سے مراد تمام وہ اعمال و مامورات ہیں جو معین آخرت و مفید مقصود ہیں جن کا مفید ہونا مستقیما میں مدلول ہے کہ استقامت کے لئے موصل الی المقصود ہونا لازم ہے اور وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی) میں تمام وہ اعمال آگئے جو مانع عن الآخرت و مضر للمقصود ہیں اور مضر ہونا فتفرق سے ظاہر ہے پس ان مقدمات سے حاصل یہ ہوا کہ ہم کو ہر کام میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ فعل معین آخرت ہے یا مضر آخرت ہے اب اس میں تمام شریعت آگئی کوئی مضمون شریعت کا اس سے خارج نہیں رہا۔ اس لئے اس آیت کے تحت میں تمام شریعت کا ذکر ہو سکتا ہے۔ اسی واسطے میں نے ابتداء میں کہا تھا کہ اس آیت کی تفصیل عمر بھر میں بھی بیان نہیں ہو سکتی اور وہ ایک شخص کی عمر نہیں بلکہ ایک جماعت کی عمر جو فی نفسہ گو متناہی ہو مگر یمعنی لَا تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ غَیْرُ مُتَنَاهِیْ (غیر متناہی کہ کس حد پر نہ ٹھہرے) ہو پس اس میں وہ احکام بھی داخل ہیں جو اس ماہ رواں یعنی شعبان کے متعلق یا ماہ آیندہ رمضان کے متعلق شریعت میں وارد ہیں لہذا میں احکام شعبان کو بھی اس کے تحت میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور رمضان کے متعلق اگر موقعہ ملا تو پھر کبھی بیان ہو جائے گا۔ شعبان کی بابت حدیث میں یہ خاص فضیلت مذکور ہے اِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا وَصُوْمُوْا نَهَارَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ اَلَا مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرَ لَهٗ اَلَا مِنْ مُسْتَرْزِقٍ فَاَرْزُقَهٗ اَلَا مِنْ مُبْتَلًى فَاُعَافِيَهٗ اَلَا كَذَا اَلَا كَذَا حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه وَسَنَدُهٗ ضَعِيْفٌ كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ تَصْدِيْرُ الْمُنْذِرِیْ اِيَّاهُ بِلَفْظِ رُوِیَ وَهُوَ عَلَامَةُ الضُّعْفِ كَمَا صَرَّحَ بِهٖ فِیْ خُطْبَةِ كِتَابِهٖ اھ تَرْغِيْبٌ ص۲۹ ج۲ لٰكِنَّهٗ يُحْتَمَلُ فِیْ فَضَائِلِ الْاَعْمَالِ۔ جامع) یعنی حق تعالٰی اس مہینہ کی پندرھویں رات میں غروب ہی کے وقت سے آسمان اول کی طرف نزول فرماتے ہیں۔

جیسا نزول ان کی شایانِ شان ہے اس میں ہم کو کاوش کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی ممانعت بھی ہے کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہے پھر فرماتے ہیں کہ کوئی مغفرت کا طالب ہے؟ کہ میں اس کی مغفرت کر دوں کوئی روزی کا طالب ہے کہ میں اس کو روزی دوں کوئی بیمار (طالب شفا) ہے کہ میں اس کو عافیت دوں اسی طرح بہت سے امور کے متعلق فرماتے رہتے ہیں کہ کوئی ایسا ہے کوئی ایسا ہے یہاں تک کہ طلوع فجر تک یہی معاملہ رہتا ہے سبحان اللہ یہ اس رات کی کتنی بڑی فضیلت ہے گویا یوں کہنا چاہیئے کہ اس رات حق تعالیٰ ہمارے گھر پر تشریف لاتے ہیں کیونکہ آسمان اول ہمارے گھر کی چھت ہے اور محبوب کا چھت پر آجانا گھر ہی میں آجانا ہے تو بس ہمارا حال اس شعر کے مصداق ہوتا ہے ؎

امروز شاہ شاہاں مہماں شدہ است مارا جبریل با ملائک دربان شدہ است مارا

(آج بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا مہمان ہے جبرائیل وملائک ہمارے دربان ہیں۔)

اب اس کو خود سوچ لو کہ جب محبوب گھر میں مہمان ہو تو عاشق کا کیا حال ہوتا ہے۔ جناب خوشی کے مارے رات بھر نیند نہیں آتی یہی جی چاہا کرتا ہے کہ ساری رات محبوب سے باتیں کرتا رہوں خصوصاً جس کا محبوب ایسا ہو جو اپنے عشاق کی باتیں سننے سے گھبراتا بھی نہ ہو نہ اس کو نیند آتی ہو نہ غنودگی ستاتی ہو ایسے محبوب کا عاشق تو ہرگز اس رات میں نہ سوویگا جس میں محبوب اس کے گھر پر آیا ہو پس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس رات میں قیام کا امر بھی نہ فرماتے جب بھی صرف اس خبر کا کہ حق تعالیٰ اس رات آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں مقتضا یہی تھا کہ ہم اس رات کو عبادت وذکر میں گذاریں اور رات بھر بیدار رہیں چہ جائیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے قُوْمُوْا لَيْلَهَا وَصُوْمُوْا نَهَارَهَا (اس کی رات میں شب بیداری کرو اور دن میں روزہ رکھو) مگر وہ شاہ شاہاں ایسا مہربان ہے کہ مہمان ہو کر بھی تمہیں سونے سے نہیں روکتا تم کو سونے کی اجازت مگر باوجود اس طرف سے اجازت ہونے کے پھر بھی یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ جیسے روز ویسے ہی اس روز کچھ تو کرنا چاہیئے۔ رات بھر جاگنے کی ضرورت نہیں بلکہ اچھا بھی نہیں کیونکہ حدیث میں ہے اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُھَا بہتر عمل خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس کو دوام کیا جائے سو شعبان کی اس شب میں اتنا جاگنا چاہیئے جس پر نباہ ہو سکے یہ نہیں کہ ایک مرتبہ تو ساری رات جاگ لئے اور دوسری مرتبہ کچھ بھی نہیں شاید کوئی صاحب اس حدیث کو سنکر یہ کہیں کہ یہ دوام تو بڑا سر لگا سال میں ایک رات تو کچھ دیر جاگنا آسان تھا سال بھر کون جاگے ارے صاحب! آپ گھبرائیں نہیں

یں سال بھر کی راتوں میں آپ کو نہیں جگاتا بلکہ آپ سال میں ایک ہی رات جاگ لیا کیجئے رہا یہ شبہ کہ اس صورت میں دوام کہاں ہوا تو میں کہتا ہوں یہ بھی ایک صورت دوام کی ہے کہ سال میں ایک رات ہمیشہ جاگ لیا کرے جیسے روٹی پر آپ کو دوام ہے مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ ہر وقت کھایا کرے یا کپڑے بدلنے پر دوام ہے کہ ہفتہ میں ایک بار یا دو بار بدلا کرتے ہیں اس دوام کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر وقت کپڑے بدلے جائیں پس اسی طرح سال بھر میں ایک رات جاگنے کا التزام کر لینا یہ بھی دوام ہے بشرطیکہ یہ ایک رات ناغہ نہ ہو تو اس رات میں اتنی مقدار بیداری کے لئے معین کرنی چاہئے کہ جس پر ہمیشہ کم از کم اس رات میں تو دوام ہو جایا کرے چاہے ایک ہی گھنٹہ ہو بلکہ میں اس سے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ چاہے دو ہی رکعت ہوں کچھ تو ہوں پس قلیل عمل بھی دوام کے ساتھ عمل کثیر بغیر دوام سے بہتر ہے اگر دو رکعت بھی کسی سے نہ ہو سکیں تو کم از کم ایک مرتبہ استغفار ہی اس رات میں کر لیا کرے التزام کے ساتھ یہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب کا شعر ہے ؎

گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم ۔۔۔ بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہونچے وہاں

سبحان اللہ یہ علوم ہیں حاجی صاحب کے حق تعالیٰ نے حاجی صاحب کو کتنا سہل راستہ الہام فرمایا تھا بس وہی انبیاء کا راستہ ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے جس کی شان یہ ہے سَهْلَةٌ بَيْضَاءُ نقية ليلها ونهارها سواءٌ حضرت حاجی صاحب کی یہی تعلیم تھی کہ کچھ کرنا چاہئے چاہے قلیل ہی ہو پس تم ہر شعبان میں اس رات کے لئے کچھ کام مقرر کر لو یہ بھی دوام ہے اگر تمام رات بیدار نہ رہ سکو تو جتنا ہو سکے پانچ منٹ ہی سہی۔ اور حدیث میں آتا ہے اس رات سب کی مغفرت ہو جاتی ہے (جو بھی مغفرت طلب کرے ۱۲) سوائے مشرک اور مشاحن کے یعنی جن دو شخصوں میں دنیوی عداوت و کینہ ہو ان کی بھی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ کہدیا جاتا ہے ان کو ابھی رہنے دو جب تک یہ صلح کرلیں (قلت رواہ البیہقی من طریق العلاء بن الحارث عن عائشۃ وقال ھذا مرسل جید یعنی ان العلاء لم یسمع من عائشۃ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم کذا فی الترغیب ص۱۷۵ ج۱) اللہ اللہ کینہ بھی کتنا گناہ ہے کہ اس کو شرک کے ساتھ جمع کیا گیا ہے کہ جس طرح مشرک کی مغفرت اس رات میں نہیں ہوتی اسی طرح کینہ ور کی بھی مغفرت نہیں ہوتی اب تو مسلمانوں میں کینہ بہت ہی بڑھ گیا ہے حالانکہ اس میں ہر مسلمان کا وہ مشرب ہونا چاہئے تھا جو صوفیہ کا ہے وہ یوں کہتے ہیں ؎

کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن ۔۔۔ آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

ترجمہ (ہمارے طریق میں کینہ رکھنا کفر ہے ہمارا آئین ہے سینہ کو مثل آئینہ صاف رکھنا)
(کینہ کو کفر کہنا کا مطلب یہ ہے کہ وہ قریب بکفر ہے اور اس کی دلیل حدیث مذکور میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشاحین کو مشرک کے ساتھ جمع فرمایا ۱۲) مگر اب تو صوفیوں میں بھی یہ بات نہیں رہی ان میں کینہ و بغض کی کثرت ہونے لگی حالانکہ مسلمانوں کو تو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے اللہ ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ کیجئے ۱۲) تو اس مرض سے بچنا چاہیئے مگر آجکل مسلمان اپنے بھائیوں ہی سے کینہ بہت رکھتے ہیں غیروں سے تو اتحاد کی کوشش کی جاتی ہے ان کو غیر قوموں سے اتنا کینہ نہیں ہوتا جتنا اپنے بھائیوں سے ہوتا ہے افسوس! بس اس رات سے پہلے ہر شخص کو اپنے دل میں سے مسلمانوں کی طرف سے کینہ نکال دینا چاہیئے ورنہ اس کی مغفرت نہ ہوگی اس دن کے ختم ہونے کے بعد (اس دن چودھویں تاریخ تھی) جو رات اب آرہی ہے وہی لیلۃ النصف من شعبان ہے جس کا نام شب برات ہے مگر حلوے مانڈے والوں کو یہاں آج ہی شب برات ہے واقعی ان بدعات کے ساتھ عقل بھی خبط ہو جاتی ہے یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ دن کو شب کہتے ہیں شاید چودھویں تاریخ کو اہتمام کرنے سے پندرھویں رات ہی مقصود ہوتی ہوگی اسی اہتمام کے سبب چودھویں تاریخ ہی کو شب برات کہنے لگے۔

دوسری غلطی یہ کہ بقرعید کی طرح شب برات کا بھی عرفہ کیا جاتا ہے یہاں کے لوگ تو عرفہ کو نہ جانتے ہوں گے مگر لکھنؤ وغیرہ میں آج سے ایک دن پہلے آفت شروع ہوگئی ہوگی پھر وہ عرفہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں صرفہ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ سب قصہ پیر جیون کا نکالا ہوا ہے انھوں نے اپنے کھانے کے واسطے ایک تو چودھویں ہی تاریخ سے شب برات شروع کردی پھر اس کا عرفہ نکالا تاکہ بار بار مٹھائی حلوا ملے۔

واللہ اگر ان کو مٹھائی وغیرہ نہ دو تو یہ خود بدعات سے توبہ کرلیں. ان کا آسان امتحان یہ ہے کہ ان سے فاتحہ خوب دلواؤ، مولود خوب پڑھواؤ اور کچھ دو دلاؤ نہیں پھر دیکھو جب ان پر مفت کی مشقت پڑے گی وہ خود ان کو بدعات کہنے لگیں گے۔

کانپور میں ایک مولوی صاحب کسی رئیس کے یہاں مولود پڑھنے گئے۔ درمیان میں آپ نے ایک شعر پڑھا اور وجد ظاہر کرکے اپنا کرتہ جھر سے پھاڑ ڈالا۔ یہ معاملہ دیکھ کر گھر والے نے اسی وقت بزاز کے یہاں سے اس بدذات کے واسطے

کپڑا منگایا دکیونکہ اس میں ان کی سبکی تھی کہ مولوی صاحب ان کے گھر آئے تھے سر ننگے اور جائیں گے ننگے ۱۲) تو یہ لوگ دنیا وصول کرنے کے لئے ایسی ایسی ترکیبیں کرتے ہیں اگر ان کو کچھ نہ دیا جاوے اس وقت سب بدعات کی حقیقت خود ہی کھل جائے گی۔ لوگ خواہ مخواہ دلائل سے ان کو طے کرنا چاہتے ہیں حالانکہ حق و ناحق کا امتحان اس ترکیب سے بآسانی ہو سکتا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی گو معقولی تھے مگر خوش عقیدہ تھے ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرت مولود پڑھنا کیسا ہے، فرمایا بڑی برکت کی چیز ہے اس کی ادنیٰ برکت تو یہ ہے کہ مولود خواں کو کم از کم دو حصے تو ضرور ہی ملتے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک خانصاحب مولانا کے پاس آئے تھے وہ اس زمانہ میں مستاجری کرتے تھے جس کا بھوپال وغیرہ میں بہت رواج تھا تو مولانا نے خانصاحب سے پوچھا کہ آجکل تو وصولیابی کے دن ہیں آپ یہاں کیسے آگئے۔ خانصاحب بولے کہ میں تو گاؤں کو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر آیا ہوں۔ مولانا نے فرمایا اچھا ہم تو اب تک یہ سمجھتے تھے کہ بڑے پیر صاحب ولی ہیں مگر آپ کے قول سے معلوم ہوا کہ پدھان بھی ہیں جو زمین و جائیداد کا بھی انتظام کر لیتے ہیں۔

غرض ان بدعات کا کچھ خاصہ ہے کہ ان سے عقل بھی خبط ہو جاتی ہے اور منشا سب کا وہی پیٹ کا دھندا ہے۔ یہ پیٹ انسان سے سب کچھ کراتا ہے۔ چنانچہ بدعات شعبان میں بھی انہی حضرت کی برکت کا ظہور ہوتا ہے مسلمان کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ جو کام کرے یہ دیکھ لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو کیا ہے یا نہیں یا اشارۃً دلالۃً اس کی ترغیب دی ہے یا نہیں چنانچہ شعبان کی اس رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا حلوا وغیرہ کچھ نہیں پکوایا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام نہیں کیا تو تم کیوں کرتے ہو۔ شیخ سعدی نے خوب فرمایا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا　　ولیکن میفزائے بر مصطفا

(یعنی زہد و ورع و صدق و صفا میں کوشش کرو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بڑھ نہیں سکتا بلکہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنا چاہتا ہے وہ اور نیچے کو گر جاتا ہے ۱۲ جامع) بھلا ان بدعات میں تو بعض منکرات ایسے

مختلط ہیں جن کی وجہ سے ان کو مباح بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر کوئی کام منکرات سے خالی بھی ہو اور فی نفسہ مباح ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار نہ کیا ہو تو عارفین اس کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ ان ہی کاموں کو پسند کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً ثابت ہیں چنانچہ مولانا گنگوہی (قدس سرہٗ) فرماتے تھے کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار فرمایا کہ بھائی بزرگوں نے تو ہر لقمہ اور ہر گھونٹ پر الحمد للہ کہنے کی ترغیب دی ہے اور یہی ان کا معمول بھی ہے مگر ہم کو تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فعل سے محبت ہے کہ بس ایک بار شروع کھانے میں بسم اللہ کہہ لے اور ایک بار فراغت کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۱۲ سب تعریف ہے اللہ ہی کے لئے جس نے ہم کو کھلایا اور پلایا اور مسلمانوں میں سے کیا) کہہ لیا مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ حافظ صاحب نے یہ کیا اچھی بات فرمائی اھ اتباع سنت اس کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے تو محض نام ہی یاد کر لیا ہے پس اتباع سنت اسی میں ہے کہ اس زمانہ کے متعلق جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہی کیا جائے اور اپنی طرف سے کچھ زیادتی نہ ایجاد کی جائے۔ شعبان کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک تو یہ ثابت ہے کہ پندرھویں رات کو کچھ اور راتوں سے زیادہ بیدار رہا جائے۔ دوسرے یہ ثابت ہے کہ پندرھویں تاریخ کو روزہ رکھا جائے، اس روزہ کا بہت ثواب ہے اور حکمت اس دن کے روزہ کی اور اس کی رات کے قیام کی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ نصف شعبان کا وقت مقدار و کیفیت وغیرہ میں رمضان کے وقت کے مماثل ہوتا ہے چنانچہ اس کے بعد رمضان تک دن کی زیادتی کمی میں نمایاں فرق نہیں ہوتا چند منٹوں ہی کا تفاوت ہوتا ہے نیز موسم میں بھی کچھ زیادہ تغیر نہیں ہو سکتا پندرہ دن میں کوئی معتد بہ تفاوت نہیں ہوا کرتا جیسی گرمی ۱۵ شعبان کو ہوگی بس قریب قریب اسی کے یکم رمضان کو ہوگی تو اس دن کے روزہ کی اور اس کی رات کے قیام کی ترغیب میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اس دن کا روزہ رکھکر اور اس کی رات کو جاگ کر امتحان کر لو کہ بس رمضان کا روزہ بھی ایسا ہی ہوگا اور تراویح کی نماز بھی ایسی ہی ہوگی جیسے اس رات کا جاگنا پھر گھبراتے کیوں ہو میں اس حکمت کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر

مجھے یہ حکمت معلوم ہوتی ہے اور گو یہ حکمت مقصود نہ ہو مگر اس دن کے صیام اور رات کے قیام پر یہ فائدہ مرتب تو ضرور ہوتا ہے کہ اس سے رمضان کے صیام وقیام کا نمونہ معلوم ہو کر اس کی ہمت بندھ جاتی ہے۔ اور مجھے یہی حکمت معلوم ہوتی ہے۔ حدیث اِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانَ فَلَا صَوْمَ اِلَّا عَنْ رَمَضَانَ (جب نصف شعبان گذر جائے تو سوائے رمضان روزہ نہ رکھا جائے) کی (جب شعبان نصف گذر جائے" اور گذر جانیکے ترجمہ سے خود پندرہویں تاریخ کا اس سے خارج ہونا مفہوم ہو گیا کیونکہ نصف متیقن پندرھویں کے بعد ہی گذرتا ہے نہ اُس سے پہلے" تو رمضان کے سوا اور روزہ نہیں) کہ اس سے بھی رمضان کے لئے ہمت کا تازہ رکھنا مقصود ہے اگر نصف شعبان کے بعد روزے رکھے گئے تو ان سے لحوق ضعف کا اندیشہ ہے جس سے شاید رمضان کے روزوں کی ہمت پست ہو جائے اور اگر نصف شعبان کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہے گی تو وہ ہمت جو ایک روزہ کے امتحان سے پیدا ہو چکی تھی کمزور نہ ہو گی باقی احکام شرعیہ کی مصالح کا احاطہ کون کر سکتا ہے یہ بھی حق تعالیٰ کا انعام ہے کچھ تھوڑی بہت حکمتیں ہم جیسوں کو بھی بتلا دی جاتی ہیں جن سے ضعیف الایمان لوگوں کو تسلی ہو جاتی ہے ورنہ مسلمان کا اصل مذاق تو یہ ہونا چاہیے

زباں تازہ کردن باقرار تو ٭ نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

اب میں ایک مضمون اور بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی پر بیان کو ختم کر دوں گا کیونکہ وقت بہت گذر گیا عصر کی نماز بھی قریب ہے یہ مضمون پہلے ایک علمی رسم سے ظاہر ہو چکا ہے اور اس کی اجمالی کیفیت ایک مختصر تقریر سے معلوم ہو چکی ہے میں مضمون کو بھی اسی آیت میں داخل کرتا ہوں یہ مضمون دستار بندی علماء ہے گو اس میں ہم لوگوں کی اغراض مختلف ہو گئی ہیں جن میں بعض اغراض فاسد بھی ہیں کہیں اس سے اپنی کارگذاری کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہیں چندہ کی کوشش کیلئے اس قسم کے جلسوں کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور چندوں میں حدود شرعیہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہیں اس کی حقیقت اور اس فعل کے درجہ کو واضح نہیں کیا جاتا جس سے عوام کو غلطی اور خود فارغ شدہ جماعت کو بھی دھوکہ ہوتا ہے لوگ ان لوگوں کو ابھی سے مقتدا و معتمد سمجھنے لگتے ہیں اور خود فارغ شدہ جماعت بھی اپنے متعلق یہ اعتقاد کر لیتی ہے کہ بس ہم آج سے مقتدا ہو گئے باقی اصل مقصود اس تقریب سے تعلیم کا اہتمام

اور غیر فارغ شدہ جماعت کو تکمیل کی رغبت دلانا ہے اور حقیقت اس کی وہ ہے جس کو میں عنقریب بیان کروں گا۔ رہا یہ کہ ہماری غرض اس وقت اس تقریب سے کیا تھی سو یہ بات گو مجھے اپنے آپ نہ بیان کرنی چاہیئے تھی مگر خدا تعالٰی کی نعمت سمجھ کر بیان کرتا ہوں کہ بحمد اللہ یہاں اس تقریب سے نہ مدرسہ کی شہرت مقصود ہے اور اس مختصر جلسہ سے جس کے لئے کوئی تداعی واہتمام مطلق نہیں کیا گیا اس کا وہم ہی کیا ہو سکتا ہے نہ مدرسہ کی کارگذاری کا اظہار مقصود ہے اور یہ کارگذاری ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ساری عمر میں مدرسہ سے ایک طالبعلم کی تکمیل ہوئی نہ اس سے کچھ چندہ کی کوشش مقصود ہے کیونکہ یہ دفتر ہی یہاں بند ہے نہ یہاں اس کی سعی ہے نہ مدرسہ سے چندہ کی فہرست اور حساب کی روداد شائع ہوتی ہے محض توکل پر کام چل رہا ہے نہ اس تقریب سے عوام پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ ان فارغ شدہ طالبعلم کو آج ہی سے مقتدا اور عالم فاضل سمجھنے لگیں بلکہ محض یہ بتلانا ہے کہ ان صاحب نے ہمارے مدرسہ میں درسیات کی تکمیل کر لی ہے اور ہمارے نزدیک ان میں استعداد اور مناسبت علوم سے پیدا ہو گئی ہے جس کی شہادت مدرسین مدرسہ نے سند دیکر ظاہر کی ہے باقی محض استعداد و مناسبت سے مقتدائیت اور فضل و کمال پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لئے شغل درس تدریس اور کتب دینیہ کا مطالعہ کرتے رہنا ضروری ہے (اور یہی مطلب ہے مدرسین کا سند دینے سے کہ ہمارے نزدیک ان میں استعداد مقتدائیت موجود ہے اگر یہ اس استعداد سے کام لیتے رہیں گے تو ان شاء اللہ ایک دن مقتدا اور معتمد عالم ہو جائیں گے ۱۲) اور دوسری غرض اس تقریب سے وہ ہے جو آیت متلوہ پر اس مضمون کے انطباق سے ظاہر ہو گی اس آیت کے اخیر میں حق تعالٰی فرماتے ہیں۔ ذَالِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اللہ تعالٰی نے تمکو ان کا حکم دیا ہے تاکہ تم متقی ہو جاؤ) میں اس مضمون کو ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ میں داخل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جس طرح اس جملہ میں حق تعالٰی نے صراط مستقیم کے اتباع کی وصیت فرمائی ہے اسی طرح دستار بندی اور اعطار سند بھی وصیت عملی ہے جس سے مقصود فارغ شدہ طالب علم کو اتباع صراط مستقیم کی وصیت مقصود ہے اور ان کو بتلانا ہے کہ تم ہمارے نزدیک عامل شریعت ہوا اور مقتدا بننے کی تم میں استعداد پیدا ہو گئی ہے اب ہم تمہاری اس قابلیت کو عملاً ظاہر کرتے ہیں کیونکہ عادۃً حیادار طبائع کو اس عملی صورت کی لاج بہت ہوا کرتی ہے

جس سے وہ اپنے اوپر ایک بار گراں محسوس کرتے ہیں نیز عوام کو بھی اس صورت سے یہ وصیت مقصود ہے کہ یہ فارغ شدہ طالبعلم اب عالم ہوگئے ہیں اب ان کا ادب کرنا چاہیئے اور ان سے مستفیض ہونا چاہیئے (بشرطیکہ یہ اسی شغل میں لگے رہیں) پس جس طرح کہ آیت میں اصل مقصود تاکیدی حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا جس کو مجازاً وصیت سے تعبیر کیا گیا اسی طرح یہاں اس عملی صورت (دستار بندی وغیرہ) سے اصل مقصود تاکیدی حکم ہے ان صاحب کو جن کی دستار بندی کی گئی ہے جس کو مجازاً میں وصیت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب اس مضمون کا تعلق آیت کے اس جزو سے واضح ہوگیا ہوگا۔

نیز انطباق کی ایک تقریر یہ ہوسکتی ہے کہ جن اعمال کی یہاں وصیت ہے ان پر عمل کرنا موقوف ہے علم پر تو عمل کی تاکید مستلزم ہے تحصیل علم کی تاکید کو تو تحصیل علم کو موجب اسعاد سمجھ کر اختیار کرے اور جہل کو موجب ابعاد سمجھ کر اختیار کرے اور جہل کو موجب ابعاد سمجھ کر ترک کرے۔ اور تیسرے مضمون کے اعتبار سے میں اس بیان کے نام میں ایک اضافہ کرکے الاسعاد والابعاد مع مجلس قباد رکھتا ہوں گو نام لمبا ہوگیا مگر مولوی قباد کے دوست اتنی مشقت برداشت کرلیا کریں گے۔ لمبے نام پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص کی کنیت ابو عبداللہ تھی کسی نے اس سے پوچھا کہ تیری کنیت کیا ہے تو صرف ابو عبداللہ کہتے ہوئے اسے شرم آئی کہ یہ تو ذرا سا نام ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ الَّذِیْ اَمْسَكَ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ الاباذنہ اس پر ظریف نے کہا مَرْحَبًا بِكَ یَا اَبَا نِصْفِ الْقُرْاٰن واقعی خوب ہی ظرافت کا جواب دیا۔ تو ایسے ہی اس وعظ کا نام بھی لمبا ہوگیا اتنا فرق ہے کہ وہاں طول بے ضرورت تھا اور یہاں بضرورت ہے۔ اب یہاں آیت کے متعلق ایک نکتہ ہے اس کو بیان کرکے میں ختم کئے دیتا ہوں نکتہ یہ ہے کہ اس جگہ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ (آپ کہدیجئے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے) سے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) تک تین آیتیں ہیں اور ہر آیت کے ختم پر حق تعالٰی نے ذٰلِكُمْ

وَصّٰکُمْ بِہٖ (اللہ نے تکو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو) فرمایا ہے لیکن پہلی آیت کے اخیر میں تو ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو) فرمایا اور دوسری آیت کے ختم پر ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو) فرمایا اور اس تیسری آیت کے اخیر میں ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ فرمایا ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب وصیت سب کی مقصود ہے تو اس تفرق عنوان کی کیا ضرورت ہے گو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مقصود تفنن کلام ہے جو ایک شعبہ ہے بلاغت کا اور کسی نکتہ کے بیان کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی مگر بعض لوگ چلبلے ہوتے ہیں وہ اتنی بات پر کفایت نہیں کرتے بلکہ ان کا ذہن اس سے آگے چلتا ہے تو انھوں نے اس تفرق عنوان میں یہ نکتہ بتلایا ہے کہ پہلی آیت میں جن پانچ امور کا ذکر ہے ان میں بجز اساءة بالوالدین کے اہل عرب اعتقادی غلطی کرتے تھے کہ امور قبیحہ کو مستحسن سمجھتے تھے صرف اساءة بالوالدین (یعنے ماں باپ کے ساتھ برا سلوک کرنے) کو اعتقاداً اچھا نہ سمجھتے تھے اس کے سوا سب میں ان کی اعتقادی غلطی تھی اس لئے باعتبار اکثر کے وہاں تعقلون فرمایا کیونکہ اعتقادیات کا تعلق زیادہ تر عقل سے ہے اور دوسری آیت میں مخاطبین کی کوئی اعتقادی غلطی نہ تھی بلکہ وہ احکام عمل کے متعلق ہیں جن میں وہ تغافل و سہو کرتے تھے اس لئے وہاں تذکرون مناسب ہوا۔ اور تیسری آیت میں کسی خاص حکم کا بیان نہیں بلکہ عام حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا تو وہاں تتقون مناسب ہوا کیونکہ تقویٰ کا بھی شرعاً عام ہے جس کا تعلق عقائد و اعمال وغیرہ سب سے یکساں ہے تو بعض عقلاء نے یہ نکتہ بیان کیا ہے اگر کسی کو پسند ہو تو اس کو اختیار کرے ورنہ اس کی کوئی ضرورت سے نہیں اور بظاہر یہ نکتہ بعید بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو لطائف تھے مگر اصل مقصود میرا وہی مراقبہ ہے کہ ہر کام اور ہر حرکت و سکون میں یہ سوچا جائے کہ یہ فعل آخرت کے لئے معین ہے یا مضر اگر معین ہو تو اس کو کیا جائے اگر مضر ہو نہ کیا جائے اس طرح ان شاء اللہ بہت جلد معاصی سے اجتناب کی ہمت پیدا ہو جائیگی اور جو اس سہل ترکیب سے بھی کام نہ لے تو وہ اپنے ہاتھوں محروم ہونا چاہتا ہے اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمادیں اور عمل کی توفیق دیں اور ان فارغ شدہ طالب علم کے لئے بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ ان کو صراط مستقیم پر چلائے اور ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین ○ تمت

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

التبلیغ کا وعظ

مسمیٰ بہ

درجات الاسلام

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ـــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے۔ جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ مسمّٰی بہ

درجات الاسلام

این	کہاں ہوا	جامع مسجد۔ صدر بازار۔ میرٹھ
متی	کب ہوا	۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ یوم الاحد شروع وقت صبح ۸ بجے
کم	کتنی دیر ہوا	۲ ½ گھنٹہ (ختم ساڑھے دس بجے ہوا)
کیف	کیونکر ہوا	کھڑے ہو کر
لِمَ	کیوں ہوا	جناب شیخ رشید احمد صاحب سوداگر صدر میرٹھ کی درخواست پر تشریف لے گئے۔ اور ان کی طلب پر بیان ہوا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	اس پر شکایت تھی کہ ہمارا اسلام تام کا اسلام ہے تیز اسلام کے تین درجے بیان فرمائے۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا۔	عموماً سب مسلمانوں کو اور خصوصاً ان لوگوں کو جو تقریر و تحریر میں اسلام کا نوحہ کیا کرتے ہیں۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ و غفر لوالدیہ و اخوانہ و مشائخہ و احبابہ و اقربائہ اجمعین۔
المستمعون	سامعین کی تعداد	تقریباً ۳۵۰۰
الاشتات	متفرقات	چونکہ حضرت مولانا پر دھوپ آگئی تھی جس سے طبیعت پریشان ہو گئی اس لئے بیان جلد ختم فرما دیا ورنہ مضمون بہت کچھ باقی تھا۔
کیفیت	کیفیت	ختم وعظ پر ایک انگریزی اسکول کے مسلمان طلبہ سو سے زیادہ حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ بیان کو وسعت دی جائے ہم ابھی حاضر ہوئے ہیں مولانا نے فرمایا کہ اب تو میں ختم کر چکا اگر کسی قدر پہلے کہا جاتا تو اس درخواست کی تعمیل کر دیتا لیکن اب طبیعت پر گرانی ہو گی۔ اسکول کے طلبہ اپنے ماسٹر کو کوستے ہوئے چلے گئے کہ اس نے ہم کو بہت دیر میں چھٹی دی حالانکہ ہم دیر سے اجازت مانگ رہے تھے ۱۲ جامع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ وَّھِیَ خَرَابٌ عُلَمَاؤُھُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَآءِ تَبْدُ مِنْھُمُ الْفِتْنَۃُ وَفِیْھِمْ تَعُوْدُ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریب ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ لوگوں

میں اسلام کا نام ہی رہجائے گا اور قرآن سے کچھ نہ رہے گا مگر رسم یعنی نقش ان کی مسجدیں بظاہر آباد ہوں گی لیکن حقیقت میں خراب ہوں گی ان کے علماء آسمان سے نیچے کی مخلوق میں سب سے بدتر ہوں گے ان ہی سے دین میں فتنہ برپا ہوگا اور ان ہی میں لوٹ آئے گا)

الحدیث میں جس عبارت کی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا (فَدَاهُ اٰبَاؤُنَا وَاُمَّهَاتُنَا) آپ پر ہمارے باپ مائیں قربان ہوں) اس میں حضرت سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (نَفْسِیْ وَرُوْحِیْ فِدَاهُ (میری جان اور روح آپ پر فدا ہو) نے اسلام کے درجات کے تفاوت کی طرف اشارہ فرمایا ہے بلکہ اشارہ کیا ہے قریب صراحت کے ہے چنانچہ عنقریب واضح ہو جائے گا۔ اسی سے سامعین کو اس مضمون کی ضرورت معلوم ہو گئی ہوگی کیونکہ اسلام سے بڑھ کر مسلمانوں کا کوئی مقصود نہیں ہمارا مقصود صرف اسلام ہے اور ہمارے تمام مقاصد باوجود متفرق و منتشر ہونے کے سب اسی ایک لفظ میں مدمج ہیں یعنی لفظ اسلام میں۔ ہمارا کوئی مقصود بھی اس سے خارج نہیں اس میں ہمارے افعال بھی آگئے اور اقوال بھی اور احوال بھی تمام شعبے اسی امر واحد کی طرف راجع ہیں مسلمانوں کی کوئی حالت کوئی قول و فعل اس سے خارج نہیں مقاصد حقیقیہ بالسرہا (تمام کی تمام) اسی ایک چیز میں منحصر ہیں یعنی اسلام بمقاصد میں حقیقیہ کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ مقاصد کی دو قسمیں ہیں بعض مقاصد حقیقیہ ہیں اور بعض غیر حقیقیہ تمام مقاصد کا ایک درجہ نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ ایک مقصود دوسرے مقصود سے راجح اور مقدم ہوتا ہے پس دنیوی امور جو مسلمانوں کے مقاصد میں داخل ہیں وہ مقاصد غیر حقیقیہ ہیں اگر دنیوی امور کا اسلام کی طرف راجع ہونا کسی کے نزدیک مخفی ہو تو ممکن ہے لیکن اس میں تو کچھ شک نہیں کہ مقاصد حقیقیہ سب اسی کی طرف راجع ہیں اور دنیوی امور مقاصد غیر حقیقیہ ہیں اگر وہ راجع نہ ہوں نہ سہی اس لئے میں نے حقیقیہ کی قید لگا دی۔ لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دنیوی مقاصد بھی اسلام ہی کی طرف راجع ہیں وہ بھی اس سے جدا نہیں ہو سکتے مثلاً ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور اس وقت ایک اندھا آدمی کنوئیں پر آرہا ہے کہ اگر اس کو بچایا نہ جائے تو کنوئیں میں گر جانے کا اندیشہ ہے اس وقت واجب بلکہ فرض ہے کہ نماز کو توڑ دے گو وہ نماز فرض ہی ہو اور اس اندھے کو بچائے یہاں ظاہر میں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ اس میں دنیا کو دین پر مقدم کرنا لازم آتا ہے کیونکہ نماز دین کا کام ہے اور جان کا بچانا دنیوی کام ہے۔ مگر واقع میں یہاں دنیا کی تقدیم دین پر نہیں ہے گو ظاہر میں

شبہ ہوتا ہے بلکہ ایک امر دین کی تقدیم ہے دوسرے امر دین پر کیونکہ حفاظت جان مسلم یہ بھی دین ہے گو ظاہر میں اس کے لئے تو دنیا ہے مگر ہمارے لئے تو یہ دین ہی کا کام ہے اگر حفاظت جان مسلم ہمارے لئے دنیا کا کام ہوتا تو یہ حفاظت اسی جگہ واجب ہوتی جہاں ہماری دنیا کا نفع ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ اس حکم میں نہ قرابت کی قید ہے نہ دوستی کی۔ بلکہ ہر مسلمان کی جان بچانا فرض ہے خواہ وہ عزیز ہو یا اجنبی دوست ہو یا نہ ہو حتیٰ کہ دشمن کی جان کا بچانا واجب ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن کی حفاظت تو دنیا ہو ہی نہیں سکتی بلکہ یہ تو دنیا کے لئے مضر ہے کیونکہ اگر دشمن ہلاکت سے بچ گیا تو ساری عمر کے لئے ایک مشغلہ رہے گا مگر شریعت کا حکم ہے کہ اگر تمہارا کوئی دشمن بھی کنوئیں میں گرتا ہو یا کوئی شخص اس کو ناحق قتل کرتا ہو تو اس کا بچانا حسب وسعت واجب ہے اس جگہ اس کی جان کی حفاظت مسلم ہونے کے لحاظ سے واجب ہے اور یہ دین ہے اور تعمق کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنی جان کی حفاظت دین میں داخل ہے گو ظاہر میں یہ دنیا کا کام معلوم ہوتا ہے کیونکہ جان ہماری نہیں ہے یہ خدا کی امانت ہے اس کو حکم الٰہی کے موافق خرچ کرنا چاہیے اگر کسی جگہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا شرعاً جائز نہ ہو تو وہاں جان کی حفاظت شرعاً واجب ہے اور یہ دین کا کام ہے مگر چونکہ ان امور کا دین ہونا اکثر لوگوں پر مخفی ہے اس لئے میں نے تقریب الی الفہم (سمجھ کے قریب کرنے) کی غرض سے مقاصد میں حقیقیہ کی قید لگادی تھی ورنہ در حقیقت ہمارے سب مقاصد خواہ حقیقی ہوں یا غیر حقیقی سب کے سب اسلام کی طرف راجع ہیں سب کام کا مرجع اسلام ہی ہے۔ پس ہمارا سب کا ایک ہی مقصود ہے یعنی اسلام اور وہ مشتمل ہے تمام مقاصد حقیقیہ و غیر حقیقیہ کو اس میں نماز روزہ حج زکوٰۃ بھی آگئے اور کھانے پینے کے احکام متعلق آمدنی بھی آگئے اسی طرح تمام معاملات و معاشرت و سیاسیات بھی اس میں داخل ہیں گو لوگوں نے ان کو اسلام سے خارج سمجھ رکھا ہے۔ آج کل صرف چند عبادات کو اسلام میں داخل سمجھا جاتا ہے نماز روزہ ہی میں لوگوں نے دین کو منحصر کر لیا ہے بس اگر نماز پڑھ لیں تو دیندار ہیں اور اگر تہجد بھی پڑھنے لگیں تو جنید ہیں اور اگر زکوٰۃ بھی دینے لگیں پھر تو ان کی دینداری میں کچھ کسر ہی نہیں اور اگر حج بھی کر لیا تو گویا رجسٹری ہو گئی۔ گو معاملات کیسے ہی خراب اور گندے ہوں اگر معاملات و معاشرات کو بھی دین میں داخل سمجھا جاتا تو فقط نماز روزہ کر لینے سے ہم اپنے کو دیندار نہ سمجھتے کیونکہ ابھی بعض اجزاء دین کے ہم سے فوت ہو رہے ہیں مگر ہماری حالت یہ ہے کہ تہجد پڑھ لینے کے بعد اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں۔ نیز کسی قدر وضع کی درستی کو بھی دین میں داخل سمجھتے ہیں کہ

ثقہ وضع ہو چوغہ اور پاجامہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو لباس ریشمی نہ ہو ڈاڑھی منڈی ہوئی یا کتری ہوئی نہ ہو تشبہ بالکفار نہ ہو اگر ایسی وضع ہو گئی تو بس ان کی دینداری میں کچھ کسر نہیں رہی بڑے پکّے دیندار ہو گئے پھر دوسروں کو اگر ہماری وضع دیکھ کر دینداری کا گمان ہو تو کچھ تعجب نہیں مگر غضب تو یہ ہے کہ ہم خود بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ ہم کو معلوم ہے کہ معاملات وغیرہ میں ہماری کیا حالت ہے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (بلکہ انسان خود اپنی حالت پر مطلع ہے گو اپنے حیلے پیش لائے) انسان اپنی اصلی حالت کو خوب جانتا ہے گو وہ کیسے ہی بہانے بنائے وہ بہانے کیا ہیں، وہ بہانے یہ ہیں کہ بعض دفعہ انسان کو اپنی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ خوب جانتا ہے کہ میں بہت سے کام شریعت کے خلاف کرتا ہوں مگر اس کی وضع اور نماز روزہ کی وجہ سے لوگ اس کے معتقد ہیں تو اس سے وہ خود بھی دھوکہ میں آجاتا اور اپنے نفس کا معتقد ہو جاتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اتنے آدمی مجھے دیندار سمجھتے ہیں گویا میری دینداری پر اجماع ہو چکا ہے اور اتنے آدمیوں کا اجماع غلط نہیں ہو سکتا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اجماع کہاں ہوا ہے ابھی ایک مسلمان کا اختلاف باقی ہے اور وہ اختلاف ایسے شخص کا ہے جس کا اختلاف اس اجماع میں قادح ہے وہ مسلمان کون ہے وہ خود تم ہو۔ کیونکہ تمہارا دل تو جانتا ہے کہ تم دیندار نہیں ہو پھر یہ اجماع کیونکر حجت ہو سکتا ہے تم جانتے ہو کہ میں نے بلوغ کے بعد بہت سی نمازیں قضا کی ہیں جن کو ابھی تک ادا نہیں کیا نہ ادا کی فکر ہے۔ دوسروں کو اس حالت کا علم نہیں اس لئے وہ تم کو دیندار خیال کرتے ہیں مگر تم کو تو اپنی حالت معلوم ہے کہ میں ایک گناہ میں مبتلا ہوں نیز تم حج میں بلا وجہ تاخیر کر رہے ہو تمہارے ذمہ کسی کا قرض آتا ہے جس کو ٹال رہے ہو پھر تم اپنے کو دیندار کیونکر سمجھتے ہو۔ یہ ہے وہ بہانہ جو منجملہ دوسرے بہانوں کے اکثر لوگوں کو گمراہ کئے ہوئے ہے کہ وہ محض دوسروں کے اعتقاد کی بنا پر اپنے معتقد ہو رہے ہیں حالانکہ ہر ایک کو اپنی حقیقت معلوم ہے اور وہ جانتا ہے کہ مجھ میں بہت سی باتیں دینداری کے خلاف موجود ہیں۔ تو یہ دینداری کیا ہوئی نوتہ ہوا کہ تم اس کو دیندار سمجھتے ہو وہ تم کو دیندار سمجھتا ہے تم اس کو نوتہ دے رہے ہو وہ تم کو نوتہ دے رہا ہے یہ تو وہی حکایت ہوئی کہ گھر سے آیا ہے معتبر نائی ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ پردیس میں تھا اور بال بچے گھر پر تھے ایک دن اس کی بیوی نے غسل کیا تھا اس لئے نتھ اتار کر رکھدی تھی اس حالت میں گھر کی

نائن آئی اس نے جو دیکھا کہ بیوی جی کے ناک میں نتھ نہیں تو وہ یہ سمجھی کہ شاید یہ رانڈ ہوگئی ہے اس لئے نتھ اتار دی ہے وہ اُلٹے پاؤں اپنے گھر گئی اور نائی سے جاکر کہا کہ تو بے فکر کیا بیٹھا ہے جلدی سے جاکر اپنے ججمان کو اطلاع کردے کہ آپ کی بیوی رانڈ ہوگئی کیونکہ آج میں نے اس کو نتھ اتارے ہوئے بیٹھا دیکھا ہے اور اس حالت میں بیوہ ہی رہا کرتی ہے۔ وہ نائی بھی بیوی کی طرح بیوقوف تھا دوڑا اپنے آقا کے پاس پہونچا بہت دور جگہ تھی کئی دن میں راستہ طے ہوا۔ میاں نے پوچھا کہاں سے آرہا ہے، نائی نے کہا حضور کے گھر سے آرہا ہوں پوچھا ہمارے گھر خیریت تھی کہا حضور اور تو سب خیریت ہے مگر آپ کی بیوی بیوہ ہوگئی آقا صاحب دونوں سے بڑھ کر احمق تھے یہ سن کر لگے رونے اور اسی وقت غمی کا سامان ہونے لگا۔ دوست احباب کو جو اطلاع ہوئی تو یہ سمجھے کہ شاید گھر سے کوئی خبر ایسی ویسی آئی ہوگی تعزیت کے لئے مجتمع ہوگئے جب مجمع اکٹھا ہوگیا تو کسی نے دریافت کیا کہ گھر سے کوئی اطلاع آئی ہے۔ کہنے لگے کہ ہائے میری بیوی رانڈ ہوگئی، اب تو لوگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ خبر کیسی جب بیوی کا شوہر یہ صحیح سلامت ہے تو پھر وہ بیوہ کیونکر ہوئی دوستوں نے کہا میاں تم بڑے بے وقوف ہو جب تم صحیح سلامت بیٹھے ہو تو تمہاری بیوی رانڈ کہاں ہوگئی آپ فرماتے ہیں کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن گھر سے جو نائی خبر لایا ہے نہایت معتبر ہے اس لئے یہ خبر غلط نہیں ہوسکتی گو میں جانتا ہوں کہ میرے ہوتے ہوئے وہ بیوہ نہیں ہوسکتی اس حکایت پر تو سب ہنستے ہیں مگر صاحبو! اس حماقت میں ہم سب مبتلا ہیں کہ باوجودیکہ اپنی دینداری کی حالت ہم کو معلوم ہے لیکن محض دوسروں کے اعتقاد کی وجہ سے ہم اپنے معتقد ہو رہے ہیں۔ اس شخص نے جو باوجود اپنے زندہ ہونے کے اپنی بیوی کو بیوہ مان لیا اس میں کیا تاویل ہوسکتی ہے سوا اس کے کہ بیوہ کے معنے بدل دیئے جائیں کہ ایک قسم بیوہ کی وہ ہے جس کا شوہر مرجائے اور ایک قسم وہ ہے جو نتھ بالی اتار دے مگر یہ خاص تو ایجاد اصطلاح ہوگی، وَلَامُشَاحَۃَ فِی الْاِصْطِلَاحِ (اصطلاح مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں) سو ہم آپ کی اصطلاح میں مزاحمت نہیں کرتے ممکن ہے کہ آپ کے نزدیک دینداری کی بھی دو قسمیں ہوں ایک حقیقی دیندار دوسرے وہ جس کو لوگ دیندار سمجھیں اس نئی اصطلاح کے موافق آپ

دیندار کیا شیخ بھی بن سکتے ہیں مگر اس حالت میں آپ ویسے ہی شیخ ہوں گے جیسے سب کا گرو شیخ نجدی ہے یعنی شیطان۔ غرض ہماری حالت یہ ہے کہ ہم دین کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اس لئے محض نماز روزہ کرکے اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ معاملات و معاشرات وغیرہ بھی سب دین ہیں حتیٰ کہ پیشاب و پاخانہ کرنا اور ان سے فراغت کرنا بھی دین ہے گو ظاہر میں راحتِ نفس ہے مگر اُن کاموں میں اگر نیت درست رکھی جائے تو سب دین کے کام ہیں مثلاً پیشاب و پاخانہ اس نیت سے کرو کہ اس سے فارغ ہو کر طبیعت ہلکی ہو گی اور تندرستی قائم رہے گی تو نماز وغیرہ میں دل لگے گا اس نیت سے یہ کام بھی باعث ثواب ہوں گے حدیث میں ہے لَا یُصَلِّیَنَّ اَحَدُکُمْ وَھُوَ یُدَافِعُہُ الْاَخْبَثَانِ۔ یعنی ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو کہ تم کو بول و براز کا تقاضا ہو۔ اب دیکھئے اس وقت نماز پڑھنا حرام اور پیشاب و پاخانہ سے فراغت کرنا واجب ہے اور یہ شخص دنیا کے کام میں نہیں بلکہ دین کے کام میں ہے کیونکہ اس حالت میں یہ حکم شرعی کا امتثال کر رہا ہے۔ پس دین کی حقیقت امتثال امر ہے جس وقت جس کام کا شریعت امر کرے اس وقت وہی دین ہے فقط نماز روزہ ہی دین نہیں بلکہ نماز وغیرہ بھی اسی وقت تک دین کے کام ہیں جب کہ امر کے موافق ہوں اگر امتثال امر نہ ہو تو یہ بھی دین میں داخل نہیں۔ مثلاً نماز خلاف امر ہو جیسے طلوع یا غروب کے وقت پڑھی جائے تو بجائے ثواب کے گناہ ہوگا۔ روزہ کیسی اچھی عبادت ہے مگر خلاف امر ہو تو وہ بھی دین کا کام نہیں۔ مثلاً کوئی شخص عید کے دن روزہ رکھے اور تمام دن غیبت بھی نہ کرے ذکر شغل ہی میں مشغول رہے اور تمام آداب صیام کی رعایت کرے مگر شام کو یہ شخص مردود ہے کیونکہ اس دن روزہ رکھنا خلاف امر ہے۔ ایسے ہی کوئی شخص حج کرے مگر ذی الحجہ کی نویں تاریخ کے بجائے دسویں کو وقوف عرفہ کرے تو اس کا حج مردود ہے کیونکہ اس نے خلاف امر کیا۔ پس معلوم ہوا کہ دین کی حقیقت امتثال امر ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ میں یہی نکتہ بیان فرمایا تھا۔ کیونکہ ظاہر میں اس آیت پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے جن و انس کو عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے حالانکہ دوسری آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ

بھی تمام مخلوق عبادت میں مشغول ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ (کیا تم کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ کے سامنے سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی بھی) اس سے معلوم ہوا کہ پہاڑ اور درخت اور تمام جانور عبادت کرتے ہیں اور ان میں کوئی قید بھی نہیں لگائی اور انسان کے لئے كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ (بہت سے آدمی) کی قید بھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان تو سب کے سب عبادت نہیں کرتے اور درخت جانور وغیرہ کو بلا قید بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ سب کے سب عبادت میں مشغول ہیں تو وصف عبادت میں بظاہر دوسری مخلوق انسان وجن سے بڑھی ہوئی ہیں پھر بھی پہلی آیت میں عبادت کو انسان وجن کے لئے تخصیص کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ ان کو محض عبادت ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس اشکال کا جواب حضرت حاجی صاحب کی ایک تحقیق سے معلوم ہوا۔ حاجی صاحب نے بطور نکتہ کے فرمایا تھا کہ عبادت کا مادہ عبد ہے جس کے معنی ہیں غلام اور اس لفظ میں غایت ذلت کا اظہار ہے چنانچہ لغۃً عبادت کے یہی معنی ہیں اسی لئے عبادت کا درجہ حق تعالیٰ کے لئے خاص ہے غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں حق تعالیٰ کو عبادت بہت پسند ہے حتیٰ کہ تسمیہ میں بھی اس کی رعایت کو حدیث میں مستحب کیا گیا ہے حدیث میں ہے اَحَبُّ الْاَسْمَآءِ اِلَى اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ۔ حق تعالیٰ کو سب ناموں سے زیادہ محبوب عبداللہ وعبدالرحمٰن ہے جن کے لفظوں ہی سے بندگی اور غلامی کا اظہار ہے۔ عورتوں کو اگر شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے وہ نام نہ بتلائے جو حق تعالیٰ کو پسند ہوں تاکہ ہم بھی وہی نام رکھا کریں تو یاد رکھو کہ اس حدیث میں عورتوں کے لئے بھی نام موجود ہیں۔ عبد کا مؤنث امۃ ہے تو عورتوں کو امۃ اللہ و امۃ الرحمٰن نام رکھنا چاہیئے۔ اس کے معنی ہیں خدا کی بندی جیسے عبداللہ کے معنے ہیں خدا کا بندہ۔ اور ہر چند کہ حق تعالیٰ کے نام بہت ہیں مگر حدیث میں عبد کی اضافت اللہ اور رحمٰن کی طرف خصوصیت سے اس لئے کی گئی ہے کہ ان دو ناموں میں ایک خاص ترجیح ہے وہ یہ کہ اللہ اسم علم ہے باقی تمام نام اسمار

صفات میں سے رحمٰن کو یہ ترجیح ہے کہ اس میں مبالغہ زیادہ ہے اس لئے لغۃً رحمٰن کا اطلاق غیر خدا پر نہیں کیا جاتا تو گو حقیقت میں یہ بھی اسم صفت ہے مگر غلبۂ استعمال کی وجہ سے اسم علم کے مشابہ ہے باقی مسیلمہ کذاب کا اپنے کو رحمٰن سے موسوم کرنا یہ محض اس کی شرارت تھی ورنہ لغۃً اس لفظ کا خدا تعالیٰ کے ساتھ مختص ہونا اسے بھی معلوم تھا مگر جس طرح فرعون اپنے کو الٰہ کہتا تھا بہرحال ان دو ناموں کے اندر دوسرے ناموں سے ایک خاص وجہ ترجیح ہے لیکن اگر حق تعالیٰ کے دوسرے ناموں کی طرف عبد یا امۃ کو مضاف کر کے نام رکھا جائے تو وہ بھی نفس فضیلت میں انہی دونوں کے مثل ہوں گے (گو کسی قدر تفاوت سہی ۱۲) پس اگر نام رکھنے میں اس کی رعایت کی جایا کرے تو اچھا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ناموں کی طرف عبد یا امۃ کو مضاف کر کے نام رکھا جائے۔ مگر آجکل لوگ ان ناموں کو بہت کم اختیار کرتے ہیں دوسرے امور کی رعایت کو مقدم سمجھتے ہیں مثلاً قافیہ وغیرہ کی ایک صاحب کی عادت تھی کہ وہ اپنی اولاد کے نام اس وزن پر رکھتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ وغیرہ ایک ظریف نے کہا کہ اب کے بچہ پیدا ہو تو اس کا نام ناقۃ اللّٰہ بیت اللّٰہ رکھ دینا وہ بڑے بگڑے کہ یہ بھی کوئی نام ہے کہنے لگے صاحب قرآن میں موجود ہیں اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی اور عورتوں کی تو عجیب عادت ہے ان کے یہاں قافیہ وغیرہ کے علاوہ ناموں میں ایک اور بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ نام زبان پر چلنے والا ہو رواں ہو۔ وہ ایک نام کو مکرر سکرر چند مرتبہ کہکر دیکھتی ہیں کہ یہ نام رواں بھی ہے یا نہیں اگر ان کی زبان پر بے تکلف رواں ہوگیا تو اچھا ہے ورنہ بُرا۔ ہمارے وطن میں ایک بی بی ہیں ان کی لڑکیوں کے نام امۃ المُنّا کے قافیہ پر ہیں جب اس قافیہ کے بہت سے نام ہوگئے اور پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی تو مجھ سے کہا گیا کہ اس کا نام رکھو میں نے کہا کہ اس قافیہ پر صرف دو نام رہ گئے ہیں اور وہ دونوں عورتوں ہی کی صفت میں کہے گئے ہیں ایک وصف حضرت علیؓ نے بیان فرمایا ہے اور ایک حضرت فاطمہؓ نے۔ حضرت علیؓ نے عورتوں کو شیطان کہا ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے ریحان فرمایا ہے تو اب اس بچی کا نام ریحان رکھدو یا شیطان رکھدو۔ شیطان تو بھلا کون رکھتا اس کا نام ریحان ہی رکھا گیا اور واقعی لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے یہ نام بہت ہی موزوں ہے۔ مگر باوجود ان تمام خوبیوں کے ایک

ایک بڑی بی اس نام کو چند مرتبہ مکرر کہہ کر کیا فرماتی ہیں کہ یہ کیا نام رکھا ریراں ریراں میں نے کہا سبحان اللہ تم نے اس نام کی اچھی گت بنائی۔ اور یہ جو میں نے کہا تھا کہ یہ نام حضرت فاطمہ کے کلام میں ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ہنسی کے طور پر عورتوں کی مذمت میں ایک شعر حضرت فاطمہ کے سامنے پڑھا ؎

اِنَّ النِّسَآءَ شَیَاطِیْنُ خُلِقْنَ لَنَا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّ الشَّیَاطِیْنُ

(عورتیں شیاطین ہیں جو ہمارے لئے پیدا کی گئی ہیں ہم شیاطین کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں)

تو حضرت فاطمہؓ نے اس کے جواب میں فرمایا ؎

اِنَّ النِّسَاءَ رِیَاحِیْنُ خُلِقْنَ لَکُمْ وَکُلُّکُمْ یَشْتَہِیْ شَمَّ الرِّیَاحِیْنُ

(عورتیں پھول ہیں جو تمہارے لئے پیدا کی گئی ہیں، ہر ایک تم سے پھول سونگھنے کی خواہش رکھتا ہے)

عورتوں میں ناموں کے متعلق ایک اور بات دیکھی جاتی ہے کہ یہ نام کچا ہے یا پکا۔ جیسے ترکاریاں بعضی کچی بعضی پکی ہوتی ہیں ایسے ہی عورتوں کے یہاں ناموں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ نہ معلوم ناموں کا کچا پکا ہونا انہیں کیسے معلوم ہوتا ہے یہ عورتوں کے خاص علوم ہیں جو مردوں کو بھی معلوم نہیں چنانچہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن کی نسبت کہا کرتی ہیں کہ یہ پکا پکا نام ہے جیسے بڈھوں کا نام ہوتا ہے تو پکا نام ان کے نزدیک وہ ہے جو بوڑھاپے کے مناسب ہو۔ اور کچا نام وہ ہے جو بچپن کے مناسب ہو باقی اس کی پہچان کہ کونسا نام بچپن میں پھبتا ہے اور کونسا بڑھاپے میں یہ عورتوں ہی کو حاصل ہے صاحب مردوں کی فہم اس سے قاصر ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اچھا ہم نے مانا کہ عبداللہ نام پکا ہے تو عورتوں کو پھر بھی یہ نام اپنی اولاد کا ضرور رکھنا چاہئے کیونکہ اس میں فال نیک ہے کہ بچہ بڈھا ہوگا۔ پس یہ تو اور وجہ اولویت ہوگئی نہ کہ وجہ انکار۔ کیونکہ عورتیں تو ایسے فال شگون کی بہت معتقد ہوتی ہیں تو وہ اس نام کو فال نیک ہی سمجھ کر اختیار کر لیا کریں۔ خیر یہ گفتگو تو بیچ میں ناموں کے متعلق بطور جملہ معترضہ کے آگئی تھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ عبادت کا مادہ عبد ہے جس سے معلوم ہوا کہ انسان عبدیت کے لئے پیدا ہوا ہے اور عبدیت خدا کو پسند ہے جس کی دلیل میں نے ابھی بیان کی ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی اطاعت کس قسم کی ہے سو انسان کی اطاعت اور دوسری مخلوقات کی اطاعت میں بڑا فرق ہے

اس کو پہلے اپنے خادموں کے اندر دیکھ لو، ہمارے یہاں دو قسم کے خادم ہوتے ہیں ایک تو نوکر ہوتا ہے اور ایک غلام۔ نوکر کی خدمات اکثر متعین ہوا کرتی ہیں گو اس سے مختلف قسم کے کام لئے جائیں مگر پھر بھی باوجود عموم کے اس میں کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں مثلاً جو نوکر آپ کی ڈیوڑھی کا ملازم ہے آپ اس سے گھر کے کام جتنے چاہیں لیلیں مگر اس سے پاخانہ نہیں اٹھوا سکتے وہ اس کام سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ اس کی خدمتیں متعین ہیں جن میں یہ خدمت داخل نہیں اس کو اس سے انکار کا حق ہے اور غلام کی خدمتیں معین نہیں ہوتیں اس سے ہر قسم کا ذلیل و خسیس اور نفیس و شریف جائز کام لیا جا سکتا ہے اس کو کسی خدمت سے انکار کا حق نہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آقا کو کسی مجلس یا محفل میں جانا ہے مگر خود کسی وجہ سے نہیں جا سکتا تو سلاطین و امراء کے قصص سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسے مواقع میں اپنے غلام کو اپنا لباس پہنا کر بھیجدیا۔ اس وقت وہ غلام شاہی منصب کے

عہ یہاں سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیئے جو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض کرتے ہیں بھلا جس غلامی کے یہ آثار ہوں کہ آقا اور غلام میں کامل اتحاد پیدا ہو جاوے اس کو خلاف عدل کون کہہ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب دشمن کی فوج کے ہزاروں لاکھوں آدمی معرکہ قتال میں اسیر و قید ہو کر آئیں تو ان کے متعلق بہتر سلوک کی صورت کیا ہے۔ اگر ان کو فوراً رہا کر دیا جائے تو یہ صورت جس قدر ضرر رساں ہے ظاہر ہے کہ جس دشمن کی کثیر تعداد کو مصیبت کے ساتھ گرفتار کیا تھا اس کو پھر اپنے مقابلہ کے لئے رہا کر دیا اور اگر ان کو قید کیا جاوے تو اس میں جو قباحت ہے ظاہر ہے۔ قیدی کو قیدی رکھ کر خواہ کتنی ہی راحت دی جائے اس کے دل سے عداوت نہیں نکل سکتی۔ دوسرے قیدیوں پر جتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اس کا اندازہ ہر سلطنت کر سکتی ہے تو دشمنوں کے اوپر اتنی کثیر رقم صرف کرنا جس سے نتیجہ کچھ بھی حاصل نہیں کیونکہ وہ دشمن کے دشمن ہی رہتے ہیں محض حماقت ہے پھر قید کے اندر اسیروں کو ہر قسم کی علمی اور تمدنی ترقی سے روکنا ظاہر ہے کہ قید میں رہ کر کوئی شخص علمی ترقی نہیں کر سکتا اس کی تمام قوائے فکریہ معطل پڑی رہتی ہیں اس لئے اسیروں کو قید رکھنا بھی کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر ضرر سے بچنے کے لئے سب کو تہ تیغ کیا جاوے تو اس کا قبیح ہونا ہر شخص کو معلوم ہے ان سب باتوں پر نظر کر کے بتلایا جاوے کہ قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کی صورت کیا ہے ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کے متعلق جو طریقہ اسلام نے بتلایا ہے اس سے بہتر کوئی مذہب نہیں بتلا سکتا اسلام کا حکم ہے کہ جتنے قیدی معرکۂ جنگ میں گرفتار ہوں اول تو ان سے اپنے قیدیوں کا

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

فرائض انجام دیتا تھا کیونکہ اس وقت وہ بادشاہ کا نائب بنا ہوا ہے اور کبھی آقا بیمار ہے غلام اس کی تیمارداری کرتا اور بعض دفعہ اس کا پاخانہ تک اٹھاتا ہے غرض غلام کے لئے کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مبادلہ کیا جاوے جو فریق مخالف کے ہاتھوں میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد جو بچیں ان کو غنائم میں تقسیم کر دیا جائے کہ وہ ان کو اپنا غلام بنا کر اپنے گھر میں رکھیں جو خود کھاویں وہی انکو کھلادیں جو خود پہنیں وہی ان کو پہناویں طاقت سے زیادہ ان سے کوئی کام نہ لیں اور ان کے دین و دنیا کے درست کرنے کا خیال رکھیں۔ جب آقا غلام کو اپنے گھر میں اولاد کی طرح رکھے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلی عداوت اس کے دل سے نکل جائے گی اور وہ آقا کے گھر کو اپنا گھر سمجھے گا اس کی اولاد کو اپنے بھائی خیال کرے گا اس طریقہ پر خزانہ سلطنت اسیروں کے بیشمار مصارف سے محفوظ رہتا ہے اور ایک ایک آدمی پر ایک ایک غلام تقسیم ہو جانے سے اس پر بھی کوئی بار نہیں پڑتا بلکہ وہ غلام کے کھانے کپڑے کو اس کی خدمت کے معاوضہ میں خوشی سے قبول کر لیتا ہے۔ مسلمان غلاموں کو علم و حرفت سے بھی محروم نہیں رکھ سکتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جاہل غلام سے مہذب اور شائستہ غلام کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے مسلمانوں نے عموماً غلاموں کی تعلیم کا بہت زیادہ انتظام کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج علماء کی فہرست میں صدہا اور ہزارہا آزاد شدہ غلاموں کا نام نہایت عزت و احترام سے لکھا ہوا نظر آرہا ہے۔ پھر چونکہ آقا کو غلام کے ساتھ ایک تعلق مالکانہ ایسا دیا گیا ہے جو انسان کو اپنی اولاد کے ساتھ بھی حاصل نہیں اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غلاموں کے ساتھ آقاؤں کو اولاد سے زیادہ تعلق ہو گیا کہ جس طرح کسی شخص کے بیٹے کو گالی دینا اور مارنا باپ کی اہانت شمار ہوتا ہے اسی طرح کسی کے غلام کو ذلیل و حقیر کرنا آقا کو ذلیل کرنا سمجھا جانے لگا۔ جو مسلمان احکام اسلام کے پابند تھے ان کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں کہ وہ غلاموں کو کس محبت اور شفقت کے ساتھ پالتے تھے اور ان کی تعلیم و تہذیب کا کس درجہ خیال کرتے تھے تو کیا اس غلامی کو خلاف عدل و انصاف کہنا انصاف کا خون کرنا نہیں ہے۔ رہا یہ کہ بعض لوگوں نے غلاموں کے ساتھ برے برتاؤ بھی کئے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ برتاؤ ایسا ہی تھا جیسا کہ بعض مسلمان نماز نہیں پڑھتے اور شراب پیتے ہیں اس کے ذمہ دار یہ لوگ خود ہیں قانون اسلام اس کا کسی طرح ذمہ دار نہیں اسلام نے غلاموں کے متعلق جس قدر رعایتی احکام صادر کئے ہیں کوئی قوم اس کی نظیر نہیں دکھا سکتی کہ دشمن کی فوج کے قیدیوں کے ساتھ اس نے اتنے حقوق کی رعایت کی ہو۔ واللہ اعلم ۱۲ جامع

خاص خدمت متعین تھیں یہی حالت انسان و دیگر انواع خلق کی ہے کہ تمام مخلوق کے متعلق خاص خاص عبادات ہیں مگر انسان کے لئے کوئی عبادت خاص نہیں (انسان سے مراد مجموعۂ انس و جن ہے یعنی مکلفین ۱۲ منہ) مثلاً ملائکہ میں بعض کے لئے عبادت رکوع معین ہے وہ رکوع ہی میں رہتے ہیں، بعض کے لئے عبادت سجود متعین ہے وہ ہر وقت سجدہ ہی میں رہتے ہیں اور وہ ایک حال پر رہنے سے تھکتے نہیں کیونکہ وہ نور سے بنے ہیں اور نور میں یہ خاصیت ہے کہ اس میں تعب و نصب نہیں ہوتا حق تعالیٰ فرماتے ہیں یُسَبِّحُوْنَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ (رات دن پاکی بیان کرتے ہیں اس سے تھکتے نہیں) اسی طرح آسمان زمین وغیرہ کے لئے ایک ایک عبادت متعین ہے۔ چنانچہ ان کی ایک عبادت تو محسوس ہے وہ یہ کہ جس کام کے لئے جو چیز بنائی گئی ہے اس کام میں آتی رہے جیسے پہاڑ جس کام کے لئے بنائے گئے ہیں اس کام میں لگے ہوئے ہیں زمین اپنے کام میں لگی ہوئی ہے آسمان چاند سورج سب ایک ایک کام میں لگے ہوئے ہیں یہ ان کی عبادت ہے چنانچہ آیت فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ ہ کی تفسیر میں یہی کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے آسمان و زمین سے فرمایا کہ تم (جس کام کے لئے بنائے گئے ہو اس کے انجام دینے کے لئے) آؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے انھوں نے جواب دیا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ غرض ان مخلوقات کا ان کاموں میں مستعمل ہوتے رہنا جن کے لئے یہ بنائے گئے ہیں ایک عبادت ہے یہ عبادت تو محسوس ہے اور ایک عبادت غیر محسوس ہے جیسے حق تعالیٰ نے ہر مخلوق کو ایک تسبیح جداگانہ تعلیم کر دی ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ پاکی نہ بیان کرتی ہو لیکن اس کی تسبیح تم نہیں سمجھتے) گو اس میں مفسرین کا اختلاف ہے بعض نے تسبیح حالی مراد لی ہے کہ ہر چیز اپنی حالت سے حق تعالیٰ کی قدرت و نزاہت کو ظاہر کرتی ہے اور بعض نے تسبیح حقیقی مراد لی ہے کہ اہل کشف کا یہی قول ہے وہ جمادات کی تسبیح کو سنتے ہیں اس لئے وہ اس کو حقیقت پر محمول کرتے ہیں۔ میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ حق تعالیٰ نے بعض ملائکہ کو یہ تسبیح تعلیم کی ہے سُبْحَانَ الَّذِیْ جَمَعَ بَیْنَ الثَّلْجِ وَالنَّارِ (پاک ہے اللہ جس نے برف و آگ کو جمع کر دیا ہے) ان فرشتوں کا آدھا جسم برف کا ہے اور آدھا جسم آگ کا ہے نہ برف آگ کی گرمی کو کم کرتا ہے نہ آگ برف کو پگھلاتی ہے اس لئے اُن کو یہ تسبیح تعلیم کی گئی ہے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے برف اور آگ کو

جمع کردیا۔ ملائکہ کی ایک جماعت کو تسبیح تعلیم کی گئی ہے سُبْحَانَ الَّذِیْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰی وَالنِّسَآءَ بِالذَّوَائِبِ پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھی سے زینت دی اور عورتوں کو زلفوں سے۔ اس پر شاید بعض لوگ خفا ہوں گے کہ یہ فرشتے تو روزہ ہماری برائی کہتے ہیں ہم کو مردوں میں بھی شمار نہیں کرتے ہیں۔ بھائی جب تم خود ہی اپنی مردانگی کی علامت کا صفایا کردو تو کوئی کیا کرے غرض اسی طرح تمام مخلوق کا ذکر متعین ہے ان کے سپرد ایک خاص عبادت ہے اور انسان کی عبادت و خدمت متعین نہیں ایک وقت میں نماز کا حکم ہے ایک وقت میں نماز سے ممانعت ہے اور پاخانہ جانے کا حکم ہے جس وقت کسی کو پاخانہ پیشاب کا تقاضا ہو اس وقت اگر کو نماز پڑھنا مکروہ ہے، پاخانہ جانا ضروری ہے اس وقت اس کا پاخانہ جانا بھی عبادت میں داخل ہے اس کو اس کام میں بھی نماز ہی کا ثواب ملے گا اور اگر اس وقت وہ نماز میں مشغول ہوا تو گناہ ہوگا غرض کبھی اس کی نماز قضاء حاجت کے حکم میں ہے اور کبھی قضاء حاجت نماز کے حکم میں ہے اسی طرح کبھی اس کو سونے کا حکم ہے کبھی جاگنے کا حکم ہے۔ حدیث میں ہے کہ تمام رات مت جاگو اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا فَاٰتِ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ (تیرے نفس کا تجھ پر حق اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے پس ہر صاحب حق کے حق کو ادا کرو) تو دیکھئے ایک مخصوص حصۂ شب میں سونا مامور بہ ہوا اور وہ مخصوص حصہ ہر شخص کے مزاج کے مناسب ہوگا جتنی دیر میں دماغ و جسم کا تعب زائل ہو جایا کرے۔ نیز اگر کسی شخص کو ذکر کرتے کرتے یا تہجد کی نماز پڑھتے ہوئے نیند کا غلبہ ہونے لگا تو اس کے لئے حدیث میں وارد ہے لِيَرْقُدْ یعنے سو رہے۔ لَعَلَّهٗ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهٗ مبادا کہیں استغفار کرتے ہوئے اپنے آپ کو برا بھلا ہی کہنے لگے مثلاً اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ (اے اللہ مجھ کو بخش دے) کی جگہ اَللّٰهُمَّ اعْفِرْلِيْ عین سے کہنے لگے تو اس کے معنی برے ہیں جس میں اپنے اوپر بد دعا ہے کہ مجھے مٹی میں ملادے اور یہاں تک بھی غنیمت ہے بعض دفعہ نیند میں حق تعالیٰ کا نام غلط سلط نکلنے لگتا ہے اس لئے میں مشورہ دیتا ہوں کہ ذکر میں جب نیند آنے لگے تو زبان سے ذکر فوراً بند کردو اس وقت قلب سے توجہ اور خیال رکھو اور کوئی شخص ذکر قلبی کو بے اصل سمجھ کر اس سے متوحش نہ ہو

یہ بھی احادیث سے ثابت ہے صحیحین کی متفق علیہ روایت ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اِحْیَانِہٖ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر وقت میں ذکر اللہ کرتے رہتے تھے) اب بتائیے کہ ذکر ہر وقت میں زبان سے کیونکر ہو سکتا ہے بعض مواقع میں ذکر لسانی نہیں ہو سکتا اب یا تو علی کل احیانہ میں مجاز کے قائل ہوجیئے کہ اس کے معنے فی اکثر احیانہ ہیں یا صوفیہ کے مذہب پر ذکر قلبی کے قائل ہو کر اس کو اپنے عموم پر رکھیے اور یہی ظاہر ہے بلکہ صوفیہ کے نزدیک تو اصل ذکر قلبی ہی ہے یعنی اگر ذکر لسانی ذکر قلبی سے خالی ہو تو وہ اس کو معتبر نہیں سمجھتے (مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذکر لسانی میں اگر حضور قلب نہ ہو تو ذکر نہ کرے چھوڑ بیٹھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ محض لسانی کو کافی سمجھ کر اس پر قناعت نہ کرے بلکہ ذکر قلبی کے لئے کوشش کرتا رہے اور وہ کوشش یہی ہے کہ لسانی پر دوام کرے اور اس کی ساتھ دل کو متوجہ کرنے کی بھی عادت ڈالے اسی طرح ذکر قلبی حاصل ہو جائے گا۔ مولانا فرماتے ہیں

از صفت واز نام چہ زاید خیال ۔۔۔ واں خیالش ہست دلال وصال

(صفت اور اسم سے تصور اور خیال پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ تصور رہبر وصال بن جاتا ہے)
ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

مست ولایعقل نہ از جام ہو ۔۔۔ اے زہو قانع شدہ برنام ہو

(تم جام محبت سے مست ولایعقل نہیں ہو تم صرف نام حق پر بجائے محبت کے قناعت کئے ہوئے ہو) اس میں نام پر قناعت کرنے سے منع فرماتے ہیں ذکر اسمی سے مطلقاً منع نہیں فرماتے کیونکہ یہی تو زینہ ہے ذکر قلبی کا اور وصول الی الذّات (ذات تک پہونچانے) کا ۱۲ جامع) اور اس حدیث سے زیادہ صریح دوسری حدیث ہے مَنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ نَفْسِہٖ ذَکَرْتُہٗ فِیْ نَفْسِیْ وَمَنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ مَلَاٍ ذَکَرْتُہٗ فِیْ مَلَاٍ خَیْرٍ مِّنْہُ اَلْحَدِیْث ۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو کوئی مجھکو اپنے دل میں یاد کرے میں بھی اس کو اپنی ذات سے یاد کرتا ہوں اور جو کوئی مجھکو جماعت میں یاد کرے میں اس کو اس کی جماعت سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں اس میں تو ذکر نفسی کو ذکر جماعت کے مقابلہ میں بیان فرمایا ہے جس میں ذکر قلبی کے سوا بظاہر اور کچھ مراد نہیں گو یہ احتمال ہے کہ مقابلہ جماعت میں ذکر ہونے سے ذکر خلوت مراد ہو باللسان مگر ایک

اور حدیث حاشیہ حصن حصین میں نقل کی ہے یَفْضُلُ الذِّکْرُ الْخَفِیُّ الَّذِیْ لَا یَسْمَعُہُ الْحَفَظَۃُ سَبْعُوْنَ ضِعْفًا۔ اھ (ص ۲۷) (ذکر خفی جس کو نگہبان فرشتے بھی نہ سنتے ہوں ذکر جلی سے ستر گنا فضیلت رکھتا ہے) اس سے ذکر خفی کا ذکر جلی سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے قُلْتُ وَلٰکِنِّیْ لَمْ اَعْرِفْ سَنَدَہٗ نَعَمْ لَہٗ شَاھِدٌ قَوِیٌّ مِنْ حَدِیْثِ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ عَنْہُ مَرْفُوْعًا قَالَ خَیْرُ الذِّکْرِ الْخَفِیِّ وَخَیْرُ الرِّزْقِ اَوِ الْعَیْشِ مَا یَکْفِیْ رَوَاہُ اَبُوْ عَوَانَۃَ وَابْنُ حَبَّانَ فِیْ صَحِیْحَیْھِمَا کَذَا فِی التَّرْغِیْبِ ص ۵۰۰ حاشیۃ المشکوٰۃ) میں کہتا ہوں اس کی سند مجھے معلوم نہیں ہاں اس کے لئے شاہد قوی ہے حدیث سعد ابن وقاص سے جو مرفوعاً ان سے مروی ہے انھوں نے بیان کیا ذکر خفی بہتر ہے رزق یا عیش سے اس قدر بہتر ہے جو کافی ہو اس کو ابو عوانہ وابن حبان نے اپنی صحیحین میں روایت کیا ہے)

بہرحال یہ تو محض ان لوگوں کی تسلی کے لئے کہا گیا جو بدون حدیث کے کسی بات کا ثبوت نہیں مانتے ورنہ اصل حکم تو یہ تھا کہ جب نیند آوے سو رہو اور اس وقت ذکر کو بند کر دو لیکن میں نے ان لوگوں کے لئے جو ذکر کا بند کرنا ایسے حال میں گوارا نہیں کرتے یہ بتلا دیا کہ وہ ذکر قلبی کیا کریں۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت ذکر میں نیند بہت آتی ہے اس کا کیا علاج آپ نے فرمایا اس کا علاج یہی ہے کہ بس تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہو۔ واقعی مشائخ محققین کی عجیب شان ہوتی ہے مگر محققین سے میری مراد وہ علماء نہیں ہیں جن کے صرف عقائد صحیح ہوں ان کو تو اہل حق اور محقق کہنا چاہیے۔ تو جب مشائخ اہل حق بولا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ دکاندار نہیں بدعتی نہیں ہیں پیری مریدی کو پیشہ نہیں بناتے بس اہل حق اور محقق تو دکانداروں اور بدعتیوں کے مقابلہ میں ہوتے ہیں مگر حق ہونے کے لئے صرف محق ہونا کافی نہیں اور یہ ضرور نہیں کہ ہر محق محقق ہو اس کی تفصیل یوں سمجھئے کہ محق ہونا تو ایسا ہے جیسے تندرست ہونا اور محقق ہونا ایسا ہے جیسے طبیب ہونا تو ظاہر ہے کہ ہر تندرست طبیب نہیں ہوتا اور نہ طبیب بننے کے لئے صرف تندرست ہونا کافی ہے پس مشائخ محققین وہ ہیں جو عقائد صحیح کے ساتھ امراض نفس و معالجات نفس سے بھی ماہر ہوں چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

محقق ہونے کے ساتھ محقق بھی تھے تو انھوں نے ذکر میں نیند آنے کا اچھا علاج بتلایا کہ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہو پھر جب کچھ نیند سے بوجھ ہلکا ہو جاوے پھر کام شروع کر دو واقعی اس کا بس یہی علاج ہے اگر کوئی غیر محقق ہوتا تو نہ معلوم کیا کیا بتلاتا چنانچہ بعض لوگ بتلایا کرتے ہیں کہ جب نیند کا غلبہ ہو سیاہ مرچیں چبایا کرو میں کہتا ہوں آخر کہاں تک۔ اگر پھر نیند آئی تو پھر مرچیں چبائے تو بھلا کتنے سیر مرچیں چبائے علاوہ اس میں اس نقصان کے کہ منہ سے بہت زیادہ پانی کا بہنا دماغ کے ضعف کا سبب ہوگا۔ نیز زیادہ مرچیں چبالے حرارت قلب کا اندیشہ ہے۔ ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ جس کام کے لئے یہ شخص جاگنے کی تدبیریں کر رہا ہے اس مرچ کے مشغلہ میں وہ کام بھی نہ ہوگا کیونکہ تجربہ کر کے دیکھ لیا جاوے کہ غلبۂ نیند میں اگر مرچ چباتے رہو اس وقت تو نیند کم ہو جاتی ہے مگر جہاں تھوڑی دیر اس کو موقوف کیا پھر نیند آنا شروع ہوئی تو یہ اچھا جان کو پاپ لگا۔ اور اگر کہیں سیاہ مرچوں سے حرارت بڑھ گئی دماغ خشک ہو گیا تو وہی بات ہو جائے گی جیسا انبہٹہ کے ایک بھولے مولوی صاحب ہر وعظ میں مسلمانوں کی عملی کوتاہیاں بیان فرما کر کہا کرتے تھے کہ یہ سب فساد مرچوں کا ہے ان کے نزدیک دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے زنا، چوری، جھوٹ، فریب، ترک صوم وصلوٰۃ یہ سب مرچوں کا فساد ہے خیر ان امور میں تو مرچوں کے فساد کو دخل ہو یا نہ ہو لیکن اگر کسی ذاکر کا دماغ سیاہ مرچیں چبانے سے خراب ہو گیا تو وہاں ضرور یہی کہا جائے گا کہ یہ سب مرچوں کا فساد ہے۔ بعض لوگ نیند دور کرنے کے لئے لونگیں چبانا بتلاتے ہیں یہ تو سخت آگ ہے اس کی تو تھوڑی مقدار بھی جگر و قلب کو پھونک دے گی پھر بہت جلد اختلاج وغیرہ کا اندیشہ ہے جس کے بعد پھر ساری عمر وظیفہ کو تو خیر باد کہو ہی گے نماز روزہ بھی چھوٹ جائے گا۔ تو یہ اچھی حفاظت ہے وظیفہ کی کہ نماز روزہ کو بھی برباد کیا یہ سب طریقے واہیات ہیں، بس اس کا آسان علاج وہی ہے جو مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہو شیخ کو معرفت کے ساتھ کسی قدر طبیب بھی ہونا چاہیئے تاکہ ہر شخص کی قوت وضعف کے لحاظ سے عمل تعلیم کرے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ضیاء القلوب میں لکھا ہے کہ ذاکر کو دودھ گھی کی تکثیر چاہیئے تاکہ ذکر جہر سے دماغ خشک نہ ہو جائے یہ کام تو ساری عمر کا ہے ایک دو روز کا کام تھوڑا ہی ہے کہ آج کیا اور کل چھوڑ دیا اس لئے دماغ کی

حفاظت بہت ضروری ہے۔ بعض لوگ ذکر کے ساتھ تقلیل غذا کو ضروری سمجھتے ہیں یاد رکھو یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے ہر شخص کا مزاج اس میں مختلف ہے تقلیل غذا سے کسی کو نفع ہوتا ہے اور کسی کو ضرر ہوتا ہے اور آجکل بوجہ ضعف قوی کے ضرر ہی زیادہ ہوتا ہے بس اس زمانہ میں تقلیل غذا کا مفید درجہ یہ ہے کہ قدرے بھوک رکھ کر کھانا کھایا جاوے یعنی دسترخوان سے ایسے وقت میں اٹھو کہ دو چار لقمہ کی بھوک باقی ہو۔ زیادہ تقلیل سے قوے دماغیہ وغیرہ پر بُرا اثر ہوتا ہے تو بھائی تم کو ذکر کرنا ہے یا نفس کو ہلاک کرنا۔ بزرگوں نے جو نفس کشی بتلائی ہے اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اس کو بھوکا مارو ان کا مطلب یہ ہے کہ اس کو تواضع کی ضرب سے ہلاک کرو اس میں ذلت پیدا کرو۔ تکبر کو توڑو اور یہ بات پیدا ہوتی ہے کسی کی جوتیاں سیدھی کرنے سے۔ تقلیل غذا سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس سے تو اور تکبر بڑھتا ہے کیونکہ یہ شخص اپنے کو صاحب مجاہدہ سمجھنے لگتا ہے اور جو لوگ پیٹ بھر کے کھانا کھاتے ہیں ان کو حقیر اور اپنے سے کم سمجھتا ہے وہی حال ہو جاتا ہے ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ سے شوی (جب فاقہ سے ہوتا ہے تو کتے کی طرح ہوتا ہے)

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان کی کوئی خدمت متعین نہیں بلکہ ہر وقت میں اس کے لئے جدا خدمت ہے جیسے غلام ہوتے ہیں ایک وقت اس کو سونیکا حکم ہے اس وقت سونا اس کی عبادت ہے ایک وقت جاگنے کا حکم ہے اس وقت جاگنا اس کی عبادت ہے ایک وقت پیشاب پاخانہ کا حکم ہے اس وقت یہی اس کی عبادت ہے پس اس کی عبادت کی حقیقت کیا ہے "محض امتثال امر" کہ جس وقت جو حکم ہو اس کو بجالائے اور اس سے ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کی ہمارے حال پر کس قدر شفقت و عنایت ہے کہ اول تو ہم سے غلاموں کا سا برتاؤ فرمایا لوکروں جیسا برتاؤ نہیں کیا۔ اور یہ کتنا بڑا فخر ہے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنا غلام بنالیں ؎ منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی ؛ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت ۔

(احسان مت جتاؤ کہ میں بادشاہ کی خدمت کرتا ہوں بلکہ اس کا احسان سمجھو کہ تم جیسے کو اپنی خدمت میں رکھ چھوڑا ہے)۔ پھر اس برتاؤ میں ہمارا نفع کس قدر ہے کہ ہم کو سونے اور جاگنے اور قضائے حاجت کرنے اور بیوی کے پاس جانے میں بھی ثواب ملتا ہے، قدم قدم پر ثواب ہی ثواب ہے کیونکہ معاشرت کو بھی دین ہی میں داخل فرمایا ہے گو بعض لوگ اسکو دین سے خارج سمجھتے ہیں۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

مگر بالکل غلط ہے حق تعالیٰ نے قرآن میں آداب مجلس اور احکام استیذان کو امرونہی کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور کسی شے کا مامور بہ ومنہی عنہ ہونا یہی دین ہونے کی علامت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا۔ اے مسلمانو! جب تم سے یہ کہا جاوے کہ کھل کر بیٹھ جاؤ تو کھل جایا کرو حق تعالیٰ بھی تمہارے لئے (جنت وغیرہ میں) وسعت کردیں گے اور جب یہ کہا جاوے کہ کھڑے ہوجاؤ تو کھڑے ہوجایا کرو۔ تو دیکھئے اس آیت میں آداب مجلس کی تعلیم دی گئی ہے اور ہر چند کہ جو تعلیم اس میں دی گئی ہے وہ امر فطری ہے کہ ضرورت کے وقت کھل کر یا کھڑے ہوکر پھر سمٹ کر بیٹھنا طبیعت انسانی کا خود تقاضا ہے مگر حق تعالیٰ نے اس کا امر اس لئے فرمایا کہ بعض لوگ ایسے متکبر اینٹھ مروڑ والے ہوتے ہیں کہ اُن سے کسی کے واسطے ہیئت بدلنا دشوار ہوتا ہے۔ میرا خود واقعہ ہے کہ میں نے ایک صاحب سے صف بندی کے وقت کہا کہ بھائی داہنی طرف آجاؤ وہ نہ آئے میں نے دوسرے شخص سے کہا بھائی ان کی تو شان گھٹتی ہے تم ہی آجاؤ تو ان کو اس قدر ناگوار ہوا کہ صف سے نکل مسجد سے بھی بھاگ گئے۔ واقعی ایسے بددماغوں میں غرور وتکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے چنانچہ اسی واسطے یہ لوگ جماعت میں بھی کم شریک ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسجد میں جُلاہے دھنے ہر قسم کے آدمی ہوتے ہیں اور وہ ہمارے دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں تو ہم کیسے آویں ارے ظالمو! خدا کے دربار میں بھی آکر تمہارا تکبر ڈھیلا نہیں ہوتا تم وہاں بھی اپنی شان کو محفوظ رکھنا چاہتے ہو اچھا پھر یہی ہے تو پھر تم جُلاہوں دھنوں کی جنت میں بھی نہ جانا کیونکہ جنت میں یہ لوگ بھی ہوں گے بلکہ تم سے زیادہ ہوں گے کیونکہ جنت کے اعمال وخصال غربا میں زیادہ ہوتے ہیں اور غالباً درجات میں بھی تم سے عالی ہوں تو وہاں تم کو یہ کیسے گوارا ہوگا کہ جنت میں جلاہوں کے ساتھ رہو اور ساتھ رہنا بھی اُن سے کم درجہ ہوکر چاہیئے تو یہ کہ جب تم کو فرشتے جنت میں لیجانے لگیں تو صاف کہدینا کہ ہم جلاہوں کے ساتھ نہیں رہتے ہم تو فرعون وشدّاد ونمرود کے ساتھ رہیں گے جیسے سودا کا اور اس کی بیوی کا قصہ ہے

سودا تو ایک رند مشرب شاعر تھا مگر اس کی بیوی نیک نماز روزہ کی پابند تھی ایک دن سودا کو مسخرہ پن سوجھا تو آپ بیوی سے کہنے لگے تو جو نماز پڑھتی ہے اس سے کیا نفع آخر اتنے دن تجھے نماز پڑھتے ہوئے ہوگئے تجھے کیا ملا اس نے کہا ہمیں آخرت میں جنت ملے گی ہم نماز کی بدولت جنت میں جائیں گے۔ تو سودا کیا کہتا ہے جا باولی! تو وہاں بھی ان جلاہوں اور ملانوں اور کنجڑوں ہی کے ساتھ رہے گی (کیونکہ جنت میں غرباہی زیادہ ہوں گے) اور دیکھو ہم قیامت کے دن جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے بادشاہ ہوں گے فرعون، نمرود، شداد، قارون ہامان وغیرہ۔ بڑا ہی مسخرہ تھا اُس کو یہاں بھی تمسخر سوجھا۔ مگر جہاں بعض امراء ایسے اینٹھ مروڑ کے ہوتے ہیں وہاں بعض بیچارے متواضع اور مسکین طبع بھی ہوتے ہیں۔ ایک دیندار نواب صاحب والی ملک کی حکایت ہے کہ ایک غریب آدمی نماز میں اُن کے دوش بدوش کھڑا ہوگیا تھا وہ غریب اُن سے بالکل مل کر نہیں کھڑا ہوا جیسا کہ نماز میں حکم ہے صرف اسی خوف سے کبھی یہ بُرا مانیں وہ بچ بچ کر کھڑا ہوتا تھا اور سلام کی ساتھ ہی فوراً بھاگتا۔ نواب صاحب نے اس کو طلب کیا وہ بہت ڈرا کہ کہیں کپڑا وغیرہ لگ گیا ہے اس کی باز پرس ہو گی مگر لوگوں نے سمجھا دیا کہ تو ڈرتا مت اور دین کے خلاف بات مت کہنا۔ جب حاضر ہوا تو نواب صاحب نے پوچھا تم ہم سے بچ بچ کر کھڑے ہوتے تھے کیا ہم سے ڈرتے تھے اس نے کہا تم سے کیا ڈرتا خدا کے دربار میں سب برابر ہیں، میں اس لئے بچتا تھا کہ کہیں مجھ میں دنیا کا اثر نہ ہو جاوے بڑے خوش ہوئے اور درباریوں سے کہا دیکھو اللہ کے بندے کیسے کیسے ہیں اور اس کی کچھ ماہواری تنخواہ مقرر کر دی اور بہت معتقد ہوئے۔ سو ایسے امراء بھی ہیں (اس موقع پر پہنچکر سامعین وعظ سے جناب شیخ رشید احمد صاحب نے فرمایا کہ مسجد کے پچھلے حصہ میں دھوپ آگئی ہے وہاں جو لوگ بیٹھے ہیں ان کو تکلیف ہے ذرا اگلے حصہ والے کچھ اور آگے بڑھ کر بیٹھ جاویں چنانچہ سب نے اس پر عمل کیا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ) دیکھئے اسی وقت ضرورت ہوگئی تَفَسَّحُوا فِي الْمَجٰلِسِ مجلس میں کھل کر بیٹھنے کی) اور بحمد اللہ سب نے تعمیل کی جو کہ علامت ہے تواضع واخلاص کی اگر اینٹھ و مروڑ والے ہوتے تو اتنی جلدی تعمیل نہ ہوتی۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاشرت کے آداب بھی داخل دین ہیں چنانچہ قرآن میں تَفَسَّحُوا فِي الْمَجٰلِسِ مجلس میں

کھل کر بیٹھنے) کا امر ہے ۔ ایک حدیث میں تفریق بین الاثنین (دو کے درمیان تفریق) کی ممانعت ہے یہ بھی آداب مجلس میں سے ہے کیونکہ بعض لوگ باہم دوست ہوتے ہیں وہ مل کر بیٹھنا چاہتے ہیں ان کو درمیان میں اجنبی کے آنے سے سخت ایذا ہوتی ہے اسی طرح اس کی بھی ممانعت ہے کہ کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر خود وہاں بیٹھا جاوے کہ یہ سخت تکبر اور ظلم ہے کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانے کا کسی کو کچھ حق نہیں (بشرطیکہ وہ مجلس عام ہو جیسے مسجد یا مجلس وعظ وغیرہ خاص مجلس نہ ہو۔ ۱۲ جامع) اور کہاں تک گناؤں شریعت نے آداب معاشرت بہت بتلائے ہیں ان کا مختصر پتہ بتلانے کے لئے میں ایک بات کہتا ہوں وہ یہ کہ آج کل بعض قرآنوں کے ساتھ فہرست مضامین قرآنیہ بھی طبع ہوئی ہے پہلے فہرست قرآن نہیں بنائی گئی تھی مگر آجکل جہاں اور نئے نئے کام ہو رہے ہیں وہاں یہ بھی ایک نیا کام ہوا ہے تو آپ قرآن کی فہرست لیکر دیکھئے اس میں آپ کو آداب اللباس آداب الکلام، آداب السلام، آداب المجلس وغیرہ ملیں گے اس سے پتہ چلے گا کہ حق تعالیٰ نے معاشرت کے باب میں بھی ضروری چیز سے تعرض کیا ہے اس کے بعد حدیث کی کوئی کتاب مثلاً مشکوٰۃ لے لیجئے اور اس کی فہرست دیکھئے اس میں بھی آپکو آداب اللباس آداب الطعام، آداب السلام، آداب المجلس، ذم الکبر، ذم التھاجر، ذم التحاسد والتباغض باب ماعلی الحکام من التیسیر، باب اطاعۃ الامراء والحکام وغیرہ وغیرہ ہر قسم کے احکام متعلق معاشرت وسیاست وسلطنت کے ملیں گے اور وہ سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال افعال سے ماخوذ ہیں اور عبادت نام ہے امتثال احکام کا اور احکام ہر قسم کے ہیں تو انسان کی کوئی حالت عبادت سے خالی نہیں ہوسکتی کیونکہ ہر حال کے متعلق شریعت کا ایک حکم ہے اور اس کا بجالانا عبادت ہے اور یہیں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اسلام میں ہمارے تمام مقاصد داخل ہیں ہمارا کوئی مقصود اسلام سے باہر نہیں کیونکہ اسلام کے معنی اطاعت ہی کے ہیں جو احکام کے متعلق ہوتی ہے اور احکام سے ہماری کوئی حالت باہر نہیں تو اسلام سے ہمارا کوئی مقصود خارج نہیں ہوسکتا اس سے آپ کو اسلام کی عظمت معلوم ہو گئی ہوگی ۔ اب سمجھئے کہ اس حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے متعلق ایک ضروری بات بیان فرمائی ہے ضروری ہوتا تو اسی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس

بات کا تعلق تو قف اسلام سے ہے کیونکہ اسلام کی ضرورت معلوم ہے اور ضروری کے ایسے متعلقات بھی ضروری ہوا کرتے ہیں کیونکہ وہ تعلق ایک خاص حیثیت کا ہے جو ترجمہ سے معلوم ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قریب ہے لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ لوگوں میں اسلام کا نام ہی رہ جائے گا اور قرآن سے کچھ نہ رہے گا مگر رسم یعنی نقش حدیث طویل ہے مگر آگے اجزاء کا بیان اس وقت مقصود نہیں گو ممکن ہے کہ ضمناً وہ بھی بیان میں آجاویں مگر مقصود اس وقت یہی جملے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام کے چند درجے ہیں لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ (نہیں باقی رہے گا اسلام بجز اس کے نام کے) میں لفظ مِنَ الْاِسْلَامِ (اسلام سے) بتلا رہا ہے کہ یہ بھی اسلام کی ایک فرد ہے گو فرد ادنیٰ ہی سہی تو ایک درجہ تو یہ ہوا جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درجۂ اسم فرمایا ہے یعنی نام کا اسلام پھر اس جملہ میں نفی و استثناء ہے جو حصر کو مفید ہے اور حصر میں ما عدا کی نفی ہوا کرتی ہے معلوم ہوا کہ اسلام میں اور بھی چیزیں ہیں جن کی یہاں نفی کر کے صرف درجۂ اسم کو باقی رکھا گیا ہے اور ویسے بھی محاورہ میں نام کا درجہ حقیقت کے مقابلہ میں بولا جایا کرتا ہے تو ایک درجہ اور نکلا جس کو کام کا اسلام یا حقیقی اسلام کہنا چاہیے اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اس حدیث کے مضمون کو اسلام سے کس قسم کا تعلق ہے اس میں اسلام کے درجے بتلائے گئے ہیں جن میں بعض ناقص ہیں بعض کامل جب اس حیثیت کا تعلق ہے تو اس کی ضرورت میں کیا کلام رہا۔ پھر جب اسلام مطلوب ہے جیسا کہ بیان بھی ہو چکا اور مسلمان کے لئے اسلام کا مطلوب ہونا بدیہی بات ہے اور قاعدہ ہے کہ جو چیز مطلوب ہوا کرتی ہے اس کا درجہ کمال ہی مطلوب ہوا کرتا ہے درجۂ نقصان کسی کو مطلوب نہیں ہوتا نہ اس پر کوئی راضی ہوتا ہے مثلاً تعلیم اولاد کا درجہ ایک کامل ہوتا ہے ایک ناقص مثلاً انٹرنس کا درجہ کامل ہے تو اس سے کم کے اوپر کوئی راضی نہیں ہوتا اور اگر کوئی زیادہ مالدار ہے اس کی نظر میں درجہ کمال بی۔ اے یا ایف۔ اے وہ اس سے کم کے اوپر راضی نہیں ہوتا پھر خود بی۔ اے اور ایف اے میں بھی دو درجے ہیں ایک ناقص ایک کامل۔ ناقص یہ کہ پڑھنے لکھنے کے بعد استعداد درست نہ ہو کسی فن سے مناسبت نہ ہو تو اس حالت میں کہا جاتا ہے کہ

صاحب تعلیم برائے نام ہوئی روپیہ ہی برباد گیا ایسی تعلیم باوجودیکہ عدم تعلیم کے مقابلہ میں کچھ درجہ ضرور رکھتی ہے مگر عموماً اس کو ناکافی اور برائے نام سمجھا جاتا ہے اور کوئی شخص اپنی اولاد کے لئے ایسی ناقص تعلیم کو پسند نہیں کرتا اسی طرح ہر چیز کو دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مطلوب میں ہمیشہ درجۂ کمال مقصود ہوتا ہے درجۂ نقصان کوئی گوارا نہیں کرتا جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ اسلام کے بھی مختلف درجات ہیں جن میں بعض کامل اور بعض ناقص ہیں اور اسلام مطلوب ہے تو اسلام میں بھی درجہ کمال ہی مطلوب ہونا چاہیئے مگر افسوس کہ اسلام میں ہم لوگ ناقص حالت پر قناعت کئے ہوئے ہیں اس کے کمال کی فکر نہیں کرتے۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی حکایت فرماتے ہیں یہ حدیث گو بظاہر بصورت خبر ہے مگر درحقیقت اس سے مقصود شکایت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دراصل ہماری شکایت فرما رہے ہیں کہ تمہاری دین سے لاپروائی رفتہ رفتہ اس درجہ بڑھ جائے گی کہ ایک وقت میں تمہارا اسلام نام کا رہ جائے گا۔ ایک بار میرے ذہن میں ایک بات آئی تھی پھر بعد تامل وہ بہت مفید اور صحیح معلوم ہوئی وہ یہ کہ جملہ خبریہ خود مقصود نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ انشاء ہوتا ہے اگر جملہ خبریہ بولا جاوے تو اس میں ساتھ ہی ایک جملہ انشائیہ مقصود ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ جس کا آپ کو انتظار تھا وہ آگیا تو یہ خبر خود مقصود نہیں ہوسکتی بلکہ مقصود یہ ہے کہ تم مطلع ہوجاؤ تاکہ انتظار کی کلفت رفع ہو) یا یہ کہ اس کی مہمانی کرو خاطر و مدارات کا سامان کرو۔ یا کسی نے خبر دی کہ آج کل حاکم وقت بدل گیا ہے۔ یہ جملہ بھی خود مقصود نہیں ہوسکتا بلکہ مقصود یہ ہوگا کہ اب اس کے مذاق کی رعایت کرنا ضروری ہے پہلے حاکم مذاق معلوم کرلینا اب کافی نہ ہوگا۔ غرض اسی طرح غور کرکے دیکھ لیا جائے کہ تمام جمل خبریہ میں کوئی نہ کوئی جملہ انشائیہ ضرور لگا ہوا ہوتا ہے۔ جو کہ فی نفسہ مقصود ہوتا ہے مگر یہ ان لوگوں کے کلام میں ہوگا جو فضول کلام کے عادی نہ ہوں ہمیشہ سوچ کر بات کرتے ہوں یعنی عقلاء کے کلام میں تو یہی قاعدہ ہے کہ جملہ خبریہ خود مقصود نہیں ہوتا ہے مگر آج کل مقصود بدل گیا ہے اس زمانہ میں خود اخبار ہی کو لوگوں نے مقصود بنالیا ہے جیسے کسی اخبار میں ایک خبر دیکھ کر بیان کردی کہ مرزاپور میں طاعون پھیل رہا ہے۔ اب ان حضرات سے اگر کوئی سوال کرے کہ اس خبر سے آپ کا

مقصود کیا ہے تو وہ خاموش ہیں ان کی خاموشی سے اس کلام کا فضول اور لغو ہونا ثابت ہو جائے گا اگر یہ کلام مفید ہوتا اور متکلم نے سوچ کر اسے زبان سے نکالا ہوتا تو وہ ضرور کسی مقصود کا نام لیتا جو صورت انشاء میں ہوتا مثلاً یہی کہتا کہ وہاں مسلمان آباد ہیں دعا کرو یا اپنی حفظ صحت کا انتظام کرو. یا وہاں جانے کا قصد نہ کرو وغیرہ وغیرہ اگر وہ ان جمل انشائیہ میں سے ایک بھی بیان کر دے تو اس کا جملہ خبریہ لغو نہ رہے گا مفید ہو جائے گا۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ آج کل اکثر لوگ فضول وعبث ولغو ولایعنی امور میں مشغول ہیں بعض لوگ کارڈ لکھتے ہیں تو ان سے یہ نہیں ہو سکتا کہ مقصود کی ایک دو بات لکھ کر کارڈ کو ختم کر دیں نہیں اس کو مکھیاں سی مار کر بھرنا فرض ولازم سمجھتے ہیں اب وہ پر کیونکر ہو گا. انہی فضول خبروں قصوں سے پہلے کارڈ ایک پیسہ کا تھا تو یہ لوگ چار پیسے وصول کرتے تھے اور اب تو آٹھ پیسے وصول کرتے ہیں واقعی بالکل مکھیاں سی مارتے ہیں جس کا پڑھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ہمارے وطن میں ایک صاحب ہیں وہ اپنے عزیز کو بڑے لمبے لمبے خطوط لکھتے تھے جس میں فضول سوالات ہوا کرتے تھے مثلاً یہ کہ آجکل غلّہ کا بھاؤ کیا ہے آپ کے پڑوس میں کون کون لوگ رہتے ہیں ان کے یہاں خیریت ہے یا نہیں اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ہوتی تھیں مکتوب الیہ سب باتوں کا جواب کہاں تک دے آخر اس لئے ان فضولیات کا جواب دینا چھوڑ دیا تو وہاں سے تقاضا ہوتا کہ تم میری سب باتوں کا جواب نہیں دیتے۔ اس نے جواب دیا کہ تمہارے خطوط میں فضول ولایعنی سوالات ہوتے ہیں میں سب کا جواب کہاں تک دوں مگر کاتب کو اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا تو مکتوب الیہ نے بھی یہی عمل شروع کیا کہ اب اُن سے اسی قسم کے فضول سوالات کرنا شروع کئے۔ حتیٰ کہ ایک خط میں سو سے زیادہ سوالات تھے تو وہ حضرت بڑے جھلائے اور لکھا کہ تم بہت فضول باتیں لکھتے ہو اس سے بڑی کلفت ہوتی ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت مجھے بھی آپ کے بیہودہ سوالات سے ایسی ہی کلفت ہوتی تھی اب آپ کو اندازہ ہوا۔ غرض اس ترکیب سے پیچھا چھوٹا۔ میرے پاس جب ایسے خطوط آتے ہیں جن میں فضول خبریں یا فضول سوالات ہوں تو میں یہ شعر لکھ دیتا ہوں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم ۔۔۔ از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ترجمہ (ہمنے دارا و سکندر کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے مہر و وفا سے علاوہ اور قصے مت پوچھو) ہم سے اگر دین کی بات پوچھو تو ہم ضرور بتلادیں گے۔ محنت سے ہم نہیں گھبراتے بشرطیکہ وہ بات اس قابل ہو کہ اس میں محنت کرنے سے خدا کی رضا حاصل ہوتی ہو ہم سے دین کا مسئلہ پوچھو اگر ہم کو جواب یاد ہوگا تو فوراً جواب دیں گے اگر یاد نہ ہوگا کتاب دیکھ کر جواب معلوم کرنے کی کوشش کریں گے چاہے اس میں ہم کو ہفتہ دو ہفتہ تک کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑے اگر پھر بھی ہم کو شرح صدر نہ ہوگا تو اپنے سے زیادہ جاننے والے کا پتہ بتلادیں گے۔ ابھی آج کل کا قصہ ہے کہ ایک شخص میرے پاس سلسلہ میں داخل ہونے کے لئے آیا چونکہ اس کی برادری میں عورتوں کو میراث نہ دینے کا رواج تھا اس لئے پہلے حقوق العباد سے سبکدوش ہونے کی اسے تعلیم کی گئی کہ پہلے اس گناہ سے نجات حاصل کرو پھر سلسلہ میں داخل ہونے کا قصد کرنا وہ بیچارہ طالب تھا اس لئے خوشی سے اس پر تیار ہوگیا اور اُس نے سب کے حقوق ادا کرنے کا تہیہ کرلیا چونکہ کئی پشتوں سے عورتوں کو میراث نہیں دی گئی تھی اس لئے جہاں تک پتہ چل سکا وہاں تک ورثہ کے نام لکھے گئے معلوم ہوا کہ پردادا کے بھی اوپر سے عورتیں محروم ہیں تو کئی بطن کا لمبا مناسخہ ہوا ورثہ کی تحقیق اور فرائض نکالنے میں دو ہفتے لگ گئے مگر ہم اس سے نہیں گھبرائے دو تین آدمیوں کو اپنے ساتھ لیکر میں نے مناسخہ نکالا اور سب کے سہام الگ الگ بتلائے اُس اللہ کے بندے نے سب ورثۂ محرومین کو ان کا حق ادا کیا ان لوگوں نے لینے سے انکار بھی کیا کیونکہ بعض کے بہت ہی معمولی حصے تھے کسی کے دو روپیہ کسی کے چار روپیہ مگر اس نے معافی کو منظور نہیں کیا بلکہ سب کا پیسہ پیسہ ادا کردیا۔ غرض ضروری باتوں میں محنت سے ہم نہیں گھبراتے ہاں فضول امر میں ہم سے ایک سطر بھی نہیں لکھی جاتی۔ اس کا احساس وہ شخص کرتا ہے جس کو وقت کی قدر ہو مگر آجکل لوگ وقت کی قدر ہی نہیں جانتے حالانکہ زندگی کی ہر ہر گھڑی ہر سکنڈ اور منٹ اتنا قیمتی ہے کہ ساری دنیا بھی اس کی قیمت نہیں ہوسکتی مرتے وقت اس کی قدر معلوم ہوگی کہ ہائے ہم سے کتنا بڑا خزانہ فضول برباد ہوگیا اس وقت آپ تمنا کریں گے کہ کاش مجھکو ایک دو منٹ کی اور مہلت مل جائے تو میں توبہ و استغفار کرکے گناہوں سے پاک ہوجاؤں حقوق العباد کے متعلق ورثہ کو وصیت کردوں مگر اس وقت مہلت کہاں اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً

وَلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ط وقت آنے کے بعد نہ ایک منٹ ادھر ہو سکے گا نہ ادھر۔ اور ارشاد ہوگا اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَا یَتَذَکَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَکَّرَ وَجَآءَکُمُ النَّذِیْرُ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر دراز اور طویل مہلت نہ دی تھی جس میں اگر تم چاہتے تو نصیحت حاصل کر سکتے تھے خصوصاً جبکہ تمہارے پاس ڈرانے والے بھی آچکے تھے (بعض نے نذیر کی تفسیر شیب (بڑھاپے) سے کی ہے ۱۲)

غرض وقت بہت قابل قدر چیز ہے لیکن لوگ اس کی قدر نہیں کرتے فضول باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ بعض طالبین کی عادت ہے کہ وہ محض حالات سے خط کو بھر دیتے ہیں اس سے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ مقصود کیا ہے اگر یہ مقصود ہے کہ ہمارے اوپر ایسے ایسے حالات وارد ہوتے ہیں تو اس اطلاع سے کیا مقصود ہے اگر یہ مقصود ہے کہ یہ حالات قابل التفات ہیں یا نہیں اور محمود ہیں یا مذموم تو اس کی تصریح ہونی چاہیئے ورنہ محض اطلاع ایک فضول امر ہے اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ آجکل اکثر لوگ اخبار فضول میں مشغول ہیں اور حدیث میں ہے حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا یَعْنِیْهِ یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ مسلمان لایعنی امور کو ترک کر دے تو یہ سب امور قابل ترک ہیں (یہ مضمون غایت تفصیل کے ساتھ وعظ ترک مالایعنی میں بیان ہو چکا ہے۔ قابل مطالعہ ہے) بعض لوگ خطوط میں خواب بہت لکھتے ہیں مجھے اس سے بھی الجھن ہوتی ہے کوئی بہت ہی عجیب و غریب خواب ہو تو اس کی اطلاع کا مضائقہ نہیں مگر یہ تو نہ ہونا چاہیئے کہ ہر خط میں خواب ہی لکھے ہوئے آیا کریں۔ اگر دس خطوط میں امراض نفس کا معالجہ دریافت کیا جائے اپنے عیوب کی اصلاح کا طریق دریافت کیا جائے تو اس کے بعد ایک خط میں خواب لکھ دینے کا بھی مضائقہ نہیں مگر اب تو حالت یہ ہے کہ دس خطوں میں تو خواب کی کیفیات ہوتی ہیں اور ایک خط میں بیداری کی۔ یہ تو یقیناً لایعنی میں داخل ہے پھر طرہ یہ کہ خواب لکھ کر اس کی تعبیر دریافت کرنا چاہتے ہیں اور مجھے اول تو تعبیر سے بہت کم مناسبت ہے دوسرے اُس کو طریق سے کچھ تعلق نہیں نہ شان اصلاح کے لئے معبّر ہونا ضروری۔ بلکہ تعبیر کے فن کو تو اسلام کی بھی ضرورت نہیں زمانہ جاہلیت میں بعض کفار ایسے معبّر ہوئے ہیں کہ علمار اسلام میں بھی ایسے معبّر نہ ہوئے ہوں گے تو جو فن مسلم و کافر دونوں میں مشترک ہو اس کو طریق یا بزرگی سے کیا تعلق

اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ جس خط میں خواب لکھا جائے اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا جائے کہ اگر تعبیر ضروری ہو تو لکھی جائے ورنہ کچھ ضرورت نہیں اس سے مکتوب الیہ پر بار نہیں ہوتا اسی لئے میں خوابوں کا جواب کم دیتا ہوں اکثر تو یہ شعر لکھدیتا ہوں ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(نہ میں شب ہوں نہ شب پرست جو خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا بندہ ہوں ان ہی کی باتیں بیان کرتا ہوں) خواب کا درجہ شریعت میں صرف اتنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے خواب کو مبشرات میں سے فرمایا ہے کہ یہ دل خوش کن چیز ہے اور برے خواب کو تحزین من الشیطان (شیطان کی طرف سے حزن و ملال میں ڈالنا) کہا گیا ہے یعنی شیطان بُرے خواب دکھلا کر مسلمان کو پریشان کرنا چاہتا ہے تو اس سے پریشان و مغلوب نہ ہونا چاہیئے ورنہ شیطان اور تنگ کرے گا خواب سے نہ کوئی جنت میں جائے گا نہ دوزخ میں کیونکہ اس کا مدار اعمال اختیاریہ پر ہے اور خواب اختیاری نہیں اگر کوئی آدمی ساری عمر بُرے خواب دیکھتا رہے تو اس کا کیا قصور ہے اور جو ساری عمر اچھے خواب دیکھے اس کا کیا کمال ہے خلاصہ یہ کہ خواب علت نہیں محض علامت ہے وہ بھی جبکہ خواب خواب ہی ہو تبخیر دماغ نہ ہو اور آجکل اکثر خواب تو ایسے ہی ہوتے ہیں کہ تبخیر دماغ سے پریشان خیالات نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر لوگوں نے اس کو مقاصد میں داخل کر لیا ہے اور خواب کے اوپر اعتماد کر کے فیصلے کر لیتے ہیں بعض لوگ چاہتے ہیں کہ مردہ کو خواب میں دیکھ لیا جائے اور جب تک وہ نظر نہیں آتا اس وقت تک متفکر رہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں ایک ضرر ہے وہ یہ کہ مردہ اگر اچھی حالت میں نظر آیا تو اس کے بعد ایصال ثواب سے غفلت ہو جاتی ہے گویا ان کے نزدیک ثواب پہونچانے کے لئے معذب ہونا بھی ضروری ہے۔ اور اگر اسے معذب دیکھا تو مسلمان سے خوامخواہ بدگمانی ہو گی حالانکہ محض خواب کی بنا پر کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی کہ جملہ خبریہ سے بھی انشاء ہی مقصود ہوتی ہے اور جس جملہ سے انشاء مقصود نہ ہو وہ مہمل ہے یہ مرض آجکل ہی ہوا ہے کہ اخبار کو بھی مقصود سمجھتے ہیں۔ پس ہر چند کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اس جگہ جملہ خبریہ وارد ہے مگر جب خبر خود مقصود نہیں ہو سکتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الحکماء والفصحاء ہیں آپ کے

کلام میں خبر سے مقصود انشا کیوں نہ ہوگا۔ اگر اس پر کوئی اشکال کرے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (فرما دیجئے اللہ ایک ہے) میں خبر سے کیا مقصود ہے میں کہوں گا کہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے تم اس کو واحد ہی سمجھو۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں بھی اس جگہ خبر مقصود نہیں بلکہ انشا مقصود ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے لوگو! تم اپنے اسلام کی تکمیل میں کوشش کرو اور درجۂ کمال حاصل کرنے کی فکر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ نام کا اسلام رہ جائے یا محض صورت ہی صورت رہ جائے اور یہ درجہ نہ کافی ہے نہ مطلوب کیونکہ مقاصد میں ہمیشہ درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے اور اس حدیث میں ضمناً ان لوگوں کی شکایت بھی ہوگئی جو محض درجۂ صورت یا درجۂ اسم پر اکتفا کرلیں گے اسی کو آپ بطور شکایت کے بیان فرماتے ہیں کہ عنقریب ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ اسلام کا نام ہی نام رہ جاوے گا اور قرآن کے صرف نقوش رہ جاویں گے۔ اس کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات تو صراحۃً معلوم ہوگئی کہ آپ اسلام کے مراتب و درجات بیان فرما رہے ہیں البتہ ان درجات کی تعیین یہ بعض کی اشارۃً ہے اور بعض کی صراحۃً۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے تین درجے بیان فرمائے ہیں لہٰذا پہلے میں ان درجات کی تعیین کرنا چاہتا ہوں پھر تکمیل کا طریقہ بیان کروں گا۔ ایک درجہ تو اس جگہ صراحۃً مذکور ہے جس کو نام کا اسلام فرمایا ہے اور دو درجے صراحۃً مذکور نہیں مگر تامل سے سمجھ میں آسکتے ہیں چنانچہ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (قرآن سے صرف نقش ہی باقی رہ جائیں گے) سے دوسرا درجہ مفہوم ہوتا ہے یعنی رسم اسلام کیونکہ جیسے قرآن میں ایک درجہ رسم قرآن ہے اسی طرح اسلام میں ایک درجہ رسم اسلام ہے جس کو صورت اسلام کہنا چاہیے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ اسم اور لفظ رسم کے معنی میں غور کرنے سے لغۃً فرق معلوم ہوتا ہے اسم کہتے ہیں نام کو اور رسم کہتے ہیں نقش کو پس درجۂ اسم میں تو شئی کا تحقق نہ صورۃً ہوتا ہے نہ معنیً محض نام ہی نام ہوتا ہے اور درجۂ رسم میں نام کے ساتھ صورت کا بھی تحقق ہوتا ہے پس یہ درجہ نام کے درجہ سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ دو درجے ہوئے اب ایک تیسرا درجہ اور ہونا چاہیے جس کے اعتبار و تقابل سے ایک درجہ کو نام کا اسلام اور ایک درجہ کو صورت کا اسلام کہا گیا ہے وہ درجہ حقیقت کا ہے ظاہر ہے کہ بدون تصور حقیقت کے نہ نام کا درجہ ہوسکتا ہے نہ صورت کا

اس لئے اس کا ماننا تو ضروری ہے۔ اب ترتیب وار سُن لیجئے کہ اسلام کے تین درجے ہوئے ایک تو تو درجۂ حقیقت ہے جس کو کام کا اسلام کہنا چاہئے، دوسری صورت کا درجہ ہے تیسرے نام کا اسلام ہے جس میں نہ حقیقت ہے نہ صورت ہے مگر برائے نام اس پر حقیقت کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ اس کو ایک مثال میں سمجھئے کہ مثلاً دوستی ایک شے ہے اس کے بھی ہمارے عُرف میں تین درجے ہیں ایک تو دوستی کی حقیقت ہے کہ دل سے خیر خواہی اور ہمدردی ہو دوسرے دوستی کی صورت ہے کہ ظاہر میں برتاؤ ایسا ہے جیسا دوستوں کے ساتھ کیا جاتا ہے مگر دل میں محبت زیادہ نہیں لیکن اس کے ساتھ اتنی بات بھی ہے کہ دشمنی کا برتاؤ بھی نہیں نہ پیچھے غیبت شکایت ہے نہ دشمنوں کے ساتھ سازش ہے یہ بھی ایک درجہ میں دوستی ہے یعنی دوستی کی صورت ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ دشمنی نہ کرنے کو بھی دوستی کہدیا جاتا ہے اور ایک قسم کی دوستی یہ ہے کہ منہ پر تو دوستی کا برتاؤ کیا جاتا ہے جھک کر سلام کرتے ہیں سامنے خوشامد کی باتیں بناتے ہیں اور پیچھے ایذا و اضرار کے درپے ہوتے ہیں تو پہلا درجہ تو کمال دوستی کا ہے اور دوسرا درجہ صورت دوستی کا ہے اور تیسرا درجہ صرف نام کی دوستی ہے جیسے منافقین کو برائے نام مسلمان کہدیا جاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ جس طرح ہماری نگاہ میں نام کی دوستی کی ذرا بھی قدر نہیں ہوتی اسی طرح خدا تعالیٰ کے یہاں منافقوں کے اسلام کی کچھ بھی قدر نہیں مومن کہلانے سے اور مسلمان نام ہو جانے سے کیا ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

میم و واؤ میم و نون تشریف نیست لفظِ مؤمن جز پئے تعریف نیست

یعنی مومن کا لفظ (بدون وجود حقیقت کے) کچھ شرافت نہیں بلکہ محض پتہ کے لئے ہے جس سے فی الجملہ امتیاز ہو جاتا ہے (اس حالت میں لفظ مؤمن کی ایسی مثال ہو گی جیسے کسی جاہل لٹھ کا نام فاضل رکھدیا جاوے تو اس نام سے اس کو ایک امتیاز تو حاصل ہو جائیگا کہ فاضل کہنے سے وہی سمجھا جاوےگا مگر نام فاضل ہونے سے وہ سچ مچ تو فاضل نہیں ہو جاتا وہ تو جاہل کا جاہل ہی رہتا ہے اسی طرح منافق کو مؤمن کے لقب سے کچھ حاصل نہ ہوگا کہیں الفاظ سے بھی کام چلا کرتا ہے۔ اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ (قرآن سے صرف نقش ہی باقی رہ جائیں گے) سے جو تم نے دوسرا درجہ مراد لیا ہے کہ لفظ رسم سے درجۂ صورت مراد ہے اُس کی کیا دلیل ہے ممکن ہے کہ اس سے بھی وہی مراد ہو جو الا اسمہٗ سے مراد ہے (مگر اس کا نام ہی نام) پس ایک جملہ میں جس درجۂ

پس ایک جملہ میں ہے دوسرے جملہ میں اسی درجہ قرآن کا بیان ہے اس کے چند جواب ہیں اول یہ کہ بلاغت کا مسئلہ ہے کہ تاکید سے تاسیس اولی ہے لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں جو کہ سید البلغاء ہیں تاسیس ہی مراد ہونی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کے متعلق درجۂ اسم مراد لینا صحیح بھی نہیں کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ علم دین جس میں قرآن بھی داخل ہے قرب قیامت میں خود مرتفع نہ ہوگا بلکہ علماء و قراء مر جاویں گے اس کے بعد مسلمان بھی دنیا سے اٹھ جائیں گے سو قرآن مجید کا علم و عمل گو باقی نہ رہے مگر خود قرآن مجید رہے گا یہ نہیں کہ قرآن کا صرف نام ہی نام رہ جائے اور اس کی صورت بھی باقی نہ رہے بلکہ قرآن کی صورت اخیر زمانہ تک ضرور باقی رہے گی لہذا اِلَّا رَسْمُهٗ (مگر اس کے نقش) سے درجۂ اسم مراد لینا صحیح نہیں ہو سکتا اس سے درجۂ صورت ہی مراد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کے اندر صرف قرآن شریف کے نقوش رہ جائیں گے اس کے سمجھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے بہت کم رہ جائیں گے اور صرف درجۂ رسم کا باقی رہنا بھی باعتبار اکثر کے ہے کل کے اعتبار سے نہیں کیونکہ قیامت تک ایک جماعت قرآن کی سمجھنے والی اور اس پر عمل کرنے والی ضرور رہے گی خواہ وہ معدودے چند ہی ہوں کیونکہ ایک صحیح حدیث میں یہ بھی آچکا ہے لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (قُلْتُ رَوَاهُ الشَّيْخَانِ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ ۱۲ جامع) (میری امت سے ایک گروہ قیامت تک حق پر مقاتلہ کر کے غالب رہے گا میں کہتا ہوں کہ اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اور لفظ مسلم کے ہیں) یعنی قیامت تک ایک جماعت حق پر ضرور رہے گی اور ظاہر ہے کہ حق پر ہونا بدون عمل بالقرآن کے ممکن نہیں کہ ایک جماعت قرآن پر عمل کرنے والی قیامت تک (مراد قرب قیامت ہے) ضرور رہے گی۔ لہذا لَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (قرآن سے اس کے نقش ہی باقی رہ جائیں گے) سے درجۂ اسم مراد نہیں ہو سکتا اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ (اسلام سے صرف اس کا نام ہی نام باقی رہیگا) بھی اکثر کے اعتبار سے ہے سب کے اعتبار سے نہیں کیونکہ ہر زمانہ میں ایک جماعت کامل الاسلام بھی ضرور رہے گی۔ اب اس کو سمجھئے کہ اسلام میں درجۂ حقیقت کونسا ہے اور نام کا اسلام کونسا ہے اور صورت اسلام کیا ہے اس کے سمجھنے

کے لئے پہلے آپ کو اسلام کی حقیقت سمجھنی چاہیئے حقیقت کے معلوم ہونے کے بعد باقی دوورجے خود ہی معلوم ہو جائیں گے۔ آج کل اسلام کا نوحہ کرنے والے تو بہت ہیں مگر افسوس حقیقت جاننے والے بہت کم ہیں۔ آجکل لکچروں اور وعظوں میں اسلام کا رانڈرونا رویا جارہا ہے کہ اسلام پستی میں آگیا، اسلام کمزور ہو گیا کوئی کہتا ہے کہ اسلام کو اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے کوئی کہتا ہے کہ اسلام مسلمانوں سے یہ درخواست کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تم یہ نوحہ کس کا کر رہے ہو۔ کیا اسلام کوئی پتلا ہے جس کے اوپر یہ آفتیں آرہی ہیں، کیا اسلام کوئی تم سے الگ چیز ہے جو کبھی بڈھا ہوتا ہے کبھی بیمار ہوتا ہے کبھی اس پر حملے کئے جاتے ہیں۔ اے صاحبو! اسلام تو حقیقت میں آپ کی ایک صفت ہے۔ تم اپنے آپکو مسلم یا مسلمان کہتے ہو تم موصوف ہو اور اسلام تمہاری ایک صفت ہے جیسے کوئی شخص حسین ہو تو حُسن اس کی ایک صفت ہے اور وہ موصوف بالحسن ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ صفت کا تحقق موصوف ہی کے ساتھ ہوا کرتا ہے جُدا نہیں ہوا کرتا چنانچہ حسن کا تحقق ہمیشہ حسین آدمی کے ساتھ ہوا کرتا ہے حسن کے لئے کوئی جُدا تحقق نہیں۔ جب یہ بات ہے تو اب بتلاؤ کہ تم جو اسلام کا نوحہ کرتے ہو اس کا مطلب کیا ہے کیا اس کی بعینہٖ یہی مثال نہیں کہ کوئی شخص حسن کا نوحہ کرتا پھرے اور اپنی خیر نہ لے۔ صاحبو! آپ کا نوحہ اسلام کرنا حقیقت میں آپنا نوحہ ہے، تمہارا تنزل یہ اسلام کا تنزل ہے، تمہاری ضرورت اسلام کی ضرورت ہے ورنہ کوئی بتلائے کہ تم سے علیحدہ اسلام کا وجود کونسا ہے مگر اب حالت یہ ہے کہ اسلام کا تو رانڈرونا روتے ہیں مگر اپنی خبر نہیں لیتے اپنی اصلاح کا کسی کو اہتمام نہیں بس وہ حالت ہے جو مولانا فرماتے ہیں ؎

کردۂ تاویل لفظ بکر را — خویش را تاویل کن نے ذکر را

برہوا تاویل قرآں می کنی — پست وکثر شد از تو معنے سنی

(تو نے لفظ بکر تاویل کی اپنی تاویل کر (یعنی اپنی اصلاح کر) نہ ذکر کی تاویل کر نفسانی اغراض سے قرآن پاک کی تاویل کرتا ہے تجھ قرآن پاک کے معنی کو کج اور بگاڑتا ہے)

جو لوگ اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ اپنی خدمت کریں جب وہ خود درست ہو جائیں گے تو اسلام بھی درست ہو جائے گا۔ اسلام کی اصل خدمت یہی ہے کہ تم اپنی اصلاح کرو اور اپنے اعمال واقوال واحوال کو اسلام کے مطابق بناؤ جب تمہاری کامل اصلاح ہو جائے گی تو اسلام کو ترقی ہو جائے گی۔ مگر اب تو یہ حالت ہے کہ اسلام کی خدمت اور حفاظت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ وقت نماز روزہ کی تعلیم اور مسئلہ مسائل بتلانے کا نہیں ہے اب تو خدمت اسلام کی ضرورت ہے اے اللہ نہ معلوم وہ اسلام کی خدمت وحفاظت کیا چیز ہے جس کے لئے نماز روزہ کی اور حلال و حرام کے جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ کسی اخبار میں کسی ریفارمر کا یہ مضمون شائع ہوا تھا کہ اسلام میں ایک ایسی چیز ہے جو ترقی سے بہت ہی سد راہ ہے وہ یہ کہ مسلمان ہو کر پانچ وقت کی نماز پڑھنا پڑتی ہے۔ بہت سے غیر مسلم مسلمان ہونا چاہتے ہیں اور وہ اسلام کو حق سمجھتے ہیں مگر پانچ وقت کی نماز کو فرض سن کر وہ اسلام سے رُک جاتے ہیں لہذا ہمارے علماء کو چاہیے کہ اسلام میں سے نماز کو نکال دیں اگر یہ نکال دی گئی تو اسلام کو بہت ترقی ہو گی اور بڑا مانع مرتفع ہو جائے گا (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اگر اسلام میں سے نماز کو نکال دیا گیا اور نکالنے کے معنی یقیناً یہی ہیں کہ نماز کو ضروری نہ کہا جاوے پھر وہ اسلام ہی کہاں رہے گا وہ بھی ساتھ ساتھ رخصت ہو جائے گا پھر اگر لوگ اسلام بھی قبول کریں تو وہ محض نام کا اسلام ہو گا حقیقت اسلام اس میں نام کو بھی نہ ہو گی تو اب جتنی بھی ترقی ہو وہ اسلام کی ترقی تھوڑا ہی ہو گی کفر کی ترقی ہو گی کیونکہ فرضیت صلوٰۃ سے انکار کرنا کفر ہے یہ تو اسلام کی خدمت ایسی ہو گی جیسے ایک بڑھیا کے گھر میں شاہی باز آ گرا تھا اس نے باز کبھی دیکھا نہ تھا اس لئے اُس کی بڑی چونچ دیکھ کر وہ بھی ٹیڑھی کہنے لگی کہ ہائے تو دانہ کیونکر کھاتا ہو گا تیری چونچ تو بڑی ٹیڑھی ہے اس کے بعد قینچی سے اُس کی چونچ کاٹ ڈالی۔ پھر ٹیڑھے ناخن دیکھ کر اُسے اور بھی ترس آیا کہ ہائے کسی نے تیرے ناخن بھی نہیں بنائے تو چلتا کیسے ہو گا اس نے ناخن بھی کاٹ دیئے۔ پھر لمبے لمبے بازو

دیکھ کر کہنے لگی کہ اتنا بوجھ لیکر سمجھ سے اُڑا کیونکر جاتا ہوگا پھر قینچی سے پر بھی کاٹ دیئے اس نے تو اپنے زعم میں اس کے ساتھ بڑی ہمدردی کی تھی مگر حقیقت میں اس نے اُس کو تباہ کر دیا جب بادشاہ کو تلاش کے بعد پتہ لگا کہ شاہی باز ایک بڑھیا کے گھر میں ہے تو اس لے منگوایا تو وہاں وہ لنڈورا بنا ہوا پہونچا بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو لے کر بازار میں اور شہر کی گلی کوچوں میں منادی کرو کہ جو شخص اپنے قدردان مربی سے جدا ہو کر نا قدروں کے ہاتھ میں جا پھنسے اس کی یہ گد بنا کرتی ہے تو صاحبو! ہم بھی آجکل اسلام کی ایسی ہی خدمت وحفاظت کر رہے ہیں جیسے اس بڑھیا نے شاہی باز کی خدمت کی تھی کہ اسلام کی ناک کان کاٹ کر آپ اسکو رونق و ترقی دینا چاہتے ہیں کہ نہ نماز کی ضرورت ہے نہ روزہ کی نہ قربانی کی نہ حج کی نہ کفریات ومعاصی سے بچنے کی اور پھر بھی وہ اسلام کی حفاظت ہی چلی جارہی ہے ان لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ہم جس کی خدمت و حفاظت کا دعوے کر رہے ہیں ہمارے اقوال وافعال سے اس کی بیخکنی ہو رہی ہے۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

یکے بر سرِ شاخ و بُن می برید خداوند بستاں نگہ کرد و دید

(ایک شخص ٹہنی پر بیٹھا ہوا جڑ کاٹ رہا تھا باغ کے مالک نے نگہ کی اور دیکھا)

ایک صاحب نے مجھ سے ابھی ایک مسئلہ پوچھا تھا میں نے اس کا شرعی جواب دیدیا تو وہ کیا کہتے گا کہ یہ تو سود کی صورت ہے میں نے کہا بہتر ہے اگر آپ کے نزدیک یہ سود کی صورت ہے تو اس پر عمل نہ کریں مگر اسلام کا حکم یہی ہے ہم اس کو بدل نہیں سکتے" افسوس! لوگوں کا مذاق آجکل یہ ہو رہا ہے کہ شریعت میں وہی مسائل رکھے جائیں جو ہماری عقل کے مطابق ہوں اور جو بات اُن کی سمجھ میں نہ آوے اس کو شریعت میں نہ رہنا چاہیے میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا کر دیا جائے تو پھر وہ مذہب اسلام کہاں رہے گا بلکہ خود ساختہ مذہب ہو جائیگا تو جس مذہب میں بندوں کی رائے اور تصنیف کو دخل ہو سکے وہ تو ایسا کر سکتا ہے مگر اسلام میں ایسا نہیں ہو سکتا یہ تو خدا کا بھیجا ہوا مذہب ہے جس کی حفاظت کا حق تعالیٰ نے خود وعدہ کیا ہے اس میں کسی کی ذاتی رائے اور تصنیف چل نہیں سکتی بہت لوگ احکام میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ذاتی تجربہ شاہد ہے کہ یہ تحریفات خود ہی مٹ جاتی ہیں اور احکام شرعیہ اپنی اسی اصلی حالت پر قائم رہتے ہیں۔

الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلام تم سے جدا کوئی چیز نہیں مسلمانوں ہی سے اسلام کا ظہور ہوتا ہے اس لئے اسلام کی ترقی تمہاری ترقی ہے اور تمہارا تنزل اسلام کا تنزل ہے جیسے کسی عورت سے دوسری عورت نے پوچھا کہ بی فوج کسے کہتے ہیں اس نے کہا کہ تیرا میاں میرا میاں یہ سب مل ملاکر فوج ہو جاتی ہے واقعی فوج کی حقیقت اس نے خوب بتلائی کوئی فوج کا الگ پتلا تھوڑا ہی ہوتا ہے یہی حالت اسلام کی ہے کہ ہمارے اور تمہارے درست ہونے سے اسلام کی ترقی ہوتی ہے کوئی ہم سے الگ چیز تھوڑا ہی ہے تو اب اگر اسلام کی ترقی چاہتے ہو تو اپنی حالت کی اصلاح کرو جب تم سب درست ہو جاؤ گے بس اسلام کو ترقی ہو گئی مگر یہ یاد رکھو کہ اپنی درستی یا اسلام کی ترقی کے یہ معنی نہیں کہ تم مال و دولت زیادہ جمع کرنے کی تدبیریں کرو یہ تو خوشحالی اور تمول کی ترقی ہے۔ اسلام کی ترقی یہ ہے کہ تم اپنی ایسی حالت بناؤ کہ تم کو دیکھ کر دنیا یوں کہنے لگے کہ ہاں بھائی یہ لوگ مسلمان ہیں یعنی تمہاری حرکات و سکنات کو دوسروں کی حرکات و سکنات سے امتیاز ہو تمہاری وضع و ہیئت ممتاز ہو تمہارے احوال و افعال و اقوال تعلیم اسلام کے تابع ہوں اُس وقت یہ بات حاصل ہو گی کہ جہاں ایک مسلمان اور ایک کافر کو جمع کیا جائیگا فوراً لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ مسلمان ہے یہ کافر ہے دونوں کے برتاؤ کو دیکھ کر لوگ پہچانیں گے کہ اس کا برتاؤ مسلمانوں جیسا ہے اس کا نہیں اب تو ہماری یہ حالت ہے کہ ہماری تقریر و تحریر معاملات و معاشرت اسلام سے بہت دور جا پڑی ہے حتیٰ کہ صورت میں بھی بہت کم امتیاز باقی ہے اس حالت میں اسلام کو ترقی کیونکر ہو اور اگر اسی حالت میں رہ کر تم نے ترقی بھی کی تو یاد رکھو وہ اسلام کی ترقی نہ ہو گی بلکہ محض مال و دولت کی ترقی ہو گی۔ مگر اس طرف لوگوں کو بہت ہی کم توجہ ہے اپنی اصلاح کی فکر ہی نہیں صرف اسلام کے تنزل کا نوحہ کرتے رہنا ان کا کام رہ گیا ہے حالانکہ خود اسلام میں کوئی نقص یا ضعف کچھ نہیں ہوا ایک دفعہ میں ایک مدرسہ کے جلسہ میں شریک ہوا وہاں ایک واعظ صاحب نے اپنے وعظ میں کہا کہ آج کل اسلام کی حالت بیوہ عورت جیسی ہے جس طرح وہ اپنے سرپرست کے مرجانے سے تیری میری دست نگر ہو جاتی ہے اسی طرح اسلام تمہارا منہ تک رہا ہے اس لئے اعانت اسلام کی سخت ضرورت ہے پھر اخیر میں اعانت کا طریقہ یہ بتلایا کہ مدرسہ میں چندہ دو۔ مجھے یہ مضمون بہت ناگوار ہوا۔

جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ اسلام کی حالت بیوہ جیسی عورت کیوں ہونے لگی ہاں تم خود رونڈوے ہو گئے ہو گئے اپنے ضعف کو اسلام کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو اسلام ہرگز ضعیف نہیں ہوا بلکہ حقیقت میں تم ہی ضعیف ہوئے ہو اور اسلام کی طرف تمہارا اس ضعف کو منسوب کرنا ایسا ہے جیسے ہمارے یہاں ایک عورت نے عید کا چاند دیکھا تھا اس وقت وہ بچے کو پاخانہ کرا رہی تھی جلدی میں اُسے کپڑے سے پونچھ کر ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھنے لگی عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ اکثر ناک پر انگلی رکھ کر بات چیت کیا کرتی ہیں انگلی میں کہیں پاخانہ لگا رہ گیا تھا تو وہ کیا کہتی ہے۔ اوئی اب کے چاند سڑا ہوا کیوں نکلا۔ اس بھلی مانس نے اپنی انگلی کی تو خبر نہ لی چاند کو سڑا ہوا بتلا دیا یہی ہماری حالت ہے کہ اپنے ضعف کی تو خبر نہیں لیتے اسلام کو ضعیف بتلاتے ہیں حالانکہ اسلام کی اب بھی وہی حالت ہے جو پہلے تھی ؎

ھنوز آں ابر رحمت دُرفشان ست　　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

(اب بھی وہ ابر رحمت درفشان ہے خم اور خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے)

سڑے ہوئے تم خود ہو ماہتاب اسلام کو سڑا ہوا کیوں بتلاتے ہو باقی جو میں نے ابھی کہا تھا کہ اسلام مسلمانوں کے ساتھ تہ لگا ہوا ہے ان سے جدا اور الگ نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کا تنزل اسلام کا تنزل ہے اور ان کی ترقی اسلام کی ترقی ہے یہ مضمون اس سے متعارض نہیں کیونکہ اس سے میری مراد ظہور اسلام ہے نہ کہ حقیقت اسلام یعنی اسلام کا ظہور مسلمانوں کے تابع ہے اور مسلمانوں کو دیکھ کر ہی دوسری قوموں کو اسلام کا ظہور معلوم ہوتا ہے ورنہ حقیقتِ اسلام ایک مستقل شئے ہے وہ کسی کے تابع نہیں کیونکہ وہ نام ہے قرآن و حدیث کی تعلیم کا اور یہ اسلام کسی وقت کمزور نہیں ہو سکتا یہ تو ابتدا سے جیسا ہے اسی حال پر موجود ہے اس کا توصہ تو کسی وقت بھی نہیں ہو سکتا اور نہ ان شاء اللہ کبھی ہوگا البتہ جس اسلام کا لوگ توصہ کر رہے ہیں وہ مسلمانوں ہی کے تابع ہے اور اس کی ترقی و تنزل کو میں نے مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے تابع کہا تھا۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کے دو وجود ہیں ایک اصلی ایک عارضی وجود اصلی اس کا مستقل ہے

اور اس میں کبھی ضعف نہیں آسکتا اور وجود عارضی اہل اسلام کے ساتھ لگا ہوا ہے اس کی قوت و ضعف مسلمانوں کی حالت کے تابع ہے اور اسی کا آج کل نوحہ ہو رہا ہے جو کہ درحقیقت اپنا ہی نوحہ ہے! صاحبو اسلام کی حالت جب خراب ہوتی جب یہودیت و نصرانیت کی طرح اسلامی احکام میں بھی خلط ہو جاتا مگر خدا کے فضل سے احکام اسلامی اب تک اسی آب و تاب کے ساتھ اپنی اصلی حالت پر ہیں گو اہل باطل نے تحریف کی بہت کوشش کی ہے مگر لفظی تحریف تو کبھی ہو ہی نہ سکی چنانچہ قرآن کو خدا تعالیٰ نے حفظ کے ذریعہ سے ایسا محفوظ کیا ہے کہ اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی احادیث میں وضاعین نے اپنی طرف سے کچھ باتیں ٹھونسنا چاہی تھیں تو حق تعالیٰ نے محدثین کی جماعت کو پیدا کر دیا جنہوں نے رجال و سند سے بحث کر کے وضاعین کی وضع کو نکال باہر کیا حدیث کی اس طرح حفاظت کی گئی البتہ تحریف معنوی اہل اہواء ہر زمانہ میں کرتے رہتے ہیں مگر وہ بھی چند روز کے بعد مٹ جاتی اور محرفین ہی کے ساتھ انکی تحریف بھی چل دیتی ہے اور اسلام کی ہر وقت وہی حالت رہتی ہے ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست   خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

(اب بھی وہ ابر رحمت درفشاں ہے خم و خمخانہ مہر و نشاں کے ساتھ موجود ہے)

اور تماشا یہ ہے کہ تحریف معنوی بھی اس وقت تک نہیں چلتی جبتک اس کی تائید میں کوئی شرعی دلیل نہ پیش کی جائے اگر کوئی شخص اپنی طرف سے ایک بات نکال کر یوں چاہے کہ مسلمان اس کو میرا قول سمجھ کر اسلام میں داخل کر لیں تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ مسلمانوں کے عقیدہ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اسلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی طرف سے کسی بات کا اضافہ بدون حکم الٰہی کے نہیں کر سکتے تھے تو دوسروں کا تو شمار ہی کیا ہے۔ بس تحریف بھی کسی شرعی حکم کے تابع ہو کر ہی کچھ روز تک چلتی ہے اور واقعی یہ غایت حفاظت ہے چنانچہ ایک دنیا پرست عالم نے کسی شخص کے لئے اس کی ساس کو حلال کرنا چاہا تھا کیونکہ اس ترکیب سے ان کو ایک ہزار کی رقم ملتی تھی تو اب دیکھئے یہ تحریف کیونکر چلی محض اتنی بات کہنے پر وہ شخص قانع نہیں ہوا کہ بس میں جائز کرتا ہوں تو بلا تکلف جائز سمجھ بلکہ ان مولوی

صاحب کو اس کے لئے باقاعدہ فتویٰ مرتب کرنا پڑا جس میں ظالم نے دلائل شرعیہ میں تحریف کی اور اسی ترکیب کا معاوضہ اس نے ایک ہزار روپیہ لیا تھا چنانچہ اس نے لکھا کہ ساس کہتے ہیں منکوحہ کی ماں کو اور ابھی تک اس کا منکوحہ ہونا ہی متحقق نہیں کیونکہ ہندوستان کی عورتیں جاہل ہیں اکثر ان کی زبان سے کلمات کفر نکل جاتے ہیں اور نکاح کے وقت لڑکی سے تجدید ایمان نہیں کرائی گئی لہذا غالب یہ ہے کہ وہ مرتدہ تھی جس کا نکاح درست نہیں ہوا تو وہ منکوحہ نہیں ہوئی تو اس کی ماں منکوحہ کی ماں نہیں ہوئی لہذا اس سے نکاح درست ہے رہا یہ کہ حرمت مصاہرت کا ثبوت تو زنا سے بھی ہو جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حرمت مصاہرت کا مسئلہ مختلف شافیہ ہے امام شافعی اس کے قائل نہیں لہذا حرمت مصاہرت کے بارہ میں ہم نے بضرورت امام شافعی کے مذہب کو اختیار کر لیا ہے تو دیکھئے اس عالم کی تحریف بھی اس ترکیب سے چلی کہ اس کو کھینچ تان کر ایک صورت فقہیہ کے تحت میں داخل کرنا پڑا گو وہ داخل ہو نہیں سکی کیونکہ اس شخص نے محض احتمال کی بنا پر اس عورت کو مرتدہ بنایا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں واقعی جب عالم بگڑتا ہے وہ ستم ہی ڈھاتا ہے جاہل تو گناہ کر کے شرماتا بھی ہے کیونکہ وہ گناہ کو گناہ سمجھتا ہے مگر عالم اگر گناہ بھی کرتا ہے تو اس کو دین کے اندر ٹھونستا ہے نعوذ باللہ منہ اسی طرح ایک جگہ کسی آدمی نے اپنی علاتی بہن سے نکاح کیا تھا نہ معلوم وہ کمبخت بہن کیونکر راضی ہو گئی اس کی ماں نے کہا کہ کمبخت یہ تو نکاح نہیں ہوا حرام ہوا کہنے لگی واہ ہم تو اپنے بھائی ہی کے پاس رہیں گے تم کو کیا۔ واقعی بھائی سے زیادہ بہن کا حقدار کون ہے تو یہ شخص قابیل وقت ہو گیا جس طرح اس نے اپنی بہن سے نکاح کرنا چاہا تھا اور یہی دلیل بیان کی تھی کہ اپنی بہن کا میں زیادہ مستحق ہوں اسی طرح اس شخص نے کیا پھر جب اس سے لوگوں نے سوال کیا کہ ظالم تو نے بہن سے نکاح کس قاعدہ سے کیا یہ تو نص قطعی سے حرام ہے یعنی وَ اَخَوٰتُکُمْ (تمہاری بہن بھی حرام ہیں) کہنے لگا کہ اَخَوٰتُکُمْ سے اخوات کاملہ مراد ہیں یعنی حقیقی بہنیں لِاَنَّ الْمُطْلَقَ اِذَا اُطْلِقَ یُرَادُ بِہِ الْفَرْدُ الْکَامِلُ (مطلق کا جب اطلاق کیا جائے تو اس سے فرد کامل مراد ہوتا ہے)

تو اس ظالم نے بھی تحریف کر کے ایک شرعی قاعدہ کے تحت میں اس کو داخل کیا۔ اسی طرح ایک صاحب نے فتویٰ دیا کہ مَنْكُوحَةُ الْجَدِّ (دادا کی منکوحہ) سے نکاح جائز ہے اور دلیل یہ بیان کی کہ مَا نَكَحَ آبَاءُكُمْ (ان عورتوں سے بھی نکاح حرام ہے جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا) سے صرف منکوحۃ الاب مراد ہے باپ کی منکوحہ حالانکہ اجماعاً منکوحۃ الجد بھی اس میں داخل ہے پھر سُنا کہ بعد میں ان صاحب نے اس غلطی سے رجوع کیا غنیمت ہے تو گو لوگ دین میں ایسی معنوی تحریفیں کرتے رہتے ہیں مگر یہ بھی چلتی نہیں چند روز میں سب مٹ مٹا جاتی ہیں کیونکہ قرآن مجید میں جابجا خدا تعالیٰ کے وعدے ہیں کہ ہم اس دین کی حفاظت کریں گے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (ہم نے ہی قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) (اور) هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (وہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اُس کو تمام دینوں پر غالب کر دیں اگرچہ مشرکین ناپسند کریں) اور حدیث میں ہے لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ۔ کہ قرب قیامت تک ایک جماعت میری امت میں سے حق پر ہمیشہ قائم رہے گی اور اُن کو اس سے کچھ ضرر نہ ہو گا کہ لوگ ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ یہ جماعت اسلام کی خدمت اور احکام کی حفاظت کرتی رہے گی اور محرفین کی لفظی و معنوی تحریفات کو دین میں سے نکالتی رہے گی وہ کسی کی مخالفت کی پروا نہ کریں گے دوسری حدیث میں ان لوگوں کو بشارت دی گئی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ بَدَأَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ۔ غریب کے معنی مفلس و نادار نہیں ہیں بلکہ عربی میں غریب کہتے ہیں پردیسی، اجنبی، بے یار و بے مددگار کو مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی ابتدا بھی ایسی حالت میں ہوئی ہے کہ اس کے یار و مددگار کم تھے اور اخیر میں بھی اس کی یہی حالت ہو جائیگی

کہ اس کے مددگار کم ہوں گے اور جو لوگ مددگار ہونگے بھی ان کا ساتھ کوئی نہ دے گا تو اسلام کے معاونین بھی اس وقت بے یار و بے مددگار ہوں گے آگے ان کو بشارت ہے فَطُوبَیٰ لِلْغُرَبَاءِ کہ ان بے یار و مددگار لوگوں کے لئے مبارکباد ہے اس سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ میں دین کے ناصر بہت کم ہو جائیں گے کیونکہ طائفہ کا اطلاق جماعت قلیل ہی پر ہوتا ہے خصوصاً جب لفظ امت کے مقابل لایا گیا ہے تو اس سے قلیل ہی مراد ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان ناصروں کے ساتھی بھی کم ہوں گے اور اس وقت یہی تھوڑی سی جماعت حق پر ہوگی یہی دین کو اصلی صورت میں ظاہر کریں گے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی جانب جماعت کثیرہ کا ہونا حقانیت کی دلیل نہیں۔

الغرض اسلام یہودیت و نصرانیت کی طرح ضعیف و کمزور نہیں ہو سکتا اس میں خلط ملت اور تحریف نہیں ہو سکتی اس لئے اسلام کا نوحہ کرنا کسی وقت بھی درست نہیں البتہ دین کو ہم لوگوں نے خود بگاڑ رکھا ہے یعنی لوگوں کی نظروں میں اپنی حرکتوں سے اس کو بدنام کر دیا ہے۔ کفار ہمارے اعمال و افعال کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی یہی تعلیم ہوگی اس لئے وہ اسلام پر اعتراض کرنے کی جرأت کرتے ہیں یا اسلام کو وحشی اور غیر متمدن مذہب بتلاتے ہیں اگر آج ہم اپنی اصلاح کرلیں تو کفار کی آنکھیں کھل جائیں کہ اسلام سے زیادہ تہذیب و تمدن کسی مذہب میں بھی نہیں پس اے صاحبو! تم اپنے ضعف کو اسلام کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو اسلام ضعیف نہیں اس کی قوت ذاتی ہے عارضی نہیں اس کی اصلی قوت کبھی زائل نہ ہوگی ہاں وہ قوت جو ہر مذہب کو اپنے متبعین کے اعتبار سے حاصل ہوتی ہے اس میں کبھی ضعف تمہاری عارضی حالت کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس ضعف کا منشا ہم خود ہیں ہماری وجہ سے یہ ضعف پیدا ہوتا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم اپنے ضعف کا علاج کرو اپنی اصلاح کر کے قوت پیدا کرو۔ ورنہ بدون اپنی اصلاح کے اسلام کا نوحہ کرنا ویسا ہی ہوگا جیسا کہ اس عورت نے چاند کو سڑا ہوا بتلایا تھا نیز جس طرح ایک حبشی جا رہا تھا

راستہ میں اسے ایک آئینہ پڑا ہوملا اٹھا کر دیکھا تو اس میں آپ کو اپنی دلفریب صورت نظر آئی جھلا کر پھینکدیا اور کہا کہ ایسا بدصورت تھا جب ہی تو کوئی تجھے یہاں پھینک گیا ہے تو جس طرح اس حبشی نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ آئینہ ہی کی یہ صورت ہے اسی طرح اسلام کے آئینہ میں آپ کو اپنا ضعف نظر آرہا ہے جس کو آپ اسلام کا ضعف سمجھتے ہیں۔ جیسے ایک بوڑھے میاں کی حکایت ہے کہ ان کا بچہ روٹی کھارہا تھا پاس لوٹا رکھا تھا اس نے جو لوٹے پر ہاتھ رکھا تو روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لوٹے میں گر گیا۔ لڑکے نے جو اس میں سے نکالنا چاہا تو اس کو پانی میں اپنی صورت نظر آئی وہ سمجھا کہ لوٹے میں کوئی دوسرا لڑکا بیٹھا ہوا ہے وہ کہنے لگا کہ ابا اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا پوچھا کس نے کہا یہ جو لوٹے میں بیٹھا ہوا ہے۔ ابا جان نے جو جھک کر دیکھا تو ان کو اپنی صورت نظر آئی۔ آپ فرماتے ہیں کہ تُف ہے تیری اوقات پر اتنی بڑی داڑھی لگا کر بچہ کے ہاتھ سے ٹکڑا چھینتے شرم نہ آئی مجھ کو اس جگہ ایک نکتہ بھی بتلانا ہے کہ اسلام وایمان ایک ہیں یا دو۔ نصوص سے یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اعمالِ ظاہرہ پر اطلاق کیا جاتا ہے اور ایمان عقائد کا نام ہے گو اطلاق میں دونوں متحد ہیں کیونکہ آجکل جو شخص صورت اسلام اختیار کئے ہوئے ہو ہم اس کو مومن ہی کہیں گے کیونکہ نفاق کا علم ہم کو نہیں ہوسکتا وحی بند ہوچکی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام وایمان میں اطلاقاً بھی فرق تھا پس آجکل دونوں کا اتحاد ایک عارض کی وجہ سے ہے کہ ہم کو نفاق کا علم نہیں ہوسکتا ورنہ اصل میں فرق ضرور ہے پس یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اسلام ہی کی شکایت فرما رہے ہیں ایمان کی شکایت نہیں فرماتے اس سے معلوم ہوا کہ جس خاص زمانہ میں مسلمانوں کے اعمال میں ایسا تغیر آجائے کہ ان کا اسلام برائے نام رہ جائے یہ ضرور نہیں کہ ایمان بھی برائے نام رہ جائے ممکن ہے کہ عقائد ضروریہ توحید ورسالت وقرآن وآخرت میں تغیر نہ آئے عقائد درست رہیں چنانچہ بحمداللہ اس وقت تک تو اکثر مسلمانوں کے عقائد درست ہیں گو بعض فروعی اختلاف بدعت وسنت وتقلید وعدم تقلید پیدا ہوگئے ہیں مگر یہ نزاع ضروریات میں نہیں

اب جبکہ رسم اور اسم کے معنی اور اسلام کے درجات معلوم ہو گئے تو اس سے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ اسلام کی بابت تو یہ شکایت فرمائی گئی کہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ (اسلام سے صرف اس کا نام ہی نام باقی رہ جائے گا) اور قرآن کے متعلق فرمایا کہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ یعنی قرآن کے نقوش ہی رہ جائیں گے حاصل اس وجہ کا یہ ہے کہ قرآن میں ایسا تغیر نہیں ہوا کہ غیر قرآن قرآن مشہور ہو گیا چنانچہ قرآن آپ کے سامنے موجود ہے قدیم سے قدیم نسخوں کا مقابلہ کر کے دیکھ لو ایک حرف کا فرق نظر نہ آئے گا بشرطیکہ اہل مطابع نے تصحیح کا پورا اہتمام کیا ہو۔ اور اگر ان لوگوں سے کچھ کوتاہی ہوئی ہے وہ بھی سب کو بلا اختلاف معلوم ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن کا کسی وقت نام ہی نام رہ جائے گا صورت بھی نہ رہے گی۔ بلکہ صورت قرآن ہمیشہ رہے گی۔ البتہ اسلام کی اُس خاص وقت میں صورت بھی نہ رہے گی بلکہ صرف نام ہی رہ جاوے گا اس سے خود یہ بات ظاہر ہے کہ رسم کا درجہ اسم سے بڑھا ہوا ہے اس پر اگر کسی کو یہ سوال ہو کہ کیا ہمارا اسلام صورتِ اسلام بھی نہیں حالانکہ ہم نماز روزہ وغیرہ بہت کچھ کرتے ہیں تو سمجھو کہ محاورات میں اعمال و اقوال کے متعلق اکثر کا اعتبار ہوتا ہے مثلاً ایک بستی میں آپ کے دشمن زیادہ ہوں اور دوست ایک دو ہو تو آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بستی ساری میری دشمن ہے اسی طرح ایک شخص آپ کے ساتھ دشمنی کے برتاؤ زیادہ کرتا ہے اور دوستی کے کم تو اس کو دشمن ہی کہا جاتا ہے دوست برائے نام بھی نہیں کہا جاتا۔ اس قاعدہ پر نظر کر کے دیکھا جائے کہ اس وقت مسلمانوں میں نماز روزہ ادا کرنے والے کتنے ہیں معلوم ہو جائیگا کہ بہت کم ہیں زیادہ وہی لوگ ہیں جن کی صورت و وضع اعمال و اقوال ہی شریعت سے بہت دور ہیں تو مجموعہ پر نظر کر کے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کا نام ہی رہ گیا صورت بھی نہیں رہی کیونکہ اسلام کا مصداق تو یہی اعمال ظاہرہ تھے۔ پھر جو لوگ نماز وغیرہ کرتے بھی ہیں اُن میں بھی یہ دیکھا جائے کہ

ایسے کتنے آدمی ہیں جن کی نماز صورت میں درست ہے قاعدہ کے موافق ہے سارے مجموعہ پر نظر کر کے اوسط یہی نکلے گا کہ اکثر کی نماز خراب ہے غرض ہماری حالت یہ ٹھہری کہ اکثر اعمال میں حقیقت تو کیا ہوتی صورت بھی کامل نہیں کیونکہ عبادت کی حقیقت تو یہ ہے جس کو ایک حدیث میں اس طرح بتلایا گیا ہے اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔ حق تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ تم اگر نہیں دیکھتے تو وہ تو تم کو دیکھ رہے ہیں اور اس کا مقتضا بھی عبادت کا اسی طرح کرنا ہے جیسا اگر تم دیکھتے ہوتے اگر اس مراقبہ کے ساتھ نماز ادا کی جائے تو اس وقت نماز کی حقیقت موجود ہو گی مگر ایسی نماز تو بھلا کون پڑھتا ہے اس لئے حقیقت کا تو پتہ ہی نہیں لیکن حقیقت کامل نہ ہو تو کم از کم صورت تو کامل ہوتی افسوس یہ ہے کہ ہمارے اعمال کی صورت بھی خراب ہے مثلاً نماز ہی میں قیام کا ادب یہ ہے کہ نظر سجدہ گاہ پر رہے ہماری حالت یہ ہے کہ نظر سجدہ کی جگہ سے بہت آگے رہتی ہے چنانچہ نماز میں سر اٹھا کر کھڑے ہوتے ہیں بعضے دیواروں پر چھت پر نظر دوڑاتے ہیں۔ قراءت کا ادب یہ ہے کہ ہر لفظ تدبر و فکر کے ساتھ زبان سے نکالیں، یہاں یہ حالت ہے کہ آموختہ سا یاد کر لیا ہے کھڑے ہوتے اور حافظوں کی طرح آموختہ سنا دیا۔ نیز قراءت کا یہ بھی ادب ہے کہ ہمیشہ کے لئے چھوٹی ہی سورت متعین نہ کی جائے ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے چھانٹ کر چھوٹی چھوٹی سورتیں مقرر کر لی ہیں اِنَّا اعطینا، قل ھو اللہ، لایلف قریش، والعصر پس ساری نمازیں انہی سے ادا ہوتی ہیں پھر غضب یہ ہے کہ ان چند سورتوں کی بھی تصحیح کا خیال نہیں کرتے الحمد کو الہمد پڑھتے ہیں انا اعطینا کو انا آیتنا پڑھتے ہیں جس کو عربی زبان کوئی نہیں کہہ سکتا کیونکہ الھمد یہ عربی لغت نہیں ہے وعلیٰ ہذا القیاس رکوع کا قاعدہ یہ ہے کہ سر اور کمر اور سرین سب برابر بسطح مستوی کی طرح

رہیں یہاں یہ حالت ہے کہ کمر اونچی رہتی ہے سر کبھی بہت جھکا ہوا ہے کبھی اونچا اٹھا ہوا رکوع میں نظر پیروں پر رہنی چاہیئے ہماری نگاہ بہت دور پہونچتی ہے پھر رکوع سے سر اٹھا کر سیدھا کھڑا ہونا واجب ہے مگر بہت لوگ سیدھی طرح کھڑے نہیں ہوتے بس یوں ہی سر کا ذرا سا اشارہ کر کے دھم سے سجدہ میں گر پڑتے ہیں بعض لوگ جلدی میں تین بار بھی تسبیح پوری نہیں کرتے پھر سجدہ کی ہیئت بھی خلاف قاعدہ بنا رکھی ہے کہنیاں زمین پر رکھی ہوتی ہیں یا بازو اچھی طرح نہیں کھلتے کمر جھکی ہوئی رہتی ہے حالانکہ سجدہ میں کمر اونچی رہنی چاہیئے۔ پھر سجدہ سے سر اٹھا کر سیدھا بیٹھ کر دوسرا سجدہ کرنا چاہیے بہت آدمی سجدہ کر کے سیدھی طرح نہیں بیٹھتے بس ذرا سا سر کا اشارہ کر کے دوسرا سجدہ شروع کر دیتے ہیں تو بھلا اس حالت میں صورت بھی درست کہاں رہی صورت تو اس کو کہتے ہیں کہ عالمگیر جب تخت نشین ہوئے تو مبارک باد کے لئے جہاں سب لوگ آئے وہاں ایک بہروپیہ بھی آیا تھا بادشاہ متبع شریعت تھے بہروپیہ کو انعام کس مد سے دیں اور تقویٰ بھگاریں تو عرفاً شان شاہی کے خلاف اس لئے آپ نے ایک لطیف حیلہ سے ٹالنا چاہا فرمایا کہ انعام دیا جاتا ہے کمال پر تم ہم کو اپنا کمال دکھلاؤ تب انعام دیں گے اور تمہارے کمال کا معیار یہ ہے کہ ایسا بہروپ اختیار کرو جس میں ہم تم کو پہچان نہ سکیں۔ عالمگیر کو اپنی فراست پر ناز تھا وہ سمجھتے تھے کہ یہ جس بہروپ میں بھی آئے گا میں ضرور پہچان لوں گا اور واقعی اُس نے مختلف قسم کی صورتیں بنائیں مگر عالمگیر نے ہر دفعہ پہچان لیا آخر جب عالمگیر نے دکن کا سفر کیا تو جتنے شہر اور قصبے راستہ میں آتے تھے سب کے حکام کو اطلاع دی گئی کہ جس شہر میں جو بزرگ ہوں ان کے نام اور احوال سے اطلاع دی جائے یہ بہروپیہ بھی راستہ میں ایک شہر کے قریب کسی پہاڑی پر جا بیٹھا اور اپنا چیلا شہر میں چھوڑ دیا اس نے مشہور کرنا شروع کیا کہ فلاں پہاڑ پر ایک بڑے پہونچے ہوئے بزرگ رہتے ہیں یہاں تک کہ اسکی طرف رجوعات شروع ہوئیں اور بڑی شہرت ہو گئی۔ چنانچہ بزرگوں کی فہرست میں حاکم شہر نے اس کا نام بھی لکھ بھیجا عالمگیر قطع منازل کرتے ہوئے اور ہر شہر کے بزرگوں سے ملتے ملاتے دعائیں لیتے ہوئے یہاں بھی پہونچے تو ان حضرت سے

ملنے کا ارادہ ہوا لیکن پہلے وزیر کو احتیاطاً بھیجا کہ جاکر دیکھو یہ شخص واقعی بزرگ ہے یا نہیں وزیر نے جو آکر ملاقات کی تو بہروپیہ نے سلوک و تصوف کے بہت سے مضامین اور علوم و معارف بیان کئے جو وزیر کے خواب میں بھی نہ آئے تھے پہلے زمانہ میں یہ لوگ علوم حاصل کرتے تھے محض پیشہ ہی نہ تھا بلکہ ایک فن ہوگیا تھا۔ وزیر نے واپس آکر بہت تعریف کی کہ میں نے تو ایسا بزرگ ایک بھی نہیں دیکھا اگر آپ اُن سے ملاقات نہ کریں گے تو میں یہ سمجھوں گا کہ آپ نے بزرگوں کو دیکھا ہی نہیں عالمگیر کو یہ سنکر اشتیاق زیادہ ہوا زیارت کو چلے جاکر بیٹھے تو ان حضرت نے عالمگیر کے سامنے بھی استغناء و توکل خوب ظاہر کیا بزرگوں کے ملفوظات و حکایات و علوم خوب بیان کئے جن سے عالمگیر کو بڑی خوشی ہوئی اس کے بعد بادشاہ نے بیس ہزار اشرفیوں کے توڑے نذر کئے بہروپیہ نے واپس کر دیئے اور کہا کہ اپنی طرح مجھ کو بھی دنیا پرست بنانا چاہتے ہو جاؤ لیجاؤ۔ عالمگیر نے خجلت کے ساتھ نذر اٹھالی اور اجازت لے کر واپس ہوئے۔ راستہ میں بادشاہ و وزیر دونوں تعریف کرتے جارہے تھے کہ حقیقت میں ایسا بزرگ نظر سے نہیں گذرا اس وقت بہروپیہ صاحب بھی پیچھے پیچھے جارہے تھے بادشاہ کی جو نظر پڑی تو اس نے جھک کر سلام کیا اور وہی دعائیہ کلمات جو بہروپیوں کی اصطلاح ہے عرض کئے۔ عالمگیر نے کہا آہا یہ بزرگ آپ تھے واقعی یہ نقل تم نے خوب کی ہم بالکل نہیں پہچان سکے۔ پھر خیمہ میں پہونچکر پانچسو روپیہ انعام دیئے جس کو بہروپیہ نے بڑی خوشی سے قبول کیا اس کے بعد عالمگیر نے اس سے سوال کیا کہ ایک بات تو بتلاؤ تم نے بیس ہزار اشرفیاں تو ناک پر مار کر واپس کر دیں اور پانچسو روپیہ اس خوشی سے لے لئے اس کی کیا وجہ تھی، اگر تم اس وقت ساری اشرفیاں لے لیتے تو حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد بھی ہم اس کو تم سے واپس تھوڑا ہی لیتے۔ اس کا جو جواب بہروپیہ نے دیا وہ سننے کے قابل ہے۔

کہا حضور یہ میں خوب جانتا تھا لیکن اس وقت میں نے صوفیہ کا بہروپ بنا رکھا تھا اس وقت اگر میں نذر قبول کرلیتا تو نقل غلط ہوتی جو میرے کمال کے لئے دھبہ تھا

جب نقل کامل ہو چکی تو اب جو کچھ حضور نے عطا فرمایا ہے یہ میرے کمال کا صلہ ہے اس کو میں نے خوشی سے قبول کیا کیونکہ میرا گذارا اسی پر ہے۔ صاحبو! نقل کے یہ معنی ہیں جو اس بہروپیہ نے سمجھے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ نماز روزہ کی نقل بھی تو پوری نہیں کرتے۔ ہمیں صورت صلوٰۃ کی اتنی رعایت تو کرنی چاہئے جیسے اس بہروپیہ نے صورت بزرگی کی رعایت کی۔ پھر صورت ظاہراً کامل ہونے کے بعد بھی وہ نقل ہی ہو گی حقیقت جب بھی نہ ہو گی حقیقت تو اس وقت ہو گی جبکہ قلب حاضر ہو اور حضور قلب کے معنی فنا کے نہیں ہیں کہ ایسی یکسوئی ہو کہ کسی چیز کی بھی خبر نہ ہو یہ تو اکابر کی باتیں ہیں میں تو ایک معمولی بات بتاتا ہوں جس پر ہر ایک کو عمل سہل ہو مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم واجد علی شاہ کے احدی بنے ہوئے ہیں کہ آسان سے آسان کام بھی ہم سے نہیں ہوتا واجد علی شاہ کے زمانہ میں کاہلوں کی ایک جماعت تھی جو احدی کے لقب سے مشہور تھے وہ کاہلی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے جن کا ایک قصہ یہ ہے کہ دو احدی ایک جگہ جمع تھے ایک لیٹا ہوا ایک بیٹھا ہوا سامنے سے ایک سوار گذرا تو لیٹے ہوئے احدی نے اسے پکارا کہ اے میاں سوار اے میاں سوار ذرا خدا کے واسطے یہاں آنا' وہ سمجھا کہ کوئی کام ہو گا۔ آیا پوچھا بتلا کیا کہتا ہے کہنے لگا کہ یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہوا ہے ذرا میرے منہ میں ڈال دے اس نے کہا کم بخت اتنا کام تجھ سے نہیں ہو سکتا تھا جو میرا راستہ کھوٹا کیا پھر اس کے ساتھی سے کہا کہ اے اتنا کام تو نے بھی نہ کر دیا تو وہ کہنے لگا کہ بس میاں ایسی بات مجھ سے نہ کہنا میں دوں گا اس کے منہ میں بیر اس سے اتنا تو ہو ہی نہ سکا کہ کل میں لیٹا تھا اور میرا منہ کھلا تھا ایک کتا آکر منہ میں پیشاب کرنے لگا اس کو ہٹا ہی دیتا سوار نے دونوں پر لاحول پڑھی کہ کمبخت دونوں منحوس ہیں۔ واقعی دین کے بارہ میں ہماری حالت بالکل ان احدیوں کے مشابہ ہے کہ ہم سے دین کا آسان سے آسان کام بھی نہیں ہو سکتا سو حضور قلب کی حقیقت نہایت سہل ہے مگر ہوتی ہے کرنے سے وہ ایک حدیث سے معلوم ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ

وسلم فرماتے ہیں مَنْ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ مُقْبِلاً عَلَیْھِمَا بِقَلْبِہٖ لَمْ یُحَدِّثْ فِیْھِمَا نَفْسَہٗ دَخَلَ الْجَنَّۃَ جو شخص دو رکعتیں اس طرح پڑھ لے کہ دل سے ان پر متوجہ ہو اور اپنے جی سے باتیں نہ کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اس سے حضور قلب کی یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ نماز پر دل سے متوجہ ہو یعنی ہر رکن کے ادا کرنے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں پھر ہر رکن کو نماز کے قاعدہ پر ادا کرے بتلایئے تو یہ کیا مشکل کام ہے۔ اگر کسی کو خطرات و وساوس آتے رہیں تو یہ حضور قلب کے منافی نہیں بس اتنا ضروری ہے کہ خود وساوس نہ لاوے اور جو آتے ہوں ان کی طرف التفات نہ کرے دیکھئے کس قدر تو آسان مگر ہم سے یہ بھی نہیں ہوسکتا وجہ ساری یہ ہے کہ دین کا اہتمام ہی قلب میں نہیں رہا اب بتلایئے جب ہمارے اعمال کی صورت بھی شریعت کے موافق نہیں تو یہ کیونکر کہا جائے کہ ہمارے اسلام میں صورت اسلام ہے بس یہی کہا جائیگا کہ اسلام نام کا رہ گیا ہے۔ پھر زیادہ افسوس یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں کسی کو دین کا تھوڑا بہت خیال بھی ہوتا ہے تو وہ دین و اسلام کی ساری اصلاح کا طریقہ صرف بیعت ہونے کو سمجھتا ہے کہ بس کسی سے مرید ہوجاؤ پھر خودبخود اصلاح ہوجائے گی بلکہ بعض تو یہ سمجھتے ہیں کہ پیر ہم سب کی طرف سے کافی ہوجائے گا ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں بس یہ لوگ اعمال کا مطلق اہتمام نہیں کرتے صرف پیروں کے نذرانہ کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کی سالانہ نذر قضا نہ ہوجائے سال بھر کی نماز روزہ قضا ہوجائے اور یہ مذاق بگاڑا ہے ان دوکاندار پیرزادوں نے کہ انہوں نے عوام کو یہی سمجھا رکھا ہے کہ بس سلسلہ میں داخل ہوجانا نجات کے لئے کافی ہے نہیں اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے عوام انہیں کے بھروسہ پر رہتے ہیں۔ ایک ایسے ہی پیر اپنے مریدوں کے گاؤں میں گئے تھے ایک گوجر کے مہمان ہوئے اس نے کہا پیر توں تو (یعنی تو تو) بڑا دبلا ہورہا ہے۔ پیر صاحب بولے کہ دبلا کیونکر نہ ہوں تم لوگ نماز نہیں پڑھتے مجھے سب کی طرف سے نماز پڑھنی پڑتی ہے روزہ نہیں رکھتے مجھے سب کی طرف سے روزے رکھنے پڑتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے سب کی طرف سے پل صراط پر چلنا پڑتا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے اس مصیبت سے دبلا ہوگیا۔ گوجر بولا وہ دیہ (یعنی تعجب) توں تو بڑا کام کرے ہے جا میں نے فلانا موگّی کا

کھیت تجھ کو دیا۔ پیر صاحب بڑے خوش ہوئے مگر ساتھ ہی یہ بھی فکر ہوئی کہ ان گنواروں کا کیا اعتبار ایسا نہ ہو کہ پھر زبان سے پھر جائے اس لئے کہا کہ چودھری جی پھر کھیت پر قبضہ کرادو۔ اس نے کہا ہاں ہاں چل ابھی قبضہ کرلے اس نے پیر کو تو آگے کیا اور خود پیچھے رہا اور ایسے راستہ سے لے چلا جہاں ایک گول چل رہی تھی اور بعض جگہ ڈول تازی بنی ہوئی تھی وہاں پھسلن بہت ہوتی ہے۔ پیر صاحب ایک جگہ پھسل کر گرے تو پیچھے سے چودھری نے ایک لات دی کہ ابے توں تو یوں کہے تھا کہ میں پل صراط پر چلا کروں ہوں جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے تو ایک بالشت کی ڈول پر تو چل ہی نہیں سکتا پلصراط پر کیا چلتا ہوگا تو جھوٹا ہے جا میں کھیت نہیں دیتا واقعی وہ پیر تو اسی قابل تھا۔ اور خیر بعض لوگ اتنے نادان تو نہیں ہیں اس لئے وہ خود بھی عمل کرتے ہیں مگر امراض قلب کے علاج میں وہ بھی کوشش نہیں کرتے بس اُن کی زیادہ دوڑ یہ ہوتی ہے کہ جب گناہوں کا خیال آیا تو پیر کے پاس آئے کہ حضور ایسی توجہ کر دیجئے کہ گناہوں سے نفرت ہو جائے چاہے پیر صاحب کو خود بھی نفرت نہ ہو بلکہ معاصی کی طرف میلان ہوتا ہو کیونکہ میلان تو نقص نہیں ہاں اس پر عزم یا عمل کرنا یہ نقص ہے پس زوال میلان کی طلب کرنا گویا فرشتہ ہو جانے کی درخواست کرنا ہے انسان تو میلان سے خالی نہیں ہو سکتا اس کا تو کمال ہی یہ ہے کہ باوجود میلان کے پھر معاصی سے بچتا رہے بدون میلان کے معاصی سے بچے میں کیا کمال ہوگا تو یہ بھی ان کی غلطی ہے کہ توجہ ہی پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں۔

صاحبو! جو کام تمہارے کرنے کا ہے وہ دوسروں کے کئے نہ ہوگا اگر دوسروں کے کئے کچھ ہو سکتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کا کام کرنے کے لئے کیوں نہ کافی ہو جاتے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی کوشش کی کہ ابو طالب ایمان لے آئیں مگر وہ ایمان نہ لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کچھ نہ کرسکے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (بے شک جس کو تم محبوب رکھتے اس کو ہدایت نہیں کرسکتے لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت دیں)

دیکھئے بچہ اگر بیمار ہو تو شفا اس کے ہی پینے پینے سے ہوگی باپ کا کام یہ ہے کہ نسخہ لکھوائے دوا لادے اس کو تیار کر دے مگر یہ تو اس کا کام نہیں کہ خود پی بھی لے اور اس کے پینے سے لڑکا اچھا ہو جائے اگر لڑکا دوا نہ پیئے تو ماں باپ کیا کر سکتے ہیں شفا تو اسی کے پینے سے ہوگی یہی حال اصلاح نفس کا ہے، چنانچہ نص میں اس کی تصریح ہے وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (انسان کے لئے وہی ہے جس کی کوشش کرے) معتزلہ نے اس آیت سے ایصال ثواب کی نفی پر استدلال کیا ہے یہ غلطی ہے کیونکہ اس جگہ حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو بات عمل پر موقوف ہے وہ بدون عمل کے حاصل نہ ہوگی بلکہ اپنے ہی عمل سے حاصل ہوگی اور ثواب ہر جگہ عمل پر موقوف نہیں ہے چنانچہ دیگر نصوص ایصال ثواب یا تسبب ثواب کے اس پر شاہد ہیں یہ بات کام کی اس آیت کے متعلق ابھی ذہن میں آئی ہے جو بہت بے تکلف ہے۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور قلب کی حقیقت حدیث کے اس لفظ سے معلوم ہو رہی ہے مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ (ان پر دل سے متوجہ ہو) تو یہ کیا مشکل کام ہے کہ اپنی توجہ کو اِدھر اُدھر نہ لے جاؤ بتلائیے اس میں کیا دشواری ہے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اس کا بھی ذرا اہتمام نہیں نمازیں ہی تمام وساوس ہم کو سوجھتے ہیں غرض حقیقت صلوٰۃ تو حضور قلب سے حاصل ہوتی ہے اور صورت صلوٰۃ اس طرح حاصل ہوگی کہ کوئی کتاب مسائل کی جس میں نماز کے فرائض و واجبات وسنن و مستحبات بیان ہوں لے کر پڑھو اور آجکل اردو میں ایسے رسائل بکثرت شائع ہو گئے ہیں اگر حضور قلب ابھی حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم صورت صلوٰۃ تو کامل کر لو۔ اور حضور کے لئے کوشش کرتے رہو اس وقت یہ کہا جائے گا کہ آپ کی نماز میں صورت صلوٰۃ موجود ہے۔ یہ تو صرف نماز کا بیان تھا اس کے بعد اپنی ساری باتوں کو دیکھو، لین دین کو اور معاملات و معاشرات کو تو ہر شعبہ میں آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری کوئی حالت ظاہر میں بھی شریعت کے مطابق نہیں لہذا اکثر کے اعتبار سے یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ

لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ (اسلام سے اس کا نام ہی باقی رہ جائیگا) جب ہمارا اسلام برائے نام ہے اور ضرورت ہے ترقی کی چنانچہ ترقی کی ضرورت پر سب کا اتفاق ہے اور ترقی ہوتی ہے تدریجاً تو ہم کو چاہئے کہ پہلے درجۂ اسم سے درجۂ رسم تک ترقی کریں پھر ان شاء اللہ تعالیٰ درجۂ رسم سے حقیقت تک بھی وصول ہو جائیگا اس سے معلوم ہوا کہ حالت موجودہ بھی بیکار وفضول نہیں یہ بھی غنیمت ہے ع. بلا بودے اگر ایں ہم نبودے (مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتی) مگر اس کو کافی نہ سمجھو بلکہ تکمیل کی فکر کرو۔ مجکو سب سے زیادہ مقصود اس حدیث کا جزو اول تھا دوسرا جزو تبعاً مذکور ہو گیا اور بحمد اللہ مقصود کے متعلق کافی بیان ہو چکا ہے۔ اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں اور اخیر میں ترقی دنیا کے متعلق اتنا اور کہتا ہوں کہ وہ اگر مقصود بھی ہے تو مقصود بالذات نہیں دین کے تابع ہے جب ہم خدا کو راضی کرلیں گے تو اس کے ہاتھ میں سب خزائن رحمت ہیں وہ ہماری مدد کریں گے پس سب سے مقدم اپنے دین کی درستی ہے جب اس تدبیر پر ہر شخص عمل کریگا تو ہر ایک کی حالت درست ہو جائیگی جس سے مجموعہ خود بخود درست ہو جائے گا پھر اسلام کی حالت جسکو تم روتے ہو درست ہو جائیگی کیونکہ تمہاری ہی کمزوری سے اسلام میں ضعف آیا تھا جب تم قوی تندرست ہو جاؤ گے اسلام بھی قوی ہو جائیگا اور تمہاری قوت کا طریقہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ تم اپنی حالت کی اصلاح کا اہتمام کرو اور خدا تعالیٰ کو راضی کرو۔ جس کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ جو لوگ اصلاح کے طریقے جانتے ہیں ان سے رجوع کرو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں ہمہ گفتیم والیک اندر بسیچ بے عنایاتِ خدا ہیچیم ہیچ
بے عنایات حق وخاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(یعنی ہم نے اوپر بہت سے وعظ و نصیحت کی ہے لیکن جس کام کے پختہ ارادہ کرنے میں جب تک حق تعالیٰ کی عنایت نہ ہو ہم محض ہیچ ہیں اور بدون خدا تعالیٰ اور خاصان خدا کی عنایت کے تو اگر فرضاً فرشتہ بھی ہو تو تیرا ورق سیاہ یعنی اعمال محض سیاہ ہوں گے۔۱۲)

اور خاصان حق کی عنایت حاصل کرنے کا بھی طریقہ یہی ہے کہ تم اپنی تکمیل کی

کوشش کرو اُن کے عنایت و کرم کے لئے روپیہ پیسہ نہیں چاہئے بلکہ وہ تو اُسی سے خوش ہوتے ہیں جس کو کام میں لگا ہوا دیکھتے ہیں گو خدمت کچھ بھی نہ کرتا ہو۔ بچّہ جتنا شوقین ہوتا ہے استاد کی عنایت اتنی ہی بڑھتی ہے، یہی قاعدہ یہاں بھی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق زیادہ دے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی اٰلہ و اصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العٰلمین۔

(اس کے بعد حضرت حکیم الامت دام مجدہم نے حسب معمول ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی)
اور دعا پر بیان ختم ہوا ۱۲ (جامع)

تمت

ضروری معروضہ

الحمد للہ تعالیٰ۔ ثم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۱۹۸۳ء کے رسالہ الابقاء پر آپ کا زرِ سالانہ ختم ہوگیا۔

۱۔ ڈاک خانہ نے وی پی رجسٹری وغیرہ کا خرچہ دُگنا کر دیا ہے۔ الابقاء بذریعہ وی پی منگاتے سے آپ کے چار روپے کا نقصان ہے۔ لہٰذا زرِ سالانہ منی آرڈر سے ارسال فرما کر اپنے چار روپے بچا لیں اور اپنے چار روپے کا نقصان نہ کریں۔

۲۔ جدید سال ۱۹۸۴ء کے لئے بیس روپیہ براہِ کرم آج ہی ارسال فرما دیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

۳۔ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک یا دو دو خریدار کا بھی زرِ سالانہ ارسال فرما دیں تو اس خالص دینی، تبلیغی، اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو مل جاوے گا۔ امید ہے کہ اِن شاء اللہ تعالیٰ ثم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یہ تینوں عرضیں قبول فرما دیں گے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ والسلام۔

طالبِ دعا محمد عبد المنّان غفرلہٗ مکتبہ تھانوی بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی ۱

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

اَلْهُدٰی وَالْمَغْفِرَہ

منجملہ ارشادات

حکیم الاُمّت مجدّد المِلّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غُفِرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ا

ایم اے جناح روڈ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وعظ المسمّٰی بہ

الہدیٰ والمغفرۃ

این	کہاں ہوا	سروٹ ضلع مظفر نگر مدرسہ محمودیہ
متٰی	کب ہوا	۱۳ر جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ بروز یکشنبہ شروع ۹ بجکر ۵۴ منٹ
کم	کتنی دیر ہوا	ختم ۱۲ بجے کل ۳ گھنٹہ ۶ منٹ
کیف	کس طرح ہوا	کرسی پر بیٹھ کر
لِمَ	کیوں ہوا	مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا جس میں ہمیشہ حضرت مولانا کا بیان ہوا کرتا ہے۔
ماذا	کیا مضمون تھا	علم کی فضیلت اور جہل کی مذمت اور عمل و بدعملی کی ترغیب و ترہیب
من استفاد	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	سب مسلمانوں کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفی اللہ عنہ
السامعون	سامعین کی تعداد	۵۰۰ تقریباً
الاشتات	متفرقات	وعظ کے بعد پھر حضرت مولانا راندھیری کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں بہت وعظ ہوئے مگر ضبط نہیں ہوئے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہ

وبارك وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ (یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور مغفرت کو چھوڑ کر عذاب سو دوزخ کے لئے کیسے با ہمت ہیں۔)

یہ ایک آیت ہے سورہ بقرہ جس میں حق تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہ نے اہل کتاب کے متعلق دو وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں کیونکہ اوپر سے اہل کتاب کا ذکر چلا آرہا ہے چنانچہ اس آیت سے پہلے یہ آیت ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

(اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کا اخفا کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں متاع قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نہ تو قیامت میں کلام کریں گے اور نہ ان کی صفائی کریں گے اور ان کو سزائے دردناک ہوگی)

اس میں اہل کتاب کی دین فروشی اور کتمان حق کا ذکر ہے اور اس پر سخت عذاب کی دھمکی ہے اس کے بعد یہ آیت ہے جو میں نے تلاوت کی اس میں ان اعمال سابقہ کا منشا بتلایا گیا ہے کہ اہل کتاب جو دین فروشی اور کتمان حق پر دلیر ہیں اس کا منشا دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ ان لوگوں نے (دنیا میں) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے (آخرت کی چیزوں میں سے) اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کیا اس کے بعد ان دونوں پر سخت وعید ارشاد فرماتے ہیں فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (دوزخ کے لئے کس قدر باہمت ہیں) یہ ایسا ہے جیسا ہمارے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ شاباش ہے اس کی ہمت کو آگ میں کودنے کیلئے کیسا باہمت ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو دوزخ میں جانے کیلئے

کیسے باہمت ہیں خلاصہ یہ کہ آیت میں ترکِ ہدایت اور اختیار ضلالت پر اور ترک اسباب مغفرت واختیار اسباب عذاب پر وعید ہے اور میں نے اسباب کا لفظ ترجمہ میں اس لئے بڑھا دیا کہ عذاب کو بلا واسطہ کوئی اختیار نہیں کر سکتا۔ جس سے بھی پوچھا جائے ہر شخص عذاب سے نفرت وکراہت اور خوف ہی ظاہر کرے گا اور کوئی یہ نہ کہے گا کہ مجھے عذاب لینا منظور ہے مگر حق تعالیٰ نے اسباب کے لفظ کو اس لئے حذف کر دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسباب کو اختیار کرنا مسبّب کو اختیار کرنا ہے۔ دیکھئے جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ بغاوت وقتل کی سزا پھانسی ہے وہ اگر قتل و بغاوت پر اقدام کرے تو عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ کمبخت پھانسی پر لٹکنا چاہتا ہے حالانکہ وہ پھانسی پر لٹکنا ہرگز نہیں چاہتا مگر اس کے اسباب کو جان بوجھ کر اختیار کرنا عقلاء کے نزدیک پھانسی ہی کو اختیار کرنا ہے۔ ایسے ہی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب اُن لوگوں نے اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کر لیا تو یوں کہنا چاہیئے کہ گویا مغفرت کو چھوڑ کر خود عذاب ہی کو اختیار کیا ہے۔ یہ تو وجہ ہوئی جانب عذاب میں اسباب کو مقدر کرنے کی کہ عذاب کو بلا واسطہ کوئی اختیار نہیں کر سکتا۔ اور جانب مغفرت میں لفظ اسباب کے مقدر کرنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ مغفرت ہر شخص کو مطلوب ہے اس کو بھی بلا واسطہ کوئی ترک نہیں کرتا جس سے بھی پوچھو گے وہ طالب مغفرت ہی ہو گا۔ پس ترک مغفرت کے بھی یہی معنی ہیں کہ اس کے اسباب کو ترک کر دیا اور ایک علت مشترکہ مقدر کرنے کی یہ بھی ہے کہ ترک و اختیار کا تعلق ان اشیاء سے ہوا کرتا ہے جو بندہ کی قدرت میں داخل ہوں اور عذاب ومغفرت انسان کی قدرت سے خارج ہیں اس لئے بلا واسطہ ہمارے ترک و اختیار کا تعلق ان کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ البتہ دونوں کے اسباب ہمارے قدرت کے تحت میں ہیں ان کے ساتھ ہمارا ترک و اختیار متعلق ہو سکتا ہے اور اسباب کے واسطہ سے عذاب ومغفرت کے ساتھ بھی ان کا تعلق ہوتا ہے۔

یہ تو ترجمہ تھا آیت کا جس سے معلوم ہو گیا کہ ترک ہدایت و اختیار ضلالت

اور ترک اسباب مغفرت واختیار اسباب عذاب بڑا سنگین جرم ہے جس کے مرتکب کی بابت حق تعالےٰ یوں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جہنم میں جاتے پر بڑے ہی دلیر ہیں اور اس جرأت کو تعجب کے صیغہ سے بیان فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو یہ جہنم میں جانے کے لئے کیسے دلیر اور بے باک ہیں اور غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہی افعال منشار ہیں تمام جرائم کا جن میں سے دین فروشی اور کتمان حق کا ذکر خصوصیت سے اوپر آ بھی چکا ہے کہ ان کا منشا یہی ترک ہدایت واختیار ضلالت وغیرہ ہوا ہے اور اس سے بطور مفہوم کے بھی معلوم ہوا کہ جس طرح ترک ہدایت و ترک مغفرت صدور معاصی و دخول جہنم کا سبب ہے اسی طرح اختیار ہدایت وطلب مغفرت صدور طاعات و دخول جنت کا سبب ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ جہل اور عذاب سے بے خوفی معاصی کا سبب ہے اور علم اور رغبت مغفرت طاعات کا سبب ہے اس طرح یہ آیت ترغیب و ترہیب دونوں کو جامع ہو گئی اس وقت اس کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حاضرین کو معلوم ہے کہ اس وقت ہم ایک دینی مدرسہ کے جلسہ میں مدعو ہیں جس کی غرض یہ ہے کہ حاضرین کے ذہن میں علم کی ضرورت اور اس کی ضد یعنی جہل کی خرابیاں واضح کی جائیں اس لئے میں نے اسی کے مناسب مضمون اختیار کیا چنانچہ میں اس وقت علم وجہل اور عمل وبدعملی کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں صرف ضرورت علم و مذمت جہل پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ اس کے ساتھ عمل اور بدعملی سے بھی بحث کروں گا اور مضمون آیت کو اس غرض سے بہت زیادہ مناسبت ہے جو ترجمہ میں ذرا غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت اختیار کرنا اس کا حاصل یہی ہے کہ علم کو چھوڑ کر جہل کو اختیار کرنا اور چونکہ علم سے مقصود عمل ہے۔ اگر عمل نہ ہوا تو گویا علم ہی نہ ہوا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے اَلشَّئُ اِذَا خَلَا عَنْ فَائِدَتِہٖ لَغَا۔ (شئ جب فائدہ سے خالی ہو بیکار ہوتی ہے) اس طرح ہدیٰ اور ضلالت میں عمل وبدعملی بھی داخل ہے اور آیت کا جزو اول ہی مقصود کے دونوں اجزار

پر دلالت کرنے کے لئے کافی ہوگیا اس کے بعد وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ (اور عذاب کو مغفرت کے عوض) میں تو عمل اور بدعملی کے تصریح ہوگئی کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں عذاب سے اسباب عذاب اور مغفرت سے اسباب مغفرت مراد ہیں اور مغفرت وعذاب کا ترتب اعمال ہی پر ہوتا ہے جن میں علم وجہل بھی داخل ہیں گو بعضوں نے عمل کو افعال جوارح سے مخصوص کیا ہے مگر درحقیقت عمل عام ہے افعال جوارح وافعال قلب دونوں کو کیونکہ عمل کہتے ہیں صرف اختیار کو۔ اور افعال قلب میں بھی صرف اختیار ہوتا ہے تو وہ بھی اعمال میں داخل ہیں اس طرح علم وجہل بھی اسباب مغفرت و اسباب عذاب میں داخل ہوگئے اور اعمال صالحہ واعمال سیئہ تو ان میں داخل ہیں ہی پس مغفرت کا حاصل عمل طاعت ہے کیونکہ مغفرت کا ترتب طاعات ہی پر ہوتا ہے اور عذاب کا حاصل بدعملی ہے کیونکہ اعمال بد ہی پر عذاب کا ترتب ہوتا ہے غرض آیت کے دونوں اجزاء الگ الگ بھی مقصود کے دونوں اجزاء کو مشتمل ہیں اور مجموعۃً بھی کیونکہ میں اوپر بتلا چکا ہوں کہ ہدیٰ میں علم وعمل دونوں داخل ہیں اس لئے کہ علم سے عمل ہی مقصود ہوتا ہے۔ پھر اس کے مقابل ضلالت میں بھی جہل و بدعملی دونوں مراد ہوں گے اور یہ بھی میں نے بتلا دیا کہ مغفرت سے بواسطہ تقدیر اسباب کے عمل طاعت مراد ہے اور علم بھی عمل میں داخل ہے تو عذاب میں بھی جہل اور بدعملی دونوں داخل ہوں گے۔ اور یہ بات ادنیٰ تامل سے معلوم ہوسکتی ہے اور یہی مقصود وقت تھا اس لئے اس آیت کو اختیار کیا گیا رہا یہ کہ ہدیٰ سے مراد علم کیسے ہوا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت کے معنی ہیں راہ نمودن اور یہ علم پر موقوف ہے کیونکہ بدون جانے راستہ بتلانا مشکل ہے یہ تو اصلی معنی ہیں اور یہاں چونکہ ہدیٰ کا مقابلہ اضلال سے نہیں بلکہ ضلالت سے ہے اور ضلالت کے معنی گمراہ ہونے کے ہیں اس تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہدیٰ کے معنے راہ جاننے کے ہیں پس ہدیٰ کا حاصل علم اور ضلالت کا حاصل جہل صادق معلوم ہوا صاحب ہدیٰ وہی ہے جو راستہ جانتا ہو اور راستہ پر چلتا ہو۔ اور گمراہ

ے راستہ بتلانا۔

وہی ہے جو راستہ نہ جانتا ہو یا جان کر اس پر چلتا نہ ہو۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ ہماری حالت کس میں داخل ہے کیونکہ قرآن مجید ہمارے لئے اصلاح کی ایک کتاب ہے ہمیں اس کے مضامین سے اپنی حالت کی اصلاح کرنی چاہیئے یہ تو اجمالاً معلوم ہوگیا کہ قرآن شریف عموماً بھی اور بلواسطہ اس آیت کے خصوصاً یہی علم و عمل کی تعلیم دے رہا ہے اور بدعملی و جہل پر وعید بتلا رہا ہے تو اب ہم کو اپنی حالت میں غور کرنا چاہیئے مریض کو چاہیئے کہ اول طبیب کی تقریر میں غور کرے پھر اپنی حالت میں غور کر کے اس کو اپنے حال پر منطبق کرے کہ میرے اندر یہ امراض ہیں یا نہیں اگر امراض موجود ہیں تو ان کے خطرات پر مطلع ہو کر جلد اصلاح کی کوشش کرے ایسے مسلمان تو کم ہیں جن کو مضامین قرآن کی صحت میں شک ہو یہ تو سب کو مسلم ہے کہ قرآن کے مضامین سب صحیح ہیں مگر غفلت اس سے ہے کہ اپنی حالت میں غور نہیں کرتے اور مضامین قرآن کو اپنے اوپر منطبق نہیں کرتے اہل علم تو بھلا اہل علم ہیں وہ تو اپنے علم پر قناعت کئے ہوئے ہیں ہی گو ان کو بھی اپنی خاص خاص حالت کے اعتبار سے غور و تامل کی ضرورت ہے مگر عموماً غیر اہل علم بھی تو اپنی حالت موجودہ پر قناعت کئے ہوئے ہیں کسی کو اصلاح کی فکر نہیں حیرت ہے کہ اگر کسی مکان میں ذرا سا نقص رہ جائے مثلاً دالان اور سہ دری تیار ہو مگر اسباب رکھنے کے لئے کوٹھری نہ ہو تو اس کو فکر ہوتی ہے کہ اگلے سال ایک کمرہ بنائیں گے اگر زیادہ وسعت بھی نہ ہوئی تو ایک دو کڑیاں تو ضرور بنا ہی دیں گے۔ مگر قصر دین کی تکمیل کا کسی کو بھی خیال نہیں ہے۔ جس تنگ کوٹھری میں ہم بسے ہوئے ہیں اسی پر قناعت ہے اس سے زیادہ ترقی کی ہوس ہی نہیں۔

پھر افسوس یہ ہے کہ خود اس کی درستی کی بھی فکر نہیں۔ اگر وہ کوٹھری کہیں سے گری ہوئی ہے یا اس کی چھت میں دو تین کڑیاں ٹوٹی ہوئی ہیں تو اس کی کچھ پروا نہیں صاحب اگر زیادہ بھی نہ ہو تو کم از کم بقدر ضرورت تو دین کی عمارت درست کر لینی چاہیئے تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک نقص فرائض و واجبات کا ہے اور ایک نقص سنن و مستحبات کا ہے اگر سنن و مستحبات کی تکمیل نہ ہو سکے تو کم از کم فرائض و

واجبات کے نقص کو تو رفع کرلیا جائے گو مسلمان ہونے کا تو مقتضیٰ یہ تھا کہ سنن و مستحبات کی بھی تکمیل کی جاتی کیونکہ مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ دین دنیا سے مقدم ہے تو جب ہم کو قصر دنیا کا نقص گوارا نہیں تو قصر دین کا نقص کیونکر گوارا ہے۔ لیکن افسوس تو اس کا ہے کہ ہم کو فرائض و واجبات کی تکمیل کا بھی اہتمام نہیں شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم معتدلہ میں ہر حالت کے اعتبار سے حکم موجود ہے ؎

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد (ہر مرتبہ وجود سے ایک حکم رکھتا ہے)

شریعت نے عقائد و عبادات کے علاوہ معاملات و معاشرات وغیرہ میں اعتدال کی رعایت کی ہے اور اسی لئے اس امت کا لقب امت عادلہ ہے۔ لیکن ہمارے تمام کام اعتدال سے گذرے ہوئے ہیں۔ کوئی کام بھی افراط و تفریط سے خالی نہیں اگر ہم اپنی حالت میں غور کریں تو معلوم ہو کہ ہماری عبادات بھی ناقص ہیں اور معاملات بھی اور معاشرت تو بالکل ہی گندی ہے۔ پھر وہ نقص سنن میں بھی ہے اور مستحبات میں بھی۔ واجبات میں بھی ہے اور فرائض میں بھی۔ اور اگر کسی کے فرائض و واجبات میں ظاہری نقص نہیں تو باطنی نقص تو ضرور موجود ہے۔ کیونکہ نقصان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جلی، ایک دقیق۔ اگر کوئی نقص جلی سے محفوظ ہے تو نقص خفی سے وہ بھی بچا ہوا نہیں۔ غرض ہمارا وہ حال ہے ؎

تن ہمہ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔ (ہمارا جسم داغوں سے بھرا ہوا ہے پھویہ کہاں کہاں رکھیں)

سر سے پیر تک ہمارا دین زخمی ہے مگر کسی کو بھی علاج کی فکر نہیں۔ بعض لوگوں کو اس سے دھوکہ ہو گیا ہے کہ وہ کاملین کو بھی اپنے نقص کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس سے وہ یوں سمجھ گئے کہ جب ایسے ایسے بزرگ بھی ناقص ہیں تو ہم ہی سے کیا تکمیل ہوگی۔ بس وہ بھی ناقص ہیں۔ اور ہم بھی ناقص۔ تو سب برابر ہیں۔ پھر تکمیل کس سے کرائیں۔ صاحبو! اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ایک شخص کے تو ہاتھ پیر موجود ہوں مگر ان میں درد ہو رہا ہو اور ایک شخص کے ہاتھ پیر ہی نہ ہوں تو یہ دونوں برابر ہو جائیں گے۔ کیا

اس کو کوئی عاقل تسلیم کرے گا ہرگز نہیں۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے بس یہی فرق ہے آپ کے نقص میں اور کاملین کے نقص میں اُن کے تو سب اعضا صحیح سالم ہیں۔ مگر کسی عضو میں درد ہو رہا ہے اس لئے وہ اپنے کو ناقص کہتے ہیں اور آپ کے دین کے تو اعضا بھی تدارد ہیں تو کیا اس حالت میں آپ کو ان کی احتیاج نہیں۔ کیا اپاہج آدمی کو اس شخص کی احتیاج نہیں ہوتی جس کے ہاتھ پیر سالم ہیں چلتا پھرتا ہے گو کسی جگہ اس کے درد بھی ہو مجھے سخت تعجب ہوا ایک شخص کی حالت پر جس نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خط میں دیکھا تھا کہ مولانا قسم کھا کر لکھتے ہیں کہ واللہ میں کچھ نہیں تو اس سے وہ کہنے لگا کہ ہم مولانا کو سچا سمجھتے ہیں اور وہ لکھتے ہیں کہ میں کچھ نہیں تو ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں اور حیرت یہ کہ مولانا کے ایک معتقد بھی شبہ میں پڑے ہوئے تھے کہ حضرت نے یہ جھوٹی قسم کیوں کھائی اس میں کیا تاویل کی جائے۔ میں نے کہا بندۂ خدا ترقی تو انبیاء علیہ السّلام کو بھی ہوتی رہتی ہے اور وہ بھی ترقی کے محتاج ہیں چنانچہ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم فرماتے ہیں وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿اور کہیے میرے پروردگار زیادہ دیجئے مجھ کو علم﴾ اسی طرح اولیاء کو بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ اور وہ انبیاء سے زیادہ ترقی کے محتاج ہیں۔ پس مولانا کی یہ قسم کمالات حقیقیہ انتہائیہ کے اعتبار سے ہے کیونکہ مولانا کی نظر طلب ترقی کی وجہ سے کمالات مستقبلہ پر ہے۔ ان پر نظر کر کے مولانا فرماتے ہیں کہ واللہ میں کچھ نہیں اور ہمارا اعتقاد مولانا کے ساتھ کمالات موجودہ کے اعتبار سے ہے اُن پر نظر کر کے مولانا سب کچھ ہیں اور عارفین کی نظر کبھی اپنے کمالات موجودہ پر نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ ہر دم اس سے آگے پر نظر رہتی ہے۔ اس لئے وہ قسم کھا کر کہدیتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں ہیں۔ پس ان کی قسم بھی سچّی اور ہمارا اعتقاد بھی سچّا ﴿دونوں میں تعارض کچھ نہیں کیونکہ تناقض کے لئے وحدت موضوع بھی شرط ہے اور یہاں موضوع مختلف ہے ۱۲﴾

بلکہ اگر ان کو تمام کمالات ممکنۃ الحصول حالیہ و استقبالیہ بھی حاصل ہو جائیں جس سے ترقی بھی ممکن نہ ہو تب بھی چونکہ اُن کی نظر کمالات حق پر ہوتی ہے ان کے

اعتبار سے پھر بھی وہ قسم کھا کر یہی کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں[۱]۔

اس تقریر سے ان کا شبہ جاتا رہا اور بہت خوش ہوئے معتقد کا شبہ تو ذرا سے اشارے میں رفع ہوجاتا ہے۔ مگر افسوس اُس مخالف کی بد حالی پر ہے جو سمجھانے سے بھی نہ سمجھا اور یہی کہتا رہا کہ آپ کی معتقدانہ تاویلات ہیں ہم تو مولانا کو سچا سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات اس نے بھولے پن سے کہی ہوتی تو زیادہ افسوس نہ ہوتا جیسے ریاست رامپور میں جو پٹھانوں کی بستی ہے۔ ایک بزرگ تشریف لے گئے لوگوں میں اُن کی بزرگی کی شہرت ہوئی تو ایک خاں صاحب ملنے آئے اور کہنے لگے کہ میں نے حضور کی

---

[۱] اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً ایک تحصیلدار یا کلکٹر یا کمشنر اپنے اجلاس میں مسند حکومت پر بیٹھا ہوا ہو کہ دفعۃً وائسرائے وہاں پہنچ جائے انصاف سے دل میں خود کرلیا جائے کہ اس وقت تحصیلدار اور کلکٹر و کمشنر کی کیا حالت ہوگی۔ اس وقت وہ مسند پر ہرگز نہ بیٹھ سکے گا اور نہ حکومت کرسکے گا۔ اور اگر اس وقت کوئی شخص ان کے پاس اپنی حاجت لائے اور وائسرائے کے سامنے ان کی تعظیم وتکریم و مدح وثنا کرنے لگے کہ حضور ایسے ہیں اور سرکار ویسے ہیں تو یقیناً یہ پانی پانی ہوجائیں گے اور قسم کھا کر کہیں گے کہ واللہ ہم کچھ نہیں ہیں اس تعظیم وتکریم وغیرہ کے مستحق حضور وائسرائے بہادر ہیں۔ وہی سب کچھ کرسکتے ہیں ہم کچھ نہیں کرسکتے تو کیا کوئی عاقل اس قسم کی قسم کو جھوٹی کہہ سکتا ہے یا اس بات کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ کلکٹر و کمشنر واقع میں کچھ نہیں ہیں اور ان کو کوئی عہدہ یا اختیار حاصل نہیں ہے کوئی عاقل اس کا یہ مطلب نہیں سمجھ سکتا بلکہ سب یہی کہیں گے کہ کلکٹر و کمشنر بجائے خود بڑا عہدہ اور اختیار رکھتے ہیں مگر وائسرائے کے منصب حکومت وعظمت وجلال کے سامنے اپنے کمالات کو لاشی بتلا رہے ہیں یہی حال کاملین کا ہے کہ وہ بجائے خود صدہا کمالات سے متصف ہوتے ہیں مگر ان کی نظر ہر وقت کمالات حق پر رہتی ہے اور جب ایک ادنیٰ بادشاہ یا وائسرائے کو دیکھ کر حاکم ضلع اپنے کو لاشی محض سمجھنے لگتا ہے تو عارف کمالات حق پر نظر کرکے کیونکر اپنے کمالات کو لاشئ محض نہ سمجھے اللہ جس کی نظر حق تعالیٰ پر ہوگی وہ کبھی اپنے اوپر نظر نہیں کرسکتا وہ تو ایک قسم کیا ہزار قسمیں کھا کر یہی کہے گا کہ میں کچھ نہیں لاشی محض ہوں مجھ میں کچھ کمال نہیں سراپا عیب ہوں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واقع میں بھی کچھ نہ ہو اور زید وعمرو وبکر کے اعتبار سے بھی لاشئے محض ہو خوب سمجھ لو۔ ۱۲ جامع۔

بہت تعریف سنی تھی اس لئے زیارت کا اشتیاق ہوا۔ بزرگ نے فرمایا کہ یہ لوگوں کا حسن ظن ہے میں تو کچھ بھی نہیں ایک نالائق بندہ ہوں تو وہ حافظ صاحب کہنے لگے کہ جب آپ نالائق ہیں تو میں جاتا ہوں، میں خوامخواہ زیارت کو آیا نالایقوں کی زیارت سے کیا فائدہ ؟ یہ کہہ کر چلتے ہوئے۔

راستہ میں ایک دوست ملے ان سے پوچھا کہاں جاتے ہو، کہا فلاں بزرگ صاحب تشریف لائے ہیں اُن کی زیارت کو جاتا ہوں اُنھوں نے کہا کہ وہ تو نالائق آدمی ہیں ان سے مل کر کیا لو گے ؟ دوست نے کہا توبہ کرو توبہ ! وہ تو بڑے بزرگ ہیں، کہا میاں وہ تو اپنی زبان سے خود اپنے کو نالائق کہتے ہیں۔ دوست نے کہا کہ بزرگ اپنے کو یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ کہا اچھا یہ بات ہے تو چلو ہم بھی چلیں گے وہ حافظ صاحب پھر آئے اور کہا حضور مجھ سے غلطی ہوئی میری خطا معاف کیجئے، مجھے معلوم نہ تھا کہ بزرگ جھوٹ بھی بولا کرتے ہیں۔ خوامخواہ اپنے کو نالائق کہہ دیتے ہیں اور واقع میں نالائق نہیں ہوتے میں نے تو یہ سُنا تھا کہ بزرگ سچ بولا کرتے ہیں تو جب آپ نے یہ کہا کہ میں تو نالائق بندہ ہوں میں نے اس کو بھی سچ سمجھا اس لئے اُٹھ کر چلا گیا۔ ان دوسرے صاحب نے بزرگ سے کہا کہ حضرت یہ بھولے سیدھے پٹھانوں کی بستی ہے۔ یہاں ایسی باتیں نہ کہیے یہ تواضع اور فنا کو کچھ نہیں جانتے۔ تو اس پٹھان نے تو بھولے پن سے یہ بات کہی تھی اس لئے اس پر افسوس نہیں مگر اس مخالف نے تو جان بوجھ کر حقیقت سمجھ کر محض عناد سے وہ بات کہی تھی اس کی حالت زیادہ افسوس ناک ہے۔ غرض بزرگوں کے ایسے کلمات سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے اگر وہ اپنے کو ناقص کہیں تو تم ان کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

(تمام جہان اس سبب سے گمراہ ہوا کہ کوئی شخص ابدال حق سے آگاہ نہیں ہوا اور کہا ہم بھی بشر ہیں یہ بھی بشر ہیں ہم اور یہ خواب وخور ونوش میں مقید ہیں)

ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ درمیاں فرقے بود بے منتہا
(انھوں نے اندھاپن سے یہ جانا کہ ہمارے اور ان کے درمیان بے انتہا فرق ہے)
ان کا نقصان ہمارے کمال سے بھی افضل ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
(بزرگوں کے افعال اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ دونوں کے فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیرؔ اور شیر یکساں ہیں)

اور فرماتے ہیں ؎

گرخطا گوید ورا خاطی مگو ور شود پر خوں شہید آں را مشو
خون شہیداں را ز آب اولیٰ تر ست ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر ست
(اگر خطا کہے اس کو خطا کرنے والا مت کہو اگر شہید خون میں لتھڑا ہوا ہو اس کو غسل مت دو شہید کا خون پانی سے بہتر ہے یہ خطا سو صواب سے بہتر ہے)

ان سے اگر واقع میں بھی خطا ہو تب بھی وہ ہمارے صواب سے بہتر ہے کیونکہ ان میں ایسی استعداد موجود ہے جس سے ان کی خطا بھی نورانی ہوتی ہے اور ہمارے اندر ایسی ظلمت ہے جس سے ہمارا صواب بھی ظلمانی ہوتا ہے ان کی استعداد کی یہ حالت ہے۔ یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیۡٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ط (اس کا تیل اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا نور علی نور ہے) ان کے زیت میں اگر آگ لگے گی تو نورٌ علیٰ نور ہوگا جس کی شان ہوگی۔ وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوۡرًا یَّمْشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ (اور ہم نے اس کو ایسا نور دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے) اور ہمارا زیت ایسا چکنا ہوا ہے جس میں اول تو آگ لگنے کی امید ہی نہیں اور اگر لگے گی بھی تو محض ایک ضعیف نور ہوگا جو ظلمت کے ساتھ آمیختہ ہوگا۔ پس بزرگوں کو اپنے نقص کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھ کر ناقص سمجھنا اور اپنے برابر خیال کرنا سخت غلطی ہے۔ صاحبو! وزارت بھی بادشاہت کے اعتبار سے کم درجہ پر ہے مگر کانسٹبلی سے تو افضل ہے

مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود　　　لیک بس عالی ست پیش خاک تود

(اس کا تیل اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا نور علیٰ نور ہے)

بزرگوں کا نقص ایسا ہے جیسے آسمان عرش کے سامنے کم ہے مگر یقیناً آسمان زمین وغیرہ سے تو بڑا ہی ہے۔ ہمارے کمالات کمالات ارضیہ ہیں اور ان کے کمالات سماویہ ہیں جو کمالات الٰہیہ عالیہ متعالیہ سے ضرور کم ہیں مگر ہمارے کمالات سے بدرجہا افضل واکمل ہیں۔ اس لئے ہم کو ان سے استغنا نہیں ہو سکتا کیونکہ جس کو زمین سے عرش پر جانا مقصود ہو اسے آسمان کو ضرور طے کرنا پڑے گا۔ صاحب اہل اللہ اپنے کو ناقص کیوں نہ کہیں وہ تو خدا کے راستہ کو طے کر رہے ہیں جس کی حالت یہ ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست

ہرچہ بروے مے رسی بروے مایست

(بھائی بے نہایت دربار ہے جس مقام پر پہونچی اس مقام پر نہ ٹھہرو باطنی حالت میں ترقی کرو۔)

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ علوم دنیا میں بھی جو لوگ صاحب کمال ہیں وہ بھی اپنے کو ناقص ہی کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک محدود کمال ہے جو ممکن الحصول ہے۔ مگر اس کا بھی حقیقی درجہ بہت عالی ہے۔ اس پر نظر کر کے ہر کامل اپنے کو ناقص ہی کہتا ہے۔ دیکھئے حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم محمود خاں اپنے فن میں کیسے کامل تھے کہ واقعی ان کو طب کا امام کہنا چاہیئے مگر کوئی ان سے پوچھتا تو وہ یہی کہتے کہ ہم کو کیا کمال حاصل ہے کچھ بھی نہیں۔ تو کیا ان کے اس کہنے سے آپ یہ سمجھ لیں گے کہ وہ بھی ایسے ہی ناقص ہیں جیسے ہم ناقص ہیں اور دونوں برابر ہو گئے اور کیا یہ سمجھ کر آپ ان سے علاج کرانا چھوڑ دیں گے ہرگز نہیں بلکہ آپ ان کی اس بات کا یہی مطلب سمجھیں گے یہ اپنے کو طب کے حقیقی کمال پر نظر کر کے جو انکے نزدیک جالینوس وبقراط وغیرہ کو حاصل تھا گو یہ لوگ بھی اپنے کو حقیقی کمال سے قاصر ہی

سمجھتے تھے (۱۲) ناقص کہہ رہے ہیں مگر اس زمانہ میں تو یہ اس فن کے امام اور سب سے زیادہ ہی کامل ہیں۔ افسوس دنیا کے کاموں میں تو لوگوں کو بہت جلدی عقل آجاتی ہے۔ اور کاملین دنیا اپنے کو ناقص کہیں تو اس سے کسی کو دھوکہ نہیں ہوتا نہ ان سے کوئی اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے مگر دین کے باب میں نہ معلوم لوگوں کی عقل کہاں جاتی رہتی ہے اور یہاں ان کو یہ دھوکہ کیوں پیش آتا ہے۔ یاد رکھو جو صاحب کمال ہوگا وہ کبھی اپنے کو صاحب کمال نہ کہے گا ہمیشہ اپنے کو ناقص ہی کہیگا کیونکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں وہ اُس اپنے علم کی وسعت ولا تناہی اور گہرائی سے آگاہ ہے اس پر نظر کر کے وہ اپنے کمال کو کبھی کمال نہیں کہہ سکتا اور جن کو آپ مدعی کمال دیکھتے ہیں ان کو کمال کی ہوا بھی نہیں لگی دعویٰ کمال اکثر ناقصین ہی کیا کرتے ہیں، اہل اللہ کبھی دعویٰ نہیں کر سکتے نہ اپنے کو صاحب کمال کہہ سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کبھی تحدث بالنعمۃ کے طور پر خدا کی نعمتوں کا بیان کر دیں مگر اس وقت بھی ان میں دعویٰ کی شان ہرگز نہیں ہوتی بلکہ عبدیت اور عجز و فنا کی شان غالب ہوتی ہے۔ چونکہ بعض لوگوں کو کاملین کے اعتراف نقص سے دھوکا ہو جاتا ہے اس لئے میں نے تفصیل کے ساتھ اس شبہ کو دفع کر دیا کیونکہ اس چودھویں صدی کے بہت لوگ ذہین ہونے لگے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ جیسے چودھویں رات کا چاند کامل ہوتا ہے۔ ایسے ہی چودھویں صدی کے لوگ بھی کامل ہیں، واقعی کامل تو ہیں مگر اس میں کلام ہے کہ کامل کاہے میں ہیں دنیا کی ذہانت میں تو واقعی کامل ہیں مگر دین کی ذہانت میں کامل نہیں ہیں۔ آج کل کے آدمیوں کی عقل دنیا کے کاموں میں خوب چلتی ہے مگر دین میں کچھ نہیں چلتی (بس یوں کہنا چاہیئے کہ آجکل مادیت کی ترقی اور روحانیت کا تنزل ہے (۱۲ جامع) یہی وجہ ہے کہ اس وقت عام طور پر دین سے غفلت ہے اور تکمیل دین کا کسی کو اہتمام نہیں اسی لئے مسائل دین پر بھی توجہ نہیں۔ کیونکہ مسائل دین کی ضرورت تو اس کو ہو جسے اپنا دین کامل کرنا ہو جیسے مسائل طب کی ضرورت اس کو ہے جسے تکمیل صحت مطلوب ہو مگر آجکل صحت جسم تو لوگوں کو مطلوب ہے صحت قلب مقصود نہیں تو پھر ان کو مسائل دین پر توجہ کیوں ہو۔

دیہاتیوں کو تو کیا کہا جائے وہ تو اپنے ہل پا تھوں میں ایسے مشغول ہیں کہ مسائل دین کے جاننے کی بھی ان کو فرصت نہیں عمل تو کیا ہی کرتے مگر جو لوگ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں جو تقریریں کرتے اور لکچر دیتے پھرتے ہیں۔ جن کو کتب بینی اور سیاست دانی بلکہ ہمہ دانی کا بھی دعویٰ ہے مسائل دین سے وہ بھی بالکل ناواقف ہیں۔ چنانچہ ایک جنٹلمین میرے ساتھ تھے وہ تھانہ بھون میں جوان کا اصلی وطن تھا فرض رباعی کی جماعت میں دو رکعت کے بعد بیٹھ گئے امام نے تو تیسری رکعت کا قیام کیا اور انھوں نے نماز ختم کر دی لوگوں نے بعد میں اس حرکت کی وجہ پوچھی تو کہا میں مسافر ہوں اس لئے میں نے قصر کیا ہے۔ سبحان اللہ اول تو وطن اصلی میں پہنچکر سفر کیسا پھر وہ بھی امام مقیم کے پیچھے۔ اسی طرح ایک صاحب ہمیشہ حضر میں قصر کیا کرتے تھے اور وجہ یہ بتلاتے کہ حدیث میں ہے کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ (دنیا میں مسافر یا رہگذر کی طرح رہ) اور ہم اس کے موافق عمل کرتے ہیں تو ہم ہر وقت مسافر ہی رہتے ہیں۔ گو وطن کے اندر ہی کیوں نہ ہوں ایسے لوگ اپنے کو اہل حدیث کہتے ہیں اور ان کو استدلالات سوجھا کرتے ہیں۔ مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی ایسوں کے نسبت فرماتے تھے کہ یہ لوگ اہل حدیث تو ہیں مگر حدیث سے مراد حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ حدیث النفس ہے یہ لوگ حدیث النفس کا اتباع کرتے ہیں واقعی اکثر تو ایسے ہی ہیں۔ میں سب کو نہیں کہتا بھلا ان حضرت سے کوئی یہ پوچھے کہ تم نے اس حدیث پر عمل کر کے نماز میں تو قصر کیا۔ دنیا کے کاموں میں بھی تو قصر کیا ہوتا مسافر کے ساتھ سفر میں نہ پلنگ ہوتا ہے نہ تخت نہ میز ہے نہ کرسی نہ کپڑوں کے دس بیس جوڑے ہوتے ہیں نہ زمین جائداد ساتھ ہوتی ہے نہ مکان ذاتی ہوتا ہے تو تم نے ان چیزوں میں بھی تو قصر کیا ہوتا مگر ان میں کوئی اختصار نہیں کیا جاتا پس تمہارا یہ دعوے غلط ہے کہ ہم حدیث کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ (دنیا میں مسافر یا رہ گذر کی طرح رہو) پر عمل کرتے ہیں (اور اگر کوئی دنیا کے کاموں میں بھی اختصار کر دے تب بھی اسے اس حدیث سے قصر صلوٰۃ فی الحضر (حضر میں قصر) پر استدلال

کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ کُنْ فِی الدُّنْیَا (دنیا میں رہ) کی قید صراحۃً موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے کاموں میں مسافر کی طرح رہنے کا امر فرما رہے ہیں نہ کہ دین کے کاموں میں، دوسرے آپ نے یہ تو نہیں فرمایا کُنْ فِی الدُّنْیَا مُسَافِرًا (دنیا میں مسافر رہ) بلکہ کَاَنَّکَ مُسَافِرٌ (گویا تو مسافر ہے) فرمایا ہے اور قصر کی اجازت مسافر حقیقی کو ہے نہ کہ مماثل مسافر کو خوب سمجھ لو ۱۲ جامع)

ایک صاحب کی حکایت سنی ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے جنگل میں جاتے کھیت پر جاتے تو قصر کیا کرتے اور کہتے کہ قرآن میں اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ (اور جب تم زمین میں سفر کرو سو تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا کہ تم نماز کو کم کر دو) مطلق آیا ہے اس میں مطلقاً زمین میں چلنے پر قصر کی اجازت دی گئی ہے تین دن یا چار دن کی مسافت کا کچھ ذکر نہیں۔ یہ بھی کوئی اہل حدیث ہی میں سے تھے۔ مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری نے فرمایا تھا کہ پھر جنگل اور کھیت ہی میں جاکر قصر کیوں کرتے ہو بلکہ گھر سے محلہ کی مسجد میں آکر قصر کیا کرو کیونکہ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ (اور جب تم زمین میں سفر کرو) تو اس پر صادق ہے۔ یہ فہم اور دین رہ گیا ہے۔ کچھ نہیں بس یہ لوگ ضُرِبْتُمْ (تم کو پیٹا جائے) بصیغۂ مجہول کے مستحق ہیں۔ پھر غضب یہ کہ اس فہم پر یہ لوگ اپنے کو تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں بس جس نے ایک دو کتابیں ادب تاریخ کی دیکھ لیں وہ بھی اپنے کو عالم سمجھتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جنٹلمینوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم میں شمار کر لیا ہے اور جتنے فضائل احادیث میں علم کے لئے وارد ہیں انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ (ترجمہ) علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں ہو ۱۲) وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چین سے بھی طلب علم کی ترغیب دی ہے حالانکہ اُس وقت چین میں دین کا علم بالکل نہ تھا بلکہ محض دنیوی علم تھا معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا پس انگریزی بھی علم ہے

اوراس حدیث کے تحت میں داخل ہے ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیئے۔ ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں قُلْتُ ذُكِرَ لَهٗ فِي الْمَقَاصِدِ طَرِيقَيْنِ وَقَالَ ابْنُ حِبَّانَ اِنَّهٗ بَاطِلٌ لَا اَصْلَ لَهٗ وَ اَخْرَجَهُ ابْنُ الْجَوْزِيِّ فِي الْمَوْضُوعَاتِ ۱ھ ص ۳۰ = قَالَ وَاَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الشُّعَبِ قُلْتُ وَقَدِ الْتَزَمَ اَنْ لَّا يُخْرِجَ مَوْضُوْعًا فَلَا شُبْهَةَ الْحُكْمَ عَلَيْهِ بِالضُّعْفِ وَالضَّعِيْفُ لَا يُحْتَجُّ بِهٖ فِي الْاَحْكَامِ ۱۲ جامع) (مقاصد میں دو طریق سے اس کو بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے یہ حدیث دو وجہ سے ضعیف ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ باطل بے اصل ہے۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ یہ ضعیف احکام اس کو حجت میں پیش نہیں کیا جا سکتا)

اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی ان لوگوں کا مدعا حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انھوں نے لفظ ولو پر نظر نہیں کی۔ یہ لفظ فرض کے لئے آتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنا چاہیئے اور فرض اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم یا مستبعد ہو موجود کو فرض نہیں کیا جاتا اور دنیوی علم کا چین میں اس وقت موجود ہونا آپ کو مسلم ہے تو اس کو لفظ ولو سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس حدیث میں وہی علم ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا اس لئے بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور وہ علم دین ہی ہے ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو جائیں تو پھر ایک بھنگی اور چمار کو بھی عالم کہنا چاہیئے کیونکہ اس کو بھی دنیا کا ایک علم حاصل ہے۔ جو کام وہ کرتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کر لیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کر لیں گے اور خیر جانے دیجیئے ہم لفظ ولو سے بھی استدلال نہیں کرتے مگر ہم کہتے ہیں کہ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں ہو) میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کونسا علم مراد ہے اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جاوے۔ بس علم شرعی وہ ہے جس کو شریعت علم کہتی ہے

جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی بھی ہیں وہ فرماتے ہیں۔

علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است

(جو علم حق کا راستہ نہ دکھائے وہ جہل ہے۔)

اور حدیث میں ہے اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَمَا فِیْھَا مَلْعُوْنٌ اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہٗ الحدیث (دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ملعون بجز ذکر اللہ کے اور وہ چیز جو ذکر کو قریب کرے) معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے وہ دنیائے ملعونہ ہے اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں۔ اب میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے خدا کی طرف قرب ہوتا ہے؟ وصل ہوتا ہے یا فصل قرب ہوتا ہے یا بعد۔ مشاہدہ ہے کہ ان سے بُعد ہی بڑھتا ہے گو چاہیئے تو یہ تھا کہ سائنس سے اور خدا کی طرف قرب بڑھتا۔ کیونکہ اس سے قدرت صانع کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں اس لئے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوتے زمانہ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں جو اکثر پورے ہوجاتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں اور ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی مگر یہ لوگ باوجود مشاہدۂ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر کہتے ہیں وجہ یہ کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہوگئی اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کرلی۔ ڈلے پتھر ایجاد کرلی۔ اگر ایجاد تمہارے اختیار میں تھی تو پہلے ہی دن کیوں نہ ایجاد کرلی۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو، باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریق آجانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے مگر عادت الہیہ یہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور و فکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتے ہیں اور بعض دفعہ اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لئے ہزار غور و فکر کے

بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے چنانچہ اب تک کسی کو یہ بات نہیں معلوم ہوئی کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور ایسی نظائر بکثرت موجود ہیں اگر غور وفکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا ہمارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کا انکشاف کیوں نہ کرلیا غرض تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ کچھ عوارض کہ بمنزلہ لوازم کے ہیں ایسے جمع ہو رہے ہیں کہ سائنس اور جغرافیہ سے قرب خداوندی نہیں بڑھتا بلکہ بُعد ہی ہوتا ہے تو یہ علم شرعی میں داخل نہیں ہوسکتے اور نہ ان کے جاننے سے دین کا علم حاصل ہوسکتا ہے ہاں ایسے لوگوں کو ایسے علم دین ضرور حاصل ہوجاتا ہے جیسے ایک لیڈر کا قصہ ہے جو آج کل مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں کہ کسی جگہ نماز کا وقت آگیا اور پانی نہ تھا تیمم کی ضرورت ہوئی تو لیڈر صاحب نے اس طرح تیمم کیا کہ اول تو مٹی کو ہاتھوں پر بہایا جیسے پانی کو بہایا کرتے ہیں، پھر کلی کرنے کے واسطے منہ میں مٹی دی شاید اس کے بعد وہ دو ہتڑ بھر کر منہ پر بھی ڈالتے اور مسح کے لئے سر پر بھی ڈالتے اور پیروں پر بھی مٹی بہاتے مگر منہ میں مٹی دیتے ہوئے بعض لوگ ہنس پڑے اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے بس انگریزی پڑھ کر ایسا علم آتا ہے کہ عقل خاک میں مل جاتی ہے بھلا اگر وہ کسی سے پوچھ ہی لیتے کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے تو اس میں کچھ ہرج تھا مگر پوچھتے کس طرح لیڈر ہو کر اپنی جہل کو کیوں کر ظاہر کریں گو مٹی سے کلی کرکے اُس سے زیادہ جہل ظاہر کردیا اور مزا یہ کہ ظہور جہل کے بعد بھی وہ قوم کے لیڈر رہی رہے یہ حالت قوم کی ہے کہ اس جہل پر بھی ان کو مقتدا ہی بنائے رکھا ان ہی حضرت کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک دفعہ موٹر میں سوار تھے نماز کا وقت آگیا موٹر ٹھہرایا گیا اور اسی میں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لی حالانکہ سامنے سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے تھے مگر انھوں نے موٹر کے اندر ہی بیٹھ کر پڑھی۔ بھلا موٹر میں ترک قیام کس طرح جائز ہوگیا۔ جب کہ موٹر کھڑا ہوا تھا۔ چلتی ریل میں تو اگر گرنے کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر نماز کی گنجائش بھی ہے مگر موٹر میں تو چلتے ہوئے بھی ترک قیام کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کا ٹھہرالینا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے اور ریل کا ٹھہرانا ہمارے اختیار میں نہیں اور اگر موٹر کھڑا ہوا ہو تب تو کسی طرح

ترک قیام کی گنجائش ہی نہیں مگر ان لوگوں نے تو محض لیڈر بننے کے لئے نماز شروع کی ہے اس لئے نماز بھی لیڈری ہوتی ہے۔ شرعی نماز کی ان کو کیا ضرورت ہے۔ گو ایسی غلطیاں دیہاتیوں سے بھی ہوتی ہیں اور ان کو بھی مسائل کا علم نہیں مگر وہ اپنے کو تعلیمیافتہ تو نہیں کہتے نہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ بیچارے اپنے جہل کا اقرار کرتے ہیں تو گو ان سے بھی علم دین سے غفلت کرنے پر کچھ مواخذہ ہو مگر شاید ان کے عجز و نیاز کی وجہ سے ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ ہو جائے چاہے تھوڑی سی سزا کے بعد ہی سہی حق تعالےٰ کو عاجز پر بہت رحم آتا ہے اس لئے بعض دفعہ گنہگاروں کو ان کی عاجزی پر بخش دیا جاتا ہے اور دعوے کے ساتھ سارا علم اور تصوف اور تقویٰ بھی دھرا رہ جاتا ہے چنانچہ ایک شخص نے جن کا نام گلاب خان تھا نیک اور صاحب علم تھے مجھ سے ایک طویل خواب دیکھنا بیان کیا جزو مقصود اس کا بیان کرتا ہوں یہ دیکھا کہ میدان قیامت قائم ہے اور حق تعالےٰ ایک ایک کا حساب لے رہے ہیں اور یہ حساب مختلف کتابوں کے امتحان کے رنگ میں ہے اور عرش پر حق تعالےٰ کی تجلی ہے اور عرش کے ایک گوشہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہیں۔ میں بہت ڈر رہا ہوں کہ میرا بھی حساب ہوگا اتنے میں کسی شخص کا امتحان ہوا اور اس پر بہت خفگی ہوئی اور ایسی غضب ناک آواز میں خفگی محسوس ہوئی کہ رعد کی کوئی حقیقت نہیں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ کچھ مدد فرمایئے ارشاد ہوا خفگی کے وقت میں کیا کروں جب میں نے دوبارہ عرض کیا تو ارشاد فرمایا تم یوں کہہ دینا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں چنانچہ مجھ کو پکارا گیا کہ جلالین میں (غالباً) امتحان دو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں اس پر تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا کہ اچھا ایک دن کی قید (جو اوروں کی سزا سے بہت خفیف تھی) اور اس سزا کے بعد بھی بہت جلد نجات بھی دیکھی۔ یہ تو عاجز کے ساتھ معاملہ تھا اب دعوی کا حال سنئے حضرت بایزید بسطامیؒ کا قصہ ہے کہ ان کو کسی نے بعد وفات کے خواب میں دیکھا پوچھا آپ کے ساتھ کیا کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا مجھ سے سوال ہوا تھا کہ ہمارے واسطے کیا لائے۔ میں نے سوچا کہ

اور اعمال تو میرے ناقص ہیں ان کا تو کیا نام لوں، البتہ میں مسلمان ہوں اور بحمد اللہ توحید میری کامل ہے اس کو پیش کر دوں۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ توحید لایا ہوں ارشاد ہوا اما تذکر لیلۃ اللبن وہ دودھ والی رات بھی یاد نہیں رہی۔ یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک رات حضرت بایزید نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا تو آپ کے منہ سے نکل گیا کہ دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہو گیا اس پر مواخذہ ہوا کہ تم نے درد کو دودھ کی طرف منسوب کیا یہی توحید ہے دودھ کی کیا ہستی ہے کہ کچھ تاثیر کر سکے۔ اسباب میں فی نفسہ کچھ تاثیر نہیں یہ تو محض علامات و امارات ہیں۔ موثر حقیقت میں حق تعالیٰ ہیں اور گو آثار کی نسبت اسباب کی طرف کر دینا شرعاً جائز ہے مگر کاملین سے بعض مباحات پر بھی مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ پھر وہ اسناد مجازی کا استعمال کس لئے کرتے ہیں ان کو ہمیشہ اسناد حقیقی کا لحاظ کرنا چاہیئے اور اسباب کی طرف مسببات کی اسناد حقیقی نہیں ہو سکتی ان کی تو حالت مشاہدہ کی یہ ہے ؎

نبارد ہوا تا نگوئی ببار
زمین نا ورد تا نگوئی بیار

(جب آپ ہوا سے یہ نہ کہیں کہ برس اس وقت تک ہوا نہیں برساتی)

اسباب بدون حکم کے کچھ نہیں کر سکتے عارف کا تو مذاق یہ ہوتا ہے ؎

گر گزندت رسد ز خلق مرنج
کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن دوست
کہ دل ہر دو در تصرف اوست

(اگر مخلوق سے تجھ کو کوئی تکلیف پہونچے تو رنجیدہ نہ ہو اس لئے کہ مخلوق سے نہ راحت پہونچ سکتی ہے نہ رنج۔ دوست اور دشمن کے خلاف کو خدا کی طرف سے جان کیونکہ دونوں کا دل اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہیں۔)

جس کا یہ مذاق ہو اور جس پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہو اس کی زبان سے یہ بات کیونکر نکل سکتی ہے کہ دودھ سے پیٹ میں درد ہو گیا۔ مولانا اسی باب میں فرماتے

ہیں۔ ؎

اَنْتَ کَالرِّیْحِ وَنَحْنُ کَالْغُبَارِ — یَخْفَی الرِّیْحُ وَغُبْرَاھَا جِھَارِ
ما ہمہ شیران وبے شیر علم — حملہ شان از باد باشد دمبدم
حملہ شان پیدا و ناپیداست باد — آن کہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(اے از دل ما ۱۲) یعنی حق تعالیٰ کے سامنے اسباب کی ایسی مثال ہے جیسے ہوا کے سامنے غبار ہوتا ہے۔ ظاہر میں غبار اڑتا ہوا نظر نہیں آتا ہے ہوا نظر نہیں آتی مگر ظاہر ہے کہ غبار کی حرکت جو کچھ ہے وہ ہوا ہی کی وجہ سے ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ ہم بھی ظاہر میں شیر کی طرح حملہ کرتے ہیں مگر ایسے شیر ہیں جیسے جھنڈے پر شیر کی تصویر بنی ہوئی ہے کہ جب ہوا چلتی ہے تو وہ حملہ آور معلوم ہوتا ہے مگر حملہ تو ظاہر ہے اور ہوا جس سے ان کی حرکت اور حملہ کا وجود ہوا ہے مخفی ہے اسی طرح ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کا منشا حق تعالیٰ کی مشیت ہے مگر ارادۂ حق مخفی ہے اور ہمارے اعمال ظاہر ہیں اس لئے لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ اسباب کو فاعل کہدیتے ہیں۔ مولانا چونکہ ادب سے بھرے ہوئے ہیں اس لئے آگے ان تشبیہات و تمثیلات سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے لئے کوئی تشبیہہ حقیقی نہیں ہوسکتی سب ناقص مثالیں ہیں اس لئے فرماتے ہیں ؎

اے بروں از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرق من و تمثیل من

سبحان اللہ مولانا کو کیسے عمدہ الفاظ ملتے ہیں۔ مثنوی میں معنوی خوبی تو ہے ہی ظاہری بلاغت و فصاحت بھی بہت اعلیٰ پایہ کی ہے۔ آگے ان تشبیہوں کا عذر بیان کرتے ہیں کہ جب یہ مثالیں ناقص ہیں تو پھر ان کو بیان ہی کیوں کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ بتلاتے ہیں ؎

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت
ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

یعنی بندہ کو آپ کی خوشنما تصویریں بیان کرنے سے صبر نہیں آتا کیونکہ آپ کو دیکھ تو سکتے نہیں تو پھر کیا آپ کے کمالات کو بھی نہ سمجھیں اور آپ کی صفات سے بھی مزے نہ لیں اور اس کے لئے تمثیل وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس گو یہ ناقص مثالیں ہیں مگر ان سے صفات کمال الٰہیہ تک کسی قدر ذہن پہنچ جاتا ہے علماء ظاہر بعض دفعہ عارفین کو بے ادب کہہ دیتے ہیں کیونکہ ان کے کلام میں تمثیلات بہ کثرت ہوتی ہیں کہیں حق تعالیٰ کو ہوا سے تشبیہ دیتے ہیں کہیں دریا سے، کہیں آفتاب سے مگر حقیقت میں عارفین سے زیادہ مؤدب کوئی نہیں اور ان تمثیلات کا عذر مولانا نے بیان کر دیا ہے کہ عاشق کو محبوب کی تصویر سے صبر نہیں آتا اُسے تصویر بھی پیاری ہوتی ہے حالانکہ ذات کے آگے تصویر ہے کیا چیز محض چند نقوش کا مجموعہ ہے مگر جو عشق سے آشنا ہے وہ جانتا ہے کہ کاغذ کی تصویر بھی اُسے کس قدر عزیز ہوتی ہے جب محبوب سامنے نہ ہو تو اس کی تصویر ہی سے دل کو کس قدر تسلی ہو جاتی ہے۔ یہی حال عارفین کی تمثیلات کا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کے تصویر کے واسطے ناقص مثالوں کو ذریعہ بنا لیتے ہیں، گویا ظاہر میں یہ بے ادبی معلوم ہو مگر ان کا باطن عشق کی وجہ سے سراپا ادب ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

بے ادب تر نیست زدکس درجہاں

اور۔ با ادب تر نیست روکس درنہاں

(بے ادب تر ان سے دنیا میں کوئی شخص نہیں اور با ادب بھی زیادہ کوئی نہیں)

غرض مولانا نے اس مقام پر یہ ظاہر فرما دیا ہے کہ موثر حقیقی حق تعالےٰ ہیں کوئی چیز مؤثر نہیں۔ اس مسئلہ کو مولانا نے تمثیلات سے بخوبی واضح کر دیا ہے۔ اور بات یہ ہے کہ یہ مثالیں گو ناقص ہوں مگر ان سے مضمون کی توضیح خوب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین کے کلام سے مخاطب کی تسلی ہو جاتی ہے اور علماء ظاہر کے کلام سے تسلی نہیں ہوتی کیونکہ ان کو ایسی مثالیں نہیں ملتیں جن سے معقول کو محسوس بنا دیں۔ عارفین کو نہ معلوم یہ مثالیں کہاں سے مل جاتی ہیں وہ دقیق سے دقیق مضمون کو

مثالوں سے ایسا واضح کر دیتے ہیں کہ بات دل میں گھس جاتی ہے۔ عارفین نے اس طرز میں عادۃ اللہ اور عادۃ الانبیاء کا اتباع کیا ہے۔ حق تعالیٰ کے کلام میں بھی مثالیں بہت ہوتی ہیں چنانچہ زبور کا زیادہ حصہ امثال ہی ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور حکماء کے اقوال میں بھی امثال بکثرت ہیں جب کمال توحید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کی طرف کسی فعل کی اسناد نہ کی جائے نہ حقیقی نہ مجازی بلکہ ہر فعل کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف کی جائے تو عارف کے نزدیک یہ بات توحید کے خلاف کیوں نہ ہوتی کہ دودھ سے درد ہوگیا چونکہ حضرت بایزیدؒ عارف کامل تھے اس لئے ان سے ان کے درجہ کے موافق مؤاخذہ ہوا کہ یہ ہی توحید ہے جس کو تم ہمارے واسطے لائے ہو کہ دودھ کی طرف درد کی نسبت کرتے ہو۔ حضرت بایزیدؒ یہ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا الٰہی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں' ارشاد ہوا کہ راہ پر آگئے تو جاؤ اب ہم تم کو ایسے عمل سے بخشتے ہیں جس پر تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ اس سے بخشش ہو جائے گی، وہ یہ کہ تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو سردی میں اکڑتے ہوئے دیکھا تھا تم کو اس پر رحم آیا اور اپنے لحاف میں لاکر سلا لیا۔ اس بچے نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو بھی ایسی ہی راحت دیجئے جیسے اس نے مجھے راحت دی، جاؤ آج ہم تم کو اس بلی کے بچے کی دعا سے بخشتے ہیں۔ سارا تصوف گاؤ خوردہ ہوگیا سارے مراقبے اور مجاہدے رکھے رہ گئے اور ایک بلی کے بچے کی سفارش سے بخشے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ ذرا سے دعوے میں حقیقت کھل گئی اور معلوم ہو گیا کہ ہماری توحید بھی ناقص ہے وہ بھی اس قابل نہیں کہ جو خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کی جاسکے حالانکہ حضرت بایزید بسطامیؒ واقع میں عارف کامل تھے ان میں تو محض ایک معنی کر اضافی نقص تھا جب ان سے ذرا سے دعویٰ پر مواخذہ ہوا تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ جہاں اضافی نقص کیا معنے حقیقی نقص موجود ہے بلکہ سر سے پیر تک نقص ہی نقص ہے اور اس پر دعوے ایسے لمبے چوڑے کہ اپنے کو تعلیم یافتہ اور عالم اور مقتدا اور مجتہد سب کچھ سمجھتے ہیں اور عمل کی یہ حالت ہے کہ رات دن گناہوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو دیندار بھی کہلاتے ہیں وہ کسی ایک کام کے اعتبار سے دیندار ہیں دوسرے کاموں میں وہ دینداری کی ذرا

پرواہ نہیں کرتے جیسے آجکل ڈاکٹر ہوتے ہیں کہ کوئی آنکھ کے علاج میں ماہر ہوجاتا ہے وہ یہی کام کرتا ہے اور اسی میں مشہور ہوجاتا ہے آنکھ کے سوا وہ کسی عضو کا علاج نہیں کرتا۔ دوسرا دانت کے علاج میں ماہر ہے وہ اسی کا کام کرتا ہے کوئی چیر پھاڑ کا مشاق ہے وہ زخموں ہی کا علاج کرتا ہے۔ اسی طرح ہم نے بھی دین کے شعبوں میں انتخاب کرلیا ہے جیسے گلستان بوستان کا انتخاب کیا گیا ہے حالانکہ اول تو طبیب کے لئے بھی یہ بات عیب کی ہے کہ وہ کسی خاص مرض ہی کا معالجہ کرتا ہے، کمال جامعیت ہی میں ہے۔ لیکن اگر وہ انتخاب کرے تو چنداں مضائقہ نہیں مگر مریض کو تو انتخاب نہ کرنا چاہیئے کہ اس کی آنکھ ناک اور ہاتھ پیر میں بیماری ہو تو ان میں سے صرف ایک کا علاج کرلے اور باقی اعضاء کا علاج نہ کرے مریض کو ایک عضو کا علاج کرکے کبھی صحت نہیں ہوسکتی اس کو تو سارے ہی جسم کا علاج ضروری ہے ورنہ بیکار ہوجائے گا۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ چند اعضاء میں نقص ہو تو ایک کا علاج پہلے کرے دوسرے کا پیچھے۔ مگر علاج تو سارے جسم کا ہی ضروری ہے اس میں یہ انتخاب کرلینا کہ ایک کا علاج ہو ایک کا نہ ہو سخت حماقت ہے۔ لیکن آج کل انتخاب کا بازار گرم ہے ہر چیز کا ست نکالا جاتا ہے، دین کا بھی ست نکال لیا گیا مگر اس کا نتیجہ وہی ہوگا کہ ایک شخص کی آنکھ اور ناک اور ہاتھ پیر وں میں مرض تھا اور اس نے صرف آنکھ کا علاج کیا تو ظاہر ہے کہ وہ لنگڑا لنجا رہ جائیگا اس انتخاب پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

کسی مسلمان بادشاہ کے زمانہ میں ایک ملحد نے قرآن پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں مکرر آیات بھی موجود ہیں یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا بادشاہ نے اس کو گرفتار کرکے بلایا اور پوچھا قرآن پر تجھ کو کیا شبہ ہے بیان کر۔ اس نے یہی کہا کہ قرآن میں بعض جگہ مکررات موجود ہیں اس لئے یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا، خدا تعالیٰ کو مکررات لانے کی کیا ضرورت تھی۔ بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اس شخص کے اعضاء مکررہ میں سے ایک ایک کاٹ دو۔ ایک ہاتھ رہنے دو اور ایک پیر۔ ایک آنکھ رہنے دو

اور ایک کان کیونکہ یہ خدا کا بنایا ہوا نہیں معلوم ہوتا خدا تعالیٰ کو مکررات کی کیا ضرورت تھی، معلوم ہوتا ہے کسی نے اس میں اضافہ کیا ہے لہذا مکررات کو حذف کردو اور ایک ایک عضو رہنے دو۔ واقعی خوب سزا دی۔ اسی طرح آجکل ہمارے بھائیوں نے دین میں انتخاب کیا ہے کوئی نماز کو ضروری سمجھتا ہے اور نماز ہی کی پابندی کرتا ہے نہ زکوٰۃ دے نہ حج کرے نہ معاملات میں سود اور رشوت سے پرہیز کرے۔ کوئی روزہ کو ضروری سمجھتا ہے اور رمضان میں روزہ کا خوب اہتمام کرتا ہے اور بقیہ اعمال وطاعات کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ کوئی حج کو ضروری خیال کرتا ہے اور حج کرکے اپنے خیال میں جنت کا مالک ہوجاتا ہے۔ اب نہ ظلم سے بچنے کا اہتمام ہے نہ غصب سے نہ امانت میں خیانت سے نہ زنا وغیرہ سے۔ لوگ ایسے ہی حاجی کو پاجی کہتے ہیں غرض اتنا اختلاف ہے آزاد افراد میں کہ اس کو دیکھ کر یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نوع نہیں۔ کیونکہ نوع کے افراد میں اتنا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ جنس ہے اور اس کے افراد انواع ہیں جس میں ہر نوع منحصر فی فرد واحد ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کی یہ تقریر ہے واقعی قیمتی لطیفہ ہے انسان کے ہر ہر فرد کی طبیعت کو دوسرے سے اتنا اختلاف ہے کہ دونوں کو متحد کہنا بعید معلوم ہوتا ہے۔ منطقین نے نطق سب کو متحد مانا ہے جس سے ادراک مراد ہے۔ ایک دیہاتی اور ایک عاقل فلسفی کے ادراک میں اتنا زمین آسمان کا فرق ہے کہ دونوں کو ایک ایک ادراک کے تحت میں داخل کرنا نہایت دشوار ہے۔ بس فلاسفہ ہی نے دونوں کو ایک نوع کے افراد سمجھا ہے ممکن ہے اُن کا ادراک ایسا ہی ہو جو تمام افراد انسان سے متحد ہوسکتا ہو ہم تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ امام ابو حنیفہ کا اور ایک کاشتکار ہل جوتنے والے کا ادراک ایک ہی حقیقت کے دو فرد ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی اصطلاح ہے کہ کوئی اس اختلاف کے بعد بھی انسان کو نوع کہے اور کوئی اس کو نوعیت کے منافی سمجھ کر انسان کو جنس کہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی رائے میں اس درجہ اختلاف ہے کہ شاید اجناس میں بھی اتنا اختلاف نہ ہو اسی وجہ سے دین کے اجزاء میں انتخاب کرنے والے بھی باہم مختلف ہیں جو نماز کو ضروری سمجھتا ہے

وہ نماز کے وقت تو دیندار معلوم ہوتا ہے بہت گڑگڑا کر منہ بنا کر دعائیں مانگتا ہے جیسے بالکل فرشتہ ہیں اور جہاں مسجد سے باہر نکلے پھر شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا ہے۔ بس یہ حالت ہے ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما گہ خندہ زند دیو نہ ناپاکی ما

ایماں چو سلامت بلب گور بریم احسنت بریں چستی و چالاکی ما

گر زندہ برم بگور ایمان خودم

(کبھی فرشتہ کو ہمارے پاکی پر رشک ہوتا ہے اور کبھی ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے۔ جب قبر کے کنارے ہم ایمان سلامت لے جائیں تو ہماری اس چالاکی اور چستی پر آفریں کہنا چاہیئے اگر گور میں اپنا ایمان زندہ لے جائیں۔)

بعض لوگ نماز روزہ حج زکوٰۃ سب کے پابند ہیں، ظاہری گناہوں سے بھی بچتے ہیں مگر ان کو اصلاح اخلاق کا اہتمام نہیں۔ تکبر، حسد، کینہ، ریا وغیرہ میں مبتلا ہیں اور عُجب سے تو شاید ہی کوئی بچا ہو۔ نماز پڑھ کر اپنی حالت کو دوسروں سے اچھا سمجھتے ہیں بے نمازیوں کو حقیر جانتے ہیں اہل علم اور ذاکرین بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ علماء کو اپنے علم پر ناز ہے وہ جہلاء کو جانور سمجھتے ہیں ذاکرین کو ذکر و شغل پر ناز ہے وہ غیر ذاکرین کو بیہودہ سمجھتے ہیں، یہاں ایک علمی شبہ ہوتا ہے میں اس کو رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اگر کوئی آدمی نماز پڑھے روزہ رکھے تو کیا وہ اپنے کو نمازی نہ سمجھے بے نمازی ہی سمجھے اور خدا نے ایمان کی دولت عطا کی ہے تو کیا وہ اپنے کو مومن نہ سمجھے اپنے کو کافر سمجھے اگر یہی تواضع ہے تو یہ تو ایسا واقعہ ہوا جیسے میں ایک دفعہ الہ آباد سے کانپور جا رہا تھا ریل میں چند نوجوان جنٹلمین سوار تھے اور ایک منصف صاحب بھی سوار تھے وہ منصف صاحب پرانے آدمی سادی وضع کے تھے تو جنٹلمینوں نے ان کو بنانا شروع کیا کھانے کا دسترخوان بچھایا اور ایک نے منصف صاحب سے کہا کہ جناب آپ بھی گوہ موت کچھ کھا لیجیے، دوسرے ساتھی نے کہا کمبخت توبہ کر توبہ کھانے کو گوہ موت کہتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ اپنے کھانے کو کھانا کہنا یہ بھی تکبر ہے۔ اس حیثیت سے

کہ اپنا کھاتا ہے گوہ موت کہنا ہی تواضع ہے۔ اس قاعدہ سے تو واقعی اپنے ایمان کو ایمان کہنا تکبر ہے اور اسے کفر کہنا ہی تواضع ہے مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ ناشکری میں داخل ہے تو اگر نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی نہ کہے تب تو ناشکری اور اگر نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی سمجھیں اور نمازی کہیں تو یہ لَا تُزَكُّوا اَنْفُسَكُمْ (اپنے نفس کا تزکیہ نہ بیان کرو) کے خلاف ہے اور عجب میں داخل ہے تو اب حیرت ہوتی ہے کہ کیا کریں اور کیا سمجھیں اور کیا کہیں۔ اس حیرت میں بعض ناحقیقت شناس تو گھبرا کر کہہ اٹھے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(تختہ سے باندھ کر قعر دریا میں ڈال دیا ہے پھر کہتے ہو ہشیار دامن نہ بھیگے)

(وقال شاعر من العرب ؎ (عرب کے شاعر نے کہا ہے)

القاہ فی الیم مکتوفا وقال لہٗ ایاک ایاک لا تبتل بالماء

(دریا میں باندھ اس کو ڈالدیا ہے پھر کہتے ہیں خبردار پانی نہ بھیگ ۱۲ جامع)

مگر محققین نے اس حیرت کو رفع فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں کہ نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی ہی کہے اور نمازی سمجھے مگر ساتھ میں یہ بھی سمجھے کہ یہ میرا کمال نہیں بلکہ محض عطائے حق ہے اور یوں کہے ؎

وَاللّٰہِ لَوْلَا اللّٰہُ مَا اهْتَدَیْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا

اور یوں کہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰہُ۔ (اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچا دیا اور نہ ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہونچاتے)

یعنی بخدا اگر خدا کا فضل نہ ہوتا تو نہ ہم سے صدقہ خیرات ہو سکتا نہ نماز پڑھ سکتے خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو ان کاموں کی توفیق دی اگر خدا تعالیٰ توفیق نہ دے تو ہم ہرگز یہ کام نہ کر سکتے۔

صاحبو! اگر کسی چمار کو بادشاہ ایک بیش قیمت موتی دیدے جو اس کی لیاقت سے

کہیں زیادہ ہے تو بتلایئے وہ کیا کہے کیا وہ اپنے کو موتی والا نہ کہے۔ نہیں موتی والا ضرور کہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہے کہ بادشاہ کی بڑی عنایت ہے کہ ایک چمار کو اتنی بڑی چیز دیدی۔ اسی طرح آپ نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی سمجھیں مگر ساتھ میں یہ بھی سمجھیں کہ ہم تو اصل میں نالائق تھے اس نعمت کے قابل نہ تھے یہ خدا کی عطا ہے کہ ہم جیسے نالائقوں کو اپنے دربار میں آنے کی اجازت دیدی دیکھئے اب شکر اور تواضع دونوں جمع ہوگئے اس طریق میں نہ عطائے حق کی ناشکری ہوئی نہ تکبر ہوا۔ نماز کو نماز بھی سمجھا اور اپنے کو نالائق بھی سمجھا اور نماز کو محض عطائے حق سمجھا اس صورت میں آپ نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر نہیں سمجھیں گے ہاں ان کے حال پر رحم کریں گے بلکہ اگر ضرورت ہو تو بے نمازوں کو دھمکاؤ بھی اور جن پر زور ہو ان کو مار دبھی مگر اس سزا کی شان یہ ہو کہ جیسے بادشاہ بھنگی کو حکم دے کہ کسی جرم میں شاہزادے کے سو تازیانے مارے تو وہ حکم شاہی کی وجہ سے مارے گا تو سہی مگر دل میں تھوڑا تھوڑا ہوتا جاوے گا اور اسے کبھی بھی شاہزادے سے افضل ہونے کا گمان نہیں ہو سکتا محض مجبور ہو کر حکم کی تعمیل کرے گا بس یہی حال ہمارا بھی ہونا چاہیئے کہ شریعت کے حکم سے اپنے نوکروں چاکروں کی اصلاح کریں اہل وعیال پر حکومت کریں بے نمازوں کو ماریں دھمکائیں مگر ان کو اپنے سے افضل سمجھیں مگر جزماً افضل نہ سمجھو تو کم از کم احتمالاً ہی سمجھو کہ شاید خدا تعالےٰ کے نزدیک کسی خاص صفت یا فعل کے سبب یہ ہم سے فی الحال افضل ہو یا فی المال اس کو افضل بنا دیں کیونکہ آپ کو محض خدا تعالیٰ کی توفیق سے نماز وغیرہ کی توفیق ہوئی ہے اور وہ توفیق کو سلب بھی کر سکتے ہیں وہ پکے نمازی کو بھی بے نمازی بنا سکتے ہیں اور ہماری اور آپ کی تو حقیقت ہی کیا ہے حق تعالےٰ تو اپنے حبیب (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کو یہ فرماتے ہیں۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ (ترجمہ) اور اگر ہم چاہیں تو اس وحی کو بالکل سلب کرلیں جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو کارساز نہ پائیں۔

آہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا خطاب دلیل ہے قرآن کے کلام اللہ ہونے کی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی ہمت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا خطاب کرسکے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا مضمون خود بنا سکتے تھے جس سے آپ کے کمالات کے زوال کا امکان ظاہر ہو پھر چونکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کانپ اٹھنے کا موقعہ تھا اس لئے آگے تسلی فرماتے ہیں ؛ اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ یعنی صرف رحمت کارسازی کرسکتی ہے۔ پھر چونکہ رحمت مشیت کے تابع ہے اور مشیت ہر مقدور کے ساتھ متعلق ہوسکتی ہے تو یہ کیسے معلوم ہو کہ یہاں مشیت کا تعلق بصورت رحمت ہی ہوگا اس لئے آگے تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں اِنَّ فضلہ کان علیك کبیرا ہ بیشک خدا تعالیٰ کا فضل آپ کے حال پر بہت کچھ ہے۔ اب پوری تسلی ہوگئی کہ گو حق تعالیٰ کو سلب وحی پر پوری قدرت ہے مگر بوجہ کمال فضل کے سلب کا وقوع کبھی نہ ہوگا پس وہ ممتنع بالذات نہیں تو ممتنع بالغیر ضرور ہے اور فضل و رحمت کے ساتھ سلب پر قدرت ہونا یہی علامت ہے غایت رحمت وفضل کی کہ ایک بات پر قدرت ہے مگر فضل و انعام کی وجہ سے قدرت کو ظاہر نہیں کرتے اور اگر سلب پر قدرت نہ ہوتی تو اضطرار ہوتا اور اضطرار کی صورت میں وحی کا سلب نہ ہونا دلیل رحمت وفضل نہ ہوتی غرض ایک دفعہ کو حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فرمادیا کہ ہم ایسے قادر ہیں کہ آپ جیسے کامل و اکمل کے کمالات بھی سلب کرسکتے ہیں گو کریں گے کبھی نہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ ارشاد ہے پھر ہم تو کیا چیز ہیں جو دعویٰ کرسکیں۔ ہماری نماز کیا اور ہمارا علم کیا اگر حق تعالیٰ چاہیں تو دم بھر میں سب سلب کرلیں۔

مولانا محمد رشید کانپوری رحمۃ اللہ علیہ کو فالج پڑا تھا تو سورۂ فاتحہ تک بھول گئے تھے حالانکہ وہ بہت بڑے عالم وفقیہ تھے مگر فالج میں یہ حالت ہوئی کہ علم تو الگ رہا سورۂ فاتحہ تک بھی بھول گئے تھے جو مسلمانوں کے بچوں کو بھی یاد ہوتی ہے۔ جب فالج سے افاقہ ہونے کے بعد ہفتہ بھر میں ان کو الحمد یاد ہوئی تو کثیر مقدار میں شیرینی تقسیم ہوئی تھی جیسے بچوں کو بسم اللہ کے موقعہ پر مٹھائی بانٹا کرتے ہیں۔ واقعی

عبرت کا موقعہ ہے۔ ایک بار مجھے خود یہ واقعہ پیش آیا کہ عشا کے بعد ذرا سی دیر مدرسہ میں لیٹ کر جو میں گھر جانے لگا تو گھر کا راستہ بھول گیا۔ حالانکہ گھر مدرسہ سے کچھ بھی دور نہیں نہ راستہ پیچدار سیدھا راستہ برسوں سے پیروں کو لگا ہوا مگر اس وقت بالکل بھول گیا۔ اور دوسروں کے گھر پر جا پہنچا۔ جب وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہ فلاں شخص کا گھر ہے۔ تو پھر بہت ہی مشکل سے سوچ ساچ کر اپنے گھر پہونچا۔ بس سمجھ لیجئے کہ ہمارا علم کیا ہے کچھ بھی نہیں سب خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور موٹی بات ہے کہ رات کو سوتے ہوئے روزانہ ہمارے سب علوم سلب ہو جاتے ہیں پھر یہ حق تعالیٰ کا فضل ہی تو ہے کہ صبح کو سب خزانہ واپس مل جاتا ہے اگر وہ چاہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ جیسے سوتے ہوئے علم سے معرّا ہو گئے تھے ایسے ہی صبح کو کورے کے کورے اٹھیں اس لئے ہم کو دعویٰ ہرگز نہ کرنا چاہیے۔ دیکھئے حضرت بایزیدؒ کے منہ سے توحید کا دعویٰ نکل گیا تھا اسی لئے اسی وقت مواخذہ ہوا اور حقیقت کھل گئی جب دعوے کے بعد ایسے کاملین کی توحید بھی ناقص ثابت ہوئی تو ہمارا تو کیا منہ ہے جو دعویٰ کریں ہماری توحید ہی کیا ہے۔ بس ہماری توحید تو اتنی ہے کہ دل سے اعتقاد اور زبان سے تکلماً خدا تعالیٰ کو واحد کہتے ہیں گو اس کی حقیقت منکشف نہ ہو وہ حقیقت یہ ہے ؎

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

یعنی خدا تعالیٰ کے سوا کسی فاعل کا مشاہدہ ہی نہ کرے گا مگر اس جگہ یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ توحید کا یہ مرتبہ عارفین کے ساتھ مخصوص ہے عام لوگ اس کے مکلف نہیں ہیں کہ کسی سبب کی طرف بھی مسبب کو منسوب نہ کریں ان کو اس کی اجازت ہے۔ بس وہ تو اس کے مکلف ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی چیز کو موثر حقیقی نہ سمجھیں۔ اس کے بعد اگر وہ تاثیر مجازی کے درجہ میں کسی سبب کی طرف اثر کو مضاف کر دیں تو ان سے مواخذہ نہ ہوگا۔ البتہ کاملین سے اس پر بھی مواخذہ ہوتا ہے وہ اس کے بھی مکلف ہیں کہ تاثیر مجازی کے درجہ میں بھی کسی چیز کی طرف اسنا دنہ کریں اور عوام کو اس کا

مکلف اس لئے نہیں کیا گیا کہ اگر وہ جملہ حوادث کی نسبت بلا واسطہ حق تعالیٰ کی طرف کرنے لگیں نافع کاموں کی بھی اور مضر کاموں کی بھی تو چونکہ ان کے قلوب میں حق تعالیٰ کی محبت وعظمت اس قدر نہیں اس لئے اندیشہ ہے کہ نعوذ باللہ ان کے قلب میں حق تعالیٰ کی طرف سے ناگواری پیدا نہ ہو جائے اور عارفین کو بوجہ غلبۂ محبت کے یہ ضرر نہیں ہوتا۔ یہاں سے اسباب کی حکمت معلوم ہو گئی کہ حق تعالیٰ نے ان کو بیچ میں واسطہ اس لئے بنا دیا ہے تاکہ عوام کو ضرر یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے ناگواری نہ ہو۔ اب یہاں میں آپ کو ایک بات بتلاتا ہوں جس سے حضرت حاجی صاحب کا امام فن ہونا معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت نے ضیاء القلوب میں مراقبہ توحید کو نقل کر کے تحریر فرمایا ہے۔ لیکن محققان حال ازیں مراقبہ منع فرمودہ اند۔ (لیکن محققین نے اس مراقبہ سے منع فرمایا ہے)

میں عرصہ تک اس شش و پنج میں رہا کہ محققین نے اس مراقبہ سے کیوں منع کیا اس میں کیا مفسدہ تھا بہت دنوں کے بعد حقیقت واضح ہوئی اس وقت حضرت کے اس جملہ کی قدر ہوئی۔ ضیاء القلوب عجیب متن ہے جب یہ کتاب لکھی گئی تو مولانا محمد قاسم صاحب نے حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا تھا کہ حضرت اس کی تو بہت بڑی شرح ہو سکتی ہے۔ حضرت نے بہت سادہ لہجہ سے فرمایا کہ بھائی میں نے متن لکھ دیا ہے تم شرح کر دو۔ بہرحال حضرت نے مراقبہ توحید سے ممانعت فرمائی ہے۔ اور میں نے حضرت کے سوا کسی محقق کے کلام میں اس کی ممانعت نہیں دیکھی۔ اب یا تو حضرت نے کسی کے کلام میں یہ بات دیکھی ہو یا کسی سے زبانی سنی ہو یا خود حضرت ہی کی رائے ہو جسے ابہام کے ساتھ تحریر فرما دیا اور یہی ظاہر ہے اس میں راز وہی ہے جو مجملاً اوپر عرض کیا ہے یعنی اس زمانہ میں قلوب میں محبت الٰہی کم ہے اس حالت قلت محبت میں اگر توحید مذکور کا تحقق ہوا تو تمام افعال کو حق تعالیٰ کا فعل سمجھے گا۔ اولاد مر گئی یا کوئی مالی نقصان ہو گیا تو اس شخص کو حق تعالیٰ کا فعل بلا واسطہ منکشف ہو گا اور محبت ہے کم تو خدا تعالیٰ سے نعوذ باللہ عداوت و بغض ہو جاوے گا۔ اس لئے آجکل اس توحید کا انکشاف عام طور پر نافع نہیں ہوتا۔

اور اگر محبت کامل ہو تو پھر کچھ ضرر نہیں ہوتا محب کا تو حال ہوگا اور قال یہ ؎

زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو

دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے قتل کریں آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے
جو کچھ کریں اس پر راضی ہوں۔)

اور وہ یوں کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت
رہے کہ آپ خنجر آزمائی کریں)

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آجکل ہم لوگوں نے دین میں انتخاب کر لیا ہے۔ کسی نے صرف نماز کو لے لیا کسی نے صرف روزہ کو کسی نے عبادات میں واجبات و فرائض کا اہتمام کیا تو اخلاق کو چھوڑ دیا۔ اس لئے اعمال بلا اخلاق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھ کر عجب اور تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، دعویٰ اور فخر کرنے لگتے ہیں، دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس حالت کی اصلاح کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے ایسے لوگوں نے دین کو نماز روزہ پر منحصر سمجھ لیا ہے اخلاق و معاملات کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ چنانچہ اخلاق کی کیفیت تو اوپر معلوم ہو چکی معاملات کی حالت یہ ہے کہ مسلمان معاملات عدالت کو وکلاء سے تو پوچھتے ہیں علماء سے کبھی نہیں پوچھتے کہ ہم یہ معاملہ کس طرح کریں یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کو معاملات سے کیا مطلب۔ چنانچہ بعض بدنصیب اس بات کو زبان سے بھی کہہ دیتے ہیں جو کہ ایک سخت کفریہ کلمہ ہے ایک شخص کی لڑکی بیوہ ہو گئی تھی لوگ اس کو عقد ثانی کی ترغیب دے رہے تھے کہ بیوہ کے نکاح کی شریعت میں بہت فضیلت ہے تم اپنی لڑکی کا دوسرا عقد کر دو۔ تو وہ کمبخت کہتا ہے

(نقل کفر کفر نہ باشد) کہ صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے روزہ نماز کے نبی ہیں شادی بیاہ کے نبی نہیں۔ اس میں ہم اپنی رائے سے جو چاہیں گے کریں گے (نعوذ باللہ و استغفر اللہ) ایک عورت کمبخت نے اسی باب میں جبکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض صاحبزادیوں کے عقد ثانی کا ذکر کیا گیا تو اس نے سن کر یہ کہا کہ (نعوذ باللہ) وہ لڑکیاں جن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد ثانی کیا ہے شریف بیوی کے پیٹ سے نہ تھیں (نعوذ باللہ) دیکھو حضرت فاطمہ کا نہیں ہوا۔ کمبخت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو کم ذات قرار دیا۔ بھلا کوئی اس احمق سے یہ پوچھے کہ تو نے جو حضرت فاطمہؓ کی مثال دی تو ان کے عقد ثانی کی ضرورت ہی کہاں اور کب ہوئی تھی وہ تو حضرت علیؓ کے سامنے ہی انتقال فرما گئی تھیں۔ پھر اس احمق کو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب بیٹیاں ایک ہی بیوی سے تھیں اور دوسری بیبیوں سے آپ کی اولاد ہوئی ہی نہیں اور ہوئی بھی تو وہ سب بھی حضرت فاطمہؓ زہرا جیسی شریف زادیاں ہوئیں کیونکہ آپ کی سب بیبیاں عالی خاندان اور اشرف نسب کی تھیں غرض معاملات میں اکثر لوگ اپنے کو خود مختار سمجھتے ہیں اور شریعت میں ان کو داخل ہی نہیں سمجھتے۔

اس انتخاب کی وجہ سے ہماری وہ حالت ہو رہی ہے کہ کسی کے ہاتھ ہے تو پیر نہیں سر ہے تو دھڑ نہیں۔ دھڑ ہے تو سر نہیں۔ مجموعہ ملکر تو ایک ایک فرد سالم نکل سکتا ہے مگر فرداً فرداً تو ہم سب ناقص ہی ہیں اور بقاعدہ منطق دیکھا جاوے تو مجموعہ بھی ناقص ہی ہے۔ کیونکہ ناقصین کا مجموعہ بھی منطقی قاعدہ سے ناقص ہی ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ اس نقص ہی پر کفایت کئے ہوئے ہیں مجموعہ کے کامل ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

آج کل ایک نئی تفسیر چھپی ہے جس کی تمہید میں لکھا ہے کہ اس تفسیر کی تصنیف میں بہت سے علماء جمع تھے تو سب کامل نہ تھے، ہر فرد ناقص تھا مگر مجموعہ مل کر تو ضرور کامل ہو گیا تھا۔ سو وہ ایسا مجموعہ تھا جیسے ایک بنئے نے دریا کے کنارے پہنچ کر گاڑی بان سے

کہا تھا کہ پانی کو کنارے اور درمیان سے دیکھ کر بتلاؤ اس نے بتلایا تو آپ نے سب کا اوسط نکال لیا اوسط کے حساب سے ہر حصہ میں پانی کمر تک نکلا آپ نے حکم دیا کہ گاڑی ڈال دو کیونکہ اوسط نکالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم ڈوبیں گے نہیں، اس لئے گاڑی ڈال دی جب بیچ میں پہونچے تو لگے ڈوبنے۔ بنئے نے فوراً حساب کو پھر دیکھا تو اوسط حساب کا برابر تھا تو آپ فرماتے ہیں لکھا جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں۔ یہ برکت مجموعہ کے اعتبار سے کرنے کی ہوئی اسی طرح اس مفسر نے چند ناقصوں کو ملا کر ایک مجموعہ بنایا کہ ایک تو کامل ہوگیا۔ جی ہاں وہ ایسا کامل ہوا ہے کہ سب کو لے کر ڈوبے گا۔

صاحبو! کیا ایک محلہ کے بہت سے آدمی مل کر اپنے مکانوں کی ایسی تکمیل پر کفایت کر سکتے ہیں کہ فرداً فرداً تو ہر ایک کا مکان ناقص ہو اور مجموعہ ملا کر سب حاجات مجتمع ہوں کہ ایک گھر میں باورچی خانہ نہ ہو اور ایک کے گھر میں پاخانہ نہ ہو باورچی خانہ ہو۔ ایک کے یہاں دالان نہ ہو سہ دری ہو، دوسرے کے ہاں سہ دری نہ ہو دالان ہو۔ ایک کے مکان میں اوپر بھی کمرہ ہو دوسرے کے یہاں نہ ہو۔ کسی کے یہاں بیٹھک ہو کسی کے یہاں نہ ہو اور سب یہ کہکر خوش ہو رہیں کہ بلا سے الگ الگ گو ہر ایک کا گھر ناقص ہے مگر تکمیل افراد کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ مجموعہ تو کامل ہے۔ بھلا ایسے کمال مجموعی سے نفع کیا۔ اگر کسی کو رات کے بارہ بجے پاخانہ لگا تو وہ اس کمال سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے کیا آدھی رات دوسرے کے گھر بھگنے جائے گا اور جس کے یہاں باورچی خانہ نہیں کیا وہ روزانہ دوسرے کے چولھے پر کھانا پکایا کرے گا۔

صاحب غور کر کے دیکھ لیجئے چار دن میں حقیقت نظر آجائے گی۔ دنیا کے معاملات میں سب جانتے ہیں کہ کمال مجموعی محض فضول ہے بلکہ کمال شخصی کی ضرورت ہے اسی لئے ہر شخص فرداً فرداً اپنے مکان کی تکمیل میں کوشش کرتا ہے اور دوسرے شخص کے مکان کے بھروسہ پر کبھی اپنے گھر کو ناقص نہیں رکھ سکتا مگر دین کے بارے میں عقل مسخ ہو جاتی ہے۔

اور سنئے اگر چند مریض اکٹھے ہو کر باہم یہ کہیں کہ میاں بعض اعضا تمہارے درست

ہیں اور بعض اعضا، میرے اور بعض فلاں کے بس مجموعہ کامل ہے۔ پھر حکیم صاحب کے پاس جانے اور علاج کرانے کی کیا ضرورت ہے بتلایئے کیا اس طرح وہ تندرست ہوسکتے ہیں ہرگز نہیں ان شاء اللہ سب ہی مریں گے۔ اسی طرح دین میں بھی اس سے کام نہیں چل سکتا کہ ایک نے نماز پڑھ لی، ایک نے روزہ رکھ لیا ایک نے زکوٰۃ دے دی، ایک نے حج کرلیا۔ بلکہ ہر ہر شخص کو اپنی ہر ہر حالت کی تکمیل پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، جس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول علم کی، پھر عمل کی کیونکہ عمل بدون علم کے نہیں ہوسکتا۔ کوئی کام بھی ہو پہلے اس کا طریقہ جاننا ضروری ہے پھر اگر علم کامل ہے تو عمل بھی کامل ہوگا اور علم ناقص ہے تو عمل بھی ناقص ہوگا دنیا کے کاموں ہی کو دیکھ لیجئے کہ جو شخص جس کام کو خوب جانتا ہے وہ اس کو عمدگی سے کرتا ہے اور جو پوری طرح نہیں جانتا وہ بہت غلطیاں کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ کام کو خراب کردیتا ہے۔ ایک شخص اصول تجارت سے واقف ہے وہ تجارت اچھی طرح سے کرے گا۔ تھوڑے سرمایہ سے بہت کچھ نفع کمالے گا، اور ایک شخص اصول تجارت سے ناواقف ہے اس کو نفع تو کیا ہوتا بعض دفعہ اصل سرمایہ بھی ڈبو دیتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص زراعت کا طریقہ جانتا ہے وہ تھوڑی سی محنت سے بہت فائدہ حاصل کرلیتا ہے اور جو اس کام کو نہیں جانتا وہ بیج کو بھی ضائع کردیتا ہے۔

میں کہاں تک مثالیں دوں خود سوچتے چلے جاؤ بس یہی حال دین کا ہے۔ لے اللہ آخر اس کی وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ دنیا کے کاموں کا قاعدہ تو سب جانتے ہیں اور اس میں سب کا یہی مشورہ ہوتا ہے کہ بھائی پہلے اس کام کو سیکھ لو پھر کرنا مگر دین کے بارے میں علم کی ضرورت کوئی نہیں سمجھتا۔ پس جو لوگ دین پر عمل ہی نہیں کرتے وہ بھی سن لیں اور جو عمل کر رہے ہیں وہ بھی سن لیں کہ علم کی ضرورت سب کو ہے کیونکہ جو لوگ دین پر عمل کر رہے ہیں اگر وہ علم سے کورے ہیں تو ان کا عمل ضرور ناقص ہوگا ان کو تکمیل عمل کے لئے علم کی ضرورت ہے اور جو عمل نہیں کرتے ان کو عمل کی بھی ضرورت۔ اور چونکہ وہ موقوف ہے علم پر اس لئے پھر علم کی ضرورت۔ غرض علم کی ضرورت سب کے

لئے ہوئی۔ رہا عمل تو خود علم کی غایت وہی ہے تو اس کی ضرورت میں کیا کلام ہو سکتا ہے مگر یہ ضرورت نہیں کہ پہلے ہی دن فاضل بھی بن جائیں اور کامل بھی بن جائیں۔ بلکہ ایک ایک دو دو بات سیکھ کر اس کے موافق عمل شروع کر دیں۔ پھر علم و عمل دونوں کی تکمیل میں لگے رہیں۔ ان شاء اللہ ایک دن دونوں میں کمال حاصل ہو جائے گا۔

افسوس تو اس کا ہے کہ ہم لوگوں نے نقصان پر قناعت کر رکھی ہے۔ تکمیل کا اہتمام ہی نہیں اس آیت میں جو میں نے تلاوت کی ہے ان ہی دو چیزوں کا ذکر ہے علم کا اور عمل کا اس میں حق تعالیٰ نے ہدیٰ و مغفرت کی ترغیب دی ہے (ہدیٰ سے مراد علم اور مغفرت سے مراد عمل طاقت ہے ۱۲) اور جہل و بدعملی پر وعید بیان فرمائی ہے شاید اس پر طلباء یہ شبہ کریں کہ یہ آیت تو اہل کتاب کے متعلق ہے تمہاری تقریر میں مسلمانوں کو اس کا مخاطب کیوں کیا گیا۔ سو خوب سمجھ لو کہ حکم عموم الفاظ پر ہوتا ہے نہ خصوص مورد پر یہی قاعدہ ہے جس کو فقہاء نے اصول میں مصرح فرما دیا ہے۔ دوسرے میں پوچھتا ہوں کہ قابل ملامت اہل کتاب کی ذات مِنْ حَیْثُ ھِیَ ذَات (اس حیثیت سے کہ ذات) تھی یا ان کے اعمال قابل ملامت تھے۔ ظاہر ہے کہ ذات پر ملامت نہ تھی بلکہ ان کے اعمال ہی قابل ملامت ہیں۔ پس یہ اعمال جس جگہ بھی پائے جائیں گے قابلِ ملامت ہوں گے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس کا مخاطب کرنا اگر ان میں بھی ان اعمال کا وجود ہو صحیح بلکہ اگر یہ مخاطب نہ ہو لیکن ان میں یہ اعمال پائے جاتے ہوں جن پر اہل کتاب کو ملامت ہو رہی ہے تو اس صورت میں مسلمانوں کو اور زیادہ غیرت کرنی چاہیئے کہ ان میں وہ اعمال پائے جاتے ہیں جو اہل کتاب کے مدار مذمت ہیں اور اس غیرت کا مقتضی ہے کہ بہت جلد جہل اور بدعملی کی اصلاح کریں اور علم و عمل کا اہتمام شروع کر دیں۔

بحمد للہ آجکل علم کا سامان بہت کچھ میسر ہے، جا بجا دینی مدارس موجود ہیں سب مسلمانوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب عربی پڑھ کر عالم ہی بنیں بلکہ جن کو عربی پڑھنے کی فرصت نہ ہو وہ اردو رسائل ہی دینی مسائل کا علم

حاصل کریں۔ آج کل خدا کا شکر ہے کہ اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ کافی مقدار میں موجود ہے لیکن ان کا خود مطالعہ کرنا کافی نہیں بلکہ سبقاً سبقاً کسی عالم سے سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں مسائل کا ترجمہ ہو جانے سے صرف زبان سہل ہو جاتی ہے مضامین سہل نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ اردو میں اقلیدس اور طب کی کتابیں بھی ترجمہ ہو گئی ہیں تو کیا ان کے مطالعہ سے کوئی شخص ریاضی داں یا طبیب ہو سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہے پھر قرآن یا فقہ کا اردو ترجمہ آپ کو استاد سے کیونکر مستغنی کر سکتا ہے میں تجربہ کی بنا پر سچ کہتا ہوں کہ محض ترجمہ کے مطالعہ سے آپ قرآن مجید یا فقہ کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے یقیناً بہت جگہ ٹھوکریں کھائیں گے اور مطلب کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے اس لئے عربی میں نہ پڑھو تو اردو ہی میں پڑھو لیکن کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھو اپنے مطالعہ کو کافی نہ سمجھو۔

مجھے پہلے بھی معلوم ہوا تھا اور اب مدرسہ کی رپورٹ دیکھ کر بھی معلوم ہوا کہ اس مدرسہ کا زیادہ تر مقصود یہ ہے کہ دیہات کے جو لوگ پوری تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ان کو ضروریات دین یعنی قرآن اور نماز روزہ وغیرہ کے ضروری مسائل کی تعلیم دی جائے۔ سو یہ موقعہ بہت اچھا ہے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور یہ خوب سمجھ لو کہ پورا عالم بننا تو فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں۔ لیکن بقدر ضرورت دین کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے۔ اس لئے اگر فرض کفایہ کی ہمت نہ ہو تو فرض عین کی مقدار تو ضرور حاصل کر لینی چاہیئے۔ آج کل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ بس ہو تو پورا عالم ہو ورنہ جاہل ہی رہے یہ بڑی غلطی ہے۔ جن لوگوں کو عالم بننے کے لئے فراغت نہ ہو وہ بیچ ہی کے راستہ پر رہیں کہ نہ عالم ہوں نہ جاہل بلکہ ضروریات دین کو حاصل کر کے اپنے دنیوی کاروبار میں لگیں اور اس کے لئے ایک سال کی ضرورت ہے زیادہ نہیں۔ ایک سال میں قرآن مجید کا ایک دو سپارہ پڑھ کر اردو میں مسائل کا علم بقدر ضرورت حاصل ہو سکتا ہے اور اتنی فرصت

تو دیہات والوں کو بھی مل سکتی ہے اس لئے کم از کم ایک سال تو اپنے بچوں کو دینی علم کی ضرور تعلیم دینی چاہیئے اور یہ مدت میں نے ان لوگوں کے لئے بیان کی ہے جو پورا قرآن پڑھانے کے لئے فراغت نہیں پاتے ورنہ ایک درجہ میں پورے قرآن کی بھی ضرورت ہے بلکہ حفظ کی بھی ضرورت ہے اگر سب کے سب دو تین ہی سپارے پڑھا کریں تو پھر قرآن کی حفاظت کیونکر ہوگی اور سب ناظرہ ہی پڑھنے لگیں حفظ نہ کریں تو قرآن مسلمانوں کے پاس کیونکر رہے گا کیونکہ اس صورت میں اگر کوئی دشمن قرآن کے سب نسخے مسلمانوں سے چھین کر ضائع کردے تو مسلمان قرآن سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور اب کسی کی مجال نہیں کہ مسلمانوں سے قرآن چھین سکے اگر مصاحف کو بھی کوئی ضائع کردے گا تو مسلمانوں کے ہزاروں بچے اور لاکھوں جوان اور بوڑھے حافظ موجود ہیں وہ اپنی یاد سے قرآن کو پھر لکھ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ خصوصیت جملہ اہل ادیان کے مقابلہ میں حفظ ہی کی برکت سے تو ہے۔

پس جن کو حق تعالےٰ نے فراغت دی ہے وہ اپنے بچوں کو پورا قرآن پڑھائیں اور جن کے دو چار لڑکے ہوں وہ ان میں سے ایک کو حافظ بھی ضرور بنائے۔ حفظ قرآن کی بڑی فضیلت ہے قیامت میں حافظ کی شفاعت سے ایک بڑی جماعت کی بخشش ہوگی اور اس کے والدین کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سے آفتاب بھی ماند ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ کرلو کہ خود حافظ کی کیا کچھ قدرومنزلت ہوگی جب اس کے والدین کی یہ عزت ہوگی اس لئے اس دولت کو بھی ضرور حاصل کرنا چاہیئے مگر جن کو فراغت نہ ہو وہ سارا نہ پڑھیں مگر کچھ تو ضرور پڑھ لیں کتنے شرم کی بات ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کی کتاب سے بالکل ہی ناآشنا ہوں افسوس آجکل تعلیمیافتہ طبقہ قرآن پڑھانے کو بالکل بیکار اور فضول سمجھتا ہے چنانچہ رامپور میں ایک صاحب جنٹلمین نے اپنے دوست سے کہا کہ آپ بھی اپنے بچے کو انگریزی اسکول میں بھیجیں انھوں نے کہا کہ نصف قرآن اس کا رہا ہے وہ ہو جائے تو بھیجوں انھوں نے پوچھا نصف قرآن کتنے روز میں ہوا ہے وہ بولے دو سال میں

تو آپ کیا کہتے ہیں کہ تم نے اپنے بچے کے دو سال تو ضائع کئے دو سال اور کیوں ضائع کرتے ہو اس مدت میں یہ ایک دو درجہ تو تعلیم کا طے کرتا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون اس ظالم کو یہ خبر نہیں کہ اس قرآن پڑھنے والے لڑکے نے اس دو سال میں نہ معلوم جنت کے کتنے درجے طے کر لئے ہیں کیونکہ قیامت میں قرآن پڑھنے والے کو حکم ہوگا کہ قرآن پڑھتے جاؤ اور چڑھتے چلے جاؤ۔ جہاں تمہارا قرآن رُک جائے وہیں تم رک جاؤ بس وہی تمہارا درجہ ہے۔ مگر تعلیمیافتہ لوگوں کو تو اسکول کے درجوں کی ضرورت ہے۔ جنت کے درجوں کی کیا ضرورت ہے اس لئے قرآن پڑھانے کو بیکار سمجھتے ہیں مگر ذرا ٹھہریں ابھی چند دن میں مرنے کے بعد بلکہ مرتے وقت ہی معلوم ہو جائیگا کہ اسکول کے درجوں کی ضرورت تھی یا جنت کے درجوں کی۔

گوالیار کی حکایت سنی ہے کہ ایک صاحب نے اپنے لڑکے کو بچپن ہی سے انگریزی میں ڈال دیا تھا اور اس کی تعلیم پر بہت روپے خرچ کئے تھے لندن بھی پاس کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہاں سے آکر وہ بیمار ہوا اور مرنے لگا تو ابا جان اس کے سرہانے بیٹھ کر رونے لگے کہ ہائے بیٹا میں نے تو تیری تعلیم پر بیس پچیس ہزار روپے خرچ کئے تھے۔ میں نے اپنی محنت کا پھل بھی نہ دیکھا۔ لڑکے نے آنکھیں کھول دیں اور کہا ابا جان اب کیا روتے ہو جب مجکو آخرت میں جہنم میں جاتا ہوا دیکھو گے اس وقت روؤ گے کیونکہ آپ نے یہ بیس پچیس ہزار روپے خرچ کر کے مجھے جہنم میں پھینکنے کا انتظام کیا ہے تم نے اس رقم سے میرے واسطے دوزخ خریدی ہے کیونکہ تم نے مجھے دین کی تعلیم سے بالکل کورا رکھا اس وقت میں دیکھتا ہوں کہ میرا سارا لکھا پڑھا بیکار ہے۔ موت کے فرشتے آنیوالے ہیں تم نے اتنی بڑی رقم میرے اوپر خرچ کر کے میرے ساتھ دوستی نہیں کی بلکہ سراسر دشمنی کی ہے۔

صاحبو! اس لڑکے نے تو اپنی حسرت کو ظاہر کر دیا اور امید ہے خدا کے فضل سے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ اس حسرت کی بنا پر بخشدیا گیا ہوگا مگر جو لوگ حسرت بھی ظاہر نہیں کر سکتے وہ بھی مرنے کے وقت اور مرنے کے بعد اس پر ضرور نادم ہوں گے۔

کہ افسوس ہم نے ساری عمر اسکولوں کے درجے اور ڈگریاں حاصل کرنے میں گنوا دی اور جنت کی ایک ڈگری بھی حاصل نہ کی ؎

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انکشَفَ الْغُبَارُ اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

(غبار جانے دو عنقریب دیکھ لوگے کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

ابھی ہوائے نفسانی کا غبار چڑھا ہوا ہے اس لئے آپ جتنا چاہیں دعویٰ کریں کہ ہم ترقی یافتہ ہیں ہم گھوڑے پر سوار ہیں ذرا غبار کو اترنے دو ابھی معلوم ہو جائیگا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا لنگڑے گدھے پر۔ میں کہتا ہوں کہ جنٹلمینوں کو اگر جنت کی طلب کے لئے تعلیم قرآن کی ضرورت نہیں تو کم از کم قومی حمیت کے ہی لحاظ سے اس کو ضروری سمجھا ہوتا۔ یہ لوگ قومی حمیت کا تو بڑے زور سے دعویٰ کرتے ہیں اور رات دن اسی کا سبق رٹتے ہیں وہ ذرا بتلائیں تو کہ قومیت اسلامی کی بنیاد کیا ہے۔ یقیناً اگر مسلمان ہیں تو یہی کہیں گے کہ قومیت اسلامی کی بنیاد قرآن مجید ہی ہے پھر حیرت ہے کہ جس چیز کے وہ حامی ہیں اسی کی جڑیں اکھاڑتے ہیں۔

صاحب اگر تعلیم قرآن بیکار ہے تو وہ قومی حمیت ہی کیا کار آمد ہے جس کا آپ دعوے کرتے رہتے ہیں۔ بس وہ حال ہے ان لوگوں کا ؎

یکے بر سر شاخ و بن می بُرید (ایک شخص شاخ کی جڑ پر بیٹھا ہوا شاخ کاٹ رہا تھا)

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر آپ کی اس بے اعتنائی سے قرآن مجید کا وجود دنیا سے ناپید ہو گیا تو ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کا نام بھی مٹ جائے گا۔ اب تک جو اسلام کا نام دنیا میں روشن ہے وہ اس مبارک کتاب ہی کی بدولت ہے اور جس فرقہ کو آپ مسلمانوں میں سب سے زیادہ بیکار سمجھتے ہیں واللہ وہی اسلامی قومیت کا محافظ ہے۔ تم ہوکس ہوا میں خدا کی قسم اگر یہ قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے والے نہ رہے تو مسلمان دنیا کے طبقہ میں کہیں بھی نہ رہیں گے۔ ساری قومی حمیت ناک کے رستہ نکل جائے گی بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ یہ فرقہ جو تمہارے نزدیک بیکار ہے صرف قومیت اسلامی ہی کا محافظ نہیں بلکہ وجود عالم کا محافظ ہے اگر یہ جماعت دنیا میں نہ رہے تو دنیا ہی نہ رہے گی بلکہ سارا عالم برباد

ہو کر قیامت آجائے گی اور یہ میں اپنے گھر سے نہیں کہتا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَبْقٰی فِی الْاَرْضِ وَاحِدٌ یَقُوْلُ اللّٰہُ اَللّٰہُ اَوْ کَمَا قَالَ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہنے والا ایک شخص بھی موجود رہے اور ظاہر ہے کہ اللہ اللہ کرنے والے یہی لوگ ہیں جن کو آپ بیکار سمجھتے ہیں اور دوسرے طبقوں میں بھی اگر کوئی خدا کا نام لینے والا ہے تو وہ بھی ان ہی کی برکت سے ان ہی کے تعلق سے ہے۔ اب تو ان جنٹلمین صاحب کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ مسلمان کا بچہ دو سال قرآن پڑھ کر دنیا و آخرت کے کتنے درجے طے کرتا ہے۔ اسکول کا ایک درجہ طے کرکے تو وہ خاک بھی حاصل نہیں کرتا اور قرآن کی ایک سورت بلکہ ایک آیت پڑھ کر وہ اسلامی قومیت کا محافظ بلکہ تمام عالم کا محافظ بن جاتا ہے یہ تو دنیا کا نفع ہے اور آخرت کا نفع تو سب جانتے ہیں پھر میں کہتا ہوں کہ آجکل جس علم کی وجہ سے لوگ تعلیم قرآن سے غفلت کررہے ہیں زمانہ نے اس وقت اس کی قلعی کھول دی ہے پہلے انگریزی تعلیم کی جس درجہ قدر تھی اب اُس کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ خدا اس محکمہ تخفیف کا بھلا کرے اس نے دکھلا دیا کہ بہت سے انگریزی پڑھنے والے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں گو اس سے رنج بھی ہوتا ہے کہ ملازمت چھوٹنے سے بعض مسلمانوں کو تکلیف ہوئی اور ان پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر اس کی خوشی ہے کہ جس کے نشہ میں وہ دین سے غافل ہورہے تھے اس محکمہ نے وہ نشہ ان کے دماغوں سے اُتار دیا اور ان کو معلوم ہوگیا کہ انگریزی تعلیم سے دین تو حاصل ہوا ہی نہ تھا دنیا بھی سب کو حاصل نہیں ہوتی۔ ایک صاحب نے خوب کہا کہ علم دنیا تو جب تک مکمل نہ ہو کسی مصرف کا نہیں اور علم دین کا جو درجہ بھی حاصل ہوجائے وہ نافع ہے۔ آخرت کا تو نفع ہے ہی دنیا کا بھی نفع بھی اگر کوئی حاصل کرنا چاہے وہ بھی حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی کو دین میں اور بھی کچھ حاصل نہ ہو صرف اذان ہی یاد کرلے جو سب سے ادنیٰ درجہ ہے علم دین کا تو وہ بھی اپنا پیٹ پال سکتا ہے دونوں وقت چین سے پکی پکائی روٹی کھا سکتا ہے بخلاف انگریزی کے کہ اس میں انٹرنس سے کم تو بالکل بیکار ہے اور انٹرنس بھی آجکل زیادہ کارآمد نہیں کیونکہ انگریزی

پڑھنے والے اس کثرت سے ہوگئے ہیں کہ ہر محکمہ میں بی۔اے اور ایم۔اے والوں کی درخواستیں پہلے سے رکھی رہتی ہیں۔ پھر اعلیٰ کے ہوتے ہوئے انٹرنس والوں کو کون پوچھتا ہے۔ بعض لوگ اپنی اولاد کو علم دین اس لئے نہیں پڑھاتے کہ مولوی غریب ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم دین غریب ہی پڑھتے ہیں اگر امراء کے بچے علم دین پڑھنے لگیں تو مولوی امیر ہونے لگیں گے تو تم اس کا اہتمام کیوں نہیں کرتے پھر تم امیر ہی مولویوں سے وعظ کہلایا کرنا اُن ہی سے مسائل دریافت کیا کرنا پھر غریب مولویوں کا تعلق صرف غریبوں ہی سے رہ جاویگا۔ دوسرے اُمراء کی تعلیم سے یہ فائدہ ہوگا کہ چندہ کا کام بند ہو جاوے گا جو جڑ ہے ذلت کی۔ امیر مولویوں کو چندہ کی ضرورت ہی نہ ہوگی بلکہ اگر وہ چندہ کریں گے تب بھی وہ نظروں میں ذلیل نہ ہوں گے۔ مگر ان شاء اللہ وہ اگر چندہ کریں گے تو ڈاکہ ہی ڈالیں گے لیکن وہ ڈاکہ ڈال کر بھی معزز رہیں گے غریب مولوی تو چندہ چار روپے ہی پر قناعت کر لیتے ہیں اور وہ چار سو سے کم پر قناعت ہی نہ کریں گے مگر بلا سے ان کی عزت تو کم نہ ہوگی اور غریب مولویوں کے چندہ سے تو دین کی بڑی بے وقعتی ہو رہی ہے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا دھندا اپنے پیٹ کے واسطے کیا جا رہا ہے اس لئے میری رائے ہے کہ علماء کو چندہ کا کام ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ جو کام دین کا کرنا ہو اسکے کئے قوم کے معزز آدمیوں کو جمع کر کے یہ کہدیا جائے کہ صاحبو! دین کی حفاظت کے لئے اس کام کی ضرورت ہے آپ بھی غور کرلیں کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر وہ ضرورت کو تسلیم کرلیں تو ان سے کہا جائے کہ سب مل کر اس کا انتظام کریں۔ علماء اصل میں کام کریں اور معززین روپیہ کا انتظام کریں غریب علماء ہی پر سارا بار کیوں ڈالا جاتا ہے کہ وہ کام بھی کریں اور روپیہ بھی جمع کریں اور اگر وہ یہ کہیں کہ یہ کام ضروری نہیں فضول ہے تو علماء کو چندہ کی ضرورت نہیں بس وہ کام بند کر کے اپنے گھر پر رہیں اور تجارت وزراعت یا کسی اور شغل میں لگیں اور فرصت کے وقت میں جتنا ہو سکے دین کا کام کر لیا کریں۔ اس صورت میں قیامت کے دن ان پر مواخذہ نہ ہوگا یہ صاف کہدیں گے کہ ہم نے مسلمانوں کے سامنے دینی خدمت کی ضرورت ظاہر کردی تھی اُنھوں نے اس کو فضول بتلایا اور روپیہ کا انتظام نہ کیا اور ہمارے چندہ کرنے سے

دین کی بے وقعتی ہوتی تھی اس لئے ہم نے چندہ نہ کیا اور معاش کے لئے دوسرے کاموں میں لگ گئے اور اسی کے ساتھ جتنا ہم سے ہوسکا اس قدر دین کی خدمت بھی کرتے رہے اس کے بعد ان لوگوں کی گردنیں نیچی ہوں گی جو دین کی خدمت کو فضول بتلاتے تھے ذرا علماء اس طرح کرکے تو دیکھیں ان شاء اللہ تعالٰی عوام سب سیدھے ہو جائیں گے اور خود چندہ کرکے روپے لالا کر دیا کریں گے۔ میں نے اوپر جہاں رپورٹ مدرسہ کے حوالے سے مدرسے کے مقصد کو ظاہر کیا تھا یہ کہہ رہا تھا کہ طبقۂ امراء کو میں نصف قرآن یا ربع قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا ان کو تو پورا قرآن پڑھنا چاہیئے پھر قرآن پڑھ کر دین کا عالم بننا چاہیئے۔ ہاں جن کو ملازمت کی ضرورت ہو ان کو اتنی رخصت ہے کہ اگر وہ عربی زبان میں دین کو حاصل نہ کرسکیں تو کم از کم اردو ہی میں پڑھ لیں کیونکہ ایسے لوگوں کو انگریزی کی بھی ضرورت ہے اور دیہات والے جو فراغت نہیں پاتے وہ کم از کم ایک سال تو دین کے لئے خرچ کردیا کریں اتنی وسعت دینے کے بعد بھی اگر لوگ جاہل ہی رہیں تو اس وعید کے لئے تیار ہو جاویں جو اس آیت میں مذکور ہے۔

اب میں عنوانِ آیت سے ایک بات پر متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالٰی نے اِشۡتَرٰی کا لفظ اختیار فرمایا ہے جس کے معنی ہیں استبدال بالتراضی (رضامندی سے بدلنا) اس سے معلوم ہوا کہ رضا و خوشی سے جہل و ضلالت کو اختیار کرنا یہ موجب وعید ہے اور افسوس ہے کہ آجکل یہی صورت ہو رہی ہے کہ لوگ خوشی کے ساتھ علم دین سے اعراض کر رہے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ اپنی اس غفلت پر کبھی ان کو افسوس نہیں ہوتا نہ علم سے محرومی پر حسرت ہوتی ہے بلکہ غضب یہ ہے کہ جو بیچارہ طالب اصلاح ہو اور اپنے بچوں کو علم دین پڑھانا چاہے اس پر چاروں طرف سے ملامت و طعن ہوتا ہے کہتے ہیں کہ کیا اپنی اولاد کو ملّا بناؤ گے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ملّا ہوکر یہ دنیا کے کام کا نہ رہے گا دنیا سے نکمّا ہو جائے گا ہم اس الزام کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے جواب میں مولانا رومی کے الزام کو پیش کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں

؎ تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند ؎ از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالٰی اپنا بنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں)
واقعی ملّا لوگ دنیا کے کاموں سے بیکار ہو جاتے ہیں۔ مگر خبر بھی ہے کن کاموں سے بیکار ہوتے ہیں سب کاموں سے نہیں

بلکہ ان کاموں سے جو خلاف شرع ہیں یا مباحات زائدہ ہیں۔ باقی جو کام شرع کے موافق ہیں اور ضرورت کے درجہ میں ہیں گو دنیا ہی کے ہوں ان میں وہ بہت چست ہوتے ہیں چنانچہ اپنے اہل و عیال کی طرف سے کبھی بیفکر نہیں ہوتے بلکہ ان کے حقوق واجبہ کو دنیا داروں سے زیادہ ادا کرتے ہیں البتہ طالب علم خاص زمانۂ طالب علمی میں دنیا کے بعضے ضروری کاموں میں بھی سست ہوتے ہیں مگر اس کا راز یہ ہے کہ وہ ایک اہم کام میں مشغول ہیں اس کی طرف توجہ لگی ہوئی ہے اور نفس ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا آپ اس کو عیب سمجھتے ہیں کہ طالب علم کو کھانے کی فکر نہیں ہوتی بعض دفعہ مطالعہ کتاب میں اس کو بھوک کی خبر نہیں رہتی یا ایک طالب علم کی حکایت ہے کہ وہ پانی کے دھوکے میں تیل پی گئے۔ آپ اس پر ملامت کرتے ہیں مگر یہ انصاف ہے۔ پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کا ایک کیرا بالدی ہل جوتنے میں ایسا مشغول ہو جائے کہ اسے روٹی کی بھی خبر نہ رہے تو کیا آپ اس کو عیب سمجھیں گے یا اس کی تعریف کریں گے کہ بڑا نمک حلال نوکر ہے آقا کے کام کو ایسی محنت سے کرتا ہے کہ اپنی جان کی بھی خبر نہیں رہتی افسوس آپ کے کام میں کسی کو اپنی خبر نہ رہے وہ تو نمک حلال قابل تعریف ہوا اور خدا کے کام میں کوئی اپنے سے بے خبر ہو جائے تو وہ سست اور کاہل اور قابل ملامت ہے۔

صاحبو! غور تو کیجیے کیا یہی انصاف ہے اور طلبا کی یہ سستی بھی صرف زمانۂ طلب ہی تک رہتی ہے۔ پھر فارغ ہو کر تو وہ ایسے چست ہو جاتے ہیں کہ ان کی برابر دنیا دار کبھی بھی چست نہیں ہو سکتے وہ تھوڑی دیر میں اتنا کام کر لیتے ہیں کہ دنیا دار دو چار مل کر بھی اس سے زیادہ دیر میں وہ کام نہیں کر سکتے۔ آپ طلباء و علماء کے پاس رہ کر ان کی حالت دیکھیں کہ وہ تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف کا کام کتنی چستی سے کرتے ہیں اور اس سے فارغ ہو کر دنیا کے کام کس پھرتی سے انجام دیتے ہیں اور اہل و عیال کی کیسی خبر گیری کرتے ہیں اور اس میں راز یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی امداد ہوتی ہے اس لئے تھوڑی دیر میں وہ بہت کام کر لیتے ہیں اس امداد پر ایک دیندار کا قصہ یاد آیا کہ وہ جمعہ کے دن اپنے کھیت میں پانی دے رہے تھے کہ جمعہ کی اذان ہوگئی انھوں نے سوچا کہ پانی کا انتظام کرتا ہوں تو جمعہ جاتا ہے اور جمعہ کو جاتا ہوں تو پانی کا کام رہا جاتا ہے بالآخر انھوں نے دین کو دنیا پر ترجیح دی اور کھیت کا کام چھوڑ کر جمعہ کو چلے گئے۔ جمعہ کے بعد جو آ کر دیکھا تو کھیت پانی سے

بھرا ہوا تعجب ہوا پڑوسی کہنے لگے کہ عجب بات ہے ہم اپنے کھیتوں میں پانی دیتے تھے اور ڈول ٹوٹ ٹوٹ کر وہ تمہارے کھیت میں پہنچ جاتا تھا۔ تو کبھی حق تعالیٰ کی امداد کھلی آنکھوں نظر آجاتی ہے اور باطنی امداد تو ہمیشہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ان کے وقت میں برکت دیدیتے ہیں اس لئے یہ خیال نہ کرو کہ تمہارا لڑکا علم سے فارغ ہو کر دنیا کے کام کا نہ رہے گا بخدا اگر وہ دیندار ہو گیا تو اپنے مفید کاموں میں وہ دنیا داروں سے زیادہ چست ہوگا دوسرے وہ کم خرچ ہوگا شان اور وضع اور فیشن کا پابند نہ ہوگا۔ تھوڑی آمدنی میں اپنا سارا خرچ چلائے گا۔ اور انگریزی پڑھنے والی اولاد کو اگر اعلیٰ ملازمت نہ ملی تو وہ ساری عمر باپ ماہی سے خرچ منگاتے رہیں گے چنانچہ ایسے نظائر موجود ہیں اب آپ کو چاہیئے کہ اپنی اولاد کو اس مدرسہ میں بھیجدیں اور میں نے اس مدرسہ میں یہ بھی رائے دی ہے جو قبول کر لی گئی کہ ایک نصاب ایسا بنایا جائے جس میں اردو فارسی میں لوگ دینیات حاصل کر سکیں اور میری رائے ہے مدرسہ کے اندر ایک ایسا نصاب ہونا چاہیئے اور میں نے کئی جگہ یہ رائے ظاہر بھی کی لیکن اہل مدارس نے اس پر توجہ نہیں کی اگر اس مدرسہ میں اس پر عمل کیا گیا اور ان شاء اللہ امید ہے کہ کیا جائے گا تو یہ بات اس مدرسہ کی خصوصیات میں سے ہوگی۔ ایک خصوصیت اس مدرسہ کی اسی جلسہ میں یہ معلوم ہوئی کہ اس مرتبہ جو جلسہ کی وجہ سے مہمانوں کا مجمع ہوا ہے ان کی دعوت وغیرہ کے لئے اور اسی طرح جلسہ کے جملہ اخراجات کے لئے خاص احباب سے چندہ کیا گیا ہے عام چندوں کی رقم میں سے جلسہ کے مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا گیا یہ بات بڑی خوشی کی ہے میری ہمیشہ سے یہی رائے ہے کہ اول تو مہمانوں کو مدرسہ کی طرف سے کھانا کھلانے کی ضرورت نہیں یہ کسی کے بیٹے کی تقریب تھوڑا ہی ہے جو آنے والوں کو کھانا دیا جائے یہ ایک قومی اور دینی کام ہے جو آئے اس کو اپنے پاس سے خرچ کر کے بازار میں کھانا چاہیئے جیسے عام قومی جلسوں میں کھانے پینے کا خرچ ہر شخص خود برداشت کرتا ہے اور اگر یہ نہ ہو اور مہمانوں کو کھانا کھلایا ہی جاوے تو اس کے لئے خاص چندہ کرنا چاہیئے جس میں سب شریک ہونے والوں کو اس بات کی صریحاً اطلاع ہو کہ یہ رقم مہمانوں کے کھلانے وغیرہ میں صرف ہوگی عام چندہ سے یہ اخراجات نہ کرنے چاہئیں کیونکہ عام چندہ دینے والے زیادہ تر یہ سمجھ کر مدارس میں چندہ دیتے ہیں کہ ہماری رقم تعلیمی کام

میں صرف ہوگی اس سے طلبہ کو کھانا کپڑا دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ اور اسی کو زیادہ ثواب سمجھتے ہیں اور اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس سے جلسہ کے مہمانوں کو کھانا کھلایا جائیگا جن میں بہت سے امراء و خوش حال بھی ہوتے ہیں تو شاید بعض لوگ اس اطلاع کے بعد چندہ نہ دیتے اس لئے میرے نزدیک عام رقوم چندہ سے جلسہ کے اخراجات میں صرف کرنا شبہ سے خالی نہیں اور شبہ بھی قوی لیں یا تو اس کے لئے خاص چندہ کیا جایا کرے یا کم از کم جلسہ میں جب چندہ جمع کیا جائے اسی وقت اعلان کر دیا جائے کہ اس جلسہ کا خرچ اس چندہ سے نکالا جائے گا جو صاحب اس میں متفق نہ ہوں اس وقت ظاہر فرما دیں تاکہ ان کا چندہ علیحدہ رکھا جاوے اس طرح بھی شبہ سے بچاؤ ہو سکتا ہے مگر اہل مدارس اتنی سہل صورت سے بھی تساہل کرتے ہیں مگر جائے خوشی ہے کہ اس مدرسہ میں اس کا لحاظ کیا گیا مجھے ایک بڑی خوشی اس مرتبہ یہ ہوئی کہ بعض دفعہ مدرسہ کی طرف سے چندہ کے لئے جو سفیر بھیجا جاتا ہے تو اس کے متعلق میں نے ایک رائے دی اور وہ بھی مان لی گئی اور وہ رائے یہ ہے کہ سفیر اگر عالم نہ ہو تو اس کو وعظ گوئی سے منع کر دیا جائے۔ محض ترغیب چندہ کا محدود الفاظ سے مضائقہ نہیں مگر غیر عالم وعظ کبھی نہ کہے اس میں چند مفاسد ہیں ایک تو یہ کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیے اور آپ فرماتے ہیں اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ کہ جب کام نااہلوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر رہو۔ گویا نااہل کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کے علامات سے ہے اور یہ امر مصرح و ثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامات قیامت سے ہوں وہ معصیت اور مذموم ہے اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں یہ منصب صرف علماء کاملین کا ہے اس لئے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں بوجہ ناواقفیت کے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی گو بعضے بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق اختیار کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے۔ پھر آجکل ایسے نفس کہاں ہیں جو صاف کہدیں کہ ہم جاہل ہیں ہم کو مسائل معلوم نہیں

ضرور کچھ گڑھ مڑھ کر جواب دیں گے اور اکثر وہ غلط ہوگا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچالیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑ جاویں۔ بعض دفعہ جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا اس کا ایسا جواب دیتے ہیں جس سے نہ جواب معلوم ہو نہ جہل ظاہر ہو۔ گنگوہ میں ایک جاہل فتویٰ دیا کرتا تھا۔ مولانا گنگوہیؒ نے اپنی نوعمری میں اس سے امتحاناً سوال کیا کہ حالت حمل میں بے شوہر عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے۔ کہا ایسا ہے جیسے گھیرا دینا۔ اس گول مول جواب سے نہ اس کا جہل ظاہر ہوا نہ جواز کا فتویٰ ہوا۔ مگر ایسے جوابات سے عوام کیا سمجھیں گے یقیناً غلطی میں پڑیں گے شاید کوئی جاہل واعظ یہ کہے کہ ہم کتابیں دیکھ دیکھ کر فتویٰ دیا کریں گے اور آجکل اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے تو میں کہتا ہوں کہ بعض مسائل کا تعلق دو باب سے ہوتا ہے، ایک باب میں تو اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے باب میں اس کا مقید ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ قیود و شرائط بعض دفعہ ایسی ہوتی ہیں جن پر جاہل تو جاہل ناقص عالم کی نظر بھی نہیں پہنچی بعض دفعہ ناتمام علم سے لوگوں کو تنگی میں ڈالیگا اور جب وہ تنگی کی برداشت نہ کرسکیں گے تو شرع کو بدنام کریں گے مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ اتحاد جنسین کے ساتھ تفاضل ناجائز ہے مثلاً چاندی کے بدلے چاندی یا سونے کے بدلے سونا خریدا جائے تو مساوات ضروری ہے تفاضل (کمی بیشی) حرام ہے اب جاہل تو اس مسئلہ کو دیکھ کر اسی طرح بیان کردیگا اور ممکن ہے کہ ایک وقت میں چاندی کا بھاؤ روپے کے برابر نہ ہو بلکہ چاندی دس آنے تولہ ہو جو ایک روپیہ کے مقابلہ میں روپیہ کے وزن سے زیادہ آجائیگی اور ان حضرت کو صرف اتنا ہی مسئلہ معلوم ہے کہ اتحاد جنس کے وقت تفاضل حرام ہے تو یہ حضرت یا تو خود روپے کے برابر ہی لائیں گے پھر گھر والے ان کو بیوقوف بنائیں گے اور یا دوسروں کو اس پر مجبور کریں گے تو دونوں صورت میں شریعت کو بدنام کریں گے کہ یہ اچھا مسئلہ ہے کہ ایک چیز روپے میں روپے سے زیادہ آسکتی ہے مگر شریعت کہتی ہے کہ نہیں برابر ہی لو زیادہ مت لو۔ تو یہ خرابی جہل کی وجہ سے ہوئی محقق اگر اس مسئلہ کو بیان کریگا تو ساتھ یہ بھی کہدیگا کہ اگر چاندی ایک روپیہ کے بدلہ میں اس سے زیادہ آتی ہو تو اس وقت روپے سے چاندی نہ خریدو بلکہ روپے کو بھنا کر کچھ دونیاں چونیاں اور ان کے ساتھ کچھ پیسے ملا کر خریدو اب جائز ہے کہ ایک روپے کے بدلے میں تولہ بھر سے زیادہ چاندی آجاوے کیونکہ ریزگاری میں جتنی مقدار چاندی ہوگی اس کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آجائیگی باقی چاندی پیسوں کے مقابلہ میں ہو جاویگی اور پیسہ اور چاندی میں جنس بدل گئی اس پر کمی بیشی جائز ہے بعض جاہل کہدیتے ہیں کہ یہ تو بات ہی کیا ہوئی روپیہ دینا اور روپیہ کی ریزگاری دینا ایک ہی بات ہے پھر اسکی کیا وجہ کہ روپے کے

بدلہ میں تو تولہ بھر سے زیادہ چاندی لے سکیں اور ریزگاری کے بدلہ میں زیادہ لے سکیں میں کہتا ہوں کہ یہ ضابطہ کی بات ہے کہ شریعت نے اس کو ناجائز کیا ہے اور اس کو جائز کیا ہے اس میں ایسے سوالات کا حق نہیں شریعت کا مقصود یہ ہے کہ تم کو نقصان بھی نہ ہو اور احکام کے پابند بھی رہو اس طرح سے کہ جو کام کرو شریعت سے پوچھ کر کرو تاکہ تم معاملات میں آزاد اور مطلق العنان نہ رہو کہ جس طرح چاہا کر لیا بلکہ حکم کے پابند ہو کر کام کرو کیونکہ جو ضروری کام تم آزادی کے ساتھ کرنا چاہتے ہو پابندی شریعت کے ساتھ بھی وہ کام ہو سکتا ہے پھر خوانخواہ گناہ میں مبتلا ہونا کونسی عقلمندی ہے۔ یہ تو مثال تھی تنگی میں ڈالنے نہ ڈالنے کی اب مسئلہ کے اطلاق و تقیید کی مثال سنئے۔ مثلاً طلاق کے باب الکنایات میں فقہاء نے لفظ اختاری کو کنایات طلاق میں بیان کیا ہے اور اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وقوع طلاق نیت کے بعد ہوتا ہے تو اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختاری میں بھی صرف نیت سے وقوع طلاق کا ہو جاویگا لیکن اسی اختاری سے وقوع طلاق کی ایک اور شرط بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ اختاری میں نیت کے ساتھ وقوع نہیں ہوتا بلکہ عورت جب اسی مجلس میں طلاق کو اختیار کر لے اس وقت وقوع ہوتا ہے اور اختیار منکوحہ کی شرط فقہاء نے باب الکنایات میں نہیں بیان کی بلکہ یہ شرط باب التفویض میں لکھی ہے پس اب اگر کوئی اختاری کو صرف باب الکنایات میں دیکھ کر حکم بیان کریگا وہ ضرور غلطی کریگا اور نیت زوج کے بعد فوراً وقوع کا فتویٰ دیدیگا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس میں بعض علماء تک بھی غلطی کر چکے ہیں چنانچہ علامہ شامی نے ایک فقیہہ کی غلطی نکالی ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ میں ایک غلط فتویٰ دیا ہے۔ نیز بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ایک کتاب میں مطلق ہے دوسری کتاب میں مقید ہے اس لئے مسائل مہمہ میں مفتی کو لازم ہے کہ صرف ایک کتاب میں دیکھ کر فتویٰ نہ دے بلکہ مختلف کتابوں میں دیکھ کر جواب دے۔ غرض فقہ کا فن بہت دقیق ہے اسی لئے میں فقہ حنفی کے سوا کسی دوسرے مذہب کی فقہی کتاب طلبا کو پڑھانے کی جرات نہیں کرتا۔ کانپور میں ایک طالب علم نے جو شافعی المذہب تھے مجھ سے اپنے مذہب کی کوئی فقہی کتاب پڑھنا چاہی میں نے عذر کر دیا مجھے یہ اختاری کا مسئلہ اس وقت یاد آگیا میں نے ان سے یہی عذر کیا کہ بعض دفعہ ایک مسئلہ ایک مقام پر مطلق ہوتا ہے اور دوسرے مقام سے یا دوسری کتاب سے اس میں کچھ قید معلوم ہوتی ہے جیسے ہمارے یہاں مسئلہ اختاری اس کی نظیر ہے تو ممکن ہے کہ آپ کے فقہ میں بھی کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں دوسری جگہ

کوئی قید مذکور ہو اور مجھے اس کی خبر نہ ہو تو ممکن ہے کہ میں آپ کو اطلاق کے ساتھ مسئلہ سمجھا دوں اور آپ بھی اس کو مطلق سمجھ کر ساری عمر غلطی میں مبتلا رہیں اس لئے میں آپ کے مذہب کی کتاب نہیں پڑھا سکتا اپنے مذہب کی کتابوں پر تو تھوڑی بہت نظر ہے اس کا ذخیرہ بھی اپنے پاس موجود ہے دوسرے مذہب پر نہ اتنی نظر ہے نہ کتابوں کا زیادہ ذخیرہ ہے اس میں غلطی ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ تم رامپور جاکر مولوی طیب صاحب عرب سے فقہ شافعی پڑھ لو وہ شافعی المذہب ہیں ان کی نظر اپنے مذہب پر زیادہ ہے وہ اچھی پڑھائیں گے علماء حنفیہ فقہ شافعی کو صحیح طور پر نہیں پڑھا سکتے جیسے علماء شافعیہ فقہ حنفیہ کو اچھی طرح نہیں پڑھا سکتے ہر مذہب والا دوسرے مذہب کے مسائل میں ضرور غلطیاں کریگا چنانچہ ہدایہ میں بعض مسائل کی نسبت دوسرے امام کی طرف غلط کر دی گئی اسی طرح شافعیہ کی کتابوں میں حنفیہ کی طرف بعض مسائل غلط منسوب کئے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے ہندوستان میں تقلید مذہب حنفی کے وجوب کی کہ یہاں رہ کر کسی دوسرے مذہب پر صحیح عمل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندوستان کے علماء اکثر حنفی ہیں اور یہاں کتابیں بھی فقہ حنفی کی زیادہ ملتی ہیں اساتذہ بھی اسی فقہ کے میسر ہو سکتے ہیں۔ دوسرے فقہ کی نہ زیادہ کتابیں یہاں موجود ہیں نہ ان کے پڑھانے والے میسر آسکتے ہیں تو پھر عمل کی کیا صورت ہو ہمارے ایک مہربان مکہ مکرمہ جاکر شافعی بن آئے ہیں یہ تو کوئی ملامت وطعن کی بات نہیں تھی اگر تحقیق کے ساتھ دوسرے مذہب کو اختیار کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مذاہب اربعہ سب حق ہیں۔ ہاں تلعب بالمذاہب البتہ حرام ہے کہ اس کو کھیل بنا لیا جائے آج حنفی ہو گئے کل شافعی ہو گئے پھر مالکی ہو گئے لیکن یہ ذرا میرے پاس آئیں تو میں ان سے پوچھوں گا کہ ہندوستان میں وہ شافعی بن کر کیونکر رہ سکتے ہیں یہاں رہ کر امام شافعی کے مذہب پر تمام مسائل میں وہ صحیح عمل کیونکر کریں گے اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو وہ خود عالم ہوتے اور فقہ شافعی کو کسی فقیہ شافعی سے حاصل کیا ہوتا سو ان میں یہ وصف موجود نہیں یا ہندوستان کے علماء سے پوچھ پوچھ کر عمل کریں گے سو میں بتلا چکا کہ ہندی علماء مذہب شافعی کے مسائل کو صحیح طور پر نہیں بتلا سکتے۔ اب یہاں امام شافعی کے فقہ پر عمل کیونکر ہوگا بس اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ وہ مکہ مکرمہ ہی جاکر رہیں اور جہاں سے وہ شافعی بن کر آئے ہیں وہیں رہ کر اس پر عمل کریں وہاں اس مذہب کے مشائخ و علماء و اساتذہ بہت موجود ہیں جب وہ ملیں گے تب یہ بات ان سے کہوں گا[۱] ابھی تو

[۱] بعد میں انھوں نے خط سے اطلاع دی ہے کہ وہ پھر حنفی ہو گئے ۱۲ منہ

انھوں نے دوسرے گذشتہ واقعات سے معافی چاہی ہے میں نے لکھدیا ہے کہ سب معاف ہے سہ

کفرست درطریقت ماکینہ داشتن   آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

الحمد للہ میرے دل میں کسی کی طرف سے کینہ کبھی نہیں ہوتا ہاں دوستانہ شکایت کبھی پیدا ہوجاتی ہے وہ بھی قائم نہیں رہتی جلدی زائل ہوجاتی ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایسے مسائل میں جو ایک جگہ مطلق ہوں دوسری جگہ مقید ہوں جاہل واعظ ضرور غلطی کریگا اور اس کے امتحان کی آسان صورت یہ ہے کسی جاہل کے وعظ میں ایک عالم کو دو چار دفعہ پردہ میں بٹھلاؤ دو چار دفعہ کی اس لئے ضرورت ہے کہ ایک دفعہ تو غلطی سے محفوظ رہ جانا ممکن ہے مگر ہمیشہ محفوظ رہنا جاہل سے دشوار ہے دو چار دفعہ کے بعد ان عالم صاحب سے پوچھ لینا کہ اس نے کتنی غلطیاں کی ہیں ان شاء اللہ حقیقت معلوم ہوجائے گی اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ کام نااہل کو نہ دینا چاہیئے میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم سے غلطی نہیں ہوتی عالم بھی بشر ہے اس سے بھی غلطی ہوسکتی ہے مگر وہ خفیف اور قلیل غلطی کرے گا شدید اور بکثرت غلطی نہ کرے گا یعنی اس کے بیان میں شاذ و نادر کبھی سو بار میں ایک بار غلطی ہوگی اور جاہل کے وعظ میں کثرت سے غلطیاں ہوں گی پھر عالم کو دوسرے وقت اپنی غلطی پر تنبہ ہوسکتا ہے اور دوسرے بیان میں اس کی اصلاح بھی کرسکتا ہے اور جاہل کو تنبہ بھی نہیں ہوتا کہ میں نے کیا غلطی کی ہے اس لئے یہ اس سے اشد ہے خوب سمجھ لو صاحب آپ کو تجربہ نہیں اور مجھے تجربہ ہے جس کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ نااہل کو وعظ کی اجازت نہ دینا چاہیے۔ واللہ جہل کی وجہ سے بڑی خرابیاں ہو رہی ہیں۔ کانپور میں ایک شخص نے ایک ایسے بکرے کی قربانی کی جس کا کوئی عضو عیب سے خالی نہ تھا لوگوں نے اس سے کہا کہ اس کی قربانی جائز نہیں، تو وہ کہتا ہے وہ ہماری بی بی صاحبہ نے فتویٰ دیا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔ پھر اس نے بیوی سے جاکر کہا کہ لوگ تمہارے فتوی میں غلطی نکالتے ہیں۔ اس نے شرح وقایہ کا اردو ترجمہ پڑھا تھا اس میں مسئلہ کا موقعہ نکال کر باہر بھیجدیا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ تہائی عضو سے کم کٹا ہوا ہو تو قربانی جائز ہے اور اس بکرے کا کوئی عضو تہائی سے زائد نہیں کٹا بلکہ کم ہی ہے کہ مجموعہ مل کر بہت زیادہ تھا' کچھ ٹھکانا ہے اس نامعقول حرکت کا کہ ایک عورت بھی شرح وقایہ کا ترجمہ پڑھ کر مفتی بن گئی۔ اب میں مکرر خلاصہ مقام کا عرض کرتا ہوں کہ آیت کا حاصل مدلول یہ ہوا کہ تحصیل علم کی بھی سخت ضرورت ہے اور عمل کی بھی۔ اس کے بعد حق تعالیٰ

فرماتے ہیں۔ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۔ یہ سخت وعید ہے جس میں حق تعالیٰ صیغہ تعجب سے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو ہدایت و مغفرت کو اور بعنوان دیگر علم و عمل کو چھوڑ کر ضلالت و معصیت میں مبتلا ہیں جہنم میں جانے کیلئے کیسے دلیر اور کیسے بے باک ہیں لفظ اصبر کے اختیار کرلے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وعید صبر و ثبات علی المعصیۃ پر ہے یعنی گناہوں پر اصرار کرنا اور ان پر جما رہنا سبب وعید ہے ورنہ ایک بار گناہ کر کے پھر نادم ہو کر اس پر ثبات نہ کرنا اس وعید کا محل نہیں بلکہ توبہ کر لینے سے آئندہ و ماضی دونوں کی مغفرت ہوجاتی ہے سبحان اللہ حق تعالیٰ کے کلام میں کیسی بلاغت اور کتنی رعایت ہے کہ لفظ لفظ سے علم عظیم پیدا ہوتا ہے۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں وقت بہت ہو گیا بارہ بج چکے ہیں اتنی دیر بیان کا قصد نہ تھا میں نے اس وقت علم و عمل کی ضرورت پر بقدر ضرورت کافی تقریر کر دی ہے اور چندہ خاص کی کوئی ترغیب نہیں دی ہاں چندہ کے اصول بیان کر دیئے ہیں اور علماء کو چندہ خاص کی ترغیب سے منع کیا ہے البتہ کام کرنے کی صورت بتلا دی ہے کہ جو کام کریں اس کی ضرورت کو مسلمانوں پر ظاہر کر دیں اگر وہ ضرورت کو تسلیم کر لیں تو ان سے کہا جائے کہ اس کا انتظام کریں پھر چندہ وغیرہ وہ لوگ خود کریں گے علماء کو اس کی ضرورت نہیں اور ضرورت نہ سمجھیں تو کام کو بند کر دیں۔

اب مہتمم صاحب مدرسہ کچھ رپورٹ مدرسہ کی طرف سے سنائیں گے اس کو سننا چاہیئے منتشر نہ ہونا چاہیئے۔ اکثر عادت ہے کہ لوگ وعظ کے بعد منتشر ہو جاتے ہیں یہ اچھا طریقہ نہیں جس جلسہ میں آپ مدعو ہیں اس کی کارروائی پوری ہونے کے بعد جانا چاہیئے۔ لہٰذا سب صاحب مدرسہ کی رپورٹ سنیں۔ اور اگر مدرسہ کے قائم رہنے کی ضرورت سمجھ میں آجائے تو اس میں کوشش سے امداد کریں اور اگر اس کو فضول سمجھیں تو یہی ظاہر کر دیں تاکہ اس کے موافق عمل کیا جائے۔

والحمد للہ رب العٰلمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

تمت

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

حرمات الحدود

منجملہ ارشادات

حکیم الاُمّت مجدّد المِلّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمّد عبدالمنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ مسمّٰی بہ

حرمات الحدود

الاشتات	المستمعون	من ضبط	من ای شان	ماذا	لم	کیف	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد [illegible]	کس نے ضبط کیا [illegible]	[illegible]	کیا مضمون تھا	کیوں ہوا	کیسے ہوا	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
	تقریباً ۴۰۰	[illegible]	[illegible]	حدود [illegible]	بعض [illegible] احکام [illegible]	کھڑے ہو کر	۲ گھنٹے	[illegible]	جامع مسجد [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّۃَ وَاتَّقُوْا

اللہَ رَبَّکُمْ لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ وَتِلْکَ حُدُوْدُ اللہِ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا ۝

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو زمانہ عدت سے پہلے طلاق دو اور عدت کو یاد رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے اور عدت میں ان مطلقہ عورتوں کو ان کے رہنے کے گھروں میں سے نہ نکالو اور وہ عورتیں خود نہ نکلیں مگر ہاں کھلی ہوئی بے حیائی کریں تو اور بات ہے یہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود ہیں جو شخص ان حدود خداوندی سے تجاوز کرے گا تو اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا تم کو معلوم نہیں شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دیں)

اس وقت جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے اس کے خاص حصہ سے مجھے مقصود کو مستنبط کرنا ہے اس مقصود کی تعیین عنقریب ہو جائے گی اس کا ضروری اور مہتم بالشان ہونا بھی معلوم ہو جائے گا جس مضمون کو میں نے اس وقت اختیار کیا ہے اس کا مجھے یہاں آنے سے پہلے خیال نہ تھا بلکہ یہاں آکر بھی از خود ذہن میں نہیں آیا میرے یہاں آنے کے بعد جب بیان کا تذکرہ ہوا تو میں سوچتا تھا کہ کیا بیان کروں کیونکہ عادتاً یہ ہے کہ بیان کے موافق موقع و مصلحت ہو کَیْفَمَا اتَّفَقَ (جیسا کہ اتفاق ہو) کسی مضمون سے بیان کر دینے کی عادت نہیں ہے اس لئے مجھ کو پریشانی تھی کہ اتفاقاً آج رات کو بعض احباب کے حفاظت حدود احکام کے متعلق تذکرہ ہوا انھوں نے یہ کہا تھا کہ ہم کو مسائل و احکام تو کتابوں سے معلوم ہو جاتے ہیں مگر احکام کی حدود معلوم نہیں ہوتیں اس لئے بعض دفعہ سخت خلجان ہوتا ہے اس کے ساتھ انھوں نے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اگر کوئی رسالہ اس مبحث پر لکھ دیا جائے جس میں ضروری احکام کے حدود بیان کر دیئے جائیں تو بہت اچھا ہو۔ اس وقت میں نے یہ جواب دیدیا تھا کہ احکام تو بہت ہیں جزئیات کا احصار بہت مشکل ہے اگر کوئی رسالہ لکھا گیا تو

اس میں خاص خاص جزئیات ہی سے بحث ہوگی اور ان کی تعیین بھی مجھے خود کرنا پڑے گی
اس صورت میں ممکن ہے کہ بعض وہ جزئیات رہ جائیں جن کی حدود معلوم ہونے کی
آپ کو ضرورت ہے تو وہ رسالہ بھی ناکافی ہوگا اس کی سہل صورت یہ ہے کہ آپ
حضرات کو جن جن جزئیات کے حدود معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے آپ
ان کو سوال کی صورت میں لکھ کر بھیجتے رہا کریں میں اس کا جواب لکھدیا کروں گا۔
اسی طرح بعض اور احباب سے کہا جائے کہ ان کو جو مسائل ایسے پیش آئیں جنکی
حدود ان کو معلوم نہ ہوں وہ بھی ان کو قلم بند کر کے سوال کی صورت میں تھانہ بھون
بھیجدیا کریں کچھ عرصہ میں ان جزئیات کا کافی ذخیرہ جمع ہو جائے گا پھر اس کو
رسالہ کی صورت میں جمع کر دیا جائے گا. اس رائے کو سب نے پسند کیا اور سوالات
بھیجنے کا وعدہ کیا یہ تذکرہ تو ہو چکا لیکن میرے خیال میں اسی وقت یہ بات
آئی کہ یہ مضمون واقعی بہت ضروری اور مہتم بالشان ہے کیونکہ آجکل مسلمانوں کی
علمی اور عملی کوتاہیوں کا زیادہ تر سبب یہی ہے کہ ہم حدود کی رعایت نہیں کرتے
نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کو اس مضمون کی طرف رغبت بھی ہے اور حدود
معلوم کرنے کے منتظر ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ مختصر طور پر اسی کا بیان آج
کے وعظ میں ہو جائے۔ مختصر اس لئے کہا کہ یہ بیان اس وقت کلی ہوگا جزئی نہ
ہوگا کیونکہ جزئیات کا احصار ہو نہیں سکتا بالخصوص ایک جلسہ میں لیکن میں نے
یہ خیال کیا کہ مَا لَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ جس چیز کو پورا حاصل
نہ کیا جا سکے اس کو بالکل چھوڑ دینا بھی مناسب نہیں جب یہ مضمون ضروری ہے
تو جتنا ایک جلسہ میں مجھ سے بیان ہو سکتا ہے مجھے بیان کر دینا چاہیئے باقی تکمیل
خود احباب کے ہاتھ میں ہے اگر وہ واقعات و جزئیات حادثہ سے سوال کریں گے
تو اور بھی ذخیرہ تو جمع ہو جائے گا ورنہ یہ بیان ہی ضبط ہو کر اس مبحث میں کام دے گا.
پس ہر چند کہ یہ بیان مختصر ہوگا لیکن پھر بھی ان شاء اللہ کافی ہو جائے گا قواعد کلیہ
پر تنبیہ ہو جانے سے بھی کسی درجہ میں کفایت ہو جائے گی ورنہ احصار تو کتب میں بھی

سے اور صحبت اہل اللہ سے اور جزئیات میں غور کرنے سے ہوگا۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ جس کام کو ہم نیک سمجھتے ہیں اس میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جس کو بُرا سمجھتے ہیں اس کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ بس ہمارے ذہن میں یہ دو کلیے جمع ہوئے ہیں کہ نیک کام میں جتنا بڑھ سکیں بڑھنا چاہیئے اور بُرے کام کو جتنا چھوڑ سکیں چھوڑنا چاہیئے ہمارے نزدیک نہ نیک کام کے کرنے کی کوئی حد ہے نہ بُرے کام کے چھوڑنے کی مثلاً ہم نے یہ سمجھ لیا کہ خرچ کرنا اچھا کام ہے تو اب اس میں بڑھتے چلے جاتے ہیں نہ اسراف کا خیال ہے نہ اس کی فکر ہے کہ اہل وعیال کو اس سے پریشانی لاحق ہوگی نہ اس کا اندیشہ ہے کہ ہم مقروض ہو جائیں گے اور زمین وجائداد قرضہ میں نیلام ہو جائے گی ہمارے نزدیک صرف رنڈی بھڑ دوں میں خرچ کرنا ہی گناہ ہے اس کے سوا اور کسی موقعہ میں خرچ کرنا گناہ ہی نہیں۔ چنانچہ تفاخر کی نیت سے خرچ کرنے کو گناہ نہیں سمجھا جاتا حالانکہ حدیث میں اس کی صاف ممانعت ہے۔

نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِيَيْنِ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بہ نیت تفاخر کھانا کھلانے والوں کے کھانے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ آجکل شادیوں کے موقعہ پر کھانا کھلایا جاتا ہے کہ اس میں اپنی آمدنی اور حیثیت کو بھی نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ تحقیق کی جاتی ہے کہ فلاں شخص نے اپنے بیٹے کی شادی میں کتنے کھانے پکائے تھے اور کتنے آدمیوں کو بلایا تھا پھر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ کھانے پکائے جائیں اس سے زیادہ مجمع کیا جائے اگر زیادہ نہ ہو تو کم از کم اس کی برابر تو ہو تاکہ وہ ہم سے بڑھا ہوا نہ رہے یہ ہے طعام المتبارئین جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ دعوت کھانے والے بھی اس کی پروا نہیں کرتے اور بے تکلف ہر دعوت کو قبول کر لیتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ داعی کی نیت کیا ہے نہ داعی کو اس کا خیال ہوتا ہے

کہ میری نیت درست ہے یا نہیں۔

رہا قرض وغیرہ اس کے لئے تو ہندی مثل مشہور ہے کہ چڑھ جا بیٹے سولی پر خدا بھلی کرے گا۔ بیدھڑک قرض لیتے ہیں اور یہ سوچ لیتا ہے کہ اولاد بعد میں خود ادا کردے گی ہمیں اس کی فکر کی ضرورت نہیں۔ صاحبو اگر آپ کے باپ دادا بھی یہی سمجھ لیتے تو آج آپ کو ان کی متروکہ جائداد میں یہ گلچھرے اڑانے کا موقعہ نہ ملتا نہ آپ کو اس ناموری کا وسوسہ آتا ساری جائیداد ان کے قرضہ میں نیلام ہوگئی ہوتی۔ پس افسوس ہے آپ کے باپ دادا نے تو اپنا خون پسینہ ایک کرکے یہ جائیداد آپ کی راحت و آسائش کے لئے چھوڑی تھی اور آپ ایسے ظالم نکلے کہ آپ کو اپنے اہل و عیال کی راحت کا ذرا خیال نہیں کہ وہ آپ کے بعد کیسے پریشان ہوں گے جبکہ ساری زمین و جائداد قرضہ میں نیلام ہوجائے گی کیا اہل و عیال کا آپ پر کچھ بھی حق نہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے ایک بار تشریف لے گئے وہ سخت بیمار تھے کہ اپنی زندگی سے مایوس تھے انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اپنے مال میں خدا کے لئے وصیت کرنا چاہتا ہوں کیا سارے مال کی وصیت کردوں' آپؐ نے فرمایا نہیں کچھ اپنے اہل وعیال کے واسطے بھی تو چھوڑ دو۔ انھوں نے نصف مال کی وصیت کا قصد کیا آپ نے اس سے بھی منع کیا۔ پھر انھوں نے تہائی مال کی وصیت کرنا چاہی۔ آپ نے تہائی کی وصیت کی اجازت دی اور فرمایا تہائی بھی بہت ہے پھر فرمایا کہ اگر تم اپنے اہل وعیال کو خوش حال چھوڑ کر جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو خالی ہاتھ چھوڑ کر جاؤ کہ وہ دوسروں کے ہاتھ کو تکتے پھریں۔ دیکھئے آپؐ نے اللہ تعالےٰ کے واسطے بھی اس طرح وصیت کرنے سے منع فرمایا جس سے اہل وعیال کو تنگی پیش آئے۔ جب نیک کاموں میں خرچ کرکے بھی اہل وعیال کو تنگ کرنا جائز نہیں تو تفاخر اور ناموری میں خرچ کرکے ان کو پریشان کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔

مگر ہم لوگوں کو اس کا مطلق خیال نہیں بیدھڑک خرچ کرتے ہیں قرض پہ قرض چڑھائے چلے جاتے ہیں اور سارا بوجھ اولاد پر ڈال جاتے ہیں کہ بعض دفعہ ان کے پاس رہنے کو مکان بھی نہیں رہتا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے)

ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ میں ایک رئیس نے بڑی بڑھیا دعوت کی تھی جس میں ہزاروں آدمیوں کو مدعو کیا اور بھنگیوں چماروں کو بھی پلاؤ زردہ کھلایا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے ان کو حکیمانہ طور پر نصیحت کی کہ شیخ صاحب آپ نے اپنی ہمت سے بھی زیادہ کام کیا، ظاہر میں تو یہ تعریف تھی مگر حقیقت میں ان کی حماقت ظاہر کی تھی کہ تم نے اسراف سے کام لیا۔ اپنی رقم برباد کی۔ اور پھر یہ فرمایا کہ لیکن اس کا افسوس ہے کہ آپ نے اس کے عوض وہ چیز خریدی ہے کہ اگر کبھی ضرورت ہو تو کانی کوڑی کو بھی نہیں بک سکتی یعنی نام اور شہرت اور یہ بھی لوگوں کا خیال ہی ہے کہ بڑھیا دعوت سے تعریف ہوتی ہے صرف دو تین دن کچھ تذکرہ رہتا ہے اس کے بعد کوئی نام بھی نہیں لیتا بلکہ بعض دفعہ تو شروع میں بھی تعریف نہیں ہوتی کیونکہ آجکل لوگوں میں حسد کا مرض بہت ہے تعریف کون کرتا ہے بلکہ مذمت کے درپے رہتے ہیں۔ ایک شخص ہزاروں لاکھوں روپیہ پر پانی پھیر کر دعوت کرتا ہے اور کھانے والوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں ذراسی بات میں کسر رہ گئی انھوں نے اس کو زبان پر لانا شروع کیا اس کا نام بھی کوئی نہیں لیتا کہ اس بیچارہ نے کتنی رقم خرچ کی ذرا کسی مہمان کو حقّہ ملنے میں دیر ہوگئی ہو یا پان کچھ دیر تک نہ ملا ہو بس وہ اسی کا رونا روتے رہتے ہیں تعریف کبھی نہیں کرتے۔

ایک بزرگ سے میں نے حکایت سُنی ہے کہ ایک بنئے نے اپنی بیٹی کی شادی میں بڑے زور کی دعوت کی تھی علاوہ انواع واقسام کے کھانوں کے اس نے ہر باراتی کو ایک ایک اشرفی بھی تقسیم کی تھی۔ جب بارات رخصت ہوئی تو بنئے کو

خیال ہوا کہ آج ضرور سب باراتی میری تعریف کرتے جائیں گے راستہ میں چل کر سننا چاہیے کیا کیا تعریفیں ہوتی ہیں چنانچہ وہ بارات کے راستہ میں جاکر چھپ کر بیٹھ گیا۔ بس یہ مقصود ہوتا ہے اسراف اور فضول خرچی سے کہ چند باتیں سُنکر جی خوش کریں۔

؏ آدمی فربہ شود از راہ گوش (آدمی موٹا ہوتا ہے تعریف سُننے سے)

مگر افسوس ان لوگوں کو یہ بھی نصیب نہیں ہوتا چنانچہ بہلیاں گذرنا شروع ہوئیں تو وہاں سناٹا تھا کسی نے بھی بنئے کی تعریف نہ کی، اسے بڑا غصہ آیا کہ یہ لوگ بڑے نمک حرام ہیں۔ میں نے تو اتنا خرچ کیا اور یہ ایک دو بات بھی میری تعریف میں نہیں کہتے۔ خیر خدا خدا کر کے ایک بہلی سے کچھ آواز آئی۔ ایک گاڑی بان دوسرے گاڑی بان سے کہہ رہا تھا کہ بھائی لالہ جی نے بڑے زور کی شادی کی کہ کھانا تو کھلایا ہی تھا ایک ایک اشرفی بھی دی، تو وہ دوسرا کہتا ہے کہ میاں کیا کیا سُسرے کے یہاں اشرفیوں کے صندوق بھرے پڑے ہیں دو دو ہی بانٹ دیتا تو اس کے گھر میں کیا کمی آجاتی، سُسرے نے ایک ہی اشرفی دی لیجئے یہ تعریف ہوئی لالہ جی کو بھی حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی کہ ایک تو میں نے روپیہ خرچ کیا اوپر سے گاڑی بان بھی میری بیٹی کو سنگوانے لگا غرض اتنا خرچ کرنے پر بھی لوگوں نے عیب ہی نکالا اور کچھ نہ سہی یہی عیب نکال دیا کہ اس سے زیادہ کیوں نہ کیا اور واقعی یہ عیب تو ایسا ہے کہ ہر شخص میں نکل سکتا ہے کہ اتنا ہی کیوں کیا اس سے زیادہ کیوں نہ کیا کیونکہ زیادہ کی کہیں حد ہی نہیں۔ پس لوگوں کا محض گمان ہی گمان ہے کہ ان فضول خرچیوں سے ہمارا نام ہوتا ہے۔ چند خوشامدیوں کی باتوں سے وہ سب کو ایسا ہی سمجھتے ہیں تحقیق کے بعد معلوم ہوسکتا ہے کہ تعریف کرنے والے کتنے ہیں اور عیب نکالنے والے کتنے۔ پھر اگر تعریف ہوئی بھی تو تم کو کیا مل گیا۔ تعریف کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ہوا ہے جو منہ سے نکلتی ہے اور بس اس کے لئے روپیہ برباد کرنا سراسر حماقت ہے۔ خصوصاً ایسے لوگوں کو کھلانا جو وقت پر کام بھی نہ آدیں کیونکہ

باراتوں میں اکثر ایسے لوگ آتے ہیں جن کی صورت سے بھی آپ آشنا نہیں ہوتے اور پہلے تو کیا تو کیا آشنا ہوتے بارات آنے کے بعد بھی آپ کو خبر نہیں ہوتی کہ کون کون آیا ہے ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ وقت پر آپ سے آنکھیں چرالیں گے مگر باوجود ان سب باتوں کے آجکل مسلمانوں کا روپیہ اس حماقت میں بہت برباد ہو رہا ہے۔ پھر افسوس یہ ہے کہ گناہ کرتے ہیں اور اس کو گناہ نہیں سمجھتے ان کو اس کا وہم بھی نہیں ہوتا کہ تفاخر میں خرچ کرنا گناہ ہے حالانکہ یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کا گناہ ہونا ظاہر ہے کیونکہ تفاخر کا منشا کبر ہے کہ ہمارا نام ہوگا ہم بڑے آدمی سمجھے جائیں گے اور کبر ایسا گناہ ہے کہ اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں تمام گناہوں کی جڑ یہی تکبر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

علت ابلیس انا خیر بد است

ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

(ابلیس کی علت یہی انانیت تو تھی اور یہ مرض ہر شخص کے اندر کم و بیش موجود ہے) حدیث مسلم میں ہے۔ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِّنْ کِبْرٍ۔ جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ غرض ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے خرچ کرنے کو اچھا سمجھ لیا ہے تو اب خرچ کرتے چلے جاتے ہیں اسراف کی بھی پرواہ نہیں کرتے حالانکہ خرچ کی شریعت میں ایک حد ہے جس سے آگے بڑھنا اسراف ہے اور اسراف کی سخت ممانعت ہے بلکہ اس پر اتنی سخت وعید ہے کہ مسرف کو شیطان کا بھائی فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا ۝

(تحقیق فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے)

اور اس میں راز وہی ہے جو میں نے ابھی بتلایا ہے کہ اسراف کا منشا تفاخر ہے اور تفاخر کا

منشاء کبر ہے اور تکبر علت ابلیس ہے۔ شیطان کے مردود ہونے کا سبب یہی تھا کہ اس نے اپنے کو آدم علیہ السلام سے افضل سمجھا اس لئے باوجود حکم خداوندی کے سجدۂ آدم سے انکار کیا یہ تو خرچ کرنے میں ہماری حالت ہے اس کے مقابل بعض لوگوں نے کفایت شعاری کا سبق پڑھا ہے، انھوں نے کسی سے یہ سن لیا تھا کہ کفایت شعاری اچھی چیز ہے۔ پس اب وہ ایسے کفایت شعار بنے کہ بالکل ہی ہاتھ روک لیا۔ بیوی بچوں کو تنگ رکھتے ہیں، ضروریات میں خرچ نہیں کرتے دین کے کاموں میں بھی خرچ نہ کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈھتے ہیں پیسہ پیسہ پر جان دیتے ہیں یہ بھی حد سے تجاوز ہے۔ شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو جب خدا دے تو خود بھی آرام سے رہے اور اہل وعیال کو بھی آرام سے رکھے مگر ہمارے کاموں کے کوئی اصول نہیں ہم جس کام کو اچھا سمجھتے ہیں اس کے ہر درجہ کو اور ہر موقعہ کو اچھا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غلطی ہے، خرچ کرنا مطلقاً اچھا نہیں بلکہ اچھا بھی ہے اور برا بھی اسی طرح خرچ نہ کرنا مطلقاً برا نہیں بلکہ برا بھی ہے اور اچھا بھی اب یہ سمجھنا کہ کس موقع پر خرچ کرنا اچھا ہے اور کس موقع پر اچھا نہیں اور کتنا خرچ کرنا چاہیئے کتنا نہ چاہیئے یہی رعایت حدود ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ نہ اپنے ہاتھ کو گردن سے باندھ لو (کچھ خرچ ہی نہ کرو) اور نہ پوری طرح کھول دو پھر تم نشانہ ملامت ہوجاؤ گے (یعنی بخل کی صورت میں) اور مفلس کنگال ہوجاؤ گے (اسراف کی صورت میں) دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا اور (وہ نیک بندے) جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ نہ انفاق مطلقاً محمود ہے نہ اقتار بلکہ دونوں میں اعتدال مطلوب ہے جس کی تفصیل فقہاء کے کلام میں ملتی ہے۔ فضول خرچی یہ ہے کہ معصیت میں خرچ کیا جائے

س میں صرف رنڈی بھڑ ووں میں خرچ کرنا ہی داخل نہیں بلکہ تفاخر اور ناموری کے لئے خرچ کرنا بھی معصیت کی فرد ہے اسی طرح مباحات میں بلا ضرورت اپنی استطاعت سے زیادہ خرچ کرنا بھی اسراف میں داخل ہے اسی طرح طاعات ضروریہ میں بھی استطاعت سے زیادہ صرف کرنا جس کا انجام اخیر میں بے صبری اور حرص و بدنیتی ہو یہ بھی اسراف ہے کیونکہ حرص و بدنیتی اور بے صبری یہ امور معصیت ہیں اور اس کا سبب ہوا استطاعت سے زیادہ صرف کرنا اور مُفْضِیْ اِلَی الْمَعْصِیَت (گناہ کی طرف پہونچانے والا) بھی معصیت ہوتا ہے لہذا یہ اتفاق معصیت ہوا۔ خلاصہ یہ کہ معصیت میں خرچ کرنا تو مطلقاً اسراف ہے اور طاعات میں استطاعت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے خوب سمجھ لو اور اقطار کی حقیقت یہ ہے کہ طاعات ضروریہ میں بالکل خرچ نہ کیا جائے یا حکم شرعی سے کم ادا کیا جائے۔ اسی طرح مستحبات و مباحات میں اتنی تنگی کی جائے جس سے اپنے کو یا اہل وعیال کو تکلیف ہو یہ بھی ناجائز ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خستہ حالی کے ساتھ آیا آپ کو اس کی حالت دیکھ کر رنج ہوا بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو خوش حال آدمی ہے تو آپ نے فرمایا لِیُرٰی اَثَرُ النِّعْمَةِ عَلَیْكَ (اوکما قال) یعنی خدا کی نعمت کا اثر تمہارے اوپر ظاہر ہونا چاہیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مباحات میں اتنی تنگی کرنا جس سے دوسروں کو یہ گمان ہو کہ اس کے پاس کچھ نہیں بیچارہ پر فاقے گذرتے ہوں گے ناجائز ہے کیونکہ اس میں نعمت الٰہی کی ناشکری ہے نیز خوامخواہ اپنے کو بلا وجہ نظروں میں ذلیل کرنا ہے اور جو کوئی ذلیل بھی نہ سمجھے تو اس کا دل دکھے گا بلا وجہ مسلمانوں کا دل دکھانا بھی برا ہے۔ صاحبو اس تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ شریعت نے جو ہر کام کی حدود مقرر کی ہیں اس سے مقصود یہ ہے کہ آپ راحت کے ساتھ زندگی بسر کریں تکلیف نہ برداشت کریں اس لئے اتنا خرچ کرنے کی بھی ممانعت ہے جس کا انجام کلفت ہو۔ اور اتنی کفایت شعاری کی بھی ممانعت ہے جس سے اپنے کو یا اہل وعیال کو تکلیف ہو۔ افسوس اب بھی لوگ شریعت کی قدر نہیں

کرتے غرض خرچ کی بھی ایک حد ہے۔ اور کفایت شعاری کی بھی ایک حد ہے ان حدود سے باہر قدم رکھنا ہمیشہ موجب کلفت ہے اور گناہ ہوا وہ الگ۔ یہ تو خرچ کے متعلق ہماری حالت تھی اب دوسری باتوں کو بھی دیکھ لیجئے اگر کسی نے بولنے کو اچھا سمجھا ہے تو اس کے بولنے کی کوئی حد نہیں جب باتیں کرنے پر آویں گے تو گھنٹوں بولتے چلے جاویں گے نہ غیبت کی پرواہ ہے نہ شکایت کی نہ اس کا خیال ہے کہ ہمارے منہ سے بعض باتیں بے تحقیق نکل رہی ہیں نہ اس کا خیال ہے کہ بعض باتوں میں ہم خود اپنی مدح کر رہے اگر ترک کلام کو اختیار کیا تو بس گم صُم بنے بیٹھے ہیں اگر کسی سے بات بھی کریں گے تو ادھوری اس کی پرواہ ہی نہیں کہ بات گول مول رہی جاتی ہے جس سے دوسرے کو تکلیف ہوگی۔ اگر کسی نے کھانے کو اچھا سمجھا تو وہ ہر وقت کھانے ہی کے فکر میں ہے۔ لذائذ اور عمدہ غذاؤں میں منہمک ہے اس کی پرواہ نہیں کہ یہ حلال ذریعہ سے حاصل ہوا یا حرام طریقہ سے بس جو آیا کھانے سے کام ہے۔ کوئی دو وقت کھاتا ہے تو یہ حضرت چار وقت پر بھی بس نہیں کرتے چاہے ہضم ہو یا نہ ہو ان کا کلّا ہر وقت چلنا چاہیئے اور اگر تقلیل غذا کو اچھا سمجھا تو اس میں حد سے بڑھ گئے دو وقت کی جگہ ایک ہی وقت کھانے لگے چاہے دماغ خشک ہو جائے بدن میں ضعف ہو جائے مگر یہ ایک وقت سے زیادہ کھانا جانتے ہی نہیں پھر اسی پر بس نہیں بلکہ لوگوں کی برائی کرتے ہیں جو اعتدال کے ساتھ دو وقت کھانا کھاتے ہیں۔ جب بیٹھیں گے کم کھانے کے فضائل بیان کریں گے جس میں درپردہ اپنی تعریف مقصود ہوگی بس ہمارا یہ حال ہے ؎

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

(جب بھوکا ہوتا ہے تو کتے کی طرح حریص ہوتا ہے اور جب کھانے کو ملتا ہے تو تند و بدرگ ہوتا ہے)

غرض ہمارے کسی کام کی بھی حد مقرر نہیں جو کام ہے حد سے باہر ہے صاحبو نماز سے بہتر کیا چیز ہے اگر حدود نہ ہوں تو اس کی کوئی حد نہ ہونی چاہیئے تھی بس یہ حکم دیدیا جاتا کہ جتنی چاہو نماز پڑھتے رہو اور جب چاہو پڑھ لو۔ حالانکہ ایسا نہیں چنانچہ طلوع فجر کے بعد سے فرض ادا ہونے تک دو سنتوں سے زیادہ نفل نماز مکروہ ہے۔

اور فجر و عصر کے فرضوں کے بعد بھی طلوع و غروب تک نفلیں مکروہ ہیں اور عین طلوع و غروب و استوار کے وقت تو کوئی نماز بھی جائز نہیں نہ فرض نہ نفل بجز اسی دن کے عصر کے اور وہ بھی کراہت کے ساتھ پھر ہر نماز فرض کا وقت مقرر ہے یہ نہیں کہ ظہر کی نماز عصر کے وقت پڑھ لو عصر کی مغرب کے وقت اسی طرح روزہ کیسی عمدہ عبادت ہے مگر اس کے واسطے بھی حدود ہیں یہ نہیں کہ جب چاہو روزہ رکھ لو سال بھر میں بعض ایام ایسے بھی ہیں جن میں روزہ رکھنا حرام ہے یعنی عید کے دن اور بقرعید کے دن اور ایام تشریق میں روزہ مکروہ تحریمی ہے۔ حج کیسی اچھی عبادت ہے مگر اس کے واسطے بھی حدود ہیں عرفات میں جانے کا خاص دن مقرر ہے، منیٰ میں آنے کا خاص دن معین ہے ان تاریخوں کے بغیر حج نہیں ہوسکتا اگر یہ حدود نہ ہوتے تو جب چاہتے حج کر لیتے مگر اب اگر عرفات کا دن نکل جائے تو سال بھر تک حج نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح احرام باندھنے کے مہینے مقرر ہیں۔ اشہر حج سے تقدیم احرام مکروہ ہے اشہر حج شوال سے شروع ہوتے ہیں گو ان سب میں حج نہیں ہوتا حج صرف ذی الحجہ کی بعض تاریخوں میں ہوتا ہے۔ لیکن ان مہینوں میں احرام باندھنے کی اجازت ہے ان سے پہلے احرام باندھنا مکروہ ہے۔ پس یہ مہینے چونکہ محل احرام ہیں اور احرام شرط حج ہے۔ اس لئے ان سب کو اشہر حج کہا جاتا ہے۔ غور کیجئے ان اعمال سے بڑھ کر کونسا عمل ہوگا مگر ان سب کے لئے حدود ہیں۔ اسی طرح معاملات کو دیکھ لیا جائے ان میں بھی حدود ہیں نکاح کی بھی ایک حد ہے کہ چار بیبیوں سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ اسی طرح ہر عورت سے نکاح جائز نہیں بلکہ بعض حلال ہیں بعض حرام بہت سی عورتیں نسب کی وجہ سے حرام ہیں بعض رضاع کی وجہ سے بعض مصاہرت کی وجہ سے۔ بیع و شرا کے لئے بھی حدود ہیں بعض صورتیں ربوا میں داخل ہیں بعض صورتیں بیوع فاسدہ ہیں بعض صورتیں بیوع باطلہ ہیں۔

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

حق تعالےٰ نے قرآن مجید میں جا بجا احکام کو ذکر فرما کر اکثر موقعہ پر تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں) فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ تمام احکام شرعیہ حدود ہی ہیں چنانچہ روزہ کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا ہے۔ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں۔ ان کے پاس بھی نہ جاؤ) طلاق کے مسائل کے بعد فرمایا ہے تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں پس ان سے تجاوز نہ کرو) گویا تمام شریعت میں حدود ہی حدود ہیں ان کو محل سمجھنا کتنی بڑی غلطی ہے مگر آجکل اسمیں ابتلاء عام ہو رہا ہے لوگ عام طور پر کاموں میں حدود کی رعایت نہیں کرتے اس لئے ضرورت ہے کہ اس بحث پر قدرے گفتگو کی جائے۔ اور احکام کی حدود سے لوگوں کو مطلع کیا جائے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی جس کو میں نے ابھی تلاوت کیا ہے۔ حق تعالےٰ نے بعض احکام بیان فرما کر تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ (یہ اللہ تعالےٰ کے مقرر کردہ حدود ہیں) فرمایا ہے مجھے اس آیت میں اخیر کا حصہ مقصود ہے پہلا حصہ مقصود نہیں شاید آپ کو پوری آیت سن کر تعجب ہوا ہوگا کہ طلاق کے ذکر کو اس مقام سے کیا مناسبت۔ مگر میں نے پوری آیت کو تبرکاً پڑھ دیا ہے مقصود اخیر کا حصہ ہے کیونکہ اس میں رعایت حدود کی تاکید مخصوص طور پر مذکور ہے جو دوسرے مقام پر نہیں۔ حق تعالےٰ نے اس جگہ اول طلاق کے احکام بیان فرمائے ہیں اس کے بعد ارشاد ہے تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ ط یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں اور جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ ظلم اخروی تو ظاہر ہے کہ تعدی حدود سے گناہ ہوتا ہے جس کا نتیجہ آخرت میں بہت سخت ہے تو یہ شخص اپنے ہاتھوں مصیبت آخرت کو خریدتا ہے مگر تعدی حدود میں اپنے نفس پر ظلم دنیوی بھی ہے کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ان حدود کے مقرر کرنے سے یہ بھی مقصود ہے کہ لوگ راحت سے زندگی بسر کریں تو ان سے تعدی کرنے میں دنیوی پریشانی بھی ضرور لاحق ہوتی ہے۔ لہذا اس میں اپنے نفس پر ظلم دنیوی بھی ہے۔ آگے فرماتے ہیں

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا ۝ تم نہیں جانتے ممکن ہے حق تعالےٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دیں۔ یہ حکمت ہے ان حدود کی جو طلاق کے متعلق اس جگہ ذکر کئے گئے ہیں اور یہی وہ مضمون ہے جو اس مقام میں خاص طور پر مذکور ہے۔ دوسرے مقام پر مذکور نہیں لَا تَدْرِیْ (تم نہیں جانتے) میں خطاب بظاہر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن حقیقت میں خطاب امت کو ہے جیسے یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو) میں اول ندا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور آگے طلقتم صیغہ جمع کا ہے جس کے مخاطب سب ہیں اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ امت اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایسا تعلق ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ندا کرنا گویا امت کو ندا کرنا ہے۔ اسی طرح لَا تَدْرِیْ (تم نہیں جانتے) میں گو خطاب بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن واقع میں یہ خطاب عام ہے اور اس میں بھی وہی نکتہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور امت میں ایسا تعلق ہے کہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کو خطاب کرنا گویا امت کو خطاب کرنا ہے۔ الغرض لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا ۝ (تم نہیں جانتے ممکن کہ حق تعالےٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دیں) میں ایک حکمت کی طرف اشارہ ہے اور گو حق تعالےٰ کے ذمہ حکمت کا بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ ہمارے میں اور حق تعالےٰ میں حاکم و محکوم کا علاقہ ہے۔ برابری کا علاقہ نہیں اور حکمت بیان کرنا دوستوں اور بھائیوں میں مناسب ہوتا ہے کیونکہ وہاں حکومت نہیں ہے۔ پس دوستوں اور بھائیوں سے جب کوئی کام لینا ہو وہاں احکام کی حکمت بتلانا ضروری ہے لیکن حکام وقت اپنے احکام میں حکمتیں نہیں بیان کیا کرتے وہ اپنی حکومت کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو حکمتیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں بس جو نہ مانے گا مجرم ہوگا اور سزا بھگتے گا۔

اسی قاعدہ پر حق تعالےٰ کے ذمہ بھی حکمتیں بیان کرنا نہیں ہے۔ لیکن ان کی رحمت نہایت درجہ ہے وہ چاہتے ہیں کہ سامعین کی اصلاح ہو ہی جاوے۔ کیونکہ

بعضے ایسے بھی ہیں جو بدون حکمت کے دل سے احکام کو نہ مانیں گے اس لئے کہیں کہیں انھوں نے احکام کی حکمت بھی بیان کردی ہے مگر بعض جگہ نہیں بھی بیان کی تاکہ سامعین کو حکمت معلوم کرنے کی عادت نہ ہو جاوے اور کسی جگہ حکمت غامض ہوتی ہے جس کو ہر شخص نہ سمجھ سکے گا اور عادت پڑ گئی ہے حکمت سن کر عمل کرنے کی تو وہ عمل بھی نہ کرے گا اور گنہگار ہوگا اس لئے خدا تعالے نے تو ہر جگہ حکمت بیان کی نہ یہ کہ کہیں بھی ذکر نہ ہو۔

اب پوری آیت کی تفسیر سنئے اس سے اس حکمت کی حقیقت واضح ہو جائیگی حق تعالے فرماتے ہیں یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں سے کہدیجئے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو زمانہ عدت سے پہلے طلاق دو یہاں سب کے نزدیک حسب روایت لِعِدَّتِھِنَّ کے معنی فِیْ قُبُلِ عِدَّتِھِنَّ (ان کی عدت سے پہلے) ہیں پھر قبل کے معنے میں حنفیہ وشافعیہ کا اختلاف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک عدت حیض سے شمار ہوتی ہے تو ان کے نزدیک قُبُل کے معنے استقبال وآمد کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ حیض آنے سے پہلے یعنی طہر میں طلاق دو۔ اور شافعیہ کے نزدیک عدت طہر سے ہے ان کے نزدیک قُبُل کے معنی ابتدار کے ہیں یعنی زمانہ عدت کے شروع میں طلاق دو۔ اس کا حاصل بھی وہی ہوا کہ طلاق طہر میں ہونی چاہئے لیکن جس طہر میں طلاق دی جائے گی حنفیہ کے نزدیک وہ عدت میں شمار نہ ہوگا۔ بلکہ عدت حیض سے شمار ہوگی اور شافعیہ کے نزدیک وہ عدت طہر بھی عدت میں شمار ہوگا۔ کتب اصول میں فریقین کے دلائل مذکور ہیں اس وقت میں ان کو بیان کرنا نہیں چاہتا۔ آگے فرماتے ہیں وَاَحْصُوا الْعِدَّۃَ یعنی طلاق دینے کے بعد تم عدت کو یاد رکھو وَاتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمْ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ جو تمہارا رب ہے یعنی طلاق کے متعلق جو خدا کے احکام ہیں ان کے خلاف نہ کرو۔ مثلاً یہ کہ حدیث میں تین طلاق دفعۃً دینے کی ممانعت ہے تو ایسا نہ کرو اور حیض میں طلاق مت دو وغیرہ وغیرہ۔

اور ایک حکم آگے مذکور ہے لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ یعنی عدت میں ان مطلقہ عورتوں کو ان کے رہنے کے گھروں سے گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے مثلاً بدکاری یا سرقہ کی مرتکب ہوں اس صورت میں سزا کے لئے گھر سے نکالی جاویں۔ یا بقول بعض علماء کے وہ زبان درازی اور ہر وقت کا رنج و تکرار رکھتی ہوں تو ان کو نکال دینا اور باپ کے گھر بھیجدینا جائز ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ یہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود ہیں اور جو شخص حدود خداوندی سے تجاوز کرے گا (مثلاً تین طلاقیں دفعۃً دیدیں یا طلاق کے بعد عورت کو گھر سے نکالدیا) تو اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا (یعنی گنہگار ہوا آگے طلاق دینے والے کو ترغیب دیتے ہیں کہ طلاق میں رجعی بہتر ہے طلاق مغلظہ نہ دینی چاہیئے فرماتے ہیں) لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا اے طلاق دینے والے تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ اس طلاق کے بعد کوئی نئی بات تیرے دل میں پیدا کردیں مثلاً طلاق پر ندامت ہو تو رجعی طلاق میں اس کا تدارک تو ہوسکے گا۔

مفسرین نے لَا تَدْرِيْ الخ کی توجیہ میں اختلاف کیا ہے بعض نے یہ کہا ہے کہ ایک طلاق دینی چاہیئے تین نہ دینی چاہئیں۔ اور ایک توجیہ یہ ہے کہ تین دفعۃً مت دو۔ اگر تین ہی دینی ہوں تو ایک طہر میں ایک طلاق پھر دوسرے طہر میں دوسری طلاق متفرقاً دینی چاہئیں۔ مجھے سب توجیہوں کا بیان کرنا مقصود نہیں صرف یہ بتلانا ہے کہ اس جگہ طلاق کی حد مذکور ہے کہ ایک وقت میں ایک دینی چاہیئے ایک دم سے تین نہ دینی چاہئیں اور اس کی حکمت یہ بتلائی ہے کہ تم کو کیا معلوم ہے کہ اس کے بعد تمہارے دل میں کیا بات پیدا ہو تو ایک طلاق دینے میں یا تین متفرقاً دینے میں مصالح و منافع کی رعایت ہے اور تین دفعۃً دینے میں معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے پھر اگر ندامت ہو تو سوائے حسرت کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ آجکل لوگوں کو تین طلاقیں دینے کا

بہت شوق ہے بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ایک یا دو سے طلاق ہی نہیں ہوتی اس کا منشا رجہل بالاحکام ہے اور بعض جانتے ہیں کہ ایک یا دو سے بھی طلاق ہو جاتی ہے مگر وہ تین اس واسطے دیتے ہیں کہ عورت اس سے مری رہے گی۔ صاحبو! نکاح تو ایک طلاق سے بھی مرجاتا ہے ہاں اس صورت میں سسک سسک کر مرتا ہے کہ عدت کے بعد ٹوٹتا ہے اور تین میں اسی وقت مرجاتا ہے تو بعض لوگ عورت کو ستانے کے لئے تین طلاق دیتے ہیں کہ اس کو رجعت کی امید کیوں دلائی اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ایک طلاق کے بعد کہیں ہماری ہی رائے نہ بدل جائے اور اس کا رکھنا منظور نہیں اس لئے تین ہی دیدیتے ہیں۔ ان کی حالت بہت افسوسناک ہے کہ خدا نے ان کو عقل اور سمجھ دی تھی مگر یہ اس سے کام نہیں لیتے ان سے کوئی پوچھے کہ اگر بعد میں تمہاری رائے بدل گئی اور اس کو اپنے پاس رکھنا چاہا تو اس کی گنجائش رکھنے میں تمہارا کیا حرج ہے عقل کی بات تو یہ ہے کہ انسان جب کوئی کام کرے تو اس کے تمام پہلوؤں کی رعایت کرے خصوصاً اکثر غصہ میں ہوا کرتی ہے اس میں گنجائش رکھنا اور سمجھ کر کام کرنا بہت ہی ضروری ہے کیونکہ بعض دفعہ عورت سے محبت ہوتی ہے لیکن اتفاقاً ناگواری پیش آگئی ایسی حالت میں تین طلاق دینا اپنے کو سخت پریشان کرنا ہے۔ جب دل میں اس کی محبت ہے تو جدائی میں کلفت ہوگی۔ اور اگر ہمت سے کام لیا تو ارتکاب حرام کا بھی اندیشہ ہے۔ بعض دفعہ عورت سے محبت نہیں ہوتی مگر اس سے اولاد ہو چکی ہے تین طلاق دینے کے بعد جب اولاد کی ویرانی اور پریشانی کا خیال ہوتا ہے تو سوائے حسرت و ندامت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اگر اولاد کو اس سے جدا کیا جائے تو مرد سے ان کی تربیت اور دیکھ بھال دشوار ہے اگر جدا نہ کیا جائے اسی کے پاس رکھا جائے تو اولاد کو ماں سے زیادہ ہمدردی ہوگی، باپ کی خاک بھی وقعت ان کے دلوں میں نہ ہوگی۔ بلکہ اس کو اپنا دشمن سمجھیں گے کہ اس نے ہماری ماں کو گھر سے نکال دیا۔

بعض دفعہ طلاق کے بعد اس شخص کو دوسری بیوی نہیں ملتی اور طلاق دینے والوں کو اکثر نہیں ملتی، خاندان میں بدنام ہوجاتا ہے کہ اس کو کون لڑکی دے یہ تو ظالم ہے طلاق دے دیتا ہے پھر یا تو صبر سے کام لینا پڑتا ہے اور ایسے بہت کم ہیں یا رنڈیوں اور لڑکوں سے خراب خستہ ہوتے ہیں جس میں دنیا کی بھی ذلت آخرت کی بھی بربادی اور گھر تباہ ہوا وہ الگ کیونکہ عورت کے بغیر گھر کا انتظام نہیں ہوسکتا تجربہ کرلیا جائے۔ ان واقعات کی بنا پر شریعت نے طلاق کے لیے بہت حدود مقرر کی ہیں۔ اول تو یہ حکم ہے کہ طلاق کو جہاں تک ٹال سکو ٹالو۔ دوسری تدبیروں سے کام لو طلاق مت دو چنانچہ فقہی مسئلہ ہے اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ عِنْدَ اللّٰہِ الطَّلَاقُ (مباحات میں مبغوض تر اللہ کے نزدیک طلاق ہے)

(اور یہ مضمون ایک حدیث کا بھی ہے جس کا مرسل ہونا صحیح ہے اور رفع ضعیف ہے کذا فی المقاصد الحسنۃ للسخاوی ۱۲ جامع) (جیساکہ سخاوی کی کتاب مقاصد حسنہ میں مذکور ہے)

نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ۔

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر (قدرتی) فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال (عورتوں پر) خرچ کیے ہیں (اس میں بتلا دیا گیا کہ عورتیں تمہارے قبضہ میں ہیں ان کی اصلاح کچھ مشکل نہیں، طلاق کی کیا ضرورت ہے۔ اول تو خدا نے تم کو قدرتی طور پر عورتوں کا حاکم بنایا ہے، دوسرے تم ان پر مالی احسانات کرتے ہو) تو جو عورتیں نیک اور لائق ہیں وہ تو (مردوں کے ان فضائل و احسانات ہی کی وجہ سے ان کی) اطاعت کرتی ہیں اور مرد کی عدم موجودگی میں بھی بحفاظت و توفیق الٰہی (اس کی آبرو اور مال کی) نگہداشت کرتی ہیں۔

(خلاصہ یہ کہ اگر تم دو باتوں کی رعایت کرو تو شائستہ اور نیک عورتیں تو فوراً تمہاری تابعدار ہو جائیں گی ایک یہ کہ تم حاکم بن کر رہو، برابری اور غلامی کے ساتھ نہ رہو۔ کیونکہ جو شخص ابتداء میں عورتوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتا ہے یا ان کی غلامی اختیار کرتا ہے تو پھر وہ ساری عمر اسی برتاؤ کی منتظر رہتی ہیں لہذا تم کو اول ہی سے ایسا برتاؤ کرنا چاہیئے جیسا کہ حاکم محکوم سے کرتا ہے۔

دوسرے تم ان کے ساتھ مالی احسانات کرو مثلاً مہر کی ادائیگی میں جلدی کرو۔ نفقہ اور کپڑے میں تنگی نہ کرو۔ ان کی دلداری اور دل جوئی کا خیال رکھو اس برتاؤ کی خاصیت ہے کہ شریفوں کے دل کو مسخر کر لیتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی بدطینت عورت ہو وہ ممکن ہے کہ اس برتاؤ سے مسخر نہ ہو اس کے لئے آگے دوسرے تدبیر بتلاتے ہیں کہ اگر کوئی عورت بددماغ ہی ہو تو اس کو بھی طلاق دینے کی ضرورت نہیں بلکہ حکمت اور تدبیر سے کام لو۔ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو (قرائن سے) ان کی بددماغی کا احتمال (قوی) ہو (محض گمان اور خیال ہی نہ ہو) تو ان کو (اول) زبانی نصیحت کرو اور (اگر اس سے نہ مانیں تو) ان کو خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو اس کا بھی عورت پر بہت اثر ہوتا ہے) اور (اس سے بھی نہ مانیں تو) ان کو (اعتدال سے) مارو (حدیث میں اس کی تفسیر آئی ہے ضَرْبًا غَیْرَ مُبَرِّحٍ کہ ایسا مارو جس سے ہڈی پر صدمہ نہ پہنچے، خون نہ نکلے سبحان اللہ کیسی حدود ہیں) فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ۚ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان پر (زیادتی کرنے کے لئے) بہانہ (اور موقعہ) مت ڈھونڈو اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ۚ کیونکہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی رفعت وعظمت والے ہیں۔

یہ عجیب مراقبہ بتلایا گیا ہے یعنی اگر تم عورتوں پر زیادتی کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈو گے تو یہ سمجھ لو کہ تمہارے اوپر بھی ایک حاکم ہے وہ کون خدا تعالیٰ۔ ان کے حقوق اور علم وقدرت سب سے زیادہ ہیں۔ اگر وہ بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی برتاؤ

کرنے لگیں اور تم کو مجرم بنانے کے لئے تو پہلے ڈھونڈھنے کی بھی ضرورت نہیں واقعی جرائم بے انتہا ہیں تو تمہارا کہاں پتہ رہے۔ پس تم کو اپنے محکوموں کے ساتھ ہی برتاؤ کرنا چاہئے جو حق تعالیٰ تمہارے ساتھ کرتے ہیں کہ باوجود تمہاری نافرمانی کے توبہ و استغفار کے بعد سب معاف کر دیتے ہیں۔ اور پچھلے گناہوں کا کچھ اثر نہیں رکھتے نیز چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو ویسے ہی معاف کرتے رہتے ہیں چنانچہ وضو اور نماز اور جماعت وغیرہ سے گناہ صغیرہ معاف ہوتے رہتے ہیں۔

اگر اس سے بھی کسی عورت کو تنبیہ نہ ہو تو اس کے لئے کیا عجیب بات بیان فرماتے ہیں وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اس میں خطاب زوجین کو نہیں ہے بلکہ اوپر والے آدمیوں کو خطاب ہے کہ اگر قرآن سے تم کو ان دونوں میاں بی بی میں (ایسی) کشاکش کا اندیشہ ہو (جس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں) تو تم لوگ ایک ایسا آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی ایسا ہی عورت کے خاندان سے (تجویز کر کے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس بھیجو (کہ وہ جا کر تحقیق حال کریں اور جو بے راہی پر ہو اس کو سمجھادیں) دیکھئے یہ کیسی اچھی ترکیب ہے کہ جب تک زوجین اپنے معاملہ کو خود سلجھا سکیں اس وقت تک خود سلجھانے کی کوشش کریں۔ اور جب ان سے نہ سلجھ سکے تو کسی کو حکم مقرر کریں کیونکہ اپنا معاملہ فریقین سے طے نہیں ہو سکتا اس لئے پنچ کی ضرورت ہوئی۔

آگے حق تعالیٰ ان پنچوں کی بابت ارشاد فرماتے ہیں اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ (ان ان دونوں پنچوں میں اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان دونوں زن و شوہر کو اصلاح کی توفیق دیدیں گے) اس میں اپنی اعانت کا وعدہ ہے کہ اس صورت میں ہم بھی معاملہ کے سلجھنے میں امداد کریں گے۔ مگر اس کے لئے ایک شرط ہے وہ یہ کہ اگر ان دونوں پنچوں کو (سچے دل سے) اصلاح معاملہ منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ اُن میاں بی بی میں اتفاق پیدا کر دیں گے (بشرطیکہ وہ اُن دونوں کی رائے پر بھی عمل کریں) اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں۔ یعنی جس طریق سے

زوجین میں باہم مصالحت ہوسکتی ہے اس کو وہ خوب جانتے ہیں پس جب حکمین کی نیت ٹھیک دیکھیں گے وہ طریق ان کے قلب میں القا فرمادیں گے۔ دیکھئے حق تعالیٰ نے طلاق سے بچنے کی کتنی عمدہ ترکیبیں بتلائی ہیں اگر لوگ ان طریقوں سے کام لیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی طلاق کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور اگر بدون طلاق کے چارہ ہی نہ رہے تو اس کے لئے یہ تعلیم ہے کہ اول ایک طلاق دو اس سے عورت کا ناز ٹوٹ جائے گا اور اگر اس میں کچھ بھی صلاحیت ہوگی تو وہ سنور جائے گی شریعت نے نہ تو طلاق سے ممانعت کی کہ چاہے باہم کیسا ہی اختلاف ہو طلاق دے ہی نہ سکے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو شوہر ہمیشہ اندر ہی اندر گھٹا کرتا اپنے غصہ کا بھڑاس نہ نکال سکتا۔ اس لئے غصہ نکالنے کی اجازت دی کہ ضرورت کے وقت طلاق دے سکتے ہو۔ مگر حدود کے ساتھ شریعت میں جذبات کی بہت رعایت کی گئی ہے۔

چنانچہ ایک حدیث ہے لَا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال وغیرہ موقوف رکھے دیکھئے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ چاہے آپس میں کیسا ہی رنج و تکرار ہو بولنا مت چھوڑو حالانکہ شریعت کو یہ بھی اختیار تھا کہ ایسا حکم دیدیتی چنانچہ بعض مشائخ نے طالبین کی اصلاح کے لئے کبھی ایسا حکم دیا ہے مگر ایسی ہمت سالکین کو ہوسکتی ہے۔ ہر شخص کو نہیں ہوسکتی۔ رنج و تکرار کا طبعی تقاضا ہے کہ جس سے تکرار ہوا اس کے ساتھ کلام نہ کیا جاوے۔ چونکہ احکام شرعیہ عام ہیں اس لئے اس جذبہ کی رعایت کر کے حکم دیا گیا کہ غصہ اور رنج میں بول چال چھوڑ دینا جائز ہے مگر اس کی حدود مقرر ہیں کہ تین دن سے زیادہ نہ ہونا چاہئے اس میں نکتہ یہ ہے کہ رنج و تکرار کے بعد فوراً سلام و کلام کرنے میں غصہ کو گھونٹنا پڑے گا اور غصہ کے گھونٹنے سے کینہ اور حقد پیدا ہو جاتا ہے اس لئے غصہ نکالنے کی اجازت دی گئی۔ کہ بول چال ترک کر سکتے ہو۔ مشائخ کو بھی ایسے موقعہ پر غصہ گھونٹنے کا حکم نہ دینا چاہئے بلکہ موقع اور حالت کو دیکھ کر حکم دینا چاہئے۔ اسی لئے شیخ بننا بڑا مشکل ہے غرض عام حکم یہ ہے کہ تین دن تک نہ بولنا جائز ہے اور تین دن سے زیادہ ترک کلام جائز نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر گذر جانے سے غصہ کم

ہوجاتا ہے۔ پھر رات گذر جانے سے اگلے دن طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے. بوجھ نہیں رہتا۔ پھر تیسرے دن غصہ بالکل جاتا رہتا ہے۔اب شریعت ایسے وقت میں دونوں کو ملانا چاہتی ہے کہ ان کے دلوں پر غصہ کا بوجھ نہیں رہا۔ تجربہ ہے کہ تین دن کے بعد غصہ اور رنج کا طبعی اثر باقی نہیں رہتا ہاں اگر کوئی سوچ سوچ کر خود ہی رنج وغصہ کو تازہ کرنا چاہے تو اور بات ہے مگر یہ رنج وغصہ کسبی ہوگا طبعی اثر نہ ہوگا۔ شریعت نے طبعی تقاضہ کی رعایت کی ہے کیونکہ وہ اختیار سے باہر ہے، کسبی امور کی رعایت نہیں کی کیونکہ ان کا وجود و عدم اپنے اختیار میں ہے مگر یہ حدود اس رنج وغصہ میں ہیں جو دنیوی سبب سے ہو اور اگر دینی سبب سے ہو تو تین دن سے زیادہ بھی ترک کلام وسلام جائز ہے جب تک کہ وہ سبب باقی ہے۔ مثلاً نعوذ باللہ کوئی مرتد ہوگیا یا کوئی شخص فاسق وفاجر و زناکار ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ قطع تعلق کا منشا محض وہ معصیت ہی ہو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ قطع تعلق تو کرتے ہیں کسی دنیوی سبب سے مثلاً ان کو کسی سے کوئی زک پہونچی ہے اس لئے بول چال قطع کرتے ہیں۔ مگر ان کا نفس مولوی ہے وہ اس کے لئے دینی سبب نکال لیتا ہے کہ میں نے تو اس شخص سے قطع تعلق اس لئے کیا ہے کہ یہ فاسق ہے یا مبتدع ہے۔ اس مرض میں آجکل مولوی زیادہ مبتلا ہیں کہ وہ دنیا کو دین بنا لیتے ہیں، مگر ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ان تاویلوں سے مخلوق کو دھوکہ دے سکتے ہیں مگر خدا کے یہاں یہ ترکیبیں اور حیلے نہیں چل سکتے ؎

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام — در غلط اندازی تا ہر خاص وعام
کارہا باخلق آری جملہ راست — باخدا تدبیر وحیلہ کے رواست
کار او بار است باید داشتن — رایت اخلاص وصدق افراشتن
گر گہے اللہ در وغے میزنی — از برائے مسکہ دوغے میزنی

(میں نے فرض کیا کہ اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے بھی دیا مگر خدا تعالیٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ تو تیرے سب کام درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر و حیلہ کب جائز ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست

رکھنے چاہئیں۔ اخلاص اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیے۔ کبھی کبھی جھوٹی اللہ کی ضرب لگاتا ہے مسکہ کے لیے چھاچھ بلوتا ہے)

ان مولویوں سے تو عوام ہی اچھے کہ وہ گناہ کر کے اس کو گناہ تو سمجھتے ہیں، مگر یہ لوگ تو گناہ کرتے ہیں اور تاویل کر کے اس کو دین میں ٹھونسنا چاہتے ہیں ان پر گناہ معصیت کا بھی ہے اور تحریف دین کا بھی۔

ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے بے نمازی آدمی سے نفرت آتی ہے، سلام کرنے کو جی نہیں چاہتا، میں نے کہا کہ تم اس وقت اپنے کو اسے سے افضل سمجھتے ہو یا نہیں۔ اگر اپنے کو افضل سمجھتے ہو تو یہ نفرت شرعی نہیں بلکہ نفسانی ہے۔ کہنے لگے کہ ہاں میں اپنے کو افضل تو سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا بس یہی کسر ہے اس حالت میں تم اس سے بدتر ہو کیونکہ تکبر اور عجب سے بدتر کوئی گناہ نہیں۔ وہ تو بے نمازی ہی ہے مگر بے نمازی اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھا کرتا ہے اور تم نمازی ہو کر اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں اور دوسرے مسلمان کو حقیر سمجھتے ہو تم اس سے بھی زیادہ ایک گناہ میں مبتلا ہو۔ یہاں شاید کسی کو یہ سوال ہو کہ جب باوجود گناہ اور فسق و فجور کے ہم دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھیں گے تو پھر حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کیا چیز ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو ہم اپنے سے افضل بھی سمجھیں اور پھر اس سے بغض بھی رکھیں۔ اس پر ہم کو غصہ بھی آوے اُس سے ترک تعلق بھی کریں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو اپنی اولاد پر بھی کبھی غصہ آتا ہے یا نہیں اس وقت آپ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اولاد پر غصہ کرتے کے وقت ان کے فعل سے نفرت بھی ہوتی ہے، ان سے قطع تعلق بھی چند روز کے لئے کر لیا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ایک شفقت بھی دل میں ہوتی ہے۔ اور وہ شفقت ہی ان سب افعال کا منشا ہوتی ہے جس کی علامت یہ ہے کہ اس کی بدحالی پر رنج و افسوس ہو کر رونا آتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ خدا کرے کسی طرح جلدی اس کی اصلاح ہو جائے۔ نیز آپ غصے کے وقت اولاد کو حقیر و ذلیل بھی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اگر کوئی دوسرا ان کو حقیر و ذلیل کرنے لگے تو آپ کو ناگوار ہوتا ہے۔ پس اگر یہی شان عاصی پر غصہ کرنے کی ہو تو وہ بغض فی اللہ ہے

ورنہ نفسانی بغض ہے۔ ایک اشکال اس جگہ یہ ہوتا ہے کہ صاحب بے نمازی سے اپنے کو بدتر کیسے سمجھ لیں اور اس کو افضل کیسے سمجھیں جب خدا نے ہم کو ایک چیز دی ہے اور دوسرے کو نہیں دی۔ تو لامحالہ ہم دوسرے کو اس سے محروم دیکھ کر اپنے سے کم اور اپنے کو اس سے زیادہ سمجھیں گے۔ مثلاً خدا تعالےٰ نے ایک شخص کو ہزاروں روپئے دیئے ہیں اور دوسرے کو ایک بھی نہیں دیا تو اس صورت میں وہ ہزاروں والا اپنے کو مفلس سے کم اور مفلس کو اپنے سے زیادہ کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس اشکال کا جواب تو خود اشکال ہی کے اندر آگیا۔ وہ یہ کہ جب یہ نعمت خدا نے آپ کو دی ہے تو آپ یوں سمجھیں کہ میں تو سب سے بدتر تھا اور اب بھی بدتر ہوں مگر خدا نے محض اپنے فضل سے مجھ کو یہ نعمتیں دیدی ہیں اس میں میرا کچھ کمال نہیں۔ اس مضمون کے استحضار کے بعد آپ میں کبر و عجب پیدا نہ ہوگا۔ باقی یہ میں نے کب کہا ہے کہ آپ اپنے کو بے نمازی اور بے نمازی کو نمازی سمجھنے لگیں۔ اگر میں یہ کہتا اس وقت یہ اشکال ہوسکتا تھا کہ صاحب امیر آدمی کو اپنے کو مفلس اور مفلس کو امیر کیسے سمجھ لے۔ نہیں امیر اپنے کو امیر ہی سمجھے اور مفلس کو مفلس سمجھے مگر اس سے اپنے کو افضل نہ سمجھے یہ خیال کرلے کہ میں خود امیر نہیں ہوا بلکہ خدا نے مجھے امیر کیا ہے۔ اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ یہ نعمت مجھ سے سلب کرکے دوسرے کو دیدے۔ یہ بات جس کے دل میں جمی ہوئی ہوگی وہ ہرگز اپنے کو دوسرے سے افضل نہ سمجھے گا اور نہ دوسروں کو حقیر سمجھے گا۔ بلکہ ان کی حالت پر اسکو رحم آئے گا۔

یہ تو سرسری جواب ہے اور حقیقی جواب یہ ہے کہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ تو آپ یہ سمجھ لیں کہ اس وقت گو میں بظاہر دوسرے سے اچھی حالت میں ہوں مگر ممکن ہے کہ خاتمہ کے اعتبار سے وہ اچھا ہو۔ نیز باعتبار حال کے بھی ممکن ہے کہ دوسرے میں کوئی ایسی عمدہ فضیلت ہو جو تم میں نہ ہو۔ مثلاً اس کو خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلق محبت زیادہ ہو، اس میں تو اضع آپ سے زیادہ ہو کیونکہ ہم نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ ان میں ظاہری اعمال کم ہوتے ہیں مگر وقت پر معلوم ہوتا ہے

کہ ان کے دل میں خدا تعالےٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بہت زیادہ ہے تیسرے جو شخص اپنے نفس کے واسطے بغض نہ کرے گا بلکہ بغض فی اللہ کرے گا وہ محض خدا کا حکم سمجھ کر کرے گا اُس کو یہ وساوس وخیال ہرگز پیش نہ آدیں گے کہ میں افضل ہوں یا دوسرا، اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بادشاہ عادل اپنے بیٹے کو کسی بات پر سزا دے کہ اس کے دس بید ماری جاویں اس وقت شاہی حکم سے بھنگی شاہزادہ کے بید مارتا ہے مگر کیا اس کے دل میں یہ وسوسہ بھی آسکتا ہے کہ میں شاہزادے سے افضل ہوں ہرگز نہیں وہ جو کچھ کرے گا محض حکم کی وجہ سے کرے گا اور اپنی فضیلت کا اُسے وہم بھی نہ ہوگا، یہی حال بغض فی اللہ میں ہوتا ہے۔ بغض فی اللہ والا دوسرے سے بغض بھی کرتا ہے اُس سے قطع تعلق اور ترک سلام وکلام بھی کرتا ہے مگر پھر دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھتا ہے جیسے بھنگی بید مارتے ہوئے بھی شاہزادہ ہی کو اپنے سے بڑا اور افضل سمجھتا ہے۔

الغرض شریعت میں جذبات کی رعایت کا بہت خیال ہے مگر اس کے ساتھ حدود کی رعایت کا بھی بے انتہا اہتمام ہے پس جذبات کی رعایت کر کے تو طلاق کی اجازت دی گئی مگر مصالح کا لحاظ کر کے اولاً رجعی کی اجازت دی کیونکہ تین طلاقیں دینا فیصلہ کرنا ہے اور غصہ میں فیصلہ کرنا ممنوع ہے حکم یہ ہے لَا یَقْضِیَنَّ قَاضٍ بَیْنَ اثْنَیْنِ وَھُوَ غَضْبَانُ۔ غصہ کی حالت میں قاضی کو فیصلہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ غصہ میں ہر پہلو پر نظر نہیں ہوتی اس وقت ایک ہی پہلو پر نظر ہوتی ہے تو اس وقت کا فیصلہ صحیح نہ ہوگا اس میں غالب احتمال غلطی کا ہے اسی طرح غصہ میں تین طلاق دینے کا انجام اکثر بُرا ہوگا بعد میں ندامت وحسرت ہوگی۔ چنانچہ ہم نے بہت واقعات دیکھے اور سنے ہیں کہ تین طلاق دے کر بعد میں لوگ پچھتاتے تھے اور اب نکاح باقی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ شوہر کا کفر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ شاید اس سے کبھی کلمہ کفر نکل گیا ہو جس سے نکاح ٹوٹ گیا ہو تو اب یہ تین طلاقیں واقع نہ ہونگی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اسی لئے شریعت نے تین طلاق ایک دم سے

دینے کی ممانعت کی ہے۔ اسی طرح غصہ میں بچوں کو مارنا نہ چاہیئے کیونکہ غصہ میں یہ خیال نہیں رہتا کہ یہ کتنی سزا کا مستحق ہے ضرور حد سے تجاوز ہو جاتا ہے، مکتب کے میاں جی اس میں زیادہ مبتلا ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ لڑکر آئے بیوی سے اور فیض عام پہنچا سب لڑکوں کو بس ذراسی بات پر ایک لڑکے کے چھڑی لگائی تھی کہ ایک طرف سے سبھی کو مارتے چلے گئے خطا کی ایک نے اور سزا دی سب کو۔ بھلا یہ بھی کوئی انسانیت ہے ان کو خدا کا خوف نہیں آتا کہ آخرت میں اس کی باز پرس ہو گی۔ یاد رکھو لڑکوں کے معاف کرنے سے یہ ظلم معاف نہیں ہوتا وہ اگر معاف بھی کر دیں تو سر کا مدعی ہو گی اور اول تو ایسے میاں جی آج کل کہاں ہیں جو بچوں سے معافی چاہیں۔ ہم نے صرف ایک ملاّ کو دیکھا ہے، گنگوہ میں وہ شاگردوں سے معافی چاہا کرتے تھے جس کی صورت یہ تھی کہ اپنی کمر کھول کر بیٹھ جاتے اور جس لڑکے کو مارتے اس کے ہاتھ میں قمچی دیدیتے کہ بھائی تو میرے مار لے۔ بعضے شریر لڑکے ایسے بھی ہوتے تھے کہ وہ میاں جی کے سڑا سڑ قمچیاں لگاتے تھے۔ اس سے بھی خرابی ہوئی کہ لڑکے گستاخ ہو گئے۔ بچوں سے معافی کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے ایسا برتاؤ کیا جاوے کہ وہ خوش ہو جاویں نہ تو زبانی کافی ہے اور نہ اُن سے انتقام لینے کو کہا جاوے۔ بس آئندہ ان کو اپنے برتاؤ سے خوش کر دینا چاہیئے۔ ان کو پلاؤ، چمکارو، چوٹ کی جگہ سہلاؤ، دودھ پلادو، پیسہ دیدو بس اس طرح وہ خوش ہو جاویں گے تو آپ کے اوپر سے حق العبد اتر جائے گا لیکن اس کے بعد توبہ و استغفار کی بھی ضرورت ہے کیونکہ حق العباد میں حق اللہ بھی فوت ہوتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے لَا تُظْلِمُوْا (ظلم مت کرو) آپ نے اس حکم کی مخالفت کی یہ خدا تعالیٰ کا حق فوت ہوا پس طریقہ یہ ہے کہ بچوں کو غصہ اترنے کے بعد سزا دی جائے اس وقت جو کچھ سزا دی جائے گی وہ خطا کے موافق ہو گی حد سے تجاوز نہ ہو گا ہاں یہ ضرور ہے کہ غصہ فرو ہو جانے کے بعد مارنے میں مزہ نہیں آوے گا مگر جیسا کہ غصہ میں مارنے سے اس وقت مزہ آتا ہے ایسا ہی کبھی بعد میں بدمزگی بھی ایسی ہوتی ہے کہ آپ سارا مزہ بھول جائیں گے۔

مثلاً آنکھ پھوٹ گئی، کان پھٹ گیا، کہیں بے موقع ضرب آ گئی تو میاں جی کھینچے کھینچے پھریں گے اور ایسا نہ بھی ہوا تو آخرت کی بدمزگی تو ضرور ہوگی۔ غرض غصہ کے وقت کا فیصلہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک دم سے تین طلاقیں ہرگز نہ دینی چاہئیں کیونکہ وہ بھی نکاح کا فیصلہ ہے۔ اگر طلاق دو تو ایک دو۔ پھر دیکھو عورت کو ندامت ہے یا طلاق سے خوش ہے۔ بعض دفعہ عورت طلاق سے خوش بھی ہوا کرتی ہے کہ اچھا ہوا قصہ ختم ہوا۔ جس کا سبب کبھی تو شوہر کی زیادتی ہوتی کبھی خود عورت کی شرارت ہوتی ہے، کبھی دونوں طرف سے زیادتی ہوتی ہے تو وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتی ہے کہ اچھا ہوا روز روز کا فضیحتا جاتا رہا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میاں بی بی دونوں نیک ہوتے ہیں مگر پھر بھی عورت کو طلاق سے مسرت ہوتی ہے کیونکہ طبائع میں مناسبت اور موافقت نہ ہونے کی وجہ سے اجتماع نہیں ہو سکتا۔ جیسے سوڈا اور تاثری فی نفسہٖ عمدہ چیزیں ہیں الگ الگ رہیں تو کچھ آفت برپا نہیں ہوتی۔ مگر جہاں اجتماع ہوا شور برپا ہوا۔ ایسے ہی بعضے میاں بی بی الگ الگ رہیں تو بہت نیک ہیں مگر اجتماع سے آفت نازل ہوتی ہے اس میں علاوہ اختلاف مزاج کے ایک اور نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ حدیث میں ہے

اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ مَا تَعَارَفَ مِنْھَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاکَرَ مِنْھَا اخْتَلَفَ

روحیں ایک مجتمع لشکر کی صورت میں تھیں پس جن میں باہم اس وقت تعارف اور آشنائی ہو چکی ہے ان میں یہاں بھی الفت و محبت ہو جاتی ہے اور جنہیں اسی وقت تعارف نہیں ہوا وہ یہاں بھی میل نہیں کھاتے۔ یہ مضمون محض منقول ہے مشاہد نہیں۔ مگر مخبر صادق کی خبر ہے اس لئے ماننا پڑے گا۔ ہاں بعضے عارفین نے جن کو یہ واقعہ یاد رہا بتلایا ہے کہ عہد الست میں جب ارواح کا اجتماع ہوا تھا تو فلاں شخص ہمارے داہنے تھا فلاں بائیں طرف تھا، فلاں سامنے تھا نیز اہل کشف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس اجتماع کی چار صورتیں ہوئی تھیں بعض ارواح کا منہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھا ان میں تو تنہا میں بھی جانبین سے الفت ہو جاتی ہے۔ بعض اس طرح کھڑی تھیں کہ ہر ایک کی پشت دوسرے کی طرف تھی۔ ان میں ہر ایک کو دوسرے سے نفرت ہوتی ہے

اور بعض اس طرح جمع تھیں کہ ایک کا منہ دوسری کے پشت کی طرف سوان میں ایک کی طرف سے میلان ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے نفرت۔ اس سے معلوم ہوا کہ مزاج کا فطری اتحاد و اختلاف اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہے جن دو شخصوں کے مزاج میں اختلاف ہوتا ہے ان میں اتحاد نہیں ہوسکتا یہ قدرتی امر ہے۔ بعض دفعہ ایک شخص نیک ہوتا ہے مگر طبیعت کو اس کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ بعضے فاسق فاجر ہوتے ہیں مگر ان کی صورت دیکھ کر طبیعت کو کشش ہوتی ہے۔ پس اس پر تعجب نہ کیا جاوے کہ وہ نیک آدمیوں میں اختلاف مزاج کیوں ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ واقعی میاں بی بی دونوں نیک ہوتے ہیں مگر باہم نباہ نہیں ہوتا۔

روایات میں ہے کہ ایک عورت نے وضع ولد سے بیس منٹ پہلے اپنے شوہر سے طلاق مانگی اس کو یہ مسئلہ معلوم تھا کہ بچہ جننے سے فوراً عدت ختم ہوجاتی ہے اگرچہ اُس سے پانچ منٹ پہلے ہی طلاق دی گئی ہو شوہر کو اس وقت خیال نہ تھا اس نے کہا کہ خدا کی بندی اس وقت تو طلاق لے کر کیا کرے گی آخر کوئی وجہ بھی، کہنے لگی کہ وجہ کچھ بھی نہیں بس میرا دل خوش ہوجاوے گا تمہارا حرج ہی کیا ہے۔ ایک طلاق سے نکاح تھوڑا ہی ٹوٹتا ہے تم پھر رجعت کرلینا اس نے طلاق دیدی اور نماز کو چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں بچہ پیدا ہوا اور عدت ختم ہوگئی۔ تو بعض عورتیں بوجہ ناموافقت مزاج کے نباہ نہیں کرسکتیں اس لئے ان کو طلاق سے خوشی ہوتی ہے اسی لئے نکاح میں موافقت مزاج اور مناسبت طبائع کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ جب مزاج میں موافقت نہیں ہوتی تو نباہ دشوار ہوجاتا ہے اور اس نکاح سے زیادہ اس تناسب کے اشتراط میں پیری مریدی کا تعلق ہے اس کا تو سارا مدار مناسبت ہی پر ہے بدون مناسبت کے کچھ نفع ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے طالب کو چاہیئے کہ جس شیخ سے بیعت ہونا چاہے اس کے پاس کچھ مدت تک قیام کرے۔ جب باہم دونوں میں مناسبت ہوجائے اس

وقت بیعت کی درخواست کرے۔ مگر آجکل لوگوں کی حالت یہ ہے کہ آج ایک بزرگ کے پاس گئے اور اُن کی کوئی بات پسند آگئی بس لگے ان سے بیعت ہونے۔ پھر کل کو کسی دوسرے بزرگ کی کوئی ادا پسند آگئی بس ان سے بیعت ہو گئے۔ ان کی بعینہٖ یہ مثال ہے گنگا گئے گنگا داس، جمنا گئے جمنا داس۔ یہ لوگ طریق کو کھیل بنانا چاہتے ہیں یاد رکھو اس طرح مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک نہ ایک دن ان کی قلعی کھُل جاتی ہے۔ پھر کسی شیخ کو اس پر اعتماد نہیں ہوتا، ہرجائی مشہور ہو جاتا ہے ؂

وفا داری مدار از بلبلاں چشم
کہ ہردم بر گلے دیگر سرایت

(بلبلان چشم سے وفا کی امید نہ رکھو کہ ہر دم ایک پھول کو چھوڑ کر دوسرے پر چہچہاتی ہیں)

بیعت کا اتنی جلدی فیصلہ کرنا نہ چاہیئے کیونکہ یہ حالت جلدی ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر غور وفکر کے بعد مناسبت تامہ دیکھ کر بیعت ہوں تو ایک ہی کو لگے لپٹے رہیں گے۔ بعض لوگ کسی کے مریدوں کی تعریف پر اس سے بیعت ہو جاتے ہیں یہ بڑی سخت غلطی ہے کیونکہ مریدین تو اپنے شیخ کی تعریف کیا ہی کرتے ہیں۔ اپنی دہی کو کوئی کھٹی نہیں کہا کرتا تم کو خود چکھنا چاہیئے اور اپنے ذوق سے اس کے کھٹے میٹھے ہونے کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔

نیز آجکل ایک یہ بھی آفت ہے کہ بعض دنیادار مشائخ نے اپنے گرگے چھوڑ رکھے ہیں جن کو یہی کام سپرد کیا گیا ہے کہ لوگوں کو بہلا پھُسلا کر لاؤ اور ہم سے بیعت کراؤ۔ اور بعض دیندار مشائخ کے یہاں بھی ایسے گرگے موجود ہیں مگر ان مشائخ کو اس کی اطلاع نہیں ورنہ وہ ہرگز اس کو گوارا نہ کر سکتے اس لئے محض مریدوں کی تعریف وثنا پر کسی سے بیعت ہوتا بڑی غلطی ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ وہ تعلق ہے جس پر ایمان کی تکمیل کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر کسی محقق عارف کے ہاتھ میں پہونچ گئے تب تو ایمان

مکمل ہو جائے گا اور اگر کسی جاہل کے ہاتھ میں پہنچ گئے تو وہ تمہارا پہلا سرمایۂ ایمان بھی غارت کر دے گا۔ افسوس اتنا بڑا تعلق مگر لوگوں کو اس کے اصول کی خبر نہیں۔ اس میں بڑی اصل دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ شیخ عارف محقق ہو دوسرے تم کو اس سے مناسبت تامہ ہو۔ اگر شیخ عارف کامل ہو مگر تم کو اس سے مناسبت نہ ہو تو خاک نفع نہ ہو گا۔ اس لئے بیعت سے پہلے مناسبت کا دیکھنا بہت ضروری ہے ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے اور اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف جاؤ گے اور اس صورت میں مشائخ طریق کے ساتھ گویا تم نے کھیل کیا۔ جس میں وبال کا اندیشہ ہے ؎

با ہر کہ نشستی و نشد جمع دلت — وز تو نرمید صحبت و گلت

زنہار ز صحبتش گریزاں می باش — ورنہ نکند روح عزیزاں بحلت

(جس شخص کی صحبت میں تم کو اطمینان قلب نہ ہوا اور اس کی صحبت ترک نہ کرو تو اس کی صحبت مٹی اور پانی کی مثل ہے ضرور اس کی صحبت کو ترک کرو ورنہ روح مردہ ہو گی)

اسی طرح اگر تم کو ایک شیخ سے نفع نہ ہوا لیکن پھر بھی تم اس کو لگے لپٹے رہے۔ اور دوسرے کی طرف رجوع نہ کیا جب بھی تم نے طریق کا حق ضائع کیا۔ غرض ایسا شخص مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نہ اس کو چھوڑتے بن پڑتی ہے نہ الگ ہوتے۔ اس لئے مناسبت کا دیکھنا بہت ضروری ہے۔ جس کے لئے پاس رہنے کی ضرورت ہے۔ اور گو عدم اعتقاد کے لئے تفتیش کی ضرورت نہیں کیونکہ مشائخ کا معتقد ہونا کچھ فرض و واجب نہیں لیکن دست بدست ہونے کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے جیسا کہ اگر تم کسی عورت سے نکاح نہ کرنا چاہو تو اس کے لئے تفتیش کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں نکاح کے لئے چھان پھوڑ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نکاح نہ کرنا معیوب نہیں لیکن نکاح کے بعد طلاق دینا بُرا ہے۔ اس لئے نکاح سے پہلے عورت کے اخلاق و عادات، صورت و سیرت کی خوب تحقیق کر لینی چاہیئے۔ لیکن مشائخ کی تفتیش خود بلا واسطہ کرے اور نکاح میں اولیاء و اقرباء کے واسطہ سے تحقیق کرے مگر آجکل نکاح میں تو مناسبت و موافقت کی

تحقیق و تفتیش کی کسی قدر ضرورت لوگ سمجھتے ہیں اور بیعت ہونے کے لئے اس کا مطلق اہتمام نہیں حالانکہ نکاح ایک دنیوی کام ہے اور بیعت ہونا دینی کام ہے جس پر ایمان کی تکمیل موقوف ہے دوسرے اس میں امور محسوسہ کی تفتیش ہے اور اس میں امور معنویہ کی اور ظاہر ہے کہ امور معنویہ کی تفتیش کے لئے اہتمام بلیغ کی ضرورت ہے ۔ تیسرے اس میں ناقصات العقل سے تعلق ہے اور اس میں کامل العقل سے تعلق ہے اتنی وجوہ ترجیح کے ہوتے ہوئے پھر بھی اس کا اہتمام نہ ہوتا جائے تعجب ہے یہ مضمون استطراداً ذکر ہوگیا۔

میں طلاق کو بیان کر رہا تھا کہ اگر ضرورت ہو تو ایک طلاق دے پھر اگر اس سے عورت کو تنبیہ نہ ہوئی ہو تو دوسرے طہر میں دوسری طلاق دے سکتا ہے ۔ اس صورت میں ایک مہینہ کم از کم سوچنے کے لئے اس کو ملے گا جس میں تمام مصالح پر نظر کر سکتا ہے ۔ دوسری طلاق ایک مہینہ کے بعد ہی دے گا جس کو بہت ضرورت ہو گی اس کے بعد پھر ایک ماہ تک اور سوچتے رہو اگر طلاق سے مصالح فوت ہونے کا اندیشہ ہو تب تو رجعت کر لو اور اگر نباہ دشوار ہی معلوم ہو تو تیسری طلاق تیسرے مہینے میں دے سکتے ہو۔ اگرچہ بہتر یہ ہے کہ تیسری طلاق نہ دے بلکہ عدت ختم ہونے دے وہ خود ہی نکاح سے نکل جائے گی شاید نکاح سے نکلنے کے بعد پھر دونوں کی رائے تجدید نکاح کی ہو تو سہولت رہے گی ۔ تین طلاق کے بعد بدون حلالہ کے نکاح نہ ہو سکے گا۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا ۔ یعنی تین طلاق ایک دم سے نہ دو تم کو کیا خبر ہے شاید حق تعالیٰ بعد میں تمہاری رائے بدل دیں پھر تم کو پچھتانا پڑے گا۔ یہ حکمت بظاہر طلاق کے متعلق ہے مگر لَا تَدْرِیْ کا تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں) کے بعد میں لانا اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمت تمام حدود کے متعلق ہے گو کہیں بے تکلف وہ حکمت مفہوم ہو جاتی ہے اور کہیں ذرا غور و تامل سے معلوم ہوتی ہے ۔ یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ شریعت کا کوئی حکم حکمت سے

خالی نہیں۔ اول تو ہر حکم میں اس کے مناسب جزئی مصالح اور حکمتیں بھی بہت ہوتی ہیں ورنہ کم از کم یہ حکمت تو لا تدری کی مدلول ہے سب کو ہی عام ہے۔ نمونہ کے طور پر سنئے حق تعالٰی نے خرچ کے متعلق فرمایا ہے۔ وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ط کہ افراط و تفریط سے بچنا چاہیے۔ اور اعتدال سے خرچ کرنا چاہیے۔ دوسری آیت میں ہے وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ (نہ اپنے ہاتھوں کو گردن سے باندھ لو نہ پوری طرح کھول دو) اس حد میں بھی یہ حکمت ہے۔ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ط یعنی اسراف مت کرو شاید حق تعالٰی بعد میں کوئی نئی بات پیدا کر دیں جس کے لئے تم کو روپیہ کی ضرورت ہونے لگے۔ بعض دفعہ مال ہوتے ہوئے کوئی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ روپیہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ مگر بعد میں دفعۃً ضرورت نکل آتی ہے، کوئی بیمار ہو گیا یا کوئی مقدمہ سر پر آپڑا اس لئے سارا روپیہ برباد نہ کرنا چاہیئے۔ کچھ اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیئے۔

ہمارے حاجی صاحب باوجود بڑے کامل تارک ہونے کے فرماتے تھے کہ اہل تعلقات کو کچھ ذخیرہ مال کا نفس کے بہلانے کو اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیئے۔ دیکھئے حکما یہ حضرات ہیں کہ ہر شخص سے اس کی حالت کے مناسب معاملہ کرتے ہیں اور واقعی وہ شیخ اناڑی ہے جو ساری دنیا کو تارک بنانا چاہے۔ جو شخص سب مریدوں کو ایک ہی لکڑی ہانکے وہ اس حکیم کے بیٹے کے مشابہ ہے جو ایک بار اپنے باپ کے ساتھ کسی مریض کو دیکھنے گیا۔ باپ نے نبض دیکھ کر کہا کہ شاید آپ نے نارنگی کھائی ہے۔ مریض نے اقرار کیا۔ حکیم نے آئندہ کو منع کر دیا۔ راستہ میں لوٹتے ہوئے لڑکے نے باپ سے پوچھا کہ آپ نے نبض سے کیسے معلوم کر لیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے۔ کہا نبض سے تو برودت و بلغم کا اثر معلوم ہوا تھا پھر وہاں نارنگی کے چھلکے پڑے ہوئے نظر آئے اس قرینہ سے میں سمجھ گیا کہ اس نے آج نارنگی کھائی ہے۔ پس صاحبزادہ کے ہاتھ ایک قاعدہ کلیہ آگیا۔ باپ تو مر گئے۔ آپ ان کی جگہ بیٹھے وہی مثل ہوئی کہ

آدمیاں گم شدند ملک خدا خر گرفت
زشتیٔ اعمال ما صورت نادر گرفت

(اہل آدمی گم ہو گئے ملک خدا گدھوں و نااہلوں) کے قبضہ میں آیا ہماری بداعمالی نے نادر کی صورت اختیار کی)

ایک مرتبہ کسی رئیس کے یہاں تشریف لے گئے اس کی نبض دیکھ کر چارپائی کے نیچے دیکھا آپ کہتے ہیں کہ شاید آپ نے نمدہ کھایا ہے۔ اتفاقاً پلنگ کے نیچے نمدہ ہی پڑا تھا لوگ ہنسنے لگے کہ بھلا نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ نبض سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں نے نکالدیا کہ جا تیری دم میں نمدہ۔

اسی طرح بعضے عطائی حکیم ہر شخص کو سنکھیے کا تیل بتلادیتے ہیں چاہے کسی کے موافق ہو یا نہ ہو، تو جیسے یہ لوگ اناڑی طبیب ہیں ایسے ہی وہ شیخ بھی اناڑی ہے جو سب کو تارک بنانا چاہے۔ یاد رکھو فطری طور پر طبائع مختلف ہیں۔ کسی کو بدون مال کے جمعیت ہوتی ہے کسی کو مال ہی سے جمعیت ہوتی ہے اور ہر ایک کے لئے توکل کی شان جدا ہے جس کو بدون مال کے جمعیت نہ ہو اس کے لئے مال جمع کرنے کے ساتھ بھی توکل جمع ہوسکتا ہے اور جس کو بغیر مال کے جمعیت ہوسکے اس کے لئے اس طرح بھی توکل صحیح ہوسکتا ہے پس توکل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ آئے سب خرچ کرڈالے کچھ جمع نہ کرے ہاں یہ کہنا چاہیئے کہ توکل کی ایک صورت یہ بھی ہے وہ حکیم عطائی ہے جو سب کو تارک بنا کر متوکل بنانا چاہے۔ دیکھئے حضرت صدیق اکبر رضؓ نے بیت المال سے تنخواہ لی ہے اور حضرت عمر رضؓ نے اول اول نہیں لی پھر بطور قرض لینے لگے مگر دونوں متوکل تھے۔ کیا حضرت صدیق اکبر رضؓ پر کوئی شخص یہ گمان کرسکتا ہے کہ وہ متوکل نہ تھے۔ نیز حضرات صحابہ میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کے پاس ہزاروں لاکھوں روپئے جمع تھے اور یقیناً صحابہ سے بڑھ کر کوئی متوکل نہیں ہوسکتا پس یہ خیال غلط ہے کہ توکل کے لئے مال جمع نہ کرنا شرط ہے۔ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ پر بھروسہ اور اعتماد ہو۔ اسباب پر نظر نہ ہو۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ اسباب کو جمع ہی نہ کرے

ایک صورت یہ ہے کہ اسباب کو جمع کرکے پھران پر نظر نہ کرے۔ تو شیخ کو چاہیئے کہ جس شخص کی طبیعت کمزور دیکھے اس کو مال جمع کرنے سے نہ روکے بلکہ مال جمع کرنے کے ساتھ اس کو توکل کی تعلیم دے اور طبیعت کا کمزور ہونا قوی ہونا یہ فطری امر ہے اگر کوئی شخص فطرۃً کمزور ہو تو اس سے ولایت و معرفت میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ میرا سارا رزق ایک دم سے دیدیجئے۔ الہام ہوا کیا تم کو ہم پر اعتماد نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ الٰہی مجھے آپ پر اعتماد کیوں نہ ہوتا۔ لیکن شیطان مجھ سے کہتا ہے کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا۔ میں کہتا ہوں خدا دے گا کیونکہ اس کا وعدہ ہے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (اور کوئی جاندار روئے زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) تو وہ کہتا ہے کہ خدا کا وعدہ سچا ہے مگر یہ تو نہیں فرمایا کہ تم کو کل ہی کو رزق مل جاوے گا۔ بس یہ وعدہ ہے کہ رزق ہمارے ذمہ ہے تو ممکن ہے کہ تین چار دن کے بعد روزی ملے جبکہ تم فاقے کرکے پریشان ہوچکو گے یہاں آکر میں خاموش ہوجاتا ہوں اگر ساری روزی مجھے ایک دم مل جائے تو میں اس کو ایک کوٹھری میں بند کرکے رکھدوں گا، پھر اگر شیطان مجھ سے کہے گا کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا تو میں اشارہ کرکے بتلادوں گا کہ اس کوٹھری میں سے کھاؤں گا پھر آگے اس کی بات نہ چل سکے گی۔ تو دیکھئے ان بزرگ نے اپنی طبیعت کی کمزوری کا کیسا علاج کیا۔ اب یہاں سے اُن واعظوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو سارے مسلمانوں کو بے ایمان بتلاتے ہیں کہ ان کو وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (اور کوئی جاندار زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) پر بھروسہ اور یقین نہیں۔ اور اس کی تائید میں یہ دلیل بیان کیا کرتے ہیں کہ دیکھو اگر کوئی شخص ان کی دعوت کردے تو شام کو میرے یہاں کھانا کھایئے گا تو اس کی بات پر ایسا یقین ہوجاتا ہے کہ فوراً چولھا ٹھنڈا کردیتے ہیں اور گھر میں کھانا نہیں پکواتے۔ اور خدا تعالےٰ

ان کی دعوت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تمہاری روزی ہمارے ذمہ ہے تو اس پر اعتماد کر کے کوئی بھی چولھا ٹھنڈا نہیں کرتا۔

یاد رکھو یہ مضمون غلط ہے اور ہر مسلمان کو حق تعالیٰ کے ارشاد پر یقین ہے مگر پھر یہ فرق اس لئے ہے کہ دعوت کرنے والا تو وقت مقرر کر دیتا ہے کہ شام کو آج ہی دعوت ہے اور حق تعالیٰ نے دن یا وقت مقرر نہیں کیا اُن کا وعدہ مطلق ہے اس لئے ابہام سے بعضوں کو پریشانی ہوتی ہے کہ نہ معلوم یہ وعدہ کب پورا ہو۔ اگر حق تعالیٰ کی طرف سے بھی وعدہ معین ہوتا تو خدا کی قسم جو کوئی مسلمان فاسق سے فاسق بھی چولھا تیار کرتا۔

دوسری یہ کہ بعض دفعہ حق تعالیٰ کا وعدہ کسی شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے جو کلام میں صراحۃً مذکور نہیں ہوتی۔ مثلاً حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تم جس کام کا ارادہ کرو گے ہم اس کو پورا کر دیں گے، مگر اس کے لئے ایک شرط بھی ہے وہ یہ کہ تم اپنی طرف سے کوشش بھی کرو۔ اسی طرح یہاں بھی احتمال ہے کہ ہر شخص کی روزی خدا کے ذمہ ہے یعنی بشرطیکہ تم اس کے لئے کوشش بھی کرو۔ اس لئے مسلمان کوشش کرتے ہیں اگر حق تعالیٰ کوشش سے بھی منع فرما دیتے تو کوئی شخص بھی اسباب کو اختیار نہ کرتا۔ بعض لوگوں کو اس جگہ ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (اور کوئی جاندار روئے زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا رزق خدا کے ذمہ ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ قحط کے زمانہ میں بھوکوں مر جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے رِزْقُهَا میں اضافت ہے جس سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کا جو رزق مقدر ہے اس کا پہونچانا خدا کے ذمہ ہے، اب جو لوگ بھوکوں مر جاتے ہیں ان کا رزق ہی نہ رہا تھا اس لئے وہ فاقہ سے مر گئے اگر ان کا رزق باقی ہوتا تو کبھی فاقہ سے نہ مرتے لہٰذا اب کچھ اشکال نہیں غرض ان بزرگ نے یہ دعا کی تھی کہ میرا سارا رزق ایک دم سے مل جائے

تا کہ اگر شیطان مجھ سے یہ کہے کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا تو میں کہدوں گا کہ اس کوٹھری سے کھاؤں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعضے بزرگ بھی دل کے کچے ہوتے ہیں ان کو رزق جمع کرنے کے بعد اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے بس سب کو تارک بنانا یہ عطائی حکیموں کا کام ہے۔ محقق کبھی ایسا نہ کرے گا چند روز سے خود مجھے یہ واقعہ پیش آرہا ہے کہ مجمع میں مجھ سے پانی نہیں پیا جاتا۔ بس تھوڑا سا پیا اور پیاس جاتی رہی یہ بھی طبیعت کی کمزوری ہے تقدیم میں اس وقت زیادہ پانی نہیں ہوتا مگر صراحی میں ہونے سے تسلی رہتی ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت۔ ہے کہ وہ ایک بادشاہ سے باتیں کر رہے تھے اور بے باکانہ گفتگو کر رہے تھے غالباً بادشاہ کو کسی حرکت پر تنبیہ کر رہے تھے بادشاہ کو غصہ آگیا اور اس نے پکارا کوئی ہے۔ تو ان بزرگ صاحب نے بھی آواز دی کہ کوئی ہے۔ بس ان کا پکارنا تھا کہ دفعۃً غیب سے ایک شیر نمودار ہو کر بادشاہ کی طرف لپکا جس کو دیکھ کر بادشاہ تو بھاگا ہی تھا وہ بزرگ خود بھی بھاگے حالانکہ انہی کی کرامت سے وہ آیا تھا مگر آپ خود بھی اس سے ڈر کر بھاگے بات کیا تھی، بات یہ تھی کہ ان کا دل کمزور تھا تو یہ بزرگی کے منافی نہیں۔ بزرگوں کو ضعف قلب اور اختلاج اور خفقان ہو سکتا ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا مرض ہے جس طرح ان کو بخار وغیرہ ہو جاتا ہے ضعف قلب اور اختلاج بھی ہو جاتا ہے اس سے ولایت و معرفت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔

دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ کی گفتگو ہو رہی تھی نبوت عطا ہو چکی تھی اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو ایک معجزہ عطا فرمانا چاہا۔ حکم ہوا کہ اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو۔ چنانچہ ڈال دیا اور وہ ہیبتناک اژدہا بن گیا موسیٰ علیہ السلام اس کو دیکھ کر ڈر گئے اور پیٹھ موڑ کر ایسے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَانٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ (سو انہوں نے جب اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی تو نہ دیکھا)

بھلا اس سے زیادہ قوت قلب کے اسباب کیا ہوں گے کہ بلا واسطہ حق تعالےٰ سے گفتگو بھی ہو چکی تھی، نبوت عطا ہو چکی تھی۔ حق تعالےٰ کے ارشاد سے عصا کو ڈالا تھا مگر پھر بھی بشریت کے اقتضا سے اژدہا کا خوف غالب ہو گیا اور بھاگ گئے معلوم ہوا کہ خوف طبعی نبوت کے بھی منافی نہیں ولایت اور بزرگی کے منافی تو کیا ہوتا بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ علماء کو ایسا ہونا چاہیئے یَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللہ کہ بس خدا ہی سے ڈریں اور کسی سے نہ ڈریں، ان کے نزدیک علماء کو نہ شیر سے ڈرنا چاہیئے نہ سانپ بچھو سے نہ توپ سے نہ بندوق سے نہ حکام سے نہ ڈاکوؤں سے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ موذی چیز سے انبیاء علیہم السلام کو بھی خوف طبعی ہوتا تھا اگر یہ خوف طبعی توکل کے خلاف ہے تو کیا معاذاللہ انبیاء علیہم السلام کو غیر متوکل کہو گے ہرگز نہیں کس کا منہ ہے جو اپنے کو موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ متوکل بتائے مگر وہاں یہ حالت تھی کہ نبوت کے بعد ان کے دل میں فرعون سے بھی خوف تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں قَالَا رَبَّنَا اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ۝ قَالَ لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی ۝ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو فرعون کی طرف سے یہ خوف ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرنے لگے یا حد سے بڑھ جائے (تم ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں) باوجودیکہ حق تعالےٰ کی طرف سے ان کو صریح اور صاف حکم ہو چکا تھا اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکشی پر کمر باندھ رہا ہے مگر باایں ہمہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے آجکل کے بہادروں کی طرح اپنی بہادری ظاہر نہیں کی کہ ہم کو نہ قتل کا خوف ہے نہ قید خانہ کا اندیشہ ہے ہم بلاخوف و خطر اس خدمت کو انجام دیں گے بلکہ انہوں نے اپنے طبعی خوف کو حق تعالےٰ سے عرض کر دیا کہ ہم کو اس کی زیادتی سے ڈر لگتا ہے اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم کو قتل نہ کر دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ طبعی خوف کا ہونا نبوت و ولایت کے بالکل منافی نہیں ورنہ حق تعالےٰ اس

خوف پر انکار فرماتے۔ مگر حق تعالیٰ نے اس پر ان کو ذرا ملامت نہیں کی بلکہ تسلی دیکر فرمایا کہ لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَکُمَا تم ڈرو نہیں تمہاری ساتھ ہوں اور دوسری جگہ ارشاد ہے نَجْعَلُ لَکُمَا سُلْطَانًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْکُمَا اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَکُمَا الْغَالِبُوْنَ ۝ کہ ہم تم کو رعب عطا کریں گے جس کی وجہ سے وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے اور تم کو اور تمہارے متبعین ہی کو غلبہ حاصل ہوگا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے طبعی خوف کے ازالہ کا سامان کرلیا اس وقت فرعون کے پاس تشریف لے گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ (وہ اللہ سے ڈرتے ہیں خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے) میں خوف طبعی کی نفی نہیں بلکہ خوف عقلی کی نفی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ آیت تبلیغ احکام کے متعلق ہے اور مقصود یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام میں سوائے خدا کے کسی سے ایسا نہیں ڈرتے کہ وہ تبلیغ سے مانع ہوجاوے۔ چنانچہ پوری آیت اس طرح ہے اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا ۝ وہ انبیاء ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہونچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

اس میں تبلیغ احکام کے وقت غیر اللہ کے خوف عقلی کی نفی کی گئی ہے۔ رہا یہ کہ ان کو کسی سے خوف طبعی بھی نہیں ہوتا یہ اس آیت کا مفہوم نہیں۔ لوگ قرآن کو ادھورا پڑھتے ہیں اس لئے اشکال ہوتا ہے پورے مضمون پر نظر کرنے کے بعد کچھ اشکال نہیں رہتا۔ غرض تبلیغ احکام کے وقت بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت خوف طبعی کسی درجہ کا لاحق نہیں ہوتا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہورہا ہے کہ ان کو فرعون سے طبعی خوف تھا اسی لئے انہوں نے حق تعالیٰ سے اپنا خوف ظاہر کرکے اس کا علاج چاہا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام ضرور کرتے ہیں اور تبلیغ کے متعلق خوف عقلی تو ان کو صرف خدا سے ہوتا ہے مخلوق کا خوف عقلی انہیں ذرا نہیں ہوتا جس کے اثر سے خوف طبعی مخلوق کا ان پر ایسا غالب نہیں ہوتا جو تبلیغ سے روک دے بلکہ اگر کسی وقت

مخلوق سے ان کو خوف طبعی ہوتا بھی ہے تو وہ خشیت خداوندی سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ پس مخلوق کے خوف عقلی کی تو مطلقاً نفی ہے اور خوف طبعی کی مطلقاً نفی نہیں بلکہ اس کے غلبہ کی نفی ہے۔

اب یہ مضمون ان شاء اللہ تعالیٰ کسی نص سے متعارض نہ ہوگا۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر علماء کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ مخلوق سے خوف عقلی ان کو ذرا نہ ہو اور خوف طبعی اگر ہو تو خوف خداوندی سے مغلوب ہو اس پر غالب نہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ علماء کے ذمہ تبلیغ فرض ہوتی ہے وہاں بیشک ان پر خوف خداوندی ہی غالب ہوتا ہے مخلوق کا خوف طبعی غالب نہیں ہوتا مگر جہاں ان پر تبلیغ فرض ہی نہو محض مستحب ہو وہاں اگر ان کو مخلوق سے طبعی خوف ہو تو اس میں کیا حرج ہے۔ بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ ان پر تبلیغ ہر حالت میں فرض ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جن علماء کو تم خائف کہتے ہو وہ اس خوف کی وجہ سے کسی فرض و واجب کو ترک کر رہے ہیں یا مباح و مستحب کو۔ اگر تم انصاف سے دلائل میں غور کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ مخلوق کے خوف سے کسی فرض و واجب کو ہرگز ترک نہیں کرتے بلکہ محض بعض مباحات یا بہت سے بعض مستحبات کو ترک کر رہے ہیں۔ سو ایسی حالت میں وہ يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ (اس سے ڈرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے) کے خلاف کیونکر ہوتے (بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ جن مسائل کی تبلیغ آجکل کے بہادر لوگ کر رہے ہیں علماء بھی ان سب کی تبلیغ کر رہے ہیں صرف عنوان کا فرق ہے۔ بہادران قوم مقابلہ اور سب و شتم کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں اور جن کو تم خائف کہتے ہو وہ تہذیب اور نرمی کے ساتھ اُن مسائل کو بیان کرتے ہیں، اب صرف اس بات کا فیصلہ باقی رہا کہ مخالفین اسلام کے سامنے آیا ہم کو مقابلہ اور سب و شتم کے ساتھ احکام کو ظاہر کرنا چاہیئے یا نرمی و تہذیب کے ساتھ سو اس کا فیصلہ خود قرآن مجید نے کر دیا ہے۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرما کر جب فرعون کے پاس تبلیغ احکام کے لئے جانے کا حکم فرمایا

تو اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ○ اور فرعون سے نرمی کے ساتھ بات چیت کرنا شاید اس کو نصیحت ہو جاوے یا خدا کا خوف اس کے دل میں آجاوے۔ دیکھئے موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ کون متوکل ہوگا اور فرعون سے زیادہ ظالم و سرکش کون مگر بااینہمہ یہ حکم ہو رہا ہے کہ اس سے نرمی کے ساتھ گفتگو کیجئے گا۔

صاحبو قاعدہ یہی ہے کہ جب کسی مخالف پر اپنا زور اور دباؤ نہ ہو تو وہاں مقابلہ اور سختی نافع نہیں ہوتی بلکہ اکثر مضر ہو جاتی ہے ایسے موقع میں اکثر نرمی ہی سے کچھ نفع ہو جاتا ہے ۱۲ جامع)

غرض بعض لوگ فطرۃً دل کے کمزور ہوتے ہیں اور بعض قوی القلب ہوتے ہیں تو وہ شیخ اناڑی ہے جو اپنی قوت کو دیکھ کر مریدوں کو بھی اسی کی تعلیم دے کہ میری طرح تم بھی تارک بن جاؤ۔ اس کی وہی مثال ہوگی جو چوہے اور اونٹ کی مثال ہے کہ ایک اونٹ سے کسی چوہے کی دوستی ہوگئی تھی، ایک مرتبہ دونوں ساتھ ساتھ جارہے تھے کہ راستہ میں دریا آیا اونٹ تو دریا میں گھس گیا چوہا کنارہ ہی پر رہ گیا۔ اونٹ نے چوہے سے کہا کہ تم کیوں رک گئے، اس نے جواب دیا کہ مجھے ڈوبنے کا خوف ہے اونٹ نے کہا نہیں پانی زیادہ نہیں ہے صرف گھٹنوں تک ہے۔ چوہے نے کہا حضور آپ کے گھٹنوں تک ہے کہ میرے بھی ذرا آپ اپنے گھٹنوں کو تو دیکھیں کہ کتنے اونچے ہیں جب اتنا پانی ہے تو میرا کہاں پتہ رہے گا۔ اسی طرح جو شیخ اپنے گھٹنوں تک پانی دیکھ کر چوہے مرید سے بھی کہے کہ چلے آؤ وہ بیوقوف ہے ہمارے حضرات نے ہمیشہ اس کی رعایت کی ہے کہ ہر شخص کو اس کے مناسب حال تعلیم کی جاوے۔ چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب صاحب کے پاس ایک خانصاحب جو کہ اس سے پہلے بھی کئی بار کسی ظالم کی شکایت اور دعا کی درخواست لے کر آچکے تھے ایک دن پھر آئے اور عرض کرنے لگے کہ حضرت وہ شخص برابر میرے اوپر ظلم کر رہا ہے اب تو اس نے میری زمین بالکل ہی دبالی ہے ظلم سے باز نہیں آتا۔ میں کیا کروں۔ حاجی صاحب نے فرمایا بھائی صبر کرو خدا تعالےٰ

تم کو اور کہیں سے روزی دیدیں گے ۔

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے یہ جواب سُن لیا' حجرہ سے باہر تشریف لائے اور خانصاحب سے کہا کہ نہیں خاں صاحب جاؤ اس کی نالش کرو ہم دعا کریں گے اور حاجی صاحب سے فرمایا کہ آپ کے نہ بیوی نہ بچّے اس لئے ہر چیز سے صبر کر کے بیٹھ گئے تو آپ سبھی کو صبر کی تعلیم کرنے لگے ۔ بھلا وہ بیچارہ بیوی بچوں والا آدمی اُس سے فاقہ مستی پر کیونکر صبر ہوگا ۔ آپ کے صبر کا انجام تو وصول الی اللہ ہے اور اس کے صبر کا انجام وصول الی السقر (دوزخ) ہے کیونکہ وہ صبر کر کے بعض دفعہ پریشان ہوگا ۔ اور جب پریشانی کے ضبط کا تحمل نہ رہے گا تو گناہ کرنے لگے گا ۔ میں کہتا ہوں کہ یہاں تک بھی غنیمت ہے اگر خدانخواستہ کسی نے ایسی حالت میں اس کو بہکا دیا تو وہ عیسائی ہوجاوے گا ۔ ہم نے ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ بعض لوگوں سے تنگی اور فقر پر صبر نہ ہو سکا تو انہوں نے دین بدل دیا نعوذ باللہ من ذلک ۔ اسی طرح حضرت حاجی صاحب اکثر عوام کو صبر کی تعلیم نہیں فرماتے تھے بلکہ ان کو اختیار اسباب کا امر فرمایا کرتے تھے ۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسماۃ نے حضرت سے عرض کیا کہ میں اپنی زمین کو وقف کرنا چاہتی ہوں ' حضرت نے منع فرمایا کہ زمین کو وقف نہ کرو اپنی ملک ہی میں رکھو اس سے نفس کو سہارا رہتا ہے ۔ یہ مضمون حدیث میں بھی ہے ۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص زمین کو فروخت کرے تو اس روپے سے جلدی کوئی زمین ہی خریدلے کیونکہ نقد میں برکت نہیں ہوتی ۔ اِدھر اُدھر خرچ ہوجاتا ہے ۔ اور ایک دوسری حدیث شریف میں یہ ارشاد بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اے عائشہؓ تم زمین وجائیداد نہ خریدنا بظاہر ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے مگر وجہ تطبیق یہ ہے کہ جس کے پاس پہلے سے زمین ہو وہ تو اس کو ضائع نہ کرے کیونکہ وہ اس سبب معاش کا پہلے سے خوگر ہے اگر زمین نہ رہی تو پریشان ہوگا ۔ اور جس کے پاس نہ ہو وہ خواہ مخواہ اپنے سر پر یہ بلا نہ خریدے کیونکہ زمین جائداد میں مشغولی زیادہ ہوتی ہے ۔ سبحان اللہ ۔

ہر شخص کی حالت کی جداگانہ رعایت ہے سب کو ایک لکڑی نہیں ہانکا گیا۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نواب صاحب رئیس چھتاری کو ایک حکیمانہ خط لکھا تھا جس میں نواب صاحب کی حالت کی بہت زیادہ رعایت تھی نواب صاحب کا ارادہ یہ ہوا تھا کہ ہجرت کرکے حرم شریف میں قیام فرمائیں۔ اول تو حضرت حاجی صاحب اکثر عازمین ہجرت کو فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں اس حالت میں رہنا کہ جسم وہاں ہو اور دل مکہ مکرمہ میں یہ اس سے بہتر ہے کہ جسم مکہ مکرمہ میں ہو اور دل ہندوستان میں اس لئے جب تک شوق کا غلبہ بیحد نہ ہو اس وقت تک ہجرت کا ارادہ نہ کرے مگر نواب صاحب کا غلبہ شوق حضرت کو معلوم تھا اس لئے منع تو نہیں فرمایا مگر ان کو یہ لکھا کہ جب یہاں آنے کا ارادہ کریں تو ریاست کا معقول انتظام کرکے آدیں تاکہ ریاست کی طرف سے کسی قسم کا فکر دل پر نہ ہو۔ ایک بات یہ بھی لکھی تھی کہ جب ریاست کا انتظام آپ دوسروں کے سپرد کریں تو اس کا خیال رکھا جائے کہ ملازمین کی تنخواہیں بڑی بڑی ہوں کیونکہ جب تنخواہ معقول ہوتی ہے تو انسان رشوت اور خیانت کا قصد نہیں کرتا اور تھوڑی تنخواہ میں اس وقت تو آپ کو کفایت معلوم ہوتی ہے مگر بعد میں ملازمین خیانت اور غبن کرکے زیادہ نقصان پہونچاتے ہیں۔ سبحان اللہ دنیا کی سمجھ بھی ان ہی حضرات کو زیادہ ہے۔ اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ مکہ معظمہ میں رہ کر آپ ریاست سے جو کچھ صدقات وخیرات کرنا چاہیں وہ رقم اپنے پاس نہ منگاویں جو کچھ سخاوت کرنی ہو سب وہیں کسی کے سپرد کردیں جو آپ کی مرضی منشاء کے موافق تقسیم کردے بلکہ مناسب تو یہ تھا کہ آپ اتنی تنخواہ کا بھی وہیں سے انتظام نہ کرتے بلکہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی کریم کے یہاں جایا کرتا ہے تو اپنے ساتھ توشہ باندھ کر نہیں لیجاتا۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

روض الریاحین میں لکھا ہے کہ ایک نوجوان لڑکا قافلہ حجاج کے ساتھ تھا مگر اس کے ساتھ کچھ توشہ نہ تھا کسی نے اس سے دریافت کیا کہ میاں تم کہاں جارہے ہو

کہا بیت اللہ کا ارادہ ہے، لوگوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ نہ کچھ توشہ ہے نہ سامان ہے آخر یوں بے سروسامان کس طرح پہونچو گے اس پر نوجوان زاہد کو جوش ہوا اور اس نے بزبان قال یا حال یہ جواب دیا ؎

وَفَدْتُ عَلَى الْكَرِيْمِ بِغَيْرِ زَادٍ　　مِنَ الْحَسَنَاتِ وَالْقَلْبِ السَّلِيْمِ
وَإِنَّ الزَّادَ اَقْبَحُ كُلِّ شَيْءٍ　　اِذَا كَانَ الْوُفُوْدُ عَلَى الْكَرِيْمِ

(میں بغیر توشہ کے نیکیوں اور قلب سلیم سے کریم کے پاس جا رہا ہوں اس لئے توشہ ہر شئے قبیح تر ہے جبکہ کریم کے پاس جانا ہو)

حاصل یہ ہے کہ میں کریم کے پاس جا رہا ہوں تو یہ بڑی بے شرمی ہے کہ اپنی ساتھ توشہ باندھ کر لیجاویں۔ تو حقیقت میں اہل حال اس کو بے شرمی سمجھتے ہیں۔ مگر حاجی صاحب نے نواب صاحب کو لکھا کہ اگرچہ مناسب تو یہ تھا کہ آپ اپنی تنخواہ کا بھی انتظام ہندوستان سے نہ کرتے لیکن چونکہ آپ ہمیشہ سے اسباب کے عادی ہیں اس لئے اپنی تنخواہ مقرر نہ کرنے میں آپ کو پریشانی ہوگی جس سے جمعیت قلب فوت ہو جائے گی اس لئے اپنی تنخواہ کا انتظام تو کر لیجئے مگر اس کے علاوہ اور کوئی جھگڑا تقسیم وغیرہ کا ساتھ نہ لائیے۔ اور یہ لکھا کہ گو یہ سخاوت ہے مگر ؎

نان دادن خود سخائے صادق است　　جان دادن خود سخائے عاشق است

(روٹی دینا خود سخاوت صادق ہے جان دینا عاشق کی سخاوت ہے)

سبحان اللہ کیسی شان ہوتی ہے اہل اللہ کی واقعی محقق جامع اضداد ہوتا ہے۔ وہ متضاد امور کو اس طرح جمع کرتا ہے کہ غیر محقق اس کی حقیقت نہ سمجھنے کے سبب پریشان ہو کر پکار اٹھتا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ　　باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

(تختہ سے باندھ کر قعر دریا میں ڈالدیا ہے پھر کہتے ہو کہ دیکھ ہوشیار رہ کہ دامن تر نہ ہو)

جس کسی کا یہ شعر ہے وہ محقق نہیں معلوم ہوتا۔ ورنہ محقق کبھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔ وہ اضداد[۱] کو جمع کر کے دکھلاتا ہے۔ چنانچہ حاجی صاحب نے اس خط میں ایسا کر کے دکھلا دیا کہ تدبیر بھی لکھی، توکل بھی،

[۱] اضداد سے مراد وہ ہیں جو بزعم اہل ظاہر کے اضداد ہوں نہ کہ حقیقی اضداد ۱۲ منہ

حاجی صاحب کی ایک اور حکایت جمع بین الاضداد کی یاد آئی۔ ایک مرتبہ مولانا رحمۃ اللہ صاحب نے آپ سے عرض کیا کہ میں سلطان کے پاس جا رہا ہوں اگر آپ فرمادیں تو سلطان سے آپ کا تذکرہ کر دوں۔ فرمایا کیا فائدہ ہوگا۔ بلکہ بس بریں نسبت (اس سے زیادہ نہیں کہ میرے معتقد ہو جاویں گے پھر اس اعتقاد کا کیا نتیجہ ہوگا بس یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ مجھ کو بلالیں گے جس کی حقیقت یہ ہوگی کہ بیت السلطان سے قرب اور بیت اللہ سے بعد ہوگا سو مجھ کو یہ منظور نہیں اس میں تو حضرت نے اپنی شان استغنا کو بیان فرمادیا۔ مگر اس میں بڑائی کا شبہ ہوسکتا تھا اس کا یہ علاج کیا کہ فرمایا لیکن میں نے سنا ہے کہ سلطان بہت عادل ہیں اور روایات میں آیا ہے کہ سلطان عادل کی دعا قبول ہوتی ہے تو آپ اُن سے میرے واسطے دعا کرادیجئے گا۔ سبحان اللہ اس درخواست میں اپنے نفس کو کیسا مل دیا۔ حقیقت ظاہر کر دی کہ دنیوی حوائج سے تو غنا ظاہر کر دی اور دینی امور میں احتیاج ظاہر کی۔ عارف کو ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ دنیوی امور میں مخلوق سے مستغنی ہو اور دینی امور میں ہر ایک کی دعا کا محتاج ہو ظاہر میں استغنا اور تواضع کا جمع ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے مگر حاجی صاحب نے دونوں کو جمع کر کے دکھلادیا۔ مگر اس درخواست میں ناتجربہ کاری کا شبہ ہوتا تھا کیونکہ سلاطین سے دعا کرانا خلاف آداب شاہی ہے میں آپ کو اس کی ایک ترکیب بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ ان کو میری طرف سے سلام پہونچا دیجئے گا اس کے جواب میں وہ علیہ وعلیکم السلام فرمادیں گے بس دعا ہو جاوے گی اور یہ بات حضرت حاجی صاحب ہی کے قول سے ثابت ہیں کہ سلام دعا ہے اور واقعی اب معلوم ہوتا ہے کہ بڑی جامع دعا ہے کیونکہ اس میں سلامتی کی دعا ہے جو کہ عام ہے ظاہری باطنی ہر قسم کی سلامتی کو اس میں تمام مقاصد داخل ہیں مگر افسوس ہے کہ آجکل لوگوں نے اس جامع دعا کو چھوڑ کر دوسرے الفاظ آداب عرض وغیرہ اختیار کر لئے ہیں۔

ایک جگہ شیخ زادوں کے مجمع میں کسی حجام نے جاکر السلام علیکم کہا، ایک شیخ صاحب نے اٹھ کر پانچ جوتے مارے۔ حجام نے کہا کہ حضور پھر کیا کہا کروں۔ شیخ صاحب بولے کہ حضرت سلامت کہا کرو۔ اس کے بعد نماز جمعہ کا وقت آیا جب امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو وہ حجام پکار کر کہتا ہے حضرت سلامت ورحمۃ اللہ حضرت سلامت ورحمۃ اللہ۔ لوگوں نے پھر اس کو مارنا چاہا تو اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر سُن لو پھر جو چاہے کرلینا۔ بات یہ ہے کہ میں نے آج شیخ صاحبوں کے مجمع میں السلام علیکم کہا تھا تو وہ بڑے خفا ہوئے اور میرے پانچ جوتے مارے اور کہا حضرت سلامت کہا کرو۔ میں ڈرا کہ اگر کہیں فرشتے بھی السلام علیکم سے ناراض ہوگئے تو وہ تو مجھے جیتا بھی نہ چھوڑیں گے کیونکہ ان میں ایک فرشتہ عزرائیل علیہ السلام بھی ہیں اس لئے میں نے نماز میں بھی حضرت سلامت کہا۔ یہ جواب سُن کر شیخ زادے شرمندہ ہوکر اپنا سا منہ لے رہ گئے۔ سو بعض جگہ تو یہ غضب ہے کہ السلام علیکم سے ناراض ہوتے ہیں مگر غریب قوم کے لوگوں کو بھی اتنی رعایت چاہیئے السلام علیکم تان کر نہ کہا کریں جس سے سننے والوں کو یہ شبہ ہو کہ یہ اپنے کو ان کی برابر سمجھتے ہیں۔

ایک بار میں کاندھلہ گیا بیٹھا تھا تو ایک نائی صاحب آئے اور بڑے تان کر سلام کیا یعنی سخت لہجہ میں السلام علیکم کہا مجھے اس کے لہجہ سے مساوات کا دعوے معلوم ہوتا تھا، میں نے جواب دیدیا۔ اس کے بعد اُس نے سوال کیا کہ حضرت جو سلام سے بُرا مانے وہ کیسا ہے۔ میں نے کہا جو سلام سے برا مانے وہ بہت بُرا اور جو تان کر سلام کرے جس سے مساوات کا دعوے ٹپکتا ہو وہ اس سے بھی بُرا وہاں جتنے رئیس بیٹھے تھے سب ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ اس مرض کو تم نے سمجھا سلام سے بھلا کون بُرا مانتا ہے مگر اس کے طرز سے لوگوں کو ناگواری ہوتی ہے اور فی الواقع چھوٹوں کا دعوے مساوات تو ناگوار ہوتا ہی ہے۔ بیٹا چاہے کیسے ہی بڑے درجہ پر ہو باپ سے تو ادنیٰ ہی ہے پھر اگر وہ باپ کی برابری کرنے لگے تو یقیناً بُرا معلوم ہوگا بیٹا ظاہر میں تو باپ سے کم ہی ہے گو باپ کافر ہی ہو اس کا بھی ادب

ضروری ہے ورنہ سلام سے مسلمانوں کو کیوں ناگواری ہونے لگی۔
حدیث میں آتا ہے کہ جنت میں حق تعالےٰ مسلمانوں کو سلام فرمائیں گے یعنی اہل جنت سے فرمائیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ قرآن شریف میں ہے سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِيْمِ (ان کو پروردگار مہربان کی طرف سے سلام فرمایا جاویگا) نیز تشہد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ (سلام تم پر اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اللہ تعالےٰ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں) کہا جاتا ہے تو ہر مسلمان روزانہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سلام کرتا ہے پھر یہ کیوں بُرا ہونے لگا۔ یہ تو بیچ میں کچھ جملے معترضہ آگئے تھے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو شیخ سب کو تارک بنانا چاہے وہ اناڑی ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے ان بی بی کو جائداد وقف کرنے سے منع فرمایا۔ امام سفیان ثوریؒ باوجودیکہ بہت بڑے تارک تھے حتیٰ کہ خلیفۂ ہارون رشید جو خلافت سے پہلے ان کا بڑا دوست تھا خلیفہ ہونے کے بعد انہوں نے ہارون رشید سے ملنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ بیت المال میں ان کے مذاق کے موافق احتیاط نہ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ہارون رشید کا خط ان کے پاس آیا تو اس کو ہاتھ سے نہیں کھولا بلکہ ایک لکڑی سے کھولا۔ خط میں ہارون رشید نے ان کی شکایت کی تھی کہ آپ نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا امام سفیان ثوری نے سخت جواب دیا اور لکھا کہ تم بیت المال میں بیجا تصرف کرتے ہو قیامت میں تم سے اس کی باز پرس ہوگی اس لئے میں تم سے نہیں ملنا چاہتا مبادا کہیں میں بھی غضب میں گرفتار نہ ہو جاؤں وقف کا مال بہت احتیاط کے قابل ہے۔
ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چراغ جلا کر کچھ کام کر رہے تھے کہ اتنے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ تشریف لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے چراغ فوراً گل کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے پوچھا کہ میرے آتے ہی آپ نے چراغ کیوں بجھا دیا فرمایا کہ اس میں بیت المال کا تیل ہے اب تک تو میں بیت المال کا کام کر رہا تھا اس لئے میرے واسطے مباح تھا اور اب ہم دونوں باتیں کریں گے

اس کے لئے بیت المال کا تیل جلانا جائز نہیں۔ اس لئے میں نے چراغ گل کر دیا۔

سبحان اللہ حضرات صحابہ میں کیسی احتیاط تھی اگر آجکل کوئی شخص ایسی احتیاط کرنے لگے تو عوام تو کیا خواص بھی اسے وہمی کہنے لگیں۔

میرے ایک دوست کا قصہ ہے کہ وہ ایک اسلامی مدرسہ میں مہمان ہوئے مغرب کے بعد مہتمم صاحب نے کسی خادم کو حکم دیا کہ ان کے کمرہ میں لالٹین روشن کر دے انہوں نے فوراً ہی کہا کہ اگر مہتمم صاحب کا تیل ہو تو لانا اور اگر مدرسہ کا ہو مت لانا۔ وہاں ایک بزرگ خانصاحب تشریف فرما تھے جو ہمارے حضرات کے صحبت یافتہ ہیں وہ کہنے لگے کہ یہ شخص اشرف علی کا تعلیم یافتہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایسی احتیاط اسی کے یہاں ہے۔ ان باتوں پر لوگ مجھے وہمی کہتے ہیں مگر ایسا وہم بھی مبارک ہے جو حضرات سلف کے مذاق سے مطابق ہو۔ تو امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اتنے بڑے تو تارک تھے مگر وہ فرماتے ہیں کہ وہ زمانہ گذر گیا جبکہ روپیہ رکھنا مضر تھا آجکل روپیہ جمع کرنا مفید ہے کیونکہ آجکل افلاس کا سب سے پہلا اثر دین پر ہوتا ہے کہ مفلسی میں انسان کو حرام و حلال کی کچھ تمیز نہیں رہتی پھر فرمایا کہ ہمارے پاس یہ دنانیر نہ ہوتے تو یہ امراء ہم کو دستمال بنا دیتے۔ مگر مال کی بدولت یہ ہم کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ اکبر یہ وہ زمانہ ہے جو خیر القرون میں داخل ہے جو صحابہ کے زمانہ سے بہت قریب ہے۔ امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس زمانہ کے بابت فرما رہے ہیں کہ اس وقت مال جمع کرنا مفید ہے اس سے قیاس کر لیا جائے کہ آجکل مال جمع کرنا کتنا ضروری ہے۔ پس جس مسلمان کے پاس کچھ ذخیرہ ہو اُسے چاہئے کہ احتیاط سے خرچ کرے اسراف نہ کرے لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا[1] شاید کسی وقت ضرورت ہو جائے تو پریشان نہ ہونا پڑے۔ اسی طرح بخل بھی نہ کرو اس کی علت بھی وہی ہے لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا (شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں) کیونکہ بخل سے بعض دفعہ ضرورت کے موقعہ میں بھی

[1] ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں۔

تنگی کی جاتی ہے اور اتنی تنگی کے بعد پھر ندامت ہوتی ہے کہ ہائے ہم نے اس موقعہ میں کیوں نہ خرچ کیا۔ مثلاً کسی نیک کام کے لئے چندہ ہو رہا ہے جس میں بہت کچھ ثواب ملنے کی امید ہے بخیل آدمی ایسے موقعہ میں بھی تنگی کرتا ہے پھر بعد میں اُسے افسوس ہوتا ہے لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا ۝ (شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں) یہاں بھی صادق ہے اب میں اسراف کے متعلق ایک بات بتلاتا ہوں جو شاید آج تک نہ سنی ہوگی وہ یہ کہ اسراف کی حقیقت مشہور یہ ہے کہ معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے اس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ قیمتی کپڑے پہننا اور گھر کے لئے زینت و آرائش کا سامان خریدنا اسراف میں داخل نہیں کیونکہ یہ انفاق امور محرمہ میں نہیں ہے اور بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ بلاضرورت خرچ کرنا اسراف ہے گو مباح ہی میں صرف کیا جائے ان کے نزدیک زیادہ قیمتی لباس بھی اسراف میں داخل ہے کیونکہ وہ ان کے نزدیک بلاضرورت ہے مگر یہ دونوں باتیں غلط ہیں بلکہ اسراف کے لئے دو حدیں ہیں اور واقع میں وہ ایک ہی حد ہے لیکن میں تفصیل کرنے کے ان کو دو قرار دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ اسراف کے معنے تو وہی ہیں جو پہلے بیان کئے گئے یعنی الانفاق فی المعصیت (گناہ میں خرچ کرنا) لیکن معاصی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو فی نفسہٖ معاصی ہیں جیسے زنا اور تفاخر وغیرہ ان میں خرچ کرنا تو ہر شخص کے لئے اسراف ہے اور حرام ہے اور بعض معاصی وہ ہیں جو فی نفسہ معاصی نہیں بلکہ مفضی الی المعصیت (گناہ کی طرف پہونچانے والا) ہونے کی وجہ سے معاصی بن گئے۔ ایسے مواقع میں خرچ کرنا مطلقاً حرام نہیں بلکہ جس کے لئے وہ فعل سبب معصیت بن جائے اس کے لئے حرام اور جس کے لئے سبب معصیت نہ ہو اس کے لئے جائز ہے تو اسراف کی ایک قسم ایسی نکلی جو ہر ایک کے لئے اسراف نہیں بلکہ بعض کے لئے اسراف ہے اور بعض کے لئے مباح ہے۔ مثلاً چار روپیہ کا حلوہ کھانا یہ ہر ایک کے لئے اسراف نہیں بلکہ جس شخص کے پاس روپیہ حاجت سے زیادہ ہو اور چار روپیہ کا حلوا کھانے سے اس پر قرض بھی نہ ہو یا قرض ہو مگر اس کا ادا کرنا اسے آسان ہو

اور کسی قسم کی پریشانی اس کو نہ ہو اس کو چار روپیہ کا حلوا کھانا یا عمدہ غذائیں کھانا جائز ہے اور جس شخص پر حلوا کھانے یا عمدہ عمدہ غذائیں پکوانے سے سودی قرض ہوتا ہے اس کے لئے یہ اسراف ہے کیونکہ اس کے حق میں یہ مقضی الی المعصیت (گناہ کی طرف پہونچانے والا) ہے۔ اسی طرح دو روپے گز کا کپڑا پہننا پہلے شخص کے لئے جائز ہے اور دوسرے کے لئے اسراف اسی طرح مکان بنانا ایک تو ضرورت کے موافق ہے یہ توسب کو جائز ہے۔ اور ایک ضرورت سے زیادہ ہے یہ بعض کے لئے جائز ہے بعض کے لئے اسراف ہے۔ جو شخص مرجع خلائق ہو کہ اس کے یہاں مہمان بکثرت آتے ہوں وہ لوگوں کو ٹھہرانے کے لئے اپنی حاجت سے زیادہ مکان بنا دے تو جائز ہے بلکہ طاعت ہے اور جس کے یہاں مہمانداری زائد نہیں ہے اس کو ضرورت سے زیادہ مکان بنانا اسراف ہے۔ ہاں اگر یہ نیت ہو کہ ایک مکان میں خود رہیں گے اور دوسرے مکانات کرایہ پر دے کر ان سے روپیہ وصول کریں گے اس صورت میں بھی زیادہ مکان بنانا اسراف میں داخل نہیں۔

اسی طرح مہمان کو عمدہ کھانا کھلانا اگر اس میں عجب و ریا و تفاخر نہ ہو احسان جتلانے کی نیت نہ ہو نہ اُس سے مقروض ہونے کا اندیشہ ہو محض تطییب خاطر ضیف کی نیت سے اپنی وسعت کا لحاظ کر کے عمدہ کھانے پکائے جائیں تو اس حالت میں یہ فعل اسراف نہیں اور جو شخص زیادہ سامان کرلے سے ان بلاؤں میں مبتلا ہو جائے اس کو زیادہ سامان کرنا حرام اور اسراف ہے۔ اس کو چاہیئے کہ جو موجود ہو مہمان کے سامنے رکھدے۔ اور اگر کچھ نہ ہو تو فاقہ کرے اور مہمان کو بھی فاقہ کی اطلاع کردے۔

حضرت شاہ ابوالمعالی کے پیر ایک مرتبہ ان کے گھر پر تشریف لائے شاہ صاحب کہیں گئے ہوئے تھے اور اُس دن ان کے گھر پر فاقہ تھا ان کی بیوی کو جب معلوم ہوا کہ پیر صاحب تشریف لائے ہیں تو ان کو فکر ہوئی کہ پیر صاحب کب کب تشریف لاتے ہیں اگر آج ان کو بھی فاقہ کرایا تو بڑی بیجا بات ہے ما ماکو

محلہ میں بھیجا کہ کسی سے آٹا دال قرض لے آوے مگر غریبوں کو قرض بھی کوئی نہیں دیا کرتا کہیں سے آٹا دال نہ ملا پھر دوسری مرتبہ بھیجا کہ پیسے ہی قرض مل جاویں تو بازار سے جنس منگالیں گے مگر کہیں سے دام بھی اُدھار نہ ملے پیر صاحب نے جو بار بار ماما کو آتے جاتے دیکھا تو کچھ کھٹکے اس سے دریافت کیا کہ تو کس فکر میں بار بار آتی جاتی ہے۔ اس نے کہا حضور بات تو کہنے کی نہیں مگر مرشد سے کیا پردہ۔ بات یہ ہے کہ آج شاہ صاحب کے یہاں فاقہ ہے۔ میں اس فکر میں ہوں کہ کہیں سے آٹا دال یا پیسے ادھار مل جاویں تو آپ کے لئے کھانا تیار ہو جاوے۔ مگر کہیں سے کچھ بھی نہیں ملا حضرت شیخ کو یہ حال سنکر رنج ہوا اپنے پاس سے انھوں نے ایک روپیہ نکال کر دیا کہ جاؤ اس کا غلہ منگاؤ اور کھانا تیار کراؤ۔ اور جب غلہ آجاوے تو ہمارے پاس لے آنا چنانچہ غلہ لایا گیا آپ نے ایک تعویذ لکھ کر غلہ میں رکھ دیا۔ اس کی ایسی برکت ہوئی کہ غلہ کسی طرح ختم ہی نہ ہوا اور عرصہ تک فاقہ کی نوبت نہ آئی۔

حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب سفر سے واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ بہت دنوں سے روزانہ بلا تکلف کھانا پک رہا ہے فاقہ ہی نہیں ہوتا ان کو تعجب ہوا کہ میرے پیچھے اتنا غلہ کہاں سے آگیا آخر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پیر صاحب تعویذ دے گئے ہیں، وہ بڑے پریشان ہوئے کیونکہ وہ فاقہ کے مشتاق تھے ان حضرات کا فاقہ اختیاری تھا اب ایسے وقت میں اگر کوئی غیر عارف ہوتا تو یوں کہتا ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

(قعر دریا میں مجھ کو تختہ سے باندھ کر ڈال دیا پھر کہتے ہو دیکھ ہوشیار رہ دامن تر نہ ہو)

کیونکہ یہاں دو چیزوں میں تعارض ہو رہا ہے اگر پیر کا تعویذ غلہ سے نکال کر الگ کرتے ہیں تو اس میں بظاہر پیر سے اپنے بڑے ہونے کا دعویٰ ہے اور اگر الگ نہیں

کرتے تو اپنے مذاق توحید کے خلاف ہے۔ مگر شاہ صاحب عارف تھے انھوں نے دونوں کو خوب۔ جمع کیا فرمایا کہ پیر صاحب کے تعویذ کی برکت کا ہمارا سر زیادہ مستحق ہے غلہ میں رکھنے سے اس کی بے ادبی ہوتی ہے لاؤ اس تعویذ کو ہم اپنے سر سے باندھیں گے چنانچہ وہ نکال کر لایا گیا اور شاہ صاحب نے اس کو اپنے سر سے باندھ لیا۔ دو تین روز میں غلہ ختم ہوگیا اور پھر وہی حالت ہوگئی جو پہلے تھی۔ کبھی فاقہ تھا کبھی کھانے پکتے تھے۔ شاید کوئی منطقی یہ کہے کہ اگر شاہ صاحب کو فاقہ کا ایسا ہی شوق تھا تو اس کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ تعویذ کو غلہ ہی میں رہنے دیتے تاکہ اس میں بھی برکت رہتی اور خود فاقہ کرلیا کرتے تو یاد رکھو یہاں منطق نہیں چل سکتی یہ معرفت کا طریق ہے جس کا فتویٰ یہ ہے کہ موجود ہوتے ہوئے فاقہ کرنا خلاف ادب ہے۔ مگر بیماری میں فاقہ کرنا خلاف ادب نہیں گو گھر میں سب کچھ موجود ہو۔ تو دیکھئے یہ حضرات کیسے بے تکلف تھے کہ ان کی تعلیم یافتہ ماما نے پیر کو بھی فاقہ کی اطلاع کردی۔

اسی طرح ہمارے استاد علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے کے یہاں ایک بار مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ مہمان ہوئے۔ اس دن ان کے یہاں فاقہ تھا انھوں نے بے تکلف مولانا سے عرض کردیا کہ آج میرے یہاں تو فاقہ ہے اور قرض کو جی نہیں مانتا اگر آپ فرمائیں تو بعض لوگ آپ کی دعوت کرنے کے مشتاق یہاں موجود ہیں ان سے کسی کو دعوت کی اجازت دیدوں، مولانا نے فرمایا کہ ہرگز نہیں میں تو تیرا مہمان ہوں اگر تیرے یہاں فاقہ ہے تو میں بھی فاقہ کروں گا' چنانچہ شام تک مولانا کا بھی فاقہ رہا۔ مغرب کے قریب ایک آدمی گاؤں سے آیا اور حکیم صاحب کو گیارہ روپے دے گیا کیونکہ اس کا کوئی عزیز حکیم صاحب کے علاج سے اچھا ہوا تھا حکیم صاحب وہ روپے لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت آپ کی برکت سے خدا تعالےٰ نے یہ روپے بھیجدیئے ہیں اب میں عمدہ کھانا پکواؤنگا حضرت نے منع فرمایا کہ بھائی تکلف مت کرو' مگر وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ حضرت

دن بھر تو فاقہ رہا اب بھی عمدہ کھانا نہ کھاویں غرض عشاء کے وقت تک پلاؤ وغیرہ بہت عمدہ تیار کرا دیا۔ تو میزبان کو ایسا ہی بے تکلف ہونا چاہیئے مگر مہمان کو زیادہ بے تکلف نہ بننا چاہیئے کہ لگیں طرح طرح کی فرمائشیں کرنے دوسرے یہ کہ میزبان اگر تکلف ہی میں رہے تو کب تک رہے گا۔ تم نے آج دو آدمیوں کے واسطے اُدھار قرض کر لیا روز روز کس کس کے لئے اُدھار کرتے پھرو گے کیونکہ آنے والوں کی یہ عادت ہے کہ جس شخص کو زیادہ مہمان نواز دیکھتے ہیں اس کے یہاں بار بار آمد و رفت رکھتے ہیں حتیٰ کہ وہ غریب تنگ آجاتا ہے مہمان بننے والوں کو اس کی ذرا فکر نہیں ہوتی کہ میزبان غریب کیا گذر رہی ہے اس لئے مجھے ایسے شخص پر بہت رحم آیا کرتا ہے جو مہمان نوازی میں مشہور ہو۔ اس کے یہاں بعض لوگ محض کھانے ہی کے واسطے پڑے رہتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بے حیا بھی بہت ہیں۔

تھانہ بھون میں ایک ملّا تھا اس بے چارہ کے یہاں مہمانوں کی کثرت رہتی حتیٰ کہ اُسے اُدھار قرض کرنا پڑتا تھا، اس نے مجھ سے شکایت کی۔ میں نے کہا کہ تم مہمانوں کے لئے نہ کچھ اہتمام اور انتظام کیا کرو اور نہ ان کو جواب دیا کرو۔ بس جتنی روٹیاں تمہارے پاس ہوا کریں وہی سب کے سامنے رکھدیا کرو چاہے کسی کا پیٹ بھرے یا نہ بھرے اُدھار قرض کر کے ہرگز نہ کرو جب لوگ بھوکے رہیں گے خود ہی آنا چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا تب اس کا پیچھا چھوٹا۔ تو یہ آنے والے مہمان اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ جس کے یہاں ہم جا رہے ہیں اس پر کیا گذر رہی ہے ان کو تو اپنے کھانے سے کام دوسرے کی کیا فکر بلکہ بعض لوگ تو سفر ہی اسی واسطے کرتے ہیں تاکہ چند روز عمدہ عمدہ کھانے ملیں گے۔

جیسا کانپور میں ایک طالب علم تھے وہ کہا کرتے تھے کہ جو لوگ فارغ ہوکر دستار بندی کرا لیتے ہیں بڑے بے وقوف ہیں کیونکہ پھر مدرسہ کی روٹیاں نہیں ملتیں اسی لئے ہم تو اتنے عرصہ سے مدرسہ میں پڑے ہیں مگر نور الانوار سے آگے نہیں بڑھتے تاکہ فراغت کے بعد روٹیاں بند نہ ہو جاویں تو اس بندۂ خدا کو پڑھنے سے بھی

روٹیاں ہی مقصود تھیں۔

مثل مشہور ہے کہ کسی طالب سے کسی نے پوچھا دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا چار روٹیاں وہ بھی کوئی ایسا ہی بندۂ شکم ہوگا جس کو پڑھنے پڑھانے سے روٹیاں ہی مقصود ہوں گی۔

اسی طرح ایک بسیار خوار سے کسی نے پوچھا کہ تم کو قرآن کا کونسا مضمون یاد ہے۔ کہنے لگا دو آیتیں ایک احکام کی ایک دعا کی۔ احکام میں کُلُوا وَاشْرَبُوا (کھاؤ اور پیو) دعا میں رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ (اے پروردگار ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما) سو بعضے مہمان بھی ایسے ہوتے ہیں۔ اس لئے میں کہہ رہا تھا کہ میزبان کو بے تکلف ہونا چاہئے کہ جو موجود ہو سامنے رکھدے اور اگر کچھ نہ ہو تو مہمان کو فاقہ کی اطلاع کردے خوامخواہ دوسروں کے لئے قرض نہ کرے۔ قرض سے بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ قرض لینا جائز ہے اگر ضرورت ہو اور پریشانی نہ ہو مگر پریشانی میں طبائع مختلف ہیں۔ بعض لوگوں کو قرض سے پریشانی نہیں ہوتی اور بعض کو بہت پریشانی ہوتی ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ اپنی وصیت میں تحریر فرماتے ہیں کہ بندہ پر کبھی قرض نہیں ہوتا۔ وہ تو قرض سے اتنا بچتے تھے کہ وصیت میں بے تکلف لکھ گئے کہ میرے قرض ادا کرنے کی کوئی فکر نہ کرے مجھ پر قرض ہوتا ہی نہیں۔

اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ پر قرض ہوتا تھا یہاں تک کہ وصال کے وقت مولانا کے ذمہ کئی ہزار روپے قرض تھے جو ایک ہزار جناب نے تنہا ادا کر دیئے۔ تو بزرگوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

(ترجمہ :- گل کے کان میں کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہے۔ بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ نالاں ہے)

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست ۔۔۔ ور بجہل آئیم ما زندان اوست
گر بخواب آئیم مستان ویئم ۔۔۔ ور بہ بیداری بہ دستان ویئم
در تردد ہر کہ او آشفتہ است ۔۔۔ حق بگوش او معما گفتہ است

(اگر علم تک ہماری رسائی ہوجائے تو یہ ان کا ایوان ہے کہ تصرف حق سے علم کا درجہ حاصل ہو اور جہل میں مبتلا رہیں تو ان کا زندان ہے کہ حق تعالےٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سو رہیں تو انھیں کے بے ہوش کیے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں۔ جو شخص کسی تردد میں گرفتار ہو رہا ہے گویا حق تعالےٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہدیا ہے)

اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ مدیون کی روح دین کی وجہ سے معلق رہتی ہے جنت میں داخل نہیں ہوتی سو یہ باقی وہ اس پر محمول ہے کہ قرض بلا ضرورت ہو اور ادا کا قصد نہ ہو اور اگر بضرورت ہو اور ادا کا پختہ قصد ہو تو اس کیلئے وعدہ ہے کہ حق تعالےٰ یا تو اس کا قرض دنیا ہی میں ادا کردیں گے ورنہ آخرت میں دائن سے معاف کرادیں گے۔ اسی لئے بعض اہل اللہ قرض پر بہت جری ہوتے تھے۔ حضرت شیخ احمد خضرویہ رح بہت مقروض تھے مگر ایسے ہی آمدنی بھی بہت تھی لوگ معتقد تھے نذرانے بہت آتے تھے اس لئے کوئی شخص قرض دینے سے انکار نہ کرتا تھا جب وہ مرنے لگے تو سب لوگوں کو اپنے اپنے روپیہ کی فکر ہوئی اور انھوں نے گھر پر آکر تقاضا شروع کیا کہ آپ تو مر رہے ہیں ہماری رقم کہاں ہے آپ خاموش ہوکر منہ ڈھانک کر لیٹ گئے۔ فرمایا، خدا پر نظر رکھو۔ اتنے میں ایک حلوائی کا لڑکا حلوا بیچتا ہوا سامنے سے گذرا آپ نے اسے بلایا

اورسارا حلوا خرید کر لوگوں کو کھلا دیا۔ لڑکے نے دام مانگے تو آپ نے فرمایا کہ بھائی یہ لوگ بھی اپنے دام ہی مانگ رہے ہے تو بھی ان کے ساتھ بیٹھ جا۔ یہ سن کر لڑکے نے رونا شروع کیا کہ ہائے مجھے تو میرا باپ مار ڈالے گا۔ لڑکے کے رونے کو دیکھ کر سب لوگوں کو شیخ پر غصہ آیا کہ بھلا ان بزرگ کو مرتے مرتے بھی قرض کرنے کی کیا ضرورت تھی مگر ان کو کیا خبر تھی کہ انھوں نے قرض خواہوں کی ضرورت سے یہ کام کیا تھا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ کسی امیر کا ایک خادم ایک سینی میں اشرفیاں لے کر حاضر خدمت ہوا اور حضرت شیخ سے عرض کیا کہ فلاں امیر نے یہ ہدیہ خدمت والا میں ارسال کیا ہے آپ نے اسے قبول فرمایا دیکھا تو بالکل قرض کے برابر تھا اسی وقت آپ نے سب قرضہ ادا فرما دیا۔ اب تو لوگ بڑے معتقد ہوئے کہ واقعی مقبول بندے ہیں۔

کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت، آپ نے حلوائی کے لڑکے کا حلوا بلا ضرورت کیوں خرید فرمایا تھا۔ اس سے تو بڑی ذلت ہو رہی تھی فرمایا کہ یہ سارے قرض خواہ جب یہاں آکر بیٹھے ہیں نے دعا کی ارشاد ہوا کہ ہمارے یہاں کچھ کمی نہیں مگر اس وقت کوئی رونے والا ہونا چاہیئے اور ان میں کوئی رونے والا ہے نہیں۔ میں نے یہ رونے کی ترکیب کی تھی۔

اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

تا نہ گرید کودک حلوا فروش ۔۔۔ بحر بخشائش نمی آید بجوش
تا نگرید طفل کے جوشد لبن ۔۔۔ تا نہ گرید ابر کے خندد چمن
گر تو خواہی کز بلا جاں وا خری ۔۔۔ جان خود را در تضرع آوری
در تضرع باش تا شاداں شوی ۔۔۔ گریہ کن تا بے دہاں خنداں شوی

(جب تک حلوا فروش لڑکا نہ رویا بخشش کا دریا جوش میں نہ آیا۔ جب تک بچہ نہیں روتا ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں جوش مارتا۔ جب تک ابر نہ برسے چمن سرسبز نہیں ہوتا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ بلا سے جان تمہاری

چھوٹ جائے تو جان سے گریہ وزاری کرو تاکہ تم کو خوشی حاصل ہو گریہ
کرو تاکہ بے دہان ہنسنے والے ہو)

پھر فرماتے ہیں ؎

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست
مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(ہر گریہ وزاری کے بعد خوشی ہے مرد آخر بیں مبارک بندہ ہے)

اس شعر میں اکبر حسین جج مرحوم نے لطیفہ کیا وہ کہتے ہیں ؎

در پس ہر لکچر آخر چندہ ایست
مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(ہر لکچر کے بعد چندہ ہے انجام سوچنے والا مبارک بندہ ہے)

وہ کہتے تھے کہ مولویوں کے وعظ تو سیکڑوں ایسے سنے ہوں گے جو چندہ کے ذکر سے خالی ہوں گے مگر لکچر ایک بھی ایسا نہ ہوگا۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرض سے پریشانی ہونے میں طبائع مختلف ہیں بعض لوگوں کو اس سے پریشانی نہیں ہوتی۔ لہذا ایسے لوگوں کو قرض کرنا جائز ہے۔ غرض اسراف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مصرف تو جائز ہے مگر اس میں خرچ کرنے سے گناہ پیدا ہوسکتے ہیں تو جہاں مصرف جائز سے بھی گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اس کو بھی اسراف کہا جائے گا اور جس کو یہ اندیشہ نہ ہو اس کے لئے وہ اسراف نہیں۔ اسپر ایک حکایت اور یاد آئی۔ حافظ محمد یوسف صاحب تھانوی نے بیان فرمایا کہ بھوپال میں ایک مرتبہ سنتیں پڑھتے ہوئے سخت بارش آگئی سب لوگ نماز توڑ توڑ کر کوئی جلدی جلدی پوری کرکے اندر بھاگ گئے مگر ایک شخص جو نہایت عمدہ قیمتی لباس پہنے ہوئے تھے اطمینان سے نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ ان کا قیمتی لباس سب بھیگ گیا مگر انھوں نے اس کی ذرا پروا نہیں کی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے اپنے کپڑے خراب کر لئے نماز مختصر کرکے اندر کیوں نہ آگئے۔ کہا مجھے خدا نے کپڑے بہت

دیئے ہیں میں گھر جا کر دوسرا جوڑا بدل لوں گا لیکن دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ محض کپڑوں کی خاطر میں نماز کو مختصر کروں۔ اس شخص کو قیمتی کپڑا پہننا جائز تھا کہ اس کی وجہ سے نماز میں قلب ذرا مشغول نہ ہوا اور ایسے لوگوں کو اجازت نہیں جن کی یہ حالت ہے کہ جب عمدہ کپڑا پہنتے ہیں تو خدا تعالٰے کے حکم کا خیال نہیں رہتا کپڑوں کی وجہ سے نماز برباد کر دیتے ہیں بعض لوگ عمدہ لباس پہنکر ایسے تکلف سے نماز پڑھتے ہیں کہ جب تک ان کے پاس والا آدمی کھڑا نہ ہو جائے اس وقت تک وہ نہیں اٹھتے۔ یہ سوچتے ہیں کہ ایسا نہ ہو ہمارا کپڑا دوسرے آدمی کے نیچے دب جائے اور اٹھتے ہوئے جھر جھر ہو جائے اس لئے وہ بعد میں اٹھتے ہیں تو ان کی ساری نماز کپڑوں کے سنبھالنے میں ختم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کو قیمتی کپڑا پہننا مکروہ ہے۔

ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جمعہ کے دن ایک نیا کرتہ پہنا جو ان کو اچھا معلوم ہوا، آپ نے قینچی منگا کر اس کی دونوں آستین کاٹ ڈالیں لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں یہ کرتہ پہن کر اپنے کو اچھا لگا اور جس وقت انسان اپنی نگاہ میں اچھا لگے اس وقت وہ خدا کی نظر میں بُرا ہوتا ہے اس لئے میں نے کرتہ کو معیوب کر دیا تھا تاکہ اس پر نظر نہ رہے۔

سبحان اللہ ان حضرات کو اپنے نفس کی کیسی نگہداشت تھی ان کو قیمتی کپڑا پہننا بالکل جائز تھا کیونکہ ان کو قیمتی لباس سے اپنے اوپر نظر نہ ہوتی تھی اور اگر کبھی اس کا شبہ ہوتا تھا تو فوراً ہی اُس کا علاج کر لیتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں کسی جگہ سے ایک آئینہ بہت قیمتی ہدیہ میں آیا۔ حضرت شیخ کنگھی کرتے ہوئے اُسے سامنے رکھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ خادم ہاتھ میں آئینہ لئے آتا تھا اتفاق سے گر کر ٹوٹ گیا خادم کو خوف ہوا کہ دیکھئے آج خفگی نہ ہو۔ اُسنے آکر عرض کیا ؎

از قضا آئینہ چینی شکست (قضاء الٰہی سے چینی آئینہ ٹوٹ گیا)

آپ نے فوراً جواب دیا ؎

خوب شد اسباب خود بینی شکست (اچھا ہوا کہ اسباب بینی ٹوٹ گیا)

معلوم ہو گیا کہ شیخ کے دل کو اس سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا جب تک موجود رہا خدا کی نعمت سمجھ کر استعمال کرتے رہے، جب ٹوٹ گیا تو دل پر ذرا بھی گرانی نہ تھی۔ اس حالت میں آپ کو قیمتی سے قیمتی سامان رکھنا بھی جائز تھا اسے اسراف نہ کہا جائے گا اور جس کو قیمتی سامان سے تعلق اور لگاؤ ہو جائے اس کے لیے ایسا سامان اسراف میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ بعض دفعہ ایک مرید کو خوش پوشاکی پر زجر فرماتے ہیں اور دوسرے کو کچھ نہیں کہتے۔ اس کا منشا یہی ہے وہ دیکھتے ہیں کہ اس کے قلب کو اس سے لگاؤ ہوتا ہے اور دوسرے کے قلب کو لگاؤ نہیں ہوتا۔ یہ مضمون بہت طویل ہو گیا مگر کچھ مضائقہ نہیں بہت سے کارآمد مضامین بحمد اللہ بیان ہو گئے۔

میں یہ بتلا رہا تھا کہ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں) ایسی عام حکمت ہے جو طلاق کے علاوہ تمام احکام میں جاری ہے۔ چنانچہ اسراف اور بخل میں بھی حکمت جاری ہے۔ اسی طرح ایک اور مثال بیان کرتا ہوں۔

دشمنی اور دوستی کے لئے بھی شریعت نے ایک حد مقرر کی ہے اور اس میں بھی اس حکمت کا جریان بہت واضح ہے بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے اَحْبِبْ حَبِیْبَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰی اَنْ یَّكُوْنَ بَغِیْضَكَ یَوْمًا مَّا وابغض بَغِیْضَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰی اَنْ یَّكُوْنَ حَبِیْبَكَ یَوْمًا مَّا یعنی دوست کے ساتھ دوستی اعتدال کے ساتھ کرو۔ شاید وہ کسی وقت تمہارا دشمن ہو جاوے تو تمہارے سارے راز معلوم ہونے کے سبب تم کو ضرر پہونچاوے۔ اور دشمن کے ساتھ دشمنی بھی اعتدال سے کرو شاید وہ کسی وقت دوست ہو جاوے تو آنکھیں سامنے کرتے ہوئے حجاب نہ ہو۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر ساری دنیا کے عقلاء جمع ہو جاویں تو اس ذات پاک (حضور صلی اللہ

کی بیرا بر ہرگز حکمتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ نے دوستی اور دشمنی کی کیسی حد بتلادی کہ دوستی ایسی کرو کہ اگر وہ کسی وقت دشمن ہوجاوے تو تم کو پریشانی نہ ہو۔ اور دشمنی بھی ایسی کرو کہ اگر کسی وقت دوست ہوجاوے تو آنکھیں سامنے کرتے ہوئے ندامت نہ ہو یہ وہی حکمت ہے لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا (شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کردیں) کہ دوستی اور دشمنی کرتے ہوئے یہ سوچ لیا کرو کہ شاید حق تعالیٰ بعد میں کوئی نئی بات پیدا کردیں۔ پھر نادم ہونا پڑے تو اسی وقت اس کی رعایت کرلینی چاہیئے۔ کیا کوئی حکیم ہے جس کی باتوں میں ایسی حکمتیں ہوں ہرگز نہیں۔ اب ہماری حالت یہ ہے کہ نہ ہماری دوستی کی کوئی حد ہے نہ دشمنی کی۔ دوستی کریں گے تو ایسی کہ دوست کو بھائی اور اولاد سے بھی بڑھادیں گے۔ بھائی سے تو روپے پیسے کا بھی حساب ہوتا ہوگا اور دوست سے کسی کا چیز کا حساب نہیں وہ جو چاہے کرے، پورا خود مختار ہے۔ اس کے سامنے اپنے سارے راز بیان کردیتے ہیں حتےٰ کہ خاندانی جھگڑے بھی سب اس کے سامنے کھولدیتے ہیں۔ عزیزوں سے تو کچھ پردہ بھی ہوتا ہے مگر دوستوں سے کسی بات کا پردہ ہی نہیں ہوتا جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی وقت وہ دشمنی پر آمادہ ہوگیا تو ان حضرت کے سارے راز ظاہر کردے گا۔ میں کہتا ہوں کہ دوستوں سے اپنے خاص راز ہرگز ظاہر نہ کرو۔ پیر سے زیادہ کوئی دوست نہیں ہوتا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ پیر سے بھی وہی راز ظاہر کرے جن سے اصلاح کا تعلق ہو۔ باقی راز مت ظاہر کرو۔ شاید کوئی یہ کہے کہ کیا پیر بھی دشمن ہوسکتا ہے۔ اگر اس میں ایسا احتمال ہو تو پھر وہ پیر بننے کے لائق ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ دشمن نہ ہوا تو شاید تم دشمن ہوجاؤ۔ اور اس کا آجکل مشاہدہ ہو رہا ہے کہ بعض لوگ ایک عرصہ تک کسی کے معتقد تھے مگر پھر کسی بات پر پیر کے دشمن ہوگئے کیونکہ وہ بات ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ افسوس یہ ایک تعلق ایسا تھا جس کو تمام تعلقات سے قوی سمجھا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں اس کے لئے بھی بقا نہیں۔ بس جب تک پیر سے کوئی بات اپنی طبیعت کے خلاف

صادر نہ ہوا اس وقت تک تو وہ پیر ہے، قطب ہے اور بڑا ولی ہے اور جس دن مرید کی طبیعت کے خلاف کوئی بات اس سے ظاہر ہوئی گو وہ شریعت کے بالکل مطابق ہو مثلاً اس نے زجر و تنبیہ کے طور پر مرید کو اپنے یہاں سے نکالدیا یا مجمع عام میں اس کو بُرا بھلا کہدیا۔ اب یہ حضرت پیر کے بھی دشمن ہو گئے اور اس کے خاندان کے بھی تو میں کہتا ہوں کہ پیر کا دشمن ہو جانا اگر بعید معلوم ہوتا ہے تو آپ کا دشمن ہو جانا کچھ بھی بعید نہیں۔ تو اسی خیال سے آپ سارے راز اس کے سامنے ظاہر نہ کیجئے کہ نہ معلوم ہم آج اُن کے معتقد ہیں کل کو ہم کیسے ہوں گے اس وقت افسوس کرنا پڑیگا۔ ہم نے بے ضرورت اپنے اسرار پر کسی کو کیوں مطلع کر دیا۔ دوسرے پیر بھی آخر بشر ہے اگر وہی دشمن ہو جاوے تو کیا محال ہے حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ہمارے استاد الاستاد فرماتے تھے کہ راحت اگر چاہتے ہو تو کسی سے توقع نہ رکھو۔ کیونکہ اکثر رنج و غم کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ہم کو کسی سے امید تو اور کچھ اور اُس سے برتاؤ اور کچھ ظاہر ہوا پھر مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ بھائی میں کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی امید نہ رکھو۔ اللہ اکبر یہی تو اہل اللہ کی علامت ہے، کہ وہ معاملات میں اپنے کو بھی دوسروں کی برابر سمجھتے ہیں چنانچہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ صحابہ کے ساتھ ایسا ہی تھا کہ کوئی خاص امتیازی شان آپ نے اپنے واسطے نہیں رکھی تھی۔ حدیث میں ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان پر تشریف لے گئے تو آپ نے تین بار السّلام علیکم أَدْخُلُ (السلام علیکم میں اندر آؤں) فرمایا۔ یہ استیذان تھا یعنی آپ نے بعد سلام کے اجازت طلب کی کہ میں اندر آؤں، حضرت سعد بن عبادہ خاموش رہے یہ خیال کیا کہ اچھا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سلام فرمائیں جو کہ دعا ہے تو ہم کو برکت دعا کی زیادہ حاصل ہو۔ جب تین بار کے بعد بھی جواب آیا تو آپ واپس ہو گئے۔ سبحان اللہ کیسی شان تھی بھلا آجکل تو کوئی ایسا کر کے دیکھے اپنے پیر کے ساتھ جو اسی وقت بیعت قطع نہ کر دیں کہ ہم نے تین بار آواز دی اور جواب بھی نہ دیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا بھی ناگواری نہ ہوئی کیونکہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے گھر میں آنے کی اجازت دے یا نہ دے اور استیذان کا یہ قاعدہ زنانہ مکان میں تو ہے ہی مردانہ مکان میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ کہ بدُون اجازت کے اندر مت جاؤ۔ مگر افسوس آجکل مسلمانوں نے اس طریقہ کو چھوڑ دیا اور شرم کی جگہ ہے کہ اس پر غیر قومیں عمل کرتی ہیں انھوں نے اسلام ہی سے

یہ قاعدہ سیکھا ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کو اسلامی اصول کی قدر نہیں البتہ مردانہ مکان میں ایک تفصیل بھی ہے وہ یہ کہ مردانہ مکان دو قسم کے ہیں ایک وہ جس میں اسی واسطے بیٹھتے ہوں تاکہ لوگ آکر ملیں وہاں استیذان کی ضرورت نہیں مثلاً مردانہ مکان کے صحن میں جانے کیلئے استیذان کی ضرورت نہیں اور ایک مردانہ مکان وہ ہے جہاں ملاقات کے لئے نہیں بیٹھتے مثلاً مردانہ مکان میں کوئی کمرہ ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں گویا کواڑ بند ہیں تو اس میں بدون استیذان کے داخل نہ ہونا چاہئے۔ خوب سمجھ لو اس میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ غرض جب واپس تشریف لے چلے اور حضرت سعدؓ نے پھر آواز سنی تو باہر نکلے اور آپؐ کے پیچھے دوڑے اور واپس تشریف لیجانے کے متعلق دریافت کیا آپؐ نے فرمایا کہ جب تیسری بار میں جواب نہیں ملا ہم واپس ہوگئے۔ کیونکہ شرعی قانون اس کے متعلق یہی ہے تو دیکھئے آپ نے اس قانون کو اپنی ذات مبارک کے لئے بھی جاری فرمایا۔ اسی طرح حدیث میں ایک اور واقعہ حضرت بریرہ کا ہے کہ جب وہ آزاد ہوگئیں اور شرعی قاعدہ سے ان کو اختیار دیا گیا کہ اپنے پہلے شوہر کے ساتھ (جس سے غلامی کی حالت میں نکاح ہوا تھا) نکاح باقی رکھیں یا فسخ کردیں اور انھوں نے اس اختیار کی بناپر فسخ نکاح کو اختیار کیا تو ان کے پہلے شوہر کو بہت رنج ہوا کیونکہ ان کو بریرہ سے محبت تھی اور حضرت بریرہ کو ان سے نفرت تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوہر کی حالت کو دیکھ کر بریرہ سے فرمایا کہ اگر تم مغیث سے نکاح کرلو تو اچھا ہے۔ حضرت بریرہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکم نہیں محض مشورہ ہے۔ تو انھوں نے صاف عرض کردیا کہ میں اس مشورہ کو قبول نہیں کرتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت بریرہ کے اس جواب سے مطلق ناگواری نہیں ہوئی۔ کیونکہ مشورہ کا قانون یہی ہے کہ دوسرے شخص کو اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ لیکن آجکل تو اس قاعدہ پر کوئی عمل کرکے دیکھے کہ پیر صاحب کوئی مشورہ دیں یا کسی کی سفارش کریں اور مرید نہ مانے تو پھر دیکھئے کیا حال ہو۔ لیکن شرعاً اس پر کوئی ملامت نہیں۔ کیونکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر عمل کرنا واجب نہیں تھا تو پیر صاحب کے مشورہ پر عمل کرنا کہاں سے واجب ہوگیا۔ تو حضرت مولانا کا اتباع سنت ملاحظہ ہو کہ اس قاعدہ کلیہ میں اپنے کو بھی داخل فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ اَحْبِبْ حَبِیْبَكَ الخ (دوست سے اعتدال کے ساتھ دوستی رکھو) سے بزرگوں نے اپنے کو بھی مستثنیٰ نہیں فرمایا۔

پس اس بناء پر بجز خاص اسرار کے جن کو اصلاح حال میں دخل ہو باقی اسرار پیر سے بھی نہ کہو پس یہ قاعدہ سب کو عام ہے اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا مَّا وَابْغِضْ بَغِيْضَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ حَبِيْبَكَ يَوْمًا مَّا (دوست کے ساتھ دوستی اعتدال سے کرو شاید کہ وہ کسی وقت تمہارا دشمن ہو جائے اور دشمن کے ساتھ دشمنی اعتدال سے کرو شاید وہ کسی وقت تمہارا دوست ہو جائے) یہ تو دوستی کی حالت کا بیان تھا کہ حد سے بڑھ جاتے ہیں اسی طرح ہماری حالت دشمنی میں یہ ہے کہ اس میں بھی حد سے نکل جاتے ہیں کہ بس جس سے عداوت ہو گی اس کی ایذا رسانی میں کسر نہیں رکھتے ہر ممکن طریقہ سے اس کو ضرر پہنچاتے ہیں خواہ وہ شریعت کے موافق ہو یا خلاف حلال و حرام کی بھی ذرا تمیز نہیں رہتی۔ لہٰذا اس حدیث میں دشمنی کی بھی حد بتلا دی۔ کیا ٹھکانہ ہے انتظام کا کہ حق تعالیٰ نے کفار تک کے ساتھ عداوت کرنے کیلئے بھی قوانین مقرر فرمائے ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (ترجمہ) اور تم کو کسی قوم کی عداوت جو اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے تم کو مسجد حرام سے روک دیا ہے اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم حد سے تجاوز کرنے لگو اور (ہمیشہ) نیکی اور تقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کا ساتھ دو اور گناہ اور ظلم میں کسی کا ساتھ نہ دو اور (ہمیشہ) خدا تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچتے رہو۔ بیشک حق تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔ دیکھئے صحابہ کی عداوت دینی تھی اور اس کا منشا بھی دین تھا کہ کفار نے مسجد حرام پر ناحق قبضہ کر رکھا تھا اور اس کے اندر نماز اور طواف کرنے سے مسلمانوں کو روک دیا تھا مگر اس میں بھی حکم ہوتا ہے کہ حدود سے مت نکلو گناہ اور ظلم نہ کرو نہ ان کاموں میں کسی کا ساتھ دو۔ اب اس ارشاد کو سنکر مسلمان اپنی حالت پر غور کریں تو ان کو معلوم ہو گا کہ وہ دوستی اور دشمنی میں حدود سے کتنا تجاوز کرتے ہیں آجکل ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جو دین کے لئے کسی سے دوستی اور دشمنی کرتے ہوں ہماری دوستی اور دشمنی سب دنیا کے واسطے ہے پھر اگر شاذ و نادر کسی کو کسی سے دین کے واسطے بھی دشمنی ہو تو اس میں حالت یہ ہے کہ دشمنی میں حدود سے اتنا تجاوز کرتے ہیں کہ دین بھی برباد ہو جاتا ہے پرائے شگون کو اپنی ناک کٹانا اسی کا نام ہے کہ دوسروں کی دنیا برباد کرنے کے لئے اپنا دین خراب کرتے ہیں آجکل دشمنی میں صرف یہ مقصود ہوتا ہے کہ دوسرے کو

ضرر پہنچ جاوے چاہے اپنے کو کچھ نفع ہی نہ ہو بلکہ خواہ اپنے کو اس سے بڑھ کر ضرر پہنچ جاوے اور اس میں راز یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے جذبات نفسانیہ کو عقل و شرع کے تابع نہیں کرتے بلکہ خود عقل و شرع کو جذبات کے تابع بنانا چاہتے ہیں اور شریعت کا حکم یہ ہے کہ جذبات نفسانیہ کو احکام الٰہی کا تابع بناؤ۔ چنانچہ ہجرت کے قبل جہاد مشروع نہ ہونے کا نکتہ محققین نے یہی فرمایا ہے کہ مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو جہاد کی اس لئے اجازت نہ ہوئی کہ اس وقت تک مسلمانوں کے جذبات نفسانیہ کی کامل اصلاح نہ ہوئی تھی مسلمانوں کی اصلاح تدریجاً ہوئی ہے۔ دفعۃً نہیں ہوئی اور یہ ایسی بات ہے جس کا انکار وہی کر سکتا ہے جس نے احادیث و آیات میں تامل نہ کیا ہو ورنہ نصوص میں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے مَنْ قَالَ وَاللَّاتِ وَالْعُزّٰی فَلْیَقُلْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَنْ قَالَ تَعَالَ اُقَامِرْكَ فَلْیَتَصَدَّقْ یعنی جس شخص کی زبان سے لات و عزیٰ کی قسم نکل جاوے اس کو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ لینا چاہیے۔ اور جس کی زبان سے یہ کلمہ نکل جاوے کہ آؤ جوا کھیلیں اس کو صدقہ کرنا چاہیے دیکھئے آجکل اگر کوئی لات و عزیٰ کی قسم کھالیوے تو اس پر کفر کا اندیشہ ہے مگر اس وقت چونکہ صحابہ نو مسلم تھے جو چند روز پیشتر ان کلمات کے عادی تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر عادت سابق کے موافق ایسے کلمات زبان سے نکل جاویں تو کلمۂ توحید پڑھ لینا چاہیے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ابتدائے اسلام میں جاہلیت کا کچھ اثر باقی رہ جانا مستبعد نہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ تعلیم فرمائی گئی تھی۔ پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ حضرات صحابہ کی اصلاح کی تکمیل تدریجاً ہوئی ہے اس لئے انکو مکہ مکرمہ میں جہاد کی اجازت نہ دی گئی کیونکہ اس وقت جہاد میں نفس کی آمیزش ہوتی اخلاص نہ ہوتا۔ اور بدون اخلاص کے دینی کامیابی کا نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے مگر مسلمان کو دنیوی کامیابی بھی بدون اس کے نہیں ہوتی اخلاص کے باب میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھیں) اور حدیث میں ہے یُؤْتٰی بِالشَّهِیْدِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ کہ قیامت کے دن شہید کو بلایا جاویگا اور اپنی نعمتیں یاد دلا کر اس سے پوچھا جائے گا کہ ہمارے واسطے تو نے کیا کیا۔ وہ عرض کرے گا کہ میں نے آپ کے راستہ میں اپنی جان دی اور کفار سے جہاد کیا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹ بولتا ہے تو نے

ہمارے واسطے جان نہیں دی بَلْ یُقَاتِلُ رِاَنَّكَ جَرِیٌّ بلکہ اس لئے سب کچھ کیا تاکہ لوگ تجھے بہادر کہیں کہ بڑا جوانمرد ہے کسی سے نہیں ڈرتا حاکم کے سامنے بڑی جرأت سے اظہار دیئے فَقَدْ قِيْلَ یعنی دنیا میں تیری بہت کچھ تعریف ہو چکی اور تیرا مدعا حاصل ہو گیا یہاں تیرے واسطے صرف جہنم ہے۔ چنانچہ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے جہنم میں کھینچ کر لے جاؤ تو حق تعالے نے حضرات صحابہ کو اس بلا سے بچالیا کہ جب تک ان کے جذبات نفسانیہ کی کامل اصلاح نہ ہوگئی اس وقت تک جہاد کی اجازت نہ دی اگر ابتداء اسلام ہی میں اجازت ہو جاتی تو بہت سے ناموری یا شفاءِ غیظ کے لئے جہاد کرتے اخلاص کے ساتھ محض رضائے حق کے لئے کام نہ ہوتا جب صحابہ کی تکمیل ہوگئی اور کفار کی ایذائیں سہتے سہتے اُن میں جذبات نفسانیہ کے دبلنے کا ملکہ پیدا ہوگیا اس وقت آپ کو ہجرت کا حکم ہوا اور مدینہ منورہ پہنچکر جہاد کی اجازت ہوئی مکہ مکرمہ میں جہاد کی ممانعت کا سبب یہ نہ تھا کہ جماعت اہل اسلام کم تھی اگر یہ سبب ہوتا تو مدینہ منورہ پہنچکر بھی اجازت نہ ہوتی کیونکہ وہاں پہنچکر بھی مسلمانوں کا مجمع کفار سے بہت ہی کم تھا اگر کم نہ ہوتا تو ملائکہ کا جوڑ نہ لگایا جاتا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوات میں اکثر ملائکہ کا لشکر آیا کرتا تھا جن کی برکت سے مسلمانوں کو غلبہ ہوتا تھا اور اگر قلت وکثرت عدد پر مدار ہوتا تو جنگ حنین میں جس میں مسلمان زیادہ تھے مغلوب نہ ہوتے اور زیادتی بھی معمولی نہ تھی بلکہ کفار سے تین حصہ زیادہ تھے چنانچہ کفار چار ہزار تھے اور مسلمان بارہ ہزار اور زیادتی عدد کے ساتھ ایک اور خصوصیت بھی تھی وہ یہ کہ بارہ ہزار کے عدد میں ایک خاصیت نص میں وارد ہے کہ لَنْ یُّغْلَبَ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا مِّنْ قِلَّۃٍ یعنی بارہ ہزار مسلمان قلت عدد سے ہرگز مغلوب نہ ہوں گے تو تمام مقتضیات غلبہ کے موجود تھے مگر پھر بھی مغلوب ہوگئے معلوم ہوا کہ قلت عدد عدم مشروعیت جہاد کا سبب نہ تھا اگر اس پر شبہ ہو کہ مسلمان تو اس سے زیادہ مغلوب ہوتے ہیں چنانچہ حنین ہی میں مغلوب ہوئے اور کیا اس میں کوئی قید نہیں یعنی اگر مقابل لاکھوں ہوں تب بھی یہ وعدہ ہے جواب خود اس حدیث ہی کی ایک قید سے نکلتا ہے وہ قید مِنْ قِلَّۃٍ کی ہے یعنی قلت سبب مغلوبیت کا نہ ہوگا گو کوئی اور علت سبب ہو جاوے۔ چنانچہ حنین میں عجب سبب ہوا اس مغلوبیت کا۔ اور ظاہرا اس میں اور کوئی قید نہیں۔ اب یہاں ایک شبہ ہے وہ یہ کہ بعد اذن بالقتال کے بھی تو بعضے مجاہدین نومسلم تھے اور ان میں تمہارے بیان کے موافق غلبہ جذبات کا ہوگا تو ان کو جہاد میں کیوں

شریک کیا گیا جواب یہ ہے کہ تجربہ ہے مخلوط جماعت میں اثر غالب عدد غالب کا ہوتا ہے اور جب جہاد مشروع ہوا اس وقت زیادہ تر جماعت کاملین کی تھی گو ان میں بعضے نو مسلم بھی ہوتے تھے مگر غلبہ کاملین کو تھا اور فلاح و کامیابی کے لئے اتنا کافی ہے کہ زیادہ تر کام کرنے والے مخلص ہوں۔ اگر تھوڑے سے غیر مخلص بھی ہوں تو مغلوبیت کی وجہ سے کام خراب نہیں ہوتا۔ دوسرے جب غلبہ مخلصین کو ہوتا ہے تو ناقصین پر بھی ان کا اثر پڑتا ہے کہ ان میں بھی اخلاص پیدا ہو جاتا ہے اور اگر غلبہ غیر مخلصین کو ہوا اور مخلص قلیل ہوں تو اس وقت معاملہ برعکس ہو جاتا ہے کہ ان غیر مخلصین کی کثرت کا اثر مخلصین پر پڑتا ہے کہ ان کا اخلاص بھی ناقص اور کمزور ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آجکل مسلمانوں کے اکثر کام پورے نہیں ہوتے کیونکہ غلبہ غیر مخلصین کو ہے اگر مخلصین کو غلبہ ہو تو پھر ناکامی کبھی نہ ہو۔ اور صحابہ کے جذبات نفسانیہ کی یہاں تک اصلاح ہو گئی تھی کہ جب کفار نے ان کو مکہ مکرمہ میں جانے سے روکا اس وقت وہ آپے سے باہر نہیں ہوئے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر جمے رہے اگر ہم لوگوں کو کبھی ایسا واقعہ پیش آوے تو نہ معلوم جوش غضب میں کیا کچھ کر بیٹھیں غرض اصل مقصود اتباع احکام ہے اور دوستی اور دشمنی وہی قابل اعتبار ہے جو احکام شریعت کے موافق ہو۔ بخدا اتباع احکام کے بغیر نہ سلطنت مقصود ہے نہ ترقی اگر خالی سلطنت مقصود ہو تو فرعون سب سے زیادہ کامیاب سمجھا جانا چاہیے نعوذ باللہ منہ بس مسلمان کا اصل مقصود یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کو راضی رکھے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار   بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(مصلحت یہی ہے کہ تمام مصلحتوں پر خاک ڈالکر تمام دوست ایک ہی محبوب کی طرف متوجہ ہو جائیں)

اگر دلیل شرعی سے خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ثابت ہو کہ گوہ کا ٹوکرا اٹھا دیں اور خاموش رہیں تو ہماری فلاح اسی میں ہے جیسا کہ مکہ مکرمہ میں حضرات صحابہ کفار کے ہاتھوں ایذائیں برداشت کرتے رہے اور اسی میں خوش رہے۔ اور اگر اتباع احکام کے ساتھ ہم کو سلطنت بھی مل جاوے تو نورٌ علیٰ نور ہے پس ہم کو نہ ترقی مقصود بالذات ہے نہ تنزل ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(فراق و وصل کیا ہووے رضائے الٰہی طلب کرو اس لئے افسوس ہے سوائے اسکے تمنا کرنا)

خدا کو راضی رکھ کر اگر دنیا مل جائے تو مبارک ہے ورنہ ایسی تیسی اس دنیا کی جس میں چند روز گلچھرے اڑا کر ہم جہنم کے کندے بن جاویں حیرت ہے کہ مسلمان مسلمان ہو کر رضائے الٰہی کے سوا کسی اور چیز کو مقصود سمجھے یہ تو دوستی اور دشمنی کے حدود تھے جو میں نے بیان کر دیئے۔ اب میں ترقی کر کے یہ کہتا ہوں کہ معاملات خلق سے متجاوز ہو کر باطنی احوال و مقامات تک کے لئے بھی حدود ہیں یعنی خوف الٰہی اور شوق خداوندی اور تواضع وغیرہ جو کہ اخلاق باطنی ہیں جن کو صوفیہ کی اصطلاح میں مقامات کہا جاتا ہے جو بظاہر علے الاطلاق ہر درجہ میں مطلوب معلوم ہوتے ہیں، ان کے لئے بھی حدود ہیں یہ نہیں کہ ان کا ہر درجہ مطلوب ہو۔ یہ مضمون شاید آپ نے کبھی نہ سنا ہوگا کیونکہ اخلاق حمیدہ باطنیہ کے بارے میں لوگوں کا عام خیال ہے کہ ان میں جتنی ترقی ہو اچھی بات ہے ان کا کوئی درجہ مذموم نہیں اور قیاس ظاہری بھی اسی کو چاہتا ہے کیونکہ یہ امور مطلوبہ ہیں اور مطلوب کا ہر درجہ مطلوب ہوا کرتا ہے۔ مگر اس قیاس میں اتنی غلطی ہے کہ امور مطلوبہ کو عام رکھا گیا ہے حالانکہ یہ قاعدہ مطلوب بالذات کے لئے ہے کہ اس کا ہر درجہ مطلوب ہوا کرتا ہے اور یہ امور مطلوب بالعرض ہیں اصل مطلوب رضائے الٰہی ہے جس کا ہر درجہ مطلوب ہے۔ اس تمہید کے بعد اب میں اخلاق و مقامات باطنیہ میں نمونہ کے طور پر بتلانا چاہتا ہوں کہ حدود سے وہ بھی خالی نہیں اور نمونہ اس واسطے کہا کہ سب احکام کا بیان کرنا دشوار ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش
کہ حسن ایں قصۂ عشق ست در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ روشنائی بکھیر کاغذ پھاڑ اور خاموش رہ اس لئے حسن یہ قصہ عشق کا ہے دفتر میں نہیں سما سکتا) حق تعالیٰ فرماتے ہیں قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۝ (آپ کہدیجئے کہ میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی ہو تو سمندر ختم ہو جائے اگرچہ اس کی مدد کے لئے ہم ایک دوسرا سمندر لے آویں) احکام الٰہی کی انتہا نہیں اس لئے نمونہ کے طور پر بیان کرتا ہوں کہ مثلاً شوق اور

خوف کے لئے بھی حدود ہیں۔ دیکھئے حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ شَوْقًا اِلٰی لِقَائِكَ فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ
اگر شوق کے لئے حد نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قید کیوں بڑھائی فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءَ
مُضِرَّةٍ وَلَا فِتْنَةٍ یعنی آپ دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ مجھے اپنے لقاء کا ایسا شوق عطا فرما
جس میں نہ کوئی ضرر ہو اور نہ کوئی فتنہ مضلہ ہو ضرار کا مقابلہ اضلال کے ساتھ مقتضی ہے کہ
یہ کوئی دنیوی ضرر ہے یعنی بیماری وغیرہ پس معنی یہ ہوئے کہ اس شوق میں مجھ کو نہ کوئی بیماری
لگے اور نہ کسی گمراہ کرنے والے فتنہ میں ابتلا رہو۔ بات یہ ہے کہ غلبہ شوق کے دو اثر ہوتے
ہیں ایک جسمانی، ایک روحانی جسمانی اثر تو یہ ہے کہ کثرت شوق سے حرارت جسمانیہ بڑھ جاتی
ہے اور جب بدن میں خشکی کا غلبہ ہو جاتا ہے جس کے لئے ضعف لازم ہے تو غلبہ شوق سے
بدن میں ضعف و اضمحلال بڑھ جاتا ہے۔ بعض دفعہ ہڈیاں تک گھل جاتی ہیں تو پہلے نماز
کھڑے ہو کر پڑھ سکتے تھے اب قعود ہی رہ گیا۔ چند دنوں کے بعد قعود بھی دشوار ہو گیا
پہلے روزے بہت رکھ سکتے تھے اب نہیں رکھ سکتے۔ وعلیٰ ہذا القیاس نیز شوق کے غلبہ میں
کھانا پینا بھی چھوٹ جاتا ہے۔ دیکھئے بعض دفعہ جب کسی عزیز کے آنے کا انتظار ہوتا ہے
تو عین کھانے کے وقت خبر آمد سن کر بھوک جاتی رہتی ہے کھانا نہیں کھایا جاتا یہی حالت
غلبہ شوق لقاء میں ہو جاتی ہے اہل شوق کو ایسے واقعات پیش آتے ہیں تو غلبہ حرارت
کے ساتھ جب غذا بھی کم ہو جاوے اب جتنا بھی ضعف ہو تھوڑا ہے۔ تو آپ نے فِیْ غَیْرِ
ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ میں ایسے غلبہ شوق کی نفی کر دی کہ اے اللہ شوق کی وجہ سے میری صحت
خراب نہ ہو کیونکہ بعض اوقات حد قدرت کے اندر بھی عمل میں سستی ہونے لگتی ہے جس سے
معصیت بھی ہوتی ہے یہ ضرر ہوا حد سے زیادہ غلبہ شوق کا۔

دوسری خرابی روحانی یہ ہے کہ شوق سے ناز بڑھ جاتا ہے کیونکہ غلبہ شوق میں
انبساط زیادہ ہوتا ہے اور زیادت انبساط سے ناز پیدا ہوتا ہے تو یہ شخص ناز میں
آکر کچھ سے کچھ بکنے لگتا ہے۔ مجذوبین میں یہی تو نقص ہے گو اس وقت اس شخص کو گناہ
نہ ہو کیونکہ غلبہ حال سے وہ بے خبر ہوتا ہے مگر تاہم یہ حال کمال کے منافی ہے۔ کمال یہی ہے

نہ ادب سے تجاوز نہ ہو۔ پھر یہ شخص تو بے خبر ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ اس کی باتیں دوسرے لوگ سن لیتے ہیں وہ ان سے گمراہ ہو جاتے ہیں اہل شوق کو چاہیئے کہ مجمع عام میں اپنی باتیں نہ کیا کریں۔ مولانا اسی کی شکایت فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند

از سخنہا عالمے را سوختند

یعنی وہ لوگ بڑے ظالم ہیں جنھوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر دنیا کو اپنی باتیں سنائیں اور مخلوق کو گمراہ کیا نیز بعض دفعہ غلبہ حال رفع ہو جانے کے بعد بھی اس شخص کی زبان سے حسب عادت کلمات شطحیہ نکل جاتے ہیں۔ اس وقت گناہ بھی ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وَلَا فِتْنَةٍ مُّضِلَّةٍ میں اس کی بھی نفی فرما دی کہ غلبہ شوق سے میں گمراہی کے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اسی طرح خوف کے لئے بھی آپ نے ایک حد بتلائی ہے حدیث شریف میں ہے۔ وَ اَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ اور اے اللہ میں آپ کا اتنا خوف چاہتا ہوں جس سے گناہوں کے درمیان اور میرے درمیان رکاوٹ ہو جاوے اور اس قید کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ غلبہ خوف سے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ صفات جلال کے مشاہدہ سے صفات جمال یعنی رحمت و رأفت خداوندی کی طرف بالکل ذہن نہیں جاتا جس سے مایوسی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ جب رحمت خداوندی سے مایوسی ہو گئی تو کفر تک پہونچ گیا فَاِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (اس لئے بجز کافر لوگوں کے اللہ کی رحمت سے کوئی مایوس نہیں ہوتا۔) اور اگر مایوسی بھی نہ ہوئی تو تعطل کی نوبت آجاتی ہے۔ سمجھتا ہے کہ جب ان اعمال سے کچھ کام نہیں چل سکتا تو یہ سب بیکار ہیں۔ اب نماز روزہ سب کو بالائے طاق رکھدیتا ہے اس ورطہ میں بہت لوگ تباہ ہو گئے ہیں۔ جو اولیاء مستہلکین کہلاتے ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنِيْ وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ (اتنا خوف جو میرے اور میرے گناہوں کے رکاوٹ ہو جائے) فرما کر بتلا دیا کہ خوف کا ہر درجہ مطلوب نہیں۔

صاحبو! جب شوق خداوندی اور خوف الٰہی کے لئے بھی حدود ہیں تو اب باقی امور کو

خود ہی سمجھ لیجیے کہ ان کے لئے حدود کیوں نہ ہوں گے شوق اور خوف میں لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا ہ (شاید اس سے اللہ تعالےٰ کوئی بات پیدا کردیں) کا اجراء اس طرح ہوگا کہ زیادہ غلبہ شوق کی تمنا نہ کرو کیونکہ شاید اس سے طاعات میں کمی ہوجاوے پھر تم پچتاؤ گے یا ناز پیدا ہوگیا اور حد ادب سے نکل گئے تو پشیمانی ہوگی اور اگر شوق کے بعد انس عطا ہوگیا تو اس وقت تم ادب کرنا چاہو گے مگر عادت کی وجہ سے کلمات ناز زبان سے نکل جایا کریں گے تو گناہ بھی ہوگا پھر پچتاؤ گے کہ ہائے میں نے اتنا شوق کیوں مانگا تھا۔

اسی طرح خوف میں سمجھ لیجیے غرض باطنی امور میں بھی حدود ہیں لیکن ظاہری امور میں تو حدود اختیاری ہیں ان سے خود بچنا چاہیے اور باطنی امور میں حدود غیر اختیاری ہیں ان کے لئے حق تعالےٰ سے دعا کرنا چاہیے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور دعا کے فرمایا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَوْقًا اِلٰی لِقَائِکَ فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّۃٍ وَلَافِتْنَۃٍ مُضِلَّۃٍ

(اے اللہ مجھے اپنی لقا کا اس قدر شوق عطا فرما جس میں نہ کوئی ضرر ہو اور نہ کوئی فتنہ مضلہ ہو)

البتہ باطنی امور میں اتنی بات اختیاری ہے کہ اپنی طرف سے کوئی درجہ اپنے لئے تجویز کرکے اس کی تمنا نہ کرے بلکہ حق تعالےٰ پر تفویض کردے امید ہے کہ یہ نمونہ تمام حدود کے لئے کافی ہوجائے گا۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل عطا فرماویں۔

(نوٹ) وعظ ختم ہونے کے بعد موذن نے فوراً وقت سے پہلے ہی اذان کہدی تاکہ سارا مجمع اسی مسجد میں نماز پڑھ کر جاوے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ بھی وہی بات ہے کہ ہم لوگوں میں حدود کی رعایت نہیں۔ موذن صاحب نے کثرت جماعت کا تو خیال کیا مگر یہ نہ دیکھا کہ ابھی عصر کا وقت نہیں ہوا۔

وصلے اللہ علےٰ سیدنا ومولانا محمد وعلےٰ آلہ واصحابہ اجمعین

واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین ہ

تمام شد

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تعالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً
(رواہ البخاری)

وعظ مسمیٰ بہ

الحجّ المبرور

(از افادات)

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب
تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الحج المبرور

این	متیٰ	کم	کیف	لِمَ	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کس لئے ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
بمبئی مکان حکیم اجمیری صاحب	۱۱ ذیقعدہ سنہ ۱۳۳۷ھ بوقت شب	۲ گھنٹہ	بیٹھ کر	حجاج کی اصلاح کے لئے	حج میں اخلاص کی ضرورت	ظفر احمد عفی عنہ	تقریباً ۲۵	مستورات زیادہ تھیں

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ۝

یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے جس میں حق تعالٰی نے ایک بڑے ضروری امر کا امر فرمایا ہے۔ اور یہ قرآن شریف کا خاص حصہ ہے کہ تھوڑے سے الفاظ میں مقصود کا ہر پہلو سے بیان ہو جاتا ہے۔ اخلاص کے بارے میں جتنی باتیں بیان کرنا ضروری تھیں وہ سب ان تھوڑے سے لفظوں میں بیان ہو گئیں ہیں۔ اگر ان سب کی تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لئے وسیع وقت کی ضرورت ہے اور وعظ کا وقت مستورات کی مصلحت سے رات کا رکھا گیا ہے اس لئے وقت میں زیادہ گنجائش نہیں کیونکہ رات کے وقت دیر تک بیان ہونے سے سننے والے گھبرا جاتے ہیں۔ بعض پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو اونگنے لگتے ہیں جس سے بیان کرنے والے کی طبیعت منقبض ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں اس کا خلاصہ عرض کئے دیتا ہوں جو ان شاء اللہ تعالٰی تھوڑے وقت میں بیان ہو جائے گا۔ اس آیت میں جس خاص ضروری بات کا امر ہے وہ اخلاص ہے۔ یوں تو اس کی ضرورت ہر وقت ہے اور ہر کام میں ہے۔ اخلاص کے بدون کوئی دین کا کام مقبول نہیں ہوتا۔

مگر اس وقت جس خاص کام کے لئے اخلاص کی ضرورت مجھ کو بیان کرنا ہے اس کے لئے ایک خاص محرک موجود ہے۔ وہ یہ کہ سامعین کو معلوم ہے کہ اس وقت ان میں سے بہت سے حضرات کا حج کا ارادہ ہے۔ جن میں مرد بھی ہیں اور مستورات بھی ہیں اور مجھے بھی بمبئی تک انہی کے پہونچانے کے لئے آنا پڑا ہے۔ اگرچہ میرے مشاغل اس قدر ہیں کہ مجھ کو اس سفر کیلئے مہلت نہ مل سکتی تھی، مگر محض اس خیال سے یہاں تک چلا آیا کہ مجھے اگر حج کی توفیق دوبارہ نہیں ہوئی تو کم از کم حجاج کی خدمت اور راحت رسانی ہی کا کچھ ثواب لے لوں۔ اگرچہ میں کسی کی کچھ خدمت بھی نہیں کر سکتا مگر غالباً میرے بمبئی تک ساتھ ہونے سے میرے رفیقوں کو بہت کچھ سہولتیں اس سفر میں

ہوگئی ہوں گی۔ اور اگر سب کو نہیں تو خاص میرے متعلقین کو تو قوت اور اُنس ضرور ہو رہا ہوگا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ میرے یہاں تک آنے سے مشہور یہی ہو گیا کہ میں حج کو جارہا ہوں خیر یہ بھی ایک نیک فال ہے۔ ان شاء اللہ تعالٰے مجھے حجاج کی معیت میں حج ہی کا ثواب مل جائے گا۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے الدال علی الخیر کفاعلہ کہ نیک کام کا راستہ بتانے والا بھی ثواب میں کرنے والے کے برابر ہے تو جب صرف دلالت کا ثواب کرنے کے مثل ہے تو اس مشقت کا ثواب کہ میں گھر سے بمبئی تک حجاج کی مصلحت سے ان کے ساتھ آیا یہ بھی ان شاء اللہ تعالٰے ثواب میں حج کے برابر ہی ہو جائے گا۔ پھر میں اس وقت حج کے کامل اور مقبول ہونے کا طریقہ بتلانا چاہتا ہوں اگر اس بیان سے کسی کو نفع ہو گیا تو دلالت علی الخیر بھی پائی گئی جس کا ذکر حدیث شریف میں صراحۃً موجود ہے۔

بہر حال بعض رفقاء کا ارادہ حج اس بات کا محرک ہوا کہ حج کے متعلق کچھ ضروری تنبیہات گوش گذار کر دی جائیں تاکہ جس امر کا انھوں نے خدا تعالٰی کی توفیق سے ارادہ کیا ہے اس کو آداب و شرائط کے ساتھ ادا کریں کیونکہ ہر چیز اپنے آداب و شرائط ہی کے ساتھ کامل ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی امر کی طرف اس آیت میں تنبیہ کی گئی ہے۔ جس کو میں نے اس وقت تلاوت کیا ہے اور وہ امر جس کی طرف اس آیت میں تنبیہ ہے بہت ہی زیادہ ضروری ہے کیونکہ یہ ایک قاعدہ مسلمہ عقلیہ ہے کہ ہر فعل میں جس چیز کی کمی ہوا کرتی ہے اس کا تدارک دوسرے محسنات سے مقدم ہوتا ہے یعنی اگر ایک کام میں کمی نہ ہو گو زوائد بھی اس میں نہ ہوں وہ تو مقصود کے لئے کافی ہے اور جس کام میں اصل ہی سے کمی ہو گو محسنات بھی اس میں ہوں وہ ناکافی ہوتا ہے پس ہر کام کی تکمیل کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے ان کوتاہیوں کو پورا کیا جائے جن پر اُس کی صحت اور مقبولیت موقوف ہے۔ پھر اگر خدا ہمت دے تو

ان مستحبات اور نوافل وزوائد کو بھی پورا کیا جائے جن سے اس کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے اور اگر نوافل و زوائد کو پورا بھی نہ کیا جائے تو حسن اصلی تو جب بھی رہے گا اور کوتاہیوں کے ہوتے ہوئے کسی کام میں حسن پیدا نہیں ہوسکتا۔

دیکھئے اگر ایک مکان میں تمام ضروریات موجود ہوں کسی معتبر چیز کی کمی نہ ہو مگر استرکاری اور بیل بوٹے نہ ہوں تو اس مکان کو ناقص نہ کہا جائے گا اور اگر اس میں باورچی خانہ یا غسلخانہ یا اور کوئی ضروری چیز نہ ہو تو چاہے اس میں ہزار بیل بوٹے ہوں اس کو یقیناً ناقص کہا جائے گا اور سب یہی کہیں گے کہ یہ مکان رہنے کے قابل نہیں۔

اسی طرح ہر چیز پر غور کرلیا جائے تو اس عقلی قاعدہ کی تائید ہر چیز میں ملے گی کہ اول ہر چیز کے نقصانات اور کوتاہیوں کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے محسنات اور زوائد کا مرتبہ بعد میں ہے۔ اس لئے میں نے اس آیت کے مضمون کو زیادہ ضروری قرار دیا کیونکہ اس میں ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس پر ہر نیک عمل کا درست اور مقبول ہونا موقوف ہے اور اس میں آج کل بہت کمی کی جاتی ہے اور وہ اخلاص ہے۔ اگرچہ اخلاص کی کمی ہمارے اکثر اعمال میں آجکل ہے اس لئے بظاہر حج کی کوئی خصوصیت معلوم نہ ہوئی ہوگی۔ مگر میں ابھی بتلا دوں گا کہ اخلاص کی ضرورت حج میں زیادہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حج کی ایک خاص شان ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر اخلاص سے خالی ہوجاتا ہے۔ اور یہ ہمارے سوء فہم کا نتیجہ ہے کہ اس کی وہ خاص شان اُس کو مقتضی ہوگئی کہ اس میں اخلاص کم ہوتا ہے ورنہ اس شان کا اصلی مقتضا یہ تھا کہ اس میں دوسرے اعمال سے زیادہ اخلاص کا اہتمام کیا جاتا۔ حج کی ایک شان یہ ہے کہ وہ ساری عمر میں ایک بار فرض ہوتا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جو کام بار بار ہوتا اس میں اگر پہلی بار اخلاص نہ ہو تو آہستہ آہستہ پیدا ہوجاتا ہے نماز دن میں پانچ مرتبہ

فرض اگر کسی کو اول روز اخلاص نصیب نہ بھی ہو تو وہ کوشش کر کے دو چار روز یا دو چار ہفتوں میں اخلاص حاصل کر سکتا ہے۔ روزہ میں اتنا تکرار تو نہیں مگر ہر سال رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ہے اگر کوئی شخص تمنا کے ساتھ بلوغ کے بعد پچاس سال کی عمر پائے تو پچاس مرتبہ زکوٰۃ فرض ہو گی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دوسرے اعمال میں اخلاص کا پیدا ہونا آہستہ آہستہ ممکن ہے اگر پہلی بار میں نہ ہو دوسری بار میں ہو جائے گا۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اخلاص کے وجوداً و عدماً تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ فعل کے وقت غایت صحیحہ کا قصد ہو یہ تو غایت اخلاص ہے اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال کا ہے۔ دوسرے یہ کہ غایت فاسدہ کا قصد ہو یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ ہے کہ کچھ بھی قصد نہ ہو نہ غایت صحیحہ کا نہ غایت فاسدہ کا بلکہ یونہی معمول کے موافق ایک کام کر لیا یہ درجہ بین بین ہے اس کو اخلاص سے اتنا بُعد نہیں جتنا دوسرے درجے کو بُعد ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور قصد یہ ہو کہ خدا تعالیٰ ہم سے راضی ہوں گے اس کے سوا اور کچھ نیت نہ ہو یہ تو اخلاص کا درجہ کمال ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص ہمارے خشوع خضوع کو دیکھ کر ہمارا معتقد ہو جاوے گا یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ ہم معمول کے موافق نماز پڑھ لیں نہ وہ خیال دل میں ہو نہ یہ خیال ہو۔ یہ مرتبہ بین بین ہے۔ یہ اگر اخلاص کا درجہ کمال نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں اس کو اخلاص سے قرب ضرور ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ فعل اختیاری فاعل مختار سے بدون کسی غرض کے تصور کے نہیں ہو سکتا تو اس کی کیا وجہ کہ بعض دفعہ ہم ایک فعل کرتے ہیں اور نیت کچھ نہیں ہوتی یہ محض عادت کی برکت ہے جب کسی کام کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود صادر ہونے لگتا ہے اس کے لئے اب بار بار ارادہ و عزم نہیں کرنا پڑتا۔

یہ مطلب نہیں کہ نماز کی نیت بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی غایت پر نظر نہیں ہوتی تکرار کی وجہ سے عادت ہوگئی ہے اور عادت کی بعد غایات کا لحاظ نہیں ہوا کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ جس کام میں تکرار ہو اس میں اخلاص سے من وجہ قرب ہے اور جس میں تکرار نہ ہو اس میں اخلاص اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ غایت صحیحہ کا تصور اور اس کا قصد نہ ہو۔ اسی وجہ سے حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ریار ہمیشہ ریا نہیں رہا کرتی کیونکہ ریار کرتے کرتے پھر اس کام کی عادت پڑجاتی ہے اور جس کی عادت ہوجاتی ہے اس میں پھر کوئی خیال نہیں آیا کرتا پھر وہ اخلاص سے قریب ہوجاتا ہے۔ اب حج کو دیکھئے تو اس میں تکرار بالکل نہیں یعنی فرض کے اعتبار سے کوئی کتنا ہی کرے مگر یہ اجتماعی مسئلہ ہے کہ حج ساری عمر میں فرض صرف ایک ہی بار ہے تو اس میں جب تک غایت صحیحہ کا تصور اور قصد نہ کیا جائے گا اس میں اخلاص نہیں پیدا ہوگا کیونکہ اس میں تکرار نہیں اور تکرار کی وجہ سے عادت بھی نہیں اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے اس احتمال کی بھی نوبت نہیں آتی کہ بالکل خالی الذہن ہوکر حج کیا جائے۔ بس اس میں دو ہی صورتیں ہیں یا تو غایت صحیحہ کا قصد ہوگا یا غایت فاسدہ کا۔ اس لئے اخلاص کے اہتمام کی دوسری عبادات سے زیادہ ضرورت ہے یہی اس وقت مجھ کو بیان کرنا ہے کہ یوں تو ہر عبادت کے لئے اخلاص کی ضرورت ہے مگر حج کے لئے خصوصاً اخلاص کی ضرورت بہت ہے کہ ساری عمر میں ایک مرتبہ اس کے ادا کرنے کا موقعہ ملتا ہے پھر نہ معلوم کسی کی قسمت میں دوبارہ بھی ہے یا نہیں تو ایسی عبادت میں بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیئے۔ اگر خدانخواستہ اس میں کوتاہی رہ گئی تو بڑی ناکامی ہوگی۔ اول تو حج کرنا دوسری عبادات کی طرح آسان نہیں۔ جانی اور مالی دونوں قسم کی مشقتیں اس میں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ دوسرے بار بار اس کی توفیق اور ہمت ہونا بھی محتمل ہے اگر ایسی حالت میں یہ ساری محنت اخلاص سے خالی ہوئی تو نیکی برباد گناہ لازم ہوا۔ پھر روپیہ

الگ ضائع ہوا اس سے زیادہ ناکامی اور کیا ہوگی۔

غرض حق تعالےٰ نے اس آیت میں بہت اہتمام سے اخلاص کا امر فرمایا ہے قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصا لہ الدین۔ فرما دیجئے کہ مجھ کو امر کیا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ کی عبادت اسی کے لئے خالص کرکے بجا لاؤں۔

یہ ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہر حکم کو ضروری ظاہر فرماتے تھے۔ آپ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) تھے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرض منصبی ہے کہ تمام احکام کو مخلوق کی طرف پہنچائے لہذا اس کی ضرورت نہ تھی کہ حق تعالےٰ خاص طور پر کسی حکم کے لئے یہ فرمائیں کہ اس کو پہنچا دو مگر پھر بھی جب کسی حکم کے لئے آپ کو یہ ارشاد ہوگا کہ اس حکم کو پہنچا دو تو ضرور اس سے اس حکم کا مہتم بالشان ہونا سمجھا جائے گا۔ چنانچہ یہاں اخلاص کا امر فرماتے ہوئے حق تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ قُل سے خطاب فرمایا ہے کہ یہ بات امت سے کہدیجئے ایک تو یہی قرینہ ہے کہ آیندہ جو حکم آئے گا وہ بہت قابل اہتمام ہے پھر اس کے بعد اخلصوا نہیں فرمایا کہ لوگوں سے کہدو کہ اخلاص کیا کریں بلکہ اس کے بجائے امرت ان اعبد اللہ فرمایا کہ یوں کہدو کہ مجھ کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے۔ اس جملہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مامور بالاخلاص ہونا ظاہر فرمایا گیا اس سے اخلاص کی عظمت بہت بڑھ گئی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبوب ہیں اور جس امر کا محبوب بھی مامور ہو وہ کیسا امر ہوگا۔ بہت ہی مہتم بالشان اور ضروری ہوگا کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور محبوب بھی اس سے مستثنےٰ نہیں۔

دنیا والوں کا اگر کوئی محبوب ہو تو اس کو احکام سے مستثنےٰ کر دیتے ہیں مگر حق تعالےٰ کے یہاں یہ قاعدہ نہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ حق تعالےٰ کے محبوب ہیں مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو احکام سے مستثنےٰ نہیں کیا گیا خصوصیت اور محبوبیت اگر ظاہر ہوئی تو اس صورت میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور زیادہ احکام لازم کئے گئے۔ تہجد دوسروں پر فرض نہیں سنت ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر

ایک قول کے موافق فرض تھا اور نافلۃً لک سے استدلال کیا گیا ہے کہ یہ تہجد آپ پر دوسروں سے فرض زاید ہے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو اولیاء کے لئے ایک مقام ایسا مانتے ہیں جہاں احکام شرعیہ اُن سے معاف ہوجاتے ہیں یہ بالکل غلط خیال ہے۔ ان لوگوں میں محبوبانِ خدا کو محبوبانِ دنیا پر قیاس کیا ہے کہ جس طرح دنیا والوں کے محبوب تکالیف اور احکام سے مستثنٰی ہوجاتے ہیں اسی طرح محبوبان خدا بھی مستثنٰی ہوجاتے ہوں گے اور یہ خبر نہیں ہے کہ یہاں محبوب ہی وہ بنتا ہے جو آئندہ بھی دوسروں سے زیادہ احکام بجا لانے والا ہو۔ حق تعالےٰ کی محبت اضطراری نہیں کہ بلاوجہ کسی سے خواہ مخواہ محبت ہوجاوے ان کی محبت اختیاری ہے اور وہ اسی سے محبت کرتے ہیں جو ان کا زیادہ مطیع ہو۔ پس جو چیز محبت کا سبب ہے وہ ہی اگر جاتی رہے گی تو محبوب کہاں رہے گا۔ پھر سب سے زیادہ محبوب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اگر محبوبان خدا احکام سے مستثنٰی ہوا کرتے تو سب سے زیادہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم مستثنٰی ہوتے مگر احادیث و اقوال علماء سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر دوسروں سے زیادہ احکام تھے۔

اور جہاں ظاہر میں آپ کے لئے رخصت ہے وہ بھی حقیقت میں عزیمت ہے وہ رخصت اس شخص کے حق میں ہے جس کو حقوق ادا کرنے کا قصد نہ ہو۔ اور جس کو حقوق ادا کرنے کا خیال ہو اور حق تعالےٰ سے عشق ہو اس سے پوچھئے کہ یہ کتنی بڑی مشقت ہے مثلاً مخالفین کا اعتراض ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ حظ نفس کے لئے تعداد ازدواج کیا۔ نو۹ بیبیوں سے نکاح کیا۔ اور افسوس یہ کہ بعض مسلمان بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں گو اعتراضاً نہیں بلکہ اپنے حظوظ نفس کی گنجائش کے لئے۔ چنانچہ بعض لوگ چند نکاح کر کے کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو کیا حرج ہے۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی تو چند نکاح کئے ہیں۔

مگر وہ یاد رکھیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حظ نفس کے لئے چند نکاح ہرگز نہیں کئے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تعداد ازدواج مصالح دینیہ کے سبب مشروع ہوا مثلاً آپ کی شان تھی شارع کی کہ آپ تمام امت کے لئے احکام الٰہی بیان فرماتے تھے۔ بعض احکام ایسے بھی ہیں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور عورتیں خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ دریافت نہ کر سکتی تھیں اور مردوں کے ذریعہ سے کہاں تک جزئیات کی تحقیق ہو سکتی اس لئے آپ کے لئے احکام کی اشاعت میں تعداد ازدواج کی مصلحت تھی کہ دوسری عورتیں ازدواج کے واسطہ سے سوال بآسانی کرلیا کریں اور جو بات ان کی سمجھ میں نہ آوے اس کو ان ازواج مطہرات کے ذریعہ سے بخوبی سمجھ لیا کریں۔ اب آپ ہی انصاف کریں کہ ہزارہا مسلمان عورتوں کو احکام سمجھانے کے لئے اگر آپ نو سے زیادہ بھی نکاح کرتے تب بھی کم تھا۔

پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تعداد ازدواج میں اعتدال کی تعلیم فرمائی ہے اور خود بھی عدل کے کسی دقیقہ کو نہیں چھوڑا، گو بعض اقوال پر آپ پر واجب بھی نہ تھا علاوہ اس کے نکاح میں دو جانبیں ہیں ایک افراط ایک تفریط۔ افراط یہ کہ باوجود قوت کے نکاح ہی نہ کرے۔ ایک تفریط کہ ضرورت سے زیادہ کرے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے منع فرمایا اور اعتدال کی تعلیم دی کہ جتنی ضرورت ہو اس سے آگے نہ بڑھے۔ اور چار سے زیادہ کسی کو بھی ضرورت نہیں اور شاذ کا اعتبار نہیں اس لئے اس سے زیادہ سب کے لئے حرام ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایک شخص کو ایک نکاح کی ضرورت تھی، اُس نے ایک نکاح کرلیا یہ تو اعتدال ہے اور اگر ایک شخص کو دو یا تین نکاح کی ضرورت ہو اور اس نے ایک پر اکتفا کرلیا تو یہ مجاہدہ ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو

اب سنئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بابت جو ملاحدہ کا اعتراض ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ان کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی قوت کا اندازہ نہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی آدمیوں جیسا سمجھتے ہیں حالانکہ عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ انبیاء علیہم السلام باطنی کمالات کے علاوہ ظاہری اور بشری کمالات میں بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے سو اور ہزار بیبیاں ہونا اہل کتاب میں مشہور ہے۔ اسی طرح ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی قوت بشریہ میں دوسروں سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں تیس مردوں کی، اور ایک روایت میں چالیس مردوں کی قوت تھی۔ پس اگر تیس یا چالیس نکاح بھی کرتے تب بھی اعتدال سے کسی طرح باہر نہ ہوتے کیونکہ آپ کو اس قدر قوت حاصل تھی، پھر جب اتنی قوت پر آپ نے نو بیبیوں پر اکتفا کیا تو یہ مجاہدہ ہوا یا کہ حظ نفس۔

بہرحال یہ صورت اعتدال سے آگے کسی طرح نہ تھی بلکہ اعتدال سے گذر کر مجاہدہ میں داخل تھی۔ پھر ضروری بات ہے کہ نو بیبیاں ہونے سے حقوق بھی آپ کے ذمہ بڑھ گئے۔ خواہ لزوماً یا التزاماً کیونکہ اس میں علماء کا اختلاف بھی ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر عورتوں کی باری مقرر کرنا اور برابری وغیرہ کرنا واجب تھا یا آپ تبرعاً کرتے تھے۔ بہرحال اس میں چاہے اختلاف ہو مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ برابری اور عدل کا پورا پورا لحاظ فرماتے تھے حتیٰ کہ بیماری میں بھی ایک کی باری میں دوسری کے گھر نہ رہتے تھے۔ البتہ مرض وفات میں جب ازواج مطہرات نے دیکھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دن کا بہت انتظار رہتا ہے تو سب نے رضامندی کے ساتھ عرض کیا کہ بس اب آپ حضرت عائشہؓ ہی کے گھر میں تشریف رکھیں۔ اور اس حالت میں ہر ایک کے گھر جانے میں آپ کو کلفت پہنچتی ہے۔

اب خیال کیجئے جائے کہ شخص کو حقوق کے ادا کرنے کا اس درجہ خیال ہو اس کے لئے نو بیبیوں کی اجازت محض ظاہر میں ایک رخصت ہے ورنہ حقیقت میں بڑی مشقت ہے۔ حتیٰ کہ بیبیوں میں عدل کرنا بڑی سلطنت کے عدل سے بھی مشکل تر ہے کیونکہ یہاں محض ضابطہ کا تعلق نہیں کہ صرف ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیلے دونوں سے محبت کا تعلق ہے ہر اک کی تکلیف سے دل دکھتا ہے۔ پھر شریعت کی پابندی کا مقتضا یہ ہے کہ ظاہری برتاؤ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح ندی جائے ایسی حالت میں عدل کرنا بڑے مرد کا کام ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم عدل کی اس قدر رعایت فرماتے تھے کہ آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد بھی آپ یہ فرمایا کرتے اللھم ھذہ قسمتی فیما الملک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک الٰہی یہ میری تقسیم ہے ان امور میں جو تیرے قبضہ میں ہیں پس مجکو اس چیز میں ملامت نہ فرمایئے جو میرے اختیار سے باہر ہے یعنی قلبی محبت اور رجحان۔ مثلاً میلان زیادہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف زیادہ تھا، تو یہ بات اختیار سے باہر تھی مگر ظاہری برتاؤ میں آپ سب کے ساتھ عدل پورا فرماتے تھے۔

پس اس مشقت پر نظر کر کے وہ رخصت بھی رخصت نہ رہی بلکہ وہ بھی عزیمت تھی اب کس کا منہ ہے کہ اپنے آپ کو احکام سے مستثنےٰ سمجھے اس لئے فرماتے ہیں قل انی امرت کہدیجئے کہ مجکو امر کیا گیا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے۔ اور آپ اس کے مامور ہیں تو وہ کیسا بڑا امر ہوگا۔ آگے فرماتے ہیں۔ ان اعبد اللہ مخلصا لہ الدین اس میں ایک بہت بڑا مسئلہ تصوف کا حل ہوگیا ہے۔

آج کل ایک فرقہ ہے جس نے تمام شریعت کی روح نکال لی ہے اور واقعی روح ہی نکال دی اور اپنی طرف سے دین کو مردہ کر دیا لیکن اللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون خدا اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا اگرچہ یہ دین لوگ ناگواری

ظاہر کرتے ہیں وہ لوگ احکام و عبادات کو بیکار سمجھتے ہیں۔ نماز کا خلاصہ نکالا ہے ذکر کہ بس خدا کی دھن لگی رہنی چاہیے نماز کی کیا ضرورت ہے۔ زکوٰۃ کا خلاصہ یہ نکالا کہ ہمدردی ہونا چاہئیں روپیہ غریبوں کو دینے کی ضرورت نہیں۔ حج کا خلاصہ یہ نکلا کہ تعلقات قطع کر دینے چاہئیں۔ مکہ مکرمہ جانے کی ضرورت نہیں۔ غرض تمام عبادات میں اخلاق کو اصل سمجھا ہے اور اعمال کو بیکار کر دیا۔ اس آیت میں اُن کا جواب موجود ہے حق تعالےٰ نے اس آیت میں امرت کا مفعول ان اعبد کو بنایا ہے اور مخلصاً لہ الدین اس کا حال ہے اور حال میں اصل ہی ہے کہ عامل کی قید اور اُس کے تابع ہوتا ہے الا بدلیل مستقل تو اخلاص کو عبادت کا تابع بنایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ عبادات اصل ہیں اور احوال و کیفیات و اخلاق ان کے تابع ہیں کہ اب کسی کا کیا منہ ہے کہ احکام و عبادات کو بے کار کہے سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے جا بجا عبادات کی تاکید اور ان کے ترک پر وعید ہے ہاں کسی کو قرآن پر ہی ایمان نہ ہو وہ جو چاہے کہے۔

اخلاص کے معنی لغت میں خالص کرنے کے ہیں اور شریعت میں بھی اس اُس کے معنی وہی ہیں جو ورود شرع سے پہلے تھے۔ خالص گھی وہ ہے جس میں کوئی دوسری چیز ملی ہوئی نہ ہو اخلاص عبادت کے معنی بھی یہ ہوئے کہ عبادت کو غیر عبادت سے خالی کیا جائے یعنی کوئی ایسی غرض اس میں ملی ہوئی نہ ہو جس کا حاصل کرنا شرعاً مطلوب نہیں ہے۔ مثلاً نماز سے بزرگ مشہور ہونا زکوٰۃ دینے سے نام آوری اور حج سے حاجی کہلانا مقصود نہ ہو اور یوں کوئی نہ کوئی غرض تو ضرور ہو گی کیونکہ فاعل مختار کا فعل غرض سے خالی نہیں ہو سکتا پس اخلاص کے یہ معنی نہیں کہ رضاء حق اور جنت کی بھی غرض نہ ہو۔ کیونکہ یہ غرض تو مطلوب ہے۔

حق تعالےٰ فرماتے ہیں وفی ذالك فليتنافس المتنافسون اس میں رغبت

کرنے والوں کو رغبت کرنا چاہیئے۔ اھ

اس سے پہلے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے جن کی طرف رغبت کرنے کا امر خود قرآن میں موجود ہے۔ وفی الحدیث، اللھم انی اسئلک الجنۃ وما قرب الیھا من قول او عمل۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح دعا کیا کرتے تھے، اے اللہ میں آپ سے جنت کی درخواست کرتا ہوں اور ان اقوال واعمال کی جو جنت کی طرف نزدیک کر دیں۔ معلوم ہوا کہ جنت کی درخواست کرنا سنت ہے۔ اسی لئے میں نے اخلاص کی حقیقت یہ بیان کی تھی کہ عبادت کے ساتھ کوئی ایسی غرض نہ ملائی جائے جس کا حاصل کرنا مطلوب نہیں اور ثواب اور جنت کا اور عذاب سے نجات کا مانگنا مطلوب ہے اس لئے یہ غرض اگر عبادت میں ملی ہوئی ہو تو یہ اخلاص کے منافی نہیں۔

بعض لوگ بے دھڑک کہہ ڈالتے ہیں کہ ہم کو جنت کی پرواہ نہیں، دوزخ کی پرواہ نہیں یہ سخت بے ادبی ہے۔ ان لوگوں کو جنت و دوزخ کی حقیقت معلوم نہیں ورنہ ساری شیخی رکھی رہ جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جنت کی طلب کی ہے اور جہنم سے پناہ مانگی ہے۔ اور بعض اہل حال سے جو اس قسم کے اقوال منقول ہیں وہ غلبہ احوال میں ان سے صادر ہوئے ہیں یہ کوئی ان کے کمال کی دلیل نہیں حالت اکمل وہی ہے جو سنت کے موافق ہو مگر وہ حضرات بوجہ غلبہ حال کے معذور سمجھے جاتے ہیں اس وقت ان کو جنت کی طرف التفات نہ تھا ورنہ جنت ایسی چیز نہیں جس کی کسی کو پرواہ نہ ہو۔ پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اصل مقصود رضائے حق ہے، ہم اُن سے یہ کہتے ہیں کہ رضائے حق پر نظر کرتے ہوئے بھی جنت کی درخواست ضروری ہے کیونکہ اول تو وہ محل رضا ہے جنت ہی میں حق تعالےٰ کی رضا کا ظہور ہوگا جب رضا مطلوب ہے تو محل رضا

بھی مطلوب ہونا چاہیئے۔ ای شی اذا ثبت ثبت بلوازمہ ہر شئے اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوا کرتی ہے مطلوب کے مقدمات اور وسائل بھی من وجہ مطلوب ہوتے ہیں۔ لہذا رضا کے مطلوب ہونے سے بھی جنت کا مطلوب ہونا لازم آتا ہے پھر اس سے بے پروائی کے کیا معنی۔ دوسرے جب حق تعالیٰ کی رضا اصل مطلوب ہے اور رضا حاصل ہوتی ہے امتثال اوامر سے یعنی احکام کی بجا آوری سے اور میں آیت قرآنی سے بتلا چکا ہوں کہ حق تعالیٰ جنت کی طرف رغبت کرنیکا امر فرماتے ہیں تو جنت کی طرف رغبت کرنے اور اس کی درخواست کرنے سے بھی رضائے حق حاصل ہوگی کیونکہ اس میں بھی ایک حاکم کا امتثال ہے چنانچہ اسی امتثال حکم کی وجہ سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے متعدد دعاؤں میں جنت کی درخواست کی ہے پس یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ عبادات میں جنت اور ثواب کی طرف التفات کرنا اخلاص کے خلاف یا کمال کے منافی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جنت حق تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کے سامنے دنیا کی نعمتیں ہیچ ہیں مگر ہم کو دنیا کی نعمتوں سے بھی استغنا ظاہر کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور ان دنیوی نعمتوں کی قدر اور شکر کا حکم کیا گیا ہے تو خدا کی اتنی بڑی نعمت سے استغنا، اور بے پروائی کیونکر جائز ہوگی۔ بس جن بزرگوں سے ایسی باتیں منقول ہیں کہ ہم کو جنت کی پروا نہیں، وہ ان سے غلبۂ حال میں صادر ہوئی ہیں۔ اس وقت ان کو جنت کی طرف التفات نہ تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان عبدیت تو یہ تھی کہ آپ کھانا تناول فرما کر یوں فرمایا کرتے تھے غیر مودع ولا مستغنی عنہ ربنا یعنی میں اس کھانے کو ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں کرتا (دوسرے وقت پھر اس کا محتاج ہونگا) اور نہ اے خدا میں اس سے مستغنی ہوں۔ پھر جنت کی نعمتوں سے کون مستغنی

ہوسکتا ہے۔

یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل جو مریدوں کی عادت ہے کہ مشائخ کے سامنے جب کوئی ہدیہ پیش کرتے ہیں تو اکثر یوں کہا کرتے ہیں کہ آپ کو اس کی کیا پرواہ ہے یہ تو حقیر اور قلیل چیز ہے یہ محاورہ قابل ترک ہے۔ بخدا اس لفظ کو سنکر میرا تو رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔ مشائخ تو کیا چیز ہیں کہ وہ خدا کی نعمتوں سے مستغنی ہوں اور ان کو خدا کی نعمتوں کی پرواہ نہ ہو آخر وہ بھی انسان ہیں ان کو بھی کھانے پہننے اور روپیہ پیسہ کی احتیاج ہوتی ہے اگر ایک پیشاب بند ہو جاوے اس وقت حقیقت معلوم ہو جائے کہ پیر صاحب دنیا کی چیزوں سے کتنے بے پرواہیں، یہ محض جہالت ہے اور جو مشائخ اس لفظ کو سُن کر خاموش ہو جاتے ہیں ان کی ہمت ہے ایسے الفاظ کبھی شیخ کے لئے استعمال نہ کرنے چاہئیں۔ جو انبیاء علیہم السلام کے واسطے بھی بولنے جائز نہیں۔ انبیاء علیہم السلام بھی خدا کی سب نعمتوں کے محتاج تھے۔

جب حضرت ایوب علیہ السلام کو خدائے تعالیٰ نے مرض سے شفا عطا فرمائی ہے وہ غسل کر رہے تھے اسی وقت ان کے اوپر سونے کی ٹڈیوں کی بارش آسمان سے ہوئی۔ وہ ان ٹڈیوں کو فوراً جمع کرنے لگے حق تعالیٰ نے فرمایا۔ افلم اکن اغنیتک کہ کیا میں نے تم کو غنی نہیں کیا۔ انھوں نے عرض کیا بلٰی یارب ولٰکن لاغنائی عن برکتک کہ خدایا آپ نے بیشک مجھے غنی بنایا ہے لیکن آپ کے تبرک سے تو بے پرواہ نہیں ہوسکتا پس خدا کی نعمتوں سے بے پروائی کسی کو کسی وقت نہیں ہوسکتی تو ہم خدا تعالےٰ کی رضا کے بھی محتاج ہیں جنت کے بھی محتاج ہیں ثواب کے بھی محتاج ہیں اور یہ وہ مقاصد ہیں جن کا اعمال رئیسہ میں مطلوب ہونا ظاہر ہے۔ ان کی نیت عبادات میں کرنا اخلاص کے خلاف نہیں۔ جب آپ کو اخلاص کی ضرورت

اور اس کی حقیقت معلوم ہو گئی۔

اب یہ معلوم کیجئے کہ حج کا کن چیزوں سے خالص کرنا ضروری ہے۔ سو سُن لیجئے کہ دنیوی اغراض ہیں جن سے حج کا خالص کرنا ضروری ہے دینی کام کے ساتھ دنیوی غرض کا ملنا ایسا ہے جیسے کہ دودھ میں پانی ملا دیا جائے اور کون نہیں جانتا کہ دودھ خالص وہی ہے جس میں پانی نہ ہو۔ اسی طرح خالص عبادت وہی ہے جس میں دنیوی غرض کوئی ملی ہوئی نہ ہو۔ اور دودھ میں پانی ملانے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دودھ میں پانی ملایا جائے۔ دوسرے یہ کہ پانی میں دودھ ملایا جائے۔ تیسرے یہ کہ دونوں کو ایک ساتھ کسی دوسرے برتن میں ڈال دیا جائے۔ حج میں آمیزش کی بھی یہی تین صورتیں ہیں۔

۱ یہ کہ حج سے پہلے ہی کوئی خرابی اس میں ڈال دی جائے۔ ۲ دوسرے یہ کہ حج کرکے اس کو خراب کر دیا جائے۔ ۳ تیسرے یہ کہ حج کے ساتھ ساتھ خرابیاں بھی ہوتی رہیں۔

حج سے پہلے خرابی ڈالنے کی صورت یہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی دنیوی غرض اس کی ساتھ ملائی جائے، مثلاً حاجی کہلانے کی نیت ہو یا مال حرام سے سفر کیا جائے۔ حج کے ساتھ ساتھ خرابیاں ہونے کی صورت یہ ہے کہ سفر حج میں معصیت کرتے ہیں۔ گناہوں سے توبہ نہ کی ہو۔ مثلاً بعض لوگ حج کے سفر میں نماز چھوڑ دیتے ہیں، اور جو کوئی اُن سے کہتا ہے کہ بھائی یہ کیسا حج ہے کہ نماز ہی موقوف کر دی۔ تو کہتے ہیں کہ صاحب ایسی گندی حالت میں نماز کیسے پڑھیں، جہاز کے پائخانہ غلیظ ہوتے ہیں چھینٹیں اڑ کر کپڑوں پر آتی ہیں کپڑوں کا کیا اعتبار جوتوں کا کیا اعتبار خدا فقہا کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے وسوسہ کو اس قدر قطع کیا ہے کہ کوئی کیا قطع کرے گا۔ فقہا فرماتے ہیں کہ جب تک قسم کھا کر یہ کہہ سکے کہ میرا وضو ٹوٹ گیا ہے اس وقت تک وہ باوضو ہے۔ اسی طرح کپڑوں کا

حکم ہے جب تک یقین نہ ہو جائے کہ ان میں ناپاکی لگ گئی ہے اس وقت تک کپڑوں کو پاک سمجھنا چاہیئے۔ خواہ کیسے ہی پاخانے غلیظ ہوں احتیاط کرکے بیٹھو۔ اور احتیاط سے اُٹھو۔ جب تم کو ناپاکی کپڑوں پر نظر نہیں آتی ان کو پاک ہی سمجھو لیجیے شریعت میں کس قدر آسانی ہے اب بھی اگر کوئی نمازیں برباد کرے وہ خود بھگتے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ یہ دو فرقے دین کے محافظ ہیں۔ فقہاء اور صوفیہ اور فقہا کا وجود تو مسلمانوں کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی۔ علماء نے لکھا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے۔ مگر فقہاء کو معلوم ہے کہ خدا کو ان کی ساتھ بھلائی منظور ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین جس کے ساتھ خدا کو بھلائی کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اس کو دین کی سمجھ یعنی فقہ عطا کرتے ہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے وفات کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا، فرمایا مجھ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد مانگو کیا مانگتے ہو میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت کردی جائے جواب ملا کہ اگر ہم تم کو بخشنا نہ چاہتے تو فقہ عطا نہ کرتے ہم نے تم کو فقہ اسی لئے عطا کیا تھا کہ تم کو بخشنا منظور تھا مگر اس سے مامون العاقبۃ ہونا لازم نہیں آتا۔ یعنی یہ نہ سمجھا جاوے کہ فقہاء پر سوء خاتمہ کا اندیشہ بالکل نہیں اس لئے مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کیونکہ حق تعالیٰ اگر فقیہ کو عذاب کرنا چاہیں گے تو فقہ کو اس سے سلب کرلیں گے، کوئی یہ نہ کہے کہ فقہ کیونکر سلب ہو جاوے گا۔ بات یہ ہے کہ فقہ کتابوں کو پڑھ لینے کا نام نہیں فقہ ایک نور ہے جو فقیہ کے دل میں ہوتا ہے جس کی برکت سے اس کو دین کی سمجھ حاصل ہوتی ہے، اور اس نور کو حق تعالیٰ جب چاہیں سلب کرلیں وہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اب تم لاکھ کتابیں پڑھتے پڑھاتے ہو مگر

چونکہ دین کی سمجھ نہیں رہی تم فقیہ نہیں ہو سکتے ۔ اور وہ نور فقہ طاعات اور اور تقویٰ سے بڑھتا ہے اور معاصی سے سلب ہو جاتا ہے جو فقیہ مطیع اور متقی نہ ہو وہ کتابوں کا فقیہ ہے حقیقی فقیہ نہیں اور نہ اس کے واسطے وہ بشارت ہے جو حدیث میں مذکور ہے ۔ اس لئے خاتمہ سے اطمینان کسی حال میں فقیہ کو بھی نہیں ہو سکتا۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ فقہ دین کی سمجھ کا نام ہے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ فقیہ صوفی ضرور ہو گا۔ ہمارے فقہار جتنے ہوئے ہیں سب صاحب نسبت اور صاحب معرفت تھے۔ نسبت اور معرفت کے بغیر دین کی سمجھ کامل نہیں ہو سکتی ۔

ایسے ہی فقہار کی شان میں فرمایا گیا ہے فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد ۔ کہ ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے جس کو دین کی سمجھ ہو گی وہ شیطان کے فریبوں کو خوب سمجھے گا اور نہ اس کی ایک چال نہ چلنے دے گا۔ اور کورے عابد کو تو شیطان جس طرح چاہے پٹی پڑھا سکتا ہے ہم نے ایک عابد زاہد کو سفر حج میں دیکھا کہ نماز بالکل چھوڑ بیٹھتے تھے شیطان نے ان کو اسی قسم کی پاکی اور ناپاکی کو توہمات میں مبتلا کر دیا تھا۔ فقیہ ان باتوں میں کبھی نہ آئے گا۔ تو حدیث میں جس فقیہ کو ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری بتلایا گیا ہے ۔ یہ وہی فقیہ ہے جس کو دین کی سمجھ ہو صرف کتابیں پڑھنے والا فقیہ مراد نہیں۔

حضرات فقہار شیطان کی ان چالوں کو خوب سمجھتے تھے اسی لئے انھوں نے پاکی اور ناپاکی کے مسائل میں بہت توسع فرمایا ہے اور یہ ان کی وسعت نظر کی دلیل ہے کہ جو باتیں ان کو پیش بھی نہ آئیں تھیں ان کو بھی سوچ سوچ کر بیان کر گئے اور پھر قواعد ایسے بیان کر دیئے جن سے قیامت تک کی جزئیات کا حکم نکالنا آسان ہو گیا۔ ان مسائل کی ضرورت گھر بیٹھے نہیں معلوم ہو سکتی مگر فقہار ایسے تنگ نظر نہ تھے کہ گھر سے باہر ان کی نظر نہ جائے۔ فقہار کے پیش نظر

دریا رکا طلاطم بھی تھا، وہ اس کے احکام بھی بیان کر گئے ہیں کہ اگر چکر آتا ہو کھڑا نہ ہوسکتا ہو تو نماز بیٹھ کر یا لیٹ کر ہی پڑھ لے۔ اگر دوران سَر کی وجہ سے کپڑوں کے پاک کرنے اور دھونے کی طاقت نہ ہو نہ کوئی رفیق یہ کام کرسکتا ہو نہ زیادہ کپڑے اس کے پاس ہوں تو اُسی ناپاک کپڑے سے نماز پڑھ لے۔ فقہا ر نے اس میں بھی کلام کیا ہے کہ اگر جہاز وغیرہ میں چکر نہ بھی ہو تب بھی بیٹھ کر نماز جائز ہے یا نہیں اگرچہ مفتی بہ قول یہی ہے کہ چکر نہ ہو تو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے مگر اس سے حضرات فقہا ر کی وسعت نظر تو معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے جزئیات کا بہت احاطہ کیا ہے۔

استنجے کی بابت بھی فقہا ر نے خوب تفصیل لکھی ہے کہ کس حالت میں فرض اور واجب ہے اور کس حالت میں سنت ہے۔ حضرت اگر فقہا ر کی یہ رخصتیں اور تحقیق نہ ہو جہاز میں تو سب نماز روزے رخصت ہوجاتے یہاں وہم نہیں چل سکتا جہاز میں بڑے بڑے وہمیوں کا وہم رخصت ہوجاتا ہے اور یہاں تو بالعوض رخصت ہوتا ہے اور مدینہ منورہ کے راستہ میں بلا عوض رخصت ہوجاتا ہے سفر مدینہ منورہ کے بعد پھر وہم پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہاں پانی بھی کم ملتا ہے۔ اور راستہ میں پیاس کی بھی شدت ہوتی ہے، بڑے بڑے وہمی وہاں جھک مار کر پانی کم خرچ کرتے ہیں تاکہ پیاسے نہ مرجائیں پھر اس پر غضب یہ ہوتا ہے کہ حاجی اپنا خون خشک کر کے پانی بچاتا ہے اور بدو مشک کھول کر بہت سا پی جاتا ہے۔

ایک مرتبہ مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے قافلہ میں بدوؤں نے حاجیوں کا پانی پینا شروع کیا۔ مولانا شیخ البدویین کے پاس تشریف لے گئے، ادیب بہت بڑے تھے۔ آپ نے جاکر اس سے کہا کہ ان بدوؤں کو منع کردو کہ ہمارا پانی نہ پئیں ہم کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں ایک جملہ آپ نے یہ بھی فرمایا ھم لا یشربون ماءنا بل یشربون دماءنا یہ لوگ ہمارا

پانی نہیں پیتے بلکہ لہو پیتے ہیں شیخ البدویین نے کہا انت فصیحٌ تم بہت فصیح بلیغ ہو۔ اس فصاحت کا یہ اثر ہوا کہ اس نے بدؤں کو روک دیا کہ شیخ کا پانی کوئی نہ پیئے غرض مدینہ منورہ کے راستہ میں تو وہم رہتا ہی نہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ وضو وغیرہ میں پانی زیادہ صرف کرتے ہیں اُن کو پانی برتنے کا طریقہ نہیں آتا ورنہ اگر طریقہ سے وضو کریں تو بہت کم پانی صرف ہوتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وضو وغیرہ میں پانی زیادہ تر بدن سے لگ کر صرف نہیں ہوتا زیادہ حصہ بدن سے لگنے سے پہلے ہی اِدھر اُدھر گر جاتا ہے تو اگر اس کا خیال رکھا جائے تو ہر چلو پانی بدن سے اچھی طرح لگ کر زمین میں گرے تو بہت تھوڑے پانی میں با فراغت وضو ہو جاتا ہے۔ تو حج میں ایک کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ نماز ہی کو بہت سے لوگ حذف کر دیتے ہیں۔ ایک معصیت خاص حج کے متعلق زیادہ یہ پیش آتی ہے کہ گھر سے نکل کر لڑنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ حج کی لڑائی مشہور ہے۔ اچھے اچھے دوستوں بلکہ باپ بیٹوں میں بھی لڑائی ہو جاتی ہے اور پیر مرید کا تعلق حالانکہ باپ بیٹے سے بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے مگر ہم نے حج میں پیر مرید کو بھی لڑتے دیکھا ہے مگر کمال یہ کہ پیر پھر بھی ان سے خفا نہ تھے باوجودیکہ شریعت میں سب سے زیادہ حق باپ کا ہے اس کے بعد استاد کا، اس کے بعد پیر کا۔ مگر یہ طبعی بات ہے کہ محبت پیر کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ پیر کا تعلق خالص دینی تعلق ہے۔ دنیا کا اس میں لگاؤ نہیں اور جس تعلق میں دنیا کا لگاؤ نہ ہوگا وہ ضرور مستحکم ہوگا۔ پیر چونکہ خالص دین کی تربیت کرتا ہے اس لئے اس سے زیادہ کوئی علاقہ موثر نہیں مگر ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حج میں پیر اور مرید کا علاقہ بھی لڑائی سے نہیں روکتا آپ یا تو یہ اس سفر کی خصوصیت ہے یا ان پیر صاحب کو کچھ دنیا اُن سے مطلوب ہوگی اس لئے ان کی وقعت مریدوں کی نظر میں نہ تھی۔ چنانچہ ہمارے قافلہ میں بھی لڑائی شروع ہوگئی ہے

اور اس کے آثار دیکھ کر مجھے سخت رنج ہوتا ہے۔ اور ابھی تو جہاز کا سفر بھی شروع نہیں ہوا۔ بمبئی تو گویا گھر ہی کے مثل ہے جب یہیں یہ باتیں شروع ہو گئیں تو آیندہ کا اور اندیشہ ہے، اس لئے اِسی وقت سے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ گناہوں سے طاعات کا ثواب کم ہو جاتا ہے تو یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ جس ثواب کے لئے روپیہ خرچ کیا جائے، جان پر مشقت برداشت کی جائے اس کے ثواب کو دو چار باتوں میں کم کر دیا جائے۔ میں کئی روز سے ایسے آثار دیکھ رہا ہوں مگر میری عادت نہیں کہ خود کسی کے معاملہ میں دخل دوں میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے اس لئے خود کسی معاملہ میں دخل دینے کو جی نہیں چاہتا یہ خیال ہوتا ہے کہ میرا تو کام نہیں میں کیوں دخل دوں۔ کسی کو لاکھ دفعہ غرض پڑے اپنی اصلاح کا طریقہ دریافت کرے۔ ورنہ میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اپنے آپ تو کسی کو اپنی اصلاح کا قصد نہ ہو اور میں اس کے پیچھے پڑتا پھروں اگر کسی وقت شفقت کا غلبہ ہوتا ہے تو میں خود بھی نرمی سے کہہ دیتا ہوں اور بعض بزرگ ایسے بھی ہیں جن پر شفقت کا غلبہ زیادہ ہے وہ خود اپنے متعلقین کے معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ مجھ پر بھی اگر کسی وقت یہ رنگ غالب ہوتا ہے تو ایسا کرتا ہوں مگر میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے، یہ دونوں مذاق ہیں اور دونوں کی اصل قرآن سے ثابت ہے۔ اس لئے کسی مذاق پر طعن کا کسی کو حق نہیں۔ اگر مجھ سے طریقہ دریافت کیا جائے گا بتلا دوں گا ورنہ جیسا کریں گے خود بھگتیں گے حج کے سفر میں زیادہ تر لڑائی جھگڑے اس سے پیش آتے ہیں۔ کہ ایک کو دوسرے سے توقع ہوتی ہے۔ پھر جب اس توقع کے خلاف برتاؤ ہوتا ہے تو جھگڑے پیش آتے ہیں۔ اس ہی لئے فقہا نے لکھا ہے کہ سفر حج میں زاد میں کسی کو شریک نہ کرے اس شرکت کی وجہ سے ہر شریک کو دوسرے سے امداد اور راحت رسانی کی توقع ہوتی ہے اور سفر کی حالت میں بعض دفعہ انسان اپنی بھی

امداد نہیں کرسکتا تو دوسرے کی کیا خاک امداد کرے گا۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص اپنا سامان کھانے پینے کا جُدا رکھے اور انتظام پکانے کا بھی الگ کرے۔ دوسرے کسی سے کچھ توقع نہ رکھے اس کے بعد اگر کسی سے ذرا سی بھی راحت پہنچ جائے گی اس کی قدر ہو گی۔ اور نہ پہونچے گی تو شکایت نہ ہو گی۔ بہر حال ان وجوہ سے یہ قصے حج سے پہلے ہی شروع ہو گئے ہیں ان کی اصلاح بہت ضروری ہے خدا تعالےٰ اس کو دفع کرے یہ بھی ان ہی معاصی میں سے ہے جو حج سے پہلے ہوتی ہیں۔

بعض لوگ ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ رقم کی بابت احتیاط نہیں کرتے۔ رشوت وغیرہ کی رقم لے کر حج کو جاتے ہیں، کبھی اور کوئی حرام کمائی ہوتی ہے حدیث میں آتا ہے رب شعث اغبر یطیل سفرہ والملبس حرام وماکلہ حرام یرفع ید یہ یدعو اللہ فان یستجاب لہ اھ او کما قال۔ بہت سے پراگندہ بال خستہ حال آدمی جو لمبا سفر کرتے ہیں ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعائیں کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ لباس بھی حرام کا ہے اور غذا بھی حرام ہے پھر ان کی دعا کیونکر قبول ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرام کمائی کے ساتھ دعا قبول نہیں ہوتی اور دعا بھی عبادت ہے۔ تو اسی سے دوسری عبادات کا حال یہی سمجھ لیا جائے کہ اور عبادات بھی حرام مال سے اگر کی جائیں گی قبول نہ ہوں گی۔ پس حرام کمائی کے ساتھ حج بھی قبول نہ ہوگا اس لئے اس کا بہت خیال کرنا چاہئیے کہ زاد راحلہ اور روپیہ وغیرہ حرام مال سے نہ ہو حلال کمائی ہونی چاہئیے۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ آجکل تو اکثر آمدنیاں حرام ہی ہیں پھر کسی کا بھی حج قبول نہ ہوگا سو یہ بالکل غلط ہے، وہی فقہاء جو رحمت عالم ہیں ان سے پوچھو دریافت کرو جو آمدنی اس کے فتوے سے جائز و حلال ہو اس کو حلال سمجھو اور فتوے کی رو سے بہت سی آمدنیاں اب بھی حلال ہیں۔ اس میں زیادہ غلو کرنے اور تقویٰ بھگارنے کی ضرورت نہیں۔

حق تعالےٰ فرماتے ہیں لا تغلوا فی دینکم دین میں غلو مت کرو۔ یعنی بات بات میں شبہات مت نکالو۔ بال کی کھال نہ کھینچو۔ ظاہر میں تو غلو اچھا معلوم ہوا کرتا ہے انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے یہ تو تقویٰ ہے کہ میں ذرا ذرا بات کی چھان بین کرتا ہوں بعض لوگ عوام کے سامنے ایسی حکایات بیان کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب روزی حلال آئے انھوں نے کہا چند روز پہلے تک تو حلال تھی مگر ایک بار میرے بیل دوسرے کے کھیت میں جا گھسے وہاں کی مٹی ان کے کھُریوں کو لگ گئی، پھر وہ میرے کھیت میں مل گئی، پھر اس میں غلہ پیدا ہوا اس لئے حلال نہیں رہا۔ مگر اس غلو کے انجام ابتلاء فی المعصیت ہوجاتا ہے یعنی تھوڑے دنوں میں یہ تقویٰ بھی جاتا رہتا ہے، اور فتویٰ بھی۔ کیونکہ جب ان توہمات کے ساتھ حلال روزی کوئی سمجھ میں نہیں آتی تو شیطان پٹی پڑھا دیتا ہے کہ بس دنیا میں حلال روزی تو میسر نہیں آسکتی۔ اور بدون کھائے پئے گذران نہیں چل سکتا تو اب حلال و حرام کی فکر ہی فضول ہے، جو آجائے اور جس طرح آجائے کھا لینا چاہیئے۔ ہمیشہ غلو کا یہی انجام ہوتا ہے کیونکہ توہمات کا سلسلہ کم نہیں ہوا کرتا، بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ پھر آخر کار گھبرا کر اس کو بھی چھوڑ دیتا ہے جس کا شریعت نے حکم کیا تھا۔

اسی واسطے فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص گیہوں کا ایک دانہ لئے پھرے کہ یہ کس کا ہے اس کو سزا دینی چاہیئے کیونکہ یہ تقویٰ کا ہیضہ ہے کہ آپ ایک دانہ کو پکارتے ہوئے پھرتے ہیں واقعی فقہا نے شیطان کے فریبوں کو خوب سمجھا ہے، ظاہر میں تو یہ حکم فقہاء کا گراں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے دانہ کو پڑا پائے تو اس کے پوچھنے میں کیا حرج ہے، مگر فقہا کی نظر انجام پر ہے کہ اس تقوی کی انتہا مصیبت ہے۔

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حرام مال کما کر حج کو جاتے ہوئے دوسرے شخص کے حلال مال سے اس کو بدل لیتے ہیں گویا خدا سے بہانہ کرتے ہیں مگر اس سے کچھ نہیں

ہوتا بدلینٗ کا حکم ایک ہی ہوتا ہے اس بدلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حلال مال بھی حرام ہوجاتا ہے۔ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ فقہاء نے بھی تو ایسا حیلہ لکھا ہے۔

جواب یہ ہے کہ اول تو وہ حیلہ اس طرح نہیں جس طرح تم کرتے ہو کہ حلال و حرام کا اولہ بدلہ کرتے ہو وہ حیلہ دوسرا ہے۔ دوسرے فقہاء نے وہ حیلہ بھی اس لئے نہیں لکھا کہ اس کے سہارے سے حرام مال کمایا کریں اور اس کو اپنے تصرف میں لایا کریں فقہاء نے وہ حیلہ صرف اس واسطے بیان کیا ہے کہ اگر کسی وقت کسی کے پاس ایسی رقم آجاوے جو کمانے والے نے تو حرام طریقہ سے کمائی ہو مگر اس کے پاس حلال طریقہ سے آئی ہو، مثلاً کسی کو میراث میں رقم مل گئی اور مرنے والا سود خوار رشوت خوار تھا، اب یہ پتہ نہیں کہ یہ ساری میراث سود اور رشوت ہی کی ہے یا بالکل حلال ہے یا دونوں قسم کا روپیہ ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ رشوت کس کس سے لی تھی اس صورت آسانی کے لئے وہ صورت بیان کر دی ہے، باقی جس نے خود رشوت لی ہے اور وہ جانتا ہے کہ فلاں فلاں سے میں نے رشوت لی ہے اس کو اس حیلہ پر عمل کرنا جائز نہیں بلکہ اس پر واجب ہے کہ جس سے رشوت لی ہے اس کو اس کی رقم واپس کر دے اور جس سے سود لیا ہے اس کو سود واپس کر دے پھر اس کے بعد دیکھے کہ حلال آمدنی کتنی بچی ہے اگر اس میں حج کر سکے تو حج کو جائے ورنہ اس پر حج فرض ہی نہ ہوگا۔ مگر آجکل تو لوگوں نے سستا نسخہ یاد کر لیا ہے کہ حرام مال خوب کماؤ بعد میں اولا بدلہ کر کے اس کو حلال کر لیں گے یہ محض خدا تعالیٰ کے ساتھ بہانہ ہے جو کبھی جائز نہیں پھر فقہا نے جو صورت حیلہ کی بیان کی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حیلہ کے بعد گناہ سے بھی بچ جائے گا گناہ پھر بھی گتا رہے گا کیونکہ اس حیلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس حرام کی رقم ہو اور وہ کسی دوسرے سے قرض روپیہ لے کر اس سے حج کر کے بعد میں اُس قرض کو اِس حرام روپے سے ادا کر دے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ اس صورت میں حج صحیح ہو گیا کیونکہ قرض گو انتہاءً معاوضہ ہے مگر ابتداءً تبرع ہے تو گویا اس نے ایسے مال سے حج کیا جو اس کو دوسرے کے پاس سے تبرعاً ملا ہے

اور اشتباہ جو مبادلہ تھا سو وہ مبادلہ دیوں میں ہے۔ عین میں نہیں یعنی جب اس نے ادا کیا ہے اس کا دین اس دوسرے کے ذمہ واجب ہوگیا پھر دونوں دین میں مقاصہ ہوگیا اس لئے حرام روپیہ ادا کرنے سے اس روپیہ میں خبث نہ آئے گا جو پہلے قرض لیا گیا تھا۔ اس سے فقہاء کی فہم کا اندازہ ہوتا ہے بھلا خشک محدث ان دقائق کو کہاں سمجھ سکتا ہے لیکن فقہاء کا اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ اس صورت میں حج صحیح ہوجائے گا حج میں کوئی خرابی نہیں یہ مطلب نہیں کہ گناہ نہ ہوگا اس صورت میں یہ شخص دوسری معصیت کا مرتکب ہوا وہ یہ کہ دوسرے شخص کو حرام مال استعمال کے لئے دیا۔ حرام مال کا نہ خود کھانا جائز ہے نہ دوسروں کو کھلانا جائز، حتیٰ کہ کافر کو بھی حرام مال کھلانا جائز نہیں یہاں تک کہ ناپاک چیزوں کا کھلانا جانوروں کو بھی جائز نہیں۔ بعض لوگ ایسا کھانا جس میں کتا بلی منہ ڈال جائے بھنگی کو دیدیتے ہیں یہ ناجائز ہے بلکہ یہ چاہیئے کہ اس سے کہدیں کہ اس چیز کو پھینکدو اس کے بعد اگر وہ خود کھالے یا اپنے گھر لے جاوے یہ اس کا فعل ہے تم خود اس کو استعمال کے لئے مت دو۔ غرض رشوت اور سود کا مال قرض میں دینا بھی جائز نہیں۔

حدیث میں ہے لعن اللہ اکل الربوا وموکلہ خدا لعنت کرے سود کھانے والے پر اور کھلانے والے پر مراد دوسرے کو دینا ہے چونکہ لینا دینا سبب ہو جاتا ہے کھانے پینے کا اس لئے اُس کو اکلہ وموکلہ سے تعبیر فرمایا مقصود یہ ہے کہ سود لینے والے اور سود دینے والے دونوں پر لعنت ہے اس میں یہ صورت بھی شامل ہے کہ سود لے کر کسی دوسرے شخص کو وہ روپیہ اپنے قرض میں دیا جائے اس صورت میں اس نے اس کو سود کا روپیہ دیا، ایک گناہ تو یہ ہوا۔ اس سے بڑھ کر ایک اور گناہ کا مرتکب ہوا۔ وہ یہ کہ اکثر لوگ حرام کا روپیہ قرض میں دے کر اپنے آپ کو بری سمجھتے ہیں ان کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا ہے تاکہ اس سے توبہ کریں۔ اور اگر اس دوسرے شخص کو خبر نہیں کی کہ یہ روپیہ

سود اور رشوت سے ہم نے حاصل کیا تھا جو تم کو قرض کے بدلہ میں دے رہے ہیں تو دھوکہ دینے کا تیسرا گناہ اور ہوا۔

خلاصہ یہ کہ حرام کمائی کرنے والے حج کو جاتے ہوئے جس طرح اولا بدلہ کرتے ہیں اس سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ مال جو بدلہ میں لیا جاتا ہے حرام کا حرام ہی رہتا ہے اور جو حیلہ فقہار نے بیان کیا ہے اس طریقہ سے اگرچہ حج صحیح ہو جاتا ہے مگر ایک گناہ کے بدلے کئی گناہ لازم آجاتے ہیں اس لئے اس کی بہت ضرورت ہے حج کے لئے خالص حلال سفر خرچ لیا کریں۔

ایک کوتاہی حج میں یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگوں کو افتخار اور اشتہار کی عادت ہوتی ہے جہاں بیٹھتے ہیں اپنے حج کے تذکرے کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کو حاجی سمجھیں لوگوں سے فخراً کہتے ہیں کہ ہم نے سفر حج میں اتنا روپیہ خرچ کیا، مکہ معظمہ میں اتنا دیا، مدینہ منورہ میں اتنا خیرات کیا یقول اھلکت مالا لبدا۔ حق تعالے کفار کی مذمت میں فرماتے ہیں کہ کافر خرچ کرکے گاتا پھرا کرتا ہے کہ میں نے مال کے ڈھیر خرچ کر دیئے یہ وہ معاصی ہیں کہ خشک مولوی بھی یہاں تک نہیں پہنچتے حج میں افتخار اور اشتہار اور تعظیم و تکریم کی خواہش نہ ہونی چاہیئے۔ اس میں تواضع و مسکنت ذلت و خواری ہونی چاہیئے۔ یہ سفر سفر آخرت کے مشابہ ہے کہ اپنے گھر بار زمین جائداد وغیرہ کو چھوڑ کر اقربا سے رخصت ہو کر جاتا ہے اور تھوڑا سا سامان ساتھ لیتا ہے جیسا کہ مردہ سب سامان چھوڑ کر صرف کفن ساتھ لے جاتا ہے بلکہ بعض حاجی بھی اس خیال سے کہ موت ہر ایک کے ساتھ ہے نہ معلوم کس وقت موت آجائے کفن بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور عوام تو اس کو بہت ضروری سمجھتے ہیں مگر افسوس ہے کہ کفن ساتھ لیکر بھی وہ کام نہیں کرتے جو کفن پہننے والے کو کرنے چاہئیں۔ جب کفن ساتھ لیا تھا تو چاہیئے تھا کہ اپنے آپ کو اسی وقت مردہ تصور کرتے اور ساری شیخی اور تکبر کو یہیں چھوڑ جاتے اور پہلے سے زیادہ اعمال آخرت کے لئے کوشش کرتے مگر کچھ نہیں یہ کفن ساتھ لینے کی بھی ایک رسم ہو گئی ہے ورنہ بعض لوگ سفر حج میں پہلے سے گناہ

کرنے لگتے ہیں، نماز چھوڑ دیتے۔ جماعت کا اہتمام تو اچھے اچھے بھی نہیں کرتے اور لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔ اور حج کر کے اپنے کو سب سے افضل سمجھنے لگتے ہیں کیا سفر آخرت کی یہی شان ہونی چاہیئے۔ سفر حج اس اعتبار سے بھی قبر کے مشابہ ہے کہ جس طرح قبروں میں کبھی دو آدمی پاس پاس دفن ہوتے ہیں مگر ہر ایک کا جدا حال ہوتا ہے کوئی راحت میں ہے کوئی عذاب میں اور ایک کو دوسرے کی حال کی خبر نہیں ہوتی اسی طرح حج میں ایک شگفتہ ہے ایک دیگر ہے اور ہر ایک کو اپنی اپنی فکر ہوتی ہے دوسرے کی فکر کسی کو نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ اور جو شخص اس سفر میں دوسروں کی خدمت کرے وہ تو گویا مجاہد فی سبیل اللہ ہے بعض لوگ ایسے بیہودہ ہوتے ہیں کہ حج میں روزانہ کے واقعات قلمبند کرتے ہیں وہاں بھی ان کو مضمون نگاری سوجھتی ہے اگر اس خیال سے کوئی شخص حالات قلمبند کرے کہ دوسروں کو حج آسان ہو جائے گا اس کا مضائقہ نہیں مگر بعض لوگوں کو محض اخبار نویسی اور مضمون نگاری کا شوق ہوتا ہے۔

ہمارے ساتھ ایک ڈپٹی کلکٹر تھے وہ ہندوستان کے اخباروں میں لکھ لکھ کر وہاں کے حالات بھیجتے تھے۔ اور سفر کی تکالیف کو بہت مبالغہ سے لکھتے تھے تاکہ پھر کوئی حج کا نام ہی نہ لے اسی طرح ایک اور صاحب تھے وہ بھی وہاں کی شکایات جمع کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس ایک محضر لکھ کر لائے جس میں وہاں کی تکالیف کو قلمبند کیا تھا کہ اس پر دستخط کر دو۔ میں نے کہا کہ حضرت تصدیق وہ کرے جس کو ان تکالیف کی اطلاع ہو، مجھکو تو کوئی تکلیف ہی پیش نہیں آئی پھر کاہے کی تصدیق کروں۔ بس وہ خفا ہو گئے اور کہنے لگے کہ بس ہندوستانیوں میں اتفاق نہیں۔ سو اگر پہلے ہی سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ سفر آخرت کا سفر ہے پھر کوئی بھی کلفت معلوم نہ ہو مگر آجکل تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جیسے گھر میں آرام کے ساتھ بسر کرتے ہیں ویسے ہی حج کے سفر میں رہیں حالانکہ سفر میں گونا مشقت اور تکلیف کا ہونا ضروری ہے۔ دل میں اگر شوق اور محبت ہو تو پھر کوئی تکلیف نہیں رہتی اور جہاں بیت اللہ پر ایک نظر پڑی اسی وقت سب کلفت رفع ہو جاتی ہے اس وقت یاد بھی نہیں آتا کہ اس سے پہلے

کیا کیا پیش آیا تھا۔ پس وہ حال ہوتا ہے جو جنت میں پہنچکر جنتیوں کا ہوگا۔
الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دار المقامۃ
من فضلہ لا یمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب ۔ جنتی جنت میں پہنچکر کہیں گے
کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے رنج و غم کو دور کر دیا بیشک ہمارا خدا بڑا بخشنے
والا قدردان ہے جس نے ہم کو ٹھکانے کے گھر میں پہونچا دیا اپنے فضل سے جس میں
نہ ہم کو کوئی مشقت معلوم ہوتی ہے نہ کچھ تھکن محسوس ہوتی ہے۔ یہی حال بیت اللہ کو
دیکھ کر اہل شوق کا ہوتا ہے۔ بعض لوگ سفر حج میں پریشان ہو جاتے ہیں معلوم ہوتا
ہے کہ وہ شوق سے خالی ہیں اور وہ اس کو سفر آخرت نہیں سمجھتے، نیز جو شخص اس کو سفر آخرت
سمجھتا ہوگا اس میں دعویٰ اور افتخار بھی نہ ہوگا ؎

فکر خود و رائے خود در مذہب رندی نیست
کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور اپنی فکر محبت کے راستے میں نہیں ہے مذہب عشق میں خود رائی اور خود بینی کفر ہے)
کلفت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے جب سفر میں کوئی بات
اپنی شان کے خلاف پیش آتی ہے تو اس سے ناگواری پیدا ہوتی ہے پھر اُسی دوسرے
سے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اگر ہر شخص اپنے آپ کو مٹا دے اور عزت و آبرو کو
بالائے طاق رکھ کر اپنے کو سب کا خادم سمجھے تو یہ باتیں پیش ہی نہ آئیں۔ مگر یہاں تو
حالت یہ ہے کہ گھر سے چلتے ہیں یہی خیال کر کے کہ ہماری یوں آؤ بھگت ہوگی۔ ہم جب
لوٹیں گے لوگ ہم کو حج کی مبارک باد دینے آئیں گے اور جو مبارک باد دینے نہ آئے اس
کی شکایت کی جاتی ہے کہ ہم حج کر کے آئے تھے ہمکو مبارک باد بھی نہ دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
ارے بھائی تم نے حج کیا تھا تو کیا کمال کیا۔ تمہارے ذمہ فرض تھا اگر ادا نہ کرتے تو جہنم
میں جھونکے جاتے اور نہ معلوم خاتمہ کس حال پر ہوتا۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ
جس شخص پر حج فرض ہو اور وہ پھر بھی حج نہ کرے تو خدا کو پروا نہیں چاہے وہ
یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ تو اگر تم حج نہ کرتے ان بلاؤں میں گرفتار ہوتے

پھر کسی پر کیا احسان کیا جو دوسروں سے مبارکباد ملنے کے منتظر ہو یاد رکھو اس اشتہار اور افتخار سے سب کی کرائی محنت اکارت ہو جاتی ہے۔ یہ وہ معاصی تھے جو زمانہ حج سے پہلے ہوتے۔ اور زمانہ حج کے قبل سے مراد وہ وقت ہے جو احرام باندھنے سے پہلے ہو باقی حج کے زمانہ میں جو گناہ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ محضورات احرام کا ارتکاب کیا جائے یعنی جو باتیں حج میں ممنوع ہیں اُن کو کیا جائے۔ مثلاً حج میں مردوں کو سر ڈھکنا حرام ہے عورتوں کو چہرہ پر کپڑا ڈالنا ناجائز ہے احرام الرجل فی راسہ واحرام المرأۃ فی وجھہا مگر اس سے یہ استنباط نہیں ہو سکتا کہ پردہ عورتوں کو نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس سے تو اور پردہ کے تاکد پر استدلال ہوتا ہے کہ عورت کو ساری عمر چہرہ کا ڈھانکنا ضروری ہے، صرف حج میں اس کو منہ کھولنا چاہیئے۔ اگر یہ حج کی خصوصیت نہ ہوتی تو احرام المرأۃ فی وجہہا کے معنی کچھ نہیں ہوں گے اگر عورت کو ساری عمر چہرہ کا کھولنا جائز ہوتا تو اس کے کیا معنی کہ عورت کا احرام چہرہ میں ہے۔ اسی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے لئے چہرہ بہت قابل اہتمام ہے جیسا کہ مردوں کو سر ڈھانکنے کا اہتمام ہوتا ہے سو احرام میں ان دونوں کے خلاف حکم دیا گیا کہ مرد سر کھلا رکھیں اور عورتیں چہرہ کھلا رکھیں مگر مطلب اس کا یہ ہے کہ کپڑا چہرہ سے لگے نہیں یہ نہیں کہ اجنبی مردوں کو چہرہ دکھاتی پھریں، بس عورتیں اپنے چہرے پر اس طرح کپڑا لٹکائیں کہ چہرہ سے علیحدہ رہے۔ چنانچہ اس کے لئے ایک پنکھا ایجاد ہوا ہے جس سے چہرہ پر کپڑا نہیں لگتا۔ اس کے علاوہ اور بھی محظورات احرام بہت ہیں جن کو فقہائے مناسک میں بیان کیا ہے اور قافلہ میں جو لوگ اہلِ علم ہیں ان سے وقت پر سب باتیں معلوم ہو جائیں گی اُن سے پوچھتے رہنا چاہیئے۔ پس یہ گناہ حج کے ساتھ ہوتا ہے کہ احرام میں جو چیزیں ممنوع ہیں ان سے پرہیز نہ کیا جاوے۔

ایک معصیت حج کے بعد یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ ریا کرتے ہیں ریا سے اکثر طاعات کے انوار زائل ہو جاتے ہیں ثواب جاتا رہتا ہے۔ اس سے بہت احتیاط چاہیئے۔

اور مستورات تو خصوصاً بہت ریا کرتی ہیں کیونکہ ان کو ساری عمر میں ایک بار حج کے لئے گھر سے نکلنا ہوتا ہے اس کو وہ بہت ہی بڑا کارنامہ سمجھتی ہیں اور حج کے بعد اگر کوئی ان کو حجن نہ کہے اس پر خفا ہوتی ہیں۔ اور وہاں سے آکر سب کے سامنے گاتی ہیں کہ ہم نے سارے مقامات کی زیارت کی ہے اگر کسی غریب نے ایک جگہ کی زیارت نہ کی ہو تو اس سے کہتی ہیں کہ تیرا حج ہی کیا ہوا تو جبل نور پر تو گئی ہی نہیں حالانکہ اصل مقصود عرفات اور بیت اللہ ہے پھر بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم مگر ان کی زیارت تو ہر شخص کرتا ہے اس لئے ان کو کوئی فضیلت میں بیان نہیں کرتا ہاں جبل نور غار ثور اور امیر حمزہ کا مزار سب گناتی ہیں اور بعض لوگ صراحۃً اپنے حاجی ہونے کا اگر ذکر نہیں کرتے تو کسی نہ کسی پیرایہ میں مخاطب کو جتلا دیتے ہیں کہ ہم حاجی ہیں۔ ایک بزرگ کسی کے یہاں مہمان ہوئے تو میزبان نے خادم سے کہا کہ اس صراحی کا پانی لانا جو ہم دوسرے حج میں ساتھ لائے تھے۔ مہمان نے کہا حضرت آپ نے ایک بات میں دونوں حج کا ثواب کھو دیا اس بات میں اس نے جتلا دیا کہ میں نے دو مرتبہ حج کیا ہے۔ یہ ریا نہیں تو اور کیا ہے۔ ریا کے طریقے بہت دقیق ہیں اگر کوئی شخص اپنے نفس کی نگہداشت کرے تو اس کو نفس کے دقائق معلوم ہو سکتے ہیں لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں اکثر لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ حج کے بعد ہر مجلس میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں، حالانکہ مسلمان کا مذہب تو یہ ہونا چاہیئے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کا قصہ نہیں پڑھا ہے ہم سے حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے سوا اور کوئی بات مت پوچھو)

ان قصوں کے لئے اسی کو فرصت ملتی ہے جس کا دل محبت الٰہی سے خالی ہوتا ہے اور جو تذکرہ نمائش و ریا کے لئے ہو تو روکنے کی قابل ہے ہی محققین تو بعض اوقات ایسے تذکرہ کی بھی اجازت نہیں دیتے جو ظاہرا طاعت معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً وہاں کے فضائل و محاسن بیان کرنا جس سے وہاں جانے کی رغبت اور شوق ہو۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

نے لکھا ہے کہ ہر شخص کے سامنے حج کی باتیں کرنا جائز نہیں کیونکہ تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر حج فرض ہے سو ایسے شخص کے سامنے تو ترغیبی مضامین بیان کرنا جائز بلکہ مستحب ہے کہ دلالت علی الخیر ہے۔ دوسرے وہ جن پر نہ فرض اور نہ ممنوع ان کے روبرو بھی بیان کرنا جائز ہے۔ تیسرے وہ جن پر حج فرض نہیں ہے اور ان کو جانا جائز بھی نہیں اس وجہ سے کہ یہ مالی استطاعت ہے اور نہ مشقت پر صبر و تحمل ہو سکے گا ان کے سامنے تشویق اور ترغیب کے قصے اور مضامین بیان کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے ان کو حج کا شوق پیدا ہوگا اور سامان ہے نہیں نہ ظاہری نہ باطنی تو خوامخواہ وہ وقت اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے جس سے ناجائز امور کے ارتکاب کا بھی اندیشہ ہے اس لئے کہ ایسے لوگوں کے سامنے حج کی ترغیب اور تشویق کے مضامین بیان کرنا جائز نہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن پر لوگوں نے امام غزالی کی تکفیر پر فتوے دیئے۔ ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج کی ترغیب سے لوگوں کو منع کرتے ہیں مگر حاشا وکلا ان لوگوں نے امام کے قول کا مطلب ہی نہیں سمجھا وہ حج کی ترغیب سے منع نہیں کرتے بلکہ لوگوں کو ناجائز امور میں مبتلا کرنے سے منع کرتے ہیں کیونکہ نادار غیر صابر لوگوں کو ترغیب دینے کا یہی انجام ہوگا۔

ایک کوتاہی بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حج سے آکر وہاں کی تکالیف کا حال بیان کرتے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں چاہے وہ واقعی کلفتیں ہوں اور اگر واقعی کلفتوں میں اضافہ کر کے بیان کیا جائے تو یہ اس سے بھی بدتر ہے، وہاں کی کلفتیں بیان کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ حج سے رک جاتے ہیں اُس کا سارا وبال ان لوگوں پر رہتا ہے جنھوں نے ان کو بہت ڈرایا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہاں ایسی تکالیف نہیں ہیں جن کا یقینی اثر ہلاکت ہو بلکہ جیسی کلفتیں یہاں گاڑی اور بہلی کے سفر میں پیش آتی ہیں ویسی ہی وہاں اونٹوں کے سفر میں پیش آتی ہیں۔ اگر آدمی احتیاط سے کام لے اور قافلہ سے علیحدہ نہ ہو تو ذرا بھی اندیشہ نہیں۔ اور بدوؤں کو کوئی خود ہی اپنی

بے احتیاطی سے ہلاک ہونا چاہے تو اس کا یہاں بھی کوئی انتظام نہیں ہو سکتا بلکہ سچ یہ ہے کہ اونٹوں کا سفر ایسا پر لطف ہوتا ہے کہ اس کے سامنے یہاں کے سفر کچھ بھی نہیں پھر اگر کچھ کلفت پیش بھی آئے گی تو اس میں ثواب کس قدر ہے۔ جب یہاں دنیا کے واسطے سفر کی تکالیف برداشت کی جاتی ہیں تو خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے لئے ذرا سی کلفت پیش بھی آجائے تو کیا مضائقہ ہے اور اگر کوئی یہ دعوےٰ کرے کہ اس سفر میں ہلاکت کا خطرہ زیادہ ہے تو یہ بالکل غلط اور مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ ہزارہا آدمی حج کو جاتے ہیں اور یوں بیس پچیس ہزار میں اگر بیس پچیس مر بھی گئے تو اتنے تو یہاں بھی ہر سال مرتے ہیں مردم شماری دیکھ لی جائے کہ پچیس ہزار آدمیوں میں سے یہاں رہ کر کتنے مرتے ہیں اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ سفر حج میں جو لوگ مرتے ہیں ان کی تعداد معمول سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پھر خواہ مخواہ لوگوں کو وہاں کی تکالیف بیان کر کے ڈرانا اور مناع خیر بننا یصدون عن سبیل اللہ میں داخل ہے یا نہیں البتہ اگر یہ کوئی عاقل حکیم شخص وہاں کی تکالیف کا تذکرہ حکمت سے کرے اس کو اس کی اجازت ہے کیونکہ اس کے بیان سے لوگ حج سے نہیں رکیں گے۔ اس کا بیان کرنا

لہ احقر جامع وعظ عرض کرتا ہے کہ اس سال افسوس ہے کہ ہندوستان میں خلافت کمیٹی کے میمبروں نے قربانی کی طرح حج سے بھی بہت لوگوں کو روکا گویا یہ لوگ حج کے بند کرنے کی کوشش کرنے میں یہ لوگ بالکل یصدون عن سبیل اللہ کے مصداق ہیں۔ حالانکہ حج ایک بہت بڑا شعار اسلامی ہے۔ اس مبارک بقعہ میں ہر سال حاجیوں کا جانا فرض کفایہ ہے۔ کسی سال میں اگر حج بالکل نہ ہو تو تمام عالم کے مسلمان گنہگار ہوں گے۔ اتنے بڑے شعار اسلامی سے روکنا اور اس کے بند کرنے میں سعی کرنا یہ کونسی حمایت اسلام ہے جس شخص پر حج فرض ہوا اور وہ بلا حج کئے مرجائے اس پر سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ تو جن لوگوں کو خلافت کمیٹی کے میمبروں نے حج سے روکا ہے اگر ان کا خاتمہ برا ہوا تو سارا وبال ان روکنے والوں کی گردن پر ہوگا اور ایک فریضہ اسلام اور شعار الٰہی سے روکنے کی وجہ سے خود ان لوگوں پر بھی سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے اس سے توبہ کریں ۱۲ ظفر احمد

اس غرض سے ہوگا کہ ان تکالیف کا اس طرح انتظام کرنا چاہیئے باقی غیر حکیم کے بیان سے لوگ رک جائیں گے۔ ہم نے دیکھا ہے ایسے بے وقوفوں کی وجہ سے بعض لوگ ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ گویا ان کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ تم یقیناً مر ہی جاؤ گے افسوس۔ یاد رکھئے کہ حج کے مقبول ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ دوبارہ پھر وہاں جانے کا شوق دل میں پیدا ہوا اور جو وہاں سے آکر پھر دوبارہ جانے سے توبہ کرلے اندیشہ ہے کہ اس کا حج مقبول نہ ہوا ہو۔ اس لئے جہاں تک ہوسکے اس کی کوشش کرے کہ دل میں پھر دوبارہ حج کا شوق پیدا ہو۔ اس کی یہی تدبیر ہے کہ وہاں کے ثواب اور منافع اخروی پر نظر کرے اور یہ سمجھ لے کہ جنت میں جو درجات حج کی وجہ سے نصیب ہوں گے ان کے سامنے یہ تکالیف کیا ہیں ان جیسی ہزار بھی کلفتیں ہوں تو کچھ نہیں اور حج میں علاوہ ثواب آخرت کے دنیا کا بھی تو نفع ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ حج کے بعد ضرور رزق میں فراخی ہو جاتی ہے پھر وسعت اور فراخی رزق کیلئے لوگ کیسی کیسی مشقتیں برداشت کرتے ہیں اگر ذراسی وہاں بھی تکلیف پیش آگئی تو اس کی وجہ سے پریشان ہونا اور دوسروں کو پریشان کرنا اور حج کی دولت سے محروم کرنا یہ کونسی عقل کی بات ہے۔ نیز حج سے اخلاق کی تہذیب پر خاص اثر پڑتا ہے۔ اور اگر کوئی حاجی اس کے خلاف پایا جاوے تو وہ ایک عارض کے سبب سے ہے۔ وہ یہ کہ علماء محققین نے لکھا ہے کہ حجر اسود میں کسوٹی کی خاصیت ہے یعنی اس میں یہ خاصیت ہے کہ اس کے استلام کے بعد جیسا شخص ہوتا ہے وہ اپنی اصل خلقت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ حج سے پہلے معلوم نہیں ہوتے کہ یہ اندر سے کیسے ہیں، مگر حج کے بعد چھپا رہنا مشکل ہے، اصل حالت ضرور کھل جاتی ہے۔ پس جس کی حالت حج کے بعد پہلے سے اچھی ہو جائے سمجھنا چاہیئے کہ اس کا حج قبول ہوا۔ اور جس کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے اس کے حج قبول نہ ہونے کا اندیشہ ہے۔

شاید اس سے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ پھر حج نہ کرنا چاہیئے تاکہ قلعی نہ کھلے

اس کا جواب یہ ہے کہ حج نہ کرنے میں اس سے زیادہ اندیشہ ہے جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہو اور وہ پھر بھی حج نہ کرے تو خدا تعالیٰ کو پرواہ نہیں ہے خواہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر پس اگر حج نہ کیا تب تو سوء خاتمہ کا اندیشہ زیادہ ہے اور حج کرنے میں تو صرف یہی اندیشہ ہے کہ قلعی کھل جائے گی وہ بھی اس وقت جبکہ اس کے آداب و شرائط کا لحاظ نہ کیا جائے ورنہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ شوق اور محبت کے ساتھ جو حج ادا کیا جاتا ہے اس سے دینداری میں ترقی ہی ہو جاتی ہے۔ پس یہ اشکال فضول ہے حج ضرور کرنا چاہیئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے آداب و شرائط کا پورا لحاظ کرنا چاہیئے۔ اور جو شخص حج میں احتیاط نہیں کرتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے بیمار بد پرہیزی کرتا ہے۔ اور جو احتیاط کے ساتھ حج کرتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی بیمار کو تنقیہ و ازالہ کی ضرورت ہے اور وہ پوری تدبیر پر عمل کرتا ہے اور پورا پرہیز کرتا ہے۔ اور اسی سے سب مواد رذیلہ کا تنقیہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حج کے بعد پھر علاج کی اور تدبیر کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ جس طرح مسہل کے بعد ہی تو آئندہ مواد خبیثہ کی پیدا وار نہ ہونے دینے کی اور جو تھوڑا بہت پیدا ہو جاوے اس کے تنقیہ کی ضرورت رہتی ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ حج کے بعد بھی ہمیشہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ مگر حج میں احتیاط ہونا اسی وقت ممکن ہے جب حج سے پہلے نفس کی اصلاح کر لی جائے ورنہ بالخصوص جھگڑے اور فساد کی تو ضروری نوبت آجائے گی۔ نیز نماز وغیرہ میں بھی ممکن ہے کہ سفر کی وجہ سے سستی ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سفر کی تکالیف کی وجہ سے شوق اور محبت میں کمی ہو جائے، اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ حج سے پہلے اصلاح نفس کا اہتمام کیا جائے۔ مگر یہ سمجھ لو کہ نفس کی اصلاح خود اپنے آپ نہیں ہو سکتی اپنی عقل اور فہم اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی کسی مربی کامل سے اس کا طریقہ پوچھو۔

کشتن این کار عقل و ہوش نیست
شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

(نفس کو مغلوب کرنا عقل و ہوش کا کام نہیں کوئی خرگوش کسی تیر کا شکار کب کرسکتا ہے)
کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے. اس میں ضرورت ہے عنایت حق و عنایات خاصان حق کی

بے عنایات حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(بے عنایت حق اور خاصان حق اگر فرشتہ بھی ہو جاؤ تو نامۂ اعمال سیاہ ہی رہے گا)
طریق اصلاح میں اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی اپنے آپ کو خاصان حق کے سپرد کردو اور ان کا اتباع اختیار کرو ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(فہم و عقل تیز کرنے سے یہ راستہ طے نہیں ہوتا حق تعالیٰ کا فضل تو عاجزی و شکستگی اور مسکنت کا خریدار ہے)
اس میں اپنے ارادہ اور اختیار کے فنا کرنے کی ضرورت ہے پستی و شکستگی کی حاجت ہے۔ ؎

ہر کجا پستی است آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہاں ہی پہنچتا ہے جہاں مشکل ہوتی ہے وہاں ہی جواب پہنچتا ہے)

ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں درد ہوتا ہے دوا وہاں ہی پہنچتی ہے۔ جہاں مرض ہوتا ہے وہاں ہی شفا پہنچتی ہے)
طلب اور درد اور شکستگی حاصل کرنا چاہیے۔ اب تو یہ حال ہے کہ جو بزرگ سمجھے جاتے ہیں شکستگی ان میں بھی نہیں۔
ایک صاحب کی حکایت یاد آئی جو ظاہر میں بزرگ اور نیک سب کچھ تھے۔ ایک بار

وہ یہاں جمعہ کے روز آئے وعظ میں شریک ہوئے مکان ان کا اتنی نزدیک تھا کہ بعد وعظ کے جاتے تو شام تک پہنچ جاتے، چنانچہ اکثر لوگ وعظ سنکر چلے بھی جاتے تھے ان کے ایک عزیز نے اس احتمال سے ان سے پوچھ لیا کہ اگر شام کو یہاں قیام ہو تو میں کھانے کا انتظام کروں بس بزرگ صاحب کہاں تھے خفا ہو گئے یہ بھی کوئی تہذیب ہے کہ آپ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کھانے کا انتظام کیا جاوے یا نہیں۔ تم کو کھانا تیار کرنا چاہیئے تھا، پھر چاہے ہم ٹھہریں یا نہ ٹھہریں۔ خدا کی پناہ اس تکبر کی بھی کوئی انتہا ہے کہ آپ سے بلا پوچھے ہی کھانا تیار کیا جاوے پھر اگر بعد میں آپ نے کہدیا کہ ہم جانتے ہیں تو اس غریب کا سارا پکا پکایا کھانا برباد جائے غرض یہ سب طرارے یہیں چھوڑ دو۔ حج میں تو سب اپنے کمالات کو گم کر دینا چاہیئے۔

عورتوں پر اور بھی تعجب ہے یہ مردوں سے بھی زیادہ حج کا ارادہ کر کے اپنے کو بڑا سمجھنے لگتی ہیں بلکہ آجکل عموماً ویسے بھی عورتوں میں بڑائی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تو یہ مردوں سے خوشامد کراتی ہیں ان کو شرم اور غیرت بھی نہیں آتی کہ مرد رات دن جان کھپا کر ان کے واسطے کما کر لاتے ہیں کیا مردوں کی عنایت کا یہی نتیجہ ہے کہ یہ مردوں کے سر چڑھیں میں سچ کہتا ہوں کہ اگر عورتیں ذرا صبر و تحمل سے کام کیا کریں تو ان کو مردوں سے زیادہ ثواب ملے کیونکہ یہ ضعیف اور کمزور ہیں ضعفار کا تھوڑا سا عمل بھی قوی آدمی کے بہت سے اعمال سے بعض دفعہ بڑھ جاتا ہے مگر عورتوں میں جس قدر ضعف ہے یہ اسی قدر مردوں پہ شیر ہوتی ہیں اور یہ مردوں کا تحمل ہے کہ ان کو سر چڑھا لاتے ہیں ورنہ ان کے سامنے عورتوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ اگر مرد کو غصہ آجائے تو ایک دن میں ان کو درست کر سکتا ہے۔ چنانچہ سخت مزاج لوگ ایسا بھی کر لیتے ہیں۔ بزرگوں نے نقل کیا ہے یغلبن العاقل و یغلبھن الجاھل کہ عاقل مرد پر تو عورتیں غالب ہو جاتی ہیں مگر جاہل مرد ان پر غالب ہوتا ہے۔ اس کا راز یہی ہے کہ عاقل تحمل سے کام لیتا ہے اور جاہل تحمل نہیں کرتا۔ اس لئے جاہلوں سے یہ خوب درست ہو جاتی ہیں۔

بہرحال عورتوں کو تکبر کرنا بہت نازیبا ہے، ان کو حج میں طرارے سے کام لینا نہ چاہیئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قبل حج ہی اپنے ملکات رذیلہ کو نکالو۔ اور

نفس کی اصلاح کرو۔

اب یہ سوال باقی رہا کہ اب تو حج کو جارہے ہیں اب قبل حج یہ سہل کیسے ہو تو میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ قبل حج کامل بن جائے کیونکہ کمال ایک دن یا ایک ہفتہ میں حاصل ہونا عادۃً دشوار ہے۔

صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامے

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی پاک و صاف نہیں ہوتا ہے جب تک محبت کا جام نہ پیئے گا بہت مجاہدات کے بعد خامی پختگی سے تبدیل ہوئی۔)

میرا مقصود یہ ہے کہ اس وقت سے اس کی فکر میں تو لگ جایئے وہ بھی اثر میں مثل اصلاح ہی کے ہے۔ جیسا قرآن مجید میں یہ حکم نازل ہوا۔ اتقوا اللہ حق تقاتہ کہ خدا تعالےٰ سے ایسا ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تو صحابہ کرام گھبرا گئے اور گھبرا کیوں گئے۔ میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ وہ اس واسطے گھبرا گئے کہ صیغۂ امر اصل میں موضوع ہے وجوب کے لئے اور اگرچہ مطلق امر کے واسطے فور ضروری نہیں مگر فور متبادر ضرور ہے۔ ہاں اگر وہ فعل یقینی طور پر تدریجی ہو تو وہاں فور متبادر نہیں ہوتا ورنہ عموماً امر سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ یہ کام ابھی فوراً کیا جائے۔ پس فاتقوا اللہ حق تقاتہ سے صحابہ یہ سمجھے کہ ہم کو اسی وقت کامل تقوےٰ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس لئے گھبرا گئے تو پھر یہ حکم نازل ہوا۔

فاتقوا اللہ ما استطعتم کہ جتنا مرتبہ تقویٰ کا اس وقت ہو سکے اُتنا اس وقت اختیار کرلو۔ اس میں کوتاہی نہ کرو۔ پھر بتدریج دوسرے مراتب میں بقدر استطاعت ترقی کرتے رہو۔

پس یہ آیت پہلے حکم کے لئے محققین کے نزدیک ناسخ نہیں بلکہ اس کا بیان ہے یعنی مطلوب تو وہی ہے کہ کامل تقویٰ اختیار کرو مگر اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول اول جتنا ہو سکے اس کو پورا کرو۔ اس میں کوتاہی نہ کرو (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

پھر آہستہ آہستہ ترقی ہوتی جائے گی۔ اور ایک دن ایسا بھی ہوگا کہ تم کامل متقی بن جاؤ گے۔ اور بتدریج اعمال تقویٰ کے اعتبار سے نہیں وہ تو ایک دم سے واجب العمل ہیں بلکہ ضعف و قوت مراتب کے اعتبار سے ہے۔

اب اُس اشکال کا جواب ہوگیا یعنی اسی وقت سے اُن ملکات رذیلہ کے ازالہ کی فکر شروع کردو بے فکری میں مت رہو۔ اس وقت اگر آپ کے قبضہ میں یہ بات نہیں ہے کہ ملکات رذیلہ کو بالکل زائل کردیں تو یہ بات تو اختیار میں ہے کہ اس کے مقتضا پر عمل نہ کرو۔ جب بار بار نفس کے تقاضوں کے خلاف عمل کیا جائے گا تو اس کی عادت پڑ جائے گی اور ضبط کی عادت سے ملکات رذیلہ کی قوت مضمحل ہوجائے گی اور اضمحلال سے پھر ان میں اتنی کمزوری ہوجائے گی کہ گویا وہ ملکات ہیں ہی نہیں اس طرح سے آپ ان شاء اللہ تعالیٰ کامل ہوجائیں گے اور اخلاق رذیلہ کی بجائے آپ میں ملکات فاضلہ پیدا ہوجائیں گے۔ لہذا آج کے سفر میں فکر اور سعی ضرور شروع کر دیجئے۔ جب آپ نے اس نیت سے فکر شروع کردی تو آپ بھی ان ہی لوگوں میں شمار ہوں گے جو کامل متقی ہیں۔ کیونکہ اہل کمال بھی اسی طرح اہلِ کمال بنے ہیں ایک دن میں کوئی کامل نہیں ہوگیا۔

دوسرے یہ کہ کمال کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ اور نہ انسان اس کا مکلف ہے انسان کا کام طلب اور فکر اور سعی ہے اگر طلب کے ساتھ ساری عمر بھی ناقص رہے تو وہ ان شاء اللہ کاملین ہی کے برابر ہوگا۔ بلکہ ممکن ہے کہ بعض باتوں میں کاملین سے بھی بڑھ جائے یعنی مشقت کے ثواب میں کیونکہ کاملین کو نفس کی مخالفت گراں نہیں ہوتی اور مبتدی کو زیادہ مشقت پیش آتی ہے تو مشقت کا ثواب اس کو زیادہ ہوتا ہے دلیل اس کی یہ حدیث ہے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم
والذی یتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجرانِ

فرماتے ہیں کہ جو شخص ماہر قرآن ہے وہ کراما کاتبین کے ساتھ ہوگا اور جو شخص اٹک اٹک کر قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس پر شاق ہوتا ہے اس کے لئے دہرا ثواب ہے پس اس مشقت کے ثواب میں ناقص کامل سے بھی بڑھ جاتا ہے اگرچہ دوسرے فضائل میں کامل بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کیسا حال گذرا۔ فرمایا مغفرت ہوگئی درجات ملے مگر ہمارا ایک پڑوسی تھا جو ہم سے کم عمل کرتا وہ ہم سے بڑھا ہوا رہا کیونکہ وہ صاحب عیال تھا، بال بچوں کی پرورش میں اس کو زیادہ اعمال کا موقعہ نہ ملتا تھا مگر وہ ہمیشہ اسی دھن میں رہتا تھا کہ اگر مجھے فراغت نصیب ہو تو خدا کی یاد میں مشغول رہوں۔ وہ اپنی مشقت اور نیت کی وجہ سے ہم سے بڑھ گیا۔ بس اس طریق میں فکر اور ذہن بڑی چیز ہے۔ اسی سے سب کام بن جاتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش
تادم آخر دمے فارغ مباش

(اس راہ میں تراش اور خراش یعنی اصلاح کی فکر میں لگے رہو آخری سانس تک اپنی اصلاح سے فارغ نہ ہو)

میرے ایک دوست نے ایک منظوم خط لکھا جس میں اس کی شکایت تھی کہ میں کام شروع کرتا ہوں پھر چھوٹ جاتا ہے۔ پھر از سر نو جوڑتا ہوں پھر نظام ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ غرض ایک طویل نظم میں اپنی پریشانی لکھی تھی اور وہ نظم مثنوی کی بحر میں تھی میرا جی چاہا کہ ان کو نظم ہی میں اور اسی وزن میں جواب دوں۔ اس وقت یہ شعر ذہن میں آیا ؎

دوست دارد دوست ایں آشفتگی
کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

(حق تعالیٰ اصلاح کے لئے فکر اور عاجزی اور تمہاری پریشان حالی کو

محبوب رکھتے ہیں اس لئے جس طرح بھی ہو سکے کوشش کئے جاؤ ناکام
کوشش بھی بالکل سو رہنے سے بہتر ہے۔)
اور یہی حاصل ہے ان اشعار کا ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

(ترجمہ ہو چکا اوپر دیکھئے)

تادمِ آخر دمے آخر بود
کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(کوشش میں لگے رہو ایک دن ضرور ایسا وقت مرنے سے پہلے
آوے گا کہ کامیاب ہو جاؤ گے حق تعالیٰ کی نظرِ عنایت سے)

بس فکر اور دھن میں لگا رہنا چاہیئے ان شاء اللہ تعالیٰ پھر آپ کا حج مردانہ
ہو جائے گا جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

حج زیارت کردنِ خانہ بود
حج ربّ البیت مردانہ بود

(حج نام ہے خانۂ کعبہ کی زیارت کا مگر صاحبِ خانہ کی زیارت عبادِ
خواص کو عطا ہوتی ہے۔)

اور یہ حج رب البیت ہر شخص پر فرض ہے گو حج البیت بھی اس شخص پر فرض نہ
ہو کیونکہ حج رب البیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف چلنا اس کی طلب
اور دھن میں لگنا سو اس کے لئے کعبہ اور مکہ مکرمہ بھی شرط نہیں اسی کو عارف
مسعود بک فرماتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید   معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(اے قوم جو نفلی حج کے لئے کعبہ شریف گئے ہو تم کسی اللہ والے سے اپنے نفس
کی اصلاح جو فرض عین ہے کرو تو یہاں ہی واصل باللہ ہو جاؤ۔)

مگر قوم حج رفتہ سے مراد سب حجاج نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن پر حج فرض نہیں اور ابھی تک انھوں نے نفس کی اصلاح بھی نہیں کی اور حج کو جانے سے ان کو بعض دینی مضرتیں پہونچنا بھی محتمل ہے ان کو خطاب فرماتے ہیں کہ تم پر حج تو فرض ہے نہیں اور نفس کی اصلاح فرض ہے تم حج کرنے کہاں چلے تم کو پہلے شیخ کی صحبت میں رہنا چاہیئے تمہارا مطلوب یہاں ہے اور جن پر حج فرض ہے ان کو یہ خطاب نہیں ہو سکتا کہ تم حج کرنے مت جاؤ شیخ کے پاس رہو۔ کیونکہ جس پر حج فرض ہے اس کو خدا کا حکم ہے کہ پہلے حج سے فارغ ہو اس کے لئے بدون حج کے مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا وہ ترک حج کے گناہ کی وجہ سے کمال سے رہ جائے گا کمال یہی ہے کہ جس وقت جو حکم ہو اس کو پورا کیا جائے تو جس پر حج فرض ہے اس کو حج ضرور کرنا چاہیئے پھر کسی شیخ کی صحبت میں وہاں سے آ کر رہے لیکن حج کے ساتھ جن احکام کا شریعت نے حکم کیا ہے ان کو بجا لانا بھی ہر حاجی کے ذمہ فرض ہے پس اگر وہ حج سے پہلے کامل نہیں بن سکتے تو کم از کم فکر اور سعی تو ابھی سے شروع کر دیں اس طریقے سے امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آخر میں کاملین کی برابر ہو جاویں گے۔ لیجئے اب تو بہت سہل نسخہ معلوم ہو گیا۔ اب یہی اگر کوئی اپنے حج کو کامل نہ کرے تو وہ جانے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم کی توفیق دے۔ اے اللہ سب حجاج کو حج مردانہ نصیب فرمائیے اور سب کی کوشش مقبول ہو اور ان کے لئے جزائے اس حج کو آئندہ اصلاح اور کمال کا ذریعہ بنا دیجئے۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ○ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

العبرۃ بذبح البقرہ

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ
محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وعظ مسمّٰی بہ

العبرۃ بذبح البقرہ

این	کہاں ہوا	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
متی	کب ہوا	۱۵ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ بعد نماز جمعہ
کم	کتنی دیر ہوا	۱ بجے شروع ہو کر ۳ بجے ختم ہوا کل ۲ گھنٹہ ہوا
کیف	کس طرح ہوا	منبر پر بیٹھ کر
لم	کیوں ہوا	احباب کی درخواست پر کیونکہ عرصے سے خانقاہ میں بیان نہیں ہوا تھا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	مجاہدۂ نفس کی ضرورت اور اس کی حقیقت اور اس کا طریقہ اور آیت ذبح بقرہ سے علم اعتبار کے طور پر اس کا استنباط اور قربانی کے متعلق کچھ بیان
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید	سالکین و اہل علم کو
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ بمنہ و کرمہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۵۰ تقریباً
الاشتات	متفرقات	اہل علم بہت محظوظ ہوئے بوجہ جدت و وقت مضامین قابل دید تھے مجاہدہ کی حقیقت منکشف ہو کر طریق آسان نظر آنے لگا۔ متعنا اللہ الفیوضہ و برکاتہ دائماً ابداً

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۰ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۰ وَاِذْ قَالَ مُوسٰی

لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا
مَا تُؤْمَرُوْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ
اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ
لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ○ قَالَ اِنَّهٗ
يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ
فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ وَاِذْ قَتَلْتُمْ
نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ
بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ
مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ
وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

(ترجمہ) اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو وہ لوگ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کردیں کہ اس کے کیا اوصاف ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو پٹھا ہو دونوں عمروں کے درمیان سو اب کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے۔ کہنے لگے درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ بیان کردیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کردیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں کیونکہ ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے اور ہم ان شاء اللہ ضرور ٹھیک سمجھ جاویں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ ہل چلا ہوا ہو

جس سے زمین جوتی جاتی ہے اور نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جاوے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے کہ اب آپ نے پوری بات فرمائی اور پھر اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم ہوتے نہ تھے اور جب تم لوگوں نے ایک آدمی کا خون کر دیا پھر ایک دوسرے پر اس کو ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو اس طرح حق تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس موقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو ایسے واقعات کے بعد پھر بھی تمہارے دل سخت ہی رہے تو ان کی مثال پتھر کی سی ہے یا سختی میں ان سے زیادہ اور بعضے پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو شق ہو جاتے ہیں پھر ان سے پانی نکل آتا ہے اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو خدا کے خوف سے اوپر سے نیچے کو لڑھک آتے ہیں اور حق تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں۔)

یہ چند آیات ہیں سورہ بقرہ کی جن سے مجھے ایک ضروری مضمون بیان کرنا ہے بعض احباب نے اس عرصہ میں درخواست کی تھی کہ کچھ بیان کر دیا جائے کسی خاص مضمون کی تو فرمائش نہ تھی بلکہ عام درخواست تھی جس کا منشاء صرف یہ تھا کہ بہت دنوں سے یہاں بیان نہیں ہوا۔ میں نے اس وقت پختہ وعدہ نہیں کیا بلکہ یہ کہدیا تھا کہ کوئی مضمون ذہن میں آگیا تو کچھ عرض کر دوں گا کیونکہ عادت یہی تھی کہ میں تکلف کر کے بیان نہیں کرتا بلکہ از خود اگر کوئی مضمون ذہن میں آجاتا ہے بیان کر دیتا ہوں اور جی بھی یہی چاہتا ہے کہ تکلف کر کے بیان نہ کیا جائے کیونکہ اس سے اثر بھی نہیں ہوتا اور تعب بھی بہت ہوتا ہے اس کے بعد میرا خود بھی جی چاہا کہ کوئی مضمون آجائے تو اچھا ہے کیونکہ درخواست خلوص پر مبنی تھی اس کے پورا ہونے کو میرا خود دل چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک مضمون ذہن میں آگیا جو بہت کام کا مضمون ہے اور عام ضرورت کا ہے۔ پھر جی چاہا کہ کوئی مضمون اس وقت کے مناسب بھی بیان ہو جائے تو اچھا ہو کیونکہ عام

ضرورت سے خاص وقت موجود کی ضرورت اشد ہوتی ہے) چنانچہ بحمد اللہ یہ خیال بھی پورا ہوگیا اور اس کے لئے مجھے دوسرے مضمون کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ پڑی بلکہ پہلے ہی مضمون کی تقریر اس طرح ذہن میں آئی جس میں ضرورت وقت سے میری مراد خصوص یہ وقت حاضر نہیں بلکہ ایک وقت محدود مراد ہے جو کہ ممتد ہے جس میں عید الاضحیٰ اور قربانی کے ایام بھی داخل ہے اور ضرورت وقت سے مراد یہی قربانی کی ضرورت ہے جو عنقریب آنے والی ہے تو یہ مضمون جو اس وقت بیان ہوگا اس میں تین پہلو ہیں۔

(۱) یہ کہ وہ مضمون ضروری ہے اور عام ضرورت کا ہے۔

(۲) پہلو یہ ہے کہ وہ مضمون قربانی کے مناسب ہے۔

(۳) پہلو یہ ہے کہ جو قصہ ان آیات میں مذکور ہے اس کو مضمون عام سے تعلق ہے اور اس کے واسطہ سے قربانی سے بھی تعلق ہے کیونکہ جس چیز سے ایک چیز کو تعلق ہوا کرتا ہے اس کے متعلق کو بھی اس سے تعلق ہوا کرتا ہے پس مضمون عام کو قربانی سے تعلق ہے اور قصہ مذکورہ فی الآیات کو مضمون عام سے تعلق ہے تو قربانی کو بھی اس قصہ سے تعلق ہوگا۔

اب میں پہلے اس مضمون عام کو بتلانا چاہتا ہوں جو عام ضرورت کا ہے تاکہ تعین مقصود کے بعد انطباق سہل ہوجائے سو وہ مضمون مقصود یہ ہے کہ نفس کشی کی ضرورت ہے یعنی مجاہدہ نفس کی اس کی عام ضرورت ظاہر ہے کیونکہ نفس سب کے ہے ایسا کون ہے جس کے نفس نہیں اور مجاہدہ واصلاح نفس کی بھی سب کو ضرورت ہے ایسا کون ہے جو اصلاح نفس سے مستغنی ہو اور سامعین سے میں اتنی درخواست کرتا ہوں کہ وہ نفس کشی کا لفظ سن کر اس کی تفسیر اپنے ذہن سے کچھ نہ گھڑیں اور نہ اس کی ضرورت ہے بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے ہم کو اپنی رائے کو اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس کی تحقیق عنقریب اپنے موقعہ پر

اسی وقت ہوجائے گی اور یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ بعض لوگ نفس کشی اور مجاہدہ کے لفظ سے یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ بس نفس کو خوب بھوکا مارے نہ کھانے کو دے نہ پینے کو نہ اچھا کپڑا پہنے نہ کسی سے ملے جلے نہ کسی سے بات کرے بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دے اور حقوق نفس کو بالکلیہ ترک کر دے نہ لیٹے نہ سووے رات بھر جاگتا رہا کرے۔ حالانکہ نفس کشی کی یہ تفسیر بالکل غلط ہے اور منشا اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگ اس فن کو حاصل نہیں کرتے (یعنی فن تصوف کو جس میں مجاہدہ و اصلاح نفس سے بحث کی جاتی ہے ۱۲) اور نہ اس کی تحصیل کو ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی ایک فن ہے جیسے فقہ و حدیث ایک فن ہے۔ جس طرح فقہ وغیرہ میں خاص اصطلاحات ہوتی ہیں جن کو تحصیل فن ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے اسی طرح تصوف کی بھی اصطلاحات ہیں جو فقہ وغیرہ کی اصطلاحات سے جدا ہیں۔ ان کی حقیقت بدون تحصیل فن کے واضح نہیں ہوسکتی اور تصوف کی جدا اصطلاحات ہونے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ شریعت سے بھی جدا ہیں۔ نہیں بلکہ فنون مدونہ کی اصطلاحات سے جدا ہونا مراد ہے۔ اور اگر وہ اصطلاحات شریعت سے بھی جدا ہوتیں جب بھی مضائقہ نہ تھا (لَا مُشَاحَّةَ فِي الْاِصْطِلَاحِ (اصطلاحات مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے) آخر نحو و صرف وغیرہ کی بہت سی اصطلاحات ہیں جن کو شریعت سے کوئی تعلق نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ تصوف کی اصطلاحات دو قسم پر ہیں ایک وہ جو مقاصد کے متعلق ہیں وہ تو شریعت سے الگ نہیں ہیں بلکہ مقاصد میں اصطلاحات تصوف کی حقیقت وہی ہے جو شریعت میں مذکور ہے اور دوسرے وہ اصطلاحات ہیں جو امور زوائد کے متعلق ہیں وہ شریعت سے جدا ہوسکتی ہیں جیسے تجدد امثال توحید وجودی۔ شغل رابطہ وغیرہ مگر مجاہدہ نفس کشی امور زوائد میں سے نہیں ہے بلکہ مقاصد میں سے ہے کیونکہ یہ ماموربہ فی الشرع (شرع میں ان کا حکم کیا گیا ہے) ہے نصوص میں جابجا مجاہدہ کا ذکر ہے۔ کہیں بصورت خبر کہیں بصیغہ امر

لہ چنانچہ مثلاً لا تحبقة رفيقك کے بعد مذکور ہے ۱۲ منہ

چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ (جو شخص مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے مجاہدہ کرتا ہے) وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ (جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب و ثواب یعنی جنت کے راستے دکھا دیں گے اور اللہ تعالےٰ کی راہ میں پوری مشقتیں برداشت کرو) وغیرہ وغیرہ پس اس کی تفسیر وہی ہونی چاہیئے جو شریعت نے بتلائی ہے کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ مقاصد میں تصوف کی اصطلاحات شریعت کی اصطلاحات سے جدا نہیں ہیں۔ پس اب اس غلطی کا منشا جہل کے سوا کچھ نہیں لوگوں نے کتابوں میں خاص خاص لوگوں کے مجاہدات کا ذکر دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ بس یہی اس کی حقیقت ہے حالانکہ حقیقت شے اور چیز ہے اور اس کا طریق تحصیل دوسری شے ہے۔ حقیقت ایک ہوا کرتی ہے اور طریق تحصیل مختلف بھی ہو سکتے ہیں (مثلاً بیماری میں پرہیز کرنا مضرات سے ضروری ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ پرہیز کی حقیقت وہی ہے جو فلاں طبیب نے فلاں مریض کو بتلائی تھی کہ ۶ ماہ تک پانی نہ پیئے کسی سے میل جول اختلاط نہ کرے اور سوائے دو چپاتیوں کے کچھ نہ کھائے سخت غلطی ہے کیونکہ وہ طریقہ اسی مریض کے ساتھ مخصوص تھا سب کے لئے وہی طریقہ نہیں اور نہ پرہیز کی حقیقت اس طریقہ میں منحصر ہے خوب سمجھ لو ۱۲ جامع)

پس لوگوں نے ایک غلطی تو یہ کی کہ مجاہدہ کی تفسیر اپنی طرف سے گھڑی۔ دوسری غلطی یہ کی کہ اس تفسیر مخترع کو نصوص میں جاری کیا اور یہ سمجھے کہ اَلَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب و ثواب یعنی جنت کے راستے دکھا دیں گے) وغیرہ میں یہی مجاہدہ مراد ہے جو ہمارے ذہن میں ہے اور یہ معنی طاقت سے باہر تھے تو کہنے لگے کہ دین پر عمل مشکل ہے چنانچہ یہ بات عام طور پر لوگوں کی زبان پر ہے حالانکہ اس میں تکذیب ہے نصوص صریحہ کی حق تعالےٰ فرماتے ہیں لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا

اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) جس میں تصریح ہے کہ دین میں طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی گئی۔ حدیث شریف میں ہے اَلدِّیْنُ یُسْرٌ کہ دین پر عمل کرنا آسان ہے اور فرماتے ہیں مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ط خدا نے تم پر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ مگر عوام اس غلطی کی بنا پر ان نصوص کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دین آسان ہے بس یوں خیال کرتے ہیں کہ یہ خاص لوگوں کے واسطے آسان ہوگا سب کے واسطے آسان نہیں، حالانکہ نص میں نفسًا عام ہے جس سے معلوم ہوا کہ کسی کو بھی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی گئی جس میں عام و خاص کا کوئی تفرقہ نہیں۔ نیز مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (تم پر خدا تعالیٰ نے دین میں کچھ تنگی نہیں کی) میں خطاب سب کو عام ہے۔ مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کیونکہ وہ لوگ مجاہدہ والا اس کو سمجھتے ہیں جو بیوی بچوں کو چھوڑ دے اور نفس کے ضروری حقوق کو بھی ادا نہ کرے۔ حالانکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِکَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً (اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے) اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا اِنَّهُمْ لَیَاکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَیَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ ط (اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ انبیا علیہ السلام کے بیوی اور بچے بھی ہوتے تھے اور وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور بازاریں ضروریات کے لئے چلتے پھرتے بھی تھے اور ظاہر ہے کہ تمام ضروریات کی جڑ اولاد و ازدواج ہی ہیں ان کے لئے انسان کو سب سامان کرنا پڑتا ہے مگر باایں ہمہ انبیا علیہم السلام ان سے الگ نہ تھے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ مجاہدہ میں انبیاء سے زیادہ کامل کوئی نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوگیا کہ مجاہدہ کی یہ حقیقت ہرگز نہیں کہ بیوی بچوں سے الگ ہوجائے۔

اور ایک بڑی خرابی اس غلطی سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس مجاہدہ مخترع میں اگر کوئی کامیاب ہو جائے تو پھر وہ اپنے کو دوسروں سے اکمل و افضل سمجھنے لگتا ہے اور جو لوگ اس طرح مجاہدہ نہیں کرتے ان کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ اول تو اس امتیاز کا منشا وہ غلطی ہے جو اس نے مجاہدہ کی حقیقت سمجھنے میں کی ہے دوسروں کو اس غلطی میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ مجاہدہ کی حقیقت اس نے صحیح سمجھی پھر بھی اسے اپنے کو افضل و اکمل سمجھنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس کو جو امتیاز حاصل ہے اس کا منشا اس کا کوئی کمال ہے یا دوسروں کا نقص سو ظاہر ہے کہ مجاہدہ شرعاً مامور بہ ہے اور اس کے نزدیک مجاہدہ کی حقیقت وہی ہے جو اس نے اختیار کی تو اس صورت میں اس کا کمال کیا ہوا بلکہ جو کچھ اس نے کیا اپنے نزدیک مامور بہ کو ادا کیا اور مامور بہ کو ادا کر کے اپنے کو صاحب کمال سمجھنا سخت حماقت ہے کیونکہ یہ کوئی کمال نہیں یہ تو ایک ضروری فعل تھا جس کو اس نے ادا کیا باقی دوسروں سے امتیاز اس لئے ہو گیا کہ اور لوگ اس مامور بہ میں کوتاہی کر رہے ہیں تو اگر ہوا تو ان میں نقص ہوا اس میں کیا کمال ہوا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص پانچ وقت کی نماز پڑھ کر اپنے کو صاحب کمال سمجھے کیونکہ اتفاق سے یہ ایسی جماعت میں جا پھنسا ہے جو پانچ کی جگہ صرف دو ہی وقت کی نماز پڑھتے ہیں، حالانکہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا کوئی کمال نہیں یہ تو فی نفسہ ہر شخص پر ضروری ہے اگر اس سے کم کرے گا گنہگار ہوگا مگر امتیاز اس لئے ہو گیا کہ دوسرے لوگ اس واجب میں کوتاہی کر رہے ہیں اور صرف دو ہی وقت کی نماز پڑھتے ہیں، تو اس سے کہا جائے گا کہ تمہارے اس امتیاز کا منشا تمہارا کوئی کمال نہیں بلکہ دوسروں کا نقص اس کا سبب ہو گیا ہے اسی طرح اس مجاہدہ کرنے والے کو سمجھنا چاہئے کہ میری اس امتیاز کا منشا میرا کوئی کمال نہیں بلکہ دوسروں کا نقص اس کا سبب ہے تو اعتقاد کمال تو لغو ٹھیرا۔ رہا اوروں کے نقص کا اعتقاد تو وہ اس کے نزدیک

نقص ہے یہ کہاں سے لازم آگیا کہ واقع میں بھی نقص ہے اور جو امر واقع میں بھی نقص ہو ممکن ہے کہ کوئی دوسرا کمال اس کی تلافی کردے۔ ایک خرابی اس معنیٰ غلط کی یہ ہوئی کہ مجاہدہ کی یہ تفسیر سمجھنے کی وجہ سے ہر شخص اس کے لئے جلدی فارغ نہیں ہوتا بلکہ کوئی پنشن کے انتظار میں رہتا ہے، کوئی لڑکوں کی شادی سے فراغت کا منتظر ہے کہ بس ان کاموں سے فارغ ہوکر پھر دنیا سے الگ ہوجائیں گے۔
خلاصہ یہ کہ ان کے نزدیک گھر کو تالا لگادینا مجاہدہ ہے اسی لئے ایسے وقت کے منتظر رہتے ہیں جس میں گھر کو تالا لگاکر بیٹھنا آسان ہو۔ گویا یہ شخص مجاہدہ اس کو سمجھتا ہے کہ ایسا بن جائے جس کو حدیث میں خالی عن الخیر کہا گیا ہے۔
لَاخَيْرَ فِيْ مَنْ لَايَأْلَفُ وَلَا يُؤْلَفُ یعنی اس شخص میں خیر نہیں جو نہ دوسروں سے مانوس ہو نہ دوسرے اس سے مانوس ہوں۔ سو حدیث سے معلوم ہوگیا کہ جس کو آجکل مجاہدہ والا سمجھا جاتا ہے۔ اس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم لاخیر فرماتے ہیں۔ کہ اس میں کچھ خیر نہیں تو وہ کمال کہاں ہوا بلکہ نقص ہوا۔ ہاں کسی معالجہ کی ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ مجاہدہ کے معنے اپنی طرف سے نہ گھڑے جائیں بلکہ انتظار کیا جائے اس کے معنے ابھی آتے ہیں اسی طرح نفس کشی کے لفظ سے اس کا ترجمہ کرکے اپنے ذہن میں کوئی حقیقت متعین نہ کریں کیونکہ نفس کشی یہ اصطلاحی لفظ ہے جو فارسی میں ترجمہ ہے مجاہدہ کا مولانا فرماتے ہیں ؎

نفس نتواں کشت الا ظل پیر
دامن آں نفس کش راسخت گیر

(نفس کو بدون پیر کے نہیں مارسکتا اس نفس کش کا دامن مضبوط پکڑلو)

اس شعر سے میرا مقصود حصول مجاہدہ کا طریقہ بتلانا نہیں ہے کیونکہ اس کو تو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس وقت صرف یہ بتلانا ہے کہ نفس کشی اصطلاحی لفظ ہے جو صوفیہ کے کلام میں مجاہدہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر شیخ کو

نفس کش کہا جاتا ہے کہ وہ مجاہدہ کا طریقہ بتلاتا ہے اور عنقریب میں اس کی حقیقت بتلا دوں گا اسی تفسیر سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ مجاہدہ کی ضرورت سب کو ہے اور ہر وقت ہے یعنی اس کی ضرورت عام بھی ہے اور دائمی بھی ہے اور یہاں سے یعنی ضرورت مجاہدہ کے دوام سے بعض سالکین کی غلطی معلوم ہو گئی جو اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ چند روزہ مجاہدہ حسب قاعدہ طریق کر کے پھر اپنے کو فارغ سمجھ لیتے ہیں اور آئندہ کو مجاہدہ سے بے فکر ہو جاتے ہیں جس کی ابتدا انہماک فی المباحات (مباح چیزوں میں منہمک ہونا) سے ہوتی ہے کہ اول وہ مباحات میں زیادہ مشغول ہوتے ہیں پھر رفتہ رفتہ مکروہات میں انہماک ہونے لگتا ہے پھر محرمات کا ارتکاب بھی ہونے لگتا ہے اور چونکہ اس شخص کو ایک وقت تک حق تعالیٰ سے تعلق خاص رہ چکا ہے جو پہلے مجاہدہ کا اثر تھا تو اب اس کی یہ حالت زیادہ بُری ہوتی ہے اس میں نکس[۱] کا اندیشہ ہے اور اس کی ایسی مثال ہو جاتی ہے جیسے کوئی عاشق مزاج شناس ہو کر محبوب کو ستانے لگے جو شخص مزاج شناس ہی نہیں ہوا اس کی حرکات اس درجہ موجب عتاب نہیں ہوتیں جیسے مزاج شناس کی حرکات موجب عتاب ہوتی ہیں پس عارف جب مکروہات و محرمات کا ارتکاب کرتا ہے اس پر غیر عارف سے زیادہ قہر و غضب ہوتا ہے اور یہی نکس (مردودیت) ہے اَعَاذَنَا اللہُ مِنْہُ (اللہ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے) اس لئے سالکین کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ مجاہدہ کی ضرورت دائمی ہے۔ یہ چند روزہ کا کام نہیں بلکہ عمر بھر کا کام ہے۔ دیکھئے جس طرح بیماری میں دوا اور پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے بیماری سے صحت کے بعد بھی تو پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ صحت کے بعد زیادہ پرہیز کی ضرورت ہے کیونکہ بیماری میں تو معدہ خراب ہوتا ہے، منہ کا مزا بدلا ہوا ہوتا ہے اس لئے مریض کو انواع و اقسام غذا کی خواہش خود بھی بہت کم ہوتی ہے اور اگر اس نے بد پرہیزی کی بھی تو بہت جلد ضرر کا احساس ہو جاتا ہے اور صحت کے بعد

[۱] مردودیت ۱۲

معدہ میں گو بقوت آجاتی ہے۔ بد پرہیزی سے معاً ضرر کا احساس نہیں ہوتا نیز اشتہار بھی ہر چیز کی ہوتی ہے تو اس وقت سنبھال کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ بعض دفعہ صحت کے بعد بھی پھر مرض کا عود ہو جاتا ہے۔ اور اطباء نے لکھا ہے کہ عودِ مرض ابتداء مرض سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اسی طرح عارفین نے فرمایا ہے کہ ابتدائی مجاہدہ کے بعد جب نفس اصلاح پذیر ہو جائے تو اس وقت مجاہدہ کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ابتداء مجاہدہ میں تو بدپرہیزی کے ضرر کا احساس جلد ہو جاتا ہے نیز اس وقت چونکہ قوائے نفسانیہ میں قوت ہوتی ہے اس لئے نفسانی خواہش کا تقاضا شدت کے ساتھ ہوتا ہے تو نفسانی خواہش پر تلبہ بھی جلد ہو جاتا ہے اور مجاہدہ سے فارغ ہونے کے بعد چونکہ تقاضائے نفس کمزور ہو جاتا ہے اس لئے ہوائے نفس کا احساس دیر میں ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے تو یہ حالت تھی کہ جہاں غیر محرم پر نظر پڑی فوراً احساس ہو گیا کہ اس نظر میں ہوائے نفس ملی ہوئی ہے اس لئے فوراً متنبہ ہو جاتا تھا اور مجاہدہ سے فارغ ہو کر جب غیر محرم پر نظر پڑتی ہے تو فوراً احساس نہیں ہوتا کہ اس میں ہوائے نفس ملی ہوئی ہے کیونکہ اس وقت تقاضائے نفس کمزور ہے۔ اب اس کو سوء نظر میں وہ ہیجان نہیں ہوتا جو پہلے ہوتا تھا اس لئے سالک اس غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس نظر میں ہوائے نفس نہیں ہے پھر وہ اس سے اجتناب کی کوشش بھی نہیں کرتا حتیٰ کہ چند روز میں وہ سوء نظر کا عادی ہو جاتا ہے، نیز ابتداء میں اس کے ضرر کا احساس جلدی ہو جاتا تھا کیونکہ قلب میں کیفیات کا رسوخ نہیں ہوا تھا ذرا سی بے اعتدالی سے کیفیت قلبی میں تغیر محسوس ہوتا تھا۔ مجاہدہ کے بعد چونکہ کیفیات قلبیہ میں رسوخ ہو چکا ہے تو اب بعض اوقات کسی بدپرہیزی اور بے اعتدالی سے ضرر کا احساس جلدی نہیں ہوتا جس سے سالک اس غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس فعل میں ہوائے نفس کو کچھ دخل نہیں ہے ورنہ میری قلبی کیفیت میں ضرور فرق ہوتا پھر وہ اس کو غیر مضر سمجھ کر اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا

اور نفس کو ڈھیل دیدیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفس اس فعل حرام کا عادی ہوجاتا ہے اور اب کسی وقت سالک کو اس کے ضرر کا احساس بھی ہوجائے تو وہ بعض اوقات نفس کے روکنے پر قادر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابتدائے مجاہدہ میں جس طرح تقاضائے نفس شدید تھا ویسے ہی نفس میں قوت کف (رکنا) بھی زیادہ تھی اور مجاہدہ کے بعد جس طرح تقاضائے نفس کمزور ہوگیا ہے اسی طرح بعض مجاہدات سے قوت کف بھی کمزور ہوجاتی ہے کیونکہ مجاہدۂ اولیٰ سے تمام قویٰ میں ضعف پیدا ہوجاتا ہے۔ اب آپ کی سمجھ میں آیا کہ فراغ من المجاہدہ (مجاہدہ سے فارغ ہونا) کے بعد مجاہدہ کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے کیونکہ اس وقت ہوائے نفس کا احساس دیر میں ہوتا ہے اس لئے استرسال[1] ہوتا رہتا ہے اور استرسال کے بعد جب ہوائے نفس کا احساس ہوتا ہے تو بعض دفعہ نفس کو روکنے پر قدرت نہیں پاتا کیونکہ اس شخص کی قوت کف کمزور ہوچکی ہے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ شہوت شیخ شہوت شاب سے اشد ہے کیونکہ جوان کا نفس زندہ ہے اس کو شہوت کا احساس بھی جلد ہوتا ہے اور احساس کے بعد اس میں قوت کف بھی زیادہ ہے وہ اپنے نفس کو جلد ہوائے نفسانی سے روک سکتا ہے۔ اور شیخ کا نفس چونکہ مرچکا ہے اس لئے اس کو ہوائے نفس کا احساس جلد نہیں ہوتا بلکہ بہت دیر میں ہوتا ہے تو اس حالت میں استرسال نفس (ڈھیل دینا) زیادہ ہوتا ہے۔ پھر اس ڈھیل کے بعد شیخ کو ہوائے نفس کا جس وقت احساس ہوتا ہے تو اب وہ ضبط پر قادر نہیں ہوتا کیونکہ جس طرح اُس کی قوت شہوت کمزور ہے اسی طرح قوت ضبط بھی کمزور ہے۔ اب وہ لاکھ کوشش کرے کہ کسی طرح نفس کو سوء نظر سے روکوں مگر قدرت نہیں ہوتی۔

اور جوان کی جس طرح شہوت کامل اور زندہ ہے اسی طرح اس کی قوت ضبط

---

[1] ڈھیل ۱۲

بھی کامل اور زندہ ہے، اسی لئے جوان کو بوڑھے سے زیادہ عفت پر قدرت ہے اور اس کی عفت شیخ کی عفت سے کامل بھی ہوتی ہے کیونکہ نہ اس کو زیادہ استرسال ہوتا ہے اور نہ استرسال کے بعد ضبط دشوار ہوتا ہے۔

پس بڈھوں کو مجاہدہ سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے ان کو جوانوں سے زیادہ پرہیز کی ضرورت ہے۔ یہ مضمون حق تعالیٰ نے بدون اعانت کتب کے قلب میں ڈالا تھا اور بحمد اللہ علم عظیم عطا ہوا جس کی قدر وہی لوگ کریں گے جن کو اس کا تجربہ ہوا ہو ایک بار میں نے یہ مضمون سہارنپور میں بیان کیا تھا، اس وقت ایک بوڑھے میاں وعظ میں موجود تھے وہ اس کو سن کر بہت ہی روئے اس وقت انکے سامنے اپنے استرسال نفس کا نقشہ کھینچ گیا تھا اور وہ سمجھ گئے کہ میں بہت بڑی غلطی میں مبتلا تھا کہ اپنے کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھتا تھا۔ اور اس مرض میں اکثر بوڑھے مبتلا ہیں یہ لوگ اپنے کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھتے ہیں حالانکہ بوڑھاپے میں صرف جسم کمزور ہوتا ہے نفس کمزور نہیں ہوتا۔ بوڑھا کچھ کر تو نہیں سکتا مگر لالچ اور حرص اس کو جوانوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے یَشِیْبُ ابْنُ آدَمَ وَیَشِبُّ فِیْهِ خَصْلَتَانِ اَلْحِرْصُ وَ طُوْلُ الْاَمَلِ یعنی انسان بوڑھا ہو جاتا ہے مگر دو خصلتیں اس میں جوان ہوتی ہیں حرص اور طول امل اس لئے بوڑھوں کو اصلاح نفس کی جوانوں سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ مضمون تو ضمناً آ گیا تھا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت رہتی ہے، پس سالکین کان کھول کر سن لیں کہ مجاہدہ کی ضرورت چند روزہ نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت دائمی ہے چند روزہ مجاہدہ کے بعد اگر تم نے بد پرہیزی شروع کی تو یاد رکھو اس کے بعد عود مرض اس شدت کے ساتھ ہوگا کہ ہلاکت کے قریب پہونچا دے گا پھر بہت کم ہیں جو اس ورطہ سے نجات پائیں اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش تا دم آخر دمے فارغ مباش

تادمِ آخر دمِ آخر بود　　　　کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(یعنی تم کو چاہیئے کہ اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ خراش تراش کرتے رہو اور آخری وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائیگی یعنی اگر طلب میں لگے رہوگے تو کسی وقت ضرور وصول الی اللہ ہو جائیگا)

یعنی اخیر دم تک اس راہ میں تراش و خراش ہی رہنی چاہیئے پس جب سلامتی کے ساتھ موت آجائے گی اس وقت مجاہدہ سے فراغت نصیب ہوگی۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جب مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تو پھر صاحب مجاہدہ و غیر صاحب مجاہدہ میں کیا فرق ہوا۔ اس کا جواب اوپر کی تقریر میں آچکا ہے یعنی دونوں میں وہی فرق ہے جو بیمار کے پرہیز میں اور بیماری سے صحت پانے والے کے پرہیز میں فرق ہوتا ہے کہ پرہیز کی ضرورت بیمار کو بھی ہے اور صحت پانے والے کو بھی مگر ظاہر ہے کہ بیمار کو سخت ضرورت ہے اور اس کا پرہیز بھی سخت ہوتا ہے اور صحت پانے کے بعد گو قدرے پرہیز کی ضرورت رہتی ہے مگر اب اتنا سخت پرہیز نہیں ہوتا جتنا بیماری کی حالت میں تھا تو کیا یہ فرق تھوڑا ہے کہ غیر صاحب مجاہدہ بیمار ہے اور صاحب مجاہدہ تندرست ہے بیمار ہر وقت خطرہ میں ہے اور تندرست خطرہ سے نکل چکا ہے۔ البتہ تندرستی کے بعد جس طرح حکیم کہہ دیا کرتا ہے کہ اب تم کو ہر چیز سے تو پرہیز کی ضرورت نہیں صرف فلاں فلاں اشیاء سے پرہیز رکھنا کیونکہ وہ تمہاری طبیعت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح صاحب مجاہدہ کو یہاں کہا جاتا ہے کہ تم کو بالکل بے فکر نہ ہونا چاہیئے بلکہ تھوڑا بہت پرہیز اب بھی کرنا چاہیئے جو کچھ دشوار پرہیز نہیں ہے بلکہ معمولی اور سہل ہے۔

دوسرا مضمون قربانی کے متعلق ہے اور اس کو مجاہدہ سے خاص تعلق ہے کیونکہ جملہ اعمال میں دو چیزیں ہیں ایک روح عمل، دوسری صورت عمل بعبارت دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ ہر عمل میں ایک باطن ہے اور ایک ظاہر ہے۔ اب سمجھو کہ قربانی میں بھی

ایک روح یعنی باطن ہے ایک صورت یعنی ظاہر ہے صورت قربانی تو اراقت دم (خون بہانا) ہے اور باطن قربانی مجاہدہ اور نفس کشی ہے۔ مگر یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ باطن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ باطن جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے یہ باطن بدون ظاہر کے معتبر نہیں۔ دوسرا وہ باطن ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید نہیں بلکہ اس کے لئے لازم ہے اس باطن کا تحقق بدون ظاہر خاص کے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ لازم کبھی عام ہوتا ہے تو وہ ملزوم کے بغیر متحقق ہوسکتا ہے اور باطن قسم اول کا تحقق بدون اس کے ظاہر کے نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ظاہر کے ساتھ مقید ہوتا ہے یہاں سے ملاحدہ کا اشکال مندفع ہوگیا۔ جو ظاہر کو مطلقاً لغو اور فضول قرار دے کر ہر عمل میں صرف باطل پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب ہر عمل میں ایک روح ہے اور ایک صورت ہے اور روح ہی مقصود ہے تو اس صورت کا مقصود نہ ہونا لازم آگیا مگر یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ روح کے مقصود ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ صورت ہمیشہ غیر مقصود ہوا کرے بلکہ بعض دفعہ روح مع الصورت مقصود ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ انسان میں ایک روح ہے اور ایک اس کی صورت یعنی جسم ہے روح کا مقصود ہونا تو ظاہر ہے چنانچہ کسی کا بیٹا مر جاوے تو موت کے بعد گو جسم ہمارے سامنے موجود رہتا ہے مگر روح کے فقدان سے مقصود فوت ہو جاتا ہے اب اس جسم کے بقا سے کچھ تسلی نہیں ہوتی بلکہ اس کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کرکے اپنے سے جدا کر دیا جاتا ہے اس سے تو روح کا مقصود ہونا معلوم ہوا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم بالکل مقصود نہ ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح اس قید کے ساتھ مقصود ہے کہ اس جسم کے ساتھ متصل ہو اگر روح ہمارے سامنے موجود ہو مگر جسم کے ساتھ اس کا اتصال نہ ہو تو اس صورت میں بقاء روح سے کچھ خوشی اور تسلی نہیں ہوسکتی چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی روح کو دوسرے جسم میں منتقل کردے اور یہ بات مشق سے حاصل ہوجاتی ہے کیونکہ روح کا بدن کے ساتھ محض تدبیر و تصرف کا تعلق ہے اور حقیقت میں وہ

جسم سے منفصل ہے جو لوگ خاص تصرفات کے عادی ہیں ان کو روح کا جسم سے انفصال محسوس ہوتا ہے یہاں تک کہ مشق کر کے بعض دفعہ ایسا شخص اپنی روح کو حقیقۃً اپنے جسم سے منفصل کر دیتا ہے اور دوسرے جسم میں منتقل کر دیتا ہے تو اگر کوئی شخص ایسی مشق کر کے اپنی روح کو کتے اور بندر کے جسم میں منتقل کر دے اور اس کے باپ کو معلوم ہو جائے کہ اس کتے یا بندر میں میرے بیٹے کی روح ہے تو کیا وہ اس وقت بھی اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرے گا جو جسم اصلی کے اتصال کے وقت کرتا تھا ہرگز نہیں بلکہ اب تو وہ اُس کو اپنا بیٹا کہنا بھی گوارا نہ کرے گا نہ اسکو شفقت و محبت سے پیار کرے گا نہ اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلانا پلانا گوارا کریگا اور اگر کسی کو اسی طرح سے نقل روح میں تردد ہو اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی ہو تو وہ یوں سمجھے کہ جس وقت بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت کو مسخ کیا گیا ہے جن میں بعضے بندر بن گئے تھے اور بعضے سور ہو گئے تھے اور تین دن تک وہ اسی صورت میں رہے اور یہ جو مشہور ہے کہ اس وقت جتنے بندر اور سور ہیں سب انہی کی نسل میں ہیں یہ غلط ہے۔ کیونکہ مسلم شریف کی صحیح حدیث میں ہے کہ وہ لوگ تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے تھے کوئی مسخ شدہ قوم تین دن کے بعد زندہ نہیں رہی اور نہ ان سے کوئی نسل چلی ہے بلکہ اس وقت کے بندر اور سور ان بندروں اور سوروں کی نسل سے ہیں جو بنی اسرائیل کے مسخ سے پہلے موجود تھے کیونکہ ان حیوانات کا وجود پہلے بھی تھا۔

بہرحال حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مسخ کے بعد تین دن تک وہ لوگ زندہ رہے تو اب بتلایئے کہ اس مدت میں روح تو یقیناً وہی تھی جو تین دن پہلے قالب انسان میں تھی مگر اس وقت وہ بندر یا سور کے قالب میں تھی اور یقیناً ان میں بعض صاحب اولاد بھی تھے اہل وعیال بھی رکھتے تھے بعضوں کے باپ دادا بھی زندہ ہوں گے تو کیا کوئی شخص ان کے مسخ ہونے کے بعد روح کے باقی رہنے کو کافی سمجھ سکتا تھا اور کیا کسی کو یہ خوشی ہو سکتی تھی کہ میرا بیٹا زندہ تو ہے گو بندر اور سور کے قالب میں ہے

یا ان کی اولاد اور بیبیاں اس صورت میں اپنے باپ یا شوہر کے زندہ رہنے سے خوش ہو سکتے تھے کہ خیر روح تو موجود ہے گو جسم کیسا ہی ہو ہرگز نہیں بلکہ یقیناً مسخ ہونے کے ساتھ ہی ان میں رونا پیٹنا پڑ گیا ہوگا اور وہ اسی وقت سے ان کو مثل مردہ کے سمجھ چکے ہوں گے ہرگز کسی کو بھی انھیں اپنا باپ یا بیٹا یا شوہر کہنا گوارا نہ ہوا ہوگا (اور اگر کسی کو یہ تردد ہو کہ واقعہ مدت دراز کا ہے نہ معلوم اس وقت کے آدمیوں نے ان بندروں اور سوروں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا ہوگا شاید ان لوگوں نے بقاء روح کی وجہ سے ان کے ساتھ آدمیوں ہی کا سا معاملہ کیا ہو تو میں ان ملحدین سے پوچھتا ہوں کہ تم ایمان سے کہو کیا تم کو اپنی اولاد اور بیوی بچوں کا بندر اور سور ہو جانا ناگوارا ہے اور کیا تم بقاء روح کی وجہ سے جو کہ تمہارے نزدیک اصل مقصود ہے اس وقت بھی ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرو گے جو صورت انسانی میں کرتے تھے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کو کوئی انسان ہرگز گوارا نہ کرے گا۔ پھر آخر اس ناگواری کی وجہ کیا ہے جب تمہارے نزدیک محض روح مقصود ہے اور صورت محض لغو وفضول ہے تو یہاں تم اس قاعدہ پر کیوں نہیں چلتے اور اپنا اور اپنے اہل وعیال کا سور بندر بن جانا تمہیں کیوں ناگوار ہے۔ آخر روح تو جب بھی موجود رہے گی ۱۲ جامع)

پھر حیرت ہے مجھے ان ملحدین کی عقل پر کہ انھوں نے اعمال شرعیہ میں مطلقاً روح کو کیونکر کافی سمجھا اور ظاہر کو مطلقاً کیسے فضول قرار دیدیا حالانکہ امور دنیوی میں وہ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کی صورت کو بیکار نہیں سمجھتے بلکہ روح کے ساتھ صورت کو بھی مقصود سمجھتے ہیں۔ دیکھئے گنا چوسنا مقصود ہے مگر اس قید کے ساتھ کہ اس کو منہ میں دبایا جائے اور پوری پوری کا رس تدریجاً چوسا جائے حالانکہ گنے میں ایک ظاہر ہے ایک باطن۔ باطن تو وہ مٹھاس ہے جو اس کے اندر ہے اور ظاہر وہ جسم ہے جس کو پوری پوری کر کے چوسا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے نوکر یا دوست سے کہے کہ میں سہارنپور کا گنا چوسنا چاہتا ہوں اور وہ اس کے سامنے

سہارنپور ہی کے گنے کی شکر لاکر رکھدے کہ اس کو پھانک لیجئے یہ اسی گنے کی روح ہے جسے آپ چوسنا چاہتے ہیں تو کیا وہ اس کو کافی سمجھے گا اور شکر پھانک لینے کو گنا چوسنے کا قائم مقام سمجھے گا' ہرگز نہیں بلکہ یہ کہے گا کہ مجھے گنا چوسنا اُس کی خاص صورت کے ساتھ مطلوب ہے۔ شکر کا پھانکنا اس مقصود کے قائمقام نہیں ہوسکتا جو لطف گنے کے چوسنے میں ہے وہ گڑ کھانے اور شکر پھانکنے میں کہاں ہے۔ پھر حیرت ہے کہ یہاں تو صورت بھی باطن کے ساتھ مطلوب ہو اور اعمال شرعیہ میں صورت مطلوب نہ ہو پس ملحدین کا یہ کہنا کہ نماز کی روح ذکر اللہ ہے بس قلب میں ذکر اللہ کا ہونا کافی ہے صورت صلوٰۃ کی کچھ ضرورت نہیں اور روزہ کی روح شہوت نفسانی کا توڑنا ہے اگر کسی اور طریقہ سے شہوت نفس شکستہ ہو جائے تو روزہ کا مقصود حاصل ہو گیا صورت صوم کی کچھ ضرورت نہیں۔ زکوٰۃ سے مقصود نفس کو صفت بخل سے پاک کرنا ہے۔ اگر کسی میں طبعی طور پر بخل نہ ہو تو اس کو صورت زکوٰۃ کی ضرورت نہیں۔ یا حج سے مقصود عشق کا حال پیدا کرنا ہے اگر کسی اور طریقہ سے یہ حال پیدا ہو جائے تو پھر حج فرض نہیں یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ہم کہیں گے کہ ان اعمال کی جو تم نے روح بیان کی ہے وہ صورت کے ساتھ مقید ہے اور ان میں روح مع الصورت مطلوب ہے مجرد روح بلاصورت معتبر نہیں (جیسا کہ کھانے کی روح تو بھوک کا دفع کرنا اور پیٹ بھرنا ہے مگر اس کے ساتھ روٹی اور سالن کی صورت بھی مطلوب ہوتی ہے اگر صورت مطلوب نہیں تو پھر ان ملحدین کو گیہوں چبانا اور آٹا پھانک لینا چاہیئے۔ کیونکہ روح اکل تو اس میں بھی موجود ہے ۱۲)

غرض ثابت ہو گیا کہ بعض دفعہ روح مع الصورت مطلوب ہوا کرتی ہے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک شخص نے نماز کے متعلق کہا کہ اس اٹھک بیٹھک سے کیا ہوتا ہے مقصود تو اور ہی کچھ ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ اسی میں کچھ ہے اور اس کے بغیر تمہارے مراقبے اور مجاہدے سب فضول ہیں اور یہ باطن کی

پہلی قسم ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے یہ باطن بدون ظاہر کے معتبر نہیں اور ایک باطن ان اعمال میں قسم دوم کا ہے مثلاً نماز کے لئے مطلق ذکر جو دوسرے مادہ میں بھی متحقق ہوتا ہے اور روزہ کے لئے مطلق کسر شہوت جو دوسرے مادہ میں بھی متحقق ہوتا ہے اور میں نے باطن کے متعلق یہ تفصیل اور تقسیم اس لئے بیان کر دی تاکہ کسی کو اضحیہ کے متعلق میرے اس قول سے کہ اس کا ایک ظاہر ہے ایک باطن ہے یہ وہم نہ پیدا ہو کہ یہ تو وہی بات ہے جو ملحدین کہا کرتے ہیں اس تفصیل سے ان شاء اللہ یہ وہم رفع ہو گیا ہو گا کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ میرے نزدیک باطن کی ایک قسم وہ بھی ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے اور ملحدین کے نزدیک کوئی قسم ایسی نہیں یہ فرق ہے ان میں اور صوفیہ میں۔

اب سنئے کہ اسی طرح قربانی میں ایک تو صورت ہے یعنی اراقت دم (خون بہانا) یہ قربانی کی صورت ہے گوشت خیرات کرنے کا نام قربانی نہیں گوشت تو چاہے تم سارا کھا لو ذرا سا بھی خیرات نہ کرو تو قربانی میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ پس قربانی تو خون بہانے کا نام ہے اور یہ اس کا ظاہر ہے۔ اور ایک اس کی روح اور باطن ہے وہ مجاہدہ ونفس کشی ہے کیونکہ یہ شخص مال خرچ کر کے جانور کو خریدتا ہے اور نفس کو اپنی چیز کا ہلاک کرنا گراں ہے تو یہ اپنے نفس کے داعیہ کو دباتا ہے اور اس کے محبوب کو فنا کر کے اس پر زخم لگاتا ہے یہی مجاہدہ ہے اور اس درجہ کا نام اصطلاح میں فنا ہے۔ اس کے آگے ایک اور درجہ ہے وہ یہ کہ قربانی سے مقصود رضائے حق ہے یہ شخص اپنے مال کو فنا کر کے رضائے حق کا طالب ہے ثواب کا قصد کرتا ہے اس کا نام اصطلاح میں بقا ہے کیونکہ مال خرچ کرنے سے نفس میں جو اضمحلال ہوا اور زخم لگا تھا وہ حصول ثواب اور تصور رضائے حق سے مندمل ہو جاتا ہے۔ قربانی کرتے ہوئے جو قلب کو صدمہ اور کلفت ہوئی تھی وہ اب مبدل بسرور وراحت ہو جاتی ہے۔ پس یہ حالت اس

حالت کے مقابلہ میں بقاء کے مشابہ ہے پس معلوم ہوا کہ قربانی کی روح فنا و بقاء ہے مگر یہ فناء و بقاء جو کہ باطن ہے اضحیہ کا یہ بھی دو قسم ہے ایک وہ جو مخصوص ہے قربانی کے ساتھ دوسرا مطلق فناء و بقاء جو دوسرے مواد میں بھی متحقق اور ہر عمل میں مطلوب ہے ہیں نے اوپر اسی کو مجاہدہ کہا ہے اور جس مجاہدہ کا مجھ کو یہاں بیان کرنا مقصود ہے وہ قسم دوم ہے اس کی یعنی مطلق مجاہدہ جس کا تعلق ہر عمل سے عام ہے اور قربانی کے ساتھ اوروں سے زیادہ اس لئے قربانی کی مناسبت محرک ہوئی بیان مجاہدہ کی اب یہ سمجھئے کہ اس فناء و بقاء میں جس کی مختصر تعبیر مجاہدہ سے کی گئی ہے۔ اصل مقصود بقاء ہے اور فنا اُس کے لئے ذریعہ ہے اس بنا پر کہا جاویگا کہ باطن اضحیہ حیوٰۃ نفس ہے مگر حیوٰۃ سے وہ حیوٰۃ طیبہ مراد ہے جو فناء نفس کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یعنی بقاء جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً

(جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو پس ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے)

وہ حیوٰۃ ناسوتی مراد نہیں جو فناء سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ حیات ناسوتی ہر شخص کی طیب نہیں ہوتی بلکہ بعض کی حیات معیشت ضنک (یعنی تنگ زندگی) ہوتی ہے چنانچہ ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے گھر خیریت ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور کہا تم مجھے کوستے ہو خیریت ہو گی تمہارے یہاں کہ نہ کچھ آگے کو نہ پیچھے کو ہمارے یہاں خیریت کیوں ہوتی کہ ماشاء اللہ بیٹوں، پوتوں بہو بیٹیوں سے گھر بھرا ہوا ہے آج کسی کے سر میں درد ہے، کسی کے پیٹ میں درد ہے، کسی کو بخار آتا ہے، کسی کو دست آرہے ہیں کسی کے چوٹ لگ گئی ہے تو ہمارے یہاں جب اتنا کنبہ ہے وہاں خیریت کیوں ہونے لگی خیریت تم جیسے کے یہاں ہوگی جس کے اولاد نہ بنیاد سارے گھر میں اکیلے پڑے رہتے ہیں

واقعی دنیا داروں کو چین کہاں مگر وہ ان تعلقات میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ ان کا مذاق بھی بدل جاتا ہے وہ ان تعلقات کو جو حقیقت میں عذاب ہیں راحت سمجھتے ہیں اور راحت کو کلفت۔ چنانچہ اس شخص نے خیریت کے سوال کو کوسنا سمجھا اور صاف کہدیا کہ ہمارے یہاں اللہ نہ کرے جو خیریت ہو' خیریت تمہارے یہاں ہوگی۔ اہل دنیا قیود و علائق میں خود پھنستے جاتے ہیں جس کے ساتھ خدا نے کوئی بھی قید اور تعلق نہ لگایا ہو وہ خود اپنے سر ہزار جھگڑے باندھ لیتا ہے' وہی حال ہے ان کا غم نداری بز بخر (غم نہ رکھے تو بکری خرید) مگر اس وقت تو بوجہ مذاق بدل جانے کے ان کو ان تعلقات و قیود کی کلفت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا گو حقیقت اب بھی معلوم ہے ایسا بے حس کوئی نہیں ہو سکتا جس کو کلفت کا کلفت ہونا بھی معلوم نہ ہو مگر چونکہ زیادت انہماک سے اب ان کی عادت ہو گئی ہے اس لئے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا (جیسے کسی شخص کے دو تین سال تک کھجلی رہے تو عادت کی وجہ سے اس کو کلفت کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا ابتدا میں تھا اب اسے ہر وقت کھجلانے ہی میں مزا آتا ہے مگر حقیقت تو اُسے بھی ضرور معلوم ہے ۱۲ جامع) مگر جب اہل دنیا مرنے لگتے ہیں اس وقت حقائق پوری طرح منکشف ہوتی ہیں اور ان کا عذاب ہونا معلوم ہو جاتا ہے اس وقت تو وہ ان تعلقات سے خوش نظر آتے ہیں اور آزادلوگوں پر ہنستے ہیں مگر جب پردہ اٹھے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ جن تعلقات سے ہم نے دل لگایا تھا وہ مار آستین تھے۔ بس وہی قصہ ہوگا ؎

کہ با کہ باختہ عشق درشب دیجور

(کس کے ساتھ محبت میں مشغول ہوا اندھیری رات میں)

کوئی شخص اندھیری رات میں کسی عورت سے مشغول ہوا اس وقت تو وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتا رہا کہ میں حسین پری پیکر کو بغل میں لئے ہوئے ہوں مگر جب صبح ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ ساری رات ایک بڑھیا چڑیل کے ساتھ مشغول رہا تھا۔

اب اس کی حسرت قابل دید ہے کہ وہ اپنے اوپر ہزار نفریں کرتا ہے اور رات کے قصہ کو یاد کر کے اُسے خود قے آتی ہے۔ خوب کہا ہے ؎

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ

اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

(غبار ہٹ جانے دو تم کو عنقریب پتہ چل جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

ایک شخص آندھی غبار میں گدھے پر سوار ہے اور کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں، دوسرا شخص متنبہ کرتا ہے کہ کمبخت تو گھوڑے پر سوار نہیں بلکہ گدھے پر سوار ہے مگر وہ ایک نہیں سنتا اور ناصح کو بے وقوف بتلاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اچھا بھائی تو یہی سمجھتا رہ ابھی غبار کھلنے پر تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیری ران کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

اسی طرح جو لوگ تعلقات دنیا میں پھنسکر خوش ہیں اور ان کو راحت سمجھتے ہیں اُن سے عارفین یہی کہتے ہیں "فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ" (غبار ہٹ جانے دو عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا) حق تعالےٰ اہل دنیا کے ان ہی تعلقات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ یعنی اے مخاطب تجھے ان منافقین کے اموال واولاد (اور دنیوی ترقی وعروج ۱۲) اچھے نہ معلوم ہونے چاہئیں۔ کیونکہ حق تعالےٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں۔ (اور ان کی جان کفر کی حالت میں نکل جائے) واقعی اہلِ دنیا کے لئے تو مال واولاد عذاب ہی ہے کیونکہ ان کو ان چیزوں سے تعلق اس قدر ہوتا ہے کہ مارے فکر کے رات دن نیند نہیں آتی ہر وقت اسی توڑ جوڑ میں لگے رہتے ہیں کہ آج اتنے روپے ہیں کل کو اتنے ہو جائیں گے۔ فلاں پر اتنا قرض ہے اُس کا اتنا سود آئے گا۔ رات کو سوتے ہیں تو روپیوں کے فکر سے بار بار آنکھ کھل جاتی ہے تو یہ خاک راحت ہے، وبالِ جان ہے

بعضوں کو اولاد سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے ان کے لئے کبھی زمین خریدتے ہیں کبھی باغ لگاتے ہیں کبھی جائداد بڑھاتے ہیں جس میں سیکڑوں مقدمے کرنے پڑتے ہیں، وصول باقی کے لئے رات دن نالشیں ہوتی ہیں گرمی اور برسات میں مصیبت کے ساتھ سفر کرتے ہیں پھر ذرا کسی بچہ کا کان گرم ہوگیا تو بھاگے بھاگے پھرتے ہیں نہ کھانے کے نہ پینے کے نہ نماز کے۔ روزہ کے ہر وقت فکر میں گھلے جاتے ہیں مسلمان کو تو خدا پر بھی نظر ہوتی ہے کافر تو ہر وقت بے چین رہتا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم اموال و اولاد سے ان منافقین کو دنیا میں عذاب دینا چاہتے ہیں تو یہ کیا تھوڑا عذاب ہے اور یہ عذاب دنیا میں ہی ہوتا ہے آخرت کا عذاب الگ ہے۔ پس اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا (حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں) میں دنیوی عذاب ہی مراد ہے آخرت کا عذاب مراد نہیں کیونکہ جس کا ذکر دوسرے جملہ میں ہے وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (اور ان کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جائے) یعنی ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ساری عمر انہی تعلقات میں گرفتار رہیں ان سے خلاصی نصیب نہ ہو حتیٰ کہ اس حالت میں ان کو موت آجاوے اور کافر ہو کر مریں۔ تو کفر کی حالت میں مرنا یہ آخرت کا عذاب ہے۔ اس لئے يُعَذِّبَهُمْ بِهَا (ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں) میں دنیوی عذاب مراد ہونا چاہیئے ورنہ جملہ ثانیہ کو پہلے کی تاکید ماننا پڑے گا اور تاسیس تاکید سے اولیٰ ہے۔ دوسرے اموال و اولاد کا دنیا ہی میں وبال جان ہونا مشاہد ہے یہ بھی اس کو مقتضی ہے کہ اس عذاب کا بھی آیت میں ذکر ہو۔ تیسرے عذاب آخرت کا ذکر تو موت علی الکفر کے بعد ہونا مناسب ہے کیونکہ وہ موت کے بعد ہی ہوگا اور یہاں ذکر موت سے پہلے عذاب کا ذکر ہے تو ظاہر یہی ہے کہ اس سے دنیوی عذاب مراد ہے فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (تم کو اچھے نہ معلوم ہوں ان کے اموال و اولاد کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو دنیا میں عذاب دیں) آیت میں تو

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (دنیا کی زندگی میں) کی قید خود ہی مذکور ہے میں نے خواہ مخواہ اتنی کوشش کی عذاب دنیوی کے مراد لینے میں یہاں تو تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اموال واولاد سے حیوۃ دنیا میں بھی ان کو عذاب دینا چاہتے ہیں مجھے فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کا لفظ یاد نہ رہا عجیب بات ہے حالانکہ بحمد اللہ میں حافظ بھی ہوں مگر خیر کچھ حرج نہیں اس تقریر سے یہ فائدہ ہوا کہ یہ مسئلہ نقلاً و عقلاً دونوں طرح ثابت ہو گیا اگر آیت میں فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (دنیا کی زندگی میں) کی قید نہ بھی ہوتی جب بھی دلائل سے یہاں عذاب دنیا کا مراد ہونا ثابت ہوتا تو اس جملہ کے بھول جانے میں بھی فائدہ ہی ہوا کہ حق تعالیٰ نے وہ دلائل قلب میں القا فرما دیئے جن سے اس قید کی ضرورت و حکمت معلوم ہو گئی بہر حال نص سے ثابت ہو گیا کہ یہ تعلقات حقیقت میں عذاب ہیں گو فساد مذاق کی وجہ سے کسی کو اس کا احساس نہ ہو علامہ غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اہل علائق کو مرتے وقت سخت تکلیف ہوتی ہے اور چونکہ مرنے کے بعد بھی روح کو ان چیزوں سے تعلق رہتا ہے جن سے دنیا میں تعلق تھا بلکہ موت کے بعد بوجہ قوت ادراک کے یہ تعلق قوی ہو جاتا ہے تو مفارقت جسم کے بعد روح کو ان علائق کی مفارقت سے ایسی اذیت ہوتی ہے جیسے عذاب جہنم اس کا یہ مطلب نہیں کہ عذاب قبر اور عذاب جہنم کی حقیقت یہی اذیت روحانی ہے جیسا کہ فلاسفہ نے سمجھا ہے بلکہ علامہ غزالیؒ کا مطلب یہ ہے کہ عذاب قبر و عذاب جہنم کے علاوہ اہل علائق کو ان تعلقات کی مفارقت سے بھی سخت اذیت ہوتی ہے اور وہ اذیت عذاب جسمانی سے بدرجہا زائد ہے بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح نعیم جنت اعمال صالحہ و علائق محمودہ کی صورت ہے اسی طرح عذاب قبر و عذاب جہنم اعمال سیئہ و علائق مذمومہ کی صورت ہے لیکن اس سے عذاب جسمانی کی نفی لازم نہیں آتی اور جن لوگوں نے علامہ غزالی کے کلام کا یہ مطلب سمجھا ہے وہ غلطی پر ہیں امام کا یہ مطلب ہرگز نہیں اور اہل اللہ چونکہ آزاد ہوتے ہیں اس لئے ان کی روح اس اذیت سے محفوظ ہے۔ اہل اللہ کو صرف ایک قید ہے یعنی فکر آخرت مگر یہ قید خود لذیذ ہے

جس سے وہ خلاصی نہیں چاہتے وہ قید تو اس کا مصداق ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی زبند
شکارش بجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اس کا شکار کمند سے خلاصی نہیں چاہتا)

اور قدسی فرماتے ہیں ؎

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آب حیات
ضاعف اللہ بہ کل زماں عطشی

(اور اس آب حیات سے میرا سیر ہونا مصلحت نہیں ہے اللہ تعالیٰ اس کی ہر زمانہ میں پیاس زیادہ کرے)

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر محبوب کی زلف کی زنجیر کے سوا دوسو زنجیر بھی لاؤ تو میں ان کو توڑ ڈالونگا)

اہل اللہ کو علائق دنیا میں انہماک نہیں ہوتا اور نہ ان کے قلب کو ان سے لگاؤ ہوتا ہے اگر ظاہر میں عارف علائق میں مشغول بھی ہو تو اُس کا قلب اُن سے فارغ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا امتحان لینا چاہا، کیونکہ ان کے یہاں حشم و خدم اور ساز و سامان بہت کچھ تھا تو اس شخص نے خیال کیا کہ یہ تو بظاہر بہت ہی مشغول ہیں شاہی کارخانہ اور امیرانہ انتظام ہے دیکھو ان کا باطن کیسا ہے۔ تو اس نے ایک دن آکر عرض کیا کہ حضرت میں حج کو جانا چاہتا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ آپ کے ہمراہ چلوں، فرمایا بسم اللہ چلو اور یہ کہکر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اس شخص نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو بہت ہی جلدی تیار ہو گئے اس کارخانہ کا تو کچھ انتظام کر دیجئے۔ فرمایا یہ کارخانہ میرا تھوڑا ہی ہے حق تعالیٰ کا ہے وہ خود انتظام کریں گے میرے اوپر اُن کا کام اٹکا ہوا نہیں ہے جب میں

نہ ہوں گا وہ کسی دوسرے سے یہ کام لے لیں گے۔ اب توشاہ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں کہنے لگے کہ تھوڑا سا توقف فرمائیے میں ذرا گھر سے کمبل لے آؤں فرمایا بس اسی برتے پہ امتحان لینے آئے تھے، میں نے تو اتنے بڑے کارخانہ پر بھی نظر نہ کی اور تم ایک کمبل سے بھی نظر قطع نہ کرسکے۔ تو بات یہ تھی کہ ان کے دل کو ایک کے سوا کسی سے تعلق نہ تھا اور اس ایک قید کے سوا اُن کو کوئی قید نہ تھی اب لوگ اس قید سے تو آزادی چاہتے ہیں جو لذیذ ہے اور ان قیود کو خریدتے پھرتے ہیں جو مصیبت ہیں شاید یہاں کسی کو شبہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو جب دنیوی اسباب سے تعلق نہیں ہوتا تو چاہیئے ان سے مفارقت سہل ہو پھر ان کا نزع کیوں شدید ہوتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں بہت شدت ہوئی حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع دیکھ کر اس کی تمنا نہیں کرتی اسی طرح بعض اولیاء کو بھی نزع شدید ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے تو بات یہ ہے کہ شدت نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں جس قدر روح کو ناسوت سے تعلق ہوگا اسی قدر نزع میں شدت ہوگی۔ مگر تعلقات دو قسم پر ہیں ایک وہ جو مانع عن الآخرت ہیں جیسے جائداد اور مال وغیرہ کی محبت ان سے جو شدت ہوتی ہے اُس سے تکلیف سخت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ تعلقات ہیں جو آخرت سے مانع نہیں ہیں بلکہ معین آخرت ہیں اور یہ وہی تعلقات ہیں جو اس کے مصداق میں داخل ہے ؎ "اسیرش نخواہد خلاصی زبند" (اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا) اس کی تعیین عنقریب آتی ہے۔ ان سے بھی نزع میں شدت ہوتی ہے مگر اس سے روحانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ شدت لذیذ ہوتی ہے کیونکہ اس کا منشا قید لذیذ ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بجز ذاتِ حق کے کسی سے نہیں ہوتا اور اس کا مقتضا سہولت نزع ہے مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد خلق و تربیت طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے اور یہ بدون توجہ الی الخلق کے نہیں ہوسکتی اس لئے ان کو امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ اور

اصلاح وارشاد کے لئے ان سے ایک گونہ تعلق ہوجاتا ہے اور یہ تعلق چونکہ بامر حق ہے اس لئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا بلکہ موجب اجرا ورسبب ترقی ہے جس سے جس قدر اصلاح وارشاد کا فیض ہوگا اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہوگا چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کے ساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور انبیاء میں بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد سب سے زیادہ یہ خدمت تھی کیونکہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے آپ ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنیوالا نہیں تو آپ کو سب سے زیادہ ارشاد واصلاح کی فکر واہتمام تھا اس لئے آپ کو نزع میں شدت زیادہ ہوئی کیونکہ روح کو امت کے ساتھ تعلق تھا اور وصال کے وقت بھی آپ کو اُن کا اہتمام تھا مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوش گوار تھا۔ آپ کے لئے اس میں اجر اور ترقی درجات تھی اس لئے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوئی مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ انبیاء کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد وتبلیغ ہوتی ہے ان کو بھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے مگر ان کو انبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی کیونکہ ان کی ذمہ داری انبیاء کے برابر نہیں ہے اس لئے ان کو مخلوق کے ساتھ اصلاح وارشاد کا تعلق بھی ان سے کم ہوتا ہے اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں ان کو نہ کسی کی فکر ہے نہ کسی سے تعلق ہے۔ ان کا نزع بہت سہل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑے شاداں وفرحاں ہوتے ہیں۔ بعضے غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں، بعضے ہنستے ہوئے جان دیتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم	راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے	تادر میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جان طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہوجائے تو خوش وخرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)

(بقیہ حاشیہ: [illegible])

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم
جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وہ وقت آگیا ہے کہ میں عریاں ہوں جسم چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں)

ان کی یہ حالت دیکھ کر بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان اولیاء سے افضل ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد ہے کیونکہ وہ موت کے وقت ان کی برابر بے فکر نہیں ہوتے ان کو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کو نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے مگر یہ اعتقاد افضلیت صحیح نہیں بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں جو صاحب ارشاد ہیں کیونکہ ان کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہے اور جو جتنا انبیاء کے مشابہ ہوگا وہ دوسروں سے افضل ہوگا لیکن تم کو اس تجویز کا حق نہیں ہے کہ اپنے لئے صاحب ارشاد ہونے کی تمنا کرو۔ بس بادشاہ کو اختیار ہے کہ تمہارا امتحان لے کر جو عہدہ جس کو چاہے دیدے جس کو چاہے تحصیلدار بنادے، جس کو چاہے ڈپٹی کلکٹر بنادے اور اسے یہ بھی اختیار ہے کہ کسی کو کوئی عہدہ بھی نہ دے بلکہ اس کو اپنا مصاحب بنالے محمود غزنوی کو اختیار تھا کہ ایک کو حسن میمندی بنادے اور ایک کو ایاز بنادے۔ حسن میمندی کے سپرد قلمدان وزارت تھا سلطنت میں تصرف کرنے کا بڑا اختیار اسے دیا گیا تھا اور ایاز کو اختیار کچھ نہ تھا مگر تقرب اتنا تھا کہ حسن میمندی کو باوجود سب اختیارات کے وہ تقرب حاصل نہ تھا بعض دفعہ یہ نوبت آئی تھی کہ محمود سے بات کرنے کی ایاز کے سوا کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی اس وقت میمندی بھی ایاز کی خوشامد کرتا تھا کہ بادشاہ تک یہ بات پہنچادو حالانکہ

ضروری اطلاع :- خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

یہ وہ شخص ہے جسے سلطنت میں کوئی بھی عہدہ حاصل نہیں اور امور سلطنت میں ایک پیسہ کا تصرف بھی اس کے اختیار میں نہیں مگر تقرب کی یہ حالت ہے پس سالک کو اپنے لئے کسی تجویز کا حق نہیں خدا تعالیٰ کے سپرد کردو اپنے آپ کو وہ جو چاہیں کریں خواہ صاحب سلسلہ بنادیں یا درباری بنالیں ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل او اندر دلش انداختند

(جس کسی شخص کو کسی کام کے لئے مقرر کرتے ہیں اسی کی طرف میلان اس کا اس کے دل میں ڈال دیتے ہیں)

سرکاری باغ میں جو درخت بھی ہے عمدہ ہی ہے کوئی درخت آم کا ہے جسے سے مخلوق کو نفع ہوتا ہے اور کوئی درخت گلاب کا ہے جس کے پھولوں کو خاص بادشاہ کی میز پر لاکر رکھا جاتا ہے کسی کو اس کے توڑنے کی اجازت نہیں پھر تم کون ہو جو آم ہی کا درخت بننا چاہو گلاب نہ بننا چاہو اسی باغ میں بلبل بھی ہے جس کا کام بجز نالہ وآہ زاری کے کچھ نہیں مگر سب کے سب اسی باغ کے رہنے والے ہیں ان میں کوئی ناقص نہیں سب کامل ہی ہیں گو حالات مختلف ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(پھول کے کان میں کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا کہ گریہ وزاری میں ہے)

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست — ور بجہل آئیم ما زندان اوست
گر بخواب آئیم مستان وئیم — ور بہ بیداری بدستان وئیم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہوجائے تو یہ ان کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے حضرت سے عطا ہوا اور اگر جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے

یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سورہیں تو ان ہی کے لیے بیہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں)

ان کو اختیار ہے جس حال میں چاہیں رکھیں۔ جب وہ اپنا بنالیں گے تو ہر حال میں تم ان ہی کے کہلاؤ گے اور جس کو وہ اپنا بنالیتے ہیں وہ ناقص نہیں رہتا وہ کامل ہی ہوتا ہے۔ گو حالات اور مذاق میں تفاوت ہو چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے مذاق و حالات و کیفیات میں بھی باہم تفاوت ہے مگر ان میں کوئی ناقص نہیں سب کامل ہیں گو بعضے اکمل ہوں مگر بعض کی اکملیت کسی کے نقص کو مستلزم نہیں کامل سب ہیں۔ اور یہاں سے میں ایک بات پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ کہ آج کل ایک سیرت نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) شائع ہوئی ہے جس کو تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبولیت حاصل ہے لوگ شوق سے اس کو خریدتے ہیں کیونکہ کاغذ چکنا اور لکھائی عمدہ ہے، ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن بھی ایسا ہی ہوگا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کسی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت ہے۔ کیونکہ کمالات نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس میں بحث ہی نہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر بادشاہ کی سوانح عمری ہے زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر و انتظام ہی کا پہلو دکھلایا گیا ہے اور اگر کسی جگہ اتفاق سے آپ کے کمالات نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر بھی ہے تو غضب یہ کیا ہے کہ دوسرے انبیاءؑ میں نقص نکالا گیا ہے۔ چنانچہ شروع ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات کے جامع تھے اور دیگر انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع نہ تھے کسی میں کوئی صفت تھی کوئی نہ تھی۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ وہ رحم سے خالی تھے اور دلیل میں یہ واقعہ پیش کیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے لئے سخت بددعا کی تھی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (اے پروردگار زمین پر کفار میں سے کسی بسنے والے کو نہ چھوڑیئے سب کو تباہ کر دیجئے ۱۲ جامع) یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ نبی کو رحم سے خالی کہا جائے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○ رہی دلیل تو اس کا جواب خود نص میں موجود ہے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو سمجھایا۔ غور کیجئے کہ سمجھانے کی بھی کوئی حد اتنی مدت تک ان کی اذیتوں پر صبر کرنا تھوڑی بات ہے ذرا کوئی کہہ کے تو دکھلائے نوسو برس تو کیا نو ہی برس میں حقیقت معلوم ہو جائے گی تو نوح علیہ السلام کا یہ تھوڑا رحم ہے کہ اتنی مدت تک قوم کی بدحالی اور ایذا رسانی پر صبر کرتے رہے اور بددعا نہ فرمائی۔ اس مدت کے بعد اگر وہ از خود بھی بددعا فرماتے تو اس کو بے رحمی نہیں کہہ سکتے تھے چہ جائیکہ انھوں نے خود بددعا نہیں فرمائی بلکہ جب ان کو وحی سے معلوم ہو گیا کہ اب ان میں سے کوئی ایمان نہ لائیگا اور ان کی تقدیر میں کفر ہی پر خاتمہ لکھا ہے اس وقت دعا فرمائی۔ بتلایئے جب ایک قوم کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے تو اس وقت ان کا باقی رہنا بہتر ہے یا ہلاک ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی بقا میں کچھ فائدہ نہیں بلکہ اندیشہ فساد ہے کہ یہ دوسروں کو بھی غارت کریں گے۔ اس وقت ان پر بددعا کرنا بے رحمی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں رحم ہے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی بددعا میں اس بات کو ظاہر فرما دیا تھا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (خداوندا اگر آپ اُن کو زندہ چھوڑیں گے تو یہ آپ کے دوسرے بندوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور کافر فاجر کے سوا کسی کو نہ جنیں گے) اور یہ بات نوح علیہ السلام نے اپنے قیاس سے نہیں فرمائی بلکہ وحی سے ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب

ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی بھی ایماندار نہ ہوگا وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (اور نوحؑ کے پاس وحی بھیجی گئی کہ سوا ان کے جو ایمان لا چکے ہیں اور کوئی تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لاوے گا سو جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں غم نہ کرو)

تو بتلایئے اس حالت میں اگر نوح علیہ السلام ان کے لئے بددعا نہ فرماتے تو اس کا انجام کیا ہوتا، ظاہر ہے کہ اُس وقت تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی مسلمان بہت ہی کم معدودے چند تھے اور کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ ان کی اولاد میں کوئی مومن ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا کہ سب ایمان دار ہی ہوں گے بلکہ ان میں بھی ایمان دار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونے والے تھے۔ بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہونے والا تھا۔ اب اگر اُس زمانہ کے کافر غرق نہ کئے جاتے اور ان کی اولاد بھی اس وقت موجود ہوتی تو مسلمانوں کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔

(احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں، جب تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اس قدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آرہا ہے تو دنیا بھر کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا، خصوصاً جبکہ ان کفار کی اولاد میں مسلمان کوئی نہ ہوتا سب کافر ہی ہوتے اس مقدمہ کے ملانے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بددعا کی ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آجاتی اور ان کو جینا محال ہو جاتا ۱۲)

غرض اس سیرت کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے ایسی سخت بددعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے

مگر اس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا کہ ان کی یہ بددعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل ہے سراسر رحم تھی ورنہ میاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دوبھر ہوجاتا۔ یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام میں تمدن وسیاست کا مادہ نہ تھا۔ نہ معلوم اس کے پاس کونسی وحی آگئی تھی (یا اس نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کا چہرہ دیکھ کر قیافہ سے پہچان لیا تھا کہ ان میں یہ مادہ ہے اور وہ مادہ نہیں ۱۲) کچھ نہیں اس اعتراض کا منشا صرف یہ ہے کہ عیسٰی علیہ السلام نے اپنی زندگی میں سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا اس سے ان حضرت نے یہ استنباط کرلیا کہ ان میں یہ مادہ ہی نہ تھا: حالانکہ عدم ظہور شئے ظہور عدم کو مستلزم نہیں بھلا اگر کسی شخص کو زندگی بھر روپیہ تقسیم کرنے کا موقعہ نہ ملے تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں سخاوت کا مادہ نہیں ذرا اس کے ہاتھ میں روپیہ دیکر دیکھو اگر پھر بھی وہ سخاوت نہ کرے اس وقت تم کو اس بات کا حق ہے ورنہ دعوےٰ بلا دلیل ہے۔ اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اگر سلطنت کا موقعہ ہی نہ ملا تو اس سے ان کا تمدن وسیاست سے خالی ہونا کیسے لازم آگیا اور تم نے کیونکر سمجھ لیا کہ ان میں انتظامی قابلیت نہیں یہ بات توجب چل سکتی تھی کہ ان کو سلطنت کا موقعہ ملتا اور پھر انتظام نہ کرسکتے۔ پس اس شخص کا اعتراض تو لغو ہوگیا۔

اب میں ثابت کرتا ہوں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام میں تمدن وسیاست اور انتظامی قابلیت بدرجہ کمال موجود ہے گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا اَنْزَلَ فِیْکُمْ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ عَدَلاً مُقْسِطًا (اوکما قال) تمہارا کیا حال ہوگا اس وقت جبکہ عیسٰی بن مریم علیہما السلام تمہارے اندر (آسمان سے) نازل ہوکر آویں گے۔ عادل ومنصف ہوکر حکومت کریں گے

تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سے مسرت ظاہر فرمائی ہے جبکہ عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے اور آپ ان کے متعلق عدل واقساط کی خبر دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ عدل و انصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہوسکتا، عدل وہی کر سکتا ہے جس میں سیاست کا مادہ بدرجہ کمال موجود ہو۔

نیز احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس وقت بہت امن وامان اور خیر و برکت ہوگی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے، اگر ان میں فی نفسہ یہ مادہ موجود نہیں تو اس وقت کیونکر سلطنت کا انتظام کریں گے۔ پس معلوم ہوا کہ اس شخص نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے وہ نہایت لغو ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ثابت کرنے کا یہ کونسا طریقہ ہے کہ آپ کے بھائیوں میں نقص نکالا جائے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہوسکتے ہیں۔ یاد رکھو انبیاء علیہم السلام سب کامل ہیں ان میں ناقص کوئی نہیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکمل ہیں تفاضل بین الانبیاء (انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت دینے) سے اسی واسطے منع کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں۔

الغرض انبیاء علیہم السلام کے مذاق باہم مختلف ہیں مگر کامل سب ہیں اور ہر ایک کا مذاق خدا تعالےٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ اسی طرح صوفیہ نے تفاضل بین الاولیاء (اولیاء کرام کے درمیان فضیلت دینے) سے بھی منع کیا ہے کیونکہ اولیاء اللہ بھی سب مقبول ہیں اور جس کا جو مذاق ہے وہ خدا تعالےٰ کو پسند ہے، ان میں بھی باہم تفضیل کا کسی کو حق نہیں کمالات سے خالی کوئی ولی نہیں یہ اور بات ہے کہ کسی کمال سے حق تعالےٰ نے کام لے لیا اور کسی کمال کو

مخفی رکھا اس سے کام نہیں لیا کسی کو صاحب ارشاد بنا دیا اس سے ہدایت خلق کا کام لیا کسی کو صاحب ارشاد نہیں بنایا اسے گم نام رکھا مگر قابلیت ارشاد سے وہ بھی خالی نہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین کے لئے تو سلطنت تجویز کرتے ہیں اور اپنی زندگی میں بعض لوگوں سے یہ فرماتے ہیں کہ اگر میں نہ ملوں تو اس معاملہ کو ابوبکر (رضی اللہ تعالےٰ عنہ) کے پاس لانا وہ فیصلہ کر دیں گے (وغیرہ وغیرہ)

اور حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یَا اَبَا ذَرٍّ اِنِّیْ اُرٰیكَ ضَعِیْفًا وَّاِنِّیْ اُحِبُّكَ وَاِنِّیْ اُحِبُّ لِنَفْسِكَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِیْ لَا تَفْصِلَنَّ بَیْنَ اِثْنَیْنِ وَلَا تَلِیَنَّ مَالَ یَتِیْمٍ (اوکماقال)

(اے ابوذر میں تم کو کمزور دیکھتا ہوں اور تمہارے لئے اور تمہارے نفس کے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے نفس کے لئے پسند کرتا ہوں نہ دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرنا نہ مال یتیم کا ولی بننا)

ان کو دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے سے منع فرماتے ہیں اور مال یتیم کی حفاظت سے روکتے ہیں اور حضرات شیخین کے تمام دنیا کے قضایا کا فیصلہ سپرد فرماتے ہیں تو کیا حضرت ابوذر ناقص تھے، کیا ان میں قوت فیصلہ نہ تھی یا وہ مال یتیم کی حفاظت نہ کر سکتے تھے۔ کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کیونکہ جس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھ لیا ہو اور آپ کی صحبت میں رہا ہو وہ ناقص نہیں رہ سکتا خصوص جس شخص سے آپ کو محبت ہو وہ ناقص رہے ایسا نہیں ہوسکتا مگر پھر بھی آپ حضرات شیخین سے جو کام لیتے ہیں حضرت ابوذر سے وہ کام نہیں لیتے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صاف فرما دیا ہے اِنِّیْ اُرٰیكَ ضَعِیْفًا کہ میں تم کو ضعیف پاتا ہوں اس لئے آپ نے ان کو قضا اور تولیت مال یتیم سے منع فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) میں نقص تھا اور ان میں

قضایا تولیت مال یتیم کا مادہ ہی نہ تھا میں کہتا ہوں کہ ضعف سے نقص لازم نہیں آتا، دیکھو بچہ ضعیف تو ہوتا ہے کہ بالغ کی برابر اس کے اعضاء میں قوت نہیں ہوتی لیکن اگر وہ تام الاعضاء ہے تو اسے ناقص نہیں کہا جا سکتا۔ ناقص وہ ہے جس کے آنکھ نہ ہو یا ہاتھ کٹا ہوا ہو یا پیر سے لنگڑا ہو۔ لیکن جو بچہ تندرست ہو اور اس کے سب اعضاء سالم ہوں ان سے ناقص نہیں کہہ سکتے بلکہ اپنی ذات کے لحاظ سے وہ کامل ہی کہلائے گا۔ گو ضعیف ضرور ہے۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ضعیف فرمانے سے حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا اگر وہ ناقص ہوتے تو آپ ان کو فقید فرماتے (یعنی فقید القوی) یا فقیر فرماتے مگر آپ تو ضعیف فرماتے ہیں پھر اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ میں استعداد قضاء و قابلیت تولیت یتیم نہ تھی۔

دیکھئے محققین کا مذہب ہے کہ ایمان، زیادت و نقص کو قبول نہیں کرتا اور شدت و ضعف کو قبول کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضعف کا مقابل شدت ہے نہ کہ زیادت نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ضعف اور نقص ایک نہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے۔ پس حضرات صحابہ میں زائد و ناقص کوئی نہیں بلکہ سب کامل ہیں اور جو کمالات حضرات شیخین میں تھے وہ ہر صحابی کے اندر مجتمع تھے البتہ شدید و ضعیف کا فرق ضرور ہے۔ اگر حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ میں ان امور کی قابلیت ہی نہ ہوتی تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو ان سے منع فرمانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نہ رسم پرست تھے نہ جاہل تھے اگر ان میں ان کاموں کی قابلیت نہ ہوتی تو وہ خود ہی یہ کام نہ کرتے کیونکہ عدم قابلیت کے ساتھ کسی کام میں ہاتھ ڈالنا یا تو جہالت سے ہوتا ہے کہ اپنی ناقابلیت کی خبر ہی نہ ہو یا رسم پرستی سے ہوتا ہے کہ اپنی ناقابلیت کا علم ہے مگر انکار کرنے میں ہیٹی سمجھتا ہے۔ حضرت ابوذر

ان دونوں باتوں سے منزہ تھے۔ اگر کسی کام کی قابلیت ان میں نہ ہوتی تو وہ ہرگز اس کام کو ہاتھ نہ لگاتے۔ پس حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو منع کرنا اس کی دلیل ہے کہ ان میں قابلیت ضرور تھی مگر آپ نے اس قابلیت سے کام لینا نہیں چاہا بلکہ اِنِّیْ اُرٰیكَ ضَعِیْفًا (میں تم کو ضعیف پاتا ہوں) فرما کر اس قوت کو ممنوع الاستعمال کردیا (اور ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ اگر بالفرض حضرت ابوذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ میں قابلیت بھی نہ ہوتی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے قضار و تولیت کا کام لینا چاہتے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کے بعد ان میں معًا قابلیت پیدا ہوجاتی کیونکہ آپ کی شان یہ ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اس کا کہنا خدا کا کہنا ہووے اگرچہ بندہ کے زبان سے نکلا ہو)

اور حق تعالےٰ کی شان یہ ہے ؎

داد او را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرط قابلیت داد اوست

(اس کے دین کے لئے قابلیت شرط نہیں ہے۔ بلکہ قابلیت کی شرط اس کی دادودہش ہے)

مگر آپؐ نے ان سے یہ کام لینا چاہا ہی نہیں ۱۲)

اسی کو میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ سالکین کو اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرنا چاہیے حق تعالےٰ جو چاہیں گے تمہارے لئے خود تجویز فرمادیں گے۔ بعض سالکین اپنے لئے مشیخت تجویز کرتے ہیں اور ذکر و شغل سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی وقت شیخ و مقتدا بن کر مخلوق کی اصلاح کریں گے۔ یاد رکھو جس کیلئے ابھی تک شیخ نے مشیخت تجویز نہیں کی اس کے لئے اس کا خیال کرنا بھی گناہ ہے

جیساکہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے لئے قضاء بین الاثنین اور تولیت مال یتیم گناہ تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے تجویز نہیں فرمایا تھا اسی لئے سالک کو شیخ کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہونا چاہیئے اگر وہ مستحبات سے بھی منع کرے تو انقیاد و اطاعت ہی کرنا چاہیئے۔ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں مشائخ پر کہ یہ مستحبات سے روکتے ہیں مگر وہ کریں تاویل حضرت ابوذر کے قصہ میں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو قضاء و تولیت مال یتیم سے منع فرمایا حالانکہ قضاء فرض کفایہ ہے اور تولیت مال یتیم بھی جبکہ اس کا حق ادا کرسکتا ہو اور یقیناً حضرت ابوذر اگر کسی یتیم کے مال کی حفاظت کرتے تو ایسی احتیاط سے کرتے جس کی حد نہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرمادیا پھر مشائخ پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے اگر وہ کسی کو روک دیں کہ تم اصلاح خلق اور نفع رسانی مخلوق کا وسوسہ نہ لاؤ۔

اور سنئے جنگ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو تو حکم دیا جہاد کا کہ صف بندی کر کے کفار کا مقابلہ کریں تلواریں چلائیں اور ایک جماعت کو حکم دیا کہ مورچہ پر خاموش بیٹھے رہیں وہاں سے ہرگز نہ ہٹیں اور لڑائی میں شریک نہ ہوں ہاتھ تک نہ ہلائیں گویا ظاہر میں ان کو جہاد سے روک دیا مگر حقیقت میں ان کا یہی جہاد تھا۔ اس جماعت کے لئے میدان میں آکر تلوار چلانا گناہ تھا چنانچہ جنگ احد میں جو فتح کے بعد شکست ہوئی حق تعالےٰ نے اس کا ایک سبب یہ بھی بتلایا ہے کہ اس مورچہ والی جماعت نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی اس لئے ہم نے فتح کے بعد تم کو شکست دیدی وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ ۝ (اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دلخواہ بات دکھادی تھی)

ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہم جہاد میں شریک نہیں ہوئے ہمیں بھی کچھ کرنا چاہیئے اس لئے بعضے مورچہ سے ہٹ کر میدان میں آگئے اور مال غنیمت پر قبضہ کرنے لگے مگر

یہ ان کے لئے گناہ شمار ہوا گو دوسروں کے حق میں بڑا کام تھا مورچہ والوں کے لئے یہی جہاد تھا کہ حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں بٹھلادیا تھا وہیں چپ چاپ بیٹھے رہتے وہ اس خاموشی ہی میں جہاد والوں کی برابر تھے یہاں سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ ترقی کا مدار اعمال ظاہرہ کی زیادتی پر نہیں بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اعمال ظاہرہ کم کرتے ہیں مگر ان کی ترقی ہوتی جاتی ہے کیونکہ ان کے اعمال باطنہ زیادہ ہوتے ہیں جیسے یہ مورچہ والے بظاہر کچھ نہیں کر رہے تھے مگر ثواب میں جہاد کرنے والوں کے برابر تھے اسی طرح صوفیہ میں ایک جماعت قلندر کہلاتی ہے وہ ظاہر میں فرائض و واجبات کے سوا کچھ زیادہ کام نہیں کرتے مگر برابر ان کی ترقی ہوتی رہتی ہے کیونکہ اعمال باطنہ ان کے زیادہ ہوتے ہیں وہ ہر وقت تفکر اور تدبر میں رہتے ہیں قلب کو خدا تعالیٰ سے مشغول رکھتے ہیں اس لئے برابر ترقی میں رہتے ہیں اسی طرح بعض لوگ صاحب ارشاد نہیں ہوتے ان کا یہ مذاق ہوتا ہے ؎

احمد تو عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کار

دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام محبوب کا دیوانہ ہو سلسلہ ہو یا نہ ہو)

ظاہر میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے فیض تو ہوا ہی نہیں یہ کیسے بزرگ ہیں مگر باطن میں وہ حق تعالیٰ کے ایسے مقرب ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ صاحب ارشاد بھی ایسے مقرب نہیں ہوتے اس لئے سالک کا مذاق عاشقانہ ہونا چاہیے اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرے کیسی مشیخت کیسا سلسلہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مرید کسی شیخ کی خدمت میں برسوں ذکر و شغل کرتا رہا مگر نفع نہ ہوتا تھا راستہ کھلتا ہی نہ تھا، شیخ سے شکایت کرتا وہ ذکر و شغل میں کچھ ترمیم یا اضافہ کر دیتے جب کسی طرح اس کو نفع نہ ہوا اور شیخ بھی تدبیر کرتے کرتے تھک گئے تو ایک دن انہوں نے مرید سے پوچھا کہ میاں یہ تو بتلاؤ

ذکر و شغل سے تمہاری نیت کیا ہے کہنے لگا میری نیت یہ ہے کہ میں اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔ شیخ نے فرمایا کہ یہی چور گھسا ہوا ہے جس نے سارے ذکر کو برباد کر رکھا ہے۔ اس خیال سے توبہ کر تو تو شرک میں مبتلا ہے ؎

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　تا راہ بیں نباشی تو کے راہبر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق　　ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(اے بے خبر کوشش کر کہ تو خبردار ہو جائے جب تک راستہ کا دیکھنے والا نہ ہوگا راہبر نہیں بن سکتا ادیب عشق کے سامنے حقائق کے مدرسہ میں اے لڑکے کوشش کر کہ کسی باپ یعنی شیخ بھی بن جائے گا)

زمانہ پسری ہی میں باپ بننے لگے صاحب پہلے بیٹا تو بن لو بعد ہی میں باپ بننے کا خیال کرنا یہ کیا کہ بیٹا بننے سے پہلے ہی باپ بننے لگے اس لئے میں بار بار کہتا ہوں کہ سالکین کے لئے خیال مشیخت گناہ اور سدِّ راہ ہے تم ہرگز اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرو بس تفویض کر دو حضرت حق کے اور حضرت حق کے سپرد کرنا یہ ہے کہ ان کے نائبین کے ہاتھ میں اپنے کو سپرد کر دو کہ وہ جو تصرف تمہارے اندر کریں اس سے راضی رہو جو وہ تجویز کر دیں اس کے خلاف کا وسوسہ نہ لاؤ ؎

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست　　نائب ست و دست او دست خداست

گر خضر در بحر کشتی را شکست　　صد درستی در شکست خضر ہست

(جو جان دیتا ہے اگر وہ جان لیلے روا ہے خدا کا نائب ہے اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ اگر خضر علیہ السلام نے دریا میں کشتی کو توڑ ڈالا تھا مگر واقع میں خضر علیہ السلام کے توڑنے میں سو درستی یعنی حفاظت تھی)

صبر کن در کار خضر اے بے نفاق
تا نگوید خضر رو ہذا فراق

رخضر یعنی مرشد کامل کے افعال پر صبر و سکوت کرتا کہ خضر یوں نہ کہدیں کہ جاؤ
ہماری تمہاری جدائی ہے)

اور فرماتے ہیں ؎

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو (جب پیر بنالو ہمہ تن تسلیم بن جاؤ)

مطبع والوں نے اس کو پیرہن لکھدیا ہے جس کا مطلب شاید کوئی یہ سمجھا ہو کہ جب شیخ سے پیرہن (یعنی خرقۂ خلافت) مل جائے اس وقت اس کی اطاعت کرو اس کے بغیر اطاعت نہ کرنا چاہیئے۔ یہ لفظ پیرہن نہیں بلکہ پیر الگ لفظ ہے اور ہین بمعنی خبردار الگ لفظ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو
ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(جب تم پیر بنالو تو یاد رکھو کہ ہمہ تن تسلیم بن جاؤ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح زیر حکم خضر علیہ السلام چلنا)

تم کو کیا خبر کہ تم کو کیا عہدہ ملنا والا ہے بس تم اپنے کام میں لگو جو عہدہ دینا ہوگا وہ خود دیدیں گے (اور حق تعالےٰ کا دیتا یہ ہے کہ وہ اپنے نائبین کے ہاتھ سے کوئی عہدہ دلوادیں گے خواہ مشیخت ہو یا گمنامی ۱۲) بعض اولیا ایسے بھی ہیں کہ صاحب ارشاد نہیں ہیں مگر ان کی حالت یہ ہوگی۔

اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِی اللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنَ الْمِسْکِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَغْبِطُھُمُ الْاَنْبِیَاءُ وَالصِّدِّیْقُوْنَ (اوکما قال) حدیث میں ہے کہ متحابین فی اللہ قیامت کے دن منابر مسک پر بے فکر بیٹھے ہوں گے ان کی اس حالت پر انبیاء و صدیقین کو رشک آئے گا اھ کہ یہ بڑے بے فکر ہیں علماء قشر تو تھک گئے اس کی تفسیر میں لگے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے مگر حقیقت تک نہ پہونچے وہ نہ بتلا سکے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اسی لئے عارف شیرازی ایسے مدارس سے برارت ظاہر کرتے ہیں ؎

از قال وقیل مدرسہ حالے دلم گرفت
(مدرسہ کی قیل وقال سے کسی حال نے میرے دل پر اثر نہیں کیا)

حالے امالہ ہے حالا کا اور حالا مخفف ہے حالاً منصوب کا ؎

از قال وقیل مدرسہ حالے دلم گرفت
یک چند نیز خدمت معشوق و مے کنم

(مدرسہ کی قیل وقال دل گرفتہ نہیں ہوا چندے محبوب اور عشق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں)

قال وقیل مدرسہ سے دل گرفتہ ہونے کا سبب یہی ہے کہ وہاں حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا بلکہ لفظوں ہی کے پھیر میں رہتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدارس بے کار ہیں ہرگز نہیں ان کی بھی ضرورت ہے اور ان کے بعد خانقاہ میں آنے کی بھی ضرورت ہے۔ نہ تنہا مدرسہ کافی ہے نہ تنہا خانقاہ کافی ہے۔ مدرسہ بمنزلہ وضو کے ہے اور خانقاہ بمنزلہ نماز کے ہے تو جو صوفی مدرسہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی نماز بلا وضو پڑھ جائے تو وہ صوفی نہ ہوگا بلکہ صافی ہوگا مگر وہ صافی نہیں جس کے متعلق کہتے ہیں ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(یعنی صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے، پختگی مجاہدات کے بعد ہوتی ہے)

بلکہ وہ صافی جس سے برتن اور پتیلیاں صاف کیا کرتے ہیں اور جو عالم مدرسہ سے فارغ ہو کر خانقاہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص وضو کر کے اسی پر قناعت کر لے اور نماز نہ پڑھے تو وہ اس کا مصداق ہے ؎

اَیُّهَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَۃِ
کُلُّ مَا حَصَّلْتُمُوْهُ وَسْوَسَۃ

(مدرسہ والو! جو کچھ مدرسہ میں علم لفظی حاصل کیا وہ وسوسہ تھا)

کیونکہ لفظی اور کتابی علم سے حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا پس خانقاہ بلا مدرسہ کے خانقاہ نہیں خوامخواہ ہے اور مدرسہ بلا خانقاہ کے درس سے مشتق نہیں بلکہ دروس سے مشتق ہے بمعنی مٹنے کے تو وہ مٹانے کے قابل ہے۔ غرض علماء قشر تھک گئے اور ان کو پتہ نہ چلا کہ متحابین فی اللہ کا مصداق اس حدیث میں کون لوگ ہیں محققین عرفاء نے پتہ لگا لیا یہ بڑے غماز ہیں انھوں نے کہا یہ وہ اولیا ہیں جو صاحب ارشاد نہیں ان کے ذمہ کسی کی اصلاح و تربیت نہ تھی اس لئے قیامت میں یہ بے فکر ہوں گے اور انبیاء علیہم السلام اولیاء اصحاب ارشاد کو اپنے متعلقین کا فکر ہوگا تربیت و تبلیغ کے متعلق حساب کا اندیشہ ہوگا اس لئے وہ پریشانی میں ہوں گے اور ان لوگوں کی بے فکری پر غبطہ کریں گے کہ کاش آج ہم بھی ایسے ہی ہوتے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے افضل ہوں کیونکہ تحصیلدار کو وائسرائے کے سامنے جاتے ہوئے بڑا فکر ہوتا ہے جو ایک مزدور چپراسی کو کبھی نہیں ہوتا اور شاید کسی وقت اپنی ذمہ داری اور پریشانی کو دیکھ کر تحصیلدار یہ تمنا کرے کہ کاش میں چپراسی ہوتا تو کیا اس سے حقیقت میں چپراسی گری افضل ہوگئی اس عہدہ سے ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ تحصیلداری کا عہدہ باوجود اس ذمہ داری کے چپراسی گری سے بدرجہا افضل ہے کیونکہ یہ شخص سرکاری عہدہ دار ہے اور چپراسی کو سرکاری دربار سے وہ تعلق نہیں جو اس کو ہے۔

اور یہیں سے حقیقت منکشف ہوگئی اس حدیث کی اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِیْ وَ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِی الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کبھی میرے دل پر بھی بادل چھا جاتا ہے اور میں اس کی وجہ سے دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں علماء قشر اس کی حقیقت نہ سمجھ سکے انھوں نے کہدیا کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے اور ہم نہیں جانتے کہ یہ غین کیا چیز ہے اور یہ طریقہ اسلم ہے کہ جس بات کی

حقیقت معلوم نہ ہو اس سے سکوت کیا جائے مگر کسی کو معلوم ہو جائے تو اس کے بیان کرنے میں بھی مضائقہ نہیں چنانچہ بہت سی آیات متشابہات میں متاخرین نے مناسب توجیہات بیان کی ہیں جیسے یَدُ اللہِ وَ وَجْهُهُ اللہِ دَ اَمْثَالُهَا (اللہ کا ہاتھ اللہ کا چہرا اور مثل اُن کے) اسی طرح اگر کسی کی سمجھ میں غین کی حقیقت آجائے تو نصوص کے خلاف بھی نہ ہو اور شانِ نبوت کے بھی خلاف نہ ہو تو اس کا بیان کر دینا مذموم نہ ہوگا۔ محققین نے اس کا مطلب سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مشاہدہ جمال حق کی دو صورتیں ہیں ایک حضور بلا واسطہ (جو مقام فنا میں ہوا کرتا ہے ۱۲) دوسرے حضور بواسطہ (جو مقام بقا میں ہوتا ہے ۱۲) حضور بلا واسطہ تو یہ ہے کہ سوائے حضرت حق کے اور کسی چیز کی طرف اصلا التفات نہ ہو ہر دم خدا تعالےٰ کی طرف بدون کسی واسطہ کے متوجہ رہے (مقام فنا میں یہی حضور غالب ہوتا ہے ۱۲) اور حضور بواسطہ یہ ہے کہ مخلوق کی طرف بھی توجہ والتفات ہو بلکہ مخلوق آئینہ بن جائے رویت جمال الٰہی کے لئے (مقام بقا میں یہی صورت حضور ہوتی ہے ۱۲) تو پہلی صورت کی نظیر یہ ہے کہ کوئی شخص محبوب کو بدون کسی حجاب کے دیکھتا رہے کہ اس کا چہرہ عاشق کے سامنے ہو اور دوسری صورت کی نظیر یہ ہے کہ محبوب عاشق سے کہدے کہ مجھ کو مت گھورو بلکہ سامنے جو آئینہ رکھا ہے اس میں سے میری صورت کو دیکھو اس وقت بھی عاشق کی توجہ محبوب ہی کی طرف ہے مگر رویت بواسطہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس دیدار میں اور پہلے دیدار میں فرق ضرور ہے جو بات بلا واسطہ دیکھنے میں ہے وہ آئینہ سے دیکھنے میں کہاں اسی طرح حضور بلا واسطہ (جو مقام فنا میں ہوتا ہے ۱۲) حضور بواسطہ سے (جو مقام بقا میں ہوتا ہے) اکمل و الذ ہے سالک کو اس میں زیادہ لذت آتی ہے کیونکہ اُس میں غیر کی طرف اصلا التفات نہیں ہوتا اور حضور بواسطہ میں گو اس کی نظر بالذات حضرت حق ہی پر ہوتی ہے مگر فی الجملہ واسطہ پر بھی نظر ہوتی ہے اور عاشق پر اتنا واسطہ بھی گراں ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام و اہلِ ارشاد کی طبیعت تو یہی چاہتی ہے کہ ہر وقت حضور بلا واسطہ رہے خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلق محبت حق تعالیٰ سے ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ آپ ہر وقت بلا واسطہ مشاہدہ جمال حق میں مشغول رہیں مگر آپ کو خدمت ارشاد میں رکھا گیا ہے مخلوق کو فیض پہنچانے کے لئے مامور کیا گیا ہے جس میں گو نہ توجہ مخلوق پر بھی کرنا پڑتی ہے گو یہ توجہ الی الخلق توجہ الی الخالق سے آپ کے لئے مانع نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے اس کو اپنے جمال کا آئینہ بنا دیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کی تو بڑی شان ہے اہل اللہ کو جو آپ کے غلامانِ غلام ہیں یہ بات نصیب ہے کہ کوئی چیز ان کو محبوب سے مشغول نہیں کرتی یہ سب کچھ ہے مگر عشق کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کو بلا واسطہ دیکھا جائے بیچ میں آئینہ کا واسطہ بھی کیوں ہو عشق کی تو یہ شان ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیثِ تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

اسی گرانی کو آپ غین سے تعبیر فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ مخلوق کے واسطہ سے توجہ الی المحبوب کرنے میں میرے دل پر بادل سا چھا جاتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ بلا واسطہ مشاہدہ زیادہ لذیذ اور بے غبار ہوتا ہے گو قرب زیادہ اسی میں ہے کہ مخلوق کے واسطہ سے مشاہدہ کیا جائے کیونکہ اس میں محبوب کی اطاعت ہے عاشق کا دل گو یہ چاہتا ہے کہ محبوب کو بدون کسی واسطہ کے دیکھوں مگر جب محبوب کی مرضی یہ ہے کہ مجھ کو آئینہ میں سے دیکھو تو اس وقت اطاعت اسی میں ہے کہ آئینہ کی طرف منہ کر لیا جائے اور اس میں سے محبوب کی صورت دیکھی جائے گو آئینہ کی طرف منہ کرتے ہوئے عاشق کے دل پر نشتر لگتا ہے

مگر وہ یہ کہتا ہے ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میرا میلان وصال کی طرف ہے اور اس (محبوب) کا میلان فراق کی طرف ہے میں نے اپنی مراد کو چھوڑ دیا تا کہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے)

وصال سے مراد حضور بلا واسطہ ہے اور فراق سے حضور بواسطہ اور عاشق کی طبیعت فطری طور پر پہلی صورت کو چاہتی ہے مگر وہ رضائے محبوب کے لئے دوسری صورت کو اختیار کرتا ہے اسی لئے مقام فنا سے مقام بقاء کی طرف آنا سالک پر طبعاً گراں ہوتا ہے مگر امر الٰہی کی وجہ سے وہ اس کو خوشی سے قبول کرتا ہے۔ اس کی دوسری مثال اس سے واضح تر یہ ہے کہ ایک عاشق محبوب کے سامنے بیٹھا ہوا اس کے چہرہ کو دیکھ رہا ہو تھوڑی دیر کے بعد محبوب امر کرے کہ ذرا بازار سے ہمارے واسطے آم لے آؤ تو بازار جانے میں گو فی الجملہ غیبت ہو گی مگر بتلایئے قرب زیادہ کس صورت میں ہے آیا اطاعت و قرب اس میں ہے کہ فوراً اٹھ کر بازار چلا جائے اور آموں کی تلاش میں مارا مارا پھرے یا یہ کہ وہیں بیٹھا رہے اور محبوب سے کہے کہ حضور مجھے تو اپنا جمال دیکھنے دیجئے یہ کام کسی اور سے لے لیجئے۔ یقیناً ہر عاقل کہے گا کہ اس وقت اس کا بازار جانا ہی موجب قرب ہے۔ اگر یہ عاشق صادق ہے تو اس غیبت کو گوارا کرے گا گو طبعاً اس پر گراں ہے اور یہ کہے گا ؎

أُرِيْدُ وِصَالَهٗ وَيُرِيْدُ هَجْرِيْ
فَأَتْرُكُ مَا أُرِيْدُ لِمَا يُرِيْدُ

(میں محبوب کے وصال کا خواہاں ہوں اور وہ ہجر کا خواہاں سو میں نے اپنی خواہش کو اس کی خواہش کی وجہ سے ترک کر دیا۔)

اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ عاشق نہیں بلکہ عاسق ہے فاسق تو نہ کہنا چاہیئے اور

کیونکہ عاشق صادق فاسق نہیں ہوا کرتا۔ اور جو فاسق ہوتے ہیں وہ عاشق نہیں بلکہ معاشق ہیں عشق کے ساتھ کبھی برا خیال آہی نہیں سکتا ہیبت محبوب ان وساوس سے مانع ہو جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق ہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

(جو عشق رنگ و روپ کی وجہ سے ہوتا ہے وہ انجام کار عشق نہیں شرم ندامت ہوتی ہے)

جس عشق میں فسق کا خیال آئے وہ نفس کی شرارت ہے۔ بہرحال قرب زیادہ اس میں ہے کہ جب محبوب عاشق کو اپنے پاس سے اٹھا کر کسی کام میں لگا دے تو اس کام میں لگ جاوے اگر وہ عاشق صادق ہے تو اس وقت بھی محبوب سے غافل نہ ہوگا بلکہ اس کام کو مرآۃ جمال بنالے گا اور یقیناً اس وقت وہ محبوب کی نظر میں زیادہ مقرب ہے کیونکہ محض محبوب کی رضا کے لئے اس نے اس کام میں مشغولی اختیار کی ہے ورنہ اس کی طبیعت کا تقاضا تو کچھ اور ہی تھا یہی حالت ہوتی ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ارشاد خلق میں کہ وہ اس خدمت میں حق تعالیٰ کی رضا کے لئے مشغول ہوتے ہیں جس میں مخلوق پر توجہ بھی کرنا پڑتی ہے۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم غین فرماتے ہیں۔ چونکہ عارفین پر یہ حالات گذرتے ہیں اور وہ مقامات فناء و بقاء کا ذوق رکھتے ہیں اس لئے وہ اس غین کو سمجھ گئے علماء ظاہر اول تو اس کو سمجھتے نہیں اور جو کچھ سمجھتے بھی ہیں تو نہ معلوم کہاں کہاں پہنچتے ہیں کوئی یہ کہتا ہے کہ انبیاء سے گناہ تو نہیں ہوتا مگر زلت کا صدور ہو سکتا ہے یہ غین اسی کا اثر تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مناسب نہیں کیونکہ آپ سے کسی زلت کا صدور عمداً نہیں ہوا بلکہ اگر ہوا بھی ہو تو خطاء اجتہادی سے ہوا جس سے قلب پر غین طاری نہ ہونا چاہیے کیونکہ خطاء اجتہادی سے قرب میں کمی نہیں ہوتی بلکہ ترقی

ہی ہوتی ہے بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ یہ غین وہ گرانی ہے جو توجہ الی الخلق سے آپ کے قلب پر ہوتی تھی اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر اس سے استغفار کرنے کی کیا ضرورت تھی یہ تو کوئی گناہ کی بات نہیں جواب یہ ہے کہ وہ جو غیبت واقع ہوگئی تھی اس کا تدارک اس حضور بلا واسطہ سے فرماتے تھے اور ہر چند کہ یہ تدارک ہر ذکر سے ہو سکتا تھا مگر وہ غیبت چونکہ صورۃً بُعد تھا اس لئے استغفار سے اس کا تدارک مناسب تھا۔ (اور ایک جواب یہ ہے کہ ہر چند یہ گرانی طبعی ہے جس میں عاشق کا دل مجبور ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو سید العاشقین ہیں اس طبعی گرانی سے بھی استغفار کرتے تھے۔ اور آپ چاہتے تھے کہ جب مجکو توجہ الی الخلق کا امر ہے تو اب مجکو حضور بلا واسطہ کی طرف میلان اور اس حضور بواسطہ سے گرانی کیوں ہو اس لئے آپ استغفار کرتے تھے اور حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے تھے ۱۲ جامع)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے لئے مشیخت وغیرہ کچھ تجویز نہ کرو بعض دفعہ حق تعالیٰ کسی کو صاحب ارشاد نہیں بناتے اور اپنا مقرب بنا لیتے ہیں اور اصل مقصود قرب حق ہی ہے جو صاحب ارشاد ہونے پر موقوف نہیں سو تم اپنے لئے اس کو کیوں تجویز کرتے ہو بس خدا کے سپرد کرو۔

نیز میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو تعلقات شرعاً مطلوب نہیں ہیں وہ عذاب ہیں ایسے تعلقات کے ساتھ حیات طیبہ حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ وہ تو معیشۃ ضنک (روزی تنگ) ہے ان تعلقات کو قطع کرنا چاہیئے اور ان کا قطع کرنا مجاہدہ ہے جو کہ فنا کہلاتا ہے اس کے بعد رضائے حق نصیب ہوتی ہے وہ بقا ہے اور یہی حقیقت ہے قربانی کی اور ہر چند کہ یہ فنا و بقا ہر عمل میں ظاہر ہوتا ہے مگر قربانی میں اس کا ظہور زیادہ ہے اس لئے قربانی سے مجاہدہ کا تعلق ظاہر ہو گیا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مجاہدہ مقصودہ بالبیان جو باطن اضحیہ ہے تو یہ وہ باطن نہیں جو ظاہر کے ساتھ مقید ہو بلکہ یہ وہ باطن ہے جو ظاہر کے لئے لازم

کیونکہ اس مطلق مجاہدہ کا حصول قربانی ہی پر موقوف نہیں بلکہ سب اعمال میں اس کا حصول ہوتا ہے البتہ یہ مجاہدہ لازم اضحیہ ضرور ہے کیونکہ اس عمل پر مجاہدہ کا ترتب ظاہر ہے باقی جو مجاہدہ کہ مخصوص بالاضحیہ ہے اور وہ بھی ایک قسم ہے باطن اضحیہ کی جو کہ بدون اضحیہ کے متحقق نہیں ہو سکتی وہ اس وقت مقصود بالبیان نہیں۔

اب میں اس قصہ کو بیان کرتا ہوں جس کا ذکر اس جگہ ان آیات میں کیا گیا ہے۔ پھر اس کی تطبیق مضمون مجاہدہ پر بیان کروں گا۔ قصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص تھا اس کے وارثوں نے طمع مال میں اس کو قتل کر دیا تھا کہ جلدی سے اس کے مال پر قبضہ ہو جائے قتل کر کے پھر خود ہی خون کے مدعی ہو گئے جب قاتل خود مدعی ہو تو قاتل کا پتہ کون دے۔ اس لئے سب کی رائے ہوئی کہ اس قصہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لیجایا جائے وہ وحی وغیرہ سے قاتل کا پتہ بتلا دیں گے۔ چنانچہ سب لوگ آپ کے پاس آئے آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا تو وہاں سے ایک جانور ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ (جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک بیل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) بقرہ سے خاص گائے مراد نہیں اور نہ اس میں تا رتانیث کے لئے ہے بلکہ تا روحدت کے لئے ہے اور بقرہ گائے بیل دونوں کو عام ہے اور بظاہر اس جگہ بیل ہی مراد ہے کیونکہ آگے اس کی صفت میں یہ بات مذکور ہے لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ کہ وہ کام کاج میں پامال نہ ہو زمین کو جوتتا اور کھیتی کو پانی نہ دیتا ہو اور یہ شان بیل کی ہوتی ہے۔ گائے سے ہل نہیں چلاتے نہ اس سے کھیتی کو پانی دیتے ہیں ہاں اس زمانہ میں اگر گائے سے بھی یہ کام لیا جاتا ہو تو خیر۔ ممکن ہے اس وقت گائیں مضبوط ہوتی ہوں جو بیل کا کام دیتی ہوں جیسے بعض لوگ عورتوں سے

چور مروایا کرتے ہیں بعض عورتیں اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ مردوں کی طرح چور کو مار لیتی ہیں۔ اور جس طرح بعض عورتیں بہادر ہوتی ہیں ایسے ہی بعض مرد عورت ہوتے ہیں۔

لکھنؤ کے ایک شاہزادے بیٹھے ہوئے تھے چھت سے سانپ گرا تو آپ فرماتے ہیں ارے کوئی مردوا ہے۔ کسی نے کہا اور حضور آپ بھی تو ماشاء اللہ مرد ہیں تو بولے واللہ خوب یاد دلایا۔ لاٹھی لانا، پھر نہ معلوم وہ سانپ ان سے مرا بھی یا نہیں مگر آپ ایسے مرد تھے کہ دوسرے کے یاد دلانے سے اپنا مرد ہونا معلوم ہوا۔

غرض ایک جانور کے ذبح کا حکم ہوا جو یا گائے تھی یا بیل تھا اب میں اسکی تذکیر و تانیث کی کہاں تک رعایت کروں، جیسے ایک بنئے نے رعائت کی تھی۔ ایک ہیجڑے نے بنئے کی دکان پر سے مُرمُرے اٹھا کر کھانا شروع کیے تو اب وہ اس سے کہتا ہے میرے تمام مُرمُرے کھا گیا کھا گئی میاں کے ایسی دھول ماروں گا کہ بی بی کی پگڑی وہاں جا کر گرے گی۔ ظالم نے اپنے کلام میں ہیجڑے کے دونوں صفات کی رعایت کی مرد ہونے کی بھی اور عورت ہونے کی بھی کبھی اس کو میاں کہا کبھی بی بی تو میں کہاں تک اس کی رعایت کروں کہ کبھی مذکر کا صیغہ استعمال کروں کبھی مؤنث کا بس میں تو سیدھا بقرہ کہوں گا مگر اس سے عربی کا بقرہ مراد ہوگا اردو کا نہیں۔ شاید آپ کہیں کہ اردو کا بقرہ کیسا تو سنئے۔ ایک بیرسٹر صاحب نے میرٹھ کے ایک مقدمہ میں جو قربانی گاؤ کی متعلق تھا ہندوؤں کی طرف سے دعوے کیا گیا تھا کہ حضور مسلمانوں کے مذہب میں تو بکرے ہی کی قربانی ہے، گائے کی قربانی ہے ہی نہیں۔ گائے تو محض ہندوؤں کے جلانے کو ذبح کرتے ہیں اور دلیل یہ بیان کی کہ دیکھئے جس عید میں قربانی ہوتی ہے اس کا نام ہی بقرعید ہے یعنی بکرے کی عید۔ اس احمق نے یہ سمجھا کہ بقر بکرے کی عربی ہے کاف کو قاف بنا کر بقر کر لیا دیا اردو والوں نے قاف کو کاف

بنا کر بکرا بنا لیا ۱۲)

مسلمانوں کے وکیل نے کہا حضور بس اسی پر فیصلہ ہے عربی لغت منگا کر دیکھ لیا جائے کہ بقر کے معنے گائے کے ہیں یا بکرے کے۔ ایسے عقلاء کی وجہ سے میں نے کہا تھا کہ بقرہ عربی کا مراد ہوگا اردو کا نہیں۔

تو جب بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے آکر قصہ عرض کیا انھوں نے جناب باری سے دعا کی وہاں سے حکم ہوا کہ ایک بقرہ ذبح کرو اور یہ نہیں تلایا کہ بقرہ ذبح کرلے سے کیا ہوگا قاتل کا پتہ اس سے کیونکر معلوم ہوگا کیونکہ آقا کو کچھ ضرورت نہیں ہے پوری بات بیان کرنے کی اور اپنے احکام کی علت وحکمت اور غایت بتلانے کی مگر غلام کا ادب یہ ہے کہ چون وچرا نہ کرے جو حکم ہو فوراً بجالائے اور جتنی بات کہی جائے اس کی جلدی تعمیل کردے چاہے اس کا فائدہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر بنی اسرائیل نے ایسا نہ کیا وہ چون وچرا میں پڑ گئے حکم کے سنتے ہی نبی پر اعتراض کردیا۔ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں منشا بنی اسرائیل کی اس غلطی کا یہ ہوا کہ وہ تو قاتل کو دریافت کرنے آئے تھے اور یہاں حکم ہوا ذبح بقرہ کا تو وہ سوچنے لگے کہ سوال وجواب میں جوڑ کیا ہوا ہمیں قاتل کا پتہ پوچھنا تھا اس کا جواب یہ تھا کہ نام بتلا دیتے فلاں ہے یا فلاں یہ بے جوڑ حکم کیسا کہ بقرہ ذبح کرو، یہ تو وہی ہوا ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ مگر انھوں نے اپنے اور خداوند تعالےٰ کے تعلق پر نظر نہ کی وہ تو غلام تھے ان کو جوڑ بیجوڑ سے کیا لینا تھا جو حکم ہوا تھا فوراً تعمیل کردیتے۔ دیکھئے اگر آپ اپنے نوکر کو حکم دیں کہ حکیم صاحب سے فلاں مرض کے لئے نسخہ لکھوالاؤ اور وہ نسخہ لکھوا کر لاجس میں شربت بنفشہ اور شیرہ بادام لکھا ہو آقا نسخہ کو دیکھ کر نوکر سے کہے کہ بازار سے ایک آنہ کے کوئلے لے آؤ اور وہ نوکر سوچنے لگے کہ نسخہ میں تو کوئلہ کہیں نہ لکھا تھا یہ نسخہ کو کیا سمجھ گئے مگر وہ خاموش ہو کر چلا گیا اور کوئلے لے آیا پھر آقا نے کہا انگیٹھی اور دیگچی لاؤ اس پر اسے اور حیرت ہوئی کہ نسخہ میں ان چیزوں کا

: کرنہ تھا مگر اس نے حکم کی تعمیل کی اس کے بعد آقا نے بنفشہ پانی میں ڈال کر انگیٹھی پر رکھا اور کوئلے دھکا کر اسے جوش دیا پھر چھان کر شکر میں قوام کیا پھر ٹھنڈا کر کے بوتل میں بھرا تو اب نوکر کی آنکھیں کھلیں اور وہ سمجھا کہ نسخہ میں جو شربت لکھا تھا اسی کے تیار کرنے کے لئے یہ سب سامان کیا گیا تھا۔ اس نوکر نے شربت تو دیکھا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ اس طرح تیار ہوتا ہے وہ سمجھتا تھا کہ بس شہد کی طرح یہ بھی بنا بنایا آتا ہوگا اس لئے اس کو کوئلوں اور دیگچی کے منگانے سے حیرت ہوئی مگر اخیر میں یہ بات دیکھ کر اپنی خاموشی پر شکر کرتا ہوگا کہ اچھا ہوا میں نے آقا سے کاوش نہ کی ورنہ اس وقت مجھے بہت شرمندہ ہونا پڑتا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ حق تعالےٰ حکیم ہے ان کے احکام میں کچھ حکمت ہوگی۔ ہم نہ سمجھیں تو کیا ہے مگر انھوں نے اپنی عقل سے چون وچرا کو دخل دیا یہ خلاف ادب ہے خوب سمجھ لو اول تو انھوں نے ذبح بقرہ کے حکم کو معاذ اللہ اس پر محمول کیا کہ موسیٰ علیہ السّلام ہم سے دل لگی کرتے ہیں یہ نبی کا ادب تھا، بھلا نبی ان سے مسخرہ پن کیوں کرنے لگے تھے اور اگر مزاح کرتے بھی تو اس کے لئے وقت و موقعہ ہوتا ہے یہ کیا موقعہ تھا مزاح کا کہ لوگ تو ایک مقدمہ فیصل کرانے آئیں اور نبی ان سے دل لگی کریں۔ پھر دل لگی بھی اس عنوان سے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً (اللہ تعالےٰ تم کو ایک بیل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) خدا تعالےٰ کی طرف سے ایک حکم کو منسوب کر کے اگر یہ بھی دل لگی ہوسکتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ معاذ اللہ موسیٰ علیہ السّلام نے خدا تعالےٰ کی طرف یہ حکم غلط منسوب کر دیا تھا استغفر اللہ۔ بھلا اس عنوان سے کچھ بھی مزاح کا احتمال ہوسکتا ہے ہرگز نہیں مگر بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو بیدھڑک کہدیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) موسیٰ علیہ السلام نے لرز کر ڈر کر فرمایا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (نعوذ باللہ جو میں جہالت والوں کا سا کام کروں) بتلا دیا کہ احکام الٰہیہ بیان کرتے ہوئے دل لگی کرنا جہالت ہے اور نبی جہالت سے معصوم ہے

پھر تمہارا اپنے پیغمبر کو ایسی بات کہنا گنوار پن کی دلیل ہے۔ اب ان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ حکم خدا تعالےٰ ہی کی طرف سے ہے چاہیئے تھا کہ اب دیر نہ کرتے فوراً تعمیل کر دیتے مگر چونکہ ان کو یہ خلجان ہو رہا تھا کہ ذبح بقرہ کو قاتل کے پتہ سے کیا جوڑ ہے۔ اس لئے مختلف خیالات میں پڑ کر متردد ہو گئے اور سوچنے لگے کہ شاید کوئی خاص بقرہ ہو گا جس کو اس کام میں دخل ہو گا۔ اس لئے سوال کیا قَالُوْا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ط کہنے لگے اے موسیٰ علیہ السلام اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ صاف صاف ہم کو بتلا دیں وہ بقرہ کیا چیز ہے یعنی کیسی ہے۔ مَاهِيَ سے اصطلاح معقول پر سوال مراد نہیں جو سوال حقیقت کے لئے موضوع ہے کیونکہ حقیقت تو ان کو معلوم ہو چکی تھی کہ بقرہ ہے بلکہ مَاهِيَ سے سوال صفات مراد ہے۔ ای ماصفاتھا (اس کی صفات کیا ہیں) اور محاورات میں مَاہِیَ سے سوال صفات بھی ہوتا ہے یہاں محاورات ہی کے موافق استعمال ہے لوگ غضب کرتے ہیں کہ قرآن مجید کو اصطلاحات فنون حاصل کرنے کے بعد پڑھتے ہیں۔ پھر ان اصطلاحات کو قرآن مجید میں جاری کرتے ہیں جس سے اشکال پڑتا ہے اور خوا مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ بھلا قرآن کریم کو اصطلاحاتِ فنون کا اتباع کس دلیل سے لازم ہے قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت اور محاورات پر سمجھنا چاہیئے اصطلاحات علوم پر منطبق نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ سب اصطلاحات نزول قرآن کے بعد مدون ہوئی ہیں باقی اس کا انکار نہیں کیا جاتا کہ مَاهِيَ محاورات میں بھی کبھی سوال حقیقت کے لئے آتا ہے مگر اس ہی میں منحصر نہیں۔ سوال کیفیات و صفات کے لئے بھی بہت مستعمل ہے (اور ممکن ہے کہ اس کو سوال عن الماہیۃ پر محمول کر کے کہا جاوے کہ ان لوگوں نے صفات کا سوال مَاہِیَ سے اس لئے کیا ہو کہ اس عجیب بقرہ کے صفات کا مجہول ہونا گویا ان کے ذہن میں خود ذات کا مجہول ہونا تھا وہ یہ سمجھے کہ جس بقرہ کے ذبح کا ہم کو حکم ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے گائے بیلوں کے ساتھ

صرف نام میں شرکت رکھتا ہے اور خواص و کیفیات میں شاید ان سب سے ممتاز ہوگا ۱۲ جامع)

وہاں سے جواب ملا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ (آپ نے یہ فرمایا کہ وہ فرماتے ہیں۔ وہ ایسا بیل ہو نہ بالکل بوڑھا نہ بچہ ہو پٹھا ہو دو عمروں کے درمیان سو اب کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے)

اب ادھر سے بھی تشدد شروع ہوا۔ کیونکہ غلام کا آقا کے حکم میں چون وچرا اور توقف کرنا خلاف ادب ہے جس کی سزا ان کو دی گئی کہ اچھا جب تم ہمارے حکم کو بے جوڑ سمجھتے ہو (کہ اس کو ہمارے سوال سے کچھ ربط نہیں) اور اس لئے بقرہ کے بارہ میں متعجب و متردد ہو کہ شاید کوئی خاص بقرہ ہوگا تو ہم بھی ایسی قیود کا اضافہ کرتے ہیں جن سے تم کو حقیقت نظر آجائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم کسی نوکر سے کہیں کہ بازار سے پانی پینے کا کٹورا خرید لاؤ۔ اس کو چاہیے کہ اس بات کے سنتے ہی حکم کی تعمیل کرے۔ مگر نہیں اب وہ پوچھتا ہے حضور! کتنا بڑا لاؤں، یہ سوال محض لغو ہے کیونکہ پانی پینے کا کٹورا سب جانتے ہیں کتنا بڑا ہوا کرتا ہے۔ مگر اس کی اس کاوش پر کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا ہو جس میں پورا آدھ سیر پانی آتا ہو نہ اس سے زیادہ ہو نہ کم اگر کچھ بھی کم و بیش ہوا تو واپس کر دیں گے۔ لیجئے اب اس کے لئے دن بھر کا دھندا ہو گیا کہ پھرے ٹکریں مارتا ہوا سارے بازار میں۔ اگر وہ سنتے ہی حکم کی تعمیل کر دیتا تو یہ مصیبت نہ اٹھانی پڑتی۔ اسی طرح بنی اسرائیل نے چون وچرا کر کے خود اپنے سر مصیبت دھری ورنہ کوئی سی گائے بیل بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے لَوْ ذَبَحُوْا اَیَّ بَقَرَةٍ اَجْزَاَتْهُمْ وَلٰكِنْ شَدَّدُوْا فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ (اگر وہ کوئی سا بیل بھی ذبح کر ڈالتے تو ان کو کافی ہوتا لیکن انھوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی ڈال دی) اب ان کے سوال پر یہ قید بڑھائی گئی کہ

وہ بقرہ نہ تو عمر رسیدہ ہو نہ بچہ ہو بلکہ درمیانی عمر کا ہو یہ قید بھی کچھ زیادہ سخت نہ تھی کیونکہ اس شان کے بیل گائے بھی بہت دستیاب ہوسکتے ہیں اور خیر خواہی اور شفقت کے طور پر یہ بھی کہدیا گیا فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ کہ جو کچھ تم کو حکم دیا گیا ہے اس کو کرڈالو۔ اس میں زیادہ کاوش نہ کرو مگر وہ کب ماننے والے تھے ان کو اس صفت سے اور تردد پیدا ہوگیا کہ یہ تو کوئی خاص صفت نہ ہوئی ایسی گائے بیل تو بہت موجود ہیں اس لئے دوبارہ پھر سوال کیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا یعنی ہم کو یہ بھی بتلادیا جائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے وہاں سے رنگ بھی متعین کردیا گیا۔ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ کہ وہ بقرہ زرد رنگ کا ہو جس کی زردی خوب گہری ہو جو اپنے رنگ سے دیکھنے والوں کو خوش کردے ان کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی کیونکہ اس رنگ کی بھی بہت سی گائے بیل تھیں اور وہ لوگ تعیین جزئی کے طالب تھے کہ بس ایسا پتہ نشان بتلادیا جائے جس میں غیر کا احتمال ہی نہ رہے (مثلاً یہ کہدیا جائے کہ وہ گائے یا بیل جو فلاں جنگل میں فلاں کھیت میں ایسے ایسے درخت کے پاس چر رہا ہے یا وہ بیل جو فلاں شخص کے پاس ہے وغیرہ وغیرہ ۱۲) اور حق تعالیٰ کی طرف سے جتنی صفات بتلائی گئیں وہ سب صفات کلیہ تھیں اور قاعدہ ہے کہ صفات کلیہ چاہے کتنی ہی ہوں ان سے تعیین نہیں ہوتی احتمال شرکت باقی رہتا ہے جیسے ایک وہمی کا قصہ ہے کہ وہ نماز میں جب کسی امام کی اقتدا کرتا تو پہلے یہ کہتا کہ اقتدا کرتا ہوں میں اس امام کی جو میرے آگے ہے اس سے بھی تسلی نہ ہوتی تو پھر کہتا کہ جس کا لباس ایسا ہے جس کا یہ نام ہے پھر وہم ہوتا کہ شاید میں نے پہچاننے میں غلطی کی ہو اور اس کا یہ نام نہ ہو تو پھر اس کی کمر میں انگلی چبھو کر کہتا کہ پیچھے اس امام کے۔ تو یہ شخص اس حقیقت کو سمجھا کہ صفات کلیہ سے تعیین نہیں ہوتی تعیین اشارہ جزئیہ سے ہوتی ہے وہ بھی اس طرح کہ اس پر ہاتھ رکھ دیا جائے۔

اسی طرح بنی اسرائیل کو بھی ان صفات سے تسلی نہ ہوئی تو سہ بارہ پھر سوال کیا
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ
لَمُهْتَدُونَ ﴿ (کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے
بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے
اور ہم ان شاء اللہ ضرور ٹھیک سمجھ جائیں گے)

یعنی ایک مرتبہ اور بتلا دیا جائے کہ وہ بقرہ کیسی ہے ان صفات سے تو تعیین نہیں ہوئی بلکہ اس شان کی بہت افراد ہیں جن میں ہم کو تشابہ والتباس ہو رہا ہے ہم متردد ہیں کہ کونسا بقرہ ذبح کریں ایک دفعہ اور وضاحت کر دی جائے ان شاء اللہ ہم راہ پا جائیں گے یعنی سمجھ جائیں گے۔ اس مرتبہ یہ خیر ہوئی کہ ان کے منہ سے ان شاء اللہ نکل گیا۔

حدیث میں آتا ہے وَلَوْ لَمْ يَسْتَثْنُوا لَمَا بُيِّنَ لَهُمْ آخِرَ الْأَبَدِ (او کما قال) یعنی بنی اسرائیل اگر استثناء نہ کرتے (یعنی ان شاء اللہ نہ کہتے) تو قیامت تک ان کو پتہ نہ دیا جاتا مگر ان شاء اللہ کی برکت سے یہ سلسلہ سوالات وجوابات کا جلدی ہی ختم ہو گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿ (موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہ وہ ہل چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاتی ہے نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جائے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے اب آپ نے پوری بات فرمائی اور اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔) کہ وہ ایسا بقرہ ہے جو کام کاج میں استعمال نہیں کیا گیا نہ زمین کو جوتتا ہے نہ کھیت کو پانی دیتا ہے (اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بقرہ سے بیل مراد ہے) تندرست بدن کا ہے جس پر کوئی داغ اور دھبہ ذرا نہیں مطلب یہ کہ جو جانور کھیتی وغیرہ کے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کے بدن پر جوا رکھنے کا

نشان یا مار پیٹ کا نشان ہوجاتا ہے وہ ایسا نہ ہو۔ اب سمجھے کہنے لگے بس اب لائے
تم ٹھیک بات۔ یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اخیر میں بھی تو کچھ زیادہ تعیین نہیں ہوئی
کیونکہ اس میں بھی تو صفات کلیہ ہی ہیں جزئیات نہیں اور تعیین جزئیات سے
ہوتی ہے نہ کلیات سے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر میں استثنار
کی برکت سے اُن کے لئے بیان ہوگیا تھا جس سے متبادر یہ ہے کہ پہلے سے کچھ
زیادہ وضاحت ہوگئی تھی ۱۲)

حالانکہ بظاہر اب بھی پہلے سے کچھ زیادہ وضاحت نہیں ہوئی جو صفات
اخیر میں مذکور ہوئی ہیں اس شان کے بیل بھی بہت ہوتے ہیں تو بات یہ ہے
کہ گو تعیین جزئی اب بھی نہیں ہوئی مگر ان کی تسلی اس طرح ہوگئی کہ اُن کے ذہن
سے ان شاء اللہ کی برکت سے وہ مقدمات واہیہ نکل گئے اور وہ سمجھ گئے کہ
تعیین جزئی ہم کو نہ بتلائی جائے گی اس لئے کاوش فضول ہے یہ کیا تھوڑی
برکت ہے ان شاء اللہ کی کہ ان کی فہم درست ہوگئی۔ غرضکہ اس کے بعد
جانور کی تلاش ہوئی اور اس قدر گراں قیمت میں ان صفات کا جانور ملا کہ بقرہ کی
کھال میں سونا بھر کر دینا پڑا مگر اس گرانی سے بنی اسرائیل گھبرائے نہیں خرید کر
ذبح ہی کر دیا۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ کہ انھوں
نے اس کو ذبح کر دیا اور وہ کرنے والے تھے نہیں۔ یہاں سے ان شاء اللہ کی
برکت معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض افعال کی تاثیر ایسی ہوتی ہے
جو ظاہر ہو کر رہتی ہے گو محل زیادہ قابل نہ ہو (یعنی فاعل ان افعال کا چاہے
کیسا ہی ہو پورا قابل یا کم قابل مگر فعل کا اثر ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے) اور
راز اس میں یہ ہے کہ بعض افعال موثر بالخاصہ ہوتے ہیں جیسے بعض ادویہ موثر
بالخاصہ ہوتی ہیں کہ خصوصیت مزاج ان کے اثر کو اثر کو نہیں روک سکتی تو جب
بنی اسرائیل کے ان شاء اللہ کا یہ اثر ہوا کہ ان کی فہم اس کی برکت سے درست
ہوگئی حالانکہ وہ کچھ زیادہ مؤدب بھی نہ تھے ان کا ادب تو اسی سے ظاہر ہے

کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے یہ خطاب کیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ط (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) پھر حکم الٰہی میں چون وچرا کی اور سب سے بڑی ادب کی بات تو وہ تھی جو انھوں نے اخیر میں کہی یعنی اَلْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ کہ اب لائے ٹھیک بات گویا اس سے پہلے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک نہ تھا اور یہ جملہ اس وقت کہا جب ان شاء اللہ کی برکت سے راہ پر آگئے تھے۔ فہم درست ہوگئی تھی تو جن کا سمجھ آجانے کے بعد یہ ادب ہے ان کا مؤدب ہونا ظاہر ہے مگر پھر بھی ان شاء اللہ نے اپنا اثر کیا گو قائل زیادہ قابل نہ تھے بلکہ ناقابل تھے۔ (اور لیجئے حدیث میں آتا ہے کہ یاجوج و ماجوج سد سکندری کو روزانہ چاٹ چاٹ کر ورق کر دیتے ہیں اور شام کے وقت یہ کہکر چلدیتے ہیں کہ بس کل کو آکر توڑ دیں گے، رات کو دیوار پھر ویسی ہو جاتی ہے جیسی تھی۔ تو پھر آکر چاٹتے ہیں روزانہ ان کا یہی شغل ہے یہاں تک کہ اخیر میں ایک دن ان کے منہ سے یہ نکلے گا کہ ان شاء اللہ کل کو آکر توڑ ڈالیں گے۔ ان شاء اللہ کی برکت سے اس رات دیوار اپنی اصلی حالت پر عود نہ کرے گی ویسی ہی ورق جیسی رہے گی جیسے وہ چھوڑ کر جائیں گے اور اگلے دن آکر توڑ ڈالیں گے ۱۲) پس اندازہ کرلیجئے کہ اگر کوئی مخلص با ادب ان شاء اللہ کہے گا تو کیا اثر ہوگا۔

اور یہاں سے میں ایک اور مضمون پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جس طرح ان شاء اللہ میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے کام آسان ہو جاتا ہے گو قائل کیسا ہی ہو (کافر ہی کیوں نہ ہو ۱۲) اسی طرح شریعت کے بعض احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی حاصل ہوتی ہے گو فاعل کیسا ہی ہو۔ آجکل ترقی کی پکار بہت ہے، ہر شخص ترقی کا طالب ہے اور دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر بھر آتا ہے اور ان کے لیڈر بار بار اس میں غور کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے مگر اب تک حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا کسی نے کہا کہ یہ لوگ سود لیتے ہیں اس وجہ سے ترقی ہو رہی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اگر اس میں یہ خاصیت

ہوتی تو چاہیئے کہ جو مسلمان سود لیتے ہیں ان کو بھی ترقی ہوتی حالانکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں وہ بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں ہیں بعضے کہتے ہیں کہ شریعت میں چونکہ تجارت کی بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے اس لئے مسلمان ترقی نہیں کرسکتے مگر یہ بھی غلط ہے کیونکہ معاملات میں حدود شرعیہ کے پابند کتنے تاجر ہیں ذرا مجھے تو بتلاؤ ان شاء اللہ دو چار کے سوا کوئی نہ ملے گا پھر ان مسلمان تاجروں کو ترقی کیوں نہیں ہوتی یہ کون سے ناجائز معاملات کو چھوڑ دیتے ہیں غرض سب کی مشق اسلام پر ہے کہ مذہب ہی ترقی سے مانع ہے چنانچہ بعض کی زبان پر تو یہ لفظ صاف صاف آگیا اور بعض نے مذہب کو تو کچھ نہیں کہا لیکن مولویوں پر نزلہ اتارا کہ یہ علماء ترقی سے مانع ہیں مگر یہ بھی غلط ہے واللہ ہم تو سب سے زیادہ تمہاری ترقی کے طالب ہیں اور وہ طریقہ تم کو تعلیم کرتے ہیں جس پر چلنے کے واسطے ترقی لازم ہے. ایک بار میں نے ایک ایسے جلسہ میں جس میں جنٹلمین بکثرت شریک تھے یہی مضمون بیان کیا تھا میں نے کہا کہ لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں۔ آج میں اس الزام کو دفع کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کروں گا۔ اس پر جنٹلمین چونکے کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان؟ میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے ہیں اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں اس پر اور بھی حیرت ہوئی میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ یعنی ہر قوم کے لئے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے پس ایک دوسرے پر سبقت کرو۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استباق کا حکم دیا ہے جس کے معنے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے ہیں اور یہی حاصل ہے ترقی کا تو ترقی کی ضرورت قرآن سے ثابت ہے بلکہ اِسْتَبِقُوْا (ایک دوسرے پر سبقت کرو) صیغہ امر ہے جس کا مقتضیٰ وجوب ہے تو یوں کہنا چاہیئے کہ قرآن میں ترقی کو واجب و فرض کیا گیا ہے۔ تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں وہ ان پر کتنا بڑا افترا کرتے ہیں۔ بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے علماء کی مجال ہے کہ اس سے منع کرسکیں پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

جنٹلمین کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کہیں اس طرح ترقی کرو اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے اس طرح ترقی کرو۔ سو قرآن مجید میں فَاسْتَبِقُوا کے ساتھ الْخَيْرَاتِ کی بھی قید ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔ اب اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہو سکتا ہے آپ یہ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ خواہاں ہیں وہ ترقی فی الخیر ہے یا ترقی فی الشر اگر ترقی فی الخیر ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے منع نہ کریں گے اور اگر ترقی فی الشر ہے تو اس کا مطلوب نہ ہونا بلکہ مذموم ہونا تمام عقلاء کے نزدیک مسلّم ہے ورنہ پھر ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے میں تو ترقی کا طالب ہوں بتلایئے آپ اُسے کیا جواب دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تیری یہ ترقی ترقی محمود نہیں بلکہ ترقی مذموم ہے جو کہ بُرے طریقہ سے حاصل کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ وہی مطلوب ہے جو محمود ہو مذموم نہ ہو پس اب یا تو آپ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے مذموم نہیں یا ہم ثابت کر دیں کہ ترقی محمود وہی ہے جس کی تعلیم ہم دے رہے ہیں اور یہ ترقی مذموم ہے جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔ اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے اور اقرار کر لیا کہ واقعی علماء کو ترقی سے اختلاف نہیں بلکہ اس کے طرق تحصیل سے اختلاف ہے کیونکہ ان طرق کے خلاف شرع ہونے کی وجہ سے اس ترقی کو ترقی فی الشر کا مصداق بنا دیا ہے۔ غرض دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ ان کی ہر حالت کو ترقی میں دخیل سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کبھی ان کی صورت وضع کو اختیار کرتے ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو، کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی ترقی سے مانع ہے اگر عورتیں آزاد ہوں گی تو علوم وصنعت و حرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کریں گی اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ اٹھائیں گی۔

ضروری اطلاع :۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان کی تھی میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفاء کی عورتیں پردہ نشین ہیں جن کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے زیادہ تعداد چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا ہمیشہ سے رواج نہیں ہے اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ ترقی کر لی، بس اس کا جواب کچھ نہ تھا وہ میرے منہ کو تکنے لگے یہاں تک مذاق بگڑا ہے کہ بعض لوگ تشبیہات غلط بولنے کو ترقی میں دخیل سمجھتے ہیں۔

ہم نے کانپور کے اسٹیشن پر ایک خانساماں کو سنا کہ وہ ایک شخص سے کہتا ہے ''ہم یہ سننا نہیں مانگتا'' میں نے کہا کمبخت تجھے اردو غلط بولنے پر کس مصیبت نے مجبور کیا بھلا انگریز تو اس لئے غلط بولتے ہیں کہ ان کو زبان نہیں آتی تجھے کس مصیبت نے گھیرا بس کچھ نہیں صاحب بہادر بننے کا شوق ہے اردو غلط بولنے کو بھی صاحب بہادری میں دخیل سمجھتے ہیں۔ صاحب بہادر بننے پر مجھے ایک اور حکایت یاد آئی مظفر نگر اور میرٹھ کے ضلع میں کچھ چمار عیسائی ہوگئے ہیں۔ عیسائی بننے کے بعد انہیں صاحب بہادر بننے کا شوق ہوا بلکہ یوں کہئے کہ یہی شوق ان کو عیسائیت کی طرف داعی ہوا اب ان کی حالت یہ ہے کہ شام کو پھٹے پرانے بوٹ سوٹ (جو انگریزوں کے یہاں سے اتارن کے طور پر مل جاتا ہوگا) پہنکر نکلتے ہیں اور سڑک پر ٹہلتے ہیں اور کھانا اس طرح کھاتے ہیں کہ گھڑوں کو اوندھا کر کے ان پر بیٹھ گئے گویا کرسی ہے اور گھڑے کو اوندھا کر کے اس پر بجھڑے کی روٹی کے ٹکڑے رکھ لئے یہ میز ہے اور ببول کے کانٹوں سے وہ ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھاتے ہیں کیا دماغ سڑے ہیں۔ انہی چماروں میں سے ایک شخص برسات کے دنوں میں کہیں جارہا تھا راستہ میں بارش آئی تو قریب ہی نہر کا ڈاک بنگلہ تھا جہاں ظہور علی نام ایک چوکیدار رہا کرتا تھا اس وقت وہ اپنی کوٹھری کے کواڑ بند کر کے سو رہا تھا تو یہ چمار صاحب چوکی پر پہونچے اور ظہور علی کو پکارنا شروع کیا' اے جہولی' اے جہولی کواڑ کھول صاحب کھڑے

بھیجیں (کٹرے بھیگیں) وہ غریب یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی انگریز دورہ میں ہوگا وہ بھیگ رہا ہوگا بارش سے پناہ لینے یہاں آگیا فوراً گھبرا کر اٹھا اور جلدی سے کیواڑ کھولے دیکھا تو وہاں چمار کے سوا کوئی نہیں پوچھا لیے وہ صاحب کہاں۔ تو کہتا کیا ہے اور ہم ہیں نہیں۔ ظہور علی نے کہا آئیں تجھے صاحب بناؤں اور جوتہ نکال پانچ چھ لگائے تو اس چمار نالائق کا ایسا دماغ سڑا کہ اپنے منہ سے اپنے آپ کو صاحب کہتا تھا۔

اسی طرح اس خانساماں کا دماغ خراب ہوا تھا کہ سیدھی صحیح اردو چھوڑ کر کہتا تھا "ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا" افسوس انگریز تو کوشش کرتے ہیں صحیح اردو بولنے کی اور وہ محض مجبوری کی وجہ سے غلط بولتے ہیں اور ہندوستانی ان کی دیکھا دیکھی صحیح اردو کو چھوڑ کر غلط بولنا اختیار کرتے ہیں بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارے اوپر کیا خدا کی مار پڑی۔ انگریزوں کی کوشش کا تو یہ حال ہے کہ ایک انگریز نے اردو بڑی کوشش سے سیکھی تھی اور اس کو اپنی اردو دانی کا دعوٰی تھا گو اس کا یہ دعوے صحیح نہ تھا کیونکہ غیر اہل زبان کبھی دوسری زبان میں اہل زبان کے برابر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اسی انگریز کا واقعہ ہے کہ ایک دن وہ صبح کو اٹھا تو طبیعت خراب تھی کسی ملاقاتی نے پوچھا کہ حضور کا مزاج کیسا ہے۔ کہنے لگا ہماری طبیعت خراب ہے آج رات سے ہم کو لید نہیں ہوئی۔ یہ اردو دانی تھی کہ انسان کے پاخانہ کو بھی لید کہتا تھا۔ واقعی چاہے کیسے ہی کوشش کی جائے دوسری زبان صحیح طور پر کم آتی ہے۔

ایک ایرانی ہندوستان میں آیا تھا اور اردو صاف بولنے لگا تھا اسے بھی اپنی اردو دانی کا دعوے تھا، لوگوں نے کہا ہم آپ کے سامنے قصداً آسان آسان باتیں کرتے ہیں جن کو آپ جلدی سمجھ لیتے ہیں اگر ہم اردو کے محاورات آپ کے سامنے بولیں تب معلوم ہو کہ آپ کتنے اردو داں ہیں۔

اس نے کہا واہ ہم سب سمجھ جائیں گے، لوگوں نے کہا اچھا بتلایئے اس جملہ کے کیا معنی ہیں۔ چھبیلی رنگیلی۔ رسیلی۔ تو آپ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ "شش گر بہ رنگین رسن گرفت"۔ چھبیلی کو چھ بلی بنایا اور رسیلی کو رسی لی یعنی چھ رنگین بلیوں نے رسی لی۔ کیا بگاڑا ہے مضمون کو۔

اسی طرح ایک ہندی ایران رہ کر آیا تھا۔ ہندوستان آکر اس نے فارسی دانی کا دعویٰ کیا۔ ایک ایرانی نے سنا اس کو جوش آیا کہ ہندی کو فارسی دانی کا دعویٰ یہ نہیں ہوسکتا وہ اس کا امتحان لینے آیا اور اس سے کہا کہ اپنا کوئی شعر سناؤ۔ اس نے فی البدیہہ ایک شعر تصنیف کیا جو ظاہر میں بہت ہی عمدہ شعر تھا ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے نازنین دیدم
بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے آتشیں دیدم

مگر ایرانی نے سنتے ہی کہا تف یہ نازنین دیدم اور آتشیں دیدم کیسا سیدھا یوں کیوں نہیں کہتے ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے
بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے

واقعی زباں داں کی اصلاح کے بعد اب معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شعر نہایت بھدا تھا جس میں فضول الفاظ بھرے ہوئے تھے اور یہ ذوق زبان دان ہی کو حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کو نہیں ہوسکتا وہ ہندوستانی باوجود ایران میں اتنے دن رہنے کے اس ذوق کو حاصل نہ کر سکا۔ غرض دوسری زبان پوری طرح نہیں آسکتی چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے زبان دان کے برابر نہیں ہوسکتا۔ خاص کر اردو زبان تو دوسروں کو آتی ہی نہیں۔ اسی لئے ہندیوں کو قرآن ایسا نہیں آتا جیسا عرب کو، جیسا اردو عرب کو ایسی نہیں آتی جیسی ہندی کو۔

ایک بار مکہ مکرمہ میں اہل عرب نے مولانا رحمت اللہ صاحب مہاجر کے

سامنے ہندیوں پر اعتراض کیا کہ یہ لوگ قرآن بہت غلط پڑھتے ہیں مولانا نے جواب دیا کہ ہندی قرآن اتنا غلط نہیں پڑھتے جتنا آپ اردو غلط بولتے ہیں۔ (مطلب یہ تھا کہ اہل عرب کا قرآن صحیح پڑھنا کمال نہیں کیونکہ وہ اہلِ زبان ہیں اور ہندی قرآن غلط پڑھتے ہیں معذور ہیں کیونکہ وہ غیر اہلِ زبان ہیں اور غیر اہل زبان کو دوسری زبان پوری طرح نہیں آسکتی، چنانچہ اہلِ عرب کو اردو صحیح نہیں آتی وہ اتنی غلط اردو بولتے ہیں کہ ہندی قرآن مجید اتنا غلط نہیں پڑھتے ۱۲)

اس پر اہلِ عرب نے کہا کہ نہیں، ہم اردو اتنی غلط نہیں بولتے۔ مولانا نے کہا اچھا کہیے ٹٹو، ٹھٹھا۔ تو وہ کہتے ہیں تتو، تتا۔ مولانا ہنسنے لگے کہ یہ اردو ہوئی نہ معلوم آپ کیا بول رہے ہیں۔ بس ہندی قرآن مجید کو ایسا غلط نہیں پڑھتے۔ خیر یہ تو مولانا نے اس وقت جواب دیدیا لیکن مولانا میں حمیت قومی بہت تھی ان کا دل چاہتا تھا کہ ہندیوں پر سے غلطی قرآن کا الزام رفع ہو جائے۔

چنانچہ اسی لئے انھوں نے مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور واقعی مولانا اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اس مدرسہ میں بڑے بڑے کامل اساتذہ رہے ہیں۔ انھوں نے اول اپنے مدرسہ میں مصر کے ایک قاری کو جن کا نام ابراہیم سعد تھا مدرس رکھا جو اس فن میں بڑے کامل اور ماہر تھے۔ قاری عبداللہ صاحب نے انہیں سے قرأت سیکھی تھی پھر وہ مدرسہ سے علیحدہ ہوگئے اور قاری عبداللہ صاحب ان کے قائم مقام ہوئے یہ ایسے کامل ہوئے کہ ایک دفعہ کسی نے ابراہیم سعد کے سامنے قاری عبداللہ صاحب کی تعریف کی کہ ہندیوں میں تو قاری عبداللہ صاحب بے نظیر ہیں، تو ابراہیم سعد نے فرمایا بلکہ عرب میں بے نظیر ہیں۔ قاری عبداللہ صاحب کے کمال کے لئے اتنے بڑے ماہر فن کی یہ شہادت بہت بڑی شہادت ہے۔ اور واقعی قاری صاحب قرآن مجید

بے نظیر پڑھتے تھے۔

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ آجکل لوگ اردو غلط بولنے کو بھی ترقی میں دخیل سمجھتے ہیں حالانکہ غیر قوموں کی جو باتیں ترقی میں دخیل ہیں وہ دوسری ہیں وہ انکی خاص صفات ہیں جو انھوں نے آپ ہی کے گھر سے لی ہیں مثلاً منتظم ہونا۔ مستقل مزاج ہونا۔ پابند وقت ہونا۔ متحمل ہونا۔ انجام کو سوچ کر کام کرنا صرف جوش سے کام نہ کرنا ہوش سے کام لیتا۔ آپس میں اتحاد و اتفاق کرنا۔ ایک دوسرے کے راز کو چھپانا اور یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور ان احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے، خواہ کوئی اختیار کرے۔ اب مسلمانوں نے تو ان احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا نہ ان میں اتحاد نہ ان میں اتفاق ہے نہ رازداری کا مادہ ہے نہ انتظام ہے نہ وقت کی پابندی ہے نہ انجام بینی ہے جو کام کرتے ہیں جوش سے کرتے ہیں ہوش سے نہیں کرتے اس لئے ان کو تنزل ہے اور غیر قوموں نے ان کے گھر سے چُرا کر ان باتوں پر عمل کرنا شروع کر دیا تو ان احکام کی خاصیت ظاہر ہوئی کہ ان کو ترقی ہونے لگی۔

پھر یہ سرقہ ناقص ہے کیونکہ چور کو گھر کے اندر کی سب چیزیں معلوم نہیں ہوا کرتیں اس کو وہی چیزیں ہاتھ لگتی ہیں جو ظاہر ہوں (یا تالے کنجی میں ہوں) دبے ہوئے خزانے کی اطلاع اسے نہیں ہوا کرتی اس لئے وہ پارس کی پتھری جو آپ کے گھر میں تھی اس کی انھیں خبر نہیں ہوئی یا خبر ہوئی مگر انھوں نے بیکار سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا کیونکہ پارس کی پتھری دیکھنے میں تو پتھر ہی ہوتی ہے اس کی خاصیت جسے معلوم ہو وہی اس کی قدر جان سکتا ہے۔ ناواقف کے نزدیک تو کانچ کا ٹکڑا اور بلور کا پتھر برابر ہے وہ پارس کی پتھری آپ کے گھر میں کیا ہے۔ ایمان و توحید و اعتقاد رسالت نماز روزہ وغیرہ۔ افسوس آپ کو اپنے گھر کی قدر نہیں اگر آپ میں وہ

صفات ہوتیں جو دوسری قوموں نے آپ سے لے لی ہیں تو پارس کی پتھری کے ساتھ مل کر آپ کو وہ ترقی ہوتی جو غیر قوموں کو خواب میں بھی کبھی نہ آئی ہوگی آپ کو وہ عروج حاصل ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا کہ کوئی ان کے ساتھ آنکھ نہ ملا سکتا تھا مگر آج کل مسلمانوں کو اس ارشادِ الٰہی پر نظر نہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط

(تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمادے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے ان کو ان کے لئے قوت دے گا اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل بامن کر دے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں)

اور یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ان کاموں کو بھی ترقی میں کچھ دخل ہے؟ حالانکہ اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر صاف صاف وعدہ ہے استخلاف فی الارض اور تمکین کا مگر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نماز روزہ اور ایمان میں بھی کچھ قوت ہے اور اس سے بھی ترقی ہوتی ہے۔ افسوس جس خزانہ کو چور نے ناواقف ہو کر یا بے کار سمجھ کر چھوڑا تھا اس کی قیمت و قوت سے خود گھر والے بھی آج ناواقف ہیں یا بعض کے اعتبار سے یوں کہیے کہ بیکار ہی سمجھتے ہیں مگر ایسوں کو تو مسلمان بھی نہ کہنا چاہیے یہ کاہے کے مسلمان جو نماز روزہ کو بیکار سمجھیں مگر ایسے تو دو چار ہی نکلیں گے زیادہ وہی ہیں جو اپنے خزانہ کی قیمت سے ناواقف اور اس کی طاقت سے بے خبر ہیں۔ اسی لئے ان اعمال کی بے قدری کرتے ہیں۔ کوئی مسلمانوں کی حالت کا تتبع کرے

تو ان میں ہزاروں ایسے نکلیں گے جن کو کلمہ بھی نہیں آتا اور لاکھوں ایسے ملیں گے جو نماز کو جانتے بھی نہیں کہ کس چیز کا نام ہے اور بہت سے وہ ملیں گے جو کبھی سال میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتے ہیں کبھی جی چاہا جمعہ کو بھی مسجد میں آجاتے ہیں اور جو تھوڑے سے اللہ کے بندے پانچوں وقت کی نماز کے پابند ہیں ان میں بھی قاعدہ کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے والے بہت کم ہیں۔ کسی کا رکوع غلط ہے، کسی کا سجدہ، کسی کا قومہ مفقود ہے، کسی کا جلسہ ایک گڑبڑ کر رکھی ہے تو اب آخر یہ کیا ہے بیقدری ہے یا نہیں اور بخدا یہ بیقدری اسی واسطے ہے کہ نماز کو صرف ثواب کا کام سمجھ رکھا ہے اس کے دنیوی منافع کی ان کو خبر نہیں بلکہ بعض جاہل تو نماز روزہ کو دنیوی ترقی سے مانع سمجھتے ہیں اور اگر ان کو حقیقت معلوم ہو جاتی کہ ان اعمال کو ترقی اور تمکن فی الارض میں بھی دخل ہے تو پھر دیکھئے آپ کہ مسلمان کس شوق سے ان اعمال کو بجا لاتے گو اس نیت سے عمل کرنا اچھا نہیں خلوص کے خلاف ہے طاعات سے ثمرات دنیا کا قصد نہ ہونا چاہئے وہ تو تابع ہیں خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں الغرض ترقی کے اسباب تو آپ کے گھر میں موجود ہیں اور آپ ہی کے گھر سے دوسروں نے چرائے ہیں اور آپ کی یہ حالت ہے کہ دوسروں سے لیتے اور در بدر گدائی کرتے پھرتے ہیں۔ پس وہ حال ہے ؎

یک سبد پرنان ترا برفرق سر   تو ہمی جوئی لب نان در بدر
تا بزانوئے میان قعر آب   وز عطش وز جوع گشتستی خراب

یعنی روٹیوں کا ٹوکرا تو سر پر رکھا ہوا ہے اور در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں دریا کے اندر کھڑے ہوئے ہیں اور پیاس کے مارے برا حال ہے۔ اب دیکھئے اسلام میں ایک تعلیم یہ ہے کہ جو شخص خاص مجلس میں ہو مجلس عام نہ ہو تو اس کے پاس بدون اجازت کے نہ جاؤ اور اس میں زنانہ مکان ہی کی تخصیص نہیں بلکہ مردانہ مکان میں بھی اگر کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا

ہواس کے پاس بھی بدون اجازت کے نہ جانا چاہیئے۔ اور زنانہ مکان میں جس طرح دوسروں کو استیذان کا حکم ہے خود گھر والے کو بھی حکم ہے کہ اپنے گھر میں بدون اطلاع کے نہ جائے ممکن ہے کوئی پردہ دار عورت آئی ہوئی ہو اگر تم بلا اطلاع چلے جاؤ گے اس کا سامنا ہو جائے گا یا ممکن ہے تمہاری ماں بہن ہی کسی وجہ سے ننگی بیٹھی ہو اپنے گھر میں دس دفعہ عورتوں کو ایسا اتفاق پیش آتا ہے اس لئے مردوں کو حکم ہے کہ اپنے گھر میں بھی بدون اطلاع کے نہ جائیں پھر اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ جب تم کسی کے پاس جانا چاہو اور وہ اجازت نہ دے بلکہ یہ کہدے کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا پھر کسی وقت ملوں گا تو اس بات کا برا نہ مانو بلکہ لوٹ آؤ فَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ (پس اگر تم سے کہا جائے لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آؤ یہ برتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف رکھنے والا ہے)

اور اس میں حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ برتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف رکھنے والا ہے کیونکہ ایسے وقت میں شرما شرمائے اگر کسی نے بلا بھی لیا تو انشراح وانبساط کے ساتھ وہ تم سے نہ ملے گا اس لئے کہ دل تو ملنے کو چاہتا ہی نہ تھا تو یقیناً اس کے قلب پر تمہاری ملاقات سے گرانی ہوگی پھر ممکن ہے کہ اس گرانی کا احساس تم کو بھی ہو جائے تو اس سے تم کو بھی دل دل میں شکایت ہوگی کہ یہ کیسا روکھا آدمی ہے کیسا بدخلق ہے جس پر میرا آنا اتنا گراں ہوا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ جب کوئی یہ کہدے کہ اس وقت میں نہیں مل سکتا فوراً لوٹ آؤ۔ اب اس مسئلہ میں ہم لوگ کتنی کوتاہی کرتے ہیں استیذان کا سبق ہم لوگوں نے بالکل ہی بھلا دیا۔ مگر دوسری قومیں اس پر عامل ہیں کوئی شخص کسی کے کمرہ میں بدون اجازت کے نہیں جا سکتا سو دیکھ لیجئے جو قومیں اس پر عمل کر رہی ہیں ان میں باہم کیسا اتفاق ہے آگے یہ ان کے تکلفات ہیں کہ استیذان کے لئے اپنے پتہ کا کارڈ بھیجتے ہیں۔ ہم کو ان تکلفات کی ضرورت نہیں بس زبانی اجازت

لینا کافی ہے مگر ہمارے تو یہ حالت ہے کہ چاہے کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو چاہے کوئی سو ہی رہا ہو مگر ان کا سلام و مصافحہ قضا نہ ہو۔

ایک دفعہ سیوہارہ میں مجھے خود یہ واقعہ پیش آیا کہ شب کے سفر سے مجھے تکان زیادہ محسوس ہوا تو جاتے ہی ایک کمرہ میں لیٹ گیا اور سونے کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک صاحب تشریف لائے اور بڑے زور سے آکر پوچھا کہ فلاں شخص (میرا نام لے کر) کہاں ہے، لوگوں نے کہا ذرا آہستہ بولو وہ سو رہا ہے۔ کہنے لگے واہ مجھے ان سے ابھی ملنا ہے لوگوں نے بہت منع کیا مگر وہ کب باز آنے والے تھے سیدھے وہیں پہونچے جہاں میں لیٹا تھا اور آکر بڑے زور سے سلام کیا میں جاگ رہا تھا مگر میں نے قصداً آنکھ نہ کھولی کیونکہ اس وقت یہی مصلحت تھی جب اس نے دیکھا کہ سلام سے بھی یہ نہیں جاگا تو میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اور پیشانی پر گھس کر چلدیئے لوگوں نے بُرا بھلا کہا کہ یہ کونسا وقت تھا سلام اور مصافحہ کا۔ تو آپ فرماتے ہیں واہ جی ہم حج کو جارہے ہیں پھر نہ معلوم کب ملنا ہوتا۔ بس اُن کا تو حج ہوا چاہے دوسرے کا کچھ ہی حال ہوجائے۔ حالانکہ شریعت میں سونے والے کی اس قدر رعایت ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے، حضرت مقداد راوی ہیں کہ ایک بار یہ چند شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان تھے۔ آپ جب رات کو ذرا دیر سے گھر میں تشریف لاتے اور یہ مہمان لیٹے ہوتے تو آپ بہت آہستہ آہستہ تشریف لاتے اور ایسی آواز سے سلام فرماتے کہ جاگنے والا تو سُن لے اور سونے والے کی نیند خراب نہ ہو۔ حالانکہ یہ وہ ذات ہے کہ اگر آپ قتل بھی کردیتے تو صحابہ کرام کو انکار نہ ہوتا بلکہ آپ کے ہاتھ سے خوشی خوشی جان دینا ان کے نزدیک فخر تھا مگر پھر بھی آپ صحابہ کی نیند کی اتنی رعایت فرماتے تھے۔ مگر یہاں یہ حالت ہے کہ ہر وقت مصافحہ ہے۔ چاہے کسی کو تکلیف ہوتی ہو۔

دیوبند کے جلسہ میں بڑا اژدہام تھا ایک بار میں نماز پڑھانے کے لئے مصلے پر پہونچ چکا تھا تو ایک صاحب تیسری صف سے نکلے اور مصلے پر سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور مصافحہ کر کے چھوڑ دیا کہ اب جاؤ، بھلا یہ بھی کوئی آدمیت تھی، اس بھلے مانس کو مصافحہ کا یہی وقت ملا تھا۔ غرض دوسرے کی راحت و تکلیف کا ذرا خیال نہیں۔ اب اگر کوئی انتظام کرنے لگے تو اسے قانون باز، قانون ساز کہتے ہیں۔

چنانچہ میرے یہاں اس قسم کی باتوں پر روک ٹوک اور انتظام بہت ہے جس پر عنایت فرماؤں نے مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں۔ ایک صاحب نے میرے منہ پر کہا کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں، انگریزوں کا سا قانون ہر بات میں انتظام ہر بات میں انتظام۔ افسوس گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں بس اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے حالانکہ اسلام سے زیادہ انتظام کسی نے بھی نہیں کیا ہر کام کا وقت مقرر ہے نماز کا بھی روزہ کا بھی حج کا بھی اور اتنا بڑا انتظام ہے کہ ذرا ایک تاریخ سے حج مؤخر ہو جائے تو پھر سال بھر سے ورے نہیں ہو سکتا تو کیا اس کو بھی انگریزی قانون کہو گے۔ عیادت اور بیمار پرسی کے لئے یہ قانون ہے اِذَا عَادَ اَحَدُکُمُ الْمَرِیْضَ فَلْیُخَفِّفِ الْجُلُوْسَ حدیث شریف میں ہے کہ جب بیمار کی عیادت کیا کرو تو اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا کرو کیونکہ بیمار کو زیادہ ہجوم سے تکلیف ہوتی ہے۔ حضرات فقہاء نے اس حکم کی حقیقت کو سمجھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس چیز سے مریض کو توحش ہو وہ کام نہ کرو جس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ مثلاً کسی کو بدھ کے دن عیادت کرنے سے اعتقاد شر کا ہو تو اس دن عیادت نہ کرو بلکہ دوسرے دن عیادت کر کے اس عقیدہ کی اصلاح کر دو کوئی زاہد خشک ہوتا تو یوں کہتا کہ نہیں کہ ایسے شخص کی عیادت بدھ ہی کے دن کرنا چاہیئے تاکہ اس عقیدہ باطلہ کی مخالفت ہو۔ تو اے صاحب پھر وہ عیادت ہی کیا ہوئی مناظرہ ہو گیا۔

عیادت سے مقصود تو مریض کی دلجوئی ہے آپ کی اس مخالفت سے یہ مقصود کہاں حاصل ہوا بلکہ اس کو تو آپ کی صورت دیکھ کر دونی وحشت ہوگی کہ یہ کمبخت بدھ کے دن کہاں آمرا دیکھئے اس کا کیا منحوس اثر ہوتا ہے تو وہ اس سے گھبرا دیگا جیسے ایک بہرا آدمی کسی کی عیادت کو گیا تھا بیمار کو اس کی صورت دیکھتے ہی خفقان شروع ہوگیا کہ یہ کمبخت کہاں آمرا اپنی سب کہے گا میری ایک نہ سنے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ اپنے جی میں مضمون پکا کر لایا تھا کہ میں پوچھوں گا کہ مزاج کیسا ہے وہ کہے گا اچھا ہوں میں کہوں گا الحمد للہ پھر پوچھوں گا علاج کس کا ہے کسی حکیم کا نام لے گا' میں کہوں گا ان کے قدم بہت مبارک ہیں ماشاء اللہ دست شفا رکھتے ہیں' ان کا علاج کبھی نہ چھوڑنا۔ پھر کہوں گا نسخہ کیا استعمال میں ہے وہ کچھ بتلائے گا میں کہوں گا انگبین ہے خدا رگ رگ میں پیوست کرے مگر وہاں سارا مضمون برعکس ہوا مریض تو اس کی صورت دیکھ کر ہی پریشان ہوگیا تھا۔ اب جو ان سے پوچھا کہ مزاج کیسا ہے بیمار نے کہا مر رہا ہوں آپ نے کہا الحمد للہ پھر پوچھا علاج کس کا ہے اس نے کہا ملک الموت کا۔ آپ کہتے ہیں خدا ان کے قدم مبارک کرے ماشاء اللہ دست شفا رکھتے ہیں ان کا علاج کبھی نہ چھوڑنا پھر کہا نسخہ کیا پی رہے ہو بیمار نے کہا زہر پی رہا ہوں آپ کہتے ہیں انگبین ہے خدا رگ رگ میں پیوستہ کرے بھلا اس شخص کی عیادت سے کیا نفع ہوا شرعاً ایسے لوگوں کو عیادت نہ کرنا چاہیئے بس اگر بہت ہی شوق ہو تو دوسروں کے ساتھ ملے جلے چلے جائیں تاکہ عیادت نہ کرنے کا الزام بھی رفع ہو جائے اور بیمار سے بات چیت بھی نہ کرنا پڑے خوامخواہ اس کا دماغ پریشان کرنے سے کیا نفع۔

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ فقہا، حکماء امت ہیں شریعت کو ان حضرات نے سمجھا ہے۔ بات چیت کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام فرمایا ہے لَا يَتَنَاجىٰ اِثْنَانِ دُوْنَ الثَّالِثِ حَتّٰى يَأْتِيَ رَابِعٌ (اوکما قال) یعنی جہاں تین آدمی بیٹھے ہوں وہاں دو شخص آہستہ آہستہ باتیں نہ کریں اس سے

تیسرے کی دل شکنی ہوگی کہ مجکو غیر سمجھا یہاں تک کہ چوتھا آجاوے تو اب دو شخص باتیں کر سکتے ہیں کیونکہ تیسرے کو باتوں کا شوق ہوگا تو وہ چوتھے سے کرنے لگے گا پھر اس کو وہ بدگمانی نہ ہوگی احتمال ہوگا کہ شاید اس چوتھے سے اخفا مقصود ہوا ور اس چوتھے کو اس تیسرے پر یہی احتمال ہوگا۔ سبحان اللہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کیسی ذرا ذراسی باتوں کی رعایت فرمائی ہے اور یہ معجزہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ باوجود اتنے مشاغل کثیرہ کے پھر بھی آپ نے معاشرت کے دقیق سے دقیق امور کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا کہ بدون نبوت کے ایسا ہوسکتا ہے ہرگز نہیں اسی جامعیت تعلیم کو دیکھ کر تو کفار کہا کرتے تھے حضرات صحابہ کرام سے کہ تمہارے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے تم کو ہر بات سکھلائی حتیٰ کہ ہگنا موتنا بھی سکھلا دیا۔ کفار نے تو یہ بات طعن سے کہی تھی مگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ ہاں بیشک حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سکھلایا ہے کہ بول و براز کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ کریں اور داہنے ہاتھ سے اپنے عضو کو نہ چھوئیں اور تین ڈھیلوں سے کم استنجے کے واسطے نہ لیجائیں اور ہڈی اور کوئلہ سے استنجا نہ کریں یہ تعلیم سن کر کفار کی آنکھیں کھل گئیں کہ واقعی بول و براز کے یہ آداب تو بدون تعلیم کے معلوم ہو ہی نہیں سکتے۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے انتظام کا کہ پیشاب و پاخانہ کے لئے بھی آداب مقرر ہیں۔ پاکی اور صفائی کا یہ قانون ہے کہ آپ فرماتے ہیں اِذَا اسْتَيْقَظَ اَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهٖ فَلَا يَغْمِسْ يَدَهٗ فِيْ اِنَائِهٖ فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ اَيْنَ بَاتَتْ يَدُهٗ ۔ جب کوئی سو کر اٹھے تو برتن میں ہاتھ نہ ڈالے کیا خبر ہاتھ کہاں کہاں پہونچا ہوگا ۔بھلا یہ انتظام ہی نہیں اور کیا ہے۔ نیز ارشاد ہے نَظِّفُوْا اَفْنِيَتَكُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ اپنے گھر کے سامنے کا میدان صاف رکھا کرو یہود کی طرح نہ بنو وہ صفائی کا اہتمام نہیں کرتے۔ سبحان اللہ جب فنا دار کی صفائی کا اتنا اہتمام ہے تو خود گھر کی صفائی کا اہتمام کیا کچھ ہوگا۔ اور جب گھر کا اتنا اہتمام ہے

تو لباس کی صفائی کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا پھر بدن اور روح کی نظافت کا امر تو کیسا کچھ ہوگا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ (چمن سے میری بہار کو قیاس کرو) اسی سے عاقل سمجھ سکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر کی نظافت کا اتنا خیال ہے تو نظافت باطن کا تو کس درجہ اہتمام ہوگا مگر آج کل مسلمان اپنے گھر کے اس سبق کو ایسا بھولے ہیں کہ اگر کوئی اس زمانہ میں نظافت مکان و نظافت لباس و بدن کا اہتمام کرنے لگے تو اس کو عیسائی اور انگریز کہنے لگیں۔

چنانچہ مدراس میں ایک انگریز اسلام لایا ایک روز وہ جامع مسجد میں گیا تو حوض کی نالی میں اس قدر رینٹ جما ہوا تھا جسے دیکھ کر گھن آتی تھی اس سے نہ رہا گیا اس نے ایک دو لوٹے پانی سے سب دھو دیا اور لوگوں سے کہا کہ صاحبو! ذرا نالی میں سے کبھی کبھی رینٹ تو صاف کر دیا کرو، دیکھو کیسا برا معلوم ہوتا ہے۔ تو لوگ کیا کہتے ہیں معلوم ہوتا ہے تجھ میں ابھی عیسائیت کا اثر باقی ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بھلا یہ بھی کوئی حرکت ہے کہ نظافت اسلامی کو کوئی دوسری قوم اختیار کر لے تو وہ اسلام سے نکل جائے اور انگریزوں کا کام ہو جائے۔ میں کہاں تک گناؤں شریعت کے انتظام کو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک انتظام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں لَا تَقُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ خَبُثَتْ نَفْسِیْ وَلْیَقُوْلَنَّ لَقِسَتْ نَفْسِیْ (او کما قال) یعنی اگر جی متلائے تو خبثت نفسی (میرا نفس خبیث ہے) نہ کہو کیونکہ مسلمان کا نفس خبیث نہیں ہوا کرتا بلکہ یوں کہو کہ میرا جی مالش کرتا ہے متلاتا ہے۔ سبحان اللہ آپ نے تو ہم کو بات کرنے کے بھی طریقے بتلائے ہیں۔ افسوس آج اگر کوئی اس انتظام پر عمل کرنے لگے تو اس کو الزام دیا جاتا ہے کہ اس کے یہاں تو انگریزوں کا سا انتظام ہے۔ ارے ہم انگریزوں کے متبع ہیں یا ان امور میں وہ خود ہمارے متبع ہیں مجھے تو کبھی ان کی معاشرت دیکھنے کا آج تک موقعہ ہی

نہیں ملا جو کچھ میں انتظام کرتا ہوں وہ اپنے گھر کی تعلیم کو دیکھ کر خود تجربہ کرتا ہوں اور چونکہ وہ انتظامات سب کی راحت کے ہوتے ہیں دوسری قوموں نے بھی ہماری کتابوں سے ان کو لے لیا اس لئے بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ جو انتظام میں نے کیا ہے، دوسری قوموں نے بھی اختیار کر رکھا ہے۔ تو اب اگر دوسری قومیں ہمارے افعال کو لینے لگیں تو کیا ہم اپنے گھر کو چھوڑ دیں یا اسے گرادیں اگر یہی عقل ہے تو ایسی عقل آپ کو ہی مبارک ہو اور یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنے قواعد میں نے اپنے یہاں مقرر کئے ہیں گو وہ میں نے اپنی ہی راحت کے لئے مقرر کئے ہیں میں کسی پر کیوں احسان رکھوں اس لئے میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ قواعد دوسروں کی راحت کے واسطے مقرر کئے ہیں گو بعض احباب کا اعتقاد ہے کہ اس میں ان کی بھی مصالح کی رعایت ہے۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو مگر وہ سب قرآن و احادیث سے بلا تکلف اور بدون تاویل کے ثابت ہیں اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ آداب المعاشرت کا دیباچہ دیکھ لے اس میں ان انتظامات کے کلیات کو قرآن و احادیث سے ثابت کر دیا گیا ہے اور جزئیات کا کلیات میں داخل کر لینا اہل علم کو کچھ مشکل نہیں اور اگر کسی کو اس میں خفا رہے تو میں اس کے بیان کے لئے حاضر ہوں۔

تو صاحب دوسری قوموں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے آپ کے گھر سے یہ چند باتیں چرالی ہیں۔ انتظام، پابندیٔ وقت، رازداری، اتحاد و اتفاق وغیرہ وغیرہ اور ان اعمال کی خاصیت ہے کہ جو ان کو اختیار کرتا ہے اُسے ترقی ہو جاتی ہے۔ اس لئے دوسری قوموں کو ترقی ہو رہی ہے اور آپ نے ان اعمال کو ترک کر دیا ہے اس لئے آپ تنزل میں ہیں۔ پھر دوسری قوموں نے جو ان اعمال کو اختیار کیا ہے وہ اختیار ناقص ہے۔ اگر اختیار کامل ہوتا تو وہ نتیجہ ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند ــ صاف گر باشد ندانم چوں کند

ایک خاک آمیز گھونٹ نے تو بچا دیا ہے اگر خالص جام پیتے تو نہ معلوم کہاں پہونچتے یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ بنی اسرائیل حالانکہ کچھ زیادہ مؤدب نہ تھے مگر با اینہمہ ان کے ان شاء اللہ کہنے کی برکت ظاہر ہوئی اس پر میں نے کہا تھا کہ بعض اعمال میں ایک خاصیت ہوتی ہے جس کا ظہور ہر محل میں ہوتا ہے گو محل کم قابل ہی کیوں نہ ہو اسی پر یہ مضمون متفرع کیا تھا کہ بعض اعمال شرعیہ کو ترقی میں دخل ہے جو انھیں اختیار کرتا ہے اس کو ترقی حاصل ہوجاتی ہے گو کافر ہی اختیار کرے اب میں پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ اس کے بعد حق تعالے فرماتے ہیں۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَأْتُمْ فِيهَا مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ○

اور جب تم نے ایک جان کا خون کر دیا پھر اس کو ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور حق تعالے کو اس بات کا ظاہر کرنا تھا جسے ہم چھپا رہے تھے یہ اس قصہ کی ابتدا ہے جس کو ترتیب میں موخر کیا گیا ہے. مفسرین نے اس تقدیم و تاخیر میں بہت سے نکات لکھے ہیں ان سب میں سہل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مقام پر دور سے بنی اسرائیل کی بے عنوانیوں کا ذکر چلا آرہا ہے اور یہاں بھی اس کا بتلانا مقصود ہے اور اس قصہ میں بنی اسرائیل سے دو بے عنوانیاں ہوئی تھیں ایک قتل کر کے اخفا وارداتِ کرنا دوسرے احکام خداوندی میں خواہ مخواہ کی حجتیں نکالنا۔ پہلی بے عنوانی ابتدا ر قصہ میں ہوئی اور دوسری اس کے بعد۔ اگر قصہ کو ترتیب وار بیان کیا جاتا تو ناظرین پہلے جزو کو مقصود سمجھتے اور دوسرے جزو کو تتمیم قصہ پر محمول کرتے اور ترتیب بدلنے سے صاف معلوم ہوگیا کہ دونوں ہی جزو مقصود ہیں اور ہر جزو سے ایک مستقل بے عنوانی پر تنبیہ کرنا منظور ہے دوسرے احکام خداوندی میں حجتیں نکالنا اخفار واردات سے بڑھ کر جرم ہے اس لئے اس کو پہلے بیان کیا گیا تاکہ ناظرین کو تنبیہ ہو جائے تاکہ خدا کے نزدیک قتل وغیرہ کی نسبت احکام میں حجتیں نکالنا زیادہ شدید ہے جس کو عام لوگ معمولی

بات سمجھتے ہیں ۱۲ جامع) اس کے بعد فرماتے ہیں۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥ (پس ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو اس طرح حق تعالٰے مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)

پھر ہم نے کہا کہ اس مقتول پر بیل کے کسی عضو کو لگاؤ اس سے وہ زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دے گا اس وقت گرکی بات بتلادی کہ بیل کے ذبح کرنے کا حکم اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے کسی عضو کے مس کرنے سے مقتول زندہ ہو جائیگا پہلے یہ بات نہیں بتلائی کیوں کہ بنی اسرائیل کی اطاعت کا امتحان مقصود تھا، جس میں وہ ناکام ثابت ہوئے مگر جب حجتیں نکالنے کے بعد انھوں نے بقرہ کو ذبح کر دیا اس وقت امتثال امر پر یہ رحمت فرمائی کہ اس حکم کی حکمت بتلائی گئی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس نے زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دیا اور پھر مر گیا یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ مقتول کے قول پر فیصلہ کیونکر ہوا کیونکہ مقتول بھی فی الجملہ مدعی ہوتا ہے اور مدعی کا قول محتاج بینہ یا اقرار مدعیٰ علیہ کا ہے خود حجت نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہاں مقتول کا قول فی نفسہ حجت نہ تھا بلکہ حجت وحی تھی جس سے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ مقتول زندہ ہو کر جو کچھ کہے گا وہ صحیح ہو گا۔

یہ تو قصہ تھا اب میں اس کو منطبق کرنا چاہتا ہوں مقصود پر یعنی مضمون مجاہدہ پر۔ قربانی سے تو مناسبت اس قصہ کے جزو اول ہی کو تھی اس کا بیان تو بوجہ مناسبت زمانہ کے ضروری تھا ہی مگر چونکہ مجھے مجاہدہ سے بھی اس مضمون کی مناسبت بیان کرنا ہے اس لئے میں نے جزو اخیر کو بھی تلاوت کیا مجاہدہ کے مقصود سے اس کو مناسبت ہے اب یہ سمجھو کہ اس وقت میں جو کچھ بیان کروں گا وہ علم اعتبار ہو گا جو کہ تفسیر آیات نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس کو تفسیر سمجھا ہے وہی صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں مگر صوفیہ کی مراد علم اعتبار سے یہ نہیں ہے کہ نصوص کو

ظاہر سے محرف کریں بلکہ ظاہر کو ظاہر پر رکھ کر پھر بطور قیاس کے امثال قرآنی کو وہ اپنے مقصود پر جاری کرتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کا قیاس ہے جس کی نصوص سے اجازت ہے جیسے فقہی قیاس کی اجازت ہے۔ چنانچہ حق تعالےٰ سورۂ حشر میں قصۂ بنی نضیر کے بیان کے بعد فرماتے ہیں فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ (اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو اس واقعہ سے) تو اب اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کا مطلب کیا ہے، یہی تو مطلب ہے کہ تم اپنے حال کو ان کے حال پر موازنہ کرکے دیکھو اگر تمہارے اندر اُن جیسے اعمال وخصائل ہوں گے تو سمجھ لو کہ یہی معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ اسی طرح عاد وثمود وغیرہ کے قصے بیان فرماکر ارشاد فرمایا ہے لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (البتہ ان کے قصوں میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے) اب بتلایا جائے کہ ان کے قصے میں عبرت کیا ہے۔ یہی تو ہے کہ ان کے اعمال میں غور کرکے اپنے کو اُن سے بچائے یہی صوفیہ نے کیا ہے کہ قصص قرآنیہ کو وہ اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں وہ ان قصوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے (بلکہ ہر چیز کی نظیر اپنے اندر قائم کرکے مشبہ بہ کے احکام کو مشبہ پر جاری کرتے ہیں ۱۲)

مثلاً قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا قصہ فرعون کے ساتھ جابجا مذکور ہوا ہے اس کی تفسیر صوفیہ کے نزدیک بھی وہی ہے جو کتب تفاسیر میں مذکور ہے موسیٰ علیہ السلام سے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور فرعون سے مراد خاص وہی شخص ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ تھا لیکن صوفیہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ تفسیر آیات کے بعد اس قصہ کو اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی ایک چیز موسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ہے یعنی روح یا عقل اور ایک چیز فرعون کے مشابہ ہے یعنی نفس اور جس طرح فرعون کا غلبہ موسیٰ علیہ السلام پر باعث فساد تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا غالب ہونا فرعون پر موجب صلاح

تھا اسی طرح نفس کا روح پر غالب ہونا موجب فساد ہے اور روح کا نفس پر غالب ہونا موجب صلاح ہے اس کے بعد وہ عام قصے کو روح و نفس کے معاملات پر منطبق کرتے چلے جاتے ہیں اب وہ کہتے ہیں کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (فرعون کی طرف جاؤ اس نے سرکشی کی ہے) کے معنی علم اعتبار کے طور پر یہ ہیں اِذْهَبْ اَيُّهَا الرُّوْحُ اِلَى النَّفْسِ اِنَّهٗ طَغٰى (اے روح نفس کی طرف جا اس نے سرکشی کی ہے) تو بتلایئے اس میں شرعاً کیا خرابی ہے۔

اس کی حقیقت قیاس فقہی کے قریب ہے۔ اتنا فرق ہے کہ قیاس کا نتیجہ بواسطہ قیاس مدلول نص ہے اور اعتبار کا نتیجہ مدلول نص نہیں بلکہ مدلول نص کے مشابہ ہے اور اسی فرق کا یہ اثر ہے کہ حکم قیاسی میں تو اگر مستقل نص نہ ہو تب بھی مقیس علیہ سے مقیس میں حکم کو متعدی کر سکتے ہیں اور حکم اعتباری میں اگر مستقل نص نہ ہو تو مشبہ بہ سے مشبہ میں حکم کو متعدی نہیں کر سکتے جیسے حدیث شریف میں ہے لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ (اس گھر میں فرشتہ نہیں آتا جس میں کتا ہو) اور اس سے بطور اعتبار یہ کہا گیا ہے کہ لَا تَدْخُلُ الْاَنْوَارُ الْاِلٰهِيَّةُ قَلْبًا فِيْهِ صِفَاتٌ سَبُعِيَّةٌ (نہیں ہوتے داخل انوار الٰہی اس دل میں جس میں بہائمی صفات ہوں) تو اگر یہ حکم کسی مستقل دلیل سے ثابت نہ ہو تو محض اس نص سے حکم کا تعدیہ نہیں کر سکتے اس لئے بجائے قیاس کے اگر اس کا نام تشبیہ رکھا جاوے تو مناسب ہے تاکہ خلط نہ ہو اور یہاں سے تسامح ظاہر ہو گیا ہو گا ان فقہاء کا جنھوں نے اقل مدت حیض کے تین دن ہونے پر اقل مدت سفر سے استدلال کیا ہے کہ دونوں حالت عارضی ہیں اور اقل مدت طہر پندرہ دن ہونے پر اقل مدت اقامت سے استدلال کیا ہے کہ دونوں حالت اصلی ہیں سو تشبیہ کو قیاس کہدیا ورنہ یقینی بات ہے کہ اگر مقیس میں مستقل دلیل نہ ہو تو ہرگز اس مقیس علیہ سے حکم مذکور کو متعدی نہیں کر سکتے البتہ اس تشبیہ سے ایک گونہ تائید و تقریب ضرور ہو گئی۔

شاید تم یہ کہو کہ دلائل سے تو علم اعتبار کا صحیح ہونا اور خلاف شرع نہ ہونا معلوم ہوگیا لیکن یہ بتلاؤ کہ اس کا ثبوت کہیں سلف سے بھی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں سلف سے بھی اس قسم کی نظائر منقول ہیں چنانچہ رزین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے جس کو تیسیر الوصول میں نقل کی ہے کہ انھوں نے ایک آیت میں اسی طرح کا مطلب بیان فرمایا ہے۔ حق تعالے فرماتے ہیں۔ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ○ (کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جن کو ان کے قبل کتاب ملی تھی پھر ان پر ایک زمانہ گذر گیا پھر ان کے دل سخت ہوگئے اور بہت سے آدمی ان میں کے کافر ہیں)

اس میں تو خشوع کا امر ہے اور قساوت قلب سے بچنے کی تاکید اس کے بعد فرماتے ہیں اِعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (جان لو کہ حق تعالے زمین کو بعد اس کے مردہ ہونے کے زندہ کردیتے ہیں اور اللہ تعالے اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ يُلِينُ الْقُلُوْبَ بَعْدَ قَسْوَتِهَا فَيَجْعَلُهَا مُخْبِتَةً مُّنِيْبَةً يُحْيِي الْقُلُوْبَ الْمَيِّتَةَ بِالْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ وَإِلَّا فَقَدْ عَلِمَ إِحْيَاءُ الْأَرْضِ بِالْمَطَرِ مُشَاهَدَةً وَمَقْصُوْدَةً إِنَّ هٰذَا مَثَلٌ ضَرَبَهُ اللّٰهُ لِعِبَادِهٖ وَيُرِيْدُ أَنَّ قُلُوْبَكُمْ كَالْأَرْضِ فَلَا تَيْئَسُوْا مِنْ قَسَاوَتِهَا فَإِنَّهَا تُحْيِيْ بِالْأَعْمَالِ كَالْأَرْضِ تُحْيِيْ بِالْغَيْثِ (حضرت ابن عباس رض نے فرمایا نرم کردیا دل کو بعد ان کی قساوت کے کہ ان کو مردہ کردیا تھا زندہ کردیا مردہ دلوں کو علم و حکمت سے

ورنہ جان لیا تھا زمین کے زندہ ہونے کو بارش سے مشاہدہ سے اور یہ مثال ہے کہ بیان کیا ہے اس کو اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کے لئے اور مراد یہ ہے کہ ان کے دل مثل زمین کے ہیں پس ان کی قساوت سے نا امید مت ہو زندہ کر دیں گے ان کو اعمال سے مثل زمین کے کہ اس کو بارش سے زندہ کرتے ہیں)

یعنی مقصود عبداللہ بن عباسؓ کا یہ ہے کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا الخ (جان لو کہ حق تعالےٰ زمین کو بعد مردہ ہونے زندہ کر دیتے ہیں) میں حق تعالےٰ نے اپنے بندوں کے لئے ایک مثال بیان فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح زمین خشک ہو جانے کے بعد بارش سے زندہ ہو جاتی ہے اسی طرح قلوب بھی قساوت کے بعد اعمال صالحہ سے زندہ ہو جاتے ہیں پس اگر کسی کے قلب میں معاصی گذشتہ سے قساوت پیدا ہو گئی ہو تو وہ اصلاح سے مایوس نہ ہو کیونکہ زمین کی نظیر تمہارے لئے ہم نے بیان کر دی ہے اس پر اپنے قلوب کو بھی قیاس کر لو۔

تو اب دیکھ لو کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت میں ارض سے قلب مراد لیا اور موت سے قساوت یہی علم اعتبار ہے ورنہ لغۃً ارض کے معنی قلب اور موت کے معنے قساوت کے کہیں نہیں ہیں مگر انھوں نے آیت کو تشبیہ پر محمول کر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں۔ اسی طرح صوفیہ بطور تشبیہ کے کہدیتے ہیں کہ موسیٰ سے مراد روح اور فرعون سے مراد نفس ہے۔ وعلیٰ ھذا جب علم اعتبار کی نظیر سلف سے بھی منقول ہے اور قواعد شرع کے بھی وہ خلاف نہیں تو اب کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر میں علم اعتبار کے طور پر اس قصہ کو مضمون مجاہدہ پر منطبق کر کے بیان کروں۔ الغرض اس جگہ یہ ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل کو ذبح بقرہ کا امر ہوا تھا اور اہل لطائف علم اعتبار کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ گویا نفس کشی کا امر ہوا تھا۔ گویا بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی گئی ہے اور یہ تشبیہ بہت مناسب ہے کیونکہ گائے بیل بھی بہت حریص ہوتے ہیں کھانے پینے کے اور نفس بھی

بہت حریص ہوتا ہے اس لئے نفس کو بقرہ کہنا تو مناسب ہے لیکن آج کل نفس کو کتا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ شعراء کے کلام میں سگ نفس بکثرت مستعمل ہے مگر یہ واہیات ہے۔ اسی طرح بعض لوگ نفس کو کافر کہتے ہیں یہ اس سے بھی واہیات ہے۔ ہمارا نفس تو الحمد للہ نہ کتا ہے نہ کافر ہے۔ ہاں بقرہ تو ہوگا۔ نہ معلوم لوگ نفس کو کیا سمجھتے ہیں لغت میں تو نفس حقیقت شے کو کہتے ہیں۔ پس نفس زید حقیقت زید ہوئی تو حقیقت میں نفس ہمارا ہی نام ہے ہم سے الگ کوئی چیز تھوڑا ہی ہے تو اپنے کو کتا یا کافر کہنا کیا زیبا ہے اور اگر نفس کوئی مستقل چیز بھی ہو تب بھی اول تو وہ ہمیشہ شریر نہیں ہوتا کہ اس کو کتے سے تشبیہ دی جاوے بلکہ کبھی مطمئنہ ہوتا ہے کبھی لوامہ بھی ہوتا ہے کبھی امارہ ہوتا ہے۔

چنانچہ نصوص میں یہ تینوں صفات مذکور ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ (اور میں اپنے نفس کو بری نہیں بتلاتا نفس تو بری ہی بات بتلاتا ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے)

اور تیسری جگہ ارشاد ہے یَا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش ہو)

پھر اگر شریر بھی ہو تب بھی مسلمان تو ہے تو مسلمان کو کافر کہنا یا کتے سے تشبیہ دینا کیا مناسب ہے ہاں بقرہ کے ساتھ تشبیہ دینے کا مضائقہ نہیں غرض جس طرح بقرہ کے ذبح کا امر ہوا تھا اسی طرح نفس کو بھی مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیئے بدون مجاہدہ کے کامیابی نہیں ہوتی۔ بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے

بس ویسے ہی کامیاب ہو جائیں چنانچہ مشائخ سے کہتے ہیں کہ اپنے سینہ میں سے کچھ دیدو میں نے اس کے متعلق ایک وعظ میں یہ جواب دیا ہے کہ سینہ میں کیا رکھا ہے بجز بلغم کے مطلب یہ کہ جو بدون مجاہدہ کے تم کو دیا جا سکے وہ تو یہی ہے اور جس چیز کے تم طالب ہو وہ سینہ سے بدون مجاہدہ کے نہیں مل سکتی۔ میرے اس مضمون پر ایک صاحب نے بہت خفا ہو کر مجھے خط میں لکھا کہ تم نے طریق کی بہت بے ادبی کی حالانکہ سینہ ہی میں تو سب کچھ ہے صوفیہ تصریحاً فرماتے ہیں کہ نسبت مع اللہ کی دولت درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنی چاہیے چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مالابدمنہ میں لکھتے ہیں۔ از سینۂ درویشاں باید جست (درویشوں کے سینہ سے ڈھونڈنا چاہیے) اور تم کہتے ہو کہ سینہ میں کیا رکھا ہے بجز بلغم کے۔ سو میرے پاس اس بات کا جواب تھا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ جو چیز سینہ سے بدون مجاہدہ طالب کے دی جا سکتی ہے وہ تو بلغم کے سوا کچھ نہیں اور جس چیز کو قاضی ثناء اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنی چاہیے میں اس کی نفی نہیں کرتا لیکن وہ مجاہدہ سے ملتی ہے بدون مجاہدہ کے نہیں مل سکتی مگر میں نے کچھ جواب نہیں دیا کیونکہ مجھے اس کے خط سے اندازہ ہو گیا تھا کہ مخاطب بھدی طبیعت کا ہے یہ خطاب کے قابل نہیں اس لئے میں نے حضرت حافظ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر عمل کیا وہ فرماتے ہیں ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار و مستی کی باتیں مت بیان کرو اس کو رنج و خود پرستی میں مرنے دو)

اور گو جواب نہ دینے سے انھوں نے مجھ کو عاجز و لاجواب سمجھا ہوگا مگر میں نے اسکی پرواہ نہ کی۔ میں نے عارفین کی تقلید کی ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ صرف طالب کو جواب دیا کرتے ہیں مدعی کو جواب نہیں دیتے چاہے وہ ان پر کتنا ہی اعتراض

کرے اور ان کو جاہل ہی سمجھے بلکہ اگر کوئی ان سے یہ کہے کہ تم کو کچھ نہیں آتا تم کچھ نہیں جانتے تو وہ خوش ہو کر کہتے ہیں کہ ہاں بھائی تم سچ کہتے ہو مجھے کچھ نہیں آتا تم سب لوگوں سے کہدو کہ یہ جاہل ہے اسے کچھ نہیں آتا میں تمہارا ممنون ہوں گا یہ عارف ہی کر سکتا ہے علماء قشر ایسا نہیں کر سکتے ان کو تو اگر کوئی کہدے کہ تم کچھ نہیں جانتے تو فوراً غصہ آجائے اور اثبات کے درپے ہوجائیں مناظرہ پر آمادہ ہوجائیں کہ آؤ بحث کر لو ابھی معلوم ہوجائیگا کون جانتا ہے کون نہیں جانتا مگر عارف سے یہ نہیں ہوسکتا اس کو تو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ کوئی اس کو جاہل ہی سمجھتا رہے کیونکہ اچھا ہوا ایک معتقد کم ہوا پیچھا چھوٹا بلکہ وہ تو بعض دفعہ قصداً ایسی حرکت کرتا ہے جس سے معتقدین کم ہوں اور اس کا راز یہ ہے کہ وہ کیمیا گر ہے اور قاعدہ ہے کہ کیمیا گر یہ نہیں چاہا کرتا کہ لوگوں کو اس کا کیمیا گر ہونا معلوم ہو اور جو کوئی یہ کہدے کہ تجھے کیمیا کچھ بھی نہیں آتی اس سے وہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں بھائی واقعی مجھے کیمیا نہیں آتی تم سب سے یہی کہدو کہ مجھے پریشان نہ کریں اہل قشر کہتے ہیں کہ قصداً ایسی حرکت نہ کرنا چاہیئے جس سے معتقد کم ہوں کیونکہ اس سے فیض اصلاح بند ہوتا ہے ہائے وہ اسی چکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح معتقد کم نہ ہوں اور دل میں تاویل کر لی ہے کہ ہمارا مقصود نفع خلق ہے۔ میاں بس جانے دو۔ ساری اصلاح آپ ہی پر تو موقوف ہے۔ بس لوگ آپ کے معتقد نہ ہوں گے تو اُن کو کہیں سے فیض ہی نہ ملے گا۔ خدا کے سیکڑوں بندے صاحب ارشاد موجود ہیں تم نے فیض کو اپنے ہی اوپر کیوں منحصر سمجھ لیا ہے یاد رکھو تمہارے معتقد کم ہونے سے فیض بند نہیں ہوسکتا اس لئے عارف ان تاویلوں پر کبھی توجہ نہیں کرتا بلکہ اس کو تو لوگوں کی بے اعتقادی سے خوشی ہوتی ہے اسے اپنے صاحب فیض ہونے کا وسوسہ بھی نہیں آتا۔ عارفین کا اصلی مذاق تو یہی ہے باقی جب اُن کے گلے ہی مڑھ دیا جائے کسی خدمت کو تو اس وقت وہ مجبور ہو کر اسے انجام دیتے ہیں مگر اس حالت میں بھی وہ ہر وقت اس کے لئے آمادہ ہوتے ہیں کہ

ان کا دنیا میں ایک بھی معتقد نہ رہے اسی لئے کسی کی بے اعتقادی سے ان کو رنج نہیں ہوتا نہ کسی کے جاہل کہنے سے غصہ آتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت اپنے فلاں مرید کو سمجھا دیجئے کہ وہ بے جا حرکتیں نہ کیا کرے ورنہ لوگ آپ سے بھی بد اعتقاد ہو جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میاں تمہارا جی چاہتا ہو بد اعتقاد ہونے کو تو تم ہو جاؤ دوسروں پر بات کیوں رکھتے ہو۔ پھر فرمایا کہ تم نے تو اپنے نزدیک یہ بڑی دھمکی دی کہ لوگ بدگمان ہو جائیں گے اور اگر کسی کو یہی مطلوب ہو کہ سب بد اعتقاد ہو جائیں تو؟ پھر فرمایا کہ واللہ مجھے تو تمہارے اعتقاد ہی نے پریشان کر رکھا ہے۔ بخدا میں چاہتا ہوں کہ سارا عالم مجھے زندیق و ملحد سمجھ کر چھوڑ دے اور میں اکیلا کسی پہاڑ میں بیٹھا ہوا اپنے محبوب میں مشغول ہوں اھ اور یہ حال ہو ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے دل باندھ لیا ہے تو پھر تمام جہان سے آنکھ بند کرلو)

اور اس کا راز یہ ہے کہ ان حضرات پر فناء کا غلبہ ہوتا ہے پھر جو اپنے کو فنا کر چکا وہ معتقدوں کی فوج جمع کرنا کیونکر چاہے گا اس کو تو واقعی مخلوق کے اعتقاد سے پریشانی ہوگی ان کا تو یہ حال ہوتا ہے ؎

تو درو گم شو وصال این ست و بس
گم شدن گم کن کمال این ست و بس

(تم محبوب میں فنا ہو جاؤ بس یہی وصال ہے اور اس فنا ہونے کو بھی بھول جاؤ بس یہی کمال ہے)

تو درو گم شو یہ تو فنا ہے اور گم شدن گم کن یہ فناء الفنا ہے کہ ایسا فنا ہو کہ اپنی فنا کی بھی خبر نہ ہو اور یہ مبالغہ شاعری نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے لوگ اس کو

شاعری مبالغہ سمجھے ہوں گے مگر میرے پاس ایک نظیر موجود ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ فناء کے لئے فناء الفناء لازم ہے وہ فناء ہی نہیں ہے جس میں اپنے فانی ہونے کی بھی خبر ہو دیکھئے نائم وہ ہے جس کو اپنی نوم کی بھی خبر نہ ہو اگر نائم کو اپنی نوم کی خبر ہو اور وہ اتنی بات جانتا ہو کہ میں سو رہا ہوں تو وہ نائم نہیں ہے بیدار ہے نیند تو اسی کا نام ہے کہ سونے والے کو یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں سو رہا ہوں اسی طرح فناء وہی ہے جس میں اپنی فنا کی بھی خبر نہ ہو اور جو شخص اپنے کو فانی سمجھتا ہے وہ فانی نہیں ہے بیدار ہے بلکہ مدعی ہے تو جس پر یہ حال غالب ہو فناء الفناء کا وہ بھلا معتقدین کی زیادتی سے کیا خوش ہو سکتا ہے وہ تو اس سے ہی خوش ہوگا کہ کوئی بھی اس کو نہ پہچانے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر چار حرفوں کی تہمت نہ لگی ہوتی تو میں ایسا اپنے کو غائب کرتا کہ کوئی یہ بھی نہ جانتا کہ میں دنیا میں پیدا بھی ہوا ہوں اھ مگر اس غائب نہ کر سکنے پر بھی آپ کی یہ حالت تھی کہ ایسی وضع سے رہتے تھے کہ دیکھ کر کوئی نہ پہچانتا تھا کہ یہ کوئی عالم ہیں۔ بس ایک لنگی گاڑھے کی کندھے پر ڈالے ہوئے رہا کرتے تھے۔ غدر میں مولانا کے پیچھے پولیس پھرتی تھی مگر کسی نے بھی آپ کو نہ پہچانا ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ مولانا مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے پولیس آئی اور خود مولانا ہی سے پوچھا کہ تم کو معلوم ہے کہ مولوی محمد قاسم صاحب کہاں ہیں تو آپ ذرا سا اپنی جگہ سے کھسک کر فرماتے ہیں کہ ابھی تو یہاں تھے، پولیس چلی گئی۔ سفر میں جب کبھی جاتے تو ساتھیوں کو نام بتلانے کی ممانعت تھی کہ میرا نام کسی سے ظاہر نہ کرنا۔ اور اگر کوئی آپ سے دریافت کرتا کہ آپ کا نام کیا ہے تو فرماتے میرا نام خورشید حسن ہے یہ مولانا کا شاید کسی تصرف سے تاریخی نام تھا مگر اسے کوئی جانتا بھی نہ تھا، مشہور نام محمد قاسم تھا وہ نہیں بتلایا کرتے تھے اگر کوئی وطن کا نام پوچھتا تو فرماتے الہ آباد۔ ایک بار کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وطن تو نانوتہ ہے الہ آباد کیسے ہو گیا۔ فرمایا نانوتہ

بھی تو خدا ہی نے آباد کیا ہے۔ بتلادیا کہ معنی لغوی کے اعتبار سے وہ بھی الہ آباد ہے سبحان اللہ کیسا اخفاء حال تھا مگر باوجود اس اخفاء کے چھپے تھوڑا ہی رہتے تھے آخر عشاق نے پہچان ہی لیا طالبوں نے تاڑ ہی لیا پھر ایسے مشہور ہوئے کہ دنیا میں نام روشن ہے، بھلا آفتاب کہیں چھپ سکتا ہے۔ جب شاہجہانپور میں مباحثہ ہوا ہے مسلمانوں کا اور آریوں اور عیسائیوں کا تو مسلمانوں نے مولانا کو بھی بلایا تھا، مولانا تشریف لے گئے مگر وقت سے کچھ ہی پہلے پہونچے تھے اس لئے آپ سیدھے میدان مناظرہ میں تشریف لے گئے، صورت سے کسی نے بھی نہ پہچانا کہ یہ کوئی عالم ہیں۔ ایک نیلی لنگی موٹی سی سر پر ڈال رکھی تھی اس شان سے آپ پہونچے۔ لوگ سمجھے کہ کوئی معمولی آدمی ہیں مگر آپ کا سادہ حسن تکلف والوں کے حسن سے بڑھا ہوا تھا، بڑے بڑے جبے عمامے والے مولوی آپ کے حسن خداداد کے سامنے گرد تھے کیونکہ ؎

حُسْنُ الْحَضَارَةِ مَجْلُوْبٌ بِتَطْرِيَةٍ
وَفِي الْبَدَاوَةِ حُسْنٌ غَيْرُ مَجْلُوْبِ

(شہریوں کا حسن بناوٹی ہوتا ہے اور دیہاتیوں کا حسن خداداد ہے)

اور آپ کی یہ شان تھی ؎

دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند
دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

(دل فریبان نباتی زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے)

حسن خداداد کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت تھی عمامہ کی اور کیا ضرورت ہے جبہ کی ؎

حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را

غرض جب آپ تقریر کے لئے اٹھے ہیں اور تقریر فرمائی ہے تو تمام جلسہ محو حیرت تھا اس وقت مسلمانوں کے جان میں جان آئی اور مولانا کے تشریف نہ لانے کے خیال سے جو رنج ہو رہا تھا مبدل بخوشی ہوگیا۔ آپ کی تقریر میں ایسی خداداد شوکت تھی

کہ اسی زمانہ میں ایک ہندو نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ کہ شاہجہاں پور کے مناظرہ میں ایک نیلی لنگی والا چھوٹے قد کا مولوی سب سے جیت گیا حالانکہ اس ہندو نے شاید مولانا کی تقریر کا ایک لفظ بھی نہ سمجھا ہوگا مگر اتنی بات وہ بھی سمجھ گیا کہ یہ سب سے جیت گئے کیونکہ علوم وحقائق میں ایک نور اور ایک شوکت ہوتی ہے جو باطل میں کبھی نہیں ہوسکتی۔ حقائق کو سن کر ہر شخص کو اس کا غلبہ نظر آجاتا ہے گو وہ سمجھا بھی نہ ہو۔

صاحبو! یہ ہیں اصلی کمالات اور اس کا نام ہے علم۔ عمامہ اور جبہ پہننے سے تھوڑا ہی عالم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ بھاگلپور میں علماء کا اجتماع ہوا تھا مولوی انور شاہ صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ جلسہ میں پہلے بڑے بڑے عمامے اور جبے والے مولوی موجود تھے مگر ایک ہندو نے مولوی انور شاہ صاحب کو دیکھ کر کہا کہ یہ شخص اس مجمع میں سب سے بڑا عالم معلوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ نہ جبہ پہنے ہوئے تھے نہ عمامہ باندھے ہوئے تھے معمولی لباس میں تھے گویا اپنی طرف سے تو انھوں نے اپنے کو چھپانا چاہا تھا مگر علم وعمل کا نور کہاں چھپتا ہے وہ تو چہرہ سے عیاں ہوتا ہے۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں) سچ ہے ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی
نیک بیں باشی اگر اہل دلی
(ولی میں نور حق ظاہر ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو نیک بیں ہو)

اور اردو میں کسی نے ترجمہ کیا ہے ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور
(جو شخص انکساری کرتا ہے اللہ تعالے اس کا درجہ بلند کرتے ہیں)

مٹانے والوں کی شہرت ہو ہی جاتی ہے۔ حدیث میں وعدہ ہے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ۔ (جو شخص انکساری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتے ہیں) اور جو شخص اپنے کو بڑھانا چاہتا ہے حق تعالیٰ اس کو گرا دیتے ہیں اسی حدیث سے لازم آتا ہے کہ مَنْ تَکَبَّرَ وَضَعَہُ اللّٰہُ (جو شخص اپنے کو بڑھاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پست کر دیتے ہیں) پس اگر کسی کو شہرت ہی مطلوب ہو تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ فنا اختیار کرے اور طلب شہرت کو دل سے نکال دے ؂

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

یعنی دیکھو عنقا نے اپنے آپ کو غائب کر دیا تو اس کا کیسا نام ہوا اسی طرح تم فنا اختیار کرو تو حق تعالیٰ تم کو رفعت و شہرت عطا کریں گے طلب شہرت سے شہرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ (یہاں پہونچکر حضرت مولانا نے کاتب وعظ سے دریافت فرمایا کہ یہ مضمون کس بات پر چلا تھا۔ احقر نے عرض کیا کہ حضرت حاجی صاحب کی حکایت بیان ہو رہی تھی کہ آپ سے کسی نے عرض کیا کہ اپنے فلاں مرید کو سمجھا دیجئے ورنہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے الخ۔ فرمایا اس سے پہلے کیا بیان ہو رہا تھا، میں نے عرض کیا اس سے پہلے یہ مضمون تھا کہ نفس کو بقرہ سے تشبیہہ دی گئی ہے تو جس طرح اُس کے ذبح کا امر ہوا تھا اس کو بھی مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیئے۔ فرمایا اس مضمون کے بعد اور حاجی صاحب کی حکایت سے پہلے درمیان میں کیا مضمون تھا وہ مضمون اس وقت نوٹ ہونے سے رہ گیا تھا۔ ختم وعظ پر یاد آیا تو نوٹ کیا گیا اس موقعہ پر میں نہ بتلا سکا چونکہ سلسلہ کا ربط اسی سے تھا اس لئے دیر تک حضرت سوچتے رہے کئی منٹ تک سوچنے کے بعد بھی جب یاد نہ آیا تو فرمایا کہ خیر یاد نہیں آتا تو نہ سہی اور ربط فوت ہو جائے تو کچھ حرج بھی نہیں کیا محبوب کی زلف ہمیشہ مسلسل ہی ہوا کرتی ہے۔

کبھی زلف^۹ پریشان بھی تو ہوتی ہے اور کیا موتی سب منظوم ہی ہوتے ہیں درمنثور بھی تو ہوتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت نے تقریر شروع فرمائی جو عنقریب آتی ہے جس کا ربط احقر بیان کر دینا چاہتا ہے۔ یہ مضمون اس پر شروع ہوا تھا کہ جو چیز بزرگوں کے سینہ سے طلب کی جاتی ہے وہ بدون مجاہدہ کے حاصل نہیں ہوتی بدون مجاہدہ کے جو چیز سینہ سے حاصل ہوسکتی ہے وہ تو بلغم کے سوا کچھ نہیں اس پر فرمایا تھا کہ میں نے ایک وعظ میں یہی بات لکھدی ہے کہ سینہ میں بلغم کے سوا کیا رکھا ہے۔ اس کو دیکھ کر ایک صاحب مجھ پر بہت خفا ہوئے اور انھوں نے مجھے خط لکھا کہ تم نے طریق کی بہت بے ادبی کی۔ سینہ ہی سے تو سب کچھ ملتا ہے۔ پھر فرمایا کہ میں گو اس شخص کو جواب دے سکتا تھا مگر میں نے جواب نہیں دیا اور حضرت حافظ کے ارشاد پر عمل کیا ؎ با مدعی مگوئید الخ گو جواب نہ دینے سے وہ مجھے عاجز ولاجواب سمجھا ہوگا مگر میں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اس پر عارفین کے مذاق کا ذکر چلا تھا کہ وہ مدعی کو جواب نہیں دیا کرتے اور اگر کوئی ان کو جاہل سمجھے تو اس سے خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا ایک معتقد تو کم ہوا۔ اور یہ سارا بیان اس پر چلا تھا کہ اس آیت میں ذبح بقرہ کا امر ہوا ہے جس سے اہل لطائف نے نفس مراد لیا ہے کہ اس کو مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بدون مجاہدہ کے کامیابی نہیں ہوتی۔ بعض لوگ بدون مجاہدہ کے کامیاب ہونا چاہتے ہیں اور مشائخ سے کہتے ہیں کہ اپنے سینہ سے کچھ دیدو یہ ان کی غلطی ہے ۱۲ جامع)

بہرحال آیت میں بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی گئی ہے جس طرح بقرہ کے ذبح کا حکم ہے نفس کے ذبح کا بھی حکم ہے مگر بقرہ کا ذبح چھری سے ہوتا ہے اور نفس کا ذبح مجاہدہ سے ہوتا ہے۔ کوئی صاحب ذبح نفس کے ظاہری معنی

---

۹ کما قال شاعر ؎ قبا وا کردہ و کاکل پریشاں کردہ می آید
بہ بیں ایں بے سروساماں چہ ساماں کردہ می آید

(قبا کھولے ہوئے کاکل بکھرے ہوئے آتا ہے دیکھو اس بے سروسامانی میں کس سروسامان کے ساتھ آتا ہے)

نہ سمجھ جائیں کہ بس لگیں خودکشی کرنے بلکہ ذبح نفس کے معنی مجاہدہ کے ہیں جس کی حقیقت عنقریب ظاہر ہو جائے گی۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انبیاء علیہم السّلام کے سنن میں سے ہے گائے کا ذبح کرنا اور بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو گائے کے گوشت سے رغبت بھی تھی۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں وارد ہے فَجَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ کہ وہ اپنے مہمانوں کے سامنے بچھڑے کا گوشت بُھنا ہوا لائے۔ اور ظاہر ہے کہ مہمان کے لئے وہی چیز لاتے ہیں جو اپنی مرغوب ہوتی ہے۔ اب آجکل لوگ کہتے ہیں کہ گائے کا گوشت سودا پیدا کرتا ہے، ہاں صاحب اب پیدا کرنے لگا ہوگا۔ (یعنی جب سے کہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد واتفاق کا خیال پیدا ہوا ۱۲ جامع) پہلے تو کبھی اس نے سودا نہ پیدا کیا یعنی اس ضرر کا کبھی ذکر نہ کیا گیا۔ پھر میں کہتا ہوں کہ وہ کونسی چیز ہے جو سودا صفرا پیدا نہیں کرتی۔ انسان میں صفرا، بلغم، سودا اور خون کے سوا اور ہے کیا اور ہر خوردنی چیز ان میں سے کسی نہ کسی کو ضرور مضر ہوتی ہے، کوئی دوا یا غذا ایسی نہیں جو بہمہ وجوہ نافع ہو اور کسی خلط انسانی کو مضر نہ ہو۔ کتب طب اٹھا کر دیکھو ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نقصان ضرور ہے۔ دودھ کی بہت تعریف کی جاتی ہے ذرا طب کی کتابوں میں دیکھو کہ اس کے نقصانات کس درجہ لکھے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ گائے کے گوشت کے قریب ہی قریب مضر نکلے گا تو یہ سب بہانے ہیں جو آجکل تراشے گئے ہیں پہلے ان کا کوئی نام بھی نہ لیتا تھا۔

غرض ابراہیم علیہ السّلام کے قصہ میں قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام گائے کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ پس ہمارے واسطے ذبح بقرہ کے لئے یہ دلیل کافی ہے پہلے زمانہ میں سواری کا زیادہ کام اونٹ سے لیا جاتا تھا بیلوں سے سواری کا کام نہ لیا جاتا تھا پس یہ تو کھیتی کے کام آتا تھا یا کھانے کے کام میں آتا تھا اور واقعی سواری کے لئے اونٹ ہی موزوں ہے کیونکہ وہ

بڑا قانع جانور ہے۔ تھوڑی سی غذا اس کے لئے کافی ہے اور ایک دن پانی پی کر کئی کئی دن تک پانی سے صبر کر سکتا ہے۔ پھر اس کی غذا بھی کچھ گراں نہیں درختوں کے پتوں پر اکتفا کر لیتا ہے اور بیل تو ہاؤ ہپ ہے اس کے لئے تو چارہ کا گٹھڑ ہونا چاہیئے پھر دانہ الگ چاہیئے اس لئے سواری میں اس سے اونٹ کی برابر راحت نہیں مل سکتی علاوہ اس کے اونٹ میں بیل سے قوت بھی زیادہ ہے۔ جتنا بوجھ وہ لے جا سکتا ہے بیل نہیں لے جا سکتا۔ اس لئے پہلے زمانہ میں بیل سے سواری کا کام نہ لیتے تھے بس یہ تو کھانے ہی کے کام میں آتا تھا یا کھیتی میں چلتا تھا اور تماشا ہے کہ جیسے عرب کے اندر قناعت کا مادہ بہت زیادہ ہے تو وہاں کے جانوروں میں بھی یہ صفت موجود ہے۔ چنانچہ اونٹ کو زمین عرب سے خصوصیت ہے تو اس میں سب جانوروں سے زیادہ قناعت ہے۔ اور ہندوستان کے لوگوں میں حرص کا مادہ زیادہ ہے تو یہاں کے جانوروں میں بھی اسی صفت کا غلبہ ہے چنانچہ بیل اور گائے کو زمین ہندوستان سے خصوصیت ہے تو دیکھ لیجئے اس میں کتنی حرص ہے کہ ہر وقت اس کا منہ ہی چلتا رہتا ہے جیسے خود ہم ہیں۔

سرسید نے غضب کیا ہے کہ عرب کی مذمت لکھتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ اس قوم میں کینہ بہت ہے حتیٰ کہ وہاں کے جانوروں میں بھی اس صفت کا غلبہ ہے چنانچہ شتر کینہ مشہور ہے مولوی محمد علی صاحب نے سرسید کی تفسیر کے رد میں ایک کتاب آلبرہان بہت ہی عمدہ لکھی ہے۔ بڑی قابلیت سے جواب دیا ہے انھوں نے اس اعتراض کا بھی بڑا عمدہ جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ اول تو جانوروں کے اخلاق سے انسانوں کے اخلاق پر استدلال کرنا یہ عجیب طریقہ استدلال ہے پھر ہم سید صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شتر کینہ جو مشہور ہے یہ عرب کا محاورہ ہے یا فارس کا ظاہر ہے کہ یہ عرب کا محاورہ نہیں فارس کا ہے تو اس سے بہت سے بہت یہ لازم آیا کہ فارس کے اونٹوں میں کینہ ہوتا ہوگا۔ عرب کے اونٹوں میں اس صفت کا ہونا کیسے لازم آیا۔

اور اگر مان لیا جائے کہ عرب کے اونٹوں میں بھی یہ صفت ہے تو آپ نے اس کے ایک عیب کو تو دیکھ لیا اس کی دوسری خوبیوں کو بھی تو بیان کیا ہوتا ؎

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

(شراب کے تمام عیب تو تم نے بیان کردیئے اس کے ہنر بھی بیان کرو)

اونٹ میں اگر ایک عیب کینہ کا ہے تو ہزار باتیں مدح کی ہیں اُس میں تحمل وجفا کشی بہت ہے، قناعت کا مادہ بہت ہے عرب کے اونٹ مطیع و منقاد بہت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ جہاں کسی نے اونٹ پر سوار ہونے کے لئے اس کی گردن کو جُھکایا وہ فوراً گردن کو زمین پر رکھ دیتا ہے پھر سوار کے پاؤں رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ اس کو اس طرح اٹھاتا ہے کہ سوار نہایت سہولت سے پشت پر پہنچ جاتا ہے۔ لوگ کثرت سے اسی طرح چڑھتے اُترتے ہیں۔ اونٹ کی لمبی گردن سیڑھی کا کام دیتی ہے۔ تو اگر اس کے ایک عیب سے عرب کے ایک عیب پر استدلال کیا گیا ہے تو اس کی ان خوبیوں سے بھی تو اہل عرب کی خوبیوں پر استدلال کیا ہوتا۔ پھر عرب میں جہاں اونٹ ہیں وہاں گھوڑے بھی تو ہیں جن کی اصالت ونجابت وشرافت ضرب المثل ہے کہ وہاں کے گھوڑے مالک کے ساتھ ایسے وفادار ہوتے ہیں جس کو سب جانتے ہیں (لڑائی میں جہاں عربی گھوڑا دیکھتا ہے کہ میرا مالک زخمی ہو کر گرا چاہتا ہے تو وہ اس وقت دشمن پر حملہ کرکے اور مالک کے پاس سے لوگوں کو ہٹا کر میدان سے اس کو لے بھاگتا ہے ۱۲) اگر یہی طریقۂ استدلال ہے تو گھوڑوں کی ان صفات حمیدہ سے بھی تو اہل عرب کے کمالات پر استدلال کرنا چاہئے تھا۔ مگر کچھ نہیں آجکل لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کرلیا ہے کہ اہل عرب کی جہالت و وحشت کو بہت ہی غلط اور بدنما بھدے عنوان سے بیان کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال ثابت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایسے جاہلوں کی اصلاح کی ایسے وحشیوں کو

ضروری اطلاع:۔ خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

متمدن بنایا ان لوگوں کی نیت تو اچھی ہے مگر عنوان نہایت بُرا ہے۔ اول تو بات اتنی کہنا چاہیئے جتنی اصلیت ہو اہل عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جہالت و وحشت ضرور تھی مگر نہ اتنی جتنی یہ لوگ بیان کرتے ہیں پھر جتنی جہالت تھی اُس کے ساتھ ان کے کمالات و صفات حمیدہ کو بھی تو بیان کرنا چاہیئے جو اُن میں خود زمانہ جہالت میں تھیں۔ اہل عرب میں ہمیشہ سے شجاعت کا جوہر موجود تھا زبان کے بڑے پکّے تھے جھوٹ بولنا جانتے ہی نہ تھے وفار عہد اُن کی ضرب المثل ہے خیانت سے بہت ہی نفرت کرتے تھے مہمان نواز اور سخی نمبر اول کے تھے اور ایک بات تو ان میں ایسی تھی جو دنیا کی کسی قوم میں بھی نہ تھی وہ یہ کہ جب وہ دشمنوں کے ساتھ اپنے مقابلہ اور لڑائی کا ذکر کرتے ہیں تو دشمن کی شجاعت و بہادری کا دل کھول کر تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ ایسے بہادر، ایسے کریم، ایسے دلیر تھے حتیٰ کہ کبھی مقابلہ میں اپنا پسپا ہونا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ غرض دشمنوں کی تعریف کرنا یہ اہل عرب کی خاص صفت ہے اس پہلو کو بھی بیان کرنا چاہیئے تاکہ ناظرین و سامعین کو اہل عرب سے نفرت نہ ہو ان کی نظروں میں یہ قوم ذلیل نہ ہو مسلمان کا دل اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل و حقیر کرے اور اس طرح اُن کا ذکر کرے جس سے قلوب میں اُن سے نفرت پیدا ہو۔ جیسا سرسید نے کیا ہے اس لئے مولانا محمد علی صاحب کو غصہ آیا اور اُس کا خوب جواب دیا۔ خدا تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ نفس کو بقرہ کے ساتھ تشبیہ دینا بہت ہی مناسب ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ

یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ بقرہ (جس کے ذبح کا حکم ہوا ہے) نہ تو بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچّہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو دونوں عمروں کے اوسط میں۔ لغت میں فارض کے معنی منقطع العمر ہیں یعنی جس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ قطع کر لیا ہو فرض کے معنی قطع ہیں

تو فارض کے معنی بہت بوڑھے کے ہوئے اور بکر کہتے ہیں اس نر یا مادہ کو جو دوسرے سے
جفت نہ ہوا ہو اور جانور عادۃً جوانی سے پہلے ہی بکر رہتا ہے جوان ہونے کے بعد
بکر نہیں رہتا پس بکر کے معنی یہاں بچہ کے ہیں. جو ابھی تک جوان نہ ہوا ہو مطلب
یہ ہوا کہ وہ بقرہ نہ بچہ ہو نہ بوڑھا ہو بلکہ ان دونوں عمروں کے درمیان ہو جس سے
متبادر یہ ہوتا ہے کہ جوان ہو کیونکہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان جوانی ہی کا درجہ
ہے۔ اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ علم اعتبار کے طور پر بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی
جاتی ہے تو اس صفت کو بھی نفس پر جاری کرنا چاہیئے جس سے اشارۃً یہ ثابت
ہوا کہ جوانی میں مجاہدۂ نفس کی زیادہ فضلیت ہے کیونکہ اس وقت غلبۂ
قوت نفس کے سبب مجاہدہ شاق ہوتا ہے۔ وَالْاَجْرُ بِحَسْبِ الْمَشَقَّةِ (یعنی
ثواب اعمال کا مشقّت کے موافق ہے) جس عمل میں زیادہ مشقت ہو وہ اُس
سے افضل ہے جس میں مشقت کم ہو۔ نیز قوت بدن کے سبب عمل بھی زیادہ ہے
اور ظاہر ہے کہ کثرت عمل موجب ہوگا کثرت ثواب کا اور اس سے لازم یہ آتا ہے
کہ بچپن اور بڑھاپے میں مجاہدہ کرنا جوانی کے مجاہدہ کی برابر نہ ہو مگر یہاں ایک
سوال وجواب ضروری ہے وہ یہ کہ جوانی کے مجاہدہ میں دو درجے ہیں ایک یہ
کہ جوانی میں مجاہدہ کرتے ہوئے کام زیادہ کیا یا مقاومت نفس میں مشقت
زیادہ برداشت کرنا پڑی اور اتنا کام اور اتنی مشقت بچپن اور بڑھاپے
میں نہ کرنا پڑی اس صورت میں تو جوانی کے مجاہدہ کا بچپن کے اور بڑھاپے
کے مجاہدہ سے افضل ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس وقت عمل اکثر و اشد ہوا تو
قرب و اجر بھی زیادہ ہوگا۔ اور ایک درجہ یہ ہے کہ جوانی میں بحالت مجاہدہ
عمل زیادہ نہیں کیا مشقت زیادہ ہوئی بلکہ اتفاق سے کسی محل میں عمل و مشقت
اُتنی ہی کرنا پڑی جتنی بچپن یا بڑھاپے کے مجاہدہ میں ہوتی تو کیا اس صورت میں
بھی جوانی کا مجاہدہ بچپن اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے افضل ہے۔ بظاہر یہ معلوم
ہوتا ہے کہ اس صورت میں جوانی اور بڑھاپے کا مجاہدہ برابر ہو کیونکہ مجاہدۂ

شباب کی فضیلت بوجہ شدت وکثرت عمل کے تھی اور وہ اس صورت میں مفقود ہے مگر یہ اس نفس سے مدلول بالا بالا عتبار کے خلاف ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ جوانی کا مجاہدہ مطلقاً افضل ہے خواہ اس میں مشقت و عمل زمانہ شیخوخت وصبا کے برابر ہو یا زیادہ ہو اور اس مدلول اعتباری کی تائید بعض احادیث کے اطلاق سے بھی ہوتی ہے جو عنقریب آتی ہے۔ وشاب نشأ فی عبادة الله (اور جوان جس نے شروع کی جوانی اپنے پروردگار کی عبادت میں) اگرچہ اس میں بھی احتمال معلل بالمشقۃ ہونے کا ہو سکتا ہے لیکن اطلاق لفظ پر اور بعض عبادات کے خالی عن المشقۃ ہونے پر نظر کرنے سے اس مدلول اعتباری کی تائید کو راجح کہا جاسکتا ہے اور اس صورت میں اس پر ایک سخت اشکال ہوگا وہ یہ کہ اس صورت میں صرف شباب کی وجہ سے بدون زیادت عمل کے قرب واجر کا زیادہ ہونا لازم آتا ہے اور شباب امر غیر اختیاری ہے تو لازم آیا کہ ایک امر غیر اختیاری کی وجہ سے اجر و قرب زیادہ ہو گیا حالانکہ صوفیہ کا قول ہے کہ قرب میں امور غیر اختیاریہ کو دخل نہیں یہ اشکال اس کی ایک نظیر میں کہ وہاں یہ حکم یقینی ہے مجھے برسوں رہا اور وہ نظیر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اولیاء سے مطلقاً افضل ہیں خواہ انبیاء کے اعمال اولیاء سے زیادہ ہوں یا برابر ہوں یا کم ہوں تو یقیناً وجہ افضلیت محض نبوت ہے اور ظاہر ہے کہ نبوت امر غیر اختیاری ہے یہاں بھی وہی اشکال ہے کہ امر غیر اختیاری کو زیادت قرب میں دخل ہوا حالانکہ صوفیہ کی تصریح ہے کہ امور غیر اختیاری کو قرب میں دخل نہیں یہ اشکال کئی سال تک حل نہ ہوا اور نہ میں نے کسی سے پوچھا چاہے کوئی اس کو میرا تکبر ہی سمجھے مگر میں نے کسی کی طرف اس لئے رجوع نہیں کیا کہ مجھے حل کی امید نہ تھی اور وجہ امید نہ ہونے کی یہ تھی کہ لوگ آج کل علوم تصوف کو فضول سمجھتے ہیں گو اعمال واشغال کا اہتمام تو کسی قدر ہے مگر علوم سے بہت ہی بے التفاتی ہے جس درجہ میں دیگر فنون کو حاصل کرنے اور پڑھنے پڑھانے ہیں اس طرح اس کی طرف توجہ نہیں ہے اس لئے اشکالات تصوف کی وقعت اور

اُن کے حل کی طرف التفات بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا اس لئے میں نے کسی سے رجوع نہ کیا ہاں حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا رہا چنانچہ بحمد للہ کئی سال کے بعد یہ اشکال رفع ہوا۔ حل اس کا یہ ہوا کہ قول اکابر میں ایک ذرا سی قید محذوف ہے وہ جو یہ فرماتے ہیں کہ قرب میں امور غیر اختیاریہ کو دخل نہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ قرب ماموربہ میں ان امور کو دخل نہیں پس ان کے کلام میں ماموربہ کی قید گو مذکور نہیں مگر مراد ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب ماموربہ جس کی تفصیل کا انسان مکلّف ہے اس میں تو صرف امور اختیاریہ ہی کو دخل ہے غیر اختیاری امور کو کچھ دخل نہیں ورنہ ماموربہ کا غیر اختیاری شے پر موقوف ہونا لازم آئے گا۔ اور یہ نص کے خلاف ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے)۔ دوسرے قرب موہوب جس کی تحصیل کا بندہ کو مکلّف نہیں کیا گیا بلکہ وہ وہب حق سے حاصل ہوتا ہے اور امور غیر اختیاریہ میں قرب موہوب میں داخل ہو سکتا ہے کیونکہ یہ قرب ہی خود اختیاری نہیں بلکہ غیر اختیاری ہے تو غیر اختیاری میں کسی غیر اختیاری کا دخیل ہونا مستبعد نہیں پس اب اشکال جاتا رہا کیونکہ نبوت سے جو قرب ہوتا ہے وہ قرب غیر ماموربہ یعنی وہبی ہے تو اس میں نبوت کو دخل ہو سکتا ہے جو کہ امر غیر اختیاری ہے۔ اسی طرح جوانی کا مجاہدہ بچپن اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے مطلقاً افضل ہونے میں بھی کچھ اشکال نہیں بلکہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ گو جوانی کے مجاہدہ میں مشقت و عمل زیادہ بھی نہ ہو جب بھی وہ زمانہ صبا و کہولت کے مجاہدہ سے افضل ہے جیسا کہ اس مقام پر اعتبار نص کا بھی مقتضا ہے۔ دوسرے ایک حدیث سے بھی جس میں چند شخصوں کے لئے قیامت میں ظل عرش کی بشارت وارد ہے یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ اس کا ایک جملہ یہ ہے وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهٖ (اور جوان جو شروع جوانی سے اپنے پروردگار کی عبادت میں ہے) اس کے اطلاق سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود شباب ہی کو فضیلت میں دخل ضرور ہے مگر یہ فضیلت موہوب اور غیر ماموربہ ہے ماموربہ اور مکتسب نہیں اس میں صرف اعمال اختیاریہ کو دخل ہوتا ہے

الحمدللہ حق تعالیٰ نے یہ علم عظیم عطا فرمایا جس سے بہت اشکالات حل ہوگئے اور علوم کا باب مفتوح ہوگیا۔ اب میں یہ بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اس علم عظیم کی تفصیل بیان کرنے سے اس وقت مقصود کیا ہے تو سمجھئے کہ میرا مقصود یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے جوانی میں مجاہدہ نہ کیا ہو اور اب بڑھاپے میں مجاہدہ شروع کرنا چاہے تو وہ عبادت شباب کی فضیلت سن کر مایوس نہ ہو کہ مجھے اب مجاہدہ سے ثواب ہی کیا ملیگا شباب تو رہا ہی نہیں بلکہ اس کو جان لینا چاہیئے کہ قرب ماموربہ اس کو بھی مجاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ اس کا مدار اعمال اختیاریہ پر ہے جن میں بوڑھا جوان برابر ہے باقی جس قرب میں شباب کو دخل ہے یعنی قرب غیر ماموربہ سو اس کی تمنا بھی بوڑھے کو نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ تو اس کے حق میں لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (مت تمنا کرو اس چیز کی جس سے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) میں داخل ہے جس میں فضائل غیر اختیاریہ کی تمنا سے منع کیا گیا ہے۔ الغرض یہ بات واضح ہوگئی کہ قرب ماموربہ ہر شخص کو مجاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے اور مطلوب یہی ہے۔ اور اس کی طلب و تمنا بھی جائز ہے پس بوڑھے کو بھی مجاہدہ کے ثمرات مکتسبہ سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ رہا یہ کہ بڑھاپے میں خود مجاہدہ کی ہی ہمت اور طاقت کہاں رہتی ہے جس سے اکتساب قرب کیا جاوے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ بوڑھے سے اس درجہ کا مجاہدہ مطلوب نہیں ہے جس درجہ کا جوان سے مطلوب ہے جوان کو جو نفع مجاہدہ شدیدہ سے ہوسکتا ہے بوڑھے کو وہی نفع مجاہدہ غیر شدیدہ سے ہوسکتا ہے کیونکہ اس کے لئے وہ ہی شدیدہ ہے۔ غرض ہر شخص کے لئے مجاہدہ کا ایک ہی طریقہ نہیں ہے بلکہ محقق ہر شخص کے مناسب مجاہدہ تجویز کیا کرتا ہے یہ کام عطائیوں کا ہے کہ وہ سب کو ایک ہی لکڑی ہانکتے ہیں کہ جو آتا ہے اس کو ایک ہی وظیفہ بتلاتے ہیں کہ چوبیس ہزار یا بارہ ہزار دفعہ اسم ذات پڑھا کرو بوڑھا ہو یا جوان سب سے چکی ہی پسواتے ہیں۔ عارف شیرازیؒ ایسے ہی لوگوں کی شکایت فرماتے ہیں ؎

خستگانرا چو طلب باشد و قوت نبود گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

(کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو اگر تم ان پر زیادتی کرو تو یہ مروت کی شرط کے خلاف ہے۔)

بیداد یہی ہے کہ تم نے ایک کمزور کو وہ کام بتلا دیا جو قوی کے مناسب تھا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چارپا را قدر طاقت بار نہ بر ضعیفان قدر ہمت کار نہ

طفل را گر نان دہی بر جائے شیر طفل مسکین را از آن نان مردہ گیر

(چارپاؤں پر ان کی طاقت کے موافق بوجھ رکھو، کمزوروں کو ان کی ہمت کے موافق کام دو۔ بچہ کو اگر روٹی دودھ کے بدلے دو تو بچہ کو مردہ سمجھ لو)

بچہ کو اگر دودھ کی جگہ روٹی دینے لگو تو ظاہر ہے چند روز میں سدہ کی تکلیف سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ محقق ایسا کبھی نہیں کرتا وہ ہر شخص کی دماغی اور جسمانی قوت کا لحاظ کر کے مجاہدہ تجویز کرتا ہے نیز فراغت و عدم فراغت کی رعایت کرتا ہے دو شخص قوی تندرست ہیں مگر ان میں ایک فارغ ہے دوسرا اہل و عیال وغیرہ میں مشغول ہے وہ ان دونوں کے لئے بھی یکساں دستور العمل تجویز نہ کرے گا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ واقعی اس طریق کے مجدد و حکیم تھے۔ حضرت کے یہاں ہر شخص کے لئے جدا تعلیم تھی۔ کسی کو صرف تلاوت قرآن کی تعلیم فرماتے تھے کسی کو محض کثرت نوافل، کسی کو ذکر اللہ پھر اس میں بھی کسی کو ذکر خفی کسی کو ذکر جہر کسی کو چوبیس ہزار دفعہ کسی کو بارہ ہزار کسی کو دو تین ہزار حتیٰ کہ حضرت نے بعض لوگوں کو صرف یہ بتلایا کہ بعد ہر نماز کے تین دفعہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ لیا کرو اور بعضوں کو یہ بتلایا کہ خانقاہ والوں کی خدمت کیا کرو جیسے پانی بھرنا، ان کے لئے گوشت روٹی لا دینا ان کی جوتیاں سیدھی کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اور بحمد للہ جس کو جو بتلا دیا وہ اسی سے کامیاب ہو گیا تو یہ حضرات ہیں حکیم نہ وہ کہ محض گل بنفشہ یاد کرے اور ہر ایک کو وہی پلایا کرے جیسے ایک حکیم کے لڑکے کا قصہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ایک مریض کے دیکھنے کو گیا کہ حکیم نے نبض دیکھ کر کہا شاید آپ نے نارنگی کھائی ہے۔ مریض نے اقرار کیا کہ واقعی

نارنگی کھائی تھی لڑکے نے باپ سے پوچھا تھا کو نبض سے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے کہا نبض سے تو صرف برودت کا غلبہ معلوم ہوا تھا پھر وہاں اتفاق سے نارنگی کے چھلکے پڑے تھے اس سے بس سمجھا کہ نارنگی کا استعمال کیا ہے بس اب بیوقوف لڑکے کے یہ نسخہ ہاتھ آگیا کہ جس مریض کے پاس جو چیز پڑی ہوئی نظر آیا کرے وہ وہی کھایا کرتا ہے چنانچہ باپ کے انتقال کے بعد جب ان کا دورہ ہوا تو یہ کسی مریض کو دیکھنے گئے آپ نے نبض دیکھی پھر اس قاعدہ کے موافق چارپائی کے نیچے نظر دوڑائی تو وہاں نمدہ پڑا ہوا دیکھا تو آپ مریض سے کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آپ نے نمدہ کھایا ہے لوگ ہنسنے لگے مریض نے کہا نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے تو آپ کہتے نبض سے تو یہی معلوم ہوتا ہے اس نے نوکروں سے کہا نکالو اس بیوقوف کو اس کی دُم میں نمدہ۔ تو ایسے ہی جو شیخ عطائی ہوتا ہے وہ دو چار اشغال یاد کر کے سب کو وہی بتلاتا ہے یہ نہیں دیکھتا کہ یہ تعلیم اس شخص کے مناسب ہے یا نہیں شیوخ کو محقق ہونا چاہیئے کہ جیسی استعداد و قوت ہو ویسی تجویز ہو۔ پس بوڑھوں اور کمزوروں کو مجاہدہ سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ اُن سے چکی نہ پسوائی جائے گی۔ بلکہ اُن کی طاقت و ہمت کے موافق کام بتلایا جائے گا بشرطیکہ وہ کسی محقق کے پاس پہنچ جائیں۔ پھر جو کچھ وہ تم کو بتلائے اس میں اپنی تجویز کو دخل نہ دو اپنی طرف سے کچھ تجویزیں کر کے اس کے سامنے پیش کرو کہ حضرت میں یہ بھی کر لیا کروں حضرت میں وہ بھی کر لیا کروں۔ بلکہ سب کام اسی پر چھوڑ دو وہ تمھاری مصلحت کو تم سے زیادہ جانتا ہے ؎

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ رسم منزلہا

(امر مباح جو طریقت کے خلاف مرتے سے منکر معلوم ہوتا ہو اگر مرشد بتلادے تو اس پہ عمل کرے اس کو حقیر نہ سمجھے کیونکہ شیخ کو اس کے نشیب و فراز کا زیادہ تجربہ ہے)

پھر ان شاء اللہ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے مگر ایک شرط اور ہے وہ یہ کہ جو کچھ تم کو بتلادے اس پر عمل کر کے اپنے حالات و کیفیات سے اُسے اطلاع بھی دیتے رہو محض اس کے کشف کے

بھروسہ پر نہ رہو کیونکہ اول تو شیخ کا صاحب کشف ہونا لازم نہیں اور ہو بھی تو کشف کے لئے دوام لازم نہیں کہ ہر وقت ہوا کرے اور ہر وقت بھی ہو تو شیخ تمہاری طلب کا بھی تو منتظر ہے۔ دیکھو حق تعالےٰ کو تو سب کا حال معلوم ہے وہاں تو کسی کے بتلانے کی کچھ ضرورت نہیں مگر طلب کے بغیر وہ بھی کچھ نہیں دیتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ کیا ہم اپنی نعمت کو تم پر چپکا دیں حالانکہ تم اس سے کراہت کر رہے ہو تو بدون طلب کے حق تعالےٰ کے یہاں سے بھی نہیں ملتا وہاں بھی اظہار طلب کی ضرورت ہے حالانکہ وہاں شان یہ ہے ؎

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن … کہ حال خستہ دلاں نیز تو خوب میدانی

(تیرے سامنے دل کا حال بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے اس لئے کہ خستہ دلوں کا حال تو خوب جانتا ہے)

واقعی حق تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے کسی کے اظہار کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی اظہار کا امر اس لئے ہے تاکہ تمہارا عجز ظاہر ہو تم ناک رگڑو گریہ وزاری کرو ان کو یہ ادا پسند ہے اس لئے دعا وغیرہ کی ضرورت ہے پھر مشائخ سے بدوں اظہار طلب کے تم کیونکر فیض لینا چاہتے ہو وہ تو انسان ہیں، محتاج بھی ہیں مستغنی نہیں ہیں ان کو اگر تمہارے اظہار طلب کا انتظار ہو تو کیا تعجب ہے اس کے بعد بقرہ کی ایک صفت یہاں پر یہ مذکور ہے قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ۔ یعنی ارشاد ہے کہ وہ بقرہ زرد رنگ کی ہو (کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو) اس صفت کو بھی نفس سے مناسبت ہے کیونکہ صوفیہ کو لطیفۂ نفس کا رنگ بھی زرد ہی مکشوف ہوا ہے اور اس کو لطیفہ میں نے اصطلاح کے اعتبار سے کہہ دیا اور وہ اصطلاح بھی تغلیب پر مبنی ہے ورنہ وہ تو کثیفہ ہے۔ البتہ مجاہدہ سے مطمئن ہونے کے بعد ایک معنیٰ کر لطیفہ ہی بن جاتا ہے۔ ایک صفت بقرہ کی یہ ہے لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا کہ وہ بقرہ کام کاج میں مستعمل نہ ہو نہ زمین کو جوتتا ہو نہ کھیت کو پانی دیتا ہے (اس میں داغ دھبہ نہ ہو) اس میں اشارہ ہے نفس کے فراغ کی طرف یعنی مجاہدہ سے پہلے

نفس کو تمام افکار و تعلقات سے فارغ کر کے یکسو ہو کر مجاہدہ کرنا چاہیئے کہ اسی حالت میں مجاہدہ کا اثر پورا ظاہر ہوتا ہے کچھ دنوں کے لئے سارے کاروبار کسی کے سپرد کر کے عزلت گزیں ہو کر مجاہدہ کرو پھر دیکھو کہ کتنی جلدی اثر ہوتا ہے (گو مجاہدہ بحالت شغل بھی اپنا اثر دکھاتا ہے مگر تجربہ ہے کہ حالت فراغ میں جیسا اثر کامل ہوتا ہے ویسا بحالت شغل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانہ میں نسبتیں قوی ہوتی تھیں اور حالت بھی عالی طاری ہوتے تھے کیونکہ پہلے زمانہ میں طالبین فراغ کے ساتھ مشغول مجاہدہ ہوتے تھے اور مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا (صحیح و سالم ہو اس میں داغ دھبہ نہ ہو) میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس مجاہدہ سے پہلے تمام معاصی سے پاک صاف ہو جائے یعنی معاصی سابقہ سے توبۂ صادق کر کے مجاہدہ کرے اگر کسی بندہ کے حقوق ذمہ ہوں ان کو ادا کر دے یا معاف کرالے اور خدا کا حق جیسے نماز روزہ قضا ہو گیا ہو تو اس سے توبہ کر کے ان کی قضا شروع کر دے اس طرح توبہ کرنے سے نفس گناہوں سے بالکل پاک ہو جائے گا کیونکہ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ (گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مثل ہے جس نے کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو) پس وہ اسی کا مصداق ہو گا مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۱۲ جامع (صحیح سالم ہے اس میں معاصی بھی نہیں) یہ تو بیان تھا صفات مذکورہ کی مناسبت کا مجاہدہ کے مضمون سے اور قربانی کے مضمون سے ان کو یہ مناسبت ہے کہ قربانی میں ایسا جانور ذبح کرنا چاہیئے جس کا ذبح کرنا نفس پر گراں ہو یعنی قیمتی جانور ہو تندرست موٹا تازہ خوبصورت ہو جس کو ذبح کر کے کچھ جی بھی تو دکھے، ایسا نہ ہو جس کو ذبح کر کے دل یوں کہے کہ اچھا ہوا پاپ کٹا۔ بعض لوگ واقعی ایسا جانور ذبح کرتے ہیں جو مارنے سے پہلے ہی مرا ہوا ہوتا ہے (تو اس کا ذبح کرنا اس کا مصداق ہے) ؎

جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا ۱۲ جامع) حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایسی اونٹنی کی قربانی کی تھی جس کی قیمت تین سو دینار تھی اگر ایسا بھی نہ ہو تو کم از کم آنکھ ناک کا تو درست ہو دیکھنے میں برا تو نہ معلوم ہو۔

اب میں مجاہدہ کی حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں تو سنیئے مجاہدہ کہتے ہیں نفس

کی مخالفت کرنے کو یعنی اس کے اقتضاءات کو روکنا مثلاً باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے تو مجاہدہ یہ ہے کہ خاموش رہو کسی وقت خاموشی کو جی چاہتا ہے اس وقت مجاہدہ یہ ہے کہ باتیں کرو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نفس کے ہر تقاضے کی مخالفت کیا کرو یہاں تک کسی وقت کھانے پینے کو جی چاہے تو بھوکے پیاسے مرنے لگو نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اقتضاءات نفس کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو یقیناً مذموم ہیں یعنی خلاف شرع ہیں ان کی مخالفت تو ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جو یقیناً محمود ہیں جیسے فرض نماز روزہ اور بقدر ضرورت کھانا پینا، کپڑا پہننا ان کی مخالفت ضروری کیا ہوتی بلکہ موافقت ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جو نہ یقیناً مذموم ہیں نہ یقیناً محمود ہیں بلکہ دونوں کو محتمل ہیں جیسے مباحات بلکہ بعض دفعہ بعضے مستحبات بھی ان میں شیخ محقق سے رجوع کیا جائے اگر وہ کہدے کہ تقاضا محمود ہے تب تو مخالفت کی ضرورت نہیں اور اگر وہ کہے کہ یہ تقاضا مذموم ہے تو اس کی مخالفت کی جائے شاید یہاں کسی ذہن کو شبہ ہو کہ تم نے مستحبات کو بھی غیر مذموم و غیر محمود کی فہرست میں شمار کر دیا حالانکہ جو چیز شرعاً مستحب ہے وہ تو یقیناً محمود ہے اس میں مذموم ہونے کا احتمال کیونکر ہو سکتا ہے سو خوب سمجھ لو کہ مستحبات گو فی نفسہ محمود ہی ہیں مگر جب نفس کسی مستحب کا تقاضا کرے اس وقت وہ کسی عارض کے سبب مذموم ہو سکتا ہے کیونکہ نفس تو امارہ بالسوء ہے یہ تو ہمیشہ برائی کی طرف لیجانا چاہتا ہے جب نفس میں کسی مستحب کا تقاضا ہوگا تو اندیشہ ہے کہ اس میں نفس کی کوئی چال ہے اس چال پر نظر کر کے وہ تقاضائے مستحب مذموم ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ بعض تقاضے ظاہر میں محمود ہوتے ہیں مگر دوسرے پہلو پر نظر کر کے مذموم ہو جاتے ہیں جیسے ایک شخص حج نفل کا قصد کرے اور وہ نماز میں سست ہو تو شیخ اس کو حج سے منع کرے گا اور یوں کہے گا ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(اے لوگو حج کو کہاں جاتے ہو محبوب یہاں ہے ادھر آؤ)

کیونکہ اس شخص کے نفس میں تقاضائے حج پیدا ہونا یہ نفس کی چال ہے وہ

چاہتا ہے کہ میں کئی حج کر کے لوگوں کی نظروں میں معزز ہو جاؤں گا یا سیر و سیاحت میں جی بہلاؤں گا اس لئے شیخ اس کو حج سے منع کرتا ہے کہ تمہارے لئے میرے ہی پاس رہنا مفید ہے حج مفید نہیں کیونکہ تمہاری نیت خالص نہیں پھر نماز میں سُست ہو ایک نفل کے لئے نہ معلوم کتنے فرض برباد کرو گے لوگ مشائخ کے ایسے احکام سُن کر اعتراض کرتے ہیں کہ حج سے روک دیا میں کہتا ہوں غلط ہے وہ حج سے نہیں روکتے بلکہ معاصی سے روکتے ہیں اس شخص کے حق میں فقیہ کے فتوے سے حج ناجائز ہے صوفی بھی فقیہ ہوتا ہے فقہ صرف ہدایہ اور کنز کا نام نہیں تصوف بھی فقہ میں داخل ہے۔ امام صاحبؒ سمجھے اس فقیہ کو وہ فرماتے ہیں اَلْفِقْهُ مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَعَلَيْهَا (نفس کا ان چیزوں کا پہچاننا جو اس کے لئے نافع اور ضرر رساں ہے فقہ کہلاتا ہے) تو فقہ اصل میں معرفت نفس للنافع والضاد کا نام ہے اور یہ تعریف فقیہ کی صوفیہ پر سب سے زیادہ صادق آتی ہے بشرطیکہ صوفی جاہل نہ ہو کیونکہ یہ حضرات نفس کے مصالح و مضار کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس حیرت ہے کہ ایک کتابی فقیہ کسی مستحب کو ناجائز کہدے وہ تو ناجائز ہو جائے اور ایک عارف فقیہ ناجائز کہے تو ناجائز نہ ہو۔ دیکھئے فقہا صاف لکھتے ہیں کہ اگر کسی وقت مستحب ترک فرض کی طرف مفضی ہو جائے تو اس وقت مستحب ممنوع ہو جاتا ہے (چنانچہ مولود فاتحہ میں مفاسد ہی کی وجہ سے بعض مستحبات کو ممنوع قرار دیا گیا ہے ۱۲) پھر اسی قاعدہ سے صوفی اگر مستحب سے روکدے تو اس پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے۔ صاحب یہ نفس بڑا ہوشیار ہے اس کے تقاضے بڑے باریک ہوتے ہیں جن میں یہ سمجھنا کہ کونسا تقاضا محمود ہے اور کونسا مذموم ہے بڑے محقق کا کام ہے بعض دفعہ ظاہر میں تقاضا بہت اچھا ہوتا ہے مگر جب حقیقت منکشف ہوتی ہے اس وقت نفس کا کید ظاہر ہوتا ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک مقام پر مشغول ریاضت تھے کہ دفعۃً قلب میں جہاد کا تقاضا ہوا کہ فلاں مقام پر مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر

کفار کے ساتھ جہاد کرو وہ بڑے پریشان ہوئے کہ یہ نفس امارہ بالسوء ہے اس لئے یہ امر بالمعروف کیسا۔ چونکہ طالب صادق تھے اس لئے کھٹک گئے مگر حقیقت منکشف نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے حق تعالیٰ سے دعا کی مجھے اس تقاضے کی حقیقت سے مطلع کیا جائے کہ یہ محمود ہے یا مذموم آخر مکشوف ہوا کہ تمہارا نفس نجات عاجلہ چاہتا ہے وہ روز کے مجاہدات سے گھبرا کر چاہتا ہے کہ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ ایک دفعہ گردن کٹ جائے تو رات دن کے رگیدنے سے بچ جاؤں۔ بس یہ معلوم کرتے ہی جہاد کے ارادے سے رک گئے۔ اور نفس سے کہا کہ جس جہاد میں اس وقت مشغول ہوں وہ تو فرض عین ہے اور جس جہاد کا تو طالب ہے وہ فرض کفایہ ہے میرے بہت سے مسلمان بھائی اس کو انجام دے رہے ہیں میں تو تجھ سے اسی طرح چکی پسواتا رہوں گا۔

تو دیکھئے کہ ظاہر میں تقاضا کیسا محمود تھا مگر اس میں نفس کی چال تھی وہ فرض عین سے ہٹا کر فرض کفایہ میں مشغول کرنا چاہتا تھا۔ کیا پوچھتے ہو اس نفس کی چالوں کو یہ بڑا شریر ہے۔ لوگ شیطان پر لعنت کرتے ہیں اور اس کو الزام دیتے ہیں مگر شیطان سے زیادہ خود انسان کا نفس اس کو تباہ کرتا ہے

(اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ ۱۲ جامع)

(تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں میں ہے)

شیطان کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہم جیسوں کو بہکانے آئے وہ تو خاص خاص لوگوں کو بہکاتا ہے جن کا نفس درست ہو گیا ہے اور ہم جیسوں کا تو نفس ہی بہکانے کے لئے کافی ہے اس کو بعض دفعہ وہ بات سوجھتی ہے کہ شیطان کو بھی نہیں سوجھتی۔ دیکھئے فرعون نے اپنے کو خدا کہا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی۔ (میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں) کا دعویٰ کیا یہ ہمت شیطان کی بھی نہ تھی۔ چنانچہ

برسبیل لکھا ہے کہ شیطان نے فرعون سے کہا تھا کہ جو بات تو نے انسان ہو کر کہی ہے میں شیطان ہو کر بھی نہ کہہ سکا تیری ہمت مجھ سے بھی بڑھی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ فرعون ہماری ہی برادری کا تھا یعنی انسان تھا اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا نفس شرارت میں شیطان سے بھی بڑھا ہوا ہے فرعون کے لئے اِنَّهٗ طَغٰی (کہ وہ سرکشی میں بڑھ گیا ہے) اسے پڑھنے کے لئے فرمایا ہے اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا ہمارے یہاں ایک شخص پڑھتا ہے اور ہمارے گھر کا کاروبار بھی کرتا ہے میں نے اس سے پوچھا کہ تمہاری ذات کیا ہے اس نے کہا تگہ میں نے کہا فرعون کے بارے میں آیا ہے اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکشی میں بڑھ گیا ہے) کہیں تگا اس طغیٰ کا ہند تو نہیں۔ خیر یہ تو ہنسی کی بات تھی مگر اس سے قرآن کی تحریف کا شبہ نہ ہو کیونکہ میرا مطلب یہ نہ تھا کہ قرآن میں لفظ طغیٰ تگہ کی عربی ہے بلکہ میرا مطلب یہ تھا کہ اردو والوں نے کہیں طغیٰ کو بگاڑ کر تگا تو نہیں کر دیا۔ بہرحال ہمارا نفس بھی کچھ شیطان سے کم نہیں ہے ہمارے بہکانے کو تو یہی بہت ہے۔ دوسرے اگر شیطان ہمیں بہکاتا بھی ہے تو اس کا اس سے زیادہ کچھ زور نہیں چلتا کہ وہ وسوسہ اور خطرہ دل میں ڈال دیتا ہے پھر اس پر عمل کرنا یہ ہمارے نفس کا فعل ہے شیطان ہم سے عمل نہیں کرا سکتا۔ چنانچہ جب قیامت میں جب دوزخ والے اس کو ملامت کریں گے کہ کمبخت تو نے ہم سب کو تباہ کیا تو وہ یہی کہہ کر صاف الگ ہو جائے گا۔ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ یعنی جب فیصلہ ہو چکے گا (اور جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے اور وہ سب شیطان کو برا بھلا کہیں گے) تو شیطان (ان سے) کہے گا کہ مجھے ملامت کیوں کرتے ہو تم سے حق تعالیٰ نے تو سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی ایک وعدہ کیا تھا جو غلط وعدہ تھا پھر تم نے خدا کے وعدہ کو چھوڑ کر میرے وعدہ کو کیوں مانا اور (میں نے تم پر کچھ زبردستی تو کی نہ تھی) تمہارے اوپر میرا قابو ہی کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ میں نے تم کو (ایک بات کی طرف) بلایا اور تم نے میری دعوت کو قبول کر لیا۔ تو اب مجھے ملامت نہ کرو اپنے نفسوں ہی کو ملامت کرو اب نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو الآیۃ۔ حقیقت میں شیطان کا کام سوا اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک بات دل میں ڈال دیتا ہے اب اس پر

عمل کرنا یہ خود ہمارا کام ہے شیطان ہم سے زبردستی عمل نہیں کرا سکتا پھر اس کو ملامت کرنا فضول ہے کیونکہ وہ تو کھلا ہوا دشمن ہے وہ اگر ہمیں بُرا مشورہ دے تو کچھ بعید نہیں مگر اس سے بڑھ کر ہمارا دشمن یہ نفس ہے جو بظاہر ہم سے ملا ہوا ہے اور باطن میں شیطان سے ملا ہوا ہے کہ جو شیطان کہتا ہے یہ کمبخت نفس اس کو خفیہ خفیہ ہمارے سامنے آراستہ و مزین کر کے پیش کر دیتا ہے جس سے ہم مبتلائے معاصی ہو جاتے ہیں مثل مشہور کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے وہی حال اس نفس کا ہے کہ یہ ہم سے مل کر ہم کو تباہ کرتا ہے باقی شیطان تو صرف شیرہ لگاتا ہے آگے سب کچھ ہم خود کرتے ہیں شیرہ لگانے کا قصہ یہ ہے کہ کسی نے شیطان سے کہا تھا کہ کمبخت تو نے مخلوق کو تباہ کر دیا کہ ان سے کیسے کیسے مفاسد کا ارتکاب کراتا ہے اس نے جواب دیا کہ بالکل غلط میں تو ذرا سا اشارہ کرتا ہوں آگے ساری خرابیاں تم اپنے ہاتھوں سے کرتے ہو آؤ میں تم کو اپنا کام دکھلاؤں یہ کہکر وہ ایک حلوائی کی دوکان پر لے گیا اور جا کر ذرا سا شیرہ دیوار کو لگا دیا اور شیرہ لگا کر خود الگ ہو گیا اور ملامت گر سے کہا کہ میرا کام تو بس اتنا تھا اب آگے تم اپنی برادری کے کرتوت ملاحظہ کرو۔ شیرہ کے اوپر مکھیاں آئیں، مکھیوں کے اوپر چھپکلی دوڑی چھپکلی کے اوپر ایک بلی جھپٹی راستہ میں ایک سوار جا رہا تھا اس کا کتا بلی کو دیکھ حملہ آور ہوا کتے نے جو بلی کو مارا تو حلوائی نے غصہ میں کتے کے لاٹھی ماری جس سے وہ مر گیا سوار نے جو اپنے کتے کو مرا ہوا دیکھا اس نے تلوار نکال کر حلوائی کا صفایا کر دیا حلوائی کے قتل پہ بازار والوں نے سوار کو مار ڈالا وہ فوج کا افسر تھا فوج کو اطلاع پہونچی کہ ہمارا افسر مارا گیا اس نے سارے شہر کا محاصرہ کر لیا اور قتل عام شروع ہو گیا۔ شیطان نے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے کیا کیا تھا اور آپ کی برادری کے بھائیوں نے کہاں سے کہاں تو بت پہونچا دی اس لئے میں نے کہا تھا کہ نفس کے اقتضاءات بڑے باریک ہوتے ہیں یہ کمبخت مستحبات اور مباحات میں بھی ہم کو دھوکہ دیتا ہے اس کے اقتضاءات محمودہ بھی قابل اطمینان نہیں۔ الغرض نفس کے تقاضے تین قسم پر ہیں ایک محمودہ ان کی مخالفت کسی حال میں بھی ضروری کیا جائز بھی نہیں بشرطیکہ شیخ محقق کہدے کہ تقاضا محمود ہے۔ دوسرے تقاضائے مذموم اس کے ترک کی ضرورت ہے تیسرے وہ جو ظاہر نہ مذموم ہیں نہ محمود ہیں یعنی مباحات بشرطیکہ ان میں انہماک نہ ہو۔ ورنہ پھر وہ بھی مذموم ہیں ان میں اکثر تو نفس کی مخالفت چاہیئے گاہے گاہے موافقت کا مضائقہ نہیں بس خلاصہ مجاہدہ کا یہ ہوا کہ

مباحات میں نفس کی مخالفت کی جائے اور محرمات میں اس کی مخالفت اس طرح کہ ترک کیا جائے اور مجاہدہ کا یہ درجہ تو سب کے نزدیک واجب ہے اس طرح کہ ان کی تقلیل اور اس کی ضرورت ہر مسلمان کے نزدیک مسلم ہے بلکہ اصل حالت کے اعتبار سے تو اس کو مجاہدہ میں داخل کرنا بھی ٹھیک نہیں بھلا زہر سے بچنا بھی کچھ مجاہدہ ہے مجاہدہ تو اُسے کہتے ہیں جس میں نفس پر مشقت و گرانی ہو اور ظاہر ہے کہ اصل مشقت فطرت میں انہی کاموں کے ترک میں ہوتی ہے جن کی فی الجملہ اجازت ہے اور جن کا حرام ہونا معلوم ہے ان کے ترک میں مجاہدہ ہی کیا ہوتا مگر چونکہ قریب قریب ہر شخص محرمات میں بھی بتلا ہے اس لئے ترک محرمات بھی مجاہدہ ہوگا ورنہ اصل فطرت کے اعتبار سے تو اصل مجاہدہ یہی ہے کہ مباحات میں بھی نفس کی مخالفت کی جائے کہیں انہماک میں کہیں نفس فعل میں بھی کیونکہ بعض موقع میں جب نفس کو مباحات سے روکا جائیگا اس وقت وہ محرمات سے بچ سکے گا کیونکہ مباحات کی سرحد محرمات سے ملی ہوئی ہے اور قاعدہ ہے کہ جس جنگل میں شیر رہتا ہو اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی سرحد کے بھی پاس نہ جاوے اگر کوئی شخص اس جنگل کی حدود میں رہکر شیر سے بچنا چاہے یہ اس کی حماقت ہے ممکن ہے کبھی غلطی سے حد کے اندر داخل ہو جائے اور شیر کا سامنا ہو جائے اس لئے سالکین کو مباحات میں انہماک سے بہت ہی احتراز چاہیئے اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ بیوی بچوں کو چھوڑنا اور گھر کو تالا لگانا یہ مجاہدہ نہیں ہے۔ کیونکہ بیوی بچوں کی خبر گیری شرعاً فرض ہے اور مجاہدہ ترک فرائض کا نام نہیں بلکہ ترک محرمات اور کہیں ترک مباحات کا نام ہے اگر کسی شخص کو بیوی سے محبت ہو جائے تو اس کے ازالہ کا حکم نہ کیا جائیگا کیونکہ یہ محبت خلاف شرع نہیں بلکہ شرعاً مطلوب ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ومن اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ۔ (اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی) مجاہدہ کی حقیقت تو معلوم ہو گئی اب بھی سمجھ لیجئے کہ مجاہدہ کا اثر کیا ہوگا کیونکہ اس میں بھی بہت لوگ غلطی کرتے ہیں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مجاہدہ سے نفس کے رذائل اور تقاضائے معصیت بالکل زائل ہو جاتے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ یہ خیال غلط ہے مجاہدہ کا یہ اثر نہیں ہے بلکہ مجاہدہ کا اثر یہ ہے کہ اُس سے تقاضائے معصیت مضمحل اور کمزور ہو جاتا ہے بعض لوگ مجاہدہ کر کے جب تقاضائے معصیت پھر اپنے اندر موجود پاتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہماری ساری

محنت بیکار گئی ان لوگوں کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ مجاہدہ بیکار نہیں گیا کیونکہ مجاہدہ سے زوال تقاضا مطلوب نہیں۔ اگر تقاضا بالکل زائل ہوجاوے تو پھر گناہوں سے بچنے میں ثواب ہی کیا ہوگا۔ ثواب تو اسی بات کا ہے کہ نفس میں تقاضائے معصیت موجود ہے اور تم اس سے بچتے ہو دیکھو عنین اگر زنا نہ کرے تو اس کا کیا کمال ہے اندھا اگر نظر بد سے بچا رہے تو کونسی خوبی ہے۔ کمال تو یہی ہے کہ تم سوانکھے ہو اور مرد ہو پھر بھی نگاہ بد سے اور زنا سے بچتے ہو مولانا فرماتے ہیں ؂

شہوت دنیا مثال گلخن است ۔۔۔ کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

(دنیا کی شہوت مثل انگیٹھی کے ہے کہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

خوب مثال دی کہ شہوات کی ایسی مثال ہے جیسے ایندھن جس سے حمام روشن ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح تقاضائے معصیت بیکار چیز نہیں بلکہ یہ حمام تقویٰ کے لئے ایندھن ہے اگر یہ ایندھن نہ ہو تو حمام تقویٰ سرد پڑ جائے تقویٰ کی رونق اور گرم بازاری اسی تقاضائے معصیت سے ہے بشرطیکہ اُس کو جلاتا پھونکتا رہے دل میں جمع کرکے نہ بیٹھے کیونکہ ایندھن سے جلانے کا کام لوگے جبھی روٹی پکے گی ورنہ بھوکے مروگے اس پر شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ جب ثواب اسی تقاضائے کی وجہ سے ملتا ہے تو پھر مجاہدہ کی اور اس تقاضے کو مضمحل کرنے کی کیا ضرورت ہے اچھا ہے اسے قوی رہنے دو زیادہ ثواب ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ مجاہدہ کی اس لئے ضرورت ہے تاکہ مقاومت (اور مقابلہ) سہل ہوجاوے (تنور میں اتنا ہی ایندھن ہونا چاہیئے جس سے تنور پھٹ نہ جائے اگر زیادہ ایندھن ہوا تو کسی وقت تنور کے ٹکڑے ٹکڑے کردیگا جس سے پاس والے بھی جل بھُن جائیں گے۔ انجن کے لئے آگ کی ضرورت مسلم ہے مگر اسی قدر جس سے بیلر پھٹ نہ جائے ۱۲ جامع) اگر تقاضائے معصیت کو مضمحل نہ کیا گیا تو کسی وقت گناہ میں مبتلا کرکے تمکو تباہ کردے گا اور اس وقت اس کا مقابلہ دشوار ہوجائے گا ران کے نیچے گھوڑا شائستہ ہی رہنا چاہیئے ورنہ کسی وقت ضرور پٹک دیگا۔ گو شائستہ گھوڑا کبھی شوخی کیا کرتا ہے مگر اس کی مقاومت سہل ہوتی ہے پس سالکین کو مجاہدہ کرکے بیفکر نہ ہونا چاہیئے بلکہ تھوڑا بہت مجاہدہ پھر بھی باقی رہے گا۔ بلکہ عارفین نے لکھا ہے کہ مجاہدۂ ابتدائی کے بعد جو مجاہدہ شروع ہوتا ہے اسکی زیادہ ضرورت ہے (جیسا کہ پہلے بتفصیل مذکور ہوچکا ہے) رہا یہ کہ جب مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تو پھر صاحب مجاہدہ

وغیرہ صاحب مجاہدہ میں کیا فرق ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں وہی فرق ہے جو ان دو سواروں میں ہے جن میں سے ایک کی ران کے نیچے شائستہ گھوڑا ہے اور ایک کے نیچے غیر شائستہ گھوڑا ہے۔ گو ہوشیار رہنے کی ضرورت تو اس کو بھی ہے جس کے نیچے شائستہ گھوڑا ہے کیونکہ شائستہ بھی بعض دفعہ شوخی کر جاتا ہے مگر اس کو اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا اس سوار کو ہوگا جس کے نیچے غیر شائستہ گھوڑا ہے کہ اس کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ ہے شائستہ گھوڑا اگر شوخی کرتا ہے تو ایک ایڑ سے سیدھا ہو جاتا ہے اور غیر شائستہ شوخی کرتا ہے تو سوار کے باپ سے بھی نہیں سنبھلتا تو یہ کیا تھوڑا فرق ہے اور سنو! دو شخص ڈاکوؤں کے جنگل میں جا رہے ہیں جن میں سے ایک تو بنوٹ جانتا ہے اور دوسرا بنوٹ نہیں جانتا تو کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں بنوٹ جاننے والا بے خوف ہو کر جائے گا کیونکہ اس کے پاس دشمن سے بچنے کی ترکیب موجود ہے اور جو بنوٹ سے ناواقف ہے وہ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر جائیگا یہی حال ہے صاحب مجاہدہ اور غیر صاحب مجاہدہ کا مگر یہ مثال یہاں پوری چسپاں نہیں کیونکہ یہاں بےخطر اور بےفکر ہونے کی کوئی صورت نہیں صاحب مجاہدہ بھی بےخطر اور بےفکر نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی باگ ایسی ذات کے قبضہ میں ہے جو نہایت بے پروائی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں۔ وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ؁ ایک واقعہ کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا (اور معصوم نہ کیا ہوتا) تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے اور اگر ایسا ہوتے تو ہم آپ کو حالت حیات میں اور بعد موت کے دوہرا عذاب چکھاتے (کیونکہ مقربان را بیش بود حیرانی۔ مقربوں کو بہت حیرانی ہوتی ہے) پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے۔ اللہ اللہ کیا شوکت ہے اور کیسی سطوت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صاف صاف خطاب ہے اسی سے تو معلوم ہوتا کہ قرآن خدا کا کلام ہے جو کسی سے بھی نہیں دبتے اور دوسرے مقام پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کو خطاب ہے۔ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ؁ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ؁ اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر وحی بھیجی ہے سب سلب کرلیں پھر اس کے لئے آپ کو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے (یہ) آپ کے رب ہی کی

رحمت ہے (جو ایسا نہیں کیا) بیشک آپ پر اس کا بڑا فضل ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلب وحی سے ڈرایا جاتا ہے تو پھر تو اور کون ہے جو سلب رحمت سے بےخطر ہو نا چاہتا ہے اللہ اللہ نہ معلوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر اس آیت کے نزول کے وقت کیا حالت گذری ہوگی۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (آپ کے رب کی ہی رحمت ہے) فرما کر سنبھال لیا ورنہ دل پھوٹ جاتا (اس وقت مولانا پر ہیبت وجلال کا خاص غلبہ تھا چہرہ سے خوف ٹپک رہا تھا ۱۲ جامع) ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب پر اس شان کا استغنا و جلال کا انکشاف ہوا تو مولانا کی یہ حالت تھی کہ بار بار بیقرار ہو کر یہ شعر پڑھتے تھے ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ در کف شیر نر خونخوارۂ

(سوائے تسلیم و رضا کے کچھ علاج نہیں شیر خونخوار کے قبضہ میں ہے)

کتنی دیر تک ان پر یہ حالت رہی پس سالک بےخطر کبھی نہیں ہو سکتا تسلیم و رضا کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اس سے عنایت حق متوجہ ہو جاتی ہے اور اسی سے کام چلتا ہے مولانا فرماتے ہیں

؎ ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ بے عنایات خدا ہیچیم ہیچ

(یعنی گو ہم نے بہت سی پند و نصیحت کی ہے لیکن کسی کام کے پختہ ارادہ کرنے میں جبتک حق تعالیٰ کی عنایت نہ ہو ہم محض ہیچ ہیں)

اور میں بھی اپنے اس بیان کے متعلق یہی کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ تعلیم کیا ہے بدُون عنایت حق کے یہ کچھ بھی نہیں ؎

ایں ہیچ گفتیم ولیک اندر بسیچ بے عنایات خدا ہیچیم ہیچ

(یہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے بدون عنایت حق تعالیٰ کے محض ہیچ ہے)

بے عنایات حق و خاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(حق تعالیٰ اور خاصان خدا کی عنایات کے بغیر اگر تو فرضاً فرشتہ بھی ہو تو تیرا نامۂ اعمال سیاہ ہے)

اس شعر میں خاصان حق کا لفظ بڑھا کر تسلی کر دی کیونکہ عنایات حق کا علم دشوار ہے تو مولانا عنایات خدا کی علامت بیان فرماتے ہیں کہ خاصان حق کی عنایت حاصل کرو جس پر خاصان خدا کی عنایت ہو سمجھ لو کہ اس پر حق تعالیٰ کی عنایت ہے پس کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کی مخالفت کرو یہ تو اصل ہے اور خاصان حق سے متعلق پیدا کرو یہ اس کا متمم ہے اور یہاں سے ان لوگوں کے لئے بھی راستہ معلوم ہو گیا جو

طالب ہیں مگر کسی شیخ کے پاس نہیں پہونچ سکتے تو یہ لوگ نفس کی مخالفت شروع کردیں جو کہ اصل طریق ہے ان شاء اللہ تعالیٰ واصل ہوجائیں گے کیونکہ مجاہدہ ہی حقیقت ہے اور مجاہدہ پر وصول کا وعدہ ہے پس یہ لوگ بھی مایوس نہ ہوں البتہ اتنا کام اور کریں کہ اوقات فرصت میں بزرگوں کے حالات و ملفوظات کا مطالعہ کرلیا کریں ان شاء اللہ اس سے وہی نفع ہوگا جو صحبت شیخ سے ہوتا ہے مگر جو لوگ شیخ کے پاس پہونچ سکتے ہیں وہ یہ ترکیب سنکر خوش نہ ہوں کہ بس ہم بھی ایسا ہی کرکے واصل ہوجائیں گے کیونکہ اول تو وہ شخص معذور ہے اس کی منجانب اللہ بلا واسطہ اعانت ہوگی اور تم معذور نہیں ہو تمہاری ساتھ اعانت خداوندی بلا واسطہ متعلق نہ ہوگی۔ دوسرا اسکو سخت سخت مشکلات قدم قدم پر پیش آئیں گی ان کو یہ سہولت کہاں نصیب جو تم کو نصیب ہے کہ جہاں گاڑی اٹکی فوراً شیخ سے رجوع کرلیا جہاں نفس کے کسی تقاضے کے متعلق شبہ ہوا کہ یہ محمود ہے یا مذموم فوراً شیخ سے دریافت کرلیا اس سہولت کی قدر تم کو کیا معلوم ہو اس کے دل سے پوچھو جس کو شیخ محقق میسر نہیں ہوا وہ کس مصیبت سے راستہ طے کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر پھر بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں وہ مجاہدہ تو شروع کریں ان شاء اللہ اعانت الٰہی ان کا ساتھ دے گی، عنایت خداوندی متوجہ ہوگی جس سے کام بن جائے گا پس اب میں ختم کرتا ہوں بحمد للہ مجاہدہ کے متعلق کافی بیان ہوگیا اور ضرورت کے موافق قربانی کی حقیقت بھی بیان ہوچکی۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم و عمل مستقیم عنایت فرمائے۔ (آمین وصلے اللہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین والحمد للہ الذی بنعمتہ وعزتہ وجلالہ تتم الصالحات) مجبر سے اترتے ہوئے فرمایا کہ اس وعظ کا نام "العبرۃ بذبح البقرۃ" رکھدیا جائے ۱۲ جامع

تمت

نوٹ:۔ افسوس کہ تنگی وقت کی وجہ سے چند آیات اخیرہ کا بیان رہ گیا یعنی واذ قتلتم نفساً فادّارأتم فیہا سے وما اللہ بغافل عما تعملون تک۔ مجاہدہ نفس سے ان آیات کی مناسبت بھی واضح ہوجاتی تو مضمون مکمل ہوجاتا خدا کرے پھر کسی موقعہ پر اس کی تکمیل ہوجائے۔ آمین ۱۲ جامع

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

نقد اللبیب فی عقد الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم

حکیم الاُمّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ـــــ دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔اے جناح روڈ) کراچی

وعظ مسمّٰی بہ

نقد اللبیب فی عقد الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم

این	متی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کوٹہ پولیس لین	۷ رجمادی الاول ۱۳۴۱ھ ۲۶ دسمبر ۱۹۲۲ء یوم منگل	شروع ۲ بجکر ۲۰ منٹ ختم ۳ بجکر ۳۳ منٹ	کھڑے ہو کر چوکی پر	ابطال رسوم	مرزا منور بیگ صاحب شارٹ نویس کوٹہ پولیس مع خواجہ صاحب حکیم صاحب	سو ڈیڑھ سو کے درمیان	قدیم اور جدید شبہات کے ازالہ کا خاص مضمون تھا۔

خطبہ ماثورہ اما بعد:۔ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی (کیا انسان گمان کرتا ہے کہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا)

یہ ایک آیت ہے سورہ قیمہ کی اس میں حق سبحانہ تعالیٰ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ نے نادانوں کے ایک خیال پر انکار فرمایا ہے اس خیال کو رد کیا ہے خواہ وہ خیال درجۂ اعتقاد میں ہو یا وہ خیال درجہ عمل میں ہو اس تعمیم کی دلیل یحسب کا لفظ ہے چنانچہ عنقریب معلوم ہو جاویگا۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ کیا گمان کرتا ہے انسان جس کو دوسرے لفظوں سے یوں تعبیر کر سکتے ہیں

ع کیا عاقل شخص کے ہے مرید حاضر مسمیٰ حبیب عقد کے باب میں ۱۲

کہ کیا خیال کرسکتا ہے انسان کہ چھوڑ دیا جاوے مہمل۔ مہمل کی تفسیر اور مفہوم سمجھنا چاہیے اور اس کے بعد جو ضرورت ہوئی ہے اس کے بیان کرنے کی وہ سمجھنی چاہیے۔ مہمل کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں دو احتمال یا تو مہمل باعتبار اعمال کے کہا گیا ہے یعنی تکلیف بالاعمال کے یا مہمل باعتبار جزا کے کہا گیا کیا معنی کے دو درجے ہیں اہمال کے' ایک درجہ تو یہ ہے کہ کسی شخص کو مکلف نہ بنایا جائے اور اس کو مطلق العنان چھوڑ دیا جاوے اور کوئی حکم اور کوئی قانون اس کے متعلق نہ ہو جس کو آزادی کہتے ہیں آجکل۔ یعنی آزاد کر دیا جاوے جیسے کوئی جانور رہا کرتا ہے آزاد اور کوئی قید اور کوئی قاعدہ اور ضابطہ اس کے لئے نہیں ہے۔ جہاں چاہتا ہے پھرتا ہے اور جہاں چاہتا ہے منہ مارتا ہے اور کوئی روک ٹوک اس کو نہیں ہے نہ وہ رات کو گھرلایا جاتا ہے نہ وہ کسی وقت باندھا جاتا ہے یعنی کسی عمل کا مکلف نہیں کیا جاتا اور نہ کسی ضابطہ میں پابند اس کو کیا جاتا ہے یہ تو اہمال ہے باعتبار تکلیف بالعمل کے۔ اور ایک اہمال باعتبار جزا کے اس کے لئے کوئی جزا سزا نہیں بلکہ اس کو بالکل آزاد اور مطلق العنان رکھا گیا ہے جزا اور سزا سے۔ یعنی جو کچھ بھی کرے اس کا کوئی اثر نہیں جزا اور سزا کے اعتبار سے یعنی خواہ وہ نیک کام کرے یا خواہ برا کام کرے نہ اس کو جزا ہے نہ سزا ہے اور اس کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ایک درجہ اہمال کا یہ ہے۔ سُدیٰ کے لفظ میں دونوں احتمال ہیں۔ اور قرآن مجید سے تائید ہوتی ہے دونوں احتمالوں کی اس واسطے کہ یہ ظاہر بات ہے کہ قرآن مجید کے اندر فرضیات سے گفتگو نہیں کی گئی بلکہ واقعات سے اور معاملات واقعیہ سے بحث کی گئی ہے اس واسطے ضرورت اس کی ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کو دیکھا جائے اور اس میں غور کیا جاوے کہ آیا دونوں معنی اہمال کے لوگوں کے ذہن میں تھے یا نہیں اس کو قرآن مجید کی آیتوں میں تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے دونوں خیال تھے۔ چنانچہ قرآن مجید کے اندر مذمت کی گئی ہے ایک خاص جماعت کی ان لفظوں سے وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ شکایت فرمائی ہے بعض فرقوں کی کہ انھوں نے حق تعالیٰ کی کوئی عظمت نہیں کی اور کوئی قدر نہیں کی جبکہ یوں کہا کہ کسی بشر پر حق تعالیٰ نے کوئی شے نازل نہیں فرمائی۔ اس خیال اور

اس اعتقاد کے لوگ تھے کہ نبوت کوئی چیز نہیں اور شریعت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ ان کے قول میں تصریح ہے مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ حق تعالےٰ نے کسی بشر پر کوئی شے نازل نہیں فرمائی بشر نکرہ اور شیءٍ بھی نکرہ ہے اور دونوں واقع ہیں تحت میں نفی کے اور یہ قاعدہ ہے عربیت کا کہ جب نکرہ تحت میں ہوتا ہے نفی کے تو مفید ہوتا ہے عموم کو یعنی اس عموم کا حاصل یہ ہوا کہ کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی گئی بشر میں بھی تعمیم ہے اور شے میں بھی تعمیم ہے پس بشر کے اندر تمام بشر آگئے حضرات بھی آگئے جو واقع میں نبی ہیں اُن کی نبوّت کا بھی وہ لوگ انکار کرتے تھے اور شیءٍ کے اندر تمام احکام آگئے یعنی کسی قسم کا کوئی حکم کوئی قانون کسی شخص پر نازل نہیں ہوا اس سے زیادہ کیا ہوگا گویا انکار اور ایک عام انکار ہے نہ کسی ضابطہ کے ساتھ مخصوص نہ کسی بشر کے ساتھ مخصوص ان لوگوں کا خیال تھا کہ نبوت کوئی چیز نہیں ہے۔ اس آیت سے تو پتہ لگتا ہے کہ اس عقیدہ کے لوگ بھی تھے اور دوسرے معنی جو ہیں اہمال کے اس کا پتہ لگتا ہے بہت سی آیتوں سے یہ آیت مذکورہ تو سوچتے ہی سے ذہن میں آئی تھی اور دوسرے معنی کے اعتبار سے جو اہمال ہے وہ تو کثرت سے منقول ہے کفار اور منکرین کے مقالات ہیں جس کا حاصل ہے بعث و نشر کا انکار بہت کثرت سے آیتیں ہیں اس مضمون کی یعنی کوئی چیز نہیں قیامت کوئی چیز نہیں حساب کتاب' وہ کہتے تھے اِنۡ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡيَا یہ فقط ہماری حیات دنیویہ ہے ولبس یونہی مرتے پیدا ہوتے چلے آئے ہیں یوں ہی سلسلہ جاری ہے کوئی مرا کوئی پیدا ہوا یعنی جیسے گھاس پھونس برسات میں لگتی ہے اور بڑھتی ہے اسی طرح سلسلہ جاری ہے۔ باقی معاد اور قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔ وَاِذَا قِيۡلَ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا قُلۡتُمۡ مَّا نَدۡرِىۡ مَا السَّاعَةُ اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ (اور جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو یقین نہیں) اسی طرح کثرت سے آیتیں ہیں جن کا مدلول یہ ہے کہ بعث و جزا کے

منکر تھے ان کا اعتقاد یہ تھا کہ قیامت اور حساب کوئی چیز نہیں ہے اس اہمال کے بھی قائل تھے تو قرآن مجید سے پتہ لگ گیا کہ دونوں اہمال کا اعتقاد تھا منکرین کو۔ حق تعالٰے نے جب انکار فرمایا اس پر اور رد فرمایا اس اہمال کے اعتقاد کو اور اہمال کے دونوں اعتقاد قرآن مجید سے ثابت ہیں اور دونوں میں منافات کی وجہ نہیں ہے جو جمع نہ کیا جا سکے رد کے اندر دونوں کو۔ لہٰذا اسی کے قائل ہو سکتے ہیں اور اس کی تفسیر کو عام کہہ سکتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوگا کیا انسان کا یہ خیال ہے کہ اس کو اعمال کا مکلف نہیں کیا گیا اور یہ خیال ہے کہ اس کے لئے سزا و جزا کچھ نہیں ہے تو گویا دونوں پر رد ہے اعمال کے مکلف نہ کرنے کے خیال پر بھی اور سزا و جزا کے انکار پر بھی۔ یہ ہے حاصل آیت کا حاصل تو معلوم ہوگیا اب یَحْسَبُ کے لفظ پر غور کرنا چاہیئے۔ یَحْسَبُ کا لفظ بمعنی پنداشتن ہے جس کا مفہوم بہت عام ہے درجۂ اعتقاد کو بھی اور درجۂ اعتقاد سے گھٹا ہوا درجہ ہے خیال کا اس کو بھی دونوں کو عام ہے یہ ایک احکام لغات میں سے ہے جس کو عربیت کے ماہرین جانتے ہیں اور یہ لفظ عام ہے اس کی تعمیم کے بعد یَحْسَبُ کا حاصل یہ ہوا کہ اس اعتقاد پر بھی انکار ہے جس کا کفار کو اعتقاد تھا اور وہ اعتقاد جازم تھا نیز اگر اعتقاد کے درجہ سے گھٹا ہوا ہو تو خیال پر بھی انکار ہے ہر چند کہ قرآن مجید میں اصل مقصود اُن ہی فرقوں پر انکار ہے جو منکر تھے مگر حق تعالٰے نے یہ کلام مقدس نازل کیا ہے جمیع امراض کے لئے۔ اس لئے اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے گئے کہ ہر مرض کا علاج ہو سکے درجۂ اعتقاد تک کی نفی تو ہے ہی قابل انکار لیکن اس سے جو کم درجہ ہے خیال کا وہ بھی قابل انکار ہے اور اس کم درجہ میں وہ درجہ بھی آگیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اعتقاد تو نہیں ہے مگر عمل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عمل ایسا ہے جیسے کہ اعتقاد انکار والوں کا عمل ہوا کرتا ہے اور اس محاورہ کو نصوص کے اندر بہت استعمال کیا گیا ہے۔

چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تارک صلوٰۃ کے لئے فَقَدْ کَفَرَ دکا فرہوگیا)

کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (جس شخص نے قصداً نماز چھوڑ دی کافر ہوگیا) حالانکہ اہل حق کا مذہب قرآن مجید کی دلیل سے یہ ہے کہ کبائر کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا اور نماز کا چھوٹنا جبکہ اس کی فرضیت کا اعتقاد ہو موجب کفر نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کی تاویل میں علماء نے غور و فکر کیا ہے اور دلائل سے ماؤل ہونا ثابت کیا ہے۔ اس کی تفصیل کی حاجت نہیں ہے اس وقت مگر صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ کفر کا لفظ استعمال کرنے سے معلوم ہوا کہ کفر کے درجات مختلف ہیں۔ ایک کفر عملی۔ ایک کفر اعتقادی۔ کفر عملی کا حاصل یہ ہے کہ اعتقاد تو مومنین کا سا ہے مگر اعمال کافروں کے سے ہیں۔ تو فَقَدْ كَفَرَ کے معنی یہ ہوں گے کہ فَقَدْ كَفَرَ عَمَلاً (عمل کے اعتبار سے کافر ہوگیا)

اس کی ایسی مثال ہے ہمارے محاورات میں جیسے کہ کوئی شخص عتاب میں زجر و توبیخ میں اپنے کسی عزیز محکوم بیٹے کو یہ کہے کہ تم تو بالکل چمار ہو گئے ظاہر ہے شرافت اس کی زائل نہ ہو گی۔ نسب اس کا بدل نہیں گیا۔ یعنی یہ کہ وہ ایک قوم سے نکل کر دوسری قوم میں داخل نہیں ہوگیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کام تم ایسے رذیلوں کے کرتے ہو جیسے چمار کیا کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ محاورات کے اندر توسیع ہے مجاز بھی ہے حقیقت بھی ہے تو اس مجاز کا حاصل یہ ہوا کہ تشبیہ دی جاتی ہے ایک شخص کو کسی خاص حالت وصفت والے کے ساتھ کسی خاص وجہ سے۔ تو فَقَدْ كَفَرَ (کافر ہوگیا) کے بھی معنی یہ ہوئے کہ فَقَدْ كَفَرَ عَمَلاً یعنی کام کیا کافروں کا سا۔ یعنی نماز کو فرض سمجھ کر نہ پڑھنا یہ مومن کی شان سے بعید ہے۔ نماز نہ پڑھنا کام ہے کافروں کا۔ کافر ہی نماز نہیں پڑھتے۔ کیونکہ وہ منکر ہیں جو نماز نہ پڑھے وہ مؤمن تو ہے بوجہ اعتقاداً فرض سمجھنے کے مگر بھائی کام تو بہت ہی بیہودہ کیا تو جیب كَفَرَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے دوسرے درجہ کے لئے بھی یَحْسَبُ کا استعمال بھی اس درجہ میں ہو تو کچھ بعد نہیں ہے۔ دوسرا درجہ کیا نکلا، یہ نکلا کہ

اعتقاد تو نہیں ہے اہمال کا۔ یعنی اعتقاد میں تو نہیں سمجھتا کہ انسان مہمل ہے یعنی مکلف نہیں ہے اعمال کا یہ کہ سزا جزا نہ ہوگی اعتقاد تو یہ ہے کہ جب کوئی پوچھتا ہے کیوں صاحب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے تمہارے اوپر۔ ہاں صاحب ہے۔ کیوں صاحب جیسا کرو گے ویسی سزا ملے گی۔ کیوں صاحب کیوں نہیں ملے گی، ایک ایک ذرہ کا حساب ہوگا۔ پوچھنے پر تو یہ کہہ دیتا ہے کہ اعتقاد ضرور ہے لیکن برتاؤ ایسا ہے جیسے اس شخص کا ہو جو معتقد ہے اس کے انکار کا یعنی جزا و سزا کے انکار کا۔ یا تشریع کے انکار کا کیونکہ اگر کوئی معتقد ہوتا انکار کا تو اس کا عمل کیا ہوتا عمل بھی ہوتا کہ وہ شتر بے مہار کی طرح مطلق العنان ہوتا کیونکہ جب اعتقاد ہی نہیں سزا جزا کا تو اس کے پابند ہونے کی ضرورت ہی کیا تو اس کا جو طرز ہے وہی اس شخص نے اختیار کیا۔ ایک درجہ یہ بھی ہے حسبان کا۔ وہ پہلا درجہ مخصوص کفار کے ساتھ ہے۔ دوسرا درجہ بہت سے ایمان والوں میں بھی پایا جاتا ہے یعنی ظاہر ہے کہ بہت سے اہل ایمان کے اعمال وہی ہیں جو منکرین میں پائے جاتے ہیں یعنی اعتقاد تو درست ہے لیکن عمل وہی ہیں جو منکرین کے ہیں کچھ فکر اور پروا نہیں ہے کہ ہم لوگ کیا کر رہے ہیں جو کچھ جی میں آیا کر لیا جس کو اتباع ہوئے کہنا چاہیئے جو خواہش ہوئی کر بیٹھے نہ یہ سوچ ہے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز نہ یہ خوف ہے کہ سزا جزا ہوگی یا نہیں، اگر کسی نے ٹوکا بھی تو گو بعض لوگ تمسخر سے یہ بھی کہہ ڈالتے ہیں ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے　　　عاقبت کی خبر خدا جانے

کیا مہمل بات ہے خدا تو جانتا ہی ہے عاقبت کی خبر جب خدا نے بتلا دیا تو خدا کے بتانے سے تم بھی تو جان گئے۔ یہ کیا معنی۔ یہ شاعروں کی آزادیاں ہیں گو یہ ضرور ہے کہ محض زبانی ہے گو اعتقاد نہ ہو مگر یہ ضرور ہے کہ یہ بے باکی کی دلیل ہے اس قدر آزاد کلمات اسی شخص کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کو

خوف نہ ہو یا جس کے قلب میں عظمت نہ ہو۔ یہ خطرناک حالت ہے اس کی سرحد کفر سے ملی ہوئی ہے مگر جو لوگ بے باک نہیں ہیں وہ یہ تو نہیں کہتے جن سے بے پروائی معلوم ہوتی ہو وہ شرمندہ ہوتے ہیں اور اکثر مسلمانوں کی حالت یہی ہے کہ کہتے ہیں کہ ہاں بھائی گنہگار ہیں۔ مبتلا ہیں بہت سی مجبوریاں ہیں کیا علاج کیا جائے۔ اللہ سے دعا کرو۔ خدا ہماری حالت پر رحم کرے اور ہمیں اس بلا سے نجات دے یہ کہنے لگتے ہیں اکثر لوگ جو اردو ذرا لکھے پڑھے ہیں انھوں نے کتابیں دیکھی ہیں اردو ہی کی سہی اب تو اردو کی کتابیں دیکھ کر بھی اپنے کو صاحب فضیلت سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بیشک گنہگار ہیں مگر اللہ تعالیٰ رحیم ہیں' کریم ہیں۔ اور غفور بھی تو ہیں۔ ان کی رحمت کے سامنے ہمارے گناہ کیا چیز ہیں۔ کیوں صاحب کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ تم کو آزاد کر دیا گیا ہے۔ یہ تو اس آیت کے خلاف ہے یا یہ معنی ہیں کہ ان کی رحمت کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ مضر نہیں۔ اگر یہ معنی ہیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ ضرر کی دو قسمیں ہیں۔ ضرر دنیوی اور ضرر اخروی۔ ضرر دنیوی یہ ہے کہ کوئی چیز کھا کر بیمار پڑ جاؤ یا سنکھیا کھا کر مر جاؤ یہ تو دنیوی ضرر ہے۔ ضرر اخروی یہ ہے کہ مرنے کے بعد سزا جزا ہو عقوبت ہو۔ یہ دو ضرر ہوئے ایک مقدمہ یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ دنیوی ضرر اخف ہے اور ہلکا ہے اخروی سزا سے۔ دو مقدمے۔ تیسرا مقدمہ یہ کہ ہر موثر چیز جو کسی اثر کی زائل کرنے والی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ وہ خفیف اثر کو جلدی زائل کرے گی بہ نسبت شدید اثر کے مثلاً آگ جلانے والی ہے اور موثر ہے افنار اجسام میں یعنی جسموں کو فنا کر دیتی ہے تو جو جسم خفیف ہو گا جیسے کپڑا اور روئی اس کو جلد اڑا دے گی بہ نسبت پتھر اور لکڑ کے۔ جب تینوں مقدمے ثابت ہو گئے اور یہ اعتقاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ضرر آخروی کو رحمت حق تعالیٰ کی زائل کر دے گی اور حق تعالیٰ معاف فرما دیں گے تو دنیوی ضرر تو اس سے اخف ہے اس کو تو بدرجہ اولیٰ زائل کر دے گی

میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ جب حق تعالےٰ کا غفور رحیم ہونا مسلم ہے، پھر اگر ایک شخص سنکھیا کھالے اور اس کو ضرر بھی پہونچ جاوے تو سنکھیا نے کیوں اثر کیا کیا وجہ ہے اس کی کیا جب کہ سنکھیا ضرر کرتا ہے اس وقت خدائے تعالےٰ رحیم ہیں یا نہیں۔ یہ اعتقاد تو کفر ہے کہ رحیم نہ رہے پھر کیا وجہ ہے اس نے ضرر کیوں کیا سنکھیا نے آپ کچھ جواب دیں گے یہی جواب دیں گے کہ رحیم تو ان کی شان ہے مگر جب تک اس کے ظہور کا ارادہ نہیں ہوگا تب تک ظہور رحمت کا فعلیت کے درجہ میں نہیں آتا اور یہ کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا چونکہ اس وقت رحمت کو متعلق کرنا نہیں چاہا اس واسطے سنکھیا کا اثر ہوگیا سو بعینہ حالت ضرر اخروی اور عقوبت نار کے بارہ میں بھی ہے اس میں کیسے بے باکی اور جرأت پیدا ہوگئی کہ وہ غفور رحیم ہیں کچھ ضرر نہ ہوگا۔ اور کچھ اثر نہ ہوگا آخرت میں بہر حال یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقتاد صحیح ہے مگر معاملہ اور برتاؤ ان لوگوں کا سا ہے جن کا اعتقاد باطل ہے۔ مسلمانوں میں کثرت سے اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو اعتقاداً تو انسان کو آزاد نہیں سمجھتے مگر عملاً آزاد سمجھتے ہیں اور زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ کہیں کہیں اعتقاداً بھی آزاد سمجھتے ہیں مگر اس آزادی میں اور کفار جس آزادی کے معتقد تھے اس میں قدرے فرق ہے ان لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ حق تعالےٰ نے مکلف ہی نہیں بنایا ان کا یہ اعتقاد تو نہیں ہے مگر ہاں بعضوں کا یہ اعتقاد ہے کہ حق تعالےٰ نے زیادہ امور میں تنگی نہیں فرمائی اور حرمت اور حلت کا قانون اس کے متعلق نہیں کیا۔

دوسرے لفظوں سے اس کی تعبیر یہ ہے کہ شریعت نے اس میں دخل نہیں دیا چنانچہ اب لوگوں کی زبان پر یہ بات آئی ہے کہ مولوی لوگ ہر بات میں تنگی کرتے ہیں یہ تو دنیا کے کام میں ہم کو اختیار دیا گیا ہے کہ جو چاہیں کریں چنانچہ میں نے ایسی تحریریں دیکھی ہیں ایک تو زبانی گفتگو ہوتی ہے عوام کو وہ زیادہ مضر

نہیں ہوتی نہ وہ باقی رہتی ہے وہ چونکہ الفاظ ہوتے ہیں جن کی حقیقت ہے صوت خاص اور صوت کی حقیقت ہے ہوا تو الفاظ کی حقیقت ایک ہوا ہوئی کیونکہ قسم کی حقیقت مقسم ہوتی ہے ہوا ایک ایسی چیز ہے کہ اڑ جاتی ہے اس کو بقا نہیں بات تمام ہوگئی منقطع ہوگئی بخلاف کتابت کے یہ گویا محفوظ چیز ہے تو بہت لوگ اس کو تقریر سے گذر کر تحریر میں بھی لے آئے ہیں چنانچہ میری نظر سے ایسی تحریریں گذری ہیں اور یہ تحریر ان لوگوں کی تحریریں ہیں جو اپنے کو محقق سمجھتے ہیں اور مصلح قوم سمجھتے ہیں اور بیڑا اٹھایا ہے قوم کی اصلاح کا مسلمانوں کی اصلاح کا مگر ایسے مصلح مثال اس شخص کے ہیں جس کی حقیقت ایک بُوجھ بجکڑ کی سی ہے کسی گاؤں میں ایک دانشمند رہتا تھا جو بہت عقلمند سمجھا جاتا تھا اتفاق سے اس گانوں میں ایک شخص سے یہ غلطی ہوئی کہ تاڑ کے یا کھجور کے درخت پر چڑھ گیا اب جو زمین نظر آئی تو خوف زدہ ہوئے اترتے ہیں تو اترا نہیں جاتا خوف کے مارے چلّانے لگے گاؤں کے لوگ جمع ہوگئے سوچ بچار کرنے لگے کہ کس طرح اتاریں کوئی تدبیر ہی سمجھ میں نہیں آئی وہی بوجھ بجکڑ یاد آئے انھیں بلایا گیا اوپر دیکھا نیچے دیکھا خوب غور کرکے فرمایا کہ رسّا لاؤ رسّا لائے حلقہ سا بنا کر گرہ لگائی گئی اس نے کہا کہ اس کو کوئی قوی شخص اوپر پھینکے کسی نہ کسی طرح اوپر پھینکا گیا ان کے پاس پہونچا کر حکم دیا یہ حلقہ کمر میں باندھ لو۔ پھر گاؤں والوں کو حکم دیا کہ جھٹکا دو کھینچو۔ انھوں نے کھینچا نیچے آپڑے، مرمراگئے، گانوں والوں نے کہا یہ کیا حماقت کی بولا قسمت، میں نے تو بہت سے آدمیوں کو اسی ترکیب سے کنویں سے نکالا اب میں قسمت کو کیا کروں۔ تو جیسے وہ بزرگ تھے ایسے ہی اس وقت مصلح قوم پیدا ہوگئے ہیں آپ نے درخت کو کنوئیں پر قیاس کیا جیسے کنویں کے اندر کا آدمی اس میں سے رسّا کھینچنے سے نکلتا ایسے ہی درخت پر سے بھی اتر آئے گا۔ یہ اس شخص نے قیاس فاسد کیا تھا تو جیسے اس نے قیاس کیا تھا یہی حالت مدعیان اصلاح قوم کی ہے جبکہ ان کے علم دین حاصل نہ ہو محض رائے کی بنا پر اصلاح کرتے ہوں یہی حالت اُن کے

قیاس فاسد کی ہے ایک حکم کو دیکھ کر اور ایک قانون کو دیکھ کر دوسری جزئی کو اس کی نظیر سمجھ کر اس پر قیاس کر کے وہاں بھی حکم چلا دیتے ہیں۔ اور یہ وہ خیال ہے جو جاہلیت کا خیال ہے کافر کہتے تھے۔ اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بیع بھی مثل سود کے ہے)

حق تعالیٰ نے جب ربوا کو حرام کیا تو شبہ کیا کہ بیع تو جائز ہے اس میں بھی زیادت ہوتی ہے اور نفع ہوتا ہے اس میں بھی زیادت ہوتی ہے اور نفع ہوتا ہے تو دونوں میں نفع ہے اس میں فرق ہی کیا ہے۔ یہ ایسی مثال ہے کہ ماں بھی عورت ہے بی بی بھی عورت ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک حلال ہے اور ایک حرام ہے کتا بھی جانور ہے بکری بھی جانور ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک حلال ہے ایک حرام واقع میں تو فرق ہے مگر ہر شخص کو اس فرق کا نہ سمجھنا ضروری نہ سمجھانا ضرور ہے۔ بلکہ ناممکن تو یہ حالت ہو رہی ہے مصلحان قوم کے۔ تو ان مصلحان قوم میں سے ایک کی تحریر دیکھی ہے جس نے کہا ہے کہ ان مولویوں نے شریعت کو تنگ کر ڈالا ہر چیز کو شریعت میں ٹھونس دیا اور یہاں تک حکم لگا دیا کہ فلاں جگہ کے بال رکھنا جائز اور فلاں جگہ کے ناجائز بھلا شریعت سے بالوں کو کیا تعلق اور صاحب یوں نہ بیٹھے یوں نہ لیٹیے۔ یوں کھاؤ۔ یوں نہ کھاؤ۔ یوں استنجا کرو یوں پیشاب کرو۔ مصیبت میں ڈال دیا مسلمانوں کو شریعت کو اس سے کیا بحث۔ ان لوگوں نے شریعت کو منحصر سمجھا ہے چند احکام میں نماز پڑھ لو روزہ رکھ لو، حج کر لو، زکوٰۃ دے لو بس ہو چکا اس سے کیا بحث شریعت کو کہ ریل میں جاؤ تو پندرہ سیر سے زیادہ اسباب نہ لے جاؤ ورنہ حقوق کا مواخذہ ہوگا یہ کوئی بات ہے اگر لے گئے کیا ریل گھس گئی ریل کا کچھ بگڑ گیا۔ مجھے ایک سرحدی کی حکایت یاد آئی ریل میں سفر کر رہے تھے دو من کا بورہ کشمش کا بغل میں لے اترے ماشاء اللہ۔ بابو آیا ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ دیا کہا اس کی بلٹی۔ کہا بلٹی کیا وہ بولا اس بورہ کا ٹکٹ۔ کہتے ہیں اس کا ٹکٹ بھی یہی ہے کہا یہ اس کا ٹکٹ نہیں ہو سکتا یہ

پندرہ سیر سے زیادہ ہے آپ نے قانون میں اجتہاد کیا کہنے لگا پندرہ سیر اس شخص کے لئے ہے جو پندرہ سیر سے زیادہ نہ اٹھا سکے ہم دو من اٹھا سکتے ہیں ہمارا یہی پندرہ سیر ہے۔ آپ کے قانون کی بھی تفسیر کی ایسے ہی مفسرین شریعت کے پیدا ہوئے ہیں جو کہتے ہیں کہ اس حکم کا یہ حاصل ہے۔ مولوی لوگ سمجھے نہیں۔ چنانچہ ربوا کے مسئلہ میں رسالے موجود ہیں خواہش نفس سے مسئلے بدل کر علماء پر الزام لگائے ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہونچے یہ بھی غنیمت ہے کہتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تو خاص وقت کے مناسب احکام بتلائے تھے، مولویوں نے ان کو عام کرلیا یا حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض حکم دیا ہی نہیں مولویوں نے ایجاد کرلیا۔

چنانچہ ایک بیرسٹر ہے الہ آباد میں ہیں وہ مولانا محمد حسین صاحب سے کہتے تھے مولوی صاحب اب تو مسلمانوں کو بہت تنزل ہے اگر علماء سود کی اجازت دیدیں تو بہت اچھا ہے۔ کہا قرآن مجید میں اس کی حرمت منصوص ہے کس کی مجال ہے اس کو حلال کرے توبہ کرو توبہ کرو۔ آپ کہتے ہیں کیا قرآن مجید میں اس کی حرمت آئی ہے کہا ہاں تو آہستہ آہستہ رخسارہ پر طمانچے مارے مولانا یہ معلوم نہ تھا اگر یہ ہے تو سر آنکھوں پر میں تو واللہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ان مولویوں نے یہ احکام تجویز کرلئے ہیں تو بعضوں کا یہ گمان ہے کہ مولویوں نے سب احکام اپنے گھر سے بنالئے ہیں۔

غنیمت ہے مولویوں ہی تک تبرا پہونچایا آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہونچے۔ الحمد للہ کہ علماء وقایہ تو ہوگئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سبحان اللہ عرض یہ ہے کہ اپنے نزدیک اس قسم کی اصلاحات کرتے ہیں۔ اس کی بنا یہ ہے کہ وہ یوں سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم کو بالکل آزاد رکھا ہے اس لئے بہت سے احکام کی تشریع کا انکار ہے سو بعضے اس اعتقاد کے لوگ مسلمانوں میں بھی ہیں۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

اب اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ان پر بھی فتویٰ دیتا مگر میں فتوے میں رعایت کرتا ہوں۔ کیونکہ ان کے اعتقاد میں اور کفار کے اعتقاد میں فرق ہے ان کا تو اعتقاد ہے کہ شریعت سرے ہی سے کوئی چیز نہیں ہے اور ان کا اعتقاد ہے کہ شریعت تو ہے مگر اس کی مجموعی ہیئت وہ نہیں ہے جو علماء نے سمجھ رکھی ہے اس لئے کافر نہیں کہے جا سکتے۔ ہاں قریب ہیں ضرور کفر کے جیسے ایک شخص نہر کے کنارے پر کھڑا ہے اور اندیشہ ہے کہ پاؤں پھسلا اور پانی میں غرق۔ بہر حال اس خیال کے بھی لوگ ہیں مسلمانوں میں قرآن مجید اس کو بھی رد کر رہا ہے اگر کوئی شخص کہے کہ اس خیال سے تو علماء بھی خالی نہیں کیونکہ علماء بھی بہت سی چیزوں کو جائز کہتے ہیں یہ نہیں کہ وہ کسی امر میں آزادی کے قائل ہی نہ ہوں ان کے نزدیک بھی بہت افعال و اعمال جائز بھی ہیں تو ایسے امور کے جائز کہنے کا حاصل یہی ہوا کہ انسان مخیر ہے شریعت نے اس کو آزادی دی ہے تو تخییر اور اختیار اور آزادی اور اطلاق جواز میں فرق ہی کیا ہوا۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جو معتقد ہیں کہ بعض امور میں ہم کو آزادی گئی ہے تو اس بناء پر نہیں کہ ان سے شریعت نے تعرض نہیں کیا بلکہ اس بنا پر معتقد ہیں کہ ان کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ایک میں شریعت کا اعمال ہے ایک میں اہمال ہے۔ غرض بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں کہ ان کے متعلق کہیں بھی قانون شرعی نے خاص قیود سے مقید نہیں کیا مثلاً قانون شریعت میں اس کے متعلق کوئی قید نہیں کہ عمامہ میں چار پیچ ہوں زیادہ نہ ہوں۔ تو بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا قانون نے اس سے تعرض ہی نہیں کیا حالانکہ یہ نہیں ہے بلکہ قانون نے اس کے متعلق بحث کی ہے اور بحث کر کے اجازت دی ہے تو علماء کا اعتقاد یہ نہیں ہے کہ بعض امور کے متعلق شریعت نے بحث ہی نہیں کی۔ نہیں بلکہ

شریعت نے بحث کی ہے اور بحث کر کے ان امور کی اجازت دی۔ غرض یہ ہے کہ جن امور کو علماء نے جائز کیا ہے ان امور کے متعلق شریعت سے فتوے جواز کا ملا تب جائز کیا اگر شریعت سے فتوے جواز کا نہ ملتا تو ہرگز جائز نہ کرتے اور آزاد لوگ شریعت میں جواز کا فتویٰ تلاش ہی نہیں کرتے۔ یہ فرق ہے علماء کی آزادی میں اور ان لوگوں کی آزادی میں۔

بہرحال قرآن مجید رد کر رہا ہے ان کے اس خیال کو یہاں ایک تقسیم اور بھی ہے وہ یہ کہ ایک قسم یہ ہے کہ تمام احکام میں یہ اعتقاد یا خیال یا برتاؤ ہے اور ایک یہ کہ بعض میں ہے اور بعض میں نہیں۔ سو ایسا تو کوئی مسلمان نہیں کہ تمام احکام میں یہ اعتقاد یا خیال یا عمل رکھتا ہو البتہ ایسے بہت لوگ پائے جاتے ہیں کہ بعض احکام میں ضرور ان کا یہی خیال یا اعتقاد یا عمل ہے چنانچہ ابھی میں نے بیان کیا کہ ان کا یہ خیال ہے کہ بہت سے امور سے شریعت نے تعرض نہیں کیا اور یہ خیال جیسا کہ نقلاً و نصاً باطل ہے اسی طرح عقلاً بھی باطل ہے وجہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ ہمارے مالک ہیں یا نہیں اور پھر مالک ہیں تو مطلقاً یا بعض وجوہ سے یا یوں سمجھئے کہ ہم لوگ ان کی ملک تام ہیں یا ملک ناقص۔ دوسرے یہ دیکھنا چاہیئے کہ مالک کو حق ہوتا ہے تصرف کا یا نہیں یعنی حق تصرف مبنی مالکیت پر ہے یا نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ تصرف کرنا موقوف ہے مالک ہونے پر نیز مالک ہونا مقتضی ہے تصرف کرنے کو یعنی جیسا کہ تصرف کرنا موقوف مالک ہونے پر ایسے ہی مالک ہونا مقتضی ہے تصرف کرنے کو یعنی نہ تصرف ہوسکتا ہے بدون مالکیت کے نہ مالکیت متحقق ہوتی ہے بدون تصرف کے پہلا قضیہ تو بالکل صاف ہے حتیٰ کہ جہاں بھی تصرف صحیح ہوگا وہاں مالکیت کا ہونا ضروری ہے خواہ ناقص ہو یا تام مثلاً حکام دنیویہ جو رعایا میں تصرف کرتے ہیں اسی بنا پر کہ وہ ایک درجہ میں اپنے آپ کو مالک سمجھتے ہیں گو وہ درجہ لغت میں

ملکیت کا ہے یعنی حاکم مالک نہیں ہے صرف ملک ہے ملک کہتے ہیں حاکم کو اور بادشاہ کو اور بادشاہ مالک نہیں ہوتا کیونکہ لوگ اس کے بردے اور غلام نہیں البتہ ایک گونہ اس کو اختیار رہوتا ہے خاص مصالح کی وجہ سے بہرحال یہ ثابت ہو گیا کہ کہیں تصرف نہیں ہوتا بدون مالکیت کے اگر ہے تو غصب اور ظلم ہے مثلاً کوئی ڈاکو اگر تصرف کرے تو اس کا نام غصب ہے اور ظلم ہے تو تصرف صحیح اور تصرف بحق بدون مالکیت کے نہیں ہوتا سو یہ تو بالکل صاف ہے البتہ اس میں ذرا اخفا ہے کہ مالکیت کا تحقق بدون تصرف کے نہیں ہوتا کیونکہ ظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک ہونے کے لئے یہ ضرور نہیں کہ تصرف بھی کرے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بادشاہ اور حکام بعض چیز کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاتے غرض اس میں ذرا اخفا ہے تو بات یہ ہے کہ ایک تو وہ مالک ہے جس کا علم ناتمام جس کی شفقت ناتمام جس کی حکمت ناتمام جس کا تصرف ناتمام جس کی ملک ناتمام ایسی مالکیت تو واقعی مقتضی نہیں تصرف کو اور ایک مالک وہ ہے کہ علم اس کا محیط ہر وقت اسے معلوم کہ کون چیز کس حالت میں ہے قدرت اس کی پوری ہر قسم کے تصرف پر وہ قادر توجہ اس کی ایسی کامل کہ ایک قسم کی توجہ دوسری قسم کی توجہ سے مانع نہیں لَا یَشْغَلُهٗ شَانٌ عَنْ شَانٍ ایک حال دوسرے حال سے اس کو غافل نہیں کرتا پھر حکم بھی علی الاطلاق کہ سب چیزوں کی مصالح کو محیط ادھر شفقت بھی عام اور تام نہایت خیر خواہ ہر چیز کی جو مصلحت ہے اس کے موافق اس کو تکمیل بھی کرتا ہے ایک مقدمہ تو یہ اور دوسرا مقدمہ یہ کہ تکمیل بلا تصرف نہیں ہو سکتی جو مالک اس شان کا ہوگا وہ ان صفات کی وجہ سے لازم ہے کہ ہر وقت اپنی مملوک چیز میں تصرف کرے حق تعالیٰ کی چونکہ یہی شان ہے اور تمام صفات کمال کی اس میں موجود ہیں تو عادۃً ممکن نہیں کہ وہ ہر چیز میں ہر وقت تصرف نہ کرے۔ پھر تصرف کی دو قسمیں ہیں ایک تصرف تشریعی ایک تصرف تکوینی کس چیز میں یہ کہ مثلاً اس شے کا موجود کرنا اس شے کو نشو و نما دینا اس کو صحت دینا اس کو

مریض کرنا اس کو ہلاک کرنا اس کو معدوم کرنا۔ یہ تو تصرف تکوینی ہوا۔ ایک تصرف تشریعی ہے یعنی یہ خطاب کرنا کہ فلاں چیز جائز ہے فلاں چیز ناجائز کسی شے کی نسبت امر کرنا کسی شے سے نہی کرنا جب ان کے تصرفات عام ہیں تو جیسا کہ تکوینی تصرف سے کوئی چیز کسی وقت خالی نہیں اسی طرح تشریعی کیفیت سے بھی کوئی شے کسی وقت عقلاً خالی نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر کوئی امر اس تصرف سے مانع ہو تو وہ اور بات ہے مثلاً مخاطب میں عقل نہ ہو بلوغ نہ ہو و مثل ذلک پس انسان کو بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ اس میں بھی ہر وقت متصرف ہیں اسی تصرف کو اس آیت میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (آپ فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا) تو صلوٰۃ اور نسک تصرفات تشریعیہ ہیں اور محیا و ممات تصرفات تکوینیہ ہیں۔ اس سے ہر قسم کے تصرفات حق تعالے کے لئے ثابت ہوئے۔ آگے فرماتے ہیں۔ لَا شَرِیْكَ لَهٗ سُبْحَانَ اللّٰهِ (اس کا کوئی شریک نہیں) اور کوئی شخص نہیں ہے جو ان تصرفات میں شریک ہو ہر چیز میں حق تعالے ہی متصرف ہیں اور کسی کا تصرف نہیں تو ایسے تصرف کا انکار کیسے ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ضروری بات ہے کہ کسی امر میں بھی ہم کو مہمل نہیں چھوڑا گیا تو لازم آگئی یہ بات اور ثابت ہوگیا کہ کسی ایک حکم میں بھی اور کسی وقت میں بھی ہم کو آزاد نہیں چھوڑا اور کوئی ایسی حالت نہیں جس سے شریعت نے تعرض نہ کیا ہو اب کیا حال ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ شریعت کا قانون ہماری ہر حالت سے تعرض نہیں کرتا بلکہ بعض سے کرتا ہے بعض سے نہیں کرتا۔ غرض حق تعالے کے قانون کو دنیوی قانون پر قیاس نہیں کرسکتے اس لئے وہاں جو حکام ہیں ان کا تصرف عام نہیں ہے کیونکہ ان کی مالکیت ناتمام ہے اور مالکیت اس وجہ سے ناتمام ہے کہ جو کمالات شرط ہیں مالکیت کے وہ ان میں ناتمام ہیں اور چونکہ حق تعالے کے

کمالات تام ہیں اس لئے ان کے تصرفات بھی عام اور تام ہوئے چاہئیں۔ غرض خدائے تعالےٰ کا یہ تصرف ہے کہ ہم ان کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں نشوونما پاتے ہیں صحتیاب ہوتے ہیں۔ مریض ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی تصرف ہے کہ وہ ہم کو ہر حالت میں خطاب کرتے ہیں کہ اِفْعَلْ کَذَا وَلَا تَفْعَلْ کَذَا یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو یہ حاصل ہے آیت کا اسی سے موقع شناسوں کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کیا ضرورت ہے اس بیان کرنے کی۔ وہ ضرورت یہ ہے کہ اس تقریب نکاح میں مجکو بلایا گیا ہے اور اس کے متعلق بھی لوگوں کے ایسے ہی غلط خیالات ہیں کہ شریعت نے اس کی رسوم سے تعرض نہیں کیا یا تعرض کیا ہے تو اس طرح سے کہ ہم کو سب رسوم کی اجازت دی ہے اور یہ خیال خصوص ان رسوم کے متعلق نہایت عام ہے جن کی صورت بھی مباح ہے پس مجکو ان ہی کی اصلاح اس بیان سے مقصود ہے کیونکہ جی یوں چاہا کرتا ہے کہ ہر وقت کی ضرورت کے اقتضاء کے موافق بیان کیا جائے ورنہ یہ حال ہوگا کہ جیسے کسی کو ہو تو بخار اور نسخہ لکھدیا جاوے دردِ سر کا تو وہ ایسا بیان ہوگا بخلاف اس بیان کے جو اقتضائے وقت کے موافق ہو وہ ایسا ہوگا جیسا مرض ویسا علاج تو ان تقریبات کے متعلق بہت لوگوں کے جو خیالات ہیں ان کے غلط ہونے کو اس وقت ظاہر کرتا ہے اس لئے تقریبات کے متعلق دو قسم کے اعمال ہیں ایک وہ ہیں جن کو ہر شخص جو ذرہ برابر بھی دین سے مس رکھتا ہے ان اعمال کو برا اور ناجائز اور حرام سمجھتا ہے وہ اعمال رسوم شرکیہ و بدعیہ ہیں جن کو ہر شخص جو ذرا بھی تعلق اور جو کچھ بھی مس دین سے رکھتا ہے ناجائز سمجھتا ہے باقی جن کو دین سے کچھ بھی مس نہ ہو ان کا تو ذکر ہی کیا ان کے یہاں تو ہر چیز جائز ہے چنانچہ پہلے زمانہ میں ہر طرح کے شگون اور ٹوٹکے فقط جائز ہی نہیں بلکہ واجب اور لازم سمجھے جاتے تھے بلکہ اب بھی پرانے خیال کی بوڑھیوں میں وہ مرض موجود ہے ذرا ذرا سی بات سے فال اور شگون لیتی ہیں جس کی نسبت حدیث شریف میں صاف لَا طِیَرَۃَ آیا ہے بدشگونی

اور ٹوٹکہ کوئی چیز نہیں بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں بدھ منحوس ہے منگل کا دن ایسا ہے فلاں دن فلاں طرف سفر کرنا برا ہے، فلاں دن فلاں طرف اچھا ہے، فلاں دن کپڑا مت خرید و فلاں دن کپڑا مت سیؤ اور بہت سے خیالات ہیں۔ کوا بولا مہمان آئے گا، جوتی پر جوتی چڑھ گئی سفر ہوگا، ہتیلی کھجلائی روپیہ آئیگا خرافات جاہلیت کے خیالات اور حیرت کی بات ہے کہ ان خرافات کے لئے دلائل تجویز کئے ہیں کہیں فال نامے ہیں کہیں حضرت علیؓ سے روایتیں ہیں۔ حضرت علیؓ انہیں ایسے سستے مل گئے ہیں کہ تمام عجائب وغرائب ان کے سر مڑھ دیئے جاتے ہیں۔ نعوذ باللہ (خدا کی پناہ)

حضرات اہلِ بیت کے علوم تو مستفاد عن النبوۃ ہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا طِیَرَۃَ (شگون کوئی چیز نہیں ہے) حضرات اہل بیت کیسے قائل ہو جاویں گے طیرہ کے۔ پہلے زمانہ میں شادیوں کے اندر ایسی رسمیں شرک و بدعت کی بے حد تھیں یہاں تک کہ موسل میں ڈوری بندھوانے کی ایک رسم تھی جب کوئی بزرگ خاندان آتا تھا تو اس سے برکت کے لئے ڈوری بندھواتے تھے۔ اور تعجب کی بات ہے کہ علماء کو بھی ان خرافات میں شریک کر لیتی تھیں۔ اپنے گھر میں کوئی عالم ہوا تو اُسے موسل میں ڈوری باندھنے لے جاتیں تاکہ برکت ہو اور من بھر کی جگہ دو من چاول نکل آویں۔ کہیں دلہن کے پلّہ میں ہلدی کی گرہ باندھتیں کہیں ایک بچہ اس کی گود میں دیتیں کہ دیکھ اللہ میاں ایسا ہی بچہ لے لوں گی، یہ باتیں کہیں کہیں کہیں اب بھی ہیں۔ کسی عورت کے اگر بچے نہ جئیں تو بعض جاہل بچہ کو پیدا ہوتے ہی گھوڑے پر ڈال آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھ اللہ میاں اگر لیتا ہے تو ابھی لے لے نہیں پھر نہیں ملے گا۔ اگر وہ کچھ دنوں نہیں مرتا تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا ان کا معاہدہ پورا ہوا معاہدہ ہوا ہی کب تھا، اگر ہوا بھی تو ایک ہی طرف سے تو ہوا۔ اس قسم کے خرافات کثرت سے ہیں۔

اناؤ کے ضلع میں میرے ایک دوست نے ایک نکاح میں مدعو کیا تھا میں نے

کہا خرافات تو نہیں ہوں گی انھوں نے وعدہ کیا کہ نہیں ہوں گی اور وعدہ بھی کیا عورتوں سے وعدہ لیکر ایک دن رات کو مجھے تو نیند میں پتہ بھی نہ چلا ان کو ڈھک ڈھک کی آواز سنائی دی، گھر میں گئے تو دیکھا کہ ڈھول بج رہا ہے، انھوں نے ڈانٹا کہ یہ کیا واہیات ہے۔ کہا نہیں ذرا سا شگون کیا تھا اتنا بھی نہ ہو تو میت میں اور شادی میں فرق ہی کیا رہے۔

میرٹھ میں تماشا ہوا ایک رئیس کے یہاں شادی تھی وہ متبع سنت تھے بالکل سادگی کے ساتھ تقریب تھی نہ ڈھول نہ تماشا نہ باجہ نہ گاجا۔ ایک صاحب چپکے سے بولے ارے میاں چونکی کسر ہے ان رئیس صاحب نے کہیں سن لیا خدمت گار کو حکم دیا کہ ایک روپے کے چنے لے آؤ۔ جب وہ لے آیا تو کہا ان کے سامنے رکھدو اور کہا پڑھئے کلمہ شریف کیا حرج ہے اور برکت ہو جائے گی اور کلمہ شریف کی برکت ہی حاصل کرنے کے لئے تو اس کو میت کے لئے پڑھتے ہیں تو میت شادی میں برکت ہو جاوے گی۔ اسی طرح سورہ یٰسین شریف جو موت کے قریب پڑھی جاتی ہے تو خاص برکات کے لئے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا خاص موت ہی سے تعلق ہے۔ میں ایک جگہ مریض کی عیادت کے لئے گیا اس وقت جی چاہا کہ برکت کے لئے سورہ یٰسین شریف پڑھوں مگر ڈر کے مارے پکار کر نہ پڑھی کہ عورتیں کو سیر گی ایک ظریف کو پورا قرآن تو یاد نہ تھا محض جاہل تھا لیکن گاؤں میں اپنے کو حافظ مشہور کیا رمضان شریف میں ادہر ادہر کی جو سورتیں یاد تھیں انھیں ملا ملا کر سنا دیا اور کہا کہ کلام مجید ختم ہو گیا مٹھائی تقسیم کرو۔ گاؤں میں ایک شخص کو یٰسین یاد تھی حافظ جی نے یٰسین پڑھی نہ تھی کیونکہ انھیں یاد ہی نہ تھی اس نے کہا حافظ جی یٰسین نہیں پڑھی وہیں بولے میاں کہیں نماز میں یٰسین بھی پڑھی جاتی ہے وہ تو مُردوں پر پڑھی جاتی ہے اگر میں پڑھ دیتا تو سارا گاؤں مرجاتا یہ سن کر وہ راضی ہو گیا مردہ کے تلبس کا اتنا بڑا اثر سمجھتے ہیں کہ مردہ کی چارپائی کو منحوس سمجھتے ہیں اس کے کپڑے پہننے کے منحوس سمجھے جاتے ہیں ان سب کو خیرات کر دیتے ہیں گویا خیرات کے لئے منحوس چیزیں ہیں مگر تماشا

ہے کہ مردہ کی ساری چیزیں تو منحوس لیکن روپیہ اور جائیداد منحوس نہیں یہ تو ایسے مبارک ہیں کہ ان کے لئے پہلے سے امیدیں لگائے بیٹھے رہتے ہیں بھائی اگر مردہ کی چیز منحوس ہے تو روپیہ اور جائداد کیوں نہ منحوس ہو گئے۔ چونکہ لیسین شریف بھی مردہ کے مرنے کے وقت پڑھی جاتی ہے لہٰذا اس کو بھی اسی ذیل میں داخل کرلیا ہے اور اب کلمہ شریف کو بھی ایسا ہی سمجھنے لگے غرض یہاں تک غلو ہو گیا ہے کہ جس شادی میں ڈھول ڈھاکہ نہ ہوا سے میت کی مجلس سمجھتے ہیں اسی لئے ان عورتوں نے شگون کیا تھا ڈھول سے صاحب خانہ مجھ سے معذرت کرنے لگے میں نے کہا کیا بات ہے انھوں نے ساری حکایت بیان کی یہاں تک کہ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ بالکل اس تقریب کو جس کے اندر رسوم شرکیہ نہوں تقریب ہی نہیں سمجھتے پہلے تو بہت زیادہ اس خیال کے تھے لیکن بعضے اب بھی اس خیال کے ہیں مگر کم دو وجہ سے ایک تو علم دین کی وجہ سے کہ اب علم دین پہلے سے بڑھ گیا ہے اور ایک علم دنیا کی وجہ سے یعنی دو قسم کے لوگ ہیں اہل دین اور اہل دنیا دونوں ان رسوم کے قبیح ہونے پر متفق ہیں۔ اہل دین قبیح سمجھتے ہیں بوجہ مخالفت شریعت کے اور اہل دنیا شریعت کے تو زیادہ لمبے چوڑے معتقد نہیں لیکن چونکہ یہ رسمیں عقل کے بھی خلاف ہیں اور لغو ہیں اس لئے نئی روشنی والے بھی ان کو قبیح سمجھتے ہیں مگر چونکہ یہ لوگ محض عقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے ان رسوم کو قبیح سمجھتے ہیں اس واسطے ہم ان کے ممنون نہیں ہیں کیونکہ انھوں نے شریعت کو نہیں لیا بلکہ محض عقل کا اتباع کیا ہم تو عقل کو بھی شریعت کے تابع رکھتے ہیں۔ ہم تو اول یہ دیکھیں گے کہ عقل جو حکم دیتی ہے وہ شریعت کے فتوے کے موافق ہے یا نہیں۔ اگر موافق ہے تو خیر ورنہ ہم یہ کہدیں گے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را — بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزما لیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

ہمیں ایسی عقل بھی نہیں چاہیے جو شریعت کے تابع نہ ہو مگر عقل بالکل بیکار بھی نہیں ہے اس کی مثال گھوڑے اور دامن کوہ کی سی ہے صرف اتنا کام عقل کا ہے کہ دامن کوہ

تک پہنچا دے اس کے بعد پہاڑ پر چڑھنے میں گھوڑا کچھ کام نہیں دے سکتا آگے ضرورت ہے قدم کی اسی طرح عقل اصول تک تو کار آمد ہے لیکن فروع کے درمیان ناکارہ محض ہے ہاں عقل پر احسان ہے کہ اگر وہ کسی مقام پر شریعت کی خادم ہو کر کچھ تقریر کر لے تو اس کی تقریر سُن لی جائے اگر کوئی بڑا حاکم تقریر کر رہا ہو تو اس کا خانساماں اس کی تائید میں کہے جی حضور بجا ہے تو کیا اس خانسامہ کے اس تائید کرنے سے اس حاکم کے قول کی کچھ قدر بڑھ گئی اور کیا وہ اس تائید سے خود حاکم ہو گیا ہرگز نہیں بلکہ اس حاکم کا اس خانسامہ پر احسان ہے کہ اس کی تائید کو سن لیا ہم تو اس خانساماں کو ڈانٹ دیتے کہ کیا بک بک کر رہا ہے تو شریعت کی یہ عنایت ہے کہ اگر عقل شریعت کی خادم ہو کر اس کی تائید کرتی ہے تو وہ اس کی تائید کو سن لیتے ہیں ورنہ عقل کے دخل در معقولات کا مقتضا تو یہ تھا کہ شریعت عقل کو بولنے تک کی اجازت نہ دیتی غرض حق تو یہ تھا کہ عقل شریعت کے سامنے لا و نعم کچھ نہ کہے بلا قیل و قال اس کا اتباع کرے ہاں البتہ اگر نعم کہے تو ہم تب بھی قدر کریں گے اور اگر کچھ نہ کہے تو وہ درجہ اس سے بھی بڑھا ہوا ہے ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گر ست — لیک عشق بے زبان روشن تر است ٭

(اگرچہ زبانی بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان روشن تر ہے)

اور اس انقیاد کے لزوم کی وجہ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو علاقہ ہے مومن کو وہ محض عقلی نہیں ہے بلکہ عشقی ہے اور جو عشقی علاقہ ہوتا ہے اس کا مقتضا یہ ہوتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو — دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اگر قتل کریں آپ پر قربان ہو دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے جو کچھ کریں میں ہر حالت میں آپ سے راضی ہوں)

اور اس کا مذہب یہ ہوتا ہے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من — دل فدائے یار دل رنجانِ من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور ناپسند

ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

ذرا بھی کہیں چون و چرا نہیں کرتا فانی محض ہوتا ہے پس عشقی علاقہ اس کو مقتضی ہے کہ جہاں شریعت کا کوئی حکم سن لے اس کو بے چون و چرا لے اس عشقی علاقہ میں عقل بیچاری کی رسائی بھی نہیں ہے مگر خیر اگر اس کی تصدیق اور تائید میں کچھ بولے تو اجازت ہے۔ بہرحال ان عقلا نے ان رسوم کی ممانعت اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ شریعت کے خلاف ہیں بلکہ اس وجہ سے ممانعت کی ہے کہ وہ ان رسوم کو اپنے نزدیک عقل کے خلاف سمجھتے ہیں اس واسطے ہم ان کے ممنون نہیں کیونکہ جب بنا ان کے حکم کی محض ان کی عقل نارسا ہے تو اگر کوئی حکم صحیح ان کے عقل کے خلاف ان کو معلوم ہوگا تو یہ اس حکم صحیح کو بھی چھوڑ دیں گے۔ لیکن خیر اس پر بھی اگر ہم ممنون نہیں تو خاص اس تائید میں شاکی بھی نہیں لیکن بعد تعمق نظر ایک حالت پر شاکی بھی ہیں مگر شاکی دوستانہ ہیں اور شکایت دوستوں ہی سے ہوتی ہے وہ مسلمان ہیں اور ہمارے بھائی ہیں وہ شکایت معاندانہ اور نفرت کی نہیں ہے وہ شکایت یہ ہے کہ عورتوں کو تو منع کرتے ہیں کہ فضول خرچیاں مت کرو اور خود ان کا یہ حال ہے کہ عورتوں کا زیور وغیرہ اتار کر اپنا فرنیچر درست کر لیا۔ میز کرسی' ہارمونیم اور گراموفون اور خاک بلا سینکڑوں فضول چیزیں جمع کر لیں۔ ایک عورت شکایت کرتی تھی اور سچی شکایت کرتی تھی کہ ہمیں تو زیور سے خالی کر دیا یہ بھی آجکل کا مذاق ہے کہ عورتوں کو لڑکا سا رکھنا پسند کرتے ہیں۔ نہ زیور ہے نہ کچھ ہے۔ یہ ایم۔ اے ہیں وہ یہ ہیں وہ بی پی ہیں۔ یہ بی۔ اے ہیں گو قافیہ نہ ملا۔ وہ عورت کہنے لگی کہ ہمارا سارا زیور چھین کر اپنے اوپر لاد لیا۔ سر پر بجائے جھومر کے ٹوپی کا پھندنا' گلے میں بجائے گلوبند کے ہار کے نکٹائی اور کالر تجویز کر لیا' پاؤں میں بجائے کڑوں کے کلب ہاتھوں میں کف حتیٰ کہ کف کی بدولت نماز کی بھی توفیق نہیں ہوتی کیونکہ وضو میں کف نہ بگڑ جاویں گے' شکن نہ پڑ جاویں گی۔ بہرحال عورتوں زیور وغیرہ اتار کر ننگا منڈا کر دیا

ان کو لگا دیا اپنی ضروریات میں اور خود فضولیات میں مبتلا ہو گئے مگر خیر ؂

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی　　گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

(خوش ہو رقیبوں سے دامن کھینچ کر گذر گئے اگرچہ ہماری مٹھی بھر خاک برباد ہوئی)

اتنا کام تو ہمارا چلا کہ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسوم نقلاً تو قبیح تھی ہی عقلاً بھی ان لوگوں نے قبیح تسلیم کر لیا ہمارا اتنا کام تو چل گیا بہرحال اہل وقت عقل پرستی کا بہت غلو ہے اس وجہ سے ہم کو یہ جوڑ لگانا پڑا کہ عقل بھی منع کرتی ہے ان رسوم شرک و بدعت کو غرض ان رسوم کو قبیح سمجھنے میں تو اہل عقل و نقل دونوں متفق ہیں۔ اب رہیں دوسری رسوم ان میں بڑے بڑے عقلا بھی مبتلا ہیں اور کیا کہوں کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن واقعہ ہے کہ بہت سے علماء بھی ان رسوم میں ڈھیلے ہیں میرے پاس ایسے خطوط آتے ہیں کہ اگر مجمع کر لیا یا کھانا کھلا دیا یا آپس میں کچھ دے دلا دیا تو اس میں شریعت کے خلاف کون سی بات ہو گئی۔ جب ہمارے طبیب ہی مریض ہیں تو پھر مریضوں کا علاج کون کرے وہ بیچارے جائیں کہاں۔ بات کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ رسوم دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو شرک و بدعت ہیں اور دوسری تفاخر کی ہیں کہتا ہوں کہ رسوم شرکیہ و بدعیہ تو بیشک گھٹ گئی ہیں لیکن تفاخر کی رسوم پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور چونکہ تفاخر کی رسوم کو رسوم ہی نہیں سمجھا جاتا اس لئے جب رسوم کی ممانعت کی جاتی ہے تو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اس وقت روشنی کا زمانہ ہے اب رسوم ہی کہاں رہ گئی ہیں اور نظائر میں ان ہی رسوم شرکیہ کو پیش کر دیتے ہیں اور واقع میں وہ بہت کم ہو گئی ہیں لیکن رسوم فخریہ پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں چونکہ پچھلے زمانہ میں بھی نہ اتنا تمول تھا نہ اتنا دماغوں میں غلو تھا نہ فخر میں غلو تھا بالکل سیدھی سادی معاشرت تھی بڑے بڑے امرا گاڑھا گزی پہنتے تھے۔ ہمارے قصبہ میں صرف ایک رئیس کے یہاں ایک فرش اور ایک مراد آبادی حقہ اور ایک فیتل سوز تھا باوجودیکہ ہزاروں خوش حال اور متمول لوگ تھے جب کسی کے یہاں شادی ہوتی تو یہ چیزیں ان کے یہاں سے منگوائی جاتیں فرش قالین وغیرہ اور کسی کے

یہاں نہ تھا اب بھی پہلے بادشاہوں کے جوڑے عجائب خانوں میں موجود ہیں انہیں کو دیکھ لیجئے وہ ایسے ادنی درجے کے ہیں کہ بادشاہ تو بہت بڑی چیز ہے اب کوئی ادنی ملازم بھی ایسے کپڑوں کو پسند نہیں کرتا یہاں تک کہ بادشاہ لوگ بھی نینو استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ظفر شاہ کا جامہ نینو کا ابتک موجود ہے کیا ٹھکانا ہے سادگی کا: اب نینو چماریاں اور بھنگنیں بھی نہیں پہنتیں۔ یہ حالت تھی اس زمانہ میں بہت ہی سادگی تھی کبر و فخر بھی کم تھا اور اس قسم کے لباس ہوتے تھے پہلے زمانہ میں اور اب تو یہ حالت ہے کہ اگر دو سو سے کم کا ہو تو وہ جوڑا ہی نہیں اس کا نام کفن رکھا ہے کہا جاتا ہے کہ جوڑا کیا دیا جیسا کفن ڈال دیا اور اکثر جو جوڑے دوسرے عزیزوں کو دیئے جاتے ہیں وہ ہوتے بھی ایسے ہی ہیں کیونکہ اب تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہوں دس چاہے ہوں بالکل کفن جیسے۔ خوامخواہ بہت سے جوڑے دئے جاتے ہیں یہ بہو کے ماں باپ کا ہے، یہ نانا نانی کا ہے، یہ خاک کا ہے، یہ بلا کا ہے غرض عدد کا پورا کرنا ضروری ہے حالانکہ ضرورت ایک کی بھی نہیں جیسے کہ کوئی لفظ بضرورت شعر بڑھ دیا جاتا ہے لیکن مصلح تو یہی کہے گا کہ شعر گفتن چہ ضرور (شعر کہنا کیا ضرور ہے)۔

مرزا فائق ایک شاعر تھے اس نے ایک خط منظوم غالب کو لکھا جس کے ایک شعر میں ید کا لفظ مشدد آتا تھا اور اس کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ تشدید بضرورت شعر غالب ایک مسخرہ شخص اگرچہ حاشیہ پر وہ نہ بھی لکھتا تب بھی وہ کہیں چوکنے والا تھا اور اب تو ایک بہانہ مل گیا مسخرے نے اس کے جواب میں ایک قطعہ لکھا۔

چہ خوش گفت فائق شاعر غترا کہ کس ہمچو من ذہن رسا نباشد
چو مقام ضرورت شعر افتد تشدید جائزہ چرا نباشد

(کیا خوب کہا فائق عزا شاعر نے کہ کوئی شخص میری مثل ذہن رسا نہیں ہے جب شعر میں کسی جگہ ضرورت پیش آجائے تو تشدید کس لئے جائز نہ ہوگی)

حقیقت میں شعر گفتن چہ ضرور (شعر کہنا کیا ضروری ہے) اسی طرح ان کو ضرورت اتنے

جوڑوں کی کیا تھی کونسی وحی نازل ہوئی تھی اس کی بنا کیا ہے محض نخرا اور اس کو کوئی بُرا سمجھتا نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری فہرست معاصی کی نہایت مختصر ہے ہم نے معاصی کی فہرست میں انتخاب کیا ہے ہماری فہرست میں معاصی صرف دو چار ہیں زنا، چوری، قتل، شراب خواری بس یہ چیزیں ہمارے نزدیک معاصی ہیں اور کوئی چیز معصیت ہی نہیں اگر یہ بات ہے تو حق تعالے کے اس ارشاد کے کیا معنی سنئے ارشاد فرماتے ہیں وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (ظاہری گناہ بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ بھی) اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں ظاہری گناہ اور باطنی گناہ۔ ظاہری گناہ کی تفسیر یہ ہے کہ جو محسوس ہو دوسروں کو اور باطنی گناہ وہ ہے جو دوسروں کو محسوس نہ ہو پس معلوم ہوا کہ یہ جو ظاہری گناہ ہیں صرف یہی گناہ نہیں ہیں بلکہ اور بھی گناہ ہیں جو محسوس نہیں - اور یہ جو محسوس گناہ ہیں ظاہر کے یہ محسوس کیوں ہیں محسوس اس لئے ہیں کہ ان کا محل محسوس ہے یعنی ہاتھ پاؤں۔ آنکھ زبان وغیرہ ان جوارح سے جو گناہ ہوتے ہیں چونکہ یہ جوارح محسوس ہیں اس واسطے ان کے افعال بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اور باطنی گناہ ایسے محل کے ہیں جو خود محسوس نہیں اس لئے وہ بھی غیر محسوس ہیں وہ محل کون ہے وہ محل ہے قلب اور نفس تو معلوم ہوا کہ بعضے گناہ قلب اور نفس کے بھی ہیں اب ذرا مہربانی کر کے ان گناہوں کے نام تو بتایئے جو نفس اور قلب کے ہیں آپ تو کیا بتائیں گے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں اور اللہ تعالی بتاتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ - خدا تعالے اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتے ہیں، حدیث صحیح میں ہے لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرٍ جس کے دل میں رائی برابر بھی کبر ہوگا وہ ہرگز جنت میں نہ جائے گا یہ ہے قلب کا گناہ۔ اب دیکھئے دوسرا گناہ قلب کا حق سبحانہ تعالے فرماتے ہیں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ یعنی اے ایمان والو اپنی خیر خیرات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نکرو مثل اس شخص کے جو لوگوں کے دکھلاوے کے واسطے خرچ کرتا ہے۔ اس آیت سے ریا کا گناہ

معلوم ہوا۔ یہ آیتیں اور حدیثیں ریا اور فخر کو حرام بتاتی ہیں اور یہ دونوں گناہ متعلق ہیں نفس اور قلب کے۔ اب اس کا تو کوئی انکار ہی نہیں کرسکتا کہ ریا اور فخر بھی گناہ ہیں کیونکہ قرآن اور حدیث سے ان کا گناہ ہونا ثابت ہے اب آگے واقعات کو دیکھئے کہ نیت کیا ہوتی ہے ان تقریبات میں کیا یہ نیت نہیں ہوتی کہ شان ظاہر ہو شہرت ہو نام ہو، ذرا ہماری بات لوگوں کی نظروں میں بڑھی رہے گو سب کی نیتیں اس میں بھی یکساں نہیں ہوتیں یعنی یہ ضرور ہے کہ انیس بیس کا فرق ہوتا ہے اور اگر زیادہ فرق بھی مان لیا جائے تب بھی کیا ہوتا ہے جس کی نیت میں زیادہ فساد بھی نہیں ہے وہ بھی یہ نہ سمجھیں کہ ہماری نیت بالکل پاک صاف ہے کچھ تو فساد ضرور ہوتا ہے اور جہاں نیت میں کچھ بھی فساد نہیں وہاں کے لئے ایک اور کلیہ موجود ہے بیفکر نہ ہوجئے آگے دوسری دفعہ بھی قانون کی آتی ہے اس کے منتظر رہیئے ہاں اگر کوئی اس کلیہ میں بھی داخل نہ ہوتا ہو تو خیر اس کو اجازت ہوگی لیکن یہ احتمال واقع ہی نہیں چنانچہ ابھی عنقریب اس کا بیان آتا ہے۔ لیجئے اب زیادہ منتظر رکھنے کی کیا ضرورت ہے، میں ابھی بیان کئے دیتا ہوں بات یہ ہے کہ اکثر طبائع کے اندر تو فخر و نمود ہی کا مادہ موجود ہے اور اس کی نسبت جیسے کلیات موجود ہیں جس کا ذکر اوپر آچکا ویسے ہی جزئیات بھی موجود ہیں چنانچہ فرماتے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم۔ مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی جو شخص شہرت کے لئے کپڑا پہنتا ہے اس کو حق تعالیٰ قیامت کے دن ذلت کا کپڑا پہنائیں گے ثوب شہرت میں اضافت لامیہ ہے تو معنی یہ ہوئے اَلثَّوْبُ لِلشُّهْرَةِ یعنی شہرت کی غرض سے جو کپڑا پہنا جاوے تاکہ لوگ انگشت نما کریں کہ کیسا بڑھیا کپڑا پہنا ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کپڑا اس نیت سے پہنا جاوے کہ ہمارا نام ہو ہماری شہرت ہو تو اسے قیامت میں ذلت کا لباس پہنایا جاوے گا حالانکہ وہ جوڑا بہت قیمتی بھی نہیں ہوتا مگر جب اس کو شہرت کی غرض سے پہنا گیا تو وعید تو متعلق ہوگئی اور شہرت کی نیت علامات سے ظاہر ہے چنانچہ بازار سے کپڑا چھانٹ کر لاتے ہیں ایک دکھایا یہ نہیں دوسرا دکھایا یہ نہیں تیسرا دکھایا یہ نہیں۔

یہ ساری چھان پھوڑ فقط اس لئے ہوتی ہے کہ وہ کپڑا ایسا تو ہو کہ کم از کم ہمارے خاندان میں تو کسی کے پاس نہ نکلے تاکہ ہمارا امتیاز ہو اور ہمارا اعزاز ہو تو روزمرہ کے لباس میں دس بارہ بیس روپیہ سے زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا پھر بھی بہت تفاخر سے اس میں وعید ہے بس جب کہ اس قدر کم خرچ کر لے پر بھی وعید متعلق ہو جاتی ہے تو جہاں ہزاروں روپیہ خرچ کر دیا جاوے وہاں کا تو کیا پوچھنا ہے ایک فساد تو یہ ہے دوسرا فساد جو اس کے لئے لازم ہے وہ اسراف ہے کیونکہ اسراف کہتے ہیں معصیت میں خرچ کرنے کو، آپ کا خیال ہوگا کہ ہم کونسی معصیت میں خرچ کر رہے ہیں ہمارے یہاں ناچ نہیں رنگ نہیں۔ اے صاحب تفاخر اور ریا بھی تو معصیت ہے پس تفاخر کے لئے خرچ کرنا معصیت ہی میں خرچ کرنا ہے اس لئے اسراف میں یقیناً داخل ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ معصیت منحصر نہیں ہے ناچ رنگ اور دیگر افعال جوارح میں بلکہ بہت سے معاصی قلب کے متعلق بھی ہیں چنانچہ تفاخر اور ریا ان ہی معاصی قلب میں سے ہے لہٰذا اس میں خرچ کرنا بھی معصیت ہی میں خرچ کرنا ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے پس یہ بھی اسراف ہوا اور ایک معصیت ہی میں خرچ کرنا کیا نماز روزہ میں بھی حد سے تجاوز ہونا اسراف ہے اور مطلق اسراف کے متعلق حق سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پس اسراف مطلقاً مذموم ہوگا۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ جس کے پاس روپیہ نہ ہو اس کے لئے تقریبات میں خرچ کرنا اسراف ہے ہمارے پاس تو بہت سا روپیہ ہے ہمارے لئے کیا اسراف ہے۔ کیوں صاحب اگر روپیہ زیادہ ہو تو کیا اس کے لئے کوئی حدود نہیں ہیں۔ سنئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اَفِی الْوُضُوْءِ سَرَفٌ کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے قَالَ نَعَمْ فرمایا ہاں وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے وَلَوْ کُنْتَ عَلٰی ضِفَّۃِ نَھْرٍ جَارٍ یعنی اگرچہ نہر ہی کیوں نہ بہ رہی ہو وہاں بھی اسراف ہوتا ہے خوامخواہ ضرورت سے زیادہ پانی خرچ کرنا وہاں بھی منع ہے غرض اسراف کی حقیقت ہے حد سے متجاوز ہونا۔ ہر شے میں جب حد سے بڑھ گئے اسراف ہو جائیگا یہ دوسرا فساد ہوا اب اگر نیت کی درستی کے سبب اس فساد سے بھی بچ گئے تو

ایک کلیہ شریعت میں اور ہے اس کی مخالفت سے ایک تیسری دفعہ تم پر قائم ہوجاویگی وہ کلیہ یہ ہے کہ جس امر مباح کے ارتکاب سے دوسرا کوئی شخص کسی محذور شرعی میں مبتلا ہوجاتا ہو وہ مباح مباح نہیں رہتا اب اگر کسی نے اپنی نیت درست بھی کر لی مگر دوسرے لوگ جن کی نیت درست نہیں ان کو تو اس شخص کے فعل سے قوت و تائید ہو گی اس لئے باوجود درستی نیت کے یہ افعال اس شخص کے لئے ناجائز ہوجا دینگی اس کی مزید تفصیل آگے بھی آوے گی اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ایک کلیہ سے بچے تو دوسرا کلیہ موجود ہے غرض خوب سمجھ لو کہ فہرست منکرات سے کوئی بچے گا نہیں جو الزامات لگائے گئے ہیں ان سے نکل کر کوئی نہیں جاسکتا ایک الزام سے بچے گا تو دوسرا الزام عائد ہوجائے گا غرض ان الزامات کی وہ حالت ہے جو اس شعر کی مصداق ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں ۔۔۔ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

ہر شخص پر ایک نہ ایک دفعہ قائم ہے اگر کسی خاص شخص پر ان دفعات میں سے ایک دفعہ قائم نہ ہوسکتی ہو تو اس کے لئے دوسری دفعہ موجود ہے تفاخر کے متعلق ایک اور حدیث یاد آئی ہے نَهَىٰ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ دَعْوَةِ الْمُتَبَارِيَيْنِ ۔ ممانعت فرمائی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو شخصوں کی دعوت قبول کرنے سے جو ایک دوسرے سے بڑھنا چاہیں اور بجھا بجھی میں کھانا کھلاویں ۔ یہ بلا ہم نے قصبات میں بہت دیکھی ہے اور شہروں میں اور طرح کی بلائیں ہیں ۔ قصبات میں تو یہ حالت ہے کہ اگر کسی نے ایک تقریب میں دو قسم کا کھانا دیا ہے تو دوسرے شخص نے اپنی تقریب میں تین قسم کا کھانا دیا، تیسرا چار قسم کا اس کا یہاں تک اہتمام ہے کہ گذشتہ فہرستیں کھانے کی نکال کر دیکھی جاتی ہیں کہ فلاں شخص کی تقریب میں کئے کھانے تھے ۔ اگر چار تھے اور چار ہی ہماری تقریب میں دئے گئے تو نام ہی کیا ہوگا اور تذکرہ ہی کیا ہوگا کیونکہ کوئی نئی بات تو نہ ہوئی چار کی جگہ چھ ہونے چاہئیں ۔ ورنہ پانچ تو ضرور ہوں اب بھلا یہ تفاخر نہیں تو کیا ہے ۔ یہ اس سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اُس سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا تو ان اہل رسم کو زبان سے اقرار ہے کہ ہم نمود کے لئے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں

چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک پردیسی صاحب نے ہمت کر کے اپنی بہن کو انہی کپڑوں میں رخصت کر دیا اس کی والدہ کے پاس کل آٹھ سو روپیہ تھا اسی میں ان کو خرچ بھی کرنا تھا۔ بڑی بی صاحبہ کی یہ تجویز تھی کہ لڑکی کو پانچ سو کا زیور دوں گی جوڑے دوں گی پھر خرچ کروں گی گویا آٹھ سو کی رقم کیا تھی چھاچھ تھی کہ پانی ڈالتے جاؤ اور بڑھتی جائے یا انھیں ضرب کا عمل آتا ہوگا کہ چار کو ضرب دیا چار سے سولہ ہوئے سولہ کو ضرب دیا چار سے چونسٹھ ہوگئے چونسٹھ کو ضرب دیا چار سے اور بڑھ گئے اسی طرح ضرب پر ضرب دیتے چلے گئے اور رقم بڑھتی چلی گئی مگر ضرب سے رقم کاغذ ہی میں بڑھتی ہے واقع میں نہیں بڑھتی واقعیت کا تو یہ حال ہے کہ ایک بنئے کا منشی دوکان پر بیٹھا حساب لگا رہا تھا بنیوں کے منشی منیم کہلاتے ہیں تو منیم جی حساب جوڑ رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ چونسٹھ کے چار ہاتھ لگے چھ ہاتھ لگے آٹھ ہاتھ لگے بارہ۔ تھوڑی دیر میں سینکڑوں کی نوبت پہونچ گئی۔ ایک فقیر بھی یہ سب کھڑا سن رہا تھا اور حاصلات کو جوڑ رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ جب حساب ختم ہو تو میں سوال کروں۔ چنانچہ جب منیم جی حساب جوڑ چکے تو اس نے سوال کیا کہ کچھ مجھے بھی مل جائے اس نے کہا میرے پاس اس وقت کچھ نہیں ہے فقیر نے کہا اجی مجھے کیوں بہکاتے ہو میں تو برابر کھڑا سن رہا تھا ہاتھ لگے اتنے اور ہاتھ لگے اتنے۔ سینکڑوں روپیہ تو ابھی ہاتھ لگ چکے ہیں پھر کہتے ہو میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں یہ کیا غضب ہے۔ اس نے کہا ارے بھائی وہ تو کاغذ ہی میں ہاتھ لگے تھے واقع میں ہاتھ خالی ہیں۔ تو اگر کسی کے پاس ضرب کا عمل ہو بھی تو اس سے کوئی رقم واقع میں تھوڑا ہی بڑھ جاتی ہے۔ بہر حال بہت ہی طوفان برپا کرنے کے ارادے تھے۔ بڑی بی کے چنانچہ ہمارے گھر میں مشورہ کرنے کے لئے رات کو آئیں میدان ہوا خالی صاحبزادے نے موقع کو غنیمت سمجھا داماد کو بلا لائے اور لڑکی کو بہلی میں بٹھا حوالہ کر دیا کہ لو بھائی لیجاؤ خود رخصتی ہوگئے وہ ماں ہمارے یہاں تھیں یہ خبر انہیں وہیں پہونچی۔ پھر تو صاحب وہ کوسنے اور رونا پیٹنا مچایا کہ آفت برپا کر دی میں نے کہا خبردار جو ہمارے گھر میں رونا پیٹنا مچایا جاوے اپنے گھر میں جاکر روؤ پیٹو۔ اس کے بعد میں نے کہا دکیا کروں کمبخت رحم آجاتا ہے میں نے

کیا) خیر جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہو چکا لڑکی تو اپنے گھر پہنچ چکی یوں کرو کہ جوڑا اب بنادو بس بھیجدوں وہ کہنے لگے ہائے میں یوں دیتی یولیستی میں نے کہا خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے میں بزاز کو بلا دوں خوب اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے بنا کر بھیجدو قبل اس کی واپسی کے سرخرو ہو جاؤ گی کیونکہ تم یہ کہہ سکو گی جب ہمیں خبر ہوئی تب ہم نے کپڑے بھیجدیئے اس سے پہلے ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ یہ سن کر وہ کیا کہتی ہیں کہ واہ جی اب کیا ہوتا ہے اصلی موقع تو دینے کا نکل ہی گیا اب کیا نام ہوگا وہ تو اب جات ہی جاتی رہی اب تو میں کچھ بھی نہیں کرونگی صاف کہتی ہے واہ جی اب تو کچھ بھی نہیں کروں گی آپ نے دیکھ لیا یہ تو زبان سے اقرار ہے اچھا ہوا بیچاری کے روپے بچ گئے ورنہ حج ہی رہ جاتا کیونکہ آٹھ سو روپیہ سے کم میں تو آجکل حج بھی نہیں ہوسکتا بالخصوص عورت کا کیونکہ بدون محرم کے عورت کو حج کرنے جانا جائز ہی کہاں ہے اور اب تو ایک شخص کے لئے پانچسو روپیہ صرف حج ہی حج کو چاہئے یعنی بلا حاضری مدینہ طیبہ کے اور اگر مدینہ طیبہ بھی جانا ہو تو تین سو روپیہ اور چاہئیں غرض آٹھ سو سے کم میں تو فقط بڑی بی کا حج بھی نہیں ہوسکتا تھا خیر اس کا بھلا ہو گیا رقم بچ گئی تو غرض جو کچھ تقریبات میں کیا جا رہا ہے سب ناموری کے لئے کیا جا رہا ہے۔ تو اب بتلایئے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ اور یہ سوال کہاں تک صحیح ہے کہ ان چیزوں میں ناجائز کی کیا بات ہے یہ بالکل غلط ہے۔ اگر گناہ کی حقیقت سے واقف ہوتے تو ہرگز ایسا نہ سمجھتے۔

ے سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا است۔ (خطا یہی ہے کہ دوست تم سخن شناس نہیں ہو)

گناہ فقط یہی نہیں ہے کہ ڈومنیاں بجائی جائیں، گناہ فقط ڈومنی ہی میں منحصر نہیں یہی تو غلطی ہے آپ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گناہ فقط دو تین ہی ہیں خصوص دل کے گناہ کو تو گناہ ہی نہیں سمجھتے حالانکہ یہ بات نہیں گناہ بہت ہیں اور ان میں دل کے بھی بہت سے ہیں حضرت جنید بغدادی کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ نماز پڑھنے مسجد میں آئے۔ دیکھا کہ ایک سائل سوال کر رہا ہے دیکھنے میں بالکل تندرست خوب ہٹا کٹا موٹا تازہ نظاہر نہ کوئی معذوری نہ مجبوری۔ انھوں نے اپنے دل میں کہا کہ ایسے شخص کو تو سوال کرنا بالکل حرام ہے اور یہ ناجائز کام کر رہا ہے حالانکہ ممکن تھا کہ اس کو کوئی خاص عذر ہو جسکی وجہ سے وہ

اکتساب کے قابل نہ ہو یا اکتساب کی قابل ہو لیکن اکتساب سے اس کی ضرورت پوری نہ ہو سکتی ہو مثلاً فرض کیجئے کسی ظالم نے اس پر ایک ہزار کی ڈگری ناحق کرادی ہے اور وہ مظلوم ہے اس صورت میں گو وہ ہاتھ پاؤں سے درست ہے مگر ہزار روپیہ وہ ایک دم کہاں سے دے بلکہ اس صورت میں دو سو چار سو روپیہ اس کے پاس جمع بھی ہوں تب بھی وہ باقی روپیہ کا اکتساب ایک دو دن میں تو نہیں کر سکتا لہٰذا ایسے شخص کو اجازت ہے شریعت سے کہ بھیک مانگ کر ڈگری کا روپیہ ادا کردے اور اپنی جان چھڑالے۔ مگر ان کو اس کی ظاہری حالت سے شبہ پڑا اور اس کو دل میں بُرا کہا۔ رات کو جو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مردہ ہے اور اس کو کاٹ کاٹ کر کھلانے کے لئے ان سے کہتا ہے یہ انکار کرتے ہیں تو ان کو جواب ملتا ہے کہ دن میں تو اس فقیر کی غیبت کر کے مردہ کا گوشت کھایا اور اب انکار ہے انھوں نے کہا کہ میں نے اس کو کچھ کہا نہیں جواب ملا غیبت زبان ہی سے کہنے سے ہوتی ہے دل سے بھی تو ہوتی ہے حق تعالیٰ تو قلب کو دیکھتے ہیں بلکہ اصل غیبت دل سے ہی ہے ؎

اِنَّ الْکَلَامَ لَفِی الْفُؤَادِ وَاِنَّمَا جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَی الْفُؤَادِ دَلِیْلاً

یعنی کلام تو در اصل قلب ہی میں ہوتا ہے زبان تو محض اس کی مترجم ہے۔ جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہ صرف اس کو ظاہر کردیتی ہے باقی بات تو وہی ہوتی ہے جو دل میں ہوتی ہے چنانچہ اٹھے اور پہونچے اسی فقیر کے پاس۔ دور سے دیکھ کر اس نے فوراً یہ آیت پڑھی وَھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَعْفُوْ عَنِ السَّیِّئَاتِ جس کا مطلب یہ تھا کہ گھبراؤ نہیں توبہ کرنے سے خدا سب گناہ معاف کر دیتا ہے چونکہ اب توبہ کر چکے ہو لہٰذا سب معاف تو دیکھئے غیبت دل سے بھی ہوتی ہے اسی طرح حدیثوں میں وعید آئی ہے ریا پر اور وعید آئی ہے حسد پر اور وعید آئی ہے کبر پر حب دنیا پر اب بتلایئے یہ سب گناہ قلب کے متعلق ہیں یا اعضاء ظاہری ظاہر ہے کہ قلب ہی کے متعلق ہیں اور بھی گناہ قلب کے متعلق کیا ہوتے سارے ہی گناہوں کا تعلق اول قلب ہی سے ہوتا ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا

نَسِدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ یاد رکھو کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے گوشت کا اگر وہ سنوارا ہوا ہوتا ہے تو سارا بدن سنور جاتا ہے اور وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے یاد رکھو کہ وہ قلب ہے واقعی قلب ہی کے اوپر دار و مدار ہے صلاح و فساد کا۔ صوفی تو اس کے قائل ہیں سارے فقہا بھی اس کے قائل ہیں دیکھئے آخر بدون نیت کے نماز ہی صحیح نہیں ہوتی اور نیت ہی سے ایک نماز سنت ہوتی ہے اور دوسری فرض مثلاً چار ہی رکعت سنت میں ہیں اور چار ہی فرض میں تو اگر سنت کی نیت کر لی سنت ہو گئی فرض کی نیت کر لی فرض ہو گئے۔ برخلاف اس کے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ نیت تو کی جائے سنت کی اور ہو جائے فرض اور یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ اگر محض قلب میں نیت کر کے نماز پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی زبان سے چاہے کچھ بھی نہ کہے لیکن چونکہ ہمارا قلب پریشان رہتا ہے اور ہم کو قلب سے نیت کرنا دشوار ہے اس لئے فقہا نے احتیاطاً زبان سے بھی نیت کے الفاظ کہہ لینا تجویز کر دیا ہے ورنہ اگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہے مگر دل میں سمجھے کہ میں ظہر کی نماز ادا کرتا ہوں تو نیت متحقق ہو جائے گی اور نیت وہ چیز ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ سارے اعمال کا دار و مدار نیت ہی پر ہے۔ اب بتلایئے فقہاء کے نزدیک بھی قلب ہی کے اوپر سارا دار و مدار ہوا یا نہیں نیت وہ چیز ہے کہ اگر ظہر کے وقت میں نیت فرض کر لی تب تو فرض ادا ہوں گے ورنہ اگر کسی نے ہزار نفلیں بھی ظہر کے وقت میں پڑھ ڈالیں مگر اس کے ساتھ نیت فرض کی نہ کی تو اس کے ذمہ فرض موجود۔ اور عذاب تیار۔ اور حضرت قلب تو وہ چیز ہے کہ حق سبحانہٗ تعالےٰ جل و علا شانہ کے ساتھ معاملہ کا سارا مدار اسی پر ہے تو اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قلب کے متعلق کوئی عمل نہیں خوب سمجھ لیجئے کہ گناہ صرف اعضا ظاہری ہی کے متعلق نہیں ہیں بلکہ قلب کے متعلق بھی ہیں جیسا کہ بالتفصیل ثابت کر دیا گیا ہے لیجئے اس جماعت کا تو فیصلہ ہوا۔ یہ بیان ذرا طویل ہو گیا لیکن یہ ضرورت تھی اس بیان کی کہ بعض لوگوں کی زبان پر یہ لفظ آتا ہے کہ شریعت کو ہماری شادی اور غمی سے کیا تعلق اسی لئے

میں نے یہ آیت پڑھی ہے اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (کیا انسان خیال کرتا ہے کہ مہمل چھوڑ دیا گیا ہے) انکار فرماتے ہیں اور نکیر فرماتے ہیں اس خیال پر کہ انسان مہمل چھوڑا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ہر چیز کو شریعت سے پوچھو۔ کہیں وہ جواز کا فتویٰ دے گی کہیں عدم جواز کا۔ بہت لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ پھر کیا کیا رسمیں کریں اور کیا کیا نہ کریں میں کہتا ہوں کہ بجز ایجاب وقبول کے سب فضول ہے کچھ نہ کرو اب چاہے مجھے کوئی دیہاتی کہے یا گنوار کہے جو چاہے کہے۔ اور دیہاتی تو ہم ہیں ہی۔ ہمارے جواب تو دیہاتی ہی ہیں چاہے کوئی بُرا مانے چاہے بھلا مانے۔ بس سوسنار کی اور ایک لوہار کی۔ اس جواب پر بعض نے مجھے رائے دی کہ ایسی سختی مناسب نہیں ایک دم سے ساری رسمیں نہ چھڑانی آہستہ آہستہ چھڑانی چاہئیں۔ رفتہ رفتہ ہی اصلاح ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے کیوں مقید کرتے ہو مجھ سے یہ کیوں کہلواتے ہو۔ اگر ایک دم سے ساری رسمیں تمھیں چھوڑنا مشکل ہیں تو تمھیں اختیار ہے تم خود رفتہ رفتہ چھوڑو باقی مجھے وہی کہنے دو جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں آخر تمھارا اس میں ضرر ہی کیا۔ اور اگر میں ایک ایک کر کے منع کروں تو اس میں یہ خرابی ہے کہ فرض کرو آج دس چیزیں ہیں قابل منع کرنے کے اور ان میں سے صرف آٹھ کو منع کیا اب وہ سمجھیں گے کہ ہم مخاطب صرف انہی آٹھ کے چھوڑنے کے ہیں خیر بیچاروں نے نفس کو مجبور کر کے ان آٹھ کو چھوڑا۔ کل کو دو کی اور ممانعت کی گئی تو اب حجت ہوگی کہ لو آج یہ دو اور بڑھا دیں تو کل تو اجازت دیدی تھی۔ آج منع کرتے ہیں ان کا کیا بھروسہ ہے خدا جانے کہاں تک یہ سلسلہ جاری ہے یہ خرابی ہے آہستہ آہستہ منع کرنے میں۔ تو مجھے کیوں مقید کرتے ہو میں تو دس کے دس ہی کو منع کروں گا تمھیں اگر ہمت نہ ہو تم ایک ایک دو کر کے چھوڑ دو مجھے خواہ مخواہ کیوں مقید کرتے ہو۔ تو صاحب میں تو یہی کہوں گا کہ صرف ایجاب و قبول چاہیئے باقی کھلانا پلانا۔ دینا دلانا جمع کرنا سب واہیات سب ہی میں خرابی ہے کسی میں تھوڑی کسی میں بہت اگر بہ نظر انصاف سے دیکھا جائے تو اکثر تو یہی ہے کہ کھلانا پلانا جمع کرنا دور دراز سے لوگوں کو بلانا جوڑے دینا لینا یہ سب صرف نام ونمود کے لئے ہوتا ہے نہ کسی کے ساتھ ہمدردی مقصود ہوتی ہے نہ کچھ۔ ہر شخص اپنے دل کو ٹٹول کر

دیکھ لے اگر کوئی کہے کہ صاحب ہم نے تو خوب غور کر کے دیکھ لیا ہماری نیت تو بالکل ٹھیک ہے ہم کو تو نام و نمود ہرگز مقصود نہیں ہیں تو اس کا وسوسہ بھی نہیں تو میں اس کی تکذیب نہیں کرتا واقعی بعضے خوش نیت بھی ہوتے ہیں میں خواہ مخواہ ان کو کیوں الزام دوں۔ اور جو مصالح وہ بیان کرتے ہیں وہ ایک حد تک ٹھیک بھی ہیں کہتے ہیں کہ اجی روز روز تو عزیزوں سے کہاں ملنا ہوتا ہے تقریبات میں سب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ غریبوں کو کھانا پہونچ جاتا ہے ہاں یہ ضرور نیک نیتی ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اول تو ایسے خالص نیک نیت ہیں کتنے پھر جو ہیں بھی انھوں نے بس ایک مصلحت کو تو دیکھا اور ہزاروں مفسدوں پر نظر نہ کی حَفَظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ اَشْيَاءُ ایک چیز پر تو نظر رہی اور دوسری بہت سی چیزیں نظر سے غائب کر دیں سو حضرت سنئے اس کے واسطے بھی شریعت نے ضوابط و قواعد مقرر کر دیئے ہیں شریعت کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے نہایت منضبط اور مکمل قانون ہے اکثر حضرات یہ مصلحتیں بیان کر کر مجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ میں ان تقریبات میں کچھ گنجائش نکال دوں صاحب اگر شریعت میرے اختیار میں ہو تب تو مجھ سے درخواست رعایت کی کی بھی جائے لیکن شریعت میرے گھر کی چیز تو نہیں اگر میں خوامخواہ دخل در معقولات کر کے اپنی طرف سے رعایت کر بھی دوں تو اس سے ہوتا کیا ہے جو امر ناجائز ہے وہ میرے کہنے سے جائز تھوڑا ہی ہو جائیگا بلکہ الٹا مجھ ہی سے سوال ہوگا کہ تم کون تھے جائز کرنے والے تو میں کیوں مصیبت میں پڑوں اب سنئے کہ شریعت نے ایسے موقع کے لئے کیا حدود اور قواعد مقرر کئے ہیں سو منجملہ ان کے ایک قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی چیز میں مصلحت اور مفسدہ دونوں جمع ہوں تو اعتبار مفسدہ کا ہوتا ہے یعنی اگر کسی چیز میں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے تو اس حالت میں مصلحت کو نہ دیکھا جائیگا بلکہ مفسدہ کا اعتبار کیا جاوے گا پھر اس کی بھی ایک حد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصلحت دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو وہ جس کا حاصل کرنا واجب ہو وہاں تو یہ حکم ہے کہ اس مصلحت کو حاصل کرو اور مفسدہ کو روکنے کی کوشش کرو۔ مثلاً جماعت میں آتے ہیں نماز کے لئے لیکن فرض کرو کہ امام ایسا ہے کہ قرآن غلط پڑھتا ہے یا اور کوئی ایسا ہی نقص ہے جس کی وجہ سے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے تو ہم

کوشش تو یہ کریں گے کہ وہ شخص امامت سے معزول کر دیا جائے لیکن جب تک ہم اس کوشش میں کامیاب ہوں گے اس وقت تک اسی کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں گے یہ نہ کریں گے کہ جماعت چھوڑ دیں کیونکہ جماعت یا سنت موکدہ ہے یا واجب اس میں علما کا اختلاف ہے ہمارے علماء حنفیہ میں محققین کی یہی تحقیق ہے کہ واجب ہے جماعت کیونکہ اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں وہ سنت موکدہ سے بڑھی ہوئی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میرا جی یوں چاہتا ہے کہ لکڑیاں جمع کراؤں پھر اذان کہلاؤں اور جماعت کراؤں پھر دیکھوں کون کون جماعت میں نہیں آیا جو جو نہیں آیا ان کے گھر جا کر پھونک دوں ایسی وعید سنت موکدہ پر نہیں ہوتی ہے اسی واسطے ہمارے بہت علماء نے جماعت کو واجب کہا ہے۔ اس پر شبہ کیا ہے بعض ذہین لوگوں نے کہ یہ وعید منافقوں کے واسطے تھی کہ اہل ایمان کے واسطے کیونکہ منافق ہی جماعت میں حاضر نہیں ہوتے تھے تو یہ وعید گھر پھونک دینے کی در اصل ان کے نفاق پر تھی نہ کہ ترک جماعت پر میں کہتا ہوں فہم سے کام لینا چاہیے اول تو اس حدیث میں کوئی قرینہ اس تخصیص کا نہیں دوسرے ایک اور بھی قاعدہ ہے کہ کفار صرف ایمان کے مکلف ہیں فروع کے مکلف نہیں اور اہل ایمان مکلف فروع کے بھی ہیں مثلاً کفار جب تک کافر ہیں انھیں یہ حکم نہیں دیا جاتا کہ نماز پڑھو کیونکہ نماز بدون ایمان کے صحیح نہیں ہو سکتی تو اگر ان کو حکم دیا بھی جائے کہ نماز پڑھو تو اس حکم سے فائدہ کیا ہوگا کیونکہ نماز صحیح تو ہونے کی نہیں پھر یہ ایک فضول بات کا حکم ہوا انھیں حکم دیا جائے گا کہ ایمان لاؤ پس ایمان لانا تھا کہ اب تمام خطاب ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور سارے فروع کے وہ مکلف بن گئے اب ہر ہر حکم ان سے متعلق ہو گیا اس کے پہلے کچھ بھی نہیں تھا اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی باغی ہو اس کو یہ خطاب نہیں کیا جاوے گا کہ اگر اتنے دن تک کوئی شخص زمین پر قابض رہے تو وہ موروثی ہو جائے گا سارے احکام کی اس کو تبلیغ نہیں کی جائے گی بلکہ اس کو سب سے پہلے حکم یہ ہوگا کہ بغاوت چھوڑ دو اس سے پہلے دفعات فوجداری اور دیوانی کے متعلق اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا جب اس نے بغاوت چھوڑ دی

تواب اس پر سارے دفعات عاید ہوگئے۔ فوجداری کے دفعات بھی دیوانی کے دفعات بھی جب یہ بات سمجھ میں آگئی تواب دوسرا قاعدہ سنئے کہ منافق تھے کافر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے بتلا دیا گیا تھا کہ فلاں فلاں منافق ہیں تو ان کا کافر ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا اور جب وہ کافر تھے تو ان کی طرف حسب قاعدہ مذکورہ جماعت کا امر متوجہ ہی نہ تھا لہذا وہ ترک جماعت پر کسی سزا کے مستحق ہی نہ تھے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا گھر کیوں جلاتے تو وہ شبہ جاتا رہا اور ثابت ہوگیا کہ یہ وعید ترک جماعت ہی پر ہے اور ایسی سخت وعید سنت موکدہ کے ترک پر ہوا نہیں کرتی اس واسطے محققین حنفیہ قائل ہوئے ہیں جماعت کے واجب ہونے کے۔ بہر حال جماعت خواہ واجب ہو خواہ سنت مؤکدہ ہے ضروری چیز تو مسجد میں آنا جماعت کے لئے ایک ایسی مصلحت ہے جو ضروری ہے مگر اس کے ساتھ یہ مفسدہ مل گیا ہے کہ امام ایسا ہے جس کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے۔ اب یہاں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے مگر مصلحت ہے واجب التحصیل تو اس صورت میں حکم یہ ہوگا کہ جماعت کو نہ چھوڑو اس مفسدہ کا علاج کرو یعنی امام کو الگ کرو مگر الگ کرو خوش تدبیری سے فتنہ فساد کی اجازت نہیں ایسی باتوں کے لئے لڑنا بھڑنا نہ چاہیئے کیونکہ لڑنے بھڑنے کے مفاسد اس کراہت کے مفسدہ سے بھی زیادہ ہیں اور اگر اس امام کے الگ کرنے پر قدرت نہ ہوگی تو اس پر عمل کریں گے کہ صَلُّوْا خَلْفَ كُلِّ بِرٍّ وَّفَاجِرٍ یعنی ہر شخص کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو خواہ وہ نیکوکار ہو یا بدکار۔ یہ حکم تو مصلحت واجب التحصیل کا تھا اور ایک مصلحت وہ ہے کہ وجوب کے درجہ میں نہیں ہے جیسے تقریبات میں بہت سے بھائیوں کا آپس میں مل لینا یا غریبوں کو وقت خاص پر کھانا مل جانا یہ مصلحت شرعاً واجب نہیں ہے اور اس کے ساتھ مفاسد بہت سے موجود جیسے تفاخر اور ریا اور کیا اور کیا۔ جہاں ایسی مصلحت جو واجب نہ ہو کسی مفسدہ کے ساتھ جمع ہو جائے گی وہاں اس مصلحت ہی کو چھوڑ دیں گے بلکہ ایسی ایسی ہزار مصلحتیں بھی کسی ایک مفسدہ کے ساتھ جمع ہو جائیں گی ان کو بھی ترک کر دیا جائیگا تو ہمارے قبضہ میں نہیں ہے

قانون کہ تمھارے مصالح کی رعایت سے اس میں وسعت کردی جائے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس قانون کی تصریح موجود ہے۔ ارشاد ہے یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ یعنی پوچھتے ہیں آپ سے کہ خمر اور جوئے کا کیا حکم ہے۔ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور ان میں کچھ نفع بھی ہیں (ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے) دیکھئے خود آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ جوئے اور شراب میں مصالح موجود ہیں لیکن چونکہ گناہ بھی موجود ہے اس واسطے حکم ان کی حرمت ہی کا ہوا۔ تو یہ قاعدہ قرآن مجید سے ثابت ہوگیا کہ جہاں مفسدہ اور مصلحت غیر مطلوب فی الشرع جمع ہو وہاں ترجیح مفسدہ ہی کو ہوگی۔ لیجئے اب تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس قانون کے انکار کی لیجئے میرا مدعا آیت سے بھی ثابت ہوگیا۔ گو اس ثبوت کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ہم مقلدوں کو حق کیا ہے نصوص سے استدلال کرنے کا ہم تو تابع ہیں اپنے ائمہ کے۔ جب ان کا مذہب مدون ہے تو ہم کو اسی کو لے لینا کافی ہے۔ یہ کام تو علمائے مجتہدین کا ہے نصوص سے استدلال کریں اور قانون مرتب کریں ہم جیسوں کو تو یہی کافی ہے کہ جس امام سے عقیدت ہو اس کے قول پر عمل کرلیں۔ مثلاً ہم اتباع کرتے ہیں امام ابوحنیفہ کا تو ان کا قول ہمارے لئے کافی ہے ہم اسی پر عمل کریں گے۔ رہا نصوص سے استدلال سو یہ ان کا کام ہے پس جب ہم مذہب حنفی میں یہ اصل لکھا ہوا مدون پاتے ہیں کہ اگر کسی کام میں مفسدہ اور مصلحت دونوں جمع ہوں تو ترجیح مفسدہ کو ہوگی بشرطیکہ مصلحت واجب التحصیل نہ ہو۔ بس اس بناء پر ہم ان رسوم کو منع ہی کریں گے۔ اب اس کا بھی جواب ہوگیا کہ اس میں مصلحتیں ہیں۔ کیونکہ جہاں مصلحتیں ہیں وہاں مفسدے بھی تو موجود ہیں۔

اب ایک بات رہ گئی یعنی بہت لوگ ایسے بھی تو ہیں جن کی نیت میں نہ تفاخر ہے نہ کبر نہ شہرت نہ کوئی اور خرابی بالکل پاک صاف ہیں وہ البتہ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب ہمارے فعل میں تو مصالح ہی مصالح ہیں مفاسد ہیں ہی نہیں سب مصلحت ہی مصلحت ہے

مفسدہ کچھ بھی نہیں۔ اللہ گواہ ہے ہماری نیت نہ تفاخر کی ہے نہ ریا کی۔ہماری نیت میں کوئی خرابی نہیں۔ہماری نیت بالکل پاک صاف ہے سو اگر کوئی ایسا دعوٰی کرے تو ہم تکذیب نہیں کرتے۔ایک مسلمان کی ممکن ہے کسی کی نیت ایسی ہی پاک صاف ہو۔ اور اسراف کا جو مفسدہ تھا اس کا وہ یہ جواب دے سکتے ہیں کہ ہمیں ماشاءاللہ خدا نے اتنا دیا ہے کہ ایسے ایسے خرچوں سے ہمیں رائی برابر بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا اول تو اس کا تسلیم ہی کرنا مشکل ہے کہ نقصان نہیں پہنچتا میں اگر آجاؤں انکار پہ تو کہہ سکتا ہوں کہ قرض ہو ہی جاتا ہے اور میں ثابت کر سکتا ہوں واقعات سے کہ بڑے بڑے لوگ بھی مقروض ہو جاتے ہیں ایسے موقعوں پر کیونکہ ہر شخص اپنی حیثیت سے بڑھ کر ہی ان تقریبات میں خرچ کیا کرتا ہے۔یوں چاہے گراں نہ سمجھیں اس قرض کو مگر خیر مجھے قیل وقال کرنا منظور نہیں ہیں میں اس کو بھی مانتا ہوں کہ اسراف بھی نہیں ہوتا بلاضرورت میں اس بحث میں کیوں پڑوں مگر ہاں جو بات کہنے کی ہے وہ تو ضرور کہی جائے گی۔کیا میں حقائق کو بھی ظاہر نہ کروں۔سو سنئے۔میں نے یہ مانا کہ آپ اپنی نیک نیتی کی بنا پر اس کلیہ سے ایک درجہ میں بچ گئے کہ جہاں مفسدہ اور مصلحت دونوں جمع ہو جائیں وہاں ترجیح مفسدہ کو ہوتی ہے۔خیر اس کلیہ سے تو آپ جیسے تیسے بچ گئے لیکن حضرت ابھی پیچھا نہیں چھوٹا ابھی ایک اور کلیہ بھی موجود ہے وہی کلیہ جس کا وعدہ میں اوپر کر چکا ہوں وہ بھی ہماری شریعت ہی کے اصول میں سے ہے اور قرآن و حدیث سے تائید کیا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے جس عمل مباح سے کسی دوسرے مسلمان کو ضرر دین کا پہونچے ہمارے لئے بھی وہ عمل مباح نہ رہے گا حتیٰ کہ کسی فعل مندوب و مستحب سے بھی اگر کسی مسلمان کے اعتقاد یا عمل میں کوئی خرابی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس مستحب کو ترک کر دیا جائے گا یہی راز ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض احادیث پر عمل کو ترک کرانے کا مثلاً حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف تھی جمعہ کے دن صبح کی نماز میں الم تنزیل اور سورہ دہر پڑھنے کی اکثر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔ چنانچہ شافعیہ اب بھی پڑھتے ہیں۔ اب تک ان کا یہی معمول ہے اور امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس کا التزام مناسب نہیں۔ دیکھئے حدیث میں تو وارد دیگر امام صاحب اس کو منع کرتے ہیں۔ اصل میں امام صاحب کے اس قول کا حاصل یہ ہے کہ یہ عمل واجب تو ہے نہیں محض مستحب ہے اور اس مستحب سے دوسروں کے واسطے ایک خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہاں اپنا اپنا تجربہ اور اپنا اپنا مشاہدہ ہے نہ ایک کو دوسرے کا رد چاہیئے نہ تنقیص۔ ممکن ہے امام ابوحنیفہؒ کو تجربہ ہوا ہو اور اس خرابی کا ان کو مشاہدہ ہوا ہو اور ان کو نہ ہوا ہو اس میں ان سے منازعت نہیں ہو سکتی۔ غرض ان کو مشاہدہ ہوا عوام النّاس کی کیفیت کا کہ بعض مستحب افعال بھی ان لوگوں کو شبہ میں ڈال دیتے ہیں چنانچہ اس معمول کے متعلق بھی امام صاحب نے سمجھا کہ جب کسی جمعہ میں بھی ناغہ نہ ہوا اور کبھی اس کے خلاف کرتے نہ دیکھیں گے تو سمجھیں گے کہ یہ عمل لازم اور واجب ہے۔ یہ تو اعتقادی خرابی ہوئی۔ دوسرے ممکن ہے کہ ایک اور بھی خرابی کا مشاہدہ ہوا ہو اور وہ عملی خرابی ہے۔ وہ یہ کہ بعض دفعہ جو نماز میں مجمع ہو جاتا ہے بڑا، تو دور والوں کو سنائی نہیں دیتا کہ امام کونسی صورت پڑھ رہا ہے، تو اب تو خیر ہے نہیں کہ امام نے سجدہ کی آیت پڑھی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے اس لئے تو کیا سجدہ یہ گئے رکوع میں۔ وہ اٹھا سجدہ سے اور یہ کہا اللہ اکبر۔ انھوں نے کہا سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ۔ بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں ایک دفعہ یہی گڑبڑ ہوئی۔ وہاں یہ دستور ہے کہ سب اہلِ مذاہب جمع ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔ کسی مصلے پر نماز ہوتی ہو شافعی پر یا حنفی پر یا کسی پر دوسرے اماموں کے مقلد بھی بلا تامل شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں کا سا قصہ نہیں ہے کہ کوئی شافعی امام ہو جاتے تو اس کے پیچھے حنفی نماز نہ پڑھیں یہ واہیات بات ہے۔ وہاں سب پڑھ لیتے ہیں ایک دوسرے کے پیچھے وہاں کوئی تخصیص نہیں کرتا۔ چنانچہ جمعہ کے دن ایک دفعہ یہ ہوا کہ صبح کی نماز شافعی مصلے پر ہو رہی تھی۔ حج کا زمانہ، مجمع تھا بہت۔ امام ٹھیرے شافعی۔ انھوں نے حسب معمول

الم تنزیل پڑھی اب انھوں نے سجدہ کی آیت پر پہنچکر سجدۂ تلاوت کیا اور اللہ اکبر کہکر ایک ساتھ سجدہ میں گئے۔ اب جنھیں معلوم نہیں ہے کہ یہ سجدۂ تلاوت کیا گیا ہے اور وہ سمجھے کہ امام نے رکوع کیا وہ گئے رکوع میں امام اٹھے سجدہ سے کہا اللہ اکبر انھوں نے کہا سمع اللہ لمن حمدہ اب امام تو قرأت میں ہے اور وہ منتظر ہیں کہ سجدہ میں جاوے اب امام سجدہ ہی میں نہیں جاتا۔ جب بہت دیر ہوگئی تو اب کوئی تو نیت توڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ آخر معاملہ کیا ہے کوئی سجدہ میں چلا گیا اس خیال سے کہ شاید تکبیر کی آواز نہ سنائی دی ہو۔ سجدہ سے اٹھ کر جو دیکھا تو لوگ کھڑے ہیں۔ خیر یہ بھی کھڑے ہو گئے اس کے بعد امام نے پھر دو رکعت پڑھیں تو ان کے نزدیک گویا امام نے تین رکعتیں پڑھیں غرض اس قدر گڑ بڑ ہوئی کہ کوئی رکوع میں ہے کوئی سجدہ میں ہے۔ کسی نے نیت توڑ دی۔ کوئی سمجھا امام نے تین رکعتیں پڑھیں۔ چنانچہ ایک شخص بجار کے بھی اس جماعت میں تھے وہ جب لوٹ کر گھر پہنچے تو کہنے لگے ارے میاں شافعیوں نے تو قرآن و حدیث کے بالکل خلاف عمل اختیار کر لیا ہے۔ مغرب کی طرح صبح کی بھی تین رکعت پڑھتے ہیں تو آپ نے دیکھا کہاں تک نوبت پہنچی۔ بس امام صاحب نے ایسے ہی واقعات دیکھ کر فرمایا کہ جو عمل واجب بھی نہیں اور عوام میں اس کے کرنے سے پڑتی ہے گڑبڑ تو کیا ضرورت ہے کہ اس کو کیا ہی جاوے جیسے بعض لوگوں کو خواہ مخواہ شوق ہوتا ہے نئی بات کرنے کا۔ چنانچہ ایک قاری صاحب نے نماز پڑھائی قرأت کے جوش میں آکر آپ نے قل ہو اللہ احد پڑھنے میں احد پر وقف نہیں کیا۔ بلکہ اس کو اللہ الصمد سے ملا کر پڑھا تو چونکہ احد پر تنوین ہے اس لئے عربیت کے قاعدہ سے اس صورت میں للہ الصمد کا ہمزہ حذف ہو جائیگا۔ اور احد کی تنوین کا نون مکسور ہو کر لام سے مل جاویگا اور اس طرح پڑھا جاویگا اَحَدُ نِ اللّٰہُ الصَّمَدُ تو گو انھوں نے صحیح پڑھا تھا مگر عوام تو نہیں سمجھتے یہاں تک بحث بڑھی کہ حضرت اس پر فوجداری ہو گئی کہ یہ اس قاری نے نیا قرآن شریف کہاں سے نکالا۔ اب بعضے جاہلوں نے کیا کیا۔ اچہ مردم میکند بوزینہ ہم، (جو انسان کرتا وہی بندر بھی کرتا ہے) ان قاری صاحب کی نقل اتاری۔ جاہل کی نقل ہی کیا۔

انھوں نے یہ کیا کہ احد پر وقف بھی کیا اور نون مکسور بھی پڑھا یعنی ن اللہُ الصَّمَدُ جو بالکل غلط ہے۔ خدا بچاوے جہل بھی کیا بری چیز ہے۔ اب فرمائیے اس موقعہ پر کیا کیا جائیگا یہی کیا جائیگا کہ جہاں جہل ہو اس قاری کو حکم دیا جائیگا شرعی قاعدہ سے کہ ایسا نہ کرے کیوں اس واسطے کہ عوام اس سے گڑبڑ میں پڑتے ہیں غرض ایسی بات کرنا جس میں عوام میں گڑبڑ پڑجاوے درست نہیں۔ تو قاعدہ یہ ٹھہرا کہ جس مباح سے اور جس مستحب سے عوام کسی دین کی خرابی میں پڑجائیں وہ فعل خواص کے لئے بھی جائز نہیں رہتا حالانکہ وہ خود اس خرابی سے بچے ہوئے ہیں۔ ایسے موقعہ پر خواص کو لازم ہے کہ وہ خود بھی ایسے فعل مباح کو بلکہ ایسے فعل مستحب کو بھی چھوڑ دیں جس سے عوام کی خرابی کا اندیشہ ہو اور حقیقت میں قاعدہ وہ پہلا ہی قاعدہ ہے مصلحت اور مفسدہ جب جمع ہوتے ہیں مفسدہ کو ترجیح ہوتی ہے کیونکہ دوسرے شخص کا خرابی میں پڑجانا یہ بھی تو مفسدہ ہے اگر لازم نہیں تو متعدی سہی۔ اسی واسطے میں نے پہلے کلیہ سے بچنے کے مقام پر یہ کہا ہے کہ ایک درجہ میں جب یہ قاعدہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھئے کہ آپ کو وسعت ہے پانچ ہزار خرچ کرلے کی اور آپ کو خدا نے علم بھی دیا ہے جس کی وجہ سے آپ کو نفس پر قدرت ہے اور آپ نے اپنے نفس کو ریا سے فخر سے کبر سے سب سے بچالیا تقریب میں کوئی بے انتظامی بھی نہیں ہوئی۔ کوئی نماز بھی قضا نہیں ہوئی بلکہ کوئی جماعت بھی فوت نہیں ہوئی۔ حالانکہ ایسے موقعوں پر نمازیں تک قضا ہوجاتی ہیں۔ جماعت کا تو کیا ذکر اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی حج کو بھی جاوے اور وہ حج ہو نفل اور اس میں ایک بھی فرض نماز کے فوت ہوجانے کا اندیشہ ہو تو حج کے جانے کی بھی اجازت نہیں۔ پھر اب دیکھ لیجئے ان تقریبات کی کیا حالت ہے۔ حالت یہ ہے کہ نہ عشا کی نماز ہے نہ صبح کی نماز ہے جماعت تو کوئی چیز ہی نہیں مگر فرض کر لیجئے کہ آپ کے یہاں ایسا بھی نہیں ہوا۔ گو یہ فرض کرلینا ہے بہت بعید اور ہے شاذ و نادر ایسا کہ نمازوں کے فوت ہونے کی نوبت نہ آتی ہو۔ خیر اگر یہ نہیں تو گپڑ سپڑ تو ضرور ہے کہ نمازیں ٹھیک وقت پر ادا نہیں ہوتیں تاہم اگر کوئی کہے کہ ہم اس کا بھی خاص اہتمام رکھیں گے کہ نہ نماز فوت ہونے دیں گے نہ جماعت، نہ تاخیر ہونے دیں گے تو بہت اچھا ہم تکذیب نہیں کرتے آپ کی ہم نے

مانا کہ آپ نے اپنے آپ کو ہر طرح کی برائی سے بچالیا۔ مگر حضور یہ بھی تو دیکھئے کہ نتیجہ کیا ہوا آپ کے فعل کا۔ آپ کو دیکھ کر آپ کے وہ بھائی اور برادری کے لوگ جو آپ سے وسعت میں اور علم میں کم ہیں مگر برابری کے دعوے میں بڑھے ہوئے ہیں وہ بھی تقریب کو اسی طرح کریں گے کہ ہم کیوں گھٹے ہوئے رہیں۔ آپ نے تو گھر میں سے دو ہزار روپے نکال کر خرچ کر ڈالے ان کے گھر میں روپیہ کہاں۔ انھوں نے جائداد گروی کر کے صرف کیا۔ اب جائداد گروی ہوئی اس کی آمدنی گروی رکھنے والا کھا رہا ہے اور وہ سود ہے اور وہ سود لینے والا ہے اور تم سود دینے والے ہو۔ اور حدیث میں دونوں پر لعنت آئی ہے لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰكِلَ الرِّبٰوا وَمُوْكِلَهٗ یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے کھانے والے اور کھلانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بلاضرورت لعنت خریدی۔ یہ کاہے کی بدولت ہوا۔ آپ کے فعل کی بدولت۔ نہ آپ ایسا کرتے نہ وہ اس بلا میں پڑتے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ روساء کو کیوں منع کیا جاتا ہے ان کے پاس روپیہ وافر ہے۔ ان پر کیا بار ہوتا ہے۔ ان تقریبات میں خرچ کرنے سے ہاں انھیں منع کرنا چاہیے۔ جو غریب ہیں میں نے کہا سبحان اللہ معلوم ہوتا ہے آپ کے دل میں ذرا بھی ہمدردی نہیں۔ میں پوچھتا ہوں اگر خدانخواستہ آپ کا بیٹا بیمار رہو اور حلوا کھانا اس کو مضر ہو تو اس وقت آپ کیا کریں گے کیا یہ کریں گے کہ آپ تو حلوا بنا بنا کر کھایا کریں اور وہ دیکھا کرے میں تو نہیں سمجھتا کہ کوئی باپ ایسا ہوگا کہ اس کے سامنے حلوا پکائے گا۔ حضرت اس وقت یہ حالت ہوگی کہ حلوا کھانا چاہیں گے بھی تو حلق سے نہ اترے گا اگر ایسا ہی کوئی قصائی ہوگا تو خیر بازار میں جا کر حلوا کھا آئیگا لیکن گھر میں تو حلوے کا نام بھی نہ آنے دیگا۔ آخر اس کی وجہ کیا، وجہ ظاہر ہے۔ یہی کہ اگر گھر میں حلوا پکے گا یا گھر میں آئے گا تو یہ نہیں ہو سکے گا کہ صرف وہی لوگ کھائیں جن کو حلوا نقصان نہیں کرتا بلکہ اوروں کو کھاتے دیکھ کر اس کو بھی حرص ہوگی یہ بھی کھائے گا اور بد پرہیزی کرے گا چونکہ اس سے محبت ہے اور اس کا نقصان ہرگز گوارا نہیں۔ اس کی خاطر سارے گھر پر حلوا حرام ہو جائیگا۔ لیجئے اس کی بنا اسی قاعدہ شرعی پر تو ہوئی

کہ جو فعل مباح ہے وہ ہمارے لئے بھی ناجائز ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے دل پر اس کا اثر برا پڑتا ہو۔ پس اگر آپ کو محبت ہوتی اور ہمدردی ہوتی مسلمانوں سے تو ایسا کبھی نہ کرتے بلکہ یہ سوچتے کہ میں تو کروں گا اس وجہ سے کہ مجھ کو وسعت ہے اور دوسرا بھائی کرے گا برابری دعوی کی وجہ سے اور وہ ہو جائیگا تباہ۔ لہذا میں ہی ہاتھ روک لوں۔ اگر محبت اور ہمدردی ہوتی تو اپنے بھائیوں کو ضرور تباہی سے بچایا جاتا۔

ایک شخص بولے کہ جب سب باتیں منع ہیں تو پھر دل کا حوصلہ کیسے نکالیں اور خوشی کس طرح منائیں۔ میں نے کہا مجھے دو پانچ ہزار روپیہ میں غریبوں کو تقسیم کر دوں۔ ایک ہزار آدمیوں کو پہونچ جاویں ایک ایک کو پانچ پانچ روپیہ، وہ تمہیں دعائیں دیں نام بھی ہو دل بھی خوش ہو۔ مگر حضرت ان باتوں میں وہ مزہ کہاں بس سن کر مرجھا گئے۔ کیونکہ اس میں حظ نفس تو نہ ہوا۔ چہل پہل، دھوم دھام، صوفیوں کا سا مزا کوئی گرے کوئی پڑے کوئی غل مچا رہا ہے۔ ایک ہنگامہ برپا ہے۔ بھلا وہاں یہ رونق کہاں۔ اللہ بھلا کرے تاشے ڈھول کا یہ رونق تو انہی سے ہوتی ہے اور نفس خوش رونق ہی سے ہوتا ہے۔

اب فرمایئے اب آگے کیا گنجائش ہے کچھ کہنے کی۔ اب تو ختم ہوگئی حجت۔ اب تو ثابت ہوگیا کہ کسی کے لئے بھی اجازت نہیں۔ بس تو اب فقط ایک چیز رہ گئی تقریب نکاح کے اندر یعنی ایجاب و قبول بلکہ اگر کسی کی ہمت ہو تو اس میں بھی اختصار ممکن ہے وہ اس طرح کہ دولہا بھی مجلس نکاح میں نہ ہو وہ کسی کو اپنا وکیل کر دے نکاح کے لئے کیونکہ یہ فرض نہیں ہے کہ دولہا خود موجود ہو جب ہی نکاح ہو سکے۔ مثلاً کوئی نوکر ہے اس کو رخصت ہی نہیں ملتی یا ملنے میں وقت ہے یا مل بھی سکتی ہے مگر کیوں لیں فرض کیجئے کسی کا جی ہی نہیں چاہتا تو بس کسی کو اپنا وکیل کر دے کہ وہ اس کی طرف سے قبول کر لے (ہنس کر فرمایا) مگر یہ سمجھا دیا جائے کہ کہیں وہ اپنے واسطے نہ قبول کر لے، یوں کہہ دیا جائے کہ میری طرف سے قبول کر لینا چونکہ وکیل بجائے مؤکل کے ہوتا ہے اس لئے نکاح صحیح ہو جائے گا۔ دیکھا آپ نے کس قدر سہولت ہے وہ نوکری پر موجود اور یہاں نکاح ہو گیا۔ چنانچہ مواہب لدنیہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نکاح کی یہی صورت مروی ہے کہ جس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

سے ان کا نکاح ہوا وہ خود موجود نہ تھے۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ میں نے فاطمہ کا نکاح علی سے کر دیا۔ اِنْ رَضِیَ عَلِیٌّ بِذٰلِكَ یعنی اگر علی منظور کریں اس کو۔ حضرت علی کو جب خبر پہنچی تب انھوں نے کہا کہ میں نے منظور کیا۔ یوں ہوا تھا نکاح حضرت علی کا تو دیکھ لیا آپنے کہ یوں بھی نکاح ہوسکتا ہے۔ برات تو برات دولھا کے ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ غور کرنے کی بات ہے اے عقلا کہ جتنی حاجات ہیں انسان کی کچھ نہ کچھ خرچ کی ضرورت سب میں ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ دو آنہ مثلاً آدمی کسی کام کو کہیں جاوے تو کھانا تو ضرور ہی کھائیگا۔ اس میں کم از کم دو آنہ تو خرچ ہوں ہی گے، اسے بھی جانے دیجیے۔ پانی سب سے سستی چیز ہے حتیٰ کہ بکتا بھی نہیں مگر اس میں بھی خرچ ہوتا ہے۔ خود پانی کی کوئی قیمت نہ سہی مگر لانے والے کو تو اجرت دینا ہی پڑتی ہے عہ مہینہ ۸ر ۲ر ۴ر کچھ تو لگتا ہی ہے۔ بہت ہی کم ہوا تو ایک پیسہ تو ضرور ہی پانی کا بھی خرچ پڑ جاتا ہوگا۔ تو کچھ نہ کچھ قیمت پانی جیسی سستی چیز کی بھی ہوئی غرض ہر چیز میں کچھ نہ کچھ خرچ کی ضرورت ہے بجز نکاح کے کہ یہ اپنی حقیقت میں ایک پیسہ پر بھی موقوف نہیں۔ کیونکہ اس کی حقیقت ایجاب ہے اور قبول اور یہ محض دو بول ہیں زبان کے۔ ان میں کسی خرچ کی کیا ضرورت، رہے چھوارے سو وہ محض مستحب ہیں۔ نہ ہوں نہ سہی کچھ بھی حرج نہیں اور مہر ادھار ہے اس وقت اس کا کوئی تقاضا نہیں اور ادھار بھی جب ہے جب دو اور جو دینا لینا ہے ہی نہیں جیسا کہ آجکل عام طور سے سمجھا جاتا ہے تب تو ان کے زعم میں ادھار بھی نہیں چنانچہ بعض وقت صاف کہتے ہیں کہ مہر تو محض ایک دباؤ کے لئے ہے۔ دینا لینا تھوڑا ہی ہے۔ کون لیتا ہے اور کون دیتا ہے (حالانکہ یہ غلط ہے مہر دَین ہے جیسے اور دَین ہوتے ہیں) خیر کم سے کم مہر ادھار تو ہے ہی اس وقت اس کا مطالبہ نہیں تو نفس نکاح میں تو یہ خرچ شامل نہ ہوا۔ اب فرمائیے سب سے زیادہ سستی چیز اگر کوئی تھی تو نکاح تھا۔ مگر اللہ بھلا کرے ہمارے بھائیوں کا سب نے آپس میں کمیٹی کرکے اس کو ایسا مہنگا کر دیا ہے کہ غریب آدمی کی تو مصیبت ہے اور اس میں مزاحمت ہے عقل کی بھی۔ اور مزاحمت ہے شریعت کی بھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

بھلا یہ کونسی عقل کہہ سکتی ہے کہ جس چیز میں مطلق روپیہ کی ضرورت نہ ہو اس میں فضول اس قدر روپیہ صرف کر ڈالو ادھر شریعت کہتی ہے أَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُ مُؤْنَةً یعنی حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ نکاح سب سے زیادہ برکت والا ہے جس میں سب سے کم خرچ ہو یہ ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں نکاح کے متعلق سارے خرچ آگئے حتیٰ کہ مہر کی کمی بھی جس کی خصوصیت کے ساتھ بھی فضیلت وارد ہے آجکل مہر کی زیادتی کو بھی بڑا فخر سمجھا جاتا ہے۔ میری بھتیجی کے نکاح میں پانچ ہزار کا مہر باندھا گیا ایک رئیس تھے سندھ کے وہ بھی نکاح میں شریک تھے میرے یہاں آئے ہوئے تھے انھوں نے سن کر بڑا تعجب کیا کہ اجی پانچ ہزار اس قدر زیادہ انھیں اتنے ہی پر تعجب ہوا حالانکہ ہمارے پاس ایک قصبہ ہے جلال آباد وہاں تو سوا سوا لاکھ روپیہ کا مہر باندھا جاتا ہے اس میں تو پانچ ہزار سستا ہی ہے مگر ان کے یہاں کے مقابلہ میں یہ بھی بہت مہنگا تھا کہنے لگے اجی ہمارے یہاں تو ایک بکری یا ایک گائے یا سات آٹھ روپیہ بہت سے بہت دس روپیہ بڑے بڑے رئیسوں کا یہی مہر ہوتا ہے۔ لیجئے ان کے یہاں مہر بس اتنا ہی ہے واقعی صاحب مہر تو بس کم ہی اچھا اور خاص کر جب دینا لینا ہی نہیں تو پھر زیادہ مقدار سے فائدہ ہی کیا اگر شان ہے تو دینے میں ہے محض نام لینے میں کیا شان اور اگر نام ہی لینے میں شان ہے تو پھر لاکھ ہی کے اوپر کیوں رہو ہفت اقلیم کا نام لے دیا کرو بلکہ دنیا و مافیہا بلکہ اخری دمافیہا بلکہ عرش اور کرسی اور جنت سب ہی کا نام کیوں نہ لے دیا کرو جب دینا لینا ہی نہیں تو پھر کیوں کسر رکھے۔ چنانچہ ایک جگہ مہر عجیب طرح کا سننے میں آیا دس مٹکے مچھروں کے دس مٹکے پسوؤں کے۔ لاحول ولا قوت یہ کیا خرافات ہے مطلب یہ کہ ساری عمر کے لئے مرد پر بار رہے اور دے ہی نہ سکے۔ اور ایک مقام پر سوا سیر کودوں کا مہر ہوتا ہے اس کو سن کر میں بڑا خوش ہوا کہ بہت ہی سستا مہر ہے مگر اس کی تفسیر کی گئی کہ سستا نہیں ہے سوا سیر کودوں سے مراد سوا سیر کودوں کا ناج نہیں ہے بلکہ اتنے روپے جتنے

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنے پتہ کو تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔

سوا سیر کودوں میں دانے ہوں۔ بھلا کیا ٹھکانا ہے سوا سیر کودوں میں لاکھوں ہی دانے ہوتے ہوں گے جن کا گننا بھی مشکل ہے تو سوا سیر کودوں کے یہ معنی ہوئے کہ لاکھوں روپیہ اب آپ ہی فرمایئے یہ کیا ہے محض رسوم قبیحہ۔ اجی مہر نہ اتنا کم ہی ہو کہ لڑکی کی تحقیر ہو نہ وسعت سے زیادہ ہو کہ دیا ہی نہ جا سکے۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیوی کا مہر گیارہ سو بھی تھا حساب سے صرف تین چار روپیہ کم ہوتے ہیں گیارہ سو سے اگر بہت ہی بڑا فخر کرنا ہے تو گیارہ سو کا مہر باندھ دو مگر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ گیارہ سو کا مہر زیادہ تھا کیونکہ ایک بادشاہ تھے حبشہ کے حضرت نجاشی یہ نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انھوں نے کیا تھا اور یہ مہر بھی انھوں نے اپنے ہی ذمہ رکھا تھا تو دیکھئے ایک بادشاہ نے اپنے ذمہ صرف گیارہ سو روپیے رکھے تو یہ بھی کوئی بڑی رقم نہ ہوئی بادشاہ کے یہاں گیارہ لاکھ تو ہوتے اگر ایسا ہی شوق ہے زیادہ مہر باندھنے کا تو خیر یہ مقدار گیارہ سو کی بھی موجود ہے مگر اتنا تو نہ بڑھاؤ کہ دیا ہی نہ جا سکے رہی شان سو شان کو رہنے دو۔ کیا نعوذ باللہ ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہماری شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ ہے، استغفر اللہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر مہر کی زیادتی کوئی عزت کی بات ہوتی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مستحق تھے اس عزت کے۔ واقعی بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عزت والا ہو سکتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقط دینی عزت ہی میں سب سے بڑھے ہوئے نہ تھے بلکہ دنیوی عزت میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور صرف مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ غیر مسلم قوموں میں اور ظاہری ساز و سامان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوا چنانچہ حج میں ایک دفعہ سو اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیلے قربانی کیے ہم نے تو کسی بادشاہ کو بھی نہیں سنا کہ اکیلے سو اونٹ کی قربانی کی ہو ۶۳ اونٹ تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ذبح فرمائے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے ہیں تو ایک چڑیا کا بھی ذبح کرنا مشکل ہوتا ہے نہ کہ ۶۳ اونٹ اور ذبح کرنا بھی چھری پھیر کر نہیں بلکہ بھالہ سے اس زمانہ میں عرب کے اندر یہی رسم تھی کہ بھالا گلے میں مارا جاتا تھا اوس کو نحر کہتے ہیں اونٹ اسی طرح ذبح کیا جاتا تھا خیال کیجئے کہ بھالا کس قوت سے لگتا ہوگا ۶۳ اونٹوں کا اس طرح ذبح کرنا سہل بات نہیں ہے ۶۳ کو خود ذبح فرمایا بقیہ کو ذبح کرنے کے لئے حضرت

علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرما دیا۔ پورے ۱۰۰ اونٹ کی قربانی فرمائی۔ اس کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا۔ روایت میں ہے کہ اُن اونٹوں کی یہ حالت تھی کہ کُلُّهُنَّ یَزْ لِفْنَ اِلَیْہِ جب وہ اونٹ ذبح کئے جانے کے لئے ایک قطار میں کھڑے کئے گئے کہ ہر اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھک جھک کر بڑھتا تھا کہ پہلے مجھے ذبح کریں ہائے اس موقع پر مجھے وہ شعر یاد آتا ہے ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف ۔۔۔ بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد (دوبار)

(تمام جنگل کے ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا اس امید میں کہ کسی دن تو شکار کو آئے گا)

یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محبوبیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ جانور بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا تھے اور اپنا ذبح ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے چاہتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ جانور بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے بلکہ جانور کیا سب مخلوق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتی تھی صحیح روایت میں ہے اِنِّیْ لَاَعْرِفُ حَجَرًا کَانَ یُسَلِّمُ عَلَیَّ یعنی فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک پتھر کو پہچانتا ہوں جو مجھکو سلام کیا کرتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ پتھر بھی آپ کو پہچانتے تھے پھر تعجب ہے کہ انسان نہ پہچانے بالخصوص جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور یہ پہچاننا نہیں ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ زبان سے کہہ لیا پہچاننا کہتے ہیں۔ کسی کے حق پہچاننے کو۔ سو سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تین حق ہیں ایک حق ہے محبت ایک حق ہے عظمت تیسرا حق ہے متابعت۔ اب لوگوں نے کیا کیا ہے کہ تجزیہ کیا ہے ان حقوق میں بعضوں نے تو محض محبت لے لی عظمت اور متابعت کو نذر انداز کر دیا بعضوں نے محض ظاہری عظمت کو کافی سمجھا محبت اور متابعت سے کوئی سروکار نہ رکھا بعضوں نے محض متابعت پر قناعت کر لی محبت اور عظمت کی تحصیل کے درپے نہ ہوئے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں حقوق کا ادا کرنا یکساں طور پر ضروری ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حق کا ادا کرنا واجب ہے محبت کا بھی عظمت کا بھی اور متابعت یعنی اتباع کا بھی چنانچہ ارشاد ہے قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یعنی اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ سے میرا اتباع کرو معلوم ہوا کہ محبت کے ساتھ اتباع بھی ضروری ہے اور سچ تو یہ ہے محبت تو وہی ہے جس کے ساتھ اتباع بھی ہو ورنہ محبت بلا

اتباع تو وہی محبت ہے کہ گھر بار سب تمہارا مگر کوٹھی کٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا اور یہ تعلق بلا اتباع تو وہی تعلق ہے کہ

گر جان طلبی مضائقہ نیست ——— ورزر طلبی سخن درین است

(اگر جان مانگو مضائقہ نہیں اور مال مانگو اس میں کلام ہے)

نہ نماز نہ روزہ نہ حج نہ زکوٰۃ کچھ بھی نہیں اور دم بھرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اے صاحب خوب سمجھ لیجئے محبت وہی معتبر ہے جس کا اثر دونوں طرف پورا پورا ہو ہم کو ایسی محبت کا ایک طرف سے بھی پوری نہیں بس ہم کو ایسی محبت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسی کسی طالب علم کی حکایت ہے کہ کسی شہزادی کو کہیں اتفاق سے آپ نے دیکھ لیا تھا بس عاشق ہو گئے یہاں تک حوصلہ بڑھا کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے کی فکریں کرنے لگیں۔ ایک روز اسی سوچ میں بیٹھے تھے کہ ایک دوست ملنے آئے پوچھا کس حال میں ہو کہا شہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہوں کہا سبحان اللہ آپ کی یہ تو حیثیت اور شہزادی سے نکاح کرنے کی فکریں طالب علم نے کہا کہ میاں آدھا سامان تو ہو بھی چکا صرف آدھا سامان ہونا اور باقی ہے۔ دوست کو بڑا تعجب ہوا تو پوچھا آخر کیونکر کہا نکاح کے لئے دولہا اور دلہن دونوں کی رضامندی شرط ہے سو میں تو بالکل راضی ہوں بس اس کے راضی ہونے کی دیر ہے آدھا سامان تو ہو گیا آدھا باقی ہے اگر اسے آدھا سامان کہہ سکتے ہیں تو واقعی اس محبت یکطرفہ میں آپ کے پاس بھی آدھا سامان موجود ہے آپ بھی خوش رہیے۔ غرض یہ تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت۔ محبت وہ ہے جس میں دوسری طرف سے بھی محبت ہو اور وہ موقوف ہے متابعت پر جب یہ نہیں تو وہ محبت ہی نہیں۔ ایک ہندی شاعر جو تھے تو رند آدمی مگر فارسی کلام ان کا صوفیانہ ہے لیکن کلام صوفیانہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ صوفی تھے بلکہ بات یہ ہے کہ شاعر ہوتے ہیں دو قسم کے ایک تو بعضے روکھے ہوتے ہیں ان کا کلام پھیکا پھیکا ہوتا ہے اور بعضے ہوتے ہیں صاحب دردایسوں کے کلام میں تصوف کی چاشنی ہوتی ہے حالانکہ دراصل تصوف سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اسی قسم کے وہ شاعر تھے چونکہ وہ صاحب درد تھے اس لئے ان کے کلام میں تصوف کا رنگ ہوتا تھا۔ ایک شخص نے ان کا کلام دیکھا تو سراسر تصوف اور معرفت میں ڈوبا ہوا پایا بس ان کی بزرگی کے معتقد ہو گئے سمجھے کہ یہ شخص کوئی زبردست صوفی اور اولیاء اللہ میں سے معلوم ہوتا ہے یہاں تک اعتقاد بڑھا کہ ان کی زیارت کے لئے ایران سے سفر کر کے آئے جب ان کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ بیٹھے حجام سے ڈاڑھی کی صفائی کرا رہے ہیں۔ اب یہ حیرت میں۔ آخر نہ رہا گیا آغا ریش مے تراشی (آغا ڈاڑھی منڈواتے ہو) آپ بولے بلے ریش می تراشم دلے دل کسے نمے خراشم (ہاں میں ڈاڑھی ترشواتا ہوں کسی کا دل نہیں دکھاتا) کسی سے صوفیوں کا

مقولہ سن لیا ہوگا کہ سارے گناہ کرو مگر کسی کا دل مت دکھاؤ۔ مگر انھوں نے بھی اس کا خوب ہی جواب دیا کہا آرے دل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مے تراشی (یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو رنجیدہ کرتے ہو) تم اپنی اس حرکت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے سارے اعمال پیش کئے جاتے ہیں جب تمہارے اعمال پیش ہوتے ہوں گے تو تمھاری اس حرکت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر دل دکھتا ہوگا۔ یہ سنتے ہی بس آنکھیں کھل گئیں صاحب درد تو تھے ہی ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور جوش میں

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا با جان ہمراز کردی (کل شعر دوبار)

خدا تمھیں خوش رکھے کتنے دن تک میں دھوکہ ہی میں رہا آج غلطی معلوم ہوئی ہے توبہ ہے جو اب کبھی ایسا کروں وہ اس گمان میں تھا کہ ان چیزوں کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت سے کیا علاقہ اس محقق کی تنبیہ سے معلوم ہوا کہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں ؎

تَعْصِی الْاِلٰہَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ هٰذَا الْعُمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ

(ترجمہ) تو نافرمانی کرتا ہے حق تعالیٰ کی اور دعویٰ کرتا ہے ان کی محبت کا یہ عجیب بات ہے ؎

لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

(ترجمہ) اگر تیری محبت سچی ہوتی تو اطاعت بھی کرتا کیونکہ عاشق معشوق کا مطیع ہوا کرتا ہے وہ کیا عاشق ہے جو معشوق کی نافرمانی کرے وہاں تو جان سے بھی مال سے بھی ہر طرح سے اطاعت کے لئے حاضر ہے اور یہاں محبت کے لئے اطاعت کی بھی ضرورت نہ سمجھی جائے یہ مضمون مجھے اس پر یاد آگیا تھا کہ کُلُّهُنَّ یَزْدَلِفْنَ اِلَیْهِ (ان میں ہر ایک آپ کی طرف جھکتا تھا) جانوروں کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی ہر اونٹ یہی چاہتا تھا کہ پہلے مجکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذبح کریں اصل ذکر یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیلے ۔۔۔ اونٹ قربانی کئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر بھی بادشاہ تھے اور بادشاہ بھی ایسے کہ کسی بادشاہ کی بھی عزت اتنی نہ تھی جتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی چنانچہ ہرقل[۱] شاہ روم اپنے تخت شاہی پر بیٹھا ہوا کہتا ہے (صحیح بخاری میں ہے روایت ہے) کہ اگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں دھوتا اللہ اکبر ایک بزرگ کے بارے میں جو ٹوٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھنے والے ہیں یہ الفاظ بادشاہ کے منہ سے کس قدر عظمت کی دلیل ہیں پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ الفاظ محض عظمت اور وقعت ہی کی وجہ سے کہے گئے ہیں نہ یہ کہ کسی مجبوری سے دیکھئے ایک زبردست خود مختار بادشاہ ہرقل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر فاصلہ پر بیٹھا ہوا

[۱] ہرقل روم کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا۔

اپنے ارکان دولت کے سامنے اتنے صریح لفظوں میں ایک ایسی بات کہہ رہا ہے جو بظاہر اس کی شان کو اس کی رعایا کی نظروں میں بہت ہی گھٹانے والی ہے اگر عزت اس کا سبب نہیں تھی تو اور کیا چیز تھی اگر یہ عزت نہیں تو پھر اور عزت کسے کہتے ہیں کیا عزت نام ہے کپڑوں کا اگر کپڑوں میں عزت ہے تو وہ ایسی عزت ہے جیسے علی حزین شاعر سے ملنے ایک شخص بڑے ٹھاٹھ سے آیا کپڑے بہت بڑھیا بڑھیا پہنے ہوئے کھڑ کھڑ بھڑ بھڑ بولتے ہوئے علی حزین پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا ان حضرت کو اس شان سے آتا ہوا دیکھ کر پاؤں سمیٹ لئے اور بہت عزت کیساتھ بٹھایا حالانکہ یہ بڑا ماغدار شخص تھا پوچھا اسم شریف یوسف نام تھا آپ فرماتے ہیں۔ ایشف علی حزین نے یہ سنتے ہی سامنے کو پاؤں پھیلا دیئے اور کہا یا اگر تو ایسف ہستی پس چرا من پائے خود را کشم (اگر تو ایسف ہے تو میں پھر پاؤں سمیٹوں) بس ساری عزت میاں کی اتنی ہی دیر میں خاک میں مل گئی غرض کپڑوں کی عزت بس اتنی ہی دیر کی ہوتی ہے جہاں حقیقت کھلی بس پھر کچھ بھی نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت ایسی عزت نہ تھی حقیقی عزت تھی ویسے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت بیحد سادہ تھی لباس بالکل معمولی ہوتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی اور حقیقی عزت حاصل تھی دنیا کے بادشاہوں کی سی زبردستی کی عزت نہ تھی اور محض دینی عزت نہیں بلکہ دنیوی عزت بھی بدرجۂ کمال حاصل تھی اب اس سے زیادہ کیا دنیوی عزت ہوگی کہ ایک بادشاہ یوں کہتا ہے کہ اگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ پاتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں دھوتا اور اس کو اپنا فخر سمجھتا تو غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیوی اور دینی ہر قسم کی عزت حاصل تھی پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ازواج و بنات کے مہر تھوڑے ہی تھوڑے مقرر فرمائے جس سے معلوم ہوا کہ مہر کا زیادہ ہونا کوئی عزت کی بات نہیں اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اگر مہر کا بڑا ہونا کوئی عزت کی بات ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سے زیادہ مستحق تھے اس عزت کے۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ مہر تھوڑا ہی کافی ہے اور بہتر ہے اب بتلایئے نکاح میں خرچ ہی کو نسا رہ گیا ایک مہر تھا سو وہ بھی ادھار نقد تو ایک پیسہ کا بھی خرچ نہیں آپ نے دیکھا نکاح ایسی سستی تو چیز مگر ہمارے بھائیوں نے مل جل کر اس کو اس قدر گراں کر دیا ہے کہ الٰہی توبہ بعض بعض قوموں میں تو عورت پر روپیہ بھی دینا پڑتا ہے اب خیال فرمایئے کہ یہ سب مزاحمت ہے عقل کی اور نقل کی یا نہیں غرض ان رسوم کی کسی پہلو سے بھی اجازت نہیں نکلتی ہاں یوں کہئے کہ صورت معصیت کی نہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے حکم تو حقیقت پر ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شریعت نے ان سے تعرض بھی کیا ہے پس اگر اب

بھی وہی خیال ہو کہ ان باتوں میں ہمکو آزادی ہے اعتقاداً یا عملاً تو کہا جائے گا اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی یعنی کیا خیال کرتا ہے انسان کہ اس کو مہمل چھوڑ دیا جائیگا مطلب یہ ہے کہ خیال غلط ہے مہمل نہیں چھوڑا جائیگا بلکہ اس کے ہر ہر فعل کی ہر ہر قول کی اور ہر ہر حال کی نگرانی ہو گی۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں چونکہ وقت کم تھا اس لئے میں بیان کر چکا اب میں صرف چار پانچ منٹ لینا چاہتا ہوں اس مجمع میں کچھ اہل علم بھی ہیں اس لئے ایک طالبعلمانہ مضمون میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں اصل مقصود تو بیان ہو چکا یہ ایک زائد بحث ہے اگر سب کی سمجھ میں نہ آوے تو کچھ حرج نہیں وہ بحث یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اس کو مہمل چھوڑ دیا جائیگا) یہاں صرف انسان کو خطاب کیا حالانکہ یہ ثابت ہے کہ جن وانس دونوں جزا وسزا پائیں گے اور جزا وسزا دونوں کو جب ہی ہو سکتی ہے جب دونوں مکلف ہوں جب دونوں مکلف ہیں تو اس خطاب میں انسان کی تخصیص کیوں کی گئی ایحسب الانسان ان یترک سدی ہاں جنوں کے ثواب کے متعلق البتہ اختلاف ہے چنانچہ امام صاحب کا قول مشہور اور کتب میں منقول ہے کہ وہ جنت میں نجائیں گے ان کی جزا ایہی ہوگی کہ عذاب سے نجات ہو جائے گی یہ امام صاحب کا مشہور مذہب ہے باقی جمہور کا مذہب یہ ہے کہ مؤمنین جن بھی جنت میں جائیں گے دلیل امام صاحب کی یہ مشہور ہے یٰقومنا اجیبوا داعی اللہ وامنوا بہ یغفر لکم من ذنوبکم ویجرکم من عذاب الیم اس آیت میں جنوں کا قول حق تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے کہ جنوں نے آپس میں کہا تھا کہ کہنا مان لو خدا تعالیٰ کے داعی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ تمہارے گناہ بخشدیگا اور تم کو عذاب الیم سے نجات دیگا یہاں عذاب سے نجات دینے کا وعدہ ہے یہ وعدہ نہیں ہے کہ جنت میں بھی داخل کریگا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ سکوت معرض بیان میں بیان ہوتا ہے یہاں جزا کا بیان ہے اگر جزا اچھا اور ہوتی تو اس کا بھی بیان ہوتا اور بیان ہے نہیں تو اور کچھ جزا ابھی نہیں تو جزا اصرف یہ ہوئی کہ ان کو دوزخ سے نجات ہو جاوے گی یہ ہے امام صاحب کا قول۔ جمہور کی دلیل یہ آیتیں ہیں فبای الاء ربکما تکذبان جنت کی نعمتیں یاد دلاکر فرماتے ہیں کس کس نعمت کو تم دونوں جھٹلا ؤ گے اے جن وانس اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نعمتیں دونوں کے ملئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تصریح اس آیت میں ہے لم یطمثھن انس قبلھم ولا جان یہ آیت حوروں کے بارہ میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حوریں جن وانس دونوں کے لئے ہوں گی اور حوریں جنت کے

اندر رہیں تو جنت میں جانا جنوں کا ثابت ہوا اور رہ مجتہد ٹھیرے مجتہد کے استدلال کا جواب دے سکتا ہے اور احقر کا گمان یہ ہے کہ امام صاحب کا مقصود نفی نہیں دخول جنت کی مؤمنین جن کے لئے بلکہ یہ مقصود ہے کہ ہم بوجہ نص صریح نہ ہونے کے ایسا حکم نہیں کر سکتے اور غالباً اطفال کے باب میں بھی امام صاحب کا یہی قول ہے واللہ اعلم لیکن ظاہراً جمہور کا قول زیادہ جی کو لگتا ہے اور اس کے اختیار کرنے سے ترک تقلید کا کسی کو شبہ نہ ہو کیونکہ یہ کوئی مسئلہ فقہ کا نہیں ہے جس میں امام صاحب کے قول کی تقلید واجب ہو یہ مسئلہ معاد کا ہے اور اس میں زیادہ اسلم یہ ہے کہ خدا کے سپرد کیا جائے خدا جانے کیا ہوگا جو ہوگا ہو رہے گا بہرحال اس کا فیصلہ ہمارے اجلاس میں نہ آویگا ہم کو کاوش کی ضرورت نہیں باقی جنوں کے مکلف ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں اور وہ ان آیتوں سے ثابت ہے سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَانِ (اے جن وانس ہم عنقریب (حساب و کتاب کیلئے خالی ہوئے جاتے ہیں یعنی حساب کتاب لینے والے ہیں) جن وانس دونوں کو ثقل فرمایا ثقل کے معنی ہیں جس پر ثقل یعنی بوجھ ہو بوجھ سے مراد وہی بار تکلیف ہے معلوم ہوا دونوں مکلف ہیں اور دوسری آیت میں فرماتے ہیں يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ قیامت میں جواب طلب کیا جائیگا کہ اے جن وانس کیا تمہارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مکلف ہیں پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیت میں یعنی اَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اسکو مہمل چھوڑ دیا جائیگا) میں صرف انسان کا ذکر کیا گیا اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ قرآن کی تبلیغ اول انسانوں ہی کو ہوئی پھر ثانیاً جنوں کو۔ ایک تو یہ جواب ہے سیدھا سادہ۔ دوسرے یہ کہ ہر چند کہ مکلف انسان اور جن دونوں ہی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی عنایت حق تعالیٰ کی انسان پر ہے اتنی جن پر نہیں ہے جن دوسرے درجہ میں ہیں لہذا مخاطب ہونا بھی ان کا تبعاً للانسان ہے اور فضائل میں بھی وہ تابع ہیں انسان کے چنانچہ جو لوگ قائل ہوئے ہیں اس بات کے کہ جن جنت میں جائیں گے وہ بھی کہتے ہیں کہ جنت کے گرد وپیش میں رہیں گے جیسے تابع لوگ ہوا کرتے ہیں بہرحال وہ تابع ہیں اس بنا پر خطاب میں ان کو شریک نہیں کیا گیا لیکن اثر خطاب میں وہ داخل ہیں کیونکہ تابع متبوع کے اثر خطاب میں داخل ہوا کرتا ہے اور تابع ہونے کے دلیل یہ آیت ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ (ہم نے بنی آدم کو مکرم کیا) صوفیہ کرام سمجھے ہیں اس کے راز کو کہ انسان مکرم کیوں ہے وہ راز یہ ہے کہ انسان مظہر اتم ہے حق تعالیٰ کا اسی واسطے آیا ہے اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ اس کے لفظی معنی تو ہیں کہ حق تعالیٰ

نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا لیکن یہ مسلم ہے کہ صورت کے معنی متبادر مراد نہیں کیونکہ اس سے تجسم لازم آتا ہے حق تعالیٰ کا سلامحالہ دوسرے معنی مراد ہوں گے جس کی حقیقت یہ ہے کہ صورت کے معنی ظہور ہیں چنانچہ صورت متعارفہ کو جو صورت کہتے ہیں وہ بھی اس بنا پر کہ وہ ظہور ہے حقیقت ذی صورت کو پس معنی یہ ہوئے کہ ایسی حالت پر پیدا کیا کہ خدا تعالیٰ کا اس حالت سے ظہور ہوا تو علیٰ صُوْرَتِہٖ کے معنی ہوئے علیٰ ظہورہٖ یہی معنی ہیں صوفیہ کے اس قول کے انسان مظہر اتم ہے ۔ حق سبحانہ تعالیٰ کا مطلب یہ کہ حق سبحانہ تعالیٰ کا ظہور پورا پورا انسان کے ذریعہ سے ہوا ۔ اس ظہور سے مراد وہی ظہور ہے جو کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (میں مخفی خزانہ تھا پس پسند کیا میں نے یہ کہ پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا) میں ہے کیونکہ اُعْرَفَ کے معنی کا حاصل یہی ہے اظہر ہوں تو حق تعالیٰ کی مظہر ہر چیز ہے لیکن انسان خصوصیت کے ساتھ مظہر ہے اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ انسان مظہر اتم ہے ایک تو یہ وجہ ہے انسان کے سب سے زیادہ مکرم ہونے کی دوسری ایک وجہ کا پتہ وہاں سے چلتا ہے جہاں مکلف فرمانے کے قصہ کو بیان فرمایا ہے وہ یہ آیت ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَانُ (ہم نے امانت کو آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا سب نے انکار کیا اور ڈر گئے اس کے اٹھانے سے اور اس کو انسان نے اٹھا لیا) سب جانتے ہیں کہ مکلف جن و انس دونوں ہیں مگر یہاں ذکر صرف انسان کا ہے کہ اسی نے ہماری امانت کو اٹھایا یہاں امانت سے مراد تکلیف شرعی ہے یعنی احکام کی تعمیل تو گویا کہا یوں گیا تھا کہ کون اختیار کرتا ہے اس تکلیف احکام کو اس شرط پر کہ جو اطاعت کریگا مثاب ہوگا جو اطاعت نہ کریگا معذب ہوگا اس کو سن کر سب ڈر گئے نہ آسمان کو ہمت ہوئی نہ زمین کو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شعور سب کے اندر ہے چنانچہ اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زمین آسمان نے سنا اور سمجھا ۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب و خاک و باد و آتش و بندہ اند با من و تو مردہ با حق زندہ اند

(آب و خاک ہوا اور آگ بندہ ہیں ہمارے سامنے مردہ حق تعالیٰ کے سامنے مردہ ہیں)

ہمارے تمہارے سامنے یہ سب چیزیں مردہ اور بے جان معلوم ہوتی ہیں لیکن خدا کے سامنے یہ سب زندہ ہیں چنانچہ بعضے حکما یونانیین بھی قائل ہیں کہ بعض جمادات میں شعور ہے اور نئے حکما بھی کہتے ہیں کہ درخت

میں روح ہے مگر خفتہ ہے۔ سبحان اللہ عقلا کو بھی وہی ماننا پڑا جو شریعت سے ثابت ہے تو اگر جمادات وغیرہ میں بھی حس و شعور مان لیا جائے جیسا کہ بہت سے اہل کشف سے ثابت ہے تو کیا حرج ہے اور ظاہر قرآن مجید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم جو اپنے نزدیک ضا شعور ہیں اور یہ سب چیزیں ہمارے نزدیک بے شعور ہیں حقیقت میں یہ بھی ذی شعور ہوں لیکن ہمارا شعور اُن کے شعور کے متعلق نہ ہوا ہو۔ غرض فرماتے ہیں کہ ہم نے آسمانوں پر اور زمینوں پر اور پہاڑوں پر امانت کو پیش کیا کہ اس کو کون اٹھاتا ہے سب نے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے مگر حضرت انسان فوراً بول اٹھے کہ ہم ہیں اس کو اٹھانے والے کچھ دیکھا نہ بھالا بس بے تامل لیکر کھڑے ہو گئے اس کو۔ ہمت تو دیکھئے آپ کی۔ اور وجہ کیا ہے اس ہمت کی۔ اسکو صوفیہ نے بیان کیا ہے۔ قرآن مجید اس سے ساکت ہے اگر کوئی مسکوت عنہ فی القرآن کا صوفیہ کے ارشاد سے قائل ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید   قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

(امانت کے بوجھ کو آسمان نہ اٹھا سکا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام مارا)

اس میں اشارہ ہے اس وجہ کی طرف یعنی دیوانہ کے لفظ میں کہ اس کے اندر دیوانگی تھی دوسروں میں یہ چیز نہ تھی۔ شرح اسکی یہ ہے کہ انسان میں شان عشق غالب تھی اوروں میں یہ مادہ اس درجہ کا نہ تھا گو کہ سب میں شعور تھا انسان ہی میں لے شعوری تھی یعنی عشق (یہ لطیفہ ہے) اس عشق سے ان حضرت کو لذت ہوئی خطاب میں تو اس سے اندازہ کیا کہ جب ایک خطاب میں یہ لذت ہے تو اگر مکلف ہونے کو مان لیں گے تو بار بار خطاب ہوا کریگا اور خوب لطف آئیگا اور بڑا مزہ ہوگا چاہے دوزخ میں بھی جلنا پڑے لیکن اس لذت کو کیوں چھوڑا بس آؤ دیکھا نہ تاؤ عشق کے جوش میں اس امانت کو اٹھا ہی تو لیا اس کو فرماتے ہیں وحملہا الانسان (اٹھا لیا اس کو انسان نے) اس میں اشارہ ہے انسان کے عاشق ہونے کی طرف بھی کہ کہ اس نے پہچان لیا اس دولت کو جو اس تکلیف کے اندر پنہاں تھی۔

اب یہاں مسلم ہے یہ بات کہ اس امانت کو جن وانس دونوں نے اٹھایا کیونکہ دونوں مکلف ہیں تو یوں ہونا چاہئے تھا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ وَالْجَانُّ (انسان اور جنوں نے اسکو اٹھا لیا) لیکن صرف انسان کو ذکر فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مکلفیت کی صفت میں اصل ہے اور جن تابع ہے تو اصل کو ذکر کیا اور تابع کو چھوڑ دیا اور جب اس صفت میں اصل ہونیکی وجہ سے اسی کا نام لیا تو اس حمل کے حقوق کے

اخلال پر جو اس آیت میں اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (کیا انسان کا یہ خیال ہے کہ اسکو مہمل چھوڑ دیا جائیگا) نکیر کیا ہے اس میں بھی اسی کا خاص بیان کیا، سبحان اللہ۔ یہ تبرعاً بیان کر دیا اس میں اصل مضمون کا پھر اعادہ کرتا ہوں یہ دیکھنا ہے کہ شریعت نے ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے آیا ہم کو ہر ہر امر میں پابند کیا ہے یا آزاد چھوڑ دیا ہے اور ہمارے افعال کو ہماری رائے پر رکھا ہے سمجھ لیجئے کہ یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہے کہ شریعت نے ہمارے افعال سے تعارض نہیں کیا شریعت نے ہر ہر چیز سے تعرض کیا ہے لیجئے قرآن مجید میں ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا یعنی کسی کے گھر میں نہ جاؤ جب تک کہ اُن سے میل نہ کر لو اور ان کو سلام نہ کر لو۔ یہ معاشرت کے احکام ہیں اور یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ یعنی اے مسلمانو جب تم سے کسی مجلس میں کہا جائے جگہ دو تو جگہ دیدو مطلب یہ کہ دب کر بیٹھ جاؤ اور جب کہا جاوے یہاں سے اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ یہ امر ہے اور اس پر وعدہ ہے یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ یہ مجالس کے آداب ہیں علیٰ ہذا عادات کے متعلق بہت سی آیتیں ہیں منجملہ ان کے یہ ہے لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَنْ تَاْکُلُوْا مِنْۢ بُیُوْتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّھٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِکُمْ اَوْ مَا مَلَکْتُمْ مَّفَاتِحَہٗٓ اَوْ صَدِیْقِکُمْ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْکُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (یعنی اندھے پر تنگی نہیں لنگڑے پر تنگی نہیں مریض پر تنگی نہیں نہ تمہارے اوپر تنگی ہے اس بات میں کہ اپنے گھر کھاؤ یا اپنے باپ کے گھر یا ماں کے گھر اور عزیزوں کے گھر جو آیت میں مذکور ہیں یعنی اپنے بھائیوں کے گھر یا اپنی بہنوں کے گھر یا اپنے چچاؤں کے گھر یا اپنی پھوپیوں کے گھر یا اپنے ماموؤں کے گھر یا اپنی خالاؤں کے گھر یا ان گھروں سے جنکی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوست کے گھر اور اکٹھے ہو کر کھاؤ یا الگ الگ۔ یہ آیت عادات کے متعلق ہوئی۔ اور یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىہُ وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ یعنی اے مسلمانو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دولت خانہ میں مت جاؤ الا آنکہ تم کو اجازت دی جائے کھانا کھانے کی غرض سے مگر اس میں بھی یہ شرط ہے کہ کھانے کے پکنے کے انتظار میں پہلے سے جا کر نہ بیٹھو بس یہ چاہیئے کہ جب بلایا جائے جاؤ اور جب کھانا کھا چکو چلے آؤ اور نہ وہاں بیٹھ کر باتیں بگھارو۔ یہ دعوت میں جانے کا قانون ہے۔ غرض ہر کام کا قانون موجود ہے

عادات کے متعلق اور لیجئے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی کھاؤ پیو اور فضول خرچ مت کرو اس کا بھی قانون ہے اور لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ یعنی نہ مردوں کی جماعت دوسرے مردوں کی جماعت سے مسخراپن کریں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے مسخراپن کریں اور نہ آپس میں طعنے دو نہ کسی کو برے نام سے پکارو۔ وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو آپ نے دیکھا یہ سلسلے عادات اور معاشرت ہی تو ہیں تو دیکھ لیجئے ہر چیز کا مکمل قانون موجود ہے۔ غرض کھانا پینا اوٹھنا بیٹھنا بولنا چالنا کھانا کمانا ہر ہر بات سے تعرض کیا معاملات کو لیجئے۔ لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ یعنی آپس میں ایک دوسرے کا مال بیجا طریق پر نہ کھاؤ مطلب یہ ہے کہ حلال طریق پر حاصل کرکے کھاؤ ناجائز طریق سے کسی کا مال مت لو وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا یعنی جائز کیا حق تعالیٰ نے بیع کو اور حرام کیا سود کو یہ معاملات ہی تو ہیں جن کے متعلق احکام ہیں تو دیکھ لیجئے ان آیتوں میں عادات کے متعلق بھی قانون ہے معاشرت کے متعلق بھی قانون ہے معاملات کے متعلق بھی قانون ہے غرض یہ ہے کہ تمام آیتیں بھری پڑی ہیں دنیوی عادات اور معاشرات وغیرہ کی تعلیم سے سب کے لئے قانون مقرر ہے اب اس کے بعد کیا گنجائش ہے یہ کہنے کی کہ فلاں چیز سے کیا تعلق ہے شریعت کو فلاں چیز کے متعلق کوئی قانون نہیں شریعت میں اسکو ہماری رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے جب یہ ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب چیز کا قانون ہو اور شادی بیاہ کا کوئی قانون ہی نہ ہو خوب سمجھ لیجئے کہ شادی بیاہ کا بھی شریعت میں قانون ہے جس کو میں نے تفصیل بیان کر چکا ہوں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم سلیم اور عمل کی ہمت اور توفیق عطا فرماویں۔ الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ سید الکائنات واشرف المخلوقات صلوٰۃ تسبق الغایات۔

بعض تحریرات ارکان تقریب جس میں یہ وعظ ہوا

خط خانصاحب خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب گورنر لوچھ کشمیر خصتی والدنوشہ، حبیب الرحمٰن سلمہ بنام جناب مولوی حکیم محمد مصطفٰے صاحب دام مجدہم از لکھنؤ ڈور والی گلی نزدیک فرنگی محل ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء

مخدومی ومطاعی جناب حکیم صاحب زاد لطفکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ میں تہ دل سے آپ کی اس تکلیف کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپ نے براہ الطاف کریمانہ سفر کوٹاہ ملقب بہ فیض کالوٹا اور وعظ نقد اللبیب فی

عقد الحبیب کی ترتیب و تکمیل میں اٹھائی اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ اب یہ دونوں رسالہ جات خدا کرے جلد طبع ہو جاویں تو ان سے امید کامل ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اصلاحِ رسوم شادی میں کافی طور سے ہو سکیگی حضرت اقدس مولانا صاحب مد ظلہم العالی کا ایک ایک لفظ پُر معنی ہے اور بڑے تجربہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے چونکہ میرے لڑکے حبیب الرحمٰن سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی ہی کے موقع پر وعظ نقد اللبیب ہوا تھا اس لئے میں نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اب یہ رائے قائم کی ہے کہ حقیقتاً شادی کے موقع پر ہجوم احباب برادری مرد و عورت کا کرنا بیحد تکلیف دہ ہے اور بجائے جاہ و عزت کے ذلت و پریشانی ہوتی ہے۔ میرے یہاں شادی کے موقع پر کوئی رسم ایسی نہیں ہوئی جیسے کہ اور جگہوں پر ایسے موقع پر ہوا کرتی ہیں صرف خاص خاص اہل برادری و اعزہ مرد و عورت کو اطلاع دی گئی تھی اس پر بھی بڑا ہجوم ہو گیا اور چار پانچ دن تک مہمانداری رہی جس میں صرف کھانے کے انتظامات میں وہ وہ پریشانیاں اٹھانی پڑی ہیں کہ میرا دل ہی جانتا ہے میں نے تو اپنے خیال میں کوئی رسم ادا نہیں کی مگر صرف دعوت ولیمہ اور اہل برادری کے جمع کرنے ہی میں مجھے تجربہ ہو گیا کہ حضرت اقدس مد ظلہم العالی کا ایک ایک لفظ وعظ بالکل صحیح ہے اور ہرگز ہرگز کبھی اس اہتمام کے ساتھ شادی نہیں ہونا چاہیے جو کچھ میں نے تخمینہ شادی کے اخراجات کا کیا تھا اس سے چہار چند خرچ ہو گیا اور اکثر اعزہ کو شکایت ہی رہی کہ انکی خاطر و تواضع نہیں کی گئی کھانے پکانے کیلئے ہوشیار رباورچیوں کا انتظام کیا گیا لیکن اسپر بھی زردہ والا معاملہ آپکو یاد ہوگا کہ نہ معلوم کس طرح سے اس میں مٹی کے تیل کی ناقابل برداشت بدبو ہو گئی تھی جسکی وجہ سے عین کھانے کیوقت جسقدر ذلت وسبکی میری ہوئی ہے میرا ہی دل جانتا ہے اسقدر کثیر تعداد کے چاول و گھی و میوہ جات کا بوجہ مٹی کے تیل کی بدبو ہو جانیکے بھنگیوں و چماروں کو بٹوا دینا دل کو بڑا شاق ہوا بلکہ اس سے بھنگیوں و چماروں میں بھی بدنامی ہوئی کہ گورنر صاحب کشمیر کے لڑکے کی شادی میں ایسا زردہ پکا۔ حالانکہ حتی الامکان بڑی احتیاط برتی گئی تھی خاص خاص متمد اعزہ کے سپرد انتظام کھانیکا تھا مگر وہ بیچارے کیا کریں جبکہ ان کے قابو سے باہر بات ہو۔ میرا تو ہزارہا روپیہ خرچ ہو گیا اور ذلت و خواری ان کے عوض میں نصیب ہوئی مجھے بڑا زعم اپنی انتظامی قابلیت پر تھا اسکا یہ نتیجہ ذلت و خواری ہوا میں نے تو اسی وقت سے عہد مصمم کر لیا کہ آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ کسی بچہ کی تقریب اس طرح سے نہ کرونگا بلکہ حضرت اقدس مد ظلہم العالی کے مواعظ جو اصلاح الرسوم کی بابت جس قدر چھپ چکے ہیں انکو خوب غور سے پڑھ کر ان پر عمل کرونگا اور کبھی شادی کے موقع پر بھی اجتماع اہل برادری وغیرہ بھی نہ کرونگا اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ مجھے اسکی توفیق عنایت فرما دیں میں سچے دل سے اپنی اس غلطی کا اعتراف کرتا ہوں جو اس موقع پر مجھ سے ہوئی۔ حالانکہ میرے بھائی عزیزم حاجی خواجہ عزیز الحسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت اصرار کے ساتھ اس تقریب پر اجتماع اہل برادری سے منع کیا تھا مگر میں نے یہ سمجھا کہ کوئی رسم خلاف

شرع شریف تو میں کروں گا نہیں صرف احباب کو اور خاص خاص اہل برادری کو دعوت ولیمہ دونگا مگر یہ نہ معلوم تھا کہ یہ بھی وبالِ جان ہو جاویگا علاوہ میری اس ذلت وخواری کے منتظمین کی اکثر نمازیں وقت پر نہ ہوئیں جماعت تو نصیب ہی نہ ہوئی اور بڑا قلق اس کا ہے کہ حضرت والا مد ظلہم العالی کے وعظ کے وقت اکثر منتظمین شرکت نہ کرسکے پردہ کا اگرچہ بہترین انتظام کیا گیا تھا مگر میں نے خود دیکھا کہ خود میری ہی نظر اکثر غیر محرم مستورات پر پڑ گئی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ ایسے موقع پر پردہ کا انتظام کما حقہ کرنا ناممکن ہے۔ بہت سے برتن بہت سے میرے کشمیری نمدے اور لوٹیاں جو بڑی قیمتی تھے گم ہو گئے جن کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ غرضیکہ شادی سے فراغت پاکر جو میں نے غور کیا تو میرے گھر میں دلہن تو آئی مگر مجھے ذلت و نقصان بہت برداشت کرنا پڑا۔ کاش میں اپنے بھائی عزیز حاجی خواجہ عزیز الحسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے کہنے پر عمل کرتا تو دلہن آتی مگر یہ ذلت و نقصان برداشت نہ کرنا پڑتا اور جو روپیہ کثیر میں نے صرف کر دیا وہ بچتا اور اس سے لڑکوں کی تعلیم میں سہولت مجھے ہوتی جس کی مجھے دقت اس وقت محسوس ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اس عریضہ کو پورا یا اس کا خلاصہ وعظ نقد اللبیب فی عقد الحبیب کا جز و کرا یا جاوے تاکہ جو صاحب پڑھیں وہ میرے اس واقعی تجربہ پر بھروسہ کر کے آئندہ ایسی رسومات دعوت وغیرہ اجتماع اہل برادری وغیرہ سے احتراز کریں اور نقصان کثیر ذلت و خواری سے بچیں۔ ایسا ہی تلخ تجربہ میرے بھانجہ اعجاز علی صاحب سلمہ ڈپٹی کلکٹر کو ہوا۔ امید ہے کہ جناب بخیر و عافیت ہونگے اور میرے لئے دعائے خیر کرتے رہیں گے کہ اللہ تعالیٰ توفیق اعمال صالحہ عطا فرمادیں اور خاتمہ بخیر کرے۔ میں ابھی تک رخصت پر ہوں ۱۲ ستمبر ۲۳ء تک میری رخصت ہے بچیوں کو دعائیں۔ دعا گو خادم عزیز الرحمٰن عفی عنہ۔

تصدیق جناب سید اعجاز علی صاحب بی اے ایم بی ای ایم آر اے ایس ڈپٹی کلکٹر بدایوں والد نوشہ کاظم علی سلمہ تحریر بالا را

مجھے اپنے ماموں صاحب خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب کی تحریر سے بالکل اتفاق ہے میں نے بھی اسی زمانہ میں یعنی گذشتہ بڑے دن کی تعطیل میں اپنے بڑے لڑکے کاظم علی سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی کی تھی میرے چھوٹے ماموں حاجی خواجہ عزیز الحسن صاحب کے مشورہ کے مطابق میرا ارادہ تھا کہ بدایوں ہی میں (یعنی جائے ملازمت پر) عقد ہو جاوے اور کسی قسم کا خاص اہتمام اجتماع وغیرہ نہ کیا جاوے۔ مگر میری والدہ صاحبہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئیں اور مجبوراً مجھے اپنے وطن قصبہ ندبئی میں ہی جاکر شادی کرنی پڑی حالانکہ میرا سارا کنبہ میرے پاس بدایوں میں تھا۔ صرف اس تقریب کے ادا کرنے کے لئے وطن مع کل کنبہ و سامان کے محض ہفتہ عشرہ کے لئے جانا پڑا، گو بوجہ تشریف آوری حضرت مولانا صاحب مد ظلہم خلاف شرع کوئی رسوم نہیں کی گئیں اور بہت اہتمام سے مستورات کی ہر امر میں روک ٹوک کرنی پڑی تاہم بیحد تکالیف اور کثیر مصارف برداشت کرنے پڑے۔ زیادتی اسباب کی وجہ سے ایک اسٹیشن پر میں خود ریل سے رہ گیا اور دسمبر کی شدید

سردی میں شب بھر بغیر بستر کے گذارنی پڑی اور ہمراہیوں کے پریشانی میسر رہجانے سے علیحدہ ہوئی۔ یہاں تک ایک مخلص عزیز چلتی ہوئی ریل سے کود پڑنے کیلئے آمادہ ہوگئے ان کو بڑی مشکل سے روکا گیا۔ غرض سفر میں بوجہ کثرت ہمراہیان وکثرت اسباب ہر موقع پر ایک مصیبت کا سامنا تھا باوجود سخت کوشش کے انتظامات تقریب میں حسب معمول بڑی گڑبڑ رہی اور اعزا اور احباب سب کو بیحد تکلیف ہوئی اور کسی سے اطمینان کیساتھ ملاقات بھی نہوسکی اجتماع مستورات بھی تجربہ سے ثابت ہوا کہ بہت بے پردگی ہوتی ہے۔ اس تقریب میں نہ صرف میراہی کثیر روپیہ صرف ہوا بلکہ جملہ اعزہ واہل برادری کو بھی اپنے متعلقین کو پرتکلف کپڑے بنانے میں بے حد خرچ کرنا پڑا بعض تو یقیناً مقروض ہوگئے۔ بیوقت کھانے اور سونے کی وجہ سے خود نوشہ کو شادی کے دوسرے ہی دن تپ اور دست ہوگئے اور ایسی حالت خراب ہوگئی کہ لینے کے دینے پڑگئے جسکی وجہ سے فوراً مجھے وطن چھوڑکر بدایوں بغرض علاج آنا پڑا گو کوئی لاکھ انکار کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ دھوم کی شادی زیادہ تر تفاخر یا بدنامی سے بچنے کے لئے کیجاتی ہے مگر میں نے تو کبھی یہ نہیں سنا کہ شادی کے بعد کسی کی تعریف ہوئی ہو بلکہ ہمیشہ اسکے خلاف ہی سنا واقعی کسی نے بالکل سچ کہا ہے۔ نہ کردن یک عیب کردن صد عیب (نہ کرنا ایک عیب اور کرنا سو عیب ہیں) کیا ہی اچھا ہو اگر مسلمانوں میں یہ رواج ہوجاوے کہ بجائے ہزارہا روپیہ ایسے موقعوں پر فضول صرف کرنیکے خود دولہا دلہن کیلئے کافی سرمایہ دیدیا جایا کرے تاکہ وہ انکے کام بھی آوے۔ ایسا بیجا صرف نہ صرف شریعت کے بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے اس دفعہ کے ذاتی تجربہ کے بعد میں نے تو مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ آئندہ بچوں کی شادی نہایت سادگی کے ساتھ بالکل شرع شریف کے مطابق کرونگا اور ہرگز خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق نہ بنونگا۔ پڑھے لکھے لوگ جتنے اس موقعہ پر موجود تھے سب پر یہی اثر تھا اور سب نے بالاتفاق یہ طے کرلیا تھا کہ آئندہ ہرگز اس قسم کی تقریبات اس طریقہ سے نہ کیجاویں اس اثر کی وجہ سے زیادہ تر حضرت مولانا صاحب دام فیضہ کی تشریف آوری وبرکت تھی۔ حضرت اقدس مولانا صاحب دام فیوضہ کے وعظ سے مسلمانوں کو بیحد فائدہ ہوگا اگر وہ اس کی پابندی کریں۔

اعجاز علی بی اے ایم بی ای ایم آر اے ایس ڈپٹی کلکٹر بدایوں ۱۵ جولائی ۱۹۲۳ء

تصدیق جناب سید صاحب علی صاحب انسپکٹر آب کاری سندیلہ ضلع ہردوئی تحریر را۔

مجھے اپنے ماموں خواجہ عزیز الرحمن صاحب قبلہ و بڑے بھائی سید اعجاز علی صاحب قبلہ کی رائے سے پورا اتفاق ہے واقعی تقریبات کے مواقع پر ایسا اجتماع کرنا جس کے باعث اوقات میں فرق آئے اور جس کا انتظام بھی قابو سے باہر ہو محض تکلفات وتصنعات پر مبنی ہے اور بجز تکلیف ونقصان کے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا چونکہ میں بھی اپنے برادر زادہ سید کاظم علی سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی کی تقریب کے موقع پر موجود تھا اور میرے سپرد بھی کھانے کا انتظام کیا گیا تھا

اس لئے مجھے بھی ذاتی تجربہ ہے کہ ایسے کثیر مجمع کی تقریب کے موقع پر نہ تو کھانا وقت پر ملتا ہے نہ سونا وقت پر ہوتا ہے اور نہ نماز وقت پر ہوتی ہے اور جماعت کیساتھ نماز ملنا تو بہت ہی مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے چنانچہ مجھے خود اسکا تلخ تجربہ ہوا ہے یعنی ۹ ؍دسمبر ۲۲ئ یوم جمعہ کو جبکہ حضرت مولانا صاحب قبلہ دام فیوضہم کا وعظ بعد نماز جمعہ ہو رہا تھا اور مجھے عین اسی وقت وعظ چھوڑ کر اپنے فرض منصبی یعنی کھانے کے انتظام کی وجہ سے وہاں سے ہٹنا پڑا جو نہایت شاق گذرا لیکن محض بدنامی کے ڈر سے ایسا کرنے پر مجبور ہوا اور پھر ایسا گرفتار ہوا کہ دوبارہ مسجد نہ جا سکا اور نہ وعظ سن سکا جس کا آج تک قلق ہے لہذا میری رائے ناقص میں ایسا اجتماع کرنا اور اس میں شرکت کرنا نہ صرف خلاف شریعت ہے بلکہ خلاف عقل بھی ہے اور اسی واسطے میں نے عہد کر لیا ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ نہ تو میں آئندہ ایسے مجمعوں میں حتی المقدور شرکت کروں گا اور نہ خود اپنے بچوں کی تقریبات میں ایسے اجتماع کروں گا بلکہ نہایت سادہ طور پر عقد شرعی کر دوں گا اللہ تعالیٰ ایسے عمل کی مجھے و نیز جملہ برادران اسلام کو توفیق دے۔ احقر حسن علی انسپکٹر آبکاری معینہ سندیلہ ضلع ہردوئی۔ المرقوم ۷؍جولائی ۲۳ئ مطابق ۲؍ذالحجہ ۱۳۴۱ھ

تصدیق جناب سید مبارک حسین صاحب انسپکٹر آبکاری حلقہ اول ایٹہ تحریر بالا را۔ ۵؍جولائی ۱۹۲۳ء

مخدومی و مکرمی جناب مولانا صاحب قبلہ السلام وعلیکم۔ آپکا گرامی نامہ پہونچا جس میں دیگر گرامی نامہ جات عالیجناب بھائی صاحب سید اعجاز علی صاحب قبلہ و جناب قبلہ ماموں خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب قبلہ ملفوف تھے میں نے تینوں خطوط کو بغور پڑھا پڑھکر پچھلی شادیوں میں جو تکالیف برداشت کی تھیں تازہ ہو گئیں مختصراً اپنے دلی خیالات کا اظہار کرتا ہوں و بزرگان مندرجہ بالا کے خیالات سے بالکل متفق ہوں مجھے اپنی لڑکی کی شادی کی فکر ایک عرصہ سے تھی اور مجھ پر فرض تھی جب میں سوچتا تھا کہ شادی کیوقت بہت سی تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں۔ بے شمار اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں اور طرح طرح کی بیشمار مذموم رسومات ادا کی جاتی ہیں میں پریشان ہوتا تھا اور اپنی زندگی میں اس قدر سادہ فرض کو ایک بڑی اہم سمجھتا تھا غرضکہ اسی طرح شش و پنج میں چند سال گذرے خدا خدا کر کے میرے لئے وہ پہلا مشکل اور مبارک وقت آیا کہ تعطیل یوم کلاں دسمبر ۲۲ئ میں میری لڑکی کی شادی ہونا قرار پا گئی۔ مشکل وقت بوجہ وجوہ مندرجہ بالا اور مبارک وقت اس لئے کہ میری اکلوتی بیٹی کا جو مجھے بیحد عزیز ہے عقد ہوا جس وقت تعین تاریخ کی اطلاع مجھے ملی میرے دو خیال پیدا ہوئے ایک تو یہ کہ شکر ہے کہ میں اب اپنے فرض سے سبکدوش ہونگا دوسرا یہ کہ خدائے پاک میری آبرو رکھے۔ آبرو ریزی کا اندیشہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھا کہ بھائی صاحب قبلہ جدید رشتہ سے میرے سمدھی ایک ڈپٹی کلکٹر تھے چنانچہ یہ اندیشہ صحیح نکلا کیونکہ اگرچہ بھائی صاحب قبلہ روشن خیال ہیں لیکن دیگر پرانے خیال کے اعزا اور بزرگوں نے اس امر کا اظہار کیا کہ تمہارا مقابلہ ایک بہت بڑے آدمی سے ہوا ہے وہ صاحب جاہ، ذی حشمت صاحب وقار اور ایک اعلیٰ حاکم ہیں اور

پاک ان کی روز افزوں ترقی فرمائے) ان سب باتوں کا خیال رکھتے ہوئے مجھے شادی کی تیاریاں کرنی چاہئیں میں بیحد مایوس ہوا اور پریشان تھا خدایا میری آبرو رکھنا قصہ مختصر یہ کہ ان خیالات سے میں مجبور ہوگیا اور اپنی مقدرت سے زیادہ تیاریوں میں دو ہفتے پیشتر سے مشغول ہوگیا اس دوران میں مجھے متعدد سفر ریلوں کو کرنا پڑا شب و روز پریشان رہا۔ تاریخ معینہ پر عالیجناب مولانا اشرف علی صاحب قبلہ مدظلہ نے میری لڑکی کا عقد پڑھایا عقد کے دوسرے دن میرا عزیز بھتیجا اور جدید رشتہ سے میرا قابل فخر داماد عزیزی سید کاظم علی سلمہ سخت بیمار ہوگیا جس کا حوالہ عالیجناب بھائی صاحب قبلہ مدظلہ نے اپنے گرامی نامہ میں فرمایا ہے۔ صاحب ممدوح اپنے ہونہار سعادتمند تعلیمیافتہ بیٹے کو اس طرح سخت علیل دیکھ کر پریشان تھے اور بیحد اضطراب تھا میں اپنے عزیز داماد کو دیکھ کر بدحواس تھا۔ ایک نوشہ کا یکایک بستر علالت پر دیکھنا ایک ایسا دردناک واقعہ ہے جو میں کبھی نہ بھولونگا۔ خدائے پاک اسکو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ بھائی صاحب قبلہ کو موسم سرما کے شدید ترین وقت میں شب کو ریل چھوٹ جانے سے اسٹیشن پر بوجہ نہ ہونے حفاظتی سامان پوشش کے جو تکلیف ہوئی قابل بیان نہیں مجھے فخر ہے کہ میری عزیز لڑکی خوش نصیب ہے کہ اس کو ایک لائق شوہر ملا خدائے پاک میرے ان دونوں بچوں کو زندگی دے مجھے یہ فخر اس وقت بھی حاصل ہوسکتا تھا کہ میری لڑکی کا عقد قطعی شرعی ہوتا اور دیگر مذموم مراسم سے مبرا ہوتا اور بلا وجہ زیر باری سے بچ جاتا۔ مجھے اس خرچ کا قطعی قلق نہیں ہے بلکہ خوشی ہے جو میں نے لڑکی پر جہیز وغیرہ میں کیا۔ البتہ مجھے ملال ہے دعوت اور دیگر بہت سی ایسی مدوں کا جنکا تفصیل وار لکھنا محال ہے اور ان پر مجھے خرچ کرنا پڑا اور مجھے اس سے تکلیف ہوئی مجھے دیگر مقامات میں متعدد مرتبہ مسلمانوں کی شادیوں میں شریک ہونیکا اتفاق ہوا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے یہاں مقابلۃً بہت سی لغو رسوم معدوم ہیں ایک موقع پر ایک لاکھ کا مہر باندھا گیا تھا اور یہ صاحب محرر چنگی تھے غرضکہ میں پہلے ہی خلاف تھا اور یہ شادی میرے لئے کافی سبق آموز ہوئی۔ آپ کی کوشش سے اور مولانا صاحب کی برکت سے پچھلی شادیوں میں بہت سی اصلاحیں ہوئیں میں اب آئندہ اپنی اولاد کا عقد شرعی کرونگا اور میں نے طے کرلیا ہے کہ میں آئندہ ایسی تقریبات میں ہرگز شرکت نہ کرونگا جہاں فضول خرچیاں ہوں اور جاہلانہ رسوم ادا کی جاویں۔ میں آپکا اور عالیجناب مولانا صاحب قبلہ کا بیحد ممنون ہوں کہ آپنے یہ کار نیک اپنے ذمہ لیا ہے اس پر اگر کاربند ہوئے تو جملہ مسلمانان نہ صرف گناہوں ہی سے بچیں گے بلکہ بربادی اور زیر باری سے نجات پاویں گے خدائے پاک مسلمانوں پر رحم فرمائے اور آپ دونوں صاحبان کی کوشش بار آور ہو۔

آپ کا مبارک حسین انسپکٹر آبکاری حلقہ اول ایٹہ

مختصر کیفیت وعظ ہذا وقوعاً وغرضاً واثراً

یہ وعظ (النقد اللبیب) بتاریخ ۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ روز منگل بعد ظہر ہوا یہ تمام سفر کوٹا کا گویا موضوع اصلی تھا اسکی طرف تمام مہمانان اور میزبانان اور زائرین سب کے کان لگے ہوئے تھے۔ یہ وعظ پولیس لائن کے میدان میں ہوا جہاں مہمانان کا قیام تھا یہ جگہ شہر کوٹا سے دو میل کے قریب فاصلہ پر ہے اہل شہر کو بھی اطلاع ہوگئی تھی چونکہ حضرت والا کا ورود اس جگہ پہلی ہی مرتبہ تھا اور شہر کے لوگ حضرت سے بالکل ناآشنا تھے اسلئے مجمع اہل شہر کا کچھ زیادہ نہ ہوا اور ان میں سے بعض کے تیوروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ چنداں اشتیاق سے نہیں آئے اس مجمع کے خیالات معلوم کرنیکو یا محض دیکھا دیکھی چلے آئے ہیں بلکہ بعضوں کے چہروں سے رنگ مخالفت بھی ظاہر تھا آئے تو اس طرح تھے مگر وعظ کے ختم پر سب کی بلا مبالغہ یہ حالت ہوئی کہ

ع۔ ہم کو تو کہتے تھے اب تم ہی کلیجہ تھام لو۔ اور بقول حضرت مجذوب سلمہٗ

کب وہ دیں گرا نہیں جس کو ذرا تکا نہیں   تیری نظر کا تیر بھی جس پہ پڑا اُچٹا نہیں

ملنے کا تیرے ہمنشیں مانتا میں بُرا نہیں   ہوش ربا کے سامنے ہائے ابھی پڑا نہیں

یہ حالت تھی کہ کسی کی سیری نہ ہوتی تھی وعظ کے شروع ہونیکے وقت اُن کے چہروں پر اجنبیت کے آثار تھے اور ختم پر انھوں نے جو شہر میں وعظ ہونیکے لئے اصرار کیا اس سے عقیدت اور خلوص اور تڑپ کے آثار نمایاں تھے حضرت والا کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور خوشامد کرتے تھے مگر حضرت والا بعض شرائط نہ پورے ہونے کی وجہ سے عذر فرماتے تھے وعظ کا ضبط کرنا احقر محمد مصطفیٰ اور خواجہ عزیز الحسن صاحب کے سپرد ہوا تھا اتنے میں معلوم ہوا کہ ایک مرزا صاحب انور بیگ نامی منجانب ریاست کوٹا مختصر نویس کا باقاعدہ امتحان پاس کرکے آئے ہیں اور فی منٹ ۵۰ لفظ لکھ سکتے ہیں وہ بھی لکھنے بیٹھ گئے اور انھوں نے بہت شوق سے لکھا ہم لوگوں کو جسقدر اس کی خوشی تھی بیان سے باہر ہے جس اہتمام سے یہ وعظ لکھا گیا آجتک کوئی وعظ نہیں لکھا گیا اور الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ جیسا وعظ ہوا ویسی ہی اسکی تحریر بھی ہوئی امید تو یہ کیگئی تھی کہ یہ وعظ بالکل لفظ بلفظ ہوگا تقریر و تحریر میں ایک لفظ کا بھی فرق نہ ہوگا اور اسی کی کوشش کی گئی لیکن اس میں کامیاب ہونے میں کسی قدر موانع پیش آگئے وہ یہ کہ بعض الفاظ کا شارٹ اردو میں ہے ہی نہیں مثلاً تبتع کا لفظ کہ مختصر نویس صاحب سے اپنا لکھا ہوا پڑھا ہی نہیں گیا دوسرے یہ کہ مختصر نویس صاحب کے سواجہ میں کل تبییض نہ ہوسکی کیونکہ بہت جلد وہاں سے کوچ ہوگیا اور خود بلا امداد ہم دونوں کے مسودوں کو صاف نہ کرسکے کیونکہ بہت سے عربی لفظ ایسے تھے جو انکی سمجھ میں نہ آئے تاہم یہ ضرور ہوا ایک ثلث بظن غالب لفظ بلفظ صاف ہوا کیونکہ حضرت کا ایما ہوا کہ علیحدہ ایک خیمہ میں ہم تینوں بیٹھیں اور فوراً صاف کرنا شروع کردیں اور کسی کام کیلئے سوائے ضرورت یا اور نماز کے وہاں سے نہ نکلیں چنانچہ ایسا ہی ہوا مختصر نویس صاحب کا اندازہ یہ تھا کہ اس طرح اہتمام سے لکھنے سے کل تک پورے وعظ کی تبییض ہوجاوے گی لیکن یہ خیال ہی خیال نکلا اور تیسرے دن تک بھی فقط ایک تہائی کی تبییض ہو پائی کیونکہ ایک ایک لفظ کو اس وقت تحریر کیا جاتا تھا جبکہ

تینوں تحریروں کو غور سے ملالیا جاتا تھا۔ تیسرے دن کوٹا سے ندیئی علاقہ بھرتپور کو کوچ ہوگیا نہ ہم لوگ کوٹا میں رہ سکتے تھے اور نہ مختصر نویس ہمارے ساتھ ندیئی جا سکتے تھے۔ ندیئی میں اسی کو غنیمت سمجھا گیا کہ احقر اور خواجہ عزیز الحسن صاحب دونوں ملکر تبییض کریں تین دن تک وہاں بھی اسیطرح ہوا کہ سوا وعظ کی تبییض کے کچھ کام نہ تھا لیکن باوجود اس اہتمام کے ان دونوں میں بھی ایک تہائی سے زیادہ صاف نہ ہوسکا اب ندیئی سے بھی کوچ ہونیوالا تھا اور احقر میں اور خواجہ صاحب میں بھی افتراق ہوا تو حضرت والا کی رائے یہ ہوئی کہ دونوں مسودے احقر کے ساتھ جاویں اور احقر دونوں مسودوں کی مدد سے صاف کرے بعد ازاں اس صاف شدہ کو معہ دونوں مسودوں کے خواجہ صاحب کے پاس بھیجدے وہ اس کو نظر ثانی فرمالیں اس کے بعد میں حسب معمول سب کو دیکھ لونگا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حاصل یہ کہ وعظ ایک ثلث کے قریب تینوں کاتبوں کے مواجہ میں لکھا گیا اور ایک تہائی کے قریب دو کاتبوں نے مل کر لکھا اور ایک ثلث احقر نے دونوں مسودوں کی مدد سے لکھا ظاہر ہے کہ جو صحت تبییض میں تینوں کاتبوں کے ملکر لکھنے سے پیدا ہوئی تھی وہ دو کے ملکر لکھنے سے نہیں ہوئی اور جو صحت دو کے ملکر لکھنے سے ہوئی تھی وہ فقط احقر کے لکھنے سے پیدا نہیں ہوئی لیکن تاہم بھی ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میری تحریر میں کل الفاظ حسب منشا محفوظ نہ ہی اکثر الفاظ ضرور محفوظ ہوگئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعض ہی الفاظ میں فرق رہ گیا ہوگا کیونکہ دونوں مسودوں کو سامنے رکھکر ایک ایک لفظ پر غور کرکے لکھا گیا اور جو کچھ اس میں کمی رہی وہ خواجہ صاحب کی نظر ثانی سے پوری ہوگئی اور حضرت واعظ صاحب مدظلہ کے نظر اصلاحی سے سب پر رجسٹری ہوگئی غرض میزبانان کوٹا کی نیک نیتی اور خلوص کی برکت ہے کہ یہ وعظ دیگر تمام مواعظ سے اس بات میں ممتاز ہے کہ ایک تہائی سے کچھ زیادہ روایت باللفظ ہے شاید کچھ ہی الفاظ بدلے گئے ہونگے اور باقیماندہ میں سے نصف جو شرکت احقر اور خواجہ صاحب کے لکھا گیا تھا اس کی نسبت بھی کہا جا سکتا ہے کہ قریب روایت باللفظ کے ہے کیونکہ خواجہ صاحب کو اس کا زیادہ اہتمام رہتا ہے کہ حتی الامکان الفاظ نہ بدلیں لیکن بلا مختصر نویسی کے اس میں حسب منشا کامیابی محال ہے تاہم دونوں مسودوں کو صاف کرنے سے بہت کم تغیر رہ گیا ہوگا اور کوئی مضمون چھوٹا یا بڑا ہرگز ترک نہیں ہوا۔ رہا باقیماندہ ایک ثلث جو صرف احقر نے دونوں مسودوں کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اسمیں بھی حتی الامکان یہی کوشش کیگئی کہ الفاظ محفوظ رہیں تاہم اجتماعی اور انفرادی تحریر میں فرق ہونا ضرور ہے لیکن اس فرق کو خواجہ صاحب کی نظر ثانی نے نکالدیا کیونکہ خواجہ صاحب نے بہت زیادہ غور اور اہتمام سے دونوں مسودوں کو سامنے رکھ کر بندہ کی تحریر کو درست کیا ہے اور اسی وجہ سے اس میں زیادہ عرصہ لگا غرض یہ ثلث آخیر بھی ثلث دوم کے حکم میں سمجھنا چاہیے۔ یہ اہتمام اس سے پہلے کسی وعظ کی تبییض میں نہیں ہوا اس وعظ کا اثر کا بیان سنئے کہ مضمون وعظ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے کسی فعل میں خود مختار نہیں ہے اور یہ خیال غلط ہے کہ شریعت نے رسوم کے متعلق آزادی دی ہے یا یہ کہ ان باتوں سے شریعت کو کیا تعلق یہ مضمون اس خوبی اور متانت اور تہذیب سے بیان ہوا کہ قلب بے ساختہ شہادت دیتا تھا کہ اس سے بہتر اس مضمون پر کوئی تقریر نہیں کرسکتا حتی کہ انسپکٹر جنرل صاحب جو مذہباً ہندو تھے کہنے لگے کہ ہم نے تو خلاصہ اس کا یہ سمجھا ہے کہ مولانا صاحب نے ریفارم اسکیم کو مذہب کے پیرایہ میں ثابت کیا ہے اور یہ سب سے بہتر اور مؤثر طریقہ ہے اور ان

لوگوں کے دلوں پر بھی حضرت واعظ صاحب مدظلہٗ کی تقریر کا سکہ جم گیا۔ جو شہر کوٹا سے اجنبیانہ آئے تھے اور مجمع کے وہ اشخاص جو رسوم کے ممانعت میں طرح طرح کے اشکال کیا کرتے تھے مقر تھے کہ اب کوئی اشکال نہیں رہا حتیٰ کہ خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب بار باران کو چھیڑتے کہ اب بولو اگر کوئی اشکال باقی ہو تو حضرت کے پاس چلو اور وہ خاموش رہ جاتے اس وعظ نے موافق و مخالف سب کو ایک خیال بنا لیا مجمع کی جو کیفیت بیان کے وقت تھی وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی جو لوگ صرف تماشائی بن کر آئے تھے بعد وعظ کے سب نے بالاتفاق اصرار کیا کہ شہر میں بھی وعظ ضرور ہونا چاہئے اور جب ان کو معلوم ہوا کہ شہر میں وعظ نہیں ہوگا تو اُن کے چہروں پر ایسی حسرت و یاس برستی تھی جیسے ان کے کوئی قیمتی چیز فوت ہوگئی ہے۔ قاضی صاحب اور تمام شہر والوں نے بار بار عرض کیا کہ شہر میں بھی وعظ ضرور ہونا چاہیے فرمایا میں نے کچھ شرائط پیش کی تھیں لیکن ان کے متعلق مجھے اطمینان نہیں ہوا اس واسطے میں معذور ہوں۔ زندگی باقی ہے تو پھر کبھی سہی۔ پھر بھی اصرار کیا گیا تو فرمایا یوں کیجئے کہ آئندہ کسی موقع پر حکام کے ذریعہ سے اختلاف وغیرہ کے انسداد کا انتظام کر کے بلا لیجئے میں حاضر ہوں اور یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ مجھ سے حق گوئی ترک نہیں ہوسکتی میری عادت چھیڑ چھاڑ کی تو ہے نہیں جیسا کہ آپ نے اس وعظ کو سن کر اندازہ کر لیا ہوگا اپنے وعظ میں میں نے اختلافی مسائل تک سے تعرض نہیں کیا لیکن اگر کوئی بات زبان پر آجائے تو روکتا بھی نہیں میں اس شرط کو بھی ملحوظ رکھئے اور بلا لیجئے بشرط موقع و فرصت انکار نہ کروں گا اس وقت ان لوگوں کی حسرت و یاس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔

یہ وعظ اس قابل ہے کہ جب کہیں شادی بیاہ میں رسوم کے متعلق بیان کی ضرورت ہو اس کو سنا دیا جاوے۔ حضرات میزبانان میں سے کئی صاحبوں نے عہد کیا کہ ہم آئندہ جب کوئی تقریب کریں گے تو بالکل موافق شرع شریف اور حضرت کے فرمودہ کے مطابق کریں گے چنانچہ کئی صاحبوں کی تحریریں وعظ کے آخر میں درج ہیں۔

تمہید ختم ہوئی۔ ناظرین اس وعظ کو بار بار مطالعہ کریں اور دعا کریں کہ حق تعالیٰ حضرت واعظ صاحب کو بایں فیوض و برکات دائم و قائم رکھیں اور حضرات میزبانان کوٹہ کو اور کاتبین کو عظ کو اور جس جس کو اس سے تعلق ہو اپنی محبت اور توفیق خیر اور سعادت دارین نصیب فرمادیں۔ آمین

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ

مسمیٰ بہ

دَوَاءُ الضِّیق

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی ——— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی ۱

دواء الضیق

رب	متی	سہ	سیف	لہ	ماذا	من ای نبان	منضبط	لستمعون	اشتات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]			[illegible]	[illegible]	

الحمدللہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ قال اللہ تعالیٰ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگدل ہوتے ہیں سو اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے رب کی تسبیح اور تحمید کرتے رہیئے اور نماز پڑھنے والوں میں سے رہیئے اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیئے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے)

یہ ایک مختصر سی آیت ہے سورۂ حجر کی اخیر کی اس میں حق تعالیٰ نے ایک حالت ناگوار کا علاج بتلایا ہے کہ جس کی ضرورت کم وبیش سب کو ہی واقع ہوتی ہے اسی واسطے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ جی ہمیشہ یہ چاہا کرتا ہے کہ ضروری مضمون جس کا وقوع بکثرت ہو بیان کیا

جایا کرے چنانچہ ان حالات میں سے ایک خاص حالت ہے جو سب حالتوں سے کسی قدر زیادہ پیش آتی ہے اس کا چونکہ اس آیت میں علاج بتلایا گیا ہے اس لئے اس آیت کو اختیار کیا گیا تاکہ لوگ اپنے اس مرض کی دوا معلوم کر کے اس کا ازالہ کر لیں اور اپنی حالتوں کو درست بنا لیں اور وہ حالت ضیق یعنی تنگی کی حالت ہے اور اس کا پیش آنا سب پر ظاہر ہے جس کا سبب خلاف طبیعت امور کا پیش آنا ہے یعنی جو خواہش یا جو مذاق جس کا ہے ہر واقعہ اس کے موافق نہیں ہوتا کثرت سے واقعات خلاف طبیعت پیش آتے ہیں اور ہر شخص کو ایسے امور پیش آتے ہیں کیونکہ انسان بہت سے تقاضوں میں گھرا ہوا ہے کہ ان سے باہر نہیں ہو سکتا چنانچہ انسان کا طبعی تقاضا ہے کہ میں ہمیشہ خوش رہوں ہمیشہ تندرست رہوں مگر اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوتی غم میں بھی مبتلا ہوتا ہے مرض بھی لاحق ہوتا ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ سب مجھ سے موافقت کریں مگر بہت سے مخالفت بھی کرتے ہیں وہ یہ چاہتا ہے کہ کثرت سے مال ہو مگر بعض اوقات بقدر حاجت بھی نہیں ہوتا اور جن کے پاس ہوتا بھی ہے تو ہوس آگے ہوتی ہے کہ اور ہو بہر حال گو خالص حالت یا خاص سبب سب میں مشترک نہ ہو مگر یہ امر سب میں مشترک ہے کہ خلاف مزاج امور پیش آتے ہیں مثلاً انسان کب یہ چاہتا ہے کہ عزیز کم ہو جاویں مگر کم ہو جاتے ہیں۔ ایسے امور کی حق تعالیٰ نے ایک مختصر فہرست ارشاد فرمائی فرماتے ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ الآیۃ۔ ترجمہ یہ ہے کہ ہم ضرور امتحان کریں گے خوف سے مثلاً حاکم مخالف کا اندیشہ دشمن کا دباؤ وغیرہ وغیرہ اور بھوک سے فقر و فاقہ سے جو نادار ہیں ان کو تو بھوک لگا ہی کرتی ہے فاقہ کی نوبت آتی ہی ہے مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو بھوک کا اثر نہ ہو جو بڑے بڑے مالدار صاحب ریاست ہیں ان کو بھی یہ نعمت میسر ہو جاتی ہے مثلاً سفر میں ہوں اور کھانا ختم ہو جائے اور ملے نہیں اور کسی خشک مزاج کو یہ شبہ نہ ہو کہ آج کل تو سفر میں کھانے کی تکلیف ہو ہی نہیں سکتی

ہر مقام پر مکان سے زیادہ اسباب راحت موجود ہیں کیونکہ یہاں وہ حالت سفر کی مراد ہے کہ جس میں کھانا میسر نہ آئے عام اس سے کہ ریل کا سفر ہو یا جنگل اور حضرت ریل تو کیا خدائے کارساز کی وہ قدرت ہے کہ امراء نے گھر بیٹھے بھوک سے بے تاب ہو کر جان بحق تسلیم کی ہے کسی متمول کی حکایت ہے، ایک شخص نے اخبار سے نقل کی تھی کہ اس کے تہ خانہ میں جو کہ اندر ہی اندر دور و دراز تک چلا گیا تھا سونے کے ستون پڑے تھے ہر ہفتہ کو وہ ان کے معائنہ کو جاتا تھا ایک مرتبہ حسب معمول گیا اور گھوڑا قریب ہی باندھ کر اندر گیا کسی وجہ سے گھوڑا بدکا اور تڑا بھڑا کر بھاگ گیا جب خزانچی آیا اور گھوڑے کو نہ پایا تو یہ سمجھ کر کہ امیر صاحب واپس تشریف لے گئے ہوں گے حالانکہ وہ وہاں سے بہت آگے تھا واپس ہونا چاہا تو قفل بند دروازہ باہر کا بڑی دور جہاں آواز بھی نہ جا سکتی تھی قفل ڈال دیا اس وقت وہ حسرت کی نظروں سے ان سونے کے ستونوں کو دیکھتا تھا کہ کچھ کام نہیں آتے کئی روز بھوکے رہ کر ختم ہو گئے. نیز ہمیشہ ہر کوئی ریل ہی میں تھوڑا ہی سفر کرتا ہے تو مثلاً سفر میں کھانا ختم ہو جائے اور نہ ملے۔ گلستاں کی حکایت مشہور ہے کہ ایک شخص ایک جنگل میں چلا جاتا تھا کسی ایسے مقام پر اس کا توشہ ختم ہو گیا کہ جہاں سے آبادی بہت دور تھی بے چارہ ادھر اُدھر پھرا اگر کہیں کوئی چیز کھانے کی نہ ملی آخر میں آ کر پڑ رہا اور زمین پر جو روپے اُس کے پاس تھے رکھ کر یہ مضمون انگلی سے لکھا ؎

در بیاباں غریب سوختہ را

شلغم پختہ بہ زنقرۂ خام

(جنگل میں مسافر فاقہ مند کو ابلے ہوئے شلغم کچی چاندی سے بہتر ہیں)

تو روپیہ پیسہ تو کھانے کے کام آتا ہی نہیں اس کی عجیب خاصیت ہے کہ جب تک جدا نہ ہو کبھی کام نہ آدے دوستی کا تو مقتضیٰ یہ تھا کہ اجتماع ہو مگر یہ ساتھ رہ کر کبھی کام نہیں آتا اس کے ساتھ جب تک دشمنوں کا سا معاملہ نہ کرو کبھی کام نہیں آتا یعنی جب اُسے پاس سے جدا کر دو۔ بہر حال ایسی چیز دوستی کے قابل

نہیں کہ وہ آپ کی دشمن اور آپ اس کے مشتاق دوست وہ ہے جس کی شان یہ ہے
ع مایا و محتاج بودیم او بما مشتاق بود ÷ (ہم اس کے محتاج ہیں اور وہ ہمارا مشتاق)
بہرحال روپیہ چاہے کتنا ہی ہو مگر جب وقت پر کھانا بھی میسر نہ ہو تو بھوک تو
سب کو ہی چکھنا پڑے گی وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ اور مال کے نقصان سے
مثلاً تجارت کی تھی اس میں نقصان ہوا برف تھی گھل گئی یا چور لے گئے بہرحال نقص
عام ہے وَالْاَنْفُسِ مثلاً بیمار ہوگیا یا مرگیا وَالثَّمَرَاتِ پھلوں کا گھٹنا
یا تو یہ کہ باغ میں پھل ہی نہیں آیا یا آیا مگر کسی وجہ سے ہلاک ہوگیا یا اولاد نہوئی
یا ہوئی اور مرگئی۔ بہرحال یہ مختصر فہرست ارشاد فرمائی ہے ان واقعات کی جو ناگوار
ہیں گو ناگواری کا پیش آنا بھی رحمت ہے حق تعالیٰ کی کہ اگر ناگواریاں نہ پیش
آتیں تو اجر صبر نہ میسر ہوتا کیونکہ اگر ناگواری نہ پیش آتی تو صبر کی ماہیۃ جو حَبْسُ
النَّفْسِ عَلٰى مَا تَكْرَهُ (نفس کو ان باتوں پر روکنا جو اس کو ناگوار ہوں) ہے
کہاں سے متحقق ہوتی اور جب متحقق نہ ہوتی تو ہم بہت بڑے ثواب سے محروم رہتے
اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اولیاء کو بوجہ مشاہدہ اس رحمت کے ناگوار طبعی
ہوتا ہے ناگوار عقلی نہیں ہوتا ہاں صدمہ ہوتا ہے مگر یہ منافی رضا کے نہیں چنانچہ
حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کا جب
انتقال ہوا تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ ایک صحابی رضہ نے عرض
کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ روتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا یہ رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔ ایک
اور حکایت یاد آئی۔

ایک بزرگ کے بیٹے کا انتقال ہوا تو وہ ہنس پڑے اور ایک ایسے بزرگ
فرض کئے جاویں کہ وہ اس حالت میں رونے لگیں دونوں کی بڑی فضیلت ہے مگر
یہ کہا جائے گا کہ رونے والے میں کمال اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھا تو بزرگوں کی حالت
میں اس قسم کا تفاوت ہوتا ہے کسی شخص نے اپنے پیر سے کہا کہ بزرگوں کی حالت

کیسے مختلف ہوتی ہے۔ پیر نے کہا کہ فلاں مسجد میں تین بزرگ بیٹھے ہیں وہاں جاکر ان کے ایک ایک طمانچہ مار کر دیکھ لو، چنانچہ سائل مسجد میں گئے ہر ایک کے ایک ایک طمانچہ مارا ایک نے تو اُٹھ کر اتنے ہی زور سے اس کے طمانچہ مار لیا اور چپکے جا بیٹھے، ایک نے خیال بھی نہ کیا اور ایک نے الٹا اس کے ہاتھ کو دبانا شروع کیا کہ تیرے چوٹ لگی ہوگی۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے صاحبزادے کے انتقال پر آنسو جاری ہوگئے تھے اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رضا حاصل نہ تھی اور یہ حدیث صحیح ہے راوی اس کے سب ثقہ ہیں تو اس میں کسی طرح کا کلام نہیں ہوسکتا ہے اور بظاہر نظر ناواقف کو یہ حالت گھٹی ہوئی معلوم ہوسکتی ہے مگر وجہ صرف یہ ہے کہ فن سے واقفیت نہیں۔ پس اس فن کے جاننے کی ضرورت ہے نہ جاننے کی وجہ سے جو سُنا اور جو چاہا سمجھ لیا اور اسی سے غلطی ہوتی ہے مگر اس فن کے حاصل کرنے کی طرف اصلا توجہ نہیں۔ طلبہ سے تعجب ہے کہ صرف و نحو میں تمام تمام عمریں صرف کر دیتے ہیں مگر اس فن کیلئے تھوڑے دن بھی صرف کرنا ضائع سمجھتے ہیں حالانکہ درسیات سے بھی یہی مقصود ہے۔ فرماتے ہیں ؎

درکنز وہدایہ نتواں یافت خدا را
سیپارۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

(کنز الدقائق اور ہدایہ میں خدا تعالیٰ کو نہیں پاسکتا سیپارۂ دل کا مطالعہ کرکہ اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے) اور

؎ چند چند از حکمت یونانیاں   حکمت ایمانیاں را ہم بخواں
صرف شد عمرت بہ بحث نحو و صرف   از کتابے عشق خواں ہم یکدو حرف

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہوگے کچھ حکمت ایمانی یعنی معرفت کی پڑھو تمھاری عمر نحو و صرف کی بحث میں گذر گئی ایک دو حرف عشق کی کتاب کا بھی پڑھو)

تو اخلاق کے حقائق ہی نہیں معلوم خیر اگر تفصیل نہیں معلوم ہے تو اتنا تو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں اور ہر حالت آپ کی افضل تھی تو جس کی حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو گی وہ ضرور افضل ہو گا کیونکہ اس نے دامن اقتدا کو مضبوط پکڑ لیا مگر مساوات نہ سمجھئے گا تو وہ حالت مشابہ ہو گی نہ کہ مساوی پس اہل کمال کے فیوض واحوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض سے صرف مشابہت ومناسبت رکھتے ہیں اور مساوی کہنا جہل اور گمراہی ہے سو جن کو مشابہت کامل ہے ان کا ادراک کامل ہے وہ ہر واقعہ سے پورے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ جب حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے انتقال کا وقت ہوا تو آپ کے آنسو ٹپک پڑے۔ یہ اثر تھا شفقت پدری کا کیونکہ یہاں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ اولاد مرگئی اور ایک یہ کہ اس امر کو خدا نے واقع کیا تو یہاں دو حق ہوئے۔ ایک اولاد کا اور ایک خدا تعالےٰ کا پس کمال یہ ہے کہ دونوں کے حقوق ادا کئے بیٹے کی محبت کی وجہ سے تو آنسو ٹپک پڑے اور متاثر ہوئے مگر نہ اس قدر کہ جزع وفزع کی نوبت پہونچی جس سے خدا کا حق فوت ہوتا تو حق کی رضا کو بھی ساتھ لئے رہے اور بیٹے کی محبت کا حق بھی ادا کیا تو دونوں کو جمع کر دکھایا جیسا خدا تعالےٰ نے ایک مخلوق ملائکہ کی پیدا کی ہے جن کی خلقت میں دو چیزوں کو جمع کیا ہے یعنی ان کا نصف بدن برف کا ہے اور نصف آگ کا اور ان کی یہ تسبیح ہے سُبْحَانَ الَّذِیْ جَمَعَ بَیْنَ الثَّلْجِ وَالنَّارِ (پاک ہے وہ ذات جس نے برف اور آگ کو جمع کر دیا) تو یہ شان یہاں بھی موجود ہے کہ غم کی آگ رضا کو ٹھنڈک نہ وہ غالب نہ یہ نہ یہ زائل نہ وہ تو پورے حقوق ادا کرنا بڑا کمال ہے۔ غیر کاملین پورے حقوق ادا نہیں کر سکتے۔ دوسرے صبر کی فضیلت بھی تو جب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ جب دل کو لگ جاوے یہی وجہ ہے کہ حق تعالےٰ نے جتنے جذبات پیدا کئے ہیں سب میں حکمت رکھتی ہے مثلاً غضب میں یہ حکمت ہے کہ عفو کی فضیلت ہمیں حاصل ہو فرماتے ہیں۔ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (غصے کے پینے والے اور لوگوں کی

خطاء سے درگذر کرنے والے) تو عفو بھی بہت بڑی فضیلت ہے اگر غضب نہ ہوتا تو اس سے محروم رہتے۔ پس نہ یہ فضیلت کہ بالکل ہی نہ آوے اور نہ یہ فضیلت ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں میں خفا ہو جائیں تحمل و عفو جانتے ہی نہ ہوں فضیلت تو یہ ہے کہ اِذَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (جبکہ غصہ کرتے ہیں اور وہ معاف کرتے ہیں) مگر یہ واضح رہے کہ عفو اور تحمل کے مواقع ہیں ہر محل و موقع میں نہ غضب مناسب ہے اور نہ عفو ہی بلکہ جو محل عفو کا ہے وہاں عفو کرنا چاہیئے اور جو موقع غضب کا ہے وہاں غضب نافع ہے زمانہ کے صوفیہ اس میں تمیز نہیں کرتے ہیں ایک ملکہ کو نہ بالکل فنا ہی کر دیں اور نہ اس کو امام مطلق ہی بنا دیں اگر کسی کے پاس سنکھیا ہو تدبیر سے وہ بھی کارآمد ہے ساری خرابی یہ ہے کہ فن ناقصوں کے ہاتھ آ گیا جیسا کہ ایک بڑھیا کے مکان میں شاہی باز آگرا تھا اس نے دیکھا کہ اس کی چونچ ٹیڑھی ہے یہ کھاتا کیسے ہوگا اُس کے پنجے مڑے ہیں یہ چلتا کیسے ہوگا غرض اس بڑھیا کو اس باز کی حالت پر بہت رحم آیا اور قینچی لے کر باز کے پنجے اور چونچ بازو وغیرہ کاٹ ڈالے اور اور اس کو مضغہ گوشت بنا دیا۔ اس زمانہ کے رسمی پیر و مرید بھی اس بڑھیا سے کم نہیں کہ تمام عالم کو تہس نہس اور برباد کرتے پھرتے ہیں۔ بڑا ولی اللہ وہ مرید شمار ہوتا ہے کہ جس کو اپنے بیوی بچوں کی خبر اور پرواہ نہ ہو مگر فی الحقیقت یہ شخص بڑا مخالف ہے خدا کا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ کریں کہ خطبہ چھوڑ کر حسن رضی اللہ عنہ کو گود میں اٹھا لیں اور یہ منہ بھی نہیں دیکھتے بلکہ دیکھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یا تو مسئلہ سے بے خبری ہے یا اس کو حالت ناقص خیال کرتے ہیں ایک جہل ہے ایک کفر۔ بہر حال غضب بھی ضروری ہے اپنے موقع پر اور بخل بھی ضروری ہے مثلاً ایک شخص اس لئے رقم مانگے کہ بھنگ پیوے گا، ناچ کراوے گا۔ یہاں بخل کی ضرورت ہے۔ پس بخل بھی جب بے موقع ہوگا تب تو مذموم ہوگا ورنہ محمود۔ خوب سمجھ لیجئے۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است
کہ از و حمام تقویٰ روشن است

(شہوت دنیا مثل ایندھن کے ہے کہ اس حمام تقویٰ کی گرم بازاری ہے)
یہ جو خواہشیں ہیں ایندھن ہیں کہ ان سے تقویٰ کا حمام روشن ہے اگر سوختہ نہ ہو تو حمام گرم نہیں ہوسکتا اسی طرح شہوت کا اگر تقاضا نہ ہو تو تقویٰ کیا مولانا نے اس شہوت کو بھی کمال بتلایا ہے کہ جس کی قوت شہویہ جس قدر بڑھی ہو وہ رکے بس وہ کامل ہے کہ

شہوت دنیا مثال گلخن است کہ از و حمام تقویٰ روشن است

(شہوت دنیا مثل ایندھن کے ہے کہ اس حمام تقویٰ کی گرم بازاری ہے)
اور اس سے وہ مسئلہ بھی حل ہوگیا کہ کوئی چیز بیکار نہیں لیجئے جس کو نقمت کہتے تھے وہ سبب رحمت کا ہوا اسی طرح صبر کی فضیلت ناگواری ہی کی وجہ سے یسر آتی ہے پس موت پر طبعی تو ناگواری ہونا حق اولاد کا ہے اور روحانی ناگواریٔ ہونا رضائے وحق حق ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں حق ادا کئے غالب کا غالب مغلوب کا مغلوب یہی عدل ہے تو اولیاء میں بھی کاملین وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف لئے ہوئے ہوں اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی کپڑے پھاڑے نہ جنگل میں بھاگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں امور خانہ داری کا بھی پورا پورا انتظام اور سلطنت کا بھی اور انتظام بھی وہ جس کی نظیر نہیں ہوسکتی امور خانہ داری کا وہ انتظام کہ آج ہر شخص اسی کا خوشہ چین ہے۔ غرضکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہر ایک امر کا انتظام تھا آپ نے بول و براز تک کے قانون بتلائے ہیں اور آج کل پیروں کا بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ فلاں شاہ نے ایک ضرب لگائی اور ہو کہا بس گر پڑے لو صاحب بس یہ پہونچے ہوئے بزرگ ہیں مگر حقیقت میں اگر اسی کا نام بزرگی ہے تو کوئی نبی بزرگ ہی نہیں ہوا کیونکہ انبیاء علیہم السلام مغلوب الحال نہیں ہوتے تھے ان کو وہ وجد نہیں آتا تھا کہ جس میں کپڑے پھاڑ ڈالیں۔ دنیاوی امور میں وہ بالکل عوام کے مشابہ ہوتے تھے بس یہ امور لوازم بزرگی سے نہیں ہاں اگر

تصنع سے نہ ہوں تو بزرگی کے منافی بھی نہیں چنانچہ بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک ابن الحال اور ایک ابوالحال تو اپنے حال پر غالب رہتے ہیں اور ابن الحال مغلوب ہوتے ہیں خلقت سے بھاگتے ہیں کپڑے پھاڑتے ہیں ہاں خلاف شریعت قصداً نہیں کرتے اور ان دونوں قسموں میں زیادہ کامل ابوالحال ہوتے ہیں مگر آجکل لوگ غالب الحال بزرگوں میں بزرگ ہی نہیں سمجھتے جیساکہ انبیاء کو ان کے زمانہ کے لوگ بزرگ نہیں سمجھتے تھے چنانچہ کفار عرب کہا کرتے تھے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا یعنی کیسے اللہ کے پیارے اور رسول ہیں کہ کھانا بھی کھاتے ہیں بازار میں چلتے پھرتے ہیں ان پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا کہ ان کی ضروریات منصبی میں مدد کرتا یا ان کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں دیا گیا یا باغ ان کو کیوں نہ دیدیا گیا جس سے کھاتے پیتے یہ تو ہم سے بھی زیادہ محتاج ہیں۔ آج کل بھی جو بزرگ ایسی شان رکھتے ہیں ان کو بزرگ نہیں سمجھتے بلکہ اب تو ایسے شخص کو زیادہ بزرگ سمجھتے ہیں جس کو عقل تک بھی نہ ہو حالانکہ دین میں عقل زیادہ کارآمد و نافع ہے کیونکہ اس کا فعل ہے انجام اندیشی مگر صرف عاجل نہیں بلکہ آجل کی لوگ انجام کے معنے بھی نہیں سمجھتے انجام اندیشی یہ نہیں کہ ایک ہفتہ کا نرخ دیکھ کر کلکتہ سے مال منگالیں۔ انجام اندیشی یہ ہے کہ احقر نے ایک بار سہارنپور سے گنگوہ کے لئے اسٹیشن پر جاکر بابو سے کہا کہ انھیں وزن کرکے محصول لے لو اس نے کہا لے جاؤ ہم گارڈ سے کہدیں گے میں نے کہا وہ گارڈ کہاں تک جاویگا کہا غازی آباد تک میں نے کہا اس کے آگے کیا ہوگا کہنے لگا وہ دوسرے گارڈ سے کہدیگا میں نے کہا وہ کہاں تک جاویگا اس نے کہا کانپور تک میں نے کہا اس کے آگے کیا ہوگا اس نے کہا بس کانپور تو جانا ہی ہے میں نے کہا نہیں بلکہ اس کے آگے پھر ایک جگہ جانا ہے (اللہ کے یہاں) وہاں کونسا گارڈ ہوگا تو وہ ہندو بابو سنائے میں آگیا اور اس پر بہت ہی اثر ہوا بس پھر کسی نے کچھ نہیں کہا فوراً وزن کرا کے دیدیا۔ اب ان شاء اللہ تعالیٰ وہاں سے بھی بیفکری ہے کہ ہم نے جو حکم تھا کردیا غرض یہ ہے انجام اندیشی اور وہ انجام جس کو آپ سمجھے ہوئے ہیں وہ نہیں ہے لوگوں نے

انجام میں تعلیل کر لی ہے کہ م کو بدل لیا نون سے یعنی انجان غرض عقل کا کام ہے انجام اندیشی اور اس کی ضرورت خصوصیت کے ساتھ دین میں جسقدر ہے ظاہر ہے پس کم عقل زیادہ بزرگ ہو گا یا عاقل انبیاء ہی کو دیکھ لو کہ ان کو وہ عقل عطا ہوئی ہے کہ نہ کسی دنیا دار کو نہ کسی دیندار کو ویسی عقل ملی پس جن کے احوال زیادہ مشابہ ہوں گے انبیاء علیہم السلام کے خصوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہی زیادہ بزرگ ہوں گے البتہ بعض بزرگ بھولے بھی ہوتے ہیں مگر بھولا ہونا لوازم بزرگی سے تو نہیں گو منافی بھی نہیں مگر نفع زیادہ بھولے سے نہیں ہوتا ہاں چاہے بھولا خود مقبول ہو کیونکہ بیا جس کو چاہے وہ ہی سہاگن ہوئے بعض اس مذاق کے بھی ہوئے ہیں کہ نفع سے بحث نہیں چنانچہ احمد جام فرماتے ہیں ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام دیوانہ ہو سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

مگر انبیاء علیہم السلام نے سلسلہ بڑھانے کی کوشش فرمائی بہرحال واقع میں خواہ یہ حالت بھی کامل ہو مگر انفع وہی ہو گا جو عاقل کامل ہو گا پس انبیاء علیہم السلام عاقل کامل تھے اور میں اسی کو ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام بھولے نہیں تھے سب تعلقات کے حقوق پورے ادا فرماتے تھے اولاد کا بھی حق تعالےٰ کا بھی یہی شان مؤمن کامل کی ہوتی ہے کہ اس کو ناگواری ہوتی ہے مگر وہ ناگواری سے مغلوب نہیں ہوتا۔ خلاصہ مقام یہ تھا کہ ناگواری ہر شخص کو پیش آتی ہے اور بیچ میں مضمون بڑھ گیا مگر ہیں سب مفید باتیں مقصود یہ ہے کہ سب کو ناگواری پیش آتی ہے اور اس پر صبر کرنے سے ثواب عظیم ملتا ہے تو ناگواری بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے۔ دیکھئے لوگ کہتے ہیں کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللہِ (خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو) سے رحمت ثابت ہوتی ہے مجھ کو تو ہر آیت میں رحمت ہر حکم میں رحمت نظر آتی ہے اگر شریعت کے ہر ایک برتاؤ کو غور سے دیکھیں تو ہر ایک میں رحمت پائی جاوے گی اور یہ میری من گڑھت نہیں سلف کے اقوال اس کے مؤید ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں سب سے بڑی آیت رحمت کی آیۃ مداینت ہے کہ آپس کا لین دین لکھ لیا کرو وجہ دلالت یہ کہ حق تعالےٰ کو جب ہمارا دنیا کا نقصان گوارا نہیں تو اخروی نقصان کو کب گوارا فرما دیں گے لکھنا مشروع فرمایا تاکہ چار پیسہ کی بھی بھول نہ ہو کہ نقصان

اٹھانا پڑے ایک لمبی آیۃ رکوع کا رکوع اسی قانون میں نازل فرمایا تو ہمارا چار پیسہ کا نقصان بھی گوارا نہیں یہ کتنی بڑی رحمت اور محبت ہے جیسے اس باپ کو کتنی محبت ہو گی کہ بیٹے کو ٹھیکرے جمع کرنے سے نہیں روکتا کہ روئے گا حالانکہ ٹھیکرے رونے کے قابل نہیں واللہ دنیاوی متاع کو ٹھیکروں سے بھی کمتر ہے بلکہ مچھر کے بازو کے برابر بھی اس کی قدر اللہ کے نزدیک نہیں اگر اتنی بھی قدر ہوتی تو کسی کافر سے بڑھ کر کوئی دوسرا مالدار نہ ہوتا اور نافرمان کو ایک گھونٹ پانی کا نہ ملتا کہ محبوب چیز مبغوض کو نہیں دی جاتی اس سے ثابت ہوا کہ مال دینا حق تعالیٰ کو فی نفسہ مبغوض ہے اگرچہ معین دین ہونے کے سبب عارضی محبت ہو جیسے محبوبیت سنکھیا کی کہ کسی دوا کا جزء ہے لہذا قابل خریداری ہے جب یہ بات ہے تو جب معین دین ہو گا محبوب ہو گا ورنہ مبغوض ہو گا یہی وجہ ہے کہ اپنے محبوبوں کو کم (یعنی حسب ضرورت) دیتے ہیں اور یہ عین رحمت ہے کہ غذا ضرورت کے موافق دے کہ عصمت بحال رہے اور انہماک فی الدنیا نہ ہو کیونکہ اگر ان کو زیادہ مال و متاع ملے تو آخران کے بھی پیچھے حرص کا جال بچھا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کو زیادہ دیتا ہی نہیں تاکہ انہماک فی الدنیا نہ ہو اور جس کا مرتبہ عنداللہ جس قدر بڑھا ہوا ہے اور جو زیادہ محبوب ہے اس کو اسی قدر دنیا سے کم حصہ ملتا ہے چنانچہ اسی سبب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے کم دنیا دی گئی اور کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ سلیمانؑ کو ساری دنیا کا مالک اور اتنا بڑا بادشاہ بنایا تھا کہ آج تک کسی کو ان کا نظیر نہیں بنایا کیونکہ وہ ان اموال سے متمول اور ان کے مالک نہ تھے بلکہ ان کے خازن محض تھے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ آپ کا معجزہ تھا کیونکہ معجزہ ہر نبی کو اس زمانہ کے موافق عطا ہوتا ہے یعنی جس زمانہ میں جس بات کا زور ہوتا ہے اسی قبیل کا معجزہ اسی قوم کے نبی کو دیا جاتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر کا بڑا زور تھا تو موسیٰؑ کو وہ معجزے عطا کئے گئے کہ جس سے اہل سحر متحیر و عاجز ہو گئے اور ناچار آپ کو رسول برحق ماننا پڑا۔

حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں طب کا بڑا زور تھا اس لئے حضرت عیسیٰؑ کو دم سے مردہ زندہ کر دینے کا معجزہ عنایت ہوا لاعلاج امراض والے کو دم کے دم میں اچھا کر دیتے۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

زمانہ بھر کا مسلم ہے کہ مادر زاد نابینا بینا کسی دوا سے بھی نہیں ہوسکتا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس کو بھی بحکم خداوندی بینا کر دیتے تھے۔ چونکہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں حکومت اور سلطنت کا زور تھا کہ ہر بادشاہ اپنی طاقت و خداداد قوت پر مغرور تھا اپنے اس زور و قوت پر مغرور ہو بیٹھے تھے خدائی اور آسمانی احکام بالکل نسیًا منسیا ہو چکے تھے اس زمانہ میں جب سلیمانؑ کو نبی برحق بناکر بھیجا گیا تو ان کو ایسا زبردست بادشاہ بنایا گیا کہ جس کو دیکھ کر وہ لوگ اپنی طاقت و زور سب بھول گئے اور سر تسلیم خم کرتے ہی بن پڑا باقی یہ بات کہ ہر نبی کو وہی معجزہ کیوں دیا جاتا ہے جس میں اس کی قوم کو غلو ہو اس میں حکمت یہ ہے کہ جس امر کا جس زمانہ میں غلبہ ہوتا ہے اس کی معرفت ان لوگوں کو زیادہ ہوتی ہے اور جس قدر معرفت زیادہ ہوتی ہے اس کی حد مقدوریت زیادہ معلوم ہوتی ہے جب معجزہ اس حد سے آگے ہوگا اس کے اعجاز کو بھی وہ لوگ خوب سمجھیں گے اور جو مصلحت ہے معجزہ کی وہ خوب ظاہر ہوگی پس سلیمان علیہ السلام کو ایسی قوت کی سلطنت دی گئی تاکہ بمقابلہ دوسرے سلاطین کے یہ بات ظاہر ہوجاوے کہ سلاطین کتنے ہی بڑھ جائیں ساری دنیا غرب سے شرق تک کے مالک ہوجائیں کتنے ہی ریلوے انجن موٹر کار وغیرہ نکالیں مگر جن اور طیور پر کہاں سے حاکم بنیں گے اُن کی زبانیں کیسے معلوم کریں گے ہوا کو کیونکر ایسا تابع بنائیں گے کہ صرف زبان ہلانے سے وہ کام کرنے لگے اور سلیمان علیہ السلام کو ان چیزوں پر حاکم بنایا سب کو ان کے قبضہ میں دیا پس اس سے معلوم ہوجاویگا کہ یہ معجزہ ہے حاصل یہ کہ سلطنت ان کو اس غرض سے دی گئی تھی جو مذکور ہوئی پس وہ خازن محض تھے اس ملک سے متمول نہ ہوگئے تھے چنانچہ لکھتے ہیں ؎ زاں سلیماں خویش را سکیں بخواند (اس وجہ سے سلیمانؑ اپنے کو مسکین کہتے تھے) قرآن بھی اس تقریر کا مؤید ہے چنانچہ ایک مقام پر فرمایا کہ داؤدؑ کو ہم نے سلطنت دی اور سلطنت بھی چھوٹی نہیں بلکہ ملک عظیم عطا فرمایا چنانچہ ارشاد ہے وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ (ہمنے ان کو ملک کو بڑا کیا) اور باوجود اس کے دوسری جگہ ان کے ہی قصہ میں فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو زرہ بنانے کا حکم دیا اگر کہیے کہ زرہ بنانا ایک صنعت تھی جس کو انھوں نے سیکھ لیا تھا باقی کھاتے پیتے سلطنت سے تھے تو یہ بھی نہ تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وَكَانَ كُلٌّ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ کیا نبی دستکاری سے

اپنے حوائج پوری کرتے تھے صاحبو یہ ان کی سلطنت تھی کہ صاحب سلطنت ہو کر ان کی غذا جَو کی روٹی ہوتی تھی اور یہ شان سوائے کاملین اور انبیاءؑ کے دوسرے کی نہیں ہوسکتی کہ سلطنت بھی کریں اور جَو کی روٹی بھی کھائیں اس لئے ان کی سلطنت سے اپنے لئے ترقی کی ہوس کا سہارا مت ڈھونڈنا تو ان کی یہ سلطنت تھی اور اس سے ایک غلطی اور رفع ہوئی کہ اب جو لوگوں نے بزرگی کے معنے کا حاصل زہد خشک نکالا ہے کہ مر رہو بیوی بچے سب چھوڑ و گھر سے منہ موڑ دو یہ کوئی بزرگی نہیں زرہ بنا کر اس سے گذارہ کرنے سے تو اس کی ممانعت نکلتی ہے ہاں ترقی دنیا جس نہیں نکلتا کیونکہ اعمل سابغات (تم پوری زریں بناؤ) کے ساتھ ہی وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (اور نیک عمل کرو) بھی ارشاد فرمایا ہے مگر آپ نے خوب عمل کیا اِعْمَلُوْا صَالِحًا (نیک عمل کرو) کو اڑا ہی دیا جس طرح کسی بسیار خوار نے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ اور پیو) پر عمل کیا تھا دعا بھی قرآن میں سے منتخب کی تو صرف رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے دستر خوان نازل فرما) غرض یہ کہ مطلب کی سب باتیں لے لیں بہر حال خدا نے دنیا کے کام سے ممانعت نہیں فرمائی ہاں اس میں اعتدال کا حکم ہے کہ منہمک اور مشغوف نہ ہو اسی استعمال معتدل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سائل کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَّيُحِبُّ الْجَمَالَ (بلا شک اللہ جمیل ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں) سائل نے پوچھا تھا کہ اَحِبُّ اَنْ يَّكُوْنَ نَعْلِيْ حَسَنًا وَّثَوْبِيْ حَسَنًا اَيَكُوْنَ هٰذَا مِنَ الْكِبْرِ (مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرا جوتا بھی اچھا ہو اور میرا کپڑا بھی اچھا ہو کیا تکبر میں سے ہے) حاصل جواب یہ کہ یہ مطلب نہیں کہ خدا تو دے عمدہ اور پاکیزہ کھانا کپڑا اور تم وہی سڑی ہوئی پوشاک اور گھسا کھانا کھاؤ یہ بے نفسی نہیں بدتمیزی ہے ہاں حد اعتدال سے آگے قدم نہ رکھو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتدال دیکھئے کہ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ النَّظَافَةَ (اللہ تعالیٰ پاکیزگی کو پسند فرماتے ہیں) اور ایک جگہ فرماتے ہیں اَلْبَذَاذَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ (سادگی ایمان سے ہے) یعنی سادگی رکھو نہ میلا پن اور نہ تکلف یعنی نہ یہ کرو کہ بغیر صابن میاں کا منہ ہی نہ دھلے بغیر آئینہ عمامہ ہی نہ باندھا جائے کہ کہیں ٹیڑھا نہ ہو جائے کہ یہ تکلف ہے جس سے بعض وقت اوروں کو بھی سخت تکلیف ہوتی ہے اور خود کو تو تکلیف

ہو نا ظاہر ہی ہے۔ ایک صاحب کے دوست ان سے ملنے کو گئے آواز دی جواب ملا بہت اچھا جواب دے کر انھوں نے آئینہ اور کنگھی منگا یا آدھ گھنٹے میں بن سنور کے نکلے یہ افراط ہے اور اسی طرح یہ نہ کرو کہ ایسے رہو کہ کپڑوں سے بدبو آوے میلے کچیلے ہو کہ اس سے بھی دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے چنانچہ فقہا رنے بدبودار کپڑے پہن کر یا بدبودار شئے مثل پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے کہ ایسے لوگ جماعت میں نہ شریک ہوں کتنا بڑا حرمان ہے کہ فضیلت جماعت سے بھی محروم رہے صاحبو علما رنے حقیقت کو سمجھا ہے جمعہ کو نہانا بدن صاف کرنا کپڑے بدلنا ضروری قرار دیا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ استری ہی کے کپڑے ہوں صابن بھی ضرور ہو اگر دھوبی کے یہاں کے یہاں کے بھی نہ دُھلے ہوں تو اپنے ہاتھ سے دھو کر صاف کر لئے جادیں پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال کی تعلیم فرمائی ہے تو خدا نے انبیاءؑ کو مال کا خازن بنایا ہے مالک نہیں بنایا اور اسی کا یہ اثر ہے جو فرمایا گیا ہے کہ نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِیَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ یعنی ہم انبیار کی جماعت نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں نہ ہماری وراثت کسی کو ملتی ہے کیونکہ وراثت تو جب ملے کہ ہم پہلے مالک ہوں ہمارے پاس تو جو ہے وہ وقف ہے اور فقرار و مساکین کا حق ہے۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول تھا کہ آپ کے خاتمہ کے ساتھ ہی مال بھی ختم ہو گیا اور اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ یہ ملک اموال دنیا کی ناقص ہے چنانچہ اس کا اثر مرض موت کے وقت ظاہر ہوتا ہے کہ ثلث سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا پس عدم ملکیت کا اثر اسی وقت سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے مگر حالت صحت تک ہمارے ضعف کے سبب ہماری تسلی کی اصل سے عدول کیا گیا چونکہ انبیار میں یہ عارض نہیں اس لئے علی الاطلاق ان کے لئے اُس اصل کو تجویز کیا گیا اور نیز اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ انبیارؑ کے ساتھ محبت فرض ہے اور محبت بغیر ایمان ہے نہیں تو اگر میراث ملا کرتی تو شاید لوگوں کو میراث اور مال کی محبت میں انبیارؑ کی موت کی تمنا ہوتی جو خلاف محبت ہے اس لئے اس کی جڑ ہی کاٹ دی اسی طرح لَا نُوْرَثُ (ہم کسی کے وارث نہیں ہوتے) میں بھی یہی حکمت ہے کہ شاید کوئی عزیز و قریب معاملات تقسیم میں ان سے اُلجھتا اس لئے یہ حکم قرار پایا کہ انبیاؑ نہ وارث ہوں کسی کے نہ اُن کا کوئی وارث ہو اور جو کچھ چھوڑا جائے وہ صدقہ ہے چنانچہ ارشاد ہے مَا تَرَکْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ (جو ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے) غرض خدا تعالیٰ نے اس سے اپنے دوستوں کو بچایا ہے تو باوجودیکہ دنیا ایسی مبغوض ہے مگر پھر بھی جب ہمارا چار پیسہ کا نقصان

بھی گوارا نہیں کیا کہ لکھ لیا کرو تو کیا رحمت ہے اور لیجئے یہ کس قدر رحمت ہے کہ اگر کوئی مالک نصاب مقروض ہو تو حکم ہے کہ قرضہ پہلے ادا کرو بندوں کا حق بندوں کو دو ہم اپنا حق یعنی زکوٰۃ ساقط کرتے ہیں انھیں دو ہمیں نہیں چاہیئے اللہ اکبر اس قدر رحمت کہ بندوں کے سامنے اپنا حق معاف فرما دیا مگر ہر موقع کو اس پر قیاس نہ کیجئے کہ ہر جگہ حق تعالیٰ کو حذف کردیا جاوے کیونکہ جس موقع پر حق عبد مقدم ہے تو اس حیثیت سے نہیں کہ وہ حق مستقل ہے بلکہ اس حیثیت سے وہاں حق اللہ اس طرح ادا ہوتا ہے کہ اس حکم کو مانو پس خواص اس حق عبد کو حق اللہ سمجھ کر بجا لائے اور اس کے ضمن میں مخلوق کا حق بھی ادا کیا بس ان کو تمام حقوق العباد میں اصل مطمح نظر حقوق اللہ ہی ہیں اور یہی شان ہوتی ہے عارفین کی کہ ان کی نظر میں مخلوق مرأۃ جمال ہوتا ہے ہے اس کی مثال آئینہ کی سی ہے جو محبوب کے سامنے رکھا ہے کہ وہاں ایک دو عاشق بھی کھڑے ہیں اور ایک مشتری بھی ہے یہ سب اس آئینہ کو دیکھ رہے ہیں مگر نظر میں دونوں کی تفاوت ہے مشتری آئینہ کو من حیث ہو مقصود دیکھ رہا ہے اور عاشق مِنْ حَيْثُ اَنَّهٗ مَرْآةٌ لِلْمَقْصُوْدِ (اس اعتبار سے وہ مقصود کے لئے آئینہ ہے) دیکھ رہا ہے لوگ ان حضرات کی حالت سنکر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ادھر اللہ سے واصل اودھر مخلوق میں شاغل مگر مثال مذکور سے خوب سمجھ لو کہ ان کو مخلوق کی طرف نظر کرنا مانع نہیں ہوتا مشغولیت بحق سے اور اس کی دوسری ایسی مثال ہے کہ کسی جماعت نے بادام بہت سے جمع کئے اور وہ روغن کے عاشق ہیں تو وہ محلہ میں مشین ڈھونڈتے پھریں گے مگر مشین کے طالب نہیں ہیں اسی طرح عارفین روغن معرفت کے عاشق ہیں اور مخلوق مشین ہے پس وہ اس مصنوع سے صانع کی معرفت کا روغن نکالتے ہیں اس مصنوع میں صانع کے مشاہدہ کی مثال میں ایک حکایت یاد آئی ہے کہ ایران کے شاہزادہ نے ایک مصرع کہا کہ ۔ ع

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود ؛ (چتکبرا موتی کسی نے نہ دیکھا ہوگا) دوسرا مصرع نہ موزوں ہوسکا، شعراء سے کہا مگر چونکہ مضمون مہمل تھا کسی شاعر سے بھی موزوں نہ ہوا دہلی بادشاہ کو لکھا کہ اس کا دوسرا مصرع موزوں کرا کے بھیج دیجئے۔ دہلی کے شعراء بھی نہ موزوں کرسکے مگر زیب النساء ایک دن سرمہ لگا رہی تھی اتفاقاً آنسو ٹپک پڑے تو دوسرا مصرع آنسو دیکھ کر موزوں کر دیا کہ ؎

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود مگر اشکِ بتانِ سرمہ آلود

(بجز سرمہ آلود مجنون کے اشک چتکبرا موتی کسی نے نہ دیکھا ہوگا)

اور بھیجدیا وہاں سے خط آیا کہ شاعر کو یہاں بھیجدو اس کے جواب میں زیب النساء نے لکھا ؎

درسخن مخفی منم چوں بوئے گل دربرگ گل ہرکہ دیدن میل دارد درسخن بیند مرا

(میں کلام میں مخفی ہوں جس طرح بوئے گل برگ گل میں مخفی ہے جس کو میرے دیکھنے کی خواہش ہے وہ مجھ کو کلام میں دیکھ لے)

مخفی زیب النساء کا تخلص ہے تو کیا آپ یہ تجویز کرسکتے ہیں مخفی کو تو سخن میں دیکھو اور ظاہر دیکھ نہ سکو اور خدا کو ظاہر دیکھ لو کسی میں طاقت ہے بس سوا اس کے کچھ نہیں ؎

ہرکہ دیدن میل دارد درسخن بیند مرا (جس کو میرے دیکھنے کی خواہش ہو کلام میں مجھ کو دیکھ لے)

فرماتے ہیں ؎ چیست قرآں اے کلام حق شناس ؛ رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

(اے کلام حق کو پہچاننے والے قرآن کیا ہے لوگوں کے رب کی طرف رب کا رونما ہے)

پس قرآن کو دیکھ لو کہ یہ اسی کا دیکھنا ہے اسی طرح مخلوق دیکھ لو مگر دیکھنا اپنے نفس کا نہیں غرض وہ لوگ بواسطہ مخلوق کے خالق کی معرفت حاصل کرتے ہیں کہ مخلوق کے واسطے سے حق تک پہنچتے ہیں وہ تو یہ سمجھ کر سب کے حقوق ادا کرتے ہیں سو ان کے دیکھنے پر اپنے دیکھنے کو قیاس مت کرو آپ کی حالت اور ہے اور ان کی حالت اور ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شَیر و شِیر یکساں ہیں)

یہ رفع تھا شبہ متعلق تقدیم حق عبد علی حق اللہ کا اور اصل مضمون رحمت حق کا تھا جس سے حق عبد حق اللہ پر مقدم کردیا اور اس سے پہلے مضمون تھا رحمت حق کا کہ ہمارے حقوق کی آیت تداینتم[لہ] میں کس طرح حفاظت فرمائی اور اس سے پہلے یہ تھا کہ ہر آیت میں رحمت کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس سے پہلے یہ تھا کہ ناگواری بھی رحمت ہے اور اس سے پہلے یہ تھا ناگواری سب کو

لہ یعنی آیت یا ایھا الذین اٰمنوا اذا تداینتم بدین الخ ۱۲ منہ

پیش آتی ہے اور یہی عماد مضمون تھا خلاصہ یہ کہ ناگواریاں سب کو پیش آتی ہیں اور چونکہ اس آیت میں اس کا علاج مذکور ہے جو کہ ضروری تھا اس لئے اس وقت بیان کے لئے اس کو اختیار کیا کہ اس کی حقیقت بتلا دوں کیونکہ اب یہ عادت ہے کہ جو ضیق پیش آتا ہے تو لوگ بجائے اس کے کہ اس کا علاج کریں اسی کا شغل کر لیتے ہیں اور علاج کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور شائد بعضے اس کو علاج ہی سمجھتے ہوں حالانکہ ضروری اور مفید اس کا حقیقی علاج کرنا ہے نہ کہ اس کو وظیفہ بنانا مثلاً کوئی مدقوق ہے تو اس کو چاہئے کہ حکیم کے پاس جا کر نسخہ لکھوائے نہ یہ کہ کہتا پھرے اَنَا مَدْ قوق (میں دق کا مریض ہوں) انا مدقوق اگر انا مدقوق کی تسبیح پر کفایت کرے گا تو بیس دن کے بعد درجہ ثالثہ میں پہونچ کر سمجھ میں آوے گا کہ نسخہ استعمال کرتا تو کچھ نفع بھی ہوتا اسی طرح ہم پر جو مصیبتیں آتی ہیں تو ان کے آزار کی تو فکر کرتے نہیں بس ان کا وظیفہ بنا لیتے ہیں اور فضول بکتے پھرتے ہیں۔ سو اس سے کیا فائدہ میں کہتا کرتا ہوں جتنے جملے ہیں دو قسم کے ہیں خبریہ، انشائیہ تو خبریہ تو اکثر فضول ہوتے ہیں اور انشائیہ اکثر مفید مثلاً یہ کہ میرا لڑکا بیمار ہے یہ خبریہ ہے۔ اگر اس کے ساتھ انشائیہ نہ ہو مثلاً یہ کہ نسخہ لکھ دیجئے تو یہ محض فضول ہوگا۔ پس جب منہ کھولا کرو تو پہلے سوچ لیا کرو کہ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں مثلاً اگر کہیں طاعون ہوا تو اب کہتے پھریں گے کہ طاعون ہو رہا ہے مگر اس کے ازالہ کی فکر نہ کریں گے۔ ایک بزرگ سے ایک شخص نے کہا کہ فلاں جگہ طاعون ہو رہا ہے فرمایا کہ یہ کیوں کہتے ہو اس سے مقصود کیا ہے وہ بھی تو کہو سو وہ مقصود جملہ انشائیہ ہوگا تو جملہ خبریہ اکثر غیر مقصود ہوتے ہیں یہ بھی ایک پہچان ہے لغو کلام کی اور لغو کلام سے بچنے کا حکم ظاہر ہے اور مثال لیجئے فرماتے ہیں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (کہو کہ خدا ایک ہے) اس میں توحید سکھلائی جس سے مقصود یہ ہے کہ فَاعْتَقِدُوْهُ (اس کا اعتقاد رکھو) بزرگوں کے پاس آجکل لوگ جاتے ہیں اسی طرح کی فضول باتوں میں اپنا اور اُن کا دونوں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ کہیں اخباروں کا ذکر ہے کہ زمینداریں بڑی ہمدردی ہے میں کہتا ہوں کہ تمہیں کیا تو اپنا جو کام ہے وہ تو کرتے نہیں اِدھر اُدھر کی فضول او لغو باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں حالانکہ اہم امور کی جانب توجہ ہونی چاہیئے کہ الاہم فالاہم مگر لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ خود اُن کے بدن پر تو سانپ اور بچھو لگے ہیں مگر دوسرے کے بدن کی

مکھی کو گاتے پھرتے ہیں پھر لوگ احمق نہیں تو کیا ہیں افسوس ہے میں اسی واسطے کہا کرتا ہوں کہ

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے محبت و عشق کی باتوں کے سوا کچھ نہ پوچھو)

فائدہ کیا ان لغو کاموں سے اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ کہ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دو گو وہ معصیت نہ ہوں کیونکہ یہ مفضی الی المعصیت ہو جاتی ہیں مگر ان کو اس کا شبہ بھی نہیں غرض خوبی اسلام کی یہ ہے کہ لغو کلام سے بچو۔ ایک بزرگ دیوبند میں تھے جن کی نگاہ اور آواز بھی بلا ضرورت نہ اٹھتی اور نہ نکلتی تھی تو وہ ہر فضول سے بچتے خواہ وہ کلام ہو یا نظر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر کی حدیث میں ہر لغو بات سے ممانعت فرمادی ہے۔ عام ہے کہ نظر ہو یا کلام ہو سب کو ممنوع فرمایا ہے اور نظر بھی بڑی بُری بلا ہے بعض نظر کی نسبت بزرگوں نے فرمایا ہے النَّظْرُ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِیْسَ (نظر ایک تیر ہے شیطان کے تیروں میں سے) حقیقت میں نظر بالکل تیر ہے جو نظر ہی نہیں آتا کہ کہاں اور کیسے لگا اور دل شکار ہو جاتا ہے شاعر کہتا ہے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشان زدۂ   بحیرتم کہ عجب تیر بیگمان زدۂ

(میرے سینہ کے اندر زخم بے نشان تو نے کیا ہے حیرت میں ہوں کہ بے کمان کے عجیب تیر تو نے مارا ہے)

تو ایسا کرے کیوں کہ زدہٗ کہنا پڑے بس نظر ہی ذرا نیچے رکھے اسی نظر کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں یَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ (وہ آنکھوں خائنہ کو جانتے ہیں) اور ان پر دزدیدہ نظر تو کیا مخفی ہوتی اس کی تو یہ شان ہے کہ آگے فرماتے ہیں وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (کہ وہ دلوں کی بھی باتیں جانتا ہے) اور اس میں باری تعالیٰ کو غیرت بھی آتی ہے کہ ہمارے غیر کو نظر محبت سے کوئی کیوں دیکھے اِلَّا بِاِذْنٍ (بجز اس کی اجازت کے) واقعی اس دل میں گنجائش غیر کی ہونا نہ چاہئے جیسے معبودیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ایسا ہی مقصودیت میں بھی نہ ہونا چاہیئے اور توحید حقیقی یہی ہے تو وہ بزرگ اتنا بچتے کہ نگاہ فضول نہ اٹھاتے اور کلام تو بہت بڑی چیز ہے غرض اس کو بھی چھوڑنا چاہیئے اگر کوئی خیرخواہ اس کو منع کرے کہ ناول بینی تو خیر مگر اُس میں اخبار بینی بھی داخل ہے اکثر مضامین ان کے خلاف شرع ہوتے ہیں۔ ایک شخص نے اسی قسم کا مضمون ایک اخبار سے نقل کیا تھا کہ اس میں کسی نے لکھا تھا کہ نماز کو

اسلام سے نکال ڈالا جائے تو بہتر ہے کیونکہ یہ مانع ترقی ہے اس لئے جو کوئی سنتا ہے کہ اسلام لاکر پانچ وقت نماز پڑھنا پڑے گا تو وہ متوحش ہو کر اسلام سے ہٹ جاتا ہے۔ علی ہذا ناول کہ صریح اور پھر مضر جھوٹ ہوتا ہے اور جھوٹ جیسے بولنا منع ہے ایسا ہی لکھنا اور سننا بھی تو منع ہے۔ میں نے ایک دفع چند سطریں اخبار بینی کے متعلق لکھدی تھیں اخباروں میں مجھ پہ بڑی لتاڑ پڑی اڈیٹروں نے ہر طرف سے بڑا غل مچانا اور چیخنا چلانا شروع کیا کہ اخبار بینی کو حرام کہتے ہیں حالانکہ میں نے اسی تحریر میں حلال و حرام اقسام کی تفصیل کر دی تھی میں نے کہا کہ اس سے میری ایک دلیل اور بڑھی کہ اخباروں میں ایسی تہمتیں ہیں ایک صاحب اخبار میں لکھتے ہیں کہ جب سے یہ طاعون ملاعون ہندوستان میں پھیلا ہے یہ ملاعون کو نسالغت ہے اس کی بالکل یہ مثال ہے جیسے کسی دیہقانی گنوار نے کہا تھا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پہ کھاٹ اس نے کہا تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولھو اس نے کہا واہ وزن تو ملا ہی نہیں تیلی نے کہا کہ بلا سے نہ ملے بوجھ میں تو مرے گا یہ تو اس جاٹ سے بھی گیا کہ یہ مہمل لغت لکھدیا پھر طاعون کو ملعون کہنا کیا گناہ نہیں یہ کیفیت ہے اخباروں کی۔ مگر آجکل تو عالم وہی ہے جو اخباروں میں مضمون لکھے تو اس طرح کے مضامین اخباروں میں شائع ہوتے ہیں کہ طاعون کو ملعون کہدیا حالانکہ حدیث میں اس کو رحمت فرمایا ہے اور اس میں جو مرے اس کو شہید فرمایا ہے تو خدا کی رحمت کو ملعون کہنا کتنی بڑی گستاخی ہے اگر کوئی کہے صاحب رحمت کیسے ہے تو دو طرح پر معلوم ہوتا ہے ایک تو یہ ہے کہ شہادت ہے یہ تو آخرت میں مشاہد ہوگی اور دنیا میں یہ مشاہدہ ہے کہ طاعون میں مرنے والے اور دوسرے مرض میں مرنے والے کو دیکھ لو تو تمھیں معلوم ہو جائیگا کہ زیادہ آثار خاتمہ بالخیر کے کس پر ہوتے ہیں طاعون میں مرنا اکثر ایسا دیکھا گیا ہے جیسا اولیاء کی وفات ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک اٹھارہ سال کا بچہ مولانا فتح محمد صاحب کی خدمت میں پڑھتا تھا دفعۃً بخار چڑھا اور تیز ہو گیا لوگوں نے اسی خیال سے کہ شکستہ دل نہ ہو اس سے کہا کہ تم کچھ خیال نہ کرنا اچھے ہو جاؤ گے۔ اس نے پیشانی میں بل ڈال کے کہا کہ یوں مت کہو اب تو خدا سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک لڑکا اسعد اللہ اس کا ہم سبق تھا اس کا ایک دن پیشتر دوسری بستی میں انتقال ہو چکا تھا لوگوں سے پوچھا وہ کیسا ہے سب نے کہدیا کہ اچھا ہے۔ اس نے عین وفات

کے وقت کہا تم بڑے جھوٹے ہو اس کا تو انتقال ہو گیا وہ میرے پاس بیٹھا ہوا ہے
ایک یہ کرامت اس کی دنیا ہی میں ظاہر ہوئی کہ عالم آخرت منکشف ہو گیا اور کشف بھی
صحیح تو اس کی وفات اولیاء اللہ کی سی وفات ہونے میں کیا شبہ ہے اسی طرح جتنے طاعونیوں
کو دیکھا سب کا خاتمہ اچھا ہوا۔ اس کو یہ ملعون لکھیں تو بتلایئے کہ جب اخباروں کی یہ حالت
ہو تو کیوں اس سے نہ روکا جائے مگر جو اس سے روکے اس کی کم بختی اس کی ممانعت میں قرآن
کی آیت موجود ہے وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ
يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔ (اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے یا جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے
ہیں اور ان کے اوپر حوالہ رکھتے تو اس کو وہ حضرات جو ان میں اس کی تحقیق کیا کرتے ہیں)
منافقین کی حالت بیان ہو رہی ہے کہ منافقین کی عجیب حالت ہے کہ اگر کوئی خبر ان کو پہنچتا
ہے اس کو بہت جلد اِدھر اُدھر شائع کر دیتے ہیں چاہے وہ خبریں پھیلانے کے قابل نہ ہوں
بتلایئے اخباروں کی یہی حالت ہے یا کہ نہیں پس جب اس کی ممانعت قرآن مجید سے بھی ثابت
ہو تو ہم کیوں نہ روکیں مگر یہ ان کے لئے ہے جو قرآن کے ماننے والے ہیں اور جو اس کو نہیں
مانتے تو اول میں اس سے خدا کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت منوا دوں گا
جب وہ اس کو تسلیم کر لے گا اس وقت قرآن مجید بھی اس کو ضرور ماننا پڑے گا پھر قرآن مجید
سے اس پر احتجاج ہوگا اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک جماعت باغی ہو جاوے
تو اول اس سے بادشاہ کا بادشاہ ہونا تسلیم کرایا جاوے گا پھر اگر اس کے بعد وہ کسی
حکم میں چون و چرا کرے گا تو اس سے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جب تم نے بادشاہ کی بادشاہی
تسلیم کر لی تو اب سنو کہ بادشاہ کا ہر حکم واجب الاطاعت ہوتا ہے اور یہ حکم بادشاہ کا
ہے بس اس کو بھی مانو اسی طرح جو قرآن کا منکر ہوگا اس سے اول توحید اور رسالت
کا ہم اقرار کرالیں گے اس کے بعد بھی اگر وہ انکار کرے کہ قرآن کلام خدا تعالےٰ نہیں تو
اس کو ہم دلیل اعجاز سے ثابت کر دیں گے پھر احتجاج کریں گے غرض یوں ہی
قصے ہو رہے ہیں یہ ہے ہماری حالت یہ تو عام خبریں تھیں اور اگر کسی نے اپنی ہی
حالت پر نظر کی تو وہ بھی بے قاعدہ ہے کہ کہتے پھرتے ہیں کہ اَنَا مَنْ فَوْقَ (میں دق کا

مریض ہوں) مگر علاج نہیں کرتے خلاصہ یہ ہے کہ اگر ناگواری پیش آئے تو بجائے اُس کو گاتے پھرنے کے اس کا علاج کرو اور علاج بھی ارزاں کچھ گراں نہیں ہے۔ اللہ میاں کا نسخہ حکیم محمود خاں کے نسخہ سے بھی گرا نہیں ہے طبیب کامل وہ کہلاتا ہے جو گھاس میں علاج کر دے چنانچہ خدائے تعالیٰ کے معالجہ میں ہلدی پھٹکری بھی نہیں لگتی بلکہ بہت ہی آسان ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کا دل ان کے اقوال سے تنگ ہوتا ہے آگے علاج بتلاتے ہیں کہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی تسبیح کیجئے حمد رب کے ساتھ اللہ کا نام لیجئے نفل پڑھئے یا ذکر کیجئے سب کو عام ہے وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ بالخصوص سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جئے اور یہ جو ہم نے بتلایا یہ تو دوا تھی چنانچہ فا تفریعیہ اس کا قرینہ ہے اب آگے فرماتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایک غذا بھی ہے کہ اگر پریشانی اور تنگدلی بھی نہ ہو تب بھی اس کو کرتے رہو یعنی وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ پس یہ غذا ہے کہ موت کے آنے تک عبادت کرتے رہو غرض اس آیت سے علاج و غذا دونوں باتیں معلوم ہوئیں۔ باری تعالیٰ نے یہاں تین صیغے اختیار کئے ہیں اور سب کا حاصل قریب قریب ایک ہے یہ صرف اختلاف عنوان ہے اور حاصل سب کا ایک ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰى وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ وَكُلٌّ اِلٰى ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(ہمارے عنوانات بیان مختلف ہیں مگر تیرا حسن ایک ہی ہے ہر عنوان اس حسن کی طرف اشارہ کرتا ہے)

بس عبارتیں مختلف ہیں اور حاصل سب کا ایک ہے یعنی مشغولی بحق خلاصہ یہ کہ اگر آپ پر تنگی آوے اور آپ کا دل تنگ ہو تو مشغول بحق ہو جئے یہ اس کا علاج ہے اول تو خدا تعالیٰ نے یہ علاج بتلایا ہے تو اب اس کے لِم کی تحقیق کی ضرورت نہیں دوسرے ہر چیز میں لِم ہونا ضرور بھی نہیں بہت سی چیزیں مؤثر بالکیفیۃ ہوتی ہیں مثلاً مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے تو کیوں اس کی خاصیت یہی ہے وہاں لِم کوئی نہیں پوچھتا اور اگر شریعت میں اس کو بتلایا جائے تو کہتے ہیں علت بتلاؤ وہاں کیوں نہیں علت پوچھی جاتی ایک شخص نے مجھ سے پوچھا نماز پانچ وقت کی کیوں فرض ہوئی اس میں کیا مصلحت ہے

یں نے کہا کہ تمہارے ناک آگے کیوں ہے پیچھے کیوں نہیں اس میں کیا حکمت ہے انہوں نے کہا کہ اگر پیچھے ہوتی تو بدنما معلوم ہوتی میں نے کہا کہ جب سب کے پیچھے ہی ہوتی تو کیوں بدنما معلوم ہوتی امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ افسوس ہے کہ اگر محمد ابن زکریا کچھ کہدے تو مان لیا جاوے اور اگر محمد بن عبداللہ کچھ کہیں تو اس کی تصدیق نہ کی جائے غرض جب یہ ثابت کردیا کہ حق تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے پھر ہمیں ضرورت نہیں کہ ہر ایک حکم کی علت بتلائیں بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس میں خاصہ یہی ہے جو خدا تعالےٰ کے ارشاد سے معلوم ہوا جس طرح طبیب کے کہنے سے ادویہ کا خاصہ معلوم ہوجاتا ہے بلکہ جو ادویہ موثر بالکیفیت کہلاتی ہیں اگر غور کیا جاوے تو وہ بھی مؤثر بالخاصیت ہی ہیں مثلاً برودت کا علاج اجزاء حارہ سے کرتے ہیں اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ علاج بالکیفیت ہے مگر غور کرتے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علت نہیں کیونکہ اول تو علاج بالمثل بھی ہوتا ہے تو وہاں علۃ کہاں گئی اور شفاء وہاں بھی ہوتی ہے معلوم ہوا کہ حرارت علۃ نہیں۔ دوسرے یہ کہ فالج زدہ کے لئے جو ادویہ گرم تجویز ہوں ان کا مزاج جس درجہ میں ہوتا ہے دوسرے میں یا تیسرے میں سو بہت سی ادویہ جو اسی درجہ میں گرم ہیں وہ دوائیں اگر دی جائیں تو وہ کیوں نہیں مفید ہوتیں اس کی وجہ پوچھو تو اختلاف خاصیت بتلایا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ وہ ادویہ مفیدہ بھی مؤثر بالخاصہ ہوتی ہیں کیفیت کا نام بدنام کیا جاتا ہے اور اگر تاثیر کیفیت کو مان بھی لیا جاوے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس کو بھی دخل سہی مگر اس میں محصور تو نہیں بس اگر اسی طرح ہم شرائع میں دعویٰ کریں کہ اس کی خاصیت یہی ہے تو کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا اور اس پر اکتفا کیوں نہیں کیا جاتا کہ قرآن میں ہے اور اس سے یہ نہ سمجھنا کہ علماء کو لم اور علل کچھ معلوم نہیں ہمیں سب کچھ معلوم ہے مگر اہل زمانہ کی رعایت ہے کہ بتلایا نہیں جاتا اور صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ قرآن میں ہے کیونکہ لم بتلانے سے اتنا نفع نہیں جس قدر مضرت ہے کہ رائے کا دروازہ کھلتا ہے سو ہمارے پاس سب کچھ ہے مگر بوجہ مذکور بتلانا مصلحت نہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہوجائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں ہے کہ معلوم نہ ہو)

مگر خیر ہم تبرعاً وجہ بھی بتلاتے ہیں سو وجہ اس یہ ہے کہ مشغولی بحق سے واقعات بھولتے ہیں اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ واقعات اتنے مؤثر نہیں ہوتے جتنا کہ مشغولی بواقعات مثلاً دو شخص فرض کیجئے کہ ان دونوں کے بیٹے مرگئے اب ایک نے تو بیٹھ کر وظیفہ رٹنا شروع کیا کہ ہائے بیٹے ہائے بیٹے اور ایک نے اتنا خیال نہ کیا چند دنوں کے بعد دیکھے گئے تو ایک سرخ وسفید اور ایک کا لازرد حالانکہ واقعہ ایک تھا معلوم ہوا کہ واقعہ مؤثر مشغولی سے ہوتا ہے اور بدون مشغولی کے طبعاً تو حزن ہوتا ہے مگر پریشان کرنے والا نہیں ہوتا پس تو معلوم ہوا کہ زیادہ پریشانی مشغولی سے ہوتی ہے پس اس علاج میں اس مشغولی کو دور کیا ہے اس طرح سے کہ مشغول بحق ہو جاؤ کیونکہ النفس لَا تَتَوَجَّہُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدٍ (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) اور اس کو سائنس والوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے تو عقلاً اور نقلاً یہ بات ثابت ہے کہ جب ہم مشغول بحق ہوں گے تو اس جانب سے توجہ گھٹے گی پس حزن کم ہو جاویگا تو عقلی طور پر بھی ثابت ہو گیا کہ دوسری طرف مشغولی علاج ہے ضیق کا آگے یوں سمجھو کہ جس طرف مشغول کیا گیا ہے جتنا محبوبیت میں قوی ہوگا اسی قدر اثر قوی ہوگا۔ اب یہ بات تحقیق کے قابل رہی کہ حق تعالےٰ زیادہ محبوب ہیں یا مخلوق تو دیکھ لیجئے کہ کسی سے جو محبت ہوتی ہے اس کی وجہ یا کمال ہے یا جمال ہے یا نوال ہے تو معلوم ہوا کہ محض ذات سے محبت نہیں کسی صفت کی وجہ سے ہوتی ہے تو اب دیکھو یہ صفتیں بالذات کس کی ہیں جس میں یہ اوصاف بدرجۂ اکمل ہوں گے وہ زیادہ محبوب ہوگا اب یہ رہ گیا کہ یہ اوصاف کس میں زیادہ ہیں تو اس میں مسلمانوں کو تو شبہ نہیں کہ سب سے زیادہ اور کمال کے ساتھ یہ اوصاف خدا ہی میں پائے جاتے ہیں اگر ظاہراً دوسرے میں ہیں بھی تو خدا میں بالذات ہیں اور غیر خدا میں بالعرض چنانچہ مخلوق میں بالعرض ہونا ہم آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ ہر شئے زوال پذیر ہے جو کل ساری دنیا پر حاکم تھے وہ آج تمام عالم کے محتاج ہیں جو کل حسن میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے ایک زمانہ ان پر وہ بھی آتا ہے کہ ان سے بدصورت دوسرا نہیں ہوتا الحاصل مخلوق کا اتصاف ان اوصاف کے ساتھ بالعرض ہے جن کو ہم اپنی آنکھوں دیکھ رہے ہیں اور خدا میں تمام یہ اوصاف بالذات علی وجہ الکمال ہیں اور بالعرض جو وصف ہوتا ہے وہ محتاج بالذات کا ہوتا ہے پس جب خدا میں یہ اوصاف بالذات ہیں تو ان کی محبوبیت قوی ہوگی

پس اگر محبوب جمال کی وجہ سے بنایا جاتا ہے تو خدا سے بڑھ کر کون جمیل ہے اور اگر کمال ونوال کی وجہ سے ہے تو خدا سے بڑھ کر کون صاحب کمال اور ذی نوال ہے بہر حال خدا سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں مگر لوگوں کو خبر نہیں اس لئے دوسری طرف مائل ہو جاتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص دیوار پر دھوپ دیکھ کر عاشق ہو جائے تو واقع میں تو آفتاب کا عاشق ہے لیکن اس کو خبر نہیں کہ نور آفتاب کا ہے اگر خبر ہو جاوے تو دیوار کی طرف التفات بھی نہ کرے اسی کو فرماتے ہیں ؎

عشق بامردہ نباشد پائدار　　　عشق را باحی و باقیوم دار

(مردے کے ساتھ عشق کو پائیداری نہیں ہے اس لئے اس حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے)

اور مخلوق کے ساتھ جو عشق ہوتا ہے انجام اس کا یہ ہوتا ہے ؎

عشق ہائے کز پئے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

عاشقی بامردگاں پایندہ نیست　　　زانکہ مردہ سوئے ما آیندہ نیست

غرق عشقے شو کہ غرق ست اندریں　　　عشقہائے اولین و آخریں

(جو عشق محض رنگ و روپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں بلکہ محض ننگ ہوتا ہے یعنی اس کا انجام حسرت و ندامت ہے مُردوں کے عشق کو بقا نہیں چونکہ مردہ پھر ہمارے پاس آنیوالا نہیں ہے عشق حقیقی میں غرق ہو جاؤ اس میں غرق ہونا اولین و آخرین کا عشق ہے)

آگے فرماتے ہیں کہ کسی کو یہ شبہ نہو کہ وہاں تک ہماری رسائی کہاں تو فرماتے ہیں کہ ؎

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　　برکریماں کارہا دشوار نیست

(یوں نہ خیال کرنا کہ بھلا ہماری رسائی اس دربار تک کہاں کیونکہ وہ کریم ہیں اور کریموں پر کوئی کام دشوار نہیں)

یعنی تم کو ہراس و نا امیدی نہ ہونی چاہیئے بہت آسان ہے ؎

یعلم اللہ دو قدم راہست دیگر بیش نیست　　　یک قدم برنفس خود نہ دیگرے بر کوئے دوست

(اللہ تعالیٰ جانتے ہیں راہِ سلوک دو قدم سے زیادہ نہیں ایک قدم اپنے نفس پر رکھ اور ایک دوسرا قدم

اور حاصل جواب کا یہ ہے کہ ہمارے کئے سے گو کچھ نہ ہوگا مگر وہ تو کریم ہیں وہ خود تم کو کھینچ لیں گے اور وصول دونوں طرح ممکن ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف　　گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(قسمت نے اگر یاوری کی تو اس کا دامن پکڑ لوں گا اگر میں نے اپنی طرف کھینچ لیا تو اچھا ہے اور اگر اس نے کھینچ لیا تو بہت ہی اچھا ہے)

البتہ طلب ادھر سے ہونا ضروری ہے پھر کام وہی بنا دیں گے اس کی ایسی مثال ہے کہ بچہ چل نہیں سکتا اور باپ کی طرف دوڑتا ہے آخر دو ایک قدم چلکر گر پڑتا ہے اور پھر دوڑ کر اس کو اس کا باپ گود میں اٹھا لیتا ہے تو یہ جو مسافت قطع ہوئی لڑکے کے چلنے سے نہیں مگر اس نے کوشش تو کی گو گر پڑا تو یہ مسافت درمیانی جس کی حالت یہ ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا جس طرح درخت انگور کو جتنا قطع کرو اور بڑھتا ہے) یہ ان ہی کے قطع کرانے سے قطع ہوگی اس لئے کہتے ہیں۔

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست　　بر کریماں کارہا دشوار نیست

(یہ مت کہو کہ ہماری رسائی اس دربار تک کہاں ہو سکتی ہے کیونکہ کریموں پر کوئی کار دشوار نہیں ہے اگرچہ تم اپنی کوشش سے نہیں پہونچ سکتے مگر وہ کریم ہیں اپنے فضل کرم سے تم کو رسائی عنایت کر دیں گے۔)

غرض محبوب حقیقی حضرت حق جل وعلا ہی ہیں مگر جن کو اطلاع نہیں وہ دیوار پر عاشق ہیں اور جب دھوپ گئی تو ہائے کیا ہوا جان نکل گئی۔

وہ چلا جان بھی چلی دو نوں برابر کھسکے　　اس کو روکوں کہ اسے پاؤں پڑوں کس کس کے (ج)

اور جن کی سمجھ میں آ گیا کہ جمال حقیقی اور کچھ ہے یہ تو محض پرتو اور عکس ہے اور مستعار ہے کسی اصل سے وہ یہ پڑھیں گے ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ　　پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

پرتو حسنت نگنجد در زمیں و آسماں　　در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

ترجمہ (اپنے حسن کو حسینوں کے چہرہ میں ظاہر کیا ہے عاشقوں کی آنکھ میں اپنے کو تماشہ بنایا ہے)
ان لوگوں کو کسی چیز سے پریشانی نہیں ہوتی اور حزن طبعی اور بات ہے اسی مقام پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہونچے تو فرمایا اِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ (اللہ تعالیٰ ہی زندہ ہیں جو نہیں مریں گے)
تو حقیقت میں محبوب حقیقی حق جل وعلا کے سوا کوئی نہیں پس اس میں جو جتنا مشغول ہو گیا اتنا ہی زیادہ اس کی تنگی دور ہو گی۔ بس خدا کی مشغولی دافع ہے تمام بلیات وصدمات ومضاً کے لئے اور یہاں سے مسئلہ تصور شیخ کا بھی حل ہو گیا کہ تصور شیخ کی ہر ایک کو اجازت نہیں کیونکہ بعضے اس کو مثل مقصود بالذات کے قرار دے کر تصور کرنے ہیں حقیقت اس کی صرف اتنی ہے کہ ذاکر مبتدی کو جو کہ مذکور کا استحضار نہیں کر سکتا۔ جب وساوس ستانے لگیں تو شیخ کا تصور کرلے کہ اس طرف متوجہ ہو جانے سے دوسرے تصورات دفع ہو جاویں گے مگر یہ تصور جو ہو تو نہ اس طرح کہ یہاں موجود ہے بلکہ اس طرح کہ فلاں جگہ میں شیخ سے ملا تھا کیونکہ یہ تصور کرنا کہ یہاں موجود ہے ایک تو ایک گونہ بے ادبی ہے کہ گویا شیخ اس کے پاس آکر حاضر ہو دوسرے جو اس سے مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ یہ خلاف واقع ہے اور خلاف واقع پر دھیان نہیں جمتا اور بے دھیان جمے وساوس دفع نہ ہوں گے پھر اس میں عقیدہ حاضر و ناظر کا بھی ہوگا اور اس میں احتمال شرک کا ہے غرض اس طرح سے تصور کرے چونکہ شیخ بہ نسبت اوروں کے زیادہ محبوب ہوتا ہے اس لئے حضرات صوفیہ دفع وساوس کے لئے اس کو تجویز فرماتے ہیں پھر جب خطرات دفع ہو جاویں تو اس تصور کو ترک کر دینا چاہئے خلاصہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے تصور کرلے کیونکہ مشغولی بشیخ عارضی ہے اصل مقصود تو حق تعالیٰ کی مشغولی ہے یہاں بعضے قلوب میں یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شیخ کی طرف جتنا ہمارا دل کھینچتا ہے خدا کی طرف نہیں کھینچتا تو اس میں مجکو گناہ ہوتا ہوگا تو سمجھ لو کہ یہ محبت طبعیہ ہے اور خدا کے ساتھ محبت عقلیہ زیادہ ہونی چاہیئے سو وہ حاصل ہے چنانچہ اس شخص سے اگر کوئی اس کا بڑا محبوب یہ کہے کہ اگر خدا سے تعلق رکھو تو ہم سے نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر ہم سے رکھنا چاہو تو خدا کو چھوڑ دو تو اس وقت یہ شخص یہی جواب دے گا کہ ہمیں تم سے تعلق رکھنا منظور نہیں۔

روز ہا گر رفت گو رو باک نیست تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنی چاہیئے اگر گئے بلا سے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک صاف ہے اسکا رہنا کافی ہے) پس وہ شبہ دفع ہو گیا خلاصہ یہ ہے کہ جب تنگی ہو تو فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی خدا کے ساتھ مشغول ہو اس مشغولی بحق سے تنگی جاتی رہے گی اب یہاں یہ بات ثابت ہو گئی کہ حق تعالیٰ کی یاد سے جمیعت دل ہوتی ہے اور یہاں جمیعت سے وہ مراد نہیں ہے جو ایک دوسری آیت میں مذکور ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں) یہاں پر اس کی تفسیر سیاق وسباق سے اور معلوم ہوتی ہے کہ اطمینان سے وہ اطمینان مراد نہیں جو ضیق کا مقابل ہے یہاں پر دوسرا اطمینان مراد ہے کہ جس کا ایمان نام ہے چنانچہ قرینہ سیاق بالوعدہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ ان کے رب کی طرف سے کیوں نہیں نازل کیا گیا آپ کہہ دیجئے کہ واقعی اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گمراہ کر دیتے ہیں اور جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کو اپنی طرف ہدایت کر دیتے ہیں) آگے فرماتے ہیں بطور مَنْ اَنَابَ کے بدل کے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یعنی مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے) جب یہ من اناب کا بدل ہے تو اس کے ساتھ متحد ہے اور من اناب بوجہ تقابل خیال کے بمعنے مہتدی و مومن ہے پس یہ اطمینان متحد ہوا ایمان کے ساتھ اور سیاق بالتحقیق یہ ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے خوشحالی اور نیک انجامی ہے) اور اصل معنی اطمینان کے سکون کے ہیں اور سکون دو طرح کا ہوتا ہے ایک سکون عقلی دوسرا سکون طبعی پس یہاں اطمینان سکون عقلی کے معنی میں ہے پس مقابل ضیق کا نہیں کیونکہ ضیق امر طبعی ہے پس یہ تو اطمینان کفر کے مقابل ہے پس طبعی نہیں اور قرآن میں دونوں استعمال موجود ہیں چنانچہ فرماتے ہیں وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ یہاں سکون عقلی ہے اور ایک جگہ طبعی ہے ابراہیمؑ کے قصے دعائے احیائے موتیٰ میں بعضے اس کی تفسیر نہ جاننے سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک کورٹ انسپکٹر یہ آیت دیکھ کر کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ وارشاد فرمایا کیا تم یقین لائے انھوں نے عرض کیا یقین کیوں نہیں لاتا لیکن یہ درخواست اس غرض سے ہے کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے) کہنے لگے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کو احیاء میں اطمینان نہ تھا شک تھا تو ان کے اس شبہ کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ

عہ قلب اس کا ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

اس آیت میں اطمینان کو مقابل شک کے سمجھے یعنی اطمینان عقلی سمجھ گئے سو یہاں بمعنی اطمینان طبعی مستعمل ہے اور شک کی نفی تو اَوَلَمْ تُؤْمِنْ (کیا تم یقین نہیں لائے) کے جواب میں ان کے بلیٰ کہنے سے ہو گئی اور حاصل اس بے اطمینانی طبعی کا یہ ہے کہ ان کو یہ تو یقین تھا کہ احیا ہو گا مگر اس کی کیفیت میں جو کئی احتمال تھے اور کسی کیفیت کا مشاہدہ نہ ہوا تھا اس لئے اس کی تعیینی میں تردد تھا اس کو عدم اطمینان فرمایا کیونکہ یہ اطمینان مشاہدہ ہی سے ہوتا ہے کہ طبعاً سکون ہو جاوے کہ یہ کیفیت واقع ہوئی ہے میں نے ان کو یہی جواب دیا بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے واقعی ترجمہ سے قرآن سمجھنا بہت مشکل ہے یہ اثر سدا ہوتا ہے محققین کے پاس رہنے سے ورنہ کتنا بڑا شبہ تھا ابراہیمؑ کو تو اطمینان نہ تھا تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ سے اور قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ادنیٰ مومن کو اطمینان حاصل ہے تو اس کو اتنا بڑا درجہ ملا کہ جو ابراہیمؑ کو بھی حاصل نہ تھا تو اس تحقیق سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اطمینان کے دو درجہ ہیں پس اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جو لوگ ایمان لائے) میں اطمینان قلبی مراد ہے وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (تاکہ میرے دل کو سکون ہو جائے) میں اطمینان طبعی اور ضیق کا علاج یہی اطمینان طبعی ہے جو مشغولی بحق سے پریشانی کے رفع کرنے میں موثر ہے گو اور بہت امور میں تردد کو رفع نہ کرے مثلاً احیاء موتیٰ کی کیفیت میں اب ایک اور قوی شبہ باقی رہ گیا وہ یہ کہ فرماتے ہیں اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے آپکی خاطر آپ کا سینہ (علم و حلم سے) کشادہ نہیں کر دیا) تو کیا شرح صدر کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگی معلوم ہوئی سو سمجھ لو کہ یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ (واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں آپ اس سے تنگدل ہوتے ہیں) سو ضیق کی دو قسمیں ہیں ایک تو یہ کہ جیسے عوام کو ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کبھی نہیں ہوا اور ایک یہ کہ نہایت ضعیف ہو سو یہ ہوا۔ مگر یہ شرح صدر کے منافی نہیں دیکھو آپ کچھ زکام ہو گیا اور وہ بھی معمولی تو آپ بھی مریض ہیں اور ایک مدقوق ہے وہ بھی مریض ہے مگر آپ کی بیماری عادۃً صحت کے منافی نہیں کیونکہ صحت غالب ہے بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ضیق بھی نہایت خفیف ہوتا تھا جو شرح صدر کے منافی نہیں اب ایک بات اور عجیب قابل تحقیق باقی رہی وہ یہ کہ اطمینان جب حاصل ہو گا تو آیا ضیق زائل ہو جائیگا یا مغلوب ہو جاوے گا تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ ضیق زائل نہیں ہوتا بلکہ مغلوب ہو جاتا ہے جس طرح انسان کے اندر سب اخلاط موجود ہیں تو جب صفرا بڑھ جاتا ہے مسہل کی ضرورت پڑتی ہے مگر مسہل صفرا کو بالکل نہیں نکال دیتا اور اگر بالکل صفراویت نہ رہے تو پھر خیریت نہیں حق تعالیٰ نے جب طبیعت عطا فرمائی ہے تو اس کے خواص لازمہ بھی عطا فرمائے ہیں ورنہ انتفاء لازم سے انتفاء ملزوم

ہو جاتا غرض زائل نہیں ہوتا ہے ہاں مغلوب ہو جاتا ہے اور اس تحقیق سے ایک بڑا ترددسالکین کا دفع ہوا وہ یہ کہ وہ بعض اوقات بعد مجاہدہ کے بھی بعضے امور طبعیہ مذمومہ کا اثر اپنے اندر پاتے ہیں اور اس سے مجاہدہ کے بیکار ہونے کا گمان کر کے مایوس ہو جاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر اخلاق ذمیمہ مغلوب ہو جاویں کہ ان کے اقتضاء پر عمل کرنے کو بآسانی ترک کر سکیں یہ کافی ہے زوال کی توقع نہ رکھیں ورنہ پھر ثواب اور فضیلت ہی کیا ہے یہ امور ذوقیہ تھے جو درمیان میں عرض کر دیئے گئے خلاصہ اور اصل مسئلہ یہی ہے کہ ضیق کا مشغولی بحق سے علاج کیا گیا ہے آپ خود بھی دیکھ لیجئے کہ مشغولی بحق سے پہلا واقعہ بھول جائیں گے یا نہیں اور میں یہ بتلا چکا ہوں کہ واقعہ پریشان ومحزون نہیں بناتا بلکہ مشغولی بواقعہ پریشان کرتی ہے اور مشغولی بحق سے وہ مشغولی تو رہتی نہیں اس لئے پریشانی نہ رہے گی مگر شاید کوئی کہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ مشغولی بحق کے بعد بھی واقعہ کی طرف توجہ رہتی ہے۔ سو جواب یہ ہے کہ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ واقعہ بالکل ہی یاد نہ رہیگا بلکہ اس کی طرف جو توجہ ہے وہ ضعیف اور مغلوب ہو جاویگی اور اثر مطلوب کے لئے یہی کافی ہے اور کمال بھی انسان کا اسی میں ظاہر ہوگا کہ موجود ذہن میں وہ بھی ہے پھر توجہ بحق کو اس پر غالب کر دیا مثلاً دو پہلوان کشتی کرنے کے لئے نکلے آپ بیچ میں آ گئے آپ نے ایک کو تو اُلٹے پاؤں بھگا دیا۔ دوسرا رہ گیا یہ تو کچھ کمال نہیں کمال قوت تو جب تھا کہ دونوں لپٹے رہیں اور آپ بیدار رہیں کہ جب ذرا ایک نے دوسرے کو گرانا چاہا آپ نے اس کو مغلوب کر دیا اسی طرح یہاں دو پہلوان ہیں مشغولی بحق مشغولی بواقعہ ان میں سے ایک پہلوان بھاگ گیا تو پھر آپ کا کیا کمال ہوا کمال تو یہ ہے کہ دونوں مستعد ہیں مگر جہاں ذرا اس نے اپنا اثر کرنا چاہا آپ نے فوراً اس کو مغلوب کر لیا متقین مبصرین کی یہی شان ہوتی ہے کہ جہاں ذرا شیطان نے اپنا اثر کرنا چاہا فَاِذَا ھُمْ مُبْصِرُوْنَ (پس اس وقت وہ مبصرین ہیں) کہ فوراً ان کی آنکھ کھل جاتی ہے اہل کمال کی یہی حالت ہوتی ہے اسی سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ کتنی ہی توجہ الی اللہ بڑھ جائے مگر پھر بھی میلان الی النساء اور محبت جاہ و مال ضرور رہتا ہے اور یہ تو انتہا تک ساتھ رہتا ہے تو توجہ الی اللہ سے توجہ الی الغیر کہاں زائل ہوئی تو یہ سمجھ کی غلطی ہے ہمارے ناقصین کی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پورے ولی وہ ہیں جو کچھ بھی نہیں کرتے نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے نہ ان کو کسی قسم کی خواہش ہوتی ہے تو یہ ولی کیا ہوئے جماد محض ہوئے نہیں کاملین میں سب کچھ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّمَا اَنَا

بَشَرٌ اَغْضَبُ کَمَا یَغْضَبُوْنَ (میں بشر ہوں غصہ کرتا ہوں جیسا کہ لوگ غصہ کرتے ہیں) وہ کھاتے بھی ہیں پیتے بھی ہیں جورو بھی رکھتے ہیں لیکن یہ سب جذبات ان میں مغلوب ہوتے ہیں کہ ان کو رضا حق سے نہیں نکلنے دیتے مگر جو ناواقف ہیں ان کو دھوکا ہو جاتا ہے اور وہ اسی خبط میں رہتا ہے کہ ایسے بزرگ سے مرید ہو کہ حسناً تصرف بھی ہو اور اگر کسی کو شیخ حسناً تصرف مل گیا اور اسکی تعلیم سے قدرے محویت کی حالت ہوگئی تو بس وہ بزعم خود نبی سی بھی بڑھ گیا اسی غلطی کے سبب لوگ جذب کو سلوک پر ترجیح دیتے ہیں استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جبتک ہم بے عقل و مدہوش رہے تو کمال ہی کیا صاحبو اللہ تعالیٰ کا نام تو ہوش بڑھانے کیواسطے لیا جاتا ہے نہ کھونے کے لئے ہاں اسکے دو طریقے ہیں کہ کبھی گھٹ کر بڑھتا ہے کبھی بغیر گھٹے اور یہ فرق مزاج کے اختلاف سے ہوتا ہے مثلاً ماء اللحم سے قوت بڑھتی ہے مگر ایک شخص کو تو ابتدا ہی سے دیدیا جاتا ہے جس میں مادہ فاسد نہ تھا اور ایک کو مسہل کے بعد دیا جاتا ہے جس میں مادہ فاسدہ ہو مگر مقصود سب کو قوت پہونچانا ہے اسی طرح جن کو ضرورت بیہوش کرکے ہوش میں لانے کی ہوتی ہے ان کو اول بیہوش کیا جاتا ہے پھر ہوش دیا جاتا ہے اور بعض کو اول سے ہی ہوش بڑھانا شروع ہو جاتا ہے۔ بہرحال استغراق خود مقصود نہیں۔ خواجہ عبید اللہ احرار فرماتے ہیں کہ استغراق میں قرب نہیں بڑھتا کیونکہ اسمیں عمل نہیں ہوتا جو مدار قرب ہے تو حقیقت میں جو ذی استعداد کامل ہیں ان پر نفسانی کیفیات طاری نہیں ہوتی ہاں روحانی کیفیات کہ جنکا اثر روح پر ہوتا ہے کاملین پر وہ کیفیات طاری ہوتی ہیں جن کا عوام کو پتہ بھی نہیں اور ان دونوں میں وہ فرق ہے جیسے گڑ اور فیرینی کی شیرینی میں کہ چمار کسی کی بیگار میں گئے اسنے فیرینی کھلائی تو چماروں نے ناک مار کر کھا تو لی مگر چودھری کہتا ہے یہ تھوک سے کیسے ہے اس کو مٹھائی مدرک نہیں ہوئی کیونکہ اسنے کبھی فیرینی کی بو بھی نہ سونگھی ہوگی اسکے نزدیک تو مٹھائی گڑ ہے تو واقعی جو سالکین متمنی کیفیات ہیں وہ دیہاتی گنوار ہیں میں تو کہتا ہوں کہ کام میں لگو کیفیات کی ہوس چھوڑو پھر دیکھئے کہ ایک دن وہ کیفیات نظر آئیں گی کہ مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ اَحَدٍ (نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی نہ کسی کے دل پر گذری) مگر تفصیلی تنبہ ان پر شیخ کے متنبہ کرنے سے ہوگا البتہ جمالی تنبہ اس پر اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ ابتدائے ذکر کے وقت جو کیفیت تھی اس کو نہ بھولنا پھر دو برس کے بعد دیکھنا کہ اب کیا حالت ہے خود تفاوت معلوم ہوگا تم چاہتے ہو آج ہی سب کچھ ہو جائے ایک بچہ کو دیکھئے کہ جتنا آج اتنا ہی کل دو ایک دن میں کوئی قابل امتیاز تفاوت نہیں ہوجاتا مگر اسی بچہ کو دس برس کے بعد دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہاں اس کو نشو و نما ہوا ہے غرض کیفیات روحانیہ تو ضرور ہوتی ہیں مگر کیفیات نفسانیہ ضرور نہیں کسی کو ہوتی ہیں کسی کو نہیں

چنانچہ بعضوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب غلبۂ ذکر ہوتا ہے تو بھوک پیاس تک جیس لگتی نیند نہیں آتی یہ سمجھا کہ یہ ثمرہ ذکر کا ہوا کہ سب چیز کی شہوت جاتی رہی خوش ہوا اس کے بعد جب کیفیت جوش کی گھٹی اور ان امور طبعیہ نے عود کیا تو مغموم ہے تو یہ ناواقفی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ جوش وخروش قائم نہیں رہتا حدیث میں ہے کہ ہر جوش میں ضعف ہوتا ہے ان جوشوں کے فرد ہونے کے بعد پھر روحانی کیفیت بڑھتی ہے وہ البتہ دائم ہوتی ہے ؎ خود قوی تر می شود خمر کہن ؛؛ خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب میں خود تیزی بڑھتی جاتی ہے خاصکر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہو)

ان کیفیاتِ نفسانیہ کا غلبہ عروج تھا اور ان کیفیات روحانیہ کا غلبہ نزول ہے غرض ان کیفیات نفسانیہ کے سکون کے بعد بعض آثار طبعیہ کا عود موجب اشتباہ نہ ہونا چاہیئے کیونکہ مقصود ازالہ طبعیات کا نہیں ہے عدم غلبہ کا ہی ہے بالکل لوگ پاگل ہو جاتے ہیں اسی کو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ زائل نہیں ہوتے بلکہ امور طبعیہ مغلوب ہو جاتے ہیں اور آیت میں جو علاج ہے اسکا یہی حاصل ہے کہ گو تنگی رہے مگر مشغولی بحق سے وہ موذی نہ ہے خود مشغولی بحق سے بھی اور اس استحضار سے بھی کہ یہ بھی من الحق ہے اس کو مثال سے سمجھئے آپ کے بدن میں ایک دشمن نے چٹکی لی تو جھلا گئے اور محبوب نے چٹکی لی تو آپ اپنے سے زیادہ خوش نصیب کسی کو نہ سمجھیں گے اور لیجئے ایک شخص نے آپ کو زور سے دبوچا تو تکلیف کس قدر ہو گی اور فرض کیجئے کہ آپکا محبوب اس طرح دبوچے تو بھی اسکا اثر بدن پر تو ضرور ہوگا مگر دل پر مسرت کے آثار نمایاں ہونگے بس ایک وہ تنگی ہے اور ایک یہ تنگی ہے مگر دونوں میں فرق زمین وآسمان کا ہے اسی طرح مشغولی بحق کی حالت میں بھی گو واقعات سے تنگی ہوتی ہے مگر یہ ایسی تنگی ہے جس سے دل مسرور ہے مثلاً اسی حالت میں جبکہ محبوب نے آپ کو بھینچ رکھا ہوا اور کوئی رقیب کھڑا ہوا وہ محبوب آپ سے کہے کہ اگر تکلیف ہوتی ہو تو مجھ کو چھوڑ کر اس کو لپٹ جاؤں تو آپ یہی جواب دیں گے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ؛؛ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

کبھی قیامت تک بھی اس پر راضی نہ ہو گے اسی طرح مشغولی بحق کی حالت میں بھی تنگی ہو مگر قلب و روح پر نہیں صرف طبیعت وجسم پر ہوتی ہے اور وہاں راستہ ہی نہیں ملتا کہ قلب تک پہونچے وہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِ التَّائِہٖ ؛؛ دھوی الاحبۃ منہ فی سَوْدَائِہٖ

ترجمہ (ملامت گروں کی ملامت تو دل کے چاروں طرف رہتی ہے اور دوستوں کی محبت سویدائے قلب میں ہے) یعنی محبت تو قلب کے اندر رہتی ہے اور ملامت باہر تو بس اس قسم کی تنگی رہ گئی ہے یہ حاصل ہے علاج کا اور اس علاج کو حق تعالیٰ نے بہت جگہ بیان فرمایا ہے ایک جگہ فرمایا ہے وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ (اور آپ اپنے رب کی تجویز پر صبر سے بیٹھے رہیئے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں اور اٹھتے وقت اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیا کیجئے اور رات میں اس کی تسبیح کیا کیجئے اور ستاروں کے پیچھے بھی) اور ایک جگہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ (اپنے رب کی تسبیح کیا کیجئے آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے بھی اور غروب ہونے کے بعد بھی) کیونکہ یہ علاج بہت نافع تھا اس لئے متعدد جگہ بتلادیا تاکہ غافل بھی اس سے غافل نہ رہے مگر افسوس اس کی قدر نہ کی اور وہ احمق جن کو تصنیف کا سلیقہ نہیں اس تکرار پر اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں تکرار ہے صاحبو مکررات قرآن میں عین شفقت ہے دیکھو ایک تو حاکم کا اعلان ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اعلان کردیا کہ کوئی گھر کے سامنے کوڑا نہ ڈالے اور ایک باپ کا کہنا ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ کہا نہ مانا پھر تنبیہ کرتا ہے پھر نہ ماننے پر کہتا ہے تو ان دونوں کے کہنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے باپ کا بار بار کہنا شفقت سے ہے اور اعلان حاکم میں شفقت نہیں تو قرآن مجید میں مکررات بوجہ شفقت خداوندی کے ہیں اور کیوں نہ ہو جبکہ اس کو ہم پر ہمارے والدین سے زیادہ شفقت ہے مگر افسوس تم نے اس شفقت کی قدر کی اور پھر اپنی خیر نہیں صاحبو اگر لفظی تکرار موجب نقص ہے تو تم اپنے اعتراض کو پچاسوں مرتبہ کیوں دہراتے ہو خیر یہ تو لطیفہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ تکرار محض شفقت کی وجہ سے ہے تو اس علاج کو شفقت سے حق تعالیٰ نے کئی جگہ بتلایا ہے میرا مقصود مستورات کے مجمع میں اس قسم کا بیان نہ تھا مگر اتفاق سے دقیق ہو گیا۔ خیر میں اب عورتوں کے متعلق کچھ بیان کرتا ہوں کہ اگر کچھ تنگی ہوا کرے تو اس کا علاج خدا کی یاد سمجھ لو اور اس کو دستور العمل بنالو کہ مثلاً جب چوری ہو جائے طاعون آجائے جو بھی شکایت ہو اس کا علاج یہ مت کرو کہ گاتے پھرو بلکہ خدا کی یاد سے علاج کرو اور یہ نہ سمجھنا کہ خدا کی یاد کرنا تیو الا ہی ہے جو ذاکر کہلاتا ہے نہیں بلکہ جس طرح ہو سکے ہر طاعت اس میں داخل ہے اور یہ بھی نہ کرو کہ زبان سے صرف سبحان اللہ سبحان اللہ رٹتے رہو اور دل پر اس کا اثر نہ ہو ایسی تسبیح کا معتد بہ اثر نہیں ہوتا ؎

برزباں تسبیح در دل گاؤ خر　　این چنیں تسبیح کے دارد اثر

(زبان پر تسبیح دل میں گاؤ خر یعنی دنیاوی خیالات ایسی تسبیح کب اثر رکھے)

بلکہ زبان سے قلب سے ہاتھ پاؤں سے سب سے ذکر کرو چنانچہ زبان کا تو ذکر یہ ہے کہ بہ کثرت تسبیح وتہلیل پڑھو اور قلب کا ذکر یہ ہے کہ اس کی نعمتیں یاد کرو اس سے یعنی تذکر نعم سے انفع اور کوئی طریقہ نہیں ہے موٹی بات ہے کہ نعمتیں مقدار میں مصیبتوں سے بڑھی ہوئی ہیں دیکھو اگر مرض بھیجا ہے تو اسکی دوا بھی پیدا فرمائی ہے

درد از یارست و درماں نیز ہم　　دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(درد بھی دوست کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی طرف سے ہے اس پر میرا دل بھی فدا ہے اور جان بھی)

یعنی درد بھیجا تو درمان بھی بھیجا فرض کرو اگر مرض ہوتا اور علاج نہ ہوتا دوا نہ ہوتی طبیب نہ ہوتا تیمار دار نہ ہوتے تو کچھ دشواری ہوتی یا نہیں ہمیں اپنے خدا سے محبت ہے تو ایسی حالت میں بھی کچھ نہ ہوتا پھر بھی ہمیں ہراساں نہ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ

درد از یارست و درماں نیز ہم　　دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(درد بھی دوست کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی طرف سے ہے اس پر میرا دل بھی فدا ہو اور جان بھی)

ہرچہ می گویند آں بہتر ز حسن　　یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

(اس کے حسن سے جو کچھ لوگ بیان کرتے ہیں وہ اس سے بہتر ہے ہمارا محبوب یہ رکھتا ہے اور وہ بھی)

اور پھر علاج کرنے والے بھی وہ کہ جو آپ کے مزاج شناسا تیمار دار ایسے نہ جو دل سے یہ چاہیں کہ میں بیمار ہو جاؤں اور یہ اچھا ہو جاوے تو ایسے معالج وخیر خواہ خدا نے پیدا کئے کہ اگر ہزار روپے بھی تنخواہ دی جاوے تو یہ ہمدردی ممکن نہیں کہ جو کہیں اس کے بجالانے کو تیار ہر طرح حاضر کہ جن سے ہر وقت قوت دل بڑھتی رہے کہ یہ خود بھی علاج ہے۔ چنانچہ بالاتفاق اور طبیب کہتے ہیں کہ قوت قلب سے مرض دفع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ والد صاحب نے مجھے الہ آباد سے کانپور لکھا کہ میں سخت بیمار رہوں تم چلے آؤ میں گیا تو دفعۃً آنکھیں کھول دیں اور پندرہ منٹ میں مجکو اپنی ساتھ بازار لے گئے کہ امرود یہاں کے بڑے نفیس ہوتے ہیں اور فرمایا کہ تمھیں دیکھ کر اچھا ہو گیا۔ حدیث شریف میں تاکید ہے کہ جب بیمار کے پاس

جاؤ تو تَفَسَّحُوا لَہٗ فِیْ اَجَلِہٖ یعنی اس کو تسلی دو کہ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے یا ابھی تمہارا وقت نہیں آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مریض کی عیادت کو تشریف لے گئے تو فرمایا لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰہ اس احمق نے کہا بَلْ حُمّٰی تَفُوْرُ اِلٰی الْقُبُوْرِ کیوں نہیں بڈھے آدمی کو بخار چڑھا ہے میں ضرور اچھا نہ ہونگا آپ نے فرمایا اچھا ایسا ہی ہوگا بالآخر وہ مرگیا فال بد ایک قسم کی نا امیدی ہے رحمت حق سے سو کبھی اس کا اثر بُرا ظاہر ہوتا ہے ہمارے وطن میں ایک لڑکی ہے بچپن میں جب اس سے کوئی کہتا کہ تیرا بیاہ کب ہوگا تو کہتی کہ بس کیا ہوگا آخر اس کے بیاہ کی ایسی مشکل پڑی کہ اللہ اللہ کرکے بڑی مدت میں ہوا (اس وعظ کے آٹھ مہینے بعد) مزن فال بد کارد حال بد: (فال بدمت لوکہ برا فال لاتی ہے)

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی کے لئے حکم فرمایا کہ طبیعت میں قوت بڑھے ایک اور بات مریض کی طبیعت کی رعایت سے فرمائی کہ مَنْ عَادَ مِنْكُمُ الْمَرِيْضَ فَلْيُخَفِّفِ الْجُلُوْسَ (یا او کوئی لفظ ہوں) یعنی مریض کے پاس تھوڑا بیٹھو کیونکہ طبعی بات ہے کہ بے تکلفی ہر ایک سے نہیں ہوتی اگر کوئی آ کر پاس بیٹھا تو اب مثلاً اس کی طرف پاؤں نہیں پھیلا تا پشت نہیں کرتا ادب کی وجہ سے اور اس سے اس پر بوجھ پڑتا ہے اور تکلیف ہوتی ہے فقہاءؒ نے خوب لکھا ہے کہ بعض لوگ بعض دنوں میں عیادت کو منحوس سمجھتے ہیں تو اس دن میں ان کی عیادت نہ کرو کیونکہ ایک تو اس وقت اس کو اذیت ہوگی دوسرے اگر اس کو کوئی ضرر پہونچ گیا تو اور زیادہ عقیدہ خراب ہوگا اور یہ وقت اس کے جہل کے علاج کا وقت نہیں یہ مرض کے علاج کا وقت ہے پھر دوسرے وقت سمجھا دینا مگر عیادت کے جلسہ میں غرض عیادت میں خلل کیوں ڈالتے ہو تو ہمارے فقہاء نے عجیب و غریب حقائق سمجھے ہیں واقعی فقیہ بننا ہر ایک کا کام نہیں کثرت روایت سے فقیہ نہیں ہوتا فقہ اس کا نام ہے حافظؒ نے خوب کہا ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ... نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(جو شخص بھی چہرہ کو آراستہ کرے لازم نہیں کہ دلبری بھی جانتا ہو جیسے جو شخص آئینہ بناتا ہو لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو یعنی جس نے کاملین کی وضع اختیار کی ضرور نہیں کہ کامل بھی ہو)

ہزار نکتۂ باریکتر ز مو اینجاست ... نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(یہاں بال سے بھی زیادہ باریک ہزاروں نکتے ہیں قلندری ہر وہ شخص نہیں جانتا جو سر منڈواتا ہو)

ہ؎ یہ کمال احتیاط بالروایت ہے ۱۲

صاحبو! یہ انھیں حضرات کا کام تھا کہ بخاری اور ترمذی سے مسائل استنباط کریں۔

غرض نعمتوں کے یاد کرنے سے بھی تنگی خاص طور پر دور ہوتی ہے اور قلب کی یہ بھی یاد ہے کہ وطن اصل کو یاد کرو کہ وطن اصلی کی یاد سے بھی تنگی دور ہو گی اور ہمارا وطن اصلی آخرۃ ہے تو مصیبت کے وقت آخرۃ کی باتوں کو یاد کرنا چاہیے وہاں کے ثواب و عذاب پر غور کرنا چاہیے فرماتے ہیں وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ (اور آخرت میں سخت عذاب ہے) وَمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگانی محض دھوکہ کا اسباب ہے) اور ایک جگہ ہے وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا لَھْوٌ وَّلَعِبٌ وَّاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (دنیوی حیات محض لہو و لعب ہے اور اصلی زندگی عالم آخرت ہے اگر ان کو اس کا علم ہوتا) یعنی اصل حیاۃ دار آخرۃ کی ہے اور حیاۃ دنیا عارضی ہے افسوس اس کو حیاۃ نہ سمجھا بلکہ اس کا نام موت رکھا البتہ جو لوگ حقیقت سمجھ گئے وہ یہ کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر ایں غم بسر آید روزے — تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(وہ دن مبارک ہے جس روز میں اس دنیائے فانی سے کوچ کروں راحت جان طلب کروں اور محبوب حقیقی کے لئے جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش و خرم اور شعر پڑھتا ہوا جاؤں)

؎ خوشا وقتے و خرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصل سے مستمتع ہو)

بس وہ موت سے خوش ہیں اس کی تمنا کر رہے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی ہے پھر یہ سوچو کہ یہاں کیا ہے یہاں عیش کا کون سا سامان ہے جو وہاں نہیں اور یہاں جو سامان ہے اس سب کا منغص کرنے والا خوف انقطاع ہے ؏ گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی ۔ بخلاف عیش آخرت کے کہ اگر معصیت نہ کی تب تو لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (نہ ان پر کچھ خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے) وہاں ہر سامان عیش موجود ہے فِیْھِمَا فَاکِھَۃٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ (ان دونوں باغوں میں میوے اور کھجوریں اور انار ہوں گے) اور فِیْھِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ لَمْ یَطْمِثْھُنَّ اِنْسٌ قَبْلَھُمْ

وَلَاجَانٌّ اور مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ (ان میں خوبصورت عورتیں ہوں گی وہ عورتیں گوری رنگت کی ہوں گی اور خیموں میں محفوظ ہوں گی ان لوگوں سے پہلے نہ کسی آدمی نے ان پر تصرف کیا ہوگا نہ جن نے وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے مشجر شاید کسی کو یہ شبہ ہوتا کہ اور تو سب چیزیں ہونگی مگر گہنا پہننا نہ ملے گا اور بعضوں کا تو یہاں بھی پہننے کو جی چاہتا ہے ایک مولوی صاحب بڈھے گوٹے ٹھپے کے کپڑے پہننے کی تمنا کیا کرتے تھے پنکھے میں گوٹہ ٹکوالیا کرتے تھے وجہ یہ تھی کہ نابینا سے بینا ہوئے تھے سو اللہ تعالیٰ نے زیور پہننے کی بھی خبر دیدی کہ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا کہ وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے) کہ خوب پہنو اب کیا چاہتے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہاں موتیوں کے مکان و باغ ہیں کہ جن میں نہریں جاری ہیں اور وہاں کی نعمتوں کا کیا بیان ہوسکتا ہے ان کی نسبت اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالَاعَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَاخَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی چیزیں تیار کیں ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں نہ کسی آدمی کے دل پر گذریں) اور جو کچھ نام و نشان آئے ہیں وہ صرف مشابہت پر مبنی ہے ورنہ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک :- اور وہاں ایک عجیب لطف ہوگا کہ بہت سے میوؤں کی صورت یکساں ہوگی اور مزہ مختلف چنانچہ ارشاد ہے وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا کہ جنت کے میوہ جات صرف رنگ و اسم میں متشابہ و مشترک مگر چکھنے کے بعد ممتاز اس میں ایک خاص لطف ہوتا ہے کہ سمجھے تھے کچھ نکلا کچھ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ دو شخص کسی امیر سے ملنے گئے ناشتہ کا وقت تھا اس نے باورچی سے کہا ناشتہ لاؤ ایک پر تکلف دسترخوان بچھا اور نہایت پتلی چپاتیاں آئیں قورمہ آیا ایک پیالہ میں اور ایک چھوٹی تشتری میں میٹھے چانول وہ اس مقدار قلیل کو دیکھ کر جل گئے اور جلدی جلدی جو کچھ سامنے تھا سب صفاچٹ کر گئے جب کھا چکے تو باورچی نے کہا یہ پیالہ اور تشتری بھی کھالیجئے وہ یہ سمجھے کہ تمسخر کرتا ہے ناخوش ہوئے اس نے معافی چاہکر پھر کہا توڑا تو نمکین بالائی اور میٹھی بالائی تو صاحبو جب دنیا میں ایسے لطائف وغرائب ہیں تو وہاں کے لطائف کسی سے بیان ہوسکتے ہیں وہاں اسی قسم کے انار ہوں گے کہ جن کو توڑتے ہی اس میں سے حور نمودار ہو گی اور نکل آئے گی۔

جب میں کانپور میں تھا تو ایک شخص شاہ عبد اللطیف صاحب کے پاس حاضر ہوا تھا مدرسہ میں آکر کہنے لگا کہ میں ایسا عمل جانتا ہوں کہ ابھی دیوار شق ہو جائے اور اس میں سے ایک عورت نکلے جو غزل اس سے آپ کہیں وہی گا دے گی ہم نے اس کو بہت عجیب سمجھا تھا وہاں رات دن ایسا ہوا کرے گا۔ غرض ساری چیزیں عیش و عشرت کی وہاں موجود ہیں خدا جزائے خیر دے اہل سنت کو کہ کتاب و سنت سے ثابت کر دیا کہ لگا ہوا باغ یہ نہیں کہ لگیگا اس سے جو تسلی ہو سکتی ہے وہ بھی رافع ضیق ہے اسی طرح کے حور و قصور اور میوے وہاں تیار ہوں گے بعض روایات میں تصریح ہے فرماتے ہیں اَلْجَنَّۃُ قِیْعَانٌ وَغِرَاسُھَا الْعَمَلُ الصَّالِحُ (جنت میدان میں اور پودے لگانا اس نیک اعمال کا ہے) اب ایک اور نعمت باقی رہ گئی کہ سب کچھ ہوگا اور اس کے ساتھ سب سے بڑھ کر خلود ہوگا کہ تم لیتے لیتے تھک جاؤ گے مگر ان کی نعمتیں ختم ہی نہ ہوں گی سو تمھارا وطن اصلی یہ ہے اور وہ دن بہت دور بھی نہیں کہ جب قیامت آوے گی تب ملے گا نہیں بلکہ مرتے ہی مل جاوے گا مگر شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ مرنے کا تصور تو منغص ہے تو اس کا تصور یوں کیا کرو کہ ایک کمرہ ہے ہم اس کی چھت کے نیچے ہے اور جنت اس کی چھت پر ہے اور وہ کمرہ آسمان ہے بس یہاں سے وہاں چلے جائیں گے مرنا کیسا رہا یہ خیال کہ وہ بڑی دور ہے وہاں تک رسائی کیسے ہوگی تو اس سے بے فکر رہو سرکاری اور قدرتی ریل گاڑی تم کو دم کے دم میں پہونچا دیگی اب ایک خیال اور ہوگا کہ دنیا میں تو ایسے ہیں جیسا کہ پاخانہ میں اور پھر اس میں آلودہ بھی ہو رہے ہیں تو یہاں سے نکل کر فوراً کیسے جنت میں پہونچ جائیں گے تو سنو کہ وہاں نہر الحیوۃ و حمام ہے جھٹ غسل دے کر حکم ہوگا کہ لے جاؤ باغ میں مگر خدا کے واسطے کہیں باغ والے کا انکار نہ کر دینا اور نہ باغ کی خبر دینے والے کا تو حق تعالیٰ کی یہ نعمتیں ہیں ان کے سوچنے کے بعد کوئی مصیبت نہیں رہتی اور یہ طریقے ہیں حُبِ دنیا گھٹانے کے کہ اس سے دنیا کی بے وقعتی ذہن نشین ہوتی ہے اور آنکھیں کھل جاتی ہیں اور جن کی آنکھیں کھل گئیں وہ یہاں کے مال و جاہ کو بے وقعت سمجھ کر یہ کہتے ہیں ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی　　بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بجاں　　شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ عشق الٰہی میں مٹ جاوے زر و مال کے حشمت اور دبدبہ میں قارون سے بہت بڑھ جا محبوب حقیقی کی راہ میں جان کو سیکڑوں خطرات ہیں اس راہ میں قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ مجنون بجا)

اور کہتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ کردم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

اور فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش دگر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور اگر دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب اور اسکی محبت کے متوالے ہیں)

اور حضرت اہل محبت سے یہ بعید نہ سمجھو دیکھئے دنیا میں جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کی طلب میں کتنی ہی ذلت اٹھانی پڑے سب گوارا ہوتی ہے بلکہ جب دیکھتے ہیں کہ اسی کے تصرف سے ہے تو پھر احتمال بھی ناگواری کا نہیں ہوتا اسی کی نسبت کہتے ہیں ؎

از خدا ازان خلاف دشمن و دوست
کہ دل ہردو در تصرف او ست

(خدا کی طرف سے ہر دوست کی مہربانی اور دشمن کی دشمنی کہ دونوں کے دل پر اسی کا تصرف ہے)

بس یہ تو سب مشینیں ہیں جو کہ کسی کے چلانے سے چلتی ہیں اور بدون اس کی اعانت کے بیکار محض ہیں لیکن جس نے اصل چلانے والے کو نہیں دیکھا وہ سمجھ رہا ہے کہ انھیں سے آٹا پستا ہے مگر اہل معرفت سمجھتے ہیں کہ ان کی رفتار عارضی ہے اصلی نہیں ہے یہ اپنی رفتار میں غیر کے محتاج ہیں ؎

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے　　یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے
یک دہاں نالاں شدہ سوئے سما　　ہائے ہوئے درفگندہ در سما
ما چو چنگیم و تو زخمہ میزنی　　زاری از ما نے تو زاری میکنی

ہم بانسری کی طرح دو منہ رکھتے ہیں ایک منہ تو اس کے لبوں میں پوشیدہ ہے

اور ایک منہ نالا ہو کر آسمان میں ہائے ہو ڈلے ہوئے ہوائے اللہ ہماری مثال چنگ کی سی ہے اور آپ گویا مضراب مار رہے ہیں یعنی ہمارے کے خالق آپ ہی تو ہیں گو ظاہر میں افعال ہم سے زرد ہو رہے ہیں مگر موثر حقیقی واقع میں آپ ہی ہیں تو اس بنا پر اگر ہم زاری کریں تو وہ ہماری طرف سے حقیقۃً نہیں ہے بلکہ گویا آپ اسی فعل کو کر رہے ہیں باعتبار موثر خالق ہونے کے)

اور فرماتے ہیں ؎

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم ۔۔۔ حملہ شاں از باد باشد دمبدم
حملہ شاں پیدا و ناپیدا ست باد ۔۔۔ آنچہ ناپیدست ہرگز کم مباد

اور فرماتے ہیں ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں ۔۔۔ یار بیروں فتنۂ او در جہاں

(یعنی ہماری ایسی مثال ہے جیسے پرچم کا شیر ہوتا ہے ہوا چلنے سے حملہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے یعنی ہمارا تصرف تصرف حق کی وجہ سے ہے ان کا حملہ نظر آتا ہے ہوا نظر نہیں آتی آگے بطور دعا کے فرماتے ہیں۔ جو چیز نظر نہیں آتی یعنی موثریت حق وہ ہمارے دل سے کبھی کم نہ ہو یار تو جہان سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا۔)

غرض سب کچھ ادھر ہی سے ہے مصیبت ادھر سے دُکھ اُدھر سے مگر یاد رکھو کہ محبت پیدا کر لو بس سب مصیبتیں آسان ہیں۔ ؏ از محبت تلخہا شیریں شود :۔ (محبت میں تلخیاں بھی شیریں ہوتی ہیں) ورنہ پھر مصائب کفر کا پھاٹک ہے اور اس محبت پر میں خوشخبری دیتا ہوں کہ جن کو محبت ہے اپنے اللہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے بھی محبوب ہیں یُحِبُّہُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ :۔ اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں ؎ آب کم جو تشنگی آور بدست ۔۔۔ تا بجوشد آبت از بالا و پست
تشنگاں گر آب جویند از جہاں ۔۔۔ آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پانی مت تلاش کرو پیاس پیدا کرو تاکہ بالا و پست سے پانی موج زن ہو پیاسے اگر پانی تلاش کرتے ہیں تو پانی بھی پیاسوں کو تلاش کرتے ہیں)

تو جب ہم اللہ کو اپنا محبوب بنالیں گے تو اللہ ہمیں اپنا محبوب بنالیگا تو محبت اُدھر سے بھی ہو گی مگر فرق یہ ہے محبوب کا عشق خفی ہوتا ہے اور عاشق کا عشق ظاہر کہ عاشق تمام عالم میں غل مچا دیتا ہے باقی یہ بات کہ یہ کیسے

معلوم ہوگا کہ اللہ کو بھی ہم سے محبت ہے تو اس کی علامت یہ ہے کہ قلب میں باری تعالیٰ ایک تعلق اپنے ساتھ پیدا کر دیتے ہیں جس سے ذکر و طاعت آسان ہو جاتا ہے بس یہی علامت ہے کہ ہم بھی مقبول و محبوب ہیں۔ حضرت حاجی صاحب نے قبول عبادت کی یہ علامت بتلائی ہے کہ جب پھر اسی کے کرنے کی توفیق ہو تو سمجھ لو کہ پہلی عبادت مقبول ہوگئی ورنہ دروازہ پر پھٹکنے ہی کیوں دیتے۔ مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کوئی عابد تھا ایک بار مایوس ہو کر کہ وہاں سے کچھ پتہ ہی نہیں ملتا سو رہا، فرشتہ آیا اور کہا ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　　ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(فرمایا وہ تیرا اللہ کہنا ہی ہمارا جواب ہے اور یہ تیرا سوز و نیاز اور درد ہمارا قاصد ہے)

تو یہ درد و شوق ہمارا قاصد ہے اور یہ علامت ہے کہ خدا کو محبت ہے یہ ہے علاج مصائب کا صاحبو بڑے بڑے عقلاء یوں سمجھتے ہیں کہ رونے سے نفع ہوگا مگر فی الحقیقت جو ہم بتلاتے ہیں اس سے نفع ہوگا اور تسلی اسی سے ہوگی یعنی مشغولی و توجہ بحق یہ ہے تسلی کا سرمایہ بات تو مختصر تھی مگر تمہیدوں میں لمبی ہوگئی مگر یہ طول سب جھالرا و رچین تھے اگر یہ نہ ہو تو کپڑا تو ہو یعنی اصل مقصود وہ یہ کہ جب مصیبت آوے خواہ عام جیسے طاعون یا خاص جیسے کوئی مقدمہ پس اگر تم نے یہ طریقہ مشغولی و تعلق بحق اختیار کیا جو میں نے بیان کیا تو وہ مثال بہلول کی مخاطب بزرگ کی صادق آوے گی کہ بہلول نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے کہا کہ ایسے شخص کے مزاج کا کیا پوچھنا کہ تم مخلوق اس کی خواہش کے موافق چلتی ہو کوئی کام اس کے ارادہ کے خلاف نہ ہوتا ہو بہلول نے شرح پوچھی فرمایا کہ میں نے اپنے ارادہ کو اس کے تابع کر دیا ہے جس کے حکم بدون ایک ذرہ نہیں ہل سکتا تو جب اپنی خواہش کو اس کے ارادہ کے تابع کر دیا تو جو واقعہ اس کے ارادہ کے موافق ہوگا میرے ارادہ کے بھی موافق ہوگا پھر غم کہاں۔ یہ توکل و رضا ہے کہ جو کچھ ہوگا یہی سمجھو گے کہ بہت مناسب بہت بہتر پس لامحالہ وہ حالت ہو جاوے گی جو ان بزرگ کی سُنی اور واقعی اگر غور کرو تو بلاؤں میں بھی نعمتیں ہیں جب رضا و اطاعت اختیار کرو گے ان مصائب کے اسرار بھی منکشف ہو جاویں گے

جس سے اور تسلی ہوگی۔
اسی انکشاف کو مولانا فرماتے ہیں۔

بینی اندر خود علوم انبیا
بے کتاب و بے معید و اوستا
(اپنے اندر بے کتاب وبغیر مددگار اور استاد انبیا جیسے علوم دیکھوگے)

منجملہ اسرار بلا کے ایک وہ ہے جو تفسیر مظہری میں ایک حدیث سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعضے میرے بندے ایسے ہیں کہ اگر ان کو تندرست و متمول رکھوں تو وہ کفر کرنے لگیں چنانچہ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ (البتہ زمین میں بغاوت کریں) اس حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں۔ وَذٰلِكَ بِاَنِّيْ اَعْلَمُ بِعِبَادِيْ (یہ اس لئے کہ میں اپنے بندوں کو خوب جانتا ہوں) بعض کی نسبت ارشاد ہے وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ (اگر میں اپنے بندوں کے لئے روزی میں کشادگی کردوں) جیسا حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑا تھا، بظاہر کوئی مصلحت نہ تھی چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا مگر اس میں کتنی بڑی مصلحت نکلی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حکمت و مصلحت سے بھرا ہوتا ہے۔ فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ (حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا)

چنانچہ ایک مصلحت یہ ہے کہ اہلِ مصیبت کو وہ وہ درجے ملیں گے کہ اغنیاء یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہمارا بدن قینچیوں سے کاٹا جاتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود بلا مانگو تم تو عافیت ہی مانگو اگر وہ مراتب اور عافیت دونوں دیدیں تو ان کے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیماری سے بچنے کی بھی دعا مانگتے تھے اور عافیت کی بھی تم بھی ہر مراد مانگو مگر ساتھ ہی یہ نیت کرو کہ اگر حاصل ہوگئی تو شکر کی توفیق عطا ہو اور اگر حاصل نہ ہو تو شکایت نہ ہوگی۔ پس ایسا شخص ہمیشہ ہر حال میں

تسلی کے ساتھ رہتا ہے۔ حضرت ایک شخص جھونپڑوں میں محلوں کے خواب دیکھتا ہے گو ظاہر میں وہ خستہ حال ہو مگر حقیقت میں وہ بادشاہ ہوتا ہے فرماتے ہیں ایسا شخص تمام لوگوں کی نظروں میں محبوب ہو جاتا ہے اور گو ظاہر میں اس کے پاس ساز و سامان نہیں ہوتا ہے مگر حقیقت میں ان کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ۔۔۔ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

اور کہتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم ۔۔۔ شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(گدایانِ عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ شاہان بے تخت و تاج ہیں)

پس حاصل علاج کا یہ ہوا کہ نا فرمانیاں بالکل چھوڑ دو دعائیں مانگو ہر نتیجہ پر راضی رہو یہ ہے وہ نسخہ جس کو حق تعالٰی نے ذکر فرمایا ہے اس کے استعمال سے یہ گو ضروری نہیں کہ تنگی زائل ہو جاوے مگر مغلوب ضرور ہو جاوے گی جس سے وہ کالعدم ہی ہو جاویگی دیکھو کوزہ کی مصری میں جو تنکا ہوتا ہے وہ بھی مصری کے بھاؤ بکتا ہے تو اگر کچھ ضیق رہا بھی تو اس میں بھی لطف ہوگا۔ چنانچہ عارف کو تکلیف میں بھی ایک لطف ملتا ہے اب چونکہ بعضے ایسے لوگ تھے کہ تنگی کے وقت تو عبادت کرتے ہیں لیکن جب تنگی دور ہو جاتی ہے تو چھوڑ دیتے ہیں اس لئے آگے فرماتے ہیں کہ ایسا نہ ہونا چاہئے بلکہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تم کو موت آجائے) کہ موت آنے تک کرتے رہو۔ بعض جہلاء نے اس کے تعبیر میں کہا کہ یقین آنے تک عبادت کرو پھر چھوڑ دو لیکن خود عقل کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ جب یقین آجائے تو زیادہ کرنا چاہیئے۔ موٹی بات ہے کہ اگر کسی کے سامنے پلاؤ کی رکابی آئے اور اسے یقین نہ آئے کہ پلاؤ ہے اس وقت تک رک رک کر کم کھائے گا، لیکن جب یقین آجائے تو اور دل کھول کر زیادہ کھائے گا مگر یہاں عجیب بات ہے کہ جب یقین آجائے تو چھوڑ دو عجیب بات ہے۔ غرضیکہ یہ مہمل معنی عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے خلاف ہونا تو بہت ظاہر ہے کیونکہ محاورہ عربی میں یقین آنے کے معنی میں تیقن آتا ہے ایتان یقین نہیں آتا تو اگر یہ مراد ہوتی تو یوں فرماتے حتی تیقن غرض یہ معنی بالکل مہمل ہیں اور یہاں یقین کے

معنے موت ہیں تو معنی یہ ہوئے حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْمَوْتُ (یہاں تک کہ ہمکو موت آجائے) اور موت کو یقین اس لئے کہا کہ وہ یقینی ہے۔ سبحان اللہ اس آیت میں دوا و غذا دونوں کو جمع کر دیا جیساکہ میں نے مفصل بیان کیا۔ مگر اس علاج سے علی سبیل الکمال منتفع ہونے کے لئے۔ بزرگوں کی صحبت کی سخت ضرورت ہے۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر تو سنگ و خارہ و مرمر شوی
چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی

(اگر تو پتھر سخت اور سنگ مرمر ہو جب کسی صاحبدل کی صحبت پہونچیگا گوہر ہو جائیگا)

اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ مکمل نسخہ کو برتنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بالخیــــــــــــــــــــــــر تمتـــ

ضروری معروضہ

الحمد للہ تعالیٰ ثم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۱۹۸۴ء کے رسالہ الابقاء پر آپکا زر رسالہ ختم ہو گیا۔

۱ ڈاک خانہ نے وی پی رجسٹری وغیرہ کا خرچہ دُگنا کر دیا ہے۔ الابقاء بذریعہ وی پی منگانے سے آپکے چار روپے کا نقصان ہے۔ لہٰذا زرِ رسالہ منی آرڈر سے ارسال فرماکر اپنے چار روپے بچالیں اور اپنے چار روپے کا نقصان نہ کریں۔

۲ جدید سال ۱۹۸۵ء کے لئے **پچیس** ۲۵ روپے براہ کرم آج ہی ارسال فرمادیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

۳۔ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک یا دو دو خریدار کا بھی زر رسالانہ ارسال فرمادیں تو اس خالص دینی، تبلیغی، اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو مل جاوے گا۔

امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ثم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یہ تینوں عرضیں قبول فرمادیں گے۔

جزاکم اللہ تعالیٰ والسلام

طالبِ دُعا محمد عبد المنان عفی عنہ مکتبہ تھانوی بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تعالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

حقیقۃ الصّبر

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم-اے جناح روڈ کراچی ۱

اطلاع ضروری:- خط وکتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

حقیقۃ الصبر

این	کہاں ہوا	تھانہ بھون مکان شیخ رشید احمد صاحب متصل عدالت والی مسجد
متٰی	کب ہوا	۲۴ محرم ۱۳۴۲ھ بروز جمعہ شروع ۷ بجکر ۲۵ منٹ
کم	کتنی دیر ہوا	۲½ گھنٹے (۹ بجکر ۵۰ منٹ پر ختم)
کیف	کس طرح ہوا	تخت پر بیٹھ کر
لم	کیوں ہوا	صاحب مکان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا بطور تعزیت کے بیان ہوا
ماذا	کیا مضمون تھا	مصیبت پر صبر کرنے کی حقیقت ہے کہ رنج طبعی کو عقلی کی حد تک پہونچاؤ اور اعمال میں نقلیں نہ کریں۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا۔	اہل مصائب کو خصوصاً اور اصحاب تحریکات خاصہ کو عموماً
من ضبطہ	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ وکان لہٗ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مجمع رجال تقریباً ۳۰ اور عورتوں کا مجمع پردہ میں اس کے علاوہ تھا۔
الاشتات	متفرقات	حضرت مولانا پر دھوپ آگئی تھی سامعین کو بھی دھوپ سے تکلیف ہونے لگی اس لیے بیان جلد ختم کر دیا گیا مضمون باقی رہ گیا تھا جسکو تیسرے دن بروز یکشنبہ مدرسہ میں پورا کیا گیا اسکا نام ما علیہ الصبر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ
اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۵

(اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے کہ ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ ہی کے پاس جانے والے ہیں ان لوگوں پر خاص خاص رحمتیں ان کے پروردگار کی طرف سے ہونگی اور عام رحمت بھی ہوگی اور یہی لوگ ہیں جن کی رسائی ہو گئی)

شاید اس آیت کو سن کر کسی کو یہ شبہ ہوا ہوگا کہ اس وقت کسی خاص مصیبت کے متعلق صبر کی تعلیم کی جائے گی اور وجہ اس شبہ کی یہ ہے کہ انا للہ اکثر ایسے ہی مواقع میں پڑھا جاتا ہے جہاں کوئی موت کا واقعہ ہوگیا ہو۔ مگر میرا مقصود اس وقت یہ نہیں ہے۔ گو اگر یہ مقصود ہو تب بھی غلط نہیں کیونکہ بعض واقعات اس گھر میں ایسے ہوئے بھی ہیں۔ مگر مجھ کو صرف مضمون تعزیت کا بیان مقصود نہیں کیونکہ اس کا بیان بارہا ہوچکا ہے۔ مصیبت کے وقت صبر کی ضرورت کو سامعین بارہا سن چکے ہیں۔ پھر ماشاء اللہ گھر والے خود سمجھ دار ہیں ان کو اس بات کے سمجھانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں میں اس وقت ایسا مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں جو شاید ابھی تک کانوں میں نہ پڑا ہوگا اور آجکل اس کی بہت ضرورت ہے۔ اس مضمون کا تعلق صرف مصیبت موت اقربا سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قسم کی مصیبت سے اس کو تعلق ہے۔ مصائب بعض خاص ہوتی ہیں جن کا اثر ایک شخص یا چند اشخاص تک محدود ہو، بعض عام ہوتی ہیں جن کا تعلق عام طور پر سب مسلمانوں سے ہو یہ مضمون دونوں قسموں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس وقت مسلمانوں پر عام مصائب کا بھی ورود ہے اس لئے اس مضمون کی بہت ضرورت ہے۔ اور میری عادت یہی ہے کہ اکثر ضرورت کے موافق بیان کیا کرتا ہوں۔ اور ایسے ہی مضامین کو بیان کے لئے اختیار کیا جاتا ہے جن کی طرف توجہ کم ہے چنانچہ اس وقت ایسا ہی مضمون مجھ کو بیان کرنا ہے میں اول اجمالاً تعیین مقصود کئے دیتا ہوں۔ تاکہ پھر تفصیل کے سمجھنے میں

آسانی ہو۔ نیز سامعین کو تمہید سے اُس مضمون کا اشتیاق بھی پیدا ہو گیا ہوگا تو دیر تک ان کو منتظر رکھنا بھی مناسب نہیں۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ انسان کی حالت یکساں نہیں رہا کرتی۔ بلکہ اس پر مختلف حالات کا ورود ہوتا رہتا ہے۔ کبھی گوارا واقعات پیش آتے ہیں کبھی ناگوار گوارا واقعات کا اثر تو یہ ہے کہ اسے دل میں نشاط وانبساط ہوتا ہے فرحت وسرور کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ تو باطنی اثر ہے اور ظاہری اثر یہ ہے کہ اس حالت میں انسان جو کام کرنا چاہتا ہے خوشی خوشی کرلیتا ہے ہر کام میں دل لگتا ہے بلکہ کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور جو شخص جس کام کا پابند ہے اس کو پابندی کے ساتھ کرتا رہتا ہے نشاط وانبساط کی حالت میں دنیا اور دین دونوں کے کام بخوبی چلتے رہتے ہیں گو کوئی شخص سستی وکاہلی یا غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے کچھ نہ کرے مگر اس حالت کا اثر یہی ہے کہ اگر کام کرنا چاہے تو کر سکتا ہے صرف ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد کوئی مانع نہیں ہوتا۔ اور ناگوار واقعات کی خاصیت یہ ہے کہ ان سے دل میں انقباض اور بستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ رنج وغم کا غلبہ ہوتا ہے طبیعت پژمردہ مرجھائی سی رہتی ہے یہ تو باطنی اثر ہے اور ظاہری اثر یہ ہوتا ہے کہ پریشانی بڑھ کر افعال میں اختلال ہو جاتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا ہر وقت قلب پر ایک فکر سوار ہے جو ہر کام میں ساتھ رہتی ہے جس کی وجہ سے اول تو کچھ کام ہی نہیں ہوتا اور جو ہوتا بھی ہے تو انتظام اور پابندی کے ساتھ نہیں ہوتا غرض دین ودنیا دونوں کے کاموں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے رنج وغم وفکر وپریشانی حدوث ارادہ عمل سے بھی مانع ہوتا ہے اور بقاء ارادہ کو بھی مانع ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے اختلال امور دنیا سے تو چنداں بحث نہیں کیونکہ اول تو اس کا ضرر مقابلہ دین کے اشد نہیں۔ دوسرے امور دنیا کے اختلال کا ضرر امر محسوس ہے اس کی طرف چند روز میں خود بخود توجہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی کے گھر میں دوکان سے روزانہ دو چار روپے آتے تھے۔ اب پریشانی میں دوکان کے بند ہونے سے وہ آمدنی بند ہو گئی تو دو چار دن کے بعد اس ضرر کا احساس خود بخود ہو جاتا ہے۔ یا کوئی ملازمت سے رخصت لے کر آیا تھا رخصت ختم ہونے کے بعد اس کو تنخواہ کے کٹنے کا خیال

جلدی ہی پیدا ہو جاتا ہے وعلیٰ ہذا جو شخص دنیا کمانے کا جو طریقہ بھی اختیار کئے ہوئے ہے اس کے بند ہونے کا ضرر اس کو جلدی ہی محسوس ہو جاتا ہے۔ اس لئے مجھے اس کے بیان کی ضرورت نہیں میں اس وقت اعمال دین کے اختلال پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ مصیبت کا اثر دین پر یہ پڑتا ہے کہ معمولات میں اختلال ہو جاتا ہے۔ انسان مصیبت سے پہلے جن اوراد کا پابند ہوتا ہے مثلاً ذکر و شغل یا نماز و تلاوت قرآن وغیرہ کا مصیبت کے وقت ان سب میں گڑبڑ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ بعض تو فرائض و واجبات کو بھی ناغہ کر دیتے ہیں اور جو دیندار کہلاتے ہیں وہ فرائض و واجبات کو تو ترک نہیں کرتے مگر معمولات زائدہ کو وہ بھی ناغہ کر دیتے ہیں۔ اور ناگوار واقعات کا اثر بہت سخت ہے کیونکہ یہ دین کا ضرر ہے اور مسلمان کے نزدیک دین دنیا سے مقدم ہے اس لئے اس کا ضرر بھی ضرر دنیا سے اشد ہے اور اس پر متنبہ کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ دین کا ضرر امر محسوس نہیں فرض نماز یا تہجد یا ذکر تلاوت قرآن کے ناغہ کرنے سے کوئی ظاہری آمدنی بند نہیں ہوتی تو اس کے ضرر کا احساس بھی جلدی نہیں ہوتا نیز اس ضرر پر کوئی عزیز یا خیر خواہ بھی متنبہ نہیں کرتا حتیٰ کہ مشائخ و معلمین کی بھی یہ عادت ہے کہ جب ان کے کسی مرید وغیرہ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کو صرف جزع و فزع نہ کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور عام طور پر صبر و شکر کی تعلیم اسی معنی کر کی جاتی ہے (کہ جزع و فزع نہ کرد ۱۲) اس پر نظر نہیں ہوتی کہ اس ناگوار واقعہ سے ان امور میں بھی خلل پڑ گیا ہے جن کا یہ پہلے سے پابند تھا ان طاعات و عبادات میں بھی گڑبڑ ہو گئی ہے جو پہلے سے ماموربہ ہیں اور نہ اس ضرر پر اس کو متنبہ کیا جاتا ہے۔ اور منشا غلطی کا یہ ہے کہ طاعات معمول بہا کی پابندی کو عموماً حقیقت صبر سے خارج سمجھا جاتا ہے اور اس کے خلل کو نقصان صبر پر محمول نہیں کیا جاتا۔ بس جو شخص مصیبت کے وقت جزع فزع نہ کرے اس کو بڑا صابر اور مستقل مزاج سمجھتے ہیں گو اس کے معمولات میں کیسا ہی خلل ہو گیا ہو یہ ایک عام غلطی ہے جس پر عوام تو کیا خواص کی بھی نظر نہیں اس لئے میں اس وقت اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔

لوگوں کی نظر ناگوار واقعات کے صرف پہلے اثر تک ہے۔ جو قلب پر واقع ہوتا ہے دوسرے اثر پر جو اعمال میں واقع ہوتا ہے بالکل نظر نہیں کی جاتی۔ دوسروں کی تو کیا شکایت خود صاحب واقعہ کو بھی اس پر نظر نہیں ہوتی۔ اگر کسی وقت کسی کی نظر ہوئی بھی تو صرف اس قدر کہ پریشانی میں فرائض و واجبات میں اگر خلل آنے لگا تو دین داروں کو اس وقت کچھ تنبہ ہو جاتا ہے۔ مگر سنن و مستحبات کے اختلال پر ان کو بھی بہت کم تنبہ ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ سنن زوائد و مستحبات کے متعلق یہ اعتقاد جما ہوا ہے کہ ان کے کرنے میں ثواب اور نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ اس لئے ان کے ناغہ ہونے کو سہل بات سمجھتے ہیں حالانکہ نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن زوائد اور مستحبات کا یہ حکم قبل شروع کے ہے اور شروع کے بعد ان کا حکم بدل جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حکم تو عین وقت اشتغال کے ساتھ مختص ہے وہ یہ کہ شروع کرنے کے بعد مستحب کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور ایک حکم عام ہے جو وقت اشتغال کے ساتھ مختص نہیں وہ یہ کہ جس مستحب کو معمول بنا لیا جائے اور کچھ عرصہ تک اس پر مواظبت کر لی جائے اب اس کا ناغہ کرنا اور مواظبت کو چھوڑ دینا مکروہ ہے اور اس کی دلیل ایک حدیث بخاری کی ہے جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا يَا عَبْدَ اللهِ لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ ثُمَّ تَرَكَهُ یعنی اے عبداللہ تم فلاں شخص کی طرح نہ ہو نا جو رات کو (نماز کے لئے) اٹھا کرتا تھا پھر چھوڑ دیا۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی اس حالت پر ناگواری اور کراہت ظاہر فرمائی ہے معلوم ہوا کہ ایک مستحب کو معمول بنا کر ترک کر دینا مذموم و مکروہ ہے۔

(قُلْتُ بُوِّبَ عَلَيْهِ الْبُخَارِيُّ مَا يُكْرَهُ مِنْ تَرْكِ قِيَامِ اللَّيْلِ لِمَنْ كَانَ يَقُوْمُهُ قَالَ الْحَافِظُ اِيْ اِذَا اَشْعَرَ ذٰلِكَ بِالْاِعْرَاضِ عَنِ الْعِبَادَةِ قَالَ وَفِيْهِ اِسْتِحْبَابُ الدَّوَامِ عَلٰى مَا اعْتَادَهُ الْمُؤْمِنُ الْخَيْرَ مِنْ غَيْرِ تَفْرِيْطٍ وَيُسْتَنْبَطُ مِنْهُ كَرَاهَةُ قَطْعِ الْعِبَادَةِ وَاِنْ لَمْ تَكُنْ وَاجِبَةً" اھ ص ۳ ج ۳ فتح الباری ۱۲ جامع)

(بخاری نے ایک باب باندھا ہے کہ مکروہ ہے رات کو اٹھنے کا ترک کرنا اس شخص کیلئے جو رات میں اٹھا کرتا تھا)

اسی لئے بزرگوں کا ارشاد ہے کہ فرائض و واجبات کے علاوہ نوافل وغیرہ کا اتنا ہی پابند ہو جس کو نباہ سکے ورنہ شروع ہی نہ کرے اس سے بڑی بے برکتی ہوتی ہے اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جب ایک کام پابند ہو پھر اس میں فتور ہونے لگے تو اس کا خلل متعدہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس عمل پر تو پھر عمر بھر بھی پابندی نصیب نہیں ہوتی اور اس سے گذر کر دوسرے اعمال میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ آج تو تہجد میں فتور ہے۔ کچھ دنوں میں صبح کی نماز کی پابندی بھی نہ رہے گی پھر وقت کی بھی پابندی نہ رہے گی نماز قضا ہونے لگے گی اور یہ سارا فساد ایک مستحب کی پابندی چھوڑنے سے ہوا اس کے علاوہ ترک پابندی میں ایک اور خرابی اس سے بھی سخت ہے۔ وہ یہ کہ شریف طبائع کا خاصہ ہے اور مسلمان سب شریف ہی ہیں کہ جب وہ کسی سے ایک خاص قسم کا برتاؤ شروع کرتے ہیں تو جب تک اس برتاؤ کا نباہ ہوتا رہے اس وقت تک تو ان کے دل میں تعلق بھی بڑھتا رہتا ہے اور جب وہ برتاؤ چھوٹ جاتا ہے تو سب سے پہلے اس صاحب تاؤ ہی کے دل میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جب دوسرے کو بھی اس کی رکاوٹ کا احساس ہو جاتا ہے وہ بھی رکنے لگتا ہے مثلاً ایک دوست کے ساتھ آپ کا ہمیشہ سے یہ برتاؤ ہو کہ جب آپ اس سے ملنے جائیں کچھ ہدیہ اور تحفہ ساتھ لیجائیں۔ پھر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ خالی ہاتھ چلے گئے تو ہر شخص اپنے دل میں غور کرے کہ اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی یقیناً خالی ہاتھ جاتے ہوئے دل رکیگا۔ اور ایک قسم کی شرمندگی اس پر طاری ہو گی گو دوسرے کو اس کے خالی ہاتھ آنے کی طرف التفات بھی نہ ہوا ہو مگر اس کے دل میں خود بخود یہ وسوسے دوڑیں گے کہ آج میرے خالی آنے سے دوست کو ضرور کچھ خیال ہوا ہوگا۔ وہ اپنے دل میں کہتا ہوگا کہ بس اب وہ تعلق نہیں رہا وہ محبت نہیں رہی چاہے اس کے دل میں کچھ بھی نہ آیا ہو مگر یہ اپنے معمول کے خلاف کرنے سے ان اوہام میں ضرور مبتلا ہوتا ہے اور یہ طبعی بات ہے۔ بس رکاوٹ کا بیج تو آج ہی سے بو یا گیا اس کے بعد یہ ہو گا کہ ایک دفعہ تو خالی ہاتھ بھی چلا گیا تھا اب مہینے گذر جاتے ہیں کہ جانے کا نام بھی نہیں لیتا۔ دور ہی سے خط کے ذریعہ سے بات چیت

کرلیتا ہے پھر کچھ عرصہ کے بعد خط کتابت کا سلسلہ بھی بند ہو جاتا ہے اور دوسرے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص مجھ سے رکنے لگا۔ اب وہ بھی اس سے رکنے لگتا ہے اور محبت مبدل بعدم محبت ہو جاتی ہے پھر عدم محبت کے بعد کبھی عداوت تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص تہجد یا ذکر و شغل شروع کرتا ہے تو جب تک وہ ان کا پابند رہے اس وقت تک اس کے دل میں حق تعالےٰ سے تعلق اور محبت کی ترقی ہوتی رہتی ہے اور جب پابندی چھوٹی تو پہلے اسی کی طبیعت میں افسردگی اور پژمردگی پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالےٰ سے اس کو ایک قسم کی ندامت سی آتی ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب حق تعالےٰ کے یہاں میرا وہ رتبہ نہیں رہا ہوگا جو پابندی اعمال کے وقت تھا۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ میں مردود و مطرود ہو گیا تو پہلے خود اس کے دل میں حق تعالےٰ سے حجاب اور رکاوٹ پیدا ہوتی ہے پھر سچ مچ ادھر سے بھی بُعد و حجاب ہو جاتا ہے پس ترک معمول سے اول اس کے دل میں افسردگی کا پیدا ہونا یہ پہلا حجاب ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اس کو نشاط و انبساط سے ترقی ہوتی ہے اور افسردگی سے اس میں کمی آتی ہے۔ جب ایک دفعہ دل میں افسردگی اور پژمردگی پیدا ہو جاتی ہے تو تعلق رابطی میں ضرور کمی آتی ہے۔ پھر یہ خیال پیدا ہونا کہ میں مردود و مطرود ہو گیا دوسرا حجاب ہے اس وقت اس کے دل سے محبت نکل جاتی ہے اور قلب خالی ہو جاتا ہے۔ پہلے درجہ میں تو حق تعالیٰ کی طرف سے حجاب نہ ہوا تھا مگر اب ادھر سے بھی حجاب ہو گیا پھر جب مردودیت کا خیال جم کر اس کے قلب سے محبت حق نکل جاتی ہے تو واجبات و فرائض میں بھی کوتاہی کرنے لگتا ہے اور معاصی پر اقدام کرنے لگتا ہے اور دل میں سمجھتا ہے کہ میں مردود تو ہو ہی گیا۔ پھر لذات نفس میں کیوں کمی کروں یہ تیسرا حجاب ہے اس وقت محبت مبدل بعداوت ہو جاتی ہے اس کے بعد بعض اوقات کفر کی سرحد سے قریب ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ ایمان تک سلب ہو جاتا ہے۔

میرٹھ میں ایک کوتوال تھے وہ بہت ظلم کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ میں جہنم میں تو جاؤں ہی گا پھر رشوت اور ظلم میں کیوں کمی کروں یہ حالت سخت حجاب کی دلیل ہے مگر نہ معلوم کس بزرگ کی توجہ کا اثر ہوا یا کونسا عمل ان کا قبول ہو گیا

ان کا خاتمہ اور انجام اچھا ہوا ؎

ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود ؎ (ورنہ تیرے دل بے رحم سے تو کوتاہی نہیں ہوئی)
انھوں نے تو اپنی طرف سے خاتمہ بُرا ہونے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ حق تعالیٰ ہی نے دستگیری فرمائی اور اس تمام حالت کا منشا اور سرچشمہ وہی افسردگی ہے جو اول اول معمولات سابقہ میں کوتاہی کرنے سے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد میں حجابات کی سات قسمیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ غفلت و اعراض بھی ہے جس کا اثر افسردگی ہے اور بقیہ چھ درجے یہ ہیں۔ حجاب تفاصل، سلب مزید، سلب قدیم، تسلی عداوت یعنی اول اعراض ہوتا ہے اگر معذرت و توبہ نہ کی حجاب ہوگیا۔ اگر پھر بھی اصرار رہا تو تفاصل ہوگیا اگر اب بھی استغفار نہ کی تو عبادت میں جو ایک زائد کیفیت ذوق و شوق کی تھی وہ سلب ہوگئی یہ سلب مزید ہے اگر اب بھی اپنی بے ہودگی نہ چھوڑی تو جو راحت و حلاوت کہ زیادتی کے قبل اصل عبادت میں تھی وہ بھی سلب ہوگئی اس کو سلب قدیم کہتے ہیں۔ اگر اس پر بھی توبہ میں تقصیر کی تو جدائی کو دل سے گوارا کرنے لگا یہ تسلی ہے۔ اگر اب بھی وہی غفلت رہی تو محبت مبدل بہ عداوت ہوگئی نَعُوْذُ بِاللہِ مِنْھَا (اللہ کی پناہ اس سے) اس لئے مستحبات معمولہ کو ترک کرنا سہل بات نہیں اس کا اثر بہت دور تک پہونچ جاتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ آدمی جس قدر مستحبات و نوافل زیادہ کرتا ہے وہ اسی قدر مقرب ہوتا ہے۔ پھر تقرب کے بعد حق تعالیٰ سے بے التفاتی کرنا سخت بات ہے حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق معاملہ فرماتے ہیں عالم ظاہر عالم غیب کا نمونہ ہے پس جیسا ہمارا مذاق یہ ہے کہ جس کو اپنے سے تعلق زیادہ نہیں ہوتا اس کی بے التفاتی زیادہ ناگوار نہیں ہوتی اور تعلق بڑھا کر جو بے التفاتی و بے اعتنائی کرتا ہے اس پر زیادہ غصہ آتا ہے۔ ایسے ہی حق تعالیٰ کے ساتھ جن کو معمولی تعلق ہے ان کی غفلت و بے اعتنائی پر زیادہ قہر نہیں ہوتا اور جو تعلق بڑھا کر مقرب بن کر غفلت و بے التفاتی کا برتاؤ کرتے ہیں ان پر زیادہ قہر ہوتا ہے۔ پس جو لوگ مستحبات

د نوافل پر مواظبت کرکے پھر ترک مواظبت اختیار کرتے ہیں وہ درباری ہوکر دربار سے غیر حاضر ہوتے ہیں اور بادشاہ کا درباری اگر دربار سے بلا وجہ بلا عذر کے غیر حاضر ہونے لگے تو اس پر بہ نسبت غیر درباری کے زیادہ عتاب ہوگا اور اگر ترک مواظبت علی المستحبات سے گزر کر وہ فرائض و واجبات میں بھی کوتاہی کرنے لگے معاصی پر بھی اقدام کرنے لگے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مقرب شاہی بن کر نافرمانی اور گستاخی کرنے لگے اور ظاہر ہے کہ مقرب کی گستاخی پر جس قدر عتاب ہوگا ایک غیر مقرب مثلاً دیہاتی یا گنوار کی گستاخی پر اتنا عتاب نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ ناگوار واقعات کا یہ اثر بہت سخت ہے کہ ان سے بعض اوقات اعمال میں تقلیل ہونے لگتی ہے لوگ مصائب کا حق صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ ایسے مواقع میں جزع و فزع نہ کیا جائے اور اسی کو کمال صبر سمجھتے ہیں اس پر کسی کی نظر نہیں کہ ناگوار واقعات کا یہ بھی ایک حق ہے کہ اس وقت اعمال سابقہ میں کمی نہ کی جائے۔ اس کو تو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھتے حالانکہ معمولات ترک کرنے کا ضرر بہ نسبت جزع و فزع کے ضرر کے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ جزع فزع کا اثر محدود و غیر متعد ہے اور اس میں انسان کسی قدر معذور بھی شمار ہوسکتا ہے اور تقلیل اعمال کا ضرر متعد ہے جو بہت دور تک پہنچتا ہے۔ اور اسی لئے مصیبت کے وقت معمولات پر جما رہنا صبر کا جزو اعظم ہے۔ اسی مضمون پر متنبہ کرنے کے لئے میں نے اس آیت کی تلاوت کی ہے جس میں حق تعالےٰ نے ہم کو مصیبت کے ہلکا کرنے کا ایک طریقہ بتلایا ہے جس پر عمل کرنے سے یہ اثر تقلیل فی الاعمال ظاہر نہیں ہوسکتا کیونکہ ناگوار واقعات سے اعمال میں تقلیل کا سبب فرط غم اور غلبۂ حزن ہے بس اگر کسی تدبیر سے غم اور رنج کو ہلکا کر دیا جائے تو اس کا یہ اثر بھی ظاہر ہوگا قاعدہ ہے کہ ازالہ سبب سے مسبب کا ازالہ ہوجاتا ہے۔ اس آیت سے اوپر بعض مصائب کا ذکر ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ۔ (ترجمہ یہ ہے۔ اور البتہ ہم تم کو ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے یعنی تم کو دشمنوں کی طرف سے اندیشہ اور خوف بھی پہونچے گا۔ اور جوع سے یعنی کسی وقت تم پر فاقہ بھی آئے گا اور اموال و نفوس اور ثمرات کے نقصان سے

یعنی کسی وقت تمھارا مال بھی ضائع ہوگا جانیں بھی ضائع ہوں گی اور ثمرات بھی ضائع ہوں گے ثمرات کی ایک تفسیر تو پیداوار ہے مطلب یہ کہ کسی وقت تمھاری کھیتوں اور باغات کی پیداوار پر آفت آئے گی اور گو اموال میں یہ بھی آ گئے تھے مگر چونکہ زمینداروں کے نزدیک یہ اعز الاموال (مالوں عزیز تر) ہیں اور مدینہ والے اکثر زمیندار تھے اس لئے ثمرات کو مستقلاً بیان فرمادیا اور ایک تفسیر ثمرات کی اولاد ہے کیونکہ وہ ماں باپ کے جگر کے ٹکڑے ہیں اسی لئے اولاد کو ثمرات القواد (دلوں کا پھل) کہا جاتا ہے اور گو وہ نفوس میں داخل ہو سکتے ہیں مگر یہاں بھی تخصیص کی وہی وجہ ہوگی جو ثمرات بمعنی پیداوار کو اموال کے بعد ذکر کرنے کی وجہ تھی یعنی چونکہ اولاد اعز النفوس (جانوں میں زیادہ عزیز) ہیں اور ان کے مرنے کا غم زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان کو جدا بیان کردیا کہ کسی وقت تمھاری اولاد بھی ہلاک ہوگی۔ اس میں ایک تو یہ بتلادیا کہ تم پر یہ واقعات وارد ہوں گے، دوسرے یہ بھی بتلادیا کہ ان واقعات سے ہم تمھارا امتحان لیں گے یہی ایک لفظ ایسا ہے کہ اگر اور بھی کچھ نہ ہوتا تو اسی سے مصیبت ہلکی ہوگئی کیونکہ امتحان کا لفظ سنتے ہی مخاطب کو فکر ہو جاتی ہے کہ مجھے اس امتحان میں پاس ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ میں فیل ہو جاؤں اور قاعدہ ہے کہ انسان امتحان کے وقت اپنے حواس و عقل کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے پس یہ سنکر کہ یہ واقعات بطور امتحان کے آئیں گے ہر شخص اس کی کوشش کرے گا کہ ان مواقع میں اپنے عقل و حواس کو مجتمع رکھے از خود رفتہ نہ ہو جائے کیونکہ امتحان کے وقت بدحواس ہو جانے سے آدمی فیل ہو جاتا ہے۔ اور مصیبت کے وقت عقل و حواس قائم رکھنا بھی اس کے اثر کو بہت کم کردیتا ہے پس لَنَبْلُوَنَّكُمْ (ہم ضرور تمھاری آزمائش کریں گے) میں اس پر تنبیہ کردی گئی ہے کہ مصائب کے وقت بدحواس نہ ہونا چاہیئے بلکہ ان کو امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ پھر اس میں صیغہ جمع متکلم اختیار فرمایا جس سے عظمت ابتلاء پر دلالت ہے کیونکہ معلوم ہو گیا کہ یہ امتحان حق تعالےٰ خود لیں گے اور جیسا ممتحن عظیم الشان ہوتا ہے ویسا ہی امتحان بھی عادۃً مہتم بالشان ہوتا ہے گو واقع میں حق تعالےٰ کی طرف سے امتحان عظیم نہ ہو آسان اور سہل ہی ہو مگر مخاطب کو

بتلا دیا کہ وہ ابتلاء عظیم کے لئے تیار رہے اور اس میں بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ پہلے سے ہم کو مطلع فرما دیا کہ تم کو ایسے ایسے واقعات پیش آئیں گے اس صورت میں تکلیف کی کلفت تو ہوگی مگر دفعۃً جو ایذا پہونچنے کی جو تکلیف ہوتی ہے وہ نہ ہوگی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو پہلے سے کہدیا جائے کہ تمہارا اپریشن کیا جائے گا۔ اس صورت میں اس کو اپریشن کی تکلیف تو ہوگی مگر دفعۃً کلفت پہونچنے کا صدمہ نہ ہوگا۔ کیونکہ پیشگی اطلاع سے وہ اس کے لئے تیار رہے گا لوگ آیت لَا تَقْنَطُوْا (ناامید مت ہو) کو آیت رحمت سمجھتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ ہر ہر آیت سے یہی رحمت ٹپکتی ہے چنانچہ اس آیت میں کتنی بڑی رحمت کا مضمون ہے کہ ہم کو مصائب کے لئے پہلے سے تیار کر دیا۔ تاکہ وقت پر بدحواس نہ ہو جائیں بلکہ یوں کہیں کہ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (یہ وہ جس کا وعدہ کیا ہے ہم سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے اور اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے) کہ یہ تو وہی بات ہے جس کا وعدہ ہم سے خدا تعالےٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے کر دیا تھا اور یہ بھی خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ انسان کی مرضی کے موافق سب کام نہیں ہوتے بلکہ بعض واقعات ناگوار اور خلاف طبع بھی اس کو پیش آتے ہیں۔ اگر سب کام اس کی مرضی کے موافق ہوا کرتے تو یہ ہلاک ہو جاتا کیونکہ اس صورت میں یہ تو اپنے لئے راحت ہی تجویز کرتا۔ اور راحت کا خاصہ ہے بیفکری اور غفلت پس دوام راحت سے یہ غفلت میں پڑ جاتا اور معاصی پر دلیر ہو جاتا اور یہ اس کے لئے سراسر ہلاکت ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے سب کام اپنی مرضی پر رکھے ہیں، ہماری مرضی پر نہیں رکھے پس جب کبھی ہم غفلت وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں اُدھر سے کسی ناگوار واقعہ کا ایک تازیانہ لگا دیا جاتا ہے جس سے کچھ دنوں تک غفلت کا علاج ہو جاتا اور خدا تعالےٰ کی طرف توجہ پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ طاعون وغیرہ کے زمانہ میں سالہا سال کے بے نمازی بھی نمازی ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو گونہ آخرت کی فکر ہو جاتی ہے گو یہ واقعات ہم کو ناگوار ہوتے ہیں مگر ان میں ہمارے واسطے حکمت اور منفعت رکھی ہوئی ہے اگر حق تعالیٰ ہماری مرضی کے موافق ہی سب کام کیا کریں تو

ہم کو آخرت کی طرف کبھی توجہ نہ ہو۔ پس ناگوار واقعات کا پیش آنا بھی بڑی رحمت ہے جیسے استاد کی شفقت یہ ہے کہ کبھی کبھی بچہ کے ایک دو قمچی مار دیا کرے ورنہ وہ تو بدشوق ہے اگر یہ کبھی اس کو کبھی ہاتھ بھی نہ لگادے گا تو بچہ بالکل خراب ہو جائے گا نہ پڑھے گا نہ لکھیگا نہ بے جا حرکتوں سے باز آئیگا بلکہ سر پر چڑھ جائے گا۔ استاد کی شان میں بھی گستاخی کرنے لگا اس حالت میں آپ خود ہی یہ رائے دیتے ہیں کہ استاد کو تنبیہ و تادیب سے کام لینا چاہیئے۔ اور اس کے حق میں اس کو شفقت سمجھتے ہیں۔ پھر اسکو کیا وجہ ہے کہ ناگوار واقعات میں حق تعالیٰ کی رحمت میں اعتقاد نہ ہو یہاں شاید سامعین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ غافلین کو ناگوار واقعات پیش آنے کی تو یہ حکمت ہے مگر کاملین کو ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں وہ تو بدشوق نہیں ہیں جس سے ان کو تنبیہ کی ضرورت ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ اہل اللہ کاملین کو بھی ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اس شبہ کا جواب اسی آیت میں لفظ لَنَبْلُوَنَّكُمْ سے نکلتا ہے کیونکہ اس میں اولاً حضرات صحابہ کو خطاب ہے جو سب کے سب کاملین ہیں اور ان سے فرمایا گیا ہے کہ تم کو ان واقعات سے آزمائیں گے معلوم ہوا کہ کاملین پر ایسے واقعات بطور تنبیہ اور تادیب کے نہیں آتے بلکہ بطور امتحان کے پیش آتے ہیں حق تعالیٰ ناگوار واقعات سے ان کی محبت و عشق کا امتحان فرماتے ہیں اور حق تعالےٰ کو خود امتحان کی کوئی ضرورت نہیں ان کو ہر شخص کی حالت خوب معلوم ہے۔ بلکہ اس امتحان سے دوسروں کو دکھلانا منظور ہے مثلاً ملائکہ وغیرہ کو کہ دیکھو ہمارے بندے مصائب میں بھی کیونکر ہم کو چاہتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم ان کو تکلیف پہونچاتے ہیں مگر پھر بھی وہ ہماری محبت سے نہیں ہٹتے۔ اور تکلیف کو عین راحت سمجھتے ہیں۔ پس اب اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ کاملین پر ایسے واقعات کیوں آتے ہیں۔ نیز لفظ لَنَبْلُوَنَّكُمْ (ہم تم کو ضرور آزمائیں گے) میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کاملین کو مصائب سے کلفت بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ اس آیت کے مخاطب حضرات صحابہ ہیں جو سب کے سب کامل ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انپر یہ واقعات بطور امتحان کے آتے ہیں۔ ایک مقدمہ

مـ؎ ہم تمھاری ضرور آزمائش کریں گے۔

تو یہ ہوا اب اس کے ساتھ ایک مقدمہ یہ ملالو کہ بدون احساس کلفت کے امتحان نہیں ہوسکتا اور یہ بالکل ظاہر اور بدیہی بات ہے جس شخص کو ناگوار واقعات سے کچھ بھی کلفت نہ ہو اس کے حق میں ان کو امتحان نہیں کہا جاسکتا امتحان ہمیشہ اسی چیز سے ہوا کرتا ہے جس کا دوسرے پر بار پڑے اور اس کو بار کا احساس بھی ہو۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو ثابت ہوگیا کہ مصائب سے کاملین کو بھی کلفت ہوتی ہے اتنا فرق ہے کہ کاملین کو صرف جسمانی کلفت اور طبعی رنج ہوتا ہے اور دنیا داروں کو جسمانی کلفت بھی ہوتی ہے اور روحانی بھی اور طبعی رنج بھی ہوتا ہے اور عقلی بھی کیونکہ اہلِ دنیا کو طول امل کی وجہ سے بہت چیزوں کے ساتھ توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اموال کے ساتھ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ اس مال سے یہ کام نکالیں گے کھیت کی پیداوار سے توقع وابستہ ہوتی ہے کہ اس مرتبہ غلہ بیچ کر فلاں کام کریں گے۔ پھر ان کے خلاف ظہور میں آتا ہے تو ان کو سخت کلفت ہوتی ہے۔ اسی طرح اولاد کے ساتھ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ لڑکا پڑھ کر امتحان میں پاس ہوگا تو یوں نوکر ہوگا یوں ہمیں کما کر دے گا پھر وہ مرگیا تو افسوس ہوتا ہے کہ ہائے یہ بچہ تو پاس ہونے والا تھا اب دور ہوگیا طبعی رنج تو مفارقت کا ہوتا ہی ہے مگر دنیا داروں کو ان امیدوں کے باطل ہوجانے سے عقلی رنج بھی ہوتا ہے اور گو زبان سے نہ کہیں مگر دل میں یہ وسوسہ اکثر کے ذہن میں آجاتا ہے کہ یہ واقعہ بے محل اور قبل از وقت ہوا اور دینداروں کو کسی چیز سے توقع وابستہ نہیں ہوتی اس کو خدا کے سوا کسی سے کچھ امید نہیں ہوتی اس کو کسی ناگوار واقعہ میں خلاف حکمت ہونے کا وہم بھی نہیں ہوتا اس لئے اس کو عقلی رنج ایسے موقع پر ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں کہتا ہے ؎

ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود (جو کچھ وہ بادشاہ کرے پسندیدہ ہو)

ہاں طبعی رنج ان کو بھی ہوتا ہے اور اتنا رنج تو ہونا چاہیئے ورنہ پھر امتحان کیسے ہوگا اور مصائب میں طبعی رنج موجب نقص نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا آپ اپنے صاحب زادہ کی وفات پر فرماتے ہیں۔ اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ

لَمَحْزُوْنَ (اے ابراہیم تمہاری جدائی میں ہم غمگین ہیں)

معلوم ہوا کہ صاحبزادہ کی وفات سے طبعی رنج آپ کو بھی ہوا اور وہ صرف مفارقت کا رنج تھا۔ انسان کو ایک جانور کے چند روز پالنے سے اس کے ساتھ اُنس ہو جاتا ہے اور اس کی مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے۔ پھر بھلا اولاد کی مفارقت کا صدمہ تو کیونکر نہ ہو یہ تو طبعی بات ہے جو طبیعت انسانیہ کا خاصہ ہے پس جو کامل بشر ہوگا اسے صدمہ کی بات سے طبعی صدمہ ضرور ہوگا ہاں کامل کو عقلی صدمہ نہ ہوگا۔ شاید کسی کو بعض بزرگوں کے ایسے واقعات سے کہ ان کو اولاد کے مرنے پر رنج نہیں ہوا بلکہ وہ ہنستے تھے یہ شبہ ہو کہ یہ حالت زیادہ کمال کی ہے اور ظاہر میں یہ لوگ ان لوگوں سے کامل معلوم ہوتے ہوں گے جو ایسے مواقع پر رنجیدہ اور غمگین ہوئے ہیں سو یہ شبہ لغو ہے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ کامل کوئی نہیں ہو سکتا۔ جب آپ کو ایسے واقعات سے رنج ہوا تو رنج ہونا نقصان کی دلیل نہیں بلکہ عاقل یہ کہے گا کہ زیادہ کامل وہی شخص ہے جس کو رنج ہوا۔ اور پھر حدود سے متجاوز نہ ہوا کیونکہ وہ واقعہ ایسا ہی ہے جس سے رنج پیدا ہونا چاہیئے۔ تو جس نے رنج کا احساس کیا معلوم ہوا کہ اس کے حواس کامل اور درست ہیں۔ اور پھر حدود پر قائم رہا تو معلوم ہوا کہ عقل و دین بھی کامل ہے اور جس کو صدمہ کی بات سے صدمہ ہی نہیں ہوا اس کے حواس درست ہونے میں کلام ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی حالت وغیرہ کی وجہ سے اس کے حواس بشریہ معطل ہیں اسی لئے اس کو ایسی بات سے رنج نہیں ہوا جس سے طبعی طور پر رنج ہونا چاہیئے تھا۔ اس فرق کو ایک مثال میں سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ ڈاکٹر نے دو شخصوں کا اپریشن کیا ایک کو تو کلورا فارم سنگھایا وہ تو آپریشن کے وقت بے حس و حرکت پڑا رہا نہ چیخا نہ چلایا نہ ہاتھ پیر ہلائے اور دوسرے کو بدون کلورا فارم سنگھائے اپریشن کیا اس نے ایک چیخ ماری مگر ہاتھ پیر بالکل نہیں ہلائے ظاہر بیں نادان کو پہلا شخص کامل معلوم ہوگا۔ مگر حقیقت شناس دوسرے کو کامل کہے گا اور سمجھے گا کہ پہلے کے تو حواس معطل تھے اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے نہ زخم کی تکلیف کا احساس ہوا اس کا حرکت نہ کرنا کمال نہیں، کمال دوسرے

شخص کا ہے کہ اس کے حواس درست تھے۔ اس کو زخم نشتر کی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا اور پھر ضبط سے کام لیا ہاتھ پیر نہیں ہلائے صرف ایک چیخ مار کر دم بخود رہ گیا اسی طرح سمجھئے کہ ایسے اولیا کو تو حق تعالیٰ نے کلورا فارم سنگھا کر مصیبت کا نشتر لگایا ہے اس لئے ان کو مصیبت کے اثر کا احساس ہی نہیں ہوا اور وہ ہنستے رہے اور انبیاء کو کلورا فارم نہیں سنگھایا کیونکہ ان میں ضبط و تحمل کی طاقت ہے وہ بدون بیہوش کئے بھی مستقل مزاج رہتے ہیں گو تکلیف کا احساس ہوتا ہے کلفت و رنج طبعی کا بھی اثر ہوتا ہے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے پہاڑ کی طرح جمے رہتے ہیں وہ اولیاء ناقص ہیں جن کو صدمہ کی بات سے طبعی صدمہ بھی نہ ہوگا کامل وہ ہے جس کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہو اس لئے کاملین کو رنج ہوتا ہے اب سمجھئے کہ یہاں کلورا فارم کیا چیز ہے وہ غلبہ حال ہے جس سے بعض دفعہ احساس معطل ہو جاتا ہے انبیاء اور اولیاء کاملین پر ایسا غلبہ حال نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو شاذ و نادر ہوتا ہے اکثر متوسطین سلوک پر غلبہ حال زیادہ ہوتا ہے۔ غرض لَنَبْلُوَنَّكُمْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کاملین پر طبعی رنج و کلفت کا اثر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ناگوار واقعات میں ان کے لئے امتحان و ابتلاء ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ سے اس اشارہ کی تائید ہوگئی اس تقریر سے یہ بات تو معلوم ہوگئی ہوگی کہ اس وقت مجھ کو اصل مقصود تقلیل اعمال کے ضرر پر تنبیہ کرنا ہے اور یہ بتلانا منظور ہے کہ بعض دفعہ جو کسی سبب سے ہم لوگ معمولات سابقہ میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں یہ حالت خطرناک اور قابل اصلاح ہے تعیین مضمون سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مضمون کچھ اس آیت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس کا بیان قریب قریب ہر آیت میں موجود ہے کیونکہ قرآن مجید میں جابجا استقامت علی الاعمال کی تاکید ہے احادیث بھی اس سے بھری ہوئی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے استقیموا ولن تحصوا (اعمال پر استقامت کرو اور ہرگز کوتاہی نہ کرو) اور ارشاد ہے ان اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ مَادِيْمَ عَلَيْهِ (پسندیدہ تر اللہ کے نزدیک وہ اعمال ہیں جن پر دوام کیا جائے) مگر تعیین آیت کی وجہ یہ ہوئی کہ آجکل مسلمانوں پر مصائب کا چار طرف سے ہجوم ہے نیز یہ مہینہ بھی محرم کا ہے جو مصیبت کا مہینہ مشہور ہے جس کا منشاء حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ (وَرَضَاهُ وَرَضِيَ عَنْ مَّنْ يُّحِبُّهُ راضی ہو اللہ ان سے اور اس شخص سے بھی راضی جو ان سے محبت رکھتا ہے)

کی شہادت کا واقعہ ہائلہ ہے جو درحقیقت ایک صدمہ جانکاہ ہے مگر جہالت کے سبب ہم لوگوں نے اس میں حدود سے تجاوز کرلیا ہے جس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ لوگوں نے اس زمانہ میں نکاح و شادی کو ناگوار اور مکروہ سمجھ لیا چنانچہ ہمارے ایک عزیزؔ کی شادی ذی الحجہ کی تیس تاریخ کو قرار پائی تھی جس میں محرم کی چاندرات کا ہونا تو متیقن تھا اور یہ بھی احتمال تھا کہ شاید کسی جگہ آج ہی محرم کی پہلی ہو تو لڑکی کے ولی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی کہ تاریخ شادی۔ کے لئے بھلا یہی دن رہ گیا تھا مگر انھوں نے اتنا کرم کیا کہ شادی میں گو خود شریک نہیں ہوئے لیکن اجازت نکاح دیدی اور اپنی طرف سے اپنے ماموں صاحب کو بھیجدیا ہم نے کہا کہ اس خیال کو توڑنا چاہئے اور اسی دن نکاح کیا مگر کئی سال تک مستورات کو فکر رہا کہ دیکھئے کوئی بات ناگوار پیش نہ آجائے اگر لڑکی کا ذرا بھی کان گرم ہوا تو اس کے ولی یہی کہیں گے کہ یہ اس تاریخ میں نکاح ہونے کی نحوست ہے مگر بحمداللہ کوئی ناگوار بات پیش نہیں آئی اور دونوں میاں بی بی خوش و خرم ہیں، صاحب اولاد بھی ہیں حق تعالٰے نے کھلی آنکھوں دکھلا دیا کہ عوام کا اس زمانہ کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے۔ نصوص میں جابجا اس کی تصریح ہے کہ نحوست و سعد کا سبب زمانہ وغیرہ نہیں نہ کوئی دن منحوس ہے نہ کوئی مہینہ نہ کسی مکان میں نحوست ہے نہ کسی انسان میں بلکہ اصل نحوست اعمال معصیت میں ہے مگر افسوس اس نحوست سے اجتناب کا کسی کو اہتمام نہیں بلکہ اسے خود بخود اپنے ساتھ لپیٹتے ہیں دوسرا اثر اس واقعہ سے یہ لیا گیا کہ اس تذکرہ کا اعادہ ہر سال ہوتا ہے چنانچہ محرم میں جابجا شہادت نامے پڑھے جاتے ہیں مجالس عزا قائم کی جاتی ہیں اور اس واقعہ کو سن کر لوگ بے اختیار رو دیتے ہیں، بعضے بری طرح نوحہ کرتے ہیں پھر شہدار کی یادگار میں تعزیے اور علم نکالے جاتے ہیں۔ نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ حالت بھی خلاف شرع اور قابلِ اصلاح ہے کیونکہ ان تمام افعال کا خلاصہ تجدید غم و اظہار حزن ہے حالانکہ تجدید غم و اظہار حزن مرضی خداوندی کے بالکل خلاف ہے مرضی حق یہ ہے کہ رنج طبعی کو اس کی حد سے نہ بڑھایا جائے اور اپنی طرف سے غم بڑھانے کا

؎ یہ واقعہ احقر جامع کی شادی کا ہے ۱۲

کوئی سامان نہ کیا جائے بلکہ حق تعالٰی نے تو رنج طبعی کے کم کرنے کے بھی سامان کئے ہیں چنانچہ وہ باتیں تعلیم فرمائی ہیں جن کے استحضار سے رنج طبعی بھی کم ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ ان صابرین کو بشارت دیدیجئے جو مصیبت پہونچنے کے وقت یہ کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اس جملہ میں ایسا مضمون سکھلایا گیا ہے جو رنج و غم کی بنیادیں اکھاڑنے والا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ کسی واقعہ سے صدمہ جب ہوا کرتا ہے جب وہ خلاف مرضی واقع ہوا ہو اور کوئی واقع خلاف مرضی جب ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اپنے ذہن میں اس کے متعلق کوئی شق تجویز کرلیں کہ یوں ہونا چاہیئے جب اس کے خلاف دوسری شق ظاہر ہوتی ہے تو وہ ناگوار اور خلاف مرضی ہوتی ہے چنانچہ کسی عزیز کی موت پر ہم کو صدمہ اسی لئے ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ یہ ہم سے کبھی جدا نہ ہو ہمیشہ پاس ہی رہے حق تعالٰی نے انا للہ میں تجویز کا استیصال کر دیا ہے فرماتے ہیں کہ تم کو یہ مضمون پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم خدا کی ملک ہیں خدا تعالٰی ہمارے مالک ہیں اور ہم ان کے مملوک ہیں اور مملوک کی ہر چیز مالک کی ہوا کرتی ہے تو ہماری چیز بھی خدا ہی کی ملک ہے اس کے ساتھ ایک مقدمہ عقلیہ یہ ملا لو کہ تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے غلام کو کسی تجویز کا حق نہیں۔ جب تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے تو ہمارا کسی عزیز کی مفارقت پر اس لئے غم کرنا کہ ہم نے اس کے متعلق یہ تجویز کر رکھا تھا کہ ہمیشہ ہمارے پاس رہے بڑی غلطی ہے آپ تجویز کرنے والے ہوتے کون ہیں۔ اس کی تو ایسی مثال ہوئی کہ گھر کی مالکہ نے الماری میں برتنوں کو ایک خاص ترکیب سے رکھدیا ہو جو ماما کی ترکیب کے خلاف ہے۔ مثلاً مالکہ نے نیچے کے برتنوں کو اوپر رکھدیا اور اوپر والوں کو نیچے رکھدیا اب ماما اس ترکیب کو دیکھ کر نالہ و شیون کرنے لگے کہ ہائے میری تجویز کے خلاف کیوں ہوا۔ تو بتلائیے آپ اس کو احمق کہیں گے یا نہیں یقیناً ہر شخص اسے پاگل کہے گا آخر کیوں۔ اسی وجہ سے تاکہ تجویز کا حق مالکہ کو ہے ماما کو کسی تجویز کا حق نہیں پھر حیرت ہے کہ آپ کی ادنٰی سی ملک تو ایسی ہو کہ اس کے

سامنے دوسروں کا حق باطل ہوجائے اور خدا تعالیٰ کی حقیقی ملک کے سامنے آپ کی تجویز باطل نہ ہو یقیناً اگر خدا تعالےٰ کو مالک حقیقی سمجھا جاتا ہے تو آپ کو اور کسی کو تجویز کا حق نہ ہونا چاہیئے پس سمجھ لیجئے کہ حق تعالےٰ نے عالم کے دو درجے بنائے ہیں۔ آسمان اور زمین جیسے الماری کے دو درجے اوپر نیچے ہوتے ہیں جس میں انھوں نے بعض ارواح کو اوپر کے درجہ میں رکھا ہے۔ یعنی آسمان میں۔ اور بعض کو نیچے کے درجہ میں رکھا ہے یعنی زمین میں پھر وہ کبھی اس ترتیب کو بدل کر اوپر کی روحوں کو نیچے بھیجدیتے ہیں۔ اور نیچے کی روحوں کو اوپر رکھدیتے ہیں اور وہ مالک ہیں ان کو ہر طرح تصرف کا اختیار ہے۔ اس میں ہم غلاموں کا اس لئے نالہ وشیون کرنا کہ ہائے ہماری تجویز کے خلاف کیوں کیا گیا حماقت ہے خوب سمجھ لو کہ انتقال کی حقیقت بالکل ایسی ہی ہے جیسے الماری کے ایک تختہ کے برتنوں کو نیچے سے اوپر کر دیا جائے اور اوپر سے نیچے کر دیا جائے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں آدمی مرکر بالکل معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ دنیا سے جو کہ نیچے کے تختہ ہے آخرت میں پہونچ جاتا ہے۔ جو اوپر کا تختہ ہے (اور یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مردہ کو مٹی میں گاڑ دیا جاتا ہے اور اس سے شاید کسی کو اس پر یہ شبہ ہو کہ آخرت میں پہونچنے کو اوپر کے تختہ پر جانا کیسے کہا گیا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو نہیں گاڑا جاتا بلکہ ایک بے جان لاشہ اور جماد محض کو گاڑا جاتا ہے وہ آدمی تھوڑا ہی ہے وہ تو صورت آدمی ہے کیونکہ آدمی اصل میں روح کا نام ہے اور روح کو مٹی میں نہیں گاڑا جاتا بلکہ اس کو اوپر بلا لیا جاتا ہے۔ اور یہ جو روایات میں آتا ہے کہ پھر روح کو جسم میں واپس کیا جاتا ہے تو یہ واپسی عالم برزخ میں ہوتی ہے اس گڑھے میں نہیں ہوتی۔ قبر حقیقی عالم برزخ ہے جو دنیا و آخرت کے درمیان ہے اور یہ قبر جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا ہے اسی عالم برزخ سے ایک قسم کا تعلق رکھتی ہے اس کی حقیقت نہیں ۱۲ جامع) پس حق تعالےٰ اپنی مملوک چیزوں میں تصرف مالکانہ کرتے رہتے ہیں کبھی کسی کو نیچے بھیجدیا کبھی کسی کو اوپر بلالیا مگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ نہیں سب نیچے ہی رہیں بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر حق تعالےٰ اس کے جواب میں یہ تجویز فرمائیں کہ اچھا پھر ہم بھی اوپر کی روحیں نیچے نہیں بھیجتے تو پھر کیا ہوگا، بس یہ ہوگا کہ سب کے سب اوت نپوت رہ جائیں گے کسی کے بھی اولاد نہ ہوگی مگر آپ کو

اس پر بھی چین نہیں اگر کسی کے اولاد نہ ہو تو وہ اولاد کے لئے ایسی گرد چھاتا ہے جس کی حد نہیں یوں تمنا کرتا ہے کہ کچھ ہو جائے چاہے چوہے کا بچہ ہی ہو جائے۔ بس آپ کی تجویز کا حاصل یہ ہے کہ اوپر کی روحیں تو نیچے آتی رہیں مگر نیچے کی روحیں اوپر نہ جائیں۔ صاحب خدا کی رحمت ہے کہ انھوں نے ہماری اس تجویز کو پورا نہیں کیا ورنہ دنیا میں رہنے کو بھی جگہ نہ ملتی سوچ لو کہ جتنے آدمی آدم علیہ السلام کے وقت سے اس وقت تک مرچکے ہیں سب زندہ رہتے تو کہاں ٹھکانا ملتا اس وقت جو ہر شخص اپنے اپنے گھر میں چین سے گذر رہا ہے اس کا یہی تو سبب ہے کہ بہت سے آدمیوں کو حق تعالیٰ نے اوپر بلا لیا ہے۔ ورنہ اگر دادے پردادے سب زندہ ہوتے تو آج گھروں میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ پھر سمجھو کہ کسی چیز کے فوت ہونے کا صدمہ جب ہوا کرتا ہے جبکہ اس کا عوض بھی نہ ملے اور اگر عوض مل جائے اور عوض بھی اصل سے زیادہ مل جائے تو غم کم ہو جاتا ہے مثلاً ایک شخص سے پیسہ لے لیا جائے اور اشرفی دیدی جائے تو اس کو پیسہ چھننے کا غم نہ رہے گا حق تعالیٰ نے اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (ہم اس کی طرف لوٹنے والے ہیں) میں اسی مضمون پر متنبہ فرمایا ہے کہ مصیبت کے وقت تم یہ سمجھا کرو کہ ہم سب خدا تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں جو رحیم و کریم اور مہربان ہیں جن کی شان یہ ہے وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ کہ تم سے جو کچھ لیتے ہیں اس کا بدلہ بھی دیدیتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کو دنیا سے بلالیا ان کو تو آخرت میں پہونچا دیا جس میں مسلمان کے لئے دنیا سے زیادہ راحت ہے تم اپنے مردوں کے ساتھ ایسا برا گمان کیوں کرتے ہو کہ خدانخواستہ وہ جہنم میں گئے ہوں گے جب ان کا خاتمہ اسلام پر ہوا ہے تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے مُردے راحت میں گئے ہیں اس خیال سے صدمہ کم ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم اگر دنیا کی راحتیں ان سے چھوٹتی ہوئی دیکھتے ہیں تو آخرت کی راحتیں اس سے زیادہ پیش نظر ہوں گی یہ بدلا تو ان کو ملا اور ہم کو یہ بدلہ ملا کہ عزیز کی مفارقت سے جو طبعی رنج ہوا ہے حق تعالیٰ اس پر بہت بڑا ثواب دیں گے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسلمان کا لڑکا مرتا ہے تو حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندے کے جگر کا ٹکڑا چھین لیا وہ کہتے ہیں ہاں خداوند فرماتے ہیں کہ پھر میرے بندے نے کیا کہا وہ عرض کرتے ہیں

خداوند آپ کی حمد کی اور شکر کیا اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کی مملوک ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) کہا ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھدو تو آپ نے دیکھا ایک چیز لے کر حق تعالٰے نے آپ کو کتنی بڑی چیز دی۔ آخرت میں جب حساب وکتاب ہوگا اس وقت آپ کو اس کی قدر ہوگی وہاں نہ یہ اولاد کام دے گی جس کے لئے آپ روتے ہیں نہ بیوی اور ماں کام دے گی وہاں ثواب ہی کام دے گا یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ لِکُلِّ امْرِءٍ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ (جس روز آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنی اولاد سے بھاگے گا ان میں ہر شخص ایسا مشغلہ ہوگا جو اس کو اور کی طرف متوجہ نہ ہونے دے گا) احادیث میں مصیبت کے ثواب کی بہت تفصیل ہے اس کو دیکھنا چاہئے۔ پس اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اسی طرف جانے والے ہیں) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہم سب خدا کے پاس جائیں گے اور وہاں ہم کو مصیبت کا اجر ملے گا اور جو مرگئے ہیں وہ بھی خدا تعالٰی کے پاس گئے ہیں جہاں ان کو دنیا سے زیادہ راحت ہے پھر صدمہ کی کیا بات ہے۔ اسی مضمون کو ایک بدوی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے تعزیت کے طور پہ عرض کیا تھا۔ جب ان کے والد حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالٰے عنہ کا وصال ہوا چنانچہ کہتا ہے ؎

اِصْبِرْ نَکُنْ بِکَ صَابِرِیْنَ فَاِنَّمَا   صَبْرُ الرَّعِیَّۃِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّأْسِ

آپ صبر کیجئے تاکہ ہم بھی آپ کو دیکھ کر صبر کریں کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کا تابع ہے اگر بڑے بھی بے صبری کرنے لگیں تو پھر چھوٹوں کا کیا حال ہوگا۔ سبحان اللہ کیونکر صبر کی تعلیم دی ہے۔ پھر کہتا ہے ؎

خَیْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُکَ بَعْدَہٗ   وَاللّٰہُ خَیْرٌ مِّنْکَ لِلْعَبَّاسِ

یعنی آپ کے لئے وہ اجر و ثواب حضرت عباس کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے جو ان کے وصال پر صبر کرنے سے آپ کو ملیگا اور حضرت عباس کے لئے اللہ تعالٰے آپ سے زیادہ بہتر ہیں۔

پس خدا تعالیٰ نے ان کو وہ جگہ دی جو ان کے لئے بہتر تھی اور آپ کو وہ چیز دی جو آپ کے لئے بہتر تھی۔ پھر غم کاہے کا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بدوی سے بڑھ کر کسی نے تعزیت نہیں کی غرض اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کی مملوک ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں) میں دو جملے ہیں پہلے جملے میں حق تعالیٰ کی مالکیت کو ظاہر کرکے بندوں کی تجویز کا استیصال کیا گیا ہے پھر جب ہم پہلے سے کسی چیز کے متعلق کوئی تجویز ہی نہ کریں گے تو کوئی واقعہ ہمارے خلاف مرضی نہ ہوگا کیونکہ خلاف مرضی ہونے کا مبنا تجویز ہی تھی جب وہ نہ رہی تو اب جو کچھ بھی ہوگا خلاف مرضی نہ ہوگا دوسرے جملے میں عوض ملنے پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے استحضار سے رہا سہا غم اور بھی ہلکا ہو جائے گا کیونکہ میں بتلا چکا ہوں کہ جس کلفت کا عوض اس سے زیادہ مل جائے اس پر رنج نہیں ہوا کرتا حزن عقلی تو ان دونوں مضمونوں کو پیش نظر کر لینے سے کبھی نہیں رہ سکتا البتہ مفارقت کا طبعی غم اس کے بعد رہ سکتا ہے سو گو طبعی غم پر مواخذہ نہیں اور نہ وہ دفعۃً زائل ہو سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے اس کے کم کرنے کا بھی سامان کیا ہے چنانچہ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (اور ہم اللہ کے پاس جانے والے ہیں) میں اس کا بھی سامان موجود ہے۔ وہ یہ کہ ہم کو جو موت عزیز سے مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے تو غور کر لیا جائے کہ یہ صدمہ نفس مفارقت پر نہیں بلکہ اعتقاد مفارقت دائمہ اس کا سبب ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب یہ ہمیشہ کے واسطے ہم سے جدا ہو گیا اگر یہ خیال ذہن میں نہ جمے تو نفس مفارقت سے زیادہ صدمہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں بھی بعض دفعہ اس سے مفارقت ہوتی تھی چنانچہ کبھی ہم کو سفر پیش آتا تھا کبھی عزیز کو سفر پیش آتا تھا جس میں مہینہ دو مہینہ اور بعض دفعہ سالہا سال کی مفارقت ہوتی تھی مگر یہ اس لئے گوارا تھا کہ پھر ملاقات کی امید رہتی ہے تو اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تم اس مفارقت کو دائمی مفارقت نہ سمجھو کیونکہ تم بھی ایک دن وہیں جانے والے ہو جہاں یہ عزیز گیا ہے اور وہاں اس سے ملاقات ہو جائے گی پس یہ مفارقت ویسی ہی چند روزہ مفارقت ہے جیسی دنیا میں کبھی سفر وغیرہ سے پیش آیا کرتی تھی ایک دن یہ مفارقت ختم ہو کر مبدل بہ وصال ہو جائیگی۔

اور قاعدہ ہے کہ جس فراق کے بعد وصال کی یقینی امید ہو وہ زیادہ گراں نہیں ہوتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدر آباد ایک شخص کو اپنے یہاں کسی اعلیٰ ملازمت پر بلالیں اور اس کے بھائی کو مفارقت کا صدمہ ہو نظام اُس کے صدمہ کی خبر سن کر خط لکھدیں کہ گھبراؤ نہیں ہم تم کو بھی بلالیں گے تو غور کر لیجئے کہ نظام کے اس خط سے غمگین بھائی کا صدمہ فوراً زائل ہو جائے گا یا نہیں یقیناً پہلا سا غم تو ہرگز نہ رہے گا۔ البتہ اب اس فکر میں پڑ جائیگا کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے کہ میں بھی وہاں پہونچ جاؤں اور جب تک مفارقت رہیگی اس وقت تک گن گن کر دن گذارے گا اور امید وصال میں یہ فراق کے دن خوشی سے گذار دے گا پس ہم کو بھی کسی عزیز کی وفات پر یہی سمجھنا چاہیئے کہ یہ مفارقت چند روزہ ہے ایک دن خدا تعالیٰ ہم کو بھی بلالیں گے جیسا اسے بلایا ہے کیونکہ حق تعالےٰ نے ہمیں خبر دی ہے کُلٌّ اِلَیْنَا رَاجِعُوْنَ (ہر شخص ہمارے پاس آنے والا ہے) پھر حیرت ہے کہ نظام حیدر آباد کے تو اس کہنے سے کہ ہم تم کو بھی بلالیں گے مفارقت کا غم جاتا رہے اور خدا تعالیٰ کے فرمانے سے ہلکا بھی نہ ہو غرض ان نصوص سے معلوم ہوا کہ حضرات شریعت کا مقصود یہ ہے کہ صدمہ کے وقت ہمارے زخم پر مرہم لگادیں چنانچہ حزن عقلی کے استیصال کا اور حزن طبعی کی تخفیف کا ہر طرح مکمل سامان کردیا ہے مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا دل ہر وقت زخمی رہے اس لئے ایسے سامان کرتے ہیں جن سے غم تازہ ہو اور صدمہ کی یاد دہانی ہو جیسے بچہ چاہا کرتا ہے کہ زخم پر جو کھرنڈ آگیا ہے اس کو نوچ کر کھجلاوے تاکہ مزا آوے مگر اس کا انجام یہ ہے کہ زخم بڑھ جاتا اور بعض دفعہ ہلاکت تک پہونچ جاتا ہے اسی لئے اسی لئے باپ یہ چاہتا ہے کہ کھرنڈ جما رہے تاکہ زخم جلدی اچھا ہو جائے شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ جب حق تعالےٰ کو ہمارے ساتھ ایسی رحمت ہے کہ وہ ہمارا غمگین رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ حزن و غم کو زائل کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر صدمہ بھیجتے ہی کیوں ہیں پوری رحمت تو یہ ہوتی کہ صدمہ اور رنج بھیجتے ہی نہ۔ جو بعد میں اس کے ازالہ کی فکر کی جائے اس کا جواب یہ ہے کہ رنج اور صدمہ بھیجنے میں حکمتیں ہیں اس لئے بھیجتے ہیں مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس حکمت کے لئے رنج صدمہ بھیجا جاتا ہے اس حکمت کو حاصل کرو رنج

ہی کو۔لے کر نہ بیٹھ جاؤ جیسے استاد بچے کو طمانچہ یا قمچی اس لئے لگاتا ہے تاکہ سبق یاد کرلے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ طمانچہ اور قمچی ہی کا سبق بنالے اگر وہ سبق جلدی ہی یاد کرلے گا تو پھر استاد شفقت سے اس کو پیار کرے گا چوٹ کی جگہ کو سہلائے گا اور اگر سبق مقصود کو اس نے یاد نہ کیا بلکہ مار ہی کو سبق بنالیا تو یقیناً اب استاد کا غصہ بڑھے گا۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ یہ ناگوار واقعات ہماری تنبیہ اور اصلاح کے لئے بھیجے جاتے ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ ہم چوکنے ہو کر اعمال کی اصلاح کرلیں یہ مقصود نہیں کہ بس رات دن ناگوار واقعات ہی کا سبق رٹتے رہیں اور زخم کو نوچتے رہیں اور اس میں پڑ کر اصل مقصود کو بھول جائیں میں بقسم کہتا ہوں اور اس سمجھنے سے زیادہ کوئی ذریعہ تسلی کا نہیں کہ ناگوار واقعات میں حکمتیں ہوتی ہیں اور اہل اللہ کو مصیبت کے وقت تعین کے ساتھ ہر واقعہ کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے گو اجمالاً اعتقاد تو سب کو ہے مگر اہل اللہ کو بالتعیین معلوم ہو جاتا ہے کہ اس واقعہ میں ہمارے واسطے یہ حکمت تھی ان کو بیماری میں چوری میں اور دشمن کی ایذا میں اور ہر ناگوار معاملہ میں کھلی حکمت نظر آتی ہے واقعہ کے ساتھ ہی ان کے دل میں کوئی کھجلاتا ہے کہ یہ معاملہ اس حکمت کیلئے کیا گیا ہے۔ بس وحی تو نہیں آتی نہ آواز سنائی دیتی ہے باقی سب کچھ ہوتا ہے رات دن ان کے قلب پر افعال الٰہیہ کی حکمتیں منکشف ہوتی رہتی ہیں پھر کیا ممکن ہے کہ ان کو ناگوار واقعات سے عقلی ناگواری ہو ہر گز نہیں۔ بلکہ ان کو مصائب میں بھی عشق محبت کی ترقی ہوتی ہے، حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے کیونکہ وہ اس کی حکمت اور منفعت کو کھلی آنکھوں دیکھتے رہتے ہیں۔ واللہ اگر کسی وقت تمام دنیا ان کی مخالف ہو جائے جب بھی ان کی محبت حق تعالیٰ کے ساتھ کم نہ ہوگی بلکہ بڑھتی رہے گی گو خاص احباب اور بعض اقربا ربھی ان کو چھوڑ دیں کیونکہ ان کو اس میں بھی حکمت نظر آتی ہے ایک کھلی حکمت تو یہ ہے کہ اس وقت عارف کی نظر مخلوق سے بالکل ہٹ جاتی ہے اور اس کا دل دنیا سے سرد ہو کر ہمہ تن خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس کو بجز ذات حق کے کسی سے امید نہیں رہتی اور دنیا کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے وہ حقیقت وہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ۔

لہ گر گریزی بر امید راحتے ہم از انجا پیشت آید آفتے

کلہ ہیچ کنجے بے دو و بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

لہ (اگر تم فرصت کی امید پر گریز کرتے ہو ممکن ہے کہ اس وقت بھی تم کو کسی آفت کا سامنا ہو جائے)

کلہ (کوئی گوشہ بغیر دوڑ دھوپ اور دام کے نہیں سوائے تعلق مع اللہ کے آرام نہیں)

مصائب و آرام اور احباب کی بے مروتی سے سالک کو اس حقیقت کا پورا انکشاف ہوجا! اور وہ ہمہ تن خلوت مع اللہ میں مشغول ہو جاتا ہے خلوت گاہ سے مراد یہ نہیں کہ چلہ کشی کرے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ دل کو ذات حق کے سوا کسی سے تعلق اور ربط نہ رہے جس کو یہ دولت حاصل ہو جائے وہ ہر دم خلوت میں ہے گو بظاہر مخلوق کے ساتھ ہو۔ اور جس کو ربط قلب باللہ حاصل نہ ہو چاہے وہ چلہ کشی بھی کرے خلوت سے محروم ہے ہاں یہ دولت حاصل ہوتی ہے اول خلوت اختیار کرنے ہی سے اس لئے اہل اللہ مبتدی سلوک کو چند روز یا چند ماہ پوری خلوت کراتے ہیں کہ اختلاط مع الخلق سے بالکل روک دیتے ہیں جیسے طبیب مسہل کے دن مریض کو خلوت کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ ہمہ تن دستوں کے تصور میں مشغول رہے۔ اختلاط اور بات چیت میں مشغول ہونے سے دستوں کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کا حاصل ہونا یکسوئی پر موقوف ہو اس کے لئے خلوت کا حکم ضروری ہے مگر لوگ اطبا پر تو اعتراض نہیں کرتے صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ بدعت کہاں سے نکالی میں کہتا ہوں کہ بدعت وہ ہے جو دین سمجھ کر اور ثواب کے اعتقاد سے اختیار کی جائے اور اگر کسی مباح کام کو جو شرعاً ممنوع نہ ہو علاجاً اختیار کیا جائے تو یہ بدعت نہیں۔ پس صوفیہ پر یہ اعتراض جب صحیح ہوسکتا ہے کہ پہلے یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ چلہ کشی کو دین سمجھ کر ثواب کے اعتقاد سے اختیار کرتے ہیں بلکہ وہ تو محض علاجاً اس کو اختیار کرتے ہیں اور یہ جواب تو علی سبیل التنزل ہے ورنہ میں کہتا ہوں کہ خلوت اور عزلت گزینی کا ثبوت شریعت میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول وحی سے پہلے

جبل حرا میں عزلت اختیار کی ہے احادیث میں آتا ہے کہ آپ ہفتہ عشرہ کے لئے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر غار حرا میں رہا کرتے تھے یہی تو چلہ کشی ہے (اور گو یہ واقعہ قبل نبوت کا ہے۔ مگر حضرات صحابہ نے بعد نبوت کے اس کو نقل فرمایا ہے اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا اور نہ یہ تنبیہ کی کہ یہ صورت اب ممنوع ہے لہذا تقریر صحابہ سے اس کا شرعاً مستحسن ہونا ثابت ہوگیا اور اگر غور کیا جائے تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تقریر ہے کیونکہ اس واقعہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے اور غالب یہ ہے کہ انھوں نے آپ سے سنکر بیان کیا ہے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فعل کو بلا انکار کے بیان فرمایا تو اس پر تقریر نبوی صلے اللہ علیہ وسلم بھی پائی گئی نیز یہ تو آپ کو معلوم تھا کہ میرے اس فعل کا سب کو علم ہے اس پر بھی آپ نے نکیر نہیں فرمایا یقینی تقریر ہے ۱۲ جامع) اور بعد میں ایسی خلوت اس لئے اختیار نہیں فرمائی کہ پھر ضرورت نہ رہی مگر بعد میں خلوت طویلہ کی ضرورت نہ رہی تھی مطلق خلوت کی کاملین کو بھی ضرورت رہتی ہے حق تعالیٰ نے نبوت کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص وقت خلوت مع الحق کے لئے مقرر کرنے کا حکم فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ کہ جب آپ (تبلیغ احکام وغیرہ سے) فارغ ہوجایا کریں تو (عبادت میں) محنت کیا کریں اور (اس وقت) صرف اپنے رب ہی کی طرف راغب ہوا کریں یعنی گو آپ ہر وقت عبادت ہی میں رہتے ہیں اور تبلیغ وغیرہ میں بھی آپ کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف رہتی ہے مگر وہ توجہ بواسطہ ہے جس میں کسی قدر مخلوق کی طرف بھی التفات ہوتا ہے (گو وہ درجہ مرآۃ میں ہی ہو مگر توجہ دوسری طرف ہے تو) اس کام فارغ ہوکر ایک وقت عبادت کا ایسا مقرر کیجئے جس میں بجز ذات حق کے کسی طرف مطلق التفات نہ ہو وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ میں جار مجرور کو فعل سے مقدم کرنا مفید حصر ہے اس لئے اس سے یہ مضمون مستفاد ہوا کہ اس وقت خدا ہی کی طرف راغب رہیں اور کسی طرف التفات نہ ہو ایک مقام پر حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وقت خلوت کی تعیین بھی فرمادی ہے کہ وہ کون سا وقت ہونا چاہیئے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِصْفَهُ

اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيلًا ؕ اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ؕ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِىَ اَشَدُّ وَطْئًا وَّاَقْوَمُ قِيلًا ؕ اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ؕ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيلًا ؕ (ترجمہ :۔ اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف یا اس نصف سے کسی قدر کم کردو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں بیشک رات کا اٹھنا خوب مؤثر ہے کچلنے میں اور بات خوب نکلتی ہے بیشک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان آیات میں حق تعالےٰ نے رات کا آخری حصہ خلوت کے لئے مقرر فرمایا ہے خواہ نصف اخیر ہو خواہ ثلث اخیر یا اس سے بھی کم وبیش اور اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ آپ کو دن میں بہت کام رہتا ہے اس میں خلوت کاملہ کا موقع نہیں مل سکتا۔ اس لئے رات کو اٹھ کر تلاوت قرآن مع الترتیل اور ذکر اللہ میں مشغول ہوا کیجئے اور اس میں تبتل کامل یعنی پوری یکسوئی کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ پھر درمیان میں اس وقت کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے کہ رات کے اس حصہ میں عبادت کرنے سے نفس پر مجاہدہ کامل ہوتا ہے۔ اور زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ ٹھیک ادا ہوتی ہے یعنی زبان وقلب دونوں متوافق ہوتے ہیں (میں کہتا ہوں کہ ان آیات سے صوفیہ کی چند عادات کی اصل نکلتی ہے اور وہ عادات یہ ہیں۔ (۱) طالبین کے لئے ہر ایک کے مناسب کوئی طریقہ ذکر متعین کر دینا۔ جیسا کہ حق تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تہجد کی نماز میں تلاوت قرآن مع الترتیل اور اس کے بعد ذکر اللہ کو متعین فرمایا ہے۔ لِاَنَّ الْاَصْلَ فِى الْكَلَامِ التَّاسِيْسُ فَيَكُوْنُ ذِكْرٌ فِىْ قَوْلِهٖ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ غَيْرَ تِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ (اس لئے اصل کلام میں تاسیس ہے اس لئے ذکر وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ میں تلاوت قرآن کے علاوہ) (۲) طالبین کے لئے وقت ذکر متعین کر دینا (۳) اور اس وقت میں فرصت وفراغ کی رعایت کرنا (۴) طالبین کو ذکر میں یکسوئی کی تاکید کرنا اور دراصل تعیین ذکر وتعیین وقت فرصت وغیرہ اسی یکسوئی حاصل کرنے کے لئے ہیں۔ کیونکہ

شیخ اگر کوئی ذکر متعین نہ کرے تو طالب کا ذہن مختلف اذکار کی طرف چلیگا کہ یہ کروں یا وہ کروں ایسے ہی کسی کو دو تین وقت فرصت کے ملتے ہوں تو اس کو ان میں بھی یہ تردد رہیگا کہ کونسا وقت زیادہ بہتر ہے کس کو ذکر کے لئے خاص کروں شیخ کی تعیین کے بعد یہ تردد زائل ہو جاتے ہیں اور ذکر میں یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے جو لوگ معمولات صوفیہ پر جلدی سے بدعت کا الزام لگا دیتے ہیں ان کو قرآن وحدیث میں کافی غور کرنے کے بعد زبان سے بات نکالنا چاہیئے۔ اگر کامل غور وخوض سے کام لیا جائے تو محققین صوفیہ کے تمام معمولات واحوال کی اصل قرآن وحدیث سے مل جائے گی جس کی دلیل حضرت حکیم الامت کا رسالہ حقیقۃ الطریقۃ اور رسالہ مسائل السلوک ہے اور ایک رسالہ التشرف جدید تصنیف ہوا ہے جس میں احادیث کثیرہ سے محققین طریق سے اصول وفروع کی تائید کی گئی ہے باقی جہلا صوفیہ کی رسوم کا کوئی ذمہ دار نہیں نہ ان کی تائید ہم کو مطلوب ہے ۱۲ جامع)

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایک خاص وقت میں خلوت کی ضرورت تھی تو اور تو کس شمار میں ہیں آپ سے زیادہ کون کامل ہوسکتا ہے۔ اسی لئے اہل اللہ ہمیشہ ایک خاص وقت[ف] خلوت کا مقرر فرماتے ہیں جس میں سوائے حضرت حق کے کسی طرف توجہ نہ ہو اور یہ حال ہو ؎

دنترا مے کہ داری دل درو بند　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے تمہارا دلی تعلق ہو جائے تو پھر تمام جہان سے آنکھ بند کرلو)

اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

[ف] ثقات سے سنا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ علاوہ نماز تہجد کے بعد نماز فجر وقت اشراق تک مراقبہ میں مشغول رہتے تھے اور یہی طریقہ حضرت مرشدی سیدی مولانا خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم کا ہے اور حضرت سیدی حکیم الامت دام مجدہم علاوہ نماز تہجد کے بعد نماز فجر جنگل کی طرف تنہا تشریف لے جاتے ہیں جس میں کامل خلوت کے ساتھ مشغول ذکر رہتے ہیں۔ ایک بار فرمایا کہ مجھے تو حق تعالیٰ اس وقت میں یعنی سیر صحرا ہی میں بہت کچھ عطا فرما دیتے ہیں ۱۲ جامع

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ رُوے   بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے
(ایک ساعت ایک لحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دار وگیر شاہی سے بہتر ہے)
فراغ دل کے ساتھ تھوڑی دیر متوجہ ہو جانا بھی بہت بڑی دولت ہے اس لئے سالکین منتہیین کو بھی ایک وقت خاص مقرر کرنا چاہیئے خواہ دس پندرہ ہی منٹ ہو جس میں غیر کا خیال بالکل نہ آوے۔ بلکہ اپنا خیال بھی نہ آوے کیونکہ توجہ الی اللہ کے وقت اپنا خیال بھی غیر ہے اسی کو حضرت قلندر فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دھم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دھم

(یعنی مجھ کو انکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کا چہرۂ انور نہ دیکھنے دوں اوران کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سُننے دوں)

مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی طرف متوجہ ہونے کے وقت آنکھ اور کان سب کو معطل کر دیتا ہوں جملہ اعضا سے بے خبر ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں اور اس کے لئے سب سے اچھا وقت تہجد کا ہے اہل اللہ نے ہمیشہ تہجد کا اہتمام کیا ہے یہ حضرات رات کی بہت ہی قدر کرتے ہیں آجکل عام لوگ شب قدر کا تو اہتمام کرتے ہیں اور راتوں کا نہیں کرتے مگر وہ حضرات ہر رات کو شب قدر ہی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

اے خواجہ چہ پرسی ز شب قدر نشانی
ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

(اے صاحب تم شب قدر کی نشانی کیا دریافت کرتے ہر رات شب قدر ہے اگر قدر جانو)

اور بات یہ ہے کہ شب قدر کی فضیلت کا اصل سبب کیا ہے اس کو دیکھنا چاہیئے احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اس رات میں غروب آفتاب سے طلوع فجر تک اہل عالم پر توجہ خاص فرماتے ہیں سو وہ توجہ خاص ہر رات میں ہوتی ہے۔ اتنا فرق ہے کہ شب قدر میں تمام رات اور اول درجہ میں ہوتی ہے اور بقیہ راتوں میں نصف وثلث اخیر میں اور دوسرے درجہ میں ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کی قلیل توجہ بھی بڑی دولت ہے

كما قال تعالىٰ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ اَكْبَرُ وَصَرَّحُوْا فِيْهَا لِكَوْنِ التَّنْكِيْرِ لِلتَّقْلِيْلِ
(حق تعالیٰ کی تھوڑی سی توجہ بھی بہت بڑی ہے تصریح کی ہے کہ رضوان کا نکرہ لانا تقلیل کیلئے ہے)
گو کثیر توجہ اس سے بھی بڑی ہے لیکن قابل قدر تو دونوں ہیں۔ اس لئے اہل اللہ ہر رات کی بہت قدر کرتے ہیں۔ ہاں شب قدر کی اوروں سے زیادہ قدر کرتے ہیں کہ اس میں وہ دولت قابل قدر اور زیادہ ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہ ہونا چاہیئے کہ اور راتوں کی بے قدری کی جائے لیکن اگر کسی سے بوجہ کثرت مشاغل کے رات کو اٹھنے کا اہتمام نہ ہو سکے تو وہ دن میں یا اول شب میں کوئی وقت خلوت کا مقرر کر لے (خواہ بعد نماز فجر یا بعد عصر یا بعد مغرب یا بعد عشاء، یا اور جس وقت میں جس کو فرصت ہو ۱۲) یہ مضمون اس شعر کی شرح میں یہاں تک پہونچ گیا۔ ع

جز بخلوت گاہ حق آرام نیست (سوائے تعلق مع اللہ آرام نہیں ہے)

اس سے پہلے یہ مضمون تھا کہ مصائب و آلام میں حکمتیں ہیں جن کو اہل اللہ تعیین کے ساتھ سمجھ جاتے ہیں پس اب یہ اشکال رفع ہو گیا کہ جب حق تعالیٰ کو ازالہ حزن و تخفیف غم کا اس قدر اہتمام ہے تو اول ہی غم کیوں دیا تھا۔ میں نے بتلا دیا کہ انھوں نے بعض حکمتوں کی وجہ سے ہم کو غم دیا ہے اور مقصود حق یہ ہے کہ ہم ان حکمتوں کو سمجھ کر ان کے مقتضا پر عمل کریں نہ یہ کہ اسی غم کا سبق پڑھتے رہیں اور اسی کو لے کر بیٹھ جائیں جیسا کہ رسوم محرم میں لوگوں نے یہی طرز اختیار کیا ہے پس محرم میں جو لوگ شہادت نامے پڑھتے ہیں یہ مقصود حق کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں تجدید غم ہے اور حق تعالےٰ کا مقصود یہ ہے کہ واقعہ غم سے سبق حاصل کر کے پھر اس کو کم کیا جائے نہ یہ کہ ہر سال تازہ کیا جائے اور سبق حاصل کرنے کے لئے اس کی اجمالی یاد گو بلا قصد ہو کافی ہے جس میں نہ تفصیل واقعات پڑھنے کی ضرورت ہے نہ ماہ محرم کی تخصیص کی ضرورت ہے نہ کسی پیرا اظہار غم کی ضرورت ہے نہ سامان اظہار کی ضرورت ہے اور اجمالی قصہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت امام مع اپنے خاندان کے میدان کربلا میں یزید کی جماعت کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے اور سبب یہ تھا کہ آپ بوجہ فسق یزید کے اس کی بیعت قبول نہ فرماتے تھے اور جماعت یزید آپ کو

بیعت پر مجبور کرتی تھی۔ آپ کے نزدیک یزید کو خلافت سے معزول کرنا واجب تھا
اسی کا سامان کرنے کے لئے آپ کوفہ جارہے تھے کہ وہاں جماعت یزید کا مقابلہ ہوگیا
اور جن لوگوں نے امداد کا وعدہ کیا تھا وہ سب اپنی بات سے پھر گئے آپ اپنی بات پر
جمے رہے آخر کار آپ کو شہادت نصیب ہوئی۔ اس سے یہ سبق حاصل ہوا کہ دین کے کام
میں اگر ایک شخص اپنے نزدیک حق پر ہو تو اسے کسی کی مخالفت کا خوف نہ کرنا چاہیئے
چاہے سارے مسلمان اس کا ساتھ چھوڑ دیں اور کچھ لوگ جان و آبرو کے بھی درپے ہوجائیں
دین کے مقابلہ میں اس کی پروا نہ کرنا چاہیئے آخر موت ایک دن آئے ہی گی پھر دین پر
جم کر آجائے تو اس سے کیا بہتر ہے اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق کا مدار کثرت
رائے پر نہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت شخص واحد ہی کی رائے حق پر ہو۔ چنانچہ جس
وقت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت یزید سے انکار کیا ہے اس وقت تمام
صحابہ اور تابعین کی رائے ان کے خلاف تھی۔ سب نے یزید کی بیعت کو قبول کرلیا تھا۔
اور اکثر نے امام حسین کو ارادہ خروج سے منع بھی فرمایا اور خیر خواہانہ نصیحت بھی کی تھی۔
مگر حضرت امام چونکہ اپنی رائے کو انشراح صدر کے ساتھ صحیح سمجھے ہوئے تھے اس سے نہ
ہٹے اور اسی پر جان دیدی۔ کیا آج کسی کا منہ ہے جو یوں کہہ سکے کہ امام کی رائے غلط تھی
کیونکہ کثرت رائے ان کے خلاف تھی یہ کثرت رائے کی شاخ آجکل ہی نکلی ہے سلف
میں بجز صورت اجماع کے جس میں سب کا اتفاق ضروری ہے محض کثرت کا کوئی اعتبار نہ
تھا چنانچہ مسائل فقہیہ میں بکثرت ایسے مسائل موجود ہیں جن میں ایک امام تمام عالم سے
تفرد کرتا ہے اور کوئی اس کی رائے کو کثرت رائے کے خلاف ہونے کی وجہ سے غلط نہیں
کہتا۔ اگر کوئی اس کارد بھی کرتا ہے تو جواب میں احادیث یا نصوص پیش کرتا ہے محض کثرت
رائے کی آڑ کوئی نہیں پکڑتا۔ پھر مخالفین کی جواب میں وہ متفرد بھی احادیث و نصوص
پیش کردیتا ہے اور اس کے مقلد یہ دیکھ کر کہ ہمارے امام کے پاس بھی اپنی رائے کی ثبوت
یہ نصوص شرعیہ موجود ہیں اس کی تنہا رائے کو قبول کر رہے ہیں اور اس کے موافق عمل
کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ حنفیہ کے نزدیک قضاء، قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہے جو تمام ائمہ

مذاہب کے خلاف ہے۔ دارالحرب میں حربی کافر کے ساتھ معاملہ ربوٰ جائز ہے جس میں جمہور ائمہ کا حنفیہ سے خلاف ہے اگر تفرد دلیل غلط ہے اور کثرت رائے دلیل صواب ہے تو ان مسائل میں آپ نے امام ابو حنیفہ کی تقلید کو کیوں نہیں ترک کر دیا (اگر واقعہ امام حسینؓ میں کوئی یہ کہے کہ اس وقت بھی بہت لوگ امام کی رائے سے موافق تھے مگر خوف کی وجہ سے موافقت ظاہر کرتے تھے سو اول تو یہ غلط ہے کیونکہ حضرات صحابہ و تابعین کی شان یہ ہے لَا یَخَافُوْنَ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ (ملامت کرنے والوں کی ملامت سے دین کے بارہ میں نہیں ڈرتے) وہ اظہار حق میں کسی سے کیا ڈرتے امام کی شہادت کے بعد یزید کے منہ پر ایک صحابی نے ایسی کوری کوری سنائی تھی کہ یزید ہونٹ چاٹتا رہ گیا تھا۔ کیا ان حضرات پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ انھوں نے خوف کی وجہ سے امام کا ساتھ نہ دیا۔ نہیں بلکہ ان کو درحقیقت امام کی رائے ہی سے اختلاف تھا اور اگر مان لیا جائے کہ خوف کی وجہ سے صحابہ و تابعین نے ساتھ نہیں دیا تھا تو اس سے ان لوگوں کو پوری سند ملتی ہے جن کو آپ آجکل ڈرپوک کہتے ہیں اور یہ مشہور کرتے ہیں کہ یہ جمہور کے ساتھ خوف کی وجہ سے شریک نہیں ہوتے وہ آپ کے اس الزام کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر کے ان صحابہ کے طرز عمل کو دلیل میں پیش کر دیں گے جنھوں نے آپ کے نزدیک خوف کی وجہ سے ایک امر واجب میں امام حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا تھا۔

نیز وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تم جو ہم کو منفرد سمجھتے ہو یہ غلط ہے بلکہ ہماری رائے کے ساتھ بہت علماء کو موافقت ہے جو خوف عوام ولعن وطعن جہلاء کے خوف سے اپنی موافقت ظاہر نہیں کرتے جیسا کہ صحابہ و تابعین کے خوف کی وجہ سے امام کی موافقت ظاہر نہ کی تھی۔ اور جو علماء تمہارے ساتھ ہیں ان میں بھی بعض افراد دل سے ہماری رائے کو صحیح جانتے ہیں مگر خوف یا طمع کی وجہ سے تمہارے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اور یہ محض الزامی جواب نہیں بلکہ اگر تفتیش و انصاف سے کام لیا جائے تو اس کا صدق واضح ہو جائے گا۔

(بقیہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

غرض آپ امام حسین رضی اللہ عنہ کو متقرد مانیں یا غیر متفرد ان کا مدعیٰ ہر طرح سیدھا ہے" (جامع) ایک سبق اس واقعہ سے یہ حاصل ہوا کہ مسلمانوں کو بتلا دیا گیا کہ کاملین کا بھی امتحان ہوا کرتا ہے۔ اور ان کو بھی تکلیف پیش آیا کرتی ہے جس سے ان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون ولی ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حد درجہ محبوب تھے جن کے بارہ میں پیشین گوئی ہے۔ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ (اہل جنت کے جوانوں کے سردار ہیں) مگر دیکھ لیجئے ان کو بھی کیسا امتحان وابتلاء پیش آیا اور گو کوئی شخص اپنے محبوب کو تکلیف نہیں دے سکتا مگر درحقیقت اہل اللہ کے لئے ان واقعات میں کلفت جسمانی سے زیادہ روحانی راحت ولذت ایسی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے یہ کلفت جسمانی کچھ نہیں معلوم ہوتی اور اگر ان سے یہ کہا جائے کہ تم چاہو تو یہ جسمانی کلفت تم کو نہ دی جائے تو وہ کبھی اس کو گوارا نہ کریں گے اور یوں کہیں گے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت ہو کہ اس پر آپ خنجر آزمائیں)

صاحب محبت تو وہ چیز ہے کہ اس میں بعض لوگ ادنیٰ ادنیٰ محبوبوں کے لئے خوشی کے ساتھ جان فدا کر دیتے ہیں حالانکہ جان دینے کے بعد وہ محبوب ان کو اس جان نثاری کا کچھ صلہ بھی نہیں دے سکتا۔ تو پھر یہ کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ عاشقان الٰہی کو جان دینے میں کچھ بھی روحانی پریشانی ہوتی ہوگی جبکہ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم رضائے محبوب کے لئے جان دے رہے ہیں اور یہ بھی یقین ہے کہ مرنے کے بعد وہ اس کا صلہ بھی بہت کچھ دیں گے شہادت کا صلہ اتنا عظیم الشان ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت کے رہنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جو دوبارہ دنیا میں آنا چاہے سوا شہید کے کہ وہ شہادت کا صلہ دیکھ کر تمنا کریگا کہ میں دوبارہ دنیا میں جاؤں اور پھر شہید ہوں پھر جاؤں اور پھر شہید ہوں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم

جیسے کامل فرماتے ہیں وَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِی سَبِیْلِ اللہِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی۔ (پسند کرتا ہوں اس بات کو کہ اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں) صاحبو شہادت میں کچھ تو لذت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں بار بار اس کی تمنا فرماتے ہیں آہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر کیا گذرتی ہوگی جو یہ بات آپ کی زبان پر آئی ورنہ آپ تو بڑے ضابط تھے (شہید جب جان دینے کے لئے بڑھتا ہے تو زبان حال سے حق تعالےٰ کی جناب میں یوں کہتا ہوا جاتا ہے ؎

بجرم عشق توام می کشند وغوغا ئیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ئیست

(یعنی وہ محبوب حقیقی سے عرض کرتا ہے کہ لوگ آپ کے عشق وجرم میں مجھے قتل کر رہے ہیں۔ ذرا آپ بھی ایک نظریہ تماشا دیکھ لیجئے۔)

پھر چونکہ مسلمان کو یقین ہے کہ حق تعالےٰ دیکھ رہے ہیں۔ تو محبوب کے سامنے اس کے نام پر جان دینے کی اسے کیا کچھ لذت آتی ہوگی اس کو وہی جان سکتا ہے ۱۲ جامع)

شہادت کی فضیلت کے لئے کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ شہید کے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور وہ پاک صاف ہو کر خدا کی جناب میں جاتا ہے تو جس کو خدا سے محبت و عشق ہوگا وہ کیونکر اس کا مستمنی نہ ہوگا۔ حقیقی شہادت کی تمنا ہر قلب مسلم میں ہے اور جس کے دل میں اس کی آرزو نہیں اس کے ایمان میں نقص ہے۔ مگر ہاں کسی موقعہ پر پیش قدمی کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ موقعہ شہادت حقیقی کا موقعہ ہے جس میں شرعاً جان دینا مطلوب ہے اور اگر شرعاً کسی موقعہ پر شہادت کے شہادت ہونے میں شبہ ہوجاوے وہاں عارف کبھی جان نہ دے گا۔ بلکہ ایسے موقعہ پر وہ اپنی جان کی حفاظت کرے گا۔ گو اس صورت میں لوگ اس کو ملامت بھی کریں بزدل اور ڈرپوک جو چاہیں کہیں اس کی کچھ پروا نہ کرے گا کیونکہ وہ حقیقی شہادت کا طالب ہے جس سے سوائے رضائے حق و اعلائے کلمۃ اللہ کے کچھ مقصود نہ ہو۔ پھر جہاں رضائے حق حاصل ہونے ہی میں شبہ ہو

وہاں محض مخلوق کی نظر میں بہادر اور جری بننے کے لئے وہ کبھی اقدام نہ کرے گا کیونکہ اس کا مشروب تو ہے ؎

گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے ہم ننگ و نام کے خواہشمند نہیں ہیں)

اور وہ یوں کہتا ہے ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا
اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

عاشق کی ناکامی محرومی کی ناکامی نہیں ہوتی بلکہ طلب ترقی کی وجہ سے وہ اپنے کو ناکام و نامراد سمجھتا رہتا ہے وہ کسی حالت پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ جتنا وصال سے کامیاب ہوتا ہے اس سے آگے ترقی کا طالب ہوتا ہے اس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی اس لئے ناکام کہدیا اور اس طریق میں یہ ناکامی ہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اپنے کو کامیاب سمجھ کر کسی خاص حالت پر قناعت کرے اور طلب کی پیاس کو بجھا دے وہ اس طریق میں ناکام ہے۔ خوب سمجھ لو۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت امام کے واقعہ میں جو سبق ہمارے لئے ہے اس کے واسطے کافی ہے اجمالی یاد کافی ہے تفصیلی واقعات کی کچھ ضرورت نہیں اور اجمالی واقعہ سے کوئی مسلمان ناآشنا نہیں۔ پھر اس کے لئے خاص طور پر ہر سال مجلسیں منعقد کرنا اور اس میں اظہار غم کے طور پر یہ واقعہ دل خراش پڑھنا اور مسلمانوں کے دلوں کو تازہ غم دے کر زخمی کرنا اور شہداء پر نوحہ و ماتم کرنا بالکل خلاف عقل؏ و خلاف مقصود ہے حق ہے۔

؏ لطیفہ:۔ ایک سرحدی کابلی محرم کے زمانہ میں ہندوستان آیا تو اس نے تعزیہ و علم وغیرہ نکلتے ہوئے دیکھے اور اس کے پیچھے کچھ لوگوں کو ماتم و نوحہ کرتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ لوگوں نے کہا تم کو معلوم نہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ اس مہینہ میں شہید ہوئے ہیں۔

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

صاحبو! میں کہہ چکا ہوں کہ صدمہ اس واقعہ میں ہوتا ہے جو مبتلا کے خلاف مرضی ہو تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ یہ واقعہ ان حضرات کے خلاف مرضی ہوا اور وہ شہادت کے طالب نہ تھے ہرگز نہیں۔ تو جب وہ شہادت کے طالب تھے تو اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ اس کے لئے نوحہ و ماتم کیسا۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان حضرات شہداء کو وہ مراتب و منازل عطا نہ فرماتے جو اب حاصل ہوئے۔ کیا آپ کے نزدیک ان حضرات کو اس واقعہ سے اجر نہیں ملا۔ اور بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر آپ کے سلف دین کے لئے ایسی جان نثاری اور جانفروشی نہ کرتے تو آج آپ کو اس کے لئے ہمت کیونکر ہوتی اور اگر یہ نظیریں آپ کے سامنے نہ ہوتیں تو ایسے مواقع میں دین کے لئے جان دینے کو تمہارے دل کیسے بڑھتے۔ قاعدہ ہے کہ نظائر سے انسان کی ہمت بلند ہوتی ہے اور سلف کے کارناموں کو یاد کر کے پچھلوں کو ان کے اتباع کا شوق ہوتا ہے اگر اس واقعہ کا ظہور نہ ہوتا تو یہ سبق ہم کو کیسے حاصل ہوتا جب اس واقعہ میں ہمارے لئے بھی حکمت ہے۔ اور ان حضرات کا بھی یہ مطلوب تھا اور ان کو اس پر اجر بھی بہت بڑا ملا ہے۔ تو پھر کیا ہر سال اس قدر اظہار غم جو آجکل کیا جا رہا ہے منشار حق کے خلاف نہ ہوگا۔

شائد اس پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ پھر کیا اس واقعہ کے وقوع کے وقت بھی غم نہ کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ بات تو اس وقت بھی تھی۔ یہ واقعہ تو اس وقت بھی ان کے لئے باعث اجر تھا اور شہادت ان کی مطلوب تھی اور اس وقت بھی ہمارے لئے اس میں حکمت تھی۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس وقت کا غم کرنا غیر اختیاری ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵ کا) سرحدی نے کہا وہ تو تیرہ سو برس پہلے شہید ہو چکے ہیں کیا ہندوستان میں اب خبر آئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ بہت ہی غافل ہیں کہ تیرہ سو برس کے واقعہ پر آج غم کرنے بیٹھے ہیں اور مثنوی میں ایک ایسی ہی حکایت ایک شاعر کی جو حلب میں زمانہ محرم میں آیا تھا لکھی ہے۔ واقعی مقتضائے عقل تو یہی ہے کہ صرف واقعہ کے وقت غم کیا جائے سالہا سال تک غم کو لیکر بیٹھنا بقول اس سرحدی کے غفلت ہی کی علامت ہے ۱۲ جامع

قاعدہ ہے کہ ظہور حادثہ کے وقت طبعی غم بلا اختیار ہوا کرتا ہے۔ اور امر غیر اختیاری میں انسان معذور ہے۔ لیکن جب طبعی غم کی حد گذر جائے اس کے بعد غم کو لے کر بیٹھنا یہ مذموم ہے۔ بس اب اس کی حکمتوں پر نظر کرنا چاہیئے۔ اس فرق کو ایک مثال میں سمجھئے۔ مثلاً ایک شخص ڈاکٹر سے خود کہے کہ میرا اپریشن کر دو۔ اس کے لئے وہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اس کی خوشامد بھی کرتا ہے مگر اپریشن کے وقت اس کے منہ سے آہ اور چیخ بھی نکلتی ہے کیا آپ اس شخص کو اس آہ پر کچھ ملامت کریں گے ہرگز نہیں آخر کیوں محض اسی وجہ سے کہ یہ غیر اختیاری بات ہے۔ بس اسی طرح یہاں سمجھئے کہ گو وقت وقوع بھی اس واقعہ کی حکمتیں عقلاً ری پیش نظر ہوتیں مگر اس وقت غیر اختیاری غم بھی ساتھ ساتھ ہوتا اور اس میں وہ معذور ہوتے۔ لیکن اب جو ہم رنج صدمہ ظاہر کرتے ہیں یہ عقلی غم ہے طبعی نہیں اور اس کی ممانعت ہے۔ جیسے مثال مذکور میں اپریشن ختم ہونے اور زخم کے اچھا ہونے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اپریشن کا غم کرتا رہے اور ہر سال اس پر ماتم کیا کرے تو اس کو یقیناً سب لوگ بے وقوف کہیں گے اور اس رنج وغم میں اُسے کوئی معذور نہ کہے گا۔ طبعی رنج وغم کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد پوری ہو جائے پھر طبعی رنج نہ ہوگا بلکہ عقلی ہوگا فقہاء نے نصوص شرعیہ سے اس حد کو سمجھا ہے واقعی صوفیہ اور فقہاء یہ دونوں فرقے حکماء امت ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان دونوں میں باہم جدال و نزاع ہے جس کی وجہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بعض لوگ ان دونوں جماعتوں میں غیر محقق بھی ہوتے ہیں۔ ان ناقصین میں نزاع ہوتا رہتا ہے ورنہ اگر دونوں محقق ہوں تو کبھی نزاع نہ ہو۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ تین روز کے بعد تعزیت کرنا پاس والوں کو ممنوع ہے ہاں جو لوگ باہر رہتے ہوں ان کو تین دن کے بعد بھی تعزیت کی اجازت ہے وجہ یہ ہے کہ تین دن میں طبعی غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد تعزیت کرنا اس کو بڑھانا ہے۔ اب یاد دہانی سے غم تازہ ہوگا۔ اور شہری آدمی تین دن کے اندر اندر آسکتا ہے اس کو تین دن کے بعد تعزیت نہ کرنا چاہیئے۔ ہاں مسافر کو اجازت ہے کیونکہ وہ تین دن کے اندر نہیں آسکتا تھا وہ تو بعد ہی میں پہونچے گا۔ اب اگر وہ آکر تعزیت نہ کرے تو طرفین میں بدمزگی

ہو گی صاحب واقعہ اپنے دل میں کہیگا کہ اس ظالم کو میری مصیبت سے غم ہی نہیں ہوا اس نے ایک حرف بھی تسلی کا نہ کہا اس لئے مسافر کو تین دن کے بعد بھی جب وہ آئے تعزیت کرنی چاہیئے اور اس کی تعزیت سے صاحب واقعہ کا غم نہ بڑھے گا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص ضرورت کی وجہ سے اتنے دنوں کے بعد تعزیت کر رہا یہ پہلے نہ آسکتا تھا۔ فقہاء نے تین دن کی حد کو غالباً اس حدیث سے استنباط کیا ہو لا یحل المؤمن ان یھجر اخاہ فوق ثلثۃ ایام کوئی شخص اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ ہجران نہ کرے یعنی اگر کسی سے دنیوی معاملہ میں رنج و تکرار ہو گیا ہو تو تین روز تک تو بات چیت سلام کلام ترک کرنا جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں کیونکہ شارع علیہ السلام نے عادت انسانیہ سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ طبعی غم و غصہ تین دن میں کم ہو جاتا ہے اس کے بعد بہ تکلف بڑھانے سے رنج بڑھے گا۔ اگر اسباب زیادہ اختیار نہ کیے جائیں تو تین دن کے بعد رنج کا غلبہ باقی نہیں رہ سکتا تو جب تک طبعی رنج کا غلبہ تھا اس وقت تک شریعت نے بھی اس کو ترک کلام میں معذور سمجھا۔ جب غلبہ جاتا رہا اب یہ معذور نہیں۔ اب ترک کلام و سلام محض خبث نفس کی وجہ سے ہے اس کی اجازت نہیں۔ اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی رحمت فرمائی کہ تین دن تک ہجران کی اجازت دیدی۔ اگر کوئی فلسفی ہوتا تو ایک دن کے لئے بھی ہجران کو جائز نہ رکھتا اور یہ کہتا کہ ہجران اتفاق و اتحاد باہمی کے خلاف ہے پس تکرار کو جلد رفع کرنا اور فوراً صفائی کر لینا چاہیئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جذبات نفس پر بڑی گہری نظر ہے۔ آپ نے تین دن تک ہجران کی اس لئے اجازت دی کہ فوراً صفائی کرنا عادۃً دشوار اور نفس پر بہت گراں ہوتا ہے آپ نے ہمارے اوپر گرانی اور دشواری ڈالنا گوارا نہیں فرمایا۔ دوسرے رنج و تکرار کے وقت چونکہ دونوں طرف نفس میں رنج و غصہ بھرا ہو گا تو فوراً صفائی کرنے سے یہ صفائی بیکار ہو گی۔ گو ظاہر میں دونوں بات چیت کرنے لگیں گے مگر دلوں میں سخت غبار رہو گا۔ اس حالت میں صفائی کرنے سے کینہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے جو غرض تھی یعنی اتحاد و اتفاق وہ مطلق حاصل نہ ہو گی۔ اس لئے آپ نے معاً صفائی کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ تین روز تک ترک کلام و ہجران سے دل کا غبار نکالنے کی

اجازت دیدی جب تین دن میں دل کا غبار نکل گیا اور غلبۂ رنج فرو ہو گیا اب ملنے جلنے کا حکم دیا اس وقت صفائی سے نفع بھی ہو گا اور چونکہ غبار نکل چکا ہے اس لئے کینہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں جذبات نفس کی جس درجہ رعایت ہے اس کی نظیر نہیں مل سکتی (اور یہ حکم دنیوی رنج و تکرار کا ہے اور اگر کسی سے دینی معاملہ میں رنج ہو گیا ہو تو اس میں یہ حد نہیں بلکہ جب تک دوسرا شخص معصیت سے جو سبب ہجران تھی توبہ خالص نہ کرے اس وقت تک ہجران کی اجازت ہے اور بعض مواقع میں واجب ہے ۱۲ جامع) اس حدیث سے تین دن کے بعد رنج کو لے کر بیٹھنے کی ممانعت ثابت ہوئی دوسری خرابی شہادت ناموں کے پڑھنے اور مجالس منعقد کرنے میں یہ تھی کہ اس میں اظہار غم ہے اور اظہار غم جائز نہیں اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے بعض صحابہ کو دیکھا کہ انھوں نے اپنی چادریں اتار دی ہیں اہل عرب کا لباس ازار و ردا تھا اس کو عربی میں حلہ کہتے ہیں مہذب لوگ قمیص بھی پہنتے تھے مگر زیادہ لوگ چادرہ اور لنگی ہی پہنتے تھے اس وقت القاء ردا (چادر اتارنا) غم کی علامت تھی جیسے آجکل بازو پر سیاہ کپڑا باندھنا لوگوں نے انگریزوں سے سیکھا ہے اور جو لوگ کرتہ پہنتے تھے وہ گریبان چاک کرتے تھے ان کے یہاں شق جیب علامت غم تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چادرہ اتارے ہوئے دیکھ کر فرمایا اَفِعْلَ الْجَاهِلِيَّةِ تَأْخُذُوْنَ اَوْ بِاَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ تَتَشَبَّهُوْنَ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اَدْعُوَ عَلَيْكُمْ دَعْوَةً تَرْجِعُوْنَ فِيْ غَيْرِ صُوَرِكُمْ (فَاَخَذُوْا اَرْدِيَتَهُمْ وَلَمْ يَعُوْدُوْا لَهٗ بَعْدُ اَخْرَجَهٗ اِبْنُ مَاجَهْ كَمَا فِي الْمِشْكٰوةِ بِسَنَدٍ ضَعِيْفٍ فِيْهِ مَتْرُوْكٌ وَلٰكِنْ تَاَيَّدَ مَعْنَاهُ بِحَدِيْثِ لَيْسَ مِنَّا مَنْ شَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ ۱۲ جامع) ترجمہ۔ کیا تم جاہلیت کا طریقہ اختیار کرتے ہو یا اہل جاہلیت کے ساتھ مشابہت کرتے ہو۔ میرا مقصد ہوا تھا کہ تم پر ایسی بددعا کردوں جس سے تمہاری صورتیں بدل جائیں اس وعید کو سنکر صحابہ نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ اظہار غم ناجائز ہے حالانکہ چادرہ اتارنے میں کوئی زیادہ اظہار نہیں مگر آپ کو اتنا بھی ناگوار ہوا۔ پھر یہ رونا اور ماتم کرنا اور اس کے لئے

مجالس منعقد کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے جو سراپا اظہار ہے۔ رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے صاحبزادہ کے واقعہ انتقال میں اَنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ (ہم تمھارے فراق میں اے ابراہیم غمگین ہیں) فرمانا سو اتنا اظہار غم وقت ظہور واقعہ کے مضائقہ نہیں جس بیان اور شکایت الٰہی نہ ہو چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا اَلْعَيْنُ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ يَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا یعنی آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں اور دل غمگین ہے مگر زبان سے وہی کہیں گے جس سے خدا راضی ہو رہا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر یہ فرمانا ؎

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا ؎ صُبَّتْ عَلَى الْاَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

(مجھ پر اتنی مصیبتیں پڑی ہیں۔ اگر دنوں پر پڑتی تو وہ راتیں ہو جاتیں)

سو اول تو بقاعدہ محدثین اس کا ثابت ہونا مشکل ہے کہ یہ اشعار حضرت فاطمہ رض ہی کے ہیں (اہل سیر کی روایت ہے جس میں رطب و یابس سب بھرے ہوتے ہیں ۱۲ جامع) دوسرے یہ غلبہ حال تھا، تیسرے اس میں کوئی شکایت تھوڑا ہی ہے صرف صدمہ کی عظمت بتلائی ہے جیسے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم کے انتقال پر اَنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ (ہم تمھاری جدائی میں اے ابراہیم غمگین ہیں) فرمایا تھا۔ رہا اس کو نظم میں فرمانا تو نظم و شعر اہل عرب کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے ان کو نظم و نثر دونوں برابر ہیں۔ چوتھے یہ بھی تو خیال کیا جائے کہ وہ واقعہ کیسا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال کیسی مصیبت عظمیٰ تھی اس وقت اگر دل پھٹ جاتا تو تعجب نہ تھا یہ بھی حضرات صحابہ رض و اہل بیت کا غایت تحمل ہے کہ انھوں نے دو چار باتوں ہی پر اکتفا کیا۔ پانچویں حضرات صحابہ کو انقطاع نزول وحی کا صدمہ زیادہ تھا کہ اب بار بار حق تعالیٰ کا کلام نازل نہ ہوگا۔ یہ نعمت ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ سو محض وفات پر اظہار غم نہ تھا بلکہ انقطاع برکات کا صدمہ بھی زیادہ تھا جس کو انھوں نے ظاہر کیا ہے۔

؎ اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ کیا اس غم کا اظہار جائز ہے کیا یہ دوسرے غموم سے جن کے اظہار کی ممانعت ہے مستثنےٰ ہے ۱۲ ظلم
اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غم دین کا ہے جو علامت ہے حب خالق کی بخلاف غم دنیا کے کہ علامت ہے حب خلق کی ۱۲ منہ

الغرض قواعد شرعیہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اظہار غم کی ممانعت ہے اس سے ان امور کا ممنوع ہونا بھی ثابت ہوگیا جو آجکل محرم میں کئے جارہے ہیں اور جتنے قصے آجکل اس قسم کے ہوتے ہیں ان کا منشا یہ ہے کہ اہل مال و اہل دولت کو دراصل روپیہ خرچ کرنے اور نام پیدا کرنے کی خواہش ہوتی ہے اس کے لئے یہ بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں جو اہل دولت دنیا دار ہیں وہ تو اپنی اولاد کی بسم اللہ اور ختنہ اور شادی وغیرہ میں دل کے حوصلے نکالتے ہیں اور جو اولاد سے محروم ہیں وہ گدھے گدھیوں کی شادی کرکے حوصلے نکالتے ہیں۔ چنانچہ بمبئی کی طرف ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں۔ ایک جگہ بندر بندریا کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی اور جو اہل دولت دیندار ہیں انھوں نے دین کی صورت میں روپیہ خرچ کرنے کا بہانہ نکال لیا کسی نے مولود شریف اختیار کیا کسی نے محرم میں ماتم برپا کیا کسی نے گیارھویں شریف نکالی کسی نے شب برات کا حلوا ایجاد کیا جو لوگ ربیع الاول میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر خوشی ظاہر کرتے ہیں کوئی ان سے یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی تو اسی مہینہ میں ہوئی ہے اس پر غم بھی تو ظاہر کرو۔ واقعی حق تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و وفات دونوں کو ایک مہینہ میں جمع کرکے اس حکمت کا اظہار فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو اس زمانہ میں نہ فرط غم ظاہر کرنے کا موقع ملے بموجب زمان ولادت ہونے کے نہ فرط سرور ظاہر کرنے کا موقع ملے بوجہ زمان وفات ہونے کے بس جب یہ مہینہ آتا ہے تو خوشی اور غم دونوں ساتھ ساتھ آتے ہیں جس سے اعتدال پیدا ہوجاتا ہے یہ تو عوام کی حالت تھی۔ اب خواص کی سنئے انھوں نے بھی اظہار شوکت و شان کے لئے بعض صورتیں نکالی ہیں مولویوں نے تو مدارس کے جلسے نکالے ہیں جن میں اکثر نام و نمود کا اظہار ہوتا ہے چنانچہ کانپور میں ایک سال دو مدرسوں کا جلسہ تھا ہر ایک چاہتا تھا کہ اپنی کارروائی دوسرے سے زیادہ دکھلائے تو ایک مدرسہ کے طلبہ کو دوسرے مدرسہ والوں نے توڑ کر اپنے یہاں بلایا کہ تم ہمارے مدرسہ سے سند اور دستار لینا دوسرے مدرسہ والوں کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ان طلبہ کو برا بھلا کہا وہ اس ارادہ سے رک گئے تو پہلے مدرسہ والوں نے ایک طالب علم کو کسی بہانہ سے بلاکر کوٹھری میں بند کر دیا اور جلسہ کے وقت تک بند رکھا

تاکہ بھاگ نہ جائے اور دستار بندی کے وقت نکال کر اسے سند اور دستار دے کر اپنے مدرسہ کی طرف منسوب کرلیا پھر کہدیا کہ اب جاؤ جہاں چاہو۔ بھلا یہ دین ہے۔ واللہ بجز شہرت اور نام کے اس سے کچھ مقصود نہیں۔ پھر جلسوں میں رقمیں ایسی صرف ہوتی ہیں جو جلسہ کے لئے مخصوص نہیں ہوتیں لوگوں نے تو نہ معلوم کیا سمجھ کر چندہ دیا تھا اور یہاں وہ رقمیں جلسہ کے انتظامات میں صرف کی جاتی ہیں انھیں رقموں سے امراء و رؤسا کی بھی دعوت ہوتی ہے اور غربا کو بھی کھلایا جاتا ہے اور اس کو ہم سب کھاتے ہیں۔ اگر ان جلسوں کا منشاء محض دین ہوتا تو ان میں حدود شرعیہ کا بھی تو لحاظ ہوتا مگر کچھ نہیں ان کا منشا بجز شہرت کے کچھ نہیں اس لئے حدود کی کچھ پرواہ نہیں۔ یہ تو مولویوں کی حالت تھی ستم یہ ہے کہ صوفیوں نے بھی جن کا مشرب اپنے کو مٹانا اور گمنام کرنا ہے نام و نمود کی بعض صورتیں نکالی ہیں چنانچہ ہر سال جابجا عرس ہوتے ہیں جن میں چار طرف سے مدعیان تصوف کا ہجوم ہوتا ہے تاکہ لوگ جان لیں کہ عرس میں جتنے حضرات تشریف لائے ہیں یہ سب صوفی ہیں۔ پھر قوالی میں حال اور وجد سے تو اچھی طرح اپنے تصوف کو ظاہر کردیا جاتا ہے کہ ہاں ہمارے اندر بھی کچھ ہے۔ صاحبو! حقیقی صوفی کبھی ان طریقوں کو پسند نہیں کرسکتا علماء کے فتوے سے بھی قطع نظر کرلی جائے تو یہ عرس وغیرہ اسباب شہرت ہونے کی وجہ سے خود طریقت کے بھی خلاف ہیں آہ اب مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب جیسے بے نفس کہاں ہیں جو شہرت و نام سے بھاگتے تھے اور اپنے کو مٹانا چاہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لباس ایسا موٹا جھوٹا ہوتا تھا کہ صورت سے کوئی نہ سمجھے کہ یہ بھی کوئی بڑے عالم یا شیخ ہیں مگر ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی
نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(ولی میں انوار الٰہی نمایاں ہوتے ہیں مگر اس کا ادراک اہل دل کو ہوتا ہے)

وہ کتنا ہی اپنے کو چھپاتے بھلا کہاں چھپ سکتے تھے پہچاننے والے پہچان ہی لیتے تھے تو پھر آپ نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ جب کہیں سفر میں جاتے ساتھیوں کو نام ظاہر کرنے سے

منع فرما دیتے تھے کہ میرا نام کسی کو نہ بتلاتا اگر کوئی مولانا ہی سے پوچھتا کہ جناب کا نام کیا ہے تو فرماتے حافظ خورشید حسن، یہ مولانا کا تاریخی نام تھا اس لئے کذب بھی نہ ہوتا اور سائل کو پتہ بھی نہ چلتا کیونکہ یہ نام مشہور نہ تھا۔ لوگوں میں مشہور نام مولانا محمد قاسم ہی تھا۔ خورشید حسن سن کر سائل یہ سمجھتا کہ یہ کوئی اور شخص ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نہیں ہیں اور اگر کوئی پوچھتا کہ آپ کا وطن کہاں ہے۔ فرماتے الہ آباد۔ بعض مخلصین کو شبہ ہوا کہ اس میں تو کذب ہوگیا تو مولانا سے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وطن الہ آباد کدھر سے ہوگیا۔ فرمایا کہ نانوتہ بھی تو خدا تعالیٰ ہی کا آباد کیا ہوا ہے تو لغۃً وہ بھی الہ آباد ہی ہے۔ مولانا تھے بڑے ذہین۔ بات بات سے ذہانت ٹپکتی تھی۔

غدر کے موقعہ میں مولانا نے ایک دفعہ عجیب ذہانت سے بچاؤ کیا۔ بعض لوگوں نے آپ کی شکایت کر دی تھی کہ یہ بھی غدر تھانہ بھون میں شریک تھے تو تین روز تک آپ روپوش رہے۔ تین دن کے بعد آپ ظاہر ہوگئے۔ لوگوں نے کہا حضرت ابھی تک آپ کی تلاش جاری ہے اور وارنٹ موقوف نہیں ہوا ابھی کچھ دنوں اور چھپے رہیئے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر تین ہی دن غار ثور میں روپوش رہے تھے بس سنت پر عمل کر لیا ہے اس سے زیادہ مدت تک مخفی رہنا زائد علی السنت ہے سبحان اللہ اتباع سنت اسے کہتے ہیں کہ روپوشی میں بھی اس کا لحاظ رہا کہ سنت سے زیادہ نہ ہو آجکل لوگ نوافل وتسبیحات ہی میں اتباع سنت کو منحصر سمجھتے ہیں کمال اتباع یہ ہے جو مولانا کے فعل سے ظاہر ہوا غرض تین دن کے بعد آپ علانیہ پھرتے تھے کئی مرتبہ گھر پر دوڑ آئی مگر آپ اپنی ذہانت سے بچ جاتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا چھتہ کی مسجد میں تھے کسی نے مخبری کر دی اور فوراً دوڑ آگئی مولانا اس وقت جہاں بیٹھے تھے اس جگہ سے ذرا کھسک کر بیٹھ گئے۔ پولیس کے افسر نے صورت سے نہ پہچانا کہ یہی مولانا محمد قاسم ہیں کیونکہ لباس مولانا کا عالمانہ نہ ہوتا تھا عامیانہ لباس پہنتے تھے اس نے سمجھا کہ یہ کوئی عالم نہیں معمولی آدمی ہے تو اس نے مولانا ہی سے پوچھا کہ یہاں مولانا محمد قاسم صاحب آئے تھے تو آپ نے اپنی پہلی جگہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ابھی تو یہیں تھے دیکھ لو۔ یہ کہہ کر اپنے

جوتے ہاتھ میں لے پولیس کے درمیان سے نکل گئے۔ بعد میں افسر پولیس کو معلوم ہوا کہ جس سے میں نے باتیں کی تھیں وہی مولانا محمد قاسم صاحب تھے وہ مولانا کی ذہانت پر بڑا حیران ہوا کہ جھوٹ بھی نہیں بولا اور صاف بچ بھی گئے۔ غرض اس ذہانت سے بچتے رہے مگر تین دن کے بعد روپوش نہیں ہوئے۔ خیر یہ تو مولانا کی ذہانت کا ایک لطیفہ تھا مجھے بتلانا یہ تھا کہ یہ حضرات شہرت سے کس درجہ بھاگتے تھے کہ صورت سے کوئی ان کو عالم یا شیخ نہ سمجھتا تھا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ رات کے وقت دیوبند سے نانوتہ جارہے تھے۔ ایک جگہ پہونچکر راستہ بھول گئے۔ کیونکہ رات کچھ باقی تھی تو آپ نے ایک شخص سے پوچھا کہ بھائی نانوتہ کا راستہ کدھر کو ہے اس نے کہا ارے تو کون ہے جو صبح ہی صبح نانوتہ کا نام لیتا ہے (مشہور ہے کہ صبح کو نانوتہ کا نام لینے سے دن بھر کھانا نہیں ملتا) فرمایا بھائی پھر کیا کہوں کہا پھوٹا شہر کہہ۔ آپ نے فرمایا اچھا بھائی پھوٹے شہر کا راستہ کس طرف کو ہے۔ اس نے بتلایا۔ کچھ دور چل کر پھر راستہ بھول گئے تو ایک شخص اور ملا اس سے پوچھا بھائی پھوٹے شہر کا راستہ کدھر کو ہے وہ کوئی نانوتہ کا رہنے والا تھا اس نے کہا ارے تو کون ہے جو ہمارے شہر کو پھوٹا شہر کہتا ہے۔ فرمایا پھر کیا کہوں نانوتہ کیوں نہیں کہتا فرمایا اچھا بھائی نانوتہ کا راستہ بتلا دے کہا یہ سامنے نانوتہ ہی تو ہے اس وقت مولانا نانوتہ میں پہونچ گئے تھے۔ مگر اندھیرے کی وجہ سے معلوم نہ ہوا کہ میں گھر کے قریب آگیا ہوں غرض راستہ میں جو بھی ملتا اور مولانا اس سے راستہ پوچھتے وہ بُرا بھلا ہی کہتا تھا۔ اور مولانا سب کی سنتے جارہے تھے کسی کی بات کا بُرا نہ مانا۔ نہ کسی سے اپنا نام ظاہر کیا ورنہ اگر نام ظاہر کردیتے تو ان اطراف کے سب لوگ آپ کو جانتے تھے نام سن کر وہ لوگ پیروں میں گر پڑتے مگر ان کو تو اس میں ہی مزا آتا تھا کہ یہ نفس ذلیل ہو۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آپ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش آگئی طلبہ سب کتابیں لے لیکر اندر چلے گئے پھر سب اپنے جوتے اٹھانے آئے تو دیکھا کہ مولانا نے ایک چادر میں سب کے جوتوں کو جمع کررکھا ہے اور اٹھانا

چاہ رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر لوگوں کو وجد آنے لگا اور دیر تک قلوب پر اس کا اثر رہا بھلا آج تو کوئی ایسا کر کے دکھا دے کہ اپنے شاگردوں کے جوتے سیٹنے لگے صاحبو حکایتیں بیان کر دینا اور بات ہے مگر کر کے دکھلانا اور بات ہے۔ مولانا کو لوگ خشک کہتے تھے بعضے متشدد کہتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی کی تربیت کرتے ہوئے مولانا کو دیکھا ہوگا اس وقت مولانا سیاست وتنبیہ فرمارہے ہوں گے وہ احمق سمجھا کہ بس یہ رات دن اسی حالت میں رہتے ہیں جیسے کوئی شخص کسی رحمدل جج کو خون کا مقدمہ فیصل کرتے ہوئے دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ جج تو بڑا خونی ہے ارے ظالم جج تو خونی نہیں بڑا مہربان ہے مگر افسوس تو اس کے پاس ایسے وقت گیا جب وہ ایک ڈاکو کے لئے سزائے موت تجویز کر رہا تھا اگر تو اس کے بنگلہ پر جا کر ملتا تو معلوم ہوتا کہ وہ کیسا مہربان ہے ایسے ہی سیاست و تربیت کے وقت کسی بزرگ کو سختی کرتے ہوئے دیکھ کر سخت مزاج سمجھ لینا بڑی حماقت ہے۔ اصلاح و تربیت میں تو ضرورت کی وجہ سے یہ حضرات سختی برتتے ہیں باقی فی نفسہ سخت مزاج نہیں ہوتے تمھیں فارغ اوقات میں ان حضرات سے ملنا چاہیئے جب حقیقت معلوم ہوگی کہ تم خشک ہو یا وہ خشک ہیں۔ ایک سخی کی عادت تھی کہ جب اس کے یہاں کوئی مہمان آتا تو بڑی خاطر مدارات کرتا تھا مگر رخصت کے وقت یہ کہدیتا تھا کہ مہربانی کر کے دوبارہ آپ یہاں نہ آئیں۔ لوگ اسے بدنام کرتے تھے کہ یہ بڑا ہی بخیل اور تنگ حوصلہ ہے جو مہمانوں سے یوں کہتا ہے پھر یہاں نہ آنا۔ ایک عاقل نے بھی یہ بات سنی اسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ شخص تو بڑا سخی اور عالی حوصلہ ہے آخر یہ بات کیا ہے اس کی تفتیش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ خود اس سخی کا مہمان بنا اس نے خوب خاطر کی اس کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کئے اس نے بھی کچھ تکلف نہ کیا اور اس کی ہر خدمت کو گوارا کرتا رہا کسی بات میں مزاحمت نہ کی کہ تم یہ کام کیوں کرتے ہو میں خود کر لوں گا جب چلنے لگا تو سخی نے کہا میری یہ درخواست ہے کہ آپ پھر بھی یہاں تشریف لائیں۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ میرے ساتھ اس نے وہ معاملہ نہیں کیا جو لوگوں میں مشہور ہے آخر اس سے ہی پوچھا کہ آپ کی نسبت جو یہ بات مشہور ہے کہ آپ مہمان سے چلتے ہوئے کہدیتے ہیں کہ یہاں پھر نہ آنا۔

اس کی کیا اصل ہے میں اسی کی تحقیق کے لئے آیا تھا مگر میرے ساتھ آپ نے برعکس معاملہ کیا کہا وہ بات غلط نہیں بالکل صحیح ہے واقعی میں ایسا کہتا ہوں مگر اس کا راز یہ ہے کہ جو کوئی میرے یہاں مہمان بن کر آتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کی خدمت کروں اسے راحت پہونچاؤں مگر لوگوں کی عادت یہ ہے کہ جب میں کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اس سے روکتے ہیں کہ آپ تکلیف نہ کریں ہم خود یہ کام کرلیں گے مجھے اس تکلف سے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگ ایک تو مجھے خدمت سے محروم کرتے ہیں ۔ دوسرے خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں کیونکہ بعضے کام صاحب خانہ جس سہولت اور عمدگی سے کرسکتا ہوں اجنبی اس طرح نہیں کرسکتا اور مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مہمان میری نظر کے سامنے تکلیف اٹھائے اور میں اس کو راحت نہ دے سکوں اس لئے میں کہدیتا ہوں کہ آپ پھر یہاں نہ آئیں اور تم نے کسی بات میں تکلف نہیں کیا جس طرح میرا دل راحت پہونچانے کو چاہتا تھا تم نے مجھے ویسے ہی کرنے دیا کسی بات سے نہیں روکا اس سے میرا دل بہت خوش ہوا اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم پھر آؤ۔ دیکھئے اس غریب کے متعلق شہرت کیا تھی۔ اور حقیقت کیا نکلی تفتیش سے معلوم ہوا کہ اس کا وہ بات لوگوں سے کہنا بھی غایت کرم پر مبنی تھا وہ مہمانوں کو راحت پہنچانا چاہتا تھا اور مہمان اس کی راحت رسانی سے روکتے تھے۔ یہی حال مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کا تھا کہ لوگ بےڈھنگا پن خود کرتے تھے اس سے مولانا کو تکلیف ہوتی تھی ورنہ اگر کوئی ڈھنگ سے مہمان ہوتا تو مولانا سے زیادہ خوش اخلاق کوئی نظر نہ آتا۔ یہ قاعدہ یاد رکھو کہ مہمان کو میزبان کے کام میں دخل نہ دینا چاہیئے مصالح کی رعایت وہی خوب کرسکتا ہے مہمان کو ان مصالح کی اطلاع نہیں ہوسکتی۔

حضرت مولانا کے یہاں ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب ایسے وقت آئے کہ مولانا اس وقت درس حدیث میں مشغول تھے مولانا معمولی طور پر مزاج پرسی کرکے درس میں مشغول ہوگئے اور یہ بھی غایت کرم تھا کہ مولانا نے ان سے دو چار باتیں کرلیں۔ ورنہ حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جس قدر عظمت مولانا کے قلب میں تھی اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس وقت کسی سے ایک بات بھی نہ کرتے۔ صاحبو! اگر کوئی شخص اپنے محبوب کا خط پڑھتا ہو تو

کیا اس وقت وہ کسی سے بات کرنا گوارا کر سکتا ہے اس کو عشاق اپنے دل میں خود غور کرلیں لیکن مولانا نے تطییب قلب مسلم کے لحاظ سے اس وقت اپنی طبیعت پر جبر کر کے ان سے دو باتیں کیں، پھر حدیث میں مشغول ہو گئے اس کی ان ڈپٹی صاحب نے یہ قدر کی کہ مولانا سے بدظن ہو گئے کہ یہ تو بہت روکھے ہیں کہ دو چار باتیں کر کے پھر التفات بھی نہ کیا غرض ان کو یہ طرز ناگوار ہوا۔ پھر اس کی انھوں نے اس طرح کسر نکالی کہ مولانا کو گورنمنٹ کی طرف سے کوئی خطاب دیا جانا تجویز ہوا تھا ڈپٹی صاحب سے بھی رائے لی گئی۔ انھوں نے اس کو روک دیا اور بڑے فخر سے اپنی کارروائی کو ظاہر کیا کہ مولانا نے ہم سے بے رخی کی تھی تو ہم نے بھی ان کو خطاب سے محروم کر دیا مولانا کو یہ خبر پہونچی تو بہت ہنسے، فرمایا کہ میں تو ان کی اس کارروائی سے ممنون ہوا کہ مجھے ایک بلا سے بچا دیا اگر میں خطاب لے لیتا تو درباروں میں جانا پڑتا۔ اگر نہ لیتا اور واپس کرتا تو اس میں حکومت کی توہین تھی تو میں تو خطاب کے پہونچنے سے ایک پریشانی میں مبتلا ہوتا کہ کیا کروں خدا ان کا بھلا کرے کہ انھوں نے خطاب کو مجھ تک آنے ہی نہ دیا بالا بالا ہی واپس کر دیا۔ ہمارے حضرات اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ حکومت کے مقرب بنیں اور درباروں میں شریک ہوتے پھریں اور اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ حکومت کی توہین کریں۔ حکام کو برا بھلا کہیں۔ یہ تو آجکل ہی نیا دستور نکلا ہے کہ حکام کو بندر اور سور کہا جاتا ہے چاہے وقت پر کچھ بھی نہ ہو سکے صرف زبان ہی بہادر ہے موقعہ پر یہ لوگ جو حکومت سے مقابلہ کرتے ہیں خود ہی بندروں کی طرح بھاگتے نظر آتے ہیں۔ پھر نہ معلوم یہ کونسی تہذیب ہے کہ حکام کو گالیاں دی جائیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ بہادر آدمی اپنے مقابل کو گالیاں نہیں دیا کرتا بلکہ قوت سے جواب دیا کرتا ہے۔ یہ طریقہ کمزوروں کا ہے کہ مقابل کو گالیاں دیکر اپنی زبان گندی کرتے ہیں۔ یاد رکھو اسلام نے یہ طریقہ ہم کو نہیں سکھایا۔ اسلام نے ہم کو تہذیب سکھلائی ہے اور یہ طریقہ جو آجکل اختیار کیا گیا ہے تہذیب اسلامی کے بالکل خلاف ہے چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ حکومت کے خطاب کو واپس کر کے اس کی توہین کی جائے۔ غرض ایسے ایسے مخلص ہوں تو وہ شہرت سے

بھاگیں ورنہ ہم تو اکثر شہرت کے طالب ہیں۔ امام شعرانی نے اخلاص کی ایک علامت بیان فرمائی ہے۔ واقعی آب ذر سے لکھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اے عزیز اخلاص کی علامت یہ ہے کہ جو کام دین کا تو کر رہا ہے اگر تیری بستی میں اس کا کام کرنے والا کوئی دوسرا آجائے تو اس سے خوش ہو اور خدا کا شکر بجا لادے کہ اس نے ایک آدمی تیرا بوجھ ہلکا کرنے کو بھیجدیا اور اس کے آنے کے بعد تو اپنے شاگردوں اور مریدوں سے کہدے کہ اس سے جاکر مستفید ہوں اس سے فیض حاصل کریں۔ پھر تو اپنا کام اس کے حوالہ کرکے اطمینان سے خدا کی یاد میں مشغول ہو (بشرطیکہ وہ دوسرا شخص صاحب کمال اور قابل اطمینان ہو۔ اور اگر ناقص وغیر قابلِ اطمینان ہو تو ایسا نہ کرنا چاہیئے مگر اس کے ساتھ عداوت وحسد بھی نہ کرنا چاہیئے ۱۲ جامع) بتلایئے ہمارے اندر ایسے کتنے افراد ہیں ہماری حالت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے سے جلتے ہیں اگر بستی میں کوئی واعظ ہے تو وہ دوسرے واعظ کے آنے سے جلتا ہے۔ کوئی شیخ ہے تو دوسرے شیخ سے جلتا ہے اگر کسی جگہ ایک مدرسہ ہے اور وہاں دوسرا مدرسہ قائم ہونے لگے تو پہلے مدرسہ والوں کو دوسرے سے حسد وعداوت ہو جاتی ہے پھر اس حالت کے ساتھ اخلاص کہاں۔ بس ہم لوگ اسی وقت تک مخلص ہیں جب تک بستی میں اکیلے ہیں ہمارے اخلاص کی قلعی اس وقت کھل جاتی ہے جب کوئی دوسرا کام کرنے والا ہمارے جیسا بستی میں آجاتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ مولویوں نے شہرت اور اظہار شان وشوکت کے لئے یہ سالانہ جلسے نکالے ہیں جیسے اہل دولت نے مولد شریف اور محرم وشب برات کی رسمیں نکالی تھیں۔ الغرض یہ سب حوصلے نکالنے کی باتیں ہیں۔ دیکھئے جو امور بدعت ہیں وہ چند روز میں اپنی حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ مولد شریف اول تو محض ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ظاہر ہوا تھا پھر قیام کی قید بڑھی پھر اس میں تعیین تاریخ وماہ کا اضافہ ہوا پھر مٹھائی تقسیم ہونے کی شاخ بڑھی۔ پھر گانے والے خوش الحان تجویز ہوئے جن میں اکثر امارد ہوتے ہیں اور بعض جگہ مرد وعورتیں سب شریک ہوتی ہیں اب وہ مولود کیا ہوا اچھی خاصی بیاہ شادی کی تقریب ہوگئی جس میں اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ بعض دفعہ

اس اہتمام میں نماز بھی قضا ہوجاتی ہے اور جماعت تو بہتوں کی فوت ہوجاتی ہے اور جو امور شرعیہ اصلیہ ہیں ان میں حدود سے کبھی زیادتی نہیں ہوتی دیکھئے نماز روزہ تلاوت قرآن تہجد اور اشراق یہ دین کے اصلی کام ہیں۔ ان میں کبھی زیادتی نہیں ہوتی جس حالت پر تھے اب تک اسی حالت پر چلے آرہے ہیں نیز امور بدعت کی یہ بھی علامت ہے کہ سخت پریشانی کے وقت میں حذف ہوجاتے ہیں اور جو دین کے اصلی کام ہیں وہ حذف نہیں ہوتے چنانچہ طاعون وہیضہ کے زمانہ میں تیجہ دسواں وچالیسواں سب حذف ہوجاتا ہے اور نماز جنازہ وکفن دفن حذف نہیں ہوتا اگر کسی سال ربیع الاول میں طاعون وہیضہ کا زور ہوجائے تو مجالس مولود بھی حذف ہوجائیں گی اور جو ہونگی بھی تو محض ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا۔ مٹھائی اور حلوا اور گانا بجانا تو ضرور حذف ہوجائے گا کیونکہ یہ سب فرصت کی باتیں ہیں یہی دلیل ہے ان کے زائد اور فضول ہونے کی خیر یہ تو لطیفہ تھا میں دلائل سے بیان کرچکا ہوں کہ دلائل شرعیہ سے اظہار غم ممنوع ہے کیونکہ اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے غم کو ترقی ہوتی ہے اور ترقی غم سے اعمال شرعیہ اور معمولات راتبہ میں خلل پڑجاتا ہے اور اس کا ضرر بہت سخت ہے جس کو میں پہلے بتلاچکا ہوں حق تعالے کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان غم سے پریشان نہ ہوں چنانچہ اسی لئے پیشگی اطلاع فرمادی کہ ہم تم کو طرح طرح کی تکالیف سے آزمائیں گے تاکہ دفعۃً کلفت آنے سے پریشانی نہ ہو پہلے سے اس کے لئے آمادہ رہیں پھر چونکہ لَنَبْلُوَنَّكُمْ (ہم تمہارا ضرور امتحان لیں گے) سے معلوم ہوگیا کہ مصائب کا آنا بغرض امتحان ہے اور قاعدہ ہے کہ امتحان میں دو درجے ہوتے ہیں ایک فیل ہونے کا ایک پاس ہونے کا تو آگے اس امتحان میں پاس ہونے کا طریقہ بتلاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (آپ صابرین کو بشارت دیدیجئے) اس جملہ سے معلوم ہوگیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے صابرین ہیں اور پاس ہونے کا طریقہ صبر ہے کیونکہ بشارت انہی لوگوں کو دیجایا کرتی ہے جو امتحان میں پاس ہوں اور اس سے بطریق مفہوم یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بےصبری فیل ہونے کا سبب ہے پھر اس جگہ بَشِّرْ میں بشارت کا اجمال ہے جس کا حاصل یہ ہے

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہو رہا ہے کہ بس آپ تو صابرین کو بشارت دیدیجئے تفصیل نہیں کی کہ کس چیز کی بشارت دے دیجئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں گے وہی ملے گا کیونکہ بشارت کہتے ہیں خوش خبری کو۔ اب اگر اس کی تفصیل کر دی جائے تو جن چیزوں کو بیان کیا جائے گا ان ہی میں بشارت کا حصر ہو جائیگا اور جب اجمالاً کہدیا گیا کہ صابرین کو خوشی ہونے کی خبر دیدیجئے تو اس میں کسی چیز کی تخصیص نہیں بلکہ عموم ہے جس سے تمام خوشی ہونے کی باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا کہ جس چیز سے بھی وہ خوش ہوں گے وہی ملے گی اور یہ کام حق تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کی خواہش کو پورا کر دیں ورنہ انسان کو تو ایک بچہ ہرا سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے اس قصبہ میں ایک بچہ نے اپنے والدین کو ہرا دیا تھا اس نے رونا شروع کیا اور ضد کرنے لگا کہ میں تو فلاں چیز لوں گا والدین نے اس کا انتظام کر دیا۔ پھر ضد کرنے لگا کہ میں تو وہ چیز کھاؤں گا وہ بھی لا کر رکھدی۔ پھر ضد کرنے لگا اور کوئی چیز مانگی وہ بھی لا کر دیدی جب ساری ضدیں پوری ہو گئیں تو کہنے لگا ہائے یہ چاند کیوں نکل رہا ہے اس کو چھپاؤ۔ بس یہاں والدین عاجز ہو گئے اور دو چار طمانچے مار کر اسے خاموش کیا۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔

ایک دفعہ اکبر نے بیربل سے کہا کہ یہ جو مشہور ہے کہ تین ہٹیں بہت سخت ہیں جن کا پورا کرنا مشکل ہے۔ راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ۔ تو ان میں بادشاہ اور عورت کی ضد کا دشوار ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہ دونوں عاقل ہوتے ہیں ممکن ہے کسی وقت سوچ کر ایسی دشوار بات کہیں جو کسی سے پوری نہ ہو سکے مگر بچہ کی ہٹ کا پورا کرنا کیا مشکل ہے اس میں اتنی سمجھ کہاں جو سوچ سوچ کر دشوار باتیں نکالے اور دوسروں کو عاجز کر دے۔ بیربل نے کہا حضور سب سے زیادہ مشکل بالک ہٹ ہی ہے جس کے پورا کرنے کے لئے بڑی عقل درکار ہے۔ اکبر نے کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا' اس کا امتحان ہونا چاہیئے۔ بیربل نے کہا حضور پھر میں بچہ بنتا ہوں آپ میری ضدیں پوری کیجئے۔ کہا اچھا۔ چنانچہ

بیربل بچوں کی طرح رونے لگا۔ اکبر نے پوچھا کیوں روتا ہے کہا ہم تو کلھیا لیں گے اکبر نے فوراً ایک کلھیا منگا دی۔ وہ پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اکبر نے فیل خانہ سے ایک ہاتھی منگا دیا۔ وہ پھر رونے لگا کہا اب کیوں روتا ہے کہا اس ہاتھی کو کلھیا میں رکھدو بس اکبر عاجز ہو گیا اور کہا اچھا اب ہم بچے بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو اس نے کہا بہت اچھا۔ اکبر کو اور کچھ تو سبق آتا نہ تھا۔ بیربل ہی کا پڑھایا ہوا سبق دہرا دیا کہ ہم تو کلھیا لیں گے اس نے کلھیا منگا دی پھر کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اس نے بازار سے مٹی کا ایک ذرا سا ہاتھی منگا دیا پھر کہا اس کو کلھیا میں رکھدو اس نے اٹھا کر رکھدیا۔ بس خاموش ہو گئے۔ بیربل نے کہا حضور آپ نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی فرمایش پر اتنا بڑا ہاتھی منگایا آپ کو ہاتھی بھی بچے کے مناسب منگانا چاہیئے تھا میں کہتا ہوں کہ اکبر نے بیربل ہی کا سبق دہرا دیا تھا اس لئے بیربل نے اسے جلدی ہی پورا کر دیا اگر وہ تھانہ بھون کے اس بچہ سے سبق لیتا تو بیربل کے باپ سے بھی یہ ضد پوری نہ ہوتی کہ ہائے چاند کیوں نکل رہا ہے اسے چھپاؤ۔ غرض بَشِّرِ کا عموم قدرت کے عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اس میں بجائے نُبَشِّرُ (ہم بشارت دیتے ہیں) صیغہ متکلم کے، بشر صیغہ امر اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ بشارت بواسطہ زیادہ موثر ہوتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر حق تعالےٰ ہم سے خود تکلم فرماتے تو غلبہ جلال وہیبت ایسا ہوتا کہ اس غلبہ کے سامنے لذت بشارت حاصل نہ ہوتی۔ اور جنت میں ہمارے قوی بڑھ جائیں گے وہاں ہم کو اس ہیبت وجلال کا تحمل ہو جائیگا تو تکلم بلا واسطہ مفید ہوگا۔ باقی دنیا میں تکلم بلا حجاب کا ہم کو تو کیا تحمل ہوتا حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو بھی تحمل نہ ہوا ان سے بھی حجاب کے ساتھ کلام ہوا ہے اور ایک دفعہ بے حجاب ہونے کی تمنا کی تھی تو دیکھنے سے پہلے ہی غلبہ انوار سے بے ہوش ہو گئے۔ بعض لوگ تَجَلّٰی رَبُّہٗ (تجلی ڈالی ان کے پروردگار نے) سے وقوع رویت سمجھ گئے ہیں یہ غلط ہے اور دھوکا اس سے ہوا کہ اردو میں تجلّی کے معنے رویت مشہور ہو گئے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں تجلی کے معنے ظہور ہیں اور یہ فعل حق تعالےٰ کا ہے رویت موسیٰ علیہ السلام کا فعل ہے تو حق تعالےٰ

کا فعل تو واقع ہوا کہ وہ ظاہر ہوئے لیکن اس سے موسیٰ علیہ السلام کے فعل رویت کا وقوع کیونکر لازم آیا قرآن میں جو ان کا فعل مذکور ہے وہ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے) ہے رویت کا کہیں ذکر نہیں بلکہ اس سے پہلے لَنْ تَرٰنِیْ (ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتا) مذکور ہے جو نفی موبد کو مفید ہے اور قابل نسخ نہیں (کیونکہ نفی موبد میں نسخ نہیں ہوا کرتا کَمَا ثَبَتَ فِی الْاُصُوْلِ (جیسا کہ اصول میں ثابت ہے) لیکن یہ تائید محض دنیا کے اعتبار سے ہے کیونکہ آخرت میں وقوع رویت ہوگا ۱۲ جامع) بعض لوگوں کو اس سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ آیت میں تجلی کا ذکر پہلے اور خرور وصعق کا ذکر بعد میں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خرور کا سبب تجلی تھی تو شبہ ہوتا ہے کہ تجلی مقدم اور خرور مؤخر تھا تو لازم آیا کہ موسیٰ علیہ السلام تجلی کے بعد بے ہوش ہوئے تجلی کے ساتھ بے ہوش نہیں ہوئے تو رویت پائی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ تجلی وخرور میں تقدم وتاخر ذاتی تھا اور زماناً مقارنت تھی تقدم وتاخر ذاتی کے لئے زماناً تقدم وتاخر لازم نہیں جیسا کہ اہل علم اس کو جانتے ہیں۔ پس تجلی کے سبب خرور ہونے سے دونوں کے مقارنت فی الزمان کی نفی نہیں ہوتی خوب سمجھ لو بہرحال دنیا میں انبیاء علیہم السلام کو بھی بلا حجاب کے کلام الٰہی کا تحمل نہیں ہوا۔ تو ہم کیا تحمل کر سکتے ہیں۔ مگر حجابات انبیاءؑ و حجابات غیر انبیاءؑ میں فرق ضرور ہے۔ ان کے لئے کم حجاب ہیں کیونکہ ان میں دوسروں سے زیادہ تحمل ہے اور ہمارے لئے زیادہ حجابات ہیں کیونکہ ہمارے اندر تحمل کم ہے اس لئے بشارت بواسطہ کو اختیار فرمایا کیونکہ ہم لذت بشارت کو اس صورت سے ادراک کر سکتے ہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ مقرر کر کے بھی صیغہ بَشِّرْ اختیار فرمایا یہ نہیں کہا وَقُلْ لَھُمْ اَنَا نُبَشِّرُھُمْ (اور ان سے کہہ دیجئے کہ ہم ان کو بشارت دیتے ہیں) یعنی واسطہ کے بعد بھی صیغہ تکلم نہیں فرمایا تاکہ لوگ بے فکری سے سن لیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ اگر بادشاہ پس پردہ ہو اور تکلم اپنی زبان پر کر رہا ہو کہ جہاہ پناہ یوں فرماتے ہیں جب بھی جلال کا غلبہ ہوتا ہے گو اس قدر نہ ہو جتنا تکلم بلا حجاب میں ہوتا اور اگر وہ

پس پردہ بیٹھ کر وزیر سے یوں کہے کہ تم ان لوگوں سے یوں کہدو تو اس صورت میں جلال کم ہو جاتا ہے گو اس وقت بھی وزیر کا کلام بادشاہ ہی کا کلام ہوگا مگر چونکہ وہ اپنی زبان پر تکلم کر رہا ہے۔ بادشاہ کی زبان پر تکلم نہیں کر رہا اس لئے جلال کا اثر کم ہو جاتا ہے اسی طرح یہاں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ رکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کون جن کی شان یہ ہے رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کہ آپ ہمارے ہی میں سے ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں کوئی اجنبی اور غیر شخص نہیں اور اپنے ہم جنس وہم قوم سے انس بھی زیادہ ہوتا ہے فیض بھی زیادہ ہوتا ہے اس کو بھی ہمارے حال پر زیادہ شفقت ہوتی ہے تو ان وسائط کا اثر ایسا ہے جیسے گرمی کی لو خس کی ٹٹی کے اندر ٹھنڈی ہو کر آیا کرتی ہے کہ یہ حجابات خس کی ٹٹی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو وہ حالت ہو جائے جو حدیث میں وارد ہے لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَا انْتَهٰى اِلَيْهِ بَصَرُهٗ (البتہ جل جاتے ہیں تمام پردے جہاں تک اس کی نظر پہونچتی ہے) غرض جملہ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (صابرین کو آپ بشارت دیجئے) میں یہ بھی بتلادیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے کون ہیں اور یہ بھی بتلادیا کہ پاس ہونیکا طریقہ کیا ہے پھر ساتھ ساتھ ان کو انعام ملنے کی بشارت بھی دیدی اور عموم بشارت سے انعام وجزا کی عظمت اور اپنے عموم قدرت کو بھی واضح کر دیا پھر صیغہ امر اختیار کر کے بشارت بواسطہ کا زیادہ مفید و موثر ہوتا بھی بتلادیا (پھر چونکہ عادت یہ ہے کہ کسی علم وفن میں امتحان دینے والی جماعت کو اسی شخص کے ہاتھ سے انعام دلواتے ہیں جو اس فن میں کامل و ممتاز ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابرین کے لئے واسطۂ بشارت بنا کر یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ آپ اکمل الصابرین ہیں اور تحمل مصائب میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں کما ورد فی الحدیث اُوْذِيْتُ فِي اللّٰهِ مَالَمْ يُؤْذَ اَحَدٌ ۱۲ جامع) (مجھ کو اتنی ایذا پہونچائی گئی ہے کہ کسی کو اتنی اذیت نہیں پہونچائی گئی) قرآن کے ایک ایک لفظ میں اتنی دلالتیں اور اس قدر رعایتیں اعجاز قرآن کی دلائل ہیں آگے فرماتے ہیں اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

(وہ ایسے لوگ ہیں جب ان پر کوئی مصیبت
پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی مملوک ہیں
اور ہم اسی کے پاس جانے والے ہیں)

یہ جملہ یا تو صفت مادحہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ بشارت جن صابرین کے لئے ہے ان کی یہ خاص مدح ہے یا صفت مقیدہ ہے کہ صابرین میں جن کی یہ شان ہے صرف انہی کے لئے بشارت ہے۔ بہرحال اس سے ہر مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوئی۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چراغ گل ہوجانے پر بھی اناللہ پڑھا کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ روشنی نعمت ہے واقعی رات کو اندھیرے مکان میں جب چراغ روشن کیا جاتا ہے تو جان میں جان آتی ہے اندھیرے گھر سے وحشت سی معلوم ہوتی ہے اس لئے آپ نے چراغ گل ہونے پر اناللہ پڑھ کر روشنی کا نعمت عظمیٰ ہونا اور اندھیرے کا مصیبت ہونا ظاہر کردیا۔ مگر آجکل اناللہ بہت بدنام ہوگیا ہے۔ لوگوں نے اس کو مردوں کے لئے خاص کرلیا ہے۔ گنگوہ میں ایک لڑکا ہر بات پر اناللہ پڑھا کرتا تھا تو ایک بڑھیا نے کہا بچے خدا سے خیر مانگ تو ہر بات پر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ کے کس کو مارے گا۔ شاید بڑھیا کو اپنی ہی فکر ہوئی ہوگی کہ بس سب سے زیادہ میری عمر ہے کہیں اِنَّا لِلّٰہِ سن کر ملک الموت گھر میں نہ آگھسیں اور مجھے سب سے زیادہ عمر والی دیکھ کر اپنے ساتھ لیجائیں اسی طرح لاحول بھی بہت بدنام ہے۔ کانپور کا ایک قصہ ہے کسی نے دوسرے کو دور سے دیکھ کر سمجھا کہ یہ فلاں شخص ہے پاس پہونچا تو اور تھا اس نے اپنی غلطی پر لاحول پڑھ دی۔ وہ دوسرا شخص اس کے سر ہوگیا کہ تم نے مجھکو شیطان کہا وہ ہر چند سمجھاتا ہے کہ میں نے تم پر لاحول نہیں پڑھی اپنی غلطی پر پڑھی ہے مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ بہت مشکل سے اس نے پیچھا چھڑایا۔ سورۂ یٰسین بھی بہت بدنام ہے اس کو بھی لوگوں نے مردوں کے لئے خاص کرلیا ہے حالانکہ حدیث شریف میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے۔ اس سورت کے دم کرنے سے بڑے مہلک امراض میں شفا حاصل ہوتی ہے مگر میں جب کسی مریض پر یہ سورت دم کرتا ہوں تو آہستہ پڑھتا ہوں کہیں زور سے پڑھنے میں وہ بیمار یا اس کے گھر والے یہ نہ کہیں کہ مارنے کو آیا تھا۔

دہلی میں ایک دفعہ مومن خاں شاعر تراویح میں قرآن سنتے تھے ایک ڈوم بھی

ان کے ساتھ نماز پڑھتا تھا وہ مومن خاں سے چند روز کے بعد کہنے لگا کہ خانصاحب
جب وہ سورت آوے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے تو مجھ سے ایک دن پہلے کہدینا تاکہ
میں اس دن نہ آؤں اس کے سننے سے آدمی مرجاتا ہے مومن خاں نے وعدہ کرلیا چندروز
کے بعد اس نے یہ بات پھر یاد دلائی تو مومن خاں نے مذاق میں کہدیا کہ وہ سورت تو
پڑھی بھی گئی مجھ کو کہنا یاد نہیں رہا۔ بس وہ ڈوم یہ سن کر سہم ہی تو گیا کہ ہائے وہ سورت
پڑھی گئی اور وہم کی وجہ سے اس کی روح تحلیل ہوگئی اور دو تین دن میں مرگیا۔ یہ محض
اس کے وہم کا اثر تھا اس سورت کا اثر نہ تھا۔ ورنہ آجکل لوگ کیوں نہیں مرجاتے
ایک شخص نے کسی گاؤں میں جاکر حافظ ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ وہ پورا حافظ نہ تھا کہیں
کہیں سے کچھ سورتیں یاد تھیں۔ رمضان میں آپنے قرآن سنایا اور جتنا یاد تھا وہ چندروز میں
سناکر کہدیا کہ قرآن ختم ہوگیا مٹھائی بانٹو۔ اور مجھے نذرانہ دو۔ گانوں والے اس کے جھوٹ
یا سچ کو کیا سمجھتے مگر ایک شخص کو ان میں سورۂ یٰسین یاد تھی اس نے کہا حافظ جی آپنے یہ کیسا
ختم کیا سورۂ یٰسین تو پڑھی ہی نہیں تو وہ کیا کہتا ہے کہ بے وقوف تو زندوں پر یٰسین پڑھوانا
چاہتا ہے، ایے وہ تو مُردوں پر پڑھی جاتی ہے اگر میں تراویح میں اسے پڑھ لیتا تو تم سب
مرجاتے۔ گاؤں والے بہکانے میں آگئے اور الٹا معترض ہی کو دھمکانے لگے کہ تو ہمیں مارنا
چاہتا ہے جو زندوں پر یٰسین پڑھواتا ہے۔ اسی جہالت کا یہ اثر ہے کہ لوگ سوائے مواقع
موت کے اور کسی جگہ اِنَّا لِلّٰہ پڑھنے سے رکتے ہیں حالانکہ (حدیث شریف میں
آتا ہے کہ جب انسان پر کوئی مصیبت آوے وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ
پڑھے تو حق تعالےٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بناتے ہیں اور جب کبھی اس
مصیبت کو یاد کرکے اِنَّا لِلّٰهِ پڑھے گا تو وہی ثواب ملے گا جو صدمہ اولیٰ کے وقت
ملا تھا ۱۲ جامع) میں بتلاچکا ہوں کہ اِنَّا لِلّٰہ کا مضمون ایسا ہے کہ اس کو مستحضر رکھنا
غم کو بہت ہلکا کر دیتا ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے افسوس لوگوں نے مرہم
کو نشتر سمجھ لیا ہے یہ محض جہالت ہے اس خیال کو دل سے نکال کر مصیبت کے
موقعہ میں اِنَّا لِلّٰہ پڑھنا چاہیئے اور اس کے مضمون میں غور کرنا چاہیئے۔ ان شاء اللہ تعالےٰ

غم پاس کو بھی نہ رہے گا اور ہلکا تو ضرور ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ نے یہ دوسرا سامان کیا ہے تخفیف حزن کا کہ رنج وغم کے موقعہ کے لئے ایسا مراقبہ ہم کو تعلیم کیا ہے جو غم کو ہلکا کرتا ہے تاکہ صبر آسان ہو جائے اور ہم مصیبت کے وقت صابرین میں داخل ہو کر امتحان میں پاس ہو جائیں اور صابرین کے لئے جس انعام کی بشارت ہے اس کے مستحق ہو جائیں۔

اب صبر کی حقیقت سنئے تاکہ وہ غلطی رفع ہو جائے جس میں عام طور پر لوگ مبتلا ہیں کیونکہ تمہید میں معلوم ہو چکا ہے کہ لوگ صرف جزع فزع نہ کرنے کو صبر سمجھتے ہیں اور مداومت اعمال کو صبر میں داخل نہیں سمجھتے ان کے نزدیک بے صبری فقط جزع وفزع کا نام ہے۔ حالانکہ مصیبت کے وقت اعمال میں کوتاہی اور کمی کر دینا بھی بے صبری میں داخل ہے اور اس کا انجام جزع وفزع سے بھی اشد ہے اس کے لئے اول صبر کے معنے سمجھنے چاہئیں تو صبر کہتے ہیں لغت میں حبس کو یعنی رکنے کو اور اصطلاح شرع میں صبر کے معنے حبس النفس ہیں یعنی نفس کو روکنا۔ عربی میں صبر کا استعمال مختلف صلات سے ہوتا ہے اور صلات سے لفظ کے اصل معنی کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایک لفظ کا استعمال مختلف صلات سے ہوتا ہے تو لوگوں کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا اصلی صلہ کونسا ہے اور عارضی صلہ کونسا ہے اسی لئے حقیقت میں غلط واقع ہو جاتا ہے لفظ صبر کی حقیقت بھی بعض لوگوں پر اسی لئے مخفی ہو گئی کہ وہ اس کا استعمال مختلف صلات سے دیکھتے ہیں چنانچہ کبھی لازم کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جیسے ایک شاعر کا قول ہے اِصْبِرْ لِکُلِّ مُصِیْبَۃٍ وَّتَجَلَّدِ (صبر کر ہر مصیبت پر اور جما رہے) کہیں صلہ فی سے آتا ہے جیسے وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی اور بیماری میں) کہیں عن سے آتا ہے جیسے حدیث شریف میں ایک منافق کا قول آتا ہے

لہ اس تقریر سے حکیم الامۃ دام مجدکم کا تبحر عربیت میں اور وسعت نظر طرق کلام میں اور مذاق صحیح فہم حقائق الفاظ میں بخوبی واضح ہے میں نے بہت غور کیا کہ صبر کا کوئی صلہ ان صلات مذکورہ کے سوا اور بھی ہے مگر نہیں ملا ۱۲ جامع۔

جو غزوۂ تبوک میں اس نے کہا تھا اِنِّی اِمْرَأٌ لَا اَصْبِرُ عَنِ النِّسَاءِ (میں ایسا آدمی کہ عورتوں سے صبر نہیں کر سکتا) کہیں علیٰ سے آتا ہے جیسے وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ (اور تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر) کہیں باء سے آتا ہے جیسے وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے) کہیں مع سے آتا ہے جیسے وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ (اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو اپنے رب کی عبادت صبح وشام کرتے ہیں) یہ تو وہ حروف ہیں جو بطور صلہ کے لفظ صبر کے ساتھ مستعمل ہوتے ہیں اور بعض حروف ایسے بھی ہیں جو اس کے ساتھ مستعمل ہیں مگر ان کو صلہ صبر نہیں کہا جا سکتا جیسے وَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (تو آپ صبر کیجئے جیسا اور ہمت والے رسولوں نے صبر کیا ہے) اور وَاصْبِرْ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (اور صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجدیں) کیونکہ کاف اور حتیٰ ہر فعل کے بعد مستعمل ہو سکتے ہیں جن سے مقصود تشبیہ اور بیان غایت ہوتا ہے اور تشبیہ اور غایت ہر فعل کیلئے ہو سکتی ہے اس لئے ان کا استعمال بطور صلہ کے نہیں بلکہ صلات وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی صلہ عن وعلیٰ ہیں باقی صلات باعتبار خصوصیات مقام کے ظروف ہیں اور وجہ عن وعلیٰ میں حصر کی یہ ہے کہ صبر کا مدخول یا مامور بہ ہے یا منہی عنہ ہے کیونکہ صبر کے معنی حبس کے ہیں بس کبھی کسی بات کے اوپر حبس ہوتا ہے کبھی کسی بات سے حبس ہوتا ہے جس بات کے اوپر روکا جائے وہ مامور بہ ہے اور جس بات سے روکا جائے وہ منہی عنہ ہے حبس کے یہی دو محل اصلی ہیں اس کے سوا اور کوئی حالت اصلی نہیں بس جہاں صبر کا استعمال بدون علیٰ وعن کے معلوم ہوتا ہے وہاں یہ اصلی صلہ مقدر ہوگا مثلاً وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ (وہ لوگ مستقل رہنے والے ہیں تنگدستی میں اور بیماری میں) کی اصلی تقدیر یہ ہے۔ اَلصّٰبِرِيْنَ عَلٰى اَحْكَامِ اللّٰهِ وَالْمُحْتَرِزِيْنَ عَنْ مَعَاصِيْهِ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ (اللہ تعالےٰ کے احکام پر مستقل رہنے والے ہیں اور گناہوں سے تنگدستی اور بیماری میں

اور احتراز کرنے والے ہیں) اور وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں) کی اصل یہ ہے وَاصْبِرْ عَلٰى حُكْمِ اللّٰهِ حَالَ كَوْنِكَ جَالِسًا مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ الخ (اور آپ مستقل رہیں اللہ کے حکم پر اس حال کہ آپ بیٹھنے والے ہوں ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں) اور وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے) کی اصل یوں تھی وَاصْبِرْ عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ وَمَا صَبْرُكَ عَلَيْهِ قَائِمًا بِشَيْءٍ اِلَّا بِاللّٰهِ (اور صبر کیجئے اللہ کے حکم پر اور نہیں آپ کا صبر کرنا قائم کسی چیز کے ساتھ بجز اللہ تعالیٰ کے) اسی طرح ہر جگہ غور کر لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ جہاں یہ لفظ عن وعلی کے بغیر استعمال ہوا ہے وہاں اصلی صلہ مقدر ہے اور جو حرف جر مذکور ہے وہ صبر کا صلہ نہیں بلکہ کسی فعل محذوف کا صلہ ہے اور زیادت تعمق سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کا اصلی صلہ صرف ایک ہی ہے یعنی علی اور عن بھی اصلی صلہ نہیں بلکہ عارضی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ صبر فی نفسہ مامور بہ ہے اور مامور بہ میں اصل افعال وجودیہ ہیں نہ کہ تروک پس صبر کا مدخول اصلی فعل مامور بہ ہی ہونا چاہیئے اور اس کے مناسب صلہ حروف علی ہی ہے نہ کہ عن اور جہاں صبر کا صلہ عن آیا ہے وہاں گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدخول صبر منہی عنہ ہے مگر تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی ایک نہ ایک مامور بہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ تروک کی دو قسمیں ہیں ایک ترک عدمی ایک ترک وجودی اور یقیناً تروک عدمیہ متعلق صبر نہیں ہو سکتے کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ صبر مامور بہ ہے اور اس میں اجر ثواب کی بشارت دی گئی ہے پس لازم ہے کہ اس کا مدخول ایسی شے ہو جس پر ثواب مل سکے اور تروک عدمیہ پر اجر نہیں ہے اور نہ چاہیئے کہ قیامت میں ہر شخص مسلم کے حسنات غالب اور سیئات مغلوب ہوں کیونکہ ہر وقت میں انسان کرتا ایک کام کو ہے اور ہزار دل گناہوں کو ترک کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کھانا کھا رہا ہے اس وقت وہ زنا اور

غیبت اور چوری ڈاکہ ظلم وغیرہ سے بچا ہوا ہے۔ پانی پیتا ہے تو اس وقت بھی وہ ہزاروں گناہوں کو ترک کئے ہوئے ہے، سوتا ہے اس وقت بھی وہ دنیا بھر کے فضول اور لغو کاموں سے الگ ہے یا فرض کرلو کہ ایک شخص کسی گناہ کا مرتکب ہے، تو وہ اس وقت ایک گناہ کے سوا باقی تمام گناہوں سے بچا ہوا ہے تو چاہیئے کہ ہر گناہ کے ساتھ اس کے نامۂ اعمال میں ہزاروں نیکیاں بھی لکھی جائیں اور اس صورت میں حسنات کا سیئات پر غالب ہونا لازم ہے کہ ایسا کوئی شخص نہ نکلے گا جس کے سیئات غالب ہوں حالانکہ یہ نصوص قرآنیہ کے خلاف ہے پس ثابت ہوا کہ تروک عدمیہ پر کوئی اجر نہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس صورت میں ترک غیر اختیاری ہے نہ کہ اختیاری اور ثواب امور اختیاریہ پر ملتا ہے نہ کہ غیر اختیاریہ پر (قانون یہی ہے گو حق تعالیٰ کسی کے ساتھ اپنے فضل سے اس کے خلاف بھی معاملہ کرسکتے ہیں مگر اس سے قاعدہ پر نقض وارد نہیں ہوسکتا ۱۲ جامع) جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب میں کہتا ہوں کہ جہاں صبر کا صلہ عن ہوتا ہے وہاں متعلق صبر ترک وجودی ہوگا نہ کہ ترک عدمی اور ترک وجودی بھی مامور بہ کی ایک فرد ہے پس گو بعض جگہ مدخول صبر منہی عنہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ بھی مامور بہ ہے مثلاً اس منافق کے قول میں جو لَا اَصْبِرُ عَنِ النِّسَاءِ (میں عورتوں سے صبر نہیں کرسکتا) وارد ہے اس کی اصل یہ ہے لَا اَصْبِرُ عَلٰی کَفِّ النَّظَرِ عَنِ النِّسَاءِ (میں عورتوں سے نظر روکنے سے صبر نہیں کرسکتا) اس جگہ مدخول صبر کف النظر ہے جو کہ ترک وجودی ہے اور یہ حقیقت میں مامور بہ ہے چنانچہ ارشاد ہے وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ (اور آپ مسلمانوں سے کہدیجئے اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں) اس میں غض بصر کا امر ہے اور یہی کف النظر ہے پس کف النظر کا مامور بہ ہونا ثابت ہوگیا۔ لہذا یہ بات محقق ہوگئی کہ صبر کا اصل صلہ علی ہے عن بھی اصل صلہ نہیں بلکہ یہ بھی خصوصیت مقام کے لحاظ سے بطور ظرف کے آتا ہے۔ جب صبر کا اصل صلہ متعین ہوگیا تو معلوم ہوا کہ ما فیہ الصبر جسے محل صبر بھی کہتے

ہیں اور ما علیہ الصبر اور عنہ الصبر ایک ہی چیز ہے یعنی عمل۔ اب اس کی حقیقت بھی واضح ہوگئی اور ثابت ہوگیا کہ صبر کے معنی حبس النفس علی الاعمال ہیں یا حبس النفس علی احکام اللہ ہیں یعنی نفس کو اعمال طاعات واحکام الٰہیہ پر جمانا اور روکے رکھنا اس میں سب اعمال آگئے جن میں تروک وجود یہ بھی آگئے پس حقیقت صبر استقامت علی الاعمال ہے اور اس میں ترک منہیات بھی داخل ہے لٰہذا بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (صابرین کو بشارت دیدیجئے) کا حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ مصائب میں اعمال طاعات پر جمے رہتے ہیں ان کے لئے بشارت ہے پس صبر کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ مصائب میں جزع فزع کو ترک کر دے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ناگوار واقعات میں بھی اپنے معمولات پر مستقل رہے اور منہیات سے بچا رہے پس یہ کتنی بڑی غلطی تھی کہ لوگوں نے صبر کے مفہوم اصلی کو تو اسکی حقیقت سے خارج کر دیا اور اس کی ایک فرد یعنی جزع فزع نہ کرنے میں اس کو منحصر کر دیا حالانکہ جس طرح مصیبت کا یہ حق ہے کہ اس وقت جزع فزع نہ کرے یہ بھی ایک بڑا حق ہے کہ اعمال میں تقلیل واختلاط نہ ہونے پائے بدون اس کے حقیقت صبر کا وجود نہیں ہو سکتا اور جو شخص ایسے وقت میں اعمال میں کوتاہی کرنے لگے وہ صابر کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہو سکتا لٰہذا مصائب میں اہتمام اعمال کی سخت ضرورت ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کی بالکل پروا نہیں بس جہاں کوئی ناگوار بات پیش آئی اب ذکر بھی ناغہ ہے اور تہجد بھی رخصت ہے تلاوت قرآن بھی ندارد ہے اور جماعت کا اہتمام بھی فوت ہے اس وقت انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس مصیبت کے بعد معمولات کی پابندی شروع کر دوں گا۔ مگر یہ اس کی غلطی ہے کیونکہ ممکن ہے اس کے بعد دوسری مصیبت آجائے پھر یہ کہو گے کہ اس کے بعد پابندی کروں گا ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی حادثہ ہو جائے تو تم اسی امروز و فردا میں رہو گے اور عمر بھر پابندی نصیب نہ ہوگی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر گریزی بر امید راحتے ہم آنجا پیشت آید آفتے

(اگر فرصت اور راحت کی امید پر گریز کرتا ہے اس وقت بھی ممکن ہے کہ تجھ کو کوئی آفت کا سامنا ہو جائے)

صاحب اس طرح عمر گذر جائے گی اور آپ کو فراغ کا وقت نہ ملے گا پس اگر پابندی چاہتے ہو تو ہمت کر کے مصیبت ہی میں کام شروع کر دو کام کا خاصہ ہے کہ وہ بخود بخود فراغ پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دو د بے دام نیست　　جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے دوڑ دھو اور دام سے خالی نہیں ہے سوائے تعلق مع اللہ آرام ور احت نہیں ہے) انسان چاہتا ہے کہ ذکر اللہ اور اعمال طاعات سے پہلے فراغ و راحت قلب حاصل ہو جائے تو پھر ان میں مشغول ہوں مولانا فرماتے ہیں کہ فراغ و راحت اس کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا پس جس چیز کے تم منتظر ہو اس کا ذریعہ وہی ہے جس کو تم چھوڑے ہوئے ہو اور اس کے بغیر تمھارا فراغ و راحت کو طلب کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص ناپاکی کی حالت میں یوں کہے کہ دریا میں اس حال سے کیونکر جاؤں میں تو ناپاک اور وہ صاف شفاف اور پاک نہیں مجھے پاک ہو کر دریا میں جانا چاہئے تو دریا اس سے یہ کہے گا کہ مجھ سے دور رہ کر تو پاک ہو ہی نہیں سکتا پاک ہونے کی تو یہی صورت ہے کہ تو اسی حال سے میرے اندر چلا آ اسی ہمارا یہ خیال خام ہے کہ غم سے خالی ہو کر ذکر و طاعات میں مشغول ہوں گے صاحب غم سے خالی ہونے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ آپ اسی حالت میں کام شروع کر دیں وہ خود سارے غموں کو دور کر دے گا واللہ مصیبت کے وقت ذکر و طاعات ہی سے غم ہلکا ہوتا ہے اور ان میں کمی کرکے اور زیادہ پریشانی بڑھتی ہے آجکل میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں پر مصائب کا نزول ہو رہا ہے اور نہ معلوم یہ کب تک زائل ہوں آجکل لوگوں کو اس کی وجہ سے تشویش ہے اور زیادہ وقت اسی قسم کی باتوں میں صرف ہوتا ہے۔ معمولات کی پابندی بالکل فوت ہو گئی ہے جو لوگ اسی قسم کی باتوں میں مشغول ہیں انھوں نے تو معمولات سابقہ کو بالائے طاق رکھ ہی دیا ہے مگر جو لوگ فضول باتوں سے الگ بھی ہیں میں دیکھتا ہوں کہ وہ بھی تشویش سے خالی نہیں ہیں ان کے معمولات میں بھی خلل واقع ہو رہا ہے اور جو ہمت کر کے معمولات کی پابندی پر جمے ہوئے بھی ہیں ان کا بھی بعض دفعہ پریشانی کی وجہ سے کام میں دل نہیں لگتا۔ مجھے خود اپنے اندر یہ بات محسوس ہوتی ہے اور میں نے تجربہ

ؑ واقعہ سہارنپور اور فتنہ ارتداد کی طرف اشارہ ہے ۱۲ جامع ۲۹

کیا ہے کہ جب مجھے کسی بات پر عمل دشوار ہوتا ہے تو میں اسی کے متعلق بیان کر دیتا ہوں اس سے مجھے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے اس لئے یہ مضمون میں نے اپنی اصلاح کی غرض سے بھی اختیار کیا ہے اور یہ بھی مقصود ہے کہ اگر کسی اور کو یہ بات پیش آ رہی ہو تو وہ بھی اپنی اصلاح کر لے اور سامعین میرے واسطے بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ مجھے مصائب میں ایسا استقلال عطا فرمائیں کہ تشویش سے معمولات فوت نہ ہوں اور ہمیشہ کی طرح دل جمعی سے پورے ہوتے رہیں اور یہ بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے اوپر سے ان مصائب کو دور فرمائیں اور جس حکمت کے لئے یہ بھیجے گئے ہیں اس کا اثر ہمارے اندر ظاہر ہو۔ کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ناگوار واقعات میں حکمت ہوتی ہے جس سے مبتلا کو سبق لینا چاہیئے یہ بڑی غلطی ہے کہ حکمت کو چھوڑ کر واقعہ ہی کو سبق بنا لیا جائے جیسا ہم لوگوں نے کر رکھا ہے کہ بس رات دن اسی کے تذکرہ میں رہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ مصیبت ہم پر کیوں نازل ہوئی ہے اگر ہماری حالت میں کوئی نقص ہے تو اس کی تلافی کر کے حالت کو درست کرنا چاہیئے تاکہ پھر حق تعالیٰ کا فضل و کرم متوجہ ہو اور یہ تازیانہ عبرت ختم ہو مگر افسوس ناگوار واقعات سے سبق لینے کی ہم کو عادت ہی نہیں بس یہ سبق سیکھ رکھا ہے کہ مصیبت کو مشغلہ بنا لیتے ہیں چنانچہ طاعون و ہیضہ کے زمانہ میں بعض لوگوں کو اسی کا شغل ہو جاتا ہے کہ آج اتنے مرے کل اتنے مرے اصلاح اعمال پر بہت کم توجہ ہوتی ہے یہی طریقہ ہم نے آج کل اختیار کر رکھا ہے کہ سوائے اخباری باتوں کے اور کچھ شغل ہی نہیں رہا جہاں بیٹھتے ہیں بس یہی باتیں ہیں اور اسی کا تذکرہ، میں یہ نہیں کہتا کہ آپ رفع مصیبت کی تدبیر نہ کریں نہیں جس طرح طاعون و ہیضہ کے لئے حفظ ما تقدم کا اہتمام جائز ہے اور بیماری کی دوا دارو مسنون ہے اسی طرح ہر مصیبت کی تدبیر جائز ہے اگر کچھ تدبیر کرنی ہو شوق سے کرو مگر گیا وہ باتیں جو ہم رات دن کرتے ہیں یہ بھی تدبیر میں داخل ہیں ہرگز نہیں بلکہ ان سے بجز مشغلہ کے اور کچھ مقصود نہیں آجکل جو ہر مجلس میں باتیں ہوتی ہیں وہ تدبیر کی باتیں نہیں محض دل بہلانے کا مشغلہ ہے لوگوں کو اس میں مزہ آتا ہے کہ ادھر ادھر کی نئی باتیں کی جائیں چنانچہ آجکل یہ تازہ واقعہ ہندو مسلمانوں کے فساد کا ظاہر ہوا ہے لوگوں نے

اسی کی باتوں کو مجلس آرائی کا ذریعہ بنالیا۔

میں تدبیر کو منع نہیں کرتا۔ تدبیر کریں مگر کون وہ لوگ جو اہل تدبیر ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر عامی نتھو خیرا مدبر نہیں ہوسکتا تدبیر کرنے والے خاص خاص لوگ ہوتے ہیں نہ کہ ہر شخص۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ یہ باتیں تدبیر کے لئے ہوتی ہیں اگر تدبیر کرنی ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک باطنی ایک ظاہری، باطنی تدبیر تو یہ ہے کہ اس وقت مصیبت کے حقوق شرعیہ کو ادا کرنا چاہیئے شریعت نے مصیبت کے وقت صبر کی تعلیم دی ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال طاعات پر استقلال و پابندی ہو اور جزع فزع و اظہار غم سے احتراز ہو جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ اور میں بتلا چکا ہوں کہ غم زائل ہونے میں ذکر اللہ و اعمال طاعات کو بڑا دخل ہے مگر افسوس آجکل اس طرف کسی کو بھی توجہ نہیں ان واقعات میں اعمال کا تو خون ہی ہوتا ہے اور جزع فزع و اظہار غم بھی بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔

چنانچہ پہلی تحریکات میں شریعت سے بہت کچھ تجاوز کیا گیا کفریات و معاصی میں بہت لوگ مبتلا ہوئے اور صاف کہا جاتا تھا کہ یہ وقت مسائل کی بحث کا نہیں کام ہونا چاہیئے۔ افسوس وہ اسلامی کام ہی کیا ہوا جس میں خدا تعالیٰ کو ناراض کیا گیا اس کے علاوہ سڑکوں اور گلیوں میں اسلام کا نوحہ اشعار میں پڑھا جاتا تھا یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو محرم میں شہادت نامہ والوں نے اختیار کر رکھا ہے آجکل واعظوں اور تقریروں میں بھی یہی سبق رہ گیا ہے کہ دل خراش الفاظ میں اسلام اور مسلمانوں نے ضعف کو ظاہر کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مصائب میں مسلمانوں کو استقلال و ثبات کے ساتھ رہنا چاہیئے کسی طریقہ سے اظہار غم کر کے اپنی کمزوری کو طشت از بام نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے غیر اقوام کے حوصلے بلند ہوتے اور مسلمان انکی نظروں سے گر جاتے ہیں چنانچہ یہ نتائج بد اس حرکت کے اب ظاہر ہو رہے ہیں مگر افسوس اس مفسدہ پر کسی کی بھی نظر نہیں پس سب سے پہلا کام اس وقت ہمارے ذمہ یہ ہے کہ معمولات سابقہ میں کمی نہ کریں خدا کی یاد اور طاعت میں جس طرح پہلے مشغول تھے اسی طرح اب بھی مشغول رہیں اور جزع فزع و اظہار غم سے کلی اجتناب کریں اور کوئی کام خلاف شریعت نہ کریں یاد رکھو معمولات میں کمی کر کے اور اعمال میں حدود شریعت سے تجاوز کر کے کبھی مصیبت زائل نہیں ہو سکتی چاہے تم کتنی ہی تدبیر کرو۔ اس حالت سے غم کو ترقی اور پریشانی میں زیادتی

ہی ہوگی۔ دوسری صورت تدبیر ظاہری کی ہے اس کی آسان اور سہل صورت یہ ہے کہ کسی کو اپنا بڑا بنالو اور بڑا ایسے شخص کو بناؤ جس کی ذہانت اور تقویٰ پر پورا اعتماد ہو کہ یہ کسی مصیبت یا پریشانی میں شریعت سے تجاوز نہ کرے گا نیز اس کی عقل وتدبیر پر بھی اعتماد ہو ایسے شخص کو بڑا بنا کر اس سے پریشانی ظاہر کردو اور بے فکر ہو جاؤ پھر وہ جو کچھ بتلاوے اس کے موافق عمل کرو۔ تم تدبیریں نہ کرو وہ خود تدبیر کریگا تم اپنے دینی اور دنیوی کام میں بے فکری سے لگے رہو اور سارا بوجھ اس کے اوپر ڈالدو۔ اور چونکہ وہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے اور خدا نے اس کو عقل وتدبیر بھی کامل دی ہے وہ اس بوجھ سے گھبرائے گا نہیں بلکہ اپنے متبعین سے یوں کہیگا ؎

من غم تو می خورم تو غم مخور

من بہ تو مشفق ترم از صد پدر

(میں تیرا غم کھاتا ہوں تو غم مت کر میں تجھ پر سیکڑوں باپوں سے زیادہ شفیق ہوں)

اس صورت میں مسلمانوں کا نہ کوئی دینی کام بند ہوگا نہ دنیوی سب کام اپنے قاعدہ سے چلتے رہیں گے۔ اور اگر کوئی بات حکام وقت سے کہنے کی ہو تو اپنے بڑوں سے مشورہ کر کے حکام کو اطلاع کردو۔ اب جو کام ان کے کرنے کا ہے وہ خود کریں گے۔ اگر پھر بھی تم پر کوئی ناگہانی آفت آجائے تو وقت پر صبر کرو اور اگر کوئی ہنگامہ ہو جاوے تو تم کو لازم ہے کہ خود ظلم نہ کرو۔ اور اپنی حفاظت کرو اس صورت میں غالب تو یہ ہے کہ دوسرا بھی ظلم سے باز آجائے گا اور اگر وہ ظلم ہی کرے تو تم شہید ہو جاؤ گے اس میں بھی مسلمان کا نفع ہے۔ شہادت وہ چیز ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے لئے ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ بِبَلَدِ رَسُوْلِکَ (بخاری کتاب الحج)

(اے اللہ مجھ کو اپنے راستہ میں شہادت نصیب فرما اور میری موت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں کر)

(ان شاء اللہ باقی آیندہ)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تمنا کیا کرتے تھے وَدِدْتُّ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی (محبت رکھتا اس بات کو کہ میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں)

(میں اوپر تفصیل کے ساتھ اس کی فضیلتیں کسی قدر بیان کر چکا ہوں مگر اتنی بات پھر کہے دیتا ہوں کہ جان دینا اسی وقت شہادت ہے جب شریعت کے موافق ہو۔ ورنہ خودکشی ہے ۱۲)

تو ظاہری تدبیر کی یہ صورت ہے مگر افسوس آجکل ہر مسلمان متفکر نظر آتا ہے یہ خودرائی کا نتیجہ ہے ان کے سر پر کوئی بڑا نہیں ہے نہ کسی کو بڑا بناتے ہیں۔ اس لئے ہر کس خود تدبیر کرنا چاہتا ہے اور ایراغیرا نتھو خیرا تدبیر کے اہل نہیں تو پریشانی ہی پریشانی بڑھتی ہے ہمارے اندر اتفاق واتحاد نہیں اس لئے ہمارا کوئی مرکز نہیں اور بدون کسی مرکز کے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ پہلی تحریکات[۵] میں ہم کو شرکت کے لئے کہا جاتا تھا ہم نے کہا کہ شرکت کے لئے کچھ شرائط ہیں جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ کوئی بڑا اور سردار ہو اور وہ اس شان کا ہو کہ اگر کوئی اس کے حکم کی مخالفت کرنا چاہے تو قوت سے اس کو دبا سکے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بدون اتفاق واتحاد باہمی کے کوئی کام نہیں چل سکتا اور جس طرح کسی اہم کام کے لئے حدوث اتحاد کی ضرورت ہے بقاء اتحاد کی بھی ضرورت ہے اور بقاء اتحاد بدون کسی سردار کے نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص ایسا بھی تو ہونا چاہیئے جو اپنی قوت وشوکت سے اس اتحاد کو قائم رکھ سکے بس وہ قہری وحدت ہو ورنہ ارادی وحدت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان تحریکات میں آپ نے جن لوگوں کو بھائی بنایا تھا انہوں نے دشمنی کا برتاؤ شروع کردیا۔ وہ ارادی اتحاد تھا۔ جب انہوں نے چاہا زائل کردیا

---

[۵] مراد تحریکات خلافت ہیں اس کے بعد دوسری تحریکات انسداد فتنۂ ارتداد کی پیدا ہوئیں جو اس وعظ کے وقت ابتدائی حالت میں تھیں ۱۲ جامع

تو یہ اتحاد جو بدون کسی سردار کے ہو لڑکوں کی یاری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لڑکے آپس میں دوستی کرتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر کہدیتے ہیں کہ جاؤ آج سے یاری کٹ کردی یہ تو نئے بھائیوں کا حال ہوا اور جو پہلے سے قدیم بھائی تھے یعنی مسلمان ان کو اصحاب تحریکات نے فاسق اور ڈرپوک بنا کر ان سے بائیکاٹ کرکے خود ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بائیکاٹ نہیں بلکہ بھائی کاٹ ہے کیونکہ اس کی زیادہ تر مسلمانوں ہی پر مشق کی گئی ہے تو اب ان کے ہاتھ سے دونوں جاتے رہے۔

وہی قصہ ہو گیا کہ جہانگیر نے نور جہاں کو بچپن میں شادی سے پہلے ایک موقعہ پر دو کبوتر دیئے تھے کہ ان کو اپنے ہاتھ میں لئے رہ میں ابھی آتا ہوں اس کے ہاتھ سے ایک کبوتر نکل گیا۔ جہانگیر نے جو واپس آکر ایک ہی کبوتر دیکھا، پوچھا دوسرا کہاں گیا۔ نور جہاں نے کہا جہاں پناہ اڑ گیا۔ جہاں گیر نے غصہ سے کہا کہ کیسے اڑ گیا۔ نور جہاں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا جہاں پناہ ایسے اڑ گیا۔ بس جہانگیر اس ادا پر فریفتہ ہو گئے اور زبان حال سے یہ کہنے لگے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشاں زدہٗ
بحیرتم چہ عجب تیر بے کماں زدہٗ

(میرے سینے کے اندر تو نے زخم بے نشاں کے مارا ہے حیرت میں ہوں کیسا عجیب تیر بے کماں تو نے مارا ہے)

اور آخر کار نور جہاں سے نکاح کر لیا۔ واقعی دل کے آنے کا بھی کوئی قاعدہ نہیں بعض دفعہ ذرا سی بات پر دل آجاتا ہے تو جس طرح ایک کبوتر تو اتفاقاً اڑ گیا تھا ایک کو نور جہاں نے خود چھوڑ دیا۔ اسی طرح ہمارے بھائیوں کو ہندوؤں نے تو اتفاق کرکے چھوڑا اور انھوں نے اپنے قدیم بھائیوں سے نفاق کرکے انہیں خود چھوڑ دیا اب دونوں ہاتھ خالی رہ گئے (دایاں بھی اور بایاں بھی کیونکہ قدیم بھائی اصحاب الیمین تھے۔ اور جدید بھائی اصحاب الشمال ۱۲ جامع)

افسوس مسلمان مصائب کے وقت سیاسیات میں دوسری قوموں کی دست نگری کرتے ہیں حالانکہ سیاست میں بھی شریعت کے مکمل احکام ان کے پاس موجود ہیں اور اسلامی سیاست تو وہ چیز ہے جس سے دنیا بھر کے سیاست داں سبق لیتے ہیں مگر مسلمان ہیں کہ دوسروں کے محتاج ہیں۔ بس وہ حال ہے ؎

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر ... تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

اور یہ حال ہے ؎

تا بزانوئے میاں قعر آب ... وز عطش وز جوع گشتستی خراب

یعنی جیسے ایک شخص کے سر پر روٹیوں سے بھرا ہوا ٹوکرا رکھا ہو۔ اور وہ بھوک کی حالت میں اس سے بے خبر ہو کر ہائے بھوک ہائے بھوک کہتا پھرے یا ایک شخص گھٹنوں تک پانی میں کھڑا ہو۔ اور ہائے پیاس ہائے پیاس گاتا پھرے۔ یہی حال آج کل مسلمانوں کا ہے۔ یہ اپنے گھر کے جواہرات سے بے خبر ہیں اور دوسروں کی کوڑیوں کے محتاج ہیں مسلمانوں نے بڑی غلطی کی کہ ان تحریکات میں شریعت کی تعلیم کو بالکل چھوڑ دیا واللہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم شریعت کو اختیار کرلو تو تشویش تمہارے پاس بھی نہ ہوگی گو تشویشناک واقعات کیسے ہی پیش آئیں کیونکہ متبع شریعت کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے ... چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

(تمام شہر حسینوں سے بھرا پڑا ہے میرا خیال ایک محبوب کی طرف ہے چشم بدخو کو کیا کروں کہ اس کے علاوہ کسی پر نظر نہیں کرتی)

اس کی نظر ہر واقعہ میں ہر حالت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے اس کے سوا کسی پر نظر نہیں ہوتی وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے محبوب کی طرف سے ہو رہا ہے پھر تشویش کیسی بس اس کو تو یہ فکر رہتی ہے کہ حق تعالیٰ راضی رہیں۔ پھر دنیا میں جو چاہے ہوتا رہو چاند سورج بھی نکلیں یا نہ نکلیں اسے اسکی پروا نہیں ہوتی۔ اس کا تو مذاق یہ ہوتا ہے ؎

مصلحت دید من آں است کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

ترجمہ :- (بڑی مصلحت یہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی کی طرف متوجہ ہو جاؤ)
اور وہ یوں کہتا ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

(ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی داروگیر شاہی سے بہتر ہے)
خاقانی اسی کو فرماتے ہیں ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ یک دم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی

(تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ حقیقت محقق ہوئی کہ ایک گھڑی خدا کے ساتھ مشغول ہونا ملک سلیمانی سے بہتر ہے)

واللہ جب تھوڑی دیر عارف کو حق تعالیٰ کا حضور بے کیف میسر آجاتا ہے اس کی وہ لذت ہوتی ہے جو تمام غموں کو کافور کر دیتی ہے پھر اس کے پاس پریشانی کہاں اس شخص کو مصیبت کے وقت یہ فکر تو ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں کہیں ناراضی کی وجہ سے تو یہ سزا نہیں دی۔ پھر جب اعمال و حالت قلب میں غور کر کے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ناراض نہیں ہیں تو اب اس کا دل قوی اور منشرح ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی کلفت میں اس کو راحت نظر آتی ہے اور گو وعدہ تو نہیں مگر وقوع اکثر یہ ہے کہ ایسے لوگ ظاہری واقعات تشویش سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور باوجود قلت جماعت و قلت سامان کے غالب و فائز رہتے ہیں (کما فی الحدیث لایزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لایضرھم من خالفھم ولاادری لایضرھم فی الدین خلاف من خالفھم ولو اضر دنیاھم احیانًا ۱۲ جامع)

اور اگر بالفرض کبھی ان کو ناکامی بھی ہو تو اتباع شریعت کی برکت سے معاملہ الٹا نہیں پڑتا کہ قہر کی سی صورت ہو جائے آجکل تو مشکل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں پر بھی زیادتی کرنے لگتے ہیں

بھلا عورتوں اور بچوں نے کیا قصور کیا پھر اس غلطی کی وجہ سے معاملہ ہم پر ہی الٹ جاتا ہے اور قہر کی سی صورت بن جاتی ہے۔ ان تشویش ناک واقعات میں جھوٹ اور مبالغہ اور تجاوز حدود بہت ہی ہوتا ہے جس سے دین برباد ہوجاتا ہے۔ چنانچہ پہلی تحریک میں ہمارے ہی بھائیوں نے بعض مسلمانوں کی طرف ایسے جھوٹ الزامات عائد کئے ہیں کہ کوئی مسلمان ان کا مصداق ہرگز نہیں ہوسکتا خصوصاً وہ مسلمان جس کی حالت کا عرصہ دراز تک تجربہ بھی کرلیا گیا ہو پھر ان باتوں کا انجام فساد ذات البین ہوا کہ دوستوں اور بھائیوں میں عداوت اور بغض پیدا ہوگیا اور فساد ذات البین وہ بلا ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِیَّاکُمْ فَسَادَ ذَاتِ الْبَیْنِ فَاِنَّھَا ھِیَ الْحَالِقَۃُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ یعنی مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرماتے ہیں کہ فساد ذات البین کو اپنے سے دور رکھو کیونکہ یہ مونڈنے والی چیز ہے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے یاد رکھو مصائب میں حدود شرع سے تجاوز کرنا اعلیٰ درجہ کی بے صبری ہے صابر وہی ہے جو ایسے مواقع میں شریعت پر جما رہے اور کوئی کام خلاف مرضی حق نہ کرے ایسے ہی صابرین کے لئے بشارت ہے اور انہی لوگوں کی فضیلت احادیث و قرآن میں بیان کی گئی ہے آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰاتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ ط یعنی صابرین پر ان کے پروردگار کی طرف سے خاص رحمتیں بھی ہیں اور عام رحمتیں بھی اس میں صابرین کے لئے دوسری بشارت ہے جو بلا واسطہ سنائی گئی ہے۔ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (آپ صابرین کو بشارت دیدیجئے) میں بشارت بواسطہ تھی یہ بلا واسطہ ہے اور یہ مبنی ہے اس قاعدہ پر کہ تاکید سے تاسیس اولیٰ ہے بعض علماء نے اس کو بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ہی کا بیان سمجھا ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ مستقل کلام ہے ماقبل کا بیان نہیں کیونکہ دونوں مستقل آیتیں ہیں پس ظاہر یہی ہے کہ دونوں کا مفہوم بھی مستقل ہو بیان کہنے میں یہ آیت مضمون سابق کی تاکید ہوگی اور مستقل ماننے میں تاسیس ہے اس لئے یہی اولیٰ ہے پس میرے ذوق میں بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ میں بواسطہ بشارت ہے اور اس جملہ میں بلا واسطہ بشارت ہے۔ بہرحال اس میں بتلایا

گیا ہے کہ صابرین پر خاص و عام دونوں طرح کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ خاص رحمت تو آخرت میں ہوگی اور رحمت عامہ کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے صابرین کو صبر و استقلال کا ثمرہ دنیا میں بھی حق تعالےٰ کھلی آنکھوں دکھلا دیتے ہیں بشرطیکہ صبر کی حقیقت صحیح طور پر موجود ہو جس کو میں مفصل بیان کر چکا ہوں اس کے بعد ایک تیسری بشارت تو ایسی بیان فرمائی ہے کہ وہ جزا تو ہر مومن صابر کو ضرور ہی حاصل ہے یعنی وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ کہ یہی لوگ راہ صواب پر چلنے والے ہیں صاحب جو شخص ناگوار واقعات میں شریعت پر کامل طور پر جما رہتا ہے گو ظاہر میں اس کو کیسی ہی کلفت ہو۔ مگر دل میں اس کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ خدا کے فضل سے میں حق پر ہوں۔ دیکھئے میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص تو وہ ہے جو اپنے نزدیک صحیح راستہ پر چل رہا ہے مگر راہ میں کچھ کانٹے اور گڑھے بھی اس کو تنگ کرتے ہیں اور ایک شخص راستہ بھولا ہوا ہے اور اسے جابجا باغات اور عمدہ عمدہ پھل ملتے جاتے ہیں غور کر کے دیکھ لیجئے کہ ان دونوں کی حالت میں فرق ہے یا نہیں بخدا زمین آسمان کا فرق ہوگا جو شخص ٹھیک راستہ پر چل رہا ہے اس کے قلب میں سکون و اطمینان ہوگا وہ کانٹوں اور گڑھوں کو بھی اطمینان سے طے کرے گا کیونکہ جانتا ہے کہ راستہ یہی ہے۔ اور جو شخص راستہ بھولا ہوا ہے اس کو قدم قدم پر پیر کا اٹھانا بھاری ہو جائے گا اور جتنے نئے نئے باغات اور پھل پھلواریاں اُسے راستہ میں نظر آئیں گی اتنی زیادہ وحشت ہوگی کہ اے اللہ میں کدھر نکل آیا یہ باغات تو میرے راستہ میں کبھی نہ آتے تھے آج یہ کیا معاملہ ہے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ متبع شریعت کو اگر کوئی کلفت بھی پیش آتی ہے تو وہ گھبراتا نہیں کیونکہ وہ راستہ کو دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے کہ مقصود کا راستہ یہی ہے اگر کسی وقت اس کو جان پر بھی خطرہ آتا ہے جب بھی یہ مسرت اس کا دل بڑھاتی رہتی ہے کہ بحمد اللہ میں خدا کے راستہ میں جان دے رہا ہوں اور جو شخص خدا کا مجرم ہے حدود سے گذر گیا ہے اس کو جان دیتے ہوئے یہ خوشی ہرگز نہیں ہوتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں غلط راستہ پر ہوں۔ میں منزل مقصود یعنی جنت پر نہ پہونچوں گا بلکہ نہ معلوم کہاں جا کر گروں گا۔ اس لئے ہدایت پر ہونا واللہ بڑی بشارت ہے اور

یہ وہ جزا اور وہ نعمت ہے جو صابر مومن کو دنیا میں ضرور ہی حاصل ہوتی ہے۔

مجھے ہدایت کا نعمت ہونا ایک بار سفر میں بخوبی محسوس ہوا عرصہ ہوا کہ میں ایک بار سہارنپور سے براہ لکھنؤ کانپور کا ارادہ کرکے ریل میں سوار ہوا میرے ایک دوست بابو صاحب بھی اسی گاڑی میں آکر پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے جب گاڑی چل پڑی تو آپس میں باتیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے کہا میرٹھ جاؤں گا۔ میں نے کہا ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جاتے ہوں افسوس ہے کہ یہ گاڑی تو میرٹھ نہ جائے گی۔ یہ تو لکھنؤ جائیگی اب یہ سنکر جوان کی حالت ہوئی کچھ نہ پوچھئے وہ سخت پریشان ہوئے۔ اور بار بار اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ میں اُن سے باتیں کرنا چاہتا اور وہ جھلاتے تھے کہ میاں تمہیں دل لگی سوجھی ہے یہاں خود ہی پریشانی ہے کہ میں نے یہ بڑی غلطی کی۔

سردی کا موسم تھا ان کو اس لئے اور بھی فکر تھی کیونکہ وہ بالکل بیک بینی و دو گوش تھے جنٹلمین سردی کا سامان ساتھ لیکر سفر کرنے کو عیب سمجھتے ہیں بلکہ لوٹا بھی ساتھ نہیں لیتے اس بھروسہ پر رہتے ہیں کہ جہاں پیاس لگے گی اسٹیشن پر پانی مل جائے گا پی لیں گے نماز کی تو انھیں ضرورت ہی نہیں مگر بعض دفعہ جب اسٹیشن پر پانی نہیں ملتا اور پیاس لگتی ہے تو ان کا بُرا حال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بار سفر میں ایک جنٹلمین صاحب نے ایک اسٹیشن کے قریب مجھ سے لوٹا مانگا کہ میں اس میں پانی لے سکتا ہوں میں نے لوٹا دے دیا اس میں کچھ پانی موجود تھا مگر جنٹلمین صاحب نے اسے پھینک دیا کیونکہ اسٹیشن قریب آنے والا تھا اتفاق سے وہاں جو اترے تو پانی نہ ملا اب آپ بڑے کھسیانے ہوئے اور خود ہی کہنے لگے

کہ بڑی حماقت ہوئی میں نے پچھلا پانی بھی پھینکدیا۔ یہ واقعی یہ لوگ اپنے کو اصولی سمجھتے ہیں یہ خاک بھی اصولی نہیں ہاں وصولی تو ہیں کہ رقمیں وصول کرنا خوب جانتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی اصول ہے کہ بادل دیکھ کر گھڑے پھوڑ دیں تو وہ بابو صاحب بھی اسی مذاق کے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور ان کے ساتھ کوئی کپڑا نہ تھا۔ کیونکہ یہ بھی آجکل اصول میں داخل ہے

خلاصہ یہ کہ ان کو کسی طرح بشاشت واطمینان حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ مجھ میں اور ان میں اس وقت کس بات کا فرق ہے میں مطمئن کیوں ہوں اور یہ بے چین کیوں ہیں۔ بس اس کے سوا کچھ فرق معلوم نہ ہوا کہ میں راہ پر تھا اس لئے مطمئن تھا اور وہ بے راہ تھے اس لئے بے چین تھے اس وقت معلوم ہوا کہ واقعی راہ پر ہونا بھی بڑی اطمینان بخش دولت ہے بے راہ گو ظاہر میں کتنا ہی سامان رکھتا ہو اس کے دل کو اطمینان وسکون حاصل نہیں ہوسکتا پس اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (اور یہی لوگ راہ پر ہیں چلنے والے) حقیقت میں بڑی بشارت ہے اور راہ پر ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو خود محقق ہوں کہ راستہ کو دیکھ رہا ہو یا کسی محقق کے ہاتھ میں ہاتھ دیدے جیسا کہ ظاہری راستہ پر چلنے کی بھی دو ہی صورہیں۔ یا تو خود سوانکھا ہو کہ آنکھوں سے راستہ کو دیکھتا ہو اور جو خود اندھا ہو تو کسی سوانکھے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر منزل پر پہونچ سکتا ہے یہی قاعدہ طریق حق کا ہے۔ واقعی محقق کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے آدھا غم تو فوراً ہی ہلکا ہو جاتا ہے۔

میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ بیماری میں محقق طبیب کی صورت دیکھنے ہی سے آدھا مرض جاتا رہتا ہے اسی طرح محقق عارف کے پاس جانے اور اس کی تسلی بخش باتوں کے سننے سے آدھا مرض تو خود زائل ہوجاتا ہے بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عارف کی محض صورت دیکھنے ہی سے مرض جاتا رہتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

اے لقاء تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(آپ کی زیارت ہی ہر سوال کا جواب ہے آپ سے بلا شک وشبہ مشکل حل ہوتی ہے)

اور محقق کی علامت یہ ہے کہ اس کی باتوں سے دل کو تسلی اور اطمینان ہوتا ہے غیر محقق کی باتوں سے اطمینان نصیب نہیں ہوتا جیسے سفر میں اگر آپ کے ساتھ کوئی ایسا رہنما ہو جس کو واقع میں راستہ معلوم نہیں تو اس کی باتوں سے آپ تاڑ لیتے ہیں کہ یہ واقف طریق نہیں ہے۔ ناواقف کی باتیں کچھ ایسی اکھڑی اکھڑی ہوتی ہیں جن سے سمجھنے والوں کو اس کا ناواقف ہونا خود بخود معلوم ہوجاتا ہے اور واقف کی باتیں دل میں گھر کر لیتی ہیں اور راز اس کا یہ ہے کہ ناواقف کو اپنی باتوں پر خود ہی اطمینان نہیں تو دوسرے کو اس سے اطمینان کا فیض کیسے پہونچے اور جاننے والا جو کچھ کہتا ہے اطمینان سے کہتا ہے تو دوسرے پر بھی اس کے اطمینان کا اثر پڑتا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۔ ؎

وعدہا باشد حقیقی دلپذیر وعدہ ہا باشد مجازی تاسہ گیر

(حقیقی وعدہ سے دل کو یقین ہوتا ہے مجازی وعدہ سے اطمینان نہیں ہوتا)

پس راہ پر ہونے کی صورت یہ ہے کہ کسی محقق سے تعلق پیدا کرو۔ جبھی آپ کو مصائب میں کمال صبر کی دولت حاصل ہوسکتی ہے اور اسی وقت آپ کو یہ بشارتیں صلوات ورحمت وہدایت کی حاصل ہوسکتی ہیں پس اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور خلاصہ وعظ پھر بیان کئے دیتا ہوں کہ مصائب میں شریعت نے ہم کو صبر کی تعلیم کی ہے مگر صبر فقط ترک جزع فزع کا نام نہیں۔ بلکہ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ کسی حال میں کسی مامور بہ میں خلل نہ آوے اور جو دینی معمولات پہلے سے اختیار کر رکھے ہیں ان پر مصیبت میں بھی دوام رکھا جاوے اگر اس طرح صبر کیا جاوے تو یہی ہر مصیبت اور ہر غم کا علاج بھی ہے۔

اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ آمین والحمد للہ رب العالمین وصلے اللہ تعالےٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلے آلہ واصحابہ اجمعین

تمت

شریعت اور طریقت

اس پرفتن زمانہ میں منجملہ دوسری عام غلطیوں کے ایک اہم اور بڑی غلطی علم تصوف کے فہم میں ہوئی، کسی نے قول و فعل کی بے قیدی کا نام تصوف رکھ لیا۔ کسی نے چند ظاہری رسوم کو تصوف کا نام دیدیا۔ اور کسی نے صرف کثرتِ اوراد و وظائف کو تصوف سمجھ لیا۔ علیٰ ہذا تصوف کے مسائل سمجھنے میں صدہا غلطیاں کیں جن سے ایک طرف تو ان کے عقائد درست نہ رہے بلکہ بعض تو شرک تک میں مبتلا ہو گئے۔ اور دوسری طرف بعض حضرات نے یہاں تک تجاوز کیا کہ اصل تصوف کا ہی انکار کر بیٹھے، اور حضرات اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی شان میں بے ادبی و گستاخی کے خوگر ہو گئے۔ تیرہ صدیوں کے مسلّمہ مسائل تصوف کو کتاب و سنت سے خارج اور شریعت کے خلاف سمجھ کر تصوف کے نام سے کوسوں دور بھاگنے لگے، یہ لوگ نہ صرف بزرگانِ دین کے برکات و فیوضات سے محروم ہی رہے بلکہ ان کے قلوب میں قساوت پیدا ہو گئی۔ ان کے علاوہ بعض حضرات تصوف کے منکر تو نہیں ہیں، حضرات اولیاء کے معتقد بھی ہیں لیکن علم تصوف کو شریعت کے علاوہ ایک علیحدہ علم سمجھتے ہیں اور مسائل تصوف کو غیر ثابت بالسنہ جانتے ہیں ان جملہ امور کے پیشِ نظر کتاب شریعت اور طریقت مرتب کی گئی ہے جس کے جملہ مضامین حضرت حکیم الامت مجدد الملت الشاہ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کا انتخاب ہیں۔ اس میں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجیہات، تعلیمات و مسائل مع دلائل و حقائق، سالک کے لئے طریق عمل اور ان کے متعلق ضروری تفصیلات مندرج ہیں جو قرآن مجید احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں کتب فقہ کی طرز پر ابواب و فصول کی صورت میں مرتب کی گئی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اسلامی تصوف و سلوک کے اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے، شاید ہی تصوف کا کوئی ایسا اہم مسئلہ ہو گا جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو، اس کے مطالعہ سے اسلامی تصوف و سلوک کے متعلق ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ تزکیۂ نفس، تہذیب اخلاق، اور اصلاح اعمال کا طریقہ نہایت واضح اور آسان ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ شریعت اور طریقت میں کوئی تضاد نہیں۔

قیمت مجلد بیس روپے علاوہ خرچ ڈاک

ملنے کا پتہ

مکتبۂ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

ایم۔ اے جناح روڈ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

تعظیمُ العلم

مع

تقسیمُ العلم

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ـــ دفتر الابقاء
مسافرخانہ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

موسومہ

تعظیمُ العِلم

مع

تقسیمُ العِلم

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	مزای شان	من ضبط	المستمع	الاشتات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	متفرقات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	حضرت حکیم الامت کو نزلہ وحرارت کی شکایت تھی پھر بھی بہت زور کا بیان تھا

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ

ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا ہُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیۡرٍ ۔

(کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لئے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ زمین میں موجود ہیں اور کامل کر دیں تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں بدون علم کے اور بدون ہدایت کے اور بدون روشن کتاب کے)

یہ ایک آیت ہے سورۂ لقمان کی اس میں حق تعالےٰ نے اپنے بعضے دلائل توحید ارشاد فرما کر منکرین توحید کی شکایت کی ہے اور ان کا انکار چونکہ بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے اس لئے اس کو مجادلہ سے تعبیر فرمایا ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا لیکن میرا مقصود اس وقت مضمون توحید کو بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی مخاطب توحید کا منکر نہیں بلکہ مجھ کو علم دین کی ضرورت اور اس کے بعضے انواع کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ مضمون اگرچہ منطوقاً اس آیت کا مدلول نہیں ہے مگر اس سے مفہوم ضرور ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ تقریر استدلال سے واضح ہو جائیگا پس یہ آیت توحید پر تو صراحۃً دلالت کرتی ہے اور علم کی ضرورت اور اس کے اقسام پر اشارۃً دلالت کر رہی ہے اور چونکہ اس وقت ایک علمی مقام میں بیان ہو رہا ہے اور میرا معمول ہمیشہ یہ ہے کہ متناسب محل مضمون بیان کیا کرتا ہوں اس لئے دوسرے مضمون کو جو اشارۃً اس آیت سے مستنبط ہو رہا ہے اختیار کرنے میں ترجیح دی گئی لیکن ربط کے لئے دلیل توحید کو بھی بیان کر دینا مناسب ہے کیونکہ ضرورت علم کی طرف اس آیت کے دوسرے جزو میں اشارہ ہے اور پہلے جزو میں صرف توحید کی دلیل مذکور ہے تو پوری آیت کی تفسیر اسی وقت سمجھ میں آویگی جبکہ دونوں اجزاء کو بیان کر دیا جائے۔ مگر پہلے جزو کا بیان محض ربط ہی کے لئے ہوگا اور اصل مقصود علم کے متعلق بیان ہے جو کہ دوسرے جزو میں مذکور ہے۔

اب سمجھنا چاہئے کہ وہ توحید کی دلیل کیا ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ اس میں خطاب ہے عقلاء کو کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالےٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہاری تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ کہ زمین میں موجود ہیں یہاں سَخَّرَ لَکُمۡ کے معنی وہ مراد نہیں ہیں جو اردو محاورہ میں

تسخیر کے لفظ سے متبادر ہوتے ہیں اور وہ معنی محل اشکال بھی ہیں لیکن منشا اس اشکال کا محض خلط محاورہ ہے اور یہ مزلہ (پھسلنے کی جگہ) ہے اہل علم کے لئے۔ بعض علماء بھی محاورات السنہ میں فرق نہیں کرتے اس لئے ان کو قرآن میں اشکالات پیش آجاتے ہیں لیکن اہل علم کو پھر بھی یہ غلطی واقع ہوتی ہے کیونکہ ان میں اکثر حضرات محاورات و لغات میں فرق جانتے ہیں۔ البتہ ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ غلطی زیادہ پیش آتی ہے کیونکہ وہ محض ترجمہ ہی کو دیکھتے ہیں اور لغات عربیہ و محاورات قرآن سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ پس یہ لوگ اکثر قرآن کے محاورات کو اپنی زبان کے محاورات پر قیاس کرکے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کسی نے سَخَّرَ لَكُمْ کا ترجمہ کسی جگہ یہ دیکھا ہو "مسخر کردیا تھا تمہارے لئے" پھر اس کو محاورہ اردو عربی میں خلط ہوگیا ہو اور اس نے تسخیر کے لفظ کو اردو محاورہ پر محمول کیا ہو۔ اور دوسرے معنی کی طرف اس کا ذہن بھی نہ گیا ہو۔ کیونکہ اس کے ذہن میں تسخیر کے وہی معنی بسے ہوئے ہیں جو محاورۂ اردو میں مستعمل ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو بات بسی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے دیوبند میں مجھے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق لکھ کر دی تھی کہ اس کو صاف کردو کسی نے حضرت سے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تھا جس کے جواب میں آپ نے وہ تحقیق لکھی تھی مسئلہ تصور شیخ صوفیہ کا ایک شغل ہے جو زمانہ قدیم میں رائج تھا۔ لیکن اب محققین نے اس شغل سے منع کردیا ہے کیونکہ اب عقول سے سلامتی رخصت ہوگئی ہے۔ بہت لوگ اس شغل سے غلطی اور گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں باقی اگر کسی سالک کی فہم سلیم ہو تو اب بھی اسکی تعلیم کا مضائقہ نہیں۔ رفع خطرات و حصول یکسوئی کے واسطے یہ شغل بہت نافع ہے۔ غرض میں اس مسئلہ کی نقل لکھ رہا تھا کہ ایک نو وارد طالب علم جو اب تک معقول میں منہمک تھے میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہیں میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ شیخ بو علی سینا کا۔ بس اس غریب کے نزدیک وہی ایک شیخ تھا اور تو سب چلا ہے ہی تھے۔ سو اس کا منشا یہی تھا کہ معقول پڑھنے کی وجہ سے ان کے ذہن میں شیخ بو علی سینا ایسا بسا ہوا تھا کہ شیخ کا لفظ سن کر ادھر ہی

ذہن منتقل ہوتا تھا۔ دوسری طرف ان کا خیال نہ گیا کہ کوئی اور بھی شئے ہو سکتا ہے یہ ایک فطری امر ہے کہ جب علوم میں وسعت نہیں ہوتی تو ہر شخص ہر بات کو اپنے علم ہی پر محمول کرتا ہے۔ یعنی جو بات اس کے ذہن میں بسی ہوئی ہے اسی کی طرف انتقال ذہن ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقص الفہم لوگوں نے صفات الٰہیہ کو اپنی صفات پر قیاس کیا۔ قرآن میں حق تعالےٰ کے لئے وجہ دید و سمع و بصر و رحمت و غضب وغیرہ کا ذکر دیکھ کر بعض لوگ تجسم کے قائل ہو گئے اس کا منشا بھی یہی ہے کہ ان کے ذہن میں صفات بشریہ ہی بسی ہوئی ہیں۔ اس لئے ان الفاظ سے تجسیم کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو گیا ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

(بہتر فرقوں کی جنگ میں تمام کو معذور سمجھو جب ان کو حقیقت کا پتہ نہ چل سکا ڈھکوسلوں کی راہ اختیار کی)

اسی طرح ترجمہ دیکھنے والوں نے تسخیر کا لفظ تعویذ گنڈوں ہی میں سُنا ہوگا اس کے سوا اور کسی جگہ اس لفظ کو نہ سنا ہوگا۔ پس قرآن میں سَخَّرَ لَكُمْ کا ترجمہ "مسخر کر دیا تمہارے واسطے" دیکھ کر ادھر ہی ذہن منتقل ہوا۔ اب وہ اس معنی کو ذہن میں لیکر علماء کے پاس پہنچے اور اپنے نزدیک بڑا اشکال لے کر آئے کیونکہ تسخیر کے معنی ان کے ذہن میں تابع و مطیع و منقاد کرنے کے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں اگر ہم کو بارش کی ضرورت ہو اور ہم بادل سے کہیں کہ برس جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ برسے گا وعلیٰ ہذا القیاس اگر سمندر میں طوفان آرہا ہو اور ہم ہوا سے یہ کہیں کہ تھم جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ تھمے گی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اس معنی کے اعتبار سے ہماری مسخر نہیں ہیں۔ اب ان کو قرآن پر اشکال ہوا کہ قرآن میں تو یہ فرمایا ہے کہ تمام چیزوں کو تمہارے واسطے مسخر کیا گیا ہے اور حالت یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں سو بات یہ ہے کہ اس شخص نے تسخیر کا لفظ تو قرآن سے لیا اور معنی

اردو محاورہ کے موافق کئے اس سے یہ اشکال پیدا ہوا حالانکہ اس کو چاہئے تھا کہ تسخیر جس زبان کا لفظ ہے اسی زبان کے محاورات کے موافق اس کے معنے لیتا تو یہ اشکال نہ پڑتا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اکثر اشکالات کا سبب یہی ہے کہ لوگ حقائق کو تو سمجھتے نہیں محض غلط محاورات سے شبہ میں پڑجاتے ہیں۔

چنانچہ ایک شخص تھانہ بھون میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے قرآن پر کچھ شبہ ہے جس کو میں بعد میں بیان کروں گا پہلے آپ اس آیت کا ترجمہ کر دیجئے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ۔ میں سمجھ گیا کہ اس کو کسی ترجمہ کے دیکھنے سے اشکال پیش آیا ہے میں نے کہا سنئے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے "اور پایا خدا تعالےٰ نے آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا" یہ ترجمہ سن کر وہ میرے منہ کو تکنے لگے میں نے کہا فرمایئے وہ کیا اشکال ہے کہنے لگے اب تو کچھ بھی نہیں۔ سو منشاء اشکال کا یہ تھا کہ بعض مترجمین نے اس آیت کے ترجمہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ پایا آپ کو گمراہ الخ اور غالباً اس زمانہ میں اردو کا محاورہ گمراہ کے بارہ میں فارسی محاورہ کے موافق ہوگا۔ فارسی میں گمراہ ناواقف کو بھی عام ہے۔ یہی محاورہ اس وقت اردو کا بھی ہوگا۔ اس لئے ان حضرات نے ضَالٌّ کا ترجمہ اس جگہ گمراہ سے کر دیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اردو محاورہ فارسی کے مطابق اس وقت بھی نہ ہو لیکن مترجم نے فارسی محاورہ کا لحاظ کر کے یہ ترجمہ کیا ہو اور عوام کی گمراہی کا اندیشہ اس لئے نہ ہوا ہو کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ عوام کو ترجمۂ قرآن کسی عالم استاد سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیئے تو ان کو اطمینان تھا کہ پڑھاتے ہوئے ہم بتلا دیں گے کہ اس جگہ فارسی محاورہ کے موافق یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے انھوں نے آزادانہ یہ لفظ لکھ دیا لیکن اب اردو کا محاورہ بدل گیا ہے آجکل گمراہ محض ناواقف کو نہیں کہتے بلکہ یہ لفظ اس زمانہ میں مذمت کی جگہ بولا جاتا ہے یعنی جو شخص بعد وضوح راہ حق کے اس راہ کو چھوڑدے۔ نیز آجکل عوام ترجمۂ قرآن کو علماء سے سبقاً سبقاً پڑھتے بھی نہیں اس لئے ان کو اشکالات پڑتے ہیں کہ انھوں نے گمراہ کا لفظ دیکھا جو کہ فارسی لفظ ہے اور معنی لئے اردو محاورہ کے موافق اس وجہ سے شبہ پیدا ہوا حالانکہ ان کو لازم تھا کہ جو لفظ جس زبان کا ہے اس کے معنے اسی زبان کے محاورہ کے موافق لیتے۔

پس سمجھنا چاہیئے کہ گمراہ کے دو معنی ہیں ایک وہ جس کو راستہ معلوم ہی نہ ہو اس معنے کیلئے آجکل اردو میں ناواقف کا لفظ مستعمل ہے۔ دوسرے وہ جو بعد بتلانے کے بھی غلط راستہ پر چلے اور عربی میں لفظ ضال بھی ان دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اس آیت میں ضال اور گمراہ سے پہلے معنی مراد ہیں یعنی ناواقف جس پر کچھ اشکال نہیں کیونکہ اب ترجمہ یہ ہوگا کہ پایا خدا نے آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام علوم حق تعالیٰ ہی کے بتلانے سے حاصل ہوئے اس میں کیا اشکال ہے۔ اور دوسرے معنی جو ضال اور گمراہ کے ہیں وہ اس آیت میں ممتنع الارادہ ہیں وہ ہرگز مراد نہیں خوب سمجھ لو۔ تو جس طرح غلط محاورہ کی وجہ سے اس آیت میں اشکال پڑا تھا اسی طرح یہاں بھی ممکن ہے کسی کو اشکال پیش آیا ہو۔ کیونکہ تسخیر کے معنے ہمارے محاورہ میں یہ ہیں کہ کسی کو ایسا تابع کر دیا جائے کہ جو ہم کہدیں وہی کرنے لگے جیساکہ تسخیر کے لئے تعویذ گنڈے لکھوائے جاتے ہیں اور وہاں تسخیر کے یہی معنی مراد ہوتے ہیں کہ دوسرا شخص ہمارا ایسا منقاد و مطیع ہو جائے کہ جو ہم کہیں وہی کرنے لگے۔ سو سمجھنا چاہیئے کہ تسخیر کے صرف یہی معنی نہیں ہیں بلکہ عربی میں تسخیر کے ایک اور معنی بھی ہیں یعنی کام میں لگا دینا اور اس آیت میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں پہلے معنی مراد نہیں کیونکہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں ہماری منقاد و مطیع نہیں ہیں کہ جو ہم کہدیں وہی کرنے لگے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مہمان تمہارے یہاں آوے اور تم اُس کی آسائش کے لئے اپنے نوکروں سے کام لو تو وہ نوکر مطیع تو تمہارے ہیں مگر تم نے اس وقت کام میں اس مہمان کے لگا دیا تو تمہارے کہنے سے یہ پانچ چھ گھنٹے جو نوکر اس کے کام میں لگے رہے یہ بھی تسخیر ہے حالانکہ وہ اس کے نوکر نہیں بلکہ تمہارے مطیع ہیں تم نے صرف ان کو اس کے کام میں لگا دیا ہے اور لغت عربیہ کے موافق کسی کو کسی کے کام میں لگا دینا بھی تسخیر کہلاتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے آسمان و زمین وغیرہ کو تمہارے واسطے کام میں لگا دیا ہے پس یہی تسخیر ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں تمہاری مطیع نہیں بلکہ ممکن ہے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو کہ ہم انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور انسان کو بھی خبر نہ ہو کہ میرے کام میں کون کون لگا ہوا ہے لیکن چونکہ تم کو ان سے منافع حاصل ہو رہے ہیں اور راحت پہونچ رہی ہے اور ان سے

تمھارے کام چل رہے ہیں اس لئے دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہے کہ حق تعالےٰ نے تمام چیزوں کو تمھارے لئے مسخر کردیا ہے یعنی تمہارے کام میں لگادیا ہے۔ پس اب سَخَّرَ لَکُمْ میں تسخیر کے معنی وہ ہوئے جو شیخ سعدیؒ نے ان شعروں میں بیان کئے ہیں ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند   تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار   شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

یعنی بادل اور ہوا اور چاند و سورج سب کے سب اپنے اپنے کام میں اس لئے لگے ہوئے ہیں کہ تم کو روٹی مل جاوے اور پیٹ بھر کے تم خدا کی عبادت میں لگو اور غفلت میں عمر نہ گذارو دوسرے شعر میں از بہر تو کے معنے یہ ہیں کہ تمھارے نفع کے لئے اور تمھاری خاطر سے یہ سب مختلف کاموں میں لگائے ہوئے ہیں اور جو کام جس کے سپرد ہے اس کو اچھی طرح ہر ایک بجالا رہا ہے۔ بہر تو کہ یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو تمھارے تابع کردیا گیا ہے۔ پس از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار کے وہی معنی ہیں جو سَخَّرَ لَکُمْ کے ہیں۔ آگے بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری۔ یعنی جب یہ تمام چیزیں باطاعت احکام الٰہیہ تکوینیہ تیرے کام میں لگی ہوئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیرے اوپر سب سے بڑی حق تعالےٰ کی نعمتیں ہیں کہ ان سب کو تیرے کام میں لگا رکھا ہے تو یہ بہت ہی بے انصافی ہوگی کہ احکام الٰہیہ تشریعیہ کی فرمانبرداری نہ کرے کیونکہ جس قدر کسی پر منعم کا احسان زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس پر اوس منعم کا شکر زیادہ واجب ہوتا ہے اور اگر وہ ناسپاسی کریگا تو سب سے زیادہ مورد عتاب بھی ہوگا۔ پس انسان بھی اشرف المخلوقات اسی وقت ہے جبکہ وہ احکام الٰہیہ کا اتباع کرے ورنہ بصورت مخالفت جمادات و حیوانات ہی اس سے اچھے ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ کے احکام کی مخالفت تو نہیں کرتے۔

اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شرف انسان کے لئے لوازم ذات سے نہیں بلکہ مبنی شرف کا اعمال ہیں۔ بعض لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ شرف کو لوازم ذات سے سمجھتے ہیں گو اعمال کیسے ہی ہوں۔ بعض لوگ فخر کرتے ہیں کہ ہم شیخ ہیں یا سید ہیں اور اس بنا پر وہ اپنے کو دوسری قوموں سے مطلقاً افضل سمجھتے ہیں گو ان شیخ و سید صاحب کے اعمال جلاہوں سے

بھی بدتر ہوں سو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر انسان کے اعمال درست نہ ہوں تو وہ جلاہوں سے تو کیا افضل ہوگا وہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہوگا۔ اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (یہ لوگ مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں) بنا، شرف اعمال صالحہ وایمان ہے ورنہ ؎

اَلنَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ اَكْفَاءُ　　اَبُوْهُمُوْ اٰدَمُ وَالْاُمُّ حَوَّاءُ

یعنی صورت کے اعتبار سے سب آدمی یکساں ہیں کیونکہ سب کے سب آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ البتہ اگر اعمال درست ہوں تو پھر شرف نسب بھی ایک درجہ میں باعث فضیلت ہوسکتا ہے۔ لیکن اس پر فخر کرنا کسی حال میں جائز نہیں ہاں تحدث بالنعمۃ (اظہار نعمت) جائز ہے۔ اور اگر انسان ہوکر اعمال خلاف انسانیت کرے تو پھر فخر و شرف کیسا ہاں اس صورت میں بھی استعداد تو اس کے اندر موجود ہے اگر اپنی استعداد کی طرف عود کرے تو پھر وہ اشرف المخلوقات ہے اور یہی محل ہے اس آیت کا وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ (ہم نے اولاد آدم کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا)

اس آیت میں جو بنی آدم کو عموماً مکرم کہا گیا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ ہر انسان میں استعداد ایسی موجود ہے کہ اگر وہ اس سے کام لے تو پھر ساری مخلوق سے زیادہ مکرم ومحترم ہوسکتا ہے اور اگر اعمال بد ہوئے تو کچھ بھی نہیں۔ بہرحال انسان پر جب نعم الٰہیہ اور مخلوقات سے زیادہ ہیں تو نافرمانی واعمال بد کی صورت میں وہ دوسروں سے زیادہ مورد عتاب ہوگا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس پر نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں اس پر شکر بھی زیادہ واجب ہوتا ہے اور ناشکری کی صورت میں اس پر عتاب بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔ دیکھو رعایا میں سے ایک معمولی آدمی اگر احکام شاہی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس درجہ مورد عتاب نہیں ہوتا جیسا کہ ایک درباری آدمی خلاف ورزی احکام پر مورد عتاب ہوتا ہے۔

الغرض انسان اشرف المخلوقات تو ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مخلوق اُس کی

غلام ہے بلکہ اس کی مثال محض مہمان جیسی ہے کہ سارا سامان اسی کے واسطے ہوتا ہے مگر وہ مالک نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے اور اشارہ کی صورت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک قضیہ شرطیہ ہے جس کے مقدم و تالی میں بظاہر ربط نہیں ہے مگر اس مقدمہ کے ملا لینے کے بعد ربط پیدا ہو جاتا ہے تو جس مقدمہ پر آیت کا مربوط ہونا موقوف ہے اس پر بھی آیت کی دلالت لازمی ہے گو بطریق اقتضا ہی سہی۔ وہ آیت یہ ہے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (ترجمہ) اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے۔

اس آیت میں بظاہر مقدم و تالی میں ربط نہیں کیونکہ آدمیوں کے افعال پر مؤاخذہ کرنے کا نتیجہ ظاہر میں آدمیوں ہی کی ہلاکت ہو سکتی ہے نہ کہ تمام حیوانات کی ہاں اگر یہ فرماتے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ الْخَلْقَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ (اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتی ہے تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے)

یا یوں فرماتے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنَ الْاِنْسَانِ (اور اگر حق تعالےٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی انسان کو نہ چھوڑتے)

تو اس صورت میں ربط ظاہر تھا لیکن آیت اس طرح وارد نہیں ہوئی وہاں تو مواخذۂ اعمال انسان پر تمام حیوانات اور جاندار چیزوں کی ہلاکت کو مرتب کیا گیا ہے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ کہ انسان کے گناہوں سے تمام مخلوق ہلاک ہو۔ ان دونوں مقدموں میں جوڑ کیا ہے۔ مگر تقریر گذشتہ کے ملانے سے اب اس اشکال کا جواب ظاہر ہے اس آیت کے ساتھ وہ مقدمہ ملا لیجئے۔ کہ انسان کے لئے سب کائنات پیدا ہوئے ہیں بس اب ربط پیدا ہو گیا۔ حاصل یہ ہوا کہ انسان تو اس صورت میں اپنے گناہوں کی وجہ ہلاک ہوتا اور بقیہ مخلوقات اس لئے ہلاک

ہوئیں کہ وہ سب انسان کے لئے پیدا ہوئیں تھیں اور قاعدہ ہے اَلشَّیْءُ اِذَا خَلَا عَنْ غَایَتِہٖ اِنْتَفٰی (چیز جب غرض و غایت سے خالی ہوتی ہے تو منتفی ہو جاتی ہے) جب انسان ہی نہ رہا جس کے لئے یہ سب پیدا ہوئے تھے تو اب ان کے باقی رہنے میں کیا فائدہ اس لئے یہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

الغرض انسان اس عالم بمنزلہ مہمان کے ہے اور حق تعالیٰ ہماری عادت کے موافق ہمارے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں اور معزز مہمان کے بارے میں ہماری عادت یہ ہے کہ مہمان کے آنے سے پہلے سب کام درست کر دیا جاتا ہے اس کی نشست و برخاست کے لئے کمرہ صاف اور درست کر دیتے بستر وغیرہ انتظام کر دیتے اور تمام ضروریات کو پہلے سے مہیا کر دیتے ہیں جس سے بعض دفعہ ناواقف دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ اس کمرہ کو اس قدر آراستہ و پیراستہ کیوں کیا جا رہا ہے بلکہ ممکن ہے کہ کوئی نادان سامان دیکھ کر یوں سمجھنے لگے کہ شاید مالک کو اس کمرہ ہی سے زیادہ محبت ہے اسی لئے وہ اس کو زیادہ آراستہ رکھنا چاہتا ہے یا اس سامان ہی کو مقصود سمجھ جائے کہ اس کا محفوظ کرنا اور قرینہ سے رکھنا ہی مالک کو منظور ہے مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ نہ اس کمرہ سے مالک کو کوئی خاص محبت ہے نہ اس سامان کی حفاظت مقصود ہے بلکہ یہ سب کچھ کسی کی آمد کے لئے انتظام ہے چنانچہ ہفتہ دو ہفتہ کے بعد جب مہمان پہنچ جاتا اور اس تمام سامان میں تصرف کرنے لگتا ہے اس وقت حقیقت شناس کے خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن نادان یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ مہمان تو ایک یا دو ہفتہ کے بعد آیا اور سامان پہلے مکمل ہو چکا کمرہ بہت پہلے سے آراستہ ہے تو وجود میں یہ سامان اور کمرہ کی آرائش مقدم ہے اور مہمان کی آمد مؤخر ہے اور مقدم مؤخر سے افضل ہوتا ہے اس لئے یہ سامان مہمان کے تابع نہیں۔ غرض یہ بیوقوف تقدیم وجود ہی کو باعث شرف سمجھتا ہے۔ پھر قاعدہ یہ ہے کہ مہمان کے چلے جانے کے بعد بھی سامان کو فوراً منتشر نہیں کیا جاتا اس سے نادان کو سامان کے مقصود ہونے کا اور زیادہ شبہ ہو جاتا ہے کہ تقدیم فی الوجود و تاخیر فی البقاء اس کی علامت ہے کہ یہ سامان مہمان کے واسطے نہیں ورنہ اس کے چلے جانے

کے قبل ہی منتشر کر دیا جاتا مگر عاقل کے نزدیک یہ بھی اسی کی علامت ہے کہ یہ سب سامان مہمان ہی کے واسطے تھا کیونکہ مہمان عزیز کے سامنے سامان کو منتشر نہیں کیا کرتے تاکہ اسکو ایک منٹ کے لیے بھی تکلیف نہ ہو چلنے وقت تک سارا سامان اسی طرح آراستہ رکھا جاتا ہے اس کی رخصت کے بعد توقف سے سامان کو منتشر کیا کرتے ہیں۔ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہماری عادت مہمان کے واسطے یہ ہے تو آپ سمجھئے کہ حق تعالےٰ نے بھی ہماری ساتھ اسی کے موافق برتاؤ کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ حٰمٓ میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ تمام کائنات انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہے اور دیگر آیات و احادیث سے یہ معلوم ہے کہ فنا پہلے انسان کا ہوگا اس کے بعد دوسری کائنات فنا ہوں گی۔ اس سے نادان کو یہ غلطی ہو سکتی ہے کہ اگر انسان مقصود ہوتا اور یہ کائنات اس کے لئے پیدا ہوتی تو اس کی طرف توجہ بھی سب سے پہلے ہوتی حالانکہ اس کو سب کے بعد پیدا کیا گیا ہے مگر یہ محض نادانی ہے کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ غایت ہمیشہ مقدم فی التصور اور مؤخر فی الظہور ہوا کرتی ہے تو انسان کا ظہور مؤخر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ توجہ بھی اس کی طرف بعد میں ہوئی بلکہ اصل مقصود خلق عالم سے انسان کا ظہور تھا لیکن حق تعالےٰ نے انسان کی آسائش کے لئے نیز اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ انسان ایک معزز مہمان ہے اس کی تمام ضروریات کو پہلے سے پیدا کر دیا یعنی بسائط کو۔ لیکن بسیط سے مراد یہ نہیں کہ وہ اشیاء بالکل ترکیب سے خالی ہیں فاقد الاجزاء ہیں بلکہ بسیط سے مراد یہ ہے جس میں ترکیب بصنعۃ العباد نہیں ہے چنانچہ جتنی چیزیں انسان کی ضرورت کی تھیں ان کے اصول ہر وقت عالم میں موجود ہیں انسان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ ان میں ترکیب و تحلیل کر کے جو کچھ چاہے تیار کر لے مثلاً درخت پہلے سے موجود ہیں انسان نے آکر اس کو کاٹا اور چیرا پھر لکڑی تختے کڑیاں وغیرہ بنالیں۔ خدا نے گیہوں پیدا کر دیا جس کو پیس کر آٹا بنایا جاتا اور پانی میں ملا کر گوندھا جاتا اور آگ پر رکھ کر روٹی پکائی جاتی ہے۔ اسی طرح جانوروں سے دودھ نکلتا اور اس سے گھی بنایا جاتا اور اس میں مٹھائی وغیرہ ملا کر حلوا تیار کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح تمام چیزوں میں غور کر لیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کا

کام صرف تحلیل و ترکیب ہے اعدام و ایجاد انسان کا کام نہیں یعنی نہ وہ کسی چیز کو اپنے پاس سے وجود دے سکتا ہے نہ کسی کے وجود کو سلب کرسکتا ہے لیکن بعض لوگ تحلیل و ترکیب ہی کو ایجاد و اعدام سمجھتے ہیں اس لئے اپنے کو موجد کہنے لگے۔ چنانچہ نمرود کو یہی غلطی پیش آئی تھی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس نے وجود صانع پر دلیل کا مطالبہ کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اس کے جواب میں ایک کھلی ہوئی دلیل بیان فرمائی کہ "رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ" کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ تو نمرود کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں یہ کہہ کر اس نے قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلایا جن میں سے ایک واجب القتل تھا اس کو تو رہا کردیا اور ایک قیدی رہائی کے قابل تھا اس کو قتل کردیا۔ حالانکہ یہ احیاء و اماتت نہ تھا کیونکہ احیاء کے معنے حیات بخشنے کے ہیں جس قیدی کو نمرود نے رہا کیا تھا اس کو پہلے سے حیات حاصل تھی نمرود نے اس کو اپنے گھر سے حیات نہ دی تھی اور اماتت ازہاق روح کا نام ہے اور جس قیدی کو اس نے قتل کیا تھا اس میں نمرود کا فعل صرف اس قدر تھا کہ اس نے اس کی گردن جدا کردی اب یہ عادۃ اللہ ہے کہ انگلی یا ہاتھ کے جدا کردینے سے جان نہیں نکلتی اور گردن کے جدا کردینے سے جان نکل جاتی ہے پس گردن کا جدا کرنا نمرود کا فعل تھا اس کے بعد جان خود بخود عادۃ اللہ کے موافق نکل گئی انسان کا اس میں کچھ دخل نہ تھا پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اس نے تفریق اجزاء و عدم تفریق اجزاء کو احیاء و اماتت کو سمجھا جب ابراہیم علیہ السلام نے اس کی کورمغزی دیکھی تو آپ نے دوسری دلیل کی طرف اس کو عجزٌ عن الفھم (فہم کے عاجز ہونے) کے سبب نہ کہ اپنے عجزٌ عن الجواب کے سبب انتقال کیا کیونکہ آپ نے یہ دیکھا کہ اگر میں اس کا جواب دوں اور احیاء و اماتت کی حقیقت بیان کروں اور یہ بتلاؤں کہ تیرا فعل احیاء و اماتت میں داخل نہیں تو یہ کوڑمغز اس فرق کو نہ سمجھ سکے گا۔ اس لئے آپ نے دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ واضح بیان فرمائی وہ یہ کہ میرا خدا وہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا کا منکر ہے تو مغرب سے آفتاب کو نکال۔ اس پر وہ کافر مبہوت ہوکر ان کا منہ تکنے لگا

اور اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔ یہاں سے اہل مناظرہ کے ایک اشکال کا جواب بھی ظاہر ہو گیا۔ اشکال یہ ہے کہ فن مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال کرنا مناظرہ کو جائز نہیں اور یہ ایک مسئلہ عقلیہ ضروریہ ہے کیونکہ اگر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز کر دیا جائے تو اس طرح سلسلۂ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہو گا۔ تم نے ایک دلیل بیان کی خصم نے اس کو توڑ دیا تم نے اس انتقال کر کے دوسری دلیل بیان کر دی اس نے اس کو بھی توڑ دیا تم نے تیسری دلیل بیان کر دی تو یہ تو غیر متناہی سلسلہ ہو جائے گا۔ پھر حق کبھی ظاہر ہی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے علماء مناظرہ نے انتقال الی دلیل آخر کو ناجائز مانا ہے اور کوئی شخص اس اشکال کا یہ جواب نہ سمجھے کہ یہ تو علم مناظرہ کا ایک مسئلہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں ان کے ذمہ ہمارے اصول کا ماننا کب لازم ہے بلکہ ہم کو ہی ان کی بات کا ماننا لازم ہے جواب ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ محض ہمارے اصول مسلمہ کی قسم سے نہیں بلکہ عقلی مسئلہ ہے جس کا تسلیم کرنا فی نفسہ ضروری ہے۔ پس اب اس اشکال کا صحیح جواب سنئے۔ بات یہ ہے کہ مناظرہ میں انتقال الی دلیل آخر اپنی مصلحت سے تو ناجائز ہے لیکن خصم کی مصلحت سے جائز ہے مثلاً ہم نے ایک دلیل غامض بیان کی جس کو خصم نہیں سکتا تو اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ دلیل غامض کو سہل عنوان سے بیان کیا جائے سو اگر اس میں تطویل زیادہ نہ ہو نیز مخاطب تسہیل کے بعد سمجھنے پر قادر ہو تب تو اس کی تسہیل کر دینی چاہیئے اور اگر تسہیل میں تطویل ہو یا مخاطب ایسا بلید ہو کہ تسہیل کے بعد بھی دلیل غامض کو نہ سمجھ سکے تو اب دوسری صورت یہ ہے کہ اس دلیل غامض سے انتقال کر کے دوسری واضح دلیل بیان کر دی جائے جس کو خصم بخوبی سمجھ سکے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت میں مخاطب کی مصلحت سے انتقال کیا تھا۔ کیونکہ آپ نے دیکھا کہ مخاطب بڑا ہی کوڑ مغز ہے اس لئے اس سے کیا امید تھی کہ وہ اماتت و احیاء کی حقیقت کو سمجھے گا اور جھک جھک نہ کرے گا۔ اگر نمرود کو کچھ بھی علم و فہم ہوتا تو

اس کی بات کا جواب بہت سہل تھا۔ ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ ازہاق روح تیری قدرت میں نہیں تیرا کام صرف گردن جدا کر دینا تھا۔ اس کے بعد روح کا نکل جانا عادۃ اللہ کے موافق ہوا تیرا اس میں کچھ دخل نہیں کیونکہ قاعدہ عقلیہ ہے اَلْقُدْرَۃُ تَتَعَلَّقُ بِالضِّدَّیْنِ کہ قدرت ضدین کے ساتھ متعلق ہوا کرتی ہے جو شخص جان نکالنے پر قادر ہوگا وہ اس کے روکنے پر بھی ضرور قادر ہوگا پس تفریق گردن کے بعد اگر زہوق روح تیرے اختیار سے تھا تو اس پر بھی تجھ کو قدرت ہونی چاہیئے کہ ایک شخص کی گردن جدا کر کے اس کی جان کو نہ نکلنے دے اگر تو اس پر قادر ہے کہ گردن کاٹنے کے بعد جان کو روک لے اور نہ نکلنے دے تو ایسا بھی کر دکھا اس کا جواب اس کے پاس ہرگز کچھ نہ تھا۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل کمزور نہ تھی اور نہ اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ نے دوسری دلیل کی طرف انتقال کیا تھا بلکہ محض اس وجہ سے انتقال کیا کہ پہلی دلیل کے سمجھنے کی اُس کوڑ مغز سے امید نہ تھی غرض انسان کا کام محض تحلیل و ترکیب ہے ایجاد و اعدام اس کا کام نہیں اور جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں چیز کا موجد ہے نہ اطلاق محض مجازی ہے کیونکہ جتنی ایجادیں عالم میں ہوئی ہیں ان کے اجزاء بسیطہ پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ ان اجزاء بسیطہ کو خدا تعالیٰ کے سوا پیدا نہیں کیا موجد کا کام صرف اس قدر ہے کہ ان سے ان اجزاء میں ترکیب دیدی ہے پس ظاہر میں اس کو صرف ہیئت ترکیبیہ اجتماعیہ کا موجد کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ہیئۃ اجتماعیہ کا موجد بھی مجازاً ہی ہے کیونکہ یہ قاعدہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ قدرت ضدین سے متعلق ہوا کرتی ہے۔ پس اگر ہیئۃ اجتماعیہ کا وجود اس شخص کے اختیار سے ہوا ہے تو لازم ہے کہ اس کو اس پر بھی قدرت ہو کہ اجزاء بسیطہ کو ملا دینے کے بعد ان پر ہیئۃ اجتماعیہ کو طاری نہ ہونے دیں حالانکہ کسی شخص کو اس پر قدرت نہیں بلکہ جب چند اجزاء کو باہم ترکیب دیا جائے گا ہیئۃ اجتماعیہ لزوماً طاری ہو جائے گی خواہ تم چاہو یا نہ چاہو یہ اس کی صاف دلیل ہے

کہ انسان کا کام بجز ترکیب کے اور کچھ نہیں نہ وہ بسیط کا موجد ہے نہ مرکب کا نہ ہیئۃ اجتماعیہ کا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے لوہے اور مقناطیس کو باہم نزدیک کر دیا جائے کہ نزدیک کر دینا تو تمہارا فعل ہے اس کے بعد مقناطیس خود بخود اس کو جذب کر لے گا خواہ تم کتنا ہم چاہو کہ جذب نہ کرے اب تمہارا کوئی اختیار نہیں اسی طرح ترکیب کے بعد ہیئۃ اجتماعیہ خود بخود فائض ہو جاتی ہے اب تم کو کوئی نہیں پوچھتا کہ تم ہو کون۔ ہاں حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ ترکیب کے بعد بھی ہیئۃ اجتماعیہ کو فائض نہ کرے۔ چنانچہ ایک پتھر ایسا ہے کہ جب اس کو سرکہ میں ڈال دیا جائے تو وہ بھاگتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ مٹی کو سیال چیز میں ڈال دینے کا مقتضا تو یہ ہے کہ وہ ساکن ہو جائے اور دونوں مجتمع رہیں مگر یہاں خلاف مقتضا اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور بدون کسی مخلوق کے صنع کے وہ جدا ہو جاتے ہیں اسی طرح اس ہیئت اجتماعیہ کے آثار کی حالت ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچا لیا حالانکہ اس اجتماع کا اثر اور مقتضا یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام جل کر خاکستر ہو جاتے مگر حق تعالےٰ نے اس اثر کو روک دیا اور اس کے خلاف دوسرا اثر پیدا کر دیا۔ اسی طرح یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں عرصہ تک زندہ رکھا اور ان کو ہضم نہ ہونے دیا حالانکہ اس ترکیب و اجتماع کا اثر و مقتضا یہ تھا کہ وہ مچھلی کے معدہ میں جا کر ہضم ہو جاتے اور زندگی ختم ہو جاتی پس حقیقت میں ایجاد و اعدام حق تعالےٰ ہی کا کام ہے انسان کا کام صرف تحلیل و ترکیب ہے پس حق تعالےٰ نے انسان کی تمام ضروریات کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی پیدا کر دیا تھا کہ جب وہ دنیا میں آیا ساری ضرورت کی چیزیں اس کو تیار ملیں صرف تحلیل و ترکیب کرنا اس کا کام رہ گیا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود
لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

ممکن ہے کہ اس پر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ جب خدا تعالیٰ کو انسان کی ایسی خاطر منظور تھی اور وہ معزز مہمان تھا تو پھر اس کو یہ تکلیف بھی کیوں دی گئی کہ وہ ترکیب و تحلیل کرتا پھرے۔ بس تمام چیزیں کامل و مکمل اس کے واسطے موجود ہوتیں تو بہتر تھا۔ درختوں پر بجائے گیہوں کے روٹی لگا کرتی کپاس کے بجائے بُنے بنائے کپڑے پیدا ہوا کرتے وعلی ہذا القیاس میں کہتا ہوں کہ اس میں حق تعالیٰ نے طبیعت انسانی کی بہت زیادہ رعایت کی ہے کیونکہ اس وقت تو گیہوں الگ پیدا ہوتا ہے اور چنا الگ تم کو اختیار ہے کہ خالص گیہوں کی روٹی پکالو یا خالص چنے کی یا دونوں کو ملا کر۔ نیز یہ بھی اختیار ہے کہ روٹی پکاؤ یا گیہوں اُبال کر کھاؤ یا اس کا ستو بناؤ یا حلوا سوہن تیار کرو غرض سدھا قسم کی چیزیں بنا سکتے ہو اور اگر بجائے گیہوں چنے کے دونوں کی روٹیاں پکی پکائی لگا کرتیں تو بس ایک ہی غذا تم کو نصیب ہوتی یہ رنگ برنگ کی غذائیں تم تیار نہ کر سکتے اسی طرح رُئی کے پیدا ہونے میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی کے موافق اس کا جیسا چاہے لباس تیار کر سکتا ہے خواہ خالص سوت کا کپڑا بنائے یا سوت اور ریشم کو ملا کر یا اون اور سوت کو ملا کر نیز یہ بھی اختیار ہے کہ کرتہ بنائے یا پاجامہ یا قمیص یا اچکن اور اگر سئے سلائے کپڑے درختوں پر لگا کرتے تو بس وہ اسی کام آتے جس کام کے لئے وہ موضوع ہوتے دوسرے لباس مختلف قسم کے تیار نہ ہو سکتے اور اگر ایسا ہو سکتا تو انسان ایک قسم کی غذا اور ایک ہی قسم کے لباس سے اکتا جاتا چنانچہ اس کا تجربہ ایک زمانہ میں ہو چکا ہے۔ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو من و سلویٰ عطا فرمایا تھا کہ بے محنت و مشقت دونوں وقت ان کو بیٹھے بٹھلائے غذا مل جاتی تھی اور غذا بھی بہت نفیس تھی مگر ان سے ایک غذا پر نہ رہا گیا آخر کو اکتا کر کہنے لگے يَا مُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ مِن بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا الآیۃ اے موسیٰ ہم سے ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہو سکے گا۔ پس اپنے پروردگار سے

دعا کیجئے کہ ہمارے لئے دو چیزیں پیدا کرے جو زمین سے اگا کرتی ہیں یعنی ترکاریاں ۔ اور ککڑی اور گیہوں اور مسورا اور پیاز قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ حضرت موسٰی علیہ السلام نے فرمایا کیا تم عمدہ چیز کے بدلے ادنٰی کو لینا چاہتے ہو جاؤ کسی شہر میں اترو وہاں جو کچھ تم مانگتے ہو مل جائے گا تو صاحبو! اگر حق تعالٰی پکی پکائی روٹی آسمان سے اتارا کرتے تو آپ بھی چند روز میں بنی اسرائیل کی طرح اس سے گھبرا جاتے اس لئے انسان کی راحت اسی میں ہے کہ ترکیب و تحلیل کا کام اس پر چھوڑ دیا گیا کہ جس طرح چاہے اپنی طبیعت کے موافق جوڑ توڑ کرتا رہے جیسا کہ قاعدہ ہے کہ بعض لوگوں کو دوسروں کے ہاتھ کا بنایا ہوا پان مزے نہیں لگتا تو ان کی راحت اور ان کا اعزاز یہی ہے کہ میزبان ان کے آگے پان دان لا کر رکھ دے کہ لو بھائی تم اپنے ہاتھ سے جیسا چاہو بنالو۔ پس جس طرح پان دان سامنے رکھ دینے کو ہر شخص غایت اعزاز سمجھتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس شخص نے میزبان کی تحقیر کی کہ اس کو پان لگانے کی تکلیف دی اسی طرح تحلیل و ترکیب کو انسان پر چھوڑ دینے سے تکلیف اور بیقدری کا شبہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ حقیقت میں یہ بھی غایت اعزاز ہے کہ حق تعالٰی نے انسان کو ایک ہی غذا ایک سے لباس پر مجبور نہیں کیا بلکہ مختلف اقسام و انواع کے استعمال کی اس کو گنجائش دی خاص خاص شرائط و حدود کے ساتھ جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے کیونکہ انسان ایک حالت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے اور یہی حکمت ہے عبادات کے تنوع و تعدد میں بھی یعنی حق تعالٰی نے ہمارے لئے ایک ہی قسم کی عبادت مشروع نہیں فرمائی بلکہ رنگ برنگ کی عبادات ہیں ۔ ایک وقت نماز ہے دوسرے وقت تلاوت قرآن ہے ایک وقت تدریس و تعلیم ہے ۔ کبھی وعظ و نصیحت ہے ۔ کبھی استغفار و درود شریف ہے اور پھر ہر حالت کے مناسب الگ الگ دعا بتلائی گئی ہے ۔ وعلی ہذا القیاس تاکہ ایک عبادت سے انسان اکتا نہ جائے اور جدید عبادت سے اس کا شوق

بڑھتا رہے دیکھئے پہلے رمضان سردی میں تھا تو لوگ اس سے اُکتاتے تھے کہ میاں یہ بھی کوئی روزہ ہے اُدھارے اُدھارے بیٹھے ہیں نہ بھوک ہے نہ پیاس ہے ذرا سا دن ہے خبر ہی نہیں ہوتی کہ روزہ بھی تھا یا نہیں روزہ تو گرمی کا لطف کا ہے کہ ذرا خبر بھی ہو کہ ہاں روزہ ہے پھر افطار میں شربت کا اور ٹھنڈے پانی کا اور بعض جگہ برف کا اہتمام ہوتا ہے۔ ٹھنڈے کنووں کی تلاش ہوتی ہے کہ جس کنویں کا پانی سب سے زیادہ ٹھنڈا ہو اس کا پانی لایا جاتا ہے سردی میں تو یہ باتیں ہوتی تھیں۔ اب جب رمضان گرمی میں آیا تو اس سے بھی گھبرا گئے۔ چنانچہ اب رمضان آنے والا ہے معلوم ہو جائے گا کہ کتنے آدمی روزہ رکھتے ہیں۔ اب یوں کہتے ہیں کہ صاحب رات تو ذرا سی ہوتی ہے۔ تراویح پڑھنے کے بعد سونے کا موقع ہی نہیں ملتا ادھر آنکھ لگی ادھر سحری کا وقت آیا اتنی دیر میں افطار کے وقت کا کھانا پانی بھی ہضم نہیں ہوتا اب سحری میں کیا کھالیں بس سحری کا لطف تو گرمیوں کی رات میں کچھ بھی نہیں۔ پھر دن ایسا پہاڑ کہ گھنٹے گنتے گنتے تھک جاؤ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا پیاس کے مارے کلیجہ نکلا جاتا ہے پھر افطار کے وقت پانی اس بری طرح پیا جاتا ہے کہ تراویح پڑھنا محال ہو جاتا ہے۔ بس گرمیوں میں نہ تراویح کا لطف ہے نہ روزہ کا۔ لیجئے اب گرمیوں کے رمضان کی برائی ہونے لگی۔ غرض انسان کو کسی ایک حالت پر قرار و چین نہیں بس اس کو تو جنت ہی میں جاکر آرام ملے گا۔ مگر وہاں بھی اس کا چلبلا پن نہ جائے گا۔ ایک خدا کے بندے کو بیٹھے بٹھلائے کھیتی کا شوق ابھرے گا بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ جب تجھے بیٹھے بٹھلائے بے مانگے ہر چیز مل رہی ہے پھر تجھے کھیتی کی ضرورت کیا ہے کچھ نہیں صرف وہی چلبلا پن کہ اس سے ایک حالت میں رہا نہیں جاتا جنت میں جو بے محنت و مشقت کھانے کو ملے گا تو آپ کو اپنی وہی حالت یاد آئے گی کہ ایک وقت میں ہم کھیتی کر کے کھایا کرتے تھے یوں ناج بوتے ہل چلاتے کھیتی کاٹتے تھے اب وہ بات ہی نہیں اس لئے اس کو کھیتی کا

شوق ہوگا چنانچہ یہ شوق بھی اس کا پورا کیا جائے گا ادھر دانہ پڑا ادھر پیدا ہوا اور پکا اور تھوڑی دیر میں غلّہ کا ڈھیر سامنے آجائے گا پھر ارشاد ہوگا دُوْنَكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ فَلَنْ يُشْبِعَكَ شَيْءٌ کہ اے ابن آدم لے دیہ کھیتی بھی تیار ہوگئی، مگر تجھے کوئی چیز سیر نہیں کرسکتی۔ قیاس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کوئی گاؤں کا رہنے والا کسان ہوگا جسے جنت میں بھی کھیتی ہی یاد آئے گی یا ممکن ہے کوئی ایسا شخص ہو جسے دنیا میں بھی سلطنت وراحت ہی ملی ہو اور جنت میں تو جو کچھ ہے سلطنت ہی سلطنت ہے تو اس شخص کو دنیا میں کھیتی کا موقع نہ مل سکا اس نے یہ چاہا کہ لاؤ جنت میں اس آرزو کو پورا کرلوں۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ بعض دفعہ سلاطین غایت تکلیف اور ساز وسامان و فرش وتخت سے گھبرا جاتے ہیں غربا کے گھر جاکر بوریے اور ٹوٹے ہوئے پلنگ پر بیٹھنے اور موٹی جھوٹی روٹی ان سے مانگ کر کھاتے تھے یہ کہتے تھے کہ عیش وآرام اور تکلف سے طبیعت گھبرا گئی اس لئے سادگی کا مزہ چکھنے کے لئے کبھی کبھی جی چاہا کرتا ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ انسان کی طبیعت ایسی چلبلی ہے کہ جس آسائش وآرام کا یہ ساری عمر طالب رہتا ہے جب وہ میسر ہوجاتا ہے تو اس سے بھی اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اسی واسطے خدا تعالیٰ نے انسان کی مرضی و نامرضی پر کچھ نہیں رکھا بلکہ سب کام اپنے قبضے میں رکھا ہے۔ کیونکہ انسان کی حالت بچوں کی سی ہے۔ اب بچے اگر ایسی ویسی فرمائش کرنے لگیں تو کیا باپ ان کی ہر فرمائش کو پورا کردیا کرتا ہے ہرگز نہیں بلکہ باپ اپنی مرضی کے موافق کام کرتا ہے۔ بچوں کی مرضی پر اگر ہر کام چھوڑ دیا جائے تو اس میں ان کی ہلاکت ہے اور بعض دفعہ اسی خلاف حکمت ہونے کے سبب بچوں کی ضدیں اور فرمائشیں پورا کرنا بھی بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ بعض دفعہ یہ ایسی ضدیں کرتے ہیں کہ والدین کو تنگ کردیتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے یہاں ایک بچہ نے رونا شروع کیا پوچھا کیوں روتا ہے

کہنے لگا مٹھائی لوں گا تیر مٹھائی دیدی پھر رونا شروع کیا بھائی اب کیوں روتا ہے۔ بولا دودھ لوں گا دودھ بھی آگیا۔ اسی طرح بہت سی سوچ سوچ کر فرمائشیں کیں اور پوری کر دی گئیں اس کو اس وقت مقصود والدین کو عاجز کرنا تھا۔ پھر اس نے رونا شروع کیا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہنے لگا کہ ہائے یہ چاند کیوں نکل رہا ہے اس کو چھپا دو۔ اب اس ضد کو کوئی کیونکر پورا کر سکتا ہے آخر ماں باپ عاجز ہو گئے۔

اسی واسطے بیربل اور اکبر میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی تھی اکبر کہنے لگا کہ یہ جو مشہور ہے کہ تین ہٹوں کا پورا کرنا مشکل ہے۔ ایک راج ہٹ، ایک تریا ہٹ، ایک **بالک** ہٹ۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا راج ہٹ اور تریا ہٹ کا دشوار ہونا تو مسلم ہو سکتا ہے کیونکہ بادشاہ اور عورت عاقل ہوتے ہیں ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی فرمائش کر بیٹھیں جس کا پورا کرنا دشوار ہو لیکن بالک ہٹ کا دشوار ہونا مسلم نہیں کیونکہ بچوں کی ایسی کیا فرمائش ہوگی جو پوری نہ ہو سکے۔ بیربل نے کہا کہ سب سے زیادہ مشکل تو بالک ہٹ ہی ہے اس کو بڑا ہی عاقل پورا کر سکتا ہے ہر شخص پورا نہیں کرتا۔ اکبر نے کہا کہ اس کے لئے عقل کی کیا ضرورت ہے بچوں کی فرمائش کو ہر شخص پوری کر سکتا ہے۔ بیربل نے کہا اچھا ہم بچہ بنتے ہیں آپ میری ضد کو پورا کریں۔ اس نے کہا اچھا۔ اب بیربل بچہ بنا اور بچوں کی طرح سسکنے لگا (اکبر کا دربار ایسا ہی ہوتا تھا وہاں یہی خرافات اکثر رہا کرتی تھیں) غرض اکبر نے پوچھا کیوں روتے ہو۔ بیربل نے کہا ہم تو ہاتھی لینگے۔ اکبر نے فوراً ہاتھی خانہ سے ایک ہاتھی منگوا دیا اور کہا سبحان اللہ آپنے بڑی مشکل فرمائش کی بیربل پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہا ہم تو کلھیا لیں گے۔ اکبر نے فوراً بازار سے ایک کلھیا بھی منگا دی اور کہا بس یہی بڑی مشکل ضد تھی بیربل پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو اس کلھیا میں کھڑا اب تو اکبر کی عقل حیران ہو گئی کہ واقعی اس ضد کا پورا کرنا مشکل ہے آخر عاجز ہو گیا اور مان گیا کہ بچوں کی فرمائش کا پورا کرنا مشکل ہے۔ پھر اس نے بیربل سے کہا کہ یہ جو

تم نے کہا تھا کہ عاقل بچوں کی ضد بھی پوری کر سکتا ہے۔ اب میری سمجھ میں جو بات نہیں آتی اس فرمائش کو عاقل کیونکر پورا کر دیگا۔ بیربل نے کہا کہ اگر عقل ہو تو سب آسان ہے۔ اکبر نے کہا اچھا اب ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد کو پورا کرو۔ اس نے کہا بہتر ہے چنانچہ اب اکبر نے سکنا شروع کیا۔ بیربل نے کہا کیوں روتے ہو آپ نے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے (میاں کو بس یہی سبق یاد تھا گھر کی عقل تو تھی ہی نہیں) بیربل نے ایک آدمی کو بھیجا کہ بازار سے جاکر مٹھائی یا مٹی کا ایک ہاتھی ذرا سا لے آؤ چنانچہ لایا گیا اور اکبر کو دیدیا گیا اب آپ نے پھر رونا شروع کیا پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا ہم تو کلھیا لیں گے اس نے کلھیا بھی منگا دی۔ پھر آپ رونے لگے پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو کلھیا میں رکھ دو اس نے اٹھا کر رکھدیا بس اکبر خاموش ہو گئے۔ بیربل نے کہا کہ یہ آپ کی عقلمندی تھی کہ بچہ کے ہاتھی مانگنے پر آپ نے اتنا بڑا ہاتھی منگا دیا۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ بچہ کی فرمائش کو اس کی حیثیت کا لحاظ کر کے پورا کرتے۔ الغرض بچے بڑی الٹی الٹی ضدیں کیا کرتے ہیں بعض دفعہ بچہ یہاں تک چاہتا ہے کہ آگ پکڑ لوں۔ سانپ کو ہاتھ میں لے لوں مگر ماں باپ اس کی اس خواہش کو پورا نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح یہ بھی خدا کی رحمت عظیمہ ہے کہ حق تعالےٰ کو ہر فرمائش کے پورا کرنے پر قادر ہے۔ پھر بھی انسان کی خواہش کا اس لئے اتباع نہیں کرتا کہ اس کو حکمت ہی کی خبر نہیں۔ بلکہ انسان کی خواہش کو حق کے تابع رکھا گیا ہے ورنہ بڑا فساد عظیم برپا ہوتا۔ چنانچہ حق تعالےٰ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ۔ الآیۃ۔ (اگر حق تعالےٰ ان کی خواہشات کا اتباع کرتے تو زمین و آسمان سب فاسد ہو جاتے) پس انسان کی مصلحت اسی میں ہے کہ اس کو اسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا گیا ورنہ یہ اپنے ہاتھوں ہلاک ہو جاتا۔

(رہتک ۔۔۔)

ایک شخص نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ حق تعالیٰ سے دعا کر دیجئے کہ مجھ کو اپنے متعلق آنے والی بات کی خبر ہو جایا کرے۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص سے فرما دیجئے کہ تیری مصلحت اسی میں ہے کہ تجھ کو آنے والی بات کی اطلاع نہ ہوا کرے تیری مصلحتوں کو تجھ سے زیادہ ہم جانتے ہیں آپ نے اس شخص کو اطلاع کر دی اس نے پھر اصرار کیا کہ میرا جی بہت چاہتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی جو قبول ہو گئی۔ چنانچہ اس کو آئندہ واقعات کی اطلاع پہلے ہی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کو معلوم ہوا کہ میرا گھوڑا مرنے والا ہے اس نے جلدی سے بازار میں جا کر اسے فروخت کر دیا اور نفع سے فروخت کیا اور اپنے جی میں بہت خوش ہوا کہ دیکھو اس علم سے میرا کتنا بڑا نفع ہوا کہ جانور میرے گھر میں نہیں مرا دوسرے کے یہاں جا کر مرے گا اور مجھے اس کی قیمت مع شئی زائد وصول ہو گئی۔ پھر اس کو یہ معلوم ہوا کہ اب میرا غلام مرنے والا ہے اس نے غلام کو بھی جا کر فروخت کر دیا اور اپنے دل میں بہت ہی خوش ہوا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ اب میں خود مرنے والا ہوں اب تو بڑا پریشان ہوا کہ اپنے کو کہاں جا کر چھپا دوں آخر موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوڑا ہوا آیا کہ شاید وہ اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت بتلا دیں۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص سے فرما دیجئے کہ اس نے اپنی موت اپنے ہاتھوں خریدی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کی تقدیر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اس عرصہ میں اس کے گھر پر ایک مصیبت نازل ہوگی ہم نے اول اس کے جانور پر ڈالنا چاہا۔ اس نے ہوشیاری کر کے اس کو اپنے سے الگ کر دیا۔ پھر ہم نے اس کے غلام پر اس کو ٹالنا چاہا اس نے اس کو بھی بیچ کر نفع حاصل کر لیا اب خود ہی رہ گیا ہے لہذا اب وہ مصیبت اس کے اوپر ضرور آوے گی ٹل نہیں سکتی۔ اس سے کہہ دیجئے کہ بس اب حسن خاتمہ کی دعا کرے موت ضرور آوے گی۔

تو آپ نے دیکھا کہ انسان کی مرضی پر کام چھوڑنے کا کیا نتیجہ ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں ہلاکت مول لے لی۔ بس حق تعالیٰ کی یہی بڑی رحمت ہے کہ سب کام اپنے قبضہ میں رکھا اور ہم کو کچھ بھی خبر نہیں دی کہ کل کو کیا ہونے والا ہے۔ لوگ علم غیب کی تمنا کیا کرتے کشف کو کمال سمجھتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کہ یہ ایسی چیز ہے کہ بعض دفعہ وبال جان ہو جاتی ہے۔ شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ قرآن میں تو علم غیب کو استکثار خیر و دفع مضرت کا سبب بتلایا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ کشف بعض دفعہ وبال جان ہو جاتا ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے۔

وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ

(ترجمہ) اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو خیر بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی مضرت نہ پہونچتی۔ اس کے چند جوابات ہیں اول تو یہ کہ آیت میں قضیہ کلیہ نہیں ہے بلکہ جزئیہ ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ خیر ہی خیر حاصل ہوتی اور شر مس بھی نہ کرتا (دوسرے یہ کہ آیت میں غیب سے مراد جمیع الغیب ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر مجھ کو غیب کا علم محیط حاصل ہوتا الخ اور ظاہر ہے کہ غیب کا علم محیط حاصل ہونا استکثار خیر و دفع مضرت کا ضرور سبب ہو سکتا ہے اور اس قصہ میں جو اس شخص کو مصیبت پیش آئی اس کا سبب یہ تھا کہ اس کو علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ اخیر تک کی سب حالت معلوم ہو جاتی تو وہ جان لیتا کہ اگر میں گھوڑے اور غلام کو فروخت کروں گا تو پھر یہ بلا میرے اوپر آوے گی)

پس کشف کے بعض دفعہ وبال جان ہونے پر کوئی اشکال نہیں کیونکہ کشف میں علم محیط نہیں ہوتا ادھورا علم ہوتا ہے اور علم محیط بشر کے لئے حاصل ہونا محال بھی ہے اور اس جگہ اس سے بحث ہی نہیں بلکہ جس قدر غیب کا علم انسان کو ہو سکتا ہے اس کے متعلق میں نے یہ کہا تھا کہ بعض دفعہ وہ وبال جان ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں۔ خوب سمجھ لو یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر انسان کے لئے پکی پکائی روٹی اور سلے سلائے کپڑے

پیدا ہوا کرتے تو وہ گھبرا جاتا کیونکہ ممکن ہے کہ ایک وقت میں اچکن پیدا ہونا اور آپ کا جی قمیص کو چاہتا ہو۔ دوسرے وقت میں پاجامہ پیدا ہوا اور آپ کی طبیعت لنگی کو چاہتی ہے۔ اور انسان اس سے بھی گھبرا جاتا ہے کہ کوئی چیز اس کے سر پر سوار ہو جائے۔ اب خدا کا شکر ہے کہ اس کے سر پر سوار کوئی چیز نہیں وہ جیسا چاہے خود بنا سکتا ہے اور اگر کسی چیز کی ضرورت نہ ہو تو یہ بھی اختیار ہے کہ کچھ نہ بنائے یہ حکمت ہے اس میں کہ حق تعالیٰ نے تحلیل و ترکیب کا کام انسان پر چھوڑ دیا ہے سر پر سوار ہونے سے مجھے اپنا ایک قصہ یاد آیا ایک صاحب نے جو کہ میرے دوست کے بیٹے ہیں میری دعوت کی تھی وہ بندۂ خدا کھانا کھاتے ہوئے میرے سر پر سوار ہو گئے بار بار مجھے ٹوکیں کہ مولانا آپ تو بہت کم کھاتے ہیں اچھی طرح کھایئے تکلف نہ فرمایئے اب وہ تو مجھے زیادہ کھانے کو فرما رہے تھے مگر میری یہ حالت کہ جب مجھے اس کا تصور آتا کہ میزبان میرے لقموں کو دیکھ رہا ہے مجھ سے غیرت کی وجہ سے لقمہ نہ ٹوٹتا آخر کار میں بھوکا ہی رہا اور اپنے گھر آکر میں نے دوبارہ کھانا کھایا۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے میری دعوت کی وہ ہر چیز مجھے اپنے آپ کھلاتے تھے مگر میری طبیعت اندر سے گھٹتی جاتی تھی۔

یہ آداب معاشرت کے بالکل خلاف ہے۔ میزبان کو چاہیئے کہ مہمانوں کو کھاتے ہوئے ہرگز نہ گھورے۔ بس سرسری نگاہ سے اتنا معلوم کرتا رہے کہ کہاں کس چیز کی ضرورت ہے۔ باقی نہ اس سے کہے کہ آپ کم کھا رہے ہیں نہ یہ کہے کہ آپ تکلف کر رہے ہیں کیونکہ جب مہمان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ میزبان میرے لقمے دیکھ رہا ہے تو اس سے بالکل نہیں کھایا جاتا۔

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دسترخوان پر ایک بدوی بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا اور دیہاتیوں کی طرح بڑے بڑے لقمے بنا رہا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے خیرخواہی کے طور پر اتنا فرما دیا کہ اے شخص اپنی جان پر رحم کر اور لقمہ چھوٹا لے تاکہ گلے میں نہ اٹک جائے۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ بدوی فوراً دسترخوان سے

اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت معاویہؓ سے خطاب کر کے کہا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمھارا کھانا کھاوے۔ تم مہمانوں کے لقموں کو تکتے ہو کہ کون چھوٹا لیتا ہے کون بڑا۔ تم کو اس سے کیا غرض تم کو دستر خوان پر مہمانوں کو بٹھلا کر پھر اپنے کھانے کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھنا چاہیئے۔ یہ کہہ کر چلتا ہوا۔ ہر چند حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا کہ کھانا اچھی طرح کھا کر جانا مگر اس نے ایک نہ مانی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا میں بیان یہ کر رہا تھا کہ انسان کی مثال معزز مہمان جیسی ہے کہ جس طرح اس کی آمد سے پہلے تمام ضروریات کا انتظام کر دیا جاتا ہے اسی طرح حق تعالےٰ نے انسان کی پیدائش سے پہلے تمام عالم کو اسی کی خاطر اور اسی کے واسطے پیدا کیا پھر جب انسان ہلاک ہو جائے گا تو سارا عالم بھی ہلاک ہو جائے گا۔ کیونکہ جس کے لئے یہ ساز و سامان تھا جب وہی نہ رہا تو اس کے رہنے میں کیا فائدہ۔ حق تعالےٰ نے آسمان و زمین کو تو پہلے پیدا کیا ہی جنت کو بھی پہلے ہی پیدا کر دیا حالانکہ اس کی ضرورت اس عالم کے بعد انسان کو ہو گی کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا اور اس میں راز یہ ہے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہو گا کہ میرا اصلی گھر جہاں ہر قسم کی راحت و آسائش ہے اس وقت موجود ہے تو اس کو اُدھر زیادہ رغبت ہو گی اور دنیا میں اس کا دل نہ لگے گا اور اگر اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ جنت تو ابھی بنی بھی نہیں دنیا کے فنا ہونے کے بعد بنے گی تو اکثر طبائع کو عالم آخرت کی طرف رغبت نہ ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو کم ہوتی کیونکہ معدوم کی طرف رغبت ہونا انسان کے طبائع میں نادر ہے گو وہ معدوم کیسا ہی یقینی الوجود ہو۔ اور اب جس وقت حق تعالیٰ کے اس ارشاد پر نظر پڑتی ہے أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ کہ جنت خدا سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے اور تقویٰ کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی بعد میں پیدا ہو گی اور وہ اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ابھی سے اس کا پیدا ہونا عبث ہے اور خدا تعالےٰ فعل عبث سے پاک ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے جس کو اولاً نص قرآنی أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (تیار کی گئی ہے خدا سے

ڈرنے والوں کے لئے۔) رد کررہی ہے کیونکہ صیغۂ ماضی کو مستقبل کے معنے میں لینا مجاز ہے حقیقت یہی ہے کہ اپنے معنی پر محمول ہو اور بلا وجہ معنی مجازی لینا جائز نہیں اور جو وجہ وہ بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں کیونکہ میں نے ابھی اس کی حکمت بتلادی ہے جس کو دوبارہ اعادہ کرتا ہوں۔ وہ حکمت یہ ہے کہ جنت کے پیدا کرنے کے بعد تو حق تعالیٰ ہم کو ان الفاظ سے خوشخبری سنا رہے ہیں کہ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ (جنت متقیوں کے واسطے تیار کی گئی ہے) اور اگر پیدا نہ ہوتی تو بجائے اس کے یہ فرماتے تُعَدُّ لِلْمُتَّقِیْنَ (یعنی جنت متقیوں کے واسطے تیار کی جائے گی) اور ان دونوں کی تاثیر فی الطبیعۃ میں جو فرق ہے اس کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اس وقت ایک شئے موجود کی طرف رغبت ہے اور اس وقت شی معدوم کی طرف رغبت ہوتی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پس جس فعل میں اتنی بڑی حکمت ہو اس کو عبث کون کہہ سکتا ہے اور یہ حکمت تو ہمارے ذہن میں آگئی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔ الغرض سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (کام میں لگادیا ہے تمہارے نفع کے لئے تمام چیزوں کو جو آسمان و زمین میں ہے) میں تسخیر سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام عالم کو انسان کے کام میں لگا رکھا ہے۔ اور وہ معنے مراد نہیں جو تسخیر کے لفظ سے محاورہ اردو میں متبادر ہوتے ہیں اور اس کے ضمن میں حق تعالیٰ نے توحید کی دلیل بیان فرمائی ہے۔ اصل مقصود آیت کا توحید ہی ہے گو تبعاً دوسرے مضامین کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے۔

حاصل استدلال کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں تو معبود بھی وہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ معبود کے لئے کامل الصفات و جامع الکمالات ہونا ضروری ہے اور خلق بہت بڑی صفت کمال ہے پس جو خالق نہیں وہ معبود بھی نہیں ہو سکتا اور جو خالق ہوگا وہ یقیناً تمام صفات کمال کا جامع ہوگا کیونکہ خلق کے معنے اعطاء وجود کے ہیں اور ظاہر ہے کہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں۔ پس جو ذات معطی وجود ہے یقیناً اس کے قبضہ میں

خزائن وجود ہیں اور جس کے قبضہ میں وجود کے خزائن ہوں وہ تمام صفات کمال کا جامع ہوگا۔ اسی لئے حق تعالےٰ نے اکثر مواقع میں توحید کی دلیل میں صفت خالقیت کو بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ صفت خالقیت تمام کمالات کو مستلزم ہے۔ حق تعالیٰ نے توحید کے دلائل میں زیادہ دقیق دلائل نہیں بیان فرمائے بلکہ نہایت سہل دلائل بیان فرمائے ہیں جن کو تھوڑی سی عقل والا بھی بہت جلدی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر جگہ صرف خالقیت سے توحید کو ثابت فرمایا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تدقیقات سے مخاطب ساکت تو ہوجاتا ہے مگر اس کی تسلّی نہیں ہوتی اور سہل عنوانات سے تسلی خوب ہوجاتی ہے جیسا کہ اس آیت میں کتنا سہل عنوان ہے کہ کیا تم نے اس بات کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالےٰ نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اُن تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہے۔ اس عنوان سے ہر شخص کا ذہن توحید کی طرف جلد منتقل ہوجاتا ہے۔ اگر منطقی استدلالی طرز ہوتا تو اس سے اس درجہ تسلی نہ ہوسکتی۔ اس جگہ شاید کوئی یہ سوال کرے کہ حق تعالےٰ کا خالق ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے وجود صانع تو معلوم ہوجائے اور اس دلیل سے وجود صانع ثابت نہیں ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ عرب دہری نہ تھے وہ محض مشرک تھے وجود صانع کا وہ انکار نہ کرتے تھے اس لئے وجود صانع کو ثابت کرنے کا قرآن نے اہتمام نہیں کیا۔ ہاں علمائے اسلام نے جب دہریوں کا بھی ایک فرقہ اسلام کے مقابل دیکھا تو انہوں نے وجود صانع پر بھی دلائل قائم کئے۔ اہل عرب کا دہری نہ ہونا قرآن کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۔

(اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں کو اور زمین۔ تو وہ یہ ضرور کہیں گے اللہ نے)

اور اس قسم کا مضمون قرآن میں جابجا مذکور ہے۔ پس جب اہلِ عرب صانع کے قائل تھے

اور شرک میں مبتلا تھے تو ان کے واسطے دلائل توحید ہی کی ضرورت تھی چنانچہ سارا قرآن دلائل توحید سے بھرا ہوا ہے لیکن وہ دلائل منطقی طرز پر صغریٰ و کبریٰ و حد اوسط وغیرہ سے مرکب نہیں ہیں۔ یہ میں نے اس واسطے کہدیا تاکہ کوئی معقولی یہ نہ کہے کہ ہم نے تو سارا قرآن دیکھ لیا ہم کو تو ایک جگہ بھی دلیل عقلی نہیں ملی سو بات یہ ہے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قرآن کا طرز دلائل کے بارہ میں استدلال منطقی کے طرز پر نہیں ہے بلکہ اکثر دلائل قرآن کے اقناعی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی اقناعی ہی ہیں بلکہ محض طرز کے اعتبار سے اقناعی ہیں ورنہ حقیقت میں وہ سب دلائل عقلیہ ہیں جو طرز عقلی پر بخوبی منطبق ہو سکتے ہیں بالخصوص دو موقعوں میں تو یہ انطباق بہت ہی ظاہر ہے ایک سورۂ بقرہ کی اس آیت میں اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَ الۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝ (آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ہیر پھیر اور کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لئے ہوئے سمندروں میں چلنا آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دینا اور اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا ہواؤں کے رُخ بدلنا تابع فرمان بادلوں کو آسمان و زمین کے درمیان اِدھر اُدھر پھرنا عقلمندوں کے لئے قدرتِ خدا کی نشانیاں ہیں)

اس آیت میں چونکہ لفظ یَعۡقِلُوۡنَ موجود ہے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دلیل عقل کے مطابق ہے اس لئے مفسرین کو موقع مل گیا کہ انھوں نے طرز عقلی پر اس کا انطباق خوب بیان کیا۔ دوسرا موقع اس آیت میں ہے لَوۡ كَانَ فِیۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ (اگر ان زمین و آسمان میں چند معبود ہوتے تو البتہ فاسد ہو جاتے)

(حاصل[م] اس دلیل عقلی کا یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں۔ بعض تو بداھۃً بوجہ مشاہدہ کے کیونکہ بعض کی نسبت ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ وہ پہلے معدوم تھیں پھر موجود ہوئیں اور بعض کے احوال میں تغیر و تبدل کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور بعض چیزیں اجزاء سے مرکب ہیں یہ بھی امکان کی علامت ہے اور بعض اشیاء بعض کی محتاج ہیں اور احتیاج بھی ممکن کا خاصہ ہے۔ غرض یہ تمام چیزیں ممکن ہیں اور ممکن کا وجود و عدم چونکہ برابر ہوتا ہے اس لئے وہ کسی مرجح کا محتاج ہے۔ وہ مرجح اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا اور اس کے وجود کے لئے بھی کسی مرجح کی ضرورت ہوگی وعلی ہذا القیاس اور تسلسل محال ہے اس لئے اس کو قطع کرنے کے لئے کسی جگہ یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح واجب الوجود ہے (جس کا وجود ضروری اور معدوم ہونا محال ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ تو دلیل ہے وجود صانع کی اب رہا اس کا واحد ہونا سو اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ واجب الوجود متعدد مثلاً دو مانے جاویں تو آیا ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر کامل ہونا ضروری پہلی شق محال ہے کیونکہ عاجز ہو سکنے والا واجب الوجود نہیں ہو سکتا اور دوسری شق پر یہ سوال ہے کہ اگر ان میں سے ایک نے کسی کام کا ارادہ کیا۔ مثلاً زید کے موجود کرنے کا تو دوسرا اس کے خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کر سکتا تو اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا جو کہ وجوب وجود کے منافی ہے اور اگر خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے تو اس کے ارادہ پر مراد کا مرتب ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری نہیں تو قادر مطلق کے ارادہ سے مراد کا تخلف لازم آئے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آویگا۔

عہ وعظ میں یہ دلیل اس تفصیل سے بیان نہ ہوئی تھی محض اشارہ کیا گیا تھا احقر جامع نے تفسیر بیان القرآن مصنفہ حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم سے اس کو مفصل نقل کر دیا ہے۔ مع تغییر یسیر فی العبارۃ روما للتسہیل ۱۲ جامع

کیونکہ ایک واجب کے ارادہ پر اس کی مراد یعنی زید کا وجود مرتب ہوگا اور دوسرے کے ارادہ پر اس کی مراد جو کہ پہلے کی ضد ہے یعنے زید کا عدم مرتب ہوگا اس صورت میں اجتماع ضدین لازم آوے گا جو کہ محال ہے پس واجب الوجود کا متعدد ہونا ہی محال ہے پس ثابت ہوگیا کہ واجب الوجود ہمیشہ واحد ہی ہوگا اور یہی مقصود ہے خوب سمجھ لو، اس جگہ ایک بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اس طرز استدلال سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ توحید کی دلیل کے لئے مطلقاً کسی مصنوع کا بیان کر دینا کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے ان مقامات پر خصوصیت کے ساتھ ان چیزوں کا بیان فرمایا ہے جو علاوہ مخلوق و مصنوع ہونے کے ہمارے حق میں نعمت بھی ہیں جس سے حاصل یہ ہوا کہ عبادت جس کی فرد اعظم توحید ہے اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ خدا کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ منعم بھی حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں گویا اس طرح دلیل عقلی کے ساتھ ایک داعی طبعی بھی بیان فرما دیا کیونکہ منعم کے احسان کا ماننا اور اس کا شکر ادا کرنا انسان کا طبعی امر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عقلی دلیل سے متاثر نہیں ہوتے تو خدا تعالیٰ کے انعامات پر نظر کر کے طبعی مؤثر سے تو متاثر ہونا چاہیے اس نکتہ کی وجہ سے تمام قرآن میں جہاں توحید کی دلیل کا ذکر ہے وہاں نعمتوں کا ذکر ضرور ہے چنانچہ اس آیت میں لَكُمْ میں لام منفعت سے انعام کی طرف اشارہ ہے اور آگے تو بالکل تصریح ہی کر دی وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ اور کامل کر دی تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی ہیں اس میں نعمت کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں نعمت ظاہرہ وہ ہے جو حواس ظاہرہ یا باطنہ سے محسوس ہو اور نعمت باطنہ وہ ہے جو عقل سے معلوم ہو یا یہ جو حواس ظاہرہ سے محسوس ہو وہ ظاہرہ ہے اور جو حواس باطنہ و عقل سے معلوم ہو وہ باطنہ ہے بہر حال اس میں نعمتوں کا اجمالاً پوری طرح احاطہ کر دیا گیا اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انہوں نے نعمت کی تقسیم ظاہر فرما دیں ورنہ نِعَمَ بَاطِنَه (باطنی نعمتوں

کی طرف بہت کم لوگوں کی نظر جاتی کیونکہ اس تقسیم کے بعد بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو نعم باطنہ کو نعمت ہی نہیں سمجھتے اور جو لوگ نعمت سمجھتے بھی ہیں وہ نعم ظاہرہ کی برابر ان کی قدر نہیں کرتے چنانچہ نعمت باطنہ یہ بھی ہے کہ حق تعالے نے آپ کو اپنی معرفت عطا فرمائی جس کا فرد اعظم اسلام ہے۔ اب ذرا انصاف سے بتلائیے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے ایسے لوگ کتنے ہیں جنہوں نے کبھی زبان سے یوں کہا ہو کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو اسلام کی دولت عطا فرمائی۔ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے۔ اسی طرح علم اور حب فی اللہ۔ بغض فی اللہ۔ توکل و رضا وغیرہ یہ سب نعم باطنہ ہیں ان پر شکر بہت کم لوگ کرتے ہیں اور یہ حال تو اس پر ہے کہ حق تعالے نے نعم باطنہ کی طرف متوجہ بھی فرمایا ہے اور اگر وہ نعمت کی تقسیم نہ فرماتے تو شاید کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ (اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہ (مگر جس کو اللہ چاہے) اور ایک بہت بڑی فہرست نعمتوں کی ہماری نظر سے غائب ہو جاتی چنانچہ خود عقل بھی ایک نعمت ہے جو کہ ایک نور کا نام ہے جو انسان کو حق تعالی عطا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مدرک کلیات ہے اور یہ بھی نعم باطنہ میں داخل ہے۔ باطنہ فرمانے سے اس پر تنبیہ ہو گئی اور اس پر تنبیہ کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ بعض لوگ عقل کے منکر ہیں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان کے اندر عقل نہیں ہے حالانکہ جانور اور انسان میں فرق ظاہر ہے مگر یہ خدا کے بندے پھر بھی عقل کے منکر ہیں اس کا عقلی جواب تو ہے ہی مگر لطیفہ کے طور پر ایک جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کا حال خوب جانتا ہے تو وہ جو عقل کے منکر ہیں وہ اپنا حال بیان کرتے ہیں سو ان میں واقعی عقل نہ ہو گی اور ہم کو اپنے گھر کا حال معلوم ہے اور ہمارے اندر عقل ہے ہم کو خود اپنا حال معلوم ہے اس لئے ہم عقل کے منکر نہیں ہیں۔ یہ جواب ایسا ہے جیسا کہ ایک بزرگ نے معتزلہ کے جواب میں بطور لطیفہ کے فرمایا ہے کہ معتزلہ جو رؤیت الٰہیہ کے آخرت میں منکر ہیں وہ بھی صحیح کہتے ہیں۔ ان کی بات کو رد کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بے چارے اپنا حال بیان

کررہے ہیں کہ ہم آخرت میں رؤیت الٰہیہ سے محروم رہیں گے سو وہ اس نعمت رؤیت سے محروم ہیں اس لئے وہ انکار میں معذور ہیں اور اہل سنت والجماعت جو رؤیت کے قائل ہیں وہ اپنا حال بیان کررہے ہیں سو ان شاء اللہ ہم کو دیدار ہوگا اس لئے ہم اس کے قائل ہیں۔ الغرض عقل کے وجود میں بھی بعض لوگوں نے کلام کیا ہے اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نعمت پر متنبہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بہرحال عقل کے وجود پر دلیل صحیح اور کشف موجود ہے جس سے معلوم ہوگیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نور ادراک ایسا ہے جو حیوانات کے اندر نہیں ہے اور اسی سے انسان حیوانات وغیرہ سے ممتاز ہے اور یہ عقل انسان کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتی ہے جو ابتدا میں اپنا کام نہیں کرتی کیونکہ بچپن میں تمام قویٰ باطنہ قویٰ ظاہرہ کی تدبیر بدن میں مصروف ہوتے ہیں اس لئے پیدا ہونے کے ساتھ ہی عقل اپنا کام نہیں کرتی پھر جوں جوں بدن کی قوت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر عقل اپنا کام کرتی ہے حتیٰ کہ بلوغ کے وقت شرعاً وہ کامل ہوجاتی ہے اسی لئے شریعت نے بالغ کو احکام کا مکلف بنایا ہے اس پر یہ اشکال نہ ہو کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ابتدار بلوغ میں بھی اکثر لوگوں کو پوری عقل نہیں ہوتی۔ پوری عقل تو ۳۰ یا ۴۰ سال کی عمر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلوغ کے وقت عقل تو کامل ہوجاتی ہے لیکن تجربہ کم ہوتا ہے۔ اور ۳۰، ۴۰ سال کی عمر میں تجربہ بھی کافی ہوجاتا ہے اس عمر میں کچھ عقل نہیں بڑھتی بلکہ تجربہ بڑھتا جاتا ہے لیکن تجربہ کی وجہ سے اس کی باتوں میں اور اعمال میں پختگی اور استواری پیدا ہوجاتی ہے اس سبب سے لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ ۳۰، ۴۰ سال کی عمر میں عقل زیادہ ہوجاتی ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اس عمر میں عقل ہی بڑھ جاتی ہو۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آیا کہ بلوغ کے وقت عقل کامل نہیں ہوتی۔ بس یوں کہنا چاہیئے کہ بلوغ کے وقت اتنی عقل ضرور ہوجاتی ہے کہ احکامِ الٰہیہ کو اور اپنے نفع و نقصان کو سمجھ سکے پھر اس کے بعد دن بدن عقل کو ترقی ہوتی رہتی ہے مگر وہ ترقی تکلیف احکام کا موقوف علیہ نہیں مکلف

ہونے کے لئے وہی مقدار عقل کافی ہے جو بلوغ کے وقت عموماً ہوتی ہے اور یہاں سے منکرین معاد کی ایک غلطی معلوم ہوئی وہ یہ کہ بعض لوگ معادیات کا انکار اس لئے کرتے ہیں کہ وہ امور محسوسہ نہیں ہیں مثلاً جنت دوزخ کا انکار اس لئے کرتے ہیں کہ ان کا مشاہدہ نہیں ہوا تو ان کو اس تقریر سے سمجھنا چاہیئے کہ بعض امور متفق علیہا مسلم عند الکل بھی ایسے ہیں جن کے وجود کا محض دلیل سے اعتقاد کیا گیا ہے اور ان کا مشاہدہ کسی نے آجتک نہیں کیا جیسے عقل اور روح وغیرہ کہ منکرین معاد بھی ان کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اب اگر ہر چیز کا وجود مشاہدہ کے بعد ہی تسلیم کیا جایا کرے تو پھر یہ لوگ عقل وروح کے وجود کے کیونکر قائل ہو گئے پس معلوم ہوا کہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا وجود یقینی ہے مگر مشاہدہ محسوس نہیں۔ اسی طرح جنت و دوزخ وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان اشیاء کا وجود بھی دلیل صحیح سے ثابت ہے لہذا اس کو تسلیم کرنا لازم ہے گو مشاہدہ کسی نے نہ کیا ہو اور جس طرح عقل نعم باطنہ میں سے ہے اسی طرح بعض علوم بھی جن کا ادراک عقل سے ہوتا ہے نعم باطنہ میں سے ہیں جیسے تمام علوم عقلیہ گو وہ منقول ہی ہوں ان کا ادراک عقل ہی سے ہوتا ہے حواس سے نہیں ہوسکتا کیونکہ نقل میں الفاظ کا ادراک سمع سے ہوتا ہے اور نقوش کا بصر سے لیکن معانی کا ادراک تو عقل ہی سے ہوتا ہے اور علوم نام معانی ہی کا ہے اسی طرح جس قدر باطنی حالات وکیفیات و اخلاق و مقامات ہیں وہ بھی سب نعم باطنہ میں داخل ہیں اور یہ سب ظاہری اور باطنی نعمتیں حق تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہیں ان کے سوا صانع و خالق اور منعم کوئی نہیں۔ پس معبود بھی ان کے سوا کوئی نہیں یہ حاصل ہے توحید کی دلیل کا آگے حق تعالیٰ منکران توحید کی شکایت فرماتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ
یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جدال کرتے ہیں۔ يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں) سے مراد يُجَادِلُ فِي تَوْحِيْدِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارہ میں جدال کرتے ہیں) مضاف مقدر ہے یعنی خدا کی توحید میں

جھگڑا کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں اور ان دلائل بینہ میں غور نہیں کرتے۔ اس آیت میں منکران توحید کی متعدد مذمتیں مذکور ہیں چنانچہ اول تو جدال ہی فی نفسہ مذموم ہے کیونکہ ہر چند کہ بظاہر جدال کی دو قسمیں ہیں ایک جدال بحق ہے ایک جدال بالباطل جیساکہ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (ان سے احسن طریقہ سے خوش اسلوبی کے ساتھ جدال بحق کرو) سے معلوم ہوتا ہے کہ جدال کا اطلاق جدال بحق پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کے تتبع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جدال اور جَدَل کا اطلاق اکثر جدال بالباطل پر ہی ہوتا ہے یہ بات سارے قرآن کو دیکھ کر بھی نہ ٹوٹے گی۔ اور جہاں جدال بالحق پر جدال کا اطلاق آیا ہے وہ اطلاق صورت جدال پر مشاکلۃً ہے کیونکہ خواہ جدال بالحق ہو یا بالباطل صورت دونوں کی ایک سی ہوتی ہے۔ جیسا مشاکلۃً جَزَاءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِثْلُهَا (برائی کا بدلہ برائی ہے مثل اس کے) فرمایا گیا کیونکہ صورۃً دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ صورت کے یکساں ہونے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک مولوی صاحب کی دستار بندی ہوئی تھی مگر وہ کسی قابل نہ تھے کتابیں سمجھ کر نہ پڑھی تھیں۔ دستار بندی کے وقت استاد سے کہنے لگے کہ اس وقت تو لوگ مجھے فاضل سمجھیں گے مگر میں حقیقت میں مد فاضل ہوں اگر لوگ مجھ سے مسائل دریافت کرنے لگے تو میں کیا کروں۔ استاد نے کہا کہ میں ایسی ترکیب بتلاتا ہوں جس سے تمہاری رسوائی نہ ہوگی بلکہ اور وقعت بڑھ جاوے گی۔ تم ہر سوال کے جواب میں یہ کہدیا کرنا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اس کے بعد کچھ نہ کہنا ورنہ قلعی کھل جائے گی۔ تو اب دیکھئے یہ جواب ایسا ہے کہ اس کو بڑا محقق وسیع النظر بھی بیان کر سکتا ہے اور ایک جاہل بھی کہسکتا ہے ظاہر میں دونوں کے جواب یکساں ہوں گے۔ لیکن حقیقت شناس فرق کو سمجھ لے گا اسی طرح جدال بالحق و بالباطل کی صورت یکساں ہوتی ہے اس لئے دونوں پر جدال کا اطلاق یکساں کر دیا جاتا ہے مگر حقیقت دونوں کی بالکل جدا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ میں آخر ان مولوی صاحب کی قلعی ایک دن کھل ہی گئی بات یہ ہے کہ سمجھنے والے لب و لہجہ سے سمجھ جاتے ہیں کہ اس قول کا منشا تحقیق اور وسعت نظر ہے یا جہل محقق کے

لہجہ میں جرأت اور استغنا کی شان ہوتی ہے اور ناقص اگر بڑی بات منہ سے نکالیگا تو اس کے لہجہ میں پستی اور کم ہمتی نمایاں ہوگی وہ محقق کی طرح جرأت کے ساتھ ایسی بات نہیں کہہ سکتا اس لئے کوئی پرکھنے والا سمجھ گیا کہ یہ مولوی صاحب جو ہر بات میں یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کچھ آتا واتا نہیں محض ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ اس نے امتحان کے طور پر پوچھا کہ مولانا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے بارے میں کیا تحقیق ہے تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے بس ان کو یہی ایک جواب یاد تھا۔ جیسے ایک طوطی کا قصہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ کسی شخص نے اس کو یہ لفظ یاد کرا دیا تھا دریں چہ شک (اس میں کیا شک) اور بازار میں آ کر دعویٰ کیا کہ یہ طوطی فارسی زبان جانتی ہے۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ ایک شخص نے اس کو خریدنا چاہا مالک نے بہت قیمت بتلائی اس نے طوطی سے پوچھا کہ کیا تو اس قیمت کے لائق ہے جو یہ شخص مانگتا ہے۔ اس نے وہی کہا دریں چہ شک۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ واقعی طوطی فارسی خوب جانتی ہے دیکھو کیسا برمحل جواب دیا ہے۔ اب تو خرید کر گھر لے گئے اور اس سے باتیں کرتے بیٹھے تو وہ ہر بات کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہتی چلی جاتی ہے موقع ہو یا نہ ہو آخر اس نے جھلا کر کہا کہ میں نہایت ہی احمق تھا جو اتنی رقم کثیر خرچ کر کے تجھ کو لایا اور دھوکہ میں آ گیا۔ اس نے اس کے جواب میں بھی یہی کہہ دیا دریں چہ شک خیر یہاں تو جواب برمحل ہو گیا گو اس نے قصد نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ان مولوی صاحب کو بھی بس اتنا ہی یاد تھا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے حتیٰ کہ آپ نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو بھی اختلافی بتلایا اگرچہ فی نفسہ یہ بھی صحیح تھا کیونکہ کفار کو توحید رسالت میں بھی اختلاف ہے لیکن مسلمان کے استفتاء کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے تو اس میں تو ائمہ مذاہب کا ہی اختلاف مراد ہوتا ہے۔ بس اب تو لوگوں میں ان مولوی صاحب کی خوب ہی قلعی کھلی کہ یہ کون جاہل ہے جو کلمہ شریف کو بھی اختلافی بتلاتا ہے اسی کے مشابہ ایک اور حکایت مجھے یاد آئی۔ کانپور میں عبدالرحمن خاں صاحب

مالک مطبع نظامی کا ایک ملازم تھا وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ جب تم حج کو چلو تو مجھ کو بھی ساتھ لے چلنا میں نے اس سے کہا کہ پہلے تم کچھ عربی سیکھ لو تاکہ وہاں کی زبان سمجھ سکو۔ وہ بے چارہ عربی سیکھنے پر بھی راضی ہوگیا میں نے اس کو اول یہ لفظ سکھایا۔ ھَاتِ الْحَجَرَ (ڈھیلے لا) اور یہ کہدیا کہ جب میں یہ لفظ کہا کروں تم اسی وقت استنجا کے واسطے مجھے ڈھیلا لا دیا کرو۔ وہ بیچارہ روز اس پر عمل کرتا۔ ایک دن مجھے استنجا کی ضرورت تھی اس لئے میں نے ڈھیلا نہ مانگا تو آپ خود ہی کہتے ہیں مولوی صاحب ھَاتِ الْحَجَرَ ہے کہا سبحان اللہ بندر کے ہاتھ لگی ہلدی کی گرہ اس نے کہا میں ہی پنساری ہوں۔ اب آپ نے ھَاتِ الْحَجَرَ کیا سیکھا ہے کہ ہر جگہ اسی کا استعمال شروع کردیا۔ امر کا صیغہ استفہام میں برت رہے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ جہاز میں بنگالی لوگ آکر اپنی زبان میں کچھ سوالات کرتے جس کو میں نہ سمجھتا اور ان کو یہ بھی نہ سمجھا سکتا کہ میں نہیں سمجھا۔ آخر میں نے ایک اردو داں بنگالی سے کہا کہ مجھے اتنا بنگلہ سکھادو کہ جب کوئی ایسا بنگالی مجھ سے بنگلہ میں باتیں کرے تو میں اس سے یہ کہدوں کہ میں بنگلہ نہیں سمجھتا انھوں نے کہا کہ تم یوں کہدیا کرو بنگالی بوزی نا یعنی پوچھی نا (اور سننے میں بوزینہ آتا ہے جس کے معنے فارسی کے اعتبار سے بہت بُرے ہیں) تو مجھے ایک مشغلہ ہاتھ آگیا۔ میں بنگالیوں سے یہی کہدیا کرتا بنگالی بوزینہ اور اس میں میرے نفس کی شرارت بھی مضمر ہوتی تھی مگر ایک بنگالی نے مجھے خوب ہی جواب دیا جب میں نے اس سے کہا بنگالی بوزینہ تو اس نے بیساختہ جواب دیا ہندوستانی بوزینہ یعنی میں اردو نہیں سمجھتا۔ الغرض جدال بالحق کو مشاکلۃً جدال کہدیا گیا ہے۔ مجھے مشاکلت پر ایک اور مسئلہ یاد آگیا وہ یہ کہ انبیاء و اولیاء پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہے حقیقت مصیبت نہیں کیونکہ مصیبت کے بارہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے مَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ کہ تم کو جو کچھ مصیبت پہونچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے ہے اس پر اشکال ہوتا ہے کہ انبیاءؑ و اولیاء پر بھی تو مصیبت آتی ہے تو کیا

اُن پر بھی گناہوں کے سبب سے آئی ہے۔ اس کا ایک جواب تو تسلیمی ہے کہ یہاں اپنے اپنے درجہ کے موافق خطا سے کون خالی ہے۔ لیکن یہ جواب اولیاء کے بارہ میں تو صحیح ہے۔ انبیاء کے بارہ میں بے تکلف جاری نہیں ہو سکتا کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے جو کچھ خطا ہوتی ہے وہ اجتہادی خطا ہے جس پر ان کو ثواب ملتا ہے تعمد معصیت کی ان میں ہرگز گنجائش نہیں اس لئے وہاں یہ کہنا کہ مصائب کا سبب ان کی خطائیں ہیں بہت بعید ہے بلکہ ان کی مصائب کا سبب محض رفع درجات ہے تو مَا اَصَابَكُمْ کا خطاب صرف عصاۃ کو ہوگا چنانچہ مَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ اس کا قرینہ ہے۔

اس لئے دوسرا جواب سب سے لطیف تر ہے کہ یہ بالکل سچ ہے کہ مصیبت گناہوں ہی کی وجہ سے آتی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مصیبت کہتے کس کو ہیں۔ مصیبت وہ ہے جس سے پریشانی اور انقباض لاحق ہو اور انبیاء و اولیاء بیماری وغیرہ سے پریشان اور منقبض نہیں ہوتے تو یہ بیماری اور فاقہ اور تنگدستی وغیرہ ان کے حق میں مصیبت ہی نہیں بلکہ راحت ہے جیسے کوئی معشوق پیچھے سے آکر اپنے عاشق کو بغل میں دبالے اول اول تو اس کو کلفت معلوم ہوگی۔ لیکن جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ دبانے والا محبوب ہے اس وقت ساری کلفت دور ہو جائے گی اور چاہے گا کہ تھوڑی دیر اور دبائے رہے۔

حدیث میں زاہر صحابی رضی اللہ عنہ کا قصہ وارد ہے۔ یہ دیہات کے رہنے والے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دیہات کی چیزیں لایا کرتے تھے اور آپ ان کو شہر کی چیزیں عطا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مذکور ہے زَاهِرٌ بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرَتُهٗ (زاہر دیہاتی ہے اور ہم شہری ہیں)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی۔ ایک مرتبہ یہ بازار میں جا رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے تشریف لا کر ان کو دبا لیا۔ اول تو زاہر بڑے گھبرائے کہ یہ کون ہیں جب معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو حدیث میں آتا ہے کہ پھر تو زاہر اپنی کمر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے سے خوب لگانے لگے تاکہ جسد اطہر

سے مَس ہو کر برکت حاصل ہو جائے پھر آپ نے فرمایا کہ کوئی اس غلام کو خرید تا ہے وہ کہنے لگے یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ مجھے فروخت کریں گے تو مجھ بہت کھوٹا پائیں گے میرا کوئی بھی گاہک نہ ملے گا آپنے فرمایا لیکن تم خدا کے نزدیک کھوٹے نہیں ہو تو کیا کوئی ایسا کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دبا لینے سے حضرت زاہر کو کچھ کلفت ہوئی تھی ہرگز نہیں اس میں جو کچھ ان کو لطف آیا ہوگا انہی کے دل سے پوچھنا چاہیئے دپھر غلام کے لفظ سے یاد کرنے میں جو مسرت حضرت زاہر کو حاصل ہوئی ہوگی اس کو ان کے سوا کون بتلا سکتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

بس کہا مجھکو اے میرے غلام   سب سے پیارا نام ہے میرا یہی (من الجامع)

اسی طرح انبیاء و اولیاء پر جب کلفت آتی ہے تو وہ یہ سمجھ کر کہ نازل کرنے والا کون ہے یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے محبوب پر دل قربان ہے جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے)

بلکہ بعض دفعہ جو اُس کلفت کے انوار و آثار کو دیکھتا ہے تو عراقی کی طرح زبانِ حال سے کہتا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت ہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں)

پھر اس کو بیماری اور تنگدستی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس کو دور ہونا پسند نہیں ہوتا۔ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا پر جب فاقہ اور مرض نہ ہوتا تو بے قرار ہو کر فرماتیں کہ شاید محبوب ناراض ہیں جو بہت دنوں سے پیام و سلام نہیں آیا۔ یعنی فاقہ اور بیماری یہ ان کے نزدیک محبوب کا پیام و سلام تھا۔ پھر ان لوگوں کی بیماری اور فاقہ مستی کو مصیبت کون کہہ سکتا ہے ہاں یوں کہئے کہ صورت مصیبت ہے جیسے آپ نے

دیکھا ہوگا کہ بعض کاریگر لوگ مٹھائی کی چیزیں بنایا کرتے ہیں کبھی مٹھائی کا درخت بناتے ہیں کبھی پھول پتے وغیرہ تو عوام کی مصیبت کو اور خواص کی مصیبت کو یوں سمجھئے جیسے ایک تو نیم کا اصلی پتہ ہو دوسرا اسی کی شکل میں مٹھائی کا بنا ہوا پتہ ہو صورت دونوں کی یکساں ہے مگر حقیقت میں آسمان زمین کا فرق ہے کہ ایک تلخ ہے ایک شیریں ہے اسی لئے حضرت رابعہ فاقہ و مرض کے نہ آنے سے بے چین ہو جایا کرتی تھیں آخر ان کو کچھ تو مزہ اس میں آتا ہوگا لیکن یہ ایک مذاق ہے اور دوسرا مذاق اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ ہر حال میں خوش ہو۔ نہ صحت سے بے چین ہو نہ مرض سے نہ فاقہ کے آنے سے گھبرائے نہ جانے سے اس سے بھی راضی ہو اس سے بھی راضی ہو بس اس کا حال اس کا مصداق ہو ؂

زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندگی بخشیں تو زہے نصیب اور موت دیں تو زہے قسمت جب جان آپ کی عاشق ہو گئی تو پھر آپ جو چاہیں کریں)

اور یہ حالت اس لئے افضل ہے کہ اس میں اپنے اختیار وارادہ کا فنا رکلی ہے کہ اپنے لئے کسی حالت کو تجویز نہیں کرتا اگر حق تعالیٰ تندرست رکھیں مال و دولت عطا فرمادیں اس سے بھی راضی ہے اگر بیمار رکھیں فاقہ بھیجیں اس سے بھی خوش ہے خوشی اور غم کلفت و راحت مدح و مذمت دونوں اس کے نزدیک برابر ہیں اور یہی کمال عبدیت ہے لوگ اہل اللہ کی تکالیف کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ بھی ان کی طرح پریشان ہوں گے مگر جس کو یہ دولت حاصل ہو جس کا مذاق عبدیت اور فنا ہو چکا ہو بھلا وہ بھی کہیں تکلیف سے پریشان ہوا کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ روتے بھی ہوں آہ بھی کہتے ہوں بیماری میں تڑپتے بھی ہوں مگر اس تڑپنے سے ان کا دل پریشان نہیں ہوتا دل کو اس وقت ایک خاص سرور ولذت حاصل ہوتی ہے باطن میں وہ پوری راحت میں ہوتے ہیں ؂

دمادم شراب الم درکشند　　　وگر تلخ بینند دم درکشند

(ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

آخر آپ نے سنا ہوگا کہ بعض عشاق نے محبوبوں کے ہاتھ سے قتل ہونا بخوشی گوارا کیا ہے تو کیا قتل کے بعد ان کی لاش تڑپی بھی نہ تھی تڑپی ضرور تھی لیکن اس کو خلاف محبت وعشق کوئی نہیں سمجھتا اسی طرح اگر اہل اللہ سے ظاہر میں کلفت کی وجہ سے آہ ونالہ اور اضطراب صادر ہو تو یہ محبت کے خلاف نہیں کیونکہ یہ تو طبعی امر ہے کہ کلفت کا احساس ہو ہاں ان کا دل مسرور ہوتا ہے جس پر واقعات بکثرت شاہد ہیں۔ ایک بزرگ کے بدن پر کیڑے پڑے ہوئے تھے وہ بے چارے راستہ میں سڑک کے کنارے آپڑے تھے ان پر ایک دوسرے بزرگ کا گذر ہوا ان کو ان کی حالت دیکھ کر رحم آیا۔ دیکھا کہ زخموں پر ہزاروں مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں ان بزرگ نے ترس کھا کر ان کا سر اٹھا کر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور پنکھا جھلنے لگے۔ اس شخص نے معاً آنکھیں کھول دیں اور کہا جاؤ یہ کون ہے جو میرے اور محبوب کے درمیان آکر حائل ہوگیا تم میرے حال پر کیا ترس کھاتے ہو مجھے تمھارے حال پر رحم آتا ہے۔ یہ حکایت تو کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ اور ایک واقعہ میرے بچپن کے زمانہ کا ہے میرے ایک عزیز جو درویش تھے۔ کمبل اوڑھے ہوئے اپنے ایک عزیز سے ملنے آئے۔ وہ دوسرے صاحب شال اوڑھے ہوئے تھے۔ یہ شال اوڑھنے والے ان درویش سے کہنے لگے کہ تم نے کیا ڈھونگ بنایا ہے کہ لباس چھوڑ کر کمبل لیا یہ کمبل تو زہر لگتا ہے۔ تو وہ درویش بے ساختہ کہنے لگے کہ مجھے تمھارا یہ شال زہر لگتا ہے میں کیا کروں الغرض آپ کو ان کی کلفت پر رحم آتا ہے اور ان کو آپ کی تندرستی وناز ونعم پر رحم آتا ہے کہ یہ لوگ آخرت میں درجات سے اور دنیا میں محبوب کی چھیڑ چھاڑ سے محروم ہیں۔

حضرت شبلیؒ جب کسی امیر کو دنیا میں منہمک دیکھتے تو یہ دعا پڑھا کرتے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ

تَفۡضِیۡلًا۔ (اللہ تعالےٰ کا شکر ہے جس نے مجھ کو عافیت دی اس چیز سے جس میں تجھ کو مبتلا کیا اور اپنی مخلوق سے بہتوں پر فضیلت دی) حدیث شریف میں یہ دعا بیمار کو دیکھ کر پڑھنے کے لئے وارد ہوئی ہے کہ جب کسی مریض و مبتلا کو دیکھو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تم اس مرض و بلا سے محفوظ رہو گے۔ مگر فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ یہ دعا آہستہ سے پڑھے مریض کو سنا کر نہ پڑھے تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو تو حضرت شیخ رح زیادہ دنیا کو بھی بلا سمجھتے تھے اور اس سے محفوظ رہنے پر شکر کرنے کے لئے یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات فقر سے کس درجہ راضی ہوں گے۔

حضرت غوث اعظم رح کو بادشاہ سنجر نے لکھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ حضرت کی خانقاہ کے لئے ملک نیمروز کا کوئی حصہ وقف کر دوں تاکہ ذاکرین و شاغلین کے خرچ کو کافی ہو جایا کرے۔ آپ نے اس کے جواب میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد ۔۔۔ در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب ۔۔۔ من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

(چتر سنجری کی طرح میرا بخت سیاہ ہو اگر میرے دل میں سنجر کے ملک ہوس بھی ہو جب سے مجھے آدھی رات کی بادشاہت ملی ہے میں ملک نیمروز کو ایک جو کے بدلے میں نہیں خریدتا)

ان عارفین کے کلام میں ظاہری شوکت و بلاغت بھی بہت ہوتی ہے اور باطنی شوکت تو ان کا حصہ ہے[1]

---

[1] الحمد للہ اس کا نمونہ اس وقت بھی موجود ہے میرے مخلص دوست جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری جو بفضلہ تعالیٰ دولت جذب و معرفت سے مالا مال ہیں کبھی کبھی اشعار بھی تصنیف فرمایا کرتے ہیں باوجودیکہ آپ کسی شاعر کے شاگرد نہیں مگر طبیعت خداداد کیساتھ جذب باطنی کے مل جانے سے آپکے کلام میں وہ شوکت و سولت ہے کہ بعض مشاعروں میں جب آپکی غزلیں پڑھی گئیں تو بڑے بڑے نامی شعرا کی غزلیں پھیکی پڑ گئیں بعض مرتبہ خواجہ صاحب کے کسی شعر کی داد میں لوگ بیساختہ کھڑے ہو ہو جاتے تھے بعد میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ شعراء کو آپ سے حسد ہونے لگا پس یہ بات بالکل سچ ہے کہ عارفین کے کلام میں ظاہری شوکت وصولت و بلاغت بھی زیادہ ہوتی ہے کَثَّرَ اللّٰہُ فِیۡنَا اَمۡثَالَھُمۡ اٰمِیۡن (کثرت کرے اللہ تعالےٰ ہم میں ان جیسے لوگوں کی یا یہ دعا قبول کر)

آخر کوئی بات تو ان کو نصیب ہے جو دنیا کی لذتوں سے اس قدر سیر ہو گئے۔ صاحبو!
ان کے دل میں ایک دولت ہے جس نے ان کو سب دولتوں سے بے نیاز کر دیا ہے
وہ کیا ہے وہ یہ دولت ہے جس کو عارف شیرازی نے بیان فرمایا ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روی
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاے وہوئے

(فراغ دل سے کچھ وقت محبوب کے چہرہ پر نظر کرنا تمام دن ہو ہائے کی چتر شاہی سے بہتر ہے)

واللہ ایک بار فراغت قلب کے ساتھ محبوب کی طرف نظر کرنا سلطنت ہفت اقلیم سے افضل ہے۔ خاقانی کہتے ہیں ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

(تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ حقیقت محقق ہوئی کہ ایک دم خدا تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونا ملک سلیمانی سے بہتر ہے)

اس میں سلیمان علیہ السلام کی توہین کا شبہ نہ کیا جائے چنانچہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہوگا کہ یک دم با خدا ہونا ملک سلیمانی سے افضل ہے تو معلوم ہوا کہ نعوذ باللہ سلیمان علیہ السلام کی سلطنت ان کے لئے مفضول حالت تھی جواب یہ ہے کہ مطلب شعر کا یہ ہے کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی کہ بکسے غیر سلیمان علیہ السلام دادہ شود (ایک دم خدا کے ساتھ مشغول ہونا اس ملک سلیمانی سے بہتر ہے جو سلیمان علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص کو دیدیا جائے) باقی سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں یا خداوند کے خلاف نہ تھا بلکہ وہ تو اس سلطنت میں بھی ہر دم با خدا تھے ان کی سلطنت بھی ذکر میں داخل تھی کیونکہ ذکر کی ایک نوع یہ بھی ہے لنگوٹہ باندھنے ہی کا نام بزرگی نہیں کاملین کو دنیا خدا تعالےٰ سے غافل نہیں کیا کرتی یہ حالت ناقصین کی ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب سلطنت کی دعا کی ہے تو ساتھ میں یہ بھی فرمادیا

رَبِّ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ یعنی مجھے ایسا ملک عطا ہو جو میرے بعد والوں کے لئے ملنا مناسب نہ ہو۔

مولانا رومی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ظاہراً اس سے حرص وحسد کا شبہ ہوتا ہے مگر واقعہ میں یہ ضعفاء کے حق میں انھوں نے اس دعا میں عین رحمت فرمائی جس کی توجیہ یہ ہے کہ مِنْ بَعْدِیْ میں بَعْدِیَّت زمانیہ مراد نہیں بلکہ بعدیت رتبیہ مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ ایسا ملک مجھے عطا کیا جائے جو میرے درجہ والوں کے لئے خواہ مناسب ہو مگر مجھ سے کم درجہ والوں کے لئے غیر مناسب ہوگا یعنی ان کو عطا نہ کیا جائے کیونکہ وہ ایسی سلطنت سے کفر وتکبر میں مبتلا ہو جائیں گے اب اس تفسیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اشکال نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ تو سلیمان علیہ السلام کے اعتبار سے مَنْ بَعْدِیْ نہیں بلکہ مَنْ قَبْلِیْ (مجھ سے پہلے) ہیں یعنی آپ تو ان کے ہم رتبہ نبوت ورسالت ہی ہیں اور درجہ میں ان سے بھی افضل ہیں۔ ختم ہوئی تفسیر مولانا کی۔ واقعی تفسیر کوئی ان حضرات سے سیکھے الغرض سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں باخدا ہونے کے خلاف نہ تھا وہ سلطنت کے ساتھ بھی ہر دم باخدا تھے اور حضرت سلیمانؑ کو تو ملک کیا مضر ہوتا جبکہ حضرات صحابہ کو مضر نہ ہوا۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ حضرات صحابہ کے پاس دنیا ایسی تھی جیسے منتر جاننے والے کے ہاتھ میں سانپ جس طرح منتر جاننے والے پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا اسی طرح حضرات صحابہ پر دنیا کا اثر نہ ہوتا تھا اس کی وجہ کیا تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کے ہاتھ میں دنیا تھی دل میں دنیا نہ تھی۔ دل میں خدا کی محبت ومعرفت اس درجہ بھری ہوئی تھی کہ وہاں دنیا وما فیہا کا گذر ہی نہ تھا مولانا نے عجیب مثال بیان فرمائی ہے ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی است
آب اندر زیر کشتی پشتی است

(کشتی میں پانی کشتی کو ڈبونے والا ہے اور اس کے نیچے ہونا کشتی کیلئے پشتی ہے)

اور حضرات صحابہ کی بھی بڑی شان ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ ہے۔

صاجبو! اولیاء امت میں بھی ایسے بکثرت ہوئے ہیں جن کو سلطنت و ملک نے ایک ساعت کے لئے بھی خدا ہونے سے نہیں روکا۔ حضرت خواجہ عبیداللہ احرار رح بہت بڑے بزرگ تھے اور اسی کے ساتھ آپ کے یہاں شاہانہ ٹھاٹھ بھی تھا۔ مولانا جامی رح زمانۂ طلب میں حضرت خواجہ صاحب کی بزرگی کا حال سن کران کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا تو وہاں پورا شاہانہ سامان تھا مولانا جامی کو خطرہ ہوا کہ یہ شخص ولی اور عارف کیا ہوگا جس کے یہاں اس قدر دنیا بھری ہوئی ہے۔ ولی کو تو فقیر ہونا چاہئے۔ اس خطرہ کو قوت ہوئی تو آپ نے برملا خواجہ صاحب کے منہ پر کہدیا۔

ع نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

(جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مرد خدا نہیں ہے)

اور یہ کہہ کر وہاں ٹھہرے بھی نہیں آکر مسجد میں لیٹ رہے۔ یہاں ان کی آنکھ لگ گئی تو خواب میں دیکھتے ہیں کہ میدانِ حشر قائم ہے اور ایک شخص مولانا جامی کے سر ہو رہا ہے کہ میرا آپ کے ذمہ فلاں حق ہے وہ ادا کیجئے آپ کہتے ہیں کہ بھائی میرے پاس تو کچھ نہیں اس نے کہا پھر میں آپ کی نیکیاں لوں گا یہ بڑے پریشان تھے کہ اتنے میں حضرت خواجہ عبیداللہ احرار رح کی سواری سامنے سے گذری اور انھوں نے مولانا جامی کو اس حال میں دیکھ کر اپنی سواری روک لی اور فرمایا کیا قصہ ہے۔ حق دار نے اپنا مطالبہ بیان کیا آپ نے فرمایا کہ یہ شخص میرا مہمان ہے اس کو تنگ نہ کرو اور جو کچھ لینا ہو ہمارے خزانہ سے جو ہمارا یہاں جمع ہے جاکر لے لو ہیبت سے آنکھ کھل گئی تو دیکھا خواجہ صاحب نماز کے لئے سواری پر آرہے ہیں مولانا جامی کے دل پر خواجہ صاحب کا رعب اور ان کی ہیبت جم گئی اور یہ سمجھے کہ واقعی یہ شخص خالی نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بڑا ہی صاحب ظرف ہے جس کو دنیا خدا سے غافل نہیں کر سکتی مولانا جامی بے ساختہ دوڑ کر قدموں میں جا گرے اور قصور کی معافی چاہنے لگے انھوں نے ہنس کر فرمایا کہ میاں خواب و خیال پر اعتماد نہیں کیا کرتے۔ اب تو ان کو اور بھی اعتقاد بڑھا کہ معلوم ہوتا ہے

یہ خواب بھی آپ ہی کا تصرف تھا اور اگر تصرف نہ تھا تو آپ کا کشف ہی بہت صحیح ہے بہر حال کھلی کرامت ظاہر ہوئی۔ مولانا جامی نے معافی چاہنے کے بعد سلسلہ میں داخل ہونے کی درخواست کی خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ذرا ہم کو اپنا وہ مصرعہ دوبارہ سنانا جو تم نے آتے ہی پڑھا تھا۔ مولانا جامی نے عرض کیا کہ حضور وہ تو میری جہالت تھی اب میری کیا مجال ہے جو ایسی بات زبان سے کبھی نکالوں۔ فرمایا ایک بار تم نے اپنی خواہش سے پڑھا تھا ایک بار ہماری خاطر سے پڑھ دو اور یہ بے ادبی نہیں کیونکہ اب تو ہم خود اصرار کر رہے ہیں نحو الامر فوق الادب (ادب سے بڑھ کر ہے) کا لحاظ کر کے پڑھ دو۔ غرض انہوں نے مجبور ہو کر پڑھا۔ ع نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد (جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مردِ خدا نہیں ہے) حضرت خواجہ احرار رح نے بلیساختہ دوسرا مصرعہ ارشاد فرمایا۔ ع اگر دارد برائے دوست دارد (اگر دوست رکھے تو محبوب حقیقی کے لئے دوست رکھے) سبحان اللہ کیا عجیب جواب ہے جس میں کاملین کے پاس دنیا ہونے کی حقیقت کھولدی کہ وہ جو کچھ رکھتے ہیں دوست یعنی محبوب حقیقی کیلئے رکھتے ہیں اپنے نفس کے لئے یہ سازو سامان نہیں رکھتے۔ یعنی مقصود بالذات نفس کی راحت نہیں ہوتی بلکہ ہر حال میں رضا کا قصد ہوتا ہے گو اس کی ساتھ راحت نفس بھی لازم آجائے۔ اور حقیقت میں یہ بڑا کمال ہے کہ متاعِ دنیا میں مشغول ہو کر انسان کا دل خدا سے غافل نہ ہو۔ الغرض کاملین کی نظر میں راحت و کلفت خوشی اور غم سب یکساں ہوتے ہیں کوئی حالت ان کو خدا تعالےٰ سے غافل نہیں کرتی پس ان پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہوتی ہے حقیقت مصیبت نہیں ہوتی گویا اس کو مشاکلۃً مصیبت کہدیا جاتا ہے اسی طرح یہاں جدال بالحق کو مشاکلۃً جدال کہدیا گیا کہ صورت ہر جدال کی ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ بات بھی پہلے ہی زمانہ کے ساتھ خاص تھی کہ جدال بالباطل کی صورت جدال بالحق کے مشابہ تھی کہ جس طرح اہلِ حق تہذیب کے ساتھ مناظرہ کرتے تھے اہلِ باطل بھی تہذیب کی رعایت کرتے تھے۔ باقی آجکل تو جدال بالباطل کا پہچاننا کچھ بھی مشکل نہیں۔ کیونکہ آجکل مناظرہ میں خصم پر پھبتیاں اڑانا خلاف تہذیب

باتیں استعمال کرنا خواہ مخواہ اپنی بات کی پچ کرنا ہر شخص کو معلوم ہو جاتی ہے جس سے سب سمجھ جاتے ہیں کہ اظہار حق مقصود نہیں محض ہار اور جیت مقصود ہے آجکل تو دنیا میں شاید ہی کہیں جدال بالحق ہوتا ہو ورنہ عموماً جدال بالباطل ہی ہوتا ہے۔
اور گو یہ حالت بہت زمانہ سے ہے مگر اس زمانہ میں پہلے سے زیادہ ترقی ہے۔

امام ابوحنیفہ رہ نے اپنے صاحبزادے حماد کو نصیحت فرمائی تھی کہ علم کلام و مناظرہ میں مشغول نہ ہونا انھوں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کو خود مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ فرمایا ہاں ہم نے مناظرہ کیا ہے لیکن ہماری یہ حالت تھی کہ ہم تمنا کرتے تھے کہ حق بات خصم کے منہ سے نکلے اور ہم اس کو قبول کریں اور تم کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ خصم کے منہ سے سوائے باطل کے کچھ نہ نکلے تاکہ تم غالب رہو ہم کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ ہمارا مسلمان بھائی اپنی زبان سے غلط بات کہے پھر اس کی پچ کرے باہم حق بات کہیں اور اس کو ہار کر ہماری بات ماننا پڑے جس سے ہمارا غلبہ اور اس کا عجز ظاہر ہو یا ضد میں آکر وہ ہماری حق بات کو رد کرنے لگے تو اس کے ایمان کا ضرر ہو اس لئے ہم یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے تو ہم اس کو جلدی سے قبول کرلیں جس سے اس کی عزت بھی ہو اور حق بھی واضح ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ امام صاحب کے بعد کا زمانہ بھی غنیمت تھا کیونکہ اس زمانہ کے لوگ جو یہ تمنا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے باطل کے سوا کچھ نہ نکلے اور حق بات ہمارے ہی منہ سے نکلے تو اس تمنا کا منشا یہ تھا کہ وہ لوگ اس بات کا قصد کرتے تھے کہ اگر کبھی خصم کے منہ سے حق بات نکل گئی تو ہم ضرور مان لیں گے ورنہ اگر ان کی نیت یہ نہ ہوتی تو اس تمنا کی ان کو کیا ضرورت تھی کہ خصم کے منہ سے باطل ہی نکلے معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ غلط بات ہی کا رد کرنا چاہتے تھے حق بات کے رد کرنے کا وہ قصد نہیں کرتے تھے مگر آجکل تو یہ تمنا کرتے ہیں کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے نہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ باطل نکلے کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے یہ بات دل میں ٹھان لیتے ہیں کہ خصم کے منہ سے جو کچھ نکلے گا اس کو رد ہی کرینگے خواہ حق ہو یا باطل ہو افسوس۔ تو یہ ایک تیسرا درجہ ہے جو پہلے زمانہ میں نہ تھا یہ آج کل پیدا

ہوا ہے کہ مناظرہ میں ہر شخص یہ ٹھان لیتا ہے کہ دوسرے کے منہ سے جو کچھ نکلے اس کو رد ہی کرنا چاہیئے اگرچہ وہ حق بات ہی ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)

کانپور میں ایک مرتبہ میں نے ایک مسئلہ بیان کیا ایک طالبعلم بولے کہ نہیں یہ مسئلہ اس طرح ہے۔ میں نے کہا کہ تم نے یہ طرح کہاں دیکھا کہنے لگے ہدایہ میں لکھا ہے۔ میں نے ہدایہ ان کے سامنے رکھدیا کہ لو اس میں نکالو اس میں ہر چند تلاش کیا مگر وہ مسئلہ نہ تھا تو اب بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کریں کہتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ ہدایہ ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ پھر اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں اور میرا یہ سوال پھر بھی موقع کا تھا کیونکہ آدمیت اس صورت کا نام نہیں بلکہ آدمیت نفس ناطقہ اور روح انسانی پر موقوف ہے جو ایک مخفی امر ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بصورت آدمی انسان بدے
احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

(اگر صورت کی وجہ سے آدمی انسان ہوتا تو احمدؐ اور ابوجہل برابر ہوتے)

بہت سے آدمی ایسے ہیں کہ ان کی صورت آدمی کی ہے لیکن روح سباع اور بہائم کی ہے۔ ایسوں ہی کی نسبت ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (یہ لوگ مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں)۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

اینکہ می بینی خلاف آدم اند ۔۔۔ نیستند آدم غلاف آدم اند

(یہ جو آدمیوں کا اختلاف دیکھتے ہو یہ آدم نہیں یہ آدم کے غلاف ہیں)

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ۔۔۔ پس بہر دستے نباید داد دست

(بہت سے آدمیوں کی شکل میں شیطان ہیں اس لئے ہر کس و ناکس کا اندھا ہو کر مرید نہ ہونا چاہیئے)

غلافِ آدم ہیں مجھے یاد آیا کہ حیدر آباد میں محرم کے زمانہ میں بعض لوگ شیر اور ریچھ بنتے ہیں یعنی شیر اور ریچھ کی کھال پہنکر لوگوں کو ڈراتے ہیں تو کیا اس سے وہ سچ مچ شیر ہو گئے ہرگز نہیں بلکہ ان کو غلاف شیر کہا جائے گا۔ اسی طرح آدمی کی کھال بدن پر لگ جانے سے کسی کو آدمی نہیں کہا جا سکتا آدمیت کچھ اور ہی چیز ہے۔ دیکھئے اصلی شیر میں اور غلاف شیر میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ یہ نقلی شیر تو کتے سے بھی سب سے پہلے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور حقیقی شیر کی یہ شان ہوتی ہے ؎

گر جہاں پُر برف گردد سر بسر
تاب خور بگدازدش از یک نظر

(اگر تمام عالم بھی برف سے پُر ہو جائے آفتاب کی تابش اس کو ایک نظر سے پگھلا دیتی ہے)

واقعی اگر جنگل میں ایک شیر آکر دھاڑ دے تو سارا جنگل کانپ جائے اور یہ نقلی شیر اُس کی آواز ہی سنکر ہگ دے۔ یہی فرق ہے حقیقی انسان اور نقلی انسان میں۔ دیکھئے ابوجہل بھی کعبہ میں جاتا تھا جبکہ وہاں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے وہ تو جا کر سب بتوں کو سجدہ کرتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک بار کعبہ میں داخل ہوئے تھے تو سارے بت سرنگوں ہو کر آپ کے قدموں میں آگرے۔ ایک وہ انسان تھا ایک آپ انسان تھے۔ پس حقیقت میں ابوجہل آدمی نہ تھا بلکہ غلافِ آدم تھا۔ اسی لئے میرا ان طالب علم سے یہ سوال ایک حد تک صحیح تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں ممکن ہے کہ آپ غلافِ آدم ہوں۔ باقی ان کا سوال محض ہٹ دھرمی تھا کیونکہ ہدایہ کا ہدایہ ہونا تطابق عبارت سے معلوم ہو سکتا تھا وہ اپنی ہدایہ لاکر اس ہدایہ کا مقابلہ کر سکتے تھے مگر صاحب ملا آن باشد کہ چُپ نشود (ملّا وہ ہے کہ چپ نہ ہو) ممکن ہے کہ تطابق عبارت کی صورت میں بھی وہ یہی کہتے کہ یہ ہدایہ نہیں کیونکہ وہ دونوں کی عبارت میں بھی اعتبار سے فرق نکال سکتے تھے کہ یہ نقوش اس حیثیت سے کہ میری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش ہیں اور اس حیثیت سے کہ دوسری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش نہیں ہیں کچھ اور ہوں گے جیسا کہ

ایک طالب علم نے اپنے بھائی کو گالی دی تھی ماں کی۔ کسی نے کہا ظالم وہ تیری بھی تو ماں ہے۔ تو آپ نے کہا کہ صاحب اعتبار کا فرق ہے اس حیثیت سے کہ وہ میری ماں ہے مخدومہ مکرمہ ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کی ماں ہے ایسی ویسی ہے۔ تو بھائی یہ اعتبار کا فرق بڑے غضب کا ہے جس کی بابت مشہور ہے لَوْ لَا الْاِعْتِبَارَاتُ لَبَطَلَتِ الْحِکْمَۃِ (اگر اعتبارات نہ ہوتے تو حکمت باطل ہو جاتی) لیکن اگر وہ اعتبارات ایسے ہی اعتبارات ہیں تو یوں کہنا چاہیے لَوْ لَا الْاِعْتِبَارَاتُ لَبَطَلَتِ الْحِمَاقَۃ (اگر اعتبارات ہوتے تو حماقت باطل ہو جاتی) غرض ان طالب علم کے اس جواب سے سب کو معلوم ہو گیا کہ ان کو محض ضد اور اپنی بات کی پچ منظور ہے آجکل عموماً یہ حالت ہے کہ محض ایک دوسرے کی ضد میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کہدیتے ہیں مثلاً دو عالموں میں مخالفت ہے تو اب وہ مخالفت دنیوی معاملات سے گذر کر مسائل شرعیہ تک پہونچتی ہے کہ جس مسئلہ میں ایک کا فتوے جواز کا ہوگا دوسرا اس کی ضد میں عدم جواز کا فتوے دے گا۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس ضد کا سہ

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر
میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

یہیں دہلی کا قصہ ہے کہ ایک زمانہ میں یہاں علماء کی دو جماعتیں تھیں ایک جماعت شیخ سدّو کے بکرے کو حلال کہتی تھی اور ایک جماعت حرام بتلاتی تھی ایک مرتبہ دونوں جماعت کے لوگوں کو ایک شخص نے دعوت میں جمع کر لیا جب سب کے سامنے کھانا رکھدیا گیا اور وہ کھانے کو تیار ہوئے تو اس نے کہا کہ ذرا تھوڑی دیر سب حضرات توقف فرمائیں مجھے کچھ کہنا ہے۔ سب نے ہاتھ روک لیا تو اس نے کہا کہ یہ جو گوشت آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے یہ شیخ سدّو کے بکرے کا ہے اب جس کا جی چاہے کھائے جس کا جی چاہے نہ کھائے پس جو لوگ اس کو حرام سمجھتے تھے انہوں نے تو ہاتھ کھینچ لیا تماشا یہ کہ جو لوگ اُس کو

حلال کہتے تھے انھوں نے بھی ہاتھ روک لیا۔ داعی نے ان سے کہا کہ صاحب یہ حضرات اگر ہاتھ روکیں تو ان کو حق ہے کیونکہ یہ اس کو حرام سمجھتے ہیں مگر آپنے کیوں ہاتھ روکا آپ کے نزدیک تو یہ حلال ہے۔ اس وقت وہ کہنے لگے کہ بھائی حق بات تو یہی ہے کہ یہ حرام ہے مگر ہم تو محض ان کی ضد میں اس کو حلال کہتے ہیں سود یکھئے یہ ضد ایسی بری بلا ہے کہ اس میں انسان کیا کچھ کر گذرتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ وہ لوگ آجکل کے اختلاف کرنے والوں سے پھر بہت غنیمت تھے کہ انھوں نے حرام کو صرف زبان ہی سے حلال کیا پیٹ کے اندر اس کو داخل نہیں کیا گویا انھوں نے زبان سے نکالا اندر داخل نہیں کیا۔ نیز موقع پر اپنی غلطی کا اقرار بھی کرلیا کہ ہم جو کچھ کہتے تھے محض ضد میں کہتے تھے اور آجکل اگر کوئی مولوی کسی کی ضد میں حرام کو حلال کہتا ہو اور اس کو ایسا موقعہ پیش آجائے جیسا اُن صاحبوں کو پیش آیا تھا تو آجکل کے ضدّی مولوی کبھی اس کا اقرار نہ کریں گے کہ ہم محض ضد میں اس کو حلال کہتے تھے اور واقع میں حق یہی ہے کہ حرام ہے۔ اور یقیناً سب کے سامنے اپنی بات کی لاج رکھنے کو طوعاً و کرہاً اس کو کھا بھی جائیں گے گو دل نہ مانتا ہو اندر سے جی متلاتا ہو، طبیعت اس کو پھینکنا چاہتی ہو مگر یہ اپنی بات کے پکے بری بھلی طرح اس کو ضرور نگل ہی جائیں گے۔ الغرض امام صاحب کے صاحبزادے کو صورت یکساں ہونے کی وجہ سے شبہ ہو گیا کیونکہ جدال بالحق و جدال بالباطل دونوں کی صورت یکساں ہی تھی اور جس طرح جدال کا اطلاق جدال بالحق پر کبھی ہو جاتا ہے اسی طرح مرار کا اطلاق بھی مرار بالحق پر کبھی ہو جاتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے۔ وَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا (سو آپ ان کے بارہ میں سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے) اس میں مرار بالحق ہی مراد ہے کیونکہ مرار بالباطل کی اجازت کسی درجہ میں نہیں ہو سکتی اور اس آیت میں مرار ظاہر کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگئی ہے تو اس کو صورۃً مرار کہدیا گیا بوجہ مشاکلت کے ورنہ حقیقی مرار حرام ہے۔ حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

مَنْ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ إِلَى آخره مجھے حدیث کے الفاظ بعینہ کم یاد رہتے ہیں اسی طرح حوالہ بھی یاد نہیں رہا کرتا کہ یہ کس کتاب کی حدیث ہے۔ اہلِ[له] علم اس کی تحقیق کرلیں۔ مجھے حدیث کا مضمون یاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علم کو اس لئے حاصل کرے تاکہ اُس کے ذریعہ سے علماء کا مقابلہ کرے اور جاہلوں سے جھگڑا کرے اور لوگوں کا رخ اپنی طرف پھیرے خدا تعالیٰ اس کو جہنم میں داخل کریں گے تو دیکھئے مرا، پر کس قدر شدید وعید ہے مگر افسوس کہ آجکل تحصیل علم سے زیادہ غرض وہی ہوتی ہے جس سے حدیث میں ممانعت وارد ہورہی ہے بلکہ آجکل تو عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں کی تحصیل علم سے کوئی بھی غرض نہیں ہوتی نہ حسن نہ مذموم۔ اب تک توہم یہ سنا کرتے تھے کہ افعال اختیاریہ بدون تصور غایت و غرض کے موجود نہیں ہوسکتے۔ مگر آجکل کے طلبہ کی حالت دیکھ کر اس مسئلہ میں ہم کو شبہ ہوگیا اور جن کی کچھ غرض ہوتی بھی ہے تو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی غرض محض رضاء الٰہی ہو بلکہ اکثر کو تو جاہ مطلوب ہوتی ہے کیونکہ بہت لوگ علم دین پڑھتے ہیں مگر اپنی اصلاح نہیں کرتے اگر رضاء الٰہی ان کو مطلوب ہوتی تو عمل کا اہتمام

[له] قلت وفی ترغیب الترهیب للمنذری ص۲۹ ج۳ ما نصه وروی عن کعب بن مالک قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من طلب العلم لیجاری به العلماء او لیماری به السفهاء ویصرف به وجوه الناس الیه ادخله الله النار۔ رواه الترمذی واللفظ له و ابن ابی الدنیا فی کتاب الصمت وغیره والحاکم شاهدا والبیهقی وقال الترمذی حدیث غریب۱۲ وعن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تعلموا العلم لتباهوا به العلماء ولا تماروا به السفهاء ولا تخیروا به المجالس فمن فعل ذلک فالنار والنار رواه ابن ماجه وابن حبان فی صحیحه والبیهقی کلهم من روایة یحیی بن ایوب الغافقی عن ابن جریج عن ابی الزبیر عنه و یحیی هذا ثقة احتج به الشیخان وغیرهما ولا یلتفت الی من شذ فیه الخ والله اعلم ۱۲ جامع

ضرور ہوتا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت لوگوں کا مشغلہ تحصیل علم کے بعد جھگڑنا ہی رہ جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرار جدال ہی کے واسطے علم حاصل کرتے تھے بس آجکل اسی میں فخر و ناموری سمجھتے ہیں کہ اس سے مقابلہ بحث کرلی اس سے جھگڑلیے کچھ جاہل ان کی طرف ہوگئے پھر علاوہ ناموری کے اس صورت میں آمدنی بھی زیادہ ہوتی ہے اور جب ان دونوں جھگڑنے والوں میں فیصلہ نہیں ہوتا تو علما محققین کے پاس سوالات جاتے ہیں اور خواہ مخواہ ان کو بھی اس جھگڑے میں پھانسا جاتا ہے اگر کوئی اللہ کا بندہ اس سے احتیاط کرے اور جھگڑے سے بچنا چاہے تو اس کے پاس سے ٹلتے نہیں اس کے سرہو جاتے ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ میں مفتی سعداللہ صاحب و مولوی سراج الدین صاحب میں لفظ اِخیتر کی بابت اختلاف ہوا کہ فصیح اِخیتر (بکسرالہمزہ) ہے یا اُخیتر (بضم الہمزہ) ایک کسرہ فصیح کہتے تھے ایک ضمہ کو مگر فیصلہ نہ ہوتا تھا بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اس اختلاف میں پڑنے سے تم کو کتنی رکعتوں کا ثواب ملا ایک فضول بحث میں وقت ضائع کیا اور فریقین نے دوسرے علمار سے استفتے کئے مولوی سراج الدین صاحب نے جو کہ بہت ہی ذکی ہیں مفتی محمد یوسف صاحب کی خدمت میں بھی سوال بھیجا انھوں نے یہ کہکر واپس کردیا کہ یہ کوئی دین کا مسئلہ نہیں جس کا جواب دیا جائے فضول بحث ہے تو مولوی سراج احمد صاحب بولے کہ اس کو دین بنانا کیا مشکل ہے آپ نے فوراً ایک صورت اپنے ذہن سے گھڑی اور اس طرح استفتار لکھا کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی بی بی سے کہا کہ اگر آج صبح سے شام تک تو نے کوئی لفظ غیر فصیح بولا تو تجھ پر تین طلاق۔ اس عورت نے لفظ اخیتر بولا تو اس پر طلاق ہوئی یا نہیں۔ پھر یہ استفتا مفتی صاحب کے پاس بھیجا گیا وہ بے چارے یہ سوال دیکھ کر مجبور ہوگئے اور ان کو اپنی تحقیق لکھنی پڑی یہ بھی اس لئے کہ شاید مفتی صاحب اس سوال سے پریشان ہوگئے ورنہ آزاد محقق اُس کا بھی جواب دے سکتا تھا وہ یہ کہتا کہ میں صاحب واقعہ کو جواب دوں گا تم کو جواب نہ دونگا یا یہ کہتا کہ جواب دینا فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں جاؤ میں تم کو جواب نہ دونگا۔

کسی اور سے پوچھو مگر ایسے جواب کے لئے کسی قدر ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ ایسے جواب دینے والے کو لوگ جاہل اور بد مزاج کج اخلاق مشہور کریں گے تو جس میں اتنی ہمت ہو کہ اگر کوئی اسکو جاہل وغیرہ کہدے تو بُرا نہ مانے وہ شخص ایسا جواب دے سکتا ہے مگر ایسی ہمت والے کم ہیں خصوص آجکل تو یہ حالت ہے کہ علماء سوال کرنے والوں سے ڈرتے ہیں ان کو بیہودہ سوال سے روک نہیں سکتے کہ اگر روکیں گے تو یہ ہم کو بدنام کریں گے یا مدرسہ کا چندہ بند کردیں گے اس لئے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں حالانکہ بعض لوگ محض تعنت کی راہ سے سوال کرتے ہیں۔ ان کا مقصود حق بات کا معلوم کرنا نہیں ہوتا بلکہ مجیب کو پریشان کرنا ہوتا ہے ایسے شخص کو تو جواب دینا شاید جائز بھی نہ ہو کیونکہ ایسا سوال گناہ ہے اور مجیب اس کی اعانت فی السوال کر رہا ہے کیونکہ اس کے جواب دینے سے سائل کو آئندہ کے لئے سوال کی جرأت بڑھتی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ بھیک مانگنے والے جنکو بھیک مانگنا حرام ہو ان کو دینا بھی حرام ہے کیونکہ ان کو سوال کرنا ہی حرام ہے اور دینے سے سوال کی اعانت ہوتی ہے اور اعانتِ معصیت بھی داخل معصیت ہے پس ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دینا چاہیئے اگر وہ یہ کہے کہ تم کو جواب معلوم ہی نہیں تو کہدو اچھا ہم تو جاہل ہیں پھر تم ہم سے کیوں سوال کرتے ہو اور اگر کوئی یہ کہے کہ تم کو تو جواب معلوم ہے پھر کیوں نہیں بیان کردیتے اس سے کہدو کہ ہاں معلوم ہے مگر تجھ کو نہ بتلاویں گے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　　　بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار عشق و مستی کو بیان نہ کرو اس کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو)

غضب تو یہ ہے کہ آجکل ہر سوال کے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے گو جواب معلوم بھی نہ ہو تو گھڑ گھڑ کر جواب لکھتے ہیں محض اس لئے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ فلاں شخص کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ۔

حالانکہ کسی بات کا جواب معلوم نہ ہوتا کوئی عیب نہیں کیونکہ علم محیط تو حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔ بڑے بڑے عالم بلکہ امام اور مجتہد کو بھی کہیں کہیں لَا اَدْرِیْ (مجھے معلوم نہیں) کہنا پڑتا ہے۔

(۱) تشنگی محل

کسی امام کی (یعنی مالک رحمہ اللہ) کی حکایت ہے کہ ان سے ایک مجلس میں چالیس سوالات کئے گئے تو انھوں نے صرف چار کا جواب دیا باقی سب کی نسبت یہی فرماتے رہے لَا اَدْرِیْ لَا اَدْرِیْ یعنی مجھے معلوم نہیں۔ پس نہ معلوم ہونے کی صورت میں خواہ مخواہ درپے جواب کے ہونا تو مذموم ہے ہی میرے نزدیک تو اگر جواب معلوم بھی ہو تو متعنت کے سامنے بیان نہ کرے اس سے تو انکار ہی کردے۔ اور یوں کہدے ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز کو ظاہر کیا جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ نہ معلوم ہو)

الغرض جواب دینے والے کو سائل کا تابع نہ ہونا چاہیئے بلکہ سائل کو اپنا تابع بنانا چاہیئے اور اگر وہ تابع نہ رہے تو اس کو جواب ہی نہ دے پس اگر یہ معلوم ہو کہ سائل منصف ہے اور طالب حق ہے اس کو ضرور جواب دے بلکہ اپنے کاموں کا حرج کر کے بھی اس کو جواب دینا چاہیئے اور اگر متعنت ہے اس کو ہرگز جواب نہ دے۔ ایسے شخص کو جواب دینے کو طبیعت بھی نہیں چاہتی اور منصف کو جواب دینے کے لئے طبیعت میں خود بخود تقاضا ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے حقیقت واضح کردی جائے۔ مولانا عبدالقیوم صاحبؒ کی عادت تھی کہ فضول سوال کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔ اور محققین نے ہمیشہ اس کا لحاظ کیا ہے کہ وقت کو فضول ضائع نہ کیا جائے اول تو ان کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی شخص کوئی مسئلہ ان سے پوچھتا تو اپنی طرف سے فتوے کبھی نہ دیتے تھے بلکہ کتاب کا نام لیکر فرمایا کرتے کہ درمختار یا ہدایہ وغیرہ میں یوں لکھا ہے۔ یہ تو آپ کی غایت احتیاط کا نمونہ ہے اور اگر کوئی شخص فقہی مسئلہ معلوم کرنے کے بعد یہ سوال کرتا کہ یہ مسئلہ کسی حدیث میں بھی ہے یا نہیں تو آپ فرمادیتے کہ میں نو مسلم نہیں ہوں خدا کا شکر ہے کہ میرے آباؤ اجداد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مسلمان چلے آرہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

جو کچھ کیا اس کو اُن حضرات نے یاد رکھا جو اس زمانہ میں موجود تھے پھر جو کچھ ان کو کرتے ہوئے دیکھا اس پر ان کی اولاد نے عمل کیا۔ اسی طرح سلسلہ بسلسلہ دین مجھ تک پہونچا ہے اس لئے مجھے حدیث کی ضرورت نہیں حدیث کی احتیاج صرف نومسلم لوگوں کو ہے جن کے آباؤ اجداد نے اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ان کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل اپنے باپ دادوں کے ذریعہ سے معلوم نہیں ہوا اس لئے احادیث کے ذریعہ سے معلوم کرنے کی ان کو ضرورت ہے مولانا عبدالقیوم صاحب کے اس جواب کا منشا صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ سائل کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ تیرا یہ سوال فضول ہے کیونکہ اگر ہم نے تجھے یہ بتلا بھی دیا کہ فلاں حدیث اس مسئلہ کی دلیل ہے تو تجھ کو وجہ دلالت کیونکر معلوم ہو گی اب اگر ہم وجہ دلالت بھی بیان کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے مقدمات اور مبادی تم کو اسی وقت پڑھاویں اور اگر وجہ دلالت میں تم ہماری تقلید کرو گے کہ چونکہ مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ پر دلالت کرتی ہے اس لئے مانتا ہوں تو پھر تم پہلے ہی سے ہماری تقلید کیوں نہیں کرتے کہ یہ مسئلہ شریعت میں اسی طرح ہے جس طرح مولوی صاحب نے بتلایا ہاں جو شخص وجہ دلالت کو سمجھ سکتا ہو یعنی طالب علم ہو جو مقدمات اور علوم مبادی سے واقف ہو چکا ہو اس کو اس سوال کا حق ہے اس کے سامنے دلائل حدیثیہ بیان کرنے کو جی بھی چاہتا ہے۔ باقی جاہلوں کے سامنے یہ علوم بیان کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تم کو تنگ کرے اور کسی مسئلہ کی تحقیق و تدقیق کرنی چاہے تو رطب و یابس بنہات و جواب اس کے سامنے رکھدو اور کہدو کہ ان میں سے تم خود انتخاب کرلو۔ مجھے انتخاب اور ترجیح کی فرصت نہیں مجھے اور بھی کام کرنا ہے جس کے واسطے میں پیدا ہوا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب نے اس کی ایک مثال بھی ارشاد فرمائی کہ ایک شخص نے جس کے کچھ بال سفید کچھ سیاہ تھے حجام سے کہا کہ میری داڑھی میں سے سفید سفید بال چھانٹ دے اس نے

استرہ لے کر سارے بال مونڈا ور سب کو سامنے رکھ کر کہا کہ اس میں سے سفید سفید چھانٹ لیجئے مجھے فرصت نہیں۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کے ارشاد پر عمل کرنا اسی شخص کو آسان ہے جو ننگ و ناموس کو آگ لگا چکا ہو کیونکہ ایسے جواب سے مجیب کی وقعت نہیں ہوتی لوگ اس کو جاہل یا بدمزاج مشہور کر دیتے ہیں۔ اسی لئے آجکل ایسے جواب بہت کم لوگ دیتے ہیں اکثر تو جھک جھک میں مشغول ہی ہو جاتے ہیں سلف کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ فضول وقت ضائع نکیا جائے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے ایک معقولی صاحب آکر لپٹ گئے کہ میں آپ سے مناظرہ کروں گا مولانا نے فرمایا کہ مناظرہ سے دو مقصود ہوتے ہیں ایک اظہار حق یہ تو آجکل مفقود ہے دوسرے بڑا بننا اور اپنی شان علم جتلانا آجکل زیادہ یہی مقصود ہوتا ہے تو اس کے لئے آپ کو مناظرہ کی ضرورت نہیں فضول کیوں مشقت میں پڑتے ہیں بآواز بلند کہے دیتا ہوں کہ صاحبو! آپ مجھ سے زیادہ عالم ہیں میں جاہل ہوں مجھے کچھ نہیں آتا بس آپ کا مقصود حاصل ہو گیا۔ چنانچہ مولانا نے بآواز بلند یہ مضمون فرما دیا اور وہ معقولی اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ سبحان اللہ! یہ حضرات کیسے بے نفس تھے اپنے آپ کو بالکل مٹائے ہوئے تھے۔ حضرت استاذ علیہ الرحمہ (مولانا محمد یعقوب صاحب کی عادت تھی کہ درس میں اگر کسی طالب علم نے آپ کی تقریر پر اعتراض کیا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ مجھ سے تقریر میں غلطی ہوئی ہے تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے تھے پھر ایک دفعہ نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بار بار فرماتے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی یہاں تک کہ اعتراض کرنے والا شرما شرما جاتا تھا اور بعض دفعہ جب کسی مضمون میں پڑھاتے ہوئے شرح صدر نہ ہوتا تو صاف فرما دیتے کہ مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا پھر اسی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ عین درس میں طلبہ کے سامنے کتاب اٹھا کر اپنے ماتحت مدرسین میں سے کسی کے پاس پہونچ جاتے اور بے تکلف فرما دیتے کہ مولانا مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا ذرا آپ اس کی تقریر فرما دیجئے انھوں نے تقریر کر دی تو پھر اپنے حلقۂ درس

ہیں انہی صاحب کا نام لے کر فرمانے کہ مولانا نے اس مقام کی یہ تقریر کی ہے
حقیقت میں ایسا بے نفس ہونا بڑا مشکل ہے آجکل لوگ اس کو ذلت سمجھتے ہیں
مگر واللہ عزت تواضع ہی میں ہے چنانچہ حدیث میں ہے من تواضع للہ رفعہ اللہ
(جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفعت عطا فرماتے ہیں)
آخر ان حضرات نے جو ایسی بے نفسی اختیار کر رکھی تھی کیا اس سے ان کی جاہ و عزت
میں کچھ کمی آگئی بخدا پہلے سے زیادہ عزت ہوگئی کہ آج ان کی یہ باتیں کمالات اور
کرامات میں شمار ہو رہی ہیں لیکن طلبہ کے ساتھ یہ برتاؤ اسی وقت تک ہونا چاہیے
جبکہ سوال صحیح ہو اور اگر بیڈھنگا سوال ہو جسکے طرز سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد محض اعتراض
اور پریشان کرنا ہے تو اول اس کو حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ
کی طرح الزامی جواب سے خاموش کر دو۔ مولانا کو الزامی جواب میں بہت ملکہ تھا مگر
وہ ایسوں ہی کے واسطے ہوتا تھا جن کا مقصود محض اعتراض ہوتا اور جو لوگ
تحقیق کے طالب معلوم ہوتے ان کے سامنے تحقیقی جوابات بھی خوب بیان فرماتے
تھے۔ مولانا میں ظرافت بھی بہت تھی جب طالب علم الزامی جواب سے ساکت
ہو جاتا تو فرما دیا کرتے تھے کہ تالاب پاس ہے (یعنی اس میں جا کر ڈوب مرو)
اور اگر کوئی شخص اس سے بھی باز نہ آوے تو اس کو جواب ہی نہ دو ؎

آنکس کہ بقرآن و خبر زو نرہی
آنست جوابش کہ جوابش ندھی

(جو شخص قرآن اور حدیث کے جواب کو تسلیم نہ کرے اس کا جواب یہ
ہے کہ اس کو جواب نہ دو)

اور اگر اس پر بھی متنبہ نہ ہوا اور جواب کا تقاضا ہی کرتا رہے تو اس کو حلقۂ درس سے
نکال دو کیونکہ جس شخص کو اپنی بات کی پچ کرنے کا مرض ہو وہ ہرگز پڑھانے کے
قابل نہیں اگر اس کے اس مرض کا علاج نہ کیا گیا اور اسی طرح سر آنکھوں پر بٹھا لیا
گیا تو اس میں ہمیشہ کے لئے یہ عادت پختہ ہو جائے گی کہ جو بات اس کے منہ سے

نکلے گی اس کی پیچ کیا کرے گا حق و ناحق کی ذرا پروا نہ کرے گا۔ اور اس کا دین پر جو برا اثر پڑے گا وہ ظاہر ہے۔

بد گہر را علم و فن آموختن   دادن تیغ است دست راہزن

(نااہل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دیتا ہے)

کلکتہ میں ایک عالم نے مسئلۂ رضاع غلط لکھا اور علماء کے پاس اس کو دستخط کے واسطے بھیجا علماء نے بالاتفاق اس پر دستخط سے انکار کیا کہ یہ تو بالکل غلط مسئلہ ہے۔ کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا آخر میں ان کو اپنی غلطی کا علم بھی ہو گیا تھا۔ مگر بات کی پیچ بری بلا ہے۔ انھوں نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ لکھ مارا اور اس میں واہی تباہی دلائل سے اپنے مطلب کو ثابت کرنا چاہا پھر وہ اپنے استاد کے پاس اُس فتوے کو لے گئے۔ اور ان سے جا کر کہا کہ اس مسئلہ میں سب لوگ مجھ سے علٰحدہ ہیں کوئی میرے ساتھ نہیں آپ ہی میرا ساتھ دیدیجئے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی یہ تو غلط مسئلہ ہے۔ اس میں ساتھ کیونکر دوں۔ کہنے لگے کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ غلط ہے مگر اب تو زبان و قلم سے نکل گیا اب تو جس طرح ہو میری تائید کر دیجئے مگر استاد نے ساتھ نہیں دیا۔ افسوس دین کو کھیل بنا رکھا ہے کہ محض اس وجہ سے کہ ایک بات زبان سے نکل گئی ہے اُس کی لکیر پیٹے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کا غلط ہونا معلوم ہے نہ معلوم ان لوگوں کے دلوں سے خوف خدا کہاں جاتا رہا۔ اب سُنا ہے کہ اُن عالم مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا خدا معاف کرے۔ اگرچہ جرم بہت سنگین ہے میں تمام مدرسین و مہتممین مدارس سے بالتجا عرض کرتا ہوں کہ للّٰہ اس بات کا کچھ انتظام کیجئے کہ سب طلبہ کو ایک لاٹھی نہ ہانکا جائے اور سب کی تعلیم کو ضروری نہ سمجھا جائے بلکہ جس شخص کے اخلاق خراب ہوں اول اس کے اخلاق کی اصلاح کا اہتمام کیا جائے۔ بات بات پر اس کو ٹوکا جائے، اگر اصلاح کی امید نہ ہو تو مدرسہ سے علٰحدہ کیا جائے۔ اسی طرح جس طالب علم کی طبیعت میں کجی معلوم ہو سلامتی سے محروم ہو اس کو بھی ہرگز پورا نصاب نہ پڑھایا جائے کیونکہ تکمیل نصاب کے بعد وہ خود بھی

اور دوسرے لوگ بھی اس کو عالم و مقتدا سمجھیں گے اور ایسا شخص مقتدا ہو کر جو کچھ ستم ڈھائے گا ظاہر ہے پھر ان سب کا وبال ان مدرسین و مہتممین کے اوپر ہوگا کہ انہوں نے ایسے نااہلوں کو کیوں علم پڑھایا میری رائے میں ایسے لوگوں کے لئے ایک مختصر نصاب اردو میں یا فارسی میں یا کسی قدر عربی میں مقرر کر لیا جائے جو ضروری مسائل و احکام کے جاننے کے لئے کافی ہو وہ نصاب پڑھا کر ان سے کہہ دیا جائے کہ جاؤ دنیا کا کوئی کام سیکھو اور کماؤ کھاؤ مجھے حیرت ہے کہ بعض مدارس میں ایک ہزار بعض میں پانچسو بعض میں سو دوسو طلبہ تعلیم پاتے ہیں کیا یہ لوگ سب کے سب مقتدا بننے کے اہل ہیں یقیناً نہیں اور ہرگز نہیں پھر اہل مدارس سب کو مقتدا کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ بخدا مسلمانوں پر زیادہ تباہی ان نااہل مولویوں کی وجہ سے بھی آئی ہے کہ ان لوگوں نے دین کو کھیل بنا لیا ہے جیسا موقع دیکھا ویسا فتویٰ دیدیتے ہیں حتیٰ کہ عوام کہنے لگے کہ بس جی دین تو مولویوں کے ہاتھ میں ہے جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس کو چاہیں حرام اس بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انھوں نے علماء سے دریافت کرنا ہی چھوڑ دیا جس کے جی میں آیا کر لیا خواہ حلال ہو یا حرام پھر اس صورت میں قہر خداوندی نازل ہونا ہی تھا۔ اس لئے میں مکرر کہتا ہوں کہ اہل مدارس کو طلبہ کا انتخاب کرنا چاہیئے اور ان میں جو اہل نظر آئیں انہی کو پوری تعلیم اور انہی کو سند فراغ دینی چاہیئے مگر اب تو بلا یہ ہے کہ لوگوں کو انتساب کا شوق ہے کہ ہمارے یہاں سے اس سال اتنے آدمی فارغ ہوئے۔ اے صاحبو! طلبہ کا فارغ کرنا بہت عمدہ ہے مگر وہ پہلے اہل تو ہوں واللہ کس قدر افسوس ہوتا ہے جب بعض فارغین کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے اعراب بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے حالانکہ اس پر اعراب لگے ہوئے ہیں وہ ان کو دیکھ کر بھی غلطی کرتے ہیں اور کتابوں کے اعراب تو وہ کیا خاک صحیح پڑھیں گے بھلا ایسے نااہلوں کے فارغ کرنے سے کیا خوشی ہو سکتی ہے بجز اس کے کہ اپنے ذمہ خیانت کا وبال رہے اور کچھ نفع نہیں صاحبو! مجھ کو سخت اندیشہ ہے کہ علماء سے خصوصاً اہل مدارس سے کہیں اس کی بازپرس خدا تعالےٰ کے یہاں نہ ہو

اس کی اصلاح کی جلد فکر کیجیے۔ یہ مضمون بہت طویل ہوگیا۔ میں یہ بیان کررہا تھا کہ طلبہ کے فضول سوالات کا جواب نہ دینا چاہیئے کیونکہ بعض طلبہ محض تنگ ہی کرنا چاہتے ہیں حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے یہاں ایک شخص پڑھتے تھے ان کی عادت تھی اعتراض کرنے کی بہت تھی مگر ہمیشہ ایک دعوےٰ کردیا کرتے کہ یہ بات تو یوں نہیں یوں ہے اور جب مولانا دلیل پوچھتے تو آپ کہتے کہ کیا سارا کام میں ہی کروں دعویٰ میں نے کردیا دلیل آپ بیان کردیجیے۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت دعویٰ تھا جس کی دلیل مدعی اپنے ذمہ نہیں سمجھتے تھے غرض آجکل جدال بالباطل کا بہت چرچہ ہے۔ علماء و طلبہ میں سے کوئی بھی اس مرض سے خالی نہیں اِلَّا مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ (مگر جس کو اللہ تعالےٰ بچائے) یہ آیت جو میں نے اس وقت پڑھی ہے قابل سبق لینے کے ہے اس میں حق تعالےٰ نے جدال بالباطل کی مذمت عجیب طرز سے بیان فرمائی ہے جس سے علم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو مجادلہ کرتے ہیں اللہ کے بارے میں یعنی خدا کی ذات و صفات و احکام میں جن میں توحید اعلیٰ فرد ہے اور بقیہ احکام اس کے بعد ہیں سب میں جدال کرنا جدال فی اللہ ہے گو درجات متفاوت ہیں اور جدال تو خود ہی مذموم ہے پھر جدال فی اللہ تو سب سے زیادہ مذموم ہے آگے فرماتے ہیں بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ۝ یعنی مجادلہ کرتے ہیں ذات و صفات و احکام الٰہی میں بدون علم کے اور بدون ہدایت کے اور بدون روشن کتاب کے اب یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ یہ قیود احترازیہ نہیں ہیں کیونکہ جدال فی اللہ کی جو کہ مذموم ہی ہوگا دو قسمیں نہیں ہوسکتیں کہ ایک وہ جو علم و ہدایت اور کتاب کے ساتھ ہو دوسرے وہ جو ان کے بغیر ہو بلکہ جدال بالباطل جب ہوگا ان تینوں کے بغیر ہی ہوگا معلوم ہوا کہ یہ قیود واقعیہ ہیں مطلب یہ ہوا کہ جدال فی اللہ یعنی جدال بالباطل کا سبب ان ہدایت و کتاب منیر کا حاصل نہ ہونا ہے پھر اسی کی ساتھ ایک بات اس جگہ یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ علم سے مراد جس میں ہدایت و کتاب منیر بھی داخل ہے مطلق علم نہیں کیونکہ جدال بالباطل کے ساتھ

مطلق علم کا اجتماع تو ممکن اور مشاہد ہے بلکہ یہاں وہ علم مراد ہونا چاہیئے جو کہ جدال بالباطل کے ساتھ جمع نہ ہوسکے پس یہاں علم سے خاص علم یعنی علم صحیح و نافع مراد ہے۔ اب یہاں سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی کہ علم صحیح و نافع کیسی قدر کی چیز ہے کہ جدال بالباطل اس کی ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور جو شخص علم صحیح و نافع سے محروم ہے وہ جدال بالباطل جدال فی اللہ میں جو کہ جدال بالباطل کا اعلیٰ فرد ہے پھنس جاتا ہے اور جدال بالباطل کا مذموم ہونا سب کو مسلم ہے تو جس چیز پر اس سے بچنا موقوف ہے اس کی ضرورت کا انکار نہیں ہوسکتا لہذا یہ مسئلہ ثابت ہوگیا کہ علم نافع و علم صحیح کی سخت ضرورت ہے اور یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہوگئی کہ جب جدال بالباطل علم صحیح کیساتھ جمع نہیں ہوسکتا تو جو لوگ باوجود علم صحیح و ہدایت و کتاب منیر کے حاصل کرنے کے پھر جدال بالباطل میں مبتلا رہتے ہیں یا تو انھوں نے ان تینوں کو سمجھ کر حاصل نہیں کیا یا اگر سمجھ کر حاصل کیا ہے تو جدال کے وقت جان بوجھ کر ان سے اعراض کرلیا ہے ورنہ اگر وہ ہر وقت ان تینوں پر نظر رکھتے اور پوری طرح عمل کرتے اور کسی وقت کسی مسئلہ میں ان سے اعراض نہ کرتے تو وہ ہرگز جدال بالباطل میں مبتلا نہ ہوتے خوب سمجھ لو جب علم کی ضرورت معلوم ہوگئی تو اب میرا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو علم نافع حاصل کرنا چاہیئے اور اس کی طرف پوری توجہ کرنا چاہیئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو نماز روزہ کی طرف تو توجہ ہے مگر علم نافع کی طرف توجہ نہیں اگر کوئی نماز نہ پڑھے روزہ نہ رکھے زکوٰۃ نہ دے حج نہ کرے تو سب لوگ اس کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں اور اگر کوئی شخص علم دین بالکل حاصل نہ کرے تو اس کو بُرا کوئی نہیں کہتا، حالانکہ بقدر ضرورت علم حاصل کرنا ہر شخص کے ذمہ ویسا ہی فرض عین ہے جیسا کہ نماز روزہ وغیرہ میرا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ مولوی بن جاویں اور میرا یہ مطلب ہو کیونکر سکتا ہے۔ میں تو ابھی اہل مدارس کو مشورہ دے چکا ہوں کہ وہ سب طلبہ کو مولوی نہ بنایا کریں تو جب میں سب طلبہ کا مولوی ہونا پسند نہیں کرتا تو عوام کا مولوی ہونا میں کیوں چاہوں گا۔ پس آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ آپ کو مولوی بننا پڑے گا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ مسائل و احکام شرعیہ کا علم بقدر ضرورت

اردو زبان ہی میں حاصل کر لیا جائے اور بچوں کو اہتمام کے ساتھ مکتب میں قرآن اور دینی رسائل پڑھنے کے لئے بھیجا جائے جب وہ بقدر ضرورت مسائل سے واقف ہو جائیں پھر تمہیں اختیار ہے جس کام میں چاہو لگاؤ اور جو رؤسار کے بچے ہیں جن کو خدا نے مالی وسعت عطا فرمائی ہے ان کو چاہئے کہ علم دین کی پوری تعلیم دی جائے کیونکہ ان کو معاش کی فکر سے خدا نے بچایا ہے تو اس کا شکر اس طرح ادا کرنا چاہئے کہ یہ لوگ دین کی خدمت کریں اور اگر پوری تعلیم نہ دی جائے تو کم از کم قرآن اور اردو کے ضروری دینی رسائل تو ان کو ضرور پڑھا دیئے جائیں تاکہ وہ اپنے مذہب سے تو کسی قدر واقف ہو جائیں اور جو لوگ اردو بھی نہ پڑھ سکیں جیسے گاؤں کے کاشتکار وغیرہ ان کو چاہئے کہ علماء سے ملتے رہیں اور مسئلے پوچھتے رہیں اگر وہ روزانہ ایک مسئلہ بھی یاد کر لیا کریں تو سال بھر میں تین سو ساٹھ مسئلے یاد ہو سکتے ہیں۔ رہ گئی عورتیں ان کو مرد تعلیم دیا کریں اور جو مرد پڑھے لکھے نہ ہوں وہ عورتوں سے کہدیا کریں کہ تم کو جو مسئلہ پوچھنا ہو ہم سے کہدیا کرو ہم علماء سے پوچھ کر تم کو بتلا دیں گے۔ بس اس ترکیب سے ساری امت بقدر ضرورت علم سے فیضیاب ہو سکتی ہے۔ اور جو لوگ اردو پڑھ بھی سکتے ہیں ان کو بھی علماء سے ملنے ملانے اور سوال کرنے کا عادی رہنا چاہئے کیونکہ بعض بات کتاب سے حل نہیں ہوتی علماء سے زبانی دریافت کرکے اس کی حقیقت حل ہو جاتی ہے اور دین کے ساتھ تعلق و مناسبت تو بدون صحبت کے حاصل ہوتا ہی نہیں۔

صاحبو! آجکل علم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اول تو مخالفین اسلام جاہل مسلمانوں کو طرح طرح سے بہکاتے پھرتے ہیں پھر خود مسلمانوں میں بعضے فرقے ایسے موجود ہیں جو ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں مگر واقع میں وہ اسلام سے دور ہیں اور بعضے گو مسلمان ہیں مگر گمراہ ہیں تو بعضے جاہل مسلمان ان گمراہ لوگوں کی باتوں کو اسلام کی باتیں سمجھنے لگتے ہیں اور دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر جو جماعت اہل حق کی کہلاتی ہے ان میں بھی بعضے ایسے ہیں جنھوں نے دنیوی اغراض کو قبلہ و کعبہ

بنا رکھا ہے کہ جس کام کے ساتھ ان کی دنیوی غرض متعلق ہوئی اس کو انھوں نے دین کا لباس پہنا کر عوام کے سامنے ظاہر کر دیا اور جس چیز کی ممانعت سے ان کی اغراض میں خلل پڑتا ہو اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے اسی لئے وہ بہت سی باتوں کو جن کو پہلے جائز کہتے تھے آج حرام کہنے لگے اور جن باتوں کو ہمیشہ سے حرام و ناجائز کہتے تھے آج اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے۔ صاحبو! یہ غرض وہ چیز ہے جس میں انسان دین سے اندھا بن جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد　　صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار　　کے شناسد ظالم از مظلوم زار

(جب غرض آجاتی تو ہنر پوشیدہ ہو جاتا ہے اور دل کی جانب سے سیکڑوں پردے آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں۔ جب قاضی دل میں رشوت لینے کی دل میں ٹھان لیتا ہے تو ظالم اور مظلوم میں امتیاز نہیں کر سکتا)

یعنی جب قاضی کے دل میں رشوت کی طمع ہوگی اُس سے صحیح فیصلہ کی امید بیکار بلکہ دور از کار ہے شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ پھر ایسے لوگوں کو تم اہل حق کیوں کہہ رہے ہو سو سن لیجئے کہ میں نے ان کو اہل حق عقائد کے لحاظ سے کہا ہے کہ ابھی تک شکر ہے ان کے عقائد صحیح ہیں اگرچہ اس غرض پرستی کے ساتھ عقائد کا بھی سخت اندیشہ ہے چنانچہ آجکل دیکھا جاتا ہے کہ اہل حق کی جماعت کے بعض افراد ان اہل بدعت اور ملحدین کے ساتھ باہم شیر و شکر ہو رہے ہیں جو ان کو کافر کہتے تھے اور یہ ان کو فاسق و فاجر کہتے ہیں پس حب فی اللہ و بغض فی اللہ کا اثر تو ابھی سے مرتا چلا ہے آگے خدا حافظ ہے غرض اہل حق میں سے بعض ہم جیسے بھی ہیں جنھوں نے دین کو اغراض کے تابع کر رکھا ہے وہ صاف کہتے ہیں کہ آخر مصلحت وقت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں بعض علماء سے آجکل کہا گیا کہ عوام بعض امور میں شریعت کی حد سے بہت دور نکل گئے ہیں اس کی روک تھام ہونی چاہئے تو وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جوش و خروش میں ایسا بھی ہو جاتا ہے کچھ پروا نہیں اس وقت تو کام ہونے دو پھر بعد میں

مسائل کو بھی دیکھ لیا جائے گا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اے صاحبو! آسمان نہیں پھٹ جاتا زمین شق نہیں ہو جاتی جب ایک عالم کی زبان سے یہ بیہودہ کلمات نکلتے ہیں افسوس مسلمان کی مصالح پر ایسی نظر بالخصوص ایک عالم کی نہایت شرم کی جگہ ہے مسلمان کو تو مصالح کے بارے میں یہ کہنا چاہیئے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(یعنی بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی محبوب حقیقی کے ہو رہو)

بس ساری مصلحتوں اور تدبیروں کی جڑ یہ ہے کہ ایک کو راضی کر لو سب کام بن جائیں گے ذرا اس تدبیر کو اختیار کر کے تو دیکھو اسی میں وعدہ ہے مال وجاہ و عزت و شوکت وغیرہ حاصل ہونے کا حق تعالےٰ فرماتے ہیں وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ہ

(وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور کیے انھوں نے اچھے کام کہ ضرور ضرور خلیفہ بنائے گا ان کو زمین میں جیسے خلیفہ بنایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے اور ضرور تمکین دے گا ان کے لئے ان کے دین کو وہ دین جو اللہ تعالےٰ نے ان کے لئے پسند کیا اور ضرور ضرور بدلے میں دیگا ان کو بعد ان کے ڈرنے کے اور عبادت کریں گے وہ میری اور نہ شریک کریں گے وہ میرے ساتھ کسی چیز کو)

اس آیت میں استخلاف فی الارض کا وعدہ ایمان و اعمال صالحہ پر مرتب فرمایا ہے اور اس استخلاف کی غایت بھی تمکین دین و عبادت مع التوحید بیان فرمائی ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ استخلاف فی الارض مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات ایمان و اعمال صالحہ و اتباع احکام ہے اس کے استحکام و حفاظت کے لئے سلطنت عطا فرمانے کا بھی وعدہ ہے پس یہ کس قدر افسوس کی بات ہے

کہ آجکل مقصود بالذات کو تابع اور تابع کو متبوع بنایا جا رہا ہے۔ ایک دوسری جگہ حق تعالٰے فرماتے ہیں وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (اور بتحقیق ہم زبور میں نصیحت کے بعد کہہ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے) اس آیت میں عباد صالحین کے لئے وراثت ارض کا وعدہ ہے تو مسلمان کو ان آیات پر نظر کر کے احکام کا اتباع کرنا چاہیئے اور تمام مصالح کو تابع احکام بنانا چاہیئے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ وعدہ ضرور پورا ہوگا گو کسی وقت ظہور وعدہ میں دیر ہو جائے تو اس سے گھبرانا نہ چاہیئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی تباہی کے لئے بددعا فرمائی تھی رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ ۖ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ

(ترجمہ) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب (ہم کو یہ بات کشف اور وحی کے ذریعہ سے معلوم ہو گئی کہ) آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں دیئے اے ہمارے رب اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں ہے نہیں اور جو حکمت تھی وہ حاصل ہو چکی تو اب ان کے اموال و نفوس کو کیوں باقی رکھا جائے پس) اے ہمارے رب ان کے مالوں کو نیست و نابود کر دیجئے اور (ان کے نفوس کی ہلاکت کا سامان کر دیجئے اس طرح کہ) ان کے دلوں کو (زیادہ) سخت کر دیجئے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہو جاویں) سو یہ ایمان نہ لانے پاویں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذاب الیم (کے مستحق ہو کر اس) کو دیکھ لیں اس دعا کے بعد حق تعالٰے کا فوراً یہ ارشاد ہوا قَالَ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَانِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ اللہ تعالٰے نے فرمایا کہ تم دونوں کی (موسیٰ و ہارون علیہما السلام مراد ہیں کیونکہ حضرت ہارون اس

دعا پر آمین کہہ رہے تھے اور آمین کہنا بھی دعا میں شریک ہوتا ہے) دعا قبول کر لی گئی سو تم (اپنے منصبی کام پر) مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں پس باوجودیکہ دعا قبول ہو چکی تھی اور اس کی قبولیت کی اطلاع بھی فوراً دیدی گئی تھی مگر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ظہور اس دعا کا چالیس سال کے بعد ہوا مفسرین نے وَلَا تَتَّبِعٰنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ کی تفسیر میں لکھا ہے یعنی استعجال نہ کرنا یعنی جیسا کہ جاہل لوگ دعا کے اگلے ہی دن وحی کے منتظر ہوا کرتے ہیں۔ دیکھئے اگر آپ کسی طبیب کے پاس جائیں کہ مجھ کو مسہل کی ضرورت ہے مسہل دیدو تو یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے کہ آج تم نے درخواست کی اور کل ہی دست آنے لگیں ہرگز نہیں بلکہ وہ اول منضج کا نسخہ لکھے گا مہینہ بھر اس کو پینا پڑے گا اس کے بعد وقت اور موسم کو دیکھ کر مسہل دیا جائے گا اور ہر مسہل کے بعد تبرید ہو گی پھر اگر مسہل میں کچھ کسر رہ گئی تو کوئی ملین شربت مہینہ بھر پینا پڑے گا۔ غرض چار مہینہ کے بعد کہیں مسہل پورا ہو گا لوگ یوں چاہتے ہیں کہ صبح کو نسخہ پی کر شام ہی کو دست آجاویں سو بعضے طبیب ایسے بھی ہیں لیکن وہ آپ کو ایسا مسہل دیں گے کہ مادہ کے ساتھ روح کا بھی اخراج کر دے گا ایک جاہل طبیب نے ایک شخص کو مسہل دیا تھا نہ معلوم جمالگوٹہ دیدیا تھا یا کیا اس کو بیحد دست آنے شروع ہو گئے لوگوں نے طبیب صاحب سے آکر کہا کہ دست بہت آگئے اب بند کر دینے چاہئیں کہا نہیں ابھی اور آنے دو مادہ نکل رہا ہے کچھ دیر کے بعد لوگ پھر آئے کہ حکیم جی ضعف بہت ہو گیا دست بند ہی نہیں ہوتے کہا کچھ حرج نہیں مادہ فاسدہ نکل رہا ہے تھوڑی دیر کے بعد پھر اطلاع دی کہ وہ تو مرنے کو ہو رہا ہے کہا نہیں جب مادہ نکل جائیگا خود اچھا ہو جائے گا' یہاں تک کہ وہ اسی میں مر گیا لوگوں نے حکیم صاحب سے کہا کہ وہ تو مر بھی گیا۔ تو آپ فرماتے ہیں اللہ رے مادے نکلنے میں تو یہ حال کیا کہ مار ڈالا اگر رہتا تو کیا حال ہوتا۔ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ موت سے آگے کیا ہوتا۔ تو آجکل لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہم کو ایسا ہی مسہل دیا جائے۔ لیکن

محقق طبیب ایسا کبھی نہیں کرسکتا وہ ہر کام کو موقع اور وقت دیکھ کر کرے گا اگر تم اس سے یہ جاکر کہو کہ ہم نے کل نسخہ پیا تھا آج دست نہیں ہوئے تو وہ نسخہ لیکر پھاڑ ڈالے گا میری غرض اس مثال سے یہ ہے کہ بعض دفعہ تاخیر ظہور میں حکمتیں ہوا کرتی ہیں اور حقیقت میں وہ تاخیر تمہارے ہی واسطے مصلحت ہوتی ہے مگر چونکہ ہم کو اپنی مصلحت کا بھی علم نہیں ہوتا اس لئے وہ تاخیر ناگوار ہوتی ہے پس جن مصالح کی وجہ سے تم احکام الٰہیہ کو پامال کر رہے وہ مصالح خود اتباع احکام پر موقوف ہیں۔ یاد رکھو مسلمانوں کو تو ہرگز اس طرح فلاح حاصل نہیں ہوسکتی کہ وہ احکام الٰہیہ کو مصالح کے تابع بنا دیں اور دنیوی اغراض کو قبلہ وکعبہ بنالیں۔ باقی کفار کی حالت دیکھ کر تم کو دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ وہ خدا کو ناراض کر کے بھی ترقی کر رہے ہیں بات یہ ہے کہ کفار خدا کے نزدیک حقیر ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے پیر کا جوتہ۔ اگر جوتہ میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکا نہیں جاتا اور مسلمان خدا کے نزدیک محبوب ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ٹوپی کہ اس میں اگر ذرا سی بھی ناپاک چھینٹ پڑ جاتی ہے تو اس کو فوراً سر سے اتار پھینکتے ہیں تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ خدا تعالٰے آپ کو بھی نعوذ باللہ جوتہ کی طرح بنا دیں کہ آپ برابر گندگی میں ملوث رہیں اور آپ کو اتار کر نہ پھینکا جائے۔ صاحبو! حق تعالٰے آپ کو ٹوپی کی طرح معزز بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کی عزت یہی ہے کہ جہاں ذرا اس میں ناپاکی لگ جائے فوراً سر سے اتار دی جائے پس خوب سمجھ لو کہ ترک احکام کے ساتھ یا احکام کو اغراض و مصالح کا تابع بنا کر مسلمان کو کبھی فلاح حاصل نہیں ہوسکتی اور اگر بالفرض حاصل بھی ہو جائے تو رضائے الٰہی تو ہرگز حاصل نہ ہوگی کہ خود فلاح سے بھی وہی مقصود ہے کیونکہ فلاح دنیوی بھی وہی محمود ہے جو معین ہو جاوے رضائے حق میں چنانچہ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (یہ وہ لوگ ہیں اگر ہم ان کو زمین میں حکومت دیں تو قائم کریں گے نماز کو اور زکوٰۃ دیں گے) خود اس پر شاہد بین ہے پس مسلمان کی اصل کامیابی رضائے حق ہے اور اس کی اصل

کوشش اس کی طلب ہے جس کا طریق اتباع احکام ہے خواہ دنیا میں کسی حال میں رہے اور اس حالت میں جو حظ اور راحت مومن کو ہوتی ہے وہ سب کامیابیوں سے بڑھ کر ہے۔ اسی بنا پر حق تعالے نے ایمان و اعمال کے ثمرات میں راہ حق پر ہونے کو بیان فرمایا ہے چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں)

یہاں حق تعالے نے مسلمانوں کی جزا میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں جن میں ایک جزاء دنیوی یعنی واقع فی الدنیا ہے عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ (اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں) دوسری جزاء اُخروی یعنی واقع فی الآخرۃ ہے وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مسلمان کے لئے جس اصلی جزاء کا وعدہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ پس ہدایت پر ہونا یہی بڑی رحمت اور راحت کی چیز ہے جس کا مشاہدہ مجھ کو ایک سفر میں اس طرح ہوا کہ ایک بار میں سہارنپور سے لکھنؤ جا رہا تھا اس لئے رڑکی جانے والی گاڑی میں سوار ہوا تو وہاں میرے ایک دوست بھی بیٹھے ہوئے ملے جو پورے جنٹلمین تھے جب گاڑی چھوٹ گئی تو آپس میں باتیں ہونے لگیں میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جاتے ہیں۔ بولے کہ میرٹھ جا رہا ہوں اس وقت میں نے انہی کے محاورہ میں کہا کہ ممکن ہے آپ میرٹھ جا رہے ہوں لیکن افسوس ہے یہ گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے۔ وہ غلطی سے بجائے میرٹھ کی گاڑی کے اس میں بیٹھ گئے تھے۔ بس یہ سُن کر ان کی یہ حالت ہوئی کہ چہرہ سے پریشانی ٹپکتی تھی، بات نہیں کر سکتے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بالکل بیک بینی و دوگوش تھے۔ کیونکہ جنٹلمینوں میں یہ بھی مرض ہے کہ وہ سفر میں

نہ کپڑے ساتھ لیتے ہیں نہ پانی پینے کا برتن ساتھ لیتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب جو کہ ریاست بہاولپور میں کسی اسکول میں پروفیسر ہیں وہ فرماتے تھے کہ ایک بار میں بہاولپور سے وطن کو آرہا تھا میری ساتھ ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی تھی۔ اس گاڑی میں ایک جنٹلمین سوار تھے وہ میرے برتنوں کو دیکھ کر ہنسنے لگے کہ یہ بھنگیوں کے سے برتن آپ کہاں سے ساتھ لائے۔ میں اس پر خاموش ہو رہا تھوڑی دیر میں ان صاحب کو پیاس لگی تو اسٹیشن پر گلاس لے کر اُترے وہاں پانی نہ ملا اور کئی اسٹیشن تک نہ ملا تو اب ان کا مارے پیاس کے بُرا حال تھا بار بار کن انکھیوں سے میری صراحی کو تکتے تھے آخر مجھے رحم آیا اور میں تختہ پر آنکھیں بند کر کے سوتا بن کر بیٹھ رہا تھوڑی دیر میں وہ صاحب آہستہ آہستہ صراحی کے پاس آئے اور اس سے مُنہ لگا کر پانی پینا شروع کیا مگر حالت یہ کہ ایک آنکھ میری طرف تھی اور ایک آنکھ پانی کی طرف بڑی گھبراہٹ میں غریب نے پانی پیا میرے جی میں آیا کہ فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لوں مگر میں نے خیال کیا کہ بے چارہ پیاسا ہے۔ جب پانی پی چکے گا پھر سمجھوں گا چنانچہ جب وہ خوب پانی پی چکے اور وہاں سے اٹھنے لگے تب میں نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن سے کیوں پانی پیا۔ بس اب تو ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور معافی چاہنے لگے۔ میں نے پھر تو ان کی بدتہذیبی خوب ظاہر کی کہ تم تہذیب کا دعویٰ محض جھوٹا کرتے ہو تم میں خاک تہذیب نہیں۔ میں کہتا رہا اور خاموش سنتے رہے۔

غرض کچھ سردی کا بھی خیال تھا مگر زیادہ پریشانی یہ تھی کہ بے راہ جا رہے تھے کہیں لاحول پڑھتے ہیں کہیں انا للہ پڑھتے ہیں میں نے اُن سے کہا کہ میاں اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ یہ گاڑی ظاہراً رڑکی سے پہلے تو ٹھہر نہیں سکتی خواہ تم کتنے ہی پریشان ہو اس لئے پریشانی بے فائدہ اطمینان سے

باتیں کرو میں تو اُن کو باتوں میں لگانا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے جھنجلاتے تھے کہ واہ میاں تم کو ہنسی سوجھی ہے اور مجھے اپنی الجھن لگی ہوئی ہے اس حکایت سے میرا مقصود یہ ہے کہ میں نے اس وقت اپنی اور ان کی حالت کا موازنہ کیا تھا تو یہ ظاہر ہے کہ رڑکی پہونچنے سے پہلے نہ میں لکھنؤ پہونچا تھا نہ ان کو میرٹھ جانا کچھ زیادہ دشوار ہو گیا تھا لیکن پھر میں اپنے آپ کو ایسا مطمئن پاتا تھا گویا کہ بادشاہ تھا کیونکہ مجھ کو اس خیال سے راحت تھی کہ میں راہ پر ہوں اور وہ ایسے پریشان تھے جیسے کوئی مجرم پنجرہ میں قید کر دیا جائے۔ ان کو اس خیال سے الجھن تھی کہ میں راہ پر نہیں ہوں۔ اسی طرح جو لوگ پیادہ سفر کرتے ہیں جب وہ راستہ بھولتے ہیں اس وقت کوئی ان کی پریشانی دیکھے کہ ایک ایک قدم من بھر کا ہو جاتا ہے۔ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اب تو آپ سمجھ گئے کہ واقعی ہدایت پر ہونا بڑی رحمت ہے۔

خدا کی قسم جو شخص شریعت کے موافق چل رہا ہو وہ بادشاہ ہے گو ظاہر میں سلطنت نہ ہو اور جو شخص شریعت سے ہٹا ہوا ہو وہ پنجرہ میں مقید ہے گو ظاہر میں بادشاہ ہو مسلمان متبع شریعت کو چونکہ یقین ہے کہ میں سیدھے راستہ پر ہوں اس لئے اس کو ساری مصیبتیں سہل معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ چند دن کی مصیبتیں ہیں پھر ختم ہو جائیں گی۔ کفار کو یہ دولت نصیب نہیں کیونکہ ان کو اپنی نجات کا کسی صحیح دلیل سے یقین ہی نہیں۔ اور باطل کا خاصہ یہی ہے کہ اس سے اطمینان و سکون کبھی حاصل ہوتا ہی نہیں ہاں کوئی جہل مرکب میں مبتلا ہو تو اور بات ہے مگر اس کو بھی اہل حق کی برابر ہرگز اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مصائب کے وقت جس قدر استقلال اہل حق میں ہوتا ہے کسی جماعت میں نہیں ہوتا۔

صاحبو! راستہ تو یہ ہے کہ خدا کو راضی کرو احکام کا اتباع کرو۔ شریعت میں گڑبڑ نہ کرو ان شاء اللہ تعالےٰ پھر کسی کی مجال نہیں کہ مسلمانوں کو نگاہ بھر کر بھی دیکھ سکے۔ باقی جو راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے اس کی تو یہ حالت ہے ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستانست

(اے اعرابی مجھ کو اندیشہ ہے کہ تو کعبہ نہ پہونچے گا اس لئے کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے ترکستان کا ہے)

خدا کی قسم اگر ہم کو پاخانہ اٹھانا پڑے اور خدا ہم سے راضی ہو تو وہی ہمارے لئے سلطنت ہے اور اگر خدا راضی نہ ہوا تو لعنت ہے ایسی سلطنت پر جو خدا کو ناراض کر کے حاصل کی جاوے۔ یاد رکھو سلطنت کوئی تقرب الی اللہ کا سبب نہیں۔

بعض انبیاء علیہم السلام ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو ساری عمر سلطنت نصیب نہیں ہوئی۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک نبی کے ساتھ صرف ایک ہی آدمی ہوگا اور بعض کی ساتھ ایک بھی نہ ہوگا تو کیا سلطنت نہ ہونے سے ان انبیاء کے درجہ میں کوئی کمی آگئی اگر محض سلطنت کوئی قرب کی چیز ہوتی تو فرعون بڑا مقرب ہونا چاہئے جس نے چار سو برس تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی تھی۔

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ، واللہ اس نبی کے مرتبہ کے سامنے جن کی ساتھ صرف ایک آدمی ہوگا یا ایک بھی نہ ہوگا سلطنت فرعون کی کچھ بھی حقیقت نہیں اتباع احکام کی دولت کے سامنے سلطنت بھی کوئی چیز ہے کہ اس کی مصلحت سے دین میں تصرف کیا جاوے اور احکام کو مصالح ملکی کا تابع بنایا جاوے ہرگز نہیں۔

الغرض ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو بعضوں کو علم نہیں وہ تو جہالت کی وجہ سے گناہوں میں زیادہ مبتلا ہیں اور بعضوں کو علم حاصل ہے تو علم صحیح حاصل نہیں انھوں نے غلط باتوں کو دین سمجھ رکھا ہے اور جن کو علم صحیح بھی حاصل ہے انھوں نے اس کو اغراض ومصالح کے تابع بنا رکھا ہے۔

میں نے اسی سفر میں ایک پردیسی مولوی صاحب کو دیکھا ہے کہ پہلے ان کے لڑکے انگریزی پڑھتے تھے اول تو یہی ان کو زیبا نہ تھا کہ مولانا ہو کر اپنی اولاد کو انگریزی پڑھاویں لیکن خیر اگر انھوں نے یہ سمجھ کر کہ دنیوی ضرورتوں کے لئے اس کا پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ درستی دین کا اہتمام کرلیا جاوے اور اس کا اہتمام انھوں نے کرلیا ہوگا کیونکہ خود عالم تھے۔ تو اب سنئے قوم نے ان پر دباؤ ڈالا کہ انگریزی اسکولوں میں لڑکوں کو پڑھانا موالات میں داخل ہے اپنے لڑکوں کو اٹھاؤ آخر انھوں نے مجبور ہو کر لڑکوں کو وہاں سے اٹھالیا اور اپنے وطن بچوں کو بھیجدیا اور وہاں بھی ان کو انگریزی ہی پڑھائی۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اگر تم نے لڑکوں کو اسکول سے اس لئے اٹھایا تھا کہ انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام ہے تو پھر تین سو کوس پر ان کو بھیج کر انگریزی ہی کیوں پڑھائی اور اگر تمہارے نزدیک انگریزی پڑھانا جائز تھا تو پھر محض قوم کے کہنے سے ایک جائز کام کو ترک کرنا اور لوگوں کی خوشامد کے لئے ان سے دبتا یہ کب مناسب تھا۔ بھلا خدا کا طالب ہو کر مخلوق کی رضا جوئی کرے اور خوشامد کر کے ان سے دبے طالب کی یہ شان نہیں ہوا کرتی واللہ اہل علم کا تو یہ حال ہونا چاہیئے ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(ترجمہ) اے دل وہ بہتر ہے کہ سرخ شراب و عشق الٰہی سے تو مست رہے بغیر سونے چاندی کے خزانوں کے تو دولت مند بن جائے گا)

ان کو اپنی فقیری میں مست رہنا چاہیئے اور کسی مالدار یا رئیس سے دین کے معاملہ میں طمع یا ملامت کی وجہ سے نہ دبنا چاہیئے اور اگر کوئی بُرا بھلا کہے تو کہنے دو اس کی ہرگز پروا نہ کرو خدا کے طالب ہو کر کسی کی ملامت وطعنہ کی پرواہ نہ ہونی چاہیئے۔ ہاں اگر کسی جگہ خوف کی صورت ہو تو شریعت سے استفتاء کرو اگر وہ موقع خوف میں درجۂ اکراہ سمجھ کر تم کو معذور سمجھے تو دبنے کا بھی مضائقہ نہیں لیکن طمع اور حرص اور خوف زوال منفعت کی وجہ سے دبنا ہرگز نہ چاہیئے اس میں علاوہ ذلت عنداللہ کے لوگوں میں بھی عزت نہیں ہوتی۔ خدا کی قسم جن عوام کی یہ پرواہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ہماری ساتھ لگے لپٹے رہیں ہم کو چھوڑ کر الگ نہ ہو جاویں اول یہ لوگ انہی کی نظروں سے گرتے ہیں کیونکہ حرص وطمع چھپی نہیں رہتی اور حریص کی عزت لوگوں کی نظروں سے گرجاتی ہے ؎

بِئْسَ الْمَطَاعِمُ حِيْنَ الذُّلِّ تَكْسِبُهَا
اَلْقِدْرُ مُنْتَصِبٌ وَالْقَدْرُ مَخْفُوْضٌ

وہ کھانا بہت بُرا جس کو ذلت سے کمایا جاوے انجام کار یہ ہوگا کہ ہانڈی تو چڑھی ہوئی ہوگی اور عزت گری ہوئی قدر کی مناسبت سے۔

ایک لطیفہ یاد آیا۔ لکھنؤ میں ایک کھانا پکتا ہے جس کو شب دیگ کہتے ہیں۔ ایک طالب علم نے اس کا ترجمہ لَیْلَةُ الْقِدْرِ (بکسر القاف) (رات کی دیگ) کیا تھا۔ شب کا ترجمہ لیلہ اور دیگ کا ترجمہ قِدر بس لیلۃ القدر بن گیا۔ خوب سوجھی۔ لَیْلَةُ الْقَدْرِ (شب قدر) تو سنا کرتے تھے۔ اس نے لَیْلَةُ الْقِدْرِ بھی ایجاد کر دی۔ خیر یہ تو ایک

لطیفہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر حال میں احکام شرعیہ کو اپنا رہنما بنانا چاہیئے خواہ مال ملے یا نہ ملے، جاہ حاصل ہو یا نہ ہو طعنے سننے پڑیں یا **تعریف**۔ کسی بات کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ کسی کے بُرا کہنے سے انسان بُرا نہیں ہوجاتا اور کسی کے بھلا کہنے سے اچھا نہیں ہوجاتا یاد رکھو اگر تم خدا کے نزدیک اچھے ہو تو چاہے ساری مخلوق تم کو کافر و فاسق و زندیق کہے کچھ اندیشہ کی بات نہیں اور اگر خدا کے نزدیک مردود ہو تو چاہے ساری دنیا تم کو غوث و قطب کہے اس سے کچھ بھی نفع نہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اہلِ حق کو اگر آج بُرا کہا جائے گا تو ان شاء اللہ تعالےٰ کسی دِن پھر ان کو اچھا کہا جائے گا اور اہل باطل کی اگر آج مدح ہوگی تو کسی دن اُن کی قلعی ضرور کھلے گی اور ان کے معتقدین ہی ان کو بُرا بھلا کہیں گے۔

شیخ ابن عربی کو ان کے زمانہ میں بہت لوگوں نے کافر و زندیق کہا حتیٰ کہ مرنے کے بعد ان کی قبر پر سالہا سال پاخانہ پڑتا رہا تو کیا جہلاء کے ان افعال سے نعوذ باللہ (اللہ کی پناہ) شیخ کا درجہ گھٹ گیا ہرگز نہیں تو اگر آج تم کو بھی لوگ بُرا بھلا کہنے لگیں تو کیوں ڈرتے ہو پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ شیخ ابن عربیؒ امام اور شیخ اور صدیق کہلانے لگے اور ان کی قبر زیارت گاہ بن گئی۔ حضرت شیخ نے اس کی نسبت پیشین گوئی بھی فرمائی تھی اِذَا دَخَلَ السِّیْنُ فِی الشِّیْنِ ظَهَرَ الْمِیْمُ سین سے مراد سلطان سلیم ہیں اور شین سے مراد ملک شام ہے اور میم سے مراد خود حضرت شیخ ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب سلطان سلیم ملک شام میں داخل ہوں گے اس وقت محی الدین بن عربی کا ظہور ہوگا چنانچہ جب سلطان سلیم کا شام پر تسلط ہوا ہے اور شیخ کی قبر کا حال معلوم ہوا تو اس کو گندگیوں سے صاف کرایا۔ اور اس پر قبہ تعمیر کیا

اس دن سے شیخ کی قبر زیارت گاہ خاص و عام بن گئی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو کچھ معاملہ ہوا سب کو معلوم ہے۔ لوگوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے۔ ان کی کتاب احیاء العلوم کو جلایا گیا تو کیا اس سے ان کی وقعت کچھ کم ہو گئی ہرگز نہیں اس کے بعد ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ احیاء العلوم کو سونے کے پانی سے لکھوایا گیا اور آج امام غزالی کے نام کی جو وقعت ہے مخفی نہیں ہر شخص ان کو حجۃ الاسلام اور امام کے لقب سے یاد کرتا ہے اور وہ لوگ جو امام غزالی اور شیخ ابن عربی کو کافر و زندیق کہتے تھے جن کی وقعت اس زمانہ میں بہت کچھ تھی۔ خدا تعالیٰ نے آج ان کے ناموں کو ایسا مٹایا ہے کہ کوئی بھی ان کا نام نہیں لیتا۔

پھر اگر اتباع احکام کی وجہ سے لوگ تمہارا ساتھ چھوڑ دیں اور تم کو سب کے سب برا بھلا کہنے لگیں تو اس میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے۔ بہت سے بہت جاہ زائل ہو جائے گی بدنام ہو جاؤ گے سو یہ کوئی نقصان نہیں بلکہ عین منفعت ہے۔ کیونکہ شہرت اور جاہ یہ وہ بلا ہے جو کہ دین و دنیا دونوں کو مضر ہے۔ دینی ضرر تو یہ ہے

؎ اشتہار خلق بند محکم است — بند ایں از بند آہن کے کم است
خویش را رنجور ساز و زار زار — تا ترا بیروں کنند از اشتہار
ایں کہ گوید نے منم انباز تو — آں کہ گوید نے منم ہمراز تو
او چو بیند خلق را سرمست خویش — از تکبر میرود از دست خویش

ترجمہ: مخلوق کی شہرت اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کب کم ہے اپنے آپ کو رنجور اور گم نام رکھو تاکہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں۔ ایک کہہ رہا ہے میں آپ کا ہم راز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا

شریک حال ہوں وہ شخص بیچارہ جب ایک مخلوق کو اپنا
سرپرست اور عاشق دیکھتا ہے پس تکبر کی وجہ سے ہاتھوں
سے نکل جاتا ہے۔)

جب آدمی دیکھتا ہے کہ ساری دنیا مجھ پر فدا ہے تو اس میں عجب وکبر پیدا ہو جاتا ہے اپنے اوپر نظر کرنے لگتا ہے آخرکار اسی عجب وکبر کی وجہ سے برباد ہو جاتا ہے افسوس بہت لوگ اس ورطہ میں آکر ہلاک ہو گئے یہ تو دین کا ضرر ہوا۔ دنیا کا ضرر یہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

خشمہا و چشمہا و رشکہا
برسرت ریزد چو آب از مشکہا

(غصے اور آنکھیں اور رشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں
جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

یعنی مشہور آدمی کے حاسد بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس صاحب جاہ کو نہ دین کی راحت ہے نہ دنیا کی۔ اس کا دین کبھی خطرہ میں رہتا ہے اور دنیاوی خطروں کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ ہاں جب حق تعالےٰ کی طرف سے بدون تمہاری طلب کے جاہ عطا ہو وہ نعمت ہے اس میں دین کا خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ ادھر سے تمہاری حفاظت کی جاتی ہے ہاں بعض دفعہ امتحان کے طور پر دنیوی خطرات ایسے شخص کو بھی پیش آجاتے ہیں۔ لیکن جس کو خدا تعالےٰ سے تعلق ہے وہ خطرات سے گھبرایا نہیں کرتا وہ سب کو خوشی کے ساتھ برداشت کر لیتا ہے۔

الغرض جاہ کا طالب ہونا بہت برا ہے اور طلب کے بعد جو جاہ حاصل ہوتی ہے اس کی وہی حقیقت ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے پھر یہ ساری عزت وجاہ محض خیالی چیز ہے اس سے تم میں کیا کمال پیدا

ہوگیا۔ مرگئے تو کچھ بھی نہیں اب تم مخلوق کی نظر میں اچھے ہوئے تو کیا بُرے ہوئے تو کیا پس آج کل عموماً ایسا ہی علم لفظی و اسمی دیکھا جاتا ہے جو جاہ طلبی میں برباد کیا جاتا ہے حالانکہ واللہ اعلم وہ جوہر ہے کہ اس میں خود ایسی لذت ہے جس کے سامنے سلطنت اور مال و دولت اور جاہ و عزت سب ہیچ ہے مگر ایسا علم محض کتاب خوانی سے میسّر نہیں ہوتا۔ ع

درکنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا

(محض کنز و ہدایہ پڑھتے خدا تعالےٰ کو نہیں پاسکتے)

یہ علم تو اس طرح حاصل ہوگا ؎

قال را بگذار و مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑو حال پیدا کرو اس حال کو پیدا کرنے کے لئے کسی کامل مرد کی جوتیوں میں جاکر پامال ہو)

اگر یہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی کی جوتیوں میں جاکر پامال ہوجاؤ اگر وہ سر پر جوتے بھی مارے تو خوش رہو پھر چند روز کے بعد دیکھنا کہ تمہارے دل میں کیسا استغنا پیدا ہوتا ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ لیکن آج کل یہی بات تو نہیں رہی۔ مولوی اول تو اہل اللہ کے سامنے جاتے نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم عالم ہوگئے اب ہم کو کسی کی کیا ضرورت ہے اور اگر کبھی پیر کی تلاش کا خیال ہوگا اور کسی کے یہاں جاویں گے تو ایسی جگہ تلاش کریں گے جہاں ان کی قدر ہو اور مشائخ بھی علم کا ادب کرکے علماء کی قدر زیادہ کرتے ہیں۔ اب یہ حضرت اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ پیر صاحب مجھے خلافت عطا فرمادیں پھر غضب یہ ہے کہ بعضے پیر بھی آج کل ایسے ہیں جو یہ سمجھ کر کہ یہ عالم ہیں ہم سے والبتہ رہیں گے

توان کی وجہ ہمارا سلسلہ بڑھے گا ایسوں کو خلافت بھی دید یتے ہیں خوب یاد رکھو کہ ایسے طالب بھی خائن ہیں اور ایسے پیر بھی خائن ہیں بھلا اگر کسی مریض کو اپریشن کی ضرورت ہو اور ڈاکٹر اس خیال سے کہ یہ مریض مجھ سے خوش رہے گا تو زیادہ انعام دے گا بجائے اپریشن کے اس کے زخم پر مرہم لگا دے تو کیا وہ ڈاکٹر خائن نہیں۔ یقیناً اس نے خیانت کی اور بڑا ظلم کیا۔ پس اے وہ شیخ جو کہ مریدوں کے مکدر ہو جانے کے خوف سے ان کے امراض پر ان کو متنبہ نہیں کرتا خدا کے واسطے تو اُن کے حال پر رحم کر اور اے وہ ڈاکٹر جو اپریشن کی جگہ مرہم لگا رہا ہے خدا کے لئے ایسا ظلم نہ کر ورنہ یاد رکھ کہ آج اگر یہ مریض تجھ سے خوش بھی ہو گیا تو کل کو جب یہ زخم ناسور بن جائے گا اس وقت یہ تیرے اوپر لعنت کریگا اسی طرح میں طالب سے کہتا ہوں کہ تجھ کو طبیب کے نشتروں پر صبر کرنا چاہئے جب ہی یہ ناسور اچھے ہو سکتے ہیں ؎

نرم گوید گرم گوید خوش بگیر
تا رہائی یابی از نار سعیر

(اس کی نرمی و گرمی کو خوشی سے برداشت کرو تاکہ تم دوزخ کی آگ سے رہائی پا سکو)

اور اگر یہ نہیں بلکہ تم ہر ڈانٹ پر غصے ہونے لگے تو اس طرح تمہاری صحت دشوار ہے۔ بھلا اگر کسی کے ناسور ہو اور وہ نشتر کے چبھانے پر طبیب سے خفا ہونے لگے تو اس شخص کی تندرستی کی کیا امید ہو سکتی ہے ؎

وز بہر زخمے تو پر کینہ شوی
پس کجا صیقل چو آئینہ شوی

ترجمہ

(اگر ہر زخم پر کینہ ہوتے ہو یعنی مرشد کی ہر تنبیہ پر ناک بھوں
چڑھاتے ہو تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہوسکتا ہے)
مولانا نے اس مضمون کو ایک حکایت کے ضمن میں تفصیل سے
بیان فرمایا ہے ؎

حکایت یہ ہے کہ ایک شخص ایک گودنے والے کے پاس گیا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنا دے۔ اس نے اپنا کام شروع کیا اور ایک جگہ سوئی کو لگایا اس نے آہ کی اور اس نے پوچھا کیا بنا رہے ہو کہا مُنہ بنا رہا ہوں کہنے لگا کہ یہ شیر کھا دے پیو یگا تھوڑا ہی جو اس کو منہ کی ضرورت ہو بس منہ کو رہنے دو۔ اس نے دوسری جگہ سوئی کو کچھ سے چبھایا آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو کہا دُم بنا رہا ہوں۔ کہنے لگا بعضے دُم کٹے شیر بھی ہوتے ہیں دُم کی ضرورت نہیں کچھ اور بناؤ اس کو رہنے دو۔ اس نے تیسری جگہ سوئی کو چبھایا اس نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو آنکھیں بولا اس کو آنکھوں کی کیا ضرورت ہے کوئی دیکھنا تھوڑا ہی رہ گیا ہے اس کو بھی چھوڑ دو۔ اس نے چوتھی جگہ سوئی کو چبھایا آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو کہا شکم کہنے لگا اونہہ اسے شکم کی کیا ضرورت ہے کچھ کھانا پینا تھوڑا ہی ہے تو مصوّر نے جھلّا کر سوئی پھینکدی اور کہنے لگا ؎

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید
ایں چنیں شیرے خدا ہم نا فرید

(شیر بے دم و سر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے ایسا شیر
تو خدا نے بھی نہیں پیدا کیا)

بندۂ خدا ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا جس کے نہ شکم ہو نہ منہ ہو نہ دم ہو نہ آنکھیں۔ جب تجھ کو سوئی کی تکلیف پر صبر نہیں تو شیر کی تصویر ہی کیوں بنواتا ہے جا اپنا کام کر ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن
بس تو از شیر دیاں کم دم بزن

(یعنی جب تم میں سوئی چبھنے کی طاقت نہیں ہے تو تم شیر ہونے کا دعوے مت کرو۔

صاحبو! اگر علم حقیقی اور علم نافع حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا تو یہی راستہ ہے یہی طریقہ ہے نشتر اور زخم کھانے پڑیں گے یعنی اپنی طرف سے اس کے لئے بھی آمادہ ہونا پڑے گا۔ باقی اس کا میں تم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جب تم اپنی طرف سے ہر طرح کی ذلت اور رسوائی کے لئے آمادہ ہو جاؤ گے تو پھر مشائخ کاملین تم سے سختی کا برتاؤ نہ کریں گے یہ حضرات بہت رحمدل اور شفیق ہوتے ہیں۔ البتہ اگر تمھارے اندر عجب وکبر کا مادہ رہا تو پھر یہ ناسور تو اپریشن ہی سے اچھا ہوگا اس کا تو یہی راستہ ہے۔ اگر یہ راستہ پسند نہیں تو پھر تمھارا اس منزل میں آنا ایسا ہوگا جس کی بابت ارشاد ہے۔

وَ لَیْسَ البرّ بان تاتوا البیوت من ظهورها ولكن البر من اتقیٰ و اتوا البیوت من ابوابها۔

(اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے اور گھروں میں ان کے دروازہ سے آیا کرو)

ہر کام اصول سے اور انتظام ہی سے اچھا ہوتا ہے خلاف اصول جو کام ہوگا خراب ہوگا۔

صاحبو! میں اس علم نافع کی ضرورت آپ کو بتلا رہا ہوں یہ وہ علم ہے جو خلوص سے حاصل ہوتا ہے اس کی کوشش کیجئے اور یاد رکھئے کہ احادیث و قرآن میں جہاں علم کی فضیلتیں مذکور ہیں وہاں یہی علم مراد ہے۔ جو خلوص کے ساتھ حاصل ہو اور جو علم طلب جاہ وغیرہ کے لئے ہو یا جو اغراض و مصالح کا تابع ہو وہ علم مُراد نہیں۔ چنانچہ اس حدیث نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے جس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں سب سے پہلے تین شخصوں کو بلایا جائیگا اوّل شہید، پھر عالم، پھر سخی۔

شہید سے سوال ہوگا کہ تونے ہمارے واسطے کیا کیا، وہ کہے گا الٰہی میں نے اپنی جان آپ کے واسطے فدا کر دی تھی۔ ارشاد ہوگا جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے جان اس واسطے دی تھی تاکہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا بہادر ہے۔ لِیُقَالَ اِنَّكَ لَجَرِیٌّ (تاکہ کہا جائے تو بڑا بہادر ہے) یعنی کیسی جان دی، عدالت میں کیسا اظہار دیا، بڑی جرات سے جواب دیا۔ فَقَدْ قِیْلَ (تو بہادر کہا گیا) یعنی لوگوں میں بہت تعریف ہو چکی اور تمہارا مقصد پورا ہو چکا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو جہنم میں گھسیٹ کر ڈال دو۔

پھر عالم صاحب بلائے جائیں گے، اُن سے بھی یہی سوال ہوگا کہ تم نے ہمارے واسطے کیا کیا، وہ کہے گا کہ میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو پڑھایا، فتوے دیئے، مسئلے بتلائے۔ ارشاد ہوگا جھوٹ بولتے ہو بلکہ تم نے سب کچھ اس لئے کیا تھا تاکہ تم کو عالم کہا جائے فَقَدْ قِیْلَ (سو تم کو عالم کہا گیا) بہت لوگ آپ کو مولوی و مولانا کہہ چکے خوب تعریفیں ہو چکیں اور تمھارا مدعا حاصل ہو چکا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو بھی گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دو۔

اِسی طرح سخی کے بارے میں وارد ہے۔

صاحبو! ریا اور حبِ جاہ سے بچو یہ بہت بُری بلا ہے۔

اب میں علم کی اس تقسیم کی بابت جو اس آیت میں وارد ہوئی ہے کچھ عرض کرکے بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو کچھ خدا تعالیٰ نے میرے قلب میں ڈالا ہے میں وہ بیان کردوں گا گو اس سے بھی اچھی توجیہ ممکن ہو جس کے پاس اس سے اچھی توجیہ ہو وہ اس کو پیش کردے۔

میرے نزدیک اس آیت سے تمام علوم درسیہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے اس طرح کہ کتاب منیر سے تو مراد علم نقلی ہے کیونکہ کتاب میں اصلی نقلی ہی ہوتا ہے مگر مراد مطلق علم نقلی نہیں ہے بلکہ علم استدلالی مراد ہے۔ چنانچہ علم کے مقابلہ سے اس کی تعیین معلوم ہوتی ہے اور ھُدًی سے مراد علم عقلی ہے کیونکہ نقلی کا مقابلہ اسی کو مقتضی ہے۔ لیکن یہاں بھی علم استدلالی عقلی مراد ہے مطلق عقلی مراد نہیں کیونکہ ھُدًی میں معنے دلالت کے ماخوذ ہیں اور استدلالی کی یہی شان ہوتی ہے اور اس سے پہلے فرمایا ہے بغیر علم (علم کے بغیر) اس سے علم ضروری مراد ہے کیونکہ اگر اس سے علم عقلی یا نقلی کسی مراد لیا جاوے تو تکرار لازم آئے گا اور اگر مطلق علم مراد لیا جاوے تو قسیم کا مقسم بننا لازم آئے گا۔ شق اول غیر مناسب اور شق دوم ناجائز ہے اس لئے میرے نزدیک اس سے علم ضروری مراد ہے۔

پس یہاں علم کی یہ اقسام مذکور ہیں۔ علم ضروری و علم کسبی۔ اور کسبی کی دو قسمیں استدلالی عقلی و استدلالی نقلی ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ اس کی ساتھ یہ ملایا جاوے کہ مقاصد کے

مقدمات بھی مقاصد کے حکم میں ہوتے ہیں اِنَّ مُقَدَّمَۃَ الْوَاجِبِ وَاجِبٌ (واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے)

اب تمام علوم درسیہ اس آیت میں داخل ہو گئے کیونکہ علوم درسیہ میں بعض علوم ضروریہ ہیں اور بعض استدلالی عقلی کی قسم سے ہیں اور بعض استدلالی نقلی میں داخل ہیں اور بعض علوم ان کے لئے مقدمات ہیں جیسے نحو وصرف وبلاغت وغیرہ۔ اسی لئے میں اس وعظ کا نام

(تعظیم العلم مع تقسیم العلم)

رکھتا ہوں

اگرچہ یہ نام طویل ہے مگر اس عنوان سے معنوں پر دلالت واضح ہے۔

خلاصہ بیان یہ ہے کہ علم شرعیہ کی سخت ضرورت ہے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے اگر تمام علوم درسیہ کی تحصیل دشوار ہو تو بقدر ضرورت ہی حاصل کر لیجئے لیکن علم حاصل کرنے کے بعد بے فکر نہ ہو جانا کیونکہ مقصود محض علم ہی سے حاصل نہیں ہوتا ہاں یہ ضرور ہے کہ علم اس مقصود کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ اصل چیز کچھ اور ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ
بے عنایاتِ خدا ہیچم و ہیچ

(یعنی گو ہم نے بہت سی وعظ و نصیحت کی ہے لیکن کسی کام کے پختہ ارادہ کرنے میں جب تک حق تعالےٰ کی عنایت نہ ہو ہم محض ہیچ ہیں)

اصل مقصود جب حاصل ہو گا جبکہ حق تعالےٰ کی طرف سے آپ کی

کشش اور آپ پر عنایت ہو گی۔ چونکہ مولانا شیخ اور مربی ہیں اس لئے آگے اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم ان عنایات الٰہیہ کے مورد کیونکر ہو سکتے ہو ؎

بے عنایات حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ستش ورق

(یعنی بغیر خدا تعالےٰ اور خاصان خدا کی عنایت کے اگر فرضاً فرشتہ بھی تو اس کا ورق اعمال محض سیاہ ہوگا)

یعنی خدا تعالیٰ سے بلاواسطہ تعلق حاصل نہیں ہوسکتا یہ عادۃ اللہ کے خلاف ہے۔ بلکہ خاصان حق کے ذریعہ سے تعلق ہوسکتا ہے پھر تم بھی ان کی طرح مورد عنایات ہو جاؤ گے اور نصرۃ الٰہی تمہارے ساتھ ہو جائے گی خاصانِ خدا سے جدا رہ کر توفیق الٰہی تمہارے ساتھ نہیں ہوسکتی خوب سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ خاصان حق سے طریقہ اور تدبیر سیکھو اور خدا تعالےٰ سے دعا کرو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ کامیابی میں دیر نہ ہوگی اب دعا کیجئے کہ حق تعالےٰ ہم کو فہم سلیم و عمل مستقیم کی توفیق عطا فرماوے آمین۔

وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اس کے بعد حضرت حکیم الامت دام مجدہم نے تھوڑی دیر تک حسب عادت ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔ پھر اہل مدرسہ کے اصرار پر طلبہ کو انعام اور سند وغیرہ اپنے ہاتھ سے عطا فرمائی اس سے فراغت پاکر جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ (جامع عفا اللہ عنہ)

بالخیر بتیک تیر

البنیان المشید ترجمہ اردو البرہان المؤید

از عارف کامل ولی بے مثال مالک گنجینہ عوارف لدنی شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ یہ وہی شیخ احمد کبیر قدس سرہٗ جنکی پیدائش سے چالیس سال قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپکے ماموں کو بشارت دی تھی کہ تمہاری بہن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا اس کا نام احمد رکھنا ۔ انبیاء کرام میں وہ ایسا ہی سردار ہوگا جس طرح کہ میں انبیاء کا سردار ہوں چنانچہ آپکو وہ مرتبہ عطا ہوا تھا جو کسی دوسرے ولی اللہ کو میسر ہوا ہوگا مثلاً جب آپ ۵۵۵ھ میں زیارت بیت اللہ کو تشریف لے گئے تو سرکار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت کیلئے بھی حاضر ہوئے گنبد خضرا صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچکر آپنے با آواز بلند کہا السلام علیک ۔ یا جدی فوراً روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے ندا آئی وعلیکم السلام یا ولدی اس ندا مبارک کو سنکر آپ پر وجد طاری ہوگیا آپکے علاوہ جتنے آدمی وہاں موجود تھے سبنے آواز کو سنا ۔ تھوڑی دیر کے بعد آپنے دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ تھا کہ جدائی دوری کی حالت میں تو اپنی روح کو روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجا تھا کہ میری طرف سے آپکے آستانہ بوسی کا شرف حاصل کرلے اور جبکہ دولت دیدار مجھے اصالتاً حاصل ہے تو آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر عزت حاصل کروں ۔ اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا ۔ اور آپنے اسے بوسہ دیا ، اس وقت روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریباً نوے ہزار عاشقان جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشتاقان روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مجمع تھا جنھوں نے اس واقعہ کو دیکھا اور سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی زیارت سے مشرف ہوئے ۔ ان میں شیخ عبدالقادر جیلانی نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت شیخ عدی اور حضرت شیخ عبدالرزاق حسینی واسطی جیسے جلیل القدر بزرگ بھی تھے ، اس واقعہ کو اس کثرت سے محدثین نے بیان کیا ہے کہ اس میں غلطی کا احتمال نہیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ جب اس ترجمہ کا معائنہ فرما رہے تھے تو ایک روز اپنی مجالس خاص میں فرمایا کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی کتاب کے ترجمہ سے مجھے ایسی خوشی ہوئی ہو جیسی اس کتاب کے ترجمہ سے ہوئی ۔ ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ سالکین روزانہ بطور ورد کے اس کا مطالعہ کیا کریں یہ کتاب نایاب ہو چکی تھی اب دوبارہ طبع کی ہے ۔

اس کے ساتھ دو رسالے تصوف وعطر التصوف بھی شامل ہیں جس میں حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے موافق البرہان المؤید کے خاص قیمتی مضامین کو خلاصہ کرکے الگ کر دیا گیا ہے ، مناسب معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ حضرت حکیم الامۃ کے رسالہ مبادی التصوف بھی شامل کر دیا جائے جس کا مطالعہ مبتدیان سلوک کے لئے بہت مفید اور نافع ہے اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کے لئے کافی شافی ہوگا ۔ معرفت وحقیقت کا نایاب خزانہ ہے امید ہے کہ برادران اسلام عموماً اور برادران سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے ۔ قیمت پچیس ۲۵ روپے علاوہ ڈاک خرچ ۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ملا

ایم ۔ اے جناح روڈ

پرنٹنگ محل کراچی

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

اَلْکَمَال فِی الدِّیْن

(للرّجال)

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی ۱

الکمال فی الدین

(للرّجال)

این	متیٰ	کم کیف	لِمَ	مَاذَا	من ای شان	من ضبط	استعمل	الاسناد
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	متفرقات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ط

یہ ایک مختصر آیت ہے جس میں حق تعالےٰ نے ایک مقصود کا بیان فرمایا ہے اور اس کے

ساتھ ہی اس کے طریق کی تعیین فرمائی ہے اور آگے چل کر میں اس کو واضح کردوں گا کہ وہ طریق نہایت ہی سہل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہر انسان کا ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک اس کی تحصیل کا طریق ہوتا ہے۔ پھر طریق کبھی سہل ہوتا ہے کبھی دشوار۔ اگر مقصود متعین ہو اور اس کا طریق معلوم ہو اور وہ طریق سہل بھی ہو تو بہت جلد کامیابی ہو جاتی ہے ناکامی کا راز صرف یہی ہے کہ یا تو مقصود متعین نہ ہو یا طریق صحیح معلوم نہ ہو۔ یا وہ طریق دشوار ہو جس کے حاصل کرنے کی ہمت نہیں۔

مثلاً ایک شخص بیمار رہے اس کی ناکامی کا سبب کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس کو صحت کا مقصود ہونا معلوم نہ ہو اس لئے وہ صحت کے لئے کوشش اور تدبیر ہی نہیں کرتا یا صحت کا مقصود ہونا تو معلوم ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ صحت حاصل کرنے کا طریقہ معالجہ ہے یا یہ بھی معلوم ہے لیکن طریق معالجہ میں غلطی کر رہا ہے صحیح طریق پر نہیں چلتا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مقصود بھی معلوم، طریق بھی معلوم اور اس کا صحیح ہونا بھی معلوم مگر ہمت نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ معلوم ہے کہ مقصود صحت ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا طریق معالجہ ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ طبیب ماہر فن ہے جو صحیح طریق سے معالجہ کرتا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ حکیم صاحب نے سو روپیہ کا نسخہ لکھ کر دیا ہے اور یہ شخص غریب ہے جو سو روپیہ کا نسخہ استعمال کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح تمام دنیوی امور میں ناکامی کا سبب یہی ہوتا ہے کہ کبھی مقصود معلوم نہیں ہوتا کبھی طریق معلوم نہیں ہوتا کبھی طریق میں غلطی ہوتی کبھی طریق دشوار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو کسب کا مقصود ہونا ہی معلوم نہیں اس لئے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے یا کسب کا مقصود ہونا معلوم ہے مگر اس کا طریق معلوم نہیں یہ دونوں شخص بھوکوں مریں گے۔ یا کسب کا طریق معلوم ہے لیکن سب نے معاش حاصل کرنے کا طریق تجارت کو بتلایا کیونکہ وہ لوگ تجارت کرنے والے تھے اور ان کو تجارت میں بہت کچھ نفع ہو چکا تھا اس لئے وہ ہر شخص کو یہی بتلاتے ہیں کہ معاش

کا طریق تجارت مگر اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور اس شخص نے کبھی روپیہ کی صورت نہیں دیکھی۔ یہ شخص بھی بھوکا مرے گا کیونکہ گو اس کو مقصود بھی معلوم ہے طریق بھی جانتا ہے لیکن لوگوں نے اس کو ایسا طریقہ بتلایا ہے جو اس کے قبضہ سے باہر ہے۔ کسی شفیق نے اس کو مزدوری کا طریقہ نہیں بتلایا جس میں صرف ہاتھ پیر چلانے کی ضرورت ہے۔ روپیہ کی کچھ ضرورت نہیں۔ غرض اسی طرح تمام کاموں میں غور کر لیجئے تو ناکامی کا راز بھی معلوم ہوگا۔

عدم تعیین مقصود۔ و عدم تعیین کا طریق یا عدم سہولت۔ اور ان دونوں کی تعیین و تسہیل کے بعد جو ناکام رہے گا وہ محض اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ناکام رہے گا یہ شخص حصول مقصود کا طریق محض تمنا کو سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی ہے محض تمنا واسطہ ہونے کے قابل نہیں۔ مثلاً ایک شخص گھر میں غلہ جمع کرنا چاہے لیکن نہ کھیتی کرے نہ بیج ڈالے نہ کچھ کرے تو اس کا گھر غلہ سے ہرگز نہ بھرے گا۔ گو وہ کتنی ہی تمنا کرتا ہے کیونکہ عادۃ اللہ اس طرح جاری نہیں ہے کہ محض تمنا سے گھر بھر جایا کرے یوں قدرت ظاہر کرنے کے لئے کبھی حق تعالیٰ ایسا کر دیں تو وہ شاذ و نادر ہے والنادر کالمعدوم۔ خدا تعالیٰ کی قدرت میں یہ ضرور ہے کہ بدون کسب وغیرہ کے بھی گھر بھر دیں اور بعض دفعہ اس کا وقوع بھی ہوا ہے کہ بعض لوگوں کو بے گمان کسی جگہ سے خزانہ مل گیا اور وہ امیر کبیر ہو گئے مگر اس کا وعدہ نہیں ہے۔ پس جب نہ عادۃ اللہ اس طرح جاری ہے نہ کوئی وعدہ کیا گیا ہے پھر کس بھروسے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا جاوے۔ مثلاً حق تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھلانے کے لئے حضرت مریم علیہا السلام کو ایک بیٹا بدون باپ کے دیا تھا مگر عادۃ اللہ یہی ہے کہ بدون باپ کے لڑکا نہیں ہوتا۔ اب اگر کوئی عورت اولاد کی تمنا کرے اور یوں چاہے کہ مریم علیہا السلام کی طرح میرے بھی بدون نکاح کے لڑکا ہو جائے تو اس کو سب پاگل کہیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس کو اولاد مقصود نہیں ہے اگر اولاد مقصود ہوتی تو یہ نکاح ضرور کرتی۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بدون ماں باپ کے پیدا کیا

تھا اب اگر کوئی مرد یہ تمنا کرنے لگے کہ میرے بھی کوئی لڑکا آدم علیہ السلام کی طرح ہو جائے کہ نہ مجھے نکاح کرنا پڑے نہ عورت کے پاس جانا پڑے۔ پس مٹی سے بنا بنایا پتلا پیدا ہو جائے تو سب لوگ اس کو احمق سمجھیں گے اور یہی کہیں گے کہ اس کو اولاد مقصود نہیں ورنہ یہ نکاح ضرور کرتا۔ غرض دنیا کے کاموں میں تمام عقلاء اسباب کے اختیار کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور محض تمنا کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ تمنا مجرد عن الاسباب کو حماقت پر محمول کرتے ہیں حالانکہ بعض اسباب پر مسببات کا ترتب یقینی بھی نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ تجارت کرتے ہیں اور ان کو نقصان ہوتا ہے۔ بعض ملازمت کرتے ہیں اور تنخواہ نہیں ملتی۔ بعضے محنت مزدوری کرتے ہیں مگر مزدوری نہیں ملتی۔ بعضے صنعت و حرفت جانتے ہیں اور ان کو کوئی کام پر نہیں لگاتا۔ لیکن محض توقع کی بناء پر سب عقلاء نے ان اسباب کی ضرورت پر اتفاق کر لیا ہے مگر حیرت در حیرت ہے کہ دین میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا حالانکہ وہ مقصودیت میں سب سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے پھر اس کے طرق بھی معین و معلوم ہیں اور ان طرق کی صحت بھی معلوم ہے کیونکہ خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا صادق ہونا مسلمانوں کے عقیدہ میں داخل ہے۔ پھر وہ طرق و اسباب دشوار بھی نہیں ہیں یہ مطلب نہیں کہ ان کے لئے ارادہ کی بھی ضرورت نہیں میں ارادہ کی نفی نہیں کرتا بلکہ مشقت کی نفی کرتا ہوں کہ اسباب دینیہ میں دشواری اور مشقت کچھ نہیں ارادہ کی بیشک ضرورت ہے۔ اور اس کی سب سے بڑھ کر دلیل حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

ما جعل علیکم فی الدین من حرج اور یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (ترجمہ) خدا نے تمہارے لئے دین میں کچھ تنگی نہیں کی۔ حرج نکرہ تحت نفی ہے جو عموم کو مفید ہے مطلب یہ ہوا کہ خدا نے دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ اس میں مطلق کچھ دشواری نہیں۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں تم کو دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ قرآن پر مسلمانوں کا

ایمان ہے اس لئے اس دعوے کے ثابت کرنے کے لئے صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ دین میں کچھ تنگی نہیں لیکن میں اسی اکتفا نہیں کرتا بلکہ ترقی کرکے کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ عقلاً بھی ثابت ہے کیونکہ جس وقت قرآن نازل ہوا ہے تمام کفار اس کی مخالفت پر آمادہ اور اس میں عیب نکالنے کے درپے تھے وہ قرآن کی تکذیب کے لئے بہانے ڈھونڈھتے رہتے تھے۔ ادھر قرآن میں تمام عالم کو دعوت دی گئی کہ وہ قرآن کا مثل بتلادیں جس سے ان کو اور بھی زیادہ اشتعال ہوگیا تھا پھر اس وقت سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ میں ملاحدہ اور مخالفین نے قرآن پر اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے اور قرآن میں یہ دعوے بڑے شد ومد کے ساتھ کیا گیا ہے کہ دین میں کچھ تنگی نہیں اگر یہ دعوے کمزور ہوتا اور اس میں کچھ بھی خلاف واقع ہونے کی بو ہوتی تو ملاحدہ اور کفار ومشرکین ہرگز اعتراض سے نہ چوکتے وہ ضرور اس کی تکذیب کرتے اور قرآن کی مخالفت کے لئے اچھا خاصہ بہانہ اُن کے ہاتھ آجاتا کہ دیکھئے قرآن کا یہ دعوے کتنا خلاف واقع ہے کہ جو دین اس قدر دشوار ہے اس کو آسان بتلایا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ تنگی نہیں ہے۔ لیکن کسی ملحد یا مخالف نے آج تک قرآن کے اس دعوے کی تکذیب نہیں کی ورنہ اور اعتراضوں کی طرح یہ اعتراض بھی ضرور منقول ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مخالفین کو اس دعوےٰ میں چون وچرا کی کچھ بھی گنجائش نہیں ملی۔ مگر افسوس ہے اس زمانہ میں قرآن پر اعتقاد رکھنے والے یعنی بعضے مسلمان اس دعوے پر اعتراض کرتے ہیں جس پر مخالفین کو بھی حرف گیری کا موقع نہ ملا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو اس پر اعتقاد نہیں۔ اعتقاد تو ہے مگر حالت یہ ہے کہ اگر وہ قرآن کے اس دعوے کی تکذیب نہیں کرتے تو دل کھول کر تصدیق بھی نہیں کرتے اس کی تصدیق کرتے ہوئے ان کے دل رُکتے ہیں۔ مگر جس مسئلہ کو مخالف بھی تسلیم کرچکا ہو اس پر مسلمانوں کا اعتراض کرنا بڑی شرمناک بات ہے۔

صاحبو! میں بقسم کہتا ہوں کہ قرآن کا یہ دعویٰ بالکل سچا اور صحیح ہے اگر اسمیں

کچھ بھی کمزوری ہوتی تو ملاحدہ ہرگز نہ چوکتے خصوصاً جبکہ وہ ان کمزور مسلمانوں کے وہ دلائل بھی سُن لیتے جو آج کل اس کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں کہ صاحب دین پر عمل کرنا بہت دشوار ہے۔ اگر تجارت کرو تو بات بات پر شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اس صورت میں ربوا لازم آگیا۔ اس صورت میں ثمن مجہول ہے اس لئے بیع فاسد ہے۔ اس صورت میں یہ شرط فاسد ہے کسی صورت میں جہالت بیع کی وجہ سے بیع فاسد ہے اور ہم کو تجارتی معاملات اہلِ یورپ سے اس طریق پر کرنے پڑتے ہیں جو ان کے یہاں رائج ہے اور اہلِ یورپ بالکل آزاد ہیں ان کے معاملات کی اکثر صورتیں خلافِ شریعت ہیں۔ اب اگر تجارت کریں تو دین پر کس طرح قائم رہیں اور دین پر قائم رہیں تو تجارت کس طرح چلے۔ قرض بلا سود کہیں سے نہیں ملتا اور تجارتی کاروبار بدون قرض کے نہیں چل سکتا اب کریں تو کیا کریں۔ ملازمت کا حال یہ ہے کہ اس میں بھی بعض کام خلاف شرع کرنے پڑتے ہیں۔ زراعت میں بھی قدم قدم پر شرعی احکام رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ میں ان سب اعتراضوں کا بھی جواب دوں گا بلکہ اور بھی کوئی اعتراض کسی کے ذہن میں ہو تو ان شاء اللہ وہ بھی اس جواب سے حل ہو جائے گا۔ مگر جواب سے پہلے میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ اگرچہ حکایت گندی ہے مگر اس حالت کے بالکل ہی مطابق ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ مثال سے مضمون جلدی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

ہمارے قصبے میں ایک عورت مغرب کے وقت اپنے بچہ کو پاخانہ پھرا رہی تھی چاندرات کا موقع تھا بچے اور عورتیں عید کا چاند دیکھ رہی تھیں یہ عورت بھی بچہ کو پونچھ پانچھ کر چاند دیکھنے کھڑی ہوئی، جلدی میں کچھ پاخانہ انگلی کو لگا رہ گیا جلدی میں اُسے خبر نہ رہی کہ میری انگلی میں کیا لگا ہوا ہے۔ اس نے عورتوں کی عادت کے موافق ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا تو اس میں سے پاخانہ کی بدبو آئی۔ تو آپ فرماتی ہیں کہ اے ہے ایکے عید کا چاند سڑا ہوا کیوں نِکلا۔ تو جس طرح اس عورت کو اپنی انگلی کا پاخانہ چاند میں محسوس ہوتا تھا اور وہ یہ سمجھتی تھی کہ چاند سڑا ہوا نکلا ہے۔

اب صاحبو! خدا کی قسم اسی طرح تم کو جو دین میں تنگی نظر آ رہی ہے یہ دین کی تنگی نہیں بلکہ حقیقت میں یہ تنگی تمہارے اندر ہے۔ تمہارے تمدن اور معیشت میں تنگی ہے جس کو میں آگے وضاحت کے ساتھ بتلا دوں گا مگر آپ کی یہ حالت ہے کہ اپنی انگلی کو تو آپ دیکھتے نہیں کہ اس میں نجاست لگی ہوئی ہے خواہ مخواہ ماہتاب شریعت کو بدبو دار بتاتے ہیں حالانکہ وہ اتنی بلندی پر ہے کہ یہ گند گیاں اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتیں۔

جیسے ایک حبشی کا قصہ ہے کہ اس کو راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا تو آپ نے اس کو اٹھا لیا اور اس میں اپنا چہرہ دیکھنا شروع کیا تو ایک ڈراونی صورت بھدی شکل اس میں نمودار ہوئی تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ یہ صورت اس آئینہ میں پہلے ہی سے بنی ہوئی ہے اپنی نسبت یہ بدگمانی نہ ہوئی کہ شاید یہ میری ہی صورت دلفریب ہو کیونکہ آدمی کو اپنی صورت تو نظر نہیں آتی اس لئے اپنی صورت کا برا بھلا ہونا خود کو کم معلوم ہوتا ہے تو اس حبشی نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اسے پھینکدیا اور کہا ایسی بری صورت کا تھا جبھی تو تجھے کوئی یہاں پھینک گیا۔

صاحبو! اسی طرح آپ کو اپنی مہیب صورت دین کے آئینہ میں نظر آتی ہے جس کو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا بھدا پن نعوذ باللہ دین کے اندر ہے۔ حالانکہ اس میں تو اس قدر صفائی اور نور ہے کہ ظلمت اور سیاہی کا وہاں نام بھی نہیں لیکن شفاف ہونے کی وجہ سے آپ کو اپنی صورت اس میں نظر آ رہی ہے جس کو آپ مزین کی صورت سمجھے ہوئے ہیں اس کی نظیر میں مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(حملہ خود تو اپنے اوپر کرتا ہے اے سادہ مرد مثل اس شیر کے جس نے اپنے اوپر خود حملہ کیا تھا)

اس کا قصہ مولانا نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے کہ۔ایک مرتبہ نخچیروں نے باہم مشورہ کیا کہ شیر روزانہ ہم کو پریشان کرتا ہے اور ایک دو کو شکار کرلیتا ہے جس سے ہر ایک کو روزانہ اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے اور اس خطرہ سے زندگی تلخ رہتی ہے آؤ ہم سب چل کر شیر سے یہ کہیں کہ وہ اس طرح ہم کو پریشان نہ کیا کرے ہم روزانہ اپنے میں سے ایک کو اس غذا کے لئے بھیجدیا کریں گے جس سے دوسروں کو تو اطمینان ہو جائے گا چنانچہ سب نے جاکر شیر سے یہ بات کہی اس نے منظور کرلیا کیونکہ اس میں اس کو بھی راحت تھی کہ روزانہ بے محنت و مشقت گھر بیٹھے غذا مل جایا کرے گی۔ اب نخچیروں نے قرعہ ڈال کر روزانہ ایک شکار کو شیر کے پاس بھیجنا شروع کیا جس کا نام قرعہ میں نکل آتا سب اس کو مجبور کرکے شیر کے پاس بھیجدیتے۔

ایک دن خرگوش کی باری آئی سب نے اس سے کہا کہ جاؤ آج شیر کی غذا تم ہی ہو کہنے لگا کہ میں تو نہیں جاتا یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں چلا جاؤں۔ یہ تو خودکشی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی یہ بات مناسب نہیں شیر سے وعدہ خلافی ہو گی کہنے لگا کہ یہ وعدہ خود ہی ناجائز ہے کیونکہ یہ خودکشی کو مستلزم ہے اور ناجائز وعدہ کا ایفا واجب ہی نہیں اب تو نخچیروں میں کھلبلی پڑگئی سارے اکھٹے ہوگئے اور خرگوش کو سمجھانے لگے کہ اگر تو نہ گیا تو شیر کو غصہ آجائے گا۔ اس نے کہا کہ بلا سے اگر اُسے غصہ آویگا تو سبھی پر آوے گا پھر جس کی موت آگئی ہو گی اسے کھالے گا۔ ممکن ہے کہ اس صورت میں میں بچ جاؤں اور جو صورت تم تجویز کر رہے ہو اس میں تو میری موت یقینی ہے اور موت محتمل پر موت یقینی کو کون گوارا کرسکتا ہے یہ تو بالکل عقل کے خلاف ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اس وعدہ خلافی سے فتنہ برپا ہو جائیگا اس نے کہا میرے لئے تو آج ہی فتنہ آگیا مجھے فتنہ کی کیا پرواہ ہے۔ میرے لئے موت سے بڑھ کر کیا فتنہ ہے۔ بیش ازیں نیست کہ وہ غصہ میں

آکر مجھے کھالے گا تو یہی تجویز تم میرے واسطے کر رہے ہو اتنا فرق ہے کہ اس وقت میں خود موت کے منہ میں جا رہا ہوں اور رفتہ کے وقت میں اپنے بچنے کی پوری کوشش کروں گا پھر بھی اگر مر گیا تو تقدیر ہے لیکن وہ صورت اس سے اہون ہے کیونکہ اُس میں خودکشی تو نہ ہو گی۔ جب نخچیروں نے دیکھا کہ دلائل سے یہ قائل نہیں ہوتا تو اب برادری کے زور سے کام لیا اور سب نے اس پر دباؤ ڈالا کہ نہیں تم کو ضرور جانا ہو گا اگر تم نہ جاؤ گے تو ہم جبراً تم کو شیر کے سپرد کر دیں گے۔ بالآخر برادری کے دباؤ سے خرگوش مجبور ہو کر چلا۔ مگر راستہ میں سوچنے لگا کہ کوئی تدبیر ایسی کرنی چاہیئے کہ جس سے جان بھی بچ جائے اور برادری بھی ناخوش نہ ہو۔ راستے میں اسے کنواں نظر پڑا جس میں پانی بھرا ہوا تھا، خرگوش بہت خوش ہوا کہ بس شیر کو اسی کنوئیں میں ڈبو دینا چاہیئے۔ اس کے بعد وہ شیر کے پاس پہنچا۔ شیر کے راتب میں چونکہ آج بہت دیر ہو گئی تھی اس لئے وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا اور یہ خیال کر رہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے ان نخچیروں نے اپنے وعدہ کو بدل دیا ہے پس میں آج جا کر ان کو کافی سزا دوں گا خرگوش کو دیکھ کر شیر بہت غرایا اور اس کو برا بھلا کہنے لگا کہ آج معمول سے زیادہ دیر کیوں ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دلوں میں وعدہ خلافی کا خیال پیدا ہوا ہے۔ خرگوش نے کہا کہ حضور آپ پہلے ہمارا واقعہ تو سُن لیں اس کے بعد ہی غصہ کیجئے گا۔ آج مجھ کو آنے میں دیر اس لئے ہوئی کہ آپ کی دارالسلطنت میں ایک قوی دشمن گھس آیا ہے جس نے راستہ روک رکھا ہے اور یوں کہتا ہے کہ تم بجائے فلاں شیر کے مجھ کو راتب دیا کرو اس کو مت دیا کرو۔ اور آج آپ کے راتب کے لئے ایک بڑا موٹا خرگوش تجویز ہوا تھا وہ میرے ہمراہ راستہ میں آ رہا تھا کہ اس کو دوسرے شیر نے پکڑ لیا میں بھاگ کر بچ گیا اور اطلاع کرنے کے لئے آپ کے پاس پہونچ گیا۔ پس اگر آپ کو اپنے راتب کی خیر منظور ہے تو اس

دشمن کو اپنی دارالسلطنت سے نکال دیجئے ورنہ کل سے آپ کا راتب بالکل بند ہے وہ کسی کو آپ تک پہنچنے نہ دے گا۔ شیر کو اپنے رقیب کا حال معلوم کرکے بڑا غصہ آیا اور کہا کہ میرے ساتھ چلو میں ابھی اس کو سزا دیتا ہوں وہ ایسا شیر کونسا ہے جو مجھ سے بھی زیادہ زبردست ہے چنانچہ خرگوش اس کو ساتھ لیکر کنویں پر پہنچا اور کہا کہ حضور دیکھئے وہ اس کنویں میں رہتا ہے اور دیکھئے اس کے قبضے میں مجھ سے بھی زیادہ موٹا تازہ خرگوش ہے شیر نے جو کنویں میں جھانکا تو اس کو اپنی صورت نظر آئی اور اپنے ساتھ ہی خرگوش کی بھی صورت نظر آئی اور یہ قاعدہ ہے کہ پانی کی تہ میں ہر چیز بڑی نظر آیا کرتی ہے تو خرگوش کی صورت بھی بڑی معلوم ہوئی۔ شیر نے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر غصہ میں اس پر حملہ کیا اور دھڑام سے کنویں کے اندر جا پہنچا۔ وہاں پانی کے سوا کیا تھا۔ اب خرگوش اوپر سے کہتا ہے کہ بس یہ تمہارا قیدخانہ ہے تم اسی میں ڈوب کر جان دیدو اور میں جاتا ہوں میرا اسلام لو۔ اس کے بعد خرگوش خوش ہوتا ہوا اپنی برادری میں پہنچا انھوں نے کہا کہ کیا تو شیر کے پاس نہیں گیا اس نے جواب دیا کہ تم نے مجھے اس کا شکار بنانا چاہا تھا میں نے اسی کو شکار کر دیا۔ اس پر مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(حملہ تو خود اپنے اوپر کرتا ہے اے سادہ مرد مثل اس شیر کے جس نے پانی کے اندر اپنی تصویر دیکھ کر اپنا رقیب اس کو سمجھ کر اس پر حملہ کر دیا)

صاحبو! یہی حال معترضین کا ہے کہ جو اعتراض وہ شریعت پر کرتے ہیں حقیقت میں وہ اپنے اوپر اعتراض کر رہے ہیں۔ مگر ان کو خبر نہیں۔ شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو ایک دعوے ہوا۔ اس کی دلیل کیا ہے۔ اور شریعت میں تنگی کا ہونا تو ہم کو مشاہدہ سے معلوم ہے کیونکہ خود دیکھ رہے ہیں کہ معاملات وغیرہ میں ہم کو شریعت پر عمل کرتے ہوئے سخت تنگی پیش آتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میں اس کی تردید و تکذیب نہیں کرتا کہ آپ کو معاملات وغیرہ میں تنگی پیش نہیں آتی میں اس کو تسلیم کرتا ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تنگی کا سبب شریعت مقدسہ ہے یا آپ کی معیشت اور تمدن کا خراب ہونا یاد رکھو کسی قانون کو تنگ اس وقت کہا جاسکتا ہے جبکہ سب آدمی اس پر عمل کرنا چاہیں اور پھر بھی اس پر عمل کرنا دشوار ہو۔ اور اگر کسی قانون پر عمل کرنا اس لئے دشوار ہو جاوے کہ ہزار آدمیوں میں سے دس آدمی تو اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور باقی تمام جماعت اس ارادہ کی مخالفت کرتی ہے اس صورت میں قانون کو ہرگز تنگ نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہی کہا جائے گا کہ تمہاری قوم کا تمدن تنگ ہے ان کی معیشت میں تنگی ہے، اس قاعدہ کو سمجھ کر سوچئے کہ آپ کو شریعت پر عمل کرنے میں تنگی کیوں پیش آتی ہے محض اسی وجہ سے تاکہ آپ تنہا اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور باقی تمام تجار اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے۔ آپ سود کی ڈگری نہیں دینا چاہتے مگر مدعی سود لینا چاہتا ہے۔ اگر آپ ڈگری نہ دیں گے تو وہ اپیل کرکے سود وصول کرلے گا۔ ایک محکمہ میں ہزار آدمی ملازم ہیں ان میں دو چار آدمی نماز کے وقت کام کرنا نہیں چاہتے باقی تمام ملازم نماز کے ضائع کرنے پر راضی ہیں اس لئے ان دو چار آدمیوں کو تنگی پیش آتی ہے اگر سب اس کا ارادہ کرلیں کہ ہم نماز کو کبھی ضائع نہ کریں گے تو حاکم محکمہ ضرور اس کے لئے قانون بنانے پر مجبور ہوگا علیٰ ہذا تمام صورتوں میں غور کرلیجئے کہ شریعت پر عمل میں تنگی محض اسی وجہ سے پیش آئے گی کہ ایک کام کا تعلق پوری جماعت سے ہے جن میں صرف دو چار آدمی شریعت پر عمل کا قصد کرتے ہیں اور زیادہ حصہ عمل کرنا نہیں چاہتا اب آپ ہی بتلایئے کہ یہ تنگی احکام شرعیہ میں ہے یا آپ کے تمدن و معیشت میں۔ صاحبو! اس طرح تو آسان سے آسان کام بھی دشوار ہو جائے گا۔ دیکھئے کھانا کھانا کتنا آسان ہے لیکن اگر آپ کسی ایسے گاؤں میں پہنچ جائیں جہاں نہ آٹا بکتا ہو نہ لکڑی داموں سے ملتی ہو۔ نہ دال اور

اور گھی ملتا ہے تو کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھانا بہت دشوار چیز ہے ہرگز نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ اس گاؤں کا تمدن تنگ ہے یا آپ کھانا چاہتے ہوں لیکن آپ کے سر پر دس ڈاکو آکر کھڑے ہو جائیں کہ جب لقمہ اٹھاؤ وہ چھین کر کھا جاتے ہیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھانا مشکل کام ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ آپ کی معاشرت تنگ ہے ڈاکوؤں کی جگہ سے علیحدہ ہو کر رہو پھر دیکھو کھانا کتنا آسان کام ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ آپ کسی ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں عموماً سب لوگوں کو شریعت پر عمل کرنے کا اہتمام ہو پھر بتلایئے کہ شریعت میں کیا تنگی ہے۔ دیکھو اگر کوئی مریض طبیب کے پاس جائے اور وہ اس کو ایسا نسخہ لکھ کر دے جس کی قیمت دو پیسے ہے سستی دوائیں لکھے اور معمولی دوائیں بتلائے جو عموماً ہر جگہ مل جاتی ہیں لیکن مریض ایسے کوردہ کا رہنے والا ہے جہاں قسمت سے معمولی دوائیں بھی نہیں ملتیں نیز حکیم صاحب نے معمولی پرہیز بتلایا تھا اور دس پندرہ چیزوں کی اجازت دیدی تھی کہ پالک کا ساگ۔ ترئی۔ کدو۔ مونگ کی دال۔ بکری کا گوشت۔ شلجم کی بھجیا وغیرہ کھا سکتے ہو لیکن اس کوردہ میں کوئی چیز بھی مریض کے کھانے کے قابل نہیں ملتی ہاں بیگن۔ کریلے اور مسور کی دال بہت ملتی ہے جس سے طبیب نے پرہیز بتلایا ہے اب یہ مریض اگر یوں کہنے لگے کہ اس طبیب کے مطلب میں بہت تنگی ہے یا یوں کہنے لگے کہ علم طب ہی بہت تنگ ہے جس پر عمل کرنا دشوار ہے تو کیا کوئی عاقل اس کی بات کو تسلیم کر سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ سب یہی کہیں گے کہ ظالم علم طب میں تو بہت وسعت ہے کہ سنگین سے سنگین مرض کا علاج ہزار روپیوں میں بھی ہو سکتا ہے اور چار پیسے کی دوائیں بھی۔ لیکن تیرا گاؤں ہی بہت تنگ ہے جس میں معمولی چیزیں بھی ملنا دشوار ہے۔ صاحبو! بعینہٖ یہی مثال ان اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کی ہے کہ وہ اپنے تمدن اور معاشر کی تنگی کو تو دیکھتے نہیں خواہ مخواہ شریعت پر الزام لگاتے ہیں کہ اس میں تنگی

اور دشواری ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ قانون شریعت سے زیادہ کوئی قانون ہو ہی نہیں سکتا جس میں مصالح دنیا و آخرت کی پوری پوری رعایت کی گئی ہو۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جس جگہ زیادہ حصہ مسلمانوں کا شریعت پر عمل نہ کرنا چاہے بلکہ عمل کرنے والوں کو بھی اس سے روکنا چاہے تو ان ڈاکوؤں کی وجہ سے تنگی پیش آجائے گی ورنہ احکام شرعیہ فی نفسہا بہت سہل ہیں جن پر اگر سب مل کر عمل کرنا چاہیں تو نہایت راحت و اطمینان سے زندگی بسر ہو حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا پھر یہ کیونکر تسلیم کرلیا جاوے کہ شریعت کے احکام وسعت انسانیہ سے باہر ہیں یا ان میں کچھ بھی دشواری ہے خدا تعالیٰ کا کلام کبھی ٹوٹ نہیں سکتا نہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہے اس مضمون کو میں نہایت تفصیل کیساتھ بیان کرسکتا ہوں لیکن میں اس مضمون پر پہلے عرصہ ہوا کہ ایک مفصل تقریر کرچکا ہوں۔ جس کا نام نفی الحرج ہے اور وہ اب قریب الطبع ہے۔ اہل مطبع کہتے تھے کہ ہم اس کو بہت جلد شائع کریں گے۔ اس میں ہر پہلو سے اس دعوے کو خوب اچھی طرح ثابت کردیا گیا کہ دین میں ہرگز تنگی نہیں اور اُس وعظ میں نو تعلیم یافتہ طبقہ کے بھی بہت حضرات موجود تھے سب نے اُس کو سُنکر گردنیں جھادیں اور اس کا اقرار کیا کہ واقعی یہ دعویٰ اچھی طرح ثابت ہوگیا اور ہمارا عرصہ کا اشکال رفع ہوا۔ اس وعظ کی ایک کاپی ہر مسلمان کے گھر میں رہنی چاہیئے خصوصًا نو تعلیم یافتہ حضرات تو ایک کاپی ضرور رکھیں کیونکہ اُنکو اس قسم کے اشکالات زیادہ پیش آتے ہیں اور دین میں شک وشبہ کا رہنا بڑا سنگین مرض ہے اس کا علاج بہت اہم ہے۔ ان شاء اللہ اس وعظ سے بہت سے اشکالات رفع ہوجائیں گے۔ حاصل یہ کہ دین مقصودیت میں بھی سب سے بڑھا ہوا ہے اور اس کا طریق بھی متعین ہے اور طریق میں تنگی بھی نہیں بلکہ سہل اور بہت سہل ہے اور پھر اُس طریق پر مقصود کا ترتب بھی یقینی چنانچہ اوپر بھی مذکور ہوا ہے اور یہاں اس کا راز بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دین کے کاموں میں ثمرہ کا وعدہ

فرمایا ہے اور اسباب دنیویہ میں اس کا وعدہ نہیں فرمایا چنانچہ دنیا کے متعلق ارشاد
ہے من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا مانشاء لمن نرید یعنی جو کوئی
دنیا کا قصد کرے گا ہم اس کو دنیا میں جس قدر ہم چاہیں گے اور جس کے لئے
چاہیں گے سردست دیدیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیوی مراد کا حصول مشیت
پر موقوف ہے یہ وعدہ نہیں کہ جو تم چاہو وہی مل جائے اور یہ بھی وعدہ نہیں کہ
ہر ایک کا مقصود پورا ہو جائے بلکہ بعض کا مقصود حسب مشیت الہٰی حاصل
ہو جاتا ہے اور بعض کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوتا اور اعمال آخرت کے
متعلق ارشاد ہے ومن اراد الاٰخرۃ وسعی لھا سعیھا وھو مؤمن فاولئک
کان سعیھم مشکورا ۔ اور جو کوئی آخرت کا ارادہ کرے اور مومن بن کر اس کے
لئے وہ کوشش کرے جو اس کے مناسب ہے تو ان لوگوں کی کوشش مشکور ہے یعنی
حق تعالیٰ اس کی قدر فرمائیں گے اس آیت میں وسعی لھا سعیھا۔ اراد۔ کا بیان
ہے یعنی ارادہ سے مراد محض تمنا نہیں کیونکہ خالی تمناہ کافی نہیں بلکہ ارادہ سے مراد قصد
جازم ہے جس کے لئے سعی لازم ہے آگے اس کی جزا مذکور ہے اولئک کان سعیھم
مشکورا ۔ کہ ان کی سعی کی قدر کی جائے گی اور ظاہر ہے کہ شاہی محاورہ میں یہ جملہ
بہت امید افزا ہے جب کوئی بادشاہ اپنے کسی خادم سے یہ کہدے کہ ہم تمھاری خدمات
کے قدردان ہیں تو اس کو انعامات جلیلہ کی پختہ امید ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھ جاتا
ہے کہ مجھ کو میری خدمات سے بدرجہا زائد صلہ ملے گا۔ جب ادنیٰ سے ادنیٰ حاکم کے
کلام میں ایسے جملہ سے بہت کچھ امیدیں پختہ ہو جاتی ہیں تو احکم الحاکمین کے کلام
میں اس جملہ سے کیا کچھ امیدیں پیدا ہونی چاہئیں اس کا فیصلہ اہل ذوق خود کر سکتے ہیں
دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں من کان یرید حرث الاٰخرۃ نزد لہ فی حرثہ ومن
کان یرید حرث الدنیا نوتہ منھا۔ دنیا کے متعلق نوتہ منھا فرمایا جس کا حاصل یہ
ہے کہ جو شخص دنیا کا قصد کرتا رہے اس کو ہم کچھ دیدیتے ہیں وعدہ نہیں کہ جو وہ چاہے
وہی دیدیں اور آیت سابقہ کے قید لمن یشاء یہاں بھی ہے اور آخرت کے

متعلق ترقی کا وعدہ ہے اور وعدہ بھی اطلاق کے ساتھ ہے جس میں مشیت وغیرہ
کی قید مذکور نہیں نہ من تبعیضیہ لایا گیا ہے جس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ارادہ
آخرت کے بعد تو مراد ضرور حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عطا ہوتا ہے
سبحان اللہ دنیا کے متعلق تو یہ بھی وعدہ نہیں کہ جو مانگے وہی مل جائے اور یہاں
زیادت کا بھی وعدہ ہے اور یہ ترقی محض آخرت ہی میں نہیں بلکہ دین اختیار کرنے
والوں کو دنیا میں بھی ان کے اعمال سے زیادہ جزا مل جاتی ہے۔ دینداروں کو دنیا
میں بھی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن کی ان کو پہلے سے خبر بھی نہیں تھی آخرت کے متعلق
تو مسلمانوں کو اس کا علم عام طور پر ہے سب جانتے ہیں کہ آخرت میں عمل سے زیادہ
صلہ ملے گا کیونکہ وہ یہ حدیث سنتے ہوئے ہیں اعددت لعبادی الصالحین مالا
عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ میں نے اپنے نیک بندوں
کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی بشر
کے دل پر ان کا خطرہ گذرا۔ لیکن دنیا میں زیادت اور ترقی کا علم بہت لوگوں کو نہیں
ہے اکثر مسلمانوں کا خیال یہ ہے کہ دین کا ثمرہ عمل سے زیادہ آخرت ہی میں ملیگا۔
اور دنیا میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اعمال صالحہ کا ثمرہ نہیں ملتا یا کم ملتا ہے مگر یہ خیال بالکل
غلط ہے حق تعالیٰ اعمال دینیہ کا ثمرہ دنیا میں بھی امید اور خیال سے زیادہ عطا فرماتے ہیں اور اس ثمرہ کی
بھی وہی شان ہوتی ہے ولا خطر علی قلب بشر کہ انسان کے دل میں پہلے سے اس کا خطرہ بھی نہیں گذرتا
شاید آپ یہ سوال کریں کہ وہ ثمرات کیا ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ دین کو اختیار کر لو خود ہی تم کو وہ ثمرات
حاصل ہو جائیں گے میں ان کو بیان نہیں کر سکتا اور وہ بیان میں آ بھی نہیں سکتے کیونکہ ان کی تو شان یہ ہے
ولا خطر علی قلب بشر اور بیان کرنے سے قابل خطور ہونا لازم آ جائیگا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں بھی اہل
دین کو وہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں جن کے بیان کیلئے الفاظ بھی نہیں ملتے ہاں کچھ کچھ پتہ ان کا بزرگوں کے
کلام سے معلوم ہوتا ہے جن کا صادق ہونا امارات یقینیہ سے معلوم ہے ایک کتاب میں ایک
بزرگ کا قول ہے۔ لکھا ہے لو علمت الملوك بما عندنا من النعمہ
لجا دلونا بالسیوف کہ اگر سلاطین کو ان نعمتوں کا علم ہو جائے جو ہمارے پاس ہیں

تو وہ تلواریں لے کر ہم پر چڑھائی کر دیں اور ان کو چھیننا چاہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے پاس وہ نعمتیں ہیں جن کی لذت کے سامنے سلطنت ہفت اقلیم کی بھی کچھ حقیقت نہیں کیونکہ سلاطین تو اسی چیز کے طالب ہو سکتے ہیں جو ان کی دولت موجودہ سے بڑھ کر ہو اگر وہ نعمت سلطنت سے کم ہوئی تو بادشاہوں کو ادھر توجہ کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے جبکہ وہ اس سے زیادہ نعمت لئے بیٹھے ہیں۔ پس یقیناً وہ نعمت ایسی ہے جس کی سلاطین کو ہوا بھی نہیں لگی۔ پھر یہی نہیں کہ بزرگوں کی یہ باتیں ہی باتیں ہیں بلکہ جس کو وہ نعمت حاصل ہوئی ہے اس نے سلطنت پر لات مار کر بھی دکھلا دیا ہے۔ ابراہیم ادہمؒ کا قصہ مشہور ہے کہ جب خدا تعالے نے ان کو اپنی خاص نعمت سے نوازا ہے تو تخت سلطنت چھوڑ کر فقر و فاقہ کو اختیار کر لیا۔ پس وہ ایسی نعمت ہے کہ جس کے سامنے وہ سلطنت کو بالکل ہیچ سمجھتے ہیں مگر ظاہر میں یہ حالت ہے کہ نہ کپڑے درست ہیں نہ صورت ٹھیک ہے اور باطن میں بھی وہ ایسے غنی ہیں کہ سلاطین کو بھی منہ نہیں لگاتے بلکہ خود سلاطین ان کی غلامی کو اپنے لئے فخر سمجھتے ہیں اس نعمت کو عارف شیرازی اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم
شہاں بے کمر و خسرواں بے کلہ اند

(حق تعالےٰ کے عاشقوں کو حقیر مت سمجھو کہ یہ بے تخت و تاج ہی باطنی سلطنت کے بادشاہ ہیں)

نیز عارف شیرازی اس نعمت کا کسی قدر پتہ بھی بتلاتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بفراغِ دل زمانے نظرے بماہروے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے و ہوئے

(فراغ دل سے ایک لمحہ کو بھی اس محبوب کی یاد میں لگنا اس سے بہتر ہے کہ شاہی چھتری سر پر ہو اور سلطنت کا شور و غل ہو۔)

معلوم ہوا کہ وہ نعمت یہ ہے کہ حق تعالےٰ کی طرف کامل توجہ اور اس سے کامل
معلق ہوجاوے ۔ اس نعمت کی یہ خاصیت ہے کہ پھر یہ شخص دنیا سے مستغنی ہو
جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جس دل میں خدا ہوگا اس میں کوئی دوسری چیز کب رہ سکتی ہے

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق وہ آگ ہے جب دل میں روشن ہوتی ہے معشوق کے علاوہ سب غیر کو
جلا کر خاک کر دیتی ہے۔)

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت
مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(صرف حق تعالیٰ ہی کی ذات دل میں باقی رہتی ہے مبارک ہوائے عشق
تجھ کو کہ تو نے غیر اللہ کو جلا کر دل کو غیر حق کی شرکت سے پاک کر دیا)

لیکن یہ بھی اس نعمت کا اجمالی ہی پتہ ہے کیونکہ اس سے بھی یہ نہ معلوم ہوا کہ خدا
تعالےٰ سے کامل تعلق کیونکر ہوا کرتا ہے اسی لئے اس میں غلطی بھی ہوتی ہے چنانچہ
بعض لوگ محض ملکۂ یادداشت کو کامل تعلق کا مصداق سمجھتے ہیں اور نسبت کی حقیقت
اسی کو سمجھتے ہیں ۔ اور ایک زمانہ تک میں بھی یہی سمجھتا رہا مگر الحمد للہ کہ اب حق تعالےٰ
نے حقیقت منکشف فرمادی حق تعالےٰ سے تعلق ونسبت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں
طرف سے تعلق ہو بندہ کو خدا سے تعلق ہو اور حق تعالیٰ کو بندہ سے تعلق ہو اگر صرف
بندہ کو تعلق ہوا اور اُدھر سے تعلق نہ ہوا بلکہ حجاب رہا تو یہ نسبت مطلوبہ نہیں بغرض
لوگ محض یادداشت کو نسبت مطلوبہ سمجھتے ہیں حالانکہ یادداشت تو مشق سے
حاصل ہو سکتی ہے نسبت مقصودہ یہ ہے کہ تم خدا سے راضی رہو وہ تم سے راضی
رہیں اور یہ بات محض مشق ذکر سے حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے کثرت ذکر کے
ساتھ اجتناب معاصی و ادائے طاعات بھی شرط ہے اگر ذکر کے ساتھ معاصی
سے اجتناب کا اہتمام نہیں اور طاعات کے بجا لانے کی فکر نہیں تو نسبت مطلو

حاصل نہیں۔ بہت لوگ اس دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ جہاں ان کو ذکر کی مشق ہوگئی اور ہر وقت خدا کا دھیان رہنے لگا بس وہ اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے لگے۔ پھر چونکہ معصیت سے اس مشق میں فتور نہیں آتا اس لئے یہ شخص یوں سمجھنے لگتا ہے کہ مجھ کو معاصی مضر نہیں حالانکہ صوفیہ کا قول ہے کہ معصیت سے نسبت باطنیہ کمزور ہوجاتی ہے اور معاصی پر اصرار کرنے سے وہ رفتہ رفتہ زائل ہوجاتی ہے بلکہ بعض لوگ یہاں تک دھوکہ میں پڑگئے کہ بعد حصول نسبت کے ایک مقام ایسا آتا ہے جس میں اس شخص سے تکالیف شرعیہ ساقط ہوجاتی ہیں اور کوئی حرام اس کے لئے حرام نہیں رہتا۔ یاد رکھو یہ صریح زندقہ ہے تکالیف شرعیہ جبتک ہوش و حواس درست رہیں کسی سے بھی کسی وقت ساقط نہیں ہوتیں۔ پس نسبت ایک ایسا تعلق ہے جو طرفین سے ہوتا ہے اگر صرف ایک طرف سے ہوا اور دوسری طرف سے نہ ہو تو وہ نسبت ایسی ہے جیسے ایک طالب علم سے کسی نے پوچھا تھا کہ آج کل کس فکر میں ہو کہنے لگا کہ شاہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہوں اُس نے پوچھا کہ پھر اس کے لئے کیا سامان کیا کہنے لگا کہ آدھا سامان تو ہوگیا آدھا باقی ہے اس نے پوچھا کیونکر کہنے لگا میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں ہے تو جیسا کہ یہ شخص اپنی رضامندی سے آدھا سامان مکمل کیے ہوئے تھا اسی طرح ان لوگوں کی نسبت ہے اور ظاہر ہے کہ نکاح میں ایک طرف کی رضا بدون رضا دوسرے کی کچھ بھی وقعت نہیں رکھتی۔ اسی طرح ان لوگوں کی نسبت جو کہ محض ایک طرف سے ہے محض بالکل کالعدم ہے اس صحیح نسبت ہی میں وہ لذّت حاصل ہوتی ہے جس کے سامنے سلطنت کی کچھ حقیقت نہیں۔

حضرت غوث اعظمؒ کی خدمت میں ایک مرتبہ ملک سنجر نے یہ لکھا کہ میں حضرت کی خانقاہ کے مصارف کے لئے ملک نیمروز کے ایک حصہ کو نامزد کرنا چاہتا ہوں حضرت اس کو قبول فرمائیں تو آپ نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوسِ ملک سنجرم
(مثل شاہ سنجر کے اس سیاہ چھتری کے جو اس کے سر پر لگائی
جاتی تھی ہمارا نصیبہ سیاہ ہو جاوے اگر ہمارے دل میں ملک سنجر کی ہوس ذرا بھی ہو)
اس زمانہ میں ان سلاطین کا پرچم سیاہ رنگ کا ہوا کرتا تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو ملک سنجر کی ہوس ہو تو چتر سنجری کی طرح میرا بخت سیاہ ہو جائے ؎

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم
(جس وقت سے ہم کو آدھی رات (نماز تہجد) کی دولت کی خبر لگ گئی ہے
میں ملک نیمروز کو ایک جو کے عوض بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوں)

ملک نیم شب اور نیمروز میں صنعت تقابل کس قدر عجیب ہے۔ ان حضرات کے کلام میں علاوہ باطنی صولت وشوکت کے ظاہری خوبیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ان حضرات کے دل کو سلطنت سے اس درجہ بے نیاز کر دیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو دنیا میں بھی وہ نعمتیں ملتی ہیں جن کا اہل دنیا کو خطرہ بھی نہیں گذرا اسی طرح ایک اور بزرگ کا قصہ ہے جو اہل دلال میں سے تھے مگر اہل ضلال میں سے نہ تھے یہ ایک حال ہوتا ہے جو متوسطانِ سلوک پر وارد ہوتا ہے کاملین اہل دلال نہیں ہوتے ان میں عجز و نیاز غالب ہوتا ہے ہاں وسط سلوک میں بعض لوگوں پر غلبۂ بسط سے دلال کا حال وارد ہو جاتا ہے وہ اس وقت ناز میں آ کر بعضی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو دوسرا اگر کہے تو مردود ہو جاوے۔
مولانا فرماتے ہیں ؎

۱ ناز را روئے بباید ہمچو ورد — چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
۲ زشت باشد روئے نازیبا و ناز — عیب باشد چشم نابینا و باز
۳ پیش یوسف نازش و خوبی مکن — جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

(ترجمہ) ۱ؔ ناز کے لئے چہرہ مثل گلاب کے پھول کے چاہیئے جب تو ایسا چہرہ نہیں رکھتا ہے تو بدخوئی کے قریب بھی نہ جائیو۔

۲ؔ بری صورت کے لئے ناز کرنا برا معلوم ہوتا ہے جس طرح کہ نابینا کا اپنی آنکھوں کا کھلا رکھنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔

۳ؔ یوسف کے سامنے ناز اور خوبی مت دکھا سوائے نیازمندی اور آہ یعقوبی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

یعنی ناز کے لئے بھی منہ چاہیئے۔ ہر ایک کا منہ ناز کے قابل نہیں ہوتا اگر کسی کو یہ حال حاصل ہو اُس کے لئے ناز بجا ہے اور اگر حال نہ ہو تو بجز آہ و نیاز کے کچھ مناسب نہیں اور کبھی تو اہلِ دلال کی بات سُن کی جاتی ہے اور گاہے اُن کی گوش مالی بھی کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ بزرگ اہل دلال میں سے تھے۔ ایک مرتبہ دن میں وہ کسی شہر پر گذرے دیکھا تو شہر پناہ کا دروازہ بند تھا دربانوں سے پوچھا کہ بھائی یہ دن میں دروازہ کس لئے بند کیا گیا ہے انھوں نے کہا کہ بادشاہ کا باز اڑ گیا ہے اس لئے اس نے حکم دیا ہے کہ شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے جائیں کہیں دروازوں سے نکل کر نہ بھاگ جاوے۔ یہ قصہ سن کر وہ بزرگ بہت ہنسے کہ معلوم ہوتا ہے بادشاہ عقل سے بالکل ہی کورا ہے بھلا باز کو دروازے سے کیا نسبت وہ اگر بھاگنا چاہے گا تو اوپر سے اڑ جائے گا دروازے بند کرنے سے اس کی کیا روک ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ہنس کر آسمان کی طرف مُنھ کیا اور حق تعالےٰ سے عرض کی کہ اچھے احمق کو آپ نے بادشاہت دی ہے۔ جس کو اتنی بھی عقل نہیں کہ باز دروازے سے جایا کرتا ہے یا اوپر سے اور ہم تو اتنے عاقل ہیں مگر ہماری یہ حالت ہے کہ نہ پیر میں جوتہ درست ہے نہ لباس اچھا ہے فوراً ادھر سے عتاب ہوا کہ بہت اچھا ہم آپ کو بھی سلطنت دیئے دیتے ہیں لیکن کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمھاری معرفت اور ولایت اور تمام کمالات مع تمہارے فقر و فاقہ کے اس بادشاہ دیدیئے جائیں اور اس کی سلطنت وغیرہ مع اس کی

حماقت کے اس کو دیدی جائے۔ بس یہ عتاب سن کر ان بزرگ کا رنگ زرد ہو گیا اور جلال خداوندی سے ڈر گئے فوراً سجدہ میں گر پڑے اور عرض کرنے لگے کہ میں اپنی خطا سے توبہ کرتا ہوں پھر ایسی گستاخی نہ ہوگی میں اپنی نعمتوں کو ہزار سلطنتوں کے بدلے میں بھی دینا گوارا نہیں کر سکتا۔ خوب کہا ہے ؎

لضینا قسمۃ الجبار فینا　　لنا علم و للجہال مال

فان المال یفنی عن قریب　　و ان العلم باق لایزال

ہم خدا کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ ہمارے لئے علم و معرفت ہو اور جاہلوں کے پاس مال و دولت ہے کیونکہ مال و دولت تو عنقریب فنا ہو جائے گا اور علم و معرفت کیلئے فنا نہیں ہے۔ اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اعمال صالحہ کا ثمرہ دنیا میں نہیں ملتا وہ اس حکایت میں غور کریں کہ ان بزرگ نے فقر و فاقہ کو کیوں گوارا کیا اور ملنے والی سلطنت پر کیوں لات ماردی آخر وہ کوئی نعمت تھی جس کے سلب ہو جانے کا نام سن کر وہ لرز گئے۔ کانپ اٹھے اور سلطنت کے بدلے میں بھی اس کو دینا گوارا نہ کیا۔ صاحبو! خدا کی قسم جن لوگوں کو اس دولت کی خبر ہو گئی ہے ان کی مستی کی کچھ حد نہیں وہ سلطنت وغیرہ کو مچھر کے پر کی برابر بھی نہیں سمجھتے ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند

فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ دین کے کاموں کا ثمرہ آخرت میں تو ملتا ہی ہے اس کو تو سب تسلیم کرتے ہیں دنیا میں بھی اعمال سے زیادہ ملتا ہے اور ایسی ایسی نعمتیں ان پر فائز ہوتی ہیں جن کے سامنے اہل دنیا کی نعمتیں کچھ بھی نہیں۔ پس دین کا مقصود ہونا بھی معلوم ہے اس کا طریق بھی معلوم ہے اور وہ طریق آسان بھی بہت ہے اور طریق پر مقصود کا ترتب بھی یقینی ہے اور دنیا و آخرت میں امید سے بھی زیادہ ثمرہ اس پر مرتب ہوتا ہے اور چوتھی بات یہ ہے کہ اس کے ثمرات دائم بھی ہیں اور دنیا کے ثمرات فانی ہیں مگر باوجود اس کے حیرت در حیرت ہے کہ لوگ

اس کے لئے سعی نہیں کرتے اور اس کے لئے اسباب کو اختیار نہیں کرتے۔ جو لوگ کچھ سعی کرتے بھی ہیں وہ محض تمنا کا درجہ رکھتے ہیں اسباب کو اختیار نہیں کرتے۔ حالانکہ دنیوی امور میں محض تمنا بلا اسباب کو سب لوگ حماقت اور پاگل پن سمجھتے ہیں مگر نہ معلوم دین کے معاملہ ہی میں کیوں سب کی عقلیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ پس اسکو سعی سمجھ لیا ہے کہ تھوڑی دیر بزرگوں کے پاس بیٹھ کر رو لئے یا وعظ میں آنسو بہالئے سو یاد رکھو محض رونے سے کچھ نہیں ہوتا کام کو اُس کے طریقہ سے کرنا چاہیئے ؎

عرفی اگر بگریہ میسّر شدے وصال
صد سال می تواں بتمنا گریستن

(اے عرفی اگر صرف رونے سے وصال اور قرب مل جاتا تو سو برس تک ہم رونے کی تمنا کرتے)

ان لوگوں کی اس تمنا کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی صاحب بزرگوں سے جاکر کہیں کہ حضور دعا کیجئے ہمارے لڑکا ہو جاوے مگر یہ حضرت نکاح کرتے نہیں تو اب بتلایئے ان کے لڑکا کہاں سے ہو۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ حضور دعا کر دیجئے ہم بھی دین میں کامل ہو جاویں مگر جو اس کا طریقہ ہے اس کو اختیار نہیں کرتے تو یہ لغو حرکت ہے یا نہیں۔ یاد رکھو ہر کام طریقہ ہی سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں واتوا البیوت من ابوابھا گو شانِ نزول اس کا خاص ہے مگر اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے اس لئے یہ حکم عام ہے۔ پس دین ایک گھر ہے اور اس کا دروازہ وہ طرق ہیں جو شریعت نے بتلائے ہیں اس دروازہ سے داخل ہو گے جبھی دین کامل ہو سکتا ہے۔ مولانا اس مضمون کو نظم میں اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

اطلبوا الارزاق من اسبابھا
وادخلوا الابیات من ابوابھا

(رزق کو حاصل کرو اس کے اسباب سے اور گھروں میں داخل ہو اس کے دروازوں سے)

اطلبوا الارزاق کو پہلے بیان فرمایا جس میں نظیر کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح تم رزق کے واسطے اسباب کو اختیار کرتے ہو اسی طرح دین کے لئے بھی اس کے طریقے اختیار کرو۔ آپ دین کے کام کرنا شروع کریں۔ ان شاء اللہ دروازہ خود بخود کھل جائیگا اور پھر آپ کو دین کے ثمرات بھی حاصل ہوجائیں گے جن میں ایک ثمرہ یہ ہے کہ آپ کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جائے گا زندگی پرلطف ہوجاوے گی باقی وہ دولت باطنیہ جو اہل اللہ کو حاصل ہے اس کی کیفیت میں آپ کو بتلا نہیں سکتا کیونکہ وہ ذوقی چیز ہے جس کو اہل ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دین کے کاموں میں لگئے۔ ان شاء اللہ آپ کو بھی وہ ذوق ہو جاوے گا اور اس سے پہلے کتنا ہی سمجھایا جائے آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اہل اللہ کو کیا دولت عطا ہوتی ہے نامرد کو عورت کی لذت کا کبھی ادراک نہیں ہوسکتا گو اس کے سامنے کتنی ہی وضاحت کردی جائے۔ ہاں جب خدا کرے گا اس کو اس مرض سے شفا ہو جائے گی۔ اس وقت وہ خود بخود اس لذت کو سمجھ جائے گا۔ پھر کسی کے بتلانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ پس خدا کے لئے آپ اس بے حسی کا علاج کیجئے۔ کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا نہ ہو مگر علاج شرط ہے اور طریقہ پر عمل کرنا ایک فرق دنیا اور دین میں اور سمجھ میں آیا وہ یہ کہ دنیوی مقاصد کے حصول کا وعدہ بدون سعی کے بھی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ ہر جاندار کی روزی خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے جو بدون سعی کے بھی اس کو مل سکتی ہے مگر اس پر بھی لوگ دنیوی مقاصد میں سعی کو ضروری سمجھتے ہیں اور آخرت کے ثمرات کا وعدہ تو بدون سعی کے ہے ہی نہیں چنانچہ صاف ارشاد ہے من عمل صالحا فلنفسه ومن اساء فعلیها یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کا ثمرہ ملے گا۔ جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ پھر تعجب ہے کہ لوگ دین میں سعی کو کس لئے ضروری نہیں سمجھتے جبکہ بدون سعی کے اس کے حصول کا وعدہ نہیں اہل اللہ نے اس فرق پر نظر کر کے دنیوی مقاصد کے لئے سعی کو ترک کردیا ہے

وہ کہتے ہیں کہ روزی کا ذمہ تو حق تعالےٰ نے لے لیا ہے اس کے لئے سعی کی کیا ضرورت ہے اور دین کے کاموں کو ہمارے اوپر چھوڑ دیا ہے ہم کو اس کیلئے سعی کرنا چاہیئے۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انھوں نے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھی نماز کا سلام پھیر کر امام صاحب نے ان بزرگ سے ملاقات کی اور یہ سوال کیا کہ آپ کھاتے پیتے کہاں سے ہیں کیونکہ آپ کوئی کام کسب وغیرہ کا نہیں کرتے۔ بزرگ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہریئے میں آپ کے سوال کا جواب ابھی دیتا ہوں یہ کہہ کر نماز کی نیت باندھ لی سلام پھیر کر فرمایا کہ اب پوچھئے آپ کیا پوچھتے ہیں امام نے کہا اب تو مجھے ایک سوال اور پیدا ہوگیا وہ یہ کہ آپ نے یہ نماز دوبارہ کیسی پڑھی ہے آپ تو ابھی نماز سے فارغ ہو چکے تھے فرمایا کہ میں نے اُس نماز کا اعادہ کیا ہے کیونکہ مجھے آپ کے سوال سے یہ شبہ ہوگیا تھا کہ شاید آپ کو خدا تعالےٰ کے اس ارشاد پر یقین نہیں وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا تو مجھے آپ کے ایمان ہی میں شک ہوگیا (یہ غلبہ ہے حال کا) اس لئے میں نے جلدی سے اپنی نماز کا اعادہ کیا کہ مبادا کہیں موت نہ آجائے اور یہ نماز میرے ذمہ ہی رہے اس کے بعد فرمایا کہ بندہ خدا کیا روزی کا ملنا کمانے ہی پر موقوف ہے حالانکہ خدا تعالےٰ نے فرما دیا ہے کہ روزی میرے ذمہ ہے پھر تمھارے قلب میں یہ سوال کیوں پیدا ہوا کیا تم کو خدا کے اس ارشاد پر اعتماد نہیں وہ امام بہت شرمندہ ہوئے۔

ایک دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے کہ دنیا خدا کا ایک گھر ہے اور ہم یہاں مہمان ہیں اور حدیث میں وارد ہے الضیافۃ ثلاثۃ ایام کہ مہمانی تین دن تک کرنی چاہیئے جب ہم دنیا میں آئے تو تین دن تک تو ہم خدا تعالےٰ کے مہمان ہیں اور خدا تعالےٰ کے یہاں ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ تو ہم کو تین ہزار سال

کے لئے تو بالکل بے فکری ہے اگر اس سے زیادہ عمر ہوئی تو پھر کچھ انتظام سوچ لیا جائے گا۔ ظاہر میں یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر اس سے اہل اللہ کے مذاق کا پتہ چلتا ہے کہ دنیوی کاموں میں وہ سعی اور اہتمام کو ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ روزی کا ذمہ حق تعالےٰ نے خود لے لیا ہے لیکن اعمال آخرت کا انھوں نے ذمہ نہیں لیا۔ اگر تم آخرت کے لئے ارادہ وسعی نہ کرو جب بھی وہ تم کو جنت دیدیں گے یا کہ از خود تم سے جنت کے کام لے لیں گے بلکہ اگر اس کے متعلق تو یہ ارشاد ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا۔ اور ارشاد ہے۔ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ۔ اور رزق کے بارے میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وارد ہے ومن کان له رزق فی رأس جبل او حضیض یأت به الله گر نہ ستانی بستم میرسد۔ پھر حیرت ہے کہ اتنے فرقوں کے ہوتے ہوئے ہم کو اعمال آخرت کی فکر نہیں اور دنیا کی فکر ہے حالانکہ ان فروق کے ہوتے ہوئے دنیا کسی درجہ میں بھی توجہ کے قابل نہیں اور ان کا مقتضا تو یہ تھا کہ دنیا کے لئے سعی اور عمل کو ناجائز ہی کر دیا جاتا مگر خدا تعالیٰ کی شفقت و رحمت ہے کہ انھوں نے ہمارے ضعف پر نظر فرما کر دنیا کے لئے بھی اسباب اختیار کرنے کی اجازت دیدی ہے اور صرف اجازت بھی نہیں بلکہ بعض مواقع میں دنیا کے لئے سعی کو فرض کر دیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے طلب الحلال فریضة من بعد الفریضة کہ حلال روزی کا طلب کرنا بھی فریضۂ شرعی کے بعد ایک فرض ہے بلکہ حکماء امت تو یہاں تک ان اسباب کی رعایت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حرام ملازمت میں بھی گرفتار ہو اور فراست سے ان کو اُس کا ضعیف الہمت ہونا معلوم ہو تو اس کو فوراً حرام ملازمت چھوڑنے کا امر نہیں فرماتے بلکہ یہ فرما دیتے ہیں کہ پہلے کوئی حلال ملازمت تلاش کر لو اس کے بعد اس کو چھوڑنا اور جبتک حلال ملازمت نہ ملے اسی میں گرفتار رہو اپنے کو گنہگار سمجھتے رہو اور خدا تعالےٰ سے استغفار کرتے رہو کیونکہ بعض لوگ تنگی معاش سے گھبرا کر عیسائی یا آریہ، قادیانی ہوگئے ہیں

اہلِ باطل اپنے گروہ میں بلانے کے لئے لوگوں کو طرح طرح کی طمع دلاتے ہیں جن کے سامنے فقر و فاقہ کے ساتھ اپنے دین پر جما رہنا ہمت والوں کا کام ہے بعض لوگ تنگی معاش سے پریشان ہو کر پیری مریدی کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں اور مخلوق کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ؏ او خویشتن گم است کرا رہبری کند، میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے جو پیر بنے پھرتے ہیں کہ اپنے گھر پر آکر وہ نماز بھی نہیں پڑھتے اور باہر جاکر مقدس بن جاتے ہیں۔ اور ایک واقعہ تو ایسا سنگین سننے میں آیا جس کی نظیر نہیں سنی گئی۔

میرے ایک دوست مولوی بیان کرتے تھے کہ ہندوستان سے ایک جاہل شخص ضلع بردوان میں جاکر پیری مریدی کرتا تھا۔ یہ شخص ضلع الہ آباد کا رہنے والا تھا اور تکیہ دار فقیر تھا۔ بردوان کے ایک رئیس اس کے پھندے میں پھنس گئے ان رئیسوں کو اکثر دنیا کی ہی عقل ہوتی ہے، دین کی عقل نہیں ہوتی اس لئے جاہل درویشوں اور طریق کے ڈاکوؤں کے ہاتھ میں اکثر رؤسا اور مالدار لوگ ہی پھنستے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس درویش کی طرف زیادہ رجوع اہلِ دنیا کا ہو وہ درویش نہیں بلکہ دنیا دار ہے کیونکہ قاعدہ ہے الجنس یمیل الی الجنس۔ اگر اس میں دین کامل ہوتا تو دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ رجوع کرتے۔ چنانچہ حدیث ہرقل میں بھی یہ مضمون آیا ہے۔ ہرقل نے ابو سفیان سے دریافت کیا کہ نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع زیادہ تر کون لوگ کرتے ہیں اغنیاء یا ضعفاء، تو انھوں نے جواب دیا کہ زیادہ تر ضعفاء اتباع کرتے ہیں تو ہرقل نے اس پر کہا ہم اتباع الرسل کہ رسولوں کا اتباع کرنے والے ضعفاء ہی ہوتے ہیں (چونکہ حضرات صحابہؓ نے ہرقل کے اس قول پر انکار نہیں کیا بلکہ سکوت فرمایا اس لئے تقریر صحابہؓ کی وجہ سے یہ قول حجت ہوگیا ۱۲ جامع) الحمد للہ کہ ہمارے حضرات کے سلسلہ میں زیادہ تر غربا و طلباء ہی کی جماعت ہے رؤسا و امراء کم ہیں (اور جو رؤسا ہیں بھی وہ عقلا اور دیندار ہیں بد دین اور کم عقل نہیں ہیں دینداری کی وجہ سے وہ نعم الامیر علی باب الفقیر کے مصداق ہیں ۱۲ جامع)

غرض ایک بار وہ بنگالی رئیس کسی کام سے ہندوستان آئے الہ آباد پہونچکر ان کو اپنے مرشد سے ملنے کا اشتیاق ہوا اس کے گاؤں میں پہونچکر کوئی چودھری چارپائی بچھائے بیٹھے تھے ان سے بڑی تعظیم کے ساتھ اس کا نام لیکر دریافت کیا کہ وہ کہاں رہتے ہیں انھوں نے کہا کہ وہ تو تکیہ دار فقیر ہے آپ اس کے ہاتھ میں کہاں پھنس گئے وہ بنگالی صاحب بولے کہ آپ جو چاہیں کہیں میرے تو وہ مالک اور مرشد ہیں وہ سمجھ گئے کہ بیچارہ عقل سے کورا ہے انھوں نے اپنے کسی نوکر سے کہا کہ فلانے تکیہ دار کو پکڑ لا۔ بنگالی رئیس نے کہا کہ حضور کے ساتھ ایسی گستاخی مجھ کو زیبا نہیں میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا آپ صرف اتنا کام کر دیجئے کہ راستہ بتلانے کے لئے خادم کو میرے ساتھ کر دیجئے انھوں نے خادم کو ساتھ کر دیا وہ ایک تکیہ میں رہتا تھا وہاں پہنچے اور بڑی تعظیم سے سلام و کلام کیا اس کی حالت یہ تھی کہ تکیہ میں اس کے پاس چند بدمعاش رہتے تھے اور ہر وقت بھنگ وغیرہ پیتا رہتا تھا۔ ان رئیس صاحب کا اعتقاد اس حالت کے مشاہدہ سے بھی نہ گیا۔ یہ پیری ایسا پیشہ ہے کہ اگر ایک دفعہ کسی کے تقدس کا اعتقاد ہو جاوے تو پھر بیوی تمیزہ کے وضو کی طرح وہ تقدس کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ تمیزہ ایک فاحشہ تھی جو نماز بھی نہ پڑھتی تھی۔ ایک بزرگ نے اس کو نماز کی تاکید کی اور وضو کرا دیا نماز کی ترکیب بتلادی جب سال بھر گذر گیا تو وہ بزرگ پھر آئے اور بی تمیزہ سے پوچھا کہ نماز بھی پڑھتی ہو کہا حضور روزانہ پڑھتی ہوں پوچھا وضو بھی کیا کرتی ہو کہنے لگی کہ حضور نے تو وضو کرا دیا تھا اسی وضو سے ابتک نماز پڑھتی رہی ہوں تو جس طرح بی تمیزہ کا وضو نہ پیشاب پاخانہ سے ٹوٹتا تھا نہ زنا اور بدکاری سے (وضو کیا لوہا لاٹ تھا) اسیطرح آجکل کی پیری جب چل جاتی ہے تو نہ وہ شراب خواری سے ٹوٹتی ہے نہ زناکاری سے نہ صوم و صلوٰۃ کے چھوڑنے سے نہ ڈاڑھی منڈانے سے نہ ننگا پھرنے سے بلکہ اگر کوئی لنگوٹہ بھی اتار پھینکدے تو اس کے اور زیادہ معتقد ہوتے ہیں۔ اگر پیر صاحب خاموش رہیں تو چپ شاہ بلکہ فنافی اللہ ہیں۔ اگر اینڈی بینڈی باتیں ہانکنے لگیں تو رموز ہیں گو وہ کفریات ہی کیوں نہ ہوں اور

کوئی ٹھیک بات کہدی تو عارف اور محقق ہیں اور منشا، اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات جم رہی ہے کہ شریعت اور ہے طریقت اور ہے اس لئے اگر کوئی شخص ظاہر میں شریعت کے بالکل خلاف ہو اس سے بھی ان کا اعتقاد زائل نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ بھی طریقت کا کوئی رمز ہوگا۔ استغفر اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ غرض اس فقیر نے چندروز تک ان رئیس صاحب کی دعوت کی آرام سے اپنے پاس رکھا۔ دو چار دن رہ کر رئیس نے واپسی کی اجازت چاہی فقیر نے اجازت دی اور کہا میں اسٹیشن تک آپ کو خود پہنچا دوں گا چنانچہ وہ اور اس کے بھائی اسٹیشن تک پہنچانے کے لئے ساتھ ہوئے اور اس کو ایسے راستے سے لے چلے جہاں آدمی بہت کم چلتے تھے جب چلتے چلتے دیر ہوگئی تو رئیس کو خطرہ ہوا اس نے کہا کہ حضور یہ تو وہ راستہ نہیں جس سے میں آیا تھا کہنے لگا کہ میں آپ کو قریب کے راستہ سے باہر باہر لے چلتا ہوں۔ یہ غریب خاموش ہوگیا یہاں تک کہ ایک ایسے بن میں اس کو جا پہنچایا جہاں نہ آدمی کا پتہ نہ جانور کا اگر آدمی گلے پھاڑ پھاڑ کر بھی چلاوے تو بھی کوئی مدد کو نہ آسکے وہاں پہونچکر فقیر نے کہا جو کچھ ساتھ لے رہے ہو رکھدو اس بے چارہ نے جو کچھ ساتھ تھا رکھدیا کہا کپڑے بھی اتار دو اس نے کپڑے بھی اتار دیئے۔ اس کے بعد اس نے رئیس کے قتل کا ارادہ کیا اس نے بہت کچھ ہاتھ پیر جوڑے اور خوشامدیں کیں کہ آپ مجھے قتل نہ کریں میں اس سے دو چند اور چند روپیہ گھر جا کر بھیجدوں گا کہنے لگا کہ اب تمہارا زندہ چھوڑنا مصلحت نہیں تم ہمارا راز کھولدوگے۔ اس نے بہت قسمیں کھائیں کہ میں کسی سے یہ معاملہ ظاہر نہ کروں گا مگر اس سنگدل نے ایک نہ سنی اور اس غریب کا کام تمام کردیا اور نعش کو ایک کنوئیں میں پھینکدیا کتنے دنوں کے بعد اتفاقاً ایک چرواہا اس کنوئیں پر آیا تو اس کو کنوئیں میں سے بدبو آئی اس نے جھانک کر دیکھا تو ایک نعش تیرتی ہوئی نظر آئی اس نے فوراً پولیس کو اطلاع دی پولیس نے نعش کو نکالا تو اس کا پہچاننے والا وہاں کوئی نہ تھا مگر اس کی جیب میں سے کچھ کاغذات نکلے جنمیں

بردوان کا پتہ لکھا ہوا تھا بس اب کیا تھا پولیس کو پتہ چلانے کے واسطے اتنا کافی تھا سراغ لگاتے لگاتے سب واقعہ منکشف ہو گیا پولیس نے اس فقیر کو پکڑا اور اس سے اظہار لیا آخر اس نے اقرار کیا کہ میں نے اس کو قتل کیا ہے چنانچہ اس کو پھانسی دی گئی بس دیکھئے تنگیٔ معاش سے پریشان ہو کر انسان کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب کر لیتا ہے۔ بعض لوگ تنگیٔ معاش سے پریشان ہو کر دوسری طرح حقوق العباد کو ضائع کرتے ہیں کسی سے قرض لے لیا اور مار لیا۔ کسی کی امانت لیکر انکار کر دیا۔ کسی کی کوئی چیز مانگ لی اور اس کو رہن رکھ دیا اور بہت سے کرتب لوگ کرنے لگتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ حقوق العباد کے تلف کرنے کا ضرر متعدی ہے جو ضرر لازم سے اشد ہے اگر یہ شخص کسی حرام ملازمت میں مبتلا رہا بشرطیکہ اس ملازمت کا فرض منصبی کسی کا اضرار نہ ہو تو اپنا ہی نقصان کرے گا مخلوق کو تو پریشان نہ کرے گا لیکن اگر اس نے بدون حلال روزی تلاش کئے حرام ملازمت کو بھی چھوڑ دیا تو پھر دوسروں کو نقصان پہونچائے گا اس لئے حکمائے امت ان اسباب معیشت کی اتنی رعایت کرتے ہیں کہ حرام سبب کو بھی حکمت سے چھوڑ ولاتے ہیں تو حلال سبب کو تو وہ کیوں چھڑانے لگے۔ بعض کم فہم لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ حرام ملازمت کی اجازت دے دی حالانکہ وہ حرام ملازمت کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ اس کے ایمان کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت تو گناہ ہی میں مبتلا ہے پھر کہیں ایمان سے بھی نہ ہاتھ دھولے نیز اس وقت تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہا ہے اس کو چھوڑ کر کہیں مخلوق کو نہ پریشان میں ڈالدے اور قاعدہ فقہیہ ہے کہ مفسدہ یسیرہ کو مفسدہ عظیمہ سے بچنے کے لئے گوارا کیا جاتا ہے لیکن اس قاعدہ سے کام لینے کا ہر ایک کو حق نہیں۔ اس کا موقع ومحل محقق ہی سمجھ سکتا ہے خوب یاد رکھو۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسباب دنیا اسباب دین کے مقابلہ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کے لئے سعی کی جائے نہ کہ ایسی سعی کریں کہ آخرت کی سعی کو بھی چھوڑ دیں مگر افسوس ہے کہ اکثر مسلمان اسباب دنیا کے اختیار کرنے کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور دین کے

بارہ میں اسباب کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ پھر بعض لوگ جو دین ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ تو قابل خطاب ہی نہیں۔ شکایت تو ان لوگوں کی ہے جو دین کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں اور پھر اس کے اسباب اختیار نہیں کرتے۔ بزرگوں کے پاس آتے جاتے ہیں لیکن ان سے دین کا راستہ پوچھتے بڑی دوڑ ان کی یہ ہے کہ بزرگوں سے جاکر عرض کرتے ہیں کہ ہم کو ایک توجہ سے کامیاب کر دیجئے گویا وہ بھی اسیطرح کامیاب ہو گئے تھے۔ میں کہتا ہوں اسی پر فیصلہ ہے اگر محض توجہ سے دین کامل ہو سکتا ہے تو ان بزرگ ہی سے پوچھ لو کہ حضور آپ بھی توجہ ہی سے کامیاب ہوئے تھے یا آپ کو کچھ کرنا بھی پڑا تھا اگر وہ محض توجہ سے کامیاب نہیں ہوئے تو پھر آپ کو اُن سے ایسی درخواست کرنے کا کیا حق ہے۔ صاحبو! یہ سب نفس کے بہانے ہیں وہ آپ کو ان دھوکوں سے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ اور منشار اس کا محض کم ہمتی اور قلت مبالاۃ بالدین ہے کہ ہم کو خدا کی طاعات میں وہ اہتمام نہیں جو دنیا کے کاموں میں ہے۔ بعض لوگ دھوپ کی وجہ سے جماعت کی نماز ترک کر دیتے ہیں لیکن اگر اس وقت حاکم بلاوے تو دھوپ کبھی مانع نہ ہو۔ عین دوپہر کے وقت حاکم کے پاس جاوینگے پھر وہاں سے آکر دھوپ کی کچھ شکایت نہ کریں گے بلکہ حاکم سے ملاقات کرنے پر فخر کریں گے کہ ہم سے آج خوب باتیں ہوئیں حاکم نے فلاں مقدمہ کی بابت یوں سوالات کئے ہمارے فلاں معاملہ کے متعلق یوں کہا۔ حالانکہ یہ کوئی فخر کی بات نہ تھی آخر حاکم کون ہے تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ فخر کی بات تو یہ ہے کہ نماز میں حق تعالےٰ سے باتیں ہوتی ہیں ہم اس قابل تو کہاں تھے کہ خدا تعالےٰ ہم سے باتیں کریں واللہ ہم تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ہم ان کا نام ہی لیلیں ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

(اگر ہم ہزار بار بھی اپنے منہ کو مشک اور عرق گلاب سے دھولیں لیکن پھر بھی لے خدا آپکا نام پاک لینا کمال بے ادبی تھا مگر آپ کے کرم نے ہمکو اجازت دیدیا کہ ہمارا نام لیا کرو)

مگر یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انھوں نے ہم کو اجازت دیدی کہ نماز میں جب چاہو اُن سے باتیں کرلو۔ پھر وہ ہماری باتوں پر توجہ بھی فرماتے ہیں ہماری عرض ومعروض کا جواب بھی دیتے ہیں۔ پھر نماز میں ہم کو قرآن پڑھنے کی اجازت دی بلکہ اس کو فرض کردیا جو کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے گویا اس طرح حق تعالیٰ بھی ہم سے باتیں کرتے ہیں پھر یہ کس قدر رحمت ہے کہ ہم کو اسم عَلَم سے پکارنے کی یعنی یا اللہ کہنے کی اجازت دی کہ اُن کا نام لے کر ان کو پکار سکتے ہیں ذرا کسی حاکم کو تو نام لے کر پکارو۔ فوراً جرم قائم ہو جاوے گا پھر نام بھی اتنا آسان کہ بچہ سب سے پہلے اللہ کا نام یاد کرلیتا ہے۔ افسوس ایسے رحیم وکریم خدا سے باتیں کرنے کے لئے لوگوں کو دھوپ مانع ہوتی ہے اور بلا وجہ جماعت کی نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر ایک رحمت یہ ہے کہ وہ ہماری طاعات ناقصہ کو بھی قبول کرلیتے ہیں۔ باقی یہ بات کہ کیسے معلوم ہوا کہ ہماری یہ طاعات ناقصہ قبول ہوتی ہیں۔ سو حضرت حاجی صاحبؒ نے قبول طاعات کی ایک علامت عجیب بیان فرمائی۔ فرمایا کہ قاعدہ ہے کہ جس شخص کے آنے سے کسی کو ناگواری ہوا کرتی ہے تو اگر وہ قادر ہو تو دوسرے وقت اس کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیا کرتا تو یاد رکھو اگر حق تعالیٰ کو تمھاری پہلی عبادت ناگوار ہوئی ہوتی تو وہ دوسرے وقت تم کو مسجد میں نہ گھسنے دیتے نہ نماز کی توفیق دیتے۔ پس جب ایک نماز کے بعد دوسرے وقت تم کو پھر اسی نماز کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلے وقت کی نماز قبول ہو چکی اسی طرح تمام طاعات میں سمجھ لو۔ واقعی عجیب بات بیان فرمائی گو یہ حجت قطعیہ نہ ہو مگر انا عند ظن عبدی بی کے ساتھ ملا کر امید ہے کہ اگر ہم حق تعالیٰ کے ساتھ یہی گمان رکھیں تو قبولیت کا اچھا قرینہ ہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم کو تو پانچوں وقت مسجد میں آنے کی توفیق دیدی اور بہت سی مخلوق ایسی ہے جن کو سال میں ایک وقت آنے کی بھی توفیق نہیں دی معلوم ہوتا ہے خدا تعالیٰ کو ان کا مسجد میں آنا گوارا نہیں۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

ایک گنوار کا قصہ ہے کہ اس کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا۔ ملاّ خفا ہونے لگا کہ لوگ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ کچھ کرتے ہیں اور جانوروں کو مسجد میں گھسا دیتے ہیں۔ گنوار نے ملاّ سے کہا کہ کیوں بڑ بڑ کرتا ہے جانور تھا مسجد میں گھس آیا کبھی ہم کو بھی آتے ہوئے دیکھا ہے۔ دیکھئے توفیق نہ ہونا اس کا نام ہے۔ اسی طرح ایک آقا اور غلام کا قصہ ہے کہ آقا اور غلام بازار میں کسی کام کو گئے تھے راستہ میں نماز کا وقت آگیا، غلام نمازی تھا اس نے آقا سے نماز کی اجازت مانگی اس نے اجازت دیدی کہ اچھا جلدی نماز پڑھ کر چلے آؤ میں مسجد کے باہر بیٹھا ہوا ہوں۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ غلام کو تو مسجد میں آنے کی اجازت دی گئی اور آقا کو باہر ہی سے روک دیا گیا۔ غلام نے آکر نماز پڑھی اور نہایت اطمینان سے فرض و نوافل کو پورا کیا حتیٰ کہ سب نمازی فارغ ہو کر چلے گئے اس کا آقا انتظار کرتے کرتے تھک گیا اس نے ایک شخص سے جو سب کے آخر میں مسجد سے نکلا تھا پوچھا کہ اب مسجد میں کتنے آدمی ہیں کہا صرف ایک آدمی ہے وہ سمجھا کہ شاید اب جلدی آجائے گا۔ مگر غلام نے وہاں تنہائی میں کوئی وظیفہ شروع کر دیا پھر بھی نہ آیا آخر آقا نے تنگ ہو کر آواز دی کہ میاں کہاں رہ گئے باہر کیوں نہیں آتے، غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا آقا نے پوچھا کون نہیں آنے دیتا کہا جو تم کو باہر سے اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو اندر سے باہر نہیں جانے دیتا۔ سبحان اللہ خوب جواب دیا صاحبو! توفیق الٰہی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ دین کے کام وہی کرتا ہے جس کو خدا توفیق دیتا ہے اور یہاں سے اہل طاعات کو سبق لینا چاہیئے اور ان کو اپنی طاعات پر غرور نہ کرنا چاہیئے نہ کسی محروم الطاعت کو حقیر سمجھنا چاہیئے کیونکہ تم جو کچھ کر رہے ہو محض توفیق الٰہی سے کر رہے ہو اپنا کمالات سمجھو بلکہ ڈرتے رہو کہ کہیں حق تعالیٰ تم سے یہ توفیق سلب نہ کرلیں جس طرح دوسروں سے سلب کرلی ہے۔ اللھم انا نعوذ بک من الحور بعد الکور ۱۲)

غرض مسئلہ توفیق پر نظر کرنے سے حضرت حاجی صاحبؒ نے قبول طاعت کی جو علامت بیان فرمائی ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور اس سے حق تعالیٰ کی رحمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بہت ہی رحمت ہے کیونکہ ہم لوگ جیسی نماز پڑھتے ہیں ظاہر ہے نہ خضوع ہے نہ خشوع نہ ذکر ہے نہ فکر۔ بس گھڑی کی کوک ہے جس سے سوئی خود بخود چل رہی ہے۔ دنیا بھر کے خیالات نماز ہی میں ہم کو سوجھتے ہیں مگر بقاعدۂ مذکورہ بھی قبول ہوتی معلوم ہوتی ہے تو اس رحمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ بھلا تم کسی حاکم کے سامنے کھڑے ہو کر دوسری طرف توجہ کرالو جو فوراً دربار سے نہ نکال دیئے جاؤ۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں قبولِ ذکر تو از رحمت ست
چوں نمازِ مستحاضہ رخصت ست

(اے خدا آپ کا ہمارے ذکر کو قبول فرمالینا آپ کی رحمت ہے جس طرح سے استحاضہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی آپ نے اجازت عطا فرمادی ہے)

واقعی خوب مثال دی کہ جیسے مستحاضہ کی نماز محض رحمت سے قبول ہوتی ہے حالانکہ اس کو نہ طہارت حاصل ہے نہ نظافت خون ٹپک رہا ہے اور شریعت فتویٰ دیتی ہے کہ کچھ حرج نہیں نماز پڑھے جاؤ سب قبول ہے۔ یہی حال ہماری نمازوں کا ہے۔ مگر اس رحمت کا حال معلوم کر کے بے فکر نہ ہونا چاہیئے کہ بس جب وہ ہر طرح قبول کر لیتے ہیں تو خشوع و خضوع کی کیا ضرورت ہے کیونکہ اس حالت میں نماز کا قبول ہونا قاعدہ کے خلاف ہے۔ قاعدہ وہی ہے کہ نماز جبھی قبول ہوگی جبکہ واجبات و شرائط کے ساتھ ادا کی جائے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ خشوع و خضوع نماز میں فرض ہے اور بعض نے اس کو سنت کہا ہے۔ بہر حال بے فکری کسی حال میں نہیں ہونی چاہیئے غیرت مند طبائع تو اس رحمت و شفقت کا حال معلوم کر کے مارے شرم کے گڑ جاتے ہیں کہ افسوس اُدھر سے

اتنی توجہ اور ہماری طرف سے ایسی بے رخی مرجانے کی جگہ ہے اور شرم سے اور زیادہ سعی اور خدمت کرتے ہیں الغرض دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ دین کو دنیا پر بہت سے وجوہ سے ترجیح ہے اور دنیا کے کاموں میں اسباب و طرق کے اختیار کرنے کی ضرورت عقلاء کے نزدیک مسلم ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دین کے اسباب اختیار نہیں کئے جاتے۔ میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ ناکامی کا راز عدم علم مقصود ہوتا ہے یا عدم تعین طریق وصعوبت طریق۔ یا عدم ترتب مقصود علی الطریق۔ اور جہاں ان میں سے کسی کا وجود نہ ہو وہاں ناکامی کا سبب بجز کم ہمتی اور سستی اور کاہلی کے کچھ نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ جو لوگ دین میں ناکام ہیں وہ محض اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ناکام ہیں اس کے سوا کوئی سبب ناکامی کا نہیں نکل سکتا کیونکہ دین کا مقصود ہونا معلوم اس کا طریق بھی معلوم۔ اور میں دعوے کے ساتھ اس کو بیان کر چکا ہوں کہ دین میں تنگی کچھ نہیں اس لئے صعوبت طریق بھی معدوم یہ بھی نصوص سے میں بیان کر چکا ہوں کہ مقاصد دنیویہ کا ترتب اسباب دنیویہ پر لازم نہیں مگر مقاصد دینیہ کا ترتب اسباب دینیہ پر ضروری ہے کیونکہ نصوص میں اس کا وعدہ بطور جزم کے ہے بلکہ ترقی عطا کرنے کا بھی وعدہ ہے اور اعانت الہٰیہ کا بھی وعدہ ہے اس کے بعد بھی اگر کوئی دین میں ناکام رہے تو اس کا سبب بجز بدبختی اور کاہلی اور سستی کے کیا کہا جاوے۔ اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں بھی حق تعالےٰ نے اسی مقصود دینی کو بیان فرمایا ہے اور ایک اس کا طریق بتلایا ہے۔ آیندہ آپ کو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس آیت میں جو طریق حق تعالےٰ نے بیان فرمایا ہے وہ کتنا سہل اور آسان طریق ہے جس سے زیادہ آسان کوئی دوسرا طریق نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس تفصیل سے پہلے میں آیت کی تفسیر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا

مع الصّدقین ٥ اس آیت کے دو جزو ہیں۔ (۱) اتقوا اللہ (۲) کونوا مع الصدقین۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ دو جملوں میں دریا کو بھر دیا ہے۔ چنانچہ ابھی تفصیل معلوم کر لینے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان دو جملوں میں کتنے بڑے مضمون کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ قرآن کے جملوں کی تفسیر مختلف عنوانات سے ہو سکتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت میں بھی کسی مفسر نے دوسرا عنوان اختیار کیا ہو مگر وہ اختلاف محض عنوان ہی کا ہوتا ہے معنوں میں ایک ہوتا ہے۔ اس آیت کا جو معنوں میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اتقوا اللہ میں مقصود کا ذکر ہے اور کونوا مع الصدقین میں اس مقصود کے طریق کا ذکر ہے کیونکہ جن لوگوں نے قرآن کو بنظر غائر دیکھا ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ قرآن میں مقاصد کے ساتھ طرق کا ذکر بھی اکثر فرما دیا کرتے ہیں اور یہ ان کی غایت شفقت و رحمت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کسی بات کا حکم فرما کر حیران و پریشان نہیں چھوڑتے بلکہ اس کا طریق بھی ساتھ کے ساتھ بتلا دیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح سے ہوگا یہ طریقہ اختیار کرو۔ اس عادت پر نظر کر کے میرا ذوق یہ بتلاتا ہے کہ اس آیت میں بھی جملہ اولیٰ میں مقصود کا بیان ہے اور ثانیہ میں طریق کا یعنی تقویٰ مقصود ہے اور معیت صادقین اس کے حصول کا طریق ہے۔ بعبارت دیگر یہ سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا امر فرمایا ہے اور معیت کاملین اس کا طریق بتلایا ہے اس کو میں آگے چل کر واضح کر دوں گا کہ تقویٰ کی تفسیر کمال دین ہے یا نہیں۔ اس وقت میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ کمال دین مقصود و مطلوب ہے یا نہیں تو سمجھ لیجئے کہ مقاصد میں ہمیشہ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے ناقص حالت میں کوئی قناعت نہیں کرتا۔ تجارت کرتے ہیں تو اس میں بھی کمال مطلوب ہوتا ہے۔ لاکھ دو لاکھ پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ جس قدر ترقی ہو اُس سے آگے کے طالب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی نہیں کرتا کہ جب ضرورت سے زیادہ

آمدنی ہو جائے تو آئندہ کے لئے سعی اور کوشش چھوڑ دے۔ نہیں بلکہ قسم قسم کی تجارتیں نئی نئی شروع کر دیتے ہیں اگر ایک شخص کے یہاں بساط خانہ کی تجارت ہے اور اس سے معقول آمدنی ہو رہی ہے تو سرمایہ زیادہ ہو جانے کے بعد وہ کپڑے کی بھی ایک دوکان کھول دیتا ہے اور ترقی ہوئی تو جوتوں کی دوکان بھی کر لیتا ہے یہاں تک کہ پہلے اگر باپ بیٹے سب مل کر ایک دوکان کر رہے تھے تو اب ہر بیٹے کی الگ دوکان کھول دی جاتی ہے چنانچہ مشاہدہ ہے پھر بہت سے مکان خرید کر کرایہ پر دیدیئے جاتے ہیں۔ غرض ہر وقت ترقی کی دھن لگی رہتی ہے کسی حد پر بس نہیں کرتے وہ حال ہو جاتا ہے۔

ع: لاینتھی ارب الا الی ارب + اگر کسی کے پاس ضرورت کے موافق زمین موجود ہو تو وہ اس پر قناعت نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے کہ آج ایک گاؤں پورا خرید لوں، ایک گاؤں خریدنے کے بعد دوسرے گاؤں کی تمنا رہتی ہے ؎

ملک اقلیم ار بگیرد پادشاہ
ہمچناں در بند اقلیمے دگر

(ایک ملک اگر بادشاہ لے لیتا ہے لیکن وہ قناعت سے محروم ہونے کے سبب دوسرے ملک کے حرص میں مبتلا ہو جاتا ہے۔)

غرض انسان دنیوی ترقی میں ہمیشہ زیادت کا طالب رہتا ہے یہاں تک کہ موت ہی سے یہ سلسلہ منقطع ہوتا ہے اس سے پہلے منقطع نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

گفت تنگِ چشمِ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

(کہا کہ دنیا دار کی تنگ نظر اور لالچ سے پُر نظر کو یا تو قناعت پُر کر سکتی ہے یا قبر کی خاک پُر کر سکتی ہے)

دنیا دار کو قناعت تو ہوتی نہیں ہاں خاک گور ہی سے اس کی حرص منقطع ہوتی ہے۔ شاید آپ مجھ کو کوئی ایسا آدمی دکھلائیں کہ جس نے دس ہزار روپیہ یا دس گاؤں حاصل کر کے بس کر دیا ہو اور آئندہ کے لئے سعی کو ختم کر دیا ہو۔ لیکن اول تو یہ بہت ہی شاذ ہے لاکھوں میں ایک آدمی ایسا ہوگا۔ والنادر کالمعدوم۔ اگر لاکھوں میں ایک آدمی آپ نے ایسا دکھلا بھی دیا تو اس سے میرے بیان پر نقص وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ قواعد میں اکثر کا لحاظ ہوا کرتا ہے اور اکثر کی حالت وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ پھر میں کہتا ہوں کہ جو شخص ایسا آپ دکھلائیں گے وہ دیندار ہوگا دنیا دار نہ ہوگا اور گفتگو اہل دنیا کی حالت میں ہے اور اگر وہ دیندار بھی نہ ہو دنیا دار ہی ہو تو اس کا ایک سرسری جواب تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک غالباً یہی کمال ہوگا جب وہ کمال حاصل ہو گیا تو مقصود تک وصال ہو گیا اس سے آگے کوئی کمال اس کی نظر میں ہے ہی نہیں پس وہ بھی طالب کمال نکلا ناقص حالت پر اس نے بھی قناعت ہرگز نہیں کی۔ اور حقیقی جواب یہ ہے کہ گو اس نے صورۃ ترقی کو ختم کر دیا مگر معنًا وہ اب بھی ترقی کر رہا ہے کیونکہ یہ شخص عاقل دنیا دار ہے نادان نہیں وہ دنیا کی روح کو سمجھ گیا ہے کہ اسباب معاش سے مقصود سکون قلب و راحت قلب ہے اور ہر وقت اسباب معاش میں لگے رہنے سے راحت و سکون قلب میسر نہیں ہوتا دل پریشان اور مشغول رہتا ہے اس لئے اس نے ایک معقول سرمایہ حاصل کر کے آئندہ کے لئے صورت ترقی کو بند کر دیا لیکن حقیقت میں وہ اب بھی ترقی کر رہا ہے پہلے اسباب میں ترقی کر رہا تھا اب مسبب اور مقصود میں ترقی کر رہا ہے یعنی راحت و آرام کے بڑھانے میں مشغول ہے غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ دنیوی اسباب میں ہر شخص کمال کا طالب ہے کسی قدر حاصل پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ اس سے بھی آگے کا طالب رہتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی خاص حد پر بس بھی کرتا ہے تو ناقص حالت

پر ہرگز بس نہیں کرتا۔ بلکہ کوشش اور سعی کو ہمیشہ درجۂ کمال پر پہنچا کر ختم کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو تجارت میں نقصان ہو رہا ہے تو اس حالت پر کوئی بھی سعی کو ختم نہ کرے گا۔ بلکہ جب اتنا سرمایہ اکٹھا ہو جائے کہ وہ ساری عمر کو کافی ہو جاوے بلکہ بچ بھی جاوے اس وقت بعض لوگ سعی کو ختم کر سکتے ہیں پس یہ بات یقیناً معلوم ہو گئی کہ ناقص حالت پر کوئی بھی قناعت نہیں کرتا قناعت ہمیشہ حصول کمال ہی کے بعد ہوتی ہے گو وہ بھی قناعت صوری ہے ورنہ حقیقت میں اب بھی ترقی ختم نہیں ہوئی ۱۲ جامع)

پھر حیرت ہے کہ دین میں لوگوں کو ناقص حالت پر قناعت کیوں ہے چنانچہ بڑی دینداری آج کل یہ ہے کہ نماز پانچوں وقت کی پڑھ لی جب نماز پڑھنا شروع کر دی تو اب وہ اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں اور اسی پر قناعت کر لیتے ہیں پھر افسوس یہ کہ جس نماز پر قناعت کی جاتی ہے وہ بھی کامل نہیں ہوتی یعنی اول تو محض نماز کے کامل کر لینے سے بھی دین کامل نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ نماز بھی کامل نہ ہو ناقص در ناقص ہی ہو اس پر قناعت کر لینا تو بہت ہی کوتاہی ہے بعضے نماز کے بعد زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں زکوٰۃ دیدی تو گویا انھوں نے جنت کو خرید لیا اور اگر حج بھی کر لیا تو پھر کیا تھا چیند وقت ہو گئے اب انھیں آگے ترقی کی کچھ ضرورت نہیں رہتی وہ اسی پر دین کو کامل سمجھ کر سعی اور ترقی بند کر دیتے ہیں عوام کی کیا شکایت کی جائے افسوس یہ ہے کہ بعض اہل علم بھی اس بلا میں گرفتار ہیں۔ ایک عالم نے مجھے لکھا کہ آپ نے جو وظیفہ وغیرہ مجھ کو بتلایا تھا وہ تو کر لیا اب آگے کچھ اور سبق بھی ہے یا بس ختم ہو گیا۔ افسوس دنیا مردار تو ایسی چیز ہے کہ اس میں کسی حد پر بھی قناعت نہیں کی جاتی۔ اور دین کو ایسا حقیر سمجھ لیا ہے کہ چار دن کام کر کے اپنے کو کامل اور منتہی ہونے کا احتمال سوچھنے لگا۔ مجھے ان عالم کا یہ خط سخت ناگوار ہوا اور میں سمجھا کہ ان کو دین کا ادب بھی بالکل نہیں کیونکہ ان کے الفاظ سے تمسخر ٹپکتا تھا میں نے ان کو لکھدیا کہ

میرا تم سے نباہ نہ ہوگا میں تم کو قابل خطاب بھی نہیں سمجھتا تم کو نہ دین کی طلب ہے نہ اس کا ادب دل میں ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؁ غرض لوگوں نے دین کو نماز روزہ زکوٰۃ وحج میں منحصر سمجھ لیا ہے اس سے زیادہ کی وہ ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ جو شخص تقویٰ کامل اختیار کرے اور حقوق العباد وغیرہ کا پورا لحاظ کرے اور دین میں ترقی کا ارادہ کرے اس کو پاگل سمجھتے ہیں مگر وہ ایسا پاگل ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اوگل سرخ ست توخونش مخواں　　　مست عقل ست اوتو مجنونش مداں

(وہ گل سرخ (گلاب کا پھول) ہے تو اس کو خون مت سمجھ وہ مست عقل نورانی ہے تو اس کو پاگل مت سمجھ)

ما اگر قلاشش وگر دیوانہ ایم　　　مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاشش اور اگر دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے کیونکہ ہم اس ساقی ازل کے مست ہیں اور اس پیمانۂ ازل کے مست ہیں)

وہ خدا کے دیوانے ہیں جن کے لئے یہ دیوانگی فخر ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد
مرعس را دیدو درخانہ نشد

(پاگل وہی ہے جو ان کا دیوانہ نہ ہوا کوتوال کو دیکھا اور گھر میں نہ چھپا)

میرے ایک دوست پہلے ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن انھوں نے اپنی دین کی حفاظت کے لئے صیغہ حکومت سے اپنا تبادلہ کرالیا ہے اب وہ تعلیم کی لین میں ہیں جس میں تنخواہ ڈپٹی کلکٹری سے کم ہے۔ اس پر بہت لوگوں نے ان کو بیوقوف بنایا کہ یہ بھی عجب دیوانے ہیں کہ اتنی بڑی تنخواہ چھوڑ کر تھوڑی تنخواہ پہ قناعت کرلی اور حکومت کا عہدہ چھوڑ کر ذلیل عہدہ اختیار کیا۔ مگر جب یہ لوگ خدا کے سامنے پہنچیں گے اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ بیوقوف کون تھا۔

انہیں دوست کا یہ قصہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ وہ ریل کا سفر کرنے کو تھے ان کے ساتھ اُن کا ایک لڑکا بھی تھا وہ اس کی عمر دریافت کر رہے تھے کہ بارہ سال سے کم ہے یا پورے بارہ سال کی ہے اگر پورے بارہ سال کی ہے تو قاعدۂ ریلوے کے موافق اس کا بھی ٹکٹ لینا چاہیئے۔ ان کے ساتھی کہہ رہے تھے کہ اس بچہ کی عمر بارہ سال کی تھوڑا ہی ہے اور اگر ہو بھی تو اس کا قد بہت کم ہے دس سال کا معلوم ہوتا ہے اگر آپ ٹکٹ نہ لیں گے تب بھی کوئی کچھ نہ کہے گا۔ انھوں نے کہا کہ ریل والے کچھ نہ کہیں تو خدا تعالیٰ تو کہیں گے کہ تم نے ایک شخص کی چیز کو اس کی بلا اجازت بدون کرایہ دئے کیوں استعمال کیا۔ وہ بے چارے اس کی عمر کی تحقیق کر رہے تھے اور اُن کے نوکر ہنس رہے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ بچہ کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہے تو انھوں نے اس کا بھی پورا ٹکٹ لیا۔ لوگ ان کو یہ رائے دیتے تھے کہ صاحب اگر آپ کے پاس یہ روپیہ ایسا ہی فضول ہے تو کسی غریب کو دیدیجئے ریل والوں کو آپ کیوں دیتے ہیں خصوصاً جبکہ وہ اس بچہ کے ٹکٹ کا آپ سے سوال بھی نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ جس غرض سے میں اس کی عمر دریافت کر رہا ہوں غریبوں کو روپیہ دینے سے وہ غرض حاصل نہ ہوگی۔ یعنی تصرف فی ملک الغیر بلا اذنہ غریبوں کو دینے سے جائز نہ ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں سب لوگ ان کو بیوقوف اور مجنوں سمجھ رہے تھے کہ فضول روپیہ ضائع کر رہے ہیں مگر وہ خدا کے مجنون تھے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب دین کا غلبہ ہوتا ہے تو مسلمان کو دنیوی مضرت کی پرواہ نہیں ہوا کرتی مگر یہ بات حکماء الٰہی سے دریافت کرنے کی ہے کہ دین کے لئے کس جگہ مضرت کا تحمل مناسب ہے اور کس جگہ غیر مناسب ہے۔

یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہر مضرت دنیویہ کا تحمل کر لینا چاہیئے اور اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے بلکہ اس میں تفصیل ہے (جس کا حاصل یہ ہے کہ جب شریعت کسی کام کو واجب کر دے یا کسی کام کو حرام کر دے تو واجب کے

ادا کرنے اور حرام سے بچنے میں اگر ہم کو کچھ دنیوی مضرت ایسی پہونچے جو مال یا آبرو کو ضرر پہنچانے والی ہو تو ہم کو اس مضرت کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے اور اگر ایسی مضرت ہو جس سے جان کا غالب خطرہ ہو تو اس وقت واجب کے وجوب اور حرام کی حرمت کا مکلف ہی یہ شخص نہ رہے گا اور مستحبات وسنن کے لئے تو مال یا آبرو کی مضرت کا تحمل کرنا بھی واجب نہیں ہوتا بلکہ افضل اور عزیمت ہے اور جان کی مضرت کا تحمل کرنا تو بعض دفعہ مستحبات وسنن کے لئے ناجائز اور حرام ہے غرض اس مسئلہ میں بہت تفصیل ہے ۱۲) جس کے لئے کتب فقہ کا مطالعہ ضروری ہے ہر شخص اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ کس جگہ مضرت کا تحمل مناسب ہے اور کہاں مناسب نہیں اور کہاں واجب ہے اور کہاں حرام ہے اگر ہر شخص کی رائے پر اس کو چھوڑ دیا جاوے تو وہی قصہ ہوگا کہ ایک شخص نے ایک مولوی صاحب کے وعظ میں توکل کی فضیلت اور اس کی ضرورت کا مضمون سُنا تھا وہ بہت خوش ہوا کہ جب خدا تعالےٰ یوں بھی روزی پہنچا سکتے ہیں تو محنت ومشقت کی کیا ضرورت ہے پس آپ نے سارا کاروبار چھوڑ دیا اور جنگل میں لب سڑک جا بیٹھا۔ اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ سڑک سے دور جا بیٹھتے یہ خیال کیا کہ سڑک کے کنارے کوئی تو آتا جاتا دیکھے گا۔ دوسرے وہاں ایک کنواں بھی پاس تھا جس پر بیٹھ کر مسافر کھانا کھایا کرتے تھے تو اس نے یہ جگہ اس لئے تجویز کی کہ ایسا بھی کیا ہے کہ کوئی مسافر بھی مجھے کھانا نہ دے گا۔ اب آپ کو مسافروں کا انتظار شروع ہوا کہ شاید کوئی آوے اور مجھے کھانا کھلاوے۔ ایک آیا اور اس نے کھاپی سیدھا اپنا رستہ لیا۔ سمجھا کہ ان شاء اللہ تعالےٰ اس مرتبہ جو کوئی آوے گا وہ ضرور مجھے دیکھ کر کھلاوے گا۔ دوسرا آیا اُس نے اس شخص کی طرف سے پشت کرلی اور سڑک کی طرف منہ کرکے کھانا کھایا اور وہ بھی چلتا ہوا اسی طرح دو تین دن گذر گئے اور کسی نے بھی اس کو ایک ٹکڑا نہ دیا۔ آخر میں ایک مسافر آیا اور اس نے بھی کھاپی کر چلنے کا ارادہ کیا تھا کہ آپ نے کھنکارا آپ نے ہیں

اس نے مڑکر جو دیکھا تو ایک آدمی نظر پڑا جس کا فاقوں کے مارے بُرا حال ہے اس کو ترس آیا اور جو کچھ بچی ہوئی روٹیاں تھیں اس کے حوالے کیں جنھیں کھا کر میاں کے حواس درست ہوئے اور بھاگا ہوا مولوی صاحب کے خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب آپ نے توکل کے بیان میں ایک قید ضروری چھوڑ دی ہے جس سے لوگوں کو دھوکہ ہوا ہوگا اور نہ معلوم کتنے آدمی اس دھوکہ سے پریشان ہوئے ہوں گے وہ تو خدا نے خیر کی کہ میں نے اپنے اجتہاد سے اس قید کو سمجھا ورنہ میں بھی ہلاک ہوگیا ہوتا۔ براہِ مہربانی آئندہ آپ جہاں کہیں توکل کا بیان فرمایا کریں اتنی قید اور بڑھا دیا کریں کہ کھنکارنے کی بھی ضرورت ہے پھر اس نے اپنا قصہ بیان کیا۔ تو دیکھئے اس شخص نے ترک اسباب کا بیان سن کر یہ سمجھ لیا کہ میں بھی ترک اسباب کا اہل ہوں اس لئے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گیا اور پریشان ہوا حالانکہ اس کی تشخیص اس کو کسی طبیب روحانی سے کرانی چاہیئے تھی کہ میں ترک اسباب کا اہل ہوں یا نہیں۔

اسی طرح ایک شخص نے وعظ میں سن لیا تھا کہ اللہ کے راستہ میں جو ایک روپیہ دے گا اس کو دس دنیا میں ملیں گے اور ستر آخرت میں۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ اس سے اچھی تجارت کیا ہوگی۔ بس سب کام چھوڑ کر یہی کرنا چاہیئے چنانچہ اس کے پاس ایک روپیہ تھا اس نے اسے خیرات کردیا اور منتظر رہا کہ اب دس روپے آویں گے کئی دن گذر گئے ایک پیسہ بھی نہ آیا بڑا پریشان ہوا یہاں تک کہ میاں کو دست لگ گئے کیونکہ اب اس کو رہ رہ کر اپنے روپیہ کے جانے کا بھی غم ہوتا تھا اور دل میں مولوی صاحب کو برا بھلا کہتا تھا کہ انھوں نے یہ کیسا غلط مسئلہ بیان کیا بے چارے کو اسی فکر میں دست اور پیچش لگ گئی بار بار اجابت کے لئے جنگل جاتا تھا۔ ایک دن وہ قضائے حاجت کر رہا تھا اور زمین کو کرید رہا تھا کہ دفعۃً مٹی میں سے ایک بٹوہ ملا جس میں پورے دس روپے تھے بڑا خوش ہوا اور دست تو فوراً موقوف ہوگئے کیونکہ جس علت

سے دست آنے شروع ہوئے تھے وہ علت ہی نہ رہی۔ دوڑا ہوا مولوی صاحب کے پاس آیا کہ مولوی صاحب۔ آپ نے جو کچھ وعظ میں فرمایا تھا بالکل درست ہے مگر اس میں ایک قید آپ نے چھوڑ دی۔ آئندہ جہاں یہ مسئلہ آپ بیان کریں ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کریں کہ مروڑے بھی لگتے ہیں اس کے بعد جس کو تحمل ہوگا ایک کے دس لے گا۔ اور جس کو تحمل نہ ہوگا وہ اس طریقہ کو اختیار نہ کرے گا۔ یہ سچ ہے کہ ایک کے دس ملتے ہیں مگر مروڑے غضب کے ہیں غرض یہ بات ضروری ہے کہ ہر شخص کو تحمل مضرت کی اجازت نہیں اس کے لئے کچھ شرائط اور محل ہیں مگر یہ بات ضرور ہے کہ جب دین کا غلبہ ہوجاتا ہے تو دین دار کو دنیوی مضرت کی پروا نہیں رہا کرتی۔

میرے ایک دوست کی حکایت ہے جو بی۔اے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ ریل کا سفر کررہے تھے ان کے پاس اسباب زیادہ تھا اور جس اسٹیشن سے وہ سوار ہوئے تھے وہاں وزن کرانے اور بلٹی لینے کی فرصت نہ ملی تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس اسٹیشن پر اتروں گا وہاں وزن کرا کے محصول ریلوے ادا کردوں گا چنانچہ جب وہ منزل مقصود پر اترے تو وہاں کے بابو سے انھوں نے کہا کہ میرے پاس اسباب زیادہ ہے جس کا محصول ادا کرنا میرے ذمہ ہے مجھ کو بوجہ تنگی وقت کے سوار ہوتے ہوئے اس کی بلٹی کرانے کا موقع نہ ملا آپ اس وقت وزن کر کے مجھ سے محصول لے لیجئے اور چونکہ میں نے اپنا واقعہ خود بیان کردیا ہے اس سے آپکو معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں نے خیانت اور خلاف ورزی قانون کا قصد نہیں کیا تھا اس لئے آپ کو اصل محصول لے لینا چاہیئے ڈبل چارج نہ کرنا چاہیئے۔ بابو نے کہا جائے ہم کچھ نہیں لیتے انھوں نے پھر اصرار کیا وہ متعجب ہوکر اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گیا اس نے بھی وزن کرنے اور محصول لینے سے انکار کیا۔ انھوں نے پھر اصرار کیا تو وہ دونوں ان کو انگریزی زبان سے ناواقف سمجھ کر انگریزی میں باتیں کرنے لگے وہ باتیں یہ تھیں کہ معلوم ہوتا ہے اس شخص نے شراب پی ہے جو باوجود

انکار کے از خود روپیہ دینا چاہتا ہے۔ انھوں نے کہا میں نے شراب نہیں پی میرا مذہب مجھ کو مجبور کرتا ہے۔ افسوس آج کل فریب اور پالیسی کا بازار ایسا گرم ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آتی کہ کوئی شخص از خود بھی خدا کے خوف سے دوسروں کا حق ادا کر سکتا ہے۔ پس وہ یوں سمجھتے ہیں کہ عاقل وہی ہے جو از خود کسی کا حق ادا نہ کرے اور جس کو خود بخود اس کی فکر لگی ہوئی ہو اسے پاگل سمجھتے ہیں چنانچہ ریل والوں نے ان کو پاگل ہی سمجھا اور یہ کہا کہ آپ اپنا اسباب لے جائیں ہماری اجازت ہے آپ کو کوئی کچھ نہ کہیگا انھوں نے کہا کہ آپ کو اس اجازت کے دینے کا کوئی اختیار ہی نہیں کیونکہ آپ ریلوے کمپنی کے مالک نہیں ہیں بلکہ اس کے ملازم ہیں آپ کو ریلوے کے حق چھوڑنے کا کیا حق ہے مگر کسی طرح ریلوے والوں نے ان سے محصول نہ لیا انھوں نے اپنا اسباب اٹھایا اور باہر آکر سوچنے لگے کہ اے اللہ میں کیا کروں۔ اب حق تعالیٰ نے ان کی اعانت فرمائی جبکہ دیکھا کہ میرے بندہ کو معصیت سے بچنے کا راستہ نظر نہیں آتا اور دوسرے لوگ اس کو معصیت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس سے بچنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ معاً دل میں یہ بات آئی کہ مقدار محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریلوے کمپنی کا لے کر چاک کر دینا چاہیئے اس طرح محصول ادا ہو جائیگا چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ صاحبو! آپ دین پر عمل کر کے تو دیکھیں انشاء اللہ قدم قدم پر آپ کو اعانت الٰہیہ کھلی آنکھوں نظر آئیگی یہ تو سب جانتے ہیں کہ کمال دین بدون اعانت خداوندی کے حاصل نہیں ہوتا مگر میں دعوٰی سے کہتا ہوں کہ ابتدائی منازل میں بھی حق تعالیٰ پوری اعانت کرتے ہیں پس دین کے کام میں ابتداء سے انتہا تک اعانت الٰہیہ ساتھ رہتی ہے پھر تم کیوں ڈرتے ہو۔ کہ صاحب دین پر عمل کیسے کریں یہ تو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ارے بھائی تم کو اگر مشکل معلوم ہوتا ہے تو خدا کو تو کوئی مشکل نہیں جب وہ تمھاری اعانت کا وعدہ فرماتے ہیں پھر یہ عذر کرنا محض نفس کی شرارت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا۔ پھر بھی افسوس ہے کہ لوگ دین میں ترقی حاصل

نہیں کرتے اور جس کو جتنا دین حاصل ہے وہ اسی پر قانع ہے۔ میں عوام ہی کی شکایت نہیں کرتا افسوس یہ ہے کہ خواص کو بھی ترقی دین کی فکر نہیں۔ بس جو تعلیم میں مشغول ہے وہ اسی پر قانع ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بڑا دیندار ہوں کہ ہر وقت قال اللہ وقال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی میں رہتا ہوں جو لوگ ذکر شغل میں مشغول ہیں وہ اسی پر قناعت کئے ہوئے ہیں کوئی ان سے پوچھے آخر شریعت میں معاملات اور معاشرات کی تعلیم کس لئے دی گئی ہے اصلاح اخلاق کا اہتمام کیوں نہیں کیا گیا ہے کیا یہ دین نہیں کیا اس پر عمل کرنے کے لئے مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسری قوم پیدا ہوگی آخر تقویٰ کی فروع فقہیہ پر تم کیوں عمل نہیں کرتے یہ مسائل فقہاء نے کس کے لئے بیان کئے ہیں۔ دنیا دار اگر قلیل حصہ دین پر قناعت کرے تو وہ اتنا خسارہ میں نہیں جتنا خسارہ اہل علم کو ادنیٰ حصہ دین پر قناعت کرنے سے پہنچیگا۔ کیونکہ دنیا دار نے اگر دین کم حاصل کیا تو اس نے دنیا میں تو لذت وراحت حاصل کرلی اور یہ مولوی صاحب دنیا میں تو پھسڈی تھے ہی اگر دین میں بھی پھسڈی رہے تو کسی طرف کے بھی نہ ہوئے نہ دنیا میں چین ملی نہ آخرت میں وہاں بھی یہ کلفت ہی میں رہیں گے اور دنیا میں تو یہ کلفت کے اندر ہیں ہی کہ نہ عالیشان محل رہنے کو ہے نہ نوکر چاکر ہیں نہ زیادہ روپیہ ہے نہ عمدہ اور لذیذ غذائیں ہیں نہ ریشمی لباس زیب تن ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ طبقہ ادنیٰ دین پر کیوں کر قناعت کرتا ہے اور دنیا کو چھوڑنے کے بعد یہ کمال دین کی فکر کیوں نہیں کرتے۔

امام غزالی نقل فرماتے ہیں ؎

ادی الملوک بادنی الدین قد قنعوا وما اراھم رضوا فی العیش بالدون
فاستغن بالدین عن دنیا الملوک کما استغنی الملوک بدنیاھم عن الدین

مطلب یہ ہے کہ میں سلاطین واہل دول کو دیکھتا ہوں کہ انھوں نے تھوڑے سے دین پر قناعت کر کے اپنے کو دنیا میں مشغول کر دیا ہے اب تم ان کو اس طرح

نیچا دکھاؤ کر تھوڑی سی دنیا پر قناعت کر کے دین میں کمال پیدا کرو اور سلاطین کی دنیا سے مستغنی ہو جاؤ کیونکہ اب ان کو نیچا دکھانے کا یہی طریقہ ہے۔ دنیا میں تو ان سے بڑھ جانا تمھاری قدرت میں نہیں ہے مگر دین میں بڑھنا تو قدرت میں ہے پس تم دین میں سلاطین کو نیچا دکھا دو کہ وہ آج تم سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں تو دین کی برکت سے کل تم ان سے بڑھے ہوئے رہو گے اور اگر تم دین میں بھی کم رہے تو سلاطین تم سے ہر جگہ بڑھے ہوئے رہیں گے اور یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ سبحان اللہ کیا عجب تعلیم ہے اور یہ لطیفہ ایسا ہے جیسا ایک شاعر نے کہا ہے ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو ؛ ہمہ خنداں بُدند و تو گریاں

(کیا تو یاد رکھتا ہے اس بات کو کہ جب پیدا ہوا تھا تو سب تو خوش ہوئے تھے اور ہنس رہے تھے اور تو رو رہا تھا)

اینچناں زی کہ وقتِ مردنِ تو ؛ ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

(پس جب تو دنیا سے جاوے تو دنیا میں ایسے اعمال کر لے کہ تو ہنستا ہوا جاوے اور لوگ رو رہے ہوں)

یعنی تم کو یہ بات بھی یاد ہے کہ جب تم پیدا ہوئے تھے تو سب لوگ ہنس رہے تھے اور تم روتے ہوئے آئے تھے۔ تو یہ لوگ نہایت ظالم ہیں کہ اُن کو تمھارے رونے پر بھی رحم نہ آیا اس وقت ان کو خوشی کی سوجھ رہی تھی اب تم ان کو اس طرح بدلہ دو کہ تمھارے مرنے کے وقت وہ سب روئیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ۔ یعنی ایسی زندگی بسر کرو جس کی بدولت سب کو تمھارے مرنے کا غم ہوا اور تم کو لقاء الٰہی کی خوشی ہو وہ روتے رہیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مرنے کے وقت بھی سب ہنسیں اور خوش ہوں کہ اچھا ہوا کمبخت کا پاپ کٹا اور تم اعمال سیئہ کی وجہ سے روتے ہوئے جاؤ تو اس مضمون میں بھی ویسا ہی مقابلہ ہے جیسا اوپر کے اشعار میں مقابلہ تھا کہ جس طرح تمھارے رونے پر لوگ ہنستے تھے

اب تم ان کے رونے پر ہنسو اور دنیا سے اس طرح جاؤ کہ آخرت کی راحتیں دیکھ کر تم بے ساختہ یوں کہو یا لیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین ۰ اے کاش میری قوم کو اطلاع ہو جائے کہ میرے خدا نے مجھے بخش دیا اور مجھ کو معززین میں داخل کر دیا ہے تو اس اطلاع سے وہ رونے سے باز آجائیں۔ یہی مقابلہ کا مضمون پہلے اشعار میں تھا کہ تم امرار و سلاطین کو دین میں نیچا دکھا دو۔ جبکہ انھوں نے تم کو دنیا میں نیچا دکھایا ہے کیونکہ آجکل کے امرار حضرات صحابہؓ کی طرح تھوڑا ہی ہیں جن کو نیچا دکھانا مشکل ہو۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تو یہ حالت تھی کہ غربار حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کرتے ہوئے آئے کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مال دار لوگ ہم سے بڑھ گئے کیونکہ جس طرح نماز روزہ ذکر و شغل ہم کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں اور ان میں یہ بات زیادہ ہے کہ وہ زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، خیرات و صدقات کرتے رہتے ہیں جہاد میں خوب مال خرچ کرتے ہیں اور یہ کام ہم نہیں کر سکتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم پانچوں نمازوں کے بعد سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھا کرو اس کا تم کو اتنا ثواب ملے گا کہ مالداروں کے صدقات و خیرات سے بڑھ جائے گا۔ مالدار صحابہؓ کو جو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے بھی یہ کام شروع کر دیا۔ غربار پھر شکایت لائے کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) امرار نے بھی وہ تسبیحیں پڑھنا شروع کر دیں جو آپ نے ہم کو تعلیم فرمائی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب میں کیا کروں۔ میں خدا کے فضل کو کسی سے کیونکر روک دوں ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ حضرات صحابہ میں جو لوگ مالدار تھے ان کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر وقت اپنے دین کی ترقی میں لگے رہتے تھے اور جو نیک کام ان کو معلوم ہوتا اس کی طرف سبقت کرتے تھے ان کو دین میں نیچا دکھانا غربار کو مشکل تھا۔ ان حضرات کے پاس مال بہت کچھ تھا مگر حالت یہ تھی کہ دل کو اس سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا تو وہ رو رہے تھے۔ لوگوں نے اُن کو تسلی دی کہ

ماشاء اللہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فلاں فلاں غزوات میں شرکت کی اور خدا کے راستہ میں اسلام کی بہت سی خدمتیں کی ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ تم کو حق تعالیٰ بخشدیں گے تم کیوں روتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں اس وجہ سے نہیں روتا بلکہ میں اس واسطے روتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہماری تنگدستی کی یہ حالت تھی کہ عثمان بن مظعونؓ کا جب انتقال ہوا تو ان کے کفن کے لئے صرف ایک چھوٹا سا کمبل تھا جس کو سر کی طرف کھینچتے تو پیر کھل جاتے اور پیر کی طرف کھینچتے تو سر کھل جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کمبل کو سر کی طرف کھینچ دیا جائے اور پیروں پر گھاس ڈال دی جاوے۔ اور آج ہمارے پاس اتنا مال ہے کہ سوائے مٹی کے اور کہیں اس کی جگہ نہیں۔ اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ سوائے زمین میں دفن کرنیکے اور کہیں اس کی جگہ نہیں دوسرے یہ کہ بجز عمارتوں میں خرچ کرنے کے اور کسی کام میں یہ روپیہ نہیں آتا تو وہ حضرات ایسے تھے کہ زیادہ مال جمع ہونے سے روتے تھے اس کی ان کو زیادہ خوشی نہ تھی۔ صاحبو! یہ وہ امرار تھے جن کی وجہ سے حضرات صوفیہ میں اختلاف ہوا ہے کہ صبر افضل ہے یا شکر افضل ہے یعنی فقر و فاقہ پر صابر رہنا افضل ہے یا مال و دولت کے ساتھ شاکر رہنا افضل ہے تو صوفیہ کرام کے اس قول میں ایسے شاکر مراد ہیں جیسے حضرات صحابہؓ تھے نہ کہ ہم جیسے حرامخور جو خدا کی نعمتیں کھا کھا کر معاصی پر اور زیادہ دلیر ہو رہے ہیں اگر حضرات صوفیہ ہمارے زمانہ کے امرار کو دیکھ لیتے تو وہ یہی فرماتے کہ صابر افضل ہے شاکر سے (الا ماشاء اللہ ۱۲) پس آجکل کے امرار کو دین میں نیچا دکھا دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے پھر تعجب ہے کہ ہم کو اس بات پر غیرت نہ آئی کہ ہم دنیا میں تو امرار سے کم رہے دین میں بھی ان سے بڑھے ہوئے نہ رہیں بالخصوص اہل علم کو تو یہ غیرت ضرور ہونی چاہیئے۔ پس ان کو لازم ہے کہ جس طرح اہل دنیا کسی وقت ترقیٔ دنیا سے نہیں تھکتے وہ بھی ترقی دین سے نہ تھکیں اور دین میں کمال حاصل کرتے رہیں جس کا ادنیٰ ایک آسان طریقہ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں جس کو میں نے تلاوت کیا ہے

حق تعالے فرماتے ہیں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتقوا اللّٰہ وکونوا مع الصدقین
اے ایمان والوخدا سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو۔ اس میں اول تقوی کا امر
ہے یہ بات تو اوپر ثابت ہو چکی کہ ہر مقصود میں درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے
اب یہ بات ثابت کرنا رہی کہ تقویٰ کمال دین ہے یا نہیں۔ نصوص شرعیہ میں غور
کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا تقوی کا امر اور فضل قرآن میں جس قدر ہے
غالباً کسی چیز کا اتنا نہیں اس سے اس کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہوا۔ اور حقیقت
اس کی یہ ہے کہ تقوے کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے، ایک ڈرنا
دوسرے بچنا۔ اور تامل کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو بچنا
ہی ہے یعنی معاصی سے مگر سبب اس کا ڈرنا ہے کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل
میں ہوتا ہے جبھی اس سے بچا جاتا۔ تقویٰ کا معنی اول میں استعمال الا ان تتقوا
منھم تقاۃ۔ میں ہے اور بچنے کے معنی میں استعمال نصوص کثیرہ میں اور اس حدیث
میں معلوم ہوتا ہے اتقوا النار ولو بشق تمرۃ۔ بچو جہنم سے اگرچہ ایک ٹکڑا
چھوارے کا دے کر یہاں بچنے ہی کے معنی بن سکتے ہیں ڈرنے کے معنی نہیں بن سکتے
غرض استعمال دونوں معنی میں وارد ہے لیکن اصل مقصود احتراز عن المعاصی ہے
اور خوف علی الاطلاق مقصود بالذات نہیں بلکہ وہ ذریعہ اور سبب ہے احتراز
عن المعاصی کا جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں فرمایا
کرتے تھے واسئلك من خشیتك ما تحول به بیننا وبین معاصیك اے
اللہ میں آپ سے آپ کا اتنا خوف مانگتا ہوں جس سے مجھ میں اور معاصی کے درمیان
میں آڑ ہو جاوے اس سے معلوم ہوا کہ خوف علی الاطلاق مقصود نہیں کیونکہ
مقاصد کا ہر درجہ مطلوب ہوتا ہے کوئی درجہ غیر مقصود نہیں ہوتا اور حدیث کی
اس قید سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف ایک خاص حد تک مطلوب ہے اس سے آگے
مطلوب نہیں وہ خاص حد یہ ہے کہ جس سے معاصی میں رکاوٹ ہو جاوے۔ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ما تحول به بیننا وبین معاصیك کی قید

بڑھا کر ایک ایسی بات بتلائی ہے جو سالکین کو سالہا سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتی ہے مگر آپ نے دو لفظوں میں اس کو حل فرما دیا وہ بات یہ ہے کہ بظاہر یہ بات سمجھ میں آیا کرتی ہے کہ خدا کا خوف تو اچھی چیز ہے پس وہ جتنا بھی زیادہ ہو اچھا ہے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس کا حد سے بڑھ جانا مضر ہوجاتا ہے اول تو زیادت خوف سے صحت خراب ہوجاتی ہے ہر وقت انسان رنج وغم ہی میں رہتا ہے اور صحت کے اختلال سے اعمال میں کوتاہی ہونے لگتی ہے دوسرے صاحب خوف کو دیکھ کر دوسرے مسلمانوں کی ہمتیں پست ہوجاتی ہیں کہ بس صاحب خدا کو راضی کرنا بڑا مشکل ہے ہر وقت رنج وغم میں گھلتا پڑتا ہے۔ تیسرے جب خوف کا غلبہ حد سے زیادہ ہوتا ہے تو یہ شخص رحمت الٰہی سے مایوس ہوجاتا ہے یا اس تک نوبت پہنچ جاتی ہے جو کہ کفر ہے اور مایوس ہونے سے وہ بالکل معطل وبیکار ہوجاتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ جب میرے کئے کچھ نہیں ہوسکتا اور میں رحمت حق کے قابل ہی نہیں ہوں تو پھر اس ساری محنت سے کیا فائدہ بس سب کام چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتا ہے تو غلبہ خوف سے یہ باتیں پیش آیا کرتی ہیں اس وقت سالک کو معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا ہر درجہ مطلوب نہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دو لفظوں میں اس حقیقت پر متنبہ کر دیا جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اصل مقصود تقویٰ بمعنی احتراز عن المعاصی ہے اور خدا کی نافرمانی سے بچنے کا کمال دین ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس میں ادائے فرائض وواجبات واجتناب عن المحرمات سب داخل ہیں کوئی مقصود شرعی اس سے خارج نہیں مطلب یہ ہوا کہ نماز بھی پڑھو کیونکہ ترک صلوٰۃ معصیت ہے، زکوٰۃ بھی دو کیونکہ ترک زکوٰۃ معصیت ہے اسی طرح تمام مامورات کا چھوڑنا معصیت ہے تو اس میں مامورات کے ادا کا حکم بھی ہے اور محرمات کے ترک کا بھی اور کمال دین کے یہی دو اجزاء ہیں تو تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہوگیا۔

دوسری دلیل ایک اور ہے جس سے تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہے وہ

یہ کہ حدیث میں ہے الا ان التقوی وجهنا و اشار الی صدرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ سن لو تقویٰ یہاں ہے یعنی تقوی کا محل قلب ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اس کے ساتھ دوسری حدیث کو ملایئے الا ان فی الجسد مضغۃً اذا اصلحت صلح الجسدُ کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب یعنی جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوجاتا ہے تو تمام بدن درست ہوجاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے سن لو وہ قلب ہے۔ اس حدیث سے اصلاح قلب کا صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہے اور پہلی حدیث سے یہ معلوم ہوچکا کہ تقوی کا اصل محل اور موصوف قلب ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ تقویٰ سے اول اصلاح قلب کی ہوتی ہے تو ان دونوں مقدموں سے تقویٰ کا مستلزم صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہوگیا اور صلاحیت کاملہ ہی کمال دین ہے پس یہ دعویٰ ثابت ہوگیا کہ تقویٰ کمال دین ہے اور قلب کو محل تقویٰ اس حدیث میں اس لئے فرمایا کہ تقویٰ بمعنی الاجتناب عن المعصیۃ کا سبب خوف خداوندی ہے اور ظاہر ہے کہ خوف کا اصلی محل قلب ہے ۱۲ جامع) یہاں تک تو جملہ اولیٰ کے متعلق کلام تھا دوسرے جملہ کی بابت میں نے یہ کہا تھا کہ کونوا مع الصادقین۔ بیان ہے مقصود مذکور کے طریق کا کہ حاصل اس کا معیت مع المتقین ہے پس صادقین

؎ اس حدیث سے بعض جاہل صوفیوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس اصل مقصود اصلاح قلب ہے اعمال ظاہرہ کی کچھ ضرورت نہیں یہ بالکل غلط اور صریح زندقہ ہے اور اس کا غلط ہونا خود اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ جب دل صالح ہوتا ہے تو تمام بدن صالح ہوجاتا ہے اور جب دل بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اعمال ظاہرہ صلاحیت قلب و فساد قلب کی دلیل ہیں پس جس شخص سے اعمال صالحہ صادر ہوں یہ اس کے قلب کے صلاحیت کی دلیل ہے اور جس سے اعمال سیئہ صادر ہوں یہ اس کے قلب کے فساد کی دلیل ہے پس صلاحیت قلب کے بعد اعمال صالحہ کا ترک ممکن نہیں اور جو شخص اعمال صالحہ کو ترک کرکے صلاحیت قلب کا دعوی کرتا ہے وہ جھوٹا ہے پس یہ مسلم کہ اصل مقصود اصلاح قلب ہے مگر وہ اعمال صالحہ کی مداومت اور اعمال سیئہ سے اجتناب سے منفک نہیں ہوسکتی ہے لہذا اعمال ظاہرہ ہرگز بے کار نہیں فافہم ۱۲ جامع۔

اسی کا ایک عنوان ہے اور متقی کے معنی کاملین فی الدین ثابت ہو چکے ہیں پس صادقین
کے بھی وہی معنی ہوں گے یعنی کمال فی الدین کا طریق کاملین فی الدین کی معیت ہے پس
کونوا مع الصّٰدقین کی توجیہ کونوا مع الکاملین ہوئی ہے کیونکہ صادقین سے معنی
مشہور صادقین فی القول مراد نہیں بلکہ راسخ فی الدین مراد ہیں جیسے ہمارے محاورہ
میں بھی پکے آدمی کو سچا کہتے ہیں اور اسی معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے بعض
انبیاء علیہم السلام کو صدیق فرمایا ہے واذکر فی الکتاب ابراھیم انہ کان صدیقًا
نبیا اور اسی صدیقیت کا درجہ بعد نبوۃ کے ہے پھر شہداء و صالحین کا درجہ
چنانچہ ایک آیت میں حق تعالیٰ نے اسی ترتیب سے ان درجات کو بیان فرمایا
ہے فاولئک مع الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء
والصالحین وحسن اولئک رفیقا اور رسوخ فی الدین بھی کمال فی الدین ہے پس
مع الصدقین کی توجیہ مع الکاملین ثابت ہوگئی ۔ نیز اس کی دلیل ایک اور آیت
ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لیس البران تولوا وجوھکم بلکہ یہ آیت اتفاق سے
میرے دونوں دعوں کو ثابت کر رہی ہے یعنی اس سے تقویٰ اور صدق دونوں کے
معنی کمال دین ہونا ثابت ہو رہا ہے پوری آیت اس طرح ہے لیس البران
تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللّٰہ والیوم الاٰخر
والملٰئکۃ والکتاب والنبیین ج واٰتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ و
المساکین وابن السبیل والسآئلین وفی الرقاب ج واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ
والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصابرین فی الباساء والضّراء وحین الباس ط
اولئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون ط

ترجمہ :۔ کچھ ساری خوبی اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب
کی طرف لیکن (اصلی) خوبی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی (ذات و صفات) پر
یقین رکھے اور قیامت کے دن پر (بھی) اور فرشتوں (کے وجود) پر (بھی) اور
(سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور مال دیتا ہو

اللہ کی محبت میں (اپنے حاجتمند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو اور دوسرے غریب محتاجوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کرلیں اور وہ لوگ مستقل مزاج رہنے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور (معرکہ) قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ صادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں اور ان اوصاف میں تمام اجزاء دین کا ذکر اجمالاً آگیا ہے دین کا کوئی جزو اس سے باقی نہیں رہا پس یہ اوصاف کمال دین کو متضمن ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان اوصاف سے متصف ہیں وہی صادق اور وہی متقین ہیں اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ صادق اور متقی وہی شخص ہے جو دین میں کامل ہو پس صدق اور تقویٰ کی حقیقت کمال دین ہونا ثابت ہوگیا۔ رہا یہ کہ آیا اس آیت میں تمام اجزاء دین کا ذکر آگیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت میں کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں عقائد، اعمال، اخلاق اور تمام جزئیات الٰہی کلیات کے تحت میں داخل ہیں اور اس آیت میں اقسام ثلثہ کے بڑے بڑے شعبے ارشاد فرمائے گئے ہیں اس اعتبار سے یہ آیت جامع جوامع کلم کے ہے جو آگے فرماتے ہیں لیس البران تولوا وجوھکم۔ بر کے معنے بھلائی کے ہیں اور لام عہد ہے معنی یہ ہوئے لیس البر الکافی ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب۔ یعنی مشرق و مغرب کی طرف نماز میں منہ کرلینا بر کافی نہیں ہے کہ اسی پر قناعت کرلی جائے اس توجیہ سے یہ اشکال رفع ہوگیا کہ استقبال قبلہ بھی تو مامور بہ شرعاً ہے اور مامور بہ شرعی کا بر ہونا لازم ہے پھر اس کی نسبت لیس البر کیوں فرمایا اس اشکال کے جواب لوگوں نے مختلف وجوہ سے دیئے ہیں لیکن جو توجیہ میں نے بیان کی ہے یہ بہت آسان ہے اور یہ توجیہ اسی وقت سمجھ میں آئی ہے۔ حاصل

اس کا یہ ہے کہ اس میں استقبال سے مطلق خیریت کی نفی نہیں کی گئی بلکہ اس کے برکافی
ہونے کی نفی ہونے کی مراد ہے رہا یہ کہ اس مضمون کی اس جگہ ضرورت کیا تھی استقبال
مشرق و مغرب سے برّ کافی کی نفی کیوں کی گئی سو بات یہ ہے کہ اس سے پہلے تحویل
قبلہ کا مسئلہ مذکور ہوا ہے جس میں کفار و مشرکین نے بہت شور و غل کیا تھا اور
اس وقت ان کی تمام تر بحث اسی میں رہ گئی تھی کہ مسلمانوں کا بھی عجیب دین ہے
کبھی کسی طرف منہ کرتے ہیں کبھی کسی طرف تو حق تعالیٰ ان کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ
تم تو اس بحث میں ایسے پڑ گئے کہ گویا مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا کوئی بڑا
مقصود ہے حالانکہ یہ مقصود نہیں بلکہ شرائط و وسائل مقصود میں سے ہے پس یہ
حماقت ہے کہ مقاصد کو چھوڑ کر غیر مقاصد کی بحث پر اکتفا کر لیا جاوے مشرق و
مغرب کی طرف منہ کرنا یہ برّ کافی نہیں بلکہ برّ کافی وہ ہے جس کا آگے بیان آتا ہے
اس کا اہتمام کرو۔ اور مشرق و مغرب کی تخصیص ذکر میں ایک نکتہ کی وجہ سے ہے
اس سے قبلہ کا مشرق و مغرب میں منحصر کرنا مقصود نہیں کیونکہ جن لوگوں سے مکہ
معظمہ کا رُخ جانب شمال میں ہے ان کا قبلہ شمال ہے اور جس جگہ سے مکہ کا رخ جنوب
میں ہے اس جگہ کا قبلہ سمت جنوب ہے۔ چنانچہ مدینہ والوں کا قبلہ جنوب ہے
اسی لئے حدیث میں اہل مدینہ کو فرمایا گیا ہے ولکن شرقوا او غربوا۔ کہ استنجا
کے وقت تم لوگ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کیا کرو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ قبلہ
مشرق و مغرب میں منحصر نہیں۔ پس اس جگہ مشرق و مغرب کی تخصیص میں نکتہ یہ ہے
کہ تمام جہات میں سے یہی دونوں جہتیں عرفاً زیادہ مشہور ہیں۔ جب ان کا غیر مقصود
ہونا بیان کر دیا تو دوسری جہات کا مقصود نہ ہونا بھی اِس سے واضح ہو گیا۔ دوسری
بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی جہت میں امتیاز بوجہ تقابل حسّی کے زیادہ محسوس
ہے پس اولاً و بالذات انہی دو جہات کا علم حاصل ہوتا ہے اور دوسری
جہات کا علم ان کے واسطے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب کی جہت کا سمجھنا
شمال و جنوب کے جاننے پر موقوف نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مشرق وہ جہت ہے

جدھر سے آفتاب نکلتا ہے اور مغرب وہ ہے جدھر آفتاب ڈوبتا ہے اور شمال و
جنوب کی معرفت بدون مشرق و مغرب کے نہیں ہو سکتی چنانچہ شمال و جنوب کی تعریف
اس طرح کی جاتی ہے کہ مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو۔ تو سے داہنے ہاتھ کی
سمت جنوب ہے اور بائیں ہاتھ کی سمت شمال ہے۔ پس یہ دونوں جہتیں اصل
ہوئیں اور جنوب و شمال ان کی فرع ہیں اور ظاہر ہے کہ اصل کے غیر مقصود
ہونے سے فرع کا غیر مقصود ہونا خود ہی سمجھ میں آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ
شریعت میں قلیل انحراف مفسد صلوٰۃ نہیں تو مشرق و مغرب جن کا قبلہ ہے وہ
اگر قدرے شمال و جنوب کی طرف مائل ہو جاویں نماز فاسد نہ ہوگی اس طرح گویا
مشرق و مغرب میں شمال و جنوب بھی آگئے۔ پس مطلب صرف یہ ہے کہ کسی جہت
کی طرف بھی منہ کرنا برّ کافی نہیں بلکہ برّ کافی وہ ہے جس کا آگے ذکر ہے وَلٰکِنَّ
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ الخ یہاں دونوں جہتیں جائز ہیں ایک یہ کہ مسند الیہ کی جانب
میں مضاف کو مقدر کیا جائے ولکن ذا البر من آمن باللہ الخ ایک یہ کہ مسند
کی طرف مضاف مقدر مانا جاوے یعنی ولکن البر برّ من آمن باللہ الخ۔ اور
حاصل دونوں کا ایک ہے خواہ یہ کہا جائے کہ بھلائی کافی اس شخص کی بھلائی ہے
یا کافی بھلائی والا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر
اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں ذات و صفات کے متعلق جس قدر احکام ہیں سب آگئے اور قیامت
کے دن پر ایمان لانے میں جزا و سزا و حساب و کتاب و جنت و دوزخ وغیرہ
کے سب احکام آگئے وَالْمَلٰٓئِكَةِ اور فرشتوں پر ایمان لائے یعنی اُن کے
وجود کا قائل ہو۔ اس میں تمام غیبیات داخل ہیں اور فرشتوں کی تخصیص اسی لئے
کی گئی ہے کہ شریعت کے معلوم ہونے کا مدار و واسطہ ملائکہ ہی ہیں وَالْكِتٰبِ
اور کتاب پر ایمان لائے یہاں کتاب بصیغۂ مفرد لایا گیا ہے۔ حالانکہ کتب
سماویہ متعدد ہیں اور ایمان لانا سب پر واجب ہے گو عمل منسوخ پر جائز نہیں۔
اور اسی وجہ سے دوسری آیتوں میں صیغۂ جمع اختیار کیا گیا ہے کل آمن باللہ

و ملائکتہ و کتبہ ورسلہ الخ لیکن یہاں صیغۂ مفرد اختیار کرنے میں اشارہ ہے ایک امر کی طرف وہ یہ کہ قرآن ایسا جامع ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ پر حاوی ہے اسی لئے اس پر ایمان لانا گویا سب پر ایمان لانا ہے۔ یا یہ کہا جاوے کہ کتب سماویہ میں سے ہر کتاب دوسری کتاب پر ایمان لانے کا امر کرتی ہے پس وہ سب مل کر بمنزلۂ کتاب واحد کے ہیں ان سب پر ایمان لانا بمنزلہ کتاب واحد پر ایمان لانے کے ہے (اور جو شخص ایک کتاب کو مان کر دوسری کا انکار کرے وہ حقیقت میں پہلی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتا) لیکن یہ حکم ایمان کا ہے اور عمل کرنا سب کتابوں پر جائز نہیں بلکہ عمل صرف موخر پر ہوگا کیونکہ وہ مقدم کے لئے ناسخ ہے والنّبیین اور پیغمبروں پر ایمان لائے یہاں تک تو امہات عقائد مذکور ہیں آگے اخلاق و اعمال کا ذکر ہے۔ اعمال شرعیہ کی دو قسمیں ہیں طاعات۔ دیانات دوسرے معاملات (معاملات کی پھر دو قسمیں ہیں ایک متعلق اموال کے دوسرے متعلق غیر اموال کے جو معاملات متعلق غیر اموال کے ہیں ان میں نکاح و طلاق و عتاق وحدود وغیرہ داخل ہیں) اور دیانات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک طاعات بدنیہ دوسرے طاعات مالیہ اسی طرح اخلاق کی دو قسمیں ہیں حسنہ و سیئہ۔ اخلاق حسنہ کے ساتھ موصوف ہونا مقصود شرعی ہے اور اخلاق سیئہ سے خالی و منزہ ہونا مطلوب ہے۔ عقائد سے آگے ان سب کے اصول مذکور ہیں جن میں طاعات مالیہ کا ذکر مقدم کیا گیا کیونکہ بہت لوگ طاعات بدنیہ میں ہمت والے ہوتے ہیں اور طاعات مالیہ میں ان کا یہ حال ہوتا ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست
گر زر طلبی سخن دریں ست

(اگر جان طلب کرلے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر مال طلب کریگا تو اس میں مجھے اعتراض ہوگا۔)

چنانچہ ارشاد ہے واٰتی المال علےٰ حبہ۔ اور دیتا ہو مال اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو علیٰ حُبّہٖ کی ضمیر اگر اللہ کی طرف راجع ہو جیسا کہ یہی ظاہر ہے تو اس میں علم

اخلاق کا بھی ایک اصل عظیم مذکور ہوگا یعنی مال خدا کے راستہ میں محبت الٰہی کی وجہ سے دینا چاہیئے اس میں ایک تو محبت الٰہی کے حاصل کرنے کی تعلیم ہوئی کہ خدا سے محبت پیدا کرنی چاہیئے محض ضابطہ کا تعلق نہ ہونا چاہیئے۔ دوسرے اخلاص کی تعلیم اور ریا و ناموری کی ممانعت ظاہر ہوئی کہ مال خرچ کرنے میں کسی کی مدح و ثنا یا شکریہ وغیرہ کا منتظر نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت اس کا سبب ہونا چاہیئے اور اخلاص بھی اخلاق باطنیہ کا ایک بڑا رکن ہے اور اگر مرجع ضمیر مال ہے تو معنی یہ ہونگے کہ ایسا مال جس سے محبت ہو اور دل کو تعلق ہو خدا کے لئے خرچ کردے اس میں ایک تو خرچ کرنے کا ادب مذکور ہوا کہ سنت کے واسطے عمدہ مال خرچ کرنا چاہیئے ردّی مال نہ دینا چاہیئے دوسرے علم سلوک کا یہ مسئلہ بھی اشارۃً مذکور ہوا کہ محبت مال جو کہ خلق ذمیم ہے اس کا علاج یہ ہے کہ جس چیز سے محبت ہو اسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کردے دو چار بار ایسا کرنے سے حب مال کا مرض جاتا رہے گا ذوی القربیٰ میں تمام قرابت دار داخل ہیں بیوی بچے بھی ان میں آگئے جن کا نفقہ مرد پر واجب ہوتا ہے اور دوسرے غریب رشتہ دار بھی آگئے جن کو کچھ دیتے رہنا اور ان کا خیال رکھنا مستحب ہے والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل اور یتیموں کو بھی دے اور مسکینوں کو بھی دے اور مسافروں کو بھی یہ سب صدقات نافلہ کیونکہ زکوٰۃ کا بیان آگے آرہا ہے۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ طاعات مالیہ کا ذکر طاعات بدنیہ سے کیوں مقدم ہوا اس کا جواب تو میں نے دیدیا کہ بعض طبائع میں بخل کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ طاعات بدنیہ کی ہمت خوب کرلیتے ہیں اور مال دینے سے جان چراتے ہیں اس لئے طاعات مالیہ کو اہتماماً مقدم کردیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ طاعات مالیہ میں سے صدقہ نافلہ کو صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ پر کیوں مقدم کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض لوگ خدا تعالےٰ سے ایسا ضابطہ کا تعلق رکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مفروضہ کے علاوہ اور کچھ خیرات نہیں کرتے اس میں گناہ نہیں مگر ضعف تعلق مع الحق کی دلیل ضرور ہے اس لئے حق تعالےٰ نے صدقات نافلہ کو زکوٰۃ سے مقدم فرمایا جس سے اس طرف

اشارہ کردیا کہ زکوٰۃ واجب ہے وہ تو تم ادا کرو ہی گے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ صدقہ خیرات موقع بموقع کرتے رہنا چاہیئے۔ دیکھئے اگر کوئی محبوب یا کوئی بادشاہ ہم سے یہ کہے کہ اس موقع میں تم دو روپیہ خرچ کردو تو غور کیجئے اس وقت ہمارے دل کی کیا حالت ہوگی کیا ہم صرف دو روپیہ ہی پر اکتفا کریں گے ہرگز نہیں بلکہ محبوب کو خوش کرنے یا بادشاہ کی نگاہ میں جاں نثار بننے کے لئے ہم دو کی جگہ دس خرچ کریں گے ورنہ چار تو دے ہی ڈالیں گے اس لئے خدا تعالیٰ سے ضابطہ کا تعلق نہ رکھنا چاہیئے۔ اس نکتہ کی وجہ سے صدقات نافلہ کو صدقہ مفروضہ مالیہ سے مقدم کیا بلکہ طاعت بدنیہ یعنی صلوٰۃ سے بھی مقدم کردیا لیکن بعد میں جب زکوٰۃ کا ذکر فرمایا تو نماز کو اس سے مقدم کیا تاکہ یہ معلوم ہوجاوے کہ رتبہ کے اعتبار سے نماز ہی مقدم ہے چنانچہ دیکھ لو ہم نے زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا ہے اور جن صدقات مالیہ کو نماز اور زکوٰۃ سے پہلے بیان کیا ہے وہاں تقدیم کی وجہ محض اہتمام بالشان ہے نہ کہ رتبہ کا زیادہ ہونا۔ رتبہ نماز کا طاعات مالیہ سے بڑھا ہوا ہے اور زکوٰۃ کا رتبہ صدقات نافلہ سے بڑھا ہوا ہے سبحان اللہ خدا تعالیٰ کے کلام میں ہر چیز کے درجہ کا کتنا لحاظ ہے۔ یہی تو باتیں ہیں جن کی وجہ سے بشر کی عقل اس کلام کو دیکھ کر چکراتی ہے کہ اتنی رعائتیں انسان ہرگز نہیں کرسکتا والسائلین وفی الرقاب اور مانگنے والوں کو بھی دے اور گردن چھڑانے میں بھی۔ یہ بھی صدقات نافلہ کی ایک فرد ہے اس میں اس قدر تفصیل ضروری ہے کہ دیگر نصوص شرعیہ سے سائلین کا لفظ ان سوال کرنے والوں کے ساتھ مخصوص ہوگیا ہے جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرتے ہوں جن کا پیشہ سوال نہ ہوگیا ہو اور جو لوگ مضبوط ہٹے کٹے سوال کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں ان کو دینا جائز نہیں نہ ان کو سوال کرنا جائز ہے۔ اس مسئلہ پر اس زمانہ میں سب سے پہلے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تنبیہ فرمائی۔ ایک دن فرمایا کہ ایک مسئلہ بتلاتا ہوں گالیاں تو بہت پڑیں گی چنانچہ واقعی جب اس مسئلہ کی شہرت ہوئی تو لوگوں نے بہت اعتراضات کئے اور برا بھلا کہا کوئی یہ کہتا تھا کہ

پس اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی فقیر کو کچھ مت دو مجھے دے جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ بس یہی تو ایک نئے مولوی پیدا ہوئے ہیں۔ آج تک کسی نے بھی ان سوال کرنے والوں کو دینا حرام نہیں بتلایا۔ مگر مولانا تو شریعت الٰہیہ کے عاقل تھے اور عاشق کو گالیوں کی پرواہ نہیں ہوا کرتی کسی نے خوب کہا ہے ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں

مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقل والوں کے نزدیک اس میں بدنامی و اعتراض ہے لیکن میں اتباع اور اطاعت کی بدنامی سے خوش ہوں ہم ایسی نیک نامی سے باز آئے جو نافرمانی سے تعلق رکھے۔)

اور اسی معنی میں ایک شعر اردو کا ہے مگر ذرا شاعریت سے گرا ہوا ہے اور نہ معلوم یہ کیا بات ہے کہ اردو کے اشعار فارسی اشعار کے سامنے پھیکے ہوتے ہیں مگر خیر مضمون کے موافق کی وجہ سے پڑھے دیتا ہوں ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا

اور جو خود ناکام ہو اسکو کسی سے کام کیا

ناکامی کا مطلب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھو۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ بھائی جو بامراد ہونا چاہے وہ کسی اور بزرگ کے یہاں جائے اور جو نامرادی چاہے وہ ہمارے پاس چلا آوے۔ پھر چپکے سے فرمایا کہ جانتے ہو نامرادی کے کیا معنی ہیں اس کے معنی ہیں عشق۔ کیونکہ عاشق بوجہ طلب اور اشتیاق کے غلبہ کے ہر جگہ اپنے آپ کو ناکام اور بے مراد ہی سمجھتا ہے وہ کسی حالت یا کسی مقام پر قناعت نہیں کرتا ہر وقت آگے کی طلب رہتی ہے اسی لئے وہ ہمیشہ ناکام رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ چشتیہ میں بعد تمکین کے بھی سوز و گداز رہتا ہے مگر یہ دنیا ہی میں ہے کیونکہ یہاں وصال کامل نہیں ہو سکتا جس سے تسلی ہو جائے لیکن آخرت میں تسلی ہو جاوے گی۔

ایک صاحبِ حال صوفی کا قول مشہور ہے ان فی الجنان جنۃ لیس فیھا حُورٌ ولا قصور ولکن فیھا ارنی یعنی ایک جنت ایسی بھی ہے جس میں نہ حوریں ہیں نہ محلات ہیں بس وہاں جو لوگ رہیں گے ان کی یہ حالت ہو گی کہ وہ ہر وقت حق تعالےٰ سے عرض کرتے رہیں گے کہ اپنے کو دکھلا دیجئے اپنے کو دکھلا دیجئے بعض لوگ اس کو حدیث سمجھتے ہیں یہ غلط ہے بلکہ ایک صوفی کا قول ہے اور قول بھی غلط میرے نزدیک اس صوفی نے جنت کو دنیا پر قیاس کیا ہے حالانکہ جنت میں حسب استعداد وصال کامل نصیب ہو جائے گا جس سے پوری تسلی ہو جائے گی اور کسی قسم کی خلش باقی نہ رہے گی جس کی دلیل یہ ہے کہ نصوص قرآنیہ سے جنت میں ہر قسم کی کلفت اور خلش کی نفی صراحۃً معلوم ہو چکی ہے اور یقیناً اگر یہ خلش وہاں بھی رہی تو اس سے بڑھ کر کوئی خلش نہ ہو گی عشاق تو آخرت ہی کی امید پر زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اگر وہاں بھی تسلی کامل نہ ہوئی تو بڑی حسرت کی بات ہے اور نصوص سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جنت میں کوئی حسرت باقی نہ رہے گی۔ ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون ہ اور دنیا میں سکون کامل اور پوری تسلی اسلئے نہیں ہو سکتی کہ یہاں وصال کامل عادۃً ممتنع ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہمارے قویٰ وصال کامل کے متحمل نہیں اور جنت میں تحمل عطا ہو جائے گا اور اہل نسبت کو جو دنیا میں وصال نصیب ہوتا ہے اس کو حالت تلوین کی اضافت سے وصال کہہ دیا جاتا ہے ورنہ حقیقی وصال کے سامنے وہ بھی کچھ نہیں بس ایک قسم کا حضور حاصل ہو جاتا ہے وہ بھی کسی وقت ہوتا ہے کسی وقت نہیں بھی ہوتا اس لئے عارف شیرازی فرماتے ہیں

در بزم دور یک دو قدح درکش و برو

یعنی طمع مدار وصالِ دوام را

(بزم قرب میں دو یا ایک جام پی اور راستہ لے یعنی دائمی وصال کی طمع مت کر)

اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ولکن یاحنظلہ ساعۃ ساعۃ یعنی ساعۃ کذا و ساعۃً کذا غرض یہ کہہ رہا تھا کہ عاشق کو بدنامی اور

ذلت اور گالیوں کی پرواہ نہیں ہوا کرتی چنانچہ مولانا گنگوہی رحمۃ نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ فقہاء نے بھی صراحۃً فرمایا ہے کہ یہ لوگ جو گلی کوچوں میں سوال کرتے پھرتے ہیں جنھوں نے سوال کو پیشہ بنا لیا ہے ان کو سوال کرنا حرام ہے اور چونکہ ان کا سوال پورا کر دینے سے ان کو آئندہ کے لئے سوال پر جرأت ہوتی ہے اس لئے ان کو کچھ دینا سوال حرام پر اعانت کرنا ہے اور اعانت علی الحرام حرام ہے۔ اس لئے ہٹے کٹے لوگوں کو سوال کرنا بھی حرام اور ان کو دینا بھی حرام خوب سمجھ لو۔ وفی الرقاب اور گردن چھڑانے میں۔ یہ قیدیوں اور غلاموں کے متعلق ہے اور اسی کے حکم میں یہ صورت بھی ہے کہ جو شخص قرض کے اندر بندھا ہوا ہو اس کی اعانت کردی جائے کہ یہ بھی گردن چھڑانے میں داخل ہے واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ اور نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔ یہاں زکوٰۃ کو نماز سے اصل کے مطابق مؤخر کردیا جس کا نکتہ اوپر مذکور ہو چکا ہے یہاں تک طاعات بدنیہ و طاعات مالیہ کے اصول عظام مذکور ہوئے آگے حقوق العباد کا بیان ہے۔ والموفون بعہدھم اذا عاھدوا۔ اور وہ لوگ عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب عہد کیا کرتے ہیں۔ ہرچند کہ حقوق العباد میں بعض حقوق ایسے ہیں جو ایفاء عہد سے مقدم ہیں مثلاً قرض کا ادا کردینا امانت میں خیانت نہ کرنا لیکن اس جگہ حق تعالیٰ نے صرف ایفائے عہد کو بیان فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ لوگ ایسے حقوق العباد کو ادا کرتے ہیں جن کا مطالبہ کرنے والا اُن سے کوئی بھی نہیں (کیونکہ ایفاء عہد قضاءً لازم نہیں گو دیانت بعض کے نزدیک واجب ہے ۱۲) تو اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہو گئی کہ جن حقوق کا مطالبہ کرنے والا موجود ہو ان کو تو ضرور ادا کریں گے اور اسی نکتہ کی وجہ سے مواریث میں وصیت کو دین پر مقدم فرمایا ہے اس سے حقوق العباد کا درجہ معلوم ہو گیا کہ جب حق تعالیٰ کو

ان حقوق کا بھی اہتمام ہے جس کا مطالب کوئی نہ ہو تو جن حقوق کا مطالب بھی موجود ہو وہ تو کس قدر قابل اہتمام ہوں گے اور یہاں بطور مثال کے بعض حقوق کا ذکر فرمایا گیا ورنہ حقوق العباد اور بھی ہیں اگرچہ لوگ فقط مال کو حق العباد سمجھتے ہیں مگر ایک حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق العباد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ حقوق العباد کے اقسام اور بھی ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو خطبہ پڑھا ہے اس میں آپؐ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا این یوم ھذا یہ کون سا دن ہے قالوا اللہ ورسولہ اعلم۔ صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا الیس یوم النحر کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے قالوا بلی صحابہؓ نے عرض کیا بیشک اس سے صحابہ کا غایت ادب معلوم ہوا کہ جس بات کو وہ جانتے بھی تھے اس کو بھی اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیتے تھے اپنی شان علم ظاہر نہ کرتے تھے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ مقام کونسا ہے پھر اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا بیشک پھر آپؐ نے مہینہ کی بابت سوال کیا اور اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے صحابہؓ نے عرض کیا بیشک۔ پھر آپؐ نے فرمایا فان اموالکم ودماءکم واعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا۔ کہ تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آپس میں تم پر ہمیشہ کے لئے ایسی ہی حرام ہیں جیسے اس مہینہ میں اس مقام میں اس دن میں حرام ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ایک قسم حقوق العباد کی جان کو تکلیف پہنچانا ہے مثلاً ناحق مارنا جس میں اہل حکومت اور معلمین بکثرت مبتلا ہیں اور ایک قسم حقوق العباد کی کسی کی آبرو کو صدمہ پہنچانا بھی ہے۔ یعنی کسی کی تحقیر کرنا کسی پر لعن طعن کرنا کسی پر بے وجہ بدگمانی کرنا یہ سب حرام ہے۔ اسی طرح کسی کی غیبت کرنا بھی ناجائز ہے بلکہ بعض نصوص سے حقوق آبرو کا درجہ زنا وغیرہ سے بھی

بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ بالخصوص آبرو کے حقوق کی ذرا پرواہ نہیں ایسے لوگ بکثرت ہیں جو کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے۔ حقوق مالیہ میں فروگذاشت نہیں کرتے اور اپنے آپ کو بڑا متقی سمجھتے ہیں کہ ہم کسی کا حق نہیں رکھتے مگر آبرو کے حقوق میں وہ بھی مبتلا ہیں۔ ہماری کوئی مجلس غیبت سے خالی نہیں ہوتی عوام کی تو کیا شکایت علماء کی مجالس بھی غیبت سے خالی نہیں اور سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ مشائخ کی مجالس بھی اس سے خالی نہیں عوام تو عوام ہی کی غیبت کرتے ہیں جن میں اکثر فساق بھی ہوتے ہیں جن کی آبرو کا زیادہ حق بھی نہیں لیکن علماء جب غیبت کریں گے تو وہ عوام کی نہ کریں گے بلکہ علماء کی غیبت کریں گے اور مشائخ ہمیشہ مشائخ کی غیبت کریں گے کیوں تاکہ یہ ہم سے بڑھ نہ جائیں۔ لوگ ہم سے زیادہ ان کے معتقد نہ ہوجائیں اسی لئے اکثر علماء و مشائخ کی مجلیس علماء و مشائخ کی غیبت سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ مقبولات الٰہی و اولیاء اللہ کی غیبت کرتے ہیں تو اس بارہ میں یہ عوام سے بڑھے ہوئے ہیں۔

یاد رکھو یہ باتیں معمولی نہیں ہیں لوگ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں حالانکہ یہ باتیں سارے نماز روزے کو لے ڈوبیں گی جس کی تم نے آبروریزی کی ہوگی قیامت میں اس کو تمہاری نیکیاں دلوائی جائیں گی اس لئے نماز روزہ سے زیادہ حقوق آبرو کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ ایک بات اور یاد آئی وہ یہ کہ مال اور جان کا حق تو مرنے پر ختم ہوجاتا ہے اور آبرو کا حق بعد موت کے بھی باقی رہتا ہے اگر بعد مرنے کے کسی کو مارو تو اس کو اس کا احساس نہیں ہوتا اس لئے ضرب کا قصاص بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح مرنے کے بعد کسی کا مال چراؤ تو وہ مال اس کا نہیں رہا ورثہ کا ہوگیا ہے لیکن مرنے کے بعد کسی کو متہم کرو اور اس کو برا بھلا کہو تو غیبت کا گناہ اس وقت بھی ہوگا اور اب اس کا کفارہ یہ ہے کہ میت کے لئے بکثرت دعا و استغفار کرو امید ہے کہ حق تعالیٰ اس کو تم سے راضی کردیں گے اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ مرنے کے بعد ضرب کا احساس نہیں ہوتا شاید کسی کو اس حدیث سے شبہ ہو۔

کسر عظم المؤمن میتا ککسرہ حیًا (مسلمان کی ہڈی کو مرنے کے بعد توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا) اس کا مطلب یہ نہیں کہ تشبیہ من کل الوجوہ ہے جس سے میت کو بعد موت کے زندہ کی برابر احساس ہونے کا شبہ کیا جاوے اگر ایسا ہوتا تو شرعًا اس شخص سے قصاص لیا جاتا بلکہ یہ تشبیہ بعض وجوہ میں ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض موت کے بھی روح کو کسی قدر تعلق جسم سے رہتا ہے اور وہ ایسا تعلق ہوتا ہے جیسا کہ اس وقت ہمارے جسم کو لباس سے تعلق ہے پس اگر کوئی ہمارا اترا ہوا کرتہ پھاڑ دے تو ہم کو کلفت ہوتی ہے اسی طرح روح کو موت کے بعد ہڈی توڑنے سے ایسی ہی کلفت ہوتی ہے۔ نیز اس تعلق کا یہ اثر بھی ہے کہ قبر کے پاس جاکر سلام و دعا جو کچھ کی جاتی ہے مردہ اس کو سنتا ہے اور شہداء میں یہ تعلق عام مومنین سے زیادہ ہوتا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ ان کا جسم بعد موت کے سالم رہتا ہے زمین اس کو کھا نہیں سکتی نیز اس تعلق سے بعض اولیاء کو مرنے کے بعد قوت تصرف بھی عطا ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان کے مزاروں پر جاکر ان سے مرادیں مانگا کریں کہ شرعًا یہ بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ ان کے وسیلہ سے حق تعالےٰ سے دعا مانگی جائے۔ باقی ان سے یہ بھی نہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دعا کرو کیونکہ شریعت میں اس کا کہیں ثبوت نہیں کہ وہ ایسی دعاؤں کے ماذون ہیں۔ احادیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں جاکر مردوں کے لئے دعا کی جائے یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو احیاء کی دعا سے نفع ہوتا ہے اور اس کے منتظر رہتے ہیں مگر اسکا

مہ قال السخاوی فی المقاصد الحسنۃ حدیث کسر اعظم المیت ککسر اعظم الحی احمد و ابو داؤد و ابن ماجۃ والبیہقی من حدیث عائشۃ مرفوعًا وحسنہ ابن القطان وقال ابن دقیق العید انہ علی شرط مسلم ورواہ الدارقطنی من وجہ آخر عنہا وزاد فی الاثم وفی روایۃ یعنی فی الاثم وذکرہ مالک فی المؤطا بلاغا عن عائشۃ رض موقوفا ورواہ ابن ماجۃ من حدیث ام سلمۃ رض ص ۱۴۸ واللہ اعلم ۱۲ جامع عفا اللہ عنہ۔

کہیں ثبوت نہیں کہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دعا کرو تو وہ دعا کر دیتے ہیں اور اولیاء سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو اپنے اجسام سے تعلق رہتا ہے جس کے بعض آثار یہ ہیں کہ ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔ ایک اثر یہ ہے کہ ان کی بیبیوں سے نکاح کرنا ان کے بعد بھی حرام ہے (گو یا یہ حکم آیات و احادیث میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بیان کیا گیا ہے مگر بعض علماء نے تمام انبیاءؑ کے لئے یہ حکم عام مانا ہے واللہ اعلم ۱۲) تو کسر عظم سے جسمانی ایذاء تو نہیں ہوتی ہاں روحانی ایذاء ہو سکتی ہے۔ اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی توڑنا۔ حضرت استاد علیہ الرحمۃ (مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) فرماتے تھے کہ مردہ کے جسم کو جلانے سے اس کو ایسی ایذاء ہوتی ہے جیسے تمہارے چادرہ کو اتار کر کوئی تمہارے سامنے جلا دے تو اس سے تم کو رنج اور غم ہوتا ہے۔ اسی طرح روح کو بھی رنج ہوتا ہے ظاہر ہے کہ چادرہ کے جلانے سے ہمارے جسم کو ایذاء نہیں ہوتی صرف روحانی ایذاء ہوتی ہے۔ یہی حال بعد موت کے بدن جلانے کا ہے۔ ایک وجہ تشبیہ تو یہ ہوئی دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ تشبیہ گناہ میں ہو کہ جب گناہ زندہ کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے ایسا ہی میت کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے۔ (قلت وھذا الوجہ اولی لانہ مبایّد بالروایۃ وقد ذکرتھا فی الحاشیۃ ۱۲ جامع) اور وجہ شبہ ترک احترام ہے کیونکہ ہڈی توڑنے اور بدن جلانے سے میت کی بےحرمتی ہوتی ہے احترام میت کا اب بھی باقی ہے اور تقدیر پر اس حدیث کا مآل بھی حقوق آبرو کی طرف ہو جائے گا۔ حاصل یہ ہوا کہ چونکہ مردہ کا احترام بعد موت کے بھی باقی ہے اور کسر عظم میں اس کی بےحرمتی اور بےعزتی ہے اس لئے یہ فعل حرام ہے اور ظاہر ہے کہ اقوال کی تاثیر بےحرمتی میں کسر عظم سے زیادہ ہے پس مردوں کو برا بھلا کہنا بھی حرام ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ اپنے مردوں کو برا نہ کہو کیونکہ وہ اعمال کی جزا کو پہونچ چکے ہیں اگر واقع میں وہ برے ہیں

تو اپنے افعال کی سزا بھگت رہے ہیں پھر تمہارا ان کو برا بھلا کہنا بے سود ہے اور اگر واقع میں وہ اچھے ہیں تو ان کو برا کہنے سے تم کو گناہ ہوگا۔ اس لئے یہ حرکت قابل ترک ہے (البتہ جو لوگ اپنی زندگی میں کوئی برا طریقہ رائج کر گئے ہوں اور ان کی موت کے بعد بھی لوگ اس کا اتباع کرتے ہوں اُن کو برا کہنے کا مضائقہ نہیں تاکہ لوگ اس کے اتباع سے باز آجائیں ۱۲ جامع) پس مسلمان مُردوں کی بے حرمتی کرنا خواہ فعل سے ہو یا قول سے ہر طرح ناجائز ہے اور اس بے حرمتی کے بہت سے شعبے ہیں جن میں سے ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ضرورت کی طرف مجھ کو میرے ایک عنایت فرما نے توجہ دلائی ہے وہ یہ کہ سنا گیا ہے کہ بعض لوگ قبرستانوں میں ہگتے موتتے ہیں اور قبرستان زمین میں گھر بناتے ہیں تو اس میں ایک تفصیل ہے جس کو غور سے سن لینا چاہیئے۔

وہ یہ کہ اگر قبرستان کی زمین کسی کی ملک ہو تب تو اس کو قبروں کے نشانات مٹا کر اس جگہ مکان بنانا جائز ہے مگر جس جگہ قبر کا نشان ہو وہاں پاخانہ بنانا ہگنا موتنا اس وقت بھی حرام ہے اور جو قبرستان وقف ہیں ان کا استعمال بالکل حرام ہے ان میں کسی کو مکان بنانا جائز نہیں اور اکثر قبرستان وقف ہی ہیں اس لئے اس سے بچنا چاہیئے اور اس میں آخرت کا ضرر تو ہے ہی کہ گناہ ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ دنیوی ضرر بھی ہوتا ہے کہ بعضے مردے پٹک بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے واقعات بکثرت سننے گئے ہیں۔ میں یہ نہیں دعوے کرتا کہ سب حکایات صحیح ہیں مگر بہت سی سند صحیح سے ثابت بھی ہیں۔ ثابت ہے پھر اس سے قطع نظر اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ قبروں پر ہگنے موتنے سے مُردوں کو ایذا ہوتی ہے[عہ]۔ اور ان میں بعض اولیاء بھی ہیں جن کی نسبت حدیث صحیح میں وارد ہے من اذی لی ولیًا فقد اذنتہ بالحرب یعنی

عہ ذکر فی المرقاۃ بروایۃ ابن ابی شیبۃ عن ابن مسعود اذی المؤمن فی موتہ کاذاہ فی حیوتہ وفی المشکوۃ عن عمرو بن حزم قال رأنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم متکئا علی قبر فقال لا تؤذ صاحب ھذا القبر او لا تؤذہ رواہ احمد ۔

جو کوئی میرے کسی ولی کو ایذا پہنچا دے اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ دیا جاتا ہے۔ اللہ اکبر یہ وعید کتنی سخت ہے خدائی الٹیمیٹم کا کون مقابلہ کر سکتا ہے پھر اس وعید کا ظہور کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ خود اولیاء کو تصرف کی اجازت دیتے ہیں اور وہ اپنے تصرف سے اس شخص کو ضرر پہنچا دیتے ہیں اور بعض دفعہ اولیاء کوئی تصرف نہیں کرتے لیکن حق تعالیٰ کو اپنے محبوب کی بے حرمتی پر غیرت آتی ہے کہ ہمارے محبوب کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا گیا۔ اس لئے حق تعالیٰ خود اس شخص کو کسی بلا میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ غرض اولیاء کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کرنا بڑا سنگین جرم ہے اگر وہ حضرات اپنی شفقت سے کچھ بھی نہ کہیں تو غیرت حق نہیں چھوڑتی اس لئے اس سے بہت بچنا چاہیے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

(ہم نے اس کائنات میں بارہا تجربہ کیا کہ اللہ والوں کے ساتھ جو بدتمیزی کرتا ہے وہ خود ذلیل ہو جاتا ہے)

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد
تا دلِ صاحب دلے نامد بدرد

(کسی قوم کو خدائے تعالیٰ ذلیل اس وقت تک نہیں فرماتے جب تک کہ وہ کسی اللہ کے مقبول بندے کو نہیں ستاتے)

یاد رکھو جب کوئی قوم کسی ولی کا دل دکھاتی ہے تو ان کا صبر ضائع نہیں جاتا حق تعالیٰ بعض دفعہ ان کی طرف سے اس طرح انتقام لیتے ہیں کہ خود ان کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی یہ مت سمجھو کہ حقوق العباد صرف جان و مال ہی کے متعلق ہیں بلکہ آبرو بھی حقوق العباد میں داخل ہے اور اس کے حقوق جان و مال سے بھی زیادہ ہیں کہ بعد موت کے بھی اس کے حقوق باقی رہتے ہیں جن میں سے ایک حق یہ بھی ہے جن کو ابھی ذکر کیا کہ

بعد مرنے کے مسلمانوں کی قبروں کا احترام کیا جائے ان کی بے حرمتی نہ کی جائے جس کو میں نے ضروری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ یہ مضمون میرے دوست نے کئی مرتبہ مجکو یاد دلایا مگر ہر بیان کے وقت میں اس کو بھول جاتا تھا کیونکہ فرمائشی مضمون بہت کم یاد رہتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ یاد رہا۔ اور بحمد للہ اس کا بیان کافی ہو گیا۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ بعض مخلصین قبرستانوں کی حفاظت کے لئے خاص اہتمام کر رہے ہیں سب مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینا چاہیئے اور ان کی اعانت کرنی چاہیئے اس تقریر پر شاید کوئی یہ اشکال کرے کہ تم نے بیان کیا ہے کہ اولیاء اللہ کی بیحرمتی سے وبال آتا ہے لیکن ہم تو اب تک قبرستانوں میں ہگتے موتتے رہے ہیں یا اولیاء اللہ کو برا بھلا کہتے رہے ہم کو تو کچھ ضرر نہیں ہوا ہم تو ویسے ہی ہٹے کٹے صحیح وسالم موجود ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض ویسا ہی ہے جیسا کہ کفار نے انبیاءؑ سے کہا تھا کہ تم روز روز ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو کہ اگر کفر کرو گے تو یوں وبال آئے گا یوں بلائیں نازل ہوں گی مگر ہم تو مدت سے کفر کر رہے ہیں اور اب بھی کفر میں مبتلا ہیں ہم پر تو کچھ بھی عذاب نہ آیا پس جو انجام کفار کے اس اعتراض کا ہوا تھا وہی انجام یہ حضرات سوچ لیں میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر اب تک کوئی وبال تم پر نہیں آیا تو کیا آئندہ کے لئے بھی تمھارے پاس وحی آگئی ہے کہ تم کبھی وبال میں مبتلا نہ ہو گے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسا اعتراض کر رہے ہیں وہ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہیں لیکن وبال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری ایک باطنی ظاہری وبال تو یہ ہے کہ جان ومال کا نقصان ہو جاوے، صحت برباد ہو جاوے مثلاً اور یہ وبال آہون ہے اور باطنی وبال یہ ہے کہ دل سیاہ ہو جاوے اس میں اعمال صالحہ کی صلاحیت باقی نہ رہے نیک کاموں سے دل گھبرانے لگے یہ وبال بہت سخت ہے کیونکہ جب دل سیاہ ہو جاتا ہے تو بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے جس کا انجام ابدالآباد کے لئے عذاب جہنم ہے۔ پس میں کہتا ہوں

کہ یہ لوگ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہیں لیکن باطنی وبال میں گرفتار ہیں
کہ ان کے دلوں سے قہر خداوندی کا خوف نکل گیا ہے جبھی تو اتنی جرأت ہے
کہ قہر خداوندی کا نام سن کر اپنی حرکتوں سے باز آنے کا قصد نہیں کرتے بلکہ الٹا
اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اگر ان کے دلوں میں قہر الٰہی کا خوف ہوتا تو جس
کام میں اس کا وہم بھی ہوتا اس سے فوراً الگ ہو جاتے۔ اسی مضمون کو مولانا
ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں ؎

آتشی گرنا مدست ایں دود چیست
جان سیہ گشت در واں مردود چیست

(اگر آگ اندر نہیں لگی تو دھواں کس سبب سے ہے اگر دل نہیں سیاہ ہو چکا تو
یہ گستاخی کے کلمات کیوں نکل رہے ہیں)

یعنی تم جو کہتے ہو کہ ہم پر گناہوں کا وبال نہیں آیا مولانا فرماتے ہیں کہ تمہارے اندر
قہر کی آگ تو جل رہی ہے اگر تمہارے اندر آگ نہیں ہے تو یہ دھواں کہاں سے
آیا یعنی یہ کلمات جرأت اور بے باکی کے تمہاری زبان سے کیونکر نکل رہے ہیں
جن سے دل کے سیاہ ہو جانے کا پتہ چل رہا ہے اور یہ بہت بڑا قہر ہے جو ظاہری
قہر سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ یہاں تک حقوق العباد کا ذکر ہو گیا آگے اخلاق کا ذکر
ہے والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس۔ اور وہ لوگ
صبر کرنے والے ہیں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال کے وقت ہر چند
کہ اخلاق باطنیہ بہت ہیں لیکن حق تعالیٰ نے ان میں سے اس مقام پر صرف
صبر کو بیان فرمایا ہے اور اس کے تین مواقع بیان فرمائے ہیں وجہ اس تخصیص
کی یہ ہے کہ صبر ایسی صفت ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد یقیناً اخلاق کا
حصول خود بخود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صبر کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ عزیز و قریب
کے مرنے پر مستقل مزاج رہے یہ بھی صبر کی ایک فرد ہے لیکن صبر کی حقیقت اس
سے عام ہے صبر کے معنی لغت میں حبس کے ہیں یعنی روکنا اور یہی معنی شریعت

میں بھی ہیں صرف ایک قید زیادہ ہے یعنی حبس النفس علی ما نکرہ انسان کا اپنے نفس کو اس کی ناگوار بات پر روکنا اور ناگواری کے اقسام پر شرعاً صبر کی تین قسمیں ہیں ایک صبر علی العمل (۲) صبر عن العمل (۳) صبر فی العمل۔ صبر علی العمل یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا یعنی اس پر جم جانا اور قائم رہنا مثلاً نماز زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلا ناغہ ان کو ادا کرتے رہنا اور صبر فی العمل یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجا لانا مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ بچہ جی اتنی دیر تک تم سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے اتنی دیر تک تمکو نماز یا ذکر ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے جب یہ ملکہ راسخ ہو جاتا ہے تو سب اعمال ٹھیک ٹھیک ادا ہوتے ہیں بعض لوگوں کو فرائض شرعیہ کی پابندی تو نصیب ہے اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو صبر علی العمل کا درجہ حاصل ہے لیکن اعمال کو بجا لاتے وقت وہ ان کے آداب و حقوق کی رعایت نہیں کرتے گڑ بڑ کر دیتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو صبر فی العمل حاصل نہیں ہوا۔ تیسری قسم ہے صبر عن العمل یعنی نفس کو ما نہی اللہ عنہ سے روکنا شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رکنا جن میں سب سے اہم صبر عن الشہوت ہے کہ نفس کے تقاضائے شہوت کو روکا جاوے اور یہ سب سے اہم اس لئے ہے کہ نفس کے دوسرے تقاضے تو ایسے ہیں کہ ان سے اگر نہ روکا جاوے تو بعد میں اس کو خود ہی بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت کا خیال کر کے نفس ان تقاضوں سے خود ہی رک جاتا ہے۔ مثلاً صبر عن الغضب بہت آسان ہے کیونکہ غصہ کے وقت گو نفس کو لذت آتی ہے مگر بعد میں کوفت ہوتی ہے مشاہدہ ہے کہ غصہ کر کے بعد میں ایک ندامت سی طاری ہوتی ہے کہ ہم نے خوامخواہ غصہ کیا بات کو ٹال کیوں نہ دیا غصہ کر کے کبھی جی بھلا نہیں ہوتا نیز بعض دفعہ کسی پر غصہ کرنے سے اس کو دشمنی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ایذا

رسائی کے درپے ہو جاتا ہے ان مضرتوں پر نظر کرکے عضو کو انسان خود ہی دبانے لگتا ہے لیکن عن الشہوت بہت مشکل ہے کیونکہ شہوت رانی میں وقت قضاء شہوت کے بھی لذت آتی ہے اور بعد میں بھی اس کی لذت رہتی ہے قضاء شہوت کے بعد کچھ کوفت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کو روحانی کوفت ہوتی ہو تو ممکن ہے لیکن ایسے بہت کم ہیں عام حالت یہی ہے کہ شہوت رانی کے بعد اس کا مزہ پڑ جاتا ہے پہلے سے زیادہ آگ بھڑک جاتی۔ ہے گو تھوڑی دیر کے لئے سکون ہو جاتا ہے اور شہوت بالنساء سے بھی اشد شہوت بالامارد ہے آج کل امردوں کے ساتھ ابتلاء عام ہو رہا ہے جس کی چند وجوہ ہیں اول تو عورتوں میں قدرتی حیا کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان سے اظہار شہوت کی جرأت ذرا دقت سے ہوتی ہے اور لڑکوں میں حیاء کا مادہ کم ہوتا ہے۔ دوسرے عورتوں کی حفاظت بہت کی جاتی ہے ان کے پاس پہونچنا آسان نہیں۔ اور جو کوئی پہونچ بھی جاتا ہے اس کی رسوائی جلد ہو جاتی ہے اور بچوں کی کچھ بھی حفاظت نہیں کی جاتی اُن کا کسی سے پردہ نہیں ہوتا۔ تیسرے اس میں اتہام کم ہوتا ہے بچوں کے سر پر شفقت سے بھی ہاتھ پھیرا جاتا ہے اور شہوت سے بھی اب اگر کسی کے بچہ کو پیار کریں اس کے سر پر ہاتھ پھیریں تو سب لوگ یہ سمجھیں گے کہ ان کو بچوں پر شفقت زیادہ ہے شہوت کی کسی کو کیا خبر ان وجوہ سے آجکل امارد کی ساتھ ابتلاء بہت زیادہ ہے اور شہوت بالنساء سے یہ شہوت بالرجال اشد ہے کیونکہ عورتوں میں محارم کے ساتھ ابتلا کم ہوتا ہے اکثر غیر محارم سے ہوتا ہے سو وہ کسی نہ کسی وقت تمھارے لئے حلال بھی ہو سکتی ہیں اگر وہ کنواری ہے تو اسی وقت نکاح کا پیغام دیا جا سکتا ہے اور اگر شوہر والی ہے تو ممکن ہے شوہر مر جاوے یا طلاق دیدے تو پھر تم اس سے نکاح کر سکتے ہو بہر حال اس میں حلت کی توقع تو۔ ہے گو کسی وقت ہو گو توقع ضعیف ہی ہو مگر امردوں کا حلال ہونا تو کسی وقت بھی متوقع نہیں بلکہ بعضے گناہ تو ایسے ہیں جو جنت میں جا کر گناہ نہ رہیں گے مثلاً شراب پینا دنیا میں گناہ ہے لیکن جنت میں شراب ملے گی

اور یہ شہوت بالرجال ایسا خبیث فعل ہے کہ جنت میں بھی اس کا وقوع نہ ہوگا پس یہ زنا اور شراب خواری سے بھی بدتر ہے، بلکہ شراب میں تو جو کچھ حرمت ہے سُکر کی وجہ سے ہے اگر کسی تدبیر سے شراب کا سُکر زائل ہو جائے مثلاً سرکہ بن جائے تو بعینہ اُسی کا پینا حلال ہو جاتا ہے لیکن شہوت بالامرد کی خباثت لذاتہ ہے یہ کسی طرح بھی زائل نہیں ہو سکتی پس یہ فعل حرمت میں سب سے بڑھا ہوا ہے کہ اس میں کسی طرح بھی حلت کی گنجائش نہیں یہ ناپاک فعل سب سے پہلے قوم لوط میں رائج ہوا اُن سے پہلے آدمیوں میں اس کا وقوع نہ ہوا تھا۔ چنانچہ لوط علیہ السلام نے اُن سے فرمایا۔ انا تون الفاحشۃ ما سبقکم بھا احدٌ من العالمین گو حیوانات میں بعض کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان میں پہلے سے اس کا وقوع تھا حق تعالےٰ نے قوم لوط پر جب سنگین عذاب نازل کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ فعل کیسا سنگین ہے کیونکہ کفر تو تمام کفار میں مشترک تھا لیکن انواع عذاب کا مختلف ہونا بظاہر خصوصیت افعال ہی کی وجہ سے ہے اور سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل بد قوم لوط نے بھی خود نہیں ایجاد کیا بلکہ شیطان نے ان کو سکھایا۔ یہ فعل ایسا خبیث ہے کہ انسان کا نفس باوجود امارۃ بالسوء ہونیکے اسکی طرف از خود منتقل نہیں ہوا بلکہ شیطان خبیث نے اس کی طرف قوم لوط کو متوجہ کیا جس کا قصہ اس طرح کتابوں میں لکھا ہے کہ شیطان خوبصورت لڑکے کی صورت میں متشکل ہو کر ایک شخص کے باغ میں سے انگور توڑ توڑ کر کھا جاتا تھا، باغ والا اس کو دھمکاتا مارتا تھا مگر یہ باز نہ آتا تھا ایک دن اس نے تنگ آکر اس سے کہا کہ کمبخت تو نے میرے باغ کا یہ پیچھا کیوں لے لیا سارے درخت برباد کر دیئے تو مجھ سے کچھ روپے لیلے اور میرے باغ کا پیچھا چھوڑ دے شیطان بصورت امرد نے کہا کہ میں اس طرح باز نہ آؤں گا اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمھارے درختوں کا ناس نہ کروں تو جو بات میں کہوں اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا وہ کیا بات ہے۔ ابلیس نے اس کو یہ فعل تعلیم کیا کہ میرے ساتھ تو یہ فعل کیا کر پھر میں تیرے باغ کو چھوڑ دوں گا چنانچہ پہلی بار

تو اس نے جبراً قہراً اپنے باغ کے بچاؤ کے لئے یہ فعل کیا پھر خود اس کو مزہ پڑ گیا وہ اس کی خوشامدیں کرنے لگا کہ تو روز آیا کر اور جتنے انگور چاہے کھالیا کر پھر اس نے دوسرے آدمیوں کو اس کی اطلاع دی اور لوگ بھی یہ فعل کرنے لگے۔ پھر کیا تھا عام رواج ہو گیا۔ اس کے بعد شیطان تو غائب ہو گیا لوگوں نے لڑکوں کے ساتھ یہ فعل کرنا شروع کر دیا۔ خدا تعالیٰ کو یہ فعل بہت ہی ناگوار ہے۔ چنانچہ لوط علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو اس فعل سے روکو ورنہ سخت عذاب آئے گا۔ انہوں نے بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے آخر عذاب نازل ہوا اور سب کے سب تباہ ہو گئے۔ صاحبو! یہ فعل ایسا خبیث ہے کہ جو اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ تو بدنام ہوتا ہی ہے مگر اس سے بڑھ کر یہ ستم ہے کہ جس نبی کی امت نے اس فعل کا ارتکاب کیا ہے آج اس نبی کی طرف سے بھی بلفظاً نسبت کرنا لوگوں میں باعث ننگ ہو گیا۔ یعنی کوئی شخص اپنے لئے یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کو لوطی کہا جاوے حالانکہ لفظ لوطی میں یائے نسبت ہے اور لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور موسوی اور عیسوی اور یوسفی۔ اگر لوط علیہ السلام کی قوم نے یہ فعل بد نہ کیا ہوتا تو آج لوطی کا لفظ باعث فخر ہوتا جیسا کہ دیگر انبیاء کی طرف نسبت کرنا باعث فخر ہے۔ مگر اس کمبخت قوم نے اپنے نبی کے نام کو بھی نہ چھوڑا۔ صاحبو! مجھے تو اس فعل کے لئے لفظ لواطت کا استعمال بہت ہی ناگوار ہوتا ہے کیونکہ لواطت کا لفظ لوط علیہ السلام کے نام سے بنایا گیا ہے تو ایسے گندے کام کا نام نبی کے نام سے مشتق کرنا بہت ہی نازیبا ہے جس نے یہ لفظ ایجاد کیا ہے بہت ہی ستم کیا ہے میرے نزدیک یہ لفظ عربیت میں دخیل اور مولد ہے فصحائے عرب کے کلام میں اس کا استعمال نظر سے نہیں گذرا۔ عربی میں اس کے لئے اتیان فی الدبر کا لفظ معلوم ہوتا ہے یا اور کوئی لفظ بھی ہو بہرحال لواطت کا لفظ قابل ترک ہے اور میرے نزدیک اغلام کا لفظ بھی مولد ہے۔ عربی فصیح میں اس کا بھی استعمال نہیں ہے یہ سب بعد کے گھڑے ہوئے ہیں۔ غرض اس فعل کی خباثت عقلاً و نقلاً ہر طرح ثابت ہے اور

طبیعت سلیمہ اس سے خود ہی انکار کرتی ہے۔ اس فعل پر سوائے بدطینت آدمی کے اور کوئی سبقت نہیں کر سکتا۔ ایک کھلا ہوا فرق شہوت بالنساء اور شہوت بالرجال میں یہ ہے کہ عورت سے قضاء شہوت کرنے کے بعد آپس میں محبت بڑھتی ہے اور مرد کی عزت عورت کی نظر میں بڑھ جاتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ یہ مرد ہے نامرد نہیں ہے۔ اور لڑکوں سے قضاء شہوت کرکے ایک دوسرے کی نظر میں اسی وقت ذلیل وخوار ہو جاتا ہے پھر بہت جلد مفعول کے دل میں عداوت ایسی قائم ہو جاتی ہے کہ وہ دوسرے کی صورت سے بیزار ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو شہوت بالرجال سے پاک وصاف ہیں مگر ان میں بھی نظر کے مرض میں اکثر مبتلا ہیں حالانکہ حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ زنا آنکھ سے بھی ہوتا ہے۔ پس امردوں کو بنظر شہوت دیکھنا بھی حرام ہے اس میں بہت کم لوگ احتیاط کرتے ہیں حالانکہ نظر مقدمہ ہے فعل کا اور مقدمۃ الحرام حرام۔ قاعدہ فقہیہ ہے یعنی حرام کے مقدمات بھی حرام ہوتے ہیں اس لئے نگاہ کی حفاظت بھی بہت ضروری ہے۔ بعض اکابر کا قول ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ اپنے دربار سے نکالنا چاہتے ہیں اس کو محبت امارد میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ محبت گو فعل اختیاری نہیں مگر اس کے اسباب اختیاری ہیں یعنی ان کو دیکھنا اُن سے اختلاط کرنا وغیرہ۔ پس مطلب یہ ہوا کہ جس کو حق تعالیٰ اپنے دربار سے مطرود کرنا چاہتے ہیں اسی کو نظر الی الامارد۔ اور اختلاط بالامارد میں مبتلا کر دیتے ہیں اور یہ افعال اختیاریہ ہیں جو مفضی ہو جاتے ہیں محبت وغیرہ کی طرف جس کا انجام طرد عن الحق ہے (اعاذنا اللہ منہ ۱۲)

دوسرے میری سمجھ میں یہ ہرگز نہیں آتا کہ لڑکوں سے کسی کو عشق ہوتا ہو۔ آج کل لوگوں نے فسق کا نام عشق رکھ لیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود　　　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

(جو عشق رنگ وروپ ظاہری پر ہوتا ہے اسکا انجام ذلت اور بدنامی اور رسوائی ہے)

کسی اور کا قول ہے ؎

این نہ عشق ست آنکہ در مردم بود
این فسادِ خوردن گندم بود

(آدمیوں کے اندر ایک دوسرے سے نفسانی عشق ہرگز عشق نہیں بلکہ گندم کھانے کا فساد ہے اگر نہ ملے تو سب عاشقی بھول جائے)

اور اگر ہزار میں کسی ایک کو عشق ہو بھی جائے تو اس کو عشق پر ملامت نہ کی جائے گی مگر اس کے بعد جو افعال اس سے صادر ہوتے ہیں ان پر ملامت کی جائے گی کیونکہ وہ اختیاری افعال ہیں حتیٰ کہ اس کا تصور کرتا اور تصور سے لذت لینا یہ بھی فعل اختیاری ہے جس کا چھوڑنا واجب ہے اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس حالت میں محبوب سے بعد کو نفع میں بہت زیادہ دخل ہے بتاعد سے اکثر یہ مرض خفیف ہو جاتا ہے اور تکشف میں جو علاج میں نے اس کا لکھا ہے اس سے بہت لوگوں کو نفع ہوا ہے اس پر بھی ضرور عمل کیا جاوے اس باب میں سالکین کو خصوصاً اور تمام مسلمانوں کو عموماً سخت احتیاط کرنا چاہیے۔

ہمارے یہاں ایک ذاکر ہیں ایک مرتبہ ان کو ذکر کے وقت ایسا معلوم ہوا کہ گویا یہ آیت ان کے قلب پر وارد ہوئی انا منزلون علی اھل ھذہ القریۃ رجزاً من السمآء بما کانوا یفسقون ؕ اور یہ منجانب اللہ الہام تھا جو کسی ہاتف وغیرہ کے ذریعہ سے ان پر القا ہوا اور اس کا مطلب بے ساختہ اُن کے دل میں یہ آیا کہ اس بستی پر جس میں میں مقیم ہوں عذاب خداوندی نازل ہونے والا ہے اور وہ عذاب بصورت طاعون ہوگا کیونکہ بعض احادیث میں طاعون کو رجز سے تعبیر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ آیت قوم لوط کی شان میں ہے اس لئے ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ اس عذاب کا سبب عمل قوم لوط ہے جو اس بستی میں بکثرت رائج تھا۔ اس کے بعد ایک جمعہ میں انھوں نے یہ واقعہ بیان کر دیا کہ مجھ کو یہ بتلایا گیا ہے کہ اس بستی پر عمل قوم لوط کی کثرت کی وجہ سے عذاب نازل ہوگا جو بصورت طاعون ہوگا۔

اس لئے لوگوں کو اس عمل سے رک جانا چاہیئے اور خدا تعالیٰ کی جناب میں توبہ و استغفار کرنا چاہیئے مگر اس عمل خبیث سے قلوب کچھ ایسے سیاہ ہو جاتے ہیں کہ ان میں تاثیر کا مادہ نہیں رہتا اس لئے لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا کہ سبحان اللہ ان پر تو وحی آتے لگی بجائے تاثیر اور توبہ کے الٹا تمسخر کرنے لگے۔ آخر تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہاں اس زور کا طاعون آیا کہ گھر کے گھر تباہ ہو گئے۔ پس خوب سمجھ لیجئے کہ اس منحوس عمل سے باطنی عذاب بھی نازل ہوتا ہے کہ قلوب مسخ ہو جاتے ہیں اور ظاہری بلائیں بھی نازل ہوتی ہیں۔ خدا سب مسلمانوں کو اس سے نجات دے۔ (آمین)

پس شہوت سے صبر کرنا صبر عن الغضب سے بھی دشوار ہے یہی وجہ ہے کہ اس مرض میں عام ابتلا ہے لیکن یہ دشواری اس وقت تک ہے جب تک آپ اس سے بچنے کا ارادہ نہ کریں اور جس دن آپ اس سے بچنے کا اہتمام کریں گے اسی دن سے آسانی شروع ہو جائے گی کیونکہ یہ مشکل آپ کے لحاظ سے ہے خدا تعالیٰ کے لحاظ سے تو مشکل نہیں آپ ارادہ کر کے دیکھیں وہ اس مشکل کو بہت جلد آسان کر دیں گے مولانا فرماتے ہیں ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست
بر کریماں کارہا دشوار نیست

(تم یہ مت کہو کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری رسائی نہیں ہو سکتی
ارے بھائی اہل کرم پر کوئی کام دشوار نہیں ہوتا)

دوسرا مصرع اصل میں ایک جملہ مقدرہ کی دلیل ہے تقدیر عبارت یوں تھی تو مگو ما را بداں شہ بار نیست .:. زیرا کہ وصول در دست تو نیست بلکہ در دست خدائے کریم ست و بر کریماں کارہا دشوار نیست + یعنی تم یہ مت کہو کہ ہم خدا کے دربار میں نہیں پہونچ سکتے کیونکہ وصول تمہارے قبضہ میں تھوڑا ہی ہے جو دشواری اس کی مانع ہو بلکہ خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور وہ کریم ہیں اپنی عنایت سے

وہ خود تم کو پہونچادیں گے کیونکہ کریموں پر بڑے سے بڑا کام بھی دشوار نہیں پس اس میں کچھ بھی دشواری نہیں کہ حق تعالےٰ ہم کو اپنے تک پہنچادیں گے ہم اس قابل نہ تھے اس لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمہاری سعی سے تو پہونچنا مشکل تھا مگر سعی کے بعد وہ امداد فرماتے ہیں تم طلب اور ارادہ کرو وہ خود تم کو پہونچادیں گے اور تمام دشواریوں کو آسان کردیں گے اس پر شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ صاحب ہماری تو طلب اور سعی بھی ناتمام ہے۔ پس یہ مانا کہ سعی کے بعد حق تعالےٰ خود پہونچادیتے ہیں مگر پہلے سعی تو ہو اور یہاں تو سعی بھی ناتمام ہے اس کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں ؎

ہم بایں دلہا نماید خویش را

ہم بدوزد خرقۂ درویش را

(اپنی ناتمام کوشش جاری رکھو لیکن حق تعالےٰ خرقۂ درویش کو (ناتمام کوشش کو) قبول فرماکر کامل فرمادیتے ہیں۔ یعنی تمہارے پھٹے ہوئے خرقہ کو خود سی دیتے ہیں)

خرقۂ درویش سے مراد سالک کی ناتمام سعی ہے۔ یعنی وہ ایسے کریم ہیں کہ تمہاری ناتمام سعی کو بھی خود ہی کامل کردیتے ہیں اور تمہارے پھٹے ہوئے خرقہ کو بھی خود ہی سی دیتے ہیں اور سالکین کے قلوب میں جلوہ گری فرماتے ہیں ورنہ ہمارے قلوب اس قابل کہاں تھے کہ حضرت حق ان کو تجلی فرمائیں لیکن تم جس حال میں بھی اپنی طلب اور ارادہ ظاہر کرو گو ناتمام ہی طلب ہی پھر وہ اپنی رحمت سے طلب کو بھی کامل کردیتے ہیں اور تمہارے دلوں کو بھی اپنی تجلی کے قابل کردیتے ہیں پھر اس میں تجلی بھی فرماتے ہیں تم کو آئینہ تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں وہ تم کو بلاکر آئینہ بھی خود ہی عطا کردیتے ہیں کہ لو اس کے اندر سے ہمارے جمال کا مشاہدہ کرو۔ سبحان اللہ کیا رحمت ہے بس اب تو کوئی اشکال نہیں رہا اب آپ کو سعی اور طلب سے کون مانع ہے آپ اس کا بھی

خیال نہ کیجئے کہ آپ کی طلب کامل ہے یا ناقص تم طلب میں لگو سب کامل ہوجائے گی۔ حدیث قدسی میں وارد ہے من تقرب الیّ شبرا تقربت الیہ ذراعًا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا ومن اتانی یمشی اتیت الیہ ھرولۃ اوکما قال جو شخص میری طرف ایک بالشت چل کر آتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ چلتا ہے میں اس کی طرف کھلے ہوئے دو ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔ اس حدیث میں بالشت اور گز وغیرہ اور دوڑ کر آنا سمجھانے کے لئے ایک مثال ہے مقصود یہ ہے کہ جو میری طرف ذرا بھی توجہ کرتا ہے میں اس کی طرف دوچند اور سہ چند توجہ کرتا ہوں کہ واقعی سچ ہے اگر حق تعالےٰ اتنی توجہ اور رحمت نہ فرمائیں تو انسان کی کیا مجال تھی جو ان تک پہونچ سکے آخر انسان کو خدا سے نسبت ہی کیا ہے وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں اس کا وہم و گمان بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتا تو جو ذات اس قدر بالا و برتر ہو اس کی معرفت اور محبت اور مشاہدہ انسان خود کیونکر کرسکتا ہے۔ پس یہ اُنہی کی عنایت ہے جو کچھ حصہ معرفت وغیرہ کا انسان کو عطا ہوجاتا ہے ورنہ واقعی وہ مسافت تو ایسی ہے ؎

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے طے نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ راستہ مثل انگور کے درخت کے قطع کرنے سے اور بڑھ جاتا ہے)

غیر متناہی مسافت ہے جس کا قطع کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے لیکن وہ کیونکر قطع ہوتی ہے سنئے ؎

خود بخود آں شہ ابرار برمی آید   نہ بزور و نہ بزاری نہ بزر می آید

(ترجمہ) وہ محبوب حقیقی خود بخود اپنے کرم سے مل جاتا ہے زور اور زاری اور زر سے نہیں ملتا یعنی اسباب وصل کے اور تدابیر رضا کے اختیار تو کرے مگر کام بنے گا صرف فضل ہی سے)

یعنی صورت وصول کی یہ ہوتی ہے کہ ابتداء میں تو سالک میں اور محبوب حقیقی میں غیر متناہی مسافت ہوتی ہے جس کو سالک طے نہیں کر سکتا مگر جب یہ چلنا شروع کرتا ہے تو حق تعالےٰ اس کے ضعف پر رحم فرماتے ہیں کہ اتنی لمبی مسافت اس سے قطع نہ ہوگی اب وہ خود بھی چلنا شروع کرتے ہیں اور ان کو اس مسافت کا طے کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تو وہ خود اس کے نزدیک آ جاتے ہیں اس طرح وصول ہو جاتا ہے۔ پس حقیقت میں بندہ واصل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالےٰ اس کے پاس پہونچ جاتے ہیں (مگر کیا ٹھکانا ہے رحمت کا کہ پھر بھی بندہ کو واصل کا خطاب دیدیا گیا ۱۲ جامع) اور اس کی مثال میں نے ایک تجویز کی ہے جس سے وصول عبد کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے وہ یہ کہ مثلاً آپ کا ایک شیرخوار بچہ ہو جو آپ سے دور کھڑا ہو، آپ اس سے کہتے ہیں کہ دوڑ کر چلے آؤ۔ حالانکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اتنی مسافت یہ طے نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی اس کو بلاتے ہیں اب بچہ ہمت کر کے ایک دو قدم چلتا ہے اور گر پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے اس وقت باپ کو خود جوش آئے گا اور وہ دوڑ کر خود آوے گا اور اس کو گود میں اٹھالے گا تو دیکھئے یہ مسافت بعیدہ جو لقاء سے مانع تھی کیونکر طے ہوئی اس طرح طے ہوئی کہ بچہ تو دو قدم چل کر گر پڑا اور رونے لگا پھر باپ خود اس کے پاس آگیا اور اس کو گلے سے لگالیا یہی صورت سلوک باطن کی ہے کہ اول تم اپنی ناتمام طلب اور سعی ظاہر کرتے ہو تمہاری وہ سعی ہرگز وصول کے لئے کافی نہیں تھی مگر جب تم دو قدم چل کر گر پڑتے ہو اس وقت حق تعالےٰ کی رحمت کو جوش ہوتا ہے وہ خود آکر تم کو گلے سے لگا لیتے ہیں مگر ہاں اس کی ضرورت بیشک ہے کہ تم بچہ کی طرح ایک دو قدم چل کر رونا تو شروع کرو۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی است آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہاں ہی جاتا ہے جہاں مشکل ہوتی ہے جواب وہاں ہی جاتا ہے)

؎ ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں درد ہوتا ہے دوا وہاں ہی پہنچتی ہے جہاں مرض ہوتا ہے شفا وہاں ہی پہنچتی ہے)

؎ گر نہ گرید طفل کے جوشد لبن
گر نہ گرید ابر کے خندد چمن

(اگر بچہ رونا نہ شروع کرے تو دودھ ماں کا کب جوش کرے اگر بادل نہ روئے یعنی بارش نہ کرے تو چمن ہرا بھرا کب ہوتا ہے)

اور رونے اور گڑگڑانے سے میری مراد یہ نہیں کہ چلانا چیخنا شروع کرو بلکہ سالک کا رونا اور گڑگڑانا یہ ہے کہ اپنی عاجزی اور ناتوانی کا مشاہدہ کرے حق تعالیٰ کے سامنے الحاح والتجا کرے تواضع اور خاکساری پیدا کرے۔ تکبر اور فرعونیت کو دماغ سے نکال پھینکے اس کے بعد وصول میں دیر نہیں لگتی ذرا تم خاکساری اختیار کر کے تو دیکھو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش
آزموں را یک زمانے خاک باش

(عرصہ تک تو پتھر دلخراش رہا ہے کچھ دن خاک بن کر بھی آزمالے یعنی تکبر ترک کر کے اللہ والوں کی جوتیاں سیدھی کرلے)

؎ در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بر دید رنگ رنگ

ترجمہ :- (موسم بہار میں پتھر کب ہرا بھرا ہوتا ہے خاک ہوجا تاکہ تجھ سے
اعمال صالحہ کے اور اخلاق حسنہ کے رنگ برنگ پھول پیدا ہوں یہ تواضع
کے برکات سے ہیں کہ آدمی صلحاء کے پاس نیازمندی سے جاتا رہتا ہے
اور فیضان خاصان حق سے مالا مال ہوتا رہے۔)

میں نے وصول الی اللہ کی مثال جو بچّہ کی حالت سے بیان کی ہے اس پر ایک بادشاہ کی حکایت یاد آئی۔ میں نے کسی بزرگ سے یہ حکایت سنی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ نیچے سے ایک درویش کا گذر ہوا۔ بادشاہ نے درویش کو آواز دی کہ ذرا میرے پاس آؤ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ اس نے کہا میں تمھارے پاس کیونکر آؤں تم بالاخانہ پر میں زمین پر اور محل کا دروازہ دور کیوں کہ شاہی محلات کا بڑا دروازہ وہاں سے دور تھا اور جس بالاخانے پر بادشاہ تھا وہاں بہت سے دروازے اور درجے طے کرکے پہونچنا ہوتا تھا۔ بادشاہ نے فوراً ایک کمند لٹکا دی کہ اس کو پکڑ لو۔ درویش نے اس کو پکڑ لیا بادشاہ نے کھینچ لیا دو منٹ میں اوپر آگیا۔ جب وہ اوپر پہونچ گیا تو بادشاہ نے ان سے سوال کیا کہ تم خدا تک کیونکر پہونچے۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ جیسے تم تک پہنچا۔ خدا تک پہونچنا تو بہت مشکل تھا مگر میں نے خدائی کمند کو مضبوط پکڑ لیا تھا انھوں نے خود ہی کھینچ لیا۔ سبحان اللہ خوب ہی جواب دیا۔ اے صاحبو! تم بھی خدا کی کمند کو مضبوط پکڑ لیتے تو اسی طرح تم بھی ان کے جذبے واصل ہو جاتے مگر افسوس ہے کہ لوگ تو کمند الٰہی کو قطع کر رہے ہیں۔
صاحبو! خدا کی کمند یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے جنھوں نے مخلوق کو خدا تک پہونچا دیا۔ انبیاءؑ کے بعد علماء حقانی و اولیاء امت پیدا ہوئے جو ہر وقت مسلمانوں کو احکام الٰہی اور اس تک پہونچنے کا راستہ بتلاتے رہتے ہیں ترغیب و ترہیب ہو رہی ہے۔ محبت الٰہی و معرفت کے فضائل و اصلاح نفس کا طریقہ بیان ہو رہا ہے مگر پھر بھی لوگوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی اور وہ اُسی

طرح غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ جو ان کو خدا تک پہنچانا چاہے اس پر طعن و ملامت چاروں طرف سے ہوتی ہے محض اس لئے کہ وہ ان کو ان کاموں سے منع کرتا ہے جو وصول الی اللہ سے مانع ہیں بس یہی کمند الٰہی کو قطع کرنا ہے جب تم ہی خود نہ پہونچنا چاہو تو خدا کو کیا غرض پڑی ہے کہ جو خوشامد کر کے تم کو پہونچادے انلزمکموھا وانتم لھا کارھون ۃ الغرض صبر عن الشہوت گو فی نفسہ دشوار ہو مگر جب آدمی اس کا ارادہ کرتا ہے تو آسانی شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ پھر بھی دشواری نہیں رہتی ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ شہوت عورتوں اور لڑکوں ہی کے تعلق میں منحصر نہیں بلکہ لذیذ غذاؤں کی فکر میں رہنا بھی شہوت ہے۔ عمدہ لباس کی دھن میں رہنا بھی شہوت ہے۔ ہر وقت باتیں بگھارنے کی عادت ہونا بھی شہوت ہے اور ان سب شہوتوں سے نفس کو روکنا یہ بھی عن الشہوت میں داخل ہے آجکل لوگوں کو باتیں بنانے کا بہت مرض ہے بس جہاں کام سے فارغ ہوئے مجلس آرائی کر کے فضول باتیں کرنے لگے میں صرف عوام کی شکایت نہیں کرتا بلکہ میں علماء و مشائخ کو بھی مجلس آرائی سے منع کرتا ہوں کیونکہ یہ مرض ان میں بھی بہت ہے۔ بعض مشائخ کے یہاں عشاء کے بعد بھی مجلس آرائی ہوتی ہے جس سے خواہ مخواہ نیند برباد ہوتی ہے اگر شیخ کے معمولات میں اس سے فرق بھی نہ آتا ہو تاہم سب اہل مجلس یکساں نہیں ہوتے ان میں سے بعض صبح کی نماز بھی غائب کر دیتے ہیں پھر یہ بھی نہ ہو تو بلا ضرورت باتیں بنانا ظلمت قلب کا سبب ہے یہی بڑا کافی نقصان ہے۔ گو اور کوئی بھی نقصان نہ ہو خصوص اگر باتیں بھی شیخ کی مدح کی ہوں جو خوشامدی مرید بناتے ہوں بیچارے ممدوح کا تو اُس سے ستیاناس ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکل ست ازاں شد خارِ جاں   از فریب داخلان و خارجان

(ترجمہ)

(جسم مثل قفس کے ہے خوشامدی لوگ اس کی تعریف کر کے فریب دیتے ہیں)

۵ ایلست گویدلے منم ہمراز تو آنت گو یدئے منم انبار تو
(کوئی کہتاہے ہم تمھارے ہمراز ہیں کوئی کہتا ہے میں تمہارا ہمراز ہوں)
۵ او چو بیند خلق را سَرمست خویش از تکبر میرود از دست خویش
(جب وہ مخلوق کو اپنی تعریف میں مست دیکھتا ہے تو تکبر کے سبب حواس باختہ اور بے وقوف ہو جاتا ہے)

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ صبر کتنا جامع خُلق ہے مگر لوگ صرف اسی کو صبر سمجھتے ہیں کہ مصیبت کے وقت رویا نہ جاوے حالانکہ شہوت و غضب کو روکنا بھی صبر ہے اور شہوت میں شہوت رجال و نساء و شہوت لباس و شہوت طعام و شہوت کلام بھی داخل ہے اسی طرح تمام معاصی سے نفس کو روکنا یہ بھی صبر میں داخل ہے۔ نیز طاعات پر پابندی کرنا بھی صبر میں داخل ہے طاعات بجالانے کے وقت ان کے حقوق و آداب کو اطمینان و سکون سے ادا کرنا بھی صبر میں داخل ہے۔ پس یہ ایسا جامع خلق ہے کہ بہت سے اخلاق اس کے اندر داخل ہیں اسی لئے حدیث میں آیا ہے الصبر نصف الایمان اور یہی راز ہے کہ حق تعالےٰ نے اخلاق میں سے اس جگہ صرف صبر کو بیان فرمایا۔

اب تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اس آیت میں تمام اجزاء دین بالاجمال مذکور ہیں آگے صبر کے چند مواقع جو مہتم بالشان ہیں بیان فرماتے ہیں فی البأساء والضراء وحین البأس۔ یعنی وہ صبر کرتے ہیں بأساء میں اور ضراء میں اور بأس کے وقت ان الفاظ کی تفسیر مفسرین نے اس طرح کی ہے کہ بأساء سے فقر و تنگدستی مراد ہے اور ضراء سے بیماری اور بأس سے حرب۔ لیکن عموم الفاظ پر نظر کر کے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بأساء سے تو فقر و تنگدستی ہی مراد ہو جس کا حاصل یہ ہو گا کہ فقر و تنگدستی میں صبر کرے یعنی خدا پر نظر رکھے مخلوق کے مال و دولت پر نظر نہ کرے نہ ان سے کچھ توقع رکھے اس میں قناعت و توکل کی تعلیم ہو گئی۔ اور ضراء سے مطلق بیماری مراد ہو خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔ ظاہری مرض میں تو صبر یہ ہے کہ

لوگوں سے شکایت نہ کرتا پھرے خدا سے دل میں مکدر نہ ہو اس میں تسلیم و رضا کی تعلیم ہو گئی۔ اور باطنی بیماریوں میں صبر یہ ہے کہ امراض قلبیہ کے مقتضا پر عمل نہ کرے ہمت سے ان کا مقابلہ کرے مثلاً کسی میں شہوت بالنساء یا بالرجال کا مرض ہے تو اس کے مقتضا پر عمل نہ کرے اور ہمت کر کے عورتوں اور مردوں کی طرف نگاہ نہ اٹھائے ان سے اختلاط نہ کرے بلکہ بُعد اختیار کرے اسی طرح بخل کا مرض ہو تو اس کے مقتضا پر عمل نہ کرے بتکلف خدا کے راستہ میں مال خرچ کردیا کرے وعلی ہذا تمام امراض کو اسی پر قیاس کر لیا جائے۔ اور بأس سے مراد مطلق شدت و پریشانی ہو تو یہ تعمیم بعد تخصیص کے ہو جائے گی یعنی فقر و فاقہ اور امراض ظاہریہ و باطنیہ میں بھی ہمت سے کام لے اور اسی طرح جو پریشانی بھی لاحق ہو اس میں مستقل مزاج رہے جس کا ایک فرد صبر عند الحرب بھی ہے کہ جہاد کے وقت لڑائی میں ثابت قدم رہے۔ پس اب صبر کا حاصل یہ ہوا کہ موحد کامل بن جانا چاہیے جس کی یہ شان ہوتی ہے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش — چہ فولادِ ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس — ہمیں ست بُنیادِ توحید و بس

(موحد یعنی اہلِ توحید کے قدموں پر اگر سونا بکھیر دو یا ان کی گردن پر تلوار رکھ دو تو بھی نہ کسی سے امید رکھتے ہیں نہ کسی سے خوف رکھتے ہیں اور یہی توحید کی اصل بنیاد ہے)

جب مقامِ صبر کامل ہو جاتا ہے تو توحید بھی کامل ہو جاتی ہے: ان تمام اجزاء شریعت کو بیان فرما کر آگے نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں اولئک الذین صدقوا و اولئک ھم المتقون ؕ یہی لوگ ہیں جو صادق ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔ یہ جملہ گویا بمنزلہ مہر کے ہے کہ سارا مضمون بیان فرما کر اخیر میں مہر لگادی کہ یہی لوگ صادق و متقی ہیں۔

چونکہ تفصیل سابق سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس آیت میں جو اوصاف

مذکور ہیں وہ تمام اجزاء دین کو جامع ہیں تو اب جملہ اولئک الذین
صدقوا و اولئک ھم المتقون سے یہ مسئلہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ صادق و
متقی کامل فی الدین کو کہتے ہیں اور یہ کہ تقوی و صدق کمال فی الدین کا نام ہے
لہذا آیت مذکورہ میں جو میں نے دعوی کیا تھا کہ اتقوا اللہ وکونوا مع الصّٰدقین
کے معنی یہ ہیں اکملوا فی الدین وکونوا مع الکاملین۔ یہ دعوی بالکل بے
غبار ہو گیا اور قرآن ہی سے اس دعوی کی تائید مل گئی (اور ظاہر ہے کہ جس تفسیر
کی تائید قرآن کی دوسری آیتوں سے ہو جائے وہ زیادہ اولی ہے ۱۲)
معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اے مسلمانوں! دین میں کامل ہو جاؤ جس کا طریقہ
بھی آگے بتلاتے ہیں کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ کاملین کے ساتھ
ہو جاؤ۔ صاحبو! جو طریقہ کمال حاصل کرنے کا حق تعالیٰ نے بتلایا ہے واللہ
کوئی سالک کوئی محقق ہرگز نہیں بتلا سکتا یہ بات کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی
کہ کاملین کی معیت سے بھی کمال حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں
کہ کاملین کی خالی معیت ہی معیت حصول کمال کے لئے کافی ہے ممکن ہے
بعض لوگ یہی سمجھے ہوں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص سالہا سال کاملین
کے ساتھ رہے اور خود کچھ نہ کرے تو اس کو کمال حاصل نہیں ہو سکتا حقیقت
یہ ہے کہ اصل طریق تو کمال فی الدین حاصل کرنے کا یہ ہے کہ اعمال میں کمال
حاصل کرو۔ اعمال میں کمال حاصل کرنا یہ ہے کہ طاعات کو بجا لاؤ اور معاصی
سے اجتناب کرو۔ چنانچہ آیت لیس البر ان تولوا وجوھکم الخ میں انہی
اعمال کو برّ کافی فرمایا ہے اور اُن کو بیان فرما کر ان لوگوں کا متقی اور صادق ہونا
بتلایا ہے جو ان اعمال کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس سے اعمال پر مدار کمال ہونا
بخوبی ظاہر ہے۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ اعمال میں کیسے کامل ہوں کیونکہ کمال
فی الاعمال کی تحصیل میں ایک مانع پیش آتا ہے جو کہ نفس ہے ہر عمل میں اس کا
ایک تقاضا مزاحم ہوتا ہے۔ شریعت حکم دیتی ہے کہ جاڑوں میں پانچوں وقت

وضو کرو نفس کی آرام طلبی اس کی مزاحمت کرتی ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ زکوٰۃ سالانہ ادا کرو۔ نفس کا تقاضا ہے کہ بخل اسکی مزاحمت کرتا ہے، شریعت کا حکم ہے کہ رشوت اور سود مت لو نفس کا تقاضا ہے کہ حرص اس کی مزاحمت کرتا ہے، شریعت کا حکم ہے کہ لڑکوں اور نامحرم عورتوں کو بُری نگاہ سے نہ دیکھو تقاضائے شہوت اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ اسی طرح حکم ہے کہ فقر و تنگدستی میں مخلوق کے مال پر نظر نہ کرو تقاضائے حرص اس کی مزاحمت کرتا ہے علیٰ ہذا القیاس جتنے احکام شریعت کے ہیں ہر عمل کے مقابلہ میں اُس کے خلاف نفس کا ایک تقاضا ہے جو اس حکم کی مزاحمت کرتا ہے تو خدا تعالےٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا تو حکم کر دیا اور اس کا طریقہ بھی بتلا دیا کہ اعمال کا جمع کرنا ہے مگر اس نفس کے ان بے شمار تقاضوں کا کیا علاج ہو جو ہر حکم پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں سو حق تعالےٰ نے کونوا مع الصّٰدِقین ۝ میں اسی مانع کو مرتفع فرمایا ہے اور نفس کی اس مزاحمت ہی کا علاج بتلایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ طریق حصول کمال فی الدین یعنی تکمیل اعمال ظاہری و باطنی میں جو مزاحمت نفس کی پیش آتی ہے اس معیت صادقین یعنی کاملین میں یہ خاصیت ہے کہ وہ مزاحمت مرتفع ہو جاتی ہے یعنی نفس میں اس درجہ کا تقاضا نہیں رہتا اور جو کچھ رہتا ہے اُس کی مقاومت سہل ہو جاتی ہے۔ پس اعمال کی تکمیل سہولت سے میسر ہو جاتی ہے اور اسی طرح کمال فی الدین حاصل ہو جاتا ہے دیکھیے کتنا آسان اور سہل علاج ہے گویا دمڑی کا نسخہ اور ہزاروں کا فائدہ ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ جڑی بوٹی کا علاج ہے جس میں دھیلہ کا بھی خرچ نہیں اور اس آیت میں جو طریقہ دینی کمال حاصل کرنے کا بتلایا گیا ہے حقیقت میں وہ اصل طریق کمال کے مانع کا مرتفع کرنے والا ہے لیکن چونکہ وہ طریق بدون اس مانع کے مرتفع ہوئے دشوار تھا اس لئے اگر اسی کو طریق کمال کہدیا جاوے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ علت تامہ دجوہ شرائط

ارتفاع موانع سے مرکب ہوتی ہے اوران دونوں میں اس میں دخل ہوتا گو وجود
معلول کا ان سب سے نہیں ہوتا دجود صرف جزو اخیری سے ہوتا ہے اور
جو طریقہ تقاضائے نفس کی مزاحمت کو مضمحل کرنے کا اس آیت میں بتلایا
گیا ہے واللہ اس سے سہل علاج کوئی نہیں بتلا سکتا۔ فن شناس لوگوں نے
نفس کی اصلاح کے لئے نہ معلوم کیا کیا طریقے تجویز کر رکھے ہیں جن پر عمل
کرنا ہمت والے کا کام ہے مگر یہ طریقہ تو ایسا آسان ہے کہ کسی کو بھی اس پر
عمل دشوار نہیں اور یہ محض قرآن کا دعوے ہی نہیں بلکہ مشاہدہ سے یہ بات ثابت
ہے کہ کاملین کی صحبت میں یہ اثر ہے کہ اُن کے پاس جاکر نفس کا تقاضا مضمحل
ہوجاتا ہے کاملین تو بھلا کامل ہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ عام مومنین کے مجمع
میں جاکر دیکھو کہ جس وقت سب لوگ نماز کا اہتمام کرتے ہوتے ہیں تو بے
نمازی کے دل میں بھی نماز کا تقاضا ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو آخر یہ بھی تو اولیاء
اللہ ہیں کیونکہ ولایت کی دو قسمیں ہیں ایک ولایت عامہ دوسری ولایت خاصہ
ولایت عامہ ہر مسلمان کو حاصل ہے اس لئے عام مومنین کی صحبت میں بھی ضرور
اثر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ کیفما اتفق جمع ہو گئے ہوں چھانٹ چھانٹ کر بدمعاش
جمع نہ کئے گئے ہوں۔ لیکن یہ بات سنکر کوئی صاحب نازنہ کریں کہ جب عام
مسلمان بھی ولی ہیں تو پھر ہم کو کسی اور ولی کی کیا ضرورت ہے ہم کیوں کسی
کے پاس جاویں کیونکہ ولایت عامہ سے جو مقبولیت حاصل ہوتی
ہے وہ ایسی ہے جیسے باغیوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں عام رعایا کو
بادشاہ کا دوست اور وفادار کہدیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے
کہ یہ لوگ باغی اور دشمن نہیں مگر کیا اتنی بات پر کوئی اکتفا کیا کرتا ہے
اور کیا اس سے عام رعایا بادشاہ کے مقربین میں داخل ہوگئی ہرگز
نہیں کیونکہ رعایا میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو چوری اور
بدمعاشی کرنے کی سزا میں قید خانہ بھیجدیا جاتا ہے جہاں روزانہ تنبیہیں

ان کی کمر پر لگائی جاتی ہیں مگر اس حالت میں بھی یہ شخص بہ نسبت باغی کے بادشاہ کا وفادار اور اس کی رعیت ضرور کہلاتا ہے جس کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ کبھی مراحم خسروانہ سے اس کو رہا بھی کر دیا جاتا ہے اور باغی مراحم خسروانہ کا اہل نہیں رہتا۔ تو ولایت عامہ بدون ولایت خاصہ کے ایسی ہی جیسے جیل خانہ کے مجرموں کو باغیوں کے مقابلہ میں بادشاہ سے تعلق ہوا کرتا ہے مگر عاقل محض اتنے تعلق پر کبھی کفایت نہیں کیا کرتا وہ خاص تعلق کے لئے کوشش کیا کرتا ہے چنانچہ میں اسی کو پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مقاصد میں درجۂ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے لیکن عام مؤمنین کی صحبت کا اثر بیان کرنے سے میرا مقصود یہ تھا کہ جب ناقصین کی صحبت میں یہ اثر ہے تو خود سمجھ جاؤ کہ کاملین کی صحبت میں کیا کچھ اثر ہوگا ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

(وہ جرعہ جو خاک ملا ہوا ہے اس طرح تم کو مست کرتا ہے تو صاف اگر پیو گے تو تمہاری کیا حالت ہوگی یعنی گناہوں کے نیک اعمال کے اثرات جب یہ ہیں تو تقویٰ کے ساتھ کیا اثر محسوس ہوگا۔)

جب خاک آمیز گھونٹ میں اتنی تاثیر ہے تو صاف اور مقطر میں تو نہ معلوم کیسی مستی ہوگی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ جس شخص کی رات کو آنکھ نہ کھلتی ہو وہ چند دنوں ایسے لوگوں میں جا کر رہے جو رات کو اٹھتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی تہجد کی عادت ہو جائے گی۔ اسی طرح جس شخص کو ذکر اللہ سے مناسبت نہ ہوتی ہو وہ کچھ دنوں ذاکرین کی جماعت میں رہے بہت جلد ذکر سے مناسبت ہو جائے گی کیونکہ ذاکرین کے حلقہ میں رہ کر خود بخود اندر سے دل تقاضا کرے گا کہ میں بھی ذکر کروں گویا آج ہی سے اس کا وہ تقاضا جو ذکر کے خلاف تھا مضمحل ہو گیا۔ پھر جو لوگ کامل ہیں ان کی صحبت میں تو کیا کچھ نفع ہوگا اس کو خود ہی سمجھ لینا چاہیئے۔ بس ان کی صحبت کا نفع یہ ہے ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد
فی الحال بصورت طلا شد

(وہ لوہا جو پارس پتھر کے ساتھ لگ جاتا ہے فوراً سونا بن جاتا ہے
یعنی اہل اللہ کے ساتھ رہیں تو بُرے لوگ بھی اچھے بن جاتے ہیں)

جیسے ایک پتھر مشہور ہے جس کا نام پارس ہے اس کی یہ تاثیر سنی گئی ہے کہ لوہے کو اس سے مس کر دیا جائے تو وہ خالص سونا ہو جاوے یہ خاصیت کاملین کی صحبت میں ہوتی ہے مگر کاملین کی صحبت کے موثر ہونے کی ایک شرط ہے اور اس کے لئے ایک پرہیز بھی ہے۔ پرہیز تو یہ ہے کہ اعمال و افعالِ شیخ میں اس کی مخالفت نہ کرو۔ اور شرط یہ ہے کہ اپنے حالات سے اس کو اطلاع دیتے رہو تمہارے نفس میں جو مرض بھی ہو اس سے صاف صاف کہدو حیا نہ کرو کیونکہ طبیب اور ڈاکٹر کے سامنے بضرورت علاج بدن مستور کا کھولنا جائز ہے۔ اسی طرح طبیب روحانی سے نفس کے امراض بیان کر دینا جائز ہیں تو ایک مرتبہ اپنا سارا کچا چٹھا اس کے سامنے کھول کر رکھدو اور اس سے مت ڈرو کہ ان کی نظر میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ بخدا اہل اللہ کی نظر میں ان سے زیادہ کوئی ذلیل نہیں وہ اپنے کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں کہ فساق و فجار بھی اپنے کو اتنا ذلیل نہیں سمجھتے اس سے بالکل مطمئن رہو پھر جب تم اپنا حال بیان کر چکو تو اُس پر وہ کچھ بتلادیں اس کا اتباع کرو یہی طریقہ علاج ظاہری میں بھی آپ کرتے ہیں کہ پہلے آپ اپنا حال طبیب سے ظاہر کرتے ہیں پھر وہ نسخہ تجویز کرتا ہے آپ اس کو استعمال کرتے ہیں اور کچھ پرہیز بتلاتا ہے اس سے آپ بچتے ہیں۔ یہی طریقہ حضرات کاملین کی صحبت میں اختیار کرنا چاہئے۔ بھلا اگر کوئی شخص طبیب کے پاس روزانہ محض ملاقات کے طور پر چلا جایا کرے نہ اس سے اپنا حال کہے نہ نسخہ پوچھے تو کیا اس طرح وہ مرض سے شفا پا سکتا ہے ہرگز نہیں اسی طرح اولیاء کی صحبت میں محض زیارت و ملاقات کی نیت سے جانا

امراض باطنیہ سے شفا حاصل ہونے میں کافی نہیں گو ان کی زیارت بھی موجب ثواب ہے یہ الگ بات ہے۔ مگر اس وقت محض ثواب حاصل کرلے سے گفتگو نہیں ثواب کے لئے تو اور بھی بہت سے کام ہیں یہاں تو کمال دین حاصل کرنے سے بحث ہو رہی ہے تو اولیاء کاملین سے کمال دین اسی طرح حاصل ہوگا جیسا کہ میں نے بیان کیا اس کا ہمیشہ لحاظ رکھو اور جب ان کے پاس جاؤ یا خط لکھو تو اس کا قصد کرو کہ اُن کے سامنے نفس کے امراض بیان کریں گے اور جو وہ بتلا دیں گے اس پر عمل کریں گے۔ پس اولیاء کاملین کے پاس رہنے کی صورت میں بھی عمل کرنا آپ ہی کو پڑے گا یہ نہیں ہوسکتا کہ تم کچھ نہ کرو اور کامل بن جاؤ مگر اتنا فرق ہوگا کہ پہلے تم عمل کا قصد کرتے تھے اور اس کے خلاف تقاضا پیدا ہوتا تھا اور ان کے پاس رہنے سے اعمال صالحہ کا تقاضا پیدا ہوگا اور دوسرا تقاضا مضمحل ہو جائے گا تو کیا یہ تھوڑا نفع ہے کہ جس کام کا کرنا پہلے مشکل تھا آج آسان ہو گیا اور صرف آسان ہی نہیں بلکہ اس کی طرف دل کو از خود تقاضا ہونے لگا کہ اس کے بغیر تم کو چین نہیں ملتا۔ صاحبو! یہ بہت بڑا نفع ہے اس کو کم مت سمجھو کاملین کی صحبت میں جا کر بس یہ بات پیدا ہوتی ہے جو اُن سے دور رہ کر نہیں پیدا ہوتی جن لوگوں کو کاملین سے تعلق نہیں وہ متقی ہوسکتے ہیں مگر بڑی مصیبت کے ساتھ ان کو تقویٰ حاصل ہوگا اور جن کو ان سے تعلق ہے ان کو بہت آسانی اور راحت سے تقویٰ حاصل ہو جاتا ہے یہ تو ان کی صحبت کا اونیٰ اثر ہے کہ اعمال میں سہولت ہو جاتی ہے اس کے بعد نور فہم اور معرفت اور احوال وکیفیات کی سلامتی مقامات باطنیہ کی ترقی حاصل ہوتی ہے اس کی تو کچھ انتہا نہیں پس یہ مضمون اس آیت کے متعلق مجھ کو بیان کرنا تھا جس کو میں بیان کرچکا اور اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ گو میں نے آج کوئی نیا مضمون نہیں بیان کیا مگر تحدث بالنعمۃ کے طور پر کہتا ہوں دعویٰ نہیں کرتا کہ میں لے آج خدا تک پہونچنے کا سیدھا رستہ آپ کو بتلا دیا ہے بلکہ یوں کہئے کہ میں نے سب کو واصل کر دیا ہے کیونکہ وصول کا آسان طریق بتلا دینا یہ بھی واصل کر دیتا ہے اور آج میں نے

ایسا آسان راستہ آپ کو بتلا دیا ہے جو شاید کبھی کان میں نہ پڑا ہوگا اب بھی اگر قدم نہ اٹھاؤ اور واصل بننے کی کوشش نہ کرو تو حجت الٰہیہ ختم ہو چکی ہے۔ اب میں اس آیت کے متعلق ایک دو بات مختصر طور پر بیان کر کے تقریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں ایک بات یہ جاننے کی ہے اور اجمالاً پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس آیت میں صدق سے مراد محض زبان سے سچ بولنا نہیں ہے کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جس صدق کو کمال دین بتلایا ہے وہ تو ہم کو حاصل ہے کیونکہ ہم سچ بولتے ہیں پس سمجھ لیجئے کہ صدق کے معنی پختگی کے ہیں اور اسی سے ولی کامل کو صدیق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام احوال و افعال و اقوال میں مرتبہ رسوخ حاصل کر چکتا ہے۔ صدق کے معنی جو اصطلاح لغاۃ و بلغاء میں بیان کئے گئے ہیں مطابقۃ الخبر للمحکی عنہ یہ معنی اصطلاح شرعی سے خاص ہیں شریعت میں صدق عام ہے افعال کو بھی اقوال کو بھی احوال کو بھی۔ اقوال کا صدق تو یہی ہے کہ بات پکی ہو یعنی واقعہ کے مطابق ہو کچی بات نہ ہو جو کہ واقع کے خلاف ہو جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں اور افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو حکم شرعی کے خلاف نہ ہو۔ پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اوس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے۔ اور احوال کا صدق یہ ہے کہ وہ سنت کے موافق ہوں پس جو احوال خلاف سنت ہوں وہ احوال کاذبہ ہیں اور جس شخص کے احوال و کیفیات سنت کے موافق ہوتے ہوں اُس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔ نیز صدق احوال کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحب حال پر باقی رہے یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی پھر زائل ہو گئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا جیسا کہ بعض لوگوں کو کسی وقت خوف کا یا توکل کا غلبہ اپنے اوپر معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا اس کو صادق الاحوال نہ کہیں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہیئے کہ جو حالت طاری ہو بعد میں وہ مقام ہو جائے اس میں سالکین کو بہت دھوکہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ محض دائم

سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو تسلیم و رضا یا توکل و رجا کا حال حاصل ہے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا جس سے اس حالت کا ان کا وہم ہونا ظاہر ہو جاتا ہے غرض صدق شریعت میں صرف اقوال کے ساتھ خاص نہیں جیساکہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اس سمجھنے سے اغلاط میں ابتلا ہو جاتا ہے اسی کو امام غزالی نے لکھا ہے کہ منجملہ احداثات کے ایک یہ بھی احداث ہے کہ لوگوں نے اصطلاحات شرعیہ کو بدل دیا ہے جیسے فقہ نام رکھا ہے کنز و ہدایہ کے پڑھ لینے کا حالانکہ فقہ شریعت میں محض کتاب پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ وہ ایک خاص فہم ہے جس سے ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے احکام کے سمجھنے کا۔ نیز سلف صالحین فقیہ ایسے کو کہتے تھے جس کو احکام کی فہم کے ساتھ عمل کامل بھی حاصل ہو مگر آجکل فقہ کے لئے عمل کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اسی طرح بہت سے الفاظ شرعیہ کو شرعی اصطلاح سے بدل دیا گیا ہے مثلاً شریعت میں علم مخصوص ہے علوم نقلیہ شرعیہ کے ساتھ مگر آج کل بعض لوگوں نے اس کو عام کر دیا ہے۔ نیچری فرقہ اس مرض میں زیادہ مبتلا ہے انہوں نے علم میں سائنس اور جغرافیہ کو بھی ٹھونس دیا ہے انگریزی زبان سیکھنے کو بھی وہ علم میں داخل کرتے ہیں چنانچہ میں نے بعض تحریریں ایسی دیکھی ہیں جن میں علم کی فضیلت احادیث سے ثابت کر کے اس پر انگریزی تعلیم اور سائنس وغیرہ کی تحصیل کو متفرع کیا ہے وہ اپنی تحریروں میں سائنس وغیرہ کی ترغیب دیتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں اطلبوا العلم ولو بالصین سے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ نعوذ باللہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جس علم کی ترغیب دی گئی ہے ان میں یہ علم بھی داخل ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے یا اس کی ترغیب دی گئی ہے یا امر کیا گیا ہے وہاں صرف علوم نقلیہ شرعیہ مراد ہیں جن میں اصل الاصول علم فقہ علم حدیث و علم قرآن ہے یہ اور بات ہے کہ ان کے مقدمات کو بحکم مقدمۃ الواجب واجب ان کے ساتھ ملحق کر دیا جائے مگر سائنس و جغرافیہ تو ان علوم کے لئے مقدمات بھی نہیں ان کو کس دلیل سے علم شرعی میں داخل کیا جاتا ہے اور ان پر احادیث سے

استدلال کس طرح صحیح ہوسکتا ہے یہ سخت مغالطہ ہے جس کی طرف بہت کم لوگوں کو التفات ہے یہی حال اصطلاح صدق میں ہورہا ہے کہ لوگوں نے اس کو محض اقوال کے ساتھ خاص کرلیا ہے حالانکہ شرعًا وہ افعال و احوال سب کو عام ہے خوب سمجھ لو۔

اب ایک بات یہ رہ گئی کہ جب تقویٰ اور صدق دونوں کا کمال دین ہونا ثابت ہوگیا تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقویٰ کا ذکر مقدم اور صدق کو مؤخر کیوں کیا گیا کیونکہ آیت کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہوسکتا ہے کہ یوں فرمادیتے یا ایھا الذین اٰمنوا اصدقوا وکونوا مع المتقین اس کے بھی وہی معنی ہوئے کہ اے مسلمانو دین کامل حاصل کرو اور کاملین کے ساتھ رہو۔ جب یہ مضمون صدق کو مقدم اور تقویٰ کو مؤخر کرنیسے بھی حاصل ہوسکتا تھا تو پھر تقویٰ کو مقدم کیوں کیا گیا۔ یہ سوال میرے ذہن میں اسی وقت آیا ہے اس سے پہلے یہ سوال ذہن میں نہ تھا اس کا جواب بھی الحمد للہ اسی وقت ذہن میں آیا ہے اس کو بیان کرتا ہوں اگر کسی کے ذہن میں اس سے اچھا جواب ہو وہ اس کو بیان کردے میرے نزدیک اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ کے تتبع سے تقویٰ کے تو درجات چند در چند معلوم ہوتے ہیں اور صدق کے درجات مختلف نہیں بلکہ اس کا ایک درجہ متعین ہے جس کی دلیل یہ آیت ہے لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت جناحٌ فیما طعموا اذا ما اتقوا واٰمنوا وعملوا الصالحات ثم اتقوا واٰمنوا ثم اتقوا واحسنوا واللہ یحب المحسنین ؁ شان نزول آیت کا یہ ہے کہ جب حق تعالےٰ نے شراب کو مسلمانوں پر حرام کردیا تو بعض صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ہم میں جو لوگ تحریم سے پہلے شراب پیتے تھے مرگئے ہیں کہیں ان کو گناہ نہ ہوا ہو۔ یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب اس وقت تک شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تھی تو انھوں نے حرام کا ارتکاب ہی نہ کیا تھا پھر صحابہ کو ان پر گناہ کا وہم کیوں ہوا۔ جواب یہ ہے

کہ اتنی بات تو صحابہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت حرمت خمر کا نزول نہ ہوا تھا لیکن ممکن ہے کہ ان کو یہ خیال ہوا ہو کہ نہ معلوم اس وقت تک جو شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تو اس کا سبب یہ ہے کہ شراب اب تک واقع میں حلال تھی یا یہ سبب یہ ہے کہ واقع میں تو وہ پہلے بھی حرام تھی لیکن چونکہ ہم لوگ اس کے عادی بہت زیادہ تھے تو دفعۃً اس کی تحریم اس وجہ سے نازل نہیں کی گئی کہ ہم اس پر عمل نہ کر سکیں گے پھر تدریجاً جب ہمارے اندر قابلیت عمل زیادہ ہو گئی اس وقت حکم تحریم نازل ہو گیا۔ پس صورت اول میں تو جن لوگوں نے تحریم سے پہلے شراب پی تھی انھوں نے حلال کا ارتکاب کیا لیکن دوسری صورت میں حرام کا ارتکاب لازم آتا ہے گو بوجہ نص نازل نہ ہونے کے ان کو گناہ نہ ہوا ہو۔ لیکن شاید اُن کے درجات میں کچھ کمی اس لئے ہو گئی کہ وہ حرام فی نفسہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دنیا سے گئے ہیں ۱۲ جامع)

اس شبہ کا ازالہ حق تعالےٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اس چیز میں جو انھوں نے (اب تک) کھایا پیا ہے (یعنے حکم تحریم سے پہلے شراب پینے میں تو ان پر کچھ گناہ نہیں ہوا) جبکہ وہ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں اور نیک اعمال کرتے رہے ہوں پھر وہ تقویٰ کرتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں پھر وہ تقویٰ کرتے رہے ہوں اور اخلاص سے کام لیتے رہے ہوں اور اللہ تعالےٰ اہل اخلاص سے محبت رکھتے ہیں اس جگہ اصل مقصود تو یہ بتلانا تھا کہ نزول تحریم سے پہلے جن لوگوں نے شراب پی ہے ان پر اس فعل کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا۔ لیکن لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات جناحٌ فیما طعموا سے چونکہ بظاہر گناہ کی نفی مطلقاً ہو رہی ہے اس لئے آگے قاعدہ کلیہ کے طور پر وہ شرائط بھی بیان فرمادیں جن کے اجتماع کے بعد گناہ کی نفی مطلقاً صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ اگر کسی شخص نے

تحریم خمر سے پہلے شراب بھی پی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو یہ گناہ تو صحیح ہے کہ شراب کی وجہ سے اس کو گناہ نہیں ہوا۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کو کچھ بھی گناہ نہیں ہوا۔

پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جب وہ لوگ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں جن کی حرمت اس وقت نازل ہو چکی تھی۔ نیز ان اعمال صالحہ کو بھی بجا لاتے رہے ہوں جن کا امر اس وقت نازل ہو چکا تھا تو پھر ان کو شراب پینے کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا۔ اب اس جگہ ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کا ذکر تین مرتبہ ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ جب ان کو ایک بار مومن کہدیا گیا اور اس کے بعد تقویٰ سے ان کو موصوف کر دیا گیا تو پھر دوبارہ اٰمنو واتقوا کے ذکر سے کیا مقصود ہے یہ ایمان کے بعد ایمان لانا اور تقویٰ کے بعد پھر تقویٰ کرنا کیسا ہے تکرار ایمان کا جواب تو یہ ہے کہ ایمان کے مختلف مراتب ہیں۔ ایک مرتبہ ایمان کا یہ ہے کہ شرک وکفر سے توبہ کرلے یہ درجہ تو ایمان کا وہ ہے جو صحت کے لئے شرط ہے کہ اس کے بغیر کوئی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا اور ایک مرتبہ ایمان کا وہ ہے جو اعمال صالحہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی اس کے دل میں پیوستہ اور جاگزیں ہو جانا اور اس پر ثبات واستقامت حاصل ہونا دوبارہ لفظ آمنوا میں اس درجہ کی طرف اشارہ ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایمان لا کر وہ اعمال صالحہ کرتے رہے اور محرمات سے بچتے رہے تو اس سے ان کو ایمان پر مداومت واستقامت حاصل ہوئی پھر اس کے بعد جیسے اعمال ہوتے ہیں ویسا ہی ایمان ان سے پیدا ہوتا ہے مطلق مداومت و ثبات علے الایمان کہ اعمال صالحہ کے ہمیشہ بجا لانے سے ہر شخص کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جس شخص کے اعمال ناقص ہیں ان سے جو ایمان پیدا ہوگا وہ بھی ناقص ہوگا اور جس کے اعمال کامل ہیں ان سے کامل ایمان پیدا ہوگا۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

تیسری مرتبہ ذکر ایمان سے اس درجہ کی طرف اشارہ ہے کہ بعد ثبات علی الایمان کے حسب اعمال ان کو ایمان میں ترقی حاصل ہوتی رہتی ہے اس کے بعد پھر ایمان کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ احسان کا ذکر فرمایا جس کے معنی شریعت میں اخلاص کے ہیں اور یہ اعلیٰ درجہ ایمان کا ہے اسی کو صدق سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور صدیق بھی صاحب احسان ہی کو کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ اس کے بعد ترقی اعمال سے درجہ احسان کا عطا ہوتا ہے اور یہی درجہ ایمان کا مطلوب ہے اور جو شخص اس درجہ میں فائز ہوتا ہے وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے پھر اس کو کچھ عذاب اور گناہ نہیں ہوتا کیونکہ محبوب مطیع کو کوئی بھی عذاب نہیں دیا کرتا۔ یہ جواب تو تکرار ایمان کے اشکال کا ہوا اور اسی سے تکرار تقویٰ کا جواب بھی نکل آیا وہ یہ کہ تقویٰ کے بھی مدارج مختلف ہیں۔ ایک تقویٰ تو یہ ہے کہ کفر و شرک سے بچے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کو ترک نہ کرے اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے پھر جیسے جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور اس تقویٰ کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا رہے گا حتیٰ کہ درجہ احسان جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے وہی تقوے کا بھی اعلیٰ درجہ ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔ پس اس آیت سے تقوے کے مراتب کا چند در چند ہونا معلوم ہو گیا اور صدق میں ایسے مدارج کی کوئی دلیل نہیں اور آیت برا ہیں اولئك الذين صدقوا دال ہے صدق کے خاص ہونے پر انتہائی درجہ کے ساتھ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ صدق کے درجات مختلف نہیں بلکہ اس کا ایک درجہ متعین ہے جس کو میں نے ابھی بتلایا ہے کہ احسان ہی کا دوسرا نام شریعت میں صدق و اخلاص ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ اگر حق تعالیٰ اس طرح فرماتے۔ یاایھاالذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّٰدقین تو سامعین کے دل پر ایک پتھر سا رکھا جاتا وہ یہ سمجھتے کہ ہم کو اول ہی دن میں کامل بن جانے کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ شروع ہی سے کامل بننا دشوار ہے اس لئے اول صدق کو بیان نہیں فرمایا بلکہ تقویٰ کا ذکر مقدم کیا کیونکہ اس کے درجات مختلف ہیں تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے گا کہ اول ہی دن میں کامل بننے کا حکم ہے بلکہ سامعین سمجھ لیں گے کہ تقویٰ کے درجات بہت ہیں مطلب یہ ہے کہ تدریجاً یکے بعد دیگرے تقوی کے تمام درجات حاصل کرتے رہو۔ یہاں تک کہ تم درجۂ صدق میں پہونچکر صادقین اور کاملین کے ساتھ مل جاؤ گے جس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ظاہر میں ان کی صحبت اختیار کرو پھر باطناً بھی اُن جیسے ہو جاؤ گے اور درجات تقویٰ کا مختلف ہوتا آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم کے شانِ نزول سے بھی واضح ہوجاتا

ضروری اطلاع۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اول فاتقوا اللہ حق تقاتہ کا نزول ہوا تھا صحابہؓ اس سے ڈر گئے کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آج ہی سے حق تقوے لازم ہوگیا۔ حالانکہ شروع ہی سے حق تقوے کا حصول دشوار ہے حق تقوی کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جیسا تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے وہ اختیار کرو۔ اتقوا اللہ حق تقاتہ میں یہ مراد نہیں کیونکہ یہ تو بشر کی طاقت سے خارج ہے اور اس کی تکلیف تکلیف مالا یطاق ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کی وسعت کے موافق جو تقوی خدا کی شان کے لائق ہے اس کو بجالاؤ۔ آیت میں یہی معنی مراد ہیں اور گویہ تقویٰ طاقت سے خارج نہیں کیونکہ اس کا مکلف کیا جانا دلیل ہے اس کے تحت الاختیار ہونے کی لیکن ابتداہی سے انسان کا اس درجہ میں پہونچ جانا دشوار ضرور ہے گو ممتنع نہیں۔ صحابہؓ کے خوف کا یہی سبب تھا پس وہ اس لئے خائف ہوئے کہ یہ درجہ گو اختیار سے باہر نہیں مگر عادۃً پہلے ہی دن اس کا حاصل ہو جانا دشوار ہے اور وہ صیغہ امر فاتقوا اللہ سے یہ سمجھے کہ ہم کو اس وقت اس درجہ کی تحصیل کا امر ہو رہا ہے نہ اس لئے کہ صیغہ امر فور کو مقتضی ہے بلکہ اس لئے کہ محاورات میں بسا اوقات امر فور کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے اور صحابہ کی نظر ہمیشہ اسی جانب جاتی تھی جس میں احتیاط ہو اس لئے انھوں نے امر فور پر محمول کیا۔ اگر یہ خطاب ہم لوگوں کو ہوتا تو ہم کو کچھ بھی اندیشہ نہ ہوتا کیونکہ ہم تاویل کر لیتے کہ امر فور کو مقتضی تھوڑا ہی ہے پس حق تقوی کا امر اسی وقت دفعۃً نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تدریجاً حاصل کرتے رہنا یہ مطلب صحابہ کے ذہن میں بھی ضرور آیا ہوگا۔ مگر انھوں نے غایت خشیت واحتیاط کی وجہ سے اس کو فور پر محمول کیا کیونکہ احتمال تو یہ بھی تھا۔ چنانچہ محاورات میں کثرت سے امر کا استعمال فور کے لئے ہوتا ہے جس کا پتہ قرینہ مقام سے چل جاتا ہے آپ اگر اپنے کسی نوکر سے پانی مانگیں اور وہ اگلے دن لاکر پلاوے تو کیا آپ خفا نہ ہوں گے ضرور خفا ہوں گے اور اس کے جواب میں نوکر یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضور نے تو اتنا فرمایا تھا کہ پانی لاؤ یہ تو نہیں فرمایا تھا کہ ابھی لاؤ کیونکہ قرینہ مقام سے اس امر کا فور کے لئے ہونا متعین ہوچکا تھا اور اسی طرح اکثر صیغہ امر کا استعمال فور ہی میں ہوتا ہے گو کبھی عدم فور کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہمارے یہاں ایک حافظ صاحب تھے جن کا لقب حافظ جنازہ تھا وہ ایک گاؤں میں

مسجد کے امام تھے وہاں کوئی مرگیا تو لوگ اس کا جنازہ مسجد میں لائے اور حافظ جی سے کہا کہ اس کی نماز پڑھا دو تو آپ نے یہ عذر کیا کہ مجھے اس وقت ایک دعا میں کچھ شبہ ہے اس کو یاد کرلوں پھر پڑھاؤں گا، لوگ جنازہ لے گئے اور کسی دوسرے سے نماز پڑھوا کر دفن کر دیا اگلے دن حافظ جنازہ صاحب نے گاؤں والوں سے کہا کہ بھائی مجھے اب دعا یاد ہوگئی ہے لاؤ اب جنازہ لے آؤ لوگ ہنسنے لگے کہ سبحان اللہ آپ کی دعا کے بھروسہ اب تک ہم اس کا اچار ڈالے رکھتے ہم نے تو اس کو دفن بھی کر دیا۔ تو دیکھئے فور و عدم فور میں فرق نہ کرنے سے لوگوں نے ان کو بیوقوف بنایا یہاں تک کہ ان کا لقب ساری عمر کیلئے حافظ جنازہ ہی پڑ گیا تو صحابہؓ نے اس آیت کو بمعنی فور سمجھا اور پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ حق تقوے کا آج ہی حاصل کرنا تو بڑا دشوار ہے پھر اس حکم کی تعمیل کیونکر ہو۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی فاتقوا اللہ ما استطعتم یعنی یہ مطلب نہیں کہ حق تقویٰ آج ہی حاصل کرلو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جتنا تقویٰ تم سے اس وقت ہوسکتا ہے۔ اس وقت تو اس کو اختیار کرو پھر ترقی کرتے رہو یہاں تک کہ حق تقویٰ حاصل ہو جاوے۔ اس تقریر پر شاید طلبہ کو یہ اشکال ہو کہ تمہاری تقریر سے تو اتقوا اللہ حق تقاتہ کا بھی مامور بہ ہونا معلوم ہوتا ہے حالانکہ حدیث میں آتا ہے کہ اس کے بعد اتقوا اللہ ما استطعتم نازل ہوئی اور اس نے پہلے آیت اتقوا اللہ حق تقاتہ کو منسوخ کر دیا سو طلبہ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ سلف کی اصطلاح میں نسخ کے معنی یہاں تبدیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر وغیرہ پر بھی نسخ کا اطلاق کر دیتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں اس پر تنبیہ کی ہے واقعی بہت لطیف بات ہے خدا ان کو جزائے خیر دے۔ پس حدیث میں جو اتقوا اللہ ما استطعتم کو ناسخ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت نے پہلی آیت کی تفسیر کر دی بیان تفسیر کو نسخ سے تعبیر کر دیا گیا۔ ورنہ فاتقوا اللہ حق تقاتہ کے معنی میں نے بیان کئے ہیں وہ ہرگز قابل تبدیل و نسخ نہیں ہیں اور ایک بات طلبہ کو یہ بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ اتقوا اللہ ما استطعتم میں استطاعت باعتبار کمیت کے مراد نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ جتنے اعمال بجا لاسکو اور جتنے محرمات سے بچ سکو بس اتنی کے تم مکلف ہو یہ معنی بالکل غلط ہیں کیونکہ تمام واجبات و فرائض کا بجالانا اور تمام محرمات سے بچنا ہر شخص پر ہر وقت واجب ہے اور سب لوگ اس وقت ان کے مکلف ہیں اور ان میں سے کوئی کام بھی استطاعت سے باہر نہیں

اس لئے کمیت کے اعتبار سے مااستطعتم کی قید کا لغو ہونا لازم آئے گا بلکہ یہ قید کیفیت کے اعتبار سے ہے یعنی اعمال شرعیہ میں جس کیفیت کا تقویٰ تم اس وقت حاصل کر سکو اس کو تو ابھی بجا لاؤ اور باقی کیفیات کے حصول کی کوشش کرتے رہو پس اس سے تقویٰ کے درجات کا کیفیت کے اعتبار سے متفاوت ہونا معلوم ہوتا ہے نہ کمیت کے اعتبار سے خوب سمجھ لو اب یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ اس آیت میں صدق کا موخر کرنا اور تقویٰ کا مقدم کرنا ہی مناسب تھا کہ اس سے سامعین کی طبیعت پر بوجھ نہیں ہوا بلکہ ہمت بلند ہوگئی کہ ہم کو تدریجاً تقوے کے مراتب حاصل کر کے کمال تقویٰ تک پہنچنا چاہیئے۔

پس اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ کمال دین مطلوب ہے۔ ہم کو اپنی ناقص حالت پر قناعت نہ کرنی چاہیئے بلکہ کمال دین حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اعمال کو کامل کیا جائے۔ فرائض و واجبات کے بجالانے میں کوتاہی نہ ہو، محرمات کا ارتکاب نہ ہو اور اعمال کے کامل کرنے میں جو نفس کی مزاحمت مانع ہوتی ہے اس کا علاج کاملین کی صحبت اختیار کرنا ہے ان کے پاس جانا چاہیئے اور جا نہ سکے تو ان سے خط و کتابت کا تعلق رکھا جائے جس میں فضول قصے نہ لکھیں بلکہ اپنے کو مریض اور ان کو طبیب سمجھ کر اپنے حالات سے ان کو اطلاع کرتے رہیں۔ پھر اس کے بعد جو کچھ وہ بتلادیں اس پر عمل کریں اور ان کے احکام کا اتباع کریں۔ پس یہ راستہ ہے خدا تک پہونچنے کا۔ جس سے زیادہ آسان راستہ کوئی نہیں بتلا سکتا۔

حجت ختم ہوچکی ہے اب دعا کیجیے حق تعالیٰ شانہ ہم کو فہم سلیم اور عمل مستقیم عطا فرماویں۔ آمین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

الوعظ المسمّٰی بہ

التحصیل والتسہیل

مع

التکمیل والتعدیل

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ـــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

الوعظ المسمیٰ بہ

التحصیل والتسہیل مع التکمیل والتعدیل

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	لمن شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس ہیئت پر ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون ہوا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	آخر جمعہ من رمضان ۲۳ سنہ ۱۳۴۲	۳ گھنٹہ اور وقت ضبط چار گھنٹہ	جالسا علی الکرسی	بوجہ اجتماع کثیر مشتاقان بیان کے	آجکل عام طور پر اہل سلوک سہولت کے طالب ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنی قوت اختیاریہ سے کام لینا نہیں چاہتے اور امور ماتحت الہیہ کو برباد کرتے ہیں پس تم خود سہولت کے طالب نہ بنو بلکہ اختیاریہ سے کام لو پھر اس کا بیان کہ اعمال رمضان کو سہولت لاعات میں دخل عظیم ہے۔	طبقہ سالکین کو خصوصاً	ظفر احمد عفا اللہ عنہ وغفر لوالدیہ ورضی عن مشائخہ	۳۰۰ تقریباً	

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ وتثبیتاً من انفسھم کمثل جنۃ بربوۃ اصابھا وابل فاتت اکلھا ضعفین ۚ فان لم یصبھا وابل فطل واللہ بما تعملون بصیر ط۔ جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے غالباً موقعہ ووقت کے لحاظ سے وہ سامعین کو غیر مرتبط معلوم ہوئی ہوگی کیونکہ اس میں احکام رمضان کا پتہ بھی نہیں مگر مجھے جزئیات سے زیادہ کلیات کا اہتمام ہے کیونکہ کلیات سننے میں کم آتے ہیں اور جزئیات کو اکثر لوگ بیان کرتے رہتے ہیں دوسرے کلیات جامع بھی ہوتے ہیں جزئیات کو اور ان کا یاد رکھنا بہت سے جزئیات کو یاد رکھنے سے مغنی ہوتا ہے اس وجہ سے میں نے اس وقت

ایک مضمون کلی اختیار کیا ہے جو کلیت وعموم کی وجہ سے احکام رمضان کو بھی شامل ہے چنانچہ تقریر سے معلوم ہو جائیگا کہ اس مضمون کو ہر عمل سے تعلق ہے اور روایات حدیثیہ کو بھی ملا لیا جائے تو اس آیت کا تعلق احکام رمضان سے اور زیادہ معلوم ہوگا نہ اس لئے کہ اس میں انفاق کا ثواب مذکور ہے اور رمضان میں انفاق کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ دوسری وجہ سے جس کو میں آخر بیان کرونگا گو انفاق کو بھی اس مہینہ سے خاص خصوصیت ہے اور یہ بھی رمضان کی ساتھ اس آیت کی مناسبت کی وجہ ہوسکتی ہے اس لئے حدیث میں اس کو شھر المواساۃ کہا گیا ہے جس کا استعمال اکثر اعانات علیٰ مالیہ میں ہوتا ہے یعنی اس مہینہ میں باہم ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا چاہیئے۔ نیز اس مہینہ میں تضاعف حسنات ہوتا ہے جو انفاق وصلوٰۃ سب کو عام ہے تو ایک تعلق عام اس آیت کا رمضان سے یہ بھی ہے یعنی اس مہینہ میں فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ہے اور نفل کا ثواب فرض کے برابر ہے مگر اس تضاعف حسنات کے معاملہ میں لوگ ایک غلطی میں مبتلا ہیں جسکو میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے مگر شاید بعض لوگ اس وقت حاضر نہ ہوں اس لئے دوبارہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض حضرات نے یہ سنکر کہ رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے اس سے یہ اثر لیا کہ رمضان کے لئے طاعات صدقہ کو ملتوی اور مؤخر کرنے لگے۔ زکوٰۃ تو عموماً اسی مہینہ میں ادا کی جاتی ہے گو وجوب زکوٰۃ اس سے پہلے ہو گیا ہو اور اس کے سوا بھی دیگر صدقات کو اس ماہ پر موقوف رکھا جاتا ہے۔ یہ غلطی ہے جس کا منشا مقصد نصوص سے بُعد ہے اور مقصد نصوص کا سمجھ لینا ہی فقہ ہے جس کی فضیلت حدیث میں یوں آئی ہے من یرد اللّٰہ بہ خیرًا یفقھہ فی الدین جس کی بنا پر علماء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت حق کیا ہے بجز فقیہ کے کہ اس کو معلوم ہے کہ خدا نے اس کی ساتھ خیر کا ارادہ کیا ہے بوجہ اس حدیث کے تو یہ فضیلت محض اس بات سے حاصل نہیں ہوئی کہ حدیث وقرآن کا ترجمہ جان لیا جائے اور کچھ علمی نکات بیان کر دیئے جائیں بلکہ یہ فضیلت اس سے حاصل ہوتی ہے کہ شارع کا مقصد سمجھ لیا جاتے اسی کا نام فقہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں ہمارے اکابر سلف ممتاز تھے گو وسعت نظر میں متاخرین بڑھے ہوئے ہیں مگر عمق نظر میں متقدمین

ملہ جس مقام پر بالکل ختم کے قریب یہ حدیث مذکور ہے من سلم لہ رمضان الخ ۱۲ ملہ کذا لفہم من القاموس مادہ اسا ۱۲ منہ

بدرجہا افضل ہیں یہاں تک کہ صحابہؓ کی نظر سب سے زیادہ عمیق ہے ان سے بڑھ کر شارع کے مقصد کو کون سمجھ سکتا ہے ان کی برابر نور ایمان وتقویٰ کس کو نصیب ہے اور علوم قرآنیہ میں عمق نظر اسی نور کی برکت سے حاصل ہوتا ہے اس مضمون پر کسی کو اس حدیث سے شبہ نہ ہو۔

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ای الخلق اعجب الیکم ایمانًا قالوا الملٰئکۃ الی آخر الحدیث یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ایک دن دریافت فرمایا کہ بتلاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے صحابہؓ نے عرض کیا فرشتوں کا آپ نے فرمایا کہ فرشتوں کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو ہر وقت اپنے رب کے قرب میں ہیں صحابہؓ نے عرض کیا پھر انبیاءؑ کا فرمایا ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو وحی کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں صحابہؓ نے عرض کیا پھر ہمارا ایمان عجیب تر ہے فرمایا تمہارے ایمان نہ لانے کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے میں تمہارے درمیان موجود ہوں یعنی تم نے مجھے دیکھا نزولِ وحی کو دیکھا میرے معجزات دیکھے پھر آپ نے فرمایا ان لوگوں کا ایمان عجیب تر ہے جو میرے بعد آئیں گے اور صرف چند اوراق دیکھیں گے جن میں قرآن ہوگا اور اُن پر ایمان لائیں گے تو اس سے یہ وسوسہ نہ ہو کہ تم صحابہؓ کو متاخرین سے افضل بتلاتے ہو اور اس حدیث کی رو سے صحابہؓ سے متاخرین کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلوں کے ایمان کو اعجب ہی تو فرمایا ہے اکمل واقوی وافضل تو نہیں فرمایا اور اعجب ہونے سے اکمل وافضل ہونا لازم نہیں آتا۔

پس اس حدیث کی بنا پر یہ مسلم کہ متاخرین کا ایمان سب سے عجیب تر ہے مگر صحابہؓ کے ایمان سے افضل واقوی نہیں کیونکہ دوسرے دلائل سے یہ طے ہوچکا ہے کہ سب سے زیادہ کامل ایمان انبیاءؑ علیہم السلام کا ہے پھر ملائکہ کا پھر صحابہؓ کا پھر جو صحابہؓ کے مشابہ ہو اسی طرح ہر زمانہ میں دیکھتے جاؤ جو شخص صحابہؓ کے ساتھ اخلاق وعادات وطرز معاملات میں مشابہ تر ہوگا اسکا ایمان قوی تر ہوگا۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اعجب ہونا قوی واکمل ہونے کو مستلزم نہیں اس کی ایک نظیر میرے پاس ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا حق تعالیٰ کا علیم وقدیر وسمیع ہونا عجیب ہے ہرگز نہیں بلکہ انسان کا علیم وحکیم ہونا عجیب ہے کیونکہ حادث ممکن کا صفات کمالیہ سے متصف

---

۵ رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ کذا فی المشکوٰۃ ۱۲

ہونا واقعی تعجب کی بات ہے اور واجب قدیم کا صفات کمال سے موصوف ہونا کیا عجیب ہے وہ بھی صفات کمال سے موصوف نہ ہو تو اور کون ہوگا مگر انسان کے علم وحکمت کے اعجب ہونے سے اس کے علم وحکمت کا اکمل ہونا لازم نہیں بلکہ اکمل و افضل واقوی اللہ تعالیٰ ہی کا علم وحکمت ہے یہ گفتگو درمیان میں ایک شبہ کے رفع کرنے کو شروع ہوگئی تھی کہ حضرات صحابہ کے ایمان کی قوت وفضیلت پر حدیث احب الخلق اعجب ایماناً سے شبہ نہ کیا جائے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مقاصد نصوص کا سمجھنا فقہ ہے جس میں حق تعالیٰ نے متقدمین کو فضیلت دی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ وغیرہ اسی عمق فہم کی وجہ سے امام ہیں اس خاص صفت میں ائمہ مجتہدین سب ممتاز ہیں اور کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا رہا یہ کہ پھر باہم مجتہدین میں کون افضل ہیں سو اس کے بیان کرنے کو ہمارا منہ نہیں ہم اس قابل نہیں کہ فقہاء میں تفاضل کریں کیونکہ اول تو ہمارا یہ درجہ نہیں دوسرے ہمارے اندر احتیاط نہیں ہم تفاضل کے وقت دوسرے کی تنقیص کر دیتے ہیں اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جڑ ہی کاٹ دی۔ فرماتے ہیں لا تفضلوا بین الانبیاء کہ انبیاء علیہم السلام میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ اور فرماتے ہیں لا ینبغی لعبد ان یقول انی خیر من یونس ابن متی اس میں انا سے مراد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ہر متکلم مراد نہیں (کما قیل ۱۲) یعنی کسی کو میری نسبت یہ کہنا لائق نہیں کہ میں یونس علیہ السلام سے افضل ہوں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام انبیاء پر قطعی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں تفصیلی گفتگو سے منع فرمادیا (نیز اس سے بھی منع فرمادیا کہ کسی نبی کا نام لیکر یہ کہا جائے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فلاں نبی سے افضل ہیں پس اجمالاً ہی کہنا چاہیئے کہ آپ سب سے افضل ہیں ۱۲) کیونکہ تفصیل سے دوسرے نبی کی تنقیص ہو جاتی ہے اور ایسے بہت کم لوگ ہیں جو تفصیلی کلام مقابلہ میں تنقیص سے بچ سکیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ غایت رحمت ہے کہ آپ نے ہم کو اس بات میں تفصیلی گفتگو سے بالکل منع فرمادیا اور اگر کسی کا اس باب میں تفصیلی گفتگو کر کے یہ خیال ہو کہ میرے کلام سے کسی نبی کی تنقیص لازم نہیں آتی تو میں اس کے سامنے ایک

معیار بیان کرتا ہوں اس پر اپنی تقریر کو پرکھ لیا جاوے وہ یہ کہ تفاضل انبیاء پر تقریر کرنے کے قبل یہ سوچ لے کہ اس مجلس میں سارے انبیاء علیہم السلام مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہیں اور میں سب کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ظاہر کر رہا ہوں اس وقت معلوم ہو جاوے گا کہ کس مضمون کے بیان کی جرأت ہوتی ہے اور کس کی نہیں ہوتی اس معیار سے اپنی اکثر تقریروں کا حدود سے تجاوز ہونا معلوم ہو جاویگا اور اس کی فکر ہو گی کہ کسی لفظ سے ایہاماً بھی کسی دوسرے نبی کی تنقیص لازم نہ آ جائے ورنہ وہ حضرات تو شائد خفا نہ ہوں مگر سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جائیں گے حدیث میں ہے الانبیاء اخوۃ من علات امھاتھم شتی ودینھم واحد یعنی انبیاء میں باہم علاتی بھائیوں جیسا تعلق ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات کیسے بھائی ہیں دنیا داروں کی طرح نہیں بلکہ ان میں باہم پورا اتحاد و اتفاق و محبت ہے تو ایسے بھائیوں میں سے ایک کو اپنے دوسرے بھائی کی تنقیص کب گوارا ہو سکتی ہے ہرگز نہیں حضرت اس معیار کو پیش نظر رکھ کر تم اپنی تمام تقریروں اور تحریروں کو جو باب تفاضل میں لکھی ہوں یا کی ہوں جانچو کہ ان میں سے کوئی بھی ایسی ہے جس کو بے تکلف تمام انبیاء کے سامنے پڑھ کر سنا سکو یقیناً ایسی تقریریں بہت کم ملیں گی زیادہ حصہ وہی ہو گا جس کو سب کے سامنے پڑھنے کی تم کبھی جراءت نہیں کر سکتے (یہ بہت سچی ترازو ہے جو ایک رتی پر بھی جھک جائے گی اس کی قدر کرو) ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں فتوے دیتے ہوئے یہ مراقبہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دے رہا ہوں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو میں فتویٰ نہیں دیتا حضرت یہ وہ باتیں ہیں جن میں صوفیہ دوسروں سے ممتاز ہیں گو اس مضمون کا عقیدہ تو سب کو ہے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے خدا کے سامنے کرتا ہے مگر اس کا مراقبہ اور استحضار دوسرا اثر رکھتا ہے بس اسی مراقبہ سے تم تفاضل انبیاء کے وقت کام لو۔ ان شاء اللہ تعالے کلام میں اعتدال پیدا ہو جائے گا۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ سلاسل صوفیہ میں بھی ایک سلسلہ والوں کو دوسرے سلسلہ پر اپنی فضیلت ثابت نہ کرنا چاہئے کیونکہ ہر سلسلہ والے کے لئے دوسرے سلسلہ کے بزرگ چچا ہیں اور چچا بمنزلہ باپ کے ہے حدیث میں

بھی ہے عم الرجل صنو ابیہ یعنی عظمت و ادب میں دونوں برابر ہیں گو بعض حقوق میں باپ مقدم ہیں۔ لیکن تمھارا باپ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ تم اپنے چچا کی یعنی باپ کے بھائی کی تنقیص و توہین کرو جب سلاسل ولایت میں بھی تفاضل سے اکابر نے منع کیا ہے تو تفاضل انبیا تو یقیناً اشد ہے اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے فضائل احادیث میں بیان فرمائے ہیں اس سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ ان کے معلوم ہو جانے سے متبعین کو تسلی ہوگی کہ اللہ تعالٰے نے ہم کو ایسا متبوع دیا اور اتباع پر زیادہ رغبت ہوگی گو یہ علوم خود بھی مقصود ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ترغیب اتباع ہی معلوم ہوتا ہے (ویحتمل ان یکون امتثالا لامرہ تعالیٰ واما بنعمۃ ربک فحدث ۱۲) کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق یہ تھا کہ آپ کو اتباع احکام کا سب سے بڑھ کر اہتمام تھا اور جس چیز کو اس میں دخل ہوتا آپ اس کو اختیار کرنے کی کوشش فرماتے اس کے متعلق کہ آپ کو اتباع کا زیادہ اہتمام ہے بہ نسبت بیان فضائل کے ایک مرد صالح کا خواب بھی ہے جو بعض رسائل میں طبع بھی کرا دیا ہے ان کو مولود وغیرہ کا بہت شوق تھا محق علیہ محبت نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے تو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں ہم زیادہ تعریف سے خوش نہیں بلکہ ہم اس سے خوش ہوتے ہیں کہ جو ہمارے احکام کا اتباع کرے مگر آجکل حالت یہ ہے کہ شعرا ایک نعتیہ دیوان لکھ کر اپنے کو سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرب سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ عمل کی یہ حالت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل خلاف ہے یقیناً ایسی تعریف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش نہیں ہو سکتے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق پر نظر کرنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل کو زیادہ تر ترغیب اتباع کی نیت سے بیان فرمایا ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ فضائل تو عقائد کی قبیل سے ہیں جو خود مقصود ہوتے ہیں اور تم ان کو مقصود لغیرہ بتاتے ہو میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہیں کہ ایک شی مقصود بالذات بھی ہو اور دوسری مقصود میں معین بھی ہو آپ کو خبر نہیں مقاصد شرعیہ کی سب کی ایسی حالت ہے جیسے مقناطیس کی حالت ہے کہ ہر مقصود دوسرے کا جاذب اور اس میں معین ہے پس عقائد کا مقصود بالذات ہونا ان کے مقصود للاعمال ہونے کے منافی نہیں اور میں نے اس

مسئلہ کو قرآن سے سمجھا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذلك علی اللہ یسیر لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم۔ بتلایئے اس آیت میں لام غایت کا متعلق کون ہے مذکور تو ہے نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی جزو اس کا صالح نہیں لامحالہ مقدر ماننا پڑے گا اب یہ بھی سمجھ لو کہ مقدر کیا ہے تو اس لام سے اوپر اللہ تعالیٰ کے مسئلہ تقدیر بیان فرمایا ہے یعنی تم کو جو مصیبت بھی پہونچتی ہے خواہ آفاقی ہو یا نفسی وہ ایک کتاب میں اپنے ظہور سے پہلے لکھی ہوئی تھی چونکہ یہ عجیب بات تھی اس لئے فرماتے ہیں کہ تعجب نہ کرو اللہ کو یہ سب آسان ہے اب اس مسئلہ کے بتلانے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو یہ مسئلہ اس لئے کیوں بتلایا تاکہ تم فائت پر غم نہ کرو اور عطا کی ہوئی چیز پر اتراؤ نہیں پس وہ مقدر اخبرنا کم بہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کو اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے کیونکہ اس سے حزن و بطر رفع ہو جاتا ہے اور حزن جڑ ہے تعطل ظاہر کی اور تکبر و بطر اصل ہے تعطل باطن کی یعنی غمگین و پریشان آدمی ظاہر میں تمام دین و دنیا میں کاموں سے معطل ہو جاتا ہے اور متکبر آدمی کا دل خدا کے تعلق سے معطل ہو جاتا ہے جب تک تکبر نہ نکلے خدا کے ساتھ دل کو لگاؤ نہیں ہو سکتا یہ تو تقدیر کو دخل تھا اعمال میں۔ اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ توحید جو اعظم العقائد و اساس العقائد ہے اس کو بھی اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے۔ چنانچہ سعدی فرماتے ہیں ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ——— چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس ——— ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(توحید کا مقام والا ایمان کامل سے مشرف ہوتا ہے اگر اس کے پاؤں پر سونے کا ڈھیر ہو یا اس کی گردن پر تلوار ہندی ہو تو ان دونوں حالتوں میں نہ تو اس کو کسی سے امید و طمع ہوگی اور نہ کسی سے خوف ہوگا اور یہی حالت توحید کی بنیاد ہے یعنی توحید سے مخلوق کا خوف و طمع زائل ہو جاتا ہے۔ جب اتنا بڑا عقیدہ بھی اصلاح اعمال میں دخیل ہے تو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے اعتقاد کو آپ کے اتباع میں دخیل مانا جاوے تو کیا اشکال ہے اور یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصود ہے گو وہ فضائل ایک درجہ میں مقصود بالذات بھی ہیں)

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں زیادہ کاوش سے منع فرمادیا کیونکہ جو مقصود ہے اس اعتقاد فضیلت سے وہ بدون تفصیل کے بھی صرف اجمالی اعتقاد سے حاصل ہوسکتا ہے اسی طرح ہمارے اکابر نے اولیاء مجتہدین میں بھی تفاضل سے منع فرمایا ہے غرض متقدمین کو فقہ اور تعمق نظر کی وجہ سے متاخرین پر فضیلت ضرور ہے لیکن باہم متقدمین[1] میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے اس سے بحث نہ کرنا چاہیئے یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ لوگوں نے حدیث تضاعف ثواب فی رمضان کے باب میں شارع کا مقصد نہیں سمجھا اور فقہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر یہ عمل کیا کہ تفاضل حسنات کے لئے طاعات کو مؤخر کرنے لگے کہ اگر کسی کی زکوٰۃ کا سال ۲۸ شعبان کو پورا ہوتا ہے تو وہ ۲۸ کو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا بلکہ رمضان کے لئے اس کو ملتوی کرتا ہے چاہے غریب مسکینوں کا (جن کا یہ مال زکوٰۃ شرعی حق ہے) خاتمہ ہی ہوجائے ارے تم کو کیا خبر ہے کہ مساکین پر کیا گذر رہی ہے تم کو یکم رمضان کا انتظار ہے اور اس غریب کی روح کو ایک ایک گھڑی کا انتظار ہے بس وہ حال ہوگا تا تو بمن می رسی من بخدا می رسم (جب تک تو مجھ تک پہونچے گا میں خدا تک پہونچ جاؤں گا یعنی موت ہی آجاوے گی) صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں جو آپ نے سمجھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ نہیں کہ رمضان تک طاعات کو مؤخر کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ رمضان میں طاعات کے اندر جلدی کی جائے یعنی جس طاعت کی ہمت ہوسکے اور جس عمل صالح کی توفیق ہوسکے اس کو جلدی رمضان ہی میں کردو رمضان کے بعد کیلئے مؤخر نہ کرو کیونکہ رمضان میں ثواب زیادہ ہے پس تضاعف حسنات کا مقصود تو تعجیل اعمال فی رمضان تھا لوگوں نے اس سے تاخیر اعمال الی رمضان سمجھ لیا۔ ع یہ ہیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا۔ (غور کرو کہ راستہ کا فرق کہاں سے کہاں تک جا پہنچا)

[1] میں کہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ فقہ کے موجد ہیں کما قال الامام الشافعی الناس کلہم عیال علی ابی حنیفۃ فی الفقہ نیز وہ تابعی ہیں کما اثبت الذہبی والحافظ ابن حجر والدارقطنی وغیرہم رویۃ الانس بن مالک وفی الحدیث خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم ولیس احد من المجتہدین المقلدین تابعیا سوا الامام پس امام ابوحنیفہؒ کا تمام ائمہ مجتہدین سے افضل ہونا تو نص سے بھی ثابت ہے اور موجد فقہ ہونے سے بھی ۱۲ مگر اس سے علی الاطلاق فضیلت سب پر ثابت نہیں ہوتی ۱۲ اشرف

اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ جس شخص کا سال زکوٰۃ ۲۸ شعبان کو پورا ہو تو کیا وہ شعبان ہی میں صدقہ کردے اس کے جواب میں میں تو یہی کہونگا کہ ہاں دیر نہ کرے رمضان کا انتظار نہ کرے رہا یہ سوال کہ کیا شعبان میں وہی ثواب ہوگا جو رمضان میں ہوتا تم اس کا ٹھیکہ لیتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ میں ٹھیکہ دار تو نہیں ہوں ہاں ٹیکہ دار ہوں کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ قواعد پر ٹیک لگا کر کہتا ہوں کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تاخیر طاعات مطلوب نہیں بلکہ تسارع و تسابق الی الخیر مقصود ہے چنانچہ جا بجا فاستبقوا الخیرات۔ یسارعون فی الخیرات نص میں وارد ہے۔ اس لئے میں جزم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تاخیر فی الخیر شارع کو ہرگز مطلوب نہیں اور میں قواعد سے کہتا ہوں کہ جس کو شعبان میں صرف کا موقعہ ملے وہ ہرگز تاخیر نہ کرے اس کو شعبان ہی میں اتنا ثواب ملے گا جو شاید رمضان کے ثواب سے بھی بڑھ جائے کیونکہ انفاق فی رمضان سے کمیۃً ثواب بڑھتا ہے اور تعجیل وسبقت فی الخیر سے کیفیۃً ثواب زیادہ ہوتا ہے اور کیفیت میں کمیت سے زیادہ مطلوبیۃ ہے۔ صاحبو! میں اس کی نظیر علما کے کلام سے اپنے پاس رکھتا ہوں حدیث میں ہے کہ مسجد محلہ میں نماز پڑھنے سے ۲۵ نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں ۵۰۰ نمازوں کا مگر محلہ والوں یہ جائز نہیں کہ محلہ کی مسجد چھوڑ چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنے جایا کریں اگر ایسا کروگے تو گناہ ہوگا۔ اس مقام پر علماء نے لکھا ہے کہ جامع مسجد کی نماز اس شخص کے حق میں کمیۃً زیادہ ہے اور مسجد محلہ کی نماز کیفیۃً زیادہ ہے (کیونکہ اس کے ذمہ اس مسجد کی آبادی واجب ہے تو یہ شخص مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے اور واجب عمارت کو بھی ادا کرتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے واجب عمارت ادا نہ ہوگا کیونکہ اس کے ذمہ اس کی عمارت و آبادی واجب نہیں بلکہ یہ واجب جامع مسجد کے محلہ والوں کے ذمہ ہے ۱۲) ہاں اگر کوئی جامع مسجد کے محلہ میں جا بسے تو اور بات ہے پھر اس کو کیفیت و کمیت دونوں میں ترقی ہوجائے گی گو قرب سے بعد اقدام کا بھی خسارہ ہوجائیگا بس تم اپنے حساب اور قواعد کو رہنے دو اس میں پانچ کو جانے دو جو حکم ہو جائے اس کو مان لو اپنی طرف سے حساب نہ لگاؤ کہ اس وقت خرچ کرنے میں ثواب کم ہوگا رمضان میں زیادہ ہوگا صاحبو! یہ تسلیم کہ رمضان میں زیادہ ہوگا مگر یہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ اس وقت کم ہوگا، ممکن ہے اس وقت ہی زیادہ مل جائے کیونکہ اس وقت خرچ کروگے تو ادا ہوگا اور رمضان تک

تاخیر کروگے تو قضا ہو جائے گا اور ادا میں جو لطف ہے وہ بات قضا میں کہاں تم کو آخرت کے حقائق وخواص کی کیا خبر۔ تم ان کے متعلق قیاس سے کام نہ لو۔ اہل سائنس کو اقرار ہے کہ ابتک خواص اشیاء کا ان کو اتنا بھی علم نہیں ہوا جتنا سمندر میں سے ایک قطرہ حالانکہ حیرت در حیرت انگیز ایجادات ہورہی ہیں اخبار میں دیکھا ہے کہ امریکہ نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے کہ اس کو پرانے کھنڈروں اور ویرانوں میں لگا یا جائے تو پہلے زمانہ کی تمام باتیں جو اس گھر کے آدمیوں نے اس گھر میں کی تھیں اس آلہ کے ذریعہ سے سنائی دیں گی اب بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ یہ آوازیں کرۂ ہوا میں اب تک موجود ہیں مگر ان کے ادراک کے لئے لطیف آلہ کی ضرورت تھی وہ اب ایجاد ہو گیا پہلے ایجاد نہ ہوا تھا اس لئے کوئی ان باتوں کو نہ سن سکا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ روحوں کی آوازیں ہیں ارواح بولتی ہیں۔ اب میں اس خبر کو بیان کر کے کہتا ہوں کہ قرآن نے کہا تھا کہ قیامت کو زمین بولے گی یومئذ تحدث اخبارها تو اس کا سب نے انکار کیا اور کہا بھلا یہ کس طرح ہوگا زمین کیونکر بولے گی کیا اس کے بھی زبان ہے۔ قرآن نے اس کا بڑا زبردست جواب دیا ہے بان ربك اوحی لها یعنی زمین اس لئے بولے گی کہ خدا کا اس کو یہی حکم ہوگا۔ اس جواب نے سب سائنس والوں کی گردنیں توڑ دیں کیونکہ اسباب ظاہرہ میں تو وہ شبہات نکال سکتے تھے اس میں کیا شبہ نکال سکتے ہیں کیونکہ یہ تو حقیقی سبب ہے اگر اس میں کلام کریں گے کہ کیا زمین کے زبان ہے تو ہم سوال کریں گے تو اچھا بتلاؤ یہ زبان کیونکر بولتی ہے کیا اس کے بھی زبان ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب عالم اسباب کی حقائق کا ابتک احاطہ نہیں ہو سکا تو عالم آخرت کی حقائق کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے پھر آپ وہاں کے ثواب وغیرہ کے بارے میں اپنا حساب اور قاعدہ رہنے دیجئے چنانچہ بعض لوگوں نے حقوق العباد کے بارہ میں ایک حساب لگایا ہے کہ زید کا ہمارے ذمہ حق ہے اور عمرو کے ذمہ ہمارا حق ہے تو اب ہمکو زید کے حق کی فکر کرنا کیا ضرور۔ قیامت میں اگر زید ہم سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا تو ہم عمرو پر حوالہ کر دیں گے کہ اس کے ذمہ ہمارا حق ہے اس سے وصول کر لو اس طرح مقاصہ ہو جائے گا مگر اول تو کیا ضرور ہے کہ دوسروں کے ذمہ آپ کے حقوق اتنے ہی ہوں جتنے دوسروں کے آپ کے ذمہ ہیں دوسرے فرض کر لیا جائے کہ برابر ہی ہو گئے مگر ممکن ہے کہ پھر بھی مقاصہ ہو کیونکہ ممکن ہے کہ

دوسرا تو تمھارے حقوق کی ادائیگی کی فکر میں عمر بھر لگا رہا ہو مگر افلاس یا اور کسی عذر کی وجہ سے مجبور رہا ہو (اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہم خود حقوق کو ادا کر دیں گے اور اس شخص پر اصلا مواخذہ نہ ہوگا ۱۲) اور تم اس مقاصہ کے حساب سے بے فکر ہوگئے ہو کتنے ابھی سے دوسرے کا حق مارنے کی ٹھان لی ہے تو تم اور وہ برابر کہاں ہوئے تم پر ظلم وغصب وخیانت وغیرہ متعدد دفعات قائم ہیں اور اس پر صرف ایک دفعہ تھی کہ قرض لیکر ادا نہیں کیا۔ تیسرے ممکن ہے کہ حقوق کے مکافات مکسوب اعمال سے ہو سکے اور موروث اعمال سے نہ ہو سکے اس لئے دوسرے شخص کی جو نیکیاں تم کو ملی ہیں وہ معاوضہ ان حقوق کا نہ ہوسکیں جو تمھارے ذمہ ہیں تو یہ حساب محض لغو ہے خدا سے ڈرنا چاہیئے کہیں بنئے کے حساب کی طرح نہ ہوجائے کہ لیکھا جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں۔ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ جس عورت کے کئی نکاح ہوئے ہوں وہ کس کو ملے گی یہ سوال بھی محض فضول ہے کیونکہ یہ تو یقینی ہے کہ وہاں کسی کو قلق نہ ہوگا سب کے سب خوش وخرم رہیں گے یہ نہ ہوگا کہ شوہروں میں باہم لڑائی جھگڑا ہو وہ کہے میں لوں وہ کہے میں لوں ممکن ہے اللہ تعالےٰ اس کے پہلے خاوند کو دنیا ہی کی عورتوں میں سے کوئی عورت ایسی ہی حسین یا اس سے بہتر دیدے کیونکہ دنیا میں بہت لڑکیاں بغیر شادی کے بھی تو مر جاتی ہیں یا حوریں زیادہ دیدیں۔ غرض اللہ تعالےٰ سب کو خوش کر دیں گے جنت میں کوئی غمگین نہ ہوگا اس لئے یہ سوال محض فضول۔ غرض یہ کہ تم خدا کے ساتھ حساب نہ لگاؤ حساب وہاں کیا کرتے ہیں جہاں مساوات ہو۔ دیکھو دوکاندار ہم سے اور آپ سے تو حساب کرتے ہیں اور بادشاہوں سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتے وہاں تجارتی مال کو بھی ہدیہ کہکر پیش کرتے ہیں اور جب وہاں سے قیمت پوچھی جاتی ہے تو قیمت نہیں بتلاتے بس یہی کہتے ہیں کہ اس کی کچھ قیمت نہیں صرف حضور کی خوشنودی ہی سب کچھ قیمت ہے۔ اس کے بعد ان کو قیمت سے بھی بہت زیادہ مل جاتا ہے پھر غضب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ساتھ حساب کتاب کرتے ہو جن کا حق یہ ہے کہ ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست ۔۔۔ تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

(اے خدا ہم اپنے گھر سے کوئی چیز بھی تو نہ لائے تھے آپ ہی نے ہر چیز ہم کو عطا فرمایا اور ہم خود بھی آپ ہی کے ہیں)

کیونکہ سب چیزیں تو اُن ہی کی ملک ہیں اور حساب وہاں ہوتا ہے ایک عوض ایک عاقد کا ہو دوسرا عوض دوسرے عاقد کا اور یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ان اللّٰہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جنت کے بدلہ میں ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے جس سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جان و مال ہماری ملک ہے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے تم بچہ کو بلا تملیک پیسہ دیدیتے ہو اور انفاق کی عادت ڈالنے کے لئے اس کے ہاتھ سے مدرسہ میں دلواتے ہو اب مدرسہ کی کارروائی میں بچہ کا نام چھپے گا کہ فلاں بچہ نے مدرسہ میں چندہ دیا تھا کارروائی میں اپنا نام دیکھ کر بچہ خوش ہوتا ہے تو کیا حقیقت میں چندہ دینے والا وہ بچہ ہے یا آپ ہیں اس کو خود سمجھ لیجئے اور یہاں استطراداً اس کے متعلق چند باتیں یاد آگئیں وہ بھی بتلا دوں ایک یہ کہ باپ کو مناسب ہے کہ بچہ کے ہاتھ سے بھی کبھی کبھی خرچ کرایا کرے کبھی اس کے ہاتھ سے فقیر کو دلوا دیا کبھی مدرسہ میں دلوا دیا تاکہ اس کا حوصلہ بڑھے اور مال کی حرص نہ پیدا ہو۔ دوسرے یہ کہ جب بچوں کے ہاتھ سے کسی دوسرے کو رقم دلواؤ خواہ فقیر کو خواہ مدرسہ کو تو اس وقت یہ رقم بچہ کو ہبہ نہ کرو بلکہ اباحت کے طور پر دو ورنہ وہ اس کی ملک ہو جائے گی پھر ہبہ صبی حرام ہوگا اور اگر غلطی سے ایسا ہو جائے تو فقیر سے یا مدرسہ والوں سے رقم واپس نہ لو بلکہ خود بچہ کو اس کے عوض اور رقم دیدو جس میں نیت عوض کی قید ضروری ہے ورنہ یہ مستقل ہبہ ہوگا پہلے کا عوض نہ ہوگا اور مدرسہ والوں کو چندہ کرنے والوں کو بھی چندہ لیتے ہوئے ان مسائل کا لحاظ رکھنا چاہیئے یہ چندہ جمع کرنے والے ہر شخص کی رقم لے لیتے ہیں خواہ کوئی بچہ دے یا عورت اور ان مسائل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ چنانچہ پانی پت میں ایک مدرسہ کے سفیر جو واعظ النساء تھے کہ ہمیشہ عورتوں ہی میں وعظ کہا کرتے تھے تشریف لائے اور چندہ کا وعظ کہا ان کو ایک ہی حدیث یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے عورتوں میں نے تم کو جہنم میں سب سے زیادہ دیکھا ہے پس صدقہ کر کے اپنے کو جہنم سے بچاؤ اگرچہ زیور ہی میں سے ہو اسی حدیث کا ہمیشہ بیان کرتے تھے۔ عورتیں مردوں کے اعتبار سے زیادہ مالدار ہیں کیونکہ تھوڑا بہت زیور ہر عورت کے ہاتھ کان میں ہر وقت ہوتا ہے۔ نیز یہ مردوں سے زیادہ سخی بھی ہیں

کیونکہ زیور میں ان کو کونسی مشقت پڑی تھی یا تو شوہر نے کما کر بنا دیا یا ماں باپ نے جوڑ جاڑ کر چڑھا دیا ان کو تو ہر حال میں مفت ہی پڑتا ہے اس لئے چندہ کے وعظ میں ان کے ہاتھ کان سے بہت جلدی زیور نکلنے لگتا ہے۔ وہ سفیر صاحب غالباً اسی لئے عورتوں میں زیادہ وعظ کہتے تھے کہ یہ مالدار بھی ہیں سخی بھی ہیں اور عقل سے کوری بھی ہیں ہر شخص کی باتوں سے متاثر ہو جاتی ہیں ان سے چندہ خوب ملے گا۔ چنانچہ ہر وعظ کے بعد ان کے پاس بہت سا زیور جمع ہو جاتا تھا۔ ایک دن کسی عورت نے اپنے کان کی سونے کی بالیاں چندہ میں دیدیں سفیر صاحب بڑے خوش ہوئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ان کی خوشی کرکری ہو گئی کیونکہ اس عورت کا خاوند جو گھر میں آیا اس نے بیوی کے کان ننگے دیکھے، پوچھا بالیاں کیا ہوئیں کہا مدرسہ کے مدرسہ چندہ میں دیدی کہا بیوقوف تو کون تھی دینے والی تجھے پہننے کو دی تھی یا تیری ملکیت بنادی تھی۔ اس کے بعد وہ سفیر صاحب کے پاس آیا اور کہا آپ کو میری بیوی نے سونے کی بالیاں چندہ میں دی تھی وہ واپس کر دیجئے کیونکہ وہ اس کی ملک نہیں ہیں میری ملک ہیں اور اس نے میری بغیر اجازت دی ہیں۔ سیدھی اور معقول بات تھی مگر سفیر صاحب کسی طرح واپس دینے کو تیار نہ ہوں اور اس سے جھگڑنے لگے۔ ان دنوں میں بھی وہاں گیا ہوا تھا سفیر صاحب میرے پاس آئے میں نے ان سے کہا کہ آپ معقول بات کو کیوں نہیں مانتے اور بالیاں واپس کیوں نہیں دیتے تو انھوں نے بڑا عذر یہ کیا کہ میں تو سو روپے کی رسید کاٹ کر دے چکا ہوں۔ اب اگر بالیاں واپس دیدوں تو مدرسہ والے تو مجھ سے روپے وصول کر لیں گے کیونکہ رسید کٹی ہوئی ہے۔ میں نے کہا اس کی تدبیر یوں کیجئے کہ ان سے وہ رسید منگوا لیجئے۔ اور اس پر ان کے قلم سے لکھوا لیجئے کہ ہم نے یہ چندہ واپس لے لیا اور دستخط کرا کے ایک دو گواہیاں بھی کرا لیجئے اسی طرح مثنیٰ رسید پر جو آپ کی بہی میں ہے واپسی مع دستخط اور گواہوں کے لکھوا لیجئے۔ پھر مدرسہ والے آپ سے کچھ نہ کہیں گے۔ یہ تدبیر سن کر مولوی صاحب کے حواس درست ہوئے ان کا بال بال بچا اور اس غریب کی بالی بچی۔ پس عورتوں سے چندہ لینے والوں کو بڑی احتیاط کرنا چاہئے کیونکہ یہ اکثر بدون شوہر سے پوچھے شوہر ہی کے مال میں سخاوت کیا کرتی ہیں۔ یہ مسائل درمیان میں

استطرادا مذکور ہوگئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس طرح آپ بچہ کے ہاتھ رقم دلوا کر بچہ کا نام کردیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کا نام کررہے ہیں ورنہ بتلایئے کہ جان آپ کی کدھر سے ہوگئی مال آپ کا کدھر سے ہوگیا یہ تو سب کچھ حق تعالیٰ کا ہے آپ کا نام برائے نام ہے اب بتلاؤ اس کے عوض میں کچھ جنت کی نعمتیں ملیں گی وہ عوض ہے ہرگز نہیں بلکہ سراسر فضل و رحمت ہے مگر اس برائے نام ملک کا شریعت نے اعتبار کیا ہے اور اس کو ملک حقیقی ہی کے احکام دیئے ہیں یہ شریعت کا بڑا احسان ہے ورنہ اگر یہ نہ ہوا در حقیقت کا مسئلہ عملاً بھی مان لیا جائے کہ ؎

در حقیقت مالک ہر شے خداست　　　ایں امانت چند روزہ نزد ماست

(در حقیقت ہر شے کا مالک خدا ہے اور بطور امانت چند روز کے لئے ہمارے پاس ہے)

تو عالم میں فساد برپا ہوجائے۔ کوئی کسی کی بیوی کو لے بھاگے کوئی کسی کی نقدی اور زیور پر قبضہ کرلے اور جب مالک کہے کہ یہ تو میری چیز ہے اس کو یہی کہکر دھمکادے کہ تیری کہاں سے آئی تھی سب چیزیں خدا کی ہیں ہم بھی خدا کے ہیں آج تک تو نے برتا اب ہم برتیں گے اس مسئلہ پر عمل ہونے لگے تو پھر شیخ صاحب بھی پٹھانوں جیسا کام کرنے لگیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

سر پنہان ست اندر زیر و بم　　　فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(راز پوشیدہ ہے نظام توحید میں اگر ظاہر کردوں تو تمام عالم میں تعطل پیدا ہو جائے)

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر توحید کو ظاہر کردوں تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا اس کی وجہ یہی ہے کہ توحید کا تو یہی مقتضا ہے کہ خدا تعالیٰ کے روبرو کسی کی ملک ملک نہیں ایک مقام پر مولانا نے اس کے مناسب ایک حکایت بیان فرمائی ہے کہ ایک ایسا ہی شخص کے باغ میں گھس کر انگور کھانے لگا۔ باغبان آگیا تو اس کو دیکھ کر بھی آپ ڈرے نہیں بے تکلف کھاتے رہے۔ اس نے دھمکایا کہ نامعقول یہ کیا کر رہا ہے کہ بدون اجازت کے میرا پھل کھا رہا ہے تو وہ صاحب حقیقت بولے بس خاموش رہ بک بک نہ لگا۔ باغ بھی خدا کا پھل بھی خدا کا ہاتھ بھی خدا کا میں بھی خدا کا پھر تو روکنے والا کون ہے۔ اس نے نوکر کو آواز دی کہ ایک رسّا اور ڈنڈا لانا اور اس میں اسکو جکڑ کر ڈنڈے سے مارنا شروع کیا اب وہ لگا چلانے تو باغ والا کہتا ہے کہ بس خاموش رہو

رستا بھی خدا کا کھٹکا بھی خدا کا میں بھی خدا کا پھر چلانے کی کیا بات ہے غرض خوب مارا آخر اس نے اس عقیدہ سے توبہ کی اور کہا ؎

گفت توبہ کردم از جبرائے عیار اختیار ست اختیار ست اختیار ست

(اس نے کہا میں توبہ کرتا ہوں اس عقیدۂ جبر سے بے شک اختیار ہم کو دیا گیا ہے ہر خیر و شر کا)

اہل جبر وہی لوگ ہیں جو حقیقت کے قائل ہیں اور اختیار کے انکار سے شریعت کے منکر ہیں انھوں نے ؎

درحقیقت مالک ہر شئی خداست میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ فاعل ہر شئی نیز خداست کہ ہر کام کرنے والا بھی انسان نہیں بلکہ خدا ہی ہے اور صفت اختیار سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے انکار کر بیٹھے ہیں میں کہتا ہوں بہت اچھا اگر انسان کو اختیار کچھ نہیں ہے تو پھر سب کو اعمال صالحہ کے بعد بھی جہنم کے لئے تیار رہنا چاہیئے کیونکہ آپ نے یہ اعمال تھوڑا ہی کئے ہیں آپ تو مجبور تھے جیسے یہاں مجبور رہو آخرت میں بھی مجبور رہو اللہ تعالیٰ جہاں بھیج دیں چلے جانا صاحبو! انسان میں صفت اختیار کا ہونا دلیل کا محتاج نہیں بلکہ یہ وجدانی امر ہے ہر شخص وجدان سے اس کو محسوس کرتا ہے کہ ہاں میرے اندر اختیار ہے۔ دیکھئے مرتعش (جس کے ہاتھ میں رعشہ ہو) اور کاتب کی حرکت ید میں فرق بین ہے پہلا شخص حرکت میں مجبور ہے دوسرا مجبور نہیں (ایک شخص کو ڈھاکر زبردستی اس کا منھ کھول کر کسی نے شراب پلادی اور ایک نے روپیہ ہاتھ میں لیا اور شراب کی بھٹی پر گیا بھاؤ تاؤ کیا اور بوتل خرید کر پی لی کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں بلکہ مجبور پہلا شخص ہے دوسرے کو مجبور کوئی نہیں کہہ سکتا ۱۲) اور یہ ایسا فرق ہے جس کو حیوانات بھی جانتے ہیں اگر آپ کتے یا بھیڑیئے کے ڈھیلا یا لاٹھی ماریں تو وہ لاٹھی ڈھیلے پر حملہ نہ کرے گا بلکہ آپ پر حملہ کریگا وہ بھی جانتا ہے کہ لاٹھی اور ڈھیلے کی خطا نہیں وہ تو مجبور ہے خطا آدمی کی ہے جو اختیار سے ہم کو ستا رہا ہے۔ بہرحال اگر شریعت نہ ہو تو حقیقت سے تو سارے عالم میں فساد ہو جائے لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ شریعت نے جو انسان کے برائے نام ملک اور اختیار کو تسلیم کر کے اس کے احکام مقرر کئے ہیں اس سے یہ تو مقصود نہیں کہ تم حق تعالیٰ کے سامنے بھی اپنی ملک

جتلایا کرو. بس انسان کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تو حقیقت پر نظر رکھے کہ اپنی جان کو اپنی جان نہ سمجھے نہ مال کو اپنا مال سمجھے نہ اپنے کمالات کو اپنے کمالات سمجھے بلکہ سب کو عطایئے حق سمجھتا رہے اور بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے شریعت پر نظر رکھے یہ ایک اشکال تھا جس کو میں نے درمیان میں حل کر دیا اب اصل بات کی طرف عود کرتا ہوں کہ تم حق تعالیٰ سے حساب نہ کرو اور شعبان و رمضان میں تفاوت نہ کرو جب موقع ہو فوراً خرچ کر دو تم کو کیا خبر کہ اس وقت کتنا ثواب ملا رمضان سے کم ملا یا زیادہ کیا عجب ہے کہ اس وقت ضرورت کے وقت جو مسکین کو سہارا مل گیا ہے اس کی دعا عرش سے کتنی اوپر گئی ہوگی اور اس دعا سے تم کو کیا کچھ ملا ہوگا اور مان لو کہ اس وقت رمضان سے کم ہی ثواب ملا تو تم کو یہ کیا خبر ہے کہ رمضان تک تم زندہ رہو یا نہ رہو اور یوں امید تو پہلے زمانہ میں بھی کسی کو نہ تھی کہ ایک دن یقیناً زندہ رہیں گے مگر پہلے زندگی کی ایسی ناامیدی بھی نہ تھی جیسی آجکل ہو گئی ہے کیونکہ آئے دن نئی نئی وبائیں قسم قسم کی بلائیں آتی رہتی ہیں اب تو ایک دن کا بھی کسی کو بھروسہ نہیں اگر کہو کہ ہم وصیت کر جائیں گے کہ رمضان میں اتنی رقم دیدی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وصیت کا ثواب اپنے ہاتھ سے دینے کے برابر نہیں دوسرے کیا بھروسہ ہے کہ ورثہ ادا کریں گے یا نہیں یہ غلطی تو ان لوگوں کو ہوتی ہے جو راغب الی الخیر ہیں اور جو راغب الی الخیر نہیں ہیں ان کے یہاں تو رمضان کا مہینہ آتا ہی نہیں جیسا ایک جنٹلمین کا قصہ ہے کہ رمضان میں ایک دوست اُن سے ملنے گئے تو دیکھا وہ بے تکلف ناشتہ کر رہے سگرٹ پی رہے ہیں کہا کیا آپ رمضان میں ایسا کرتے ہیں کہنے لگے رمضان کیا ہوتا ہے کہا ایک مہینہ کا نام ہے تو جنٹلمین نے مہینوں کی گنتی شروع کی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی۔ الخ کہاں ان میں تو رمضان کا نام کہیں بھی نہیں یہ تو نمبر اول کے جنٹلمین تھے اور جو نمبر دوم کے جنٹلمین ہیں ان کے یہاں رمضان آتا تو ہے مگر بلائے بے درماں کی طرح آتا ہے کیونکہ وہ سارے سال تو مشغول رہتے ہیں۔ جنوری فروری میں رمضان کی خبر ان کو ایک دم ہو جاتی ہے کہ آج رمضان آگیا تو وہ گھبرا کر کہتے ہیں کہ ابھی ابھی تو گیا تھا ابھی پھر آگیا۔ صاحبو! مسلمانوں کو تو شمسی حساب میں ایسا غلو نہ چاہیئے

کرسال بھر بھی اسلامی مہینوں کی خبر نہ ہو یہ میں نے مانا کہ تجارتی ضرورتیں شمسی حساب پر مجبور کرتی ہیں تو میں اس سے منع نہیں کرتا آپ تجارتی کاغذات میں اسی سے حساب رکھئے مگر نجی معاملات میں کونسی مجبوری ہے دوستوں کو جو رات دن خطوط لکھے جاتے ہیں ان میں شمسی حساب کی کیا ضرورت ہے اس کو چھوڑو اور اپنی نجی خط وکتابت میں قمری حساب کو استعمال کرو۔ غرض اس میں شک نہیں کہ رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے اور اس لئے تمام سال میں رمضان کا مہینہ سب مہینوں سے افضل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں جو لوگوں نے سمجھا ہے کہ اس کی وجہ سے طاعات کو دوسرے مہینوں پر ملتوی رکھتے ہیں کہ رمضان میں کریں گے یا درکھو کہ شارع کا یہ مطلب ہرگز نہیں ایک تو یہ غلطی تھی ایک دوسری غلطی پر اور متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ لوگوں نے رمضان کے فضائل میں سے بس یہی یاد کرلیا ہے کہ اس میں حسنات کا تضاعف ہوتا ہے اور یہ نہیں یاد رکھا کہ گناہ کا بھی تضاعف ہوتا ہے کیونکہ مبارک مکان ومبارک زمان میں جس طرح نیکی بڑھتی ہے گناہ بھی بڑھتا ہے جیسا کہ زنا کرنا ہر جگہ بُرا ہے مگر مسجد میں کرنا بہت ہی بُرا ہے۔ اسی طرح رمضان کا گناہ اور دنوں کے گناہ سے سخت ہوگا پس رمضان میں جبکہ طاعات وحسنات کا اہتمام ضروری ہے ایسا ہی سیئات سے اجتناب بھی سخت ضروری ہے مگر یار لوگوں نے گناہوں میں بھی وہی خانہ ساز حساب لگایا ہے جو حسنات میں لگایا تھا یعنی اللہ تعالیٰ سے ضابطہ کرنا چاہتے ہیں چنانچہ علماء سے پوچھتے ہیں کہ یہ کام کرنا کیسا ہے وہ بتلاتے ہیں کہ گناہ ہے تو اس کے بعد سوال ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا سا گناہ ہے یا بڑا گناہ ہے میں ایسے نامعقولوں کو یہ جواب دیتا ہوں کہ کیوں صاحب اگر چھوٹا گناہ ہوا تو آپ کا ارادہ کرنے کا ہے اگر کہے ہاں تو میں کہتا ہوں کہ پھر مجھے بھی اجازت دو کہ تمہارے گھر کے چھپر میں ایک چھوٹی سی چنگاری رکھدوں اور اگر کوئی ایسا کرے اور یہ کہے کہ یہ تو ذرا سی چنگاری ہے اس کا کیا حرج ہے تو تم گوارا کرلو گے اس کا جواب سب یہی دیتے ہیں کہ نہیں کیونکہ ذرا سی چنگاری کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے خدا بری گھڑی نہ لائے تو حضرت ایسی ہی ہر چیز کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے خصوصاً گناہ کا اور ایک گناہ تو ایسا ہے جس کا بڑھنا بڑے ہی غضب کا ہے اور اسی سے لوگ بہت بےفکر ہیں یعنی نگاہ بد۔ کان پور میں ایک شخص بوڑھے ثقہ پابند صوم وصلوٰۃ تہجد گزار تھے مگر اس بدنظری کی بدولت ایک بیہودن کے عشق میں گرفتار تھے اور یہ حال ہوا کہ ایک دن میرے سامنے

رونے لگے اور کہا کہ اس عشق نے تو میرا ایمان بھی برباد کر دیا نہ میرا اسلام کچھ رہا نہ ایمان بس اگر وہ یہودن ہے تو میں یہودی ہوں اور وہ مسلمان ہے تو میں مسلمان ہوں۔ میں نے کہا توبہ توبہ کرو یہ کیا بکنے ہو مگر وہ ایسے بیخود تھے کہ باوجود میرا ادب کرنے کے میرے سامنے بھی ایسے کلمات کفر کہہ گئے۔ حضرت یہ نظر بد سخت خطرناک ہے۔ حدیث میں ہے النظر سہم من سہام ابلیس (روی الحاکم عن ابی حذیفۃ و صحح اسنادہ کذا فی تخریج المراقی) کہ یہ شیطان کا تیر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشاں زدہ ۔۔۔ بحیرتم چہ عجب تیر بے کماں زدہ

(میرے سینے میں ایسا زخم مارا کہ اس کا نام و نشان بھی نہیں ہے میں حیرت زدہ ہوں کہ بدون کمان کے عجب تیر مارا ہے) واقعی یہ تیر بے کمان ہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اس لئے رمضان میں تمام گناہوں سے عموماً اور نظر بد سے خصوصاً نہایت اہتمام کیساتھ بچنا چاہئیے یہ مضمون صرف استطراداً بیان ہو گیا کیونکہ اس وقت جو آیت میں نے پڑھی ہے اور اس سے جو مضمون بیان کرنے کا ارادہ ہے اس کو رمضان سے صرف اسی وجہ سے تعلق نہیں ہے کہ آیت میں انفاق کا ذکر ہے اور رمضان میں انفاق کی فضیلت وارد ہے بلکہ زیادہ تعلق دوسری وجہ سے ہے مگر استطراداً کچھ مضمون انفاق کے متعلق بھی بیان کر دیا گیا کیونکہ آیت میں تو انفاق کا بھی ذکر ہے گو مجھ کو مقصود بالذات دوسرا مضمون ہے اب میں اصل مقصود کو شروع کرنا چاہتا ہوں جس کے لئے اول ترجمہ آیت کا سننا ضروری ہے تاکہ ترجمہ نہ جاننے والوں کو بھی ربط کا عجیب ہونا معلوم ہو جائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں (تاکہ آئندہ انفاق بھی اور دوسرے اعمال صالحہ بھی سہولت سے صادر ہوا کریں) ان لوگوں کے صدقات و نفقات کی حالت مثل ایک باغ کی حالت کے ہے جو بلند زمین پر ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زمین تو نشیب کی اچھی ہوتی ہے جس میں پانی ٹھہرے بلند زمین میں پانی کیونکر ٹھہرے گا۔ جواب یہ ہے کہ زمین بلند سے یہ کیونکر سمجھ لیا گیا کہ وہ گنبد ہے بلکہ بلند بھی ہے اور مسطح بھی ہے کیونکہ بلندی پر ہوا لطیف ہوتی ہے اس کے بعد ارشاد ہے اصابھا وابل اس کو موسلا دھار بارش نصیب ہو گئی تو وہ اپنا پھل دو چند لایا یا چار چند۔ دو باتیں اس لئے کہی کہ ضعف کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ضعف کہتے ہیں مجموعہ مثلین کو تو ضعفین تثنیہ ہے اس کے معنی چار مثل یعنی چار چند کے ہو گئے اور بعض نے کہا ہے

کہ ان مثلین میں سے ہر مثل کو ضعف کہتے ہیں ان کے نزدیک ضعفین کا ترجمہ دو چند ہوگا جیسے زوج کبھی ہر فرد کو کہتے ہیں جس کا تثنیہ زوجین بمعنی صفین آتا ہے اور کبھی مجموعہ فردین کو کہتے ہیں جیسے دو کے عدد کو زوج کہتے ہیں بمعنی مجموعہ عددمن آگے فرماتے ہیں فان لم یصبھا وابل فطل اور اگر اس کو موسلا دھار بارش نہ پہونچے تو پھوار بھی کافی ہے ای فطل یکفیہ او یکفیہ طل یا تو طل مبتدا ہے خبر محذوف ہے یا فاعل ہے جس کا فعل مقدر ہے اور نکرہ کا مبتدا ہونا جو ممنوع ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ مقید نہیں ہوتا اور اگر مفید ہو تو مبتدا ہونا جائز ہے اور یہاں مفید ہے وجہ افادہ کی یہ ہے کہ یہ صورۃً نکرہ ہے اور معنیً نکرہ موصوف ہے کیونکہ طل سے مراد مطلق طل نہیں بلکہ وہ طل ہے جو اس باغ سے لگے اس کو پہونچے اس کے بعد ارشاد ہے واللہ بما تعملون بصیر ؀ اس کا ربط آیت کے اجزاء کی تحلیل سے معلوم ہوگا بدون اس کے معلوم نہ ہوگا اور تحلیل اجزاء میں طول ہے اس لئے اُس کو ترک کرتا ہوں اگر موقع ہوا تو اخیر میں اس پر بھی تنبیہ کر دوں گا خدا کرے یاد رہے۔ اب میں اپنا مقصود جو اس آیت سے مجھے استنباط کرتا ہے بیان کرتا ہوں اور وہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو میں اپنے احباب سے اکثر خاص خطاب سے عرض کیا کرتا ہوں اور آج عام خطاب سے سب کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ پس مسئلہ تو جدید نہیں مگر شاید تقریر میں کچھ جدت آجائے اور قدیم بھی ہو تو ہر قدیم فرسودہ نہیں ہوتا... آسمان کتنا پرانا ہے مگر حالت یہ ہے کہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں فارجع البصر هل ترىٰ من فطور ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاسئا وهو حسير؀ کہ ذرا دیکھو تو کہیں سے کچھ پھٹا ہوا نظر آتا ہے پھر بار بار دیکھو تو نگاہ تھک کر لوٹ آئے گی (اور کوئی شقاق یا فطور نظر نہ آئے گا) شمس و قمر کتنے پرانے ہیں مگر دیکھو ویسے ہی آب و تاب کی ساتھ اب تک موجود ہیں اور بعضے پرانے نئے بڈھوں سے اچھے ہیں۔ بہر حال مضمون کا جدید ہونا کچھ ضرور نہیں مگر آج کل لوگوں کو جدت کا ہیضہ ہے، ہیضہ مردوں کو بھی

ہوتا ہے گو حیض عورتوں ہی کو ہوتا ہے مگر ہیضہ اور حیض قریب ہی قریب ہے۔ تجوید و قرأت سے کون بولتا ہے عام تکلم و تلفظ میں تو حیض ہیضہ برابر ہے۔ قرأت پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک قاری صاحب نے اپنے شاگردوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ہر بات قرأت سے کیا کرو تو ایک دفعہ حقہ پیتے ہوئے قاری صاحب کے عمامہ پر چنگاری گر پڑی شاگرد نے قاری صاحب کے سامنے کھڑے ہوکر ہاتھ باندھ کر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرأت کے ساتھ پڑھ کر نہایت ترتیل سے کہا جناب قاری صاحب جناب قاری صاحب آپ کے عمامہ شریف پر آگ کی ایک چنگاری گر پڑی ہے اور ہر جگہ خوب مد کھینچا اتنی دیر میں عمامہ کی آنگل جل گیا وہ مسئلہ یہ ہے کہ آج کل بعض سالکین کو سہولت کی بہت تلاش ہے جس کی وجہ صرف راحت طلبی ہے جیسے ایک طبیب ماہر کہتا ہے کہ کوئی صورت ایسی ہوتی کہ سارا کھانا ایک دم سے پیٹ میں اتر جایا کرے لقمہ لقمہ نہ کھانا پڑے تاکہ تداخل طعام نہ ہو خیر اس شخص کی اس رائے کی بنا تو ایک مصلحت بھی ہے لیکن آجکل تو ایسا ممکن بھی ہوتا تو اس کی بنا، راحت طلبی ہی ہوتی۔ افسوس آجکل سالکین بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے خود بخود سارا کام ایک دن میں ہو جائے یہ سخت غلطی ہے۔ صاحبو! راحت کی جگہ تو عالم آخرت ہے اور وہاں بھی جو راحت حاصل ہوگی وہ بھی دنیا کی جہد کا ثمرہ ہے۔

ع چندروزے جہد کن باقی بخند

(چند دن مجاہدہ کرلو پھر تعلق مع اللہ کی دولت پانے کے بعد تمام زندگی بہار دائمی سے ہمکنار رہیگی) بدون مشقت و مجاہدہ کے راحت نصیب نہیں ہوسکتی ہاں اگر حق تعالیٰ خود ہی دنیا میں راحت دیدیں تو اور بات ہے تمکو طلب راحت کا کیا حق ہے تمھارا مذاق تو یہ ہونا چاہیئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندہ کریں آپ کی عطا ہے اگر قتل کریں آپ پر میری جان فدا و قربان ہے دل تو آپ پر قربان ہے جو چاہیں آپ ہمارے ساتھ معاملہ فرمائیں)

مولانا ایسے ہی لوگوں کی بابت فرماتے ہیں ؎

پس زبون وسوسہ باشی دلا   گر طرب را باز دانی از بلا

(اے دل اگر تو راہ عشق کی کلفتوں کو عیش سمجھنے کے بجائے بلا سمجھے گا تو نامراد ہوکر

بُرے وسوسوں میں مبتلا رہے گا)

اور فرماتے ہیں ؎

تو بیک زخمی گریزانی زعشق   تو بجز نامی چہ می دانی زعشق

(تو ایک ہی زخم سے اپنے دعویٰ عشق سے بھاگ نکلا پھر تو سوائے نام عشق سن لینے کے اور عشق کا مفہوم تو کچھ نہیں جانتا)

پس آجکل سالکین کی محبت و طلب کی یہ حالت ہے جیسے ایک شخص ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کہا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ کسی ظریف نے سُن لیا اس نے اُس کے ساتھ دل لگی کی کہ اگلے دن اندھیرے سے اس درخت پر ایک رسی ساتھ لیکر جا بیٹھا جب رات کو وہ شخص آیا اور وہی دعا شروع کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ لے تو اس ظریف نے دبی زبان سے کہا کہ اے میرے بندے آج میں تجھے کھینچتا ہوں یہ رسی اپنے گلے میں ڈال لے وہ بڑا خوش ہوا کہ اب مجھے معراج ہو گی رسی کا پھندا فوراً گلے میں ڈال لیا اور ظریف نے کھینچنا شروع کیا جب ایک بالشت زمین سے اٹھا اور پھندے سے گلا گھٹنے لگا تو فوراً کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے چھوڑ میں نہیں کھنچتا اس نے رسی چھوڑ دی اور اس نے فوراً پھندا گلے سے نکالا اپنے گھر کا رستہ لیا پھر ساری عمر اس درخت کے نیچے جانے کا نام نہیں لیا بس یہی حالت آجکل کے طالبوں کی ہے کہ جبتک تکلیف نہ ہوتی کہ عمل میں بھی کچھ مشقت نہ ہو اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت و عشق کا دعویٰ ہے اور جہاں کچھ تکلیف یا مشقت ہوئی سارا عشق رخصت ہوا حالانکہ ان کو تو جان دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے۔

متاع جان جاناں دینے پر بھی سستی ہے الی آخرہ

مگر اب سالک سالک نہیں ہونا چاہتے بلکہ مالک ہونا چاہتے ہیں اسی لئے سہولت کے طالب ہیں چنانچہ میرے پاس کثرت سے خطوط میں یہ فرمائش آتی ہے کہ کوئی سہل طریقہ آسان سا عمل کوئی سہل سا نسخہ بتلا دیجئے ایسی درخواست کا جواب ایک بزرگ نے خوب دیا ان سے ایک پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر نے یہی درخواست کی تھی کہ کوئی سہل سا طریق بتلا دیجئے

جس سے بہت جلدی کامیابی ہو جائے بزرگ نے ابھی اس کا جواب نہیں دیا بلکہ باتوں میں لگایا اور باتوں باتوں میں ان سے دریافت کیا کہ ڈپٹی صاحب ذرا اپنی سوانح عمری تو بیان فرمایئے کہ آپ نے کیا کیا پڑھا اور کس طرح ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ انھوں نے اپنی سرگذشت بیان کی کہ بارہ سال تک انگریزی پڑھی بی۔ اے کا امتحان دیا پھر قانون کا امتحان دیا پھر سال بھر تک ملازمت کے لئے سفارشیں حاصل کیں درخواستیں دیں تو نائب تحصیلدار رہا پھر کئی سال کے بعد تحصیلدار رہا پھر ڈپٹی کلکٹر ہوا اور سالہا سال کی ملازمت کے بعد اب پنشن ملی ہے۔ جب یہ اپنی سرگذشت بیان کر چکے تو بزرگ نے فرمایا کہ آپ کو شرم تو نہیں آتی کہ دنیا مردار کیلئے تو اتنی عمر برباد کی اور مشقتیں برداشت کیں اور طلب خدا کے لئے یہ درخواست ہے کہ تھوڑی سی مدت میں کامیابی ہو جائے۔ ڈپٹی صاحب کم از کم طلب خدا کے لئے اس سے دگنی مدت تو صرف کرو کیونکہ آخرت دنیا سے افضل ہے۔ تو افضل کے لئے مفضول سے دگنی مدت تو چاہئے ورنہ مساوی تو ضرور چاہئے۔ واقعی عقل کا مقتضٰی تو یہی ہے جو ان بزرگ نے فرمایا۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ جو لوگ طلب خدا میں سہولت کے طالب ہیں وہ کیسی سخت غلطی میں مبتلا ہیں ہم کو تو وہ کام کرنا چاہیئے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے۔ وصول و حصول کا تقاضا نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ہماری برائے نام کوشش پر وصول و حصول کا مرتب ہو جانا خود خلاف قاعدہ ہے تو اس برائے نام کوشش پر حصول ثمرات کا اپنے کو مستحق سمجھنا اور عدم حصول کی شکایت کرنا سخت ناانصافی ہے اور وہ کام کیا ہے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے وہ تحصیل عمل بالاختیار ہے کہ اپنے اختیار کو صرف کر کے اعمال کو بجالائیں اور اسی استعمال اختیار کا دوسرا لقب امانت ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان ط کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین و جبال پر پیش کی کہ اس کا تحمل کرتے ہو تو سب نے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ اس امانت سے مراد کیا ہے محققین علماء فرماتے ہیں کہ اس سے تکلیف تشریعی مراد ہے اور تکلیف کے معنی تحصیل عمل بالاختیار کیونکہ مطلق عبادت و اطاعت سے تو کوئی شے خالی نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم استوی الی السماء

وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین ۔ کہ ہم نے زمین و آسمان سے کہا کہ ہمارے احکام (تکوینیہ) کے لئے تیار ہو جاؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے سب نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے تیار ہیں اور لفظ طائعین سے صاف رد ہو رہا ہے ان لوگوں کا جو سموات و ارض و جمادات کی عبادت کو حالیہ یا قسریہ کہتے ہیں میں کہتا ہوں کیا قسر و حال میں طوع بھی ہوا کرتا ہے ہرگز نہیں۔ بہر حال عادل و مطیع تو تمام مخلوقات ہیں لیکن مکلف سب نہیں بجز انسان کے اس سے معلوم ہوا کہ تکلیف و اطاعت میں فرق ہے اور جس امانت سے تمام عالم گھبرا گیا وہ تکلیف ہی ہے جس سے مراد عمل مع الاختیار ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالے نے تمام مخلوق سے یہ فرمایا تھا کہ ہمارے کچھ احکام تشریعیہ ہیں ان کا مکلف بالاختیار کون ہوتا ہے یعنی جو شخص ان کا تحمل کریگا اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کی جاوے گی یعنی اس کی قوت ارادیہ ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہ ہوگی بلکہ عمل و عدم عمل دونوں پر قدرت دیجائے گی پھر جو اپنے اختیار سے احکام کو بجالائے گا اسکو مقرب بنالیا جائے گا اور جو اپنے اختیار سے احکام میں کوتاہی کریگا اس کو مطرود کر دیا جائے گا۔ اس سے سموات و ارض و جبال اور تمام مخلوق ڈر گئی۔ انسان اسکے لئے تیار ہو گیا تو اللہ تعالے نے اس کو مکلف بنا دیا یعنی اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کر دی گئی۔ باقی مخلوقات میں یہ صفت اختیار اور عقل نہیں ہے (وہ جن احکام تکوینیہ کو یا عبادت کو بجالاتے ہیں وہ ان کیلئے طبعی ہیں یعنی ان کی قوت ارادیہ اس کے خلاف کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی بخلاف انسان کے کہ جن احکام کلیہ مکلف ہے وہ اس کے لئے طبعی نہیں بلکہ اس کی قوت ارادیہ عمل و عدم عمل دونوں کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اب اس کی تکلیف کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ اپنے اختیار سے ایک جانب کو ترجیح دے یعنی جانب عمل کو مامورات اور جانب عدم عمل کو منہیات میں اسی کا نام تحصیل عمل ہے) اور اس سے یہ لازم نہیں کہ غیر انسان عاقل نہ ہو ممکن ہے کہ دوسری مخلوقات بھی عاقل ہوں مگر عاقل کامل نہیں یعنی ان کو عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں جو تکلیف احکام کے لئے کافی ہو۔ آخر صبی مراہق بھی تو عاقل ہے مگر باوجود عقل کے مکلف نہیں کیونکہ اس کی عقل کامل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو اور چونکہ اس پر کوئی شرعی **اشکال** لازم نہیں آتا اس لئے میں اسکا قائل ہوں کہ تمام

مخلوقات، حیوانات و نباتات حتی کہ جمادات بھی عاقل ہیں یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ انسان کے سوا سب غیر عاقل ہے ہاں یہ مسلم ہے کہ ان میں اتنی عقل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو پس وہ مثل مراھق کے عاقل ہو سکتے ہیں اس کی کسی نص سے نفی نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے۔ آخر ہد ہد کی گفتگو حضرت سلیمانؑ کی ساتھ جو قرآن میں مذکور ہے کیا یہ سب طبعی کلام ہے ہرگز نہیں بلکہ عاقلانہ کلام ہے اور اگر اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ قرار دو کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی خدمت کے لئے بعض حیوانات کو عقل دیدی تھی تو میں کہوں گا کہ اب بھی بعض حیوانات کی حرکات ایسی ہوتی ہیں جن کو خالی از عقل کہنا دشوار ہے چنانچہ جس کی حکایت میں اب بیان کرتا ہوں وہ مرحوم؎ مرگیا یعنی ہمارے گھر میں ایک طوطا تھا اس نے ایک دن بیبیوں کو پان کھاتے دیکھ کر خود بھی پنجرہ سے نکلکر اس ترتیب سے پان کھایا کہ اول تو پان کا ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا پھر چونہ کی ڈبیہ میں سے چونچ پر ذرا سا چونہ لیا پھر کتھ کی ڈبیہ میں سے کتھ لیا اور دو دانہ چھالیہ کے اٹھائے اور سب کو ملا کر کھا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہاں ہی تمباکو کی ڈبیہ تھی مگر تمبا کو نہیں کھایا سب کو اس حرکت پر حیرت ہوگئی کہ اس نے کیونکر با قاعدہ سارا کام کیا اور جب حیوانات میں بھی ایک درجہ عقل کا ہوسکتا ہے اور اس کے بعد بھی وہ مکلف نہیں تو یہاں سے سمجھ لو کہ اگر مجاذیب میں بھی ایک درجہ عقل کا ہو تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے اور یہ نہ کہنا چاہیئے کہ ان کو تو کھانے پینے کا پورا ہوش ہے پھر یہ مجذوب کدھر سے ہوئے اسی لئے شیخ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ مجاذیب پر اعتراض نہ کرو گو ظاہر میں وہ صحیح الحواس معلوم ہوں کیونکہ صحت حواس تو بہائم میں بھی ہے جانور بھی اپنے نفع و نقصان کو سمجھتا ہے مگر اتنے ادراک سے وہ مکلف نہیں ہوا تو مجذوب بھی باوجود عقل قلیل کے غیر مکلف ہو سکتا ہے جس کی مثال واضح وہی ہے صبی مراھق کی مگر اس کے لئے ایک معیار بھی ہے کہیں تم کافروں کو بھی مجذوب نہ کہنے لگو وہ معیار یہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

جملہ دانایاں ہمیں گفتہ ہمیں ہست داناں رحمۃ للعالمیں

(جملہ اہل عقل کا مقولہ ہے اور واقعی دین کا محقق تمام کائنات کے لئے اپنے دور حیات میں رحمت ہوتا ہے)

؎ ظرافت سے مرحوم کہدیا ۱۲

یہ دوسرا مصرع جملہ معترضہ ہے جو بطور مدح کے درمیان میں لایا گیا ہے کہ واقعی محقق بھی عالم کے لئے سراپا رحمت ہے یہ گفت کا مقولہ نہیں اس کا مقولہ اگلے شعر میں ہے ؎

گر انارے می خری خنداں بخر   کہ دہد خندہ اش زدانہ او خبر

(شعر اول میں جملہ اہل عقل کا مقولہ یہ ہے کہ جب انار خریدنے کا ارادہ ہو تو کھلا ہوا خریدنا کیونکہ انار کا کھلنا اس کے اندر کے دانتوں کی حالت سے آگاہ کرتا ہے)

کہ اگر ایک انار خریدو تو کھلا ہوا خریدو کیونکہ کھلے ہوئے انار کا اندرونی حال ظاہر ہوجاتا ہے بند انار مت لو کہیں اندر سے کچا اور خراب نہ نکلے ؎

نامبارک خندۂ آں لالہ بود   کہ خنداں او سواد دل نمود

(گل لالہ کا کھلنا اس کے لئے نامبارک ہے کیونکہ اس سے اس کے اندر کا عیب (سیاہی) ظاہر ہوجاتا ہے)
مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی صحبت اختیار کرو اور اس سے فیض لینا چاہو تو پہلے علامات و آثار کو دیکھ کر اسے جانچ لو اگر وہ سالک ہو تو آثار سلوک کو دیکھو اور اگر مجذوب ہو تو یہ دیکھو کہ اس زمانہ کے صلحاء اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں اگر وہ اس کو مجذوب کہیں اچھا سمجھیں تو وہ اچھا ہے گو نماز روزہ کا پابند نہ ہو۔ اگر صلحاء زمانہ اس کو مجذوب نہ سمجھیں اور ظاہری حالت اس کی خلاف شرع ہو تو اس کے پاس نہ جاؤ تو امانت یہ تھی کہ اللہ تعالےٰ نے مخلوقات سے فرمایا کہ یہ صفت اختیار ہے اور یہ عقل ہے ان کو کون لیتا ہے جو ان کو لے گا وہ مکلف احکام بنایا جائیگا اس سے سب ڈر گئے اور انسان تیار ہوگیا پس مکلف بجز انسان و جنات کے کوئی نہیں اور شمس و قمر و احجار جو جہنم میں جائیں گے تو معذب ہوکر نہ جائیں گے تاکہ تکلیف کا شبہ ہو بلکہ آلۂ تعذیب ہوکر جائیں گے تاکہ کفار کو ان کو دیکھ کر حسرت ہو کہ افسوس ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا جو ہماری تو کیا اپنی بھی امداد نہیں کرسکتے اور گو امداد امداد کا علم غیبت میں بھی ہوسکتا تھا مگر اس صورت میں کفار کو یہ وسوسہ ہوتا کہ نہ معلوم خداتعالےٰ نے ہمارے معبودوں کو کہاں مقید کردیا جو ہماری امداد نہ کرسکے اس لئے سب کو پاس پاس کردیں گے کہ لو یہ تمہارے معبود ہیں اگر ان میں کچھ طاقت ہے تو ان سے امداد طلب کرلو اس صورت میں ان کو حسرت زیادہ ہوگی اب یہاں ایک سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ انسان کو

کیا سوجھی تھی جو اس امانت کے لئے تیار ہو گیا کیا یہی سب سے بڑا تیس مار خاں تھا اس کا جواب یہ ہے کہ انسان میں عشق کا مادہ بہت زیادہ ہے اسی لئے میں ابتداء طالب علمی میں کہا کرتا تھا کہ انسان کی حقیقت حیوان عاشق ہے اس کی فصل عاشق ہے کیونکہ ناطق تو جنات و ملائکہ بھی ہیں عاشق انسان کے سوا کوئی نہیں (اور عشق و محبت میں فرق ہے اس لئے محبت کا وجود ملائکہ و جنات میں بھی ہو سکتا ہے میں محبت کی ان سے نفی نہیں کرتا عشق کی نفی کرتا ہوں جس کے لئے جوش اور شوق اور ہیجان و ولولہ لازم ہے ۱۲) غرض انسان میں عشق بہت زیادہ تھا اور اس وقت بھی تھا جبکہ اسکو عقل کامل بھی عطا نہ ہوئی تھی (کیونکہ عقل کامل تو بعد حمل امانت کے عطا ہوئی اور غلبہ عشق تو قلت عقل ہی میں زیادہ ہوتا ہے اسی لئے کیفیات باطنہ کا غلبہ قلیل العقل پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ غلبۂ کیفیات کے لئے یکسوئی شرط ہے جو غیر عاقل کو زیادہ میسر ہوتی ہے اور عاقل کو تو یکسوئی کے برابر بھی یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کا دماغ برابر کام کرتا رہتا ہے اور یہ گفتگو قاعدہ کی بناء پر ہے ورنہ باب جذب الٰہی ہر شخص پر مفتوح ہو سکتا ہے وہ کسی قاعدہ سے مقید نہیں۔ بہر حال انسان کے حمل امانت کا منشاء عشق تھا اور اس کو میں نے عارف شیرازی کے کلام سے سمجھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان نے شریعت کے بار کو اٹھانے سے عاجزی ظاہر کی اور ہم دیوانوں کے نام قرعۂ فال نکل آیا یعنی انسان نے سر پر یہ بار اٹھالیا۔)

اس میں لفظ دیوانہ سے منشاء حمل امانت پر اشارہ ہے (اور اسی سے معلوم ہو گیا کہ عشق دیوانگی کا نام ہے جو محبت کے علاوہ درجہ ہے ۱) جب یہ معلوم ہو گیا کہ امانت اختیار و عقل کا نام ہے تو جو لوگ تسہیل کے طالب ہیں وہ اس امانت اختیار کو برباد کرنا چاہتے ہیں کہ بس ہم کو اپنے ارادہ اور اختیار سے کچھ نہ کرنا پڑے مفت سہولت سے کام ہو جایا کرے کوئی ایسا حال غالب ہو جائے کہ گناہ خود بخود چھوٹ جائیں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے ایسا استغراق ہو جائے کہ نماز میں خود بخود دل لگنے لگے ہمکو احضار قلب کی ضرورت نہ ہو گویا یہ شخص صفت اختیار کو معطل کرنا چاہتا ہے اور جو شخص امانت الٰہیہ کو اور ایسی بڑی نعمت کو ضائع کرے جس میں انسان تمام مخلوق سے

ممتاز ہے اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا بزرگوں نے تو اللہ تعالٰی کے تجلیات کی اس قدر عظمت کی ہے کہ ایک بزرگ نے کسی صوفی کے متعلق سنا کہ وہ کھانا کھاتے ہوئے لذیذ شوربے میں پانی کا پیالہ بھر کر ڈالدیتا ہے تاکہ نفس کو لذت نہ آئے فرمایا طفل طریقت ہے یہ اس تجلی الٰہی کو رد کرتا ہے جو لذیذ طعام کے ساتھ متعلق ہے اور اس حکمت کو برباد کرتا ہے جو لذائذ دنیا میں رکھی گئی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ یہ نمونہ ہوں لذائذ آخرت کا مگر اس تجلی کا انکشاف اور اس حکمت کی معرفت محض نیت کرنے اور نویت ان اکل اللذیذ لیکون انموذجاللاخرۃ کہنے سے حاصل نہیں ہوتی کہیں آپ آج ہی سے نفس پرستی اور لذات میں انہماک شروع کر دیں بلکہ اس کی معرفت بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

صوفی نشود صافی تا در نہ کشد جامی　　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(صوفی کے نفس کی صفائی نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اللہ تعالٰی کی محبت کا جام نہ پیئے بہت مجاہدات کے بعد خامی پختگی سے تبدیل ہوتی ہے) اس لئے بسیار سفر کی ضرورت ہے اور بسیار سفر کو تو آپ کیا سمجھیں گے میں اس وقت دو سفر بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ سالک کا ایک سفر تو الی الاحوال ہے کہ اس پر حالات طاری ہوتے ہیں اور ایک دوسرا سفر من الاحوال ہے جس میں وہ سب احوال سلب ہو جاتے ہیں پھر اس کے بعد دوسرے نوع کے احوال عطا ہوتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے باغ میں درختوں پر دو قسم کے پھول آتے ہیں ایک چھوٹا پھول ہوتا ہے وہ چند روز کے بعد جھڑ جاتا ہے اس وقت ناواقف روتا ہے کہ ہائے میرا باغ برباد ہو گیا مگر محقق خوش ہے کہ الحمد للہ سفر اول ختم ہو کر سفر ثانی شروع ہوا زاول عروج ہے۔ دوسرا نزول ہے ۱۲ ظ) پھر سچا پھول آتا ہے وہ باقی رہتا ہے اب اس پر پھل لگنے شروع ہوتے ہیں یا جیسے صبح دو ہوتی ہیں کاذب جس کا نور جلدی ہی زائل ہو جاتا ہے۔ دوسری صادق جس کا نور بڑھتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اے شدہ تو صبح کاذب را رہین　　　صبح صادق را ز کاذب ہم ببین

(اے شخص تو صبح کاذب کے فتنے میں پڑ گیا اور دھوکہ سے اسی کو صبح صادق سمجھ گیا حالانکہ صبح صادق کی تحقیق تجھ پر لازم تھی تاکہ کاذب اور صادق کا فرق معلوم کر سکے)

؎ اور عجیب بات ہے کہ پہلا پھول زیادہ بھڑک دار ہوتا ہے۔ دوسرا بھڑک دار نہیں ہوتا یہی کیفیت حالات تلوین تمکین کی ہے ۱۲ ظ

مولانا نے سفر اول کو صبح کاذب سے تشبیہ دی اور سفر ثانی کو صبح صادق سے کہ جیسے اول صبح کاذب کی روشنی آتی ہے جس کی روشنی بڑھتی چلی جاتی ہے اسی طرح سالک پر دو حالتیں گذرتی ہیں ایک میں احوال ناقصہ عطا ہوتے ہیں اور دوسری منزل میں احوال ناقصہ سلب ہو کر احوال کاملہ عطا ہوتے ہیں۔ اب یہ شخص پختہ ہو گیا اس کو حق ہے کہ لذائذ بھی کھائے اور عمدہ لباس بھی پہنے کیونکہ اب یہ ہر شئے میں تجلی حق کا مشاہدہ کرتا اور اس کا حق ادا کرتا ہے۔ صوفی خام کو حق نہیں کہ مرغ مسلّم کھایا کرے لیکن اگر بلا تکلف مل جائے تو انکار بھی نہ کرے کھالے بشرطیکہ حلال ہو اور حلال بھی خالص ہونا ضرور نہیں بلکہ نخالص بھی کافی ہے یعنی جو فتوی سے حلال ہو بس وہ حلال ہے زیادہ کاوش اور تقویٰ بھگارنے کی ضرورت نہیں جیسے ایک شخص کی ہمارے قصبہ کے افسر پولیس نے دعوت کی تھی آپ نے دعوت قبول کر کے عین وقت پر کھود کرید شروع کی کہ یہ دودھ کہاں سے آیا گوشت کس طرح آیا غلہ کیسے داموں سے آیا تنخواہ کے روپیہ سے یا رشوت سے غرض بھرے مجمع میں داعی کو ذلیل کیا یہ تقوی کا ہیضہ ہے اگر کسی شخص پر اطمینان نہ ہو تو یا تو اس کی دعوت ہی منظور نہ کرے لطیف پیرایہ سے عذر کر دے یہ نہ کہے کہ آپ کی آمدنی حرام ہے اس لئے دعوت قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس عنوان سے اس کی دل شکنی ہوگی باقی امر بالمعروف کے لئے اور بھی بہت وقت ہے اسیوقت امر بالمعروف ضرور نہیں کیونکہ امر بالمعروف میں یہ بھی شرط ہے کہ ایسا وقت اور موقعہ تجویز کرے جس میں مخاطب کے قبول کی امید ہو بس یا تو عذر کر دے یا یہ کر دے جیسا میں نے ایک تھانہ دار سے معاملہ کیا انھوں نے میری دعوت کی میں نے مجمع کے سامنے تو بلا شرط قبول کر لی پھر تنہائی میں لیجا کر ان سے کہہ دیا کہ ذرا کھانے میں اس کی رعایت رکھی جائے کہ تمام سامان تنخواہ کی رقم سے کیا جائے۔ وہ کہنے لگے صاحب بھلا یہ کب ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھی ناپاک مال کھلاؤں۔ اس طرح اپنا بھی بچاؤ ہو گیا اور داعی کی دل شکنی بھی نہ ہوئی غرض یہ کہ جو مال فتوی سے حلال ہو اس میں تامل نہ کرو۔ مولانا فضل الرحمٰن خاں صاحب گنج مرادآبادی کے ایک خلیفہ تھے جو حاضر خدمت رہتے تھے ایک بار مولانا کے یہاں کہیں سے کھانا آیا حضرت

نے ان کے پاس بھیج دیا وہ کہنے لگے کہ آپ نے کچھ تفتیش بھی کرلیا ہے کہ حلال ہے یا حرام تو مولانا نے فرمایا ارے کھالے بڑا حلال کھانے والا آیا زیادہ تحقیق کرے گا تو بھوکوں مرجائے گا۔ مولانا کا مطلب بھی یہی تھا کہ جو مال فتویٰ سے حلال ہو وہی کافی ہے گو اہل ورع کے نزدیک حلال نہ ہو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اہل اللہ کو تو عطائے حق کی اتنی قدر ہے کہ ان بزرگ نے شوربہ میں پانی ملانے والے صوفی کو طفل طریقت فرمایا کہ تجلی الٰہی کو برباد کرتا ہے اور وہ تجلی مذکور ہے نعماء آخرت کی اور اس کو فقہا نے بھی سمجھا ہے میں ان کو بھی حکماء امت سمجھتا ہوں جیسا کہ صوفیہ کو سمجھتا ہوں اور حیرت ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں بڑا جھگڑا ہے مگر یہ جھگڑا غیر محققین میں ہے محقق دونوں کا جامع ہوتا ہے تو ہدایہ میں جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ چار انگشت تک ریشم مردوں کو بھی جائز ہے وہاں ایک دلیل تو نقلی لکھی ہے اور ایک دلیل عقلی لکھی ہے لتکون انموذجا لحریر الجنۃ یعنی تھوڑا سا ریشم مردوں کے لئے اس واسطے جائز کردیا گیا تاکہ حریر جنت کا نمونہ سامنے ہوجائے پھر یہ حکمت دیگر لذائذ ونعم کو بھی عام ہے اس لئے اس کے ابطال کو محقق نے ناپسند کیا اور مبطل کو طفل طریقت کہا اسی طرح جو شخص سہولت کا طالب ہے وہ امانت الٰہیہ اختیار کو باطل کررہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے اہل اللہ نے بہت سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

چنانچہ ایک بار حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ وعظ فرمارہے تھے کہ درمیان میں دفعۃً ساکت ہوگئے اور کچھ دیر تک ساکت رہ کر پھر بیان شروع فرمایا اور کہا کہ اس وقت میرے سکوت کی یہ وجہ ہوئی کہ ایک بزرگ ابھی شام سے بغداد ایک قدم میں بطور کرامت کے آئے تھے میں نے ان کو متنبہ کیا ہے کہ اس تصرف میں حکمت عطائے قدم کا ابطال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قدم اس لئے دیئے ہیں تاکہ ان سے مشی کا کام لیا جائے جب بطور کرامت کے راستہ طے کیا جائے گا تو اس میں یہ حکمت باطل ہوگی وہ بزرگ اس سے توبہ کرکے واپس ہوگئے (مطلب یہ ہے کہ از خود ایسا تصرف نہ کرنا چاہیے اور اگر بلا قصد کے کبھی حق تعالیٰ طویل راستہ کو قصیر کردیں تو وہ کرامت غیر اختیاریہ ہے

جو نعمت ہے نیز طریق کی دعا کا بھی مضائقہ نہیں جیسا حدیث میں ہے اللھم اطو عنا البعد صرف تعرف بالقصد کی ممانعت ہے ۱۲) اسی طرح ایک بار ہمارے حضرت حاجی صاحب کے یہاں بے وقت بہت سے مہمان آگئے گھر والوں کو فکر ہوئی تو حضرت نے اپنا رومال گھر میں بھیجدیا کہ اس کو آٹے پر ڈھک دو اور پکانا شروع کرو ان شاءاللہ تعالیٰ برکت ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایسی برکت ہوئی کہ سب مہمانوں نے فراغت سے کھانا کھالیا اور بہت بچ رہا۔ اس کی اطلاع حضرت حافظ محمد ضامن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کو ہوئی تو آپ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کرامت مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا تعرف عطا فرمایا۔ بس آپ کا رومال سلامت رہے۔ پھر دنیا میں قحط تو کیوں آئے گا۔ اور قحط میں جو حکمتیں ہیں وہ کیوں باقی رہیں گی۔ حضرت حاجی صاحب کو تنبیہ ہوا اور فرمایا حافظ صاحب میں اس سے توبہ کرتا ہوں ان شاءاللہ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا۔ تو حضرت جب اہل اللہ نے حق تعالیٰ کی ذرا ذرا سی تجلیات کی اس قدر عظمت کی ہے اور ان کی حکمتوں کے ابطال کی ممنوع قرار دیا ہے تو بتلایئے اتنی بڑی امانت کا ابطال جس پر تکلیف کا مدار ہے کیونکر ممنوع ہوگا۔ اب میں ان لوگوں کو متنبہ کرتا ہوں جو طریق میں سہولت کے طالب ہیں کہ وہ اس بے ادبی سے توبہ کریں جس کا بے ادبی ہونا بھی شاید ان کو اب تک معلوم نہ ہوا ہوگا بلکہ وہ اب تک اس طلب سہولت کو دینداری سمجھتے ہوں گے مگر وہ کان کھول کر سن لیں کہ اس طلب میں وہ امانت الٰہیہ کا ابطال کر رہے ہیں پس سہل یہ ہے کہ وہ بجائے تسہیل کے اسہال لے لیں جس سے ضعف ہو جائے گا تو پھر یہ معذور ہو جائیں گے۔ اس وقت مولانا ان کے لئے عذر کا فتویٰ دیدیں گے، پھر وضو کی جگہ تیمم ہو جائے گا اور زیادہ ضعف ہوا تو بجائے قیام کے قعود رہ جائے گا اور اس سے بھی زیادہ ضعف ہوا تو صوم و صلوٰۃ سب ساقط ہو جائیں گے جو کامل سہولت ہے اور جب تک معذور نہیں ہوئے اس وقت تک سہولت کی طلب کے کیا معنی جو کہ معذورین کے لئے خاص ہے بلکہ غور کیا جائے تو وہاں بھی ان کو سہولت مزعومہ نہیں ہے کیونکہ اس عذر کے

سبب وہ سہل عمل بھی ان کو دشوار ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ تم تحصیل عمل کے مکلف ہو کہ اپنے
اختیار کو صرف کرکے عمل کرو تم کو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں۔ ہاں صرف اتنا حق ہے
کہ عمل تمھارے اختیار و قدرت سے خارج نہ ہو سو اس کا شریعت میں پورا لحاظ
ہے کہ امور غیر اختیاریہ کا تم کو مکلف نہیں کیا بلکہ اختیارات کا مکلف بنایا ہے
اب تم یہ چاہتے ہو کہ اختیارات میں ارادہ و اختیار و قدرت کے استعمال کی بھی
ضرورت نہ رہے اس کا تم کو کیا حق ہے بلکہ اس میں سراسر ابطال امانت اختیار
ہے جس کا جرم ہونا اوپر واضح ہو گیا پس تم کو تو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں ہاں اگر
شریعت کسی جگہ خود تسہیل کا لحاظ کرے تو یہ اس کی عنایت ہے مگر تم کو اس کے
مطالبہ کا حق نہیں۔ اور نصوص میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے بعض
مقامات پر تحصیل و تسہیل دونوں کو جمع بھی کر دیا ہے مگر اس کا التزام نہیں کیا بعض
جگہ محض تحصیل عمل کا امر ہے تحصیل مبحوث عنہ کی رعایت نہیں کی۔ تفصیل اس
اجمال کی یہ ہے کہ شریعت میں کہیں تو صرف امر و نہی ہے کہ اس کام کو کرو اور اس
کو نہ کرو یہ تو تحصیل کا عنوان ہے اور کہیں امر و نہی کی ساتھ سہولت عمل کا طریقہ
بھی بتلا دیا ہے جس میں تکلیف و عنایت دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ مگر اس سے یہ
سمجھ لینا کہ شارع کے ذمہ تسہیل بھی ہے سخت نادانی ہے۔ شارع کو حق ہے کہ
امور اختیاریہ کی تحصیل کا امر کرے اور سہولت عمل کا طریقہ نہ بتلائے اور اگر
چاہے تو بتلا بھی دے۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھ کر اب سنئے کہ اس مقام پر حق تعالے
نے انفاق کا امر فرمایا ہے یہ تو تحصیل ہے مگر اس میں تکلیف کی ساتھ عنایت کو بھی جمع کر دیا ہے
بعبارت دیگر یوں کہئے کہ طلب تحصیل کی ساتھ تسہیل کی بھی رعایت کی ہے بیان اس کا یہ ہے کہ انفاق
فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری کے لئے عادۃً تصور غایت ضروری ہے جس کے بغیر صدور
نہیں ہو سکتا پس صدور فعل کے لئے تصور غایت کا شرط عادی ہونا ضروری ہے اور وہ بھی اکثر ی
لیکن اس میں مجھ کو کلام ہے کہ تصور غایت عقلاً بھی لازم ہے یا نہیں حکماء اس کو عقلاً لازم کہتے ہیں
اسی لئے تصور غایت کو علت شمار کیا ہے جس کو علت غائیہ سے موسوم کرتے ہیں مگر اس کے لزوم عقلی میں

کلام ہے۔ آپ مدرسہ میں جاکر طلباء سے پوچھئے کہ وہ کس لئے پڑھ رہے ہیں سو میں سے ساٹھ بھی غایت نہ بتلاسکیں گے اور جو بتلائیں گے بھی ان میں بہت سے اسی وقت گھڑیں گے اور لیجئے کھانا تو سب کھاتے ہیں اور یہ فعل اختیاری ہے ذرا بتلا دو کہ کھانے کے وقت کیا غایت ذہن میں ہوتی ہے اور کیا سوچ کر کھاتے ہو یقیناً بہت سے آدمی کچھ بھی نہیں سوچتے اور کوئی غایت ان کے ذہن میں نہیں ہوتی ہاں جو ان پڑھ ہیں ان کی تو البتہ اس میں ایک غایۃ ہوتی ہے وہ کیا ہے خائط (پاخانہ) کہ کھائیں اور ہگیں۔ . . . اور وہ بھی لازم التصور نہیں بلکہ لازم الترتب آپ تعجب کریں کہ یہ کیسی غایت ہے ایک بڑے فلسفی نے یعنی صاحب شمس بازغہ نے بھی شمس بازغہ میں غایت کی یہ بھی ایک قسم لکھی ہے کالتغوط للاکل بندہ خدا کو مثال بھی ایسی ہی ملی مگر اعتراض کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہر شخص کا اپنا اپنا مذاق ہے ان فلسفیوں کی طبیعت ایسی ہی ہوگی۔ جیسے ایک بادشاہ نے چار سمت کی چار عورتیں جمع کی تھیں ایک دفعہ اس نے سب کی طبائع کا امتحان کرنا چاہا اور رات کے اخیر حصہ میں سب سے پوچھا کہ اب کیا وقت ہے سب نے باتفاق کہا کہ صبح ہوگئی اس نے دلیل پوچھی تو ایک نے کہا کہ میری نتھ کا موتی ٹھنڈا ہو گیا ہے یہ بہت لطیف وجہ بیان کی کیونکہ صبح کی ہوا میں خنکی زیادہ ہوتی ہے اس نے موتی کی ٹھنڈک سے اس پر استدلال کیا۔ دوسری نے کہا کہ پان کا مزہ منہ میں بدل گیا ہے۔ تیسری نے کہا کہ شمع کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے یہ دلائل تو لطافت ادراک پر مبنی تھے۔ چوتھی نے کہا کہ میرا گوہ آرہا ہے بادشاہ نے اس بیوی کو الگ کر دیا کیونکہ اس کے جواب سے کثافت فہم مترشح تھی تو جیسے ان جوابات کی بنا اختلاف مذاق پر تھی ایسے ہی شمس بازغہ کی مثال ان فلسفیوں کے مذاق کی خبر دے رہی ہے۔ غرض مجھے افعال اختیاریہ میں تصور غایۃ کا لزوم عقلی مسلم نہیں ورنہ تخالف نہ ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعادۃ اکثریہ بدون تصور غایۃ کے افعال اختیاریہ کا صدور دشوار ہے خصوصاً افعال شاقہ کا اور اتفاق فعل شاق ہے تو اس کے قبل اس کی غایت کا تصور ضروری ہوگا سو یہاں دو غائتیں مذکور ہیں۔ اول غایت تو یہ بیان فرمائی ابتغاء مرضات اللہ کہ وہ لوگ

اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا رطلب کرنے کے لئے اس غایۃ کا اثر تو تحصیل ہے کہ اس کے تصور کے بغیر اس فعل اختیاری کا صدور عادۃً دشوار تھا اس کے بعد ایک اور غایۃ بیان فرماتے ہیں وتثبیتا من انفسھم مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں من بمعنی لام ہے ای تثبیتا لانفسھم یعنی دوسری غرض انفاق میں یہ ہوتی ہے کہ اپنے نفسوں میں (اعمال کے اندر) پختگی پیدا کریں اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض بخیلوں کو انفاق میں بہت دشواری ہوتی ہے جن کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   در زر طلبی سخن دریں است

(اگر جان طلب کرو تو کوئی حرج نہیں مگر مال اگر طلب کروگے تو اس میں اعتراض ہوگا)

جیسا مولانا نے ایک بدوی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں ایک کتا اس کا رفیق تھا وہ مرنے لگا تو بدوی اس کی مفارقت کے غم میں رونے لگا۔ کسی مسافر نے پوچھا کہ تو کیوں روتا ہے کہا یہ کتا میرا رفیق سفر تھا اب یہ مر رہا ہے میں اس کے غم میں رو رہا ہوں پوچھا اس کو تکلیف کیا ہے کہا بھوکا ہے فاقہ سے مر رہا ہے اس نے دیکھا کہ ایک طرف ایک پوٹلا بندھا ہوا رکھا ہے بدوی سے پوچھا کہ اس پوٹلہ میں کیا ہے کہا سوکھی ہوئی روٹیاں ہیں کہا ظالم جب تجھے اپنے کتے سے اس قدر محبت ہے کہ اس کے غم میں رو رہا ہے تو اس میں سے ایک روٹی نکال کر کیوں نہیں کھلا دیتا تو وہ کہتا ہے ؎

گفت نا ید بے درم در راہ ناں   لیک ہست آب دو دیدہ رائگاں

(اس نے کہا کہ روٹی تو بغیر مال کے نہیں ملتی اور آنسو تو مفت کے نکل آتے ہیں)

کہ مجھے اتنی محبت نہیں جو اسے روٹیاں کھلا دوں روٹی کو تو دام لگے ہیں اور آنسو مفت کے ہیں بس میں اتنی ہی محبت رکھتا ہوں کہ اس کو رو لوں تو حق تعالےٰ وتثبیتا من انفسھم میں ایسے بخیلوں کے لئے انفاق کی دشواری اور تنگی رفع کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم انفاق اسی نیت سے کرو کہ اس سے نفس میں قوت پیدا ہوگی اور انفاق سہل ہو جائیگا۔ بار بار اسی نیت سے انفاق کرو تو یہ مادہ راسخ ہو جائیگا اس غایت کا اثر تسہیل ہے اور جو طریقہ سہولت انفاق کا یہاں بتلایا گیا ہے یہ تمام اعمال

یں جاری ہے کہ تکرار عمل سے ہر عمل صعب سہل ہوجاتا ہے گو فطری خلق کی برابر سہولت نہ ہو یعنی جیسے فطری سخی کو انفاق میں سہولت ہوتی ہے ویسی آسانی گو نہ ہو مگر تکرار سے بھی بہت کچھ سہولت ہوجاتی ہے خصوصاً جبکہ تکرار اسی غرض سے ہو تاکہ عمل سہل ہوجائے اور یہ غرض گو بالذات مقصود نہیں بلکہ غرض اول اصل ہے مگر چونکہ اس بخیل کو انفاق دشوار تھا اس لئے دوسری غرض کو تسہیل کے لئے بیان فرمادیا اسی طرح ایک حدیث میں ہے یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء متفق علیہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ایک غرض بیان فرمادی کہ اس سے عفت فرج وحفاظت نگاہ سہل ہوجاتی ہے۔ اصل مطلوب تو تحصین فرج وغض بصر ہے جو کہ بدون نکاح بھی قدرت واختیار میں ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا بھی امر فرمادیا کیونکہ وہ اس مطلوب کی تسہیل کا وسیلہ ہے اسی لئے اغض واحصن صیغہ تفضیل سے فرمایا یعنی یہ غض وتحصین میں زیادہ معین ہے اور اسی لئے نکاح کو غض بصر وحصن فرج کی غایۃ تسہیل کہا ہے کیونکہ نگاہ وشرمگاہ کی حفاظت بدون نکاح کے بھی ممکن ہے کیونکہ نگاہ کا اٹھانا امر اختیاری ہے کوئی دوسرا تو سر نہیں اٹھادیتا اور یہ امر مشاہد ہے لیکن اس شخص کو اس میں دھوکا ہوجاتا ہے کہ یہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نظر میں مضطر ہوں اور دھوکہ اضطرار کا اس لئے ہوتا ہے کہ آجکل لوگ عموماً نگاہ نیچی رکھنے کے عادی نہیں۔ اونٹ کی طرح سر اٹھاکر ہی چلنے کے عادی ہیں اس لئے نگاہ میں اپنے کو مضطر سمجھتے ہیں پھر نگاہ ڈال کر ہٹانے میں اس کو نفس کی ساتھ کشاکشی سخت ہوتی ہے جس کی مقاومت دشوار ہوتی ہے اس دشواری کو وہ اضطرار سمجھنے لگتا ہے حالانکہ وہ اضطرار نہیں ہے کیونکہ وہ اس حالت میں بھی غض بصر پر قادر رہتا ہے پس وہ مختار ہے اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ جس اضطرار میں میتۃ حلال ہوجاتا ہے اضطرار تو وہ بھی نہیں کیونکہ عدم تناول پھر بھی اختیار میں رہتا ہے پھر بھی سخت تکلیف کو شریعت نے اضطرار قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے فمن اضطر فی مخمصۃ تو معلوم ہوا کہ سخت تکلیف بھی اضطرار میں داخل ہے تو غض بصر میں بھی جب سخت بے چینی ہونے لگے وہ اضطرار کیوں نہیں اور اگر

اضطرار ہے تو وہ شخص معذور ہے تو میں کہوں گا کہ آیت میں اضطرار اصطلاحی کا ذکر نہیں بلکہ اضطرار لغوی کا ذکر ہے اور یہ اضطرار لغوی اکل میتہ میں عذر ہے اور نظر بالشہوۃ میں عذر نہیں اگر کوئی کہے کہ اس فرق کا کیا سبب اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی قسمت خدا کی یہی مرضی یہ جواب تو ضابطہ کا تھا اب میں تبرعاً دونوں میں فرق بھی بتلاتا ہوں کہ اختصار مخمصہ میں موت کا اندیشہ ہے اور حیات کا بقاء مطلوب ہے کیونکہ وہ معراج ترقی ہے حیات ناسوتیہ ہی سے روح کو ترقی ہوتی ہے کیونکہ مدار ترقی اعمال ہیں اور روح مجردہ مصدر بعض اعمال کا نہیں ہو سکتا تھا اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو پھر جنت سے دنیا میں ہمارے بھیجے جانے کی کیا ضرورت تھی اور نظر الی الاجنبیہ سے بچنے میں موت کا خوف نہیں بلکہ غض بصر میں زیادہ حیات ہے۔ حدیث میں وعدہ ہے کہ جو شخص تقاضائے نظر کے وقت نگاہ نیچی کر لے اس کو حلاوت ایمان نصیب ہوتی ہے۔

اور اس کی ساتھ ایک طبعی حلاوت بھی ہوئی ہے وہ یہ کہ جب غض بصر کے بعد اس کا دل یہ کہتا ہے کہ شاباش آج شیطان کو خوب زیر کیا اور یہ فخر اہل اللہ نے بھی کیا ہے مگر اشر و بطر کی ساتھ نہیں بلکہ تحدث بالنعمۃ کے طور پر اور اس قسم کا فرح محمود ہے چنانچہ نص ہے قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا۔ غرض غض بصر میں باطنی حیات بھی ہے اور حیات ظاہرہ کا ابقاء بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ یہ نگاہ بد جان و ایمان تک لے لیتی ہے ابن القیمؒ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی امرد پر عاشق تھا اور وہ اس سے نفور رہا تک کہ یہ عشق میں گھل کر مرنے کے قریب ہوگیا اور آثار نزع شروع ہو گئے اس امرد کو اطلاع ہوئی تو اس کے دل میں رحم آیا کہ لاؤ ایک دفعہ اس سے مل لوں اب تو مر ہی رہا ہے وہ اس ارادہ سے گھر سے چلا اور اس کی اطلاع کسی نے عاشق کو کی تو فوراً جسم میں قوت آگئی اور اٹھ بیٹھا پھر امرد کو اپنی بدنامی کا خیال ہوا اور راستہ ہی سے لوٹ گیا اور مومن کے قول پر عمل پیرا ہوا ؎

کہا اس بت سے مرتا ہے وہ مومن — کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

اس امرد نے اس وقت اسی شعر پر عمل کیا اس کی اطلاع بھی عاشق کو ہوئی تو

پھر گر پڑا اور نزع شروع ہوگیا۔ لوگوں نے اس کو کلمہ کی تلقین شروع کی تو بجائے کلمہ کے اس نے امرد کو خطاب کر کے اشعار پڑھنا شروع کئے جس میں ایک شعر یہ تھا ؎

رضاك اشھی الی فؤادی — من رحمۃ الخالق الجلیل

(اے معشوق تیری رضا مجھے زیادہ محبوب ہے حق تعالیٰ کی رحمت سے نعوذ باللہ تعالیٰ منہ)

نعوذ باللہ نعوذ باللہ اور اسی کلمۂ کفر پر جان دیدی۔ اور خطرہ نظر عمد میں ہے اور وہی حرام بھی ہے باقی اور نظر فجارۃ میں یہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ فوراً غض بصر کرنے سے وہ اثر قوی نہیں ہونے پاتا اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ ممکن ہے اس میں بھی ہلاکت ہو جائے تو میں کہوں گا کہ یہ امکان ایسا ہے جیسا امام ابو یوسفؒ کے شاگرد نے مجلس امالی میں سوال کیا تھا کہ آپ نے ابھی جو یہ فرمایا ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی روزہ افطار کرلینا چاہیئے تو بھلا اگر کسی دن آفتاب ہی غروب نہ ہو تو کیا کرے اور وجہ فرق کی یہی ہے کہ نظر فجارۃ میں بوجہ عدم التفات کے دقائق حسن کا ادراک نہیں ہوتا یوں ہی سرسری طور پر صورت سامنے ہو جاتی ہے اب اس کو حکم ہے صرف نظر کا اگر فوراً نگاہ کو ہٹالے تو کچھ بھی خطرہ نہیں اور اگر اس کے بعد عمداً دیکھنے لگا تو اب اس کو اس کی ساتھ تعلق ہو جانے کا احتمال ہے اور تعلق کے بعد اگر وصال نہ ہوا تو موت کا خطرہ ہے اور ایک دو بار وصال ہوگیا تو اس سے پیاس بجھے گی نہیں بلکہ زیادہ بھڑکے گی ؎

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق — مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور اگر کسی کو ہمیشہ وصال میسر ہو سکتا ہے تو اس کمبخت کو نکاح سے کون چیز مانع ہے ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے لم یر للمتحابین مثل النکاح یعنی جن میں باہم محبت ہو جائے ان کو نکاح کر لینا چاہیئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر اس کا علاج نظر و وصال سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی طرف سے خیال کو ہٹا دے جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی بد صورت بد شکل کا مراقبہ کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو دیکھو میں اس کا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں مراقبہ موت و رویت تو سب بتلاتے ہیں میں بد شکل کافر کا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں کیونکہ طب میں کبھی طیبات سے علاج ہوتا ہے کبھی خبیثات سے (اور اگر کوئی شکل قابل نفرت مراقبہ

کے لئے نہ ملے تو پھر اس محبوب ہی کو بدشکل تصور کرو یعنی یوں خیال کرو کہ یہ ایک دن مرے گا اور اس کا چہرہ خاک میں مل جائے گا اس میں سے خون پیپ ناک اور آنکھ کے راستہ سے بہے گا اس کے بدن میں کیڑے پڑ جائیں گے تھوڑی دیر اس کی اس حالت کا مراقبہ کرو اس سے بھی نفع ہوگا) اور خیال ہٹانے کی یہ صورت نافع نہیں کہ تم براہ راست اس کے حسن کے تصور دفع کرنے کا قصد کرو کیونکہ اس میں پھر استحضار ہوگا حسن کا سلب بھی جلب ہو جائے گا میں نے مولانا سید احمد صاحبؒ دہلوی سے ایک حکایت اسی قبیل کی سنی ہے کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کی شادی میں دولہا کے لئے کسی کا دوشالہ مانگ کر مجلس نکاح میں اوڑھا دیا وہ اوچھا آدمی تھا اس نے دوشالہ تو دیدیا مگر اب جو شخص مجلس میں سے آکر پوچھتا کہ دولہا کہاں ہے وہ کہتا ہے کہ دولہا تو وہ ہے مگر دوشالہ میرا ہے لڑکے کے باپ نے کہا تو بڑا اوچھا آدمی ہے بھلا اس کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ دوشالہ میرا ہے اس نے کہا کہ بہت اچھا اب نہ کہوں گا۔ اس کے بعد کسی نے پوچھا کہ دولہا کونسا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ دولہا تو وہ ہے اور دوشالہ میرا نہیں ہے۔ بارات والوں نے پھر ملامت کی کہ کمبخت تجھے دوشالہ کے ذکر ہی کی کیا ضرورت ہے اس نے کہا بہت اچھا اب سے ذکر نہ کروں گا اس کے بعد کسی نے پوچھا تو کہا کہ دولہا تو وہ ہے اور دوشالہ کا ذکر ہی نہیں کہ کس کا ہے اس پر دولہا نے دوشالہ اتار کر پھینکدیا تو دیکھئے اس نے دوشالہ کی نفی کی تھی مگر وہ بھی اثبات تھا اسی طرح محبوب کے تصور کو بلاواسطہ دفع کرنا یہ بھی جلب تصور ہے بلکہ اس کا صحیح قاعدہ وہ ہے جس کو فلاسفہ اور صوفیہ نے بیان کیا ہے النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد کہ ایک آن میں دو چیزوں کی طرف نفس متوجہ نہیں ہو سکتا اور گو اس کو قاعدہ عقلیہ کہا جاتا ہے مگر میرے نزدیک یہ بھی قاعدہ عقلیہ نہیں بلکہ قاعدہ عادیہ ہے مگر عادۃً اس میں لزوم ایسا ہے جس سے لزوم عقلی کا شبہ ہو جاتا ہے اور اس قاعدہ کے استعمال کا طریقہ وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کسی دوسری شے کی طرف توجہ کو منعطف کرو کیونکہ عشق بطالت سے ہوتا ہے اطباء نے اس کی تصریح کی ہے اسی لئے طلبہ کو عشق زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ بہت بیفکر ہیں (پہلے زمانہ کے طلبہ ایسے بے فکر تھے اس لئے ان میں یہ مرض نہ تھا اور

آج کل بیفکری زیادہ ہے) کیونکہ جو کام ان کے ذمہ ہے مطالعہ و تکرار وغیرہ اختیاری ہے کہ جب چاہیں الگ کر دیں اور بیفکر ہو جاویں باقی جو شخص کسی فکر میں لگا ہوا ہو اس کو عشق نہیں ہوتا چنانچہ گھس کھدے مزدور کو تصور حسینان کی کہاں مہلت ہے پس تم بطالت و بیفکری کو دور کرو اور کوئی شغل اپنے ذمے لگاؤ اور کسی شے کی طرف اپنی توجہ کو منعطف کرو حدیث میں اسی علاج کی تعلیم ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر اجنبیہ پر نظر پڑ جائے تو اسی وقت اپنی بیوی سے جاکر مشغول ہو جاؤ۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں فان الذی معہا مثل الذی معہا (کہ جو چیز اس کے پاس ہے ویسی ہی اس کے پاس ہے) ظاہر میں یہ جملہ معمولی بات ہے مگر حقیقت میں یہ ایک قاعدہ عظیمہ پر تنبیہ ہے جس کی تقریر حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے فرمائی ہے جو کسی کے کلام میں میری نظر سے نہیں گذری اس کو بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو ہمارے اکابر کے کمال علوم کا اندازہ ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ متناولات میں چار قسم کی چیزیں ہیں بعض میں محض لذت مقصود ہے جیسے فواکہ بعض میں دفع حاجت مقصود ہے بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب حاجت ہے جیسے اغذیہ یومیہ بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب لذت ہے اور عادۃً قرب نساء ایسی ہی چیز ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ میں ہم کو اس امر کی تعلیم فرمائی ہے کہ تم اس میں بھی حاجت ہی کو غالب رکھو اور دفع حاجت میں اجنبیہ اور منکوحہ دونوں مساوی ہیں یہ مطلب ہے ان الذی معہا مثل الذی معہا (ای انہما مساویان فی قضاء الحاجۃ) سبحان اللہ بے نظیر علم ہے۔ بہرحال شارع نے اس حدیث معشر الشباب تزوجوا الخ میں نکاح کی ترغیب اس لئے دی ہے تاکہ غض بصر سہل ہو جاوے اور یہ شارع کے ذمہ نہ تھا بلکہ محض عنایت تسہیل کی وجہ سے ارشاد فرمایا کہ جس کو غض بصر دشوار ہو وہ نکاح کرلے گو شارع کو یہ بھی حق تھا کہ بدون اس کے بھی غض بصر کا امر فرما دیں کیونکہ نظر اختیاری ہے جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہوا اور اس سے معلوم ہوا کہ کبھی شارع بھی تسہیل کا لحاظ فرماتے ہیں پس صوفیہ اہل بدعت نہیں جو اعمال شرعیہ میں سہولت کا طریق بتلاتے ہیں اور اسی میں مشائخ علماء ظاہر سے ممتاز ہیں کیونکہ علماء اس کو نہیں جانتے پس صوفیہ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے یہ بدعت کہاں سے نکالی کہ اعمال شرعیہ کی تسہیل کے طرق

بتلاتے ہیں۔ میں نے بتلا دیا کہ شارع نے بھی کبھی اس کا لحاظ فرمایا ہے۔ چنانچہ اول تو شارع نے تسہیل غض بصر کے لئے نکاح کو تجویز کیا اور جو نکاح پر قادر نہ ہو اس کے لئے اسی تسہیل کے لئے ارشاد ہے ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء کہ جو نکاح نہ کر سکے وہ روزے رکھا کرے کیونکہ روزہ بمنزلہ اختصار کے ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ اختصار کے بعد بھی بعض دفعہ شہوت کم نہیں ہوتی چنانچہ تجربہ ہے کہ ایسے لوگ باندیاں خریدتے ہیں اور ان سے مجامعت کرتے ہیں ہاں ان کو انزال نہیں ہوتا اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع عضو کے بعد بھی شہوت باقی رہتی ہے ایسا مرد مساحقہ کا طالب ہوتا ہے ایک بزرگ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو شہوت باقی رہتی ہے۔ وہ حکایت یہ ہے۔ ایک شخص کو خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تمنا رہتی تھی چنانچہ ایک بار ملاقات ہوئی اور حضرت خضرؑ نے دریافت فرمایا کہ بتلاؤ مجھ سے کیا کام ہے کہا میرے لئے دعا کر دیجئے کہ بے فکری کی زندگی نصیب ہو۔ فرمایا دنیا میں بیفکری دشوار ہے کیونکہ یہ دار ابتلاء ہے یہاں چین نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ تم دنیا میں مختلف لوگوں کی حالت دیکھ کر کسی ایک کو تجویز کر لو میں دعا کروں گا کہ تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ اس نے کہا بہت اچھا یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی تو بیفکر ملے گا۔ چنانچہ اس نے سیاحت شروع کی اور امراء و سلاطین کا امتحان شروع کیا معلوم ہوا کہ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی فکر ضرور ہے بیفکر کوئی نہیں۔ پھر ایک جوہری کو دیکھا کہ وہ بڑا بے فکر ہے صبح کو دکان کھولتا ہے دس بارہ لڑکے جوان اس کے پاس دکان میں رہتے ہیں جو اس کے بیٹے معلوم ہوتے تھے اور نوکر چاکر ان کے علاوہ تھے۔ وہ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھتا اور خوب خیرات کرتا اور تجارت بھی کرتا ظاہر میں اس کو کوئی فکر معلوم نہ ہوتا تھا یہ اس کے پاس تین دن ٹھہرا اور اس کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا کہ بس میں بھی اسی کے مثل ہونے کی دعا کراؤں گا پھر خیال ہوا کہ اس سے بھی دریافت تو کرنا چاہیئے مبادا اس کو کوئی ایسا فکر ہو جس کی مجھے اطلاع نہ ہو چنانچہ اس سے دریافت کیا اور وجہ بھی بتلادی کہ میں نے حضرت خضرؑ سے یہ درخواست کی تھی انھوں نے یہ جواب دیا اور اب تجھ کو دیکھ کر مجھے خیال ہوتا ہے کہ تیری جیسی زندگی کی دعا کراؤں یہ سن کر وہ جوہری سانس بھر کر آبدیدہ ہوا اور کہا خدا

میری جیسی مصیبت تو کسی دشمن کو بھی نہ دے پھر قصہ بیان کیا کہ میری بیوی بہت حسین ہے ایک دفعہ وہ بیمار ہوئی اور مرنے کے قریب ہوگئی میں رونے لگا تو اس نے کہا کیوں روتے ہو تم تو چار دن کے بعد دوسرا نکاح کرلو گے پھر مجھے بھول بھال جاؤ گے میں نے کہا یہ ہرگز مجھ سے نہ ہوگا کہا سب یوں ہی کہا کرتے ہیں تو میں نے استرہ نکال کر اپنا عضو کاٹ ڈالا کہا اب تو اطمینان ہوگیا اس نے کہا ہاں اب واقعی اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد وہ کمبخت اچھی ہوگئی۔ در میں بیکار ہو چکا تھا تو اس نے نوکروں سے تعلق پیدا کرلیا اور یہ جتنے لڑکے آپ کے سامنے ہیں سب انہی نوکروں کی عنایت ہیں مگر میں خاموش ہوں کیا کہوں کیونکہ یہ بلا میں نے اپنے ہاتھوں خریدی ہے اب یہ شخص اپنے گھر واپس آیا اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی پوچھا کہو تم نے کسی کو تجویز کیا کہا واقعی دنیا میں کوئی بھی فکر سے خالی نہیں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا بس تم یہ خیال چھوڑ دو اور اس کی درخواست کرو کہ حق تعالیٰ تم کو اپنی محبت عطا فرمائیں اور آخرت کی بیفکری نصیب ہو کہا ہاں بس اسی کی دعا کر دیجئے واقعی یہی بات ہے پھر اگر کچھ بیفکری ہے تو تعلق مع اللہ ہی میں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بغیر پریشانی اور جال کے نہیں مگر ہاں تنہائی میں حق تعالیٰ کی یاد ہی سے چین و آرام)

خلوت گاہ حق سے مراد تعلق مع اللہ ہی ہے تو اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اس شخص کو اپنی حالت پر حسرت تھی اس حسرت میں خواہش کو بھی دخل تھا کہ تمتع کی خواہش موجود مگر فقدان اسباب و آلات سے معذور اس لئے غمزدہ تھا اور روزہ ان سب سے بڑھ کر ہے کہ شہوت بھی کم ہو جاتی ہے اور انسان بھی بیکار نہیں ہوتا۔ مگر ایک بات سمجھ لینا چاہیئے کہ بعض دفعہ روزہ سے ابتداء صوم میں شہوت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے اس سے دھوکہ نہ کھایا جائے کہ شریعت نے یہ کیسا علاج تجویز کیا بات یہ ہے کہ بعض دفعہ قلت شہوت کا منشا کثافت اخلاط ہوتا ہے ایسی حالت میں چونکہ روزہ سے اخلاط میں لطافت پیدا ہوگی تو اول اول شہوت بڑھے گی مگر یہ برابر روزہ رکھتا ہے تو کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہوگا اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ قلت شہوت کا منشا کبھی کثافت اخلاط ہوتا ہے اس کو میں بہت دعوے کیساتھ کہتا ہوں

اور بیا تنگ دہل کہتا ہوں کہ جس پر شہوت کا زیادہ غلبہ ہو وہ اس وقت خوب پیٹ بھر کر
کھانا کھالے تو شہوت افسردہ ہو جائے گی مگر شارع نے یہ علاج اس لئے تجویز نہیں کیا کہ
اس سے لحوق امراض کا اندیشہ ہے بہر حال کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہے گو ابتداء
میں ضعف کا احساس نہ ہو چنانچہ اخیر حصہ رمضان میں ہر شخص کو ضعف معلوم ہوتا ہے گو افطار
وسحر میں اس نے کتنا ہی پیٹ بھر کر کھایا ہو کیونکہ میرے نزدیک سبب ضعف تبدیل وقت ہے
تقلیل غذا سے ضعف نہیں ہوتا پس جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روح صوم تقلیل غذا ہے
جب افطار وسحر میں خوب پیٹ بھر کر کھا لیا تو اس روزہ سے فائدہ ہی کیا ہوا ان کا قول میرے
نزدیک صحیح نہیں بلکہ صرف تبدیل وقت ہی ضعف بہیمیت کے لئے کافی ہے۔ غرض یہ حدیث
صاف بتلا رہی ہے کہ شارع نے جس طرح تحصیل اعمال کا اہتمام کیا ہے اسی طرح تسہیل اعمال کا
بھی کہیں کہیں لحاظ فرمایا ہے چنانچہ یہ حدیث تو رعایت تسہیل میں صریح تھی اب آیت میں غور
کیجئے تو یہاں بھی حق تعالیٰ نے اول ایک غایت تحصیل عمل کے لئے بیان فرمائی اس کے بعد دوسری
غایت تحصیل عمل کے لئے ذکر فرمائی کہ تکرار انفاق سے انفاق سہل ہو جاتا ہے پس انفاق میں یہ
غرض بھی ملحوظ رکھنا چاہئے اور یہ طریقہ تمام اعمال کی تسہیل میں مفید ہے تکرار عمل سے ہر عمل شاق
سہل ہو جاتا ہے جیسا اوپر[لہ] بھی مذکور ہو چکا ہے مگر طرق تسہیل کا بتلانا شارع کے ذمہ نہیں یہی
وجہ ہے کہ تمام احکام میں اس کی رعایت نہیں کی گئی اور ہر عمل کی سہولت کا طریقہ شارع نے نہیں
بتلایا نیز علماء کے ذمہ بھی طرق سہولت بتلانا لازم نہیں اور اسی کی فرع یہ بھی ہے کہ علماء کے
ذمہ یہ بھی نہیں کہ سائل کے جواب میں ایسی تقریر کریں کہ مخاطب کی سمجھ ہی میں آجائے جبکہ وہ مسئلہ
ان کے فہم سے عالی ہو ہاں مسئلہ کی تقریر کر دینا جبکہ وہ ضروری سمجھیں ان کے ذمہ ہے خواہ
مخاطب سمجھے یا نہ سمجھے اور اگر مخاطب سے فہم کی امید نہ ہو تو علماء کے ذمہ تقریر کرنا بھی لازم
نہیں ان کو یہ کہدینے کا حق ہے کہ تم اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ رامپور میں ایک شخص نے مجھ سے کہا
کہ معراج کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا مجھے اس پر کچھ اشکالات ہیں میں نے کہا بیان کیجئے کہا یہ کیونکر ممکن
ہے کہ انسان زمین سے آسمان پر پہونچ جائے کیونکہ درمیان میں کرہ زمہریر ہے کرہ نار ہے۔ نیز حکماء کا

[لہ] جس مقام پر حدیث یا معشر الشباب کا ذکر شروع ہوا ہے اس مقام سے ذرا پہلے اس کا بیان آیا ہے ۱۲ منہ

قول ہے کہ چند میل اوپر ہوا نہیں ہے وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ سانس کیلئے ہوا کی ضرورت ہے پھر معراج کیونکر ہوئی میں نے کہا بدون تنفس کے زندہ رہنا محال ہے یا مستبعد ہے اسی طرح زمہریر و نار میں زندہ رہنا محال یا مستبعد ہے گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت محال و مستبعد میں فرق ہی نہ سمجھتے تھے میں نے ان دونوں میں فرق ظاہر کیا اور کہا اب آپ کے اشکالات کا حاصل یہ ہوا کہ معراج کا واقعہ مستبعد ہے سو اس سے ہم کو انکار نہیں معجزات مستبعد تو ہوتے ہی ہیں ورنہ معجزہ ہی کیوں کہا جاوے لیکن محال ہرگز نہیں کیونکہ اس میں عقلی استحالہ کچھ نہیں وہ کہنے لگے کہ یہ دقائق میں نہیں سمجھتا مجھے اس کی کوئی نظیر مشاہدات میں بتلایئے میں نے کہا کہ نظیر پر ثبوت دعویٰ موقوف نہیں ہوتا کیونکہ نظیر بھی تو ایک واقعہ ہے اگر ہر واقعہ کو دوسرے واقعہ کے واسطے سے مانا جائیگا تو یا تو تسلسل لازم آئیگا اور وہ محال ہے یا کہیں سلسلہ کو قطع کرو گے تو یہ آخیر کا واقعہ بدون نظیر کے مانا گیا پھر واقعہ معراج ہی کو اولاً بدون نظیر کے کیوں نہیں مانا جاتا مگر وہ پھر بھی وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتے رہے کہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا بس اتنی کسر رہ گئی کہ میں آپ کے سامنے آسمان پر اڑوں کہ دیکھو معراج یوں ہوا کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ تنفس کی ضرورت مکث طویل میں ہوتی ہے اور مکث طویل ہی سے حر و برد کا اثر بھی لازم آتا ہے سرعت سیر میں نہ تنفس کی ضرورت ہے نہ مرور فی النار سے احتراق لازم آتا۔ ہے چنانچہ چراغ کی لو میں جلدی جلدی انگلی چلائی جائے تو آگ کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا پس اگر مان لیا جائے کہ اوپر ہوا نہیں ہے تو اس واقعہ معراج پر کیا اشکال ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طیقہ کو جو نہایت سرعت سے طے کیا ہے جس میں آپ کو تنفس کی ضرورت ہی نہیں ہوئی اور ضرورت ہوتی بھی تو پندرہ بیس منٹ حبس دم کرنے سے ہلاکت نہیں ہوتی اور اسی سرعت کی وجہ سے آپ کے جسم پر نار و زمہریر کا اثر نہیں ہوا مجھے یہ جواب پسند آیا اور خیال ہوا کہ اس وقت یہ بات معلوم ہو جاتی تو سائل کی تسلی ہو جاتی مگر مجھے زیادہ خیال نہیں ہوا کیونکہ تسلی کرنا ہمارے ذمہ نہیں ہے۔ علیگڈھ میں ایک پروفیسر میرے پاس آئے جو علوم عربیہ کے استاد وہاں مشہور تھے۔ انھوں نے ایک حدیث[۵] حاکم کا متن پڑھا و لا ظهرت الفاحشة

---

۵ کذا فی الترغیب ۱۲

فی قوم الاسلط علیھم الموت یعنی وبا اور طاعون کثرت زنا سے ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا طاعون و زنا میں ارتباط سمجھ میں نہیں آیا۔ کہا ارتباط نہیں سمجھ میں آیا میں نے کہا پھر اس کے نہ سمجھنے سے ضرر ہی کیا ہوا کہنے لگے ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے سے نفع ہوتا۔ میں نے کہا وہ نفع کیا ہے کہنے لگے اطمینان میں نے کہا اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل کہا اگر یہ مطلوب نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کو طلب نہ فرماتے۔ میں نے کہا کہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز حضرت ابراہیمؑ کے لئے نافع ہو وہ آپ کے لئے بھی نافع ہو۔ بس وہ اس پر خاموش ہو گئے۔ میں نے اس کے بعد ان سے کہا کہ مولانا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ملانوں کو اس کا ارتباط معلوم نہیں۔ الحمد للہ کہ ہم کو بعض اسرار کا علم بھی بزرگوں کے طفیل سے حاصل ہے مگر ہم بتلانا مصلحت نہیں سمجھتے اور میں نے یہ شعر پڑھا ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(اہل اللہ اسرار شریعت کو ظاہر کرنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ ان حضرات کو اسرار کا علم نہیں ہے) ہمیں خبر ہے مگر آپ کو نہیں بتلاتے کیونکہ اسرار کا بتلانا ہمارا ذمہ نہیں صرف احکام کا بتلانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر میں نے احباب کے جلسہ خاص میں اس ارتباط کی تقریر کر دی۔ غرض اسی طرح طرق تسہیل کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں بلکہ مشائخ کے بھی ذمہ نہیں گو مشائخ بنے اسی سے ہیں اگر وہ فن تسہیل سے واقف ہیں مگر یہ ان کے ذمہ نہیں محض ان کی عنایت و رحمت ہے مخلوق پر کہ وہ طرق تسہیل بتلا دیتے ہیں اور وہ بھی اس طریق کو اس شخص کے لئے استعمال کرتے ہیں جو تحصیل میں ساعی ہو اور جو شخص تحصیل اعمال میں کوتاہی کر کے تسہیل کا طالب ہو وہ اس کی ساتھ تسہیل کا معاملہ نہیں کرتے بلکہ تکلیف کا معاملہ کرتے ہیں (یہاں پہونچکر اذان عصر ہو گئی تو فرمایا کہ بس میں اب ختم ہی کرنے والا ہوں یہ فرما کر خاموش ہو گئے اور اذان کے بعد فرمایا کہ) اب میں مقصود کی توضیح کر کے چند باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کر کے ختم کرتا ہوں میرا مقصود اس آیت کی تلاوت سے یہ تھا کہ شارع نے اصل میں ہم کو اعمال اختیاریہ کی تحصیل کا مکلف کیا ہے اور شارع کے ذمہ تسہیل کی رعایت نہیں مگر محض عنایت کی وجہ سے بعض دفعہ تسہیل کی بھی رعایت فرما لیتے ہیں۔

جیساکہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔ پس سالکین کی یہ بڑی غلطی ہے کہ وہ سہولت کے طالب ہیں اور طلب تحصیل میں کوتاہی کرتے ہیں اس میں مقصود بالذات کو تابع اور مقصود بالعرض کو اصل قرار دینا ہے نیز صفت اختیار کا ابطال ہے جو امانت الٰہیہ ہے۔ اب میں مختصراً تشبیہہ کے متعلق جو اس آیت میں مذکور ہے کچھ عرض کرتا ہوں حق تعالےٰ نے یہاں نفقات کو جنات سے تشبیہہ دی ہے وجہ تشبیہہ یہ ہے کہ جس طرح باغ میں پھل کو ترقی ہوتی ہے اسی طرح نفقات میں زیادتی ہوتی ہے اور وابل سے اخلاص کی تشبیہہ مقصود ہے جس کی دلیل اوپر کی آیات ہیں کیونکہ اوپر ریاء فی الانفاق کی مذمت ہے کالذی ینفق مالہ ریاء الناس ولا یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر الاٰیہ اس کے بعد انفاق کی فضیلت بیان فرمائی گئی اور جب وابل سے مراد اخلاص ہے اور اس کے مقابلہ میں طل مذکور ہے اور وابل کہتے ہیں موسلا دھار بارش کو طل کہتے ہیں پھوار کو تو اس تقابل سے معلوم ہوا کہ وابلؔ سے اخلاص کامل مراد ہے اور طلؔ سے اخلاص قلیل مراد ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر اخلاص کامل ہوا تو نفقات میں ترقی زیادہ ہوگئی اور اگر اخلاص قلیل ہوا تو وہ بھی ترقی کے لئے کافی ہے گو زیادہ ترقی نہ ہو اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل بھی مطلوب ہے بلکہ اس سے وہمیوں کا علاج کیا گیا ہے کیونکہ اگر اخلاص کامل ہی کا مطلوب ہوتا ان کے ذہن نشین ہوجائے تو ان سے کوئی عمل نہ ہوسکے گا کیونکہ پہلے ہی دن اخلاص کامل میسر نہیں ہوسکتا جیسے ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے سامنے ایک جنازہ کی نماز شروع ہوئی اور وہ شریک نہ ہوئے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھی فرمایا کہ میں نیت کی تصحیح میں مشغول رہا یہی سوچتا رہا کہ اس وقت اس میت کی نماز پڑھنے میں کیا نیت ہے کیونکہ نماز جنازہ میں مختلف نیتیں ہوتی ہیں کبھی اعزہ و اقرباء کی خاطر سے پڑھی جاتی ہے۔ کبھی میت کی وجاہت کا اثر ہوتا ہے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ میت محلہ دار ہے اگر نماز نہ پڑھیں گے تو اہل محلہ ملامت کریں گے یہی وجہ ہے کہ رئیس یا عالم کے جنازہ کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے غریبوں کے جنازہ کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا اگر اخلاص منشا ہوتا تو یہ فرق کیوں ہوتا۔ اسی طرح حافظ اگر تراویح میں سوچتا رہے کہ میں تراویح میں جو بنا سنوار کر قرآن پڑھ رہا ہوں اس میں کیا نیت ہے کیونکہ تنہا نماز پڑھتے ہوئے ایسا اہتمام نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ تراویح ہرگز نہ پڑھا سکے گا

پس اس وہم کا علاج کر دیا گیا کہ تم کس وہم میں پڑے ہمارے یہاں اخلاص قلیل بھی کافی ہے پس تم اپنی طرف سے برا قصد نہ کرو اس کے بعد بےفکر ہو کر کام میں لگو اور اخلاص کامل کے لئے سعی کرتے رہو اسی طرح سے ایک دن اخلاص کامل بھی میسر ہو جائے گا اور اگر پہلے ہی دن اخلاص کامل پر عمل کو موقوف رکھا تو تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا یہ مطلب ہے فان لم یصبھا وابل فطل کا کہ ابتدا میں اخلاص قلیل ہی کو کافی سمجھو اور عمل شروع کر دو یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل ہی مطلوب ہے بلکہ مطلوب تو اخلاص کامل ہے مگر اس کے حصول کا طریقہ یہی ہے کہ اول قلیل ہی سے عمل شروع کر دو طل پر مجھے ایک لطیفہ ہارون رشید کی باندی کا یاد آ گیا گو مضمون سے اس کو تعلق نہیں مگر لفظ طل سے تعلق ہے۔ ہارون رشید نے اپنی ایک جاریہ کو کسی غلام سے ہنستے بولتے دیکھ لیا جس کا نام تھا طل (غلام لونڈیوں کے ایسے ہی نام ہمارے عرف میں رکھتے ہیں جیسے بہار وغیرہ) ہارون الرشید نے اس جاریہ کو ڈانٹا اور کہا خبردار جو کبھی اس سے بات کی بلکہ کبھی زبان سے اس کا نام بھی مت لینا ایک بار وہ لونڈی قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھی یہی آیت آئی اس کو معلوم ہوا کہ امیرالمومنین ایسے موقع پر موجود ہیں جہاں اس کی آواز جا رہی تھی تو اس نے کیا مزہ کیا کہ آیت کو اس طرح پڑھا فان لم یصبھا وابل فالذی نھانی عنہ امیرالمومنین امیرالمومنین ہنسنے لگے اور خطا معاف کر دی اور نام لینے کی اجازت دیدی پس اصل مقصود تو اخلاص کامل ہے اور اسی کا امر ہے وہی مطلوب ہے اور اس سے تکمیل عمل کی مقصودیت پر دلالت ہو گئی مگر چونکہ اس میں بعض وہمیوں کو غلو ہو جاتا ہے اس لئے فطل میں اس کی تعدیل کر دی گئی گویا فاصابھا وابل میں تکمیل کی تعلیم تھی اور فطل میں تعدیل کر دی گئی تو اس آیت میں چار چیزیں مذکور ہوئیں تحصیل، تسہیل، تکمیل، تعدیل اور اسی مناسبت سے میں اس بیان کا نام التحصیل والتسہیل مع التکمیل والتعدیل تجویز کرتا ہوں اور اس مضمون کو خاص رمضان سے یہ تعلق ہے کہ طاعات رمضان کو بھی مثل تکرار انفاق کے تسہیل اعمال میں بڑا دخل ہے یعنی رمضان میں یہ خاصیت ہے کہ اس ماہ میں جن طاعات پر مداومت کر لے سال بھر ان پر مداومت سہل رہتی ہے اور جن گناہوں سے بچنے کا اہتمام کر لے سال بھر ان سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ ابن حبان نے ایک حدیث مرفوع روایت کی ہے من سلم لہ الجمعۃ سلم لہ ما بینہ وبین الجمعۃ الاخری ومن سلم لہ رمضان سلم لہ السنۃ کلھا و قلت اخرجہ

السیوطی فی الجامع الصغیر واعزاہ الی الدارقطنی وابن عدی واحمد عن عائشۃ بلفظ اذا سلمت الجمعۃ سلمت الایام واذا سلم رمضان سلمت السنۃ وقال العزیزی و ھو حدیث ضعیف ص۱۳۵ ج۱)

رہا یہ کہ رمضان میں یہ خاصیت بالکیفیت ہے یا بالخاصہ ہے دونوں احتمال ہیں اگر بالخاصہ ہے تو تب تو وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور بالکیفیت ہے تو یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ مہینہ بھر کسی عمل سے رکنے میں اس سے اجتناب کی عادت ہو جاتی ہے اب سال بھر اس سے بچنا سہل ہو جاتا ہے اسی طرح کسی عمل کے کرنے میں بھی ایسا ہی سمجھو مگر سہولت کے معنے یہ ہیں کہ اگر آپ اس عادت سے کام لو تو سہولت ہو جائے گی یہ معنی نہیں کہ عادت سے کام لینے کی بھی ضرورت نہ رہیگی جیسے کسی شخص کی آنکھیں بنائی گئیں اور ان میں روشنی آگئی تو آنکھ کے درست ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اس سے کام لیگا آنکھیں کھولیگا تو نظر آئیگا اگر کوئی احمق یہ کہے کہ میں تو آنکھ نہ کھولوں گا کھولنے سے نظر آیا تو فائدہ ہی کیا ہوا آنکھ بننے کے تو یہ معنی ہیں کہ بدون کھولے بھی نظر آئے تو ایسی تیسی اس احمق کی پس یہ مطلب نہیں کہ رمضان لاٹھی لے کر تم کو گناہوں سے روکے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ . . .

. . . . اس کی ایسی برکت ہے کہ اس میں گناہوں کو اہتمام سے چھوڑ کر بعد میں اس برکت سے کام لینا چاہو تو گناہوں کا چھوڑنا آسان ہوگا ورنہ پھر یہ عالم ابتلاء ہی کیا ہوا اگر جبراً تم سے گناہ چھڑا دیئے جائیں۔ پس اب بقیہ رمضان میں اہتمام کے ساتھ گناہوں سے بچو خصوصاً لگاؤ بد اور غیبت سے اور اعمال صالحہ کا اہتمام کرو تلاوت قرآن و نماز و ذکر میں مشغول رہو اور دوسرے دنوں سے آجکل کچھ کام بڑھا دو اور ایک عمل جس کو رمضان سے خصوصیت ہے ابھی باقی ہے یعنی شب قدر کی تلاش کرنا اس کا بھی خاص اہتمام کرو ابھی کچھ لیالی قدر باقی ہیں ان کو غنیمت سمجھو دو راتیں تو گذر گئیں ہیں اگر ان میں اہتمام نہ کیا ہو تو بقیہ ہی کا اہتمام کرلو تاکہ فان لم یصبھا وابل فطل ہی کا مصداق ہو جائے اور کل رات میں نہ جاگ سکو تو زیادہ حصہ جاگ لو یہ بھی نہ ہو سکے تو دوسری راتوں سے کچھ زیادہ جاگ لو یہ بھی فان لم یصبھا وابل فطل میں داخل ہے غرض نہ سب راتیں ضروری ہیں نہ پوری رات ضروری ہے جتنا ہو جائے غنیمت ہے اس سے دریغ نہ کرو۔

مرا از زلف تو موئے بسند ست ؛ ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست

(مجھے اے محبوب آپ کے زلف ہی کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس کو راہ مت دو)

زلف محبوب کی خوشبو ہی کافی ہے یہ شعر شیخ عبدالحق نے اس موقعہ پر لکھا ہے جہاں حدیث میں یہ قصہ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں حلق راس کے بعد اپنے موئے مبارک تقسیم فرمائے تھے شیخ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال دنیا میں موجود ہیں گو سند صحیح کے ساتھ ہم کو نہ ملیں مگر ہم کو یہ خبر ہی کافی ہے شیخ میں عشق کا غلبہ ہے اشعار محبت بڑے موقعہ سے ذکر کرتے ہیں چنانچہ اس حدیث کی شرح میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کے وصال کا واقعہ مذکور ہے کہ ایک دن صحابہؓ جماعت کی ساتھ نماز پڑھ رہے تھے حضرت صدیق اکبرؓ امام تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرہ کا پردہ اٹھا کر صحابہؓ کی جماعت کو دیکھا اور تبسم فرمایا صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم کو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک دیکھ کر ایسی حالت ہوئی کہ قریب تھے کہ نماز توڑ دیں شیخ اس وقت کو بیان کر کے یہ شعر لکھتے ہیں ؎

در نماز خم ابروئے تو چوں یاد آمد حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

(نماز میں جب آپ آپکے ابرو کا خم یاد آتا ہے تو ایسی حالت ہوتی ہے کہ محراب نے بھی فریاد کیا)

خیر یہ تو استطراداً ذکر ہو گیا اصل مقصود پہلا شعر تھا کہ ؎

مرا از زلف تو موئے بسندست ہوس را رہ بوئے بسندست

تو اگر ساری رات نہ جاگ سکو تو جتنا ہو سکے اور دنوں سے کچھ زیادہ شب قدر میں جاگ لو۔ ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے ؎

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہونچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالۂ و فریاد ہم

میں عالی ہمتوں کی ہمت کم نہیں کرتا بلکہ کم ہمتوں کی ہمت بڑھا رہا ہوں کہ وہ زیادہ نہ کر سکیں تو قلیل ہی سے دریغ نہ کریں اور جو زیادہ کر سکتے ہیں وہ زیادہ میں کمی نہ کریں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمادیں اور عمل کی توفیق ہو۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین ط

ملہ ترجمہ گذشتہ صفحہ پر ہو چکا ہے۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تعالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

المعرق والرحیق
للمحرق والغریق

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ
محمّد عبد المنّان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی ——— دفتر الابقا
مسافرخانہ بندر روڈ / ایم۔اے جناح روڈ کراچی

وعظ مسمّٰی بہ

المعرق والرحیق للمحرق والغریق

این	کہاں ہوا	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
متٰی	کب ہوا	۱۲ رجب ۱۳۴۳ھ بروز شنبہ بوقت صبح
کم	کتنی دیر ہوا	تقریباً ۳ گھنٹے ۴۵ منٹ
کیف	کس طرح ہوا	مونڈھے پر بیٹھ کر
لم	کیوں ہوا	بعض اہل خانقاہ کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	انسان پر دو کیفیتیں طاری ہوا کرتی ہیں کبھی شوق کبھی سکون دونوں میں حکمتیں ہیں اپنے لئے کوئی خاص صورت تجویز نہ کرنا چاہیئے۔ وصول دونوں سے ہو جاتا ہے اور جنت میں جزا بھی ہر کیفیت کے مناسب ہوگی۔
من استفاد	کس طبقہ کو زیادہ مفید	سالکین کو بالخصوص اور سب مسلمانوں کو بالعموم
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ وکان لہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	تقریباً ۵۰
الاشتات	متفرقات	الحمد للہ اس وعظ کی تسوید تفصیلی کا جلد ہی موقع آگیا اللہ تعالیٰ تسوید مواعظ کا اہتمام کرنیوالیکو جزائے خیر عطا فرمادیں اس کی تسوید تفصیلی ۲۰ رجب ۱۳۴۳ھ یکشنبہ کو شروع ہو کر ۲ شعبان ۱۳۴۳ھ کو اختتام کو پہونچی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ ان الابرار یشربون من کأس کان مزاجھا کافوراً ہ عینا یشرب بھا عباد اللہ یفجرونھا تفجیراً ہ یوفون بالنذر ویخافون

سے مگر ضابطہ نے بعد ختم وعظ بھی ۱۵ منٹ تک کچھ باقی ماندہ مضامین نوٹ کرلئے لہٰذا وقت ضبط ۴ گھنٹے ہے ۱۲ جامع

یوماً کان شرہ مستطیرا ہ ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا ہ انما نطعمکم لوجہ اللہ لانرید منکم جزاءً ولا شکورا ہ انا نخاف من ربنا یوماً عبوسا قمطریرا ہ فوقٰھم اللہ شر ذالک الیوم ولقّٰھم نضرۃ وسرورا ہ وجزاھم بما صبروا جنۃ وحریرا متکئین فیھا علی الارائک لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا ہ ودانیۃ علیھم ظللھا وذللت قطوفھا تذلیلا ہ ویطاف علیھم بانیۃ من فضۃ واکواب کانت قواریرا ہ قواریرمن فضۃ قدروھا تقدیرا ہ ویسقون فیھا کأسا کان مزاجھا زنجبیلا ہ عینا فیھا تسمی سلسبیلاً۔

اس وقت مجھ کو جس مضمون کا بیان کرنا ہے وہ ان آیات کا مدلول نہیں ہے مگر علم اعتبار کے طور پر ان آیات کو اس مضمون سے ایک مناسبت لطیفہ ہے اور اسی لطافت کی وجہ سے ان کو پڑھا گیا ہے ہر چند کہ ان آیات کی دلالت قواعد شرعیہ سے اس مضمون پر کافی نہیں ہے مگر وہ مضمون دیگر نصوص صریحہ میں منصوص ہے اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس وقت میں انھیں آیات کی تلاوت کرتا جن آیات کی دلالت اس مضمون پر صریح ہے مگر اس کو تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کوئی نئی بات نہ معلوم ہوتی اور جی یہ چاہا کرتا ہے کہ بیان میں افادۂ جدیدہ ہو اس لئے میں نے ان آیات کو جدید فائدہ کے لئے تلاوت کیا ہے تاکہ ان سے اس مضمون پر ایک لطیف استشہاد ہو سکے اس لطافت کی غرض سے میں نے ان آیات کو بیان کے لئے اختیار کیا۔ اب وہ مضمون سننا چاہیئے جو کہ بہت ضروری ہے گو اس وقت کا بیان محض اس مضمون کی ضرورت کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ بعض طالبین کی استدعا کی وجہ سے ہو رہا ہے مگر بات یہ ہے کہ محض استدعا بیان کے لئے محرک کافی نہیں بلکہ استدعا کے بعد جب کوئی ضروری مضمون بھی ذہن میں آجاتا ہے اس وقت بیان ہوتا ہے پس مضمون کی ضرورت کو بھی بیان میں دخل ضرور ہے اور اس مضمون کا اصل خطاب اہل ذکر کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ اس کی ضرورت سالکین کو جو اللہ کا نام لینے والے ہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے اس لئے میں نے اس کے بیان کے لئے یہ مجلس جس میں سالکین کثرت سے ہیں اختیار کی ہے گو استدعا پرسوں (جمعرات کو) ہوئی تھی اور شاید مستدعی نے قرب جمعہ کی وجہ سے یہ خیال کیا ہو گا کہ بیان جمعہ میں ہو گا۔

اور شاید اسی خیال سے استدعا بھی جمعہ کے قریب کی گئی کیونکہ وہ دن بھی ایسا ہے جس میں اہل علم کی عادت بیان کرنے کی ہے مگر میں نے چند وجوہ سے کل بیان نہیں کیا۔ ایک تو کچھ طبیعت اچھی نہ تھی اور میں نے وعدہ اسی شرط پر کیا تھا کہ اگر طبیعت میں نشاط ہوا تو بیان کردوں گا گو نشاط کا پیدا ہونا جی کے سمجھانے پر ہے جب آدمی کسی کام کا ارادہ کرلیتا ہے تو نشاط بھی پیدا ہو ہی جاتا ہے پس یہ کوئی مانع قوی نہ تھا۔ مگر وعدہ نشاط ہی پر معلق تھا اور اصل وجہ کل نہ بیان کرنے کی یہ تھی کہ جمعہ کے دن مجمع عام ہوتا ہے اور اس مضمون کا تعلق زیادہ تر خاص جماعت سے ہے یہی مقصود بالخطاب ہیں۔ دوسرے جمعہ میں اجتماع ایک دعوت عامہ للصلوٰۃ کی بنا پر ہوتا ہے لوگ نماز کی غرض سے آتے ہیں اس کے بعد اگر بیان کیا جاتا ہے تو بعض لوگوں کو شرما شرمی بیٹھنا پڑتا ہے آزادی نہیں رہتی اور جمعہ کے علاوہ کسی دن میں بیان کیا جائے تو دعوت عامہ کی وجہ سے اجتماع نہ ہوگا بلکہ دعوت خاصہ سبب ہوگی اور یہاں تو دعوت خاصہ بھی نہیں ہوئی بلکہ اتفاقاً یا خود کسی سے سن سنا کر سب لوگ جمع ہو گئے ہیں تو اس صورت میں جو کوئی سنے گا آزادی سے سنے گا۔ کیونکہ وہ خاص اسی غرض کے لئے آیا ہے۔ بہرحال چونکہ اس مضمون کی ضرورت اہل ذکر ہی کو محسوس ہوتی ہے اس لئے یہ خاص وقت اس کے لئے مقرر کیا گیا۔ عام وقت اور عام مجمع اختیار نہیں کیا گیا اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس کی ضرورت اہل ذکر ہی کو محسوس ہوتی ہے۔ سب کو محسوس نہیں ہوتی ورنہ درحقیقت مضمون عام ضرورت کا ہے سب مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہے مگر کیا کیا جائے آجکل مسلمانوں نے عموماً ذکر اللہ کو چھوڑ رکھا ہے ایک خاص جماعت ہی ذاکر رہ گئی ہے ورنہ کیا ذکر اللہ بھی ایسی چیز ہے جو کسی خاص جماعت سے مخصوص ہو اس کی تو ہر مسلمان کو ضرورت ہے اگر سب ذاکر ہوتے تو اس مضمون کے مخاطب بھی سب ہی ہوتے مگر افسوس کہ آجکل عموماً مسلمان ذکر سے غافل ہیں رات دن دنیا ہی کے قصہ میں لگے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کو وقت نہیں ملتا اے صاحب وقت تو اتنا ملتا ہے کہ اس کو ادھر اُدھر کاٹتے پھرتے ہیں مگر یہ کہیئے کہ وقت کی قدر ہی نہیں اور ذکر کی طلب ہی نہیں طلب وہ چیز ہے کہ

اپنا وقت خود نکال لیتی ہے اور عام لوگوں کی میں کیا شکایت کروں ستم یہ ہے کہ سمجھ دار لوگ بھی اس سے غافل ہیں اور سمجھ دار لوگوں سے میری مراد اہل علم ہیں کہ ان کو بھی پڑھنے پڑھانے اور تصنیف و وعظ گوئی ہی میں مزا آتا ہے ذکر سے جان چراتے ہیں پرسوں میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا جو اہل علم ہی میں سے ہیں گو مشاہیر و ممتازین میں سے نہیں وہ لکھتے ہیں کہ اوراد سے میرا بڑا جی گھبراتا ہے کہ یہ کہاں کا جنم روگ لگا کہ روز صبح کو سورۂ یٰسین پڑھو ظہر کے بعد ہر روز انا فتحنا پڑھو بعد عشا کے سورۂ ملک پڑھو اور روزانہ چکی کی طرح کئی ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کرو۔ ہاں مطالعہ کتب میں بہت جی لگتا ہے مگر انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اس وسوسہ کو دفع کرتا ہوں اور ہمت کر کے سب اوراد پورے کرتا ہوں یہ علم کا اثر تھا کہ وسوسہ کی غلطی پر متنبہ ہو گئے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ وسوسہ ہی کیوں آیا کبھی روٹی کھانے کے متعلق وسوسہ نہ آیا کہ یہ روز گیہوں کی روٹی کھانا کہاں کا جنم روگ لگا کبھی بیوی کے پاس لیٹنے میں یہ خیال نہ ہوا کہ یہ کہاں کا جنم روگ پیچھے لگ گئی اور اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جائے اور معشوق اس کے پاس روزانہ آیا کرے تو کیا اس کو کبھی یہ خیال ہو گا کہ یہ کہاں کا جنم روگ پیچھے لگا کمبخت روز ہی آتا ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ تو یہ بہانا ڈھونڈھے گا کہ اور تھوڑی دیر بیٹھے عاشق محبوب کے ساتھ مجالست اور محادثت میں کبھی اختصار کا طالب نہیں ہوتا بلکہ خدا سے یہ چاہتا ہے کہ وصل کی رات کبھی تمام ہی نہ ہو پھر وہ اس کی روزانہ آمد و رفت سے کیونکر گھبرا سکتا ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب سوال ہوا "وما تلک بیمینک یا موسیٰ" تو آپ جواب میں عرض کرتے ہیں ھی عصای اتوکؤ علیھا و اھش بھا علیٰ غنمی ولی فیھا مآرب اخریٰ یہاں آپ نے ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب سے کام لیا مگر اطناب مہمل نہیں جس کو اسہاب کہا جائے بلکہ اطناب مفید جو کہ بلاغت کی ایک نوع ہے اور مفید کس کو موسیٰ علیہ السلام کو کیونکہ اس اطناب سے ان کو اپنے شوق کا اظہار مقصود تھا کہ جب محبوب کے ساتھ بات کا موقعہ مل گیا تو جہاں تک دائرہ بلاغت میں رہ کر کلام میں وسعت ہو سکے اس کو وسعت دینا چاہیے۔ اس لئے آپ نے عصا کے متعلق جتنی باتیں بیان میں آسکتی تھیں سب بیان کر دیں

یہ بھی اہل طریق کا ایک معمول ہے کہ وہ سوال کا جواب مقام ادب میں بھی پورا دیتے ہیں گو اس میں اطناب ہی ہو جائے البتہ ایسا اطناب نہ ہو جو بے کار و فضول ہو بلکہ جواب پورا ہو اور اطناب مفید ہو۔ آجکل یہ عجیب ادب نکلا ہے کہ بزرگوں کے سامنے گفتگو ادھوری کرتے ہیں آدھی بات زبان پر ہوتی ہے آدھی پیٹ میں کبھی جواب پورا ہی نہیں دیتے کیونکہ پوری بات کہنا خلاف ادب ہے سبحان اللہ اور تکلیف دینا بڑا ادب ہے ارے بھائی اگر ان کے سامنے بولنا بے ادبی ہو بھی تو امر کے بعد تو بے ادبی نہ رہے گی کیونکہ مشہور مسئلہ ہے "الامر فوق الادب" اول تو جواب پورا دینا بے ادبی ہے ہی نہیں اور اگر فرضاً ہو بھی تب بھی امر کے وقت تو امر کا بجا لانا ہی ادب ہے۔ یہاں محض اہل حال کی ایک غلطی معلوم ہو گئی وہ یہ کہ بعض اہل حال بیماری اور مصیبت وغیرہ میں دعا نہیں کرتے اور اس کو خلاف ادب سمجھتے اور یوں کہتے ہیں ؎

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن
کہ حال خستہ دلاں را تو خوب می دانی ""

(آپ کے سامنے حال دل کہنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ آپ تو حالِ دل خستہ کو خوب جانتے ہیں)

کہ حق تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم ہے پھر دعا کی کیا حاجت ہے۔ وہ سن لیں کہ گو بظاہر تمہاری دلیل صحیح ہے اور اس کے لحاظ سے دعا کی ضرورت نہیں مگر ایک دوسری وجہ سے ضرورت ہے وہ کیا وہ ضرورت یہ ہے کہ محبوب کا امر ہے وہ چاہتے ہیں کہ تم بے ضرورت ہی ان سے مانگو اور اپنی احتیاج ظاہر کرو۔ گو وہ سب کچھ جانتے ہیں اسی کو مولنا فرماتے ہیں ؎

از دعا نبود مرادِ عاشقاں　　جز سخن گفتن بآں شیریں دہاں

(دعا سے عاشقوں کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ اسی بہانے سے اس محبوب حقیقی سے خوب دیر تک لذت کلام و مناجات حاصل ہوتی ہے۔)

یعنی دعا سے عاشقوں کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ محبوب کے ساتھ کچھ دیر باتیں ہی کر لیں کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہو گی کہ وہ خود دعا کا امر فرماتے ہیں تو وہ عاشق بڑا محروم ہے جس کو محبوب اجازت دے کہ ہم سے باتیں کرو اور وہ منہ بند کر لے کہ آپ کو

توسب معلوم ہے پھر میں کیوں کہوں یہ تو خامی عشق کی دلیل ہے اگر عاشق ہوتے تو اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے کہ جب وہ بولنے کی اجازت دے رہے ہیں تو مجھ کو خوب بولنا چاہیئے۔ اسی لئے امر کے بعد وہ خوب بولتے ہیں اور اتنا بولتے ہیں کہ دوسرے اس کو بے ادب سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

بے ادب تر نیست زوکس درجہاں　　　با ادب تر نیست زوکس درنہاں

(مولانا رومیؒ عاشقان حق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بظاہر بے ادب ان سے جہان میں کوئی نہیں ہے لیکن ان سے با ادب بھی باطن میں جہان کے اندر کوئی نہ ہوگا اور بظاہر بے ادب جوش عشق میں معلوم ہوتے ہیں۔)

جہاں سے مراد علانیہ ہے اور نہاں سے مراد باطن ہے یعنی عاشق سے بڑھ کر ظاہر میں کوئی بے ادب نہیں ہوتا (کیونکہ وہ ایسا سر ہوکر دعا کرتا ہے جیسے کسی سے لڑ رہا ہو) اور باطن میں اس سے بڑھ کر با ادب کوئی نہیں ہوتا کیونکہ اس کے زیادہ بولنے کا منشا محبت ہے اور اس طریق میں محبت ہی بڑا ادب ہے (وہ دلیلہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء) مگر اتنا فرق ہے کہ محبت میں عارف تو حدود کا خیال رکھتا ہے اور مجذوبین و مسلوب العقل لوگوں سے بعض کلمات حدود سے باہر بھی نکل جاتے ہیں مگر چونکہ منشا اس کا بھی محبت ہی ہے اس لئے وہ ظاہر میں بے ادب معلوم ہوتے ہیں مگر باطن میں ادب سے بھرے ہوئے ہیں ان پر ملامت کا حق نہیں گو تقلید بھی جائز نہیں بہرحال امر کے بعد عاشق کو سکوت جائز نہیں جب وہ بولنے کا حکم کرے تو بولنا چاہیئے۔ اس لئے یہ کسی ناقص کا کلام ہے ؎

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن الخ محقق کا کلام یہ ہے کہ ؎

از دعا نبود مراد عاشقاں　　　جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہاں

(دعا سے مراد عاشقوں کی صرف یہی ہوتی ہے کہ اس بہانے سے حق تعالیٰ کے ساتھ شرف ہمکلامی نصیب ہو جاتی ہے) اور

گفتگوئے عاشقاں درکار رب　　　جوشش عشق است نے ترک ادب

(عاشقوں کی گفتگو حق تعالیٰ کی محبت میں جوش عشق سے ہوتا ہے نہ کہ ترک ادب سے جیسا کہ اہل

ظاہران کے ظاہر کلام سے بدگمانی کرتے ہیں)

اس وقت بولنا ہی ادب ہے اور پوری بات کہنا ہی محبت کی علامت ہے اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مقام پر ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب کے ساتھ جواب دیا کیونکہ وما تلك بیمینك یا موسیٰ کے جواب میں اتنے لمبے جواب کی ضرورت نہ تھی صرف ھی عصا کہدینا کافی تھا بلکہ صرف "عصا" بھی کافی تھا "ہی" کا بڑھانا بھی اطناب ہے بلکہ یائ متکلم کی بھی ضرورت نہ تھی صرف "عصا" ہی کافی تھا اور خیر اس کو اگر کوئی اطناب نہ مانے تو آگے "اتوکؤ علیھا واھش بھا علی غنمی تو یقیناً اطناب ہے کہ یہ میری لاٹھی ہے جس پر میں سہارا لیا کرتا ہوں اور اس سے بکریوں کے لئے پتے جھاڑا کرتا ہوں پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اتنا اور بڑھاتے ہیں ولی فیھا مآرب اخریٰ کہ اس سے میرے اور بھی کام نکلتے ہیں۔ اس میں تفصیل کا موقع رکھ لیا کہ ایسی بات کہی جس سے پھر سلسلہ کلام کا تازہ ہوسکے کہ وہ پوچھیں ہاں صاحب وہ دوسرے کام کیا ہیں تو پھر اور باتیں بیان کروں یا بے پوچھے عرض کرسکیں کہ اس وقت جو عرض کیا تھا ولی فیھا مآرب اخریٰ اس وقت اس کی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تو اس وقت اطناب کا منشاء صرف یہی تھا کہ عاشق محبوب کے ساتھ گفتگو میں اختصار نہیں کیا کرتا بلکہ یہ چاہا کرتا ہے کہ ایک منٹ کی بات ہو تو چار منٹ لگ جائیں کیونکہ اس کو محبوب کے ساتھ گفتگو کرنے میں لطف آتا ہے جان میں جان آتی ہے تو وہ ایسے موقعہ میں تطویل کلام کے لئے موقعہ ڈھونڈا کرتا ہے۔

اسی طرح عارفین دعا ضرور کرتے ہیں جس میں مقصود محض حق تعالےٰ سے مناجات اور نیازمندی کی چپکے چپکے باتیں کرنا ہوتا ہے عارف کو تو دعا میں ثواب کا قصد بھی نہیں ہوتا گو اہل ظاہر کو اس سے وحشت ہوگی مگر میں سچ کہتا ہوں کہ عاشق کو محبوب سے باتیں کرتے ہوئے بجز لذت خطاب کے اور کسی طرف التفات نہیں ہوا کرتا۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو اس مقام پر تطویل کی ہے تو اس سے ان کو ثواب کا قصد تھا۔ صاحب اس پر تو ان کو التفات بھی نہ ہوگا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عارفین کو ثواب سے استغنا ہوتا ہے ہرگز نہیں ان کا تو کوئی فعل بھی طلب

ثواب سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ طلب ثواب کے معنے طلب رضا ہی تو ہیں اور طلب جنت اور طلب رضا واحد ہے اور ظاہر ہے کہ عاشق کا کوئی فعل طلب رضا، محبوب سے خالی نہیں ہوتا پس عشاق کا دعا رکے وقت محض خدا تعالےٰ سے بات چیت کا قصد کرنا یہ بھی حقیقت میں طلب ثواب ہی ہے پس یوں کہنا چاہیئے کہ ان کو ثواب کا قصد ہوتا ہے مگر ادھر خیال والتفات نہیں ہوتا جب محبوب عاشق سے کوئی بات کہتا ہے تو اس کا جواب دیتے ہوئے عاشق کو ثواب کی طرف التفات نہیں ہوسکتا گونی نفسہ مقصود ضرور ہے اور اتنی بات تو ہم کو بھی حاصل ہے کہ گو ہماری نماز کچھ چیز نہیں ہے مگر نماز کے وقت ہم کو بھی ثواب پر التفات نہیں ہوتا گو اگر کوئی پوچھے کہ تم نماز کیوں پڑھتے ہو تو سوال کے بعد جواب میں یہی کہیں گے کہ ثواب کے لئے پڑھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ثواب کا قصد تو ہوتا ہے ورنہ یہ جواب کیوں دیتے مگر نماز پڑھتے ہوئے اس کا التفات بہت کم ہوتا ہے بس یہی مطلب ہے میرے اس قول کا عشاق کو دعا میں ثواب کا قصد بھی نہیں ہوتا اور بھلا ثواب سے عاشق کو استغنا کیونکر ہوسکتا ہے جبکہ سید العاشقین صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ کھانے کے بعد یوں فرماتے تھے۔" غیر مودع ولا مستغنی عنہ ربنا" سبحان اللہ کیا عبدیت ہے کھانا کھا چکنے کے بعد اس کو اٹھا دینا چونکہ ایک قسم کے اعراض کو موہم ہوسکتا ہے تو آپ اس کو اس طرح دور کرتے ہیں کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ میرا پیٹ بھر گیا اور چونکہ اب کھانے کی گنجائش نہیں رہی اس لئے کھانے کو اٹھاتے ہیں ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں کرتے شام کو پھر مانگیں گے اور ہم اس سے مستغنی نہیں ہوئے ہیں۔ جب دنیوی نعمتوں سے بھی عشاق کو استغنا نہیں ہے تو ثواب سے ان کو کیونکر استغنا ہوسکتا ہے ۔ بعض جہلا کی عادت ہے بزرگوں کے سامنے کچھ ہدیہ پیش کرتے ہیں تو یوں کہا کرتے ہیں کہ ہے تو حقیر ہدیہ اس قابل نہیں کہ پیش کیا جاوے آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے نہ آپ کو اس کی پروا ہے مگر ہماری خاطر سے قبول کر لیجئے یہ نہایت سخت کلمہ ہے نعم الٰہیہ سے کسی کو استغنا نہیں مشائخ کی بزرگی بھی اسی وقت تک ہے جب تک اللہ تعالےٰ دونوں وقت کھانے کو دے رہے ہیں اور جو

یہ نہ ہونہ معلوم کیا حالت ہو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا قصہ بیان فرماتے ہیں یہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے بھائی ہیں مگر تقویٰ میں سب سے بڑھے ہوئے تھے گو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرح زیادہ مشہور نہیں ہوئے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے ان کے سامنے دھیلہ کی کوڑیاں ہدیہ میں پیش کیں آپ کو اس کی رغبت پر رحم آیا اور غریب ہونا تو اسی سے ظاہر تھا کہ بیچارے نے دھیلے کی کوڑیاں پیش کیں تو آپ نے فرمایا بھائی ان کو تم ہی اپنے کام میں لے آؤ اس نے اصرار کیا کہ حضرت میرا تو جی چاہتا ہے کہ آپ ہی انکو قبول کرلیں میں نے آپ ہی کی نیت سے جمع کی ہیں مگر آپ نے عذر کردیا وہ بیچارہ واپس لے گیا۔ اس پر مبتلاء عتاب ہوگئے یا تو اس لئے کہ ایک مسلمان کی دل شکنی ہوئی تھی یا اس لئے کہ آپ کے نفس میں کوئی بات مخفی ہوگی ممکن ہے کچھ وسوسہ استغنار کا تحقیر ہدیہ کی بناء پر آگیا ہو کہ میں یہ کوڑیاں لیکر کیا کروں بعض دفعہ نفس میں کچھ دقیقہ مخفی ہوتا ہے اور کسی عمل میں نفس کا کچھ شائبہ ہوتا ہے جس کی مبتلاء کو خبر نہیں ہوتی اسی لئے بعض دفعہ شیخ مرید کی کسی ادنیٰ بات پر تشدد کرتا ہے جس سے مرید کو شبہ ہوجاتا ہے کہ شیخ بڑے متشدد ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر مواخذہ کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ بات مرید کی نظر میں خفیف ہوتی ہے اور شیخ کی نظر میں شدید ہوتی ہے کیونکہ اس میں نفس کا جو کید ہے وہ مرید کی نظر سے خفی ہے اور شیخ کی نظر میں جلی ہے۔ حدیث میں آیا ہے "الشرك اخفى فى امتى من دبيب النمل على الصفا کہ شرک میری امت میں چکنے پتھر پر چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہے۔ بھلا اول تو چیونٹی کی چال ہی کیا ہوتی ہے پھر وہ بھی چکنے پتھر پر اس میں تو کچھ بھی اس کا احساس نہیں ہوسکتا تو جو مرض ایسا خفی ہو دوسرے تو اس کو کالعدم سمجھیں گے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بھی شرک فرمارہے ہیں۔ تو کیا نعوذ باللہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بھی متشدد تھے کہ اتنی ذراسی بات کو شرک سے تعبیر فرماتے ہیں ہرگز نہیں پھر حق تعالیٰ کی نظر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ ہے وہ تو اس سے بھی خفی تر کو جانتے ہیں اس لئے بعض دفعہ حق تعالےٰ کسی ایسی بات پر مواخذہ فرماتے ہیں جس کا قابل مواخذہ ہونا مبتلا کو معلوم نہیں ہوتا گو؟

کتنا ہی بڑا عارف ہو مبتلا کو بعض دفعہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کام میں نفس کا کچھ شائبہ تھا مگر حق تعالےٰ کو معلوم ہوتا ہے اس لئے مواخذہ فرماتے ہیں اور یہ بھی حق تعالےٰ کی رحمت ہے عارفین پر کہ ان کی بات بات پر مواخذہ فرمالیں۔ کیونکہ جس بچہ کو استاد روز ایک پھچی مار دیتا ہو یہ اس کی دلیل ہے کہ استاد کو اس پر شفقت ہے اور جس بچہ کو کبھی سزا نہ ملتی ہو اس پر خطرہ ہے کہ شاید استاد اسے اپنے مکتب سے نکالنا چاہتا ہے اس کو آزاد چھوڑ دینا اس کی دلیل ہے کہ استاد کو اس سے محبت نہیں ہے اس لئے دنیا میں حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ مواخذہ ہوتا رہنا بھی رحمت کی دلیل ہے بلکہ اگر آخرت میں بھی مواخذہ ہوا اور کسی مسلمان کو حق تعالےٰ جہنم میں بھیجدیں تو یہ بھی ان کی رحمت ہے کیونکہ قدر نعمت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید۔ نعمت کی قدر مصیبت کے بعد معلوم ہوا کرتی ہے جو شخص جہنم کا عذاب بھگت کر جنت میں جائے گا اس کو جنت کی بہت قدر ہوگی۔

ایک حدیث کے متعلق اپنے استاد علیہ الرحمۃ کا ایک مضمون یاد آگیا جو اسی اصل پر مبنی ہے۔

وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت میں جب سب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہونچ جائیں گے تو جنت میں کچھ جگہ خالی رہ جائے گی اور جہنم بھی نہ بھرے گی۔ تو جنت عرض کرے گی کہ مجھ سے بھرنے کا وعدہ تھا تو مجھے بھرا جائے اور جہنم بھی کہے گی کہ ہل من مزید۔ کچھ اور بھی ہے تو حق تعالےٰ جہنم کے لئے کسی نئی مخلوق کو پیدا نہ کریں گے بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس میں اپنا قدم رکھدیں گے یہ متشابہات میں سے ہے ہم اس کا مطلب بیان نہیں کرسکتے۔ تو حق تعالےٰ کے قدم رکھنے سے جہنم سمٹ کر بھر جائے گی اور کہے گی قط قط یعنی بس بس میں بھرگئی اور جنت کے لئے ایک نئی مخلوق پیدا کرکے اس میں آباد کردیں گے جس سے وہ بھر جائے گی جب یہ حدیث ہم نے پڑھی تو میں نے حضرت استاد سے عرض کیا کہ حضرت یہ لوگ تو ہم سے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ بدون کچھ کئے بغیر مشقت کے جنت لے لیں گے کاش ہم انھیں میں سے ہوجاتے۔ تو حضرت استاد نے فرمایا خدا نہ کرے کہ ہم ان میں سے ہوتے میاں وہ ہم سے زیادہ خوش قسمت نہ ہوں گے ہم ہی ان سے اچھے ہوں گے واقعی ان حضرات کے علوم بھی عجیب ہیں جن کا دوسری جگہ کہیں پتہ نہیں فرمایا ہم دنیا کے

مصائب جھیل کر جب جنت میں جائیں گے تو جوش میں کہیں گے الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیہا نصب ولا یمسنا فیہا لغوب ۵ انھیں یہ بات کہاں نصیب کیونکہ جہاں حزن ہو وہیں اذھب عنا الحزن کا بھی لطف ہے انھیں کیا لطف جن کو مشقت ہی نہیں ہوئی وہ تو یہ سمجھیں گے کہ بس یوں ہی ہوتا ہوگا کہ پیدا ہوئے اور جنت میں بس گئے ان کو جنت کی قدر ویسی نہ ہوگی جیسی ہمیں ہوگی تو آپ سمجھ لو کہ جس شخص کو دنیا کی تکالیف کے ساتھ جہنم کا عذاب بھی بھگتنا پڑے اس کو دخول جنت کے وقت اذھب عنا الحزن کا لطف اوروں سے زیادہ حاصل ہوگا گناہ کی قدر اور لذت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو ڈوبنے کے بعد ساحل پر پہونچا ہو اس کے دل سے ساحل کی لذت پوچھو اور جو شخص ڈوبا ہی نہیں اس کو ساحل کی قدر اور لذت اس کے برابر نہیں ہوسکتی۔

اب میں یہاں اپنا ایک قصہ ایک شبہ کے واقع ہونے کا اور اس کے جواب کے منکشف ہونے کا بیان کرنا چاہتا ہوں اور گو یہ مضمون متن میں بیان کرنے کے قابل تھا تمہید میں بیان کرنے کا ارادہ نہ تھا مگر اسی وقت یاد آیا تو میں بیان کئے دیتا ہوں نہ معلوم پھر یاد رہے نہ رہے ایک دفعہ مجھ کو کچھ پریشانی سی پیش آئی تھی جیسا کہ زمانہ طلب میں عموماً اہل طریق کو پیش آیا کرتی ہے جبکہ وہ مجاہدات اور اذکار و اشغال کچھ مدت تک کر لیتے ہیں اور ثمرہ محسوس نہیں ہوتا تو دل میں وصول کے لئے اضطراب اور بے چینی اور عجلت کا مضمون پیدا ہوتا ہے یہی حالت باوجود مجاہدہ نہ کرنے کے براہ ہوس مجھ کو پیش آئی اور قلب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے گو ہم اس قابل نہیں مگر الٹی سیدھی ہم کو حق تعالیٰ کی طلب بھی ہے گو عشق سعدی تا بزانو ہی کی مثل سہی شیخ سعدی نے ایک عاشق کو دیکھا تھا جو کسی محبوب کی طلب میں کوٹھے پر سے کود پڑا تھا۔ ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ آپ نے قصہ پوچھا کہ یہ کیوں پڑا ہے کیسے ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے کہا کہ یہ اپنے محبوب کو دیکھ کر کوٹھے پر سے کود پڑا اس لئے چوٹ لگ گئی۔ تو شیخ سعدی رح بھی اسی زینہ کی ایک سیڑھی پر چڑھ کر کود پڑے اور فرمایا "عشق سعدی تا بزانو" کہ بھائی ہمارا عشق اتنا ہی ہے کہ ایک گو بلندی ہے

تو ایسے ہی گو ہماری طلب کامل نہیں مگر پھر بھی بحمد اللہ کچھ تو ہے۔ ادھر حق تعالیٰ قادر ہیں۔ ان کو اسباب و وسائط کی کچھ ضرورت نہیں وہ اگر چاہیں تو دفعۃً واصل کر سکتے ہیں ادھر وہ علیم بھی ہیں ہماری اس بے چینی اور اضطراب کی ان کو خبر بھی ہے پھر رحیم بھی ہیں اس حالت میں ان کو رحم بھی آتا ہوگا پھر وصول میں دیر کیوں ہے جلدی کیوں نہیں ہو جاتا واقعی سچ فرمایا خلق الانسان عجولًا انسان میں عجلت کا مادہ فطری ہے غرض ان مقدمات کے بعد وصول کی تاخیر سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کس لئے ہے جب زیادہ الجھن بڑھی تو میں نے مثنوی سے فال لی اور اس فال کا یہ مطلب نہ تھا کہ میرے اعتقاد میں مولانا رومی نے آکر ورق لوٹ دیئے ہرگز نہیں بلکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ مولانا رومی متبرک بزرگ اور محقق تھے ان کا کلام بھی متبرک اور جامع ہے۔ حق تعالیٰ اس برکت کو اس طرح ظاہر فرما دیتے ہیں کہ اس میں سے کوئی موافق مضمون نکال دیتے ہیں چنانچہ مثنوی کھولتے ہی سر ورق پر اس کا جواب موجود تھا۔ یہ بھی نہیں کہ سطریں گننے کی ضرورت پڑی ہو جس کا جی چاہے مثنوی مطبوعہ کھول کر دیکھ لے یہ اشعار سر ورق پر ملیں گے اور جواب بھی ایسا نکلا کہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی زندہ ہوتے تو یہی جواب دیتے۔ واقعی عجیب جواب ہے جس میں کمال یہ ہے کہ میرے مقدمات بھی سب تسلیم کر لئے گئے پھر جواب دیا گیا فرماتے ہیں ؎

چارہ مے جوید پئے من داد تو می شنودم دوش آہ سرد تو

(تمہاری طرف سے سعی اور ہماری تلاش ہم کو تسلیم ہے۔ اور اے عاشق ہم نے کل تیری آہ اس میں طلب اور علم کو تسلیم کیا گیا کہ بیشک تم کو طلب بھی ہے اور درد کے لئے چارہ کی تلاش بھی ہے اور مجھ کو اس کی خبر بھی ہے میں تمہاری آہ و فریاد کو سن رہا ہوں ؎

می توانم ہم کہ بے ایں انتظار رہ نمایم داد ہم راہ گذار

(میں اس کی قدرت رکھتا ہوں کہ بے انتظار ہی تم کو قرب تمام عطا کر دوں)

تا ازیں طوفان دوراں وارہی بر سر گنج وصالم پا نہی

(تاکہ تم اس طوفان مجاہدات سے نجات پا جاؤ اور میرے قرب کے خزانے کو پا جاؤ)

اس میں قدرت کا ذکر ہے کہ یہ بھی مسلم ہے کہ ہم بدون کسی انتظار کے بھی واصل بنا سکتے ہیں اور ہم کو رحم بھی آتا ہے کہ تم کس طوفان بلا میں گرفتار ہو۔ جلدی وصول ہو جانے میں اس طوفان سے بھی نجات ہو جائے گی۔ ان سب مقدمات کا مقتضا تو یہی ہے کہ وصول میں دیر نہ ہوتی مگر ایک مقدمہ تمہاری نظر سے رہ گیا وہ یہ کہ جیسے ہم علیم و قادر و رحیم ہیں اسی طرح ہم حکیم بھی ہیں پس تم نے یہ تو دیکھ لیا کہ طلب و رحمت و قدرت کا مقتضا تعجیل تھی یہ نہ دیکھا کہ حکمت کا مقتضا تاخیر ہے آگے تاخیر کی حکمت کا بیان ہے اور وہ اللہ عجیب حکمت ہے فرماتے ہیں ؎

لیک شیرینی و لذات مقر ہست بر اندازۂ رنج سفر

(لیکن وصل کی شیرینی اور قرب، منزل کی لذت سفر کے مشقتوں کے اعتبار سے محسوس ہوتی ہے) وہ حکمت یہ ہے کہ قرار گاہ پر پہونچنے کی شیرینی اور لذت مشقت سفر کے موافق محسوس ہوا کرتی ہے جس کو سفر میں زیادہ تعب اور مشقت ہوتی ہے اس کو منزل پر پہونچنے کے بعد اتنی ہی لذت بھی آتی ہے اور جس کو بدون تعب کے وصول ہو گیا اسے منزل پر پہونچنے کی پوری قدر نہیں ہوتی ؎

زانکہ از فرزند و خویشاں برخوری کز غریبی رنج و محنت ہا بری

(جو مسافر کئی سال پر اپنے بال بچوں میں آتا ہے جس کو گھر آکر بہت لطف محسوس ہوتا ہے) جو مسافر کئی سال کے بعد اپنے گھر پر آتا ہے بیوی بچوں سے مل کر اس کو زیادہ خوشی ہوتی ہے پس یہ حکمت ہے تاخیر فی الوصول میں تاکہ تم کو وصول کی پوری قدر ہو۔ اگر سستے ہی پہنچ جایا کرتے تو وصول کی بے قدری کرتے کیوں اس لئے کہ ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(جو شخص کسی چیز کو مفت پا جاتا ہے اس کو مفت میں دیدیتا ہے جس طرح نادان بچہ موتی کو روٹی کے بدلے میں دیدیتا ہے)

اور جس شخص کو مشقت اور مصیبت کے بعد وصول ہوگا اس کی تو عمر بھر یہ حالت رہیگی کہ ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر ز باغ دل خلالے کم بود

اس کو ذرا ذراسی کوتاہی پہاڑ کی برابر گراں معلوم ہوگی اور جو آسانی سے پہنچ گیا ہے وہ اتنا پھونک پھونک کر قدم نہ رکھے گا کیونکہ عدم وصول کی بے چینی کا اندازہ ہی نہیں ہوا پس یہ جواب دیکھ کر میری تسلی ہوگئی جو بہت بڑی حکمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرات میں جو اہلِ تصرف بھی ہوئے ہیں وہ تصرف سے کام نہیں لیتے تھے اور کسی کو ایک توجہ سے واصل نہیں بناتے تھے اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات صاحب تصرف نہ تھے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بس یہ تو محض ملاّ ہیں نماز روزہ کر لیتے ہیں ان میں تصرف وغیرہ کچھ نہیں یہ بالکل غلط ہے بحمداللہ ہمارے حضرات میں بڑے بڑے صاحب تصرف بھی ہوئے ہیں جن کو تصرف کی کامل قدرت حاصل تھی مگر وہ اس سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ طالبین ہی سے چکی پسواتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ یہ خود محنت کر کے واصل بنیں تاکہ وصول کی قدر ہو اور جو تصرف سے واصل ہوگا اس کو وصول کی قدر نہ ہوگی۔ دوسرے بلا اذن تصرف کرنا کمال عبدیت کے بھی خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون صاحب تصرف ہوگا اگر آپ تصرف کرتے تو سارے عالم کو ایک دم سے ولی بنا دیتے کسی کی مجال نہ تھی جو کفر کر سکتا مگر آپ نے اس سے کام نہیں لیا۔ حضرت ابو طالب کے متعلق آپ کی خواہش بھی تھی کہ یہ ایمان لے آئیں مگر آپ نے قوت تصرف کو استعمال نہیں کیا۔ تو خدا معاف کیجئے

؎ سوال:۔ هذا الكلام يرده ظاهرا قوله تعالیٰ انك لاتهدی من احببت ولكن الله يهدی من يشاء فانه يكفی قدرة التصرف عنه صلی الله عليه وسلم۔ جواب:۔ ليس فيه نفی ذلك ولو كان كذالكان حق العبادة انك لاتهدی من شئت ولكنه قال تهدی من احببت فعلم به انه صلے الله عليه وسلم لم يرد هداية احد نعم احبها بعض والحب غير الارادة ولو اراد ذلك وصرف فيه همة لهدی الله الناس جميعا ۲ (رجا مع) ثم المشية لو درجتان احدهما صرف القدرة فقط و ثانيتها صرف الهمة مع ذلك والثابت بالاية لو ثبت هو الاول فقط والمنفی فی كلامنا هو الثانی ۱۲ (اشرف)

کہ ابوطالب کے نام کے ساتھ زبان سے حضرت ہی نکلتا ہے حالانکہ وہ ایمان نہیں لائے مگرچونکہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی اور محبت بھی ایسی کہ جان نثار تھے اور چچا بھی تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے محبت تھی اس لئے زبان پر ان کے نام کے ساتھ بیساختہ حضرت نکل جاتا ہے ابوجہل کے نام کے ساتھ کبھی نہیں نکلتا کیونکہ وہ آپ کا چچا تھا اگرچہ حقیقی نہ تھا مگر اس کے ساتھ ہی موذی بھی بہت تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے بہت ایذا دی ہے اس لئے اس کے نام کے ساتھ کوئی تعظیمی لفظ نہیں نکلتا۔ ایسے ہی ابولہب کے نام کے ساتھ بھی نہیں نکلتا کہ وہ حقیقی چچا ہے مگر ایذا میں ابوجہل کے مثل تھا بعض لوگ سورۃ تبت کے پڑھنے سے کراہت کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی مذمت ہے اس کے پڑھنے سے آپ کو ایذا ہوتی ہوگی اور اس کے متعلق ایک خواب بھی مشہور ہے۔ مگر جو خواب دلائل شرعیہ کے خلاف ہو وہ حجت نہیں ہوا کرتا، بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام الٰہی کے پڑھنے سے کبھی ایذا ہوسکتی ہے ہرگز نہیں یہ مانا کہ وہ آپ کا چچا تھا مگر ادھر یہ بھی تو دیکھو کہ حق تعالیٰ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسا علاقہ تھا پھر محبوب اگر اپنے کسی عزیز سے بغض رکھے تو کیا عاشق کو اس سے بغض نہ ہوگا ضرور ہوگا اور محبوب اگر اس عزیز کی مذمت کرے تو کیا عاشق کو اس سے ایذا ہوگی کبھی نہیں ہوگی بلکہ لذت آئیگی (یہاں یہ ضرور ہے کہ کسی خاص صورت کی تعیین کرلینا مناسب نہیں کہ اس میں سورہ تبت اور اس کے غیر سب برابر ہیں۔ ممکن ہے کسی نے اسی صورت کو قرأۃ کے لئے ورد بنالیا ہو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشرطیکہ خواب کا قصہ صحیح ہو لطیف عنوان سے خواب میں متنبہ فرمایا ہو ممکن ہے کہ اس شخص میں ادب کم ہو آپ نے بطور معالجہ کے اس کے لئے یہ تجویز فرمایا ہو ۱۲ جامع) بہرحال اگر آپ تصرف سے کام لیتے تو کم از کم اپنے عزیزوں پر تو ضرور اثر ڈال دیتے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔ اسی سنت کا اتباع ہمارے حضرات کرتے ہیں وہ بھی تصرف سے کام نہیں لیتے اور اگر کبھی کسی متوسط نے ایسا کیا بھی تو اکابر نے اس کو مٹادیا ہے۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا واقعہ ہے کہ آپ ایک

دفعہ کسی بادشاہ سے گفتگو کر رہے تھے ساتھ میں حضرت شبلی بھی تھے اثناء گفتگو
میں بادشاہ نے حضرت جنید کو کوئی سخت کلمہ کہا وہ تحمل سے کام لیتے رہے مگر حضرت
شبلیؒ سے نہ رہا گیا وہاں کوئی قالین بچھا ہوا تھا جس پر شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی
حضرت شبلیؒ نے اس تصویر پر توجہ کا اثر ڈالا تو وہ سچ مچ شیر بن گیا۔ حضرت جنیدؒ نے
دیکھ لیا انھوں نے فوراً اس پر ہاتھ رکھدیا تو وہ پھر مٹ گیا اور تصویر کی تصویر رہ گئی
بادشاہ نے پھر کسی بات پر کوئی سخت کلمہ کہا حضرت شبلیؒ نے پھر توجہ کی جس سے دوبارہ
وہ تصویر سچ مچ شیر کی صورت بن گئی۔ حضرت جنیدؒ نے پھر ہاتھ رکھ کر اس کو مٹا دیا کئی
بار ایسا ہوا حتیٰ کہ ایک دفعہ بادشاہ کی نظر بھی شیر پر پڑ گئی تو اس کا رنگ فق ہو گیا
اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو حضرت جنیدؒ نے تسلی کی کہ آپ نہ گھبرائیں اس کی
مجال نہیں کہ میرے ہوتے ہوئے آپ کو کچھ بھی کہہ سکے آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔
آپ کو حق ہے کہ ہمیں جو چاہیں کہیں میں کبھی آپ کے مقابلہ میں تصرف نہ کروں گا۔ یہ
شبلی بچہ تھا اس سے تحمل نہ ہوا اس نے تصرف سے کام لے لیا۔ مگر میں اپنے سامنے
اس کے کسی تصرف کو آپ پر چلنے نہ دوں گا بالکل بے فکر رہیں۔ حضرت جنیدؒ نے تو اس کو
بے فکر کر دیا مگر اس کو ان حضرات کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ خدا تعالیٰ نے ان کو
کتنی قوت عطا کی ہے بس اس کے بعد سنبھل سنبھل کر باتیں کرنے لگا پھر کوئی گستاخی
نہیں کی۔ سو ہمارے اکابر تو ایسے ہوئے ہیں کہ خود تو تصرف کیا کرتے اگر کسی چھوٹے
نے کیا بھی تو اس کو مٹا دیا غرض وہ تصرف اس لئے نہیں کرتے کہ اول تو اس میں
سالک کو نعمت کی قدر نہیں ہوتی کیونکہ قدر تو بعد مشقت ہی کے ہوتی ہے
دوسرے پھر وہ ہمت توڑ دیتا ہے پس توجہ ہی کے سہارے پر چلتا ہے۔ تیسرے
یہ طریقہ خلاف سنت بھی ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کبھی تصرف سے کام نہ لیتے
تھے (اس مقام پر پہنچکر حضرت مولانا کو ما قبل کا ربط یاد نہ رہا تو جامع وعظ سے دریافت
فرمایا تو اس نے اطلاع کی کہ یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ خدا تعالیٰ کا مواخذہ بھی رحمت
ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں اس پر فرمایا کہ ۱۲ جامع) میں یہ بیان کر رہا تھا کہ

حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر کبھی گرفت ہوجانا بھی رحمت ہے۔ جیسے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے ساتھ معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل ابھی آتی ہے اسی پر یہ مضمون چل پڑا تھا کہ وصول میں تاخیر ہونا بھی رحمت ہے اس میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں اور اسی حکمت کے ضمن میں اپنے اکابر کے تصرف نہ کرنے کی وجہ بھی بتلادی تھی اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس غریب کا ہدیہ جو دھیلہ کی کوڑیاں تھیں واپس کردیا تو اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا کہ اسی دن سے تمام فتوحات بند ہوگئیں اور فاقہ پر فاقہ گذرنے لگا اول تو انہوں نے اس کو حکمت خاص پر محمول کیا کہ شاید رفع درجات کے لئے یہ معاملہ ہورہا ہے مگر پھر تنبہ ہوا کہ نہیں یہ تو عتاب ہے۔ عارف کو خدا تعالیٰ نے ایک نور دیا ہے وہ اس سے سمجھ لیتا ہے کہ کونسی مصیبت رفع درجات کے لئے آئی ہے اور کونسی عتاب کی وجہ سے آئی ہے (جس کی ایک علامت یہ ہے کہ جس مصیبت کا منشا عتاب ہوتا ہے اس سے بے چینی اور پریشانی بڑھتی ہے) غرض آثار سے وہ سمجھ گئے کہ یہ فتوحات کی بندش کسی عتاب کی وجہ سے ہے پھر سوچنے سے خیال آیا کہ فلاں دن اس غریب کی کوڑیاں واپس کردی تھیں شاید یہ بات ناپسند ہوئی ہے۔ بس اسی وقت گھبرا کر بلایا اور خود سوال کیا کہ بھائی وہ دھیلہ کی کوڑیاں ہمیں دیدو آہ یا تو دینے سے بھی نہ لیا تھا یا خود اس سے مانگ رہے ہیں ؎

ایں چنیں شیخے گدائے کو بکو عشق آمد لااُبالی فاتقوا

(ایسا شیخ آج گدائی گلی درگلی کررہا ہے عشق کی یہی شان ہے یہ بڑا ہی لااُبالی ہے اس سے بچ کے رہو)

واقعی یہ عشق بھی بہت ناچ نچاتا ہے وہ بیچارہ یہ سن کر باغ باغ ہوگیا۔ اور کہا مولانا واقعی مجھے آپ کے انکار سے بہت کلفت ہوئی تھی اور میں نے اب تک وہ کوڑیاں خرچ نہیں کیں۔ دل نے گوارا ہی نہیں کیا کہ ان کو خرچ کروں اب تک ویسی ہی رکھی ہیں آپ نے کہا بس جلدی لے آؤ اب میں اس کلفت کا تحمل نہیں کرسکتا جو تم کو ایذا دینے سے

مجھے پہنچ رہی ہے چنانچہ اس نے وہ کوڑیاں دیں اور آپ نے خوش خوش لے لیں بس اسی دن سے فتوحات کا دروازہ کھل گیا صاحبو! عارفین کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ وہ دھیلہ کی کوڑیوں سے بھی مستغنی نہیں ہیں اور اگر کبھی ذرا بھی کسی ادنیٰ نعمت سے استغنا کا وسوسہ پیدا ہو جائے تو پھر خود مانگتے ہیں پھر ان کو دعا میں ثواب یا جنت سے استغنا کیونکر ہوسکتا ہے۔ اس لئے یہ مولانا نے فرمایا ہے کہ ؎

از دعا نہ بود مراد عاشقاں جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہاں

(دعا سے عاشقان حق کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ سے اسی بہانہ سے ہم کلامی کی لذت نصیب ہو جاتی ہے) اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو لذت خطاب کے سوا جنت یا ثواب کی طلب اور پروا نہیں ہوتی ہرگز نہیں پروا تو ان کو ہر چیز کی ہے ہاں غلبہ لذت وخطاب میں بعض دفعہ ثواب وغیرہ کی طرف التفات نہیں ہوتا جیسا کہ میں نے نماز کی مثال سے اس کو واضح کر دیا تھا اور یہ مضمون دعا کا اس پر چلا تھا کہ عاشق محبوب کے روز روز آنے اور دیر تک بات چیت کرنے سے نہیں گھبرایا کرتا بلکہ وہ تو اس کا موقعہ ڈھونڈا کرتا ہے کہ کسی طرح اور دیر تک باتیں ہوں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جواب میں اسی لئے اطناب سے کام لیا تھا اس پر درمیان میں ان سالکین کی غلطی ظاہر کر دی تھی جو دعا کو ترک کر دیتے ہیں اور بتلا دیا تھا کہ گو حق تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اور تمہارے بتلانے اور مانگنے کی ضرورت نہیں مگر محبت کا مقتضا یہ ہے کہ جب محبوب بولنے کی اجازت دے تو بات چیت کے موقعہ کو غنیمت سمجھے اور خوب عرض ونیاز کرے اور جو چاہے مانگے (یعنی حدود میں رہ کر ۱۲ جامع) غرض عاشق کبھی محبوب کے روز روز آنے سے نہیں گھبرایا کرتا جیسا کہ ہم روز روز دو وقت روٹی کھانے سے نہیں گھبراتے تو حیرت ہے کہ ہم لوگ روٹی سے تو مستغنی نہیں ہیں مگر ذکر سے مستغنی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اہل علم بھی خط میں لکھتے ہیں کہ اوراد سے جی گھبراتا ہے کہ یہ کہاں کا جنم روگ لگا جس کا تذکرہ ابھی کیا تھا افسوس ان لوگوں نے دنیا کے کاموں کو کبھی جنم روگ نہ سمجھا دیکھئے جو لوگ کسی کام پر ملازم ہیں وہ روزانہ

اسی کام پر لگتے ہیں کوئی روز آٹے کی مشین چلاتا ہے کوئی روز تعمیر کے کام پر جاتا ہے آخر اس کو جنم روگ کیوں نہیں سمجھا گیا بس یوں چاہیئے کہ ہر دن نیا کام کیا جائے ایک ہی کام روز روز کیوں کیا جاتا ہے اس کا منشا صرف یہ ہے کہ ان کاموں کو تو مفید اور ضروری سمجھتے ہیں اس لئے عمر بھر روزانہ کرنے سے بھی نہیں گھبراتے اور ذکر کو مفید اور ضروری نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ جنم روگ معلوم ہوتا ہے حضرت یہ ہماری بد قسمتی ہے ورنہ ذکر ایسی چیز ہے کہ مسلمان کو تو اس سے کبھی غفلت نہ ہونا چاہیئے تھی، غالباً حضرت خواجہ عبید اللہؒ احرار کا ارشاد ہے کہ مجھے بہت زمانہ کے بعد معلوم ہوا کہ عالم میں اہل غفلت بھی ہیں ورنہ ابتداء سے میں یہ سمجھتا تھا کہ سب لوگ ذاکر ہیں۔ خدا سے غافل کوئی نہیں۔ خواجہ صاحب بچپن ہی سے صاحب نسبت تھے مادرزاد ولی تھے ان پر کبھی غفلت گذری ہی نہیں اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ سب ایسے ہی ہوتے ہوں گے بعد میں معلوم ہوا کہ دنیا میں اہل غفلت بھی ہیں۔ اس نمونہ کے ایک بزرگ اس زمانہ میں بھی ہوئے ہیں۔ مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند رحمۃ اللہ علیہ کے والد صاحب مادرزاد ولی تھے۔ ایک دفعہ کوئی گوجران کی بھینس چرالے گیا حضرت نے تلاش کیا تو لوگوں نے اسی پر شبہ ظاہر کیا کہ حضرت فلاں شخص لے گیا ہے آپنے اس سے فرمایا کہ بھائی ہماری بھینس اگر لی ہو تو دیدو اس نے قسم کھالی کہ حضرت میں نے آپ کی بھینس نہیں لی کسی نے جھوٹ موٹ میرا نام لے دیا ہے آپ کو یقین آگیا اور لوگوں سے کہا کہ اس نے نہیں لی وہ تو قسم کھاتا ہے۔ یہاں تو وہ قسم کھا کر بری ہو گیا مگر خدا تعالےٰ سے کیونکر چھوٹتا غیب سے اس پر افتاد پڑی اور نقصان پر نقصان اموات پر اموات ہونے لگیں سمجھ گیا کہ یہ حضرت کے سامنے جھوٹی قسم کھالے اور ان کو تکلیف پہونچانے کا وبال ہے آخر جھک مار کر آیا اور اقرار کیا کہ حضرت میں نے آپ کی بھینس چرائی تھی میری خطا معاف کردیجئے فرمایا کہ تو نے قسم کھا کر کہا تھا میں نے نہیں لی۔ کہا میں نے جھوٹی قسم کھالی تھی یہ سن کر حضرت گھبرا گئے اور فرمایا اللہ کسوں (یعنی اللہ کی قسم یہ پرانا محاورہ تھا) مجھے تو آج خبر ہوئی کہ مسلمان جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے پہلے بزرگوں کے محاورات سیدھے

سادے ہوتے تھے اللہ کی قسم کی جگہ اللہ کسوں کہتے تھے تو بعض مادرزاد ولی اور صاحب استغراق آجکل بھی ہوتے ہیں بہرحال ذکر ایسی ہی چیز ہے کہ ہر مسلمان کو لازم ہونا چاہیئے مگر بدقسمتی سے آجکل لازم نہیں رہا اس کی بھی ایک خاص جماعت رہ گئی ہے سو اس مضمون کا تعلق ان ہی اہل ذکر سے ہے اس لئے اس کے لئے ایک خاص مجلس منعقد کی گئی ورنہ حقیقت میں یہ مضمون سب مسلمانوں کے لئے عام تھا۔ اب اس کو سن لیجئے وہ مضمون یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے تمام افعال میں رضا چاہیئے۔ اور اپنی تجویز کو ان میں دخل نہ دینا چاہیئے" گو یہ بات سب کو معلوم ہے اور اعتقاداً سب ذاکرین اس کو مانے ہوئے ہیں مگر حالاً کبھی اس میں کوتاہی ہو جاتی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ الوان محبت مختلف ہیں کسی میں التہاب ہے اور کسی میں خمود ہے یعنی بعض میں طلب کا لون کیفیت عشقیہ وشوقیہ کے ساتھ ہوتا ہے جس کا خاصہ ہے التہاب اور اضطراب یعنی سوزش وشورش اور بعض میں انس کے ساتھ ہوتا ہے جس کا خاصہ ہے خمود اور برودت تو کبھی صاحب خمود اپنے کو التہاب واحتراق سے خالی دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں محبت سے محروم ہوں کیونکہ وہ محبت کو لون التہاب کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے پھر عجلت کی وجہ سے اپنے لئے التہاب کو تجویز کرتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ کسی طرح میرے اندر بھی التہاب پیدا ہو اور جب کسی حکمت سے حق تعالیٰ اس میں یہ کیفیت پیدا نہیں کرتے تو یہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھ کر مغموم رہتا ہے مگر یہ اس کی غلطی ہے اس نے یہ نہیں سمجھا کہ محبت کا ایک لون برد خمود بھی ہے پس یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں محبت سے محروم ہوں ہرگز محروم نہیں ہو محبت سے تم بھی حصہ لئے ہوئے ہو۔ مگر اس کا رنگ دوسرا ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ یہ محبت سے اپنے کو خالی سمجھنے والا کیا کبھی ایک دن کی نماز بھی ترک کر سکتا ہے اگر کوئی اس کو ہزاروں روپیہ دے اور یہ کہے کہ آج نماز نہ پڑھو تو کیا یہ اس کو گوارا کر سکتا ہے ہرگز نہیں کوئی مسلمان اس کو گوارا نہ کرے گا ہاں شرط یہ ہے کہ صاحب طلب ہو طالب دنیا نہ ہو ورنہ وہ تو ایک پیسہ میں بھی نماز کو بیچ دے گا ہزاروں کا تو کیا ذکر چنانچہ آجکل بہت مسلمان دین فروشی کر رہے ہیں

اور بعض اہل علم بھی اس گناہ میں مبتلا ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ عوام کی دین فروشی تو بصورت دنیا ہوتی ہے وہ گناہ کو گناہ کی شکل میں کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گنہگار بھی سمجھتے ہیں۔ اور مولوی صاحب کی دین فروشی بصورت دین ہوتی ہے وہ گناہ کو طاعت بنا کر کرتے ہیں غلط فتوے دیں گے اور ٹھونس ٹھانس کسی کلیہ کے تحت میں داخل کر دیں گے۔ ان سے تو وہ عوام ہی اچھے جو گناہ کر کے ڈرتے اور اپنے کو برا سمجھتے ہیں اور یہ مولوی صاحب تو طاعت بنا کر ڈرتے بھی نہیں کیونکہ اپنے نزدیک وہ گناہ کو شریعت کے موافق بنا چکے ہیں شاید اس پر کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ تم نے عوام کی دین فروشی کو علماء کی دین فروشی سے اچھا کیونکر کہدیا۔ اور ان کو صاحب خشیت اور مولویوں کو خشیت سے خالی کیونکر بنا دیا حالانکہ نص سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت تو علماء ہی میں ہوتی ہے جہلا میں نہیں ہوتی چنانچہ حق تعالےٰ اس کی تصریح فرماتے ہیں انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں علم خشیت کے لئے شرط ہے علت نہیں ہے۔ اس کی تفسیر میں لوگ غلطی کرتے ہیں کہ علم کو علت خشیت سمجھتے ہیں اس لئے اس پر یہ اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ آیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ کوئی عالم خشیت سے خالی نہ ہو۔ اور کسی مولوی سے گناہ کا صدور نہ ہو حالانکہ اس کے خلاف مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ اشکال پہلے مجھے بھی ہوتا تھا پھر خود بخود قلب پر یہ بات وارد ہوئی کہ اس کا حصر کا مفہوم تو یہ ہے کہ "لا یخشی اللہ من عبادہ الا العلماء" جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ "لا خشیۃ الا بالعلم" نہ کہ "لا علم الا بالخشیۃ" پس یہ حصر ایسا ہو گیا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لا صلوٰۃ الا بطہور کہ نماز بدون وضو کے نہیں ہوتی جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا جہاں وجود ہو گا وضو کے ساتھ ہو گا بدون وضو کے نہ ہو گا۔ یہ تو مطلب نہیں کہ جب وضو کا وجود ہو تو اس کے ساتھ نماز کا وجود بھی لازم ہو اسی طرح یہاں پر علم شرط خشیت ہے کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے گو وہ مولوی بھی نہ ہو کیونکہ جاہل بھی خدا سے ڈرتا ہے تو اسے کم از کم عذاب ہی کا علم ہے تو خشیت بدون علم کے اس کو بھی نہیں ہوئی باقی یہ ضرور نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں

خشیت لازم ہو کیونکہ علم اس کی علت نہیں اور علت کا وجود تو معلول کے وجود سے مستلزم ہوتا ہے مگر شرط کا وجود مشروط کے وجود کو مستلزم نہیں ہوتا ہاں انتفاء شرط انتفاء مشروط کو بیشک مستلزم ہوتا ہے سو ایسی نظیر کوئی نہیں دکھا سکتا کہ کہیں خشیت کا وجود بدون علم کے ہو گیا ہو تو علم لوازم خشیت سے ہوا نہ کہ خشیت لوازم علم سے بہرحال اس آیت کی تفسیر میں بہت لوگوں نے غلطی کی ہے اس لئے میں نے متنبہ کردیا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ علوم معقولہ سے فہم قرآن میں بہت سہولت ہو جاتی ہے چنانچہ شرط اور علت کا نام سنتے ہی طلبہ فوراً سمجھ گئے ہوں گے کہ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے یہ کام کی بات تھی اس لئے درمیان میں بیان کر دی گئی۔ غرض جو لوگ طالب دنیا ہوں ان کا تو ذکر نہیں مگر طالب حق جو صاحب خمود ہی ہو ہرگز کسی طرح کی وجہ سے نماز کو قضا نہیں کرسکتا پس اس کا اپنے کو محبت سے خالی سمجھنا غلط ہے اگر محبت سے محروم ہوتا تو نماز سے اتنی محبت نہ ہوتی اور طالب ہو کر بھلا محروم کیونکر ہو سکتا ہے میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ طالب کبھی محروم نہیں ہوتا کیونکہ حق تعالٰی کا وعدہ ہے

من تقرب الی شبرا تقربت الی ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الی باعا

یعنی جو میری طرف ایک بالشت بھر قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس سے قریب ہوتا ہوں اور جو ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے میں ایک باع یعنی دونوں کھلے ہوئے ہاتھوں کی مقدار اس سے قریب ہوتا ہوں اور یہاں چونکہ طلب موجود ہے تو قصد تقرب بھی موجود ہے اور اس پر وعدہ ہے عطاء تقرب کا تو محرومی نہیں ہوسکتی بلکہ یقیناً یہ شخص مقرب ہے۔ گو اس کا تقرب بصورت تنزل ہی ہو اور گو اس کے زعم میں خلود اور محرومی ہو کیونکہ عروج قرب حق کی یہ بھی ایک قسم ہے کہ تنزل کی صورت میں ہو مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبر کہ معراج مرا نیست از معراج یونس اجتبا

(حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری معراج کو حضرت یونس علیہ السلام کے معراج پر ترجیح مت دو ان کا عروج بصورت نزول ہے قرب حق بصورت نزول ہے قرب

حق بصورت عروج پر منحصر نہیں ہے جیسا کہ سجدہ میں قرب بصورت نزول ہے)

قرب نز پستی ببالا رفتن است قرب حق از قید ہستی رستن است

(قرب حق بلندی اور پستی پر جانا نہیں ہے۔ قرب حق قید ہستی سے خلاصی پانا ہے)

مولانا نے حدیث لا تفضلونی علی یونس بن متی کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ اس کے عموم میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو کیونکہ جس طرح قرب حق کی ایک صورت پستی سے بلندی کی طرف جانا ہے اسی طرح ایک صورت یہ بھی ہے کہ بلندی سے پستی کی طرف جائے قرب حق صورت عروج ہی میں منحصر نہیں بلکہ کبھی بصورت نزول بھی ہوتا ہے اگر قرب ہمیشہ بصورت عروج ہی ہوا کرتا تو حق تعالیٰ واسجد واقترب نہ فرماتے بلکہ واسجد وابتعد فرماتے کیونکہ سجدہ میں تو بلندی کی طرف نہیں جاتا بلکہ بندہ پستی کی طرف جاتا ہے اگر یہ بعد ہوتا تو حق تعالیٰ اسپر واقترب کو مرتب نہ فرماتے حالانکہ نص میں صراحۃً سجدہ کو سبب قرب فرمایا گیا ہے معلوم ہوا کہ قرب کبھی بصورت نزول بھی ہوتا ہے پس تم یہی سمجھو کہ تم کو اسی صورت سے قرب عطا ہوا ہے۔ صاحب اگر تم خدا سے دور ہوتے تو وہ طاعات وذکر کی تم کو کبھی توفیق نہ دیتے اور یہ طلب تمہارے اندر پیدا نہ کرتے۔ یہ مضمون حضرت حاجی صاحبؒ نے بیان فرمایا تھا واقعی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے شبہات کے حل کرنے کے امام تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ فرمایا کہ جو شخص حج کر کے یہ وسوسہ رکھے کہ نہ معلوم میرا حج قبول ہوا یا نہیں وہ بڑا بدگمان ہے۔ اگر حج تعالیٰ کو قبول حج منظور نہ ہوتا تو وہ تم کو اپنے دربار میں آنے بھی نہ دیتے دور ہی سے دھکے دیدیتے جیسا کہ ہزاروں کو باوجود وسعت دولت کے حاضری کی توفیق نہیں دی۔ جب حق تعالیٰ نے تم کو اپنے گھر تک بلا لیا تو امید قوی رکھو کہ ان شاء اللہ تعالیٰ حج قبول ہے اور حدیث میں ہے۔ انا عند ظن عبدی بی" اس قاعدہ سے امید ہے کہ اگر تمہارا حج قابل قبول بھی نہ ہو تو اس گمان نیک کی برکت سے قبول ہو جاوے گا۔

اسی طرح ایک واقعہ ایک ذاکر نے عرض کیا کہ حضرت میں چوبیس ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کرتا ہوں مگر کچھ نفع نہیں معلوم ہوتا۔ فرمایا یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم کو اس قدر ذکر کی توفیق ہوئی۔ سبحان اللہ اس سے زیادہ اور کیا حل ہوگا غرض جو شخص طلب میں مشغول ہے وہ یہ نہ سمجھے کہ میں صرف طالب ہی ہوں اور اسی طلب سے کام کر رہا ہوں بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ حق تعالےٰ کو بھی اس سے محبت ہے صاحب حق تعالیٰ ہی کی محبت سے آپ کام کرتے ہیں اگر ان کو محبت نہ ہوتی تو آپ کی کیا مجال تھی جو طلب میں مشغول ہوتے اور ذکر و طاعات بجالاتے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست

(پانی مت تلاش کرو پہلے اپنے اندر پیاس پیدا کرو پیاس کی برکت سے پانی تمہارے اندر سے جوش یعنی پانی کی تلاش کم کرو اور اپنے اندر تشنگی پیدا کرو جہاں تشنگی ہوگی وہاں پانی خود بخود پہنچ جائے گا آگے فرماتے ہیں کہ جس طرح پیاسے پانی کے طالب ہیں اسی طرح پانی بھی ان کا طالب ہے ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پیاسے لوگ اگر جہاں سے پانی تلاش کرتے ہیں تو پانی بھی اپنے پیاسوں کو تلاش کرتا ہے)

مطلب یہ ہے کہ ہر محب محبوب بھی ہوتا ہے اور ہر طالب مطلوب بھی ہوتا ہے تم تنہا اپنے ہی کو طالب نہ سمجھو بلکہ تمہارا بھی کوئی طالب ہے اور اسی کے طلب کے اثر سے تمہارے اندر طلب پیدا ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں کیں بہ نسبت ہست ہم این وہم آں

(جس کو عاشق دیکھو سمجھ لو کہ یہ محبوب بھی ہے اگر مطلوب اور محبوب نہ ہوتا تو اس کو طلب ہی نہ ہوتی)

پس اتنا فرق ہے کہ تمہارا عشق تو ایسا ہے کہ تم نے دنیا میں غل مچا دیا ڈھول پیٹ دیئے۔ کہ ہائے ہم مرے ہائے ہم چلے۔ تم نے تو ایک شور برپا کر دیا اور معشوق کا عشق

مخفی ہے وہ ڈھول نہیں پیٹتے - فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں است و ستیر عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر

(معشوقوں کا عشق پوشیدہ ہوتا ہے اور عاشقوں کا عشق ڈھول کی طرح ظاہر ہوتا ہے)

لیک عشق عاشقاں تن زہ کند عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

(لیکن عاشقوں کا عشق ان کو لاغر کرتا ہے اور معشوقوں کا عشق ان کو فربہ کرتا ہے)

تمہارے عشق کی شان تو یہ ہے کہ اس سے چہرہ زرد ہوگیا لبوں پر خشکی آگئی اضطراب اور بے چینی بڑھ گئی اور عشق محبوب کی شان عدم تغیر و عدم تاثر ہے۔ پس فربہ کند کہنا مجاز ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہاں تاثر اور تغیر نہیں ہے جیسا عاشق کو کیفیت عشق سے تاثر و تغیر ہوتا ہے جیسے گریہ و آہ و زاری و زردی رنگ ورخ وغیرہ۔ اور چونکہ عدم تاثر و عدم تغیر کے لئے عادۃً مخلوق میں فربہی لازم ہے تو مولانا نے بطور کنایہ کے لازم بول کر ملزوم کا قصد کرلیا اور یہ کوئی جرم نہیں۔ قرآن و حدیث میں ایسے محاورات کا استعمال بکثرت موجود ہے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں حق تعالیٰ بندہ سے فرمائیں گے۔ "مرضت فلم تعدنی واستطعمتک فلم تطعمنی" کہ میں بیمار ہوا تو میری عیادت کو نہ آیا میں نے کھانا مانگا تو نے دیا نہیں۔ مومن عرض کرے گا "یا رب کیف اعودک وکیف اطعمک وانت رب العلمین" کہ الٰہی میں آپ کی عیادت کیسے کرتا اور آپ کو کھانا کیسے کھلاتا آپ تو رب العالمین ہیں اور ان تغیرات سے منزہ ہیں ارشاد ہوگا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور اس نے تجھ سے کھانا مانگا سو تو نے اس کی عیادت نہ کی نہ اُسے کھانا دیا اور اگر تو اس کو پوچھنے جاتا اور اس کی خدمت کرتا "لوجدتنی عندہ" تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا بتلایئے یہ مجاز کا استعمال ہے یا نہیں ورنہ کیا حق تعالیٰ پر مرض کا حقیقی اطلاق صحیح ہوسکتا ہے ہرگز نہیں علیٰ ہذا قرآن میں حق تعالیٰ کے رؤف و رحیم اور غضب وغیرہ کا جو استعمال ہے کیا اس کو حقیقت پر حمل کیا جا سکتا ہے کبھی نہیں علماء نے خود تصریح کی ہے کہ ان صفات کا حمل حق تعالیٰ پر غایات کے اعتبار سے ہوتا ہے

نہ کہ مبادی کے اعتبار سے ۱۲)

پھر صوفیہ ہی نے اگر مجاز کا استعمال کرلیا تو کیا قصور ہو گیا ان علماء خشک سے خدا بچائے کہ خواہ مخواہ صوفیہ پر دھڑا دھڑ کفر کے فتوے لگانے لگے۔ حالانکہ اس سے بڑھ بڑھ کر نصوص میں الفاظ موجود ہیں اور رات دن یہ خود اس میں تاویلیں کرتے ہیں پھر صوفیہ کے کلام میں تاویل کر لینے اور کنایہ و مجاز پر حمل کرنے سے ان کو کیا چیز مانع ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض صوفیہ سے دین کا ضرر بھی ہوا ہے مگر غیر محققین سے باقی محققین سے کبھی ضرر نہیں ہوا محقق ایک جگہ اگر مجاز کا استعمال کرتا ہے تو دوسری جگہ اس کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں تو مولانا نے عشق الٰہی کی ایک مثال بیان کر دی اور دوسری جگہ ان تمثیلات سے برات ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے بروں از وہم و قال وقیل من
خاک بر فرقِ من و تمثیل من

(اے وہ ذات کہ ہمارے وہم اور قیل قال سے بالا تر ہے ہمارے تمثیلات پر خاک ہو اور ہمارے سر پر بھی یعنی جو بے مثل ذات ہے اس کی مثال کیسے ممکن ہوگی)

اس کے بعد تمثیل کا عذر بیان کرتے ہیں کہ جب یہ تمام تمثیلات ناقص ہیں تو پھر ان کو بیان کس لئے کیا جاتا ہے۔ تو فرماتے ہیں ؎

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت
ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

(لیکن بندہ کو بدون تصور صبر نہیں آتا ہے اور تصور بدون مثال کے ممکن نہیں ہے پس ہر وقت اپنی جان کو پیش کرتا رہتا ہے)

یعنی بندہ کو بدون آپ کے تصور کے صبر نہیں آتا اور تصور بدون مثال کے ہو نہیں سکتا کیونکہ غائب کا تصور کسی نہ کسی صورت ہی سے ہوگا مگر وہ صورت عین حق نہ ہوگی بلکہ محض مثال ہوگی۔ آخر نماز میں جو تم حق تعالٰے کا تصور کرتے ہو تو کیا

یہ ذات کا تصور ہے ہرگز نہیں بلکہ مثال کا تصور ہے ورنہ وہ تو ورار الورا ثم ورار الورار ہے جو بھی مثال خدا کی ہمارے ذہن میں آتی ہے حق تعالےٰ سب سے پاک ہیں۔ اسی لئے صوفیہ یوماً فیوماً ترقی کی وجہ سے روزانہ تصور سابق سے توبہ و استغفار کرتے جاتے ہیں۔ کیونکہ ترقی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مثال سابق ناقص تھی اسی کو ایک آزاد صوفی نے اس عنوان سے بیان کیا ہے جو ظاہر میں بہت دحشت ناک ہے واقعی بعضوں کا جی ہی چاہتا ہے کہ ان پر فتوے لگے مگر وہ محض عنوان ہی کے درجہ میں وحشت ناک ہے مطلب وحشت ناک نہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

بیزارم ازاں کہنہ خدائی کہ تو داری

ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

(ہم ایسے جمود سے کہ تیرے تصور میں بے زار ہیں ہمارے تصور میں تو ہر روز ترقی ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ تم کو ترقی نہیں تم جمود پر رہو اور ہم حق تعالیٰ کی ہر روز ترقی باطنی کے سبب نئی نئی شان کا مشاہدہ کرتے ہیں)

ظاہر میں تو شرک معلوم ہوتا ہے کہ میرا ہر دن نیا خدا ہے اور تمہارے پُرانے خدا سے میں بے زار ہوں مگر مطلب یہ ہے کہ تم کو چونکہ ترقی نہیں ہوئی اس لئے ساری عمر ایک ہی مثال سے حق تعالےٰ کا تصور کرنے رہتے ہو اور مجھ کو روزانہ ترقی ہے اس لئے مجھے ہر دن نئی مثال سے تصور ہوتا ہے۔ غرض مجاز کا استعمال جس طرح قرآن و حدیث میں ہے یوں ہی صوفیہ کے کلام میں بھی ہے اس سے متوحش ہونا دلیل نا واقفیت ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے کو صرف طالب ہی نہ سمجھو بلکہ خدا تعالےٰ کو بھی تم سے محبت ضرور ہے اور اسی محبت کا یہ اثر ہے کہ تم کو طلب دیدی پھر اپنے کو محروم کیوں سمجھتے ہو لیں میں نے حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد سے مولانا رومیؒ کے اقوال سے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "من تقرب الی

ذراعاً تقرابت الی باعاً" سے بلکہ یوں کہو کہ حق تعالےٰ سے کیونکہ یہ حدیث قدسی ہے جو حق تعالےٰ کا ہی ارشاد ہے قرآن میں اور حدیث قدسی میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ قرآن متلو ہے اور یہ متلو نہیں ہے۔ یہ ثابت کر دیا ہے کہ طالب کبھی محروم نہیں ہوتا تو حیرت ہے کہ یہ شخص باوجودیکہ اس میں آثار محبت موجود ہیں (یعنی طلب اور قصد ۱۲) پھر اپنے کو محبت سے خالی سمجھتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو شراب پلائی گئی ہو مگر زیادہ تیز نہ ہو تو وہ یوں سمجھے کہ مجھے سوڈا پلایا گیا ہے۔ جیسے رڑکی میں اس کا عکس ہوا تھا کہ وہاں ایک مولوی صاحب گئے اور رات کو ایک مسجد میں وعظ کہا اگلے دن ایک تاجر نے ان کی دعوت کی تو یہ اس کی دوکان پر گئے اس وقت وہ تاجر سوڈے کی بوتل پینے کے واسطے کھول رہا تھا۔ پہلے پہل سوڈے کی بوتلوں کی ڈاٹ باہر کی طرف بڑے زور سے کھلتی تھی۔ تو اس کی تیزی سے مولوی صاحب یہ سمجھے کہ شراب پی رہا ہے۔ آپ نے اس کو نصیحت کی کہ ہم سے محبت کرتے ہو اور شراب پیتے ہو۔ اس نے کہا یہ شراب نہیں ہے بلکہ سوڈا ہے۔ ان کو یقین نہ آیا کہ بھلا ایسا جوش شراب کے سوا بھی کسی چیز میں ہو سکتا ہے۔ اس نے پھر یقین دلایا غرض بڑی مشکل سے ان کو یقین آیا کہ واقعی سوڈا ہی ہے۔ اب اس تاجر نے مولوی صاحب سے بھی کہا کہ ایک بوتل آپ بھی پی لیں اول تو انھوں نے انکار کیا مگر اصرار کے بعد ایک بوتل پی لی۔ تھوڑی دیر کے بعد تاجر نے یہ شرارت کی کہ بیٹھے بیٹھے جھومنے لگا۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ جھومتے کیوں ہو کہا یہ تو شراب تھی مجھے اس کا نشہ چڑھنے لگا ہے۔ اب تھوڑی دیر میں آپ بھی اسی طرح جھومیں گے۔ بس یہ سن کر مولوی صاحب کا تو رنگ فق ہو گیا اور کہنے لگے اللہ کے واسطے مجھے کسی کوٹھری میں بند کر دو تاکہ مجھے نشہ کی حالت میں کوئی دیکھنے نہ پائے۔

لوگ کیا کہیں گے کہ رات تو یہ وعظ کہہ رہے تھے اور اب شراب پینے لگے اور خدا کے واسطے کسی سے کہنا نہیں میں تو پہلے ہی شراب سمجھ کر تمہیں بھی اس سے روکتا تھا مگر تم نے دھوکہ سے مجھے پلادی تاجر نے کہا کہ اب تو جو ہونا تھا ہوچکا اب ذرا لوگ بھی تو آپ کا تماشہ دیکھیں۔ مولوی صاحب رونے لگے اور اس کی بہت خوشامد کرنے لگے تب وہ ہنس پڑا اور کہا مولوی صاحب آپ تو بہت ہی بھولے نکلے کہ ساری بوتل پینے کے بعد بھی آپ کو یہ احتمال باقی رہا کہ شاید یہ شراب ہی ہو میں تو آپ سے ہنسی کررہا تھا آپ گھبرائیں نہیں بڑی کوشش سے ان کو اطمینان ہوا۔ تو جیسے ان مولوی صاحب نے سوڈے کی بوتل کو شراب سمجھ لیا تھا ایسے ہی بعض سالکین شراب محبت پی کر یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے سوڈا پی رکھا ہے صاحب یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم شراب کو سوڈا سمجھتے ہو محض اس لئے کہ اس میں تیزی کم ہے سو یاد رکھو کہ شرابیں مختلف ہیں کسی میں تیزی کم ہوتی ہے کسی میں زیادہ اسی لئے کسی میں التہاب ہے اور کسی میں نہیں جس میں التہاب نہیں ہوتا وہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھنے لگتا ہے۔ غرض بعض دفعہ محبت ایسی لطیف کیفیت کے ساتھ ہوتی ہے جس کا خود صاحبِ محبت کو بھی پتہ نہیں چلتا مگر پہچاننے والا پہچان لیتا ہے۔ سو اس حالت میں آپ کو محقق کی بات مان لینی چاہیئے۔ اسی محبت کی کمی کے تو ہم پر دو واقعے یاد آگئے۔

ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے فرمایا کہ میں اپنے اندر حاجی صاحب کی ایسی محبت نہیں پاتا جیسے مریدوں کو شیخ سے ہوا کرتی ہے۔ تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اس کا علی جواب دیا کہ اول تو اس بات کو ٹال گئے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے تھوڑی دیر میں فرمایا کہ مولانا مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماشاء اللہ آپ حاجی صاحب سے بھی بڑھے

ہوئے ہیں پس یہ سن کر مولانا گنگوہی گھبرا گئے ۔ اور فرمایا توبہ کرو توبہ کہاں میں اور کہاں حاجی صاحب رح میں تو ان کی خاک پا کے بھی برابر نہیں مجھے آپ کی اس بات سے سخت تکلیف پہنچی ۔ تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ تو یہ کہتے تھے کہ مجھے حاجی صاحبؒ سے محبت نہیں پھر اتنی توبہ استغفار اور گھبراہٹ کیوں ہے ۔ مولانا نے فرمایا جزاک اللہ واقعی تمہارے اس بات سے مجھے معلوم ہوگیا کہ بہت محبت ہے تو مولانا نے زبانی جواب نہ دیا بلکہ عملی جواب دیا کیوں اس لئے کہ ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گراست لیک عشق بے زباں روشن تر است

(اگرچہ تفسیر زبان کی روشن ہے لیکن عشق تو بے زبان ہی زیادہ عمدہ تفسیر بیان کرتا ہے)

بعض دفعہ زبانی جواب سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو بے زبان سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح ایک بار حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک رئیس نے گڑھی پختہ میں عرض کیا کہ حضرت حدیث میں آیا ہے کہ جب تک آدمی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیوی بچوں اور ماں باپ سب سے زیادہ محبت نہ ہو اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوتا تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان لوگوں سے زیادہ محبت نہیں ہے بلکہ ان سے کم ہے ۔ اس لئے اندیشہ ہوتا ہے ۔ مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے بھی اس کا عملی جواب دیا کہ اول حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا ۔ ان رئیس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں مزہ آنے لگا تو درمیان میں مولانا نے فرمایا کہ آپ کے والد صاحب بھی بڑے اچھے آدمی تھے مجھے ان کی ایک حکایت یاد آگئی بس یہ سُنکر وہ رئیس کہنے لگے کہ حضرت یہ بیچ میں آپ نے کیا بات شروع کردی ۔ بھلا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں میرے والد کا ذکر کیسا وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں کیجئے ۔ جواب تک کر رہے تھے ۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کو تو اپنے والد کا تذکرہ بہت ناگوار ہوا ۔ بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

تذکرہ میں کسی کا ذکر کیونکر گوارا ہو سکتا ہے فرمایا تم تو کہتے تھے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ماں باپ سے زیادہ محبت نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں ان کے تذکرہ سے ناگواری کیوں ہوئی۔ معلوم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے مگر وہ ایسی رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہے کہ پتہ نہیں چلتا موقعہ پر اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اب تو رئیس صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا مولانا واقعی آپ نے خوب سمجھایا۔ دلائل سے اس طرح سمجھ میں نہ آتا جیسا آپ نے عملاً سمجھا دیا تو حضرت واقعی بات یہی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالے و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے اگر باپ ماں یا بیوی بچے نعوذ باللہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ بے ادبی اور گستاخی کا کلمہ کہدیں تو اس وقت دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے کہ آپ ان کو کچا کھا جائیں گے اور تن بدن میں آگ لگ جائے گی۔ اگر بیوی بچوں کی محبت زیادہ ہے تو اس وقت وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ موقعہ پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کی محبت نہیں جبھی تو حق تعالے فرماتے ہیں والذین آمنوا اشد حبا للہ مگر اس کا دعویٰ نہ کرنا چاہیئے کہ ہم کو اللہ و رسول صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کی محبت سب سے زیادہ ہے بس دل کو تو سمجھالو مگر زبان سے دعویٰ نہ کرو اور نہ اتنی تواضع کرو کہ اپنے کو محبت سے خالی ہی سمجھنے لگو۔ بس یہاں تو خاموشی ہی چاہیئے خود کچھ فیصلہ نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو کسی کے سپرد کردو اور جو کچھ وہ فیصلہ کردے اس پر مطمئن رہو ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند

(کسی صاحب نظر کو اپنا موتی دکھاؤ کہ وہ اصلی ہے یا نہیں چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں بن سکتا)

بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب کوئی تم سے پوچھے کہ تم کو خدا سے محبت ہے یا نہیں تو سکوت کرو کچھ جواب نہ دو کیونکہ انکار تو کفر ہے اس لئے کہ اس میں تکذیب ہے حق تعالے کے قول والذین آمنوا اشد حبا للہ کی، اور اقرار دعویٰ ہے اور دعویٰ پر

کبھی پکڑ ہو جاتی ہے اور امتحان ہونے لگتا ہے گو تحدث بالنعمہ کے طور پر محبت ظاہر کرتا ہے دعویٰ نہیں مگر بعض دفعہ تحدث بالنعمہ اور دعویٰ کی صورت ایک ہو جاتی ہے لہجہ کے ذرا سے فرق سے بات بدل جاتی اور تحدث نعمت دعویٰ بن جاتا ہے اور دعوے اس طریق میں بہت سخت چیز ہے۔ حضرت سمنون محب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ غلبہ حال میں ان کے منہ سے یہ نکل گیا ؎

فلیس لی فی سواك حظ　　　فکیف ماشئت فاختبرنی

(میرے لئے آپ کے سوا کسی شے میں کوئی لذت نہیں پس آپ ہمارے اس دعویٰ میں جس طرح چاہیں امتحان کر سکتے ہیں)

کہ مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں حظ نہیں ہے۔ آپ جس طرح چاہیئے مجھے آزمالیجئے بس فوراً امتحان شروع ہو گیا اور امتحان بھی ایسا سخت جس کی انسان کو برداشت مشکل ہے یعنی پیشاب بند ہو گیا۔ پیشاب بند ہونے کی ایسی تکلیف ہوتی ہے کہ الامان سارے طبیب اور ڈاکٹر عاجز ہو گئے مگر کسی طرح بند نہ کھلا کیونکہ وہ تو امتحان تھا اور دعا اس لئے نہ کرتے تھے کہ محبوب روٹھے ہوئے تھے۔ بس ان کے دعوے کی حقیقت تو ظاہر کر دی پھر خود ہی رحم فرمایا اور ادھر ہی سے دعا کی اجازت ہوئی مگر اجازت بھی اس طرح نہیں ہوئی کہ ان سے کہا ہو یا بلاواسطہ ان کے پاس پیغام بھیجا ہو بلکہ اس طرح اجازت ہوئی کہ رات کے وقت ایک فرشتہ کو حق تعالےٰ نے بھیجا جس نے رات بھر حضرت سمنون کی آواز میں دعا کی ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں　　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

(بہتر یہی ہے کہ محبوبوں کے اسرار کسی دوسرے کی زبان سے عیاں ہوں)

سننے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت سمنونؒ ہی دعا کر رہے ہیں صبح کو مریدوں نے آکر عرض کیا کہ حضرت کیا رات کو آپ دعا کر رہے تھے فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہا آپ کی آواز آرہی تھی آپ سمجھ گئے کہ اُدھر سے دعا کی اجازت ہو گئی ہے مگر اب بھی خود دعا نہیں کی کیونکہ ادھر سے اجازت بواسطہ ہوئی تھی۔ تو آپ نے

بھی بواسطہ دعا کی واقعی محبوب کے انداز بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں جن کو عشاق ہی سمجھتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمۂ ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

(خوبی اس کرشمۂ ناز و خرام کا نام نہیں ہے بہت سی ادائیں بتوں کی اور ہیں جن کا ابھی تک نام بھی لغت میں نہیں ہے ان کو صرف عاشقوں کا دل سمجھتا اور) حضرت سمنون نے اس انداز کو سمجھ لیا کہ جب ادھر سے بواسطہ اجازت دی گئی ہے تو مجھے بھی بواسطہ دعا کرنی چاہیئے ابھی بلاواسطہ دعا کی اجازت نہیں چنانچہ آپ نے بھی فرشتوں جیسے آدمیوں کو واسطہ بنایا یعنی معصوم بچوں کو بس روز مکتب میں جاتے اور بچوں سے کہتے۔ ادعوا لعمکم الکذاب اے بچو اپنے جھوٹے چچا کے لئے دعا کرو۔ چچا تو اس واسطے کہ عرب میں بڑی عمر والے کو عم ہی کہا کرتے ہیں اور کذاب اس لئے کہا کہ دعویٰ نباہ نہ سکے۔ تو صاحبو! یہاں دعوے کا کام نہیں اور زیادہ تواضع بھی اچھی نہیں کہ اپنے کو محبت سے خالی کہنے لگو بس یہاں تو خاموشی ہی مناسب ہے، واقعی محبت کا راستہ بھی عجیب ہے۔ حاجی صاحب فرماتے ہیں ؎

ارے یارو جسے کہتے ہیں الفت
قیامت ہے قیامت ہے قیامت

اور ایک عاشق نے عشق کی حقیقت کو خوب ہی بیان کیا ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن

(عاشقی کیا ہے کہدو کہ محبوب کا غلام بن جانا اور دل کو اس کے سپرد کرکے خود حیران رہنا)

بس یہاں تو یہی کرنا چاہیئے کہ دل ان کو سپرد کرکے خود حیران کھڑا رہے نہ کرے زبان سے اقرار کرے نہ نفی کرے اس سے اگلا شعر بہت سخت ہے اہل ظاہر اس سے متوحش ہونگے مگر مجمع خاص ہے اور اس سے پہلے میں بیان کرچکا ہوں کہ صوفیہ مجاز اور کنایہ کا استعمال کثرت سے

کرتے ہیں تو امید ہے کہ غلط فہمی نہ ہوگی پھر میں اس کا مطلب بھی بیان کر دوں گا تو استبعاد رفع ہو جائے گا۔ کہتے ہیں ؎

سوی زلفش نظرے کردن و رویش دیدن ؛ گاہ کافر شدن وگاہ مسلماں بودن

(کبھی تو محبوب کے زلف پر نظر کرنا اور حالت قبض و غم میں مبتلا ہو جاتا اور کبھی اس کے چہرے کو دیکھنا اور حالت بسط اور لذت وصال میں مسرور ہونا)

اس میں زلف سے مراد تجلیات جلالیہ ہیں اور رخ سے مراد تجلیات جمالیہ اور کفر سے مراد فنا ہے اور اسلام سے مراد بقا ہے کیونکہ کفر میں جہل بالتصدیق ہوتا ہے اور اسلام میں علم وتصدیق ہوتی ہے۔ اسی طرح حالت فنا میں کچھ خبر نہیں رہتی تو وہ مشابہ جہل کے ہے اور بقاء میں واردات وعلوم کا ادراک ہوتا ہے وہ مشابہ تصدیق اسلام کے ہے۔ غرض یہاں بولنے چالنے کا موقع نہیں ہے حیرت ہی حیرت ہے۔ بس گلا گھونٹ کر حجرہ بند کر کے بیٹھو اور ان کی طرف متوجہ رہو۔ نواب شیفتہ خوب فرماتے ہیں ؎

چہ خوش ست باتو بزمے بہ نہفتہ ساز کردن

در خانہ بند کردن در شیشہ باز کردن

(کیا اچھی حالت ہوگی کہ آپ کے بزم میں مخفی راز و نیاز کی باتیں کرنا اور گھر کا دروازہ بند کر کے شراب محبت حقیقی کا شیشہ کھولنا اور پینا)

پس سالکین کو چاہیئے کہ ہر حالت میں راضی رہیں اور زبان کو بند رکھیں نہ اپنے کو صاحب محبت کہیں نہ خالی اور محروم کہیں میں نے بتلا دیا کہ طالب محروم نہیں ہوا کرتا دیکھو کہیں تمہارے خالی کہنے پر وہ واقعی خالی ہی نہ کر دیں اور بالفرض اگر تم کو محبت ہی نہ ہو جب بھی خاموش ہی رہو جب محبت تقسیم ہوگی تو تم کو بھی مل جائیگی کیونکہ چپکا کھڑے رہنے والے پر بھی رحم آجاتا ہے دیکھو جب مٹھائی تقسیم ہوتی ہے تو بعضے بچے تو اچھلتے کودتے اور چلاتے ہیں کہ ہمیں بھی دو اور بعضے بیچارے چپکے کھڑے رہتے ہیں تو ان پر تقسیم کرنے والوں کو رحم آیا کرتا ہے کہ یہ بچہ بیچارہ کچھ نہیں بولتا خاموش کھڑا ہے اس کو ضرور دینا چاہیئے تو اس کو خاموشی کی وجہ سے

اوروں سے پہلے حصہ مل جاتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض تم میں محبت نہ بھی ہو جب بھی دعویٰ یا نفی سے چلاؤ نہیں صورت سوال بن کر چپکے بیٹھے رہو ان شاء اللہ تم پر رحم کر کے ایک دن محبت عطا کر دی جائے گی صاحبو! یہ الوان محبت ہیں کسی میں التہاب و اضطراب ہے اور یہ بھی انہیں کا رنگ ہے اور کسی میں جمود و خمود ہے یہ بھی انہیں کا رنگ ہے میں دوبارہ مولانا کا شعر یاد دلاتا ہوں ؎

عشق معشوقاں نہاں است دستیر　　　عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر

(عشق معشوقوں کا پوشیدہ رہتا ہے اور عاشقوں کا عشق ڈھول کی طرح ...)

تو صاحب خمود کو خوش ہونا چاہیے کہ اس کو عشق محبوب کا خاص رنگ عطا ہوا ہے اور ایک حالت تردد و حیرت کی ہے اس پر بھی راضی رہنا چاہیے یہ بھی محبت کا ایک رنگ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

در تردد ہر کہ او آشفتہ است　　　حق بگوشش او معما گفتہ است

(جو عاشق خاموش کچھ سوچ رہا ہو تو سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ (راز محبت) کہدیا ہے وہ بیچارہ اسی کو سوچتا رہتا ہے)

اس کے کان میں کوئی معما کہہ دیا ہے کہ سوچتے رہو وہ بیچارہ اسی کو سوچ رہا ہے جیسے ہم لوگ آپس میں پہیلی کہا کرتے ہیں جس کو دوسرا گھنٹوں سوچتا ہے۔ ایک اور عاشق اس مضمون کو دوسرے عنوان سے کہتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است　　　بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(پھول کے کان میں آپ نے کیا کہدیا ہے کہ وہ ہنس رہا ہے اور بلبل کے کان میں کیا راز کہدیا ہے کہ وہ ہر وقت اشکبار ہے)

تو صاحب ان کے مختلف الوان ہیں کسی کو ہنسا رکھا ہے اور کسی کو رلا رکھا ہے بس جس کو وہ ہنساتے ہیں وہ رونے کی ہوس نہ کرے اور جس کو وہ رلاتے ہیں وہ ہنسنے کی خواہش نہ کرے جس کو جس حال میں رکھیں راضی رہے خود کچھ تجویز نہ کرے

کہ ہائے میرے اندر التہاب ہوتا اضطراب ہوتا یا صاحب التہاب یوں کہے کہ میرے اندر برود و خمود ہوتا۔ ان تجویزوں کو چھوڑ و میں یہ نہیں کہتا کہ تدبیر نہ کرو۔ تدبیر ضرور کرو۔ مگر تدبیر کے یہ معنی نہیں کہ حالت موجودہ سے راضی نہ رہو بلکہ تدبیر کے یہ معنی ہیں کہ کسی محقق سے اپنا حال کہدو پھر جو وہ کہے اسکا اتباع کرو۔ اور یہی تدبیر ہے اور جب تک حق تعالیٰ خود تم کو بصیرت نہ دے دیں اس وقت تک محقق کا اتباع کرتے رہو اس کے بعد بیفکر رہو۔ طالب کو محرومی کا وسوسہ بھی نہ لانا چاہئے۔ ان شاء اللہ طالب ضرور واصل ہو کر رہیگا ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی جلدی ہوتا ہے کوئی دیر سے کیونکہ آج اگر کسی پہلوان کی چار سیر خوراک ہے تو ایک بچہ یہ ہوس نہ کرنے لگے کہ میں بھی آج ہی سے چار سیر کھانے لگوں تو اسکا انجام یہ ہے کہ دو دن میں ختم ہو جائیگا اس لئے ہر شخص کو اتنی ہی خوراک دی جاتی ہے جس کا اس کو تحمل ہے ؎

؎ چارپا را قدر طاقت بار نہ ‏ ‏ ‏ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

(جانوروں پر بقدر تحمل بوجھ لادو کمزور لوگوں کو انکی صحت کے اندازہ سے کام سپرد کرو)

؎ طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر ‏ ‏ ‏ طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

(بچہ کو اگر دودھ کی جگہ روٹی دوگے تو بچہ کو اس روٹی سے مرا ہوا پاؤگے)

بچہ کو تو یہی مناسب ہے کہ اس وقت دودھ ہی پیتا رہے پھر جب رفتہ رفتہ بڑا ہوگا اس دن وہ بھی اس پہلوان کی طرح سیروں ہضم کریگا۔ جلدی مناسب نہیں تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں خمود و جمود کی جگہ شوق و ذوق والتہاب و اضطراب کا رنگ عطا ہو جائے یہ تمہاری غلط تجویز ہے تم کو کیا خبر کہ یہ شوق و ذوق کے غلبہ میں تمہارا کیا حال ہوتا اب تو ایمان بھی سلامت ہے ممکن ہے کہ غلبہ شوق میں تمہارا ایمان بھی رخصت ہو جاتا ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن ‏ ‏ ‏ کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تم بندگی بشرط مزدوری مت کرو کیونکہ خواجہ بندہ پروری خوب جانتے ہیں)

بس حق تعالےٰ خود ہی ہر ایک کی تربیت اس کے مناسب حال طریقہ سے فرماتے ہیں ہم کو سمجھنا چاہئے کہ یہ صورت ہمارے لئے تجویز کی گئی ہے یہی بہتر ہے۔ شوق و ذوق بیشک عجیب آثار ہیں لیکن بعض دفعہ خطرناک بھی ہیں اس لئے ہر ایک کے مناسب نہیں ہوئے قربان جائیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

پھر قربان ہوجئے آپ کے کہ آپ نے شوق کی دعا بھی فرمائی تو کن قیود کے ساتھ فرماتے ہیں۔
"والسألك شوقا الى لقائك فى غير ضراء مضرة ولا فتنة مضلة یعنی میں آپ سے شوق لقا مانگتا ہوں مگر اس طرح جس میں نہ ضرا مضر ہو نہ گمراہ کن فتنہ ہو لوگ حدیثوں سے تصوف نہیں سمجھتے حالانکہ حدیث و قرآن ہی میں تصوف ہے اور کہیں نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ شوق کے لئے دو قیدیں بیان فرمائی ہیں ایک یہ کہ ضرا مضرہ نہ ہو میرے ذوق میں اس کی یہ تفسیر ہے کہ اس سے جسمانی تکالیف پیدا نہ ہوں دوسرے یہ کہ فتنہ مضلہ نہ ہو اس میں آپ نے بتلا دیا کہ شوق کا ہر درجہ مطلوب نہیں بلکہ بعض درجات خطرناک بھی ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ بعض دفعہ شوق کے غلبہ سے ایک ضرر تو جسم کا ہوتا ہے وہ یہ کہ جوشش عشق سے بدن گھلنے لگتا ہے جیسے تپ دق سے گھلتا ہے کہ حرارت اندر ہی اندر جسم کو کھا لیتی ہے۔ اور یہ دنیا کو بھی مضر ہے دین کو بھی کیونکہ ترقی مطلوب میں جسم کو بھی بڑا دخل ہے مدعیان تصوف اس کو نہیں سمجھتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جسم میں جس قدر لاغر و ضعیف ہوگا اسی قدر روح لطیف ہوگی اور ترقی روح سے ہوتی ہے یہ غلط ہے ترقی مطلوب صرف روح سے کبھی نہیں ہوسکتی ورنہ روح تو عالم بالا میں بدون جسم کے پہلے سے موجود تھی اگر ترقی مطلوب کا مدار صرف روح پر تھا تو اس کو جسم میں مقید کر کے کیوں بھیجا گیا بس عالم ارواح ہی میں رکھا جاتا معلوم ہوا کہ ترقی مطلوب کی بعض فرد بدن ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے کیونکہ روح مجرد سے نماز کیونکر ادا ہوتی نماز تو جسم ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے اور اگر روح کو بقول متکلمین مادی ہی مان لیا جاوے تب بھی اس سے روزہ مثلاً کیونکر ادا ہوتا کیونکہ متکلمین بھی اس کے قائل ہیں کہ روح گو مادی ہے مگر نہایت لطیف ہے جیسے ملائکہ سو جیسے فرشتوں کو بھوک پیاس نہیں لگتی اسی طرح روح کو بھی نہیں لگتی تو روزہ کا صدور تو روح سے کبھی نہ ہوسکتا وعلی ہذا بہت سے اعمال جسم پر موقوف ہیں اس لئے حفاظت جسم بھی ضروری ہے۔
اسی لئے سید العاشقین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں" ان لجسدك عليك حقا" اور جو محققین حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ذاکر کو دودھ گھی خوب کھانا چاہیئے اور تمام رات نہ جاگنا چاہیئے مگر آجکل

جہلا صوفیہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جسم کو مار دو تاکہ خدا جلدی مل جاوے جی ہاں ضرور ملیں گے وہ تو فرماتے ہیں لا تقتلوا انفسکم تو شوق میں ایک ضرر تو یہ ہوتا ہے کہ جسم کو امراض لگ جاتے ہیں جس سے اعمال نہیں ہو سکتے اور جب اعمال نہ ہوئے تو ترقی بھی نہ ہو گی۔ شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرض کی حالت میں زیادہ اعمال نہ بھی ہوں تو اعمال صحت کا ثواب برابر ملتا رہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی اعمال پر موقوف نہیں بدون اعمال کے بھی ہو سکتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ حدیث سے تو صرف پہلے اعمال کا ثواب ملنا معلوم ہوتا ہے اس سے ترقی قرب کہاں ثابت ہوتی ہے یہ دعوی آپ بدون نص کے کیسے کرتے ہیں اور کسی عمل کا ثواب مل جانا اس کو مستلزم نہیں کہ جو ترقی خود مباشرت عمل سے ہوتی وہی اب بھی ہو گی (دیکھو تین دفعہ قل ہو اللہ پڑھنے کا ثواب پورے قرآن کے برابر ہے تو کیا اس سے یہ لازم آیا کہ تین دفعہ قل ہو اللہ کہنے سے ترقی بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی پورے قرآن کی تلاوت سے ہوئی ہے یا صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس تک ذکر اللہ کرنے کا ثواب حج و عمرہ کے برابر ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شخص کو وہی قرب ہو گا جو حج و عمرہ کرنے والے کو ہوتا ہے یہ دعوی بلا دلیل ہے ۱۲) دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حالتِ مرض میں باوجود قلت اعمال کے ترقی بھی مثل صحت کے ہوتی ہے تو یہ بھی بدون اعمال کے نہیں بلکہ اعمال ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ حالت صحت میں اعمال ہو چکے ہیں اسی کے ساتھ حالت مرض کو ملحق کر دیا گیا اگر ملحق بہ نہ ہوتا تو یہ الحاق کیسے ہوتا معلوم ہوا کہ اصل سبب ترقی اعمال ہی ہیں۔ دوسرا ضرر یہ ہوتا ہے کہ حالت شوق میں بعض دفعہ انسان حق تعالیٰ سے بہت کھل جاتا ہے پھر نہ معلوم کیا کیا بکنے لگتا ہے۔ جیسے بعض اہل ادلال ہوئے ہیں گو ان سے خود مواخذہ نہ ہو مگر اضلال تو ضرور ہوتا ہے کہ دوسرے اس کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی نقص ہے علاوہ ازیں بعض دفعہ غلبہ ادلال میں حد سے نکل کر خود بھی یہ شخص گمراہ ہو جاتا ہے کیونکہ کسی وقت ایسا غلبہ حال نہیں ہوتا جس میں زبان پر قابو نہ ہو مگر زبان سے بے ساختہ کچھ نکل جاتا ہے جس میں یہ اپنے کو معذور سمجھتا ہے اور . . . . واقع میں معذور نہیں ہوتا تو مواخذہ میں گرفتار ہو جاتا اور بارگاہ قرب سے نکال دیا جاتا ہے

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شوق کی طلب میں یہ دو قیدیں بڑھا دیں سبحان اللہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دو جملوں میں معانی کو کس طرح قید فرمایا ہے کہ دو لفظوں میں تمام مضرات سے پناہ مانگ لی۔ غرض غلبہ شوق میں یہ آفات ہیں اس لئے تم اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرو اور اگر تم کو غلبہ شوق نہ عطا ہوا ہو تو سمجھ لو کہ شاید تمہارے لئے غلبۂ شوق میں کوئی آفت ہوتی اس لئے خدا تعالےٰ نے تم کو برد و خمود میں رکھا وہی ہر حالت کی حکمتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں ؎

آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند — او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو کہ تجھے امیر نہیں بناتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ تیری ہی مصلحت کے یہ خلاف ہے کہ تجھے مالدار بنا دیا جاوے کیونکہ تیری مصلحت کو تجھ سے وہ بہتر جانتے ہیں۔)

اور اگر کسی کو شوق کا غلبہ عطا ہوا ہو تو وہ اسی میں راضی رہے وہ جمود و خمود کو طلب نہ کرے ممکن ہے کہ اس کے واسطے یہی ضروری ہو۔ کیونکہ بعضے انجن تو ہوا سے چلتے ہیں اور بعضے انجن آگ سے چلتے ہیں ممکن ہے کہ اس کے انجن کے لئے حرارت ہی کی مناسبت ہو اگر یہ حرارت سے خالی ہوگیا تو کھڑا کا کھڑا رہ جائے گا جیسا کہ حضرت عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

صنما رہ قلندر سزوار بمن نمائی — کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے محبوب راہ عشق اور طریق جذب سے ہمکو راستہ طے کرائے کیونکہ زہد خشک کا راستہ بہت طویل نظر آتا ہے)

بہر حال محبت کا ایک رنگ التہاب ہے اور ایک رنگ خمود بھی ہے۔ بس صاحب خمود بھی اپنے کو محروم نہ سمجھے اب میں ان دونوں نسبتوں کی مثال دیتا ہوں کہ ان میں ایک تو لون چشتیہ ہے (یعنی التہاب واضطراب) اور ایک لون نقشبندیہ ہے (یعنی برود و خمود) پس اگر کوئی صاحب حرارت نہ ہو وہ گھبرائیں نہیں بلکہ یہ سمجھ لے کہ مجھے لون نقشبندیہ حاصل ہے گو وہ چشتیہ کا مرید ہو کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ چشتیہ سے چشتیہ ہی پیدا ہوں بلکہ کبھی چشتیہ سے نقشبندی پیدا ہوتے ہیں۔ اور کبھی نقشبندیہ سے چشتی پیدا ہوتے ہیں جیسے مرغی کے نیچے بطخ کے انڈے رکھدو تو بچے بطخ ہوں گے کہ وہ تو ذرا بڑے ہو کر دریا میں تیریں گے

اور ماں کھڑی منہ تکے گی وہ دریا میں تیر نہ سکے گی اور نہ بچے اس کے پاس رہ سکیں گے۔ گو وہ کتنا ہی بلاتی رہے کیونکہ بطخ کے بچوں کو تو دریا ہی سے مناسبت ہوگی گو تربیت مرغی کے نیچے ہوئی ہو وہ اس کے بلانے سے خشکی پر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح چشتی شیخ کے سارے مرید چشتی نہیں ہو سکتے بلکہ بعضے نقشبندی ہوں گے ان کو پانی سے مناسبت ہوگی اور بعضے چشتی ہوں گے ان کو آگ سے مناسبت ہوگی ہاں کوئی قیاس فاسد کرے تو اور بات ہے۔ جیسے ایک احمق شخص نے کسی کو دیکھا تھا کہ وہ کٹری دکھا کر بھینس کو ڈلیو ڈلیو کر رہا تھا اس نے پوچھا کہ میاں تم کٹری کو کیوں دکھا رہے ہو کہا اسے دیکھ کر بھینس کنارہ پر آجائے گی۔ ایک دفعہ ان حضرت کی چارپائی ندی میں بہ گئی تو آپ دوڑ کر گھر سے پیڑھا لائے اور اسے چارپائی کو دکھا کر ڈلیو ڈلیو کرنے لگے کسی نے کہا کہ میاں یہ کیا کہا کہ یہ چارپائی کا بچہ ہے اسے دیکھ کر وہ چلی آئے گی۔ اسی طرح ایک شخص تاڑ کے درخت پر چڑھ گیا تھا اس کو چڑھنا ہی آتا تھا اترنا نہ جانتا تھا جب اترا نہ گیا تو شور کرنے لگا کہ مجھے اتار دیں گرا لوگ حیران ہوئے کہ کس طرح اتاریں تو بوج بجکڑ کو بلایا اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا بس تدبیر سمجھ میں آگئی اس کے پاس ایک رسّا پھینکو چنانچہ پھینکا گیا پھر اس سے کہا کہ اسے کمر میں مضبوط باندھو اس کے بعد لوگوں سے کہا کہ زور سے جھٹکا مارو وہ نسرا نیچے گرا اور گرتے ہی مر گیا لوگوں نے بوج بجکڑ سے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا کہا افسوس ہے کہ اس کا وقت ہی آگیا تھا ورنہ ہم نے تو اس طرح کنوئیں میں سے بہت سے آدمی نکالے ہیں سو یہ تو قیاس فاسد ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ہر شخص کی طبیعت جدا ہے اور اس کے لئے طریقہ تربیت بھی الگ ہے سب کو ایک لاٹھی نہ ہانکنا چاہیئے۔ یہ میں نے اس واسطے کہدیا کہ شاید کوئی شخص چشتیہ سے مرید ہو اور صاحب حرارت نہ ہو بلکہ صاحب سکون ہو تو وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں تو نقشبندی ہو سکتا ہوں کیونکہ چشتیہ سے مرید ہوں اور نہ چشتی ہوں کیونکہ صاحب سکون ہوں تو بس میں کورا ہی ہوں۔ صاحب کورا تو نہیں ہے ہاں کور بیشک ہے کہ اس کے پاس دولت موجود ہے مگر اندھا ہے خواہ مخواہ اپنے کو محروم سمجھتا ہے تو یہ غلطی ہے کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ چشتیہ سے چشتی ہی پیدا ہوں نقشبندی نہ پیدا ہوں بلکہ یہاں ہر ایک سے دونوں

طرح کے رنگ حاصل ہوتے ہیں یہاں اب و ولد میں مناسبت ضروری نہیں جیساکہ ابوت و نبوت ظاہر یہ ہیں بھی مناسبت تامہ ضروری نہیں چنانچہ کالے سے گورے اور گورے سے کالے پیدا ہوتے کبھی باپ احمق ہوتا ہے اور بیٹا ذہین کبھی برعکس مگر بعضے ایسے جامد ہوتے ہیں کہ نقشبندی خاندان میں بیعت ہو کر چشتی بننا گوارا نہیں کرتے بعضے چشتی سلسلہ میں مرید ہو کر نقشبندی بننا گوارا نہیں کرتے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک نقشبندی کے مرید نے قبض کی شکایت کی حضرت نے اس کو ذکر جہر بتلایا کہنے لگا میں تو نقشبندی ہوں میں ذکر جہر کیونکر کروں فرمایا پھر مت کرو سو یہ محض جہالت ہے۔ صاحب نقشبندی اور چشتی میں حنفیہ شافعیہ کا سا اختلاف نہیں ہے جو حنفی یوں کہے کہ میں امام کے پیچھے فاتحہ کیونکر پڑھوں میرے مذہب میں تو حرام ہے۔ بلکہ ان دونوں میں ایسا اختلاف ہے جیسا اطبا اور ڈاکٹروں میں ہوتا ہے۔ اب اگر طبیب یونانی کوئی ڈاکٹری دوا بتلائے یا ڈاکٹر کوئی یونانی دوا پلائے تو کیا حرج ہے اسی طرح اگر کوئی نقشبندی ذکر جہر کو کسی کے لئے نافع بتلائے یا کوئی چشتی اپنے کسی مرید کو ذکر خفی بتلائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں کوئی تقیید نہ تھی ہر شخص کے لئے اس کے مناسب تجویز فرماتے تھے کسی کو بالجہر کسی کو بالسر کسی کو تلاوت قرآن کسی کو تکثیر نوافل کسی کو خدمت خلق چنانچہ بعض کے لئے صرف اس کو نافع فرماتے تھے کہ تم اہل خانقاہ کی روٹی گوشت لادیا کرو۔ پس مشائخ اور طالبین کو ایسا ہونا چاہیئے یہ نہیں کہ نقشبندی خاندان میں داخل ہوئے ہیں تو اب جہر کو حرام سمجھ لیں چاہے کیسی ہی ضرورت ہو یا چشتی ذکر خفی کو حرام سمجھ لیں چاہے کسی کے واسطے جہر مناسب ہو یا نہ ہو۔ مشائخ کو محقق اور مجتہد ہونا چاہیئے پس لوگوں کو مقلد بن کر رہنا چاہیئے ان کو اپنی تجویز کا دخل نہ دینا چاہیئے پس لوگوں کو تجویز کا خبط ہوتا ہے چنانچہ ایک صاحب مجھے خط میں لکھتے ہیں کہ ہم کو شغل انحد کی اجازت دیدی جائے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ کو اتنی بات حاصل ہے کہ خود اپنے لئے معمول تجویز کرلیں تو پھر کسی سے رجوع کی آپ کو کیا حاجت ہے۔ طب میں بڑا کام تو تشخیص ہی ہے اور تشخیص کے بعد علاج کر لینا کیا مشکل ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ اس شخص میں فلاں خلط کا غلبہ ہے اور وہ سبب مرض ہے جس کے لئے

مبردات ومفرحات کا استعمال مفید ہوگا تو اس کے بعد جس کا دل چاہے علاج کرے کیا یہ بھی کوئی طریقہ ہے علاج کا تشخیص تو خود کرلیں اور علاج دوسرے سے کرائیں اس طریق میں تو یہ ہونا چاہیئے کہ بس حال بیان کرکے مردہ بدست زندہ ہوجاؤ۔ اپنی تجویز اور تشخیص کو دخل مت دو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو ہمچو موسیٰ درطریق خضر رو

(جب مرشد کو پکڑ لیا تو اس کے سامنے رائے زنی مت کرو اس کے حکم پر عمل کرو
مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت خضر علیہ السلام کی بات پر عمل کرو)

بعض نسخوں میں غلطی سے پیرہن لکھ دیا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ جب خلافت مل جاوے تب پیر کا کہنا ماننا چاہیئے اس سے پہلے نہ مانے یہ بالکل غلط ہے بلکہ یہ دو لفظ الگ الگ ہیں ؎ چوں گزیدی پیر — ہیں تسلیم شو۔

کہ جب کسی کو پیر بنالو تو اب اپنے کو بالکل سپرد کردو۔ انحد وغیرہ یا کوئی شغل خود بخود تجویز نہ کرو۔ اس مقام پر افادہ جدیدہ کی غرض سے لفظ انحد کی تحقیق بھی بیان کردینا مناسب ہے۔ بہت لوگوں کا اور پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ لفظ دو حرفوں سے مرکب ہے ان حرف نفی ہے جو ہندی لفظ ہے اور حد لفظ عربی ہے جس کے معنی ترکیبی غیر محدود ہیں اور یہ خیال تھا کہ چونکہ اس شغل میں جو صورت مسموع ہوجاتی ہے وہ غیر محدود ہے۔ اس لئے اس کو انحد کہا جاتا ہے۔ بعضے اس کو غیبی صوت سمجھتے ہیں اور ملکوتی صوت کہتے ہیں ممکن ہے کہ کسی کے لئے صوت ملکوتی بھی منکشف ہوتی ہو مگر صوت حق تو ہرگز نہیں ہے بعض جہلاء نے اس کو صوت حق سمجھا ہے یہ غلط ہے چنانچہ اس خیال کے لوگوں نے شیخ سعدیؒ کے شعر کی تفسیر اسی صورت سے کی ہے وہ شعر یہ ہے ؎

الست از ازل ہمچناں شاں بگوش بفریاد قالوا بلےٰ درخروش

(الست کی آواز عاشقوں کے کانوں میں ہے اور ان کا قالوا بلیٰ کہنا بھی ان کو خوب
یاد ہے یعنی ان کے کانوں میں یہ آوازیں اب تک محسوس ہورہی ہیں فراموش نہ ہوسکیں)

یہ تفسیر بالکل صحیح نہیں ہے اور اس کو صوت حق سمجھنا بالکل غلط ہے کیونکہ کلام الٰہی صوت وحروف سے

منزہ ہے شیخ فرید عطار رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے عارف اور محقق ہیں فرماتے ہیں ع قول اور الحن نے آواز نے۔ اور یہی علماء اہل سنت کا قول ہے کہ کلام الٰہی کیلئے صوت نہیں ہوئی اور شغل انحد میں صوت ہوتی ہے پس یہ صوت حق نہیں ہوسکتی۔ حقیقت یہ ہے در اصل یہ صوت ناسوتی ہے جو تموج ہوا سے پیدا ہوتی ہے کان بند کرنے سے اندر ہوا محسوس ہوجاتی ہے اس سے آواز پیدا ہوجاتی ہے بعض لوگوں نے اسکو صوت حوض کوثر کہا ہے اور اس کے متعلق ایک حدیث بھی بیان کرتے ہیں اول تو اس حدیث کے ثبوت کا حال معلوم نہیں (قال الجامع اشار الواعظ قدسہ العزیزی فی شرح الجامع الصغیر اھ) اور اگر حدیث ثابت بھی ہو جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ عزیزی نے اسکی تصحیح کی ہے تو وہ تشبیہ پر محمول ہے کہ حوض کوثر کی آواز اس صوت کے مشابہ ہے یہ مطلب نہیں کہ بعینہ یہی صوت حوض ہے یہ تو حقیقت صوت میں کلام تھا۔ لفظ کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ اصل میں انادی ہے جو ہندی لفظ ہے بمعنی قدیم اصل میں یہ شغل جوگیوں سے لیا گیا ہے چونکہ یکسوئی پیدا کرنے میں بہت نافع ہے اس لئے بعض مشائخ نے اس کو اختیار کیا تھا اور جوگیوں کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ صوت قدیم ہے اسی لئے وہ اس کو انادی کہتے ہیں مگر وہ لوگ مشرک ہیں ان کی بات قابل قبول نہیں اور غالباً مشائخ نے اسی واسطے اس کو انادی سے انحد کر دیا تاکہ عقیدہ جوگیہ کا ابطال ہوجائے اور انحد کہنا غلط نہیں کیونکہ غیر محدود کی دو قسمیں ہیں ازلی اور ابدی سو مشائخ کی مراد انحد بمعنی ابدی ہے کہ جانب مستقبل میں یہ غیر محدود ہے۔ چنانچہ اگر عمر بھر کان بند رکھے جائیں تو یہ صوت ختم نہیں ہوتی پس یہ غیر محدود بمعنی لاتقف عند حد ہے اور ابدیت حدوث کے منافی نہیں بلکہ اس کے مناسب صرف ازلیہ ہے اور وہ انکی مراد نہیں خوب سمجھ لو چونکہ یہ کام کی تحقیق تھی اس لئے میں نے اس پر متنبہ کر دیا ممکن ہے بعض لوگ اس غلطی میں پڑے ہوں بہرحال طالب کو خود کوئی شغل تجویز نہ کرنا چاہیئے بلکہ ہر طرح اپنے کو شیخ کے سپرد کر دے اور اس کی تجویز میں چون و چرا نہ کرے کیونکہ اس طریق کا زیادہ مدار اعتماد پر ہے بلکہ میں ایک اور بات پر متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ طالب کو شیخ کے ساتھ علمی مباحث میں بھی گفتگو نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس میں رد و قدح انکار و اقرار کی صورت ہوتی ہے جو شان طلب کے منافی ہے ہاں طالب کو استاد سے خوب چون و چرا کرنا چاہیئے کیونکہ استاد اشکالات علمیہ کے حل کرنیکو پہلے سے آمادہ ہوکر بیٹھتا ہے اور شیخ اس کام کے لئے تیار ہوکر نہیں بیٹھتا وہ دوسرے کام کے لئے ہے جہاں عمل کی ضرورت ہے باتوں کی ضرورت نہیں پس شیخ کے ساتھ کان ہوکر رہنا چاہیئے اور استاد کے ساتھ زبان ہوکر۔ (ان شاء اللہ باقی آئندہ)

ہمارے مولانا فرماتے تھے کہ ہر طالب علم کو چون وچرا نکند دہر درویشے کہ چون وچرا کند بدر دراتحر اگاہ باید فرستاد۔ پس شیخ سے استاد کا کام نہ لو سونار سے لوہار کا کام نہ لو اس کے سامنے لوہا مت لاؤ۔ بلکہ سونا چاندی لاؤ تاکہ وہ خوبصورت جھمکے اور کرن پھول اور جھومر تیار کرکے تمہارے کان اور سر پر لگا دے پس یہ بڑی غلطی ہے کہ کسی کے پاس طالب بن کر نہ جائیں اور اس کو شیخ بنائیں پھر اس سے کام لیں۔ دوسرے صاحبو! ماں سے ماما کا کام نہ لو گو اس میں ایک میم اور ایک الف زیادہ ہو گئے مگر عزت تو گھٹ گئی کیونکہ ماں کو ماما بنانا ذلت تجویز کرنا ہے۔ لہذا شیخ سے علمی مباحث میں گفتگو نہ کرنا چاہیئے مگر آجکل طالبین اس کا خیال نہیں رکھتے۔ ہاں گاہے گاہے ادب کے ساتھ ہو تو اس کا بھی مضائقہ نہیں یا عرصہ تک پاس رہنے سے دونوں کی طبیعت کھل گئی ہو تب بھی حرج نہیں کیونکہ انشراح کے بعد پھر ایک ناز کی سی حالت ہو جاتی ہے اور مقام ناز کے احکام جدا ہیں اس وقت جتنا چاہے بولو اور جو چاہے پوچھو کچھ مضائقہ نہیں اسی کو کہتے ہیں ؎

اے خانۂ نیاز نہ چلنے سے تو مچل   یعنی مقام ناز ہے جس چال چاہے چل

مگر ایسے لوگوں کو شیخ کے ساتھ مباحث علمیہ میں گفتگو کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں ورنہ وہی مثال ہوگی جیسے ایک شخص تھا جس کی بیوی اس کی کچھ زیادہ خاطر و مدارات نہ کرتی تھی ایک دفعہ اس نے ایک ولایتی کو دیکھا جو اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا۔ گھوڑا شوخی میں ادھر ادھر منہ مارتا تھا اور ولایتی اسکو چمکار کر کہہ رہا تھا کھاؤ بیٹا کھاؤ یہ بیوقوف سمجھا کہ شاید کھاؤ گھوڑے کی اس ہیئت کو بھی خاطر و مدارات میں کچھ دخل ہے دل میں سوچا کہ آج سے ہم بھی اسی طرح کھایا کریں گے گھر پہنچکر بیوی سے کہا کہ آج ہم گھوڑے بنیں گے ہماری اگاڑی پچھاڑی باندھو اور ایک توبڑے میں کھانا بھر کر ہمارے منہ پر چڑھاؤ ہم ادھر ادھر منہ ماریں گے تو تم کہنا کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ اس غریب کے تمام احکام کی تعمیل کی یہ گھوڑے کی طرح بحالت رکوع کھڑے ہوئے اور دم کی جگہ ایک جھاڑو باندھی گئی منہ پر توبڑا چڑھایا گیا اگاڑی پچھاڑی باندھی گئی اور اب اسنے ولایتی کے گھوڑے کی طرح شوخی کرنا شروع کی اور بیوی کہتی جاتی کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ یہ اور اچھلے کودے پیچھے کہیں چراغ رکھا تھا اس سے جھاڑو میں آگ لگ گئی یہاں تک کہ بدن کے کپڑوں تک پہنچ گئی اب میاں تو بندھے جوڑے کھڑے تھے

وہ کیونکر آگ سے بچتے بیوی بھی ان ہی کی طرح بیوقوف تھی یہ حال دیکھ کر کوٹھے پر جا چڑھی اور محلہ والوں کو پکارا ارے دوڑیو میرا کھوڑا جلا۔ محلہ والوں نے دل میں کہا کہ کمبخت کو کھانے کیلئے تو ملتا نہیں اسکے یہاں گھوڑا کہاں سے آیا معلوم ہوتا ہے کہ ویسے ہی شرارت سے چیخ رہی ہے یہ کسے خبر تھی کہ وہ شوہر کو گھوڑا کہہ رہی ہے آخر کار میاں وہیں جلکر مرنڈا ہو گئے۔ یہی حال ناقص کا ہوتا ہے جب وہ اپنے کو کامل پر قیاس کرنے لگے مولانا فرماتے ہیں۔

نازرا روئے ببایدہمچو ورد　　　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد روئے نازیبا و ناز　　　　عیب باشد چشم نابینا و باز

پیش یوسف نازش وخوبی مکن　　　　جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

لہ (ناز کے لئے چہرہ مثل گلاب کے پھول کے چاہیئے جب ایسا چہرہ نہ ہو تو ناز کے قریب بھی مت جاؤ۔
لہ بدصورت کا ناز کرنا بڑا معلوم ہوتا ہے جس طرح کہ اندھے کو اپنی آنکھ کا کھلا رکھنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔
سہ یوسف جیسے حسین کے سامنے کیا ناز کرتے ہو اسکے سامنے تو صرف نیاز اور آہ یعقوبی کرنی چاہئے یعنی طالب اور مرید مرشد کے سامنے ناز نہ کرے نیاز اور تواضع سے رہے)

طالب کو شیخ کے سامنے نہایت ادب سے رہنا چاہیئے اور کسی کو اس کے سامنے بولتا ہوا دیکھ کر اپنے کو اس پر قیاس نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ایک خاص حالت انشراح پر پہنچ چکا ہے اس کا بولنا اور بحث کرنا سب ادب میں داخل ہے اور تمھارا بولنا بے ادبی میں داخل ہوگا اور بے ادب کا اس طریق میں کچھ کام نہیں ؎

بے ادب را اندریں رہ بار نیست　　　　جائے او بردار شد در دار نیست

(بے ادب کے لئے اس راہ میں کچھ حصہ نہیں ہے اس کا مقام دار پر ہے نہ کہ دیار میں ہے)
یعنی بے ادب کی جگہ دار پر ہے (یعنی سولی پر) اور دار کے اندر (یعنی گھر میں) اس کے لئے جگہ نہیں۔ صاحبو بزرگوں نے جو شیوخ کے آداب لکھے ہیں وہ لغو نہیں ہیں اور ان تمام آداب کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ کا جی بُرا نہ کرو اس کے قلب کو مکدر نہ کرو ورنہ تم کو فیض بھی گدلا ہی پہونچے گا۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے کہ شیخ میزاب رحمت ہے جس کے واسطے سے تمکو فیض پہنچتا ہے پس میزاب رحمت کو میلا مت کرو ورنہ فیض بھی گدلا ہو کر آئیگا۔ یہ خلاصہ ہے ان آداب کا مشائخ نے اپنی پرستش نہیں کرائی بلکہ تم کو خالص و مصفّا زلال رحمت پلانا چاہتے ہیں اور اس کا یہی طریقہ ہے کہ اس کا دل میلا نہ کرو بس ایک حق

شیخ کا یہ بھی ہے کہ طالب اپنی رائے اور تجویز کو دخل نہ دے تم یہ مت سوچو کہ میرے واسطے غلبۂ شوق مناسب تھا اور اب تک حاصل نہیں ہوا۔ یا التہاب واضطراب کی مجھے ضرورت تھی اور یہ بات پیدا نہیں ہوئی۔ بس تم تو اطلاع واتباع سے کام رکھو جب تمہارے سر پر ایسا شفیق موجود ہے۔ جو یوں کہتا ہے ؎

من غم تو میخورم تو غم مخور　　　بر تو من مشفق ترم از صد پدر

(جب میں تمہارا غم کھاتا ہوں پھر تم غم مت کھاؤ تمہارے اوپر میں تو سیکڑوں باپوں سے زیادہ مہربان ہوں)

پھر تم کو کسی فکر اور سوچ کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو حالات سے اطلاع کر کے بے فکر رہو اور اگر شیخ پر ایسا اعتماد نہیں ہے تو یہ بدگمانی ہے اور ؎

بدگمانی کردن وحرص آوری　　　کفر باشد پیش خوان مہتری

(بدگمانی کرنا اور حرص کرنا ایسے محسن کے سامنے سخت بے ادبی ہے یعنی مرشد سے بدگمانی محرومی ہے)

اس کا انجام بجز محرومی کے کچھ نہیں طالب کو شیخ پر اعتماد کلی رکھنا چاہیئے کہ یہ جو کچھ بتلاتا ہے اسی میں میرا نفع ہے بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ شیخ محض ہماری تسلی کے واسطے یہ کہدیتے ہیں کہ وساوس کا کچھ حرج نہیں ان پر التفات نہ کرو۔ التہاب واضطراب نہ ہونے کا بھی مضائقہ نہیں تم کو مقصود حاصل ہے یاد رکھو یہ سراسر بدگمانی اور شیخ پر رہزنی کا الزام ہے۔ ارے شیخ کو تمہاری جھوٹی تسلی کرنے سے کیا ملتا ہے اس کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ جھوٹی باتوں سے تم کو بہلائے کیا تم سے اسکو کچھ جائداد دینا رہ گئی ہے اس کی تو یہ حالت ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

(آئینہ کے پیچھے طوطی صفت ہوں جو کچھ میرے دل میں حق تعالیٰ الہام فرماتے ہیں میں وہی اصطلاح طالبین کے لئے کہتا ہوں) ــــ وہ تم کو وہی طریقہ بتلاتا ہے جو اس کے دل پر تمہارے مناسب القا ہوتا ہے وارثان انبیا کی تعلیم کی وہی شان ہے جو تعلیم انبیا کی شان ہے کہ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(اہل اللہ کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے در اصل وہ الہام حق ہوتا ہے اگرچہ وہ کلام اسکی زبان سے جاری ہوتا ہے)

اتنا فرق ہے کہ انبیا وحی سے کہتے ہیں جو قطعی ہے اور اہل اللہ وارد والہام سے کہتے ہیں جو ظنی ہے باقی اپنی طرف سے وہ کچھ نہیں کہتے ہیں، تم تو یہی سمجھو گو وہ کبھی اجتہاد بھی کرے اور اگر وہ اجتہاد میں

غلطی کریگا تو خود کبھی مشتبہ ہو کر اصطلاح کردے گا تم کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے یہ تو اسکی تعلیم کے متعلق گفتگو ہے جو تربیت باطن کے متعلق ہو اور اگر کوئی مسئلہ فقہی اجتہادی ہو تو اس میں بھی شیخ کی غلطی پکڑنے کا ہر طالب کو حق نہیں صرف اہل علم کو حق ہے وہ بھی ادب کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کا ان کو بھی حق نہیں اور اہل علم میں بھی ان کو حق ہے جس سے طبیعت کھلی ہوئی ہو وہ جس طرح چاہیں غلطی پکڑیں کیونکہ ایسے لوگ ادب کے حدود سے نہ نکلیں گے اس طریق میں مچلنے روٹھنے اور لڑنے جھگڑنے کی تو گنجائش ہے مگر گستاخی و بے ادبی کی گنجائش نہیں نہ اس لئے کہ شیخ کو اس کی وجہ سے اپنی کسرشان کا خیال ہوگا یا تم سے عداوت ہو جائے گی۔ ہرگز نہیں جس پر یہ اثر ہوتا ہو وہ شیخ بنانے کے قابل نہیں کیونکہ ؎

دریائے فراواں نہ شود تیرہ بسنگ   عارف کہ برنجد تنک آبست ہنوز

(دریائے فراواں میں پتھر مارنے سے کوئی اثر نہیں ہوتا جو عارف مخلوق کی ایذا رسانی سے رنجیدہ اور متاثر ہوتا ہے (یعنی عقلی طور پر) وہ ابھی مبتدی ہے اس کا پانی ابھی قلیل ہے۔ البتہ طبعی اثر سے کامل بھی متاثر ہوتا ہے)

عارف تو اپنے کو سب سے بدتر سمجھتا ہے۔ وہ کسی کی بے ادبی سے برا نہیں مان سکتا بلکہ یہاں بے ادبی اور گستاخی کی اس لئے گنجائش نہیں کہ اس سے شیخ کو تمہاری طلب میں شک ہو جائیگا اور وہ یہ سمجھے گا کہ اس شخص کو مجھ سے تعلق اور محبت نہیں ہے کیونکہ طلب و محبت کے لئے کچھ آثار و شرائط ہیں۔ اور بے ادبی و گستاخی ان کی اضداد ہیں اور شیخ کو طالب کے متعلق یہ خیال ہو جاتا کہ اس کو مجھ سے محبت نہیں میزاب رحمت کے مکدر کا سبب ہے اس پر وہ تم کو اپنی مجلس سے نکال کر باہر کر دیگا کہ تم کو طالبین میں داخل ہونیکا حق نہیں۔ ہاں اجنبی بنکر آؤ پھر جتنا چاہو برا بھلا کہو۔ طالب بنکر گستاخی کرنا نفاق اور دھوکہ دہی ہے۔ اور اگر تم عالم نہیں ہو تو پھر فقہی اجتہادی مسائل میں شیخ کی غلطی ہرگز نہ نکالو نہ ادب سے نہ بے ادبی سے کیونکہ مسائل اجتہادیہ میں فقہاء کا اجتہاد ہوتا ہے۔ تو ممکن ہے شیخ نے کسی دوسرے فقیہ کے اجتہاد کو راجح سمجھا ہو اس میں تم دخل دینے والے کون ہو۔ اب ختم کے قریب آ گیا ہوں خلاصہ میرے بیان کا یہ ہے کہ محبت کے دو نوں ہیں۔ ایک التہاب و اضطراب جو نسبت چشتیہ کا رنگ ہے اور ایک برودت و خمود جو نسبت نقشبندیہ کا رنگ ہے پس طالب کو ہر حال میں لاضی اور خوش رہنا چاہیئے

اور اپنے کو کسی حال میں محبت سے خالی اور محروم نہ سمجھنا چاہیئے۔ درمیان میں اعتماد علی الشیخ کا مسئلہ اسی کی توضیح کے لئے بیان کر دیا گیا تھا۔ اب میں اول وہ آیت پڑھتا ہوں جس میں یہ مضمون منصوص ہے۔ پھر وہ آیت پڑھوں گا جو میں نے تلاوت کی ہیں جن سے استشہاد لطیف کے طور پر اس مضمون کو مناسبت ہے در اصل آج کافور زنجبیل کے متعلق ایک نکتہ میری سمجھ میں آیا جس کے لئے مجھے اپنی کتاب مسائل السلوک دیکھنے کی ضرورت پڑی جس میں آیت قرآنیہ سے مسائل تصوف کو ثابت کیا گیا ہے تو میں اس میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کافور زنجبیل کے متعلق جو نکتہ میری سمجھ میں آیا ہے کسی صوفی نے اس پر تنبیہ کی ہے یا نہیں کیونکہ مسائل السلوک میں منقول ہے مضامین بھی بکثرت ہیں گو زیادہ اپنے ہی اقوال ہیں اور میرے قلب پر جب کوئی بات وارد ہوتی ہے تو میں یہ چاہا کرتا ہوں کہ سلف کے کلام سے اس کی تائید بھی مل جائے تو اچھا ہے کیونکہ ہمارے علوم وہی قابل اعتبار ہیں جو علوم سلف سے مؤید ہوں مگر اس وقت جلد دوم نہ ملی اور یہ مضمون اگر ہوتا تو جلد دوم ہی میں ہوتا کیونکہ یہ آیت جس میں زنجبیل و کافور کا ذکر ہے جلد دوم ہی میں آ سکتی تھی۔ جب اخیر کی جلد نہ ملی تو میں نے ویسے ہی بے ضرورت جلد اول کو دیکھا اتفاق سے شروع صفحہ پر ایک در آیت نکل آئی جس میں یہ مضمون صریح تھا اس سے مجھے بہت ہی خوشی ہوئی کیونکہ نص میں صریح ہونے کے بعد کسی کی تائید کی کیا ضرورت ہے اہل علم کو مضامین علمیہ میں وہ لذت آتی ہے کہ کسی چیز میں بھی نہیں آتی جب کوئی نیا علم حاصل ہوتا ہے تو واللہ سلطنت ہفت اقلیم اس کے سامنے گرد معلوم ہوتی ہے جبھی تو کہتے ہیں ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند … از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

(یقیناً جس کو حق تعالیٰ اپنا خاص بناتے ہیں تمام دنیا کے کاموں سے بیکار فرما دیتے ہیں مگر ؎

نکتہ ہو اگر تو مجذوب کیا غم … بڑی کار آمد یہ بیکاریاں ہیں)

اب لوگ ان سے دنیا کے خرافات میں شرکت چاہتے ہیں بھلا یہ حماقت نہیں تو کیا ہے۔ بہرحال یہ مضمون صراحۃً مل جانے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی اور یہ میرا کمال نہیں بلکہ استدعا کرنے والوں کی کشش ہے۔ کہ ان کے افادہ کے لئے حق تعالیٰ یہ علوم عطا کر دیتے ہیں مشائخ کو غرہ نہ کرنا چاہیئے کہ ہمارے اوپر یہ علوم و واردات فائض ہو رہے ہیں۔ صاحب یہ طالبین کی کشش ہے ان کی تربیت کے لئے حق تعالیٰ یہ علوم مشائخ کو عطا فرماتے ہیں جیسے ماں کی پستان میں بچہ کی کشش سے دودھ اترتا ہے۔ اگر بچہ دودھ نہ پئے تو دو چار دن میں چھاتیاں اکڑ اکڑ کر سوکھ جائیں گی اور دودھ خشک ہو جائیگا۔ اسی طرح طالبین نہ ہوں تو مشائخ پر بھی واردات بند

ہوجائیں دیگر یہ بات مشائخ کے سمجھنے کی ہے طالبین یہ اعتقاد نہ رکھیں ان کو مضر ہوگا۔ وہ شیخ ہی کا کمال سمجھیں اپنا کمال نہ سمجھیں ۱۲) بھلا اور تو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انما انا قاسم واللہ یعطی کہ میں تو صرف بانٹنے والا ہوں اور دینے والے حق تعالیٰ ہیں بس یہی اعتقاد مشائخ کو رکھنا چاہیئے کہ ہم محض واسطہ فی التقسیم ہیں ہمارا ذاتی کمال کچھ نہیں انما انا قاسم پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حج کو تشریف لے گئے تو بعض خدام بھی ساتھ ہولئے جن میں سے بعض کے پاس تو زادراہ تھا اور بعض کے پاس کچھ نہ تھا انھوں نے آکر مولانا سے عرض کیا کہ ہمارا بھی حج کو جی چاہتا ہے مگر سامان کچھ نہیں۔ مولانا بڑے خلیق تھے فرما دیتے کہ بھائی چلے چلو جو میرا حال وہی تمہارا حال یہاں تو یہ رنگ تھا اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رنگ تھا کہ ایک صاحب نے مولانا سے یہی عرض کیا کہ حضرت میرا بھی حج کو جی چاہتا ہے فرمایا کچھ سامان بھی پاس ہے۔ کہا کچھ نہیں صرف توکل پر چلتا ہوں مولانا نے فرمایا جاؤ بیٹھو بڑے توکل والے ہو بس جس وقت سب لوگ ٹکٹ لیں گے تم بابو کے سامنے توکل کا لوٹہ رکھدینا کہ اس میں سے ٹکٹ کے دام نکال لو۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ میں کون تبوت تھا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ میں رنگ ولایت تھا۔ اور واقعی انتظام تو مولانا گنگوہیؒ ہی کے طرز میں ہے۔ خود ہمنے ایسے توکل والوں کو دیکھا ہے کہ جہاز میں اور مکہ معظمہ جدہ پہنچکر توکل کے بجائے ان میں محض تاکل رہ جاتا ہے بس جہاں کوئی دستر خوان بچھا کر بیٹھا اور یہ متوکل صاحب اس کے سر پر سوار ہوگئے کہ یا شیخ لقمہ اتنی عربی تو جہاز ہی سے سیکھ لیتے ہیں میں نے کہا ہاں بھائی تم شیخ ہی کو لقمہ بنالو اسے ہی کچے کو کھاجاؤ۔ راستہ میں یہ لوگ بہت تنگ کرتے ہیں اس سفر میں اول کھانا پکانا ہی موت ہے نہ معلوم کس مصیبت سے تو کھانا تیار ہوتا ہے اور جب کھانے بیٹھو تو چار طرف سے یا شیخ لقمہ یا شیخ لقمہ مجھے تو ان لوگوں پر بڑا غصہ آتا تھا کہ جب ان پر نہ حج فرض تھا نہ قناعت توکل میسر تھا تو یہ آئے کس لئے۔ غرض مولانا محمد قاسم صاحبؒ کسی سے انکار نہ فرماتے تھے اس لئے ان کے ساتھ بہت سے لوگ ہوگئے۔ اب راستہ میں جہاں مولانا کو فتوحات ہوتیں اور ہدایا ملتے تو سب ساتھیوں کو بلا کر تھوڑا تھوڑا تقسیم فرمادیتے۔ کسی نے عرض کیا حضرت اپنے واسطے بھی تو کچھ رکھ لیجئے تو بے ساختہ فرمایا انما انا قاسم واللہ یعطی۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ لطیفہ ہے کہ میں تو قاسم ہوں (نام بھی قاسم ہی تھا) اور اللہ دینے والا ہے میرے پاس جو کچھ آتا ہے سب ساتھیوں ہی کی غرض سے آتا ہے۔ مولانا کے یہاں ایسے لطیفے کثرت سے رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا کی مجلس میں کچھ مٹھائی تقسیم ہو رہی تھی

اور ہم نے سنا ہے کہ مولانا کی مجلس میں کھانا پینا مٹھائی بانٹنا اکثر رہا کرتا تھا۔ کوئی مجلس بہت کم اس سے خالی ہوتی تھی تو ایک دفعہ مولوی محمد فاضل صاحب بھلتی مٹھائی تقسیم کررہے تھے اخیر میں کچھ بچ گئی تو مولانا فرماتے ہیں۔ الفاضل للقاسم کیا عجیب لطیف جملہ ہے جس کے چند معنے ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بچا ہوا بانٹنے والے کا ہے دوسرے یہ کہ بچا ہوا مسمی بہ قاسم ہے یعنی میرا تیسرے یہ کہ مسمی بہ فاضل مسمی بہ قاسم کے لئے ہیں۔ لام تخصیص کا ہے یعنی ایک دوسرے کے لئے مخصوص ہے (مولوی فاضل صاحب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مخلص شاگرد تھے ۱۲) چونکہ مجلس بے تکلفی کی تھی اور مولانا نے مزاح کا موقعہ دیدیا تھا تو مولوی فاضل صاحب نے بھی لطیفہ کا جواب دیا کہا نہیں الفاضل للفاضل والقاسم محروم۔ اس کے بھی چند معنی ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ بچا ہوا مسمی فاضل کا ہے یعنی میرا اور مسمی بقاسم محروم ہیں یعنی آپ۔ دوسرے یہ کہ بچا ہوا اس شخص کا ہے جو فاضل ہے (یعنی مولانا) اور بانٹنے والا محروم ہے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ جب شیخ و طالب میں بے تکلفی و انشراح ہوچکا ہو تو پھر مذاق اور دل لگی اور شوخی سب کی گنجائش ہے لیکن ہر ایک اپنے کو دوسرے پر قیاس نہ کرے خیر یہ تو ادا انا قاسم پر ایک لطیفہ یاد آگیا تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس مضمون کا صراحۃً مل جانا میرا کمال نہیں بلکہ استدعا کرنے والوں کی کرامت ہے۔ بہر حال اس مضمون کو حق تعالٰے نے اس آیت میں صراحۃً بیان فرمایا ہے جو سورۂ ہود کی آیت ہے۔ ولئن اذقنا الانسان منا رحمۃ ثم نزعناها منه انه ليئوس كفور ولئن اذقناه نعماء بعد ضراء مسته ليقولن ذهب السيئات عنى انه لفرح فخور الا الذين صبروا وعملوا الصالحات اولئك لهم مغفرة واجر كبير۔ پ ۱۲ ع ۲ (ترجمہ) اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیں تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دُکھ درد رخصت ہوا (اب) وہ اترانے لگتا ہے (اور) شیخی بگھارنے لگتا ہے مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (وہ ایسے نہیں ہوتے) ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے انسان کا ایک طبعی خاصہ بیان فرمایا ہے کہ اس کی حالت یہ ہے کہ اگر ہم اس کو کسی رحمت کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہوجاتا ہے یہاں رحمت عام ہے رحمت ظاہرہ و باطنہ دونوں کو کیونکہ اس جگہ اس کو اطلاق کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور دوسری جگہ تصریح فرمائی ہے کہ رحمت کی

دو قسمیں ہیں چنانچہ ارشاد ہے ھوالذی اسبغ علیکم نعمۃ ظاھرۃ و باطنۃ کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے اوپر اپنی نعمتوں کو کامل کیا ہے ظاہری بھی اور باطنی بھی نعمت ظاہرہ کے معنی یہ ہیں کہ محسوس ہو اور باطنہ وہ ہے جو محسوس نہ ہو۔ خواہ دینی نعمت ہو یا دنیوی نعمت باطنہ دینیہ کی مثال تو شوق و ذوق وغیرہ ہے ایسے ہی انس و اطمینان وغیرہ رنگ مختلف ہیں کسی نعمت کا رنگ کیفیت عشقیہ جذبیہ کے ساتھ ہے اور کسی کا سلوک و معرفت عقلیہ کے طور پر باقی نعمت ہونے میں دونوں برابر ہیں اور نعمت باطنہ دنیویہ کی مثال عقل و شعور و ادراک و تمیز و ذکاوت و فطنت و علم وغیرہ ہے۔ بہرحال یہاں نعمت باطنہ سے اصطلاح تصوف تو مراد ہے نہیں مگر صوفیہ جن کو نعم باطنہ کہتے ہیں وہ بھی اس میں داخل ضرور ہیں گو ان میں انحصار نہ ہو اور منا کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رحمت غیر مکتسبہ موہوبہ مراد ہے جس میں اختیار انسان کو دخل نہ ہو کیونکہ نعمت مکتسبہ اختیاریہ کے سلب پر رنج کرنے کی ممانعت نہیں نہ اس پر یہ وعید ہے مثلاً کوئی شخص نماز پڑھتا روزے رکھتا ہے پھر کسی دن یہ نعمت سلب ہو جائے کہ نماز روزہ فوت کر دے تو اس پر رنج ہونا چاہیے اور اس رنج کرنے پر کوئی وعید نہیں ہے یہ وعید تو رحمت موہوبہ غیر مکتسبہ کے سلب پر رنج و پریشانی کرنے کے متعلق ہے چنانچہ منا رحمۃ اس کا قرینہ ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں ہے نہ سلباً نہ وجوداً۔ اگر کوئی نعمت موہوبہ بدون اس کے اختیار کے سلب ہو جائے تو اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ نہ قرب میں کمی ہوگی۔ اور اگر کوئی مصیبت و نعمت بدون اس کے اختیار کے پیدا ہو جائے تو اس پر بھی مواخذہ نہ ہوگا۔ نہ قرب میں کمی آئیگی بشرطیکہ اپنے اختیار کو ذرا دخل نہ دے مثلاً بڑے بُرے وسوسے از خود آنے لگیں یا کسی مخلوق سے اضطرار عشق ہو جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا اور یہ نہ کہا جائے گا کہ تم کو بے اختیار بھی وسوسے کیوں آئے اور بے اختیار ہی عشق کیوں ہوا بلکہ اگر اس میں اختیار کو دخل نہ دیا جائے تو عشق مجازی بھی رحمت ہو جاتا اور عشق حقیقی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ غرض عدم اختیار کی صورت میں نقمت بھی نعمت ہے اور جیسے امراض جسمانی میں اجر ملتا ہے کیونکہ ان سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح امراض باطنیہ میں بھی اجر ملتا ہے اگر ان کے بڑھانے کی کوشش نہ کرے بلکہ ازالہ و امالہ کی فکر کرے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عاشقی گرزیں سرو گرزاں سرست ☆ عاقبت مارا بداں شہ رہبرست

(عشق مجازی پر اگر صبر کیا جائے اور ہر طرح سے تقویٰ کا اہتمام ہو تو یہ عشق حقیقی کی طرف رہبری کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ اپنے اختیار سے یہ عشق مجازی نہ اختیار کیا گیا ہو)

اور یہی مطلب مولانا جامیؒ کے اس ارشاد کا ہے ؎

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است — کہ آں بہر حقیقت کارسازی است

(عشاق مجازی جو بدون اختیار ہو جاوے گھبراؤ مت کہ اسی سے حق تعالیٰ کی محبت اور اہل اللہ کی محبت سمجھ میں آجاوے گی بشرطیکہ خلاف شرع کوئی کام نہ کرو بس صبر سے کام لو)

اگر اول الف با تا نخوانی — ز قرآں حرف خواندن کے توانی

(اگر تم الف با نہ پڑھو گے تو آگے قرآن پاک کس طرح پڑھو گے)

یعنی اگر بے اختیار عشق مجازی کسی میں پیدا ہو جائے تو اس میں گھبرائے نہیں کیونکہ اس درجہ میں وہ بھی کام کی چیز ہے۔ اگر احتیاط رکھے تو وہ عشق حقیقی کا زینہ بن جاتا ہے باقی یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عشق مجازی کو از خود لپیٹ لو بلکہ اگر لپیٹ جائے تو اس سے کام لو چنانچہ شیخ سعدیؒ از خود لپیٹ لینے کی تو صاف صاف نفی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

سوم باب عشق ست و مستی و شور — نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

(تیسرا باب عشق و مستی غیر اختیاری کا ہے نہ وہ عشق جو فسق ہوتا ہے اور قصداً کسی سے کیا جاتا ہے)

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جو گلستان و بوستان میں عشق مجازی کی کچھ حکایتیں لکھدی ہیں اس سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدانخواستہ شیخ بھی آجکل کے لوگوں کی طرح عشق باز اور امردوں کو گھورنے والے تھے اور وہ عشق مجازی کو مطلقاً اچھا کہتے تھے یہ بالکل غلط ہے۔ شیخ نے جہاں کہیں عشق مجازی کی مدح کی ہے یا ایسے عشاق کی حکایتیں لکھی ہیں اس سے مراد وہی عشق ہے جو از خود بلا اختیار لپیٹ جائے۔ چنانچہ باب عشق کے شروع ہی میں فرماتے ہیں۔ ع نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

اور ایک مقام پہ فرماتے ہیں ؎

نداند صاحب دلاں دل بہ پوست — وگر ابلہے داد بے مغز اوست

(اہل دل ہرگز کسی غیر اللہ کو دل نہیں دیتے نہایت بے وقوف اور بے مغز لوگ ہی عشق مجازی میں مبتلا ہوتے ہیں)

وہ تو ایسے شخص کو جو از خود مخلوق کو دل دے ابلہ اور بے مغز فرما رہے ہیں۔ پھر وہ اس کی طرح یا تعلیم کیونکر کر سکتے ہیں۔ بلکہ فرماتے ہیں ؎

مکن بد بہ فرزند مردم نگاہ — کہ ناگاہ فرزند مدت آید تباہ

دکسی کے لڑکے کو بری نظر سے مت دیکھو ورنہ تمہارے لڑکے کو دوسرے لوگ بری نظر سے دیکھیں گے)
واقعی جو شخص دوسروں کی اولاد سے برا تعلق رکھتا ہے دوسرے بھی اس کی اولاد سے ایسا ہی تعلق کرتے ہیں۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ میرا لڑکا لوگوں سے محفوظ رہے تو اس کو چاہیئے کہ دوسروں کی اولاد سے برا تعلق نہ رکھے۔ بہرحال شیخ امرد پرست نہ تھے جیسا کہ جاہلوں کا خیال ہے انھوں نے تو ایک جگہ ایک امرد پرست کی حکایت بطور ذم کے لکھی ہے کہ بقراط کا ایک زاہد پر گذر ہوا جو بیہوش پڑا تھا بقراط نے پوچھا کہ اسے کیا ہوا یہ کیوں پڑا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ایک حسین لڑکے کو دیکھ کر اسے نور خداوندی کا مشاہدہ ہوا تو وجد سے بیہوش ہو گیا۔ بقراط نے کہا کہ اس کو امرد ہی میں خدا کا نور نظر آیا میرے اندر نہ نظر آیا یہ جھوٹا ہے۔ محض نفس کی شرارت سے یہ اس پر عاشق ہوا ہے۔ اگر قدرت خدا کے مشاہدہ سے عاشق ہوا ہوتا تو اس کی نظر میں امرد اور ڈاڑھی والا دونوں برابر ہوتے اور گو بقراط کا قول خود کوئی حجت نہیں مگر فلسفی کے قول کی تائید محقق کوئی کردے تو اس کو صحیح کہا جائیگا چنانچہ اس حکایت کو نقل کر کے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل ؛ کہ در خوبرویان چین و چگل

(محقق تو اونٹ میں بھی وہی جمال حق دیکھتا ہے جس طرح اور مخلوق کے حسن کو آئینہ جمال جمال حقیقی سمجھتے ہیں لیکن غیر محقق عشق مجازی میں دھوکہ سے پڑ جاتا ہے اور اس طرح وہ فسق میں مبتلا ہو کر تباہی کے قعر میں گر جاتا ہے)
بہرحال مشائخ نے جس عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ وہ وہ ہے جس کا نہ حدوث اختیاری ہے نہ بقا اختیاری ہے یعنی نہ اس کو اختیار سے پیدا کیا گیا نہ اختیار سے باقی رکھا گیا ہے کہ نہ تو محبوب کے دیکھنے کو جاتا ہے نہ اس کی آواز سننے کا قصد کرتا ہے نہ سامنے آنے جانے پر قصداً نظر کرتا ہے نہ ارادہ سے اس کا خیال لاتا ہے اگر ایسا کرے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد حق تعالیٰ کا عشق اس کے قلب میں جوش زن و موج زن ہوگا اور یہ بھی نہ ہوا تو یہ شخص بڑا مجاہد ہوگا۔ مجاہدہ بھی واصل ہے اور ایک حدیث اس کے متعلق مشہور ہے گو صحت کا حال معلوم نہیں جس میں اس کو شہید کہا گیا ہے۔ عن عشق فکتم وعف فمات فھو شھید (قلت قال فی الدار المنتثرة لہ طرق من حدیث ابن عباس قلت اخرجہ الحاکم فی تاریخ نیسابور و الخطیب فی تاریخ بغداد و ابن عساکر فی تاریخ دمشق و اخرجہ الخطیب ایضاً من حدیث عائشة بلفظ من عشق فعف ثم مات مات شھیدا و اورد الدیلمی بلا اسناد عن ابی سعید العشق من غیر ریبة کفارة للذنوب اھ ص ۲۰۸ – ۱۲ جامع)

اس میں دو شرطیں بیان کی گئی ہیں ایک عفت جس کے معنی ہیں معاصی سے بچنا اور معاصی کی چند مثالیں میں نے بیان کردی ہیں جن سے عشق سے بچنا ضروری ہے۔ دوسری کتمان یعنی عشق کو چھپانا یہ اس واسطے ضروری ہے تاکہ دوسرے کی (یعنی محبوب کی) بدنامی نہ ہو خصوصاً اگر عورت سے عشق ہو جائے تو وہاں کتمان بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لوگوں کے گمان بہت دور دور پہونچتے ہیں کہ شاید دونوں میں ملاقات ہوئی ہوگی۔ پھر اس سے عورت کی بہت بدنامی ہوتی ہے اور کسی کو بلا وجہ بدنام کرنا یا بدنامی کا سبب بننا گناہ ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جب عشق مجاز میں گھٹ گھٹ کر مرجانا شہادت ہے بوجہ تحمل مشقت شدیدہ کے تو عشق حقیقی میں گھٹ گھٹ کر مرجانا شہادت کیوں نہ ہوگا کیونکہ اس میں بھی عشق مجازی سے مشقت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ جو نسبت شوقیہ ہے یہ آگ جیسی ہے دل کو بھون کر رکھدیتی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

"غلام آں کلماتم کہ آتش افروزد"۔ اسی لئے نسبت چشتیہ کبھی آگ کی صورت میں مکشوف ہوتی ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجلی گر پڑی۔ ایک شخص نے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے اوپر بجلی گری۔ فرمایا مبارک ہو نسبت چشتیہ حاصل ہوگی تو جو اس میں مرجائے وہ حریق نار کے مشابہ ہے اور نسبت سکون پانی جیسی ہے جو نہایت ٹھنڈی ہوتی ہے چنانچہ کبھی اس کا انکشاف بارش کی شکل میں ہوتا ہے کبھی دریا کی شکل میں اسی واسطے نقشبندیہ پانی کا مراقبہ بتلایا کرتے ہیں کہ یوں تصور کرے کہ گویا قلب پر عرش سے ہلکی ہلکی پھوار پڑرہی ہے۔ ہم بحمداللہ دونوں کے یہاں گئے ہیں چشتیہ کے پاس بیٹھ کر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگ برس رہی ہے ان کی باتوں سے اور توجہ سے حرارت بڑھتی تھی اور بچپن میں مولانا رفیع الدینؒ صاحب کے حلقہ میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ نقشبندی تھے بعض دفعہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قلب پر برف رکھدیا ہو اور یوں خیال ہوتا تھا کہ شاید فرشتوں میں بھی ایسی ہی برودت وسکون کی کیفیت ہوگی جیسی اس وقت ہمارے اندر ہے اور جس طرح آگ سے کبھی موت کی نوبت آجاتی ہے اسی طرح پانی بھی کبھی ڈبو دیتا ہے چنانچہ سکون وانس کے غلبہ سے بعض دفعہ استغراق پیدا ہو جاتا ہے جس میں انسان تدبیر بدن نہیں کرسکتا نہ کھانے کے ہوش رہتے ہیں نہ پینے کے اس کا وہی حال ہوتا ہے جو پانی میں ڈوبنے والے کا ہوتا ہے کہ گھٹ گھٹ کر جان دیتا ہے۔ غرض غلبہ ہر کیفیت کا قاتل ہے پھر یہ لوگ شہید کیوں نہ

ہوں گے ضرور ہوں گے تو اب سالک کو کسی حال میں پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ خواہ غلبۂ شوق ہو یا غلبۂ انس ہو ہر حال میں راضی رہے ایک دن وصول ضرور میسر ہوگا اور نہ بھی ہوا اور یوں ہی طلب میں گھٹ گھٹ کر مرگیا۔ خدا کے راستہ میں اگر جان بھی جائے تو کیا ہوا پھر اس وقت یہ شہید ہوگا اور شہید بھی واصل ہوتا ہے اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ نسبت چشتیہ آگ کے مشابہ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ چشتیہ میں برودت نہیں ہوتی یا نقشبندیہ میں حرارت نہیں ہوتی بلکہ دونوں نسبتیں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں جیسے جسم میں حرارت و برودت دونوں ساتھ ساتھ مجتمع ہوتی ہیں۔ البتہ غلبہ ایک کو ہوتا ہے چشتیہ میں حرارت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور نقشبندیہ میں برودت کا دوا نے شراب پی رکھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شراب میں پانی کا جزو بھی ہوتا ہے لیکن چشتیہ کی شراب میں تو سنکھیا ملا ہوا ہے جس سے حرارت بڑھ جاتی ہے اور نقشبندیہ کی شراب میں افیون ملا ہوا ہے جس سے برودت کا اثر غالب ہو گیا عارف فرماتے ہیں ؎

ازاں افیوں کہ ساقی می درافگند — حریفاں را نہ سر ماند نہ دستار

معلوم ہوتا ہے کہ شراب میں افیون ملانے کا رواج تھا تو نقشبندیہ کی شراب ایسی ہے اور ظاہر ہے کہ افیون کے مل جانے سے گو عارض برودت کا غلبہ ہو گیا مگر شراب کی حرارت بالکلیہ زائل نہیں ہوگی اور یہ فرق بھی دونوں نسبتوں میں ابتدا اور توسط میں نظر آتا ہے اور انتہا میں تو اہل شوق بھی اہل انس ہو جاتے ہیں یعنی چشتیہ بھی نقشبندی بن جاتے ہیں جیسے ہنڈیا ابتدا میں کھد کھد کرتی ہے اور پکنے کے بعد خاموش ہو جاتی ہے۔ پس اخیر میں چشتیہ کی حالت بھی سکون کی ہو جاتی ہے مگر حرارت زائل نہیں ہوتی بلکہ قوت ضبط بڑھ جاتی ہے پہلے اوپر بھی اثر تھا اب اندر ہی اندر کام کرتی ہے چنانچہ ایک بار حضرت جنید رحمۃ اللہ کی مجلس میں کسی نے کوئی شعر پڑھا جس پر بہت لوگوں کو وجد ہوا مگر حضرت جنیدؒ ویسے ہی سکون کے ساتھ بیٹھے رہے کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو وجد نہیں ہوا تو فرمایا۔ وتری الجبال تحسبها جامدة وهي تمر مر السحاب۔ یعنی قیامت میں تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کروگے کہ وہ اپنی جگہ پر جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چلتے ہوں گے مطلب یہ تھا کہ حرکت تو ہم کو بھی ہو رہی ہے مگر دوسروں کو نظر نہیں آتی ہماری حرکت پہاڑ کی سی حرکت ہے۔ پھر فرمایا کہ ذرا میرے بدن کو ہاتھ تو لگاؤ بس ہاتھ لگانا تھا کہ خون کا فوارہ جسم سے نکل پڑا معلوم ہوا کہ آپ پر بھی وجد کا اثر بہت سخت ہوا تھا مگر ؎

کسی کے دل میں رہی اور کسی کے پار گئی

غرض جب حدیث میں عشق مجازی پر صبر کرنے والے کو شہادت کی بشارت دی گئی ہے تو عشق حقیقی کی تکالیف پر صبر کرنا شہادت کیوں نہ ہوگا۔ خصوصاً جبکہ کلفت باطنی کلفت ظاہری سے اشد ہے۔ ایک محقق فرماتے ہیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(اے شخص تیرے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہ چبھا تو کیا جانے اس شیروں کو جو تلواروں کی بلا کو سر پر کھاتے ہیں)

اور شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

خوشا وقت شوریدگان غمش　　اگر تلخ بینند دگر مرہمش

(کیا اچھا وقت ہوتا ہے کہ محبوب حقیقی کے غم سے شوریدہ حال ہیں اگر ناموافق حالات ہوتے ہیں تب بھی خوش ہیں اور اگر موافق حالات ہیں تب بھی خوش ہیں)

گدایان از بادشاہی نفور　　بامیدش اندر گدائی صبور

(اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کو دیکھو کہ بادشاہت سے نفرت کئے ہوئے اور حق تعالیٰ کی رضا کی امید میں گدائی پر صابر ہیں)

دمادم شراب الم درکشند　　وگر تلخ بینند دم درکشند

(ہر وقت دنیا کے رنج و غم کھاتے ہیں اور ان تلخیوں کے باوجود صبر و شکر سے رہتے ہیں)

ان کے قلب پر واللہ ہر دم آرے چلتے ہیں اور دم بخود رہتے ہیں یہ تو نقشبندیہ کا حال ہے آگے فرماتے ہیں ؎

سماع اے برادر بگویم کہ چیست　　چو طاقت نماند بدانم کہ کیست

(سماع اے بھائی بتاؤں کہ کیا چیز ہے مگر سماع سننے والوں کو میں جانتا ہوں کہ کون ہیں)

آگے فرماتے ہیں ؎

بتسلیم سر در گریباں برند　　چو طاقت نماند گریباں درند

(بحالت تسلیم سے سر در گریباں ہوتے ہیں اور جب تسلیم کی طاقت نہیں ہوتی تو گریبان پھاڑ ڈالتے ہیں)

یہ چشتیہ کا حال ہے کہ اول تو وہ بھی ضبط سے کام لیتے ہیں جب طاقت ضبط نہیں رہتی تو ہاتھ پیر مارتے ہیں اور اگر یہ حدیث صحیح بھی نہ ہو تو وہ حدیث تو صحیح ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء امت کی فہرست بیان فرمائی ہے کیونکہ امت میں شہداء بہت ہیں۔ صرف مقتول ہی شہید نہیں ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

المطعون شہید والمبطون شہید والغریق شہید والحریق شہید اور ایک روایت میں ہے ومن مات بھدم الدار ومن ماتت بجمع۔ او کما قال ای فی النفاس او الحمل۔ یعنی جو طاعون میں مرے وہ بھی شہید اور جو پیٹ کی بیماری میں مرے جیسے ہیضہ وغیرہ وہ بھی شہید اور جو پانی میں ڈوب جائے وہ بھی شہید اور جو آگ میں جل جائے وہ بھی شہید اور جس پر مکان گر پڑے اور دب کر مر جائے وہ بھی شہید جو عورت بچہ کی وجہ سے مر جائے وہ بھی شہید اور جو آگ میں جل جائے وہ بھی شہید ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی شہدا ہیں اور میرے نزدیک سب میں علت مشترکہ یہ ہے کہ کسی ایسی مشقت کا ورود ہو جس کا تحمل عادۃً دشوار ہو چنانچہ جتنی نظیریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں ان سب میں ایسی مشقت ہے جس کا تحمل دشوار ہے۔ طاعون میں ایک آگ سی بدن میں لگ جاتی ہے ہیضہ میں بھی سخت کرب و بے چینی ہوتی ہے ڈوبنے والا اور مکان سے دب کر مرنے والا گھٹ کر جان دیتا ہے وعلی ہذا اور میں بتلا چکا ہوں کہ نسبت چشتیہ نار کے مشابہ ہے اور نسبت نقشبندیہ پانی کے مشابہ ہے اور شوق کی آگ اور انس کی برودت ظاہری آگ پانی سے اشد ہیں تو یہ بھی حریق و غریق کے مشابہ ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بیجا نہیں کہ مقتول بالسیف کے مشابہ ہیں کیونکہ مقتول بالسیف کے شہید ہونے کی بھی تو یہی علت ہے کہ اس نے ایسی مشقت کا تحمل کیا ہے جس کا تحمل عادۃً دشوار ہے اور اس علت کا قرینہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے علاوہ اور بہت سوں کو شہید فرمایا ہے معلوم ہوا کہ مقتول کی شہادت کسی علت سے معلل ہے اور چونکہ وہ علت ان نظائر میں بھی موجود تھی اس لئے ان کو بھی مقتول کے ساتھ ملحق کر دیا گیا اور میں بتلا چکا ہوں کہ ان سب میں علت مشترکہ بھی ہے یعنی ورود مشقۃ شدیدۃ یتعذر تحملھا عادۃً اور جب حکم معلل ہے تو جہاں یہ علت پائی جائے وہاں حکم کا قیاساً ثابت کر دینا غلط نہ ہوگا اور عشق حقیقی میں مشاق و آلام قتل بالسیف سے زیادہ ہیں مقتول بالسیف تو ایک دفعہ جان دے چکا تلوار چل گئی قصہ ختم ہوا اور یہاں یہ حال ہے کہ ؎ کشتگان خنجر تسلیم را٭ ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست ٭ جن پر کیفیات باطنیہ طاری ہوتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان پر کیا گذرتی ہے واقعی وہ تو نہ معلوم کتنی مرتبہ جلتے اور مرتے ہیں۔ ایک عارف فرماتے ہیں انتم تخافون المعاصی ونحن نخاف الکفر۔ ظاہری تکالیف میں تو جان ہی کا خطرہ ہے اور باطنی تکالیف میں ایمان کا خطرہ ہے اور خطرہ کے

اور یہ خطرہ سب سے اشد ہے۔ حضرت شبلیؒ نے ایک دفعہ کسی سالک سے پوچھا ای الصبر اشد کہ بتلاؤ سب سے زیادہ سخت کونسا صبر ہے و قال الصبر باللہ قال لا قال الصبر مع اللہ قال لا یعنی اس نے کہا صبر باللہ بہت سخت ہے فرمایا نہیں۔ کہا صبر مع اللہ بہت سخت ہے فرمایا نہیں۔ قال فای الصبر اشد اس نے کہا پھر آپ بتلائیں کہ کونسا صبر اشد ہے فرمایا الصبر عن اللہ خدا سے صبر کرلینا زیادہ سخت ہے اور یہ کہکر ایک چیخ ماری اور بیہوش ہوگئے۔ ہائے (اسوقت مجمع کی عجیب حالت تھی اور حضرت مولانا پر بہت مجمع جلال تھا ۱۲ جامع) اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

لہ ای کہ صبرت نیست از فرزند و زن　　　صبر کے داری ز رب ذو المنن

لہ ای کہ صبرت نیست از دنیای دوں　　　صبر چوں داری ز نعم الماہدوں

(لہ اے شخص تجھے فرزند و زن سے صبر نہ آیا مگر پھر کس طرح تو حق تعالیٰ جیسے محسن سے صبر کئے بیٹھا ہے۔
لہ تجھ کو صبر دنیائے دوں سے نہیں ہے لیکن حق تعالیٰ سے کس طرح سے صبر آگیا ہے)

واقعی خدا سے صبر نہیں ہوسکتا اور سب سے ہوسکتا ہے اور سالک کو ہر وقت اس کا خطرہ رہتا ہے کہ کہیں یہ حالت پیدا نہ ہوجائے اس کو اپنی طلب پر ہمیشہ بدگمانی رہتی ہے کہ میرے اندر طلب ہے بھی یا نہیں اور اس غم میں معلوم کتنی دفعہ ہلاک ہوتا اور جیتا ہے میں دوبارہ وہ شعر پڑھتا ہوں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(اے شخص تجھے تو کانٹا بھی پیر میں نہ چبھا پھر تجھے اس شہر کا حال کیا معلوم ہوسکتا ہے جو سر پر تلواروں کے واروں کا تحمل کرتے ہیں۔)

اے صاحب جس راستے پر وہ چل رہے ہیں واللہ وہ تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہے ان کی جان پر جو بنتی ہے اس کی کسی کو کیا خبر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مشائخ بڑے مزہ میں ہیں لوگ ان کے ہاتھ چومتے ہیں تعظیم و تکریم کرتے ہیں ہدایا و تحائف لاتے ہیں بس یہ سب سے زیادہ بیفکر ہیں ارے تم کو ان کے دل کی کیا خبر کہ خدا تعالےٰ کے کیا کیا معاملات ان کے ساتھ پیش آتے ہیں اور کیسے کیسے خطرات ان پر گذرتے رہتے ہیں بھلا جس کے سر پر تلوار کھڑی ہو اس کو کسی کی تعظیم و تکریم یا ہاتھ پیر چومنے سے کچھ لطف آسکتا ہے یہ محض بدگمانی ہے۔ اولیاء اللہ کے ساتھ تو جب ان کی یہ حالت ہے تو کیا مقتول سیف اور حریق و غریق تو شہید ہوں اور یہ لوگ شہید نہ ہوں یہ بھی ضرور مقتول فی سبیل اللہ کی طرح شہید ہیں اور یہ میں قرآن کی تفسیر نہیں کرتا کہ لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء میں اولیاء بھی داخل ہیں بلکہ علم اعتبار و قیاس کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ بھی انھیں کے حکم میں

ہیں اور یہ کوئی تنہا میری رائے نہیں بلکہ قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے بھی تفسیر مظہری میں شہداء کے ذکر کے ساتھ فرمایا ہے اذا کان ھذا حال المقتول بسیف الکفار فکیف بقتیل سیف الجبار کہ جب مقتول سیف کفار کی یہ فضیلت ہے تو جو سیف جبار سے مقتول ہوا ہو اور تلوار عشق کا کشتہ بنا ہو اسکی تو کیا کچھ فضیلت ہو گی اس سے معلوم ہوا کہ میں اس مسئلہ میں متفرد نہیں ہوں بل لی فیہ سلف سلف میں بھی بعض کی یہی رائے ہے پس طالب کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ان شاء اللہ وہ ہر حال میں واصل ہے یا شہید ہے خواہ نسبت شوقیہ ہو یا نسبت انسیہ ہو ایک صورت میں وہ حریق ہے اور دوسری صورت میں غریق ہے اور دونوں کیلئے بشارت شہادت ہے۔

(یہاں پہونچکر پھر حضرت مولانا نے کاتب سے ماقبل کا ربط دریافت فرمایا کہ یہ مضمون کس بات پر بیان ہوا تھا اس نے عرض کیا کہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہوا تھا کہ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں ہوتا فرمایا کہ ہاں جامع) ہاں یہ کہہ رہا تھا کہ مواخذہ کا مدار اختیار پر ہے اور بے اختیار کے تو اگر زحمت بھی پیش آئے تو وہ رحمت ہے جیسے عشق مجازی اور وساوس اور خطرات وغیرہ تو امور غیر اختیاریہ سے انسان کو پریشان نہ ہونا چاہیئے مگر انسان کی عادت یہ ہے کہ یہ رحمت موہوبہ غیر مکتسبہ کے سلب سے بھی پریشان ہوتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے انه لیئوس کفور کہ ناامید ہو جاتا اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ چنانچہ کسی میں التہاب و اضطراب کی کیفیت نہ ہو تو وہ اپنے کو محبت سے خالی و محروم سمجھ کر وصول سے ناامید ہو جاتا ہے حالانکہ یہ کیفیات غیر اختیاریہ ہیں ان کے ہونے نہ ہونے پر کچھ بھی مدار نہیں پھر یہ شخص ناامیدی کے ساتھ ناشکری بھی کرتا ہے کہ جن افعال اختیاریہ کی حق تعالیٰ نے اس کو توفیق دے رکھی ہے ان کی قدر نہیں کرتا اور ان کو اپنے لئے قرب و اصول کا کافی ذریعہ نہیں سمجھتا۔ ایک عادت تو انسان کی یہ ہے دوسری عادت یہ ہے ولئن اذقناه نعماء بعد ضراء مسته لیقولن ذهب السیئات عنی کہ اگر پریشانی کے بعد حق تعالیٰ اس کو راحت دیدیں تو بے فکر ہو کر کہتا ہے کہ بس اب تو مجھ سے مصیبت ٹل گئی اور یہ شکر کے طور پر نہیں کہتا بلکہ اس طرح کہتا ہے انه لفرح فخور یعنی خوش ہو کر اتراتا ہے کہ اب تو بلا ٹل گئی بس اب کیا ہے کام مار لیا۔ چنانچہ بعض لوگ مقدمہ دائر ہونیکی حالت میں تو متفکر و پریشان رہتے ہیں حق تعالیٰ سے دعائیں کرتے اور بزرگوں سے وظیفے پوچھتے پھرتے ہیں۔ اور جہاں مقدمہ جیت گئے تو اس کو خدا کی نعمت نہیں سمجھتے بلکہ اترا کر کہتے ہیں کہ صاحب ہمارے گواہ بڑے پکے تھے حاکم بڑا سمجھدار تھا اور ہمارے وکیل نے خوب بحث کی تھی یوں کہا اور یوں جواب دیا تھا۔ اس وقت ان لوگوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس

جیت کو اپنی سعی و کوشش کا نتیجہ سمجھتے ہیں قبول دعا اور رحمت حق کا نتیجہ نہیں سمجھتے ارے تم کیسا وکیل لئے پھرتے ہو کہیں دوبارہ کیل نہ لگ جائے۔ خدا تعالیٰ کو پھر تمہارا ویسا ہی حال کر دینا کیا مشکل ہے۔ مگر انسان کا خاصہ ہے کہ ماضی کو بہت جلد بھول جاتا اور آئندہ کے لئے بالکل بےفکر ہو جاتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ انہ کان بکم رحیما ہ واذا مسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ فلما نجکم الی البر اعرضتم وکان الانسان کفورا ہ تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے (فائدہ کے) لئے کشتیوں کو سمندر میں چلاتا ہے تو اس وقت خدا کے سوا تمہارے سب معبود (ذہن) سے غائب ہو جاتے ہیں (اور کسی تدبیر پر نظر نہیں رہتی اللہ ہی اللہ یاد رہتا ہے) پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچا لے آتے ہیں تو اعراض کرنے لگتے ہیں اور (واقعی) انسان ہے بڑا ناشکرا (کہ اتنی جلدی پہلی حالت کو بھول جاتا ہے) آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ تم کو یہ بےفکری کیوں ہو گئی۔ افامنتم ان یخسف بکم جانب البر او یرسل علیکم حاصبا ثم لا تجدوا لکم وکیلا۔ کیا تم کو کوئی اس سے بھی اطمینان ہو گیا کہ شاید خدا تعالیٰ خشکی ہی میں دھنسا دیں سخت ہوا بھیج دیں پھر تم کو کوئی بھی کارساز نہ ملے چنانچہ ابھی زلزلہ اور طوفان خشکی ہی میں آ گیا تھا کانگڑا میں بعض مکان زمین کے اندر دھنس گئے اور بہت آدمی تباہ ہو گئے۔ جاپان میں ایسا سخت زلزلہ آیا تھا کہ لاکھوں آدمی مر گئے اور کروڑوں کا نقصان ہوا۔ یہ تو خسف ہی کا نمونہ ہے اور سخت ہوا کا بھی نمونہ آ چکا ہے چنانچہ پچھلے دنوں اخبار میں یہ بات آئی تھی کہ ہردوئی میں ایسی سخت ہوا چلی جس سے بعضے آدمی اڑ گئے اور کہیں سے کہیں جا کر گرے اور وہ تو خشکی میں بھی طوفان بھیج سکتے ہیں چنانچہ ابھی پہاڑوں سے چشمے اُبل پڑے تھے جن سے سخت طوفان برپا ہوا ہزاروں گانوں تباہ اور ہزاروں آدمی برباد ہو گئے اور مویشیوں کا نقصان الگ رہا۔ آگے بڑے مزے کی بات فرماتے ہیں کہ کیا تم کو اس سے بھی اطمینان ہو گیا کہ شاید حق تعالیٰ پھر دریا ہی میں تم کو بھیج دیں کوئی ایسی ضرورت آ پڑے جس سے دوبارہ دریا ہی کا سفر کرنا پڑے جس کو ایک دفعہ چکھ چکے ہو ام امنتم ان یعیدکم فیہ تارۃ اخری فیرسل علیکم قاصفا من الریح فیغرقکم بما کفرتم ثم لا تجدوا لکم علینا بہ تبیعا ہ یہ تو ظاہری مضار سے بےفکری کا جواب ہے اور باطنی خطرات سے بےفکری کا جواب بھی یہی ہے کہ اگر کسی شخص کو آج کیفیت شوقیہ حاصل نہ تھی پھر حاصل ہو گئی تو وہ بےفکر کس بات پر ہوتا ہے۔ ارے جس خدا نے تم کو پہلے جمود و خمود کے دریا میں ڈال رکھا تھا

وہ پھر اسی دریا میں لوٹا سکتا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وہ دوسری سخت گھاٹیاں تمہارے رستہ میں پیدا کر سکتا ہے کیونکہ جس طرح ظاہر میں دریا اور پہاڑ ہیں دلدل ہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

آسماں ہاست درولایت جاں　　　　کار فرمائے آسمان جہاں

(روح کی سلطنت میں بہت سے آسمان ہیں اور آسمان جہان کا کار فرما یعنی حق تعالیٰ کا خاص نور بھی ہے)

دررہ روح پست وبالا ہاست　　　　کوہہائے بلند وصحرا ہاست

(روح کے راستے میں بہت بلندیاں اور پستیاں ہیں بلند بلند پہاڑ اور صحرا ہیں)

اور فرماتے ہیں ؎

غیب را ابرے وبادے دیگر است　　　　آسمانے آفتابے دیگر است

(عالم غیب کے لئے ابر اور باد دوسرے ہیں اور آسمان اور آفتاب وہاں کے دوسرے ہیں)

مگر وہ دریا پانی کے نہیں ہیں نہ پہاڑ پتھر کے ہیں اور حزب البحر میں جو بحر الدنیا و بحر الآخرۃ کہا ہے وہ تشبیہ پر محمول ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا ہی بحر ہے جیسا کہ دنیا کا غرض باطن میں بھی جبال و بحار ہیں جن کو صوفیہ کبھی آیت قرآنیہ کے تحت میں بھی اشارۃً بیان کر دیتے ہیں مگر تفسیراً نہیں بلکہ اعتباراً۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جن چیزوں کا خطرہ حق تعالیٰ نے اس جگہ اہل ظاہر کے لئے بیان فرمایا ہے باطن میں بھی تشبیہاً یہ خطرات موجود ہیں پھر بے فکری کیسی غرض حالات غیر اختیاریہ کے سبب سے پریشانی بھی مذموم اور ان کے حصول سے بیفکری بھی مذموم ہے۔ اسی کی حق تعالےٰ نے یہاں شکایت فرمائی ہے کہ انسان ایک حالت میں تو یؤس کفور بن جاتا ہے اور ایک حالت میں فرح فخور اور دیکھئے ان دونوں میں مقابلہ کیا اچھا ہے ہر حالت کے متعلق ایک صفت باطنی ہے ایک ظاہری ہے۔ سلب رحمت کے وقت تو یاس باطن میں ہوتا ہے اور کفر ظاہر میں اور عطائے نعمت کے وقت فرح باطن میں ہوتا ہے اور فخر ظاہر میں پس دونوں میں عجیب مقابلہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ یہ حالت سب کی نہیں بعضے اس سے مستثنیٰ بھی ہیں الا الذین صبروا وعملوا الصالحات مگر وہ لوگ جو صابر ہیں یہاں صبر کے معنی وہ نہیں ہیں جو عوام میں مشہور ہیں کہ کسی کے مرنے پر نہ روئے کیونکہ یہاں کون مرا تھا ہاں کیفیات مر گئی تھیں تو خیر یہ بھی اس کے عموم میں داخل سہی مگر نہ رونے ہی میں صبر کا انحصار نہیں ہے

بلکہ صبر سے مراد استقلال ہے یعنی ان معمولات پر جما رہنا جو شارع اور نائب شارع نے تجویز کر دیئے ہیں ان پر ہر حالت میں پابندی کرنا چاہیئے چاہے کوئی کیفیت حاصل ہو یا حاصل نہ ہو نہ کسی کیفیت کے سلب سے پریشان ہوکر معمولات میں خلل ڈالو۔ نہ کسی کیفیت کے سلب سے پریشان ہوکر معمولات میں خلل ڈالو۔ نہ کسی کیفیت کے حصول سے بیفکر ہوکر معمولات میں کمی کرو یہ معنی ہیں صبر کے آگے صبر کی علامت بیان کرتے ہیں کیونکہ دعوی صبر آسان نہیں کہ جس کا جی چاہے اپنے کو صابر کہنے لگے ؎

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھوی ولکن لایخفی کلام المنافق

(اور محبت کا دعویٰ تو عشق میں جائز ہے مگر منافق کا کلام اور دعویٰ پوشیدہ نہیں رہتا)

بلکہ اس کے لئے کچھ علامات و شرائط ہیں یعنی وعملوا الصالحات کہ اعمال صالحہ بجالاتے رہیں اور ظاہراً و باطناً معاصی سے بچتے رہیں جن میں یاس و ناشکری اور بطر و فخر بھی داخل ہے اور نماز روزہ بھی داخل ہے پس جو شخص اوراد پر اکتفا کر کے طاعات کو بیکار سمجھنے لگے اور یہ دعوے کرے کہ اب مجھ کو نماز روزہ کی زیادہ ضرورت نہیں رہی مجھ کو رسوخ نسبت حاصل ہوگیا ہے وہ جھوٹا ہے اس کو رسوخ وغیرہ کچھ حاصل نہیں ورنہ اعمال صالحہ میں کوتاہی نہ کرتا اسی طرح جو شخص طاعات واجبہ پر اکتفا کر کے اذکار و اشغال و معمولات زائدہ کو ترک کردے کہ ان سے کچھ نفع تو ہوتا ہی نہیں وہ بھی غیر مستقل اور ناقص فی المحبۃ ہے صبر کے معنی یہ ہیں کہ معمولات مستحبہ اور طاعات واجبہ سب کو دواماً ادا کرتا رہے۔ بعض دفعہ آدمی اوراد سے گھبراتا ہے اور دوسرے نیک کاموں میں اس کا دل لگتا ہے اس وقت اوراد کو ہرگز ترک نہ کرے کیونکہ دوسری طاعات کا شوق جو پیدا ہوا ہے وہ بھی ان ہی اوراد کی برکت ہے اور اگر اوراد کو ترک کردو گے تو چند روز میں دوسری طاعات کا بھی شوق نہ رہے گا جو پیدا ہوا ہے۔ میں نے ان اہل علم[عہ] کو لکھا تھا کہ تم جو اوراد سے گھبراتے ہو اور لکھتے ہو کہ مجھے مطالعہ کتب میں مزہ آتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ وردہی کا اثر ہو کہ آپ کو مطالعہ کتب میں مزہ آتا ہے یہ جواب بطریق منع ہے مگر محض الزامی جواب نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان طاعات میں باہم علاقہ بھی ہے کہ ایک طاعت سے دوسری کو قوت ہوتی ہے گو تم کو اسکی

عہ جن کا ذکر شروع وعظ میں ہوا ہے انھوں نے اوراد کو جنم روگ بتلایا تھا ۱۲ جامع

خیر نہ ہو ذاکرین اس کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس دن معمول پورا ہو جاتا ہے اس دن ہر کام میں طبیعت کو بشاشت اور نشاط ہوتا ہے اور جس دن معمول ناغہ ہو جاتا ہے اس دن کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اور کاموں میں جو نشاط ہوتا تھا وہ ورد کی برکت تھی مگر غلطی سے وہ شخص یوں سمجھتا ہے کہ مجھے اور کاموں سے خود دلچسپی ہے۔ جی ہاں ذرا اوراد کو چھوڑ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ اور کاموں سے کتنی دلچسپی ہے۔ پس یاد رکھو کہ ان اوراد ہی کی برکت سے نماز میں جی لگتا ہے انہی کے ذریعہ سے تلاوت قرآن میں مزہ آتا ہے وغیرہ وغیرہ اور اس کا امتحان یہ ہے کہ دو ایسے شخصوں کی حالت کا اندازہ کر کے دیکھو جن میں سے ایک صاحب ورد ہو اور ایک صاحب ورد نہ ہو تو آپ صاحب ورد کو فرائض و واجبات کے ادا میں چست پائیں گے گو خود ورد میں اس کا دل نہ لگتا ہو۔ اور غیر صاحب ورد کو اس کی برابر چست نہ پائیں گے تو کیا ورد کا یہ تھوڑا نفع ہے کہ اس کی برکت سے فرائض و واجبات میں چستی پیدا ہو جاتی ہے۔ پس یہ اوراد بیکار نہیں ہیں۔ بڑے کام کی چیزیں ہیں جبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحبات وسنن کی ترغیب دی ہے بلکہ اگر احادیث کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض و واجبات سے زیادہ سنن ومستحبات کی ترغیب و بیان فضائل کا اہتمام فرمایا ہے کیونکہ واجبات کو تو لوگ خود ہی کرتے ہیں ان کے لئے زیادہ ترغیب کی ضرورت نہ تھی اور سنن ومستحبات کا لوگ خود اہتمام نہیں کرتے اور ہیں ضروری بھی اور مفید اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا (۲جامع) اور اسی واسطے مشائخ نے بھی مستحبات کا بہت اہتمام فرمایا ہے۔ چنانچہ اہل طریق کا ارشاد ہے من لا ورد لہ لا وارد لہ جس شخص کا کوئی ورد نہ ہو اس پر کوئی وارد بھی نہ ہوگا اور یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں حقیقت میں صاحب واردات وہی لوگ ہیں جو اوراد کے پابند ہیں اور جو لوگ سوائے فرائض و واجبات کے کچھ نہیں کرتے ان پر واردات نہیں ہوتے (الاقلیل ۳) پس خوب سمجھ لو کہ جس طرح فرائض و واجبات کی ضرورت ہے ایسے ہی اوراد کی بھی ضرورت ہے گو دونوں کا درجہ برابر نہیں بلکہ فرائض و واجبات اصل اور اوراد ان کی فرع ہیں مگر اصل کا نفع ان فرع ہی کے ساتھ کامل ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آپ مسہل لینا

چاہیں تو اس کے لئے طبیب آپ کو ایک نسخہ لکھ کر دیتا ہے یہ تو اصل مسہل ہے لیکن اس کے بعد وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ دو چار گھنٹے کے بعد مدد کے لئے سونف کا عرق بھی نیم گرم پینا یا یخ جلا پا یا کوئی گولی کھالینا تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مدد بیکار ہے ہرگز نہیں مدد کی بھی بہت ضرورت ہے ورنہ مسہل میں ضرور کسر رہیگی اسی طرح یہاں سمجھو کہ اوراد و نوافل فرائض کے لئے بمنزلہ مدد کے ہیں اس کا نفع اس کے ساتھ مل کر ہی کامل ہوتا ہے پس ان کی پابندی بھی بہت ضروری ہے اور یہی معنی ہیں صبر کے کہ آدمی اپنے معمولات پر مستقل رہے جو شخص ہر حالت میں اپنے معمولات پر جما رہیگا اور اعمال شرعیہ کا پابند رہیگا وہ کسی نعمت موہو نہ غیر اختیاریہ کے سلب سے یاس و کفران میں اور کسی نعمت موہوبہ کے عطا سے فرح و فخر میں مبتلا نہ ہوگا کیونکہ اس کی نظر میں اعمال مکتسبہ اختیاریہ مقصود بالذات ہوں گے اور اعمال موہوبہ غیر اختیاریہ مقصود بالذات نہ ہوں گے اور جو احوال موہوبہ کو مقصود بالذات سمجھتا ہے وہ ان کے حصول پر اعمال و معمولات میں اکثر کمی کر دیتا ہے اور سلب احوال پر یاس و کفران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں اولئک لھم مغفرۃ و اجر کبیر اس میں اول مغفرت کو مقدم فرمایا اس کا مزہ عشاق سے پوچھو غیر عشاق کو اس کی زیادہ قدر نہ ہوگی وہ تو یہ سمجھیں گے کہ بس صبر اور اعمال صالحہ کا صلہ کیا ملا کہ گناہ بخشدیئے گئے نہ جنت کا ذکر ہے نہ حور و قصور کا مگر عشاق کے دل سے اس کی قدر پوچھو کہ وہ اس کو سنتے ہی زندہ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ تو طلب رضا ہی میں مرتے ہیں اور جنت کی طلب بھی وہ رضا ہی کے لئے کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

با تو دوزخ جنت است اے دلربا　　　بے تو جنت دوزخ ست اے جانفزا

(آپ کے ساتھ دوزخ جنت ہے اور آپ کی جدائی سے جنت بھی دوزخ ہے)

اسی لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اول یہ فرمایا گیا ہے لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر اہل ظاہر کو ماقبل سے اس کا ربط سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اوپر فرمایا ہے انا فتحنا لک فتحا مبینا ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے اور نمایاں کامیابی دی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخشدیں تو اہل ظاہر یہاں چکراتے ہیں کہ بشارت فتح سے مغفرت کا کیا جوڑ ہے مگر عشاق نے اس کا ربط سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اصل میں تو فتح کے مضمون پر اتمام نعمت اور ہدایت و استقامت و نصرت و غلبہ کو متفرع کرنا مقصود تھا مگر چونکہ ان چیزوں کا مزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی

وقت آسکتا تھا جبکہ پہلے یہ تسلی کر دی جائے کہ حق تعالٰے آپ سے راضی بھی ہیں اس لئے ان بشارات کی لذت کامل کرنے کے لئے پہلے لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تاخر فرمایا گیا اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مذاق عشق غالب تھا آپ کو سب سے پہلے اسکی فکر رہتی تھی کہ محبوب راضی بھی ہے یا نہیں اس لئے اول اس کا اطمینان دلا کر پھر دوسری بشارتوں کو بیان کیا گیا ہے ویتم نعمتہ علیک ویہدیک صراطا مستقیما وینصرک اللہ نصرا عزیزا کہ اس فتح سے آپ پر نعمت کا کام تمام کرنا مقصود ہے اور آپ کو صراط مستقیم پر پہونچانا اور نصرت الٰہی کے ساتھ (مخالفین پر) پورا غلبہ دینا منظور ہے (یہ فتح بطور استدراج وغیرہ کے نہیں اور نہ یہ غلبہ عارضی ہے بلکہ کامل و مکمل ہے جس کے بعد مغلوبیت کا احتمال ہی نہیں۔ وقد کان کما قال فان الاسلام لم یزل فی العروج والظہور بعد ذلک (لفتح ۱۲ جامع) اسی طرح یہاں بھی حق تعالٰے نے عشاق کی رعایت سے مغفرت کی بشارت کو مقدم فرمایا جب ادھر سے اطمینان ہوا اور معلوم ہو گیا کہ محبوب راضی ہیں تو اب عاشق کو بھوک لگی۔ اس سے پہلے تو کسی چیز کی بھی طلب و خواہش نہ تھی اب جنت و حور وغیرہ کی طلب ہوئی کہ حضرت ہیں کچھ اور بھی ملیگا کیونکہ کریموں کا قاعدہ ہے کہ جس سے راضی ہوتے ہیں اس کو اپنی رضامندی کی کچھ نشانی بھی دیا کرتے ہیں جیسے خلعت وغیرہ تو ارشاد ہوتا ہے واجر کبیرہ اور ان کے لئے مغفرت کے ساتھ بڑا اجر بھی ہے (یہاں بھی عشاق کے مذاق کی رعایت ہے۔ اجر کی تفصیل نہیں کی کہ کیا ملے گا یہیں یہ فرمایا کہ بڑا اجر دینگے اور جس چیز کو محبوب بڑا کہدے پھر اس کی بڑائی کی کیا انتہا ہے معلوم ہو گیا کہ وہ انعام ملیگا جو ہمارے وہم و گمان سے بھی باہر ہے ۱۲ جامع) یہ تو مضمون مقصود کا بیان تھا اب میں آیات متلوہ سے اس مضمون کی لطیف مناسبت بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ یہاں حق تعالٰی نے اہل جنت کے لئے دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے ایک یشربون من کاس کان مزاجہا کافورا ۵ اور آگے فرمایا ہے یسقون فیہا کاسا کان مزاجہا زنجبیلا یعنی ایک جگہ تو فرماتے ہیں کہ جنت میں نیک بندے ایسی شراب کے جام پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہو گی۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ان کو ایسا جام شراب پلایا جائیگا جسمیں زنجبیل کی آمیزش ہو گی (دوسری کی ۱۲) اسکے متعلق میرے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ یہ اختلاف مزاج باعتبار اختلاف احوال کے ہے اس کی تفصیل کے لئے اول دو مقدمے سمجھ لیجئے ایک یہ کہ آخرت میں جزا کو عمل سے مناسبت ہو گی۔

دوسرے یہ کہ نعمائے جنت صورت اعمال ہیں اور یہ دونوں مقدمے سلف کے اقوال سے مؤید ہیں بلکہ اشارۃً احادیث سے بھی ان کا پتہ چلتا ہے اول اہل کشف کے اقوال سے تو اس میں بہت صریح ہیں مگر بعض علماء ظاہر نے بھی اس کو بیان کیا ہے چنانچہ ھٰذا الذی رزقنا من قبل کی تفسیر میں مفسرین نے چند اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ نعمائے جنت صورۃً نعمائے دنیا کے مشابہ ہوں گے ان کو دیکھ کر جنتی کہیں گے کہ یہ تو وہی چیزیں ہیں جو ہم نے اس سے پہلے دنیا میں کھائی تھیں اور بعض نے کہا ہے کہ ثمرات جنت باہم مشابہ ہوں گے۔ اس لئے ایک بار کسی چیز کو کھاکر پھر دوبارہ جب کوئی چیز سامنے آئے گی تو صورۃً پہلے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے کہیں گے کہ یہ تو ابھی کھائی تھی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ نعمتیں اعمال کی صورت ہونگی جن کو دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ آہا یہ تو وہی نماز ہے جس کی ہم کو دنیا میں توفیق ہوئی تھی اور وہ مناسبت ایسی ظاہر ہوگی جس کی صاحب عمل فوراً سمجھ جائے گا اور گو اس تفسیر کو علماء ظاہر نے زیادہ قبول نہیں کیا مگر اس کی تغلیط بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ احادیث سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان الجنۃ قیعان وغراسھا سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہ جنت چٹیل میدان ہے اور اس کے درخت تسبیح وتحمید وغیرہ ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت کے درخت ان کلمات کی صورت ہیں اسی طرح بعض نصوص قرآنیہ میں ہے۔ ذوقوا ماکنتم تعملون کہ چکھو ان چیزوں کو جو تم کرتے تھے اگر اس میں تاویل نہ کی جائے تو ظاہر نص ان لوگوں کی تائید کرتا ہے جو جزاء کو صورت اعمال کہتے ہیں باقی یہ مقدمات اقناعیہ ہیں۔ میں ان کی بنا پر دعویٰ نہیں کرتا اور نہ آیات کی تفسیر کرتا ہوں بلکہ ایک لطیف استشہاد علم اعتبار کے طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ بہرحال حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ جنت میں جو شراب ملے گی اس میں کافور کی آمیزش ہوگی جیساکہ دنیا میں بعض لوگ شراب میں سرور وکیف بڑھانے کے لئے کوئی مفرح چیز ملالیا کرتے ہیں جیساکہ صاحب معلقہ کہتا ہے ؎

لہ الا ھبی بصحنک فاصبحینا	ولا تبقی خمور الاندرینا
لہ مشعشعۃ کان الحص فیھا	اذا ما ء الماء خالطھا سخینا

ترجمہ شعر لہ (اے محبوب اپنے پیالے سے ہیں صبح کی شراب پلا اندرین کی شرابیں ہم سے بچا کر نہ رکھنا۔ سے وہ شراب ایسی تیز ہو جو گلے میں اٹکنے والی ہو جب پانی اس سے ملے تو اور تیز ہو)

آیت میں مزاجہا کے معنی آمیزش کے ہیں۔ مزاج طبی مراد نہیں۔ اللہ بچائے واعظین سے نہ معلوم وہ اس جگہ مزاج کے معنے میں کیا گڑ بڑ کرتے ہوں گے آگے کافور کی تفسیر ہے عینا یشرب بہا عباد اللہ۔ اس میں عینا کافور سے بدل ہے یعنی وہ کافور ایک چشمہ کا نام ہے دنیا کی طرح کافور کی پڑیہ نہ ہوگی۔ یہاں تو کافور منجمد ہوتا ہے اور وہاں سیال ہوگا اور زنجبیل کا بھی وہاں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے وہ بھی کوئی منجمد چیز نہیں ہے بلکہ سیال ہے۔ اور قلیل مقدار میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک چشمہ ہوگا جیسے جنت میں دودھ کی نہریں ہوں گی۔ اس پر دیانند نے ایک بیہودہ اعتراض کیا تھا کہ وہاں اتنی گائیں کہاں سے آئیں گی جن کے دودھ سے نہریں چل پڑیں گی سبحان اللہ یہ عقل ہے۔ دوسرے ادیان کے مقتداؤں کی گویا ان کے نزدیک بدون تھن کے دودھ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ تھن میں دودھ کہاں سے آتا ہے کیا اس کے واسطے بھی کوئی دوسرا تھن ہوتا ہے اگر یہ ہے تو پھر تسلسل مستحیل لازم آئے گا۔ پر یہ مشاہدہ کے بھی تو خلاف ہے۔ بھلا تھن کے لئے دوسرا تھن کہاں ہوتا ہے۔ لہذا ضرور کہنا پڑے گا کہ تھن میں بدون کسی تھن کے دودھ آگیا معلوم ہوا کہ دودھ کا پیدا ہونا تھن پر موقوف نہیں تو جس خدا نے یہاں خون اور گوبر میں سے ایسا لطیف دودھ نکال دیا کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ نہر میں دودھ پیدا کر دے۔ لہذا یہ اعتراض محض بے عقلی کا ہے۔ ع

تو مشو منکر کہ حق بس قادر ست

(تو منکر مت ہو کہ حق تعالیٰ بہت ہی صاحب قدرۃ ہیں)

افسوس کہ دوسرے ادیان والوں کو خدا تعالیٰ کی قدرت کا بھی علم نہیں جبھی تو ان کے مقتدا ایسی بے سر و پا باتیں کہتے ہیں غرض کافور ایک چشمہ کا نام ہے

جس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو دنیا میں ہم دیکھتے ہیں بلکہ وہ نہایت عجیب و غریب شے ہے لیکن دنیا کی تمام چیزوں میں سے اس کو کافور سے زیادہ مشابہت ہے ایسے ہی زنجبیل کی بھی حقیقت وہ نہیں جو ہم لوگ سمجھتے ہیں لیکن اس کو بھی تمام اشیاء میں زنجبیل دنیا سے زیادہ مناسبت ہے اس کا ضرور قائل ہونا پڑے گا کیونکہ یہ قرب اوصاف ہی سبب ہوا ہے اسے کافور یا زنجبیل کہنے کا ورنہ کچھ اور کہا جاتا لیکن فی الجملہ مناسبت ہونے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کے خواص اور مزہ وغیرہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسا دنیا کے کافور وزنجبیل کا ہوتا ہے بلکہ خواص اور مزہ اس کا علیحدہ ہے جو نہایت لذیذ وخوشگوار ہوگا۔ آگے فرماتے ہیں یشرب بھا عباد اللہ کہ اس چشمہ سے اللہ کے بندے پئیں گے۔ یہاں عباد اللہ سے یا تو ابرار ہی مراد ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اضافت تخصیص کے لئے ہے۔ یعنی اصل میں تو وہ خاص مقربین کے لئے ہوگا مگر ابرار کو بھی ان کے طفیل میں مل جائے گا۔ آگے فرماتے ہیں،
یفجرونھا تفجیرا یہ عجیب تماشہ ہے یعنی وہ چشمہ اپنی طبیعت سے نہ بہے گا۔ بلکہ نیک بندوں کا تابع ہوگا ان کے اشارہ پر چلے گا۔ جہاں چاہیں لیجائیں گے اگر کہیں اونچے پر بیٹھے ہوں گے اور چشمہ کو وہاں بلائیں گے تو فوراً اوپر پہنچ جائے گا کیونکہ جنت اور جنت کی ہر چیز ذی حیاۃ ہے۔ اہل کشف نے وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان کی یہی تفسیر کی ہے جس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ترغیب و ترہیب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما خلق اللہ جنۃ عدن خلق فیھا الاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر قال لھا تکلمی فقالت قد افلح المومنون رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط باسناد بن احدھما جید۔
نیز اہل کشف نے فرمایا ہے کہ جہنم بھی ذی حیاۃ ہے وہ کوئی بے جان نہیں ہے بلکہ جان دار اژدہے کی شکل میں ہے اور اتنا بڑا ہے کہ اس میں آسمان و

زمین سب آسکتے ہیں جیسے سمندر میں بعض مچھلیاں جہازوں سے بھی بڑی ہیں اور اس قول کی تائید ان احوال سے ہوتی ہے جو جہنم کے متعلق احادیث میں وارد ہیں۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے میدان میں جہنم کو اس طرح لایا جائے گا کہ اس کے ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوئے ہوں گے۔ مگر اس پر بھی وہ قابو سے باہر ہوگی اور چیختی چلاتی آئے گی۔ سو بھلا بے جان چیز کے لئے بھی کہیں باگیں ہوتی ہیں اور وہ بھی کہیں چیخا چلایا کرتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں جہنم اور جنت کا کلام کرنا بھی وارد ہے۔ اہل کشف کی اس تحقیق کے بعد ان احادیث میں تاویل کی کچھ حاجت نہیں رہتی۔ نیز قرآن مجید میں نار کو ھل امتلأت کا خطاب اور اس کا ھل من مزید سے جواب مذکور ہے۔ نیز احادیث میں ہے کہ جو شخص جنت طلب کرتا ہے جنت اس کو طلب کرتی ہے اور جو شخص جہنم سے پناہ مانگتا ہے جہنم اس سے پناہ مانگتی ہے اور صاحبو جن چیزوں کو ہم یہاں بے جان سمجھتے ہیں وہ بھی تو خدا تعالیٰ کے سامنے ذی حیات ہیں گو ہمارے سامنے جماد ہیں۔ چنانچہ قرآن میں وارد ہے قلنا یا نار کونی بردا وسلٰما علیٰ ابراھیم۔ اور ہم نے کہا کہ اے آگ تو ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا ذریعہ بن جا۔ اہل لطائف نے لکھا ہے کہ اگر سلاماً نہ فرمایا جاتا تو آگ اتنی ٹھنڈی ہو جاتی کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس کی برودت سے تکلیف پہنچتی اب سلاماً کی قید کے بعد اتنی ہی ٹھنڈی ہوئی جو ناگوار نہ ہو۔ سو اس میں حق تعالیٰ کا آگ کو خطاب کرنا مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ خطاب ذی حیات کو ہوا کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

آب و باد و خاک و آتش بندہ اند
تا من و تو مردہ با حق زندہ اند

(پانی وہوا خاک اور آگ سب بندے ہیں ہمارے ساتھ تو وہ مردہ معلوم ہوتے ہیں مگر حق تعالےٰ کے ساتھ ان کا تعلق زندہ کا ہے)

اسی طرح آسمان وزمین دجبال وغیرہ سے حق تعالےٰ کا خطاب فرمانا نص میں مذکور ہے نیز ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے علاوہ اور بھی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن سے عناصر کا ذی حیات ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مفسرین نے اصحاب الاخدود کے قصہ میں لکھا ہے کہ ایک یہودی بادشاہ نے مسلمانوں کو مرتد ہونے پر مجبور کیا جب لوگوں نے اس سے انکار کیا تو ظالم نے بہت سی خندقیں کھودیں اور ان میں آگ جلائی اور مسلمانوں کو مجبور کیا یا تو آگ کو سجدہ کرو ورنہ تم کو اسی میں ڈالدیا جائے گا۔ چنانچہ بہتوں نے انکار کیا اوران کو آگ میں ڈالدیا گیا منجملہ ان کے ایک عورت بھی تھی جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا اس کو بھی کفر پر مجبور کیا گیا جب اس نے انکار کیا تو بچہ کو گود میں سے چھین کر آگ میں ڈالدیا گیا۔ اللہ اللہ کیسے پکے مسلمان تھے کہ ایسے سخت امتحانات میں بھی ثابت قدم رہے۔ پھر مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی بڑی پختہ تھیں۔ ایک آجکل کے مسلمان ہیں جو ذرا سی تنگی اور افلاس سے پریشان ہوکر مرتد ہونے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ بس یوں کہئے کہ ان کے دل میں اول ہی سے ایمان نہیں تھا ورنہ ایمان جب دل میں پیوستہ ہوجاتا ہے پھر نہیں نکل سکتا۔ غرض جب بچہ کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت ماں کو ذرا گھبراہٹ ہوئی اور اس کے قدم ڈگمگانے لگے اس وقت حق تعالےٰ نے اس کی امداد فرمائی کہ بچے کو بولنے کی طاقت دیدی اور اس نے اندر سے ماں کو پکارا ؎

اندر آمادر کہ من اینجا خوشم　　گرچہ درصورت میان آتشم

(اندر آجا اے میری ماں کہ میں یہاں خوش ہوں اگرچہ بظاہر آگ میں ہوں)

اندر آ اسرار ابراہیم بیں　　کو درآتش یافت وردویاسمیں

(اندر آجا اے میری ماں اور اسرار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مشاہدہ کرلے کہ انھوں نے نمرود کی آگ میں گلاب اور چنبیلی کی بہار پائی تھی)

کہ اے ماں تو بھی اندر آجا اور ذرا اندر آکر دیکھ یہاں تو عجیب وغریب باغ اور پھول پھلواریاں ہیں یہ سنکر عورت بھی ازخود آگ میں کود پڑی۔ اب کیا تھا بس تو

مسلمان آگ سے ڈر رہے تھے ۔ یا پروانہ وار سب کے سب دمادم کودنے لگے اب یہ حال ہوا کہ سپاہی ان کو روکتے تھے اور وہ زور کر کے خود آگ میں گرتے تھے یہ حالت دیکھ کر بہت سے کافر بھی مسلمان ہو گئے اور کلمہ پڑھ کر آگ میں گرنے لگے ۔ اس پر وہ یہودی جھلا اٹھا اور آگ سے کہنے لگا اے آگ تجھے کیا ہوا تو جلاتی کیوں نہیں ۔ کیا تو آگ نہیں رہی کچھ اور بن گئی ۔ اس وقت آگ نے جواب دیا ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم
اندر آتو تا بہ بینی تابشم

(اس آگ نے کہا کہ میں تو وہی آگ ہوں تو آ کے تو دیکھ کہ میں کس قدر گرم ہوں)

کہا میں تو وہی آگ ہوں ذرا تو اندر آ پھر میری تپش کو دیکھ باقی ان کے واسطے میں آگ نہیں رہی کیونکہ ان کو جلانے کا مجھے حکم نہیں ہے اس کے بعد آگ پھیلی اور جتنے کفار خندقوں کے کنارہ بیٹھے ہوئے تھے بادشاہ سمیت سب جل بھن کر خاک ہو گئے ۔ پس جمادات دنیا میں بھی حق تعالےٰ کے سامنے ذی حیاۃ ہی ہیں گو ہم کو جماد نظر آتے ہیں اور آخرت میں ہم کو بھی ہر چیز ذی حیات معلوم ہو گی ۔ اسی لئے جنت کے چشمے اور نہریں مسلمانوں کے اشاروں پر چلیں گے جب یہ معلوم ہو گیا کہ نعمائے جنت صورت اعمال ہیں اور جزا کو عمل سے مناسبت ہو گی ۔ تو اب سمجھئے کہ وہاں جو مسلمانوں کو شراب ملے گی وہ کس چیز کے مناسب اور مشابہ ہے یعنی وہ کونسا عمل ہے جس کی صورت عالم آخرت میں شراب ہے ۔ تو اہل لطائف نے لکھا ہے کہ یہ محبت کی صورت ہے ۔ محبت میں بھی ایک تیزی اور سرور اور کیفیت و مستی ہوتی ہے شراب میں بھی یہی صفات ہیں تو وہ اس کی صورت ہے ۔ مگر اس شراب کو دنیا کی شراب پر قیاس نہ کرنا یہاں کی شراب تو ذی شرور ہے جس سے بیہودہ افعال و اقوال صادر ہوتے ہیں اور ہوش وہواس باختہ ہو جاتے ہیں ۔ اور وہاں کی شراب طہور ہے کہ خود بھی پاکیزہ اور پینے والوں کو بھی پاکیزہ بنانے والی ہے

نہ اس سے درد سر اور چکر ہوگا نہ عقل زائل ہوگی لایصدعون عنہا ولاینزفون
مگر اس سے یہ مت سمجھنا کہ وہ شراب سراب محض ہوگی جیسے پانی پی لیا ہر گز نہیں بلکہ
اس سے سرور ونشاط اس درجہ حاصل ہوگا جو یہاں کی شراب سے نہیں ہوسکتا منافع
تو سب اس میں علی وجہ الکمال ہوں گے۔ مگر مضار و نقصانات بالکل نہ ہوں گے
تو وہاں شین کے ساتھ ساتھ سین بھی ہوگا یہ نہیں کہ شین کے بجائے سین ہو یہ دنیا
ہی کی ترکیب ہے جس میں شین اور سین آگے پیچھے ہیں یکجا نہیں ہیں۔ وہاں دونوں
ساتھ ساتھ ہوں گے یہاں کی شراب تو یصد عن السبیل اللہ ہے اور وہاں
کی شراب یصد عن غیر اللہ ہے۔ بہرحال اہل لطائف نے اس پر تو تنبیہ کی
ہے کہ شراب آخرت صورت محبت ہے لیکن اس پر کسی نے تنبیہ نہیں کی کہ اس کے
لئے مزاج ایک جگہ کافور بتلایا گیا ہے اور ایک جگہ زنجبیل تو یہ مزاج کس چیز
کی صورت ہے اور اس کو کس سے مناسبت ہے اس کے متعلق میرے قلب
پر یہ لطیفہ وارد ہوا ہے کہ یہ محبت کی انہی دونوں نسبتوں کا لون ہے کافور
کو نسبت انس سے مشابہت ہے اور شراب کافور آمیز اُس لون محبت کی صورت
ہے کیونکہ کافور بارد المزاج ہے اور زنجبیل کو نسبت شوق سے مشابہت ہے
اور شراب زنجبیل آمیز اس لون محبت کی صورت ہے کیونکہ زنجبیل حار المزاج
ہے اور شوق میں حرارت والتہاب ہوتا ہے لہذا یہ اس کے مناسب ہے جیساکہ
نسبت انس میں برود و خمود و سکون ہوتا ہے اور کافور اس کے مناسب ہے پس
نقشبندیہ کو وہاں شراب کافور ملے گی اور چشتیہ کو شراب زنجبیل (یعنی ان کو زیادہ
وہ اور ان کو زیادہ یہ ملے گی کیونکہ حرارت و سکون سے دونوں خالی نہیں ہاں ایک پر
ایک کا غلبہ ہے سو اس کا مقتضا یہی ہے کہ دونوں کو دونوں شرابیں دی جائیں گی۔
مگر کثرت و قلت کا فرق ہوگا ۱۲ جامع) اور دیکھئے جیسے یہاں نسبت سکون اور نسبت
عشق کے آثار مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہاں بھی دونوں کے ساتھ مختلف
معاملہ ہوگا۔ چونکہ نسبت سکون میں غلبہ صحو کو ہوتا ہے اور اس میں اختیار و

ارادہ فنا نہیں ہوتا تو ان کے واسطے فرمایا گیا ہے یشربون من کاس کہ وہ خود جام شراب پئیں گے اور نسبت عشق میں اختیار وارادہ باقی نہیں رہتا تو ان کے متعلق ارشاد ہے ویسقون فیہا کاساکان من اجہا زنجبیلا کہ یہ وہاں بھی خود نہیں پئیں گے بلکہ دوسرے ہی لاکران کو پلائیں گے کہ وہ ابھی مستی ہی میں رہیں گے یشربون اور یسقون میں جو فرق ہے وہ اہل ذوق پر مخفی نہیں ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے اس کو تفسیر کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اعتبار کے طور پر اہل لطافت کے مناسب یہ لطیفہ بیان کر دیا ہے کہ کافور وزنجبیل کو ان دونوں نسبتوں کے رنگ سے مناسبت ہے اور جیسے کافور وزنجبیل جنت میں شراب کے ساتھ ملائے جائیں گے جس سے شراب کا اصل اور ان کا فرع ہونا ظاہر ہو رہا ہے اسی طرح یہاں بھی سمجھئے کہ نسبت انس اور نسبت عشق کے آثار میں جو اختلاف ہے کہ ایک میں غلبۂ حرارت ہے اور ایک میں برد یہ مقصود نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود محبت ہے جو دونوں میں مشترک ہے پس صاحب سکون کو عدم التہاب سے پریشان نہ ہونا چاہیئے اور نہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھنا چاہیئے بلکہ یوں سمجھئے کہ شراب محبت مجھے بھی حاصل ہے۔ مگر اس میں کافور ملا ہوا ہے جس کی وجہ سے حرارت کا غلبہ نہیں ہوتا پر اس کا حرج ہی کیا ہے تم بھی اللہ تعالےٰ کے مقربین میں داخل ہو اور اس جماعت میں سے ہو جن کو جنت میں کافور آمیز شراب دی جائے گی۔ پس ہر حال میں راضی رہو۔ اور اپنی تجویز کو دخل نہ دو حق تعالےٰ جس کو چاہتے ہیں کافور ملا کر پلاتے ہیں۔ اور جس کو چاہتے ہیں زنجبیل ملا کر پلاتے ہیں۔ واصل دونوں ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عاشقے گر زین سرو گر زاں سرست

عاقبت مارا بداں شہ رہبرست

(عاشقی خواہ سکون قلب سے ہو یا اضطراب قلب سے ہو دونوں ہی حق تعالیٰ کے واصل ہیں کسی پر شوق اور عشق کا غلبہ ہے کسی پر انس اور سکون کا)

میں نے پہلے اس بیان کا نام "الکافور والزنجبیل" تجویز کیا تھا اسی وجہ سے کہ اس میں نسبت مع اللہ کے دو الوان کا ذکر ہوا ہے جن کو ان دونوں سے مناسبت ہے مگر بعد میں پھر دوسرا نام تجویز کیا جو ذرا عام لوگوں سے غیر مانوس ہے یعنی (المعرق والرحیق للمغرق والحریق) اس میں معرق کو تو مغرق سے مناسبت ہے اور رحیق کو حریق سے معرق کہتے ہیں۔ اس شراب کو جس میں پانی ملایا گیا ہوا ور مغرق کہتے ہیں غریق کو قاموس سے معلوم ہوا کہ مغرق اور غریق دونوں واحد ہیں مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دریائے سکون وخمود میں ڈوبا ہوا ہے یعنی صاحب نسبت انس اس کے لئے تو شراب آب آمیز ہے اور جو جلا بھنا رہتا ہے یعنی صاحب نسبت عشقیہ اس کے لئے رحیق ہے یعنی شراب خالص کیونکہ لغت میں رحیق کے یہی معنی ہیں گو اس نام میں کافور وزنجبیل کی آمیزش پر اشارہ نہ ہوسکا مگر فرق پھر بھی ظاہر ہوگیا۔ کیونکہ جس شراب میں پانی ملا ہوا ہو وہ خالص شراب سے تیزی میں کم ہوتی ہے پس اس نام سے یہ معلوم ہوگیا کہ غریق وحریق دونوں شراب خوردہ ہیں۔ مگر ایک نے تیز شراب پی ہے۔ ایک نے پانی ملی ہوئی۔ محروم کوئی نہیں میں نے اول یہ چاہا تھا کہ اس کا نام العریق والرحیق للغریق والحریق رکھوں کہ یہ بولنے میں ذرا سہل تھا۔ مگر لغت میں مجھ کو عریق کے معنی شراب آب آمیز نہیں ملے اور دوسرے جو معنے ملے وہ اس جگہ مناسب نہ تھے۔ اگر کسی کو لفظ عریق کا بمعنی معرق ہونا ثابت ہو جائے تو پھر یہ نام بہت اچھا ہے۔ میری نظر کتب لغت پر زیادہ نہیں ہے پس میرے پاس تو قاموس ہی ہے اسی میں سب تنگ و ناموس ہے اس میں مجھ کو یہ بات نہیں ملی ممکن ہے کہ کسی اور کتاب میں اس لفظ کا بمعنی معرق استعمال ہونا دستیاب ہو جائے۔ بہرحال اس وقت تو یہی نام میں نے تجویز کیا ہے۔ المعرق والرحیق للمغرق والحریق اور زیادہ تر اس نام کی رعایت سے میں نے سورۂ دہر کی آیات پڑھی ہیں تاکہ میرا یہ لطیفہ قائم رہے۔ ورنہ اصل مقصود کو دوسری آیت میں مصرح تھا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی محبت عطا فرمائیں خواہ اس رنگ کی ہو یا اس رنگ کی۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔ تمت بالخیر

ضروری معروضہ

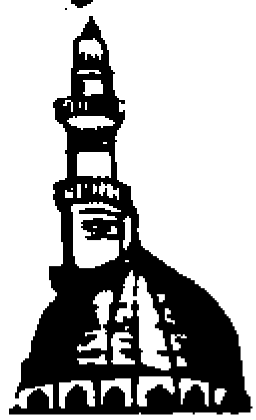
الحمد للہ تعالیٰ ثم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۱۹۸۵ء کے رسالہ الابقاء پر آپ کا زرِ سالانہ ختم ہو گیا
۱۔ ڈاک خانہ نے وی پی رجسٹری وغیرہ کا خرچہ دوگنا کر دیا ہے۔ الابقاء بذریعہ وی پی منگانے سے آپ کے چار روپیہ کا نقصان ہے۔ لہٰذا زرِ سالانہ منی آرڈر سے ارسال فرما کر اپنے چار روپے بچا لیں۔ اور اپنے چار روپے کا نقصان نہ کریں۔

۲۔ جدید سال ۱۹۸۶ء کے لئے پچیس ۲۵ روپے براہ کرم آج ہی ارسال فرما دیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

۳۔ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک یا دو دو جدید خریدار کا بھی زرِ سالانہ ارسال فرما دیں تو اس خالص دینی، تبلیغی، اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو مل جاویگا۔ اسی فیس منی آرڈر میں چار خریداروں تک کا زرِ سالانہ آسکتا ہے۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ثم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یہ تینوں عرضیں قبول فرما دیں گے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ والسلام۔

طالبِ دعا محمد عبدالمنان غفرلہٗ مکتبہ تھانوی بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی

رسالہ الابقاء جلد ۷ ۵ نمبر ۱ — جمادی الاول ۱۴۰۶ھ مطابق جنوری ۱۹۸۶ء



بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

التبلیغ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

ملقّب بہ

المربع فی الربیع

منجملہ ارشادات حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ❁ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ - بندر روڈ - کراچی

فون: ۷۲۷۵۲۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ مسمّٰی بہ

ذکر الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

ملقب بہ

المریع فی الربیع

این	متی	کم	کیف	لماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد کانپور	۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ یوم جمعہ	۲ گھنٹے	بیٹھ کر	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کا بیان	حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری	۵۰۰	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰہُ لَہٗ رِزْقًا ۝ (خدا تعالیٰ نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا وہ نصیحت نامہ دیکر ایک ایسا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا جو تم کو اللہ تعالیٰ کے صاف صاف احکام پڑھ پڑھ کر

سُناتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں تاریکیوں سے نور کی طرف آئیں جو شخص اللہ (تعالیٰ) پر ایمان لاویگا اور اچھے عمل کریگا خدا (تعالیٰ) اس کو ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے بلا شک اللہ (تعالیٰ) نے بہت اچھی روزی دی) یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اسی کی تلاوت پر اس لئے اکتفا کیا گیا کہ اس وقت اس جزو آیت ہی کا صرف بیان مقصود ہے حق تعالیٰ نے اِس آیت کے جزو میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے حقوق اور برکات بیان فرمائے ہیں وجہ اس بیان کے اختیار کرنے کی اس وقت یہ ہے کہ بعض محبین کی عادت ہے کہ وہ اس زمانہ میں تذکرہ کیا کرتے ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا۔ اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے مگر اس کے ساتھ جو اُن کو غلطی واقع ہوتی ہے اس کا رفع کرنا بھی ضروری ہے۔ اِس آیت میں غور کرنے سے اور نیز دوسری نصوص میں غور و نظر کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کچھ حقوق ہیں جن کا ادا کرنا واجب ہے۔ اور ادائے حق کے معنے یہ ہیں کہ تمام حقوق ادا کئے جاویں۔ ایک کیا اور ایک نہ کیا اِس سے ادائے حق نہیں ہوتا علم کی کمی سے مختلف قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں اُن میں سے ایک غلطی یہ بھی ہے کہ بعض ایک حق کو اور بعض دوسرے کو اور بعض تیسرے حق کو ادا کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے ادائے حق کر دیا حالانکہ ادائے حق کے معنی یہ ہیں کہ تمام حقوق کی رعایت کی جائے مثلاً باپ کا حق یہ ہے کہ اُس کا ادب بھی کرے اطاعت بھی کرے اُس کے لئے دُعا بھی کرے اُس کی تعظیم بھی کرے اگر اس کو حاجت ہو خدمت بھی کرے اور مثلاً بادشاہ کا حق یہ ہے کہ اُس کا ادب کرے اُس کے احکام کو مانے اُس کی عظمت دل میں ہو اُس کی اطاعت کرے اب اگر کوئی شخص اُس کی تعظیم نہ کرے یا احکام کو نہ مانے تو اُس نے بادشاہ کا حق ادا نہیں کیا۔ مثلاً جب گفتگو کرتا ہے تو نہایت خلاف یا تعظیم و تکریم تو اِس قدر کرتا ہے کہ پچھلے پاؤں ہٹتا جاتا ہے مگر قانون کے خلاف کرتا ہے قانون کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ ہاں زبان سے بادشاہ کی مدح و ثنا خوب ہی کرتا ہے اور اُس کے متعلق مختلف جلسوں میں خوب تقریریں کرتا ہے اور اگر کوئی کہتا ہے تو جواب میں یہ کہتا ہے کہ جو میں کر رہا ہوں میرے نزدیک ادائے حق یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی اِس عذر کو قبول نہ کرے گا بلکہ سب سے بڑا حق تو سُلطان کا رعایا پر یہی ہے کہ اُس کی مخالفت نہ کی جائے۔ غرض یہ تو ادائے حقوق کی حقیقت ہے۔

اب سمجھئے کہ حقوق میں تفاوت ہوتا ہے۔ باپ کا اور حق ہے ماں کا اور بی بی کا اور بیٹے کا اور بہن کا اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا اور خدا تعالےٰ کا اور اور یہ قاعدہ سب میں مشترک ہے کہ ادائے حق اسی کو کہیں گے جو سب حقوق ادا کئے جائیں مثلاً باپ کا حق یہ تھا کہ اُس کی تعظیم بجا لاتا اطاعت کرتا اس کی خدمت کرتا اس کی مدح کرتا دُعا کرتا ادب سے گفتگو کرتا۔ مگر بیٹے کی حالت یہ ہے کہ نہ اُس کی تعظیم بجالاتا ہے نہ اطاعت کرتا ہے نہ دُعا مگر ہاں مجمعوں میں باپ کی مدح و ثنا خوب کرتا ہے تو کیا اس کو کہا جاوے گا کہ وہ باپ کا حق ادا کرتا ہے۔ اگر باپ کہتا ہے کہ بیٹا اُٹھ کر پانی دے دو تو یوں جواب دیتا ہے کہ میں نے آپ کی بہت سی تعریفیں کر دی ہیں اب مجھے ضرورت اطاعت کی نہیں رہی میں خدمت نہ کروں گا یہ کہاں کی علت لگائی کہ میں یہ باتیں بھی کروں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عاقل اس کو ادائے حق نہ کہے گا علیٰ ہذا اور حقوق کے بارے میں بھی ایسا ہی کہہ دے۔ اِن مثالوں سے معلوم ہو گیا کہ بعض حق ادا کرنے سے حق ادا نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جو حقوق ہیں تو اُن کا ادا کرنے والا وہی شخص سمجھا جائے گا جو سب حقوق ادا کرے اور کسی شخص کے اس طرز کو کافی نہ سمجھا جائے گا کہ ایک حق تو ادا کرے اور باقی کو چھوڑ دے۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب ضرورت اس امر کی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق پہچانے جائیں۔ اس باب میں اس وقت تین جماعتیں ہو رہی ہیں۔ کثرت سے وہ لوگ ہیں کہ اُن کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا دعویٰ ہے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زبانی فضائل بیان کرنے کو کافی سمجھتے ہیں نہ اطاعت سے بحث ہے نہ اُن کے دِل میں حقیقی محبت ہے نہ تعظیم ہے۔ تین حقوق تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ایک حق اطاعت ایک حق محبت ایک حق عظمت۔ سو زیادہ حصہ تو اُن لوگوں کا ہے جو صرف زبانی محبت پر اکتفا کرنے کو کافی سمجھتے ہیں نہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی خبر نہ حقیقی محبت کی خبر نہ عظمت کی۔ بس اس کو کافی سمجھتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک کر لیا جاوے باقی جتنا اہتمام ذکر کا ہوتا ہے اطاعت کا نہیں ہوتا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر اطاعت کرتے تو علماء سے رجوع کرتے ان سے مسائل دین کے پوچھتے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر کا طریقہ دریافت کرتے اُن سے احکام کی تحقیق کرتے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ

اُس کا ذکر بھی نہیں۔ سو زیادہ لوگ تو اسی قسم کے ہیں اس واسطے ضرورت اس کی ہوئی کہ اس غلطی کو رفع کر دیا جاوے۔ محبت بیشک بڑا حق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس کا مقتضے یہ بھی ضرور ہے کہ ذکر مبارک کیا جاوے مگر اسی کا مقتضے یہ بھی ہے کہ اطاعت کی جائے اسی کا مقتضے یہ بھی ہے کہ تعظیم کی جائے چنانچہ دنیا میں جس سے محبت و خلوص ہوتا ہے اس کا کہنا مانا جاتا ہے اس کی عظمت قلب میں ہوتی ہے خود اس کی محبت کا تقاضا ہے کہ اُس کی مرضی کے خلاف نہ کیا جائے خواہ اس کو خبر ہو یا نہ ہو مجھے خوب یاد ہے کہ مجکو ایک ادنیٰ اچکن میں رفو کرانے کی ضرورت تھی۔ ایک دوست سے میں نے کہا کہ کسی کاریگر سے رفو کرا دو اور اُجرت پوچھ کر بتلا دو۔ چنانچہ انھوں نے رفو کرنے کے لئے وہ اچکن کاریگر کو دیدی۔ جب رفو ہو کر آگیا تو میں نے اُجرت پوچھی تو کہا کہ اُجرت اُس نے بتلائی نہیں پھر میں نے تقاضا کیا تو کہا کہ وہ بتلاتا نہیں میں نے اصرار کیا کہ پوچھ آیئے مگر ٹلاتے رہے بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے پاس سے اُجرت دیدی تھی اور ظاہر تک نہیں کیا محبت سے تو غرض یہ ہوتی ہے کہ دل ٹھنڈا ہو محبوب کا اُسے راحت ہو اس لئے خبر ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ اور جہاں خبر بھی ہوتی ہو تو وہاں تو زیادہ اثر ہوگا زیادہ اہتمام ہوگا اور جب یہ بھی معلوم ہو کہ اُس کو اس طرح خبر ہوتی ہے کہ خلاف کرنے میں ایذا بھی ہوتی ہے تب ظاہر ہے جیسا کچھ اہتمام ہوگا اور یہ محبت کیسی ہے کہ اپنے محبوب کو تکلیف پہونچائی جائے اب یجئے کہ سب جانتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اعمال امت کے پیش ہوتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کیا اور فلاں نے یہ کیا۔ کوئی شراب پیتا ہو رشوت لیتا ہو فسق و فجور میں مبتلا ہو سب کی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کی جاتی ہے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کتنی محبت تھی اُمت سے یہ حالت تھی کہ رات رات بھر کھڑے کھڑے قدم مبارک ورم کر جاتے تھے صرف اُمت کے لئے دُعا کرنے میں۔ ایک بار ساری رات گذر گئی اس آیت کی تلاوت میں اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○ (اگر آپ ان کو عذاب دیں تو آپکے بندے ہیں اور اگر بخش دیں تو آپ زبردست قادر ہیں) یعنی آپ زبردست[1]

[1] یہ ترجمہ صرف انت العزیز الحکیم کا ہے اس کی تقریر اس لئے کر دی کہ بعض نادان اس کا ارتباط ان تغفر لہم کیساتھ نہیں سمجھتے ۱۲ منہ

قادر ہیں کیا مشکل ہے آپ کو بخشنا۔ ساری رات اسی میں گذر گئی۔ ہمارا وجود بھی کہیں نہ تھا اور آپ کی حالت یہ تھی مولانا فرماتے ہیں ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

نہ ہم تھے نہ ہماری طرف سے تقاضا تھا مگر بے کہے ہوئے درخواست پیش بھی ہو گئی اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اہتمام بھی شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کیا نفع۔ ہم کیا پیش کر رہے ہیں۔ کیا فیض تھا ہم سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو۔ اور ہم کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ہزاروں قسم کا نفع پہونچتا ہے اگر کہو کہ ہم درود شریف پڑھتے ہیں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کو نفع ہوتا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا آپ لوگوں کو ہوتا ہے۔ ہمیں ارشاد ہے حق تعالیٰ کا کہ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (اے ایمان والو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجو) اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ ہزار روپیہ ہیں ہم سے کہو کہ ہم اپنے بیٹے کو دیدیں تو اس نوکر کے مقبول بنانے کو اور اس کی عزت بڑھانے کو یہ صورت تجویز کی ہے نہ کہ بیٹا روپے ملنے میں اس نوکر کا محتاج ہے۔ اگر نوکر نہ بھی کہے تب بھی روپیہ بیٹے کے لئے تجویز کر لیا گیا ہے صرف نوکر کی عزت افزائی کے لئے ایسا کیا ہے یہی حال درود شریف کا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ رحمت کی دعا کرو رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے۔ رحمت بھیجنا تو منظور ہی ہے (خواہ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں) چنانچہ اس کے قبل اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں) موجود ہے مگر ہماری قدر بڑھانے کو ہمیں کہدیا کہ درود بھیجو کہ تمہارا بھی بھلا ہو جاوے ورنہ کوئی شخص کیا منہ لیکر کہہ سکتا ہے کہ آپ ہمارے محتاج ہیں اور اس کہنے سے آپ پر رحمت ہو گی۔ یہ شبہ شاید کسی خشک مزاج کو ہوتا اس لئے رفع کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ حق تعالیٰ کا ہے وہ ہماری درخواست پر موقوف نہیں اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ اور عبادات بعض دفعہ مقبول ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مردود لیکن درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا ہے۔ سو اگر ہمارے عمل کا آپ پر رحمت نازل ہونے میں کوئی اثر ہوتا تو جیسے اور اعمال ہیں یہ بھی ہمارا عمل ایسا ہی ہونا چاہئے تھا (کبھی مقبول اور کبھی مردود) سو ہمیشہ مقبول ہونا دلیل ہے اس کی کہ

درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا ہے

معلوم ہوا کہ ہمارے عمل کا اس میں کوئی اثر نہیں ۔ حق تعالیٰ ضرور رحمت بھیجتے ہیں ۔ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں اِس لئے (درود شریف) کبھی غیر مقبول نہیں ہوتا ۔ بس خدا تعالیٰ کو رحمت بھیجنا تو ہے ہی ہم کو جو حکم دیا تو صرف ہمارا عزّت بڑھانے کے لئے ۔ نیز ہمارے اعمال ظاہر ہے کہ مقبول ہونے کے قابل ہی نہیں اور جو عمل مقبول نہ ہو وہ کالعدم ہے پھر ہمارا درود پڑھنا کالعدم ہوا مگر پھر بھی آپ پر رحمت ہوتی ہے کوئی شخص یہ احسان نہ سمجھے کہ میں درود بھیجتا ہوں تب ہی رحمت ہوتی ہے ۔ اگر ہم آفتاب کے سامنے ہوگئے تو آفتاب نے ہم کو منور کردیا آفتاب ہمارا محتاج شعاع میں نہیں پس علماء کے قول سے اس کی بھی تائید ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے نفع کے محتاج نہیں البتہ اس مقام پر ایک شبہ اور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دین کی تعلیم کی ہے اور ہمارے عمل کرنے سے آپ کو بھی ثواب پہنچتا ہے تو اگر ہم عمل نہ کریں تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ثواب کیسے ملے گا پھر ہمارے عمل کو اس میں دخل ہوا ۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اس نیت سے تعلیم فرمائی کہ اُمتی عمل کریں اور نیت پر اجر ملتا ہے پس جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی نیت فرمائی تو آپ ہر حال میں ماجور تو ہوگئے ۔ اب ہمارے عمل کرنے کا اثر اتنا رہا کہ عمل کرنے سے آپ کا جی خوش ہوتا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں اُمتی نے یہ عمل کیا تو آپ خوش ہوتے ہیں بہرحال حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کوئی نفع نہیں مگر پھر بھی آپ کو ہم سے کتنی محبّت اور ہماری یہ کیفیت کہ زبانی دعویٰ محبت کا بہت اور خیر بعض میں کسی قدر زبانی سوز و گداز بھی سہی ۔ چنانچہ جب اِس قسم کی مجالس میں شعر اشعار پڑھے جاتے ہیں تو ہائے ہو بہت کرتے ہیں مگر اس کی پرواہ نہیں کہ جس سے محبت کا دعویٰ ہے اعمال ناشائستہ کا ارتکاب کرکے اُن ہی کو ایذا پہونچا رہے ہیں تو صاحب ایسے سوز و گداز سے کیا نتیجہ ۔ مجھے اس پر ایک قصہ یاد آیا ۔ ایک شاعر آزاد منش تھے ۔ بعض کا دل رقیق ہوتا ہے وہ بھی ایسے ہی تھے اِس لئے ان کے کلام میں سوز و گداز تھا ایک شخص اُن کا فارسی کلام دیکھ کر کلام سے اُن کو صوفی سمجھ کر ایران سے چلے ۔ آکر کیا دیکھا کہ ایک حجام خلیفہ اُن کے سامنے ہے اور اُن کا چہرہ استرے سے صاف کر رہا ہے اُس شخص نے جھلّا کر کہا کہ آغا ریش می تراشی (آغا کیا داڑھی منڈواتے ہو) شاعر صاحب نے کہا کہ بلے ریش می تراشم مگر دل کسے نمی خراشم یعنی داڑھی تو ترشواتا ہوں مگر کسی کا دل نہیں دکھاتا بڑا گناہ دل دُکھانا ہے ۔ اُس نے بیساختہ جواب دیا کہ آرے دل

آجکل کے مدعیان محبت کی حالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی (یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دل رنجیدہ کرتا ہے) مطلب یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاع ہوگی کہ فلاں شخص سنت کے خلاف کر رہا ہے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کیسی ایذا ہوگی۔ یہ سُنکر شاعر کی آنکھیں کھل گئیں اور زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتے تھے ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے کہ تونے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھ کو محبوب کا ہمراز کردیا)

یعنی تم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے میں تو اندھا تھا آج معلوم ہوا کہ مجھ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل کو تکلیف پہونچ رہی ہے۔ غرض یہ محبت کیسی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو ایذا پہونچ رہی ہو یہ تقریر تو اس پر مبنی تھی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تین حق ہیں۔ عظمت۔ اطاعت۔ محبت۔ لیکن اگر کوئی شخص تینوں حق کو جُدا جُدا نہ سمجھے بلکہ صرف ایک محبت ہی کو حق سمجھے تو میں کہتا ہوں کہ خود محبت ہی ایک ایسا حق ہے کہ اور حقوق کو مستلزم ہے یعنی محبت مستلزم ہے عظمت کو بھی اطاعت کو بھی یعنی جب سچی محبت ہوگی تو عظمت بھی ہوگی اطاعت بھی ہوگی۔ مگر لوگوں نے صرف یہ یاد کرلیا ہے کہ ہم عاشق ہیں رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے۔ بس اپنے زعم میں اور کسی بات کے مکلف ہی نہیں رہے بلکہ اگر سچ مچ بھی سوزوگداز ہوا اور اُس سے چیخنا چلانا رقت کا طاری ہونا یہ آثار پیدا ہونے ہوں تو گو ظاہر نظر میں یہ کمال معلوم ہوتا ہے مگر محققین کے نزدیک خود یہ ضعیف محبت ہے اور ضعیف اس وجہ سے کہ محل محبت کا ہے قلب اور یہ علامتیں ہیں ضعف قلب کی تو جب قلب ہی ضعیف ہے تو جو اس کی صفت ہوگی وہ بھی ضعیف ہوگی اس کو محبت کامل نہیں کہیں گے۔ محبت کامل وہ ہے کہ رگ رگ عشق سے چور ہو مگر پھر بدحواس نہ ہو۔ سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ سے کیسی محبت تھی صحابہؓ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیسی محبت تھی کسی صحابی کا قصہ ایسا بتلاؤ کہ محبت میں بدحواس ہوگئے ہوں۔ سب میں زیادہ چاہنے والے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہیں۔ آپ کی یہ حالت تھی محبت میں کہ جب آپ غار میں چھپے ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے یوں عرض کیا کہ پہلے مجھے جانے دیجئے شاید کوئی چیز موذی ہو۔ جب غار میں پہونچے تو اُس میں بہت سے سوراخ تھے آپ نے اپنے کپڑے

چیخنا چلانا وغیرہ کمال نہیں

پھاڑکر ان کو بند کیا دو سوراخ باقی رہ گئے اور کوئی چیز بند کرنے کو رہی نہیں تو آپ نے دونوں پاؤں اُس میں اڑا دیئے اور کہا کہ یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ تشریف لے آیئے۔ کیا انتہا ہے اِس عشق و محبت کی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لاتے اور نیند غالب ہوئی تو حضرت صدیقؓ کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرمایا۔ وہاں اُس سوراخ میں ایک سانپ تھا اُس نے حضرت ابوبکرؓ کے پاؤں میں ڈسا۔ مگر پاؤں محض اس لئے نہ ہٹایا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بیچین نہ ہوں۔ آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے اور چہرۂ مبارک پر آنسو گرنے سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دُعا کر دی اثر جاتا رہا۔ مگر اُنھوں نے تو اس بھروسہ پر پاؤں نہ دیا تھا کہ اگر کچھ ضرر پہونچے گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دُعا کر دیں گے۔ مگر باوجود اس (محبت) کے کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا جس میں ابوبکرؓ مغلوب ہو گئے ہوں۔ سب سے بڑا واقعہ وفات کا تھا ایسے عشاق کو تو جس بھی نہ رہنی چاہیے تھی مگر وہ ہی ہیں کہ ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کسی قدر پریشان ہو گئے اسی میں ان کو اجتہادی غلطی ہوگئی وہ غلطی یہ تھی کہ بعض صحابہؓ وفات ہونے کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا زندہ ہونا سمجھتے تھے کہ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے معراج میں (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جاکر واپس آگئے تھے اسی طرح یہاں بھی ہوگا کہ گو وفات ہوگئی مگر پھر زندہ ہو جاویں گے) اس وقت ایک عارضی غیبت ہے اس کے مرتفع ہونے پر آپ زندہ ہو جاوینگے یہ خیال تھا بعض صحابہؓ کا۔ یہی حال تھا حضرت عمرؓ کا یوں کہتے تھے کہ اگر کوئی کہیگا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ گھر میں تشریف لے گئے اور چہرۂ مبارک سے چادر اُٹھا کر پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا طِبْتَ حَیًّا وَّمَیِّتًا یعنی آپ حیات و موت دونوں حالت میں پاک ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ آپ اس سے منزّہ ہیں کہ حق تعالےٰ آپ پر دو موتیں جمع کریں۔ نہیں کبھی نہیں ایسا ہوگا۔ اور باہر آکر فرمایا عمرؓ سے اے بھلے مانس بیٹھ پھر جاکر خطبہ پڑھا مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ (جو شخص تم میں سے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ مرگئے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالےٰ زندہ ہیں نہیں مریں گے) اور یہ آیت پڑھی انک میت وانہم میتون (کہ آپ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کروگے) اور یہ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ

عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ (سو آپ کا انتقال ہو جاتے یا آپ شہید ہو جاویں تو کیا تم لوگ اُلٹے پھر جاؤ گے) اور بعض صحابہؓ کا جو یہ خیال تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت میں محبوب کی موت کا خیال بھی لانا گوارا نہیں ہوتا اس لئے صحابہؓ کبھی سوچتے بھی نہ تھے کہ موت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہوگی ۔ مجھ کو اس پر تعجب ضرور ہوتا تھا مگر ایک واقعہ دیکھ کر الیقین ہو گیا قریب کا واقعہ ہے ۔ ایک بی بی کی شادی ہوئی ایک عالم سے وہ عالم مر گئے شدید صدمہ ہوا جس کی وجہ سے یہ تحقیق ہوئی کہ اُس بی بی کا گمان یہ تھا کہ عالم مرا نہیں کرتے اور یوں کہا کرتی تھی کہ میں بڑی خوش قسمت ہوں جو ان سے شادی ہوئی کہ کبھی مریں گے نہیں ۔ اُن کا طاعون میں انتقال ہو گیا تھا ۔ وہ بی بی کہتی تھیں کہ میں نے سُنا ہی نہ تھا کہ مولوی مرتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے اب موجود ہیں جو علماء پر موت کے ورود کو بعید سمجھتے ہیں تو صحابہؓ کا مرتبہ حال ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسا خیال ہو تو کیا بعید ہے مگر حضرت ابو بکرؓ باوجود کمال عشق کے مستقل رہے تو حقیقت میں کمال عشق وہ ہے جو کمال عقل کے ساتھ ہو سو ایسا شخص مغلوب ہوگا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام نہیں چھوڑ یگا ۔ ہمارے مجمع میں ایک مجذوب ہیں اللہ اور اہل اللہ کا نام سنکر اس قدر چلاتے ہیں کہ تاب نہیں رہتی مگر نماز میں کبھی چیخ نہیں نکلتی آہ بھی نہیں نکلتی ۔ یہ کمال اتباع کی دلیل ہے شیخ عبدالحق ردولویؒ اس قدر مغلوب الحال تھے کہ جامع مسجد میں تیس برس تک نماز پڑھنے پر بھی مسجد کا راستہ یاد نہ ہوا مگر جماعت ایک وقت کی بھی قضا نہ ہوئی ۔ مخدوم صابرؒ بارہ برس تک مستغرق رہے مگر کبھی نماز قضا نہ ہوئی ۔ نماز پڑھی پھر مستغرق ہو گئے یہ کمال عقل کی علامت ہے اور عقل جس قدر زیادہ کامل ہو گی اُتنی ہی زیادہ محبت ہو گی جیسے یہ حضرات اہل محبت تھے کہ خدا کے احکام کے اندر مغلوب نہ ہوتے اور اس کا راز یہ ہے کہ محبت بڑھتی ہے معرفت سے اور معرفت ہوتی ہے عقل سے ۔ جتنی عقل کامل ہو گی اُتنی ہی معرفت ہو گی اور جتنی معرفت ہو گی اتنی محبت ہو گی جتنی عقل کم ہو گی معرفت کم ہو گی ۔ بس کامل العقل وہ ہے جس کی شان انبیاء علیہم السلام کی سی ہو ۔ انبیاء علیہم السلام کو کتنی محبت تھی مگر مغلوب نہیں ہوتے تھے سو کمال محبت تو یہ ہے کہ اضطراراً بھی احکام میں اختلال نہ ہو لیکن اگر ایسا اختلال بھی ہو گیا تو گو کمال نہیں مگر صدق تو ہے اور جہاں اختیاراً و قصداً اختلال ہو جیسے یہ لوگ (مدعیان محبت) کھاتے پیتے زراعت کرتے ہیں ۔ رشوت ، سود بٹا دیتے لیتے ہیں پھر عاشق ۔ یہ اچھے

کمال عشق وہ ہے جو کمال عقل کے ساتھ ہو

کامل العقل وہ ہے جس کی شان انبیاء کی سی ہو

عاشق ہیں کہ سارے احکام ان سے ٹل گئے ۔ ظاہر ہے کہ جب مغلوب نہ ہوگا تو تمام احکام اس پر ہوں گے سوا ایسے لوگوں کے متعلق تو کما ں سے قطع نظر کر کے محبت ہی میں کلام ہے۔ دوسرے محبت کی خاصیت یہ ہے کہ اِذَا جَاءَتِ الْاُلْفَةُ رُفِعَتِ الْكُلْفَةُ (جب ہوگئی الفت اٹھ گئی کلفت) یعنی وہ شخص محب رسوم کا پابند نہیں ہوتا تکلف جاتا رہتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان مدعیوں میں تکلف اور زیادہ ہے۔ صحابہؓ کی شان تھی کہ وہ اکثر اوقات ذکر کرتے تھے رسم کی اس میں کوئی قید نہ تھی چار آدمی بیٹھے ہیں بجائے اس کے کہ اور کوئی ذکر کریں بس حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے تھے ہماری یہ کیفیت ہے کہ کسی کو سال بھر کے بعد یاد آتا ہے کسی کو مہینہ کے بعد گیا وہ اس کے منتظر رہتے تھے کہ مجمع کریں شیرینی منگائیں اب یہ کیا بات ہے کہ کبھی بلا اس کے ذکر ہی نہیں ہوتا۔ خصوص جبکہ تکلف آپ کی سنت کے بھی خلاف ہو جن کی محبت کا دعوی ہے۔ بس گو ایک لمپ کافی ہو مگر بیس بیس جلائیں گے کیا یہ اسراف نہیں ہے واعظ کے لیے مسند بچھایا گیا ہے خواہ ریشمین ہی ہو اس کا استعمال کہاں جائز ہے۔ داڑھی ترشوائی ہے۔ یہ ادب ہے محفل ذکر شریف کا۔ اور جہاں ایسا تکلف نہ ہو اور کوئی شخص محفل منعقد کرے تو کوئی بھی نہ آئے۔ یہیں کا نپور کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اشتہار دیا کہ فلاں مسجد میں میلاد ہے مگر اخیر میں مٹھائی نہ بانٹی تو برا بھلا کہنے گئے کہ بڑا دھوکا دیا۔ محبوب کا ذکر سنکر بھی مٹھائی کی سوجھ رہی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے سامنے ہفت اقلیم کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ یہ محبت تو کیا ہوتی نقل محبت بھی نہیں اگر نقل ہوتی تو کم از کم صورت تو ویسی بنا لیتے وہ ہی ہیئت بنا لیتے۔ اس پر عالمگیر کی حکایت یاد آئی جب عالمگیر کی تخت نشینی کا جلسہ ہوا تو کام کے لوگوں کو عطایا دیئے گئے ایک بہروپیہ بھی مانگنے آیا مگر عالمگیر عالم تھے اس کو کس مد سے دیتے اور ویسے صاف انکار کرنا بھی آداب شاہی کے اعتبار سے نازیبا معلوم ہوا حیلہ سے ٹالنا چاہا۔ اس سے کہا کہ انعام کسی کمال پر ہوتا ہے۔ تمہارا کمال یہ ہے کہ ناشناسا صورت میں آؤ مگر وہ جب کبھی بھیس بدل کر آیا بادشاہ نے پہچان پہچان لیا کبھی دھوکا نہیں کھایا کہ جس روز دھوکہ دیا ہے گا انعام کا مستحق ٹھیرے گا اتفاق سے عالمگیر کو سفر دکن کا درپیش تھا۔ بہروپیہ داڑھی بڑھا مقدس لوگوں کی صورت بنا رستہ میں کسی گاؤں میں جا بیٹھا کچھ روز کے بعد شہرت ہوگئی۔ عالمگیر کی عادت تھی کہ جہاں جاتے تھے علماء اور فقرا سے برابر ملتے تھے چنانچہ جب اس مقام پر پہونچے وہاں شہرت سنکر اوّل وزیر کو اُس کے پاس بھیجا۔ وزیر نے کچھ مسائل تصوّف کے پوچھے اُس نے سب کے

جواب معقول دیئے۔ بات یہ تھی کہ اُس وقت بہروپیئے بزرگ کو قصداً حاصل کرتے تھے۔ وزیر نے آکر عالمگیر سے بہت تعریف کی۔ عالمگیر خود ملنے گئے۔ آپس میں خوب گفتگو رہی اور خوب سمجھ گئے کہ شاہ صاحب کامل شخص ہیں۔ چلتے وقت ایک ہزار اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔ اُس نے لات ماری اور کہا کہ تو اپنی طرح ہم کو بھی سگ دنیا خیال کرتا ہے۔ اِس سے اور بھی اعتقاد بڑھا۔ واقعی استغنا عجیب چیز ہے۔ عالمگیر لشکر میں واپس چلے آئے پیچھے پیچھے بہروپیہ صاحب پہونچے کہ لائیے انعام خدا تعالیٰ حضور کو سلامت رکھے۔ بادشاہ نے کہا ارے تو تھا۔ غرض انعام دیا مگر کہا اور کہا کہ اُس وقت جو پیش کیا تھا اُس کو کیوں نہیں لیا تھا وہ تو اِس سے بہت زیادہ تھا اور میں اس کو واپس تھوڑا ہی لیتا۔ اُس نے کہا کہ حضور اگر میں لیتا تو نقل صحیح نہ ہوتی کیونکہ وہ فقیری کا روپ تھا اور فقیر کے شان کے خلاف تھا وہ لینا۔ نقل تو اس کو کہتے ہیں کم از کم مدعیانِ محبت نے شکل تو بنائی ہوتی اہلِ محبت کی سی۔ اگر شکل بناتے تو ظاہر ہی میں رسم اور قیود کی پابندی نہ ہوتی۔ عرب میں پھر یہاں سے تفاوت ہے یہ حالت ہے کہ چھوارے بانٹنے شروع کیئے اگر کچھ آدمی بچ رہے اور چھوارے ختم ہوگئے تو کہہ دیتے ہیں (خلاص) یعنی اب نہیں رہا۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ اگر مٹھائی آنے میں دیر ہو تو پڑھنے والے کہہ دیتے ہیں کہ ذرا تھام تھام کر پڑھنا ابھی مٹھائی منگائی ہے ابھی آئی نہیں کبھی ناک کٹی ہوجاوے۔ یہاں تو نقل بھی نہیں دعویٰ ہی ہے۔ بے تکلفی پر یاد آیا کہ ایک بزرگ تھے اُن کی عادت تھی کہ کبھی کبھی کچھ منگا کر مساکین کو تقسیم کر کے روح مبارک صلے اللہ علیہ وسلم کو ثواب پہنچا دیتے ایک دفعہ کچھ نہ تھا چنے ہی تقسیم کر دیئے تو خواب میں دیکھا کہ چنے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھے ہیں۔ محبت کا طریق یہ ہے۔ محبت میں تو تکلف ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بزرگ کے خلوص اور بے تکلفی کی حکایت یاد آئی کہ وہ ایک دوسرے بزرگ سے ملنے چلے ان کا جی چاہا کہ کچھ لے چلیں مگر پاس کچھ تھا نہیں بس یہ کیا کہ جنگل سے خشک لکڑیاں ہی تھوڑی سی جمع کر کے لے گئے اور پیش کر دیں اُنھوں نے حکم دیا خادم کو یہ لکڑیاں احتیاط سے رکھو جب ہمارا انتقال ہو تو پانی ہمارے غسل کے لئے ان ہی لکڑیوں سے گرم کیا جائے ہم کو اس کی برکت سے اُمید ہے نجات کی۔ یہ کیفیت تھی بے تکلفی کی اور اب تو یہ حالت رہ گئی ہے کہ یوں خیال کرتے ہیں کہ پیر کی خدمت میں جب جائیں کہ جب کچھ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیر کو بھی دنیا دار سمجھتے ہیں اگر ایسا سمجھا ہے تو ایسے پیر کو چھوڑ دینا واجب ہے

یہ تو مریدوں کی آکلات کی کیفیت تھی اب رہے پیر سو اُن کی بھی طمع کی یہ حالت ہے کہ جب کوئی مریدین میں سے ان کے پاس آتا ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کچھ لایا ہو گا۔ بقول مولانا گنگوہیؒ کے کہ کوئی سر کھجلانے لگے تو پیر یہ سمجھیں گے کہ پگڑی میں سے نکال کر کچھ دیگا۔ ایسا طمع کا باب کھلا ہے ایسے پیروں سے تو ان کے بعضے مُرید اچھے جو پیر سے محض نیک نیتی سے تعلق رکھتے ہیں گو اس تعلق رکھنے میں ان سے غلطی ہوئی مگر خلوص تو ہے۔ ایک ایسے ہی پیر و مرید کا قصہ یاد آیا کہ ایک مرید نے اپنے پیر سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری غلیظ میں۔ پیر نے کہا کہ کیوں نہیں ہم ایسے ہی ہیں اور تم ایسے ہی ہو۔ مرید نے فوراً کہا کہ حضور ابھی خواب پورا نہیں ہوا میں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی چاٹ رہا ہوں۔ پیر نے کہا نکل یہاں سے خبیث۔ اُس نے کہا کہ خبیث تو ہوں مگر دیکھا یوں ہی ہے یا تو واقعی یہ خواب ہی دیکھا ہو گا یا مرید نے پیر کا حال ظاہر کرنے کو تراشا ہو گا ہر حال میں مطلب یہ تھا کہ مرید کا تعلق تو پیر سے دین کے لئے تھا اور پیر کا تعلق مرید سے دنیا کے لئے تھا یہ حالت ہو رہی ہے۔ پیری کیا ہے ایک دکان ہے کیسی پیری مریدی۔ اگر پیر ایسا ہے کہ تمہارے خالی جانے سے ناراض ہو گا تو واجب ہے آپ کے ذمہ اُس کو طلاق دو۔ غرض یہ تکلفات سب علامتیں اسی کی ہیں کہ خلوص اور حقیقی محبت نہیں اسی طرح ذکر مبارک نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سمجھئے کہ اگر سچی محبت ہو تو قیود و تکلفات کا انتظار نہ ہوتا۔ چلتے پھرتے یہ نہ سوچتے کہ پہلے لڈو بٹوالیں اس وقت ذکر کریں گے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا۔ ارے بھائی کیا اس میں اس قسم کی کوئی شرط ہے۔ نماز میں تو وقت و عدد وغیرہ کی شروط ہیں مگر ذکر میں تو بجز موافقت حدود شرعیہ کے ایسی کوئی شرط نہیں۔ جیسا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کوئی شرط نہیں چنانچہ ارشاد ہے کہ خدا تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرو۔ اس میں نہ وضو کی قید ہے نہ وقت کی قید نہ عدد کی قید بلکہ یہ ہونا چاہئے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی — شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب سے غافل نہ رہو شاید کرم پر لطف کی نگاہ کرے اور تم آگاہ نہ ہو)

ہر آنکہ غافل از حق یک زمان است — در آں دم کافر است اما نہان است

(جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ایک گھڑی غافل ہے اس گھڑی وہ کافر ہے لیکن پوشیدہ ہے)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر کرتے تھے یَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْ كُلِّ اَحْيَانِهٖ

(یعنی اپنے سارے وقت میں ذکر اللہ کرتے تھے) البتہ علماء نے اتنا تو فرمایا ہے کہ پاخانہ پیشاب کے وقت زبان سے نہ کرے لیکن قلب سے دھیان رکھے جب ذکر اللہ کے یہ احکام ہیں اور عشاق کے نزدیک آپ کا ذکر مثل ذکر اللہ تعالیٰ کے ہے جب اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے کوئی قید نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیوں قید ہوگی۔ چار آدمی بیٹھیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرلیں۔ تنہا ہو ذکر کرلے بلکہ تنہائی میں تو بہت لطف آتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ کوئی محب اپنے محبوب کے وصال سے لطف اندوز ہو)

جو بڑی بڑی محفلیں کرتے ہیں اُن سے قسم دیکر پوچھے کہ بارون اس خاص ہیئت کے تم کو کتنی توفیق ہوتی ہے اس ذکر کی۔ کوئی کتاب پڑھتے ہو اس سے مزہ لیتے ہو بلکہ بعض تو اسکو (یعنی میلاد کو) دین بھی نہیں سمجھتے بلکہ عمل سمجھتے ہیں روزگار کی ترقی کا۔ اسی نیت سے کرتے ہیں گیارہویں بارہویں اور یوں سمجھتے ہیں کہ سال بھر تک جو کمایا تھا گیارہویں بارہویں کرنے سے گذشتہ تو ساری کمائی پاک ہو جاویگی اور آئندہ آفات سے بچے رہیں گے عہدہ بڑھے گا اولاد جئے گی اِن دنیاوی اغراض سے کرتے ہیں اِلَّا مَا شَاءَ اللہُ اِسی لئے ایسے لوگوں میں بالکل ادب بھی نہیں ذکر مبارک کا یہیں کا قصہ ہے کہ ایک جگہ میلاد ہوا اور اس سے اگلے ہی دن وہیں ناچ ہوا۔ شادی تھی ایک صاحب کے یہاں جس میں ناچ کی دعوت بھی کی گئی تھی بعض اُن کے دوستوں میں ثقہ بھی تھے انھوں نے انکار کیا۔ بس ان کی ضرورت سے یہ محفل کی تھی مگر دوسرے دن وہیں ناچ کی محفل کرادی جو اُن کو اصلی مقصود تھا۔ اس شخص نے دونوں پلے برابر سمجھے۔ یہ حالت ہے۔ اور بعض جگہ اگر کوئی ایسا امر منکر بھی نہیں ہوتا تب بھی سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ روایات میں اس قدر بے اعتدالی کرتے ہیں کہ جن کا سر نہ پاؤں۔ قصیدے اس قسم کے پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میں عرض کرتا ہوں واقعات دکھاتا ہوں تاکہ محض فرضی دعویٰ نہ سمجھا جائے۔ ایک قصیدہ ہے اور اس کا یہ شعر ہے شاعری میں آکر یہ کہدیا ؎

طوافِ کعبہ مشتاقِ زیارت کو بہانہ ہے کوئی ڈھب چاہئے آخر قلیوں کی خوشامد کا

یعنی اصل تو زیارت مدینہ کی ہے حج مقصود نہیں ہے حج محض ایک مصلحت سے کرتے ہیں اور وہ مصلحت یہ ہے کہ اللہ میاں (نعوذ باللہ) عاشق ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اور ہم بھی

عشاق کے نزدیک آپ کا ذکر مثل ذکر اللہ کے ہے جس میں کوئی قید نہیں

بعض میلاد کو محض موجب برکت روزگار کی ترقی کا ذریعہ سمجھ کر کرتے ہیں

لوگوں میں ذکر مبارک کا ادب نہیں

قصائد مروجہ میلاد میں بے ادبی

عاشق اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے چلے اور محبوب کے دو عاشق آپس میں رقیب کہلاتے ہی ہیں تو گویا اللہ میاں (نعوذ باللہ) ان کے رقیب ہوتے اور رستہ میں کھڑا تا ہی رقیب کا جو قادر ہو شاید جانے نہ دے اس لئے حج کر کے اُن کی خوشامد کرلینی چاہیئے اس سبب سے پہلے طواف کعبہ کرتے ہیں کہ خوش رہیں اور کچھ کھنڈت نہ ڈال دیں (نعوذ باللہ) اور لیجئے ؎

بے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

یہ جو مشہور ہے کہ سایہ نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ تو یہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے گو وہ ضعیف ہیں مگر فضائل میں متمسات ہو سکتی ہیں سو شاعر صاحب اس کا نکتہ بیان کرتے ہیں کہ سایہ کیوں نہ تھا تو وہ نکتہ یہ ہوا کہ یعقوب علیہ السّلام نے جس طرح یوسف علیہ السّلام کو رخصت کرتے وقت یہ سوچکر کہ یوسفؑ مجھ سو جُدا ہوتے ہیں میرے دل کو تسلّی کیسے ہوگی پیراہن رکھ لیا اسی کو دیکھ لیا کروں گا۔ اِسی طرح نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ نے حضرت رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجنا چاہا تو سوچ ہوئی کہا کہ میں کاہے سے تسلّی حاصل کروں گا۔ اِس لئے سایہ کو رکھ لیا کہ اس سے تسلی تو ہو جایا کرے گی الٰہی توبہ الٰہی توبہ۔ اِنصاف سے کہئے کہ ان مضامین کے بعد ایمان باقی رہ سکتا ہے اس شعر میں حق تعالیٰ کے لئے بیچینی ثابت کی ہے پھر بصیر ہونے کا انکار کیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ جب بصیر و خبیر ہیں تو پھر کیا اللہ تعالےٰ کو نعوذ باللہ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا کرتے پھر سایہ رکھنے کی ضرورت نہ ہوتی کیا ایسی محفل کرنے سو بکڑ دھکڑ نہ ہوگی۔ بانی محفل پر مواخذہ نہ ہو گا۔ اگر دین ایسا سستا ہے کہ کہیں سے بھی نہیں جاتا تب تو خیر گستاخی بھی کوئی چیز نہیں مگر دین تو ایسا سستا نہیں ہے، کیا دین کے یہ معنی ہیں کہ سب کچھ کئے جاؤ اور وہ نہ جائے۔ یہ تو اللہ میاں کی شان میں سوءِ ادب تھا اب انبیاء علیہم السّلام کی شان میں دیکھئے ایک شاعر صاحب کہتے ہیں ؎

بر آسمانِ چہارم مسیح بیمار است تبسّم تو برائے علاج در کار است

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام آسمانِ چہارم پر بیمار ہیں اور اُن کا علاج آپ کا تبسّم ہے سچ بتلایئے کہ کیا حضرت عیسیٰؑ بیمار ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تبسّم سے وہ اچھے ہو جائیں گے اور حقیقت میں اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ناراض کرنا ہے۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ کیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایسی بات سے خوش ہوں گے جس میں دوسرے نبی کی توہین ہوتی ہو۔ آپ سمجھئے کہ آپ کے کوئی بھائی حقیقی ہو اور اُس کے ایک بیٹا ہو اور وہ آپ کی شان میں

گستاخی کرے تو کیا بھائی کو یہ بات پسند ہوگی اسی طرح انبیاء علیہم السّلام آپس میں بھائی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب میں بڑے ہیں اگر آپکے کسی نبی کی توہین اور اُن کی شان میں گستاخی کی تو کیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہوں گے۔ ایک شاعر صاحب ہیں کہ انھوں نے نعت لکھنے کے لئے روشنائی تجویز کی ہے اور حضرت یعقوب علیہ السّلام کی آنکھ کو اُس روشنائی کے حل کرنے کے لئے کھرل قرار دیا ہے وہ شعر اس وقت مجکو یاد نہیں رہا۔ سچ بتلایئے ایمان سے اگر ہم انبیاء علیہم السلام کو کسی موقع پر مجتمع پائیں اور وہاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہوں تو کیا اُس مجمع میں ہم ان اشعار کا تکرار کر سکتے ہیں کیا یعقوب علیہ السّلام کی آنکھ میں روشنائی پیس سکتے ہیں یا ان کے منہ پر ایسی بات کہہ سکتے ہیں۔ تو جو بات منہ پر کہنا بے ادبی قرار دیجاوے کیا پیچھے کہنا گستاخی نہ ہوگی۔ انبیاء علیہم السّلام کی تو بڑی شان ہے۔ مخلص لوگوں نے تو دوسرے اہل اللہ کے ساتھ اس کی رعایت کی ہے۔ ایک قصہ یاد آیا۔ ایک عورت جس کو جذام کا مرض تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں طواف کعبہ کر رہی تھی آپنے فرمایا یَا اَمَۃَ اللّٰہِ اُقْعُدِیْ فِیْ بَیْتِكِ وَلَا تُؤْذِی النَّاسَ یعنی کہ لوگوں کو تیری وجہ سے تکلیف ہوتی ہے اب نہ آنا۔ چنانچہ وہ چلی گئی پھر عرصہ کے بعد پھر طواف کا شوق ہوا آکر طواف کرنے لگی۔ ایک شخص نے کہا خوب دل کھول کر طواف کر جو شخص تیرا روکنے والا تھا وہ انتقال کر گیا کہنے لگی وہ شخص ایسا نہ تھا کہ سامنے تو اس کا اتباع کیا جائے اور بعد میں مخالفت کی جائے یہ کہکر چلدی اور کہا کہ اب نہ آؤں گی کیونکہ وہ منع کر گئے تھے۔ میں تو اس لئے آئی تھی کہ طواف کر کے پھر اُن کو راضی کر لوں گی جب وہ نہیں پھر کس سے معاف کراؤں۔ سو آدمی پیچھے وہ معاملہ کرے جو سامنے کر سکتا ہو۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السّلام کے پیچھے کیوں ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جو سامنے نہیں کر سکتے۔ کسی نے خوب رد کیا ہے اس شعر کا (جس میں دیدۂ یعقوب کو کھرل بنایا تھا) وہ یہ ہے ؎

ابھی اُس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل
نظر آتا ہے جسے دیدۂ یعقوبؑ کھرل

اور کہتے ہیں ؎

توبہ ہے یوں ہو کہیں چشم نبی صلی اللہ علیہ وسلم مستعمل
کوئی تشبیہ تھی اور نصیب اجہل

انبیاء علیہم السّلام کی شان میں تو ایسے اشعار بطور نقل بھی کہتے ہوئے پریشانی ہوتی ہے بلکہ سب سے بڑھ کر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نہایت بے ادبی کی جاتی ہے۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کی جاتی ہے

آپ کی شان میں کہتے ہیں فتنۂ عرب ۔ شورِ عجم ۔ آوردہ رسم کافری ۔ جس ذات نے کفر کی جڑ کاٹی
ان کے لئے یہ کہا جاتے ۔ اصل میں یہ امیر خسروؒ کا شعر ہے جو مجازی فرضی محبوب کے لئے کہا گیا ہو کسی نے
اُس کو نعت کے اشعار میں تضمین کر لیا ہے باقی امیر خسروؒ نے یہ شعر نعت میں نہیں کہا اور اگر
امیر خسرو بھی کہتے تو ہم اُن کی نسبت بھی یوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ معاف کرے ۔ اگر وہ ایسا کہتے
تو اُن کی بھی غلطی ہوتی باقی اُن کی نسبت ہم زیادہ اِس لئے نہ کہتے کہ وہ بزرگ ہیں وہاں
تاویل غلبۂ حال کی ہو سکتی ہو گو اوروں کو اُس کا نقل بطور شغل کے جائز نہ ہوتا مگر جو صاحب
حال بھی نہ ہو اس کے پاس کیا عذر ہو ان گستاخیوں کا ۔ اب بتلایئے یہی محبت ہے نیز اگر
محبت ہوتی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرے حقوق محبت بھی تو ادا ہوتے ۔ جو لوگ
اہتمام کرتے ہیں اس مجلس کا اُن سے قسم دیکر پوچھو کہ وہ کس قدر درود شریف دن رات
میں پڑھتے ہیں اگر اُن سے جبکہ وہ محفل میں بلانے کے لئے آدیں یوں کہو کہ جتنے درود شریف
وہاں پڑھے جاتے ہیں میں اُس سے زیادہ یہاں پڑھ لوں گا تو کبھی راضی نہ ہوں ۔ ایک شخص
ایک ہزار مرتبہ درود شریف پڑھ رہا ہو اُس پر تو انکار ہو اور جو محفل میں چار مرتبہ بھی نہ
پڑھیں گے وہ محب ہیں ایسے ہی لوگ اصلاح کرنے والے کو کہتے ہیں کہ مولود شریف کا منکر ہے
مگر ۔ ا حبو سمجھنے کی بات ہو کہ نماز سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں لیکن اُس میں بھی اگر کوئی شخص بجائے
قبلہ کے ادھر (مثلاً مشرق کی طرف) منہ کرکے اور گھٹنے کھول کر پڑھے اور اس پر کوئی منع
کرے تو کیا یہ کہا جائیگا کہ یہ نماز سے روکتا ہو ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے روکنا تو
اس کو کہتے ہیں کہ نہ تو کلمہ پڑھنے دے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے دے ایسے شخص کو
بیشک منکر کہیں گے ۔ ایک شخص کہتا ہو کہتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر واجب ہے
مگر تعجب ہے کہ اُس کو منکر کہا جاتا ہو جو شخص یوں کہے کہ نشر الطیب پڑھو اور وہ کتابیں پڑھو
جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے حالات ہیں ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات
مذکور ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے احکام ہیں یہ سب ذکر ہی ہیں مگر ان میں
کوئی قید نہیں ہو ۔ کیا ایسے شخص کو منکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہیں گے ۔ کیا یہ تہمت نہیں ہو ۔ کیا اس کا
حساب نہ ہوگا ۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ سے کسی نے پوچھا کہ
مولود کیسا ہے تو فرمایا کہ ہم تو ہر وقت مولود کرتے ہیں اور کلمہ طیبہ پڑھا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اور فرمایا یہ بھی مولود ہو گیا ۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے

تو آپ کا کلمہ کیسے پڑھا جاتا۔ مولانا کا یہ مولود شریف تھا ایسے شخص کو یہ کہنا کہ منکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسکو محبت نہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی سخت بات ہے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ذکر کرتے تھے وہاں یہ قیدیں کہاں تھیں کسی صحابی نے مٹھائی منگائی ہو کسی نے صحابہؓ کو بلا کر جمع کیا ہو نہ آنے والوں کو لتاڑا ہو تو بتلاؤ۔ بات یہ ہے کہ یہ چیزیں دو طرح سے ایجاد ہوئی ہیں بعض تو تکلف و تفاخر کی غرض سے چنانچہ ہم اس کی علامت بتلاتے ہیں کہ ایک فہرست لکھوا اور اس میں یہ بھی لکھو کہ ہمارے یہاں مٹھائی نہ ہوگی دیکھیں ایسی فہرست لکھنا کون گوارا کرتا ہے اس سے تو بانی صاحب کی طبیعت اور نیت کا حال معلوم ہو گیا اگر تفاخر نہیں تو یہ کیوں ناگوار ہے۔ آگے سننے والوں کی نیت کو دیکھئے کہ اگر کوئی ہمت کر کے لکھ بھی دے تو پھر دیکھنا آتا کون ہے۔ دو قسم کی محفلیں کر کے دیکھ لو ایک وہ محفل جس میں مٹھائی ہو اور ایک وہ جس میں مٹھائی نہ ہو پھر دیکھو کہاں زیادہ آدمی ہوں گے۔ دوسرے تفاخر کی ایک دلیل یہ ہے کہ اگر اتفاقاً مٹھائی کم ہو جاتے اور آدھے آدمی بلا مٹھائی چلے جائیں تو ناک کٹنے کے خیال سے کسی قدر قلق ہوتا ہے۔ اگر لوگ مسجد میں نماز کے لئے آئیں گو کسی اشتہار ہی پر آئیں اور جگہ نہ ملے تو کوئی شکایت نہیں کرتا کہ مہتمم صاحب نے ہماری بیقدری کی اور نہ مہتمم کو اس کا خیال ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو جگہ نہیں ملی ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نہ مہتمم کہہ سکتا ہے کہ ہمارے اوپر کوئی احسان نہیں آپ دین کا کام کرنے آئے تھے جس قدر اہتمام ہم سے ہو سکتا تھا ہم نے کر دیا ہمارے ذمہ کچھ بھی نہیں۔ ہاں کسی کے بلائے ہوئے شادی میں آؤ اور اہتمام میں کمی ہو تو شکایت ہو سکتی ہے پھر جب محفل میلاد میں جگہ نہ ملنے یا مٹھائی سے رہ جانے میں شکایت ہوتی ہے اور خود محفل انجام دینے والے کو بھی سخت شرمندگی ہوتی ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس کو مثل حاضری مسجد کے نہیں سمجھتے مثل شرکت شادی کے سمجھتے ہیں جہاں تفاخر سبب ہوتا ہے اہتمام کا جس کی کمی سے شکایت ہوتی ہے پس اگر اس محفل کو دین کا کام سمجھتے ہیں تو حالات مذکورہ میں شرمندگی کیوں ہوتی ہے۔ اسیطرح مٹھائی موقوف کر دی جاوے تو اس سے سامعین کی نیت کا اندازہ ہو جاویگا کہ کتنے آدمی ذکر میں شریک ہوتے ہیں مگر مٹھائی کے موقوف کرنے سے یہ نفع ضرور ہوگا کہ دوسرے غریب بھی ہمت کریں گے ذکر کی جن کو وسعت نہیں اگر ہو گی اسکو گوارا کر سکتا ہے۔ تمام کیسے ہوگا غرض ان رسوم کے ایجاد کی بنا، ایک تو یہی تکلف و تفاخر ہے جس کو ابھی بیان کر چکا ہوں اور بعض شروع ہوئی ہیں غلبۂ حال سے چنانچہ قیام کی اصل یہی غلبۂ حال اور

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ذکر کرتے تھے وہاں قیود کہاں تھیں

رسوم کی ایجاد دو طرح سے ہوئی ہے

وجد ہی اور آداب وجد میں سے امام غزالیؒ نے لکھا ہے احیاء العلوم میں کہ اگر مجلس میں کسی کو وجد ہو اور وہ کھڑا ہو جاوے تو سب کو چاہئے کہ کھڑے ہو جائیں کیونکہ مخالفت سے انقباض ہوتا ہے اور موافقت سے انبساط ۔ مخالفت سے طبیعت بجھ جاتی ہے ۔ تو یہ قیام کرنا بھی ذکر مبارک میں کوئی حکم شرعی نہیں صحابہؓ سے ثابت نہیں محض ایک قسم کا وجد ہے کسی وقت میں کسی صاحب حال پر حال طاری ہوا وہ حالت غلبہ میں کھڑا ہو گیا اور مطابق ادب وجد کے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس کے کھڑے ہونے پر سب کھڑے ہو گئے ۔ بس اصل تو اتنی تھی بعد میں کسی کو یہ ہیئت طبعاً پسند آئی بس پاس کر لی (یعنی یہ بات اختیار کر لی کہ جب ذکر ولادت شریف ہو تو ضرور کھڑا ہوا جائے) اب غلو کی یہ حالت ہے کہ نماز تو بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے عذر میں مگر میلاد بدون قیام نہیں ہوتا ۔ بہرحال جب یہ وجد تھا تو جب غلبۂ حال نہیں تو پھر اس کے اختیار کرنے کے کیا معنے ۔ پھر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج اور وفات کا بھی تو ذکر ہی ہے ۔ نزول وحی کا ذکر بھی ذکر ہے پھر پیدا ہونے کے ذکر کی کیا تخصیص ہے بس رسم ہے اور کچھ بھی نہیں ۔ جیسے بعض بعض جگہ سماع میں اختراعات ہو گئے ہیں کہ اصل تو گذر گئی رسم رہ گئی ۔ ایک موقع پر ایک بزرگ پر عین سماع کے اندر ایک وجد طاری ہوا وہ اُٹھ کر مسجد کی طرف چلے قوال ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے قوال بھی پہونچ گئے مسجد میں ۔ بس اتنی حقیقت تھی ۔ ایک دفعہ ایسا ہو گیا تھا ۔ اب وہاں لازم ہو گیا ہے کہ عین سماع کے اندر صاحب سجادہ قصداً کھڑے ہوتے ہیں اور مسجد میں جاتے ہیں اور قوال ان کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں اور مسجد میں بیٹھ کر گانا بجانا ہوتا ہے ۔ اسی طرح کوئی صاحب وجد ذکر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سُن کر کھڑے ہو گئے تھے محبت میں رسول ﷺ کی اور دوسرے شرکاء مجلس کھڑے ہو گئے اُن کی موافقت میں ۔ میں پوچھتا ہوں کہ اب یہ لازم کیوں ہو گیا ۔ اگر یوں کہو کہ جی چاہتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر کسی مستحب میں بھی احتمال ہو اوروں کے بگڑنے کا تو اُس کو نہ کرنا چاہئے چہ جائیکہ مستحب بھی نہ ہو محض جی ہی چاہتی چیز ہو تو اگر میں اُس کو اس مفسدہ کے سبب ترک کر دیں تو کیا حرج ہے اور اگر بالکلیہ ترک کرنے کو دل گوارا نہ کرے تو اچھا ضرور اصلاح تو ضروری ہونا چاہئے ۔ جس کی سہل صورت یہ ہے کہ میلاد میں کبھی قیام کریں کبھی نہ کریں اگر ایسا ہو تو کیا حرج ہے صاحب اگر پھر کوئی تم پر اعتراض کرے تب ہی کہئے مشکل تو یہ ہے کہ اس کو ایسا لازم سمجھتے ہیں کہ بھلا کوئی ترک قیام کرا تو لے ۔ باقی منع کرنیوالے مطلقاً حرام نہیں

کہتے جیسا کرنے والے لوگ مطلقاً واجب سمجھتے ہیں بہرحال جب ایسی ایسی باتیں پیدا ہوگئیں تو اگر نہ کہا جائے تو کیا کیا جائے۔ اسی طرح گیارہویں میں گیارہ تاریخ کی پابندی نہ کرو کبھی نو کو کرلو کبھی بارہویں کو کرلو مگر عقیدہ درست رکھو اب تو یہ بھی نہیں اکثر لوگ گیارہویں ڈر کے مارے کرتے ہیں کہ نہ کریں گے تو حضرت سیدنا غوث پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ناخوش ہو جاویں گے جس سے کچھ ضرر ہو جاویگا اگر خوف سے نہ کرتے اُن کو مقبول سمجھ کر محبت سے کرتے تو پھر پابندی کی کیا ضرورت تھی کیا مقبولین و اولیاء کی یہ شان ہوتی ہے کہ نذرانہ دو خوش ورنہ ناخوش۔ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ میں نے اِن بدعات کے متعلق بیان کیا تو وعظ کے بعد ایک صاحب کہنے لگے کہ ایسے مسائل بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی خواہ مخواہ لوگوں کو بھڑکانا۔ میں نے کہا ضرورت آپ ہی حضرات نے ثابت کی ہے اگر آپ یہ بدعات نہ کرتے ہوتے تو ہمیں ان کے رد کی نوبت نہ آتی۔ آپ کرنا چھوڑ دیں ہم رد کرنا چھوڑ دیں قصور تو آپ ہی کا ہے آپ عمل کرتے ہیں بلا ضرورت۔ ہم کہتے ہیں بضرورت۔ باقی ہم نفس عمل کو منع نہیں کرتے تم تخصیص تاریخ کی چھوڑ دو اور نیت اپنی درست کرلو ہم کچھ نہ کہیں گے۔ نیت یہ مت رکھو کہ روزگار میں ترقی ہوگی یا بیٹا ہوگا۔ نیت یہ رکھو کہ حضرت غوث اعظمؒ ہمارے محسن ہیں کہ ہم کو اُن سے دین پہونچا اگر وہ تشریف رکھتے ہوتے تو اُن کی خدمت کرتے اب یہ نہیں ہو سکتا تو ہم اُن ثواب ہی بخش دیں تو پھر ہم منع نہیں کریں گے مگر معیار اس نیت کا یہ ہوگا کہ پھر سب کی نیاز ہونا چاہیے ابوحنیفہؒ کی بھی امام بخاریؒ کی بھی (کیونکہ سب محسن ہیں) حضرت غوث اعظمؒ کی تخصیص نہ ہوگی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تخصیص کیوں کرلی ہے اسی طرح ہم قیام کو منع نہیں کرتے مگر کہیں تو ذکر ولادت کے وقت کھڑے ہو جاؤ کبھی رضاعت کے بیان میں کبھی معراج کے ذکر میں۔ علیٰ ہذا ایک ہی محفل میں تین چار دفعہ کھڑے ہو جاؤ۔ اگر اس طرح رکھو تو کون شخص منع کرے۔ یہ حقیقت ہے اس عمل کی۔ مقصود یہ ہے کہ محبت رسول یہ نہیں ہے جیسے تم کرتے ہو۔ محبت کے لوازم سے ہے کہ سب حقوق ادا کیے جائیں اُن میں سے ایک ذکر بھی ہے۔ پھر ذکر میں درود شریف بھی ہے قرآن شریف کی تلاوت بھی جس میں جا بجا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا نہایت جامع تذکرہ ہے اگر قرآن شریف ختم کرلیا تو گویا پورا ذکر کرلیا چنانچہ آپ کے تذکرہ میں فرماتے ہیں

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ الخ

ذکر میں کلام اللہ خود سب داخل ہیں ذکر صرف آپ کی پیدائش ہی کا ذکر

(حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں) اسی طرح بہت آیتیں ہیں ان سب آیات میں ذکر ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا اور ذکر بھی بادشاہوں کا سا۔ اگر کسی بادشاہ کی سوانح عمری لکھو تو کیا بس اتنا لکھو گے کہ فلاں تاریخ پیدا ہوا اور فلاں تاریخ تخت نشین ہوا۔ اصل سوانح عمری تو یہ ہے کہ اس نے اتنے ملک فتح کئے یہ یہ احکام جاری کئے اِس اِس طرح مخالفین کی سرکوبی کی ایسی ایسی شجاعت ظاہر کی یہ ہے اصل سوانح عمری بس اس قاعدہ سے آپ کی اصل سوانح عمری دو ہی چیزیں ہیں قرآن و حدیث۔ قرآن شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری شان ظاہر ہوتی ہے۔ آپکے اخلاق کا ذکر ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ اور آپ کی شان میں فرماتے ہیں اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (ہم نے آپ کو اس شان کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور مومنین کے لئے بشارت دینے والے اور کفار کو ڈرانے والے ہیں اور سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں) اسی طرح حدیث میں آپکا کھانا پینا۔ سونا جاگنا اور دوسرے حالات مذکور ہیں۔ اے اللہ اس کا تذکرہ کیوں نہیں ہوتا۔ میں اس کی وجہ بتلاتا ہوں۔ ایک حریص سے پوچھا تھا کہ تجھ کو قرآن شریف میں کونسا حکم سب سے زیادہ پسند ہے اُس نے کہا كُلُوْا وَاشْرَبُوْا کہ کھاؤ اور پیو۔ پوچھا دُعا کونسی پسند ہے کہا رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (اے ہمارے پروردگار ہم کو آسمان سے دسترخوان نازل فرما) پس جس طرح اس شخص کو یہ پسند آیا اور یہ پسند کیوں نہ آتا کیونکہ اور باتوں میں تو نفس کے خلاف کچھ کرنا پڑتا ہے اور اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اسی طرح اِن لوگوں میں سارے ذکروں میں یہ پسند آیا کہ آپکا نور پیدا ہوا پھر وہ آپ کی والدہ میں آیا پھر فلاں تاریخ ولادت شریف ہوئی بس اور یہ ذکر پسند نہیں آیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جاگ جاگ کر طاعت کی ہے۔ ایک ہی آیت کی تلاوت میں رات گذر گئی۔ پاؤں مبارک ورم کر گئے اور یہ ذکر پسند نہیں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضی ظاہر کی ہے معصیت سے۔ ریا سے۔ حرام خواری سے۔ اس کو نہیں بیان کیا جاتا۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ اس میں نفس کے خلاف کرنا پڑتا ہے سو اگر محض رسم ہی کی پابندی ہے تو اس کا علاج نہیں اور اگر عقل سے کام لیا جاتا کوئی چیز ہے تو کیا یہ شان ہوتی ہے محبین کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور تذکروں کو اڑا ہی دیں اسی طرح محبت کے لوازم سے ہے آپ کی شان میں گستاخی نہ کرنا اور آپکی تعظیم کی جاوے

نیز متابعت کرنا۔ میرے ایک صالح دوست نے جو کہ ذکر مبارک کے عاشق تھے خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم اُس کی شفارش نہ کریں گے جو ہماری بہت تعریفیں کرے۔ ہم تو اُس کی سفارش کریں گے جو ہمارا کہنا مانے۔ یہ تو اُن کا ذکر تھا جنھوں نے بزعم خود آپ کے حقوق میں سے صرف محبت کا پہلو لیا بعض وہ ہیں جنھوں نے عظمت کو لیا ہے نہ تو محبت ہے نہ متابعت اکثر یہ وہ لوگ ہیں جن پر تعلیم جدید کا مذاق غالب ہے طرز ان کا یہ ہے کہ یہ لوگ علماء سے علتیں احکام کی پوچھتے ہیں احکام میں خود علتیں نکالتے ہیں اور جو بات اپنی عقل نارسا و ناقص کے خلاف ہو اُس کے ماننے میں اُن کو تامل ہوتا ہے کہیں کہتے ہیں کہ پلصراط پر چلنا عقل کیخلاف ہے (اس لئے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے تیز ہے پھر کیسے کوئی چل سکتا ہے) کہیں کہتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں کا بولنا عقل کیخلاف ہے غرض بڑی ارزاں چیز ان کے یہاں یہی ہے کہ جہاں چاہیں کہدیں کہ عقل کیخلاف ہے اُن امور میں سے ایک معراج بھی ہے کہ اُن کے نزدیک عقل کے خلاف ہے کہتے ہیں کہ تھوڑی دور جا کر ہوا نہیں ہے وہاں پہنچکر جاندار کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا یہ طرز بتلا رہا ہے کہ ان کو محبت نہیں ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی۔ کیونکہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس کے احکام میں شبہ نہیں ہوا کرتا فرض کیجئے کسی عورت سے محبت ہوجائے اور وہ کہے کہ اپنا کرتہ نکال کر سر بازار برہنہ نکل جاؤ تو میں تم سے خوش ہوں گی تو اگر وہ شخص محبت وعشق میں پکا ہے تو کبھی نہ پوچھے گا کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ بلکہ یوں کہیگا کہ میرے محبوب نے اپنے راضی ہونے کی ایک صورت تو نکالی۔ مجکو اس فرمائش کی وجہ دریافت کرنے سے کیا غرض۔ میرا تو مطلب نکلتا ہے ہرگز کسی مصلحت اور حکمت کے معلوم ہونے کا انتظار نہ کریگا۔ محب کی تو بڑی مصلحت کا راضی کردینا ہے جب ایک عورت مردار کی محبت میں یہ حال ہے کہ اس کے احکام کی علت دریافت نہیں کیجاتی تو یہ احکام تو دیکھو کیسی ذات مقدس کے ہیں اُن کی علتیں کیوں دریافت کی جاتی ہیں بس بات یہ ہے کہ جو لوگ احکام میں شبہات نکالتے ہیں ان کو محبت نہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اور اگر محبت نہیں ہے تو ان کا ایمان ہی کیا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تصریحاً فرماتے ہیں

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ (یعنی تم میں سے کوئی مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک اس کو اپنے والد اور بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ ہوجائے) اس سے معلوم ہوا کہ جب تک اتنی محبت نہوگی تو ایمان نصیب نہوگا خود حق تعالےٰ فرماتے ہیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو اللہ تعالےٰ سے زیادہ شدید محبت ہے)

بعض وہ لوگ ہیں جنھوں نے صرف عظمت کو لیا ہے محبت اور متابعت کو چھوڑ دیا

ایمان باللہ وہ ہے جس میں محبت ہو شدت کیساتھ اور ایمان باللہ اور ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم متلازم ہیں پس ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرط بھی وہی شدت محبت ہوگی اور علاوہ شہادت قرآن وحدیث کے ویسے بھی تو مشاہدہ ہے اور موٹی بات ہے کہ طاعت کا لطف ہی بلا محبت نہیں آتا جو طاعت بلا محبت کے ہو وہ محض ضابطہ کی طاعت ہوتی ہے حقیقی طاعت نہیں ہوتی اس طاعت کی ایسی مثال ہوگی جیسے انجن میں بھاپ نہ ہو اور اُس کو مزدور ٹھیلتے ہوں جس کی رفتار کچھ بھی قابل اعتبار نہیں ہوتی جہاں ٹھیلنا بند کیا بس رُک گیا۔ اسی طرح بدون محبت کے جو طاعت ہوگی قابل اعتبار نہیں طاعت جب ہی قابل اعتبار ہوگی کہ آگ لگی ہوئی ہو۔ بھاپ بھری ہو محبت کی بلکہ قطع نظر لطف کے آسان بھی طاعت جب ہی ہوتی ہے کہ جب محبت ہو۔ مثلاً ایک تو مزدور کا کہنا ماننا اُس کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ جہاں آقا ٹلا اور کام سے بیٹھ گئے اور ایک کسی محبوب کا محب کو کسی بات کی فرمائش کرنا اور اس کا کام پر لگ جانا اُس کی یہ حالت ہوگی کہ اگر اُس حالت میں کوئی اس سے یہ بھی کہے کہ کھانا تو کھالو تو وہ یہ ہی کہے گا کہ میں جب تک کام کو پورا کر لوں گا مجھکو کسی بات میں چین نہ آئیگا غرض مزدور کے کام میں اور محب کے کام میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے خوب سمجھ لیجئے کہ دوام طاعت جو کہ عادۃً سہولت پر موقوف ہے بلا محبت نہیں ہوتا پس جب عقلاً بھی محبت طاعت مفروضہ کا موقوف علیہ ہے تو ضرور محبت بھی فرض ہے اور ان لوگوں کو جب محبت نہیں تو ظاہر ہے کہ متابعت بھی نہیں جو محبت پر موقوف ہے اور ویسے بھی بدیہی ہے کہ جو لوگ احکام میں شبہات نکالتے ہیں وہ عمل کیا خاک کریں گے۔ غرض محبت و متابعت سے تو یہ عاری ہیں البتہ ان لوگوں کے قلب میں آپ کی عظمت ہے ضرور مگر عظمت بھی وہ نہیں جو مطلوب ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت جس حیثیت سے ہونی چاہیے وہ اُن میں نہیں یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اصالتاً ایک شاندار اور عاقل بادشاہ سمجھتے ہیں اور ضمناً نبی بھی بس زیادہ عظمت آپ کی ان کے دل میں بادشاہ ہونے کی حیثیت سے ہے نبی ہونے کی حیثیت سے آپکی زیادہ عظمت ان کے ذہن میں نہیں اگر نبی ہونے کی حیثیت سے اصل عظمت ہوتی تو احکام میں علتیں نہ ڈھونڈتے کیونکہ نبی موسس احکام نہیں مبلغ احکام ہیں۔ اسی طرح آپکا نام بانیٔ اسلام نہ رکھتے جیسا کہ یہ لوگ آپ کو بانیٔ اسلام کہا کرتے ہیں میرے نزدیک یہ لقب عیسائیوں سے لیا گیا ہے وہ لوگ اسلام کو خدا تعالےٰ کا بنایا ہوا نہیں سمجھتے بلکہ بوجہ انکار نبوت کے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو بنایا ہے۔ مسلمانو لِلّٰہ اس لقب کو چھوڑو

خوب سمجھ لیجئے کہ بانیٔ اسلام خدا تعالیٰ ہیں آپ کی تو یہ شان ہے ؎

دلِ پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استادِ ازل گفت بگو می گویم

(دلِ پسِ پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھا دیا ہے جو حکم استادِ ازل سے ملا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں۔)

آپ نے تو اُدھر سے سُنا اِدھر کہہ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز خود نہیں بنائی۔ آپ تو حکایت بیان فرما رہے ہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ آپ صرف سفیر ہی نہیں بلکہ ہمارے آقا اور سردار بھی ہیں اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک پیام پہونچانا تو وہ ہے جیسے ڈاکیہ خط پہونچاتا ہے اور ایک وہ جیسے اُستاد مضامین شاگرد کو پہونچاتا ہے استاد صرف حکایت کرنیوالا ہی نہیں بلکہ حاکم اور مُربّی بھی ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی شان ہے بعض بے ادب لوگوں کو دھوکا ہوا ہے کہ نعوذ باللہ آپ کی مثال محض سفیر جیسی ہے سو یہ محض باطل ہے بلکہ ہم غلام ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ ہمارے آقا ہیں۔ البتہ مبلغ ہونے کے معنے یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے گھٹاتے بڑھاتے نہیں ہیں اور اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ اجتہاد نہیں فرماتے تھے مگر وہ اجتہاد بھی مآلاً احکام وحی ہی میں داخل ہے کیونکہ جس اجتہاد کو قائم رکھنا ہوتا تھا وہ وحی سے منسوخ کر دیا جاتا تھا پس جو منسوخ نہ ہوا وہ بھی وحی منصوص بن گیا پس احکام اجتہادیہ میں بھی آپ کی یہی شان ہے ؎

آپ محض سفیر نہ تھے بلکہ مربی بھی تھے

اجتہاد کی دو قسمیں ہیں

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

(اس کا کہا ہوا اللہ تعالیٰ کا کہا ہوا ہے اگرچہ بندے کے منہ سے نکلا ہے)

اور اوپر جو کہا گیا ہے کہ آپ محض سفیر نہ تھے مُربّی تھے اس کا ایک کھلا قرینہ یہ ہے کہ آپ کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی شخص اُمّت میں سے خلاف کرتا تھا تو آپ افسوس کرتے تھے کہ کیوں بگڑ رہا ہے سو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اس طرح کام سپرد ہوتا جیسے سفیر کے ہوتا ہے تو آپ افسوس ہی کیوں کرتے کیونکہ جب آپ نے سفارت پوری کر دی تو آپ بری ہو گئے۔ سفیر کا کام تو اتنا ہی ہے خواہ کوئی جنّت میں جائے یا دوزخ میں افسوس کے کیا معنی اِس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ سفیر محض نہ تھے۔ غرض نہ تو سفیر محض تھے جیسا اہلِ تفریط سمجھے ہیں اور نہ مخترع احکام تھے ہمارے متبوع تھے مگر وحی کے بالکل تابع جب یہ ہے تو آپ کے فرمودہ احکام خدا تعالیٰ کے احکام ہیں پھر خدا تعالیٰ کے احکام میں عقل دوڑانا چہ معنے کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم ہمارے علم کے جنس سے نہیں کہ ہم وہاں تک رسائی کی فکر کریں سو جب اِن لوگوں نے عقل دوڑائی تو

[illegible]

معلوم ہوا کہ یہ لوگ آپ کی شانِ نبوّت کو مغلوب اور شانِ سلطنت کو غالب سمجھتے ہیں اور خیال کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ایک بادشاہ شاندار سمجھتے ہیں اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ جب کبھی یہ لوگ آپکے کارنامے بیان کرتے ہیں تو صرف بادشاہت کے کارنامے بیان کرتے ہیں آپکے فقر و فاقہ کو کبھی بیان نہیں کرتے کہتے ہیں کہ اس میں ہیٹی ہوگی مگر خوب سمجھ لو کہ جنکی عظمت محدود ہے اُن میں تو ایسی باتوں سے کمی ہو سکتی ہے ورنہ اِن حکایتوں سے کیا کمی ہوتی بلکہ اگر کسی کے پاس لشکر و حشم و خدم سب کچھ ہو اور اس صورت میں اس کو غلبہ و رعب حاصل ہو تو وہ چنداں کمال نہیں۔ بڑی عظمت تو اِس میں ہے کہ ایسی تو آپ کی حالت مگر پھر رعب کی کیا کچھ کیفیت۔ اِن لوگوں نے اپنے مذاق کے موافق قیاس کیا ہے جیسے ان کے یہاں اناج نہ رہے تو چھپاتے ہیں مہمان کے لئے کہیں سے سالن منگاتے ہیں تو مہمان سے چھپا کر لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ میرے یہاں کا قصہ ہے وہ یہ کہ ایک دفعہ ہمارے یہاں سالن کم ہو گیا گھر کے لوگوں نے بھائی کے یہاں سے چھپا کر سالن منگایا کہ مہمان کو خبر نہ ہو کہ یہ دوسری جگہ سے آیا ہے۔ جب کھانے بیٹھے تو میں نے صاف کہدیا کہ یہ بھائی کے یہاں سے آیا ہے۔ اور میں نے گھر میں کہا کہ ہم سے جو دوستوں کو محبت ہے تو اللہ تعالیٰ کے واسطے ہے پھر اس میں اس کی کیا گنجائش دوسرے ہماری شان ہی کیا ہے جو گھٹ جاویگی سو اپنی نسبت تو ہمیں یہی کہنا چاہیئے کہ ہماری شان ہی کیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ دوسرا ہے کہ آپ کی اِتنی بڑی شان ہے کہ وہ ایسی حکایات سے گھٹتی ہی نہیں کوئی سمندر سے ایک قطرہ لے لے تو اس میں کیا کمی ہوگئی۔ اگر چیونٹی نے ایک ریزہ مٹھائی کا حلوائی کی دُکان سے توڑ لیا تو اس کی دُکان میں کیا کمی ہو گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ہی ارفع ہے آپکے اُمتیوں میں ایسے ایسے گذرے ہیں کہ سلطنت کی بھی پروا نہیں۔ حضرت غوث اعظم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس شاہ سنجر نے لکھا تھا کہ ملک نیمروز کا ایک حصہ آپ کی خانقاہ کے خرچ کے لئے نذر کرنا چاہتا ہوں قبول فرمائیے۔ آپ نے جواب میں یہ دو شعر لکھے ؎

چوں چترِ سنجری رُخِ بختم سیاہ باد	در دل اگر بود ہوسِ ملکِ سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب	من ملکِ نیمروز بیک جو نمی خرم

(۱) چترِ سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملکِ سنجر کا وسوسہ بھی ہو اس لئے کہ مجھے جب سے [illegible]

نیم شب کی سلطنت مل یہ میری نظر میں نیمروز کی سلطنت ایک جو کے برابر نہیں)

حضرت ابراہیم ابن ادہم جب سلطنت ترک کر کے چلے گئے تو ارکانِ دولت میں کمیٹی ہوئی کہ کسی طرح اُن کو لانا چاہیئے وزیر گیا دیکھا کہ آپ گدڑی اوڑھے ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں عرض کیا کہ حضور سلطنت درہم برہم ہو رہی ہے حضور تشریف لے چلیں آپنے فرمایا کہ یہ سلطنت تمہیں مبارک ہو مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑی سلطنت عطا فرمادی ہے۔ اس کے بعد آپنے اپنی سوئی گدڑی سے نکال کر دریا میں پھینک دی اور وزیر سے کہا کہ میری سوئی دریا میں سے نکلوا دو۔ وزیر نے بیشمار آدمیوں کو دریا میں داخل کر دیا وہاں سوئی کا پتہ کہاں آپنے فرمایا کہ اچھا اب ہماری سلطنت دیکھو یہ کہکر مچھلیوں کو مخاطب کیا کہ اے مچھلیو میری سوئی لاؤ ۔ صدہا مچھلیاں اپنے اپنے منہ میں کوئی سونے کی کوئی چاندی کی سوئی لیکر حاضر ہوئیں۔ آپنے فرمایا کہ میری وہی لوہے کی سوئی لاؤ۔ ایک مچھلی وہی لوہے کی سوئی لیکر نکلی آپنے وزیر کے سامنے ڈالدی اور فرمایا کہ دیکھی میری سلطنت تمہیں اپنی سلطنت پر بڑا ناز ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

رو بر سلطاں و کار و بار بیں ۔۔۔ حسن تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهَار بیں

(بادشاہ کے پاس جاؤ اور کاروبار دیکھو عمدہ باغ کر اس کے نیچے نہریں جاری دیکھو)

عارف شیرازیؒ کہتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم ۔۔۔ شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

(یعنی گدایانِ عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ شاہان بے تخت وتاج ہیں)

اور کہتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ۔۔۔ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہو لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستاروں پر حکم کرتا ہوں)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں زلزلہ آیا آپنے زمین پر پاؤں مار کر فرمایا اسکنی یا ارض اے زمین ٹھہر جا۔ بس زمین ٹھہر گئی۔ کیا حقیقت ہے سلطنت کی اس کے سامنے۔ ایک دفعہ دریائے نیل خشک ہوگیا ہمیشہ چڑھا کرتا تھا اُسی سے آبپاشی ہوتی تھی اُس دفعہ نہ چڑھا۔ عمرو بن العاص یا عبداللہ بن عمرو بن العاص مصر کے عامل تھے لوگوں نے آکر عرض کیا آپنے فرمایا کہ کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے تو تم کیا کرتے ہو لوگوں نے کہا کہ جب ایسا ہوتا ہے تو

ہر ایک جوان حسین لڑکی بھینٹ دیتے ہیں اس سے وہ جاری ہوجاتا ہے آپ نے فرمایا کہ جاہلیت کی رسم کبھی نہیں ہوگی اسلام میں اور میں خلیفہ کو لکھتا ہوں انھوں نے حضرت عمرؓ کو لکھا حضرت عمرؓ نے نیل کے نام ایک حکمنامہ بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ اے نیل اگر تو خدا تعالیٰ کے حکم سے جاری ہے تو کسی شیطان کے تصرف سے بند ہونے کے کیا معنے اور یہ نہیں ہے تو ہم کو تیری کچھ پروا نہیں خدا تعالیٰ ہمارا رازق ہے۔ آپ کے اس لکھنے پر مخالفین ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ دریا پر بھی حکومت کرتے ہیں مگر قلندر آنچہ گوید دیدہ گوید (قلندر جو کچھ کہتا ہے دیکھا ہوا کہتا ہے) آپ کو شبہ بھی نہ ہوا کہ ایسا نہ ہوا تو عزت کرکری ہوگی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ اس رقعہ کو اعلان کے ساتھ لیکر چلے اور مخالفین کا گروہ بھی آپ کے پیچھے چلا ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ اس رقعہ سے اور دریائے نیل کے جوش سے کیا نسبت مگر وہ رقعہ دریائے نیل میں ڈالنا تھا کہ دریا کو جوش آیا اور لبریز ہو کر چلنے لگا۔ اور یہ باتیں تو کوڑھ مغزوں کے سمجھانے کے لئے ہیں واقع میں تو ان کی سلطنت کچھ اور ہی ہے جس کو حضرت بایزید بسطامیؒ نے ذرا تیز الفاظ میں کہا ہے مگر پھر کوئی ایسا نہ کہے انھوں نے کہا ہے مُلْکِی اَعْظَمُ مِنْ مُّلْكِ اللهِ (میرا ملک اللہ تعالیٰ کے ملک سے بڑا ہے) جس کا مطلب یہ ہے کہ جتنی چیزیں ہیں وہ تو ملک ہیں اللہ کا اور اللہ تعالیٰ ملک ہے ہمارا اور ظاہر ہے کہ کہاں اللہ تعالیٰ کی علو شان اور کہاں دوسری چیزیں اس لئے ہمارا ملک اعظم ٹھیرا اور یہ آپ نے مرتبہ ناز میں کہا ہے ہر شخص کا منہ اس کہنے کے لائق نہیں کیونکہ ؎

نازرا روئے بباید ہمچو ورد   چوں نہ داری گرد بدخوئی مگرد

(ناز کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس مت بھٹکو)

حاصل یہ کہ ان کی سلطنت کو کیا پوچھتے ہو اور جب اولیاء اللہ کی یہ کیفیت ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ دنیوی سلطنت کیا بلا ہے۔ سو آپ صرف بادشاہ نہیں ہیں بادشاہ تو آپ کے غلام ہیں۔ آپ کو صرف بادشاہ قرار دینا تعظیم نہیں ہے آپ کو نبی قرار دینا یہ ادب اور تعظیم ہے مگر آپ کی تعظیم میں ایک امر نہایت لازم اور فرض ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کا ادب ملحوظ رکھا جاوے آپ کو حق تعالیٰ کے برابر نہ کردیا جائے۔ آجکل تو واعظین ایسی حکایات تراشتے ہیں کہ جن کا سر نہ پاؤں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی اور اولیاء اللہ کی شان میں بھی چنانچہ ایک حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی ملے ہیں حکایات تراشنے کو ایک حکایت گھڑی ہے کہ ایک بڑھیا گئی حضرت غوث الاعظم رح کے پاس اور

کہا کہ میرا بیٹا مرگیا اس کو زندہ کر دیجئے آپنے فرمایا کہ زندہ نہیں ہوسکتا اُس کی عمر ختم ہو چکی تھی بڑھیا نے کہا کہ اگر اس کی عمر ختم نہ ہوتی تو آپنے کہنے کی کیا ضرورت تھی آپسے تو اسی واسطے کہا ہی کہ عمر ختم ہو گئی اور آپ کو زندہ کرنا پڑیگا آپنے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا وہاں سے بھی اسی ذلیل کی حکم ہوا کہ زندہ نہیں ہوسکتا آپنے بھی وہی جواب دیا جب کسی طرح عرض منظور نہ ہوئی اور اِدھر بڑھیا نے تنگ کیا تو آپنے عزرائیل سے تھیلا روحوں کا چھین اُسے کھول دیا ساری روحیں پھُر پھُر اُڑ گئیں اور تمام مُردے زندہ ہو گئے آپنے فرمایا کہ دیکھا ایک کو نہ جلایا اب اچھا ہوا عزرائیل نے خدا تعالیٰ کے یہاں نالش کی وہاں سے حکم ہوا کہ ہم کو دوست کی خاطر منظور ہے خیر جیسے وہ کہیں وہی سہی الٰہی توبہ کتنی بڑی گستاخی ہے حق تعالیٰ کی شان میں۔

کیا خدا تعالیٰ کی سلطنت اودہ کی سلطنت ہے کہ کوئی قاعدہ قانون ہی نہیں جس کا جو جی چاہا کر گذرا۔ ایسی غیر آئین سلطنت پر ایک حکایت یاد آئی۔ کوئی شہر تھا اَن نیاؤ پور۔ اَن نفی کا کلمہ ہے نیاؤ کے معنے ہیں انصاف کے اور پور شہر کو کہتے ہیں اس کے معنے ہوئے بے انصافی کا شہر۔ ایک گرو اور ایک اُس کا چیلا اُس شہر میں جا پہونچے اور چیزوں کا بھاؤ پوچھا۔ سب کا بھاؤ سولہ سیر۔ گیہوں بھی سولہ سیر۔ چنے بھی سولہ سیر۔ گھی بھی سولہ سیر۔ نمک بھی سولہ سیر۔ گوشت بھی سولہ سیر غرض سب کا ایک ہی بھاؤ۔ گرو نے یہ حال دیکھ کر چیلہ سے کہا کہ یہاں سے چلو یہ شہر رہنے کے قابل نہیں۔ یہاں کھرے کھوٹے سب ایک بھاؤ تلتے ہیں۔ چیلہ نے کہا کہ ہم تو یہاں رہیں گے خوب گھی کھائیں گے طاقت آئے گی۔ ہرچند گرو نے سمجھایا مگر اس نے ایک نہ مانی۔ خیر ایک عرصہ تک وہاں رہا کئے۔ افراط سے سب چیزیں ملیں چیلہ کھا کھا کر خوب موٹا ہوا۔ ایک دفعہ اتفاق سے ایوان شاہی پر پہونچے راجہ کے یہاں ایک مقدمہ پیش تھا وہ یہ کہ دو چور کسی مہاجن کے یہاں گئے تھے چوری کرنے نقب دیکر ایک باہر پہرہ پر رہا ایک اندر گیا اُس پر وہ دیوار گر پڑی دب کر مرگیا اُس کے ساتھی نے دعویٰ دائر کر دیا مہاجن پر کہ اس نے دیوار کمزور بنائی تھی کہ وہ گر پڑی۔ مہاجن کو حاضر کیا گیا اُس نے عذر کیا کہ میرا قصور نہیں معمار نے ایسی دیوار بنائی تھی۔ معمار حاضر کیا گیا اُس سے پوچھا اُس نے کہا کہ مزدور نے گارا پتلا کر دیا تھا اُس نے اینٹ کو اچھی طرح نہیں پکڑا۔ مزدور حاضر کیا گیا اُس سے پوچھا گیا اُس نے کہا سقہ نے پانی زیادہ چھوڑ دیا تھا اِس لئے گارا پتلا ہو گیا۔ سقہ حاضر کیا گیا اُس نے کہا کہ سرکاری ہاتھی میری طرف دوڑا آرہا تھا مشک کا

ان نیاؤ پور کی ایک حکایت بطرز ادق

دہانہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس لئے پانی زیادہ پڑ گیا فیلبان کو حاضر کیا گیا اس نے کہا کہ ایک عورت بجتا ہوا زیور پہنے آرہی تھی پازیب کی جھنکار سے ہاتھی چونک گیا وہ عورت حاضر کی گئی اُس نے کہا کہ سُنار نے پازیب میں باجا ڈال دیا تھا سُنار کو حاضر کیا گیا اُس کو کچھ جواب نہ آیا۔ آخر کہیں تو سلسلہ ختم ہونا۔ آخر یہ تجویز ہوا کہ اس سنار کو پھانسی دیجائے۔ اُس کو پھانسی پر لے گئے اور گلے میں پھانسی ڈالی اس کی گردن ایسی پتلی تھی کہ حلقہ اُس کے گلے میں برابر نہ آیا حلقہ تھا بڑا۔ جلاد نے آکر کہا کہ حلقہ اُس کے گلے میں نہیں آتا اس پر یہ تجویز ہوا کہ کسی موٹے سے کو پھانسی دیدو۔ تلاش ہوئی تو سوائے چیلہ صاحب کے اتنا موٹا کوئی اور نہ ملا یہ پکڑے گئے انھوں نے گروجی سے کہا کہ اب کیا کروں۔ گروجی نے کہا کہ بھائی میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ شہر رہنے کے قابل نہیں مگر تو نے نہ مانا اب اپنے کئے کو بھگت۔ چیلہ نے کہا کہ حضور کسی طرح بچائیے کچھ تو کیجئے آخر آپ کا بچہ ہوں گرو نے تدبیر نکالی کہ آپس میں جھگڑنا شروع کیا گرو کہے کہ مجھے پھانسی دو اور چیلہ کہے کہ مجھے دو خوب جھگڑے یہاں تک کہ راجہ تک نوبت پہنچی۔ راجہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ گرو نے کہا کہ یہ ایسی ساعت ہے کہ جو کوئی اس ساعت میں پھانسی چڑھے تو سیدھا بیکنٹھ جائے اس لئے ہم جھگڑتے ہیں کہ پھر ایسی ساعت نہ ملے گی۔ راجہ نے کہا کہ پھر اس سے اچھا موقعہ کہاں نصیب ہوگا ہمیں پھانسی دیدو۔ چنانچہ اس منحوس کو پھانسی دیدی گئی۔ ایسے راجہ کو پھانسی ہی دینا اچھا۔ پاپ کٹا خس کم جہاں پاک۔ یہ قصہ تھا اُن نیاؤ پور کا سو بہت سے لوگ مسلمان ہو کر ایسی سلطنت سمجھتے ہیں خدا تعالیٰ کی جیسے اُن نیاؤ پور کی حکومت کہ کوئی قاعدہ اور قانون ہی نہیں اندھا دھند معاملہ ہے جس کے کچھ اُصول ہی نہیں۔ صاحبو کتنا بڑا ظلم و ستم ہے کہ اولیاء کو یا انبیاء کو خدا تعالیٰ کی برابر بلکہ مطابق ایسی خرافات حکایات کے خدا تعالیٰ سے بڑھ کر قرار دیا جاوے اس لئے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا رت بڑھاؤ کہ خدا تعالیٰ ہی میں ملا دو کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ناخوش ہوں گے اُب بعض وہ لوگ رہ گئے کہ کسی قدر متابعت تو کرتے ہیں مگر نہ اُن کے دل میں عظمت ہے اور نہ محبت اور یہ لوگ زیادہ اُن میں ہیں جو آجکل کسی امام کا اتباع نہیں کرتے کہتے ہیں کہ ترجمے موجود ہیں ضرورت کیا ہے اکابر کی اتباع کی۔ ہم خود دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں اگر عربی نہیں سمجھتے تو ترجمہ ہی سے احکام نکال لیتے ہیں سو ان میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ نہ بزرگوں کا ادب کرتے ہیں نہ صحابہؓ کا نہ ائمہ کا۔

اس وقت تین قسم کی جماعتیں ہیں

اور بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں خشک الفاظ استعمال کرتے ہیں بس ظاہراً اطاعت تو کرتے ہیں اور بدعات سے بھی بچتے ہیں مگر نہ عظمت جیسا بیان ہوا اور نہ وہ سوز و گداز جو محبت میں ہوتا ہے غرض فی اس وقت یہ تین جماعتیں ہیں۔ ایک وہ جو محبت رکھتے ہیں مگر اتباع و عظمت نہیں۔ ایک وہ جو عظمت کرتے ہیں لیکن محبّت و اتباع نہیں۔ ایک وہ جو اتباع کرتے ہیں مگر عظمت و محبّت نہیں۔ سو یہ تینوں جماعتیں پورے حقوق ادا نہیں کرتیں کسی نے ایک کو لیا دو کو چھوڑا کسی نے دو کو لیا تیسرے کو چھوڑا علیٰ ہذا۔ جامع وہ شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں۔ متابعت میں۔ عظمت میں سرافگندہ رہتا ہو پس

آیت میں جو لفظ ذکر ہے اس کی توجیہ

اس آیت میں یہی مضمون ہے آیت کا ترجمہ پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن تمہید میں مضمون طویل ہو گیا اب ترجمہ کرتا ہوں فرماتے ہیں حق تعالیٰ شانہ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا ؕ اس کی توجیہ میں اختلاف ہے۔ ایک توجیہ تو یہ ہے کہ ذکر کی تفسیر کلام مجید سے کی جائے اور ذکرا کا بدل الاشتمال ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور ایک توجیہ یہ ہے کہ ذکرا کے معنی ہیں شرفا کے اور رسولاً اس سے بدل الکل ہو۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک شرف نازل کیا سو شرف کا لفظ عظمت کو ظاہر کر رہا ہے۔ وہ کون ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اَنْزَلَ بھی آپ کے شرف پر دلالت کر رہا ہے

انزال کے معنی

کیونکہ انزال اوپر سے نیچے آنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تھی تو اونچی رکھنے کی چیز بوجہ شرف کے مگر تمہاری خاطر سے نیچے بھیج دیا ہے اس صورت میں آپ کا شرف در شرف ظاہر ہو گیا۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ دوسرے موقع پر قرآن شریف میں ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا حالانکہ وہاں اوپر سے نیچے آنا نہیں پایا جاتا کیونکہ لوہا آسمان سے تو نازل نہیں ہوتا وہ تو زمین میں سے نکلتا ہے اس لئے انزال کے معنے اوپر سے نیچے آنے کے کہاں ہوئے۔

انزلنا الحدید کی توجیہ

جواب یہ ہے کہ وہاں تعذرؔ حقیقت کے سبب مجاز مراد لیا ہے اور لَقَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا میں تعذر نہیں اس لئے حقیقت مراد ہے۔ دوسرے علماء نے اس کی بھی یہ توجیہ کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ کئی چیزیں آئی تھیں۔ ہتوڑا تھا اور کئی چیزیں تھیں اور وہ اوپر ہی سے آئی تھیں۔ تیسری توجیہ یہ کہ حدیدؔ نکلتا ہے زمین سے اور سبب اور مادہ اُس کا بخارات ہیں جو پانی سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی اوپر سے آتا ہے اور زمین میں نفوذ کرتا ہے سو اس طرح بھی معنے حقیقی ہی ہیں۔ غرض حقیقی معنے انزال

عہ دشوار ہونا۔ عذر اور حجت لانا کسی بات میں عہ لوہا اور وہ چیز جس کو تیز کیا گیا ہو مثل چھری کے۔

کے اوپر سے آتے کہے ہیں اور انزل کا کلمہ بارش کے لئے بھی آیا ہے سو آپکے اس کا استعمال ہونا یہ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپ کی شان بارش کی سی ہے کہ وہ بھی رحمت ہے اور آپ بھی رحمت چنانچہ حدیث میں ہے اَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ لیعنی میں خدا تعالیٰ کی رحمت ہوں جو بندوں کے لئے خدا تعالیٰ کے پاس سے تحفہ کر کے آیا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاصیت بارش کی سی ہے چنانچہ بارش سے حیات ہوتی ہے ارض کی اور آپسے حیات ہوتی ہے قلب کی۔ ایک شعر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ نے ایسے موقع پر پڑھا تھا کہ کسی نے آپسے مسئلہ مولد کے متعلق پوچھا تھا آپنے فرمایا لو ہم مولد پڑھتے ہیں اور یہ شعر پڑھا

تر ہوئی باران سے سوکھی زمیں — یعنی آئے رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِیں

اِس شعر سے میرے اِس مضمون کو اور قوت ہوگئی۔ غرض ذِکْرًا میں آپ کی عظمت کیطرف اشارہ ہے رَسُوْلًا میں متابعت کی طرف کیونکہ مدار متابعت کا رسالت ہے اور اٰمَنُوْا میں محبّت کی طرف کیونکہ ایک آیت میں ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (ایمان والے اللہ تعالیٰ سے شدید محبّت رکھتے ہیں) اور حبّ اللہ اور حبّ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تلازم ہے تو جس طرح ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ کی شدت محبّت لازم ہے اسی طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت محبّت۔ آگے ہے مُبَیِّنَاتٍ یعنی خود ظاہر بھی اور ظاہر کرنے والے بھی آگے ارشاد ہے لِیُخْرِجَ الَّذِیْنَ الخ لیخرج میں لام غایت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیوں بھیجا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس لئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے برکات حاصل کریں اور یہ شبہ نکیا جاوے کہ جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ موصوف ہوگا وہ تو خود ہی خارج مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (ظلمات سے نور کی طرف نکلنے والا) ہوگا پھر ان کے خارج کرنے کے کیا معنی سو مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ظلمت سے نور کی طرف خارج ہوئے ہیں وہ ایمان اور اعمال صالحہ کر کے ہوئے ہیں یعنی یہ برکت ایمان اور اعمال صالحہ ہی کی ہے کہ وہ تاریکی سے نور کی طرف لے آئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپکے پورے حقوق ادا کرنے چاہئیں یعنی ذکر بھی کریں محبت بھی کریں متابعت بھی ادب و تعظیم بھی۔ آگے آیت میں خاصیت ایمان اور اعمال صالحہ کی بیان فرماتے ہیں وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ الخ مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کر کے کیا ملے گا۔ بشارت دیتے ہیں کہ یہ ملیگا یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کا یہ ثمرہ ہے کہ حق تعالیٰ ایسی جنات

میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خالدین میں یہ بتلایا کہ وہ نعمتیں بلا حساب اور بلا انقطاع ہوں گی۔ یہی دو صورتیں کمال نعمت کی ہوتی ہیں کہ نفیس بھی ہو کہ مزیت کیفا ہے اور بلا انقطاع بھی ہو کہ مزیت کما ہے سو یہ جنت میں حاصل ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ کے جملہ حقوق ادا کر کے جنت کی نعمتیں حاصل کریں اور اگر حقوق ادا نہ کیے برائے نام تھوڑی سی تعریف کر لی یا محفل منعقد کر لی اس سے کچھ نہیں ہوتا مثلاً طبیب کی تعریف سے کیا فائدہ جب تک اس سے نسخہ لکھا کر اس کا استعمال نہ کیا جاوے اور اس کے کہنے پر عمل نہ کیا جاوے اور یہ حقوق آپ کے دائمی ہیں تو آپ ایسی بارش کے مشابہ نہیں جو کسی خاص موسم میں ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بارش ہیں کہ جس سے ہمیشہ بہار رہی بہار ہے کبھی خزاں ہی نہیں یہ نہیں کہ ربیع الاول میں تو بہار ہوا اور مہینوں میں نہ ہو۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بہار جو حیات میں تھی وہ اب بھی بحالہ ہے اب میں اس مضمون کے مناسب اس شعر پر اپنے وعظ کو ختم کرتا ہوں ؎

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہار کا دائمی ہونا

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

(وہ ابر رحمت ابھی تک درفشان ہے خم و خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے۔)

محروم ہے وہ شخص جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات حاصل نہ کرے۔ دعا کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نصیب ہو متابعت کی توفیق ہو آپ کی عظمت ہو قلب میں فقط اور اس وعظ کا نام بمناسبت کلمات قرآنیہ کے ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم مناسب ہے اور لقب اس کا بمناسبت آپ کے معنوی برکات کے مشابہ ہیں باران و بہار کے الربیع فی الربیع مناسب ہے۔ (پھر دعا کر کے جلسہ ختم کیا۔)

الحمد للہ کہ وعظ ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ملقب بہ الربیع فی الربیع چھپ کر تمام ہوا۔ اس کے علاوہ حضرت مرشدنا و مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دیگر مواعظ و تصانیف اور دوسری کتب دینیہ و قرآن شریف وغیرہ پتہ ذیل سے طلب فرمائیے۔

؎ فی القاموس ارتع یرتع نما و زاد و فیہا الربیع الخصیب فی الحدیث غیثا مغیثا مریئا مریعا و قیل یفی فی وصف المطر مربع النبات فی اللمعات مریعا ای آتیا بالربیع والخصب ویقال امرعت الارض اخصبت ویروی مربعا بضم المیم وکسر الیاء ای ینبتہا للربیع آہ فالمریع یستعمل مفعولا مجردا او فاعلا مزیدا من الربیع او فعیلا من المرع و بینہما اشتقاق و بہ ظہر وجہ التقلیب ۱۲ منہ

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

الوعظ

مسمّٰی بہ

اَلشَّرِیْعَۃُ

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ـ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ ـ بندر روڈ کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وعظ مسمّٰی بہ

اَلشَّرِیۡعَۃ

این	متی	کم	کیف	لماذا	من انتفع	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس ہیئت سے ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کے لئے زیادہ مفید تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
مطبع نظامی ٹپکاپور کانپور	۱۸ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ یوم یکشنبہ	۳ گھنٹہ ۳۵ منٹ	کھڑے ہو کر	وجوب اتباع شریعت بدلائل عقلی و نقلی	جدید تحریکات والوں کے لئے زیادہ مفید تھا	احمد عبد الحلیم لکھنوی	۵۰۰	مجمع رجال و نساء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہ ثُمَّ جَعَلۡنٰکَ عَلٰی شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡھَا وَلَا تَتَّبِعۡ اَھۡوَآءَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ہ اِنَّھُمۡ لَنۡ یُّغۡنُوۡا عَنۡکَ مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ط وَاِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ بَعۡضُھُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ج وَاللّٰہُ وَلِیُّ الۡمُتَّقِیۡنَ ہ ھٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَھُدًی وَّرَحۡمَۃٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ○ (پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا سو آپ اسی طریقہ پر چلے جایئے۔ اور ان جاہلوں کی خواہشوں پر نہ چلئے۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے۔ اور ظالم ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دوست ہے نیک لوگوں کا یہ قرآن عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت ہے۔)

یہ چند آیتیں ہیں سورۂ جاثیہ کی اِن میں حق تعالیٰ نے ایک نعمت کا ذکر فرمایا ہے جو
عطا کی گئی ہے اوّلاً بالذات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً وبالتبع
حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کو۔ اور چونکہ اِس نعمت کو نعمت نہیں سمجھا جاتا بلکہ
بجائے نعمت کے مصیبت وکلفت سمجھا جاتا ہے اِس لئے اِس وقت اس کا اختیار
کرنا ضروری ہوا۔ اب یہاں تک مذاق بگڑا ہوا ہے کہ اتنی بڑی نعمت کی قدر نہیں بلکہ
اِس کو مصیبت اور کلفت سمجھ کر اِس سے بچنے کی فکر ہے جیسے کوئی مریض دوا کو مصیبت
سمجھے اور اس سے بڑھ کر ناشکرا وہ ہے جو غذائے لطیف کو مصیبت سمجھے اِس کو ایک
اچھی اور لطیف غذا دی جاتی ہے اور وہ اس سے منہ بند کرتا ہے تو ایسے شخص کے
اعتقاد کو درست کرنا اور خیال کی اِصلاح نہایت ضروری ہے۔ وہ نعمت کیا ہے
جسے کلفت سمجھا جاتا ہے وہ شریعت ہے جو اسی عنوان سے اِس آیت میں مذکور ہے
اور باعتبار اختلاف احوال مکلفین کے اس کے دو درجے ہیں دوا اور غذا اور دونوں
میں کوئی تعارض نہیں بلکہ ایک ہی چیز ہے جو بعض کے اعتبار سے دوا ہے اور دوسری ۳
بعض کے اعتبار سے غذا۔ اور غذا تو نعمت ہوتی ہی ہے مگر دوا بھی واقع میں نعمت ہے
کیونکہ مریض کے حق میں دوا ہی ذریعہ ہے غذا کا کیونکہ دوا کا مقصود مریض کے لئے
یہی ہے کہ نعمتوں کا نعمت ہونا اس کو محسوس ہو موٹی بات ہے کہ ایک کو دودھ ہضم
نہ ہوتا ہو یا گوشت ہضم نہ ہوتا ہو اور ان میں لذت اور قوت اور فرحت سب ہے
مگر ایک شخص کو فساد معدہ کی وجہ سے ہضم نہیں ہوتا تو اس کی کیا تدبیر کی جاویگی
اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ خوب کھاوے اور دست آویں یہ مذاق ہے وہ جو یہ
تدبیر کرے۔ ہمارے وطن میں ایک بوڑھے تھے کھاتے جاتے اور قے کرتے جاتے اور
منہ صاف کر کے پھر کھاتے حالانکہ اس کی یہ تدبیر نہ تھی بلکہ اُن کو دوا سے اپنی اصلاح
کرنا چاہیے تھی تو ایسے شخص کے حق میں دوا بھی نعمت ہے۔ اِسی طرح شریعت بعض
کے اعتبار سے دوا ہے مگر چونکہ ذریعہ غذا کا ہے اِس لئے اُس کے حق میں بھی نعمت ہے
اور جن کے حق میں غذا ہے اس کا نعمت ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ اب سمجھنا چاہیئے کہ

شریعت دوا کس کے حق میں ہے اور غذا کس کے حق میں سو دوا تو اس کے حق میں ہے جو ابھی کلفتِ مجاہدہ میں ہے اور لوگ اس مجاہدہ ہی سے گھبراتے ہیں اور جو اس کا قصد بھی رکھتے ہیں وہ منتظر بوڑھاپے کے ہیں حالانکہ اس وقت آدمی قریب قریب معطل ہوجاتا ہے پھر اخلاق ذمیمہ جو شباب میں راسخ ہوچکے ہیں وہ جدا مزاحمت کرتے ہیں کیونکہ جو خصلتیں جوانی میں جم چکی ہیں وہ بڑھاپے میں بھی نہیں جاتیں مگر پھر بھی لوگ کہا کرتے ہیں کہ جوانی میں کھانے پینے کے دن ہیں جب بڑھاپا آئیگا تو اللہ اللہ کریں گے یہ غلطی ہے دو وجہ سے اوّل تو جس چیز کی عادت جوانی میں نہ ہو وہ بڑھاپے میں یوں بھی نہیں ہوسکتی دوسرے بڑھاپے میں قوت وہمت نہیں رہتی کسل بڑھ جاتا ہے مشکل سے ٹھیل ٹھیل کے اُٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے فرض نماز کے لیے مشکل سے اُٹھا جاتا ہے ایک بزرگ کہتے تھے کہ یہ قول کہ ؎

دریغا کہ عمر جوانی گئی ۔۔۔۔ جوانی گئی زندگانی گئی

۶ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زندگانی کیونکر گئی کیونکہ بڑھاپا آنے سے اور آرام سے بیٹھے رہتے ہیں لڑکے بالے یا نوکر چاکر پنکھا جھل رہے ہیں پاؤں دبا رہے ہیں مگر جب بڑھاپا آیا تو واقعی سمجھ میں آگیا کہ جوانی گئی زندگانی گئی کیونکہ نہ کھانے کی حلاوت نہ پینے کا مزہ نہ سونے کا چین نہ جاگنے کا لطف اگر دماغ میں یبوست غالب ہے تو سب لوگ سو رہے ہیں یہ رات بھر اختر شماری میں مشغول ہیں نیند ہی نہیں آتی اور اگر رطوبت غالب ہے، تو ہر وقت آنکھیں بند ہیں اونگھ رہے ہیں اُٹھنا چاہتے ہیں مگر اُٹھا نہیں جاتا پھر اس کے علاوہ کہیں ناک میں درد ہے کہیں کان دکھتا ہے کبھی ٹانگ میں درد ہے کبھی برسات کی ہوا لگ کر کمر میں درد ہے جیسے مولانا رومیؒ نے ایک بوڑھے کی حکایت لکھی ہے کہ وہ ایک طبیب کے پاس گیا اور اُس نے کہا کہ میرے سر میں درد ہے طبیب نے کہا کہ بڑھاپے سے اُس نے کہا کہ زکام بھی ہے اُس نے کہا بڑھاپے سے اُس نے کہا کہ بلغم بھی سینہ پر جما ہوا ہے اُس نے کہا یہ بھی بڑھاپے سے ہے اُس نے کہا کھانا بھی اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا اُس نے کہا یہ بھی بڑھاپے سے

غرض اس بوڑھے نے جو کہا اس کے جواب میں طبیب نے یہی کہا کہ یہ بھی بڑھاپے سے ہے یہ سن کر وہ بوڑھا بہت غصّہ ہوا اور ایک دھول ماری طبیب کے تیری طب میں یہی رہ گیا ہے کہ بڑھاپے سے اُس نے کہا کہ میاں صاحب میں تمہاری اس دھول مارنے کا بُرا نہیں مانتا تم معذور ہو یہ بھی بڑھاپے سے ہے واقعی طبیب کامل تھا کہ سمجھ گیا کہ یہ ناحق کا غصّہ بھی بڑھاپے ہی سے ہے بہرحال یہ تو زندگانی کا لطف گیا اور وہ جو جوانی میں لوگوں کے دلوں میں وقعت تھی باستثناء اہل اللہ کے وہ بھی چلی گئی کیونکہ ان کی دوستی سچ مچ کی دوستی ہے کیونکہ وہ محض دین کی وجہ سے ہوتی ہے اور روں کی دوستی محض اغراض کی وجہ سے ہے جب بڑھاپا آیا تو بڑے میاں اپنی ہی اغراض پورے نہیں کرسکتے تو اوروں کے کیا پورے کریں گے تو جب واسطہ نہیں رہا تو دوستی بھی ختم ہوگئی اور اہل اللہ کو جو مستثنیٰ کیا ہے مراد اس سے وہ ہیں جو واقع میں اہل اللہ ہیں اور جو واقع میں اہل اللہ نہیں اور اپنے کو صورت بں اہل اللہ کی پیش کرتے ہیں ان کی دوستی تو دنیا داروں سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہ دعویٰ کرتے ہیں تقدس کا پھر ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں بعض تو خود اپنے کو غلطی سے اہل اللہ سمجھ رہے ہیں مگر واقع میں وہ اہل اللہ نہیں ہیں اور ان کی غلطی کی بناء یہ ہے کہ چار جاہل عوام معتقد ہوگئے اور انھوں نے حضور حضور مولانا مولانا شاہ صاحب شاہ صاحب کہنا شروع کردیا تو یہ سمجھے کہ میں بھی کچھ ہوں گا جب ہی تو یہ معتقد ہوئے ہیں کیونکہ جو معتقد ہوئے ہیں وہ پاگل تو ہیں نہیں کچھ سمجھ ہی کے معتقد ہوئے ہیں سُبحان اللہ اچھا اِستدلال ہے اگر مخلوق کی عقیدت پر دارو مدار ہے بزرگی کا تو کیوں صاحب سب ہی تو معتقد نہیں ہیں غیر معتقدین بھی تو ہیں ان کی بداعتقادی سے کیوں نہ استدلال کیا جائے سچ یہ ہے کہ نہ خوش اعتقادی کوئی چیز ہے نہ بداعتقادی ضابطہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کے ساتھ اپنا معاملہ کیسا ہے اگر خدا تعالےٰ کے ساتھ معاملہ اچھا نہیں ہے تو ساری دنیا کا غوث و قطب کہنا کوئی چیز نہیں غرض عوام کا

اعتقاد کچھ نہیں ہے

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

چند جاہلوں کے معتقد ہونے سے عیسیٰ نہیں ہو سکتے اگر کچھ ہے تو کسی صاحبِ نظر کو دکھلاؤ اگر وہ تصدیق کر دے تو ٹھیک ہے ورنہ محض جہلاء کے اعتقاد سے کچھ نہیں ہوتا جہلاء کا اعتقاد کاہے پر ہے تو ان کا اعتقاد تو اس پر ہے کہ جو ہماری مرضی کے موافق ہو وہ ٹھیک ہے اور جو مرضی کے خلاف ہو تو فیہ کلام جب ان کا یہ مدار اعتقاد ہے تو اس فکر میں پڑنا ہی لاحاصل ہے مخلوق تو ہزاروں ہی اور ہر ایک کی خواہش دوسرے کے معارض تو پھر کس کو کس کو راضی کرے۔ ہمارے حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک شخص تھا اس کے پاس ایک ٹٹو تھا اور بیوی بچے اور کنبہ رکھتا تھا اس کو سفر پیش آیا اس نے تجویز کی کہ ایک جانور ہے اور کتنے سوار ہیں باری باری سب مل کے چڑھتے اُترتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ پہلے وہ خود سوار ہوا اور اپنے سیانے لڑکے کو ۶
اور بیوی کو پیادہ لے کے چلا چلتے چلتے ایک گاؤں میں گذر ہوا گاؤں والوں نے اُسے سوار دیکھ کر کہا کہ تجھے سوار ہوتے شرم نہیں آتی کہ بچہ پیادہ اور عورت جو قابل رحم ہے وہ پیادہ اور ہٹا کٹا ہو کے سوار ہے اُس نے کہا بات تو ٹھیک ہے بس خود اُتر پڑا اور بیوی کو سوار کر دیا دوسرے گاؤں میں پہونچا گاؤں والوں نے دیکھ کے کہنا شروع کیا کہ جورو کا غلام ہے کہ سائیس کی طرح گھوڑے کی رسی پکڑے چلا جا رہا ہے ارے کمبخت تجھ پر کیا مار آئی تو نے اپنا وقار کیوں کھویا اُس نے کہا یہ بھی سچ ہے آؤ ابکی سب مل کے سوار ہوں چنانچہ وہ اِس حالت میں ایک تیسرے گاؤں میں پہونچا وہاں لوگوں نے کہا کہ ارے کیسا ظالم ہے کہ جانور پر سب کو ایک دم سے لاد دیا ہے ارے ایک دفعہ گولی مار دے ترسا ترسا کے مارنے سے کیا فائدہ اُس نے کہا یہ بھی معقول فرداً فرداً بھی بیٹھ چکے عورت کو بھی تنہا سوار کر چکے سب مل کے بھی بیٹھ چکے اب صرف یہی اِحتمال باقی ہے کہ

کوئی بھی سوار نہ ہو چنانچہ سب مل کے پیادہ پا چلے اب پانچویں گاؤں پر گذر ہوا وہاں لوگوں نے اس حالت کو دیکھ کے کہا دیکھی ناشکری خدا تعالیٰ نے سواری بھی دی تو اس کی قدر نہیں ارے اگر ایک سواری تھی تو سب مل کے باری باری چڑھتے اُترتے چلے جاتے اُس نے کہا کہ اب کسی طرح الزام سے نہیں بچ سکتے اب وہی کرو جو اپنے جی میں آوے اور کسی کے کہنے کی پروا مت کرو بس پھر وہ سب اُترتے چڑھتے چلے گئے تو خدا تعالیٰ نے اُسے اِس تجربہ سے عقل دیا ہی کہ وہی کرو جس میں راحت ہو اور کسی کے طعن و تشنیع کی پروا مت کرو جیسے بزرگوں پر کفر تک فتوے لگتے ہیں اور وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور کسی کے کہنے کی پروا نہیں کرتے۔ امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند — آرے آرے میکند با خلق عالم کار نیست

ہاں بھائی بُت پرستی کرتا ہوں تمہارا اجارہ ہے؟ میں کہتا ہوں ہم تو کیا ہیں خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہو سکتا ہے ؏ ۷

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

سارے کمال آپ میں موجود اور کوئی صفت ایسی نہیں جو علیٰ وجہ الکمال آپ میں موجود نہ ہو اور اُس کو مخالفین نے بھی تسلیم کیا تھا چنانچہ بہت جگہ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۔ اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۠ آپ کو اِس طرح پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو دوسری آیت میں بطور استفہام انکاری کے فرمایا ہے کہ کیا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانا جو اس کا انکار کرتے ہیں مطلب یہ کہ باوجود پہچان لینے کے اِنکار کرتے ہیں۔ غرض سب اچھی طرح جانتے تھے اور اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے چنانچہ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں کفار نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا ایک جگہ اونٹ ذبح ہوا تھا اس کی اوجھڑی پڑی تھی تو آپس میں مشورہ کیا کہ کون شخص یہ اوجھڑی سجدے کی حالت میں آپ پر لاکر رکھ دے روایت میں ہے

فقام اشقی القوم یعنی جو سب سے زیادہ شقی اور بدبخت تھا وہ تیار ہو گیا۔ کفر میں بھی درجے ہوتے ہیں کوئی مڈل کوئی انٹرنس اور کوئی ایف۔اے اور کوئی بی۔اے تو ان میں جو سب سے بڑا کافر تھا یعنی بی۔اے تھا اُس نے کہا میں جاؤں گا چنانچہ وہ گیا اور اوجھڑی اُٹھا لایا اور اسے کمر مبارک پر رکھ دی آپ سجدے ہی میں پڑے رہے کہ اتنے میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آئیں اور اس اوجھڑی کو ہٹایا اور کفار کو خوب خوب کہا اور کوری کوری سُنائیں اور آپ نے بھی نماز کے بعد بد دُعا شروع کی یا تو وہ اس حرکت پر آپس میں ہنستے تھے اور مضحکہ کرتے اور مذاق اُڑاتے تھے جیسے اوباشوں کی عادت ہوتی ہو جب بد دعا کے کلمات سُنے تو سب کا رنگ فق ہو گیا ساری ہنسی بھول گئے کیونکہ یہ یقین تھا کہ جیسا فرما رہے ہیں ویسا ہی ہو گا ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

۸ (آپ کا فرمان گویا فرمودۂ خدا ہے اگرچہ وہ فرمان ایک اللہ کے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے ادا ہوا ہے)

تو غرض اتنے تو معتقد مگر زبان سے آپ کو مجنون کاہن شاعر ساحر وغیرہ ناشائستہ الفاظ سے یاد کرتے تھے گو دل میں وہ آپ کو سچا سمجھتے تھے مگر زبان سے تو یہ کہتے تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ معاملہ ہوا تو اور کوئی کیوں یہ توقع کرے کہ وہ طعن و تشنیع سے بچ جائے گا۔ غرض بعض مصنوعی اہل اللہ تو دھوکہ میں ہیں کہ انھیں شبہ ہے کہ ہم بھی بزرگ ہیں اور ہوتے ہیں وہ اہل دنیا اور بعض خود دھوکہ میں نہیں مگر دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں تو ان سب کی دوستی بھی محض دنیا ہی کے واسطے ہوتی ہے غرض بہت کم لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کے واسطے محبت کرتے ہیں اور یہ محبت کبھی زائل نہیں ہوتی اعتقاد تو جاتا رہے مگر محبت رہتی ہے اِس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بدمعاش لڑکا ہو اور باپ اسے ایک عرصہ تک نیک چلن سمجھتا رہا اور اس کی نیک چلنی پر اس کا اعتقاد تھا مگر اب کسی وجہ سے اُسے اس کی بدمعاشی کا علم ہوا تو دیکھئے اعتقاد

توجاتا رہا مگر محبت باقی ہے بلکہ اس وقت تو کچھ فکر نہ تھی اور اب اور فکر بڑھ گئی کہ
ہائے یہ بگڑ گیا چاہتے ہیں کہ یہ درست ہو جاوے اس کے لئے کہیں بزرگوں سے
دعا کرا رہے ہیں کہیں تعویذ لکھوا رہے ہیں کہیں عزیزوں اور دوستوں سے مشورہ
کر رہے ہیں کہ اس کی درستی کے لئے کیا تدبیر کی جاوے ۔ یہی حالت ہو حب فی اللہ
کی کہ محبوب بگڑ بھی جاوے تب بھی محبت باقی رہتی ہے بلکہ اس حالت میں اور
بڑھ جاتی ہے ورنہ کیا پڑی ہو کہ اس کے لئے دعا کرے یا اہتمام کرے ۔ بس اس
معیار پر دیکھ لیجئے کہ محبت خدا تعالیٰ کے لئے ہے یا اپنی اغراض کے لئے تو جن کو
محبت اغراض کے لئے ہوتی ہے تو ایسے لوگ جوانی تک دوست رہتے ہیں
اور جب بڑھاپا آیا تو اب جانتے ہیں کہ بڑے میاں سے اب کام نہیں نکل سکتا
توسب نے چھوڑ دیا بلکہ یہ خود غرضی یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے مال میں
تصرف کرتا ہے تو ورثہ کو یہ بھی ناگوار ہوتا ہے اور اولاد اور بیوی بھی ناک بھوں
9 چڑھاتی ہو کہ جتنا کم خرچ ہو اتنا ہی اچھا کہ ہمارے لئے بچ جاوے گا بلکہ بعض جگہ
جہاں معذور ہو جاتے ہیں مثلاً اندھے ہو گئے تو اس وقت نوکر چاکر بھی پروا
نہیں کرتے یہ پکارتے ہیں اور وہ سنتے ہیں مگر جواب نہیں دیتے کہ یہ ہمارا کیا
کرلیں گے اور ہنستے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اب احتمال نہیں ہے جوانی آنے کا
جو بدلہ لیں اب وارثوں کی خوشامد کرتے ہیں کہ ان سے سابقہ پڑنے والا ہے
تو غرض بعض اپنے مال سے بھی بڑھاپے میں منتفع نہیں ہوسکتے تو کیا آپ اس
بڑھاپے کے منتظر ہیں میاں بڑھاپا آئے گا تم اس وقت کام ہی کے نہیں رہوگے
اور جوانی میں طاعات کرنے میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ جب جوانی میں طاعات
کا خوگر ہو جاویگا تو بڑھاپے میں عادت کی وجہ سے آسانی ہو جاوے گی اسے
تو ہر شخص عقل سے سمجھ سکتا ہے دوسری بات یہ کہ جب بڑھاپا اتنا آجاوے کہ
کچھ نہ کرسکے اس کے لئے حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص صحت کی حالت میں
نیک عمل کرتا ہو اور مرض میں نہ کرسکے یا حالتِ اقامت میں کرتا ہو سفر کی وجہ

سے نہ کر سکے تو فرشتوں کو حکم کیا جاتا ہے کہ اس حالت میں بھی عمل پورا لکھنا یہاں تو پنشن آدھی دی جاتی ہے اور وہاں پوری پنشن دی جاتی ہے بلکہ اور ایک ضمیمہ بھی اس پنشن کے ساتھ ملتا ہے وہ کیا ہے وہ عمل نہ کرنے کی حسرت کا اجر کہ پڑے سو رہے ہیں اور سبحان اللہ سبحان اللہ کا ثواب لکھا جا رہا ہے یہ جوانی کے عمل کی برکت ہے ورنہ یہ ثواب کیسے ملتا یہ دلیل نقلی سے معلوم ہوا غرض دلیل سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ جوانی کے عمل سے بوڑھاپے کا تدارک ہو سکتا ہے تیسری بات ذوقی عارفین کے سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اعمال میں ایک برکت خاصہ ہے جس سے قلب میں نور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نور وہی ہے جس کے لئے تہجد کے وقت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا اے اللہ میرے قلب میں نور پیدا کر دے وَفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا اور میرے کانوں میں نور پیدا کر دے وَفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا اور میری آنکھوں میں نور پیدا کر دے وَفِیْ مُخِّیْ نُوْرًا اور میرے
گودے میں نور پیدا کر دے وَفِیْ عَظْمِیْ نُوْرًا اور میری ہڈیوں میں نور پیدا کر دے ۱۰
وَفِیْ شَعْرِیْ نُوْرًا اور میرے بالوں میں نور پیدا کر دے وَفِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا اور میری رگوں اور پٹھوں میں نور پیدا کر دے وَفِیْ لَحْمِیْ نُوْرًا اور میرے گوشت میں نور پیدا کر دے وَفِیْ دَمِیْ نُوْرًا اور میرے خون میں نور پیدا کر دے اور یہاں تک کہ اَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا بڑھا اس نور کو میرے لئے وَاجْعَلْنِیْ نُوْرًا مجھے سراپا نور کر دے وَاجْعَلْ مِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا اور میرے اوپر نور کر دے وَاجْعَلْ مِنْ تَحْتِیْ نُوْرًا اور میرے نیچے نور کر دے وَعَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا میرے داہنے نور کر دے وَعَنْ شِمَالِیْ نُوْرًا اور میرے بائیں نور کر دے۔ اسی کا ترجمہ مولانا رومیؒ نے کیا ہے ؎

نور او در یمین و یسر و تحت و فوق   بر سر و بر گردنم مانند طوق

(اس کا نور دائیں بائیں نیچے اوپر ہر طرف ہے جیسے گلے کا ہار گردن کو گھیرے ہوتا ہے)

وہ نور لالٹین کی روشنی نہیں بلکہ ایک کیفیت خاصہ ہے کیونکہ حقیقت

نور کی یہ ہے کہ ظَاهِرٌ لِنَفْسِهٖ وَمُظْهِرٌ لِغَیْرِهٖ یعنی خود بھی ظاہر ہو اور دوسری کو بھی ظاہر کردے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ تعالیٰ نور دینے والے ہیں آسمانوں اور زمین کا) میں بھی نور کے یہی معنی ہیں نور کے معنے چمک دمک نہیں ہیں تو یہ ہوئی نور کی حقیقت کہ خود بیّن ہوتا ہے اور دوسرے حقائق کو بیّن کر دیتا ہے اور قلب کے اندر اس نور کے پیدا ہونے سے ظلمت دفع ہوتی ہے کونسی ظلمت ظلمت کسل کی ظلمت کینہ کی ظلمت حسد کی ظلمت کبر کی ظلمت غصہ کی ظلمت معصیت کی وغیرہ وغیرہ اور اس کے اندر نشاط تازگی شگفتگی اور فرحت پیدا ہو جاتی ہے تو ایسا شخص بڑھاپے میں بھی نکمّا نہیں ہوتا حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص دوامًا تلاوتِ قرآن کرتا ہے بڑھاپے میں اس کے حواس خراب نہیں ہوتے بڑھاپے میں، عموماً حواس خراب ہو جاتے ہیں اس سے بچنے کی تدبیر تلاوتِ قرآن ہے اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ باوجود بڑھاپا آجانے کے بھی ان کے حواس قائم رہتے ہیں جیسے مولانا فضل الرحمٰن صاحب ۱۱
قدس سرہٗ کہ سو برس سے سن متجاوز تھا مگر حواس ویسے ہی تھے یہ سب تلاوت قرآن کی برکت تھی اسے عقلاء نہیں جانتے اہل اللہ جانتے ہیں کہ راز اس میں کیا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

خود قوی تر میشود خمرِ کہن خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب کی تیزی خود بڑھ جاتی ہے خصوصاً اس شراب کی جو من جانب اللہ عطا ہوئی ہو)

یعنی پرانی شراب تیز ہو جاتی ہے تو یہ بوڑھے میاں پہلے سے بھی تیز ہو جاتے ہیں اس میں راز یہ ہے کہ وہ اس وقت اہل مشاہدہ ہیں اور مشاہدہ کے معنے توجہ تام کے ہیں یہ توجہ ہی وہ حظ ہے کہ بڑھاپے کا بھی ضعف نہیں معلوم ہوتا جیسے ایک بوڑھا آدمی ہو اور وہ مَر رہا ہو اس نے اپنے بیٹے کو جو کہیں سفر میں ہے خط لکھا کہ تم فوراً چلے آؤ اور بیٹا آگیا تو بڑے میاں کا یہ حال تھا کہ کروٹ بھی کوئی اور بدلوائے یا بیٹے کی صورت دیکھتے ہی فرطِ خوشی سے چارپائی پر سے

خود بخود اُٹھ بیٹھے تو جب بیٹے کے مشاہدہ میں یہ اثر اور قوت ہے تو محبوب حقیقی کے
مشاہدہ میں یہ اثر کیسے نہ ہوگا بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگا اسی کو عارف شیرازیؒ
فرماتے ہیں ؎

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(اگرچہ میں بوڑھا اور کمزور و ناتواں ہوگیا ہوں لیکن تیری صورت دیکھتے ہی جواں ہوجاتا ہوں)

بس یہ حالت ہوتی ہے کہ کسل اور سستی نہیں رہتی یہ اثر تو شباب میں طاعت
کرنے کا عاجل میں ہے اور آجل میں یہ اثر ہے کہ حدیث میں ہے شاب نشأ فی
طاعۃ اللہ یعنی جس کی جوانی کا نشو و نما خدا تعالےٰ کی طاعت میں ہوا وہ قیامت
کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا اس روز دھوپ اس شدت کی ہوگی کہ بھیجے
پکنے لگیں گے زمین تانبے کی ہوجائے گی یعنی جس طرح تانبا فوراً گرمی کو قبول
کرلیتا ہے اور مٹی دیر میں اور کم گرمی کو قبول کرتی ہے تو زمین یا وجود مٹی کے
۱۲ تانبے کی سی ہو جائے گی کہ تپنے لگے گی اور آفتاب سوا نیزہ پر آجاویگا یعنی بالس
برابر سر سے اونچا ہوگا یعنی زمین کی قابلیت و انفعال بڑھ جائے گی اور
آفتاب کی فاعلیت بڑھ جائے گی تو اس وقت کیا حال ہوگا گرمی کا دیکھو
اس وقت کتنی دور ہے حکماء تو کہتے ہیں کہ چوتھے آسمان پر ہے اور اس پر کچھ
دلائل بھی پیش کرتے ہیں مگر ان کے مقدمات مخدوش ہیں جن سے یہ حکم کرنا
بناء الفاسد علی الفاسد ہے اور شریعت نے کوئی اس کا فیصلہ نہیں کیا مگر
بظاہر نصوص سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب پہلے آسمان پر ہے گو کوئی دلیل
محکم اس پر بھی نہیں بہرحال پہلے آسمان پر ہو تب بھی بہت دور ہوا کہ پانچسو
برس کی راہ ہے تو اتنے بُعد پر بھی دیکھ لیجئے تھوڑی سی دھوپ میں کیا حال
ہوتا ہے تو اس روز جبکہ قرب کے سبب آفتاب کی فاعلیت اور زمین کی قابلیت
بڑھ جائے گی گرمی کی شدت کا کیا حال ہوگا پھر کوئی بچاؤ بھی نہ ہوگا لَا تَرٰی
فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا کہ وہاں نہ ہمواری ہوگی نہ کوئی ٹیلہ ہوگا نہ کوئی چھت یا

دیوار ہوگی کہ اُسی کے سایہ میں بیٹھ جائیں ایسے وقت میں سایہ کی کتنی قدر ہوگی تو ایسی بڑی نعمت کی (جس کی بدولت عرش کا سایہ تمہارے قبضہ میں ہے) قدر نہیں جانتے افسوس کہ تم اپنی قدر نہیں جانتے کہ تم کیا ہو نفس وشیطان کے پنجہ میں پھنس کر اپنی قدر کھو دی تم وہ ہو کہ عرش بھی تمہارے قبضہ میں ہے بایں معنی کہ ایسی تدبیریں تمہارے ہاتھ میں ہیں کہ ان سے عرش کا سایہ تم کو مل سکتا ہے حدیث شریف میں چند اعمال کا ذکر ہے ان میں یہ بھی ہے کہ وہ جوان جس نے طاعۃ اللہ میں نشوونما پایا قیامت کے روز اُسے عرش کا سایہ ملے گا تو اس جوانی کی یہ فضیلت ہے کہ اس کے واسطے عرش کا سایہ نصیب ہوا غرض ایسی نعمت ہے جوانی جسے تم اِس میدانِ اُمید میں برباد کر رہے ہو کہ جب بڑھاپا آئے گا عمل کرلیں گے خوب سمجھ لو کہ جب تم سے جوانی میں نہ ہوا تو بڑھاپے میں کیا ہوگا اور اگر فرض کیجئے ہمت کر کے کیا ہی تو یہاں دو چیزیں ہیں ایک عمل اور ایک
اس کی روح ۔ روح کیا ہے وہ طمانیت ہے جس سے قلب کو حلاوت اور راحت ۱۳
ہوتی ہے یہ وہ چیز ہے کہ اعمال کی بھی روح ہے اور اموال کی بھی روح ہے اِس وجہ سے کہ دوکان کھولنے کارخانہ کھولنے اور جائداد حاصل کرنے سے مطلب کیا ہے یہی تاکہ راحت سے زندگی بسر ہو تو اصل سب کی چین ہوا لیکن افسوس ہے کہ جس طریق سے تم اعمال کرتے اور اموال حاصل کرتے ہو اس سے چین نہیں حاصل ہوگا ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی　　کایں رہ کہ تو میروی بترکاں ست

جس رستہ پر تم جا رہے ہو مجھے اُمید نہیں کہ اس سے کعبہ پہونچو کیونکہ یہ راستہ کعبہ کا نہیں ترکستان کا ہے اِسی طرح وہ لوگ اموال و متاع کے ذریعہ سے چین حاصل ہونے کے خیال سے اس کے بڑھانے کی فکر میں منہمک رہتے ہیں حالانکہ مال کی خاصیت ہے کہ جوں جوں بڑھتا ہے پریشانی بڑھتی ہے ہر وقت ادھیڑ بن رہتی ہے کہ اور بڑھے یا گھٹنے نہ پائے اہلِ عرفان کا

قول ہے ؎

وَمَنْ یَحْمِدُ الدُّنْیَا لِعَیْشٍ یُسُرُّہٗ　　فَسَوْفَ لَعَمْرِیْ عَنْ قَلِیْلٍ یَلُوْمُہَا

جو شخص کسی مسرت بخش عیش دنیا کی مدح کر رہا ہے وہ عنقریب اس کی مذمت کریگا ابھی حس جاتی رہی ہے جب حس ہوگی تو معلوم ہوگا۔ ابھی دو حالتیں ہیں دنیا کی ایک بڑھنا ایک گھٹنا دونوں حالتوں کے متعلق خوب کہا ہے ؎

اِذَا اَدْبَرَتْ کَانَتْ عَلَی الْمَرْءِ حَسْرَۃً　　وَاِنْ اَقْبَلَتْ صَارَتْ کَثِیْرًا ھُمُوْمُہَا

دنیا جاتی ہے تو حسرت کو اپنی جگہ چھوڑ جاتی ہے اور آتی ہے تو پریشانیوں کو ساتھ لاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کو چھوڑ دو مطلب یہ ہے کہ اس میں روح پیدا کرلو وہ تدبیر کرو جس سے روح پیدا ہو وہ تدبیر روح پیدا ہونے کی میں بتادوں گا۔ یہ تو ثابت ہوچکا ہے کہ روح اعمال واحوال کی یہ ہے کہ قلب کو چین ہوجاوے۔ اب یہ ثابت کرنا رہ گیا کہ یہ کاہے سے ہوا کرتا

۱۴ ہے اسے دلیل کے قبل تجربہ سے بتلاتا ہوں کہ بڑھاپے میں جس چیز سے چین ہوتا ہے وہ جوانی کا عمل ہے شیخ عبدالحق محدث رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر تم کو یہ منظور ہو کہ بڑھاپے میں آسودہ رہو تو جوانی میں گناہوں کو چھوڑ دو خصوص دو چیزوں کو ایک حسن پرستی اور دوسرے خوش آوازی میں مشغول ہونا ان دونوں سے بالخصوص بہت بچو ورنہ بڑھاپا آوے گا اور قلب میں بےچینی پیدا ہوگی اور یہ بات کیوں پیدا ہوگی اسے ہم نہیں جانتے وہ تجربہ کا دعویٰ کرتے ہیں جیسے شیخ سے عقیدت ہو وہ ان کی پکائی ہوئی کھاوے ورنہ خود پکاوے۔ اب تجربہ کے بعد دلیل سے کہتا ہوں کہ چین کی تدبیر کیا ہے مسئلہ عقیدت ہے کہ چین قلب کے متعلق ہوتا ہے جوارح کا چین بھی دراصل قلب کا چین ہے کیونکہ ہاتھ پاؤں اور ڈیل میں درد ہو تو قلب بےچین ہوتا ہے نہ کھانے میں مزہ آتا ہے نہ دریا کی سیر میں لطف آتا ہے غرض کسی چیز میں دل نہیں لگتا تو چین کیا ہوا قلب کا سکون یعنی دل کا قرار پاجانا اور چین کا مقابل

ہے بیچینی جب چین سکون ہوا تو بیچینی بے سکونی ہوئی اور بے سکونی حرکت ہوئی
کیونکہ حرکت سکون کے مقابلہ میں ہے تو سکون اور چین انقطاعِ حرکت کا
نام ہوا اور انقطاع حرکت کب ہوتا ہے جب کوئی چیز اپنے مرکز پر پہونچ
جائے کیونکہ حرکت مرکز پر پہونچنے کے لئے ہوتی ہے مثلاً ڈھیلے کا مرکز زمین
ہے اگر اس کو اُچھال دو تو وہ پھر بلندی سے پستی کی طرف رجوع کرے گا
کیونکہ پستی اور زمین اس کا مرکز ہے اور اس وقت تک حرکت کرتا رہیگا
جب تک زمین تک جو اس کا مرکز ہے نہ پہونچ جاوے اور بیچ میں کوئی
مکان دیوار یا چھت اسے روکنے والی ہے تو رُک جائے گا مگر تقاضا یہی
رہے گا کہ کسی طرح نیچے اُترے چنانچہ جب یہ حجاب زائل ہوجاویگا فوراً
اُتر آوے گا تو جو ڈھیلے زمین پر نہیں ہیں وہ بیچ میں ہوتے ہیں دیکھو پتھر
کو زمین سے اُٹھاؤ تو وزنی معلوم ہوتا ہے یہ وزن کیا ہے اصل میں یہ تقاضا
ہے کہ مرکز سے نہ اُٹھاؤ کیونکہ جب ہاتھ سے چھوٹتا ہے وہیں پہنچ جاتا ہے اور 15
مرکز کیا ہے جہاں قرار ہو اب قلب کا مرکز دیکھئے کیا ہے سو مرکز کے دو
مرتبے ہیں ایک حسی ایک معنوی حسی تو مشاہدہ سے متعین ہوجاتا ہے اور
معنوی خاصیت سے معلوم ہوگا سو مرکز کی خاصیت ہے محبوبیت یعنی مرکز مطلوب
کو کہتے ہیں چنانچہ مطلوب ڈھیلے اور پتھر کا زمین ہے اسی طرح جو قلب کا محبوب
ہوگا وہ قلب کا مرکز ہے اور محبوب کون ہوتا ہے جس سے مناسبت ہو
تو قلب کو جس سے مناسبت ہوگی وہی محبوب ہوگا اور وہی اس کا مرکز ہوگا
میں نے ایک باپ سے سُنا ہے کہ مجھکو جو فلاں بڑے بیٹے سے محبت زیادہ ہے وجہ یہ کہ
وہ میرا سا ہے یعنی مجھے اس سے مناسبت ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ قلب کو
کس چیز سے مناسبت تامہ ہے سو برہان اور وجدان سے ثابت ہوچکا ہے کہ
قلب کو پوری مناسبت صرف حضرت حق سبحانہ سے ہے اور اسی مناسبت
کی نسبت شہادت دی ہے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ اِنَّ اللہَ

خلق آدم علی صورتہ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا یہاں
صورت کے معنی شکل نہیں بلکہ وہی مناسبت ہے جسے صوفیہ نے ایک خاص
عنوان سے کہا ہے (جسے علماء خشک نہیں قبول کرتے) کہ انسان مظہر ہے
حق تعالیٰ کا اس لفظ مظہریت سے چونکتے ہیں اور حقیقت میں یہ عنوان تفسیر
ہے اسی حدیث کی اور بدون اس تفسیر کے سخت اشکال پڑتا ہے جس سے
بچنے کے لئے بعضوں نے ضمیر کا مرجع بنایا ہے آدم کو یعنی آدم کو آدم کی
صورت پر پیدا کیا یعنی جیسی صورت آدم کے لئے مناسب تھی اس صورت
پر پیدا کیا مگر بعض روایات میں بجائے صورتہ کے صورۃ الرحمٰن آیا ہے اسے
کیا کریں گے اس کے جواب میں انھوں نے اسے روایت بالمعنی باجتہاد الراوی
بنایا ہے میں کہتا ہوں کیوں تکلف کرتے ہو جو تفسیر صوفیہ کرام نے بیان کی
وہ نہایت بے تکلف اور سہل ہے۔ یہ دیکھئے کہ صورت کسے کہتے ہیں اگر کہو
چہرہ کی شکل کو کہتے ہیں اچھا مانا مگر یہ دیکھنا ہے کہ اس کو کیوں کہتے ہیں ۱۶
صورت کی حقیقت کیا ہے سو حقیقت صورت کی ظہور ہے چنانچہ یہ بھی
محاورہ ہے صورۃ المسئلہ کذا اور یوں بھی کہتے ہیں اس کام کے بننے کی
کیا صورت ہے تو یہاں صورت کے معنے ظہور کے ہیں اور چہرہ کو بھی صورت
ظہورت ہی کے معنے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس سے ظہور ہوتا ہے حقیقت
انسانیہ کا اور یہ حقیقت وہ ہے جس کو انا سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ روح
ہے جسے حکماء نفس ناطقہ کہتے ہیں اور وہ ایک مخفی چیز ہے چونکہ روح ایک
خفی چیز تھی جسے کالبد نے ظاہر کر دیا اس لئے کالبد کو صورۃ کہہ دیا تو اصل
معنی صورت کے ظہور کے ہوئے اب سمجھئے کہ خلق آدم علی صورتہ کے
معنے علیٰ ظہورہٖ ہوئے یعنی خدا تعالیٰ نے اپنے ظہور پر آدم کو پیدا کیا
یعنی آدم کو پیدا کر کے اپنے صفات کو ظاہر کر دیا کہ خدا تعالیٰ سمیع بھی ہو
بصیر بھی ہے متقن بھی ہے محکم بھی ہے ان ہی صفات کا کچھ حصہ انسان کو دیکر

اپنے صفاتِ کمالیہ کو ظاہر کر دیا گو اور مخلوق سے بھی صفات کا ظہور ہوتا ہے مگر
انسان سے بوجہ اجمع لکمالات ہونے کے زیادہ ظہور ہوتا ہے اسی واسطے اسکو
مظہر اتم کہتے ہیں صوفیہ نے کیا کیا وہی انھوں نے بھی کہا جو حضور صلے اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ہاں صرف اصطلاح بدل دی یہ ان کا لطیفہ ہے کہ اپنے
اسرار کو عوام سے بچانے کے لئے اصطلاحیں مقرر کر لی ہیں ورنہ وہ قرآن و
حدیث سے جدا ہو کر کوئی نئی بات نہیں کہتے ہاں علما رخشک جو انکی اصطلاح
نہیں سمجھ سکتے ان پر اعتراض کر دیتے ہیں جو واقع میں ان پر نہیں ہوتا بلکہ
اپنی فہم پر ہوتا ہے ؎ اصطلاحاتے است مرابدال را ۔ اور محققین کی
عادت ہوتی ہے کہ وہ طالب کے سامنے تو ان نکات کو ظاہر کر دیتے ہیں
لیکن معاند کے سامنے اعتراضات سنکر بھی خاموش رہتے ہیں بلکہ اپنے
متوسلین کو بھی اظہار سے منع کر دیتے ہیں کما قال الشیرازی ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی ۷

(عشق کے بھید مدعی کے سامنے مت کہو ۔ چھوڑ دو تاکہ غرور اور گھمنڈ میں مرجائے)

وجہ یہ کہ ان کو جوش نہیں آتا جوش آتا ہے عازم اظہار کو اسی لئے کیمیاگر
کو کبھی جوش نہیں آئے گا اگر کوئی اس کا انکار کرے تو وہ اور خوش ہوگا کہ
چلو اچھا ہوا لوگوں کے ہجوم سے بچے اور پولیس کے خوف سے بچے اور جو کیمیاگر نہیں
ہے محض دوکاندار ہے اور لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتا ہے وہ طرح طرح کی کوششوں
سے اپنا کیمیاگر ہونا ثابت کر دیگا اسی طرح اہل اللہ جب دیکھتے ہیں کہ معتقد
کم ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں کہ چلو خلوت بالمحبوب کی دولت نصیب ہوئی ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو)

ایک اور عاشق نے کہا ہے ؎

چہ خوش ست باتو بزمی نہفتہ ساز کردن در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیا ہی اچھا ہو کہ محفل میں تنہا ہو اور گھر کا دروازہ بند شراب کی بوتل کھلی ہوئی پاس رکھی ہو)
اس سے زیادہ خوشی کا کیا مقام ہوگا کہ محبوب کا وصل ایسے موقع سے حاصل ہو کہ
کوئی پکارے تک نہیں کیا محبوب کے وصل کے وقت کوئی یہ چاہے گا کہ کوئی آکر
پکارے ارے فلانے اس وقت تو یہ چاہے گا کہ ایک چار گھنٹے کے لئے ساری
دنیا مجھ کو چھوڑ دے تو کام بن جاوے اور کبھی جیسے نقدۂ حرمتہ کی ضرورت ہو
البتہ معتقدین کے ہونے سے فکر ہوگی کہ ایک اسامی کم ہوگئی۔ بہرحال مظہر اتم
حق تعالیٰ کا انسان ہے کیونکہ انسان کو حق تعالیٰ سے مناسبت تامہ ہے
اور یہی مناسبت سبب تھا محبوبیت کا اور محبوبیت صرف مرکز میں ہوتی
ہے تو معلوم ہوا اور ثابت ہوگیا کہ قلب کا مرکز صرف ذاتِ حق ہے اور
اسی سے قلب کو قرار اور چین حاصل ہو سکتا ہے بس یہی ایک صورت ہے
چین کی کہ خدا تعالیٰ سے دل لگاؤ اسی کو فرماتے ہیں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ
۱۸ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ یعنی جو لوگ ایمان والے ہیں اور ان کے دلوں کو چین ہوتا
ہے خدا تعالیٰ کے ذکر سے اور اس میں حصر اس لئے نہیں کہ خدا تعالیٰ ہی کے
ذکر سے چین ہوتا ہے کیونکہ مخاطب ابھی سمجھ رہا تھا کہ چین اور چیزوں سے
ہوتا ہے تو اسے بالفعل تو صرف اتنا ہی بتا دیا کہ چین خدا تعالیٰ کے ذکر سے
بھی ہوتا ہے سبحان اللہ کیا تدریجی تعلیم ہے کہ مخاطب قبول ہی کرلے اگر
ابتدا ہی سے حصر کے طور پر فرماتے تو ایک قسم کا معارضہ ہو جاتا یہ نہیں کیا
پہلے یہ بتایا کہ اور چیزوں سے چین ہونے کی ہم نفی نہیں کرتے مگر خدا تعالیٰ
کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے جب مخاطب نے یہ سمجھ لیا کہ خدا تعالیٰ کے ذکر سے
بھی چین ہوتا ہے تو آگے فرمایا اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کہ آگاہ ہو جاؤ
اور خبردار ہو جاؤ کہ خدا تعالیٰ ہی کے ذکر سے دلوں کو چین ہوتا ہے اور
کسی چیز سے چین نہیں ہوتا پہلے جملہ میں تو بذکر اللہ جو ظرف ہے تطمئن کا اپنی
جگہ پر ہے یعنی مؤخر ہے اور آگے بذکر اللہ کی تقدیم فرمائی تاکہ حصر کو مفید

ہو کہ تقدیم ما حقہ التاخیر مفید حصر ہوتا ہے اور پھر اس کو اَلاَ حرف تنبیہ سے موکد بھی کر دیا کہ ہوشیار ہو جاؤ کہ خدا تعالےٰ ہی کی یاد سے دلوں کو چین ہوتا ہی اس کی دلیلیں میں ابھی سب بیان کر چکا ہوں اِس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں اسی کا ترجمہ مولانا رومیؒ نے کیا ہے ؎

گر گریزی بر امید راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

(اگر کسی راحت یا آرام کی اُمید پر بھاگتا ہو تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

جہاں جا کے پناہ لوگے کہیں چین نہیں ملے گا کہیں کوئی آفت آئے گی اور کہیں کوئی مصیبت کہیں دوستوں کی طرف سے پریشانیاں پیش آئیں گی اور کہیں دشمنوں کی طرف سے ؎

ہیچ کنجے بے درو بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے درد دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہی خلوت گاہ حق کے سوا کہیں جگہ آرام نہیں)

کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں پریشان کرنے کے لئے بھیڑیئے نہ ہوں جز بخلوت ۱۹
گاہ حق آرام نیست ؂ یہ ترجمہ ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوجاتا ہے) کا۔ غرض آرام کی چیز صرف یہ ہی خلاصہ یہ کہ جب خدا تعالیٰ سے تعلق ہوجاتا ہے جو مرکز ہے قلب کا تو پھر حرکت نہیں ہوتی قلب کو اور یہی سکون ہے اب اگر دنیا کی تدبیریں بھی کروگے مگر قلب کو مرکز پر رکھوگے تو پھر پریشانی نہیں ہوگی جیسے پرکار کا ایک پرہ مرکز پر ہوگا اور ایک دائرہ کے محیط پر حرکت کریگا تو جو حصّہ مرکز پر ہوگا وہ حرکت نہیں کرے گا کیونکہ مرکز نقطہ حقیقی ہوتا ہے اور حرکت وضعیہ میں نقطہ مرکزیہ کو حرکت نہیں ہوتی ایک پہیہ بہت بڑا ہے اور اس کے اندر ایک اور ہے اُس سے چھوٹا پھر اُس سے چھوٹا پھر اُس سے چھوٹا تو حرکت سب کو ہوگی جو بڑا ہے اس کو زیادہ اور جو چھوٹا ہے اس کو کم مگر ان سب محیطوں کا مرکز ہے اُسے بالکل حرکت نہ ہوگی۔ اب سمجھئے کہ

ایک باطن قلب ہے جو مرکز پر ہے اور ایک ظاہر قلب ہے جو محیط پر دورہ کرتا ہے باطن قلب خدا تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہے اور ظاہر قلب کمانے میں مصروف ہے بلکہ اس محیط پر چلنے والے کو بھی حکم ہے کہ چلاؤ ورنہ دائرہ قطع کیسے ہوگا وہ دائرہ کیا ہے بیوی بچوں کا نان و نفقہ قلب کے اسی ظاہر اور باطن پر متنبی کہتا ہے ؎

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِی التَّائِہِ وَھَوی الْاَحِبَّۃِ مِنْہُ فِی سَوْدَائِہٖ

یعنی ملامت کرنے والیوں کی ملامت قلب کے ارد گرد ہے اور احباب کی محبت سویدار قلب میں ہے۔ پس سویدار قلب جو اندرون قلب ہے وہ غیر متحرک ہے جب اس میں خدا تعالیٰ کا ذکر اور محبت جم جائے گی تو پھر حرکت نہیں ہوگی اس کی علامت یہ ہے کہ خوشی اور غم دونوں حالتیں یکساں ہوں گی خوشی ہے تو الحمد للہ اور غم ہے تو الحمد للہ کیونکہ وہاں نہ

۲۰ غم مطلوب ہے، نہ خوشی مطلوب ہے، مطلوب تو ان کی رضا ہے ؎

بس زبون وسوسہ باشی دلا گر طرب را باز دانی از بلا

یعنی اگر تم خوشی کو بلا سے ممتاز سمجھتے ہو تو ابھی وساوس میں مبتلا ہو ؏

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

(دوست کی طرف سے جو کچھ بھی اچھا ہی ہے)

خوشی بھی انھیں کی ہے اور غم بھی انھیں کا ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من دل فدائے یار دل رنجانِ من

(تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے دل قربان ہے ایسے یار پر جو میرے دل کو رنجیدہ کرنیوالا ہے)

محبوب کی رضا مقصود ہے جس طرح اس سے مصافحہ کرنے سے فرحت ہوتی ہے اسی طرح اس کی چپت میں بھی فرحت ہوتی ہے چپت میں چوٹ تو ضرور لگے گی کیونکہ معشوق اچھا خاصہ کھاتا پینا ہٹا کٹا تھا اس کا ہاتھ بھی زبردست ہی ہوگا اور اس سے چوٹ بھی ضرور لگے گی مگر چوٹ سرپر

لگے گی دِل پر نہیں لگے گی اِسی سے یہ چپت میں بھی خوش ہیں دلیل یہ ہے کہ اگر معشوق کہے کہ اگر تمہارے چوٹ لگتی ہو تو لاؤ میں تمہیں چھوڑ کر رقیب کو اسی طرح چپت لگاؤں دباؤں تو وہ اس کا یہ جواب دیگا ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(ایسا دشمن کا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو۔ خنجر آزمائی کے لئے دوستوں کا سر سلامت ہے)

کہ جب ہم موجود ہیں تو رقیب کو کیوں مارتے ہو ؎

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے　　کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

تو جس کے قلب میں خدا تعالیٰ کا تعلق جم جاتا ہے اس کو کسی حال میں غم نہیں ہوتا عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(فراق و وصل کی کیا حقیقت ہے رضائے دوست کے سامنے)

۲۱ یعنی وصل کو بھی مطلوب نہیں سمجھتے اگر کوئی کہے کہ وصل تو مطلوب ہی ہے اس کے مطلوب نہ سمجھنے کے کیا معنی جواب یہ ہے کہ وصل مزعوم عند السالک کو مطلوب نہیں سمجھتے یوں تو فی نفسہ وصل حقیقی مطلوب ہی ہے البتہ وصل مزعوم کو مطلوب نہیں سمجھتے جسے سالک مطلوب سمجھتا ہے کیونکہ سالک غیر کامل کو ان حقائق کی خبر نہیں ہوتی جب تک شیخ کامل کی تقلید نہ ہو ایسا سالک محض اپنے علم سے کام لیتا ہے اور یہاں علم و فضل کا مٹانا ضروری ہے اسی کو مولانا نے ایک حکایت میں بیان کیا ہے کہ ایک نحوی صاحب جنھیں اپنی نحودانی پر ناز تھا سفر کے ارادہ سے کشتی پر سوار ہوئے راستہ میں ملاح سے پوچھا کہ میاں تم نے کچھ نحو بھی پڑھی ہے اُس نے کہا نہیں کہنے لگے افسوس تم نے آدھی عمر کھوئی اس کے بعد کشتی گرداب میں آگئی اور چکر کھانے لگی ملاح نے پوچھا میاں کچھ تیرنا بھی جانتے ہو انھوں نے کہا نہیں اُس نے کہا افسوس تم نے ساری ہی عمر کھوئی مولانا فرماتے ہیں ؏ محو می باید نہ نحو اینجا بداں (اللہ تعالیٰ کے راستہ میں

محویت کی ضرورت ہے علم نحو کی ضرورت نہیں) تو یہاں تو اس کی ضرورت ہے یہاں نرا ظاہری علم وفضل کافی نہیں اس سے محقق نہیں ہوتا اور اگر علم وفضل کی وجہ سے محقق ہو تو وہ دلائل کا محقق ہے وجدان کا محقق نہیں ہے دلائل کیا چیز ہیں اندھے کی لکڑی کہ اس کے سہارے سے ٹٹول ٹٹول کے چل رہا ہے جہاں وہ لکڑی ٹوٹ گئی بس کچھ بھی نہیں تو اسی طرح اس نے اپنے علم سے وصال کی تعریف گھڑی کہ وصال کسے کہتے ہیں کہ کچھ کیفیت ہونے لگے کچھ سنسناہٹ ہونے لگے جی لگنے لگے اگر جی لگا تو سمجھے ہاں وصل ہوگیا اور اگر جی نہیں لگتا اور وساوس کا ہجوم ہوگیا تو سمجھا کہ بس مردود ہوگیا تو اس کو غلطی یہ ہوئی کہ کیفیات کو وصل اور وساوس کو فراق سمجھا حالانکہ یہ قبض وبسط ہے فراق ووصل نہیں ہے اور قبض وبسط دونوں وصل ہی کی قسمیں ہیں چنانچہ جس طرح محبوب کا پاس بلا کر بٹھانا وصل ہے اسی طرح یہ حکم دینا کہ جاؤ آم لاؤ یہ بھی وصل ہے یہ نہیں کہ آموں کی جستجو میں جو وقت صرف ہوا اور محبوب سے جدا رہنا پڑا یہ فراق ۲۲
ہوگیا۔ کسی شاعر نے کہا تھا ؎

اُس کے کوچہ سے جب اُٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں ۔۔۔ تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

اور کسی نے اس کی اصلاح کی تھی ؎

اُس کے کوچہ سے کب اُٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں ۔۔۔ وہ ہوسناک ہیں جو رو بقفا جاتے ہیں

مگر یہ اُس اُٹھنے میں ہے جو از خود ہو وہ حقیقت میں خلاف ہے لیکن اس کے علاوہ ایک مرتبہ اور ہے وہ یہ کہ معشوق خود اُٹھا دے تو یہ اُٹھنا عین وفاداری ہے مثلاً اگر معشوق کہے آم لاؤ تو فوراً چلا جائے اور اگرچہ لغۃً یہ زمانہ فراق کا ہوگا مگر اہلِ عقل کے نزدیک یہ زمانہ اس وصال سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ اس میں تو محبوب کے ناراض ہوجانے کا بھی جو کہ حقیقی فراق ہے اندیشہ ہے اور اس میں اس کے ناراض ہوجانے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ جتنی دیر آم لانے میں لگے گی اتنی دیر تک اس کے راضی رہنے کا یقین ہے تو جو عاشق ہے وہ

اس حالت میں بھی مزے میں ہے اور نہایت خوش ہے کہ محبوب کی رضا تو حاصل ہے اور اس حالت میں وہ عاشق ضرور یہ کہے گا ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(فراق و وصل کیا چیز ہے دوست کی رضا اور خوشی کی کوشش کر اس کے سوا اور کچھ طلب کرنا افسوس کی بات ہے)

اور یہ وہ فراق ہے کہ جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی گوارا فرمایا کیا آپ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ فراق صوری یعنی توجہ الی الغیر مطلقاً بھی نہ ہو مگر آپ کو ارشاد ہوا وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ. قُمْ فَاَنْذِرْ. فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ. وَاتْلُ عَلَیْهِمْ کہ کفار کے پاس جایئے اور انھیں انداز و تبلیغ فرمایئے اور کلام الٰہی سنایئے اور اس پر آپ اُٹھے اور خلوت میں بجائے محبوب حقیقی سے مناجات کرنے کے مشرکین و کفار سے خطاب فرماتے ہیں یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِفْعَلُوْا كَذَا وَلَا تَفْعَلُوْا كَذَا گو آپ کی توجہ محبوب حقیقی کی جانب سے اس وقت بھی منقطع نہیں ہوئی تھی مگر ایک گونہ حجاب تو تھا کیونکہ ایک تو براہ راست محبوب کا دیکھنا ۲۳
اور ایک آئینہ کے اندر اس کا چہرہ نظر آنا تو حق تعالیٰ کے دیکھنے کی مثال ایسی ہے کہ پہلے تو خود محبوب کو بلا واسطہ دیکھ رہے تھے اور اب بواسطہ مرآت کے دیکھ رہے ہیں گو توجہ اب بھی تام ہے مگر بلا حجاب نہیں کیونکہ مرآت حجاب ہے گو شفاف ہے اور وہاں حجاب تو حجاب خود اپنی ذات کا حائل ہونا بھی گوارا نہیں حضرت بوعلی قلندرؒ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے رخ انور کو دیکھنے نہ دوں اور کانوں کو ان کی باتیں سننے نہ دوں)

ہمارے اور محبوب کے درمیان آنکھ اور کان کا بھی کیوں واسطہ ہو اس کی بھی غیرت آتی ہے غرض یہ حجاب تھا جسے حق تعالیٰ کے ارشاد سے گوارا کیا گو وہ حجاب اُن کی رضا سے تھا مگر وصال بلا حجاب کے مقابلہ میں تو فراق ہی تھا تو دوسرے مؤمنین کیوں نہ اس فراق کو گوارا کریں ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق   ترک کام خود گرفتم تا بر آید کام دوست

(میں ملنا چاہتا ہوں وہ جدا رہنا چاہتا ہے میں اپنی ارادہ کو اس کے ارادہ پر قربان کرتا ہوں)

خلاصہ یہ کہ عاشق قبض و بسط میں کچھ فرق نہیں کرتا نہ قبض میں گھبراتا ہے نہ بسط میں ناز کرتا ہے کیونکہ یہ سب وصال ہی کی حالتیں ہیں اور گو ظاہر قلب محیط پر دائر ہے جو دنیا کے کاموں میں مشغول ہے مگر باطن قلب جو مرکز ہے وہ مشغول ہے تسلیم و رضا میں یہی وجہ ہے کہ اسے کسی حالت میں بھی تغیر نہیں ہوتا اور کسی مصیبت سے نہیں گھبراتا یہاں تک کہ مرنے سے بھی نہیں گھبراتا اِس واسطے کہ اس وقت بھی مطلوب تو پاس ہی ہے بلکہ موت کا وقت تو وہ ہے کہ پرکار کا باہر کا پرہ جو محیط پر تھا وہ بھی اندر کے پرہ کے قریب آرہا ہے کیونکہ تمام افکار دنیا خود بخود منقطع ہو رہے ہیں تو اور خوشی کی بات ہے کہ یہ جسم ہیولانی جو ایک گونہ حجاب تھا اُٹھا جاتا ہے اسی کو ایک بزرگ وقت نزع

۲۴ اِس طرح فرما رہے تھے ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم   جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وہ وقت آگیا کہ میں عریاں ہو جاؤں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں)

اور اسی کے ساتھ یوں بھی کہہ رہے تھے ؎

چیست توحید آنکہ از غیر خدا   فرد آئی در خلا و در ملا

(توحید کی شان کب ہو سکتی ہے سوائے خدا کے جھکا رہے تنہائی میں اور میل جول کے وقت)

غرض اسی خوشی میں جان دیدی۔ ابن الفارض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو بڑے صاحبِ کشف و صاحبِ حال تھے جب ان کا زمانہ وفات قریب آیا تو آٹھوں جنّتیں ان پر منکشف ہو گئیں یہ دیکھ کر انھوں نے منہ پھیر لیا اور غلبۂ حال میں یہ فرمایا کہ ؎

ان کان منزلتی فی الحب عندکم   ما قد رأیت فقد ضیعت ایامی

کہ اگر محبت کا صلہ یہی ملا تو ساری عمر ہی برباد ہوئی پھر کہتے ہیں وہ جنّتیں

مستور ہوگئیں اور خاص تجلی کا ظہور رہوا اور روح پرواز کر گئی گویا وہ حالت تھی جیسے اور ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

(اگر ملک الموت میری جان نکالنے آئے تو جب تک میں آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں جان نہ دوں گا)

غرض جس شخص کی یہ حالت ہو وہ کس قدر چین میں ہوگا۔ میں راہب نہیں بناتا نہ میں کارخانے چھوڑاتا ہوں میں تو صرف یہ بتاتا ہوں کہ ظاہر قلب سے دنیا کے کام کرو اور باطن قلب کو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کرو باقی یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی کو طلاق دیدو اور بچوں کو عاق کر دو اور کوٹھری میں بیٹھ جاؤ کیا سارا جہان چھوڑ کے بس اللہ میاں کوٹھری میں ہیں نعوذ باللہ ان کا تو کوئی مکان نہیں وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ وہ تو ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں ہاں تم ہی ان سے دور رہو اس لیے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ یعنی ہم تم سے بہت نزدیک ہیں یہ نہیں فرمایا کہ انتم اقرب الینا کہ تم ہم سے بہت نزدیک ہو اس لئے کہ تم تو دور رہو اور وہ نزدیک ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ قرب و بُعد تو نسب متکررہ میں سے ہے جب ایک دوسرے سے قریب ہوگا تو دوسرا بھی اس سے قریب ہوگا ایک بعید ہوگا تو دوسرا بھی بعید ہوگا مگر یہ قرب جسمی میں ٹھیک ہو یہاں قرب کے معنے قرب علمی کے ہیں قرب جسمی کے نہیں ہیں پس مراد محض یاد اور توجہ ہے تو اس اعتبار سے وہ قریب ہیں یعنی تمہاری طرف متوجہ ہیں اور تم بعید ہو یعنی تم ان کی طرف متوجہ نہیں پس اگر تم ذرا ان کی طرف متوجہ ہو تو پھر ان کا قرب تمہیں معلوم ہو ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تو اپنے حجاب بے خودی کو لے حافظ درمیان سے ہٹادے)

حضرت بایزید بسطامیؒ نے حضرت حق جل و علا شانہ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا یا رب دلنی علی اقرب الطرق الیک یعنے مجھے اپنے تک پہونچنے کا سب

مختصر راستہ بتا کہ بس اس سے سیدھا اور مختصر نہ ہو۔ سبحان اللہ خواب میں بھی
یہی دھیان ہے جواب میں فرماتے ہیں دع نفسك وتعال اپنے نفس کو چھوڑ دو
اور چلے آؤ کیسا سہل راستہ ہے یعنی اپنے نفس کے تقاضے پر عمل چھوڑ دو یعنی
اپنی رائے کو اپنے ارادہ کو اور مصالح کو چھوڑ دو بس ان مصالح ہی نے تو خراب
کیا ہے ہر بات میں غرض ہر بات میں پالیسی یہی وجہ ہے کہ انھیں چین نہیں اور
اللہ والوں کو اس لئے تکلیف نہیں کہ ان کے سویدائے قلب میں پالیسی اور
غرض نہیں ہے حضرت بہلول نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے انھوں نے
کہا اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اس کی خواہش کے
موافق ہوتا ہو پھر اسے کاہے کی تکلیف حضرت بہلول نے کہا کہ حضرت یہ تو
سمجھ میں نہیں آتا وہ ہنسنے لگے اور کہا کہ اس پر تو تمہارا ابھی ایمان ہے کہ بدون
خدا تعالیٰ کے ارادہ کے کچھ نہیں ہوتا جب یہ سمجھ گئے تو اب یہ سمجھو کہ جس نے
اپنی خواہش ہی نہ رکھی ہو اور اپنی مرضی کو بالکل خدا تعالیٰ کی مرضی میں فنا ۲۶
کر دیا ہو تو جو کچھ ہوگا وہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق تو یہی ہوگا اور اس کی
مرضی بھی وہی ہے جو خدا تعالیٰ کی مرضی ہے بس وہ اس کی خواہش کے موافق
بھی ہوگا اس کا کوئی خاص ارادہ ہی نہیں نہ یہ کہ ابھی مر جاویں نہ یہ کہ دس
برس زندہ رہیں کہ ذرا بیمار ہوتے اور دھڑکا پیدا ہوا کہ ہائے ابھی تو ایک
ہی برس گذرا ہے ابھی تو نو برس اور باقی ہیں نہ یہ خواہش کہ غریب ہو کر رہیں
نہ یہ خواہش کہ امیر ہو کر رہیں جیسے زاہدوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کمل ہی ملے
دو شالہ نہ ملے اگر دو شالہ ملا تو ناک منہ چڑھ گیا اور دنیا دار کی یہ خواہش ہوتی
ہے کہ دو شالہ ملے اگر کمل ملے گا تو اس کا ناک منہ چڑھ گیا سو غور کرو تو تم کیا
اور تمہاری مرضی ہی کیا اگر کمل دیں کمل اوڑھو اگر دو شالہ دیں دو شالہ اوڑھو
اگر غریب بنائیں خوشی سے اسے گوارا کرو اگر بادشاہ بنائیں بادشاہ بن جاؤ
ایک جوڑا روز بدلنے کو دیں ایک جوڑا روز پہنو اور اگر ایک جوڑا ایک برس

میں دیں تو ایک برس میں پہنو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو ان کے شیخ نے
ایک کرتہ دیا تھا وہ اسے ساری عمر پہنے رہے جب پھٹ جاتا گھورے پر سے
گدڑے چیتھڑے جوڑ بٹور کے دھوتے اور دھوکے پیوند لگا لیتے تھے وہ کرتہ اب
بھی موجود ہے اور زائرین نہایت عقیدت سے اُسے آنکھوں سے لگاتے
ہیں اور بادشاہوں کے تخت و تاج کا پتہ بھی نہیں اور نہ کوئی انھیں پوچھتا
ہے وجہ یہ کہ وہ عطیہ تھا سرکاری اور گو عطیہ سرکاری یہ بھی ہے مگر یہ بادشاہ
اسے عطیہ نہیں سمجھتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا ہے ہم نے حاصل کیا ہے ہمیں اس کا
استحقاق ہے اس خودی کی وجہ سے وہ مٹا دیا گیا اور اس میں یہ برکت عطا
کی گئی کہ وہ اب تک باقی ہے اگر کوئی کہے کہ وہ عمر بھر کیوں ایک کرتہ پہنے
رہے اگر بدل ڈالتے تو کیا وہ عطیہ نہ ہوتا۔ تو بات یہ ہے کہ اُن کو دوسرا
میسر ہی نہ تھا باوجودیکہ ابراہیم لودی بادشاہ ان کے مُرید تھے مگر کبھی بادشاہ
کی نذر قبول نہیں کی کہ یہ بیت المال کا ہے جو عامہ مسلمین کا ہے بادشاہ کو اس ۲۷
میں تصرف جائز نہیں ہے اگر چاہتے تو بہت کچھ لے لیتے اور بڑے عالیشان
محل تیار کر لیتے۔ ابراہیم بادشاہ کی بہن بھی حضرت سے مرید تھیں اور اس
درجہ کی بیوی تھیں کہ آپ فرماتے تھے اگر عورتوں کو خلیفہ بنانا مشائخ کا
معمول ہوتا تو میں ابراہیم کی بہن کو خلافت دیتا اُن سے بھی کبھی نذر قبول
نہیں فرمائی کہ اُن کے یہاں بھی وہی بادشاہ کا پیسہ ہے جو بیت المال کا ہی
ایک مرتبہ آپ کے یہاں ایک بزرگ تشریف لائے وہ ان کو ایک میلا
اور پھٹا سا کرتہ پہنے دیکھ کر سمجھے کہ یہ بنتے ہیں اور شبہ کی بات بھی کی تھی کہ
جس شخص کا بادشاہ مرید ہو اس کو کاہے کی کمی ہے انھوں نے فرمایا کہ بعض
لوگ زاہدوں میں داخل ہونے کو پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتے ہیں شیخ
سمجھ گئے کہ مجھ پر تعریض ہے ان سے علیحدگی میں عرض کیا کہ میں بنتا نہیں
بلکہ میرے پاس اس کرتے کے سوا اور ہے نہیں بڑی تنگی سے بسر ہوتی تھی

اور فاقے ہوتے تھے اِس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ آپ کے گھر میں سے آپ کے پیر کی بیٹی تھیں اگر کچھ ہوتا تو کیا آپ ان سے دریغ فرماتے اُن کی یہ حالت تھی کہ فاقے ہوتے تھے اور جب کئی فاقے گذر جاتے تو بیوی کہتیں کہ حضرت اب تو تاب نہیں فرماتے گھبراؤ نہیں جنّت میں عمدہ عمدہ کھانا پک رہا ہے وہ بھی ایسی نیک تھیں کہ اس اُدھار پر راضی ہو جاتیں غرض شیخ کی تو عسرت کی یہ حالت تھی اور ایک حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حالت تھی کہ آپ ایسا کپڑا پہنتے تھے کہ اتنا قیمتی کپڑا خلیفہ وقت بھی نہیں پہن سکتا تھا حشم و خدم اور عمدہ و لطیف غذائیں اور مُرغ پلاؤ وغیرہ سے سابقہ رہتا اور جہاں یہ تھا وہاں یہ بھی یقینی تھا کہ اگر دونوں کی حالتوں کو ایک دوسری سے بدل دیا جاتا تو دونوں خوشی سے قبول کر لیتے غرض عارف کی یہ شان ہونی چاہئے کہ جس حال میں رکھیں زندہ رہے مارے تو مرجاوے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دِل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو ۲۸

(زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور قتل کر دیں تو آپ پر فدا ہوں - دِل آپ پر فدا ہے جو کچھ کریں میں اس پر راضی ہوں)

حاصل یہ ہے کہ اپنے اِرادہ کو فنا کر دو - اور یہاں ایک اشکال ہو کہ صاحب جب ارادہ کو فنا کر دیں تو نماز اور روزہ کا بھی ارادہ فنا کر دیں سو سمجھ لو کہ ارادہ کو فنا کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ جو ارادہ حق کے خلاف ہو اُسے فنا کر دو اور جو ارادہ حق کے موافق ہو وہ تو مطلوب ہے اور نماز و روزہ کا ارادہ مرضی حق کے موافق ہے اس کو فنا مت کرو غرض یہ ہے کہ چین کی جڑ اور روح جو اس کو جوانی میں حاصل کر لے گا جو کہ اس وقت درجہ درجہ میں دوائیں ہو گی تو بڑھاپے میں آرام سے رہے گا اور چین سے بسر کرے گا اور بحکم غذا بھی ہو جائے گی اور یہ اوپر ثابت ہو چکا ہے دوا بھی نعمت ہے اور غذا بھی نعمت ہے کیونکہ وہ مجاہدہ ہے اور غذا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے نصیب نہیں ہو سکتا اِس لئے وہ مجاہدہ بھی نعمت ہے - اِس مقام پر جس

نعمت کا ذکر ہے اس کے یہی دو درجے ہیں بعض کے لئے غذا یہ سب اس کی تمہید تھی تمہید میں قدرے طول ہو گیا مگر خیر میں مقصود میں بھی کیا بیان کرتا اس میں بھی یہی بیان کرتا۔ بہرحال حق تعالیٰ نے ایک نعمت مرحمت فرمائی اولاً رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً آپ کے غلاموں کو جسے لوگ تکلیف اور مصیبت سمجھتے ہیں مجھے اپنے بچپن کی ایک حکایت یاد ہے کہ ایک بار میں مسہل پینے سے گھبرا رہا تھا تو والد صاحب نے فرمایا کہ تم مسہل پی لو تمہیں ایک روپیہ دیں گے چنانچہ اس روپیہ کی لالچ میں وہ مسہل پی لیا لیکن جب عقل آئی اس وقت معلوم ہوا کہ مسہل پینے سے انکار کرنے میں کس قدر غلطی پر تھا کیونکہ وہ درحقیقت میرے ہی آرام کے لئے تھا اسی طرح جب ہمیں عقل آوے گی تو اس نعمت کی قدر ہو گی کہ بڑی چیز ہے اگر دوا ہے تب بھی نعمت ہے کیونکہ صحت اسی سے ہے اور غذا کا لطف صحت ہی سے ہے غذا مطلوب بالذات ہے تو دوا مطلوب بالعرض ہے بہرحال دوا ہو یا ۲۹
غذا ہر حال میں نعمت ہے اور وہ نعمت کیا چیز ہے اب میں اس کا نام بتائے دیتا ہوں جس کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں یعنی شریعت اب تو شریعت کا نام سنا اور ڈرے کہ بس بھائی خدا خیر کرے اب حکم ہو گا کہ کھاؤ نہیں، پیو نہیں، ہنسو مت، بولو مت۔ ایک عنایت فرماتے مجھ سے فرمایا کہ شریعت کا خلاصہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ نہ ہنسنے کی جگہ ہنسو نہ رونے کی جگہ روؤ گلا گھونٹا ہوا رکھو میں نے کہا آپ جیسے سمجھدار جیسے خلاصہ نکالیں گے تو واقعی پھر تو یہی خلاصہ ہو گا شریعت کا ایسے بدمذاق لوگوں کی بالکل اس چمار کی لڑکی کی مثال ہے کہ ایک راجہ تھا گنوار سا اس کی ایک لڑکی تھی اس کی شادی وہ کسی سے نہیں کرتا تھا کیونکہ اسے یہ خبط تھا کہ کوئی میرے برابر کا نہیں ہے بڑے بڑے راجاؤں کے پیام پھیر دیتا تھا اتفاق سے ایک مرتبہ شدت سے آندھی چلی اور زور کے بگولے میں ایک چمار کا لڑکا

اُڑکر راجہ کی چھت پر گرا لوگوں کو اور راجہ کو یہ تعجب ہوا کہ یہ لڑکا یہاں کہاں
سے اور کیوں آیا عقلاء کو بلایا گیا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے انھوں نے سوچ کے
کہا کہ یہ غیبی آدمی ہے جو اس لڑکی کے ساتھ شادی کے واسطے بھیجا گیا ہے جب
عالم شہادت میں کوئی آدمی شادی کے قابل نہ نکلا تو عالم غیب سے اس کو بھیجا
گیا حکم دیا اسے حمام میں لے جاؤ کپڑے بدلواؤ جب اسے حمام میں لے چلے وہ
بڑا چلاّیا راجہ نے حکماء سے پوچھا کیا ہے یہ چلاّتا کیوں ہے انھوں نے کہا
حضور یہ عالم غیب سے تازہ آیا ہے ابھی ہم لوگوں سے مانوس نہیں ہے اس سے
گھبراتا ہے اُسے زبردستی حمام میں لیجا کر گرم پانی سے نہلایا جب کپڑے پہنانے
کا قصد کیا گیا تو کپڑے دیکھ کر اور گھبرایا اور بہت چلایا راجہ نے پھر حکماء سے
پوچھا انھوں نے کہا اس نے ابھی دنیا کی چیزیں نہیں دیکھی ہیں اچھا اس کے
سامنے بہت سے جواہرات لائے جائیں یہ ان سے مانوس ہوگا چنانچہ بہت سے
۳۰ جواہرات خوب چمکتے چمکتے اس کے آگے لاکے رکھے گئے تو وہ پریشان ہوا اور
لگا چلانے سب سے اخیر میں حکماء کی یہ رائے ہوئی کہ اچھا خود شہزادی کو اس کو
سامنے بٹھا دیا جائے کہ شاید اُسے ادھر رغبت ہو اور یہ قرار پکڑے جب
شہزادی سامنے لائی گئی تو اب تو اس کے چلانے اور پریشان ہونے کی کوئی
حد و انتہا ہی نہ رہی بہت ہی رویا چلایا اب حکماء نے کہا کہ اچھا اسے آزاد
کر دیا جائے جب یہ اس عالم سے مانوس ہوگا تب شادی کی جائے چنانچہ
وہ آزاد ہوتے ہی سب کپڑے اُتار اور اپنی لنگوٹی باندھ مخلی بالطبع ہوکر
اپنے گھر کی طرف بھاگا اور گھر پہنچ کر اپنی ماں کو لپٹ گیا اور اس طرح اپنی
سرگذشت سنانے لگا کہ مجھے ڈاکو پکڑ لے گئے تھے میری میّا مجھے ایک کوٹھری
میں بند کیا (یہ حمام کا خاکہ ہے) تب بھی میں نہ مرا میری میّا پھر انھوں نے
مجکو کفن پہنایا (یہ جوڑے کی قدر کی ہے) تب بھی میں نہ مرا میری میّا پھر
وہ جلتی بلتی آگ لائے (جواہرات کا نقشہ ہے) تب بھی میں نہ مرا میری میّا

پھر وہ ایک ڈائن کو بلا لائے (یہ شہزادی ہے) کہ مجکو کھا جائے تب بھی نہ مرا میری میّا۔ بس جو مذاق اس چمار کے لڑکے کا تھا وہ مذاق ہم لوگوں کا ہے کہ شریعت جیسی حسین شہزادی کو ڈائن سمجھ کر اس سے گھبراتے اور بھاگتے ہیں اجی شریعت تو ایسی حسین ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(از سرتا پا جدھر بھی نگاہ ڈالتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ ہے)

افسوس ہم نے اسے چھوڑ کے دنیا کو محبوب بنایا ہے جس کی یہ حالت ہے ؎

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد　　چوں باز کنی مادر مادر باشد

یعنی سمجھے کہ یہ بڑی حسین اور نوجوان ہوگی مگر جب چادر اٹھا کے دیکھا تو وہ نانی اماں سے بھی بڑی تھی اب سمجھ لیجئے کہ آپ نے کس کو چھوڑا اور کس کو لیا ؎

بقول دشمن پیمان دوست بشکستی　　ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

(بقول دشمن دوست سے عہد کیوں توڑ دیا۔ دیکھ تو سہی کیوں قطع تعلق کیا اور کیوں ملا)

۳۱ وجہ یہ ہے کہ شریعت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور نہ اس کا حسین چہرہ دیکھنے کے لئے آنکھ بنوائی اس لئے دنیا کی برائیاں نہیں دکھائی دیتیں اجی اندھا اس سے زیادہ کیا دیکھتا ہے کہ ڈیل نرم نرم ہو بس یہ حسن ہے اس کے نزدیک اور چاہے چہرہ پر آدھ سیر قیمہ بھرنے کی ضرورت ہی ہو اور چاہے ایسا ہو کہ جیسے اُپلے میں کوّا مٹھونگیں مار گیا ہو آنکھیں درست کرائیں تو اصل حسن کی پہچان ہو اور آنکھ میں یہ دھند اور جالا کا ہے کا ہے غرض نفس کا ہے اور اتباع ہوا کا ہے شریعت نے تو حقیقی مصالح کی ذمہ داری لی ہے خاص آپ کی موافقت نفس کا تو ٹھیکہ نہیں لیا ہے حکمت کے اقتضا سے جیسا مناسب ہوگا شریعت ویسا حکم کرے گی حکیم تو وہی ہے جو مرض کے مناسب نسخہ تجویز کرے نہ کہ مریض کے نفس کے مناسب اور جو مریض کی مرضی کی رعایت کرے گا وہ اصل میں طبیب نہیں ہے وہ فیس اینٹھنے والا ہے جو کہ آپ کی مرضی کے

موافق نسخہ لکھ کر آپ کو خوش کر کے فیس لینا چاہتا ہے بہت لوگ علماء میں بھی ایسے ملیں گے کہ فیس لے کے مستفتی کی مرضی کے موافق فتویٰ لکھ دیتے ہیں میں نے ایک ہزار روپیہ کا فتویٰ دیکھا جس میں سگی خوشدامن کا نکاح داماد سے حلال لکھا تھا آپ کو تعجب ہوتا ہوگا کہ قرآن میں جس کی حرمت کی تصریح ہے اس کی حلت کا فتویٰ کیسے لکھ دیا اور لوگوں نے اُسے مان کیسے لیا اجی کمال تو جب ہی ہے کہ جب لوگ مان بھی لیں کیونکہ فتویٰ تو لوگوں کے اعتراض سے بچنے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے جب اعتراض سے بچاؤ نہ ہوا تو وہ فتویٰ ہی کیا ہوا اور پھر ہزار روپیہ کون دیتا ایسے فتوے لکھنے والے بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ قصہ یہ تھا کہ ایک داماد ساس پر فریفتہ ہو گیا تو اس نے ایک مفتی سے کہا کہ کیا ترکیب کروں کہ اس سے نکاح کر سکوں اُس نے کہا ہزار روپیہ دو ترکیب میں بتا دوں گا چنانچہ اس نے ہزار روپئے دیئے ہزار روپیہ لے کے اُس نے کیا ترکیب کی کہ یہ لکھا کہ ساس اس کو کہتے ہیں جو منکوحہ کی ماں ہو۔ پہلا مقدمہ ۴۲
منکوحہ اس کو کہتے ہیں جس کا نکاح شریعت کے موافق ہوا ہو۔ دوسرا مقدمہ عموماً عورتیں کلمات شرک وکفر اپنی زبان سے جاری کرتی ہیں جس سے مرتد ہو جاتی ہیں اور مرتدہ کا نکاح درست نہیں ہوتا اس لئے قبل نکاح تجدید ایمان ضروری ہے تیسرا مقدمہ۔ یہ مشرکہ تھی کہ عادت کے موافق کلمات شرک وکفر زبان پر لاتی تھی چوتھا مقدمہ۔ اور اسے تجدید ایمان نہیں کرائی گئی۔ پانچواں مقدمہ۔ لہٰذا شرعاً نکاح نہیں ہوا مشرکہ سے مومن کا نکاح نہیں ہوتا جب یہ منکوحہ نہ ہوئی اس کی ماں ساس بھی نہیں ہوئی۔ رہ گئی حرمت مصاہرت سو یہ ابوحنیفہؒ کی گھڑت ہے جو حدیث کے خلاف ہے اس لئے حدیث کے مقابلہ میں ہم ابوحنیفہؒ کا قول نہیں مانتے۔ اے لیجئے بس وہ حرمت مصاہرت سے بھی بری ہو گئی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن اسی طرح میں نے اور طرح طرح کے فتوے دیکھے ہیں تو کیا یہ لوگ طبیب ہیں

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

صاحب طبیب تو وہی ہے جو اپنی مرضی کا نسخہ لکھے اور مریض کو اس کے پینے پر مجبور کرے چاہے فیس ملے یا نہ ملے اسی طرح بہت سی باتیں شریعت کی بھی جو آپ کے خلاف ہوں گی آپ کو ناگوار ہوں گی مثلاً کسی شخص کی عادت رشوت لینے کی ہے جب اُسے یہ معلوم ہوگا کہ رشوت لینا حرام ہے تو کس قدر ناگوار ہوگا کہ ہزار روپیہ کا نقصان ہوا اگر اتفاق سے اسی لینے والے کو کہیں رشوت دینا پڑے تو اُس وقت اس قانون کی خوبی سمجھ میں آجاوے اگر کوئی اس سے ہزار روپے رشوت کے لے کے فتویٰ سنے اور واپس کر دے تب اس سے کوئی پوچھے کہ شریعت کا حکم کیسا ہے یہ کہے گا کہ سُبحان اللہ کیا کہنا ہے شریعت کا بھلا ایسے خود غرض کا کیا فیصلہ اپنی اغراض سے قطع نظر کر کے فیصلہ کرو تو ہم مانیں گے اِس سے تو معلوم ہوا کہ محض غرض کے بندے ہو بلکہ اگر کوئی غرض سے بھی قطع نظر کرے اور وہ عقل سے اپنی مصالح کا فیصلہ کر لیا کرے تو یہ فیصلہ بھی قابل اعتبار نہیں کیونکہ وحی کے آگے عقل کیا چیز ہے۔ غرض شریعت سے ناگواری کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی خوبیاں دیکھنے کے لئے آنکھ نہیں ہے اگر آنکھ ہو تو معلوم ہو جائے کہ شریعت میں کہیں حق تعالےٰ نے اپنی غرض پوری نہیں کی ہے ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم — بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

(میں نے مخلوق کو اپنا فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہیں بنایا بلکہ اس لئے بنایا کہ اس پر جود و کرم کروں)

آپکے مصالح کی ایسی رعایت کی ہے کہ شاید آپ خود بھی نہ کر سکتے۔ مثلاً شریعت نے یہ بتایا کہ پھل آنے سے پہلے باغ کی فصل بیچنا حرام ہے تو یہ فیصلہ مالک باغ کو ناگوار ہو کہ پھل آنے سے پہلے تو باغ پانچسو کو بکتا تھا اور اب پھل آئے اور کم آئے تو اڑھائی سو کو بیچنا پڑا لیکن خریدنے والے سے پوچھو کہ وہ شریعت سے کتنا خوش ہے کہ پانچسو جس باغ کے دیتا تھا ڈھائی سو میں مل گیا اِسی طرح ایک شخص نے ایک بیٹی اور ایک دور کا عصبہ چھوڑا آدھی میراث بیٹی کو ملے گی اور آدھی عصبہ کو اس میں بیٹی کو بڑا ناگوار ہوا کہ

یعنی نانی نانی اور میرے باپ کا مال یہ دور کا رشتہ دار ہے خواہ مخواہ دیدیا مگر اس عصبیت سے پوچھو تو وہ کہے گا سبحان اللہ شریعت میں حقائق کی کیا رعایت ہے کہ دور دور کی قرابت کو بھی اس قدر مانا ہے تو اب ایک ہی حکم ہے مگر دو آدمیوں میں سے اپنی اپنی اغراض کی وجہ سے ایک کو ناگوار ہوا اور ایک کو گوارا ہے اب ہم کس کے فیصلہ کو ان دونوں میں سے مانیں ؎

تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيْعًا كَذَالِكَ يَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِيْرُ

یعنی لات اور عزّٰی دونوں کو چھوڑ دیا ہم ان دونوں میں سے کسی کا فیصلہ نہیں مانیں گے کیونکہ یہ دونوں خود غرض ہیں ہم تو وحی کا فیصلہ مانیں گے کیونکہ وہاں شائبہ غرض کا نہیں ہے اس لئے وہی قابل اعتبار ہے وحی کا فیصلہ یہ ہے کہ شریعت قانون عام ہے جو مصالح عامہ کی رعایت کرتا ہے جیسے سرکاری قانون مثلاً سڑک پر پیشاب کرنا جرم ہے اب ایک شخص کو زور کا پیشاب لگا وہ کہاں جائے وہاں تو یہ حکم ہے پیشاب مت کرو اور یہاں موت نکلا جا رہا ہے تو وہ شخص کیا کہے گا کہ بڑی سختی کا قانون ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پیشاب کی تو اجازت ہوتی مگر اس کی بدبو سے بچنے کے لئے کوئی ایسی دوا ڈال دی جاتی کہ دماغ بحس ہو جاتے اس لئے کسی کو بدبو نہ معلوم ہوتی بھلا کون اسے پسند کریگا کہ اس گدھے کے موتنے کے واسطے سب کو بحس بنا دے اسی طرح شریعت نے بھی مصالح عامہ کی رعایت سے قانون بنایا ہے تم اس میں مصالح خاصہ اور وہ بھی نفسانیہ ڈھونڈھتے ہو۔ اور شریعت کا اچھا معلوم ہونا مصالح عامہ کی رعایت سے یہ تو حکما و عقلا کی نظر میں ہے اور ایک نظر ہے عشق و محبت والے کی اس کو اس سے اچھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دوست کا قانون ہے یہ حکما کی نظر سے بڑھ کر ہے جیسے کوئی طوائف اپنے کسی عاشق سے یہ کہدے کہ تم لنگوٹی باندھ کے تمام آبادی کے بازار میں پھرو یہ اس سے نہیں پوچھے گا کہ بی اس میں تمہارا کیا فائدہ بلکہ

فوراً اِدھر اُدھر دوڑنے لگے گا اگر کوئی کہے بھئی گدھے یہ کیا ہے تو وہ کہے گا
قال الجدار للوتد لم تشقنی ، قال الوتد انظر الی من یدقنی ایک شخص دیوار
میں کیل ٹھونک رہا تھا تو دیوار نے کیل سے شکایت کی کہ میں نے کیا کیا جو
میرے جگر کو شگافتہ کر رہی ہے کیل نے جواب دیا اس سے پوچھو جو مجھے ٹھونک
رہا ہے۔ تو حکماء و عقلاء احکام کے لم کے درپے ہوں گے اور جو عاشق ہوگا
وہ یہ کہے گا کہ حکمت اس سے پوچھیے جس نے یہ قانون مقرر کیا ہے مجھ کو کچھ
بحث نہیں بس مولوی صاحب کو یہی جواب اختیار کر لینا چاہیئے ؎

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

(مجھے پردہ کے پیچھے طوطے کی طرح رکھ چھوڑا ہے مجھے جو اُستاد کہہ دیتا ہے وہی کہتا ہوں)

غرض یہی علماء کو بھی مناسب ہے میں ان کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر حکم و اسرار
معلوم بھی ہوں تو پوچھنے پر تو ہرگز مت بتاؤ چاہے یہی گمان کریں کہ انھیں
نہیں آتا۔ اور پوچھنے والے بھی خوب سمجھ لیں کہ جاننے والے بھی بہت ہیں ۳
مگر تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تمہیں سب بتا دیا کریں جیسے طبیب کہ جانتا
سب ہے کہ تین ماشہ گل بنفشہ کیوں لکھا اور چھ ماشہ گل گاؤ زباں کیوں لکھا
مگر کوئی مریض پوچھنے لگے تو وہ نہیں بتائے گا اگر وہ کہے کہ معلوم ہوتا ہے
تمہیں طب نہیں آتی ہاں صاحب نہیں آتی پسند ہو پیو ورنہ مت پیو
عارف شیرازیؒ کہتے ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز کو ظاہر کیا جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں کہ نہ معلوم ہو)

یعنی کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو مگر ہم تمہارے کہنے سے نہیں
بتاتے اور حقیقت میں مصلحت اور حکمت پوچھنے کی ضرورت ہی کیا محبوب
حکم سمجھ کر کرنا چاہیئے محبوب سمجھ کر اس کے حکم کی علت دریافت کرنا عشق
کے بالکل ہی خلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جاؤ ہم عاشق ہی نہیں پھر ہم پر

وظائفِ عشق بھی واجب نہیں تو صاحب تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے عشق تو
لوازم ایمان سے ہے جب تم نے آمنّا کہا تو عشقنا کا التزام بھی کر لیا جیسے کوئی
شخص کہے مجھ پر نان و نفقہ بی بی کا کیسے واجب ہو گیا میں نے تو اس کا التزام
نہیں کیا تھا صرف قبلتُ النکاح کہا تھا ہر شخص یہی کہے گا جب قبلتُ کہا
جب ہی شوہری کے حقوق کے ملتزم ہو گئے پس اسی طرح جب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم کہا پس عاشق ہو گئے کیونکہ اس کلمہ سے مومن ہو گئے اور
مومن کے بارے میں ارشاد ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ جو لوگ خدا تعالیٰ
پر ایمان لائے وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں تو
تصدیق ایمان کے ساتھ ہی سارے کے سارے عاشق ہو گئے اب آپ عشق سے
انکار کریں تو کیا ہوتا ہے جب عاشق ہونا ثابت ہو گیا تو عشق کے حقوق ادا کرو
بس کان مت ہلاؤ اور سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو اگر کوئی اس انقیاد
کا قصد کرے تو اول اول تو تکلف ہوتا ہے پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے تو ۴
اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے جس طرح دوا عادت پڑنے سے غذا ہو جاتی ہے
اگر کوئی کہے کہ دوا کیونکر غذا ہو جاتی ہے تو میرے پاس اس کی لاجواب مثال
موجود ہے دیکھئے حضرت تمباکو سلمہ اللہ تعالےٰ کہ کوئی اس سے مشکل سے بچا ہوگا
کہیں اکلا اور کہیں شربا اس کا استعمال ہوا کرتا ہے شروع کرتے وقت کیسی
متلی ہوتی تھی کیسی اُبکائیاں آتی تھیں چکر آتا تھا مگر جب عادت پڑ جاتی ہے
تو پھر یہ جناب سب سے زیادہ مرغوب ہو جاتی ہے روزے میں سب کو تو
پانی اور شربت کی فکر ہوتی ہے مگر انہیں نہ پھلکیوں کی پروا نہ شربت کی
پروا نہ افطاری سے مطلب ارے بھئی حقہ دیدو ایک پان دیدو ایسی مکروہ
چیز کیسی محبوب ہو گئی اے اللہ تمباکو کی تو اتنی محبت اور شریعت کی اتنی
بھی نہیں ارے بھئی تمباکو ہی سمجھ لیا ہوتا تمباکو تو کیا ہوتا آخر کسی طرح بھدے
لوگوں کو سمجھاؤں بھی۔ اگر خمیرہ گاؤ زبان نہیں سمجھتے تو خمیرہ تمباکو ہی سمجھو۔

بہرحال اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ عادت ڈال لو تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے بعض بزرگوں کو کسی تکلیف کے وقت نماز کو اُٹھتے ہیں ناک منہ چڑھاتے دیکھ کر اگر یہ شبہ ہو کہ عادت پڑ جانے کے بعد ان پر کیوں اثر ہے بات یہ ہے کہ ان کے دل پر اثر نہیں ہے صرف جسم پر ضعف کی وجہ سے اثر ہے اور دل میں نہایت خوش ہیں اس کی مثال بھی میرے پاس موجود ہے اور وہ نظیر حضرت تمباکو کے دوست مرچ ہیں کہ ناک بہہ رہی ہے آنسو جاری ہیں سی سی کر رہے ہیں مگر کھائے چلے جاتے ہیں کیوں صاحب اگر تکلیف ہے تو کیوں کھاتے ہو بات یہ ہے کہ تکلیف منہ کو ہے مگر زبان اور حلق کو تو مزہ آتا ہے اس لئے منہ کی تکلیف گوارا ہے تو اب سمجھ میں آ گیا لذت والم دونوں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح امتثال امر محبوب میں گو بدن کو تکلیف ہو مگر دل اور روح شاداں ہے اس عادت کا یہ اثر ہے کہ اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے گو بدن کو آرام ملا کہ پڑے سوتے رہے مگر ۵
قلب کو جو تکلیف ہے اس کے آگے یہ آرام کچھ بھی نہیں حضرت مولانا فرماتے ہیں ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر ز باغِ دِل خلالے کم بود

(اللہ والے کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر دل کے باغ میں گنجائش کم ہوتی ہے)

یعنی اگر باغِ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے اُس وقت دیکھو اُن کے غم کو پھر اس میں بھی دو درجے ہیں زاہد کو تو غم ہوتا ہے مطلقاً عمل فوت ہو جانے کا اور عارف کو غم ہوتا ہے باختیار خود فوت ہو جانے کا اور بلا اختیار فوت ہونے کا کچھ غم نہیں ہوتا کیونکہ دوست نے اس میں یوں ہی تصرف کیا مگر یہ بات تمام لوگوں کو سنانے کی نہیں کیونکہ یہ اگر قصداً بھی سو گئے اور نماز قضا کر دی تو حیلہ نکال لیں گے کہ محبوب کی یوں ہی مرضی تھی تو یہ مرضی مرض والوں کے لئے نہیں کیونکہ وہ خود مَرضی (بفتح الراء)

ہیں یعنی مرض والے بہرحال تکلیف طبعی سے جسم کو پریشانی ہوتی ہو مگر روح کو نہیں ہوتی
بلکہ ان اعمال سے ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ وہ غذائے روح بن جاتی ہیں کہ اگر وہ نہ
ملیں تو پریشان ہوتی ہے صرف شروع میں کسی قدر کلفت ہوتی ہے جیسے مشاہدہ کو پہلے مجاہدہ کرنا پڑتا
ہے یا غذا سے پہلے دوا کی حاجت ہوتی ہے پھر تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے
تو حضرت ایسی چیز ہے شریعت جس سے ڈرتے ہیں لوگ حالانکہ اس میں ہمارے
کل مصالح دینیہ و دنیویہ کی پوری رعایت کی ہے اور ساری مصلحتوں سے بڑھ کر
تو چین ہے جو بدون اتباع احکام شریعت نصیب ہی نہیں ہو سکتا اگر کوئی
شخص کہے کہ بدون اتباع احکام کے بھی چین نصیب ہو سکتا ہے کیونکہ چین
تو بقول تمہارے تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتا ہے پس اگر ہم ہر وقت خدا تعالیٰ
کو یاد کریں اور اتباع شریعت نہ کریں تو تعلق مع اللہ تو حاصل ہو گیا پس
چین سے رہیں گے تو خوب سمجھ لو کہ مطلق تعلق سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا
ایسے تعلق میں چین کو گمان بھی ہے فی الواقع اس میں بے چینی مضمر ہے جو ۶
مرنے کے بعد کھل جائے گی جیسے ایک ایرانی گنوار ہندوستان میں آیا ایک
حلوائی کی دکان پر جا کے حلوا لیا اس نے دام مانگے یہ وہاں سے بھاگے وہ حلوائی
بھی پیچھے بھاگا جب وہ اتنا بھاگ کر قریب تھا کہ پکڑ لے آپ نے وہ حلوا جھٹ
منہ میں رکھ لیا کہ جو نہ ہمارا نہ تمہارا وہ پکڑ کے پولیس میں لے گیا تھانہ دار
کوئی رحمدل تھے انہوں نے بجائے چالان کرنے کے یہ سزا دی کہ گدھے پر سوار
کر کے اور اعلان کے لئے ڈھول کے ساتھ شہر سے باہر نکال دینے کی سزا دی
لونڈوں نے جو اسے گدھے پر سوار دیکھا تو وہ بھی تماشہ کے طور پر ساتھ ہو لئے
یہ ہندوستان کی سیر سے فارغ ہو کر اپنے ملک پہونچے وہاں لوگوں نے
ان سے پوچھا کہ آغا ہندوستان رفتہ بودی چہ طور ملک ست۔ ہندوستان
کیسا ملک ہے آپ نے کہا خوب ملک ست۔ بڑا اچھا ملک ہے پوچھا گیا
بچہ طور تو آپ فرماتے ہیں در ہندوستان حلوا خوردن مفت ست۔ حلوا

مفت کھانے میں آتا ہے۔ سواری خر مفت ست۔ گدھے کی سواری مفت ملتی ہے۔ ڈم ڈم مفت ست۔ باجا مفت ملتا ہے۔ فوج طفلاں مفت ست۔ لڑکوں کی فوج مفت ملتی ہے۔ ہندوستان خوب ملک ست تو جیسے ان حضرت کو یہ معلوم ہوا کہ یہ حشم خدم عزت کا سامان تھا یا نہایت ذلت کی سزا تھی اسی طرح ان کو نہیں معلوم کہ یہ چین ہے یا بے چینی لیکن کہاں تک ؎

فَسَوْفَ تَرَیٰ إِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ ۔۔۔ أَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ أَمْ حِمَارُ

(جب غبار چھٹ جائے گا تو جلدی معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر

یعنی مرنے کے بعد فوراً پتہ چل جائے گا کہ تم نے اچھا کیا یا برا)

جب حقیقت منکشف ہوگی اس وقت معلوم ہوگا کہ چین تھا یا بے چینی جیسے اس آغا کو جب ان سب باتوں کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی تو کس قدر شرمندہ ہوا ہوگا اسی طرح انھیں بھی مرتے وقت معلوم ہو جائے گا کہ وہ لذت تھی یا بے لذتی غرض جو تعلق و نسبت مطلوب اور سرمایۂ راحت ہے تو وہ ہے ۷
جو جانبین سے ہو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (ان سے اللہ راضی ہوا اور سب اللہ سے راضی ہوئے) وہ نسبت ہی نہیں جو صرف ایک ہی طرف سے ہو جیسے کسی شہر میں ایک پردیسی طالب علم تھے اُن کے دیس کے کوئی آدمی ان سے ملنے گئے انھوں نے پوچھا میاں طالب کس رنگ میں ہو کہنے لگے کہ شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں پوچھا کیا سامان ہوا کہنے لگے ہاں آدھا کام تو ہو گیا آدھا باقی ہے پوچھا کس طرح کہنے لگے میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں خوب آدھا ہو گیا تو یہ آلو پن ہے اسی طرح بہت سے لوگ بزعم خود صاحب نسبت ہیں جو ملکہ یادداشت بہم پہنچا کر اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں مگر اتباع شرع نہ ہونے کے سبب ان کے زعم کا حاصل یہ ہے کہ ہم تو راضی ہیں مگر اللہ میاں راضی نہیں۔ خوب سمجھ لو کہ ان کے راضی ہونے کا معیار صرف احکام کا اتباع ہے اگر اسی حال میں موت آگئی تو سب کھل جائے گا کہ یہ تعلق ان کو

پسند نہ ہونے کے سبب تمہاری نظر میں کس قدر خوار ہوگا بقول سعدیؒ ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت زر و خاک یکساں نماید برت

آپ نے ہزار روپے محبوب کو بھیجے کہ وہ خوش ہو مگر معلوم ہوا کہ وہ خوش نہیں ہوا اور اُس نے نہیں لیا اور انھیں واپس کر دیا کسی نے اگر کہا کہ گھر میں بھیجدو تو یہی کہو گے پھینکو بھی میں کیا کروں گا ایسے منحوس روپیہ کو اسیطرح جب معلوم ہوگا کہ حق تعالےٰ اِس تعلق سے راضی نہیں ہوئے تو اس تعلق کو کیا سمجھو گے تعلق وہی ہو کہ دونوں جانب سے ہو اور یہ تعلق بدون اتباع شریعت کے ہو نہیں سکتا تو دیکھئے شریعت کتنی بڑی چیز ہوئی حق تعالےٰ اسی کو فرماتے ہیں ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا۔ ثُمَّ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے ہیں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ
مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ ۸
رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۔ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں اور ہم نے ان کو دنیا جہان والوں پر فوقیت دی اور ہم نے ان کو دین کے بارہ میں کھُلی کھُلی دلیلیں دیں سو انھوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ آپس کی ضدا ضدی کے آپ کا رب ان کے آپس میں قیامت کے روز ان امور میں فیصلہ کر دیگا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے اس کے بعد فرماتے ہیں ثُمَّ جَعَلْنٰكَ الخ یعنی پھر آپ سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب وغیرہ عنایت کی تھی اس کے بعد ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا مِنَ الْاَمْرِ میں مِنْ بیانیہ ہے کہ وہ شریعت یا طریقہ خاص کیا ہے وہ امر دین ہی پس اس کا اتباع کیجئے۔ لقب کتنا لطیف ہے شریعت یعنی جس عنوان سے علماء

اتباعِ دین کا امر کرتے ہیں وہی عنوان آیت میں وارد ہوگیا جس سے صریحاً مدعا
علماء کا ثابت ہوگیا۔ اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے
وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اور ان جاہلوں کی خواہشوں کا اتباع
نہ کیجئے۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ طرز بیان ہے یہ نہیں فرمایا وَلَا تَتَّبِعْ غَيْرَهَا
کہ غیر شریعت کا اتباع نہ کیجئے بلکہ یوں فرمایا کہ جہلاء کی خواہشوں کا اتباع
نہ کیجئے اس میں یہ بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہشیں ہیں
وہ ہوائے نفسانی ہیں اس لئے وہ عمل کے قابل نہیں اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترازی ہے یعنی اَلَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ کی اہوا کا
اتباع جائز ہے بلکہ یہ قید واقعی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء
ہی نہیں ہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ
9 تو جہلاء ہیں جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانے میں نہ آنا تو اس کا
یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ غیر مفسدین کے بہکانے میں آجانا نہیں مطلب
یہی ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں اُن سے بچتے رہنا
اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو اور اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ کا مفعول جو ذکر نہیں
فرمایا سبحان اللہ اس میں عجیب رعایت ہے اگر مفعول ذکر فرماتے تو وہ
امرالدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہوجاتا کیونکہ امردین ہی میں تو کلام
ہورہا ہے تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لئے مذموم ہے کہ
وہ اہوا ہے اور اہوا اس لئے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا
فعل ہے اس لئے یہاں مطلق علم کی نفی کر دی کہ اہوا اس لئے مذموم ہے کہ
وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل ہی جاہل ہیں یہ دعوے کہ جو شخص شریعت
کا متبع نہ ہو وہ بالکل جاہل ہے اتنا بڑا ہے کہ سارا عالم اس میں مقابل
ہے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پورا یقین ہے کہ یہ ساری

دنیا کو جاہل بنانا اتنی پکی بات ہے کہ اس میں ذرا احتمال خلاف کا نہیں ورنہ آپ کو جھجک ضرور ہوتی کہ کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھے اور اس وقت گو ظاہر میں آپ نہیں تشریف رکھتے مگر آپ کا علم وفیض تو ہے جیسے آفتاب پر ابر آجاوے تو آفتاب نظر سے پوشیدہ ہے مگر اس کی روشنی تو ہے بلکہ چوندھوں کے لئے تو یہ ابر بھی رحمت ہے کہ براہ راست وہ اس کا تحمل نہ کر سکتے اسی طرح لتنے لوگ ایسے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو یقیناً حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے عار کرتے اور اس سے حدود کفر میں پڑ جاتے تو اچھا ہوا کہ ابر آگیا ورنہ ان چوندھوں کی بڑی مشکل ہوتی بہرحال اب وہ آفتاب کی روشنی ابر سے بھی چھن رہی ہے اس موقع پر میں مولانا کا یہ شعر پڑھتے پڑھتے رُک گیا وہ شعر یہ ہے ؎

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ ۔۔۔ چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنے آفتاب رخصت ہوگیا اور میں اسے اس لئے پسند نہیں کرتا کہ آفتاب رخصت نہیں ہوا وہ تو اب بھی درخشاں ہے صرف ابر کے نیچے چھپ گیا ہے بلکہ یہ شعر اس موقع پر مناسب ہے ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست ۔۔۔ خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

(اب بھی وہ ابر کرم دُرفشاں ہے خم اور خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے)

اور مولانا نے وہ شعر کسی دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے فیض لینے والے اب بھی موجود ہیں جو اب بھی اس دعوے کو ثابت کرنے کو تیار ہیں کہ جو متبع شریعت نہ ہو وہ جاہل ہے اور میں خود تو دعویٰ نہیں کرتا مگر دین کے محاسن پر نظر کرکے کہتا ہوں کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا لائق ہو مگر عالم نہ ہو اور نہ کسی عالم محقق کی صحبت میں رہا ہو اس کو کسی محقق کی

صحبت میں چھ مہینے کے لئے بھیجدو خدا کی قسم اس چھ مہینے میں وہ محقق یہ
ثابت کردے گا اور اس عاقل کی زبان سے اقرار کرالے گا کہ میں احمق
ہوں اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا
سکتا اگر اس سے زیادہ دلیل کو جی چاہے تجربہ کرلو کہ چھ مہینے کی محنت
لو پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھو اس وقت دیکھ لوگے کہ یہ شخص آئے گا تو
اپنے کو عاقل کہتا ہوا مگر جائے گا یہ کہتا ہوا کہ میں احمق ہوں نہیں بلکہ
احمق تھا کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آجاوے گی تب
معلوم ہوگا کہ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ کا مدلول کیسا یقینی ہے کہ
جو چیز شریعت کے مقابلہ میں ہے وہ جہل ہے میں جانتا کچھ بھی نہیں
مگر جونپور کے ایک شاعر صاحب میرے یہاں آئے جو عرفی تہذیب
سے آراستہ تھے میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ ادنیٰ ہوں اسی طرح
11 دس بیس دفعہ ادنیٰ کی اضافت ادنیٰ کی طرف کی جائے بہر حال میں
کچھ بھی نہیں ہوں مگر چند روز رہنے کے بعد جب وہ واپس گئے تو
وہاں جاکے انھوں نے ایک رسالہ لکھا اس میں یہ بھی لکھا تھا عمر بھر
جسے ہم تہذیب سمجھا کئے وہاں جاکر یہ معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی
نہیں تھی خیر وہ تو مرگئے ایک اور دہلی کے طبیب بھی آئے چند روز
یہاں رہنے سے وہ بھی یہ کہنے لگے کہ جن کو ہم اب تک کمالات سمجھتے
تھے سارے نقائص نکلے اور جنھیں ہنر سمجھتے تھے وہ سب عیوب تھے تو
اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں اگر شبہ ہو تجربہ
کرلیجئے اس لئے فرمایا اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ جاہلوں کا اتباع
نہ کیجئے اور یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے جسے امام غزالی
رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے
میں ہے اور اطلاق مُضر ہے کیونکہ اطمینان اور چین بدون تقیید

کے نہیں ہوتا مثلاً ہم نے یہ ارادہ کرلیا کہ جب بیمار ہوں گے ہم فلانے
طبیب کا علاج کریں گے تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے بیماری کا
خوف نہیں ہوگا اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا
علاج کریں اور اگر تقلید نہیں ہے مثلاً ہم کسی خاص طبیب کے
پابند نہیں اگر آج ذرا سا تغیر پیش آیا ایک طبیب سے رجوع
کیا دوسرا تغیر پیش آیا دوسرے سے رجوع کرلیا تیسرا پیش
آیا تیسرے سے رجوع کرلیا تو اس میں دل کو چین نہیں ہوگا اور
ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کی تغیر میں کس طبیب سے رجوع
کریں گے غرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے چاہے وہ طبیب
دانشمند بھی نہ ہو مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہوجائے گا اور
اگر وہ تقلید حقائق کے موافق ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا ہے اگر
شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونے کا بھی دعوے نہ ۱۴
ہوتا جیسا کہ مدلول ہے وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ تو کا
تب بھی اتباع شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب تو جبکہ شریعت
کا علم و حکمت کے موافق ہونا ثابت کردیا گیا تو اس اتباع کا
ضروری و مصلحت و موجب طمانیت ہونا اور بھی ثابت ہوگیا
آگے وعید ہے اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا یہ لوگ خدا تعالیٰ
کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے یعنی گو یہ آج مددگار
بننے کا دعوے کرتے مگر خدا تعالیٰ کے یہاں ذرا کام نہیں آسکتے
اس پر اہل حق کو تردد ہوسکتا تھا کہ اتباع کے بعد ہم تو اکیلے
رہ گئے اس لئے فرماتے ہیں وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ
وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۱۹ اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے
ہیں اور اللہ تعالیٰ دوست ہے اہل تقویٰ کا اس سے تردد

رفع ہوگیا کہ اہل اہواء اگر ہم سے الگ ہوگئے تو کچھ پروا نہیں کیونکہ
خدا تعالیٰ تو ہمارے ساتھ ہے۔ آگے مقصود کی طرف رجوع کرتے
ہیں اور شریعت میں جو صفتیں ہیں انھیں بتاتے ہیں هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ قرآن یا شریعت عام لوگوں کے لئے
دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے
لئے بڑی رحمت ہے لهٰذَا بَصَائِرُ بصائر جمع بصیرت کی ہے بصیرت
کہتے ہیں باطنی روشنی کو جیسے بصر کہتے ہیں نگاہ یعنی ظاہری روشنی
کو تو شریعت بصائر ہے یعنے باطن کو روشن کرنے والی ہے وھدی
اور سراپا ہدایت ہے کہ اس سے راستہ نظر آتا ہو اور مقصود
تک پہونچا دیتی ہے ورحمۃ اور رحمت ہے جو کہ مقصود ہو۔ گویا شریعت
تین چیزوں کا مجموعہ ہے یہاں پر ایک نکتہ ہے جو چند سال پہلے بھی
۱۴ ذہن میں آیا تھا مگر اُسے بھول گیا تھا اِس وقت پھر یاد آگیا
وہ نکتہ یہ ہے کہ راہ رو کو انھیں تین چیزوں کی ضرورت ہے جب
آدمی مقصود تک جانا چاہتا ہے تو اس کے لئے ایک مقصود ہوتا
ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے مقصود تک پہونچ
سکتے ہیں اور ایک بصر یعنے نگاہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے راستہ
نظر آوے حق تعالیٰ کے قربان جائیے کہ شریعت کو بتلاتے ہیں کہ
یہ ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کئے ہوتے ہے هٰذَا بَصَائِرُ یہ آنکھیں
بھی ہیں وھدی اور راستہ بھی اسی کے ذریعہ سے طے ہوتا ہو ورحمۃ
اور رحمت ہے یعنے مقصود بھی اِسی سے حاصل ہوتا ہے سبحان اللہ
بصیرت طریق مقصود تینوں اسی ایک شریعت میں ہیں۔ اب رہا یہ کہ
بصائر کو جمع کیوں لائے اور ھدی ورحمۃ کو مفرد کیوں لائے اِس
میں نکتہ یہ ہے راستہ چلنے والے تو بہت ہوتے ہیں اور سب

کی آنکھیں الگ الگ ہوتی ہیں اس لئے اس کو جمع لائے اور راستہ ایک ہی ہوتا ہے اور مقصود بھی سب کا ایک ہی ہوتا ہے وہاں مفرد لائے۔ پھر آگے فرماتے ہیں یہ کہ رحمت تو ہے مگر ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ لقوم یوقنون یقین کرنے والوں کے لئے۔ یقین کے دو درجے ہیں ایک تقلیدی اور ایک تحقیقی۔ تقلیدی تو یہ کہ احکام کو بلا دلیل مان لو پھر اُن احکام کی برکت سے تحقیقی یقین ہوجائے گا جیسے شروع میں الف بے کو محض اُستاد کی تقلید سے مان لیتے ہو اس کے بعد اسی تقلید کی بدولت بڑے بڑے علوم کے محقق بن جاتے ہو اگر شروع ہی میں یہ پوچھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ الف بے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ جاہل ہی رہو گے اس لئے پہلے کسی محقق کی تقلید کرو پہلے ہی سے محقق بننے کی کوشش مت کرو

۱۴ اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　تا راہ بیں نہ باشی کے راہ بر شوی

(اے جاہل کوشش کرکے صاحب علم ہوجا۔ راستہ دیکھنے کی بجائے راستہ دکھلانے والا ہوجا)

اور طریقہ محقق بننے کا یہی ہے کہ پہلے تقلید کرو

درمکتب حقائق پیش ادیب عشق　　ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

آج یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ہی سے اباجان بن جائیں ابھی ماں کا دودھ بھی نہیں چھوٹا مگر باوا بننے کا شوق ہے اجی پہلے باوا تو بن لو یعنی چارپائی کے پایہ کی برابر تو ہولو پھر باوا بننا ابھی تو پسر ہو خوب پسر پسر کے سویا کرو جب بڑے ہو گے تب باوا بھی بن جاؤ گے۔ ہیں تو جاہل کندہ ناتراش مگر یہ ضرور پوچھیں گے کہ کیوں صاحب اس حکم میں کیا راز ہے اور اس کی کیا حکمت ہے میاں پہلے کام تو شروع کرو پھر خود معلوم ہوجائے گا۔ کوئی بادشاہ کے پاس جاتے ہی یہ کہنے لگے کہ میں آپ کے خزانہ کی پڑتال کروں گا ذرا کنجیاں

دے دیجئے تو وہاں سے ظاہر ہے کہ نکال دیا جائے گا اگر خزانہ دیکھنا ہے تو پہلے بادشاہ کی خدمت کرو ممکن ہے کہ وہ خوش ہو کے خود کہیں جاؤ اِسے ہمارے خزانے دکھلا لاؤ اِسی طرح یہ اسرار جو خزائن ربّی ہیں یہ درخواست سے نہیں معلوم ہوتے بلکہ اطاعت سے حاصل ہوتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیا بے کتاب و بے معید و اوستا

(تم کو بلا معین و اُستاد کے اور بغیر کتاب کے انبیائے کرام جیسے علوم حاصل ہوں گے)

جب وہ خوش ہوں گے تو وہ علوم عطا کریں گے جو نہ کتابوں سے حاصل ہو سکتے تھے نہ اُستادوں سے بہر حال یقین کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ تقلید سے یقین حاصل کیا جائے اور ایک یہ کہ تحقیق سے اور جو یقین ابتدا میں تقلید سے حاصل ہوگا وہ اِنتہا میں تحقیق ہو جائیگا
15 خلاصہ تمام بیان کا یہ ہے کہ ہم میں اِتباعِ شریعت کی بیحد کمی ہے اس کا تدارک کرو اور جو کام کرو پہلے عالمِ شریعت سے تحقیق کرلو مگر تحقیق ایسے سے کرو جو سچّی بات بتلاوے اور جو خود اپنی خواہش نفسانی کو شریعت کے اندر ٹھونسے اور زبردستی غیر دین کو مصالح اور پالیسی کی وجہ سے دین بنا دے وہ واقع میں عالم ہی نہیں وہ تو جاہل ہے اُس سے مت پوچھو ورنہ وہ اپنے ساتھ تمہیں بھی گمراہ کرے گا اگر کہو کہاں ہے جو سچّی بات بتلاوے تو ڈھونڈو ڈھونڈھنے سے سب مل جاتا ہے طبیب کیسے مل جاتا ہے اِسی طرح سچّا صاحبِ شریعت عالم بھی مل سکتا ہے بہر حال جو کام کرو پہلے اِستفتاء کرو اور جو عالم ہیں انھیں چاہئے کہ قرآن و حدیث پر عمل کریں اور جو عامی ہیں وہ علماء سے دریافت کر کے عمل کریں خواہ اس میں دنیا کا نفع ہو یا نقصان جب ایسا کرو گے تو پھر

چند روز میں دیکھو گے کہ خود بخود برکات ظاہر ہوں گے۔
خلاصہ یہ ہوا کہ مصالح کو چھوڑو اور شریعت پر عمل کرو اگر کوئی کہے کہ یہ خلاصہ تو پہلے ہی بیان ہو سکتا تھا اِس قدر تفصیل کی کیا ضرورت تھی تو بات یہ ہے کہ تفصیل سے بہت سی زائد باتیں بھی معلوم ہو گئیں اور مضمون کی دِل میں وقعت بھی بڑھ گئی ورنہ محض خلاصہ سے اِتنا دِل نشین نہ ہوتا بہرحال خدا تعالےٰ سے دُعا کیجئے کہ ہم سب کو اِتباعِ شریعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تمام شُد

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رواہ البخاری

وعظ

مسمّٰی بہ

الاستغفار

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ ۔ بندر روڈ ۔ کراچی

۱۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ مسمّٰی بہ

الاستغفار

اَین	مَتیٰ	کَم	کَیف	مَاذا	مَن اِنتَفَع	لِمَ	مَن ضَبَط	المُستَمِعُون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید ہے	کیوں ہوا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد سہارن پور	۱۱ صفر سنہ ۳۲ھ	ڈیڑھ گھنٹہ	بیٹھ کر	استغفار کی ضرورت	ہر طبقہ کو مفید ہے	سہارنپور اتفاقاً جانا ہوا لوگوں کی درخواست پر بیان ہوا	محمد عبداللہ عفی عنہ گنگوہی	۲۰۰	اہل علم کا کم اور عام لوگوں کا زیادہ مجمع تھا۔

۱۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰۤى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ

(اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ) پھر (ایمان لاکر) اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر خوب بارش برساوے گا اور (ایمان و عمل کی برکت سے) تم کو اور قوت دیکر تمہاری (موجودہ) قوت میں ترقی کردیگا (پس ایمان لے آؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے)

اعراض مت کرو ۱۲) اِس آیت کریمہ کا مضمون ہود علیہ السلام کا خطاب ہے اپنی قوم کو حق تعالیٰ نے اِس مقام پر اس کو نقل فرمایا ہے۔ اِس آیت کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ہر چند کہ ہماری ہر حالت ایک سے ایک زیادہ ایسی ہی ضروری ہے کہ اُس کے متعلق بیان کیا جاوے تاہم بعض حالت کا اقتضاء یہ ہوتا ہے کہ اس کے اشتراک اور عموم کی وجہ سے مناسب سمجھا جاتا ہے کہ اس کے متعلق اہم سمجھ کر بیان کیا جاوے اس وقت مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر کہ کم و بیش سب پریشانی میں مبتلا ہیں مناسب معلوم ہوا کہ اِس مضمون کو اختیار کیا جاوے کہ اس میں معالجہ ہے تمام پریشانیوں کا ترجمہ سے معلوم ہوگا کہ وہ کیا مضمون ہے اور نیز معلوم ہو جائے گا کہ اِس کی ضرورت ہے۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ الخ (اے میری قوم اپنے گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگو الخ) یہاں پر شبہ نہ ١٥
کیا جاوے کہ ہم لوگ تو اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ہم کو ہود علیہ السلام کا ارشاد سُنانے سے کیا فائدہ اِس لئے کہ یہ مسلم ہے کہ اُمم سابقہ کے احکام بلا انکار اگر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو سنا دیں تو وہ ہمارے لئے بھی حجت ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ اُصول یعنی عقائد اور اخلاق حمیدہ کے ماموربہ ہونے میں سب انبیاء کا ایک مشرب ہے اِس میں کسی نبی کا اختلاف نہیں مثلاً توحید رسالت کا اعتقاد ظلم کا بُرا ہونا، عدل کا مستحسن ہونا، سچ بولنا یہ بالاتفاق مسلم ہیں اِسی فہرست میں سے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگنا بھی ہے جس کا اِس آیت میں بیان ہے پس جبکہ اللہ تعالیٰ نے اِس ارشاد کی نقل کے بعد انکار نہیں فرمایا اور نیز یہ ان اعمال سے ہے کہ جن کا ماموربہ ہونا تمام شرائع میں یکساں رہا ہے تو لامحالہ ہم بھی اِس کے ضرور

مخاطب ہوں گے ۔ رہی یہ بات کہ اگر اس مضمون کو بیان ہی کرنا تھا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی اِرشاد نقل کر دیا جاتا حضرت ہود علیہ السلام کا اِرشاد کیوں نقل کیا گیا اِس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کا اِرشاد نقل کرنے میں ایک خاص مصلحت ہے وہ یہ کہ آپ صاحبوں کو معلوم ہو جاوے کہ یہ مضمون بہت ہی اِہتمام کے قابل ہے اِس لئے کہ قوم عاد بہت پرانی قوم ہے پس جبکہ وہ بھی اِس مضمون کے مخاطب ہیں تو اِس سے معلوم ہوا کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے بلکہ یہ وہ بات ہے کہ ہمیشہ سے انبیاء اپنی اپنی قوم کو کہتے آئے ہیں ۔ حضرت ہودؑ علیہ السلام اپنی قوم کو اِرشاد فرماتے ہیں اے میری قوم اپنے رب سے مغفرت مانگو پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ ۔ خلاصہ ارشاد کا اِصلاح کے دو درجے ہیں اوّل اپنے گناہ معاف کرانا اُس کے بعد خدا تعالےٰ کی طرف طاعت کے ساتھ متوجہ ہونا اِس پر کیا ثمرہ مرتب ہوگا یُرْسِلِ السَّمَآءَ یعنی اِستغفار اور رجوع اِلی اللہ کا ثمرہ دنیا میں تم کو یہ ملے گا کہ اللہ تعالےٰ تم پر بارش بھیجیں گے اور تمہاری قوت موجودہ کے اندر اور قوت بڑھا دیں گے قوم عاد قوت کے اندر مشہور ہیں آگے ارشاد ہے اور خدا تعالےٰ کے حکم سے روگردانی مت کرو جرم کرتے ہوئے ۔ یہ آیۃ کا ترجمہ ہوا ترجمہ سے مضمون کی اجمالی تعیین ہو گئی ہوگی کہ اس کے دو جز ہیں اوّل مغفرت مانگنا دوسرے طاعت کی طرف رجوع کرنا خلاصہ حاصل یہ ہے کہ آیۃ میں دو مامور بہ ہیں استغفار اور رجوع اِلی الطاعۃ اور دو اس کے ثمرے ہیں بارش ہونا اور قوت بڑھ جانا اور کمزوری اور ضعف کا جاتا رہنا اور ایک منہی عنہ ہے وہ مجرم ہو کر اعراض کرنا ہے ۔ ہود علیہ السلام نے جو اس میں فرمایا باعتبار مقصود ایراد کے یہ درحقیقت اللہ تعالےٰ ہی کا ہم کو ارشاد ہے گویا اللہ تعالےٰ ہم کو

خلاصہ آیۃ یقوم استغفروا ربکم الخ مع ربط مقام ۲۰

ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم کو کسی قسم کی شکایت قحط کی یا کمزوری یا
ادبار یا تنزل کی ہو تو اس کی تدبیر اور اس کا علاج وہ ہے جو ہم نے
بتلایا ہے اور وہ نہیں ہے جو تم نے اختیار کیا ہے یہ حاصل ہے اس
مقام کا ترجمہ سے مضمون کی تعیین اور حاصل سے اس کی ضرورت[1] کا
علم ہوگیا ہوگا کہ اس مضمون کی کیا ضرورت ہے تفصیل اس اجمال کی
یہ ہے کہ مسلمانوں کو عموماً دیکھا جاتا ہے کہ پریشان ہیں اور یوں تو
ہر شخص کو خاص خاص پریشانیاں ہیں مگر ایک عام پریشانی اور مشترک و
مدید شکایت تو تنزل اور پستی کی ہے کہ یہ پرانی شکایت ہے دوسری
جدید پریشانی قحط اور قلت باراں کی ہے یہ دو پریشانیاں اس وقت
ہم سب کو عام ہیں اس لئے ان کا انتظام ضروری ہے کیونکہ انسان
کو جو مصیبت لاحق ہوتی ہے عقل اس کو مقتضی ہے کہ اس کی تدبیر کرے
اور تدبیر بھی وہ جو صحیح تدبیر ہے ہمارے[2] بد دینوں کی یہ حالت ہے کہ ۲۱
بعضے تو ان میں سے ایسے جواں مرد ہیں کہ تدبیر کی پرواہ ہی نہیں
کرتے اور بعضے جو کچھ کرتے بھی ہیں وہ الٹی تدبیر کرتے ہیں پس یہ کہنا
صحیح ہے کہ بالکل تدبیر کرتے ہی نہیں چنانچہ بعضے تو صرف یہ کرتے ہیں کہ
بس شکایت کرتے ہیں کوئی تو کہتا ہے کہ امسال ایسی خشکی ہوئی ہے کہ
مویشیوں کو چارہ تک نہیں ملتا ہے بھوکے مر رہے ہیں کوئی کہتا ہے
اس فصل میں بارش نہ ہوئی تو گرانی بہت زیادہ ہو جائے گی جو
ذرا دیندار ہیں وہ کہتے ہیں کہ میاں یہ سب ہماری شامت اعمال ہے
مگر اصلاح وہ بھی نہیں کرتے جو اصطلاح جدید ذرا مہذب ہیں وہ ترقی
و تنزل پر لکچر دیتے ہیں کوئی بیماری کی شکایت کرتا ہے میرے پاس
بھی خطوط آتے ہیں کہ بعض جگہ بیماری شروع ہو گئی ہے کوئی کہتا ہے کہ
خیر بھائی ہمارے یہاں تو امن ہے تو گویا بالکل بے فکر ہی ہو گئے یہ اور

[1] استغفار کے مضمون کی ضرورت

بھی غضب ہے یاد رکھو کہ جیسے تمہارے یہاں بیماری ہونا اندیشہ ناک ہے
اسی طرح تمہارے آس پاس ہونا یہ بھی خوفناک ہے اللہ تعالیٰ نے کفار
کو ان دونوں سے خوف دلایا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ (اور یہ (مکہ کے) کافر تو ہمیشہ
(آئے دن) اس حالت میں رہتے ہیں کہ ان کے (بد) کرداروں کے سبب ان پر کوئی حادثہ پڑتا رہتا
ہے یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتا رہتا ہے) پس ہمارے شہر میں بیماری کا جیسے
خوفناک ہے اسی طرح ہمارے ضلع میں ہونا یا ہماری کمشنری میں ہونا
یا ہمارے ملک میں ہونا بھی خطرناک اور فکر کی بات ہے غرض دو
شکایتیں اس وقت غالب ہیں ایک بیماری و قحط وغیرہ کی اور دوسری
قوم کے ذلیل اور روز بروز کمزور ہوتے جانے کی اور باقی خاص خاص
شکایتیں یا خاص خاص بیماریوں کی شکایتیں وہ تو معمولی طور پر رہتی
ہی ہیں مگر اس وقت غالب اور مشترک آفات کے متعلق عرض کرتا ۲۲
ہوں اور مجکو اس میں دو جماعتوں کی شکایت ہے اوّل شکایت تو
عام لوگوں کی ہے اور دوسری مہذب لوگوں کی ہے جو کہ بیدار مغز
کہلاتے ہیں سو میں کہتا ہوں کہ یہ پریشانیاں سب صحیح اور واقعی ہیں
لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی کوئی تدبیر بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو میں
مطلق تدبیر کے متعلق پوچھتا ہوں کہ کس چیز کی ارجح والنفع تدبیر کونسی
ہوتی ہے آیا وہ تدبیر جو عقلاء محض استدلال سے تجویز کریں یا وہ جو
کوئی تجربہ کار بعد تجربہ کے تجویز کرے سو بڑا فرق ہے عاقل کی تجویز
اور تجربہ کار کی تجویز میں چنانچہ مثل ہے سَلِ الْمُجَرِّبَ وَلَا تَسْئَلِ الْحَكِيْمَ
(تجربہ کار سے دریافت کرو عاقل سے مت پوچھو) عاقل کی تجویز تو محض تخمینی رائے
کی طرف مستند ہوتی ہے اور تجربہ کار کی تجویز تکرار مشاہدہ سے ناشی
ہوتی ہے اور ثانی کی ترجیح اوّل پر ظاہر ہے پس جبکہ تجربہ کار کا علم

بلاؤں میں تدبیر کی ضرورت

حالانکہ وہ بھی اِستدلالی ہے حکیم کے علم پر ترجیح دیا جاتا ہو تو عالم الغیب والشہادۃ کا علم کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا اور اس سوال کے جواب میں یوں کیوں نہیں کہا جاتا کہ حق تعالےٰ سے اِس کی تدبیر پوچھو خاص سرکار جو عالم اور حکیم سب کچھ ہیں اگر کسی مرض کا نسخہ عطا فرمادیں تو کیوں اس کو اِستعمال نہیں کیا جاتا اِس دوا سے بڑھ کر اور کون سی دوا ہوگی جو مرض اور دوا کے خالق سے عطا ہو عقلاء اور اہل الرائے تو محض تخمین اور رائے اور قیاس ہی سے کہتے ہیں کہ اِس مرض کی یہ دوا ہے مثلاً طاعون ہی ہے اس کی دوائیں اور تدبیریں محض ظنّی ہیں ان کی نافعیت کا اور ان کے اِستعمال کرنے کا مخالف نہیں ہوں یہ اطبّاء کی ہی عادت ہے کہ جس طبیب کا علاج کرو دوسرا نسخہ پینا اس کے نزدیک جائز نہیں اور حق تعالےٰ کو یہ حق بدرجہ اولیٰ حاصل تھا کہ وہ یہ فرما دیتے کہ جو
۲۳ ہم نے دوا اور تدبیر بتلائی ہے اس کو ہی اِستعمال کرو خصوصاً اس صورۃ میں جبکہ تدبیر صحیح کا انحصار بھی اُسی میں ہے لیکن ان کی یہ رحمت ہے کہ اور تدبیروں کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا اس لئے میں تدبیر ظنیہ مجوزۂ عقلاء کا مخالف نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ صرف تدابیر ظاہری اور طب کے ایسے پیچھے کیوں پڑے ہو کہ صحیح تدبیر اور سچی طب کو بالکل ہی بھول گئے ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں　　حکمت ایمانیاں راہم بداں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب　　صحت آں حس بجوئید از حبیب
صحت ایں حس زمعموری تن　　صحت آں حس زتخریب بدن

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے کچھ دن حکمتِ ایمانی یعنی معرفت کی تو پڑھو ۔ حسِ جسمانی کو درست کرنا چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو اور اگر حس روحانی کو ترقی منظور ہو تو مرشدِ کامل سے رجوع کرو ۔ حسِ جسمانی سے تو بدن کی

(درستی ہوتی ہے اور حسن روحانی کی صحت بدن کی تخریب سے ہوتی ہے۔)

پس جو طب حکیم حقیقی نے ارشاد فرمائی ہے بالکل کافی ہے لیکن باوجود اس کے یہ بھی اجازت دیدی ہے کہ اور نسخہ بھی پیو تو حرج نہیں بلکہ ترغیب دی ہے تَدَاوَوْا عِبَادَ اللّٰہِ (اللہ کے بندوں سے علاج کراؤ) جس کی حقیقت اہل اللہ و مربیانِ قلب نے سمجھی چنانچہ انھوں نے ترکِ اسباب کو علی الاطلاق جائز نہیں رکھا یہاں سے وہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو کہ بہت لوگ ناتمام باتیں سُنکر کہدیا کرتے ہیں کہ یہ مولوی تو چاہتے ہیں کہ دنیا کے کاروبار ترک کرکے مسجد کے کونہ میں تسبیح لیکر بیٹھ جاویں حاشا وکلا مولویوں کا یہ مقصود ہرگز نہیں بلکہ تم اگر ایسا کرو بھی تو وہ تم کو روک دیں کیونکہ آدمی بالطبع اسباب ظاہرہ کا خوگر بنایا گیا ہے پس اگر اسباب کو ترک کریگا تو اس کی جمعیت وسکون میں ضرور فرق پڑے گا اس کی ایسی مثال ہے کہ

ترکِ اسباب علی الاطلاق جائز نہیں

۲۴ ایک طبیب کامل ہے اس کو مریض کے حال پر بہت عنایت اور شفقت ہے اس نے مریض کو نسخہ لکھ کر دیا لیکن وہ طبیب یہ بھی جانتا ہو کہ اس مریض کو ضعف اور توہم کی وجہ سے اس پر قناعت نہ ہوگی اور اسکو خیال رہے گا کہ فلاں دوا اگر پیتا تو جلدی کامیاب ہوجاتا اور یہ اس کی دُھن اور اُدھیڑبن ممکن ہے کہ اِس حد تک ہو کہ اصلی دوا سے بھی اعراض کرے اِس لئے وہ براہ عنایت اس کی تسلّی کے واسطے کہدیتا ہو کہ دوا تو اس مرض کی یہی ہے جو ہم نے بتلائی ہے لیکن اگر تم کوئی اور دوا بھی پیو تو تم کو اختیار ہے تو اس مریض کو اگرچہ شفا اور صحت تو اسی باقاعدہ اور صحیح نسخہ سے ہوگی اور مریض خواہ کچھ سمجھے لیکن طبیب کو چونکہ شفقت اور محبت ہے وہ اپنا نام بھی کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا مقصود تو یہ ہے کہ اس کو صحت ہوجائے۔ وہی مثل ہے کہ کام تو کسی کا اور نام کسی کا ہے

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی تیری زلفوں کا کام ہے لیکن مصلحتاً عشاق نے چین کے ہرنوں پر الزام لگا دیا ہے)

پس اسی طرح حق تعالےٰ کا مقصود یہ ہے کہ ہمارے بندے کسی طرح اچھے ہوجائیں چاہے وہ حکیم جی ہی کا نام کر دیں اور ان کو پریشانی نہ ہو بس یہ وجہ ہے کہ ترک اسباب کو منع کر دیا ورنہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (اور کوئی (روزی کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ سب اسباب ترک کر دیتے اور تجارت زراعت نوکری صنعت یک لخت چھوڑ دیتے ہاں اقویا کو اجازت دی ہے کہ اگر تم ترک اسباب کرو تو جائز ہے کیونکہ ان کو ترک اسباب سے اپنی قوت توکل کی وجہ سے پریشانی لاحق نہ ہوگی باقی ضعفاء کو یہی حکم ہے کہ تدبیر کرو ایک صحابی کا قصہ ہے کہ ان سے تخلف تبوک لغزش ہوگئی تھی پھر اللہ تعالےٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی انھوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اللہ تعالےٰ نے میری توبہ قبول فرمائی ہے اس کے شکریہ میں میں چاہتا ہوں کہ اپنا سب مال تصدق کر دوں فرمایا نہیں سب مت دو کچھ رکھ لو اس قصہ سے اور نیز شریعت کے ہر ہر حکم سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ شریعت نے جذبات طبعیہ کی بڑی رعایت کی ہے اور اسلام کے سب احکام فطرتِ سلیمہ کے موافق ہیں حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک بی بی نے عرض کیا کہ میں اپنی جائداد وقف کرنا چاہتی ہوں حضرت نے فرمایا کہ نہیں نہیں ایسا نہ کرو کچھ رکھ لو نفس کو کبھی پریشانی ہو جایا کرتی ہے پھر وہ پریشانی دین تک مقتضی ہوتی ہے حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ وہ زمانہ گیا کہ درہم و دینار رکھنا تقویٰ و توکل کے خلاف تھا اب تو اگر کسی کے

پاس کچھ مال ہو تو اس کو حفاظت سے رکھنا چاہیئے کہ ہمت انسان جب
مفلس ہوتا ہے تو اوّل اس کا دین ہی برباد ہوتا ہے بعض بزرگوں نے
رزق ملنے کی عجیب طریقہ سے دُعائیں مانگی ہیں چنانچہ ایک بزرگ نے دُعا
کی تھی کہ اے اللہ جو کچھ میری قسمت میں لکھا ہے ایک دم سے دیدو
ارشاد ہوا کہ کیا ہم پر اطمینان نہیں عرض کیا کہ اطمینان کیوں نہیں
شیطان مجھ کو بہکاتا ہے اور کہتا ہے کہ کہاں سے کھائے گا میں کہتا ہوں
کہ اللہ تعالٰے دیگا وہ کہتا ہے کہ یہ تو یقینی ہے کہ دیگا مگر یہ تو خبر نہیں کہ
کب دیگا اِس سے میں پریشان ہوتا ہوں آپ مجکو اگر ایک دم سے
دیدیں گے تو میں کوٹھری میں بند کر کے رکھ لوں گا جب شیطان کہیگا کہ
کہاں سے کھائے گا میں کہہ دوں گا کہ اِس کوٹھری میں سے کھاؤں گا وہ
اس میں کوئی شبہ نہ ڈال سکے گا اور پریشان نہ کر سکے گا یہاں سے یہ بھی
معلوم ہوا کہ سلوک میں خاص کیفیات مثلاً باوجود مال نہ ہونے کے ۲۶
پریشانی نہو سو یہ مطلوب نہیں اگر مال رکھ کر جمعیت اور تسلّی ہو تو
رکھے اور اگر خرچ کر کے اطمینان حاصل ہو تو خرچ کر دے بعض طبیعتیں
ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان کی مِلک میں بہت سی چیزیں ہوں تو ان کا دل
گھبراتا ہے بہرحال اس باب میں سے دوا دارو کی بھی اجازت ہے
لیکن دوا کو موثر بالذات نہ سمجھے کہ بغیر اس کے شفا ہی نہ ہوگی بہت
لوگ ہم نے دیکھے ہیں کہ دوا بالکل نہیں کرتے ہیں جلال آباد کے ایک
رئیس نے کہ حکیم کو بلاتے گاڑی بھیجتے فیس دیتے اور حکیم جی سے کہتے کہ
آپ بلا تامل جتنے کا چاہیں نسخہ لکھئے دس کا بیس کا پچاس کا چنانچہ حکیم جی
نسخہ لکھ دیتے ملازم کو دیتے کہ جاؤ بھائی دکھلاؤ عطار کو کتنے کا ہے
عطار کہتا کہ پچیس روپیہ کا ہے کہتے لاؤ صندوقچی سے پچیس روپیہ گن کر
دیتے کہ جاؤ خیرات کردو مساکین کو میری یہی دوا ہے چنانچہ جب یہ

ایک بزرگ کا واقعہ

کیفیات مطلوب بالذات نہیں

عمل کرتے فوراً اچھے ہو جاتے ہمارے ایک دوست ہیں وہ کبھی دوا نہیں کرتے اِس مرتبہ وہ سخت بیمار ہوئے ہر چند ان کو سمجھایا گیا کہ علاج کرو مگر ایک نہ سُنی آخر لوٹ پوٹ چند روز کے بعد اچھے خاصے ہو گئے معلوم ہوا کہ تدبیر حقیقی پر کفایت کرنا بالکل کافی ہے اگر کوئی کہے کہ اگر تدبیر حقیقی یہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ بعضے لوگ نری دوا سے اچھے ہو جاتے ہیں صاحبو! تم سمجھتے ہو کہ وہ اچھے ہو گئے وہ اچھے نہیں ہیں ایک بخار تو چلا گیا اس کو ایک بخار اور ہے جو اس کے لئے روح فرسا بن رہا ہے جس کا انجام ہلاک جسمانی ہی نہیں بلکہ ہلاک ابدی ہے۔ اصلی تدبیر طاعت ہی ہے اُس کے ہوتے ہوئے دوا کی اجازت ہے پس جمع کرنا جائز اور نری طبعی تدبیر پر اکتفا کرنا ناجائز۔ ہم لوگ اسی میں مبتلا ہیں کہ اور تدابیر سب کرتے ہیں اور اصلی تدبیر سے غافل ہیں سو طاعون کی تدبیر میں
۲۷ صفائی مکانات کی اور فنائل ہی کافی نہیں ہے بلکہ دوسری صفائی بھی ضروری ہے اور یہ دوسری صفائی وہ نہیں جو بعضے بدمذاق لوگ سمجھتے ہیں یعنی وہ تعویذوں کو کافی سمجھتے ہیں کہ تعویذ دروازہ پر چسپاں کر دو طاعون تعویذ سے ڈر کر بھاگ جائے گا یہ ان سے بڑھ کر ہیں جو دوا پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ دوا کا کھانا اور استعمال کرنا بیماری زائل ہو جانے کی طبعی تدبیر تو ہے لیکن تعویذ کا چسپاں کرنا طاعون کے بھاگ جانے کے لئے تو اُس درجہ کی طبعی تدبیر بھی نہیں اور نہ باطنی و حقیقی جیسا کہ اصلاح حالت تدبیر حقیقی ہے پس اس پر اتنا اعتقاد رکھنا بہت ہی عجیب ہے جتنا وہ لوگ رکھتے ہیں جو کہ تعویذوں کے معتقد ہیں یعنی ان کو شک ہی نہیں ہوتا گویا ایک پٹہ لکھوا لیا ہے صاحبو! طاعون تو جب بھاگے جبکہ باہر سے آتا ہو طاعون تو گھر کے اندر موجود ہے باہر تعویذ لگانے سے کیا ہوتا ہے وہ طاعون کیا ہے معصیت

کیونکہ طاعون ہو یا کوئی اور مصیبت ہو اس کا اصلی سبب تو معصیت ہے پس جب معصیت بحالہ رہے تو دشمن تو تمہارے گھر کے اندر ہے باہر کے انتظام سے کیا ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود — حیلۂ فرعون زیں افسانہ بود

(دروازہ بند کرلیا لیکن دشمن گھر کے اندر تھا۔ فرعون کا حیلہ محض افسانہ تھا۔)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ فرعون نے اپنے دشمن کو یعنی موسیٰ علیہ السلام کو گھر کے اندر رکھا اور ان کو پرورش کیا اور دشمنوں کا انتظام کرتا تھا صاحبو! لوگ باوجود اصلاح نہ کرنے کے جو تدبیر کر رہے یہ فرعونی تدبیر ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی جو اصلی سبب ہے پریشانیوں کا اس کو چھوڑتے نہیں اور بالائی تدبیریں کرتے ہیں یاد رکھو جب تک کہ مرض کے اصلی سبب کا استیصال نہ کیا جاوے مرض نہ جائے گا پس جب تک کہ معصیت نہ چھوڑیں گے ان بلاؤں سے خلاصی نہیں ہو سکتی سو اس سبب کی طرف کسی کو التفات تک بھی نہیں آپ ہی بتلایئے فیصدی کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو اس کا احساس ہو اور وہ تدبیر کرتے ہوں ہاں ظاہری تدبیریں کرتے ہیں لیکن اصلی تدبیر سے غفلت ہے اور بعضے کوئی تدبیر بھی نہیں کرتے دیکھئے آجکل بارش کی کمی ہے بتلایئے اس کے لئے کیا تدبیر کی ہے طاعون میں تو خیر کچھ کرتے بھی ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تدبیر کو منحصر سمجھ لیا ہے اپنی وہمی اور ظنی تدبیروں اور اسباب میں اور طاعون کے کچھ ظاہری علاج بھی ہیں اس لئے اس کی تدبیر تو کرلی اور بارش برسنے کا کوئی طریقہ کسی کو یاد نہیں اس لئے اُس سے عاجز ہیں بڑے بڑے مدبر اور عقلاء موجود ہیں لیکن کسی کی قدرت میں یہ بات نہیں کہ واقعی بارش برسا دیں باقی ایک گندی بارش ایک تدبیر سے بھی ہو چکی ہے اُس کی نفی نہیں کرتا چنانچہ

[حاشیہ: مصیبتوں کا اصلی سبب معصیت ہے]

۲۸

[حاشیہ: امساک باران کے لئے کوئی تدبیر نہیں کرتا]

ایک حکایت میں نے ایک کتاب میں دیکھی ہے کہ فرعون خدائی کا دعویٰ کیا کرتا تھا ایک سال بارش نہوئی قحط ہوگیا لوگوں نے آکر شکایت کی کہ ہم لوگ قحط میں ہلاک ہورہے ہیں تم کیسے خدا ہو بارش کیوں نہیں برساتے فرعون نے شیطان سے کہ کسی وقت اس سے دوستی ہوگئی تھی یہ سب قصہ کہا شیطان نے وعدہ کیا کہ کل بارش ہوگی چنانچہ اس نے سب شیطانوں کو جمع کرکے کہا کہ سب اوپر جاکر موتو چنانچہ بارش تو ہوئی لیکن بدبو کے مارے دماغ پھٹے پڑتے تھے فرعون نے پوچھا کہ یہ کیسی بارش شیطان نے کہا کہ احمق ہوا ہے جیسا تو خدائے باطل ہے ویسی ہی تیری بارش ہے اور جیسے وہ خدائے حقیقی ہیں اسی طرح کی ان کی بارش ہے اور یہ جو حدیثوں میں آیا ہے کہ دجال جہاں چاہے گا بارش ہوجائے گی تو یاد رکھو کہ اس سے بارش کا اس کے قبضہ میں ہونا لازم نہیں آتا یہ استدراج ہے اس کے چاہنے پر ابتلاءً اللہ تعالےٰ کی قدرت سے ہوگی اس کے معتقد سمجھیں گے کہ اس نے بارش کی ہے لیکن یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اس میں تو تلبیس ہوجاویگی جواب یہ ہے کہ یہ دھوکہ کی بات نہیں ہے اس لئے کہ اس کے ماتھے پر کافر لکھا ہوگا کہ جس کو پڑھا ان پڑھا سب پڑھ لیں گے اور دوسرے یہ کہ وہ کانا ہوگا اور حق تعالےٰ سب عیوب سے پاک ہیں لیکن باوجود اس کے بھی بعضے لوگ گمراہ ہوجاویں گے اور ان دونوں علامتوں کی تاویلیں کرلیں گے میرے ایک استاد بیان فرماتے تھے کہ ایک مقام پر ایک اندھے نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا ساٹھ ستر آدمی اس کے ساتھ ہوگئے ایک طالب علم نے اس سے کہا کہ اگر تم خدا ہو تو اپنی آنکھیں کیوں اچھی نہیں کرلیتے کہنے لگا کہ ہم اپنے بندوں کا (نعوذ باللہ) امتحان کرتے ہیں کہ دیکھیں کون ہماری تصدیق کرتا ہے اور تکذیب کرتا ہے غرضکہ

قصۂ فرعون و بارش از شیطان

تحقیق بارش از دجال و تلبیس و جواب آن

۲۹

آنکھ پھوٹی ہوئی اور ماتھے پر کافر لکھا ہوا اس سے زیادہ اور کیا دلیل اس کے بطلان کی ہوگی یہ تو ایک موٹی بات ہے دوسرے ایک باریک بات اس کے بطلان کے شناخت کی حدیث میں آئی ہے وہ یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس ظاہر بینائی سے اس کو دنیا میں دیکھوگے اور حق تعالےٰ کو دنیا میں ان آنکھوں سے کوئی دیکھ نہیں سکتا اس سے صاف معلوم ہوا کہ وہ خدا نہ ہوگا۔ ان دلائل کے ہوتے ہوئے بھی کوئی بگڑے تو بگڑے بہر حال بارش کے متعلق کوئی تدبیر بھی نہیں کرتے اور البتہ خالی شکایتیں کیا کرتے ہیں میاں کتنے دن ہوگئے بارش نہیں ہوئی قحط ہوگیا میں کہتا ہوں کہ اس کہنے سے کیا مقصود ہے کس کو سناتے ہو کیا یہ اللہ میاں پر اعتراض ہے یا اللہ میاں کو یا کسی آدمی کو صرف سنا رہے ہو آدمیوں کو سنانا تو ظاہر ہے کہ مقصود نہیں اس لئے کہ آدمی کچھ کر ہی نہیں ۳۰
سکتے اور اللہ تعالیٰ کو بھی صرف سنانا اور خبر دینا ہرگز مقصود نہیں اس لئے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے اب یہی شق رہی کہ یہ اعتراض ہے اور گویا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ امر خلاف حکمت ہے ایسا نہ کرنا چاہئے تو دیکھ لیجئے کہ حق تعالےٰ پر اعتراض کرنا کیا ہوتا ہی اگر قصداً ہی یہ اعتراض ہوتا تو میں اس کو کفر کہتا لیکن اب کہ قصد نہیں ہے سخت بے ادبی اور گستاخی ضرور کہوں گا مجھے تو واللہ ان کلمات سے سخت وحشت ہوتی ہے ہاں اگر اس جملہ خبریہ سے یہ مقصود ہو کہ دعا کرو کہ بارش ہو تو دوسری بات ہے لیکن قرائن حالیہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مقصود نہیں اگر کہو کہ ہمارا تو کچھ بھی مقصود نہیں ہوتا یوں ہی ہانک دیتے ہیں تو اس صورت میں یہ لغو ہوا اور لغو سے بھی احتراز کرنا چاہئے حدیث میں ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا یَعْنِیْهِ

بارش نہ ہونے اور دوسرے مصائب عامہ کے متعلق شکوے کے کلمات اور ان کا درجہ کفر ہونا۔

(آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ لایعنی اور بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے) غرض ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ فضول اور لغو میں تو مشغول ہیں اور جو اصلی اور صحیح تدبیر ہے اس سے غفلت ہے اور وہ تدبیر وہ ہے جو اس آیت کریمہ میں مذکور ہے یعنی استغفار اور رجوع الی اللہ (اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہونا) اگر کوئی شبہ کرے کہ یہ تدبیر بھی کی جاتی ہے چنانچہ دعائیں کرتے ہیں گناہوں سے توبہ کرتے ہیں مگر اس سے بھی کچھ نہیں ہوا تو صاحبو! جواب یہ ہے کہ خود آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تدبیر کرنے والے بہت ہی کم ہیں تو یہ کیا تدبیر ہوئی کہ ایک نے تو تدبیر کی اور زیادہ اس کی ضد اور خلاف کریں یعنی ایسے اعمال کریں کہ اُلٹا اثر ہو اور اثر غالب ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے جو زیادہ ہوں چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصّٰلِحُوْنَ (کیا ہلاک کر دو گے حالانکہ ہمارے درمیان نیک
31 آدمی بھی ہیں) تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا نعم اذا کثر الخبث پس جب زیادہ سوء تدبیر کے مرتکب ہیں تو باوجود بعض قلیل کے تدبیر کرنے کے مصائب کا نزول کیا محل شبہ رہا باقی یہ بات کہ ان صلحاء پر تو وہ مصیبت نہ آنا چاہیے سو بعض حکمتوں سے عادۃ اللہ یہ ہے کہ اس حالت میں دنیا میں جو مصیبت آتی ہے اس میں سب ہی شریک ہوتے ہیں ہاں آخرت میں اپنے اپنے اعمال کے موافق محشور ہوں گے اور دنیا میں بھی وہ شرکت ظاہری ہی ہوتی ہے ورنہ صلحاء کے حق میں وہ مصیبت ظاہری حقیقت میں رحمت ہی ہوتی ہے سو بعض صلحاء کے اعتبار سے تو یہ جواب ہے اور بعض صلحاء کے اعتبار سے دوسرا جواب ہے وہ یہ کہ اس زمانہ کے بعض صلحاء بھی منکرات کو دیکھتے دیکھتے مداہن ہو گئے ہیں اب جو لوگ علماء اور اتقیاء اور صلحاء کہلاتے ہیں باستثنائے خواص اہل اللہ کے اکثر کی کیفیت یہ ہے کہ نافرمانی

کرنے والوں سے ان کو انقباض نہیں ہوتا بے تکلف میل جول کھانا پینا
شادی بیاہ مرنے جینے میں شرکت اہل معصیت کی کرتے ہیں میں نے سُنا
ہے کہ یہاں لوگ کوکین بہت کھاتے ہیں مگر کوئی ایک ہی شخص بتلا
دیجئے کہ اُس نے اپنے کسی عزیز کو صرف اِس وجہ سے چھوڑ دیا ہو کر وہ
کوکین کھاتا ہے برابر ملتے جلتے ہیں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوتی اسی
طرح ہر معصیت کو سمجھ لیجئے۔ حدیث شریف میں امم سابقہ کے قصوں
میں ایک قصہ وارد ہوا کہ جبرئیل کو ایک گاؤں کی نسبت حکم فرمایا کہ
اس کو اُلٹ دو۔ عرض کیا کہ اے اللہ فِیْهَا فُلَانٌ لَمْ یَعْصِ قَطُّ یعنی اس
میں فلاں شخص ہے کہ اس نے کبھی گناہ نہیں کیا۔ حکم ہوا کہ مع اس کے
اُلٹ دو فَاِنَّهٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ وَجْهُهٗ فِیَّ قَطُّ یعنی وہ ہماری نافرمانی دیکھتا تھا
اور کبھی اس کے چہرے پر تغیر تک نہیں ہوا۔ دیکھو جو شخص باغیوں سے
ملتا ہے وہ بھی باغی ہی شمار ہوتا ہے۔ ایام غدر میں جس نے باغیوں کو پناہ ۳۲
دی سرکار کے نزدیک وہ بھی مجرم شمار ہوا جس کے ہم وفادار ہوں گے
تو یہ وفاداری کی بات نہیں ہے کہ اس کے دشمنوں سے ملیں۔ پس اگر
صلحاء کہیں ہیں بھی وہ بہت تھوڑے ہیں۔ زیادہ تعداد تو ایسے ہی
لوگوں کی ہے جو نافرمانی میں مبتلا ہیں۔ ہاں کوئی یہ ثابت کرے کہ بستی
کی بستی صالح ہو اور پھر وہاں بلائیں اور امراض اور قحط ہو سو یہ
بہت مشکل ہے صلاحیت اور تقویٰ تو بڑی چیز ہے اُس کا تو اثر ہی
دوسرا ہے برائے نام ہی کوئی تھوڑی دیر کے لئے حق تعالیٰ کی طرف
رجوع ہو کر دیکھ لے کہ کیا رحمت ہوئی۔ دیکھو استسقاء کی دو ہی رکعت
ہیں جو بہت سے بہت دس منٹ میں ہو جاتی ہیں لیکن باستثنائے
شاذ و نادر کے بہت کم ایسا ہوا ہے کہ مؤثر نہ ہوں۔ جب کبھی پڑھی گئی
ہیں بارش ضرور ہوئی ہے کوئی رجوع ہو کر دیکھے تو۔ سندیلہ ایک

ترک امر بالمعروف پر ایک قصہ

صلوٰۃ استسقاء کی برکت

مقام ہے وہاں ایک مرتبہ اِمساک باراں ہوا قحط ہو گیا۔ مخلوق بہت پریشان ہوئی۔ استسقا کی نماز کئی روز پڑھی گئی بارش نہ ہوئی وہاں کے رؤسا کے پاس بازاری عورتیں آئیں اور اُنھوں نے عرض کیا کہ صاحبو! یہ سب ہماری بداعمالی کے نتیجے ہیں ہم تبہ کار سیہ رو ہیں ہماری نحوست سے تم کو بھی یہ پریشانی ہوئی ہم کو اجازت دیدیجئے کہ ہم بھی میدان میں جمع ہو کر توبہ کریں لیکن جب ہم جمع ہوں تو ایسا اِنتظام کر دیجئے کہ وہاں جنگل میں کوئی شخص ہمارے پاس نہ آوے ایسا نہ ہو کہ بجائے رحمت کے اور زیادہ غضب نازل ہو۔ چنانچہ اِنتظام کر دیا گیا اور وہ سب وہاں گئیں اور سجدے میں پڑ کر رونا شروع کیا اور کہا کہ اے اللہ یہ ہماری نحوست ہے ہم بہت گنہ گار ہیں ہم بہت سیہ رو ہیں ہماری وجہ سے مخلوق کو پریشان نہ کیجئے اور جو جو کچھ بن سکا حق تعالےٰ کی جناب میں عرض کیا حق تعالےٰ کو عاجزی پسند ہے ناقل اِس حکایت کے یوں کہتے تھے کہ اُنھوں نے سر نہیں اُٹھایا تھا کہ بارش شروع ہوئی اور خوب ہوئی مولانا فرماتے ہیں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را ما دروں را بنگریم و حال را

(ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے ہم باطن اور حال کو دیکھتے ہیں۔)

یعنی ہم ظاہر کو اور الفاظ کو نہیں دیکھتے اگر الفاظ لمبے چوڑے باضابطہ ہوں لیکن خشک ہوں دل میں کچھ نہ ہوا حق تعالےٰ کے نزدیک ان کا کچھ مرتبہ نہیں ہم تو دل کو اور حال کو دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ تقویٰ طہارت پر کسی کو ناز نہ ہو ہمارے دربار میں تقویٰ طہارت جب ہی مقبول ہے جبکہ اس میں عبدیت اور خشوع خضوع ہو اور خشک تقویٰ ہمارے دربار میں قابل قدر نہیں ہے۔ موضع لوہاری میں ایک مرتبہ اِسی طرح اِمساک باراں کی وجہ سے مسلمانوں نے اِستسقا کی نماز

تیاری کی۔ بنیے دیکھ کر کہتے تھے کہ اب کے تو بارش ہے ہی نہیں یہ فضول کوشش کر رہے ہیں مسلمانوں نے دعا کی کہ اے اللہ ہم کو ان کے سامنے ذلیل نہ کر۔ ابھی دعا ہی میں مشغول تھے کہ بارش شروع ہوئی۔ وہی بنیے کہنے لگے کہ یہ مُسلّے (مسلمان) رام جی کو بہت جلدی راجی (راضی) کر لیں ہیں۔ پس جبکہ باوجود ہماری اتنی کوتاہیوں کے تھوڑی سی توجہ میں بھی رحمت ہو جاتی ہے تو اگر ہم پوری اپنی اِصلاح کر لیں اور دل سے توبہ اور رجوع اِلی الحق کریں تو کیسے رحمت نہ ہوگی ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد ۔۔۔ اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(کوئی شخص ایسا نہیں کہ عاشق ہوا ہو اور محبوب نے اس کے حال پر نظر نہ کی ہو۔ اے صاحب (تمہیں) درد ہی نہیں ہے ورنہ طبیب موجود ہے۔)

پس یہ فرض فرضِ محال ہے کہ ہم سب نیک ہوں اور بارش نہ ہو اور بالفرض
۲ اگر نہ بھی ہو تب بھی یوں نہ کہیں گے کہ ناکامی ہوئی۔ اس کو ناکامی کہنا کامیابی کی حقیقت نہ جاننے سے ہوا ہے۔ میں کامیابی کی حقیقت بتلاتا ہوں اس سے ناکامی کا عِلم ہو جائے گا۔ صاحبو روپیہ مل جانا۔ ارزانی کا ہونا۔ روٹی کا ملنا۔ ہر شئے کا حسب دلخواہ ملنا لوگ اس کو کامیابی کہتے ہیں۔ یاد رکھو یہ کامیابی کی صرف صورت ہے کامیابی کی حقیقت نہیں۔ چنانچہ میں ایک مثال عرض کرتا ہوں اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ چیزیں اپنی ماہیت میں کامیابی نہیں ہیں۔ دو شخص فرض کئے جاویں ایک شخص تو ایسا ہے کہ ایک لاکھ روپیہ اس کی مِلک میں ہے اور جائداد ہے نوکر چاکر غرض سب سامان دنیا کا اس کو میسر ہے لیکن اس پر ایک مقدمہ فوجداری کا قائم ہو گیا اور اس میں پھانسی کا حکم ہو گیا۔ اور ایک دوسرا شخص ہے جو اسی کے پڑوس میں رہتا ہے جس کی اوقات یہ ہے کہ وہ ۸ر کا مزدور ہے۔ مزدوری کی اور کھا کر

اپنے بیوی بچوں میں سو رہا۔ یہ امیر آدمی ہمیشہ اس کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا
تھا۔ اگر آج اس امیر کو یوں کہا جاوے کہ تم کو ایک صورت سے خلاصی
ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم اپنا سارا سامان اس شخص کو دیدو بجائے تمہارے
یہ اُس جُرم کا اقرار کرلیگا اور اس کو پھانسی ہو جاوے گی اور تم بچ
جاؤگے مگر اس کے بعد ناداری سے تمہاری حالت ایسی ہو جائیگی جیسی
اس شخص کی ہے تو وہ امیر یقیناً یہی کہے گا کہ اس سامان کی کیا حقیقت
ہے اگر اس سے دونا بھی میرے پاس ہو اور وہ دیکر میری جان بچے تو
میں راضی ہوں۔ اور اگر اس غریب کو کہا جائے کہ تم کو اتنا روپیہ اور
سامان ملتا ہے لیکن تمہاری جان لی جاوے گی وہ کہے گا کہ جب میری
جان ہی گئی تو میں اِس سامان کو لیکر کیا کروں گا۔ سو صاحبو اگر یہ روپیہ
اور جائداد اور مکانات ہی کامیابی اور مقصود اصلی ہیں تو کیا وجہ
۳ ہے کہ آج ان کو وہ شخص کامیابی کیوں نہیں سمجھتا اور ان کے دینے پر
کیوں راضی ہے اور وہ غریب آدمی کیوں ان کے لینے پر راضی نہیں
ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں کامیابی کی صورتیں ہیں حقیقت
کامیابی کی اور شے ہے وہ کیا ہے راحتِ قلب چونکہ مال سے راحت
ہوتی ہے اِس لئے وہ مقصود ہے بالذات مقصود نہیں ورنہ ہر حالت
میں مقصود ہوتا۔ چنانچہ اِس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ خود غلط بود آنچہ
ما پنداشتیم (جو کچھ ہم نے گمان کیا واقع میں غلطی تھی) پس بڑی چیز اور اصلی مقصود
راحتِ قلب ہے اسی واسطے وہ دو لاکھ روپیہ دینے پر بے تکلف اور
دِل سے راضی بلکہ مصر ہے اور وہ آٹھ آنے کا مزدور ان پر تھوکتا بھی
نہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو اب ہم اس شبہ کا جواب دیتے ہیں
اور دعویٰ کرتے ہیں کہ راحت اور سکون حقیقی جو حقیقت ہے کامیابی
کی صرف اللہ تعالےٰ کی اطاعت میں ملتا ہے۔ پس اِس لئے میں نے کہا

تھا کہ اصلاح و تقویٰ کے اختیار کرنے کے بعد اگر بارش وغیرہ بھی نہ ہو اور
تمہارا مصیبت بھی دور نہ ہو تب بھی یوں نہ کہیں گے کہ ناکامی ہوئی۔ اس
حالت میں بھی کامیابی ہی ہے اس لئے کہ اس شخص کو اس مصیبت میں بھی
پریشانی نہ ہوگی راحت اور سکون ہی ہوگا۔ اور یہ نرا دعویٰ ہی نہیں
ہے کہ راحت منحصر ہے اطاعت میں۔ اہل طاعت کی حالت کا مشاہدہ
کر لیجئے کہ ان کو کوئی شئے پریشان نہیں کرتی ان کا قلب ہر وقت مطمئن ہے
اور جو کچھ حق تعالیٰ کی جانب سے پیش آتا ہے وہ اس پر دل سے راضی
ہیں خواہ وہ نعمت ہو یا نقمت (مصیبت) ہو۔ ارزانی ہو یا گرانی بارش ہو
یا نہ ہو اور وہ اسی کو دل سے کامیابی سمجھتے ہیں۔ پس یہ ثابت ہوگیا کہ
اگر سب نیک ہوں اور پھر بھی بارش نہ ہو تب بھی اس کو ناکامی نہ
کہیں گے بلکہ وہی عین کامیابی ہے اس لئے کہ قحط اور امساک باراں
۴ اسی وقت مصیبت ہے جبکہ اس سے پریشانی ہو اور جبکہ وہ ہر حالت
میں راضی ہیں تو ان کے لئے یہ مصیبت ہی نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا
ہوں کہ سب اگر اصلاح کر لیں تو اس کا کہنا ہی کیا ہے۔ اگر ایک شخص
بھی اپنی اصلاح کر لے تو وہی کامیاب ہو جاوے گا اس کو ہرگز پریشانی
نہیں رہے گی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری میں جو راحت ہے وہ
کسی شئے میں بھی نہیں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حق تعالیٰ سے
محبت ہوتی ہے اور محبت وہ شے ہے کہ تمام تلخیوں کو شیریں کر دیتی ہے
اور حق تعالیٰ کی محبت میں یہ اثر کیسے نہ ہوگا۔ مجازی عشق میں یہ اثر
ہوتا ہے کہ تکلیف کو راحت بنا دیتا ہے۔ مثلاً کسی پر عاشق ہوا اور آپ
چلے جا رہے ہوں کہ پیچھے سے کسی نے ایک گھونسہ بڑی زور سے ایسا رسید کیا
کہ بڑی تکلیف و اذیت ہوئی پیچھے پھر کر جو دیکھا تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہ گھونسہ
مارنے والا وہ شخص ہے جس کے دیکھنے کی برسوں سے تمنا تھی اور غیبت میں جس کا

محبت اور عشق تلخیوں کو شیریں بنا دیتا ہے

نام لیکر دل کو تسلّی دیا کرتا تھا جیسے ایک حکایت ہے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم — می نمود ے بہر کس نامہ رقم
گفت ای مجنونِ شیدا چیست ایں — می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشقِ نامِ لیلےٰ می کنم — خاطرِ خود را تسلّی می کنم

(کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے کہ ریت پر انگلی سے کسی کو خط لکھ رہا ہے پوچھا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر کے اپنے دل کو تسلّی دے رہا ہوں)

جس کا نام ہی بجائے مسمیٰؒ کے تھا اب وہ سامنے جلوہ افروز ہے - اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس حالت میں کیا اس گھونسہ کی اس کو تکلیف ہو گی. اگر عشق میں سچا ہے تو یوں کہے گا کہ ایک گھونسہ نہیں تم میرے دس گھونسے لگا لو مگر میرے سامنے رہو جسم کو تو اس مے تکلیف ضرور ہو گی لیکن قلب تو یہی کہیگا ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

اور یہ کہے گا ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من — دل فدائے یار دل رنجانِ من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ایسے محبوب پر دل قربان ہو جو میرے دل کو رنجیدہ کرنیوالا ہے)

اور یہ کیوں ہے محض اس لئے کہ یہ محبوب کی جانب سے ہے ؎

از محبّت تلخہا شیریں بود

(محبت میں تلخیاں بھی شیریں ہیں)

جب مخلوق کی محبت میں یہ حالت ہے تو ؎

عجب داری از سالکانِ طریق — کہ باشند در بحرِ معنی غریق
خوشا وقت شوریدگانِ غمش — اگر ریش بینند دگر مرہمش

گدایانے از بادشاہی نفور — بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند — وگر تلخ بینند دم درکشند

(تو سالکان طریق سے جو کہ حقیقت کے دریا میں غریق ہیں تعجب کرتا ہے اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر غم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اور اس کی امید پر فقیری میں کرنے والے ہیں ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

ازالۂ شبہ جو مصائب آتے ہیں ان سے وہ پریشان نہیں ہوتے

جبکہ تمہارے جیسا آدمی جو تمہاری مثل خون اور کھال اور گوشت پوست سے بنا ہے تمہاری یہ حالت بنا دیتا ہے تو صاحبو محبوب حقیقی کے عشق میں تو یہ اثر کیسے نہ ہوگا۔ پس کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ بعد اصلاح کے بھی ناکامی ہوتی ہے رہی یہ بات کہ اگر محبوب ہی کی یہ مرضی ہو کہ مصیبت میں پھنسا رہے پھر تو کامیابی ہونا اور مصیبت سے نکلنا ممکن ہی نہیں تو
۶ پھر کامیابی کدھر سے ہوئی۔ بات یہ ہے کہ میرا مقصود صرف یہ ہے کہ ان کو اطمینان اور چین اور سکون ہر وقت رہتا ہے اس کا نام میں نے باعتبار حقیقت کے کامیابی رکھا ہے میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مصائب ان پر نہیں آتے مصائب صوریہ آتے ہیں مگر اس سے وہ پریشان نہیں ہوتے ازجا رفتہ (پریشان) نہیں ہوتے اور کیوں ہوں اس لئے کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ بندہ کے واسطے وہی کرتے ہیں جو اس کے لئے بہتر ہو حق تعالیٰ کو ماں سے زیادہ شفقت ہے ؎

طفل می لرزد زنیش احتجام — مادرِ مشفق ازاں غم شادکام

(بچہ نشتر لگواتے سے لرزتا ہے مگر مشفق ماں اس سے مطمئن اور خوش ہوتی ہے)

خدا تعالیٰ ان کو مریض رکھیں یا تندرست مفلس رکھیں یا امیر مگر ان کو ذلیل اور پریشان نہیں کرتے اس کے خلاف کہیں بتلاؤ تب شبہ کی گنجایش ہے بہرحال ثابت ہوگیا کہ ان مصیبتوں سے بچنے کی تدبیر حقیقی

صرف اطاعت کاملہ ہے۔ پس اس تدبیر کو اختیار کرو اور دین کی طرف توجہ کرو اور اس کے طریقہ سے توجہ کرو۔ بہت لوگ اس کے متعلق بھی غلطیوں میں مبتلا ہیں یعنی اگر دین کی طرف آتے ہیں تو نئے رنگ سے اور جو اس کا اصلی طریق ہے اس طریقہ پر نہیں چلتے۔ مثلاً کسی بزرگ سے کہتے ہیں کہ حضرت کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ گناہ مجھ سے نہ ہوں گویا حضرت کے پاس کوئی زنجیر ہے کہ آپ کو اس میں جکڑ دیں گے تو گویا وہ نرے بزرگ ہی نہیں بلکہ کوتوال یا داروغہ جیل بھی ہیں۔ ایک معقولی مولوی صاحب تھے ان کے ملنے کے لئے ایک خانصاحب رئیس آئے اور وہ رئیس مستاجری پر گاؤں لیا کرتے تھے مولوی صاحب نے پوچھا خانصاحب گاؤں کا انتظام کس کے سپرد کر آئے خانصاحب نے فرمایا کہ بڑے پیر صاحب کے سپرد کر دیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا آہا ہم تو یہ سمجھا کرتے تھے کہ بڑے پیر صاحب نرے ولی ہیں معلوم ہوا کہ وہ گاؤں کے پدہان بھی ہیں۔ ظاہر میں تو معلوم ۷
ہوتا ہے کہ یہ مولوی صاحب بڑے گستاخ تھے اور واقع میں گستاخ وہ خانصاحب تھے کہ بڑے پیر صاحب کو انھوں نے ایسے لغو کام کا سمجھا تو ایسے ہی ہمارے بھائی اول تو دین کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اگر کچھ ضروری شوق ہوتا ہے تو ایسی بیہودہ فرمائشیں کرتے ہیں ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی　　تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

بعضے کہتے ہیں کہ حضرت اپنے سینہ میں سے کچھ دیدیجئے گویا ان کے پاس کوئی پڑیہ ہے کہ وہ اس میں سے تم کو بھی دیدیں گے۔ ایک بزرگ نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ جس کے سینہ میں سے تم مانگتے ہو یہ دیکھو کہ اس کے سینہ میں کیونکر آیا۔ برسوں مجاہدے کئے محنتیں کیں خدمتیں کیں اپنے حظوظ نفسانیہ پر خاک ڈالی جب کچھ ملا سو تم بھی اسی طرح کرو ؎

صوفی نشود صافی تادر نکشد جامے　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدہ نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

بڑے بڑے سفر سے مراد مجاہدے اور مشقتیں ہیں اتنے مجاہدے کے بعد خامی گئی ہے۔ غرض یہ نرا خبط ہے بعضے دانشمند ایسے لوگوں کا علاج بھی کردیتے ہیں جیسے ایک ظریف سیّاح شاہ صاحب کی نسبت ایک خانصاحب کو خیال ہوگیا کہ یہ کیمیا جانتے ہیں آئے اور بات شروع ہوئی۔ خانصاحب السّلام علیکم۔ شاہ صاحب وعلیکم السّلام۔ خانصاحب۔ شاہ صاحب میں نے سُنا ہے آپ کیمیا جانتے ہیں۔ شاہ صاحب۔ ہاں جانتے ہیں۔ خانصاحب۔ ہم کو بھی بتلادو۔ شاہ صاحب۔ نہیں بتلاتے تمہارے باوا کے نوکر ہیں۔ پھر تو خانصاحب کو اور بھی زیادہ اعتقاد بڑھا اور منت کرنے لگے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ خانصاحب جسطرح ہم نے سیکھی ہے اس طرح سیکھو خدمت کرو پاؤں دباؤ حُقّے بھرو جو ہم کھلاویں وہ کھاؤ اور جو ہم کہیں وہ کرو۔ اگر کبھی مزاج خوش ہوگا اور دل میں آجاویگا بتادیں گے۔ خانصاحب راضی ہوگئے۔ رات ہوئی شاہ صاحب نے کچھ گھاس پھوس اُبال کر خانصاحب کے سامنے رکھ دیا۔ خانصاحب نے ایسا کھانا کب کھایا تھا ذرا ناک چڑھانے لگے۔ شاہ صاحب نے کہا ابھی تو اوّل ہی منزل ہے۔ جب خانصاحب نے یہ رنگ دیکھا تو کیمیا سے عمر بھر کے لئے توبہ کی۔ صاحبو خدمتیں کرو۔ محنتیں کرو خدا تعالیٰ فضل فرمانے والے ہیں۔ طلب کا تو یہ حال پھر چاہتے ہو کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مل جائے یہ تو طریق بزرگی کے متعلق کلام تھا۔ اب اس کے ثمرات کے متعلق لیجئے کہ بزرگی کے ثمرات اپنے ذہن میں کیا سمجھ رکھے ہیں مثلاً اگر کوئی اچھا خواب نظر آگیا بس یہ بزرگی ہے اور اگر خواب بند ہوگئے سمجھ گئے کہ بزرگی ہماری جاتی رہی۔ میرے پاس بہت خطوط خوابوں کے متعلق آتے ہیں میں تو جواب میں یہ شعر لکھ دیتا ہوں ؎

(حاشیہ: ایک خانصاحب اور ظریف سیاح کی حکایت)

(حاشیہ: بزرگی کے ثمرات لوگوں نے کیا سمجھے)

نشبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　چو غلام آفتابم ہمہ زآفتاب گویم

(نہ شب ہوں نہ شب پرست جو خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا غلام ہوں اسی کی باتیں بیان کرتا ہوں)

جو دریافت کرو بیداری کی حالت پوچھو۔ خواب تو اگر یہ بھی دیکھ لو کہ سور کا گوشت کھایا ہے واللہ ذرہ برابر تم کو بُعد نہیں ہوا اور اگر خواب میں یہ دیکھو ہم جنّت میں ہیں واللہ اس سے کچھ قرب نہیں ہوا۔ بہرحال کام کرو۔ کام کرنے سے کچھ ملتا ہے اور سینہ میں کیا دھرا ہے ہاں سینہ میں تو بلغم ہے وہ تم کو دیدیں گے اور بعضے لوگ اِس طرح دین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ دُنیا لیکر بزرگوں کے پاس جاتے ہیں۔ کیا معنی کہ بزرگوں کے پاس جاویں گے اور ان کا وقت بھی ضائع کریں گے اور دنیا بھر کے قصے وہاں بیان کریں گے حضرت بمبئی میں یہ ہو رہا ہے۔ روم میں یہ قصہ ہوا۔ روس میں یہ واقعہ ہوا صاحبو تم کو روم روس کے قصوں سے کیا لینا ہے۔ خود تمہارے اندر ایک روم روس ہے کہ ان میں روزانہ جنگ رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎ 9

اے برادر عقل یکدم باخود آر　　دمبدم در تو خزاں است و بہار

(اے بھائی تھوڑی دیر کے لئے ذرا عقل درست کرکے دیکھ خود تیرے اندر دمبدم خزاں و بہار موجود ہے)

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ　　تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو۔)

حکیم سنائی کہتے ہیں ؎

آسمان ہاست در ولایت جاں　　کار فرمائے آسمانِ جہاں

در رہ روح پست و بالا ہاست　　کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

(ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کار فرما ہیں روح (باطن) کے راستہ میں پست و بالا (نشیب و فراز) کوہ و صحرا موجود ہیں)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ؎

وانت الکتاب المبین الذی　　باحرفہ یظہر المضمر

وتزعم انك جرم صغير وفيك انطوی العالم الاکبر

(اور تو مثل ایسی روشن کتاب کے ہے جس کے حرفوں سے مضمر باتیں ظاہر ہوتی ہیں تو اپنے آپ کو جسم صغیر سمجھتا ہے حالانکہ تیرے اندر بڑا جہان لپٹا ہوا ہے)

صاحبو تمہارے اندر سب کچھ ہے روم بھی ہے روس بھی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں مکان بنے ہوئے ہیں مقصود یہ ہے کہ جب تم روم روس کی لڑائی دیکھو یا سنو تو اپنے اندر روح و نفس کی لڑائی کے متعلق بھی غور کیا کرو کہ تم پر تمہارا نفس غالب ہے یا روح غالب ہے یہ کیا ظلم و ستم ہے کہ بیرونی لڑائیوں کے تو تذکرے کرو اور اپنے اندر جو لڑائی ہے اس سے غفلت ہو

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے محبت اور عشق کی باتوں کے سوا کچھ نہ پوچھو)

یاد رکھو اگر اس سے غفلت میں رہے تو بہت پچھتاؤ گے۔ یہاں تو ناکامی ہو ہی رہی ہے وہاں بھی ناکام رہو گے۔ بہت جلدی اصلاح کر لو۔ اس آیت میں اس کا طریقہ مذکور ہے اور وہ طریقہ مرکب ہے دو جزو سے اور ان دونوں میں ترتیب بھی ہے اوّل تو یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے معافی مانگو مگر معافی مانگنا یہ نہیں کہ صرف زبان سے استغفر اللہ استغفر اللہ کہہ لیا یہ تو نقل ہے معافی مانگنے کی جیسے کسی فارسی دیہاتی نے کسی واعظ سے سنا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی تو آپ فرماتے ہیں " بارہا کردیم و شد نماز (ایسا ہم نے بہت مرتبہ کیا اور نماز ہو گئی) نام اُٹھنے بیٹھنے کا سمجھے۔ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ ایک عورت اور مرد میں یہ رشتہ ہے ان کا نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں۔ فرمایا کہ نہیں ہو سکتا کہنے لگا کہ ہم نے تو کیا تھا ہو گیا۔ نہ ہونے کا مطلب یہ سمجھا کہ الفاظ ایجاب و قبول کے منہ سے نہ نکل سکیں گے بس جیسی یہ نماز اور نکاح ہوا تھا ایسے ہی ہم لوگوں کا استغفار بھی ہے۔ صاحبو ہر گناہ کے استغفار کا طریقہ جدا ہے

طرز اصلاح کے دو جز استغفار و طاعت

گناہوں کو دیکھو کیا ہیں۔ اگر حقوق العباد میں ان کی استغفار یہ ہے کہ
ان کو ادا کرو ان کی معافی استغفار پڑھنے سے نہ ہوگی۔ اگر روزے نماز
ذمہ پہ ہیں ان کی استغفار یہ ہے کہ ان کی قضا کرو۔ اگر گناہ ہیں ان کی
توبہ کا طریقہ استغفار بندامت پڑھنا ہے نیز توبہ و استغفار کے لوازم میں
سے ہے معاصی کا ترک کرنا خواہ دیانات کے متعلق ہوں یا معاملات کے
مثلاً آجکل اکثر لوگ آمدنی و خرچ کے طریقوں میں حدود شریعت کا لحاظ
نہیں رکھتے۔ اِس زمانہ میں آمدنی کے بہت سے طریقے خلاف شرع شائع
ہوئے ہیں کہ جوے یا ربوا سے خالی نہیں۔ دیوالی کی رات میں جو جوا
کھیلا جاتا ہے اس کو تو بُرا سمجھتے ہیں لیکن آجکل سٹہ جو چل رہا ہے اس سے
پرہیز نہیں کرتے ان سٹہ والوں میں بہت لوگ ایسے ہیں کہ نمازی اور ڈاڑھی
لمبی ٹخنوں سے اوپر پاجامہ ہاتھ میں تسبیح بڑے متقی لیکن سٹہ سے ان کا تقویٰ
11 نہیں ٹوٹتا۔ یاد رکھو یہ بالکل جوا ہے اسی طرح چٹھیاں جو پڑتی ہیں یہ بھی جوا
ہے۔ اس سے بڑھ کر بیمہ کمپنیاں جو نکلی ہیں وہ بھی حرام ہیں۔ ان کے تو شروع
ہی میں بیم آگیا ہے (یہ لطیفہ ہے ۱۲ جامع) اور شادی فنڈ اور جان بیمہ اور
ایک قسم کے ٹکٹ کی تقسیم کا سلسلہ یہ سب حرام و قمار جوا اور ربوا ہیں۔
اور ان میں سخت دھوکہ بھی ہے۔ شریعت میں کوئی معاملہ پیچیدہ نہیں اور
اِن طریقوں میں سخت پیچیدگی اور دھوکہ ہے۔ یہ تو آمدنی کے طریق ہیں اور
خرچ کے اندر تو کچھ باک ہی نہیں جہاں چاہتے ہیں تنعمات میں فضول سامان
میں ناموری کے کاموں میں بے دھڑک خرچ کرتے ہیں سمجھتے ہیں اپنی شے ہے
جس طرح چاہیں صرف کریں اور سب سے زیادہ گندہ مصرف جو اس شہر
میں کثرت سے ہے کوکین کھانا ہے۔ اِس کوکین سے سینکڑوں گھر برباد ہوگئے
ظاہر میں تو ذرا سی چیز ہے لیکن مفاسد اس کے کثیر ہیں۔ شیطان کا شیرہ ہے
شیطان کو کسی نے کہا تھا کہ تو بڑا ملعون ہے گناہ کراتا ہے۔ اس نے کہا

میں کیا گناہ کرتا ہوں میں تو ایک ذراسی بات کرتا ہوں لوگ اس کو بڑھا دیتے ہیں دیکھو میں تم کو تماشا دکھلاتا ہوں۔ ایک دوکان پر پہونچے۔ ایک اُنگلی شیرہ کی بھر کر دیوار کو لگادی اس پر ایک مکھی آبیٹھی ایک چھپکلی اس پر جھپٹی اس پر دوکاندار کی بلی دوڑی اس پر ایک خریدار کا جو کہ فوجی سوار تھا کتا لپکا۔ دوکاندار نے اس کتے کے ایک لکڑی ماری۔ سوار کو غصہ آیا اُس نے دوکاندار کے ایک تلوار ماری بازار والوں نے انتقام میں سوار کو قتل کر ڈالا۔ فوج میں خبر ہوئی فوج والوں نے بازار کو گھیر کر قتل عام شروع کرادیا۔ بادشاہ وقت نے دوسری فوج سے ان ظالموں کو سزا میں قتل شروع کر دیا۔ ایک گھنٹہ میں تمام شہر میں خون کے ندی نالے بہہ گئے۔ شیطان نے کہا دیکھا میں نے کیا کیا تھا اور لوگوں نے اس کو کہاں تک پہونچا دیا۔ اِسی طرح یہ کوکین بھی شیطان کا شیرہ ہی جب تک

۱۲ اپنے پاس روپیہ رہتا ہے اس کو خرید کر کھاتے ہیں جب وہ ختم ہوجاتا ہے تو اثاث البیت بیچ کر کام چلاتے ہیں جب وہ بھی ختم ہوگیا تو بیوی کا زیور پھر جائداد اور گھر غرض سب اُڑا دیتے ہیں جب اپنا سرمایہ ختم ہولیا پھر پڑوسیوں پر صفایا شروع کر دیا۔ کسی کے برتن اُٹھا لئے کسی کے یہاں نقب دیدی آخر جیلخانہ میں چلے جاتے ہیں وہاں مفت کی روٹیاں کھاتے ہیں گھر رہنے میں تو کچھ فکر بھی تھی وہاں کچھ فکر ہی نہیں۔ بعضے ایسے بیحیا ہوتے ہیں کہ جیلخانہ سے جب چھوٹتے ہیں تو کہہ کر آتے ہیں کہ ہمارا چولھا باقی رکھنا ہم پھر آویں گے۔ غرض یہ کوکین بڑی بلا کی شے ہے اور ہزاروں اس میں مبتلا ہیں اور تعجب ہے کہ سب بلائیں اور مصیبتیں اُٹھاتے ہیں لیکن چھوڑتے نہیں لوگ کہتے ہیں کہ چھوٹتی نہیں صاحبو! جب ہمت قوی کرلی جاوے تو سب چھوٹ جاتی ہی۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ تعالٰے علیہ کی خدمت میں ایک گاؤں کا رہنے والا

شیطان کی حیلہ سازی

کوکین شیطان کا شیرہ ہے

حضرت مولانا گنگوہی کی بابت ایک گاؤں والے کا قصہ

مرید ہونے کے لئے آیا حضرت نے کلمات بیعت کے کر جن کا کہ حاصل معاصی سے توبہ ہے کہلا دیئے۔ جب توبہ کر لی تو کہتا ہے کہ مولوی جی افیم سے تو توبہ کرائی ہی نہیں حضرت نے فرمایا مجھے کیا خبر کہ تو افیون کھاتا ہے۔ اچھا یہ بتلا کتنی کھاتا ہے جس قدر کھاتا ہو میرے ہاتھ پر رکھ دے مگر اس نے جیب میں سے افیون کی ڈبیہ نکال کر دور پھینکی کہ مولوی جی جب توبہ ہی کر لی تو اب کیا کھاویں گے گھر گیا تو دست شروع ہوئے اس نے مولانا سے کہلا کر بھیجا کہ حضرت دعا کیجیو اچھا ہو جاؤں چند روز کے بعد تندرست ہو کر پھر آیا۔ دو روپیہ حضرت کی خدمت میں پیش کئے حضرت نے بعد انکار کے اس کے اصرار سے قبول فرمائے کہتا ہے حضرت جی یہ تو آپنے پوچھا ہی نہیں کہ یہ روپیہ کیسے ہیں حضرت نے فرمایا بتلاؤ کیسے ہیں۔ کہا افیم کے ہیں پوچھا افیم کے کیسے کہنے لگا کہ میں دو روپیہ ماہوار کی افیون کھاتا تھا۔ جب میں نے افیون چھوڑی تو میرا نفس بہت خوش ہوا کہ دو روپیہ بچیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تیرے لئے نہیں بچاؤں گا۔ میں یہ ۱۳
دو روپیہ اپنے پیر کو دوں گا۔ بظاہر لوگ اس گنوار کو اس کی گفتگو سے غیر مہذب سمجھے ہوں گے حضرت تہذیب نام لکھنؤ اور دہلی کے الفاظ کا نہیں ہے وہ تعذیب ہے تہذیب نام ہے تہذیب نفس کا جس کا بڑا شعبہ خلوص ہے جو اس گنوار میں کمال کے ساتھ حاصل تھا۔ سو آپ نے الفاظ کو تو دیکھا لیکن یہ نہ دیکھا کہ اس گنوار میں کس درجہ کا خلوص اور تکلف اور تصنع سے کتنا دور تھا کہ جو بات تھی بلا تکلف سب کہدی مولانا فرماتے ہیں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را ما دروں را بنگریم و حال را

(ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے دل کا اور حال کو دیکھتے ہیں)

اور اس گنوار کی قوت علمی و عملی پر غور فرمایئے کہ کس درجہ تھی۔ قوت علمی تو فہم اس بات کا کہ نفس کے خلاف کرنا چاہیے اور عملی قوت یہ کہ ایک دم سے ایک مدت کی عادت کو جو سالہا سال کے مجاہدہ سے بھی نہیں چھوٹتی چھوڑ دی۔ع بہ جاں

ع اور پھر حضرت کی قوت فیضان کو بھی ملاحظہ فرمایئے کہ کس درجہ تھی ۱۲ جامع

یہ نفس کے حیلے حوالے ہیں جب آدمی دل سے ہمت کرتا ہے اور قصد کرتا ہے کسی کام کے چھوڑنے کا تو حق تعالیٰ ضرور امداد کرتے ہیں پس کو کین بھی ہمت کر کے چھوڑ دو۔ اسی طرح اور سب بیہودہ اخراجات ترک کر دو۔ خلاصہ یہ ہے کہ آمدنی اور خرچ کے طرق کی بھی اصلاح کیجئے نیز توبہ و استغفار کا ایک شعبہ اخلاق ذمیمہ کی بھی اصلاح ہے

دوسرا جزو اصلاح کا طاعت ہے

ایک مدلول آیت یعنی اصلاح کے دو جزوں میں سے ایک جزو میں تو کلام ہو چکا اب دوسرا جزو اصلاح کا جو آیت میں مذکور ہے یہ ہے ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ یعنی پھر بعد استغفار کے حق تعالیٰ کی طرف طاعت کے ساتھ رجوع ہو جاؤ۔ یہ بھی توبہ کے لوازم سے ہے آگے اس اصلاح کا ثمرہ بیان فرماتے ہیں يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا یعنی

اصلاح کا ثمرہ

تم پر بارش بہت برسنے والی بھیجیں گے۔ یہ بارش خواہ ظاہر میں ہو یا اگر ظاہر میں دیر بھی ہو گئی تو اس بارش کی روح تو ضرور ہی ہوگی اور اس کو باطن کی بارش کہنا چاہیے یعنی قلب پر رحمت کی بارش ہوگی جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے کہ کامیابی کی غایت

۱۴ طمانیتِ قلب و راحتِ روح ہے وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ یعنی دوسرا ثمرہ یہ ہوگا کہ تمہاری موجودہ قوت کو بڑھا دیں گے اس وقت تو قوت مالی و جاہی ہے اس اصلاح کے بعد قوتِ قلب عطا فرماویں گے پھر جو بھی مصیبت آوے گی وہ صورت مصیبت ہوگی اور حقیقت میں یہ حالت ہوگی کہ اس مصیبت پر ہزار راحتیں قربان کرو گے اور زبان حال سے کہو گے ع ہر چہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ محبوب کی جانب سے پیش آئے وہ خیر ہی ہوتا ہے) آگے ارشاد ہے وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ یعنی اعراض مت کرو مجرم ہو کر۔ مطلق ولا تتولوا نہیں فرمایا اس لئے کہ تولی کی دو قسمیں ہیں ایک صورت تولی ایک حقیقت تولی۔ صورتہً تو یہ کہ بشریت سے غلطی ہو گئی۔ ایسی غلطیوں سے انسان بچ نہیں سکتا اور حقیقت تولی ہوتی ہے مقابلانہ و باغیانہ تو فرماتے ہیں کہ باغیانہ تولی مت کرو یعنی باغی مت بنو اور گناہ سے تو کیسے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر گناہ ہو جائے تو ساتھ کے ساتھ توبہ کر لو حدیث شریف میں ہے کُلُّکُمْ خَطَّاؤُنَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ یعنی تم سب خطا وار ہو اور بہتر خطا وار توبہ کرنیوالے ہیں۔ یہ تعلیم ہے حق تعالیٰ کی اور یہ طریقہ وہ ہے کہ جس سے قومی مالی جسمی دینی دنیوی ترقی ہوتی ہے اس کو پلے باندھو یاد رکھو کہ ہماری دنیوی فلاح دین کیساتھ وابستہ ہے جب ہم اس کے خلاف ہوا ہے تنزل اور پستی اور ادبار اور قحط سب ہی بلائیں مسلط ہو جاتی ہیں اب اللہ تعالیٰ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

وعظ
ملقب بہ
فوائد الصحبۃ

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی ۱۵

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ ۔ بندر روڈ ۔ کراچی

بسم الله الرحمٰن الرحيم

وعظ ملقب بہ

فوائد الصحبة

اين	متى	كم	كيف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	کھڑے ہو کر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

بسم الله الرحمٰن الرحيم

۱۶

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیاوی زندگانی

کے رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانیے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا یہ حال حد سے گذر گیا ہے) یہ ایک آیت ہے سورۃ کہف کی اس میں ایک نہایت ضروری مضمون مذکور ہے اور وہ ایسا مضمون ہے کہ اس کی ضرورت عام ہے عوام وخواص سب کے لئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا مضمون جس کی ضرورت عوام وخواص سب کے متعلق ہو نہایت ہی ضروری ہوگا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ضرورتیں بعض تو صرف عوام کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض صرف خواص کے اور بعض عوام وخواص دونوں میں مشترک ہوتی ہیں اور ہرچند کہ پہلی دونوں ضرورتیں بھی اپنے درجہ میں ضروری ہوتی ہیں لیکن جو ضرورت مشترک ہو وہ نہایت ہی ضروری ہوگی نیز دوسری وجہ اس کے اہم ہونے کی یہ بھی ہے کہ قاعدہ ہے کہ بعض ضروریات کی تو اہلِ ضرورت کو اطلاع ہوتی ہے مگر کسی وجہ سے اُس پر عمل کرنے میں کوتاہی ہوتی ہے۔ اور بعض کی تو اطلاع ہی نہیں ہوتی۔ تو یہ بعضے امور ایسے 17
ہوتے ہیں کہ وہ عوام کے نزدیک نہایت ہی خفیف ہوتے ہیں لیکن واقفین حقائق کے نزدیک وہ نہایت ہی اہم ہوتے ہیں۔ اِسی طرح اعمال وامراض میں بھی بعض تو ایسے ہیں کہ اُن کی سب کو اطلاع ہے اور گو وہ بھی ضروری ہوتے ہیں مگر زیادہ ضروری وہ ہیں جن کی اطلاع ہی نہ ہو۔ اِس آیت میں ایسا ہی مضمون بیان کیا گیا ہے جس کی ضرورت مشترکہ کے ساتھ خود خبر بھی بہت کم لوگوں کو ہے۔ اور یہ بیخبری کا دعویٰ یا تو لوگوں کے عقیدہ سے دریافت کر لیجئے کہ اس مضمون کے متعلق کیا عقیدہ ہے یا طرزِ عمل سے کیونکہ جس امر کے ساتھ غیر ضروری کا سا برتاؤ کیا جاوے گا یہی سمجھا جاویگا کہ اس کی ضرورت کی اِطلاع ہی نہیں۔ خاص کر جبکہ عقیدہ بھی کسی درجے میں شہادت دے۔ میں اس مضمون کی اجمالی تعیین کئے دیتا ہوں پھر ترجمہ سے تفصیلاً بھی تعیین ہو جاوے گا مگر ترجمہ سے قبل اس کے شانِ نزول کا

بیان کر دینا مناسب ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو شفقت امت پر ہے حتیٰ کہ اُمت دعوت پر بھی اِس کا پتہ کتب سیر و تواریخ و احادیث سے چل سکتا ہے۔ اِن کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بے اِنتہا شفقت تھی سب پر اور اثر اُس شفقت کا یہ تھا کہ آپ ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ اُمت کو کس طرح نفع پہونچے۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ اِس سوچنے سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی کوئی خاص غرض تھی یا اپنے کسی خاص نفع کی تحصیل مقصود تھی ہرگز نہیں بلکہ محض اُمت کے نفع اور اس کی بہبودی کے لئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس تدبّر و تبلیغ پر بغیر قصد ثواب مرتب ہو جاوے اور اِس طرح حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی نفع پہونچے۔ لیکن یہ نفع حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تبلیغ کے وقت پیش نظر نہ تھا اور اسی نفع اجر تبلیغ کی بنا پر خدا تعالےٰ نے اُن کفار

۱۸ کے متعلق جن سے بالکل یاس ہو گیا تھا یہ فرمایا کہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ[ع] یہ نہیں فرمایا کہ سَوَآءٌ عَلَيْكَ کیونکہ آپ کے لئے انذار و عدم انذار مساوی نہیں تھا بلکہ انذار ثواب مرتب ہوا جو کہ عدم انذار کی صورت میں نہ ہوتا اور یہیں[۲] سے اہلِ عِلم کے نزدیک اِس اعتراض کا بھی جواب ہو جاویگا کہ جب آپ کا انذار و عدم انذار مساوی تھا تو ایک عبث فعل آپ کے کیوں سپرد ہوا حاصل جواب کا یہ ہے کہ عبث تو اُس وقت کہا جا سکتا تھا کہ جب آپ کے حق میں بھی برابر ہوتا اور جب آپ کے حق میں برابر نہ تھا لِتَرَتُّبِ الثَّوَابِ عَلَى الْاِنْذَارِ وَانْتِفَائِهٖ عَلٰى عَدَمِهٖ (بسبب ثواب مرتب ہونے کے ڈرانے پر اور نہ مرتب ہونا نہ ڈرانے پر) تو یہ فعل عبث نہ رہا۔ غرض اس میں تو شبہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو تبلیغ و انذار پر ثواب تو ملتا ہے لیکن گفتگو یہ ہے کہ یہ ثواب آپ کی نظر میں بھی انذار سے مقصود تھا یا نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم

اُمت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت

آیت سواء علیہم پر ایک شبہ اور اس کا جواب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انذار سے مقصود ثواب نہ تھا

ع ترجمہ:- برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

کی شفقت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محض ثواب مقصود نہ تھا کیونکہ اگر آپ کو محض ثواب مقصود ہوتا تو اس قدر دلسوزی کی کیا وجہ تھی۔ ثواب تو صرف تبلیغ پر بھی مرتب ہو جاتا تھا جس کے باب میں قرآن مجید میں ارشاد ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شاید آپ اپنی جان کو ہلاک [illegible] نے والے ہیں اس وجہ سے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں) اور وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (اور آپ ان [illegible] نہیں ہیں) اور لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحَابِ الْجَحِيْمِ (دوزخ والوں کی نسبت آپ سے سوال نہ ہوگا) ان سب آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بیحد غم تھا ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو صاف لفظوں میں ارشاد بھی فرمایا۔ حدیث شریف میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ میری تمہاری ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی نے آگ روشن کی ہو اور پروانے گرتے ہوں وہ شخص ان پروانوں کو ہٹاتا ہو لیکن وہ اس پر غالب آجاتے ہوں اسی طرح تم لوگ دوزخ کی 19
آگ میں جان جان کر گرتے ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ ہٹاتا ہوں لیکن تم مجھ پر غالب آئے جاتے ہو اور اس میں گھسے جاتے ہو۔ ان الفاظ سے ہر زبان داں کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ مقصود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ تھا کہ یہ لوگ آگ سے بچیں اور یہی وجہ تھی کہ اگر کوئی ایسی تجویز آپ کے روبرو پیش کی جاتی جس سے آپ کو اپنے مقصود حاصل ہونے کی امید ہوتی ہو تو آپ اس کو بہت جلد قبول فرما لیتے تھے اسیؑ سے کفار مشرکین کو ایک شرارت سوجھی اور انھوں نے دق کرنے کے لئے ایک مشغلہ نکالا جیسے آجکل مصلحین کے ساتھ کیا جاتا ہے چنانچہ کفار نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (یہ تو کیوں کہا ہوگا یا محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا ہوگا) ہم آپ کے پاس آیا کریں تو کچھ سُن لیں لیکن چونکہ آپ کے پاس غرباء کا مجمع رہتا ہے جن کے پاس بیٹھتے ہوئے ہمیں عار آتی ہے

ع ثُمَّ اٰمَنَ بَعْضٌ مِّنْهُمْ بَعْدَهٗ ۱۲ (پھر اس کے بعد ان میں سے بعض ایمان لے آئے)

اس لئے ہم نہیں بیٹھتے۔ اگر آپ ان کو علیحدہ کر دیا کریں اور ہمارے لئے ایک مستقل مجلس علیحدہ کر دیں اور جس وقت ہم آیا کریں ان کو اُٹھا دیا کریں کیونکہ ہمارے پاس بیٹھ کر ان کا حوصلہ بڑھے گا۔ تو ہم حاضر ہوا کریں۔ اور ان سے اُن کو یہ ہرگز مقصود نہ تھا کہ ہم مسلمان ہو جائیں گے بلکہ محض دق کرنا منظور تھا کہ تھوڑی دیر احباب میں مفارقت ہی رہے گی۔ کیونکہ صحابہ کرام کو وہ محبت تھی حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہ کسی کو نہیں ہوئی۔ اور یہی سبب تھا اطاعت کاملہ کا ورنہ اگر کامل محبت نہ ہو تو اطاعت کاملہ ہو نہیں ہو سکتی

(صحابہ رضی اللہ عنہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال محبت)

آجکل اکثر دینداروں میں بھی محض ضابطہ کی محبت ہے۔ صاحبو بہت بڑا فرق ہے ضابطہ کی محبت میں اور جوش کی محبت میں۔ اوّل میں کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے اور اس میں ضرور فروگذاشت ہو جاتی ہے وہ محض مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور ربسا اوقات ایک مصلحت کے قائم مقام دوسری مصلحت ہو جاتی ہے تو نفس کہتا ہے کہ مقصود تو آگ سے بچنا ہے اس گناہ کو کر لو اس کے بعد توبہ کر لینا تو آگ سے تو اس طرح بھی بچ جاؤ گے اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو ہمارے نفس نے دلیر کر دیا ہے تو آگ سے بچنے کی مصلحت ایک محرک عقلی ہے جس پر تقاضائے نفس غالب آسکتا ہے اور محبت محرک طبعی ہے کہ اگر یہ بھی معلوم ہو جاوے کہ ترک اطاعت پر عذاب نہ ہوگا تو بھی مخالفت سے شرماتا ہے کیونکہ وہاں داعی الی الاطاعۃ (اطاعت کی طرف داعی) طبعی ہو جاتا ہے۔ اِسی لئے فرماتے ہیں ؎

(محبت کی دو قسمیں ہیں ایک ضابطہ کی دوسری جوش کی) ۲۰

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے مرشد مجھ کو قلندری کا راستہ بتلا دیجئے کیونکہ پارسائی کا راستہ تو بہت دور دراز کا ہے)

تو صحابہؓ کا اطوع الخلق (تمام مخلوق سے زیادہ اطاعت کرنے والے) ہونا اِسی وجہ سے ہے کہ وہ عاشق تھے نرے مصلحت بین نہ تھے ان کی یہ حالت تھی ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چکار ‌‌‌‌‌‌‌‌‌ کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(حاشیہ مصلحت مبنی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کلام سمجھ کر تحمل اور تدبیر چاہیے)

ان کی اطاعت پر مصلحت بھی مرتب ہو جاتی تھی لیکن محبت اور اطاعت مصلحت پر مبنی نہ تھی اُن کی یہ حالت تھی کہ اگر مخالفت کرنا بھی چاہتے تو نہیں ہوسکتی تھی۔ صحابہؓ کی محبت کا اندازہ اِس سے کیجئے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے پختہ مکان ڈاٹ دار کسی مصلحت سے بنا لیا کہ وہ مصلحت ضرورت کے درجے میں نہ تھی گو انھوں نے کسی درجے میں ضروری سمجھا ہو اتفاق سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گذر ایک مرتبہ اس طرف سے ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس مکان کو دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کس کا مکان ہے صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فلاں شخص کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا اور واپس تشریف لے آئے۔ جب صاحب مکان حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو انھوں نے سلام عرض کیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی طرف سے منہ پھیر لیا وہ دوسری ۲۱
طرف سے آئے آپ نے اُدھر سے بھی منہ پھیر لیا۔ اب تو ان کو بہت فکر ہوئی انھوں نے دوسرے صحابہ سے دریافت کیا تو اُنھوں نے کہا کہ کوئی خاص بات تو ہم کو معلوم نہیں ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مکان کی طرف تشریف لے گئے تھے اور تمہارے مکان کو دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ ہم نے بتلا دیا تھا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ فرمایا تو نہیں لیکن اُس وقت سے خاموش ہیں۔ دیکھئے اس حدیث میں کہیں تصریح نہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکان کی بابت کچھ بھی فرمایا ہو اُس لئے صاحبِ مکان کے پاس اِس یقین کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کبیدگی کی وجہ یہ مکان ہی ہے۔ آجکل کی عقل کا تو جس کی نسبت کسی کا قول ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

عقل دور اندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو میں نے دیوانہ بنایا)
یہ فتویٰ ہوتا کہ پوچھ تو لیتے یہی وجہ ناراضی کی ہے یا کچھ اور۔ اگر یہی تو خیر
اس کو گرا دیں بلکہ آجکل تو اس پر بھی اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ پوچھا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
اس میں خرابی کیا ہے یہ تو فلاں فلاں مصلحتوں پر مبنی ہے جیسا آجکل ورثۃ الانبیاء
کے ساتھ ان کے احکام خداوندی پہونچانے کے وقت اور منکرات پر تنبیہ کرنے
کے وقت معاملہ کیا جارہا ہے تو صحابہ کرام بھی ایسا کر سکتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے
اس حکم کے اسرار دریافت کرتے جیسا آجکل دریافت کیے جاتے ہیں اور حضور
صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو اسرار کی اطلاع بھی تھی علماء کو تو اسرار کی خبر
بھی نہیں یہ تو قانون کے عالم ہیں نہ کہ اسرار قانون کے عالم تو اس صورت
میں علماء سے اسرار کا دریافت کرنا ہی غلطی ہے لیکن حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
تو صاحب وحی ہیں آپ کو تو اگر بالفرض اسرار کی اطلاع نہ بھی ہوتی تو خدا تعالیٰ
۲۲ سے پوچھ کر بتلا دیتے لیکن اُن صحابی نے ان سب کو نظر انداز کر کے وجہ خفگی
کی تعیین کی بھی تو ضرورت نہیں سمجھی بلکہ جس میں ذرا سا بھی احتمال سبب
غضب ہونے کا ان کو ہوا اُس کو خاک میں ملا دیا یعنی اُسی وقت جا کر مکان
کو زمین کے برابر کر دیا۔ شاید آجکل کے عقلاء اس حرکت کو خلاف عقل بتلا دیں کہ محض احتمال
پر اتنا مال ضائع کر دیا۔ لیکن اگر خلاف عقل ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گرانے پر ناخوش ہوتے۔ غرض
انھوں نے فوراً مکان گرا دیا اور پھر گرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع بھی نہیں کی بلکہ اپنی قسمت پر
بھروسہ کر کے بیٹھ رہے کہ جس طرح حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتفاقاً مکان
کو دیکھ لیا تھا۔ اسی طرح میرے گرانے کی اطلاع بھی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی میری
قسمت میں ہے تو اتفاقاً حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہو جاویگی۔ کیونکہ جانتے تھے کہ اطلاع تو جب
کروں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکان گرانے کا احسان ہو یہ تو محض اپنی ہی بھلائی ہے قُلْ لَّا تَمُنُّوْا
عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰىکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ
(اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ فرما دیجیے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ اللہ ہی تم پر احسان

رکھتا ہے کہ تم کو زیان کی ہدایت فرمائی اگر تم سمجھ ہو غرض حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پھر اس طرف جو گذر ہوا آپ نے فرمایا کہ وہ مکان کیا ہوا صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صاحب مکان کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوراً ہی آکر مکان کو گرا دیا حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو سنکر بہت خوش ہوئے اور زیادتی تعمیر کی مذمت فرمائی۔ اب یہ دوسرا مسئلہ ہے کہ کتنی تعمیر ضروری ہے جو یہاں مذکور نہیں۔ تو صحابہ کرام کی محبتؓ کا یہ عالم تھا اور اس محبت کا مقتضٰے یہ بھی ہے کہ صحابہؓ کی زلات بالکل معاف ہوں۔ دیکھئے اگر کسی جاں نثار خادم سے کبھی کوئی غلطی ہو جاتی ہو تو اس کی پرواہ بھی نہیں کیا کرتے۔ ابھی حال ہی میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک صاحب کے بدن میں ایک گہرا زخم ہو گیا تھا ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ اِس زخم میں اگر کسی آدمی کا گوشت لیکر بھرا جائے تو یہ برابر ہو جائے۔ ان صاحب کا ایک
۲۳ نوکر اس وقت موجود تھا کہنے لگا کہ میری ران میں سے جس قدر گوشت کی ضرورت ہوے لیا جاوے۔ اب بتلایئے کہ اگر اس خادم سے کبھی کوئی سرسری لغزش ہو جاوے تو کیا وہ آقا اُس پر مواخذہ کریگا ہرگز نہیں۔ پس یہ ہی وجہ ہے کہ صحابہ پر طعن کرنا جائز نہیں۔ صاحبو! جو مشاجرات صحابہ سے منقول ہیں اور جتنی لغزشیں ہوئی ہیں اگر ان سے دس حصہ زیادہ ہوتیں وہ بھی معاف تھیں۔ غضب کی بات ہے کہ آپ اپنے کو قدر داں سمجھتے ہیں کہ وفادار جاں نثار کی لغزش کو قابل معافی سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اتنا بھی قدر داں نہیں سمجھتے اسی سے ہم بلاتامل کہتے ہیں کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ (صحابہ سب کے سب عادل ہیں) اور اس حدیث پر اعتماد رکھیں گے لَا یَمَسُّ النَّارُ مَنْ رَاٰنِیْ (جس شخص نے مجھ کو دیکھا اس کو آگ نہ چھوئے گی) اور اگر صحابہ کے بعض افعال ذلت ہیں تو ہم ان کی نسبت کہیں گے

؎ خون شہیداں را ز آب اولی ترست ... ایں خطا از صد ثواب اولی ترست

صحابہؓ کی لغزشیں سب معاف ہیں

(شہید دل کا خون پانی سے اولیٰ تر ہے یہ خطا سو ثواب سے زیادہ بہتر ہے)

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جان نثاری کا وہ دور اصل

غرض صحابہؓ کی یہ شان تھی اور ان کی اس محبت کا علم اور اندازہ ان کفار کو بھی تھا چنانچہ جب حدیبیہ کی صلح ہوئی ہے اور علی سبیل التعاقب رؤسائے کفار مسلمانوں میں آئے ہیں تو ایک رئیس نے جاکر اپنی قوم سے کہا ہے کہ میں نے بڑے بڑے شاہانِ دنیا کا دربار دیکھا ہے۔ کسریٰ اور قیصر کے درباروں میں شریک ہوا ہوں مگر کسی کے حشم و خدم کو میں نے اتنا مطیع نہیں دیکھا جس قدر کہ اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مطیع ہیں یہ حالت ہے کہ اگر آپ تھوک پھینکتے ہیں تو وہ زمین پر نہیں گرتا اور جب وضو کرتے ہیں تو اس کا غسالہ لوگ اپنے ہاتھوں پر لیتے ہیں اور اگر کسی کو نہیں ملتا تو وہ دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مل کر اپنے منہ پر پھیر لیتا ہے گویا وہ حالت تھی ؎

مرا از زلف تو موئے بسندست   ہوس را رہ مدہ بوی بسندست

(یعنی اگر محبوب نہ ملے تو اس کا ایک بال ہی کافی ہے اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو ہی بہت ہے)

۲۴ صاحبو! بتلایئے یہ بھی کہیں قرآن میں یا حدیث میں حکم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غسالہ وضو اپنے منہ پر ضرور ملا کرو اللہ اکبر۔ اِس وقت بہت سی جماعتیں صحابہؓ پر طعن کرتی ہیں مگر اُن کی اِس حالت کو نہیں دیکھتے بھلا نماز و روزہ وغیرہ کی بابت تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جنّت کے شوق میں کرتے تھے لیکن غسالہ وضو کا حکم وجوبی یا اِستحبابی کہیں آیت میں تھا کہ اس کو منہ پر مل لیا کرو تو فلاں فضیلت ملے گی اِس وقت تو واللہ بعضے ایسے مستقل مزاج ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرتے دیکھتے تو کبھی حرکت بھی نہ ہوتی کیا اِس وقت سو میں ایک شخص بھی ایسا برتاؤ کرسکتا ہے جو صحابۂ کرام نے کیا بلکہ عجب نہیں کہ اِس فعل سے استنکاف کرتے

ہمارا زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعید ہونا رحمت ہے

صاحبو ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ اِس وقت میں پیدا ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں پیدا نہ ہوئے ورنہ ہمارا یہ استنکاف خدا جانے ہم کو کس حد میں داخل کرتا۔ اِس وقت جو ہم بہت سی باتوں میں فتویٰ کفر

سے بچ جاتے ہیں تو اس لئے کہ علماء تاویل کر لیتے ہیں کہ یہ استنکاف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امر سے نہیں بلکہ فلاں شخص سے ہے جس کے واسطے سے یہ امر اُس کو پہونچا ہے۔ نسبت الی الرسول صلے اللہ علیہ وسلم (رسول صلے اللہ علیہ وسلم کیطرف نسبت) میں شک پیدا ہونے سے یہ اعتراض کیا ہے اور اگر ہم اُس وقت ہوتے اور یہ حالت ہوتی تو ہمارے ان افعال پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کفر کا فتویٰ ہوتا تو یہ خدا تعالےٰ کی رحمت ہے کہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جس کی نسبت حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وہ زمانہ آویگا کہ دسواں حصہ بھی اگر کوئی عمل کریگا تو اُسکی نجات ہو جاوے گی مگر اُس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں پانچ وقت کی نماز فرض تھی تو اب نصف وقت کی نماز کافی ہوگی۔ یعنی اگر فرض و وتر کا مجموعہ بیس رکعتیں ہوں تو دو رکعتیں کافی ہو جاویں۔ چونکہ یہ شبہ ہو سکتا تھا اس لئے میں اس حدیث کی توضیح کرتا ہوں کہ یہ تخفیف کیفیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کمیت کے اعتبار سے یعنی اعمال میں جو خلوص اُس وقت تھا اگر اس وقت تو حصہ کم بھی ہو تو نجات ہو جائے گی۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہم پر ہے کہ ہم زمانہ تخفیف میں پیدا ہوئے۔ یہ تو تخفیف کا بیان ہے اور تاویل کی مثال یہ ہے کہ مثلاً بیوہ کا نکاح ثانی ہے کہ اس سے عام طور پر قلوب میں تنگی ہے یعنی جیسا اوّل مرتبہ دل ہوتا ہے دوسری مرتبہ نکاح کرنے میں اُتنا دل کھلا ہوا نہیں ہوتا۔ آگے یہ دیکھ لیجئے کہ خداوند تعالیٰ اسی تنگی کی نسبت کیا فرماتے ہیں فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (آپ کے رب کی قسم ہے یہ لوگ مومن نہ ہوں گے تا وقتیکہ آپ کو اپنے جھگڑوں میں حکم نہ بناویں جو آپ فیصلہ فرما دیں اس پر اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پوری طرح تسلیم کر لیں)، تو اس پر کیا فتویٰ ہوتا مگر اس وقت ہم ان لوگوں کی اس تنگی کی یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ یہ حکم شرعی سے استنکاف

امر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ... کا ماننا ضروری ہے اور اس کا انکار کفر ہے

صحابہؓ کی اطاعت و انقیاد کی ایک عجیب حکایت

نہیں ہے بلکہ عرف کی وجہ سے طبعی شرم آتی ہے لیکن اگر حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کو فرما دیتے کہ نکاح ثانی کرو اور اس کے قلب میں اس سے تنگی پیدا ہوتی تو اُس وقت کیا بچاؤ ہوتا کیونکہ خطاب خاص خود دلیل ہوتی بطلان عذر کے لئے اور اس کے لئے نظیر موجود ہے کہ حضرت زینبؓ کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے کرنا چاہا اور حضرت زینبؓ بوجہ عالی خاندان ہونے کے ذرا رُکتی تھیں اور اسی طرح ان کے بھائی بھی۔ فوراً یہ آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ط (کسی مومن اور مومنہ کو شایاں نہیں کہ جب اللہ (تعالیٰ) و رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کسی امر کا فیصلہ فرمادیں تو (اُس امر میں) اُن کو اختیار رہے) حالانکہ یہ ایک دنیا کا معاملہ تھا لیکن اس میں بھی حکمِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے چون و چرا کرنے کی اجازت نہیں ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ خواہ دُنیا کا کام بتلاویں

۲۶ یا دین کا کام بتلاویں مگر جس کو فیصل کر کے فرماویں اس سے انکار کفر ہے تو اس وقت اگر ہم انکار کرتے تو فوراً کافر ہو جاتے اور اس وقت تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ مولویوں کے طرزِ بیان سے استنکاف ہے نہ کہ حکمِ شریعت سے تو ہمارے لئے اُس زمانہ سے بعید ہونا ہی رحمت ہوا۔ یہ صحابہؓ ہی کا حوصلہ تھا کہ اُنھوں نے اپنا مال اپنی جان اپنی اولاد گھر بار اپنے مصالح سب آپ کے سپرد کر دیئے تھے یہ حالت تھی کہ میں نے ایک مقام پر دیکھا ہے مگر اس وقت یاد نہیں کہ ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرنا چاہتے تھے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اس کو دیکھ بھی لیا ہے مقصود یہ تھا کہ کسی تدبیر سے ایک مرتبہ اس کو دیکھ لو۔ یہ مطلب نہ تھا کہ جا کر اس عورت کے ماں باپ کو پیغام دو کہ مجھے اپنی لڑکی دکھلا دیں مگر وہ ایسے بھولے بھالے تھے کہ جا کر اُس عورت کے ماں باپ کو پیغام دیا کہ مجھے اپنی اپنی لڑکی دکھلا دو۔ اس لڑکی کے ماں باپ کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ اُنھوں

کچھ کہنا چاہا۔ پس پردہ لڑکی بھی موجود تھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام سنکر فوراً پردہ ہٹا دیا اور اپنے ماں باپ سے کہا کہ خبردار حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے بعد کچھ نہ بولنا اور اس شخص سے کہا کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے تو میں حاضر ہوں تم مجھے دیکھ لو۔ صاحبو! یہ محبّت کا خاصہ ہے کہ اس میں مصالح اور ننگ وعار سب بالائے طاق رکھے جاتے ہیں فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما   اے دوائے جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق خدا تجھ کو خوش رکھے تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہوجاتے ہیں اور تجھ سے تمام امراض کا علاج ہوجاتا ہے تجھ سے نخوت و ناموس کا دفعیہ ہوجاتا ہے تو ہمارے لیے مثل افلاطون اور جالینوس کے ہی)

کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ اے دوائے نخوت و ناموس ما۔ صاحبو! یہ
۲۷ حالت تھی کہ کثرت سے صحابیات نے مختلف اوقات میں آکر حضور میں عرض کیا کہ آپ ہم کو قبول فرمالیجئے اور اپنی کنیزی میں لے لیجئے اور آپ نے فرما دیا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے پھر کیا اس فعل پر ان کی مذمت کی گئی ہرگز نہیں۔ ان کی جو قدر کی گئی اُس کو بھی سُن لیجئے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی نے ایک مرتبہ ایسے ہی واقعہ پر یہ کہہ دیا کہ مَا اَقَلَّ حَیَاءَھَا (کیسی بے شرم ہے) حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ بگڑ گئے اور فرمایا کہ وہ تجھ سے ہزار درجہ اچھی تھی کہ اپنے کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتی تھی۔ اور یہی راز ہے کہ غیر صحابی خواہ کتنا ہی بڑا ہوجاوے لیکن صحابی کے برابر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر معاویہؓ گھوڑے پر سوار ہوں اور اُس کے پیروں کی گرد اڑ کر اُس گھوڑے کی ناک پر جا بیٹھے تو حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی وہ ناک کی گرد عمر و

بن عبد العزیزؒ اور اویس قرنیؒ سے افضل ہے - ہم کو اس فتوے کی قدر نہیں ہے مگر اہل محبت جانتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظمؒ نے کیا بات فرمائی۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری (گوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہو یا جوہری جانتا ہے) تو صحابہؓ میں بڑی بات یہ تھی کہ وہ حضرات پورے عاشق تھے - اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علمی عملی وہ اصلاح کی کہ نہ کوئی فلسفی اپنی قوم کی کر سکا اور نہ کوئی سلطان اپنی رعایا کی کر سکا کیونکہ ان کے پاس تو نور ہی دوسرا تھا جس کو فرماتے ہیں اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (کیا جو مردہ ہو پس اس کو ہم زندگی بخشیں اور اس کے لئے ہم ایک نور کر دیں کہ وہ اس کو لوگوں میں لئے پھرتا ہے) اس کو نور سے تعبیر کیجئے یا برکت صحبت کہیے سب کا خلاصہ ایک ہی ہے ؎

(صحابہ کے پاس نور صحبت نبوی کی برکت تھی)

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ   وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(ہمارے عنوانات بیان مختلف ہیں مگر تیرا حسن ایک ہی ہے ہر عنوان اسی حسن کی طرف اشارہ کرتا ہے)

۲۸ اگر ہم بھی اس مقام پر پہنچنا چاہیں جس پر صحابہ تھے (یعنی باعتبار عطا کے کیونکہ وہ جاہ تو ہم کو کہاں نصیب) تو صورت یہ ہے کہ ہم اُن سے وابستگی اطاعت کی پیدا کر لیں کہ اس کی بدولت انہی کے ساتھ ساتھ لگے چلے جاویں جیسے ایک انجن پشاور سے چلے اور کلکتہ پہونچے اور ایک ٹوٹی ہوئی گاڑی بھی کلکتہ پہونچنے کی متمنی ہو تو اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس انجن کے ساتھ اپنی زنجیر ملا دے - تو اب ہمارا بھی یہی کام ہونا چاہئے کہ ہم صحابہؓ کے ساتھ تعلق پیدا کریں۔ خیر یہ سب جمل معترضہ تھے۔ مقصود یہ تھا کہ صحابہؓ کی محبت کا یہ عالم تھا - اور کفار کو بھی اس کا علم تھا اس لئے اُن کا مقصود یہ تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے ان میں جدائی ہی ڈالدیں تو یہ رنگ لاتے مگر دوستی کے پیرایہ میں ؎

(رجوع بمقصود بیان)

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت   دام داں گرچہ زدانہ گویدت
زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر   تاکہ گیرد مرغ را آں مرغ گیر

(دشمن اگرچہ کوئی بات دوستانہ طریق پر تم سے کہے مگر تم اس کو دھوکہ ہی سمجھو کیونکہ شکاری جانوروں کو پکڑنے کے لئے ان ہی جیسی آواز میں نکالا کرتا ہے)

بدخواہوں کا ہمیشہ قاعدہ ہے کہ برنگِ خیر خواہی بدخواہی کیا کرتے ہیں دنیا میں بہت لوگوں نے مسلمانوں سے ایسا کیا ہے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ان کفار نے یہی معاملہ کیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فراست عجیب تھی لیکن اس احتمال سے کہ شاید یہ اسی طرح ایمان لے آویں اس شرط کو منظور فرمالیا رہا صحابہ کے رنج کا خیال تو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ صحابہؓ تو اپنے ہیں ان کو تو اگر ساری عمر کے لئے بھی الگ کردیں تب بھی الگ ہو جاویں گے کیونکہ وہ تو طالب رضا ہیں اُن کی تو وہ حالت ہے کہ ؎

اُرِيْدُ وِصَالَه وَيُرِيْدُ هِجْرِیْ　　فَاَتْرُكُ مَا اُرِيْدُ لِمَا يُرِيْدُ

۲۹ (میں اس کے وصال کا خواہشمند ہوں اور وہ فراق چاہتا ہے تو اسکی خواہش کی خاطر میں اپنی خواہش چھوڑ دیتا ہوں)

فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　کہ حیف باشد از غیر او تمنائے

(کیا وصال اور کس کا فراق رضائے محبوب کی تمنا ہونی چاہئے اس سے غیر اس کی تمنا کے افسوس ہوگا)

کس کا فراق اور کس کا وصال رضا کی تمنا ہونی چاہئے اور یہاں سے ایک اور جملہ مفیدہ یاد آگیا کہ جب عاشق پر رضائے محبوب کا اتباع ضروری ہے نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صحابہ عاجل مصلحت پر نظر نہ کرتے تھے گو مصلحت اس پر مرتب ہو جائے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ احکام شرعیہ میں گو مصلحت ہو مگر اطاعت اس پر موقوف نہ ہونا چاہئے بلکہ اطاعت محض رضا کے لئے ہو۔ دیکھئے اگر کسی عورت سے عشق ہو جاوے اور وہ حکم کرے کہ میں جب ملوں گی کہ جب تم پائجامہ چڑھا کر سر پہ ٹوکرا رکھ کر جوتے نکال کر فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک دس چکر لگاؤ تو یہ ہرگز نہ پوچھے گا کہ اس میں

کیا مصلحت ہے ؎ رندِ عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار۔ الخ (عاشق کو مصلحت بینی سے کیا کام) اگر عاشق ہے تو بیس دفعہ کر دکھاتے گا۔ کہاں کی تہذیب اور کس کی عار۔ وہ اس تہذیب کو تعذیب سمجھے گا کیونکہ مانع وصال یار ہے ایسے وقت پر تو مصلحت بینی اُس شخص کا کام ہے جو فارغ عن المحبّت ہو اور میں یہ نہیں کہتا کہ احکام شرعیہ میں حکمتیں نہیں ہیں۔ حکمتیں ضرور ہیں مگر اوّل تو ہم کو ان کا احاطہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے درک کا طریقہ نہیں جو اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ محض موہوب ہیں جن کا اکثر ترتب تقویٰ پر ہوا ہے۔ ذرا تاریخ میں دیکھئے کہ اُمت میں جو بڑے بڑے لوگ جیسے شاہ ولی اللہؒ ابن العربیؒ عبدالکریم جیلیؒ وغیرہ گذرے ہیں اور انھوں نے حکم و اسرار شریعت کے لکھے ہیں تو کیا انھوں نے ان اسرار کو کسی مدرسہ میں سیکھا تھا یا کسی مناظرہ سے حاصل کیا تھا ہرگز نہیں مگر بات کیا تھی کہ مدرسہ سے نکل کر علم پر عمل
۳۰ کرنا شروع کر دیا۔ خلوص اختیار کیا اس سے اُن کے قلب میں ایک نور پیدا ہوا جس کی بدولت ان کو سب کچھ منکشف ہو گیا۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(تم کو بے معین اور بغیر استاد و کتاب کے انبیاء جیسے علوم حاصل ہوں گے۔)

تو اگر اسرار معلوم ہونے کا کوئی طریقہ ہے تو یہ ہے لیکن اس پر بھی طالبِ حق کو اسرار کی ہوس نہ ہونا چاہئے۔ اِس لئے کہ یہ محبت کے خلاف ہے۔ جب ایک مردار کا عاشق اس کی فرمائش کا راز دریافت نہیں کرتا اور خواہ بعد میں یہی معلوم ہو کہ اس میں خاک بھی مصلحت نہ تھی۔ مگر اطاعت میں کس طرح دوڑتا ہے تو طالبِ حق اور عاشقِ خدا کو ایسی کاوش کب زیبا ہے۔ غرض ایسی کاوش طریقِ محبت کے بالکل خلاف ہے۔ طریقِ عشق تو اطاعت میں دیوانہ ہونا ہے کہ ؎ اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد (وہی دیوانہ ہے جو دیوانہ نہ ہوا تھا جیسا) اگر آپ اس کے نظائر دنیا میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ...

احکام شرعیہ میں حکمتیں ہیں مگر ان کے علوم کا طریقہ تقویٰ ہے

ہرگز یہ خطاب نہ کرتا لیکن جبکہ آپ محبوبان مجازی کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں کہ ان کے ہر حکم کو بغیر دریافت اسرار پورا بجالاتے ہیں نیز حکام مجاز کے ساتھ بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے کہ اگر صاحب کلکٹر آپ سے یہ کہے کہ ہم کو آج رات کے وقت دو بجے فلاں مقام پر تم سے فلاں امر میں مشورہ کرنا ہے جس کو ہم پرسوں انجام دیں گے تو آپ کے دل میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہ آویگا کہ جب پرسوں اس کام کو کیا جاویگا تو کل دن میں بھی تو اُس کی بابت مشورہ ہوسکتا ہے پھر رات کو مجھے بیچین کرنے سے کیا فائدہ ۔ اور اگر وسوسہ آویگا بھی تو آپ اس کو دفع کریں گے کہ خواہ کوئی مصلحت ہو یا نہ ہو ہمیں تو ان کی رضامندی مقصود ہے تو جب اہل محبت اور اہل حکومت کے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ ہے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیوں نہیں ہے کیا خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تحقیقات مصالح کی مشق کے لئے تم کو ملے ہیں اور اگر دونوں موقعوں میں کوئی فرق ہے تو ۳۱
بتلایئے اور فرق نہیں تو پھر یہاں لِمَ کَانَ کَذَا اور کَیْفَ کَانَ کَذَا (یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا) کیوں ہے بلکہ خدا تعالیٰ تو محبوب بھی ہیں اور حاکم بھی تو یہاں تو بدرجہ اولیٰ یہ حالت ہونی چاہئے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی رضائے تو　　جان شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندگی بخشیں تو زہے نصیب اور موت دیدیں تو زہے قسمت جب دل آپکا عاشق ہوگیا تو پھر آپ جو چاہیں کریں)

؎ زبان تازہ کردن باقرار تو　　نیکیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

کیا معنے چون وچرا کے اور ہمارا حق ہی کیا ہے ہم کو نسبت ہی کیا ہے کہ ہم چون چرا کریں ہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مخالفان اسلام کا منہ بند کرنے کے لئے ہم اسرار پوچھتے ہیں اور اُن کا منہ بند کرنا ضروری تو ہم کو اسرار بتلانا بھی ضروری ۔ لیکن اگر میں مخالفین کے لئے اس سے اچھا جواب آپ کو بتلا دوں

اور آپ کے اِس جواب کا مخدوش ہونا ثابت کر دوں پھر تو یقیناً اِس شبہ کی گنجائش نہ رہے گی اس کا بیان یہ ہے کہ مسلمان دو قسم کے ہیں ایک اہلِ علم دوسرے عوام تو اگر آپ عوام میں سے ہیں تب تو سیدھی بات یہ ہے کہ معترض کو عالم کا نام بتلا دیجئے کہ ان سے پوچھو ہم زیادہ نہیں جانتے اور اگر اہلِ علم میں سے ہیں یا وہ آپ کو ذی علم سمجھتا ہے تو اس کے لئے دوسرا جواب ہے وہ یہ کہ آپ یوں کہئے کہ احکام قوانین ہیں اُن کے اسرار اسرار قوانین ہیں اور ہم قانون کے جاننے والے ہیں اسرار قانون ہم نہیں جانتے نہ ان کا بتلانا ہمارے ذمہ واجب ہے۔ دیکھئے اگر صاحب جج کسی مقدمہ میں ڈگری دیدیں تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس قانون کی روسے آپنے ڈگری دی ہے میں اس قانون کو تو مانتا ہوں لیکن مجھ کو خود اِس میں یہ کلام ہے کہ یہ قانون مصلحت کے خلاف ہے اس لئے آپ اس کا راز بتلا دیں اور اگر وہ ایسا کہے بھی تو اس کو توہین عدالت اور جرم سمجھا جاویگا اور اس پر صاحب جج کو حق ہوگا کہ توہین عدالت کا اُس پر مقدمہ کرے اور اگر مقدمہ بھی قائم نہ کیا تو اتنا تو ضرور کریگا کہ کان پکڑ کر اس کو عدالت سے باہر کر دیگا۔ اور اگر اُس وقت اس کی طبیعت میں حکومت کے بجائے حکمت غالب ہوئی تو یہ جواب دیگا کہ ہم عالمِ قانون ہیں واضع قانون نہیں مصالح واضع سے پوچھو۔ تو کیا کسی عقلمند کے نزدیک یہ جواب نامعقول جواب ہے یا بالکل عقل کے موافق۔ اگر عقل کے موافق ہے تو آپ مولوی بن کر یہ جواب کیوں نہیں دیتے کہ ہم عالمِ قانون ہیں واضع قانون خداتعالےٰ ہے مصالح ان سے پوچھ لینا۔ وہ جواب دیں گے خواہ اسرار بتلانے سے خواہ دماغ کی اصلاح کرنے سے اور یہ فروع اسلام کے متعلق جواب ہے۔ البتہ اگر مخالف اسلام کو نفس اسلام کی حقانیت تحقیق کرنا منظور ہے تو اصولِ اسلام میں عقلی گفتگو کریں گے ان میں ہم یہ مذکور جواب نہ دیں گے بلکہ ۳۲

اس کی حقانیت کے دلائل عقلیہ بتلائیں گے خواہ دس برس تک ہم سے کوئی پوچھے جائے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص سلطنت سے باغی ہوجائے اور بادشاہ کو بادشاہ نہ مانتا ہو اور آپ اسے منوانا چاہیں اور وہ اس کے ماننے کے لئے یہ طریق اختیار کرے کہ آپ سے ہر قانون کی مصلحت دریافت کرے تو آپ ہرگز اس کو یہ راہ نہ دیں گے اور اس کو ایک تطویل لاطائل سمجھیں گے اور اس شغل کو فضول قرار دیں گے البتہ یہ کریں گے کہ بدلائل بادشاہ کو بادشاہ ثابت کریں گے اور قانون کو اُس کا قانون ثابت کریں گے پھر جس قانون کی نسبت وہ دریافت کریگا اور اُس کی مصلحت پوچھے گا آپ اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ ہم اسکی مصلحت نہیں جانتے۔ وہ بادشاہ ہے اور یہ اُس کا قانون ہے اور بادشاہ کا قانون واجب العمل ہوتا ہے پس یہ بھی واجب العمل ہے۔ بعینہ یہی تقریر خدا تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام میں بھی جاری کریں گے کہ دلائل عقلیہ سے ایک اُن کا صادق ہونا دوسرا ان احکام کا اُن کیطرف منسوب ہونا ثابت کر دیں گے۔ اور فروع میں اتنا ہی کہدیں گے کہ صادق کے احکام ہیں اور ایسے احکام واجب الامتثال ہیں۔ دوسری نظیر لیجئے حکیم عبدالمجید خاں کا حکیم ہونا تو محتاج دلیل ہے لیکن ان کے حکیم مان لینے کے بعد کسی مریض کو یہ اختیار نہیں کہ اُن کی تجویز کردہ اوزان ادویہ میں چون وچرا کرے اور اس کی لِم اُن سے دریافت کرے۔ پس جب دنیاوی معاملات میں یہ امر مسلّم ہے تو شریعت کے احکام میں کیوں چون وچرا کیا جاتا ہے۔ صاحبو! یہ نہ سمجھیں کہ مولوی احکام کے مصالح نہیں جانتے۔ ان کے پاس سب کچھ ذخیرہ موجود ہے لیکن سے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز   ورنہ در مجلس رنداں خبری نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ معلوم نہ ہو)

میرے پاس اگر کوئی دو برس رہے تو میں انشاء اللہ تعالےٰ ثابت کردوں گا کہ ہر حکم شریعت میں حکم عقلیہ ہیں مگر ہم اُن کو علوم عظمیہ نہیں سمجھتے کیونکہ وہ سب ظنی ہیں۔ لوگوں نے بہت سے حکم لکھے ہیں اور اب بھی الہام سے ہوتے ہیں مگر یہ سب علوم ظنّیہ ہیں اِس لئے علماء اس میں مشغول نہیں ہوتے۔ دوسرے اس میں یہ بھی خرابی ہے کہ اگر کبھی وہ ظنیت کے سبب مخدوش ہو گئے اور حکم بزعم سامع اسی پر مبنی تھا تو اُس کے منہدم ہو جانے سے حکم شریعت بھی منہدم ہو جاویگا۔ لہٰذا بیان اسرار سے جواب دینا بے غبار رستہ نہیں صاف جواب یہی دینا چاہیئے کہ ہم اسرار نہیں جانتے قیامت میں خدا تعالےٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ لینا۔ دیکھو اگر ابھی ایک منادی کرنے والا منادی کرے کہ صاحب کلکٹر کا یہ حکم ہے تو کوئی بھی اس سے گلخپ ہوتا ہے کہ حکمت اس حکم کی بیان کرو ورنہ نری منادی تعصب ہے۔ پس ہم کہیں گے کہ جب منادی کرنے والے سے گلخپ ہوگے اور اس کو اُس منادی کے مصالح بتلانے پر مجبور کروگے تو ہم بھی بتلا دیں گے۔ غرض حِکَم (حکمتیں) و اسرار کا علم ہم کو بھی الحمد للہ ہم جانتے ہیں لیکن وہ ظنّی ہیں۔ علم قطعی یہ ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے اور خدا تعالےٰ کا حکم قطعی ہے لہٰذا یہ قطعی۔ بس یہ ہے علم قطعی۔ مگر بات یہ ہے کہ قطعی علم میں مزا نہیں ہوتا اور اختراعیات میں لذت ہوتی ہے۔ یہ ہے اِس مرض کی اصل وجہ۔ اِس پر مجھے حکایت یاد آئی کہ میں شاہجہانپور سے سفر کر رہا تھا۔ ایک جنٹلمین گاڑی میں بیٹھے تھے ایک اسٹیشن پر ان کے خادم نے آکر اطلاع دی کہ حضور وہ تو سنبھلتا نہیں کہنے لگے کہ یہاں پہونچا دو۔ یہ سُنکر مجھے تعجب ہوا کہ وہ کون چیز ان کے ساتھ ہوگی جو خادم سے نہیں سنبھل سکی اور اب یہ گاڑی میں منگا کر اس کو سنبھال لیں گے آخر چند منٹ بعد دیکھا کہ خادم صاحب ایک بہت بڑے اونچے کتے کو زنجیر میں باندھے ہوئے لا رہے ہیں اور وہ کتا زور کر رہا ہے۔ آخر وہ اُن کے

اسرار شرعیہ کو علم ظنیہ پر مبنی کرنا موجب خرابی ہے

۲

ایک جنٹلمین اور اس کے کتے کی حکایت سے سوال کا جواب

سپرد کیا گیا۔ اُنھوں نے ریل کی آہنی سلاخوں سے اس زنجیر کو باندھ دیا اُس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوتے اور کہنے لگے کہ جناب! کُتّے کا پالنا کیوں حرام ہوا۔ باوجودیکہ اِس میں فلاں وصف ہے اور فلاں وصف ہے کتنے ہیں۔ انھوں نے اتنے وصف بیان کئے کہ شاید ان میں بھی نہ ہوں۔ میں سب سُنتا رہا۔ جب وہ کہہ چکے تو میں نے کہا کہ جناب میں نے سُن لیا اِس کے دو جواب ہیں ایک عام کہ وہ اِس کے علاوہ اور بھی بہت سے شبہات کا جواب ہے اور ایک خاص کہ وہ خاص اسی کے متعلق ہے کونسا عرض کروں فرمانے لگے دونوں کہہ دیجئے۔ میں نے کہا جواب عام تو یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے پالنے کی ممانعت فرمائی ہے اور یہ جواب عام اِس لئے ہے کہ قیامت تک کے لئے شبہات کا جواب ہے البتہ اِس میں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے دوسرے یہ کہ
۳ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے اگر ان میں کلام ہو تو ثابت کروں کہنے لگے کہ یہ تو ایمان ہے یہ تو عام جواب تھا اور یہ علمی اور حقیقی جواب تھا لیکن ان کو اس کی قدر نہ ہوئی اور کچھ حظ نہ آیا۔ کہنے لگے کہ جناب اور جواب خاص کیا ہے میں نے کہا کہ وہ یہ ہے کہ کُتّے میں جس قدر اوصاف آپ نے بیان کئے واقعی وہ سب ہیں لیکن باوجود ان اوصاف کے اس میں ایک عیب اتنا بڑا ہے کہ اس نے تمام اوصاف کو خاک میں ملا دیا وہ یہ کہ اِس میں قومی ہمدردی نہیں ہوتی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک کتّا دوسرے کتے کو دیکھ کر کس قدر از خود رفتہ ہوجاتا ہے۔ اِس جواب کو سُنکر وہ بہت ہی محظوظ ہوتے اور وہ اس کو جواب قطعی سمجھے۔ حالانکہ یہ محض ایک محض نکتہ ہے۔ مجھے تو خبر نہ تھی کہ یہ کون ہیں اتفاق سے جب میں اٹاوہ سے بریلی آیا تو مولوی ظہور الاسلام صاحب تحصیلدار کہنے لگے کہ آپ سے اِس قسم کی گفتگو کسی سے ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ ہوئی تو تھی فرمانے لگے کہ

علیگڑھ کالج کے طالب علم اِس جواب کا تذکرہ کر رہے تھے اور اِس جواب سے بہت خوش تھے۔ مجھ کو اِس سے گمان ہوا کہ شاید وہاں کے تعلیم یافتہ ہوں۔ میں نے اِس کو اس لئے ذکر کیا ہے کہ میں یہ بتلا دوں کہ جس جواب پر وہ اِس قدر خوش تھے علاوہ فضول ہونے کے میری نظر میں اس کی کچھ بھی وقعت نہ تھی اور میں اس کو جواب ہی نہیں سمجھتا تھا۔ غرض علّت اور حکمت کا دریافت کرنا عشق و محبّت کے بھی بالکل خلاف ہے جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ہاں اگر یہ کہو کہ ہم عاشق ہی نہیں تو دوسری بات ہے لیکن خدا تعالےٰ اس کی بھی نفی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (اور مومنین اللہ تعالےٰ کی محبت میں زیادہ شدید ہیں) شدّت ہی کو عشق کہتے ہیں عشق چونکہ پامال لفظ تھا اس لئے قرآن و حدیث میں اِس کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اور اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ میں عشق کا لفظ استعمال کرنا بے ادبی ہے
۴ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص وائسرائے کی تعریف کرنے لگے اور یہ کہے کہ اُن کو کنسٹبل کے اختیارات بھی حاصل ہیں تو اگرچہ واقع کے اعتبار سے یہ صحیح ہے لیکن یہ مدح سخت ہجو اور بے ادبی ہی بلکہ بعض اوقات بعض ایسے امر کی نفی بھی موہم نقص ہو جاتی ہے ؎

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست ایں نہ مداح است او مگر آگاہ نیست

(بادشاہ کو کوئی شخص کہے کہ وہ جولاہہ نہیں یہ اس کی تعریف نہیں ہو بلکہ وہ بادشاہ کے مرتبہ سے واقف نہیں ہے)

تو جس کی نفی بھی مدح نہ ہو اس کا اثبات تو کیسے مدح ہو جاویگا وہ تو اور بھی زیادہ قدح ہوگا تو لفظ عشق کو خدا تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے نہ استعمال کرنا چاہیے۔ قرآن و حدیث میں بھی اس کو استعمال نہیں کیا گیا ہے ہاں شدتِ حُب کا لفظ آیا ہے تو جب خدا تعالےٰ ہی فرما چکے ہیں کہ تم عاشق ہو تو عشق سے اِنکار کیسے کر سکتے ہو۔ پس عاشق کا ۱۳۴

اہل ایمان سب سے بڑھ کر عاشق ہیں

قرآن و حدیث میں عشق کا لفظ نہ آنے کی وجہ

مذہب اختیار کرو۔ خوب کہا ہے ؎

یا مکن با پیلبانان دوستی   یا بنا کن خانہ بر انداز پیل

(یا تو ہاتھی والوں سے دوستی نہ کرو ورنہ اپنا گھر اتنا بڑا بنواؤ کہ اس میں ہاتھی آسکے)

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی   یا فرو شو جامۂ تقویٰ بہ نیل

(یا تو چہرہ پر عاشقی مت گداؤ یا جامہ تقوے کو نیل سے دھو ڈالو)

طریق محبت میں قدم رکھنے سے اسرار کا خزانہ ملتا ہے

الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ زبردستی کھینچکر ہم کو عاشقین میں داخل کیا گیا ہے۔ گویا ہماری وہ حالت ہے کہ ہم بھاگتے ہیں اور ہم کو پکڑ پکڑ کر بلایا جاتا ہے کہ تم تو ہمارے ہو تم کہاں چلے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بہت تعجب کرتے ہیں یعنی خوش ہوتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑ کر جنت میں داخل کئے جاتے ہیں۔ سو صحابۂ کرام کا انداز بھی عشق تھا جیسا اوپر مذکور ہوا وہی تم بھی اختیار کرو۔ اور اس کے برکات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ممکن ہے کہ تم کو وہ علوم بھی عطا ہو جاویں جن کے تم طالب ہو یعنی اسرار۔ دیکھو اگر کوئی بادشاہ سے کہے کہ ہم کو اپنا خزانہ دکھلاؤ تو اس کو گستاخ سمجھا جاویگا۔ البتہ اگر خزانہ دیکھنے کی تمنا ہے تو اس کی اطاعت کرو اس سے بے تکلفی پیدا کرو پھر ممکن ہے کہ ایک دن ہو کہ ایسی عنایت بادشاہ تم کو خود ہی خزانہ پر لیجا کر کھڑا کر دے۔ خوب کہا ہے ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ   جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(فہم و خاطر تیز کرنا یہ حق تک پہونچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے بجز شکستہ لوگوں کے فضل خداوندی کسی کو قبول نہیں کرتا)

یعنی بدوں شکستگی اور پستی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اور پستی ہی میں یہ اثر ہے ؎

(بقیہ حاشیہ ص۲۲) کیسے دیگئی جواب یہ ہے کہ عشق تو سب میں ہے مگر عوارض میں مستور ہے۔ چنانچہ محرک کے ورود پر ہر شخص میں اس کا ظہور ہوتا ہے پس جس وقت وہ مستور ہوتا ہے اس وقت لِمَ اور کَیفَ (کسلئے اور کیسے) بھی سوجھتا ہے لیس مقصود مقام کا یہ ہے کہ ان محرکات کو کہ ان میں تفکر بھی کام میں لاؤ اور آثار سے متلون ہو کر ان آثار میں سے لِمَ اور کیف کا قطع ہونا بھی ہو جائے

ہرکجا پستی است آب آنجا رود ہرکجا مشکل جواب آنجا رود

(جس جگہ نیچان ہوتا ہے پانی وہیں مرتا ہے جہاں اشکال ہوتا ہے وہاں ہی جواب دیا جاتا ہے)

ہرکجا دردے دوا آنجا رود ہرکجا رنجے شفا آنجا رود

(جس جگہ بیماری ہوتی ہے وہیں دوا کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں رنج ہوتا ہو وہاں شفا پہونچتی ہے)

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں را یک زمانے خاک باش

(تم نے برسوں پتھر کی طرح سخت رہ کر دیکھ لیا اب ذرا آزمانے ہی کو کچھ دن خاک ہوکر دیکھ لو)

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتے ہیں خاک ہو جاؤ تو رنگ برنگ کے پھول اُگیں گے)

خلاصہ یہ ہے کہ تفویض وتسلیم سے کام چلتا ہے اور بالکل خاک میں مل جانے سے۔ اور جس کو یہ دولت ملی ہے اسی طرح ملی ہے۔ اور جو ساری عمر قیل وقال میں رہے، تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ پس پہلا طریقہ محمود اور ہدایت اور دوسرا طریقہ مذموم اور ضلالت ہے ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ ہم نے دونوں رستے دکھلا دیئے اب جس کا جدھر جی چاہے چلا جاوے۔ مضمون بہت بڑھ گیا ۴

مقصود یہ ہے کہ صحابہؓ کو ایسی محبت تھی کہ اگر آپ فرماتے کہ ساری عمر ہم کو نہ دیکھو تو وہ ایسا ہی کرتے چنانچہ دو واقعے ہوئے بھی۔ ایک اویس قرنیؒ کا کہ انھوں نے باوجود شدت اشتیاق زیارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم شرعی سنکر کہ والدہ کی خدمت نہ چھوڑنا تمام عمر زیارت نہیں کی مجھے تعجب ہے ان لوگوں پر کہ جو زیارت فی المنام (سونے میں زیارت) کی تمنا کرتے ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت احکام میں نہیں کرتے حالانکہ زیارت فی المنام (خواب میں زیارت) موخر ہے رتبہ میں زیارت فی الیقظ (بیداری میں زیارت) سے تو حضرت اویسؒ نے یہاں تک اطاعت کی کہ زیارت فی الیقظ (بیداری میں زیارت) بھی نہیں کی۔ کیونکہ سمجھتے تھے کہ اطاعت کا تو کچھ بدل نہیں اور زیارت کا بدل ہے۔ وہ یہ کہ اگر یہاں نہ ہوگی تو

بیان محبت صحابہؓ

حضرت اویس قرنیؒ کی اطاعت والدہ کا قصہ

زیارت فی المنام سے اطاعت افضل ہے

آخرت میں ہو جاویگی۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

کشتۂ کہ عشق دارد نگذاردت بدیں سان ‌ ‌ ‌ بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(عشق میں جو کشش ہو وہ تجھے یوں ہی نہ چھوڑ دیگی بلکہ اگر تو جنازہ پر نہ آیا تو مزار پر ضرور آئیگا)

اِس میں بھی بدل کا مضمون ہے۔ جب اویس قرنیؒ سے کہ تابعی ہیں ایسا
1 حضرت وحشیؓ کی اطاعت کا قصہ
واقعہ ثابت ہے تو صحابہؓ کا کیا کہنا ہے۔ دوسری حکایت حضرت وحشیؓ
کی ہے اگرچہ یہ صحابی مشہور نہیں ہیں لیکن ہیں صحابی۔ گو حضرت عمرؓ اور
حضرت ابوبکرؓ کے درجہ کے نہیں ہیں ؎

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود ‌ ‌ ‌ لیک بس عالیست پیش خاک تود

(آسمان اگرچہ عرش کی نسبت پست ہے مگر ایک خاک کے ٹیلہ کے سامنے تو بہت بلند ہے)

تو ان کا واقعہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا تھا۔ جب یہ
2 حضرت وحشیؓ کے قصہ پر ایک شبہ اور اس کا جواب
مسلمان ہو کر آئے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ هَلْ تَسْتَطِيعُ اَنْ
تُغَيِّبَ وَجْهَكَ عَنِّي (کیا اپنا چہرہ مجھ سے غائب رکھ سکتے ہو) یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے
کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے چچا سے اِس قدر محبت تھی کہ اُن کی
بدولت ایک مسلمان سے ایسے رنجیدہ رہے کہ اُن کی صورت دیکھنا بھی
پسند نہیں فرماتے تو یہ تو بڑی رنج کی بات ہے کہ آپ خلاف مزاج امر
سے اِس قدر متاثر ہوتے ہیں تو اس حالت میں عاصی آپ سے کیا اُمید
کریں خدا جانے آپ کتنے ناخوش ہوں اور ہم کو کہاں دور پھینک دیں
مگر ہم کو اس واقعہ ہی سے ایک بہت بڑی بات بشارت کی ہاتھ آئی۔ یہی
واقعہ ہے کہ جس سے اِنشاء اللہ تعالےٰ ہماری تمام مشکلات حل ہونگی۔ کیونکہ
اِس سے معلوم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے متاثر ہونے والے
ہیں کہ ایک منتسب کی دنیاوی تکلیف کی آپ کو سہار نہیں تو قیامت
میں اگر ہم حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن پکڑ کر کھڑے ہو جاویں گے
تو یقیناً حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری مصیبت کو دیکھ نہ سکیں گے

اور ہماری مدد فرما دیں گے۔ اور صحابہ کرام نے اسی قسم کی ایک حدیث سے ایک ایسی ہی عجیب بات سمجھی تھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث بیان فرما رہے تھے صحابہؓ نے اس پر عرض کیا ھَلْ یَضْحَکُ رَبُّنَا یَا رَسُوْلَ اللہ علیہ السلام یعنی کیا اللہ میاں ہنستے بھی ہیں۔ اور یہیں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ صحابہ کرام کا علم کیسا عمیق تھا کہ اللہ میاں کے ہنسنے کو تو پوچھا لیکن آجکل کے طباعوں کی طرح اس کی کیفیت نہیں پوچھی۔ کیونکہ جانتے تھے کہ جب خدا تعالےٰ ہی کو پوری طرح نہیں پہچانا تو اس کی صفات کی کیفیت کیسے سمجھ میں آسکتی ہے ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبانِ مرغاں را

(جب تو نے کبھی سلیمان علیہ السلام کو دیکھا ہی نہیں تو پھر پرندوں کی بولیاں کیسے سمجھے گا)

ایک بزرگ سے کسی نے شبِ معراج کی مفصل گفتگو کے متعلق سوال کیا تو

۸ انھوں نے جواب میں کیا خوب فرمایا ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد

(کس کی ہمت اور حوصلہ ہو کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا)

غرض صحابہؓ نے اس حدیث کو سنکر عرض کیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ایسے رب سے خیر کے ملنے سے محروم نہ رہیں گے جو ہنستا بھی ہے یعنی اب کچھ غم نہیں کیونکہ نہیں معلوم کس بات پر ہنس پڑیں گے اور ہمارا کام بن جاویگا۔ صاحبو صحابہؓ کے یہ علوم ہیں۔ اب ان میں ہمیں اس لئے لطف نہیں آتا کہ ہمارا قلب مثل عنین کے ہو گیا ہے اس کو حس نہیں رہی جیسے عنین کو عورت میں لطف نہیں آتا۔ اسی طرح ہم باعتبار قلب کے عنین اور نابالغ ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

خلق اطفالند جز مستِ خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(ساری مخلوق بچوں کی طرح ہو سوائے اس شخص کے جو حق تعالیٰ کا مست ہو لیس بالغ وہی ہو جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا)

حاشیہ: صحابہ کرام کا علم بہت عمیق تھا اور آجکل کے طباعوں کی حالت

قصہ حضرت وحشیؓ

توصحابہؓ نے جیسے اُس حدیث سے سمجھا اُسی انداز پر اس وقت خدا تعالیٰ نے حضرت وحشیؓ کے متعلق ارشاد نبوی صلے اللہ علیہ وسلم سے میری دل میں یہ بات ڈالی کہ اگر ہم مخل جاویں گے تو ضرور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہماری مدد فرماویں گے غرض حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت وحشیؓ سے فرمایا اور انھوں نے کرکے دکھلا دیا کہ تمام عمر سامنے نہیں آئے ؎

اُرِیْدُ وِصَالَهٗ وَیُرِیْدُ ہِجْرِیْ ۔ فَاَتْرُكُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

(میں اس کے وصال کا ارادہ کرتا ہوں وہ میرے فراق کا ارادہ کرتا ہے۔ پس میں اپنی مراد کو اس کی مراد کی وجہ سے چھوڑتا ہوں)

کیا کیا لہریں ان کے دِل میں اُٹھتی ہوں گی کہ ؎

از فراق تلخ میگوئی سخن ۔ ہرچہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

(فراق کی تلخ باتیں کرتے ہو اور جو چاہو سو کرو مگر یہ نہ کرو۔)

اگر گردن بھی کاٹ لیتے تو یہ غم نہ ہوتا۔ ایک تو جُدائی کا غم دوسرا یہ غم کہ ۹
لوگوں کی نظروں میں کیسی ذلت ہوگی مگر عاشق تھے کچھ بھی پروا نہ کی۔ جان و مال و آبرو سب فدا کردیا۔ اور دوسرے صحابہؓ بھی کیسے مہذب کہ کسی نے اُن کو ذرا نہیں چڑایا بلکہ اُن کی زیارت کرنے ملک شام میں جاتے تھے چنانچہ اُن سے ایک صحابی ملنے گئے اور اُن سے حضرت حمزہؓ کے قتل کا واقعہ پوچھا۔ کہنے لگے خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کا کفارہ بھی ہوگیا کہ میں نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔ تو صحابہؓ جب ایسے تھے کہ اتنی بڑے امر میں اطاعت کرلی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یقین تھا کہ اگر ہم ایسا کرلیں کہ ان رؤسا کے آنے کے وقت اِن غربا کو مجلس میں رہنے سے منع کردیں تو اُن کو تو ذرا بھی ناگوار نہ ہوگا اور شاید یہ رؤسا ایمان لے آویں ورنہ اتمام حجت ہی ہوجاویگا۔ اِس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سوچ رہے تھے کہ ایسا کریں یا نہ کریں کہ یہ آیت نازل ہوئی وَاصْبِرْ

نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنَاکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (اور آپ اپنے کو ان لوگوں کیساتھ مقید رکھا کیجئے جو اپنے رب کی عبادت صبح وشام محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیاوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانیئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا یہ حال حد سے گذر گیا ہے۔)

یہ شانِ نزول بیان کیا تھا جس میں بعض اور ضروری مضمون بھی بیان ہو گئے اب میں ترجمہ بیان کرتا ہوں فرماتے ہیں وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدَاۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ الاٰیۃ روکے رکھو اپنے کو اُن لوگوں کے ساتھ جو صبح وشام اپنے رب کی عبادت اِس طرح کرتے ہیں کہ اُس عبادت میں ارادہ کرتے ہیں محض خدا تعالیٰ کی رضا کا یعنی اپنے نفس کو مقید کر کے رکھئے یعنے اُن کو اُٹھانے کی اجازت تو کہاں ہے خود بھی نہ اُٹھئے۔ مثلاً
۱۰ خود ہی اُٹھ کر ان رؤسا کو دوسری مجلس میں لیکر بیٹھ جاتے جس میں اُن غربا کی ذلت بھی نہیں ہوتی دیکھئے وَاصْبِرْ نَفْسَکَ (جمائے رکھئے اپنے نفس کو) ارشاد ہے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی تقاضا ہو قلب میں کہ میں اُٹھوں کیونکہ اِس اُٹھنے کا داعی بھی دین ہی تھا مگر صبر کر کے بیٹھئے اِس سے سمجھئے کہ کیا چیز ہیں مساکین۔ محض اِس لئے کہ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ (محض اس کی رضا جوئی کا ارادہ کرتے ہیں) خوب کہا ہے ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم ۔۔۔ شہاں بے کمر وخسرواں بے کلہ اند

(گدایانِ عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ بے تاج وتخت کے بادشاہ ہیں ۱۲)

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ۔۔۔ کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستاروں پر حکم کرتا ہوں ۱۲)

جب ہی تو یہ بات ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ دوجہان کے بادشاہ ہیں فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ[ع] اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ

ع اے اللہ زندہ رکھ مجھ کو مسکین اور موت دے مجھ کو مسکنت کی حالت میں اور محشور فرما مجھ کو مساکین کے گروہ میں ۱۲

دیکھئے یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا حشر میرے ساتھ ہو بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کے ساتھ ہو یعنی وہ لوگ تو اپنی جگہ رہیں میں اُن کے ساتھ ہو جاؤں جہاں مسکین ہوں وہیں میں ہوں ورنہ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ جہاں میں ہوں وہاں یہ آجاویں۔ اور یہ یہاں سے اندازہ ہو گا کہ مسکنت کیا چیز ہے۔ صاحبو وہ اتنی بڑی چیز ہے کہ ایک ایسے بڑے سخت مرض کا علاج بھی ہے کہ وہ تمام مفاسد کی جڑ ہے اس سے تمدن اور دین دونوں بگڑتے ہیں اور وہ مرض کبر اور نخوت ہے کہ جتنی متعدی خرابیاں ہوتی ہیں۔ لڑائی غیبت حسد یہ سب تکبر کی بدولت ہوتے ہیں ہمارے مرشد حاجی صاحبؒ نے ایک مرتبہ ایک ایسی عجیب اور گہری بات فرمائی کہ جو آجتک کسی رفارمر کی زبان پر بھی نہیں آئی۔ فرمانے لگے کہ لوگ اِتفاق کی کوشش کرتے ہیں اور اُس کی جڑ کی خبر نہیں ہے۔ اتفاق کی جڑ ہے تواضع۔ ہر شخص اپنے
11 اندر تواضع پیدا کرے کیونکہ نا اتفاقی ہمیشہ کبر سے ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ہر شخص اپنے کو دوسرے سے بڑا سمجھے گا تو بہت سی باتوں میں اپنے حقوق کی اضاعت بھی سمجھے گا ہر بات میں اپنے کو دوسرے پر بڑھانا چاہے گا اور اس سے نا اتفاقی پیدا ہو گی۔ اور جب ہر شخص میں تواضع ہو گی تو ہر شخص اپنے اوپر دوسرے کے حقوق سمجھے گا اور اُن میں اپنے کو قاصر پاوے گا تو سب کے سب ایک دوسرے کے سامنے لچیں گے اور یہی اتفاق ہے۔ ہمارے عقلاء اتفاق کی کوشش کر رہے ہیں مگر ساتھ ساتھ کبر و نخوت کا بھی اہتمام کر کے اُسی اتفاق کی جڑ کاٹ رہے ہیں بعینہ وہی حالت ہے ؎

یکے بر سرِ شاخ و بن مے برید خداوند بستاں نگہ کرد و دید

(ایک آدمی ٹہنی پر ہے اور جڑ کاٹ رہا ہے مالک باغ نے نظر کی اور دیکھا)

تو ہم شاخِ اِتفاق پر بیٹھے ہیں لیکن کبر کے تبر سے اُس کی جڑ کاٹ رہے ہیں

مسکنت کی فضیلت

اتفاق کی جڑ تواضع ہے

آج خودداری تکبر کی تعلیم کی جاتی ہے اور اُس کا نام رکھا گیا ہے اولوالعزمی صاحبو! اولوالعزمی یہ ہے کہ سلطنت پر لات ماردی اور حالت یہ ہو کہ لنگے زیر و لنگے بالا (ایک لنگی باندھے ہوئے اور ایک لنگی اوڑھے) اور اولوالعزمی کا حاصل یہ ہے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ؎ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
اُمید و ہراسش نباشد زکس ؎ ہمیں است بنیاد توحید و بس

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ زر بکھیریں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں اُمید و خوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے ۱۲)

اور وہ حالت ہو ؎

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند ؎ فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

(جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہوگئی اس کو جان اور فرزند و اسباب کی پروا نہیں ۱۲)

۱۲ صاحبو! اولوالعزمی وہ ہے جو صحابہ نے کر کے دکھلا دی کہ ماہان ارمنی کے دربار میں جب حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سو آدمیوں کو ہمراہ لیکر تشریف لے گئے تھے۔ ماہان ارمنی نے حریر کا فرش بچھایا ہوا تھا۔ حضرت خالدؓ نے اس کو اُٹھا دیا۔ ماہان نے کہا کہ اے خالدؓ میں نے تمہاری عزت کے لئے یہ فرش بچھایا تھا۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا فرش تیرے فرش سے بہت اچھا ہے اب غور کیجئے کہ حضرت خالد صرف سو آدمیوں کے ساتھ ہیں اور ماہان ارمنی کے پاس دو لاکھ فوج ہے۔ لیکن حضرت خالدؓ کیا گفتگو کرتے ہیں۔ ماہان ارمنی نے کہا کہ اے خالدؓ میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو بھائی بنا لوں حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ بہتر ہے کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں) ماہان ارمنی نے کہا کہ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا تو اس حالت میں ہم نے حقیقی بھائیوں کو بھی چھوڑ دیا تجھ کو

کیا بھائی بناتے ۔ پھر حضرت خالدؓ نے فرمایا اے ماہان تو مسلمان ہوجا ورنہ وہ دن قریب نظر آرہا ہے کہ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے اس طرح حاضر کیا جاویگا کہ تیرے گلے میں رسی ہوگی اور تجھ کو ایک شخص گھسیٹتا ہوگا ۔ اس پر ماہان ارمنی آگ ہوگیا غضبناک ہوکر کہا کہ پکڑو ان لوگوں کو حضرت خالدؓ فوراً کھڑے ہوگئے اور ہمراہیوں سے خطاب کرکے فرمایا کہ خبردار اب ایک دوسرے کو مت دیکھنا اب انشاء اللہ تعالیٰ حوض کوثر پر ملاقات ہوگی اور فوراً میان سے تلوار کھینچ لی ۔ یہ ہیئت دیکھ کر ماہان مرعوب ہوگیا اور کہنے لگا کہ میں تو ہنسی کرتا تھا ۔ جب حضرت خالدؓ درست ہوکر بیٹھے یہ ہے اولوالعزمی نہ یہ کہ غایت کبر و نخوت و تنفر عن المساکین (مسکین سے نفرت) سے جنگل میں جا بسے کہ نہ مسلمان اُن کو دیکھ سکیں نہ یہ مسلمانوں کو دیکھ سکیں نیز جس کا نام آج اولوالعزمی رکھا گیا ہے وہ وہ ہے جس کی
بابت قرآن مجید میں ارشاد ہے لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۱۳
(نہیں ارادہ کرتے ہیں بڑائی کا زمین میں اور نہ فساد کا ۱۲) تو اولوالعزمی صحابہؓ نے کرکے دکھلائی ہے اور وہ توحید سے ہوتی ہے ۔ آجکل تکبر کا نام اولوالعزمی رکھا گیا ہے اور اُس کی تعلیم دیجاتی ہے ۔ صاحبو! کیسے افسوس اور رنج کی بات ہے آج بچوں کو وہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اُن میں بچپن ہی سے اینٹھ مروڑ پیدا ہوجاوے ۔ مجھ سے ایک رئیس نے پوچھا کہ اگر بچہ نوکر کی خطا کرے تو کیا کرنا چاہیے یعنی اس حرکت پر اُس کو کسی قسم کی تنبیہ کرنی چاہیے یا نہیں ۔ میں نے کہا اُس بچہ کو کہنا چاہیے کہ اُس نوکر سے عذر کرے ۔ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی ذلت کی بات ہے ۔ اس سے اولوالعزمی میں ضعف ہوتا ہے ۔ پھر جب میں نے اس اولوالعزمی کی حقیقت سمجھائی کہ یہ بدخلقی اور تکبر ہے تب اُن کی سمجھ میں آگیا ۔ صاحبو واللہ لوگوں کو پرورش اور تربیت نہیں آتی ۔ تربیت یہ تھی کہ جو پہلے اتالیق کرتے تھے ۔ ایک شاہزادہ کی

حکایت ہے کہ وہ ایک معلّم کے پاس پڑھتا تھا۔ ایک روز بادشاہ جو مکتب میں گئے تو دیکھا کہ نہ شاہزادہ ہے اور نہ معلّم ہے۔ دوسرے لڑکوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ معلّم صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر گئے ہیں اور شاہزادہ اُن کے پیچھے ساتھ گیا ہے۔ بادشاہ کو یہ حرکت ناگوار ہوئی اور جس طرف اُن کا جانا سُنا تھا خود بھی اُسی طرف کو چلا۔ آخر ایک جگہ ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے دیکھا کہ میاں جی گھوڑے پر سوار ہیں اور شاہزادہ گھوڑے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ بادشاہ نے معلّم سے پوچھا کہ آخر اس کا کیا سبب ہے۔ کہنے لگے کہ جناب آپ کو معلوم ہے کہ یہ شاہزادہ ہے اور خدا تعالیٰ نے کیا تو یہ تخت سلطنت پر بھی متمکن ہوگا اُس وقت ایسے بھی مواقع ہوں گے کہ یہ سواری پر ہو اور اِس کے ساتھ اِس کے حشم خدم بھی ہوں۔ پس میں ابھی وقت سے اِس کو گھوڑے کے ساتھ بھگا کر یہ بتلا رہا ہوں کہ خدام کو پیادہ
۱۴ دوڑنے میں ایسی تکلیف ہوا کرتی ہے تاکہ یہ اپنی تکلیف کو یاد کر کے اپنے حشم خدم پر رحم کرے اور وسعت سے زیادہ تکلیف اُن کو نہ دے۔ یہ سُنکر بادشاہ بہت خوش ہوا اور کہا جزاک اللہ (اللہ تعالیٰ تجھ کو جزا دے) تم نے بہت بڑی اصلاح کی۔ تو یہ ہے تربیت کا طریق۔ اب تکبّر کا ایسا چرچا ہوا ہے کہ خدا تعالےٰ کی پناہ اور یہی ہماری تباہی کا سبب ہے اور اس کا علاج ہی مسکنت جو بات دس برس کے مجاہدہ میں بہ دِقّت حاصل ہو سکتی ہے وہ مسکنت سے ایک دن میں حاصل ہو جاتی ہے اور یہ مسکنت کی وہ منفعت ہے جو میری سمجھ میں آئی ورنہ اصل یہ ہے کہ مسکنت فی ذاتہا بھی محبوب عند اللہ ہے۔ پیا جس کا چاہے وہی سہاگن ہوئے۔ شاید اِس تقریر سے کسی کے دل میں یہ بات پیدا ہو کہ ہم بھی گھر لٹا دیں گے اور مساکین میں داخل ہو جاویں گے۔ صاحبو ہرگز ایسا مناسب نہیں۔ مساکین میں داخل ہونے کا یہ طریق ہے کہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی اس شخص کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے)

تکبر کا علاج

آیۃ صدور و اصبر نفسک سے صحبت نیک کی فضیلت

تم اُن سے محبت رکھو انشاء اللہ تعالےٰ انھیں کے درجہ پر پہونچ جاؤ گے۔ اسی لئے
فرماتے ہیں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم یَا عَائِشَۃُ قَرِّبِی الْمَسَاکِیْنَ وَجَالِسِیْہِمْ
(نزدیک ہو تو مساکین کے اور ان کے پاس بیٹھ) لفظ قربی (نزدیک ہو تم) میں تو اُن کو آنے دینے کے
لئے فرمایا اور لفظ جالسیہم (بیٹھ تو ان کے پاس) میں اس سے بڑھ کر یہ بتلا دیا کہ
اگر وہ خود نہ آویں تو جا کر بیٹھو۔ دیکھئے کتنی بڑی عزت ہے مساکین کی یہ ہی
مسکنت ہے جس سے خود حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد ہوا کہ اِصْبِرْ
نَفْسَکَ الخ (جمائے رکھئے اپنے نفس کو) یہ بیان تھا ترجمہ آیت کا۔ اور آیت کے
ترجمہ سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مقصود میرا کیا بیان کرنا ہے مگر میں تصریحاً
بھی کہے دیتا ہوں سو مدلول لغوی آیت کا تو یہ ہے جو کہ میں نے بیان کیا مگر
اس کی ایک غایت ہے اُس غایت سے میرا مقصود اچھی طرح سمجھ میں آجاویگا
میں نے سوچا تھا کہ کوئی صریح آیت سمجھ میں آجاوے مگر جلدی میں سمجھ میں
نہیں آئی۔ لیکن خیر اب سمجھئے کہ غایت اِس اِصْبِرْ سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۵
رعایت نفع صحابہ کی کیونکہ دو حال سے خالی نہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم
سے مساکین کو نفع پہونچتا ہے یا نہیں اگر نہیں پہونچتا تو پھر اِس حکم سے کیا
فائدہ ہوتا۔ اور اگر کوئی کہے کہ شاید حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو نفع پہونچتا
ہو اجر تبلیغ کا تو یہ بالکل غلط ہے کہ صرف اِس کو مدار حکم کہا جاوے۔ اس
میں صحابی کی کیا تخصیص ہے یہ تو تبلیغ الی الکفّار (کفار کی تبلیغ) میں بھی مشترک ہے
پس معلوم ہوا کہ اِن مساکین کو آپ سے نفع پہونچنا بڑی غایت ہے اِس
حکم کی یعنی اگر یہ آپ کے پاس بیٹھیں گے تو ان کو نفع ہوگا۔ اِس سے ثابت
ہوا کہ مقبولانِ الٰہی کے پاس بیٹھنے سے نفع ہوتا ہے۔ یہ چھوٹا سا جملہ ہے مگر
میں اس کی تفصیل کروں گا اور یہ ہی میرا مقصود ہے بیان سے اور یہ مسئلہ
سب کے نزدیک مسلّم بھی ہے اور قرآن شریف میں منصوص بھی ہے اِتَّقُوا
اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ (اللہ تعالےٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو) اِس آیت

نیک صحبت کی ضرورت اور اس کو ضروری نہیں سمجھا جاتا

میں تو یہ مصرح ہی ہے اور جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اُس میں گو مصرح
نہیں لیکن حسب تقریر مذکور لازم آگیا۔ پھر یہ کہ اُس کا مسلّم ہونا ہی کافی
ہے لیکن باوجود مسلّم ہونے کے افسوس ہے آپ کے دلوں میں درجہ ضرورت
میں یہ کبھی نہیں آیا اور یہ ہی ضرورت داعی ہوئی اس کے بیان کی۔ یہ تو
عام خیال ہے کہ نیک صحبت نافع ہوتی ہے لیکن اس کا ضروری ہونا سو
عقیدہ کے درجہ میں بھی اِس سے غفلت ہے اور عمل کے اعتبار سے بھی۔
تفصیل اس کی یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے لئے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی فلاح
کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن میں جو دین کا مذاق غالب رکھتے ہیں وہ دین
کے لئے مولوی بناتے ہیں جو دنیا دار ہیں وہ معاش کے لئے تیار کرتے
ہیں۔ غرض ایک نے دین کی فلاح کی کوشش کی اور ایک نے دنیا کی فلاح
کی کوشش کی لیکن اِس فہرست مساعی میں کہیں یہ فکر نہیں جس کا نام
نیک صحبت ہے یعنی بالاستقلال اِس کا اہتمام کسی نے بھی نہیں کیا۔ جیسے ۱۶
اور کاموں کو ضروری سمجھتے ہیں اِس کو کسی نے بھی ضروری نہیں سمجھا۔ مثلاً
ہفتہ بھر میں ایک دن یا مہینہ بھر میں ایک دن یا سال بھر میں ایک مہینہ
کسی نے اِس لئے دیا ہو کہ اِس میں صحبتِ نیک سے مستفید ہوں تو ہمارا یہ
عمل اِس کی شہادت دے رہا ہے کہ ہم نے اِس کو کسی درجہ میں بھی ضروری
نہیں سمجھا۔ دیکھئے سارے کاموں کے لئے وقت مقرر ہیں کھانے کے لئے بھی
آرام کے لئے بھی سیر کے لئے بھی مگر صحبتِ نیک کے ذریعہ سے محض تہذیب
اخلاق کے لئے بھی کسی نے وقت مقرر کیا ہے ؟ اِس کے جواب میں محض
صفر ہے۔ یہ ہے وہ مضمون جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے اس لئے کہ
اس کی طرف سے غفلت عام اور ضرورت اس کی بیحد کہ دنیا کا یا دین کا
کوئی کمال بغیر صحبت کے نہیں ہو سکتا۔ ہاں نام کو جو چاہے ہو جاؤ باقی
واقع میں وہ حال ایسا ہی ہے کہ ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(خواجہ کا گمان ہے کہ اس کو کچھ حاصل ہے خواجہ کو بجز غرور کے کچھ حاصل نہیں۔)

اِس وقت لوگ مطالعہ کتب کو کمال سمجھتے ہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ کوئی کمال بدون ماہر سے حاصل کئے نہیں آسکتا اور ماہر سے حاصل کرنا موقوف ہے صحبت پر۔ اور دنیاوی کمالات کو جانے دیجئے اس کا مجھے تجربہ نہیں نہ مجھے اُس کے متعلق گفتگو کرنے کی ضرورت ہے

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم چو غلام آفتابم ہمہ از آفتاب گویم

(میں نہ شب ہوں نہ شب پرست کہ خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا غلام ہوں محبوب ہی کی باتوں کو کہتا ہوں)

گو مولویوں پر یہ بھی اعتراض ہے کہ دنیا کی اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں بتلاتے مگر میں اِس کا ایک جواب دیا کرتا ہوں کہ یہ اعتراض ایسا ہے کہ جیسے حکیم محمود خاں کے پاس کوئی مدقوق جاوے اور وہ نبض دیکھ کر ایک نسخہ لکھ دیں جب وہ نسخہ لیکر باہر آیا تو دروازہ پر ایک چمار ملا کہنے لگا کہ ۱۷
حکیم صاحب نے کیا بتلایا۔ مریض نے نسخہ دکھلا دیا دیکھ کر کہنے لگا کہ تمہاری جوتی ٹوٹی ہوئی ہے اس کے متعلق بھی کچھ بتلایا۔ مریض نے کہا کوئی نہیں کہنے لگا کہ حکیم محمود خاں بھی دنیا کی ضرورت سے بالکل ہی غافل ہیں۔ صاحبو اِس مشیر کو کیا جواب دیجئے گا بجز اس کے کہ یہ حکیم صاحب کا منصب ہے اور یہ تیرا کام ہے۔ اِسی طرح ہم دق روحانی کا نسخہ بتلاتے ہیں اور دنیاوی مقاصد کو جوتی سینے کے درجہ میں سمجھتے ہیں۔ تو پھر ہم پر ہمارے خلاف منصب کیوں الزام دیا جاتا ہے۔ صاحبو! غضب ہے کہ سنار کے پاس کھرپا لیجاؤ کہ اس کو بنا دے یا قاضی شہر سے چارپائی بنواؤ وہاں اگر حکیم محمود خاں جوتی بنوانے سے منع کریں تو وہ مجرم ہیں۔ لیکن اگر جوتا اِس طرح سے سلوایا جاوے کہ کھال میں کوستالی نکلنے لگے تو حکیم محمود خاں پر فرض ہے کہ منع کریں اور کہیں کہ اِس زخم سے تمہارا سارا بدن سڑ

[illegible]

(علماء دنیا حاصل کرنے کو منع نہیں کرتے)

جاویگا۔ بس اسی طرح اگر مولوی جائز طریقوں سے دنیا کمانے کو منع کریں تو بیشک مولویوں پر الزام ہے لیکن اگر دین میں نشالی نکالنے لگے گی تو وہ ضرور منع کریں گے اور یہ منع کرنا واقع میں ترقی سے روکنا نہیں ہے۔ صاحبو! اگر ایک شخص جیب میں اشرفیاں بھرے اور جب جگہ رہ جاوے تو اوپر سے کوڑیاں بھرنے لگے اور کوڑیوں کو ٹھونس ٹھونس کر بھرنے کے بوجھ سے جیب پھٹنے لگے کہ اشرفیاں نکلنے لگیں اور یہ حالت دیکھ کر کوئی شخص اس کو اس طرح کوڑیاں بھرنے سے منع کرے تو اس کو مانع ترقی کہا جاوے گا ہرگز نہیں۔ وہ کوڑیاں کس کام کی جو اشرفیاں کھو کر حاصل کی گئیں ہوں۔ پس جب آپ کا دین کہ اشرفیوں سے زیادہ قیمتی ہے برباد ہو رہا ہے تو دنیا کی چند کوڑیاں جمع کرکے آپ کو کیا فلاح ہوگی تو اس حالت میں مولوی ضرور منع کریں گے اور اگر یہ امر آپ کی سمجھ میں آجاویگا تو آپ بھی کہنے لگیں گے ؎ ۱۸

مبادا دل آں فرومایہ شاد کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(وہ کمینہ خوش دل نہ رہے جس نے دنیا کی وجہ سے دین کو خراب کیا۔)

ہم کو گو یہ بھی جائز ہے کہ ہم آپ کو آپ کے دنیاوی نقصانات سے بھی بچاویں لیکن ہم اس کو اپنا منصب نہیں سمجھتے اس لئے دوسرے مشاغل دینیہ کے غلبہ سے قصداً ایسا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ؎

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

(جو کچھ ہم نے پڑھا سب کو فراموش کردیا بجز محبوب حقیقی کی باتوں کے کہ ان ہی کا تکرار کرتے ہیں۔)

دیکھئے انگریزوں کا فتویٰ ہے کہ ہر کام کے لئے ایک جماعت رہنی چاہیئے تو اس فتوے کے مطابق مولویوں کو صرف دین کے کام کے لئے رکھو۔ مگر آجکل عجب اندھیر ہے کہ سارے کام ایک ہی جماعت کے ذمے سمجھے جاتے ہیں اور سارے کاموں کے الزام مولویوں ہی پر ہیں۔ اور اگر مولوی کچھ

کرتے بھی ہیں اور روپیہ کی نسبت اِن حضرات سے کہتے ہیں کہ روپیہ ہمارے
پاس نہیں وہ جمع کیجئے تو جواب ملتا ہے کہ تم ہی چندہ بھی کر لو۔ مجھے ایسے
لوگوں کی حالت پر اکبر کے زمانہ کا ایک قصہ یاد آیا کرتا ہے کہ اکبر نے
کبھی خوشی میں اپنے بھانڈ کو ایک ہاتھی دیدیا تھا وہ کھلاوے کہاں سے
آخر اُس نے ایک ڈھول اُس کے گلے میں ڈال کر چھوڑ دیا۔ اکبر شاہ نے
اتفاقاً اس ہیئت میں دیکھا۔ پوچھا۔ اُس نے کہا حضور جب مجھ سے کھلایا
نہ گیا میں نے ڈھول گلے میں ڈال کر چھوڑ دیا کہ بھائی مانگ اور کھا۔ تو
گویا مولوی اکبر کے بھانڈ کے ہاتھی ہیں۔ کیوں صاحب مولویوں کو کیا
ضرورت پڑی ہے کہ روپیہ مانگیں۔ ہمارا کام زبان اور ہاتھ کا ہے۔
باقی روپیہ دینا یا جمع کرنا یہ آپ کا کام ہے۔ بیان اِس کا تھا کہ دنیاوی
اصلاحات میں دخل دینا مولویوں کا کام نہیں ہے بلکہ اُن کا حسن تو یہ
ہے کہ اس سے یہ واقف بھی نہ ہوں۔ بچہ کا کمال یہ ہے کہ وہ بالکل بھولا ۱۹
ہو۔ دوسرے ایک بڑی خرابی اِن کے دنیا سے باخبر ہونے میں یہ بھی ہے کہ
اگر ان کو دنیا کا کام آوے تو نفس ان کے بھی ساتھ ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر یہ
چند روز میں شکر فروش اور چاول فروش ہوں گے۔ دیکھو اگر ڈرائیور کو
سیکنڈ کی سواری ملے تو وہ کبھی انجن میں نہ بیٹھے گا تو مولوی دُنیا سے
ناواقف ہی رہنے چاہئیں۔ اور صاحبو غضب ہے کہ ایک تو ہم تکلیف
کے انجن میں بیٹھ کر آپ کی راحت رسانی کے لئے اپنا بدن اور کپڑے سیاہ
کریں اور پھر یہ اعتراض ہم پر ہو کہ تم گارڈ کیوں نہیں بنتے۔ اِس لئے
میں دنیا کی اِصلاح کا ذکر ہی نہیں ہوتا گو وہ بھی موقوف صحبت ہی پر
ہے مگر میں صرف دینی اِصلاح کا ذکر کرتا ہوں کہ دین کی اِصلاح محض
کتابیں دیکھ کر نہیں ہو سکتی۔ یہ صحبت ہی سے ہو سکتی ہے مطالعہ کتب سے
اِس کی کوشش کرنا ایسا ہے جیسے طب کی کتابیں دیکھ کر کوئی شخص

بیوی کو مسہل دینے لگے اور حکیم محمود سے نہ پوچھے محض اِس لئے کہ قرابادین اعظم ہمارے پاس ہے جس کسی سے بھی ایسا کہنے کو کہو وہ یہی کہے گا کہ صاحب ہر فن کے کچھ دقائق ہوتے ہیں جن کو صاحبِ فن ہی سمجھ سکتا ہے میں بدون حکیم کے مسہل دینے کی جرات نہیں کرتا۔ پس اِسی طرح اِس فن دین میں بھی کچھ غوامض ہیں لہذا کتابوں پر اکتفا کرنا سخت غلطی ہے ہرگز کتابوں پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ صحبت اختیار کیجئے چونکہ وقت کم رہ گیا ہے اِس لئے مختصر کر کے ختم کرتا ہوں (سامعین نے اِلتجا کی کہ مختصر نہ کیا جاوے اس کے بعد پھر فرمایا) غرض صحبتِ نیک کی سخت ضرورت ہے مگر اس کی طرف لوگوں کو مطلق توجہ نہیں۔ حالانکہ بدون صحبت معمولی کام کا بھی سلیقہ نہیں ہوتا۔ دیکھئے رسالہ خوان نعمت کو دیکھ کر کبھی گلگلے نہیں پکا سکتا تو جب حرف دنیویہ بھی بدون صحبت کے حاصل نہیں ہوسکتے تو فنون شریفہ تو کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک وکیل صاحب میرے ہاں مہمان ہوئے میں نے اُن سے ترجمہ قانون لیکر دیکھا اور اپنے نزدیک اس کو سمجھا پھر میں نے وکیل صاحب سے پوچھا کہ آیا اس کے معنی یہی ہیں جو میں نے سمجھے ہیں کہنے لگے کہ نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں اور ان کے بیان کرنے کے بعد وہی معنے صحیح معلوم ہوئے جو انھوں نے بتلائے تھے۔ تو دیکھئے اُردو مادری زبان ہے مگر چونکہ اِس فن سے واقفیت نہ تھی اِس لئے صحیح معنی سمجھ میں نہ آئے تو اگر کسی دوسری زبان کی کتاب ہو یا اس سے ترجمہ کر کے آئی ہو تو چونکہ غیر زبان کے دقائق پر تو بدون مہارت اِطلاع علیٰ وجہ الکمال نہیں ہوتی۔ اور ترجمہ میں وہ خصوصیات محفوظ نہیں رہتیں جو اصل زبان کے الفاظ میں تھیں۔ اِس لئے محض کتاب دیکھ کر کبھی کوئی شخص اصل بات کی تہ کو نہیں پہونچ سکتا۔ دیکھو اگر ذوق کا ایک شعر لیکر فارسی میں اس کا ترجمہ کر دو تو ہرگز وہ لطف نہ آویگا۔ پس یہی حالت

صحبت نیک کی ضرورت اور بدون صحبت کوئی فن حاصل نہیں ہوتا ۲

قرآن و حدیث کی ہے۔ تو اوّل زبان سیکھو پھر ماہر فن کے متعلق اہلِ فن
سے اس کے احکام سیکھو تب وہ فن حاصل ہوگا۔ ورنہ قرآن بدون مفسّر
کے اور حدیث بدون محدّث کے ہرگز حل نہیں ہوسکتی اور علماء کو اس کا
اندازہ ہوگا کہ باوجود اس کے کہ وہ دن رات اس میں رہتے ہیں مگر پھر
بھی اُن کو گاہے پوچھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے بعض اوقات اپنے
اساتذہ کے سامنے اُن کے مطلب بیان فرمانے پر اس کے خلاف اس مقام
کی تقریر کی اور انھوں نے اُس کو قبول کیا۔ تو جب شاغلین کی یہ حالت
ہے تو جن لوگوں کو یہ مشغلہ ہی نہیں وہ محض اپنے فہم پر کیسے مطمئن ہوسکتے
ہیں۔ بعض دفعہ ایک مسئلہ کے ساتھ دوسری قیود جو اُس مقام پر مذکور
نہیں ملحوظ ہوتی ہیں جس میں نہایت ماہر کی ضرورت ہوتی ہے اسی لئے
میں نے ایک طالب علم شافعی المذہب کی درخواست پر اُس کو فقہ شافعی
پڑھانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کبھی ایک مسئلہ میں ایک ۲۱
قید معتبر ہوتی ہے لیکن وہ اُس خاص جگہ مذکور نہیں ہوتی بلکہ دوسری
جگہ مذکور ہوتی ہے تو ایسے مقام پر بوجہ عدم استحضار در عدم مہارت مجھے
فروگذاشت ہوتی۔ میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ لفظ اِخْتَارِیْ
(اختیار کر تو) کنایات میں سے ہے اس کو باب الکنایات میں دیکھ کر بعض لوگوں
کو یہ لغزش ہوئی کہ وہ یہ سمجھے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو بہ نیت طلاق یہ
لفظ کہدے تو طلاق ہوجاوے گی۔ حالانکہ یہ مسئلہ ایک تو باب تفویض
طلاق سے متعلق ہے اور دوسرے باب کنایات سے تو باب کنایات میں
تو یہ لکھا ہے کہ یہ کنایہ ہے اور باب تفویض میں یہ لکھا ہے کہ وقوع کی شرط
یہ ہے کہ عورت اِخْتَرْتُ نَفْسِیْ (میں اپنے نفس کو اختیار کیا) بھی کہے اور اگر
عورت کچھ نہ کہے تو مرد کے صرف اِخْتَارِیْ (اختیار کر) کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی
اسی لئے میں نے ان شافعی المذہب سے انکار کر دیا۔ اور مولوی طیّب صاحب

عرب شافعی کا نام بتلا دیا تھا کیونکہ دیانت کی بات یہی تھی۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں کہ جب تک کامل شیخ اس کے غوامض پر مطلع نہ کرے اس وقت تک وہ حل نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے صحبت کی حاجت ہوئی سو ایک ضرورت تو صحبت کی اصلاح علمی کے لئے ہے اور دوسری اصلاح دین کی عمل ہے جس کے لئے ضرورت ہے تربیت کی اور وہ بھی موقوف ہے صحبت پر اور عمل کا موقوف ہونا تربیت پر اور محض علم کا اس کے لئے کافی نہ ہونا اس سے ظاہر ہے کہ عمل میں علماء بھی کوتاہیاں کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسوں کی یہ حالت ہے کہ ؎

(دو قسم کی اصلاح علمی و عملی)

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند ۔ چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس ۔ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

(واعظ لوگ محراب و منبر پر جلوہ فرما ہوتے ہیں جب خلوت میں جاتے ہیں دوسرا کام کرتے ہیں۔ ایک اشکال مجھ کو پیش آیا ہے دانشمند مجلس سے دریافت کر توبہ کا حکم کرنے والے خود توبہ نہیں کرتے ۱۲)

۲۲ آخر کیا وجہ ہے کہ غیبت کی برائی جانتے ہیں مگر مبتلا ہیں۔ جانتے ہیں کہ کینہ رکھنا برا ہے مگر سینکڑوں اہلِ علم اس میں مبتلا ہیں سو وجہ یہی ہے کہ تربیت نہیں ہے اور اس کی وجہ سے عمل کمزور ہے تو عمل کے لئے فقط علم اور ارادہ کافی نہیں تربیت کی بھی حاجت ہے لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ عمل ارادی چیز ہے تو اس کے لئے ارادہ کافی ہوگا مگر اس میں غلطی یہ ہوئی کہ خود ارادہ کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہے اس پر نظر نہیں کی گئی یا یوں کہئے کہ ارادہ جب ہی کافی ہے کہ مواقع موثر نہ ہوں اور بدون تربیت موانع ہوتے ہیں مثلاً منازعات نفس بھی موانع ہیں کہ آپ سردی میں اٹھ کر نماز پڑھنا چاہتے ہیں لیکن نفس آپ کو روکتا ہے تو اس کے لئے ضرورت ہے تربیت کی اس سے منازعات ضعیف الاثر ہو جاتے ہیں گو بالکل ان کے مواد کا استیصال نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو اس میں یہ دھوکہ

(منازعات نفس کا علاج بدون تربیت نہیں ہوتا)

ہوجاتا ہے کہ مجاہدات سے منازعات بالکل باطل ہوجاتے ہیں لیکن یہ
غلط ہے ہاں ضعیف ہوجاتے ہیں ؎

نفس اژدرہاست اوکے مردہ است   از غمِ بے آلتی افسردہ است

(نفس اژدہا ہے وہ نہیں مرا ہاں غمِ بے آلتی سے افسردہ ہے)

مولاناؒ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک اژدہا سردی میں ٹھٹھرا پڑا تھا اُس کو
ایک مارگیر نے مُردہ سمجھ کر رسوں میں جکڑ لیا اور گھسیٹ کر شہر میں لایا
لوگ جمع ہوگئے وہ شیخی بگھار رہا تھا کہ میں نے اِس طرح اس کو گرفتار
کیا ہے اور اس طرح اس کو مارا ہے لوگ بھی تعجب کر رہے تھے اتنے
میں دھوپ جو نکلی وہ اس کی حرارت سے جنبش کرنے لگا معلوم ہوا کہ
زندہ ہے مخلوق بھاگی اور ساری شیخی اس کی کرکری ہوگئی۔ اس کو
ذکر کرکے مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

نفس اژدرہاست اوکے مردہ است   از غمِ بے آلتی افسردہ است ۱۴،

یعنی نفس تو ایک اژدر ہے وہ مرا نہیں ہاں غمِ بے آلتی سے افسردہ ہوگیا
ہے تو افسردگی کے اسباب کو نہ چھوڑنا چاہئے اور وہ مجاہدات واشغال
اور تدابیر خاصہ ہیں اِس لئے تعلیم اصلاح کے ساتھ ان تدابیر کی تعلیم بھی ضروری
کرنا چاہئے۔ اکثر ہمارے مُصلحین اوامر و نواہی اور وعدہ وعید کو ہمیشہ ذکر
کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ تدابیر نہیں بتلاتے حالانکہ اس کی سخت ضرورت
ہے کیونکہ اس میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جھوٹ
نہ بولیں مگر نفس کہتا ہے کہ اب فلاں مصلحت ہے بول ہی لینا چاہئے
اور ہم نفس سے مجبور ہوجاتے ہیں۔ دیکھو اگر بدن میں صفرا بہت
بڑھ جاوے تو نرے مُسَکّنات (تسکین دینے والی دوائیں) سے تسکین نہیں ہوتی بلکہ
مزیل (زائل کرنیوالی ادویہ) کی ضرورت ہوگی۔ تو محض نصیحت بمنزلہ مسکّن ہے اور
تدابیر بمنزلہ مزیل۔ غرض ان منازعات کے لئے تربیت کی حاجت ہوتی

حاصل تقریر یہ ہوا کہ دو چیزوں کی ضرورت ثابت ہوئی۔ ایک علم دوسرا عمل جو موقوف ہے تربیت پر۔ اوّل کے لئے خاص قسم کے شیوخ کی ضرورت ہے اور دوسرے کے لئے خاص قسم کے شیوخ کی ضرورت ہے۔ پس علم و عمل دونوں موقوف ہوئے صحبت پر مگر ہم لوگ اس سے غافل ہیں۔ چونکہ میں نے کہا تھا جس کی ضرورت ہو اور اُس سے غفلت ہو اُس کے بتلانے کی سخت ضرورت ہوتی ہے اِسی لئے میں اس کو بتلانے کو عرض کر رہا ہوں کہ صحبت وہ چیز ہے کہ علم اور عمل کا کمال دونوں اس پر موقوف اور علم و عمل دونوں ضروری اور موقوف علیہ ضروری کا ضروری پس کس قدر ضروری ٹھیری۔

اب یہ بات کہ علم اور عمل دونوں ضروری ہیں سو اس کا مختصر بیان یہ ہی کہ جو خرابی دنیوی یا اُخروی واقع ہوتی ہے یا اخلال علم سے ہوتی ہے یا اخلال عمل سے۔ اُخروی خرابی کا ترتب تو ظاہر ہے اور اس کے واسطے نصوص وعید دلیل کافی ہیں اور دُنیوی خرابی کا ترتب اس طرح ہے کہ جس کا جی چاہے ۲۴
دیکھ لے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر عمل کر کے ہر پریشانی سے نجات ہوتی ہے اور اسی طرح مخالفت کرنے سے پریشانی کا ہجوم ہوتا ہے۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ عمل کرنے سے ہر تعب سے نجات ہوتی ہے مگر پریشانی سے ضرور نجات ہوتی ہے اور اصل کلفت یہی ہے اور اگر پریشانی نہو تو خود تعب و مشقت میں بالذات کوئی کلفت نہیں۔ اِسی پر حکایت یاد آئی کہ مولوی غلام مصطفےٰ جو میرے ایک دوست ہیں وہ ایک رئیس کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے اور نماز بھی پانچوں وقت پڑھواتے تو ان لڑکوں کی ماں کوستی تھی کہ اِس مولوی نے میرے بچوں کو زکام میں مبتلا کر دیا صبح کو وضو کراتا ہے۔ سو صاحب ایسی مشقت تو دین میں ہوتی ہی مولانا فضل الرحمٰن صاحب علیہ الرحمۃ سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ ایک عورت کا شوہر گم ہوگیا ہے۔ مولوی صاحب رح نے فرمایا کہ مرد کی تو سے

دونوں اصلاح کیلئے علم و عمل دونوں ضروری ہیں

علم و عمل کیلئے ضرورت صحبت

علم و عمل کی کمی سے دنیوی خرابی

حرج کی حقیقت

دینداروں کی پریشانی کا جواب

برس کی عمر تک انتظار کرو۔ کہنے لگا کہ جناب اِس میں تو بڑا حرج ہے اور دین میں حرج ہے نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھائی اگر یہ حرج ہے تو جہاد میں بھی حرج ہے سو حرج کے یہ معنی نہیں۔ حَرَج کہتے ہیں پریشانی اور اُلجھن کو سو اسلام میں یہ نہیں ہاں تعب و مشقت ہے تو کیا دنیا کے کاموں میں تعب اور مشقت نہیں ہے واللہ جو شخص شریعت پر عمل کریگا تمام پریشانیوں سے نجات میں رہے گا۔ اِس پر شاید کوئی یہ کہے کہ ہم بہت دینداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر تکلیف میں رہتے ہیں مثلاً اُن کی آمدنی کم ہوتی ہے اور خرچ تنگی سے ہوتا ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ تکلیف جسم پر ہے روح پر نہیں اور پریشانی ہوتی ہے روح کی تکلیف ہے پس اس کی مثال دلدادگان شریعت کے اعتبار سے ایسی ہے جیسے کسی عاشق سے کوئی مدت کا بچھڑا ہوا محبوب ملے اور دور ہی سے دیکھ کر

۲۵ یہ محب اس کو سلام کرے اور اُس کے گلے سے لگا لینے کا متمنّی ہو اور اس کی عین تمنا کے وقت وہ محبوب دوڑ کر اُس کو گلے سے لگا لے اور اِس قدر زور سے دباوے کہ اُس کی ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں۔ اب میں اہلِ وجدان سے پوچھتا ہوں کہ اِس دبانے سے عاشق کو کچھ تکلیف ہوگی یا نہیں۔ یقیناً تکلیف ہوگی۔ لیکن یہ ایسی تکلیف ہے کہ ہزاروں راحتیں اس تکلیف پر قربان ہیں۔ اگر عین اسی تکلیف کی حالت میں محبوب کہے کہ اگر تجھ کو کچھ تکلیف ہو تو چھوڑ دوں اور جو تیرا رقیب سامنے موجود ہے اس کو اسی طرح دبا لوں تو وہ کیا جواب دیگا۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب دیگا کہ ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔ سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں)

اور یہ کہے گا کہ ؎

اسیرت نخواہد رہائی ز بند ۔۔۔ شکارت نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اس کا شکار جال سے رہائی نہیں ڈھونڈتا ۔۱۲)

غرض اگر عشق و محبت ہے تو اس تکلیف کی اُس کو ذرا پرواہ نہ ہوگی بلکہ اس میں ایک گونہ لذت ہوگی ۔ یہ تجربہ کی بات ہے ۔ آپ اہل اللہ کی حالت کو مشاہدہ کر لیجئے کہ اُن کو اِس قلتِ مال و تنگیٔ خرچ سے ذرا روحانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ جس طرح آپ کو ان کی ناداری پر رحم آتا ہے اُنکو آپ کی مالداری پر رحم آتا ہے ۔ حضرت شبلی صاحب رحؒ کسی متنعم کو دیکھتے تو فرماتے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا ط (خدا تعالےٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اس چیز سے عافیت میں رکھا جس میں تجھ کو مبتلا کیا ہے اور مجھ کو اپنی مخلوق میں سے بہتوں پر فضیلت دی) تو آپ اہل اللہ پر اُن کی ظاہری تکلیف کو دیکھ کر رحم کرتے ہیں مگر اُن کو اپنے اوپر رحم نہیں آتا اِس واسطے کہ وہ اس کو پریشانی ہی نہیں سمجھتے اور واقع میں یہ پریشانی نہیں ہے ۔ میں پھر دعویٰ کرتا ہوں کہ متبع سُنّت کو کبھی پریشانی نہیں ہوتی ۔ اُس کی ہر وقت یہ حالت ہوتی ہے ؎ ۲۶

کوے نومیدی مرد کامیدہاست ۔۔۔ سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی اُمیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالےٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ اُمیدیں رکھو)

اور اُمید وہ چیز ہے کہ جن لوگوں نے بی ۔ اے پاس کیا ہے ان سے پوچھئے کہ امتحان کی تیاری میں کیا کیا مشقتیں اُٹھائی ہیں محض اُمید کامیابی پر کسی نے خوب کہا ہے ؎

اگرچہ دُور اُفتادم بایں اُمید خورسندم ۔۔۔ کہ شاید دست من بار دگر جانانِ من گیرد

(اگرچہ میں محبوب سے دور پڑا ہوں اس اُمید میں خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا دوبارہ ہاتھ پکڑلے)

خاص کر جو لوگ ایک دو مرتبہ فیل بھی ہو گئے ہیں اُن پر تو یہ شعر خوب چسپاں ہے اُن کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ روٹی کی پرواہ نہ آرام کا

خیال ہر وقت کتاب ہے اور وہ ہیں تو تعجب کی بات ہے کہ دس روپیہ کی ہوس میں روٹی اور آرام چھوڑنے والا تو عالی ہمت سمجھا جائے اور کوئی اس کو مصیبت زدہ نہ سمجھے اور خدا تعالےٰ کا طالب اگر تنعم چھوڑ دے تو وہ پریشانی میں مبتلا سمجھا جاوے غرض وہ دعویٰ ثابت رہا کہ ان لوگوں کو پریشانی نہیں ہوتی (یہاں تک کرنے کے بعد نماز عصر کے لئے سب مجمع اٹھا۔ بعد نماز عصر پھر بیان شروع ہوا تو فرمایا کہ) میں نے تقریر کو اس مسئلہ پر چھوڑا تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنیوالا ہر قسم کی پریشانی سے محفوظ رہتا ہے اور اس پر جو شبہ ہوا تھا اُس کو بھی زائل کر دیا تھا۔ اب اگر اس کی وجہ بھی سمجھ لی جاوے تو بہتر ہی سُو اس کی ایک وجہ تو عقلی ہے اور ایک وجہ عشقی ہے۔ عقلی وجہ تو یہ ہی کہ اس تعلیم میں ہر مفسدہ کی اصلاح ہے اور اس کو اہل انصاف نے گو وہ دوسری قوم کے ہوں تسلیم کیا ہے اور اگر کسی نے تعصب سے کام لے کر ۲۷
نہیں مانا ہے تو دوسروں نے اس پر رد کیا ہے۔ دوسری وجہ ایک عشقی ہے کہ وہ دیوانوں کے سمجھنے کی ہے (اور اگرچہ واقع میں یہ درجہ بھی عقلی ہی مگر چونکہ اُس کو عقلاء نے کم سنا ہے اس لئے اس کو عقلی نہیں کہا) اور وہ یہ ہے کہ عقلی قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی صاحب اقتدار کا مطیع ہوتا ہے وہ اس کو پریشانی سے بچاتا ہے تو خدا تعالےٰ سے زیادہ کون صاحب اقتدار ہوگا۔ پس حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے سے چونکہ خدا تعالےٰ کی اطاعت کرتے ہیں وہ اُن کو ہر قسم کی پریشانی سے بچاویں گے۔ ہاں اگر کوئی ایسی پریشانی ہوتی کہ وہ خدا تعالےٰ کے اختیار سے خارج ہوتی تو دوسری بات تھی مگر ساری دنیا کا مسلم مسئلہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے اختیار سے کوئی چیز خارج نہیں البتہ اگر کوئی امر بظاہر پریشانی کا ہو لیکن وہ واقع میں پریشانی نہ ہو تو اُس سے حفاظت کا دعویٰ نہیں جیسے بچہ کی حفاظت

ماں باپ کرتے ہیں لیکن اگر کسی عضو میں مادہ فاسد جمع ہو جاتا ہے تو اس کے اخراج کے لئے ماں باپ نشتر بھی دلواتے ہیں بچہ سمجھتا ہے کہ ماں باپ میری بالکل حفاظت نہیں کرتے اور روتا ہے مگر بچہ کی اور مادر مشفق کی رائے میں فرق یہ ہے کہ ؎

طفل مے لرزد زنیش احتجام   مادر مشفق ازاں غم شاد کام

(بچہ نشتر لگانے سے لرزتا ہے مگر شفیق ماں اس سے مطمئن اور خوش ہوتی ہے)

تو یہ تکلیف واقع میں راحت ہے اور ایسی پریشانی سے تو کسی مدّعا کی طلب میں کوئی بچ نہیں سکتا اور نہ بچنے کی کوشش کرتا ہے وہ عشقی وجہ یہ ہے جو واقع میں عقلی بھی ہے اور میں محض عقلی وجہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ قرآن کریم سے بھی اس کو ثابت کرتا ہوں فرماتے ہیں وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (جو شخص اللہ سے ڈرے اللہ تعالےٰ اس کے واسطے کوئی راہ کر دیں گے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیں گے کہ اس کا گمان بھی نہ ہوگا) ۲۸

یہ وعدہ ہے خدا تعالےٰ کا۔ غرض یہ دعویٰ اور عقل ہر دو سے ثابت اور مؤید ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے والا کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اور جیسا اتباع میں اثر ہے نافرمانی میں بھی یہ اثر ہے کہ نافرمان ہر دم پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور گو یہ اس کو راحت سمجھتے ہیں مگر واقع میں وہ پریشانی ہے اس لئے ضرور ہوا کہ میں اوّل پریشانی کی حقیقت بتلا دوں۔ سو سمجھئے کہ پریشانی کس کو کہتے ہیں۔ پریشانی کہتے ہیں تشویش قلب کو نہ کہ مشقت ظاہری کو۔ پس آپ دیکھ لیجئے کہ جو لوگ نافرمانی میں مبتلا ہیں ان کا قلب ہر وقت مکدر اور مظلم رہتا ہے اور جس کا نام جمعیت ہے وہ ان کو ہرگز میسر نہیں ہوتی اور جس قدر بھی تعلقات دنیا زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں پریشانی بڑھتی چلی جاتی ہے اور اگر کسی کو اس کی بھی حس نہ رہے تو

نافرمان ہمیشہ پریشان رہتا ہے

پریشانی کی حقیقت اور نافرمان کے لئے اس کا اثبات

وہ اِمتحان کرے۔ اور وہ اِمتحان یہ ہے کہ یہ شخص ایک ہفتہ بھر کے لئے فارغ ہوکر خلوص کے ساتھ ذکر اللہ کرے جب ایک ہفتہ گذر جائے تو دیکھے کہ قلب میں کوئی نئی کیفیت محسوس ہوتی ہے یا نہیں اِنشاء اللہ تعالیٰ ضرور محسوس ہوگی۔ اب اِس کیفیت کو محفوظ رکھے اور خلوت کو چھوڑ دے اِس کے بعد غفلت کے آثار میں تو خود ہی مبتلا ہوجاویگا پھر اس کے ایک ہفتہ بعد اُس پہلی محفوظ کیفیت اور اس ابتلاء کے بعد کی کیفیت کو موازنہ کرکے دیکھے تو مقابلہ ہوگا کہ واقعی میں اِس وقت پریشانی میں ہوں اور حالت موجودہ حالت محفوظہ کے سامنے ظلمت اور پریشانی نظر آوے گی اور حالت محفوظہ جمعیت اور نورانیت معلوم ہوگی۔ یہ ہے اِس کا اِمتحان اِس سے انشاء اللہ تعالےٰ معلوم ہوجاویگا کہ اہلِ دنیا سب پریشانی میں مبتلا ہیں اور بدون اِمتحان اکثر کو اس کی حِس نہ ہوگی۔ کیونکہ جس نے
۲۹ کبھی جمعیت کو نہیں دیکھا وہ پریشانی کو کیا سمجھے۔ وہ تو پریشانی ہی کو جمعیت سمجھے گا مگر اس کو جمعیت سمجھنا ایسا ہے جیسے ایک سرحدی پیہانی نے اپنی ذلّت کو عزّت سمجھا تھا۔ مشہور ہے ایک صاحب ہندوستان آئے حلوائی کی دوکان پر پہونچے تو حلوا دیکھکر جی للچایا دام وام پاس نہ تھے آپ نے بغیر پوچھے اُس میں سے بہت سا اُٹھا لیا اور کھا گئے۔ حلوائی نے نالش کردی۔ قاضی شہر نے یہ تعزیر تجویز کی کہ اِن کو گدھے پر سوار کرکے لڑکوں کو اس کے پیچھے پیچھے کردو کہ ڈھول بجاتے چلیں اور تمام شہر میں اسی حالت سے گشت کراؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب وطن واپس گئے تو اہلِ وطن نے پوچھا۔ آغا ہندوستان رفتہ بودی ہندوستان راچہ طور یافتی (آغا ہندوستان گئے تھے ہندوستان کیسا پایا) آپ جواب دیتے ہیں آغا ہندوستان خوب ملک است۔ انجا حلوا خوردن مُفت است۔ سواری خر مُفت است۔ فوج طِفلاں مُفت است۔ ڈم ڈم مفت است

(آغا ہندوستان اچھا ملک ہے حلوہ کھانا مفت ہے اور گدھے کی سواری مفت ہے بچوں کی فوج مفت اور ڈم ڈم مفت ہے) تو جیسا اِن صاحب کو اِس کیفیت میں لطف آیا تھا ویسا ہی اِس وقت تنعم پرستوں کو ہے کہ آج یہ حشم وخدم عزت اور سامان جمعیت معلوم ہوتا ہے ایک دن حقیقت کھلے گی کہ گدھا ران کے نیچے ہے لیکن سمجھ رہے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہیں کیونکہ گھوڑے پر سوار ہونا نصیب نہیں ہوا اگر کبھی گھوڑے پر سوار ہوں تو معلوم ہو کہ پہلے گدھے پر سوار تھے یا گرد وغبار میں گدھے گھوڑے میں امتیاز نہیں ہوا اِسی کو کہتے ہیں ؎

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

(عنقریب دیکھے گا تو جب غبار کھلے گا کہ تیرے قدم کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا)

تو جب یہ غبارِ غفلت کھلے گا اُس وقت معلوم ہوگا کہ ران کے نیچے کیا چیز تھی۔ بہرحال مخالفت میں کبھی جمعیت نہیں ہوتی۔ تو اُس تمام تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ عمل کتنی ضروری چیز ہے اور بے عمل کتنی پریشانی میں ہیں پس عمل کی ضرورت تو اس سے ظاہر ہوگئی اور علم موقوف علیہ ہے عمل کا سو وہ بھی اِسی سے ضروری ٹھیرا۔ غرض دو چیزوں کی ضرورت متحقق ہوئی علم کی اور عمل کی اور علم کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے اور عمل کے لئے تربیت کی ضرورت ہے اور ان دونوں کے لئے صحبت کی ضرورت ہے پس صحبت اس درجہ کی ضروری ٹھیری۔ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر کسی کو کتابی علم نہ ہو اور محض صحبت ہو تو بقدر ضرورت کفایت ہو جاتی ہے ہاں اصطلاحی مولوی نہیں ہوگا کیونکہ یہ کمال علمی تو بدون درس وتدریس کے نہیں ہوسکتا مگر ہاں بقدر ضرورت حاصل ہوسکتا ہے بلکہ اگر حافظہ اور تدین کامل ہو تو کمال علمی بھی صرف صحبت سے بدون درس تدریس کے حاصل ہوسکتا ہے چنانچہ اکثر صحابۂ کرام کا علم زیادہ تر

۳۰

علم و عمل کی بذریعہ صحبت کی ضرورت

صحبت یعنی اصطلاحی علم بھی کافی ہے

تربیت بھی صحبت پر موقوف ہے

خالی صحبت سے بدون کتب و درس ہی کے تھا بعد کو چونکہ حالت بدل گئی اِس لئے اُس کی حفاظت کی غرض سے مدون کرنے کی ضرورت ہوئی کہ اگر مدون نہ ہوگا تو لوگ محفوظ نہ رکھیں گے یا ان کے دعویٰ حفظ یا صحت نقل پر اعتماد نہ ہوگا تو تدوین اور تدریس کی ضرورت لغیرہ ہے لعینہ نہیں ہے تو تعلیم والا تو صحبت سے مستغنی نہیں اور صحبت والا تعلیم کتابی سے مستغنی ہوسکتا ہے۔ یہ تو گفتگو تھی تعلیم کے موقوف ہونے میں صحبت پر۔ اب دوسرا جُز تربیت جس کی ضرورت تعلیم سے بھی زیادہ ہے سو وہ بدون صحبت کے کسی درجہ میں بھی حاصل نہیں ہوسکتی حتیٰ کہ غیر اہلِ ملّت نے بھی اس کی ضرورت سمجھی چنانچہ کالجوں میں جو بورڈنگ بنائے جاتے ہیں اور شہر کے بچوں کو بھی ان میں رکھا جاتا ہے محض اِس لئے کہ اساتذہ کے خواص طبیعت اُن میں پیدا ہو جاویں اور یہ میں نے اِس لئے نقل کیا کہ آجکل کے مذاق والے لوگ بھی مطمئن ہو جاویں ورنہ ہم کو غیر ملّی لوگوں کے طرزِ عمل کے ۳۱
نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم تو اس کو ایسا یقینی سمجھتے ہیں کہ جس میں ذرا بھی شک نہیں کیونکہ ہم کو تو روز مشاہدہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ذی علم لوگ میرے پاس اصلاح کے لئے آتے ہیں اور اُن کے اخلاق اچھے نہیں ہوتے اور وہ چاہتے ہیں کہ کچھ ذکر و شغل پوچھ کر چلے جاویں لیکن میں بجائے ذکر و شغل سکھلانے کے اُن کو وہاں رہنے کا مشورہ دیتا ہوں اور وہ رہتے ہیں۔ چند روز تک اس مجمع میں رہنے سے کسی نہ کسی کی برکت سے اُن کی حالت درست ہو جاتی ہے اگرچہ وہ برکت کسی چھوٹے ہی کی ہو۔ اور اسی لئے بڑوں کو بھی ضرورت ہے چھوٹوں کی کیونکہ کبھی اُن کی برکت سے بڑوں کی اِصلاح ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم چھ ماہ یا سال بھر تک ہمارے پاس رہو اور یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی مگر پھر جب رہتے ہیں اور

پہلی حالت میں تغیر شروع ہوتا ہے اور بات بات پر ان کو روکا ٹوکا جاتا ہے تو ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ واقعی اس کی ضرورت تھی تو چونکہ ہم کو ایسے واقعے ہمیشہ پیش آتے ہیں اس لئے ہم کو تو اہل تمدن کے قول کے نقل کرنیکی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ آجکل لوگوں کو بدون اس کے تسلی نہیں ہوتی اس لئے انکی حکایت بھی نقل کردی پس ہم کو دو جماعتوں کی ضرورت ہے ایک تو وہ جماعت جس سے تعلیم حاصل کریں دوسری وہ جماعت جس سے تربیت ہو۔ اب اس کے متعلق دستور العمل بتلانا رہا سو اس دستور العمل میں تفاوت ہوگا۔ کیونکہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو کہ پڑھے لکھے نہیں ہیں تو ان کے لئے تو اور دستور العمل ہوگا اور وہ یہ ہے کہ اگر ان کو فراغ ہو تو اول درس کتابی کے ذریعہ سے علوم کی تحصیل کرائی جاوے۔ اگر پورا عالم بھی نہ بنے تو کم از کم دو چار برس تک اسی کام میں لگا رہے اور ان دو چار برس میں کوئی دوسرا کام نہ ہو (یہ میری رائے ہے) شغل علم میں یہ حالت رہے کہ ۳۲

"چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد" (جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے)

اب یہ آپ کو اختیار ہے چاہے جتنی مدت تجویز کریں مگر کم از کم ایک سال ضرور ہو اور ایک سال کے بعد اگر علوم معاشیہ کی بھی حاجت ہو تو تعلیم دین و دنیا مخلوط رہے اور ان میں جو لوگ تکمیل کرسکیں ان کی تکمیل بھی کرائی جاوے کہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے جس کو لوگ بیکاروں کا کام سمجھتے ہیں۔ میرے پاس کلانور کے ایک شخص آئے میرے بھتیجے کے متعلق پوچھنے لگے وہ کیا کرتا ہے؟ میں نے کہا عربی پڑھتا ہے۔ کہنے لگے کہ عربی کے بعد انگریزی کا بھی ارادہ ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے تو اس کو ترقی نہ کرائی جاوے گی کہ انگریزی پڑھ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کرے۔ میں نے کہا کہ اگر سب اسی میں مشغول ہوں تو پھر دین کا خادم کون بنے آخر اس کی بھی تو ضرورت ہے کہنے لگے کہ اس کے لئے مدرسہ دیوبند سے ہر سال

حاشیہ: علوم دینیہ کی تحصیل کا دستور العمل۔ ناخواندہ لوگوں کا دستور العمل

بہت لوگ نکلتے ہیں میں نے کہا سبحان اللہ کیا انصاف اور خیر خواہی ہے اگر مولوی ہونا ترقی کی بات ہے تو میرے بھتیجے کے لئے کیوں نہ تجویز ہوا اور اگر تنزل اور ذلت کی بات ہے تو دیوبند کے طالب علموں کے لئے کیوں تجویز ہو کیا وہ قوم کی اولاد نہیں۔ غرض جو لوگ فارغ ہو سکیں اُن کو پورا مولوی بنایا جاوے اور اس کے لئے اُمراء کے بچے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ غرباء معاش سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ پس یا تو وہ دوسرے کام میں لگ کر علم کو ضائع کریں گے اور یا بعضے علم کو ذریعہ کسب بنا دیں گے جس کے بعد نہ اُن کے وعظ میں اثر ہوگا نہ اُن کے فتوے معتبر سمجھے جاویں گے اور اُمراء مستغنی ہیں اس لئے اُن کے اصلاحات کا اثر زیادہ ہوگا اِس لئے اُمراء پر لازم ہے کہ اپنے بچوں میں سے ایک دو کو ضرور تکمیل علوم دینیہ کے لئے منتخب کریں مگر انتخاب کا وہ قاعدہ نہ ہو جو اب تک ہوتا چلا آرہا ہے یعنی جو سب سے زیادہ غبی اور کودن ہو اسی کو عربی کے لئے تجویز کر لیا۔ اور پھر خود ہی مولویوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بیوقوف ہوتے ہیں۔ صاحبو! مولوی تو بیوقوف نہیں ہوتے لیکن بیوقوف مولوی بنا دیئے جاتے ہیں۔ اب تم انتخاب اس طرح کرو کہ جو ذہین اور ذکی ہو اُس کو مولویت کے لئے تجویز کرو پھر دیکھو کہ مولوی کیسے عقلمند اور ہوشیار ہوتے ہیں مگر لوگوں کی تو حالت عام طور سے یہ ہو گئی ہے کہ جو چیز کسی کام کی نہ ہو وہ اللہ میاں کے نام بھینٹ چڑھائی جاتی ہے اللہ میاں کو جانے لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ جو چیز کسی کے کام کی نہ ہو وہ اللہ میاں کے نام۔ اِسی لئے کودن و غبی اللہ تعالےٰ کے دین کے لئے اِنتخاب کیا جاتا ہے۔ تو اس اِنتخاب سے معاف کیجئے کیونکہ اِس اِنتخاب میں پڑھنے والے کا تو نفع ہے لیکن قوم کا کوئی نفع نہیں قوم کو ایسے لوگوں سے نفع ہو سکتا ہے کہ جو سیر چشم اور ذہین ہوں یہ دستور العمل تو اُن ناخواندہ لوگوں کے لئے ہوا جو کہ خواندہ ہو سکتے ہیں اور جو ناخواندہ

لوگ بوجہ فراغ نہ ہونے کے باقاعدہ نہ پڑھ سکیں وہ کبھی کبھی علماء کے پاس
جایا کریں اور اُن سے علم دین کی باتیں پوچھا کریں۔ اور آجکل لوگ گو علماء
سے ملتے ہیں لیکن بہت ہی بُری طرح یعنی اُن کو اپنے مذاق کے تابع کرتے
ہیں کہ اخبار وکیل میں یوں لکھا ہے اور وطن میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ صاحبو
اُن کو تو وطن اور وکیل کی ضرورت نہیں تم اپنے وطن کی خبر لو اور اپنے وکیل
بنو یعنی اُن کے پاس جاکر اپنے افعال اور امراض سے اُن کو مطلع کرو اور اس
کی اِصلاح پوچھو۔ یہ تعلیم کی صورت ہے غیر فارغین کے لئے۔ جب اس مختلف
طریق سے علوم حاصل ہو جاویں پھر صحبتِ صالحہ کی تدبیر کرو۔ خود بھی صلحاء
کے پاس جاؤ اور اپنے بچوں کو بھی علماء کے پاس لیجاؤ اور اُن کو وہ باتیں سناؤ
دیکھو اب بچے چھٹی میں آتے ہیں لیکن محض فٹ بال اور کرکٹ میں سارا وقت
صَرف ہوتا ہے۔ کم سے کم ایک گھنٹہ روزانہ اس کے لئے ضرور دو کہ وہ کسی
عالِم کے پاس جاکر بیٹھا کریں۔ یہ سب تفصیل ہوئی ناخواندوں کے دستور العمل
کے متعلق۔ اب دوسرے وہ لوگ ہیں کہ وہ بقدر کافی لکھے پڑھے ہیں اور
علوم ضروریہ میں معتدبہ اِستعداد رکھتے ہیں کہ ان کو اِصطلاحی مولوی کہہ
سکتے ہیں اور وہ اِس واسطے اپنے لئے ضرورت تعلیم کی یا تربیت کی بھی نہیں
سمجھتے۔ میں اُن کے لئے یہ کہتا ہوں کہ گو وہ خود فاضل ہونے کے سبب علوم
میں بدرجہ اعتماد علماء کے معتقد نہ ہوں مگر علوم میں علماء سے مراسلت ضرور
رکھیں۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ فلاں عالِم سے پوچھو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ سب سے
پوچھو اور بہتر تو یہ ہے کہ مسائل علمیہ میں ہر ہفتہ چار مولویوں کے پاس خط
بھیجد یا کرو اور اُن کے جوابوں کو مقابلہ کرکے دیکھا کرو ہم کسی خاص مولوی
کا مقید نہیں کرتے اور مقابلہ کے وقت بدون رائے قائم کئے ہوئے دونوں
کے جواب کو اِنصاف سے دیکھو اور اگر خدشہ رہے تو بدون اِظہار نام ایک
کے دلائل کو دوسرے کے سامنے پیش کرو اِسی طرح اگر آپ کیا کریں گے تو

خواندہ حضرات کا دستور العمل

اِنشاء اللہ تعالیٰ تمام مسائل میں حق واضح ہو جاویگا اور اگر بفرض محال کسی مسئلہ کی حقیقت واقعیہ مخفی بھی رہ گئی تب بھی آپ پر قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا ورنہ سخت اندیشہ ہے اور جن کو مناسبت علوم سے اِس درجہ کی نہیں اور وہ موازنہ اور مقابلہ نہیں کرسکتے ان کے لئے یہ طریق ہے کہ وہ کسی ایک کو اختیار کرلیں جیسے کسی شخص کو طب سے مناسبت نہ ہو تو وہ اختلاف اطباء کے وقت کیا کریگا اور اس کے لئے کیا مناسب ہے آیا دونوں کے نسخوں کو دیکھ کر ترجیح دینا یا اجمالی دلائل سے کسی ایک کو اِنتخاب کرلینا ؎

دلارامے کہ داری دل در دبند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے اس کے لئے تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو ۱۲)

اور یہیں سے یہ بھی حل ہوگیا ہوگا کہ اگر مولویوں میں آپس میں اختلاف ہو تو کیا کریں اور کس کے قول پر عمل کریں تو جواب یہی ہے کہ اطباء میں بھی تو آپس میں اختلاف ہوتا ہے پھر وہاں کیا کرتے ہو یہی کرتے ہو کہ جو سب میں بڑا ہو اُس سے رجوع کرتے ہو اور بڑا ہونے کی علامت یہ ہے کہ اُس نے کسی ماہر سے حاصل کیا ہو مدت سے کام کر رہا ہو اُس کے ہاتھ سے اکثر لوگ شفایاب ہوتے ہوں تو جب علماء میں اختلاف ہو تو یہی دیکھو کہ یہ کس کے شاگرد ہیں کتنے دنوں سے دین کی خدمت کرتے ہیں لوگوں کو اُن سے کیسا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اگر ایک کا اُستاد دین میں بڑا ماہر تھا اور یہ مدت سے دین کی خدمت بھی کر رہا ہے جو علامت ہوگی مہارت کی۔ اس کے اصحاب دین کا پہلو بھی زیادہ لئے ہوئے ہیں جو بجائے دستِ شفائے طبیب کے ہے اور دوسرے میں یہ بات نہیں تو پہلے کو لے لو اور دوسرے کو چھوڑ دو۔ یہ علماء میں اِنتخاب کا طریقہ ہے مگر یہ طریقہ ان کے لئے ہے جو قوت فیصلہ نہیں رکھتے باقی جو لوگ قوت فیصلہ رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ مفصل دونوں جگہ تحقیق کریں اور پھر موازنہ کریں جیسا اوپر مذکور ہوا۔ یہ تو تعلیم کی بابت تھا۔ اب رہ گئی

تربیت اُس میں خواندہ ناخواندہ سب کا ایک ہی دستور العمل ہے وہ یہ کہ اُس کے لئے ایسے شخص کو انتخاب کریں جس نے اپنے اخلاق درست کر لئے ہوں اور اس کا اندازہ مشاہدہ علامات سے ہو سکتا ہے کہ متعدد مشائخ کو جا کر دیکھیں اور یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ دیکھئے دنیا کے ایک سودے کے لئے شہروں میں مارے مارے پھرتے ہیں تو اگر بزرگوں کی تلاش میں بھی دو چار جگہ ہو آویں تو کیا مشکل ہے اور وہ علامات یہ ہیں کہ دیکھیں کون بزرگ ایسا ہے جو علمِ دین بقدرِ ضرورت رکھتا ہو اور علم پر عمل کرتا ہو اپنے متعلقین پر شفقت کے ساتھ احتساب کرتا ہو اور اُس کی صحبت میں لوگوں کو دنیا سے دلبستگی نہ رہتی ہو اُس کے پاس رہنے والے غالب دیندار رہوں جو شخص ایسا ملے اُس کے پاس آمد و رفت رکھے اور جب موقع ملے چند روز تک اس کے پاس رہے اس کے اخلاق درست ہو جائیں گے کیونکہ جب پاس رہیگا تو دیکھے گا کہ اُس نے چار موقع پر غصہ کو ضبط کیا ہے تو ایک جگہ خود بھی ضرور ضبط کریگا اور اسی طرح عادت ہو جاویگی اور اگر پاس رہنا ممکن نہ ہو تو ایسے شخص سے مراسلت ہی رکھو اپنے امراض لکھ کر بھیجو کہ مجھے حرص ہے طمع ہے بے استقلالی ہے پھر وہاں سے جو کچھ لکھ کر آوے اُس پر عمل کرو وہ حضرات تہذیب اخلاق کے لئے وظیفہ نہ بتلا دیں گے بلکہ تدابیر بتلاوینگے اور گو وہ کتابوں میں بھی ہیں لیکن وہ مبتدی کو مفید نہیں ہوتیں اس لئے کہ کتابوں میں کلیات ہیں باقی اپنے حالات جزئیہ کا منطبق کرنا اُن کلیات پر اس کے لئے فہم کافی نہیں۔ تو یہ تو تربیت کا طریق ہے خواہ مجالست سے ہو یا مراسلت سے ہو اور یہ طریقہ جیسا آپ کے لئے ہے آپ کے بچوں کے لئے بھی ہے اگرچہ وہ انگریزی وغیرہ ہی میں مشغول ہوں اس حالت میں ایسا ہونا چاہئے کہ چھٹی میں کم سے کم ایک چوتھائی چھٹی کا اُن بزرگ کے پاس گذاریں۔ خربزہ کو دیکھ کر خربزہ رنگ پکڑتا ہے اگر سال بھر میں

ایک ماہ بھی آپ کے بچے کسی ایسے شخص کی صحبت میں رہ لیں گے تو ان کو نہ تنّس مضر ہو سکتا ہے نہ انگریزی - یہاں تک مردوں اور بچوں کی تربیت کا دستور العمل مذکور ہوا - اب رہ گئیں عورتیں تو عورتوں کے لئے ایک تو یہ صورت ہے کہ اگر خاندان میں کوئی بزرگ عورت ہو تو اُن کے پاس جا کر بیٹھیں اور اگر نہ ہو تو اُن کو بزرگوں کے ملفوظات سُناؤ اور زندہ بزرگوں کے حالات سُناؤ اور ان کو ایسی کتابیں دو تاکہ وہ اُن کو پڑھا کریں - علامہ غزالی علیہ الرحمۃ کی کتابیں سُناؤ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے بہت نافع ہوتی ہیں یہ دستور العمل ہوا تعلیم اور تربیت کا جن میں ایک کا تعلق علماء سے ہے دوسرے کا مشائخ سے - اب ان دونوں جماعتوں کے متعلق لوگ ایک غلطی کرتے ہیں وہ غلطی یہ ہے کہ ایک عیب تو علماء میں نکالا جاتا ہے کہ باعمل نہیں اور اس لئے اُن سے علوم بھی اخذ نہیں کرتے اور اسی طرح ایک عیب مشائخ میں نکالا جاتا ہے کہ عالم متحقق نہیں اور اس لئے ان سے اپنی تربیت کا طریق نہیں حاصل کرتے - آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی جامع شخص ملے تو ایسے جامع نواب کم ملیں گے - صاحبو! اگر ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی برابر جامع نہ ملے تو کیا حرج ہے اور اگر دین کی تحصیل میں ایسا ہی کمال شرط ہے تو پھر تحصیل دنیا میں بھی ایسا ہی ہونا چاہئے - پس نوکری بھی نہ کیا کرو کیونکہ سلطنت نہ ملی تو نوکری کیا ہوگی اور اس کے جواب میں کہو کہ وہ نہیں یہی سہی تو یہاں بھی میں یہی کہوں گا کہ ابوحنیفہؒ نہیں تو آجکل کے مولوی ہی سہی - اسی طرح مشائخ میں جنید بغدادیؒ کی تلاش ہوتی ہے وہاں بھی یہی جواب ہے - نیز اگر جنید کو تلاش کرتے ہو تو تم بھی اُن ہی کے مستفیدین جیسی طلب بھی تو پیدا کرو - صاحبو! یہ غنیمت سمجھو کہ تمہاری طلب کے موافق تو بزرگ مل گئے - غرض علماء میں تو یہ عیب نکالا جاتا ہے کہ علماء میں عمل نہیں ہوتا اور بعض کے اعتبار سے یہ سچ بھی ہے مگر

اوّل تو سب علماء کو بے عمل سمجھنا غلطی ہے بہت علماء با عمل بھی ہیں اور میں اُنکا نام بھی بتلا دیتا مگر جب لوگ پوچھتے ہی نہیں تو میں کیوں بتلا کر بیقدری کروں اور اگر باعمل لوگوں میں بھی عیوب نکالے جائیں کہ فلاں عالم میں یہ عیب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ " ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود" (کسی بشر کا نفس خطا سے خالی نہیں) دوسرے اگر بے عمل بھی ہوں تو دیکھو اگر حکیم محمود خاں بد پرہیز ہوں تو کیا اُن سے نسخہ نہ لکھواؤ گے۔ ضرور لکھواؤ گے۔ سو تعلیم میں اُن کے عمل کو کیا دخل ہے ہاں تربیت اگر اُن سے نہ کراؤ تو گنجائش ہے مگر تعلیم علم کے لئے تو وہ کافی ہیں مثلاً اگر آپ ان سے ردیہ الٰہیہ یا جبر و قدر کا مسئلہ پوچھئے تو اس میں ان کے عمل کو کیا دخل۔ اور اسی قبیل کا شبہ علماء کے متعلق بھی ہے کہ علماء میں اختلاف ہے ہم کس کی مانیں تو میں کہہ چکا ہوں کہ قواعد سے ایک کو ترجیح دیکر اُس کی مانو جیسے اگر مختلف وکلاء کے پاس جاؤ اور وہ مقدمہ میں مختلف رائیں دیں تو اخیر ایک کو ترجیح دو گے جب ہر امر میں یہی قاعدہ ہے تو دین میں ہی سارے شبہات کیوں کئے جاتے ہیں اور ان قواعد ترجیح کا اوپر بیان ہو چکا ہے غرض علماء چاہے بدعمل ہوں مگر اُن سے علم حاصل کرو۔ اسی طرح مشائخ میں یہ عیب نکالا جاتا ہے کہ پورے مولوی نہیں اور اس لئے شیوخ ایسے ڈھونڈتے ہیں جو پورے عالم بھی ہوں یعنی اُن کی درسی کتابیں کل ختم ہوں۔ صاحبو! جس طرح تعلیم علوم میں پورے باعمل ہونے کی ضرورت نہیں اسی طرح تربیت میں پورے ہونے کی ضرورت نہیں البتہ بقدر ضرورت علم ہونا ضرور ہے ایسا نہ ہو جیسے ایک فقیر کی نسبت لکھا ہے کہ اُس نے مجاہدہ کرنے کے لئے ایک نتھنے میں گوہ کی بتی دے رکھی تھی اور ایک آنکھ پر موم کی ٹکیا رکھ لی تھی کہ جب ایک آنکھ سے کام چلتا ہے تو دوسری کی کیا ضرورت اور ایک نتھنے سے پھولوں کی خوشبو سونگھتے ہیں تو دوسرے سے غلیظ سونگھ کر اُس کی مکافات ہونی چاہیئے گویا اللہ میاں

کو بھی آپ نے رائے دی تھی کہ دو آنکھیں فضول بنائی ہیں۔ اِتفاق سے کوئی صحبت یافتہ علماء کا اس کے پاس جا پہونچا اور اُس کو اِطلاع دی کہ تمہارا تو وضو نماز سب غارت ہے آخر وہ بہت رویا اور اپنی اِصلاح کی۔ اِس لئے عِلم بقدر ضرورت تو ہونا ضروری ہے مگر کمالِ علم کی ضرورت نہیں۔ بس علماء کے عِلم کو دیکھو عمل کو مت دیکھو اور مشائخ میں عمل کو دیکھو کامِل علم کی تلاش کرو۔ البتہ اگر اتفاق سے کوئی ایسا مِل جاوے کہ وہ عالِم بھی ہو اور شیخ بھی سُبحان اللہ اُس کی تو وہ حالت ہے ؎

بہارِ عالمِ حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحابِ صورت را بہ بو اربابِ معنی را

(اس کی عالمِ حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

تو پھر اُسی ایک ہی سے تعلق رکھو اور اگر ایسا نہ ملے تو دو سے تعلق رکھو اور دو کچھ زیادہ نہیں دنیا کے لئے تو ہزاروں سے تعلق رکھتے ہو تو اگر دین کے لئے دو کے ناز اُٹھالو تو کیا تعجب ہے اس تعدد سے جو اصل مقصود ہے یعنی حق تعالیٰ وہ تو ایسا ہے کہ اگر اس کے لئے ہزاروں سے بھی تعلق رکھا جاوے اور ان کی ناز برداری کی جاوے تو کم ہے ؎

کشند از برائے دلے بارہا خورند از برائے گلے خارہا

طلبگار باید صبور و حمول کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(ایک دل کیلئے بہت سی تکلیفیں اُٹھاتی ہیں، ایک پھول کیلئے بہت سے کانٹے کھاتے ہیں طالب چاہیے صبر کرنیوالا اور مشقت برداشت کرنیوالا میں نے کسی کیمیا گر کو)

اور اسی میں یہ بات بھی آگئی کہ اگر ایک سے ناکامی ہوئی تو دوسرے سے رجوع کرو جیسے کوئی مریض کہ معالجہ میں اُس کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(طلب سے باز نہ رہوں گا جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے یا تو تن محبوب حقیقی کے پاس پہونچ جائے یا جان تن سے نکل جائے)

اِسی کو کہتے ہیں ؎

طلبگار باید صبور و حمول کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(طلبگار صبور و حمول چاہیے کہ ہم نے کیمیا گر کو ملول نہیں دیکھا)

عمر بھر اسی دُھن میں رہو پھر ممکن نہیں کہ محروم رہو ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد ❊ اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(ایسا کوئی نہیں کہ عاشق ہوا ہو محبوب نے اس کے حال پر نظر نہ کی ہو اے صاحب درد ہی نہیں ورنہ طبیب ہے)

اس زمانہ میں مربی اور شیخ بنانے کے قابل کون حضرات ہیں

اور اسی دُھن باقی رکھنے کے لئے فرماتے ہیں ؎

اندریں راہ می تراش می خراش ❊ تا دم آخر دمی فارغ مباش

تا دم آخر دمی آخر بود ❊ کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(اس طریق وصول الی اللہ ہمیشہ اُدھیڑ بن میں لگے رہو اور آخر وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو۔ آخر وقت تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز و رفیق بن جائیگی)

یعنی کوئی وقت ایسا ضرور ہوگا کہ مقصود تک رسائی ہوگی۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور ہر چند کہ میں نے کہا تھا کہ میں ان علماء باعمل کے نام نہ بتلاؤں گا مگر پھر یہی رائے ہوئی کہ بتلا دوں لیکن اِس لئے نہیں کہ خواہ مخواہ ان کے معتقد ہی ہو جاؤ۔ میرے کہنے سے تو اس وقت معتقد ہو کہ میرے معتقد ہو سو میں کہتا ہوں کہ آپ ہرگز میرے معتقد نہ ہوں میں خود قابل اعتقاد نہیں صرف مسائل بتلانے والا ہوں اور یہ کہنا میرا تواضعاً نہیں نہ اِس میں مجھے تواضع کرنے کی ضرورت ہے جو چیز اپنے پاس ہے اس کو ظاہر کرتا ہوں۔ میں بحمد اللہ علم ضروری جانتا ہوں اس کے بتلانے کے لئے میں تیار ہوں۔ گو وہ کامل نہیں ہے چنانچہ بہت سی باتیں مجھے معلوم بھی نہیں اور اگر مجھ سے کوئی ایسی بات پوچھی جاویگی اُس کے متعلق میں یہ کہہ دوں گا اور کہہ دیتا ہوں کہ میں نہیں جانتا۔ پس علم ضروری کا انکار نہیں اور قابل اعتقاد ہونے کا دعویٰ نہیں اِس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ میرے کہنے سے ان بزرگوار کے معتقد ہو جاؤ۔ خود جانچو۔ دیکھو سو اس غرض سے نام نہیں بتلاتا بلکہ محض اِطلاع مقصود ہے سو وہ بزرگ یہ ہیں۔ ایک مولانا عبدالرحیم صاحب

رائے پوری جو اسی جلسہ میں تشریف فرما ہیں۔ یہ تو تربیت کے لئے کافی ہیں۔ دوسرے بزرگ حضرت مولانا محمود حسن صاحب کہ وہ افادۂ علم اور تربیت دونوں کے لئے کافی ہیں۔ تیسرے بزرگ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کہ وہ بھی تعلیم اور تربیت دونوں کے لئے کافی ہیں۔ اور نام اِس وقت میں نے نہیں لئے۔ میں نے ایک تنبیہات وصیت لکھی ہے اُس میں چند بزرگوں کے نام لکھ دیئے ہیں آپ خود اُن کا اِمتحان کرلیں۔ لیکن اِمتحان ایک دو دفعہ کے ملنے سے نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو اکثر لوگ خشک مزاج بتلاتے تھے کیونکہ یا تو کبھی ملے نہیں اور یا اگر ایک دو دفعہ ملے تو اتفاق سے ایسے وقت ملے کہ مولانا کسی دوسرے شغل یا احتساب میں مشغول ہوئے۔ بس اس ایک جلسہ میں دیکھ کر عمر بھر کے لئے ایک غلط حکم کر دیا اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص سُنے کہ فلاں جج صاحب بڑے خوش خلق ہیں اور یہ سُنکر اُن سے ملنے کو عدالت میں جاوے اور اتفاق سے ایسے وقت پہونچے کہ صاحب جج دو آدمیوں کو حبس دوام کا حکم سُنا رہے ہوں اور دو کو پھانسی کا حکم سُنا رہے ہوں تو یہ شخص یقیناً اُس جج کو نہایت درجہ خونخوار سمجھے گا لیکن عقلمند آدمی کہے گا کہ بھائی تم نے عدالت میں دیکھا پھر اتفاق سے اُس وقت سنگین مقدمات پیش تھے ذرا اُن کے بنگلہ پر جاکر تو دیکھو اسی طرح بزرگوں کے پاس ایک وقت جاکر دیکھا اور کہہ دیا کہ نہایت خشک ہیں۔ صاحبو! کم از کم ایک ایک ہفتہ تک رہ کر تو دیکھو۔ اور اگر پھر بھی سوائے اپنے کوئی پسند نہ آوے۔ تو ہم اس کا علاج نہیں کر سکتے۔ شاید اِس فہرست سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ اپنے ہی سارے بزرگوں کا نام دے دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

ہلی بھگت ہے۔ تو اوّل تو خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ ملی بھگت ہے یا کیا۔ دوسرے میں نے تو بیعت کرنا بھی چھوڑ دیا ہے پھر ملی بھگت کا احتمال رہا۔ صرف جو مجھ کو معلوم تھا بتلا دیا۔ ہاں یہ شبہ تو اب بھی رہا کہ بزرگوں کی تعریف کرنا درحقیقت اپنی تعریف ہے کہ ہم بھی بزرگ ہیں کہ بزرگوں کو پہچانتے ہیں ؎

مادح خورشید مداح خود است کہ دو چشمم ونامرمدست

(آفتاب کی تعریف کرنیوالا خود اپنی تعریف کرنے والا ہے اِس لئے کہ اس کی دونوں آنکھیں اس سے روشن ہیں)

سو اس کا جواب یہ ہے کہ خیر یہی ہی آپ یوں ہی سمجھیں اِس سے ہم کیونکر بچیں۔ دوسرے آپ کو کیا خبر ہے کہ میں نے خود پہچان کر ہی کہا ہے تاکہ وہ شبہ ہو ممکن ہے کسی بزرگ سے سُنکر ہی کہا ہو اور اُس کی بزرگی اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللهِ فِي الْاَرْضِ کے قاعدے سے محقق ہوئی ہو بہر حال آپ ان سب کو دیکھئے اور سب کا اِمتحان کیجئے ؎

ما نصیحت بجائے خود کردیم روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس بر رسولاں بلاغ باشد وبس

(ہم نصیحت بجائے خود کی ہے اور ایک زمانہ اس میں گذارا ہے اگر کسی سننے کی رغبت نہ تو رسول پر بس پہونچا دینا کوئی عمل کرے یا نہ کرے)

پس اِسی صحبت کے نافع ہونے کی بنا پر فرماتے ہیں کہ اپنے صحابہ رضؓ کو محروم نہ کیجئے اور اپنے نفس کو اُن کے ساتھ جمائیے۔ اب میں آیت کا خالی ترجمہ کرکے ختم کئے دیتا ہوں۔ ترجمہ یہ ہے کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے کو ایسے لوگوں کے ساتھ جماکر بٹھلائے جو اپنے پروردگار کو صبح وشام پکارتے ہیں اور آپ کی آنکھیں اُن سے ہٹنے نہ پاویں (یعنی آنکھیں بھی اُدھر ہی متوجہ رہیں) اس سے

بھی میں ایک دوسرا مسئلہ استنباط کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بزرگوں کی توجہ سے بھی نفع ہوتا ہے تو گویا اول جملہ میں تعلیم کا بھی اشارہ ہوا کہ پاس بیٹھنے سے احکام بھی حاصل ہوں گے اور دوسرے میں تربیت کا۔ آگے فرماتے ہیں تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (دنیوی زندگی کے رونق کے خیال سے) اس کو بعض نے مستقل جملہ کہا ہے یعنی کیا آپ دنیا کی زینت چاہتے ہیں۔ مگر میں نے اس کو جملہ حالیہ سمجھا ہے اور لَا تَعْدُ میں منفی کو اس کا عامل اور عَيْنَاكَ کو بوجہ اقامت عین مقام ذات ذوالحال اور مقید کی نفی یہاں قید اور ذی قید دونوں کے ارتفاع سے ہے یعنی جو عدوان بارادۂ زینت حیوٰۃ دنیا ہوتا وہ متروک ہے۔ اِس طرح سے کہ عدوان ہے نہ ارادۂ زینت پس اس سے وقوعِ زینت کا لازم نہیں آتا۔ آگے دوسری نہی ہے لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا یعنی اِن کا کہنا نہ مانو جن کو ہم نے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور اس نے اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع کیا اور اس کا کام حد سے نکلا ہوا ہے۔ یہاں سے ایک تیسری بات بھی معلوم ہوئی کہ مشورہ بھی ایسے شخص کا قبول کرے جس کی یہ حالت نہ ہو اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ الخ (ہم نے اس کے دل کو غافل کر دیا ہے) کیونکہ بے دین کے مشورہ میں بھی برکت نہیں ہوتی۔ چنانچہ رؤسار کفار کے اس مشورہ تخصیص مجلس کے قبول سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ممانعت فرما دی۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ اس میں تعلیم اور تربیت دونوں کا بذریعہ صحبت نافع ہونا بتلایا ہے اور شیوخ کا بھی علاج کر دیا ہے کہ آپ بھی بے پروائی نہ کریں سبحان اللہ کیا عجیب جامع جملہ ہے

اب میں ختم کر چکا - اور اتمام حجت کے لئے پھر کہتا ہوں کہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے صحبتِ نیک کا اہتمام کرو - اب ہر شخص جو چاہے اِس صحبت صالح کے متعلق دستور العمل مقرر کرلے خواہ ہفتہ میں ایک دن یا مہینہ میں دو تین یا سال میں ایک ماہ یا کم وبیش - خدا تعالےٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ فہم سلیم اور توفیق عمل کی بخشیں

آمین ثمّ آمین

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

وعظ

مسمّٰی بہ

تذکیر الآخرہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ ۔ بندر روڈ ۔ کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ

تذکیر الآخرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ

(خدا تعالیٰ نے فرمایا ہرگز یوں نہیں بلکہ تم جلدی یعنی دنیا کو دوست رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑے دیتے ہو) میں اس وقت جس مضمون کو بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ایک نہایت ضروری مضمون ہے اور مولوی شبیر احمد صاحب کی تقریر "دار الآخرہ" کا گویا تتمہ ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں اعتقاد آخرت کا بیان کیا ہے میں آخرت کے متعلق عمل کا بیان کرنا چاہتا ہوں جو آیت میں نے اوپر تلاوت کی ہے اس میں خداوند تعالیٰ زجر و توبیخ کے ساتھ فرماتا ہے کہ تم لوگ اس چیز کو پسند کرتے ہو جو عاجلہ ہے اور آخرت کو چھوڑے دیتے ہو۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کو لئے ہوئے ہیں اور دنیا میں مبتلا ہیں اور آخرت کو

چھوڑے بیٹھے ہیں ان کے لئے اِس آیت میں تنبیہ ہے پہلا مضمون (مولوی شبیر احمد صاحب کا مضمون) علمی تھا اور یہ گویا عملی ہے اور چونکہ مقصود علم سے عمل ہی ہے اِس لئے یہ میرا مضمون گویا اس مضمون کا متمّم (پورا کرنیوالا) ہے اور ہر چند کہ بعض علوم ایسے ہیں جو قطع نظر عمل سے خود مِنْ حَیْثُ الْعِلْم (علم کی حیثیت سے) بھی مقصود ہیں اور اِسی لئے حکماء نے بھی اپنے فنون کے مثلاً طب ہی کے دو جزء قرار دیئے ہیں علمی اور عملی اور تمام دنیا اِس تقسیم کو مانتی ہے۔ اور یہ دونوں ہی مطلوب ہیں لیکن تاہم وہ علوم مقصود بھی نظر غائر میں کسی نہ کسی عمل سے من وجہ ضرور تعلق رکھتے ہیں مثلاً خدا تعالےٰ کے ایک ہونے کا اِعتقاد ایک مقصود ہی مگر عمل میں بھی اس کا ایسا خاص اثر ہے کہ جس درجہ کا یہ اعتقاد ہوتا ہے اُسی درجہ تک اُس عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے عارف و صحابہؓ کی عبادت کا فرق مراتب کا یہی راز ہے۔ عارف و صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین (ان سب پر اللہ تعالےٰ کی خوشنودی ہو) کی عبادت خواہ مالی ہو یا بدنی اس کے مقابلہ میں کسی کی عبادت نہیں ہوسکتی صحابہ کی عبادت میں کیا بات زیادہ ہے؟ وہی علم و خلوص عارف کی دو رکعتیں ہماری دو لاکھ رکعتوں سے بہتر و افضل ہیں اس لئے کہ علم واذعان اور خلوص اس میں اِس قدر پایا جاتا ہے جو ہماری عبادت میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ حضرت مرشدی نے فرمایا تھا کہ عارف کی دو رکعت غیر عارف کی لاکھ رکعت سے بہتر و افضل ہیں حضرت نے یہ غلط نہیں کہا اور نہ اِس میں مبالغہ ہے حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو میرا صحابی آدھا مد غلّہ خیرات کرے وہ اُحد پہاڑ کی برابر سونا خرچ کرنے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے اگر اس حدیث کی بناء پر آدھ سیر غلہ کے مقابلہ میں آدھ سیر سونا لیا جائے اور اس کی نسبت سے اُحد

پہاڑ کو دیکھیں تو نسبت معلوم ہوگی کہ کیا ہے۔ اور اگر یہ نسبت اِس طرح لی جائے کہ بجائے آدھ سیر غلہ کے اُس کی قیمت لے کر پھر سونے کی قیمت سے موازنہ کیا جائے تو اور زیادہ نسبت حاصل ہو اور یہ ثواب کی زیادتی صرف علم معرفت کی زیادتی سے ہے اور اس سے اچھی طرح صحابہ کی عبادت اور ہماری عبادت کی نسبت معلوم ہوسکتی ہے۔ بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ مولوی بھی عجیب آدمی ہیں کہیں اِس حدیث کی عِلّت محبت و خلوص کو بتلاتے ہیں اور کبھی علم و معرفت کو اور ایک ہی حدیث سے متعدد مواقع پر متعدد کام لیتے ہیں سو واضح ہو کہ خلوص و محبت کا بھی علم و معرفت ہی سے حاصل ہوتا ہے جو صحابہ میں پایا جاتا تھا۔ پس ایک ہی چیز ہے خواہ اس کو خلوص سے تعبیر کرو خواہ علم و معرفت سے خوب کہا ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ فَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی حسن ہے اور ہر عنوان جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اِسی علم و معرفت سے ان حضرات کو وہ ادراک عطا ہوا تھا کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اوّل بار دیکھا تو باوجود اُس وقت تک وہ خلوص جو بعد صحبت میسر ہوا نہ تھا مگر طلبِ حق کا جس قدر خلوص تھا اُسی کا یہ اثر تھا کہ دیکھتے ہی بیساختہ بول اُٹھے هٰذَا لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ (یہ چہرہ جھوٹے شخص کا نہیں ہوسکتا)

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی نیک بیں باشی اگر اہلِ دلی

(ولی کے اندر انوارِ الٰہی نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر تم اہلِ دل ہو تو اسکا ادراک کرسکتے ہو۔)

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں) تو جب وہ کامل خالص ہوگیا ہوگا تو کیا حال ہوا ہوگا ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند صاف گر باشد ندانم چوں کند

(ایک چلو خاک آلودہ جب مجنوں بنا دیتا ہے اگر صاف ہو تو نہ معلوم کیا کر دے)

غرض صحابہؓ کو علم خالص تھا اِسی وجہ سے ہماری سعادت کاملہ بھی ہے کہ صحابہ کا اتباع کریں۔ ایک نظیر سے اس واقعہ کی کہ ہم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نقش قدم پر کیوں چلیں اور ان کی زندگی ہماری رہنما کیوں ہے تحقیق نہایت دِل نشین مثال سے ہوسکتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ریل کس طرح چلتی ہے ریل کے چلنے میں متحرک اوّلاً انجن ہی ہر گاڑی میں انجن نہیں ہوتا بلکہ اگر ہر گاڑی میں انجن ہوتا تو شاید ریل چلتی بھی نہیں بلکہ ساری گاڑیوں کے لئے ایک ہی انجن ہوتا ہے جو سب کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ترکیب یہ کہ حرکت اوّلیہ ایک چیز میں ہوتی ہے اور دوسری چیزوں کو مرتبط کر دیا جاتا ہے جیسا کہ ریل گاڑی میں ہوتا ہے کہ انجن صرف متحرک اوّلاً ہوتا ہے اور ساری ریل گاڑی انجن سے مرتبط ہوتی ہے اکیلا انجن جو متحرک اوّلاً ہے ساری گاڑیوں کو کالکا سے کلکتہ تک لیجاتا ہے۔ جب ایک انجن متحرک اوّلاً بہت سی گاڑیوں کو ہزارہا کوس لیجاتا ہے تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ اگر ایک شخص صحابہؓ سے تعلق رکھنے والا خدا تعالیٰ تک پہونچ سکے جو شخص خدا تعالیٰ تک پہونچنا چاہے وہ صحابہؓ کے انجنوں سے مرتبط ہو جائے ؎

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

(ایک چیونٹی کو کعبہ میں پہونچنے کا ارادہ ہوا کبوتر کے پاؤں پکڑے اور یکایک پہونچ گئی)

ایک چیونٹی تھی غریب و مفلوک الحال اُس نے حج کے جانے کا ارادہ کیا لیکن کوئی سامان اس کے پاس موجود نہ تھا اسی فکر میں حیران و پریشان تھی حجاج سے ترکیب پوچھی حاجیوں نے بتلایا جہاز میں اتنے دنوں سفر کرنا پڑتا ہے اور اونٹوں پر اتنے دن تک سفر ہوتا ہے تب

کہیں یہ ہزار ہا میل کا سفر ختم ہوتا ہے۔ لیکن اِس میں بڑی دقتیں ہیں ہزاروں میل کا سفر سیکڑوں روپیہ کا خرچ چور ڈاکو کا خوف جان کا خطرہ غرض بڑی بڑی تکلیفیں ہیں جن کو اُٹھا لینے کے بعد کہیں حج نصیب ہوتا ہے بیچاری یہ سُنکر سخت پریشان و ہراساں ہوئی اسی ذوق و شوق اور غمگین حالت میں تھی کہ ناگہاں ایک رہبر نظر آیا جو مصداق تھا اِس شعر کا ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال   مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

(یعنی آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے اور آپسے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے)

اور اس نے پوچھا کہ کہو کیسی حالت ہے بیچاری رنج و غم میں بیٹھی ہوئی تھی ایک دردمند کو پاکر کچھ تسکین حاصل ہوئی اور کہا کہ میری حالت کیا ہے حج کو جانا چاہتی ہوں دل میں شوق محبت بھرا ہوا ہے لیکن پہونچنے کے وسائل نہیں اِس وجہ سے غمگین و پریشان ہوں۔ اگر کوئی تدبیر آپ بتلاسکیں تو للہ بتلایئے اس شخص نے کہا کہ اچھا میں ایک طریقہ بتلاؤں اگر نخوت و تکبر نہ کرو کیونکہ نخوت و تکبر سے مقصد حاصل نہیں ہوتا اور آدمی ہمیشہ ناکام رہتا ہے اس نے کہا بہت بہتر میں ہر طرح راضی ہوں اتنے میں ایک کبوتر آگیا اور جنگل میں دانہ چگنے لگا وہ شخص جانتا تھا کہ یہ کبوتر حرم جانے والا ہے اس سے کہا اگر تم جانا چاہتی ہو تو اس کبوتر کے پاؤں پکڑ لو اور نخوت و غرور نہ کرو حرم میں پہونچ جاؤگے ؎

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد   دست برپائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

(ایک چیونٹی نے حج جانے کا ارادہ کیا حرم کے کبوتر کے پاؤں پکڑے اور حرم۔ پہونچ گئی)

غرض اِس سے یہ ہے کہ وابستگی و ارتباط میں نخوت و غرور اور تکبر نہ کرو وابستگی و ارتباط میں اِستنکاف کا ہونا کامیابی کی دلیل ہی آگے وابستگی

کے ساتھ استنکاف کروگے تو ہرگز کامیاب نہ ہوگے اور رہ جاؤگے مسلمانوں میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ وہ مقتداؤں سے ارتباط اور تعلق پیدا کریں کیونکہ مسلمانوں میں اتباع سے عار پایا جاتا ہے اور وجہ استنکاف کی یہ ہے کہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ اپنے کو دولتمند اور صاحبِ عزت خیال کرتے ہیں اور عارف باللہ اکثر غریب وخستہ حال ہوتے ہیں اس لئے یہ خیال کرکے یہ لوگ چھوٹی حیثیت کے ہیں۔ غریب ومفلوک الحال ہیں میلے کچیلے اور بدحیثیت ہیں اور ہم بڑے دولتمند صاحبِ عزت ہمارا اور ان کا کیا جوڑ۔ ہم ان سے کیا تعلق اور ربط پیدا کریں افسوس اسی چھوٹے بڑے کے خیال نے شیطان کو راندۂ درگاہ بنایا یہاں شیطان نے یہی تو کہا تھا کہ میں ایک چھوٹی حیثیت کے وجود کو جو مجھ سے ارذل اور کمتر ہے کیوں سجدہ کروں یہی نخوت وتکبر اس کی تباہی کا موجب بنا اور اسی نے اُس کو کھویا اور یہی ہم کو خراب کر رہا ہے۔ آج یہ مرض مسلمانوں میں کثرت سے ہے اور ہر شخص اس میں مبتلا پایا جاتا ہے میں اعتراضاً نہیں کہتا بلکہ شفقت کے لحاظ سے کہتا ہوں مسلمانو! اس خیال کو چھوڑ دو ہماری ناکامیابی کی یہی وجہ ہے اور ہماری تباہی کا یہی موجب ہے۔ اس صورت پرستی نے ہم کو برباد کیا ہے اہلِ حقیقت صورت کی نسبت فرماتے ہیں ؎

گر بصورت آدمی انساں بدے | احمد و بوجہل ہم یکساں شدے ﷺ
اینکہ می بینی خلاف آدم اند | نیستند آدم غلاف آدم اند

(اگر آدمی کی صورت کی وجہ سے انسان ہوتا تو احمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور ابوجہل یکساں ہوتے یہ کہ خلاف آدم کے تجھ کو نظر آتا ہے آدم نہیں ہیں آدم کے غلاف میں ہیں)

لباس کو چھوٹے بڑے ہونے کا معیار نہ بناؤ لباس کو دیکھ کر چھوٹے بڑے ہونے کا احتمال نہ کرو مولوی صاحب دس روپیہ کے نوکر ہیں میلے کچیلے

اور ٹوٹے پھوٹے حال میں ہیں اس کی طرف نہ دیکھ لباس کے اچھے برے ہونے سے آدمی کا اچھا بُرا ہونا معلوم نہیں ہوتا اگر شریعت مجبور نہ کرتی تو اہل اللہ اور عارف باللہ پائجامہ بھی نہ پہنتے ان لوگوں کو جسم کی آرائش اور زینت سے کام کیا ہے

نباشد اہلِ باطن درپئے آرائش ظاہر بنقّاش احتیاجے نیست دیوارِ گلستاں را

(اہل اللہ آرائش ظاہری کے درپے نہیں رہتے ان کو ظاہری آرائش کی حاجت نہیں جیساکہ نقاش کو دیوارِ گلستاں کی کچھ حاجت نہیں)

ذوق شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

عریاں ہی دفن کرنا تھا زیر زمیں مجھے
ایک دوستوں نے اور لگا دی کفن کی شاخ

اِس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بادشاہ ذی حشمت و شوکت تھے لیکن اُن کے بھائی لنگی باندھے ہوتے پھرا کرتے تھے۔ بادشاہ کو شرم آتی تھی کہ میں اِتنا بڑا بادشاہ اور میرا بھائی صرف لنگی باندھے ہوئے پھرتا ہے۔ ان کو بلا کر بادشاہ نے کہا کہ بھائی مجھے شرم آتی ہے تم پائجامہ تو پہن لو اُنھوں نے کہا کہ ایک شرط سے کہ جب کرتا بھی ہو کہا کرتے بہت کہا کرتے کے ساتھ ٹوپی بھی ہو بادشاہ نے کہا ٹوپی بھی بہت کہا کہ جوتہ بھی ہونا چاہیے بادشاہ نے کہا جوتے بھی بہت کہا کہ جب یہ سب چیزیں ہوں تو ایک سواری بھی ہونا چاہیے بادشاہ نے کہا کہ سواری بھی ہو انھوں نے کہا سواری گھوڑے کی اور اس کے لئے ایک اصطبل اور سائیس بھی ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا یہ چیزیں بھی موجود ہیں پھر کہا ایک مکان رہنے کے واسطے بادشاہ نے کہا بڑے بڑے عالیشان مکان آپ کے واسطے موجود ہیں کہا کہ پھر ایک سلطنت بھی ہونی چاہیے بادشاہ نے کہا سلطنت بھی حاضر ہے شوق سے تخت پر بیٹھیے اور حکمرانی کیجیے یہ سب پوچھ کر بادشاہ

سے کہنے لگے کہ میں پائجامہ ہی کیوں پہنوں جس میں اتنے جھگڑے ہوں اور ایسا بکھیڑا ہو۔ غرض جو لوگ عارف باللہ ہوتے ہیں انھیں ایسے تکلفات سے غرض نہیں ہوتی سادہ زندگی رکھتے ہیں اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور نہ ان کے قلب میں اس سامان کی وقعت ہوتی ہے۔ ایک بزرگ نے ایک بادشاہ سے دریافت کیا کہ اگر آپ کسی موقع پر راستہ بھول جائیں اور وہاں پیاس معلوم ہو اور تشنگی بیچین کر رہی ہو اور ایک شخص پانی لے کر آوے اور کہے کہ میں یہ کٹورا پانی آدھی سلطنت کو فروخت کرتا ہوں تو آپ اسے خرید لیں گے بادشاہ نے کہا بلا شک میں آدھی سلطنت میں اس ایک کٹورہ پانی کو خرید لوں گا۔ بزرگ نے کہا اگر اسی طرح کبھی آپ کا پیشاب بند ہو جائے اور کوئی شخص یہ کہے کہ میں نصف سلطنت کے معاوضہ میں پیشاب کا بند کھولتا ہوں تو آپ اس پر راضی ہو جائیں گے۔ کہا بیشک بزرگ نے فرمایا کہ آپکی سلطنت کی کیا قیمت۔ ایک کٹورہ بھر پانی اور پیشاب ایسی قیمت کی چیز پر نخوت و غرور کرنا اور دوسروں کو حقیر و ذلیل خیال کرنا کہاں تک درست کہا جا سکتا ہے یہاں سے حالت معلوم ہوئی ہوگی آجکل کی ترقی کی۔ میں ترقی کو منع نہیں کرتا بلکہ ترقی کو پسند کرتا ہوں لیکن اسی طرح جس طرح کہ ایک نیک اور مسلمان کو ترقی حاصل کرنی چاہیئے۔ ایسا نہیں کہ ترقی میں دین ہی کو بھول جائیں اور خدا تعالےٰ کا خیال بھی نہ آئے جو لوگ خدا تعالیٰ کو جان لیتے ہیں وہ دنیا سے زیادہ محبت کیا بالکل محبت نہیں رکھتے ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند — فرزند و عزیز و خانماں راچہ کند

(جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہوگئی اس کو جان اور فرزند و عزیز اور اسباب کی پرواہ نہیں)

دنیا کا وجود ان کی نظروں میں کاہ سے زیادہ نہیں چھوٹے بچے مٹی کے گھروندے کھلونے بناتے ہیں عقلاء ان پر ہنستے ہوئے گذرتے ہیں

اور بچوں کو بلا کر دکھاتے ہیں کہ ان دیوان خانوں میں آؤ اور ان کو دیکھو اِسی طرح عرفاء۔ اور اہل اللہ آپ کے بلند قصروں اور محلوں کو دیکھ کر آپ کو دار آخرت کی ترغیب دیتے ہیں اور جب آپ کو ملتفت نہیں پاتے تو وہ آپ پر ہنستے ہیں اور آپ کی حالت پر یہ کہتے ہوئے افسوس کرتے ہیں ؎

دلا تاکے دریں کاخ مجازی　　کنی مانند طفلاں خاکبازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ　　کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرازاں آشیانہ بیگانہ گشتی　　چو دونا چغد ایں ویرانہ گشتی

(اے دل اِس مجازی محل (دنیا) میں بچوں کی طرح خاک بازی کرتا رہے گا تو وہی ہاتھ کا پلا ہوا پرندہ ہے کہ تیرا آشیاں اس محل سے باہر تھا کس لئے اپنے آشیانہ سے انجان ہوکر اُلو کی مانند اس ویرانہ کا ہو رہا)

پس اِس سامان کو قبلہ و کعبہ مت بناؤ۔ اور ان علماء کو جو خستہ حالت میں ہوں میلے کچیلے ہوں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھو وہی لوگ خاصانِ خدا تعالےٰ اور کچھ لے جانے والے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا چھوڑ دو اور تمام تعلقات کو ترک کردو بلکہ غرض یہ ہے کہ دنیا میں اِس قدر منہمک نہ رہو کہ خدا تعالےٰ کو بھی بھول جاؤ بلکہ دنیا کو نظرِ حقارت سے دیکھو اور خاصانِ خدا تعالےٰ کی عزت کرو۔ اہل اللہ سلطنتوں اور حکومتوں کی پرواہ نہیں کرتے اور ان کو وبال جان خیال کرتے ہیں۔ قصہ مشہور ہے کہ حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی خدمت مبارک میں سلطان سنجر نے خط لکھا جس میں تحریر کیا کہ ایک حصہ ملک کا آپ کے خدام کے لئے آپ کو دیتا ہوں۔ آپ نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد　　در دل اگر بود ہوسِ ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب　　من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

(چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو اس لئے کہ جب سے مجھ کو نیم شب کی سلطنت ملی ہے میری نظر میں نیمروز کی سلطنت ایک جو کے برابر بھی نہیں)

ایک عارف کا قول ہے کہ ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہروئے ۔ بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

(یعنی ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دار وگیر شاہی سے بہتر ہے)

جس شکستگی کو حقارت سمجھتے ہو اس کی نسبت حدیث قدسی ہے اَنَا عِنْدَ الْمُنْکَسِرَۃِ قُلُوْبُھُمْ (میں شکستہ دل لوگوں کے ساتھ ہوں) یہی شکستگی شرط وصول ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ ۔ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

ہر کجا پستی است آب آنجا رود ۔ ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے شفا آنجا رود ۔ ہر کجا رنجے دوا آنجا رود

(یعنی فہم و خاطر تیز کرنا حق تک پہونچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے بجز شکستہ لوگوں کے فضل خداوندی کسی کو قبول نہیں کرتا جس جگہ نیچان ہوتا ہے وہاں پانی مرتا ہے جہاں مشکل پیش آتی ہے وہاں ہی جواب دیا جاتا ہے جس جگہ بیماری ہوتی ہے وہیں دوا کی ضرورت پڑتی ہے جہاں بیماری ہوتی ہو وہاں ہی شفاء پہونچتی ہے ۱۲)

ہم لوگوں کو طلب نہیں ہے اگر طلب ہوتی تو اتباع میں تذلل بھی گوارا ہوتا اگر کوئی شخص کسی پر عاشق ہو جائے اور معشوقہ عاشق سے کہے کہ تمام کپڑے اتار کر لنگوٹ بند ہو جاؤ تب وصل ہوگا۔ واللہ ایسا ہی کریگا۔ اس کو لنگوٹ بند ہونے میں کچھ بھی تامل نہ ہوگا۔ اور تمام شرم حیا بالائے طاق رکھ دی جائے گی لیکن خدا تعالیٰ کے لئے ایسا نہیں ہے

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود ۔ گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلےٰ کے عشق سے کیا کم ہو عشق خداوندی میں گیند کی طرح لڑھکنا زیادہ اچھا ہے ۱۲)

ایک زندہ نظیر سے اس کو دیکھئے کیمیاگروں کی حالت سب کو معلوم ہے کہ کپڑا

ان کے بدن پر نہیں ہوتا میلے کچیلے اور غلیظ رہتے ہیں لیکن عام لوگوں کے علاوہ والیان ملک اور بادشاہ تک ان کے پیچھے ایک بڑا ہوا حقہ لئے پھرا کرتے ہیں اگرچہ حقیقت میں وہ کیمیا گر نہ ہو۔ اللہ اکبر ایسی کیمیا کے لئے اپنے عیش وعشرت اپنی ذاتی عزت ووجاہت کو تباہ کردیا لیکن جن کو سچ مچ کی کیمیا آتی ہے جو لوہے کو سونا بناتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اگر ان کے پیچھے پھرو تو تعجب نہیں کیونکہ کیمیا گر حقیقت میں وہی ہیں حاصل یہ کہ اگر تم بھی صحابہ سے ارتباط حاصل کروگے ان کا واسطہ ڈھونڈو گے تو یقیناً کامیاب ہوگے کیونکہ خدا تعالےٰ تک پہنچنے کا صحیح راستہ بتلانے والے یہی ہیں جس طرح کہ چیونٹی کبوتر کے پاؤں میں لگ کر کعبہ مقدس پہنچ گئی تو ہم بھی اسی طرح صحابہ کے پاؤں میں لگ کر کس طرح اللہ تعالےٰ تک نہ پہونچیں گے۔ پہونچیں گے اور ضرور پہونچیں گے اور صحابہ سے واسطہ پیدا کرنا حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے واسطہ حاصل کرنا ہے تو کامیابی یقینی ہے۔ غرض معرفت وعلم ہی نے صحابہ کو یہ درجہ دیا ہے علم ومعرفت بہت بڑا درجہ رکھتا ہے اگر علم ومعرفت کوئی چیز نہیں ہے تو دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے لیکن اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ اس کا تعلق بھی عمل سے ہے بدون عمل وہ چنداں نافع نہیں مگر دیکھا جاتا ہے کہ طلباء میں علم کا ناز پیدا ہوگیا ہے اور وہ خیال کرنے لگے ہیں کہ یہ علم ہمارے لئے کافی ذخیرہ ہے اور ہم بحیثیت علم ایک بڑی حیثیت رکھتے ہیں عقائد تو ان کے درست ہوتے ہیں لیکن اعمال ان کے ٹھیک نہیں ہوتے غلطی یہ پڑی ہوئی ہے کہ وہ علوم وعقائد کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور عمل کی طرف توجہ نہیں کرتے میں ان کو بتلاتا ہوں کہ تم عقائد کے گھمنڈ میں عمل درست نہیں کرتے اور جو کچھ ہے عمل ہی ہے اگرچہ علم ومعرفت کے بعد ہی سہی۔ قنوج میں ایک صاحب عامل بالحدیث سے ملاقات ہوئی

مجھ سے کہنے لگے کہ اجی حضرت ہم صرف نماز ہی کے چند مسئلوں میں حدیث
پر عمل کرتے ہیں باقی معاملات میں حدیث کا نام بھی نہیں لیتے مثلاً میں
عطر بیچتا ہوں اور اس میں تیل بھی ملاتا ہوں۔ غرض عملاً ہم بہت کمزور
ہیں۔ اسی طرح ہم حنفی ہیں ہمارے عقائد درست ہیں لیکن اعمال کی شکایت
ہم میں بھی ہے حالانکہ عمل وہ چیز ہے کہ جس پر سب چیز موقوف ہے۔ ہرچند کہ
بعض علوم و معارف ایسے ہیں جن کا عمل سے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ
خود وہ علوم ہی مقصود معلوم ہوتے ہیں لیکن قرآن شریف اور احادیث
کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی غایت بھی عمل سے خالی نہیں۔
مثلاً خداوند تعالیٰ کلام پاک میں فرماتا ہے مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي
الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي
اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ (کوئی مصیبت
نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہے قبل
اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں اور یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے (یہ بات) بتلا اس وجہ سے دی تاکہ
جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں) اِس
آیت میں مسئلہ تقدیر کی تعلیم کی ہے یعنی جو کچھ مصیبت آفاقی یا انفسی
پہونچتی ہے وہ ہم نے پہلے سے لکھ رکھی ہے یہ ایک تعلیم ہے لیکن اس علم
میں بھی ایک عملی غایت موجود ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ
ہم نے تقدیر کی تعلیم کیوں دی اِس لئے کہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے فوت
ہو جائے اُس پر مغموم مت ہو اور جو چیز مل جائے اس پر شاداں نہ ہو
(مراد فرح کبر ہے) اِس تعلیم میں ایک یہ بھی بڑی خوبی ہے کہ خداوند تعالیٰ
نے بالکل طبیعت کے موافق بتلایا ہے۔ کیونکہ غم و رنج طبعی ہوتا ہے۔ اس
تعلیم سے غم کے موقع پر طبعاً تسلّی و تسکین حاصل ہو سکتی ہے اور حوادث
میں وہ سکون کا باعث ہو جاتی ہے تمام عقلاء جمع ہو کر بھی ایسی تدبیر

نہیں بتلا سکتے۔ غرض مسئلہ تقدیر کی ایک غایت تسلی و تسکین صبر و سکون بھی ہے چنانچہ لِكَيْلَا تَأْسَوْا (تاکہ تم اتراؤ نہیں) میں اس کی تصریح ہے اور یہ ایک ایسی غایت ہے جس کا فائدہ اظہر من الشمس (سورج سے زیادہ ظاہر) ہے۔ ایک مفروضہ واقعہ سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی خیال کیجئے کہ دو شخص ایک ہی جگہ کے ہوں دونوں کی ہر طرح سے یکساں حالت ہو لیکن فرق صرف یہ ہو کہ ایک ان میں تقدیر کا قائل ہو اور دوسرا تقدیر کا قائل نہ ہو اور دونوں کے دو لڑکے بھی یکساں ہوں دونوں نے یکساں تعلیم پائی ہو اور دونوں کے والدین نے یکساں تعلیم دی ہو دونوں کے والدین کی اُمیدیں ان سے وابستہ ہوں اتفاق سے دونوں لڑکے بیمار ہوں یکساں دونوں کا مرض ہو اور معالج بھی دونوں کا ایک ہی ہو ڈاکٹر کی غلطی سے علاج ناکافی ہو اور دونوں مَر جائیں دونوں کے والدین کو سخت رنج ہوگا لیکن دونوں کا فرق اس موقع پر تقدیر کے مسئلہ سے ہوگا جو شخص تقدیر کا قائل ہے اس کی زبان سے تو اس موقع پر بیساختہ یہ کلمہ جاری ہوگا لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا یعنی جو کچھ مصیبت آتی ہے وہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ خدا تعالیٰ کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے جو ایک لڑکے کو مار ڈالا تھا اس میں بہتری ہی تھی خداوند تعالیٰ بلا کسی حکمت کے کوئی کام نہیں کرتا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری والد کے انتقال پر ایک بدوی نے مجھ سے کہا۔

اِصْبِرْ نَكُنْ بِكَ صَابِرِيْنَ فَاِنَّمَا صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّاْسِ

آپ صبر کیجئے آپ بڑے ہیں اور ہم چھوٹے ہیں آپ کی وجہ سے ہم بھی صبر کریں گے۔

خَيْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهٗ وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِّنْكَ لِلْعَبَّاسِ

آپ کے والد کے مرنے سے کسی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ آپ کو اور انکو دونوں کو فوائد پہنچے آپ کو ثواب ملے گا جو عباس سے بہتر ہے اور عباس کو اللہ میاں مل گئے جو تم سے خیر ہے جب کسی کا نقصان نہیں ہوا تو غم کیسا۔ یہ مقولہ ہے ایک بدوی کا جو تقدیر کا قائل تھا دیکھو اس سے کیسی تسلی ہوسکتی ہے۔ دوسرا شخص جو تقدیر کا قائل نہیں ہے کہتا ہے کہ لڑکے کو ڈاکٹر کی بے تدبیری نے مارڈالا اگر ڈاکٹر تدبیر سے علاج کرتا تو لڑکا کبھی نہ مرتا۔ میں ڈاکٹر پر دعویٰ کروں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب پر دعویٰ دائر کردیا گیا اور بیچارے ڈاکٹر صاحب کو جیلخانہ ہوگیا لیکن وہ حسرت اب بھی موجود ہے کہ اگر علاج میں بے تدبیری نہ ہوتی تو لڑکا نہ مرتا اس سے معلوم ہوگا کہ تقدیر کا قائل ہونا کیا کام دیتا ہے کہ غم کی عمر دو تین ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوتی چنانچہ قائل تقدیر کا سکون غم کے ازالہ کا سبب بن گیا اور منکر تقدیر کا غم ہمیشہ باقی رہا۔ اسی طرح ہر علم اور ہر اعتقاد میں ایک غایت عمل کی ضرورت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ خداوند تعالےٰ آخر شب میں آسمان اوّل پر نزول فرماتے ہیں اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ حرکت خداوند تعالےٰ کے لئے خلاف ہے لیکن اعتراض کی نوبت کیوں آتی ہے۔ غایت عمل پر نظر نہ ہونے سے اگر غایت عمل پر نظر ہوتی یہ اعتراض ہی پیدا نہ ہوتا بلکہ یہ سنتے ہی عزم ہوتا کہ اس وقت توجہ الی اللہ (اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ) میں زیادہ اہتمام چاہئے کہ وقت قرب و قبول کا ہے اس کا پتہ مثال سے ملے گا کوئی حاکم دورہ پر ہو اور کسی جگہ سے قریب آجاوے اور لوگ آکر کہیں کہ فلاں حاکم یہاں سے ۶ میل کے قریب آگئے ہیں اور عنقریب آنا چاہتے ہیں اگر اس جگہ کے ملازم کہنے لگیں کہ کل تو اتنی دور تھے آج اس قدر مسافت طے کرکے کیونکر آئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ وہ لوگ کام نہیں کرتے اگر

وہ کام کرتے ہوتے تو قریب ہونے کی توجیہ نہ ڈھونڈتے بلکہ کام کی درستی کے اہتمام میں لگ جاتے اِسی طرح حدیث میں خداوند تعالیٰ کے قرب کو اِس لئے بتلایا جاتا ہے کہ قرب کے جان لینے سے تنبیہہ ہوگی اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور بزبانِ حال کہیں گے ؎

امروز شاہاں مہماں شدہ است مارا　　جبریل باملائک درباں شدہ است مارا

(آج بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا مہمان ہے جبرائیل معہ فرشتوں کے ہمارے دربان ہوئے ہیں)

مجھے حضرت مولانا مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حکایت یاد آئی حدیث پڑھی گئی تھی کہ جو شخص تازہ وضو سے دو رکعت نماز پڑھے اور ان رکعتوں میں حدیث النفس نہ کرے تو اس کے گذشتہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ ایک طالب علم نے کہا کہ حضرت ایسا ہو سکتا ہے کہ نماز میں خیال نہ آوے مولانا نے فرمایا کہ کبھی کر کے بھی دیکھا تھا یا ویسے ہی شبہ کرتے ہو غرض محض الفاظ کی توجیہہ کی تحقیق بیکاری کی علامت ہے عمل کو مقصود سمجھنا چاہئے۔ اور اِسی وجہ سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسا امر کبھی نہیں پوچھا اور نہ کبھی اعتراض کیا۔ ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے معراج میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں بزرگ نے کیا خوب جواب دیا ہے ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں　　بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(اب کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا؟)

کسی اور نے کہا ہے ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را　　چہ شناسی زبان مرغاں را

(تو نے جب سلیمان علیہ السلام کو دیکھا نہیں تو پھر پرندوں کی بولیاں کیسے سمجھے گا ۱۲)

عنقا شکار کس نشود دام چیں　　کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا جال پھیلانا اور کوشش کرنا لاحاصل ہے اسی طرح

ذات بحت کی کنہ کا ادراک نہیں کرسکتا اس لئے فکر و سوچ بیکار ہے)
وجہ یہ کہ تمہاری عقلوں کا جس قدر احاطہ ہے اللہ میاں کا احاطہ اُس سے بہت زیادہ ہے اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (اللہ تعالٰی ہر چیز پر محیط ہیں) محاط محیط کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ پانی کے کیڑوں میں سے ایک کیڑا سر نکال کر دیکھے کہ بڑے بڑے سامان ہیں خدا تعالیٰ کی حکمتوں سے جہان معمور ہے لیکن وہ سب کے اسرار کو کیا سمجھ سکتا ہے اِسی طرح محققین کی وصیت ہے ے

حدیث مطرب ومی گو و راز دہر کمتر جو ۔۔۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

(مطرب و مے یعنی عشق و محبت کی باتیں کر و زمانہ کے بھید اور اسرار کی ٹوہ میں مت لگو کیونکہ یہ عقدہ نہ کسی نے حل کیا نہ کرسکے گا)

اور اس مرض سے بڑھ کر علوم غیر شرعیہ کی تحقیق ہے نصوص شرعیہ سے جیسا آجکل جب کوئی مسئلہ سائنس کا سُنا اور اس کو قرآن مجید میں داخل کرنے کی کوشش کی بھلا قرآن مجید میں سائنس و فلسفہ کے مسائل ڈھونڈنا کواکب وغیرہ کی تحقیقات کرنا لغویات نہیں تو کیا ہے قرآن مجید میں اس کے متعلق اگر کچھ آیا ہے تو وہ توحید پر استدلال کرنے کے لئے آیا ہے تو اس غرض سے تفصیل کی حاجت نہیں بہت اجمال بھی کافی ہے حتیٰ کہ بدوی نے استدلال کیا ہے اَلْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ وَالْاَثَرُ يَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْرِ فَالسَّمَاءُ ذَاتُ الْاَبْرَاجِ وَالْاَرْضُ ذَاتُ الْفِجَاجِ كَيْفَ لَا يَدُلُّ عَلَى اللَّطِيْفِ الْخَبِيْرِ یعنی مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے (اور قدم چلنے والے کا پتہ دیتا ہے تو آسمان برجوں والا اور زمین راستوں والی کس طرح اللہ تعالیٰ کے وجود کا پتہ نہ دیں گے) یہ تمام چیزیں جو کائنات میں نظر آتی ہیں خدا تعالیٰ کے وجود پر کیسے دلیل نہ ہوں گی۔ قرآن مجید میں سائنس و فلسفہ کی تحقیقات دیکھنے کی مثال بعینہ ایسی ہی جیسی کوئی جوتی سینے کی ترکیب طب اکبر میں دیکھے قرآن مجید طب اکبر ہے جوتی سینے کی کتاب نہیں ہے قرآن مجید میں روحانی تربیت اور

اصلاح کے نسخے ملیں گے سائنس و فلسفہ کی لغویات سے اُسے کیا تعلق اگر بقدر ضرورت کسی سائنس کے مسئلہ سے توحید وغیرہ پر استدلال کیا گیا ہی تو اس میں کلام نہیں لیکن قرآن مجید کو سائنس کی کتاب سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔ صحابہ کا خدا تعالےٰ کی ذات وصفات پر بحث نہ کرنا امور کائنات کے متعلق کچھ دریافت نہ کرنا اِس امر کو بتلاتا ہے کہ یہ سب باتیں زائد از ضرورت ہیں ایک سچے مسلمان کو ایسی باتوں سے واسطہ کیا پس علوم وہی مقصود ہیں جن کی کوئی غایت عملی بھی ہو جیسا مسئلہ تقدیر و حدیث نزول الرب ہیں معلوم ہوا اِسی طرح توحید کی غایت میں خداوند تعالےٰ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ فرمایا ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ (کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے) اِس سورۃ میں خدا تعالیٰ کی ذات وصفات بیان کی گئی ہے اِس سے فائدہ یہ ہی کہ جس وقت خدا تعالےٰ کو ایسا سمجھو گے غیر خدا پر طمعاً و خوفاً نظر نہ ہو گی جس طرح حاکم کا مقرب رعایا سے نہیں ڈرتا اِسی طرح توحید پرست غیر خدا سے نہیں ڈرے گا۔ اکبر شاہ سے جنگل میں ایک گنوار سے دوستی ہو گئی اکبر نے گنوار کو گھر بلایا کہ اگر تمہیں کچھ ضرورت پیش ہو تو ہمارے پاس آ گنوار کو ایک مرتبہ کچھ ضرورت پیش آئی اور وہ اکبر شاہ کے پاس آیا دیکھا کہ اکبر شاہ نماز پڑھ رہے ہیں نماز پڑھ کر دُعا کی گنوار نے دیکھا کہ جب یہ خود خدا تعالےٰ سے مانگتے ہیں تو کیا میں نہیں مانگ سکتا اکبر شاہ سے کہا کہ تمہارے احسان کی ضرورت نہیں ہم خود اس سے مانگ لیں گے جو تم کو لاکھوں دیتا ہے وہ کیا مجھے نہ دیگا توحید کا یہ اثر ہوتا ہی کہ ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش | چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس | ہمیں ست بنیاد توحید بس

(یعنی موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ زر بکھیر لیا خواہ اس کے سر پر تلوار رکھیں اُمید

اور خوف اس کو بجز خدا تعالٰے کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے ۱۲)

اگر غور کیا جائے گا تو تمام مسائل اعتقادیہ میں علاوہ غایت نجات کے اور بھی بہت سی غایات عملی نکلیں گی پس جب علم کا عمل سے یہ تعلق ہے تو ضرور ہے کہ مسئلہ اثبات آخرت کے ساتھ جس کا بیان مولوی شبیر احمد صاحب نے کیا ہے اس کے اہتمام عمل کا مضمون بھی بیان کیا جاوے اس لئے میں نے اس آیت کو اختیار کیا ہے کہ یہ عمل کو بھی ضروری بتلا رہی ہے پس اس آیت (آیت مذکورۃ العنوان) میں حق تعالٰے نے شکایت کی ہے محبتِ دنیا کی اور آخرت کو چھوڑ دینے کی اور جب دنیا سے مراد یہ ہے کہ دنیا کو دین پر ترجیح دی جاوے اور آخرت کا خیال مطلقاً نہ رہے تو بعضے محبین دنیا اس کو مطلق کسب دنیا پر محمول کرکے اس تعلیم پر مضحکہ کرتے ہیں اور تعلیم کنندوں کی یہ مثال دیتے ہیں کہ ایک بادشاہ کے ہاں علماء کا دخل تھا بادشاہ ان کی مرضی پر چلتے تھے مولوی صاحبان نے کہا کہ بادشاہ سلامت یہ تمام فوج وغیرہ جو فضول جھگڑا لگا رکھا ہے اس سے فائدہ کیا بیکار مصارف ہیں مناسب ہے کہ تمام فوج موقوف کر دی جائے بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور تمام فوج کو موقوف کر دیا غنیم کو معلوم ہوا کہ فلاں بادشاہ نے فوج کو برخاست کر دیا ہے فوراً لشکرکشی کی اور سرحد کے قریب آپہنچا بادشاہ نے مولوی صاحب سے کہا کہ دشمن حملہ کرکے آپہنچا ہے مولوی صاحب نے کہا کہ ہم جا کر فیصلہ کئے دیتے ہیں چنانچہ گئے اور جا کر اس کو سمجھایا کہ یہ کام بہت بُرا ہے کسی کا ملک چھین لینا بڑے گناہ کا موجب ہے ایسا نہ چاہیے غنیم کہیں ایسی نصیحتوں سے باز رہ سکتا تھا ناکام واپس آئے اور بادشاہ سے کہا کہ صاحب وہ تو مانتا نہیں آپ ہی جانے دیجئے آپ کا ملک گیا اُس کا ایمان گیا۔ اسی طرح مولویوں کے کہنے پر چلے تو سارا گھر بار چھوڑ بیٹھے میں لقسم کہتا ہوں کہ اس الزام کی

وجہ صرف یہ ہے کہ علماء کی صحبت میں نہیں رہتے ان کے پاس رہنے کے لئے کچھ مدت تو نکالو زیادہ نہیں تو چالیس دن ہی سہی افسوس ہے اپنے جسمانی معالجہ کے لئے ملازمت سے بوضع تنخواہ رخصت لیتے ہیں گھر کا انتظام کرتے ہیں روپیہ خرچ کرتے ہیں جسمانی مرض کے لئے بیکار رہنا اور نقصان گوارا کرنا منظور ہے معالج ڈاکٹر کو سولہ روپیہ فیس کے دینے منظور لیکن روحانی مرض کے ۔ اسلئے کچھ بھی نہیں کرتے عربی حول سرجن (مولوی) کے پاس روحانی امراض کے معالج کے لئے بہت قلیل مدت چالیس دن اگر رہیں تو تمام اعتراضات وسوالات کے جواب ہوجائیں سب کام طلب اور ضرورت سے ہوتے ہیں چونکہ جسمانی امراض سے صحت مطلوب ہوتی ہے اُس کے لئے ہر قسم کے نقصان اور تکلیف گوارا کرتے ہیں اور روحانی مرض سے خود ہی شفا پانا مقصود نہیں ہوتا کاش وہ اس کے ازالہ کی بھی ایسی ہی تدبیریں کرتے کیا کسی محقق کے پاس چالیس دن رہ لینا بھی کوئی بڑا مشکل کام ہے انشاء اللہ تعالیٰ اس کی صحبت ہی تمام ترشبہات کے رفع کے لئے کافی ہوجاوے گی زیادہ قیل وقال کی حاجت نہ ہوگی بقول ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

(آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے بلاشبہ آپ سے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے)

اس کی دلیل یہی ہے کہ آزما کر دیکھ لو بقول مولانا ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب　　گر دلیلت باید از وے رومتاب

(سورج کا نکلنا ہی آفتاب کی دلیل ہے اگر تجھ کو دلیل کی ضرورت ہے تو اس سے منہ مت موڑ)

اور چالیس دن کی تخصیص جو میں نے عرض کی ماخذ اُس کا ایک حدیث ہے جس کا یہ مضمون ہے کہ جو شخص چالیس روز اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری کرتے ہیں

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

ہر مسلک محل

لیکن یہ شرط ہے کہ مولویوں کے پاس رہنا کسی دنیوی غرض سے نہ ہو ورنہ ہرگز فائدہ نہ ہوگا۔ جیسا ایک گنوار کا واقعہ ہے کہ ایک گنوار سے کسی مولوی نے کہا کہ اگر تو چالیس دن نماز پڑھ لے تو تجھ کو میں ایک بھینس دوں گنوار نے کہا بہت اچھا جب چالیس دن گذر گئے تو گنوار آیا اور کہا مولوی صاحب میں نے چالیس دن نماز پڑھ لی بھینس دلوا دیجئے مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے تو بھینس دینے کو صرف اس واسطے کہا تھا کہ تجھ کو نماز کی عادت ہو جائے گنوار نے کہا کہ تو جاؤ ہم نے بھی بے وضو ہی ٹرکائی تھی۔ اگر مولوی صاحب کی خدمت میں رہیں تو روٹی کھانے کی غرض سے نہیں بلکہ روٹی اپنے اپنے گھر سے کھا دیں تاکہ کچھ قدر بھی ہو۔ ایک مفید عام رسالہ میں نے حضرت کے حکم سے چھپوایا تھا میں چاہتا تھا کہ مفت دوں لیکن حضرت نے حکم دیا کہ مفت نہیں بقیمت دینا کیونکہ مفت کی قدر نہیں ہوتی۔ غرض اخلاص وعقیدت اور فراغت کے ساتھ کام کرنا چاہیے تاکہ کچھ مفید نتیجہ نکل سکے۔ کیرانہ (ضلع مظفر نگر) میں ایک شخص کو ایک تحصیلدار صاحب نے پیش کیا اور کہا کہ ان کو بڑے شبہ ہیں اگر آپ کچھ فرمائیں تو ان کی تسکین ہو جائے میں نے کہا کہ یہ میرے ساتھ چلیں اور چند روز وہاں رہیں شبہات خود بخود دور ہو جائیں گے عارف شیرازیؒ اس چالیس دن کے لئے فرماتے ہیں ؎

شنیدم رہروے در سر زمینے — ہمیں گفت ایں معما با قرینے

کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف — کہ در شیشہ بماند اربعینے

(یعنی کوئی سالک اپنے ہم نشین سے یہ معمہ کہہ رہا تھا شراب اس وقت صاف ہوگی جب چالیس دن شیشہ میں رہے)

پس چالیس دن تو شیشۂ قلب میں محبت الٰہی کی شراب کو بساؤ تمہارے قلب کا اطمینان ہو جائے گا۔ اگر بڑوں کے پاس رہنے کی ہمت نہ ہو تو

خدا کے لئے تم چالیس روز میرے ہی پاس رہ کر اِس سستے نسخہ سے فائدہ اُٹھا کر دیکھ لو غرض صحبت ہی سے یہ شبہ بھی جاتا رہے گا کہ مولوی لوگ کسب دنیا سے منع کرتے ہیں اصل یہ ہے کہ وہ جب دنیا سے روکتے ہیں جس کی مذمت اِس آیت میں ہے اور آیت سے حدیث حُبُّ الدُّنیا رأسُ کُلِّ خَطِیئَۃٍ (حُبِّ دنیا تمام گناہوں کی جڑ ہے) کی تصریح بھی ہوگئی۔ غرض ایک تو ہے کسبِ دنیا اور ایک ہے حُبِّ دنیا توکسب دنیا تو جائز ہے اور حُبِّ دنیا ناجائز اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو پاخانہ میں بضرورت طبیعت بیٹھنا اور ایک پاخانہ کو پیارا سمجھ کر اس میں جی لگا کر بیٹھنا۔ اوّل صورت جائز دوسری ناجائز۔ اِسی طرح دنیا کو کمانا تو جائز لیکن دنیا کو مرغوب و محبوب سمجھنا حرام۔ قرآن شریف میں ان ہی الفاظ سے تصریح کی گئی ہے یعنی کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ یعنی عاجلہ کو محبوب سمجھتے ہو اور آخرہ کو چھوڑے بیٹھتے ہو۔ اور اس خصوص میں ایک شبہ کا اِحتمال ہے یہ کہ بعضے آدمی یہ سُن کر کہ یہ آیت کفار کے متعلق ہے کہنے لگتے ہیں کہ کفار کے متعلق آیات ہیں ہم کو کیا تعلق ہے اِسی طرح اگر وہ کسی ترجمۂ قرآن میں دیکھ لیتے ہیں کہ یہ آیت مکّی نہیں تو وہ خیال کر لیتے ہیں کہ غیر مکّی آیت سے ہم کو کیا تعلق اِس لئے اِس موقع پر اس کے متعلق بھی کچھ بیان کر دینا ضروری ہے۔ خداوند تعالےٰ کو کسی کی ذات سے محبت و عداوت نہیں ہے بلکہ اس کی بنا اعمال خاصہ ہیں اور گو بعض احکام کا مورد اگرچہ خاص ہوتا ہے لیکن الفاظ کے عموم سے حکم ہوتا ہے اِس لئے کفار کی شان میں جو بعض آیات اُتری ہیں وہ اگرچہ باعتبار مورد کے خاص ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے۔ پس جس عمل پر کفار کی شکایت ہے اگر وہ عمل ہم میں بھی ہے تو ہم کو بھی سبق حاصل کرنا چاہیئے دوسرے اگر پھر بھی خاص ہی مانا جاوے تب اور

بھی زیادہ افسوس ہے ہم پر کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ کافروں کی خصلتیں ہم میں پائی جائیں پس ایسی حالت میں یہ شبہ کہ کفار کے متعلق آیات سے ہمیں کیا واسطہ کسی طرح گنجائش نہیں رکھتا بلکہ کفار کی شان میں جو آیات ہوں ان کا اثر ہم پر زیادہ ہونا چاہیئے غرض کفار پر جو طعن و ملامت اور شکایت ہے وہ ان کی ذات کی وجہ سے ہے یا فعل کی وجہ سے یہ امر سب جانتے ہیں کہ ان کی شکایت ذات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ فعل کی وجہ سے ہے۔ اگر تم مسلمان ہو تو ان آیات کو دیکھ کر جو کفار کی شان میں ان کے فعل کی وجہ سے ہیں عبرت حاصل کرو اور دیکھو کہ جو خصائل کفار کے تھے وہ آج ہم میں پائے جاتے ہیں افسوس کس قدر بڑی بات ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شریف کو چمار کہہ دیا جائے اُس کو بہت بڑا معلوم ہوگا لیکن اگر چمار کو چمار کہا جائے تو اُس کو خیال بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح کفار کو کافر کہہ کر خطاب کرنے سے جتنا اُنھیں خیال ہو سکتا ہے اس سے زیادہ ہمیں ہونا چاہیئے چنانچہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (جس شخص نے قصداً نماز ترک کر دی تو وہ کافر ہو گیا) میں یہی بات سمجھنا چاہیئے کہ تاویل بہ نسبت عدم تاویل کے اس خاص اعتبار سے زیادہ موجب ہے تغلیظ کو اور اس سے زجر و توبیخ اور بڑھ گئی ہے اور اشتداد کم نہیں ہوا ایک اور شبہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ترک آخرۃ پر جو ملامت ہے مراد اس سے ترک اعتقادی ہے یعنی انکار اور ہم خدا تعالےٰ کے فضل سے آخرت کے قائل ہیں پس خود لفظ ہی عام نہیں اور اس لئے اس کا مصداق ہم نہیں ہو سکتے جواب اس کا یہ ہے کہ اوّل تو یہ قید بلا دلیل ہے دوسرے اگر تسلیم بھی کیا جاوے تو دوسری بعض آیات عموم میں محکم ہیں تیسرے ظاہر لفظ سے تو شبہ اطلاق کا ہے اور جس دل میں درد ہوتا ہے وہ تو تھوڑے سے لفظی التباس سے بھی بےچین ہو جاتا ہے خفیف سا خفیف التباس بھی ان کی جان پر بنا دیتا ہے۔

ع عشق است و ہزار بدگمانی

(عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں)

لیکن اس کے لئے طلب کی ضرورت ہوتی ہے معترض خالی الذہن طلب سے دور ہیں حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ مشہور ہے کہ ایک کنجڑا ان کے سامنے سے گذرا اور آواز لگائی اَلْخِیَارُ الْعَشَرَۃُ بِدَانِقٍ یعنی دس ککڑیاں ایک دانگ میں یہ آواز سنتے ہی آپ کا ذہن "خیار" کے دوسرے معنی کی طرف منتقل ہوا یعنی خیر کی جمع آپ ایک چیخ مار کر بیہوش ہو گئے اور فرمانے لگے جب دس نیکیوں کی قیمت ایک دانگ ہے تو ہم بروں کی کیا قیمت ہے واقع میں کسی چیز کی فکر میں یہی حال ہوتا ہے خوب کہا ہے ؎

بسکہ درجان فگار و چشم بیدارم توئی   ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

(میری چشم و جان میں تو ہی سمایا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ ہی کو گمان کرتا ہوں)

ایک اور واقعہ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ جمعہ کے دن خطبہ پڑھ رہے تھے اور بعض لوگ پریشان پھر رہے تھے آپ نے ان کے بٹھلانے کے لئے ارشاد فرمایا اِجْلِسُوْا (بیٹھ جاؤ) اس وقت ایک صحابی دروازہ پر تھے جس وقت آپ کی مبارک زبان سے اِجْلِسُوْا (بیٹھ جاؤ) کا لفظ ان کے کان میں پہونچا اُسی وقت دروازہ ہی پر بیٹھ گئے ہر چند کہ یہ حکم ان کے لئے نہ تھا لیکن شدت اطاعت غالب آگئی اور گوارا نہ ہوا کہ آپ ایک حکم فرمائیں خواہ کسی کو سہی اور اس کی تعمیل نہ کی جائے مسلمانو! تم میں ذوق اور محبت نہیں طلب صادق تم میں نہیں پائی جاتی اگر محبت و طلب ہوتی تو ہرگز ایسے شبہات و اعتراضات پیش نہ آتے۔ حق یہی ہے کہ اس آیت (مذکورۃ العنوان) میں خداوند تعالےٰ کا مقصود مطلقاً حب عاجلہ اور ترک آخرت پر شکایت کرنا ہے اور اس کے مختلف مراتب ہیں جس مرتبہ کی حُبِّ دنیا ہوگی اسی درجہ ترک آخرۃ ہوگی اور ویسی

ہی ملامت ہوگی اگر حُبِّ دنیا و ترک آخرۃ مرتبہ اعتقاد میں ہو یعنی آخرۃ کا انکار ہے تو ابدالآباد تک جہنّم میں رہے گا کیونکہ کفر ہے اور اگر آخرۃ کا اعتقاد تو ہے لیکن عمل نہیں تو فسق ہے اور عذاب محدود کا استحقاق غرض جس طرح عقیدہ ضروری ہے اُسی طرح عمل بھی اور یہ عقیدہ مرجیہ کا ہے کہ عقیدہ درست ہونا چاہیے عمل کی ضرورت نہیں ہے عمل اور ایمان دونوں اپنے اپنے درجہ پر ہیں ہم چونکہ اہلسنت وجماعت ہیں اس لیے دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ہر چند کہ دوسرا مرتبہ اور اس کی شکایت اوّل درجہ پر نہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا لیکن یہ مرتبہ بھی چھوٹا نہیں خاطر جمع نہ ہوجے بلکہ اگر یہ صغیرہ بھی ہوتا تب بھی بیفکری کی چیز نہ ہوتا خیال کیجئے کہ چھوٹی سی چنگاری کیا گل کھلاتی ہے صغیرہ گناہ پر بھی جرأت کرنا بڑا زیان ہے اگر صغیرہ کوئی بڑی بات نہیں ہے تو جو صاحب یہاں سے جائیں وہ اپنے گھر جاکر چھت میں ذراسی چنگاری آگ کی رکھ دیکھیں کہ وہ تھوڑی دیر میں کیا اثر دکھاتی ہے۔ اِسی طرح چھوٹا سا گناہ بھی تمام نیکیوں کو برباد کرسکتا ہے جس طرح کہ چھوٹی سی چنگاری سارے گھر کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے اور دوسرا درجہ ترک آخرت کا اگرچہ معصیت ہے کفر نہیں اور معصیت کا درجہ کفر سے کم ہے لیکن اس پر عمل کرنا بھی تو سخت ظلم ہے اور کفر کے مقابلہ میں کم ہونے سے اس کا فی نفسہٖ صغیرہ ہونا لازم نہیں آتا مولانا کی ایک مثال مجھے یاد آئی فرماتے ہیں ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود　　لیک بس عالیست پیش خاک تود

یعنی آسمان گو عرش سے چھوٹا ہے مگر زمین سے تو بڑا ہے اگر کوئی شے درجہ میں چھوٹی ہو تو یہ لازم نہیں کہ وہ فی نفسہٖ بھی چھوٹی ہو۔ اور بعضے مدعی تو ہیں اعتقادًا ماننے کے مگر واقع میں وہ مِنْ حَیْثِیَّتِ الْمَذْہَب (دین کی حیثیت سے) نہیں مانتے بلکہ قومیت کی حفاظت کے لیے مانتے ہیں۔ مذہب چونکہ

ایک ایسی چیز ہے جو تمام افراد کو متحد بنا سکتا ہے اِس وجہ سے اُس کو اختیار کر لیا ہے اگر ان کی یہ غرض کسی اور مذہب سے حاصل ہوتی تو وہ ہرگز مسلمان نہ ہوتے۔ ایک اخبار میں یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ اب چونکہ ترقی کا زمانہ ہے اِس لئے وحشیانہ خیالات کو چھوڑ دینا چاہیے اور سب ایک ایسے نقطۂ خیال پر قائم ہو کر ایک مذہب اختیار کر لینا چاہیے اور اس کی صورت یہ ہے کہ توحید کو اختیار کر کے اس کو اصل مذہب قرار دیں اور اعتقاد رسالت کو بھی چھوڑ دیں افسوس! مسلمان اور یہ رائے ؎ از مذہب من گبر و مسلماں گِلہ دارد (میرے مذہب سے گبر و مسلمان گلہ کرتے ہیں)

ایک ایسے ہی شخص کے جواب میں میں نے کہا کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو تو تسلیم کرتے ہو اور توحید یہی ہے کہ اُس کو ذات و صفات میں کامل اور متوحد خیال کیا جائے اور منجملہ کمالات کے صدق بھی ہو جھوٹ بولنا بڑا نقص ہے پس اعتقاد کذب منافی توحید ہوگا اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ پس جو شخص رسالت کا منکر ہوگا وہ توحید ہی کا منکر ہوگا پس ثابت ہوا کہ توحید کا قائل ہوگا لازم ہے کہ رسالت کا بھی قائل ہو مگر ایسے قوم پرست رسالت ہی کا خاتمہ کیے دیتے ہیں اور ایسے لوگ اگرچہ بعض اوقات اسلام کی کچھ خدمت بھی کرتے ہیں لیکن خدمت ہمارے نزدیک اِس لئے قابل قدر نہیں کہ ان کا مقصود خود خدمت مذہب نہیں ہے بلکہ محض ترقی قوم مقصود ہی اور اگر اسلام کو سچا سمجھ کر اس کی خدمت کی جاتی تو ان کے آثار سے اس کی جھلک معلوم ہوتی لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں۔ چنانچہ عقائد اسلام پر جرح کی جاتی ہے اہل دین کو حقیر سمجھا جاتا ہے مسائل اسلام میں شبہات پیدا کیے جاتے ہیں۔ اگر حق سمجھ کر دین مذہب کی خدمت کی جاتی تو ان باتوں کی کہاں نوبت آتی ان کی غرض تو صرف قومیت کا بڑھانا

اور قومیت کو نشو و نما بخشتا ہے جس طرح دوسری قومیں ترقی اور نشو و نما حاصل کر رہی ہیں۔ ترقی کی دوڑ میں سب سے آخیر میں مسلمان جاگے لیکن ایسے جاگے کہ سوتے ہی رہتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ غرض ترک آخرت کے مراتب مختلف ہیں اور اس کے اعتبار سے آجکل چند قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ (۱) پرانی وضع کے اُمراء جو عام قسم کی بُرائیوں میں مبتلا پائے جاتے ہیں اگرچہ آسائشی زندگی نے انھیں ایسا بنا دیا ہے کہ اُن کی عملی زندگی بہت خراب ہے لیکن وہ بایں ہمہ جب علماء و صلحاء کو دیکھتے ہیں تو دل سے تعظیم بجا لاتے ہیں اور جھک جاتے ہیں اور یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ اللہ والے ہیں ان کا ادب کرنا چاہئے ادب کرتے ہیں حتیٰ کہ محض درویش صورتوں تک سے ڈرتے ہیں خدمت کرتے ہیں اگرچہ وہ رہزن ہی کیوں نہ ہوں اور واقع میں یہ دنیادار لوگ ان درویشوں سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ میرے ایک عزیز بیان کرتے تھے کہ فلاں جگہ کے اُمراء تمام جنتی ہیں اور فقراء دوزخی کیونکہ اُمراء تو فقراء سے دین کے لئے تعلق رکھتے ہیں اور فقراء اُمراء سے دنیا کا تعلق رکھتے ہیں۔ ایک حکایت کسی پیر مرد کی مشہور ہے کہ مرید نے پیر سے خواب بیان کیا دیکھتا ہوں کہ میری اُنگلیاں پاخانہ میں بھری ہوئی ہیں اور آپ کی اُنگلیاں شہد میں پیرجی نے کہا ہاں ٹھیک تو ہے اس میں شک ہی کیا ہے ہم ایسے ہی ہیں اور تو ایسا ہی ہے۔ مرید نے کہا ابھی خواب پورا نہیں ہوا یہ بھی دیکھا کہ میں تمہاری اُنگلیاں چاٹ رہا ہوں اور تم میری اُنگلیاں چاٹ رہے ہو پیر بہت خفا ہوئے۔ اِس حکایت کا وہی حاصل ہے کہ مرید تو پیر سے دین حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ مشابہ شہد کے ہے اور پیر مرید سے دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے کہ مشابہ پاخانہ کے ہے (۲) وہ لوگ ہیں جن کے دل میں اِسلام کی وقعت و عظمت ہی نہیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کا علاج

موت کو یاد کرنا ہے علم و اعتقاد تو تھا ہی عمل کی کمی تھی اِس وجہ سے موت کی یاد ان کے لئے عبرت بخش ہوگی چنانچہ فرمایا گیا ہے اَکْثِرُوْا ذِکْرَھَا ذِمِ اللَّذَّاتِ موت کو اکثر یاد کیا کرو موت کے خیال اور مراقبہ سے بہت جلد اِصلاح ہو جائے گی علاوہ ازیں فرمایا گیا ہے کہ اگر بیس مرتبہ روزانہ موت کو یاد کیا کرے تو شہادت کا مرتبہ حاصل ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف موت کا نام لے لیا کرو بلکہ غرض یہ ہے کہ موت کو اِس طرح یاد کرو کہ گناہوں سے بچانے کا سبب بن جائے۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ وہ کسی محقق کی خدمت میں رہیں خدا کے لئے مسلمانو! رحم کرو تم نہایت خطرناک حالت میں ہو تمہاری اِصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ اب معلوم کرنا چاہیئے کہ جس طرح اہل دنیا کی یہ قسمیں ہیں اسی طرح اہلِ دین باعتبار ترک آخرت کے دو قسم پر ہیں اہلِ ظاہر و اہلِ باطن۔ ظاہر دینداروں میں یہ کمی ہے کہ بعض اعمال آخرت کے جن کے ترک کو وضع کے خلاف نہیں سمجھتے انھوں نے چھوڑ رکھے ہیں۔ اور مضرات آخرت میں مبتلا ہیں مثلاً غیبت کرنا جو بلائے عام ہونے کے سبب مخل تقویٰ ہی نہیں سمجھا جاتا جیسا بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ فسق و فجور سے بھی نہ ٹوٹتا تھا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو   پیش مرد کامل پامال شو

(قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جاکر پڑجاؤ گے)

اور بدون اس کے تو اکثر حالت یہ رہتی ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب منبر می کنند   چوں بخلوت می رسند ایں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس   توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

(یہ واعظین جو محراب و منبر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں جب خلوت میں پہونچتے ہیں اور دوسرا کام کرتے ہیں مجھ کو ایک اشکال ہے دانشمند مجلس سے پوچھو توبہ کی نصیحت کرنے والے خود توبہ کیوں نہیں کرتے)

یہ تو خرابی واعظوں میں ہے ایک خرابی تارکین وعظ میں اس سے بڑھ کر ہے وہ یہ کہ بعضے لوگ اس لئے خود وعظ نہیں کہتے کہ خود عامل نہیں اس میں دوگناہ ہیں ایک تو خود عامل نہ ہونا اور عمل کرنے کی کوشش نہ کرنا دوسرے اور لوگوں کو بھی تبلیغ نہ کرنا بعض اہل علم دولتمندوں کے پاس پڑے رہتے ہیں اور لالچی وطماع ہو جاتے ہیں یہ بڑی بات ہے جو لوگ اچھے ہوتے ہیں وہ دولتمندوں سے ہمیشہ متنفر رہتے ہیں بِئْسَ الْفَقِيْرُ عَلٰى بَابِ الْاَمِيْرِ وَنِعْمَ الْاَمِيْرُ عَلٰى بَابِ الْفَقِيْرِ (فقیر امیر کے دروازہ پر جائے وہ برا ہے اور امیر جو فقیر کے دروازہ پر ہو وہ اچھا ہے) اسی لئے وہ حق نہیں کہہ سکتا کیونکہ طمع ان کو مانع ہوتی ہے ؎ طمع بگسل و ہرچہ خواہی بگو (لالچ کو چھوڑ دو جو چاہو کہو) شاہ سلیم کا واقعہ ہے کہ شاہجہاں ان کے پاس آئے تو انھوں نے پاؤں بھی نہ سمیٹے جو کسی نے پوچھا تو فرمایا کہ جب سے ہاتھ سمیٹا پاؤں پھیلا دیا۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے لکھنؤ کے ایک شاہزادہ حاضر ہوئے اور زمینی سلام کیا آپ نے انگوٹھا دکھا دیا اُس نے اشرفی نذر دی آپ نے منہ چڑا دیا مولانا نے ایسا قصداً کیا تھا کیوں؟ اس لئے کہ اہل دنیا تنگ نہ کریں اور غیر مہذب سمجھ کر وہ پاس نہ آئیں تاکہ دنیا داروں کے جھگڑوں سے نجات ہو یہ سب بے طمعی کے سبب تھا۔

پس جب مال کا علاج ایسے اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنا ہے اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنے سے مال و دولت سے محبت دور ہو جاتی ہے اور غناء باطنی حاصل ہوتا ہے یہ کمی تھی اہل ظاہر میں اس سے اہل باطن خوش ہو رہے ہوں گے کہ ہم میں کوئی کمی نہیں اور نہ کوئی خرابی ہو لیکن ان کو واضح رہنا چاہئے کہ لطیف غذا جب بگڑتی ہے تو سب سے ہی زیادہ گندی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیوں کا بگڑنا ہے ان میں جو بگڑتے ہیں ان میں بدخلقی بدمزاجی وغیرہ ایسی بری باتیں پائی جاتی ہیں حالانکہ

درویشوں میں ان امور کا پایا جانا نہایت ہی مستنکر ہے۔ حضرت قبلہ و کعبہ کی تعلیم بتلاتا ہوں حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ بعض درویش اُمرار کی تحقیر کرتے ہیں یہ ہمیں پسند نہیں جب امیر تمہارے دروازہ پر آگیا تو حسب قول نِعْمَ الْاَمِیْرُ عَلٰی بَابِ الْفَقِیْرِ (امیر اچھا ہے فقیر کے دروازہ پر) وہ نعم الامیر میں داخل ہو گیا اس لئے اس سے اخلاق برتنا چاہیئے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سب سے ملتے اور سب کی تعظیم کرتے تھے نَزِّلُوا النَّاسَ مَنَازِلَھُمْ ہمارے لئے حکم ہے یعنی لوگوں کو ان کے مرتبوں کے موافق بٹھاؤ میرا خیال ہے کہ خدا تعالےٰ جس کو بڑا بنائے جیسے امرار اس کو تم بھی بڑا سمجھو البتہ خوشامد و طمع سے دور رہو اور خوش اخلاقی برتو مگر افسوس ہی کہ جو خوش اخلاق بنے ہیں وہ امرار سے خود ملتے نہیں امرار کے گھروں پر جاتے نہیں تو ایسوں سے بھلا ان کی اصلاح کیونکر ہو ئیں نہ تو خود ان کے گھر جائیں اور نہ ان کو اپنے آنے سے روکیں بلکہ اگر وہ آئیں تو ان سے ملنے میں عذر نہ کریں کیونکہ ان کی اصلاح بھی تمہارا فرض ہی۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بعض امرار اور دنیا دار علمار کی جو شکایت کیا کرتے ہیں وہ خود ہماری اصلاح کے لئے ہمارے پاس کیوں نہیں آتے یہ شکایت بیجا ہے انھیں غور کرنا چاہیئے کہ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے کنوئیں پیاسوں کے پاس نہیں آیا کرتے علمار کو تمہاری ضرورت نہیں تم کو علمار کی ضرورت ہے تم ان کے پاس جاؤ کیا کبھی سول سرجن بھی بغیر بلائے اور فیس لئے تمہارے گھر آیا ہی اس خیال سے اگر میری رائے میں مولوی بھی اپنی فیس مقرر کر دیں تو اچھا ہے لیکن ابھی مولوی جلدی نہ کریں کہیں میری رائے ظاہر ہوتے ہی فیس لگا دیں بلکہ ابھی کچھ انتظار کریں ابھی اس کا موسم نہیں آیا ہے یہ عیب مذکور بدمزاجی کا تو دنیا دار درویشوں میں ہے دوسرا عیب جو سچے صوفیوں میں تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ (یعنی دنیا عاجلہ کو اختیار کرتے ہیں) ہے وہ دقیق ہے وہ یہ کہ ذرا سا

کام کر لینے کے بعد اس امر کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی کیفیت پیدا ہو اور جب کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو پیر صاحب سے شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے ورد پڑھا سب کچھ کیا لیکن ابھی تک کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوئی یہ بھی حُبّ عاجلہ (دنیا کی محبت) میں داخل ہے کیونکہ کیفیت ثمرہ عاجلہ ہے جو موعود بھی نہیں اصل موعود و مقصود ثمرہ آخرت کا ہے کہ وہ نجات اور رضا ہے پس یہ بھی بڑی کمی ہے جس پر نظر ہی نہیں ہے اس کا علاج نقل کرتا ہوں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اگر کوئی آکر کہتا کہ حضرت اللہ کے نام سے کچھ فائدہ نہیں ہوا آپ جواب میں فرماتے کہ یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اللہ کا نام لیتے ہو۔ ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　　ویں نیاز و سوز درد دل پیک ماست

(تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک (میں حاضر ہوں) ہے اور تیرے دل میں یہ نیاز و سوز ہمارا قاصد ہے)

نیز حضرت نے فرمایا کہ تم کسی امیر کے گھر جاؤ جو تمہارا آنا پسند نہ کرے تو وہ کان پکڑ کر نکال دیگا پس جب مسجد میں جاتے ہو اور وہاں سے نہیں نکالے جاتے تو سمجھو کہ حاضری مقبول ہے چنانچہ غیر مقبولین کو حاضری کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ ایک واقعہ ہے کہ کسی امیر کے غلام نے نماز کے وقت مالک سے اجازت چاہی مالک نے کہا اچھا غلام مسجد میں چلے گئے اور مالک دروازہ پر بیٹھے رہے غلام کو بہت دیر ہوگئی اور مالک نے مجبور ہو کر پکار کر دریافت کیا کہ اتنی دیر سے کیا کر رہے ہو غلام نے کہا کہ باہر آنے نہیں دیتا مالک نے کہا کون باہر آنے نہیں دیتا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا۔ ایک شخص نے ایک محقق سے کہا کہ اتنے دن ہوئے ذکر و شغل کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا جواب میں فرمایا کہ اگر نفع بھی نہ ہو تو کچھ پروا نہیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ مالک کسی غلام سے کوئی کام لے اور وہ مالک سے کہے کہ کیا ملے گا؟ کیا غلام کا یہ جواب گستاخی نہ ہوگا۔ اسی طرح ہم خدا تعالیٰ کے غلام ہیں ہمیں کیا حق ہے کہ ہم اُس سے کچھ معاوضہ مانگیں۔ بوستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص عبادت کرتا تھا آواز آئی کہ

قبول نہیں ہوتی مگر وہ عبادت میں مشغول رہا ایک مرید نے پیر سے کہا کہ ایسی عبادت سے کیا فائدہ جو مقبول نہیں ہوتی پیر نے کہا اے برخوردار ے

توانی ازاں دل بہ پرداختن — کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

(اس سے دل اٹھا سکتا ہے کہ جان لے کہ بغیر اس کے دوسرے سے موافقت کرسکتا ہے)

اگر دوسرا اور دروازہ ہوتا تو میں وہاں چلا جاتا دروازہ یہی ایک ہے اس سے علیحدہ ہو کر کہاں ٹھکانا ہے اس پر فوراً آواز آئی ے

قبول است گرچہ ہنر نیست است — کہ جز ما پناہِ دگر نیست است

(قبول ہو اگرچہ تیرا ہنر نہیں کیونکہ سوائے ہمارے تیرے لئے دوسری پناہ نہیں ہے ۔۱۲)

کانپور میں ایک بزرگ تھے شاہ غلام رسول رسول نما وہ اپنی توجہ سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مقبول کی زیارت کرا دیتے تھے ان کے علاوہ اور بھی ایسے لوگ گذرے ہیں وہ لکھنؤ اپنے مرشد کے پاس گئے بیعت ہونے کے لئے مرشد نے استخارہ کے لئے فرمایا شاہ صاحب وہاں سے تھوڑی دور ہٹ کر جا بیٹھے پھر حاضر ہوگئے مرشد نے کہا یہ کیسا استخارہ تھا۔ کہا کہ میں نے بیعت ہونے کے لئے نفس سے کہا بیعت بک جانے کو کہتے ہیں تو آزادی کو چھوڑ کر غلام بنتا ہے کیوں بیوقوف ہوا ہے نفس نے جواب دیا کہ بک جانے کے بعد خدا تعالیٰ تو ملے گا میں نے کہا کہ کیا تیرا اجارہ ہے اگر نہ ملا نفس نے کہا اگر نہ ملے گا تو بلا سے مگر اُسے خبر تو ہوگی کہ ہم کو کسی نے طلب کیا تھا مگر ہم نہ ملے ے

ہمینم بس کہ داند ماہرویم — کہ من نیز از خریداران اویم

(یہی مجھ کو کافی ہے کہ محبوب کو علم ہوجائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں۔)

مولوی صاحب نے فرمایا جز اک اللہ ایسا استخارہ کسی نے نہیں کیا۔ ہر کام میں مقصود کام ہی ہونا چاہیے خواہ ثمر ملے یا نہ ملے ہر حالت میں راضی رہنا چاہیے اگر ایسا نہ کیا گیا تو تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (دنیا کو دوست رکھتے ہو) میں من وجہہ داخل ہوگی مسلمانو! آخرت کے لئے عمل کرو ورنہ اس شکایت میں داخل ہو جاؤ گے ۔ تمام شد

۲۰۱

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رواہ البخاری

وعظ

مسمّٰی بہ

الاتّفاق

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الاتِّفاق

اشتات	المستمعون	من ضبط	لِم	من ای بیان	ماذا	کیف	کم	متیٰ	این
متفرقات	سامعین کی تخمینی تعداد	کس نے لکھا	کیوں بیان ہوا	کس طبقہ کو زیادہ مفید ہے	کیا مضمون تھا	کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
[illegible]	۲۰۰	[illegible]	[illegible]	تعلیم یافتہ حضرات کو	اتفاق کے اسباب کی تحقیق	بیٹھ کر	۲ گھنٹے ۱۰ منٹ	۱۰ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ	جامع مسجد تھانہ بھون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَھُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ؕ (بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے تو عنقریب اللہ تعالےٰ ان کے لئے محبت پیدا کردیں گے) یہ آیت سورۂ مریم کی ہے۔ مجھ کو اس سے ایک ضروری مضمون کا بیان کرنا مقصود ہے اور خود اُس کی ضرورت تو پہلے سے سب ہی کے نزدیک مسلّم ہے۔ مگر بیان کی ضرورت ذہن میں ابھی آئی ہے میں گڈھی پختہ گیا تھا اُس کے متصل حسن پور ہے وہاں بھی جانا ہوا اور

وہاں وعظ بھی ہوا تھا۔ عین بیان کے وقت اِس مضمون کی ضرورت بھی ذہن میں آئی چنانچہ کچھ ناتمام سا بیان بھی کیا۔ ارادہ یہ تھا کہ اس مضمون کو کسی موقع پر مستقلاً بیان کروں گا۔ آج بیان کا ارادہ نہ تھا لیکن بعض احباب اور بعض اعزا تشریف لے آئے اور زبانِ حال سے اُن کی فرمائش اور اشتیاق ظاہر ہوا۔ اِس لئے دل چاہا کہ اُس مضمون کو آج بیان کر دوں لیکن یہ سوچتا تھا کہ اُس مضمون کو کسی آیت یا حدیث سے بیان کروں کوئی آیت یا حدیث ایسی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ مضمون اُس کا مدلول صریح ہو۔ جمعہ سے پہلے غسل وغیرہ کی تیاری میں پھر رہا تھا کہ اِتفاقاً یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے قلب پر جاری ہوگئی لیکن اِس خیال سے نہیں کہ اِس مضمون سے اُس کا تعلق ذہن میں آیا ہو اِس طور سے کہ ہر مسلمان کو خالی وقت میں شوق میں کسی آیت یا حدیث کے بیان سے تکرار کرنے کی توفیق ہو ہی جاتی ہے عین تلاوت کے وقت تو کچھ خیال نہیں آیا بعد میں دفعۃً ذہن منتقل ہوا کہ یہ تو میرے مقصود پر صریح دال و ناطق ہے۔ میں نے اس کو مِنجانب اللہ سمجھا اور اس کو اپنے مضمون مقصود کا متمسک بنایا۔ رہا یہ کہ وہ مضمون کیا ہے سو وہ نفس ترجمہ سے ذہن میں نہ آویگا۔ مگر برکت کے لئے اول ترجمہ کسی قدر تفسیر کے ساتھ کئے دیتا ہوں حق تعالٰی فرماتے ہیں کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے عنقریب اللہ تعالٰی ان کے لئے محبّت پیدا کر دیں گے یعنی ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے لئے اللہ تعالٰی ایک وعدہ فرماتے ہیں اور وعدہ بھی قریب کا۔ گو یہ آخرت کا وعدہ بھی ہوسکتا ہے کہ آخرت بھی قریب ہی ہے مگر سَیَجْعَلُ کے س سے متبادر یہی ہے کہ دنیا کا وعدہ ہے۔ کیونکہ قرب متعارف دنیا ہی کو ہے چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کام جلدی ہو جائے گا تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہو جائیگا۔ پس ہم کو بِنَاءً عَلَى الْقَوَاعِدِ اللِّسَانِيَّةِ (زبان کے قواعد کی بنا پر)

یہ حق حاصل ہے جس شے کی نسبت حق تعالیٰ جلدی ہو جانے کا وعدہ فرماویں اُس کو دنیا کے وعدہ پر اور دنیا میں بھی بہت جلد حاصل ہو جانے پر محمول کرلیں بہر حال ایمان اور عمل صالح پر وعدہ وُدًّا کا جس کا نام محبت ہے فرماتے ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح والوں کی محبّت اللہ تعالےٰ پیدا کردیں گے۔ اِس مقام پر اہلِ علم اس کو یاد رکھیں کہ میں نے اِس حاصل ترجمہ میں وُدّ کو مصدر مبنی للمفعول یعنی مصدر مجہول لیا ہے۔ آگے چل کر یہ بات کام آوے گی۔ یہ تو ترجمہ ہوا آیت کا۔ اِس ترجمہ سے وہ مضمون ذہن میں نہ آیا ہو گا۔ قبل اس کے کہ میں آیت سے اپنا مضمون مقصود اِستنباط کروں اوّل اُس مضمون کی تعیین کردوں اور اس سے بھی اوّل سمجھنا چاہیئے کہ وہ مسئلہ جس طرح قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہے اسی طرح وہ تمدّن کا بھی مسئلہ ہے بلکہ تمدّن پرستوں کے نزدیک تو تمامی مسائل تمدّن کا وہی اصل الاصول اور راس اور اساس ہے اور ان کا کوئی لکچر و تقریر اس سے خالی نہیں ہوتا وہ مسئلہ کیا ہے اِتفاق ساری دنیا اس کی دعوت دیتی ہے خواہ اس کی حقیقت سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں لیکن اس پر اتفاق ہے کہ اتفاق ضروری ہے اور تمدّن کے تمام اُصول اس پر موقوف ہیں۔ کوئی اصل تمدّن کی بغیر اس کے بار آور نہیں ہو سکتی۔ ہر چند کہ اب شہرت کی وجہ سے یہ مسئلہ باوقعت نہیں رہا لیکن حقیقت کے اعتبار سے اب بھی اُمہات مسائل سے ہے خصوص تمدن کو اس کے ساتھ بہت ہی بڑا علاقہ بلکہ اس کا (مسائل کے اُصول) موقوف علیہ اور مبنیٰ ہے۔ پس میں اس مسئلہ کو اِس آیت سے بیان کرنا چاہتا ہوں اور اس کے سننے کے بعد یہ بھی معلوم ہو جاوے گا کہ قرآن مجید ہی وہ شے ہے کہ ہم کو ہر موقع اور ہر شے میں اس کی ضرورت ہے کوئی حالت ہماری ایسی نہیں کہ ہم کو اس کی ضرورت نہ ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کپڑا بننے کی ضرورت ہو یا مکان بنانے کی ضرورت ہو یا

کوئی مشین چلانے کی ضرورت ہو تو اُس کا بھی طریقہ قرآن مجید میں مذکور ہے ہم اِس کا دعویٰ نہیں کرتے اور نہ ہم سب اس کو نباہ سکتے ہیں اگرچہ بعض لوگوں نے اِس کا بھی التزام کیا ہے چنانچہ شیخ محی الدین بن عربی رحمہ اللہ کی ایک کتاب ہے شجرہ نعمانیہ اُس کا نام ہے۔ اُنھوں نے اپنے زمانہ سے لیکر نفخ صور تک کے حالات صرف سورۃ روم کی اوّل آیات سے لکھے ہیں اور اس میں علم جفر و تکسیر وغیرہ سے کام لیا ہے حروف کے اعداد لیکر اُن کے اندر کچھ قواعد جاری کئے ہیں۔ اصل میں تو واقعات انکو منکشف ہوئے ہیں انھوں نے خاص ذوق و سلیقہ سے ان آیات سے ان کو چسپاں کر دیا ہے اور یہ سب رموز ہیں پھر اُس کی شرح بھی خود ہی لکھی ہے وہ بھی رموز میں ہے پھر کسی بزرگ نے اس کی شرح کی بھی شرح لکھی ہے لیکن وہ بھی رموز اور اشارات میں ہے باوجود اِس قدر اخفاء کے پھر ڈر ہوا ہے کہ کوئی سمجھ کر ظاہر نہ کر ڈالے اِس لئے ماتن اور شارح دونوں نے بے انتہا قسمیں دی ہیں کہ اگر کوئی ان کو سمجھ جاوے تو منہ پر نہ لاوے۔ بعضوں نے اور علوم بھی قرآن مجید سے نکالے ہیں اور اسی بناء پر بعض لوگوں نے کہا ہے ؎

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِنْ تَقَاصُرُ عَنْہُ اَفْہَامُ الرِّجَالِ

(قرآن پاک میں جملہ علوم ہیں لیکن لوگوں کی عقل و فہم وہاں تک پہونچنے سے عاجز ہیں)

مگر میں کہتا ہوں ؎

ومن دیدنی حب الدیار لاھلہا وللناس فیما یعشقون مذاہب

(کون شخص جو دیار محبوب کو ان کے اہل کے لئے قریب کردے لوگوں کے عشق کے بارہ مختلف طرق ہیں)

ہر شخص کا مذاق جُدا ہے۔ ہمارا مذاق تو اس کے خلاف ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کتاب کا کمال اس کے موضوع کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی جس فن کی وہ کتاب ہے اُس فن میں یکتا ہونا اور زوائد سے خالی ہونا یہی

اس کی خوبی ہے۔ طبِ اکبر کی یہ خوبی نہیں ہے کہ اُس میں غیر طب کے بھی مسائل ہوں مثلاً صرف و نحو کے مسائل اُس میں مذکور ہوں اُس کا کمال تو یہ ہے کہ اُس میں طب کے مسائل خوبی سے درج ہوں۔ ہاں اُن کے ضمن میں یا اُن مسائل کی تتمیم کے لئے اگر دوسرے فن کے مسائل آجاویں تو مضائقہ نہیں جیسے نفیسی کی کلیات میں فلسفہ سے کام لیا گیا ہے۔ پس قرآن مجید ایک طب کی کتاب ہے۔ آپ کو یہ جملہ سُنکر شاید شبہ ہوا ہوگا کہ قرآن مجید میں گل بنفشہ کا تو کہیں ذکر نہیں پھر اس کو طب کیسے کہہ دیا۔ صاحبو! میری مراد طب سے طب جسمانی نہیں ہے۔ طب روحانی ہے یہ طب وہ ہے جس کی نسبت فرماتے ہیں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں　　حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں

(تم کب تک حکمت یونانی کی کتابیں پڑھوگے حکمت ایمانی و معرفت کی بھی کتابیں پڑھو)

آگے دونوں طبوں کی غایت بیان فرماتے ہیں ؎

صحت ایں حس بجوئید از طبیب　　صحت آں حس بجوئید از حبیب

صحت ایں حس ز معموری تن　　صحت آں حس ز تخریب بدن

(اِس حس جسمانی کی درستی چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو اور اگر اُس حس روحانی کی درستی منظور ہے تو مرشد کامل سے رجوع کرو حس جسمانی کی صحت بدن کی درستی سے ہوتی ہے اور حس روحانی کی صحت بدن کی تخریب سے ہوتی ہے ۱۲)

تو قرآن مجید اس طب کی کتاب ہے۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ طب بدنی کی کتابوں میں تو امراض بدنیہ اور اُن کے علاج اور تدبیریں لکھی ہیں جس کا ثمرہ صحت و بقاء محدود دنیوی ہے اور قرآن مجید جس طب کی کتاب ہے اس میں امراض نفسانیہ اور ان کا علاج مذکور ہے اور اس کا ثمرہ ہلاکت ابدی سے نجات ہے۔ پس قرآن مجید میں صرف اس طب کے مسائل ہونا قرآن مجید کا یہی کمال ہے۔ اور دوسرے مسائل

اپنے ذہن سے اُس میں لگالینا یہ قرآن مجید کے لئے نقص کا باعث ہوگا باقی بزرگوں کے کلام میں جو غیر فن کے بعض اسرار کا تعلق قرآن مجید سے متوہم ہوتا ہے سو وہ مدلولات کی حیثیت سے نہیں بلکہ لطائف کے درجہ میں ہے آجکل بہت سے قرآن مجید کے دشمن دوست نما پیدا ہوتے ہیں جو قرآن مجید میں سے سائنس کے مسائل درجہ دلالت میں ثابت کرتے ہیں۔ یہ سخت دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں وہ تو فخر کے طور پر کہتے ہیں کہ جو مسئلہ اہل یورپ اور سائنس دانوں نے آج سمجھا ہے وہ قرآن مجید میں تیرہ سو برس پہلے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکل چکا ہے۔ لیکن فی الواقع ؂

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست   حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

(بے عقل کی دوستی دشمنی ہے۔ حق تعالیٰ ایسی خدمت سے بے پرواہ ہیں۔)

خدا تعالےٰ کو اور خدا تعالےٰ کے کلام کو اس خیر خواہی کی ضرورت نہیں یاد رکھو اس مسلک میں کئی طرح کی دشمنی ہے۔ اور مولوی لوگ اُن مسائل کی تحقیق اور قرآن مجید کے ساتھ زبردستی چسپاں ہوسکنے کی تقریر سے بیخبر نہیں ہیں۔ چنانچہ میں حالانکہ ایک ادنیٰ طالب علم ہوں مگر خود میرے پاس اس کا بڑا دفتر ذہن میں موجود ہے لیکن اُن ہی خرابیوں کے سبب قرآن مجید سے اُن کو کبھی متعلق نہیں کیا جاتا بقول بزرگے ؂

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ تو مجلس عارفین میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہو)

ہمارے زمانہ کے یہ محققین تو یوں سمجھتے ہیں کہ اِن مُلّانوں کو خبر نہیں ہے۔ صاحبو اِن مدّعیوں کو تو ایک ہی خبر ہے کہ یہ مسائل قرآن مجید سے اِسطرح نکلتے ہیں اور مُلّانوں کو اس کی بھی خبر ہے اور اِس میں جو مضرت ہے اس کی بھی خبر ہے۔ چنانچہ اہلِ نظر وتحقیق کے نزدیک ایک خرابی جو اِس کیلئے

لازم غیر منفک ہے یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے وہ مسئلے اُس فن کے
نہیں طب کی کتاب اگر کوئی لکھے اور اس میں ایک فصل تو لکھے امراض راس
کی اور آگے اُس کے فَعَلَ فَعَلَا فَعَلُوْا کی بحث لکھے پھر دوسری فصل لکھے
امراض البطن کی اور تیسری فصل میں یَفْعَلُ یَفْعَلَانِ کی بحث لکھ دے تو
یہ کتاب کیا ہوگی۔ آدھی میزان الطب اور آدھی میزان الصرف اُس کو
کہا جاوے گا۔ پھر اُس کو اگر اہلِ علم کے روبرو پیش کیا جاوے تو اُس
کتاب کو کون پسند کرے گا تو کیا قرآن مجید کو آپ ایسا بنانا چاہتے ہیں
کیا یہ قرآن مجید کے لئے نقص نہ ہوگا دوسرے جو مسائل قرآن مجید سے
یہ لوگ اِستنباط کرتے ہیں اور جن کے اوپر بڑا فخر و ناز ہے وہ کوئی دقیق
مسائل بھی نہیں۔ سب ممدِ (مددگار) و معاون شکم و دہن کے ہیں تو جن کے نزدیک
شکم و دہن اور اُن کی خدمت بڑی چیز ہے ان کے نزدیک یہ مسائل
بیشک مہتم بالشان اور مایۂ فخر و ناز ہوں گے۔ ہم تو ان کو کچھ بھی نہیں
سمجھتے۔ اور اگر وہ ایسے مسائل ہوں جن میں شکم و دہان کی بھی امداد نہیں
تو پھر تو بالکل ہی لغو ہوں گے کیونکہ نہ آخرت کے لئے مفید نہ دنیا کیلئے
نافع حاصل یہ کہ وہ مسائل اگر کچھ کام کے ہیں تو دنیا ہی کے کام کے ہیں
تو جن کے نزدیک دنیا بڑی چیز ہے وہ ان مسائل پر فخر کرے اور جن کو
دنیا اُس کی اصلی حالت پر نظر آرہی ہو اور وہ اصلی حالت کیا ہے یہ ہے کہ
لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى مِنْهَا كَافِرًا شَرْبَةَ مَاءٍ
یعنی اگر دنیا اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کی برابر ہوتی تو کافر کو اس میں
سے ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ پلاتے۔ پس ان کے نزدیک تو یہ مسائل باد
در دست اور نقش بر آب (ہوا ہاتھ میں اور نقش آب پر) سے بھی کم ہیں ان تحقیقات
کی اہلِ نظر کی نظروں میں ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص تھانہ بھون کا
جغرافیہ لکھے اور اس میں اس نے یہ تو لکھا ہے کہ فلاں جگہ جامع مسجد ہے اور

وہ ایسی ہے اور بازار اس قسم کا ہے اور فلاں موقع پر قاضی نجابت علی صاحب
کا مکان ہے لیکن کسی جگہ لونڈیوں نے کھیلنے کے لئے گارے سے پیر مکوڑا بنایا
تھا بھلے مانس نے اُس جغرافیہ میں وہ بھی لکھ دیا تو ظاہر ہے کہ جغرافیہ داں
اور اہلِ علم اُس شخص پر کیسا کچھ ہنسیں گے اور کس قدر بیوقوف بنائیں گے
سو اسی طرح اہلِ بصیرت بھی اس زمانہ کے محققین کی تحقیقات پر ہنستے ہیں
واللہ دنیا کے مسائل قرآن مجید میں ہونا ایسے ہی ہیں بلکہ اس سے بھی کمتر
جیسے اس جغرافیہ میں لڑکیوں کا ریت کا گھر۔ اور منشا اصلی اِن تحقیقات کی
قرآن میں داخل کرنے کا یہ ہے کہ یہ لوگ اہلِ یورپ کو اللہ تعالےٰ اور
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی برابر بلکہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم سے بڑھ کر جانتے ہیں۔ چنانچہ اگر اللہ تعالےٰ اور رسول صلے اللہ
علیہ وسلم کی بات اُن کے موافق ہو تو مانتے ہیں ورنہ اُس میں پھیر پھار
کرتے ہیں۔ پس جو مسائل اُن لوگوں نے سمجھے ہیں قرآن مجید کو ان کی موافق
بنانے کے لئے اُن کو قرآن سے استنباط کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان
کے اقوال اور اُن کی تحقیقات کو تو ان لوگوں نے اصل ٹھیرایا اور قرآن کو
تابع۔ سو اس منشار کا فساد ظاہر ہے۔ سو بنار بھی فاسد۔ پھر اُس پر ان
مسائل کا بوجہ دنیوی ہونے کے بے وقعت ہونا گویا مبنی کا فاسد ہونا ہی
پھر قرآن مجید سے استنباط کرنا بنار الفاسد علی الفاسد (فاسد کی فاسد پر بنا ہی)
چنانچہ ان کے بے وقعت ہونے کی مسلمان کے نزدیک یہ کافی دلیل ہے
کہ خدا تعالیٰ و رسول صلے اللہ علیہ وسلم تو دنیا کی تحقیر کرے توہین کرتے
اور پھر ان حضرات کو اس پر فخر ہے ناز ہے۔ یاد رکھئے آپ کے نزدیک
اِس وقت دنیا قابل قدر و قعت ہے اور جب كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (جتنے
روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جاویں گے ۱۲) کا ظہور ہو گا اور آپ جو اِس وقت
من چنینم من چنانم (میں ایسا ہوں میں ویسا ہوں) کر رہے ہیں آپ بھی اِس مَنْ

(عربی من) میں داخل ہو جائیں گے اُس وقت معلوم ہوگا کہ ہم کس جہالت میں مبتلا ہیں آج جس سکہ کی قدر ہے کل وہاں اس کی کچھ قدر نہ ہوگی اور اس سکہ کی وہی مثال ہوگی کہ باپ نے اپنے لڑکے نادان کو ایک روپیہ جس پر ٹھپا ہی لگی ہوئی تھی دیا۔ لڑکا اُس کو لیکر باہر نکلا تو کسی ٹھگ نے دیکھ لیا ٹھگ کے پاس ایک شیشہ کا ٹکڑا تھا جو چمک دمک ظاہری میں اس روپیہ سے بڑھ کر تھا اُس لڑکے کو اُس نے دھوکہ دے کر وہ روپیہ لے لیا اور شیشہ کا ٹکڑا دیدیا۔ اب لڑکا خوش ہے کہ میرے پاس روپیہ ہے جب بازار پہونچے تو وہ میوہ فروش کو وہ روپیہ دیا اُس نے اُٹھا کر پھینک دیا کہ یہ روپیہ یہاں نہیں چلتا۔ یہ مصنوعی اور ظاہری بازار میں چلتا ہے یہ تو واقعی اور سچا بازار ہے یہاں سچا سکہ چلے گا۔ اب یہ لڑکا تہی دست رہ گیا اُس وقت سمجھ میں آیا ؎

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر تہیدست را دل پراگندہ تر

(بازار جس قدر بھرتا اور رونق پر آتا ہے تہی دست کا دل زیادہ پراگندہ ہوتا ہے ۱۲)

اُس وقت سوائے حسرت کے کچھ ہاتھ نہ آویگا۔ یہ سب قصہ موت کے ساتھ ہی نظر آجائے گا۔ یہ سائنس کے مسائل اوران تحقیقات جدیدہ کا وہاں پتہ بھی نہ لگے گا وَضَلَّ عَنۡكُمۡ مَا كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ (اور وہ تمہارا دعویٰ سب تم سے غائب ہوگیا) الحاصل ایک خرابی تو قرآن شریف سے مسائل سائنس وغیرہ کی یہ ہوئی۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ سائنس کے مسائل ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں۔ پرانی سائنس آجکل گرد ہو رہی ہے۔ حال کی سائنس کی

عہ استعداد قبول حق کی جو فطرۃً سب کو ملی ہے ۱۲ عہ ناگواری طبع ونفس ۱۲ جامع عہ رہزن دین من الجنۃ والناس ۱۲ جامع للعہ دنیا ومتاع دنیا جن کو لوگ خریدتے ہیں اور دولت ایمان برباد یا بے رونق کردیتے ہیں یا کم ازکم اُس میں لگ کر اس دولت کو بھولتے ہیں ۱۲ جامع

خود اختلاف ہے اور ممکن ہے کہ آیندہ جو محققین پیدا ہوں ان کی تحقیقات
اِس کے بالکل خلاف ہوں تو آج اگر کسی سائنس کے مسئلہ کو قرآن مجید
کی تفسیر بنا دیا اور یہ ثابت کر دیا اور تسلیم کر لیا کہ یہ مدلول قرآنی ہے تو
کل کو جبکہ ان مسائل کی غلطی ثابت ہو جاویگی ایک ادنیٰ سا ملحد اس کو
غلط ثابت کر کے پھر اس سے قرآن مجید کا نعوذ باللہ خلاف واقع کے
ہونا دکھلا دیگا اور مخالفین کو یہ کہنے کی گنجایش ہو جاویگی کہ تمہارے
مذہب کی یہی کتاب جس میں ایسے خلاف واقع مسائل ہیں۔ پس یہ مسلک
درحقیقت قرآن کی خیر خواہی نہیں بلکہ بدخواہی ہے۔ تیسری خرابی اور ہے
اور اُس کو میں بے غیرتی سے تعبیر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان مسائل کو مدلول
قرآنی بناتے ہیں گویا اہلِ یورپ کو احسان جتلانے کی گنجایش دیتے ہو کہ
وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بدولت آج قرآن مجید کے معنی معلوم ہوئے۔ اگر
ہم اِن مسائل کی تحقیق نہ کرتے تو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سے لیکر اس وقت
تک کسی کو قرآن مجید کا پتہ نہ لگتا اور تم کو غیرت دے دے کر وہ کہیں گے
کہ کہاں گئے ابوبکرؓ کہاں گئے عمرؓ کہاں ہیں غزالیؒ اور کہاں ہیں ابن عباسؓ
دیکھو اِن حضرات میں سے کسی نے قرآن مجید کو نہیں سمجھا۔ پھر سمجھا کس نے
یورپ کے دہریوں نے جرمن کے ملحدوں نے۔ افسوس جب ایسا ہوگا تو
ڈوب مرنے کا وقت ہوگا۔ خدا کی قسم ہے ہمارے یہاں سب کچھ ہے اور
دوسروں کے یہاں کچھ نہیں۔ کیوں اُن کی کاسہ لیسی کی جاتی ہے اور کیوں
قرآن مجید میں اُن کی خاطر سے تحریف کی جاتی ہے ؎

بر ہوا تاویل قرآں می کنی — پست و کژ شد از تو معنی سنی
چوں ندارد جاں تو قندیلہا — بہر بینش میکنی تاویلہا
کردہٗ تاویل لفظ بکر را — خویش را تاویل کن نے ذکر را

(جو اپنی خواہش کے موافق قرآن میں تاویل کرتے ہو جس سے اس کے روشن معنی پست و کج ہو جاتے ہیں)

(تمہارے اندر قرآن کے سمجھنے کا فہم ہی نہیں اس لئے تاویلات کرتے ہو قرآن کے سمجھنے کا فہم پیدا کرو اور تاویلات کو چھوڑ دو)

خود تمہارے اندر سب کچھ ہے۔ تمہارے اندر وہ نور موجود ہے کہ اُس کے ہوتے ہوئے تم کو کسی کی حاجت نہیں۔ اُس نور کی طرف توجہ کرو دیکھو تو کیا کیا علوم کھلتے ہیں جن کے سامنے یہ علوم مادیہ سب خرافات نظر آویں گے

بینی اندر خود علوم انبیار　　　بے کتاب وبے معید و اوستا

(اپنے اندر بے کتاب اور بغیر معین واُستاد کے انبیار جیسے علوم پاؤ گے ۱۲)

اُس وقت تم کو معلوم ہو گا کہ وہ سب تحقیقات بچوں کا کھیل تھا۔ پس اے مہذبین کی جماعت اِس کا ہرگز ہرگز وسوسہ بھی نہ لاؤ کہ قرآن مجید میں ساری چیزوں کو ٹھونسو ہاں ضمناً تبعاً کوئی مسئلہ اس حیثیت سے آجاوے کہ اُس کو بھی طب روحانی میں دخل ہو تو اور بات ہے چنانچہ اتنی سائنس قرآن مجید میں بھی موجود ہے جہاں ارشاد ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ یعنی بیشک آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں لیکر جو نفع دیتی ہیں لوگوں کو اور پانی میں جو اُتارا ہے اللہ نے آسمان سے پھر جلا دیا اس سے زمین کو اس کے مرنے (خشک ہونے) کے بعد اور پھیلا دیئے اُس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادل میں جو گھرا ہوا ہے آسمان زمین کے درمیان میں (سب میں) دلیلیں ہیں اُن لوگوں کے واسطے جو عقل رکھتے ہیں۔ سو ان آیات سے اِن چیزوں کی تحقیقات منظور نہیں کہ اِس حیثیت سے اس کا طب روحانی

سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس سے مصنوع سے صانع پر استدلال کیا ہے کہ یہ سب مصنوع ممکن ہیں ان کے لئے کوئی محارث ضروری ہے اور اس حیثیت سے اس کا تعلق طب روحانی سے ظاہر ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ یعنی اور ہم نے بنایا آدمی کو سنی ہوئی مٹی سے پھر ہم نے اس کو رکھا نطفہ بنا کر مضبوط جگہ (عورت کے رحم) میں۔ پھر ہم نے بنایا اس نطفہ کو لوتھڑا۔ پھر ہم نے اُس لوتھڑے کی بنائی بوٹی۔ پھر بنائی بوٹی کی ہڈیاں۔ پھر پہنا دیا ہڈیوں کو گوشت۔ پھر اسکو بنا کر کھڑا کیا ایک نئی صورت میں۔ تو با برکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ دیکھئے اس آیت میں سائنس انسانی کے تمام تقلبات و اطوار موجود ہیں مگر اس میں کاوش نہیں کی گئی اور نہ اس حیثیت سے بیان کیا کہ ماہیات بیان کی جائیں بلکہ مقصود قدرت پر استدلال ہے اور بیان بھی سیدھی طور سے ہے جس کو ساری دنیا سمجھ سکتی ہے اِس لئے کہ قرآن مجید کے مخاطب تمام عالم کے افراد ہیں اور ان میں سب طرح کے ہیں۔ اکثر تو عوام ہیں اِس لئے اُس کے خطابات بھی ایسے ہیں کہ جس کو ہر عامی سمجھ سکتا ہے۔

ع سوال اس مقام پر شبہ ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ لَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ (اس قرآن کے عجائبات ختم ہو جائیں گے) کیا ان عجائب میں یہ مسائل فلسفیہ شامل نہیں ہو سکتے اور کیا ہر عامی کا سمجھنا اس حدیث کے معارض نہیں۔ جواب۔ عجائب سے مراد اگر علوم فلسفیہ ہوں تو لازم آتا ہے کہ صحابہ میں کسی نے ان عجائب کی ایک فرد بھی نہیں سمجھی کیونکہ کسی صحابی نے قرآن مجید سے ان چیزوں کو کبھی نہیں بیان کیا عجائب سے مراد علوم نافعہ فی الآخرت ہیں کہ وہ دوسری دلائل صحیحہ کے بھی مدلول ہیں لیکن اہل فہم عالی کو قرآن مجید سے بھی مفہوم ہو جاتے ہیں جن کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے إِلَّا فَهْمًا أُوتِيَهُ الرَّجُلُ فِي الْقُرْآنِ (لیکن فہم جو دی گئی قرآن کے بارے میں عطا کیا گیا ہو) اور عامی کا سمجھ سکنا ہر مضمون کیلئے عام نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جتنا حصہ ضروریات دین میں داخل ہے اس پر وجہ دلالت اور جو اس کے لئے مقدمات بیان کئے گئے ہیں ان کا مفہوم و مدلول عام فہم ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ (اور البتہ ہم نے قرآن آسان کر دیا ذکر کیلئے) اسکی دلیل ہے اور ضروریات دین کی تعریف اہل علم کے نزدیک معروف ہے ۱۲ اشرف

غرض سائنس وغیرہ کے مسائل قرآن مجید میں اتنے ہی لئے گئے ہیں کہ جن کو نجات ابدی میں دخل ہے۔ پس میں نے جو دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید کی ہم کو ہر موقع میں ضرورت ہے اور ہر جگہ کام آتا ہے۔ اس ہر موقع سے مراد طبعیات اور ریاضیات وطرق معاش کے مواقع نہیں بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ جن امور کو فلاح اُخروی میں دخل ہے خواہ اُس کا وقوع دنیا میں ہو یا آخرت میں ہو اُس میں ہم کو قرآن مجید کی ضرورت ہے اور جو محض دنیا ہی ہو یا کہ نہ دنیا ہو نہ آخرت کے متعلق ہو بلکہ لغو ہو قرآن مجید کو اس سے بحث٭ نہیں۔ سو اُن اُمور دنیویہ نافعہ فی الدین (دین میں نفع دینے والے) میں سے ایک اتفاق بھی ہے کہ وہ قرآن مجید میں مامور بہ ہے چنانچہ ارشاد ہے یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ یعنی اے ایمان والو اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو تم بزدل وسست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جاوے گی۔ دیکھئے اس آیت میں مسئلہ اتفاق کو بیان فرمایا ہے۔ اس پر بیشک ہم فخر کریں گے کہ قرآن مجید نے ہم کو کیسے عجیب وغریب مسئلہ کی تعلیم کی ہے اور جی کھول کر ہم اس کو مدلول ومنصوص قرآنی کہیں گے۔

باقی اور علوم جو بزرگوں نے قرآن سے نکالے ہیں اُن کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں مدلول قرآن نہیں ہیں۔ یوں نہ کہیں گے کہ ثابت بالقرآن ہیں ہاں منطبق موافق کہدیں گے۔ چنانچہ اوپر بھی اجمالاً عرض کیا گیا ہے اور مدلول اور منطبق میں بڑا فرق ہے۔ ایک مثال سے آپ کو اس کا فرق ظاہر ہوگا۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس حجام آیا اور اُس نے کہا کہ خط بنوا لیجئے۔ اُس نے جواب دیا کہ بڑھنے دو۔ اتفاق سے جس وقت

٭ یعنی اس کے تحصیل کے طرق قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ باقی جواز وعدم جواز کی حیثیت سے اُس سے بھی بحث ہے ۱۲ جامع

اُس نے یہ جواب دیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے ڈوم بھی اُن کی لڑکی کی شادی کا خط لیکر آیا۔ وہ بھی اتفاق سے اِس جواب سے اپنا مطلب نکال لے تو یہ جواب "بڑھنے دو" دونوں سوالوں کا ہو سکتا ہے اوّل سوال کا تو اِس طرح کہ خط بڑھنے دو جب بڑھ جائے گا بنوائیں گے۔ دوسرے سوال کا اِس طور پر کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے اُس کو بڑھنے دو پس پہلے معنی کو تو مدلول کہیں گے اور دوسرے کے مدّعا پر اس کو صرف منطبق کہیں گے۔ قصد تو یہ تھا کہ نائی کو جواب دیں لیکن یہ کلام کی لطافت ہے کہ وہ ڈوم کا بھی جواب ہو گیا پس اس کو نکتہ اور لطیفہ کہہ سکتے ہیں اور تفسیر نہیں کہہ سکتے۔ یہاں سے ایک بات اور کام کی سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ صوفیہ کرام نے آیات کے متعلق کچھ بصورت تفسیر کے کہا ہے مثلاً اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے) کے متعلق لکھا ہے اِذْهَبْ اَيُّهَا الرُّوْحُ اِلَى النَّفْسِ اَنَّهٗ طَغٰى اور اَذْبَحُوْا بَقَرَةَ النَّفْسِ (اے روح نفس کے پاس جا اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے اور ذبح کرو نفس کے بیل کو) تو ان تاویلوں کو دیکھ کر دو جماعتیں ہو گئی ہیں۔ ایک تو جو صوفیہ کی محبت سے خالی ہیں اور یَحْمِلُ النُّصُوْصَ عَلٰى ظَوَاهِرِهَا (نصوص کو ظواہر پر محمول کرتے ہیں) کے پورے پابند ہیں اُنھوں نے تو اِن تاویلات کا بالکل اِنکار کر دیا کہ کہاں فرعون کہاں نفس کہاں موسیٰ کہاں روح۔ یہ تو ایسا ہے کہ زمین بول کر آسمان مراد لے لیں۔ اور صوفیہ کو اس بنا پر ضال و محرّف کہہ کر ان کے منکر ہو گئے۔ سو ان کو تو یہ ضرور ہوا کہ حضرات اہل اللہ کے برکات سے محروم ہوئے۔ دوسرے وہ تھے جو اِن حضرات کی محبت میں غرق ہیں وہ یہ کہنے لگے کہ قرآن کا مدلول اور تفسیر یہی ہے علماء ظاہر نہیں سمجھے اِس میں تو سارا قصہ باطن کا ہے۔ پھر اس بات میں ان غالین کا یہاں تک غلو بڑھا کہ بعض جگہ تو انھوں نے قرآن مجید کی گت ہی بنا

دی۔ جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک جلد ساز تھے جو شخص کتاب یا قرآن جلد بندھوانے لاتا تھا۔ وہ اُس میں کچھ اِصلاح ضرور کر دیا کرتے تھے ایک شخص قرآن شریف جلد بندھوانے کے لئے اُن کے پاس لائے اور کہا کہ اس کی جلد باندھ دو مگر شرط یہ ہے کہ کچھ اصلاح نہ دیجیو۔ کہنے لگے کہ اب تو میں نے توبہ کر لی ہے۔ جب جلد تیار ہوگئی اُس شخص نے پوچھا کہ کچھ اِصلاح تو نہیں دی کہنے لگے کہ توبہ توبہ میں کیا اصلاح دیتا مگر دو تین جگہ تو صریح غلطی تھی اُس کو صحیح کر دیا۔ ایک جگہ تو یہ تھا عصیٰ آدمؑ تو یہ صریح غلطی ہے عصا تو موسیٰؑ کا تھا میں نے اُس جگہ بجائے آدمؑ کے موسیٰؑ بنا دیا ہے۔ اور ایک مقام پر خرّ موسیٰ تو خر عیسیٰؑ کا تھا وہاں عیسیٰؑ بنا دیا ہے۔ اور ایک جگہ ولقد نادانا نوحٌ (تحقیق پکارا ہم کو نوح نے) تھا تو نوحؑ تو دانا تھے میں نے وہاں نا کاٹ کر اس طرح کر دیا ہے ولقد دانا نوحٌ اور ایک مشترک اور عام غلطی تھی وہ یہ کہ جگہ جگہ فرعون۔ قارون۔ ہامان ابلیس کا نام تھا تو ایسے کفار ملعونوں کا قرآن میں کیا کام وہاں میں نے اپنا اور تمہارا نام لکھ دیا۔ کہا خدا تیرا ناس کرے تو نے میرا قرآن شریف ہی کھو دیا۔ تو وہ مصلح صاحب اِسی مذاق کے ہوں گے واللہ یہ لوگ بالکل ہی برباد ہوتے خدا کی قسم ہے کہ قرآن کا یہ مدلول ہرگز ہرگز نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نماز سب اُڑ گیا اِس لئے کہ تمام نصوص کے مدلولات کو بلکہ تمام شریعت کو ان لوگوں نے بدل دیا۔ میرے ایک دوست رئیس پیران کلیر گئے تھے ایک طرف سے آواز آئی ابے او مُرغے انھوں نے کچھ التفات نہ کیا پھر آواز آئی انھوں نے اس طرف دیکھا تو کہا ابے تجھ کو ہی بلاتے ہیں یہاں آ یہ گئے کہ دیکھیں کیا کہتے ہیں کہنے لگے کہ دیکھ اللہ تعالیٰ نے جب روحوں کو پیدا کیا تو سب کو جمع کر کے حکم دیا کہ بنگ بوزہ مت چھوڑنا تو ہم تو قریب تھے ہم نے صحیح سُنا اور مولوی لوگ دور تھے

سے موسیٰ علیہ السلام مراد ہے

انھوں نے بجائے بنگ بوزہ کے نماز روزہ سن لیا جاوے یہ نکتہ ہے مرشدوں کا یاد رکھو تو ان تفسیروں کی بدولت یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے ایسے صوفیوں نے ناس کیا ہے دین کا خود بھی تباہ ہوئے اوروں کو بھی تباہ کیا سو یہ تو محض لغو وخرافات ہیں لیکن اس وقت کلام ہے صوفیہ محققین کی تاویلات واشارات میں سو اس میں بعضے تو ان کے ہی منکر ہو گئے اور بعضے مفسرین کے منکر ہو گئے اب رہ گئے ہم بیچ میں کہ ہم قرآن کو کلام اللہ اور صوفیہ کو اہل اللہ جانتے ہیں تو دونوں کی اتفاق وحفاظت کے لئے ضرور ہوا کہ ان تاویلات کو ایسے معانی پر محمول کیا جاوے کہ کلام اللہ کی بھی تحریف نہو اور اہل اللہ کا کلام بھی خلاف قواعد شرعیہ نہ ہو اس لئے ہم کہتے ہیں کہ صوفیہ کرام نے جو آیات کے معنی بیان کئے ہیں یہ فی الواقع تفسیر نہیں ہے اور نہ وہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر ہیں اُن کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن میں فرعون سے نفس اور موسیٰ سے روح اور بقرۃ سے نفس مراد ہے جو کچھ وہ فرمارہے ہیں یہ علم اعتبار کہلاتا ہے اور علم اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو قیاس کیا جاوے تو مطلب یہ ہے کہ فرعون و موسیٰ کے قصہ پر اپنے حال کو بھی قیاس کرو اس کی ایسی مثال ہے جیسے زید نے ایک کام عمرو کی دیکھا دیکھی کیا اور اُس میں اس کو ناکامی ہوئی تو اُس موقع پر کہتے ہیں کہ کوّا چلا تھا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا تو اس کلام میں کوّے سے مراد زید اور ہنس سے مراد عمرو یقیناً نہیں ہے کوّے سے کوّا مراد ہے اور ہنس سے ہنس ہی مراد ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ دو موقع ایک حالت کے اندر متطابق ہیں ایک موقع پر جو نظر پڑی تو دوسرا موقع اس کو دیکھ کر یاد آ گیا اور ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہہ دیدی مثلاً یہاں زید وعمر اور اُن کے قصے کو کوّے اور ہنس اور اُن کے قصہ سے تشبیہہ دیدی پس

اِذْهَبْ اَیُّھَا الشَّیْخُ الخ (اے مدح جاتو) سے یہ مراد ہو کہ اے قاری جب تو قرآن پڑھے اور یہاں پہونچے تو اِس قصہ سے یہ سبق لو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز فرعون کی مشابہ اور ایک چیز موسیٰ کے مشابہ ہے قصہ کو قصہ ہی کے طور پر مت پڑھو بلکہ قرآن شریف کے ہر ہر موقع سے اپنی حالت پر مطابق کرتے جاؤ اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ یہ مطلب ہے صوفیہ کرام کا پس دونوں فرقے غلطی پر ہیں جو ان تاویلات کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں اور جو ان کو تفسیر مدلول قرآنی قرار دیتے ہیں وہ تو بالکل گئے گذرے ہیں یہ تاویلات لطائف اور نکات کے درجہ میں ہیں تفسیر نہیں ہیں اور ان کو علوم قرآنیہ نہیں کہہ سکتے علوم قرآنیہ وہ ہی ہیں جس پر عبارۃ النص یا اشارۃ النص یا اقتضاء النص یا دلالۃ النص سے اِستدلال ہو سکے ورنہ وہ نکات و لطائف کا درجہ ہے جیسے کسی شخص نے آیۃ وَکُلُّھُمْ اٰتِیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَرْدًا (اور قیامت کے دن سب کے سب اس کے پاس تنہا تنہا حاضر ہوں گے) کے متعلق کہا تھا کہ قیامت آئندہ آنے والی ہے اِس لئے قرآن مجید میں فردًا کہا گیا فردًا کہتے ہیں کل کے دن کو یہ ایک نکتہ ہے ورنہ فردًا بمعنی کل فارسی ہے اور آیت میں فردًا سے مراد متفردًا یعنی تنہا متوحدًا ہے اہل لطائف نے کہیں کہیں ایسے نکتوں سے کام لیا ہے گو شرعًا بعض جگہ پسندیدہ نہیں ہے جیسے ایک جولاہا تھا اُس نے دو چار سورتیں پڑھ لی تھیں مگر ماں کا حق ادا نہ کرتا تھا اُس کی ماں اُس کو لیکر ایک بزرگ کی خدمت میں آئی کہ دیکھئے حضرت یہ میرا حق ادا نہیں کرتا اُن بزرگ نے فرمایا کہ بھائی تم ماں کا حق کیوں نہیں ادا کرتے کہا کہ حضرت قرآن میں تو ماں کا حق ہی نہیں آیا اُن بزرگ نے پوچھا کہ تو نے کچھ قرآن پڑھا ہی کہنے لگا جی ہاں اَلَمْ تَرَ کَیْفَ تک یاد ہے اُن بزرگ نے فرمایا کہ تَبَّتْ تو پڑھو اُس نے پڑھی جب مَآ اَغْنٰی عَنْہُ

مَالُهٗ وَمَاکَسَبَ (اس کا مال اور اس کی کمائی اس کے کام نہ آئی) پر پہونچا تو فرمایا کہ دیکھو تو کہتا ہے کہ ماں کا کچھ حق نہیں قرآن میں تو یہ ہے کہ ماکاسب یعنی ماں کا سب ہے وہ مان گیا اور اسی دن سے عہد کیا کہ ماں کی خدمت کیا کروں گا۔ اس لطیفہ سے یہ تو فائدہ ہوا کہ وہ ماں کا حق ادا کرنے لگا لیکن ضرر بھی ہوا کہ ساری عمر اسی جہل میں مبتلا رہے گا ایسے ہی ایک شخص ایک مولوی صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ مولوی صاحب تم کہتے ہو کہ قرآن میں سب چیزوں کا ذکر ہے یہ تو بتلاؤ کہ قرآن میں باؤ مرہٹہ کا بھی ذکر ہے مولوی صاحب نے کہا ہاں ہے اور مذمت کے ساتھ ذکر ہے وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ لوٹے) کہ باؤ اللہ کے غضب میں ہے یہ نکات ہیں بلکہ نکات بھی ان کو نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ نکتہ وہ ہے کہ جس سے تفسیر نہ بدلے یہاں تو تفسیر ہی بدل جاتی ہے لطائف اور نکات بھی وہ ہی مقبول ہیں کہ انطباق بھی ہو جائے اور تفسیر نہ بدلے اس واسطے میں ان دونوں قصوں کے جواب کو ناپسند کرتا ہوں۔ پس اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا کہ نہ تو شیخ اکبر اور دیگر صوفیہ قدس اسرارہم پر کچھ اعتراض ہو سکتا ہے اور مفسرین نے جو تفسیر اور مدلول قرآنی بیان کیا ہے نہ اس میں کچھ شبہ ہے ہاں اعتراض اہل غلو پر ہے جو ان کا یا ان کا انکار کرتے ہیں خواہ وہ اہل غلو برنگ جہلاء ہوں یا بہیئت علماء ہوں۔ یہ مفصل گفتگو تھی بعض اشارات و لطائف قرآنیہ کے متعلق جو جملہ معترضہ کے طور پر آ گئی۔ اب مضمون مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ قرآن نے ہم کو اس مقام پر مسائل تمدن میں سے ایک مفید مسئلہ اتفاق کی بھی تعلیم بھی فرمائی پس وہ اس وجہ سے شریعت میں مامور بہ ہے اور دنیا دین دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے اور اصلاح دین بھی اس سے

ہوتی ہے اور اصلاحِ دنیا بھی جو لوگ دیندار ہیں اُن کی نظر تو اس کے منافع دین پر ہے اور جو دنیا دار ہیں اُن کی نظر اس کے منافع دنیا پر ہے خصوص ہمارے زمانہ کے ترقی خواہ بھائیوں کے نزدیک تو بڑا قبلہ وکعبہ دنیا ہی ہے حتیٰ کہ اُن کے نزدیک تو خالص دینی کام میں بھی دنیا ہی کی مصلحت پیشِ نظر رہتی ہے اور اس کی وقعت اسی مصلحت دنیوی کے سبب ہوتی ہے اور یہ مذاق اہلِ یورپ سے ماخوذ ہے چنانچہ ایک جرمنی ڈاکٹر نے نماز کے منافع لکھے ہیں کہ نماز ایسی اچھی ورزش ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی ورزش کی ضرورت نہیں اور صحت خوب قائم رہتی ہے اُس بھلے مانس نے نماز کو اتنا ہی سمجھا آگے ذہن ہی نہیں گیا جیسے کسی مولوی صاحب نے ایک گنوار کو نصیحت کی کہ نماز پڑھا کر کہا بہت اچھا چند روز کے بعد مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی جی نواج (نماز) بہت بھائدے (فائدے) کی چیج (چیز) ہے مجھے بائی (ریاح) کی بیماری تھی جب موندھا (اوندھا) پڑوں جب ہی باوی لکڑی (نکلتی ہے) جیسے اُس گدھے نے نماز کا یہی فائدہ سمجھا تھا ایسے ہی اس جرمنی محقق نے نماز کا فائدہ اتنا ہی سمجھا مگر ہمارے ترقی یافتہ بھائی ایسی باتوں سے خوش ہوتے ہیں اور ریجھے جاتے ہیں اور اگر کوئی ہم سے پوچھے تو ہم تو یہ کہیں گے کہ اس جرمنی کی اس تحقیق کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کے پاس پانچسو روپیہ کا دوشالہ ہو اور وہ اس کے منافع یہ بیان کرے کہ یہ دوشالہ بہت اچھی شے ہے سفر میں اگر کہیں سوختہ نہ ملے تو اس کو جلا کر چاء پکا سکتے ہیں تو فی نفسہ یہ صحیح ہے کہ چاء اس سے پک سکتی ہے لیکن کیا اس شخص کو یہ نہ کہا جاوے گا کہ اِس نے اِس دوشالہ کی قدر نہیں جانی۔ نماز کے فائدے ہم سے پوچھو اور ہم سے کیا ہم کیا چیز ہیں حق تعالےٰ سے پوچھو اور ہم سے

(باقی آئندہ اِنشاءاللہ تعالیٰ)

پوچھو میں نے اس لئے کہہ دیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ درحقیقت حق تعالٰی کا کہا ہوا ہے ہماری تو وہ مثال ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استاد ازل گفت بگومی گویم

(آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

سو نماز کا فائدہ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ یعنی سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ پس نماز کا اصلی مقصود قرب ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

قرب ترلیستی بہ بالا رفتن است　　بلکہ قرب از قید ہستی رستن است

یعنی قرب اس کا نام نہیں ہے کہ نیچے سے اوپر کو چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ قید ہستی سے چھوٹ جاؤ اس لئے کہ اوپر جانا قرب جب ہوتا ہے کہ خدا تعالٰی کا مکان اوپر ہوتا خدا تعالٰی مکان سے پاک ہے پس اس کا قرب یہی ہے کہ اپنی ہستی کو خاک میں ملا دو اسی کو وصل کہتے ہیں بعض لوگ وصل کے خدا جانے کیا کیا معنی سمجھتے ہیں وصل کے معنی اہل فن سے پوچھئے شیخ شیرازی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ فرماتے ہیں ؎

تعلق حجاب ست و بے حاصلی　　چو پیوندھا بگسلی واصلی

(تعلقات غیر اللہ حجاب اور لا حاصل ہیں جب ان تعلقات کو قطع کر لوگے تو تم واصل ہو گے)

یعنی غیر کے ساتھ کے علاقے جب قطع کر دوگے واصل ہو جاؤ گے یہی تعلق حجاب ہے پس سجدہ کی غرض اپنی ہستی و تعلق کو مٹانا اور ہستی کا مٹانا یہ نہیں ہے کہ سنکھیا کھا کر مر رہو مطلب یہ ہے کہ دعوٰی اور انانیت دماغ سے نکالو یہ سجدہ اس کا سامان ہے اس لئے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور پھر تمام اعضاء انسان کے اندر اشرف چہرہ ہے اسی واسطے چہرہ پر مارنا حرام ہے حکم ہے کہ مجرم کے بھی چہرہ پر مت مارو قتل کرنا جائز اور چہرہ پر مارنا ناجائز اس لئے کہ چہرہ معظم ہے تو ایسے شریف عضو کو حکم ہے کہ اَرْذَلُ الاشیاء (تمام چیزوں سے زیادہ رذیل) کے ساتھ ملصق کر دو یعنی

زمین کے ساتھ جو بہت سے وجوہ سے اور نیز باعتبار جز کے پست ترین مخلوق ہے تو یہ کاہے کی تعلیم ہے اسی کی تعلیم ہے کہ اپنے کو مٹادو اور ہستی کو کھودو کہ یہ تمہاری ہستی تمہارا حجاب بن رہی ہے۔ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق و معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہو رہی ہے حافظ خودی کو درمیان سے اُٹھا۔)

پس نماز کی یہ حکمت ہے مگر جرمنی صاحب نے چونکہ ورزش اس کی حکمت بیان کی ہے تو ہمارے بھائی اس تحقیق پر عشق ہیں یاد رکھو شارع نے یہ حکمت نماز کی کہیں نہیں بیان کی اور جو چیز شریعت میں نہیں ہے وہ سب ہیچ ہے گو اُس جرمنی کی زبان سے اتنا نکلنا بھی غنیمت ہے۔ لیکن اے بھائیو تم کو کیا ہو گیا کہ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ) کے
ہوتے ہوئے ایک جرمنی کافر کی تحقیقات کو پسند ہی نہیں بلکہ اُس پر ناز ۲
کرتے ہو کیوں خواہ مخواہ گداگری کرتے ہو تمہارے یہاں سب کچھ ہے آپ لوگوں کی وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

یک سبد پُر نان ترا بر فرق سر　　　تو ہمی جوئی لب نان در بدر
تا بزانوئے میان قعر آب　　　وز عطش وز جوع گشتی خراب

(تیرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا موجود ہے تو ایک ٹکڑے روٹی کے لئے دربدر مارا پھرتا ہے تو زانو تک نہر میں کھڑا ہوا ہے اور پیاس اور بھوک سے خراب ہو رہا ہے۔)

اے صاحبو آپ کے یہاں ساری دولتیں موجود ہیں کیوں فقیروں سے مانگتے ہو کیوں جرمنیوں کی کاسہ لیسی کرتے ہو۔ الحاصل اتفاق بھی ایسی ہی شے ہے کہ اہل یورپ کو لِلدُّنیا (دنیا کیلئے) مطلوب ہے اور ہم کو لِلدِّین (دین کیلئے) مطلوب ہے مگر اس کا ایک ضروری مسئلہ متفق علیہا ہونا تو ثابت ہوا اب اس آیت میں غور کیجئے کہ اس میں سے اس مسئلہ کے متعلق کیا تحقیق

ہے اس کے لئے ایک چھوٹی سی تمہید کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ساری دنیا اتفاق اتفاق پکار رہی ہے مگر اس کے جو اسباب ہیں ان سے بالکل ناواقفیت ہے بالکل اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص چھت پر جانا چاہتا ہے مگر زینہ سے نہیں جاتا اُوچک کر جانا چاہتا ہے اور ایک جست لگاتا ہے اور گر پڑتا ہے اسی طرح پھر جست لگاتا ہے اور پھر گرتا ہے تو یہ شخص چھت پر کیوں نہیں پہنچا اس لئے کہ جو طریق ہے جانے کا اُس سے نہیں گیا اُس نے اس پر عمل نہیں کیا ؎

اُطْلُبُوا الْاَرْزَاقَ مِنْ اَسْبَابِهَا وَادْخُلُوا الْاَبْيَاتَ مِنْ اَبْوَابِهَا

(روزی کو اس کے اسباب سے طلب کرو اور گھروں میں دروازوں سے داخل ہو)

اِس واسطے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی کہ مطلقاً اسباب چھوڑ دو بلکہ اس کا حکم کیا ہے کہ جس شے کے جو اسباب پیدا کئے گئے ہیں اُس کو اُن ہی سے طلب کرو اس پر بعضے لوگ خوش ہوئے ہوں گے کہ اس سے ۲
تو وہی بات ثابت ہوئی جو اہلِ دنیا کا مطلب ہے یعنی تدبیر پرستی چنانچہ اسی بناء پر لوگ اہل اللہ پر ہنستے ہیں اور اُن کو اجاریوں کی پلٹن اور گرانی کا سبب اور قوم پر بار قرار دیتے ہیں ایک شخص بزعم خود مفسر قرآن ہیں اور لوگ اُن کے ترجمہ پر فریفتہ ہیں اس لئے کہ محاورہ کے موافق ہے صاحبو! محاورہ کے موافق تو ہے لیکن قرآن کے موافق نہیں ہے ایسے ہی محاورہ کا شوق ہے تو چہار درویش اور حاتم طائی کی عبارت بہت ہی بامحاورہ ہے اور اگر یہ کہا جاوے کہ وہ تو قرآن نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ وہ ترجمہ بھی بہت مقامات میں قرآن نہیں اس لئے کہ ایسے ایسے مسائل نکالے ہیں کہ وہ قرآن کا مدلول نہیں ہے چنانچہ آیت وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بغیر حق جائز کے مت کھاؤ) کی تفسیر میں حاشیہ پر لکھا ہے کہ یہ جو بعض لوگ دنیا کے

تمام دھندے چھوڑ چھاڑ کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں اُن کو کیا حق حاصل ہے کہ قوم کی آمدنی کھائیں جب کچھ حق نہیں تو باطل ہی اور باطل ہے تو اس آیت سے حرام ہے لوگ استدلال پر فریفتہ ہیں مرے جاتے ہیں میں اس استدلال کی حقیقت کھولتا ہوں کہ یہ جو باطل جس کا ترجمہ ناحق ہے اس ناحق میں جو حق ہے اس سے کیا مراد ہے حق واجب یا جائز اگر حق واجب مراد ہے تو ہم مفسر صاحب سے پوچھتے ہیں کہ تم کو کیا حق حاصل ہے کہ ایک کتاب تصنیف کردی اور سرکار سے ہزار روپیہ انعام کے لے لئے کیا سرکار پر یہ حق واجب ہے اور ان مفسر صاحب کو کوئی ہدیۃً روپیہ دے تو اُس کے قبول کرنے کا ان کو کیا حق حاصل ہے خوب یاد رکھو کہ اِس ناحق میں حق سے مراد حق جائز ہے پس ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بدون حق جائز کے مت کھاؤ پس جس شے کا لینا جائز نہ ہو وہ مت کھاؤ اور اگر محبت سے کوئی کچھ دے تو یہ ناجائز نہیں مفسر جی ۴
نے حق سے مراد حق واجب لیکر اپنے اوپر بھی سینکڑوں اعتراض لے لئے غرض یہ حضرات اہلِ توکل کی تحقیر اسی اسباب پر کرتے ہیں تو شاید میرے اِس کہنے سے کہ اسباب سے مسببات کو حاصل کرو ان معترضین کو اپنی تائید کا شبہ ہوا ہوگا خوب سمجھ لو کہ ترک اسباب میں تفصیل ہے جو عنقریب آتی ہے اُس کے نہ جاننے ہی سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ متوکلین نے پھر اسباب کو کیوں چھوڑا جبکہ تم کہتے ہو کہ شریعت نے ترک اسباب کی اجازت نہیں دی سو خوب سمجھ لو کہ یہ اعتراض ناتمام علم سے پیدا ہوا ہے جیسے ایک حکیم جی تھے اُن کے ایک صاحبزادہ بھی تھے مگر تھے عقل کے کورے اُن کو حکیم صاحب نے طب پڑھائی اور مطب میں بھی وہ ساتھ رہتے تھے حکیم جی ایک مریض کو دیکھنے گئے نبض دیکھ کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نارنگی کھائی ہے جس سے تمہاری حالت کل کے

اعتبار سے بگڑی ہوئی ہے مریض نے اقرار کیا صاحبزادہ صاحب کو حیرت ہوئی کہ ابّا جان نے یہ کیسے پہچانا کہ نارنگی کھائی ہے جب وہاں سے آئے تو پوچھا حکیم صاحب نے کہا کہ بھائی قرائن اور علامات اور نبض سے اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ کسی بارد شے کا اِستعمال کیا ہے چارپائی کے نیچے نارنگی کے چھلکے پڑے تھے اس سے اس کی تعیین بھی ہو گئی۔ اب صاحبزادہ صاحب کو ایک قاعدہ ہاتھ آ گیا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے پڑی ہوئی ہوتی ہے مریض اُسی کو کھا کر بیمار ہو جاتا ہے بڑے حکیم نے تو رحلت فرمائی اب چھوٹے حکیم جی کا دور دورہ ہوا ایک مریض کی شامت آئی اُن کو بلایا اُس کو دیکھنے گئے نبض دیکھی چارپائی کے نیچے جھانکے وہاں نمدہ پڑا ہوا تھا کہنے لگے کہ ہم کو معلوم ہو گیا کہ تمہاری جو یہ حالت ہے اُس کا ایک خاص سبب ہے وہ یہ کہ تم نے نمدہ کھایا ہے سب
لوگ ہنس پڑے کہ نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے اور حکیم جی کو نکلوا دیا ۵
سچ ہے نیم مُلّا خطرۂ ایمان نیم حکیم خطرۂ جان۔ پس ایسے ہی ہمارے معترضین ہیں کہ جب سنا کہ شریعت نے ترک اسباب سے منع کیا ہے علم تو تھا نہیں تمام اسباب کو اس میں داخل کر کے متوکلین اور تارکین اسباب پر ایک اعتراض جڑ دیا خوب سمجھ لو کہ اسباب کی تین قسمیں ہیں اسباب قطعیہ ظنیہ وہمیہ سبب قطعی کسی شے کا تو وہ ہے کہ عادۃً وہ اُس شے کا موقوف علیہ ہے اگر وہ سبب نہ ہو تو اُس شے کا تحقیق بھی نہ ہو جیسے کھانا کھانا پیٹ بھرنے کے لئے پانی پینا سیرابی کے واسطے سو رہنا آرام کے واسطے اِن اسباب کو چھوڑنا تو حرام ہے اگر کوئی چھوڑ دے اور اسی میں مر رہے تو حرام موت مرے گا حتیٰ کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اہل توکل بھی خلوت میں ایسی جگہ نہ بیٹھے جہاں کسی کا نہ گذر ہو اور نہ کسی کو اس کے حال کی اِطلاع ہو دوسرے اسباب وہمیہ ہیں وہ یہ ہیں کہ مسبب کے

اُن پر مرتب ہونے کا بہت بعید احتمال ہو جیسے کوئی خیالات پکادے کہ میں
تحصیلدار ہو جاؤں گا پھر ڈپٹی کلکٹر ہوں گا بہت سی میری اولاد ہو جائیگی
جب زیادہ مال ہوگا تمام ضلع منظفرنگر کو خریدوں گا غرض جہاں جہاں
تک ذہن پہنچایا اسی طرح تجارت میں بعید بعید صورتیں سوچے اور اُن
کے اسباب میں مشغول ہو ایسے اسباب وہمیہ واجب الترک ہیں اس کو
دنیا کے اندر کھپ جانا کہتے ہیں۔ تیسرے اسباب ظنیہ ہیں کہ مسبب ان پر
غالباً مرتب ہو جاتا ہے اور کبھی بلا ان اسباب کے بھی وہ مسبب حاصل
ہو جاتا ہے جیسے تجارت سے۔ ضرورت کے موافق روپیہ ملنا زراعت سے
غلہ حاصل ہونا کہ مسبب ان پر اکثر تو مرتب ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا
اور کبھی بلا ان اسباب کے بھی مسبب حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ ہم مشاہدہ
کرتے ہیں کہ جو لوگ ان اسباب میں مشغول نہیں ہیں ان کو بھی یہ چیزیں
ملتی ہیں پس ان اسباب ظنیہ کے ترک کو اصطلاح میں توکل کہتے ہیں اور ٦
اِس میں تفصیل یہ ہے کہ ضعیف النفس کے لئے جائز نہیں اور قوی النفس
کے لئے جائز بلکہ مستحسن و مستحب ہے لیکن اِس نیت سے توکل جائز نہیں کہ
یہ بھی ایک طریق ہے روپیہ ملنے کا جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ
مولوی صاحب سے وعظ میں سُن لیا کہ جو خدا تعالےٰ پر توکل کرے
اللہ تعالےٰ اس کو ضرور رزق پہونچاتے ہیں اور یہ بھی اُس نے سُنا تھا کہ
ایسی جگہ بیٹھنا جائز نہیں جہاں کسی کا گذر نہ ہو جنگل میں جاکر ایک کنوے
کے قریب آپ جا بیٹھے اور منتظر رہے کہ اب میرے واسطے خوان لگ کر
آوے گا چنانچہ دو تین روز گذر گئے اتفاق سے اُدھر سے کسی کا گذر بھی
نہ ہوا کئی روز کے بعد ایک مسافر آیا سمجھا کہ مجھے بھی کچھ دیگا اُس مسافر
نے اُس کی طرف تو پشت کی اور (حسب عادت) راستہ کی طرف منہ
کیا کہ آتے جاتے کو دیکھیں گے اور روٹی کھا کر چلا گیا اِس کی اُس کو

بھی نہ ہوئی اسی طرح ایک اور آیا وہ بھی اسی طرح بیٹھ کر اور کھا کر چلا گیا
اُس نے اپنے جی میں کہا کہ یہ تو بڑی رسم نکلی ہے تیسرا آیا تو آپ فرماتے
ہیں اھون اھون (صورت ہے جو حکایت ہے کھنکارنے کی) اُس نے
جو مڑ کر دیکھا کہ ایک آدمی فاقہ سے ضعیف نحیف ہو کر پڑا ہے اُس کو
رحم آیا اُس نے بلا کر اُس کو روٹی کھلائی خوش خوش مولوی صاحب
کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ مولوی صاحب توکل پر حق مگر آپ نے تعلیم
میں کسر رکھی اتنی بات رکھ لی یہ نہ کہا کہ کھنکارنا بھی پڑتا ہے۔ تو بعضے
آدمی ہاتھ پاؤں توڑ کر اس لئے بھی بیٹھ جاتے ہیں کہ میاں بے فکری سے
کھانے کو ملے گا چین سے رہیں گے کچھ کرنا نہ پڑیگا تو کوئی قابل قدر نہیں
خدا تعالیٰ کے نزدیک بھی اس کی کوئی قدر نہیں کمال نہیں حضرت سلطان
ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حکایت لکھی ہے کہ جب بلخ کی
سلطنت چھوڑ کر نکلے ہیں تو اوّل ہی دن ایک جنگل میں پہونچے وہاں شام ۷
ہو گئی ایک مقام پر لیٹ رہے بھوکے پیاسے تھے اور قریب ہی ایک
اور درویش بھی رہتا تھا شب کے وقت اُن کے واسطے غیب سے ایک
خوان آیا کہ کھانوں کی خوشبو سے تمام جنگل مہک اُٹھا اور اُس درویش
کے واسطے دو روٹی جو کی آیا کرتی تھیں حسبِ معمول وہی آئی وہ درویش یہ
دیکھ کر جل گیا اور حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ مجھے تو یہاں پڑے
ہوئے اتنے سال ہو گئے میرے واسطے تو یہی جو کی روٹی ہے آج تک ترقی
نہوئی اور یہ آج ہی آیا اس کے واسطے ایسے کھانے بھیجے ہاتف کے ذریعہ
سے ندا آئی کہ یاد کر تو کون تھا اور اس کو دیکھ یہ کون ہے تو ایک گھس کھدا
تھا اس قابل بھی نہ تھا پہلے صبح سے شام تک مصیبت بھرتا تھا اب بے مشقت
اُس سے زیادہ ملتا ہے غنیمت نہیں سمجھتا اگر پسند نہیں فلاں درخت کے
نیچے تیرا کھُرپہ جالی رکھا ہے نکل اور گھاس کھودنا شروع کر غرض توکل

میں تو نے کون کمال کیا کمال تو اُس شخص کا ہے کہ سلطنت اور حشم خدم کو ہمارے واسطے اس نے چھوڑ دیا بہرحال اگر تجھ کو سیدھی ہی طرح کھانا ہی کھا ورنہ کھر یہ جالی تیرا رکھا ہے جیا اور سنبھال سنکر لرز گیا اور بہت توبہ استغفار کی پس روٹیوں کے واسطے گوشہ اختیار کرنا توکل نہیں شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

نان از برائے کنج عبادت گرفتہ اند　　صاحبدلان نہ کنج عبادت برائے نان

(روٹی اہل اللہ نے گوشہ عبادت کے لئے لی ہو نہ گوشہ عبادت روٹی کے لئے پکڑا ہے ۱۲)

یعنی روٹی اس واسطے لیتے ہیں کہ اللہ اللہ کریں نہ کہ اللہ اللہ اس لئے کریں کہ روٹی ملے یہ تو خداع اور مکاری ہے کہ جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ؎

گہہ گہے آہے دروغے میزنی　　از برائے مسکہ دوغے میزنی

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام　　در غلط اندازی تا ہر خاص و عام

کار ہا با خلق آری جملہ راست　　با خدا تزویر و حیلہ کے رواست ۸

کار با او راست باید داشتن　　رایت اخلاص و صدق افراشتن

(تو کبھی کبھی جھوٹی آہ کھینچتا ہے گویا مکھن حاصل کرنے کے لئے چھاچھ بلوتا ہے۔ میں نے فرض کیا اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا تعالےٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں خداوند تعالےٰ کے ساتھ مکر و حیلہ کب جائز ہے خدا تعالےٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنا چاہئیں اور اخلاص اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیے ۱۲)

خلاصہ یہ ہے کہ جس ترک اسباب کی شریعت میں ممانعت ہے وہ اسباب قطعیہ ہیں اُن کا چھوڑنا حرام ہے اور اسباب وہمیہ کا ترک خود مامور بہ ہے. اور اسباب ظنیہ میں یہ تفصیل ہے جو ابھی عرض کی گئی۔ اور یہ سب تفصیل مسببات دنیویہ کے متعلق ہے اور جو مسببات دینیہ ہیں چونکہ وہ مطلقاً

محمود و مطلوب ہیں اُن کے اسباب ہر درجے میں محمود ہوں گے بشرطیکہ کسی ضروری
امر میں خلل نہ ہو پس اتفاق جو ایک شے ہے اس کے لئے بھی کوئی سبب ضرور
ہے اور چونکہ وہ محمود ہے اس کے اسباب بھی قابل اہتمام ہوں گے سو
اُس سبب کی ہمارے عقلا نے تحقیق نہیں کی بلکہ جو اس کے اسباب نہیں
ہیں ان کو سبب قرار دیا اسی لئے اتفاق متحقق نہیں ہوتا پس یہ امر مبحوث
فیہ اور قابل تفحص ہوا کہ سبب اتفاق کا کیا ہے تاکہ اس کو اختیار کرنے سے
اتفاق پیدا ہو سو اس کی تفحص میں ہم کو بفضلہ تعالیٰ دریوزہ گری کی ضرورت
نہیں ہمارے پاس تو قرآن ہے اس میں اس کے متعلق ارشاد ہے هُوَ الَّذِیْ
اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ
جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ
یعنی خدا تعالیٰ کی وہ شان ہے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کہ اس نے
۹ اپنی مدد اور مومنین کے ساتھ آپ کو قوت دی اور ان کے دلوں میں
باہم اُلفت ڈال دی اگر آپ روئے زمین کا تمام مال خرچ کر لیتے تو
آپ ان کے قلوب میں اُلفت نہ ڈال سکتے لیکن اللہ ہی نے اُن کے
درمیان اُلفت ڈال دی بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔ دیکھئے
جہاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم جیسے مدبّر عاقل حکیم دور اندیش ہوں کہ
جن کی عقل کے کامل ہونے پر تمام جہان کا اتفاق اور نادر یہ کہ تمام روئے
زمین کے خزانے اتفاق کے لئے خرچ کریں اور نتیجہ کیا ہے مَآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ
(آپ ان کے دلوں میں باہم اُلفت نہ ڈال سکتے) اس سے کیا پتہ لگتا ہے۔ اس سے یہ
معلوم ہوتا ہے کہ اسباب ظاہرہ جیسے کوئی فنڈ اسلامی بنانا لکچر دینا۔
رسالوں میں مضامین اتفاق کے شائع کرنا اس سے اتفاق پیدا نہیں
ہوتا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ (لیکن اللہ ہی نے ان کے درمیان اُلفت ڈال دی) سے
معلوم ہوتا ہے کہ مدار اتفاق کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ دلوں میں اُلفت

پیدا کر دیتے ہیں ۔ آپ مجھ کو چاہیں میں آپ کو چاہوں ہر ایک دوسرے کے نزدیک محبوب ہو ۔ اب یہ بات رہی کہ وہ اُلفت اور محبت خدا تعالیٰ کس طرح سے پیدا کر دیتے ہیں اس کا سبب کیا ہے ۔ یہ بھی حق تعالیٰ ہی سے پوچھو ۔ چنانچہ اس محبت پیدا کرنے کے واسطے اِس آیت میں ارشاد فرمایا ہے جو میں نے اوّل تلاوت کی ہے اور تبرکاً وتذکیراً پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا یعنی اِیمان اور عمل صالح سے حق تعالیٰ ان لوگوں کی محبّت بمعنی محبوبیت پیدا کر دیتے ہیں اب اہلِ علم کی سمجھ میں آیا ہو گا کہ میں نے وُد کو مصدر مبنی للمفعول مجہول کیوں لیا ۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کی یہ خاصیت بیانِ فرمائی ہے کہ اس کے اختیار کرنے والے قلوب میں محبوب ہو جاتے ہیں ۔ پس جبکہ ایک جماعت کی جماعت ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے تو ان میں ایسا اتفاق پیدا ہو گا کہ کبھی نہ جائے گا لَا یُزَالُ وَلَمْ یَزَلْ (نہ زائل کیا جائے گا نہ زائل ہو گا) ہو جائے گا پس اصلی سبب اتفاق کا ایمان اور عمل صالح ٹھیرا ۔ اب فرمایئے کہ دنیا میں کتنے عاقل ہیں جنھوں نے یہ راز سمجھا ہو ۔ ہاں اِتفاق اِتفاق سب گاتے ہیں ۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اتفاق کا نام بھی نہ لو مگر ایمان اور عمل صالح اختیار کر لیجئے اِتفاق آپ کی لونڈی ہے دست بستہ وہ آپ کے سامنے آکر کھڑی ہو جائے گی آپ کو اس کی ضرورت نہیں کہ آپ لکچر دیں یا مضمون لکھیں اور پھر اتفاق بھی ایسا ہو گا کہ مرنے تک اور مرنے کے بعد جنّت میں بھی نہ جائے گا اور دعوے سے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی ہے وہ محبت جو قائم رہنے والی ہے باقی محبتیں سب زائل ہونے والے ہیں ۔ میں اِس کا نمونہ دکھلاتا ہوں ۔ دیکھئے پیر سے جو محبت ہوتی ہے وہ کیسی ہوتی ہے کہ کبھی نہیں جاتی اگر کسی اَمرد سے محبت ہو گئی ہے تو وہ جب

ہی تک ہے جب تک اُس کے چہرے پر ڈاڑھی نہ آجاوے یا جُھریاں نہ پڑیں ؎

این از عشق است آنکہ در مردم بود　　این فساد از خوردن گندم بود
عشق با مردہ نباشد پائدار　　عشق را با حی و قیوم دار
عشق ہائے کز پئے رنگے بود　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

(گندم کے فساد یعنی لوگوں میں جو عشق ہے وہ عشق نہیں مُردہ کے ساتھ عشق کو پائداری نہیں عشق حق تعالےٰ کا جو حی و قیوم ہیں اختیار کرو جو عشق رنگ و روپ پر ہوتا ہے وہ آخر کار ننگ و افسوس ہوتا ہے اس لئے خدائے حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی رہے گا۔)

عاشقی با مردگاں پائندہ نیست　　زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

(یہ شخص جو مُردوں میں ہے گندم کھانے کے فساد سے ہے مردہ کے ساتھ عشق کو پائداری نہیں ہے)

اور پیر کے ساتھ جو عشق ہے اس کی کیفیت سُنئے کہ پیر صاحب پر تو روز بروز بڑھاپا آتا جاتا ہے اور ان کا ان پر عشق بڑھتا جاتا ہے ؎ 11

خود قوی تر مے شود خمر کہن　　خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پُرانی شراب میں خود تیزی بڑھتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوئی ہی)

آخر پیر میں کیا شے ہے کہ اس سے ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ اگر وہ جان بھی مانگے اس سے بھی انکار نہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟ اس کا سبب وہی ایمان اور عمل صالح ہے چونکہ اس ایمان اور عمل صالح سے یہ اعتقاد ہی کہ یہ حق تعالےٰ کا مقرب ہے اس لئے طبعًا اس کی محبت ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات پیر اس سے ناخوش بھی ہوتا ہے مارتا بھی ہی کبھی کبھی نکال بھی دیتا ہے اور طرح طرح کی خدمتیں لیتا ہے مگر ان کی کیفیت یہ ہی کہ بچھے جاتے ہیں مَرے جاتے ہیں۔ یہ نمونہ آنکھوں سے دیکھ لیجئے اب موجود ہی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے ایک مرید بیان کرتے تھے کہ حضرت ایک مرتبہ حرم میں تشریف رکھتے تھے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ

دوسرے کو مار رہا ہے۔ ہم لوگ سمجھتے تھے یہ کوئی نوکر ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ پیر مرید ہیں اور فرمایا دیکھو پیر ایسے ہوتے ہیں۔ کبھی ہم نے بھی تم لوگوں کو مارا ہے واقعی حضرت کو اس قدر رحمت اور شفقت تھی کہ کہیں نہ دیکھی نہ سُنی ؎

ہم نے اُلفت کی نگاہیں دیکھیں   جانیں کیا چشمِ غضبناک کو ہم

میں نے حضرت کو دیکھا ہے کہ اپنے مریدوں کے ساتھ وہ برتاؤ فرماتے تھے جیسا کہ لوگ اپنے پیروں کے ساتھ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت سے فیض زیادہ ہوا خیر یہ تو حضرت کی خاص حالت تھی مگر مقصود اس وقت مجکو ان حضرت پیر کے قصّہ سے استدلال کرنا ہے کہ وہ مرید بڑی خوشی سے پٹ رہا تھا جو بدون محبت کامل کے اپنے اختیار سے کوئی انسان اسکو گوارا نہیں کرسکتا اور اس محبت کا منشا صرف یہی امر ہے کہ اس کو اللہ والا و بلفظ دیگر کامل الایمان
12 کامل العمل سمجھتے ہیں حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک مولوی صاحب فرماتے تھے کہ خدا جانے یہ فقیر کیا گھولکر پلا دیتے ہیں ہم طالبعلموں کو کھلاتے ہیں پہناتے ہیں سبق پڑھاتے ہیں کتاب اپنی پاس سے دیتے ہیں ان کے تمام ناز نخرے اُٹھاتے ہیں اور جب پڑھ لکھ کر چلے جاتے ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں اور ان فقیروں کے پاس جو آتا ہے منہ سے بولتے تک نہیں وہ خانقاہ میں پڑے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں ہے کبھی شاہ صاحب ہنس پڑے تو عید آگئی جیسے کسی عورت کو اس کا خاوند منہ نہ لگاتا تھا۔ ایک روز اس نے گاجر کھا کر بینڈی عورت کے ماردی تو اس نے اپنی ماں کو کسی کے ہاتھ کہلا کر بھیجا کہ کھائی تھی گاجر ماری تھی بینڈی اماں سے کہنا کہ کچھ کچھ سہاگ بہوڑا ہے (آیا ہے) ایسے ہی یہ مرید صاحب بھی پیر صاحب کے ہلنے سے پھولے نہیں سماتے برسوں کے بعد اگر کچھ بتلا دیا تو بہت ہی خوش ہیں حالانکہ پیر صاحب پر کون سی محنت پڑی ذرا زبان ہلا دی۔ ساری محنت مرید ہی کرتا ہے پھر حالت

یہ ہے کہ نہ اُس کے کھانے کی خبر نہ پینے کی خبر اور خدمتیں کرو وہ علیحدہ اور اگر پیر صاحب کے یہاں بھینس بھی ہے تو سانی کرو چارہ لاؤ بھینس کو چراؤ دودھ نکالو اور جب چاہیں بھینس کی وجہ سے مرید کو نکال دیں جب چاہیں ماریں مگر وہ ہے کہ ٹلتا ہی نہیں زندگی تک تو یہ حال رہتا ہی اور جب پیر صاحب مرگئے بیوی بچوں کو چھوڑ ان کی قبر کا مجاور ہو گیا غرض خدا جانے کیا پلا دیتے ہیں کہ سریش ہو کر لپٹ جاتا ہے۔ حضرت ان کے پاس ایک مقناطیس ہے وہ اس سے جذب کرتے ہیں وہ کیا ہے وہی خدا تعالےٰ کی اطاعت شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ　　　که گردن نه پیچد ز حکم تو ہیچ

(تو بھی حق تعالیٰ کے حکم سے گردن نہ پھیر کہ تیرے حکم سے کوئی گردن نہ پھیرے گا ۱۲)

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

۱۴ ہر کہ ترسید از حق و تقوی گزید　　　ترسد از وے جن وانس وہر چہ دید

(جو شخص اللہ تعالےٰ سے ڈرا اور اس نے تقویٰ اختیار کیا تو اس سے جن و انسان اور جو چیز اس کو دیکھتی ہے ڈرتی ہے)

یہ خوف اور محبت کا جمع ہونا بھی نہایت عجیب وغریب ہے۔ دیکھئے اس قسم کے نمونے موجود ہیں کہ مدار محبوبیت کا ایمان اور عمل صالح ہی ہے۔ اب مجھے اپنے اس دعوے پر دلائل کی ضرورت نہیں اس لئے کہ جبکہ میں مشاہدہ کرا رہا ہوں تو دلیل کی اب کیا ضرورت رہی۔ مگر تبرعاً اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں کہ ایمان وعمل صالح کی وجہ سے محبت کیوں ہوتی ہی اصل وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس میں خاصیت ہی یہ رکھ دی ہی جیسے بعض دوائیں بالخاصہ موثر ہوتی ہیں ایسے ہی یہ بھی ہے لیکن یہ زمانہ ہے تحقیقات کا اس لئے اس پر اکتفا نہ کیا جاویگا اس لئے میں اس کی دو وجہ بیان کرتا ہوں ایک تو راز ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی کو

اوّل بیان کرتا ہوں حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ
کی اطاعت کرتا ہے تو حق تعالیٰ اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جبرئیل
علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ تمام ملائکہ میں پکار دو کہ فلاں بندہ سے ہم کو
محبت ہے تم بھی اس کو دوست رکھو پھر حکم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی پکار
دو اگر کوئی کہے کہ ہم کو کسی کی نسبت بھی اعلان نہیں۔ سنئے بات یہ ہے کہ
فرشتوں کا اعلان قلوب میں ہوتا ہے اور وہ یہی کہ اس کی محبت قلوب
میں پڑجاتی ہے۔ چنانچہ زمین میں یہ اعلان کیا جاتا ہے فَیُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ
فِی الْاَرْضِ (پس رکھ دیا جاتا ہے اس کے لئے مقبولیت زمین میں) پس وہ سب کی نظروں
میں مقبول ہوتا ہے اس کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے استشہاد
میں یہ آیت پڑھی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ
وُدًّا (بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے تو عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں
محبت پیدا کردیں گے) حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ آیت پڑھنا صریح دال ہے ۱۴
اس پر کہ وُدًّا (محبت) یہاں پر مصدر مبنی للمفعول ہے اور میرا اس مضمون کو
اس آیت سے استنباط کرنا صحیح ہے دوسرا راز باطنی یہ ہے کہ محل محبت
کا قلب ہے اور قلوب حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے جب وہ قلوب میں
کسی کی محبت پیدا کرنا چاہیں گے بالاضطرار اس کے سامنے جھک جانا
ہی پڑے گا۔ اس کے سامنے پھر کسی کا حوصلہ نہیں ہے کہ ٹیڑھا چلے۔ ایک
مقام پر ایک بزرگ سے کوئی شخص اُلجھا دونوں طرف خشک خشک
جواب ہوئے ان بزرگ کے پاس سے وہ شخص پچاس قدم بھی نہ گیا ہوگا کہ
دل میں ایک چوٹ سی لگی اور قدم آگے نہ بڑھا اور واپس آکر ہاتھ
جوڑے کہ خدا کے واسطے میرا قصور معاف کردو۔ اور یہ کہا کہ خدا جانے
مجھکو کیا ہوگیا کہ میں قدم آگے بڑھاتا تھا اور پیچھے کو ہٹتا تھا وہ بات کیا
تھی یہ نہیں کہ اُن بزرگ نے کچھ تصرف کیا ہو بلکہ اس پر ایک سرکاری

پیادہ مسلط ہو گیا اور کشاں کشاں اس کو پکڑ لایا غرض ان بزرگ نے جب قصور معاف کیا اُس وقت وہ گیا اس سے معلوم ہوا کہ قلب میں کوئی بات خدا تعالےٰ پیدا کر دیتے ہیں غرض راز باطنی تو اس کا یہ ہے اور راز ظاہری یہ ہے کہ محبت کے تین سبب ہوا کرتے ہیں۔ نوالؔ ۔ کمالؔ ۔ جمالؔ کبھی نوالؔ یعنی عطا و احسان سبب محبت کا ہوتا ہے۔ چنانچہ محسن سے اسی بناء پر محبت ہوتی ہے اور عطا ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کی خطا معاف کردی جاوے یا کسی کا کام کر دیا جاوے۔ کسی کی بیہودگی پر درگذر کی جاوے۔ کبھی کمالؔ کی وجہ سے محبت ہوتی ہے خواہ علمی ہو یا عملی یا اخلاقی مثلاً اہلِ علم سے محبت اسی واسطے ہوتی ہے کہ اِن میں کمالِ علم ہے اگرچہ اس کے عِلم سے اپنے کو بھی نفع نہو اور جیسے حاتم کی سخاوت سُن کر اس کی طرف ایک میلان ہوتا ہے اور جیسے رستم سے اسی واسطے محبت ہے کہ اس میں شجاعت کا کمال ہے۔ مجھ کو یاد ہے کہ بچپن میں اردو شاہنامہ دیکھا کرتا تھا جب ۱۵
کبھی لڑائی کا قصہ آتا تو جی سے تمنّا ہوتی تھی کہ خدا کرے یہ لکھا ہو کہ رستم جیت گیا۔ حالانکہ اگر وہ جیت گیا یا ہار جاوے تو ہم کو کیا نفع ہے مگر اُس کے کمال کی وجہ سے کان اِس بات کو نہیں سُن سکتے تھے کہ ہار گیا۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کے اندر شجاعت کا کمال تھا۔ اس زمانہ میں جو بہت سے واقعات لڑائی کے ہوئے تو مسلمانوں کے غلبہ کو سنکر مسلمانوں کا دل تو خوش ہوتا ہی تھا مگر بہت سے ہنود کو بھی دیکھا کہ وہ ان کے غلبہ کو سُنکر خوش ہوتے تھے۔ اس کا سبب بھی وہ ہی محبّت ہے ترکوں سے بسبب ان کے کمالِ شجاعت کے اور اس کے علاوہ ایک سبب ترکوں سے محبت کا ان کی مظلومیت بھی تھی کہ یہ بھی کمال میں داخل ہے اس لئے کمال یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے اور جب اس پر ظلم ہو تو مستقل رہے۔ تیسرا سبب محبت کا جمالؔ ہوتا ہے جیسے کوئی حسین جمیل ہے اُس سے بالطبع محبّت

ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ گورے چٹے کو
جمیل نہیں کہتے یہ تو پوست پرستوں کا مذہب ہے کہ ان کے یہاں محبت
جمال صورت ہی سے ہے۔ عقلاء کے نزدیک اصلی جمال یہ ہے کہ اخلاق
تناسب و اعتدال ہو اور اسی سے کشش ہوتی ہے قلوب کو اگر اس کے
ساتھ صورت بھی کچھ اچھی ہو تو بہت ہی کچھ کشش ہوتی ہے یہ ہیں طبعی
اسباب محبت کے اب دیکھئے مطیعان شریعت میں یہ امور کس درجہ کے
ہوتے ہیں کیونکہ خود تعلیم شریعت ہی ان کی جامع ہے چنانچہ نوال کی تو
یہ کیفیت ہے کہ ایثار۔ جود۔ کرم۔ عطا انسان ہی کے ساتھ نہیں بلکہ
جانوروں تک کے ساتھ کرنے کا حکم فرمایا ہے جو ہمدردی شریعت نے
تعلیم کی ہے کیا کوئی اس کا مقابلہ کرسکتا ہے اور اس پر ممکن ہے کہ کوئی
ایسا شخص جو سانپ وغیرہ کو بھی نہیں مارتا یہ کہے کہ شریعت نے توموذی
جانوروں کے مارنے کا حکم دیا ہے یہ کیا ہمدردی ہے اور ہم تو موذی ۱۶
جانوروں کو بھی نہیں ستاتے۔ صاحبو! ہر شے کا ایک مصرف ہے رحم اور
ہمدردی کا بھی موقع ہے اگر اس موقع پر کی جائے گی تو مدح کے قابل
ہوگی ورنہ ہمدردی نہ ہوگی دیکھو پیار محبت بہت اچھی شے ہے مگر کس کے
ساتھ اپنے بچوں کے ساتھ بیوی کے ساتھ اگر کوئی بیہودہ معمول کرلے کہ
جب گھر آیا کرے اماں جان کو پیار کیا کرے تو اس کو سب مسخرہ اور بیوقوف
اور بے ادب کہیں گے۔ اسی طرح مثلاً باپ کو برخوردار نورچشم کہنے لگے
تو معیوب ہوگا۔ غرض ہر شے کے اندر اعتدال ہونا چاہئے ورنہ پھر وہ
اپنی حد سے نکل کر اپنی ضد میں جا پہنچتی ہے بقول اہل تحقیق اَلشَّیْئُ اِذَا
خَرَجَ عَنْ حَدِّہٖ لحق نقیضہٗ (جبکہ کوئی چیز اپنی حد سے نکل جاتی ہے تو اپنی ضد میں جا پہنچتی ہے)
مثلاً ترحم ہی ہے اس میں اگر اعتدال نہ ہوا مثلاً چوہوں کو نہیں مارا تو
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے آدمیوں کو مارا کیونکہ وہ آدمیوں کو تکلیف

دیں گے کیا اچھا رحم ہوا کہ چوہوں پر تو رحم کیا اور اپنی بنی نوع کا نقصان کیا۔ اسلام نے اخلاق کی تعدیل کی ہے۔ یہ تو نوال میں گفتگو تھی۔ اب کمال کو لیجئے۔ بڑا کمال علم ہے شریعت میں اس کے حاصل کرنے کی بہت ہی تاکید ہے۔ سخاوت اور شجاعت بھی کمال ہیں شریعت نے اِن دونوں کا بھی ایسا اہتمام کیا ہے کہ کوئی اِس کی نظیر نہیں دکھلا سکتا۔ اب رہ گیا جمال تو اس کا مدار ہے اخلاق پر اِس لئے کہ اخلاق جمیلہ میں جو کشش ہے حُسنِ صورت میں اِس قدر نہیں ہے اگر کسی میں اخلاق جمیل ہوں اگرچہ ترکیب اعضاء کے قاعدے سے عرفاً وہ حسین نہ ہو مگر اس کے اندر ایک دلرُبائی چہرہ پر حلاوت اور نور ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے حسینوں میں وہ بات نہیں ہوتی۔ بازاری عورتیں اپنے کو بہت بناتی ہیں مگر چونکہ اخلاق ذمیمہ ان کے اندر ہوتے ہیں اِس لئے چہرہ پر پھٹکار برستی ہے بھولا پن نہیں ہوتا۔ بخلاف
عفیف عورتوں کے کہ کیسی ہی میلی کچیلی کالی کولی ہوں مگر اُن کے اوپر ۱۷
ایک نور اور کشش ہوتی ہے سو اعمال صالحہ میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جمال بڑھ جاتا ہے حق تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ (اُن کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں) مولانا فرماتے ہیں ؎

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی — نیک بیں باشی اگر اہلِ دلی

(انوارِ الٰہی ولی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر تو اہلِ دل ہے تو اس کا ادراک کر سکتا ہے ۱۲)

کسی نے خوب ترجمہ کیا ہے ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور — کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اور اگر کسی کا ذہن اِتنا عمیق نہ ہو اور غایت بلاہت سے وہ حسن متعارف ہی میں جمال کو منحصر سمجھتا ہو تب بھی ظاہر ہے کہ محبوبیت کاملہ کے لئے اس کا مدار ہونا مشروط ہوگا اِس حَسین الصورت کے حَسین السیرت ہونے پر جس سے

پھر اصل مدار ایمان وعمل صالح ہی کے لئے ثابت رہی ورنہ اگر اسکی سیرت
اچھی نہ ہوئی تو بعض کو اس سے محبت ہی نہ ہوگی اور اگر کسی کو ہوگی کامل نہ
ہوگی یعنی ضعیف ہوگی یا جلدی زائل ہو جاوے گی یعنی جب یہ حسن جاتا
رہے گا تو محبوبیت بھی جاتی رہے گی اور حسن سیرت پر جو محبوبیت ہوگی
وہ مدت العمر باقی رہے گی علاوہ اس کے اگر اس سے بھی قطع نظر کی جاوے
تب بھی محبوبیت کے لئے مجموعہ اسباب کا جمع ہونا ضروری نہیں اگر مومن
عامل صالحات میں جمال بھی نہ ہو تب بھی دوسرے اسباب تو قوت کیساتھ
موجود ہیں وہ بھی محبوبیت کے لئے کافی ہیں اور اگر کسی کافر میں محبوبیت
پائی جاوے تو اگر وہ اخلاق اسلامی میں سے کسی خلق کے پائے جانے
سے ہے تب تو اس کا سبب وہی عمل صالح ٹھیرا باقی یہ بات کہ پھر مومن
کی کیا تخصیص ہوئی اس کی تحقیق یہ ہے کہ وہ خلق بھی غیر مومن میں اس
کمال کے ساتھ ہرگز نہ پایا جاوے گا جیسا مومن میں کیونکہ مومن میں
۱۸ اس کا مقتضی مضبوط ہوگا یعنی ابتغاء مرضات حق (مرضیات الٰہی کو چاہنا) جس
میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا بخلاف کافر کے کہ اس کا جو منشا رہوگا وہ متبدل
ہوگا اور اس کے تبدل سے وہ خلق متبدل ہو سکتا ہے پس کمال محبوبیت
مومن ہی میں رہی اور اگر اخلاق کے علاوہ اور کوئی امر ہے جیسے حسن صورت
وغیرہ تو وہ عام محبوبیت کا سبب نہ ہوگا چنانچہ مسلم و مشہور ہے معشوق
من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت ست (وہ میرا معشوق ہے جو تیرے نزدیک برا ہے)
بخلاف اسباب تعلیم فرمودۂ شریعت کے کہ اس میں یہ اثر عام ہے البتہ جس کے
مدرکات ہی ٹھیک نہ رہے ہوں یا اس کی کوئی غرض فوت ہوتی ہو اس کا
اعتبار ہی نہیں یہ مضمون آئندہ مقصوداً بھی آتا ہے اور لیجئے ایک سبب
محبت کا خوش معاملگی و خوبی معاشرت ہے جو مفہوم کلی کمال میں داخل
ہو سکتی ہے شریعت نے اس کی یہاں تک تعلیم کی ہے کہ دور دور تک کے

احتمالات تک پر نظر فرمائی ہے کہ کسی کے مال میں بلا اجازت متصرف نہ کرو
کسی کے خلوت خانہ میں بلا اجازت نہ جاؤ اگر جاؤ تو اجازت لیکر جاؤ اور
اس کا طریقہ کیسا اچھا تعلیم فرمایا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر کہو کہ السلام علیکم
اَدْخُلُ یعنی میں آؤں تین بار کہنے پر اگر جواب نہ ملے تو واپس چلے آؤ کواڑ
مت کھٹ کھٹاؤ ممکن ہے کہ اس وقت ملنے سے کچھ عذر ہو سوتا ہو یا جی
نہ چاہتا ہو اُس کو معذور سمجھ کر واپس چلے آؤ اور اگر اندر سے یہ کہہ دیا
جاوے کہ اس وقت واپس جاؤ تو واپس چلے آؤ بُرا مت مانو چنانچہ ارشاد
ہے هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ کہ یہ زیادہ صفائی کی بات ہے شاہ عبدالقادر صاحب
اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں یعنی اس میں ملاقات صاف رہتی ہے جناب
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ
کے گھر تشریف لے گئے وہ عوالی میں رہتے تھے بعض عوالی کئی کئی میل کے
فاصلہ پر تھے اور السّلام علیکم انا اَدْخُلُ (میں آؤں) تین بار فرمایا جب تینوں ۱۹
مرتبہ جواب نہ آیا تو آپ واپس تشریف لے جانے لگے حضرت سعد بن
عبادہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ دوڑے کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کہاں چلے فرمایا
کہ تین مرتبہ کے بعد انتظار کرنا نہ چاہیے سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
میں تو برابر سنتا رہا مگر اس لئے نہیں بولا کہ اچھا ہے یہ دعائیہ کلمات جو
اس زبان مبارک سے نکل رہے ہیں جتنے مل جائیں غنیمت ہیں افسوس
ہے کہ آجکل بجائے السّلام علیکم کے جو تمام دعاؤں اور ادب کو جامع ہے
آداب کورنشات نکلا ہے آداب کے معنی تو میرے نزدیک یہ ہیں کہ آ
پاؤں داب یہ ادب ہوا کہ دوسرے کو حکم پاؤں دابنے کا کر رہے ہیں
بعض لوگ بندگی کرتے ہیں۔ میں جب کانپور اوّل اوّل گیا تو وہاں مسلمانوں
میں بھی اس لفظ بندگی کا رواج دیکھا ہے اب جو کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے
تو وہ بندگی کہتا ہے مجھے غصّہ آیا کہا کہ میں کیا ہندو ہوں جو بندگی مجھ کو

کہتے ہیں وہاں کے لوگوں نے کہا کہ یہاں کا رواج ہی یہ ہے۔ یاد رکھو یہ سب خرافات ہیں السلام علیکم سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے تمام دُعاؤں کو جامع ہے لیکن خدا تعالےٰ کو ان لوگوں کو اس کی برکات سے محروم کرنا ہے اس لئے ان کو توفیق ہی اس کی نہیں ہوتی غرض حضرت سعد بن عبادؓ رضی اللہ تعالےٰ عنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو پھر لاتے دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خود اپنے اوپر اس قانون کو جاری کیا اور پھر کمال اخلاق یہ ہے کہ شکایت حکایت نہیں یہاں تو کوئی ادنیٰ آدمی بھی ہو تو کہنے لگتا ہے کہ تم بڑے مغرور ہو ہم پکارتے چلاتے رہے سُنا ہی نہیں۔ اور اس باب میں شرع نے یہاں تک رعایت کی ہے کہ ارشاد ہے لَا یَتَنَاجیٰ اِثْنَانِ دُوْنَ الثَّالِثِ یعنی اگر تین آدمی بیٹھے ہوں تو دو آپس میں سرگوشی نہ کریں اس لئے کہ اس کا دل دُکھے گا کہ بس میں ہی غیر تھا مجھ سے چھپانا منظور تھا کہاں ہیں تمدن کے مدعی میں بقسم کہتا ہوں کہ شریعت نے تمدن کی اس قدر رعایت کی ہے کہ اُتنی کوئی کرتا تو کیا اُس کے دقائق اور اس کے علل سمجھنے کے لئے بھی بڑے دماغ کی ضرورت ہے افسوس شریعت جیسے دلبر رعنا کو لوگ ڈائن سمجھتے ہیں ارے شریعت تو وہ محبوب ہے کہ جیسا کسی نے کہا ہے ؎ ۲۰

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے)

جس ادا کو دیکھو دل کھینچتا ہے۔ اے صاحبو! اپنے گھر کی دولت چھوڑ کر کیوں دوسروں سے بھوٹی کوڑیاں مانگتے ہو تمہاری معاشرت تمہارے کھانے پینے تمہارے اخلاق تمہاری سیاست و انتظام شریعت نے کسی بات کو بھی تو نہیں چھوڑا افسوس ہے کہ اور ہزار افسوس ہے کہ ایسی محبوبہ کو چھوڑ کر چڑیلوں پر گرتے ہو کیونکہ شریعت کے سامنے تہذیب جدید کو بالکل یہی نسبت

ہے اور طرفہ یہ کہ شریعت میں دین کی راحت تو ہے ہی دنیا کی بھی پوری آسائش
ہے اور اسی طرح اس تہذیب مخترع میں دین کا تو جو کچھ بھی ضرر ہو خود دنیا کی
بھی کلفتیں ہیں چنانچہ مقابلہ اور امتحان ہی کے طور پر دیکھ لو مثلاً آجکل ہمارے
ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں اور شریعت کو قید بتلاتے
ہیں ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ مقید ہیں اور ہم آزاد ہیں
ایک صاحب کانپور میں کوٹ پتلون بوٹ سوٹ سے کسے کسائے میری پاس
آئے وہ بیٹھنا چاہتے تھے کرسی پر تو وہ سہولت سے بیٹھ جاتے لیکن ہم غریبوں
کے پاس کرسی کہاں ہمارے لئے تو چٹائی پر بیٹھنا فخر ہے اب وہ کھڑے ہیں
لیکن کھڑے کھڑے بات کیسے کریں ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھی چھڑی پر سہارا
دیکر اور تاک لگا کر بھد سے گر پڑے مجھے بڑی ہنسی آئی بتلایئے یہ تہذیب
ہے یا تعذیب یہ آزادی ہے یا قید ہے بیٹھنا تو مصیبت تھا ہی اور اٹھنا
۲۱ اور بھی زیادہ مصیبت ہوا اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں تو بس وہاں ہی پڑے
رہتے ہوں گے اور لیجئے اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجاوے تو ہم تو دانہ
بھی چبا سکتے ہیں اور روٹی ہو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں
اور ان کے لئے میز ہو کرسی ہو کانٹا ہو چھری ہو جب یہ کھانا تناول فرمائیں
کپڑوں میں ہماری یہ حالت ہے کہ پاجامہ نہ ہو لنگی باندھ لیں گے اچکن نہ ہو
کرتہ کافی ہے عمامہ نہ ہو ٹوپی ہی سہی پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو بجز
حدود شرعیہ کے کوئی قید نہیں اگر وہ بھی نہ ہو تو ننگے سر رہیں گے اور پھر
اچکن اگر بانات کا ہو تو اس کی قید نہیں کہ پاجامہ کشمیرہ کا ہو لٹھے کا ہو
گاڑھے گزی کا ہو کسی شے کا ہو نہ ہو لنگی بھی کفایت کرتی ہے انکو یہ مصیبت
ہے کہ اگر پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو
قمیص بھی اُس کے مناسب ہو ورنہ فیشن کے خلاف ہے کیوں صاحبو یہ
آزادی تو بڑی بھاری قید ہے میں ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا

ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آزاد ہیں باقی نہ کھانے میں آزاد نہ پینے میں آزاد نہ پہننے میں آزاد ہر بات میں مقید ہیں اگر آزاد ہیں تو خدا تعالیٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آزاد ہیں تو خاک پڑے ایسی آزادی پر اور بھاڑ میں جائے ایسی مطلق العنانی اور مبارک رہے ہم کو یہ قید اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو حالت یہ ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند   شکارش نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی کا خواہشمند نہیں ہوتا اور شکار جال سے نکلنے کا طالب نہیں ہوتا۔)

اور یہ وہ قید ہے ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم   غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر دو صد زنجیر بھی ہوں تو توڑ دوں سوائے اپنے محبوب کی بندش کے یعنی سوائے اپنے محبوب کے کسی کا گرفتار ہونا برداشت نہیں کر سکتا)

۲۲ اور ہماری ایسی قید ہے کہ [illegible] محبوب کسی کو ملا ہو اور وہ اپنے [illegible] سے [illegible] عاشق کو اپنے پاس بٹھلالے اور [illegible] کو چھوڑے تو اس عاشق کی اس وقت کیا حالت ہوگی اس کی تو [illegible] یہ حالت [illegible] ؎

[illegible] فتادم بدیں امید [illegible]   کہ شاید دست من [illegible] گریبان من گیرد

([illegible] اس امید میں [illegible] کہ کبھی تو میرا ہاتھ دوبارہ میرا محبوب پکڑ لیگا)

بھلا اب کیا حال ہوگا بلکہ اگر وہ محبوب یہ کہے کہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے میں تکلیف ہو تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں تو وہ عاشق یہ کہے گا کہ میرا ہاتھ کیا [illegible] بھی [illegible] ؎

نشود نصیب دشمن [illegible]   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

[illegible]

ہیں جن کو خدا تعالیٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام اس [illegible]

محبت ہے کیا وہ اس قید کو ناگوار سمجھے گا ہرگز نہیں جس کو کسی کوئی محبت ہوئی ہوئی ہوگی وہ ہی اُس کا لطف جانتا ہے ہاں جس قلب میں محبت کا مذاق ہی نہ ہو وہ کیا جانے کہ اس میں کیا لطف ہے نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہوتا ہے ورنہ اگر مذاق ہے تو خدا جانتا ہے کہ ساری قیدیں آسان ہیں وہ چولھے میں ڈالے گا ان قیدوں سے آزاد ہونے کو اور بھاڑ میں ڈالے گا ایسی عقل کو اور سر پہ رکھ لے گا دیوانگی کو اسی دیوانگی کی نسبت مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر مفلس و قلاش اور دیوانہ ہیں بھی دولت کیا کم ہو کہ محبوب حقیقی کی صحبت میں مست ہیں)

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہو ناداری ہو بیماری ہو افلاس ہو اُس کو سب گوارا ہیں اور اوّل تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی اور بالفرض اگر ہوں بھی تو اُس کو اس حالت میں بھی چین ہے سکون ہے اطمینان ہی ۲۳
اُس کی زندگی لطف کی زندگی ہے خواہ کیسی حالت میں ہو حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً یعنی جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اُسکو ہم پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں ان کی ہر وقت تسلّی کی جاتی ہی اُن کے قلب میں سکون اور چین کا افاضہ ہوتا رہتا ہے اور اُن کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے ؎

سوئے نومیدی مرو کامیدہاست　　سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی اُمیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ جیو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالےٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ اُمید رکھو)

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ تعب بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں اور ایسی قید کے مقابلہ میں جو آزادی ہے وہ نری مہمل ہے اور سراسر خسران ہی حرمان ہی

اور یہ آزادی بس خدا تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آزادی ہے
ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ اسلام نے ہم کو کیسی آسایش کی
معاشرت سکھلائی ہے اور حقوق کی کہاں تک رعایت کی ہے اور لیجئے اسلام
کی تعلیم ہے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ ہو اور یہ جڑ ہے محبوبیت باہم دگر کی
چنانچہ ارشاد ہے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ مسلمان
وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں یعنی کسی کو اُس سے
ضرر و اذیت نہ پہونچے یہ تو کلیہ ہے پھر اس کی جزئیات کی عملی اور علمی طور
سے ایسی تعلیم فرمائی ہے کہ انتہا کو پہونچا دیا ہے چنانچہ تعلیم ہے کہ اگر کوئی
بھائی مسلمان سوتا ہو اور تم کو اُٹھنے اور کہیں جانے کی ضرورت ہو تو
آہستہ سے اُٹھو اور آہستہ سے جوتے پہنو آہستہ سے کواڑ کھولو اگر بات
کرو آہستہ سے کرو یہ سب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھا دیا جیسا
نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے لَیْلَةُ الْبَرَاءَةِ (شب برات) ۲۴
کے قصہ میں مذکور ہے وقت کم ہے ورنہ ایک ایک جزئی کے متعلق میں
قصے بیان کر دیتا میں نے ایک کتاب آداب المعاشرت لکھی ہے اس میں
یہ دکھلا دیا ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ دینے کی شارع نے کتنی رعایت
کی ہے آجکل جو دیندار کہلاتے ہیں وہ دینداری کو ان چند باتوں میں
منحصر سمجھتے ہیں کہ پائنچے ٹخنے سے اوپر کر لئے ڈاڑھی بڑھالی نماز پڑھ لی
بس دیندار ہو گئے باقی نہ اخلاق کو جزو دین سمجھتے ہیں نہ معاشرت کا
دین سے کچھ تعلق جانتے ہیں نہ معاملات ان کے شریعت کے موافق
ہیں کسی کو ستا لیا کسی کی غیبت کر لی کسی کو حقیر سمجھ لیا کسی کی آبروریزی
کرلی اور پھر دیندار کے دیندار اس کی وہ مثال ہے جو مولانا یا اور کوئی
مصلح فرماتے ہیں ؎

ملنے کا پتہ - مکتبہ تھانوی مسافرخانہ بندر روڈ - کراچی عـــــ

از بروں گور کافر پر حلل	واندروں قہر خدائے عزّوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید	ور درونت ننگ می دارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر خدائے عزّوجل کا عذاب ہو رہا ہے باہر سے تو بایزید بسطامیؒ جیسے پر طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے ۱۲)

ایسے دینداروں کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ بس دیندار ایسے ہی ہوتے ہیں اور شریعت کی یہی تعلیم ہے صاحبو! یاد رکھو کہ دین نام صرف ظاہر ہی کے درست کرنے کا نہیں گو ظاہر کی اصلاح بھی دین میں مامور ہے مگر صرف اُس سے پورا دیندار نہیں ہوتا پورا دیندار وہ ہے جو شریعت کے ہر ہر حکم پر عمل کرے ظاہر کے متعلق بھی اور باطن کے متعلق بھی حَسین اُس کو کہیں گے جو سر سے پاؤں تک حَسین ہو اور اگر سب اعضاء خوبصورت ہوں اور آنکھیں پھوٹی ہوئی ہوں تو وہ حسین نہیں ۲۵
ہے پس جس کے اندر ایک بات بھی دین کے خلاف ہو گو وہ ہم سے اچھا ہے لیکن اُس کو نمونہ دین کیوں سمجھتے ہو۔ اور دیکھئے شریعت کی تعلیم ہے کہ سفارش سے بھی کسی کو تکلیف نہ دو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے حضرت مغیثؓ کی سفارش کی جو اوّل اُن کے شوہر تھے اور انھوں نے خیار عتق کی بناء پر تفریق کرلی تھی اُن سے نکاح کرنے کے لئے فرمایا وہ پوچھتی ہیں کہ آپ کیا حکم فرماتے ہیں یا سفارش آپنے فرمایا سفارش کہنے لگیں مجھ کو منظور نہیں آپ ناخوش نہیں ہوتے اس سے ثابت ہوا کہ سفارش وہی ہے جس میں کسی پر زور نہ ڈالا جاوے تو اتنی تکلیف بھی کسی کو گوارا نہیں کی گئی اسی طرح دین کے اندر صفائی کا حکم ہے دیکھئے اگر معاملات کو صاف رکھیں تو ممکن نہیں کہ دلوں میں فرق آوے بہرحال شریعت کا جو حکم معاملہ و معاشرت و

اخلاق کے متعلق لیجئے اُس کی تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس تمام کا
خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ ہو۔ الحاصل جو اسباب محبت
کے ہیں نوال جمال کمال شریعت نے اُن کی بابلغ وجہ (کامل طریقہ سے) تعلیم
فرمائی ہے پس جو شخص شریعت پر عمل کریگا جو کہ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (عمل
کئے نیک)، کا مدلول ہے وہ بالطبع محبوب ہو جائے گا اور اپنی قوم میں
تو محبوب ہو ہی گا غیر قوموں میں بھی اس کا اعتبار ہو گا اس سے بعض
اعمال صالحہ کا دوستی میں دخل ہونا۔ سمجھ میں آگیا ہو گا جو کہ باب معاملہ
و معاشرت و اخلاق سے ہے اب یہ بات رہ گئی کہ ایمان اور نماز روزہ
کو کیا دخل ہے محبوبیت میں سو اُس کی نسبت سنو کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ
کوئی کام ہو اوّل اُس کا قلب میں ارادہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کا جوارح
سے ظہور ہوتا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ کسی امر پر نباہ بغیر اس کے نہیں
۲۶ ہو سکتا کہ اس کا تقاضا شدید قلب میں راسخ ہو جائے اور اُس کے اضداد
و موانع قلب سے مرتفع ہو جائیں ورنہ ارادہ ہو گا مگر غیر راسخ جب
راسخ نہیں تو اکثر ارادہ بھی نہ ہو گا تو عمل بھی نہ ہو گا پس ثابت ہوا کہ مداومت
و استقامت بدون تقاضائے قلب کے نہیں ہوتا پس اس قاعدہ کے
موافق اخلاق و معاملات و معاشرت کی درستی بھی جس کا دخیل ہونا
محبوبیت میں مسلم ہو چکا ہے جب ہی نبھ سکتی ہے کہ ان چیزوں کا قلب
میں تقاضا و رسوخ ہو اور وہ تقاضا و رسوخ بغیر ایمان اور روزہ نماز
کے نہیں ہو سکتا اس لئے کہ تمام تو ... متعلقہ تصدیق و معاملات اللہ تعالیٰ
و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی ہم کو تعلیم فرمائی ہیں تو جب تک
تصدیق اللہ تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قلب میں راسخ
نہ ہو گی تو اُن تعلیمات پر استقامت نہ ہو گی یہ تو ایمان کا دخل ہوا اور
روزہ نماز کو یہ دخل ہے کہ یہ کیفیت قلبی تقاضے کی موقوف ہے

قلب کی صفائی پر اور قلب کی صفائی بغیر روزہ نماز نہیں ہوتی روزہ سے تو اس طرح کہ اُس سے قوت بہیمیہ کا انکسار ہوتا ہے اور نماز سے تواضع پیدا ہوتی ہے تکبر ٹوٹتا ہے اور تکبر و بہیمیہ ہی اصل ہے بہت سے اخلاق ذمیمہ کی پس صوم و صلوٰۃ سے اس کی اصلاح ہوگی اور اس کی اصلاح سے معاملات وغیرہ درست ہوں گے جو مدار ہے محبوبیت کا اور مسبب کا سبب ہے پس نماز و روزہ سبب ہوا محبوبیت کا مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ایمان اور صوم و صلوٰۃ کا موضوع لہٗ (جس کیلئے وضع کئے گئے ہیں) صرف یہی ہے اصلی موضوع لہٗ تو اُن کا قرب الٰہی ہے لیکن یہ محبوبیت بھی اوس پر خاصہ لازمہ کے طور پر مرتب ہوجاتی ہے چونکہ یہاں بیان تھا محبوبیت و مودۃ کا اس لئے اس کا بھی اس میں دخل بیان کر دیا گیا۔ اب دو سوال رہ گئے ایک سوال تو یہ ہے کہ ہم بعضے دینداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ
۲۷ شریعت کے پورے پابند ہیں اور ساری دنیا کو نصیحت کرتے ہیں لیکن سب سے ان کی لڑائی رہتی ہے لوگ اُن کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے وہاں محبوبیت کا ترتب کیوں نہیں ہوا جواب اس کا یہ ہے ع

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

(اے دوست تجھ میں یہی ہے کہ تو سخن فہم نہیں ہے)

یہ سوال آپ کی کم فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ صاحبو! نصیحت کا بھی شارع نے قانون مقرر کیا ہے جب کوئی شخص اُس قانون کے خلاف کریگا تو اُس نے کمال ایمان و عمل صالح ہی میں خلل ڈالا۔ اس لئے لامحالہ وہ ایمان و عمل صالح کے اس ثمرہ مودت و محبوبیت سے ضرور محروم رہیگا اِس سے وہ شبہ جاتا رہا اور وہ قانون یہ ہے کہ نصیحت خیر خواہی اور محبت اور ہمدردی سے ہو نفسانیت کا اس میں شائبہ نہ ہو تو جو شخص اِس قانون کے موافق عمل کریگا اُس کی کسی سے مخالفت ہو ہی نہیں سکتی

شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے مجلسِ وعظ میں ایک شخص کو دیکھا کہ اُس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہے کوئی اور مولوی صاحب ہوتے تو بُلا کر ملامت کرتے بُرا بھلا کہتے سچ یہ ہے کہ ہم لوگ نام کے مولوی ہیں اور نرے الفاظ پرست ہیں حالانکہ الفاظ یاد کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک حال نہ ہو۔ مولانا رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مردِ حال شو　　پیشِ مردِ کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ دو حال پیدا کرو کسی کامل شخص کے سامنے پامال ہو جاؤ تو صاحب حال بن جاؤ گے)

پس اگر کوئی نرا مولوی ہوتا تو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیک باتوں کا حکم اور بری باتوں سے منع کرنا) کی آیات و احادیث پر اس طرح عمل کرتے کہ بلا کر اس کو بُرا بھلا کہتے اب عداوت و نفرت جانبین میں ہوتی اور اُس کو دیکھ کر بیشک یہ شبہ پیدا ہوتا کہ تم تو کہتے ہو کہ شریعت پر عمل کرنے سے محبوب ہو جاتا ہے اور اُس پر لوگ پروانوں کی طرح گرتے ہیں لیکن ہم تو دیکھتے ہیں کہ بجائے دوستی کے اور اُلٹی عداوت اور نفرت ہو گئی۔ لیکن شاہ صاحب نے یہ نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جایئے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے وہ ٹھہر گیا بعد فراغت کے فرمایا کہ بھائی اپنا عیب آدمی کو معلوم نہیں ہوتا مجھے اپنے اندر ایک عیب کا شبہ ہے وہ یہ کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے اور اس پر ایسی ایسی وعیدیں آئی ہیں تو آپ ذرا دیکھ لیں کہ واقعی میرا شبہ صحیح ہے یا نہیں وہ شخص پانی پانی ہو گیا اور عرض کیا کہ حضور آپ کا پاجامہ کیوں لٹکتا میرا البتہ لٹک رہا ہے اور اُسی وقت اس کو جا کر درست کر لیا۔ اور ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی پس اگر محبت اور حکمت عملی سے کہا جاوے تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی بُرا مانے اسی واسطے امر بالمعروف اور وعظ عام کی ہر شخص کو اجازت نہیں ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ۲۸

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی چاہیے کہ ایک جماعت تم میں سے ایسی ہو کہ جو خیر کی طرف داعی ہوں اور نیک بات کا حکم کریں اور بری بات سے منع کریں دیکھئے یہ نہیں فرمایا کہ تم سب امر بالمعروف (اچھی باتوں کا حکم کرنا) کرو بلکہ یہ فرمایا کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہونا چاہیے کہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف کا ہر شخص اہل نہیں ہے ہر شخص کو اجازت نہیں ہے کہ وہ وعظ عام اور خطاب عام کرے البتہ جن پر پوری قدرت ہے جیسے اپنے اہل وعیال وہاں اصلاح کا ہر شخص مکلف ہے يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ۵٦ (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ) غرض ہر کام تدبیر سے ہوتا ہے میرا معمول ہے جب میں کہیں سفر میں ہوتا ہوں مجھ سے فرمائش ہوتی ہے کہ وعظ میں فلاں بات کا ذکر کرنا ۹
میں صاف انکار کر دیتا ہوں بعضے ایسے بھولے بھالے ہوتے ہیں کہ منبر پر بیٹھ کر وہی سبق گاتے ہیں جو ان کو پڑھایا جاتا ہے لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کہلایا ہوا کہہ رہے ہیں اس سے اثر ضعیف ہو جاتا ہے اور لوگوں کو ناگوار بھی ہوتا ہے میں ایسی فرمائش پر ہرگز عمل نہیں کرتا حتیٰ کہ نواب صاحب ڈھاکہ نے مجھ کو بلایا تھا میں نے پہلے یہ شرط کر لی تھی کہ آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ مجھ سے کسی خاص بات کے وعظ میں بیان کرنے کی فرمائش کریں چنانچہ انھوں نے موافق شرط کے کسی بات کی فرمائش نہیں کی میں نے وعظ میں جو چاہا بیان کیا کسی نے بھی برا نہیں مانا میں نے اس کا تجربہ کیا ہے کہ فرمائشی وعظ کا اور رنگ ہوتا ہے اور خود کہنے میں اور بات ہوتی ہے بس شریعت کا قانون ہے کہ نصیحت وتذکیر

میں آداب واحتساب کی رعایت کرو اور اگر کوئی باوجود آداب
کے رعایت کرنے کے بُرا مانے اس پر شبہ واقع نہیں ہوسکتا اس لئے کہ
صفراوی کو مٹھائی کڑوی معلوم ہوہی گی اِس لئے کہ اس کا مزاج ہی خراب ہے
امر بالمعروف کی خاصیت میں کچھ خرابی نہیں اس کا خاصہ تو یہ ہے کہ ممنون
ہونا چاہیے ہمارے امراض اس شخص نے معلوم کرائے ایک اعتراض تو یہ تھا جس کا
جواب ہوگیا دوسرا سوال یہ ہے کہ بعض دیندار بھی نہیں ہوتے اور پھر بھی وہ
محبوب ہوتے ہیں تو پھر محبوبیت صرف دینداری کا خاصہ کیا ہوا
میں اس کا راز بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب کوئی محبوب ہو اور وہ
دیندار نہ ہو تو یہ دیکھو کہ علت اس کی محبوبیت کی کیا ہے سو علت
اس کی اکثر تو وہی شے نکلے گی جس کا شریعت نے حکم کیا ہے مثلاً
کوئی کافر سخی ہے یا عادل ہے تو اس سے اُس کی سخاوت اور عدل
کی وجہ سے محبّت ہوتی ہے اور سخاوت اور عدل دونوں کی شریعت ۳۰
نے تعلیم کی ہے کفر کے ساتھ مل کر بھی اُنھوں نے اپنا اثر دکھلایا ؏

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند — صاف گر باشد ندانم چوں کند

یعنی شراب کا گھونٹ مٹی میں مل کر جب مست بنا دیتا ہے تو خالص
شراب تو کیا کچھ نہ کرے گی۔ اِسی طرح اعمال شرعیہ کفر
کی نجاست کی آلودگی کے ساتھ بھی جب اپنا کام کر رہے ہیں اگر
ایمان کے ساتھ ملیں گے تو دیکھو کیا رنگ لاتے ہیں۔ ایک جواب
تو یہ ہوا دوسرا جواب یہ ہے کہ محبوبیت مطلقہ یعنی من کل الوجوہ
(ہر اعتبار سے) میں گفتگو ہے ہر شخص کے نزدیک محبوب بنا دے یہ بجز
مومن کامل کے کسی کو نصیب نہیں اگر کوئی کافر کبھی خلق حسن کے
ساتھ متصف ہے تو وہ بعض کے نزدیک محبوب ہے اور بعض کے
نزدیک نہیں بلکہ کفر یا بعض اخلاق ذمیمہ کی وجہ سے مبغوض ہے

اب شبہ جاتا رہا اور اگر حسن وغیرہ علت ہو تو اس کا جواب اوپر آچکا ہے اب ایک اعتراض اور باقی رہا وہ یہ ہے کہ ایک مومن جو شریعت کا پورا پابند ہے اس کا کسی سے مقدمہ ہو اور اس میں وہ مومن ہی حق پر ہے تب بھی فریق مقابل اس کو نظر غیظ سے دیکھتا ہے نظر محبت سے ہرگز نہیں دیکھتا اب وہ خاصہ کہاں گیا جواب اس کا یہ ہے کہ ہر شئے کی خاصیت کے ظاہر ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی معارض نہ ہو اگر معارض ہو تو یوں کہیں گے کہ شئے اپنے اثر سے مختلف ہوگئی تو یہاں یہ معارض ہے کہ اس کو اس کے زعم میں ضرر پہنچ رہا ہے اس لئے یہ شخص اگر نظر غیظ سے دیکھے تو ہمارے دعوے کے کچھ منافی نہیں ہے ہاں عام طور سے دیکھو کہ دوسرے لوگ کس نظر سے دیکھتے ہیں سو یقینی بات ہے کہ
۱۴۱ ایسے موقع پر عام طور پر سب یہی چاہا کرتے ہیں کہ خدا کرے یہ جیت جاوے اسی طرح اگر غیر مومن اگر مظلوم ہو تو سب کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی فتح ہو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفر سبب مودۃ کا ہے یہاں اس کی مظلومیت اس کی مبغوضیت کے معارض ہورہی ہے در اصل وہ مبغوض ہی ہے۔ پس خلاصہ یہ ہوا کہ محبوبیت اعمالِ صالحہ اور ایمان میں منحصر ہے اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوئی کہ جو اتفاق اور محبوبیت و مودت (دوستی) کو اس راہ سے طلب نہیں کرتے ہیں۔

ترسم کہ نرسی بکعبہ اے اعرابی — کیں راہ کہ تو میروی بترکستان است

(میں ڈرتا ہوں اے اعرابی تو کعبہ نہ پہونچے گا اس لئے جو راستہ تو نے چلنا اختیار کیا ہے وہ ترکستان کا ہے)

چنانچہ جو لوگ اتفاق اتفاق پکار رہے ہیں اور شریعت کے

کے خلاف کر رہے ہیں اُن کو آج تک تو کامیابی ہوئی نہیں اگر کوئی
کہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض جگہ ان میں اِتفاق ہے صاحبو وہ
اتفاق نہیں اِس لئے کہ آپ کو واضح ہو گیا ہے کہ اتفاق ہوتا ہے
باہمی اُلفت سے اور اُن میں اُلفت نہیں وہ عارضی اتفاق کی
صورت ہے بہت جلدی زائل ہوتا ہے کیونکہ منشاء اِس اِتفاق
کا اتحاد اغراض ہے جب تک ؏ اغراض متحد ہوتے ہیں وہ اتفاق
کا ڈھانچہ قائم رہتا ہے اور جب اغراض میں اختلاف ہوتا ہے
فورًا وہ اتفاق ٹوٹ جاتا ہے بخلاف مومن کے اِتفاق کے
اِس لئے کہ اس کی غرض اور مطلوب ہمیشہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ
صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رضا ہے اور اس میں تزاحم محتمل
ہی نہیں اِس لئے اُس کا اتفاق قائم رہتا ہے دو مومن اگر
جنوب و شمال میں بھی ہیں اور ان میں کوئی سابقہ تعلقات ۳۲
بھی نہیں اُن میں بھی اتفاق ہے پس عقلی طور سے ثابت ہو گیا
کہ اتفاق اگر ہے تو مومنین میں ہے اور اگر باقی رہ سکتا ہے تو
اُنہی کا اِتفاق باقی رہ سکتا ہے اور اسی پر قیاس کر لیجئے
اِس کی ضد کو کہ بغض اور عداوت جب ہو گا خلاف شریعت
کے کرنے سے ہو گا اور بغض اگر قائم رہنے والا ہے تو وہ ان
میں ہی ہے جو ایمان یا عمل صالح میں خلل ڈالتے ہیں پھر بھی
مومنین میں جتنا بھی ایمان ہے اسی مقدار کے موافق ان میں
مودت و محبت لازم ہے پس اگر آپ محبوب بننا چاہتے
ہیں اور اپنے آپس میں اتفاق قائم رکھنا چاہتے ہیں تو خدا تعالےٰ

؏ اِس کا ظہور جب کسی غیر قوم سے مخالفت ہو۔ ۱۲ جامع

ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کیجئے ، ورنہ مبغوضیت کے لئے تیار ہو جائیے ۔ لیکن خدا کے لئے ایمان اور عمل صالح کو اس نیت سے نہ کیجئے کہ ہم محبوب بنیں ، بلکہ قصد تو اطاعت کا حق کا ہونا چاہئے ۔

ہاں اس پر یہ ثمرہ بھی مرتب ہو جاتا ہے جیسے جب خانہ کعبہ کا ارادہ ہو تو بمبئی کی سیر کا ارادہ نہ کرو ۔ نیت تو ہونا چاہئے حج کی ہاں راستہ میں بمبئی بھی آوے گی اور سیر بھی کرلوگے ۔

اور یہاں سے یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ بعض لوگ جو نماز کی حکمت یا حج کی حکمت یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ نماز سے صفائی حاصل ہوتی ہے ، اور جماعت کی حکمت یہ کہتے ہیں کہ پانچ وقت جب محلہ کے مسلمان ملیں گے تو آپس میں اتفاق ہوگا اور جمعہ میں شہر کے مسلمانوں میں اتفاق ہوگا ۔ اور حج میں تمام عالم کے مسلمانوں میں اتحاد ہوگا میری تقریر کا ان کی تقریر سے متحد ہونے کا شبہ نہ کیا جاوے کہ وہ بھی ان اعمالِ صالحہ کو مورثِ اتفاق بتلاتے ہیں اور یہی میں نے کہا ۔ سو ان کی اور میری تقریر میں بہت بڑا فرق ہے ۔

ان کی غرض تو یہ ہے کہ مقاصد بالاصلیہ ان احکام کے یہی اتحاد و اتفاق ہیں اور میرا مقصود یہ ہے کہ موضوع لہٗ اصلی تو ان طاعات کا قربِ الٰہی ہے اور خدا تعالیٰ کا راضی کرنا ۔ ہاں جو ثمرہ ان پر بلا قصد مرتب ہو جاتا ہے وہ یہ بھی ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں ۔ گو ان کے لئے یہ اعمال موضوع نہیں ۔ پس میری تقریر کو ان کی تقریر کے ہمرنگ ہرگز نہ سمجھا جاوے ۔

الحاصل اتفاق کا اتباع شریعت میں اور نا اتفاقی کا شریعت کے خلاف کرنے میں منحصر ہونا ثابت ہوگیا۔ اور جس طرح سے اس تقریر سے اتفاق کے اسباب معلوم ہوگئے جن کا حاصل اطاعتِ حق ہے اسی طرح اس سے نا اتفاقی کے بھی اسباب معلوم ہوگئے ہونگے۔ کہ معصیت حق ہے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعاء کیجئے کہ توفیق عمل کی عطا فرمادیں۔ آمین ثم آمین۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

وعظ مسمّٰی بہ

حقیقتِ احسان

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

"مکتبہ تھانوی"، دفتر الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وعظ مسمیٰ بہ

"مواعظ اشرفیہ"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔ اما بعد واضح ہو کہ حضرت زبدۃ العارفین عمدۃ الواعظین مقتدانا مرشدنا مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جو جو وعظ کانپور میں قلمبند ہوئے ہیں منجملہ ان کے یہ ایک بہت بڑا معرکہ کا وعظ ہے جو اکثر دینی اور دنیوی نصائح و منافع پر مشتمل ہے۔ اور اس کا نام مواعظ اشرفیہ قرار پایا ہے۔ جو جو صاحب اس سے منتفع ہوں اس میں تمام سعی کرنیوالوں کے لئے دعائے خیر فرماتے رہیں۔ ۴

وعظ ششم جو اشرف العلماء سراج الواعظین حضرت مولانا حاجی حافظ شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۷ ربیع الاول ۲۳ھ روز جمعہ دو گھنٹہ بیس منٹ تک بمقام جامع مسجد کانپور فرمایا۔ دعاء مانگ کر اس خطبہ ماثورہ کو پڑھ کر وعظ شروع فرمایا:۔

وعظ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ

رَسُوْلَہٗ صَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔

یہ ایک حدیث شریف کا ٹکڑا ہے اور جواب ہے ایک سوال کا جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر کیا تھا۔ جس کا پورا قصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس حالت میں کہ ہم ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک موجود تھے۔ ناگاہ ہم پر ایک ایسا شخص ظاہر ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت کالے تھے، اس پر سفر کا نشان تو معلوم نہیں ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھڑ کر باادب بیٹھ گیا۔ اور پوچھنے لگا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وآلہ وسلم اسلام کس کو کہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعمال اسلامیہ کو ذکر فرمایا۔ کہ خدا کے سوا ۵
کسی کو معبود نہ جاننا، اور محمدؐ کے رسول اللہ ہونے کی تصدیق کرنا، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، رمضان شریف کے روزے رکھنا، اور استطاعت ہونے پر بیت اللہ کا حج ادا کرنا۔

یہ سنکر اس شخص نے آپؐ کی تصدیق کی کہ آپ سچ ارشاد فرماتے ہیں۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھتا بھی ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس شخص نے سوال کیا کہ ایمان کس کو کہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقائد اسلامیہ کو ارشاد فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرنا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا۔ قیامت کے دن پر ایمان لانا اور تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لانا۔ اس شخص نے اس کو بھی سنکر کہا کہ سچ ارشاد فرماتے ہیں۔

پھر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ "یعنی احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگر

نہیں دیکھتے ہو تم اس کو پس وہ تحقیق تم کو دیکھتا ہے "

اس سوال کے علاوہ اس شخص نے اور اور سوال بھی کئے تھے جو پوری حدیث میں مذکور ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب کے جواب بخوبی ارشاد فرمائے تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ اس شخص کے چلے جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے عمرؓ تم جانتے بھی ہو کہ یہ سوال کرنے والے کون تھے، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ[1] اَعْلَمُ " اللہ اور اسکا رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جاننے والے ہیں " حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا فَاِنَّہٗ جِبْرَئِیْلُ اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ " یعنی یہ سوال کرنیوالے جبرئیل علیہ السلام تھے، تمہارے پاس اس لئے آئے تھے کہ تم کو تمہارا دین سکھلادیں "

وجہ اس آنے کی یہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کو زیادہ پوچھ گچھ سے منع فرمایا تھا۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ امور دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو پیش آئیں یا واقع ہوں ان کا پوچھنا تو ضروری ہے اس سے ممانعت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ محض فرضی صورتیں نکال نکال کر احتیاطاً پوچھ رکھنا اگرچہ ابھی نہ ہوئی ہوں، جیسے اب بھی ایک تو عام لوگ ہیں ان کو تو یہ چاہئے کہ جب کوئی امر پیش آوے اس وقت دریافت کرلیں یا ایسا کوئی امر جس کا واقع ہونا غالب ہو وہ دریافت کرلیں۔ یہ نہیں کہ فرضی بعید الوقوع صورتیں دریافت کرکر کے پریشان کریں۔ البتہ طلباء جن کا کام ہے مسائل کی تحقیق کرنا وہ اگر دریافت کریں تو مضائقہ نہیں اور بعض لوگوں کی جو یہ عادت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ مولویوں کو دق کرنے کے لئے ایسی باتیں پوچھا کرتے ہیں جن کی کوئی صورت نہیں۔ یہ سب بیکار و فضول ہے۔ صحابہؓ کو جو سوال سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا تھا اس کی کئی وجہیں ہیں۔

اوّل تو یہ کہ ایسی فرضی باتیں دریافت کرنا خلاف ادب تھا۔ دوسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضروری بات خود ہی بیان فرمادیا کرتے تھے، آپ کا ارشاد ہے

[1] ادب کی وجہ سے صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے اس طرح کہدیا کرتے تھے ۱۲

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (مجھ کو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے) یہ تو آپؐ کا فرضِ منصبی ہی تھا، اور خود آپؐ اعلیٰ درجہ کی شفقت رکھتے تھے۔ ضرورتوں کو سمجھتے تھے آپ بغیر بتلا دیا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں سوالات کرتے رہنے کی ضرورت ہی کیا تھی جس طرح اگر کوئی طبیب حاذق شفیق ہو اس نے نبض دیکھ لی۔ ضروری امور دریافت کر کے تشخیص کر لی نسخہ لکھ دیا، پرہیز بتلا دیا۔ سارے ضروری امور سے خود ہی غایت شفقت کے باعث سے آگاہ کر دیا تو پھر ایسے شخص سے دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی۔

تیسری یہ بھی مصلحت ہو سکتی ہے کہ بعض منافقین گھڑ گھڑ کر صورتیں پوچھا کرتے تھے اور غرض اس سے محض دق کرنا ہوتا تھا اس لئے مسلمانوں کو بھی منع کر دیا گیا تاکہ منافقین کو آڑ نہ ملے۔ چنانچہ خود مجھ[1] سے ایک شخص نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ دو شخص چلے جاتے تھے اور ان کے ہمراہ ایک عورت تھی، ایک شخص اس کا خاوند تھا دوسرا اس کا بھائی۔ اتفاق سے چوروں نے دونوں کو قتل کر ڈالا سر تن سے جدا ہو گیا۔ وہ رونے لگی۔ اتفاق سے ایک درویش کامل کا اُدھر سے گذر ہوا۔ وہ واقعہ دریافت کرنے کے بعد اس عورت سے کہا کہ دونوں کے سر دھڑ سے لگا دے۔ اس نے خاوند کے دھڑ کے ساتھ بھائی کا سر اور خاوند کا سر بھائی کے دھڑ کے ساتھ لگا دیا۔ انھوں نے دعاء کی دونوں زندہ ہو گئے۔ تو بتلاؤ کہ وہ عورت کس کو ملے گی! میں نے کہہ دیا کہ جناب مجھے نہیں معلوم۔ ایسی باتوں کے پوچھنے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ جواب نہ دے سکیں گے تو ہم کہیں گے کہ ہم نے ایسی بات پوچھی کہ اس کا جواب عالم سے بھی نہیں آیا یا ہم ایسے بڑے ہیں ایسے ذہین ہیں اور بس۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ بعض بات آسان ہوتی ہے اور پوچھنے کی بدولت دشوار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب حج فرض ہوا تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ اَفِیْ کُلِّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (کیا ہر سال میں ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)، آپؐ نے کچھ دیر سکوت فرمایا۔ پھر ارشاد کیا کہ اگر میں

[1] یعنی مولانا اشرف علی صاحب علیہ الرحمۃ سے ۱۲

نَعَمْ (ہاں) کہدیتا تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور تم لوگوں سے نہ ہو سکتا مصیبت میں پڑ جاتے۔ اور آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ذَرُوْنِیْ مَا تَرَکْتُکُمْ (یعنی مجھ کو چھوڑے رکھو جو مناسب سمجھوں گا اس سے تم کو آگاہ کر دیا کروں گا تم کھود کھود کر نہ پوچھا کرو) یہ وہ مصلحتیں تھیں جو ممانعت سوال کے باعث تھیں اور اس وقت میرے خیال میں آئیں ممکن ہے کہ اور اور بھی مصلحتیں ہوں۔

بہرحال ممانعت سوال کی وجہ سے صحابہؓ دریافت کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ بعض امورین اُن کے خیال میں آتے ہوں گے لیکن اس میں تردّد ہو جاتا ہوگا کہ نہ معلوم یہ باتیں ضروری ہیں یا نہیں، ان کا پوچھنا بے ادبی تو نہیں ہے اسلئے ڈر کے مارے نہ پوچھ سکتے تھے۔ یہ بھی ایک مرتبہ ہے جو حاصل کرنے کے قابل ہے کہ جو دل میں کھٹکے اُسے ترک کر دیا جاوے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے دَعْ مَا یُرِیْبُكَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْبُكَ (یعنی جس چیز سے تمہیں کھٹکا ہو اسے چھوڑ کر ایسی چیز
۸ اختیار ہو جس سے کھٹکا نہ ہو) پس خدائے تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو اس لئے بھیجا تھا کہ وہ پوچھیں گے تو صحابہؓ کو بہت سی دین کی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

اب یہ سمجھئے کہ میں نے اس وقت اس لئے احسان کے بیان کو اختیار کیا ہے کہ اس کی بڑی ضرورت ہے، لوگ اس سے بالکل غافل ہو رہے ہیں۔ احسان کے متعارف معنی جو اردو میں مشہور ہیں وہ یہاں مراد نہیں۔ یہ عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں اچھا کرنا، اور یہاں مراد ہے عبادت کو اچھا کرنا۔ اب دیکھئے اوّل تو لوگ عبادت ہی سے بھاگتے ہیں اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ دنیوی کاموں میں دن رات لگے رہتے ہیں، ذرا ذرا سی باتوں کے لئے مشقت اُٹھاتے ہیں۔ خصوصاً اگر تھوڑی سی دنیا کی امید ہوتی ہے تو بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں اور مشقتیں اٹھانے میں دریغ نہیں کرتے لیکن عبادت میں کوتاہی کرتے ہیں اور دنیا طلبی میں سرگرم ہیں۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ اس کی (یعنی دنیا طلبی کی)، اور ترغیب دی جاتی ہے، جلسے ہوتے ہیں، کمیٹیاں قائم ہوتی ہیں اور کوشش ہے کہ خوب مال و دولت کی حرص بڑھ جاوے، ہوا و ہوس

میں ترقی ہو، دن رات ترقی ترقی کی پکار ہو رہی ہے۔ ہوا و ہوس کا نام بدل کر ترقی رکھ دیا ہے۔ آخر اس سے مطلب کیا ہے، یہی نا کہ مال خوب حاصل کیا جاوے، مکان بھی نہایت عالیشان ہو، کپڑے بھی نہایت قیمتی ہوں، اسباب بھی بیش بہا ہو، غرضیکہ دنیوی عیش و سامان کے جمع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاوے۔ چاہے دین رہے یا جاوے۔

لیکن یہ بھی معلوم رہے کہ ترقی کا مسئلہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ آپ اس کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں جس کا نہایت معتبر اور سچا واقعہ اس طرح پر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ بالاخانہ پر تشریف رکھتے تھے۔ وہاں صرف ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی، آپ اس پر لیٹے ہوئے تھے، جسم شریف پر چٹائی کے نشان بن گئے تھے۔ اور سرہانے کی جانب کچھ کچے چمڑے لٹک رہے تھے۔ پائنتی کی جانب کچھ ببول کی پتیاں پڑی ہوئی تھیں تاکہ ان چمڑوں کو ان سے دباغت دے لیا جاوے۔

9 حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حالت کو دیکھ کر رونے لگے، آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، اور عرض کرنے لگے کہ یا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیصر اور کسریٰ وغیرہ جو شرک اور کفر میں مبتلا ہیں خدا کی عبادت نہیں کرتے وہ تو چین و آرام سے گذاریں اور آپ اس تنگی کی حالت بسر کریں۔ آپ دعا فرمائیے کہ خدائے تعالیٰ آپ کی امت کو وسعت عنایت کریں۔

یہ حضرت عمرؓ کا ادب تھا کہ امت کی وسعت کے لئے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا اَفِیْ شَكٍّ اَنْتَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ (کیا اے عمرؓ بن الخطاب تم اب تک شک ہی میں پڑے ہوئے ہو) اُولٰٓئِكَ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَیِّبَاتُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ (ان کو لذیذ چیزیں دنیا میں جلدی سے مل گئی ہیں) مطلب یہ ہے کہ تمام آرام و آرائش کفار کو دنیا ہی میں مل گیا ہے آخرت میں وہ محروم رہیں گے۔ اب ہم لوگوں کے لئے خدائے تعالیٰ نے آخرت میں ذخیرہ کر رکھا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے افلاس اور تنگدستی

کی شکایت کی تھی اور چاہا تھا کہ دعا کر دی جائے اور فراغت اور وسعت ہو جائے۔ مال و دولت با فراط مل جائے، خوب ہی آسایش و آرام سے گذرنے لگے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ترقی کی درخواست کی تھی اور چاہا تھا کہ جیسے کفار کو مال و دولت میں ترقی حاصل ہے اسی طرح مسلمان بھی ترقی کریں۔ آپ نے فیصلہ فرمادیا کہ انکو یہاں مل گیا ہے ہم کو قیامت میں ملے گا۔ ایک یہ بات لوگ بہت کہا کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں ترقی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ دوسری قومیں بھی ترقی یافتہ نہ تھیں، اب ضرورت ہے۔ ان سے دریافت کرنا چاہیے کہ کیا اس زمانہ میں کسی نے ترقی نہ کی تھی قیصر اور کسریٰ کی عیش پرستیاں اور عیش و نشاط کے سامان دیکھیے، تاریخ پڑھیے۔ مال و دولت میں عیش میں آرام میں تزک و احتشام میں کیا تھا جو اُن کے پاس نہ تھا عمدہ سے عمدہ سامانِ عشرت مہیا تھے۔ اور مسلمانوں کے پاس وہ سامان اور اسباب نہ تھا۔ پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا جو اوپر مذکور ہوا۔ تواب کیا باقی رہ گیا۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو صحابہؓ کو افراطِ دنیا سے کچھ ضرر بھی نہ ۱۰
ہو سکتا تھا، کیونکہ قلب نہایت قوی رکھتے تھے۔ خدا کی اطاعت فرمانبرداری ان کے دلوں میں رگ و ریشوں میں گھسی ہوئی تھی۔ دل و جان سے احکامِ شرعیہ کی تعمیل پر آمادہ اور سرگرم رہتے تھے۔ خدا کے خوف سے ہر وقت ترساں و لرزاں رہا کرتے تھے۔

اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اگر کسی شخص کو سانپ کے پکڑنے اور اس کے زہر کے اثر نہ کرنے کا منتر یاد کرا دیا گیا ہو تو وہ سانپ کو بے کھٹکے پکڑ سکتا ہے۔ اگرچہ سانپ اس کے ہاتھ میں ہو۔ مگر وہ ہر طرح سے مطمئن رہتا ہے۔ دنیا اگرچہ سانپ کے مثل تھی لیکن صحابہؓ کو اس کا منتر یاد تھا۔ یعنی ذکر اللہ۔ خدا کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں اُن کو دنیا سے کیا ضرر ہو سکتا تھا۔ بخلاف ہم لوگوں کے کہ منتر تو یاد نہیں اور سانپ کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہلاکت۔ جہاں ذرا اس نے ڈسا اور خاتمہ ہوا۔

صحابہ کرامؓ کی وہ حالت تھی کہ اس کا کچھ کہنا ہی نہیں۔ حضرت عمرؓ جن کی دیانت، حق پرستی، قوت ایمان ایسے تمام اخلاق وصفات موافقین کیا مخالفین کے نزدیک بھی مسلم الثبوت ہیں ذرا ان کی حالت دیکھئے خلافت کا تو زمانہ اور کپڑے پیوند لگے پہنے ہوئے چکنا سالن تک نہ کھاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے آپ کی دعوت کی تھی، اور گوشت پکا رکھا تھا، جس میں گھی بھی کسیقدر ڈالا ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے وقت حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا میاں تم نے تو ایک سالن کے ساتھ دوسرا سالن بھی جمع کر دیا ہے۔ یعنی ایک تو گھی اس سے بھی روٹی کھائی جاسکتی ہے دوسرا گوشت کہ اس سے بھی روٹی کھا سکتے ہیں، اسقدر اسراف اور تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔

حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا کہ میں نے اس میں مقدار معین سے زیادہ صرف نہیں کیا ہے۔ جس قدر خرچ لے کر گوشت خریدنے نکلا تھا اسیقدر میں بوجہ معمولی گوشت ہونے کے تھوڑے کا گوشت لے لیا اور باقی کا گھی خرید لیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بات صحیح ہے مگر میرے نزدیک غیر مناسب ہے۔ الغرض وہ کھانا آپ نے نہیں کھایا۔ چھپر رہنے کو تھا، کوئی بڑا محل نہ تھا، دربان نہ تھے، پہرہ چوکی نہ تھا۔ اپنے کام کو خود کر لیا کرتے تھے، راتوں کو گشت لگاتے تھے، لوگوں کی حالت دریافت کرتے تھے، ضعفاء اور مساکین کی خبر لیتے تھے، پھر بھی آپ کی کیفیت اور حالت کو دیکھئے بغور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت حذیفہؓ جن کا صاحب اسرار لقب ہے اس وجہ سے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو منافقین کے نام بتلا دیئے تھے تو حضرت عمرؓ ان سے قسم دے دے کر پوچھا کرتے تھے کہ سچ بتلانا کہیں میرا نام تو ان لوگوں میں نہیں ہے۔ جب تقویٰ اور خشیت کی یہ حالت ہو تو پھر اگر ایسے لوگوں کے پاس دنیا ہوتی تو ان کو کیا ضرر ہو سکتا تھا۔

اب بتلایئے کہ اس زمانہ کے مناسب کیوں ترقی نہ تھی اور اس زمانہ کے مناسب کیوں ہے؟ کیا اس زمانہ میں کچھ ترقی نہیں ہوئی تھی؟ اکاسرہ اور قیاصرہ کے پاس

اس چیز کی کمی تھی، اور صحابہؓ کو ضرر کا احتمال بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے اور تمام چیزوں میں بھی یہی عذر کیا کرتے ہیں۔ نماز کی نسبت کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ضرورت تھی، جب نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، کیونکہ بت پرستی حال ہی میں چھوڑی تھی اس لئے ضرورت تھی کہ خدا کی عبادت کریں تاکہ بتوں کا خیال دل سے نکل جائے۔ روزہ زکوٰۃ کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں غصہ وغیرہ کا غلبہ تھا قوت کا زور تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ روزہ رکھیں تاکہ ضعف آجائے وہ سختی جاتی رہے۔ اب خود ہی لوگ ضعیف اور مہذب ہو رہے ہیں اب کیا ضرورت ہے۔ رہا حج چونکہ وہ تجارت کا ذریعہ تھا، تجارت کے لئے لوگ جمع ہوا کرتے تھے حج کی بھی بیخ لگا دی۔ رہ گئی زکوٰۃ سو وہ تو ان کی ترقی کے بالکل خلاف ہے۔ تصویروں کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے لوگ بت پرستی کے عادی ہو رہے تھے، اس کو اچھا سمجھتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد بھی خیال کچھ نہ کچھ دل میں بسا ہوا تھا، اگر تصویر وغیرہ رکھتے تو خیال سابق میں زیادتی ہوتی اور بت پرستی کا ذریعہ ہو جاتا اب کیا ضرورت ہے۔ اب تو بعض بت پرست ۱۲
قومیں بھی اس کی قباحت کو تسلیم کرتی جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں میں تو پشتہا پشت سے بت پرستی کا نام بھی نہیں، اب تصویر سے کیا حرج ہے۔

غرض طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا ہے جو کچھ جی میں آتا ہے لکھتے ہیں۔ یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اسلام ہی کی ضرورت نہیں، جان چھٹی ہوئی۔ دعویٰ تو اسلام کا اور اس کے تمام احکام سے انکار۔ ہر ہر چیز کے ساتھ پھیر پھار کر دین سے انکار کرنا چاہتے ہیں۔ صاف صاف انکار کرنا تو ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ لوگ برا کہیں گے۔ اگرچہ بعض نے ہمت کر کے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ مذہب ہی مانع ترقی ہے۔ ایک کمیٹی لکھنؤ میں ہوئی تھی ترقی کے ذرائع اور موانع سوچنے کے متعلق۔ وہاں ایک صاحب نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ مذہب ہی مانع ترقی ہے۔ ایک صاحب نے وہیں خوب ہی جواب دیا اور کہا واقعی یہی بات ہے، لیکن مذہب کی طرح قانون بھی مانع ترقی ہے، جب مذہب سے دستبردار ہو تو قانون کو بھی چھوڑ دو۔

چوری ڈکیتی کی جائے تو بہت سا مال جمع ہوسکتا ہے۔ اگر موقع ہو اور کسی کے قتل سے مال ہاتھ آتا ہو تو اس سے دریغ کرنے کی کیا وجہ؟ غضب کو بھی جی چاہتا ہوگا، پھر کون مانع ہے یہی ناکہ قانون ان امور کے مرتکب ہونے والے کو سزا ہوتی ہے۔ ذرا خلاف قانون کریں تو خبر لیجائے۔ انصاف تو یہ تھا کہ اگر مذہب سے دستبردار ہوتے تھے تو قانون کو بھی چھوڑ دیتے اس کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ غضب ہے حکام ظاہری کے قانون کا تو اتنا خوف اور حاکم حقیقی اور تمام جہان کے بادشاہ یعنی اللہ تعالیٰ کے قانون میں یہ دلیری اور گستاخی، عجب اندھیر ہو رہا ہے۔ دنیا میں انہماک ہے ایسی حالت میں عبادت کی بھلا کہاں نوبت آسکتی ہے۔ اگر کچھ لوگوں کو توفیق ہوئی بھی تو محض صورت عبادت کی ہوتی ہے معنی عبادت کے بالکل نہیں ہوتے۔ معنی سے یہ عبادت محض معرا ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بادام تو ہو اور اس میں مغز نہ ہو، صرف پوست ہی پوست ہو۔ یا جیسے دیوالی کی مورتیں اور تصویریں ہوتی ہیں کہ یہ کمہار ہے یہ لوہار وغیرہ ہے سب ہی کچھ ہے لیکن اصلیت نہیں۔ نام کو آدمی لیکن آدمیت ۱۲
نہیں۔ نام تو ہاتھی ہے اور کام کچھ نہیں کرسکتا۔ کسی چیز کو اٹھا نو در کنار وہ خود خریدنے اور بنانے والے پر لدا لدا پھرتا ہے۔ اگر کوئی حاکم کسی سے کہے کہ ہمیں ایک آدمی کی ضرورت ہے اور کوئی شخص آدمی کی تصویر پیش کر دے کہ حضور اس کو نوکری میں قبول فرمادیں، تو کیا وہ حاکم اس بیوقوف نادان سے ناراض نہ ہوگا، اور اس کی بیہودہ حرکت کو سخت بے ادبی اور گستاخی نہ سمجھے گا، سزا نہ دیگا! تو پھر بڑے غضب کی بات ہے کہ ہم خدا کے سامنے اس ... کر آدمی یعنی صورتِ آدمی کے مثل صورت عبادت کو بے خوف وخطر پیش کریں اور گستاخی کا ذرا خیال بھی نہ آئے۔ عبادت بے جان تو پیش کریں اور شرماویں نہیں۔

اب سمجھنا چاہئے کہ عبادت کی رُوح اور جان کیا ہے، اس کی حقیقت اور صورت میں کیا فرق ہے۔ کونسی چیز ہے جس کے ہونے سے صورتِ عبادت اصلی عبادت ہوجاتی ہے، اس کا کیا وجہ ہے۔ پس اس حدیث سے دیکھئے عبادت کے اچھا کرنے

حقیقت بتلائی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے اچھا ہوتے کے کیا معنی ہوا کرتے ہیں۔ یعنی اس میں کوئی نقصان نہ ہو کوئی کسر نہ رہے جیسی چاہئے ویسی ہی ہو۔ غرض ہر چیز کا اچھا ہونا اس کے مناسب جدا طریق سے ہوتا ہے۔ مثلاً اچھی روٹی وہ ہوگی جس کا مادہ بھی اچھا صورت بھی اچھی ہو جو اس کا ثمرہ ہے وہ بھی اچھا ہو۔ اسی طرح یوں کہا کرتے ہیں کہ فلاں طالب علم امتحان میں اچھا رہا، یعنی اس کی تقریر بھی اچھی تھی، تحریر بھی، طرز بیان بھی خوب صاف تھا، مطلب واضح تھا، حشو و زوائد سے کلام مبرا تھا، یعنی تمام ضروریات مجتمع تھیں۔ کوئی حالت ایسی نہ تھی جس کی کمی رہ گئی ہو۔ اسی پر قیاس کرکے عبادت کے اچھا ہونے کے معنی بھی سمجھئے۔ کہ جتنے امور کی عبادت میں ضرورت ہے جو جو چیزیں واجب الاجتماع ہیں سب کی سب اس میں پائی جاویں، کسی چیز کی کسر نہ رہے۔

یہ تو اجمالاً تھا، اب اس کی تفصیل کہ وہ کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جن سے
عبادت اچھی ہوتی ہے شرائع میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ لوگ عموماً ۱۴
غلطی کرتے ہیں اور صرف صورت اور نقلِ عبادت ہی کو عبادت سمجھتے ہیں۔ یعنی فقہاء نے جو ضبط کر دیا ہے قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ، قومہ وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ فقہاء نے لکھا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اور جو فقہ کا موضوع تھا اس کے موافق انہوں نے لکھا ہے۔ لیکن یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ تمام امور جن کا عبادت سے تعلق ہے اس میں منحصر ہیں۔ شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ اور کچھ بھی ہے۔ اس فقہ کے ساتھ ایک دوسری فقہ یعنی معنی شرع کا بھی اعتبار ہے اس معنوی فقہ کو تصوف کہتے ہیں۔ تصوف کو علٰحدہ اور الگ کتابوں میں لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقہ سے خارج ہو جاوے۔ یہ علٰحدگی ایسی ہے جیسی فقہ مشہور میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ الگ الگ کتابیں ہیں۔ کتاب الصلوٰۃ کے مسائل کتاب الزکوٰۃ میں نہیں ملیں گے اور نہ کتاب الزکوٰۃ کے کتاب الصلوٰۃ میں۔ اس سے کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ کتاب الزکوٰۃ یا کتاب الصلوٰۃ فقہ میں داخل نہیں۔ اسی طرح

کتاب التصوف بھی فقہ ہے۔ اگرچہ اس کی کتابیں الگ ہیں۔ اگر کوئی ہدایہ کی ہر ہر کتاب کو الگ الگ چھاپ دے تو کیا کتاب الصلوٰۃ کتاب الزکوٰۃ وغیرہ ہدایہ سے خارج ہو جائیں گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اسی طرح توحید، اخلاص یا کبر، تواضع، عجب وغیرہ اخلاقِ حمیدہ اور رذیلہ کے احکام بھی فقہ میں داخل ہیں۔ عموماً لوگ نماز میں قیام، رکوع وغیرہ ہی کو عبادت کی حقیقت سمجھتے ہیں، اور اسی میں عبادت کو محصور جانتے ہیں۔ عوام تو عوام طالب علموں کی بھی شکایت ہے۔ ہم لوگوں کی خود حالت قابلِ افسوس ہے۔ اہلِ علم خود اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو علم کی تو فکر ہے لیکن عمل کی نہیں۔ بڑا اہتمام اس کا ہوتا ہے کہ ہم ساری کتابیں پوری کر لیں۔ ہدایہ بھی، صدرا بھی، شمس بازغہ بھی، لیکن عمل کرنے کی ذرا بھی پرواہ نہیں قوتِ عملیہ اس درجہ ضعیف ہو رہی ہے اسدرجہ اس میں خلل آگیا ہے اس قدر مختل ہو رہی ہے جس کا حساب نہیں۔ ایسی ایسی خفیف حرکات کرتے ہیں جس سے افسوس ہوتا ہے۔ بہت سے معاصی ہیں کہ ان میں شب و روز مبتلا ہیں، اور ۱۵
خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا، کسی کی چیز بلا اجازت اٹھالی، اور جہاں چاہا ڈال دی۔ کسی کی کتاب بلا اجازت لے لی اور ایسی جگہ رکھ دی کہ اسکو نہیں ملتی وہ پریشان ہو رہا ہے۔ کسی سے کسی اچھے کام کا وعدہ کیا اور اس کے پورا کرنیکی ذرا فکر نہیں۔ اس طرح سینکڑوں قصے ہیں کہاں تک بیان کئے جاویں۔

لیکن باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی ان کے علم و فضل میں شک نہیں ہوتا، حالانکہ فقط کسی چیز کا جان لینا کوئی ایسا کمال نہیں۔ یوں تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے۔ بڑے بڑوں کو بہکاتا ہے۔ تفسیر میں وہ ماہر، حدیث میں وہ واقف، فقہ میں وہ کامل۔ کیا ہے جس کو وہ نہیں جانتا۔ اگر زیادہ نہ جانتا ہوتا تو علماء کو بہکا کیسے سکتا؛ جب کوئی شخص کسی فن میں ماہر ہوتا ہے جب ہی تو وہ اپنے سے کم جاننے والے کو دھوکا دے سکتا ہے۔ اس میں (یعنی شیطان میں) اگر کمی ہے تو صرف اسی بات کی ہے کہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا۔ چنانچہ حدیث شریف میں

بھی آیا ہے ایسا علم جو عمل کے لئے نہ ہو جہنم کا ذریعہ ہے۔ اس حدیث میں لیجاری بہ العلماء و لیماری بہ السفہاء (تاکہ فخر کریں ساتھ اس کے علماء اور مناظرہ اور جھگڑا کریں ساتھ اس کے سفہاء) وغیرہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ہم لوگ ایسے غافل ہو رہے ہیں کہ اپنی اصلاح کی ذرا فکر نہیں کرتے۔ بعض گو لوگ قصداً گناہ نہیں کرتے لیکن بے پرواہی کی وجہ سے ان سے گناہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی شکایت کے قابل ہیں۔ اگر کوئی ملازم سرکاری بے پروائی کرے اور کام خراب کردے تو کیا اس سے باز پرس نہ ہوگی؟ لوگوں نے عبادت کا ست نکال لیا ہے، مثلاً بظاہر اٹھ بیٹھ لئے اور نماز ادا ہوگئی، خصوصاً اہلِ علم بھی اس کا خیال نہیں کرتے کہ سوائے ظاہری قیام، قعود کے اور بھی کچھ ہے اور وہ ضروری بھی ہے۔ جس قرآن میں قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ صَلَاتِهِمۡ (تحقیق ان مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں) ہے اسی میں خَاشِعُوۡنَ بھی آیا ہے۔ جب صَلَاتِهِمۡ (اپنی نماز) کے
۱۶ لفظ سے نماز کو مطلوب شرعی سمجھتے ہیں تو کیا وجہ خَاشِعُوۡنَ (خشوع کرنیوالے ہیں) سے خشوع کو مطلوب نہیں سمجھتے۔ اسی طرح اور مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ خشوع بھی ویسا ہی ہے جیسے قیام و رکوع وغیرہ۔ اس غلطی کو دفع کرنا نہایت ضروری ہے کہ ایک کو تو ضروری سمجھیں اور دوسرے کو نہ سمجھیں، حالانکہ دونوں حکم یکساں ضروری ہیں۔ یہ خشوع ہی ہے جس سے عبادت اچھی ہوتی ہے۔ احسان اسی سے حاصل ہوتا ہے۔

احسان کے متعلق تین چیزیں ہیں اول احسان کا ضروری ہونا، دوسرے احسان کی حقیقت، تیسرے تحصیلِ طریقِ احسان۔ اجمالاً اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ احسان خشوع سے حاصل ہوتا ہے اور خشوع کا مطلوب ہونا قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الخ (تحقیق مسلمانوں نے فلاح پائی) سے معلوم ہو چکا ہے۔ اب اس کا ضروری ہونا سنئے:۔

خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَمۡ يَاۡنِ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِكۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَـقِّ ۙ وَلَا يَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ

قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ۔

ترجمہ: کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق (منجانب اللہ تم) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جاویں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاویں جن کو ان کے قبل کتاب (آسمانی) ملی تھی (یعنی یہود و نصاریٰ) پھر (اسی حالت میں) اُن پر زمانہ گذر گیا (اور توبہ نہ کی) پس اُن کے دل سخت ہوگئے۔

یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے۔ اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آگئیں۔ دیکھو عبادت میں خشوع نہ ہونے پر کیسی وعید ہے۔ شکایت کی ہے۔ اور یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کیا ہے۔ کہ ایسے نہ بنو۔ اس سے ظاہر ہے کہ ترک خشوع کیسی بُری چیز ہے۔ جس کے باعث سے کفار کے ساتھ آدمی مشابہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کا ثمرہ بیان فرمایا ہے فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ (پس ان کے دل سخت ہوگئے) قساوتِ قلب نہایت بُری چیز ہے۔ قساوت کی نسبت قرآن شریف میں ہے فَوَيْلٌ
۱۷ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (یعنی تباہی اور ہلاکت ہے ان کو جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں وہ لوگ کھلی کھلی گمراہی میں پڑے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ارشاد فرماتے ہیں قلب قاسی خدا سے بہت دور ہے، ان سب نصوص سے ثابت ہوا کہ قساوت بُری چیز ہے اور خشوع ضروری ہے۔ لیکن خرابی یہ ہو رہی ہے کہ لوگ خشوع کی حقیقت نہیں سمجھتے اسی وجہ سے اس کی فکر بھی نہیں کرتے۔ جو شخص کسی چیز سے واقف نہ ہوگا وہ اس کو حاصل کیا کرے گا۔ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خشوع کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے سوا کسی کا خیال نہ آوے، ایسی مدہوشی ہو جاوے کہ تیر برچھا کچھ ہی لگے اس کی خبر نہ ہو پس انسان جماد کی طرح بن جاوے آدمیت سے گذر جاوے۔ کوئی پوچھے یہ معنی کہاں لکھے ہیں اور کس نے لکھے ہیں اس کا کچھ جواب نہیں۔ اور واقعی کہیں بھی یہ معنی نہیں لکھے ہیں۔ یہ شبہ کم فہم اور غیر شفیق واعظوں کی بدولت پڑا ہے۔ انھوں نے ایسی حکایتیں بیان کیں جن سے دھوکہ میں پڑ گئے۔ پڑھے لکھے آدمی بھی اس سے ناواقف

ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں اُن کے درس میں کوئی تصوف کی کتاب تو ہے نہیں، لیکن عام لوگوں کے سنانے کے لئے موجود ہو گئے۔ امراض قلبی اور امراض باطنی کے علاج کرنے پر آمادہ ہیں، وعظ و نصیحت کرنے پر مستعد۔ حالانکہ خود نہیں سمجھتے تو ایسے شخص کی مثال ہے جس نے نہ طب پڑھی ہے۔ مطب کیا اور علاج کرنے لگا۔ علاج کے لئے پہلے طب پڑھنا ضروری ہے اور پھر مطب کرنا بھی لازمی ہے۔ بغیر اس کے قابلیتِ علاج نہیں آسکتی۔ ایسے ہی مدارس کی نسبت کسی نے کہا ہے ؎

اَیُّہَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَۃِ ۔ کُلُّ مَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَۃ

؎ علم نبود غیرِ علمِ عاشقی ۔ مابقی تلبیس ابلیسِ شقی

یعنی اے قوم جو کچھ تم نے مدرسۂ علم (لفظی) حاصل کیا وہ وسوسہ تھا علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے۔

جس طرح کنز و ہدایہ ضروری ہے ویسے ہی ابوطالب مکی کی قوت القلوب اور امام غزالیؒ کی اربعین اور شیخ شہاب الدینؒ سہروردی کی عوارف کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ یہ تو گویا طب پڑھنا ہے اور اس کا مطب یہ ہے ؎ ۱۸

قال را بگذار مردِ حال شو ۔ پیش مردِ کاملے پامال شو

"قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو، یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑو۔"

کیسی ناانصافی کی بات ہے کہ جب دس برس علم ظاہری کی تحصیل میں صرف کئے تو دس ماہ تو باطن کی اصلاح میں صرف کرو۔ اور اس کا یہی طریق ہے کہ کسی کامل کی صحبت میں رہو۔ اس کے اخلاق، عادات، عبادات کو دیکھو کہ غصہ کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ شہوت کے وقت میں وہ کیسی حالت میں رہتا ہے۔ خوشامد کا اس پر کہاں تک اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح تمام اخلاق کا حال ہے۔ کیونکہ پھر جب کبھی اس کو غصہ آئے گا تو سوچے گا کہ اس کامل کی غصہ کے وقت کیا حالت ہوئی تھی ہم بھی ویسا ہی کریں۔ اس کے اخلاق و عادات پیش نظر

ہو جائیں گے ۔ یہ اس کا مطلب ہوا۔ چنانچہ کہا ہے ؎

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی ؏ تاراہ بیں نباشی کے راہ بر شوی
در مکتبِ حقائق پیشِ ادیبِ عشق ؏ ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

"اے بے خبر کوشش کر کہ صاحب خبر ہو جائے ۔ جب تک راہ بیں (رستہ دیکھنے والا) نہ ہوگا
راہ بر (راستہ دکھلانے والا) کیسے ہو سکتا ہے ۔ اس لئے حقائق کے مدرسہ میں ادیبِ
عشق کے سامنے کوشش کر کہ ایک نہ ایک روز باپ (یعنی مصلح) بن جائے گا "

ساری خرابی انہی ناعاقبت اندیش واعظوں کی ڈالی ہوئی ہے ۔ ایسی ایسی حکایتیں بیان کرتے ہیں جس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ عمل کرنا بہت ہی دشوار ہے ۔ اور جو کچھ کرتے ہیں ایسی حکایتوں کی وجہ سے اس کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں ۔ مثلاً طلب حلال کے متعلق یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حلال روزی کی طلب میں نکلے ، ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جس کے پاس حلال روزی کی خبر لگی تھی ۔ اس
19 نے جواب دیا کہ تھی تو میرے پاس لیکن چند روز سے حلال نہیں رہی ۔ اتفاق سے میرا بَیل دوسرے کے کھیت میں چلا گیا دوسرے کھیت کی مٹی اس کے پَیر میں لگ کر میرے کھیت میں آگری ۔ اس لئے اب روزی حلال نہیں رہی " محض مستبعد بات ہے ۔ اوّل تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کے بَیل کھیت ہی میں ہمیشہ رہا کریں ۔ باہر نکلنے کی نوبت ہی نہ آئے ۔ اور اگر ہو بھی تو اس سے کہیں حرمت آتی ہے ۔ اور تمام امور سے قطع نظر کر کے اگر اس کی کوئی توجیہ بھی ہو تو اس بزرگ کی خاص حالت ہوگی عام تکلیف تو نہیں دی جا سکتی ۔

اب ظاہر ہے کہ اس حکایت کو سُن کر یہ خیال پیدا ہوگا کہ حلال روزی تو ممکن نہیں ، اس لئے پھر خوب دل کھول کر حرام ہی کمایا جاوے ۔ جس طرح ملے ، چوری سے ، دغا بازی سے ، رشوت سے ، سُود سے سب لینا چاہئے ۔ اور اس طرح تباہ ہو جاتے ہیں ۔ ایسی باتیں بیان کرنے سے ان کی غرض ہوتی ہے کہ وعظ میں ذرا رنگ آجاوے ۔ نئی بات ہونے کی وجہ سے لوگوں کو پسند آئے ، خوب

واہ واہ ہو، شریعت میں ہرگز ایسی تنگی نہیں ہے۔ ایسی تنگی کی تو ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک بخیل صاحب کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ بے چراغ بڑھائے ہوئے نماز پڑھنے کو مسجد میں چل کھڑے ہوئے، راستے میں یاد آیا کہ یہ فضول خرچی ہے۔ لوٹ کر چراغ گل کرنے آئے۔ لونڈی نے پوچھا خیر تو ہے، حضور کیسے لوٹ آئے؟ اتنی فضول خرچی ہوئی کہ آپ کے یہاں تک لوٹ کر آنے میں جوتہ گھس گیا ہوگا۔ بڑے خوش ہوئے اور جواب دیا کہ چراغ جلتا ہوا چھوڑ گیا تھا اس کے بجھانے کو آیا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے پہلے ہی گل کر دیا تھا۔ وہ بولے شاباش کہ تو بڑی محتاط ہے۔ اور تجھے فکر ہے کہ کوئی فضول خرچی نہ ہو حتّٰی کہ میرے جوتہ گھسنے کا بھی خیال ہے لیکن سمجھ لے کہ میں نے لوٹتے وقت جوتہ اُتار کر بغل میں دبالیا تھا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ شریعت ایسی مہمل باتوں سے پاک ہے ایسی تنگی اس میں کہاں؟ بلکہ جب حلال صورتیں بکثرت بتلائی جائیں گی توفیق
۲۰ عمل کی ہوگی، حلال روزی کی فکر کریں گے۔ سمجھ لو کہ ہدایہ و کنز وغیرہ میں جو جو چیزیں حلال لکھی ہیں وہ بلاشبہ حلال ہیں اس میں ذرا شک نہیں۔ بات کیا ہے کہ اہلِ باطن جو مغلوب الحال تھے یہ اُن کی حکایتیں ہیں، عوام کے سامنے اُن کو بیان کر دیا۔ یہ تو وہی مثل ہو گئی کہ ایک شخص کو ہیضہ کا عارضہ تھا، حکیم صاحب نے اُن کے لئے وہی خشکہ تجویز فرمایا۔ اور ایک شخص کو ضعفِ دماغ تھا اس کے لئے مقوی چیزیں گوشت، یخنی، دودھ، قورمہ تجویز کیا۔ اب اگر ہیضہ والا سُن کر اِس پہ عمل کرنے لگے تباہ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا مرے گا۔

اسی طرح جو حالات بیان کئے تھے سچ تھے، لیکن یہ کس کے تھے اہلِ باطن کے لئے، یہ ضروری نہیں کہ ہر سچی بات بیان کر ہی دی جائے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی خشوع ہے اور یہی بڑا کمال ہے کہ تیر بھی لگے تو خبر نہ ہو۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز کو ذرا طویل کردوں لیکن کسی بچے کے رونے کی

آواز سنتا ہوں تو مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان ہو جائے گی۔

اب بتلایئے کہ یہ کمال کی حالت ہے یا وہ۔ تیر کی خبر نہ ہونا بھی ایک حالت ہے جسے استغراق و محویت کہتے ہیں۔ لیکن وہ خشوع نہیں ہے۔ نماز کے معنی اگر کوئی بیان کرے کہ صبح صادق سے لیکر غروب آفتاب تک نہ کھانا تو یہ غلط ہی اگرچہ نماز بھی کوئی چیز ہے لیکن یہ نماز نہیں ہے اسی طرح یہ حالت ہے تو ضرور لیکن یہ خشوع نہیں ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کہ ایک مرتبہ مقدمہ پیش ہوا، مدعا علیہ نے گواہی پر جرح کی کہ نماز نہیں پڑھتا۔ اس نے کہا واہ صاحب میں تو حج بھی کر آیا ہوں۔ قاضی نے اس سے پوچھا کہ اچھا بتلا زمزم کیا چیز ہی اور عرفات کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ زمزم ایک بوڑھا آدمی ہے اور عرفات ایک باغ ہے۔ جس میں وہ بوڑھا بیٹھا ہوا ہے۔ قاضی نے کہا کہ کیا غلط کہتا ہے فضول بکتا ہے ہم نے خود حج کیا ہے زمزم ایک کنویں کا نام ہے، اور عرفات ایک جنگل ہے۔ اس نے کہا جب میں گیا تھا اس وقت تو یہی تھا آپ ۲۱
کے جانے کے وقت بدل گیا ہوگا۔

خشوع کے معنی یہ کہنا کہ کچھ خبر نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے کاذب نے کنویں اور عرفات کی حقیقت بیان کی تھی۔ ہاں اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ بھی ایک حالت ہے۔ جیسے عرفات و زمزم کا وجود واقعی تھا، گو جو وہ کہتا تھا نہ تھا گو بعض لوگ سرے سے اس حالت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ امر خلاف فطرت ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص نماز پڑھتا ہو اس طرح کہ اسس کو تیر نکلنے کی خبر نہ ہو۔ اس منکر کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی مادر زاد عنین لذت جماع کا انکار کرے، یا کوئی مادر زاد اندھا کہے کہ لوگ جس کو دیکھنا کہتے ہیں وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ حالانکہ ایسے واقعات ثابت ہوئے ہیں۔ امام مالکؒ حدیث شریف کا بیان کر رہے تھے ان کی آستین میں کہیں سے کمبخت ایک بچھو گھس گیا تھا وہ ڈنک مارتا تھا جس کے صدمہ سے ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا لیکن آپ

نہیں کرتے تھے اور برابر حدیث شریف کا بیان کرتے رہے۔ حتیٰ کہ گیارہ بار اس نے نیش زنی کی۔ جب گھر میں آکر کرتہ اُتارا تو کُرتے میں خادم نے بچھو کو دیکھکر عرض کیا کہ آپ نے اس وقت کیوں نہیں اظہار فرمایا۔ جواب دیا کہ مجھے شرم آئی کہ حدیث شریف کے وقت دوسری طرف متوجہ ہوں،

لیکن باوجود اس کے خشوع کے یہ معنی نہیں کہ دوسرا خیال نہ آوے۔ جو شخص خشوع کی حقیقت نہ سمجھے گا سخت غلطی میں مبتلا ہوگا۔ سمجھے گا کہ دوسرا خیال تو رک سکتا نہیں اور بندہ خشوع کا ہے مکلف اس لئے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) میں شک کرنے لگے۔ ایسی حکایتوں سے یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔

اب چاہئے کہ خشوع کی حقیقت کو خوب سمجھ لیجئے۔ پہلے لغت کے موافق اس کے معنی بیان کئے جاتے ہیں پھر شرعیات سے اس کی تائید کردیجائے گی۔
اس سے معلوم ہوجائے گا کہ خشوع کیا چیز ہے۔ خشوع کے معنی ہیں دب جانا پست ہوجانا، یعنی سکون جیسا کہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۲۲

"یعنی منجملہ اس کی (قدرت اور توحید کی) نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ (اے مخاطب) تو زمین کو دیکھ رہا ہے کہ دبی دبائی پڑی ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے"

چونکہ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ سے خَاشِعَةً کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اہتزاز اور اُبھرنے میں حرکت ہے تو خاشعۃ کے معنی سکون اور پستی والی کے ہوں گے۔ مقابلہ سے ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں خود لغت شاہد ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر شے کا حرکت و سکون جداگانہ ہوتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ ہاتھ چل رہا ہے تو اس کے معنی ہلنے جلنے اور نقلِ مکانی کے ہوں گے۔ اور اگر کہا جائے کہ فلانے کی طبیعت خوب چلتی ہے تو یہاں یہ معنی نہیں مراد ہوں گے بلکہ یہاں اور معنی

ہوں گے یعنی فکر کرنا اور سوچنا۔ جب یہ معلوم ہوگیا تو اب سنئے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو دو قسم کی چیزیں عنایت فرمائی ہیں ظاہر اور باطن، یا یوں کہو کہ جوارح اور قلب۔ پس کمال خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ جوارح بھی ساکن رہیں اور قلب بھی۔ لیکن دونوں کا سکون جدا جدا ہے۔ جوارح کا سکون تو یہ ہے کہ اِدھر اُدھر دیکھے نہیں ہاتھ پیر نہ ہلائے اور اس کے مقابلات کا نام حرکت ہوگا۔ اور قلب کا سکون اس کی حرکت کے مقابل ہے۔ حرکت تو یہ ہے کہ خیال کرنا، تصور کرنا، فکر کرنا یعنی سوچنا، اور سکون اس کا عدم ہے۔ اور ظاہر ہے کہ فکر کرنا اور سوچنا فعل اختیاری ہے اور قدرت اور اختیار ضدین سے متعلق ہوتا ہے۔ پس جب یہ حرکت اختیاری ہے تو اس کے مقابل سکون بھی یعنی سوچنا اختیاری ہوگا۔ اور آدمی اختیاری ہی چیزوں میں مکلف ہوتا ہے۔ لہٰذا خشوع کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے اختیار سے دوسرا خیال نہ لانا یہ نہیں کہ دوسرے خیال کا دل میں نہ آنا۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ خیال کا آنا تو اختیاری نہیں ہے۔ ۲۳
اور خیال کا لانا اختیاری ہے۔

پس خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ اپنے اختیار سے دوسرے خیالات دل میں نہ لاوے۔ رہا اگر کوئی خیال بلا اختیار آوے تو وہ خشوع کے منافی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض صحابہؓ نے پوچھا کہ میرے دل میں ایسے ایسے خیال آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہوجانا اُن سے آسان معلوم ہوتا ہے آپؐ نے فرمایا اَوَجَدْتُمُوْہُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذٰلِكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ، "یعنی آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اس کو پایا ہے۔ یعنی کیا ایسے خیالات تمھیں آتے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا یہ تو صریح ایمان ہے" اور کیوں نہ ہو، چور تو وہیں آتا ہے جہاں مال ہو متاع ہو۔ اسی طرح شیطان وہیں آتا ہے جہاں متاعِ ایمان ہو۔ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

دیو آید سوئے انساں بہر شر ٭ پیش تو ناید کہ از دیوے بتر

"شیطان تو انسان کی طرف شر کے لئے آتا ہے تیرے پاس نہ آئے گا کہ شیطان سے بدتر ہے۔"

شیطان بڑا استاد ہے اپنا وقت فضول ضائع نہیں کرتا، جو خود شیطان بنگیا ہے اس کو بہکانے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہاں جس میں کچھ ایمان باقی ہے اسی کی فکر میں رہتا ہے۔ اپنی دُشمن کا پکا ہے۔ ایمان داروں ہی کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ ہم لوگوں کو تو اس سے خاص صفت میں سبق حاصل کرنا چاہیے تھا۔

ایک چور نہایت نامی تھا، ہمیشہ چوری کیا کرتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ سُولی دیدی گئی۔ حضرت جنیدؒ نے دوڑ کر اس کے پیر چوم لئے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ اس کی استقامت قابل تعریف ہے۔ اگر ہم خدا کی اطاعت میں ایسی استقامت کریں تو ہمارے مدارج کا کہیں ٹھکانا ہی نہ رہے اپنے کام میں لگا رہنا چاہیئے اور وسوسہ اور خیالات کی کچھ پرواہ نہ کرنا چاہیئے بُرے بُرے خیالات جن پر عمل نہ ہو مگر طبیعت منقبض ہو، اُلجھے، بزرگوں ہی کو آتے ہیں۔ فاسقوں کو ایسے خیالات نہیں آتے۔ اور ان وساوس سے پریشانی کا باعث یہی ہے کہ کسی طبیب قلب کی صحبت نہیں نصیب ہوئی۔ اگر کوئی جاننے والا مل جاتا تو کہدیتا کہ اگر وسوسے آتے ہیں تو آنے دو کچھ پرواہ نہ کرو۔ قلب کی حالت تو شاہی سڑک کی سی ہے۔ کہ اس پر حاکم، رئیس اور ادنیٰ چمار دونوں گذرتے چلے جاتے ہیں ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں ٭ درمیان شاں برزخ لا یبغیاں

"بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر جاری ہیں، مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے"

شیطان کی حالت کتے کی سی ہے۔ کتا بھونکا کرے اور التفات نہ کیا جائے تو آپ چُپ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کو دفع کرنا چاہے تو اور زیادہ غصہ کر کر کے بھونکتا ہے۔ اسی طرح وساوس شیطانی کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ کیونکہ شیطان سے جو دبتا ہے اور اس کا خیال رکھتا ہے

اس کے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ وسوسے پر جو غمگین ہوگا وہ سخت پریشان ہوگا۔ بلکہ جب وسوسہ آئے تو اور خوش ہونا چاہئے کہ الحمد للہ دولت ایمان موجود ہے اگر آدمی میں قوت توکل اور اعتماد علی اللہ (اللہ پر بھروسہ) کی صفت ہو تو ایک شیطان کیا اگر لاکھ شیطان ہوں تو کچھ نہیں بنا سکتے۔ ہاں قصداً خیال کالانا بیشک منافی خشوع اور حضور قلب کے ہے۔

اب اِس تقریر سے ذہن نشین ہوگیا ہوگا کہ خشوع اور حضورِ قلب اختیاری ہے اور نہایت آسان ہے لیکن تاہم جب تک طریق نہ معلوم ہو اور اس پر عمل نہ کیا جاوے کامیابی نہیں ہوسکتی۔ کپڑا سینا آسان ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کیسے کپڑا سیتے ہیں، لیکن سینا جب ہی آسکتا ہے کہ کسی درزی سے طریق سیکھا جاوے اور اُس پر عمل کیا جاوے۔ اسی طرح حضورِ قلب کا حال ہے، اُس طریقے کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے۔ یہ مسئلہ عقلی ہے کہ اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدٍ (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا) یعنی پوری توجہ ایک ہی چیز کی طرف ہوا کرتی ہے۔ ایک آن میں اگر دو ۲۵
چیزیں خیال میں ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ دونوں میں سے کسی کی طرف بھی پوری توجہ نہیں۔ یا دو چیزیں نظر آتی ہوں تو توجہ کامل دونوں میں سے کسی کی طرف بھی نہیں۔ جس چیز کو آدمی گھورتا ہے اسی کی طرف دیکھنے میں توجہ ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ طریقہ یہی ہے کہ ایک خیال رکھیں تو دوسرے خیالات خود دفع ہوجائیں گے اور کوئی خیال نہ آئے گا۔ کیونکہ اگر یہ کوشش کی جاوے کہ ایک ایک کرکے خیالات دفع کئے جاویں تو سخت دشواری پیش آئے گی اور دفع ہوجانا ناممکن ہوجائے گا۔ کیونکہ اول تو دیکھی ہوئی چیزیں انسان کی بکثرت ہیں۔ پھر علاوہ اس کے انسانی قوتِ متفکرہ یا متخیلہ انکو ترکیب دے دیکر بے تعداد فرضی صورتیں اختراع کیا کرتی ہے۔ مثلاً آپ نے دو سر کا آدمی کبھی نہیں دیکھا ہوگا لیکن یہ قوتِ متفکرہ ایک دھڑ اور دو سر کو جوڑ کر

خیالی صورت بنا کر سامنے کھڑا کر دیتی ہے۔ اور انسان کو معلوم ہونے لگتا ہے کہ دوسر کا آدمی ایسا ہو سکتا ہے۔

بہر حال ایک ایک خیال کو دفع کرنا بہت دشوار اور بڑی ہی مصیبت ہے۔ کبھی بھول کر بھی خیالات دفع کرنے کے پیچھے مت پڑو۔ پس اس کا طریقہ یہی ہے کہ کسی نیک چیز کی طرف دھیان لگا دو، اس دھیان کے باندھتے ہی سارے خیالات خود بخود ہٹ جائیں گے۔ بعض سالکین نے ناواقفی کے باعث ہجوم وساوس سے پریشان ہو کر خودکشی کر لی ہے۔ یہ کیوں، اس لئے کہ یا تو ان کو شیخ نہیں ملا یا شیخ کی تعلیم کی قدر نہیں کی۔ شیخ، جس پر یہ امور گذرے ہوتے ہیں جانتا ہے اور بتلا سکتا ہے۔ ایسی پریشانی کی حالت کو قبض کہتے ہیں۔ اس میں عبادت میں بھی مزہ نہیں آتا اور جی گھٹتا ہے، اور جی گھٹنے کی وجہ یہ ہے کہ لذت نہیں ملتی۔ ہم لوگوں کی عجیب حالت ہے۔
عبادت بھی ایسی کرنا چاہتے ہیں جس میں حظِ نفسانی ملے۔ عبادت بھی چاہتے ۲۶
ہیں تو مزیدار۔ حالانکہ مزہ مطلوب نہیں ہے بلکہ تعبّد مطلوب ہے۔ البتہ مزے سے عبادت سہل ہو جاتی ہے۔ غرض طالب کی یہ حالت ہونا چاہیے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش ۔۔ اگر ریش بینند وگر مرہمش

اس کے غم کے پریشان لوگوں کا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں

گدایانے از پادشاہی نفور ۔۔ بامیدش اندر گدائی صبور

ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنیوالے اور اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے

دمادم شراب الم در کشند ۔۔ اگر تلخ بینند دم در کشند

ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں

اگر مردِ عشقی کمِ خویش گیر ۔۔ وگرنہ رہِ عافیت پیش گیر

اگر عاشق ہے تو محبوب کے عشق میں آپکو فنا کر، ورنہ اپنی آسائش کی راہ اختیار کر

مترس از محبت کہ خاکت کند ؎ ۔۔ کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

؎ مت ڈر کہ محبت تجھکو خاک کر دیگی اس لئے کہ اگر تجھ کو ہلاک کریگی تو بقائے جاودانی تجھ کو عطا کرے گی۔

؎ ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

"جس کو عشق سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کو لذت قرب علیٰ وجہ الکمال حاصل ہوجاتی ہے اس لئے اسکو مردہ نہ کہنا چاہئے"

؎ باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش   بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال   مرغ زیرک گر بدام افتد تحمل بایدش

باغبان کو اگر صحبت گل کی خواہش ہے تو اس کو بلبل کی طرح ہجر کے کانٹوں کی اذیت پر صبر کرنا چاہئے اے دل محبوب کی زلف کے پھندے میں پھنس کر پریشانی سے گریہ وزاری مت کر۔ سمجھدار پرند جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر وتحمل چاہئے۔

؎ ناخوش تو خوش بود بر جانِ من   دل فدائے یار دل رنجانِ من

محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں"

؎ پس زبونِ وسوسہ باشی دلا   گر طرب را باز دانی از بلا ۲۷

پس برا وسوسہ ہوا اے دل اگر خوشی کو بلا سے جدا جانے۔

ہمت والوں کا تو یہ قول ہے ؎

روزہا گر رفت گو رو پاک نیست   تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

"ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے اگر گئے بلا سے، عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا ہونا کافی ہے"

تم لذت کی کچھ فکر نہ کرو، کام کئے جاؤ، لذت نہ آئے بلا سے نہ آئے۔ حضورِ قلب کا طریق کلی طور پر تو معلوم ہوگیا۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سی شے ہے جس میں دل لگایا جائے۔ اس کے دو طریق ہیں، ایک تو مشہور ہے جو لوگوں نے اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہی) سے سمجھا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ سمجھنا صحیح نہیں۔ اور اس کا بیان آگے آویگا۔

دوسرا طریق (جو استاد علیہ الرحمۃ مولانا محمد یعقوب صاحب نے بتلایا تھا۔ اور الحمد للہ کہ ایک حدیث سے بھی میری سمجھ میں آگیا اور تجربہ بھی اس کے مفید ہونے پر شاہد ہے) یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اس طرح کہ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ یعنی حال یہ ہو کہ اپنے دل سے نماز پر متوجہ رہے۔ اب نماز دیکھنا چاہئے کہ نام کس کا ہے۔ سو اس میں بعض چیزیں تو مختلف ہیں ان کی طرف توجہ کرنے سے مبتدی کو یکسوئی حاصل ہونا ذرا تکلف ہے۔ اس لئے دیکھنا چاہئے کہ اس میں ایسی کونسی چیز ہے جو نماز میں برابر ہوتی رہتی ہے۔ سو وہ ذکر اللہ ہے کہ ابتداء سے انتہا تک پایا جاتا ہے۔

تو اب نماز میں متوجہ ہونے کی صورت اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی کہ ذکر اللہ کی طرف برابر توجہ رہے۔ یعنی جو کچھ پڑھا جاوے سوچ سوچ کر پڑھا جائے۔ پہلے
۲۸ سوچ لو پھر زبان سے نکالو، یہ نہیں کہ ریل گاڑی ہے جہاں ڈرائیور نے کل چلادی اور گاڑی اُڑی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسٹیشن آگیا اور ڈرائیور نے روکی تو تھمی۔ اس طرح سے اپنے اندر کی ریل گاڑی کو اگر ہم چلائیں گے تو لڑے گی۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا کہ سارے قوائے محمودہ کے مسافر پاش پاش ہو جائیں گے اور زمین باطن میں ہلچل پڑ جائے گی۔ دنیاوی ریل کے لڑنے کا حال تو اسی وقت آنکھ سے نظر آجاتا ہے ہماری اندرونی ریل کے لڑنے کا حال قیامت میں کھلے گا۔

بہرحال چاہئے کہ ہر ہر لفظ کو سوچ سوچ کر پڑھو۔ اگرچہ اس میں دو چار دن مشقت معلوم ہوگی جی گھبرائے گا، کیونکہ جی روکنا پڑے گا، لیکن جہاں ہم اپنے دنیاوی ذرا ذرا سے کاموں میں مشقت اٹھاتے ہیں خدا کے لئے ذراسی مشقت اٹھانا گوارا کریں، جب دنیا بے مشقت نہیں ملتی تو خدا کو چاہتے ہو کہ بے مشقت ہی مل جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے قربان جائیے کیسے چھوٹے چھوٹے لفظوں میں اتنے بڑے بڑے دشوار کلام کو آسان کر کے بتلادیا

اور کیوں نہ ہو عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَ اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ (اللہ تعالیٰ نے مجھکو تعلیم دی پس بہترین ہے میری تعلیم، اور اللہ تعالیٰ نے مجھکو ادب سکھایا پس بہترین ہے میری تادیب)۔ یہ خدا کی تعلیم ہے سے

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

آپ کا فرمان اللہ کا فرمان ہے، اگرچہ ایک اللہ کے بندے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے مُنہ سے ادا ہوا ہے۔

سے در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استادِ ازل گفت ہما میگویم

پسِ پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھادیا ہے، مجھے جو حکم استادِ ازل سے ملتا وہی کہتا ہوں۔

اس کے علاوہ ایک مشہور طریق حضورِ قلب کا وہ ہے جو حدیث اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ الخ سے لوگوں نے سمجھا ہے۔ یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال کرے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں، اور اگر یہ نہ ہو تو یہ سمجھے کہ خدا مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ پس گویا دو طریق متقابل ہیں لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ اوّل تو نقلوں کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ سوال حقیقتِ احسان سے ہے نہ طریقِ تحصیلِ احسان سے ہے۔ چنانچہ جو جواب دیا گیا ہے اس میں احسان کی حقیقت بتلائی ہے نہ کہ طریق۔ چنانچہ اس کے قبل بھی اسلام اور ایمان کی حقیقت ہی سے سوال وجواب کا ہونا اس کا اور بھی مؤید ہے، دوسرے تجربہ بھی شاہد ہے کہ تصورِ رویتِ حق حضورِ قلب کے لئے عموماً اور خصوصاً مبتدی کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ کیونکہ طبیعت پریشان ہوتی ہے کہ خدا کو کیسا سمجھوں۔ اور ایک صورت سمجھ میں آتی ہے پھر اس کا دفع کرتا ہے۔ اسی طرح پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو کبھی دیکھا نہیں اس کا تصور کیسے جم سکتا ہے۔ البتہ منتہی کو خدا کے دیکھنے کا تصور بے کیف ذوقی طور پر میسّر ہو جاتا ہے۔ اور طریقہ عام ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں اگر مضاف محذوف مان کر (یعنی طریقہ ان الخ) سے طریق ہی قرار دیا جاوے تو تقابل ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیونکہ کَاَنَّکَ تَرَاہُ ۲۹

کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر تم اسے دیکھتے نہ ہو تو بیشک وہ تمھیں دیکھتا ہے۔ سو یہ مضمون جملہ اُولیٰ کے ساتھ جمع ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اگر تم ایسی عبادت نہ کر سکو کہ گویا اسے دیکھتے ہو (تو یہ سمجھو) کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ بہر حال یہ طریق الفاظ حدیث اور تجربہ دونوں کے خلاف ہے۔ پس اس حدیث میں حقیقتِ احسان کا بیان ہے، طریق مذکور نہیں۔ رہا حدیث کے معنیٰ کیا ہیں تو اس کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کام کر رہا ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ اس وقت ہمارا مالک اور حاکم دیکھ رہا ہے تو وہ شخص کام بالکل ٹھیک کرنے لگے گا۔ اور احتیاط رکھے گا کہ کوئی خرابی نہ ہونے پائے۔ اور اگر کہیں خود حاکم کو دیکھ لیا تب تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے۔ اپنی انتہائی کوشش صرف کرکے کام کو خوب اچھی طرح انجام دے گا۔ چنانچہ طالب علموں ہی کو دیکھ لیجئے کہ اُستاد کی عدم موجودگی میں آپس میں بیٹھتے ہیں تو ظرافت اور ہنسی کی باتوں میں بھی
باک نہیں ہوتا۔ دل کھول کر ایک دوسرے سے بولتے ہیں، کہیں پیر پھیلائے ۳۰
ہیں، کہیں کوئی شعر پڑھ رہے ہیں۔ اور جہاں کسی نے دیکھ لیا کہ مولوی صاحب دیکھ رہے ہیں فوراً مؤدب ہو کر بیٹھ گئے اور خاموشی اختیار کرلی۔ اور کہیں اپنی نظر استاد پر پڑ گئی تب تو ادب کا ٹھکانا ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ حاکم کی نظر کے سامنے ہونے کے وقت کام خوب عمدگی سے ہوتا ہے، تو مطلب اس حدیث کا یہ ہوا کہ خدا کی ایسے حُسن و خوبی سے عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو یعنی اگر فرضاً تم خدا کو دیکھتے تو سوچو اس وقت تمھاری عبادت کس طرح کی ہوتی۔ اب بھی اسی حالت کے مشابہ تمھاری عبادت ہونا چاہیے) اس لئے کہ اگر تم اسے نہ بھی دیکھتے ہو تو کیا ہوا وہ تمھیں دیکھ رہا ہے (یہ اس لئے بڑھایا کہ پہلے جملے سے یہ سوال ہو سکتا تھا کہ جب واقع میں ہم نہیں دیکھتے تو اس طرح کی تحسین عبادت کس طرح ممکن ہے، اس کا جواب اس سے مفہوم ہو گیا کہ دیکھنے والے کی تحسین کے لئے حق تعالیٰ کی رویت کا تعلق بھی کافی ہے)۔ غرض

فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ (پس اگر تم اس کو نہیں دیکھتے) میں فائے تعقیب نہ لیجائے، بلکہ فائے علت قرار دی جائے، یہاں تک تو آپ کو خشوع کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی۔ اس کا ضروری ہونا بھی ثابت ہوگیا۔ طریقہ سے بھی واقفیت حاصل ہوچکی۔

اب خاتمہ کے طور پر ایک امر اور بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس خشوع کے پیدا کرنے کا وقت کونسا ہے۔ آیا ہر وقت خشوع ہی کے اہتمام میں رہیں یا اس کا کوئی خاص وقت ہے تو اب سنئے کہ **ایک خشوع تو مستحب ہے اور دوسرا واجب ہے**۔ مستحب تو یہ ہے کہ ہر وقت یہی حالت استحضار کی قلب پر غالب رہے۔ لیکن یہ ہر شخص کے لئے نہیں ہے۔ صرف اسی کو جائز ہے جسکی ایسی حالت نہ ہو کہ نہ تو خود اس کی ضروریات میں مخل ہو، نہ کسی دوسرے کی حق تلفی کا باعث ہو ورنہ تباہی کی نوبت آجائے گی۔ مستحب کے لئے واجبات ترک ہونے لگیں گے، بجائے ثواب کے اُلٹا وبال ہو جائے گا۔ مثلاً اگر کسی کی
بی بی آٹے کے لئے پیسے دے کہ آٹا لے آؤ بچے بھوکے ہو رہے ہیں اور وہ لگے ۲۱
رہیں خشوع حاصل کرنے میں جس کی وجہ سے بچے بھوکے مریں، تو ایسا خشوع موجب قرب نہیں ہوسکتا۔ خدا سے دوری کا باعث ہوگا۔ حکایت ہے کہ ایک ولایتی صاحب کسی مسجد میں ٹھیرے تھے۔ جب رات کو تہجد پڑھنے کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ ایک مسافر جو وہاں سو رہا تھا خرّاٹے لے رہا ہے۔ آپ نے اس کو کئی دفعہ تو اٹھا اٹھا کر بٹھا دیا اور کہا کہ تم کس طرح سوتے ہو ہمارے خشوع میں خلل پڑتا ہے۔ وہ بیچارہ تھکا ہوا تھا پھر سوگیا۔ آپ کو جو غصہ آیا نکال چھُرا اس کا کام تمام کردیا۔ اچھا خشوع حاصل کیا کہ بیچارے کی جان ہی لے ڈالی۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ انھوں نے اپنی بی بی بچّوں کو تباہ کر رکھا ہے۔ اور غلطی میں مبتلا ہیں، دائمی حضورِ قلب اور خشوع کے پیچھے حق تلفیاں کرتے ہیں۔ یہ امر نہایت نازیبا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوگئی کہ کسی نے نوکر سے کہا کہ ہم بھوکے ہیں کھانا لاؤ، وہ بجائے کھانے کے دوڑ کر برف سے ٹھنڈا

کرکے پانی لے آیا اور اسی پر اصرار کرتا ہے کہ نہیں جناب پانی ہی پیجئے بہت ٹھنڈا ہے، کھانا نہ کھائیے تو ایسے نوکر سے مالک خوش ہوگا یا ناراض۔ جیسے ایک صاحب کا نوکر تھا اس سے مانگا خلال وہ اٹھالایا بانس، مانگا لحاف وہ اٹھالایا گھوڑے کا چارجامہ اور اصرار کرتا ہے کہ لو اسی کو اوڑھ لو۔ یہ گستاخی ہے یا نہیں۔ یہ ساری خرابیاں خودرائی کی ہیں، خودرائی بھی بڑی مضر شے ہے ؎

فکرِ خود و رائے خود در عالم رندی نیست کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

اپنی رائے اور فکر کو راہِ سلوک میں کچھ دخل نہیں ہے۔ اس طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے۔"

مناسب تو یہ ہے کہ ایسا ہوجائے ؎

چوں قلم در پنجۂ تقلیب رب

۴۲ یہاں تو جو حکم ہو وہ ہی کرو، یہی کمال ہے۔ مثلاً اگر کسی کو پائخانہ زور سے لگا ہو اور وہ نماز پڑھنا چاہے تو بُرا ہے۔ چاہئے کہ پہلے فارغ ہوجائے پھر نماز پڑھے۔ اگر کوئی اصرار کرے اور کہنے لگے کہ صاحب نماز پڑھنا تو عبادت ہے اور پیشاب پائخانہ تو نجاست کا کام ہے۔ میں تو نماز ہی پڑھوں گا، تو وہ بیجا کرتا ہے۔ اس طرح نماز کا بھی ستیاناس کرے گا۔

خلاصہ یہ کہ اس مرتبہ خشوع کا اہتمام اس کے لئے ہے جس سے اسکے باعث نہ تو کسی کا حق تلف ہو، نہ دین کا ضرر ہو اور نہ کسی کو دنیا کا ضرر پہونچے۔ دین کے ضرر کی صورت یہ ہے کہ کوئی طالب علم ہے کہ رات کو تو خشوع پیدا کرتا رہے، مطالعہ دیکھا نہیں۔ صبح کو جب سبق پڑھنے بیٹھے تو کچھ سمجھ میں آتا نہیں آخر بے دلی سے پڑھ پڑھ کر کتابیں تمام کیں۔ نہ کچھ آیا نہ گیا۔ علم دین ایسی ضروری چیز سے محروم رہے۔ بلکہ ناقص سے لوگوں کا مقتدا بنکر تباہ کرنا شروع کیا۔ دُنیا کا ضرر یہ کہ بال بچے جن کا نفقہ اس کے ذمہ ہے اس میں کوتاہی ہونے

لگی۔ اسی طرح ترک اسباب ظاہری اگرچہ مستحب ہے لیکن اسی کے لئے جس کی وجہ سے اہل وعیال کے حقوق کے ادا کرنے میں کمی نہ ہونے پائے ورنہ نہیں۔ لیکن ہاں جسے کسی کی فکر نہ ہو اور وہ بھی اس مرتبہ کی تحصیل سے غافل ہے تو بڑا ظلم ہے۔ ایسے ہی شخص کے بارہ میں ہے ؎

ہر آنکو غافل از حق یکزمان است　　دراں دم کافر است اما نہان است

"جو شخص اس سے ایک گھڑی غافل ہے اس گھڑی میں کافر ہے لیکن نہاں ہے"

؎ حضوری گر ہمی خواہی ازو غافل مشو حافظ
متی ماتلق من تہوی دع الدنیا واہملہا

"اگر محبوب حقیقی کے دربار کی حضوری اور قرب
چاہتے ہو تو اس سے غافل مت ہو بلکہ اس کی طرف
متوجہ رہو، اور جب اپنے محبوب سے ملاقات کرو،
یعنی اس کی عبادت میں مشغول ہو تو دنیا اور مافیہا
کی طرف التفات مت کرو"

؎ مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار　　بگذارند و خم طرۂ یاری گیرند

"میرے نزدیک مصلحت یہ ہے کہ یار لوگ تمام کاموں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کے تصور میں لگ جائیں"

؎ جملہ اوراق وکتب درنار کن　　سینہ را از نور حق گلزار کن

"تمام اوراق وکتابیں آگ میں جلادو اور سینہ کو اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن کردو"

؎ ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درا
تو ز غنچہ کم ندمیدۂ درِ دل کشا بچمن درا

"تمہارے اندر خود چمن ہے اس کو پھاڑ کر تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرو"

؎ آسمانہاست در ولایتِ جاں　　کار فرمائے آسمانِ جہاں
در رہِ رُوح پست و بالاہاست　　کوہہائے بلند و صحراہاست

"ولایتِ جان میں بہت سے آسمان ہیں جو آسمانِ دنیا میں کارفرما ہیں۔ رُوح کی راہ میں نشیب و فراز اور بلند پہاڑ و صحرا ہیں"

۵ بر دلِ سالک ہزاراں غم بود　　گر ز باغِ دل خلالے کم بود

"سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے"

بہتیرے لوگ ہیں کہ ان کو خدا نے اطمینان دیا ہے۔ جائداد کی آمدنی چلی آرہی ہے، گھر سے باہر قدم نکالنا نہیں پڑتا، پھر بھی دن رات فضول مضمون میں مبتلا رہتے ہیں۔ کہیں یہ ذکر ہو رہا ہے کہ جاپان اور روس میں لڑائی ہو رہی ہے، کہیں جاپان کو ڈگری دلا رہے ہیں کہیں روس کو، فکر پڑی ہے کہ کیا ہونا چاہئے۔ گویا ان کے سامنے روس و جاپان کا مقدمہ پیش ہوگا، اور فیصلہ کی ان سے درخواست کی جائے گی۔

دن رات ایسی ہی لایعنی باتوں میں مصروف ہیں۔ یہ اطمینان رکھیں
۲ ان کے پاس یہ مقدمہ نہیں پیش ہونے کا۔ ہاں اپنے اندر کے روس و جاپان کی فکر کریں۔ اس کی بیشک ان سے بازپرس ہوگی کہ تم نے قوتوں کو جا سے صرف کیا ہے یا بے جا؟

ایسے شخص کو تو چاہئے تھا کہ حُبِّ الٰہی میں غرق ہو کر اُن مقربین میں سے ہو جاتا جن کے ساتھ خصوصیت کے معاملات ہوتے ہیں، چنانچہ ایک بزرگ تھے انھوں نے پاؤں پھیلا دیئے تھے، ان پر عتاب ہوا،

مقربوں کے احکام ہی دوسرے ہو جاتے ہیں، جو باتیں عام لوگوں کو جائز ہوتی ہیں اُن کے لئے بے ادبی میں داخل ہیں۔ ع

مقرّباں را بیش بود حیرانی

"مقربین کے لئے حیرانی بہت ہوتی ہے"

اور گو اس میں مشقت شدید ہے لیکن قرب کے ساتھ اگر

اگر مشقت بھی اٹھانا پڑے تو کیا ؎

ہر کجا یوسف رُخے باشد چو ماہ — جنّت است آں گرچہ باشد قعر چاہ

"جس جگہ محبوب ہو وہ جگہ جنّت ہے، اگرچہ گہرا کنواں کیوں ہو"

؎ چہ خوش وقتے و خرم روزگارے!
کہ یارے برخورد از وصل یارے!

"وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس
میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو"

حاصل یہ کہ ایک تو وہ تھا جو فارغ محض تھا، اور ایک وہ ہے جس کے متعلق اور بھی خدمتیں ہیں۔ اہل و عیال کا نان و نفقہ واجب ہے، درس و تدریس میں مشغول ہے، وعظ و نصیحت سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، اُس کی طرف لوگوں کی حاجت ہے، ایسے شخص کو ایسا اہتمام خشوع کہ ہر وقت اسی میں رہے ناجائز ہے۔ اس کے ذمّے خشوع واجب حاصل کرنا ہے۔ اس پر واجب ہے کہ عبادت کے وقت خشوع خاص پیدا کرے۔ کیوں کہ اُس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ جب تک کسی عبادت میں مشغول ہے دنیا کا کوئی کام تو کر ہی نہیں سکتا۔ پھر فائدہ کیا ہوا کہ اس نے اپنا وقت مفت پریشان کیا۔ اس لئے یہ مرتبہ ہر شخص پر واجب ہے۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ خدا کا کیا ہی انتظام ہے کہ نہ ہر شخص کو صوفیٔ مستغرق بنا دیا اور نہ غفلت کی اجازت عنایت ہوئی۔

سارے وعظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ پہلے تو مقدمہ بیان ہوا جس میں عوام و خواص سب ہی کی شکایت تھی، کہ خشوع کیوں حاصل نہیں کرتے، اس کے بعد مقصود کا بیان ہوا، وہ تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ اوّل حقیقت، دوسرے فرضیت خشوع، تیسرے طریق خشوع۔ اس کے بعد خاتمہ مذکور ہوا جس میں درجات خشوع کا ذکر ہوا۔

اب خدا سے دعاء کرنا چاہئے
کہ خدا تعالےٰ توفیق
عنایت فرمائے خشوع سے
بہرہ ور اور کامیاب بنائے!!
آمین ثم آمین

فقط

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً
رواہ البخاری

وعظ

جو مشتمل ہے آیۂ کریمہ

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ـ دفتر الابقاء
متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وعظ جو مشتمل ہے آیۂ کریمۂ

فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ہِیَ الْمَاْوٰی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔ (اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا)

یہ آیت سورۂ وَالنّٰزِعٰتِ کی ہے، اس میں حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے ایک ایسی چیز کے حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے جس کا ہر شخص خواستگار ہے۔ جس کو ذرا بھی اطلاع اس کی ہو جائے وہ مفتون ہو جائے۔ مگر پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ کسی چیز کی خواہش معتبر جب ہی ہوتی ہے کہ جب اس کے ذرائع میں بھی سعی کی جائے، جو شخص کسی شے کا طالب، مگر اس کے اسباب حاصل نہ کرے اس کو اس شے کا طالب نہیں کہہ سکتے مثلاً کوئی مالدار ہونا

چاہیے۔ مگر جب اس سے کہیں ان علوم کو حاصل کر جو اکتساب روپیہ کے لئے ضروری ہیں۔ پھر کسی واقف کار کی صحبت میں رہ کر ان علوم پر عمل یعنی اکتساب میں مہارت ہو پھر کوئی کام شروع کر اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھ، کہ خرچ آمدنی سے کم رہے، تاکہ کچھ پس انداز ہو اور تھوڑا تھوڑا جمع ہو کر ایک رقم ہو جائے اور تمول حاصل ہو۔ تو کہتا ہے واہ صاحب مجھ سے علوم میں محنت نہیں ہوتی، کسی کے نخرے کیوں اٹھائے جانے لگے۔ پھر پابندی کا بار خواہ مخواہ اپنے اوپر کیوں لوں اور خرچ کو محدود کر کے دل کو کیوں ماروں جتنا جی چاہے گا خرچ کروں گا؛ اس شخص کو تموّل کا طالب نہیں کہتے اس کو بو الہوس کہتے ہیں۔

یا کوئی شخص جامع مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے مگر ان راستوں کو نہیں اختیار کرتا جن سے جامع مسجد میں پہنچے اور قدم نہیں بڑھاتا، تو یہ شخص جامع مسجد میں کیسے پہونچے گا، اور کیا کہہ سکتے ہیں ۷
کہ یہ ثواب کا طالب ہے؟ یا کوئی شخص چاہتا ہے کہ غلہ اس کے پاس آجائے اور جب کہتے ہیں کھیتی کر، زمین میں بیج ڈال، پانی دے، کھیت کی نگہداشت کر، تو کہتا ہے کون کھیتی کرے اور سینچائی کس سے ہو سکتی ہے، کون گھر چھوڑ کر حفاظت کے لئے جنگل میں جا کر پڑے، مجھے تو غلہ چاہیئے، یہ شخص احمق ہے اور غلہ کا طالب ہی نہیں ہے۔

اور جیسے کوئی اولاد چاہے اور جب کہا جائے نکاح کر اولاد ہو جاوے گی تو کہتا ہے کون بکھیڑے میں پڑے، نکاح میں ایک رقم صرف کروں پھر نان ونفقہ کا مطالبہ ہو، مکان چاہیئے، مہر کی فکر ہو، اور اور طرح طرح کی مصیبتیں کون مول لے، نکاح تو کرنے کا نہیں بس میں تو لڑکا چاہتا ہوں؛ یہ احمق ہی ہے۔ اللہ میاں نے اس فعل خاص کو ولد کے لئے سبب قرار دیا ہے، اس کو اختیار کرو اولاد بھی مل جائے گی۔

اور جیسے کہ کوئی چاہے کہ پیٹ بھر جائے اور جب کہیں کھانا کھاؤ لقمہ کو چباؤ اور نگلو پیٹ بھر جائے گا تو کہتا ہے کہ صاحب میں یہ تو کرنے کا نہیں۔ ظاہر ہے کہ محض احمق ہے۔

توضیح کے لئے یہ کئی مثالیں دی گئیں تاکہ یہ مقدمہ ذہن نشین ہو جائے میں آگے انشاء اللہ ان سے کام لوں گا۔ غرض طالب اگر ذرائع کو اختیار کرے تو طالب ہے ورنہ بوالہوس ہے۔ ایسا آدمی ضرب المثل ہو جاتا ہے۔ دیکھنے اور سننے والے کہا کرتے ہیں کہ آدمی تو معقول ہیں مگر خبط ہو گیا ہے۔ دیکھئے پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہوا ہے، نکاح تو کرتے نہیں اور اولاد کی دھن ہے۔ کیسا افسوس ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مسلم ہے کہ اگر سعی نہ کرے ذرائع میں تو پاگل ہے۔ پس۔ اب تعجب یہ ہے کہ یہ قاعدہ دنیاوی امور میں تو ہر کس و ناکس، عالم، جاہل، بڑے اور چھوٹے سب کے نزدیک تسلیم کیا ہوا ہے، اور
جب دین کا معاملہ آپڑتا ہے تو بڑے بڑے عقلاء احمق بنجاتے ہیں۔ وہاں ۸
مقصود کی زبانی طلب کو ہی طلب کہنے لگتے ہیں۔ اور اطمینان رہتا ہے کہ بڑے طالب ہیں اور اس طلب پر نتیجہ ضرور مرتب ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو زبان سے اولاد اولاد کہنے والے کو بھی طالب ولد کہنا چاہئے اور امید رکھنی چاہئے کہ اس کے اولاد ہوگی (معلوم نہیں کس طرح ہوگی شاید مرد کے بچہ پیدا ہوگا) معلوم نہیں کیا بات ہے، فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا میں تو اسباب کو دخل ہو اور آخرت میں نہ ہو، بلکہ معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی اسباب کو اتنا دخل اپنے مقاصد میں نہیں ہے جتنا کہ آخرت کے اسباب کو مقاصدِ آخرت میں ہے۔

اسبابِ اخروی [illegible]

یہ بات ظاہراً مشکل معلوم ہوئی ہوگی، کیونکہ ذہن نشین یہی ہو رہا ہے کہ دنیاوی کام تو اختیاری ہیں اور اخروی نہیں۔ جو لوگ ذرا عقلمند ہیں وہ اتنا اور کہہ لیتے ہیں کہ ہوتا تو سب کچھ تقدیر ہی سے ہے مگر اسباب

حق تعالیٰ نے معتبر فرمادیئے ہیں۔ مسئلہ تقدیر کو سمجھا مگر غلط سمجھا، چاہے فاسق ہوں یا فاجر ہوں، اگر تقدیر میں جنت ہے تو جائیں ہی گے، دنیا میں بھی یونہی کیوں نہ کہا کہ اسباب کو حاصل کریں یا نہ کریں اگر تقدیر میں مسبب لکھا ہے تو ملے ہی گا، نہ کوئی پیشہ کریں نہ کھیتی کریں نہ کھائیں اگر قسمت میں تموّل اور غلہ اور پیٹ بھرنا لکھا ہے تو ہو ہی جائے گا۔

بلکہ جیسا یہ خیال ہے کہ فسق و فجور کے ساتھ بھی جنت مل سکتی ہے باوجودیکہ یہ اعمال اس کے مضر ہیں، اس کے ساتھ یہ خیال بھی تو ہونا چاہئے تھا کہ دنیا کے مسببات درصورت ذرائع اختیار نہ کرنے کے تو کیا ان کے منافی اسباب کو اختیار کرنے کی صورت میں بھی اگر تقدیر میں ہیں تو مل ہی کر رہیں گے۔ تو جس کو غلہ کی طلب ہو اگر اس کے یہاں کھیت کھڑا ہو تو کھڑے ہوئے کھیت میں آگ لگا دینا چاہئے اور خوش ہونا چاہئے کہ اب
غلہ ملے گا۔ جیسا کہ اب فسق و فجور کر کے اطمینان سے بیٹھے ہیں کہ جنت ملے ۹
ہی گی غلطی یہی کہ دنیا کو اختیاری سمجھا اور آخرت کو نہیں۔ یا تو دونوں کو اختیاری سمجھا ہوتا یا دونوں میں تقدیر پر بیٹھے رہے ہوتے۔ ذرا غور سے سمجھ میں آجائے گا کہ واقعی بات کیا ہے۔

عقائد کا مسئلہ ہے کہ ہر سبب پر جو اثر مترتب ہوتا ہے وہ باذنہٖ تعالیٰ (واللہ تعالیٰ کے حکم سے) ہے۔ جلانا آگ کا لگانا اثر دائمی اور متفق علیہ ہے، مگر جب تک اذن نہ ہو احراق مترتب نہیں ہوسکتا۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں نے نہایت تیز آگ میں ڈالا، مگر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہدیا ٹھنڈی ہوجا۔ کچھ بھی صدمہ نہ پہنچا اور احتراق[1] مترتب نہ ہوا۔ اگر یہ اثر آگ کے لئے ذاتی ہوتا یا جزوِ ماہیت یا لازمِ ماہیت ہوتا تو کیوں منفک[2] ہوتا؟ کیا آگ آگ نہ رہی اور یہی قصہ اعمالِ صالحہ میں بھی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و

[1] جلانا ۱۲ [2] جدا ۱۲

آپ وسلم فرماتے ہیں کوئی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا ، مطلب یہ ہے کہ عمل تاثیر بالذات نہیں کہ کسی کو جنت میں لے جائے ، مشیت ایزدی شرط ہے (جس کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ عمل دخولِ جنت میں کچھ دخل نہیں رکھتا) عمل کو وہی دخل ہے دخولِ جنت میں جو آگ کو ہے احراق میں۔ آگ کے احراق کے لئے بھی مشیت شرط ہے اور دخولِ جنت کے لئے بھی۔

بہرحال ایک آیت اور ایک حدیث سے ثابت ہوگیا کہ کسی چیز میں تاثیر بالذات نہیں ہے اگرچہ اثر کیسا ہی یقینی اور دائمی ہو مگر ذات میں کسی چیز کی داخل نہیں کہ اثر کرے۔ سب مشیت باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ حق تعالیٰ کے مرتب کرنے سے سبب مرتب ہوتا ہے تو اب اس کی تحقیق باقی ہے ، کہ آیا اسباب دنیویہ پر مرتب کرنے کا حق تعالیٰ نے یقینی وعدہ کیا ہے یا اسباب اخرویہ پر اس کے مرتب کرنے کا یقینی وعدہ کیا ہے۔
10 تو نصوص و واقعات دونوں سے دیکھئے کہ دنیوی اور دینی دونوں اسباب میں سے کس پر ترتب اثر یقینی ہے کس پر وعدہ ہے باری تعالیٰ کا ، اور تجربہ سے بھی کون یقینی ہے۔

سو کہیں نہیں فرمایا گیا نصوص میں کہ اسبابِ دنیوی پر اثر ضرور مرتب ہوگا ، اور تجربہ و واقعات سے بھی یہی نکلتا ہے۔ بسا اوقات کھیتی کرتے ہیں ، اور ایک دانہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ یہی حال جاہ و ثروت کا ہے۔ بہت سی تدبیریں کی جاتی ہیں مگر عمر گذر جاتی ہے اور غربت ہی رہتی ہے۔ اور کبھی بے تدبیر مالدار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو کبھی نہ کہیں گے کہ جاہ و ثروت تدبیر پر ہے۔ میں نے خود ایسے واقعے دیکھے ہیں کہ جن کی اوقات کسی وقت میں دو آنہ کی تھی آج وہ لاکھ پتی ہوگئے۔ اگر آپ کہیں کہ انھوں نے تدبیر سے اسقدر مال حاصل کیا ہے تو میں کہتا ہوں آپ ان کے پاس جائیے ، اور اول سے آخر تک ان کی سوانح عمری لکھئے اور ان کی کُل تدبیریں بھی

لکھئے کہ پہلے ان کے پاس دو آنہ تھے، اس کا انھوں نے فلاں سودا خریدا اور صبح سے شام تک پھیری کرکے بیچا، اس میں ایک سوا نفع ہوا، ایک آنہ میں سے نصف کھایا اور نصف اصل میں شامل کر دیا، اگلے دن ڈھائی آنے کا سودا لے کر پھیری کی، ساڑھے تین آنے یا چار آنے ہوگئے، اسی طرح راس المال بڑھتا گیا، یہاں تک کہ جب تعداد آنوں سے نکل کر روپیوں میں آگئی تو کچھ پس انداز کرنے لگے، جب ایک کافی رقم جمع ہوگئی تو جائیداد خریدلی، پھر اس کی آمدنی کو بقدر ضرورت خرچ کیا، اور کچھ داخلِ خزانہ کرتے گئے یہاں تک کہ خزانہ بڑھتے بڑھتے لاکھ تک پہنچ گیا لکھ پتی ہوگئے۔

اس کو مفصل لکھئے بلکہ تمام تغیرات کو تاریخ وار قلمبند کیجئے، اب اگر یہ تدبیر سبب ہے ان کے جاہ و ثروت کی تو آپ بھی ایسا ہی کیجئے جیسا انھوں نے کیا کہ دو آنہ کا سودا لیجئے اور پھیری کیجئے اور نفع کو شامل راس المال کرتے جائیے، بعد چندے کچھ پس انداز کیجئے اور جائیداد خریدلیجئے پھر خزانہ بڑھائیے یہاں تک کہ لکھ پتی بنجائیے۔ میں کہتا ہوں کبھی بھی تو ان تدبیروں سے آپ ان کی برابر نہیں ہو سکتے۔ کیا وجہ ہے کہ تدبیرے اس نے حاصل کیا اور تم نہیں کرسکتے؟ وجہ یہی ہے کہ سب کچھ باری تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ اسباب دنیا پر ہمیشہ اللہ میاں اثر مترتب نہیں فرماتے۔ 11

میرے دعوے کا ایک جزو ثابت ہوگیا کہ اسباب دنیوی پر نتیجہ کا مترتب ہونا ضروری اور دائمی نہیں رہا۔ دوسرا جزو یعنی آخرت، سو دیکھئے فرماتے ہیں مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا یعنی جو کوئی آخرت کا طالب ہو اور کوشش کرے تو اس کی سعی ضائع نہ جائے گی۔ بلکہ فرماتے ہیں نَزِدْ لَهٗ فِىْ حَرْثِهٖ (ہم زیادتی کریں گے اسکے لئے کھیتی میں)، یعنی اس کا نتیجہ بقدر عمل ہی نہیں زیادہ دیا جائے گا! دیکھ لیجئے

وعدہ کے یقینی ہونے سے نتیجہ مترتب ہونا ضروری اور یقینی ہوا یا نہیں۔ میرا مدعا ثابت ہوگیا۔ کہ اسباب دنیوی پر اثر مترتب ہونے کا کہیں وعدہ نہیں، اور اسباب اخروی کے لئے وعدہ ہے۔

پھر تعجب ہے کہ دنیا میں جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں وہ اکثر جتنا چاہتے ہیں نہیں ملتی، مگر پھر اکتساب ذرائع سے کوئی غفلت نہیں کرتا، اور غفلت کرنے والا احمق سمجھا جاتا ہے۔ اور آخرت میں اس قدر ملتا ہے جس کا ارادہ بھی نہیں کیا جاتا اور پھر اکتساب ذرائع سے غفلت ہو اور غفلت کرنے والے کو کوئی احمق نہ کہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ (سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانۂ غیب میں موجود ہے)، اور حدیث قدسی میں فرماتے ہیں اَعۡدَدۡتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیۡنَ مَا لَا عَیۡنٌ رَأَتۡ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتۡ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلۡبِ بَشَرٍ "میں نے اپنے نیک
بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی، ۱۲
نہ کسی کے دل میں اس کا خیال تک گذرا۔" حالانکہ یہ خیال بڑی وسیع چیز ہے۔ مگر بروئے حدیث وہ چیزیں اسباب آخرت پر متفرع ہوتی ہیں جو خیال میں بھی نہ آسکیں۔ اب سوچئے کہاں تک سوچیں گے، جمال، باغ، نہریں، خادم، ماکولات و مشروبات وغیرہ جہاں تک بھی آپ کا خیال پہنچے، پھر ایک مرتبہ ایسا نکلے کہ خیال سے بھی باہر ہو، اور عقل اس کے ادراک سے قاصر ہو، مگر وہاں ملے گا ان شاء اللہ تعالیٰ اگر فضل ہوا آخرت میں ترتب اثر تو کیا اس اثر کا وعدہ ہے کہ سبب ہے اور اس سے کچھ نسبت بھی نہیں۔ جمال اور باغ وغیرہ میں بھی ایسے مراتب نکل سکتے ہیں کہ خیال سے باہر ہوں، اور بعض نتیجے وہاں کے وہ ہیں کہ ان کا صرف لفظ ہی سنا ہے ماہیت تو عقل میں بھی نہیں آتی، وہ رویت[1] الٰہی ہے۔

غرض ترتب اثر یقینی ہوا کیونکہ وعدہ فرمایا ہے باری تعالیٰ نے کہ اثر ہم ضرور

[1] دیدار۔

متفرع کریں گے تم ذرائع کو حاصل کرو، اور لوگوں کے خیال میں یہ جما ہوا ہے کہ آخرت بے اختیاری ہے اور دنیا اختیاری ہے۔ اسی نے لوگوں کو بٹھا دیا کچھ نہیں کرتے اور دنیا کے معاملات میں یہ حال ہے کہ جب چاہتے ہیں دنیا حاصل کرنا اسباب کو جمع کرتے ہیں، حالانکہ بارہا اسباب کے تخلف کو بھی مقاصد سے دیکھ چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ جن اسباب کو دخل نہیں وہ جمع کئے جائیں اور جن کو دخل ہے ان کو نہ اختیار کیا جائے، کیسے کہا جائے کہ ایسا شخص جنّت کا طالب ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعجب ہے جنت سے کہ اس کا طالب کیسے سوتا ہے!

اس سے اور ماسبق سے ثابت ہو گیا کہ جو اسباب کو حاصل نہ کرے اس کے دماغ میں خلل ہے۔ طلب صرف معتبر نہیں بلکہ طلب صادق ضروری ہے۔ اور اس کے لئے کسب ذرائع لازم ہے جیسا کہ بسط کے ساتھ ابتک
۱۲ بیان کیا گیا۔ سو اس آیت میں اللہ میاں نے جنّت کے طلب کا ذریعہ بتایا ہے جس کے سب لوگ مشتاق ہیں۔

یہاں ایک بات اور قابلِ تحقیق ہے وہ یہ کہ اس آیت سے جنت کا مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ میں بعض ایسے گذرے ہیں جن کے کلام میں یہ مضمون پایا جاتا ہے کہ نہ ہم کو جنّت کی طلب ہے نہ دوزخ کا خوف ہے تو یا تو جنّت مطلوب نہیں یا وہ لوگ مخالف قرآن کے ہیں۔ جیسے ایک صاحبِ حال کی نقل ہے (یہ قصہ حضرت رابعہ بصریہ کا ہے) کہ ایک روز غلبۂ جذب میں ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لے کر نکلیں۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت یہ کیا! کہا تمام عالم کو جنّت اور دوزخ ہی کے خیال نے تباہ کر دیا میرے مالک کا نام کوئی نہیں لیتا۔ آج میں فیصلہ کئے دیتی ہوں پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کردوں گی اور آگ بہشت میں لگاؤں گی۔" سو بات یہ ہی کہ یہ اقوال وحکایات اہل حال کے ہیں، اور غلبۂ حال سے ان کو معذور

سمجھا جاوے گا۔ ہم سوال کو تو ان لوگوں کے اقوال کو نقل کرتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ایسی بات جذب میں کوئی کہدی جائے باقی قصداً کہنا یا اس کو کمال سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ جذب کوئی کمال نہیں۔ اور یہ وہ اختیاری چیز ہے جو لوگ اختیار سے ایسے لفظ کہتے ہیں حاشا وکلا جو اعلیٰ و ادنیٰ کسی درجہ میں بھی وہ شمار ہوں۔ غلبہ کے تو معنی ہی بے اختیاری کے ہیں۔ پھر بے اختیاری کا اختیار سے ہونا کیا معنی!

آجکل لوگوں نے اسی کو کمال سمجھ رکھا ہے جو کوئی واہی تباہی کلمات بیباکانہ بکتا ہو اس کو بڑا پہنچا ہوا سمجھتے ہیں کہ فلاں بزرگ مست ہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ جن بزرگوں سے ایسے کلمات منقول ہیں ان کے لئے بھی یہ حالت کچھ کمال کی نہ تھی۔ ہاں غلبۂ حال کی وجہ سے معذور تھے۔ کوئی الزام ان پر عائد نہیں ہوتا۔ اور رہے نقّال سو وہ تو کسی طرح معذور ہی نہیں ہو سکتے۔ ان کے اقوال کے دعوے کے ساتھ نقل سخت بیہودگی ہے۔ غرض ان لوگوں کی یہ ایک حالت معذوری کی تھی، ورنہ جس چیز کا مطلوب ہونا قرآن سے ثابت ہو، اور جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم طلب فرماویں اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْهَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ۔ (اے اللہ میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں، اور وہ چیز جو اس (جنت) کی طرف قریب کردے، قول ہو یا عمل) اس کی نسبت دوسرے کا کیا منصب ہے کہ ایسا کہے۔ آیات و احادیث میں صاف طور پر طلبِ جنت کی فضیلت آئی ہے۔ اہلِ حال معذور تھے حال کی وجہ سے اور اب تو لوگوں میں حال ہی نہیں رہا، نقل نقل رہ گئی ہے۔ اس کو فرماتے ہیں مولانا ؂ عدم نقل احوال ۱۴

حرفِ درویشاں بدزدد مردِ دوں ✻ تا بہ پیشِ جاہلاں خواند فسوں

"درویشوں کے الفاظ چرا کر کمینہ آدمی جاہلوں کے سامنے ان کو اپنے دام میں پھنسانے کیلئے منتر پڑھتا ہے۔"

جن میں کچھ ہے ہی نہیں وہ ان کے دعووں کی نقل کر کر کے جاہلوں میں بزرگ بنتے ہیں۔ مجھ کو ایک شخص اسی سفر میں ملے کہ وہ کچھ مالی اعانت چاہتے تھے۔ ادھر اُدھر کی باتوں میں اپنی محویت بھی ظاہر کی۔ لمبی لمبی باتیں کرنے لگے، کیا پرواہ ہے جنت کی اور کیا خیال ہے دوزخ کا۔ میں نے کہا میاں بیٹھے بھی رہو چار روپے کے لئے تو گھر چھوڑے پھرتے ہو جنت کی طرف التفات بھی نہ کروگے۔

ان نقالوں میں رنگ البتہ اصل سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سو ہر چیز میں تجربہ کر لیجئے کہ اصل میں نقل کی سی آب وتاب نہیں ہوتی، رنگ و روغن کو دیکھکر شیفتہ ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اس شخص نے اصل چیز نہیں دیکھی اور محض ناواقف ہے۔

غرض اہلِ حال تو بحث سے مستثنےٰ ہی ہیں، اور جنت کا مطلوب ہونا بحالہٖ باقی رہا، البتہ یہ ضرور ہے کہ مشہور تقسیم میں اس کے مطلوب ہونے کی دو صورتیں ہیں اور میرے نزدیک ایک تیسری صورت اور بھی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کی نعمتوں کو مقصود سمجھکر کھانے کو پینے کو باغوں کو مکانات کو نہروں وغیرہ کو غرض اصلی جان کر طلب کیا جائے۔ مذاق مختلف ہوا کرتے ہیں، کسی کو مکانات کا شوق ہے، کسی کو دلکش فضاؤں کا، کسی کو بچوں کا، کسی کو حسن و جمال کا، کسی کو ماکولات و مشروبات کا، اور جنت میں سب کچھ ہے تو جو چیز جس کو مرغوب ہو ملے گی۔ حدیث شریف میں ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شخص تمنا کریگا کہ میں تو کھیتی کرتا، اللہ میاں فرمائیں گے ابن آدم کا پیٹ ہی نہیں بھرتا، اور دم کے دم میں سب چیز موجود ہو جاوے گی۔ بات کہتے میں ہرا بھرا کھیت پھر انبار کے انبار غلہ تیار ہے تو کتنی کھیتی چاہئے! یہ ایسا ہے جیسا کہ بچہ طرح طرح کی ضدیں کیا کرتا ہے اور سب پوری کی جاتی ہیں، والدین

جانتے ہیں کہ اَولیٰ ضدیں ہیں مگر جو مانگتا ہے دیتے ہیں۔
تو بعض لوگ جنت کو اس لئے طلب کرتے ہیں۔ دوسری قسم وہ لوگ ہیں جو جنت کو اللہ میاں کی لقاء کے لئے طلب کرتے ہیں یہ لوگ طالب درحقیقت اللہ میاں کے ہیں۔ مگر ان کو معلوم ہوا ہے کہ رویت اور رضا خاص جنت میں ہوگی۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ جنت میں پہنچ جائیں تاکہ مقصود اصلی حاصل ہو۔ غرض نعمت کے طالب نہیں بلکہ منعم کے ہیں۔ مثال اس کی یہ ہے کہ ایک محبوب نے باغ میں لوگوں کو بُلایا، جس میں ہر قسم کا عیش و نشاط موجود ہے، جو میوے کہیں نہیں ہیں وہ وہاں موجود، وہ مکانات جن کا نقشہ تک کسی کے خیال میں نہ گذرا ہو وہاں تیار، نہریں، حوض، دلکش فضائیں، خادم، غلام۔ غرض جملہ چیزیں موجود ہیں۔ بعض جانے والے ایسے ہوں گے جو غسل کرنے اور حوضوں میں غوطہ لگانے کی غرض سے
۱۴ جائیں گے، اور بعض تازہ بتازہ ہواؤں کا لطف اٹھانے کے لئے اور بعض میووں سے لذت حاصل کرنے کے لئے وعلیٰ ہٰذا۔
اور ایک جانے والے وہ ہیں کہ اس محبوب پر عاشق ہیں اور باغ میں اس واسطے جاتے ہیں کہ ان کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارا محبوب باغ میں ہی یہ سُن لیا ہے اور باغ کو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل باغ کو نہیں ڈھونڈھتے باغ والے کے شیدائی ہیں، اس وقت چونکہ محبوب باغ میں ہے اس واسطے باغ کی طرف جاتے ہیں اور وہ اگر جنگل میں آجائے تو باغ کا خیال بھی اُن کے ذہن میں کبھی نہ گذرے۔
باغ کی طرف جانے والے یہ دو قسم کے لوگ ہوئے، ایک[عہ] وہ کہ نفس باغ کے طالب ہیں، دوسرے وہ کہ نہ انھیں باغ کا خیال ہے نہ جنگل کا۔ محبوب کی طرف نگاہ ہے۔ مشہور قسمیں طالبانِ جنت کی تو یہی دو ہیں، اور میرے

عہ دیدار۔ عہ یہ پانچ سطریں بعینہ مولانا مدظلہ کے لکھے ہوئے کی نقل ہیں جو مسودہ میں بروقت اصلاح تحریر فرمائی۔

نزدیک تیسری قسم اور ہے لیکن ذرا دقیق ہے، وہ یہ کہ طالب تو نعمت کے ہیں لیکن نہ حظ کی وجہ سے بلکہ اپنے تذلل اور عبدیت کی وجہ سے اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ بلا واسطہ طالب منعم کے ہوں، وہ اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس کے کوچہ کا ایک گوشہ مل جاوے۔ یہ تیسری قسم ہوئی پس طالب نعمت کا مبتدی ہے اور طالب منعم کا متوسط ہے اور طالب نعمۃ لِلعَبدِیَۃ کا واقع میں طالب کامل منعم کا ہے منتہی ہے۔ اور صاحبِ حال بحث سے خارج ہے۔

عدم طلب جنت افضل نہیں

خلاصہ یہ کہ لوگوں کا خیال مطلقاً یہ ہے کہ طلبِ جنت سے عدم طلب کا درجہ بڑھ کر ہے۔ حالانکہ غور کرنے سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔ کہیں آیات و نصوص میں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ عدم طلب کوئی شئے حَسَن ہے۔ بہت سے بہت یہ کہہ سکتے ہیں کہ عدم طلب والا معذور ہے، سو معذوری میں فضیلت کہاں۔

17

مبتدی و منتہی کا فرق

حاصل یہ کہ طالب جنت کی تین قسمیں ہوگئیں کہ یا مبتدی ہے یا متوسط یا منتہی۔ سو متوسط کا حال تو اکثر ممتاز ہوتا ہے۔ لیکن مبتدی اور منتہی کا حال بہت متشابہ ہوتا ہے مگر واقع میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مبتدی ایک کام میں لگا ہوا ہے گو حقیقت نہیں پہچانتا مگر آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے۔ کبھی حقیقت شناس بھی ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں وجد میں آجانا ڈھاریں مارنا مغلوبوں کا کام ہے۔ جو صاحبِ کمال ہے اس کو حال نہ آنسو ٹپکا سکتا ہے نہ حال اس کے بدن میں حرکت پیدا کر سکتا ہے، نہ حال اس کی زبان سے بیساختہ کلمات نکلوا سکتا ہے۔

شاہ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد اینجا مردانند کہ دریاہا فرد برند و آروغ نزنند"

لہ اس وقت مجلس پر ایک کیفیتِ عجیبہ طاری تھی ۱۲

(منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ سے فریاد میں آگیا۔ اِس خبگہ مرد ہیں کہ دریا کے دریا چڑھا جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے) منتہی کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے اگرچہ کہ منتہی راستہ طے کئے ہوئے ہوتا ہے اس واسطے ہر مقام پر اس کے افعال سے واقفیت ٹپکا کرتی ہے اور مبتدی مقلدانہ چلتا ہے۔

تفاوت مبتدی و منتہی

اسی طرح جنّت کے مانگنے والوں میں جو مبتدی یا منتہی ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ مبتدی طالب ہے مزہ کے لئے اور منتہی مزہ سے گذرا ہوا ہے۔ پھر جنّت کی طلب جو کرتا ہے سو وہ محبوب کے حکم سے ہے۔ گویا منتہی عبدیت ظاہر کرتا ہے کہ جو حکم ہو اس کی تعمیل کے لئے تیار ہوں اور مبتدی کی فنا میں ابھی کمی ہے۔ اس کا التفات مزہ کی طرف ہنوز باقی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایسی چیز کی طلب کا حکم ہوتا کہ مزہ اس میں نہ ہوتا تو ممکن ہو اس صورت میں مبتدی کے پیر اکھڑ جاتے اور منتہی جما ہوا ہے۔ اس کی لغزش کی
کوئی وجہ نہیں وہ مزہ کا طالب ہی نہیں جس کے رہنے نہ رہنے پر اس کی طلب ۱۸
کا دار و مدار ہو، چونکہ طلب کا حکم پایا ہے اس واسطے تعمیل کر رہا ہے۔

فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہیے) امر کا صیغہ ہے۔ یہ شخص زبانِ حال سے کہہ رہا ہے ؎

طلب امتثال امر ہے

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دین ۔۔۔ خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

"اگر مجھ سے شہنشاہِ دین طمع خواہاں ہو تو پھر قناعت پر خاک ڈال دوں"

جب اُدھر سے ہی طلب کا حکم ہے تو طلب نہ کرنا عدول حکمی ہے۔ مطیع اطاعت میں ایسا محو ہوتا ہے جیسے کسی کو شراب پلادیں (شراب دو ہیں حلال اور حرام شرابِ محبت حلال ہے) شراب پی کر آدمی سب طرف سے بے خبر ہو جاتا ہے اسی طرح جو بندہ ہے وہ امتثالِ امر میں مخمور ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ محویت بیخودی نہیں ہے۔ بعض ناواقف اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اگر نماز میں محویت ہو جائے تو رکوع و سجود کیسے ہوں۔ محویت کے معنی یکسوئی کے

محویت بیخودی نہیں

ہیں، صرف باری تعالیٰ کی طرف خیال ہوتا ہے۔ اس صورت میں عبادت بطریق احسن ہوگی، رکوع و سجود نہ ہونا کیا معنی۔

عام لوگ محویت اس کو سمجھتے ہیں کہ کچھ واہی تباہی کلمات زبان سے نکال دیں یا آئندہ کی باتوں پر دعوے کے ساتھ حکم لگا دیا کریں اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں اور کہا کرتے ہیں۔ اللہ میاں پر ایسا ناز ہے کہ جو مُنہ سے نکل گیا پورا ہوکر رہتا ہے۔ یہ مسلّم سہی کہ دعا، قبول ہوتی ہے مگر ہر چیز کو مانگ بیٹھنا اور وجوب سے حکم لگا دینا انہی سے ہوسکتا ہے جو بیخود ہیں، یہ محویت محمود نہیں۔ محویت محمود میں حق سبحانہٗ تعالیٰ سے نہایت قرب ہوتا ہے۔ اور جتنا جس کو قرب ہوتا ہے اتنا ہی عظمت کا اس پر ظہور ہوتا ہے اور اتنا ہی اپنے نفس کا تذلل کھل جاتا ہے۔ پھر جس پر محبوب کے اعلیٰ درجہ کی عظمت اور اپنی ذلت کھل گئی ہو اس کی نسبت کیا آپ خیال کرسکتے ہیں کہ جہاں چاہے بیدھڑک قدم اٹھا بیٹھے گا۔ بادشاہ کے دو بچے ہیں ایک ناسمجھ اور ایک سمجھدار
19 ناسمجھ تو جب آتا ہے سیدھا گود میں جگہ لیتا ہے، نہ آداب مجلس کی کچھ خبر نہ اراکین کا لحاظ نہ بادشاہ کا ادب نہ شاہی پوشاک کا خیال، پیر صاف ہیں یا خاک آلودہ آئے اور زانو پر چڑھ بیٹھے۔

اور ہوشیار بچہ جب آتا ہے تو نیچی نگاہ کیے ہوئے، چہرے پر اراکین کا لحاظ ظاہر، مجلس کا رُعب چھایا ہوا اور نہایت ادب سے پاؤں پکڑ کر حاضری کی اجازت مانگ کر مؤدب کھڑا ہوتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ سمجھدار کو عظمت شاہی کی خبر ہے اور ناسمجھ کو نہیں۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ ناسمجھ بچہ بادشاہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ رکھتا ہے کہ اس قدر قرب اس کو حاصل ہے کہ شاہی پوشاک پر میلے پیروں سے جا چڑھتا ہے اور جو اُلٹی سیدھی ضدیں کرتا ہے۔ پوری کی جاتی ہیں۔ نہیں۔ قربِ صوری اس کو حاصل ہے اور قرب حقیقی سمجھدار کو، اگرچہ سمجھدار گود میں نہیں ہے اور کسیقدر فصل سے کھڑا ہے میلے

پیروں سے کپڑوں پر جا چڑھنا اور اُلٹی سیدھی ضدیں کرنا گستاخی ہے فضیلت نہیں
زائد سے زائد یہ ہے کہ بچہ ان حرکات میں معذور سمجھا جاتا ہے۔
اسی طرح اہل حال کہہ اٹھتے ہیں کہ نہ دوزخ نہ بہشت نہ اُس کا خوف ہو
نہ اس کی خواہش۔ ان دونوں میں سے کسی کی خبر ہی نہیں۔ یہ کامل نہیں ہیں
ان پر ابھی عظمت کا انکشاف پورا نہیں ہوا۔ اس وجہ سے اتنی جرأت ہے
کہ قرب کے اعلیٰ درجہ کا دعویٰ ہے۔
دیکھئے ایک نہایت ذلیل شخص کسی عالی شان محبوب کی طرف جانا چاہتا
ہو تو اول تو برسیں چاہئیں اس کوشش کے لئے کہ کسی طرح راستہ کے موانع
رفع ہوں، دربان وچوبدار وغیرہ سے ساز ہو جائے تب توقع کی جائے کہ ان کی
درخواست محبوب تک پہونچ سکے گی، اگر اس میں کوشش ان کی چل گئی کہ درخواست
محبوب تک پہنچ گئی اور پھر قسمت کی یاوری سے محبوب نے بہت ہی لطف
۲۰ فرمایا کہ حاضری کی اجازت دیدی تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دربار میں جاتے وقت
ان کی بڑی سے بڑی آرزو کیا ہوگی۔ یہ تو کبھی خیال بھی نہ جائے گا کہ مجھے
محبوب بنالیں، بڑا حوصلہ یہ ہوگا کہ چوکھٹ کو بوسے دینے کی اجازت ملجائے
اس کا یہ حوصلہ کرنا کیا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چوکھٹ کا طالب ہے؟
نہیں یہ شخص چوکھٹ کا طالب نہیں ہے۔ بلکہ اپنی حالت کو دیکھ کر اس سے
زیادہ کی ہمت نہیں کرتا۔ حق تعالیٰ اگر اس کو چوکھٹ سے بڑھانا چاہیں تو
پیروں میں رعشہ پڑ جائے گا۔ سو منتہی اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ (آپسے میں جنت کی درخواست
کرتا ہوں) کہے گا نہ اس واسطے کہ جنت کا طالب ہے بلکہ طالب محبوب حقیقی ہی کا
ہے مگر اس سے بڑھکر حوصلہ اپنی ذلت اور ان کی عظمت کو دیکھکر نہیں کرسکتا
معلوم ہوگیا ہوگا کہ طالب تین قسم کے ہیں مبتدی یعنی طالب جنت کے
حظ کے لئے، اور منتہی یعنی طالبِ جنت عظمتِ محبوب کی وجہ سے اور متوسط الحال
مبتدی اور منتہی میں فرق مشکل ہے اور متوسط الحال کا حال ممتاز اور ظاہر

ہوتا ہے حال سے مغلوب ہوتا ہے گو ایسا مغلوب نہ ہو کہ حدِ شرع کی حفاظت نہ کر سکے۔ کیوں کہ ایسا شخص تو جیسا اوپر عرض کیا گیا مبحث سے خارج ہے لیکن مغلوب ہونے سے صرف اس قدر مراد ہے کہ ذراسی بات پر رونے لگتا ہے، ذراسی بات پر وجد آجاتا ہے، زبان سے بے اختیارانہ کلمات نکلنے لگتے ہیں اس کو عوام کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ کمال نہیں ہے، کمال یہ ہے کہ حال پر غالب آجائے اور حال کوئی تغیر اس میں نہ پیدا کر سکے۔ ایسے شخص کے پہچاننے کے لئے بڑی بصیرت چاہئے۔ اس کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے۔ عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ منتہی کا پہچاننا کچھ آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متوسط اولیاءؒ کو تو لوگوں نے پہچان لیا، اور اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السّلام کو نہ پہچان سکے قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (انھوں نے کہا تم تو مثل ہماری بشر ہو) متوسط اولیاء میں تو جوش وخروش دیکھتے ہیں اور اولیائے کاملین اور انبیاء علیہم السّلام کی حالت بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔ اسی ۲۱
کو مولانا فرماتے ہیں ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد　　　کم کسے از سرِ حق آگاہ شد

تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انھوں نے اللہ کے اولیاء کو پہچانا نہیں،

گفتہ اینک ما بشر ایشاں بشر　　　ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

اور کہنے لگے ہم بھی انسان وہ بھی انسان وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں،

ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ　　　درمیاں فرقے بود بے منتہا

ان بیوقوفوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ان میں اور ہم میں بڑا فرق ہے،

ایں خورد گردد پلیدی زو جدا　　　واں خورد گردد ہمہ نورِ خدا

یعنی ایک کھاتا ہے تو اس سے پلیدی و بخل و حسد پیدا ہوتا ہے وہ دوسرا کھاتا ہے تو وہ تمام تر نورِ خدا یعنی عشقِ الٰہی پیدا ہوتا ہے

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

یعنی بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر اور شیر۔

مگر ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ پہچانے جائیں۔ صاحب کمال کو ایک عجیب استغناء ہوتا ہے۔ دنیا کا ذرا سا کمال کسی کو حاصل ہوجاتا ہے تو کسی کی طرف التفات نہیں کرتا۔ یہ لوگ تو وہ کمال رکھتے ہیں کہ اس کی ماہیت بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ قصداً اظہار تو کہاں ان کو تو غیرت آتی ہے کہ کسی پر اظہار ہو کیمیاگر کبھی اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے ٹھگ البتہ کمالات دکھاتے پھرا کرتے ہیں۔ پھر دیکھ لیجئے کہ یہ کمالات شعبدے ہی ہوتے ہیں۔ جس کے اندر کچھ ہے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور جو دکھاتا پھرتا ہے اس میں کچھ ہے نہیں۔ اُن لوگوں کو تو کبھی اپنے آپ سے بھی غیرت آجاتی ہے قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

۲۲ یعنی مجھکو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرۂ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی ان کی باتیں نہ سننے دوں"

میری آنکھ آپ کی طرف دیکھے، میرا کان آپ کی بات سُنے۔ یہ لوگ امتثالِ امر میں لگے ہوتے ہیں کوئی اُن کو پہچانے یا نہ پہچانے کچھ پروا نہیں، نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ اپنی طرف سے کبھی اظہار کا تصور نہیں کرتے ہاں اللہ میاں کبھی ظاہر کردیتے ہیں۔ اس وقت یاد رکھنے کی بات ہے کہ اخفاء بے ادبی ہے کیونکہ اطاعت تعمیلِ حکم اور رضا ہے۔ جس طرح رکھیں بندہ کو اسی طرح رہنا چاہئے۔ جب کہیں خاموش رہو خاموش ہوجائے اور جب کہیں کھل جا تو بلا تامل کھُل جائے۔ یہ کھُل جانا بھی طاعت ہے۔ اس وقت اخفاء اتباعِ نفس ہے اس وقت اس کو اظہار میں وہی لذت ہوگی جو پہلے اخفاء میں تھی۔

بغیر حکم اظہار اخفاء میں بے ادبی

ع ؎ غالباً وعظ کے وقت مصرعہ اولیٰ دوبارہ پڑھا گیا ہو اس لئے دوبارہ لکھا گیا ہے۔ ۱۲

غرض صاحب کمال اپنے قصد کو کبھی دخل نہیں دیتا، نہ اخفا میں نہ اظہار میں بس فنا ہوتا ہے تعمیلِ حکم میں، اور جو کوئی بالقصد اپنے آپ کو ظاہر کرتا پھرتا ہے وہ ابتک فنا ہی نہیں ہوا۔ جب صاحب کمال سرتاپا محو ہوا امتثال امر میں تو اس کو اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی کہ میں ظاہر ہوں یا نہ ہوں، بلکہ معمولی سی حالت ہوتی ہے اگر طلب کا حکم نہ ہوتا تو طلب بھی نہ کرتا مگر حکم ہے اس لئے بغرض اس کی تعمیل کے طلب کرتا ہے، مبتدی بھی طلب کرتا ہے اور منتہی بھی۔ طلب میں دونوں شریک ہیں اور کسی بات سے حالت ظاہر نہیں ہوتی۔ پھر فرق کیا جائے تو کس طرح۔ مولانا فرماتے ہیں

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

یعنی ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا، پس کلام کو تاہ کرنا چاہئے۔

مبتدی اور منتہی میں فرق بڑا مشکل ہے۔

۲۳ بالجملہ طالبوں کی تین قسمیں ہوئیں، اور جنت مطلوب بہرحال ٹھہری اور اس کی طلب مامور بہ اور فرض ہے۔ اب وہ مقدمہ بھی یاد ہوگا کہ ذریعہ کا اکتساب ضروری ہوا۔ جنت جب ہر شخص کی مطلوب ہے تو اس کے ذرائع کی طلب بھی ہر ایک کے ذمہ ہے ورنہ وہی بوالہوسی ہوگی۔ اس ذریعہ اور طریق کو فرماتے ہیں وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (اور جو شخص دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور اس نے نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا) سبحان اللہ کَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ (بادشاہوں کا کلام کلام کا بادشاہ ہوتا ہے)۔ جنت اتنی بڑی چیز اس کی طلب کا خلاصہ فرما دیا تاکہ طالبوں کو آسانی ہو، اتنے بڑے مطلوب کے لئے جس قدر ذرائع اور طرق ہوتے کم تھے۔ مگر حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایک ایسی بات بتادی جیسے گُر ہوتا ہے۔ گُر اس لئے ہوا کرتا ہے کہ کثیر التعداد افراد کو جن کو بالاستقلال ایک ایک کو یاد رکھنا دشوار

ہو اس کے ذریعہ سے یاد رکھیں۔ جیسے کوئی خادم کو محفل کے دروازے پر بٹھادے
اس غرض سے کہ غیر آدمیوں کو اندر نہ آنے دے تو اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے
کہ زید، عمرو، بکر، خالد وغیرہ ایک سو نام اس کو بتادیتے جائیں کہ ان میں سے
جو کوئی آئے اس کو منع کرے۔ اس میں کسی قدر دقت خادم کو پیش آئیگی،
کہ ایک فہرست بنائے گا جس میں یہ سب نام درج ہوں اور ہر آنیوالے
سے نام پوچھکر اوپر سے نیچے تک ساری فہرست میں تلاش کرے گا کہ یہ
نام اسمائے مندرجہ فہرست میں سے ہے یا نہیں۔ ہر بار ساری فہرست دیکھنی
پڑے گی۔ نیز کسی قدر دقت آنے والوں کو ہوگی کہ ہر شخص کو اتنی دیر ٹھہرنا
پڑے گا کہ جب تک وہ تمام فہرست کو دیکھے۔ سہولت اس میں ہے کہ مختصر
سی بات بتادی جائے کہ جس کو تو پہچانتا ہے اس کو نہ آنے دینا۔ اس سے نہ
فہرست کی ضرورت رہے گی نہ کچھ اور دقت پیش آئے گی۔ اسی کو گر کہتے ہیں
۲۴ جنت کے حصول کے لئے بہت سے طریق ہیں جن کا فرداً فرداً یاد رکھنا نہایت
دشوار تھا اس لئے حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایک ایسا امر بتادیا کہ جب اس کی
رعایت رکھی جاوے تو جو فعل بھی کیا جائے گا وہ وہی ہوگا کہ اس کو کچھ نہ کچھ
دخل ہے جنت میں۔ اللہ میاں کے کلام کی قدر اسی کو آتی ہے جو طالب
ہے۔ جب کسی کے جدت پیش نظر ہو تو انتہا درجہ کا شوق پیدا ہوگا۔ اور
جب بتایا جاوے کہ اس کے طلب کے فلاں فلاں طریق ہیں (اور چونکہ
جنت بڑی چیز ہے اس کے طرق بھی کثیر ہی ہوں گے) ان کی کثرت کو دیکھکر
یہ شخص گھبرا اُٹھے گا مگر چونکہ شوق انتہا درجہ کا پیدا ہوچکا ہے اس لئے یہ تو
ہوگا نہیں کہ چھوڑ بیٹھے بلکہ ایک حالت سخت اضطراب کی پیدا ہوگی۔ اس
شخص کے سامنے اگر کوئی قاعدہ کلیہ پڑھ دیا جائے جو جامع ہو تمام طرق کو
تو ہر کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ اس کی کیا حالت ہوگی، وجد کی سی کیفیت
ہو جائے گی۔ اس کو قدر آئے گی کہ کلام باری تعالیٰ کیا چیز ہے۔ اس گر کو

جنت کی طلب

فرماتے ہیں وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی (اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو اس نے حرام خواہش سے روکا) اس میں دو کام فرماتے ہیں جو تمام طرق کو جامع ہیں۔ ایک اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف دوسرا وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی (اور نفس کو اس نے حرام خواہش سے روکا) الف لام عوض مضاف الیہ ہے اَیْ عَنْ ھَوَاھَا (اس کی خواہشوں سے) نفس کو اس کی خواہشوں سے روکنا، یہ دونوں عمل جملہ طرق حصولِ جنّت کو جامع ہیں، ہرچند کہ یہ دونوں عمل افراد بہت سے رکھتے ہیں اور تفصیل کرتے وقت افراد میں کچھ کمی نہ ہوگی مگر اس اختصار کی منفعت یہ ہے کہ جب یہ دونوں مضمون ذہن نشین ہوجائیں تو ہر فردِ عمل میں اس کی رعایت رکھنے سے نیک و بد میں تمیز سہولت سے ہو جائے گی۔ گو میں یہی ہوا کرتا ہے کہ افراد کم نہیں ہوجاتے صرف طریقِ شناخت میں اختصار و سہولت ہوجاتی ہے۔ دیکھئے کتنی سہولت ہوگی
۲۵ جب آدمی کے دل میں خوف ہوگا کہ مجھے ہر ہر عمل میں حق سبحانہٗ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا تو ہر کام کو تامل کے ساتھ کرے گا اور خیال رکھے گا کہ یہ کام کہیں خلافِ مرضی باری تعالیٰ نہ ہو، اس سے ایک بصیرت پیدا ہوجائے گی کہ ہر بُرے عمل کو پہچان لے گا اور اس سے بچ جائے گا اور جو سمجھ میں نہ آوے گا اس خوف کی وجہ سے اس کو علماء سے پوچھے گا۔ اس طرح سے کوئی فردِ معصیت اس کی نظر سے نہ چھوٹ سکے گا۔ ورنہ جنّت جیسی بڑی چیز کے لئے کثرت سے ذرائع ہونے چاہئیں، ظاہر ہے ان کا ابتداءً ذہن میں منضبط کرنا امکان سے بھی باہر معلوم ہوتا ہے۔

آپ نے جان لیا کہ طرقِ طلبِ جنّت کا حاصل دو امر ہیں۔ اب یا تو ایک دونوں میں سے اصل ہے اور دوسرا معین۔ یا دونوں اصل ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے اپنے مذاق سے کہ اصل نَھَی النَّفْسَ (نفس کو روکنا) ہے اور خوف اس کے لئے معین ہے۔ میں یہ اپنے دل سے نہیں کہتا ہوں بلکہ اس

حدیث ہے کہ نَسْأَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ دعا مانگتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کہ "اے اللہ ہم مانگتے ہیں خوف میں سے اس قدر کہ حائل ہو جاویں آپ اس سے ہم میں اور معصیت میں" تعلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ خشیت معصیت سے بچنے کے لئے مطلوب ہے بالذات مقصود نہیں، ورنہ نَسْأَلُكَ خَشْيَتَكَ (ہم آپ سے آپ کا خوف مانگتے ہیں) مطلقاً فرماتے۔ کسی چیز کی حد معترز کرنے سے صاف یہی بات مفہوم ہوا کرتی ہے کہ اس سے زیادہ مطلوب نہیں۔ خوف کی حد فرمادی کہ اس قدر چاہتے ہیں کہ معصیت سے مانع ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو جائے تو محمود نہیں۔ خوف مع الرجاء (امید کے ساتھ خوف) یہی ہے۔ اگر خوف ہی خوف ہو کہ رجاء نہ رہے اور ناامیدی تک نوبت پہنچ جائے تو یہ کفر ہے۔ اس سے معصیت چھوٹتی نہیں، بلکہ آدمی یہ سمجھ کر کہ طاعت سے کیا ہوگا زیادہ معصیت میں پڑجاتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ایک مغلوب کو تب معلوم ہوا کہ شریعت میں جو توسط ہے اس میں یہ مصلحت ہے یہ ایک وکیل صاحب تھے، نماز روزہ کے خوب پابند تھے، خوف غالب ہوا تو عجیب حالت ہوئی پریشان ہوگئے۔ ایسی حالت تھی کہ زبان سے بات ٹھیک نہیں ادا ہوتی تھی قریب تھا کہ نماز بھی چھوڑ دیں، اور یہ سب کچھ ہوا تھا ایک کتاب کو دیکھکر۔ ازدیاد خوف کی حد ۲۶

کتابوں کو بطور خود دیکھنے میں یہ خرابی ہے۔ لوگ کہتے ہیں استادوں کے نخرے کون اٹھائے، عبارت اردو ہوتی ہی ہے اس کے سمجھنے میں کیا دقت ہے، کیوں کہ اردو ہماری زبان مادری ہے۔ اگر یہی بات ہے تو ہر شخص جس فن کا چاہے بلا استاد پورا عالم بن سکتا ہے۔ کتابیں ہر فن کی موجود ہیں حالانکہ مشاہدہ اور تجربہ اس کے خلاف ہے "جائے استاذ خالی است" (استاد کی جگہ خالی ہے)، وجہ یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کتاب میں ایک جگہ نہیں لکھی جاسکتیں ہر بات علیحدہ علیحدہ لکھی جاتی ہے۔ ابواب و فصول کتب کا مطالعہ بطور خود مضر ہے

اسی لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور اگر ایک جگہ متفرق باتیں لکھدی جائیں، تو کتاب کی ترتیب میں فرق آجائے اور ڈھونڈھنے والوں کو بڑی دقت پیش آئے، کوئی خاص مضمون کہاں تلاش کریں، مثلاً نماز، روزہ و زکوٰۃ کے مسائل کتب فقہ میں بلا تفصیل ابواب کَیْفَمَا اتَّفَقَ (جیسا اتفاق ہوا) جمع کردیئے جائیں تو کس قدر دقت ہوجائے کہ ایک ذرا سے مسئلہ کی وجہ سے ساری کتاب پر نظر ڈالنی پڑے۔ جملہ علوم و فنون میں یہی حالت ہے کہ کتاب میں متفرق مضامین ایک جگہ نہیں لکھے جا سکتے تو بطور خود کتاب دیکھنے والے کو اگر کوئی شبہ واقع ہو تو اگرچہ حل اس کا کتاب میں کہیں مذکور ہو مگر چونکہ اسکو اطلاع نہیں ہے کہ وہ حل کہاں مذکور ہے اس لئے دل میں وہ اشکال جم جاتا ہے۔ اور بسا اوقات یہ خیال ہوجاتا ہے کہ کتاب میں غلط لکھا ہے، مصنف خود نہیں سمجھا۔ حالانکہ کتاب میں غلطی نہیں ہے سمجھ کا قصور ہے، جو شبہ ذہن میں آیا ہے وہ کسی دوسری بحث کے مناسب کتاب کے اس باب میں اس کا حل ہوگا۔ اور پڑھانے والا تمام کتاب پر حاوی ہوتا ہوتا ہے۔ متعلم کے شبہ کرنے سے یا از خود تنبیہاً ہر موقع پر اس کی ضرورت کو بتاتا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیئے اور فنون کی کتابوں سے زیادہ تصوف میں خاصکر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بلا استاد کبھی مطالعہ نہ کرے۔ دیگر فنون میں تو یہ ہے بہت سے بطور خود دیکھنے سے وہ فن نہ آئے گا اور تصوف میں خطرہ ہے کہ آدمی ہلاکت میں پڑ جائے اور ایمان جاتا ہے ؎

گر روی صد سال در راہ طلب ۔۔۔ راہبر نبود چہ حاصل زاں تعب

"اگر راہِ طلب میں سو سال بلا رہبر کامل کے چلے گا تو تعب مشقت کے سوا تجھ کو کچھ حاصل نہ ہوگا"

گر ہوائے ایں سفر داری دلا ۔۔۔ دامنِ رہبر بگیر و پس برآ

اے دل اگر اس ہجرت کے سفر طے کرنے کی خواہش رکھتا ہو تو کسی رہبر کامل کا دامن مضبوط پکڑ کے چلا آ۔

درارادت باش صادق اے فرید　　تا بیابی گنجِ عرفاں را کلید

اے فرید حسنِ عقیدت اور ارادت کا دامن کبھی نہ چھوڑ تاکہ تجھ کو گنجِ معرفت کی کنجی حاصل ہو جائے۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق　　عمر بگذشت و نہ شد آگاہِ عشق

بلا مرشد کے طریقِ عشق میں جس نے قدم رکھا، اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا۔

ان وکیل صاحب نے احیاء العلوم کی کتاب الخوف کو دیکھا تھا اور ایک مقام کو ناتمام سمجھے اس سے ایسا خوف دل میں بیٹھا کہ بات نہ کر سکتے تھے اور نیند اُڑ گئی مگر یہ خیریت تھی کہ آپ ہی آپ کوئی رائے قائم نہیں کی جیسا کہ آجکل عادت ہے کہ بزرگوں کے اقوال کتابوں میں دیکھکر کسی واقف کار سے اُن کے سمجھنے کی کوشش تو کرتے نہیں اپنی طبیعت سے جو چاہتے ہیں حکم لگا دیتے ہیں، حتیٰ کہ ان بزرگوں سے بدعقیدہ ہو جاتے ہیں اور واہی و تباہی کلمات بکنے لگتے ہیں، یا اس کے موافق غلط عقیدہ رکھکر خراب ہوتے
۲۸ ہیں۔ میرے پاس آئے کہ کچھ امید نہیں، کچھ ہی کرے کہ جنت ملے گی تمام عمر کوشش کرے اور دنیا کو تلخ کر دے مگر کتاب کا لکھا ہوا اگر سچ ہے تو خاتمہ ذرا میں بگڑ سکتا ہے۔

جس وقت میرے پاس کتاب لے کر آئے تو یہ حالت تھی کہ ہاتھ کانپتے تھے زبان لڑکھڑاتی تھی کتاب کی عبارت نہ پڑھی جاتی تھی جیسے کسیکو پھانسی کا حکم سُنا دیا جاوے۔ اس وقت یہ بات سمجھ میں آئی کہ حد سے زائد غلبۂ خوف اچھی چیز نہیں۔ میں نے اور مقام اسی کتاب کے دکھلائے، بحمد اللہ ان کے سب شبہے حل ہو گئے اور قلب کو سکون ہوا۔ کہنے لگے آپ نے مجھے بچا لیا، جانے کیا ہوتا، میری جان نہ رہتی یا ایمان جاتا۔

لکھا کتاب ہی میں سب کچھ ہے مگر دوسرے سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ لکھنے والوں نے حتی الامکان سہولت اس قدر کر دی کہ اکثر جگہ شبہات بھی حل کر دیتے ہیں لیکن پھر بھی اُستاد کی ضرورت باقی ہے۔

استتار بھی رحمت ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات کسی حقیقت کا زیادہ انکشاف بھی مضر ہوجاتا ہے جیسا اُن وکیل صاحب پر استغنارِ حق زیادہ متجلّی ہوا، اور یہ حالت ہوگئی، اسی واسطے بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ جیسے تجلّی رحمت ہو استتار بھی رحمت ہے۔ واللہ اگر تجلی تام ہوجائے تو فنائے عالم ہوجائے یا جان جاتی رہے یا ایمان جاتا رہے۔ میں نے خود دیکھا وکیل صاحب کو کہ قریب تھا کہ نماز تک چھوڑ دیں۔ وجہ کیا تھی کہ صرف غلبۂ خوف۔ اس واسطے فرماتےہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ (اپنے خوف سے اتنا جو ہمارے اور آپ کے معاصی کے درمیان حائل ہوجائے) صرف اتنا خوف چاہتے ہیں کہ معصیت کو مانع ہو اتنا نہیں چاہتے کہ ہم متحمل نہ ہوں۔ معلوم ہوا کہ خوف محمود وہی ہے جو معصیت سے روکے، اور جو خوف خود باعث معصیت ہوجائے وہ معصیت کی طرح بُرا ہے اسی
۲۹ واسطے لکھا ہے کہ بڑھاپے میں امید غالب رکھے اور جوانی میں خوف، بوڑھے آدمی سے ویسے ہی کچھ نہیں ہوسکتا اگر اور خوف غالب ہوجائے گا تو رہے سہے بھی ہاتھ پیر پھول جائیں گے، اور امید میں کچھ نہ کچھ کئے ہی جائے گا، اور جوانی میں قوت ہوتی ہے خوف کا تحمل ہوسکتا ہے جتنا خوف زیادہ ہوگا نفس کو تنبیہ ہوگی، معصیت سے اجتناب ہوگا۔ اور اعمالِ حسنہ کی کوشش کرے گا۔ ہر وقت کے واسطے تدبیر جداگانہ ہے۔ باطنِ طب بھی ظاہری طب کی طرح ہے، کبھی دوا سرد دیتے ہیں کبھی گرم کبھی تنقیہ کرنا پڑتا ہے، کبھی تقویت، اسی طرح باطنی امراض کی تدبیریں بھی مختلف ہیں۔

معلوم ہوگیا ہوگا کہ خوف معین ہے اور ترکِ خواہشات اصل۔ اب صاف ہے کہ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ (ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے) ذریعہ ہے اور مقصود نَهَى النَّفْسَ (نفس کو روکنا) ہے۔ ذریعہ اسی حد تک محمود ہوتا ہے کہ مقصود تک پہنچائے، اور اگر ذریعہ کو اس حد تک پہنچادیا جائے کہ مقصود

فوت ہونے لگے تو یہ مذموم ہے کیونکہ ذریعہ ذریعہ نہ رہا، خوف اسی قدر چاہئے کہ نفس کو تنبیہ ہو۔

پس خلاصہ طریق کا ترک ہوا ہے اور خوف اس کا معین اور یہی حاصل ہے اس گُر کا۔

اب دیکھو کہ نوکر کو یہ بتادینا کہ ناشناسا کو اندر نہ آنے دینا کہنے میں ذرا سا ہے کرنے میں بہت ہے جو کام کہ فہرست بتانے سے نکلتا وہی اس سے نکلتا ہے، بلکہ فہرست میں تو افراد محدود ہوجاتے، اگر ان کے سوا کوئی ناشناسا آنے والا ہوتا تو اس کو منع نہ کرسکتا اور اس لفظ کے بعد ایک کے منع سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا، اور کسی تعداد تک ناشناساؤں کی حد نہ رہی، اسی طرح حق سبحانہ تعالیٰ نے گُر بتادیا کہ اگر سوچ تو ولی ہوجایے، ایک فرد بھی نافرمانی کا اس سے خارج نہیں۔

دیکھئے نافرمانی ہوتی کیوں ہے، مثلاً نماز پڑھی یا تاخیر کرکے پڑھی یا بے توجہی ہوئی، حضورِ قلب کے ساتھ ادا نہ ہوئی اگر غور کیا جاے تو سبب اس کا ضرور ایسا نکلے گا کہ منجملہ افراد خواہشِ نفسانی کے ہوگا۔ فرض کیجئے کہ نماز نہ پڑھنے کا سبب یہ ہوا کہ نیند آرہی تھی عشاء کا وقت ہوا مگر آرام میں خلل گوارا نہ ہوا، سو کر صبح کردی، آرام اور تن پروری خواہشِ نفسانی ہی ہے، تاخیر بھی اکثر جب ہی ہوتی ہے کہ آدمی دوسرے کسی کام میں لگا ہوا ہو اس کام کے اوھر بیچ میں رہجانے سے نقصان مال کا اندیشہ ہوتا ہے اس نقصان کو گوارا نہ کیا، اور نماز میں تاخیر کردی، یہ حُبِّ مال ہو کہ منجملہ خواہشاتِ نفسانی کے ہے۔ اسی طرح نماز میں بے توجہی بھی جبھی ہوگی کہ جب توجہ دوسری طرف ہو توجہ کا ایک طرف نہ رہنے دینا بھی نفس ہی کا کام ہے۔ اس کی خواہش سے ہوتا ہے۔

غرض کسی نے ترک طاعت کیا یا ارتکابِ معصیت تو صرف نفسانی خواہش

سے اس کے اندر بھی کچھ آگیا، ہر چیز میں خیال رکھے کہ نفس کی خواہش ہے یا نہیں، جب اس پر کوئی محافظت کرے گا تو ممکن نہیں کہ اس سے معصیت ہو سکے۔ تھوڑے دنوں عادت ڈالنے سے اس کا نفع معلوم ہو سکتا ہے ہر کام کو کرتے وقت سوچ لیا کیجئے کہ اس میں نفس کو لذت آتی ہے یا نہیں اگر لذت آتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ ضرور ایک فرد معصیت کا ہے۔ پھر اس لذت سے مغلوب نہ ہو جائیے، اور اس کی مضرت کو پیش نظر رکھئے۔ اکثر گناہوں میں سب جانتے ہیں کہ مضرتیں ہیں مگر پھر خواہش نفسانی سے مغلوب ہو کر اس کو کرتے ہیں۔ مثلاً غیبت کرنے والا جانتا ہے کہ اگر اس شخص کو خبر پہنچ گئی تو مجھ سے لڑائی ضرور ہو گی اور بہت سے نقصان پہنچیں گے نفع تو کوئی بھی مرتب نہ ہو گا، مگر پھر کرتا ہے اور کرنے سے طبیعت کو سکون ہوتا ہے۔ جیسے کسی سے بدلہ لے لیا۔ یہ خواہش نفسانی ہی ہے جس
کے سامنے مضرت کا خوف بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ ۳۱

ایسے بھی پرہیزگار ہیں کہ خود غیبت نہیں کرتے مگر سننے میں مزہ آتا ہے۔ بہت کیا تو جب کسی نے غیبت کی، رفع الزام کے لئے کہہ دیا، میاں جانے دو اور پھر رغبت کے ساتھ سن رہے ہیں دل میں سمجھ رہے ہیں کہ میں غیبت سے محفوظ ہوں، بہت احتیاط کرتا ہوں، دوسرے کو بھی منع کر دیتا ہوں (قانونی برتاؤ اللہ میاں سے) جناب اللہ میاں کو دل کی بھی خبر ہے ؎

کار با او راست باید داشتن — رایتِ اخلاص و صدق افراشتن

(اس خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھنا چاہئے اور اخلاص وصدق کا علم بلند رکھنا چاہئے)

فقط زبانی باتوں سے کیا کام چلتا ہے۔ اگر ان کے باپ کو کوئی گالیاں دینے لگے تو کیسے لڑنے لگیں گے۔ ممانعت اس کو کہتے ہیں۔ اس وقت یہ نہ ہو گا کہ ایک دفعہ اسے منع کر دیں اور پھر بیٹھے سنتے رہیں۔ حضرت اس

منع سے برأت نہیں ہوتی ۔ غیبت میں یہ بھی شامل ہے ۔ دیکھئے کہ بعد ممانعت کے اگر وہ خاموش ہو جائے تو ان کے دل میں اشتیاق و انتظار رہتا ہے ۔ ظاہراً غیبت نہ کی سہی ظاہر بینوں کی نگاہ میں پرہیزگار بنجائیں مگر باطن میں تو مرض موجود ہے ، نفس نے جو خواہش کی تھی اس کا ظاہر تک اثر نہ آیا سہی قلب میں تو اس سے التذاذ اور اس کی طرف میلان عزم کے ساتھ موجود ہے ۔ یہی اتباعِ نفس ہے ۔ غرض سوچنے والا سمجھ سکتا ہے کہ معصیت کس حد تک ہوگی ۔ جہاں تک خواہشِ نفسانی پائی جائے ۔ یہ ایسا جامع لفظ ہے کہ کوئی فرد معصیت اس سے باہر نہیں جا سکتا ۔ جب کوئی معصیت ہوگی ، خواہشِ نفسانی سے اور برائی باوجودیکہ ظاہر ہے مگر نفس کی چال میں بڑے بڑے ہوش مند آجاتے ہیں ۔ کوئی چیز رشوت میں مثلاً ملنے لگے تو نفس ضرور بتاتا ہے کہ فلاں فلاں کام تجھے کرنے ہیں اُن کے لئے اتنے خرچ کی ضرورت
ہے ، اور ساتھ ساتھ تاویل ذہن میں آتی ہے کہ یہ شخص خوشی سے دیتا ہے ۴۲
اور تجھے ضرورت ہے ہی اس وقت لے لینا چاہئے ، پھر اللہ میاں کریم ہیں ، یہ ضرورتیں بھی رفع ہو جائیں اور پھر توبہ سے گناہ بھی نہ رہیگا ، کیسی اچھی بات ہے ۔ حضرت یہ سب تدبیریں ہیں جن سے نفس جال میں پھانستا ہے ، اور اس تاویل کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب کہ خوف دل میں ہوتا ہے ، ورنہ تاویل کی بھی کون ضرورت ہے ۔ اور اتنی دیر کب گوارا ہے گردن پکڑ کر حکم دیا کہ رقم ہرگز جانے نہ پائے بس اس کی تعمیل ہوگئی ۔ ہاں جنکو محتاط پاتا ہے ان کے لئے خواہ مخواہ کی ضرورتیں کھڑی کر دیتا ہے اور سمجھا دیتا ہے کہ ان کا پورا کرنا ہے ، حالانکہ یہ اسراف ہے ۔ مگر ضرورتیں ایسی تراش لیتے ہیں کہ اس کو اسراف بھی نہیں سمجھتے ۔ آجکل کے عقلمند اس مرض میں بہت مبتلا ہیں ۔ مجھے ایک شخص ملے اور خوش خبری سُنائی کہ لڑکا نائب تحصیلدار ہوگیا ۔ میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے ، اب ذرا صاحبزادے کو یہ

تنبیہ کیجئے کہ اسراف نہ کریں۔ کہا جناب کچھ سامان تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی آمد و رفت ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چار بھلے مانس آ کر بیٹھیں اور میز کرسی لیمپ وغیرہ گھٹیا رکھے ہوں یا مکان شاندار نہ ہو۔

یہ اسراف ہے جسے ضروری سمجھ رکھا ہے حالانکہ ضرورت دو قسم کی ہوتی ہے ایک واقعی اور ایک فرضی۔ واقعی ضرورت کی تو انتہا ہو سکتی ہے اور فرضی ضرورت کی کہیں انتہا نہیں۔ ظاہر ہے کہ فرضی میں بے انتہا گنجائش ہے۔ فرض میں محالات تک آ سکتے ہیں۔ جب فرضی ضرورت کی کوئی انتہا نہیں تو اس کے رفع کے لئے کونسی رقم کافی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں جو بھی رقم لی جائے گی متناہی ہوگی۔ پھر متناہی لامتناہی کے برابر کیسے ہو سکتی ہے۔

اسراف معصیت تو ہے ہی اور وبال اخروی تو آخرت میں ہوگا، مگر
۱ دنیا میں بھی اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے۔ کہ خاندان کے خاندان اس کی بدولت تباہ ہوگئے۔ ایک شادی بھی جس نے کی اس میں فرضی ضرورتیں پوری کیں تو نقدی اور جائداد اور مال و متاع سب اُن کے نذر کر دیا۔ اور پھر بھی پورا نہ ہوا۔ قرض لے کر بمشکل آبرو بچائی۔ پھر اس قرض سے بعد چندے آبرو بھی گئی۔ ذرا سا ختنہ ہے یا بسم اللہ ہے اور اس کے لئے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں سے آنی چاہئے خواہ رشوت لے کر ہو یا سودی قرض لے کر ہو یا گھر بیچ کر، ایسا نہ ہو کوئی رسم رہ جائے۔ یہ سب فرضی ضرورتیں ہیں، بیوی کے کان میں پانسو سے کم کا زیور نہ ہو خواہ میاں کی اوقات دو ہی پیسہ کی کیوں نہ ہو، کہیں سے پانسو لاؤ تب مُنہ دکھاؤ۔ میز کرسی، پوشاک حسب قاعدہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بڑا آدمی آئے اور چھوٹا کہہ دے۔ حضرت بڑے آدمی کو یہ بھی تو معلوم ہوگا کہ میاں کی اوقات صرف پچاس ہی روپے کی ہے پھر بڑا کیسے کہہ دے گا۔ یہ ضرورت نہیں

صرف فیشن ہے۔
لطف یہ ہے کہ علماء رسموں کو منع کرتے ہیں تو یہ لوگ اُن کے شریک
ہو جاتے ہیں اور بڑے شکر گذار ہوتے ہیں کہ صاحب یہ تو آپ بڑا کام کرتے
ہیں کہ فضولیات کو چھوڑاتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ اتنا سونا لاد لیا جائے
کان کٹ پڑیں، یہ روپیہ کسی ایسے کام میں کیوں نہ لگایا جاوے جس سے
راس المال محفوظ رہے، اور چار پیسے ملنے لگیں، تجارت کی جائے یا جائیداد
خرید لی جائے۔ شادی کی رسمیں مطلقاً چھوڑ دی جائیں، اس روپے سے لڑکی
کے لئے کوئی صورت بسر اوقات کی کیوں نہ کردی جائے۔ آتشبازی وغیرہ
سے ذرا سی دیر کا حظِ نفس نہ ہوا نہ سہی۔
غرض علماء کی تائید کرتے ہیں۔ البتہ پُرانی وضع کے لوگوں کو ضرور شاق
ہوتا ہے۔ اور ان نئے فیشن کے لوگوں کو جب ترکِ دین آسان ہوا تو رسمِ
دنیا کیا۔ یہ لوگ ساتھ دیتے ہیں اور بھولے سیدھے لوگ خوش ہوتے ہیں
کہ یہ بھی علماء کے ہمخیال ہیں بُری بات سے منع کرتے ہیں لیکن چوری انکی پکڑی
گئی کہ رسموں سے بیوی کو روکتے ہیں اصلاحِ میز و کرسی کے لئے نہ اسواسطے
کہ اسراف نہ ہو، یا روپیہ کسی منفعت کے کام میں لگے۔ بلکہ اس لئے کہ اِدھر
سے روپیہ بچے تو اپنے فیشن کو درست کریں، میز و کرسی سے کمرہ سجائیں، ہارمونیم
باجا منگائیں، کوئی نیلام سے خالی نہیں جاتا۔ بیوی پر تو تقاضا ہے کپڑا کم پہنو،
سال بھر کے لئے صرف دو جوڑے کافی ہیں، گھر میں اپنے سب طرح بسر
ہوسکتی ہے۔ بہت کرو کہیں جانے کے لئے ایک اُجلا جوڑا بنا لو، زیور جو کچھ میکہ
سے لائی ہو وہی کیا تھوڑا ہے، بہت ہوس اچھی نہیں ہوتی، سادگی کے بھی
خلاف ہے۔ ایک صاحب نے بیوی سے کہا ہم کماتے کماتے مرے جاتے ہیں
اور تمھیں ذرا خیال نہیں جتنا آتا ہے سب خرچ ہو جاتا ہے ایک پیسہ نہیں
بچتا، خرچ میں کمی نہیں کرتی بیوی نے کہا میرے یہاں کوئی بازار کی چاٹ

نہیں آتی، کوئی چیز ضرورت سے زائد میں نہیں منگاتی، کسی کو ایک پیسہ تمہاری بلا اجازت میں نہیں دیتی، جو کچھ خرچ ہے تمہارا ہی ہے۔ میں کس چیز میں زیادہ خرچ کرتی ہوں، اور کونسے خرچ میں کمی ہوسکتی ہے۔ کہا نہیں تم نے خرچ بڑھا ہی رکھا ہے۔ اگر ماما نہ رکھو تو اس کی تنخواہ اور خوراک بچے یا نہیں ہم ایک چکی خرید دیں خود پیس لیا کرو اور روز کی پسنہاریوں کی دقت نہ ہو اور پسائی کے دام بچیں۔ اس میں تمہارا ایک اور بھی نفع ہے کہ تندرستی اچھی رہے گی، ریاضت کرنا آدمی کے لئے بہت ضروری اور مفید ہے۔ گھر کی لیپ پوت بھی خود کرلیا کرو۔ ذرا ذرا سے کاموں کے لئے مزدور ڈھونڈنے پڑتے ہیں، ان سب ترکیبوں سے ایک کافی رقم بچ سکتی ہے، تھوڑا ہی تھوڑا کرکے بہت ہوجاتا ہے مگر جب تمہیں خیال ہو۔

غرض بیوی کو سب مدوں میں تخفیف کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں۔ وہی بیچاری گلا گھونٹنے کے لئے ہے ہر طرح بسر کرسکتی ہے مگر تمہاری کسی مد میں ذرہ بھر کمی نہ ہو۔ کمرہ میں معمولی لیمپ سے کام نہ چلے برقی لیمپ ہونا ضروری اور وہ بھی بقدر ضرورت نہیں بلکہ دس پانچ رکھے ہیں، نازک چیز ہے، شاید کوئی ٹوٹ جائے تو دوسرا موجود رہے۔ اور ان میں بھی آج ایک نئی ایجاد ہوجائے تو پہلے خریدے ہوئے سب ردی ہیں اب نئے طرز کے خریدنے چاہئیں۔ وعلیٰ ہذا۔

بیوی کے لئے تو زیور بھی اسراف ہے اور آپ کے لئے کوئی چیز بھی اسراف نہیں۔ بیوی کا اسراف ایک طرح کا ہے پرانے فیشن کا اور میاں کا اسراف دوسری طرح کا ہے نئے فیشن کا۔ دونوں کو چھوڑو وَتَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيعًا (میں نے لات وعزیٰ سب کو چھوڑ دیا) یہ سب فضولیات ہیں جنکو نفس ضروری بتاکر طلب کرتا ہے، ان کی تکمیل خواہش نفس کی تعمیل ہے جس میں بڑے بڑے عقلمند گرفتار ہیں۔ معلوم نہیں عقل کس طرح روا رکھتی ہے کہ

اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھ میں دیدیا جائے جس کی دشمنی دنیا میں بھی ظاہر ہو چکی، اسراف کے نتائج آپ نے دیکھ لئے ہیں۔ مسلمان کا کام تو یہ تھا کہ ہر کام میں پوچھتا کہ حق تعالیٰ کا کیا حکم ہے بجائے اس کے ہر کام میں شیطان اور نفس سے پوچھا جاتا ہے کہ سرکار کا کیا حکم ہے اور جو اس نے کہدیا بے دھڑک کر ڈالا، خواہ اللہ کے خلاف ہو یا رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کے مسلمانوں! کیا جواب ہوگا اگر پوچھا جائے گا اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

"پوچھیں گے اے بنی آدم کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا دشمن ہے، میری عبادت کرنا، یہ سیدھا راستہ ہے، اور دیکھ چکے تھے کہ بہتوں کو اس نے گمراہ کر دیا تھا، کیا تمہیں عقل نہ تھی، اب یہ جہنم موجود ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔" ۴

میں کہتا ہوں اگر صرف پوچھا ہی جائے اور دوزخ نہ بھی ہو تو یہ کیا تھوڑا ہے کہ کہا جائے، کیوں صاحب ہمارا عہد یاد ہے، ہم سے تعلق قطع کر کے باوجودیکہ ہم ہر وقت مہربان تھے، اس سے جوڑا جو ہر وقت دشمن تھا۔ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ خجالت اٹھانی پڑے۔ دنیا میں تو قاعدہ مسلّمہ ہے کہ بھلائی کا بدلہ بھلائی۔ مگر اللہ میاں کے ساتھ معاملہ برعکس کیا جاتا ہے۔ جس قدر اُس طرف سے احسانات زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر اِس طرف سے کفرانِ نعمت ہوتا ہے۔ جس قدر اُدھر سے ساتھ دیا جاتا ہے اسی قدر اِدھر سے قطع کیا جاتا ہے۔ اور بمقابلہ محسن کے دشمن کی پیروی ہوتی ہے۔ دشمن نے جس چیز کا حکم کر دیا اس کو کہا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت ہے

اور اللہ میاں نے جس کا حکم کیا وہ قدرت سے باہر ہے۔ اور ترقی سے روکنے والا ہے۔ حضرت یہ چیزیں جن کو نفس ضروری ثابت کرتا ہے ان میں انہماک سے حق تعالیٰ سے بُعد بڑھتا ہے۔ اور غفلت پیدا ہوتی ہے سہ

عاقبت سازد ترا از دیں بری ⁂ ایں تن آرائی وایں تن پروری

"تیری تن آرائی اور تن پروری آخرکار تجھ کو دین سے دور کردے گی"

با ہواؤ آرزو کم باش دوست ⁂ چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

"یعنی آرزو اور ہوائے نفسانی کا پیرو مت بن چونکہ اس کی یہ حالت ہے کہ تجھکو اللہ تعالیٰ کے راستے سے بہکا دیتی ہے"

تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست ⁂ چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

"جب تک تو خواہش کے تابع ہے تیرا ایمان تازہ نہیں ہے مانند ہوا کے سوائے قفل کے اس کا دروازہ نہیں ہے"

۵ دیکھو ایک جگہ کیا شکایت فرماتے ہیں اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ "اس شخص کو بھی دیکھا تم نے جس نے اپنا معبود خواہش نفسانی کو بنایا" ہم کو چھوڑ کر ہمارے دشمن کی اطاعت اختیار کی۔ تعجب ہے کہ اللہ میاں نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا، احکام کی مصلحتیں بتائیں اور سمجھایا اور خاک نہ سُنا۔ اور نفس نے اندر سے ایک شرہ چھوڑ دیا کہ اِفْعَلْ کَذَا "ایسا کر" بس ایسی بیعت کی ہے کہ کوئی ضرورت نہیں دل کی اور کچھ حاجت نہیں مصلحت دریافت کرنے کی جو حکم ہوا فوراً تعمیل۔ اللہ میاں کے احکام میں کبھی ہر ہر بات کی علت ڈھونڈھی جاتی ہے اور اس کی مصلحت پوچھی جاتی ہے۔ حالانکہ شرائع میں علل اور مصالح ضرور ہیں مگر ہر شخص کی عقل نارسا کی رسائی تو وہاں تک نہیں پھر ہم کو علت نکالنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب دلیل صحیح سے ثابت ہوگیا عمل کر لیا۔ کبھی اس میں گنجائش نکالی جاتی ہے کہ کیوں صاحب اس کے خلاف کرنے میں کچھ اسلام سے تو خروج نہیں ہوتا

بس جب اسلام سے خروج نہیں ہوتا اور نفس کا حکم خلاف پرہے ہی جس کو ضرورت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے پھر کیوں نہ کیا جائے۔ یہ حالت بھی ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام کا کسی قدر پاس ہے اور دعویٰ ہے کہ ہم شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتے۔ (خلاف شریعت شاید منحصر فرد واحد ہے۔ یعنی وہ عمل جس میں خروج عن الاسلام (اسلام سے خارج ہونا ہی لازم آجائے)۔ اور جو لوگ کہ پورے آزاد ہیں اُن کو تو دلیل غیر دلیل سے بحث ہی نہیں، ان کے نزدیک گویا خود احکام کا خلاصہ ہوائے نفس ہی ہے۔ اللہ میاں کے احکام کوئی چیز ہی نہیں۔

جو لوگ اسلام کا پاس رکھتے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیوں صاحب جس قدر حکمتیں اللہ میاں کے احکام میں ہوتی ہیں اگر نفس کے حکم میں ہوتیں تو کیا حرج تھا۔ اتنی حجت تو کیا اگر نفس سے خواہش کے وقت صرف اتنا ہی پوچھ لیا کریں کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ جس کی وجہ سے اختیار کیا جائے، اور پھر مصلحت میں غور کرلیا کریں کہ واقعی ہے یا فرضی، تب بھی تو بہت سی برائیوں سے حفاظت ہو جائے۔

مگر کہاں اس کے ہاتھ میں تو ایسی باگ دی ہے کہ جب وہ کہے چل چلنا پڑتا ہے اور جب کہے ٹھیر، ٹھیرنا پڑتا ہے۔ نفس اگر خندق میں گرائے تو خندق ہی میں گرنا پسند ہے اور اگر آسمان پر چڑھائے تو آسمان پر چڑھنا قبول ہے اللہ میاں نے ایک حکم کیا کہ اس میں مصلحت تھی اس کو نہ کیا۔ اور نفس نے ایک خواہش کی جس میں سراسر مضرت تھی اس کو کر ڈالا،

ایک تاجر سے کوئی تو کا مال پچیس اوپر تنو کو خریدتا تھا مگر نہ دیا اور دیا کہاں جہاں چھبیس اور کم ملے۔ نہ معلوم اوّل خریدار سے اس کو اتنی منافرت کیوں ہے اس کو اتنا خیال کہ پچیس زیادہ دیتا ہے گویا وہ اپنا نقصان کرتا ہے کہ تجارت میں کچھ اس کے چند پڑ رہے اور ان کو ایسی ضد کہ اپنا مال

شریعت کی حکم میں ہمیشہ مصالح ہیں اور نفس کی خواہش میں مضرت

معصیت کے دنیاوی ضرر

پھینکیں گے اور خسارہ ہی دیں گے مگر تمھاری مخالفت کو ہاتھ سے نہ جانے دینگے افسوس۔

خواہشِ نفسانی وہ بُری چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی صدہا معصیتیں ہیں کہ ان میں دنیاوی نقصان ہیں۔ معصیت میں دنیا کی بھی مضرتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اللہ میاں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں آدمی اسباب کو جمع کرتا ہے مگر وہ اسباب، مُؤَدِّی اِلَی السَّبَب (سبب کی طرف پہنچانے والے) بہت کم ہوتے ہیں۔ ہر کام میں پریشان رہتا ہے۔ بعض آدمی ذرائع کم رکھتے ہیں اور کام زیادہ نکلتا ہے۔ اس کے برعکس اس کو ذرائع زیادہ رکھنے پڑتے ہیں اور کام اتنا بھی نہیں ہوتا۔ اور ایک یہ کہ رزق میں تنگی ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے ہم پر تو تنگی نہیں۔ میں کہتا ہوں رزق سے مقصود کیا ہے اطمینان یہ معصیت کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا، اطمینان فراغ قلب کا نام ہے ناجائز طریق سے کتنا ہی مال حاصل کر لیجئے۔ مگر جو نشاط اور بے فکری قلب کو 7
تھوڑے حلال کے مال سے ہوتی ہے وہ ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔

یہ ایسی بات ہے کہ تجربہ ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ وجدانی سی بات ہے

شعر؎ پرسید یکے کہ عاشقی چیست ٭ گفتیم کہ چو ما شوی بدانی

"ایک شخص نے پوچھا عاشق کس کو کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ جب ہماری طرح ہوگا تو تجھ کو معلوم ہوگا کہ عاشقی کیا ہے"

عنین محض کو کتنا ہی سمجھاؤ کہ عورت کی یہ لذت ہوتی ہے مگر وہ ہرگز نہ سمجھے گا اور اُلٹا تمھیں کو بیوقوف بنائے گا۔ اگر اس کو سمجھانے کی کوئی تدبیر ہے تو بس یہ کہ اس کا علاج کرو، جب قوتِ رجلیّت پیدا ہو جائے گی آپ بیوقوفی اور عقلمندی کو سمجھ لے گا، معصیت کو چھوڑ کر طاعت اختیار کرو دیکھو قلب میں کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ آشکارا ہو جائے گا کہ اطمینان یہ چیز ہے۔

اس پر دلیل فلسفی بھی ہے وہ یہ کہ معصیت کرنے والا غیر اللہ کا طالب ہے اور اس تک پہنچ جانا اور اس کو پالینا ضروری نہیں، اور مطیع طالب ہے اللہ میاں کا اور وہ ہر وقت اس کے پاس ہیں۔ ادھر سے ذرا سی کوشش چاہئے اُدھر سے خود کرم فرماتے ہیں۔ غیر اللہ کی طلب پر چونکہ نتیجہ کا ترتّب ضروری نہیں اس لئے کامیابی نہیں ہوتی۔ اور دل کو فراغ حاصل نہیں ہوتا اور اللہ میاں کی طلب پر نتیجہ مترتب ہو جاتا ہے، اس لئے قلب کو راحت ملتی ہے۔ اسی کا نام اطمینان اور فراغ ہے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ اس کی لذت وہی جانتا ہے جو پاتا ہے ؎

سالہا تو سنگ بودی دل خراش ۞ آزموں را یک زمانے خاک باش

برسوں تو تم دلخراش پتھر (متکبر) بنے رہے آزمائش اور امتحان ہی کی نظر سے کچھ دن خاک بنکر دیکھ لو ۔

سالہا تو سنگ بودی دل خراش ۞ آزموں را یک زمانے خاک باش

ارے غافل، پتھر تو برسوں رہا ہے امتحان کے لئے ذرا دیر خاک ہو کر بھی دیکھ جو کبھی نام بھی لے پتھر ہونے کا۔ خاک ہونا وہ چیز ہے کہ خاک ہو کر پتھر ہونا کسی نے قبول نہیں کیا۔ اور پتھر بہتیرے خاک ہو گئے۔

طاعت وہ چیز ہے کہ جب تک کسی نے کی نہیں تبھی تک وہ علیحدہ ہے جہاں تھوڑی سی بھی کی پھر طاعت خود اس کو نہیں چھوڑتی۔ وہ چھوڑنا چاہتا ہے مگر یہ اُڑ اُڑ کر لپٹتی ہے۔ کر کے دیکھو، امتحاناً ہی سہی۔ میں کہتا ہوں امتحان کرنے سے تو اثر کیا بھولے سے بھی طاعت اگر ہو گئی تو اثر ضرور کرے گی۔ کپڑا بھولے سے رنگ میں گر جائے تو گو وہ بات نہ آئے گی کہ اگر کوئی قصداً رنگتا، مگر دھبے تو ضرور پڑ ہی جائیں گے۔ تجربہ ہوا ہے لوگوں کو کہ دھوکہ سے اطاعت ہو گئی اور اثر ہو گیا۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک چور بادشاہ کی لڑکی پر

عہ غالباً حضرت مولانا نے وعظ کے وقت اس کو مکرر پڑھا ہوگا اس لئے مکرر لکھ دیا گیا ۱۲ محمد انعام اللہ عفی عنہ

عاشق تھا ایک روز کہیں چوری کے ارادہ سے بادشاہ کے یہاں پہنچ گیا۔ وہاں بادشاہ اور بیگم میں اسی لڑکی کی شادی کی نسبت گفتگو تھی۔ بادشاہ کہہ رہے تھے کہ میں تو اس کی شادی کسی ایسے شخص سے کروں گا کہ نہایت عابد و زاہد متقی ہو۔ یہ چور صاحب چوری تو بھول گئے اور بہت غنیمت سمجھا کہ آج خوب کام بنا وہاں آکر ایک مسجد میں جا بیٹھے۔ اور دن رات عبادت کرنا شروع کی، تہجد بھی، اشراق بھی، چاشت بھی، غرض عبادت ہی سے کام تھا۔ لوگوں میں شہرہ ہوا کہ ایک بڑے عابد صاحب تشریف لائے ہیں رفتہ رفتہ تمام شہر میں ان کی شہرت ہوگئی، اُدھر بادشاہ نے آدمی تعینات کر رکھے تھے کہ دیکھو شہر میں سب سے زیادہ عابد و پرہیزگار کون ہے۔

ان مخبروں نے خبر دی کہ ایک عابد صاحب فلاں مسجد میں قیام رکھتے ہیں، ان سے زیادہ متقی و پرہیزگار کوئی نظر نہیں آتا۔ بادشاہ نے خاص
۹ وزیر کو ان کے پاس پیغام لے کر بھیجا اور یہاں کام ہو چکا تھا۔ انھوں نے التفات بھی نہ کیا۔ خیر وزیر نے نہایت ادب سے پیغام شاہی سنایا؛ انھوں نے کہا دراصل نیت تو میری فاسد تھی اسی غرض سے عبادت شروع کی تھی مگر حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا، اب مجھے نہ آپ کی لڑکی کی ضرورت ہے، نہ آپ کے جاہ و حشم کی بس تشریف لیجائیے اور میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔

طاعت ایسی ہی چیز ہے کہ بعض اوقات گو اس میں غرض صالح نہ ہو مگر انجام کار اسی سے درستی ہو جاتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ بہت لوگ اغراض فاسدہ سے اسلام قبول کرتے ہیں لیکن آخر کو وہی اسلام کامل ہو جاتا ہے ایسوں کے اسلام کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ بعض لوگ غافل نادان کہتے ہیں کہ ان بھکاریوں کو مسلمان نہ کرنا چاہئے۔ ان لوگوں نے پیشہ کر لیا ہے انکے مسلمان کرنے کا نتیجہ ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ مسلمانوں سے روپیہ ٹھگتے

پھریں، کوئی کہتا ہے میرے ذمہ اتنا قرضہ تھا مسلمان لوگ مل کر ادا کریں۔ کوئی کہتا ہے مجھے روزہ نماز سیکھنے کے لئے فلاں فلاں کتاب کی ضرورت ہے، مسلمان لے دیں۔ اس میں اسلام کی بدنامی ہے کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔ مجھ سے ایک صاحب یہی فرماتے تھے میں نے ان کو جواب دیا کہ اگر ایسی بدنامی کی وجہ سے اخراج عن الاسلام (اسلام سے خارج کرنا) کریں تو آپ میں بھی ایسے عیوب ہیں جن سے اسلام بدنام ہوتا ہے۔ اُن کی وجہ سے آپ کو اسلام سے کیوں نہ نکال دیں۔ نیا مسلمان تو جنید بغدادی ہی ہو اور موروثی شیطان بھی ہو تو پروا نہیں۔

میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ بعض اوقات مسلمان کسی طمع سے ہوتا ہے، مال کی طمع ہو یا اور کسی چیز کی مگر اسلام وہ چیز ہے کہ خود دل میں جگہ کر لیتا ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَاَبَى الْعِلْمُ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ لِلّٰهِ (میں نے علم سیکھا تو تھا غیر اللہ کے لئے مگر علم نے خود نہ مانا اور اللہ ہی کا ہو کر رہا) آگ جلاؤ اور یہ قصد نہ کرو کہ لکڑی جلے۔ تھوڑی دیر میں لکڑی راکھ ہو جائے گی۔ آگ میں یہ اثر کہ لکڑی میں خود گھس جاتی ہے، آپ کے قصد پر موقوف نہیں۔ کسی بزرگ سے کسی نے کہا دیکھئے صاحب فلاں آدمی دکھلاوے کا ذکر کیا کرتا ہے۔ کہا، تو دکھلاوے کا بھی نہیں کرتا وہ دکھلاوے کا کرتا ہے مگر کرتا تو ہے۔ کبھی نہ کبھی ذکر اس کے دل میں جگہ کر ہی لے گا اور تجھے کیا امید ہے۔

ہمارے حضرتؒ فرماتے تھے عبادت اوّل ریا ہوتی ہے چند روز میں عادت ہو جاتی ہے۔ پھر عبادت اور اخلاص۔ یہ بات بالکل صحیح ہے، دیکھ لیجئے کہ بچپن میں آدمی نماز پڑھتا ہے اس وقت کیا حالت ہوتی ہے۔ پھر سن شعور میں اور کیفیت ہوتی ہے اور بڑی عمر میں کچھ اور ہی بات پیدا ہو جاتی ہے، بچپن میں استاد یا والدین کے خوف سے پڑھی جاتی ہے۔

اگر کسی وقت ان کی نگرانی نہیں ہوتی تو ٹال بھی دی جاتی ہے یا بے وضو ہی اُڑا دیتے ہیں، یہ ریاء ہی ہے۔ پھر پڑھتے پڑھتے سن شعور میں پہنچکر طبیعت مانوس ہو جاتی ہے۔ اور جیسا کہ اور امور ضروری کا تقاضا ہوتا ہے ایسا ہی نماز کا ہونے لگتا ہے۔ تا وقتیکہ ادا نہ کر لی جائے، طبیعت پر بار رہتا ہے۔ اگر نفس کبھی ٹالنا چاہتا ہے تو زائد سے زائد تاخیر کی نوبت آتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ قضا کر دیں۔ یہ مرتبہ عادت کا ہے۔ اس کے بعد تو بحمد اللہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بلا نماز چین ہی نہیں پڑتا۔ یہ مرتبہ اخلاص کا ہے۔

غرض عبادت ابتداءً کسی کیفیت کے ساتھ ہو مگر کبھی نہ کبھی خود دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے۔ اس کا تجربہ مدرسہ میں رہ کر اچھی طرح ہوا۔ بہت سے طلبہ کو دیکھا کہ اوّل ان کی نیت اچھی نہیں ہوتی، مگر فارغ ہوتے ہی مخلص بنجاتے ہیں۔ بالکل حالت پلٹ جاتی ہے۔ وجہ یہی ہے ١١
کہ اوّل اگرچہ نیت ٹھیک نہ تھی مگر شروع ایسی چیز کو کیا ہے کہ وہ خود ٹھیک کر لیتی ہے۔ یہی بات ہے کہ اس کو جو لوگ نہیں جانتے ہیں وہ طالب علموں کی ابتدائی حالت دیکھکر طرح طرح کے اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ بالکل مہمل ہوتے ہیں، دنیا سے تو ناآشنا ہیں ہی دین میں کیا کمال پیدا کیا۔ میں کہتا ہوں ابھی ان کی حالت کیا دیکھتے ہو، پڑھتے رہو انہی میں مقتدا لوگ ہوں گے اور انہی میں غزالیِ وقت بھی ہوں گے۔ طالب علموں سے اگر ذرا سا قصور ہو جاوے تو تمام شہر میں سن لیجئے، اسلامی مدرسہ والوں نے یوں کیا، کس قدر مغائرت اس لفظ سے ٹپکتی ہے۔ آپ کو ان سے تعلق رکھنا چاہئے یا قطع کرنا۔ یہ تمھارے دین کے حامل ہیں ان سے قطع کرنا کس سے قطع کرنا ہے، آپ کو ان سے تعلق ہی رکھنا چاہئے۔ اگر آپ کا بچہ بازار میں کسی سے لڑ آئے اور یہ بھی آپکو

معلوم ہو جائے کہ سراسر زیادتی اسی کی تھی تو آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ اگر لڑائی کے وقت آپ پہنچ جائیں گے تو لڑکے کی زیادتی اور عدم زیادتی کی طرف تو خیال بھی نہ ہوگا اس وقت تو اسی کی حفاظت کریں گے اور جس طرح ممکن ہوگا اس کی بات نیچی نہ ہونے دیں گے۔ پھر اس غصہ کے فرو ہونے کے بعد علیحدگی میں بچہ کو فہمائش کریں گے۔ کہ آئندہ ایسی زیادتی نہ کرنا (یہ بھی جب ہے کہ آپ بہت ہی حق پسند ہوں ورنہ باطل ہی کی پیروی ہوگی اور اس کو کچھ علامت وغیرہ نہ ہوگی)، اور اگر کوئی غیر آدمی پوچھے گا کہ میاں کیا بات تھی تو یا تو اپنے بچہ کیسی کہیں گے اور اگر بالکل ہی صریح خطا ہوگی تو کہدیں گے کچھ نہیں بازار میں ایک آدمی سے کچھ جھگڑا ہو گیا تھا، لڑکا تیز مزاج ہے دبتا کسی سے ہے نہیں بات بڑھ گئی۔

اپنے بچہ کے عیب کو کیوں مشہور نہ کیا۔ اس کا عیب عیب نہیں ہے
۱۲ وجہ یہ ہے کہ اس سے آپ کو طبعی تعلق ہے، اس کی بدنامی آپ کی بدنامی ہے، بچہ سے طبیعت کے حکم سے تعلق ہے۔ طالب علم سے حق تعالیٰ کے حکم سے تعلق رکھا ہوتا اس کے قصور کو بھی اپنے بچہ کے قصور کی طرح دبایا ہوتا۔ بچہ کی بدنامی میں اپنی بدنامی سمجھی تھی۔ طالب علم کی بدنامی میں اپنے دین کی بدنامی سمجھی ہوتی۔

بعض لوگ کہدیتے ہیں کہ اگر ان کے قصور نہ پکڑے جائیں تو ان کو تنبیہ کیونکر ہو۔ میں کہتا ہوں اپنی طبیعت ہی سے انصاف کر لو کہ جس طرح اپنے بچہ کو تنبیہ کرتے ہو اسی طرح طالب علم کو کرتے ہو یا نہیں! فرض کر لو کہ تمہارا بچہ اس قدر شریر ہو کہ باوجود فہمائش کے بھی نہ مانے اور بدتر سے بدتر حرکتیں کرے جس سے خاندان بھر پر دھبہ آجائے، ننگ و ناموس کو بٹہ لگ جائے تب آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں؟ کیا اس سے بالکل قطع کر دیتے ہیں قطع نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی قطع بھی کرے تو دل پر وہ صدمہ رہتا ہے کہ

موت سے بدتر ہے۔ باوجود قطع کے تمام عمر یہی چاہتے ہیں کہ کاش یہ احمق اپنی حرکتیں چھوڑ دے۔ خود سمجھانے سے جب اثر نہیں ہوتا تو جن کا وہ لحاظ کرتا ہے اُن سے فہمائش کرائی جاتی ہے۔ طالب علم کے کسی بڑے جرم پر تو کیا ایک چھوٹے سے قصور پر بھی میں پوچھتا ہوں کہ اسی طرح مشفقانہ تنبیہ ہوتی ہے یا اجنبیانہ۔ اگر اسی طرح مشفقانہ تنبیہ آپ کرتے ہیں تو الحمد للہ وہو المقصود (یہی مقصود ہے) اور اگر ایسا نہیں ہے تو میں پھر کہتا ہوں کہ ان سے آپ نے قطع کیوں کیا، کیا وہ آپ کے دین کے محافظ نہیں ہیں؟ یا آپ کے ذمہ دین کی حفاظت نہیں ہے؟ ان کے ایک قصور پر آپ سب کو بدنام کیوں کرتے ہیں۔ کیا آپ کے سب بچے ایک ہی سے صالح ہوتے ہیں! یا بچپن ہی سے آپ کے بچے تمیزدار ہوتے ہیں! ان میں بھی اگر ایک کم سمجھ ہے تو بڑے بڑے سمجھدار بھی تو ہیں، آج اگر یہ کم استعداد ہیں تو کل امام وقت اور غزالیِ
وقت بھی تو انہی میں سے ہوں گے۔ ابتدائی حالت دیکھ کر اُن پر اعتراض ۱۳
مت کرو۔ ہر طاعت کی ابتدائی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ طاعت ہونی چاہئے خواہ کسی طرح ہو پھر طاعت آدمی کو خود درست کرلیتی ہے۔ اور طاعت ایسی چیز ہے کہ اس میں دنیاوی اور دینی دونوں نفعے ہیں۔ رزق میں کشائش ہوتی ہے اگرچہ آدمی چنداں مالدار نہ ہو مگر طاعت کے ساتھ عجیب طرح کا اطمینان اور فراغ قلب میں ہوتا ہے اور برعکس اس کے معصیت سے رزق میں تنگی ہوتی ہے اور اطمینان ہر کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی مضرتیں ہیں جو معصیت پر متفرع ہیں مضرات اور یہ تو لازمی۔

غرض فرمانبرداری سے ہمیشہ مسرت ہوتی اور معصیت سے مضرت، اور یہ گو لازمی مضرتیں ہیں۔ اکثر مضرتیں متعدی ہو جاتی ہیں۔ جیسے غیبت کہ جب ایک آدمی کسی کی غیبت کرے گا تو دوسرے کو خبر پہنچے گی۔ پھر وہ کیوں رد کرے گا

بلکہ اس سے زیادہ کرے گا۔ اس سے دونوں میں عداوت پیدا ہوگی۔ پھر عداوت وہ چیز ہے کہ جب دو میں پڑجاتی ہے تو دونوں کا نماز روزہ سب عداوت ہوجاتی ہے، اٹھنے میں بیٹھنے میں سونے میں، ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کو نقصان پہنچے، نیت نماز کی باندھ رکھی ہے، اور دل میں دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچی جارہی ہیں۔ یہ کیا نماز ہوئی۔ شغلِ قلب ہوا اور کاہے سے حرام چیز سے، منہ میں روزہ ہے اور زبان دوسرے کی غیبت میں آلودہ ہے، دل میں خوش ہیں کہ روزہ ہے یہ خبر نہیں کہ روزہ میں ان چیزوں کو تو چھوڑا جو فی نفسہٖ حلال تھیں۔ یعنی کھانا پینا اور جو چیز ہمیشہ حرام ہے اس کو نہ چھوڑا تو کیا روزہ ہوا۔

غرض یہ عداوت اسی غیبت کی بدولت ہوئی، اور عداوت وہ چیز ہے کہ قلب کو ایک ہی طرف کا کرلیتی ہے، اور صرف ایک کام کا رہ جاتا ہے، اور مضرت رسانی آپ جانتے ہیں کہ چھوٹا سا لفظ کس قدر شر کو جامع ہے۔ تفصیل ۱۴
کی ضرورت نہیں، اظہر من الشمس (سورج سے زیادہ ظاہر) ہے۔ یہ اتحاد کی ضد ہے۔ جتنی خیر دنیاوی و دینی اتحاد میں ہے اتنا ہی شر بمقابلہ اس کے اس میں ہے۔ یہ سب کاہے سے ہوا صرف ذرا سی غیبت سے۔ یہ معصیت کی متعدی مضرت کی مثال ہوئی۔ یہ بھی خواہشِ نفسانی کا ایک فرد ہے۔ اور خواہشِ نفسانی کی ایک خرابی سنئے، میرا اور آپ کا جائداد پر مقدمہ ہے۔ ہر شخص کی خواہش ہوگی کہ مجھ کو ہی پورا مل جاوے۔ بس لڑائی ہوگئی۔ اگر دونوں یہ کہتے کہ ہمیں کچھ نہیں چاہئے تو طول کاہے کو کھنچتا۔ مقدمہ بازی کی نوبت کیوں آتی، اور باہمی نفاق اور عداوتیں کیوں پیدا ہوتیں،

چنانچہ حدیث شریف میں ایک قصہ ہے (امم سابقہ میں بھی بڑے بڑے اچھے لوگ ہوئے ہیں) ایک شخص نے دوسرے کے ہاتھ ایک مکان بیچا، مشتری نے جب دخل لیا تو اس میں ایک گھڑا سونے کا بھرا ہوا پایا۔ وہ گھڑا لے کر

بائع کے پاس آیا کہ تم اپنا گھڑا لے لو، تمھارے مکان میں سے نکلا ہے۔ اس نے کہا میں تو مکان کی قیمت لے چکا میرا اس میں کیا ہے، اس نے کہا میں نے تو قیمت مکان کی دی ہے اس پر عقد ٹھیرا ہے یہ گھڑا عقد میں شامل نہیں میں کیسے لیلوں" ایمانداری اسے کہتے ہیں۔ اگر آجکل گھڑا نکل آئے تو مزہ آجائے۔

کانپور میں دو آدمیوں نے کہیں سُن لیا تھا کہ شب برات میں جو دعاء مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے، شب برات کو دونوں ایک مٹی کا بڑا ڈھیلا لے کر بیٹھے، اور اس پر ایک رومال ڈھانک دیا۔ اور دعاء مانگنی شروع کی، کہ یا اللہ یہ مٹی سونا ہوجائے، جب تمام رات جاگے اور اسی دعاء میں رہے، جوں جوں صبح قریب ہوتی تھی اشتیاق بڑہتا جاتا تھا کہ اب یہ سونے کا ہوجائے گا۔ بشکل صبح پکڑی اور جلدی سے اس کو کھولا۔ دیکھیں تو وہی مٹی، ساری آرزوئیں خاک ہوگئیں اور دل مرگیا کہ شب قدر بھی خالی گئی جسپر بڑا اعتماد تھا، طرح طرح کے شیطانی خیال دل میں آئے کہ دعاء کو ویسے بھی ۱۵
سُنا کرتے تھے کہ قبول ہوتی ہے، اور آج تو شب قدر تھی۔ اسی تردد میں بیٹھے تھے، خیریت ہوئی کہ بندۂ خدا ایک درزی پہنچ گیا، یہ کچھ اہل علم کی صحبت پائے ہوئے تھا، اس نے پوچھا کیسے سُست ہو، انھوں نے سارا قصہ بیان کیا، کہا بھائی شکر کرو، اسی میں کچھ حکمت ہوگی۔ ایک ذرا سی بات تو مجھے معلوم ہوتی ہے کہ اللہ میاں تمھارے بدخواہ نہیں ہیں۔ تم نے تو یہ سمجھا کہ مٹی کے سونا بننے میں تمھارا نفع ہے مگر تھا نقصان۔ ابھی جب صبح کو تم نے ڈھیلہ کو کھولا، اگر وہ سونے کا نکلتا تو تم دونوں میں لڑائی تو ابھی ہوتی، پھر جانے کہاں تک طول کھینچتا، ممکن ہے کہ ڈھیلا کسی تیسرے کا ہوجاتا اور تم دونوں میں لڑائی مفت میں بندہ جاتی" آدمی سمجھدار تھا، دونوں کی تسکین ہوگئی۔ موہوم سونے کے لئے تو اتنی محنت کی، کہیں سونے کا گھڑا نظر پڑجائے تو جانے کیا ہو۔ اس کو دیکھئے کہ گھڑا مالک مکان کو دینے

آیا اور مالک کو دیکھئے کہ لینے سے انکار ہے۔
وہ لوگ ایسے تھے۔ صحابہ کا ایک قصہ کتاب میں آتا ہے کہ ایک غزوے میں بہت سے آدمی شہید ہوئے۔ چند آدمی نزع کی حالت میں تھے، موت کے وقت تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے۔ ایک شخص نے آواز دی کہ کوئی میرے حلق میں ذراسا پانی ڈالدے تو بڑا کام کرے۔ ایک بندۂ خدا کاسہ میں پانی لیکر پہنچے، اور چاہتے تھے کہ ان کے منہ میں ڈالیں کہ اتنے میں ایک طرف اور آواز آئی کہ ذراسا پانی کوئی پلاتا انھوں نے پڑے پڑے کہا کہ پہلے ان کو پلاؤ پھر مجھے پلانا، یہ شخص پیالہ لے کر اُن کے پاس پہنچے، پلانا ہی چاہتے تھے کہ اسی طرح اور ایک آواز آئی، غرض مقتل میں چھ سات جگہ اسی طرح پانی لئے پھرے، اور سب یہی کہتے رہے کہ پہلے میرے بھائی کو پلاؤ۔ اخیر میں جنکے پاس پہنچے ان کو پلانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ دم آخر ہوگیا۔ یہ شخص واپس ہوئے اور پہلوں کے پاس پانی لائے۔ جس کو دیکھا دم آخر ہوچکا ہے ایک نے بھی پانی نہ پیا۔ اور پیالہ بھرا ہوا لے کر چلے آئے۔ ۱۶

ایثار اس کو کہتے ہیں، پانی وہ چیز ہے کہ سفرِحج میں دیکھا ہے کہ باپ بیٹے کو پیاس کے وقت میں چھوڑدیتا ہے۔ موت کے وقت کی پیاس کا کیا حال ہوگا۔ غرض ہم میں جو بجائے ایثار کے کشاکشی اور نزاع وجدال ہے اسکی وجہ ہی اتباعِ ہوا ہے۔ یہی باہم اتفاق نہیں ہونے دیتا۔ آجکل سب نے یاد کرلیا ہے اتفاق اتفاق، یہ خبر نہیں کہ اتفاق کاہے سے ہوتا ہے۔ اتفاق ہوتا ہے خواہشِ نفسانی کو روکنے سے۔ دو شخصوں میں جب جھگڑا ہوگا کسی ایسی ہی چیز پر ہوگا کہ ہر ایک ان میں سے اس کی خواہش رکھتا ہوگا۔ اگر وہ دونوں اپنی خواہش کو روک لیں اور اس چیز کی طلب چھوڑدیں تو پھر جھگڑا کیسا اور نا اتفاقی کہاں، اتفاق اتفاق کہتے رہے اور نفس کو روکتے نہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔

غرض جملہ شروں کی اگر جڑ ہے تو خواہش نفسانی ہی ہے۔ خواہش نفسانی ہی روکنے کی چیز ہے۔ دیکھئے اگر روکا نہ جائے نفس کو تو کیا انجام ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو سب ہی نے سمجھا حتیٰ کہ حکام میں سے ان لوگوں نے جن کو مذہب سے علاقہ بھی نہیں حاکم کیا کرتا ہے، بعض افعال سے روکتا ہے اور بعض کی اجازت دیتا ہے۔ جن افعال سے روکتا ہے وہ وہی تو ہیں جنکو لوگ کرنا چاہتے ہیں، مگر اس کے نزدیک باعث مضرت نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ دنیاوی مصلحت کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر حاکم ان افعال سے نہ روکے تو دیکھئے کیا ہو، ڈاکوؤں کو ڈاکہ ڈالنے دے، چوروں کو چوری کرنے دے زبردستوں پر زبردستوں کو ظلم کرنے دے۔ غرض ہر شخص کو مخلّٰی بالطبع کر دے کہ اپنی خواہش کے موافق جو چاہو کرو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حالت میں کس لطف سے زندگی بسر ہوگی۔

١٧ قانون کیا ہے ملک کے افعال کی ایک حد قائم کرنے والی چیز ہے۔ یا کچھ اور جو کوئی حد سے گزرے اس کو جزا و سزا ہوتی ہے جب اس گزرنے میں کچھ برائی سمجھی گئی ہے تب ہی تو اس پر جزا و سزا ہے۔ سب کو مخلّٰی بالطبع کیوں نہ چھوڑ دیا فرض کیجئے کسی کو روپے کی ضرورت ہے یا ضرورت نہیں بھی ہے یوں ہی کسی سے چھیننے کو جی چاہتا ہے۔ تو اس کو کیوں منع کرتے۔ اور اگر چھین لے تو چالان کیوں ہوتا ہے وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے ضرورت ہے یا میرے جی کو کیوں مارتے ہو خواہش پوری کرنے دو، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اجازت دینے میں کوئی ایسی مضرت ہے، کہ اس کے مقابلہ میں ضرورت کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔

دنیاوی انتظاموں کو بھی دیکھ کر یہ بات صاف نکلتی ہے کہ خواہش نفسانی روکنے ہی کی چیز ہے۔ اگر خواہش نفسانی روکنے کی چیز نہیں ہے تو اپنے گھر میں بی بی کو کیوں روکتے ہو، اس کو تو طرح طرح سے سمجھاتے ہو، زیادہ زیور فضول ہی پوشاک میں زیادہ تکلف سے کیا فائدہ، مگر اپنے نفس کو نہیں روکتے۔ اگر آزادی ہی

پسند ہے تو بی بی کو بھی آزادی دو جس طرح چاہے خرچ کرے۔ اور اگر آزادی میں نقصان ہے تو جس طرح بی بی کو بے فائدہ کاموں سے روکتے ہو اپنے نفس کو بھی پابند کرو، مگر دونوں کے آزاد ہونے کو تو کوئی پسند نہ کرے گا تو لامحالہ دوسری ہی شق رہ گئی کہ دونوں پابند ہوں۔ پابندی وہ چیز ہے کہ کسی کو اس سے چارہ نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جو عقلمند ہیں بالاختیار کرتے ہیں اور کم عقل بجبر اور قہر پابند بنائے جاتے ہیں، آپ نفس کو بالکل آزاد کسی طرح نہیں کر سکتے، اگر قانونِ خداوندی سے آزاد کر دیا اور اللہ میاں نے دنیا میں کچھ نہ کہا تو قانونِ دنیاوی پابند بنانے کے لئے موجود ہے۔ اور دست بدست سزا تیار ہے بہت سی خواہشیں ہیں کہ قانون کی وجہ سے چھوڑ دینی پڑتی ہیں۔ کیونکہ ان پر عمل کرنے سے سزا ہوتی ہے۔

اے مسلمانو! قانون کی وجہ سے تم نے خواہشِ نفسانی کو چھوڑ دیا اور

۸ اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم سے نہیں چھوڑتے، کیا غضب کی بات ہے۔ اگر قانوناً ممانعت ہو جائے تو ایک بھی حیلہ باقی نہ رہے۔ اور اللہ میاں اگر کسی کام کی ممانعت کریں تو اس میں حیلے نکالے جائیں، اور ایسی ایسی تاویلیں کی جائیں کہ تاویل کے مرتبہ سے نکل کر تحریف تک پہنچ جائیں۔ اور اگر بالکل ہی صریح حکم ہو تو اس کا مقابلہ ضرورت سے کیا جاتا ہے۔ کہ حکم تو یہی تھا مگر اب ضرورت ہے۔ قانون کے مقابلہ میں یہ ضرورتیں کہاں چلی جاتی ہیں۔ افسوس محبتِ الٰہی مصلحتِ دنیوی کے برابر بھی نہ ہوئی ؎

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود ٭ گوئے گشتن بہرِ او اولےٰ بود

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود ٭ گوئے گشتن بہرِ او اولےٰ بود

مولیٰ کا عشق لیلےٰ کے عشق سے کب کم ہو، اس کے لئے کوچہ گردی زیادہ بہتر ہے؟

یہ مردار عورت اگر کہے رات بھر کھڑے رہو تو کر گذریں گے اور اللہ میاں

حـ تنبیہ واعظ صاحب نے اس کو مکرر پڑھا ہوگا جامع وعظ نے بھی مکرر لکھا ہے ۱۲

کے حکم سے عشاء کی نماز بھی بھاری ہے۔

ایک شخص کا قصہ ہے (یہ ایک بزرگ ہیں، پہلے حالت ایسی ہی تھی بعدہٗ بڑے شخص ہوئے ہیں) ایک عورت سے تعشق تھا بڑی تمناؤں کے بعد ایکدن کہیں شام کو بات کرنے کا موقع مل گیا اور صورت یہ تھی کہ کھڑکی کے نیچے بات کرنے کھڑے ہوتے تھے ایسے محو ہوئے کہ تمام رات اسی طرح گذر گئی، عشاء کی نماز بھی فوت ہوئی، جب مؤذن نے اذان دی تو حضرت کیا کہتے ہیں بھلے مانس تجھے بھی آج ہی عشاء کی اذان سویرے کہنی رہ گئی تھی۔ کسی نے کہا جناب خبر بھی ہے صبح ہوگئی، صبح کی اذان ہے۔ منہ پھیر کر دیکھا تو واقعی صبح ہے۔ دل پر اثر ہوا بہت روئے، ایک عورت کے خیال میں حق سبحانہٗ تعالیٰ کا فرض قضا ہوا، ایک بزرگ کے ہاتھ پر توبہ کی اور اس خیال کو چھوڑا۔ پھر صاحب کمال ہوئے اور سبھی کچھ ہوا۔

۱۹ ایک عورت کی محبت میں یہ حالت ہوتی ہے، غور کریں تو آجکل احکام الٰہی کی اتنی بھی تو قدر نہیں جتنی کہ ایک کسبی کے احکام کی، احکامِ الٰہی خواہ کیسے ہی سہل ہوں اور سراسر مفید اور حکمت ہی حکمت ہوں، مگر شاق ہوتے ہیں۔ اگر کسبی انہی احکام کو کہے جو اللہ میاں نے فرمایا تو کچھ تکلیف نہ رہے بلکہ اگر کبھی ان احکام کو بھی کہے جو اللہ میاں کے خلاف ہیں تب بھی کچھ شاق نہ ہوں۔ معلوم ہوا کہ احکام فی نفسہٖ شاق نہیں صرف محبت کی کسر ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ تھی کہ اللہ میاں کے سامنے کَالْقَلَمِ فِیْ یَدِ الْکَاتِبِ (کاتب کے ہاتھ میں قلم کی طرح) ہوتا اور غیر کے سامنے لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا انصاف کی بات ہے کہ اللہ میاں کی طرف سے بندہ پر کس قدر انعام و افضال ہر وقت ہوتے ہیں اور غیر اللہ کی طرف سے خاک بھی نہیں ملتا، پھر اپنے منعم کے سامنے نرم ہونا چاہیے، یا آپ جیسے عاجز بلکہ دشمن کے سامنے، ظاہر ہے کہ منعم ہی کے سامنے ہونا چاہیے۔

چونکہ بر میخت بہ بندو بستہ باش ۔ چوں کشاید چابک و برجستہ باش
ہمچو کلکم درمیانِ اصبعین ۔ نیستم در صفِ طاعت بین بین

"جب باندھ دیں تو بندھ جاؤ جب کھولدیں تو چست و چالاک ہو جاؤ۔ میں قلم کی طرح دو انگلیوں میں ہوں، صفِ طاعت میں بین بین نہیں ہوں"

مسلمان کو اللہ میاں کے سامنے ایسا ہونا چاہئے جیسے کاتب کی انگلیوں میں قلم، کہ اسکو کچھ عذر نہیں، کاتب کو اختیار ہے جس طرف چاہے چلائے اور چلائے یا نہ چلائے۔ کیا غضب ہے کہ اللہ میاں کے ہاتھ میں تو ایسے نہ ہوں اور ہوں کس کے ہاتھ میں نفس کے۔ بُت پرستی کو منع کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہر شخص کی بغل میں بُت ہے۔ ظاہری بت پرست پر تو طرح طرح کے طعن کیے جاتے ہیں اور ان کو احمق بتایا جاتا ہے، اور اپنے آپ باطنی بُت پرستی میں مبتلا ہیں اور عقلمندی کا دعویٰ ہے۔ کسی نے ایک بُت کو پوجا کسی نے دوسرے کو۔ کیا
۲۰ فرق ہے لات کو پوجنے والے میں اور عزیٰ کو پوجنے والے میں۔ جہاں ظاہری بُت پرستی چھوڑی ہے باطنی بھی چھوڑو، اپنی باگ نفس کے ہاتھ میں مت دو۔ حق تعالیٰ اپنے منعمِ حقیقی کے تصرف میں ہمہ تن اپنے آپ کو دیدو۔ احکامِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دو، اتباع تو وہی ہے کہ آدمی اپنے ارادے کو چھوڑ دے اور دوسرے کے ارادے کے تابع ہو جائے۔ دیکھ لیجئے قانون کے سامنے کیا حال ہوتا ہے کہ اپنی خواہش چھوڑنی پڑتی ہے۔ اور حاکم کے حکم کو ماننا پڑتا ہے۔

اب لوگوں نے حق سبحانہٗ تعالیٰ کے حکم کا اتباع تو بالکل چھوڑ ہی دیا، اوروں ہی کا اتباع اختیار کر لیا، اور اتباع کرنے کی دو چیزیں تھیں، عقائد اور اعمال۔ اعمال میں تو یہ گنجائش نکالی گئی ہے کہ ہم مجبور ہیں اور یہ احکام مصلحتِ وقت کے موافق نہیں، مگر اب عقائد میں بھی خواہش نفسانی کو ترجیح ہونے لگی ہے اعمال کو پہلے ضروری تو سمجھتے تھے مگر تکلیف سمجھ کر ان کے ادا میں قصور کرتے تھے، اب ان کی ضرورت ہی ذہن سے اُڑ گئی، ادائے اعمال کو تو چھوڑا

تکلیف کی وجہ سے مگر اُن کے وجوب کے عقیدہ میں کیا تکلیف تھی، ہاں اس میں بھی ایک تکلیف تھی، وہ یہ کہ نفس نے دیکھا اگرچہ میں نے اداتے اعمال سے روکدیا مگر تاوقتیکہ ان کے وجوب کا عقیدہ اس کے ذہن میں ہے ممکن ہے کہ پھر کبھی ادا پر مستعد ہوجائے۔ اس وقت پھر مجھے کوئی تدبیر اس کے روکنے کی کرنی پڑے گی۔ اور احتمال ہے کہ روکنے سے نہ رُکے۔ اس لئے اس احتمال کے قطع کرنے اور اپنی بار بار کی تکلیف بچانے کے لئے نفس نے یہ تدبیر نکالی کہ سرے سے اُن کے وجوب کا عقیدہ ہی اڑادینا چاہئے۔ عقائد اعمال کے لئے بمنزلہ جڑ کے ہیں۔ جڑ کاٹ دینے سے احتمال ہی نہیں رہتا کہ شاخیں پھر ہری ہوں گی۔ عقائد کے بدلنے سے نفس بہت سی تکلیفوں سے بچ گیا۔

ایک صاحب فرمانے لگے کہ دین میں جو کچھ حارج ہے وہ نماز ہے۔ غیر مذہب کے بہت سے آدمی اس وقت اسلام میں آنے کو تیار ہیں مگر یہ خیال مانع
۲۱ ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد نماز پڑھنی ہوگی۔ پانچ وقت کی پابندی سر پڑیگی۔ مولوی لوگ نماز کی قید اٹھادیں تو آج ہی دیکھئے کتنے کافر مسلمان بنتے ہیں، اور مسلمانوں کی جماعت کتنی بڑھ جاتی ہے۔ (نماز ایسی مولویوں کی ہے کہ معاف کردیں)

ایک صاحب کہتے ہیں سود کی ممانعت سے افلاس آگیا اور قومیں سود ہی کے ذریعہ سے ترقی کرتی جاتی ہیں؛

غرض جو جسکی سمجھ میں آتا ہے احکام الٰہی میں اصلاح دینے کو تیار ہے، گویا اللہ میاں کو یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہم سے رائے لیکر کیوں احکام مقرر نہ کئے تھے، کثرتِ رائے پر کیوں فیصلہ نہ کیا۔

ہم لوگوں کا کیا حال ہے، عقائد میں یہ حال، اعمال میں یہ حال۔ صورت میں آزادی، آمدنی میں حلال حرام کی خبر نہیں، زمینداروں نے طرح طرح کے ناجائز ابواب باندھ رکھے ہیں۔ بیع وشراء میں عقد کے صحت و بطلان کی پرواہ نہیں۔ آم کی بہار بکتی ہے حالانکہ آم کا وجود بھی نہیں ہوتا یہ بیع باطل ہے۔

بیع باطل میں مال مشتری کی ملک نہیں ہوتا۔ اس کا رد واجب ہے یکے بعد دیگرے جہاں تک سلسلہ چلا جائے کسی کی ملک نہ ہوگا۔ گناہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

غرض معاملات کی صفائی کی طرف اصلاً خیال نہیں۔ زبان غیبت میں اور طعن میں مبتلا، قلب حرص میں اور طمع میں گرفتار۔ اونٹ سے کسی نے پوچھا اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، کہا کوئی بھی نہیں۔ ایسی ہی ہم لوگوں کی حالت ہے، ظاہر کی طرف دیکھئے وہ ٹھیک نہیں باطن کی طرف نظر کیجئے وہ درست نہیں، حالانکہ حق تعالیٰ نے صرف احکام ہی نہیں نازل کئے، بلکہ ایک اتنا بڑا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) بھیج کر یہ بھی بتا دیا کہ اس نمونے کے ہو کر آؤ، تعلیم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی شے کی پیمائش زبانی بتا دی جائے اور کہہ دیا جائے کہ اتنی لانبی، اتنی چوڑی، اتنی موٹی بنا کر لاؤ۔

اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کا ناپ تول بتانے کے ساتھ بنا ہوا نمونہ
۲۲ بھی دکھا دیا جائے کہ آخری صورت ایسی پیدا ہونی چاہئے یہ نہایت ابلغ ہے خوشنویس لکھنے والوں کو بتاتا ہے کہ الف تین قط کا لکھو، اور اوپر کی نوک ایسی ہو اور نیچے کی ایسی، مگر یہ بتانا کافی نہیں۔ لکھنے والوں کو ہرگز الف بنانا نہیں آسکتا تاوقتیکہ استاد اس کی صورت بھی اپنے ہاتھ سے کھینچ کر نہ دکھادے اگر ہاتھ سے لکھ کر دکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو استاد کے نخرے اٹھانے کی کیا ضرورت رہتی، کتابوں میں سب حرفوں کی پیمائش لکھی ہے اسی کو پڑھکر خوشنویس بنجاتے۔ حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

سو احکام تو ظاہر و باطن کی تحدید کا نام ہے جس سے ظاہر و باطن کی ایک خاص صورت پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح کہ تین قط سے الف کے طول کی حد قائم ہو اور نصف قط یا کم و بیش سے اس کے عرض کی انتہا مقرر ہو کر ایک خاص صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن تھا کہ اللہ میاں صرف احکام نازل فرمادیتے جو ظاہر و باطن کی ناپ تول ہیں، اور یہ فرمادیتے کہ یہ ناپ تول ہیں، ان کو پورا پورا

درست کرو یہاں تک کہ وہ صورت پیدا ہوجائے جو ہماری مرضی کے موافق ہو اس وقت معلوم ہوتا کہ ہم لوگ کس قدر حرج میں پڑ جاتے اور کیسی کیسی دقتیں پیش آتیں تمام عمر احکام کی پابندی کرتے اور پھر اطمینان نہ ہوتا کہ وہ صورت پیدا ہوگئی جو حق تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے۔ مگر نہیں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، احکام بھی نازل فرمائے اور محض اپنی رحمت سے نمونہ بھی دکھادیا کہ اصلاً تردد نہ رہے کہ احکام کی پوری پوری تعمیل ہوگئی یا نہیں، اپنی صورت کو نمونے سے ملاکر دیکھ لو ذرا سا بھی فرق ہو تو معلوم ہو جائے گا کسی حکم کی تعمیل میں کسر رہی۔

مگر اس رحمت کی کیا قدر ہوئی ہم کس قدر نمونہ کے موافق بنکر آئے اگر درزی کو اچکن سینے کو دو اور وہ ساری اچکن بہت ٹھیک اور خوب صورت بدن کے موافق سیئے، کہیں جھول تک نہ رہے، سلائی کہیں ٹیڑھی نہ ہو غرض سب طرح ٹھیک ہو صرف ایک آستین کو چار انگل چھوٹا کر لائے تو کیا آپ اس کو لے لیں گے؟ اور کیا یہ بات اس کی سن لیں گے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے آستین بھی دو ہیں صرف ایک آستین چار انگل کم رہ گئی ہے تو کیا ڈر ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس اچکن کو آپ اس کے سر سے ماریں گے۔ اور اگر اس نے قصداً ایسا کیا ہے تو قیمت واپس لینے پر بھی اکتفا نہ ہوگا کچھ جرمانہ بھی لیا جائے گا۔ حالانکہ نمونہ سے صرف چار انگل مخالفت ہے۔ ۲۴

یہاں نمونہ سے چار انگل بھی مطابقت نہیں۔ اللہ میاں کا حکم تھا کہ نمونہ کے مطابق ہو اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کریں گے) مَاۤ اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ (جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ)۔

افسوس مسلمانوں نے ہر بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کیا، جو وضع بتائی اس کے خلاف وضع تراشی، نکاح نیا تراشا، اخلاق نئے اختیار کئے، اب عقائد میں بھی تراش خراش ہونے لگی، اور

پھر لطف یہ ہے کہ دعویٰ ہے اتباع کا، معلوم نہیں کہ اتباع کس چیز کا نام ہے اگر کوئی ایسے لوگوں کو دیکھے تو کیا کہہ سکتا ہے کہ یہ قوم اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ میں ہے، گروہ میں ہونے کے لئے کسی بات میں بھی مطابقت نہیں، بلکہ جان جان کے مخالفت کی جاتی ہے، اس گروہ میں ہونا تو کہاں اب تو اس گروہ کے لوگوں سے ملنا بھی نہیں چاہتے، کیوں کہ اس گروہ میں ترقی نہیں ہے۔

ایک شخص نے مجھ سے لکھنؤ میں بیان کیا کہ آج کمیٹی ہوئی جس میں ان اسباب پر بحث کی گئی جو مسلمانوں کو ترقی سے روک رہے ہیں۔ بہت سے اسباب بیان کئے گئے، آخر میں یہ طے ہوا کہ مذہب مانع ہے ترقی سے۔ اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ نوبت پہنچ گئی ہے۔ اس لامتناہی ترقی ہی نے خرابی ڈالی ہے۔ کہیں اس ہوس کی انتہا بھی ہوگی، حالانکہ یہ ترقی ہرگز اطاعت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی، کیوں کہ اطاعت میں کچھ نہ کچھ پابندی ضرور کرنی پڑے گی

۲۴ اور یہ ترقی مطلق العنانی کو چاہتی ہے۔ یہ ترقی وہی حاصل کرسکتا ہے کہ نہ یہ دیکھے کہ روپیہ حق سے آیا نہ یہ دیکھے کہ ناحق سے۔ چوری سے وہ نڈر ہے۔ ظلم سے اسے خوف نہ ہو، روپیہ حاصل ہو جس طرح ہو، حالانکہ قطع نظر خلافِ دین ہونے سے ایسا مال دنیا ہی میں فلاح نہیں دیتا، بلکہ جس راہ سے آیا تھا اسی راہ جاتا ہے۔ اس میں برکت مطلق نہیں ہوتی۔ رشوت کے ہزار اور حلال کے سو برابر نہیں۔ جو غرض ہے روپیہ سے وہ حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ بیان کیا گیا۔

تو اب سوچو اپنے اوپر ایسی چیزیں کیوں لازم کرلیں جن کے لئے کوئی تعداد روپے کی کافی نہیں ہوتی۔ اور کسی مرتبہ ترقی پر بس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چیزیں لازم کس نے کیں اسی ہوائے نفس نے۔ حق سبحانہ تعالےٰ نے اسی کا علاج بتایا ہے (اب میں اس پر بیان کو ختم کرتا ہوں)۔

غرض سارا فساد خواہشِ نفسانی سے ہوا ہے، سو علاج کیا ہے کہ نفس کو خواہش سے روکو۔ مرض کا علاج یہی ہوتا ہے کہ اس کے مادہ اور سبب کو

قطع کیا جائے۔ جب سبب جاتا رہے گا مرض بھی نہ رہے گا۔

مسلمانوں نفسانی خواہشوں کو چھوڑو اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کی اطاعت کرو، کیا اللہ میاں کا کچھ حق نہیں ہے آپ لوگوں پر، دیکھئے اللہ میاں ایسے ایسے امراض کا علاج بتاتے ہیں جن کو تم اپنے آپ کسی طرح نہ سمجھ سکتے اور وہ اندر ہی اندر تمہارا کام تمام کر ڈالتے۔ تعجب ہے کہ طبِ اکبر کی قدر ہو مگر احکامِ الٰہی کی قدر نہ ہو۔ جانتے ہیں کہ طبِ اکبر کے خلاف کریں گے تو صحت محفوظ نہ رہے گی اور مرض گھیر لے گا۔

صاحبو! طبِ اکبر پر عمل نہ کرنے سے صحتِ جسمانی میں خرابی آتی ہے اور احکامِ الٰہی پر عمل نہ کرنے سے قلبی اور روحانی صحت برباد ہوتی ہے پھر جو شرف قلب اور روح کو جسم پر ہے وہی اس کی صحت کو اس کی صحت پر اور اس کے محافظ کو اس کے محافظ پر ہونا چاہئے۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ احکامِ الٰہی کی کیا عظمت ہونی چاہئے۔ اور اللہ میاں کا بتایا ہوا علاج کس قدر قابلِ قدر چیز ہے۔ وہ علاج یہی ہوائے نفس کا چھوڑنا ہے ۲۵

اس کا آسان طریق میں بتائے دیتا ہوں چند روز کرنا پڑے گا بہت ہی تھوڑے دنوں میں انشاء اللہ تعالیٰ نفع معلوم ہوگا۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ ہر کام ابتداءً تکلیف سے ہوتا ہے۔ پھر کرتے کرتے اس میں ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے، سو آپ اس کا التزام کر لیجئے کہ کوئی قول کوئی فعل معاً دل میں آتے ہی نہ کر ڈالا کیجئے کہ وہ خواہشِ نفس کے موافق ہوگا۔ بلکہ ہر کام سے پہلے ذرا سوچنا چاہئے اس کی عادت ڈالنی چاہئے کہ جو کام کیا جائے، پہلے سوچ لیا جائے کہ یہ کام حق تعالیٰ کے خلاف تو نہیں، یہ میرے لئے مفید ہے یا مضر، بیدھڑک ہو کر کام کرنے کی عادت بالکل چھوڑ دی جائے۔ اوّل اوّل یہ ذرا شاق ہوگا مگر تھوڑے دنوں میں عادت ہو جائے گی۔ اس کا ہر کام میں خیال رکھو، یہ حالت ہو جائے کہ بات منہ سے نکالنی ہے مگر رک گئے۔

کہ حق تعالیٰ کا امر کیا ہے اور نفس کی خواہش کیا جس بات میں نفس کی خواہش پائی اس کو زبان سے نہ نکالا نہ اس پر عمل کیا۔ رہی یہ بات کہ تمیز کیونکر ہو حق تعالیٰ کے امر نفس کی خواہش میں اس کے لئے علمِ دین کی ضرورت ہے تھوڑا علم ضرور چاہئے، کتاب نہیں پڑھ سکتے ہو تو پوچھ لو چند روز یہی عادت ڈالو اس سے کسیقدر آپ کے بولنے میں کمی ہوگی اور کسیقدر آپ کے کھانے میں کمی ہوگی مگر جس وقت لذت اس کی حاصل ہوگی تو آپ پھر تھوڑے کو بہت پر ترجیح دیں گے۔ تھوڑی چیز ہو اور اچھی ہو وہ بہتر ہے اس سے کہ بری ہو اور بہت ہو۔ غلیظ کتنا ہی ہو ایک چمچہ فیرنی پر اس کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔

جب طاعت میں کسی کو لذت آنے لگتی ہے تو اس معصیت کی حقارت اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے پھر معصیت کا کرنا اس سے زیادہ دشوار ہونے لگتا ہے جتنا کہ پہلے طاعت کرنا تھا (مسلمان پر طاعت کرنے میں عادی ہونے سے پہلے بھی جو بار ہوتا ہے وہ ایک کلفت ہوتی ہے کہ نیا کام کرنے میں محسوس ہوتی ہو جیسا کہ دیگر امور عادیہ کچھ تغیر ہونے سے معلوم ہونے لگا کرتی ہے ورنہ طاعت کو کر کے تو مسلمان کو ہمیشہ نشاط اور فرحت ہی ہوتی ہے) عادی ہو جانے کے بعد تو معصیت سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور اگر احیاناً معصیت ہو بھی گئی تو طبیعت مشوش رہتی ہے اور کسی طرح چین نہیں آتا تا وقتیکہ استغفار نہ کرلے (طاعت میں عجیب لذت ہے کہ آدمی لاکھ روپے پر ایک نماز کو ترجیح دیتا ہے کوئی بات تو ہے کہ اگر مسلمان سے کہیں کہ لاکھ روپے لیلے اور آج ظہر کی نماز نہ پڑھ تو روپیہ نہ لیگا اور ظہر پڑھے گا۔ ضرور کوئی ایسی چیز پاتا ہے کہ لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ حالانکہ ہماری نماز کچھ نماز نہیں، اول سے اخیر تک کوئی رکن بھی قابل اعتبار نہیں نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل اِدھر اُدھر ہے۔ زبان سے قرأت کر رہے ہیں مگر مطلق خبر نہیں کہ اللہ میاں سے کیا کہہ رہے ہیں۔ خیریت یہ ہے کہ زبان الفاظ پر عادی ہوگئی ہے۔ آپ ہی آپ قرأت کرلیتی ہے ورنہ باعتبار احکام ظاہری بھی عدم صحت کا فتویٰ دیا جاتا اور اعادہ واجب ہوتا۔ سر سجدہ میں ہے مگر خیال اور ہی کہیں ہے اس حالت پر بھی آدمی لاکھ روپیہ سے زیادہ کوئی چیز اس میں پاتا ہے کہ لاکھ روپیہ پر اس کو ترجیح دیتا ہے۔ نماز نماز ۲۶

وجائے تو اندازہ کر لیجئے کہ کیا اثر رکھے ؎

جرعۂ خاک آمیز چوں مجنوں کند ؎ صاف گر باشد ندانم چوں کند

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند ؎ صاف گر باشد ندانم چوں کند

"یعنی جب شراب کا ایک گھونٹ مٹی میں مل کر مست بنا دیتا ہے تو خالص شراب تو کیا کچھ نہ کریگی"

واقعی طاعت وہ چیز ہے اگر اس میں ایک لحظہ کا لطف بھی میسر ہو جائے تو آدمی دنیا و ما فیہا کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے خواہشِ نفسانی کا تو دشمن ہی ہو جائے، نفس کے پھندے میں آدمی جب ہی تک آجاتا ہے جب تک کہ طاعت کی لذت سے واقف نہیں ہوا۔ عادت ڈالئے پھر لذت آنے لگے گی اور کچھ کلفت نہ رہے گی۔ ابتداء میں کسیقدر کلفت ضرور ہوتی ہے۔ غرض یہ عادت ڈالنی چاہئے کہ ہر کام کو سوچکر کرے، اگر وہ کام خواہشِ نفس سے ہو تو نہ کیا اس طرح معصیت چھوٹ جائے گی اور طاعت ہی طاعت رہجائے گی اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہو کہ ترک ہوائے نفس کے لئے متعین ہے خوف۔ اور یہ ظاہر بھی ہر جس کام سے بھی کوئی باز رہتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف خوف سے باز رہتا ہے جسمانی سزا کا ۲۷
خوف ہو یا مال کے نقصان کا، یا چشموں میں سُبکی کا یا جس چیز کا بھی ہو مگر ہوگا خوف ہی ڈاکو ڈاکہ کیوں نہیں ڈالتا سزا کے خوف سے۔ بچہ شرارت سے کیسے رکتا ہو پٹنے کے خوف سے بہت جرم سے لوگ باز رہتے ہیں جرمانہ کے خوف سے محفل میں آدمی تہذیب سے کیوں بیٹھتا ہو اور خلاف متانت حرکات سے کیوں باز رہتا ہو سُبکی کے خوف سے۔ وعلیٰ ہذا۔ خوف ہی تو اُٹھ جاتا ہو جو ملک میں امن قائم نہیں رہتا اور غدر ہو جاتا ہو۔ خوف ہی ہے کہ جملہ برائیوں کی جڑ کاٹنے والا ہو خوف ہی ہو کہ جملہ طاعت کا ذریعہ ہو۔ البتہ یہ بات سمجھنے کی ہو کہ خوف تو ہر مؤمن کو ہو پھر کیا وجہ کہ ہوائے نفسانی نہیں چھوٹتی وجہ اس کی یہ ہو کہ خوف کا استحضار نہیں۔ اور استحضار نہ ہونے کی وجہ صرف ایک ہی عذاب کا نہ سوچنا۔ بس منتہا کے معالجہ یہ سوچنا ہوا اس سے خوف کا غلبہ و استحضار ہوگا جو ترکِ ہوا کیلئے کافی ہو جاویگا۔

اب صرف اس کا طریق سہل بتائے دیتا ہوں کہ سوچنا شروع کیجئے اور اس کیلئے ایک وقت مقرر کیجئے مثلاً سونے کا وقت ہو وقت آپکے کسی دنیا کے کام میں بھی حرج نہوگا۔ دنیا کے کام میں تو سارا وقت دیا ہو اللہ میاں کے کام میں نکما ہی وقت دو، اتنا تو کرو۔ اللہ میاں اس میں تمہارا

ما مکر، لکھنا، وجہ، رگ: حکہ۔ ۱۲

کام بنا دینگے وہاں تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ بندہ ذرا ادھر کو منہ کرے اور رحمت کے انبار اس پر بکھیر دیں۔ پندرہ بیس منٹ دیر میں سونے لیٹ کر یا بیٹھ کر یاد کیا کیجئے کہ آج کیا کیا گناہ کیے۔ فہرست گناہ تیار کیجئے پھر دل میں خیال جمائیے گویا میدانِ قیامت موجود ہے اور میزان کھڑی ہے۔ اپنا مددگار کوئی بھی نہیں، دشمن بہتیرے ہیں، حیلہ کوئی چل نہیں سکتا، زمین گرم تانبے کی طرح کھول رہی ہے، آفتاب سر پر، دوزخ سامنے ہے، اور ان گناہوں کا حساب ہو رہا ہے کوئی جواب معقول بن نہیں پڑتا۔ جب حالات پیشِ نظر ہونگے تو بے اختیار ہاتھ جوڑ کر حاکم کے روبرو معذرت کریگا کہ بیشک خطاوار ہوں کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر کچھ سہارا ہے تو صرف حضور کے رحم کا۔ اسی کو استغفار کہتے ہیں۔ رات کو یہ کیجئے پھر صبح اٹھ کر یاد رکھئے کہ فلاں، فلاں گناہ کئے تھے اور رات ان سے استغفار اور عہد کیا تھا سو آج وہ گناہ نہونے پائیں۔ اس سے اگر اسی دن تمام گناہ یک لخت نہ چھوٹ جائینگے تو کمی تو ہوہی جائیگی اور چند روز میں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ گناہ رہ سکیں۔ یہ ایسی تدبیر ہے کہ چند ہی روز کرنے سے آدمی معاصی سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے! اور دل میں گناہ کیوقت خود ایک ہراس پیدا ہو جاتا ہے۔

محاسبۂ نفس روزانہ

٢٨ پھر اس کیلئے علم کی ضرورت ہوگی کہ معلوم ہو یہ کام معصیت ہے اور یہ طاعت۔ سو علم دین حاصل کیجئے اور اگر کم فرصتی کا عذر ہے تو چند کتابیں اردو میں منتخب کردی گئی ہیں ان کو کسی سمجھدار سبقاً سبقاً پڑھ لیجئے، رفعِ ضرورت کیلئے کافی ہیں۔ کتابوں کو خود نہ پڑھئے کہ اس سے طبیعت میں پہلے جو اشکال ہوتے ہیں وہ حل نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات نئے اشکال پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور باعثِ مضرت ہوتے ہیں۔

کم فرصتی میں علم دین حاصل کرنا

حاصل سارے وعظ کا یہ ہوا کہ جنت مطلوب ہے اور اس کا ذریعہ ہے ترکِ ہوا۔ اور اس کا معین ہے خوف۔ اور اس کا طریق ہے مراقبہ۔ جب مراقبہ کیا خوف پیدا ہوا اس سے خواہشِ نفسانی چھوٹ گئی اس پر نتیجہ مرتب ہوا

فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى ۝

"بلاشک جنت ہی ایسے لوگوں کا ٹھکانا ہے"

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فہم اور توفیق عمل کی عطا فرمادیں۔ آمین۔

تمت

ملنے کا پتہ ... مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی نمبر ۱

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

مَا عَلَيْهِ الصَّبْرُ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

مُحمّد عبدُ المنّان غفرلہٗ

۲۹

"مکتبہ تھانوی"، دفتر "الابقاء"
متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی نمبر۱

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ

مُسَمّٰی بہ

مَا عَلَیْہِ الصَّبْرُ

اَلْاَشْتَاتُ	مَنِ اسْتَمَعَ	مَنْ ضَبَطَ	مَنْ بَیَّنَ	مَاذَا	لِمَ	کَیْفَ	کَمْ	مَتٰی	اَیْنَ
متفرقات	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
یہ بیان حقیقۃ الصبر کا تتمہ ہے چونکہ اس میں پابندی اعمال کے طرق کا بیان رہ گیا تھا اس لئے اس جزو کو بیان کرکے مضمون کو مکمل کر دیا گیا۔ فقط		احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ وکان لہ	[illegible]	ماعلیہ الصبر اعمال امور ہیں اور صبر علی العمل کی ایک صورت ایک حقیقت یعنی یہ کہ مقصود پر نظر رکھے	بعض مہمانوں نے بیان کی فرمائش کی ان کی طلب پر ہوا	بیٹھ کر	ایک گھنٹہ ۲۵ منٹ	۲۰ محرم ۱۳۳۲ھ بروز یکشنبہ بعد نماز صبح	خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون در کوٹھی مدرسہ

۳۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ

”ان لوگوں پر خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور عام رحمت ۳۱
بھی ہوگی اور وہی لوگ ہیں سیدھی راہ پر“

جس جزو کی آیت میں نے تلاوت کی ہے اس کے سننے سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ بیان ماسبق کا تتمہ ہے (کیونکہ پرسوں اسی آیت کے متعلق بیان ہوچکا ہے اس بیان کا نام حقیقۃ الصبر ہے) ہر چند کہ یہ بیان بظاہر غیر ضروری ہے، کیونکہ اسی جمعہ کو اس مضمون پر بیان ہوچکا ہے۔ نیز اس وقت میرا قصد بھی بیان کا نہ تھا، اور جب بعض مہمانوں نے فرمائش کی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ کیا بیان کروں، مگر پھر خیال آیا کہ پہلے بیان میں ایک جزو بیان سے رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ اگر وقت ملتا تو میں ایک جزو اس مضمون کے متعلق اور بیان کرتا۔ مگر اس وقت تمہید طویل ہوگئی اور دوسرے مضامین ضروریہ کے بیان میں دیر ہوگئی اس لئے یہ جزو رہ گیا، تو چونکہ اس وقت ایک ایسا مضمون بیان کیا جائے گا جو پہلے بیان نہیں ہوا۔ اور اس کے بغیر مضمون سابق ناتمام رہا جاتا ہے اس لئے یہ بیان غیر ضروری نہیں اور سننے کے بعد

اس کی ضرورت خود ہی معلوم ہو جائیگی۔

اب میں اوّل اس جزو کی تعیین کئے دیتا ہوں پھر اس کے متعلق ضروری تفصیل بھی عرض کر دوں گا۔ گو وقت تنگ ہے، کیونکہ جن مہمانوں نے بیان کی فرمائش کی ہے وہ اسی ریل سے جانیوالے ہیں اس لئے زیادہ تفصیل کا موقع نہیں، اگرچہ میں نے انسے یہ کہدیا ہے کہ بیان ممتد ہو جائے تو وہ گھڑی دیکھکر وسط بیان میں اٹھکر چلے جائیں بلکہ اگر بیان ریل کے وقت تک ختم نہ ہوا تو میں انشاء اللہ درمیان میں خود ہی اطلاع کر دوں گا کہ ریل پر جانے والے اب چلے جائیں، اسی لئے میں نے گھڑی اپنے پاس رکھ لی ہے تاکہ وقت کو دیکھتا رہوں۔ لیکن جی یہ چاہتا ہے کہ جن صاحبوں نے فرمائش کی ہے وہ اوّل سے اخیر تک بیان میں شریک رہیں تاکہ کامل مضمون اُن کے کانوں میں پڑ جائے، کیونکہ پورا مضمون اول سے اخیر تک شریک رہنے سے معلوم ہوا کرتا ہے۔ بعض دفعہ کسی مضمون میں کچھ قیود ہوتی ہیں جو اخیر میں بیان کی جاتی ہیں۔ اس لئے وسط میں اُٹھ جانے سے اکثر ناتمام مضمون کانوں میں پڑتا ہے۔ تو جی یہ چاہتا ہے کہ فرمائش ۳۲ کرنیوالوں کے سامنے ہی مضمون ختم ہو جائے۔ اسی لئے میں نے نماز فجر کے متصل ہی بیان شروع کر دیا ہے مگر پھر بھی وقت زیادہ نہیں اس لئے میں قدر ضرورت پر اکتفاء کروں گا اور زیادہ تفصیل نہ کروں گا، مگر انشاء اللہ ضروری باتیں سب بیان کر دی جائیں گی۔ جو لوگ پہلے بیان میں شریک تھے، ان کو معلوم ہے کہ اس وقت بعد چند مقدمات کے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ حقیقت صبر میں پابندیِ اعمال بھی داخل ہے عام طور پر لوگ اس کو صبر میں داخل نہیں سمجھتے بلکہ صرف ترکِ جزع و فزع کے ساتھ اس کو مختص سمجھتے ہیں اس خیال کی غلطی اس بیان میں تفصیل کے ساتھ ظاہر کی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ تصریح کی گئی تھی کہ مَا عَلَیْہِ الصَّبْر اور محلِ صبر حقیقت میں ایک ہی چیز ہے۔ مگر اسوقت ماعلیہ الصبر کی تعیین نہ کی گئی تھی، اس وقت میں اس کی تعیین کرنا چاہتا ہوں یہی وہ جزو ہے جو اس وقت بیان سے رہ گیا تھا۔

اب سمجھئے کہ ماعلیہ الصبر کیا ہے تعیین اجمالی اس کی یہ ہے کہ ماعلیہ الصبر ماموربہ ہے

یعنی جس وقت جس کام کا امر ہو اس پر ثابت رہنا صبر ہے اور وہ مامور بہ ما علیہ الصبر ہے۔ پس اگر کسی وقت معمولات کے ترک کا امر ہو تو اس وقت ترک معمولات ہی ما علیہ الصبر ہوگا اور معمولات مناسب نہ ہوگا۔ یہ بات اس بیان سے واضح نہ ہوئی تھی بلکہ اس وقت اجمالاً اتنا کہہ دیا گیا تھا کہ اعمال طاعات محلِ صبر ہیں، اور یہ بتلایا تھا کہ صبر کا ایک محل خاص ہے کہ ناگوار واقعات میں ناگواری کا تحمل کرنا اور جزع فزع نہ کرنا۔ اور ایک محل عام ہے کہ اس وقت تمام معمولات کو ادا کریں اور کسی وقت امر ناگوار کی وجہ سے اعمال میں خلل نہ ڈالیں۔ ورنہ اس گنوار کی سی مثال ہوگی جس نے رمضان کا روزہ رکھا تھا اتفاق سے اس کی بھینس مرگئی تو اس نے فوراً روزہ توڑ ڈالا، اور خدا تعالیٰ سے خطاب کرکے کہا کہ آپ نے میری بھینس ماردی تو جاؤ ہم نے بھی روزہ توڑ دیا۔

ہندبین گو اس طرح کھلم کھلا نہ کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ در پردہ وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں گو اعتقاداً نہ سہی مگر عملاً سب ایسا کرتے ہیں۔ کہ جہاں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی امر ناگوار پیش آیا اس کی وجہ سے فوراً اعمال میں خلل ڈال دیا۔ حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ ناگوار واقعات میں ہمارا کیا بگڑتا ہے، کچھ بھی نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے ؎ "ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود" ناگوار واقعات میں جس قدر حکمتیں ہوتی ہیں ان پر نظر کرکے یہ کہنا غلط ہے کہ ان سے ہمارا کچھ بگڑ گیا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ عین رحمت ہیں جیسے میں نے استاد کی مار اور ڈاکٹر کے اپریشن کی مثال سے اس کو بیانِ گذشتہ میں واضح کردیا تھا۔ نیز میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ واقعات ہمارے اوپر بطور امتحان کے آتے ہیں جس میں کامیاب ہونے پر ہم کو اجر عظیم کی بشارت ہے تو حق تعالیٰ نے آپ کو انعام دینے کی غرض سے آزمایا تھا۔ آپ سمجھے کہ ہمارا نقصان کردیا۔ یہ تو وہی مثل ہوگئی کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے سمجھا کہ میری آنکھیں ہی پھوڑ دیں۔ پھر جس چیز میں حق تعالیٰ نے تصرف کیا ہے وہ اُن کی ہی چیز تھی آپ کا اس میں تھا کیا کچھ بھی نہیں۔ خدا تعالیٰ اگر ہمارے مال میں تصرف کریں یا متعلقین میں تصرف کریں یا ہمارے اولاد میں تصرف کریں تو یہ سب چیزیں انہی کی تو ہیں۔ اپنی چیز

چیز میں اگر وہ تصرف کریں تو تمھارا کیا بگڑا۔ یہی مقدمہ غلط ہے کہ یہ چیزیں تمھاری ہیں۔ جب تمھاری کوئی چیز نہیں تو ان کے نقصان سے تمھارا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ پھر اعمال میں کوتاہی کس لئے ہے۔ صاحبو! یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے۔ کہ اپنی چیز میں تصرف کر کے بندوں کو صبر کا صلہ دیتے ہیں۔ حالانکہ بندوں کو کسی تصرف پر نہ غم کرنے کا کچھ حق ہے نہ رنج کرنے کا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے ان کا بگاڑا ہی کچھ نہیں جو اُن کو رنج و غم کا حق ہو اور اگر وہ ناحق رنج کر کے صبر بھی کریں، تو یہ کچھ کمال کی بات نہیں۔ بس ان کے رنج کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنا خزانہ ایک خزانچی کے سپرد کر کے کسی وقت میں لے لے اور خزانچی رونے چلانے لگے تو کیا کوئی عاقل اس کے رنج کو بجا کہہ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر وہ رنج کر کے صبر و تحمل بھی کرلے تو کیا کوئی اس کو اس صبر و تحمل کی بنا پر مستحق انعام کہہ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

یہی حالت ہماری ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو خزانچی بنا رکھا ہے۔ اور اپنی کچھ چیزیں ہمارے سپرد کردی ہیں۔ اور جب چاہتے ہیں وہ اپنی چیزوں میں تصرف کرلیتے ہیں۔ ۲
تو ہم کو نہ اس میں کچھ رنج و ملال کا حق ہے نہ بے جا رنج پر صبر کر کے کچھ انعام کا استحقاق ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس بے جا رنج پر صبر کرنے سے اجر و ثواب اور انعام و جزا کی بشارت دی ہے پھر حسرت ہو کہ ہم ناگوار واقعات میں خدا تعالیٰ سے خفا ہو کر اعمال میں خلل ڈالنے لگیں، جیسا کہ اس گنوار نے کیا تھا کہ بھینس کے مرنے پر روزہ توڑ دیا۔ اور کم و بیش ناگواری سے بہت کم لوگ خالی ہیں۔ طبعی رنج تو غیر اختیاری ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ عقلی ناگواری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ وہ چیز جس میں حق تعالیٰ نے تصرف کیا ہے تمھاری ہی چیز تھی اور یہ بھی مان لیا جائے کہ تمھارا کچھ بگڑ بھی گیا تب بھی ناگواری کا حق نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ؎

آنکہ بجائے تست ہر دم کرمے ۔۔۔ عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

"جس شخص نے تجھ پر عمر بھر احسان کیا ہو اگر اس سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو معذور سمجھ"

اے صاحب جس خدا نے سالہا سال ہم کو راحت و آرام میں رکھا ہے، اگر کسی وقت وہ تکلیف بھی دے دیں تو کیا یہی انسانیت ہے کہ ہم اس تکلیف کو زبان پر لائیں اور ناگواری کا اثر لے کر اطاعت میں کوتاہی کرنے لگیں؟ صاحبو! سلاطینِ عالم فوجی ملازموں کو سالہا سال بے مشقت گھر بیٹھے تنخواہ دیتے ہیں، اور کسی وقت دشمن کے مقابلہ میں بھی بھیجدیتے ہیں، تو بتلائیے کیا اس وقت فوجی ملازم کو اس حکم پر ناگواری کا کچھ بھی حق ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس وقت کہا جاتا ہے کہ نمک حلالی یہی ہے کہ جس بادشاہ نے برسوں گھر بیٹھے تنخواہ دی ہے، اور بلا کسی مشقت و کلفت کے خبر گیری کی ہے کسی وقت اس کے حکم سے مشقت بھی ضرور برداشت کرنا چاہئے، (بشرطیکہ وہ حکمِ خدا تعالیٰ کے خلاف نہ ہو)۔
چنانچہ فوجی ملازم کبھی ایسے وقت میں انکار نہیں کرتا اور خوشی کے ساتھ دشمن کے مقابلہ میں بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے ہر قسم کی مصیبت کو برداشت کرتا ہے اور جان دینے کو اپنی سعادت اور نمک حلالی سمجھتا ہے۔

۳ پھر کس قدر افسوس ہے کہ باوجود دعویٰ شرافت کے ہمارا خدا تعالیٰ کے ساتھ وہ برتاؤ بھی نہ ہو جو ایک ادنیٰ فوجی ملازم کا جو اکثر چھوٹی قوموں کے لوگ ہوتے ہیں ایک ادنیٰ بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ واقعی اگر مصیبت میں ہمارا کچھ بگڑا بھی ہوتا جب بھی ایسے محسن سے ناگواری کا خیال دل میں لانا یا زبان سے ظاہر کرنا بالکل ہی انسانیت سے دور اور شرافت کے خلاف ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام کی حکایت ہے کہ وہ ابتداء میں کسی شخص کے غلام تھے، ایک دفعہ ان کے آقا نے ککڑی منگائی اور اس کی قاشیں کرکے پہلے ایک قاش اپنے ہاتھ سے حضرت لقمانؑ کو دی، جس کو انھوں نے خوشی خوشی کھا لیا، وہ اتفاق سے بہت تلخ تھی مگر حضرت لقمان نے ذرا منہ نہ بنایا نہ کوئی اثر ناگواری کا ظاہر ہونے دیا آقا سمجھا کہ شیریں ہوگی، اس نے بھی ایک قاش کھائی تو فوراً تھوکنے لگا اور ان سے سوال کیا کہ کیا تم کو یہ کڑوی نہیں لگی، فرمایا تلخی معلوم تو ہوئی تھی، پوچھا پھر تم نے خوشی خوشی کیسے کھا لیا ذرا بھی منہ نہ بنایا، فرمایا کہ حضور جس ہاتھ سے میں نے عمر بھر

اتنی شیرینیاں کھائی ہیں کیا اس کے ہاتھ سے ایک تلخی پر منہ بناتا۔ یہ تو انسانیت کے خلاف تھا اس لئے میں نے ناگواری ظاہر نہیں کی۔ اسی کو سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

آنرا کہ بجائے تست ہر دم کرمے ٭ عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

پھر کوئی یہ تو بتلائے کہ ناگواری کی حالت میں اعمال کے اندر خلل ڈالنے سے حق تعالیٰ کا کیا نقصان ہے اگر تم نماز روزہ کی پابندی کروگے تو حق تعالیٰ کو بخش دوگے اور جو نہیں کروگے تو ان کا کیا بگاڑ دوگے؟ جو کچھ نقصان ہوگا تمہارا ہی ہوگا۔ پھر اس حالت میں تو کسی مصیبت کی وجہ سے اعمالِ طاعات میں خلل ڈالنے کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی نے ایک شخص سے روپیہ قرض لے کر مکان بنایا تھا، قرضخواہ نے روپیہ کا تقاضا کیا، تو کہدیا ابھی روپیہ ہمارے پاس نہیں ہے، اس نے زیادہ تقاضا کیا تو آپ نے غصہ میں آکر مزدور لگا کر بنا بنایا مکان ڈھا دیا، کہ جاؤ ہم تمہارے روپیہ کا مکان ہی نہیں رکھتے، بھلا اس نے مکان ڈھا کر کس کا نقصان کیا۔ قرضخواہ
کے روپے تو پھر بھی ذمہ رہے، ایک نقصان اور سر لے لیا کہ مکان سے بھی ہاتھ دھویا ۴

اسی طرح ناگوار واقعات میں اعمال و معمولات کے ترک سے معصیت تو کم ہو نہیں جاتی، ہاں ترکِ اعمال کا نقصان اور بڑھ جاتا ہے۔ ایک نقصان تو غیر اختیاری ہوا تھا یہ دوسرا نقصان ہم اپنے ہاتھوں کرتے ہیں، جس سے معصیت کو اور ترقی ہوتی ہے، جیسے کسی شخص کی ناک پر بار بار مکھی بیٹھتی تھی جس سے وہ تنگ آگیا، تو اس نے غصہ میں ناک ہی کاٹ ڈالی کہ جاؤ ہم اڈا ہی نہیں رکھتے۔ بھلا مکھی کا اس سے کیا نقصان ہوا اس کو تو اب چشمۂ شیریں مل گیا اور ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں ٭ مگس و مرغ و مور گرد آیند

"جس جگہ میٹھا پانی ہوتا ہے وہاں مکھیاں اور دوسرے جانور جمع ہوجاتے ہیں۔"

پہلے تو مکھی ہی آتی تھی اب چیونٹی اور چیونٹے بھی آئیں گے، یہی حال ہمارا ہے کہ ایک مصیبت میں اعمال ترک کرکے ہم دوسری آفتوں کو بھی بلالیتے ہیں۔

ح۵ ترجمہ پہلے گذر گیا ۱۲

اس مضمون کو پہلے بیان میں تفصیل کے ساتھ بیان کر کے میں نے یہ کہا تھا کہ مصائب کے وقت اعمال میں خلل نہ ڈالنا چاہئے جس سے متبادر یہ ہوا تھا کہ اپنے معمولات پر پابند رہنا چاہئے، اور اسی کو ماعلیہ الصبر سمجھا گیا تھا۔ اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اعمالِ ظاہرہ ماعلیہ الصبر کی صورت ہیں، اور اس کی حقیقت دوسری شے ہے، یعنی امتثالِ امر یعنی جس وقت جس بات کا امر ہو اس کا بجالانا صبر ہے، اور وہ مامور بہ ماعلیہ الصبر ہے اگر کسی وقت پابندیٔ معمولات میں امتثالِ امر ہو اس وقت معمولات ماعلیہ الصبر ہیں، اور جس وقت ترکِ معمولات میں امتثالِ امر ہو اس وقت ترکِ معمولات ماعلیہ الصبر ہیں، یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ماعلیہ الصبر فقط صورتِ اعمال کے ساتھ خاص ہے بلکہ امتثالِ امر کی رعایت اس میں ضروری ہے اس کو میں پہلے صراحۃً بیان نہ کر سکا تھا کیونکہ وقت نہ ملا، اب اس کو بیان کرتا ہوں، اور اس کے لئے مجھے دوسری آیت تلاش کرنے کی فکر ہوتی، مگر الحمد للہ کہ اسی آیت میں ایک لفظ اس پر دال ہے۔ وہ
5 لفظ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ہے۔ میں نے پہلے اس کو بطور بشارت کے بیان کیا تھا، مگر اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ماعلیہ الصبر اور مامور بہ ہے۔ گویا اسمیں صابرین کا پتہ بتلایا گیا ہے کہ صابر وہ لوگ ہیں جو ناگواری کے وقت ہدایت پر قائم رہتے ہیں یعنی سیدھے راستہ پر جمے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ راستہ پر چلنے سے کسی مقصود پر پہنچنا مطلوب ہوتا ہے، پس مُھْتَدُوْنَ کا حاصل یہ ہوا کہ ناگواری کے وقت وہ لوگ سیدھے راستہ پر چلتے ہیں اور مقصود پر نظر رکھتے ہیں، پس یہاں ایک تو یہ بات بتلائی گئی ہے کہ یہاں دو راستے ہیں ایک سیدھا اور ایک ٹیڑھا۔ چنانچہ دوسری آیت میں اسکو صراحۃً بیان فرمایا ہے وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ لوگوں سے فرما دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا اس کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں کا اتباع نہ کرو وہ تم کو خدا کے راستہ سے متفرق کر دیں گے۔ مقصود تو یہ ہے کہ ٹیڑھا راستہ تم کو خدا تعالیٰ سے جدا کر دے گا

مگر نفرق بکم عن سبیلہ مبالغۃً فرمایا گیا ہے کہ ٹیڑھے راستوں پر چل کر تم کو خدا تو کیا ملتا خدا کا راستہ بھی نہ ملے گا اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ میں سیدھے راستہ پر چلنے کا ذکر توصراحۃً ہے۔ کیونکہ ہدایت اسی کو کہتے ہیں ٹیڑھے راستہ پر چلنے کو ہدایت نہیں کہتے بلکہ ضلالت کہتے ہیں۔ رہی دوسری بات یعنی سیدھے راستہ پر چلنے کے ساتھ مقصود پر نظر رکھنا، سو گو اس کا ذکر صراحۃً نہیں، مگر ادنیٰ تامل سے اس پر بھی اس کی دلالت واضح ہے، کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی راستہ پر چلنے سے کسی مقصود پر پہنچنا ہی مطلوب ہوتا ہے راستہ خود مطلوب نہیں ہوتا، اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملایا جائے کہ طریق دو قسم کے ہیں ایک حسی دوسرے معنوی۔ طریق حسی کا موصل الی المقصود ہونا چلنے والے کے قصد و ارادہ پر موقوف نہیں، بلکہ اگر راستہ سیدھا ہو تو آنکھیں بند کر کے بھی چلنے سے مقصود تک وصول ہو جاتا ہے، مثلاً دہلی کو جو سیدھی سڑک جاتی ہے اس پر جو کوئی بھی چلے گا دہلی پہنچ جائے گا، خواہ دہلی کا
۶ قصد ہو یا نہ ہو، اور طریقِ معنوی کی یہ حالت نہیں، اس میں بدون قصد و ارادہ کے وصول نہیں ہو سکتا۔ گو راستہ سیدھا بھی ہو، مگر ہر وقت مقصود پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے،

اب سمجھو کہ اس طریق کا مقصود کیا ہے، سو نصوص میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ مقصود اس طریقِ معنوی سے رضائے حق ہے، اور نصوص ہی سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ مقصود بدون ارادہ و نیت کے حاصل نہیں ہو سکتا گو راستہ سیدھا ہی اختیار کیا گیا ہو، چنانچہ حدیث میں ہے۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِ امْرَاَۃٍ یَّتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ۔

"تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ اور آدمی کو وہی ملتا ہے جو اسکی نیت ہو، پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

کے دین کی خاطر ہو اس کو اسی کا اجر ملے گا، اور جو شخص ہجرت دنیا یا کسی عورت سے نکاح کی نیت سے کرے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے کی (یعنی ایسی ہجرت دنیا کے لئے ہے دین کے لئے نہیں اس لئے اس کا اجر و ثواب بھی نہیں)۔"

اس حدیث کا پہلا جزو إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ بتلا رہا ہے کہ اعمالِ شرعیہ سے ثواب بدون نیت کے حاصل نہیں ہوتا (اعمال کی تفسیر اعمالِ شرعیہ سے اس لئے کی گئی کہ شارع علیہ السلام کو اعمالِ غیر شرعیہ سے بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ پھر آگے ہجرت کا ذکر فرمانا اس کا قرینہ ہے اور ثواب الاعمال سے تفسیر اس لئے کی گئی کہ وجودِ اعمال بدونِ نیت کے ہو سکتا ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے، لہٰذا توقف وجودِ اعمال علی النیۃ شارع کا مقصود نہیں ہو سکتا، کیونکہ اوّل تو یہ خلاف واقع ہے، دوسرے وجود اشیاء بھی ان امور کے قبیل سے ہے جو شارع علیہ السلام کی بحث سے خارج ہیں، شارع کا مقصود بیانِ احکام ہوتا ہے نہ کہ بیانِ کیفیات وجود۔ اب اس میں گفتگو ہو سکتی ہے کہ یہاں صحت اعمال مراد ہے یا ثواب اعمال۔ سو اس کا جواب حنفیہ نے کتبِ فقہ میں دیدیا ہے، کہ چونکہ ثواب اعمال کا نیت پر موقوف ہونا اجماعی ہے، اس لئے تقدیر صحت سے تقدیر ثواب اولیٰ ہے ۱۲ جامع) اور ثواب و رضا باہم قریب قریب ہیں، جب حق تعالیٰ کسی عمل پر ثواب دیں گے تو اس سے راضی بھی ہوں گے۔ دوسرے ثواب سے بھی رضا ہی مقصود ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ رضا ثواب کی اعلیٰ فرد ہے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے متعلق صاف فرمایا کہ اگر اس سے خدا مطلوب نہ ہو تو وہ شرعاً قابلِ قدر اور لائقِ اعتبار نہیں اور اس سے خدا تک وصول نہ ہوگا، تو دیکھئے ہجرت کتنا بڑا عمل ہے کہ جہاد کے برابر ہے، اور اس کا طریقِ ہدایت ہونا یقینی ہے کیونکہ عمل شرعی ہے مگر بدونِ نیت و ارادہ کے وہ بھی موصل نہیں۔ علیٰ ھذا نماز کتنا بڑا عمل ہے لیکن خدا کے لئے نہ ہو بلکہ ریاکاری سے ہو تو ہرگز وصول و قرب مرتب نہ ہوگا، اسی طرح جملہ اعمالِ شرعیہ میں غور کر لیا جائے کہ مقصود کی نیت اور قصد

سب میں شرط ہے بدون اس کے وہ موجب وصول نہیں ہوسکتی، جب نصوص شرعیہ سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ بدون نیت کے کوئی عمل مقبول نہیں، تو معلوم ہوا کہ ہدایت صرف اس کا نام نہیں کہ اعمالِ شرعیہ کی صورت کو اختیار کر لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ طلب رضاءِ حق بھی شرط ہے پس یہ ثابت ہوگیا کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ میں سیدھے راستہ پر چلنے کے ساتھ مقصود پر نظر رکھنا بھی مذکور ہے، کیونکہ اس کے بغیر ہدایت کی صورت ہی صورت ہوگی حقیقت نہ ہوگی، اور مقصود رضاءِ حق ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ صابر وہ ہیں جو ناگواری کے وقت رضاءِ حق پر نظر رکھتے ہیں اور اس کو فوت نہیں کرتے، اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ رضاءِ حق کا مدار امتثالِ امر پر ہے، پس صبر کی حقیقت امتثالِ امر ہوئی، اور ماعلیہ الصبر مامور بہ ہوا، یہی مطلوب تھا،

اب ہمارے اندر بعض لوگ تو ایسے ہیں جو پریشانی کے وقت طریق ہی میں خلل ڈالتے ہیں کہ جہاں مصیبت آئی فوراً اعمالِ سابقہ کی پابندی چھوڑ دی اور ناجائز امور میں مبتلا ہوگئے، اکثر لوگ تو ایسے ہی ہیں ان کی تو زیادہ شکایت نہیں، یہ تو گفتگو ہی سے خارج ہیں، دوسری جماعت وہ ہے جو طریق پر غلو کے ساتھ جمے رہتے ہیں کسی حال میں بھی انکی تسبیحیں اور معمولات فوت نہیں ہوتے۔ مگر ان کی نظر مقصود پر نہیں ہوتی اس لئے بعض دفعہ ان سے مقصود فوت ہو جاتا ہے، مثلاً بعض لوگ ایسے معمولات کے پابند ہوتے ہیں کہ چاہے لڑکا مر جاوے مگر وظیفہ فوت نہیں ہوتا، لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں کہ بڑے پابند اوقات ہیں، مگر قواعدِ شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی پابندی شرعاً محمود نہیں، یہ غلو فی الدین میں داخل ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ پابندی کا توڑنا بھی مامور بہ ہے، بلکہ بعض دفعہ نماز شروع کر دینے کے بعد نماز کا توڑ دینا بھی واجب ہوتا ہے جیسے کوئی اندھا آرہا ہو اور اس کے راستہ میں کنواں یا گڑھا ہو جس میں اس کے گرنے کا اندیشہ ہوا تو نماز کا توڑنا اور اس کا بچانا واجب ہے۔ اس وقت امتثالِ امر اسی میں ہے کہ عمل کو توڑ دے اس وقت نماز پڑھنے میں امتثالِ امر نہیں۔

ایک صحابی کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ وہ جنگل میں گھوڑے پر سوار چلے جارہے تھے کہ

نماز کا وقت آگیا، وہ گھوڑے سے اُترے اور وضو کر کے گھوڑے کی لگام ہاتھ میں لے کر نماز میں مشغول ہو گئے، وہ گھوڑا کبھی کبھی شوخی کر کے ایک دو قدم چلتا تھا تو آپ بھی ایک دو قدم اس کے ساتھ آگے پیچھے ہٹ جاتے تھے، ایک خارجی نے ان کو نماز میں آگے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ کر اعتراض کیا کہ یہ کیسی نماز ہے، ان صحابی نے فرمایا کہ تم کیا جانو، ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے ہیں، آپؐ نے ہم پر ایسی سختی نہیں کی کہ سفر میں بھی اسی طرح خشوع و اطمینان سے نماز پڑھیں جس طرح حضر میں پڑھا کرتے ہیں ۲، بھلا اگر میں گھوڑے کو چھوڑ کر نماز پڑھتا اور گھوڑا بھاگ جاتا، تو پھر کیسی پریشانی ہوتی، پھر شاید اس وقت یہ خیال آتا کہ ہائے میں نے نماز ہی کیوں پڑھی تھی جو اتنا نقصان ہوا، اور یہ حالت بہت سخت ہے، کہ انسان طاعت کر کے اس پر پچھتائے " اس لئے حضرات صحابہؓ کو تقوی کا غلو نہ تھا، کہ چاہے کچھ ہی ہو جائے مگر معمول نہ چھوٹے، کیونکہ بعض دفعہ معمول کی پابندی ظاہر میں تو اچھی ہوتی ہے مگر باطن میں اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ پابندی سے جب دنیا کا ضرر ہوتا ہے تو اس وقت طاعت پر پچھتاتا ہے، اسی لئے میں بعض لوگوں 9
سے جو حج کا ارادہ کر کے جاتے ہیں یہ کہہ دیتا ہوں کہ سفر مدینہ میں اگر خطرات سے پورا اطمینان ہو تو جانا ورنہ حج کر کے واپس آجانا، گو یہ بات ظاہر میں بہت سخت ہے مگر میں اس نیت سے کہہ دیتا ہوں کہ ایسا نہ ہو خطرہ کی حالت میں سفر کر کے بعد میں نفس یہ کہے کہ ہائے میں ناحق ہی آیا، اور سفرِ مدینہ پر پچھتائے تو یہ حالت مدینہ نہ جانے سے زیادہ سخت ہوگی۔ کیونکہ اس وقت تو یہی حسرت ہوگی کہ ہائے میں زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم رہا اور امید ہے کہ یہ حسرت ہی کام دے جائے، اور اب یہ افسوس ہوگا کہ ہائے میں کیوں آیا تھا، اور ان دونوں حالتوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ اس خارجی معترض کی نگاہ اس دسیسہ پر نہ پہنچی تھی، اس لئے اس نے صحابی پر اعتراض کیا۔ خارجی لوگ بظاہر اعمال کے بہت پابند ہوتے تھے، اور وہ نماز روزہ میں اہلِ سنت سے زیادہ پختہ تھے، کیونکہ ان کے یہاں اعمال جزوِ ایمان ہیں اور ان کے نزدیک گناہ کبیرہ سے بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ مگر ان میں اعمال کی صورت بھی صورت تھی حقیقت نہ تھی،

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ بعض لوگ قرآن کو ایسا سنوار کر پڑھیں گے جیسا کہ تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے مگر حالت یہ ہوگی کہ قرآن ان کے گلے سے نیچے نہ اُترے گا بس اوپر ہی اوپر رہیگا وہ اسلام سے ایسے نکلیں گے جیسے تیر بعض دفعہ نشانہ سے تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہے کہ اس میں خون کا نشان تک نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ شریعت میں اعمال ظاہرہ کی ایسی پابندی مطلوب نہیں جس میں محض صورت ہی صورت ہو اور مقصود پر نظر نہ ہو، بلکہ ایسی پابندی مطلوب ہے جس میں ہر وقت مقصود یعنی رضاءِ حق پر نظر ہو، گو اس سے بعض دفعہ صورت میں بھی خلل آجائے، چنانچہ ایک بار امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سفر میں تھے اونٹ پر چلتے ہوئے نیند آگئی اور بالکل طلوعِ شمس کے قریب آنکھ کھلی، جلدی سے اُتر کر وضو کیا، نماز شروع کی، امام ابو یوسف امام بنائے گئے، امام ابو یوسف نے چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھیں اور تمام ارکان میں تخفیف کی، رکوع اور سجدہ وغیرہ جلدی جلدی ادا کیا، اس وقت کوئی زاہد خشک ہوتا تو یوں کہتا کہ نماز ناقص ہوئی، مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے نماز کے بعد فرمایا
۱۰ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ صَارَ یَعْقُوْبُنَا فَقِیْھًا خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یعقوب یعنی امام ابو یوسف فقیہ ہو گئے، اس وقت ان کا نماز میں جلدی کرنا تفقہ کی علامت تھی، کیونکہ طلوعِ شمس قریب تھا اگر وہ جلدی نہ کرتے تو نماز قضا ہو جاتی، اور گناہ ہوتا، دوسرے ادا نماز کا درجہ قضا سے بہت بڑھا ہوا ہے، پس اس وقت جلدی کرنے ہی سے نماز کامل ہوئی، خشوع خضوع کی ساتھ پڑھنے سے ناقص ہوتی، مگر ان باتوں پر فقیہ کی نظر ہی پہنچ سکتی ہے کہ اس وقت جلدی مناسب ہے یا ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا مناسب ہے، جاہل تو ہر حالت میں ایک سی ہی نماز پڑھے گا، چاہے وہ ادا ہو یا قضا ہو جائے، یا رفقاء کو ایذا ہونے لگے، چنانچہ ایک بزرگ ہمارے ساتھ سفر میں تھے، راستہ میں مغرب کی نماز پڑھی گئی تو اس بندۂ خدا نے فرض و سنت کے بعد صلوٰۃ الاوابین شروع کر دی، اب جب تک ان کی صلوٰۃ اوابین ختم نہ ہو گئی سب لوگ رُکے رہے، تمام رفقاء کو تکلیف ہوئی، اسی طرح ایک اور بزرگ کے ساتھ لوگ سفر میں چل رہے تھے، ظہر کی نماز کا وقت آیا تو وہ حضرت فرضوں کے بعد وظیفہ پڑھنے بیٹھ گئے، لوگوں نے کہا سوار ہو جائیے، تو آپ فرماتے ہیں کہ میں تو ظہر سے عصر

تک بیٹھا کرتا ہوں میں عصر سے پہلے نہیں اٹھ سکتا تمام رفقاء سخت پریشان ہوئے اور آئندہ کو توعہد کرلیا ہوگا کہ ان کے ساتھ کبھی سفر نہ کرنا چاہئے، تو یاد رکھو ایسی پابندی میں محض صورت عمل ہوتی ہے حقیقت نہیں ہوتی، کیونکہ اس وقت شریعت کا حکم ہے کہ معمول کو ترک کرکے ضروری پر اکتفاء کرو اور رفیقوں کو تکلیف نہ پہونچاؤ، حدیث میں جریج عابد کا قصہ آتا ہے کہ وہ اپنے صومعہ میں مشغول عبادت تھے کہ نیچے سے ان کی ماں نے پکارا وہ دل میں کہنے لگے کہ اے اللہ ادھر میری ماں پکار رہی ہے اور ادھر میری نماز ہے میں کیا کروں، بالآخر وہ نماز ہی میں لگے رہے، ماں نے چند بار پکارا مگر انھوں نے جواب نہ دیا۔ اس وقت شریعت کا حکم یہ تھا کہ وہ بول پڑتے اور نماز کا بعد میں اعادہ کرلیتے، کیونکہ نماز فرض نہ تھی، نفل تھی، اور ماں کو اطلاع نہ تھی کہ یہ نماز میں مشغول ہیں، اس وقت جواب نہ دینے سے اس کو کلفت ہوتی تھی، چنانچہ اس نے دو تین بار آواز دینے کے بعد دعاء کی، جس کا لمبا قصہ حدیثوں میں آتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو نقل کرکے فرمایا

11 لَوْكَانَ فَقِيْهًا لَاَجَابَ اُمَّهٗ یعنی اگر جریج فقیہ ہوتے تو اپنی ماں کو ضرور جواب دیتے خاموش نہ رہتے، دیکھئے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز توڑ دینے کو افضل قرار دیا، حضرت جریجؒ کو یہ شبہ ہوا تھا کہ نماز حق اللہ ہے اور ماں کو جواب دینا حق العبد ہے اور حق اللہ حق العبد سے مقدم ہے، اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ دوسرا مقدمہ تو صحیح ہے کہ حق اللہ حق العبد سے مقدم ہے۔ مگر پہلا مقدمہ غلط ہے کہ اس وقت ماں کو جواب دینا محض حق العبد ہی تھا ان کو بوجہ عدم تفقہ کے یہ خبر نہ تھی کہ اس وقت نماز کا توڑنا اور ماں کو جواب دینا حق اللہ بھی ہے، کیونکہ اس وقت اسی کا امر تھا اور جس چیز کا جس وقت امر ہو وہ حق اللہ بھی ہے محض حق العبد نہیں، گو ظاہر میں بندہ سے اس فعل کا تعلق ہو، اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں کہ جس فعل کا تعلق عبد سے دیکھتے ہیں اس کو حق العبد ہی سمجھتے ہیں حالانکہ جب وہ شرعاً مامور بہ ہے تو حق اللہ بھی ہے اور حقوق العباد سب کے سب مامور بہا ہیں تو وہ حق اللہ سے خالی نہیں۔ پس کسی بندہ کے واسطے نماز توڑ دینا درحقیقت حق اللہ کی رعایت ہی ہے، کیونکہ اس وقت خدا تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ ابھی کل پرسوں کا واقعہ ہے کہ میں

صبح کی سنتیں پڑھ رہا تھا کہ بڑے گھر سے آدمی دوڑا ہوا یہ خبر لایا کہ گھر میں سے کوٹھے کے اوپر
سے گر گئیں ہیں، میں نے خبر سنتے ہی فوراً نماز توڑ دی، یہاں تو سب سمجھدار لوگ ہیں، مگر
شاید بعض ناواقف اپنے دل میں اس وقت یہ کہتے ہوں گے کہ ہائے بیوی کے واسطے
نماز توڑ دی، بیوی سے اتنا تعلق ہے کہ خدا کی عبادت کو اس کے لئے قطع کر دیا، بیشک
اس وقت اگر کوئی دوکاندار پیر ہوتا وہ ہرگز نماز نہ توڑتا، کیونکہ اس سے جاہل مریدوں
کے نظروں میں ہیٹی ہوتی، مگر الحمد للہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی کیا کہے گا۔ اگر کسی
کی نظر میں اس فعل سے میری ہیٹی ہوئی وہ شوق سے کوئی دوسرا شیخ تلاش کر لیں جب
خدا کا حکم تھا کہ اس وقت نماز کو توڑ دو تو میں کیا کرتا، کیا اس وقت جاہلوں کی نظر
میں بڑا بننے کے لئے میں حکم خداوندی کو چھوڑ دیتا اور جریج عابد کی طرح نماز ہی میں مشغول
رہتا، وہ تو اس حکم سے ناواقف تھے، اس لئے معذور تھے، مگر میں تو بحمد اللہ اس حکم سے
ناواقف نہ تھا ظاہر ہے کہ جب بیوی کوٹھے پر سے گری، تو اس کی چوٹ کو شوہر ہی ہلکا کر سکتا
۱۲ ہے، اور وہی دریافت کر سکتا ہے کہ چوٹ کہاں لگی کہاں نہیں لگی، خصوص ایسی حالت
میں کہ گھر کے اندر بجز ایک ناسمجھ بچی کے اور ایک معذور بڑھیا کے کوئی امداد کرنے والا بھی
نہ تھا، اور امداد کرنے والے ہوں بھی تو کوٹھے سے گر جانا بعض دفعہ ہلاکت کا سبب
ہو جاتا ہے، فوراً ہی کوئی تدبیر ہو جائے تو زندگی کی آس ہو سکتی ہے، اس لئے بھی مجھ کو فوراً
جانا ضروری تھا، اس لئے میں نے شرعاً اس وقت نماز کا توڑ دینا اور فوراً جا کر انکی خبر گیری
کرنا ضروری سمجھا، حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے کہ
حضرات حسنین رضی اللہ عنہما میں سے کوئی ایک صاحبزادے مسجد میں آ گئے اس وقت وہ
چھوٹے بچے تھے چلتے ہوئے لڑکھڑاتے تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ توڑ کر ان کو
دور ہی سے گود میں اٹھا لیا، حالانکہ خطبہ بحکم صلوٰۃ ہے جو بدون کسی سخت عذر کے قطع نہیں
ہو سکتا، تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نواسوں کے لئے خطبہ توڑ دیا تو میں کیا چیز تھا،
اتنے بڑے حادثہ کے وقت سنتوں کی نیت نہ توڑتا، اس میں بیوی کی رعایت نہ تھی بلکہ
حق اللہ کی رعایت تھی، کیونکہ اس وقت خدا کا حکم یہی تھا، خدا کے حکم کے سامنے بیوی

کیا چیز ہے، اگر حق تعالیٰ کسی وقت بیوی کے قتل کا حکم دیں تو سچا مسلمان ایسا بھی کردے گا، اور جہاں وہ اس کی خبر گیری کا حکم دیں وہاں وہ اس کے لئے نماز بھی توڑ دے گا اور دونوں صورتوں میں دونوں فعلوں کا سبب حق اللہ ہی ہوگا، پس جس جگہ شریعت ترک معمولات کا امر کرتی ہو جیسے سفر میں رفقاء کی رعایت سے فرائض وسنن مؤکدہ پر اکتفاء کرنا یا جس جگہ نماز توڑنے کا امر کرتی ہو جیسے کسی مسلمان کی حفاظت وخبر گیری کے لئے ایسا کرنا۔ وہاں معمولات کی پابندی کرنا غلو فی الدین اور تقویٰ کا ہیضہ ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص ایک دانہ گیہوں کی تعریف یعنی تشہیر کرتا پھرے کہ یہ دانہ کس کا ہے اس پر تعزیر جاری کی جائے، آخر کیوں، اسی لئے تو کہ یہ ورع نہیں بلکہ ورع کا ہیضہ ہے،

پس ہمارے اندر بعض لوگ تو وہ ہیں جو پریشانی کے وقت طریق کو بالکل ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو اپنی وضع بنانے کے لئے طریق پر غلو کے ساتھ جمے رہتے ہیں، لیکن مقصود کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، کیونکہ ان کی نیت اس وقت معمولات کی پابندی سے امتثالِ امر اور طلبِ رضاء حق نہیں، بلکہ محض اپنی وضع کو قائم رکھنا ہے اور یہ طریق ایسا نہیں جو ۱۴ بلا قصد کے بھی موصل ہوسکے، یہاں تو ہر وقت ارادۂ امتثالِ امر کی ضرورت ہے، جس عمل میں امتثالِ امر کی نیت نہ ہوگی وہ عمل موصل نہ ہوگا، پس جہاں شریعت تھوڑی دیر کے لئے ترکِ معمولات کا امر کرتی ہو وہاں بھی معمولات پر جما رہنا یہ پابندیٔ طریق محض صوری ہے جس میں مقصود کا پتہ بھی نہیں۔ پس میں نے جو پہلے بیان میں مصائب کے وقت پابندیِ اعمال کی ضرورت کو ظاہر کیا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک شریعت ترکِ معمولات کا امر نہ کرے اس وقت تک تو معمولات کو ترک نہ کرے اور جس وقت جتنی دیر تک ترک معمولات کا امر کرے اس وقت اتنی دیر تک معمول کو ترک کردے، اور اس حالت میں معمول کو ترک کر دینا بھی پابندیِ طریق میں داخل ہے۔ کیونکہ اس وقت اس میں امتثالِ امر ہے، اور پابندیٔ طریق امتثالِ امر ونہی کا نام ہے۔ مثلاً سفر میں قصر کا امر کو وہاں اتمام کرنا گو ظاہر میں پابندیِ طریق مگر حقیقت میں پابندی نہیں کیونکہ خلافِ امر ہے، خلاصہ یہ کہ پابندیِ طریق کی حقیقت مامور بہ کو بجالانا ہے اور یہی ما علیہ الصبر ہے۔

باقی یہ بات کہ کہاں ترک معمول مامور بہ ہے کہاں نہیں، اور جہاں ترک معمول کا امر ہے وہ کتنی دیر کے لئے ہے علم شریعت اور محققین کی صحبت سے معلوم ہو سکتی ہے، کیونکہ شریعت ترکِ معمولات کا امر کسی ضرورت شدیدہ ہی سے کرتی ہے، اور قاعدہ ہے کہ اَلضَّرُوْرِیُّ یَتَقَدَّرُ بِقَدْرِ الضَّرُوْرَۃِ (ضروری کام ضرورت کے وقت سے پہلے بھی کرلیا جاتا ہے) اس لئے ضرورت سے زیادہ معمول کو ترک کرنا صبر کے خلاف ہوگا اور اس وقت یہ ترک ماعلیہ الصبر میں داخل نہ ہوگا، خوب سمجھ لو، لیکن یہاں بعض ناواقفوں کو ایک دھوکہ ہوتا ہے میں اسکو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ اہل علم کو معلوم ہے کہ اعمال تین قسم کے ہیں، ایک وہ جو دین میں نافع ہیں ان کا تو کرنا مامور بہ ہے خواہ وہ درجۂ فرضیت و وجوب میں ہو یا درجۂ سنت و استحباب میں، اور بعض وہ ہیں جو دین میں مضر ہیں ان کا ترک مامور بہ ہے خواہ درجۂ حرمت میں ہو یا کراہت میں، اور بعض وہ ہیں کہ جن کے فعل یا ترک کا امر نہیں، وہ مباحات ہیں، پہلی دو قسموں کا ماعلیہ الصبر میں داخل ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ وہ مامور بہ ہیں، خواہ فعلاً ہو یا ترکاً، لیکن مباحات کو اکثر مامور بہ سے خارج سمجھتے ۱۴
ہیں کیونکہ ظاہر میں وہ مامور بہ فعلاً یا ترکاً نہیں ہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری قسم بھی پہلی ہی دو قسموں میں داخل ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اپنے اثر کے لحاظ سے مباحات دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ دین کے لئے نافع ہیں، جیسے بغرض حفظ صحت چلنا پھرنا ورزش کرنا، یا نافع نہیں۔ اگر دین میں نافع ہے تو وہ فعلاً مامور بہ ہے گو درجۂ وجوب میں نہ ہو، مگر جب مباح نافع فی الدین کو اچھی نیت سے کیا جاوے تو وہ مستحب ضرور

عہ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ضرورت کے وقت اگر ایک معمول نہ ہوسکے مثلاً سفر میں تہجد و اشراق کی پابندی نہ ہوسکے تو ان اعمال کے وقت ذکر اللہ ہوسکتا ہے لہٰذا اس وقت کو ذکر سے خالی نہ چھوڑے خواہ تلاوتِ قرآن کرلے یا ذکر لسانی جہر یا اخفاء کے ساتھ کرے، غرض اس وقت کو یادِ خدا سے خالی نہ جانے دے تاکہ دل کو اس وقت خاص میں معمول کا خیال رہے یہ بھی پابندی کا قائم مقام ہے فقہاء نے لکھا ہے کہ حائضہ کو نماز کے وقت میں وضو کرکے مصلے پر بیٹھ کر کچھ دیر سبحان اللہ والحمد للہ کی تسبیحیں پڑھ لینا چاہئے تاکہ نماز کی عادت باقی رہے۔ فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے، لہٰذا یہ غلطی ہے کہ سفر یا مرض میں اوقاتِ عبادت کو یوں ہی فضول کردیں یا بھی مشغول نہ کیا جاوے ۱۲ جامع

ہوجاتا ہے اور اس میں ثواب بھی ملتا ہے، یا وہ دین میں نافع نہیں تو فضول ہے اور فضولیات کا ترک کر دینا مامور بہ شرعاً ہے، چنانچہ حدیث میں ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ اسلام کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ مالا یعنی کو ترک کر دیا جائے، جب فضولیات کے ترک کو حُسنِ اسلام میں دخل ہے اور حُسنِ اسلام مامور بہ اور مطلوب ہے، تو ان فضولیات کا ترک بھی مامور بہ ہوگیا، گو ان کو حرام نہ کہا جائے مگر فضولیات میں اشتغال کراہت سے خالی نہیں، پس مباحات کا مامور بہ سے خارج ہونا اس لحاظ سے ہو کہ اس کی ذات مِنْ حَيْثُ ہِیَ ذات دین کے لئے نافع یا مضر نہیں لیکن اثر کے لحاظ سے مباح یا نافع ہے یا فضول ہے اور فضول کا حسن اسلام کے لئے مضر ہونا حدیث سے معلوم ہوچکا ہے تو یوں کہنا چاہئے کہ مباح بھی یا نافع ہے یا مضر تو مآل کے اعتبار سے وہ بھی مامور بہ میں داخل ہے جس کے بعض افراد فعلاً مامور بہ ہوتے ہیں، اور بعض ترکاً، لہذا یہ بھی ماعلیہ الصبر سے خارج نہیں، تو ہم کو مصائب میں جس طرح حرام اور مکروہ سے بچنا ضروری ہے اسی طرح فضولیات سے بچنا بھی ضروری ہے۔ لوگوں کو فضولیات سے بچنے کا بہت ہی کم اہتمام ہے، اسی لئے مصائب کے وقت بیکار تذکروں میں وقت گذارتے ہیں اور اس کو صبر کے خلاف نہیں سمجھتے، حالانکہ جب صبر کی حقیقت امتثالِ امر ہے تو فضولیات میں مشغول ہونا خلافِ صبر کیوں نہ ہوگا، جب کہ شارع علیہ السلام ترک مالایعنی کا امر ترغیب کے صیغہ سے فرمارہے ہیں، اہل اللہ کو اس کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے کہ ایک بزرگ ایک فضول بات زبان سے نکلنے پر تیس برس تک روئے تھے، مگر بعض لوگ اس میں بھی غلو کرتے ہیں کہ جب وہ فضولیات سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں تو خشک بنکر بیٹھ جاتے ہیں، کوئی انکے پاس آئے تو مزاج پُرسی کو بھی فضول سمجھتے ہیں، اور جو دوسرا ان کی مزاج پرسی کرے تو ناک منہ چڑھاتے ہیں، اور جب وہ کسی کامل کو ہنستے دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسا کامل ہے جو فضول افعال میں مبتلا ہے دوڑتا بھی ہنستا بھی ہے اس غلطی کا منشا یہ ہے کہ ان لوگوں نے بعض مباحات کی ذات کو فضول قرار دے لیا ہے ان کے نزدیک دوڑنا، ہنسنا دیر تک کسی سے باتیں کرنا مطلقاً فضول ہے، حالانکہ کوئی

مباح اپنی ذات سے فضول نہیں بلکہ مباح کا نافع یا فضول ہونا اکثر کے تابع ہے جس مباح پر کوئی نفع دینی مرتب نہ ہو اور نہ اس میں نفع دینی کا قصد ہو وہ فضول ہے، اور جس پر نفع مرتب ہو یا اس میں کسی دینی نفع کا قصد ہو وہ فضول نہیں، بلکہ نافع ہے اور ماموربہ کی فرد ہو، پس ناقص کا کامل کے دوڑنے ہنسنے اور بہت باتیں کرنے پر اعتراض کرنا اس کے فہم کا قصور ہے، کامل محض نفس کے لئے یہ کام نہیں کرتا بلکہ وہ ان افعال میں دینی نفع کا قصد کرتا ہے، اس لئے اس کے حق میں یہ افعال فضول نہیں۔ خبر بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گاہے صحابہؓ سے مزاح فرمایا کرتے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ کی ہے، تو کیا تمہارے نزدیک معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ کام فضول کئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ کوئی مباح اپنی ذات سے فضول نہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ جن کاموں کو تم فضول سمجھتے ہو ان میں بھی کوئی دینی حکمت ہو، چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں ایک حکمت مناسب نبوّت تھی، وہ یہ کہ

۱۶ آپ کا جلال خداداد بہت بڑھا ہوا تھا جو صحابہ کو آپ کے سامنے دل کھول کر بات کرنے سے مانع تھا، اس لئے آپ نے اُن کو اپنے سے بے تکلف کرنے کے لئے مزاح شروع فرمایا، کیونکہ افادہ واستفادہ کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ طرفین کے دل کھلے ہوئے ہوں کسی کو انقباض نہ ہو، انقباض مانع فیض ہوتا ہے خواہ طالب کی طرف سے ہو یا مربی کی طرف سے ہو، اسی طرح ہر کامل کے ہنسی اور مزاح میں اس کے مناسب حال کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے جس پر ناقص کی نظر نہیں پہنچتی، اس لئے وہ اعتراض کرتا ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ کی ہے اس میں یہ حکمت تھی کہ آپ نے امت کو تعلیم دی ہے کہ اگر زیادہ عمر والا کمسن لڑکی سے شادی کرے تو اس کو یہ نہ چاہئے کہ اپنی طرح اس بچی کو بھی دانا بنا کر رکھے، بلکہ اس کے جذبات کی بھی رعایت کرے، بچیوں کی طبیعت کھیل کود کو چاہا کرتی ہے تو اس کو اس کا موقع دینا چاہئے اور اگر وہ شوہر کے لحاظ وادب سے کھیل کود میں شرم کرتی ہو تو اس کو صرف قولاً ہی نہیں بلکہ عملاً اجازت دینی چاہئے، اسی لئے آپ خود حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑے ہیں

اور بعض دفعہ آپؐ نے ان کو حبشی بچوں کا کھیل بھی دکھلایا جو مسجد کے فنا میں نیزوں سے کھیل رہے تھے ان کو گڑیوں سے کھیلنے کی بھی اجازت دی اور کبھی ایسا ہوتا کہ محلہ کی لڑکیاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو گھر میں تشریف لاتے دیکھکر گڑیوں کے کھیل سے متفرق ہوجاتیں تو آپؐ ان کو جمع کرکے لاتے کہ میں کچھ نہیں کہتا تم اطمینان سے کھیلو، ان سب امور میں امت کو تعلیم دیگئی ہے کہ بوڑھا مرد کمسن لڑکی سے شادی کرکے اس کے ساتھ کیونکر معاشرت کرے، پس چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان افعال کو حسن معاشرت میں دخل ہے جو شرعاً مطلوب ہے. نیز امت کو بھی حسن معاشرت کی تعلیم ہے اس لئے یہ فضول نہیں ہیں مگر ناقصین کی نظر چونکہ صورت ہی پر پہنچتی ہے حکمت تک نہیں پہنچتی اس لئے وہ کامل پر اعتراض کردیتے ہیں اسی لئے کفار کہتے تھے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۂ یہ کیسے رسول ہیں کہ ہماری طرح کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں انبیاءؑ نے ایسے اعتراضوں کا یہ جواب دیا اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ
عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۂ بیشک ہم تم جیسے ہی بشر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس پر چاہتے ہیں احسان 17
فرمادیتے ہیں. بس ہم میں اور تم میں اتنا فرق ہے کہ ہم پر خدا تعالیٰ کا خاص احسان ہے اور تم پر وہ احسان نہیں" غرض صورت میں کامل اور غیر کامل یکساں معلوم ہوتا ہے کامل کو منِ الٰہی سے امتیاز ہوتا ہے اور منِ خداوندی کی اطلاع کسی کو نہیں ہوسکتی بجز اس کے جس کے آنکھیں ہوں اس لئے کامل کا پہچاننا بڑا مشکل ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام ۂ پس سخن کوتاہ باید والسلام

"ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا، پس کلام کوتاہ کرنا چاہیئے"

یہ بڑی غلطی ہے کہ ناقص کامل کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگے اور ان کو زیادہ باتیں کرتے ہوئے دیکھکر یہ سمجھنے لگے کہ وہ بھی اس کی طرح لایعنی میں مشغول ہیں، کیونکہ کاملین کو حق تعالیٰ ایک ایسا ذوق عطا فرمادیتے ہیں جس سے باتیں کرتے کرتے ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ اب خاموشی کی حد آگئی ہے اُس وقت وہ فوراً خاموش ہوجاتے ہیں، اور ناقص کو یہ ذوق حاصل نہیں وہ اگر زیادہ باتیں بنائے گا تو ضرور لایعنی میں مبتلا ہوگا اس لئے اس کو زیادہ باتیں

کرنا مضر ہے اور کامل کو مضر نہیں کاملین کی باتیں بھی ذکر ہی ہوتی ہیں، اور جس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ ان کی باتوں سے خواہ وہ دین کے متعلق ہوں یا دنیا کے اہل مجلس پر ذکر اللہ کا اثر غالب ہوتا ہے، اور جتنی دیر تک بھی کوئی ان کے پاس بیٹھا باتیں سنتا رہے حق تعالےٰ ہی کی طرف متوجہ رہیگا، اور ناقص کی باتوں میں یہ اثر نہیں ہوتا ۱۲)

ایک دفعہ مولانا فتح محمد صاحب کو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں زیادہ دیر لگ گئی، اور اٹھتے وقت بطور معذرت کے حضرت سے عرض کیا کہ آج حضرت کا بہت حرج ہوا کیونکہ یہ وقت عبادت کا تھا۔ فرمایا کہ میاں کیا تسبیح چلانا ہی عبادت ہے، دوستوں سے باتیں کرنا بھی تو عبادت ہے (کیونکہ اس میں تطییب قلب مسلم ہے ۱۲) اور ایک بار میرا نام لے کر فرمایا کہ میاں اشرف علی جب ہم مجلس میں باتیں کرتے ہوں اس وقت بھی تم ہمارے باطن کی طرف متوجہ رہا کرو یہ مت سمجھنا کہ اس وقت تو باتوں میں مشغول ہیں اس لئے باطن سے فیض نہ ہوگا، بھائی ہمارا باطن اس وقت بھی

۱۸ ذکر ہی میں مشغول ہوتا ہے تو بات کیا ہے، اس کا راز یہی ہے کہ کامل باتیں بھی عبادت ہی کی نیت سے کرتا ہے اس کا باطن اس وقت بھی مشغول بحق ہوتا ہے، اسی لئے اس کو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ اب خاموشی کا وقت ہے اور اس وقت بولنے کی ضرورت ہے، اس وقت مزاح کی ضرورت ہے تو اس کا کوئی قول و فعل عبادت و ذکر سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے کامل کو ہنسی مزاح اور زیادہ باتوں میں مشغول دیکھکر اپنے اوپر قیاس کرکے اس پر اعتراض نہ کرنا چاہئے، جن باتوں کو تم فضول سمجھتے ہو وہ کسی حکمت یا ضرورت کی وجہ سے ان میں مشغول ہوتا ہے، صوفیہ نے اس کو خوب سمجھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خلوتِ طویلہ سے طبیعت گھبرا جائے تو چند روز کے لئے خلوت کو چھوڑ کر لوگوں سے ملنا ملانا اور دوستوں سے باتیں کرنا اور ہنسی مزاح کرنا چاہئے، یا کچھ دنوں کے لئے سفر کرکے کسی شہر میں سیر و تفریح کے لئے چلا جانا چاہئے، بلکہ امام غزالیؒ نے تو اس حالت میں ان امور کے اختیار کرنے کو واجب لکھا ہے، جس کی وجہ سے انپر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا، کہ انھوں نے مباحات بلکہ بظاہر فضولیات کو واجب کہدیا

مگر امام کی رائے صحیح ہے، کیونکہ قاعدہ فقہیہ ہے مُقَدِّمَۃُ الْوَاجِبِ وَاجِبٌ کہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے اور جب طبیعت اعمالِ طاعات سے گھبرانے لگے تو اسکو طاعات کی طرف مائل کرنا واجب ہے ورنہ یہ حالت بڑھتے بڑھتے تعطل کی طرف مفضی ہوجائے گی، اور جب کثرتِ اعمال سے طبیعت اُکتا جائے تو اس صورت میں انشراح وانبساط کے لئے اختلاط وسیر وتفریح ومزاح بھی مفید ہوتا ہے، اس راز کو محقق ہی سمجھ سکتا ہے، غیر محقق تو ایسے موقع میں یہ بتلائے گا کہ یَا بَاسِطُ کا وظیفہ پڑھو، یَا فَتَّاحُ کا ورد کرو، مگر محقق اس کی رائے پر ہنستا ہے اور کہتا ہے ؎

بے خبر بودند از حالِ دروں ✿ استعیذ اللہ مما یفترون

جن طبیبوں نے علاج کیا ان کو اندرونی بیماری کا پتہ نہ چلا، پناہ مانگتا ہوں اطباء کے اس افتراء اور بہتان سے

اس جگہ مولانا نے طبیبِ الٰہی کا قول نقل فرمایا ہے کہ اس نے دوسرے اطباء کی رائے سُنکر یہ کہا ہے ؎

19 گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند ✿ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

اطباء نے مرض پہچانا نہیں، علاج مرض کے خلاف ہونے سے بیماری اور بڑھ گئی

سو غیر محقق تو اس موقع پر ایک وظیفہ اور بڑھا دیتا ہے، یہ نہیں دیکھتا کہ وظیفوں ہی سے تو یہ حالت پیدا ہوئی، مگر وہ اُلٹا اور وظیفہ ہی بڑھاتا چلا جاتا ہے تو اس سے مرض کم ہوگا یا بڑھے گا، ظاہر ہے کہ جب سببِ مرض میں اضافہ ہوگا تو مرض کی بھی ترقی ہوگی، محقق اس وقت علاج بالضد کرتا ہے، وظیفوں سے قبض ہوا ہو تو وہ ترکِ وظائف کی تعلیم کرتا ہے، خلوت سے انقباض ہو تو وہ ترکِ خلوت کا امر کرتا ہے، اور اس سے بہت جلد حالت میں افاقہ ہوجاتا ہے۔ میرے ایک دوست تھے مولوی صادق الیقین صاحب مرحوم، وہ بیعت تو حضرت حاجی صاحبؒ سے تھے، اور اجازت یافتہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے تھے، مجھ سے بھی ان کو محبت وعقیدت کا تعلق تھا، ایک دفعہ ان پر قبض شدید طاری ہوا، تو مجھے اطلاع کی، کیونکہ میں اس وقت ان کے وطن سے قریب کانپور میں تھا، میں نے لکھا کہ آپ کچھ دنوں کو ذکر وشغل اور

خلوت بالکل ترک کر دیجئے اور لکھنؤ جا کر چوک وغیرہ میں سیر و تفریح کیجئے۔ اول تو ان کو اس جواب سے بڑی وحشت ہوئی، مگر انھوں نے اس پر عمل کیا۔ اس طریق میں انقیاد و اتباع کی بہت ضرورت ہے خود رائی اس طریق میں سدّ راہ ہے، چنانچہ انھوں نے انقیاد سے کام لے کر فوراً عمل کیا دو ہی تین دن میں سارا قبض جاتا رہا، اور شدت سے بسط طاری ہوا، اب ایسا شخص اگر ہنسی مزاح میں مشغول ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ علاجاً ایسا کر رہا ہے اور ضرورت کی وجہ سے ان کو اختیار کر رہا ہے مگر ظاہر بین کو کیا خبر وہ تو صرف یہ دیکھ کر کہ یہ شخص زاہد و عابد ہو کر شیخ و صوفی ہو کر ہنسی مذاق کر رہا ہے اس کو یہ کیا معلوم ہے کہ اس وقت اس کا ہنسنا اور مزاح کرنا ہی عبادت ہے کیونکہ مقدمہ واجب ہے،

غرض جن امور مباحہ کو فضول کہا جاتا ہے وہ اسی وقت تک فضول ہیں جب ان سے دین میں کوئی نفع نہ ہو، اور اگر کوئی مباح دین میں نافع ہو تو وہ فضول نہیں، اس لئے بے ضرورت مباحات میں مشغول ہونا بھی برا اور ضرورت کے وقت مشغول نہ ہونا بھی
۲۰ برا ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ مباحات بھی اپنے اثر کے اعتبار سے مامور بہ میں داخل ہیں بحمد اللہ اس تقریر سے **مَا عَلَيْهِ الصَّبْر** کی تعیین بخوبی ہو گئی، اور صبر کی حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو گئی، شبہات کا ازالہ بھی ہو گیا،

خلاصہ یہ ہے کہ ناگوار واقعات کے وقت دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ جو طریق حق تعالیٰ کی طرف پہونچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے اس میں تو خلل نہیں آیا، خواہ وہ واجبات ہوں یا مستحبات، کیونکہ مستحبات کی پابندی بھی خواص کے لئے ایک درجہ میں ضروری ہے۔ حدیث میں ہے أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللهِ أَدْوَمُهَا، کہ حق تعالیٰ کی طرف سب اعمال میں زیادہ محبوب وہ ہیں جن پر دوام کامل ہو، اس میں لفظ اَحَبُّ عاشق کی نظر میں دوام کی ضرورت کو بتلا رہا ہے، کیونکہ جب ایک چیز حق تعالیٰ کو محبوب ہے تو عاشق کو ان کے سامنے محبوب ہی چیزیں پیش کرنا چاہئے۔ لفظ اَحَبُّ سے دوام کی عدم ضرورت پر وہی استدلال کرے گا، جس میں محبت و عشق نہ ہو ورنہ عاشق تو یہ سن کر کہ محبوب فلاں چیز سے خوش ہوتا ہے اس پر جان نثار کر دے گا،

اور جب تک محبوب ہی اس سے منع نہ کرے اس وقت تک اس کو اپنے ذمہ لازم کریگا، میں پوچھتا ہوں کہ آخر عبادت اور عمل سے مقصود کیا ہے، ظاہر ہے کہ رضا حق مطلوب ہے، تو عامل کو ضروری ہے کہ عمل اس طرح کرے اور اس میں وہ طریق اختیار کرے جس سے محبوب خوش ہوتا ہو، اور حدیث سے معلوم ہو چکا کہ حق تعالیٰ دوام سے خوش ہوتے ہیں، تو دوام کا اہتمام ضروری ہوا، اور دوسری حدیث میں تو اس کی تصریح ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یَا عَبْدَ اللّٰہِ لَا تَکُنْ مِثْلَ فُلَانٍ کَانَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ ثُمَّ تَرَکَ " اے عبداللہ (بن عمر) تم فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا جو رات کو اٹھا کرتا تھا پھر قیام لیل ترک کر دیا، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معمول مستحب کے ترک پر صراحۃً کراہت کا اظہار فرمایا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مستحب کو معمول بنا کر بلا عذر ترک کر دینا ایک گونہ مکروہ ہے تو دوام ضروری ہوا، اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ عمل تھوڑا سا اختیار کرو جس پر نباہ ہو سکے، اور کسی وقت زیادہ کا شوق ہو تو میں کہتا ہوں کہ اس وقت زیادہ کر لو، مگر اپنے ذمہ زائد کو لازم نہ کرو، معمول اسی مقدار کو سمجھو ۲۱
جس پر نباہ کر سکتے ہو، اور اسی کی پابندی کو لازم سمجھو، کبھی نشاط و سرور ہو تو زیادہ بھی کر لو مگر اس کی پابندی کو لازم نہ سمجھو، اس صورت میں اگر کبھی زیادہ نہ ہو سکا تو قلیل کو ادا کر کے تسلی ہو جائے گی کہ ہاں معمول پورا ہو گیا، کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ بغیر معمول پورا کئے تسلی نہیں ہوتی، (اور یہی حکمت ہو صوفیہ کے اس فعل کی کہ وہ طالبین کے لئے ذکر کی کوئی مقدار معین کر دیتے ہیں، حالانکہ ذکر ایسی چیز ہے کہ اس کی کوئی مقدار معین نہ ہونا چاہئے، جتنا بھی زیادہ ہو اچھا ہے، مگر بغیر تعیین مقدار کے ذاکر کی تسلی نہیں ہو سکتی وہ ہر دن اسی فکر میں رہیگا کہ نہ معلوم جتنا ذکر میں کر رہا ہوں یہ وصول الی المطلوب کے لئے کافی بھی ہے یا نہیں، اور جب شیخ نے ایک مقدار معین کر دی اب اس کو پورا کر کے تسلی ہو جاتی ہے ۱۲) اور اس طریق میں تسلی قلب و جمعیتِ خاطر کی رعایت بہت ضروری ہے اس لئے اپنے ذمہ عمل اتنا ہی لازم سمجھو جس کو نباہ سکو، زیادہ کو معمول نہ بناؤ تا کہ روزانہ قلب کو تسلی حاصل ہوتی رہے کہ کام پورا ہو گیا، اہل اللہ کو جمعیتِ قلب کا

بہت زیادہ اہتمام ہوتا ہے، کیونکہ اس طریق کا مدار اسی پر ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے اسی لئے حق تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ میرا عمر بھر کا رزق ایک دم سے دیدیا جائے، ارشاد ہوا کیا ہمارے اوپر اعتماد نہیں، عرض کیا اعتماد تو ہے مگر شیطان روز آکر مجھے پریشان کرتا ہے کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا، میں جواب دیتا ہوں کہ اللہ دے گا وہ کہتا ہے کہ اللہ تو دے گا مگر یہ تو وعدہ نہیں کہ کب دے گا، ممکن ہے کہ تین چار روز بھوکا رکھکر دیں، پس یہاں آکر میں خاموش ہو جاتا ہوں، اگر آپ مجھے عمر بھر کا رزق ایک دم سے دیدیں تو میں اس کو اپنے گھر میں بھر کر قفل لگا دوں، اور جب شیطان کہے گا کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا تو میں کہدوں گا کہ دیکھ اس کوٹھری میں سے کھاؤں گا، ان بزرگ نے جمع و طمع کے ذریعہ سے (مگر طمع من اللہ) جمعیتِ قلب کو حاصل کرنا چاہا، اور بعضے قناعت و توکل کے ذریعہ سے اس کو طلب کرتے ہیں، بہرحال کامل کا مطلوب رضا و جمعیتِ قلب مع اللہ ہے خواہ طمع سے حاصل ہو یا توکل سے، جس میں خدا تعالیٰ نے طمع ہی کا مادہ رکھا ہے وہ توکل اور قناعت کو کیونکر
۲۲ اختیار کرے، وہ تو طمع ہی ظاہر کر کے جمعیت کا طالب ہوگا، اسی کو فرماتے ہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں ؎ خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

"جب دین کا بادشاہ مجھ سے طمع کا اظہار کرے، تو پھر ایسی قناعت پر خاک پڑے"

لیکن وہ مخلوق سے طمع ظاہر نہ کرے گا بلکہ محبوب سے ظاہر کرے گا، اسی طرح جس کو خدا تعالیٰ نے راحت کا عادی بنایا ہے وہ راحت ہی کے ذریعہ سے جمعیت طلب کرے گا، اچھے کپڑے پہنے گا، اچھا کھانا کھاوے گا، اور جب تک حق تعالیٰ ہی مشقت نہ بھیجیں اس وقت تک وہ اپنے اختیار سے طریقِ مشقت کو کبھی اختیار نہ کرے گا، اور جب حق تعالیٰ ہی اس کو مشقت میں ڈالتے ہیں تو اس میں دوسروں سے زیادہ رضا و تحمل ظاہر ہوتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من ؎ دل فدائے یارِ دل رنجانِ من

"تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے، دل فدا ہو ایسے یار پر جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے"

اور یوں کہتا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ٭ سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

"دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپکی تیغ کا کشتہ بنے، دوستوں کا سر ہی سلامت رہے کہ اس پر آپ کا خنجر چلے۔"

اس کا مذاق تفویضِ کلی ہوتا ہے، حق تعالیٰ جس حال میں رکھتے ہیں اسی میں خوش رہتا ہے۔ بعض لوگ یہاں آئے اور کہنے لگے کہ یہاں تو فقیری معلوم نہیں ہوتی، اچھے کپڑے پہنتے ہیں، اچھا کھانا کھاتے ہیں، میں نے کہا جاؤ کسی لنگوٹ بند کے یہاں، بلکہ کسی ننگ دھڑنگ کے یہاں جس نے لنگوٹہ بھی اُتار پھینکا ہو، آجکل بہت لوگ اسی مذاق کے ہیں کہ ننگ دھڑنگ آدمی کے جلدی معتقد ہو جاتے ہیں، اور وہ انھیں گالیاں بھی دے تو راضی رہتے ہیں، بلکہ اگر کفریات بھی بکے جب بھی معتقد رہتے ہیں، حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ کہیں چلے جاتے تھے، راستہ میں
۲۳ ایک مجمع دیکھا، معلوم ہوا کہ بیچ میں ایک ننگ دھڑنگ آدمی بیٹھا ہوا کمبخت کفریات بک رہا ہے، نالائق اپنے عضو کو ہلا ہلا کر کہتا ہے کہ توبہ توبہ یہ تو اللہ کا الف ہے۔
(نقل کفر کفر نباشد) اور بہت لوگ اس کے معتقد ہو رہے ہیں، شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک ہمراہی شاگرد سے فرمایا کہ اس شخص کی کمر میں ایک لات مارو اور یہ کہو کہ نامعقول بے پیرا معلوم ہوتا ہے بھلا کہیں الف کے نیچے دو نقطے بھی ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب جامع فنون تھے، ننگوں کا جواب انہی کے مذاق میں دیا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سارے معتقدین فَتَنَبَّرُوْا (جہالت) ہو گئے۔ اس طرح فتنہ فرو ہوا، اور یہ مذاق کچھ آج سے نہیں، پرانا مذاق ہے، لوگ ہمیشہ سے ایسے شخص کے کم معتقد ہوتے ہیں جو آدمیوں کی شکل میں ہو، عقل و تہذیب سے آراستہ ہو۔ چنانچہ کفار کو انبیاء پر یہی اعتراض تھا کہ یہ تو ہمارے جیسے آدمی ہیں، وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ نبی آدمی نہ ہونا چاہئے۔ یہی مذاق آجکل ہے کہ آدمیت کو کمال کے منافی سمجھتے ہیں، چنانچہ جتنا کوئی آدمیت سے گذرا ہوا ہو اس کے جلدی معتقد ہو جاتے ہیں۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ مصیبت کے وقت معمولات میں کمی نہ کرو، اور طریق وصول کی طرف متوجہ رہو، ورنہ یاد رکھو اگر تم طلب میں کمی کردو گے تو اُدھر سے بھی عطاء میں کمی ہو جائے گی، حق تعالیٰ اس وقت تک اپنا برتاؤ بندہ کے ساتھ نہیں بدلتے، جب تک وہ خود اپنے برتاؤ کو نہ بدلے، إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ جب ادھر سے برتاؤ بدلتا ہے تو اُدھر سے بھی معاملہ بدل جاتا ہے، صوفیہ کا ارشاد ہے مَنْ لَا وِرْدَ لَهٗ لَا وَارِدَ لَهٗ جس کا کچھ ورد نہ ہو اس پر وارد بھی نہیں ہوتا، اور اس طریق میں وارد بڑی نعمت ہے، جس سے جزئیات میں ہر دم الہام ہوتا رہے کہ اب یہ کرنا چاہیے اس وقت بولنا چاہیے، اس وقت خاموش رہنا چاہیے۔ اس طریق کے علوم کتابی نہیں ہیں، جو کتاب سے جزئیات کے احکام معلوم ہوتے رہیں، یہاں تو ہر جزئی کے لئے الہام کی ضرورت ہے، چنانچہ کامل کو ہر وقت الہام پر الہام ہوتا رہتا ہے، اور یہ حالت وِرد کی پابندی ہی سے حاصل ہوتی ہے، بدون وِرد
۲۴ کے وارد نہیں ہو سکتا، دوسرے یہ تو نادانی کی بھی بات ہے کہ ایک نقصان تو غیر اختیاری ہوا تھا، یعنی مصیبت تکوینیہ دوسرا ضرر اپنے اختیار سے مول لیا جائے یعنی ترکِ معمولات، دنیا دار بھی ایسا نہیں کرتے، ان کا بھی یہ قاعدہ ہے کہ ایک مد میں نقصان ہوتا ہے تو وہ دوسری مد میں ترقی کی فکر کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زمانۂ جاہلیت کے ایک حلیم کی حکایت بیان فرمائی تھی کہ اس کے بھتیجے نے اس کے بیٹے کو قتل کر دیا، لوگ قاتل کو پکڑ کر اس کے پاس لے گئے تو غایت حلم یہ تھا کہ اس نے اپنی نشست بھی نہیں بدلی جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح بیٹھا رہا، اور یہ کہا إِحْدٰى يَدَيَّ قَطَعَتِ الْأُخْرٰى میرے ایک ہاتھ نے دوسرے ہاتھ کو کاٹ دیا ہے، اب یہ حماقت ہے کہ میں دوسرے ہاتھ کو بھی کاٹ دوں، ثُمَّ قَالَ وَلٰكِنْ أَدُّوْا إِلٰى أُمِّ ابْنِي دِيَةَ ابْنِهَا مِنْ إِبِلِي فَإِنَّهَا لَا تَرْضٰى بِدُوْنِهَا۔ پھر کہا لیکن میری بیوی کو میرے اونٹوں میں سے اس کے بیٹے کی دِیت دیدو، کیونکہ وہ بدون دیت کے راضی نہ ہوگی۔"

دیکھئے یہ ایک کافر تھا جس نے ایک غیر اختیاری ضرر سے پریشان ہوکر اختیاری ضرر کو گوارا نہ کیا، تو کیا ہم کو مسلمان ہوکر ایسا نہ ہونا چاہئے؟ پس یہ بڑی حماقت ہے کہ ہم مصائب غیر اختیاریہ کی وجہ سے اپنے معمولات کو تباہ کرکے اختیاری ضرر میں مبتلا ہوں اس وقت اعمال پر جمارہنا یہی صبر ہے۔ ایک بات تو یہ قابل لحاظ ہے، دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ پابندیٔ طریق میں رضائے حق کا قصد کرو محض عادت کے طور پر پابندی نہ کرو۔ پس اگر کہیں ضرورت شدیدہ سے ترکِ معمول میں رضائے حق معلوم ہو تو وہاں ضرورت کے وقت تک معمول کو ترک کردو لیکن ذکرِ خدا سے اس وقت کو بھی خالی نہ جانے دو، چاہے چلتے پھرتے ہی ہو یا آہستہ ہی ہو ۱۲ جامع) اور اس ضرورت کے ختم پر پھر پابندی شروع کردو (ترکِ معمول سے جو بے برکتی ہوتی ہے وہ جب ہی ہے جب کہ ترک میں رضائے حق نہ ہو ورنہ رضائے حق کے ساتھ ہر حالت میں برکت ہی برکت ہے ۱۲) جب رضائے حق کا اہتمام ہوگا تو ہر حال میں وہی کام ہوگا جو امر کے موافق ہے، کسی حال میں مامور بہ ترک نہ ہوگا، اس سے قلب میں ایک حلاوت پیدا ہوگی، اور زبان و دل و گوش سب پابند ہوجائیں گے۔ جمعیت و سکون حاصل رہیگا، پریشانی کا نام بھی نہ رہے گا، اور جب امتثالِ امر میں خلل ہوتا ہے یا بلا وجہ معمولات ناغہ ہوتے ہیں تو خیالات میں تفرق ہوجاتا ہے اور خیالات کے تفرق سے رُوح بھی پریشان ہوجاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎ ۲۵

جاں ہمہ دم زیں لگد کوبِ خیال ٭ می شود مجروح و خستہ پائمال

انسان کا دل خیالات کی کش مکش سے ہر وقت زخمی اور بے حال و برباد رہا کرتا ہے ۔

نے صفامی ماندش نے لطف و فر ٭ نے بسوئے آسماں راہِ سفر

نہ اس میں صفائی باقی رہتی ہے اور نہ زندگی کا لطف باقی رہتاہے، نہ اس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی رہتا ہے ۔

صاحبو! حق تعالیٰ نے ہر شخص کو آسمان کی طرف سفر کرنے کی قوت عطا فرمائی ہے، مگر تشتتِ اعمال سے ہم اس قوت کو خود ہی کمزور کررہے ہیں، ذکر و طاعات د

امتثال امر کی پابندی اور التزام کرکے دیکھو انشاء اللہ خدا کے ساتھ دل لگا رہے گا اور چاروں طرف سے اطمینان نصیب ہوگا، اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے) عارف کو مصائب میں بھی یہ اطمینان نصیب ہوتا ہے اور اس کا قلب چاروں طرف سے مطمئن ہوتا ہے، یہ تو دنیوی پریشانی کا حال تھا کہ اس کی وجہ سے اعمال ومعمولات پر امتثالِ امر میں لوگ خلل ڈالتے ہیں۔

اب میں ایک باطنی پریشانی کا حال بتلانا چاہتا ہوں، جو بعض دفعہ پابندیٔ اعمال کے ساتھ پیش آتی ہے، وہ یہ کہ بعض لوگ اعمال ومعمولات پر پابندی کرنا چاہتے ہیں مگر جب کام کرنے بیٹھتے ہیں فوراً شیطانی وساوس اور نفسانی خطرات آکر گھیر لیتے ہیں، اور بعض دفعہ ایسے واہیات کفریہ وسوسے آتے ہیں جن سے سالک پریشان ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں طریق سے ہٹ گیا، اور خدا تعالیٰ کے یہاں سے مردود ہو گیا ہوں، اس حالت میں بہت لوگ کام کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، کیونکہ یہ وسوسے
۲۶ کام ہی کے وقت آتے ہیں، مگر یہ بڑی غلطی ہے، اس طرح تو تم نے شیطان کی مراد پوری کر دی، وہ یہی تو چاہتا تھا، چنانچہ ایک صاحب نے اس حالت کی وجہ سے تلاوت قرآن بالکل چھوڑ دی تھی، کیونکہ جب وہ قرآن پڑھنے بیٹھتے ساتھ ہی ساتھ دل میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گالیوں کے خطرات آتے تھے، ایک تفسیر تو جلالین کی تھی ایک تفسیر وبالین کی خود بخود ان کے ذہن میں آتی تھی، آخر وہ گھبرا گئے، اور تلاوت چھوڑ بیٹھے، مجھ سے یہ حال بیان کیا، میں نے کہا اس کا یہ علاج نہیں، اس کا یہ علاج ہے کہ خوب تلاوت کرو اور گالیاں ذہن میں آویں تو آنے دو یہ تو ویسا حال ہو گیا ہے

بحرِ تلخ و بحرِ شیریں ہمعناں ✽ درمیاں شاں برزخ لایبغیاں

بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے ایک دوسرے سے ملتے نہیں۔

کام کے ساتھ ان وساوس وخطرات سے کچھ بھی تنزل یا بُعد نہیں ہوتا، ہاں جب کام

چھوڑ دوگے تو بُعد کا اندیشہ ہے گو وساوس بھی نہ ہوں، اس لئے سالک کو طریق پر قائم ہوکر بے فکر رہنا چاہئے، عارف فرماتے ہیں ؎

درطریقت ہرچہ پیش سالک آید خیر اوست ✿ برصراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

یعنی جب تک صراطِ مستقیم پر جمارہے، یعنی اعمالِ اختیاریہ میں خلل نہ ڈالے تو بیفکر رہے، اب اس کے بعد چاہے بلا اختیار کچھ ہی ہوتا رہے کفر کے وسوسے آویں، یا معصیت کے، سب بے ضرر ہیں، بلکہ بخدا صراطِ مستقیم پر رہ کر تمام ظلمتیں انوار ہیں جیسے نورِ عین کہ وہ منبع انوار ہیں مگر خود سیاہ ہے، اور صوفیہ نے فرمایا ہے کہ لطیفۂ اخفیٰ کا لون بھی سیاہ ہے، اور تجلی ذاتی اصطلاحی سیاہ رنگ میں بھی ظاہر ہوتی ہے پس اگر اعمالِ اختیاریہ میں خلل نہیں تو قلب میں کیسی ہی ظلمات ہوں وہ سب خیر و نور ہی ہیں چاہے وساوس کفریہ ہی کیوں نہ ہوں، لہٰذا اُن سے گھبرا کر کام میں ہرگز خلل نہ ڈالنا چاہئے، اس طرح تو یہ قیامت تک بھی پیچھا نہ چھوڑیں گے، اس کا علاج یہی ہے کہ کام میں لگا رہے اور اُن پر التفات بھی نہ کرے۔ جب شیطان دیکھیگا ۲۷ کہ یہ تو خطرات سے گھبراتا ہی نہیں نہ کام میں کمی کرتا ہے تو وہ جھک مار کر خود ہی پیچھا چھوڑ دے گا۔ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو وضو کے بعد شبہ ہوگیا کہ شاید خفین پر مسح نہیں کیا، حضرت نے دوبارہ پھر مسح کرلیا۔ بس دوبارہ مسح کرنا غضب ہوگیا، فرماتے تھے کہ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ ہر دفعہ وضو کرکے جب نماز شروع کروں یہی وسوسہ آوے کہ مسح نہیں کیا، مہینہ بھر تک پریشان رہا، ایک مہینہ کے بعد جو مولانا مصلے پر نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے پھر وہی وسوسہ آیا، مولانا نے دوبارہ اعادہ مسح نہیں کیا، اور نماز کی نیت باندھ لی، شیطان نے کہا کہ بے وضو نماز ہوگی، مولانا نے فرمایا کہ ہونے دے، تیری بلا سے، اس نے کہا بے وضو نماز پڑھ کر کافر ہو جاؤ گے، کیوں کہ تم عمداً ایسا کررہے ہو، مولانا نے فرمایا کہ تیری بلا سے تو بڑا آدمیوں کو کافر ہونے سے بچانے والا نکلا ہے، اتنی دنیا کو تو کافر بنا رکھا ہے تجھے ان کی فکر نہ ہوئی، سب سے زیادہ میرے ہی کفر کی فکر ہوئی، جا، چاہے نماز ہو

یا نہ ہو، وضو سے ہو یا بے وضو ہو میں تو اب مسح کرتا نہیں، فرماتے تھے کہ بس اس دن
کے بعد شیطان نے پھر یہ وسوسہ نہیں ڈالا، یہ بڑا ہوشیار ہے۔ بعض دفعہ خیر خواہ
بنکر دھوکہ دیتا ہے، چنانچہ ایک بار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو تہجد کی نماز کے لئے
شیطان نے جگایا، پوچھا کون ہے؟ کہا میں ہوں ابلیس، فرمایا کیوں جگایا؟ کہا تہجد
کا وقت ہے، نماز پڑھ لیجئے، فرمایا کہ تجھے اس سے کیا مطلب تو ایسا خیر خواہ کب سے
بن گیا؟ کہا آخر کبھی تو میں بھی کام کرنے والا تھا ہی، وہ جوش آ گیا، تو فرمایا
کمبخت اس وقت تیرے اس جگانے میں بھی کوئی راز ہے، جب تک تو راز نہ بتلائیگا
اس وقت تک محض تیرے کہنے سے پیچھا نہ چھوڑوں گا، کہا صاحب بات یہ ہے کہ
میں نے کل آپ کا تہجد ناغہ کرا دیا تھا اور میں خوش ہوا تھا کہ آج ان کا نقصان
کر دیا، مگر تم نے جو صبح اُٹھ کر تہجد کے فوت ہونے پر رنج و غم اور آہ و افسوس کیا اس
سے تمہارے درجے اتنے بلند ہو گئے کہ تہجد سے بھی نہ ہوتے تو میں نے کہا اس سے تو
28 ان کا تہجد پڑھنا ہی اچھا ہے، یہ تو ناغہ کر کے آرام سے نیند بھی لیتے ہیں اور درجہ
بھی لیتے ہیں، تہجد میں کم از کم نیند تو خراب ہو گی، گو آخرت کا نقصان نہ ہو گا۔ حضرت
معاویہ رضی اللہ عنہ یہ راز سُن کر اٹھ بیٹھے اور تہجد کی نماز پڑھ لی، اس وقت اگر کوئی
غالی صوفی ہوتا تو شاید تہجد پڑھتا ہی نا، اور یہ کہتا کہ اس وقت تہجد پڑھنے میں شیطان
کی اطاعت ہے، حالانکہ اس کی تو مخالفت کرنا چاہئے، مگر اس کو بھی محقق ہی سمجھتا ہے
کہ شیطان کی مخالفت کہاں کرنا چاہئے، اگر ہر بات میں مخالفت کی جائے اور شیطان
دیکھ لے کہ اس کو میری مخالفت میں غلو ہے تو پھر وہ ہمیشہ نیک کاموں ہی کا امر کریگا،
تاکہ یہ شخص مخالفت کر کے طاعات سے محروم رہے۔ اس لئے محقق مخالفت میں بھی
غلو نہیں کیا کرتا، اگر اس وقت حضرت معاویہؓ تہجد نہ پڑھتے تو ظاہر ہے کہ یہ عمداً ناغہ
ہوتا اور اس پر وہ رنج و افسوس بھی نہ ہوتا، جو غلبۂ نیند پر ناغہ ہونے پر ہوا کرتا ہے تو
رنج و غم سے جو ترقی ہوتی وہ اب نہ ہوتی اور تہجد کا وقت پا کر اُسے بھی فوت کر دیتے تو
نقصان ہی نقصان تھا، نفع کچھ نہ ہوتا، اس لئے انھوں نے تہجد پڑھ لیا یہی تو باتیں

ہیں جن کی وجہ سے حدیث میں آتا ہے فَقِیْہٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ
ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے ۔ مراد فقیہ النفس ہے جو احکام
کے ساتھ نفس وشیطان کے مکائد سے بھی عارف ہو، اور سلف کی اصطلاح میں فقہ
محض علم ظاہر کے ساتھ مختص نہ تھا، بلکہ علم باطن بھی اس میں داخل تھا۔ چنانچہ
امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی تعریف مَعْرِفَۃُ النَّفْسِ مَالَہَا وَمَا عَلَیْہَا منقول
ہے جس میں علم اخلاق وسلوک بھی داخل ہے کیونکہ معرفۃ النفس مالہا وما علیہا
اس کو بھی شامل ہے، پس حدیث میں فقہ کے وہی معنی ہیں جو سلف میں متعارف تھے
نہ وہ معنی جو متاخرین کی اصطلاح ہے ۔ فقیہ ظاہر تو ہجوم وساوس سے ذکر اور تلاوت
قرآن کو چھوڑ بیٹھتا ہے جس سے شیطان اپنے مقصود میں کامیاب ہوجاتا ہے، مگر فقیہ
باطن کہتا ہے کہ اس حالت میں کام کو ہرگز نہ چھوڑے بلکہ کام میں لگا رہے چاہے کتنے
ہی وسوسے آئیں، کچھ پروا نہ کرے، اور وساوس سے ہرگز پریشان نہ ہو، نہ اُن کے دفع
کی کوشش کرے، اور نہ ازخود اُدھر متوجہ ہو بلکہ اپنی توجہ کو ہمت کے ساتھ ذکر وغیرہ ۲۹
میں مشغول کرے اور وساوس سے بے توجہی اور بے التفاتی برتے، انشاء اللہ چند
روز میں خود ہی سب وسوسے جاتے رہیں گے، اور شیطان اپنی مراد میں ناکام ہوکر خود ہی
پیچھا چھوڑ دے گا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر کسی وقت غیب سے بھی کوئی خطاب
پریشانی کا قلب پر وارد ہو اس سے بھی پریشان ہوکر کام کو نہ چھوڑے، کیوں کہ
کبھی غیب سے بطور امتحان کے کوئی بات کہدی جاتی ہے، کہ دیکھیں یہ شخص درجات
کے لئے عمل کر رہا ہے یا محض ہماری محبت میں کام کر رہا ہے، اس وقت کامیابی
کا طریقہ یہی ہے کہ عمل کو ہاتھ سے نہ دے، اور بدستور اپنے کام میں لگا رہے۔ چنانچہ
ایک بزرگ کو ذکر کے وقت غیب سے یہ آواز آتی تھی کہ تو کافر ہوکر مرے گا چاہے
کچھ ہی کر، وہ بڑے پریشان ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے، چونکہ یہ عارف تھے اس لئے
یہ بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ آواز شیطان کی نہیں ہے بلکہ غیب ہی کی آواز ہے، اس
لئے پریشانی زیادہ تھی، قسمت سے اُن کے شیخ اس وقت زندہ تھے گھبرائے ہوئے شیخ

کے پاس گئے، واقعی شیخ بھی بڑی نعمت ہے سالک چاہے کتنا ہی کامل ہو جائے، مگر شیخ کی احتیاج فی الجملہ باقی رہتی ہے، کامل کو بھی بعض دفعہ ایسی حالت پیش آتی ہے جس کو وہ خود حل نہیں کر سکتا، اس وقت شیخ ہی امداد کرتا ہے، چنانچہ انھوں نے اپنے شیخ سے اس حالت کو بیان فرمایا، فرمایا کام میں لگے رہو اور اس آواز سے پریشان نہ ہو، یہ دشنامِ محبت ہے، معشوقوں کا قاعدہ ہے کہ عاشقوں کو بعض دفعہ ناز و انداز سے یوں ہی پریشان اور تنگ کیا کرتے ہیں، سبحان اللہ واقعی شیخ محقق تھا، کیا قیمتی بات کہی کہ یہ دشنامِ محبت ہے، غور کیجئے کہ طالب کی اس جواب کو سنکر کیا حالت ہوئی ہوگی، بس اب تو وہ محبوبِ حقیقی سے یوں کہتا ہوگا ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ؎ جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

"تو نے مجھے برا کہا مگر میں خوش ہوں، تیرے لب کے لئے جواب تلخ تلخ ہی بہتر ہے"

اور شیخ کو اس طرح دعائیں دیتا ہوگا ؎

۳۰ جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ؎ مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

"اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور میرا محبوب حقیقی سے تعلق پیدا کر دیا"

اور شیخ کے پاس سے یہ کہتا ہوا لوٹا ہوگا ؎

از درِ دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم ؎ ہمہ غم آمدہ بودم ہمہ شاداں رفتم

"دوست کے دروازہ پر ہم کس حال میں گئے تھے سب غمگین گئے تھے سب خوش و خرم واپس لوٹے"

اور یوں کہتا ہوگا ؎

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند ؎ واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند (حافظ)

"کل رات صبح کے وقت غم و غصہ سے مجھکو نجات دی، رات کی اندھیری میں مجھکو حیاتِ نو بخشی"

باقی یہ کہ دشنامِ محبت کذب تو نہ ہوا اور خوش خاتمہ کو بدخاتمہ کہنا تو کذب جواب یہ ہے کہ قرآن میں مومن کو کافر بالطاغوت کہا گیا ہے، ممکن ہے کہ معنی اس وارد کے یہ ہوں گے کہ تو مومن ہو کر مرے گا خواہ تجھ سے کوئی معصیت صادر

ہو جاوے جیسے حدیث میں ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ (جو عمل چاہو کرو، میں نے تمھیں بخشدیا) تو دیکھیے غیر محقق تو شیطانی خطرات سے بھی پریشان ہو جاتا ہے اور محقق عالمِ بالا کے دلشکن خطابات سے بھی پریشان نہیں ہوتا، وہ ان کو بھی دشنامِ محبت سمجھ کر اپنے کام میں لگا رہتا ہے، اور میں کہتا ہوں کہ اگر وہ دشنام محبت بھی نہ ہو بلکہ ظاہری پر محمول ہو تب بھی عمل کو ترک نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اگر یہ عمل کی حالت میں کافر ہوگا تو بدون عمل کے تو اکفر ہوگا، پھر ترکِ عمل سے فائدہ کیا، صاحب اگر وحیِ قطعی سے بھی کفر پر خاتمہ ہونے کا علم ہو جائے جب بھی عشق کا مقتضٰے یہ ہے کہ محبوب سے تعلق محبت کو ترک نہ کرے بلکہ محبت میں ثابت قدم رہے ؎

ورنہ شاید بدوست رہ بردن ؛ شرطِ عشق است در طلب مُردن

عاشقانِ مجازی میں بھی جو سچے عاشق ہیں انھوں نے ایسا کر کے دکھلا دیا ہے، مجنوں کو لیلیٰ سے محبت تھی مگر لیلیٰ کے باپ نے اس کی شادی دوسرے شخص سے کر دی جب مجنوں کو یہ خبر پہونچی تو کہنے لگا ؎ ۳۱

وما اکثر الاخبار ان قد تزوجت ؛ فهل یاتینی بالطلاق بشیر

اور مرتے دم تک باوجود وصال سے ناامیدی کے محبت وعشق پر ثابت قدم رہا ۱۲ جامع)

بوستان میں ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ ایک رات وہ تہجد کے لئے اٹھے، تو غیب سے آواز آئی کہ یہاں کچھ قبول نہیں چاہے کتنا ہی کر، اور یہ آواز اتنے زور سے آئی کہ ایک مُرید نے بھی سُن لی، مگر وہ بزرگ اللہ کے بندے وضو کر کے تہجد میں مشغول ہو گئے، اگلا دن ہوا تو پھر حسب معمول تہجد کو اٹھے، مرید نے کہا حضرت ایسی بھی کیا بے غیرتی ہے کہ وہ تو دھکے دیں اور آپ پھر بھی لپٹتے ہیں، جب وہاں کچھ قبول ہی نہیں تو آپ خواہ مخواہ اپنی راحت میں کیوں خلل ڈالتے ہیں؟ یہ سُنکر بزرگ رونے لگے اور فرمایا بیٹا یہ تو بتلاؤ کہ اس دروازہ کو چھوڑ کر میں جاؤں کہاں، اس لئے بھی تو نہیں جہاں ان کو چھوڑ کر چلا جاؤں، بس میرا تو یہی ایک در ہے اور اسی پر دیدوں گا چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں انھیں اختیار ہے۔ روتے ہوئے شیخ

توانی ازاں دل بپرداختن ؎ کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

اس شخص سے دل کیسے خالی کر سکتے ہو جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اس کے گذر کر سکتے ہو "

بس اس پر دریائے رحمت کو جوش آگیا، اور پھر آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت ؎ کہ جز ما پناہے دگر نیستت

قبول ہے اگرچہ کمال کی کوئی بات اس میں نہیں سوائے اس بات کے کہ تونے یہ کہدیا کہ ہمارے سوا پناہ کی کوئی دوسری جگہ نہیں "

کہ جاؤ قبول کر لیا مگر اس کے ساتھ ایک چرکہ بھی لگا دیا کہ گو ہنر تو کچھ نہیں مگر ہم کو رحم آتا ہے اس لئے قبول کر لیا کیونکہ تیرا ہمارے سوا کوئی ٹھکانا نہیں،

تو صاحبو! اہل اللہ تو اس حالت میں بھی کہ صاف صاف غیب سے مردود کر دیا جائے عمل کو نہیں چھوڑتے پھر حیرت ہے کہ ہم ذرا ذرا سی مصیبت یا ہجوم وساوس سے عمل کو ترک کر دیں، پس اب میں ختم کرتا ہوں، خلاصہ سارے بیان کا یہ ہوا کہ ناگوار واقعات میں جس
۴۲ صبر کی ہم کو تعلیم کی گئی ہے اس کی حقیقت امتثالِ امر ہے اور مامور بہ ما علیہ الصبر ہے۔ پس ایسی حالت میں ہم کو احکام پر مستقیم رہنا چاہئے اور عمل میں خلل نہ ڈالنا چاہئے اور عمل میں مقصود پر نظر رکھنی چاہئے جو کہ رضا حق ہے، اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں کیونکہ بدون ان کی امداد کے نرے علوم و مجاہدات سے کچھ نہیں ہو سکتا، جو کچھ ہوتا ہے ان کی عنایت ہی سے ہوتا ہے ؎ ایں ہمہ گفتیم لیک اندر بسیچ ؎ بے عنایاتِ خدا ہیچیم ہیچ !

(یہ سب جو کچھ ہم نے کہا بغیر حکم خداوندی ہم ہیچ ہیں اور کچھ نہیں کہہ سکتے)

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق ؎ گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

بغیر حکم خداوندی اور خاصانِ خدا کی عنایت کے اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق بھی سیاہ ہے "

حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں، اور عمل کی ہر حال میں توفیق دیں، آمین،

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ تمت

(نوٹ) اس رسالہ کا سال ختم ہو گیا براہ کرم آئندہ سال ۱۳۸۷ھ کیلئے پچیس ۲۵ روپے آج ہی بھیجدیں اور خریداری ختم نہ کریں۔ منی آرڈر بھیجنے کا پتہ:- مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء، متصل مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی

رسالہ الابقاء جمادی الاولیٰ جمادی الثانی ۱۴۰۷ھ شمارہ ۱ جلد ۵۸ — مطابق جنوری ۱۹۸۷ء

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلۂ التبلیغ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

النعم المرغوبۃ

(فی)

النعم المحبوبۃ

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

(اس وعظ کے متعلق ضروری تمہید)

للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

(یعنی)

افتتاح اسٹیشن تھانہ بھون ٹاؤن

ناظرین میں سے جن حضرات کو کبھی تھانہ بھون آنیکا اتفاق ہوا ہوگا اُنکو معلوم ہوگا کہ تھانہ بھون کا ریلوے اسٹیشن آبادی سے قریب دو میل کے فاصلہ پر واقع تھا اس لئے حضرت حکیم الامت دام مجدہم السامی کو جیسے تھانہ بھون کے قریب ریل کے جاری ہونیکی خوشی تھی کہ اس سے احباب کو آنے جانے میں سہولت ہوگئی ساتھ ہی یہ بھی تمنا تھی کہ اسٹیشن آبادی سے متصل بن جائے تو زیادہ سہولت و راحت ہو جائے کیونکہ رات کے وقت اور برسات کے موسم میں سفر کرنیکے لئے تو اسٹیشن کا دور ہونا بہت ہی گراں گذرتا تھا۔ الحمد للہ کہ حضرت اقدس کی یہ تمنائے دیرین پوری ہوگئی کہ حکام ریلوے نے اس تکلیف کا احساس کرکے ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء کو تھانہ بھون کی آبادی سے متصل عیدگاہ کے پاس جو آبادی سے پانچ منٹ کی مسافت ہے ایک دوسرا اسٹیشن عارضی طور پر بنام تھانہ بھون ٹاؤن کھولدیا اور یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر امتحان میں یہ اسٹیشن کامیاب ہوگیا تو ہم جلد اس کو مستقل کردینگے۔ یہ وعظ اسی جدید اسٹیشن کے افتتاح کی خوشی میں ہوا ہے تاکہ اس نعمت کا شکر ادا کیا جائے۔ ۴

پس جن صاحبوں کو حضرت حکیم الامت دام مجدہم سے قلبی تعلق ہے اُن کو چاہیئے کہ وہ بھی اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ حضرت مولانا کی تمنا کو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا۔ اور اس کی ساتھ عملاً بھی اس اسٹیشن کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں جسکی صورت یہ ہے کہ جو صاحب تھانہ بھون کا قصد کریں وہ سہارنپور و شاہدرہ وغیرہ میں جب تھانہ بھون کا ٹکٹ لیں تو تھانہ بھون ٹاؤن کے نام سے ٹکٹ لیں اور اسٹیشن پر اُتریں صرف تھانہ بھون کا ٹکٹ نہ لیں کیونکہ یہ نام قدیم اسٹیشن کا ہے جدید اسٹیشن کا نام تھانہ بھون ٹاؤن ہے فقط۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ (جامع وعظ ہذا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

النعم المرغوبة فی النعم المركوبة

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	لِمَ	ماذا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	الاشتات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	سبب بیان کیا تھا	کیا مضمون تھا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	متفرقات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

۳

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا
ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد
ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ

صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم ۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ وتحمل اثقالکم الیٰ بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس ان ربکم لرؤف رحیم ۔ والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ ط ویخلق ما لا تعلمون ۔

یہ سورۂ نحل کی آیات ہیں جنمیں حق تعالیٰ نے خاص انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔ ہرچند کہ حق تعالےٰ کی بہت سی نعمتیں ہیں جن کا شمار بھی نہیں ہوسکتا چنانچہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے ارشاد فرمایا ہے۔ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو ان کا احاطہ نہیں کرسکتے) مگر اس کثرت وتعدد کی ساتھ دو دو قسم پر منقسم ہیں۔ ایک قسم تو وہ نعمتیں ہیں جنسے ملابست زیادہ ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن سے ملابست زیادہ نہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ جن نعمتوں کے ساتھ تلبس زیادہ رہتا ہے ان کی طرف تو کچھ توجہ ہوتی بھی ہے اور ان کا شکر بھی کر لیتے ہیں کبھی کبھی زبان سے بھی دل کی موافقت کے ساتھ یہ لفظ نکل جاتا ہے کہ اللہ تیرا شکر ہے اور جنکی ساتھ تلبس کم ہے انکی طرف التفات بھی کم ہے اور ان کا شکر بھی کم کیاجاتا ہے بلکہ غالب حالت یہ ہے کہ ان کا شکر نہیں کیا جاتا۔ ان نعمتوں میں سے جنکی ساتھ تلبس کم ہے اور اسی لئے انکی طرف التفات کم ہے مرکوبات بھی ہیں (یعنی سواری کی چیزیں) کیونکہ ظاہری نعمتیں چند ہیں ماکولات۔ مشروبات۔ ملبوسات۔ منکوحات۔ مسکونات۔ (معلومات ۲) اور مرکوبات میں نے قافیہ کے لئے مرکوبات کہہ دیا ہے ورنہ مستعمل مراکب ہے مجھے اسکی تحقیق نہیں کہ مرکوب کی جمع مرکوبات صحیح ہے یا نہیں تحقیق کرلیا جائے۔ ان میں سب سے زیادہ تلبس تو اول کی تین نعمتوں سے ہے یعنی ماکولات ومشروبات وملبوسات سے اسی لئے عام طور پر لوگ انہی کو نعمتوں میں شمار کرتے ہیں اور اسی پر شکر کرتے ہیں چنانچہ کھانا کھاکر پانی پی کر عام طور سے لوگ خدا کا شکر کرتے ہیں اور نیا کپڑا پہن کر بھی بعض لوگ شکر بجالاتے ہیں (اور معلومات سے عوام کو تلبس کم ہے اہل علم کو زیادہ ہے مگر اسکی طرف ان میں سے التفات بہت کم لوگوں کو ہے ہاں جب کوئی نیا علم حاصل ہوتا ہے تو اکثر التفات ہوتا ہے اور اس پر بھی شکر ادا کرتے ہیں ۱۲) اسکے بعد تلبس زیادہ منکوحات ومسکونات سے ہے کیونکہ بیوی سے ہر روز تلبس ہوتا ہے اور

گھر سے بھی گو دن میں تلبس کم ہو مگر رات میں ضرور ہوتا ہے اسی لئے حدیث میں جو آیا ہے کہ تین چیزوں میں نحوست ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہ ہے کہ اگر نحوست کسی چیز میں ہوتی تو ان تین میں ہوتی المرأة والدار والفرس یعنی عورت میں اور مکان میں اور گھوڑے میں۔ یہ پہلی روایت کی تفسیر ہے تو اسکی وجہ یہی ہے کہ ان سے تلبس زیادہ ہے اور جس چیز سے زیادہ تلبس ہوتا ہے اُس کے آثار پر نظر زیادہ ہوتی ہے اور اسکے عیوب سے تکلیف بھی زیادہ ہوتی ہے اور فرس ہر چند کہ مرکوبات سے ہے اور میں نے اوپر کہا تھا کہ مرکوبات سے تلبس کم ہے اور حدیث میں اسکو دار و مراة کی ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی ساتھ بھی تلبس زیادہ ہے (بناءً علی الوجہ الذی ذکرناہ) سو اس کی توجیہ یہ ہے کہ فرس کے ساتھ مالک فرس کو تلبس اختلاط زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اُس کو کھلاتا پلاتا ہے اُس کی خدمت کرتا ہے خصوصاً اہل عرب کو زیادہ اختلاط تھا۔ وہ گھوڑوں سے بہت محبت کرتے تھے حتیٰ کہ اپنی اولاد کی طرح محبت سے اُن کو پالتے تھے اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ گھوڑوں کے انساب بھی محفوظ رکھتے تھے۔ اسی لئے عرب کے اشعار میں آپ کو گھوڑوں کی بہت تعریف ملے گی حضرت حسان بن ثابت (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر خاص ہیں ۱۲) فرماتے ہیں ؎

تظل جیادنا متمطرات یلطمهن بالخمر النساء

(ہمارے گھوڑے فتح مکہ کے دن کیے بعد دیگرے آگے بڑھتے ہونگے اور عورتیں اپنی اوڑھنیوں سے اُن کے منہ پر طمانچہ[عہ] مارتی ہونگی) یا یہ مطلب ہے کہ ہماری عورتیں اپنی اوڑھنیوں سے اُن کے منہ صاف کرینگی۔ یعنی جنگ میں جو غبار وغیرہ ان کے منہ پر لگ گیا ہوگا میدان جنگ سے واپسی پر اُس کو اپنے دوپٹوں سے دور کرینگی اختار المعنی الاول المولوی حبیب احمد فی ترجمۃ کلام الملوک والمختار عندی المعنی الثانی وھو الذی اختارہ صاحب مجمع البحار

عہ یعنی جب مردوں کو مقابلہ کی تاب نہ رہیگی تو عورتیں گھروں سے نکلکر مقابلہ کریں گی اور گھوڑوں کے منہ پر اوڑھنیاں ماریں گی۔ قال ابن اسحٰق بلغنی عن الزہری انہ قال لما رای رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم النساء یلطمن الخیل بالخمر تبسم الی ابی بکر الصدیق اھ ای وذکر قول حسان ہذا کذا فی السیرۃ لابن ہشام (ص۲۵۱ ج۲) قلت وقد رائیت فی موضع ولا احضرہ الآن انہن کن نساء الانصار وہذا یناسب المعنی الذی ذکرتہ ثانیا ای کن یمسحون وجوہ الخیل بخمرہن تصدیقا بقول حسان شاعر الانصار ۱۲ ظفر

صفحہ ۲۵۴ ای یمسحن النساء بھا واستعار لہ اللطم ای ینفضن ما علیہا بخمرھن لینز لن الغبار یعنی تعا عنہ لم اھ) پس اختلاط کے اعتبار سے تو گھوڑے کیساتھ تلبس زیادہ ہے مگر رکوب کے اعتبار سے تلبس کم ہے اسی لئے میں نے کہا تھا کہ مرکوبات اُن نعمتوں میں سے ہیں جنکی ساتھ تلبس کم ہے یعنی رکوب کے اعتبار سے کم ہے اسی لئے نکاح پر شکر کیا جاتا ہے گھر بنا کر شکر کیا جاتا ہے اور سواری کا جانور خریدتے وقت تو شاید شکر کر لیا جاتا ہو مگر سواری کے وقت بہت کم شکر کرتے ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ نعمت مرکوب کی طرف التفات کم ہے اس لئے میں اس وقت اس نعمت کا بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس پر توجہ و التفات زیادہ ہو اور اس کا بھی شکر ادا کیا جائے اور اسوقت یہ مضمون جو اختیار کیا گیا ہے حالانکہ پہلے سے بیان کا خیال نہ تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض صاحبوں نے درخواست کی ہے اور یہ درخواست ایسے وقت کی ہے جبکہ ایک خاص نعمت ہمکو عطا ہوئی ہے کہ ایک خاص مرکوب میں ہمکو سہولت کا سامان عطا کیا گیا ہے اس وجہ سے یہ مضمون جو نعمت مرکوبات کے متعلق ہے اختیار کیا گیا ہے۔ اب سمجھئے کہ ایک بڑی نعمت تو ان مرکوبات کے متعلق یہ ہے کہ وہ باوجود اتنی قوت کے ہمارے مطیع ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس مقام پر جتنے مرکوبات کا ذکر فرمایا ہے وہ سب کے سب ہم سے زیادہ قوی ہیں۔ اور ہم شتر کی برابر تو کیا ہوتے شتر مرغ بھی نہیں بلکہ اس سے بھی کمزور ہیں۔ شتر مرغ عجیب جانور ہے۔ صورت میں تو اونٹ کے مشابہ ہے مگر اس کے دو بازو بھی ہیں جیسے پرندے کے ہوتے ہیں مگر ان سے وہ اُڑ نہیں سکتا ہاں بھاگتا خوب ہے اب نہ وہ بوجھ لادنے کے قابل ہے کیونکہ پرندوں میں شمار کیا جاتا ہے نہ پرندوں ہی میں داخل ہے۔ کیونکہ نام کے ساتھ شتر بھی لگا ہوا ہے فرید عطار فرماتے ہیں کہ نفس کی حالت بھی بالکل شتر مرغ جیسی ہے۔ صوفیہ ہر جگہ سے سبق لے لیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

چوں شتر مرغ شناس ایں نفس را — نے کشد بار و نہ پرد بر ہوا

گر بپرگوئیش گوید اشترم — ور نہی بارش بگوید طائرم

اگر اس پر بوجھ لادو تو کہتا ہے کہ میں تو پرندہ ہوں اور جو اُڑنے کو کہو تو کہتا ہے میں تو شتر ہوں کہیں اونٹ بھی اُڑا ہے۔ غرض نفس سے جو کام بھی لو تو وہ بہانہ ڈھونڈھتا ہے جیسے ہندوستان کے سود خوار کہ اگر ان سے یہ کہو کہ سود حرام ہے اس سے توبہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ دار الحرب

وجہ اختیار مضمون

۶ مرکوبات ایک نعمت ہیں شتر مرغ ... قوی بازو اور پر ... انسان ... ہیں

نفس کی حالت شتر مرغ جیسی ہے

ہندوستان کے سود خوار بھی شتر مرغ جیسے ہیں

میں سود لینا جائز ہے بعض علمار کا اس پر فتویٰ ہے اس لئے ہم لیتے ہیں اور اگر کہو کہ اسکی زکوٰۃ کیوں نہیں دیتے تو کہتے ہیں کہ مال حرام میں بھی کہیں زکوٰۃ فرض ہے۔ اب دینے کے وقت وہ سود ہو گیا اور حرام۔ اور لینے کے وقت حلال تھا۔ بہرحال شتر مرغ تو کمزور جانور ہے گو نام میں شتر ہے مگر وہ بار برداری کے قابل نہیں۔ لیکن اونٹ گھوڑا بیل۔ بھینسا۔ خچر وغیرہ اس قدر قوی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی آدمی کے اوپر پیر رکھدے تو اس سے اٹھا بھی نہ جائے مگر خدا تعالیٰ کی کیسی نعمت ہے کہ ایسے قوی قوی جانوروں کو ایک ذرا سا لونڈا لکڑی لئے ہوئے ہانکتا ہے اور سب کان دبائے اسکے آگے آگے ہو لیتے ہیں کیا غضب کی تسخیر ہے۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ سوار ہوتے ہوئے اس نعمت کو یاد کرو اور اس کا شکر کرو۔ وتقولوا سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین؀ اور یوں کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اسکو ہمارا تابع کردیا حالانکہ ہم قوت و طاقت سے خود اسکو قابو میں نہ کرسکتے تھے۔ یہاں تسخیر کے یہ معنی ہیں کہ انکو تمھارے تابع کردیا۔ اور کسی جگہ تسخیر کے معنی کام میں لگا دینا بھی ہے جیسا کہ الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموات والارض اور وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنہار کیونکہ ظاہر ہے کہ سمٰوات و ارض کی تمام اشیاء ہمارے تابع نہیں۔ نہ شمس و قمر نہ لیل و نہار بلکہ یہاں تسخیر سے مراد یہ ہے کہ تمام عالم کو تمھارے کام میں لگا دیا گیا ہے۔ بہرحال جن جانوروں کو ہم اپنا تابع دیکھتے ہیں یہ تسخیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ورنہ اگر کسی وقت اللہ تعالیٰ جانور کو مست کردیں اور وہ سرکشی پر آجائے تو انسان کی کچھ حقیقت نہیں کہ قوت سے اس کا مقابلہ کرسکے بلکہ اگر مقابلہ کریگا تو خارجی اسباب سے کریگا جیسے بندوق وغیرہ۔ مگر جانور کے پاس گھر کے آلات موجود ہیں جیسے سینگ وغیرہ اسکو خارجی اسباب کی ضرورت نہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سوار ہوتے ہوئے اس نعمت تسخیر کو یاد کر کے خدا تعالیٰ کی حمد کرو اسکے بعد یہ بھی یاد کرو وانا الی ربنا لمنقلبون کہ ہم اپنے پروردگار کے پاس جانے والے ہیں اس کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ نعمت معاش کو

ع اس موقع پر حافظ محمد حسن علی خانصاحب رئیس گڑھی پختہ گڑھی سے آگئے تو حضرت مولانا نے انکو دیکھکر فرمایا کہ آپ نے بڑی ہمت کی کیونکہ وہ صبح کی نماز سے پہلے گھوڑی پر سوار ہو کر وعظ کی خبر سنکر آئے تھے اور جلدی ہی آگئے حضرت مولانا نے گذشتہ تقریر کا خلاصہ انکی خاطر سے دوبارہ بیان فرمایا اور فرمایا کہ بیان ابھی شروع ہوا ہے زیادہ نہیں ہوا۔ ۱۲ جامع

یاد کر کے معاد کو بھی یاد کرو تو مشہور ربط ہے۔ اور بعض اہل لطائف نے کہا ہے کہ اس کا ربط یہ ہے کہ اس سواری سے دوسری سواری کو یاد کرو یعنی جنازہ کو۔ جسکے متعلق کسی نے کہا ہے ؎

دھر نیگے تجھکو جنازہ پر تخت شاہی سے | اگر خزانہ و لشکر ہزار ہوئے گا

عوام تو اس ربط سے خوش ہوئے ہونگے کیونکہ چٹ پٹا مضمون ہے مگر اہل علم جانتے ہیں کہ پختہ بات کون سی ہے (اور ایک ربط یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انا الی ربنا لمنقلبون میں اس امر کی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تسخیر حیوانات من جانب اللہ ہے کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آنیوالا ہے کہ خود دوسروں کے ہاتھوں میں مردہ بدست زندہ ہوگے پس اس حالت کو یاد کر کے سمجھ لو کہ اس حیات چند روزہ میں جو تم حیوانات کو اپنا مسخر دیکھتے ہو یہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو تم خود تو اپنے وجود اور ذات پر بھی قابض نہیں ہو دوسروں پر تو کیا قابض ہوتے ۱۲ جامع)

اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کی تعلیم فرمائی ہے ایک وتذکروا نعمۃ ربکم دوسرے وتقولوا سبحان الذی سخر لنا ھذا یعنی اس نعمت کو دل سے بھی یاد کرو اور زبان سے بھی اس کا اقرار کرو پس ہر چند کہ دل سے استحضار بھی کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے اسکی قولاً بھی تعلیم فرمایا ہے تاکہ اس سے استحضار بالقلب آسان ہو جائے کیونکہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ زبان سے ذکر کرنے میں قلب آسانی کے ساتھ ذاکر ہو جاتا ہے اسی واسطے فقہاء نے نیت صلوٰۃ بالقول کو مندوب فرمایا ہے جس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بدعت انہوں نے کہاں سے نکالی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیت باللسان کا کہیں ثبوت نہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر عملاً ثبوت نہیں تو قولاً ثبوت موجود ہے اور قول بھی حق تعالیٰ کا دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر بالقلب و ذکر باللسان کو جمع فرمایا ہے پس جو حکمت یہاں ذکرین کے جمع کرنے میں ہے اسی حکمت کی وجہ سے اگر فقہاء نیت صلوٰۃ میں جمع ذکرین کو افضل فرمائیں تو کون سا جرم ہے پھر میرے پاس اسکی نظیر سنت سے بھی موجود ہے یعنی تلبیہ جس میں ذکر باللسان افضل ہے بلکہ شرط احرام ہے محض نیت سے احرام منعقد نہیں ہوتا جب تک تلبیہ نہ کہے (پھر تلبیہ میں رفع صوت بھی مسنون ہے جیسا کہ حدیث میں ہے افضل الحج العج والثج اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تلبیہ بالقلب کافی تھا۔ زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے تو یہی جواب دیا جائیگا کہ ذکر باللسان کو ذکر بالقلب کی

ف ۸ ذکر قلبی کیساتھ ذکر باللسان کا جمع کرنا افضل ہے

ف نیت صلوٰۃ باللسان کا نقلی ثبوت

تیسیر میں دخل ہے پس یہی حکمت یہاں بھی موجود ہے ۱۲) یہ تو درمیان میں ایک علمی لطیفہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مرکوب میں ایک نعمت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے قوی مخلوقات کو انسان کا تابع کر دیا ہے اور یہ نعمت ہم کو بلا کسب واکتساب کے حاصل ہے انہیں حق تعالیٰ کا انعام پوری طرح ہر شخص کو محسوس ہو سکتا ہے۔ اور جو نعمت انسان کو کسب و اکتساب سے حاصل ہوتی ہے اس میں تو وہ کبھی دعویٰ بھی کرنے لگتا ہے جیسے قارون نے کہا تھا انما اوتیتہ علی علم عندی جب اس کو لوگوں نے نصیحت کی کہ جیسے خدا تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو دوسروں پر احسان کر تو کہنے لگا کہ یہ مال تو مجھے ایک علم کی بدولت حاصل ہوا ہے جو میرے پاس ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کو کیمیا آتی تھی لیکن تفسیر اس پر موقوف نہیں۔ میرے نزدیک علم سے مراد سلیقہ اور لیاقت ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی
9
ذاتی لیاقت اور سلیقہ سے یہ مال حاصل کیا ہے (نعوذ باللہ) خدا کا مجھ پر کیا احسان ہے۔ خیر قارون کم بخت کا یہ اعتقاد ہوگا مسلمانوں کا خدا نہ کرے یہ اعتقاد کیوں ہونے لگا وہ تو ہر نعمت کو عطائے حق سمجھتے ہیں۔ خواہ سبب سے ہو یا بلا سبب کے، اور کسب سے حاصل ہو یا بلا کسب کے مگر یہ ضرور ہے کہ جو نعمت بلا سبب ظاہری اور بدون کسب کے حاصل ہو اس نعمت کا اثر زیادہ ہوتا ہے جیسے کوئی انہیں بہت سا روپیہ ہدیہ میں دے جائے اور جو روپیہ تجارت اور ملازمت یا مزدوری سے حاصل ہو اس کے نعمت ہونے کی طرف التفات کم ہوتا ہے گو اعتقاد قارون جیسا نہ ہو مگر حالت ایسی ہے جس سے دیکھنے والے کو شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس کو نعمت نہیں سمجھتے بلکہ اپنے علم و ہنر کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص گھوڑا خریدنے جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ کہا بازار جا رہا ہوں، گھوڑا خریدوں گا۔ دوست نے کہا کہ انشاء اللہ بھی کہہ لو۔ بولا اس میں انشاء اللہ کی کیا بات ہے؟ گھوڑا بازار میں ہے۔ روپے میری جیب میں ہیں اب جا کر خرید لونگا۔ بس روپیہ پاس ہونے سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ سب کام اس کے قبضہ میں ہے۔ مگر کبھی اللہ تعالیٰ اس کا عجز ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی رحمت ہے اگر انسان پر ابتلاء واقع نہ ہو تو استدراج میں تو یہ مبتلا ہو جائے بس مصائب و بلاہیں بھی حکمتیں ہیں۔ بڑی حکمت تو یہی ہے کہ اس سے

انسان کو اپنی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے اپنا عجز مشاہد ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر خدا خواہد نہ گفتند از بطر پس خدا بنمود شان عجز بشر

مولانا نے کنیزک کے قصہ میں فرمایا ہے کہ بادشاہ نے اُس کے معالجہ کے لئے بڑے بڑے اطبار کو جمع کیا جن کو اپنے علم و فن پہ ناز تھا مگر حق تعالیٰ نے اُن کو اُن کا عاجز ہونا دکھلا دیا جو دوا وہ استعمال کرتے اُس سے اُلٹا اثر ہوتا تھا ؎

از قضا سرکنگبیں صفرا فزود روغنِ بادام خشکی می نمود

از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

پس دراصل ہر زخم کا مرہم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے ان کے سوا کسی کے قبضہ میں شفا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسی طرح امراض باطنہ کا علاج بھی حق تعالیٰ ہی فرماتے ہیں عارفین کو تو اس کا شب و روز مشاہدہ ہوتا ہے اور غیر عارفین کو بھی کبھی حق تعالیٰ اپنی قدرت دکھلاتے رہتے ہیں مگر ان کو عارفین کی برابر مشاہدہ اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ غور نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں رہتے اور عارفین اللہ تعالیٰ کے معاملات کو جو اُن کے ساتھ ہو رہے ہیں غور سے دیکھتے رہتے ہیں اس لئے ان کو خوب مشاہدہ ہوتا ہے کہ فلاں مصیبت سے ہمارے فلاں مرض کا علاج کیا گیا ہے۔ اور فلاں تکلیف ہماری فلاں خطا کا بدلہ ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جب مجھ سے حق تعالیٰ کی کوئی نافرمانی ہو جاتی ہے تو میں اُس کا اثر اپنے گھر والوں میں اور سواری کے جانور میں مشاہدہ کرتا ہوں کہ اُس دن یہ سب کے سب مجھ سے نافرمان ہو جاتے ہیں۔ گھر والے بات کا جواب نہیں دیتے اور میرا مقابلہ کرتے ہیں۔ گھوڑا پوری طرح سواری نہیں دیتا شرارت کرنے لگتا ہے۔ یہ واقعات کم و بیش سب کو پیش آتے ہیں مگر عام لوگ اس کو اتفاقیات پر محمول کرتے ہیں یا گھر والوں کی بدخلقی پر اور گھوڑے کے عیب پر کیونکہ اُن کو نہ اپنے افعال پر نظر ہے نہ اُن کے نتائج پر توجہ ہے۔ مگر بعض دفعہ حق تعالیٰ ایسی دست بدست سزا دیتے ہیں جس سے ہر شخص کو محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ میرے اس فعل کی سزا ہے اور اسی کو میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ کی اس میں بڑی رحمت ہے۔ اگر کبھی کبھی ایسا نہ ہوا کرے تو انسان کی آنکھیں ہی نہ کھلیں چنانچہ وہ گھوڑا خریدنے والا یہ کہکر کہ

ف ۱۰ عارفین کو بلا و مصیبت کی حکمت کا شب و روز مشاہدہ ہوتا رہتا ہے

انشاء اللہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بازار میں پہنچا تو کسی جیب کٹ نے جیب میں سے روپے نکال لئے۔ گھوڑے کا سودا کر کے جو اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں میدان صاف تھا شرمندہ ہو کر ناکام واپس ہوا۔ اتفاق سے وہ دوست پھر ملا اور کہا کیا حال ہے؟ کہنے لگا ہم بازار گئے تھے انشاء اللہ گھوڑا خریدنے کا قصد تھا انشاء اللہ جیب کٹ نے جیب میں سے روپے نکال لئے۔ انشاء اللہ اب خالی ہاتھ گھر جا رہا ہوں انشاء اللہ۔ ایسا سبق ملا کہ اب موقع بے موقع بھی انشاء اللہ کا ورد ہو گیا

غرض انسان کی یہ عادت ہے کہ جو چیز بلا سبب بلا کسب کے اسکو حاصل ہو اسکو تو نعمت سمجھتا ہے اور جس کے اسباب اس کے قبضہ میں ہوں اور اسکے کسب کو اس میں دخل ہو اسکو نعمت نہیں سمجھتا اور اگر اعتقاداً سمجھے بھی تو شان نعمت کا زیادہ اثر اسکے اوپر ظاہر نہیں ہوتا۔ اس لئے ایسی نعمتوں کے نعمت ہونے پر متوجہ کرنے کے لئے حق تعالیٰ مرکوب کی نعمت کو بیان فرماتے ہیں اور اس میں بھی یہاں رکوب کو نہیں بیان فرمایا کیونکہ رکوب سے جو نفع حاصل ہوتا ہے یعنی طی طریق اسکو بعض لوگ پیادہ چلکر بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسی بات بیان فرمائی ہے جو کھلی نعمت ہے جو ظاہراً انسان کی قدرت سے باہر ہے یعنی وتحمل اثقالکم الیٰ بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس کہ مراکب تمہارے بوجھ لاد کر ایسے مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں تم اس بوجھ کو تو کیا پہنچاتے خود بھی نہ پہنچ سکتے تھے مگر سخت مشقت اور مصیبت کے ساتھ۔ یا یہ ترجمہ ہو کہ مع بوجھ کے اس جگہ نہ پہنچ سکتے تھے مگر مشقت کی ساتھ۔ سواری کی چیزوں میں یہ نعمت کھلی نعمت ہے۔ اس میں کسی کو یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ ہم کو سواری کی ضرورت نہیں بلکہ سب اپنے کو اس کام میں سواری کا محتاج سمجھتے ہیں۔ مگر سبحان اللہ۔ حق تعالیٰ کا کلام کیسا جچا تلا ہے کہ اس نعمت میں بھی صرف یہ نہیں فرمایا لم تکونوا بالغیہ بلکہ اس کی ساتھ الا بشق الانفس بھی بڑھا دیا کہ ہاں سخت مصیبت کیساتھ پہنچنا پہنچانا ممکن تھا۔ اس میں ہم کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم کی گئی ہے کہ بات ایسی کہو جو ہر حال میں صحیح ہو۔ کوئی اس پر نقض وارد نہ کر سکے پس ہر چند کہ یہاں بظاہر یہ دعویٰ بالکل تام ہے کہ تم بوجھ لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر میں بدون سواری کے نہیں پہنچ سکتے تھے مگر کوئی معقولی اسپر یہ کہہ سکتا تھا

کہ ایک صورت سے پہنچ سکتے ہیں وہ یہ کہ سارا سامان ایک دم سے نہ اٹھایا جاتا بلکہ اس کے
مختلف عدد بنا کر ایک عدد کو تھوڑی دور پر رکھ دیں پھر دوسرے کو لیجائیں پھر تیسرے کو۔ اس
طرح ایک ایک کر کے سب کو ایک جگہ پہنچا دیں پھر وہاں سے ایک ایک کر کے سب کو قریب کی دوسری
جگہ پہنچا دیں تو اس طرح بدون سواری کے بوجھ کو لیجا سکتے ہیں اور یہ احتمال عقلی ایک معقولی مولوی
نے ہم کو بتلایا۔ انہوں نے اس عقلی احتمال کو واقع کر کے دکھلا دیا۔ ہمارے ایک دوست میں کیرانوی
وہ شاملی کے اسٹیشن پر بہت سا بوجھ لیکر اترے اور قلیوں سے کہا کہ اس کو باہر ٹمٹم کے پاس
پہنچا دو اور مزدوری طے کر لو۔ قلیوں نے بہت مزدوری مانگی آپ نے انکار کر دیا اور کہا ہم خود لیجائیں گے
قلی ہنسنے لگے کہ یہ اکیلا آدمی اتنا سامان کیونکر لیجائیگا۔ مگر انہوں نے قلیوں کو نیچا دکھا دیا۔ آپ نے
یہی کیا کہ سارے سامان کو جو ایک دو عدد کی صورت میں تھا کھولا اور اس کے متفرق عدد ہلکے ہلکے
بنائے۔ پھر قلیوں کے سامنے ہی ایک عدد کو اٹھا کر دور رکھ آئے مگر اتنی دور کہ سامان بھی زیر ۱۳
نظر رہے پھر دوسرا عدد اٹھا کر لے گئے پھر تیسرا۔ یہ حکمت دیکھکر قلی ڈھیلے ہو گئے اور سمجھ گئے کہ یہ تنہا
سارے سامان کو باہر لیجا سکتے ہیں تو اب وہ خود ہی تھوڑی مزدوری پر راضی ہو گئے۔ واقعی یہ
صورت ہمارے ذہن میں تو نہ آتی۔ مگر وہ معقولی آدمی تھے۔ انہوں نے یہاں بھی معقول سے کام لیا
تو اگر آیت میں الا بشق الانفس نہ ہوتا تو کوئی معقول یہ احتمال نکالکر آیت پر اعتراض کر سکتا
تھا اس لئے حق تعالیٰ نے یہ جملہ بڑھا کر کلام کو مضبوط کر دیا کہ اگر پہنچاتے بھی تو بڑی مصیبت سے
پہنچاتے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مصیبت بہت ہے (دن بھر میں اس طرح دو تین کوس بھی طے
نہیں ہو سکتے۔ بڑی منزل تو کسی طرح طے ہی نہیں ہو سکتی) اور گو یہ احتمال بہت بعید ہے کہ اس صورت
سے کوئی شخص بوجھ کو پہنچائے۔ مگر حق تعالیٰ نے اس بعید احتمال کا بھی لحاظ فرمایا جس میں ہم کو تعلیم ہے
کہ کلام میں بہت احتیاط کرنا چاہئے۔ دیکھو ہماری کیسی شان ہے کہ لا یسئل عما یفعل وھم
یسئلون۔ ہم سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا مگر پھر بھی ہم اپنے کلام میں کس قدر احتیاط
کرتے ہیں پس تمکو بھی احتیاط فی الکلام کا عادی ہونا چاہئے۔ قرآن میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور
خضر کا قصہ مذکور ہے اسکی بنا بھی اسی مسئلہ کی تعلیم پر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام
میں ایک بے احتیاطی ہو گئی تھی کہ وعظ میں کسی نے آپ سے سوال کیا ای الناس اعلم کہ اس وقت

آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اطلاق کیساتھ جواب دیا أَنَا
کہ میں سب سے زیادہ عالم ہوں۔ مطلب یہ تھا کہ علوم شرائع اور علوم نبوت میں سب سے بڑا عالم میں
ہوں اور اسی مراد کے اعتبار سے کلام صحیح تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انبیاء اولوالعزم
سے ہیں ہزاروں انبیاء ان کی شریعت کے متبع ہوئے ہیں اور خود اُن کے زمانہ میں بھی حضرت
ہارون علیہ السلام نبی تھے مگر وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے اور موسیٰ علیہ السلام کسی نبی
کے تابع نہیں بلکہ مستقل صاحب شریعت تھے۔ پس علوم شرائع و نبوت میں اُس وقت اُن سے
۱۴۳ زیادہ عالم کوئی نہ تھا مگر آپ نے جواب میں لفظاً یہ قید بیان نہ فرمائی تھی بلکہ اطلاق کیساتھ جواب دیا
اس پر عتاب ہوا اور وحی نازل ہوئی بلیٰ عبدنا خضر هو اعلم منک کہ کوئی آپ سے زیادہ عالم
کیوں نہیں۔ ہمارا بندہ خضر آپ سے زیادہ عالم ہے یعنی بعض علوم میں وہ زیادہ عالم ہیں گو وہ
علوم شرائع اور علوم نبوت سے افضل نہ ہوں مگر آپ کے اطلاق کلام پر تو علم خضر سے نقض وارد
ہوسکتا ہے کیونکہ علم میں تو وہ بھی داخل ہے۔ میں اس مقام پر علم موسیٰ اور علم خضر کا فرق تفصیل
کیساتھ بیان کرنا نہیں چاہتا کیونکہ دوسرے مقامات پر اس کا بیان مفصل ہوچکا ہے۔ مگر اجمالاً
اتنا کہے دیتا ہوں کہ خضر علیہ السلام کا علم کشف کونی تھا اور اس علم کو علم نبوت اور کشف
الٰہی سے جو کہ موسیٰ علیہ السلام کا علم تھا کوئی نسبت نہیں مگر فی نفسہ وہ بھی ایک علم ہے اور علم لدنی
ہے جس میں وہ موسیٰ علیہ السلام سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے محض تنبیہ قولی پر اکتفا
نہیں فرمایا بلکہ عملی اصلاح فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جاؤ خضر سے ملو اور اس کے علوم کو دیکھو۔
اسکو مشائخ صوفیہ سمجھتے ہیں علماء ظاہر عملی اصلاح کو کچھ نہیں جانتے (الا الاسم والرسم ۱۲)
علماء تو کسی کے اندر تکبر دیکھیں گے تو اُس کی اصلاح میں صرف تکبر کی مذمت اور وعیدیں بیان
کردینگے اور بس۔ اور شیخ اس طرح اصلاح کرتا ہے کہ جاؤ فلاں مسافر کے پیر دباؤ جو خراب خستہ
حالت میں پڑا ہے جسکی رال بھی چل رہی ہے۔ اب مرید چونکہ شیخ کے سامنے چوں نہیں کرسکتا
اس لئے جھک مار کر جاتا ہے اور پیر دباتا ہے گو دل دل میں شیخ کو کوستا بھی ہو کہ بڑے متشدد
ہیں مگر ایسا کوسنا ہزار کوس بھاگ جاتا ہے وہ شیخ کو نہیں لگتا پھر اس غریب مسافر پر غصہ
آتا ہے کہ یہ کم بخت کہاں سے آمرا تھا جو میرے سپرد اسکی خدمت ہوئی۔ مگر یہ غصہ فضول ہے اگر

وہ نہ آتا تو شیخ کسی اور تدبیر سے علاج کرتا مثلاً نمازیوں کے جوتے سیدھے کراتا شروع میں تو یہ علاج پہاڑ کی برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ گراں معلوم ہوتا ہے مگر چند روز میں نفس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ ایسے ایسے کام کرتے کرتے نفس کو تواضع کی عادت ہو جاتی ہے پھر نفس درست ہو جاتا ہے۔

عادت کے اوپر ایک اور حکایت یاد آئی مولوی صدیق احمد صاحب گنگوہی جو گڑھی میں بھی مدرس رہے ہیں اپنی حکایت بیان فرماتے تھے کہ جب میں نیا نیا دیوبند کے مدرسہ میں گیا تو ایک رئیس کے یہاں میرا کھانا مقرر ہوا۔ اُس زمانہ میں دیوبند کے لوگ طلباء کی بہت عزت کرتے تھے اب کی خبر نہیں مگر جہاں تک میرا خیال ہے دیوبند کے لوگ اب بھی دوسری جگہ کے لوگوں سے زیادہ طلباء کی عزت کرتے ہیں۔ اور جو زمانہ ہم نے دیکھا ہے اُس وقت تو بہت ہی عزت کرتے تھے کہ طلباء کو دیکھکر رؤسا اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور طلباء کو عزت کیساتھ بٹھلاتے تھے۔ اُس زمانہ میں چونکہ عوام متواضع تھے اِس لئے طلباء کو گھروں سے کھانا لانا معیوب نہ تھا اور شاید پہلے بزرگوں نے اسی واسطے طلباء کیلئے یہ صورت اختیار کی ہو تاکہ اُن کا تکبر زائل ہو۔ مگر اب میری رائے نہیں ہے کہ طلباء گھروں پر کھانا لینے جائیں کیونکہ اب اہلِ دُنیا طلباء کو ذلیل وحقیر ؎۵ سمجھنے لگے۔ اگر طلباء اُن کے گھروں پر روٹی کے واسطے جائیں گے تو وہ اور زیادہ اُن کو ذلیل سمجھیں گے۔ ہاں مؤذن اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ اہلِ محلہ سے اپنا حق وصول کرتا ہے وہ ان کی مسجد کی خدمت کرتا ہے اور اپنی خدمت کا معاوضہ طلب کرتا ہے تو یہ ایسا ہے جیسے کوئی درزی کسی رئیس کے یہاں اپنے پیسے مانگنے جائے اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ اور گو طلباء کا بھی حق مسلمانوں کے ذمہ ہے مگر لوگ عام طور پر اس حق کو اپنے اوپر نہیں سمجھتے اور جو شخص اپنے ذمہ حق نہ سمجھتا ہو اُس سے جبراً حق وصول کرنا ذلت ہے ہم کو اس کی ضرورت نہیں۔ قیامت کے دن ان کو خود معلوم ہو جائیگا کہ اُنہوں نے دین اور اہلِ دین کی کس قدر

؎۵ اور یہ تعلیم انگریزی کے شائع ہونیکا نتیجہ ہے کیونکہ علم دین کے حاصل کرنیوالوں کو ایسے ہی رؤسا حقیر سمجھتے ہیں جنھیں انگریزی تعلیم کا اثر آگیا ہے اور دین سے بے تعلقی ہوگئی ہے اور جو رؤسا اس اثر سے محفوظ ہیں وہ اب بھی طلباء وعلماء کی عزت کرتے ہیں۔ واللہ المستعان ۱۲ ظ۔

حق تلفی کی ہے۔ تو مولوی صدیق احمد صاحب کہتے تھے کہ اول وقت جو میں روٹی لینے گھر پر گیا تو قدم نہ اٹھتا تھا پھر گھر پر پہنچ کر آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی کہ روٹی بھیج دو بشرم کے مارے دیوار سے لگ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں صاحب خانہ جو ایک رئیس تھے خود ہی باہر آئے اور مجھے کھڑا دیکھا تو کہنے لگے کہ آپ کا ہی کھانا میرے غریب خانہ پر مقرر ہوا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں سنکر انہوں نے فوراً چارپائی منگائی اور مجھے عزت سے بٹھلایا اور پوچھا آپ کھانا یہاں ہی کھائیں گے یا مدرسہ لیجائیں گے۔ میں نے شرم کی وجہ سے کہہ دیا کہ یہیں کھاؤں گا انہوں نے فوراً ملازم سے کہا کہ آپ کے ہاتھ دھلاؤ اور گھر میں سے کھانا لاکر آپ کو کھلا دو۔ جب کھانے سے فارغ ہو کر مدرسہ میں آیا تو ساتھیوں نے کہا کہ تم کھانا نہیں لائے؟ میں نے کہا کہ مجکو تو گھر تک جانا ہی محال تھا اور میں سب کے سامنے ہاتھ پر رکھکر روٹیاں یہاں تک بھی لاتا میں نے تو وہیں کھا لیا۔ ساتھیوں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہمارے اندر بعضے ایسے بھی ہیں جن کا کھانا کہیں مقرر نہیں۔ تو جن کا مقرر ہے وہ سب ملکر ان کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں تو سب کا کام چل جاتا ہے شام سے تم کھانا وہیں لانا۔ میں نے کہا بہت اچھا لاؤنگا۔ کہتے تھے کہ شام کو جو میں کھانا لایا تو بار بار دل میں یہ آتا تھا کہ زمین پھٹ جائے تو میں اس میں سما جاؤں۔ مگر دو تین وقت لانے کے بعد پھر دل کھل گیا اور اب تو یہ حالت ہے کہ اگر تم کہو تو بھنگی کے گھر سے میں کھانا لے آؤں۔ سو واقعی چند روز تک ایسا کام کرنے سے جس میں نفس کی ذلت ہو نفس ذلت کا عادی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے مشائخ تکبر وغیرہ کی عملی اصلاح کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کے پوتے مولانا ابو سعید صاحبؒ جب سلطان نظام الدین بلخیؒ کے پاس دولت باطنیہ کی طلب میں پہنچے ہیں تو آپ نے سنا ہو گا کہ انہوں نے کیسی کیسی تکبر شکن خدمتیں ان سے لی ہیں تا کہ امراض نفس کا عملی علاج ہو پھر جیسی ان کی اصلاح ہوئی ہے سب کو معلوم ہے۔ غرض اس واقعہ میں حق تعالیٰ نے قولی اصلاح پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ عملی اصلاح بھی فرمائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر کے پاس جانیکا حکم ہوا پھر حالانکہ حق تعالیٰ تمام جغرافیہ عالم سے موسیٰ علیہ السلام کو واقف فرما سکتے تھے۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر کا موقع و مکان تعیین کے ساتھ نہیں بتلایا بلکہ اجمالاً اتنا بتلایا کہ وہ مجمع البحرین پر

(line "کہا کہ مجکو تو گھر تک جانا ہی محال تھا ... یہاں تک" bears margin number) ۱۵

ملیں گے۔ اور حکم ہوا کہ ایک مچھلی تل کر ساتھ لے لو جب وہ زندہ ہو کر توشہ دان سے نکل بھاگے تو سمجھ لینا کہ خضر علیہ السلام اسی جگہ ہیں۔ اس اجمال کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام سالہا سال کے سفر کیلئے تیار ہو کر چلے کہ نہ معلوم کب اور کتنی مدت میں پہنچنا ہوگا چنانچہ نص میں ہے واذ قال موسیٰ لفتٰہ لا ابرح حتی ابلغ مجمع البحرین او امضی حقبا۔ اس اجمال میں بھی موسیٰ علیہ السلام کی اصلاح تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی طلب دیکھئے کہ سالہا سال تک چلنے پر مستعد ہو گئے۔ سبحان اللہ۔ پھر حق تعالیٰ کی امداد یہ ہوئی کہ مجمع البحرین تک جانے میں تو ان کو ذرا تکان نہیں ہوئی ہاں جب موقع سے تجاوز ہو گیا تو اب تکان محسوس ہوا (اللہ تعالیٰ طالبین کی اسی طرح امداد فرمایا کرتے ہیں کہ طریق کو ان کے لئے آسان کر دیتے ہیں ۱۲) چنانچہ آپ نے خادم سے فرمایا کہ آج کے سفر سے تکان معلوم ہوا ہے لاؤ ناشتہ لاؤ۔ اس پر خادم نے عرض کیا کہ میں آپ سے کہنا بھول گیا۔ وہ مچھلی تو کل ہی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم تو اسی کے منتظر تھے۔ ۱۶۰
واپس لوٹو منزل مقصود اسی جگہ ہے جہاں سے ہم آگے بڑھ گئے۔

پھر اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر سے درخواست کی ھل اتبعك علٰی ان تعلمن مما علمت رشدا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ جو علم آپ کو حاصل ہے وہ آپ مجھے بھی سکھلا دیں۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تھے ان کو استیذان کی ضرورت نہ تھی مگر ادب یہی ہے کہ استاد سے اجازت لے اور اپنی طلب کو ظاہر کرے اور علماء تو صرف الفاظ ظاہرہ کے درپے ہوتے ہیں مگر صوفیہ نے اس سے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ چلنا ہو تو بلا اجازت کے ساتھ نہ چلے بلکہ اجازت لیکر ساتھ چلنا چاہیئے کیونکہ ساتھ چلنے سے بعض دفعہ دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے اس کی آزادی میں خلل پڑتا ہے چنانچہ ایک دفعہ برسات کے زمانہ میں ایک مولوی صاحب رات کے وقت میرے ساتھ ہو لئے میں نے ان کی وجہ سے اچھا راستہ ان کے لئے چھوڑ دیا اور خراب راستہ خود اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندھیرے میں ایک گڑھے کے اندر میرا پیر گرا جس سے تمام کپڑے خراب ہو گئے۔ اگر وہ میری ساتھ نہ ہوتے

عہ قلت وفیہ تنبیہ لسیدنا موسیٰ علیہ السلام عن نقصان علمہ حیث لم یتفرج وزہ عن المعقود وفیہ کان تنبیہا ایضاً علی ان العلم الذی اوتیہ نفر من جنس ہذا العلم الذی لحقک النصب بعدہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۲ ظ

(حاشیہ:) موسیٰ علیہ السلام کے شاگردی کی درخواست کرنا۔ بدون اجازت کسی کے ساتھ نہ چلنا چاہیئے۔ ساتھ چلنے میں دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے اس پر ایک حکایت

تو میں خراب راستہ کیوں اختیار کرتا۔ ایک دفعہ ایک وکیل صاحب ایک مجلس نکاح سے گھر تک میرے ساتھ ہو لئے حالانکہ اس وقت آنت آنتر جانے کے سبب تقاضے کے ساتھ گھر جا رہا تھا انکی وجہ سے مجھے باتوں میں مشغول ہونا پڑا اور آہستہ آہستہ چلا۔ تنہا ہوتا تو تیزی کے ساتھ جاتا۔ مگر وہ ظالم گھر پر پہنچنے کے بعد بھی واپس نہ ہوئے بلکہ دروازے پر جم کر کھڑے ہو گئے اور باتوں کا سلسلہ قائم رکھا آخر مجبور ہو کر مجھے بے مروتی سے کہنا پڑا کہ اب مجھے جانے دیجئے مگر وہ پھر بھی نہ ٹلے تو میں منہ موڑ کر خود ہی چل دیا۔ آج کل لوگوں کو اس کا احساس ہی نہیں کہ دوسرے کو ان کے فعل سے تکلیف ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے بھی اگر رات کو اٹھتے تو اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ ان کی نیند خراب نہ ہو انکو تکلیف نہ ہو حالانکہ وہ محبوبہ ہونے کے ساتھ خود محب و جاں نثار بھی تھیں اور ایسی جاں نثار تھیں کہ حضور کی شان میں فرماتی ہیں ؎

لواحی زلیخا لو رأین جبینہ   لآثرن بالقطع القلوب علی الیدٖ

۱۷ زلیخا کو ملامت کرنے والیاں اگر حضور کا چہرۂ مبارک دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھ کاٹنے کے دل کے ٹکڑے کر ڈالتیں۔

ایشیائی مذاق کے اعتبار سے جو کہ عرب کا سادہ مذاق تھا یہ کلام غایت عشق کو ظاہر کر رہا ہے۔ اور زلیخا کے جس قصہ کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے اس کا اجمالی واقعہ یہ ہے کہ جب زلیخا کا عشق مصر میں مشہور ہوا تو وہاں کی عورتوں نے اس کو ملامت کی کہ غلام پر فریفتہ ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام اس وقت غلاموں ہی کی طرح فروخت ہو کر اسکے ہاتھ میں آئے تھے یہ باتیں سنکر زلیخا نے ان کے اعتراض کا عملی جواب دینا چاہا زبان سے کچھ نہیں کہا۔ تدبیر یہ کی کہ ان کو دعوت کے بہانہ سے اپنے گھر بلایا اور یوسف علیہ السلام کو پردہ میں کر دیا پھر سب عورتوں کے سامنے چاقو سے کاٹ کر کھانے کے پھل اور میوے رکھدیئے اور ہر ایک کے سامنے ایک ایک تیز چاقو رکھدیا۔ جب عورتوں نے چاقو ہاتھ میں لے لیا اور پھل تراشنے کا قصد کیا تو عین اس موقعہ پر زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو بلایا کہ ذرا یہاں تو آؤ (وہ سمجھے کسی کام سے بلاتی ہوگی۔ چونکہ وہ ظاہر میں آقا تھی اس لئے خدمت کے ارادہ سے تشریف لے آئے ۱۲) اب جو وہ سامنے کے

اور عورتوں کی نظر اُن کے حُسن و جمال پر پڑی تو سب کے ہوش اُڑ گئے۔ بدحواسی میں چاقو سے پھل کی جگہ اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔
اب تو زلیخا کو موقعہ ملا کہ کیوں تمہارے حواس کہاں گئے۔ ہوش تو ٹھکانے کر دیں تو ایک دن بھی ایسی بدحواس نہیں ہوئی سب نے شرمندہ ہو کر کہا۔ حاش للّٰہ ماھذا بشراط ان ھذا الاملک کریم۔ کہ بخدا یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ زلیخا نے کہا فذلکن الذی لمتننی فیہ کہ دیکھ لو یہی ہے جس کی محبت پر تم نے مجھے ملامت کی تھی اس قول کا ترجمہ کسی نے شعر میں خوب کیا ہے ؎

این ست کہ خون خوردہ ودل بردہ بسے را ۔۔۔ بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

تو حضرت عائشہؓ ان عورتوں کے بارہ میں فرماتی ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا جمال دیکھکر تو انہوں نے ہاتھ ہی کاٹے تھے اگر ہمارے حضور کا جمال جہاں آرا دیکھ لیتیں تو دل و جگر کے ٹکڑے کاٹ ڈالتیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہ کو حضور سے کس درجہ کا عشق تھا تو کیا اُن کو حضور کے کسی فعل سے کلفت ہو سکتی تھی۔ ہرگز نہیں مگر باایں ہمہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک رات حضور آدھی رات کو اُٹھے فقام رویدا وانتعل رویدا وفتح الباب رویدا وخرج من الباب رویدا۔ آہستہ سے اُٹھے آہستہ سے نعلین پہنے آہستہ سے دروازہ کھولا آہستہ سے باہر نکلے۔ ۱۸
آپ نے اس قدر احتیاط کی مگر حضرت عائشہ کے تو دل کو آپ سے تعلق تھا۔ آپ کا جدا ہونا تھا کہ دل پر اس کا اثر ہوا اور فوراً آنکھ کھل گئی۔ جب آپ کو بستر پر نہ پایا تو آپ کو وساوس عاشقانہ آنا شروع ہوئے ؎

باسایہ ترا نمی پسندم ۔۔۔ عشق است و ہزار بدگمانی

یہ خیال ہوا کہ شاید کسی دوسری بیوی کے پاس تشریف لے گئے ہیں اور جب عاشق کی یہ حالت ہے کہ باسایہ ترا نمی پسندم۔ تو باغیرہ ترا نمی پسندم تو بدرجۂ اولی ہوگا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ حضرت عائشہ سے رہا نہ گیا اور فوراً اوڑھنی اوڑھکر آپ کے نشانات قدم کو دیکھتی ہوئی پیچھے پیچھے چلیں۔ دیکھا کہ آپ بقیع الغرقد میں (جو مدینہ کا قبرستان ہے) مُردوں کیلئے دعا کر رہے ہیں

اس کے بعد کا قصہ سامعین کو غالباً معلوم ہوگا کیونکہ مواعظ میں بیان ہو چکا ہے۔
مقصود اس سے یہ تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دوسروں کی راحت کا اس قدر اہتمام تھا مگر آج کل لوگوں کو اس کا مطلق اہتمام نہیں۔ اسی لئے بدون اجازت کسی کے ساتھ ہو لیتے ہیں خواہ اس پر گرانی ہی ہو۔ صوفیہ نے اس سے منع کیا ہے اور قصہ موسیٰ و خضر سے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ ساتھ چلنے کے لئے بھی اجازت لینا چاہیئے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خضر سے ساتھ رہنے کی اجازت لی۔ اس کے جواب میں خضر علیہ السلام نے اُستادانہ ناز سے کام لیا کہ تم میری ساتھ رہکر تحمل نہیں کر سکتے ممکن ہے اُن کو کشف سے معلوم ہوگیا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطا پر متنبہ کرنے کے لئے بھیجا ہے اس لئے ان کی ساتھ نازِ اُستادانہ برتنا مناسب ہے کہ اس سے اصلاح کامل ہوگی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ستجدنی انشاء اللہ صابرا ولا اعصی لک امرا کہ نہیں انشاء اللہ آپ مجھے صابر و متحمل پائیں گے اور میں کوئی بات آپکے خلاف نہ کرونگا۔ سبحان اللہ! کیسی شان ہے کہ ابھی تو تمام عالم کے پیشوا اور مقتدا بنے ہوئے تھے اور آج دوسرے کی شاگردی اور اطاعت پر آمادہ ہیں۔ اس پر حضرت خضر نے فرمایا فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیء حتی احدث لک منہ ذکرا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو چپ چاپ ساتھ ہو لیں کسی معاملہ میں خود سوال کی ابتدا نہ کریں۔ جب تک میں خود نہ بتلاؤں۔ عـہ

اس میں خاموشی کی تعلیم تھی۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ سالک کو سکوت لازم ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ہر در و لیشے کہ چون و چرا کند دہر طالب علمے کہ چون و چرا نکند ہر دو را در چراگاہ باید فرستاد۔ اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام کو خضر نے طریقت کی یعنی طریق باطنی کی تعلیم دی تھی۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ طریقت شریعت سے جدا نہیں۔ شریعت ہی کی تکمیل ظاہر و باطن کا نام طریقت ہے اور اس میں موسیٰ علیہ السلام سے حضرت خضر زیادہ عالم نہ تھے اور جو واقعات ملاقات خضر کے بعد ظاہر ہوئے

عـہ لکون ما اصاب موسیٰ ہو من جہۃ الکلام وسرعۃ القول وبداءۃ الجواب وعلاجہ التانی فی الکلام والتدبر والتامل فیہ قبل ان یتلفظ بہ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ۔

ہیں جن میں حضرت خضر نے اپنا علم ظاہر کیا تھا ان کو طریقت سے کچھ بھی علاقہ نہیں بلکہ وہ تو محض کسب تکوینی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کشف کوئی نہ کمال ہے نہ مقصود ہے۔ ہاں بلا طلب کے کسی کو حاصل ہو جائے تو نعمت ہے کیونکہ وہ بھی ایک علم ہے۔

اور میں نے جو خضر کے اقوال سے مسائل سلوک مثلاً سکوت سالک وغیرہ کا استنباط کیا ہے سو نہ اس وجہ سے کہ یہاں سلوک کی تعلیم تھی بلکہ اس وجہ سے کہ خضر فی نفسہ شیخ طریقت تھے اُن کا مذاق یہی تھا۔ تو دیکھیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم عملاً کس طرح دی کہ اُن کو خضر کا شاگرد بنایا گیا جو اُن سے کسی طرح بھی درجۂ قرب میں زیادہ نہ تھے۔ نہ علوم شرائع و نبوت میں افضل تھے۔

اسی کی طرف یہاں الا بشق الانفس بڑھا کر ہم کو متوجہ کیا گیا ہے کہ دیکھو ہم نے کلام میں کس قدر احتیاط کی ہے تمکو بھی احتیاط کرنا چاہیئے۔ ۴۰

اب سمجھو کہ میں نے لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس کے ترجمہ میں یہ کہا ہے کہ تم اس شہر میں مع اسباب و اثقال کے نہ پہنچ سکتے تھے۔ حالانکہ نص میں صرف بالغیہ وارد ہے۔ بالغیہ بھا نہیں ہے مگر قرینۂ مقام سے یہ بات معلوم ہے کہ مراد بھی ہے کہ تم مع اسباب و اثقال کے وہاں نہ پہنچ سکتے تھے کیونکہ اگر بلوغ مع الاثقال مراد نہ ہوتا تو لم تکونوا بالغیہ کو تحمل اثقالکم سے ربط نہ ہوگا عـــہ۔ پس ربط اس بات کو چاہتا ہے کہ لم تکونوا بالغیہ سے مراد لم تکونوا بالغیہ بھا ہے۔ اور جب یہ مراد ہے تو مقام مبلغیہ کو مقتضی ہے اب یہ سوال ہوگا کہ اس کی جگہ بالغیہ کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مبالغہ کیلئے عـــہ بالغیہ اختیار فرمایا کہ تم مع اسباب کے تو کیا مجرد بدن بھی وہاں نہ پہنچ سکتے تھے۔ اور مبالغہ خلاف احتیاط نہیں۔ کیونکہ مخاطب پر مبالغہ کا مبالغہ ہونا مخفی نہیں رہتا۔

عـــہ قلت ولا یخفی ما فیہ فان الربط حاصل بدون ذلک ایضا والمعنی تحمل اثقالکم الی بلاد بعیدۃ لم تکونوا واصلین الیہا مشاۃ خفافا متجردین ایضا ای و مع الاثقال بالاولیٰ ۱۲ ظ۔ عـــہ قلت وعندی لا مبالغۃ فیہ فان بعض البلاد لا تیسر الوصول الیہا ماشیا متجردا الا بشق الانفس فی نفس الامر و قولہ الی بلد عام لکونہ نکرۃ فیصدق الکلام بالبلاد والبعیدۃ غایۃ البعد التی لا یقدر الانسان الماشی علی وصولہا الا فی شہر بسنین مع التعب الشدید واللہ تعالیٰ اعلم ففیہ دلالۃ علی نعمۃ المرکوب ایضاً قلت و ہذا من باب اختلاف الذوق فان بعض الربط قریب عند واحد بعید عند آخر ۱۲

اس کے بعد ارشاد ہے والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ ط یعنی خدا تعالیٰ نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے سواری اور زینت کیلئے۔ یہاں حق تعالیٰ نے دو نعمتیں بیان کی ہیں۔ ایک رکوب (سوار ہونا) دوسرے زینۃ چونکہ یہ مجموعہ سب انعام میں نہیں ہے اس لئے اسکو خیل وبغال وحمیر کے ساتھ ذکر فرمایا۔ کیونکہ اونٹ کی سواری میں کوئی زینت نہیں ہاں گھوڑے کی سواری میں بڑی زینت ہے اور خچر میں بھی زینت ہے کیونکہ وہ گھوڑے کے قریب ہی ہے ہم نے دیکھا ہے کہ بعض رؤسا رتھوں میں خچر کو بھی جوڑتے ہیں مگر گدھے میں شاید کلام ہو کہ اس میں کون سی زینت ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ گدھے بھی سب گدھے نہیں ہوتے بلکہ بعضے گدھے خچر کے قریب ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ جیسے خچر گھوڑے کے قریب ہے اسی طرح خر خچر کے قریب ہے اور قریب کا قریب قریب ہے مگر اسپر معقولی طلبہ کو یہ اعتراض ہوگا کہ اس طرح تو کلکتہ بھی قریب ہے کیونکہ ہمارے سے دہلی قریب ہے اور دہلی سے علی گڑھ، اس سے ٹونڈلہ، اس سے کانپور، اس سے الہ آباد، اسی طرح قریب ہے قریب کو ملاتے جاؤ اور اخیر میں کہدینا کہ قریب کا قریب قریب ہے۔ مگر انہوں نے غور نہیں کیا کیونکہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قریب کا قریب قریب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے درمیان وسائط زیادہ نہوں اور عرفاً ایک دو واسطہ سے بعد نہیں ہوتا اس سے زیادہ سے بعد ہو جاتا ہے اور قرآن میں کلام محاورات کے موافق ہے اس کو عرف سے سمجھنا چاہیئے۔ سو عرف میں ایک دو واسطہ بعید نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً کوئی اپنے کو فاروقی صدیقی کہے تو اس میں بعد نہیں۔ اور کوئی اپنے کو نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرے تو اس میں بعد ہوگا جیسے ایک بھنگی ڈوبنے لگا تھا اس نے چلا کر کہا۔ ارے میں ڈوبا مجھے بچاؤ تو کسی نے اس کے حال پر توجہ نہ کی تو اس نے یوں کہنا شروع کیا کہ نبی زادہ ڈوبا جاتا ہے جلدی بچاؤ۔ یہ سنکر لوگ دوڑ پڑے اور اسکو نکال لیا۔ دیکھا تو بھنگی ہے۔ کہا تو نبی زادہ کدھر سے ہوگیا تو وہ جواب دیتا ہے کہ آدم علیہ السلام نبی تھے یا نہیں؟ کہا ہاں۔ کہا میں آدم کی اولاد میں ہوں یا نہیں؟ تو میں بھی نبی زادہ ہوا۔

تیسرے یہ کہ گدھا غریب تو خواہ مخواہ ہی ذلیل اور بدنام ہے ورنہ عقلاً اس میں ذلت کی کیا چیز ہے مشہور یہ ہے کہ گدھا بیوقوف ہوتا ہے۔ مگر ایک گدھے والے جو شہزادہ تھے اور پڑزادہ کا کام

ادب کی سواری میں زینت ہے

سواری میں زینت ہے ایک تجویز

۲۱

ایک بھنگی کا لطیفہ

حمار کا تحمل

چونکہ

کرتے تھے مجھ سے کہتے تھے کہ گدھا بڑا عاقل ہوتا ہے اب ہمیں تحقیق کی ضرورت نہیں بس تقلید ہی کافی ہے ہاں اسکی آواز البتہ منکر ہے مگر یہ ذلت کا سبب نہیں ہو سکتا۔ آخر توپ کی آواز ہی کونسی اچھی ہے کان کے پردے پھاڑ ڈالتی ہے مگر ذلیل نہیں پس یہ مسلم کہ گدھے کی آواز بری ہے۔ خصوصاً جب کہ سب مل کر بولیں ہمیں اس کا زیادہ تجربہ ہے کیونکہ ہم گدھوں کے محلّہ میں رہتے تھے اس لئے مجھے اس پر اتفاق ہے اور نص میں بھی تو اس کی آواز کو انکر الاصوات کہا گیا ہے مگر صورت کے منکر ہونے سے اس کی ذات میں ذلت نہیں آئی اور ایک عجیب بات ہے کہ گرمیوں کے موسم میں خصوصیت کے ساتھ گدھے زیادہ بولتے ہیں اسی کی بنا پر بعض ملحدین نے اس حدیث پر اعتراض کیا اذا سمعتم نہیق الحمار فتعوذوا باللہ فانہ رأی شیطانا (کہ جب گدھے کی آواز سنو تو اللہ کی پناہ مانگو کیونکہ اُس نے شیطان کو دیکھا ہے اور اس کو دیکھکر بولا ہے) کہ اگر وہ شیطان کو دیکھکر بولتا ہے تو اس کی کیا وجہ کہ گرمیوں میں زیادہ بولتا ہے۔ کیا گرمیوں میں شیطان کو زیادہ دیکھتا ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ہاں یہ بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ شیاطین نار سے پیدا ہوئے ہیں ممکن ہے انکو حرارت سے خوشی ہوتی ہو اس لئے گرمیوں میں زیادہ پھیلتے ہوں اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں انہ رأی شیطانا قضیہ مطلقہ ہے جو بعض ازمنہ میں وقوع سے بھی صادق ہو سکتا ہے لہذا نہیق حمار کے بعض افراد بھی اگر رویت شیطان سے ناشی ہوں یہ قضیہ صادق ہو جائیگا۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر نہیق کا سبب رویت شیطان ہی ہو اور یہ وہ بات ہے جو میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں ایک عالم کے جواب میں بیان کی تھی۔ اور یہ وہ وقت تھا جبکہ یونان نے ترکی حکومت کو شکست دیکر ادڈریانوپل وغیرہ فتح کر لئے تھے جس سے بعض ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب اور تزلزل آ گیا تھا اور ملاحدہ تو یہ [illegible] لگے تھے کہ خدا بھی نصرانیت کا حامی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کا حامی نہیں۔ اس پر دہلی کے بعض مخلصین نے مجھے بلایا کہ یہاں بیان کی سخت ضرورت ہے تاکہ اس قسم کے شبہات کا ازالہ کیا جائے چنانچہ میں گیا اور اسی موضوع پر بیان ہوا جس میں اس قسم کے شکوک و شبہات کا بہت خوبی کیساتھ بحمد اللہ ازالہ کر دیا گیا اور خاتمہ پر بطور اتمام حجت کے میں نے یہ بھی کہدیا کہ اگر اب بھی کسی کے ذہن میں کچھ شبہ اور وسوسہ ہو تو ظاہر کر دے ایسا نہ ہو کہ میرے جانے کے بعد یوں کہا جائے کہ یہ شک رہ گیا اور وہ شبہ رہ گیا اور یہ بات منجانب اللہ اتمام حجت

حدیث اذا سمعتم نہیق الحمار پر ملاحدہ کا اعتراض اور اس کا جواب

۳۴۴

کے لئے میری زبان سے نکل گئی تھی ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس طرح تحدی کیساتھ اعلان کرتا اس
پر ایک پنجابی عالم کھڑے ہوئے اور کہا اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں ولقد کتبنا فی الزبور
من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ
لکھدیا ہے کہ اس زمین کے وارث و مالک میرے نیک بندے ہونگے) پھر اس کی کیا وجہ ہے
کہ اس کے مالک کفار ہو گئے۔ میں نے کہا مولانا آپ تو عالم ہیں ذرا یہ تو دیکھیے کہ یہ قضیہ دائمہ ہے
یا مطلقہ ہے؟ چونکہ وہ عالم تھے اتنی ہی بات سے سمجھ گئے اور کہا بس بس میں سمجھ گیا اب کچھ شبہ نہیں رہا۔
(محل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہونگے
کفار کبھی مالک نہ ہونگے۔ بلکہ اس میں اطلاق کیساتھ یہ وعدہ ہے کہ میرے نیک بندے زمین کے
وارث ہونگے اور اطلاق کے صدق کیلئے ایک بار وقوع کافی ہے چنانچہ بحمد اللہ حضرات صحابہ روئے
زمین کے مالک بن چکے ہیں۔ زمانہ عروج اسلام میں کوئی سلطنت مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہ
رکھتی تھی۔ اور یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آیت میں ان الارض سے
مراد یہی دنیا کی زمین ہے۔ ورنہ ظاہراً آیت کے سیاق و سباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے
مراد ارض جنت ہے۔ کہ جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہونگے۔ اس پر کچھ بھی اشکال نہیں
خوب سمجھ لو ۱۲) بہرحال حدیث پر کچھ اشکال نہیں ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ نہیق حمار کا سبب رویت
شیطان ہے مگر یہ دائمی سبب نہیں۔ ممکن ہے کبھی وہ اپنی طبعیت سے بھی چیختا ہو اور قضیہ کے مطلقہ
یا دائمہ ہونے پر نظر کرنے سے بہت سے اشکال رفع ہو جاتے ہیں مگر اہل علم اس پر نظر نہیں کرتے اسلئے
بعض اشکالات کے جواب میں پریشان ہو جاتے ہیں ان کو چاہیئے کہ جب کسی آیت یا حدیث پر
اشکال وارد کیا جائے کہ یہ حکم فلاں مادہ میں متخلف ہے فوراً اس پر اول نظر کی جائے کہ آیت یا
حدیث میں حکم دائمی ہے یا مطلق، تو انشاء اللہ معلوم ہوگا کہ زیادہ اشکالات کا منشا یہ ہے کہ لوگوں
نے مطلقہ کو دائمہ سمجھ لیا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ گدھے کی آواز کا منکر ہونا مسلم ہے مگر اس سے
زینت پر کیا کلام ہے۔ آواز کو زینت میں کچھ دخل نہیں بلکہ حسن فن کی زینت عام طور پر آواز ہی
سے سمجھی جاتی ہے یعنی فن موسیقی اس میں بھی اہل فن سریلی آواز کی ممیگی کو کمال نہیں سمجھتے بلکہ کمال

ع و ہذا ہو الذی اختارہ الشیخ فی تفسیرہ بیان القرآن ولعنی ان اکثر المفسرین علی ذلک و اللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ

دوسری شے کو سمجھتے ہیں چنانچہ ہمارے اُستاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو ایک زمانہ میں جبکہ مولانا گورنمنٹ کے مدارس کے ممتحن مقرر تھے اور اجمیر میں ملازم تھے فن موسیقی سیکھنے کا شوق ہوا اور اس شوق کا منشا صرف یہ تھا کہ مولانا کو جامعیت کا شوق تھا۔ ہر علم کو حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے سوا اور کچھ منشا نہ تھا۔ کیونکہ مولانا کے ہم عمروں میں سے ایک ثقہ نے (جنکا نام مولوی رعایت الحق تھا) مجھ سے بیان کیا ہے کہ مولانا بچپن اور جوانی میں بھی ویسے ہی نیک تھے جیسے بڑے ہو کر نیک تھے۔ مولانا نے جوانی میں بھی کبھی معصیت کا ارتکاب نہیں کیا۔

غرض مولانا نے ایک میر صاحب سے جو فن موسیقی کے ماہر تھے اس فن کو حاصل کیا۔ پھر مولانا کو تو اس شغل سے خدا تعالیٰ نے اس طرح نکالا کہ ایک دن آپ اپنے حجرہ میں بیٹھے ہوئے جو لب سڑک بالاخانہ پر تھا موسیقی کی مشق کر رہے تھے کہ ایک مجذوب نیچے سے گذرا اور اس نے پکار کر کہا ارے مولوی! تجھے خدا نے اس کام کے واسطے پیدا نہیں کیا دوسرے کام کیواسطے پیدا کیا ہے۔ مولانا کے دل میں تو اسی وقت سے نفرت پڑگئی اور اس شغل کو چھوڑ دیا۔ اور مولانا کے اُستاد کو اس طرح نفرت ہوئی کہ ایک دفعہ کوئی راجہ اجمیر آیا وہ اس فن کا شائق تھا اُس نے سب اہل کمال کو جمع کیا ان میں وہ میر صاحب بھی تھے۔ انہوں نے جب گانا شروع کیا تو راجہ کے ہمراہ جو ایک اُستاد تھا اُس نے اُن کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا۔ یا کہ سبحان اللہ کیا گلا پایا ہے بس اس پر انہوں نے ستار وغیرہ پھینک دیا اور کہا لعنت ہے اس کام پر جس میں کمال حاصل کرنے کی داد وہ ملتی ہے جو ایک ڈوم کو دادی جاتی ہے کہ کیا گلا پایا ہے۔ کیا موسیقی اس کا نام ہے کہ آواز اچھی ہو۔ آواز تو ایک رنڈی کی اور ایک بچہ کی مجھ سے اچھی ہوسکتی ہے۔ اگر میرے فن کی یہی قدر ہے تو میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں اس واقعہ سے انکو گانے بجانے سے نفرت ہوگئی اور دونوں اُستاد شاگرد اس کام سے تائب ہوگئے۔ یہ بظاہر مولانا کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے مولانا کے اُستاد کو بھی آپ کی صحبت کی برکت سے توبہ نصیب کی۔ تو دیکھئے حالانکہ گانے بجانے کی خوبی اور زینت آواز ہی سے ہے مگر اہل کمال کی نظر میں اس کی کچھ وقعت نہیں بلکہ وہ کمال کسی اور چیز کو سمجھتے ہیں پس آواز کی خرابی سے گدھے کی زینت میں خرابی نہیں۔ مگر اس کو زیور اور عمدہ زین لگام پہنایا جائے تو گھوڑے کی طرح یہ بھی اچھا لگے گا۔ بمبئی میں دو سیٹھ بے اولاد تھے انہوں نے

مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک پیر سے گانا سیکھنا اور مجذوب کی بات سے نفرت ہونا۔ ص ۲۴

اپنا حوصلہ نکالنے اور شوق پورا کرنے کے لئے ایک گدھے اور گدھی کی شادی کی تھی اولاد والے تو اپنے بیٹا بیٹی کی شادی میں دل کے حوصلے نکالتے ہیں اور نام و نمود کے لئے بیدریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں بے اولادوں کو یہ خبط سوجھتا ہے کہ لاؤ جانوروں ہی کو بیٹا بیٹی بنا کر اُن کا بیاہ کردو۔ چنانچہ ایک سیٹھ کا گدھا تھا ایک کی گدھی تھی۔ ایک گدھے کا باپ بنا ایک گدھی کا اور دونوں کو خوب عمدہ لباس پہنایا گیا۔ گدھی کو زیوروں سے آراستہ کیا گیا تو یقیناً وہ گدھی زینت میں گھوڑے سے کچھ کم نہ رہی ہوگی۔ ہندوستان کے گدھے اس واسطے بھی اچھے نہیں لگتے کہ ان کی خدمت نہیں کی جاتی جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں گدھے کی سواری کو معیوب سمجھا جاتا ہے اگر یہاں گھوڑے کی طرح گدھے کی بھی سواری کا رواج ہو جاتا اور گھوڑے کی طرح اُس کی خدمت کی جاتی تو اتنا بُرا نہ لگتا۔ چنانچہ عرب کے گدھے یہاں کے گدھوں سے اچھے ہوتے ہیں خصوصاً نجد کے (۱۲) الخ میں زینت بھی ہے اور سواری کا کام بھی گھوڑے کی برابر دیتا ہے۔ اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ لباس اور زیور وغیرہ سے اونٹ عہ میں بھی زینت آجائے گی وہ بھی اچھا لگنے لگے گا؟ تو میں کہتا ہوں ہاں لیکن اسکی بیڈھنگی رفتار ساری زینت کو کھوتی ہے ؎

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق — تحسین کنند و او خجل از زشت پائے خویش

اور یہاں ایک اور نکتہ قابل غور ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لترکبوھا پر تو لام غایت داخل کیا ہے اور زینۃ پر لام داخل نہیں کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ رکوب تو ایسی غرض ہے جو قابل قصد ہے جو شان غایت کی ہوتی ہے اور زینت قابل قصد نہیں بلکہ امور زائدہ میں سے ہے۔ اس لئے اس کو بصورت غایت ذکر نہیں فرمایا گو معنیً غایت ہی ہے لیکن یہ امر مقصوداً قابل تحقیق ہے کہ اگر کوئی شخص زینت ہی کے لئے اور اسی قصد سے کسی چیز کا استعمال کرے مثلاً عمدہ لباس پہنے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جائز ہے

عہ میں کہتا ہوں کہ لباس کی زینت قابل اعتبار نہیں یہ تو محض عارضی ہے لباس و زیور تو ایک بیجان تصویر میں بھی زینت پیدا کردیتا ہے اور اوپر اس کا ذکر محض تبرعاً ہوا ہے اور بظاہر آیت میں اونٹ کیلئے رکوب و زینت کا بیان نہ کرنا اس پر مبنی ہے کہ اصل خلقت ابل رکوب و زینت کیلئے نہیں ہے بلکہ حمل اثقال الی بلاد بعیدہ کیلئے ہے گو اس سے رکوب و زینت کا کام بھی لے لیا جائے اور اصل خلقت خیل و بغال و حمیر رکوب و زینت کیلئے ہے گو ان سے بھی حمل اثقال کا کام لے لیا جائے۔ فلا یلزم نفی الرکوب والزینۃ عن الابل واللہ اعلم ۱۲ ظ

مگر اطلاق کی ساتھ نہیں جس سے اہل تفاخر کو گنجائش مل سکے بلکہ اس میں تفصیل ہے جس کو میں موارد سے سمجھتا ہوں۔ وہ تفصیل یہ ہے کہ عمدہ لباس اپنا جی خوش کرنے کے لئے یا اپنے کو ذلت سے بچانے کے لئے یا دوسرے شخص کی اکرام کیلئے پہنے تو جائز ہے مثلاً اگر ہمکو یہ معلوم ہو جائے کہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فلاں جگہ تشریف فرما ہیں تو ہم یقیناً عمدہ لباس پہنکر جائیں گے اور اس وقت مقصود حضور کی تعظیم ہوگی۔ انسان اپنے معظم کے سامنے اچھے ہی لباس میں جایا کرتا ہے۔ تاکہ اس کی عظمت ظاہر ہو۔ ہاں عمدہ لباس اس نیت سے پہننا حرام ہے کہ اپنی عظمت ظاہر کی جائے اور دوسروں کی نظر میں اپنی بڑائی ثابت کی جائے خلاصہ یہ ہوا کہ لباس میں چار درجے ہیں۔ ایک تو ضرورت کا درجہ ہے۔ دوسرا آسائش کا۔ تیسرا آرائش یعنی زینت کا۔ یہ تین درجے تو مباح ہیں بلکہ پہلا درجہ واجب ہے۔ اور چوتھا درجہ نمائش کا ہے یہ حرام ہے اور یہ لباس ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر چیز میں یہی چار درجے ہیں ایک ضرورت، دوسرے آسائش، تیسرے آرائش، چوتھے نمائش، ضرورت کا قافیہ بھی اگر مل جاتا تو اچھا ہوتا کہ کلام میں زینت ہو جاتی اور زینت جائز ہے۔ غرض دوسروں کی نظر میں اپنی وقعت بڑھانے کو زینت کرنا حرام ہے باقی نفس زینت حرام نہیں دیکھئے شریعت کے کیسے پاکیزہ حدود ہیں اور اس میں کس قدر وسعت ہے کہ چار درجوں میں سے صرف ایک درجہ کو حرام کیا گیا ہے۔ باقی سب کی اجازت ہے مگر افسوس ملحدین آنکھیں بند کر کے شریعت پر تنگی کا الزام لگاتے ہیں۔ واللہ ان لوگوں نے شریعت کو دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں اسکے بعد ارشاد ہے ویخلق مالا تعلمون اور اللہ تعالیٰ وہ چیزیں پیدا کرتے ہیں جن کو تم نہیں جانتے۔ مطلب یہ ہے کہ مخلوقات الہیہ کا تمہاری معلومات ہی میں انحصار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ میں ایسی چیزیں بھی پیدا کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر نہیں۔ مثلاً ذہن کے اندر بعض جراثیم ایسے پیدا ہوتے ہیں جو انسان وحیوان کے لئے قاتل ہیں اور بعض مواد ایسے پیدا ہوتے ہیں جو موذیات کو فنا کرنے والے ہیں ہم کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سا مادہ کب پیدا ہوا اور کب فنا ہو گیا یہ تو آیت کی تفسیر تھی اب میں اس کے متعلق چند فوائد ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ۲۶

چند فوائد

ایک فائدہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ایک سواری ریل ایجاد ہوئی ہے بعض ذہینوں کو

اس کے متعلق اس کی تلاش ہے کہ ریل کا ذکر بھی قرآن شریف میں کہیں ہے یا نہیں ہر چند کہ اسکی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ قرآن حرفت وصنائع اور ایجادات کے بیان کرنے کو نازل نہیں ہوا جیسا کہ بارہا میں نے اس پر متنبہ کیا ہے اور قرآن کو جو تبیاناً لکل شیءٍ کہا گیا ہے تو وہاں کل شیء سے مراد کل شیءٍ من امور الدین ہے نہ کہ کل شیءٍ ولو من امور الدنیا۔ اس لئے یہ تحقیق مذکور محض ایک امر زائد ہے لیکن تبرعاً میں اس کو بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ اس وقت یہ بیان ایک ایسی ہی نعمت کے شکریہ میں ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریل کے متعلق ہم کو عطا فرمائی ہے اور جسکو دوسرے مرکوبات کی ساتھ وصف مرکوبیت میں مشارکت بھی ہے۔ سو بعض ذہنیوں نے اس کو سورۂ یٰسٓ کی اس آیت وآیۃ لھم انا حملنا ذریتھم فی الفلک المشحون وخلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون ۵ میں داخل کیا ہے کہ اس میں ریل کا بھی ذکر آگیا ہے (کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ لوگوں کے لئے اس بات میں بھی قدرت کی دلیل موجود ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری بھری کشتیوں میں سوار کیا اور ہم نے ان کے لئے کشتی کے مثل اور چیزیں بھی پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں) اور ریل سب سے زیادہ کشتی اور جہاز کے مشابہ ہے کہ جیسے جہاز میں انسان اپنی تمام ضروریات کو ساتھ لے کر سفر کرتا ہے ایسے ہی ریل میں کر سکتا ہے مگر یہ قرآن کی تحریف ہے کیونکہ یہاں خلقنا لھم صیغہ ماضی کا ہے، تو لازم آئیگا کہ ریل کا وجود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی ہوا اور اس کا بطلان ظاہر ہے بلکہ اس سے مراد بعض کے نزدیک تو اونٹ ہے اور اس کا لطف عربیت کے جاننے سے زیادہ آئیگا کیونکہ اہل عرب اونٹ کو سفائن البر یعنی خشکی کا جہاز کہتے تھے۔ چنانچہ یہ مصرعہ مشہور ہے سفائن بر والسراب بحارھا اور میرے نزدیک اس سے مطلق انعام مراد ہیں کیونکہ سورۂ زخرف میں ہے وجعل لکم من الفلک والانعام ما ترکبون یہاں فلک اور انعام دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انعام و کشتی باہم متناسب ہیں مگر مماثلت کی صورت جب ذہن میں آئے گی کہ کشتی تو چھوٹی ہو اور جانور بڑا۔ یہ نہیں کہ جانور چھوٹا ہو

۵ تجار عموماً اپنی اولاد ہی کو سفر میں بھیجتے تھے اور خود دکان پر رہتے تھے اس لئے اولاد کا سوار کرنا مذکور ہوا۔ ۱۲ ظ

اور جہاز ہے اس کا موازنہ کرو جیسے بیربل اور اکبر شاہ کا قصہ ہے کہ اکبر نے بیربل سے کہا مقاکہ مثل مشہور ہے راج ہٹ، تریاہٹ، بالک ہٹ۔ سو اول کی دو ضدیں تو واقعی سخت ہیں باقی تیسری کیا مشکل ہے۔ بیربل نے کہا حضور سب سے سخت تو یہی ہے۔ البتہ اگر عقل ہو تو پھر مشکل نہیں۔ اکبر شاہ نے کہا اس میں عقل کی کون ضرورت ہے۔ بیربل نے کہا بہت اچھا میں بچہ بنتا ہوں۔ آپ میری ضد پوری کیجئے۔ بادشاہ نے کہا۔ اچھا تم بچہ بنو اور ضد کرو ہم ہر ضد کو پورا کریں گے۔ بیربل نے بچوں کی طرح رونا شروع کیا اور کہا ہم تو ہاتھی لیں گے۔ اکبر نے فیل خانہ سے ہاتھی منگوا دیا۔ اس نے پھر رونا شروع کیا اور کہا ہم تو کلھیا لیں گے۔ اکبر نے کلھیا بھی منگوا دی وہ پھر رونے لگا اور کہا ہاتھی کو کلھیا میں رکھو۔ یہاں اکبر عاجز ہو گیا۔ اور کہا اچھا تم جو کہتے تھے کہ اگر انسان عاقل ہو تو بچوں کی ضد پوری کر سکتا ہے۔ یہاں عقل کیا کام دے گی۔ بیربل نے کہا حضور عقل کے ساتھ بچہ کی ضد ضرور پوری کی جا سکتی ہے۔ اکبر نے کہا اچھا لو ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو۔ چنانچہ آپ نے اسی سبق کو دوہرایا کہ ہم تو ہاتھی لیں گے۔ بیربل نے بازار سے مٹی کا ننھا سا ہاتھی منگا دیا۔ پھر کہا ہم تو کلھیا لیں گے اس نے بڑی سی کلھیا منگا دی۔ پھر کہا ہاتھی کو اس میں بند کرو۔ بیربل نے ہاتھی کو کلھیا میں رکھ دیا ۲۸
اور کہا حضور نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی ضد پر فیل خانہ سے ہاتھی منگایا۔ آپ کو بچہ ہی کے مناسب ہاتھی منگانا چاہیئے تھا۔ اسی طرح یہاں فلک و انعام میں مناسبت کا لحاظ کر کے کشتی چھوٹی اور جانور بڑا لینا چاہیئے۔ اور بعض حضرات نے ریل کو سورۂ نحل کی اس آیت ویخلق ما لا تعلمون میں داخل کیا ہے (کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی چیزیں پیدا کریگا جن کو تم نہیں جانتے) گو یہ تحریف تو نہیں ہے مگر بعید ضرور ہے کیونکہ یخلق بظاہر صیغۂ حال ہے اور ظاہر ہے کہ ان سواریوں میں جو آج کل ایجاد ہوئی ہیں صحابہ کے زمانہ میں کوئی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اور اگر اس کو مستقبل لیا جائے تو صحابہ کچھ سمجھے ہی نہ ہوں گے۔ پھر یہ ایجادات خلق کے بعد تو معلوم ہو گئیں اور اس آیت کے تحت میں وہی اشیاء داخل ہو سکتی ہیں جو بعد خلق کے بھی معلوم نہ ہوں اس لئے اس کی تفسیر میں

ع کوئی کہہ سکتا ہے کہ اجمالاً اتنا سمجھ گئے ہوں گے کہ آئندہ زمانہ میں سواری کیلئے کچھ اور اشیاء بھی پیدا ہوں گی تفصیل سمجھنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ نص میں مالا تعلمون موجود ہے ۱۲ ع اگر یخلق کو استقبال اور لا تعلمون کو حال پر محمول کیا جائے تو اشکال وارد نہ ہوگا۔ ای یخلق فی المستقبل ما لا تعلمونہ ایہا المخاطبون بالقرآن اولاً فی ہذا الوقت ولا بعد فی ذلک لکون بعض الخطابات مخصوصاً بالصحابۃ کقولہ وانتم لم تطؤہا ۱۲ ظ۔ قلت وہو بعید فی ذوقی والصنیع کلہا للحال والخطاب عام للقرائن وتخصیص الخطاب فی ما لم تطؤہا القرینۃ التخصیص بخلاف القیاس ۱۲۔ اشرف

سہل بات وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے کہ مراد وہ چیزیں ہیں جو انسان کے لئے مثل نعم مذکورہ
کے نافع ہیں اور تم کو ان کی خبر بھی نہیں جیسے مواد ارضیہ جو موذیات کو فنا کرتے رہتے ہیں اور
نافع ہونے کی قید باقتضار مقام ہے کہ اشیاء نافعہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ پس حاصل مقام کا
یہ ہوا کہ ہم ایسے نفع رساں ہیں کہ بعض چیزوں کی تم کو خبر بھی نہیں اور ہم ان سے تم کو نفع پہنچا
رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ بس وہی چیزیں تمہارے نفع کی پیدا کی ہیں جو تم کو معلوم ہیں جیسے نعم مذکورہ اور
اس تقریر پر یخلق مالا تعلمون کا ربط بھی نعم مذکورہ سے ظاہر ہو گیا یعنی ربط تقابل۔
اور بعض حضرات نے ما یفتح اللہ من رحمۃ فلا ممسک لہا میں ریل کو داخل کیا ہے کیونکہ
بعض سلف نے فرمایا ہے کہ من رحمۃ میں ہر وہ نعمت داخل ہے جو بندوں کی راحت و آسانی
کے لئے ایجاد ہوئی ہے۔ چنانچہ ٹمدن وغیرہ کو بھی انہوں نے اس میں داخل کیا ہے اس میں البتہ
زیادہ بعد نہیں۔ اسی واسطے میں نے بھی اپنی تفسیر کے حاشیہ میں اس مقام پر لکھدیا ہے کہ
من رحمۃ کے عموم میں ریل بھی داخل ہے۔ اور اتفاق عجیب یہ ہوا کہ جس دن میں اس آیت ۲۹
کی تفسیر لکھ رہا تھا اسی دن پہلے ریل ہمارے قصبہ کے سامنے سے ریل گذری ہے اس لئے
میں نے تفسیر کے حاشیہ میں یہ بھی لکھدیا کہ بحمد اللہ آج ہماری بستی کے سامنے سے عیدگاہ
کے قریب ریل گذری ہے اور اس کی ساتھ ریل کے جاری ہونے کا سنہ اور تاریخ بھی لکھدی تاکہ
محفوظ رہے۔ غرض اس آیت میں ریل کا داخل کرنا بعید نہیں اور خود میں نے بھی اسی میں اس کو
داخل کیا تھا۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک بات اس سے بھی زیادہ قریب آئی ہے
وہ یہ کہ اگر ذکر کو حقیقی اور حکمی کے لئے عام لیا جائے تو میرے نزدیک ریل کا ذکر وتحمل اثقالکم
الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس میں سب سے اقرب طرق کی ساتھ ہو جاویگا کیونکہ
حق تعالیٰ نے یہاں مراکب میں وجہ نعمت اس غایت کو بیان فرمایا ہے کہ وہ تمہارا بوجھ ایسے
بلاد تک پہنچاتے ہیں جہاں تم بدون مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ تو جس سواری میں بھی
یہ غایت موجود ہوگی وہ حکماً اس نعمت میں داخل ہو کر مثل انعام کے نعمت کی ایک فرد ہوگی
اور ریل میں یہ غایت سب سے زیادہ موجود ہے تو وہ بھی حکماً اس نعمت میں داخل ہے۔ اور جب

عہ اس ریل کے تھانہ بھون میں جاری ہونیکا وقت جو تفسیر کے حاشیہ میں لکھا ہے ۲۲ ماہ صفر ۱۳۲۵ ہجری ہے۔

ریل بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اسی پر مولانا شیخ محمد صاحب کی حکایت

نعمت میں داخل ہے تو جس طرح نعمت انعام پر ہم کو شکر کی تعلیم دی گئی ہے اسی طرح نعمت ریل پر بھی شکر ادا کرنا چاہیئے مگر اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔

میں نے بچپن میں مولانا شیخ محمد صاحبؒ کا (جو تھانہ بھون کے بڑے علماء میں سے تھے ۱۲) ایک وعظ سنا تھا اس وقت میری عمر زیادہ نہ تھی مگر مولانا سے مجھے محبت تھی اور مولانا کو مجھ سے محبت تھی اس لئے میں کوشش کرکے وعظ میں شرکت کیا کرتا تھا اس لئے مجھے مولانا کے مواعظ کی کچھ کچھ باتیں اب تک یاد ہیں چنانچہ ایک بار مولانا نے وعظ میں فرمایا کہ مجھے ریل کا نعمت ہونا ابھی تک محسوس نہ ہوا تھا یعنی اس طرف التفات نہ ہوا تھا مگر ایک دن جو ریل میں بیٹھا اور جلدی سے منزل پر پہنچ گیا تو اس وقت اس نعمت کی بڑی قدر ہوئی اور معلوم ہوا کہ ریل بھی حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جو ہم لوگوں کو عطا ہوئی ہے۔ پس میں آپ صاحبوں کو بھی مطلع کرتا ہوں کہ اس کو نعمت سمجھو اور اس کا شکر ادا کرو۔ تو جب بڑے بڑے علماء کو اس کا نعمت ہونا جلدی معلوم نہیں ہوا تو عوام کو اگر اس کا نعمت ہونا معلوم نہ ہو تو زیادہ شکایت نہیں۔ مگر تنبیہ کے بعد تو احساس ہونا چاہیئے اس لئے میں بھی مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی طرح کہتا ہوں کہ

ریل پر سوار ہوتے وقت کیا پڑھنا چاہیئے

اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھو اور اس پر شکر کرو اور شکر مراکب کے دو صیغے قرآن میں وارد ہیں۔ ایک سبحان الذی سخر لنا هذا وما كنا له مقرنين وانا الى ربنا لمنقلبون جو رکوب انعام کے وقت اللہ تعالیٰ نے ہم کو تعلیم فرمایا ہے اور دوسرے بسم اللہ مجریها ومرسٰها ان ربی لغفور رحیم جو رکوب سفینہ کے وقت نوح علیہ السلام نے اختیار فرمایا تھا اور چونکہ ریل کو حمل اثقال میں انعام کے ساتھ بھی مشابہت ہے اور سرعت سیر وغیرہ میں کشتی کے ساتھ اس لئے بہتر ہے کہ دونوں کو جمع کرلیا جائے۔

ریل سے جہنم کی یاد تازہ ہوتی ہے

ایک فائدہ یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ ریل کو دیکھکر مجھے جہنم یاد آتا ہے کیونکہ اس کا انجن جہنم کی اس صفت کا مصداق ہے وهى تفور تكاد تميز من الغيظ کہ اس قدر جوش کھاتا ہے گویا غصہ اور قہر سے ابھی پھٹ پڑے گا۔ اور ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے کہ ریل کے تیسرے درجہ جہنم کی اس صفت کا مذکر ہوتا ہے كلما دخلت امة لعنت اختها کہ جیسے جہنم میں ایک جماعت دوسری جماعت پر لعنت کرے گی۔ ایسے ہی ریل میں تیسرے

درجہ والے آپس میں خوب لڑتے ہیں جب کسی اسٹیشن پر نئے نئے مسافر تھرڈ میں بھرتے ہیں تو جو پہلے سے بیٹھے ہوتے ہیں وہ انہیں کوستے برا بھلا کہتے ہیں کہ سارے اسی گاڑی میں آجاؤ تمہارے واسطے اور کہیں جگہ نہیں رہی۔ منہ پر آنکھیں نہیں کہ یہ تو پہلے ہی سے بھر رہی ہے بس تمہاری سزا یہ ہے کہ کھڑے رہو۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ جگہ تو بہت ہے سمٹ سمٹ ہو کر بیٹھو کیا تم ہی نے کرایہ دیا ہے۔ تم ریل کے مالک ہو پھر خوب گالم گلوچ اور جھگڑا فساد ہوتا ہے۔ اُس وقت بالکل یہی منظر ہوتا ہے کلما دخلت امۃ لعنت اختہا۔ اور جب کہتے ہیں کہ ہم نے بھی تو ٹکٹ لیا ہے اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے لکل ضعف۔ اور جب کہتے ہیں کہ تم کو ہم پر کیا ترجیح ہے۔ اُس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے فما کان لکم علینا من فضل۔

۳۱ اور ایک شان اس میں جنت کی بھی ہے۔ وہ یہ کہ جنت میں جب چیز کو دل چاہیگا وہ جلدی مل جائیگی۔ اس بات میں ریل جنت کے مشابہ ہے کہ جس چیز کو دل چاہتا ہے ریل کے ذریعہ سے جلدی حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ کلکتہ اور پشاور کے میوے یہاں دوسرے دن پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے شہروں میں ہر ملک کی چیزیں ہر وقت ملتی ہیں نیز جیسے جنت میں جہاں جانے کو دل چاہا فوراً پہنچ گئے۔ اسی کا نمونہ گو ادنیٰ ہی نمونہ ہو اس میں بھی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے اور اس کے متعلق اسٹیشنوں کا اندازے تقارب اور ہر اسٹیشن پر ضرورت کی چیزیں ملنا بالکل بلاد سباط کو یاد دلاتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے وجعلنا بینہم وبین القری التی بارکنا فیہا قری ظاہرۃ وقدرنا فیہا السیر سیروا فیہا لیالی وایاما آمنین اور گو یہ نعمت دنیوی تھی مگر اس پر ناشکری کی مذمت اس طرح فرمائی گئی فقالوا ربنا باعد بین اسفارنا وظلموا انفسہم فجعلناہم احادیث ومزقناہم کل ممزق الآیہ پس اسی طرح یہ ریل بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس کا شکر کرنا چاہیئے اور اس کے اندر جو مشابہتیں جنت و دوزخ کی مذکور ہوئیں ان پر اگر نظر کی جائے تو نعمت ظاہری کی ساتھ اس سے نعمت باطنہ یعنی تذکر آخرت بھی حاصل ہوگی اور ریل میں یہ نعمت عامہ تو سب لوگوں کیلئے تھی جس کا یہاں تک ذکر ہوا اور ایک نعمت خاص ہماری بستی کو یہ حاصل ہوئی ہے کہ ہمارا اسٹیشن پہلے بہت دور تھا اب خدا کے فضل سے بہت قریب ہو گیا۔ جس سے قصبہ والوں کو اور باہر سے یہاں آنے والوں کو بہت ہی راحت اور آسانی

ہوگئی اس کا بھی ہم لوگوں کو شکر کرنا چاہیئے ۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے لئن شکرتم لازیدنکم (اگر شکر کروگے تو میں نعمت کو ترقی دونگا) اس لئے انشاءاللہ امید ہے کہ یہ نعمت جس حال میں اسوقت ہے اس سے ترقی پاجائیگی (مثلاً یہ کہ اسٹیشن جو قریب بنا ہے عارضی سے مستقل ہوجائیگا ۱۲) اور چونکہ شریعت کی ہم کو یہ بھی تعلیم ہے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ کہ نعمت جن لوگوں کے واسطہ سے تم کو ملے ان لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے اس لئے جو لوگ اس امر میں ساعی ہوئے ہیں ہم کو ان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ یہ بھی شکر نعمت کا تتمہ ہے اور اُن کے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ زبان سے ان کی تعریف کی جائے ۔ اُن کو دعا دی جائے اور ان کے اس احسان کو لوگوں میں ظاہر کیا جائے ۔ مع رعایۃ الحدود وفیہ ۱۲

(اور سب سے زیادہ منعم حقیقی اللہ جل جلالہ کا شکریہ ادا کیا جائے کہ بدون اُن کی مشیت و حکم کے کچھ نہ ہوسکتا تھا ۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی نے اس قصبہ پر یہ انعام فرمایا ورنہ بظاہر اس کی کچھ اُمید نہ رہی تھی اللھم ما اصبح بنا من نعمۃ او باحد من خلقک فمنک وحدک لا شریک لک فلک الحمد ولک الشکر دائما ابدا حمدا الابرید قائلہ الا رضاک ۱۲ جامع) اور اس نعمت الٰہیہ کا شکریہ بہت دنوں تک کرنا چاہیئے بھول نہ جائیں ۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی نعمتوں کے شکریہ کی توفیق دے ۔ اور ادائے شکر بالعمل کی بھی توفیق دے اور دخول جنت کے ساتھ اتمام نعمت فرمائیں ۔ آمین ۔ وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ہ

نوٹ :۔ اس بیان کے بعد حضرت حکیم الامۃ نے فرمایا کہ ایک فائدہ اس آیت کے متعلق اور ذہن میں تھا جو بیان نہ ہوسکا ۔ وقت پر ذہن سے نکل گیا ۔ اگر بعد ظہر کے طبیعت اچھی رہی تو بیان کردونگا ۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً
رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ

سلسلہ

التبلیغ

کا

۳۳

وعظ مسمّٰی بہ

المجاہدہ

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی، دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّی بہ
المجاہدہ

۳۴

این	کہاں ہوا	مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور
متی	کب ہوا	۲ رمضان [illegible] بوقت شب بعد عشاء
کم	کتنی دیر ہوا	ڈیڑھ گھنٹہ
کیف	کس ہیئت سے ہوا	قائماً
لمہ	کیا سبب تھا	اہل مدرسہ اور طلبہ کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون بیان ہوا	مجاہدہ کی ضرورت اور اس کا بیان کہ صرف صلاح عقائد اصلاح عمل کیلئے کافی نہیں بلکہ مجاہدہ کی بھی ضرورت ہے کہ اسکے بغیر عمل سہل نہیں ہوتا
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	علماء و طلبہ کو خصوصاً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد (رحمہ اللہ)
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۵۰۰ تقریباً و مجمع نساء اسکے علاوہ
الاشتات	متفرقات	

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۝ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ من کان یرجو لقاء اللہ فان اجل اللہ لاٰت وھو السمیع العلیم ۝ ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ

ان اللہ لغنی عن العٰلمین ۝ والذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لنکفرن عنھم سیئاتھم ولنجزینھم احسن الذی کانوا یعملون ۝ صاحبو! اسوقت ایک ضروری مسئلہ اصلاح عمل اور طرز عمل کے متعلق بیان کرنیکا قصد ہے اور وہ مسئلہ ایسا بدیہی ہے کہ اسکے ثبوت کیلئے مشاہدہ ہی کافی دلیل ہے کسی نص کی ضرورت نہیں کیونکہ نص کی ضرورت تو اثبات احکام یا اخبار عن الغیب کیلئے ہوا کرتی ہے۔ اور جو امور مشاہدہ کے متعلق ہوں ان کے لئے مشاہدہ کے سوا اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی ہاں اگر کوئی تبرعاً دلیل بھی بیان کردے تو اس سے مدعیٰ اور مؤکد ہو جائے گا چنانچہ وہ مسئلہ جو اسوقت بیان ہوگا اسی قسم کا ہے کہ مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت و معلوم ہے مگر میں نے اسوقت حسب معمول آیات کی تلاوت تبرعاً کردی ہے کیونکہ ان آیات کو اس مسئلہ سے ایک ظاہر علاقہ ہے۔ اب وہ مسئلہ سننا چاہئے اور اسکی ضرورت بھی اس کے سننے سے معلوم ہو جائے گی کیونکہ جی یہ چاہا کرتا ہے کہ جو کچھ بیان ہو کسی ضروری مسئلہ کے متعلق ہو ورنہ یونتو بیان کرنے کو بہت سی باتیں ہیں مگر بلا ضرورت کے لوگوں کا وقت صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا اب غور سے سنئے کہ ہم لوگوں سے اپنے عمل کے بارہ میں ایک غلطی ہو رہی ہے جس کی تفصیل یہ ہے باب عمل میں آجکل دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جنکو صرف اعتقاد کی درستی کا خیال ہے وہ عمل کو عظیم بالشان ہی نہیں سمجھتے اسلئے انکو اصلاح عمل اور تکثیر اعمال کا اہتمام ہی نہیں۔ اگر یہ لوگ یوں کہتے کہ عقیدہ کا درجہ عمل سے زیادہ ہے تو ہم کو ان سے منازعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کا ہمکو بھی انکار نہیں واقعی یہ درست ہے کہ عمل کا درجہ عقیدہ سے مؤخرہ ہے مگر اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ عمل فضول و بیکار ہے کیا جو چیز کسی سے مؤخر ہو وہ بیکار ہوا کرتی ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ شاخوں کا مرتبہ جڑ سے مؤخر ہے مگر باینہمہ کوئی بھی شاخوں کو بیکار نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ درخت بار آور نہیں ہو سکتا جس کی شاخیں نہ ہوں اگرچہ اس کی جڑ کیسی ہی مضبوط ہو ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ خالی عقیدہ جس میں عمل نہ ہو بار آور نہ ہو گا مجرد عقائد سے بغیر عمل کے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو مطلوب شارع ہے گو کبھی بعض کیفیات بغیر اعمال کے حاصل ہو جائیں مگر کیفیات خود مطلوب نہیں باقی جو ثمرہ شارع کے نزدیک مقصود ہے وہ بغیر اعمال کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمکو اخبار شارع سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بدون

۴۵

عقیدہ و عمل دونوں کی درستی کے ثمرۂ مقصودہ کے حصول کا یقین نہیں ہو سکتا گو یہ ممکن ہے کہ بعض کو صرف اصل کی درستی سے بھی حاصل ہو جائے مگر بوجہ وعدہ نہ ہونے کے اس کا یقین نہیں۔ ان لوگوں نے قرآن کی صرف ایک آیت یاد کر لی ہے ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون جس سے یہ سمجھ لیا کہ محض علم کافی ہے یعنی اصلاح عقیدہ اور یہ نہ دیکھا کہ قرآن میں بہت جگہ یہ بات بھی مصرح ہے کہ عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے بھی برابر نہیں ہو سکتے سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلہم کالذین آمنو وعملوا الصلحت سواء محیاہم ومماتہم ساء ما یحکمون ہ ایک مقام پر ارشاد ہے۔ ام نجعل الذین آمنو وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار ط ایک جگہ ارشاد ہے افمن کان مومنا کمن کان فاسقا لا یستوٗن ہ بہر حال ثابت ہو گیا کہ عادۃ اللہ یہ ہے کہ دین سے جو خاص ثمرہ مطلوب ہے، وہ بغیر عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک غلطی تو یہ تھی۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ بعض لوگ اعمال کی ضرورت تو سمجھتے ہیں مگر اعمال کی ساتھ کسی اور شئے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ظاہر بیں ان کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے عقیدہ اور عمل دونوں کو ضروری سمجھا مگر اس میں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ انہوں نے تصحیح عقائد کے بعد اصلاح اعمال اور تکمیل اعمال ومواظبت اعمال کیلئے صرف ارادہ کو کافی سمجھا حالانکہ تجربہ اور مشاہدہ اسپر دلالت کرتا ہے کہ اصلاح اعمال کی سہولت کیلئے ایک اور شئے کی بھی ضرورت ہے اگرچہ نفس اصلاح ممکن ہے یعنی وہ امر اصلاح کا موقوف علیہ عقلاً نہیں ہے اور نہ عادۃً اس معنی کر موقوف علیہ ہے کہ اس کے بغیر کسی طرح بھی عمل نہ ہو سکے لیکن اس معنی کر ضرور موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے عمل بسہولت نہیں ہو سکتا پس وہ سہولت میں موقوف علیہ ہے گو صدور عمل بغیر اسکے ہو سکتا ہے۔ اسکی مثال ریل کی سی ہے کہ جیسے مسافت طویلہ بدون ریل کے بسہولت طے نہیں ہو سکتی اگرچہ بدقت طے ہو سکتی ہے ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح عقائد کے بعد گو صدور عمل تکلف بدون اس خاص شئے کے ہو سکتا ہے مگر بسہولت نہیں ہو سکتا بلکہ سہولت اعمال کیلئے اس خاص شئے کی ضرورت ہے مجھے اسوقت اسی کا بیان کرنا

۳۶

مقصود ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جسکے معلوم نہ ہونے سے باب عمل میں بہت لوگ غلطی کر رہے ہیں حاصل اس شئے کا یہ ہے کہ صدور اعمال بعد اصلاح عقائد کے گو ارادہ سے ہو سکتا ہے لیکن اس ارادہ کے کچھ معاوقات وموانع مزاحم ہو جاتے ہیں جس سے صدور اعمال دشوار ہو جاتا ہے اور اس دشواری سے بعض اوقات عدم صدور اعمال کی نوبت آجاتی ہے تو سہولت کیلئے اس شئے کی ضرورت ہوئی۔ اس شئے کے حصول کے بعد صدور اعمال بالکل سہل ہو جاتا ہے۔ اور میں اسکو تجربہ سے ثابت کرنا چاہتا ہوں ابھی آیت سے استدلال نہیں کرتا کیونکہ آیت میں دوسرے معانی بھی محتمل ہیں اسلئے اول میں تجربہ سے اس کا ثبوت دیتا ہوں پھر بعد میں تبرعاً آیات سے تائید کردوں گا۔ سنئے اس شئے کا نام ہے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس یہ بات بہت قابل قدر ہے اسکو معمولی نہ سمجھئے۔ اب تجربہ سے اسکی ضرورت کو معلوم کیجئے کہ یہ تو سب مسلمان جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نماز پڑھنے کو بہت لوگوں کا جی بھی چاہتا ہے ترک صلوٰۃ سے ان کا دل بھی برا ہوتا ہے مگر پھر بھی بہت لوگ نماز نہیں پڑھتے باوجودیکہ سب کو عقیدہ فرضیت صلوٰۃ کا حاصل ہے۔ اسی طرح بعضے ارادہ کرکے پڑھتے بھی ہیں مگر وہ ارادہ بعض عوائق سے مضمحل ہو کر موثر نہیں رہتا اور اسوجہ سے نماز پر دوام نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صدور ودوام اعمال کیلئے صرف اصلاح عقائد یا ارادہ ضعیفہ کافی نہیں ہے بلکہ کسی اور شئے کی ضرورت ہے جسکے بعد صدور ودوام ورسوخ اعمال ضروری ہے اور وہ تکمیل اعمال کا موقوف علیہ ہے اور وہ شئے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس ہے چنانچہ بے نمازی اسی واسطے بے نمازی ہے کہ وہ اپنے نفس کا اتباع کرتا ہے اور اسکو آرام دیتا ہے۔ اگر وہ مجاہدہ نفس کرتا تو بے نمازی نہ ہوتا یہاں شاید کوئی یہ سوال کرے کہ جو لوگ نماز پڑھتے وہ کونسا مجاہدہ کرتے ہیں ان کے نفس کو کونسی مشقت ہے بلکہ الٹا ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان کو نماز فوت ہونے سے رنج ہوتا ہے تو فوت میں مشقت ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو مشقت تو ہے مگر شوق کی وجہ سے وہ مشقت باقی نہیں رہی اور شوق ہی کی وجہ سے ان کو اس میں لذت آنے لگی جس کا اعلیٰ مرتبہ وہ ہے جو حدیث میں وارد ہے جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ اور یہ درجہ تو کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کہ

۴۷

نماز سے لذت اور راحت حاصل ہو تو کم و بیش مشقت رہتی ہی ہے مگر جسکو یہ درجہ حاصل ہے اس کو بھی اول مشقت و مجاہدہ کرنا پڑا ہے پھر مجاہدہ کرتے کرتے یہ حال ہوگیا کہ مشقت مغلوب اور شوق و لذت غالب ہوگئی یہ تو خواص کی حالت ہے اور عام طور پر تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ نمازی آدمی بھی بعض دفعہ نماز میں کسل کرنے لگتے ہیں مگر حق تعالیٰ کی توفیق سے وہ کسل دور ہو جاتا ہے اور یہ توفیق عادۃً ان کے مجاہدہ پر مرتب ہوتی ہے کیونکہ ان کا ارادہ نفس کی مخالفت ہی کا ہوتا ہے نفس کی موافقت میں ترک صلوۃ کا ارادہ نہیں کرتے ارادہ کے بعد ذرا دہمت سے کام لیتے ہیں کہ توفیق حق شامل حال ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے حدیث میں اسباغ الوضوء علی المکارہ کا ثواب زیادہ وارد ہے اور اسی واسطے حدیث میں آیا ہے حجبت النار بالشہوات وحفت الجنۃ بالمکارہ کہ جہنم شہوتوں سے محجوب ہے، اور جنت مشقتوں سے گھری ہوئی ہے یعنی جیسے باغوں کے گرد کانٹوں کی باڑہ ہوتی ہے ایسے ہی جنت کے گرد مکارہ ہیں جس سے مراد اعمال شاقہ ہیں تو جو شخص جنت کے اعمال کر رہا ہے یعنی وہ اعمال جو موجب دخول جنت ہیں یقیناً وہ مکارہ کو پھاند کر آیا ہے اگر وہ مکارہ کو پھاند کر نہیں آیا تو جان لے کہ یہ رستہ جنت کا نہیں ہے بس بات یہ ہے کہ مکارہ کو پھاند کر تو آیا ہے مگر اس کے شوق اور غلبہ حال سے وہ مکارہ لذیذ ہوگئے جیسے کوئی عاشق محبوب سے ملنے کو دس پانچ کوس طے کرکے آیا ہو تو مشقت تو اس نے ضرور کی گو عشق کی وجہ سے اسکو اس میں لذت ہی آئی ہو۔ اگر ایسے نہ ہوتے تو یہ اہل جنت نہ ہوتے کیونکہ اہل جنت کی تو شان یہ ہے کہ وہ جنت میں جاکر یوں کہیں گے ۲۴۸

الحمد للہ الذی اذہب عنا الحزن ط ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ ط لا یمسنا فیہا نصب ولا یمسنا فیہا لغوب ہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ان کی ساتھ غم لازم تھا گو جسمانی ہی تھا بہر حال وہ شبہ بالکل رفع ہوگیا کہ نمازی کونسا مجاہدہ کرتے ہیں حاصل جواب کا یہ ہے کہ شوق کی وجہ سے مشقت نہاں ہو جاتی ہے اور یہی خاص خاص لوگوں میں ہے ورنہ غالب طبائع میں تو شوق و محبت کم ہے ان میں تو مشقت موجود ہے اور ہمارے پاس اس جواب کے علاوہ ایک کافی جواب یہ بھی ہے کہ الشاذ کالمعدوم اگر کوئی

نمازی ایسا بھی ہو جسکو اصلا مشقت نہ ہوئی ہو اور نہ ہوتی ہو مادر زاد ولی ہو تو یہ شاذ ہے
اس سے گفتگو نہیں۔ غرض غالب حالت یہی ہے کہ نماز روزہ وغیرہ میں مشقت ہوتی ہے
اور اس مشقت میں بعض اوقات مانعیت کی نوبت پہونچ جاتی ہے اور اس مشقت کی
مانعیت کا علاج مجاہدہ ہے۔ پس ترتیب صحیح یہ ہے کہ اول تو عقیدہ صحیح کرے اور عقائد و
علوم صحیحہ حاصل کرے کہ اس سے اعمال کی تحریک ہوتی ہے۔ مثلاً یہ عقیدہ حاصل کیا کہ
اللہ تعالیٰ خالق و رازق ہیں اس سے خدا تعالیٰ کے احسانات اپنے اوپر معلوم ہونگے
اور ذکر و فکر احسانات سے محبت و اطاعت کی تحریک ہوتی ہے۔ اور یہ تحریک باعث
عمل ہے مگر اس باعث کی ساتھ بعض اشیاء مانع بھی ہوتی ہیں اور وہ موانع غالباً دو ہیں
ایک اسباب تنعم دوسرے ضعف نفس یعنی باوجود عقیدہ صحیح ہونے کے اور تحریک طاعت
پیدا ہونے کے بھی بعض دفعہ نفس ضعف و کم ہمتی کی وجہ سے یا اسباب تنعم اور سامان
راحت میں منہمک ہونے کے سبب سے نماز روزہ وغیرہ سے سستی کرتا ہے اور بعض دفعہ ۴۹
نفس اپنی تسویل سے ان موانع کے ساتھ عقیدہ صحیحہ سے بھی مانعیت کا کام لیتا ہے اور یہ نہایت
حیرت کا مقام ہے یعنی عقائد و علوم صحیحہ سے تو طاعات و اعمال صالحہ کی تحریک ہوتی ہے
مگر نفس کبھی ایسی شرارت کرتا ہے کہ عقیدہ صحیحہ سے ترک اعمال میں کام لیتا ہے مثلاً کسی وقت
گناہ کا تقاضا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا کہ گناہ سے جہنم میں
جائے گا اس وقت نفس عقائد صحیحہ میں سے ایک عقیدہ سامنے کر کے پہلے عقیدہ پر غلبہ
حاصل کرنا چاہتا ہے یعنی یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں اور اس عقیدہ کی اسطرح
تقریر کرتا ہے کہ واقعی گناہ کر کے جہنم میں جانیکا اندیشہ ہے مگر یہ جب ہے کہ گناہ سے توبہ
نہ کی جائے اور اگر توبہ کر لیجائے تو سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور میں عزم کرتا ہوں
کہ فوراً توبہ کر لوں گا اور ایک دفعہ کے بعد پھر یہ گناہ نہ کرونگا تو دیکھئے نفس کیسا شریر ہے
کہ عقیدہ صحیحہ سے معصیت میں مدد لیتا ہے حالانکہ اس عقیدہ کی تعلیم کا حاصل صرف
یہ ہے کہ جس شخص سے پہلے گناہ ہو چکے ہوں اور اب وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا چاہے
تو اس کی تسلی کیلئے یہ عقیدہ بتلایا گیا ہے تاکہ گنہگاروں کی ہمت شکستہ نہو اور وہ مایوس

ہوکر خدا سے بے تعلقی ہی کو اپنے لئے تجویز نکرلیں دوسرے یہ کہ بجز انبیاء علیہم السلام کے اتقیاء و
صلحا بھی معصوم نہیں بعض دفعہ ان سے بھی جہالت کی وجہ سے خطا سرزد ہو جاتی ہے اب
اگر یہ عقیدہ نہ تبلایا جاتا کہ اللہ تعالی غفور رحیم ہے تو وہ ہرگز اپنے تقوی و صلاح ماضی کیطرف
عود نکر سکتے بلکہ یہ سمجھ لیتے کہ اب تو ہم گنہگار ہو ہی چکے ہیں جہنم میں جائیں ہی گے پھر نفس کی
لذات میں بھی کیوں کمی کی۔ خطا اور لغزش کے بعد اتقیا و صلحا کو تقوی و صلاح کی طرف
واپس لانے والا یہی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی غفور رحیم ہے۔ اس سے انکو توبہ و استغفار کی
ہمت ہوتی ہے اور چند روز تک بار بار توبہ و استغفار کرنے سے ان کی تسلی ہو جاتی ہے کہ انشاء اللہ
وہ گناہ معاف ہو گیا خوب سمجھ لو اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ مخالفین اسلام نے جو اس
تعلیم پر اعتراض کیا ہے کہ یہ تعلیم جرائم پر جری کرنی والی ہے یہ ان کی غلطی ہے جس کا منشا قلت تدبر
ہے اگر وہ غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ تعلیم نہوتی تو ایک دفعہ جس سے گناہ ہو جاتا وہ
عمر بھر جرائم ہی میں گرفتار رہتا ایک دفعہ یا چند دفعہ خطا ہو جانے کے بعد نیکی اور تقوی و 40
صلاح کی طرف واپس لانے والا یہی عقیدہ ہے جسپر وہ اعتراض کر رہے ہیں۔ پس یہ عقیدہ
تو مخلوق کے دلوں میں خدا کی محبت بڑھانے والا ہے جس سے مخلوق کو اپنے خالق سے تعلق
پیدا کرنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور جرائم کو کم کرنے والا ہے اور استیصال جرائم کیلئے اس کی
ساتھ دوسرا عقیدہ یہ ہے ان اللہ شدید العقاب کہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے اسی لئے
قرآن میں جہاں اللہ تعالی کی رحمت و مغفرت کا ذکر ہے وہاں ساتھ ہی سطوت و شدت
انتقام کا بھی ذکر ہے جس کا ایک نمونہ یہ ارشاد ہے نبیٔ عبادی انی انا الغفور الرحیم
وان عذابی ہو العذاب الالیم اسی طرح کثیر مواقع میں (مخالفین کی فہم پر ہم کو تعجب ہے
کہ وہ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جس سے ان کا دل خود راضی نہیں وہ انصاف کیساتھ
اپنے دل کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے یقیناً وہ یہی کہے گا کہ میں ایسا پروردگار چاہتا
ہوں جو رحیم و کریم ہو کہ اپنے جان نثاروں کی تقصیر و خطا سے درگذر کرتا ہو باغیوں اور
دشمنوں کو سخت سزا دیتا ہو۔ یقیناً نظام عالم کا قیام ایسے ہی بادشاہ سے ہو سکتا ہے جو
نہ محض سخت ہو کہ دوست بھی اس سے مطمئن نہوں نہ محض نرم ہو کہ دشمن بھی بیفکر ہو جائیں

جب یہ عقلی قاعدہ اور مسلم مسئلہ ہے تو اسلام اسی کے موافق تعلیم کرتا ہے تو اعتراض کیوں کیا جاتا ہے ۱۲ جامع) غرض نفس کی شہوت وغیرہ بعض دفعہ عقائد صحیحہ سے مخالف کام لینے لگتی ہے اس لئے ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جو اس مانع کا مقابلہ کرے اور وہ مجاہدہ ہے کیونکہ ان سب موانع کا حاصل یہ ہے کہ نفس لذت و آرام چاہتا ہے والعلاج بالضد پس اس کا علاج یہی ہے کہ نفس کو مشقت و تعب کا عادی بنایا جائے۔ اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ اب لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو محض اصلاح عقائد کو اصلاح عمل کے لئے کافی سمجھتے ہیں انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ عقیدہ کے مزاحم بعض موانع ہوتے ہیں اس لئے ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جس سے یہ موانع دور رہوں ورنہ وہ حالت ہوگی سے

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

تو دیکھئے ایسی ضروری چیز اور لوگ اس سے بالکل غافل ہیں جو لوگ اعمال میں کوشاں بھی ہیں وہ بھی یوں چاہتے ہیں کہ بدون مشقت کے کام ہو جائے یعنی جنکو دین کا شوق الم
بھی ہے وہ بھی مشقت سے گھبراتے ہیں تو یہ لوگ حقیقت میں طالب نہیں بلکہ ہوسناک ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ طالب دنیا کو تحصیل دنیا میں جسقدر مشقت ہوتی ہے اتنی مشقت و پریشانی دین میں نہیں ہوتی دوڑ دھوپ اور جسمانی تکالیف تو الگ رہیں طالب دنیا کو قلبی تشویش اور پریشانی بھی بہت ہوتی ہے اور طالب دین کو جسمانی مشقت بھی طالب دنیا کی برابر ہرگز نہیں ہوتی باقی قلبی تشویش و پریشانی تو اسکے پاس بھی نہیں پھٹکتی یہ اور بات ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے آخرت وجہنم کی اس کو دہشت ہوتی ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی۔ پس طالب دنیا اور طالب دین کے اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اب دونوں کی طلب کو دیکھو تو دنیا والے باوجود اسقدر دوڑ دھوپ اور پریشانی کے یوں کہتے ہیں سے

دست از طلب ندارم تا کام من برآید   یا تن رسد بجانان یا جان زتن برآید

جب وہ دنیا کے کام میں اس قدر مشقت برداشت کرتے ہیں تو خدا کے کام میں اگر کسی کو خدا کی محبت ہے یہ درخواست کیوں ہے کہ سارا کام بدون مشقت کے ہو جائے مثلاً بعض لوگ الم

نظر بد کے گناہ میں مبتلا ہیں جب ان سے کہا جاتا ہے کہ نگاہ نیچی رکھو اور مت دیکھو کیوں کہ دیکھنا اختیاری امر ہے اس کا ترک بھی اختیاری ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نظر کے روکنے پر قادر نہیں مگر واللہ یہ جواب بالکل غلط ہے یہ شخص قادر ضرور ہے مگر وہ مشقت سے گھبراتا ہے اور یوں چاہتا ہے کہ بدون مشقت کے قادر ہو جاؤں اس کے نزدیک قدرت کے معنی یہی ہیں کہ بدون مشقت کے آسانی سے کام ہو جائے سو اس معنی کر واقعی قادر نہیں مگر ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی یوں چاہے کہ بدون منہ میں لقمہ دیے کھانا کھالوں اور جب اس طرح پیٹ نہ بھرے تو کہنے لگے کہ کھانا بہت مشکل ہے ہاتھ ہلاؤ روٹی تک لیجاؤ اس کو توڑو پھر لقمہ بناؤ منہ میں دو پھر چباؤ پھر نگلو۔ اگر اسی کا نام دشواری ہے کہ کچھ بھی نہ کرنا پڑے تو واقعی نظر بد سے بچنا دشوار ہے اور تم اس کے روکنے پر قادر نہیں مگر اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کوئی عاقل اسکو تسلیم نہیں کر سکتا کہ قدرت علی العمل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اصلا مشقت نہ ہو
اور عجز عن العمل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کسیقدر مشقت ہو جب یہ معنی مسلم نہیں تو وہ لوگ جو ۴۲
اپنے کو غض بصر سے عاجز کہتے ہیں غور کریں کہ وہ ایسی حماقت میں مبتلا ہیں انہوں نے قدرت و عجز کی حقیقت ہی غلط سمجھ رکھی ہے ورنہ یہ لفظ کبھی زبان پر نہ لاتے کہ ہم غض بصر پر قادر نہیں۔ غرض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ بغیر مشقت کے نظر بد کو روک لیں سو قرآن میں اس کا ذمہ کہاں ہے وہاں تو مطلق حکم ہے قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم (مسلمانوں کو حکم دیدیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں) یعنی خواہ تکلیف ہو یا نہ ہو مشقت ہو یا نہ ہو کچھ پروا نہیں ان کو ہر حال میں غض بصر کرنا چاہیے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو خود اس آیت کا مطلب یہی ہے کہ باوجود مشقت کے غض بصر کرنا چاہیے۔ اور اس مشقت کو برداشت کرنا چاہیے یہ بات اہل علم کے سمجھنے کی ہے کہ قرآن کی تعلیم کا اکثر طرز یہ ہے کہ ممنوعات میں انہی چیزوں سے صراحۃً منع کیا گیا ہے جن کا تقاضا طبیعت انسانیہ میں ہوتا ہے اور جن کا تقاضا طبیعت میں نہیں بلکہ طبیعت انسانیہ کو اس سے خود نفرت ہے اس سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا چنانچہ اکل ربوا سے شراب پینے سے منع کیا گیا ہے مگر پیشاب پاخانہ کھانے سے منع نہیں کیا گیا کیونکہ اُس کا تقاضا تھا اِس کا تقاضا تھا ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب دوسرا

مقدمہ اس کی ساتھ یہ ملاؤ کہ جس چیز کا تقاضا طبیعت میں ہو اس سے رکنا مشقت ودشواری کا سبب ہے یہ مقدمہ عقلی اور بدیہی ہے اب سمجھئے کہ جب قرآن میں نظر بد سے منع کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ طبائع میں اس کا تقاضا ہے اور جس کا تقاضا طبیعت میں ہو اس سے روکنا سبب مشقت ہے تو آیت کا تو خود یہی مطلب ہوا کہ باوجود مشقت کے اس گناہ سے بچو مگر آجکل کے دینداریوں چاہتے ہیں کہ بغیر مشقت کے سب کچھ ہو جائے اسی کی میں شکایت کر رہا تھا کہ یہ کیسی طلب دین ہے جس میں راحت کی طلب ہے حالانکہ طالب دنیا ذرا سی مردار دنیا کیلئے جان و دل سے مرتے کھپتے رہتے ہیں اور طالب دین کو بغیر مشقت کے حصول دین و اصلاح اعمال کا انتظار ہو رہا ہے افسوس ہے

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

صاحبو! اگر آپ اسی انتظار میں رہیں گے کہ بدون مشقت کے اعمال کی اصلاح ہو تو یہ شہوات نفسانیہ دل میں اپنی جڑیں ایسی مضبوط کر لیں گی کہ پھر واقعی اس کی اصلاح میں سخت
۴۴۳ مشقت کی ضرورت ہوگی کیونکہ ان شہوات سے جسقدر مسامحت وساہلت کی جاتی ہے اسی قدر ان کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت لوگ اسی کے منتظر ہیں کہ کسی بزرگ کی توجہ سے ہماری اصلاح ہو جائے یا وظیفہ سے یا تعویذ سے نفس مہذب ہو جائے حاصل یہ کہ خود کچھ کرنا نہ پڑے۔ یاد رکھو یہ سخت غلطی ہے نفس تمہارا راہ مار رہا ہے اور یہ شیطان کی بڑی رہزنی ہے نفس کی اصلاح بدون مجاہدہ کے نہیں ہو سکتی توجہ اور وظیفہ سے اصلاح مشقت نفس کی لوازمات میں ترقی ہو جاتی ہے آگے کو راہ مفتوح ہو جاتا ہے رذائل کی اصلاح تو ان ہی سے ہوتی ہے الا نادر والنادر کالمعدوم۔ اور اس سے بڑھ کر ایک نہایت دقیق اور نہایت عمیق شیطان کی رہزنی یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ مشقت سے ترک معصیت میں کام لیتا خود معصیت کو ترک معصیت کا ذریعہ بتاتا ہے یعنی جب کسی متقی کو بار بار نگاہ نیچی کرنے سے مشقت ہوتی ہے تو شیطان اس کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ میاں ایک دفعہ اسکو خوب جی بھر کے دیکھ لو اس سے ہوس پوری ہو جائیگی پھر نہ دیکھنا تو یہ روز روز کا رونا تو موقوف

ہو جائے گا مگر واللہ اس جی بھر کے گناہ کرنے سے تو اس کی رگیں اور مضبوط ہو جائیں گی۔ پھر اس کا اس گناہ سے نکلنا بہت دشوار ہو جاویگا کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ شہوت کو نظر سے ترقی ہوتی ہے پھر جب جی بھر کے دیکھنے سے بھی آگ نہیں بجھتی تو شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ ایک دفعہ جی بھر کے اس سے منہ کالا کر لو پھر توبہ کر لینا۔ اس کے بعد پھر یہ روز یہی ہوتا رہتا ہے کہ آج توبہ کر دوں کل توبہ کروں ابھی جی نہیں بھرا اگر اب توبہ کرونگا تو پھر تقاضا ہوگا چنانچہ بعض تو اسی انتظار میں ختم ہو گئے اور توبہ نصیب نہ ہوئی اور بعض کو سالہا سال کے بعد عنایت حق نے سنبھالا تو توبہ کی توفیق ہوئی مگر ذخیرہ گناہوں کا کتنا جمع ہو گیا یہ تو عملی خرابی ہوئی اور اعتقادی خرابی یہ ہے کہ یہ شخص ترک معصیت کا مقدمہ خیال کر کے معصیت کو طاعت سمجھنے لگتا ہے پس یاد رکھو کہ ترک معصیت کیلئے بھی معصیت کا اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں بلکہ ابتدا ہی سے اس معصیت کے تقاضے کا مقابلہ کرنا چاہیئے ؎

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے ۔۔۔ بنیروی شخصے برآید زجائے
وگر ہمچناں روزگارے ہلی ۔۔۔ بگردونش از بیخ برنگسلی
سرچشمہ باید گرفتن بمیل ۔۔۔ چو پر شد نہ شاید گذشتن بپیل

اور جو شخص ترک معصیت کیلئے اعتنا معصیت کو ذریعہ بناتا ہے اس سے بھی یہی غلطی ہوئی کہ اس نے مشقت سے بچنا چاہا مگر ع سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

خوب سمجھ لو کہ مشقت سے بچنا ہی غلطی ہے۔ مرد ہو کر رہو نامرد نہ بنو۔ اور مرد اسی کا نام ہے جو شیطان کا مقابلہ کرے پھر گناہوں سے بچنے میں مشقت اول اول ہی ہوتی ہے پھر ذرا مشقت نہیں ہوتی جو اس سے بھی گھبراتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ گلستاں پڑھنے سے گھبرائے اس کو سب عقلاً بھی جواب دیتے ہیں کہ یہ مشقت چند روزہ ہے پھر تم کو گلستاں میں وہ لطف آئیگا کہ تم اسکو خود نہ چھوڑو گے اور اگر آج ذراسی مشقت سے گھبراؤ گے تو پھر جاہل رہو گے اور اس سے زیادہ مشقت کرنا پڑے گی یعنی پھاوڑہ چلانا پڑے گا۔ اسیطرح گناہ کے چھوڑنے میں جو ذراسی مشقت ہے اگر اس سے گھبراؤ گے تو اس سے بڑھکر مشقت کا سامنا ہوگا ایک تو اسوقت جبکہ گناہ کا ارتکاب کرو گے کیونکہ گناہ کرنے میں علاوہ عذاب

آخرت کے دنیا میں بھی عذاب ہوتا ہے گناہ سے دونوں جہان میں تکلیف ہوتی ہے۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ گناہ کرنے میں کیا مشقت ہے تو صاحبو! واللہ جو لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں وہ سخت مصیبت میں گرفتار ہیں سکون قلب واطمینان کا انکو خواب بھی نہیں آتا ہر وقت ان کا دل وحشت زدہ رہتا ہے اور گناہ کرکے اسکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا کہیں ٹھکانا نہیں وہ خود اپنی نظر میں بہت ذلیل ہوجاتا ہے اور جب اسکو کوئی مصیبت پیش آجاتی ہے۔ اس وقت تو اسکو ایسی پریشانی ہوتی ہے کہ بدحواس ہوجاتا ہے تو واللہ گناہ کرنے والے بڑی غلطی میں ہیں کہ گناہ سے جو غرض تھی یعنی مسرت وہ بھی انکو حاصل نہیں ہوتی یہ تو دنیا کی تکلیف ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے جو بہت سخت ہے مگر بعض لوگ سیر بھر بوجھ اٹھانیکا تجربہ کرکے کئی من بوجھ اٹھانے کو تیار ہوجاتے ہیں یہ ان کی حماقت ہے انکی یہ پہلوانی اسی وقت تک ہے جب تک کئی من کا بوجھ سر پر رکھا نہیں گیا جسدن بڑا بوجھ سر پر رکھا جائیگا ان کا کچومر ہی نکل جائیگا ایسے ہی بعض لوگ جہنم کے پہلوان معلوم ہوتے ہیں مگر اس کو دیکھا نہیں اسلئے ساری پہلوانی ہے اور جسدن دیکھ لیں گے اس دن یہ حالت ہوگی۔ یوم یعض الظالم علی یدیہ یقول یالیتنی اتخذت مع الرسول سبیلا ہ یا ویلتا لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا ہ لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جاءنی وکان الشیطان للانسان خذولا ہ بس امراض باطنہ کے بھی علاج کا وہی طریقہ ہے جو امراض جسمانیہ کا ہے کہ جب مرض لاحق ہوا اسیوقت اس سے دور رہنے اور بچنے کی تدبیر کرو اسکو لپٹانے کا بھی نام نہ لو اور گو گناہ سے بچنے میں کسی قدر مشقت ہوتی ہے مگر وہ تھوڑی دیر کی مشقت ہے پھر راحت ہی راحت ہوگی مثلاً کسی کو حسن پرستی کا مرض ہو تو اسکو چاہیئے کہ حسین سے باتیں کرنا ملنا ملانا اسکو گھورنا بالکل چھوڑ دے کہ یہ سخت مضر ہے گو اسوقت ٹھنڈک پہونچتی ہے مگر اس کے بعد جڑ مضبوط ہوجاتی ہے اور عمر بھر کی مصیبت جان کو لگ جاتی ہے چونکہ اسوقت مجھے زیادہ تر فروع ہی کا بیان مدنظر ہے اسلئے چند فروع مجاہدہ کی اور بھی بیان کرتا ہوں مثلاً غضب کے روکنے میں بعض وقت تکلیف ہوتی ہے اور یہ مجاہدہ ہے مگر اس کے بعد ایک خاص فرحت وراحت ہوتی ہے اور اگر غصہ کو نہ روکا گیا بلکہ جو زبان پہ آیا کہتا گیا تو اسوقت ۴۵

تو نفس خوش ہوتا ہے مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد دل میں کدورت ہوتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہی نفس جو پہلے بہکا رہا تھا بعد میں ملامت کرتا ہے اور اسکے بعد غصہ کے نتائج بد دیکھکر نوبت ہی قلق ہوتا ہے گو نفس ان کی تاویلات بھی کرے مگر پھر بھی اسکو کدورت ضرور ہوتی ہے تجربہ کرکے دیکھا گیا ہے کہ غصہ روکنا ہمیشہ اچھا ہوا اور جب اسکو جاری کیا گیا تو اس کا انجام ہمیشہ برا ہوا اور دل کو قلق بھی ہمیشہ ہوا جیسے مریض کو طبیب کہتا ہے کہ پرہیز کرو دوا پیو تو اس کو بد پرہیزی سے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے کیونکہ بد پرہیزی کا برا انجام بہت دلوں تک رہتا ہے اسی طرح گناہ کرکے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ گناہ کے بعد نفس خود اپنے کو ملامت نہ کرے پھر بعضے اس ندامت کے بعد ہمیشہ کیلئے گناہ سے توبہ کر لیتے ہیں اور بعضے ایک بار توبہ کرکے پھر گناہ کرتے ہیں پھر توبہ کرتے ہیں توبہ تو دل لگی ہو گئی اگرچہ یہ ثابت ہے کہ توبہ اگر سو بار بھی ٹوٹ جائے تب بھی قبول ہو جاتی ہے مگر یہ شرط تو ضروری ہے کہ توبہ کی حقیقت تو پائی جائے مگر اکثر حالت تو یہ ہے کہ جو ۴۶
لوگ ایک گناہ سے بار بار توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ صرف زبانی ہوتی ہے ورنہ عین توبہ کے وقت بھی ان کا یہ عزم ہوتا ہے کہ یہ گناہ پھر بھی کرینگے۔ میں اسی کو دل لگی کہہ رہا ہوں۔ اسلئے جب کوئی شخص اعمال صالحہ کا قصد کرے یا اصلاح نفس کا ارادہ کرے تو وہ اپنے کو اس کام کے لئے پہلے تیار کرلے کہ اول اول مشقت برداشت کرنا اور نفس کی مخالفت کرنا پڑے گی پھر مجاہدہ و مخالفت نفس کے مراتب مختلف ہیں ایک مرتبہ مبتدی کے مجاہدہ کا ہے ایک منتہی کے مجاہدہ کا ہے۔ مبتدی کو تو مجاہدہ میں اول اول دشواری زیادہ ہوتی ہے اور منتہی چونکہ اپنے نفس کو مہذب کر چکا ہے اس سے اعمال صالحہ بلا تکلف صادر ہونے لگتے ہیں مگر ایک مجاہدہ کی ان کو بھی ضرورت ہے یعنی نفس کی نگہداشت کی کہ ہر وقت اس کے افعال و حرکات پر نگاہ رکھے غافل نہ ہو اور یہ مجاہدہ کچھ زیادہ دشوار نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو وہ سوار ہے جسکے نیچے ایسا گھوڑا ہے جسپر ابھی سواری شروع کی گئی ہے اسکو زیادہ ہوشیاری کی بھی ضرورت ہے اور زیادہ مشقت کا بھی سامنا ہے کیونکہ نیا گھوڑا بہت شرارت کرتا ہے اور قابو سے باہر ہو جاتا ہے دوسرا وہ شخص ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہے

جو سواری میں شائستہ ہو چکا ہے اس کو زیادہ مشقت کا تو سامنا نہیں مگر ہوشیار بیٹھنے کی اسکو بھی ضرورت ہے، کیونکہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی کبھی بمقتضائے حیوانیت شوخی کرنے لگتا ہے مگر وہ شوخی ایسی ہوتی ہے کہ سوار کی ذراسی دھمکی اس کے دفع کرنے کو کافی ہے لیکن اگر سوار بالکل غافل رہا تو کسی وقت یہ شایستہ گھوڑے کے اوپر سے بھی ضرور گرے گا پس نفس کی نگہداشت کا مجاہدہ منتہی کو بھی لازم ہے۔ اب یہاں سے میں سالکین کی ایک غلطی پر تنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ بعض دفعہ مہذب نفس بھی شوخی شرارت کرنے لگتا ہے سو بعض لوگوں کو یہ حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نفس میں کوئی برا میلان دیکھکر بڑے گھبراتے ہیں کیونکہ ان کے ذہن میں یہ جم گیا ہے کہ مجاہدہ سے اخلاق رذیلہ بالکل زائل ہو جاتے ہیں اور منشا اس خیال کا یہ ہے کہ اکثر وسط طریق میں وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ تقاضائے معاصی گویا بالکل نہیں رہا حالانکہ اخلاق طبعیہ مجاہدہ سے زائل نہیں ہوتے بلکہ مغلوب و مضمحل ہو جاتے ہیں اور اکثر سلوک کے وسط میں ۴۷
غلبہ حالات و کیفیات کی وجہ سے بہت زیادہ مغلوب و مضمحل ہو جاتے ہیں اس طرح کہ زائل معلوم ہونے لگتے ہیں پھر انتہا میں جب غلبہ حالات کم ہو جاتا ہے اور تمکین حاصل ہوتی ہے تو اخلاق طبعیہ پھر ابھرتے ہیں اس وقت سالک گھبراتا ہے اور رنج کرتا ہے کہ افسوس ہنوز روز اول ہی ہے میرا تو سارا مجاہدہ ہی بیکار گیا نفس تو اسی حالت میں ہے جس حالت میں پہلے تھا اور یہ رنج اسلئے مضر ہے کہ اس کے اس رنج و غم سے شیطان کو راہ ملتا ہے کہ وہ اسکو تعطل کی طرف لیجاتا ہے اور اس حالت میں اس شخص میں شکستگی بھی بیحد ہو جاتی ہے کہ بات بات میں کہتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں ہوں اور ظاہر میں تو یہ تواضع ہے مگر اس میں رنگ شکایت کا ہے گویا خدا تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو بھلا کر یہ سمجھتا ہے کہ جب میرے اندر گناہ کا تقاضا موجود ہے تو اب میرے پاس کوئی نعمت نہیں حالانکہ یہ سخت ناشکری ہے پھر اس سے بڑھکر یہ کہ یہ شخص اپنی تمام ریاضات گذشتہ کو یاد کر کے اپنے دل میں یوں کہتا ہے کہ میں بڑا بدقسمت ہوں کہ اتنی محنت کے بعد بھی مجھے ناکامی ہی رہی بس اب میرے واسطے کیا رہا کچھ نہیں۔ اور بعض اوقات یہ شخص اپنی کامیابی سے مایوس ہو کر نفس کو بالکل آزادی دیدیتا

ہے کہ جب مجاہدات کے بعد بھی ناکامی ہی ہے تو نفس کو مصیبت میں کیوں ڈالا یہ شخص اس غلطی میں اسلئے مبتلا ہوا کہ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں مجاہدہ کر کے تقاضائے گناہ سے بھی معصوم ہو گیا اور اب میرے اندر سے اخلاق رذیلہ بالکل نکل گئے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کشاکشی ہمیشہ رہتی ہے ہاں مبتدی جیسی نہیں رہتی اسلئے میں کہتا ہوں کہ اعمال صالحہ کا جب قصد کرے تو اول ہی نفس کو یہ سمجھالے کہ ان اعمال میں مشقت ہمیشہ رہے گی اور عمر بھر مجاہدہ کرنا ہوگا۔ اور یہاں سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ شیخ کتنی بڑی نعمت ہے کہ وہ کیسے کیسے عقبات سے سالک کو نکالتا ہے اور اس کا عقبات سے نکالنا یہی ہے کہ وہ حقائق صحیحہ پر مطلع کرنا اور غلط اعتقادات سے بچاتا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر و پس بر آ
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　　عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

اور فرماتے ہیں ؎

صد ہزاران دام و دانہ ست اے خدا　　ما چو مرغان حریص بے نوا
بے عنایات حق و خاصان حق　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

خدا کے خاص بندوں کی کسی پر عنایت ہو جائے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ بہرحال خوب سمجھ لو کہ اعمال صالحہ میں مشقت ہمیشہ رہتی ہے کیونکہ وہ اعمال نفس کی خواہش کے خلاف ہیں نفس ان میں منازعت ضرور کرتا ہے قلیل یا کثیر اسلئے مخالفت نفس کی عمر بھر ضرورت ہے اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ اور یہاں سے بعض واعظین کی غلطی معلوم ہو گئی کہ وہ یہ آیت یعنی واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی کو مسلمانوں کے حق میں پڑھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو نماز میں کسل کرے وہ منافق ہے بات یہ ہے ان لوگوں کو قرآن کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ کسل کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ عمل میں مشقت کا سامنا ہو مگر عقیدہ میں ضعف یا شک نہ ہو تو یہ وہ کسل نہیں ہے جو منافقین کی شان تھی یہ تو کسل طبعی ہے اور طبعی کسل اعمال شرعیہ میں مخلصین کو بھی ہو سکتا ہے

کیونکہ یہ اعمال نفس پر گراں ہیں نفس ان میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اور اعمال شرعیہ میں مشقت کا سامنا ہونا آیت وما جعل علیکم فی الدین من حرج کے خلاف نہیں کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین فی نفسہ آسان ہے دشوار نہیں یہ اور بات ہے کہ منازعت نفس کی وجہ سے اس میں دشواری آجائے کیونکہ یہ ضرور ہے کہ اعمال شرعیہ میں نفس کی خواہشوں کو پامال کیا جاتا اور اس کی مخالفت کی جاتی ہے اور یہ نفس کو ضرور گراں ہے تو اس منازعت وکشاکشی کی وجہ سے دشواری آجانا یسر فی نفسہ کے خلاف نہیں اسی لئے قرآن میں وما جعل علیکم فی الدین من حرج سے پہلے وجاہدوا فی اللہ حق جہادہ بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ دین میں مجاہدہ کی بھی ضرورت ہے پس ایک جزو ہی کو مت دیکھو دونوں جزوں کو ملاؤ تو حاصل وہی نکلے گا جو میں نے عرض کیا ہے۔ اب سنئے کہ ایک تو طبعی کسل ہے جس کا منشا منازعت نفس ہے یہ منافقین کے ساتھ خاص نہیں اور ایک اعتقادی کسل ہے کہ اس شخص کو نماز کی فرضیت پر اور خدا اور رسول

۴۹ پر ہی ایمان نہیں ہے محض کسی مصلحت کی وجہ سے نماز پڑھ رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دل سے نہ پڑھے گا بلکہ بیگار سی ٹالیگا اور کسل کی ساتھ نماز ادا کرے گا یہ کسل منافقین کی شان ہے اور خدا نہ کرے کہ کسی مسلمان کی ایسی شان ہو۔ بہرحال اعمال شرعیہ میں مجاہدہ کی ضرورت عمر بھر کے لئے ہے مبتدی کو بھی اور منتہی کو بھی اور دونوں کو کبھی نہ کبھی اعمال میں منازعت نفس کی وجہ سے کسل بھی پیش آتا ہے مبتدی کو زیادہ منتہی کو کم اس کسل ہی کے رفع کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے نیز کسی وقت دونوں کا نفس معاصی کا تقاضا کرتا ہے اس کے مقابلہ کے لئے بھی مجاہدہ کی دونوں کو ضرورت ہے۔ تو ایک غلطی تو مبتدی کرتا ہے کہ وہ اپنے کو مشقت سے بچانا چاہتا ہے اور مجاہدہ کرتا ہی نہیں بلکہ اسی انتظار میں ہے کہ سارا کام بدوں مشقت کے ہو جائے اور ایک غلطی منتہی کرتا ہے کہ وہ ابتدا میں مجاہدہ کر کے آئندہ کیلئے مجاہدہ سے اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ طبائع بشریہ پھر عود کرتے ہیں اور اس وقت منتہی کو بھی معاصی کا تقاضا ہوتا ہے اور اس کا نفس بھی طاعات میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اس وقت اس کو بھی مجاہدہ کی

ضرورت ہوتی ہے مگر مبتدی اور منتہی کے مجاہدہ میں بڑا فرق ہے جس کی مثال اوپر گذر چکی ہے کہ جیسے ایک شخص تو شائستہ گھوڑے پر سوار ہو اور ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس پر آج ہی سواری کی گئی ہے۔ شائستہ گھوڑے کے سوار کو بھی ہوشیار بیٹھنے کی ضرورت ہے کیونکہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی شوخی شرارت کرنے لگتا ہے مگر اس کے دبانے میں اس قدر مشقت نہیں ہوتی جسقدر نئے گھوڑے کے دبانے میں ہوتی ہے اس لئے منتہی کا اپنے گذشتہ مجاہدہ وریاضت کو بیکار و بیہودہ سمجھنا بھی غلط ہے اور آئندہ کے لئے بھی وہ مجاہدہ سے مستغنی نہیں اور اعمال صالحہ کا کرنا کسی وقت بھی مشقت سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ فروع میں اس کی ایک اور مثال یاد آئی مثلاً کسی شخص کے اندر کبر ہے تو اس کے دو علاج ہیں ایک علمی اور ایک عملی علاج تو مثلاً یہ ہے کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور یوں سمجھے کہ مجھے اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے اور دوسروں کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص یقینی معیوب ہو وہ معیوب ظنی سے بدتر ہے اسلئے مجھے اپنے کو سب سے کمتر سمجھنا چاہیئے اور عملی علاج یہ ہے کہ جسکو تم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہو اسکی ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آؤ اور یہ عملی علاج جزو اعظم ہے بدون اسکے علمی علاج تنہا کافی نہیں مگر اس کا بجالانا دشوار ضرور ہے۔ ہر شخص سے آسان نہیں مگر تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جب تک یہ عملی علاج نہ کیا جائیگا کبر دور نہ ہوگا۔ ایسے ہی حسد کا علاج یہ ہے کہ جس سے حسد ہو اسکے لئے ترقی خیر کی خوب دعا کیا کرے اور اسکی ساتھ احسان بھی کرتا رہے چند دن میں حسد دور ہوجائیگا مگر یہ بات آسان نہیں گو فی نفسہ یہ سب اعمال آسان ہیں مگر نفس کی منازعت کی وجہ سے دشوار ہو رہے ہیں۔ مگر ان میں دشواری اول اول ہی ہے کیونکہ نفس کی کشاکشی ابتدا میں زیادہ ہوتی ہے پھر زیادہ منازعت نہیں رہتی مگر ایک دو مرتبہ عملی علاج کرکے بیفکر ہونا چاہیئے بلکہ اسکو مدت دراز تک جسکو شیخ محقق تجویز کرے کرنا چاہیئے کیونکہ ایک دو دفعہ سے مرض کی جڑ نہیں جاتی اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎ ۵۰

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

غرض یہ طریقہ ہے اعمال کی اصلاح کا اور باطن کی اصلاح کا کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جلوے اور اسکو مشقت کا عادی بنایا جائے مگر آجکل لوگوں سے مشقت تو ہوتی نہیں۔

یوں چاہتے ہیں کہ ہمارے آرام میں بھی خلل نہ آوے اور اعمال کی بھی اصلاح ہوجائے
باطن کی بھی اصلاح ہوجائے چنانچہ ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے ایسا وظیفہ تبلادو جس سے
نماز قضا نہ ہو میں نے کہا کہ اگر وظیفہ قضا ہونے لگا تو اس کے واسطے دوسرا وظیفہ پڑھو گے
پھر اس کے واسطے تیسرا یہ تو سلسلہ غیر متناہی چلے گا اس کا علاج تو یہ ہے کہ جسدن نماز قضا
ہو اس دن بھوکے رہو یا ۴ر صدقہ کرو اور یہ صدقہ نہ تو اتنا زیادہ ہو جس کا تحمل نہ ہو نہ
اتنا کم ہو جس کی نفس کو خبر بھی نہ ہو بلکہ درمیانی درجہ کا ہو جس سے نفس پر کسیقدر گرانی ہو اور
اس سے کہدو کہ جب تو نماز قضا کرے گا میں تجکو یہی سزا دوں گا۔ اور یہ علاج میں نے یا صوفیہ
نے اپنی طرف سے اختراع نہیں کیا بلکہ نصوص سنت میں اس کی اصل موجود ہے حدیث میں
ہے من قال تعال اقامرک فلیتصدق یعنی جس کی زبان سے یہ کلمہ نکل جائے کہ آؤ جوا
کھیلیں وہ صدقہ کرے اسی طرح حیض کے زمانہ میں غلطی سے جماع ہوجائے تو وہاں بھی
صدقہ کا حکم ہے ابتدائے حیض میں ایک دینار اور آخر میں نصف دینار۔ اور راس میں راز
یہ ہے کہ صدقہ کرنے سے نفس پر زیادہ مشقت پڑتی ہے وہ اس سے بچنے کیلئے تھوڑی مشقت ۵۱
کو برداشت کرلیتا ہے اور یہ کام اس سے چھوٹ جاتے ہیں تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان مواقع کیلئے کوئی وظیفہ نہیں تبلایا بلکہ ایسا علاج تبلایا جس میں نفس کو مشقت ہے اس سے
صاف معلوم ہوا کہ اصلاح نفس کا طریقہ مجاہدہ ہی ہے وظیفوں سے اصلاح نہیں ہوا کرتی۔

شاید طلبہ کو یہاں یہ شبہ ہو کہ امام ابوحنیفہؒ تو غرامت مالیہ کو ناجائز فرماتے ہیں پھر تم یہ جرمانہ
کیونکر تبلاتے ہو۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اپنے اوپر جرمانہ کرنا جائز ہے دوسروں پر جائز
نہیں اور ہم یہی تو تعلیم کرتے ہیں کہ جب عمل میں کوتاہی ہو تم خود اپنے اوپر جرمانہ کیا کرو یہ تو نہیں
کہتے کہ مریدوں سے کوتاہی ہو تو ان پر جرمانہ کرکے تم وصول کیا کرو اگر کوئی شیخ ایسا کرے
تو بیشک ناجائز کا مرتکب ہوگا۔

یہ تو وہ امراض تھے جو مردوں اور عورتوں میں مشترک تھے اب میں بعض ان امراض کا
علاج تبلاتا ہوں جو مستورات کی ساتھ خاص ہیں کیونکہ اسوقت مستورات کا مجمع بھی موجود ہے
سو مستورات میں ایک مرض یہ ہے کہ جب چند عورتیں جمع ہونگی تو ہمیشہ دنیا کی باتیں کریں گی

مرد کبھی جمع ہوتے ہیں تو کبھی خدا و رسول کی باتیں بھی کر لیتے ہیں مگر عورتوں کے مجمع میں خدا و رسول کی باتیں کبھی سننے میں نہیں آئیں بلکہ ان کی تمامتر گفتگو زیور کپڑے روپے پیسے کے متعلق ہوتی ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان میں زیور کی محبت اور لباس کی محبت زیادہ ہے اس کا علاج یہ ہے کہ زیور کا استعمال کم کر دیا جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ اپنے گھر میں استعمال کم کرو کیونکہ اپنے گھر میں تو عموماً عورتیں زیور پہنتی ہی نہیں اور لباس بھی معمولی ہی پہنتی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کسی دوسرے کے جاؤ تو زیور کم پہنکر جاؤ اور لباس بھی معمولی پہنکر جاؤ باقی سارے زیور کو اور قیمتی جوڑوں کو اپنے گھر میں پہنو کیونکہ شریعت نے عورتوں کو چاندی سونے کا زیور اور ریشم کا کپڑا صرف اسی لئے حلال کیا ہے تاکہ وہ شوہر کے سامنے اس سے زینت کر سکیں تو ان کے استعمال کا اصلی محل اپنا ہی گھر ہے مگر اب عورتوں نے اس تعلیم کے خلاف یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ شوہر کے سامنے تو معمولی حالت میں رہیں گی اور دوسرے گھر ۵۴
بن ٹھنکر جائیں گی تو یہ عمل خلاف شریعت بھی ہے اور اس سے زیور و لباس کی محبت بھی بڑھتی ہے اسلئے عورتوں کو شریعت کی اصل تعلیم پر عمل کرنا چاہیئے کہ اپنے گھر میں سب زیور لباس پہنا کریں اور دوسرے گھر میں معمولی زیور و لباس پہنکر جایا کریں اس سے زیور و لباس کی محبت ان کے دل سے کم ہو جائے گی اور سب سے بڑا مجاہدہ یہ ہے کہ شادی اور دوسری تقریبات کے موقعہ پر سادے کپڑے اور سادا زیور پہنکر جایا کریں۔ اصلاح تو اسی طرح ہو گی بغیر اس کے کتابیں پڑھنے اور وعظ سننے سے کچھ نہ ہو گا۔ رہا یہ کہ نوبت دشوار ہے نل پر آرا چل جائے گا "نہ بھری برادری میں سب تو اچھے زیور و عمدہ لباس سے آئیں اور ہم سادے لباس معمولی زیور میں ہوں تو صاحبو! دنیا کا بھی تو کوئی کام بدون محنت کے نہیں ہوتا اے اللہ دینداری عورت ایسی سستی کیوں ہے کہ لوگ دیندار بدون محنت کے بننا چاہتے ہیں۔

؎ ناز پروردۂ تنعم نہ برد راہ بدوست   عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ اتنی محنت کرو جس سے نفس تھک جائے بعضے اہل مجاہدہ ایسے بھی ہیں چنانچہ ہمارے ساتھ سفر حج میں جہاز میں ایک شخص تھے وہ کئی کئی دن تک کچھ نہ کھاتے اور جب کھانے بیٹھتے تو کئی دن کی خوراک ایک ہی وقت میں کھا جاتے لوگوں نے

ان سے کہا کہ یہ کیا واہیات ہے کہ ایک وقت میں تم کئی دن کی خوراک کھا جاتے ہو کہا
میں مجاہدہ کرتا ہوں کیونکہ مجاہدہ کی ایک قسم تو ترک اکل ہے اور ایک قسم اکثار اکل
یہی ہے کہ اتنا کھائے کہ نفس پریشان ہو جائے کیونکہ مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان
کرنا ہے اور جس طرح ترک طعام سے پریشان ہوتا ہے بہت کھانے سے بھی پریشان ہوتا ہے
سو یہ قول غلط ہے مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے بلکہ نفس کو مشقت
کا خوگر بنانا اور راحت و تنعم کی عادت سے نکالنا ہے اور اس کے لئے اتنا مجاہدہ کافی ہے
جس سے نفس پر کسیقدر مشقت پڑے بہت زیادہ نفس کو پریشان کرنا اچھا نہیں ورنہ وہ بالکل
معطل ہو جائے گا تو خوب سمجھ لو کہ محنت ہمیشہ مستحسن نہیں بلکہ جب اعتدال سے ہو اور
اس پر نتیجہ اچھا مرتب ہو اسوقت مستحسن ہے اسپر مجھے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ
کا مقولہ یاد آیا کہ آپنے ایک مدرس کو مدرسہ سے الگ کرنا چاہا اور مہتمم صاحب نے ان کی سفارش
کی کہ یہ محنتی بہت ہیں تو مولانا نے فرمایا کہ اگر محنت ہی مطلوب ہے تو مجھے چالیس روپے تنخواہ
دیکر مدرس اول کیوں بنایا بلکہ ایک پنہاری کو چکی دیکر درسگاہ میں بٹھلادو وہ مجھ سے ۳۴ ل
زیادہ محنت کرے گی اور مزدوری صرف دو آنہ لیگی۔ پس مجاہدہ میں افراط بھی مذموم ہے بلکہ
اعتدال کی رعایت لازم ہے اسی کو شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

نہ چنداں بخور کز دہانت برآید　　نہ چنداں کہ از ضعف جانت برآید

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک
قواما ہ یعنی خدا کے خاص بندے وہ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں
نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ وہ خرچ اس کے درمیان میں معتدل ہوتا ہے پس مجاہدہ میں بھی اعتدال
کی رعایت کرنا چاہیئے۔ مگر اس اعتدال کو بھی آپ اپنی رائے سے تجویز نہ کیجئے کیونکہ بیمار
کی رائے بیمار ہوتی ہے اس طریق میں اپنی رائے سے کامیابی نہیں ہوتی۔ ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست　　کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

بلکہ کسی محقق سے درجۂ اعتدال معلوم کیجئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں علمائے قوانین ظاہرہ و باطنہ
پیدا کئے ہیں ان سے رجوع کرو اور ان سے طریق مجاہدہ معلوم کرو۔ پھر جیسے طالبان

عمل میں دو فرقے ہیں ایک وہ جو محنت سے بچنا چاہتے ہیں دوسرے وہ جو محنت میں غلو کرتے ہیں اسی طرح طالبان علم میں بھی دو فرقے ہیں ایک وہ جو یوں چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا بھی نہ پڑے اور عالم ہو جائیں اس کی ترکیب انہوں نے یہ نکالی کہ مدرسہ میں داخل ہو کر کسی جماعت میں شریک ہو گئے اور کبھی کبھی درس میں بھی شریک ہو گئے پھر دس دن بارہ دن کو غائب ہو گئے نہ مطالعہ ہے نہ تکرار ہے نہ سبق کے وقت توجہ ہے جماعت نے کتاب ختم کر لی تو ان کی بھی ختم ہو گئی وہ درسیات سے فارغ ہو گئی تو یہ بھی فارغ کہلانے لگے گو واقع میں بالکل ہی فارغ ہوں یعنی کورے تو یاد رکھو اس طرح علم نہیں آیا کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسوں ہی کے واسطے فرمایا ہے ؎

لو کان ہذا العلم یدرک بالمنی ‏ ما کان یبقی فی البریۃ جاہل
فاجہد ولا تکسل ولا تک غافلا ‏ فندامۃ العقبی لمن یتکاسل

اور بعضے محنت میں افراط کرتے ہیں کہ اتنی محنت کرتے ہیں کہ دماغ بھی خراب ہو جائے۔

م ٥ افراط تفریط دونوں برے ہیں۔ شریعت کو ہر شے میں اعتدال مطلوب ہے، اہل مجاہدہ کا ایک افراط یہ بھی ہے کہ بعضے تقلیل غذا میں غلو کرتے ہیں بعضے ہاتھ کو سکھاتے ہیں بعضے لباس نہیں پہنتے بلکہ آگ سلگا کر سردی گذارتے ہیں یہ وہ مجاہدے ہیں جو آجکل جوگیوں میں رائج ہیں اور غضب یہ ہے کہ بعضے مسلمان بھی ان مجاہدات کو کمال اور جوگیوں کو باکمال سمجھنے اور ان کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ کچھ کمال نہیں کیونکہ بدن کو مار دینے کیا ہوتا ہے مطلوب تو وہ مشقت ہے جس سے نفس پر مشقت ہو یہ ضرور ہے کہ مشقت نفس میں بعض دفعہ مشقت جسم کو بھی دخل ہوتا ہے مگر اس میں اعتدال ضروری ہے مثلاً روزہ رکھ لیا جائے اعتکاف کر لیا جائے بس یہ مشقت کافی ہے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ صاحبو جس طرح طبیب دوا تجویز کر کے اس کی مقدار بھی خود ہی تجویز کرتا ہے اسی طرح آپ کو مجاہدہ کی مقدار بھی شریعت ہی سے معلوم کرنا چاہیے جبکہ اصل مجاہدہ کو آپ نے شریعت ہی سے معلوم کیا ہے۔

اب یہاں ایک بات اور سمجھئے کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں ایک مجاہدہ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی کیا جائے مثلاً نوافل کی تکثیر سے نماز کا عادی کرنا اور روزہ کی کثرت سے حرص طعام وغیرہ

کم کرنا اور ایک مجاہدہ بمعنی مخالفت نفس ہے کہ جسوقت نفس معصیت پر داعی ہو اس وقت اسکے
تقاضے کی مخالفت کرنا۔ اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے اور پہلا مجاہدہ
بھی اسی کی تحصیل کیواسطے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہوگا تو
اسکو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہو گی۔ لیکن اگر کسی کو بدون مجاہدہ جسمانیہ کی
مخالفت نفس پر قدرت ہو جائے تو اسکو مجاہدہ جسمانیہ کی ضرورت نہیں مگر ایسے لوگ شاذ و نادر
ہیں اسی واسطے صوفیہ نے مجاہدہ جسمانیہ کا بھی اہتمام کیا ہے اور ان کے نزدیک اسی کے چار ارکان
ہیں ترک طعام۔ ترک کلام۔ ترک منام۔ و ترک اختلاط مع الانام اور ترک سے مراد تقلیل ہے ترک
کلی مراد نہیں۔ جو شخص ان ارکان اربعہ کا عادی ہو جائیگا واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائیگا
کہ تقاضائے معصیت کو ضبط کر سکے گا مگر میرا مقصود اسوقت مجاہدہ جسمانیہ کا بیان کرنا نہیں
ہے بلکہ مجاہدہ نفسانیہ کا بیان مقصود ہے کہ گناہ کے وقت نفس کو روکو اور اس میں جو مشقت
لاحق ہوتی ہے اسکو برداشت کرنا چاہئیے کیونکہ بدون مشقت کے کوئی کام نہیں ہو سکتا ۵۵
نہ دنیا کا نہ دین کا۔ یہ ہے وہ مسئلہ جسکی ضرورت تھی اور لوگ اس سے غافل ہیں یعنی
مخالفت نفس کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے اس کی مخالفت کرو۔ اور یہ بات اس وقت
آپ کو حاصل ہو گی جبکہ نفس کی جائز خواہشوں کی بھی مخالفت کیا کرو۔ مثلاً کسی لذیذ
چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش کو پورا نہ کیا جائے بلکہ اس کی درخواست کو رد کر دیا جائے
دس دفعہ میں سے ایک دفعہ اس کی جائز خواہش پوری کر دی اور نو دفعہ ٹالدی جب
مباحات میں تم مخالفت نفس کے عادی ہو گے اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت
پر آسانی سے قادر ہو گے اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے وہ بعض
اوقات تقاضائے معصیت کے وقت اسکو نہیں دبا سکتا تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے یہاں سے
معلوم ہوا کہ صوفیہ نے جو ارکان اربعہ مجاہدہ کے تجویز کئے ہیں اس میں انہوں نے ابتداع
نہیں کیا اول تو احادیث میں غور کرنے سے ہر رکن کی اصل مل سکتی ہے دوسرے انہوں نے
تسہیل مخالفت نفس عند ارادہ المعصیۃ کیلئے یہ نوع مجاہدہ کی بطور تدبیر کے تجویز کی ہے تدبیر میں
نصوص کی بھی حاجت نہیں البتہ نصوص کے خلاف نہ ہونا چاہئیے خلاصہ یہ کہ لوگوں نے جو یہ سمجھ لیا ہے کہ

دین کے کاموں میں مشقت برداشت کرنیکی ضرورت نہیں غلط ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ دین سارا مجاہدہ ہی ہے کیونکہ دین نام ہے۔ پابندی کا اور پابندی نفس کو گراں ہے۔ پس بدون مجاہدہ کے دین کامل نہیں ہوسکتا۔ اب میں اس مسئلہ کو ان آیات پر منطبق کرنا چاہتا ہوں جو میں نے شروع میں تلاوت کی ہیں۔ میں نے تین آیتیں تلاوت کی ہیں ایک

من کان یرجو لقاء اللہ فان اجل اللہ لآت وہو السمیع العلیم یہ آیت راجع الی العقیدہ ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں تو اللہ کا وہ وقت معین ضرور آنیوالا ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اقوال کو) خوب سنتے اور (ان کے افعال واحوال کو) خوب جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اوپر بعض مسلمانوں کو جو کفار کی ایذاء سے گھبراتے تھے تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ان کو صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائیگا کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی حالانکہ ہم ان سے پہلے مسلمانوں کو بھی آزمائش سے پرکھ چکے ہیں اسکے بعد جملہ معترضہ کے طور پر کفار کو یہ مضمون سنایا گیا ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ وہ ہم سے بچکر بھاگ جائیں گے سو ان کی یہ تجویز بہت بیہودہ ہے اس جملہ معترضہ میں کفار کی تنبیہ کیساتھ مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی بھی کردی گئی کہ کفار کی یہ ایذائیں چھوڑنہ ہیں پھر ہم ان کو اچھی طرح پکڑنے والے ہیں اس کے بعد پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں ان کو تو ایسے واقعات سے پریشان نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ کا وہ وقت مقرر ضرور آنے والا ہے (اسوقت سارا غم غلط ہوجائیگا) اور اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں (تو وہ ان کی باتوں کو سنتے اور کاموں کو جانتے ہیں اسوقت ان کی طاعات قولیہ اور طاعات فعلیہ سب کا اجر دیکران کو خوش کرینگے) اس آیت میں رجاء سے مراد اعتقاد جازم ہے مگر اس میں ایک لطیفہ ہے جسکی وجہ سے اعتقاد کو بعنوان رجاء بیان فرمایا وہ یہ کہ آیت مکی ہے جسکے مخاطب کفار بھی ہیں جو قیامت کے معتقد نہ تھے منکر تھے اسلئے اللہ تعالیٰ نے آیت کو رجاء و امکان سے شروع فرمایا جس سے کفار کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کیونکہ استحالہ کی تو اس میں کوئی بات ہی نہیں اور جب ممکن ہے تو ارشاد فرماتے ہیں کہ جسکو لقاء اللہ کا امکان بھی معلوم ہو۔ ۵۶

ہم اسکو تبلاتے ہیں کہ اس کا وقوع بھی ضرور ہونے والا ہے پس ہماری خبر کے بعد اس کے وقوع میں شک نکرنا چاہیئے وہو السمیع العلیم یہ صفات یہاں بہت ہی مناسب ہیں کیونکہ ایمان کے دو جزو ہیں ایک تصدیق بالقلب دوسرے اقرار باللسان کیونکہ قدرت کے وقت اقرار باللسان بھی فرض ہے تو ایمان کے بیان میں ان صفات کا ذکر بہت ہی خوشنما ہے تاکہ بندوں کو اطمینان ہو جائے کہ ہمارا ایمان خدا تعالیٰ سے مخفی نہیں رہ سکتا ان کو ضرور اس کا علم ہوتا ہے تصدیق قلبی کو بھی جانتے ہیں اور اقرار لسانی کو بھی سنتے ہیں یہ آیت تو باب العقائد کے متعلق تھی۔ اس کے بعد دوسری منزل مجاہدہ ہے جو تصحیح عقائد سے موخر ہے اور تکمیل اعمال سے مقدم ہے یعنی اعمال کی تحریک تو عقائد ہی سے ہو جاتی ہے مگر تکمیل اور رسوخ مجاہدہ سے ہوتا ہے اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے ومن جاہد فانما یجاہد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العلمین یعنی جو شخص کچھ محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی واسطے محنت کرتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ تمام اہل عالم سے بے نیاز ہے (اسکو کسی کی محنت و مجاہدہ کی ضرورت نہیں) میرا مقصود اس جگہ یہ تبلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول عقائد کا ذکر فرمایا ۵۷
پھر مجاہدہ کا ذکر اعمال کے ذکر سے جو آئندہ تیسری آیت میں آتا ہے پہلے فرمایا اس کے کچھ تو معنی ہیں سو ممکن ہے کسی کے ذہن میں اور کوئی وجہ ہو میرے ذہن میں اس کی وجہ یہ آئی ہے کہ اس ترتیب سے یہ تبلانا مقصود ہے کہ عقائد مذکورہ آیت اولی کے صدور اعمال مذکورہ آیت ثالثہ میں موثر ضرور ہیں مگر وہ تاثیر بلا واسطہ کمزور ہوتی ہے اور بواسطہ مجاہدہ کے قوی ہو جاتی ہے اس لئے مجاہدہ کے توسط بین العقائد والاعمال ظاہر کرنے کے لئے یہ ترتیب اختیار کی گئی ہے اب آیت کا مطلب سنئے مطلب یہ ہے کہ جو کوئی مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے واسطے مجاہدہ کرتا ہے یہ جملہ اسواسطے فرمایا کہ نصیحت کا اثر کامل ہو کیونکہ جب نصیحت میں ناصح کی کوئی غرض ہوتی ہے اثر کم ہوتا ہے اور دنیا میں بے غرض نصیحت کرنے والا بجز انبیاء علیہم السلام کے کوئی نہیں مگر انبیاء کی نصیحت تو خدا ہی کی نصیحت ہے وہ تو محض مبلغ سفیر ہیں باقی سب کی کچھ نہ کچھ غرض ہوتی ہے اسی لئے امام غزالی رح نے لکھا ہے کہ جیسا شاگرد کو استاد کا ممنون ہونا چاہیئے ایسا ہی استاد کو بھی شاگردوں کا ممنون ہونا

چاہیئے کیونکہ اگر شاگرد نہوتے تو استاد کے علوم میں ترقی نہ ہوتی کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ بہت سے علوم استاد کے قلب پر درس کے وقت القا ہوتے ہیں اور یہ شاگرد کی کشش سے ہوتا ہے جیسے بچہ ماں کی پستان چوستا ہے تو دودھ اترآتا ہے اگر بچہ دودھ پینا چھوڑ دے تو چار دن میں اس کی پستان خشک ہو جائیں اسی طرح ترقی فی العلوم میں شاگردوں کا استاد پر احسان ہے۔ پس دنیا میں جس پر بھی کوئی احسان کرتا ہے محسن الیہ کی طرف سے بھی اسپر کوئی نہ کوئی احسان ضرور ہے بجز حضرت حق کے کہ ان کو کوئی کچھ نفع نہیں پہونچا سکتا نہ ان کے افعال معلل بالاغراض ہیں وہ جس پر جو احسان کرتے ہیں بالکل بے غرض اور سراسر عنایت و کرم ہی ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم　　　　بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

اسی لئے یہاں فانما یجاہد لنفسہ پڑھایا گیا تاکہ نصیحت کا اثر کامل ہو جائے کہ ہم کو تمہارے اعمال و مجاہدات سے ذرا بھی نفع نہیں جو کچھ نفع ہے سراسر تمہارا ہی ہے پھر مجاہدہ کر کے
۵۸ اپنی ہی ذات پر احسان کرو کسی دوسرے پر احسان نہ کرو ان اللہ لغنی عن العلمین بیشک اللہ تعالیٰ کی ذات اہل عالم سے بے نیاز ہے یہ لفظ ہمارے محاورہ میں خدا تعالیٰ کے متعلق چند مقام پر استعمال کیا جاتا ہے بعض جگہ اس کا استعمال بری طرح کیا جاتا ہے اس سے احتراز کرنا چاہیئے یعنی جب کوئی جوان موت ہو جاتی ہے جو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مرگیا ہو تو اس وقت برادری والے تعزیت کو جمع ہوتے ہیں اور میت کی موت کا ذکر ہوتا ہے تو ایک کہتا ہے ہائے ہائے کیسا جوان تھا جوانی چڑھ رہی تھی دوسرا کہتا ہے ابھی ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا عمر نے وفا نہ کی تیسرا کہتا ہے کہ کیسی بیوقت موت ہوئی بچے کیسے ذرا ذرا سے چھوڑ گیا ان کی پرورش کی بڑی دقت ہوگئی چوتھے پورے بجکڑ سب کے جواب میں کہتے ہیں میاں اس کی ذات بڑی بے نیاز ہے وہ بے پرواذات ہے اس موقع پر اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ نعوذ باللہ کارخانہ خداوندی میں بڑا اندھیر ہے مصالح عباد پر مطلق نظر نہیں بس جو جی میں آیا کر دیا جو چاہا حکم دیدیا تو خدائی کیا ہوئی اودھ کی سلطنت یا ان بناو نگر کا راج ہو سو یہ کلمہ

اس موقع پر تو بہت سخت ہے اسکے تو یہ معنی ہوے کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں حالانکہ قرآن خدا کی رحمت کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ غرض یہ معنی میں نے اسلئے بیان کر دیئے تاکہ کوئی آیت میں لفظ غنی کو اس معنی پر محمول نکرے بلکہ قرآن میں غنی کو دو معنی میں استعمال کیا گیا ہے ایک یہ کہ خدا کو تمہارے عمل صالح سے کوئی نفع نہیں یہاں یہی معنی ہیں دوسرے یہ کہ خدا کا تمہارے کفر و معاصی سے کچھ ضرر نہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم کہ اگر تم کفر کرو تو خدا تعالیٰ کو اس سے ضرر نہ ہوگا۔ تیسری آیت اعمال کے متعلق ہے والذین آمنوا وعملوا الصالحات لنکفرن عنہم سیئاتہم ولنجزینہم احسن الذی کانوا یعملون یہاں ایمان کا مکرر ذکر اسلئے فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ عمل بدون ایمان مقبول نہیں۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرما دیں گے یعنی جہنم سے ان کو نجات دینگے اور ان کو جزا احسن دینگے میرا مقصود جو کچھ تھا وہ بحمد اللہ حاصل ہو گیا کہ ایمان و عمل صالح مقصود اصلی ہے اور مجاہدہ اسی کی تکمیل کے واسطے ہے کہ بدون مجاہدہ کے عمل 39
صالح علی سبیل الکمال حاصل نہیں ہوتا چنانچہ برادری کی رسمیں بھی لوگوں سے اسی واسطے نہیں چھوٹتی ہیں کہ وہ مجاہدہ سے کام نہیں لیتے رسوم قدیمہ کے چھوڑنے میں نفس کو کلفت ضرور ہوتی ہے لیکن اگر نفس مجاہدہ کا عادی ہو تو اس سے گھبرائے گا نہیں نہ ذلت کی پروا کرے گا نہ کسی کے طعن کی پروا کرے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ذلت اور طعن کی پروا کرنا محض اسوجہ سے ہے کہ دین کی وقعت نہیں یا دیندار بننے کی خواہش نہیں کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ جس چیز کی وقعت انسان کی نظر میں ہو یا اس سے محبت ہو تو اس کی تحصیل میں ذلت و طعن کی ہرگز پروا نہیں۔ چنانچہ بہت سے شرفاء کو آپ دیکھیں گے کہ وہ بازاری عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں کیا اس سے برادری میں ان کی ذلت نہیں ہوتی یا لوگ طعن نہیں کرتے مگر چونکہ اسکو اس سے محبت ہے اسلئے کسی کی بات کی پروا نہیں کرتا اسی طرح بعض لوگ اپنی لڑکی کو ایسے لڑکے سے بیاہ دیتے ہیں جو ذات میں یا نسب میں ان سے کم ہے مگر مالدار بہت بڑا ہے اس موقعہ پر بھی برادری کی طرف

بہت کچھ لعنت ملامت ہوتی ہے مگر نفع کے سامنے کسی بات کی پرواہ نہیں کی جاتی۔
اے اللہ! دین ہی اسواسطے رہ گیا ہے کہ یہاں ہر مانع کی پرواکی جاتی ہے کوئی کہتا ہے
کہ اس میں چھوڑنے میں ذلت ہے کوئی کہتا ہے کہ برادری طعن دے گی کہ خرچ کرتے ہوئے
جان نکلتی تھی اسلئے شریعت کی آڑ لیلی کوئی کہیگا کہ ان کو دوسروں کے یہاں کھانا ہی آتا ہے
کھلانا نہیں آتا میں تسلیم کرتا ہوں کہ برادری سب کچھ کہے گی لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ سب
باتوں میں برادری کے کہنے کی پرواہ نہیں کی جاتی بعض لوگ کسی غریب کی زمین یا گھر کا کوئی
حصہ دبا لیتے ہیں برادری تو وہاں بھی برا بھلا کہتی ہے کوئی چماری سے یا لونڈوں سے منہ
کالا کرتا ہے وہاں بھی تو لوگ اسکو ذلیل کرتے اور گلی کوچوں میں برا بھلا کہتے پھرتے ہیں
اگر تم برادری کی باتوں کو ایسا ہی ماننے والے ہو تو براہ کرم ان باتوں میں بھی برادری
کی طعن و ملامت کی پروا کر لیا کرو۔ کچھ نہیں یہ تو محض بہانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ
تمہارا خود اس میں کرنے کو جی چاہتا ہے اگر تمہارا جی نہ چاہتا تو تم کسی کی بھی
پروانہ کرتے جیسا دوسرے کاموں میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ پھر جو لوگ برادری ۶۰
کی ملامت کا بہانہ کرتے ہیں ان کے واسطے ایک اور جواب ہے۔ وہ یہ کہ جیسے
تمہاری دنیا کی ایک برادری ہے دین کی بھی تو ایک برادری ہے یعنی علماء و صلحاء
ہم نے مانا کہ اس میں چھوڑنے میں دنیا کی برادری تم کو برا کہے گی مگر دینی برادری تم کو
اچھا کہے گی اور شاباشی دے گی اور تمہارے حق میں دعا کرے گی اور اس سے بڑھکر
ایک اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہونگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہونگے
اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کتنی بڑی چیز ہے افسوس خدا کے مقابلہ میں برادری کی رضامندی
کی پروا کرنا کتنی سخت بات ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جو حضرت شعیب علیہ السلام
نے اپنی قوم کی حالت کے متعلق فرمائی تھی قال یٰقوم ارھطی اعز علیکم من اللہ واتخذتموہ
وراءکم ظہریا ان ربی بما تعملون محیط ۰ بعض لوگ آپس میں نا اتفاقی رکھتے ہیں
اور مصالحت نہیں کرتے وہ بھی اسی واسطے کہ مشقت سے گھبراتے ہیں
اگر وہ نفس کو مجاہدہ کا عادی کر لیتے تو کسی کو ایک دوسرے سے معافی

چاہیے میں پس و پیش ہوتا گو معافی چاہنا ابتداً بہت مشکل ہے مگر جو شخص مجاہدہ سے نفس کو پامال کر چکتا ہے اسکے لئے ایک بھنگی سے بھی معافی چاہنا دشوار نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ آجکل جو لوگ نفاق و اتحاد کا لکچر دیتے ہیں یہ کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ یہ لکچرار بھی اور لکچر سننے والے بھی اول مجاہدہ سے نفس کی اصلاح کریں بدون اس کے ہرگز اتفاق و اتحاد قائم نہیں ہو سکتا چنانچہ اگر اس لکچرار ہی کی رائے سے کوئی دوسرا شخص کسی میں مخالفت ظاہر کردے تو یہ اتحاد و اتفاق کا سب لکچر بھول جائیں گے اور دوسرے شخص کی مخالفت و تذلیل و تحقیر کے درپے ہو جائیں گے پھر دونوں میں ایسی بری طرح مخالفت چلتی ہے کہ اخبار کے کالم کے کالم دونوں کی طرف سے گالیوں میں بھرے ہوئے شائع ہوتے ہیں جس سے دونوں کی تہذیب اور اتفاق و اتحاد کی حقیقت کھل جاتی ہے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے کہ لوگ اتحاد و اتفاق کیلئے تقریریں تو کرتے ہیں مگر اس کی جڑ کو کوئی مضبوط نہیں کرتا اتحاد و اتفاق کی جڑ تواضع ہے 61 متکبرین میں کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا اگر ہوگا تو اسی طرح کہ ایک شخص اپنے تکبر کو چھوڑ کر تواضع اختیار کرے سبحان اللہ! یہ مقولہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور یہ ایسے حجرہ نشین کا مقولہ ہے جس نے سیاسی میدان میں قدم بھی نہیں رکھا مگر واللہ سب سیاست داں انکے سامنے بچے ہیں کوئی شخص بھی اتحاد و اتفاق کے لئے اس سے بہتر نسخہ نہیں بتلا سکتا پس اتحاد و اتفاق کی جڑ تواضع ہے اور تواضع کی اصل مجاہدۂ نفس ہے کیونکہ تواضع اس کا نام نہیں کہ زبان سے اپنے کو خاکسار نیازمند ذرۂ بمقدار کہدیا بلکہ تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی تم کو واقعی ذرۂ بمقدار اور خاکسار سمجھکر برا بھلا کہے اور حقیر و ذلیل کرے تو تم کو انتقام کا جوش پیدا نہ ہو اور نفس کو یوں سمجھا لو کہ واقعی تو تو ایسا ہی ہے پھر برا کیوں مانتا ہے اور اگر کسی کی برائی سے کچھ رنج و اثر بھی نہ ہو تو یہ تواضع کا اعلیٰ درجہ ہے کہ مدح و ذم برابر ہو جائے مطلب یہ کہ عقلاً برابر ہو جائے کیونکہ طبعاً تو مساوات نہیں ہو سکتی ہاں کوئی مغلوب الحال ہو تو اور بات ہے اسی طرح طلبہ اور مدرسین میں ایک مرض ہے کہ اپنی غلطی کا کبھی اقرار نہیں کرتے اگر کوئی بات زبان سے غلط نکل جائے یا کتاب کے کسی مقام کی غلط تقریر

ہو جائے اور کوئی طالب علم اس کی صحیح تقریر کرے تو مدرس اس کو ہرگز تسلیم نہ کرے گا جہانتک
ممکن ہوگا اپنی بات کو بنانے کی کوشش کرے گا اس کا منشا یہی ہے کہ یہ شخص نفس کو مشقت
میں ڈالنا نہیں چاہتا مشقت سے بچانا چاہتا ہے کیونکہ غلطی کا اقرار کرلینا نفس پر بہت گراں
ہے اور گرانی کی وجہ یہ ہے کہ نفس اسکو سبب ذلت سمجھتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے
بخدا اقرار خطا سے اور عزت بڑھ جاتی ہے ہم نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ
علیہ کو بارہا دیکھا ہے کہ جب درس کے وقت کتاب کے کسی مقام پر شبہ ہو جاتا تو کتاب
ہاتھ میں لیکر اپنے ماتحت مدرس کے پاس چلے جاتے اور فرماتے کہ مجھے اس مقام پر
شرح صدر نہیں ہوا ذرا آپ اس کی تقریر فرما دیں بھلا مدرس اول ہو کر ماتحت مدرس
سے ایسی درخواست کرنا کوئی معمولی بات تھی بہت بڑی بات تھی مگر کیا اس سے
نعوذ باللہ مولانا کی عزت و وقعت کم ہوگئی بخدا ہرگز نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ ہوگئی
چنانچہ آج یہ بات مولانا کے محاسن میں بیان ہو رہی ہے اور ان کے دیکھنے والے آج
ان صورتوں کو ترستے ہیں کہ ہائے وہ لوگ کہاں گئے جن کو دوجہاں کے اپنے نقص کے اقرار ۶۲
میں ذرا بھی پس و پیش نہ تھا اور اب ایسا زمانہ آگیا کہ ناقصوں کو بھی اپنے نقص کے اقرار سے عار ہے
بلکہ وہ اپنے لئے کمال کے مدعی ہیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بھی
عادت تھی کہ درس کے وقت اگر کسی مقام کی تقریر میں آپ سے لغزش ہو جاتی اور کوئی
ادنیٰ طالبعلم پھر عرض کر دیتا کہ حضرت اس مقام کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے تو مولانا فوراً
اس کی بات کو ہاں کر کے صاف فرما دیتے کہ میں نے غلطی کی صحیح مطلب وہ ہے جو تم نے
بیان کیا پھر ایک دفعہ پر بس نہ ہوتا تھا بلکہ بار بار اس جملہ کو دہراتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی
میں نے غلط مطلب بیان کیا تھا۔ وہ طالبعلم شرمندہ ہو جاتا کہ میں نے ناحق تقریر کی مگر مولانا اپنی
غلطی کے اقرار سے نہ رکتے تھے اور واللہ اس سے مولانا کی عزت و محبت و عظمت پہلے سے
زیادہ بڑھتی تھی پس نفس کا یہ خیال غلط ہے کہ اقرار خطا سے ذلت ہوتی ہے اور بالفرض اگر
ذلت ہوتی بھی ہے تو کیا تم کوئی کام ذلت کا نہیں کرتے ہو اگر ایسا ہی ذلت سے بچنا ہے تو
کسی شخص کے مکان سے طلبہ کھانا بھی نہ لایا کریں اور کوئی مولوی صاحب چندہ کیواسطے

بھی نہ جایا کریں کیا اس میں ذلت نہیں ہوتی لہذا جب مولوی چندہ کے لئے دورہ کرتے ہیں عوام اسکو بہت ذلت سے دیکھتے ہیں خصوصاً جس چندہ میں خطاب خاص ہو جائیں تو بہت ہی ذلت ہوتی ہے اور دوسرے پر جبر بھی ہوتا ہے اسی لئے مجھے ایسے چندہ کے جواز میں کلام ہے۔ جو خطاب خاص سے وصول کیا جاتا ہے مگر طلبہ و علماء اس کے جواز کی کوشش کرتے ہیں اور ذلت کی پروا نہیں کرتے پھر اقرار خطا ہی میں ذلت کی پروا کیوں ہے بس وجہ یہ ہے کہ چندہ وغیرہ میں گو ذلت ہے مگر روپیہ تو ملتا ہے اور اقرار خطا میں روپیہ نہیں ملتا سو آپ تو اہل علم ہیں آپ کی نظر تو نفع عاجل پر نہ ہونا چاہیئے بلکہ نفع آجل پر ہونا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ اقرار خطا میں خدا کی رضا ضرور ہے حدیث میں من ترک الجدال والمراء بنی لہ بیت فی الجنتہ او کما قال اور کہاں تک فروع بیان کروں آپ غور کر کے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم جتنے گناہوں میں مبتلا ہیں سب کی اصل یہ ہے کہ ہم نفس کو مشقت سے بچانا چاہتے ہیں اور جتنے اوامر کو ہم ترک کر رہے ہیں اس کی اصل یہی ہے پس معلوم ہوا کہ اصلاح اعمال و اصلاح نفس کا مدار عادی مجاہدہ پر ہے اسی مسئلہ کو بتلانے کے واسطے اسوقت یہ بیان اختیار کیا تھا جو الحمد للہ بقدر ضرورت بیان ہو گیا اب دعا کیجیئے کہ حق تعالیٰ شانہ گناہوں کے چھوڑنے کی ہمکو ہمت عطا فرمائیں کہ یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے پھر اسپر دو کامیابیاں مرتب ہونگی ایک تو بڑی کامیابی خود گناہوں کا چھوٹ جانا ہے کیونکہ جرائم کا نہ ہونا یا کم ہونا بھی بڑی کامیابی ہے دوسرے رزق میں وسعت ہوگی کیونکہ اعمال صالحہ کو اور گناہوں کے چھوڑنے کو رزق کی وسعت میں بہت بڑا دخل ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولو ان اھل القری آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ولٰکن کذبوا فاخذناھم بما کانوا یکسبون اسی طرح معاصی کو تنگی رزق و نزول بلا میں بڑا دخل ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس قوم میں سود کی کثرت ہوگی اللہ تعالیٰ اس پر قحط مسلط کر دینگے اور جس قوم میں زنا کی کثرت ہوگی اس پر طاعون وغیرہ ایسے امراض مسلط ہونگے جو پہلے لوگوں نے دیکھے

۶۲۳

بھی نہ تھے پس مجاہدہ میں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی کامیابی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ دینی اور دنیوی اور تمدنی اور سیاسی تمام مصالح کی بنیاد اور جڑ یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کی مخالفت کا عادی بنے اور نفس کو مشقت کا عادی بنائے اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالے ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق شامل حال ہو

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا

ومولانا محمد

وعلی آلہ واصحابہ

وبارک

وسلم

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

اشرف علی

۱۳ ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ ۶۴

(ختم)

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمی بہ

الصلات فی الصلوات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّی بہ

الصلات فی الصلوات

ای ثمراتہا فیہا ۱۲ منہ

این	کہاں ہوا	مکان حضرت حکیم الامۃ تھانہ بھون
متی	کب ہوا	شب ۲ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ بعد مغرب
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ ۵ منٹ
کیف	کس ہیئت سے ہوا	پلنگ پر بیٹھکر
لم	کیوں ہوا	بعض مہمان مستورات کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	نماز کی فضیلت کہ تمام اعمال میں مقصود بالذات نماز ہی ہے بقیہ اعمال مقصود بالغیر ہیں
من ای	کس طبقہ کے مناسب تھا	تمام مسلمانوں کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	(شیخ الاسلام مولانا) ظفر احمد عثمانی (رحمہ اللہ)
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مرد تقریباً ۳۰۔ مجمع مستورات انکے علاوہ تھا
الاشتات	متفرقات	نماز کی فضیلت میں یہ بیان بہت ہی عجیب ہے۔ ۳۴ صفحہ

ھ تمام مواعظ الصلات بمعنی الثمرات والتی تطلق علی ما یترتب علی الصلوات دنیٰ فی ذاتہا ان فیہا ۳۴

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ۔ یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے جو کوہ طور پر عطائے نبوت کے وقت ارشاد ہوا ہے جس میں

حکم ہے نماز کا یہ حال ہے اسوقت کے مضمون کا وجہ اسکے اختیار کرنیکی یہ ہے کہ بعض مہمانوں نے جنہیں
زیادہ مستورات ہیں بیان کی فرمائش کی ہے کہ کچھ احکام ہمکو بھی سنا دیئے جائیں ان کی مصلحت
سے یہ بیان تجویز کیا گیا چونکہ وقت مختصر ہے یعنی مغرب سے عشا تک اس لئے مختصر ہی بیان کا
قصد ہے کیونکہ مضامین طویلہ بھی مختصر ہوسکتے ہیں اگر ان کو اجمال کے درجہ میں رکھا جائے گو یا جتبا
مالہ وما علیہ کے بیان میں تطویل نکی جائے بلکہ اصل مقصود پر نظر رکھی جائے تو طویل مضمون بھی
مختصر ہوسکتا ہے چنانچہ نماز کا بیان جسقدر طویل ہے سبکو معلوم ہے فقہار کی کتابوں میں بھی
اس کی بحث بہت طویل ہے اور صوفیہ کے رسائل میں بھی اگر اس کی پوری تفصیل کی جائے تو
زمانہ دراز چاہئے پھر اس مختصر وقت میں جو ایک گھنٹہ سوا گھنٹہ کی مقدار ہے کیونکہ اتنی ہی دیر
بیان کرنیکا ارادہ ہے پوری تفصیل کیونکر ہوسکتی ہے لیکن وہی بات ہے جو میں کہہ چکا ہوں
کہ اگر درجۂ اجمال پر کفایت کی جائے تو طویل بیان بھی مختصر ہوسکتا ہے چنانچہ اس وقت یہی
ارادہ ہے کہ مختصر بیان کرونگا مگر وہ مجمل تو ہوگا مبہم نہ ہوگا انشاء اللہ جس قدر بیان ہوگا واضح ہوگا ۶۷
اور چونکہ بیان مستورات کی فرمائش سے تجویز ہوا ہے اسلئے مضمون بھی ان کے مناسب اختیا
کیا گیا اور وہ مضمون نماز کا ہے کیونکہ مستورات شریعت کے اور کاموں کی مشتاق بھی
ہیں اور مستعد بھی ہیں مگر نماز سے بہت ہی کاہل اور غافل ہیں نماز کا نہ ان کو زیادہ شوق
ہے نہ اس کے لئے ہمت کرنیکا خیال ہے اور اصل ساری کوتاہی کا منشا یہ ہے کہ نماز
کا شوق نہیں اگر شوق ہوتا تو سب کوتاہی خود بخود رفع ہوجاتی اور جتنے بہانے کئے
جاتے ہیں سب کا جواب وہ شوق ہی دیدیتا اور یہاں سے ایک بات کام کی یاد آگئی جو شاید
پہلے بیانات میں بھی مذکور ہوئی ہے چونکہ وہ نہایت کام کی بات ہے اسلئے اسوقت بھی بیان
کرتا ہوں وہ یہ کہ صرف بندہ کے ارادہ سے کام نہیں ہوتا یہ مطلب نہیں کہ ہو نہیں سکتا بلکہ
دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہوتا نہیں ہے بارہا اس کا تجربہ ہوچکا ہے خصوصاً دوام و استمرار
تو محض ارادہ سے ہوتا ہی نہیں بلکہ ایک اور چیز ہے جسکو داعیہ اور تقاضا کہا جاتا ہے کام
اس سے ہوتا ہے اسی کا نام شوق ہے جو کام محض ارادہ سے ہو وہ دوامًا نہیں ہوسکتا بلکہ

ـــہ ارادہ صرف ایک گھنٹہ بیان کرنے کا تھا مگر بلاقصد دو گھنٹے تک طویل ہوگیا ۱۲ ظ۔

کام داعیہ سے ہوتا ہے جو محض وہبی ہے ہر چند کہ ارادہ بھی مخلوق حق ہے مگر پھر بھی اس میں اکتساب کو بھی دخل ہے جسکی وجہ سے بندہ کی طرف بھی اس کی اسناد کی جاتی ہے اور تقاضا محض موہوب ہے اور اس کی بہی ضرورت ہے کیونکہ اکتساب کا حال تو معلوم ہو گیا کہ بعض لوگ زمانہ دراز سے تہجد کی تمنا کرتے ہیں اور اب تک اس میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ اب تک ان میں محض شوق عقلی ہے شوق طبعی جسکو تقاضا کہتے ہیں وہ ابھی ان کو حاصل نہیں ہوا۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن اعمال کا دوام ہم سے صدور ہوتا ہے یہ محض موہبت ہے حق تعالیٰ نے ایک داعیہ آپ کے اندر پیدا کر دیا ہے جو کشاں کشاں آپ کو عمل کی طرف لیجاتا ہے اسلئے ہمکو اپنے اعمال پر ناز نہ کرنا چاہیئے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بچہ ہے جو لکھنا نہیں جانتا مگر دوات وقلم کو دیکھکر خوش ہوتا ہے اور لکھنے کی کوشش کرتا ہے آپنے اس سے کہا لکھو اور اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑ اپنے ایک دو لفظ لکھدیئے ان کو دیکھکر بچہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے یہ لفظ لکھے اور آپ بھی تعریف کرتے ہیں کہ اب تو تم منشی ہو گئے بس اسی طرح حق تعالیٰ آپ سے کام لیتے ہیں اور نام آپ کا کر دیتے ہیں کہ تم نے نماز پڑھی قرآن پڑھا ذکر کیا اسی لئے حدیث میں استعملہ کا لفظ آیا ہے اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎ ٦٨

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

اور ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ واقعی حق تعالیٰ کی طرف سے تیسیر ہوتی ہے کہ جو کام دوسروں کو دشوار تھا آپ کیلئے آسان کر دیا اور یہ آسانی داعیہ سے ہوتی ہے اسی کا نام توفیق ہے جو لوگ راستہ طے کرتے ہیں وہ اسکو خوب جانتے ہیں کہ سب کام حق تعالیٰ کی تیسیر ہی سے ہوتے ہیں گو اعتقاد تو ہر مسلمان کو ہے مگر ان کو اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ وہ راستہ طے کر رہے ہیں جسمیں انکو عقبات پیش آتے ہیں اسوقت ان کو حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور عقبات اسی کو پیش آتے ہیں جو کام کرنے والا ہو رستہ پر چل رہا ہو اور اس کو طے کرنے کی فکر میں ہو اور جو کام ہی نہ کرے

راستہ طے کرنے کا قصد ہی نہ کرے اسکو کیا پیش آئے گا خاک۔ آجکل ایک نئے درویش ہیں
جو لوگوں کو مرید کرنے لگے ہیں اور خود کسی محقق سے تعلق نہیں نہ اجازت ہے ان سے کسی نے
کہا اگر تم کو طریق میں کوئی اشکال پیش آتا ہوگا تو کس سے حل کرتے ہوگے کیونکہ تمہارا کسی محقق
سے تو تعلق ہے ہی نہیں تو جواب دیا کہ مجھے اشکال ہی نہیں ہوتا سائل نے جواب مجھ سے نقل کیا
میں نے کہا وہ سچ کہتے ہیں تم ان کی تکذیب نہ کرو کیونکہ اشکال تو اسے پیش آئے گا جو کچھ کام
کرے اور وہ کچھ کرتے ہی نہیں کورے ہیں ان کو کیا اشکال ہوتا غرض جو لوگ کام کرتے
ہیں ان کو عقبات پیش آتے ہیں اور اس وقت ان کو اس حقیقت کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جو کچھ
کام ہوتا ہے حق تعالیٰ کے کام لینے سے ہوتا ہے اگر وہ کام نہ لیں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا ایک
عارف کا قصہ غالباً عوارف میں لکھا ہے اور غالباً محض احتیاط کے لئے کہدیا ہے ورنہ مجھے
اچھی طرح یاد ہے کہ یہ قصہ اسی میں ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے ارادہ کیا کہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کر دوں تو کلمہ
زبان سے نہ نکلا زبان بند ہوگئی ہر چند زبان کو حرکت دی مگر لا الٰہ الا اللہ زبان سے نہ نکلا چونکہ ان ۶۹
لوگوں کی دوسروں سے زیادہ تربیت ہوتی ہے گو رحمت عامہ اور تربیت عامہ سب پر ہے مگر ان پر
رحمت خاصہ ہوتی ہے اور تربیت بھی ان کی خاص طور پر ہوتی ہے اسلئے ان کو ایسی ایسی باتیں پیش
آتی ہیں تاکہ ہر وقت متنبہ رہیں بس یہ سمجھ گئے کہ یہ کسی جرم کی سزا ہے جو مجھ سے صادر ہوا ہے مگر اسوقت
یاد نہ آیا آخر سوچنا شروع کیا اور حضرت حق سے بھی دعا کی کہ مجھے اس جرم پر مطلع کیا جائے تاکہ بڑے
اہتمام کی ساتھ توبہ کروں دیر کے بعد یاد آیا کہ کتنے برس کا عرصہ ہوا ایک کلمہ لاابالی پن میں زبان سے
نکل گیا تھا جس میں حضرت کی شان میں کچھ گستاخی تھی آج مدت کے بعد اسکی سزا دی گئی اللہ اکبر کیسا
حلم ہے کہ فوراً گناہ کی سزا نہیں دیتے کبھی تو ہاتھ کے ہاتھ سزا مل جاتی ہے اور کبھی دیر میں سزا ہوتی
ہے اور زیادہ یہی ہے کہ فوراً سزا نہیں دیتے ہر فعل میں حکمت ہوتی ہے پس کسی گناہ پر اگر فوراً سزا
نہ ہو یا کچھ عرصہ تک نہ ہو تو اس سے بےفکری نہ چاہئے۔ کیونکہ سزا میں تعجیل لازم نہیں غرض ان بزرگ
نے جرم یاد آنے کے بعد اس سے توبہ کی اور زبان جاری ہوگئی ان حضرات کو ایسے ایسے
واقعات پیش آتے ہیں جن سے اشغال کا موہبت ہونا ان کو مشاہد ہو جاتا ہے واقعی وہی کام لینا
چاہتے ہیں جو ہماری زبان سے ذکر جاری ہوتا ہے اور ہمکو نماز کی توفیق ہوتی ہے ورنہ

اگر وہ زبان بند کر دیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں اور طریق حق کو تو کیا مجال ہے کہ ہم خود طے کر سکیں جس کی شان یہ ہے سہ

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا   کہ میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

بس اب جو لوگ واصل ہیں وہ خود واصل نہیں ہوئے کہ منزلیں طے کر کے حق تعالیٰ تک پہونچے ہوں بلکہ گویا حق تعالیٰ ہی خود ان کے پاس پہونچ گئے انہوں ہی نے مسافت کو کم کر دیا ورنہ بڑا طویل قصہ تھا تو اب یوں کہنا چاہیئے کہ سہ

خود بخود آں شہ ابرار بمن آید   نہ بزور ونہ بزاری نہ بزری آید

شاعر نے تو بت عیار کہا تھا میں نے اسکو بدلکر شہ ابرار کر دیا کیونکہ وہ لفظ ایسے موقعہ پر خلاف ادب ہے۔ بہر حال کام شوق سے ہوتا ہے کہ قلب میں داعیہ پیدا ہو جائے محض ارادہ سے کام نہیں ہوتا اور عورتوں کو نماز کا شوق اور تقاضا نہیں ہے دوسرے اعمال کا شوق بھی ہے تقاضا بھی ہے چنانچہ روزہ کا عورتوں کو شوق بھی ہے اور اس کے لئے مردوں سے زیادہ مستعد ہیں اور جنہیں بخل زیادہ نہیں ان کو زکوۃ دینے کا بھی شوق ہے اور حج کا ولولہ بھی ۷۰
ان میں بہت ہے مگر نماز کا نہیں اسی کی شکایت ہے شاید آپ یہ کہیں کہ ابھی تو تم کہہ چکے ہو کہ شوق وہبی ہے کسبی نہیں پھر شکایت کیا اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک شوق وہبی ہے مگر شوق پیدا کرنیکے اسباب تو اختیاری ہیں تو میری شکایت کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں شوق پیدا کرنیکے اسباب بھی اختیار نہیں کرتیں۔ اگر کسی میں بطور وہب کے شوق نہیں ہے تو اسکے اسباب اختیار کر کے کسب کے شوق کو حاصل کرنا چاہیے گو اسوقت بھی وہ حاصل ہوگا وہب ہی سے مگر حق تعالیٰ نے اکثر وہب کیلئے بھی کچھ اسباب کسبیہ ایسے بنا دیے ہیں جنکے اختیار کرنے پر عادۃً وہب مرتب ہو جاتا ہے اور مقصود حصول وہب ہے خواہ خود بخود ہو جائے یا تمہارے کسب پر مرتب ہو جائے اسی کو عارف فرماتے ہیں سہ

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف   گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

اسی طرح خود بخود شوق پیدا ہو جائے تو کیا اور اسباب اختیار کرنے پر مرتب ہو جائے تو کیا ہر حالت میں مقصود حاصل ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسباب ترتب شوق اختیاری ہیں تو اب

میری شکایت صحیح ہے اور اس شکایت کا حاصل یہی ہے کہ گو شوق وہبی ہے مگر جن اسباب پر اس وہب کا ترتب ہوتا ہے وہ اختیاری ہیں انکو کیوں نہیں اختیار کیا گیا دیکھو دخول جنت اور حصول مغفرت محض وہبی ہے چنانچہ حدیث میں لا یدخل الجنۃ احد لعملہ کہ عمل سے جنت میں کوئی نہ جائے گا بلکہ محض فضل سے جائے گا مگر باینہمہ ارشاد ہے سارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا کعرض السموات والارض اس میں جنت ومغفرت کی طرف مسارعت کا امر ہے گویا ارشاد ہے کہ جنت ومغفرت کو حاصل کرو حالانکہ جب وہ موہبت محضہ ہے اور اختیار سے خارج ہے تو اسکو کیسے حاصل کریں اور غیر اختیاری کی تحصیل کا امر کیا بات وہی ہے کہ گو یہ چیزیں فی نفسہ وہبی ہیں اور بالذات اختیاری نہیں مگر عادۃً جن اسباب پر اس موہبت کا ترتب ہو جاتا ہے وہ اسباب اختیاری ہیں اسلئے انکے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو اختیارات کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ان کی تحصیل کا امر ہے اور انکی طرف مسارعت نکرنے پر شکایت ہے اب سوال ہوتا ہے کہ کیا جنت ومغفرت کے حاصل
کرنے کا کوئی راستہ ہے جسکی طرف دوڑیں اور دوڑ کر جنت میں پہونچ جائیں مولانا اس اشکال ۷۱
سے گھبرا کر پھر سنبھل کر فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

کہ واقعی گو اس دنیا میں جنت تک پہونچنے کا کوئی راستہ اور سوراخ نظر نہیں آتا مگر تم کو چاہیے کہ یوسف علیہ السلام کی طرح دنیا سے پریشان ہو کر بھاگنا شروع کر دو یعنی جتنا تم عمل کر سکتے ہو اتنا عمل شروع کرو پھر وہ خود تمہارے سامنے راستہ کھول دیں گے جیسے یوسف علیہ السلام کے قصہ میں مشہور ہے کہ جب زلیخا نے انکو سات دروازوں کے اندر طلب کیا اور ہر دروازہ کو مقفل کر دیا تو ظاہر میں بھاگنے کے سب راستے بند تھے مگر انہوں نے خدا کے بھروسہ پر اپنا عمل شروع کر دیا کہ وہاں سے بھاگے یہ تو ان کا فعل تھا آگے حق تعالیٰ کی امداد تھی کہ جس دروازہ پر پہونچے اس کا قفل ٹوٹتا گیا اور دروازہ خود بخود کھلتا گیا اسی طرح آپ اپنا کام شروع کیجئے اور ان اسباب کو اختیار کیجئے جنپر عادۃً وہب کا ترتب ہوتا ہے جو لوگ واصل ہیں جنکا مسمیٰ کر کہ اصطلاح میں وصول کہا جاتا ہے ان سے پوچھئے کہ وہ کیونکر واصل

ہوئے کیا اپنے اختیار سے واصل ہوئے ہرگز نہیں کیونکہ وصول کو اتفاقاً وہبی مانا گیا ہے اور
جو واصل ہیں ان کو تو اسکے وہبی ہونیکا مشاہدہ ہے وہ کبھی اسکو اختیاری نہیں کہہ سکتے
چنانچہ چین نہ آئے گا نماز ہی سے راحت حاصل ہوگی بدون نماز پڑھے دل بےچین رہیگا اور
یہ بات کچھ دین ہی کے کاموں کیساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا کا بھی کوئی کام بدون مجاہدہ کے
درست نہیں ہوتا دیکھو خوشنویسی ہی ہے اس میں مبتدی کو کیسی محنت پڑتی ہے کہ ایک جیم
کی نوک پلک درست کرنے میں عرصہ لگتا ہے بہت دیر میں ایک جیم بنتا ہے اس کے بعد
استاد کے سامنے لیگئے تو وہ کہتا ہے کہ غلط ہے مگر اسی طرح محنت کرتے چند روز میں ایسی مہارت
ہو جاتی ہے کہ آنکھ بند کر کے بھی لکھے تو حرف صحیح ہی ہوگا اور ایک منٹ میں پچاس جیم لکھدیگا
عادۃ اللہ یہی ہے کہ محنت کا نتیجہ راحت ہے اور مشقت کا ثمرہ سہولت ہے (اسوقت
دروازہ کی طرف سے ایک بچہ کی آواز رونے کی آئی اور دیر تک آتی رہی حضرت نے فرمایا
کہ اسواسطے میرا جی نہیں چاہتا مستورات میں بیان کرنیکو حالانکہ سب بچوں کو باہر کر دیا گیا تھا
مگر پھر ماما میں اتنی سرکشی ہے کہ بچہ کو دور لیجا کر خاموش نہیں کرتی دروازہ ہی پر کھڑی رُلا رہی ۷۲
ہے ۱۲) میں یہ کہ رہا تھا کہ مشقت کا ثمرہ سہولت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان مع العسر
یسراً (کہ مشقت کے ساتھ سہولت ہے) اس کی ایک تفسیر تو مشہور ہے ہی کہ مع بمعنی بعد
ہے اور مطلب یہ ہے کہ عسر کے بعد یسر ہوتا ہے اور یسر اُخروی مراد ہے مگر میں کہتا ہوں کہ
مع اپنے معنی پر ہے اور دنیا میں بھی عسر کی ساتھ یسر ہے اور یہ عسر اعمال کا ہے روزانہ
یہ خاصیت ہے کہ جو مشقت پہلے دن تھی وہ اگلے دن نہیں رہتی اور جو اگلے دن ہے وہ
اس کے بعد نہیں رہتی اس سے معلوم ہوا کہ عسر کے ساتھ ساتھ ہی یسر ہے جو تدریجاً ظہور میں
آتا ہے تو جس عمل کا آپ کو شوق نہ ہو اسکے لئے مجاہدہ کرنا چاہئے انشاء اللہ مجاہدہ کے بعد
ایک دن شوق عطا ہو جائے گا جو محض وہب سے ہوگا اب جنکو شوق حاصل ہے وہ سمجھ
لیں کہ تم کو شوق از خود نہیں بلکہ حقیقت میں یہ شوق ہے حق تعالیٰ تم کو کشاں کشاں لیجا
رہے ہیں وہ اس پر ناز نہ کریں کہ ہم کو حج کا شوق ہے یا زکوٰۃ کا شوق ہے یہ سب حق تعالیٰ
کا فضل ہے ورنہ فی نفسہ آپکا بھی وہی حال ہوتا جو بد شوقوں کا حال ہے چنانچہ دیکھ لیا جائے کہ جنکو زکوٰۃ

کا شوق ہے ان کو زکوٰۃ یا نفقہ واجبہ دینا تو آسان ہے جو انفاق معین ہے مگر غیر معین انفاق ان کو
آسان نہیں۔ یہ گراں ہوتا ہے زکوٰۃ دینے کے بعد اور کسی موقع ضرورت پر خرچ کرتے ہوئے ان کی
جان نکلتی ہے کیوں؟ محض اسلئے کہ حق تعالیٰ نے انکو اس کا شوق نہیں دیا داعیہ پیدا نہیں ہوا مگر
یہ غنیمت ہے کہ یہ لوگ بھی بخیل میں داخل نہیں انکو بخیل نہیں کہہ سکتے کیونکہ حق واجب کو تو وہ ادا
کرتے ہیں اور عورتوں کو جو صوم و حج و زکوٰۃ کا شوق ہے اس کی ایک طبعی لم بھی ہے میں یہ نہیں
کہتا کہ یہ طبعی لم سب میں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس سے خالی بہت ہی کم ہونگی گو بعضی اللہ کی بندیاں
ایسی بھی ہیں جن کو محض محبت حق کی وجہ سے ان عبادات کا شوق ہے لیکن اکثر کی حالت یہ ہے کہ
ان کو اس طبعی لم کی وجہ سے بھی شوق ہے جسکو میں بیان کرنا چاہتا ہوں اس سے میرا مطلب
یہ ہے کہ ان عبادات کا اگر شوق ہوا بھی تو چنداں کمال نہیں کیونکہ ان میں حظ نفس بھی
فی الجملہ موجود ہے گو وہ حظ جائز ہی ہو مگر خالص عبادت ہونے کی وجہ سے تو شوق
نہوا اور یہ میں اسلئے کہتا ہوں تاکہ ناز ٹوٹ جائے اور عورتیں اپنے اس شوق پر ناز نکریں ۲۴۷
کہ ہمکو روزہ اور حج کا شوق ہے کیونکہ شوق وہی معتبر ہے جو محض اللہ کے واسطے ہو نفس کی
آمیزش نہ ہو سو حج کا شوق تو اکثر عورتوں کو اسلئے بھی ہے کہ ایک جگہ پڑے پڑے طبعاً جی اوکتا
جاتا ہے اس میں سفر ہے ذرا چلنا پھرنا نصیب ہوتا ہے۔ دوسرے اسمیں تمیز و تفرد کی شان بھی ہے
کیونکہ یہ ایسی عبادت ہے جسکے کرنیوالے تھوڑے ہیں جس نے ایک دفعہ حج کر لیا وہ بیچاری
عورتوں میں تنہا حجن شمار ہوتی ہیں اور اس میں ایک حظ ہے کہ ہم دوسروں سے ایک صفت
میں متمیز ہیں اور زکوٰۃ کا شوق اول تو عورتوں میں بہت کم ہے اکثر تو زکوٰۃ دیتی ہی نہیں اور جو دیتی
بھی ہیں انکو زکوٰۃ کا اسلئے شوق ہے کہ اس میں بھی حظ نفس ہے کیونکہ دوسرے کو کچھ دینا موجب
تعلی ہے۔ دینے والا محسن ہوتا ہے اور لینے والا احسانمند ہوتا ہے اور یہ بھی نفس کے لئے بڑا
حظ ہے کہ دس آدمی اسکے احسان سے دبے ہوئے ہیں گو وہ اس احسان کی وجہ سے کوئی اپنی
غرض اور اپنا کوئی کام ان سے نہ لے کیونکہ اس صورت میں تو زکوٰۃ کا ثواب ہی باطل ہو
جائے گا نہیں بلکہ صرف زکوٰۃ دینے ہی سے دوسرا آدمی اس سے نیچا اور یہ دینے والا اس سے
اونچا ہو جاتا ہے۔ الید العلیا خیر من الید السفلی اور یہ بھی بڑا حظ ہے دوسرے یہ کہ

دفعہ کسی غریب کی خستہ حالت دیکھکر انسان کا دل خود بھی کڑہتا اور دردمند ہوتا ہے تو اس کی امداد کرکے اپنا بھی جی خوش ہوتا اور درد کم ہوجاتا ہے یہ بھی ایک حظ ہے گو منہی عنہ نہو اسی لئے بعض بزرگوں نے اپنے مریدوں سے ایسا مجاہدہ کرایا ہے جو محض مجاہدہ ہی مجاہدہ ہو یعنی اس میں حظ نفس نہو چنانچہ ایک بزرگ نے اپنے مرید کو ذکر شغل تعلیم کیا مگر عرصہ تک اسکو کچھ اثر نہ ہوا فتح باب نہ ہوا تو شیخ نے پوچھا کہ میاں کیا تمہارے پاس کچھ دینار ہے جس سے تم کو محبت ہے کہا حضرت ہاں سَو دینار ہیں جنسے مجکو محبت ہے فرمایا ان کو اپنے پاس سے الگ کردو مرید نے منظور کرلیا شیخ نے پوچھا کس طرح الگ کروگے کہا حضرت کسی غریب کو دیدوں گا فرمایا نہیں بلکہ یوں الگ کرو کہ ایک دینار روزانہ سمندر میں ڈال آیا کرو اب اہل ظاہر اسپر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تو اضاعت مال ہوا جو منہی عنہ ہے مگر ان صاحبوں نے اس منشا کو نہیں سمجھا جسپر مشائخ کی نظر ہے اسی لئے وہ اہل تربیت پر اعتراض کرتے ہیں بات یہ ہے کہ اضاعت مال واقعی منہی عنہ ہے مگر یہاں اضاعت ہی نہیں کیونکہ اضاعت وہ ہے جسمیں کوئی منفعت و مصلحت نہ ہو اور یہاں اصلاح نفس منفعت ہے اصلاح کا کوئی خاص طریق متعین کرنا امر اجتہادی ہے سو اگر کسی مربی نے اسکو اسلئے ترجیح دی ہو کہ اس میں اصلاح کامل ہے تو کچھ بعید نہیں اور کامل اسلئے سمجھا گیا کہ یہ مجاہدہ محضہ ہے اور انفاق متعارف میں حظ بھی ہے جس میں مجاہدہ میں کمی ہوگئی اسلئے اسکو ترجیح دیدی مگر دیکھنا یہ ہے کہ اسکی علت کیا ہے علت یہ ہے کہ اس میں نعمت کی بیقدری ہے۔ اور اسلئے انہوں نے یہ حکم دیا کہ ایک دینار روزانہ سمندر میں ڈالدیا کرو کہ یہ صورت نفس کو بہت ہی کھلنے والی ہے کیونکہ اس میں کوئی حظ نہیں پھر وہ بھی ایک دفعہ ڈالنے کو فرماتے تو سہل تھا اور روزانہ ایک دینار کا ڈالدینا تو نفس کو بہت ہی کھل دے گا کہ ہر دن دلپر ایک آرا سا چلے گا اب مجاہدہ پورا ہونیکے بعد محبت مال سے اس کا دل بالکل خالی ہوجائے گا بتلایئے اس منشا کے سمجھنے کے بعد اسپر کیا اعتراض ہے۔ غرض عورتوں کو زکوٰۃ کا شوق اسلئے بھی ہے کہ دو چار مسکینوں کے ہاتھ پر پیسے رکھنے سے جی خوش ہوتا ہے اس میں نفس کو حظ حاصل ہوتا ہے اور روزہ کا جو عورتوں کو شوق ہے اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ فطرۃً روزہ ان پر آسان ہے کیونکہ انپر رطوبت و برودت کا غلبہ ہے اور روزہ شاق انپر ہوتا ہے

جنہیں رطوبت کم ہے اور حرارت غالب ہے چنانچہ مردوں کی یہی حالت ہے کہ انپر رطوبت کا غلبہ نہیں اور حرارت کا بھی غلبہ ہے اسی لئے ان کو روزہ گراں ہے دوسرے یہ ہے کہ کھانا ان کے ہاتھوں سے تیار ہوتا یا کم از کم نگاہ سے تو ہر وقت گذرتا ہے اس سے بھی ان کی بھوک پیاس مرجاتی ہے ہم نے ایک مرتبہ زمانہ طالب علمی میں بڑے اہتمام سے گلگلے پکائے تھے مگر تیار ہونے کے بعد جو وہ سامنے آئے تو طبیعت افسردہ ہوگئی اور کچھ زیادہ مزا نہ آیا کیونکہ سارا اہتمام اپنے ہاتھوں سے ہوا تھا اپنے سامنے پکے اور تیار ہوئے تھے تو دیکھ دیکھ کر نیت بھر گئی اسی وجہ سے مردوں کو عموماً تجربہ ہے کہ دعوت کا کھانا اپنے گھر کے کھانے سے لذیذ معلوم ہوتا ہے گو وہاں بجز دال گوشت کے کچھ بھی نہ ملے مگر پھر بھی لذیذ معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ دفعتہً و بغتتہً سامنے آجاتا ہے پہلے سے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کیا ملے گا اور گھر کے کھانے کی خبر پہلے ہی سے ہوجاتی ہے کہ آج یہ کھانا پکے گا اس علم کی وجہ سے وہ کھانا گو ہمیشہ جدید ہو مگر من کل وجہ جدید نہیں ہوتا غرض اور جسقدر عبادتیں ہیں سب میں کچھ نہ کچھ حظ نفس بھی ہے ۷۵
اس لئے عورتوں کو ان کا شوق ہے اور نماز میں کچھ حظ نہیں چنانچہ حج میں جو آزادی تھی وہ نماز میں نہیں بلکہ اسکے خلاف یہاں پابندی ہے کہ چاروں طرف سے جکڑ دیئے گئے نہ کسی سے بات کرسکتے ہیں نہ ادہر ادہر دیکھ سکتے ہیں گو کوئی حسی مشقت تو نہیں ہے جو سبکو نظر آئے جیسے کوئی بوجھ اٹھوایا جاتا یا ایک دو میل چلایا جاتا یہ کچھ نہیں مگر ایسی مشقت ہے جو خود اس شخص کو محسوس ہوتی ہے اور وہ مشقت تقیید کی ہے کیونکہ پابندی اور قید خود گراں ہے مثلاً ایک جگہ ایک پلنگ پر بیٹھے رہنا خود فی نفسہ گراں نہیں اگر آزادی کے ساتھ بیٹھنا ہو چنانچہ بعض دفعہ دن بھر ایک جگہ بیٹھے رہتے ہیں لیکن اگر کوئی آپ سے یہ کہہ جائے کہ آدھ گھنٹہ تک تم میرا اسی جگہ انتظار کرنا یہاں سے جانا نہیں تو اب یہ آدھ گھنٹہ بیٹھنا گراں ہے اور ہر منٹ منٹ بھاری ہوتا ہے کیونکہ آزادی فوت ہوگئی یہ بات نہیں رہی کہ جب چاہیں اٹھکر چلدیں یہی حال نماز کا ہے کہ تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد سے نماز پوری کرنے تک بندھ گئے اب نہ بول سکتے ہیں نہ چل پھر سکتے ہیں نہ کھا پی سکتے ہیں یہ نفس پر گراں ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے نماز ہی کے متعلق یہ فرمایا ہے انہا لکبیرۃ اور کسی عبادت کے متعلق یہ بات

نہیں فرمائی کیونکہ اور عبادات میں کچھ حظ نفس بھی ہے اور پابندی نہیں اور نماز میں حظ نفس کچھ نہیں اور پابندی سخت ہے (اور جسکو نماز میں حظ آتا ہے وہ نفس کو مارنیکے بعد آیا ہے تو اسکو حظ نفس نہیں کہ سکتے ۱۲) پھر دوسری گرانی یہ ہے کہ نماز دن میں پانچ دفعہ ہے اور عبادات میں یہ کثرت نہیں چنانچہ زکوٰۃ سال میں ایک دفعہ فرض ہوتی ہے حج عمر بھر میں ایک دفعہ فرض ہے اور روزہ گو سال میں تیس دن کا ہے مگر اس میں وحدت کی شان بھی ہے کیونکہ سب روزے متواتر ایک ہی مہینہ میں ہیں اور نماز میں تعدد ایسا ہے جسمیں وحدت کی شان نہیں کیونکہ سب نمازیں مسلسل ایک وقت میں نہیں ہیں بلکہ فصل کیساتھ علیحدہ علیحدہ وقت میں ہیں اور بجز فجر و ظہر کے بقیہ نمازوں میں فصل بہت ہی قلیل ہے جس کی وجہ سے زیادہ وقت نماز ہی کی فکر میں گذرتا ہے ایک نماز پڑھکر آئے اور دوسری کا فکر سوار ہے گویا اس طرح سارے دن نماز ہی میں رہتے ہیں لحدیث لا یزال احدکم فی الصلوٰۃ ما انتظر الصلوٰۃ دیوبند میں ایک معقولی طالب علم آئے تھے جو بے نمازی تھے کیونکہ معقولیوں کے نزدیک مہارت فی المعقول کی شرط ارتکاب معصیت بھی ہے اور معاصی بھی خاص خاص جنکا بیان اس مجلس میں خلاف تہذیب ہے اسلئے وہ معقولی صاحب نماز نہ پڑھتے تھے کیونکہ یہ معصیت بھی مہارت فی المعقول کی ایک شرط ہے اور دیوبند کے مدرسہ میں ماشاءاللہ نماز کی بہت پابندی ہے طلبہ خود بھی نماز پڑھتے ہیں اور جو بے نمازی ان میں آپھنسے اسکو بھی کسنکر ساتھ لیجاتے ہیں چنانچہ ان معقولی صاحب کو بھی نماز کیواسطے لیگئے ایک نماز پڑھکر بیٹھے تھے کہ تھوڑی دیر میں دوسری نماز کی تیاری ہوئی اور ان کو بھی لے گئے پھر تیسری نماز کی تیاری ہوئی پھر چوتھی کی تو وہ معقولی کہنے لگا کہ ہم نے سنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اول پچاس نمازیں معراج میں فرض ہوئی تھیں پھر آپ کی درخواست پر پچاس سے پانچ رہ گئیں مگر دیوبند کے مدرسہ میں پوری پچاس ہی فرض ہیں کہ یہاں تو نماز کے سوا کچھ کام ہی نہیں ابھی نماز سے فارغ ہو کر آئے اور چین سے بیٹھے بھی نہیں کہ پھر نماز اس سے نمٹ کر آئے تھے کہ پھر تقاضا ہے۔ چلو نماز کو یہاں تو ہر وقت نماز ہی نماز ہے۔ واقعی جسکو نماز کی عادت نہ ہو اسکو یہ پانچ وقت کی نماز پچاس وقت کی برابر معلوم ہوتی ہے کیونکہ گو یہ ظاہر

۷۶

میں پانچ ہیں مگر وحدت اور تسلسل کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ فصل کیساتھ ہیں اور فصل بھی زیادہ نہیں جسکی وجہ سے سارا دن نماز ہی کی فکر میں گذرتا ہے نمازی آدمی بیفکری کیساتھ کسی کام میں منہمک نہیں ہوسکتا یہانتک کہ بیفکری سے سو بھی نہیں سکتا رات کو بار بار آنکھ کھلتی ہے کہ کہیں صبح کی نماز کا وقت نہ نکل جائے تو سبحان اللہ وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالے نے لیلۃ الاسراء میں پچاس کی جگہ پانچ نمازیں مقرر فرما کر ارشاد فرمایا تھا خمس وہی خمسون لا یبدل القول لدی وما انا بظلام للعبید کہ یہ پانچ نمازیں ہیں اور یہ پچاس ہی کی برابر ہیں میرے یہاں بات بدلا نہیں کرتی تو ثواب کے اعتبار سے تو یہ پانچ نمازیں پچاس کے برابر ہیں ہی کیونکہ ہر نیکی دس نیکی کی برابر ہے لیکن ظاہری اثر اور تاثیر کے اعتبار سے بھی یہ پانچ پچاس کے ہی برابر ہیں کیونکہ سارا دن انہی میں مشغول ہو گیا ہے اور اس طرح نمازی ہر وقت گویا نماز ہی میں رہتا ہے اور ان پانچ کا پچاس کے برابر ہونا بے نمازیوں کو محسوس ہوتا ہے جو اول اول نماز شروع کرتے ہیں گو نمازیوں کو احساس نہ ہو اب نمازیوں کو غور کرنا چاہئیے کہ تم سے قوی تو اس سے عاجز ہیں اور تم پانچوں وقت سہولت سے نماز پڑھ لیتے ہو یہ کیا بات ہے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تم میں دوسروں سے زیادہ قوت ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ تم کہاں کے قوی ہو بس بات وہی ہے جو پہلے میں نے بیان کی تھی کہ حق تعالیٰ نے تمہارے اندر داعیہ پیدا کر دیا ہے اور ان میں وہ داعیہ نہیں ہے تو حقیقت میں تم خود نماز نہیں پڑھتے بلکہ حق تعالیٰ تم سے پڑھواتے ہیں ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوے چیں بستہ اند

ایک مصلحت شرعیہ سے تمہارا نام کر دیا گیا گو اس میں کچھ واقعیت بھی ہے گو وہ بھی عطا ہی کی ہوئی تھی پس اگر آپ کی مثال اس بچہ کی سی نہیں جو لکھنا بالکل نہیں جانتا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر تم کوئی حرف لکھدو تو اس بچہ کی مثال تو ضرور ہے جو لکھنا کچھ کچھ جانتا ہے مگر نہایت بدخط ہے اور آپ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر صحیح اور خوبصورت جیم لکھدیں تو گو اس صورت میں یہ لفظ من وجہ اس کا لکھا ہوا بھی ہے مگر یہ بات کس کی بدولت ہوئی کہ ایسا خوشنما خوبصورت لکھا گیا کہ میرزا پنجہ کش نے بھی اس پر صاد کر دیا یہ کسی دوسرے کی بدولت ہے تو آپ اپنے اعمال

کی ایسی ہی مثال سمجھئے بس واقعہ یہ ہے کہ لا جبر و لا قدر و لکن الامر بین بین میں جبر کا قائل نہیں ہوں کہ فرقہ جبریہ کی طرح آپ کو جبر کی طرف لیجاؤں اور اختیار کی بالکل نفی کردوں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنے نمازی اور ذاکر شاغل ہونے پر ناز کا حق نہیں کیونکہ ان اعمال کا صدور تنہا آپ کی قوت ارادیہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک دوسری قوت بھی کام کر رہی ہے جسکی بدولت آپ نمازی بنے ہوئے ہیں یعنی داعیہ اور وہ محض موہوب ہے یہ تو نمازیوں کے متعلق ہے کہ وہ اس امر موہوب پر نظر کر کے اپنے ناز کا علاج کریں اور بے نمازیوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ اس داعیہ کی تحصیل کا قصد نہیں کرتے۔ اور اسی داعیہ سے آپکو اس بات پر بھی تنبہ کرتا ہوں کہ آپ بے نمازیوں کو حقیر نہ سمجھیں یہ مطلب نہیں کہ انکو تنبیہ و زجر نہ کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کو ذلت کی نگاہ سے نہ دیکھیں زجر و تنبیہ کرو مگر اسکی ساتھ اپنے کو ان سے افضل نہ سمجھو بلکہ محض شفقت کی وجہ سے تنبیہ کرو پس زجر و تنبیہ تو اس بنا پر کرو کہ یہ اپنی قوت ارادیہ سے کام کیوں نہیں لیتے اور اپنے کو ان سے افضل اسلئے نہ سمجھو کہ یہ موہبت ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو ہم بھی ایسے ہی ہوتے جیسے یہ ہیں تو دیکھئے زجر و تنبیہ عدم تحقیر کی ساتھ کس ۷۸
سہولت سے جمع ہو گئی یہاں سے ایک شاعر کا قول باطل ہو گیا جو اس قسم کی الجھنوں سے پریشان ہو کر کہتا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ　　باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ شاعر باذوق تو ہے مگر محقق نہیں محقق کبھی احکام شرعیہ میں ایسا نہ کہے گا کیونکہ وہ سب اضداد کو جمع کر دیتا ہے یعنی جو ناقصوں کی نظر میں اضداد ہیں ورنہ واقع میں احکام شرعیہ کے اندر اضداد کا جمع ہے ہی نہیں چنانچہ امر بالمعروف اور عدم تحقیر مسلم میں لوگ تضاد کا اعتقاد کرتے ہیں کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم دوسرے شخص کو کسی گناہ پر زجر و تنبیہ بھی کریں اور اسکو حقیر بھی نہ سمجھیں تو میں نے بتلا دیا کہ اسکو زجر و تنبیہ تو اسلئے کرو کہ اس نے اپنی قوت ارادہ و اختیار سے کام کیوں نہیں لیا لیکن حقیر اسلئے مت سمجھو کہ تم جو اس گناہ سے محفوظ ہو محض اپنے ارادہ و اختیار سے محفوظ نہیں ہو بلکہ حق تعالیٰ نے تم میں ایک داعیہ پیدا کر دیا ہے جو کشاں کشاں طاعات کی طرف لیجاتا اور معاصی سے روکتا ہے اور گو یہ داعیہ ارادہ و اختیار

ہی کے استعمال سے عطا ہوا ہے اور اس عاصی کو بھی ارادہ و اختیار کے استعمال سے یہ داعیہ
عطا ہوسکتا تھا مگر فی نفسہ تو امر موہوب ہے مکسوب نہیں پھر آپ کو اپنی فضیلت اور دوسرے
کی ذلت کے اعتقاد کا کیا حق ہے خوب سمجھ لو۔ بہر حال میں بے نمازیوں کی شکایت اور ان کی
زجر و تنبیہ سے منع نہیں کرتا یہ جائز ہے بلکہ مامور بہ ہے چنانچہ میں اسوقت خود بھی ان کی شکایت
کر رہا ہوں اور چونکہ مجھے زجر و تنبیہ کا اختیار نہیں ہے اس لئے میں ترغیب کا مضمون بیان
کرتا ہوں جس سے سامعین کو نماز کی فضیلت معلوم ہوگی اور فضائل سنکر امید ہے کہ رغبت ہوجائے گی
اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اقم الصلوٰۃ لذکری۔ حضرت سیدنا موسیٰ
علیہ السلام سے کوہ طور پر بہت سی باتیں ہوئیں انہی میں یہ حکم بھی ہوا اوپر سے ارشاد ہے
فلما اتٰہا نودی یا موسیٰ ۰ انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طوی وانا اخترتک
فاستمع لما یوحیٰ انّنی انا اللہ لا الٰہ الا انا فاعبدنی ۰ اول تو ان کو نبوت کی خبر دی گئی کہ میں نے
تمکو نبوت کے واسطے منتخب کیا ہے اب کان لگا کر اس بات کو سنو جو تم پر وحی کی جاتی ہے ۷۹
انّنی انا اللہ لا الٰہ الا انا کہ میں اللہ ہوں معبود ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں اس کے بعد
ارشاد ہے فاعبدنی اس میں فاء تفریع کے لئے ہے جو انّنی انا اللہ پر متفرع ہے کہ جب میں
ہی معبود حق ہوں تو اب تم میری عبادت کرو اسکے بعد ارشاد ہے واقم الصلوٰۃ لذکری
کہ نماز کو میری یاد کیواسطے قائم کرو یعنی اس کی پابندی کرو تو نماز کی کتنی بڑی شان ہے کہ توحید
کے بعد عبادت کا مطلقاً امر ہوا جس میں نماز بھی داخل تھی مگر اہتمام بالشان کے لئے نماز کو
الگ بیان فرمایا شاید کسی کو شبہ ہو کہ بنی اسرائیل پر شاید صرف نماز ہی فرض ہو اور کوئی عبادت
فرض ہی نہ ہو تو یہ شبہ غلط ہے کیونکہ روزہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی تھا جیسا کتب
علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم کی تفسیر میں آدم علیہ السلام پر صوم ایام بیض اور
شریعت موسویہ میں صوم عاشوراء شریعت عیسویہ میں رمضان کے فرض ہونے کو مفسرین نے
ذکر کیا ہے اور زکوٰۃ بھی فرض تھی جیسا سورۂ مائدہ میں آیت لئن اقمتم الصلوٰۃ و آتیتم الزکوٰۃ کا
خطاب بنی اسرائیل کو مذکور ہے پھر بھی نماز کو سب سے مقدم کیا بلکہ اس موقعہ پر نماز کے سوا
کسی اور عبادت کا امر ہی نہیں ہوا بلکہ اسکے بعد معاد کا ذکر شروع ہوگیا ان الساعۃ آتیۃ

اکا د اخفیہا الایات تو ایسے وقت میں جبکہ حق تعالیٰ کی تجلی ہو رہی تھی جس کی حقیقت ہم اسکے
سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک نور تھا مگر تیز ایسا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اسکو نہ سمجھے پھر
اسوقت حق تعالیٰ کی طرف سے کلام بھی ہو رہا تھا اس کی حقیقت بھی کوئی نہیں بیان کر سکتا

سہ تو ندیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبان مرغاں را

بعض کہتے ہیں کہ کلام لفظی بواسطہ تھا اور بعض کہتے ہیں کلام لفظی بلا واسطہ تھا اور بعض
کہتے ہیں کہ کلام نفسی ہی تھا اور اسلم یہ ہے کہ اس میں سکوت کیا جائے اور اگر کوئی سوال کرے
تو یہ جواب دیدیا جائے سہ

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

بہرحال خواہ حقیقت کچھ ہی ہو مگر موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر حق تعالیٰ ہمکلام ہوئے تھے
اور اسوقت ایک خاص تجلی بھی ہو رہی تھی اس وقت میں غور کر لیجئے کہ حق تعالیٰ نے جن باتوں کا
موسیٰ علیہ السلام کو امر کیا ہو گا وہ باتیں کس درجہ کی ہونگی ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی ملاقات میں
محبوب جن باتوں کا حکم کرتا ہے وہ نہایت عظیم الشان ہوتی ہیں خصوصاً جبکہ ملاقات بھی اس ۸۰
شان خاص سے ہو کہ تجلی بھی ہو اور ہمکلامی بھی ہو تو ایسے خاص وقت میں حق تعالیٰ نے
موسیٰ علیہ السلام کو نماز کا حکم فرمایا ہے جو کہ موسیٰ علیہ السلام کیلئے معراج اور خاص قرب
کا وقت تھا پھر آپ اپنے حضور کی معراج کو دیکھ لیجئے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج
میں خاص قرب میں کس عبادت کا حکم ہوا نصوص سے صراحۃً معلوم ہے کہ معراج میں نماز ہی
کا حکم ہوا ہے نہ زکوٰۃ اسوقت فرض ہوئی نہ روزہ نہ حج بلکہ یہ سب عبادتیں مدینہ میں فرض ہوئیں
اور نماز آسمان پر فرض ہوئی بلکہ آسمان سے بھی اوپر۔ اس سے بھی نماز کا خاص شرف واضح ہے
تو اس میں غور کر کے نماز کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے۔

اب میں اقم الصلوٰۃ لذکری میں ایک نکتہ بیان کرتا ہوں جس سے نماز کی فضیلت دیگر
عبادات پر بہت زیادہ ثابت ہوتی ہے اور یہ محض نکتہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے وہ یہ کہ
اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ثمرہ کیلئے مقصود ہوں اور ثمرہ عمل کا مغائر ہو دوسرے وہ
جو ثمرہ کے لئے مقصود نہیں بلکہ لذاتہٖ مقصود ہے اور جو ثمرہ اسکے ساتھ مذکور ہے وہ اسکا مغائر نہیں بلکہ

عین ہے مثلاً ہم کسی حاکم سے ملنے جائیں اور وہ ہمکو کوئی کام بتلائے تو بعض کام تو ایسے
ہوتے ہیں جو خود مقصود نہیں بلکہ ان کا ثمرہ مقصود ہے مثلاً حاکم یہ کہے کہ تم انٹرنس پاس کرلو
تو ہم تم کو فلاں عہدہ دیدینگے یہاں انٹرنس پاس کرنا خود مقصود نہیں بلکہ عہدہ مقصود ہے
جو اس کا ثمرہ ہے اور یہ ثمرہ عمل کا غیر ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ یوں کہے تم ہمارے
پاس ہر روز آیا کرو یہاں یہ عمل خود مقصود ہے کیونکہ حاکم کے دربار میں حاضری نصیب ہوجانا
یہ خود بڑی چیز ہے گو اس پر ثمرات بھی مرتب ہوتے ہیں مگر ان ثمرات کے ساتھ خود حاضری
دربار بھی بڑا مقصود ہے چنانچہ بہت لوگ اس حاضری ہی کیلئے بڑی بڑی کوششیں کرتے
ہیں گو اسکے حصول کے بعد کوئی ثمرہ بھی حاصل نہو۔ اب میں نماز کے متعلق دعوی کرتا ہوں
کہ نماز میں جتنے اعمال ہیں اور نماز ان اعمال سے مرکب ہے وہ سب اجزا ایسے ہیں کہ اعمال
تو ہیں ہی مگر ثمرات بھی ہیں یعنی ان اعمال کے لئے کوئی ایسا ثمرہ نہیں جسکے اعتبار سے
ان اعمال کو مقصود بالعرض اور اس ثمرہ کو مقصود بالذات کہا جائے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے ۸۱
کہ اجزاء صلوٰۃ خود مقصود بالذات ہیں جسکو میں ابھی ثابت کئے دیتا ہوں اور جب اجزاء کا یہ حال ہے
تو صلوٰۃ کا حال بھی اس سے معلوم ہوگیا کہ وہ بھی مقصود بالذات ہے کیونکہ اجزاء میں اور
مجموعہ میں محض اعتباری تغایر ہے اور تغایر اعتباری محض فرض ہی فرض ہے، امور واقعیہ
میں اس کا اعتبار فضول ہے اور کسی عمل کا مقصود بالذات ہونا اور مقصود بالعرض نہونا
یہ اس کی بڑی فضیلت اور اعلی درجہ کا کمال ہے۔ اب سنئے کہ نماز کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی
محبوب عاشق سے کہے کہ ہمکو دیکھو اور ہم سے باتیں کرو ہرچند کہ دیکھنا اور باتیں کرنا ایک
عمل ہے مگر ایسا عمل ہے کہ خود ہی عمل ہے اور خود ہی ثمرہ مقصودہ ہے اس سے کوئی اور
ثمرہ مقصود نہیں عاشق کے دل سے پوچھو وہ اس عمل سے کسی غیر کو مقصود نہ سمجھے گا کیونکہ
وہ تو عمر بھر اسی کو ترستا تھا کہ کسی طرح ایک نگاہ محبوب کو دیکھ لوں اور اس سے ایک دو بات
کرلوں تو اب جبکہ محبوب نے اسکو اپنے دیکھنے اور اپنے سے ہمکلام ہونیکا امر کیا ہے یقیناً اسکو
اس رویت و کلام سے کسی اور ثمرہ کی طلب نہوگی بلکہ اسی کو مطلوب سمجھیگا رہا یہ اشکال کہ
صاحب اصل مقصود تو لذت ہے جو رویت و کلام محبوب سے حاصل ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے

کہ احکام طبعیہ میں لذت رویت وکلام کا غیر نہیں بلکہ عین ہے کیونکہ وہ ان کی ساتھ ساتھ معاً حاصل ہوتی ہے دونوں میں تقدم وتاخر زمانی نہیں اور احکام طبعیہ میں تقدم و تاخر زمانی ہی سے تغائر ہوا کرتا ہے نہ کہ تقدم وتاخر ذاتی سے جو چیزیں زماناً ساتھ ساتھ ہوں گو ذاتاً ان میں ایک مقدم ایک مؤخر ہو عرفاً ان کو طبعاً متحد ہی سمجھا جاتا ہے تو ہر چند کہ نظر سے لذت ہوگی مگر عاشق کے نزدیک وہ نظر کا غیر نہیں بلکہ اسکو تو نظر من حیث ہو ہو ہی مقصود ہوگئی ہے یہی وجہ ہے کہ عاشق کو تمنائے دیدار وآرزوے لقاء کیساتھ لذت کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا غرض نماز ایسا ہی عمل ہے کہ عمل بھی ہے اور ثمرہ بھی ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نماز کسی ثمرہ کے بھی اعتبار سے مقصود بالعرض نہ ہو بلکہ دعوی یہ ہے کہ نماز من کل الوجوہ مقصود بالعرض نہیں بلکہ اسکے اندر بھی مقصودیت بالذات کا ایک درجہ موجود ہے پس نماز سے رضائے حق اور دخول جنت کا مقصود ہونا اور اس ثمرہ کے اعتبار سے اس کا مقصود بالعرض ہونا ہمارے دعوے کے منافض نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کھانیکا اخیر مقصود جزو بدن ہونا ہے مگر مقصود عاجل لذت ہے جسکی وجہ سے یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ کھانا اچھا پکا ہوا ہو مرچ بھی مرغ ہو دسترخوان بھی اجلا ہو روٹی بھی صاف وعمدہ ہو جلی ہوئی اور سیاہ نہ ہو تا کہ کھا کر لذت آوے یہ اہتمام بلیغ بتلاتا ہے کہ لذت بھی خود مقصود ہے ورنہ بدل مایتحلل تو ہر طرح کی غذا ہو سکتی ہے اسی طرح نماز کا ثمرہ ۸۲
اخیر گو حصول رضا اور دخول جنت ہے مگر اجزاء صلوٰۃ خود بھی مقصود بالذات ہیں۔ اب انکی مقصودیت کو سنئے کہ نماز کی حقیقت کیا ... نماز قیام وقعود ورکوع وسجود وقراءت سے مرکب ہے اور ان ارکان کے ساتھ تسبیح وتقدیس (ا) ہر و ذکر بھی لگا ہوا ہے یہ نماز کے اجزاء ہیں اب تبلائیے کہ اگر نماز فرض نہ ہوتی تو جو چیزیں اب نماز کے اندر ہیں کیا آپ ان کو نہ ڈھونڈتے ؟ یقیناً آپ خود ان کو ڈھونڈھتے اور ان کی طلب وتلاش میں عمر ختم کر دیتے کیونکہ ہر عاشق کو اس کی تمنا ہوتی ہے کہ محبوب کے سامنے اپنا عجز ونیاز ظاہر کرے اور اس کی تعریف وثنا میں بان کرے اور ... کی یاد سے دل کو تسلی دے تو کیا آپ کو حق تعالے سے محبت نہیں ؟ کوئی شخص اس کا اقرار نہیں کر سکتا کیونکہ اول تو حق تعالے سے انسان کو فطری محبت ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ حق تعالیٰ کے اندر صفات کمال ایسی ہیں جن کی وجہ سے محبت ہونا ہی چاہئے

کیونکہ استقراء سے اسباب محبت تین صفتیں ہیں جمال وکمال ونوال (یعنی عطا وسخا) اور محبت کسی صفت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے ذات سے محبت نہیں ہوا کرتی الا نادراً کسی کو تو حسن وجمال کی وجہ سے کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو بتلایئے حق تعالیٰ سے بڑھکر کون حسین وجمیل ہے کوئی بھی نہیں کسی کو کسی کے ساتھ کمال کی وجہ سے محبت ہے جیسے استاد کی ساتھ شاگرد کو اور منصف عادل بادشاہ کیساتھ ہر شخص کو محبت ہوتی ہے گو وہ اس کی رعایا بھی نہو یا جیسے سخی بادشاہ سے ہر ایک کو محبت ہوتی ہے گو اسکو ابھی تک کچھ بھی نہ ملا ہو میرے ایک دوست کہتے تھے کہ مدینہ منورہ میں ایک عالم بہت عسرت میں ہیں اور حیدرآباد سے ان کی کوئی تنخواہ بھی نہیں مگر ریاست حیدرآباد کیلئے بہت دعا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس ریاست سے مسلمانوں کو بہت فیض ہے اب کہئے ان کو نواب حیدرآباد سے کیوں محبت ہے محض صفت سخاوت کی وجہ سے اور کبھی نوال وعطا کے سبب محبت ہوتی ہے تو حق تعالیٰ سے ۸۳ بڑھکر کون صاحب نوال وکمال ہوگا کہ وہ عاصی ومطیع سبکو روزی دیتے ہیں غرض جو اسباب محبت کے ہیں ان میں حق تعالیٰ سب سے اکمل ہیں بلکہ اگر نظر کو غائر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اوصاف ثلثہ کی وجہ سے آپ کو جس سے بھی محبت ہے وہ حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کی محبت ہے دیکھئے اگر دیوار پر آفتاب کی روشنی پڑ رہی ہو اور کوئی شخص اس کو دیکھ کر دھوپ پر عاشق ہوجائے تو حقیقت میں یہ آفتاب ہی کا عشق ہے کیونکہ صفت کا عشق موصوف کا عشق ہے اسی طرح جس شخص کو کسی آدمی کے ساتھ اسکے جمال یا کمال ونوال کی وجہ سے محبت ہے وہ در حقیقت حق تعالیٰ سے محبت ہے کیونکہ یہ صفات اس میں اپنے آپ پیدا نہیں ہوگئے بلکہ جس نے اس کی ذات کو پیدا کیا ہے اسی نے یہ صفات اسکے اندر پیدا کئے ہیں تو نقش کی محبت دراصل نقاش کے ساتھ محبت ہے کیونکہ نقش خود تو نہیں بن گیا کسی نے اسکو بنایا ہے پس کسی عالم سے محبت ہونا حق جل وعلا سے محبت ہے ایسے ہی کسی محسن سے محبت ہونا حق تعالیٰ سے محبت ہے کیونکہ جو صفات ان میں تم دیکھ رہے ہو وہ حق تعالیٰ کی صفات کا ظل ہے اسی نظر کو عمیق کر کے اگر دل میں قائم کر لیا جائے تو حق تعالےٰ سے بہت جلد بلا واسطہ محبت ہوجائے گی جس کی صورت یہ ہے کہ آپ ہر چیز کو دیکھ کر یہ سوچا کریں سے

پر باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگار ہا۔ ہائے جس نے ایسی ایسی چیزیں حسین و باکمال بنائی

ہیں وہ خود جیسا ہوگا۔ بہر حال یہ بات تو ہم نے تبرعاً بیان کردی ورنہ اصل یہ ہے کہ انسان کو حق تعالےٰ سے طبعی محبت ہے مگر اس کو اس محبت کی خبر نہیں اور احساس کچھ مشکل بھی نہیں ہیں نے جو بات ابھی بتلائی ہے اس کی دوا کرو جب جلد اس محبت کا احساس ہو جائے گا اور جب اس کا احساس ہوگا تو آپ محب ہوں گے اور حق تعالیٰ محبوب ہوں گے اب بتلائیے کہ محبت کا یہ تقاضا ہوتا ہے یا نہیں کہ میں محبوب کا نام لوں محبوب سے باتیں کروں محبوب کے سامنے کھڑا ہوں اسکے سامنے اپنا عجز و نیاز ظاہر کروں حضرت محبت وہ چیز ہے جو کسی حال میں محبوب کا نام لئے بغیر چین سے نہیں بیٹھنے دیتی مجنوں کو لیلیٰ سے محبت تھی تو یہ حال تھا کہ کبھی کبھی بیٹھا بیٹھا ریت میں لیلیٰ کا نام لکھا کرتا تھا اور اسی سے دلکو تسلی دیا کرتا تھا مولانا فرماتے ہیں ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود و انگشتان قلم — می نمود سے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں — می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلیٰ می کنم — خاطر خود را تسلی می کنم ۸۴

نیز محبت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ عاشق دوسروں کی زبان سے بھی اس کا نام سننا اور تذکرہ سننا چاہتا ہے ابو نواس کہتا ہے ؎

الا فاسقنی خمرا وقل لی ہی الخمر — ولا تسقنی سرا متی امکن الجہر

اسکو شراب سے محبت تھی تو کہتا ہے کہ شراب پلاتا جا اور یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے شراب ہے کیونکہ محبوب کا نام سننے سے بھی لذت آتی ہے اگر سننے میں لطف نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی سے کیوں فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھو میں سننا چاہتا ہوں اور وہ صحابی فرماتے ہیں اعلیک اقرأ و علیک انزل۔ یعنی آپ کو سننے کی کیا ضرورت ہے آپ پر تو قرآن نازل ہی ہوا ہے مگر آپ فرماتے ہیں کہ نہیں سننے کو جی چاہتا ہے کیونکہ خود پڑھنے میں توجہ منقسم ہوتی ہے اپنی قرأت کی طرف بھی اور سننے میں ہمہ تن ادھر ہی توجہ ہوتی ہے عشاق غور کر کے دیکھ لیں کہ جیسا خود اپنی زبان سے ان کو محبوب کا تذکرہ پسند ہے اسی طرح دوسرے کی زبان سے بھی تذکرہ سننے کو جی چاہا کرتا ہے اور ایسا جی چاہتا ہے کہ اسکے ضمن میں کی

دوسرے کا تذکرہ ٹھونسدیا جائے تو سخت ناگوار ہوتا ہے اس پر ایک حکایت یاد آئی مولانا مظفر حسین صاحب سے ایک رئیس نے کہا کہ حضرت حدیث میں آتا ہے لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (متفق علیہ) یعنی کوئی شخص اس وقت تک مومن ومسلمان نہ ہوگا جبتک کہ اپنے والد اور اولاد اور سب آدمیوں سے زیادہ میرے ساتھ محبت نہ ہو اور میں دیکھتا ہوں کہ مجھ اپنے باپ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت ہے تو کیا میں مومن نہیں مولانا نے اسوقت کچھ جواب نہیں دیا دوسری باتوں میں لگ گئے اور باتوں باتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا اور آپ کے کمالات بیان کرنا شروع کئے وہ رئیس نہایت شوق سے حضور کا تذکرہ سنتے رہے جب مولانا نے دیکھا کہ ان کو بہت لطف آرہا ہے تو درمیان ہی میں حضور کا تذکرہ چھوڑ کر فرمانے لگے کہ اچھا اسکو تو رہنے دیجئے اب آپ کے والد صاحب کے کمالات بیان کرتا ہوں انمیں بھی بڑے بڑے کمالات تھے بس وہ رئیس یہ سنکر بے چین ہوگئے اور کہا حضرت آپنے رسول اللہ صلی اللہ ۸۵
علیہ وسلم کے تذکرہ میں یہ والد صاحب کا قصہ کہاں سے ٹھونسدیا توبہ توبہ کیا ان کے کمالات بھی کوئی چیز ہیں جو حضور کے کمالات کے ساتھ بیان کئے جائیں مولانا اس سے میرا دل بہت دکھا اس کو چھوڑیئے اور حضور ہی کا تذکرہ کیجئے مولانا نے فرمایا کیوں صاحب اگر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے والد کے ساتھ محبت ہے تو حضور کے تذکرہ میں ان کا تذکرہ ناگوار کیوں ہوا اور اس سے دل کیوں دکھا۔ بس شکر کیجئے کہ آپ کو حضور ہی کیساتھ زیادہ محبت ہے جسکا احساس تقابل کے وقت ہوتا ہے اب تو ان رئیس کی آنکھیں کھل گئیں اور مولانا کو بہت دعائیں دیں۔

واقعی عارفین قیل وقال سے جواب نہیں دیا کرتے وہ عملی جواب دیا کرتے ہیں جس سے مخاطب کی تسلی ہو جاتی ہے اگر مولانا دلائل سے ان رئیس کا اطمینان کرنا چاہتے تو وہ اطمینان ہرگز حاصل نہ ہوتا جو اس عملی جواب سے ہوا۔ سو بحمد اللہ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حق تعالی سے محبت نہ ہو۔ محبت سبکو ہے اور جان ومال واہل وعیال سے بھی زیادہ ہے کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں مگر وجود محرک کیوقت تحریک ہوتی ہے۔ غور کر لیا جائے کہ اگر ایک مجلس میں کسی مسلمان کے باپ کو گالی دیجائے اور اسی مجلس میں کوئی شخص نعوذ باللہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے تو دل کو ٹٹول کر دیکھو کس پر زیادہ غصہ آئیگا یقیناً جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ کہا ہے اسپر غصہ زیادہ آئیگا۔ بہر حال عاشق کا دل اسکے لئے بیچین ہوتا ہے کہ محبوب کا نام لے اس کا تذکرہ سنے اس سے باتیں کرے یہ سب باتیں نماز میں موجود ہیں ہاں صرف ایک کسر ہے کہ دیدار نہیں تو اس میں حضرت حق کی طرف سے کوئی مانع نہیں وہ ہر وقت تجلی میں مستور نہیں ہیں بلکہ مانع عاشق کی طرف سے ہے کہ اسکی آنکھ پر پردہ پڑا ہوا ہے ؎

شد ہفت پردہ چشم ایں ہفت پردہ چشم — بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لن ترانی فرمایا گیا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے اگر مانع ادہر سے ہوتا تو لن اُری فرماتے اور اگر اُدہر سے مانع ہوتا تو معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور جنت میں ہم کو کیسے رویت ہوگی کیونکہ ذات حق میں تو تغیر نہیں ہوسکتا جو یہ احتمال ہو کہ پہلے ذات میں مانع نقاب نہیں رہا بلکہ ہم میں ہی تغیر ہو جائیگا کہ اسوقت رویت کے متحمل نہیں ہیں پھر متحمل ہو جائیں گے کیونکہ ہم متغیر ہیں اسی طرح حدیث میں جو آیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ مجھ
میں اور حق تعالیٰ میں ستر ہزار حجاب حائل ہیں وہ مانع بھی ذات میں نہیں جبریل علیہ السلام ۸۶
ہی کے اعتبار سے مانع ہے اور ان حجابات میں حکمت بھی ہے جو وجہ الٰہی پر ہیں بلکہ بقاء عالم کے لئے ان کا ہونا ضروری ہے ورنہ مسلم کی حدیث میں ہے کہ اگر حق تعالیٰ ان حجابات کو رفع کردیں تو لاحرقت سبحات وجہہ ما انتہی الیہ بصرہ تمام عالم جل بھنکر فنا ہو جائے اس سے بھی ہمارا ہی نقص ثابت ہوا کہ ہم ان انوار کے متحمل نہیں اگر وہ بے حجاب ہو جائیں تو سب نیست و نابود ہو جائیں مگر جنت میں ہماری یہ حالت نہ رہے گی وہاں استعداد و تحمل پیدا ہو جائے گی تو اسوقت بلاواسطہ رویت ہوگی اور سب حجابات مرتفع ہو جائیں گے اور ان کے رفع سے ہم ہلاک نہ ہونگے البتہ ادراک کنہ کا اسوقت بھی نہ ہوگا اور اسی کو فرمایا ہے۔ لا یبقی علی وجہہ الا رداء الکبریاء غرض اسوقت ہم ان حجب کے سبب حق تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتے مگر قاعدہ یہ ہے کہ جس محبوب کی ذات کو عاشق نہ دیکھ سکے وہاں تعلقات قرب ہی سے دل کو تسلی دیتا ہے۔ تو نماز میں گو رویت نہیں مگر کیا قرب کے تعلقات اسمیں تھوڑے ہیں چنانچہ آپ حق تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں ان کا نام لیتے ہیں انکی تعظیم و تقدیس کرتے ہیں تو کیا

وصال کامل نہو سکنے کی صورت میں عاشق کو یہ باتیں مطلوب نہیں ہوتیں غور کیجئے اگر نام لینے سے بھی ممانعت ہوتی تو کیا حال ہوتا دیوبند میں ایک شخص کسی طالب علم پر عاشق تھا اور اس کا نام لیکر بار بار پکارا کرتا تھا اس طالبعلم نے عاشق کے ایک دھول مارا اور کہا خبردار جو آج سے تونے میرا نام لیا غور کیجئے جب عاشق کو نام لینے سے بھی روک دیا جائے تو اس کے دل پر کیا حالت گذرے گی پھر اسکے بعد نماز میں حق تعالے نے اپنے ساتھ ہمکلامی کی اجازت دیدی ہے کہ ہمارے ساتھ بات چیت کرو یہ کتنا بڑا شرف عطا ہوا حدیث میں ہے کہ جب بندہ الحمد للہ رب العلمین کہتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں حمدنی عبدی پھر الرحمن الرحیم مالک یوم الدین کہتا ہے تو فرماتے ہیں مجدنی عبدی کہ اب میرا بندہ میری تعریف کر رہا ہے اب میری بزرگی بیان کر رہا ہے یہ آپ کے کلام ہی کا تو جواب ہے اور جواب بھی کیسے مزے کا کہ بار بار آپ کو اپنا بندہ فرماتے ہیں اس کا لطف عشاق سے پوچھو ایک ۸۷

عارف فرماتے ہیں ؎

اگر یک بار گوید بندۂ مومن — ز فوق عرش گذر دخندۂ من

(وہ اگر کہدے مجھے اپنا غلام — سب سے پیارا نام ہو میرا یہی!)

شاید آپ کہیں کہ اس جواب کو ہم تو نہیں سنتے تو سمجھ لیجئے کہ اسوقت آپ کے مناسب یہی ہے کہ کانوں سے آپ جواب کو نہ سنیں لیکن جب مخبر صادق خبر دے رہے ہیں کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں تو پھر اس جواب میں شبہ کی کیا گنجایش ہے دیکھئے اگر آپ کسی محبوب کی پس پردہ تعریف کریں اور بعد میں کوئی شخص پردہ کے اندر سے آکر تم سے کہدے کہ محبوب تمہاری باتوں کو سنکر بہت خوش ہو رہا تھا اور چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ واقعی یہ میرا عاشق ہے تو بتلایئے اس خبر سے آپ کا کیا حال ہوگا یقیناً عاشق کو وجد آجائے گا اور بار بار پوچھے گا کہ ہاں کیا کہا تھا تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس ادنی مخبر کے قول سے بھی کم ہوگیا جو آپ کو اسپر وجد نہیں آتا بس یقین رکھئے کہ حق تعالیٰ یقیناً آپ کی بات کا جواب دیتے ہیں گو آپ کے کان نہ سنیں لیکن ذرا مجاہدہ کرکے دیکھو تو دل ضرور سنے گا محبوبوں کی باتیں یونہی ہوا کرتی ہیں وہ عشاق کی طرح ڈھول نہیں بجایا کرتے مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر

یہاں غنیمت ہے اگر کھلم کھلا ان کے جواب کو نہیں سنا تو یہ بھی بہت ہے کہ ان کے جواب دینے کی خبر تو سن لی ۔ ؎

مرا از زلف تو موئے بسندست ہوس را رہ مدہ بوے بسندست

یہ بوے زلف ہی تو ہے کہ حدیث سے حضرت حق کے جواب کی خبر پہونچ گئی ۔ اگر عشق کے ساتھ عاشق میں نیازمندی بھی ہو تو اسکو ان باتوں کی قدر ہوگی یہ حوصلہ سے زیادہ ہوس ہے کہ آپ علی الاعلان جواب سننے کے درپے ہوں ؎

آرزو مے خواہ لیک اندازہ خواہ برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

ایاز قدر خود بشناس بلکہ تم ایاز بھی نہ بنو سراپا نیاز بنجاؤ غرض یہ تعلقات قرب بھی ایک گونہ مشاہدہ ہی ہے گو بواسطہ سہی ۔ سو اگر مشاہدہ بلا واسطہ نہیں ہے تو مشاہدہ بواسطہ ہی کو غنیمت سمجھو ۔ ایک مشاہدہ بواسطہ یہ بھی ہے کہ تمام مخلوق مرآۃ حق ہے آپ مصنوعات باری میں نظر کر کے یہ سوچئے ؎ چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا ۔ اس سے آپ کو ۸۸
صفات کمالیہ حق کا مشاہدہ ہوگا یہ تو مشاہدہ عامہ ہے اور نماز میں اس سے بھی بڑھکر مشاہدہ ہے وہاں یہ دیکھو کہ قلب تجلی گاہ حق ہے اس وقت ذوقاً تمکو حق تعالیٰ رأی العین معلوم ہونگے اہل ذوق اسکو جانتے ہیں بس دنیا میں تو اتنا ہی مشاہدہ کافی ہے یہاں اس سے زیادہ ہوس نہ کرو کہ تمہارے حوصلہ سے باہر ہے اس حوصلہ سے آگے تمنا پر مجھے حضرت حاجی صاحبؒ کی ایک بات یاد آئی کہ بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا آپ کے سامنے ظاہر کی تو فرمایا کہ میاں تمہارا بڑا حوصلہ ہے جو حضورؐ کے دیکھنے کی تمنا ہے ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ گنبد خضرا ہی کی طرف نظر کر لیں یہ نیازمندی کا غلبہ ہے اور عاشق کو نیازمند ہی ہونا چاہئیے اسی کو ایک عاشق اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روی

ہماری نگاہ اور محبوب کے چہرہ پر پڑے بڑی حیرت ہے کہاں ہماری ناپاک نگاہ اور کہاں

وہ پاک چہرہ اسی کو بوعلی قلندر فرماتے ہیں سے

غیرت از چشم برم روے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

اپنی آنکھ اور کان سے بھی غیرت آتی ہے آخر یہ کیا بات ہے۔ وہی نیازمندی۔ جب نیاز کا غلبہ ہوتا ہے تو محبوب کو دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی یہ استطرادی مضمون تھا مقصود یہ ہے کہ نماز میں گو دیدار تو نہیں ہے مگر دیدار کے قریب ہی مشاہدہ ہے کیونکہ حدیث میں ہے اقرب ما یکون العبد وہو ساجد فی الصلوٰۃ (او کما قال) کہ بندہ کو سب سے زیادہ قرب نماز میں بحالت سجدہ ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے واسجد واقترب کہ سجدہ کرو اور ہم سے قریب ہو جاؤ اگر انسان میں موانع قرب یعنی معاصی و غفلت وغیرہ کم ہوں تو اس قرب کا بھی مشاہدہ ہوتا ہے جتنے موانع کم ہوں گے اسی قدر مشاہدہ قرب زیادہ ہوگا اور اگر نماز میں خاص مشاہدہ
89 نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص رنج کے وقت نماز کا حکم نہ ہوتا واقعہ یہ ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کے اس قول سے سخت رنج پہونچا تھا ان اللہ استلقی علی العرش فی یوم السبت لکراحتہ (نعوذ باللہ منہا) کہ اللہ تعالیٰ چھ دن میں آسمان و زمین پیدا کرکے ساتویں دن یعنی سنیچر کو عرش پر لیٹ گئے تاکہ تھکن دور ہو اور آرام ملے نعوذ باللہ نعوذ باللہ اور اسپر یہود کے قول کے رد کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ولقد خلقنا السموات والارض وما بینہما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب فاصبر علی ما یقولون۔ ہم نے بیشک آسمان زمین کو اور ان کے درمیانی اشیاء کو چھ دن میں پیدا کیا مگر ہم کو کچھ تھکن ذرا بھی نہیں ہوئی (کیونکہ یہ تو تاثر ہے جو ممکن کی شان سے ہے واجب کو تاثر نہیں ہوا کرتا) پس آپ ان (یہودیوں) کی باتوں پر صبر کیجئے (زیادہ رنج نہ کیجئے) اس کے بعد یہ بڑھایا وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب جس میں نماز کا حکم ہے اب دیکھنا چاہیے کہ اسکو تسلی میں کیا دخل ہے کیونکہ یہ قرآن ہے جس کا لفظ لفظ مربوط ہے کوئی بات بے ربط نہیں تو فاصبر علی ما یقولون کے بعد تسبیح یعنی صلوٰۃ کا امر یہ بتلاتا ہے کہ صلوٰۃ معین صبر ہے اور یہ ایسی اعانت ہے جیسے عاشق کو کسی دشمن کی گستاخی سے جو اس نے محبوب کی شان میں کی ہو رنج ہوا ہو اور محبوب یہ کہے کہ تم ان باتوں سے رنج نکرو آؤ تم ہم سے باتیں کرو یہودیوں کی باتوں کو چھوڑو غضب ہے محبوب

کی اس بات سے عاشق کو کسقدر تسلی ہوگی اسی طرح حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ ان کی بیہودہ باتوں سے رنج نہ کیجئے آیئے نماز میں ہم سے باتیں کیجئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنج کا اندازہ دوسری آیت سے ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں قد نعلم انہ لیحزنک الذی یقولون فانہم لا یکذبونک ولکن الظلمین بایات اللہ یجحدون ہ ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کافروں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے۔ آگے مشہور تفسیر تو یہ ہے اور میں نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ فانہم لا یکذبونک علت ہے ایک جملہ محذوفہ کی تقدیر یوں ہے فلا تحزن وکل امرہم الی اللہ فانہم لا یکذبونک الخ یعنی آپ غم نہ کیجئے اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیجئے کیونکہ یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے (کیونکہ آپ کو تو محمد امین کہتے اور صادق مانتے تھے) بلکہ یہ ظالم تو خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ (سو آپ کس لئے رنج کرتے ہیں وہ آپ کو تو کچھ نہیں کہتے ہماری آیتوں سے گستاخی کرتے ہیں سو ہم خود نمٹ لیں گے) مگر ایک بار مجھے ذوقاً دوسری تفسیر سمجھ میں آئی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عشق مع اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اس مشہور سے یہ ابہام ۹۰
ہوتا ہے کہ حضور کو آیات الٰہیہ کی تکذیب سے رنج نہ ہونا چاہیئے بلکہ اپنی ذات کے ساتھ جب کوئی خلاف بات ہو اسوقت رنج ہونا چاہیئے حالانکہ آپ کے عشق و محبت کا مقتضا یہ ہے کہ آپ کو کفار چاہے کتنا ہی کہہ لیتے اس سے آپ کو زیادہ رنج نہ ہوتا آپ کو تو بڑا رنج اسی کا تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کی ساتھ گستاخی کرتے اور آیات الٰہیہ کی تکذیب کرتے تھے۔ پس خاص اس اعتبار سے اس کی تفسیر قریب یہ ہوسکتی ہے کہ فانہم لا یکذبونک علت ہے قد یحزنک الذی یقولون کی اور ترجمہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کو کفار کی باتوں سے بہت رنج ہوتا ہے کیوں اسلئے کہ وہ آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اگر آپ ہی کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو آپ کو زیادہ غم نہ ہوتا مگر آپ کو تکذیب آیات الٰہیہ کا تحمل نہیں ہوسکتا اس صورت میں حذف و تقدیر کی بھی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر آپ کی شان عشق کے بھی موافق ہے اور اس حدیث کے بھی موافق ہے کان لا ینتقم لنفسہ فی شیء الا ان تنتہک حرمات اللہ فینتقم فیہا للہ او کما قال۔ کہ آپ اپنے واسطے اپنی ذات کیلئے کسی سے کسی بات میں انتقام نہ لیتے تھے

ہاں اگر حرمات کی توہین ہوتی دیکھتے تو اسوقت اللہ تعالیٰ کیلئے انتقام لیتے تھے۔ اور گو ظاہراً
یہ تفسیر سیاق سے بعید ہے مگر ایک بار ذوقاً کچھ قریب معلوم ہوئی تھی اسی لئے اس مقام پر اپنے
دعوے کی تائید میں اسکو ذکر کر دیا گو وہ دعوے اسپر موقوف نہیں بلکہ ظاہر ہے کہ آپ کو کفار کی
ان گستاخیوں سے جو حضرت حق کی شان میں وہ کرتے تھے سخت رنج ہوتا تھا تو ایسے شدید حزن
کیلئے نہایت قوی تسلی کی ضرورت ہے اور یہاں تسبیح بمعنی صلوٰۃ کو تسلی کے طور پر بیان کیا گیا ہے
اور عادۃً عاشق کو تسلی کسی چیز سے ایسی نہیں ہوتی جیسے محبوب کے قرب و مشاہدہ سے ہوتی ہے
پس معلوم ہوا کہ نماز میں ایسا قوی قرب و مشاہدہ ہوتا ہے جو کسی اور امر سے نہیں ہوتا ورنہ حق تعالیٰ
تسلی کے لئے اسی امر کی تعلیم کو اختیار فرماتے اسی لئے حدیث میں آتا ہے کان اذا حزبہ
امر فزع الی الصلوٰۃ کہ جب حضور کو کوئی بڑا فکر پیش آتا تو آپ جلدی سے نماز میں مشغول ہو جاتے
کیوں اسی لئے تا کہ حق تعالیٰ سے باتیں کر کے دل بہلائیں اور تسلی و سکون حاصل کریں اور واقعی 91
تجربہ و مشاہدہ ہے کہ رنج و فکر میں نماز میں مشغول ہو جانے سے رنج بہت کم ہو جاتا ہے اور اگر موانع
قرب کم ہوں تو بالکل رنج کا ازالہ ہو جاتا ہے تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے زیادہ کہنے کی کیا ضرورت
ہے۔ بہر حال نماز میں جو حق تعالیٰ کیساتھ ہمکلامی ہے اور ان کی تسبیح و تقدیس ہے یہ مشاہدہ کافی ہے
کہ بندہ حق تعالیٰ کی طرف بشرا شرہ متوجہ ہو جائے اگر اس میں کمی ہو تو البتہ مشاہدہ میں کمی ہے اسکی تلافی کرنا
چاہیئے پھر جب یہ مرتبہ حاصل ہو جائیگا کہ نماز میں حق تعالیٰ کے سوا کسی کی طرف توجہ نہ رہے تو آپ کو خود ہی
اس کا لطف حاصل ہوگا اور اسوقت آپ سمجھیں گے کہ میں نے جو اس مشاہدہ کو کافی کہا ہے یہ صحیح تھا
دنیا میں بڑی کامیابی بندہ کی یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف یکسوئی کیساتھ نماز میں توجہ نصیب ہو جائے
اسی کیواسطے صوفیہ مجاہدے کرتے ہیں اور اسی کو مشاہدہ سے تعبیر کرتے ہیں پھر نماز میں تلاوت قرآن
بھی ہوتی ہے۔ اور قرآن ایسی چیز ہے جسمیں ایک مستقل شان مشاہدہ ہے کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ کلام میں
متکلم کا جلوہ ہوتا ہے اور کسی کے کلام کو دیکھ لینا گویا متکلم کو دیکھ لینا ہے کیونکہ اس سے متکلم کی طبیعت کا انداز
اور رنگ بخوبی معلوم ہو جاتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اخباروں میں جو عورتوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں تو اہل
ادراک اسی سے ان کی طبیعت کی شوخی وغیرہ کا پتہ لگا لیتے ہیں یہ واقعی ویسا ہی ہے جیسے بیحجاب دیکھ لیا
اسی لئے بعض فقہا نے صوت عورت کو عورت کہا ہے گو بدن مستور ہی ہو کیونکہ گفتگو اور کلام سے بھی

عشق و میلاں ہوجاتا ہے اسی واسطے میں عورتوں کے مضامین کا اخبارات میں شائع ہونا پسند نہیں کرتا بلکہ ناجائز سمجھتا ہوں ہاں اگر یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ یہ مضمون عورت کا ہے تو مضائقہ نہیں مگر اس میں بھی یہ شرط ہے کہ عورت خود اڈیٹر سے خط وکتابت نہ کرے کیونکہ اڈیٹر خط سے بھی پہچان لیتے ہیں کہ کاتب مرد ہے یا عورت ایک جگہ اس مضمون نویسی سے بڑا فتنہ ہوگیا کہ عورت اخبار کے اڈیٹر سے اسی سلسلہ میں خط وکتابت کرتی تھی اڈیٹر کے خطوط بھی اس کے نام آتے تھے اول اول تو مضامین ہی کے متعلق خط وکتابت تھی پھر محبت آمیز خط آنے لگے اب اس عورت کا خاوند اڈیٹر سے خط وکتابت کو منع کرتا ہے مگر عورت باز نہیں آتی ہم نے کہا کہ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ آپنے ابتدا میں خط وکتابت کو گوارا کیا پس اگر کسی کو ایسا ہی اپنی بیوی کے مضامین شائع کرانیکا شوق ہو تو اسکو بلا واسطہ خط لکھنے کی اجازت نہ دے بلکہ مرد اپنے آپ اپنے نام سے مضمون بھیجے اور میرے نزدیک تو یہ بھی پسند نہیں گو میں اسکی حرمت پر فتوی نہیں دیتا مقصود میرا یہ ہے کہ صرف کلام سے بھی متکلم کا بہت کچھ مشاہدہ ہوجاتا ہے اسپر مجھے ایک حکایت یاد آئی زیب النساء عالمگیر کی بہن بہت بڑی شاعرہ تھی جس کا تخلص مخفی تھا ایک دفعہ شاہ ایران کو خبط سوجھا کہ آپ نے ایک بے تکا مصرع موزوں کیا۔ ۹۲

دُر ابلق کسے کم دیدہ موجود۔ پھر سارے شعراء کو جمع کیا کہ اس پر دوسرا مصرعہ لگاؤ تمام شعراء عاجز ہوگئے کہ ہم سے اسپر مصرع نہیں لگتا یہ تو کون کہتا کہ حضور کا مصرع ہی بیہودہ ہے مگر مطلب یہی تھا۔ چونکہ اسوقت ہندوستان میں بھی فارسی کے شعرا ایسے ایسے تھے جو اہل زبان کی برابری کرتے تھے اسلئے شاہ ایران نے یہ مصرع شاہ دہلی کے پاس بھیجا کہ اپنے یہاں کے شعراء سے اسپر دوسرا مصرع لگوا کر بھیجئے کیونکہ شعراء ایران سب عاجز ہوگئے بادشاہ نے تمام شعراء کو اسکی اطلاع کردی یہ خبر زیب النساء کو بھی پہونچی وہ بھی فکر میں ہوئی۔ ایک دن صبح کے وقت زیب النساء نے جو سرمہ لگایا تو وہ کچھ آنکھ میں تیز لگا جس کی تیزی سے ایک آنسو گرا جو سرمہ کی سیاہی سے ملکر دُر ابلق کی مثال ہوگیا تھا فوراً شاہ ایران کے مصرع کی طرف ذہن منتقل ہوا اور دوسرا مصرع سمجھ میں آگیا ؎

دُر ابلق کسے کم دیدہ موجود	مگر اشک بتان سرمہ آلود

محبوب کے آنسو کو موتی سے تشبیہ دیا ہی کرتے ہیں سرمہ کی آلودگی اسکو دُر ابلق کہنا بہت

ہی موزوں ہوگیا اور واقعی اس مصرع کے سوا اور کوئی مصرع اس پر لگ بھی نہ سکتا تھا اور
نہ در ابلق کی مثال اس سے بہتر کوئی بیان کر سکتا ہے اس نے فوراً شاہ دہلی کو اطلاع کی کہ
شاہ ایران کی درخواست پوری ہوگئی اور یہ مصرع لکھکر بھیجدیجئے اس سے شاہ دہلی
بھی خوش ہوے کہ جس مصرع کے پورا کرنے سے شعراء ایران عاجز ہوگئے تھے ہندوستان
کی شاعرہ نے اسکو پورا کر دیا اور بہت اچھا پورا کیا واقعی بادشاہوں کا دماغ بھی بادشاہ ہوتا
ہے غرض ایران خط پہونچا شاہ ایران کو بھی بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارا مصرع بیہودہ نہ رہا اور
تمام شعراء کو بلاکر جمع کیا اور کہا دیکھو ہندوستان کے ایک شاعر نے ہمارے مصرع پر مصرع
لگا دیا۔ شعراء نے جب سنا ہے تو عش عش کر گئے کہ واقعی بہت اچھا جوڑ لگایا شاہ ایران سے
عرض کیا کہ اس شاعر کو یہاں بلائیے ہم اس کی شاگردی اختیار کریں گے شاہ ایران نے دہلی
خط لکھا کہ اس شاعر کو ایران بھیجدیا جائے ہم اس کی بہت تعظیم و تکریم کریں گے اور تمام
۹۴ شعراء اس کی شاگردی اختیار کریں گے شاہ دہلی نے زیب النساء کو خط سنایا اور کہا لو اور
شاعری کرو اب جاؤ ایران تمہارا وہاں سے بلاوا آیا ہے۔ زیب النساء نے کہا کہ میرے جانیکی ضرورت
نہیں آپ شاہ ایران کو لکھدیجئے کہ میں نے شاعر سے آپ کی تحریر کا تذکرہ کیا تھا اس نے جواب
دیا اور جواب میں بھی شعر ہی لکھوایا ؎

در سخن مخفی منم چوں بوے گل در برگ گل   ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اس جواب سے شاہ ایران سمجھ گئے کہ شاعر عورت ہے تو دیکھئے مخفی نے اپنے کلام کے دیکھنے کو خود
اپنے ہی دیکھنے کے قائم مقام بتلایا اور واقعی یہ مبالغہ نہیں کلام کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو متکلم کا
ہوتا ہے گو برابر نہ سہی مگر قریب قریب تو ہوتا ہی ہے اب حق تعالیٰ کا کلام قرآن آپ کے سامنے
ہے اسکو پڑھ لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کو دیکھ لیا یہ دوسرا مشاہدہ ہے جو نماز میں ہوتا ہے
پھر محبوب سے ہمکلام ہونیکے بعد جی چاہتا ہے کہ ان کا ذکر کریں ان کی ثنا و حمد کریں تو نماز
سرے سے اخیر تک ذکر ہی ذکر ہے اور یہ سب وہ امور ہیں جو عاشق کو خود مقصود بالذات
ہوتے ہیں تو یہ نماز کے اجزاء محض اعمال ہی نہیں بلکہ ثمرات بھی ہیں نیز نماز جب عین
ذکر ہے جیسا عنقریب آتا ہے تو اب اقم الصلوٰۃ لذکری ایسا ہے جیسا کہ یوں فرماتے

اقم الصلوٰۃ للصلوٰۃ یا یوں فرماتے اذکرنی لذکری کیونکہ ذکر اور صلوٰۃ میں تغائر نہیں ہے
بلکہ حقیقۃً اتحاد ہے گو اعتباری تغائر تو ہے اور اسی لحاظ سے لذکری پر لام کا داخل ہونا
بھی صحیح ہوگیا مگر واقع میں تغائر نہیں گو عنوان دو ہیں بلکہ نماز عین ذکر ہے اور ابھی معلوم
ہوچکا کہ عاشق کو محبوب کا ذکر خود بالذات مقصود ہوتا ہے تو نماز کا مقصود بالذات ہونا
اس سے بھی ثابت ہوگیا اور یہ بات سوائے نماز کے کسی طاعت میں نہیں ہے
کہ وہ خود عمل بھی ہو اور ثمرہ بھی پس نماز کی یہ حقیقت ہوئی پھر موسیٰ علیہ السلام کو
مقام قرب خاص میں اس کا امر ہونا یہ کتنا بڑا شرف ہے اب صلوٰۃ کا ذکر ہونا جس آیت
سے مستفاد ہوتا ہے اسکو ذکر کرتا ہوں مگر ایک تفسیر پر وہ آیت یہ ہے اتل ما اوحی الیک
من الکتاب واقم الصلوٰۃ ط ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبرط
اس کی دو تفسیریں ہیں ایک یہ کہ لذکر اللہ اکبر میں ذکر مستقل مامور بہ ہے مطلب
یہ ہوگا کہ جو کتاب آپ کی طرف نازل ہوئی ہے اسکی تلاوت کیجئے اور نماز کو قایم کیجئے
بیشک نماز بیحیائی اور گناہ سے روکتی ہے یہاں تک تو قرآن اور نماز کا ذکر تھا آگے ذکر اللہ ۹۴
کا امر ہے کہ اللہ کی یاد بڑی چیز ہے اسی جگہ سے بعض جہلاء صوفیہ کو غلطی ہوئی کہ وہ صرف ذکر کو
لیکر بیٹھ گئے اور نماز وغیرہ کے تارک ہوگئے حالانکہ اول تو یہ ضرور نہیں کہ اکبر کا مفضل
علیہ یہاں نماز و تلاوت ہو اور ذکر کی افضلیت ان کے اعتبار سے بیان کرنا مقصود
ہو ممکن ہے کہ مقصود یہ ہو کہ ذکر بھی فی نفسہ بہت بڑی چیز ہے یہ مطلب ہو کہ نماز
و قرآن سے بھی اکبر ہے دوسرے اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ نماز و تلاوت سے کسی خاص
وجہ سے اکبر ہے تو اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ نماز و تلاوت وغیرہ بیکار رہیں قابل ترک
ہیں اگر اکبر کے سامنے اصغر بیکار ہو تو چاہیئے کہ ان ہی مستدل شاہ صاحب کے چھوٹے
بیٹوں کو بڑے کے ہوتے ہوئے ذبح کر دیا جائے اور اگر ان کے نزدیک بڑے بیٹے کے
ہوتے ہوئے بھی اصغر کے وجود کی ضرورت ہے اور وہ اسکے ذبح پر راضی نہیں ہیں تو
پھر یہاں کیوں دعوی کیا جاتا ہے کہ ذکر کے ہوتے نماز وغیرہ کی ضرورت نہیں خیر یہ تو
مشہور تفسیر تھی اور میں نے ثابت کر دیا کہ اس سے بھی جہلاء صوفیہ کا مدعی حاصل نہیں ہوتا مگر

میرے نزدیک اس کی دوسری تفسیر ہے وہ یہ کہ اتل ما اوحی الیک میں تو تلاوت قرآن کا امر ہے اور اسکی فضیلت بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جسکی اصل ایک صفت ہے حق تعالیٰ کی اور اللہ تعالیٰ کی صفت فضیلت ظاہر ہے اس کے بعد نماز کا امر ہے اور نماز چونکہ ہمارا عمل ہے اسلئے اس کی فضیلت بیان کرنے کی ضرورت تھی تو اس کی یہ فضیلت بتلائی گئی کہ وہ فحشاء و منکر سے روکتی ہے آگے اس کی علت کا بیان ہے کہ نماز فحشاء و منکر سے کیوں روکتی ہے لانہا ذکر اللہ ولذکر اللہ اکبر وہ اسواسطے گناہوں اور بےحیائی سے روکتی ہے کہ وہ ذکر اللہ ہے اور ذکر اللہ بڑی چیز ہے جو محبت و خشیت پیدا کرتا ہے پھر وہ فحشاء و منکر سے کیوں نہ روکے گا۔ جب اس آیت کی یہ تفسیر لی جاوے۔ اور یہ تفسیر قواعد کے بھی خلاف نہیں بلکہ غور کیا جاوے تو اوفق بالسیاق ہے تو اب اگر میں اقم الصلوٰۃ لذکری میں ذکر سے صلوٰۃ ہی کو مراد لوں تو کیا
95 بعید ہے غرض میرا یہ دعوی بیغبار ہوگیا کہ نماز لذاتہ ہی مقصود ہے اور روزہ و حج و زکوٰۃ وغیرہ میں مقصودیت لذاتہا کی اس درجہ کی شان نہیں بلکہ وہ مقصود لغیرہا ہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو ان میں عبادت کی شان بھی ایک عارض کی وجہ سے ہے مثلاً ترک طعام وشرب وجماع جو روزہ کا رکن ہے یہ خود فی نفسہ عبادت نہیں لیکن عارض کسر نفس کی وجہ سے یہ عبادت ہوگیا بلکہ اگر اس میں تشبہ بالحق کی شان پر نظر کی جاوے تو اس میں تو شان عبادت کی جگہ دوسری شان کا غلبہ نظر آویگا اسی طرح حج میں بھی جتنے افعال ہیں وہ ایک عارض کی وجہ سے عبادت ہیں ورنہ دوڑنا بھاگنا گھومنا پتھر پھینکنا معمولی افعال ہیں مگر عبادت اس لئے قرار دیے گئے کہ عشاق بندوں کو بیت اللہ کے منسوب الی اللہ ہونے سے طواف بیت سے کسی درجہ میں تسلی ہو جیسا کہ محبوب کے تخت کے طواف سے تسلی ہوتی ہے اسی طرح دوسرے افعال بھی عاشقانہ مقرر کئے گئے تاکہ اس میں داعیہ محبت کی ترقی اور بندوں کی تسلی ہو اسلئے یہ عبادت ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی حاجت فقیر کے لحاظ سے عبادت ہے اور جہاد و اضحیہ وغیرہ میں تو فقہاء نے خود کہا ہے کہ جہاد و اراقت دم حیوان فی نفسہ عبادت نہیں بلکہ اتلاف نفوس ہے لیکن عارض اعلاء کلمۃ اللہ کی وجہ سے عبادت

ہو گئی غرض اور سب عبادات میں عوارض کی وجہ سے عبادت کے معنی پیدا ہو گئے تو وہ مقصود لغیرہا ہیں اور نماز خود عبادت ہے جیسا مذکور ہوا۔ پس نماز ہی ایسی عبادت ہے جو مقصود بالذات ہے پھر حیرت ہی نہیں کہ اس عبادت سے عورتوں کو شوق نہیں اور نہ اس کا اہتمام ہے اور جو عبادتیں مقصود لغیرہا ہیں ان کا بڑا شوق ہے یہ تو بے نمازیوں کو سنانا تھا اب نمازیوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی نماز پر ناز نکریں کیونکہ حق تعالیٰ نے محض صل نہیں فرمایا کہ نماز پڑھا کرو بلکہ اقم الصلوٰۃ فرمایا ہے جس میں اقامت کا امر ہے اور اقامت صلوٰۃ یہ ہے کہ اس کے سب ارکان اعتدال وتسویہ کے ساتھ ادا کئے جائیں تو نماز پڑھکر بیفکر نہو جئے بلکہ اقامت کی کوشش کیجئے اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے

حق تعالیٰ ہمکو نماز کا شوق عطا فرمائے اور اقامت
صلوٰۃ کی توفیق نصیب ہو
وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ
آلہ واصحابہ اجمعین ٥
واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

۹۶

اشرف علی
۷ / ذی قعدہ سنہ ۱۳۵۰ھ

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمی بہ

علو العباد من علوم الرشاد

این	متی	کم	لم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیوں ہوا	کیسے ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کتنے تھے	متفرقات
[illegible]	۱۵ شعبان ۱۳۳۲ھ	تقریباً ۲ گھنٹہ	×	کھڑے ہوکر	آداب مجالس اور فضیلت علم و عمل	[illegible]	تقریباً پندرہ سو آدمی ۱۵۰۰	[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم ۰

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا ایھا الذین اٰمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت واللہ بما تعملون خبیر ۰

یہ سورۂ مجادلہ کی آیت ہے حق سبحانہ وتعالیٰ اس میں بعض آداب مجالس کے بیان فرماتے ہیں ہر چند آیت کا شان نزول

ع شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے (بقیہ برصفحہ آئندہ)

خاص ہے مجلس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں اسلئے خصوصیت مورد کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ عموم الفاظ کے اعتبار سے حکم عام ہوگا پس خاص حضور ہی کی مجلس کیساتھ یہ حکم مخصوص نہیں۔ بلکہ یہ حکم تمام مجالس کو عام ہے اور حق تعالیٰ شانہ نے اس جگہ اس حکم کے جو کہ دو حکموں پر مشتمل ہے امتثال پر اسکے ثمرہ کا بھی وعدہ فرمایا ہے چنانچہ پہلے حکم اور اسکے ثمرہ کیلئے ارشاد ہے اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم۔ یہ تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ ہے آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں واذا قیل انشزوا فانشزوا یہ تو حکم ہے اور اسکا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت اور اس ثمرہ اور اس کے وعدہ میں اول تعمیم فرمائی اسکے بعد تخصیص کے طور پر بعض لوگوں کے واسطے یعنی اہل علم کیلئے ثمرہ جداگانہ بیان فرمایا اور تخصیص بعد تعمیم بقواعد علم بلاغۃ اہتمام کو مقتضی ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل علم کو چاہیئے کہ اسکو مہتم بالشان سمجھکر اسکا خاص طور پر اہتمام کریں اور اسوقت اسکو بیان کیلئے اسواسطے اختیار کیا گیا کہ یہ امر بظاہر شعائر وارکان دین سے نہیں بلکہ ایک معمولی سی ۹۸
عادت ہے جسکی ہر جلسہ میں ضرورت ہوتی ہے مگر عام طور پر لوگ اسکو ضروریات سے خیال نہیں کرتے اسلئے اسکو بیان کیلئے اسکو اختیار کیا گیا۔ اس اجمال کی تفصیل اسکے ترجمہ سے واضح ہوجائیگی اور ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانو جب تم سے کہا جاوے کہ مجلس میں فراخی کردو تو فراخی کر دیا کرو اور جب تم سے کہا جاوے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ جایا کرو یعنی اگر اس جگہ سے اٹھنے کا امر ہو تو اس جگہ سے اٹھ جایا کرو پھر خواہ تمکو دوسری جگہ بیٹھنے کا حکم ہوجاوے خواہ چلدینے کا امر ہو تو اسی پر عمل کیا کرو اسکا انکار نہ کیا کرو اور ظاہر ہے کہ یہ امر عقائد میں سے نہیں اعمال رکینہ سے نہیں مالی حقوق میں سے نہیں اسلئے ظاہر معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر چونکہ واقع میں قابل اہتمام اور ضروری امر ہے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) بہت سے صحابیؓ حاضر تھے کہ اصحاب بدر آئے (وہ لوگ جو جنگ بدر میں شریک تھے۔ اس وقت مجلس میں کچھ تنگی تھی حضور نے حاضرین مجلس کو حکم فرمایا کہ ملکر بیٹھو اور ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے بعض کو حکم فرمایا کہ اٹھ جاؤ اپنے کسی دوسرے کام میں لگو یا اٹھا دوسری جگہ بیٹھ جاؤ صحابہ تو حضور کے لبوں کو تکتے تھے وہ اسپر نہایت خوشی سے عامل ہوگئے لیکن منافقین نے کہ وہ ایسے موقع کیلئے ادھار کھائے بیٹھے رہتے تھے اسپر اعتراض کیا۔ خدا تعالیٰ نے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض لغو ہے کیونکہ حضور کے وہ دونوں حکم مناسب اور مستحسن تھے اور مستحسن کو غیر مستحسن کہنا حماقت ہے ۱۲ (شفاف الرحمٰن از وعظ فضل العلم داخل حصہ (۸) دعوت عبدیت

اسئے اسکو نہایت اہتمام کیساتھ بیان فرمایا۔ چنانچہ اول تو یا ایہا الذین آمنوا سے خطاب ہے باوجودیکہ
قرآن سے مؤمنین ہی مخاطب ہیں اور اکثر قرآن میں مسلمانوں ہی کو خطاب ہوتا ہے پھر اس صریح خطاب سے
کیا فائدہ ہے تو خوب سمجھ لو کہ اس سے مقصود رغبت دلانا ہے کہ یہ امر ہر چند شعائر دین سے نہیں اسلئے
عام طور سے ممکن ہے کہ لوگوں کو اس کا اہتمام نہ ہو مگر ہمارے مخاطب وہ ہیں جو ہمپر اعتقاد رکھتے ہیں وہ
ضرور اسکو قبول کرینگے اس طرز کلام سے اس مضمون کی سامعین کو رغبت دلائی اور دوسرا اہتمام اذا قیل بصیغہ
مجہول سے ظاہر فرمایا باوجودیکہ واقعہ خاصہ میں اس قول کے قائل خاص حضور اقدس ہیں پھر بھی عنوان
عدم تعیین قائل سے تعبیر فرمایا یعنی قیل مجہول کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا بجائے صیغہ معلوم (قال لکم
کے) اور یہ عدول اسوجہ سے فرمایا کہ اس مسئلہ میں حضور کے ارشاد کی تخصیص نہیں اسلئے حکم عام ہے
ہر صدر مجلس کے قول کو تیسرا اہتمام یہ کہ امر کے صیغہ کیساتھ بیان فرمایا یعنی فافسحوا اور فانشزوا اور
ظاہر ہے کہ امر حقیقۃً وجوب کیلئے ہوتا ہے جب تک کہ کوئی قرینہ صارفہ عن الحقیقۃ نہو۔ گو واجبات کے
درجات مختلف ہوتے ہیں کہیں وجوب لعینہ ہوتا ہے کہیں وجوب لغیرہ مگر نفس وجوب میں شرکت ضرور 99
ہوتی ہے چوتھا اہتمام یہ ہے کہ تفسحوا کا امر اور اسکا ثمرہ جدا بیان فرمایا اور انشزوا اور اس کا ثمرہ جدا بیان
فرمایا ورنہ اگر اختصار کے ساتھ مجلس میں حکم صدر کی اتباع کا مشترکا امر فرمادیتے تو اسدرجہ اہتمام نہوتا
جیساکہ جدا جدا بیان کرنے میں ہوا۔ پانچواں اہتمام یہ ہے کہ لفظ فی المجالس بصیغہ جمع فرمایا باوجودیکہ
فی المجلس بھی کافی تھا اور وہ بھی جنس کی وجہ سے عام ہوتا مگر چونکہ اس میں یہ احتمال باقی تھا کہ اس عام
کو خاص پر محمول کرلیا جاتا اور مجلس سے خاص مجلس مراد لیلی جاتی (یعنی حضور کی مجلس) اسلئے فی المجالس
فرماکر اسکا احتمال بھی قطع فرمادیا کہ اب احتمال تخصیص کا ہو ہی نہیں سکتا لہذا حکم عام ہوگا تخصیص کا
احتمال ہی نہیں۔ چھٹا اہتمام یہ ہے کہ جس ثمرہ کو مرتب فرمایا اسکا بڑا ہونا ظاہر فرمادیا کیونکہ مقتضاء علم
بلاغت کا یہ ہے کہ عادۃً چھوٹے ثمرہ کو ذکر نہیں کیا کرتے اور یہاں ثمرہ کا ذکر موجود ہے اور قرآن کا
فصیح و بلیغ ہونا مسلم ہے پس قرآن میں کسی ثمرہ کا ذکر ہونا اسکو مقتضی ہے کہ یہ ثمرہ بہت بڑا ہے اور
جب ثمرہ بڑا ہوتا ہے تو عمل کا بڑا ہونا بھی ضروری ہے جبپر اسقدر بڑا ثمرہ مرتب ہوا ہے تو اس سے
عمل مذکور کی یعنی توسع اور قیام کی اہمیت و عظمت بھی معلوم ہوئی ساتواں اہتمام خاص اہل علم کی
فضیلت ظاہر کرنے کیلئے یہ کیا گیا کہ ثمرہ یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت میں

ایمان والوں کو اولاً و عموماً اور اہل علم کو ثانیاً و خصوصاً بیان فرمایا تاکہ اہل علم کی بالتخصیص فضیلت معلوم
ہو جاوے پھر اس سب کے بعد خلاف پر وعید ہے واللہ بما تعملون خبیر۔ اس سے اور زیادہ
اہتمام بڑھ گیا یعنی اگر تم اس پر عمل نکروگے تو جو کچھ تم کروگے حق تعالیٰ اس سے خبردار ہیں اسلئے تمہیں
مخالفت سنبھل کر کرنی چاہیئے پس واللہ بما تعملون خبیر ظاہراً وعید ہے اور یہ بھی احتمال ہے
کہ یہ وعدہ ہو کہ اس عمل کے کرنے پر ثمرہ کا ترتب ضرور ہوگا کیونکہ تمہارے اعمال کی حق تعالیٰ کو
خبر ہے اسلئے اس عمل کے کرنے پر ثمرہ کا ترتب فرمادیں گے۔ یا اعمال مذکورہ کے معتد بہ ہونیکی شرائط
کی طرف اشارہ ہے یعنی تفسح فی المجالس یا انشوز مطلقاً معتبر و معتد بہ نہیں بلکہ اس میں خلوص بھی شرط
ہے یعنی صرف صورۃ عمل پر ثمرہ مذکورہ مرتب نہوگا بلکہ اخلاص بھی ضروری ہوگا اور اخلاص امر
باطنی ہے اسلئے اپنے خبیر بمعنی عالم بباطن الامور ہونے پر تنبیہ فرمادی۔ غرض ان سب اہتماموں سے
معلوم ہوا کہ یہ عمل نہایت مہتم بالشان ہے یہ تو آیت کا حل اجمالی ہے جس سے میرا مقصود علم و عمل کا
اہتمام ثابت کرنا ہے عمل کا اہتمام تو ظاہر ہے کہ ایک معمولی عمل کیلئے یہاں اتنا اہتمام فرمایا گیا ہے
پھر جو عمل ذاتاً بھی عظیم ہو اس کا اہتمام تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہوگا اس سے تمام اعمال کا مہتم بالشان ۱۰۰
ہونا ظاہر ہوگیا۔ اور علم کا اہتمام اس طرح ہوا کہ ثمرہ میں اہل علم کو عام مومنین سے جدا بیان کیا اور
تخصیص بعد تعمیم کے مفید اہتمام کو ہوتی ہے۔ اب میں اس مضمون کے بعض اجزا اور متعلقات کی
تفصیل مختصر عرض کرتا ہوں اور اس سے پہلے ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے وہ شبہ یہ ہے کہ آداب
مجالس تو ایک معمولی اور چھوٹا سا عمل ہے اسکو اسقدر اہتمام سے کیوں بیان فرمایا کیونکہ یہ کوئی درجہ
عقائد سے نہیں فرائض سے نہیں ارکان و واجبات سے نہیں اسدرجہ کا اہتمام تو ان امور کا ہونا
چاہیئے جو ذاتاً بڑے ہوں اور جو امر ذاتاً بڑا نہ ہو اسکے ایسے اہتمام کی کیا ضرورت ہے اور آداب مجالس
کوئی ایسا امر نہیں جسکے اہتمام کی اسقدر ضرورت ہو یہ شبہ بہت سے لوگوں کے ذہن میں آیا ہوگا
جسکی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگوں نے اس عمل کو معمولی سمجھ رکھا ہے اور اسی وجہ سے عام طور پر
اس کا اہتمام نہیں کرتے تو منشا شبہ کا صرف یہ بات ہے کہ یہ ایک معمولی اور چھوٹا سا عمل ہے اور معمولی
شئی قابل اہتمام نہیں ہوتی حالانکہ اولاً تو یہی مقدمہ غلط ہے کہ معمولی اور چھوٹی شئی قابل اہتمام نہیں ہوتی
کیونکہ چھوٹا اور معمولی ہونیکے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ قابل اہتمام اور قابل قدر نہ ہو دیکھیے سب سے چھوٹا آسمان

سماء دنیا ہے۔ عرش کرسی وغیرہ سے بہت چھوٹا ہے مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ سماء دنیا کوئی چیز نہیں یا سماء دنیا قابل وقعت نہیں بلکہ باوجودیکہ عرش وغیرہ سے وہ بہت چھوٹا ہے مگر پھر بھی اپنی ذات میں اسی طرح بہت سی اور چیزوں کے مقابلہ میں قابل وقعت ضرور ہے عرش وکرسی سے چھوٹا ہوا تو کیا لیکن ٹیلوں کے مقابلہ میں تو بہت بڑا ہے ؎

آسمان نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی است پیش خاک تود

اور نظیر دیکھو آسمان کے سامنے ستارے کتنے چھوٹے ہیں مگر ان میں بعضے بعضے زمین سے بھی بہت بڑے ہیں تو ستاروں کا چھوٹا ہونا اسکو مقتضی نہیں کہ ستارہ قابل وقعت نہو یہ تو محسوسات میں گفتگو تھی اب اعمال میں دیکھو کہ ارکان بھی آپس میں متفاوت ہیں مثلاً نماز میں قیام سجدہ جلسہ مختلف ارکان ہیں مگر سب ایک درجہ کے نہیں کیونکہ ان کے فضائل مختلف ہیں وہ آپس میں چھوٹے بڑے ہیں کوئی چھوٹا کوئی بڑا کیونکہ صغر وکبر امور اضافیہ میں سے ہے مگر ایک رکن کا دوسرے کے اعتبار سے چھوٹا ہونا اسکو ہرگز مقتضی نہیں کہ وہ رکن قابل وقعت نہیں ورنہ اسکی رکنیت ہی محل کلام ہو جائے گی پس یہ مقدمہ ہی غلط ہے کہ جو چیز کسی سے چھوٹی ہو وہ قابل اہتمام ہی نہو مگر اس غلطی 101
میں آجکل بہت لوگ مبتلا ہیں چنانچہ بعض جہلاء صوفیہ نے ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر کے بعد ولذکر اللہ اکبر کو دیکھکر نماز ہی چھوڑ دی کیونکہ ان لوگوں نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے کہ نماز تو صرف فحشاء اور منکر ہی سے بچاتی ہے اس میں صرف یہ عارضی فضیلت ہے اور ذکر اللہ اپنی ذات میں بڑی چیز ہے تو جو لوگ ذکر اللہ میں مشغول ہوں ان کو نماز کی حاجت نہیں مگر اس شبہ کا منشاء صرف تفسیر کا بدلنا ہے ذرا صحیح تفسیر کیجئے تو یہ شبہ جاتا ہے اس کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس آیت میں نماز کی فضیلت بیان فرماتے ہیں کہ نماز کی پابندی کرو کیونکہ نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے اور نماز فحشاء ومنکر سے اسلئے روکتی ہے کہ وہ ذکر اللہ پر مشتمل ہے اور ذکر اللہ بڑی چیز ہے اس میں ایسی ہی برکت اور خاصیت ہے اب اس تقریر کے بعد جواب دیکھئے سو دیکھو حاصل ولذکر اللہ اکبر دلیل ہے ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر کی کہ نماز فحشاء وغیرہ سے اسلئے روکتی ہے کہ وہ مشتمل ہے ذکر اللہ پر اور ذکر اللہ بہت بڑی چیز ہے اسکی یہی خاصیت ہے تو اب بتلاؤ کہ اس تقریر سے نماز کا بڑا ہونا لازم آیا یا چھوٹا ہونا جب نماز بھی بڑی چیز ہے تو وہ قابل ترک کیسے ہوئی دوسرے

ہمکو یہ بھی مسلم نہیں کہ چھوٹی چیز قابل ترک ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر غور کیجئے۔ ہم سوال کرتے
ہیں کہ اگر کسی کے دو لڑکے ہوں ایک چھوٹا ایک بڑا کیا چھوٹے کو قتل کر دینگے ہرگز نہیں پس یہ
قاعدہ مسلم نہیں کہ چھوٹی چیز قابل ترک ہوا کرتی ہے اگر ذکر اللہ نماز سے بڑا بھی ہو تو نماز کو اس کے
مقابلہ میں ترک نہیں کر سکتے چہ جائیکہ وہ ذکر اللہ کو بھی مشتمل ہو۔ یہ تفاوت تو دنیا میں بھی ہوتا ہے
کہ کوئی چیز بڑی ہے اور کوئی چھوٹی مگر دنیا میں سینکڑوں ایسی مثالیں ہیں کہ بڑی شے کے موجود
ہوتے ہوئے بھی چھوٹی شئی کی حاجت رہتی ہے اور چھوٹی شئے قابل ترک نہیں ہوتی۔ دیکھئے
بادشاہ اپنے سب ماتحتوں اور چھوٹوں کو معزول نہیں کر سکتا اور اگر معزول کر دے تو کام نہیں چل
سکتا اور دیکھئے انگلیوں میں آپس میں کسقدر تفاوت ہے مگر سب کی حاجت ہے صرف بڑی پر اکتفا نہیں
ہو سکتا چھوٹی کی بھی حاجت ہے بلکہ بڑے کی بڑائی چھوٹے کے وجود پر موقوف ہے اگر چھوٹے نہ ہوتے
تو بڑے کا وجود بے قدر تھا اس بناء پر چھوٹے کا وجود بھی مہتم بالشان ہے۔ چنانچہ بادشاہ کو رعایا
کی سخت حاجت ہے بلکہ بادشاہ کی بادشاہی رعایا پر موقوف ہے اگر رعایا نہ ہو تو بادشاہی ہی معرض
۱۰۲ خطرہ میں ہو جاوے اس مضمون کو شاعرانہ مضمون نہ خیال کیا جاوے بلکہ یہ بات واقعی ہے
اور سچ یہ ہے کہ بڑے اعمال میں نورانیت چھوٹے ہی اعمال سے ہوتی ہے چنانچہ فرائض کی تکمیل
نوافل سے ہوتی ہے اگر کوئی نوافل ادا نہ کرے اور بالکل ترک کرے تو اس کا فرض بھی غیر کامل
ہوگا گو بمعنی ناقص نہیں مگر بمعنی غیر اکمل ہوگا اور اگر مع نوافل ادا کرے تو وہ فعل اکمل ہوگا تو دیکھئے
تکمیل فرائض کی نوافل سے ہوئی۔ تو امثلہ سابقہ میں جیسے چھوٹوں سے بڑوں کی تکمیل دنیا میں
ہوتی ہے ایسی ہی آخرت میں بھی نوافل سے تکمیل فرائض کی ہوگی یعنی فرائض میں جسقدر کمی ہوگی
نوافل سے اسکی بھرتی کیجاویگی۔ اور یہ تکمیل فرائض کی نوافل سے کبھی تو ایک جنس کے اعمال میں ہوتی
ہے (یعنی فرائض جس جنس کے ہیں وہ نوافل مکملہ بھی اسی جنس کے ہوں) اور کبھی یہ تکمیل فرائض کی
نوافل غیر جنس سے ہوتی ہے مثلاً نماز سے پہلے آپ کے پاس کوئی شخص آیا جو پراگندہ حال اور
بدصورت وغیرہ تھا جسکی تعظیم کو جی نہ چاہتا تھا اٹھنے کو دل گوارا نہ کرتا تھا مگر آپ نے نفس کی مخالفت
کی اور نفس کو مجبور کر کے اسکی تعظیم کی اور تواضع اختیار کی پھر گئے جب نماز پڑھی تو اس تواضع
کی برکت سے نورانیت بڑھ جاویگی جسکا اہل باطن کو شب و روز مشاہدہ ہوتا ہے اور راز اسکا یہ ہے

کہ اعمال میں سب میں باہم مناسبت ہے نیک اعمال کو نیک سے اور بد کو بد سے خواہ جنس میں اتحاد ہو یا نہ ہو تو ہر عمل خیر دوسرے عمل خیر کا مؤید و مقوی ہوتا ہے مثلاً آپکا ایک نوکر اور باورچی ہے آپ نے اسکو آواز دی آپکے پکارنے سے وہ فوراً حاضر ہوگیا سو ایک تو اس کا حاضر ہونا اسوقت ہے اور ایک اسوقت ہے کہ وہ کسی سے لڑ بیٹھا اتفاقاً اسی حالت میں آپ نے اسکو پکارا تو وہ حاضر تو ضرور ہوگا مگر اس حاضری اور پہلی حاضری میں فرق ضرور ہوگا باوجودیکہ نوکر کی آقا سے لڑائی نہیں ہوئی بلکہ دوسرے شخص سے ہوئی تھی مگر اس عمل منکر کا یہ اثر ہوگا کہ لہجہ کلام میں ادب و نیازمندی کی وہ شان نہ ہوگی جو پہلے تھی اسی طرح اگر نماز سے پہلے کوئی عمل تواضع کا کیا تو اس کا نماز میں یہ اثر ہوگا کہ نماز میں نورانیت بڑھ جاویگی اور اگر نماز سے پہلے کسی کے ساتھ تکبر کا معاملہ کیا تھا اگرچہ تکبر جنس صلوٰۃ سے نہیں مگر تکبر کا ظلمانی اثر نماز میں ضرور رہیگا اور نماز سے پیشتر وہ تکبر کرنا مانع نورانیت صلوٰۃ ضرور ہوگا یہی مطلب اور مقصود ہے اس حدیث کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الحسد تاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب حسد نیکیوں کو اس طرح کھا لیتا ہے جیسے لکڑی آگ کو اگرچہ اسپر علماء کا اتفاق ہے کہ باوجود ۱۶۴
حسد کے بھی حسنات باقی رہتی ہیں مگر معنی یہ ہیں کہ اعمال میں نورانیت نہیں رہتی اسی طرح صوم کے بارہ میں ارشاد ہے[1] اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابہ احد او قاتلہ فلیقل انی امرء صائم تو اس حدیث میں مقصود یہی ہے کہ عمل صوم میں ان افعال کے ارتکاب سے نورانیت نہیں رہتی گو روزہ باطل نہیں ہوتا پس ثابت ہوگیا کہ جو اعمال ہم جنس نہیں وہ بھی باہم ایک دوسرے کے مکمل ہیں لہذا چھوٹی شئے کو بے وقعت نہ سمجھنا چاہیے چھوٹی اشیاء بڑوں کی حفاظت کیلئے ہوتی ہیں یہ گفتگو تو اس بات کے تسلیم کر لینے پر تھی کہ یہاں اس آیت میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ چھوٹی اور معمولی بات ہے اور دوسرا جواب تحقیقی یہ ہے کہ یہ تعلیم درحقیقت معمولی نہیں بلکہ بہت بڑی ضروری تعلیم ہے آپنے اس کی ظاہری صورت پر نظر کی ہے حقیقت پر نظر نہیں کی حقیقت میں یہاں حق تعالیٰ نے ہمکو تواضع کی اور ترک تکبر کی تعلیم دی ہے اور میں عنقریب واضح کرونگا کہ تکبر کتنی سخت چیز ہے مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کو

---

[1] رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث طویل الخ وایضاً رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصوم جنۃ فلا یرفث ولا یجہل فان امرء قاتلہ او شاتمہ فلیقل انی صائم ص ۲۵۴ و ص ۲۵۵
ترجمہ حدیث اور جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو پس نہ فحش باتیں کہے اور نہ لڑے تو کہدے کہ میں روزہ دار ہوں۔

اس کا احساس نہیں بہرحال اس زمانہ میں یہ عام غلطی ہے کہ جو دیندار بھی ہیں وہ عقائد اور نماز روزہ وغیرہ
اذکار و اشغال کا تو ضرور اہتمام کرتے ہیں مگر اخلاق و معاشرت اکثر کی نہایت گندی ہیں بعضے آدمی تو اخلاق
و معاشرت کی طرح معاملات کو بھی دین سے خارج سمجھتے ہیں مگر خیر متقی لوگوں نے معاملات کا تو خیال کیا مگر
معاشرت و اخلاق کو تقریباً سب نے ہی بالکل بالائے طاق رکھدیا حالانکہ حسن معاشرت کا معاملات سے
بھی زیادہ خیال رکھنا لازمی ہے اسوجہ سے کہ معاملات کا اثر تو اکثر مال پر ہوتا ہے اور معاشرت کا اثر قلب
پر ہوتا ہے اور قلب پر جو اثر ہو وہ مال کے اثر سے زیادہ گراں اور موجب صدمہ ہوتا ہے مثلاً
ایک شخص آپ کے پاس آیا اور آپ نے اس کی طرف التفات نہ فرمایا اس کی بات کا جواب نہ دیا اس
سے اس کا دل دکھا تو اس اخلال معاشرت کا اثر اسکے قلب تک پہنچا یا ماں باپ کی نافرمانی کی انکا دل
دکھایا تو یہ آثار موذیہ اخلال معاشرت سے اور اسکو ضروری نہ سمجھنے سے پیدا ہوئے پس ثابت ہوا
کہ حسن معاشرت حسن معاملہ سے بھی زیادہ ضروری ہے عارف شیرازی کا قول ہے ؎

مباش در پئے آزار ہرچہ خواہی کن … کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

یعنی برابر اس گناہ نیست اور اس شعر میں جو ہرچہ خواہی کن کہا گیا ہے یہ تو مبالغہ پر محمول ہے ۱۰
اگر اس میں عموم لیا جائے اور اسکو خاص کہا جاوے غیر معاصی کے ساتھ اور مباش در پئے آزار کو
تمام معاصی کیلئے عام لیا جاوے تو تقریر مقصود کی یہ ہوگی کہ جس طرح اخلال معاشرت سے دوسروں کو آزار
ہوتا ہے مثلاً باپ کو نافرمانی سے آزار ہوتا ہے اسی طرح جمیع معاصی سے مثلاً نماز
نہ پڑھنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بوجہ شفقت کے آزار ہوتا اور تکلیف پہنچتی ہے چنانچہ ایک آیت کریمہ
سے یہ بات صاف ظاہر ہے فلعلک باخع نفسک علی آثارھم ان لم یومنوا بھذا الحدیث اسفا یعنی شاید آپ
ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون قرآنی پر ایمان نہ لائے غم سے اپنی جان دیدینگے یعنی اتنا غم نہ کیجئے
کہ قریب بہ ہلاکت ہو جائیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضور کو بوجہ شفقت کے مخلوق کی بدحالی
پر شدید رنج ہوتا تھا دیکھئے مدرس کو جب شفقت زیادہ ہوتی ہے اور مقصود مدرس کا یہ ہو کہ کسی
صورت سے یہ پڑھنے والے کتاب سمجھ جاویں تو اسکو ان کے نہ سمجھنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے اسی لئے
وہ تقریر کے بعد سوال کیا کرتا ہے کہ سمجھ بھی گئے اور اس کا منشا محض شفقت ہے اسی طرح جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد تبلیغ کے صحابہ سے فرمایا الا ھل بلغت الا ھل بلغت صحابہ فرماتے نشھد انک

آپ نے فرمایا اللھم اشہد (رواہ البخاری) حضور کی شفقت کی یہ شان ہے کہ آپ نے تئیس برس میں
اس قدر تبلیغ کی اور اسقدر جانفشانی برداشت کی کہ کوئی نہیں کر سکتا کلیات کی علیحدہ تبلیغ فرمائی
اور جزئیات کی علیحدہ پھر جزئیات میں ایک ایک جزئی کی تبلیغ فرمادی یہ تو تبلیغ قولی تھی پھر اسی پر اکتفا
نہیں فرمایا بلکہ تبلیغ عملی بھی فرمائی یہ سب حضور کی شفقت ہے نیز صحابہ کا خلوص بھی قابل نظر ہے کیونکہ
اگر صحابہ کی طلب کامل نہ ہوتی اور ان میں خلوص نہ ہوتا وہ علوم محفوظ نہ رہتے مگر بحمد اللہ آج حضور کے
تمام علوم محفوظ ہیں جنکو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے اس قلیل عرصہ میں اسقدر علوم کیونکر
بیان فرمادیئے خصوص جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ محض تعلیم ہی کے کام کیلئے فارغ نہ تھے بلکہ
اسکے ساتھ انتظام ملکی اور تدابیر غزوات کا کام بھی آپ کو بہت زیادہ کرنا پڑتا تھا حضور صلعم کی اس
شفقت کا خیال تو کیجیئے کہ باوجود اسقدر مشاغل کثیرہ کے آپنے کسقدر اور کس درجہ ہمکو معاشرت سکھلا
اور کس درجہ آداب مجالس سکھلائے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہمکو ایک دوسرے کو اذیت دینے سے بچایا
ایک دو نمونہ بتلاتا ہوں غور کیجیئے کہ حضور فرماتے ہیں کہ جب کسی مجمع میں تین آدمی ہوں تو دو آدمی علیحدہ ۱۰۵
سرگوشی نکریں جب تک کہ چوتھا آدمی نہ ہو دیکھیئے آداب مجالس کی کسقدر رعایت فرمائی۔ سلف صالحین کا
معمول تھا کہ جب کسی مجلس میں چوتھا آدمی نہوتا اور دوسرے آدمی سے تنہائی میں بات کرنی منظور ہوتی
تو چوتھے آدمی کے آنے کا انتظار کرتے تاکہ وہ اس سے ہمکلام رہے اور اسکو توحش نہو نہ نفرت
اور نہ اس خیال سے کہ مجھسے ہی اخفاء راز مقصود ہے۔ اور دیکھیے حضور فرماتے ہیں کہ اگر کھانا کھاتے
ہوئے لقمہ گر پڑے تو اسوقت یہ خلاف ادب ہے کہ اسکو چھوڑ دے بلکہ فلیمط عنہ اذی اسکو صاف کر کے
کھالیوے۔ دیکھیئے کیسے چھوٹے چھوٹے اور دقیق دقیق امور پر آپ کی نظر تھی کسی بات کو چھوڑا
نہیں اس تعلیم میں آپنے کھانے کا کسقدر ادب تعلیم فرمایا ہے جسکی نظیر نہیں مل سکتی اسپر مجھے ایک حکایت یاد آئی
ایک مرتبہ مجھے سفر کا اتفاق ہوا ریل میں ایک صاحب رئیس ہمراہ تھے انہوں نے کھانا جو کھایا اتفاق سے
ایک بوٹی گر پڑی انہوں نے جوتے سے تختہ کے نیچے سرکا دی چونکہ میں قولاً ان سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا اسلئے
میں نے عملاً حکم شرعی بتلانا چاہا تاکہ ان کو معلوم ہو جائے اسلئے میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ اس
بوٹی کو دھوکر مجھے دیدو میں کھاؤں گا انہوں نے کہا اگر میں کھالوں میں نے کہا یہ آپ کی ہمت ہے چنانچہ
انہوں نے کھالی میرے اس طرز عمل کا انپر بیحد اثر ہوا اور دوسروں سے کہنے لگے کہ واقعی میری سمجھ میں آگیا

اگر دس برس تک بھی اس کے متعلق نصیحت کی جاتی تو دل میں نہ گھستی اور اس طریق سے ایک مرتبہ کامل عمر کے لئے کارگر ہوگیا۔ صوفیہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ امر بالمعروف نہیں کرتے حالانکہ یہ اعتراض بالکل لغو ہے ان کی برابر کوئی بھی امر بالمعروف نہیں کر سکتا وہ تو امر بالمعروف ایسا کرتے ہیں کہ اپنے اوپر جھیلتے ہیں یعنی وہ قولاً امر بالمعروف کم کرتے ہیں زیادہ تر عملی تعلیم کرتے ہیں کیونکہ عملی تعلیم قولی تعلیم سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے اسی طرح حضورؐ نے بہت چھوٹے چھوٹے اعمال کا اہتمام کیا اور کوئی امر چھوڑا نہیں بلکہ ہر حکم کو عملاً دکھلا دیا تاکہ سامع پر زیادہ اثر ہو تو اسقدر اہتمام محض شفقت پر مبنی ہے مگر ہماری ایسی بری حالت ہے کہ اگر صحابہؓ زندہ ہو کر ہمیں دیکھیں تو ہمیں حضورؐ کی امت میں خیال کرنا انکو دشوار ہو جاوے ہماری حالت تو اسقدر ابتری اور ردی ہوگئی کہ قابل بیان نہیں نہ ہمارے عقاید کامل ہیں نہ اعمال عبادات نہ معاملات نہ معاشرت نہ اخلاق نہ اقوال نہ احوال غرض ہر چیز ناقص اور گمزور ہے اور عوام نے تو ادب خداوندی تک کو بھی بالائے طاق رکھدیا حتٰی کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی جناب میں گستاخی کرنا شروع کر دی چنانچہ امسال بارش بکثرت ہونے کے باعث ایک صاحب نے کسی گانوں والے سے کہا کہ بھائی توبہ واستغفار کرو ہمارے گناہوں کی شامت ہے جو اسقدر بارش ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں تو اناج ہے جسکے گھر میں اناج نہ ہو وہ توبہ کرے۔ افسوس آجکل یہ مسلمان ہیں اگر حضورؐ کے سامنے ہمارے یہ اعمال پیش ہوں تو حضورؐ کو کسقدر اذیت ہو اور اگر کیا معنی بلکہ یقیناً پیش ہوتے ہیں کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ اعمال امت کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ہائے پھر آپ کو ہماری اس بدحالی پر کتنا رنج ہوتا ہوگا پس سہ مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کن الخ اگر مبالغہ پر بھی محمول نہ کیا جاوے تب بھی یہ کلام درست ہے اور اس سے کسی گناہ کی اجازت مفہوم نہیں ہو سکتی کیونکہ گناہوں سے اگر اور کسی کو بھی ایذا نہ ہو تو حضورؐ کو تو ایذا ہوتی ہے۔ اور حضورؐ سے زیادہ مسلمانوں کے لئے کون ہے جسکا دل خوش کرنا مطلوب ہو اسپر مجھے مرزا بیدل کی ایک حکایت یاد آئی

مرزا بیدل کا کلام صوفیہ کے طرز پر ہوتا تھا ایک ایرانی انکا کلام دیکھکر اور بزرگ سمجھکر ان سے ملنے کیلئے دہلی آیا یہ اسوقت ڈاڑھی تراش رہے تھے اس شخص نے یہ منظر دیکھکر کہا آغا ریش میتراشی انہوں نے ... صوفیہ نے جواب دیا کہ تصوف تو بڑی سستی چیز ہوگئی سب بس ایک دو نکتے یاد کر لئے اور صوفی بن گئے آجکل تصوف ختم نکتوں کا نام رہ گیا گویا وہ نکتے جاننا ہی ہوں جیسے

یک صاحب نے والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ کا ترجمہ کیا تھا اے نفس تیری ہی سجاد منزل ہماشہ با دولہ صاحب نے کسی صوفی جاہل نے دریافت کیا تھا کہ بتاؤ رزق بڑا ہے یا محمد بابا صاحب نے کہا اول تو اس کی کوئی جزئی تعلیم نہیں دی گئی مگر پھر بھی قواعد کلیہ سے حضور ہی کا رتبہ بڑا معلوم ہوتا ہے نکتہ تو یہ پیر معلوم ہوتا ہے دیکھو اشہد ان محمدا رسول اللہ میں پہلے ان رزق کا نام آیا پیچھے حضرت کا معلوم ہوا کہ ان بڑا ہے کیا واہیات ہے جو کلمہ کے اندر ان حرف مشبہ بالفعل ہے یا بندی کا ان سمجھے اسی طرح مولوی فیض الحسن صاحب سے کسی فقیر نے دریافت کیا کہ بتاؤ پانچ میم کون سے ہیں تو یہ سوچ کر مولوی صاحب اس مہمل سوال کا جواب کیا دیتے تو وہ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ دیکھو مکہ مدینہ مولی محمد کا نپور ہیں ایک صوفی صاحب آئے طلبہ سے کہنے لگے کہ بتلاؤ آسمان پر کیا چیز ہے زمین پر کیا چیز نہیں قرآن میں کیا چیز نہیں پھر خود ہی بولے کہ آسمان پر قبر نہیں زمین پر ستارہ نہیں قرآن میں جھوٹ نہیں۔ یہ تصوف رہ گیا ہے آجکل۔ سو مرزا بیدل نے بھی ایسا ہی ایک نکتہ نکالا کہ شعر ملے، دل کسے کمی خراشم۔ یعنی ع مباش در پئے آزار ہر چہ خواہی کن۔ پر میرا عمل ہے۔ ایرانی نے اللہ البتا ١٠٧
اس نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ مرزا بیدل ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔ ایرانی نے کہا بلے دل رسول اللہ اللہ میخراشی۔ یہ سنکر تو مرزا بیدل کی آنکھیں کھل گئیں اور ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور بزبان حال یہ شعر پڑھنے لگے ؎

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی   مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

اب وہ شبہ جاتا رہا کہ نماز روزہ کے چھوڑنے میں کسی کو تکلیف نہیں پہونچتی اسلئے نماز روزہ کے ترک میں مضائقہ نہیں۔ صاحبو اس سے تو اس ذات کو تکلیف پہنچتی ہے جس سے بڑھ کر مسلمان کو کوئی چیز بھی محبوب نہیں۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاملات سے زیادہ معاشرات کا اہتمام ضروری ہے کیونکہ معاملات کی اصلاح میں تو زیادہ تر لوگوں کے مال کی حفاظت ہے اور حسن معاشرت میں مسلمانوں کے قلب کی حفاظت ہے اور ظاہر ہے کہ مال سے دل کا رتبہ بڑھا ہوا ہے۔ نیز معاشرت کی اصلاح میں علاوہ قلوب کے لوگوں کی آبرو کی بھی حفاظت ہے اور ظاہر ہے کہ آبرو کی حفاظت بدنیا ان کے ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے عرفاً بھی شریف آدمی مال بلکہ جان سے بھی زیادہ آبرو کو سمجھتا ہے چنانچہ جان بچانے کیلئے تو شریف آدمی مال کو خرچ کرتا ہے اور آبرو بچانے کیلئے جان و مال دونوں کو دیتا ہے

اور حدیث حقوق میں بھی تینوں کی حفاظت مامور بہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ان اللہ تعالیٰ
حرم علیکم دمائکم واموالکم واعراضکم کحرمتہ یومکم ہذا فی شہرکم ہذا فی بلدکم ہذا۔ حضور نے حجۃ الوداع
میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہارے خون یعنی جان اور مال اور آبرو باہم ایک دوسرے پر قیامت
تک ویسے ہی حرام ہیں جیسے آج کے محترم دن میں محترم مہینے میں اور محترم بلد میں حرام
ہیں پس مسلمانوں کے مال کی بھی حفاظت کرو جان کی بھی حفاظت کرو آبرو کی بھی حفاظت کرو
اسلئے کہ حقوق العباد میں یہ سب داخل ہیں صرف مالی حقوق کا نام حقوق العباد نہیں اور یہ
معاشرت بعض حیثیات سے نماز روزہ سے بھی زیادہ قابل اہتمام ہے کیونکہ عبادات کی اخلال
سے صرف اپنا ضرر ہے اور معاشرت کے اخلال سے دوسروں کا ضرر اسی لئے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے معاشرت کا بہت اہتمام فرمایا ہے ایک ایک کر کے تمام امور کی تعلیم فرما دی ہے چنانچہ
ارشاد ہے اذا جاءکم کریم قوم فاکرموہ کہ جب تمہارے پاس کسی قوم کا سردار آوے اسکی تعظیم کرو تذلیل نہ کرو
خصومت نکرو۔ حضور کے اصحاب پڑوسی یہودی تک کو ہدیہ دیا کرتے تھے اور بیماری میں اس کی
عیادت کرتے۔ اسی طرح ایک یہودی کا قرضہ حضور پر چاہتا تھا اس نے مسجد میں آکر مانگا اس وقت آپ کے ۱۰۸
پاس موجود نہ تھا آپ نے فرمایا کہ ٹھہرو لینا یہودی نے کہا کہ میں تو لیکر جاؤں گا اللہ اکبر کس درجہ
حسن معاشرت تھی کہ رعیت کا ادنیٰ آدمی بھی جو چاہے کہے اور آپ باوجود ہر طرح اختیار و قدرت
انتقام نہیں لیتے۔ صحابہؓ نے کچھ کہنا بھی چاہا حضورؐ نے روک دیا اور فرمایا کہ ان لصاحب الحق
مقالاً کہ صاحب حق کو تقاضے کا حق ہے چنانچہ وہ بیٹھا رہا اور رات کو حضورؐ کو گھر بھی نہ جانے دیا
تو آپ مسجد ہی میں رہے صبح کی نماز پڑھی یہ حال دیکھکر بعد نماز اس یہودی نے کہا کہ میں نے تورات
میں پڑھا تھا کہ نبی آخر الزماں کے یہ صفات ہیں میں نے اور تو سب صفات دیکھ لی تھیں صرف
صفت حلم کا امتحان باقی تھا سو آج اس کا بھی امتحان ہو گیا واقعی آپ سچے نبی ہیں اشہد ان لا الہ
الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ۔ مسلمان ہو گیا۔ صاحبو! حضورؐ نے جب غیر مسلم کی اسقدر رعایت
کی ہے تو مسلم کی تو کس قدر رعایت فرماتے ہوں گے۔ پھر غیر مسلم آدمی تو ہے حضورؐ نے تو جانوروں
پر بھی رحم کا حکم فرمایا ہے اور ان کے بھی حقوق بیان فرمائے ہیں چنانچہ حکم ہے کہ جانوروں کو زیادہ
نہ مارو بھوکا نہ رکھو تحمل سے زیادہ کام نہ لو زیادہ بوجھ نہ لادو مجھے یاد آیا کہ ایک صاحب نے مجھے

خط میں لکھا تھا کہ جانوروں کے حقوق میں ابتک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تو واقعی اسوقت تک کوئی کتاب مستقل نہیں لکھی گئی تھی اور ضرورت تھی اسلئے میں نے ارشاد الہائم فی حقوق البہائم ایک کتاب لکھی ہے جانور رکھنے والوں کو اس کتاب کے رکھنے کی ضرورت ہے اس سے معلوم ہوگا کہ شریعت میں جانوروں کے کس درجہ کے حقوق ہیں حدیث شریف میں بنی اسرائیل کی ایک عورت کا قصہ مذکور ہے کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا نہ تو چھوڑتی تھی اور نہ کچھ کھانے کو دیتی تھی پھر حضور نے دوزخ میں اسکا عذاب دیا جانا دیکھا دیکھئے ایک بلی کے ستانے پر اسے عذاب ہوا اور جانور کی تکلیف پہونچانے پر وہ معذب تھی اور ہماری حالت یہ ہے کہ عام انسان اور عام مسلمان کا تو کیا خیال کرتے ہم تو حقیقی بھائی کو اذیت پہونچانے پر کمربستہ ہیں جان اور دبا رہے ہیں بلکہ ہم لوگوں کی معاشرت اعزہ و اقارب کیساتھ زیادہ خراب ہے حالانکہ ہم جانوروں تک پر بھی رحم کرنے کے لئے مامور ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ان افعال پر ضرور ہم سے سوال ہوگا۔ حاصل یہ ہے ۱۰۹
کہ شریعت نے معاشرت کے بارہ میں بھی بہت زیادہ اہتمام کیا ہے اسلام بڑی چیز ہے۔ اسلام نے ہمیں تمام ضروری امور سکھلائے ہیں تاکہ اسلام پر بالکل وہم نہ رہے کہ اسمیں فلاں بات کی کمی ہے فلاں پہلو کی رعایت نہیں سو بحمد اللہ اسلام کامل مکمل شریعت ہے اور کیوں نہ ہو خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور حق تعالیٰ تو ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں اور شفیق اپنے علم میں کسی ضروری بات کو نہیں چھوڑا کرتا اسلئے حق تعالیٰ نے کسی ضروری بات کو اسلام میں نہیں چھوڑا۔ اور حق تعالیٰ کا علم کامل ہے اسلئے واقع میں بھی کوئی ضروری بات نہیں رہی بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ بات کی بھی تعلیم رسول کے واسطہ سے کردی ہے گو ہمکو بعض پابندیاں گراں ہوتی ہیں

مگر شفقت کا یہی مقتضا ہے کہ باوجود گرانی مخاطب کے پھر بھی اسکو نفع پہونچایا جائے چنانچہ میرا ہی واقعہ ہے کہ بچپن میں مجھے کنکوے کا شوق تھا جہاں چھٹی ملی کنکوا لیکر باہر چلدیا اور میرے بال بھی رکھے ہوئے تھے اتفاق سے بالوں میں جوئیں پڑگئیں میری والدہ صاحبہ کا تو انتقال ہوگیا تھا اپنی نانی صاحبہ کی پرورش میں تھا ان کو شفقت و محبت زیادہ تھی انہوں نے کئی بار سر منڈوانے کی بابت مجھ سے کہا مگر میں حسب معمول کنکوا لیکر چلدیتا ایک روز انہوں نے پہلے سے کھلی گندھوا کر رکھ دی تھی میرے آتے ہی موقع پاکر فوراً سر میں لپیٹ دی بس اب میں مجبور ہوگیا بال دھلوائے

کہاں جاسکتا تھا۔ دیکھئے اسوقت انکا یہ فعل ناگوار تھا مجھکو خبر ہی نہ تھی کہ میرے لئے کیا مفید ہے مریض کو کیا خبر کہ میرے لئے کیا نافع ہے مگر انکی یہ عنایت اور شفقت تھی کہ مجھے مجبور کر کے راحت پہونچائی تہیں یہی برتاؤ حق تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہے کہ ہم بعض دفعہ احکام سے تنگ ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ مجبور کرتے ہیں کہ تمکو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ شفقت کا ایک واقعہ اور یاد آیا ایک شخص ہمارے یہاں آنکھ بنانے والے تھے۔ ایک شخص آنکھ بنوانے آیا انہوں نے کام شروع کیا تو وہ تکلیف کے خوف سے انکو برا بھلا کہہ رہا تھا مگر وہ ہنس رہے تھے اور آنکھ بنا رہے تھے اگر شفقت نہ ہوتی تو بیچ ہی میں کام چھوڑ دیتے مگر انہوں نے مریض کی ناگواری پر اصلاً نظر نہیں کی بلکہ غایت شفقت سے نشتر لگاتے رہے۔ ہمارے یہاں کے ایک رئیس نے جو اسوقت موجود تھے ان سے کہا بھی کہ دیکھئے یہ کیا بکتا ہے مگر انہوں نے جواب دیا کہ تھوڑی دیر میں دیکھنا جب نظر آنے لگے گا تو کیسی دعائیں دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت حق جلشانہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے کا نتیجہ آخرت میں ہم پر روشن وظاہر ہو جائیگا گو اسوقت ہماری 11
گرانی ہوتی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید۔ غرض حضور نے تمام اعمال معاملات معاشرت تمام امور ہمکو سکھلائے تاکہ ہم اپنی اصلاح کر لیں۔ مگر اب ہماری حالت ایسی خراب ہے کہ دیگر اقوام کے لوگ ہماری حالت دیکھکر اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ افسوس ایک زمانہ وہ تھا کہ اہل اسلام کے کارناموں کو دیکھکر بہت سے لوگ مسلمان ہوتے تھے آج مسلمانوں کی حالت دیکھکر لوگ اسلام سے منحرف ہوتے جاتے ہیں چنانچہ مدراس کا قصہ سنا ہے کہ ایک انگریز اسلام کی خوبیاں دیکھکر مسلمان ہو گیا تھا اتفاقاً مسجد میں آیا تو مسجد میں دیکھا کہ نالی میں تھوک وغیرہ بہت پڑا ہے اور مسجد بھی صاف نہیں ہے اس نے صفائی کی نسبت لوگوں سے کہا سب لوگ اسکے پیچھے پڑ گئے کہ یہ تو ابھی تک عیسائی ہے کہ صفائی صفائی پکار رہا ہے اور اسکو مسجد سے نکال دیا بعض ذی فہم مسلمانوں کو اطلاع ہوئی انہوں نے ان صاحب سے معذرت کی کہ یہ لوگ ناواقف تھے آپ کچھ خیال نہ کریں اس نومسلم نے جواب دیا کہ میں اسلام کے محاسن اور کارنامے دیکھکر مسلمان ہوا ہوں مسلمانوں کی حالت دیکھکر اسلام نہیں لایا ہوں میں جانتا ہوں کہ محمد صاحب صلی اللہ علیہ وسلم صفائی کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ صفائی تو اصل میں ہمارے یہاں کی چیز ہے جو آجکل عیسائیوں [illegible]

مسلمانوں نے ایسی چھوڑدی ہے کہ اگر کوئی صفائی برتے تو عیسائی کے نام سے موسوم ہوتا ہے صفائی
کے باب میں حدیث میں ہے ان اللہ نظیف یحب النظافۃ اور دوسری حدیث میں ہے نظفوا افنیتکم
اسلام کی برابر تو طہارت ونظافت کسی مذہب میں نہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ استری اور کلف
کا اہتمام کرو اور ہر وقت بنے ٹھنے رہو کیونکہ اس کا نام نظافت نہیں۔ بلکہ یہ تصنع اور تکلف ہے
اور تن آرائی ہے اسکے متعلق تو حدیث میں ہے کہ البذاذۃ من الایمان کہ سادگی ایمان کا جزو ہے
بذاذت کے معنی میلا کچیلا رہنے کے نہیں بلکہ سادگی سے رہنے کے ہیں پس نظافت اور طہارت کی
حقیقت یہ ہے کہ کپڑے اور بدن کو صاف پاک رکھو اگر میلا ہو جائے تو دھو ڈالو صاف ہو جاؤ
اور پاک بنجاؤ شریعت اسلامیہ میں طہارت کی تو بہت ہی زیادہ تاکید ہے کہ بدون طہارت کے نماز
نہیں ہوتی اور گو بدون نظافت کے ہو جاتی ہے مگر بدہیئت بنکر نماز پڑھنا مکروہ ہے فقہا نے لکھا
ہے کہ جس حالت سے مجمع احباب میں جانا انسان کو ناگوار ہو اس ہیئت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے نیز
یہ بھی حکم ہے کہ جس شخص کے کپڑوں میں سے پسینہ کی سخت بدبو آرہی ہے اسکو جماعت میں شریک ہونا 111
مکروہ و ممنوع ہے مگر آجکل ہماری وہ حالت ہے کہ مولانا نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک
کافر لڑکی اسلام کی طرف راغب تھی اتفاق سے اسکے گھر کے قریب مسجد میں ایک موذن بدآواز آگیا
اس نے جو اذان دی تو لڑکی نے باپ سے دریافت کیا کہ ابا یہ کیا ہو رہا ہے۔ باپ نے جواب دیا
کہ بیٹی تو جس مذہب کی طرف راغب ہے یہ اس کی اذان ہے۔ لڑکی کا یہ سنکر اسلام سے دل پھر گیا
تو اس کا باپ اس خوشی میں کچھ ہدیہ لیکر ان موذن صاحب کے پہنچا کہ اس شخص کے سبب مجھکو
یہ خوشی نصیب ہوئی موذن صاحب سمجھے کہ یہ مجھ سے بہت راضی اور خوش ہے اسلئے ہدیہ لایا ہے
مگر جب واقعہ معلوم ہوا تب حقیقت حال منکشف ہوئی۔ یہی ہماری حالت آجکل ہے کہ ہمکو
دیکھکر کفار اسلام سے چھٹنے لگے ہیں حالانکہ فی نفسہ اسلام کی یہ حالت ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم | کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

صاحبو! مسلمانوں کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہو گئی تھی آپ نے اسکو ایک یہودی
کے پاس دیکھا اور اس سے مطالبہ کیا اس نے نہ دی اور یہ کہا کہ یہ تو میری ہے آپ باوجود
خلیفہ ہونے کے مگر اسکو لیکر مدعی بنکر حضرت شریح قاضی کے یہاں پہنچے قاضی صاحب

گواہوں کو طلب کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے صاحبزادہ اور ایک آزاد شدہ غلام کو گواہی میں پیش کیا حضرت علیؓ کے نزدیک ولد عادل کی گواہی باپ کے موافق جائز تھی مگر قاضی شریح کے نزدیک جائز نہ تھی اسلئے قاضی صاحب نے صاحبزادے کی گواہی رد کر دی اور ایک گواہ اثبات دعوی کے لئے ناکافی تھا اسلئے زرہ یہودی کو دیدی۔ اللہ اکبر ایک بادشاہ وقت کی چیز چوری جائے اور بادشاہ اسکو پہچان لے اور ایک ادنی آدمی رعیت کا جو کہ مسلمان بھی نہ ہو بے تکلف اپنی ظاہر کرے پھر بادشاہ اپنے ہی ماتحت قاضی کے یہاں محاکمہ کے لئے جاویں اور صاحبزادہ کو گواہی میں پیش کریں جو کہ اہل جنت کے سردار ہیں اور قاضی صاحب ان کی گواہی قبول نہ کریں اور زرہ یہودی کو دلوادیں اور خلیفہ اسکو قبول کرلیں۔ آخر یہ حقانیت ان کو بجز تعلیم اسلام کے کس نے دی ہے پس اسلام یقیناً حق ہے یہودی یہ حالت دیکھکر فوراً مسلمان ہوگیا اور حضرت علیؓ سے بیعت ہوگیا اور جنگ صفین میں شہید ہوا صاحبو! مسلمانوں کے یہ اخلاق تھے مگر اب ہمارے اخلاق دیکھکر مسلمانوں کو بھی دین سے نفرت ہو جاتی ہے غرض ہمیں نماز روزہ کا تو خیال ہے مگر اخلاق کا بالکل خیال نہیں ظاہر میں اخلاق چھوٹی چیز ہے مگر واقع میں یہ بہت بڑی چیز ہے کیونکہ ۱۱۲
تمام اعمال کی جڑ اخلاق ہی ہیں حقیقت اس کی یہ ہے کہ ایک درجہ منشار کا ہوتا ہے اور ایک ناشی کا یعنی ایک تو افعال ہوتے ہیں اور ایک ملکات۔ اور ملکات اصل ہیں اور افعال فرع ملکات ہی سے اعمال ناشی ہوتے ہیں جیسے جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی اس سے افعال سرزد ہوتے ہیں مثلاً آپ نے کسی پر ظلم کیا یا سخت کلامی کی تو اسکا منشا تکبر ہے اگر آپ میں تکبر نہ ہوتا تو یہ عمل سرزد نہ ہوتا اور یقیناً ظلم بری چیز ہے اور اسکی اصلاح واجب ہے تو پھر تکبر کی اصلاح کیوں نہ واجب ہوگی جو کہ ظلم کا منشا ہے اور جسکی اصلاح کے بغیر ظلم کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی مگر ہماری غلطی یہ ہے کہ افعال پر تو ہمکو نظر ہے ملکات پر نظر نہیں اور وجہ اسکی یہ ہے کہ ملکات کی اصلاح نفس کو ناگوار ہے اعمال اسدرجہ گراں نہیں۔ اسلئے اخلاق کو بالکل چھوڑ دیا ہے جسکا منشا یہ ہے کہ ہم کو اسکی ضرورت ہی کا احساس نہیں اگر انکو ضروری سمجھتے تو پھر گرانی کا خیال ہرگز نہ کرتے جیسے پھل توڑنے میں کانٹوں کا لگنا ناگوار نہیں ہوتا چونکہ پھل توڑنا ضروری چیز ہے اسلئے کانٹوں کا خیال نہ کیا جاویگا اسی طرح اگر اخلاق کی ضرورت کا احساس ہو جاوے تو پھر انکی اصلاح میں کتنی ہی مشقت ہو سب گوارا ہو جاوے

صاحبو! اعمال سے پہلے ان کی جڑ یعنی اخلاق کی اصلاح کرو سو ایک فرق تو اعمال و اخلاق میں منشا اور ناشی ہونے کا ہے اور ایک فرق یہ ہے کہ ترک اخلاق کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص سے عام نفرت ہو جاتی ہے برخلاف نماز روزہ کے کہ اسکے تارک سے نفرت نہیں ہوتی۔ شاید کوئی کہے کہ صاحب متکبروں سے نفرت کہاں ہے ان کی تو تعظیم کیجاتی ہے سو یاد رکھو کہ لوگ متکبر کی تعظیم خوف کی وجہ سے کرتے ہیں محبت کی وجہ سے نہیں کرتے، وہ تعظیم ایسی ہے جیسے اس مجلس میں اگر بھیڑیا آجاوے اور اسکی وجہ سے آدمی کھڑے ہو جاویں تو آپ خود انصاف کرلیں کہ یہ کھڑا ہونا کیسا ہوگا کیا تعظیم کیلئے ہوگا یا دہشت کے سبب ہوگا اسی طرح متکبر کی تعظیم کو سمجھو کہ دل سے نہیں بلکہ اسپر چونکہ قدرت نہیں اسلئے صورۃً اسکی تعظیم کیجاتی ہے چنانچہ ظالم اگر معزول ہو کر کسی مقدمہ میں گرفتار ہو کر جیلخانہ میں چلا جاوے تب دیکھیں اسکی کیسی تعظیم ہوتی ہے بلکہ وہاں تو موقع اور قدرت ملنے کی وجہ سے ہر شخص بدلہ لینے پر تیار ہو جاتا ہے اور اسکے مقابل ایک اللہ والا ہے اگر اسپر اتفاقاً صورۃً تکلیف بھی ہو جائے تو اسکی تکلیف کا سب آدمی ۱۱۴
تذکرہ کرتے اور افسوس کرتے ہیں اور حتی الوسع اسکو آرام پہونچانیکی کوشش کرتے ہیں چنانچہ ہمارے ایک بزرگ زمانہ غدر میں ماخوذ ہو کر جیلخانہ میں لیجائے جا رہے تھے اتفاق سے نماز کا وقت آگیا ان بزرگ نے پولیس کے افسر سے جو کہ ہندو سکھ تھا اجازت چاہی داروغہ نے کانسٹبلوں سے کہا کہ بھائی انہیں چھوڑ دو اور بیڑیاں کھولدو۔ یہ ایماندار آدمی معلوم ہوتے ہیں یقین ہے کہ یہ نہ ہوکیں گے۔ صاحبو! یہ اثر ہے اللہ والوں کے اخلاق کا اور تکبر کا یہ اثر ہے کہ اسکے مرتکب سے نفرت ہوتی ہے تو جسکے یہ آثار ہوں آپ ہی انصاف کیجئے کہ وہ چھوٹی چیز کیسے ہو سکتی ہے اور اخروی اثر یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ متکبر جنت میں نہ جائیگا اب اس حدیث کے جو بھی معنی ہوں مگر ہر اعتبار سے کیا یہ تھوڑی وعید ہے سو اگر اب بھی تکبر چھوٹی اور خفیف شئے ہے تو اسکی وہی مثال ہوگی جیسے ایک طبیب ناواقف نے کسی کو مسہل دیا تھا اس سے دست آنے شروع ہوئے طبیب صاحب سے ظاہر کیا گیا کہ دست بکثرت آرہے ہیں فرمایا آنے دو مادہ خارج ہو رہا ہے چند بار اسی صورت سے شکایت کی گئی مگر طبیب نے ہر بار میں وہی کہا کہ آنے دو مادہ نکل رہا ہے۔ غرض اسقدر دست آئے کہ مریض مر گیا اعزہ نے پھر اطلاع کی کہ صاحب وہ تو مر گیا فرمانے لگے اللہ اکبر کسقدر یہ مادہ سخت تھا کہ خروج کے بعد بھی مار دیا اگر یہ مادہ باقی رہتا تو نہ معلوم کیا حالت ہوتی۔ جاہل؟ ارے اس سے زیادہ اور کیا ہوتا۔ جسطرح دستوں کا

آنا اس جاہل کے نزدیک معمولی اور خفیف بات تھی اسی طرح اگر تکبر بھی جس کا انجام دوزخ میں جانا ہے خفیف اور معمولی بات ہے تو جناب ہی فرما دیں کہ اس سے بڑی بات اور کیا ہے اس سخت مرض کے علاج میں جو میں خاص اہتمام کرتا ہوں اس کی بدولت بدنام ہوں کہ بہت تیز مزاج ہے اسکے یہاں ذرا ذرا سی باتوں پر گرفت ہوتی ہے اور بعض لوگ اس تیزی کو جو کہ تکبر کا علاج ہے تکبر پر محمول کرنے ہیں مگر میں دعوے سے نہیں کہتا خدا کی نعمت بیان کرتا ہوں کہ الحمدللہ میرے اندر تکبر نہیں ہے مگر لوگوں کو تکبر کی حقیقت کا علم نہیں اسلئے بدگمانی ہے صاحبو اگر طبیب شفقت کی بنا پر لوگوں سے امراض کا اظہار کرے اور مریض اسے سختی سمجھیں تو آپ ہی بتلا سکے کہ علاج کی کیا سبیل ہو سکتی ہے اور امراض باطنہ کا علاج کس صورت سے ہو سکتا ہے افسوس اصلاح کے متعلق ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ اس معاملہ میں طبیب روحانی کی ذرا سی تدبیر کو بھی سختی سمجھتے ہیں اور سلف صالحین کی یہ حالت تھی کہ تکبر و عجب وغیرہ کی اصلاح میں مریدوں سے بڑے بڑے مجاہدے کرالیتے تھے اور وہ سختی نہیں سمجھی جاتی تھی چنانچہ ذوالنون مصری رح کی حکایت ہے کہ ایک مرید نے ایکدفعہ آکر شیخ سے عرض کیا کہ حضرت کے فلاں مرید نے شراب پی رکھی ہے اور شراب کے نشہ میں شراب خانہ کے دروازہ پر پڑا ہے حضرت نے فرمایا کہ تم شراب خانہ سے اسکو اٹھا لاؤ شیخ کا حکم تھا ہرچند کہ نفس پر ثقیل اور شاق گذرا مگر مجبور شراب خانہ کی طرف چلے اور اسکو کمر پر لاد کر واپس ہوئے لوگوں نے دیکھکر دونوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا کہ میاں دونوں شرابی ہیں مگر ایک پر نشہ کا اثر ہو گیا اور دوسرے پر ابھی نہیں ہوا افسوس یہ مقطع صورت اور تصوف کا دعویٰ اور یہ اعمال استغفراللہ۔ یہ صاحب سمجھ گئے کہ میں نے جو حضرت سے اس شخص کی شکایت کی تھی اور اپنے کو ان شرابی سے اچھا سمجھا تھا اسلئے حضرت نے میرے نفس کو یہ سزا دی ہے کہ مجھے بھی ساتھ میں بدنام کرایا۔ تو پہلے بزرگ ان طریقوں سے تکبر و عجب کی اصلاح کرتے تھے کیونکہ جب تک یہ خناس دماغ سے نہیں نکلتا اسوقت تک وصول میسر نہیں ہوتا اسی طرح حضرت شبلی رح کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک مرید آیا اور ثمرات کے عدم ترتب کی شکایت کی شیخ نے جب طریق تزکیہ بدل کر دیکھا کہ کسی طریق سے نفع مرتب نہیں ہوتا تو سمجھ گئے کہ اس کے اندر عجب و کبر کا مرض ہے جو نفع سے مانع ہے تو شیخ نے ایک ٹوکرا اخروٹ سے بھرا ہوا دیکر حکم دیا کہ فلاں محلہ میں جہاں ان کے معتقدین زیادہ تھے جا بیٹھو اور اعلان کر دو کہ ایک دھول کے

بدلے ایک اخروٹ دونگا ایک دہول مارد اور ایک اخروٹ لیجاؤ اسی طرح یہ ٹوکرا ختم کردو یہ حالت تھی معالجہ کی۔ مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذرا سی بھی سختی ہوتی ہے تو ناگوار ہوتی ہے کہ ہم پر سختی کیوں ہوتی ہے لا لیہ الا اللہ طلب کا دعویٰ اور بات بات پر ناگواری۔ صاحبو اطلب کا نام بھی کیوں بدنام کرتے ہو مولانا فرماتے ہیں ؎

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی　　پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

تو بیک زخمے گریزانی زعشق　　تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

طالب کا تو یہ مذاق ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　دل فدائے یار دل رنجان من

پس زبون وسوسہ باشی دلا　　گر ہوس را باز داری از بلا

اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہم سے شیخ کی سختیاں تو کیا برداشت ہوتیں اور ہم شیخ کے تو کیا ہوتے

115 بعضے تو اللہ کے بھی نہیں چنانچہ ایک شخص نے روزہ رکھا اتفاق سے اسی دن اس کی بھینس مرگئی تو کم بخت نے فوراً منہ سے لوٹا لگا کر پانی پی لیا اور روزہ توڑ کر آسمان کی طرف منہ کرکے خدا تعالیٰ سے کیا کہتا ہے کہ لے روزہ رکھوالے۔ نعوذ باللہ خدا کے ساتھ یہ معاملہ اور اس شخص پر تعجب نہ کرنا ایسے لوگ آجکل بھی بکثرت ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ جاہل زبان سے بھی کہدیتا ہے اور مہذب زبان سے تو نہیں کہتا مگر دل میں حق تعالیٰ کے افعال پر اعتراض وہ بھی کرتا ہے پھر ایسے لوگوں کے ساتھ معالجین اگر اس قسم کے معاملات میں ظاہری سختی کرتے ہیں تو بدنام ہوتے ہیں کہ بد اخلاق ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اہل حقیقت منشا کو دیکھتے ہیں مثلاً کہ تکبر کو کفر کا باپ سمجھتے ہیں کیونکہ کفار کو حق خوب معلوم تھا اور حضور کی نبوت کو خوب پہچانتے تھے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم وان فریقا منہم لیکتمون الحق وہم یعلمون اور ام لم یعرفوا رسولہم فہم لہ منکرون اور وجحدوا بہا واستیقنتہا انفسہم ظلما وعلوا مگر باوجود پہچاننے کے اتباع سے عار کرتے تھے تو ان کے کفر کا منشا بھی تکبر تھا کیا اب بھی کسی کو شبہ ہے اخلاق کے مہتم بالشان ہونے میں کیا آجکل ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو کہ باوجود جاننے کے حکم الٰہی سے عار کرتے ہیں۔ تو کیا انکا علاج نہ کیا جاوے۔

خوب یاد رکھنا چاہیے کہ یہ معمولی چیز نہیں اکثر گناہوں کی جڑ یہی ہے حتیٰ کہ کفر بھی اکثر تکبر ہی سے

پیدا ہوتا ہے اسی طرح اکثر معاصی بھی چنانچہ بہت لوگ بیدھڑک داڑھی منڈواتے اور ترشواتے ہیں اور جب نصیحت کیجاتی ہے تو نہایت بیباکی سے کہتے ہیں کہ میاں تمام عمر تو اس وضع سے رہے اب کیا توبہ کرینگے اور یہ شعر زبان زد ہوتا ہے۔ ؎

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن　　آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بھائی تم آخری ہی وقت میں توبہ کرلو خدا تعالیٰ معاف کر دیں گے مگر تکبر قلب کو ایسا مسخ کر دیتا ہے کہ آخری وقت میں بھی توبہ کی توفیق نہیں ہوتی حضورؐ کے زمانہ میں کفا حضور کا پیغمبر ہونا جانتے تھے مگر تکبر کی وجہ سے قلوب مسخ ہو رہے تھے جیسا ابھی قریب بیان ہوا بعض اہل سیر نے ذکر کیا ہے کہ فرعون نے مسلمان ہونا چاہا تھا مگر کچھ تو اس کا تکبر اور کچھ ہاماں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع سے روکا کیونکہ ہاماں بھی متکبر تھا۔ غرض یہ تکبر بڑی بلا ہے نمعلوم کہاں جاکر دھکا دیگا چنانچہ مجلس میں کسی کو جگہ نہ دینا اور کسی کے کہنے سے نہ اٹھنا اسی طرح کھانا گرا ہوا نہ اٹھانا اور جھکنے سے عار کرنا اور کھانا جھک کر نہ کھانا جیسا آجکل میز کرسیوں پر کھانا کھایا جاتا ہے کہ جھکنے سے عار آتی ہے مسجد میں نہ جانا۔ ان سب کا سبب بھی تکبر ہے ایک صاحب میرے پاس مسجد میں تشریف لائے مگر کوٹ پتلون 116
بوٹ جوتہ زیب تن تھا آکر فرش سے باہر کھڑے ہو گئے وہ اسکے منتظر رہے کہ میں اٹھکر ان کے پاس آکر ان سے گفتگو کروں۔ دیکھئے یہ کون سی تہذیب ہے کہ جاویں تو خود ملنے کیلئے اور اسکے منتظر ہیں کہ یہ خود اٹھکر ہمارے پاس آئے یہ بھی اسی تکبر کی فرع تھی۔ پھر لطف یہ کہ اگر کوئی شخص اس قسم کے مواقع میں ان کیلئے نہ اٹھے تو بدماغ کہلائے اور ان خرد ماغوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔

ایک اور صاحب مدرسہ میں میرے پاس تشریف لائے جنکا تمام جسم متصل واحد تھا لکڑی کی طرح بندشوں سے کھینچا ہوا تھا وہ بھی تھوڑی دیر تو کھڑے رہے شاید کرسی کے منتظر ہوں گے مگر وہاں کرسی کہاں آخر مجبور ہو کر پھر بیٹھنا چاہا تو دھم سے گر پڑے اور اٹھنا اور بھی دشوار ہوا اس فرعونی وضع کا جیسی کوئی راحت بھی نہیں سبب یہی تکبر ہی ہے کہ جہاں جائیں وہاں ان کے لئے کرسی منگائی جائے اور تاکہ ہر وقت بالکل فرعون کہلاتے رہیں جھکنے کی بھی توفیق نہ ہو حتی کہ کھانے کے وقت بھی جھکنا نہ پڑے اسی واسطے میز کرسی پر کھانا کھاتے ہیں حالانکہ حضورؐ اپنی ذات مقدس کے باب میں فرماتے ہیں کہ میں تو غلاموں کی طرح کھانا کھاتا ہوں میں اس کے متعلق آپ لوگوں سے سوال کرتا ہوں کہ اگر

جارج پنجم آپ کو ایک امرود دیکر اپنے سامنے کھانے کا حکم دیں تو میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسکے تناول کیلئے آپ میز کرسی اور کانٹے چھری کے منتظر ہوں گے ہرگز نہیں اور اگر جارج کے اس دیئے ہوئے امرود کی ایک قاش آپ کے ہاتھ سے گر جاوے تو کیا اسکو زمین ہی پر پڑا رہنے دیں گے اور بوٹ جوتہ سے آگے کو سرکا دیں گے یا فوراً اٹھا کر کھالیں گے شاید صاف بھی نہ کریں بتلائیے اسوقت کس طرح عملدرآمد کرینگے یقینی امر ہے کہ آپ فوراً اٹھالیں گے اور کھالیں گے تو یہاں بھی اسی طریق سے عمل کیوں نہیں کیا جاتا۔ کیا نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی عظمت جارج پنجم سے کم ہے کہ ان کی دی ہوئی نعمت کی ساتھ اتنا بھی معاملہ نہیں کرتے۔ اور ایک سوال اسکے متعلق یہ ہے کہ اگر آپکو جارج پنجم اپنے سامنے اس امرود کے کھانے کا امر کریں جیسا اوپر مذکور ہوا تو بتلائیں آپ اسکو رغبت کی صورت سے کھاویں گے یا بلا رغبت کھاویں گے بالکل ظاہر ہے کہ غایت درجہ کی رغبت کا اظہار کرکے کھائیں گے اور رغبت اور پسندیدگی کے اظہار کیلئے اسکو اور جلدی جلدی اور عجلت کیساتھ کھائیں گے

۱۱۷ بس یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاکل اکلا ذریعا اگر کوئی جاہل کہے کہ یہ عجلت متانت کے خلاف ہے تو ہو مگر عشق کے خلاف تو نہیں حضور کو حق تعالیٰ کا مشاہدہ تھا اسلئے ایسی صورت سے کھاتے تھے کہ بے رغبتی کی صورت ظاہر نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ بڑے کے مشاہدہ کیوقت تکبر نہیں رہتا اسلئے ایسے افعال ہی پیدا نہیں ہوتے جو تکبر پر دال ہوں چاہے کھانا کھانے میں ہو یا مجلس میں جگہ دینے میں۔ بعض آدمیوں میں تکبر ایسا نمایاں ہوتا ہے کہ ذرا سی بات بھی کسی کی نہیں سن سکتے چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں تو بالغ تھا نا بالغ نہیں اور مجھے نماز پڑھانے کا اتفاق ہوا تو داہنی طرف آدمی کم تھے۔ میں نے ایک صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ داہنی طرف آدمی کم ہیں آپ اس طرف آجائیں تو وہ صاحب بائیں طرف اخیر میں کھڑے تھے اسی طرح کھڑے رہے میں نے ان کے پاس والے سے کہا کہ بھائی ان کی تو شان گھٹتی ہے تم ہی اس طرف آجاؤ یہ سنکر وہ بیحد غصہ ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم کبھی اس مسجد میں نہ آوینگے ہماری بےحرمتی ہوتی ہے اسوقت میرا بچپن کا زمانہ تھا اور بچپنے میں تیزی ہوتی ہی ہے اسلئے یہ تیز جملہ منہ سے نکل گیا اب اسوقت تو ایسی بات کبھی نہ کہوں) میں نے کہا مسجد بھی آپکی محتاج نہیں چنانچہ وہ حضرت فوراً جوتے اٹھا اور چلتے ہوئے تو بعضے لوگوں کی یہاں تک حالت ہے کہ غصہ تو مجبیرا ور انکار و تکبر مسجد میں آنے سے اور بعضے دعا

میں خدا سے تکبر کرتے ہیں چنانچہ ہمارے یہاں کا واقعہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک لڑکا ہے بہت نیک نماز روزہ کا پابند مگر اسکے اقارب کو شریعت کی طرف توجہ نہیں چنانچہ ایک مرتبہ اسی کا چچا کہتا ہے کہ یہ لڑکا جو نماز پڑھ کر ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا ہے اسکے گھر میں کیا گھاٹا ہے جو خدا تعالیٰ سے مانگتا ہے۔ نعوذ باللہ عجب بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہ تو جگہ جگہ عبادت کا امر فرماویں۔ اور یہ لوگ عبادت کرنے سے جسمیں دعا بھی بڑی فرد ہے عار اور تکبر کریں غرض یہ تکبر تمام مرض ہے ہمارے جو اندر گھسا ہوا ہے اس آیت میں اس کا بھی علاج کیا گیا ہے اور اس کی بھی اصلاح کی گئی ہے۔ اب تو آپ کا وہ شبہ زائل ہو گیا کہ یہ مضمون تو معمولی ہے نہ ارکان میں سے ہے نہ فرائض میں سے پھر اس کا اتنا اہتمام کیوں کیا گیا۔ پس اب تو واضح ہو گیا کہ اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس میں ایک بڑی ضروری تعلیم ہے کیونکہ بعد تامل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاص اہتمام سے تکبر کا علاج کیا گیا ہے جو منشا ہے آداب مجالس پر عمل نہ کرنے کا اور بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کرنے کا پھر جب اصل اور جڑ خرابی کی جاتی رہے گی یعنی تکبر کا علاج ہو جائے گا اور اسکے علاج سے گناہ متروک ہو جاوینگے تو اب اعمال کے کرنے سے ارتفاع موانع
کے سبب ان کا اصلی ثمرہ ضرور مرتب ہوگا۔ یہ حقیقت ہے اس تعلیم کی اسکو معمولی نہ سمجھو۔ اگر کوئی صاحب کہیں ۱۱۸
کہ صدر مجلس کے کہنے پر عمل کرنے کو ازالہ تکبر میں کیا دخل ہے ہم نے تو ایکبار ایسا کیا مگر کچھ بھی اثر نہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو ایک بار عمل کرنا بھی بیکار نہیں مگر ایک بار میں معتد بہ اثر کا ظہور نہیں ہوتا لیکن اگر آپ بار بار اسپر عمل کریں گے تو خود ہی اثر معلوم ہو جائیگا دیکھو ایک جگہ پانی کا قطرہ ٹپکتا ہے تو اسوقت تو اس سے کچھ محسوس نہیں ہوتا لیکن اگر اسی طرح ٹپکتا رہے تو دس برس میں اس پانی کے قطرہ ہی سے غار ہو جاویگا اور ظاہر ہے کہ اس اثر میں جس طرح مجموعہ من حیث المجموع کو دخل ہے اسی طرح ہر ہر قطرہ کا بھی دخل ہے اسی طرح ہر امر شرعی پر ایکمرتبہ عمل کرنا بھی ضرور تصفیہ باطن میں اثر رکھتا ہے گو کمال اثر کی علت تامہ نہ سہی اسکے لئے ضرورت ہے تکرار و دوام کی یہانتک ایک جزو کا بیان تمام ہو گیا جو آداب مجالس کے بارہ میں ہے اور اس جزو کیواسطے رسالہ آداب المعاشرت کا مطالعہ کافی نافع ہے اب میں بقیہ اجزاء کو بیان کرنا چاہتا ہوں یہ تمہید میں مذکور ہوا ہے کہ آیت میں دو عمل اور دو ثمرے بیان کئے گئے ہیں عمل اول تفسح فی المجالس اور اسکا ثمرہ یفسح اللہ لکم اور یہ عمل مع ثمرہ کے بیان ہو چکا اور عمل ثانی انشزوا جسپر ثمرہ رفع درجات کو مرتب فرمایا ہے اور نشوز کا امتثال

چونکہ واقع میں تفسح فی المجالس سے ارفع ہے کیونکہ اس میں انقیاد کا زیادہ اظہار ہے جو نفس کو زیادہ
شاق ہے اسلئے اس پر ثمرہ بھی ارفع یعنی رفع درجات کا مرتب فرمایا غالباً یہ امر بیان سے رہ گیا کہ
فافسحوا اور فانشزوا عام ہے خواہ جوارح سے ہو یا قلب سے یعنی جسوقت مجلس میں تفسح کا حکم ہو کشادگی
کردے اور جب مجلس سے اٹھایا جائے اٹھ جائے اور جب تک اس حکم کی نوبت نہ آوے تو اسکے لئے
دل سے آمادہ رہے اور اس آمادگی سے قلب میں زیادہ وسعت ہوگی اصلاح اخلاق کیلئے کیونکہ
حالت قلب کی زیادہ قابل اعتبار ہے مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

صورت رفعت بود افلاک را ۔۔۔ معنی رفعت روان پاک را

اور حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آسمان ہاست در ولایت جاں ۔۔۔ کار فرمائے آسمان جہاں ،
119 در رہ روح پست و بالا ہاست ۔۔۔ کوہہائے بلند و صحرا ہاست

صوفیہ کرام نے روح ہی کا زیادہ اعتبار کیا ہے اور یہ احکام حسیہ میں بھی امطرد ہے دیکھئے ایک
شخص تو روزمیہ کا مزدور ہے اور ایک شخص رئیس ہے مگر اسپر پھانسی کا مقدمہ قائم ہوگیا اسوقت
اگر پوچھا جائے کہ ان دونوں میں کون آرام سے ہے تو کوئی نہ کہے گا کہ یہ غنی اس مزدور سے زیادہ
آرام میں ہے بلکہ وہ غنی تمنا کریگا کہ کاش یہ مزدوری میں ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس آرام
کا مدار روح پر ہے یا کہ جسم پر اگر جسم کی راحت کو راحت کہئے تو غنی سے مفلس کسی حال میں اچھا نہ ہوتا
پس یقیناً یہی امر منقح ہوا کہ آرام اور راحت روح کی معتبر ہے نہ کہ جسم کی اس حکمت کیلئے حق سبحانہ تعالیٰ شانہ
کا یہ ارشاد ہے یفسح اللہ لکم اور فانشزوا یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت ظاہر و باطن
سب کے لئے شامل رکھا گیا اب اس مضمون ضمنی کے بعد یرفع اللہ الذین آمنو کا بیان کرتا ہوں کہ یہاں
حکم رفع درجات اولاً عام مومنین کیلئے ثابت فرمایا پھر تخصیصاً اہل علم کیلئے اس کا حکم کیا اور صرف
یرفع اللہ الذین آمنو منکم پر اکتفا نہیں فرمایا گو وہ اہل علم کو بھی شامل ہو جاتا سو ایسا کرنے سے مقصود
اہل علم کی فضیلت کا ثابت کرنا ہے اور راز اسکا یہ ہے کہ ایک عمل تو عوام کا ہے کہ بوجہ بہت سے
حقائق نہ جاننے کے وہ اس عمل کے پورے حقوق ادا نہیں کر سکتے اور ایک عمل اہل علم کا ہے وہ
اسکے زیادہ حقوق ادا کر سکتے ہیں پس اس عارض کے وجہ سے ان دونوں عمل میں ضرور فرق ہوگا

ضعیف وقوی ہونے کا اور کامل وناقص ہونے کا جب دونوں کے اعمال میں فرق ہوا اور اہل علم
کا عمل قوی اور کامل ہو اہل علم کو اہل علم پر ضرور فضیلت ہوگی اسی وجہ سے اہل علم کو جدا کر کے بیان کیا اور یہ
ظاہر ہے کہ اہل علم اور عوام میں جو یہ فرق ہوا اسکا مدار بجز علم کے اور کوئی شے نہیں۔ لہذا علم ہی
ایسی چیز ہوئی جس سے اہل علم کو فضیلت ہوئی پھر جب علم مقبول اور محبوب ہوا تو اہل علم بھی
ضرور محبوب اور مقبول ہوں گے اور قاعدہ ہے کہ محبوب کو غیر محبوب سے زیادہ دیتے ہیں اسلئے
اہل علم کو زیادہ اجر ملے گا اب میں اس راز کا بھی راز بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک ثمرہ تو نفس عمل پر مرتب
ہوتا ہے اور ایک اس کی خصوصیت پر مثلاً دو شخصوں سے ایک مضمون لکھوایئے جن میں سے ایک تو
محض مضمون لکھدے اور ایک منشی ذی فہم ہو کہ اسکو سمجھے بھی اور خوشنویسی سے زیب وزینت کے
ساتھ لکھے بھی تو ظاہر ہے کہ جو ثمرہ لکھائی کا اس منشی کو ملیگا وہ ہرگز پہلے شخص کو نہیں ملیگا تو یہ زیادتی
نفس عمل پر نہیں ہوئی بلکہ اسکے تحسین وتکمیل پر اسپر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک معمار تھا وہ تعمیر کرتے
ہوئے نقش ونگار اور نزاکت وصفائی ستھرائی میں مستغرق تھا اسپر ہمارے ماموں صاحب نے
۱۲۰ کہا کہ میاں کیوں وقت ضائع کر رہے ہو بس چنائی کردو وہ معمار بولا کہ منشی جی جب آپ لکھتے ہیں اس
حالت پر قیاس کرلیں کہ اسوقت آپ کیسے مرکز اور باریک اور موٹے خطوط کے تناسب اور ہر حرف
کی اور ہر شد مد کی مقدار کا اہتمام کرتے ہیں آخر آپ ایسے کیوں وقت ضائع کرتے ہیں نفس کتابت پر
کیوں نہیں اکتفا کرتے۔ ماموں صاحب لاجواب ہوگئے۔ تو جب محسوسات میں یہ بات ظاہر ہے کہ تکمیل کے
بعد جو قدر ہے وہ قبل تکمیل نہیں ہوتی۔ اور تکمیل ہوتی ہے اسکے فن داں سے کیونکہ بدون فن دانی
کے کام کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی پس تکمیل موقوف ہوئی علم پر اور جب کسی عمل میں تکمیل ہوگی
تو وہ عمل افضل ہوگا اور اس عمل کے ثمرات بھی افضل ہوں گے پس اس وجہ سے اہل علم کے
عمل پر ثمرات بھی عوام کے ثمرات سے زیادہ مرتب ہوں گے حضرت حاجی صاحب رحمۃ علیہ
فرمایا کرتے تھے کہ عارف کی نماز غیر عارف کی لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔ اسپر کہ تکمیل موقوف
ہے علم پر مجھے ایک حکایت یاد آئی حضرت حاجی صاحبؒ کے ایک خلیفہ تھے ایکمرتبہ انہوں نے قصداً
اہتمام کر کے نہایت خضوع وخشوع سے نماز پڑھی اور نماز پڑھکر مراقب ہو کر عالم مثال کی طرف
اس کی صورت دیکھنے کیلئے متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ نہایت حسین جمیل صورت ہے جو سر سے پیر تک

زیوروں میں لدی ہوئی تھی مگر آنکھوں سے اندھی یہ واقعہ حضرت حاجی صاحب سے بیان کیا
حضرت نے معاً سنتے ہی فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آنکھیں بند کرکے نماز پڑھی ہوگی عرض کیا
جی ہاں حضرت نے فرمایا یہی وجہ ہے کہ اندھی نظر پڑی حضرت کا فہم عجیب غریب تھا فرمانے لگے کہ
آنکھ کا بند کرنا خطرات سے بچنے کیلئے گو جائز ہے لیکن یہ زیادہ اچھا ہے کہ آنکھیں کھلی رہیں گو لاکھوں
خطرات آتے رہیں کیونکہ نماز میں آنکھیں کشادہ رہنا موافق سنت کے ہے اور بند کرنا خلافِ سنت ہے
یہ فرق ہے عارف اور غیر عارف میں جسکا مدار وہی علم کا ہونا نہ ہونا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عارف کی ایک
رکعت غیر عارف کی لاکھ رکعت سے افضل ہے اب تو معلوم ہوگیا کہ یہ وجہ ہے علم کی رفعت کی دوسری
ایک وجہ یہ ہے کہ اعمال کا ثمرہ علم ہی کی وجہ سے ملتا ہے کیونکہ وہ موقوف ہیں علم پر تو جو موقوف
پر ثمرہ ملتا ہے وہ بلحاظ موقوف علیہ کے ملتا ہے کیونکہ اس کے بدون موقوف کا وجود ہی نہیں
ہو سکتا پس عمل کا اجر بھی علم ہی پر موقوف ہوا پس عقلاً بھی علم کی فضیلت ثابت ہوگئی اور اسی سے ۱۲۱
علماء کیلئے زیادت اجر کا ملنا عقلاً معلوم ہوگیا اب میں نو تعلیم یافتہ جماعت کی ایک غلطی پر متنبہ
کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شریعت میں جو علم کی فضیلت وارد ہے اس میں علم سائنس وعلم معاش
وغیرہ داخل نہیں بلکہ علم احکام مراد ہے جو قرآن وحدیث وفقہ میں منحصر ہے اور بعض احادیث
و نصوص میں جو علم کا لفظ مطلق وارد ہوا ہے تو اس مطلق سے یہ مقید ہی مراد ہے اس سے ایسا
عموم سمجھنا جس میں سائنس وغیرہ سب داخل ہو جائیں ایسا ہے جیسا کوئی شخص کہے کہ تعلیم
حاصل کرو اور اس کا یہ مطلب بیان کیا جائے کہ پاخانہ کمانا بھی سیکھو ہرچند کہ گو اٹھانا بھی واقع
میں علم کا ایک شعبہ ہے مگر عرفاً تعلیم حاصل کرنے سے ہرگز ہرگز کوئی شخص یہ نہ سمجھیگا کہ گو اٹھانیکی
بھی تعلیم مراد ہے پس اسی طرح قرآن وحدیث میں جو علم کی فضیلت مذکور ہوئی ہے اس علم میں سائنس
وغیرہ ہرگز داخل نہیں بلکہ یہ علم تو بمقابلہ علم احکام کے علم جہل ہے دیکھئے قرآن مجید میں حق تعالے نے
[illegible] تو تقدیم ہوا فرمایا اس سے انکا اہل علم ہونا ظاہر فرمایا ہے اور اس کے بعد
[illegible] فرمایا ہے جس میں انہیں سے علم کی نفی فرماتے ہیں تو یہاں نفی علم سے مراد علم مع العمل
کی نفی ہے [illegible] معلوم ہوا کہ شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے وہاں علم سے وہ علم مراد ہے جسکو
عمل [illegible] لازم ہو بلکہ اس کے ساتھ عمل موجود بھی ہو پس بتلائیے کہ سائنس کو عمل شرعی میں کیا دخل ہے

جواسکو اطلاقات شرع میں داخل کیا جائے۔ اس دعوے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے
ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درہما ولکن ورثوا العلم پس اس سے روز روشن کی طرح ظاہر
اور واضح ہوگیا کہ شریعت میں علم سے مراد علم دینار اور درہم نہیں حالانکہ حق تعالی نے بعض انبیاء
علیہم السلام کو علوم ذرائع کسب بھی عطا فرمائے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ انکو علم سے تعبیر
فرمایا اور نہ ان میں وراثت جاری ہوئی کہ جو کسب ایک نبی کو عطا فرمایا تھا وہ وراثۃً انکی اولاد میں چلا ہو
جب یہ امر منقح اور منطے ہوگیا کہ علم سے مراد ایسے ذرائع وطرق کسب بھی نہیں جو بعض انبیاء کو عطا فرمائے
گئے تھے جیسا داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانا سکھلایا اور ان کے ہاتھ میں لوہے کو موم بنا دیا گیا والنا لہ الحدید
ع در کف داؤد آہن یا موم شد۔ اور اس قسم کے کسب اور انبیاء علیہم السلام کو بھی عطا فرمائے گئے
تھے چنانچہ زکریا علیہم السلام نجار تھے نیز بعض انبیاء کے لئے ہوا کو مسخر فرما دیا مگر ان سب امور میں
سے انبیاءؑ کسی امر کے لئے مبعوث نہیں ہوئے اور نہ انبیاء کی وراثت بجز علم شرعی کے اور
کسی چیز میں جاری ہوئی سو جب یہ مفید علوم بھی نصوص فضیلت میں داخل نہیں تو پھر سائنس
۱۴۲ اور جغرافیہ جو طرق کسب میں سے بھی نہیں علوم انبیاء میں کیونکر داخل ہوسکتے ہیں پس معلوم ہوا کہ
انبیاءؑ کے کلام میں علم سے مراد علم نبوت ہے نہ کہ علم کسب اور نہ علم طبعیات وغیرہ۔ الغرض اس ذی
فضیلت علم سے دین کا علم مراد ہے اور اہل علم کی فضیلت اسی علم کی وجہ سے ہے اب ان فضائل کے
بعد چونکہ یہاں علماء کے ناز کا موقع تھا کہ ہم اہل علم ہیں اور ہمارا عمل عوام سے بڑھا ہوا ہے تو ان لوگوں
کی تنبیہ کیلئے فرماتے ہیں واللہ بما تعملون خبیر ای علیم ببواطن الامور یعنی خدا تعالی کو عمل کے ساتھ باطن کی
بھی خبر ہے۔ وہ سب کے باطن کو بھی دیکھ رہے ہیں کہ کس میں اخلاص ہے اور کس میں نہیں محض علم پر
ناز نہ کرنا کیونکہ یہ علم تو شیطان اور بلعم باعور کو بھی حاصل تھا شیطان بقول مشہور معلم ملائکہ بھی تھا اور
بلعم باعور اپنی قوم کا واعظ بھی تھا اور دونوں شخص علم کے ساتھ عمل ظاہر کے بھی جامع تھے بڑے عابد
اور جفاکش مجاہدہ کرنیوالے تھے مگر ان کے باطن میں اخلاص اور خدا تعالی کی محبت ومعرفت پوری نہ تھی
اسلئے یہ علم وعمل سب بیکار ہوگیا پس عمل کیساتھ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوئی جسکا نام حال باطنی
ہے بدون حال کے علم وعمل قابل اعتبار نہیں اور یہ حال کتب بینی سے حاصل نہیں ہوتا یہ کسی صاحب
حال کی جوتیاں سیدھی کرنے سے نصیب ہوتا ہے۔ غرض اس جگہ آیت میں باختلاف وجوہ دلالت

تین چیزیں مذکور ہوئیں علم و عمل و حال اور ان تینوں کی تحصیل ضروری ٹھہری اور اگر محض علم و عمل حاصل ہوگیا مگر حال نہ ہو تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے واللہ بالعملون خبیر جیسا قریب ہی مذکور ہوا یعنی خدا باطن کو بھی دیکھتے ہیں۔ نرے ظاہری علم و عمل کو نہیں دیکھتے عارف رومیؒ فرماتے ہیں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را | ما درون را بنگریم و حال را

اور فرماتے ہیں ؎

ناظر قلبیم اگر خاشع بود | گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود

حق سبحانہ تعالیٰ زیادہ دل کو دیکھتے ہیں۔ ہم لوگ ظاہر میں پارسا اور مقدس سے بنے ہوئے ہیں مگر باطن میں یہ حالت ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل | و اندروں قہر خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید | وز درونت ننگ میدارد یزید

۱۲۴ اور محض علم کے ناکافی ہونے کو ایک دوسرے حکیم بیان فرماتے ہیں ؎

علم رسمی سر بسر قیل ست و قال | نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

یعنی اگر اسپر اکتفا کیا تو سوائے قیل و قال کے کچھ نہیں محض اس سے حال حاصل نہیں ہوتا ہاں اگر اس کے بعد کسی صاحب حال کو لپٹ جائے تو پھر یہ علم رسمی بہت کارآمد ہے جاہل صوفی سے عالم صوفی افضل ہوتا ہے آگے علم حقیقی کو بتلاتے ہیں ؎

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت | زنگ گمراہی ز دل بزدایدت

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند | خوف و خشیت در دلت افزوں کند

تو ندانی جز بجوز د لا بجوز | خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

اسی مضمون پر مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک نحوی کو دریا کا سفر پیش آیا علم نحو سے زیادہ دلچسپی تھی حاشیہ عبدالرحمٰن و عبدالغفور و عصام از بر تھا۔ جاہلوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ جب کشتی میں بیٹھے مطمئن ہو کر ملاح سے دریافت فرماتے ہیں کہ میاں تم نے نحو بھی پڑھی ہے اس نے کہا نہیں صاحب میں نے نحو نہیں پڑھی۔ فرمانے لگے کہ تو نے اپنی آدھی عمر

یونہی کھوئی وہ بیچارہ یہ سنکر غمزدہ ہوکر خاموش ہوگیا اتفاق سے کشتی بھنور میں پڑگئی اب اس ملاح کا موقع آیا دریافت کیا کہ مولوی صاحب آپ نے تیرنا بھی سیکھا ہے فرمانے لگے نہیں تو ملاح نے جواب دیا کہ جناب نے اپنی ساری ہی عمر کھوئی کیونکہ یہ کشتی اس بھنور میں ڈوبتی ہے ؎

محوی باید نہ نحو اینجا بداں ۔ گر تو محوی بے خطر در آب راں ۔

افسوس ہم نے قال ہی پر کفایت کی حال نہ حاصل کیا صاحبو! اگر ہم مرنے لگیں تو کیا یہی جی چاہیگا کہ اسی قال پر خاتمہ ہوجائے جس پر ہم اسوقت ہیں ہرگز نہیں مگر پھر بھی یہ حالت ہے کہ اگر آجکل کسی کے میرزاہد اور حدیث کے اسباق میں تعارض ہوجاوے تو حدیث کے سبق کو چھوڑدیں گے مگر میرزاہد نہ چھوڑے گا لیکن مرتے ہوے اس میرزاہد کی حقیقت معلوم ہوگی اسوقت بزبان حال یوں کہیں گے

؎ ایہا القوم الذی فی المدرسہ ۔ کل ما حصلتموہ وسوسہ

علم نبود غیر علم عاشقی ۔ ما بقی تلبیس ابلیس شقی

میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا آپ کا یہی دل چاہتا ہے کہ موت کے وقت صدرا کی مثناۃ بالتکریر کی تقریر زبان سے نکلے ہرگز نہیں پس معلوم ہوا کہ یہ علم ضروری نہیں بلکہ زاید از ضرورت ہے۔ ہذا قاعدہ مسلمہ الضروری تیقدر بقدر الضرورۃ پر عمل فرماکر غیر مقصود میں اس قدر غلو نہ کیجئے ۔ یہ مسلم کہ پائخانہ ایک ضروری شئے مگر آدمی بقدر ضرورت ہی پاتخانہ میں رہتا ہے یہ نہیں کہ پائخانہ کے ساتھ دلبستگی اور شیفتگی ہوجائے اسی طرح جب فلسفہ وغیرہ محض آلات ہیں اور علوم دینیہ کے لئے مقدمات کے درجہ میں ان کی ضرورت ہے نہ مقصودیت کے درجہ میں تو بقدر ضرورت ہی ان کا اکتساب اور شغل کیجئے البتہ منطق بہت ضروری اور مفید ہے مگر رفع ضرورت کیلئے منطق میں قطبی ہی تک سمجھکر پڑھ لو تو بہت ہے ملاحسن اور حمداللہ کی بھی کیا ضرورت ایک رسالہ بھی ... کافی ہے جل بسیط و مرکب منطق کا مسئلہ نہیں بلکہ فلسفہ کا مسئلہ ہے مگر اس کی بحث خواہ مخواہ ... در کتب منطقیہ میں موجود ہے اسی طرح اور بہت سے مسائل فلسفہ کے کتب منطقیہ میں ... لکھے ہیں اہی کیلئے مدرسین اور طلبہ بہت سے رسالے پڑھتے پڑھاتے ہیں حالانکہ فلسفہ ضرورت سے زیادہ ہے ... آجکل اکثر طلبہ کے خطوط میرے پاس منطق و فلسفہ کے عدم فہم کی شکایت کے آتے ہیں ... چھوڑدو قرآن و حدیث پڑھو۔ مگر اس زمانہ میں حدیث و قرآن سے

بہت ہی کم تعلق ہے معقولات سے دلچسپی زیادہ ہے اسلئے وہ درسیات سے فارغ ہوکر ایسے
مولوی بنتے ہیں کہ ؎

مولوی گشتی ندآگہ نیستی خود کجا تو از کجا و کیستی

غرض مکلفین میں تین قسم کے لوگ تھے حق تعالیٰ نے ہر ایک کو اسکے حالت کے مطابق اس آیت
میں نصیحت فرمائی ہے ہر ایک کو اسکی حالت کے مطابق ضروری امر کی رغبت دلائی ۔ جاہلوں کو
علم کی رغبت دلائی ہے اور اہل علم کو عمل کی اور عالم باعمل کو حال کی جیسا کہ توضیحات سے واضح
ہوچکاہے اور حال وہ چیز ہے کہ بدون اسکے کوئی عمل کامل نہیں ہوسکتا بدون حال کے عمل کی
ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کو آدمی ٹھیلتے ہوں آخر کب تک ٹھیلیں گے اور کیا اسی طرح منزل
مقصود تک پہونچ سکتے ہیں بہت مشکل ہے اور ہر وقت خطرہ ہے کہ بیچ میں ہی تھک کر چھوڑ
دیں ہمنے بہت لوگوں کو دیکھا ہے جو اعمال کے بہت پابند تھے مگر حال سے خالی تھے کہ انہوں نے
۱۲۵ مرض الموت میں نماز چھوڑ دی جسکا سبب یہی تھا کہ حال سے محروم تھے اور حال کے ساتھ عمل
کی ایسی مثال ہے جیسے انجن میں اسٹیم بھرا ہوا ہو کہ بہت جلد گاڑی کو منزل پر پہونچا دیتا ہے
اور اس میں یہ خطرہ نادر ہے کہ بیچ ہی میں گاڑیوں کو چھوڑ دے اسی کو کہتے ہیں کہ ؎

تسبیح و خرقہ لذت مستی نہ بخشدت ہمت دریں عمل طلب از مے فروش کن

صاحبو عمل کی ہمت مستی حال سے ہی پیدا ہوتی ہے اسکو حاصل کرو بحمد اللہ اب بھی ایسے ساقی
موجود ہیں جنکے یہاں شراب محبت فروخت ہوتی ہے جسکی قیمت صرف طلب ہے طلب کی پونجی
لیجاؤ اور جتنی چاہو شراب خریدلو مگر طلب کے یہ معنی ہیں کہ تم اپنے کو اسکے سپرد کردو کہ وہ جو چاہے
تمہارے اندر تصرف کرے اور جس طرح چاہے آزمائے کیونکہ اس شراب کے پینے کے لئے کچھ شرائط ہیں
ان شرائط کے بعد ہی پلائی جاتی ہے بغیر ان کے ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا اور بدون شراب محبت پئے
ہوئے حال پیدا نہیں ہوسکتا بعض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہمیں کچھ کرنا نہ پڑے بس ایک چھو سے
مستی پیدا ہوجاوے یہ غلط خیال ہے کہ اگر کوئی شخص شراب خانہ میں جاکر خمار سے یوں کہے کہ ایک
پھونک مار کر اور چھو کر کے مجھے اس طرح کی شراب دیدے جس سے بدون پئے ہی مجھے مستی پیدا
ہوجائے اور کسی قسم کی تلخی بھی نہ معلوم ہو یقین ہے کہ ساقی یہی جواب دے گا کہ مستی پیدا کرنے کی صورت

تو یہی ہے کہ دام خرچ کرو اور شراب پیؤ اور میری چھوپی ہے کہ اسے پی جاؤ۔ پھر حیرت ہے کہ ظاہری مستی تو جو ایک معمولی چیز ہے بدون کچھ خرچ کئے کو بغیر تپے حاصل نہ ہو سکے اور باطنی مستی جسکے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی گرد ہے ایک چھو سے حاصل ہو جاوے اور تمہیں کچھ نہ کرنا پڑے آجکل بعض لوگ شیوخ کاملین کے پاس جاتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہم کو کسی قسم کی محنت اور مشقت برداشت نہ کرنا پڑے بلا محنت و کلفت کے مقصود حاصل ہو جاوے ایسے لوگوں کو طلب کا نام لینے ہی کی کیا ضرورت ہے جب وہ تلخی شراب کا بھی تحمل نہیں کر سکتے ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن   از چنیں شیر ژیاں پس دم مزن

مثنوی میں ایک حکایت پر مولانا نے یہ شعر فرمایا ہے کہ ایک شخص اپنا بدن گودوانے چلا اور گودنے والے سے جاکر کہا کہ میرے شانہ پر شیر کی تصویر بنا دے تاکہ لڑائیوں میں بہادر رہوں اور شجاعت کا مجھ میں اثر رہے۔ اس نے اسکے کہنے کے مطابق ایک مقام پر سوئی چبھوئی تو آپ سے
۱۲۶ سوئی کی تکلیف برداشت نہ ہو سکی شور و غل مچانا شروع کیا اور اس سے سوال کیا کہ میاں کیا عضو بناتے ہو اس نے جواب دیا کہ دم بنا رہا ہوں فرمانے لگے کہ بے دم کا بھی شیر ہوتا ہے دم کو چھوڑ دو یہ لنڈورا ہی سہی اس نے دوسری جگہ سے گودنا شروع کیا اس دفعہ آپ نے پہلی مرتبہ سے بھی زیادہ شور مچایا اور پوچھا کہ اب کونسا حصہ بنتا ہے اس نے جواب دیا کہ کان تو آپ فرمانے لگے کہ کانوں کو بھی جانے دو بوچا ہی سہی کیونکہ شیر کا وجود کانوں پر موقوف نہیں۔ اس نے وہ جگہ چھوڑ کر تیسری جگہ سوئی چبوئی کہ بدستور سابق دریافت کیا کہ اب کیا بنا رہا ہے اس نے کہا۔ پیٹ آپ فرماتے ہیں کہ تصویر کو پیٹ کی کیا حاجت ہے اسے کوئی کھانا پینا تو نہیں ہے اس نے جھلا کر سوئی زمین پر ٹپکدی اور کہنے لگا کہ ؎

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید   ایں چنیں شیرے خدا ہم نا فرید

کہ ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا۔ میں کس طرح بناؤں پھر مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن   از چنیں شیرے ژیاں پس دم مزن

حافظ فرماتے ہیں ؎

یا مکن با پیلبانان دوستی   یا بنا کن خانہ بر انداز پیل

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی یا فروشو جامہ تقوی بہ نیل

میاں جس جماعت میں شامل ہونا چاہو پہلے اپنے کو اس جماعت جیسا بنالو پھر شرکت کا نام لینا کیونکہ ہر جماعت کی شان جدا ہے۔ مسخروں کی جماعت ڈھول دھپ کے لئے ہے اس میں شریک ہونا چاہو تو ڈھول کھانے کو تیار رہو جاؤ۔ اور مولویوں کی جماعت میں مسائل کی تحقیق ہوتی ہے اس میں شریک ہونا چاہو تو علمی باتوں کی قابلیت پیدا کرلو۔ اور اہل حال کی جماعت حالات اور واردات کے لئے ہے اس میں داخل ہونا چاہو تو نفس کو پامال کرنے کے لئے آمادہ رہو ۔

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی

پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

غرض اگر ایسے لوگوں کی مجالس میں جانے کا قصد ہو تو پہلے اپنے ارادہ کو بالکل چھوڑ دیجئے اور کالمیت فی ید الغسال ہو کر ان کی خدمات میں جائیے وہ لوگ طبیب ہیں اور طبیب کبھی مسہل ۱۴۷
بھی دیتا ہے گو تلخ ضرور ہوتا ہے مگر چونکہ وہ مواد فاسد کو دور کر دے گا اس لئے اس کا پینا عقلاً ثقیل اور دشوار نہیں معلوم ہوتا ایسے ہی یہ لوگ بھی طبیب روحانی ہیں جو شخص واقعی طالب صحت ہو کر ان کے پاس جائے گا وہ کبھی مسہل سے ناک منہ نہ چڑھائے گا خیال تو کرو اگر ایک شخص نے ایک مٹکے میں ڈھیلا گوبر لگا ہوا پھینک دیا تو اب اس میں یہی کرنا پڑے گا کہ گوبر مع پانی کے نکال دیا جاوے گا اور صاف کر کے پھر نیا پانی بھرا جاویگا اسی طرح اگر کوئی شخص رذائل نفس سے ملوث ہو کر شیوخ کے پاس جائے گا تو وہ بھی اس کو دھوئیں اور مانجیں گے اور اچھی طرح صاف کریں گے پھر اسکے بعد میٹھا پانی بھریں گے۔ مگر آجکل ناپاک پانی کے صاف کرنے کا تو لوگوں کو خیال نہیں اور پہلے ہی دن نیا پانی بھرنا چاہتے ہیں بس تسبیح و زہد وغیرہ پر نظر ہے حالانکہ نیا پانی اسی وقت صاف اور ستھرا رہے تا جبکہ نکما اور میلا پانی پہلے صاف کر دیا جاوے لہذا اخلاق ردیہ کو پیشتر صاف کرنے کی حاجت ہوگی اور اسکے ساتھ ہی ان مضر علوم کو بھی رخصت کرنا پڑے گا جو آپ کے دماغ میں مکدر پانی کی طرح بھر رہے ہیں اسکے بعد پھر صاف اور عمدہ پانی آوے گا۔ یہ ہے طریقہ کامیابی کا اس مجموعہ کے متعلق یہ ارشادات ہیں ۔

قال را بگذار مرد حال شو　　پیش مرد کاملے پامال شو

تسبیح و خرقہ لذت مستی نہ بخشدت　　ہمت دریں عمل طلب مے فروش کن

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست　　کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

مگر ان سب تدبیروں کے بعد بڑی شرط یہ ہے کہ طالب ہو اور عاشق ہو اور اس طرح سے چین ہو کر طلب میں اس کا یہ ورد ہو سہ

اے بادشہ خوباں داد از غم تنہائی　　دل بے تو بجاں آمد وقت است کہ باز آئی

اے درد توام درمان در بستر ناکامی　　وے یاد توام مونس در گوشۂ تنہائی

جب طلب میں اسقدر پریشانی ہوگی اسوقت مربی روحانی اور طبیب باطن یہ کہے گا کہ سہ

من غم تو میخورم تو غم مخور　　بر تو من مشفق ترم از صد پدر

اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے واللہ بما تعملون خبیر سے یعنی جب تمہاری یہ حالت ہوگی ہم کو بھی خبر ہوگی اور تم پر لطف فرماویں گے۔ غرض آیت مذکورۃ الصدر میں جیسا کہ تقریر کی گئی علم و ۱۲۸
عمل و حال تینوں کی طرف اشارہ ہے اور بقدر ضرورت بحمد اللہ تینوں کا بیان بھی ہوگیا جو عمل کے لئے کافی وافی ہے اور چونکہ میرے مواعظ اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں اسلئے مواعظ کے نام بھی رکھدیے جاتے ہیں تو اس وعظ کا بھی نام رکھنا مناسب ہے چنانچہ میں اس بیان کا نام علو العباد من علوم الرشاد رکھتا ہوں جس میں نام مبارک استادی جناب مولانا عبد العلی صاحب کی طرف بھی اشارہ ہے جو اصل آمر ہیں اس بیان کے اور نیز اس میں مضمون آیت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں بیان ہے علو درجات عبادت کا۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو علم و عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور قال کے ساتھ حال بھی نصیب ہو۔ آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

اشرف علی

آغاز جے سنہ ۱۳۵۵ھ

التبلیغ کا وعظ

مسمی بہ

شرط التذکر

این	کب	کم	کیف	من ضبط	المستمعون	الاشتات
[illegible]	شب جمعہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	متفرقات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	قدیم وضع کے حضرات زیادہ تھے

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدی اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین ۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ انما یتذکر اولوا الالباب یہ سورہ زمر کی ایک آیت کا حصہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے دو ضروری امر بیان فرمائے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ان کا طریقہ تحصیل بھی بتلا دیا تاکہ تحصیل میں سہولت ہو جاوے ۔ (اس طریق تحصیل کی تقریر وعظ ہذا کے تین ربع کے بعد آتی ہے جہاں اس آیت کی طرف عود کیا گیا ہے) اور منشاء اس کا شفقت ہے کیونکہ اصلاح کرنے والے کے ذمہ طریقہ تحصیل کا بتلانا ضروری نہیں ہے مثلاً حکیم کا منصب نسخہ لکھنا ہے اور یہ حکیم کے ذمہ نہیں کہ مریض کو نسخہ ملنے کی جگہ اور اس جگہ تک پہونچنے کا طریقہ بتلا دے ۔ یہ مریض یا تیماردار کا فرض ہے کہ اس کو تلاش کرے اور جس طرح ہو سکے دوا لاوے بس اگر حاکم ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ فقط حکم بیان فرما دیتے تو اس کا بجا لانا بندہ پر فرض ہونا چاہیئے خواہ آسانی سے کرے خواہ بدقت لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نہایت شفیق بھی ہیں اسلئے احکام بجا لانے کی آسان آسان تدبیریں بھی ارشاد فرما دیتے ہیں جس سے مخاطب کی ہمت بڑھ جاتی ہے جیسا کہ شفیق استاد بھی ایسا کرتے ہیں کہ طلبہ کو آسان آسان تدبیریں حفظ مضامین

کی تبلادیتے ہیں، جلالین دو مصنفوں کی تصنیف ہے اور دونوں کا نام جلال الدین ہے اسلئے طلبہ کو یاد نہیں رہتا کہ نصف اول کس کا ہے اور دوسرا کسکا تو میں نے بعض طلبہ کو یہ ترکیب تبلائی کہ ایک نصف تو سیوطی کا ہے اور ایک محلی کا اور سیوطی کے اول میں سین ہے اور محلی کے اول میں میم ترتیب حروف میں سین مقدم ہے اور مقدم والے کا حصہ مقدم اور میم موخر والے کا حصہ موخر ہے پس مقدم مقدم کے لئے ہے اور موخر موخر کیلئے تو یہ سہیل ناشی شفقت سے ہے جب مخلوق میں یہ شفقت ہے حق تعالیٰ میں تو کس قدر شفقت ہوگی کیونکہ مخلوق جو شفقت کرتی ہے وہ اپنے ذاتی مصالح دنیویہ یا اخرویہ کی وجہ سے کرتی ہے اور حق تعالیٰ اس سے مستغنی ہے نہ مخلوق کی وجہ سے ان کی ذات پاک کو کوئی نفع پہونچ سکتا ہے نہ نقصان وہ لم یزل ولا یزال ہے فرماتے ہیں ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم ۔ بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

پس خدا تعالیٰ کی شفقت نہایت ہی کامل درجہ کی ہوگی مگر تعجب ہے کہ ہم لوگ مخلوق کا تو احسان مانتے ہیں جنہیں خود ان کی بھی غرض ہوتی ہے اور احسانات خداوندی کا خیال بھی نہیں کرتے نعوذ باللہ گویا یوں سمجھتے ہیں کہ وہ تو خدا کے ذمہ تھا کیونکہ احسان جب مانا جاتا ہے کہ کسی نے انعام دیا ہو اور جب قرض ادا کیا ہو تو احسان کی کیا بات ہے حالانکہ حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے کہ جب کوئی تمہارا قرضہ بھی ادا کرے تو اسکو دعا دیا کرو اور راز اس میں یہ ہے کہ قرض کی خاصیت ہے کہ جب کوئی حاجت پیش آتی ہے تو اپنا دیا ہوا قرض یاد آتا ہے کہ ہائے وہ روپے ہوتے تو اسوقت کام آتے حتی کہ اگر پچاس مواقع پر روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے تو پچاس ہی مرتبہ ان روپوں کا خیال آتا ہے حالانکہ وہ فقط ایک ہی جگہ کام آتے مگر طبعی بات ہے کہ قرض بار بار یاد آتا ہے اور ہر بار تکلیف ہوتی ہے اسیوجہ سے قرض دینے کا ثواب بھی زیادہ ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ صدقہ کا دس حصہ ثواب ملتا ہے اور قرضہ کا اٹھارہ حصہ کیونکہ قرض عادۃً وہی لیتا ہے جسکو ضرورت ہو اور خیرات تو بلا ضرورت بھی لے لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ ضرورت میں دینے کا زیادہ ثواب ہے تو اس شخص نے اس کی تکلیف تو رفع کی اور خود تکلیف اٹھائی اور دوسرے کو اس کی تکلیف رفع کرکے وہی شخص نفع پہونچا سکتا ہے جو خود تکلیف اٹھا دے اسلئے قرض کا ثواب صدقہ

زیادہ ہے اور گو صدقہ دینے میں بھی کچھ نہ کچھ نفس کو تکلیف ہوتی ہے مگر تھوڑی ہی دیر کیلئے یہ خیال کرکے کہ روپے جیب سے نکل گئے مگر پھر یکسوئی ہوگئی اور قرض میں تو بار بار یاد آنیکی سخت تکلیف ہوتی ہے بس قرضہ دینے میں زیادہ اجر ہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ صدقہ خیرات بند کر دیا جاوے۔ کیونکہ حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں جیسا کہ ماں بہن کی محبت اور قسم کی ہے اور بیوی کی محبت اور طرح کی ہے پس اسی طرح صدقہ کا اجر ایک حیثیت سے زیادہ ہے اور قرض کی فضیلت دوسری حیثیت سے غرض جب قرضدار نے قرضہ ادا کیا تو قرض خواہ کو اس نے انتظار کی تکلیف سے نجات دیدی اسواسطے حدیث میں تعلیم دی گئی ہے کہ قرض ادا کرنے والیکو دعا دیا کرو چنانچہ طبعاً بھی ادا کرنے والے کا ممنون ہوتا ہے غرض مخلوق کا احسان تو ادائے قرض کیوقت بھی مانتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کو نعوذ باللہ ایسا قرضدار سمجھتے ہیں کہ گویا اس سے قرض وصول کرنے میں ہم نے خود احسان کیا کہ وصول کر لیا اگر کوئی کسی کو ایک وقت عمدہ کھانا کھلا دے تو یاد رہتا ہے کہ اس نے کھانا کھلایا تھا اور تعریف کرتے رہتے ہیں لیکن خدا کی کبھی ایسی یاد نہیں آتی جسکی بے شمار نعمتیں ہم کو رات دن ملتی رہتی ہیں ۱۴۱
بس یوں سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ ہم نے ہی یہ سب کچھ کمایا ہے خدا کا اس میں کیا دخل ہے یہ خیال نہیں کرتے کہ ہاتھ اسی نے دئے اور سب سامان وہی مہیا کرتا ہے درحقیقت ہر چیز ملک تو خدا ہی کی ہے جیسا کہ ہل چلانے سے اناج پیدا ہوتا ہے لیکن اناج ہل کی ملکیت میں نہیں سمجھا جاتا بلکہ انسان کو مالک قرار دیا جاتا ہے اسی طرح ہم درحقیقت اس قابل نہیں کہ ہماری طرف کوئی شئے بروئے ملک منسوب کی جاوے بلکہ اپنے کو ہل کی طرح سمجھنا چاہیئے یہ خدا کا انعام ہے کہ اسنے ہماری طرف محض نام کی ملک کو منسوب کرکے ہمیں مالک قرار دیدیا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ؎

فی الحقیقت مالک ہر شئے خداست   ایں امانت چند روزہ نزد ماست

دیکھو اگر کوئی ہمیں سامان دیدے تو ہم آیا سامان کا احسان مانتے ہیں یا کہ سامان دینے والے کا بس ہر شئے اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے وما بکم من نعمۃ فمن اللہ ہمارا فقط نام ہی نام ہے ورنہ حقیقت میں ہمارا دخل ہی کیا چنانچہ میں کہتا ہوں تم نے غلہ بونے میں کتنا کام کیا بس یہ کیا کہ جا کر جنگل میں غلہ بکھیر دیا گھر میں سے نکال کر باہر پھینک آئے پھر پانی دیکر اور بھی برباد ہونیکا کام کر دیا کہ جلدی گل گلا کر خراب ہوجاوے تم نے غلہ پیدا ہونیکا کونسا کافی انتظام کیا یہ شاخ کس نے نکالی اور ڈھیلوں

کے اندر سے اور پرلانیکی کیا کوشش کی کیا تم نے ڈھیلے میں سوراخ کیا تھا آفتاب کو حرکت کون دیتا ہے
بارش کس کے قبضہ میں ہے اور طرح طرح کی آفتوں سے کون محفوظ رکھتا ہے سب کچھ خدا ہی کرتا ہے
انسان کچھ بھی نہیں کرسکتا اور جو کچھ تھوڑا بہت برائے نام کرتا بھی ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت
سے کرتا ہے اور اس مثال سے کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ کاشتکار ہی خدا کے محتاج ہیں جیسا کہ
بیان کیا گیا اور نوکری پیشہ والے محتاج نہیں ہیں اسکو بھی سن لیجیے کہ اول تو ان کا وجود اور اعضا
سب خدا ہی کے عنایت کئے ہوئے ہیں اور نیز جسکے تم ملازم ہو اس سے وہی دلواتا ہے کیونکہ اسکے
دل میں تمہارے ملازم رکھ لینے کا خیال خدا ہی نے پیدا کیا بیسیوں آدمی ملازمت کی درخواست
کسی کسی سے کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ جب تک دوسرے کے دل میں خیال نہیں ڈالتے تو کوئی درخواست
بھی منظور نہیں ہوتی پھر ہر مہینے تنخواہ دینے کو نیت بھی حق تعالیٰ ہی نے پیدا کیا۔ اگر وہ نہ دیوے
تم کیا کرلو اور اگر نالش کرو تو سب میں نالش کی ہمت کہاں اور اگر حاکم تمہارے خلاف فیصلہ کر دے
تو پھر کیا زور لگا سکتے ہو غرض ہماری کوشش پر نتیجہ کا مرتب ہونا اور خود ہمیں کوشش کی توفیق
ہونا نیز یہ سب خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے اسی طرح ایجادات میں سمجھ لو کہ تمہارا کام صرف دماغ
سے سوچنا تھا مگر دماغ میں بات کا آجانا یہ تو اختیاری نہیں اگر اختیاری ہے تو اتنی دیر تک کیوں
سوچتے رہے اگر قبضہ میں تھا تو فوراً ہی دماغ میں لے آتے پھر ایجاد میں اتنا عرصہ کیوں لگاتے
پھر ایجاد کی حقیقت ہے ترکیب و تحلیل اسکے سوا موجد کیا کرسکتا ہے اگر اس نے کئی چیزوں کو ملا ہی
دیا مگر آخر وہ مفردات کہاں سے آئے اور ان کی جداگانہ تاثیرات پھر مرکب ہونے کی بعد نئی تاثیر
کس نے پیدا کی بہر حال ہر کام میں خدا کی قدرت کا اقرار کرنا لازمی ہے بس ہمارا نام کرنیکو بندہ کی طرف
نسبت کی اجازت دی ہے مگر اس کی اجازت نہیں دی کہ خدا کو بالکل بھول ہی جاؤ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقان ... مصلحت را تہمتے بر آہوے چین بستہ اند

ارشاد ہے افرأیتم ما تحرثون ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون - کیا پیدا وار تم کرتے ہو یا ہم لو نشاء
لجعلنه حطاما اگر ہم چاہیں تو سب کو فنا کر ڈالیں بنا بنایا کھیت برباد کردیں اور تم جو دعویٰ کرتے ہو
آبپاشی کا کنوؤں سے اور نہروں سے ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون کیا بادل میں سے
تم پانی برساتے ہو یا ہم اور اگر دیا سلائی رگڑ کر آگ لگا دی تو یہ بتلاؤ کہ اس میں یہ خاصیت

کس نے رکھی - ایک ملحد کا قصہ ہے کہ اس نے تبارک الذی کی یہ آیت سنی قل ارأیتم ان اصبح ماؤکم غوراً فمن یاتیکم بماء معین - اگر ہم پانی کو زمین کی گہرائی میں اتار دیں تو تم پانی کہاں سے لاؤ اس مغرور نے کہا ناتی بہ المعول والمعین کہ ہم پھاوڑے اور مزدوروں کے ذریعہ سے کھود کر نکال لیں گے آخر کہیں تو نکلیگا - حق تعالیٰ گو بہت رحیم ہیں اور اس حلم ہی سے بیہودہ اور بے عقل لوگوں کی جراءت بڑھ جاتی ہے ورنہ عقلمند تو اور زیادہ شرماتے ہیں لیکن جب کوئی حد سے گذر جائے تو اسکو کبھی فوراً سزا بھی دیدیتے ہیں ؎

حلم حق با تو مواساہا کند	چونکہ از حد بگذری رسوا کند

اس گستاخ کو رات کو خواب میں آواز آئی ذھبنا بماء عینیک فات بہ بالمعول والمعین یعنی ہم نے تیری آنکھوں کا پانی خشک کر دیا اب تو پھاوڑے اور مزدوروں کے ذریعہ سے ذرا اسکو تو نکال لے صبح جو اٹھا تو اندھا تھا اگر وہ کمبخت اسوقت بھی استغفار کرتا تو خدا رحمت کرتا وہ بڑے رحیم ہیں - چنانچہ جب قارون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائی - دراصل وہ زکوٰۃ کی وجہ سے مخالف ہو گیا تھا کہنے لگا کہ یہ مال تو میں نے اپنی تدابیر سے جمع کیا ہے کسی کا اس میں کیا حق بنا رمخاصمت تو یہ تھی - لیکن کمبخت نے دشمنی میں یہ حرکت کی کہ ایک فاحشہ عورت کو کچھ روپیہ دیکر آمادہ کیا کہ بھرے مجمع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگا دے ایک دفعہ حضرت موسیٰ نے وعظ میں زنا سے ممانعت فرمائی اور توراۃ کا حکم سنایا کہ جو کوئی زنا کریگا ہم اسکو رجم کریں گے - قارون نے کہا کہ یہ حکم عام ہے یا خاص جواب میں فرمایا عام ہے قارون نے کہا فلاں عورت سے دریافت کیجئے کیا کہتی ہے آپ نے اسکو بلایا اس نے کہا اس کمبخت نے مجھکو سکھایا تھا کہ تو حضرت پر تہمت لگا نا اب توبہ کرتی ہوں حضرت موسیٰ ؑ نے قارون پر بد دعا کی ارشاد ہوا کہ میں نے زمین کو آپ کے قبضہ میں کر دیا آپ نے حکم دیا یا ارض خذیہ فوراً زمین نے پکڑ لیا اور وہ نیچے اترنے لگا اور آپ بار بار یہی فرماتے تھے آخر غرق ہو گیا مخالفوں نے کہا کہ اس کا مال لینے کے واسطے غرق کر دیا آپنے زمین کو حکم دیا کہ اس کا مال بھی لیلے تو ساتھ میں مال بھی غرق ہو گیا - اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ علیہ السلام قارون تم کو پکارتا رہا اگر وہ مجھکو پکارتا تو اسپر رحم ہو جاتا - صاحبو یہ اسکی عنایت ہے کہ ہم کو بدون ہماری دعا ہی کے محفوظ کر رکھا ہے ورنہ ہم بھی ایسے ہی گناہ

کرتے ہیں جنکے باعث غرق ہونے کے قابل ہیں ہم بھی قارون کی طرح بدلالت قال نہیں مگر بدلالت حال یہی سمجھتے ہیں کہ یہ مال و دولت سب ہم نے خود جمع کیا ہے خدا کا اسمیں کیا دخل نعوذ باللہ حالانکہ سب کام وہی کرتا ہے ہر شے اسی کی ملک ہے انسان کا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور پیشتر یہ بھی عرض کرچکا ہوں کہ یہ شفقت ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ بلا اپنی کسی غرض کے ہمارا کام کردیتے ہیں پھر ہم جب مخلوق کا احسان ملنتے ہیں جو کہ سب کاموں میں اپنے اغراض کا بھی محتاج ہے تو خدا کی عنایات علیہ میں غور کرکے تو اسپر جان قربان کردینی چاہیے ان بیشمار عنایات میں سے ایک بڑی عنایت یہ ہے کہ حق تعالیٰ احکام کی بجاآوری کے آسان ہوجانیکا طریقہ بھی تعلیم فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ اسی کی رعایت سے سورہ بقرہ کے پہلے موقع پر ارشاد فرمایا یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی الاٰیۃ ان کو جب ایمان لانیکا حکم دیا تو ساتھ ہی اپنی نعمتیں یاد دلائیں تاکہ نعمت کو یاد کرکے توفیق ایمان ہو پھر یا بنی اسرائیل والے موقع پر اصلاح کی سہولت کے اور طریقے بھی بتلائے جسکی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ان بنی اسرائیل میں دو مرض تھے حب مال اور حب جاہ انکو جہلاء سے آمدنی بہت تھی وہ ڈرتے تھے کہ ایمان لے آویں گے تو یہ نذرانے ملنے بند ہوجاوینگے کیونکہ عوام کا اعتقاد تو جہالت ہی پر مبنی ہے ورنہ ان کا اعتقاد سب گاؤ خورد ہوجاتا ہے چنانچہ گنگوہ کے ایک پیر صاحب حج کو جاتے تھے انہوں نے بعض اہل علم کے اثر سے بدعات ترک کردی تھیں جب وہ بمبئی پہونچے تو وہاں کے سیٹھ جو ان کے مرید تھے پاؤں پر گرنے لگے انہوں نے منع کیا تو وہ لوگ کہنے لگے کہ پیری بگڑ گئے اب بھی یہ بات بکثرت دیکھی جاتی ہے کہ بہت لوگ بوجہ حب جاہ و مال کے حق کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ جس طرح ان تابعین سے نذرانے وصول ہوں وہی بات کہتے ہیں یہی بنی اسرائیل کے علماء خیال کرتے تھے کہ آج تو ہم سردار ہیں پھر غلام ہوجاوینگے اور غلام کو کون پوچھتا ہے۔ ارے تمکو خبر نہیں ہے یہ غلامی وہ ہے جس پر ہزار سلطنتیں قربان ہیں دیکھ لیجئے اب بھی جو غلام ہیں کیا وہ بھوکے یا ذلیل ہیں یہ ان کی بیوقوفی تھی حق تعالیٰ نے اس کا علاج فرمایا اور کیا عجیب علاج ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ مال یا جاہ کی محبت چھوڑ دو کیونکہ خلاف طبع ہونے کے سبب اول تو اس کا سننا ہی گراں تھا ابتدأً یہ دشوار بھی ہے بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ زکوٰۃ دیا کرو اور نماز پڑھا کرو زکوٰۃ سے مال کی محبت کم ہوجاویگی اور نماز سے عاجزی پیدا ہوجاویگی حب جاہ نہ رہے گی۔ دیکھئے کیسی سہل تدبیر

تیلادی اور اسی تسہیل کی تکمیل کیلئے ارشاد ہوتا ہے یا ایہا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصٰبرین یعنی اے مومنو صبر اور نماز کے ساتھ مدد چاہو۔ استعینوا خود بتلا رہا ہے کہ اسمیں کسی کام کو آسان کرنے کی تعلیم ہے تب ہی تو استعانت کی حاجت ہوئی اور اس سہولت کی توجیہ یہ ہے کہ نماز سے خدا تعالیٰ کی عظمت بڑھ جاویگی اور اپنی عظمت یعنی حب جاہ نکل جاویگی آگے نماز میں خود ایک دشواری تھی اسلئے صبر کی تعلیم دی اس کا دخل نماز کی سہولت میں اس طرح ہے کہ نماز میں فعل ہے اور صبر میں ترک ہے یعنی کچھ کرنا نہیں پڑتا اور ترک آسان ہے فعل سے جیسا کہ روزہ رکھنا آسان ہے کیونکہ عادۃً ہر وقت بھوک کی طرف التفات نہیں رہتا کسی کام میں لگ کر بھوک کو بھول جاتے ہیں اور نماز میں افعال اور توجہ کا مقید ہونا پڑتا ہے تو وہ زیادہ گراں ہے اسکو آسان کرنے کیلئے صبر کی تعلیم دی جو سہل ہے اور صبر کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے قلب میں یکسوئی کی عادت پیدا ہوتی ہے اور یکسوئی سے نماز کی گرانی دفع ہو جاتی ہے کیونکہ قیود صلوٰۃ کی گرانی کا سبب قلب کی حرکت فکریہ ہی ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی خیال کی طرف چلتا رہتا ہے اسکو مقید کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور جب یکسوئی کے رسوخ سے یہ حرکت منقطع ہوگئی تو نماز آسان ہوگئی پھر صبر گو بہ نسبت عبادات وجودیہ کے سہل تھا لیکن تاہم اپنی ذات میں کسی قدر دشواری سے خالی نہ تھا اسلئے ایک دوسرے مقام پر صبر کو آسان کرنے کے لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے جب انسان اسکو سوچیگا تو ناگوار امور میں صبر کرنا آسان ہو جاویگا و نیز صبر جس طرح بواسطہ نماز کے حب جاہ کا علاج ہے اسی طرح وہ حب مال کا بھی علاج ہے اس طرح سے کہ جب صبر کی عادت ہو جاویگی تو مال کی ضرورت بھی کم ہو جاویگی کیونکہ مال کی ضرورت تو لذات کیلئے زیادہ ہوتی ہے جب صبر سے لذات پر قابو ہوگا تو زیادہ مال کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ پھر نماز کی تسہیل کی ایک اور تدبیر فرمائی جسکی ساتھ مکلف کے جذبات کو کسی قدر تسلیم بھی کر لیا کیونکہ فطرۃً اس تسلیم سے بھی سہولت بڑھ جاتی ہے اسکی تقریر یہ ہے کہ نماز کو جو انسان دشوار سمجھتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا رد نہیں فرمایا بلکہ انہا لکبیرۃ میں ارشاد فرما دیا کہ بیشک نماز مشکل ہے مگر اسکو سہل کرنے کیواسطے ایک استثنا بھی فرمایا الا علی الخاشعین یعنی سب کو مشکل نہیں جسکو خشوع کی صفت حاصل ہے اسکو دشوار نہیں خشوع کہتے ہیں قلب وجوارح کے سکون کو یعنی تمام حرکات کو بند کر دینا جب اس

سکون کی عادت ہو جاویگی تو نماز آسان ہو جاویگی اور یہ ترکیب تبلا کر پھر بھی شفقت سے کام لیا
ضابطہ سے کام نہیں لیا یعنی آگے الذین یظنون میں خشوع کو آسان کرنے کے لئے ایک مراقبہ بتا
کہ خدا سے ملنے کا خیال رکھو اور اس مراقبہ کو دو وجہ سے حصول خشوع میں دخل ہے ایک تو یہ کہ
جب خدا سے ملنے کا اعتقاد تازہ ہوگا تو وعدہ وعید یاد آجاویں گے جیسا کہ ملازم خیال کیا کرتا ہے
کہ اگر نوکری کا کام پورا کر دیا تو تنخواہ ملیگی اور ایسا نہ ہوا تو محرومی ہوگی یا سزا ملیگی یہ تو عاقلانہ حکمت ہے
اور دوسری وجہ عاشقانہ ہے وہ یہ کہ ہر شئے کو مرکز پر پہونچکر سکون ہو جاتا ہے چنانچہ ڈھیلا
پھینکو تو زمین پر آتا ہے اور یہ توجہ الی المرکز کرتا ہے اور جب تک خاص نقطہ پر نہ پہونچے اسوقت
تک تقاضائے حرکت باقی رہتا ہے اور مرکز پر پہونچکر جنبش نہیں کرتا اب قلب کا مرکز دیکھنا چاہیئے
کہ کیا ہے قاعدہ یہ ہے کہ ہر شئے کو اسکے مقصود کے حصول سے سکون ہوتا ہے۔ پھر مقاصد بھی
مختلف ہیں ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی۔ غیر حقیقی میں گو سکون ہوتا ہے مگر وہ عارضی ہوتا ہے
مثلاً بیٹے سے ملاقات ہوئی تو سکون واطمینان حاصل ہوا مگر کسی عزیز کے انتقال کی خبر سے
وہ سکون عارضی زائل ہو گیا اور سکون تام مقصود حقیقی پر پہونچکر ہو سکتا ہے اور مقصود حقیقی
حق تعالیٰ ہیں پس سکون کامل حق تعالیٰ تک پہونچنے ہی پر حاصل ہو سکتا ہے اب یہ سمجھو کہ ان تک
پہونچنے کے کیا معنی وہ جسم تو ہے نہیں کہ جسم چل کر جسم سے جا ملے اس کا طریق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ
کی طرف توجہ تام ہو جاوے پس یہ توجہ تام قلب کا مرکز پر پہونچ جانا ہے جب مرکز پہنچ جاویگا
تو سکون تام حاصل ہوگا اور توجہ تام کا مبدا خدا کے ملنے کا اعتقاد ہے اس سے توجہ الی اللہ ہوگی
اور سیر الی اللہ یہی ہے پھر اس سے سیر فی اللہ کا سلسلہ شروع ہو جاویگا پس تمام مقصود کیسے آسانی سے
ختم ہو گیا اس سے زیادہ کوئی آسانی کا طریق نہیں غرض حق تعالیٰ ہمیشہ ہر حکم کے ساتھ طریق تحصیل و
تسہیل بھی تبلا دیا کرتے ہیں۔ اسیطرح اس آیت انما یتذکر اولوا الالباب میں دو چیزوں کا امر
ہے اپنے عنوان سے کہ طریق عمل بھی ساتھ ساتھ مذکور ہے اور وہ دو چیزیں یہ ہیں علم اور عمل
اور اپنے قاعدہ میں ہر ایک کو دوسرے کی طرف احتیاج ہے چنانچہ علم عمل کیلئے شرط ہوتا ہے اور
بدون ... کے عمل بیکار ہوتا ہے تو دونوں چیزوں کی حاجت ہوئی اور یہ کوئی دین ہی کے ساتھ خاص نہیں
ہر مقصود دنیا میں ان ہی دونوں کا دخل ہے۔ مثلاً تجارت میں خسارہ ہوتا ہے یا بوجہ عدم علم کے

یا بوجہ عدم عمل کے مثلاً ہمارے وطن میں ایک نے تجارت کی تھی چاولوں کی اور گھر والوں کو حکم دیدیا
کہ خوب کھایا کرو یا گنگوہ میں ایک شخص نے کپڑے کی تجارت کی تھی اور جو عمدہ تھان آتا اس میں
گھر والوں کے جوڑے بنتے ایسے لوگوں کو ضرور خسارہ ہوگا کیونکہ یہ تجارت کے اصول کے
خلاف تھا بلکہ تجارت کے اصول کا تو حاصل یہ ہے کہ کوئی شئے گھر میں بھی بلا قیمت کے نجاد
خلاصہ یہ کہ کوئی کام بلا اصول کے نہیں ہوتا اور اصول کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے
ایک یہ کہ اصول کا علم ہو اور دوسرے یہ کہ اسپر عمل ہو اگر علم نہوا تو عمل ہو نہیں سکتا اور عمل
نکیا تو علم کا نفع ہی نہیں ہوتا پس ہر مقصود کے لئے ان دو چیزوں کی ضرورت مسلم ہوگئی اب
جاننے کہ مقصود دو ہیں ایک دین ایک دنیا اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا اصل مقصود دین ہے۔
قرآن شریف دین ہی سکھلانے کو آیا ہے دنیا کی گو اجازت ہے مگر اس کی ترکیب تبلانا قرآن کا
منصب نہیں کیونکہ دنیا تو تجربہ سے بھی سمجھ میں آسکتی ہے لیکن یہ خدا کی عنایت ہے کہ اس کے
۱۴ے اصول بھی اللہ تعالیٰ ہی نے ابتدائے عمارت ارض میں تعلیم فرما دیئے تھے یہ ان کا احسان ہے
کیونکہ عقل گو اسکے لئے کافی تھی مگر آسانی سے کافی نہوتی جیسا کہ قابیل اپنے بھائی ہابیل کی لاش
لئے پھرتا رہا کہ ابا جان دیکھکر خفا ہو جاویں گے خدا نے رحم کیا ایک کوا بھیجا اس نے سکھایا کہ لاش
لاش کو زمین میں دفن کر دے۔ غرض ایسے اصول بذریعہ الہام یا وحی کے بتلا دئے تھے بعض
انبیاء ابتداء میں اصول معاش ہی کی تعلیم کیلئے مبعوث ہوئے تھے مگر اب اس تعلیم کی ضرورت نہیں
رہی کیونکہ خوشنویس شاگرد کو کل دنیا بھر کے الفاظ نہیں سکھایا کرتا بلکہ چند الفاظ کی مشق کرانے سے
سب الفاظ آجاتے ہیں ایسا ہی دنیا کی ترکیبیں شریعت محمدیہ نے نہیں بتلائیں کیونکہ شریعت اسلامیہ
سے پہلے دوسرے انبیاء اسکی تعلیم اصولاً دے چکے ہیں بس وہ تعلیم فروع کے لئے کافی ہوگئی پس اب
جو بعضے لوگ کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں ہر شئی کی تدبیر تلاش کرنا چاہیئے یہ ان کی سخت غلطی ہے کیونکہ
قرآن طب روحانی ہے اور ظاہر ہے کہ طب اکبر میں موچی کا پیشہ نہیں ملیگا اور جو شخص اس میں اس قسم کی
ترکیبوں کو تلاش کرے اسکے دماغ میں خلل ہے علی ہذا سب جانتے ہیں کہ مرض افلاس کا نسخہ طب اکبر
میں نہیں ملیگا البتہ طب اکبر میں یہ ضرور ملیگا کہ جوتا پاؤں میں کاٹ لے تو فلاں مرہم مفید ہے۔ اسی طرح
حصول دنیا کی ترکیبیں قرآن میں نہ ملیں گی ہاں دنیا سے جو ضرر ہوتا ہے اس کا مرہم قرآن میں مذکور ہے

اس میں احکام کی حیثیت سے دنیا کا ذکر ہے اصول دنیاوی ہونے کی حیثیت سے دنیا کی تعلیم نہیں
البتہ باوجود اس میں دنیوی تعلیم نہ ہونیکے تجربہ سے ثابت ہے کہ ان دینی اصول پر عمل کرنیوالا دنیا میں
بھی کامیاب ہوتا ہے۔ بانسمنڈی کانپور میں ایک دکاندار تھا وہ اپنے بانسوں میں عیب ظاہر کردیا کرتا
تھا اور اس کے مقابلہ میں دوسرے دوکاندار اپنے مال کی تعریف کیا کرتے تھے اسلئے اس غریب کا مال کم
بکتا تھا لیکن تھوڑے ہی کچھ دنوں میں سب لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ یہ سچ بولتا ہے اور دوسرے جھوٹی
تعریفیں کرتے ہیں اسلئے سب دوکانیں پھیکی پڑ گئیں اور اس کی دوکان خوب چلنے لگی جس سے دنیا
بھی حاصل ہوگئی اور دین بھی نہ بگڑا غرض دین پر چلنے سے تبعاً دنیا کا بھی فائدہ ہوتا ہے مگر قرآن و حدیث
میں دین کی تعلیم اس دنیوی منفعت کی حیثیت سے نہیں مثلاً یہ تعلیم نہیں سفر حج میں بمبئی کی سیر
ہوجاتی ہے اسلئے حج فرض کیا گیا ہے گو ہم کو اس کا موقع حاصل تھا کہ حج کی حکمت میں یہ بیان کرتے کہ
اس سے تجربہ اور سیر بھی حاصل ہوتی ہے مگر ہم اس کو بے ادبی سمجھتے ہیں بلکہ یہ احکام اسواسطے
تبلائے گئے ہیں کہ عذاب سے بچ جنت میں پہونچ گو قرآن پر عمل کرنے سے دنیا کی فلاح بھی خود بخود بھی ۱۴۸
حاصل ہوجاتی ہے مگر مقصود نہیں اسی طرح دین کے خلاف کرنے سے دنیوی فلاح میں بھی کمی ہوجاتی
ہے جس میں راز یہ ہے کہ کسی کو خزانہ حاصل کرنا ہو تو اسکو خزانہ والے سے موافقت کرنا لازم ہے کیا
کوئی کہہ سکتا ہے کہ صاحب خزانہ سے دشمنی کرکے خزانہ ملے گا ہر گز نہیں پس خزائن دنیا خدا کے ہاتھ
میں ہیں یہ بھی ان کو راضی کرکے ہی مل سکتے ہیں مگر آجکل یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ شریعت پر عمل کرنے
سے افلاس ہوتا ہے۔ صاحبو! یہ تبلاؤ کہ جب سب چیزیں خدا کے قبضہ میں ہیں تو کیا اسکو ناراض
کرکے کچھ مل سکتا ہے۔ کاکڑ یا منعف اپنے دوست کی پرورش کریگا یا دشمن کی شاید کوئی کہے
کہ دلائل تو صحیح ہیں مگر مشاہدہ اسکے خلاف ہے حضرات آپنے دنیا کی حقیقت نہیں سمجھی اور اپنے اس
معشوق کو بھی نہیں پہچانا آپ کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص ایک عورت کا عمدہ لباس دیکھکر
اسکے پیچھے ہو لیا جب پاس جاکر دیکھا تو بڑھیا تھی اور بدصورت بقول شخصے ؎

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد　　　چوں باز کنی مادر مادر باشد

میں بقسم کہتا ہوں کہ طالبان دنیا کو دنیا کی حقیقت نہیں معلوم فقط نام سنکر فریفتہ ہیں اسکا
خلاصہ کسی نے خوب کہا ہے ؎

عارفے خواب رفت درفکرے دید دنیا بصورت بکرے
کرد از وے سوال کاے دلبر بکرچونی باین ہمہ شوہر
گفت یک حرف باتوگویم راست کہ مراہرکہ بود مرد نہ خواست
وانکہ نامرد بود خواست مرا زاں بکارت ہمیں بجاست مرا

خاصہ یہ کہ جو لوگ دنیا حاصل کرتے ہیں انکو حاصل نہیں اور جنکو حاصل ہے وہ منہ بھی نہیں لگاتے اسلئے دنیا ابھی تک کنواری ہے جسکی بکارت زائل نہیں ہوئی دوسرے بزرگ نے اس کی حقیقت اجمالی اس طرح ظاہر کی ہے ؎

حال دنیا بپرسیدم من از فرزانہ گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانۂ
بازگفتم حال آنکس گوکہ دل دروی بہبست گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانۂ

لوگ دنیا اسکو سمجھتے ہیں کہ اسباب بہت ہو بیوی بچے ہوں اگر یہی بات ہے تو امراء کو کبھی تشویش نہ ہوتی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اوروں سے زیادہ پریشان ہیں تو یہ خاک دنیا ہے صاحبو! اگر کسی رئیس ۱۱۷۹
کو پھانسی کا حکم ہو جاوے اور احباب کو اسکی ملاقات کی اجازت مل گئی ہو اور سب اس کی ہمدردی کرتے ہوں اور ہر قسم کی راحت پہونچاتے ہوں خدمت و اطاعت کرتے ہوں تو یہاں ہر طرح کا سامان عیش کا موجود ہے مگر دل کو دیکھئے تو افسردہ ہے اگر اسوقت اسکے سامنے کوئی باجا بجانے لگے تو اسے کیا بھلا معلوم ہو گا پس اگر یہ اسباب فی الواقع اسباب نشاط ہیں تو پھر اسے نشاط کیوں نہیں پس معلوم ہوا کہ دنیا کی حقیقت یہ سامان نہیں بلکہ اس کی روح چین اور راحت ہے اور چین و راحت واللہ ایک چیز کے سوا کسی شئے میں نہیں اور یہ دعوی قرآن شریف سے تو ثابت ہے ہی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب تقدیم معمول عامل پر حصر کیلئے ہوتی ہے معنی یہ ہوے سنو اللہ ہی کے ذکر سے قلوب اطمینان پاتے ہیں اس ترکیب سے صاف معلوم ہوا کہ اسکے سوا کوئی چین کی چیز نہیں مگر مشاہدہ سے بھی یہ دعوی ثابت ہے اور مشاہدہ سے زیادہ کون شئے قاطع نزاع ہوگی ایک شخص مینارہ پر کھڑا ہوا سورج کو غروب ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے اور لوگ نیچے کھڑے ہوے گھڑیاں دیکھکر کہتے ہوں کہ ابھی غروب کا وقت نہیں ہوا آیا اسوقت یہ گھڑیوں کو صحیح کہے گا یا اپنے مشاہدہ کو ٹھیک سمجھے گا یقیناً یہی کہے گا کہ مجھکو گھڑی کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح جو لوگ مشاہدہ

بررہتے ہیں اہل اللہ کے چین کا انکو ضرورت نہیں دلائل قایم کرنے کی اور اگر ان کے خلاف دلائل سنیں گے تو ان کو ہنسی آویگی اور جسکو شک ہو وہ مشاہدہ کرلے اس طرح سے کہ جنکو وہ دنیا کا مالک اور ترقی یافتہ جانتے ہیں ان کے ہمراز بنکر ان کی اندرونی حالت دریافت کریں کہ ان کو کتنے غم ہیں اور اس طرح اہل اللہ کی خدمت میں رہکر دیکھیں کہ وہ کتنے خوش ہیں انکی اکل یہ حالت پاؤگے سہ

لنگگے زیر و لنگگے بالا　　　نے غم دزد و نے غم کالا

دکانداروں کا ذکر نہیں سچے اور واقعی اہل اللہ کو تم دیکھو گے تو خدا کی قسم اور مکرر خدا کی قسم تم خود کہدو گے کہ چین میں وہی ہیں قسم کھا کر کہتا ہوں اور تم میرا اعتبار نکرو خود دیکھ لو اور وجہ اس راحت اور چین کی یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے کسی امر میں کچھ تجویز نہیں کرتے کہ فلاں کام اس طرح ہونا چاہیئے بلکہ جو کچھ بھی قضا و قدرت سے پیش آوے ہر حال میں اسپر خوش اور راضی رہتے ہیں اور کلفت کا راز یہی ہے کہ خلاف توقع کوئی بات واقع ہو اور اس سے روح کو تکلیف ہو سو جہاں توقع ہوگی وہاں ہی خلاف کا احتمال ہے جہاں یہی نہو وہاں کلفت کا کیا کام سو دنیا دار تو ہمیشہ ادھیڑ بن میں رہتے ہیں ان کی ہزاروں توقعات اور تجویزیں ہوتی ہیں اور جب ان کی شیخ چلی جیسی امیدوں کا بنا بنایا گھر گرجاتا ہے تو ان کو رنج ہوتا ہے۔ اسلئے وہ ہر وقت مصیبت اور رنج میں رہتے ہیں بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کا یہ مذہب ہوتا ہے سہ

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

وہ اپنے لئے کوئی تجویز ہی پاس نہیں کرتے نہ آئندہ کیلئے امیدیں قائم کرتے ہیں اپنے کو خدا کے حوالہ کرکے ہر حال میں ہر واقعہ کو اپنے لئے اچھا سمجھتے ہیں اسلئے ہمیشہ خوش رہتے ہیں ان کو رنج کیسا جسکو یقین نہو وہ تجربہ کرے انشاء اللہ خود بول اٹھے گا پس ان کی یہ حالت ہوتی ہے سہ

موحد چہ بر پائے ریزی زرش　　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس　　　ہمیں ست بنیاد توحید و بس

اور یہ حالت ہوتی ہے سہ

سپردم بتو مایۂ خویش را　　　تو دانی حساب کم و بیش را

حضرت بہلولؒ نے کسی عارف سے ان کا مزاج دریافت کیا انہوں نے فرمایا اس کے مزاج کو کیا پوچھنا

جس کی خواہش کے مطابق تمام دنیا کا کاروبار چلتا ہو بہلول نے دریافت کیا یہ کیسے فرمایا میں نے
اپنا ارادہ فنا کر دیا اور اللہ کی تقدیر پر راضی ہو گیا پس جسکا ارادہ ارادۂ خداوندی میں فنا ہو جاوے اور
ظاہر ہے کہ ہر کام حق تعالے کے ارادہ کے مطابق ہوتا ہے پس اسی طرح وہ اس شخص کے خواہش کے
موافق بھی ہو گا واقعی سچ ہے جو شخص دین پر پورا عمل کرتا ہے اسی کو دنیا کی چین بھی نصیب ہوتی
ہے میرے استاد علیہ الرحمۃ نے ایک حکایت بیان فرمائی تھی کہ کوئی شخص حضرت خضر کی ملاقات
کے لئے دعا کیا کرتا تھا ایک روز خضر تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا چاہتے ہو اس نے کہا ایسی
دعا کر دیجئے کہ دنیا میں مجھے کوئی غم نہ ہو فرمایا یہ دعا تو کر نہیں سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ تو دنیا میں
جس شخص کو سب سے زیادہ بے غم دیکھے اسی کی موافق تیری حالت ہونے کی دعا کر دوں تو ایسے
شخص کو منتخب کرے۔ وہ پھرتا پھرتا حیران ہو گیا اور کوئی امیر و رئیس بے غم نہ ملا آخر ایک جوہری
کو دیکھا جو صبح کو دوکان پر آتا خوبصورت خوبصورت لڑکے اسکے ساتھ ہوتے بہت سے نوکر چاکر
بھی ہمراہ آتے صبح سے شام تک خرید و فروخت کرتا اور غربا کو بہت کچھ خیرات کرتا اس نے اس کی مجموعی
حالت سے خیال کیا یہ ضرور بے غم ہو گا میں ایسا ہونیکی دعا کرا لوں پھر دل میں کہا کہ قبل دعا کرا لینے
کے اس سے تو حال دریافت کر لینا چاہیئے شاید کوئی مخفی حالت ہو چنانچہ اس سے تمام واقعہ
بیان کیا اور کہا کہ بھائی صاحب مجکو خضرؑ سے دعا کرانی ہے کہ تمہارا جیسا ہو جاؤں بتلاؤ
تو سہی تم کو تو کوئی غم نہیں ہے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کہا بھائی مجکو تو ایسا غم ہے کہ
کسی دشمن کو بھی نہ ہو اور قصہ سنایا کہ ایک بار میری بیوی جو میری بڑی ہی محبوبہ تھی سخت بیمار
ہو گئی تھی میں رونے لگا اس نے کہا روتے کیوں ہو میں مر جاؤنگی تم اور شادی کر لینا میں نے کہا
ویسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ بولی ممکن ہے ابتو تیرا ایسا ہی خیال ہو مگر پھر نہیں رہ سکتا بہت
دیکھا یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں جب اسکو کسی طرح یقین نہ آیا میں نے شدت عشق میں اپنا عضو تناسل
اس کے سامنے کاٹ ڈالا کہ اب تو یقین آ گیا۔ اتفاق سے وہ مری نہیں اچھی ہو گئی اور میں بیکار ہو گیا
اب وہ کم بخت نوکروں سے سازش رکھتی ہے اور یہ سب بچے دوسروں ہی سے ہیں اب میں دیکھتا
ہوں اور گھلتا ہوں اسنے کہا بھائی تو تو بڑے ہی گندے غم میں مبتلا ہے اللہ بچائے آخر حضرت خضر کے
پاس گیا اور سارا حال سنایا پوچھا اب کیا خیال ہے اس نے کہا بس دین کی دعا کر دیجئے غرض اہل دنیا

کی تو یہ حالت ہے بے شک چین جسکا نام ہے نہ دنیا اور نہ آخرت دونوں کا نہ بندوں ہی کو میسر ہوتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیہم ولاہم یحزنون ہ الذین آمنوا وکانو یتقون ہ لہم البشریٰ فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ط لا تبدیل لکلمٰت اللہ ط ذالک ہوالفوز العظیم۔ دیکھئے صاف ارشاد ہے کہ متقیوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں خوشخبری ہے اور پھر اس کی تاکید فرماتے ہیں لا تبدیل لکلمٰت اللہ یعنی اللہ کا کلام بدلتا نہیں ذالک ہوالفوز العظیم یعنی یہ بڑی کامیابی ہے سو یہ برکت ہے دین کی مگر پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ اس حیثیت سے ان اعمال کی تعلیم نہیں کی گئی کہ دنیا کی چین نصیب ہو بلکہ ان کی تعلیم محض دین کیلئے ہے اور عمل میں بھی خالص اطاعت خداوندی ہی کی نیت کرنا چاہئے غرض مسلمانوں کا اصلی مقصود آخرت ہے اور اس مقصود کیلئے مطابق قاعدہ عقلیہ ونقلیہ کے علم وعمل دونوں کی ضرورت ہے اور اسوقت ان دونوں میں کوتاہی ہو رہی ہے پس اس آیت میں ان ہی دونوں کا ذکر ہے اب ہر شخص دیکھ لے کہ علم وعمل دونوں میں اس سے کتنی کوتاہی ہوتی ہے اور اس سے لسانی بدنی کتنے گناہ دن رات میں ہوتے ہیں بلکہ کوتاہی علم سے بعض کا تو گناہ ہونا بھی معلوم نہیں ہوتا مثلاً متاع دنیا کی طرف نظر حرص کرنا گناہ ہے لاتمدن عینیک الیٰ ما متعنا بہ الآیۃ مگر اس کی کسی کو خبر بھی نہیں کہ یہ بھی گناہ ہے حرام تو کیا مکروہ بھی نہیں جانتے اسی طرح علمی کوتاہی کا یہ اثر ہے کہ نماز تک کے مسائل بھی معلوم نہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ تو یہ ہے کہ دین تو مختصر ہے راہ نجات کافی ہے دنیا حاصل کرنا چاہئے اور حالت یہ تھی کہ ایک صاحب نے جو نوکری پر سے اپنے وطن آئے تھے اپنے وطن اصلی میں امام مقیم کے ساتھ ظہر کی دو رکعت پڑھیں کیونکہ ایک دو روز کیلئے ملازمت سے آئے تھے اور بزعم خود مسافر تھے۔ دین کے معاملہ میں ایسے جاہل اور دنیا کے لحاظ سے پانچسو روپے کے ملازم ایک بہت بڑے شخص رہبر قوم نے جو آجکل لیڈر بنے ہوئے ہیں ایک موقع پر تیمم کیا تو آپ نے مٹی منہ میں بھر کر تھوک دی گویا مٹی سے کلی کی۔ لوگ جلدی سے ہنسنے لگے ورنہ خدا جانے آگے کیا کیا کرتے شریعت کا تو یہ حکم ہے کہ ڈھیلے وغیرہ پر بھی ہاتھ مار کر جھاڑ دے تاکہ مثلہ ہو اور ان حضرت نے مٹی سے کلی کی غرض اگر توجہ کی جاوے تو پتہ لگے کہ کن کن کوتاہیوں میں ہم مبتلا ہیں بعض بستیاں ایسی ہیں کہ وہاں ہزاروں کی آبادی ہے لیکن ایک شخص بھی مسائل سے واقف نہیں افسوس

ہر مسافر کو ضروری قانون ریلوے کا یاد ہوتا ہے اگر یاد نہ ہو تو پاس رکھتے ہیں ورنہ دریافت کرتے ہیں اسی طرح اگر فکر ہو تو ضرور علم دین بھی حاصل کریں اور میں یہ نہیں کہتا کہ متبحر عالم بن جاؤ کیونکہ دیگر امور کو معطل کرنا مقصود نہیں ہے البتہ ضروریات سے تو واقف ہونا لازم ہے اسی واسطے بعض لوگ غیبت میں مبتلا ہیں اور اسکو برا بھی جانتے ہیں لیکن جب کوئی ٹوکتا ہے تو اسی ناواقفی کی بدولت کہتے ہیں کہ ہم تو اسکے منہ پر کہدیں کوئی کہتا ہے یہ تو سچی بات ہے پھر غیبت کہاں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جب عرض کیا گیا کہ کیا سچی بات بھی غیبت ہے تو جواب میں فرمایا کہ غیبت تو وہی ہے جو سچی بات کسی کے پیچھے کہی جاوے اور اسکو بری لگتی ہو ورنہ جھوٹ بات تو بہتان ہے اسی طرح بہت آدمی تجارت کرتے ہیں یا ضروریات خریدتے ہیں مگر ناواقفی کی وجہ سے یہ پتہ نہیں کہ کس معاملہ سے سود کا گناہ ہو گیا اور کونسا معاملہ ناجائز کر رہے ہیں غضب یہ کہ بعض معاصی میں لذت و منفعت تو نظر آتی ہے جیسے رشوت مگر بعض میں تو لذت ہے نہ منفعت مفت ہی میں عذاب سر پر لیا جیسا کہ چاندی اکروپیہ کی عوض
۳۴ میں سوا تولہ خریدی تو گنہگار ہو گیا اور یہ سود ہو گیا جس کی سخت وعید آئی ہے کیونکہ مسئلہ ہے کہ چاندی سے چاندی کا تبادلہ ہو تو برابر سرابر ہونا چاہیئے اگر کوئی کہے کہ اس مسئلہ پر عمل کرنے میں تو بوجہ چاندی کے ارزاں ہونیکے ٹوٹا ہو گا یہ اعتراض بھی ناواقفیت سے پیدا ہوا کیونکہ غیر جنس سے تبادلہ کرنے میں کمی بیشی ناجائز ہے مثلاً نو روپے کی چاندی دس تولہ نو روپیہ سے تبادلہ مت کرو بلکہ غیر چاندی کا سکہ معاملہ میں شامل کر دو مثلاً یوں معاملہ کرو کہ آٹھ روپیہ نقد اور ایک روپیہ کے پیسے دیدو پھر دس تولہ کیا چاہے بیس تولہ چاندی لیلو تو گناہ سے بھی بچ جاؤ گے اور نقصان بھی کچھ نہ ہو گا اور انشاء اللہ کسی جگہ گاڑی ہرگز نہ اٹکے گی اور سنار بھی اس سے نہ گھبرائے گا چنانچہ میں ایک سنار سے زیور بنوایا کرتا تھا اس نے کہا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ ہیر پھیر کیوں کیا کرتے ہو میں نے کہا مذہبی مسئلہ ہے اور تیرا کچھ نقصان نہیں یہ سنکر اس نے کہا اب تو اس سے زیادہ مشقت ہو تب بھی آنکھوں پر اسی طرح بھوپال میں ایک ہندو صراف سے کسی مسلمان نے کوئی زیور کا معاملہ کیا جو قاعدہ فقہیہ پر منطبق نہ تھا ہندو نے کہا کہ یہ تو تمہارے مذہب میں جائز نہیں پھر اس نے طریقہ بتلایا حضرت اگر آپ شریعت پر عمل کرنے لگیں تو مخالفین خود آپ کو مدد دینے لگیں کہ یوں کر دیں یوں نہ کرو۔

یک اہل علم نے سہارنپور میں زری دار ٹوپی خریدی پانچ روپے میں اور ادھار کرنا چاہا تو
دوکاندار نے کہا مولوی صاحب چاندی کی مقدار میں تو ادھار جائز نہیں مولوی صاحب کو
جب یاد آیا اور فرمایا اچھا پھر کسی وقت دام لاکر خرید لوں گا دوکاندار نے کہا کہ کیا اسمیں ادھار کی
کوئی صورت جائز نہیں ہو سکتی انہوں نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں دوکاندار نے خود بتلایا کہ تم مجھ سے
روپیہ قرض لیکر ٹوپی کی قیمت اسوقت ادا کردو اور دوسرے وقت میرا قرض دیدینا تو بات یہ ہے کہ
اس نے گو ہدایہ نہ پڑھا تھا مگر اسکی عادت تھی کہ علماء سے دریافت کرکے عمل کیا کرتا تھا بعض لوگ عذر
کرتے ہیں کہ ہم پڑھ نہیں سکتے میں کہتا ہوں کہ پوچھنے میں کیا دقت ہے لوگوں کو وعظ کا تو شوق ہے کہ مزے
مزے کی باتیں سن لیں اور مولویوں پر اعتراض بھی ہو سکتا ہے کہ علماء وعظ میں مسائل ضرور یہ بھی بیان
کردیا کریں تو کیا حرج ہے یہ خیال میرے دل میں بھی پیدا ہوا تھا اور اسی خیال سے ایک دفعہ میں نے
سونے چاندی کے مبادلہ کے مسائل وعظ میں مفصل بیان بھی کئے تھے اور میں خوش ہوا تھا کہ آج
لوگوں کو یہ مسئلے خوب حل ہو گئے مگر تھوڑی دیر میں دو شخص جھگڑتے ہوئے میرے پاس آئے وجہ
غلطی کی یہ ہوئی کہ کئی مسئلے انہوں نے ایکدم سے سنے تھے تو خلط ہو گیا تب میری سمجھ میں آیا کہ پہلے
علماء اس مصلحت سے مسائل فقہیہ وعظ میں بیان نہیں کرتے تھے البتہ ایک شکایت اب بھی باقی ہے
یعنی مسائل دریافت کرنیکی ضرورت تو ظاہر کرنا چاہیے اب تو فقط ہنسانے رلانیکی حکایات کا نام وعظ
ہے ویسے اگر اتفاقاً کوئی واقعہ ہنسی کا ذکر میں آجائے تو دوسری بات ہے مگر قصداً ایسا کرنا تو گویا مضحکہ ہے
جیسا ایک بزرگ سے کسی نے ذکر کیا کہ فلاں جگہ شہادت نامہ پڑھا گیا ہے فرمایا سعادت نامہ پڑھتے تو
اچھا تھا کیونکہ خود بخود رنج میں رونا آجاوے تو دوسری بات ہے مگر رونے کا اہتمام کرنا اور منہ بنا بنا کر
رونا تو شرعاً جائز ہے نہ اہل عقل کے نزدیک کوئی مفید بات ہے سو وعظ کی غرض ہنسانا رلانا نہیں
بلکہ اس کی غرض ترغیب و ترہیب ہے پس اسمیں نیک کام کا شوق دلاویں اور غفلت دور کریں اسی
کی فرع یہ ہے کہ وعظ میں مسائل دریافت کرنیکی ضرورت بیان کرنا لازم ہے ایک غلطی عوام کی اسکے
متعلق یہ ہے کہ بعض لوگ مسائل اسلئے دریافت نہیں کرتے کہ یہ کام تو ہمکو ضرور ہی کرنا ہے اگر پوچھنے
سے ناجائز ثابت ہوا اور پھر جان کر کیا تو پکڑ ہوگی اور ویسے تو معذور رہیں گے سو یہ بالکل غلط ہے
جب اس کا خلاف شرع ہونا احتمالاً معلوم ہے تو یہ بھی ایک گونہ علم ہے اسلئے اہل علم ہی کے برابر

افسوس ہوا پر ان مسائل کا معلوم ہونا شرط نہیں البتہ اگر شفقت ہی نہو تو نہ پوچھنے کی گنجایش ہے غرض
مسائل دریافت کرنا ہر حال میں ضروری ہیں گو عمل کی بھی توفیق سر دست نہو کیونکہ جب ضرورت یا توفیق
عمل کی نصیب ہولی اسوقت ہر مسائل کا جاننا کام آوے گا ورنہ اگر اسوقت کوئی تبلانے والا نہ ملا تو
بڑی دقت ہوگی اور ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بار بار کان میں بات پڑنے سے عمل کی ہمت ہوہی جاتی
ہے اور اگر بالفرض نہ ہو تو اعتقاد ہی درست ہو گیا جرم کی ایک دفعہ سے تو بچ جاؤگے اگر فرضاً ایک شخص
پر کئی دفعات جرم کے قائم ہیں تو ایک کا ٹل جانا کیا غنیمت نہیں اسی طرح بد عملی الگ گناہ ہے اور بے علمی
مستقل گناہ اور سخت گناہ کیونکہ عقائد اعمال سے مقدم ہیں پس علم حاصل کرنے سے دفعہ شدید تو ٹلی ایک
بد عملی کی دفعہ ہی میں سزا ہوگی دونوں تو قائم نہوں گی اور مسائل معلوم کرنے کی آسان اور نافع تدبیر
تو مدرسہ کا قائم کرنا ہے گو چھوٹا ہی ہو جسمیں کوئی عالم کامل رکھا جاوے اور ہر شخص اپنی لیاقت اور فرصت
کے مطابق ان سے پڑھا کرے چاہے اردو ہی میں سہی مگر بدون پڑھے بطور خود صرف کتاب دیکھنا
۱۵۵ کافی نہیں اس کی ایسی مثال ہوگی کہ ایک شخص نے اپنی گھر والی کو گلگلے پکاتے دیکھ کر اس کے ہاتھ
سے آٹا خود لے لیا تھا اور کہا یہ کام تو ہم بھی کرسکتے ہیں تو آپ نے اونچے ہی سے کھڑے کھڑے آٹا
کڑاہی میں ڈالدیا تمام تیل اوچٹ کر منہ پر آگیا اور منہ پھونک لیا جب اتنی موٹی بات کا صرف دیکھنا
کافی نہوا کسی کے تبلانے کی ضرورت تھی تو مسائل کا مطالعہ تو کیسے کافی ہوسکتا ہے البتہ اگر پڑھنے کا
موقع نہ ہو تو پھر تحصیل مسائل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن مقرر کرکے باالتزام کسی
عالم سے مسائل سن لیا کریں اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم ہر بات پوچھکر تو کیا کریں یہ علم حاصل ہونیکا طریقہ ہے
اور عمل کے متعلق یہ ہے کہ اول تو اکثر علم سے عمل بھی خود ہی ہونے لگتا ہے اور دوسری تدبیر تیب
یہ ہے بکثرت اہل اللہ کی صحبت میں رہا کرے جو کہ واقعی اہل اللہ ہوں اگر یہ نہو سکے تو ان سے خط و کتابت
ہی رکھے انکی صحبت اور مخاطبت میں خاصیت ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے سے ارادہ میں قوت ہوتی ہے یہ
ضروری بیان تھا علم و عمل کا ان ہی دونوں چیزوں کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں انما یتذکر اولوالالباب
یتذکر میں عمل اولوالالباب میں علم مراد ہے اور ظاہری عنوان عمل کو تذکر سے اسلئے بدلدیا تاکہ اس کے
حصول کا طریق بھی ساتھ ہی معلوم ہوجاوے یعنی یہ تبلادیا کہ تذکر سے عمل کی توفیق ہوجاتی ہے اور
یہ بالکل ظاہر ہے کہ جو چیزیں داعی الی العمل ہیں جیسے وعدہ وعید اور جیسے حق تعالیٰ کی نعمتیں اور انکا

تہرو غلبہ وغیرہ ان کے بار بار یاد کرنے سے طبعاً عمل کا تقاضا ہوتا ہے اسی طرح بجائے عنوان علم کے
لفظ لب لایا گیا اس میں بھی اسی طرح اشارہ ہے طریق تحصیل علم کا صحیح طور پر استعمال کرنا اور لب ذریعہ ہے
علم کا پس اس میں علم اور عمل دونوں کی تحصیل کا طریقہ بتلا دیا گیا اور اس دوسری تعبیر سے یہ بھی معلوم
ہو گیا کہ ہر شخص ہر بات جاننے کی قابل نہیں بلکہ اسکے جاننے کیلئے عقل کی ضرورت ہے مگر آجکل باوجود عقل و
فہم نہ ہونے کے ہر شخص کو علمی مضامین کے سمجھنے کا دعویٰ ہے اور ایسے ایسے سوالات علماء سے کرتے ہیں
جن کا جواب بھی ہرگز انکی سمجھ میں نہیں آسکتا اور علماء بھی یہ غضب کرتے ہیں کہ ہر شخص کے سوال کا جواب
دیدیتے ہیں۔ اور علماء کے اس حلم ہی سے لوگ بد اخلاق ہو گئے مگر جو عالم محقق ہوگا وہ ایسا کبھی نہ کرے گا
چنانچہ مولانا حافظ محمد نعیم صاحب لکھنوی سے کسی نے دریافت کیا کہ فلاں حافظ صاحب نے دریافت
کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ و حضرت علیؓ کے واقعہ میں تحقیق کیا ہے مولانا نے فرمایا کہ وہ حافظ جی کیا
کام کرتے ہیں جواب دیا کہ کپڑا بیچتے ہیں فرمایا اور تم کیا کرتے ہو کہا کپڑے رنگتا ہوں مولانا نے ارشاد فرمایا
کہ تم دونوں اپنے کام میں لگو علی جانیں معاویہ جانیں نہ ان حضرات کے بارہ میں تم سے کچھ مواخذہ
ہوگا اور نہ ان کا مقدمہ تمہارے سپرد ہوگا اور اگر ہوا تو میں سفارش کر کے تمہارے اجلاس سے اٹھوا دونگا
میرٹھ میں ایک شخص نے ایک مولوی صاحب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین کی
نسبت سوال کیا مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ تم کو نماز کے فرائض یاد ہیں جواب دیا کہ نہیں
مولوی صاحب نے جواب دیا افسوس جس نماز کا سب سے اول سوال ہوگا اسکے تو فرائض بھی معلوم
نہیں اور جس چیز کے متعلق نہ تم سے قبر میں سوال ہوگا نہ حشر میں۔ اس کی فکر میں پڑ گئے واقعی لوگوں
کو جسکی ضرورت ہے اسکی فکر نہیں اور جواب دینے والے علماء کی یہ غلطی ہے کہ وہ لوگوں کی دلشکنی کا
خیال کرتے ہیں اور جواب دینے بیٹھ جاتے ہیں مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ ایسی وسعت اخلاق میں لوگوں
کی دین شکنی ہے جو دل شکنی سے اشد ہے بعض اہل علم خیال کرتے ہیں کہ انکار میں سبکی ہوگی سبحان اللہ
بس تو پھر جہلا جو کچھ فرمائشیں کیا کریں وہی بجا لایا کرو ورنہ سبکی ہوگی کہ یہ کیسا مولوی ہے جس سے
ایک چھوٹا سا کام بھی نہ ہوسکا جیسا ایک جاہل نے کسی مولوی سے نکاح پڑھانے کیلئے کہا تھا انہوں نے واقعہ
دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مرد و عورت میں باہم قرابت محرمیت ہے مولوی صاحب نے کہا نکاح نہیں ہوسکتا
اس نے خوشامد کی مگر مولوی صاحب کیسے مانتے اس نے ایک موذن سے پڑھوا لیا اور صبح کو آکر مولوی

صاحب سے کہا کہ واہ تم تو بڑے عالم مشہور ہو تم سے ایک نکاح نہ ہوسکا دیکھو موذن نے
پڑھ دیا تو جو لوگ سُبکی سے ڈرتے ہیں وہ ایسے ایسے نکاح بھی پڑھا دیا کریں کیا بیہودہ خیال ہے
سُبکی کا یہ خیال اس کی بیّن دلیل ہے کہ آپ کے پاس کمال نہیں ورنہ کسی کی مذمت اور
سُبکی کی پرواہی نہوتی کیا اگر تو اس سے خوش ہوتا ہے کہ سب لوگ مجکو جاہل سمجھتے رہیں اور چاہتا
ہے کہ میرا کمال مخفی رہے اور ہر اہل کمال کی یہی حالت ہے خدا اگر ظاہر کردے تو دوسری بات ہے بڑی
خریداری تو خدا کی ہے بس تمہارے خریدار وہ کافی ہیں کوئی اور ہو یا نہو بادشاہ جس کا سودا خریدے
اور چار نہ خریدے تو اسے کیا غم ہے بس علماء کو چاہئیے کہ فضول سوال کا جواب ہرگز نہ دیا کریں چاہے
کیسی ہی سُبکی ہو ایک شخص نے میرے پاس چند سوالات بھیجے جو محض فضول تھے اور اخیر میں دھمکانے کیلئے
حدیث من سئل عن علم فکتم الجم بلجام من نار بھی لکھدی میں نے کہدیا کہ تم کو جواب نہ ملیگا اور جب ایسا
ہوا اسوقت تم میری مدد نہ کرنا افسوس آجکل علماء پر تو الزام ہے بدخلقی کا اور لوگ خود خیال نہیں کرتے
کہ ہم کیسے کیسے بیہودہ امور دریافت کرتے ہیں ایک انسپکٹر نے مجھے خط لکھا کہ کافر سے سود لینا کیوں
حرام ہے میں نے لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے پھر ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے
اس سوال کا ذکر کیا اور میرے خشک جواب کی شکایت کی میں نے پوچھا کہ کیا آپ اپنے فرض منصبی میں
ہر شخص سے ایک طرح کا برتاؤ کرتے ہیں کہا نہیں میں نے کہا بس ہمارے محکمہ میں بھی یہی ہے کہ ہر شخص
سے جداگانہ معاملہ ہے جن سے خاص تعلق ہے ان سے اور معاملہ ہے اور اجنبیوں سے ضابطہ کا
برتاؤ ہے مگر اب چونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے لہذا اب ایسا معاملہ نہ ہوگا لیکن اس ملاقات کا آپ
پر بھی یہ اثر ہوگا کہ آپ بھی ایسا بیہودہ سوال نہ کریں گے غرض علماء کو اس کا اہتمام چاہئیے کہ بیہودہ
اور فضول امور کا جواب نہ دیا کریں اور جہلاء کو بھی لازم ہے کہ ایسے فضول سوال نہ کیا کریں مثلاً
قبر میں زندہ ہوکر دم گھٹنے کا اشکال کیا جاتا ہے اس کا جواب عامی کو نہ دو بلکہ اس سے کہدو کہ جو کام
کرنے کے ہیں ان کے متعلق سوال کرو یہ مسئلہ عمل کے متعلق نہیں ہے بس خلاصہ قاعدہ کا یہ ہوا کہ بعض
بات تو کرنے کی ہوتی ہے اسکے تو احکام دریافت کرلو اور بعض بات سمجھنے کی ہوتی ہے وہ اگر صاف ہو
تو سمجھ لو اگر دقیق ہو تو اسپر اجمالی اعتقاد رکھو اور تفصیلی کاوش میں نہ پڑو کیونکہ اگر عالم اسے بیان بھی کردے تب بھی
عامی کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور سمجھکر کوئی نفع بھی نہوگا مثلاً اگر کوئی یہ سمجھ جاوے کہ پل صراط پر کیوں کر چلیں گے

تو کیا چلنے سے بچ جاؤ گے یا چلنا آسان ہو جاوے گا ہرگز نہیں بلکہ یہ بات مانکر تو نہ جو وہاں پہنچکر
چلنے کا طریقہ معلوم ہو جاویگا اور آسانی ہو جاوے گی دیکھو تو سہی کہ تم نے ایسے ہی تو بہت سی باتیں بے سمجھے
مان رکھی ہیں مثلاً زمین کا گول ہونا اور تمام سمتوں سے آباد ہونا بلکہ فلسفہ میں بعض باتیں ایسی ہیں
کہ عام لوگ ان کو سمجھ بھی نہیں کر سکتے اور فلاسفہ کے نزدیک وہ مسلم ہیں مثلاً یہ کہ ایک چیونٹی کی
حرکت سے ساری زمین ہلجاتی ہے کوئی اسکا یقین کر سکتا ہے ہرگز نہیں مگر پھر بھی فلاسفہ کے معتقدین کو
تقلیداً اس کو ماننا پڑتا ہے پھر کیا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی بھی عظمت نہیں کہ انکی باتیں تقلیداً
تسلیم کر لیں پس بہت سی باتیں تم نہیں سمجھ سکتے اور میں بھی فراخ دلی سے اقرار کرتا ہوں کہ بعض باتیں
میں بھی نہیں سمجھ سکتا مگر میرا ایمان سب پر ہے اور بعض باتیں ہم جانتے ہیں مگر بیان نہیں کرتے کیونکہ
ان کا بیان کرنا ہمارے ذمہ نہیں نیز عوام کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتیں مثلاً پل صراط کا بال سے باریک
ہونا اور تلوار سے تیز ہونا ایک امر نقلی ہے جسکو میں عقلی طور پر ثابت کر سکتا ہوں وہ اس طرح کہ ہر شے
کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک صورت پل صراط ایک صورت ہے اسکی حقیقت معلوم کرنا چاہیئے تو (۱۸)
کشف سے معلوم ہوا کہ وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے اور شریعت اس کی حقیقت ہے اور یہ کشف
اسلئے مقبول ہے کہ شریعت کے خلاف نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ اشارات نصوص سے اس کی تائید
پر استدلال بھی کیا جا سکے پس یہ صراط مستقیم یعنی شریعت قیامت میں بشکل پلصراط نظر آوے گی اور شریعت
ہر چیز کے افراط و تفریط کے درمیان ایک وسط چیز ہے اور وسط حقیقی وہ ہے جو تقسیم نہ ہو سکے ورنہ
وسط وسط نہ رہیگا اس میں خود طرفین اور وسط نکلے گا اور یہ لا منقسم ہے پس شریعت بال سے بھی
باریک ہوئی اور چونکہ اسپر چلنا دشوار ہے اسلئے تلوار سے تیز بھی ہوئی پس یہی باریک اور تیز چیز
صورت پلصراط میں ظاہر ہوگی تو دیکھئے ہم نے عقلی طور پر حقیقت پلصراط کی بتلا دی مگر اب بتلائیے ہم ایسی
باتیں اگر آپ کو بتلا دیں تو ان کو سمجھیگا کون چنانچہ اس جلسہ میں بھی بہت لوگ اس مضمون کو نہیں سمجھے
ہونگے بعض کہتے ہیں کہ بس بیان کر دیا جائے چاہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اول تو اس سے نفع کیا بلکہ بعض
کو غلط فہمی سے ضرر ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اہل کمال کا تو یہ چھپانے کا مذاق ہوتا ہے کہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز   ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

خلاصہ یہ کہ علماء سے احکام پوچھو علل نہ پوچھو یعنی یہ مت پوچھو کہ یہ کیوں ہوا اور اگر ایسا ہی شوق ہے

تو با قاعدہ طالب علم ہو پھر پوچھو یہ ہونا یہ رشتہ کا ایک قاعدہ ہوتا سب سوالات علل کا یہی قاعدہ ہے اور اگر طالب علم نہیں بنتے تو پھر طالب درویش بنکر رہو جسکا نام تسلیم و تفویض محض ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے ہر طالب علمے کہ چوں وچرا نکند و ہر درویشے کہ چوں و چرا کند ہر دو را بچراگاہ باید فرستاد۔

درویش کا مذہب یہ ہوتا ہے کہ بلا چون وچرا تسلیم کرلے اور ہر مسلمان درویش ہے کیونکہ خدا کے طالب کو درویش کہتے ہیں یہ کبھی مت کہنا کہ ہم درویش نہیں ہیں اگر درویش ہونا سمجھ میں نہیں آتا تو اچھا طالب علاج تو ہو تو طالب علاج کو یہ اجازت نہیں کہ نسخہ کے اجزار کی تحقیق کرے اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔ جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

ہاں طالب علم کو چونکہ فن حاصل کرنا ہے اور اسکو دریافت کئے بغیر فن حاصل نہ ہوگا اسلئے اسکو دریافت علل کا حق بھی ہے و نیز اسکو دریافت کرنیکی تمیز و سلیقہ بھی ہے وہ بیہودہ و بیکار سوال کبھی نہ کریگا اور اگر کوئی طالب علم بھی بیہودہ بات پوچھے تو اسکو بھی روک دیا جائیگا امام ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس املا میں ایک شخص خاموش بیٹھا رہتا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا تم کیوں نہیں بولتے کہا اب بولا کروں گا۔ ایک روز تعجیل افطار کی حدیث کے سلسلہ میں بیان کیا گیا کہ جب آفتاب یقیناً غروب ہو جاوے پھر روزہ فوراً افطار کرلو وہ طالب علم بولا کہ اگر کسی دن آفتاب غروب نہ ہو تو کیا کریں امام صاحب نے فرمایا کہ بس تم خاموش ہی رہا کرو۔ ایک اور حکایت ہے کہ کوئی بہو چپ بیٹھی رہتی تھی اسکی ساس نے کہا کہ بات چیت کیا کرو بہو تو بولتی ہی اچھی لگتی ہے اس نے کہا میری اماں نے بولنے سے منع کر دیا تھا ساس نے کہا تیری ماں احمق ہے تو بولا کر کہنے لگی اچھا۔ ایک روز بولی کہ اماں اگر تمہارا بیٹا مر جاوے تو میرا نکاح کسی دوسرے سے کر دوگی یا یوں ہی بٹھلائے رکھوگی ساس نے کہا بہو تیری ماں نے ٹھیک کہا تھا تو خاموش ہی رہا کر۔ تو بعض آدمی بولنے کے قابل نہیں ہوتے کانپور میں ایک استفتار آیا مولوی محمد رشید صاحب کانپوری مرحوم کے پاس کہ گھوڑے کے جنازہ کی نماز پڑھنا کیسی ہے مولوی صاحب نے ظرافت کے پیرایہ میں تحقیقی جواب لکھا کہ اگر کسی نے اس گھوڑے کو کلمہ پڑھتے ہوئے سنا ہو تو جنازہ کی نماز پڑھنا چاہیئے ورنہ نہیں جواب کیسا مدلل دیا

کہ نماز جنازہ مسلمان کی ہوتی ہے اور جب تک کلمہ نہ پڑھے مسلمان نہیں ہوتا تو گو ذہانت سے ایسے جواب ہوسکتے ہیں۔ مگر اصل بات یہی ہے کہ جاہلوں کو فضول بات کا جواب ہی نہ دیا جاوے اور اس سے سب عوام رنجیدہ نہوں کہ ہم کو جاہل اور ناقابل قرار دیا کیونکہ صحبت علماء سے بعض عوام جاہل نہیں رہتے خواص ہوجاتے ہیں گو اخص الخواص نہوں پس جاہل وہ ہے جو خدا کا راستہ نہ جانتا ہو اور جو واقف ہو وہ عالم ہے گو لکھا پڑھا نہو البتہ ایسا شخص عالم لازم ہے عالم متعدی نہیں اسکو وعظ وغیرہ کی اجازت نہوگی یا یوں کہو کہ عالم ہے معلم نہیں جیسا کہ تندرست طبیب نہیں اسلئے علاج نہیں کرسکتا بلکہ علاج طبیب ہی کرتا ہے اسی طرح جو ناخواندہ صحبت علماء میں ضروریات دین سے واقف ہوگیا ہو وہ تندرست تو ہے چاہے دوسروں کو نفع نہ پہونچا سکے مگر اس کو جاہل نہیں کہہ سکتے کیونکہ علم لکھنے پڑھنے ہی پر موقوف نہیں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کثرت سے ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اسی شان کے متعلق فرماتے ہیں نحن امۃ امیۃ لانکتب ولانحسب اس ارشاد میں آپ نے سب فلسفہ اڑا دیا مگر باوجود اس کے کتنے بڑے عالم تھے پس عالم ہونیکے لئے تو درسیات کا پڑھنا شرط نہیں لیکن معلم ہونے کے لئے اسوقت ضرورت شدید ہے غرض اولوا الالباب کے لفظ میں ان ہی علوم مقصود کی طرف اشارہ ہے اب میں ختم کرتا ہوں۔ خلاصۂ وعظ یہ ہے کہ علم وعمل کی ضرورت ہے اور علم کا طریق پڑھنا اور مسائل کا سننا اور پوچھنا ہے اور عورتوں کی تعلیم کا طریقہ شاید ذکر نہیں کیا گیا وہ بھی بطور تتمہ کے بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ گھر میں رہکر مسائل پڑھیں اور جب کسی نئے مسئلہ کے پوچھنے کی ضرورت ہو تو محرم مردوں کی معرفت علماء سے دریافت کرادیں مگر کسی حال میں پردہ میں کوتاہی نہ کریں۔

والحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہ

واصحابہ اجمعین

اشرف علی

(آغاز جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمی بہ

نشر الرحمۃ

این	کہاں ہوا	عید گاہ تھانہ بھون
متیٰ	کب ہوا	۲۸ شوال ۱۳۳۶ھ
کم	کتنی دیر ہوا	ایک گھنٹہ قبل از نماز استسقا
کیف	کس ہیئت پر ہوا	×
لم	کیوں ہوا	امساک باراں کی بنا پر
ماذا	کیا مضمون تھا	حق تعالیٰ سے دعا کرنے میں نا امید نہ ہونا چاہیئے بلکہ امیدوار رہنا چاہیئے
من ذا السامعون	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	سب مسلمانوں کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم بجنوری
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	×
الاشتات	متفرقات	×

خطبہ ماثورہ - اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ ط وھو الولی الحمید ط اسوقت تھوڑا سا بیان ہوگا سب صاحب متوجہ ہو کر سن لیں - یہ ایک آیت ہے جس میں حق جل شانہ وعم نوالہ کی وسعت رحمت کا ایسے عنوان سے بیان ہے کہ اس سے بڑھکر کوئی عنوان کسی کے ذہن میں آ نہیں سکتا تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر چیز کا حصول وجود شرائط اور ارتفاع موانع پر موقوف ہے چنانچہ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ ہر چیز کے لئے کچھ شرائط وجود اور کچھ اس کے روکنے والے موانع ہوتے ہیں مثلاً بادشاہ سے کچھ لینا ہو تو اس کی خوشامد اطاعت کرو یہ تو شرائط و اسباب ہیں اور اگر کسی نے اس کی شان میں گستاخی کی - گالی دیدی سخت کلامی کی تو یہ موانع ہیں اسکے بعد سے انعام موقوف ہو جاتا ہے یا بادشاہ سے نوکری کی درخواست کی اور یہ شرط تھی اور وہ دینے کو

آمادہ ہو گیا اس کے بعد فوراً اس شخص نے یہ کہدیا کہ مجھے تو آپ سے امید نہیں ہے فضول ہے آپ سے مانگنا یہ مانع ہے اس صورت میں نوکری دینا تو درکنار دینے کا قصد بھی نہ کریگا اور کہیگا کہ جا ایسے بیحیا کو ہم نوکری نہ دینگے ہماری خوشامد کرتا اور ہم سے امید رکھتا تو ہم دیتے غرض کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ اس صورت میں بادشاہ اسکو نوکری دیگا۔ یقیناً تمام عقلاء کی رائے یہی ہوگی ایسے شخص کو نوکری دینا آداب سلطنت کے خلاف ہے اخلاصہ یہ کہ موانع عطاء میں سب سے بڑھکر مانع یہ ہے کہ کھلے لفظوں میں ناامیدی ظاہر کردے اور یوں کہدے کہ آپ کیا دیں گے اس میں تو کوئی تاویل بھی نہیں ہو سکتی اول تو آداب شاہی کا مقتضا یہ ہے کہ شبہ سے بھی یہ بات ظاہر نہ ہونا چاہیئے کہ ہم کو امید نہیں ہے چہ جائیکہ زبان پر لائی جاوے اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی عظمت اس کے قلب میں بالکل نہیں ہے ایک مقدمہ تو یہ سمجھ لو دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جیسے حق سبحانہ تعالیٰ سے زبان کے کلمات مخفی نہیں ہیں اسی طرح دل کی باتیں اور خیالات بھی ان سے مخفی نہیں ہیں جیسے وہ علیم باللسان ہیں اسی طرح علیم بذات الصدور بھی ہیں پوشیدہ لفظوں میں کلام کرو یا ظاہر الفاظ میں ان کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں ان کے نزدیک پنہاں اور علانیہ یکساں ہے۔ کوئی بھی فرق نہیں۔ ان کی تو وہ شان ہے جیسا لقمان علیہ السلام نے فرمایا۔ یٰبنی انہا ان تک مثقال حبۃ من خردل فتکن فی صخرۃ او فی السموات او فی الارض یات بہا اللہ ان اللہ لطیف خبیر۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز پوشیدہ ہو اور پھر سخت پتھر کے اندر ہو چاہے آسمان میں ہو یا زمین میں ہو اللہ تعالیٰ کو سب کا علم ہے۔ جب یہ دونوں مقدمے سمجھ میں آگئے تو اب آیت کا ترجمہ سنئے جس سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ موانع رحمت کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی رحمت کو نہیں روک سکتے فرماتے ہیں کہ اس کی وہ شان ہے کہ اتارتا ہے مینہ ناامیدی کے بعد اور پھیلاتا ہے رحمت اپنی۔ یہاں تنزل الغیث پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ینشر رحمتہ بھی لائے تاکہ محض نزول بارش کے سننے سے طوفان نوح کا شبہ نہ ہو سکے کیونکہ بارش کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ بارش ہو مگر اتنی کثرت سے ہو کہ سب غرق ہو جائیں پس

بشیر رحمت سے بتلادیا کہ بارش بھی ایسی نہیں جو موجب ہلاکت ہو بلکہ اسکے ساتھ رحمت بھی شامل ہوتی ہے۔ اور یہاں ینزل کے مقابلہ میں بشرا اور غیث کے مقابلہ میں رحمت لائے ہیں اس سے اشارہ ہے اسطرف کہ بارش دور دراز تک ہوتی ہے یہ نہیں کہ ایک باد و کھیت میں ہوکر رہ جا ہو بلکہ وہ رحمت کی طرح پھیل جاتی ہے پس بشیر رحمتہ جملہ سابقہ ہی کی تفسیر ہے یہ تو آیت کا ترجمہ ہوا اس سے وسعت رحمت کیسی کچھ ثابت ہوتی ہے ان مقدمات میں غور کرکے دیکھئے جو ابھی بیان کئے گئے ہیں جن میں ایک مقدمہ تو یہ تھا کہ ناامیدی مانع عطا ہے مگر خدائے تعالےٰ کے یہاں وہ بھی مانع نہیں بلکہ ناامیدی کے بعد بھی فضل فرماتے ہیں۔ دوسرا مقدمہ یہ کہ حق تعالی کو خفایا کی اطلاع مثل ظواہر کے ہے فالقلب عندہ کاللسان ان کے نزدیک دل کی بات ایسی ہی ہے جیسے زبان سے کہی ہوئی اس لئے قلب کی ناامیدی مانع ہونی چاہئیے تھی مگر خدا تعالی کے یہاں بالکل مانع نہیں اور یہ واقعی ہے کہ معاملہ اللہ تعالیٰ کا بندوں کے ساتھ ایسا ہی ہے کہ وہ باوجود موانع کے بھی فضل فرماتے رہتے ہیں غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ روزمرہ ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں کچھ بارش ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس سے بڑھکر نظیریں موجود ہیں خدا تعالیٰ کی رحمت ایسی وسیع ہے کہ ایک بزرگ کے الہاموں میں سے ایک الہام یہ بھی ہے کہ رزق میرا ایسا ہے کہ اگر کوئی شخص پانچوں وقت نماز کے بعد دعا کرے کہ اللھم لا ترزقنی یعنی اے اللہ مجھے رزق مت دیجیؤ تب بھی میں رزق نہ بند کروں تو مانگنے پر تو کیوں نہ دوں گا اب خیال کیجئے کہ ہمارا یہ گمان کتنا غلط ہے کہ ہم خدا تعالی سے ناامید ہوں غرض کہ جو کچھ کمی ہے ہماری طرف سے ہے ادہر سے کوئی دریغ نہیں ہے۔ ہاں کبھی توقف ہو جاتا ہے جس سے خفیف سی کلفت ہوتی ہے تاکہ متنبہ ہوکر بندے متوجہ ہو جائیں کیونکہ جس لڑکے کو استاد یہ چاہتا ہے کہ کل کو زیادہ نہ پٹے تو اسکے ایک دو تھپی آج ہی مار دیتا ہے تاکہ وہ اپنا سبق یاد کرلے اور کل کو نوبت زیادہ پٹنے کی نہ آئے اور جسے کل کو خوب پیٹنا ہے اسے مہلت دیتا ہے جب کل ہوئی اور وہ سبق میں غوطے کھانے لگا تو اب اس کی خوب مرمت ہوگی مگر پہلے دن یہ دوسرا لڑکا استاد کی ظاہری مہربانی دیکھکر یہ سمجھتا تھا کہ میاں جی کو مجھ سے عشق ہے کہ مجھے کچھ نہیں کہتا اور اپنے دل میں خوش ہے مگر جو ہیں گھنٹہ کے بعد اس عشق کی حقیقت

معلوم ہوگئی اسی طرح آج بھی بعض لوگ اس دوسرے لڑکے کی طرح خدا تعالیٰ کی عطاؤں کو اپنے اوپر مستمر دیکھ کر اسکو خدا تعالیٰ کی رضا کی دلیل سمجھتے ہیں اور مغرور رہیں تھانہ بھون کے ایک متکبر رئیس کی حکایت ہے کہ ایک شخص حضرت حاجی صاحب کے مریدوں میں سے اللہ کا نام لینے والے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے مگر غریب قوم کے انکے سامنے کو نکلے - اللہ کا نام لینے سے طبیعت میں لطافت آہی جاتی ہے ان رئیس صاحب نے کہا کہ یہ کون ہے جو ہماری برابری کرتا ہے بڑا صاف ستھرا بنکر نکلتا ہے اور اٹھکر غریب کے پانچ جوتے ماردیئے - اس نے یہ کہا کہ قیامت میں کسر نکلے گی ان رئیس صاحب نے مسخراپن سے جوتہ سامنے رکھدیا کہ تو میرے ماردے اس نے کہا کہ جدا میری کیا مجال - تو آپ کیا کہتے ہیں - اب بھی معلوم ہوا کہ ہم کو خدا ہی کا حکم ہے کہ تم کو مارا کریں کیونکہ دیکھئے ہم نے تو شرارت بلا کے جوتے مار لئے اور تو اجازت پر نہیں مار سکتا - کیا ٹھکانا ہے اس تکبر کا یہ استدراج ہے اگر نعمتیں دلیل ہوتیں تو سب سے زیادہ ولی فرعون ہوتا اور اگر مصائب علامت غضب ہوتیں تو انبیاء سب سے زیادہ (نعوذ باللہ) مغضوب ہونے چاہئیں کیونکہ سب سے زیادہ مصائب انہی کو پیش آئی ہیں چنانچہ حدیث میں ہے ان اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل کہ سب سے زیادہ بلا انبیاء پر آتی ہے پھر اس پر جو ان کے بعد افضل ہو چنانچہ حضرت زکریا آرہ سے چیرے گئے نوح کی قوم نے نو سو سال تک ان کے پتھر مارے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا کیا تکالیف پیش آئیں تو کیا انبیاء مقبول نہیں تھے - خوب سمجھ لو کہ نہ دنیا کا عیش علامت ہے قرب و مقبولیت کی اور نہ اس کی تکالیف دلیل ہیں مردودیت کی چنانچہ خود صریح نص اسکی ساتھ ناطق ہے - اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی اکرمن ط واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اہانن ط کلا ترجمہ آدمی کا یہ حال ہے جب جانچے اسکو رب اس کا پھر اسکو عزت دے اور اس کو نعمت دے تو کہے میرے رب نے مجھے عزت دی اور جس وقت اسکو جانچے پھر تنگ کرے اسپر روزی کی تو کہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا کوئی نہیں مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے یاد رکھو کہ مقبولیت و قرب کا مدار عیش پر اور مردودیت کا مدار تنگی پر نہیں بلکہ عیش و عشرت استدراج ہوتا ہے اور کبھی بلا مصیبت رحمت ہوتی ہے چنانچہ یہ بھی

ف خدا تعالیٰ کی عطاؤں کو کم دیکھ کر رضا سمجھنا غلط ہے

۱۵۴

ف دنیا کا عیش علامت مقبولیت کی اور تنگی علامت مردودیت کی نہیں ہے

خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ہماری کوتاہی پر چرکہ لگا دیں۔ اس طرح سے امساک باراں بھی رحمت ہے تاکہ کوتاہیوں سے باز آجائیں سرکشی کو چھوڑ دیں چنانچہ فرماتے ہیں لیذیقہم بعض الذی عملوا۔ اگر اس کے بعد بھی تنبہ نہ ہو اور متوجہ نہ ہوں تو حقیقی غضب نازل ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اہلہا بالبأساء والضراء لعلہم یضرعون ۰ ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ حتی عفوا وقالوا قد مس آباءنا الضراء والسراء فاخذناہم بغتۃ وہم لایشعرون

ترجمہ۔ اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی کہ نہ پکڑا ہو وہاں کے لوگوں کو سختی اور تکلیف میں شاید وہ گڑگڑائیں پھر بدل دی ہم نے برائی کی جگہ بھلائی (یعنی تکلیف کی جگہ آرام) یہانتک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ پہنچتی رہی ہمارے باپ داداؤں کو بھی تکلیف اور خوشی (یعنی زمانہ کا انقلاب ہے اس میں طاعت و معصیت کا کیا دخل) پھر پکڑا ہم نے ان کو ناگہاں اور وہ خبر نہ رکھتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ سختی اور تکلیف اس لئے بھیجتے ہیں تاکہ رجوع کریں جب رجوع نہیں کرتے تو بجائے اسکے کہ اور تکالیف بھیجتے ان کے لئے راحت کا سامان کر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ سب مصیبت گناہ کے سبب نہ تھی کیونکہ دیکھو ہم نے گناہ بھی کئے اور اب بھی کر رہے ہیں اور مصیبت خود ٹل گئی اور ہمارے باپ داداؤں کے وقت میں بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ کبھی تکالیف ہوتی تھیں اور کبھی راحت بھی زمانہ کی روش۔ یہ ہم پر بھی گذر گئی دنیا کا یہی دور چلا آتا ہے اور کچھ بھی نہیں بس زمین سے تبخیر ہوئی بارش ہوگئی تبخیر نہ ہوئی بارش بند ہوگئی اگر گناہ پر مدار ہوتا تو اب بارش کیوں ہوگئی کیونکہ ہم تو اب بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں پس یہ جو علماء کہتے ہیں کہ گناہوں سے مصیبت آتی ہے غلط ہے اگر گناہوں سے مصیبت آتی تو ہمیں اب راحت کیوں پہنچتی۔ فاخذناہم بغتۃ یعنی جب راحت کے سامان دیکھ کر غافل ہوگئے تو ہم نے اچانک پکڑ لیا۔ یاد رکھو کہ مصیبت بحیثیت متنبہ اور متوجہ کرنے کے نعمت ہے اور نعمت بحیثیت ڈھیل اور دہوکہ کھانیکے مصیبت ہے اگر ایک دفعہ بارش ہوگئی تو نازمت کرو اور امساک ہوا تو اسکو سبب مت خیال کرو بلکہ رحمت سمجھو کہ ایک قمچی لگی ہے سو ادہر سے سزا بھی رحمت ہے اور حق تعالیٰ کی تو یہ شان ہے کہ ناامیدی پر بھی عطا فرماتے ہیں تو امید پر کیوں نہ عطا کرینگے اور آیت میں

من بعد ما قنطوا جو واقع ہے بظاہر سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قنوط (نا امیدی) سبب ہے بارش کے لئے جیسے ایک دوسری آیت میں آیا ہے من بعد ما جرنا کہ وہاں ہجرت سبب ہے مغفرت کیلئے دونوں جگہ یکساں عنوان ہے سو سمجھ لیجئے کہ یہاں ایسا نہیں ہے کہ قنوط بارش کا سبب ہو بلکہ حقیقت میں تو وہ موانع میں سے ایک مانع ہے۔ اجابت میں اسکو کوئی دخل نہیں یہ جدا بات ہے کہ خدا تعالیٰ باوجود مانع ہونیکے پھر بھی نعمت کو نہیں روکتے صاحبو! اسوقت بھی بہت سے قلوب میں تردد ہے کہ دیکھئے نماز استسقاء سے بارش ہوگی یا نہیں اور یہ پہلے آچکا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک دل سے کہنا ایسا ہی ہے جیسے حاکم مجازی صرف الفاظ پر مطلع ہوتا ہے اور حاکم حقیقی ضمیر کو اسیسے معلوم کرلیتے ہیں میرے استاد ایک حکایت عالمگیر کے زمانہ کی بیان کرتے تھے کہ ایک راجہ کا انتقال ہوگیا تھا اس نے ایک لڑکا چھوڑا خورد سال اور راجہ کا ایک بھائی جوان تھا لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ عالمگیر بھائی کو راجہ بنا دینگے مگر وزیر اعظم کی رائے بیٹے ہی کو راجہ بنانیکی تھی اسلئے اس بچہ کو عالمگیر کے روبرو پیش کرنے کی رائے قائم کرکے شاید اسکو دیکھکر عالمگیر رحم کھا کر اسی کیلئے گدی تجویز کردیں اسکو اپنے ساتھ لے چلا اور تمام راستہ سکھاتا ہوا گیا کہ بادشاہ سلامت فلاں بات پوچھیں تو یوں کہنا اور اگر یہ دریافت کریں تو یوں جواب دینا جب قلعہ کے دروازہ پر پہونچے لڑکے نے کہا کہ ان باتوں کے علاوہ اگر اور کچھ پوچھا تو کیا کہونگا۔ وزیر اس سوال سے دنگ رہ گیا اور کہا کہ صاحبزادے جس خدا نے یہ سوال تجھے سکھلایا ہے ان باتوں کے جواب بھی وہی خدا سکھادے گا۔ غرض عالمگیر کو اطلاع ہوئی وہ حویلی میں تھے لڑکے کو بوجہ خورد سال ہونے کے اندر بلالیا اور اسوقت لنگی باندھے حوض کے کنارے پر غسل کیلئے کھڑے تھے لڑکے نے زنانہ میں جاکر عالمگیر کو سلام کیا بادشاہ نے مزاحاً اس لڑکے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر حوض کے مقابل کردیا اور کہا چھوڑ دوں لڑکا قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا کہ آپ مجھکو ڈوبنے سے کیا ڈراتے ہیں میں کیسے ڈوب سکتا ہوں آپ کی تو وہ شان ہے کہ کسی کی اگر انگلی بھی پکڑ لیں تو وہ ڈوب نہیں سکتا اور میرے تو دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھوں میں ہیں میں کیسے ڈوب سکتا ہوں عالمگیر اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور اسی کو راجہ بنا دیا اور بالغ ہونے تک وزیر

کو سرپرست مقرر کر دیا۔ دیکھئے اس واقعہ میں تعلق اور وثوق و توکل ظاہر کرنے سے یہ اثر ہوا
حالانکہ یہ شاعرانہ نکتہ تھا اور حق تعالیٰ کے یہاں تو حقائق ہیں اور حقیقت میں وہ کیا عالمگیر تھے حقیقی
عالمگیر تو خدا تعالیٰ ہیں مگر اتنا معلوم ہوا کہ یہ عمل ہے کامیابی کا یعنی وثوق ظاہر کرنا بس تم بھی حسن ظن اور
قوت رجا کو اپنا معتقد و وقت رکھو پھر ثمرہ دیکھو۔ بدو منشی خوب دعا مانگتے ہیں خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا
کرتے ہیں کہ مجکو بخشدے پھر کہتے ہیں ضرور بخشیگا کیوں نہیں بخشیگا جیسے کوئی لڑتا ہے یہ گمان نکرنا
چاہئے کہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں بلکہ خوش ہوتے ہیں حدیث میں ہے: ان اللہ یحب الملحین
فی الدعا کہ اللہ میاں دعا میں الحاح کرنیوالوں کو دوست رکھتے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ خود چاہتے
ہیں کہ ہم سے کوئی لے چنانچہ روزانہ شب کیوقت شہنشاہ حقیقی آسمان اول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں
اور فرماتے ہیں کہ کوئی ہے ایسا اور کوئی ہے ایسا جو ہم سے کچھ مانگے (کذا فی جمع الفوائد باب وقت الدعا
عن الستہ الا النسائی) آسمان دنیا چھت ہے آپکے گھر کی شہنشاہ حقیقی گویا آپ کی گھر تشریف لاتے ہیں
اسوقت یہ کیفیت ہوتی ہے شعر امروز شاہ شاہان مہمان شدہ است مارا۔ جبریل با ملائک دربان
شدہ است مارا۔ کوئی کریم ایسا نہیں جو سائلوں کے گھر پر انکی حاجات کو دریافت کرنے آئے اگر
ایک دن ایسا کرے بھی تو ہر روز نہیں کر سکتا اور وہ ایسے کریم ہیں کہ ہر روز تشریف لاتے ہیں
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکا جی ہی چاہتا ہے کہ کوئی سوال کرے اور لے (جی میں نے مجازاً کہا
جیسے تعلیم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک میں ہے ورنہ خدا تعالیٰ جی سے پاک ہیں) مگر لینے کا بھی طریقہ
ہوتا ہے کریم کو ناراض کر کے نہیں لیا جاتا تو ان کو اپنی اطاعت سے راضی بھی رکھو اور ایک اور
کرم دیکھئے کہ جسقدر بھی نیک کام ہیں وہ سب ہمارے ہی کام ہیں ان کا نفع ہمارے ہی لئے ہے وہ خدا تعالیٰ
کے نفع کے کام نہیں مگر با ایں ہمہ پھر ان کو طلب کرتے ہیں اور نہ کرنے سے ناراض ہوتے ہیں جیسے
کوئی آقا باورچی سے ناراض ہو کر تو نے کھایا کیوں نہیں حالانکہ کھانا کام خود باورچی کا ہے اور
اس کا نفع بھی اسی کو ہے یہ غایت کرم کی دلیل ہے مثلاً نماز حقیقت میں ہمارا کام ہے اور اسکا
نفع ہمارے ہی لئے ہے خدا تعالیٰ کو کوئی نفع نہیں مگر پھر بھی ہمارے نکرنے پر ناراض ہوتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی یہ غایت کرم ہے اور اسکو حق اللہ یعنی خدا تعالیٰ کا کام
کہنا مجازاً ہے ہمارے اعمال نہ کرنے پر خدا تعالیٰ کا ناراض ہونا خود دلیل رحمت کی ہے مجھے بچپن میں

لگی اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا حالانکہ اسکے کھانے میں میرا ہی نفع تھا مگر پھر بھی میرے والد صاحب اسمیں روٹی چور چور کر کر زبردستی مجھے کھلاتے یہی معاملہ اللہ میاں کا ہے کہ نماز مثلاً انکا کام نہیں ہمارا کام ہے ہمارا ہی نفع ہے مگر پھر بھی حکم کرتے ہیں کہ کرو گویا زبردستی ہم کو نفع پہونچانا چاہتے ہیں حالانکہ انکی کوئی غرض متعلق نہیں۔ زبردستی کھلانے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی وہ یہ کہ مراد آباد میں ایک صاحب علی میری دعوت کرنا چاہتے تھے میں نے کسی عذر سے انکار کیا تو انہوں نے میرے سامنے تفسیر کبیر رکھدی اور کہا کہ اس مقام پر مجھے کچھ پوچھنا ہے میں نے دیکھا تو اس جگہ دعوت کے مسائل تھے میں نے کہا کہ آپ مجھپر حجت قایم کرکے دعوت کرتے ہیں یہ کیا تہذیب ہے کہنے لگے کہ مجھے یہاں شبہ تھا اس لئے یہ موقع کھولا ہے ایک بزرگ مولوی روشن خاں صاحب وہاں موجود تھے میں نے اس امر کی ان سے شکایت کی مجھسے کہنے لگے کہ خدا کا شکر کرو کہ لوگ تفسیر دکھلا دکھلا کر اور حجت قائم کر کر کے دعوت کھلاتے ہیں میری کوئی دعوت کرے تو جلدی سے منظور کر لوں۔ یہ حکایت بطور لطیفہ کے بیان کی خدا تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے کہ اگر کوئی نہ لے تب بھی دیتے ہیں جیسے دوا پینے میں مریض ہی کا نفع ہے اگر نہ پیئے اور ہلاک 15
ہو تو طبیب کا کچھ نہیں بگڑتا مگر کوئی طبیب اگر ایسا شفیق ہو کہ اس کے دوا نہ پینے پر ناراض ہو اور کہے کہ تم نے دوا کیوں نہیں پی تو یہ غایت درجہ اس کا کرم ہے۔ یہی حال حق تعالیٰ کا ہے کہ ہم اعمال کرنا نہیں چاہتے اور اپنے ہی حق میں کانٹے بوتے ہیں مگر وہ زبردستی کرانا چاہتے ہیں اور اُدھر سے روزانہ طلب ہے کہ بندے ہم سے مانگیں حدیث میں ہے لم یسئل اللہ یغضب علیہ۔ کہ جو اللہ میاں سے سوال نہ کرنے تو اللہ میاں اسپر غصہ کرتے ہیں مگر اب لوگوں نے یہ ذخیرہ سیکھ لیا ہے کہ امساک باران تو ہو رہا ہے مگر نہ اعمال درست کرتے ہیں نہ موروثی زمین چھوڑتے ہیں نہ پرائی زمین دبا لینے کا کچھ خیال کرتے ہیں نہ لڑکیوں کا حق دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ سب باتوں کو چھوڑ کر بس ایک بات اختیار کر رکھی ہے کہ سیر سیر بھر اناج جمع کیا اور روٹی پکائی اور بانٹ دی اور لینے والے کون آدھے کے تو ہتمم صاحب مالک اور باقی کے اپنے عزیز و تائی وغیرہ مساکین کے نام کا کچھ بھی نہیں مثل مشہور ہو ندھا بانٹے شیرنی اپنے اپنوں کو دے جھنجھانہ میں ایک شخص کے یہاں گیارھویں تھی دس آدمیوں کی دعوت کی اور اسمیں بلائے گئے کون ڈپٹی تحصیلدار نائب تحصیلدار وغیرہ وغیرہ جب وہ کھانا کھا کر چلے تو

ن
لوگوں کا
عجیب ذخیرہ

ایک شخص نے کہا کہ جس نے مساکین نہ دیکھے ہوں وہ انکو دیکھ لے اول تو آجکل لنگر کی یہ حقیقت ہے دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جاوے کہ مستحقین ہی کو دیتے ہیں تو صرف اسی پر اکتفا کر بیٹھے کیا ہوتا ہے تاوقتیکہ پورا کام نہ ہو اسکی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی کو دق کا مرض ہو کہ اس میں بخار تو ہوتا ہی ہے اسکے ساتھ سینہ میں جلن بھی ہو اور بھی ہو اور بھی عوارض لاحق ہوں کوئی شخص جملہ تدابیر کو نظر انداز کر کے صرف سینہ پر صندل کا لیپ کر دے تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ اسکو پورا فائدہ ہوگا ہاں سینہ کی سوزش کو نفع ہوگا کامل نفع کی صورت تو یہ ہے کہ سینہ پر صندل کا لیپ ہو اور پینے کیلئے ایک نسخہ ہو کوئی مناسب روغن دماغ کی مالش کیواسطے ہو اور کوئی چیز تقویت کی غرض سے ہو۔ ہماری حالت تو یہ ہے جیسے مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت بیان کی ہے فرماتے ہیں کہ

ہرچہ کردند از علاج و از دوا ؛ رنج افزوں گشت و حاجت ناروا ؛ ایک روحانی طبیب آیا اور اس نے کہا

گفت ہر دارو کہ ایشان کردہ اند ؛ آن عمارت نیست ویران کردہ اند ؛ بے خبر بودند از حال درون ؛

استعیذ اللہ مما یفترون۔ یاد رکھو کہ نہ روٹی کھلانے سے کچھ ہوتا ہے نہ اناج بانٹنے سے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ عمل مبارک اور نیک نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کافی نہیں ہے سپاہی اور جرنیل فوج میں ہوتے ہیں مگر جرنیل اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ صدقہ کو بھی ضرور دخل ہے بارش میں مگر زا کافی نہیں ہے جب تک اسکے ساتھ دوسری چیزیں نہ ہوں اصلی تدابیر امساک باراں کی اسکے سبب کا ازالہ ہے یعنی حق تعالیٰ کی ناراضی کا علاج کرنا وہ علاج کیا ہے ماضی سے استغفار اور توبہ اور آئندہ کیلئے اصلاح۔ اسکے بعد وعدہ ہے وہو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ اور حق تعالیٰ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا اسیواسطے یہ مجمع ہوا ہے کہ نماز اور خطبہ ہو پھر استغفار و عزم اصلاح اور تضرع سے امید کے ساتھ دعا ہو اور دل سے پورا یقین ہو جانے کا۔ حاکم کا یہ کہنا کہ مانگو دلیل ہے اجابت کی یہ کیوں شبہ کیا جاوے کہ نہ معلوم حضور دینگے بھی یا نہ دینگے۔ اگر دیر بھی ہو جاوے تو اس میں بھی حکمت سمجھیں اب دعا کیجئے کہ ہم لوگوں کے قلب میں اخلاص اور حضور قلب پیدا ہو اور اس کی توفیق ہو فقط۔ اسکے بعد نماز اسکے بعد خطبہ اور دعا ہوئی

بعدازاں حضرت والا نے تھوڑا بیان اور بھی فرمایا جو ذیل میں منقول ہے۔ ایک بات اور سن لیجئے سب صاحب وہ بات یہ ہے کہ اسوقت دعائیں مانگ کر بے فکر نہ ہونا چاہیئے کہ ہم نے حق تعالیٰ کا پورا حق ادا کر دیا گویا انکے ذمہ قبول کرنا فرض ہو گیا اب کسی چیز کا انتظار نہیں یہ سخت غلطی ہے صاحبو! دنیا میں اسکی مثال موجود ہے کہ حاکم کے یہاں ایک عرضی کافی نہیں سمجھی جاتی خواہ کتنی ہی خوشامد کی بھری ہوتی ہو بلکہ عادۃ انتظار کیا کرتا ہے کہ اسکی خواہش سچی بھی ہے یا یک دن محض مضمون نگاری کی ہے اور اگر شوق اور ضرورت ہے

تو ایک عرضی پر بس نہیں کرتے بلکہ عرضی پر عرضی دیتے ہیں کبھی تھکتے نہیں۔ حدیث میں ہے ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اللہ یستجیب مالم یعجل قالوا وما العجلۃ قال ان یقول دعوت فلم یستجب لی او کما قال یعنی اللہ میاں دعا کو قبول فرماتے ہیں جب تک جلدی نہ کرو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ جلدی کی حقیقت کیا ہے حضورؐ نے فرمایا کہ جلدی یہ ہے کہ دعا کی مقبولیت میں دیر ہوئی تو اس نے خیال کر لیا کہ دعا تو قبول ہوتی نہیں اسلئے اس قصہ کو جانے ہی دو دعا کرنا چھوڑ دی اسلئے معلوم ہوا کہ شرط عادی عطا کی یہ ہے جلدی نہ مچائیے مانگے جائیے اسلئے پانچوں نمازوں کے بعد بھی اسی عجز و زاری کیساتھ مانگتے رہیے تنگ نہ ہوں اور اپنے ہر عمل کو شرع کی موافق درست رکھیں۔ استعجال پر ایک قصہ یاد آیا ایک شخص کو جو میرے ملاقاتی تھے ایک بغدادی بزرگ نے فراخی رزق کا عمل بتایا اور کہا اسکے بعد ایک پری جیسی آویگی اور کچھ مجاوگی وہ کہتے تھے کہ میں نے عمل پورا کیا اور اسکے آنیکا منتظر رہا جب وہ نہ آئی اٹھکر تھیٹر میں چلا گیا میں نے مزاحاً کہا کہ وہ اسی وجہ سے نہ آئی کہ تم نے وظیفہ کے وقت نیکی اختیار نہیں کی تھی۔ ہماری حالت بھی ایسی ہی ہے کہ یہاں تو تضرع و زاری کرتے ہیں اور وہاں جاکر معاصی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہمکو اس قسم کے قصوں پر تو ہنسی آتی ہے مگر اپنے حالات پر ہنسی نہیں آتی مثلاً ابھی جاکر گھنگے کہ جیسے گئے تھے ویسے ہی آئے صاحبو! اس کا عقلی یا نقلی ثبوت کیا ہے کہ نماز استسقا سے فوراً اسی وقت بارش ہو جاتی ہے۔ صاحب کلکٹر سے کوئی نہیں کہتا کہ ہم نے چار عرضیاں دیں کچھ جواب اب تک نہیں ملا آپ دینگے یا نہیں۔ بس برابر نمازوں کے بعد دعا کرتے رہو یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ختم ہو جائے کیونکہ خدا تعالی کا تعلق تو ساری عمر کا ہے چاہے ان کی طرف سے کچھ ظاہر نہ ہو تم اپنا انکسار مت چھوڑو تاخیر میں بھی مصلحتیں ہوتی ہیں رہا یہ سوال کہ پھر وہ مصلحتیں کیا ہیں تو آپ کوئی پارلیمنٹ کے ممبر نہیں کہ آپکو وہ مصلحتیں بتلائی جائیں یا آپ رائے دیں کہ ابھی بارش ہونی چاہیے۔ چونکہ یہ اکثر ہوتا ہے کہ دعا مانگ کر بیٹھ رہے کہ جب اسکی بھی شنوائی نہیں تو جانے بھی دو اسلئے میں نے اس غلطی پر تنبیہ کر دیا یاد رکھو اس وقت زیادہ اندیشہ ہوتا ہے حق تعالی کے غصہ کا کیونکہ پہلے تو یہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہماری خطا ہی ہے اب اس طرف کی کوتاہی کا خیال ہو جاتا ہے نعوذ باللہ ظاہر ہے کہ یہ حالت بہت اندیشہ ناک ہے کیونکہ خدا تعالی پر یہ الزام ہے جو عبودیت کو قطعاً خلاف ہے اسلئے ضروری ہے کہ برابر مانگتے رہو۔ وہ اگر چاہیں بالمعنی العرفی قبول کریں یا نہ قبول کریں تم اپنا منصبی کام پورا کرتے رہو کیونکہ بندہ کیلئے مناسب یہی ہے کہ ہمیشہ عجز و انکسار ظاہر کرتا رہے اب دعا کرنا چاہیے پس دعا ہوئی اور مجمع منتشر ہو گیا فقط۔

نوٹ:۔ اسکے بعد وعظ شکر العطاء کا ملاحظہ فرما لینا مناسب ہے فقط :۔ اشرف علی ۲ شعبان ۱۳۵۱ھ

ف شرط عادی عطا کی جلدی نہ کرنا ہے ہماری کی ایک خراب حالت کا بیان۔

۱۶۰

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

۱۶۱ وعظ مسمی بہ

شعبان فی شعبان

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

شعبان فی شعبان

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کیونکر ہوا	سبب وعظ	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون ضلع مظفر نگر	۵ شعبان المعظم ۱۳۳۶ھ ہجری	۱ گھنٹہ					حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم بجنوری		

خطبہ ماثورہ اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا انتصف شعبان فلا تصوموا ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ والدارمی والترمذی کذا فی المشکوٰۃ) یہ ایک حدیث مختصر ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حکم بیان فرمایا ہے ظاہراً تو اس کا تعلق شعبان سے ہے مگر واقع میں مقصود اس میں رمضان شریف کا ایک حکم ہے چونکہ شعبان کا وقت رمضان شریف کے متصل ہے اسلئے اس وقت بیان کے لئے اس حدیث کو اختیار کیا ہے آج کے وعظ میں بعض احکام شعبان کے متعلق اور بعض احکام رمضان کے متعلق مذکور رہیں گے ۔ لفظ کے اعتبار سے تو اس حدیث کا مضمون شعبان کے متعلق ہے اور معنی میں غور کیا جاوے تو یہ حدیث رمضان سے بھی تعلق رکھتی ہے ۔ آپ نے اس میں کیلئے

ایک نہایت کارآمد دستورالعمل بیان ہوا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ طالب تمام مؤمنین ہیں
اسلئے وہ دستورالعمل تمام مؤمنین کیلئے ہوگا کیونکہ ایمان کے حقوق میں سے یہ ہے کہ آدمی
ہمیشہ اللہ کی طلب میں لگا رہے اسلئے سب ہی مؤمنین طالب ہیں۔ سو جو حکم یہاں سے
مستنبط ہوتا ہے وہ باعتبار حکمت کے ایک دستورالعمل ہے مؤمنین طالبین کا سو حاصل حدیث
کا دو مضمون ہیں ایک تو لفظوں کا مدلول ہے دوسرا معنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔
میں دونوں کو مختصراً عرض کرونگا ظاہری لفظوں کا مطلب تو یہ ہے کہ جب آدھا شعبان
ہو جایا کرے تو روزہ مت رکھا کرو یہ تو الفاظ سے اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے اور ترجمہ کا یہ حکم
تو متعلق شعبان کے ہے مطلب یہ ہے کہ نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنا مناسب نہیں اور
اس لاتصوموا میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ نہی تحریمی نہیں ہے بلکہ ارشادی ہے یعنی حضور صلی اللہ
علیہ وسلم مشورہ دیتے ہیں کہ نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنا مناسب نہیں اور ساتھ ہی
ساتھ غور سے دیکھا جاوے تو اسمیں نصف شعبان کے روزہ کے جواز کی طرف اشارہ ہے ۱۹۳
کیونکہ یوں فرما رہے ہیں کہ اذا انتصف شعبان فلا تصوموا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب نصف شعبان
ہو چکے تو روزہ مت رکھو اور نصف شعبان ہو چکنے کا تحقق یوم وسط کے گزرنے سے
ہوتا ہے نہ کہ اس سے پہلے تو آگے کو روزہ رکھنے سے نہی ہوئی اور اس سے پہلے کی نہی نہیں
اور نصف سے پہلے میں خود یوم نصف شعبان بھی داخل ہے۔ تو اسمیں اشارہ ہو گیا عدم نہی
عن صوم یوم النصف کی طرف۔ رہا یہ کہ جب اس سے نہی نہیں ہے تو وہ جائز ہے یا مستحب سو
جواز اور استحباب فی نفسہ دونوں محتمل ہو سکتے ہیں اس کیلئے دوسری دلیل کی ضرورت ہے سو
دوسرے دلائل سے معلوم ہوا ہے کہ نصف شعبان کا روزہ مستحب ہے تو اب شعبان میں تین جزو ہیں
ایک خاص یوم نصف شعبان دوسرا اسکے قبل تیسرا اس کے بعد تینوں کا حکم جدا جدا ہے نصف
سے قبل کا روزہ تو جائز ہے یعنی بلا استحباب خاص اور بلا کراہت جیسے اور ایام کے روزے ہیں
ویسے ہی قبل نصف شعبان کے روزے ہیں ان میں تخصیص کوئی نہیں ہاں روزہ رکھنے سے ثواب
ملیگا اور نفس روزہ کی فضیلت حاصل ہوگی کیونکہ سوائے ایام منہیہ کے سب دنوں میں روزہ
رکھنا جائز ہے۔ دوسرا جزو خاص نصف شعبان جسکو پندرہ تاریخ کہتے ہیں اس کا روزہ

منتخب ہے نہی بعد النصف اس میں روزہ کی نہی ہے گو ارشادی ہی سہی۔ حدیث میں نصف شعبان کے روزہ کی فضیلت کے ساتھ پندرھویں رات کی بھی فضیلت آئی ہے اور پندرھویں رات سے مراد وہ رات ہے جو چودہ تاریخ گذر کر آتی ہے اور وجہ اسکے پندرھویں ہونے کی یہ ہے کہ شریعت میں رات کو مقدم سمجھا گیا ہے دن پر اسلئے جب رویت ہلال شعبان ہو جاوے تو وہ رات شعبان ہی میں شمار ہوگی اسواسطے جو رات ۱۴ تاریخ کے ختم ہونے پر ہوگی وہ پندرھویں رات ہوگی راز اس کا یہ ہے کہ شریعت میں حساب مقرر ہے چاند سے اسلئے رات تاریخ کا جز سابق ہے اب رہی یہ بات کہ حساب چاند سے کیوں لیا گیا ہے سورج سے کس واسطے نہیں رکھا گیا جیسا کہ اور لوگوں نے سورج سے حساب رکھا ہے تو راز اس کا یہ ہے کہ چاند سے حساب رکھنے میں سہولت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم شریعت سہلہ لیکر بھیجے گئے ہیں یہ تو ایک ظاہری حکمت ہے باقی اس شریعت میں جو برکات و اسرار ہیں وہ غامض بھی ایسے ہیں جو افلاطون کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتے اور ظاہری آثار سہل بھی ایسے ہیں کہ اتنی سہولت کسی اور طریق میں نہیں ہوسکتی دونوں پہلو پر نظر کرکے یہ شعر یاد آتا ہے ؎ ۱۶۴

(حاشیہ: ف شعبان میں پندرھویں رات کی تعیین کا راز)

(حاشیہ: ف شریعت میں چاند سے حساب رکھنے کا راز)

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد … برنگ اصحاب صورت رابو ارباب معنی را

جیسے بعضے حسین کہ ان میں ظاہری آب و تاب اور دلکشی بھی ہوتی ہے گو سرسری نظر سے دیکھا جائے اور اگر تدقیق کیجائے تو باطناً بھی بیحد اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ شریعت کی ایسی ہی مثال ہے کہ ظاہری حسن بھی ہے اور باطنی حسن بھی اور بعض وہ حسین ہیں کہ ظاہری آب و تاب تو ان میں ہے مگر تدقیق کی جائے تو ان میں حسن باطنی نہیں ہوتا پختگی نہیں ہوتی ایک وہ ہیں کہ جوں جوں ان میں تدقیق کی نظر کیجائے دقائق حسن کے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں ظاہر بھی دلربا ہے اور باطن بھی ایسا جانفزا ہے کہ حد و حساب ہی نہیں شریعت غراء کے سارے احکام ایسے ہی ہیں چنانچہ میں جس کا ذکر کر رہا ہوں وہ بھی ایسا ہی ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شریعت میں جو چاند سے حساب رکھا ہے اسمیں یہ بھی راز ہے کہ اگر تمام لوگوں پر کبھی سہو مسلط ہو جائے یعنی کسی کو بھی تاریخ یاد نہ رہے تو آفتاب سے کوئی ذریعہ تاریخ معلوم کرنیکا نہیں ہو سکتا اس سے عام شورش پھیل جائے اور چاند ایسی چیز ہے کہ اول تو

اس کی کمی اور زیادتی کو دیکھکر روزانہ تاریخ کا بھی اندازہ ممکن ہے اور اگر پریشانی بھی ہو گی تو ختم ماہ تک ہو گی چاند ہو جانے پر پھر حساب جاری ہو سکتا ہے بخلاف سورج کے کہ اسمیں یہ صورت نہیں ہو سکتی پس چاند کا حساب سہل ہے عامی تک حساب لگا سکتا ہے جو اس امت کے مناسب ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے نحن امۃ امیۃ لانکتب ولانحسب جو امر دوسروں کے نزدیک عیب ہے وہ اس امت کیلئے ہنر شمار کیا گیا ہے وہاں گھڑیاں جنتریوں آلات رسد کی ضرورت ہے یہاں ان بکھیڑوں کی حاجت نہیں یہاں افلاطون اور دیہاتی سب برابر ہیں یعنی سب آسانی سے حساب کر سکتے ہیں کوئی دقت ہی نہیں ایک اور دقیق حکمت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدائی احکام ہیں وہ یہ کہ اس میں تمام عالم کی رعایت ہے اور جس قانون میں رعایت تمام عالم کی ہو وہی خدائی قانون ہو سکتا ہے شریعت ہی ایسا قانون ہے جس میں تمام عالم کی رعایت ہے۔ مثلاً روزہ ہی ہے اگر اس کا حساب سورج سے ہوتا مثلاً مئی یا جون میں سے کوئی مہینہ اسکے لئے معین ہوتا تو جس موقعہ پر مئی جون میں گرمی ہوتی ہے اس جگہ روزے ہمیشہ گرمی میں رہا کرتے اور جہاں سردی ہوتی ہے وہاں سردی ہی میں ہمیشہ رہتے پس کسی جگہ کے باشندوں پر تو روزے ہمیشہ گرمی میں ہوتے اور کسی جگہ کے لوگوں کے لئے سردی ہی میں رہتے تمام عالم کے لئے سہولت تو اس میں ہے کہ جہاں اب گرمی میں تھے کبھی آئندہ ان کیلئے سردی میں ہو جائیں اور جس جگہ اب سردی میں تھے وہاں آئندہ گرمی میں ہو جائیں تا کہ ہر موسم کی حالت پیش نظر رہے اور یہ چاند کے حساب میں ہو سکتا ہے سورج کے حساب میں یہ صورت ممکن نہیں تمام عالم کے لئے سہولت ہونا یہ برکت باطنی ہے باقی تمام اسرار کا احاطہ کون کر سکتا ہے غرض پندرہویں شب وہ ہے جسکی صبح کو پندرہ تاریخ ہو اس رات کو قیام کرو اور دن کو روزہ رکھو حدیث میں اسکو تصریحاً بیان کیا گیا ہے اب رہی یہ بات کہ اس شب میں کونسی عبادت کرنا چاہیئے تو اسکی بابت حدیث میں کوئی عبادت خاص منقول نہیں کہ نوافل ہی پڑھے یا قرآن شریف ہی کی تلاوت کرے وغیرہ وغیرہ جونسی عبادت میں سہولت معلوم ہو اسکو جتنا اختیار کرے باقی بزرگوں سے جو کوئی خاص عبادت منقول ہے مثلاً بعض کا اپنے مریدین کو نوافل معین کر کے بتلانا تو اسمیں

ف: چاند کا حساب سہل ہے

ف: شریعت ہی ایسا قانون ہے جس میں تمام عالم کی رعایت ہے

۱۶۵ بحر:

ف: روزوں کا حساب چاند سے رکھنے میں تمام عالم کے لیے سہولت ہے

ف: پندرہویں شب شعبان میں کوئی عبادت خاص منقول نہیں اور بزرگوں کے معمول کا سبب یہ ہے

انہوں نے بعض کے اعتبار سے سہولت کا لحاظ رکھا ہے اور ان مریدین کے مناسب وہی عبادت ہوگی کیونکہ بعض اوقات اگر معین کرکے نہ بتلایا جاوے تو کام بسہولت نہیں ہوسکتا اس لئے بزرگوں نے ایک مناسب حال طریقہ تجویز کرکے بتلا دیا تعلیم تو اس بنا پر ہوئی تھی مگر مریدوں میں جاہل زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ عالم اول تو بہ نسبت جہلاء کے ہیں ہی بہت کم دوسرے وہ مرید بھی بہت کم ہوتے ہیں گو اب ہونے لگے ہیں اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ مولوی درویشی کے خلاف ہیں مولوی درویشی کے خلاف نہیں ہیں مگر وہ کسی کو درویش کم سمجھتے ہیں اسلئے مرید بھی کم ہوتے ہیں غرض جہلاء نے یہ سمجھ لیا کہ بس اس رات میں یہی عبادت متعین ہے دوسری نہیں سو یہ غلط ہے جو بات قرآن وحدیث سے ثابت نہو وہ بدعت یا زندقہ ہے باقی بزرگوں کی طرف ہمیں حسن ظن ہے کہ انہوں نے قرآن وحدیث کے خلاف نہیں تبلایا بلکہ انہوں نے کسی خاص شخص کی مناسبت کے لحاظ سے اس کے لئے خاص طور پر اس طریق کو مناسب سمجھکر تبلا دیا ہوگا خوب سمجھ لو کہ اس رات میں کوئی عبادت خاص منقول نہیں خواہ وعظ سنو خواہ نوافل پڑھو خواہ تلاوت کرو اختیار ہے اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ صوموا نہارہا تو یہ امر بھی استحبابی ہے یعنی روزہ پندرہویں کا مستحب ہے فرض واجب نہیں غرض قوموا لیلہا سے اس رات کی فضیلت معلوم ہوگئی اور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ میاں اس رات میں آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں (جس قسم کا نزول ان کی شان کے موافق ہو ہمارا جیسا نزول مراد نہیں) اور فرماتے ہیں ہل من داع فاستجیب لہ ھل من مستغفر فاغفر لہ صبح تک یہی کیفیت رہتی ہے اب ایک اور مدعا کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس کا ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ اس رات میں فضیلت ہے ایک دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس میں فضیلت ہوگی اس میں معصیت بہ نسبت دوسرے اوقات کے بہت بری ہوگی جیسے مکان کا حکم ہے اسی طرح زمان کا حکم ہے مثلاً ایک تو گناہ معمولی جگہ پر کرنا اور ایک مسجد میں کرنا مسجد میں گناہ کرنا زیادہ برا ہے اسی طرح ایک تو گناہ کرنا دوسرے اوقات میں اور ایک متبرک اوقات مثلاً رمضان شریف میں گناہ کرنا یہ بہ نسبت دیگر ایام کے بہت برا ہے اور یہ رات بھی متبرک ہے تو اسمیں بھی گناہ اور اوقات سے اشد ہوگا اور جو گناہ اس رات میں کئے جاتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو کہ برنگ عبادت نہیں ہیں اس کا برا ہونا تو بالکل ظاہر ہے جیسے اس رات میں آتشبازی

۱۶۶
ف باری تعالیٰ کا نزول شعبان کی پندرہویں رات میں آسمان دنیا کی طرف
ف جو وقت یا جگہ میں فضیلت ہوتی ہے اس میں معصیت زیادہ قبیح ہوگی
ف جو گناہ اس شب میں کئے جاتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں

چھوڑی جاتی ہے جسکی وہی مثل ہے کہ گھر پھونک تماشہ دیکھو اس میں کبھی ہاتھ جل جاتے ہیں مال اور جان دونوں کا نقصان ہوتا ہے پس علاوہ معصیت ہونے کے اس میں دنیا کا بھی تو نقصان ہے دوسری قسم جو کہ معصیت برنگ عبادت ہے وہ کیا ہے بدعت چنانچہ اس رات میں ایک بدعت بھی عوام میں جاری ہے اگرچہ ہمارے یہاں نہیں ہے مگر بعض بڑھیاں اب بھی جاری کئے ہوئے ہیں جیسے حلوہ اور چونکہ بدعت میں مزہ بہت ہے اسلئے تاویلیں کر کر کے اسکو جائز کرنا چاہتے ہیں اور منع کرنے سے نہیں مانتے۔ غرض چونکہ اسکے اندر لطف ہے اور شیوع ہے اور چونکہ بدعت بھی ایک معصیت ہے اس شب بابرکت میں ان معاصی کا ارتکاب اشنع ہوگا۔

ف: ماہ شعبان کا تیسرا جزو

یہ اس ماہ کا دوسرا جزو ہے۔ اور اس ماہ میں تیسرا جزو اور ہے یعنی نصف شعبان کے بعد کا جو زمانہ ہے جس کا ذکر اس حدیث میں ہوا ہے جسمیں روزہ کی ممانعت ہے جس کی وجہ معلوم کرنے کا شاید سامعین کو انتظار ہو کیونکہ آجکل اسرار کی تفتیش کا بہت زور ہے ہر حکم کے متعلق لوگ پوچھتے ہیں کہ اس حکم کی کیا وجہ ہے اور اس کی کیا علت ہے بعض لوگ تو یہاں تک پوچھتے ہیں کہ سؤر کیوں حرام ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ غرض ہر چیز کی علت پوچھتے ہیں میں نے ایک شخص کو لطیفہ کا جواب دیا تھا اس نے لکھا تھا کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے میں نے جواب لکھا کہ آپ کے سوال عن الحکمۃ میں کیا حکمت ہے بتلایئے بس ختم ہو گئے تو میں ایسے سوالات کا جواب نہیں دیا کرتا اور علماء کو بھی اس سے منع کرتا ہوں بعض لوگوں کو ایسے سوالات کے جواب نہ ملنے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ہم اگر علت دریافت کریں یا علماء خود ہی وجہ بیان کر دیں تو کیا قباحت ہے آخر مجتہدین نے بھی تو احکام کی علتیں بیان کی ہیں تو بات یہ ہے کہ جب بندر آدمی کی نقل کریگا تو اسی کا کچلا ہو جاویگا چنانچہ ایک قصہ ہے کہ کسی جگہ بڑھئی لکڑی چیر رہے تھے قریب میں ایک بندر بیٹھا ہوا تھا وہ اتفاق سے کسی کام کو چلے گئے بندر کو نقل کی عادت ہوتی ہی ہے وہ اس لکڑی پر آکر بیٹھ گیا اور اس نے انکی نقل کرنی چاہی اس لکڑی میں لکڑی کی میخ ٹھکی ہوئی تھی تاکہ آرہ چلنے کی جگہ رہے اسکے بعض اعضاء (یعنی فوطے) اس لکڑی کے اندر آ گئے اب جو بندر نے اسپر بیٹھکر زور کر کے میخ نکالی تو لکڑی کے دونوں پٹ آپس میں مل گئے اب یہ رہ گئے تڑپتے ہوئے اتنے میں بڑھئی آ گئے انہوں نے یہ حال دیکھکر خوب خبر لی سر کا کچلا ہو گیا پیچھے کا دیوزینہ نیست بجا رہی۔ تو صاحبو! اسی طرح آپ مجتہدین کی نقل کرتے ہیں

ف: آجکل احکام کی علل پوچھنے کا مرض ہے

ف: مجتہدین کی علتیں بیان کرنے کی وجہ

یہ کیا ضرور ہے کہ جس نوع کا کام مجتہدین کرتے تھے وہ آپ سے بھی بن سکے۔ شعر

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر | گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد | کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
ہمسری با انبیاء برداشتند | اولیاء را ہمچو خود پنداشتند

صاحبو اجمالاً اتنا سمجھ لو کہ بزرگوں کے اقوال کی تقلید کرنا چاہئے ان کے افعال کی نہیں کرنا چاہیے باقی مولانا کے کلام میں جو یہ شعر ہے ؎

خلق را تقلید شان بر باد داد | کہ دو صد لعنت بریں تقلید باد

جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تقلید بالکل ہوتی نہیں چاہیئے نہ قول میں نہ فعل میں چنانچہ بعضے غیر مقلدین اسکو استدلال میں پیش کیا کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا تقلید قولی پر لعنت نہیں کرتے بلکہ تقلید فعلی ہی پر کرتے ہیں چنانچہ اس قصہ میں تقلید فعلی ہی کا ذکر ہے اس کے بعد یہ شعر لائے ہیں تو لعنت بھی اسی پر ہے۔ اور کسی کا تو کیا ذکر ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی بھی تقلید علی الاطلاق نہیں ہے الا بعد تحقیق عدم الاختصاص تو اوروں کے فعل میں تو کہاں گنجایش ہوگی کیونکہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل آپکی ذات مبارک کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہو، اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک طبیب سنکھیا کھا رہا ہو اور ایک جاہل شخص اسکو دیکھکر سنکھیا کھانے لگے اگر کوئی اس سے کہے کہ تو سنکھیا کیوں کھاتا ہے وہ اس پر یہ جواب دے کہ فلاں طبیب کو میں نے سنکھیا کھاتے ہوئے دیکھا ہے اس لئے میں بھی کھاتا ہوں تو اسکو یوں کہا جائیگا کہ تجھکو اسکے فعل کی تقلید ہرگز درست نہیں کیونکہ طبیب سنکھیا کھائیگا تو اسکو ضرر نکریگا کیونکہ وہ اسکے کھانے کی تدبیر سے واقف ہے اور جاہل کھا کر تباہ ہوگا یہ مثال ہے تقلید فعلی کی۔ اب یہ کہنا غلط ہے کہ ہم تو بزرگوں کے فعل کی تقلید کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی احکام کی علل اور حکمتیں بیان کی ہیں اسی طرح ہم بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ تو اجمالی جواب ہے اور تفصیلی جواب یہ ہے کہ انہوں نے بضرورت تعدیہ حکم مسکوت عنہ کے حکم منطوق کی تعلیل کی ہے نہ کہ بلا ضرورت مصالح تراش کر ان کو احکام کی بنا قرار دیا ہے۔ پھر جو لوگ احکام کی علل اور حکمتوں کے درپے رہتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں جو علماء سے علل و حکمتیں

ف: بزرگوں کے قول کی تقلید کرنا چاہئے فعل کی نہیں

۱۶۸

ف: علل تلاش کرنے والے دو قسم کے ہیں۔

دریافت کرتے ہیں دوسرے وہ ہیں کہ خود علل اور حکم بیان کرتے ہیں ان کی حالت ان سے بھی زیادہ خطرناک ہے مجھے ایک لطیفہ یاد آیا وہ یہ کہ ایک صاحب نے سُوَر کی حرمت کی علت بیان کی تھی کہ یہ اصل میں سو، ار ہے اور رسُو، کہتے ہیں برائی کو چونکہ اس میں برائی ہے اسلئے حرام کیا گیا۔ آجکل ایسی علل بیان کی جاتی ہیں جس پر ہنسی آتی ہے ان صاحب سے پوچھئے کہ اس کا یہ نام ہی کیوں رکھا گیا۔ اگر احکام تابع نام کے ہیں تو کوئی شراب کا نام شراب الصالحین رکھدے تو کیا وہ حلال ہو جائیگی۔ اور تعجب یہ ہے کہ ایسی باتوں کی کتابیں جمع ہونے لگیں اور اول تو زیادہ لوگوں کی یہی حالت ہے کہ خود علل وحکم بیان کرتے ہیں اور جو ان میں محتاط ہیں وہ خیر پوچھ ہی لیتے ہیں اب رہا یہ اعتراض کہ فقہاء نے ایسا کیوں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو ضرورت پیش آئی تھی جیسا اوپر مذکور ہوا چنانچہ اسی حدیث میں جو حکم لا تصوموا ہے اس کی علت فقہاء نے تلاش کر کے سمجھی کہ ضعف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نصف اخیر شعبان میں روزہ سے نہیں فرمائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسوقت روزہ رکھنے سے کہیں ضعف نہ ہو جائے پھر اس سے رمضان کے روزہ میں خلل واقع ہو اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف شعبان کے بعد روزہ سے نہی فرمادی اب اس علت کے معلوم ہو جانے سے اس کا درجہ بھی متعین ہو گیا وہ یہ کہ فی نفسہ روزہ حرام نہیں ایک عارض کی وجہ سے ممانعت ہے اگر وہ عارض نہ پایا جاوے تو روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہ ہوگا مثلاً کسی کو ضعف نہ ہوتا ہو اور وہ عادی ہو ان ایام میں روزہ رکھنے کا اور روزہ رکھنے سے کوئی اثر معتد بہ رمضان میں واقع نہ ہو تو اسکو رکھنا جائز ہوگا چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رمضان شریف سے دو تین روز قبل روزہ نہ رکھے مگر جسکی عادت ہو حاصل یہ کہ ایک تو مجتہدین کو ضرورت تھی درجہ معین کرنے کی اسلئے علل بیان کی ہیں اور ایک ضرورت حکم کے تعدیہ کرنے کی پیش آتی تھی تعدیہ کی وجہ یہ ہوئی کہ قرآن وحدیث میں کلیات بیان ہوئے ہیں اور بہت سے جزئیات کی تصریح نہیں ہے اب ان جزئیات کا حکم کس طرح معلوم ہو اسلئے فقہاء نے احکام کی علل بیان کیں کہ جس جگہ یہ علل پائی جائیں گی حکم بھی پایا جاویگا اس طریقہ سے جزئیات کا حکم نکل آئیگا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اجتہاد کی اجازت قرآن وحدیث سے ثابت ہے کیونکہ

اگر اجتہاد کی اجازت نہ ہوتی تو قرآن وحدیث میں کلیات مذکور نہ ہوتے بلکہ جزئیات مذکور ہوتے پس کلیات کا مذکور ہونا اور جزئیات کا زیادہ مذکور نہ ہونا اجازت اجتہاد کی دلیل ہے دو ہتہ تبلاؤ پھر اس صورت میں جزئیات کا حکم کیسے معلوم کیا جائیگا یہ دلیل منکرین پر بڑی حجت ہے تعجب ہے کہ وہ ایسے صریح مقدمات کے نتیجہ سے انکار کرتے ہیں اور اس اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ غیر منصوص پر منصوص کا حکم جاری کیا جاتا ہے بوجہ اس تشابہ کے جو دونوں میں پایا جاتا ہے جو اشترا ہوتا ہے کسی وصف میں جب غیر منصوص میں وہ وصف پایا جاویگا منصوص کا حکم وہاں بھی متعدی کیا جاویگا۔ اس طرح سے جزئیات غیر منصوصہ کا حکم معلوم ہو جاویگا یہ صورت ہے تعدیہ کی پس مجتہدین کو تو بیان علل کی یہ ضرورت پیش آتی ہے کیا ضرورت ہے کیونکہ اب تو احکام مدون ہو چکے ہیں ہاں ہم اب بھی ان جزئیات میں اجتہاد کی اجازت دیتے ہیں جو مدون نہیں۔ مگر ان جزئیات غیر مدونہ میں بھی ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ وہ اس کا محل نہ ہو۔ اسی جزئی غیر مدون کی ایک مثال آجکل ہوائی جہاز ہے کہ پہلے یہ تھے ہی نہیں۔ اسکے بارہ میں میرے قلب میں یہ خیال آیا تھا کہ اسکو پانی کے جہاز پر قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ آبی جہاز مستقر ہے زمین پر اگرچہ بواسطہ سہی اس طرح کہ پانی جہاز کو اٹھائے ہوئے ہے اور پانی کو زمین اٹھائے ہوئے ہے تو اسپر نماز گویا زمین پر پڑھنا ہے اور ہوائی جہاز کو ہوا پر استقرار نہیں ہے نہ ہوا کو زمین پر استقرار ہے چنانچہ ظاہر ہے تو پھر اسپر نماز کیسے جائز ہوگی اب ضرورت ہوگی اجتہاد کی میں نے ایک تحریر میں اس کا جواب لکھا ہے اور ہوائی سفر میں قصر کا مسئلہ بھی لکھا ہے یہ میں نے اسلئے کہا ہے کہ علما اس جانب توجہ کریں۔ آجکل تو یہ غضب ہے کہ احکام منصوصہ تعبدیہ کی بھی حکمت پوچھتے ہیں اور بزعم خود بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں سو یہ اول تو تقلید نہیں دونوں کا فرق اوپر ظاہر کر چکا ہوں اور اگر تقلید ہی فرض کیجاوے تو تقلید قولی چاہیئے فعلی نہیں چاہیئے جو شخص کسی ضرورت سے پلاؤ کا پکانا سیکھتا ہو اور پکانا نہ جانتا ہو اسکو ضرورت ہوگی ترکیب سیکھنے کی یہ ضرورت پیش آتی ہے مجتہد کو باقی جسے کھانا ہی ہو اسکو پکانیکی ترکیب پوچھنے کی کیا ضرورت ہے یہ حالت ہماری ہے سو ہمیں عمل کیلئے احکام معلوم کرنیکی ضرورت ہے علت یا حکمت دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں علاوہ اسکے اسمیں ایک ضرر بھی ہے وہ یہ کہ علت حکمت معلوم ہو جانے کے بعد طاعت کی عظمت

۱۲۰

ف

جزئی غیر مدون کی ایک مثال آج کل ہوائی جہاز ہے

کا وہ اثر قلب پر نہیں ہوتا جو بدون اسکے معلوم کئے عمل کرنے سے ہوتا ہے پس تم احکام کی حکمت معلوم کر کے اس عظمت کو کیوں کھوتے ہو اور اگر ایسا ہی علم اسرار کا شوق ہے تو اسکی بھی یہی صورت ہے کہ پہلے بدون معلوم کئے ہی عمل شروع کر دو کام کرتے کرتے برکات و اسرار خود ہی محسوس ہونے لگتے ہیں ابتداءً تو کچھ بھی نہیں ہوتا اگر تم نماز اس طرح پڑھو جسکا نام نماز ہے تو اکثر اس کے اسرار بھی معلوم ہو جاتے ہیں گو مقصود نہیں مگر یہ ابتدا ہی سے نہیں ہو سکتا دیکھئے بچے کا بچہ جس وقت ہوش سنبھالتا ہے تو بنئے اسی وقت سے اسکو کمانا سکھاتے ہیں مثلاً اس کو اول ہی سے حلوا وغیرہ بیچنا شروع کرا دیتے ہیں۔ مگر اس حالت میں اسکو کچھ بھی مزہ نہیں آتا بلکہ اسوقت کلفت معلوم ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ اسی خیال سے کراتے ہیں کہ آئندہ اسکو مزہ آویگا پھر آہستہ آہستہ اور کام اسکے سپرد کرتے ہیں پھر ایک وقت اسپر ایسا آتا ہے کہ اسکو مزہ آنے لگتا ہے اور اس کام کے اسرار خود ہی کھلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس کام کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتا صاحبو! اسی طرح تم بھی کام کرتے ہو کام خود برکات کو نمایاں کر دیگا جس کام پر مداومت مع اسکی شرائط کے کی جاتی ہے خود وہ عمل ہی اپنی حقیقت بتلا دیتا ہے جب تم پر کام کرتے کرتے برکات منکشف ہونگے تو کام لینے والوں کو دعا دوگے چنانچہ میرے دل سے والد ماجد صاحب کیلئے دعا نکلتی ہے کہ وہ ہمیں دین پڑھا گئے تھے اب اسکے برکات محسوس ہوئے حالانکہ جس وقت ہم نے عربی شروع کی تھی اور فال فعالا فالوا کی گردان کرتے تھے تو بڑی تنگی اور کلفت ہوتی تھی اب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے چنانچہ میری نانی صاحبہ کہ انہوں نے مجھکو پرورش کیا تھا ایک روز کہنے لگیں کہ تجھے یاد بھی ہے کہ تو یوں کہا کرتا تھا کہ نانی عربی نکلے چربی تو واقعی ایک وہ وقت بھی تھا اور اسوقت اس کی قدر و منزلت معلوم نہ تھی مگر والد صاحب کے حکم سے ہمیں لگے رہے تو خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب کتابوں کے پڑھنے کا نام ہو گیا۔ گو جسے علم کہتے ہیں وہ اب بھی حاصل نہیں ہوا مگر اس ناتمام ہی علم پر بے انتہا خوشی ہوتی ہے اور والد صاحب کیلئے دعا نکلتی ہے حضرت یہی حالت ہر عمل کی ہے کہ ابتدا میں تو تنگی پیش آتی ہے اسوقت نہ اسرار و برکات منکشف ہیں نہ معلمین کی قدر دل میں ہوتی ہے پھر جب مداومت کیجاتی ہے اور اسرار و برکات کھلتے ہیں تو راہ پر لگانے والوں کے حق میں دعا نکلتی ہے بس کام کرنا حکمتوں کے معلوم ہونے پر موقوف

نہیں بلکہ حکمتیں معلوم کرنا عمل پر موقوف ہے حکمتیں تو مداومت سے خود معلوم ہو جاویں گی اس کی ایسی مثال ہے جیسے نابالغ بچہ سے کہا جائے کہ شادی کر لے تو وہ اسکو مصیبت سمجھیگا اور کہیگا کہ کون گلے میں طوق ڈالے اگر اسکی شادی کر بھی دیجائے تو بی بی کی صورت دیکھکر ہی گھبرائیگا مگر جب قبل جوانی کا سرسراہٹ اٹھنے لگا اور شادی کے اسرار معلوم ہونگے تو شادی کرنیوالوں کو دعا دیگا حضرت نماز روزہ کرنیوالے بھی بالغ نہیں ہوئے ابھی تو یہ حالت ہے شعر

خلق اطفالند جز مست خدا | نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

بزرگوں نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ بالغ طبی وہ ہے کہ جسمیں سے منی[سہ] نکلنے لگے اور طریق کا بالغ وہ ہے جسمیں سے منی نکل جاوے (یعنی خودی) یہ معنی ہیں نیست بالغ جز رہیدہ از ہوائے کے پھر تو یہ حالت ہوتی ہے کہ بی بی کے لئے محنت مشقت سے کمانا بھی لذت ہے حتی کہ اسکے لئے جہنم میں بھی جانا لذت ہے اس طرح سے کہ اسکی خوشی کے واسطے خدا تعالیٰ کو ناراض کرتے ہیں کہ بلا سے فلاں کام سے خدا ناراض ہوگا بی بی تو خوش ہوگی اب بھی تو یہ وہی بی بی ہے جسکو یہ پہلے ڈائن خیال کرتا تھا پس معلوم ہوا کہ آدمی ذہن کا کام کرتا رہے پھر لذت بھی آنے لگتی ہے پھر تو ایسی دلچسپی ہوتی ہے کہ اسکے سامنے سلطنت کی بھی پروا نہیں کرتا یہاں ایک نکتہ قابل بیان ہے وہ یہ کہ شاید اس مضمون کو سنکر حسرت ہوتی ہوگی کہ یہ درجہ ہمکو نصیب ہونے کی کیا امید ہے سو میں بشارت دیتا ہوں کہ بحمد اللہ یہ درجہ ہر مسلمان پابند نماز کو حاصل ہے خیر سلطنت تو کون دیتا ہے کس کے قبضہ میں ہے جسکے ملنے نہ ملنے کے وقت اس درجہ کا موازنہ ہو سکے مگر یہ صورت تو ممکن ہے کہ کوئی یوں کہے کہ تم ایک وقت کی نماز چھوڑ دو ہم تمہیں دس ہزار روپیہ دینگے تو واللہ نمازی آدمی ان پر پیشاب کر دیگا جسکو نماز کی عادت ہے وہ کبھی اسپر راضی نہوگا پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو نماز میں مزہ نہیں آتا تو اس مثال نے تمہارے قول کو غلط کر دیا کیونکہ اگر مزا نہیں آتا تو اس ہزار روپیہ پر اسکو کیوں نہ ترجیح دی گئی کچھ تو مزا ہے جسنے اپنی طرف کھینچ لیا اگر کہو کہ خدا کا خوف اس کا باعث ہوا ہے میں کہتا ہوں کہ اگر صرف خدا کا خوف ہی اس کا باعث ہوتا تو ایسا نمازی زنا میں کیوں مبتلا ہو جاتا ہے غیبت کیوں کرتا ہے وہاں خوف

سہ ایک جگہ منی عربی ہے دوسری جگہ فارسی ہے ۱۲ منہ

۱۷۲ ن طاعت پر مداومت کرنے سے ایسی دلچسپی ہو جاتی ہے کہ اسکے سامنے سلطنت ہیچ معلوم ہوتی ہے

کہاں چلا گیا معلوم ہوا کہ یہاں صرف لذت مانع ہوئی ہے نماز کے عدم ترک کی۔ یہ تو ہم جیسوں کی نماز کا حال ہے باقی حقیقی نماز کا تو کیا کہنا ہے اس کی تو یہ حالت ہے شعر

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

حب ہی تو خدا تعالیٰ نے عام مومنین کیلئے یہ فتویٰ دیا ہے والذین آمنوا اشد حبا للہ شدت حب عشق ہے اس میں سب مومنین کو عاشق فرمایا ہے۔ ایک رئیس کی حکایت ہے کہ انہوں نے مولانا مظفر حسین صاحب رح سے سوال کیا کہ مولانا حدیث میں ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ماں باپ اور سب سے زیادہ نہ ہو تو مومن نہیں ہوتا سو یہ درجہ تو محبت کا ہم اپنے دل میں نہیں پاتے۔ مولوی صاحب نے اس کا عملی جواب دیا وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا تذکرہ شروع کیا پھر اسکو بند کر کے یہ کہنے لگے کہ آپ کے والد صاحب بھی بہت اچھے آدمی تھے اور انکی خوبیوں کا ذکر شروع کر دیا۔ رئیس صاحب جھلا کے کہنے لگے کہ حضرت میرے والد کا ذکر کہاں داخل کر دیا مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں نے آپ کی بات کا جواب دیا ہے کہ اگر آپ کو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باپ سے زیادہ محبت نہیں تو حضور کے کمالات کے درمیان میں باپ کا ذکر کیوں ناپسند ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی محبت باپ سے زیادہ ہے۔ رئیس صاحب کی آنکھیں کھل گئیں شبہ رفع ہو گیا میں کہتا ہوں کہ عامی سے عامی کو بھی محبت شدیدہ ہے اللہ و رسول کی مگر اس کا اظہار موقع پر ہوتا ہے۔ صاحبو تمہارے اندر سب مادے موجود ہیں مگر ان کے صاف کرنے کی ضرورت ہے جیسے سونا زمین ہی سے نکلتا ہے مگر سونے کے ٹکڑے نہیں ہوتے بلکہ اسکے ذرے مٹی میں ملے ہوتے ہیں ان ذروں کو مٹی سے صاف کر کے اور پگھلا کر سونے کے ڈھیلے بناتے ہیں ایسے ہی اپنے کو صاف کر کندن نکل آویگا اپنے کو بے دولت مت سمجھو تم دولت مند ہو اسلئے تمہیں دریوزہ گری کی ضرورت نہیں تمہارے اندر سب کچھ موجود ہے اور تمہاری وہ حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر　　تو ہمی جوئی لب ناں دربدر

تمہاری اپنی مثال ہے جیسے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے ایک گھر خریدا اسکی

دیوار میں ایک گھڑا سونے کا گڑا ہوا تھا مگر اس شخص نے اسکو کھودا نہیں اسوجہ سے کہ دیوار میں گڑھا ہو جائیگا حالانکہ اسکو چاہیے تھا کہ گھڑے کو نکال لیتا کیونکہ اسکے مل جانے سے ویسے ویسے دس گھر بنجاتے اور گڑھا ہونے کا خیال لغو تھا اسی طرح یہ جسم ایک دیوار ہے اور اسکے اندر سونا ہے اسکو نکال کر پھر جسم کو ویسا ہی بنا لینا اور اسکی یہ صورت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں شعر

صحت این حس ز معموری تن　　　صحت آن حس ز تخریب بدن

پہلے اپنے جسم میں گڑھا کرو اسکو مجاہدات سے دبلا کرو اسکے بعد سونا نکلیگا مگر اس تخریب کی بھی ایک حد ہے جسکو جاننے والے بتا سکتے ہیں بہر حال انسان کے اندر سب خزانے موجود ہیں انکو ظاہر کرنے اور صاف کرنے کی ضرورت ہے بس یہی نماز اور یہی روزہ جسکو ہم بیکار سمجھتے ہیں بڑی دولت ہے بعض لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ کیا ہماری نماز اور کیا ہمارا روزہ یہ کہنا واہیات بات ہے۔ بہت تواضع بھی اچھی نہیں ہوتی ناشکری ہو جاتی ہے۔ حد سے زیادہ تواضع پر ایک حکایت یاد آئی ہیں الہ آباد سے کانپور کا سفر کر رہا تھا اسی درجہ میں چند جنٹلمین بیٹھے تھے ان میں بیچارے منصف بھی جو اس مجمع کے نئے تھے آ بیٹھے جو کہ بہت سیدھے سادھے تھے انہوں نے خواہ مخواہ ان لوگوں کی کمیٹی میں داخل ہونا چاہا چونکہ سیدھے تھے ان جنٹلمینوں نے انکو کمیٹی میں داخل کر کے ان کی خوب گت بنائی (خوب مذاق اڑایا) چنانچہ کھانا کھاتے میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ آئیے آپ بھی گوہ موت کھا لیجئے دوسرے جنٹلمین نے اسکو ٹوکا اور کہا کہ آپ کھانے کو گوموت سے تعبیر کرتے ہیں جنٹلمین صاحب بولے کہ حضرت ہمارا کھانا اس حیثیت سے کہ ہمارا ہے اسکو کھانا نہ کہنا چاہیئے یہ تکبر ہے بھلا ہم میں کہاں لیاقت ہے آپ کو کھانا کھلانے کی بس تواضعاً اسے گوہ موت ہی کہنا چاہیئے تو جیسی یہ تواضع تھی ایسی ہی ہماری تواضع ہے جو کہدیا کرتے ہیں کہ ہماری نماز اور روزہ کیا ہے کچھ نہیں۔ بات یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی تواضع بھی اچھی نہیں ہوتی پس اپنے نماز روزہ کو یہ خیال کرنا کہ ہمارا نماز روزہ کس قابل ہے گو تواضعاً ہی ہو اچھا نہیں۔

حضرت یہ نماز روزہ عطا ہے حق تعالیٰ کی۔ ہم میں تو قابلیت اتنی بھی نہیں کہ ایمان بھی نصیب ہو یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی نعمت ہیں خدا کے ذمہ آپکا چاہنا ہی کیا تھا کہ جو یہ عطا ہوئی یہ سب

نماز روزہ بڑی دولت ہے

۱۲۴

حد سے زیادہ تواضع اچھی نہیں اس کے متعلق ایک حکایت

حقیقت ناشناسی ہے بس یہ سب نعمتیں بھی ہیں اور واقعی ان چیزوں میں لذت بھی ہے گر کے دیکھو حکمت معلوم ہونے کے درپے نہ ہونا چاہیئے وجہ اس کی وہی ہے جو ابھی مذکور ہوتی تھی کہ عام لوگوں کو حکمت معلوم نہ ہونے سے احکام کی عظمت زیادہ ہوتی ہے یعنی جو محض خدا کا حکم سمجھکر کرتا ہے اسکے قلب میں وقعت ہوتی ہے اعمال کی مولانا فرماتے ہیں شعر

ف عام کیلئے بلا معرفت حکمت احکام کی عظمت زیادہ ہے

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست　　لیک عشق بے زباں روشن ترست

وہی سچا عاشق ہے جو علل وحکم کے درپے نہ ہو باقی مجتہدین اس سے مستثنے ہیں کیونکہ وہ عمل شروع کرنے کی حکمت تلاش نہیں کرتے نہ علت پر عمل کو موقوف رکھتے ہیں بلکہ تعدیہ واستنباط احکام کیلئے علل دریافت کرتے ہیں بہر حال فرق معلوم ہو گیا مجتہدین میں اور ہم میں

۵ ف نصف شعبان کے بعد روزہ کی ممانعت کی حکمت

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نہی فرمائی بعد نصف شعبان کے روزہ رکھنے سے گو اس کی حکمت معلوم کرنے کی ضرورت نہیں جیسا مفصلاً مذکور ہوا لیکن اگر تبرعاً بزرگوں کے قول کو نقل کر دیا جاوے اس طرح سے کہ عمل کا موقوف علیہ نہ ہو تو مضائقہ بھی نہیں سو وہ حکمت یہ ہے کہ نصف شعبان کے بعد روزہ نہ رکھنے سے قوت حاصل ہوگی رمضان پر اور اس حکمت سے اسکا درجہ بھی متعین ہو گیا کہ نہی ارشادی ہے۔ دوسرے اس حکمت پر نظر کر کے اس سے ایک عام مسئلہ مستنبط ہو گیا وہ یہ کہ رمضان کے لئے پہلے سے آمادہ ہو جانا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ تیاری عظیم الشان کی عظیم الشان ہی ہوتی ہے تو اسکے لئے بہت ہی اہتمام کرنا چاہیئے اور یہی مطلب تھا اس کا جو میں نے پہلے بیان کیا تھا کہ ظاہری تعلق حدیث مذکور الصدر کا شعبان سے ہے مگر حقیقت میں چونکہ اسکا تعلق رمضان سے بھی ہے اسلئے اسکو بھی بیان کروں گا سو اب میں اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں

ف شریعت نے تمام احکام میں سہولت رکھی ہے

حاصل یہ ہے کہ حکمت بعد نصف شعبان کے روزہ نہ رکھنے میں تقویت ہے رمضان پر ذرا غور کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے احکام میں بہت ہی سہولت کی ہے مثلاً یہ کہ رمضان شریف کے روزوں میں صعوبت ہوتی تو فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے کھا پی لو تاکہ رمضان میں آسانی ہو اور اسکے لئے تیار رہو اور یہ آسانی اسی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام احکام میں سہولت کی رعایت کی گئی ہے دیکھیئے خاص رمضان شریف میں بھی حکم ہے کہ افطار میں تعجیل کرو اور سحری تاخیر سے کھاؤ تاکہ بھوکا رہنے کا زمانہ کم ہو جاوے ظاہر ہے کہ جب افطار میں جلدی

ہوگی اور سحری نہ دیر کرکے کھائی جائیگی تو ترک غذا کا زمانہ کم ہوگا بخلاف اس کے کہ افطار میں دیر کا حکم ہوتا اور سحری میں تعجیل ہوتی تو زمانہ بھوکے رہنے کا طویل ہو جاتا سو ایسا نہیں ہوا بلکہ سہولت کی رعایت فرمائی گئی اور دیکھئے کہ ہمارے لئے صوم وصال سے نہی فرمائی اسمیں بھی کتنی سہولت ہے ورنہ کیسی دقت پیش آتی تو دیکھئے سہولت کی کیسی دقیق رعایت کی ہے غرض شریعت میں ظاہری و باطنی دونوں حکمتیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے حفظ حدود کا بڑا ہی اہتمام کیا ہے اور تصوف کا حاصل بھی یہی حفظ حدود ہے ؏ گر حفظ مراتب نکنی زندیقی۔ چنانچہ گو روزہ ایک عبادت مقصودہ ہے اس میں جتنا امتداد ہوتا بعید نہ تھا مگر اس کی بھی ایک حد ہے میں اسکو کہاں تک بیان کروں شریعت کے ہر حکم میں حکمت ہی حکمت ہے دیکھئے حدیث میں ہے کہ اگر اوراد میں نیند آجائے تو سو رہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فلیرقد ارشاد فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا کہ اگر نیند آجاوے تو آنکھوں میں مرچیں بھر لو تاکہ نیند جاتی رہے اور ایسی عبادت کس کام کی جسمیں نفس کو بیحد مشقت میں ڈالا جاوے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مسجد میں تشریف لائے دیکھا کہ وہاں دو ستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی ہے دریافت فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت زینب نے باندھ رکھی ہے جب انکو عبادت کرتے کرتے نیند آنے لگتی ہے تو اس سے سہارا لگا لیتی ہیں آپ نے فرمایا کہ اسکو توڑ دو حضرت مولانا گنگوہیؒ سے کسی نے پوچھا کہ ورد پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگے تو کیا کرنا چاہئے فرمایا کہ تکیہ پر سر رکھکر سو رہو جب طبیعت ہلکی ہو جاوے پھر پڑھنے لگو۔ اور اگر نیند کو زبردستی دفع بھی کیا جاوے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے صفرا میں اشتعال بڑھ جاتا ہے سودا میں ترقی ہو جاتی ہے خیالات فاسدہ آنے لگتے ہیں اور بعض اوقات وہ انکو الہام سمجھکر اپنے کو بزرگ جاننے لگتا ہے آخر یہ ہوتا ہے کہ جنون ہو جاتا ہے خود حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک ذاکر شخص کو تقلیل منام و طعام سے منع فرمایا تھا اور یہی اس کے لئے مصلحت تھا مگر اس نے کہنا نہ مانا آخر جنون ہو گیا ان ہی شخص کو اخلاط میں اشتعال ہونے سے سنہری حروف میں کچھ عبارتیں نظر آنے لگی تھیں اور وہ اسکو کمال خیال کرتا تھا مولانا نے فرمایا کہ انکو جنون ہونیوالا ہے آخر ایسا ہی ہوا۔ اس راہ میں بدون رفیق کے کام نہیں چلتا

ف سارے تصوف کا حاصل۔

ف ۱۲۶ اوراد میں نیند آجاوے تو کیا کرنا چاہئے۔

ف نیند کو زبردستی دفع کرنیکا برا انجام۔

ف سلوک میں بے رفیق کام نہیں چلتا۔

شعر
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق ۔۔۔ عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق
یار باید راہ را تنہا مرو ۔۔۔ بے قلاؤز اندریں صحرا مرو
ہر کہ تنہا نادر ایں راہ برید ۔۔۔ ہم بہ عون ہمت مردان رسید

اکثر دوسونے کا انجام خشکی ہوتی ہے اور اس سے انسان کو ایسے امراض گھیر لیتے ہیں کہ آدمی پھر کسی کام کا نہیں رہتا جو شخص مجھ سے شکایت کرتا ہے کہ نیند بہت آتی ہے تو میں کہدیتا ہوں کہ سورہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند کی بہت رعایت کی ہے ہاں قصداً غفلت نکرو باقی نیند کے بارہ میں تو ارشاد ہے لا تفریط فی النوم ہاں جاگنے کے بعد اٹھ کھڑا ہونا چاہیے پھر اس میں بھی زیادہ مروکھپو مت ورنہ یہ کیفیت ہوجائیگی کہ ع چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے یعنی چند دنوں ذکر و شغل کر کے عمر بھر کو بیٹھ جاؤگے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ سبق اتنا یاد کرو کہ تھوڑا شوق باقی رہجائے مگر یہ مطلب نہیں کہ غافل ہوجاؤ۔ حج میں دیکھو کیسی سہولت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے و للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا استطاعت کی قید لگادی یہ نہیں کہ استطاعت نہ ہو جب بھی حج فرض ہے غرض شریعت کے ہر حکم میں سہولت ہے میں دعوی کر کے کہتا ہوں کہ کسی نے اتنی سہولت نہیں کی جتنی اللہ و رسول نے کی ہے اور جہاں بظاہر دشواری معلوم ہوتی ہے اس کی غرض بھی سہولت ہی ہے غرض ہر حکم میں سہولت ہی کی رعایت ہے چنانچہ اسی اصل پر فرماتے ہیں اذا انتصف شعبان فلا تصوموا مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ میں سہولت کی رعایت رکھو تاکہ اس سے نفرت نہ ہونے لگے ایک شخص نماز پڑھتے تھے اور حضور قلب کا اہتمام کرتے تھے مگر اس کی حقیقت نہ سمجھتے تھے اسلئے اس میں بہت مشقت اٹھاتے تھے اسکا یہ نتیجہ تھا کہ بجائے اسکے کہ نماز کے وقت فرحت ہوا نکو بڑی کلفت پیش آتی تھی کہ مصیبت آتی میں نے انکو حضور قلب کی حقیقت بتلائی جس سے اسکی سہولت ثابت ہوئی تب ان کی وہ حالت موقوف ہوئی میں اسوقت بھی فائدہ عامہ کیلئے اس کا اعادہ کرتا ہوں وہ کیا ہے ایک مثال سے سمجھ میں آجائیگی۔ فرض کرو کہ دو شخص حافظ قرآن ہیں ایک کا قرآن شریف تو ایسا پکا ہے کہ اسکو متشابہ ہی نہیں لگتا بے سوچے فر فر پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے جیسے گھڑی میں کنجی لگادی اور وہ

چل رہی ہے رکتی ہی نہیں یا جیسے اسپنسل چھوڑ دیا ایسے شخص کو خیال کرنے اور سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی اور دوسرا وہ ہے جو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اسکو خوب تشابہ لگتے ہیں ظاہر ہے کہ اس شخص کو سوچنے کی اور الفاظ قرآن پر نظر رکھنے کی خاص ضرورت ہوگی تو بحالت موجودہ اس کچے حافظہ کی جسقدر توجہ الفاظ قرآن کی طرف ہے وہی حقیقت ہے حضور قلب کی جسقدر توجہ اسکو الفاظ قرآن کی طرف ہے نمازی کو اتنی توجہ نماز کی طرف ہونا کافی ہے یعنی رکعات کی طرف توجہ ہو کہ کتنی ہوئیں اور کیا ان میں کیا ہے کیونکہ رکعت مرکب ہے چند اعمال سے جب ہر عمل کو سوچ سوچ کر کیا اور الفاظ قرآن کو اس طرح پڑھا کہ اسکے بعد یہ لفظ ہے اور اسکے بعد یہ بس حضور قلب ہوگیا چاہے اسکے ساتھ بے اختیار وسوسے کتنے ہی آتے ہوں وہ حضور قلب کے منافی نہیں ہیں اب اس مشہور شعر کی حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی ؎

برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

یہ شعر مولانا رومیؒ کا نہیں ہے سو معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ مضمون صحیح نہیں ہے بلکہ اس قسم کی تسبیح بھی نفع سے خالی نہیں میں نے اس شعر کا رد کیا ہے کہ ؎ ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر۔ البتہ اگر بقصد تصور گاؤ خر کا مراد ہو تو اصل شعر بھی صحیح ہے۔ صاحبو! حدیث میں ہے کہ الدین یسر کہ دین آسان ہے اور قرآن شریف میں ہے ما جعل علیکم فی الدین من حرج کہ دین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی تنگی نہیں رکھی اگر دین اسی کا نام ہے جیسا متشدد دین نے کیا ہے تو کیا ساری احادیث قرآن غلط ہو جائیگا۔ بات یہ ہے کہ نہ تو دین اتنا سہل ہے جیسا کہ بعض نے سمجھ لیا ہے کہ آسانی تو جب ہو جبکہ دین کو بالکل چھوڑ دے اور سانڈ کی طرح آزاد پھرے بطلان اس کا ظاہر ہے کیونکہ آسانی ایسی چیز کے ساتھ متعلق ہوتی ہے جسکا وجود بھی ہو اسواسطے کہ جب یوں کہتے ہیں کہ یہ چیز آسان ہے تو اسکا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس چیز کا وجود تو ہے اور باوجود موجود ہونے کے پھر اسمیں سہولت ہے اور جو شئے معدوم ہو تو اسکو نہیں کہہ سکتے کہ یہ شئے آسان ہے اس لئے جب دین ہی نہ رہیگا تو آسان کس کو کہیں گے اور بعض نے تشدد اتنا کیا کہ اسکو ڈراؤنا دیو بنا دیا دین کا تو حال ہے جیسے بیساختہ شعر صادق آتا ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ف محض زبان پر تسبیح کا ہونا نفع سے خالی نہیں ۱۷۸

ف دین نہ بہت سہل ہے اور نہ بہت دشوار گذار

تشدد دین نے دین کو ایسا دشوار بنایا ہے جیسے شاعروں کا معشوق کہ پلکیں ایسی جیسی تیر ابرو ایسی جیسے کمان منہ ایسا جیسا نقطہ زلفیں سانپ جیسی اور کمر تھی ہی نہیں۔ یہ شاعروں کا معشوق ہے جسکا وجود ہی نہیں اور اگر اس شکل کا کوئی آدمی سامنے آجاوے سب سے اول بھاگنے والے یہی عاشق ہوں۔ صاحبو! دین میں نہایت سہولت ہے کام اس طرح کرو کہ نشاط رہے اگر نشاط نہو اسکی تدبیر کرو اگر خلاف نشاط عوارض خود پیش آجائیں تو عمل کو مت چھوڑو بلکہ عوارض کے دور کرنے کی تدبیر کرو۔ یہ حاصل ہے اس حدیث کا یہ تو عاملین کا علاج ہے نصف شعبان کے بعد پس ان کا علاج یہ بتایا کہ اذا انتصف شعبان فلا تصوموا کہ نصف شعبان کے بعد روزہ مت رکھو تاکہ نشاط باقی رہے نفس پر زیادہ تشدد مت کرو بلکہ رمضان سے پہلے اسکو راحت میں رکھو اور تشدد کے متعلق ایک دقیق اور مفید بات یہ ہے کہ جو عمل میں زیادہ کاوش کرتا ہے وہ خاص ثمرات کا منتظر رہتا ہے اگر اس میں دیر ہوتی ہے تو وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود ایسے مجاہدات کے مجھکو اب تک ثمرات کیوں نہ ملے حالانکہ میں اتنا مجاہدہ کرتا ہوں گویا اپنی عبادت پر ناز ہوجاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں اور اپنے کو ثمرات کا مستحق سمجھنے لگتا ہے کہ میری عبادت پر ثمرات کا دینا گویا خدا کے ذمہ ہوگیا اور یہ عین کبر ہے اور جو شخص اعتدال سے کرتا ہے تو وہ یہ خیال ہی نہیں رکھتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ میں کرتا ہی کیا ہوں جسپر ثمرات مرتب ہونے وہ تو ثمرات کا خیال کرتے ہوئے بھی شرماتا ہے ایسا شخص صرف فضل کا امیدوار ہوتا ہے یہ تو کام کرنیوالوں کے متعلق علاج تھا۔ اور کاہلوں کیلئے یہ بیان نہیں تھا اب کاہلوں کا علاج بتاتا ہوں اور اسی حدیث سے بتاتا ہوں طب کامل وہ ہے جو ایک دوا سے دو متضاد مریضوں کا علاج کرے حدیث ایسی ہی طب کامل ہے سو جو لوگ بالکل غفلت میں ہیں کہ کام ہی نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو اسوجہ سے کہ اگر نہ کروں گا تو لوگ یوں کہیں گے کہ کچھ کرتے ہی نہیں جسقدر فرض ہوچکا ہے اسی پر اکتفا کرتے ہیں اس سے زیادہ کرنا ان پر وبال ہوتا ہے ان کا علاج جو اسی حدیث میں مذکور ہے یہ ہے کہ وہ کام کرنیکی عادت ڈالیں عادت سے کام آسان ہوجاتا ہے وہ صرف رمضان شریف کے روزہ پر اکتفا نہ کریں بلکہ گاہ بگاہ نفل روزہ بھی رکھتے رہیں تاکہ رمضان شریف میں روزہ رکھنا ان پر آسان ہو کیونکہ اگر عادت نہو تو پھر دفعۃً پر سخت دشواری پیش آتی ہے کہیں تم کو کا تقاضا ہے

ف عوارض نشاط کے پیش آنے پر عمل کو مت چھوڑو بلکہ عوارض کا علاج کرو ۲۹

ف نفس پر زیادہ تشدد مت کرو

ف کاہلوں کا علاج

کہیں دو دو دن کا انکی روزہ میں یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا ساری دنیا سے لڑ رہے ہیں انکا روزہ ایسا ہوتا ہے جیسے مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

چون گرسنہ میشوی سگ میشوی چونکہ خوردی تند وبدرگ میشوی

سو شریعت نے ایسوں کے لئے سہولت کا طریقہ بتلا دیا کہ کبھی نفل روزہ بھی رکھ لینا چاہیئے اور یہ بھی اسی حدیث سے معلوم ہوا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں نصف شعبان کے بعد صوم سے منع کیا ہے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے روزے کا محل ہے اور محل میں روزہ کی فضیلت پر دلیل قائم ہے پس اس اشارہ میں کاہلوں کا علاج بتلا دیا اور شریعت نے اس علاج میں اتنی

ف شریعت کی آسانی کہ دن بھی روزے کے بتلادیے

اور آسانی کی کہ ان نفل روزوں کے دن بھی بتلا دیئے کہ رمضان کے علاوہ محرم کو روزہ رکھو تو اتنا ثواب ہے ذی الحجہ میں اتنا ہے پھر سب روزوں کی سرحد شعبان میں لگی کہ ایک روزہ پندرہویں کا بھی رکھ لو اس میں بتلا دیا کہ شعبان میں ایک دن روزہ رکھکر دیکھو تو سہی پھر رمضان کے روزہ سے نہیں ڈرو گے کیونکہ پندرہویں شعبان کا زمانہ رمضان کے بالکل قریب ہے اسکے بعد رمضان تک مقدار ۱۸۰

ایام اور کیفیت موسم میں زیادہ فرق نہیں ہوتا تو اس روزہ سے رمضان کا نمونہ معلوم ہو جائیگا کہ بس رمضان کے روزے بھی ایسے ہی ہونگے جیسا یہ ہے پھر یہ بھی بتلا دیا کہ اس کے بعد پندرہ دن کھاتے پیتے رہو تو اس میں بھی سہولت کا سامان بتلا دیا بتلائیے کہ اس روزہ کے رکھنے میں تشدد ہوا یا سہولت جو لوگ کبھی روزہ نہیں رکھتے رمضان شریف میں انپر آفت آتی ہے جیسا جو حافظ قرآن کبھی نہیں پڑھتے تراویح میں انکی عجیب کیفیت ہوتی ہے اور جو پڑھتے رہتے ہیں ان کو بالکل دقت پیش نہیں آتی اس سے اس امر کی بھی حکمت معلوم ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

ف بیان حکمت مروا صبیانکم بالصلوٰۃ

فرمایا کہ مروا صبیانکم بالصلوۃ اذا بلغوا سبع سنین واذا بلغوا عشرا فاضربوہم یعنی جب بچے سات برس کو پہونچیں تو ان کو نماز کا حکم کرو اور جب دس برس کے ہوں اور نہ پڑھیں تو انکو مارو حالانکہ بچے اس عمر میں مکلف نہیں ہوتے کیونکہ بالغ نہیں ہوتے۔ بارہ برس سے کم میں لڑکا بالغ نہیں ہوتا البتہ لڑکی نو کم میں بالغ ہو جاتی ہے تو یہ کیا بات ہے کہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے اور حکم ہو رہا ہے نماز کا اور روزہ بھی مار کر میں کہتا ہوں واللہ اعلم نہایت سہولت کی رعایت ہے کیونکہ بالغ ہونے پر اگر دفعۃً ہجوم ہو جاتا سب احکام کا تو ایکدم سے بیچارہ مصیبت میں

پڑ جاتا تعجب نہیں تھا کہ ایک دم سے ہجوم ہونے پر خودکشی کر لیتا یا شریعت کو چھوڑ بیٹھتا اگر شریعت بھی نہ ہوتی تو میں پوچھتا ہوں کہ عقلاء اس بارہ میں کیا تجویز کرتے یہی تجویز کرتے کہ پہلے سے اسکو تھوڑا تھوڑا احکام کا عادی بنایا جاوے مگر شریعت نے تمکو یہ دولت مفت دیدی اس لئے تو قدر نہیں ہوتی شریعت کی خوبی مصیبت پڑنے کے بعد معلوم ہوتی ہے صحابہ رض کو شریعت کی قدر تھی کیونکہ بعد مشقت و تعب کے شریعت حاصل ہوئی تھی ہمیں قدر نہیں کیونکہ بلا مشقت کے ہمیں سب کچھ مل گیا ہے چنانچہ اسی حدیث کو دیکھ لیجئے اذا انتصف شعبان فلا تصوموا جس میں سبحان اللہ روزہ رکھنے میں بھی سہولت کی رعایت کی ہے اور نہ رکھنے میں بھی دونوں حکموں میں سہولت ہے گویا دو متضادین کو جمع کر دیا ایسا جمع تکوین میں ہوا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ بعض فرشتے حق سبحانہ و تعالیٰ نے ایسے پیدا فرمائے کہ آدھا جسم ان کا برف کا ہے اور آدھا آگ کا اور تسبیح ان کی یہ ہے سبحان الذی جمع بین الثلج والنار اسی طرح یہاں متضادین کو جمع کر دیا بڑا کمال یہی ہے کہ متضادین کو جمع کر دے اور ساتھ ہی بینہما برزخ لا یبغیان مولانا فرماتے ہیں ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں — در میان شان برزخ لا یبغیان

اگر سہولت کا قصہ عقلاء کے سپرد کیا جاتا تو وہ یا تو اس پہلو پر نظر کرتے کہ اس طرح عادت پہلے سے ڈالیں کہ کبھی فرصت ہی نہیں دیتے اور یا بالکل آزاد چھوڑ دیتے اور دونوں میں دشواری تھی آسانی اسی میں ہے کہ عادت بھی رکھو اور ترک بھی کرو عادت پر یاد آیا کہ قاری عبداللہ صاحب مکی نے جو کہ فن تجوید میں میرے استاد ہیں جب میں ہندوستان آنے لگا تو مجھ سے فرمایا تھا کہ ہندوستان جاتے ہو مگر اتنا خیال رکھنا کہ جو کچھ سیکھا ہے وہ ضائع نہ ہو جائے جس کی صورت یہ ہے کہ پاؤ پارہ روزانہ اسی طرز سے پڑھ لیا کرنا اگر ایسا کرتے رہو گے تو فن سے مناسبت عملی باقی رہے گی ورنہ اجنبیت ہو جاوے گی واقعی کیسی آسان تدبیر فرمائی جس میں مشقت بھی نہیں اسی طرح آدمی جس کام کو کبھی تھوڑا تھوڑا کرتا رہتا ہے تو سب کچھ ہو جاتا ہے اور نہیں تو سب عبادتوں کی عادت اور مشق کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی جامع عبادت مرحمت فرمادی ہے جس میں تھوڑی تھوڑی سب عبادتیں ہو جاتی ہیں وہ کیا ہے نماز کہ

اس میں ہر قسم کی عبادت موجود ہے اور پھر زیادہ مشقت نہیں دیکھئے تکبیر تحریمہ سے سلام تک فاقہ کو لازم کر دیا یہ روزہ کا نمونہ ہے حج کے بھی معنی موجود ہیں کیونکہ حج میں احرام کے بعد بہت سی چیزیں ممنوع ہو جاتی ہیں یہاں بھی بعد تکبیر تحریمہ بہت سی امور ناجائز ہو جاتے ہیں حج میں تلبیہ ہے۔ یہاں بھی تکبیریں ہیں۔ حج میں بدن کو تعب ہوتا ہے یہاں بھی موجود ہے حج میں احرام سے نکلنے کے لئے حلق ہے یہاں بھی نماز سے نکلنے کے لئے سلام ہے حج میں قصد بیت ہے یہاں بھی توجہ الی البیت ہے وعلی ہذا القیاس۔ نماز میں زکوٰۃ کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ زکوٰۃ میں مال خرچ ہوتا ہے یہاں جان بھی خرچ ہوتی ہے اور مال بھی کیونکہ نماز بدون لباس کے درست نہیں اعتکاف کے معنی کا پایا جانا ظاہر ہی ہے۔ دیر تک انسان مسجد میں محبوس رہتا ہی محققین نے کہا ہے کہ نماز میں قربانی بھی ہے وہ اس طرح کہ ذبح کے وقت اللہ اکبر کہتے ہو اور جانور کو ذبح کرتے ہو یہاں اللہ اکبر کہکر اپنے نفس کو اللہ کے راستہ میں قربان کرتے ہو۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔ ۱۸۲

معنی تکبیر ایں است اے امیم　　کاے خدا پیش تو ما قرباں شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر میکنی　　ہمچنیں در ذبح نفس کشتنی،
گوے اللہ اکبر و ایں شوم را　　سر بہ بُر تا وارہد جان از عنا
تن چوں اسمٰعیل و جاں ہمچوں خلیل　　کرد جاں تکبیر بر جسم نبیل

غرض نماز میں خاص جامعیت ہے تمام عبادات کے نمونے اس میں موجود ہیں اس میں تھوڑی عادت روزمرہ فاقہ کی بھی ڈالی گئی اور دیکھئے سہولت کہ حق تعالیٰ نے ہم کو زیادہ فاقہ بھی نہیں دیا ہمارے فاقہ کا بھی لحاظ کیا ہے چنانچہ مسئلہ ہے اذا اجتمع العشاء والعشاء فابدءوا بالعشاء یعنی جب کھانا اور عشاء کی نماز جمع ہو جاویں تو پہلے کھانا کھالو تاکہ نماز میں طبیعت منتشر نہ ہو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ سے اس کی حکمت منقول ہے آپ نے فرمایا ہے لان یکون اکلی کلہ صلوٰۃ احب الی من ان یکون صلاتی کلھا اکلا یعنی کہ میرا سارا کھانا نماز ہو جاوے یہ اس سے اچھا ہے کہ ساری نماز کھانا ہو جاوے مطلب یہ تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے جب نماز کا خیال رہیگا تو سارا وقت مراقبہ نماز میں گذریگا اور انتظار صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ ہی تو اس کا کھانا نماز ہوگا پھر اس کے بعد نماز بھی فراغت سے پڑھیگا تو اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جو بھوکا رکھ کر نماز

اذا اجتمع العشاء والعشاء فابدءوا بالعشاء کی حکمت

ادا کرے گا تو نیت کھانے ہی میں پڑی رہے گی تو وہ نماز بھی کھانا ہو جاوے گی غرض جو شخص کھانا کھا رہا ہے اور دل نماز میں ہے تو نماز ہی ہو رہی ہے بخلاف اس شخص کے جو بھوکا نماز پڑھ رہا ہے اور دل پڑا ہوا ہے کھانے میں تو اسکی نماز بھی کھانا ہو رہی ہے عارفین نے ہر موقعہ پر ان اصول کی رعایت کی ہے حضرت حاجی صاحبؒ سے جو شخص مکہ شریف میں قیام کی بابت عرض کرتا تو آپ فرماتے کہ دل رہے مکہ میں اور جسم ہندوستان میں وہ اس سے اچھا ہے کہ دل رہے ہندوستان میں اور دھڑ ہو مکہ میں کیونکہ مکہ میں رہکر کسی دوسری جگہ کا اشتیاق ہونا بیت اللہ سے اعراض کی صورت ہے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ مکہ میں مستقلاً مقیم تھے وہ بیمار ہوئے بیماری میں ان کے منہ سے بار بار یہ نکل رہا تھا کہ مجھکو ہندوستان لے چلو لوگ ان کا پلنگ اٹھا کر دوسری جگہ رکھدیتے اور کہتے کہ ہندوستان پہونچا دیا بس اسی میں ان کا انتقال ہو گیا اس لئے مکہ میں رہنا ہر شخص کا کام نہیں اس کیلئے بڑے دل کی ضرورت ہے اور وہاں کے بہت آداب ہیں آجکل تو لوگ مکہ بھی سیر و تفریح کیلئے جاتے ہیں چنانچہ ایک نواب سے نظر بندی کے بعد پوچھا گیا تھا کہ تم کہاں رہنا چاہتے ہو انہوں نے مکہ کو منتخب کیا چنانچہ وہاں پہونچا دیے گئے مگر وہاں انکی عادت یہ تھی کہ راستہ پر بیٹھ جاتے اور عورتوں کو تاکا کرتے تھے بھلا ایسے جانے سے کیا نتیجہ اس لئے بعض کو ہندوستان ہی رہنا اچھا ہے ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں حضرت مسعود بکؒ فرماتے ہیں کہ ؎

اے قوم بہ حج رفتہ کجائید کجائید   معشوق دریں جاست بیائید بیائید

اس میں ایسے ہی لوگ مخاطب ہیں جنکے دلوں میں ہنوز بیت اللہ کی محبت و عظمت پیدا نہیں ہوئی چونکہ اہل اللہ کی نظر حقائق پر ہوتی ہے اسلئے اسکو یہ مشورہ دیا گیا غرض شریعت میں ہر ہر قدم پر سہولت ہے مقصود یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ کسی طرح کام ہو اس لئے قدم قدم پر سہولت کی رعایت ہے اور اس سہولت کی روح اور خلاصہ یہی ہے کہ کام ہو اور انسان سہولت سے کام کرتا رہے اسی لئے اذا انتصف شعبان فلا تصوموا دونوں قسموں کو محیط ہے عاملین کو بھی اور کاہلین کو بھی دونوں کو سہولت کا طریقہ بتلا دیا اور جب اس حد سے تعدی ہوگی تو کام نہ ہو سکیگا بعض لوگ تشدد کریں گے اور نصف شعبان سے رمضان تک روزے

رکھیں گے ان کو رمضان میں مصیبت نظر آئیگی اور بعض لوگ نصف شعبان کا روزہ بھی نہ رکھیں گے انکو بھی رمضان کے روزے آنے سے جاڑہ چڑھیگا غرض ہر صورت میں کام نہو سکیگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ کام ہو جائے مگر آجکل قال زیادہ ہے کام نہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

کار کن کار بگذر از گفتار　　　اندریں راہ کار باید کار

اور اگر کام کرنے کے اصول کا خود احاطہ نہ ہو سکے تو سب سے اچھی صورت کام کرنے کی یہ ہے کہ محققین میں سے کسی کو اپنا قائد بنالے وہ قائد اتباع شریعت اور سہولت کیساتھ تدریجاً مقصود کی طرف لیجائیگا اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بیل سے آہستہ آہستہ روزانہ تدریجاً کام لیا جاتا ہے تو اسکو سو کوس بھی لیجا سکتے ہو اور ایک وہ بیل ہے کہ جسپر کبھی سواری نہیں ہوتی اور سال بھر　اس سے کام لینا چاہو تو وہ کچھ بھی کر کے ندیگا اب اسکے لئے ایک ہوشیار گاڑیبان کی ضرورت ہے جو اسکو تھوڑا تھوڑا روز جوڑا کرے وہ تین میل کا روزمرہ چکر دیا کرے اور شام کو راتب کھلایا کرے کچھ عرصہ میں وہ بیل خوب کام دیگا لہذا عادی بنانے کیلئے دو چیز کی ضرورت ہے کام لینا اور آرام دینا نفس کی بھی یہی کیفیت ہے کہ بدون کسی ایسے رہبر کے ٹھیک نہیں ہوتا جو کام بھی لے آرام بھی دے اور میں مرید ہونیکو نہیں کہتا ہوں کہ اس سے مرید ہو جاؤ میں کام کا طریقہ پوچھنے کو کہتا ہوں کہ کسی محقق سے پوچھ پوچھ کر کام کیا کرو اور بحمد اللہ میں نے بہت آسان طریقہ حدیث سے آپ کو بتلا دیا ہے ان احکام کو یاد رکھئے اور رمضان شریف کیلئے شگفتہ ہو جائے بعض لوگ رمضان شریف میں بہت پژمردہ رہا کرتے ہیں اور بہت توڑے رہتے ہیں میں اسکے متعلق ایک تجربہ کی بات بتاتا ہوں جسمیں روزہ ایسا سہل ہو جاوے کہ نہ برف کی ضرورت رہے نہ شربت کی نہ بلائی کی وہ یہ کہ روزہ میں یہ کبھی مت کہو کہ آج گرمی ہے آج خشکی ہے آج تو دل گرا جاتا ہے بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے اس قسم کا تذکرہ اور خیال بھی مت کرو بلکہ کسی ایسے کام میں لگجاؤ جسمیں انہماک زیادہ ہو جیسے تلاوت قرآن یا کوئی کمائی کھانیکا وسیلہ تاکہ خیال بٹا رہے اور روزہ کی طرف دھیان ہی نہ جائے کیونکہ خیال کو بڑا دخل ہے اسکو کر کے دیکھو انشاء اللہ تعالیٰ روزہ معلوم بھی نہ ہوگا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل کی مرحمت فرمائیں۔ فقط

اشرف علی　۴ ار رمضان سنہ ۱۳۵۱ھ

ف　بیل کی عجیب مثال

۱۸۴

ف　نفس بدون رہبر کے درست نہیں ہوتا

ف　روزہ معلوم ہونے کی عمدہ تدبیر

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ

سلسلہ

التبلیغ

کا

۱۸۵

وعظ مسمی بہ

مثلث رمضان

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمی بہ

مثلث رمضان

اين	متى	كم	كيف	لم	ماذا	من المستمعون	من ضبط	اشتات	الآخر
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	سامعین کی تعداد	کس نے لکھا	[illegible]	متفرقات
تھانہ بھون جامع مسجد	الجمعۃ الثالث من رمضان ۱۳۳۴ھ	۲ گھنٹے	×				حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری		

تنبیہ از جامع وعظ حضرت مدظلہ نے اس مجموعی وعظ کے تین جزو قرار دئے اور ہر ایک کا نام جدا جدا تجویز فرمایا۔ پہلا الریان من رمضان۔ دوسرا القرآن فی رمضان۔ تیسرا الیقظان فی رمضان۔ اور مجموعہ کا نام مثلث رمضان تجویز فرمایا۔ اور وجہ تین جزو قرار دینے کی یہ ہوئی کہ حضرت والا کا قصد یہ تھا کہ اس رمضان شریف میں چار جمعہ واقع ہوں گے اور چاروں میں چار مضامین علیحدہ علیحدہ بیان کردئے جاوینگے مگر اتفاق سے حضرت کی طبیعت ناساز ہوگئی حتی کہ چند روزے بھی قضا ہوئے اور ضعف اسقدر ہوگیا تھا کہ بیان پر قدرت ہونا مشکل تھی چنانچہ دو جمعہ میں وعظ نہیں ہوا اور تیسرے جمعہ میں وعظ فرمایا جس میں مختصراً پہلے جمعوں کے بھی مضامین آگئے (یعنی جن مضامین کا پہلے دو جمعوں میں بیان کیا جاتا) چنانچہ ایک

۱۸۶

۲

ف

تنبیہ از جامع وعظ

مضمون پہلے جمعہ کے متعلق ہے اور ایک دوسرے کے اور ایک تیسرے کے اور حضرت نے گزشتہ دو جمعہ میں وعظ نہ ہونے کے عذر کا اظہار بھی شروع وعظ میں فرمایا اور چوتھے کے متعلق وعدہ کر لیا گیا جیسا کہ معلوم ہو جائے گا۔

خطبہ ماثورہ معمولہ۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کما رواہ الشیخان عن سہل بن سعد

ان للجنۃ ثمانیۃ ابواب منہا باب یسمی باب الریان لا یدخلہ الا الصائمون۔ یہ ایک حدیث ہے جسکو شیخین یعنی امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے سہل بن سعد صحابیؓ سے روایت کیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک دروازہ کا نام باب الریان ہے سوائے روزہ داروں کے اور کوئی اس میں سے داخل نہ ہوگا یہ تو ترجمہ ہے اس حدیث کا میرا مقصود بعض فضائل رمضان کا بیان کرنا ہے اور یہ مضمون منجملہ چند مضامین وقتیہ کے ایک مضمون ہے پہلے سے یہ خیال تھا کہ اس ماہ کے چار جمعہ ہوں گے اور ہر جمعہ میں ایک ایک مضمون ان مضامین میں سے بیان کر دیا جاویگا مگر اسباب ایسے ہو گئے کہ میں اس سے پہلے جمعوں میں بیان پر قادر نہیں تھا چنانچہ اب تک ضعف باقی ہے اس لئے آج ایک ضروری مضمون بیان کر دیا جاویگا جسمیں مختصراً پہلے جمعوں کے مضامین بھی آجائیں گے اور اخیر جمعہ باقی ہے چوتھا مضمون بشرط خیریت انشاء اللہ اسمیں بیان کر دیا جاویگا اگر سب جمعوں میں قدرت ہوتی تو آج کے حصہ میں تیسرا مضمون آتا اتفاقی بات ہے کہ ایک بھی بیان نہیں ہوا اور یہ غیر اختیاری امر تھا اب بھی پوری قدرت نہیں مگر میں نے خیال کیا کہ اگر زیادہ بیان نہ ہوگا تو تھوڑا ہی سہی اس کے قبل تو اتنی بھی قدرت نہ تھی وہ چاروں مضمون ضروری اور قابل تفصیل تھے اگر عوارض پیش نہ آتے تو بالاستقلال ایک ایک جمعہ میں انکا بیان ہوتا اب اگر تینوں مضمون مفصلاً آج ہی بیان ہوں تو اسکے لئے وقت بہت چاہئے اسواسطے قصد یہ ہے کہ تینوں کا مختصراً بیان کر دیا جائے اور زیادہ وقت تو اکثر توابع میں صرف ہوتا ہے اصل مضمون طویل نہیں ہوتا اس لئے توابع کا حذف کرنا مناسب معلوم ہوا۔ ضروری افادہ پر نظر کر کے آج تینوں کا بیان مختصراً کر دیا جائیگا سو ایک تقریر کا مضمون تو حدیث سے شروع کر دیا ہے جس کا پھر ترجمہ کرتا ہوں کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک کا نام باب الریان ہے۔

۳

۱۸۷

سوائے روزہ داروں کے اسمیں کوئی اور داخل نہوگا یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے رکھے ہیں اور جہنم کے سات لوگ اسکی حکمت سبقت رحمتی علی غضبی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت غضب پر سبقت لیگئی اسلئے جنت کے دروازوں کی تعداد جہنم سے زیادہ ہے گویا اجازت دی کہ اگر کثرت سے داخل ہونیوالے ہوں تو آسانی سے داخل ہوسکیں کیونکہ تعداد دروازوں کی زیادہ ہے اور اس میں ترغیب بھی ہے کہ جنت میں زیادہ جانیوالے ہونے چاہئیں اور جہنم میں جانیوالے کم ہوں اور کوشش کرنی چاہیئے کہ اسمیں نجائیں گو وقوع اسکے خلاف ہے یعنی جنت میں کم جائیں گے اور جہنم میں زیادہ اور یہ لوگوں کی سوء تدبیر کی وجہ سے ہے ورنہ ان کے کرم میں کمی نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ دروازے اس مکان میں زیادہ رکھے جاتے ہیں جسمیں وسعت ہو اس سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں وسعت زیادہ ہے اگرچہ سوء تدبیر کیوجہ سے جہنم والوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور جہنم بھی کوئی چھوٹی سی چیز نہیں گو جنت سے وسعت میں کم ہے چنانچہ جہنم کی وسعت اس سے ثابت ہے کہ باوجود اس کے کہ جہنم میں جہنمی کثرت سے داخل ہوچکیں گے پھر بھی پکارے گی ہل من مزید کہ اور ہو تو دیدو جیسے بھوکے سے دریافت کرتے ہیں کہ اور کچھ چاہیئے تو وہ کہتا ہے کہ اور ہو تو دیدو اور یہی حال جنت کا ہوگا مگر اللہ میاں اتنے رحیم و کریم ہیں کہ دوزخ کو تو اپنے حکم سے شکم سیر کردیں گے کسی کو بلا عمل داخل نکرینگے اور جنت کیلئے ایک نئی مخلوق پیدا کرینگے جنکو بلا عمل محض اپنے فضل سے جنت مرحمت فرمائیں گے غرض اسکو اتنی وسعت اسلئے دیدی ہے کہ اس کے دروازوں کی تعداد جہنم سے زیادہ رکھی ہے اور جہنم کے بھرنیکے لئے نئی مخلوق پیدا نہ ہوگی بلکہ اسی کے اجزا کو سمیٹ کر تنگ کردیں گے۔ ورنہ حاکمیت کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اہل جنت کو دوزخ میں داخل فرما دیتے تو کسی کو بھی چون وچرا کی گنجائش نہ تھی

> ہست سلطانی مسلم مر ورا نیست کس را زہرۂ چون وچرا

مگر وہ صرف حاکمیت سے کام نہیں لیتے بلکہ حکمت سے کام لیتے ہیں چنانچہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اسمیں حکمت ہی ہوتی ہے گو ہمیں معلوم نہو۔ پھر ایک طریقہ تو دوزخ کے پر کرنیکا یہ تھا کہ اہل جنت کو دوزخ میں بھیجتے اور ان کو معذب فرماتے اور دوسرا یہ تھا کہ ان کو دوزخ میں بھیجتے اور معذب نہ فرماتے وہ اس پر بھی قادر ہیں اور ایسا واقع بھی ہے کہ کوئی دوزخ میں ہو اور معذب نہو چنانچہ حدیث میں ہے

ف جنت کے آٹھ دروازے اور دوزخ کے سات رکھنے کی حکمت۔

ف جنت میں وسعت زیادہ ہے گو دوزخ بھی کوئی چھوٹی چیز نہیں۔

جنت فضل سے ملیگی کیونکہ خدا کے ذمہ کسی کا حق نہیں۔

ف دوزخ میں کوئی بیگناہ ہو اور اسکو عذاب ہو یہ واقع نہ ہوگا۔

الوائدۃ والموؤدۃ کلتاہما فی النار کہ زندہ درگور کرنیوالی اور زندہ درگور کیگئی دونوں آگ میں ہیں۔
ہندوستان میں بھی لڑکیوں کے مارنے کی عادت تھی مگر سلطنت نے اس کا انتظام کر دیا عرب میں
یہاں سے زیادہ آفت تھی کہ لڑکی کو زندہ درگور کر دیتے تھے کہ وہ خود ہی گھٹ کر مرجاتی تھی یہاں تو
مار کر دفن کر دیتے تھے مگر عرب کا طریقہ یہاں سے اشد تھا شاید اس صورت سے مارنےمیں عرب کا
یہ خیال ہو کہ مارنے کے فعل کو اپنے ذمہ کیوں رکھیں یا معلوم نہیں کہ عرب کے نزدیک اس کا کوئی
اور اختراعی سبب تھا غرض کہ یہ رواج تھا اور یہ حدیث اس کے متعلق ہے الوائدۃ والموؤدۃ
کلتاہما فی النار اس میں ظاہراً یہ شبہ ہوتا ہے کہ بچی نے کیا خطا کی ہے جسکی وجہ سے وہ دوزخ
میں ڈالی گئی۔ علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ
بچی دوزخ میں تو ہوگی مگر معذب نہ ہوگی جیسے جہنم میں فرشتے بھی ہونگے مگر معذب نہ ہونگے
چنانچہ خزنہ جہنم دوزخ ہی میں ہوں گے مگر وہاں بھی ویسے ہی مقرب ہیں جیسے جنت کے
فرشتے جنت میں کیونکہ اصل انعام تو بندہ پر یہ ہے کہ اسکو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہو خواہ
دوزخ میں ہو یا جنت میں اگر دوزخ میں معیت ہے تو پھر تکلیف کا کیا ذکر ہے وہی جنت
ہے اور اگر جنت میں معیت نہ ہوتی تو وہ دوزخ سے بدتر ہوتی سہ

بالو دوزخ جنت است اے جاں فزا بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

خزنہ جہنم کے ساتھ خدا تعالیٰ کی معیت ہوگی اس لئے وہ فرشتے آرام ہی میں ہونگے اس کی واضح
مثال دنیا میں موجود ہے دیکھئے جیلخانہ میں ایک تو مجرم ہوتے ہیں اور ایک وہ جو وہاں ملازم
ہیں مجرمین کو تکلیف ہوتی ہے کہ ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہوتا ہے اور ملازمین جیسے اور جگہ
خوش ہیں اسی طرح وہاں بھی وجہ یہی ہے کہ مجرمین کے ساتھ حکومت کی معیت نہیں ہوتی
بلکہ عتاب متعلق ہوتا ہے اور ملازمین کے ساتھ معیت ہوتی ہے البتہ ایک شبہ یہاں یہ واقع
ہوتا ہے کہ پھر موؤدہ کو جہنم میں رکھنے سے فائدہ کیا جبکہ وہ معذب نہیں کیا اس کے لئے
جہنم ہی میں ٹھکانا تھا جواب یہ ہے کہ اول تو ہمیں مصلحت دریافت کرنے کی مجال نہیں۔
خیر میں مصلحت بھی بتاتا ہوں وہ یہ کہ بچی جسکو زندہ درگور کیا تھا وہ ماں کے پیش نظر ہے
اس سے ماں کیلئے زیادتی عذاب کی مقصود ہے کہ اسکو دیکھ دیکھ کر اپنا فعل یاد کرکے خوب

کڑھے اور رنج ہوکہ ہائے میں کیسی سنگدل تھی کہ میں نے اپنی بچی کے ساتھ یہ حرکت کی جس کی وجہ
آج عذاب بھگت رہی ہوں نیز ممکن ہے کہ اسپر حقیقت بھی منکشف نہو اور وہ یہی سمجھتی رہے
کہ میری بچی پر بھی عذاب ہو رہا ہے حالانکہ وہ معذب نہیں اور حقیقت منکشف نہ ہونے سے اسکا
حسرت اور رنج اور زیادہ ہوجاوے جو کہ باعث زیادتی عذاب کا ہے اور یہ ضرور نہیں
کہ وہاں سب ہی کو ایسا انکشاف عام ہوجاوے کہ کوئی چیز مخفی ہی نہ رہے ہاں دنیا سے
زیادہ وہاں انکشاف ہوگا وجہ یہ ہے کہ ممکنات کے علوم متناہی ہیں اور یہ جب ہی ہو سکتا
ہے کہ بعض علوم مخفی بھی ہوں بس ماں یہ سمجھے گی کہ مجھ پر عذاب ہے اور میری وجہ سے بچی
پر بھی عذاب ہے اس سے عذاب میں زیادتی ہوگی اور اولاد سے تعلق فطری ہے وہاں
بھی یہ تعلق بالکلیہ منقطع نہوگا کیونکہ فطریات عادۃً بدلا نہیں کرتے تو جب ماں یہ سمجھے گی کہ میری
وجہ سے یہ بھی عذاب میں ہے اس سے اسکی کلفت بڑھے گی اگر اس محل پر حدیث کو محمول
کرلیا جاوے تو کیا قباحت ہے اس سے بھی اوضح واقرب الی الفہم ایک اور نظیر ہے وہ
یہ کہ حدیث میں ہے الشمس والقمر مکوران فی النار یوم القیمۃ کہ آفتاب اور چاند بے نور 19
کرکے جہنم میں ڈالے جاوینگے۔ یہاں بھی وہی شبہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کیا خطائی ہے کہ جس کی وجہ
سے جہنم میں ہونگے جواب یہ ہے کہ خطا کی تحقیق کی ضرورت اسوقت ہے جبکہ وہ معذب بھی ہوں
سو وہ معذب نہونگے اور ان کو دوزخ میں ڈالنے سے مشرکین کو دکھانا ہوگا کہ یہ خود کو تو دوزخ
سے بچا ہی نہ سکے تم کو تو کیا بچا سکتے۔ اس کو اقرب اس لئے کہا گیا کہ ذی روح کا معذب ہونا
اتنا مستبعد نہیں جتنا غیر ذی روح کا معذب ہونا (اس موقعہ پر ذی روح وہ لڑکی ہے جسکو زندہ
درگور کیا تھا اور غیر ذی روح شمس و قمر ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکی معذب تو نہوگی مگر اس کا
معذب ہونا اتنا بعید نہ تھا جتنا کہ شمس و قمر کا معذب ہونا بعید ہے کیونکہ لڑکی ذی حیات ہے اور
ذی حیات کو عادۃً تکلیف ہونا بعید نہیں اور شمس و قمر غیر ذی حیات ہیں اور غیر ذی روح کو
عادۃً تعذیب نہیں ہوتی چنانچہ لکڑیوں کو آگ میں جلاتے ہیں مگر بوجہ غیر ذی روح ہونے کے انکو
تکلیف ہونا مستبعد ہے بخلاف اس کے کہ کسی جاندار کو آگ میں ڈالدیں کہ اس کو تکلیف ہونا کچھ بھی
ابعد نہیں اگرچہ حق تعالیٰ کو اسپر بھی قدرت ہے کہ غیر ذی روح کو بھی معذب فرماویں) پس شمس و قمر

ف دوسری نظیر کہ ایک شے دوزخ میں ہو اور معذب نہ ہو

ف شمس و قمر دوزخ میں ہونگے مگر معذب نہ ہونگے

ہونگے تو وہ دوزخ میں مگر معذب نہ ہونگے کیونکہ ذی روح نہیں اور اسی لئے مکلف نہیں بلکہ بعض
ذی روح بھی مکلف نہیں جیسے حیوانات و بہائم بلکہ بعض ذوی العقول بھی بواسطہ انبیاء کے
مکلف نہیں یعنی ان کی طرف انبیاء کی بعثت نہیں ہوئی گو بعض اہل لطائف اسکے بھی قائل ہوئے
ہیں کہ ملائکہ بھی اس طرح مکلف ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت انکی طرف بھی ہے بلکہ بعض نے
یہ بھی کہا ہے کہ بعثت جمادات کی طرف بھی ہے اور وہ بھی مکلف ہیں اور بعثت الی کافۃ الخلق
سے استدلال کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ ایک لطیفہ ہے اور اگر اسکو مان بھی لیا جاوے تو
کہا جاویگا کہ یہ مکلف تو ہیں مگر ان چیزوں سے عصیان کا ظہور نہیں ہوا اسلئے معذب نہ ہونگے
چنانچہ کلام اللہ سے ان کا مطیع ہونا ثابت ہوتا ہے الم تر ان اللہ یسجد لہ من فی السموات ومن
فی الارض والشمس والقمر والجبال والشجر والدواب وکثیر من الناس۔ اگر ان سے عصیان
ہوتا بوجہ اس کے کہ اس قول میں ان کی طرف بھی بعثت ہے اور یہ مکلف ہیں اسلئے
ضرور تھا کہ یہ معذب بھی ہوں مگر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عصیان نہیں کیونکہ
حق تعالیٰ نے سموات وارض وشمس وقمر ودواب سب کے متعلق بلا استثناء کے یسجد لہ فرمایا (۹۱)
ہے اور ناس کے لئے کثیر کی قید بڑھائی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ناس میں تو بعض مطیع
اور بعض عاصی ہیں مگر اور مخلوقات میں سب مطیع ہیں اور آیت میں ناس سے مراد انس و
جن دونوں ہیں کیونکہ ناس کا ترجمہ ہے لوگ اور لوگ جنکو بھی کہتے ہیں مگر ایک طالب علم تھے
وہ جانوروں کو بھی لوگ کہا کرتے تھے ایک دفعہ کہنے لگے کہ بندر لوگ بڑے شریر ہیں مگر محاورہ
میں لوگ صرف انس وجن کو کہتے ہیں غرض انس وجن ہی تو دو قسمیں ہیں بعض فرمانبردار اور بعض
نافرمان اور جو ان کے سوا ہیں وہ سب فرمانبردار ہیں لہذا شمس وقمر کا غیر معذب ہونا واضح ہو گیا اسکے
خلاف کا احتمال ہی نہیں گو طالب علمی کے زمانہ میں ایک شخص مجھ سے جھگڑ رہے تھے کہ یہ بھی معذب
ہوں گے اور سبب یہ بتلاتے تھے جو چیزیں سبب معصیت ہوئی ہیں وہ بھی معذب ہونے
چاہئیں جواب اس کا یہ ہے کہ سبب معصیت ہونا جو بالاختیار ہو وہ معذب ہونے کو مستلزم
ہے نہ وہ جو کہ سبب بلا اختیار ہو چنانچہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ تسبیب بلا اختیار معصیت نہیں
ہے فقہاء اور صوفیہ ہی شریعت کو خوب سمجھنے والے ہیں ان ہی دونوں گروہ نے شریعت کے

اسرار کو خوب سمجھا ہے گو بعضے فقہاء اور صوفیہ میں لڑائی بھی رہی ہے مگر جو حضرات جامع شریعت وطریقت ہوئے ہیں وہ کبھی نہیں لڑے شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ محقق وہ ہے جسمیں تین وصف ہوں فقیہ ہو محدث ہو صوفی ہو محققین میں لڑائی نہیں ہوئی ہاں غیر محققین میں ہوئی ہے ؏ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ (محققین صوفیا اور علماء میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔)

غرض فقہاء نے یہ مسئلہ سمجھا ہے کہ مطلق سبب بننا معصیت نہیں اس لئے جو چیزیں بلا اختیار سبب معصیت ہوتی ہیں وہ معذب ہونگی۔ البتہ اسمیں کلام ہے کہ شمس وقمر آیا اپنی جگہ رہکر جہنم میں ہوں گے یا ان کو اپنی جگہ سے ہٹا کر جہنم میں ڈالا جائیگا جمہور کی رائے ہے کہ دونوں کو ہٹا کر جہنم میں ڈالا جاوے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم بھی بہت بڑی ہے اس لئے کہ یہ اجرام یعنی شمس وقمر کوئی چھوٹی سی چیز نہیں ہیں شمس زمین سے ہزاروں حصہ بڑا ہے ایسے ہی قمر کو سمجھنا چاہیے۔ باایں ہمہ مثل گولے کے جہنم میں پھینکدیے جاوینگے مگر شیخ اکبرؒ کا کشف ہے کہ شمس وقمر اپنی جگہ رہیں گے اور جہنم میں بھی ہوں گے اور وہ اس طرح کہ جہنم کو ان کی مستقر تک بلکہ اس سے بھی آگے بسط دیا جاویگا یعنی جہنم کی آگ میں بسط ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی ہانڈی ڈھکی ہوئی پک رہی ہو اور پھر اس کو کھول دیا جاوے تو اس کی گرمی پھیل جاتی ہے اسی طرح جب جہنم کو کھول دیا جاویگا تو اسکی حرارت پھیل جاوے گی جس سے سمندر وہوا سب آگ بنجاویں گے حتی کہ آسمان تک حرارت پہونچیگی جو آفتاب وقمر کو بھی محیط ہوجاوے گی اور آفتاب وقمر دونوں اسمیں داخل ہونگے یہ صورت ہوگی شمس وقمر کے اپنی جگہ رہنے کی اور جہنم میں بھی ہونے کی اور پھر جہنم کی آگ بنجاوے گی ہوکر ساتویں آسمان کے مقعر تک پہونچیگی اور وہاں بہت ہی لطیف ہوجائیگی کہ اس کی لطافت میں لذت ہوگی اور جنت کے بسنے والے اسی لطیف گرمی سے پکیں گے اور جنت ساتویں آسمان کے محدب پر ہوگی اس کشف کی قرآن وحدیث نہ تائید ہی کرتے ہیں اور نہ تکذیب ہی کرتا ہے کشفیات میں ہم شیخ اکبرؒ کے تابع نہیں ہیں لیکن اگر کوئی اس کا قائل بھی ہو مگر جزما نہیں تو کچھ حرج بھی نہیں کیونکہ جیسے تائید نہیں ویسے تکذیب بھی نہیں یہ فائدہ کے طور پر بیان کردیا۔ بہرحال یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کہ شمس وقمر جہنم میں ہوں اور معذب نہ ہوں۔ تو اس بناء پر ممکن تھا کہ اہل جنت دوزخ میں

ف شمس وقمر اپنی جگہ رہکر جہنم میں ہونگے یا وہاں سے ہٹاکر ڈالدیے جاویں گے ۱۹۲

ف جنت کو بھی جہنم کی لطیف حرارت پہنچے گی۔

(بقیہ [illegible])

بھیجدیے جاتے اور معذب نہ ہوتے مگر حق تعالیٰ کی رحمت کو دیکھئے یہ احادیث میں آتا ہے کہ جب جنت میں اہل جنت داخل ہو چکیں گے پھر اس میں جگہ باقی رہجاویگی تو حق سبحانہ تعالیٰ ایک مخلوق کو پیدا کریں گے کہ وہ اس میں رہا کرے گی اسی طرح جب جہنم باوجود اہل جہنم کے داخل ہونے کے ہل من مزید کہتی رہے گی اسکے لئے حق تعالیٰ یہ نہ کریں گے کہ کسی مخلوق کو پیدا کر کے اس میں داخل کریں اور اس کا پیٹ بھر دیں گو وہ باوجود جہنم میں رہنے کے معذب بھی نہ ہوتے۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ بلا وجہ عذاب کی صورت کو بھی گوارا نہیں فرماتے کہ کسی کو پیدا کر کے اس میں صورۃً بھی داخل فرمائیں۔ یہ عین رحمت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دوزخ کے پکارتے رہنے پر حق تعالیٰ اپنا قدم اس پر رکھدیں گے تو وہ کہیگی بس بس۔ اس حدیث کے معنیٰ تو واللہ اعلم کیا ہیں اور اگر کوئی بات بھی سمجھ میں آوے مگر وہ بات مجلس عام میں کہنے کے قابل نہیں اسلم طریق یہی ہے کہ زبان کو بند رکھا جائے اہل ظاہر کو تو جہاں اطمینان ہوجاتا ہے تو بولتے بھی ہیں مگر صوفیہ تو بولتے بھی نہیں وہ تو ایسے اسرار کے ظاہر کرنے والوں سے

194 ناراض ہیں۔ اسی کو مولانا رح فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند　　　　وز سخنہا عالمے را سوختند

البتہ کبھی رمز میں کہہ بھی جاتے ہیں جیسے ؎

در بشر روپوش گشتہ آفتاب　　　　دم مزن واللہ اعلم بالصواب

چنانچہ وحدۃ الوجود کے موقعہ پر کہہ بھی دیا اور پھر اتنا ہی منع بھی کر دیا بات یہ ہے کہ ایسے اسرار کے ظاہر کرنے میں اشارہ اور الفاظ کافی نہیں ہیں۔ انکی تو یہ حالت ہے ؎

اے بروں از وہم و قال و قیل من　　　　خاک بر فرق من و تمثیل من

پھر کبھی کسی مثال کے بیان کرنیکا عذر بھی ظاہر کرتے ہیں کہ بدون بولے صبر نہیں آتا ؎

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت　　　　ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

مستی کے غلبہ میں ایسے الفاظ نکلجاتے ہیں مگر پھر کہتے ہیں ع خاک بر فرق من و تمثیل من۔ مطلب یہ ہے کہ میں امثال میں اسرار بیان کر دیتا مگر وہ کافی نہیں مگر ان حضرات کو کبھی صحو ہوتا ہے اور کبھی سکر سکر کی حالت میں کہہ جاتے ہیں یہ ان کی حالت ہے جن پر حال

غالب ہو جاتا ہے اور جو حال پر غالب ہیں ان کی زبان سے تو کبھی ایسی باتیں نکلتی ہی نہیں چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی زبان سے کبھی ایسی باتیں نکلیں ہی نہیں کیونکہ وہ حال پر غالب ہوتے ہیں صحابہؓ میں بھی جو مغلوب الحال تھے وہ قلیل ہیں تاہم ان کی زبان سے ایسی باتیں تو نہیں نکلی ہیں مگر بعض حالات ظاہر ہو گئے اور جو حال پر غالب تھے جیسے ابوبکرؓ و عمرؓ وغیرہ ان سے کبھی نہ ایسی باتیں صادر ہوئیں نہ ایسے حالات ظاہر ہوئے۔ بات یہ ہے کہ امت ایک باغ ہے اس میں ہر قسم کے درخت ہیں سرد بھی ہے جس پر مختلف ہواؤں کا اثر نہیں ہوتا اس میں چھوئی موئی کے درخت بھی ہیں کہ ہاتھ لگانے سے کملا جاتا ہے جس کو شرمندہ بھی کہتے ہیں باغ میں سب چیز کی ضرورت ہے پھر اس باغ میں بچے بھی ہیں بڑے بھی ہیں دیوانے بھی ہیں مجذوب بھی ہیں ہر طرح کے لوگ ہیں یہ باغ محمدی ہرا بھرا ہے اور ہرا بھرا رہیگا سو فیہ مغلوب الحال بھی ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو حال پر غالب ہیں غرض حدیث میں ہے یضع قدمہ مگر میں اس کے متعلق زیادہ نقل نہیں کرتا یہ تو دوزخ کی حالت ہوئی اسی طرح جنت بھی پکاریگی کہ اے اللہ مجھکو بھر دیجئے تو حق سبحانہ تعالیٰ ایک مخلوق پیدا کر کے اسمیں داخل فرما دینگے کہ وہ اس میں رہا کریں گے۔ میں نے اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے عرض کیا کہ ہم بھی انہی میں سے ہو جاتے تو کیا اچھا ہوتا فرمانے لگے کہ خدا نہ کرے وہ کیا جانیں جنت کا مزہ جنہوں نے کبھی تکلیف نہیں اٹھائی مزہ انکو تو آوے گا جو یوں کہیں گے الحمد للہ الذی اذہب عنا الحزن۔ ہمیں چین ہو گا انہیں کیا چین جس نے روزہ نہ رکھا ہو تو اسکو شام کے وقت کیا مزہ افطار کا آیا۔ اسی بنا پر کہا کہ بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ شام کے وقت روزہ داروں میں بیٹھ کر کہتے ہیں لاؤ ہم بھی روزہ افطار کر لیں مگر جب روزہ نہیں تو جانے کس چیز کا افطار کرتے ہیں یہ بھلے مانس روزہ دار تو ہوتے نہیں مگر افطاری میں سب سے پہلے آموجود ہو جاتے ہیں مگر انہیں کیا مزہ مزہ تو شام کے وقت روزہ دار کو ہوتا ہے کہ پانی کا پینے سے ان کی جان آتی ہے استاد کیلئے پوچھا کرتے ہیں کہ یہ پانی کہاں کا ہے ایک شخص تو کہنے لگے کہ میں تو رمضان شریف میں اسٹیشن پر رہتا کہ وہاں کے کنوئیں کا پانی عجیب ہے اسی طرح جنت کا مزہ بھی اہل مصیبت کو ہوگا یہ ایک مضمون اپنے استاد سے سنا ہوا بیان کر دیا

ف استغراق کی ایک نہر چاہے تو ہر سرسبز کی ہے ...

ف جنت کی تمنا نہ کیجیو دیکھ کر اصحاب کہف کو

ف بعض روزہ خور بھی افطار میں آموجود ہوتے

۱۹۳

ف افطاری کا لطف اور لطف روزہ دار کو ہے جو سوختہ اور افروختہ ہوتا ہے۔

اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت ہمارے مشائخ کی کتنی ممتاز ہے ان حضرات کی زبان سے کیسی محقق بات نکلتی ہے۔ اسی طرح ایک محققانہ مضمون اور سنئے حدیث میں ہے کہ اہل جنت کو ایک خاص غذا عطا ہوگی اور غذا اس زمین کی روٹی ہوگی اس میں اشکال یہ ہے کہ کیا ڈھیلے اور پتھر کھائیں گے کیونکہ زمین میں تو یہی چیزیں ہیں دوسرے اس میں حکمت کیا ہے کہ اس زمین کی روٹی ملے کیا کوئی دوسری چیز جنت کی نہ تھی۔

ف جنت میں زمین کی روٹی کی تحقیق

ہمارے اساتذہ نے اسکو حل کیا ہے جسکا حاصل یہ ہے اور بات بھی نہایت لطیف ہے گو درجہ ظن میں ہے۔ اشکال کا جواب تو یہ ہے کہ حدیث میں یہ کہاں ہے کہ ڈھیلے اور پتھر کھائیں گے وہاں تو روٹی کا ذکر ہے کہ حق تعالیٰ زمین کی روٹی دینگے اور سب اہیں سے کھائیں گے یہاں بھی تو ہم زمین ہی کے اجزاء کھاتے ہیں دیکھئے ایک من گیہوں بوتے ہیں اور بیس من پیدا ہوتے ہیں جو ایک من سے زائد ہیں وہ زمین ہی کے تو اجزاء ہیں عناصر کے امتزاج کی
۱۹۵ ایک خاص ترکیب سے مٹی کی شکل گیہوں کی بن گئی پس تم یہاں بھی تو زمین ہی کے اجزاء کھا رہے پھر جیسے یہاں چھننے کے بعد کھاتے ہو اسی طرح اللہ میاں وہاں بھی لطیف اجزاء کو چھانکر کھلائیں گے زمین سے جتنے پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں سب زمین ہی کے تو اجزاء ہیں اجزاء لطیف ان شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں تو ایک سوال تو اس سے حل ہو گیا۔ باقی رہا حکمت کا سوال تو میں اپنے اساتذہ ہی سے اسکو نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بہت سے اللہ کے بندے وہ ہیں جنہوں نے دنیا کی چیزوں کو چکھا تک نہیں خواہ اضطراراً کہ میسر نہیں ہوئی یا اختیاراً بمصلحت مجاہدہ و معالجہ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو پان کا مزہ نہیں جانتے تو بعضوں نے میوے نہ کھائے ہونگے بعض نے گوشت نہ کھایا ہوگا تو اگر ان کو صرف جنت ہی کی نعمتیں دیتے تو انکو دنیا اور جنت کی نعمتوں میں تفاوت نہ معلوم ہوتا اور بدون تفاوت کے پوری لذت اور قدر نہ ہوتی اسلئے انکو اس شکل میں دنیا کی نعمتیں بھی عطا فرمائیں گے اور وہ نعمت دیکھو کہ جیسی ہزار ہا قسم کے مزے ہونگے کیونکہ جتنے مزے دنیا میں ہیں زمین ہی سے نکلے ہوئے ہیں تاکہ موازنہ کرکے لذت زاید ہو پھر اصل میں تو صرف ان زاہدوں کو بحکمت مذکورہ کے سبب کھلانا منظور ہوگا مگر کرم کی عادت پر زاہدوں کے ساتھ ہم شرمندوں کو بھی

کھلا دیں گے پس جیسا اس موازنہ سے نعم جنت کا مزہ بڑھے گا اسی طرح ایسے ہی موازنہ سے جنت کا مزہ ایسے ہی لوگوں کو ہوگا جو دنیا میں مشقتیں اور مصائب اٹھا کر راحت کے موقعہ پر پہنچیں گے بخلاف ان کے جنہوں نے دنیا دیکھی ہی نہیں پیدا ہوتے ہی جنت میں داخل کر دئے گئے۔

بہرحال اتنا معلوم ہوا کہ جنت اور دوزخ دونوں کے پر کرنے کے طریق میں رحمت کا ظہور ہوگا اسی ظہور کی فرع یہ بھی ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے مقرر فرمائے جنت کے متعلق ایک اور لطیف مضمون یاد آیا اسکو بھی بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض حضرات کو جنت کا جو نقشہ مکشوف ہوا ہے اس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جنت کے طبقات الگ الگ نہ ہوں گے کہ ایک پورب میں تو دوسرا دکھن میں ہو وعلیٰ ہذا۔ بلکہ اوپر نیچے ہونگے کہ نیچے مثلاً ادنیٰ درجہ ہو اس کے اوپر اعلیٰ پھر اس کے اوپر اور اعلیٰ ہذا چنانچہ فردوس سب سے بلند ہوگا۔ اسپر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس صورت میں سب سے اوپر کے درجہ کا چھوٹا ہونا لازم آتا ہے حالانکہ وہ سب سے بڑا ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ اگر کوئی مکان نیچے سے چھوٹا ہو اور اوپر جا کر پھیلاؤ ہو جائے یہاں تک کہ تمام جنات سے باہر نکل جاوے تو اس میں کیا استبعاد ہے جیسے درخت کہ اس کا تنا عرض میں کتنا مختصر ہوتا ہے اور اوپر جا کر کتنا پھیلاؤ ہو جاتا ہے اسی طرح وہاں بھی ممکن ہے۔ ایک سوال حدیث کے متعلق اور ہے وہ یہ کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ہر شخص کا عمل جس دروازہ کے مناسب ہوگا اسی دروازہ سے پکارا جائیگا مثلاً کسی نے نماز زیادہ پڑھی ہوگی تو وہ باب الصلوٰۃ سے بلایا جاوے گا اور جس نے روزے زیادہ رکھے ہونگے تو وہ باب الریان سے بلایا جاویگا اب فرض کیجئے کہ کوئی شخص ایسا ہو کہ جس نے ہر قسم کے عمل بکثرت کئے ہوں تو وہ مستحق اس کا ہوگا کہ وہ شخص ہر دروازے سے بلایا جاوے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کیا کہ کوئی شخص ایسا بھی ہوگا کہ سب دروازوں سے بلایا جاویگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ارجوان تکون منہم کہ مجکو امید ہے کہ ان لوگوں میں تم ہوگے۔ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ ایک شخص مختلف دروازوں کی طرف کھنچا کھنچا پھرے نیز مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی صورت کیا ہے کیونکہ ایک شخص ایک ہی دروازہ سے داخل ہو سکتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جو تقریر پہلے کی گئی کہ جنت کے طبقات الگ الگ نہ ہونگے اسپر یہ اعتراض

ف جنت کا نقشہ جو اہل اللہ کو مکشوف ہوا ہے اس سے جنت کے طبقات کی کیفیت معلوم ہوتی ہے

۱۹۶

ف ایک شبہ اور جواب

ف ایک اور شبہ مع جواب

پڑتا ہی نہیں۔ مثلاً فرض کیجئے کہ باب الصلوٰۃ پہلا دروازہ ہے اور کسی نے نمازیں زیادہ پڑھی ہیں وہ اس دروازہ سے بلایا گیا اور داخل ہو کر جنت میں پہونچ گیا اور نہ وہیں رہ گیا ایک وہ شخص ہے جس نے نماز روزے دونوں عمل بکثرت کئے تو وہ باب الصلوٰۃ سے گذر کر دوسرے دروازہ باب الریان میں گیا اور جنت میں داخل ہو کر وہیں رہ پڑا اب ایک شخص وہ ہے کہ اس نے ہر قسم کے اعمال بکثرت کئے ہیں تو وہ باب الصلوٰۃ میں اول داخل ہوا بعد باب الریان میں پہونچا پھر تمام دروازوں کو طے کرتا ہوا اعلیٰ جنت میں پہونچ گیا ہاں اگر جنت کے طبقات الگ الگ ہوتے تو اعتراض بظاہر لازم آتا گو اس میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلایا جاوے سب دروازوں سے مگر داخل ہو ایک ہی سے اس طور سے بلانے میں اس کا اکرام زیادہ ہے لیکن تقریر مذکورہ کے بعد تو کوئی اعتراض ہی نہیں باقی
جو امور کشف کے متعلق بیان ہوئے ہیں یہ تخمینیات اور مظنونات درجہ میں ہیں کوئی دلیل ۱۹۷
شرعی ان پر نہیں اور نہ انکی تکذیب پر کوئی نص ہے اگر چاہو اپنے دل کو سمجھا لو۔ غرض جنت
کے آٹھ دروازوں میں سے ایک کا نام باب الریان ہے اس حدیث میں روزہ کی فضیلت ف ۱۳
بیان فرماتے ہیں کہ روزہ دار ہی اس دروازہ سے داخل ہونگے اور اطلاق لفظ روزہ سے مراد عام ہے نفل ہو یا فرض پھر جب نفل کی بھی اتنی فضیلت ہے تو فرض کی تو کیا کچھ فضیلت ہوگی اور روزہ کے فضائل تو بہت ہیں مگر یہ ایک فضیلت نہایت مزہ دار ہے کیونکہ پیاسے کو پانی کا نام سننے سے مزہ آتا ہے اسی واسطے نام بھی وہ لیا گیا کہ جسکے سننے سے فرحت ہو وہ کیا باب الریان یعنی تر و تازہ دروازہ جو پانی سے سیراب ہوا اور روزہ دار کو جیسی پانی سے فرحت ہوتی ہے اور کسی چیز سے کم ہوتی ہے اور پانی جیسا محبوب ہے دوسری چیز نہیں اور قاعدہ ہے کہ محبوب کا نام لینے سے بھی مزہ آتا ہے اگر مزہ نہ آتا تو ایک عاشق یہ شعر نہ کہتا اگرچہ وہ شراب ہی کو کہہ رہا ہے ؎

الا فاسقنی خمرا وقل لی ہی الخمر ۔۔۔ ولا تسقنی سرا متی امکن الجہر

کہ شراب پلاتا جا اور اسکے ساتھ یوں کہتا جا کہ شراب ہے یہ محبوب کے نام سے لطف حاصل کر رہا ہے اور یہ چاہ رہا ہے کہ پلانیوالا زبان سے اس کا نام بھی لیتا جاوے

اس میں بھی مزہ ہے کوئی عاشق مزاج کبھی نہ کہیگا کہ محبوب کا نام لینا بے مزہ ہے غرض روزہ میں سب سے زیادہ محبوب ہے پانی اسی واسطے بعض نے ایسی حدیث چھانٹی جس میں پانی کا ذکر ہے اور پانی بھی اللہ میاں کے یہاں کا جسکی یہ صفت ہے لا لغو فیہا و لا تاثیم ایک ہمارے دوست ہیں اور ضابطہ سے ملازم وہ پانی پر بڑے ولدادہ ہیں ایک روز انہوں نے پانی بہت ہی پی رکھا تھا کسی نے کہا کہ کہیں تمہارا پیٹ نہ پھٹ جائے کہنے لگے کہ اگر محبوب کے وصل میں جان بھی جاتی رہے تو کیا حرج ہے مجھے اسکے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا وہ کہ انکے گاؤں میں قحط تھا ان بیچاروں کو روٹی پیٹ بھر نہیں ملتی تھی ایک روز انہوں نے دیکھا کہ ایک دوسرے گاؤں میں سے لوگ بھاگے جا رہے ہیں اس کا سبب دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہاں مرض ہیضہ کا پھیل رہا ہے اس لئے بھاگ رہے ہیں گاؤں والوں نے پوچھا کہ یہ مرض کیسے ہوتا ہے کسی نے کہا کہ بہت سی روٹی کھا جانے سے ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ مبارک مرض کبھی ہمیں نہ ہوا جیسے محبوب کے وصل میں مرنا قبول چاہے جان جاتی رہے مگر محبوب مل جاوے پھر یہ حالت یہاں ہی کی غذاؤں کی ہے کہ زیادہ کھاؤ تو مرنے کی نوبت آ جائے اور حق تعالیٰ کے یہاں تو کتنا ہی کھا لیں گے کچھ بھی نہ ہوگا اور پیٹ بھی نہ چلے گا البتہ پسینہ نکلیگا جسمیں مشک کی خوشبو نکلے گی یہ خبر علاوہ ہمارے تفریح کے بددینوں کا منہ بند کرنے کو بھی دیدی ہے کیونکہ بعض اہل سائنس اعتراض کرتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ غذا کھائیں اور پیٹ بھی نہ چلے نہ اجابت کے ذریعہ سے فضلہ نکلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا منہ بند کرنے کے لئے فرما دیا کہ جو فضلہ ہوگا بھی وہ پسینہ کے راستہ سے دفع ہوگا جسمیں خوشبو مشک کی سی ہوگی اور غور کیا جاوے تو یہ اعتراض ہی فضول ہے جنت کی غذاؤں میں اتنا فضلہ ہی نہیں جو اجابت کی حاجت ہو دنیا کے اندر اسکی نظائر بہت ہیں گی بعض غذائیں تو ایسی ہیں کہ انکو کھا کر فضلہ بہت ہی خارج ہوتا ہے اور بہت سی ایسی غذائیں ہیں کہ ان کا فضلہ بہت ہی کم نکلتا ہے جنت میں اللہ میاں نے اپنی قدرت کی مشین سے غذاؤں کو فضلات سے ایسا صاف کیا ہے کہ ان میں رہا ہی نہیں اور کچھ غبار رہا بھی وہ اسیقدر ہے کہ صرف پسینہ ہی سے نکل سکتا ہے اور کسی چیز کی ضرورت نہ ہوگی افسوس ہے کہ معترضین روزمرہ ایسی نظائر

ف ایک پیر جی کا لطیفہ

198

14

ف حق تعالیٰ کے یہاں کی غذائیں [illegible] کا جواب

اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر تامل و فہم سے کام نہیں لیتے یہ کلام استطرادًا آگیا تھا اب
مضمون سابق کی طرف عود کرتا ہوں جو باب الریان کے متعلق ہے یعنی دنیا میں ایسا پانی
کہاں باب ریان کے معنی ہیں وہ دروازہ پانی سے سیراب ہونیوالا دروازہ کا نام لیتے ہی سوکھی
روحیں روئیں میں جان آگئی یہ دروازہ کا نام ہے جو انہیں کیلئے بہت ہی مناسب ہے
چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا افطار کی تعلیم فرمائی ہے اسمیں بھی ایسی ہی مناسبت
ہے یعنی اسمیں بھی پانی کا ذکر ہے حکیم ایسے ہی ہوتے ہیں دعا یہ ہے ذهب الظمأ وابتلت
العروق وثبت الاجر انشاء اللہ اور ایک یہ دعا بھی ہے اللھم لک صمت وبک آمنت
وعلیک توکلت وعلی رزقک افطرت۔ ذهب الظمأ الخ کے معنی یہ ہیں کہ پیاس
جاتی رہی اور رگیں تر ہوگئیں اور خدا نے چاہا تو ثواب ثابت ہوگیا۔ رہا یہ شبہ کہ
سنانے کسکو ہیں بات یہ ہے کہ کسی کو نہیں سناتے بلکہ اللہ میاں کی نعمت کو یاد کرتے ہیں
199 زبان سے کہکر مزہ لے رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدہ بھی کرایا تو ایسا جسمیں
15 لطف ہے دن بھر تو انتظار کا لطف اٹھایا اور شام کو روزہ افطار کرنے بیٹھے تو سیرابی
کی نعمت بھی حاصل ہوگئی زبان سے اس کا تذکرہ بھی ہوا واللہ عجیب لطف ہے معلوم رمضان
میں لوگ کیونکر بے روزہ رہتے ہیں میرے چار روزے بیماری کی وجہ سے قضا ہوئے تھے
دن میں کھانے پینے سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میں نے چوری کی ہے حالانکہ میں نے کوئی
کام برا نہیں کیا کیونکہ طبیب صاحب نے افطار کی اجازت دیدی تھی چار روزوں کے
بعد پھر افطار کو جی نہ چاہا اگرچہ ان ناغہ کے ایام میں کھانا پینا بوجہ خوف ضعف کے تھا کہ نہ کھانے
سے کہیں ضعف نہ بڑھ جائے مگر صاحب واللہ اس کھانے پینے میں ہرگز وہ لطف نہ تھا
جو افطار کرکے کھانے پینے میں آتا ہے پانچویں روز دنیا میں کچھ بے انتظامی ہوگئی میں نے
کہا کہ جاؤ اب میں پیتا ہی نہیں اور روزہ رکھ لیا میں تعجب کرتا ہوں ان لوگوں سے جو بلا عذر
روزہ نہیں رکھتے کیسے ان کا دل گوارا کرتا ہے بعض اسلامی ریاستوں میں سنا ہے کہ روزہ
نہ رکھنے پر جرمانہ بھی ہوتا ہے پہلے ان تو یہ حالت تھی کہ بعضے کھلم کھلا کھاتے پھرتے ہیں اور جان کر لوگوں
اس سے صاف کہدیتے ہیں کہ جب اللہ کی چوری نہیں تو بندوں کی کیا چوری میں کہتا ہوں کہ

ایسے لوگ بازار میں اپنی بی بی سے ہم بستر کیوں نہیں ہوتے کیونکہ جب اللہ میاں کی چوری نہیں تو بندوں کی کیا چوری اگر بازار والے دیکھ لیں گے تو کیا حرج ہے بلا عذر لوگوں کے سامنے کھاتے پیتے ہوئے پھرنا اس کا تو کیا ذکر ہے ادب یہ ہے کہ صاحب عذر بھی سب کے سامنے افطار نہ کرے غرض روزہ داروں کو کئی طرح کے لطف حاصل ہوتے ہیں روحانی لطف تو ہیں ہی ہم جیسے پیٹ کے کتوں کو بھی لطف ہے دیکھیا انتظار میں اسوقت کیسا لطف ہے کسی غیر محقق کا قول ہے ؎

جو مزہ انتظار میں دیکھا، پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا

ف
محبوب حقیقی کی لطف غیر متناہی

غیر محقق اس لئے کہا کہ یہ کلام علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کیونکہ دنیا کے محبوبین کا لطف تو بیشک وصل ہونے پر ختم ہو جاتا ہے لیکن محبوب حقیقی کے قرب کا لطف غیر متناہی ہے کبھی ختم نہیں ہوتا وہاں تو یہ کیفیت ہے ؎

دلارام در بر دلارام جو ... لب از تشنگی خشک و بر طرف جو
نگویم کہ بر آب قادر نیند ... کہ بر ساحل نیل مستسقیند

۲۰۰

ایک اور شعر ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار ... گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دار

۱۴ ف
باوجود لطف کے غیر متناہی ہونے کے جنت میں سیری بھی ہوگی

جن کی یہ شان ہے ان کی طلب بھی غیر متناہی ہے ایک شاعر طلب کے غیر متناہی ہونے کو بیان کرتا ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش ... حسن ایں قصۂ عشق ست در دفتر نمی گنجد

عشق کا بھی کہیں پتہ نہیں حسن و جمال کا بھی کہیں پتہ نہیں مگر ہاں ہم جنت میں سیری بھی ہوگی اور لذت میں بھی ترقی ہوگی اور یہ جو بعض اہل حال کا مقولہ ہے کہ جنت میں ایک درجہ سے بعض عشاق ایسے ہونگے کہ وہ ہر وقت ارنی ارنی پکارینگے اور یہ ان کا پکارنا ختم نہ ہوگا اور اس درجہ میں حور و قصور وغیرہ نہوں گے تو یہ کشف مؤول ہے تاویل یہ ہے کہ شاید کسی ساعت قلیلہ کیلئے ایسا ہو مگر پھر سیری ہو جاوے گی اور اس حد کے بعد وہ چیزیں بھی ہونگی جیسے میدان حشر میں بعض تجلیات کی نسبت لوگ کہیں گے کہ آپ ہمارے رب نہیں ہیں ہم اپنے رب کو پہچانتے ہیں پھر دوسری صورت سے تجلی ہوگی اور ہونگی دونوں تجلیاں

ف
بعض اہل کشف کے قول کی تاویل

حق تعالیٰ کی گر پہلی تجلی سے قناعت نہ ہوگی اس کے بعد جو تجلی ہوگی اس سے قناعت ہوجاویگی چونکہ یہ کسی درویش کا قول ہے اس لئے میں نے تاویل کی ہے اگر اس تاویل کو کوئی نہ مانے بلکہ ظاہر ہی پر محمول رکھے تو جانیئے ہم دوسرا جواب دینگے کہ ہم قرآن و حدیث کے خلاف اس کشف کو نہیں مانتے کیونکہ جنت میں ایسا کوئی درجہ ہی نہیں کہ جہاں حور و قصور نہ ہوں جنت میں سب کچھ ہوگا اور سیری بھی ہوگی سیری نہ ہونا غلط ہے وہاں تو وہ کیفیت ہوگی جسکو یاد کرکے اب یہ کہنا زیبا ہے کہ ؎

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم ۔۔۔ کہ شاید دست من بار دگر جانا من گیرد

یوں نہیں کہا کہ دست جاناں خود گیرم کیونکہ جاناں من گیرد میں اور ہی لطف ہے آپ کو بشارت ہے کہ جنت میں آپ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوگا انہ بکل شئی محیط کی لذت عشاق کو اب بھی ہے وہاں اور بھی اتم ہوگی مزہ سے چین سے وہ آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ ۲۰۱
پوری سیری اسی سے ہوتی ہے لہٰذا جنت میں پوری سیری ہوگی وہاں تجلی نام ہے اور محیط ہے پھر احاطہ بھی بلا حجاب۔ محب اور محبوب میں اگر کپڑا حائل ہو تو سیری نہیں ہوتی ۱۷
اللہ میاں کپڑوں سے پاک ہیں البتہ حجابات درمیان میں ہیں جنت میں سارے حجابات مرتفع ہوجاویں گے سوائے ردائے کبریا کے کوئی حجاب نہ ہوگا جسکی حقیقت ادراک کنہ کا امتناع ہے نیز جنت میں سیری اسلئے بھی ہوگی کہ جنت لغب و ب کلی سے خالی ہے وہاں انتظار و اشتیاق بعد کا نہ ہوگا پس یہ کسی غیر محقق کا قول ہے کہ جو مزہ انتظار میں دیکھا پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وصل یار میں اور زیادہ لطف ہے پیش رزو کا لطف کیا پوچھتے ہو پانی کے انتظار میں ایک لطف پھر پیتے وقت اس سے زیادہ لطف پھر رگیں بھی تر ہوگئیں یہ تیسرا لطف پھر آخرت کے لطف کی خبر دی کہ باب ریان ریان یعنی وہ دروازہ تر بتر ہوگا جو اس میں داخل ہوگا وہ بھی تر بتر و سیراب ہوجائیگا اگر کسی کو خیال ہو کہ ہم باب الریان کو کیا سمجھیں گے عربی تو جانتے ہی نہیں پھر یہ نام سنکر وہاں کیا مزہ آدیگا تو خوب سمجھ لیجئے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی وہاں سارے عربی داں ہوجاویں گے ... باب الریان کو بھی سمجھ لیں گے اور اس کا نام بھی ریان ہوگا۔ دیکھنے میں بھی ریان ہوگا یعنی تر بتر

بعض نے کہا ہے کہ جریان کی اسناد باب کی طرف حقیقی ہے یعنی وہ دروازہ خود بھی ترو تازہ
ہوگا کہ اس میں نہریں ہونگی فوارے ہونگے وہ لچکتا ہوا ہوگا مگر یہ نہیں کہ اس میں کچھ ہوگی
بعض نے کہا ہے کہ اسناد مجازی ہے یعنی دروازہ کو جریان کہنا باعتبار ان لوگوں کے ہے
جو اس میں وارد ہونگے یعنی وہ ترو تازہ ہوکر جاویں گے اس کے بعد ایک گفتگو اس میں
ہے کہ جنت کی چیزیں جس حالت پر ہوں گی آیا وہ چیزیں خود بھی اس حالت کا ادراک کریں گی
یا نہیں بعض نے کہا ہے کہ انکو بھی ادراک ہوگا مثلاً دروازہ ترو تازہ ہوگا تو وہ اپنے ترو تازہ ہونیکا
ادراک بھی کریگا۔ اسی طرح اور چیزوں کا حال ہے وان الدار الآخرة لهي الحيوان سے بظاہر یہی
مفہوم ہوتا ہے کہ آخرت سراپا حیوٰۃ ہے کیونکہ زیادہ مستعمل حیوان بمعنی مصدر ہے یہ ایسا
کہ جیسے زید عدل اور اگر صفت بھی ہو تو بمعنی ذی حیات ہوگی پس وہاں کی در و دیوار
۲۰۲ میں بھی زندگی ہوگی نیز ادیب گذیں گی نغمات پیدا ہوں گے درخت گائیں گے اور بظاہر
اس لئے کہا کہ کلام میں یہ بھی احتمال ہے کہ الدار کا مضاف مقدر ہو یعنی حیوٰۃ الدار الآخرۃ ہی الحیوٰۃ
۱۸ باقی جنت کا بولنا خود حدیث میں آیا ہی ہے اور وہ بظاہر حقیقت پر محمول ہے یہی صوفیہ کا
مسلک ہے بعض اہل ظاہر خشک ہیں وہ کہتے ہیں کہ جنت مثل بولنے والے کی ہوگی جیسے
بیجان تصویر کو کہدیتے ہیں کہ ابھی جیسے اب بول پڑیگی یہ حیات کے قائل نہیں مگر یہ
محض تاویل ہے صوفیہ کا قول ظواہر نصوص سے مئوید ہے ان کے نزدیک دوزخ بھی
ذی حیات ہوگی دلیل یہ ہے کہ ہل من مزید پکارے گی نیز اس میں اور بھی آثار حیات کے
پائے جاتے ہیں نیز بعض اہل کشف نے جہنم کی شکل کے بارہ میں کہا ہے کہ اس کی شکل
اژدھے کی سی ہے اس کے پیٹ میں سانپ بچھو وغیرہ بھرے وغیرہ ہیں سارا جہنم اژدہے کی
صورت ہے اس سے ایک حدیث کے معنی بلا تاویل کے سمجھ میں آجاویں گے کہ حدیث میں
آتا ہے کہ جہنم میدان قیامت میں لائی جاویگی جسکی ستر ہزار باگیں ہونگی اور ہر باگ کو ستر ہزار
فرشتے پکڑے ہوئے ہونگے مگر پھر بھی قابو سے نکلی جاتی ہوگی اور کڑکتی ہوگی اور ہل من مزید
پکارتی ہوگی اس کے معنی صوفیہ کے قول پر اس طرح سمجھ میں آتے کہ چونکہ وہ ذی حیات ہے
اس لئے اس قسم کے آثار اس سے پائے جاویں گے بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو جس

ت
جنت کی ہر
چیز ذی حیات ہے

ت
دوزخ بھی ذی
حیات ہے

بدولت اہل باطن سمجھتے ہیں اور لوگ نہیں سمجھتے اور جاندار ہونے کی صورت میں اس کا اثر
فرحت میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اہل باطن کے مسلک پر سیرابی کی فرحت صائمین کو
بہت زیادہ حاصل ہوگی کیونکہ جب سنیں گے کہ باب الریان ذی حیات ہوگا تو یہ سمجھیں گے کہ
دروازہ میں داخل ہونے والے تو خوش ہوں ہی گے مگر وہ دروازہ بھی بوجہ ذی حیات
ہونے کے خوش ہوگا اور پھاٹک کے جاندار ہونے پر خلاف عادت ہونے کے خیال سے
تعجب نہ کیا جاوے کیونکہ خلاف عادت ہی نہیں جیسے دنیا میں بچے کیلئے اماں جان
پھاٹک بنجاتی ہیں کہ لڑکا اس کے طریق خاص سے نکلتا ہے ایسے ہی وہ دروازہ ہوگا
اور یہ تعجب ایسا ہی ہے جیسے ایک ملحد نے اعتراض کیا تھا کہ جنت میں دودھ کی نہروں
کے واسطے اتنی گائیں کہاں سے آئیں گی جواب یہ ہے کہ دنیا میں دودھ تھن میں سے نکلتا
ہے اور خدا ہی پیدا کرتا ہے اگر وہاں وہ نہر ہی خاصیت میں ایک بڑا تھن ہو اور اس میں
دودھ پیدا کر دیا جاوے تو کیا تعجب کی بات ہے اسی طرح جیسے یہاں جاندار پھاٹک
پیدا کئے ہیں وہاں بھی پیدا کر دیں تو کیا محل تعجب ہے اور قرآن سے بھی روزہ دار کیلئے
دو نعمتیں ثابت ہوتی ہیں سیرابی کی بھی اشربوا سے اور سیری کی بھی کلوا سے چنانچہ ارشاد
ہے کلوا واشربوا ہنیئا بما اسلفتم فی الایام الخالیۃ پس روزہ دار ریان بھی بنائے
جائیں گے اور شبعان بھی اور حدیث میں گو شبعان صراحۃً مذکور نہیں مگر ریان خود شبعان پر
دلالت کرتا ہے کیونکہ پانی پینے کا لطف پیٹ بھرنے ہی پر آتا ہے دوسرے کریموں کی عادت
ہے کہ کھانا کھلا کر پانی پلایا کرتے ہیں۔ خالی پیٹ پر نہیں پلاتے ہاں بعض بخیلوں کی یہ عادت
ہوتی ہے کہ پانی سے مہمان کا پیٹ بھرنا چاہا کرتے ہیں تاکہ کھانا کم کھاوے کریموں کی عادت
یہ ہے کہ کھانے کے بعد پانی دیتے ہیں قبل نہیں دیتے تاکہ کھانا خوب کھایا جاوے بہذا ریان
عادۃً شبعان کو متلازم ہے باقی ریان کے عنوان میں صرف پانی کی بشارت اس لئے دی
کہ صائم کو زیادہ مرغوب یہی ہے اسی کی بشارت میں ارشاد ہوا ہے کہ لا یدخلہ الا الصائمون
یعنی اس میں روزہ دار ہی جائیں گے اور میں نے جاوید جنت کے نقشہ کے ذکر میں ایک
مثال درخت کی بیان کی ہے کہ جڑ عرض میں کم ہوتی ہے اور شاخیں زیادہ

ہوتی ہیں اسپر جنت کے درختوں کے متعلق ایک مضمون یاد آگیا اس کو بھی عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جنت کے درخت کی جڑ اوپر اور شاخیں نیچی ہونگی مگر اس کا ظاہری مطلب مراد نہیں کہ جڑ تو آسمان کی طرف ہو اور شاخیں زمین کی طرف جیسے کوئی چھوٹے سے درخت کو الٹا جاوے کہ اسکی جڑ اوپر کو شاخیں نیچے کو ہو جاویں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جڑ تو اونچی سطح پر ہوگی اور اسی سطح کے گرداگرد اس سے نشیب میں خلا ہوگا اس میں شاخیں جڑ سے نیچے تک نیچی ہونگی جیسے کوئی پھلواری گملہ میں رکھکر وہ گملہ کسی اونچی ستون پر رکھدیا جاوے اور اس کی شاخیں گملہ سے بھی نیچے پہنچ جاویں اور حکمت اس میں یہ ہوگی کہ اہل جنت لیٹ کر بیٹھکر سب طرح پھل توڑ سکیں۔ مثلاً جڑ زمین سے دس فٹ اونچی ہو اور شاخیں زمین سے دو فٹ بلند ہوں۔ جیسے دنیا میں اونچے چبوترہ پر درخت ہوتے ہیں جنکی شاخیں زمین کے متصل ہوتی ہیں یہانتک منجملہ ان تقریروں کے ایک تقریر کہ جو بیان ہوئی اس تعویذ کا نام الریان من رمضان مناسب ہے یعنی ریان کے حصول کی بشارت رمضان کی وجہ سے اور جو مضمون اس سے پہلے جمعہ میں بیان کرتا اگر طبیعت اچھی ہوتی وہ

اس آیت کے متعلق ہونا جو آئندہ ذکر کرتا ہوں یعنی شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ہدی للناس وبینات من الہدی والفرقان ہدی للناس میں تنوین تعظیم کی ہے یعنی بڑی ہدایت ہے لوگوں کیلئے اور دلائل واضحہ ہیں یہ عطف تفسیری ہے "من الہدی" میں من تبعیضیہ اور الف لام جنس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن بڑی ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور دلائل واضحہ ہیں ان شرائع سماویہ میں سے جنکی شان ہدایت ہے یعنی شرائع سماویہ تو متعدد ہیں ان میں سے ایک قرآن بھی ہے اب "من" کا تبعیضیہ ہونا واضح ہوگیا اور یہ تخصیص بعد تعمیم ہے یوں تو تمام کتب سماویہ اور تمام شرائع کی شان ہدایت ہے مگر اس تخصیص سے قرآن کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے اور فرقان لوازم ہدی سے ہے کیونکہ وضوح حقیقت کے بعد امتیاز من الحق والباطل لازم ہے۔ یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ موقع تو ہے رمضان کی فضیلت بیان کرنے کا چنانچہ اوپر سے صوم ہی کا ذکر چلا آرہا ہے اور بیان کی گئی قرآن کی فضیلت اسکی کیا وجہ ہے جواب یہ ہے کہ فضیلت بیان کرنے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہے

ف جنت کے درختوں کی جڑ اوپر اور شاخیں نیچی ہونیکا مطلب

۲۰

ف آیۂ کریمہ شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن کی تفسیر

ف اشکال اور اسکا جواب قابل دید

ایک تو یہ کہ خود اس چیز کی فضیلت بیان کریں اور ایک یہ کہ فضیلت تو بیان کریں دوسری شئے کی اور اس کی فضیلت اس سے لازم آجاوے اور یہ احسن طریق ہے کیونکہ اس میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی ہے اسی کو کہتے ہیں ؎ خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں۔ مثلاً ہمکو حضرت حاجی صاحبؒ کی فضیلت بیان کرنا ہو تو اس کا ایک طریق تو یہ ہے کہ خود ان کی فضیلت بیان کریں اور دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہیں کہ حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا گنگوہیؒ جیسے شخص ہیں اور یہ احسن طریق ہے پس اسی طریق سے رمضان کی فضیلت اس طرح لازم آگئی کہ ماہ رمضان وہ ہے جسمیں ایسا اور ایسا کلام نازل ہوا ہے جس ماہ کو اتنی بڑی چیز سے ملابست ہوگی تو وہ ماہ کتنی فضیلت رکھتا ہوگا ظاہر ہے کہ بڑی فضیلت والا ماہ ہوگا۔ اب ماہ رمضان میں نزول قرآن سے برکت ہونیکے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ برکت اسکو قرآن کے نازل ہونے سے
۲۰۵
حاصل ہوئی ایک یہ کہ برکت اس ماہ میں پہلے سے تھی اور قرآن کے نازل ہونے سے یہ
۲۱
ماہ نورٌ علیٰ نور ہو گیا ہو۔ اسی کے مناسب نعت کا یہ شعر ہے ؎ نبی خود نور اور قرآن ملا نور۔ نہ ہو پھر ملکے کیوں نورٌ علیٰ نور۔ اسی طرح یہاں ہوگا کہ رمضان خود نور پھر قرآن دوسرا نور بس اس سے ملکر یہ نورٌ علیٰ نور ہو گیا اور اس کی فضیلت کے بیان میں قرآن شریف کا نازل ہونا ہی کافی ہے اور کسی فضیلت کے بیان کی حاجت نہیں اور چونکہ رمضان اور قرآن میں مناسبت ہے اس لئے اعلیٰ درجہ کی عبادت اس ماہ میں تلاوت قرآن تجویز کیجاتی ہے اور تلاوت قرآن کی طرف اس ماہ میں میلان بھی زیادہ ہوتا ہے اسی لئے میں اپنے احباب کو مشورہ دیا کرتا ہوں کہ قرآن کی تلاوت کو اس ماہ میں دوسری عبادات پر غالب رکھیں اور اسی لئے میں نے طالبین کو اس ماہ میں کچھ تعلیم ع نہیں جی یوں چاہتا ہے کہ اس ماہ میں تلاوت کو غالب رکھیں اور اس تجویز کی اس سے تقویت ہوتی ہے چنانچہ جبرئیل علیہ السلام حضورؐ کے ساتھ رمضان میں قرآن کا دور کرتے تھے اور وفات کے سال دو دفعہ دور ہوا ہے صحابہؓ کا اور امت کا یہی عمل رہا ہے

ع حضرت کی عادت شریفہ ہے کہ رمضان میں تعلیم و تلقین خاص کو بند کر دیتے ہیں ہاں افادات عامہ پہلے سے زیادہ ہو جاتے ہیں ۱۲ ظ پھر بعد میں اس میں بھی بہ تقاضائے وقت کچھ ترمیمیں ہوتی رہیں ۱۲ منہ۔

کہ رمضان میں ختمات قرآن کا خاص اہتمام کیا ہے علماء کا بھی یہی قول ہے کہ اس ماہ میں تراویح میں ایک دفعہ کلام اللہ کے ختم کو سنت موکدہ کہا ہے لیکن سنت اسوقت ہے کہ اس میں کوئی مفسدہ نہو اور اگر مفسدہ ہو تو اسکو ترک کر دینگے مثلاً ٹھیکہ دار حافظ کے سوا اور کوئی نہیں ملتا ہے چونکہ بعض جگہ اس سنت پر عمل کرنے سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے اسلئے وہاں سنت کو ترک کر دیں گے۔ آجکل حافظ دو قسم کے ہیں ایک تو بشرط شئ کے مرتبہ میں یعنی کلام اللہ سنانے پر شرط کرلیں یہ صورت تو جائز نہیں کیونکہ سنانے پر اجرت لینا حرام ہے اس موقع پر سنت پر عمل چھوڑ دیں گے اور دوسری شرط لا شئے کے مرتبہ میں یوں کہیں کہ ہم جب پڑھیں گے کہ تم ہمیں کچھ نہ دو ہاں اور گو ایک احتمال لابشرط شئے کا بھی ہے لیکن تتبع عرف سے اس کا مرجع بھی ان ہی دو قسم سے ایک قسم ہے اسلئے تقسیم واقعی ثنائی ہی رہی گو عقلی ثلاثی ہے بہر حال اگر حافظ بشرط لا شئے ملجاوے تو کلام اللہ سننے میں کاہلی نہ کرے بلکہ سننے کے لئے مستعد ہونا چاہیے خیال کرنے کی بات ہے کہ لوگ دنیا کے واسطے کتنی محنت کرتے ہیں اسکے مقابلہ میں یہاں تو کچھ بھی نہیں مگر بے رغبتی کی یہ حالت ہے کہ بعض کو تراویح ہی میں نیند آتی ہے سو اس کا علاج کرنا چاہیے آسان علاج ایک تو یہ ہے کہ سیاہ مرچ کھالو اس سے نیند جاتی رہے گی اور سیاہ مرچ نافع بھی ہے البتہ لال مرچ مضر ہے اس کے مضر ہونے پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بزرگ دماغ سے معذور رہتے جب ان کے سامنے مسلمانوں کی کسی قسم کی خرابیوں کا ذکر ہوتا تو یوں فرماتے کہ یہ سب فساد مرچوں کا ہے جو بات بھی ہوتی یہی فرما دیتے ایک شخص کہنے لگے کہ کیا بے جوڑ بات ہے جس نے ہنسکر کہا بڑی جوڑ دار ہے اس طرح سے کہ مرچوں سے کھانا مزہ دار ہو جاتا ہے اور بوجہ مزہ دار ہونیکے کھایا بہت جاتا ہے اور زیادہ کھانے سے قوت بہیمیہ میں ترقی ہوتی ہے اور وہ باعث ہوتی ہے فساد کا ہم تو بزرگوں کے قول کی تاویل کریں گے گو وہ بزرگ کیسے ہی ہوں خیر یہ تو ہنسی کی بات تھی باقی نیند کا اصل علاج یہ ہے کہ پانی کم پیو مشائخ اہل مجاہدہ کا قول ہے کہ نیند کا مادہ پانی ہی ہے اسکو امام غزالی نے لکھا ہے پھر بھی اگر نیند زیادہ آوے تو سیاہ مرچ چبالو آخر خدا تعالیٰ سے کچھ لینا بھی ہے یا نہیں حق سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ایطمع کل امرئ منہم ان یدخل

ف رمضان میں ختم قرآن تراویح میں سنت موکدہ ہے

ف اس زمانہ کے حافظ دو قسم کے ہیں

۲۰۶

۲۲ ف نیند کا ایک آسان علاج

ف مشائخ اہل مجاہدہ کا قول کہ نیند کا مادہ پانی ہے

جنت نعیم کلا کیا ہر شخص اس کی طمع رکھتا ہے کہ نعمتوں والی جنت میں داخل کیا جاوے ایسا ہرگز نہیں یعنی بدون کئے کچھ نہ ملیگا پہلے اعمال کے ذریعہ سے جنت کی قابل تو ہنو بدون اعمال کئے کیا منہ ہے جنت کے لینے کا پس رمضان میں ہمت کرکے ایک قرآن تو سن ہی لو بہرحال سنت سے۔ آثار سے۔ بزرگوں کے معمولات سے۔ ذوق سے ثابت ہوتا ہے اس ماہ میں قرآن کی تلاوت خاص درجہ میں مطلوب ہے۔ یہ دوسری تقریر ہے اس کا نام القرآن فی رمضان رکھنا مناسب ہے۔ دونوں تقریروں میں مناسبت بھی ہے کہ پہلی تقریر میں رمضان کی فضیلت کا بیان تھا اور اس میں قرآن کا بیان ہے جسمیں ایک وجہ تو مناسبت کی یہ ہے کہ قرآن کا نزول رمضان شریف میں ہوا ہے دوسرے نص حدیث قرآن شریف اور روزہ دونوں قیامت کے دن شفاعت کریں گے رمضان کہیگا میں نے اسکو پیاسا رکھا تھا اسواسطے اس شخص کو بخشدیجئے اور قرآن کہیگا کہ میں نے اسکو جگایا تھا اسلئے میری شفاعت قبول فرمائیے پھر لفظ رمضان کو ان ایام صیام سے لفظی مناسبت بھی ہے کہ رمض سخت گرمی کو کہتے ہیں اصل وجہ تو اس کی یہ ہوئی تھی کہ جب مہینوں کے نام تجویز ہوئے تھے تو ان ایام میں سخت گرمی تھی اس لئے اسکا رمضان رکھا پھر خدا تعالےٰ نے ان ایام میں عبادت ایسی مقرر کی کہ اگرچہ سردی ہی ہو تب بھی بہ نسبت اور ایام کے اس میں کچھ تو تپش ہوتی ہی ہے یعنی بھوک کی یا پیاس کی تپش یہاں دوسری تقریر ختم ہوئی۔

اب تیسری تقریر رہ گئی اس میں شب قدر کا بیان ہے اسکو تقریر بالا سے مناسبت یہ ہے کہ جیسے رمضان شریف میں قرآن نازل ہوا اسی طرح لیلۃ القدر میں نازل ہوا ہے چنانچہ ایک جگہ تو یہ ارشاد ہے شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن اور دوسری جگہ یہ ارشاد ہے انا انزلناہ فی لیلۃ القدر اور لیلۃ القدر کا رمضان میں ہونا نصوص حدیث سے ثابت ہے۔ لہذا پس دوسری اور تیسری تقریر میں بھی پوری مناسبت ہوگئی اب شب قدر کے متعلق بعض ضروری باتیں بیان کرتا ہوں ایک یہ کہ آجکل اکثر لوگ یہ پوچھا کرتے ہیں کہ شب قدر میں کیا عبادت کریں اس کا جواب یہ ہے کہ دن کو تو زیادہ تر تلاوت میں صرف کرے تدبر سے تلاوت کرے اگر تجوید نہ آتی ہو تو کم از کم بقدر ضرورت اسکو سیکھے اور رات

کو بھی حق تلاوت ادا کرے اور لیلۃ القدر میں زیادہ جاگے کچھ تلاوت کچھ نوافل میں مشغول رہے
اور دس دن اعتکاف کی مشروعیت میں یہ بھی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ شب قدر کا جاگنا ن اعتکاف کی حکمت
نصیب ہو کیونکہ اعتکاف مسجد میں ہوگا اور جب یہ مسجد میں پڑا رہیگا تو کوئی تو اٹھے ہی گا اسکو
بھی توفیق ہوجاویگی۔ پھر یہ ایک لطیفہ رحمت دیکھئے کہ اللہ میاں نے اعتکاف کے
دس دن معین کئے اور لیلۃ القدر کی پانچ راتیں جنمیں ایک ایک دن کا ہر دو رات کے
بیچ میں فاصلہ بھی کر دیا تاکہ آسانی ہو جاگنے میں کہ جو تکان ایک رات کے جاگنے سے ہوگیا
ہے وہ ایک دن آرام کرنے سے جاتا رہے آج اٹھارہ تاریخ ہے اور کوئی خبر اسکے خلاف
ابتک نہیں ملی پس جس مسجد میں جماعت ہوتی ہو اسمیں ۲۰ بیس تاریخ یعنی پرسوں کو غروب آفتاب
سے پہلے اعتکاف کی نیت کرکے جا بیٹھے اور چاند رات کو نکل آوے اگر تیس کا چاند ہو تو دس ۲۰۸
دن پورے ہوجائیں گے اور اگر انتیس کا ہوا تو گو تعداد میں نو دن ہونگے مگر ثواب دس دن ن
کا ملیگا اس اعتکاف میں علاوہ اور حکمتوں کے ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ ان دنوں شب قدر کی
میں شب قدر نصیب ہوجاتی ہے جسمیں عبادت کرنا ایک ہزار ماہ کی عبادت سے زیادہ عبادت کی
فضیلت رکھتا ہے جو اسی سال سے بھی زیادہ ہوتا ہے اتنی تو عمر بھی شاذ و نادر ہوتی ہے فضیلت ۲۴
پس اسی بنا پر ایک شب قدر میں جاگنا ایسا ہے گویا ساری عمر سے بھی زیادہ عبادت کی جسکا
مطلب دوسرے عنوان سے یہ ہوا کہ ساری عمر بھی عبادت کی اور مرنے کے بعد بھی کچھ
دنوں عبادت کی۔ اتنا ثواب ہے اس رات میں عبادت کا کہ ایک رات کی عبادت تمام
عمر کی عبادت سے بڑھ جاتی ہے تو ضرور اس کی کوشش کرے اگر ساری رات نہ جاگ سکے
اور نیند کا غلبہ ہو اور اکثر حصہ جاگ سکے تو بھی شب قدر کی فضیلت ملیگی پس سستی نکرے
اور نیند نہ آنے کی تدابیر کرے مثلاً یہ کہ رات کو کھانے پینے میں قدرے کمی کرے اگر پھر بھی ضرورت
ہو تو کالی مرچ چبا وے اور جو بھی تدبیریں نیند نہ آنے کی ہوں سب کرے اور اگر باوجود تدبیر
کرنے کے پھر بھی نیند غالب ہو تو وہ نیند معتبر ہے یعنی پھر سو رہے لیکن یہ نہیں کہ ذرا سی نیند
آئی اور پڑکر سو رہے۔ اور نیند کے غلبہ کی صورت کو اسطرح سمجھو کہ ایک بڈھے کی حکایت ہے
کہ وہ پڑھ رہے تھے "کریما ببخشائے برحال ما" اور نیند میں نکل رہا تھا اری ماں جب

یہ نوبت آجاوے تو سورہے کیا لطف و رحمت ہے کہ ایک رات کی عبادت کو ہزار ماہ کی برابر قرار دیدیا اور پھر نیند کے غلبہ کا بھی اعتبار فرمایا اور نیند کے غلبہ کی صورت میں اکثر حصہ رات کے جاگنے کو بھی فضیلت شب قدر کی مرحمت فرمائی۔ ؎ طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا من العنایۃ رکنا غیر منہدم۔ ہمارے لئے بڑی بشارت سنو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عنایت الٰہی کے رکن ہیں آپ نے فرمایا ہے کہ میں ایک رحمت ہوں کہ تحفہ بنا کر مجھ کو بھیجا ہے "انا رحمۃ مھداۃ" مگر ہماری وہ حالت ہے کہ کھائیں اور غرائیں اور پھر کہیں کہ لا تبع ثواب الجنۃ جن کا مقام ناز کا ہو اگر وہ کچھ کہدیں تو زیبا ہے مگر ہر ایک کو ان کی نقل کرنے کا حق نہیں ؎ ناز را روے بباید ہمچو ورد۔ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد۔ اس مقام کو اصطلاح میں ادلال کہتے ہیں جو ہر ایک کا مقام نہیں جنکا مقام ادلال ہے ایسی باتیں کہنا ان مرتبہ ہے نہ کہ اہل اضلال کا حضرت رابعہ بصریہ جن کا مرتبہ ناز کا تھا وہ حج کو گئیں جب حج کر چکیں تو کہتے ہیں کہ میں ثواب کی ہر حالت میں مستحق ہوگئی اگر حج قبول ہوا ہے تب تو ظاہر ہے اور جو قبول نہیں ہوا تب بھی ثواب کی مستحق ہوں کیونکہ یہ عاشق کے لئے بڑی سخت مصیبت ہے کہ وہ محبوب کی درگاہ میں آوے اور محروم واپس جائے ؎ از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم۔ ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم۔ تو اس صورت میں تو میں مصیبت زدہ ہوں گی کہ میرا حج مردود ہوگیا اور آپ نے مصیبت پر بھی اجر کا وعدہ فرمایا ہے بہر حال ثواب دینا پڑے گا میں ٹلوں گی نہیں اور جو اہل ناز نہ ہو تو اسکو تنبیہ کرتے ہیں ؎ ناز را روئے بباید ہمچو ورد ؛ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد ؛ پیش یوسف نازش و خوبی مکن ؛ جز نیاز و آہ یعقوبی مکن ؛ چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش ؛ ہمچو او باگریہ و آشوب باش۔ ایک درویش نے حضرت ابراہیم ابن ادہم کو دیکھکر ناز کیا تھا حالانکہ اس کا مرتبہ ایسا نہ تھا پھر دیکھئے اس کا کیا حشر ہوا قصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ابن ادہم سلطنت کو ترک کرکے ایک جنگل میں پہونچے وہاں ایک درویش رہتا تھا کہ اسکو غیب سے کھانا آتا تھا اس نے خیال کیا کہ اگر یہ شخص یہاں ٹھہر گیا تو میرے کھانے میں کمی ہوگی اس نے کہا کہ یہاں ٹھہرنے کا حکم نہیں ہے جیسے موذنین کی اکثر عادت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم جہاز میں عدن پہونچے سیر کو جی چاہا اس لئے وہاں اترے شب کو ہم ایک مسجد کے

حجرہ کی چھت پر جاکر پڑے۔ مؤذن صاحب آئے اور کہا کہ نکلو یہاں سے میں تو بولا نہیں اس
خیال سے کہ بحث کی یہاں گنجائش نہیں اور یہ خیال کیا کہ جیسا بنے پڑے رہو کوئی نکالے
گا نکل جاوینگے۔ ایک سندی سوداگر بھی ہمراہ تھے جو عرب میں تجارت کرتے تھے
وہ بولے ہم عرب ہیں اور ہمیشہ یہاں ٹھہرتے ہیں۔ مؤذن ہمکو عرب ہی سمجھا پھر تو
کہنے لگا کہ یہاں بیٹھے ہو مسجد کے اندر قالین بچھے ہیں ہوا سے حفاظت کا انتظام ہے۔
وہاں چلو چنانچہ وہاں لے گیا اور خوب خاطر کی اسی طرح وہ درویش چھپری والا گھبرایا
وہ بھی صاحب کرامت تھا اس کو غیب سے روٹی ملتی تھی مگر وہ حالت غربت سے فقیر ہوا تھا
اس کا وہی حوصلہ تھا وہ بڑبڑایا اور کہا کہ یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے حضرت ابراہیم
ابن ادہمؒ نے فرمایا کہ میں روٹی نہیں مانگتا تب اسکو تسلی ہوئی۔ مجکو روٹی سے تسلی ہونے پر
ایک حکایت یاد آئی۔ ایک سچے بزرگ سے ایک گاؤں کے لوگ مرید ہوگئے ان کے
پہلے پیر جو آئے اور یہ قصہ معلوم ہوا تو ان بزرگ کی قوم کا نام لیکر کہنے لگے کہ فلانی قوم ۲۱۰
میں بھی کہیں بزرگ ہوئے ہیں ایک دانشمند دیہاتی بولا کہ یہ بات تو بزرگ جانتے ہوں گے
کہ کس قوم کے بزرگ ہوتے ہیں کس قوم کے نہیں ہوتے مگر ایک بات تو وہ ہم سے فرما گئے
ہیں کہ پہلے پیر کا بھی حق سمجھنا۔ اسپر پیر صاحب کہنے لگے کہ خیر وہ بھی بزرگ آدمی ہیں۔ مجکو
ایک جگہ جانیکا اتفاق ہوا وہاں قریب مقام میں ان لوگوں کے ایک پیر تھے ان کو خیال ہوا
کہ شاید واعظ یہ میری جڑ کاٹیں گے وہ خود بھی وہاں آئے اور ایک مولوی صاحب کو بھی
اپنے ساتھ لائے کہ شاید بحث کی نوبت آئے تو ان کو مقابل بنا دینگے آخر وعظ ہوا تو میں نے
بیان کیا کہ میں ایک کام کی بات بتاتا ہوں کہ دین کی باتیں تو اہل علم سے پوچھو اور ان کو
کوئی نذرانہ وغیرہ مت دو اور مالی خدمت پیروں کی کرو مگر دین کی باتیں پوچھنے کی
تکلیف ان بزرگوں کو مت دیا کرو بس مسائل کے لئے تو مولویوں کو رکھو اور خدمت
کے لئے فقیروں کو۔ ان کو پریشان مت کرو ہاں ان کی خدمت کرو اور مولویوں کو ایک
پیسہ مت دو پیر صاحب خوش ہوگئے اور میرے خوب ہاتھ چومے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ جتنے
بدعتی ہیں اگر ہم لوگ ان کی تنخواہ مقرر کردیں تو سب ہماری سی کہنے لگیں کیونکہ ان کی سب بدعات

کھانے کے لئے ہیں ورنہ اگر اس طرف سے یکسوئی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائیں بطور
نمونہ کے ایک واقعہ لکھنؤ کا عرض کرتا ہوں وہاں دستور ہے کہ الگ الگ کھانا رکھکر
اور مردوں کے ساتھ نام ذکر کرکے جدا جدا فاتحہ دلواتے ہیں کہ اس کا ثواب فلاں کو پہونچے
اور اس کا فلاں کو بعض نے مجھ سے کہا کہ علماء نہ معلوم جدی جدی فاتحہ کو کیوں منع کرتے
ہیں۔ میں نے کہا نہیں تم الگ الگ ہی دلواؤ مگر فاتحہ دینے والے پیر جیون کو کچھ مت
دو جب دیکھیں گے کہ فاتحہ تو بیس بار دینا پڑی اور ملا کچھ بھی نہیں انشاء اللہ پہلے ہی دن وہ
بھی کہنے لگیں گے کہ الگ الگ کی ضرورت نہیں کہنے لگیں گے کہ ان قیدوں کی ضرورت
نہیں یہ تو ساری روٹیوں کی باتیں ہیں۔ ایک مسجد کا قصہ ہے کہ وہاں ایک ملا رہتے تھے
ایک روز ایک بڑھیا عورت روٹی لائی وہ وہاں اسوقت نہ تھے ایک مسافر تھا وہ روٹی
اسکو دیدی ملاجی آئے اور ان کو قصہ معلوم ہوا انہوں نے سوچا کہ یہ تو برا راہ نکلا اسکی
بندش اگر نہ ہوگی تو آئندہ جانے کیا ہو سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل؛ چو پر شد نشاید گذشتن ۲۱۱
بہ پیل۔ بس لاٹھی لیکر مسجد میں دوڑنا اور ادھر ادھر لاٹھیاں مارنا شروع کیا بڑھیا نے بھی ۲۷
سنا اور تمام لوگ جمع ہوگئے یہانتک کہ اخیر میں ملاجی بیہوش ہوکر گر گئے۔ لوگ کہنے لگے
ملاجی کو کیا ہوگیا وہ بولے کہ میرے پاس مت آؤ میرا اس مسجد میں گذر نہیں ہوگا لوگوں
نے کہا آخر بات تو بتلاؤ کہنے لگے بات کیا بتلاؤں بات یہ ہے کہ میں تو یہاں کے سب
مردوں کو جانتا ہوں میرے پاس جو کچھ آتا تھا سب کو مناسب طور پر ثواب بانٹ کر
کھالیتا تھا وہ حصہ لیکر چلے جاتے تھے آج اجنبی شخص کو کھانا پہونچنے پر مردوں کو کچھ ملا نہیں وہ
سب مردے میرے سر ہوگئے میں ہٹاتے ہٹاتے تھک گیا تو ہر روز کہانتک ان کا مقابلہ کرونگا
لوگوں نے کہا کہ بھائی تجھکو ہی دیا کریں گے کہیں مت جائیں پڑا رہ صاحبو لوگ ایسی استادیاں
کرتے ہیں مولویوں نے سب کی جڑ کاٹ دی ہے اسلئے سب ان سے ناخوش ہیں خیر تو وہ درویش یہ
سنکر کہ میری روٹیوں میں سے نہ بانٹیں گے خوش ہوگیا اور حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کو جگہ ٹھہرنے کی دیدی
کھانے کے وقت اس کے پاس معمولی روٹی سالن اور مٹی کے پیالہ میں پانی آیا اور ان کے پاس غیب
سے ایک خوان لگا ہوا آیا جسمیں رنگا رنگ کے کھانے تھے تمام جنگل اس کی خوشبو سے

ہنس گیا وہ درویش جانتا تھا کہ یہ ابراہیم ہیں جو ابھی سلطنت کو چھوڑ کر فقیر ہوئے ہیں تو وہ حق
تعالیٰ سے کہنے لگا کہ کیا یہی انصاف ہے ہم تو اتنے دنوں کے خادم ہیں اتنی مدت مجاہدات
میں گذری ہمیں تو معمولی روٹی اور سالن دیا جائے اور اس نے نہ ابھی زیادہ عبادت کی
نہ مجاہدہ اور پھر یہ خاطرداری وہاں سے حکم ہوا کہ بکومت اپنی حیثیت یاد کر کہ تو کون تھا ایک
گھس کھدا تھا اور اس کی حیثیت کو دیکھ کہ بادشاہت چھوڑ کر آیا ہے اگر منظور نہیں تو فلاں درخت
کی جڑ میں کھرپا جالی رکھا ہوا ہے اسکو سنبھال وہ درویش جوتیاں لگ کر سیدھے ہو گئے۔
غرض یہ ہے کہ ہر ایک کا منہ نازکا نہیں حضرت رابعہؒ کا منہ نازکا تھا مگر جن کا منہ نازکا نہیں
وہ بھی بزبان حال ناز کر رہا ہے کہ سوئیں یا جاگیں اجر لینے کو تیار البتہ اگر نیت جاگنے کی ہو
اور عذر سے سو گئے تو پھر ہر حالت میں اجر ہے پھر تو وہی بات ہے جیسے بعض ہندوؤں کا مقولہ
ہے کہ مسلمان سب طرح مزہ میں ہیں بڑھ جائیں تو امیر گھٹ جائیں تو فقیر مر گئے تو پیر مسلمان
ہر حال میں اچھا ہے۔ جاگتے اجر سوتے اجر سو یہ نیت کی برکت ہے مگر ارادہ تو جاگنے کا کرو ایک ۲۱۲
تدبیر رات کے جاگنے کی اور یاد آئی کہ دن کو سو رہا کرو اگر باوجود ان تدابیر کرنے کے پھر سو گئے تو ۲۸
اجر ملیگا۔ غرض اپنی طرف سے کوشش کرو اور سمجھ لو کہ بدون کئے کچھ نہیں ملتا اب میں بیان کو
ختم کرتا ہوں یہ تینوں تقریریں ہیں اگر تینوں دفعہ بیان کرتا تو مبسوط ہوتیں۔ مگر مختصر اسب کچھ بیان
کر دیا اللہ میاں عمل کی توفیق دیں اس اخیر تقریر کا نام تقضان فی رمضان مناسب معلوم
ہوتا ہے اور مجموعہ کا نام مثلث رمضان۔ فقط

اشرف علی۔ ۱۸ر شوال ۱۳۵۲ھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ التبلیغ

۲۱۳

کا

وعظ مسمی بہ ۲۹

العتق من النیران فی رمضان

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمی بہ

العتق من النیران فی رمضان

این	متی	کم	کیف	لم	من استمع	ماذا	من ضبط	السامعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کیوں ہوا	کس نے سنا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲۵ رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ	۲۱ منٹ					حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری		

خطبہ ماثورہ اما بعد فقد قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم ھو شھر اولہ رحمۃ و اوسطہ مغفرۃ و آخرہ عتق من النیران ۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان ۔ آج جس مضمون کا بیان ہے وہ ایک مضمون ہے ان چار مضامین میں سے جو چار جمعوں کے لئے تجویز ہوئے تھے جمعہ گذشتہ میں تین مضامین کا بیان مختصراً کیا گیا تھا اسوجہ سے کہ پہلے دو جمعوں میں بیان کا اتفاق نہیں ہوا جسکی وجہ اس سے پہلے جمعہ میں عرض کردی گئی تھی ۔ آج چوتھے مضمون کا بیان مستقلاً ہوگا کیونکہ خیریت کی شرط متحقق ہوگئی اس لئے بیان کی بھی نوبت آئی (اسکے قبل کے جمعہ میں وعظ شلث رمضان میں بوجہ کسل طبع بشرط خیریت بیان کا وعدہ ہوا تھا) جو الفاظ حدیث اسوقت تلاوت کئے گئے ہیں ان میں ایک خاصیت ختم رمضان کی بھی بیان ہوئی ہے اور اب رمضان قریب ختم ہے اس لئے اس حدیث کو بیان

کے لئے اختیار کیا گیا۔ ہر چند کہ اس حدیث میں ایک خاصیت اوّل رمضان کی اور ایک اوسط رمضان کی بھی بیان ہوئی ہے مگر اسوقت بوجہ مناسبت وقت کے زیادہ مقصود اخیری کا مضمون ہے اس لئے اسکو اختیار کیا گیا سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسا مہینہ ہے جسکے تین حصے ہیں اور تینوں حصّوں کی خاصیت جدا جدا ہے ایک اول۔ دوسرے اوسط۔ تیسرے آخر اول حصہ تو رحمت ہے یعنی ابتداء اس مہینہ کی رحمت سے ہے۔ دوسرا حصہ مغفرت ہے یعنی اسمیں بخشش ہوتی ہے اور اس کا آخر عتق من النار ہے یعنی رہائی ہے جہنم سے یہ حاصل ہے ترجمہ حدیث کا۔ اجمالاً سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اس مہینہ کے تین خواص بیان ہوئے ہیں اور تینوں خواص مرغوب فیہ ہیں کہ ان کی طرف ہر مسلمان کو رغبت ہے۔ ایک رحمت ہے کونسا مسلمان ہوگا جسکو رحمت کی ضرورت نہ ہو اور دوسرا جزو مغفرت ہے کونسا مسلمان ہے جسکو مغفرت
کی ضرورت نہیں اور تیسرا جزو عتق من النار ہے ایسا کون مسلمان ہے جو رہا ہونا نہ چاہتا ہو ۲۱۵
جہنم سے ان تینوں کی طرف سب ہی کو رغبت ہے۔ اور ان تین کی تخصیص کی وجہ یہی ہے کہ ۳۱
عام رغبت زیادہ تر ان ہی کی طرف ہوتی ہے اور امور مرغوبہ کو مناسب ترتیب سے بیان کرتے ہیں اور بھی رغبت کی زیادتی ہو جاتی ہے اس لئے ایک بخاص ترتیب سے بیان کیا گیا کہ اول رحمت کو لائے اسکے بعد مغفرت کو پھر عتق من النار کو جسکا مناسب ہونا عنقریب مذکور ہوگا اور ان ہی تین اجزاء پر رمضان کی تقسیم بھی ہوگئی کہ دس دن رحمت کے لئے ہیں اور دس مغفرت کیلئے اور دس عتق من النار کے واسطے۔ اسمیں بھی زیادہ رغبت ہے بیان مقصود سے پہلے ایک اور مضمون ذہن میں آگیا کہ شریعت نے اس ماہ کے لئے دو عبادتوں کو خاص کیا ہے ایک روزہ دوسرے تلاوت قرآن۔ اور ان کو پہلے جمعہ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں اور اسوقت ماہ رمضان سے دونوں کی مناسبت بھی ذکر کر دی گئی تھی۔ مگر صرف ایک مضمون اس کے متعلق رہ گیا تھا کہ باہم ان دونوں (یعنی روزہ و تلاوت قرآن) میں کیا مناسبت اور ارتباط ہے تو اس کو پہلے بیان کر دینا مناسب ہے کہ وہ ماقبل کا تتمہ ہے اس کو بیان کر کے پھر اس حدیث کے متعلق بیان ہو جاویگا سو وہ یہ

ارتباط یہ ہے کہ ایک خاصیت ان دونوں میں مشترک پائی جاتی ہے یعنی تلاوت قرآن میں اور روزہ میں اور وہ خاصیت قرب خاص ہے حق تعالیٰ کا تلاوت میں بھی خاص قرب ہوتا ہے ایسے ہی روزہ دار کو بھی خاص قرب حاصل ہوتا ہے حق تعالیٰ کا یہ دوسری بات ہے کہ تلاوت میں وجہ قرب اور ہو اور روزہ میں وجہ قرب اور مگر نفس قرب خاص میں دونوں شریک ہیں۔ تلاوت سے تو اس لئے قرب خاص ہوتا ہے کہ کلام کو خاص مناسبت ہوتی ہے متکلم سے اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس کی تلاوت کرے گا اس کو خاص تعلق ہوگا صاحب کلام سے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی دیوان وغیرہ تصنیف کیا ہو اور ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اسکے دیوان کو پڑھ رہا ہے تو مصنف کو اس کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا ہو جاویگا خواہ وہ پڑھنے والا کلام سمجھتا بھی نہ ہو جب بھی اس کے ساتھ محبت خاص ہوگی اور اس کی طرف عنایت خاص مبذول ہوگی بلکہ ایک معنی کر اس شخص کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی جو بدون سمجھے ہوئے اسکے کلام کو پڑھ رہا ہو کیونکہ ممکن ہے کہ سمجھنے والے کو مضامین سے حظ حاصل ہوتا ہو اسوجہ سے اسکے کلام کی تلاوت کرتا ہو اور مصنف کی محبت تلاوت کا باعث نہوئی ہو بخلاف اس شخص کے جو بدون سمجھے ہوئے تلاوت کرتا ہو کہ اس کا باعث سوائے محبت مصنف کے اور کچھ نہیں۔ اس بیان سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا جو بعض نئے خیال کے لوگ کیا کرتے ہیں کہ قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ اور مقصود ان کا اس سے سمجھکر پڑھنے کی ترغیب دینا نہیں بلکہ یہ غرض ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ کا پڑھنا بھی بند ہو جاوے معانی کا پڑھنا تو بند ہو ہی گیا چنانچہ علوم عربیہ کو بجز چند غرباء کے اور کوئی نہیں پڑھتا چنانچہ یہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ بچوں کو شروع ہی سے انگریزی پڑھاؤ جی کلام اللہ کو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا نتیجہ اگر اس رائے کا نتیجہ نکالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ غرض انکی یہ ہے کہ قرآن بالکل مٹ جائے مگر یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ان حضرات کا مقصود تو یہی ہے یہ جدا بات ہے کہ یہ نور بجھ نہیں سکتا یہ تو کیسے بجھ سکتا ہے اولیاء اللہ کا نور جو اس سے بہت کم درجہ میں ہے وہ تو بجھتا ہی نہیں اولیاء کے نور کی یہ حالت ہے ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد　چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

ن تلاوت قرآن اور روزہ میں مناسبت کیا ہے

ن تلاوت سے قرب کس لئے ہوتا ہے

۲۱۹

ن دفع اس شبہ کا کہ قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ۔

ن اللہ کا نور بجھ نہیں سکتا

اور راز اسکا یہ ہے کہ وہ بھی حقیقت میں خدا ہی کا نور ہے گو قرآن کے درجہ کا نہ ہو مگر پھر بھی
کسی درجہ میں خدا کا نور ہے اور خدا کے نور کی وہ روشنی ہے کہ ہزاروں کافروں نے
اسکو بجھانا چاہا مگر بجھ نہ سکی - ایک ایک مقبول بندہ کے ہزاروں مخالف ہوئے ہیں اور
ہمیشہ چاہتے رہے کہ اس کے انوار کو مٹادیں مگر وہ انوار اب تک باقی ہیں اور مٹانے والوں کا
کہیں پتہ اور نشان بھی نہیں بلکہ بعضوں کی تو نسل بھی باقی نہیں جب تو مؤمنین کا نور نہیں
بجھتا اور دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہتی ہے تو قرآن جو خدا تعالیٰ کا خاص نور ہے کیسے
بجھ سکتا ہے خیال کیجئے کہ بچے تک قرآن حفظ پڑھ رہے ہیں خصوصاً رمضان شریف میں
تو برکات قرآن کا خوب ہی مشاہدہ ہوتا ہے پھر اسے کون مٹا سکتا ہے ایک ملحد نے قرآن
کو مٹانا چاہا تھا اور صورت اس کی یہ اختیار کی تھی کہ جس قیمت کو قرآن ملتا اس کو خرید کر
تلف کر دیتا ایک شخص نے اس سے کہا کہ تم یہ کیا کرتے ہو اس نے کہا کہ جب تک مسلمانوں ۲۱۷
میں قرآن باقی ہے اسلام بھی باقی ہے ہم چاہتے ہیں کہ قرآن مٹے تو اسلام بھی مٹے وہ
شخص ہنسا اور کہا کہ تمہاری خیرخواہی تو مناسب نہیں مگر اسلام کی یہ بھی خاصیت ہے کہ مخالف
کی خیرخواہی کرنے سے بھی نہیں روکتا اسلئے میں خیرخواہی سے کہے دیتا ہوں کہ تم خواہ
مخواہ اپنا روپیہ برباد کر رہے ہو اس طریقہ سے قرآن مٹ نہیں سکتا۔ مانا کہ قرآن کی جلدوں
کو تم خرید کر تلف کر دوگے مگر جن سینوں میں یہ کلام محفوظ ہے ان کا کیا کروگے اس کلام
کی تو یہ شان ہے بل ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم بچوں تک کو
یاد ہے اگر متعدد لوگوں یا بچوں کو سہو بھی ہوتا ہے تو سب کو ایک جگہ نہیں ہوتا کسی کو کہیں
ہوتا ہے اور کسی کو کہیں تو ایک دوسرے کو بتلا دیتا ہے حافظ اس کے ہر زمانہ میں بیشمار
ہیں غرض اگر قرآن کی جلدیں دنیا سے مفقود بھی ہوجاویں تو چند حافظ جمع ہو کر مکمل لکھوا
دیں گے - اس ملحد نے کہا کہ ہم آپ کے بہت شکرگزار ہیں کہ آپ نے ہم کو بہت بڑے مالی نقصان
اور مشقت سے بچایا مظفر نگر میں ایک جلسہ تھا ایک مولوی صاحب نے قرآن کی حفاظت کے
متعلق کچھ بیان کیا اور پھر ایک آیت پڑھی جس میں قصداً بھول گئے اور اہل جلسہ کی
طرف خطاب کیا کہ جو حفاظ یہاں موجود ہیں وہ کھڑے ہو جاویں اور مجھکو بتلادیں

ف: ایک ملحد نے قرآن کو مٹانا چاہا کیا ہو سکتا ہے

ف: مظفر نگر کا واقعہ قرآن کے متعلق

سینکڑوں حافظ کثرت سے ہو گئے مولوی صاحب نے کہا کہ مجھے یہ دکھلانا تھا کہ ظاہر ہے کہ
حفاظ اس جلسہ میں چھانٹ کر نہیں بلائے گئے محض اتفاق ہی سے جمع ہوگئے ہیں جب اتفاقی
مجمع محدود میں اتنی کثرت سے حفاظ موجود ہیں تو ایک ضلع میں کتنے ہوں گے اور ایک
کمشنری میں کتنے اسی طرح تمام دنیا میں ان کی کتنی تعداد ہوگی۔ ایک جلسہ میں
مختلف قوموں کے لوگ موجود ہیں آیا کوئی اس کی نظیر پیش کرسکتا ہے کہ کوئی وید کا یا انجیل
وغیرہ کا ایک ہی حافظ دکھا سکے تو دکھلائے مخالف لوگ بھی اس بات کو دیکھکر دنگ ہوگئے
اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی حفاظت وحقانیت قرآن کی اس کے علاوہ ایک بات
یہ ہے کہ مذاہب باطلہ کی اشاعت روپیہ خرچ کرنے سے ہوتی ہے اور جسقدر خرچ ہوتا ہے
اس کے حساب سے کچھ بھی اشاعت نہیں اور وہ لوگ دن رات اسی دھن میں لگے ہوئے
ہیں۔ اور اہل حق کچھ بھی خرچ نہیں کرتے جسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اہل حق کو اللہ تعالیٰ پر
اعتماد ہوتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دین تو اللہ میاں کا ہے وہ خود اس کی خبرگیری فرمائیں گے۔ ۲۱۸
مسلمانوں میں ایک سبب دین سے بے توجہی کا توکل بھی ہے اگرچہ ایسا توکل خوبی کی بات نہیں اسلئے
میں اس کی تعریف تو نہیں کرتا مگر واقع میں ہے یہ بھی ایک سبب اور باوجود خرچ نکرنے کے
اشاعت بحمداللہ خوب ہو رہی ہے۔ مجھے اسپر کہ دین تو اللہ میاں کا ہے ایک واقعہ یاد آیا وہ
یہ کہ ابرہہ بادشاہ نے خانہ کعبہ پر چڑھائی کی تھی اور اس کا قصد خانہ کعبہ کے شہید کردینے کا تھا عبدالمطلب
مکہ کے رئیس تھے گو ملک کے رئیس نہ تھے لیکن حکومت کے رئیس تھے اور یہ نور پاک محمدی کی برکت
تھی کہ آپ کے آباء واجداد ہمیشہ سردار رہے ہیں جب ابرہہ کی فوج مکہ کے قریب پہونچی تو ان کے
اونٹ ابرہہ کی فوج نے چھین لئے جب ان کو خبر ملی تو بادشاہ کے پاس پہونچے وہ تعظیم
کیلئے بیساختہ کھڑا ہوگیا تخت پر بٹھایا اسکو یہ یقین تھا کہ عبدالمطلب خانہ کعبہ کیلئے
سفارش کرینگے۔ ان سے پوچھا کہ آپ کیسے تشریف لائے انہوں نے کہا کہ میرے اونٹ
آپ کی فوج نے پکڑ لئے ہیں انکو چھوڑ دیجئے اس نے اس بات کو سنکر فوراً حکم دیا
اور اونٹ چھوڑ دیئے گئے پھر کہا کہ یہ بات آپکی ریاست سے بعید ہے کہ کیا حقیر شے کی
سفارش آنے کی۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ ضرور خانہ کعبہ کی سفارش کیلئے آئے ہیں اور

میں نے یہ قصہ بھی کر لیا تھا کہ آپ کی سفارش پر چھوڑ نہیں دونگا عبد المطلب نے کہا کہ میں پاگل
نہیں ہوں جو ایسی سفارش کروں خانہ کعبہ میرا نہیں سب اگر میرے گھر کو آپ نے ضبط کیا ہوتا
تو میں اس کی سفارش کرتا خانہ کعبہ تو خدا کا گھر ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت خود کرے گا۔ واقعی
کیسی سمجھ کی بات تھی ابرہہ کو یہ سنکر جوش آیا اور حملہ کا حکم دیا پھر جو اس کی گت بنی ظاہر ہے تو
دیکھئے عبد المطلب کو خدا پر کیسا بھروسہ اور اطمینان تھا حق کی یہ بھی خاصیت ہے کہ جو حق
سے متمسک ہوتا ہے بے فکر ہوتا ہے گو اسوقت بیفکری میں غلو ہو گیا ہے یہ ضرور ہے کہ
حق سبحانہ تعالیٰ اپنے دین کے خود محافظ ہیں مگر سامان و اسباب کا توسط بھی عادۃ اللہ
ہے ہاں حق کی یہ خاصیت یقینی ہے کہ بے توجہی سے اسکو ضرر نہیں ہوتا۔ اہل باطل کو جتنی
کوشش ہے کہ جان توڑ کر اپنے مذہب باطل کی اشاعت میں لگے رہتے ہیں اہل حق اس کا
۲۱۹ عشر عشیر بھی نہیں کرتے اگرچہ اب تو یورپ کی دیکھا دیکھی انجمنیں قایم ہونے لگی ہیں اور
کوشش سنئے کہ بھی ہوا اور وہ بھی پہلے یہ بات کہاں تھی مگر جب سے مسلمانوں میں اس رنگ
کا ضبط آ گیا ہے اسی وقت سے خبط بھی پیدا ہو گیا پہلے ضبط تو نہ تھا مگر ربط تھا بہر حال ۳۱
مسلمان کفار سے بہت کم کوشش کرتے ہیں اور مسلمانوں میں جو اہل حق ہیں وہ اہل باطل
سے کم کوشش کرتے ہیں چنانچہ بعضے فرقے اہل بدعت کے ہیں میں ان کا نام نہیں لیتا
خواہ مخواہ کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتا گو وہ تو ہمارے حضرات کا نام لے لیکر
برا بھلا کہتے ہیں مگر ہمارا تو یہ طرز عمل ہے کہ اشخاص کا نام لینا تو درکنار ہم تو فرقہ کا
بھی نام نہیں لیتے مگر میں اتنا کہتا ہوں کہ ان کے مذہب کی اشاعت میں سینکڑوں بیس ہزار روپیہ
سالانہ خرچ ہوتا ہے اور یہاں قاعدہ سے سینکڑوں بیس سو بھی خرچ نہ ہوتا ہوگا مگر پھر بحمد اللہ
اہل حق کو ہی غلبہ ہے۔ باطل کی مثال ایسی ہے جیسے بیل گاڑی کہ جب تک اسکو بیل ٹھیلتے رہے
ہیں چل رہی ہے جہاں ٹھیلنا موقوف کیا اور رک گئی۔ اور حق کی خاصیت ایسی ہے جیسے
بجلی کی گاڑی کہ برابر رفتار سے چلی جا رہی ہے حق تو خود انجن ہے جس کی برق پورے انداز
پر ہے کہ اس کی رفتار یکساں حالت پر رہتی ہے یہ خاصیت حق کی ہے ہر زمانہ میں حق
کے حامی و مددگار ضرور رہتے ہیں گو قلیل سہی مگر ایک وہ بھی ہیں جو حق کو مٹانا چاہتے ہیں گو

ف تمسک بالحق بے فکری ہوتا ہے

ف بعض اوقات بھی اشاعت مذہب کیلئے بہت روپیہ صرف ہوتا ہے

ف حق و باطل کی عجیب مثال

نور حق ہونے کے سبب مٹ نہیں سکتا وہ کہتے ہیں کہ جب قرآن شریف کے معنی نہیں سمجھتے
تو پڑھنے سے کیا فائدہ۔ صاحبو! کلام اللہ کا اصلی نفع دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا ہے اصلی دولت
قرب خداوندی ہے اور وہ کلام اللہ کے سمجھنے پر موقوف نہیں گو سب کے لیے اس کی
اجازت نہیں کہ سب کے سب بدون سمجھے ہوئے پڑھیں بلکہ مقصود ہے کہ لوگ ایسے بھی ضرور
ہونے چاہئیں کہ خود بھی کلام اللہ کو سمجھیں اور دوسروں کو بھی سمجھا سکیں اور بعض
کلی اسی او سمجھکر پڑھتے ہیں سے مگر ایک حیثیت سے اس شخص پر حق تعالیٰ کی زیادہ عنایت
ہوگی جو بدون سمجھے ہوئے کلام اللہ کی تلاوت کرتا ہو کیونکہ صرف حق تعالیٰ کی محبت ہی
اس کا باعث ہو سکتی ہے میں اس تقریر سے ان لوگوں کا دل تھامنا چاہتا ہوں جو کلام اللہ
کے نہ سمجھنے پر افسوس کرتے ہیں۔ اب سنئے تلاوت قرآن پر کیا فضیلت حاصل ہوگی۔
حدیث میں ہے کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اس لئے جس نے الحمد کہا اسکو پچاس نیکیاں
مل گئیں اس حساب سے پورے کلام اللہ کی تلاوت پر کتنی نیکیاں ہوں گی۔ امام احمد بن حنبلؒ
نے حق سبحانہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ عرض کیا کہ اے اللہ وہ کونسا عمل ہے جو آپ سے
زیادہ قریب کردے ارشاد ہوا وہ عمل تلاوت قرآن ہے آپ نے عرض کیا بفہم او بلا
فہم کہ سمجھکر یا بلا سمجھے۔ ارشاد ہوا بفہم او بلا فہم سمجھکر ہو یا بدون سمجھے ہو۔ راز اس میں
یہ ہے کہ مصنف اپنے کلام کے پڑھنے سے خوش ہوا کرتا ہے پس جب بندہ اللہ میاں
کے کلام کو پڑھیگا تو اللہ میاں خوش ہونگے ایک وجہ تلاوت کی فضیلت کی یہ ہے
کہ جتنے بھی حق تعالیٰ کے افعال ہیں بندہ کے ویسے ہی افعال افعال حق کی نقل نہیں
ہوتے صرف ایک یہی فعل ایسا ہے کہ بندہ کی تلاوت بالکل نقل ہوتی ہے کلام حق کی
یعنی جیسے اللہ میاں کلام کر رہے ہیں یہ بھی کر رہا ہے مثلاً بندہ کا دیکھنا حق تعالیٰ
کے دیکھنے کی نقل نہیں ہے اور اللہ کا کلام جو پڑھ رہا ہے وہ اسکے صیغوں کو ویسے
ہی ادا کر رہا ہے جس طرح خدا تعالیٰ کلام فرماتے ہیں۔ مثلاً بندہ نے تلاوت کی۔ قلنا
یا نار کونی برداً و سلاماً علی ابراہیم یا پڑھا قلنا یا ادم اسکن انت وزوجک الجنۃ یا
اسکو ادا کیا۔ فجعلنا ہا نکالا لما بین یدیہا وما خلفہا وعلی ہذا القیاس ہر جزو کی تلاوت میں

ف تلاوت قرآن پاک کا اصلی نفع

۲۲۰ ف امام احمد بن حنبلؒ کا خواب ۲۷

تعالیٰ اللہ تعالیٰ کا ادا نہیں کیا جاتا۔ تو جیسے حق تعالیٰ کلام فرماتے اسی طرح بندہ بھی کلام کر رہا ہے اور تلاوت کا طریق بھی اہل طریق نے اسی طرح تجویز کیا ہے کہ بندہ کے پڑھنے کے وقت یہ تصور کرے کہ گویا بندہ گراموفون ہے اور متکلم حق سبحانہ تعالیٰ ہیں کہ اپنے کلام کو حق تعالیٰ نے اس میں بند کر دیا ہے اور وہ اس میں سے بلا قصد نکل رہا ہے گویا یہ تجلی کلامی ایسی ہی ہو رہی ہے جیسے شجرہ طور پر ہوئی تھی درخت سے آواز آ رہی تھی کہ انی انا اللہ لا الہ الا انا وہ کلام حقیقت میں شجرہ کا نہ تھا شجرہ تو محض واسطہ تھا متکلم اللہ میاں تھے اسی طرح بندہ کی زبان سے اللہ میاں کلام فرما رہے ہیں جس طرح نَے یعنی بانسلی میں سے آواز نکلتی ہے کہ وہ حقیقت میں نَے کی آواز نہیں بلکہ بجانے والے
کی آواز ہے کہ نَے میں ہو کر نکل رہی ہے اسی کو مولانا بطور استعارہ کے فرما رہے ہیں ۲۲۱

؎ دو دہاں داریم گویا ہمچو نے — یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے
یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما — ہائے وہوئے درفگندہ در سما

پس تلاوت ایسی چیز ہے کہ اس میں پورا تشبہ ہے بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ اور جسکو کسی ۳۷
سے تشبہ ہو وہ اس کا مقرب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب بادشاہ سواری پر نکلتے ہیں تو بعض مصالح سے مصاحبین کو اپنا جیسا لباس پہناتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تلاوت کرنے والے بندوں کو گویا اپنا خاص لباس کلام پہنایا ہے گویا بندے خاص مصاحب ہیں کہ ان کو لباس کلام سے آراستہ فرمایا۔ بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنکے سینوں میں کلام اللہ ہے مگر ہم نے اس کی ناقدری کر رکھی ہے کہ اجرت پر پڑھ کر دس دس روپیہ کو بیچتے پھرتے ہیں اس کلام کی تو یہ شان ہے ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتہٗ — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حضرت جنہوں نے قدر کی ہے ان کی حالت یہ ہے کہ ایک حافظ صاحب جو قاری بھی تھے سفر میں رہزنوں کے ہاتھوں بالکل بے سروسامان ہو گئے تھے ایک جگہ پہونچے وہاں کے رئیس کو معلوم ہوا کہ کلام اللہ اچھا پڑھتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حاجتمند بھی ہیں حاضر ہو کر درخواست کی کہ کچھ ایک دو آیت سنا دیجئے حافظ صاحب نے کہا کہ نماز کے وقت سن لیجئے گا

اصرار کرنے پر حافظ صاحب نے سنا دیا بعد سننے کے رئیس صاحب نے کچھ پیش کیا حافظ صاحب نے کہا کہ اگر آپ کلام اللہ نہ سنتے تو میں لے لیتا اب تو نہیں لوں گا کیونکہ مجھکو یہ آیت یاد ہے لاتشتروا بآیات اللہ ثمنا قلیلا یہ کہکر حافظ صاحب اٹھ کر چلے گئے قدر کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

اے مسلمانوں اس نعمت کی قدر کرو۔ اگر تم قدر نہ کروگے تو کیا مخالفین قدر کرینگے وہ تو اپنے کلام اللہ کی بھی قدر نہیں کرتے جسکو وہ دعوے سے کلام اللہ کہتے ہیں چنانچہ ایک شخص نے بیان کیا کہ ایک عیسائی سائیکل پر سوار جا رہا تھا اور انجیل کو مقعد کے نیچے رکھ چھوڑا تھا۔ انہوں نے اپنی مذہبی کتاب کی یہ قدر کی ہے اسی طرح مسلمانوں میں بعضے فرقے اپنے حق پر ہونے کے مدعی ہیں مگر موقعہ پر انکا حال معلوم ہو جاتا ہے میں آرہ ایک مدرسہ میں گیا تھا
وہاں ایک شخص مدعی اجتہاد سوتے ہوئے نکلے اور الماری میں سے موطا مالک نکال کر ایک شخص ۲۴۲
کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ میاں اس میں تو وہ حدیث نہیں ملی اور یہ کہکر موطا کو زمین پر زور
سے دے مارا کسی نے ان سے کہا کہ حدیث کا تو ادب کرو تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو گرد جھاڑی ہے ۳۸
اسکو گرد سے صاف کر دیا کیا برا کیا ایک تو شرارت کی اور پھر اسکو تاویل سے بنایا بھی واقعی تاویل بھی بری چیز ہے اور یہ اپنی بات کی پچ کرنے کا مرض اکثر طالب علموں میں پیدا ہو جاتا ہے ادب بھی ایک شعبہ ہے دین کا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ن ادب بھی شعبہ ہے دین کا بے ادبی کے متعلق ایک قصہ

از خدا خواہیم توفیق ادب — بے ادب محروم گشت از لطف رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد — بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

ادب کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک جگہ گئے وہاں انکے ایک شاگرد تھے وہ ان سے ملنے نہیں آئے یہ بے ادبی کی بات تھی ان بزرگ نے تحقیق جو کیا تو معلوم ہوا کہ آنے سے معذور رہے اس وجہ سے کہ ان کی ماں سخت معذور ہے ان کے چلے آنے سے ماں کو تکلیف ہوتی خیر اس امر میں تو انہوں نے شریعت پر عمل کیا کیونکہ ماں کی خدمت واجب تھی مگر کوئی وقت تھوڑا سا نکالکر آجاتے تو ممکن تھا لیں اس صورت میں انہوں نے ایک کوتاہی کی اور ایک عبادت استاد نے فرمایا کہ ان دونوں عملوں میں

ایک ایک خاصیت ہے ماں کی خدمت سے تو ان کی عمر بڑھے گی اور استاد کی بے ادبی کرنے سے کسی کو ان کے علم سے نفع نہیں ہوگا۔ یہ شاگرد بڑے عالم تھے ان دونوں عملوں کا اثر یہ ہوا کہ عمر ان کی سو برس سے زیادہ ہوئی مگر ایسے سوانح پیش آئے کہ تمام عمر ایسے دیہات میں قیام رہا کہ ان کے علم سے کسی کو نفع نہیں ہوا حالانکہ یہ بہت بے ادبی بھی نہ تھی مگر استاد کو ان کا یہ ملنا ناگوار ہوا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کا علم نہ پھیلا ہر عمل کی جدا خاصیت ہے۔

اب یہ سمجھئے کہ کلام اللہ کا ادب ایک حسی ہے وہ یہ کہ اس کی تعظیم کرنا اس کو چومنا بلندی پر رکھنا وغیرہ اور دوسرا ادب معنوی ہے وہ یہ کہ اس کو فروخت مت کرو اس پر اگر کوئی اعتراض کرے کہ مطبع والے بڑے گنہگار ہیں کیونکہ وہ دن رات یہی کام کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نقوش کو فروخت کرتے ہیں نقوش کی بیع جائز ہے اور کلمات کی ناجائز نقوش مجازاً کلام ہیں اور تلاوت واقع میں کلام اللہ ہے اور ہمکو اس فرق کی بھی حاجت نہ تھی جبکہ شریعت نے لکھے ہوئے کی قیمت کی اجازت دی ہے اور پڑھنے پر اجازت نہیں دی بس ہمارے لئے شریعت کا فیصلہ کافی وافی ہے اور اسی طرح شریعت نے تعلیم پر اجرت لینے کی اجازت دی ہے اگر کوئی اعتراض کرے کہ اگر حفاظ کو نہ دیں تو تراویح نہ ہوں گی کیونکہ کوئی سنائیگا نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ مشاہدہ اسکے خلاف ہے پڑھنے والے کثرت سے ہیں سننے والے مل ہی جاتے ہیں پھر پیش بریں نیست کہ اگر تراویح میں سنانا سب چھوڑ دیں تو اس سے دین ضائع نہ ہوگا اور اگر تعلیم کو سب چھوڑ دیں تو دین ضائع ہو جائیگا۔ سو اگر کسی موقع پر کوئی حافظ جائز طریقہ سے سنانیوالا نہ ملے تو الم ترکیف سے تراویح پڑھ لیں۔ کلام اللہ بڑی دولت ہے اسکی بے قدری نہ چاہیئے قدر کرو اور پڑھو خواہ سمجھکر یا بے سمجھے کیونکہ کلام اللہ کی تلاوت خواہ سمجھکر ہو یا بے سمجھے ہو اس میں خاصیت تشبہ بالحق کی ہے اور یہی خاصیت ہے روزہ کی کہ اس میں بھی حق تعالیٰ کے ساتھ تشبہ ہے کیونکہ خدا کی شان ہے نہ کھانا نہ پینا نہ بی بی رکھنا اور روزہ میں بندہ کی یہی حالت ہوتی ہے روزہ میں ایک صمدیت کی شان ہے لہذا دونوں عملوں میں تشبہ بالحق ہوا یعنی تلاوت قرآن میں اور روزہ میں اور یہ دونوں عمل رمضان میں ہیں اسلئے دونوں عملوں کو رمضان سے مناسبت ہوئی۔ دوسرے مناسبت

قرآن اور روزہ میں یہ ہے کہ کلام اللہ سے انوار پیدا ہوتے ہیں یہی خاصیت روزہ کی ہے کہ اس سے بھی انوار پیدا ہوتی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ انوار پیدا ہونے کی وجہ علیحدہ علیحدہ ہو یعنی تلاوت میں اور وجہ ہو اور روزہ میں اور۔ وہ یہ کہ تلاوت عبادت وجودی ہے اور روزہ عبادت عدمی دونوں میں تفاوت ہے مگر نورانیت پیدا کرنے میں مشترک ہیں رہی یہ بات کہ روزہ سے نور کیسے پیدا ہوتا ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ کھانے سے قوت بہیمیہ میں ترقی ہوتی ہے اور نار شہوت بھڑکتی ہے جو کہ منافی ہے نور کے اور جب آدمی کھانے پینے سے رکیگا تو نار شہوت میں کمی ہوگی اور جسقدر اس میں کمی ہوگی اسی قدر نور میں ترقی ہوگی مگر یہ مطلب نہیں کہ بالکل نامرد ہو جاؤ بلکہ مادہ شہوت باقی رہنا چاہیئے ہاں غلبہ نہ ہونا چاہیئے اور بقدر ضرورت شہوت رہنے میں بھی حکمت ہے کیونکہ نار شہوت گو ایک درجہ میں منافی ہے نور کے مگر بدون اسکے نورانیت بھی حاصل نہیں ہوتی اس کی مثال ایسی ہے جسکو مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است — کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

یعنی شہوت کی مثال ایسی ہے جیسے حمام میں خس وخاشاک سے آگ جلتی ہو کہ وہ ایک درجہ میں پانی کے لئے مضر کی چیز ہے مگر پانی کے اندر اس سے حرارت ونورانیت آگئی اگر آگ نہ ہو تو حرارت ونورانیت کیسے آئے اور یہ نورانیت آئی کیسے یہ آڑ کی وجہ سے آئی کہ پانی اور آگ میں ایک آڑ حائل ہے یہ آڑ ہی کی برکت ہے کہ پانی میں نورانیت آگئی۔ اسی طرح مادہ شہوت گو ایسی چیز ہے کہ بعض دفعہ نار شیطانی کی طرف پہونچا دیتی ہے مگر نورانیت بھی اس کی وجہ سے آتی ہے اگر شہوت نہ ہوتی تو اجر کیسے ملتا کیونکہ نامرد کا زنا سے رکنا کوئی کمال نہیں اور نہ اسکو زنا سے بچنے پر کچھ ثواب ہے پس اجر کے لئے مادہ شہوت ہونا چاہیئے مگر صرف ایک آڑ کی ضرورت ہے اور بڑی آڑ اسکے تقویٰ ہے جسکی بڑی معین بی بی ہے اسی لئے بی بی کے پاس جانے سے ثواب حاصل ہوتا ہے جسکی تصریح حدیث میں موجود ہے اور ساتھ ہی اسکی علت بھی مذکور ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جسکی شہوت بڑھے اور بی بی سے تعلق نہیں ہوا اور برا تعلق ہو جاوے تو لامحالہ گنہگار ہوگا جب اس نے برے تعلق کو چھوڑ کر نکاح کر لیا تو

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

بی بی سے تعلق رکھا تو ضرور اجر ملیگا بی بی سے تعلق رکھنا تو نور کا معین ہے کیونکہ بی بی کی وجہ سے تقلیل ہوگی شہوت کی جب اس کی تقلیل ہوگی تو نور کی تکثیر ہوگی - ایک گھٹا تو دوسرا بڑھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ روزہ میں ترک باعث ہوا نور کا اور تلاوت میں وجود سبب ہے نور کا اس صورت میں تسبیب للنور سے باہم مناسبت ہوگئی تو یہ دو عبادتیں ہیں جنکو خاص تعلق ہے رمضان سے ان کی خاصیت بھی تقریر کے ضمن میں بیان ہوگئی تو یہ اپنے خواص کے اعتبار سے عبادات فاضلہ ہونگے اور عبادات فاضلہ سے اجر ملتا ہے اور نور بڑھتا ہے اسی طرح گناہوں سے حفاظت رکھنے میں بھی نور کو ترقی ہوتی ہے اور نور میں خاصیت ہے کہ اس سے قرب ہوتا چلا جاتا ہے جس کی علامت یہ ہے اَلتَّجَافِیْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْمَیْلُ اِلٰی دَارِ السُّرُوْرِ۔ یہ نور کی خاصیت ہے اور یہ نور ان عبادات کے وقوع کے وقت بھی ہوتا ہے اور بعد میں بھی رہتا ہے اور وہی نور گناہوں سے بھی روکتا ہے جیسے نماز کی نسبت آیا ہے کہ برائیوں سے روکتی ہے چنانچہ ارشاد ہے ع۱ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ جس کی ایک سہل تفسیر یہ ہے کہ جب تک آدمی نماز میں مشغول ہے اس وقت تک برائیوں سے رکا رہتا ہے مثلاً اگر نماز نہ پڑھتا ہوتا تو وقت غیبت وغیرہ میں مبتلا ہو سکتا تھا جب نماز پڑھنے لگا تو اس وقت اس سے حفاظت ہوگئی آیت مذکورہ کی اس تفسیر میں کوئی غبار نہیں یہاں تک بیان تھا بیان سابق کے تتمہ کا اب اس حدیث کے متعلق عرض کرتا ہوں جس کی تلاوت اس جلسہ میں کی سب سو اس کے اجزاء میں ترتیب ہونا اور ترتیب کے مناسب ہونے کا دعوی آغاز میں بیان ہو چکا اب اس مناسبت کی وجہ عرض کرتا ہوں کہ یہ جو اس حدیث میں فرمایا ہے کہ ع۲ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَّاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَّاٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ ان تینوں میں نہایت مناسب ترتیب ہے کیونکہ طاعت پر اول مرتب ہوتا ہے رحمت کا چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ اور چونکہ طاعت کی خاصیت ہے گناہوں سے روکنا جس کی طرف اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ میں اور ع۳ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ میں قریب بصراحت اشارہ ہے تو جب گناہوں سے رکاوٹ ہوگئی تو اس پر مغفرت مرتب ہوگی اور چونکہ گناہ سبب ہے دوزخ کا اور اس سے مغفرت ہوگئی ہے اس لئے اب اس پر عتق من النار مرتب ہوگا - یعنی رمضان شریف ایسا مہینہ ہے

ع۱ بیشک نماز بے حیائی اور بری بات سے روکتی ہے پارہ ۲۱ سورۃ عنکبوت رکوع ۵

ع۲ اس کے شروع میں رحمت ہے اور درمیان میں مغفرت اور آخر میں دوزخ سے نجات

ع۳ بیشک اللہ کی رحمت قریب ہے نیکی کرنے والوں سے ... پارہ ۸ رکوع ۱۳

پارہ ۱۲ رکوع ۱۰ ع۳ بیشک نیک کام برے کاموں کو مٹا دیتے ہیں۔

کہ ان دونوں عمل یعنی صوم و قرآن کی برکت سے اس کے اول میں رحمت اور اوسط میں مغفرت اور آخر میں عتق من النار ہوتا ہے۔ یہ ترتیب عقل کے بھی موافق ہے عقل بھی اسی ترتیب کو چاہتی ہے چنانچہ دیکھئے مجرم کے حق میں یہی ترتیب ہوتی ہے کہ جب مجرم حاکم کی خوشامد اور اطاعت کرتا ہے تو اس پر حاکم کی مہربانی ہوتی ہے اس کے بعد اس کے قصور کو معاف کرتا ہے اس کے بعد رہائی ہوتی ہے معلوم ہوا حضور صلعم کا ارشاد سائنس کے موافق ہے ایک سائنس طبعی ہے اور دوسری شرعی یہاں طبعی سائنس موافق ہے شرعی سائنس کے پس رمضان شریف میں بھی رحمت اس مجرم پر ہوگی جو حق تعالیٰ کو خوشامد اور اطاعت کرکے راضی کرنیکی کوشش کرے ورنہ بجائے رحمت کے زحمت ہوگی مگر بہت لوگ اس دھوکہ میں ہیں کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو سمجھ لیتے ہیں کہ اب رحمت نازل ہوگی حالانکہ وہ رحمت کے کام کچھ بھی نہیں کرتے غیبت کرتے ہیں بری نگاہ کرتے ہیں علیٰ ہذا اور گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ غرض چونکہ رحمت و مغفرت میں یہ ترتیب عقلی ہے اور عقلاً ان کا ترتب اعمال پر ہوتا ہے تو اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے کہ ان چیزوں کا ترتب اعمال پر ہوتا ہے خواہ اعمال کو فاعل بالکیفیۃ کہو یا فاعل بالخاصہ۔ فاعل بالکیفیۃ ہونیکے معنی یہ ہیں کہ اعمال پر جو اثر مرتب ہوتا ہے اس اثر مرتب ہونیکی کوئی وجہ معقول ہے یعنی عقل میں آتی ہوئی ہے کہ یہ اثر فلاں وجہ سے مرتب ہوا اور فاعل بالخاصہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اعمال پر اثر مرتب ہونے کی کوئی وجہ عقل میں نہیں آتی بلکہ وہاں یوں کہنا پڑتا ہے کہ خدا نے اعمال میں فلاں اثر رکھدیا ہے جب وہ کئے جاتے ہیں تو یہ اثر ان پر مرتب ہوتا ہے اور کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ جیسے دوا کی دو قسمیں ہیں ایک فاعل بالکیفیۃ دوسری فاعل بالخاصہ۔ فاعل بالکیفیۃ کی مثال یہ ہے جیسے کسی کو غلبہ صفراء سے بخار تھا حرارت بڑھی ہوئی تھی اسلئے پیاس بھی تھی اسکو بارد دوا مثلاً آلو بخارا پلائی گئی کہ اس نے حدت صفراء کو توڑ دیا حرارت و پیاس کو زائل کر دیا یہاں اس کی اثر کی وجہ عقل میں آتی ہے کہ صفراء حار ہے اور آلو بخارا میں برودت کی کیفیت ہے اور حرارت کا مقابلہ برودت سے ظاہر ہے اور فاعل بالخاصہ کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کہربا کا قلب پر لٹکانا کہ اس سے قلب کو قوت

حاصل ہوتی ہے مگر اس اثر کی وجہ عقل میں نہیں آتی کہ کس وجہ سے قلب کو قوت حاصل ہوئی بس یہی کہیں گے کہ خدا تعالیٰ نے اس میں یہ اثر خاص رکھدیا ہے۔ پس اگر اعمال کو فاعل بالخاصہ کہو تو اس میں کسی تقریر کی ضرورت نہیں اور اگر فاعل بالکیفیۃ کہو تو اس کی تقریر مثلاً یہ ہوگی روزہ سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور اس کی بھی وجہ عقل میں آتی ہے وہ یہ کہ روزہ سے انکسار ہوتا ہے شہوات نفسانیہ کا اور جب انکسار ہوگا تو تقویٰ پایا جائے گا چنانچہ کلام اللہ میں روزہ سے تقویٰ کا پایا جانا صراحۃً مذکور ہے فرماتے ہیں۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (جامع وعظ کہتا ہے کہ اعمال کو جو دوا کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جیسے دوا میں حرارت و برودت وغیرہ کیفیات ہیں اسی طرح اعمال میں حرارت و برودت وغیرہ ہوگی جیسے بعض عوام کا خیال ہے کہ بعض اوراد و اسماء جلالی ہیں اس سے مزاج میں حدت و حرارت پیدا ہوتی ہے اور بعض جمالی بلکہ صرف وجہ کے مدرک بالعقل ہونے نہ ہونے میں تشبیہ دی گئی ہے کہ اگر کسی دوا کے اثر کی وجہ عقل میں آتی ہے تو وہ فاعل بالکیفیۃ ہے ورنہ بالخاصہ چونکہ ابتداءً یہ شبہ خود مجھکو پیش آیا ممکن ہے کہ کسی اور کو بھی پیش آوے اسلئے شرح کردی ۱۲) اور اس کی جانچ ماہر ہی کر سکتا ہے کہ اس دوا کا اثر بالکیفیۃ ہے یا بالخاصۃ ہر شخص کا کام نہیں اسی طرح اعمال میں ہر شخص نہیں کہہ سکتا کہ انکا جو اثر ہے وہ بالکیفیۃ ہے یا بالخاصۃ۔ بہر حال اعمال کو خواہ فاعل بالخاصۃ کہو یا بالکیفیۃ رمضان کی ان برکات کا ظہور اعمال ہی سے ہوگا بدون اعمال کے نہ رحمت ہوگی نہ مغفرت نہ جہنم سے آزادی الا ماشاء اللہ۔ خوب سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں عمل ہی کی قدر ہے اور جب تک عمل کر کے خدا تعالیٰ کو مہربان نہیں کیا تو کچھ بھی نہیں کیونکہ خدا کو کسی کے چہرے سے عشق نہیں۔ ایک بات استطراداً اس جگہ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کی طرف نسبت عشق کی (یعنی یوں کہنا کہ خدا فلاں کا عاشق ہے ٹھیک نہیں) بعض صوفیہ نے اور اکثر شاعروں نے خدا کیلئے لفظ عشق کا استعمال کیا ہے۔ سو شاعر تو کوئی چیز نہیں باقی صوفیہ سو وہ گو مغلوب الحال ہونے کے سبب معذور رہے مگر ان کی تقلید اس میں جائز نہیں کیونکہ بچہ اگر باپ کی ڈاڑھی نوچے اور وہ اسپر کچھ نہ کہے تو بچے کے فعل کو

اچھا نہ کہا جاویگا گو اس بچے سے گرفت بھی کی جاوے گی اور نہ ہوشیار بیٹے کو اسکی تقلید جائز ہوگی اس لئے جو کلمہ مغلوب الحال کے منہ سے نکلے تو وہ قول فی نفسہ تو برا ہے مگر اسپر گرفت نہیں کیجاتی اور نہ اس کی تقلید کیجاتی ہے اس کی دوسری مثال ایسی ہے جیسے کسی گنوار نے کچہری میں جاکر عرضی بے ٹکٹ لگی ہوئی حاکم کے ہاتھ میں دیدی حاکم نے کہا کہ اسپر آٹھ آنہ کا ٹکٹ لگاؤ گنوار نے فوراً ایک روپیہ نکال کر کہا کہ لے آٹھ آنے کا ٹکٹ لگا دے اور آٹھ آنے تو رکھلے حاکم نے اسے بیوقوف سمجھ کر کہا کہ اس کی عرضی بلا ٹکٹ ہی لے لو۔ ذرا آپ تو کریئے دیکھیے کہ گت بنی ہے گنوار کو جو معافی دی ہے مقرب سمجھکر نہیں دی بلکہ بیوقوف سمجھکر یہی کیفیت مغلوب الحال کی ہے کہ اسکو معافی مقرب سمجھکر نہیں دیجاتی بلکہ بیوقوف خیال کرکے سہارنپور میں ایک دفعہ اس قدر زور سے بارش ہورہی تھی کہ اندیشہ تھا شہر کے غرق ہو جائیگا ایک مجذوب ڈنڈا ہاتھ میں لئے جھونپڑی سے باہر نکلا اور آسمان کی طرف منہ کرکے کہا کہ بس کر بس کر بہت ہولی بارش بند ہوگئی ظاہر میں یہ مقرب تھے درباریوں میں
۲۲۸ شمار تھے حالانکہ ان کو قرب سے علاقہ بھی نہیں مقرب وہ ہیں جو کمالات باطنی کے ساتھ طریق سنت پر قائم ہیں ۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

پس عشق کا اطلاق حق تعالی پر جائز نہیں اور مغلوب الحال معذور ہیں مقرب ہیں تو پڑے ترساں ولرزاں رہتے ہیں ان کی زبان سے کبھی ایسے کلمات صادر نہیں ہوسکتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون مقرب ہوگا آپ فرماتے ہیں اِنِّیْ اَخْشٰکُمْ لِلّٰہِ کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنیوالا ہوں غرض خدا تعالی کو عاشق کہنا ادب کے خلاف ہے بعض لوگ حق تعالی کو عاشق رسول کہدیتے ہیں یہ بڑی غلطی ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ میاں کا عاشق کہنا چاہیئے اللہ تعالی کی طرف اگر نسبت کرنا ہو تو محبت کا لفظ استعمال کریں یوں کہیں کہ خدا تعالی کو محبت ہے کہ یہ نصوص کی موافق ہے۔ بہرحال، حق تعالی کو اعمال سے محبت ہے کسی کی ذات سے عشق نہیں جب اعمال کا شرط ہونا معلوم ہوگیا اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ تم نے رمضان میں اللہ میاں کو راضی کرنے کے لئے کوئی عمل کیا

یا نہیں اسی واسطے حدیث میں ہے رَغِمَ اَنفُہٗ رَغِمَ اَنفُہٗ رغم انفہ تین شخصوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا فرمائی ایک وہ جس کے سامنے میرا نام (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا) لیا گیا اور اس نے مجھ پر درود شریف نہ بھیجا دوسرا وہ کہ جس کے ماں باپ کو بڑھاپے کے سبب اس کی طرف احتیاج تھی باوجود وسعت ان کی خدمت نہ کی تیسرا وہ کہ جس پر رمضان کا مہینہ آیا اور قبل مغفرت گذر گیا یعنی جیسا قبل رمضان تھا ویسا ہی اب بھی رہا یعنی اپنے اعمال کی اصلاح نہ کی۔ بلکہ یہ حالت رہی ؎

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود ۔۔۔ چوں بیاید ہنوز خر باشد

صاحبو! اب رمضان شریف قریب ختم کے ہے کچھ ہی دن باقی ہیں اگر حالت نہ بدلی ہو تو اب بدل لو اللہ میاں کی وہ شان ہے کہ ایک آن میں فضل فرما دیتے ہیں اگرچہ اس کی تکمیل تو اول سے ہوتی ہے۔ اب میں ایک سوال کا جواب دیکر بیان کو ختم کرتا ہوں سوال یہ ہے کہ حدیث اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَّاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَّاٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ میں جو تین امر مذکور ہوئے ان کو رمضان کے مہینے پر منقسم کیا۔ گیا ایک ایک امر کے لئے دس دس دن ہونگے یعنی دس دن رحمت کیلئے اور دس دن مغفرت کے لئے اور دس عتق من النار کے لئے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ رحمت تھوڑی تھوڑی ہوتی ہوتی دس دن میں حاصل ہوگی اور اسی طرح مغفرت اور اسی طرح عتق۔ حالانکہ یہ سب باتیں جب ہوتی ہیں ایک آن میں ہو جاتی ہیں اس تدریج کے کیا معنی۔ جواب یہ ہے کہ رحمت و مغفرت و عتق کے درجات مختلف ہیں دس روز میں ان کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ تو اجمال ہے تفصیل اسکی یہ ہے کہ جب کوئی غلام اپنے آقا کی خدمت کرتا ہے تو مہربانی تو اول ہی سے شروع ہو جاتی ہے مگر پوری مہربانی اسوقت ہوتی ہے جبکہ وہ کوئی کارروائی دکھلاوے اور اسکو کچھ زمانہ خدمت کرتے ہوئے گذر جائے اور آقا کو اسپر اطمینان ہو جاوے اسی طرح حق تعالیٰ کی طرف سے طاعت شروع کرنے پر رحمت کا نزول فوراً شروع ہو جاتا ہے مگر اس کی تکمیل دس روز میں ہوتی ہے اسی طرح مغفرت اور عتق من النار کو سمجھئے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے کچھ معتد بہ کام کر کے دکھلاؤ جب رحمت کی تکمیل ہوگی اور پھر مغفرت اور عتق من النار کی شارع نے ہر ایک کی

تکمیل کے لئے دس دس دن مقرر کئے ہیں اگرچہ بندوں کے معاملات میں آہستگی کا راز اور
ہے اور خدا تعالیٰ کے معاملات میں اور ہے یعنی بندے جو آہستگی کے ساتھ غلام پر مہربانی کرتے ہیں
تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بندوں کو آئندہ کا حال معلوم نہیں کہ غلام کیسی خدمت کرے گا جب
ان کو کچھ زمانہ گذرنے پر خدمت کا حال معلوم ہو جاتا ہے اسوقت انعام کی تکمیل کرتے
ہیں یہاں یہ صورت نہیں ہو سکتی کیونکہ حق تعالیٰ عالم الغیب ہیں ان کو معلوم ہونے کا
انتظار نہیں یہاں وہی راز ہے جو عالم کو آہستگی کے ساتھ پیدا کرنے میں ہے،
حق تعالیٰ قادر تھے اس پر کہ آن واحد میں تمام عالم کو پیدا فرما دیتے مگر ایسا نہیں کیا
بلکہ چھ دن میں بنایا اس میں تعلیم ہے اس کی کہ کام میں آہستگی چاہئے یہی صورت یہاں
بھی ہو سکتی ہے کہ جلدی کسی کی ساتھ اعتماد و اختصاص کا معاملہ کرنے کا خلاف مصلحت ہونا بتلایا
ہے دوسرے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گناہ مادہ ظلمت کا ہے جیسے طاعت مادہ نور کا
بتدریج نور بڑھتا ہے، اور گناہ چھوڑنے سے بتدریج ظلمت گھٹتی ہے اسلئے رحمت و مغفرت میں
تدریج ہوتی ہے پھر طاعت کی کمی اور معصیت کی زیادتی ہی بعد کے اسباب تھے اور روہ ۲۳۰
روزے سے بتدریج مضمحل ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب پورا اضمحلال ہو گیا تو اب
کہیں گے کہ عتق من النار اب کامل ہوا اور یہ اثر پورے مہینہ بھر گناہ چھوڑنے پر مرتب ہوگا
اس سے معلوم ہوا کہ تکمیل رحمت و مغفرت اور عتق من النار کا سبب ترک گناہ ہے پس رمضان
میں گناہ بالکل ترک کر دینے چاہئیں اسی لئے حدیث میں رمضان کے زمانہ میں اس کی
زیادہ تاکید ہے اور رمضان میں گناہ کرنا بہ نسبت اور ایام کے زیادہ اشد قرار دیا گیا ہے
خلاصہ یہ ہے کہ ایک زمانہ نور رحمت کے کامل ہونے کے لئے ہے اور ایک مغفرت کی تکمیل کیلئے
اور ایک عتق من النار کے مستحکم ہونے کے واسطے یہ تقریر جب ہے کہ جب اعمال کو فاعل
بالکیفیۃ کہا جاوے مگر یہ شق یقینی نہیں ہے کہ اعمال فاعل بالکیفیۃ ہی ہیں بلکہ ان کو موثر بالخاصہ
بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ان اعمال میں یہ خاصیت رکھدی ہے کہ ان کے کرلنے سے اثر
خاص مرتب ہوتا ہے اور وہ اثر کسی کیفیت کے معلل نہیں مگر بالخاصہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ
کسی شرط کے ساتھ بھی مقید نہیں بالخاصہ ہونیکے تو صرف یہ معنی ہیں کہ ہمیں کیفیت معلوم نہیں جیسے

کہا مگر پھر بھی اسکے اثر کیلئے قرب قلب شرط ہے اگر کوئی بجائے قلب کے پاؤں پر باندھے تو کچھ بھی اثر نہ ہوگا اسی طرح اگر ہم مان بھی لیں کہ خود رمضان شریف میں یہ خاصیت ہے کہ اسمیں رحمت و مغفرت وعتق حاصل ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل تحقیق ہے کہ آیا اسکی خاصیت مرتب ہونے کے لئے کوئی چیز شرط ہے یا نہیں ممکن ہے کہ شرط ہو. تو حدیث سے معلوم ہوا ہے کہ ترک گناہ شرط ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے روزہ میں بدعمل اور جھوٹی باتیں نہ چھوڑیں تو اللہ میاں کو اسکے بھوکے پیاسے رہنے کی کچھ پرواہ نہیں ایک اور حدیث میں ہے کہ بہت سے روزدار روزہ رکھتے ہیں مگر ان کو روزہ سے بھوک پیاس کے سوا کچھ فائدہ نہیں سو حدیث سے شرط معلوم ہوگئی کہ گناہ سے بچنا اور اعمال صالحہ کرنا رمضان کے اثر یا لخاصہ میں مشروط ہے اب رمضان شریف کا زیادہ حصہ تو گذر گیا اب وہ صورت تو نہیں ہوسکتی کہ دس دن ایک خاص حالت ہو اور دس دن دوسری خاص حالت ہو اب اس قدر ممکن ہے کہ جسقدر امکان میں ہو اسقدر کرے اسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی جرم سے رہا ہو کر تحصیلدار نہ ہو تو نائب تحصیلدار تو ہو جاوے - افسوس ہے اس شخص پر کہ اب بھی کچھ نہ کرے

اب آپ کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو انعامات رمضان شریف کے مہینے کے اس حدیث شریف میں مذکور ہوئے ان کے آپ مستحق ہوئے ہیں یا نہیں جو دن باقی ہیں غنیمت ہیں اور وہ بہت قلیل ہیں کیونکہ آج جمعہ ہے اور منگل کو چاند دیکھیں گے اگر منگل کو نہ ہوا تو بدھ کو ضرور ہی ہے پس ایک صورت میں بدھ کی عید ہوگی ورنہ جمعرات کی پس ایک صورت میں رمضان کے چار دن باقی ہیں اور ایک صورت میں پانچ دن ان میں دو راتیں شب قدر کی باقی ہیں بہرحال چار دن تو یقیناً رمضان کے باقی ہیں تو ابھی ہر قسم کے فضائل کا حصہ باقی ہے ان میں کچھ کر لینا چاہیئے پھر ایک سال کے بعد یہ موقع میسر ہوگا پس اس کی کوشش کرو کہ استحقاق کامل ہو جاوے عتق من النار کا اس استحقاق کی صورت یہی ہے کہ تلاوت وغیرہ عبادات کرو اور روزہ کو گناہ سے بچاؤ خصوص پرائے مال پر قبضہ کرنے سے بچو۔ رمضان میں ترک گناہ سے ایک نفع تو یہی ہے کہ گناہ کے وبال سے بچو گے دوسرا نفع یہ ہے کہ گناہ معاف ہوں گے اہل اللہ کا تجربہ ہے کہ جو شخص اس ماہ میں اچھے کاموں کی عادت ڈالتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے تو سال

پھر تک اس کا اثر رہتا ہے یعنی طاعت و ترک معصیت میں سہولت ہوتی ہے اب عید کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں حسی عید کو تو سب جانتے ہیں مگر ضرورت ہے حقیقی عید سمجھنے کی سو حقیقی عید اسی کی ہے جس نے یہ استحقاق حاصل کیا عید حقیقی اسی کی ہے جس نے جہنم سے عتق حاصل کیا جیلخانہ والوں کی کیا عید ہے ان کے لئے تو وعید ہے۔ عید کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جیلخانہ سے رہائی پاکر جلسہ اور جشن کرتا ہے عید کی ہیئت ہی اسکو بتلا رہی ہے چنانچہ رہائی کے جلسہ میں چند کارروائیاں کی جاتی ہیں خوشی منائی جاتی ہے کچھ تقسیم بھی کرتے ہیں حاکم کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں عید میں کیا ہے یہی چیزیں تو ہیں اظہار بشاشت کا حکم ہے تقسیم مال کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے کا حکم ہے دو رکعت پڑھنے کا حکم ہے جسکا حاصل شکریہ ہے اور اس دن میں صدقہ فطر خرچ کرنے کا بھی امر فرمادیا پھر خرچ کرنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں رکھا بلکہ اسکو واجب کردیا اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو شاید خرچ ہی نہ کرتے اور اس کا تعین بھی کردیا۔ اظہار بشاشت کی ہیئت بھی معین ۲۳۴
کردی ورنہ تم رنڈیاں نچاتے باجے بجاتے اور دوسرے خرافات کرتے بلکہ اس کی صورت معین فرمادی کہ غسل کرو کپڑوں میں سے جو اچھا کپڑا ہو اسکو پہنو عطر لگاؤ صدقہ فطر دو نماز پڑھو اس سے ثابت ہوا کہ عید جشن ہے جب یہ ہے تو جشن کی خوشی اسی کو ہے جس نے حاکم کو راضی کرلیا ہے اور جس سے حاکم ناراض ہو اس کی کیا عید اور کیا خوشی۔

بہرحال رمضان اور عید کی یہ حقیقت ہے چونکہ رمضان کے بعد عید آنیوالی ہے اس لئے اسکو بھی مختصراً بیان کردیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ رمضان شریف قریب ختم ہے دوزخ سے آزادی کا اہتمام کرنا چاہیئے اس کے بعد عید حقیقی سے مشرف ہوگے اور اگر ایسا نہ کیا تو وہ صرف صورت اور نام کی عید ہوگی جس سے کیا فائدہ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ نیک عمل کے کرنے اور گناہوں سے بچنے کی توفیق دیں فقط

اشرف علی

۲۲ شوال المکرم سنہ ۱۳۵۱ھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو اٰیۃ
رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

۴۳۴

وعظ مسمّی بہ

اصل العبادۃ

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر "الابقاء"
متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ملا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمی بہ

اصل العبادۃ

این	کہاں ہوا	کیرانہ جامع مسجد
متی	کب ہوا	یوم جمعہ ۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹہ
کیف	کس ہیئت سے ہوا	جالساً علی المنبر
لم	کیوں ہوا	احباب دائرہ کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	عبادت بدون علم کے نہیں ہوسکتی اور عبادت مقصود ہے اس لئے تحصیل علم ضروری ہے اس کے ضمن میں علم کی فضیلت بیان فرمائی
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ہر طبقہ کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مسودہ میں لکھی ہوئی نہیں
الاشتات	متفرقات	

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم
اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ۔ ہرچند کہ اسوقت طول سفر سے ایسا تکان ہے کہ بیان کی ہمت نہ ہوتی

تھی مگر احباب نے محبت سے درخواست کی میں نے عذر بھی کیا ادھر سے اصرار ہوا تو میں نے یہ خیال کیا کہ جتنی دیر احباب کے جواب و سوال میں لگے گی اتنی دیر بیان ہی کر دوں گا اسلئے میں نے درخواست منظور کرلی اور بیان کی ہمت ہوگئی مگر بیان مختصر ہوگا لیکن نہ ایسا مختصر کہ مقصود میں مخل ہو بلکہ مقصود کے لئے انشاء اللہ کافی شافی ہوگا اسوقت جو حدیث میں نے پڑھی ہے اسمیں ایک عام غلطی کی اصلاح ہے اول اس کا ترجمہ کرتا ہوں پھر تفصیل عرض کرونگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم سے ادنی آدمی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور شان تو یہ ہے ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جب آپ تمام انبیاء سے اور سب ملائکہ سے افضل ہیں تو اولیاء کس پوچھ میں ہیں اور امت کے ادنی آدمی تو کس شمار میں ہیں حضور کی برابر تو کوئی بھی نہیں ہے نہ علم میں نہ حال میں نہ عمل میں نہ کمال میں نہ عبادت میں نہ درجات قرب میں خود ارشاد فرماتے ہیں آدَمُ وَمَنْ دُونَهُ تَحْتَ لِوَائِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ کہ آدم علیہ السلام اور ان کے سوا سب آدمی قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے ہوں گے۔ غرض حضور صلعم کی خصوصیات دیکھنے سے یہ بات واضح ہے کہ حضور صلعم کی برابر بھی کوئی نہیں زیادہ تو کیا ہوتا پھر امت بیچارہ اس میں بھی ادنی امتی پر تو کسقدر فضیلت ہوگی حضور صلعم فرماتے ہیں کہ عالم کی فضیلت عابد پر اسدرجہ کی ہے جسدرجہ میری فضیلت ہے ایک ادنی امتی پر یہ تو حدیث کا ترجمہ ہوا اب میں اس غلطی پر تنبیہ کرتا ہوں جس میں لوگ مبتلا ہیں اور اسی لئے اسکی اصلاح کی ضرورت ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ انسان سب کے سب عبادت کیلئے پیدا ہوئے ہیں اسلئے عبادت کی تو ضرورت ظاہر ہے اور علم کی ضرورت اسلئے ہے کہ عبادت کا طریقہ بدون اسکے معلوم نہیں ہوسکتا۔ اور ظاہر ہے کہ ہر کام کے لئے طریقہ کی ضرورت ہے مثلاً روٹی کھانا ضروری ہے مگر اسکے لئے طریقہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ روٹی کیونکر پکائی جاتی ہے آٹا کیونکر پیسا جاتا ہے غرض ہر کام میں علم و عمل دونوں کی ضرورت ہوتی ہے اب سمجھئے کہ لوگوں کی اس باب میں غلطی کیا ہے سب سے پہلی غلطی تو یہ ہے کہ لوگوں کو اول تو دین کی طرف توجہ ہی نہیں اگر ہوتی ہے تو وہ بھی دنیا کی غرض سے ہوتی ہے باستثناء غربا کہ ان بیچاروں کو

تو دین کی محبت سے جو کام کرتے ہیں دین کے واسطے کرتے ہیں مگر یہ جو بڑے طبقہ کے لوگ ہیں ان کو جو دینی کام کی رغبت ہوتی ہے محض تفاخر اور جاہ کے لئے ہوتی ہے چنانچہ آجکل جو انجمنیں قائم ہیں اس کے عہدہ دار اپنے نام کے ساتھ سکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ اور گورنر وغیرہ لکھتے ہیں بس یہ جاہ اور عزت ان کو مطلوب ہے ورنہ خود اپنے قلم سے اپنے نام کیساتھ ان عہدوں کا ذکر نہ کرتے۔ بریلی سے میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا اس میں ہو لکھے اپنے نام کے ساتھ گورنر یتیم خانہ لکھا تھا پھر تہذیب یہ کہ خط میں استفتار تھا اور جواب کے لئے ٹکٹ ندارد۔ میں نے اتنی رعایت کی کہ جواب لکھکر بیرنگ روانہ کردیا ان حضرت نے میری اس رعایت کی یہ قدر کی کہ بیرنگ خط کو واپس کردیا اس واقعہ کے بعد میں نے بیرنگ خط بھیجنے سے توبہ کرلی بس جس خط میں ٹکٹ نہ ہو جواب کے لئے اس کو چند روز امانت رکھکر ردی میں ڈالدیتا ہوں پھر جلدی ہی میرا بریلی جانا ہوگیا تو میں نے وہ بیرنگ خط اپنے ٢٤
ساتھ لے لیا کہ اگر ان حضرات سے ملاقات ہوتی تو ان سے ایک آنہ وصول کروں گا چنانچہ وہاں پہونچکر میں نے ایک مجلس میں بھائی سے اس کا ذکر کیا کہ یہاں یتیم خانہ کے گورنر صاحب کون ہیں انہوں نے ایسی بدتہذیبی کی کہ میرے پاس استفتا بھیجا اور جواب کے لئے ٹکٹ بھی نہ رکھا قاعدہ کے موافق تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ میں خط کو ردی میں ڈال دیتا مگر میں نے رعایت کرکے ان کے خط کا جواب بیرنگ دیدیا تو انہوں نے میرے ساتھ یہ تہذیب برتی کہ بیرنگ خط واپس کرکے مجھے تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا میں ان حضرت سے اپنا ایک آنہ وصول کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ تاوان ناحق میرے ذمہ پڑا۔ بھائی نے یاد نہیں کیا کہا پھر مجلس برخواست ہونے کے بعد بھائی نے کہا کہ آپ نے غضب کیا یہ صاحب جو آپ کے سامنے بیٹھے تھے یہ گورنر صاحب کے صاحبزادہ تھے میں نے کہا اچھا ہوا گورنر صاحب کو اپنی حرکت کا علم تو ہوجائے گا تو بڑے طبقہ کے لوگ اکثر دین کے کام دین کی نیت سے نہیں کرتے بلکہ دنیا کی نیت سے کرتے ہیں چنانچہ ایک انجمن کے سکریٹری شراب پیتے تھے مگر اس کے ساتھ بھی وہ اسلامی انجمن کے سکرٹری تھے کیا ایسے لوگوں سے یہ توقع ہوسکتی ہے کہ وہ دین کے واسطے انجمن کی خدمت

کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ محض جاہ کے واسطے مجھے اس انجمن میں بلایا گیا تھا میں نے
انکار کر دیا کیونکہ جس انجمن کا سکرٹری نا اہل ہو اس میں شرکت کرنا سکرٹری کی جاہ
بڑھانا ہے اور نا اہل کی جاہ بڑھانا اور اس کے عہدہ کو تسلیم کرنا خود ناجائز ہے ہاں
کوئی اسواسطے شرکت کرے کہ ایسے نا اہلوں کے معزول کرنے میں سعی کرے تو جائز
ہے اور ایسے لوگوں کو سکرٹری وغیرہ صرف اسواسطے بنایا جاتا ہے کہ وہ چندہ خوب
وصول کرتے ہیں غربا کے اوپر ٹیکس کی طرح چندہ مقرر کرتے ہیں اور اپنے دباؤ اور
اثر سے جبراً وصول کرتے ہیں۔ اس کام میں ان کی مدح کیجاتی ہے کہ فلاں صاحب
دین کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں سبحان اللہ! یہ بڑا دین کا کام کیا کہ غربا کے گلے پر
چھری رکھکر چندہ وصول کر لیا۔ ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جو کھلم کھلا ڈاکو ہیں کیونکہ وہ لوگوں
سے مال چھینکر اپنے بال بچوں کو تو کھلاتے ہیں جنکا نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے تو گو ان کا ذریعۂ
سا بقرہ ۲ معاش تو حرام ہے مگر مصرف ایسا ہے جس میں خرچ کرنا ان کے ذمہ واجب تھا تو وہ حرام کا
ارتکاب کرکے ایک واجب سے تو سبکدوش ہوئے اور یہ سکرٹری صاحب حرام
طریقہ سے چندہ وصول کرکے ایسی جگہ صرف کرتے ہیں جسکی خدمت ان کے ذمہ
واجب بھی نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ انجمن کی خدمت ان کے ذمہ واجب نہیں اور ڈاکو
۴ کی سزا معلوم ہے تو یہ لوگ اس کے واسطے تیار رہیں۔ افسوس آجکل چندہ میں اس کا
پارہ ۴ اصلا لحاظ نہیں کیا جاتا کہ یہ مال خوشی سے دیا گیا ہے یا جبر سے۔ حق تعالیٰ شانہ نے
رکوع ۱۲ تو بیوی کے مال کے بارہ میں بھی یہ فرمایا ہے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ
هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا کہ اگر بیوی اپنے دل کی خوشی سے مرد کو اپنے مہر میں سے کچھ دیدے
تو اس کا کھانا جائز ہے۔ یہاں بھی طیب نفس کی قید ہے حالانکہ میاں بیوی کا تعلق
۲ عاشق معشوق کا تعلق ہوتا ہے اور ایسے تعلق میں ناگواری بھی بہت ہی کم ہوتی ہے
پارہ ۲ تو پھر غربا کا روپیہ بدون طیب قلب کے کیونکر جائز ہوگا۔ بیوی کے معاملہ میں ایک
رکوع ۱۵ مقام پر اس سے بڑھکر ارشاد ہے وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ
لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ط

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی کہ اگر تم نے اپنی بیوی کو دخول سے پہلے طلاق دیدی ہو
اور مہر مقرر ہوچکا ہو تو بیوی کے لئے نصف مہر ہے مگر یہ کہ وہ اپنا
حق معاف کردے (تو کچھ نہ رہے گا) یا جسکے ہاتھ میں نکاح کی ڈور ہے (یعنی شوہر)
وہ معاف کردے (تو پورا مہر رہے گا) اور اے مردو تم معاف کردو تو یہ تقوی
کے زیادہ قریب ہے یعنی مرد کے لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ عورت کی معافی کا منتظر
نہ رہے بلکہ خود اپنا حق معاف کردے۔ تو دیکھئے باوجودیکہ عورت اگر خوشی سے
مہر معاف کردے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے اور اس کی اجازت دیدی گئی تھی مگر اس
مقام پر دوسرا ادب سکھلایا گیا ہے کہ غیرت کا مقتضا یہی ہے کہ عورت کی معافی کو قبول نہ کرو
بلکہ تم اسکے ساتھ احسان کرو۔ جب بیوی کے ساتھ لین دین کرنے اور اس کا عطیہ قبول
کرنے کے لئے یہ آداب ہیں تو بھلا چندہ کے لئے آداب نہ ہوں گے؟ ضرور ہیں اور
ان کا لحاظ کرنا واجب ہے۔ شریعت مقدسہ نے تو ہدیہ کیلئے بھی آداب مقرر کئے ہیں چنانچہ
ایک ادب یہ ہے مَا اَتَاکَ مِنْ غَیْرِ اِشْرَافِ نَفْسٍ فَخُذْہُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْہُ نَفْسَکَ کہ جو چیز
ہدیہ وغیرہ بدون انتظار کے آجائے لیلو اور جو انتظار سے آئے اپنے نفس کو اسکے
پیچھے مت ڈالو۔ اسپر ایک واقعہ مجھے یاد آیا بلگرام میں ایک بزرگ عالم متوکل تھے
ایک دن ان کے یہاں فاقہ تھا صبح کو جو وہ حسب معمول پڑھانے بیٹھے تو شاگردوں نے چہرہ
اور آواز سے پہچان لیا کہ شیخ کو فاقہ کا ضعف ہے اس نے دو چار سطریں پڑھکر کتاب
بند کردی اور یہ کہا کہ میری طبیعت آج اچھی نہیں آج سبق موقوف فرمادیجئے۔ استاد نے
سبق کا ناغہ منظور فرما لیا اور شاگرد وہاں سے اٹھکر اپنے گھر گئے اور تھوڑی دیر میں ایک خوان
سر پر رکھے ہوئے آئے جسمیں عمدہ عمدہ کھانے تھے وہ خوان استاد کے سامنے پیش کیا کہ یہ
ہدیہ قبول فرمایئے استاد نے کہا کہ یہ ہدیہ ایسے وقت آیا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت تھی
مگر ایک عذر اسکے قبول سے مانع ہے وہ یہ کہ تم جسوقت اٹھکر چلے ہو میرے دل میں یہ خیال
آیا تھا کہ تم کھانا لینے گئے ہو اور حدیث میں آیا ہے مَا اَتَاکَ مِنْ غَیْرِ اِشْرَافِ نَفْسٍ فَخُذْہُ
وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْہُ نَفْسَکَ اور یہ ہدیہ اشراف نفس کے بعد آیا ہے اسلئے اس کا قبول

کرنا خلاف سنت ہے۔ وہ شاگرد بھی ان بزرگ کی صحبت کی برکت سے فہیم تھے اس نے شیخ پر اصرار نہیں کیا۔ اگر ہم جیسے ہوتے تو اصرار کرنے لگتے اور عاجزی کے ساتھ منہ بنا بنا کر خوشامد کرتے کہ جس طرح بھی ہو اب تو قبول ہی کر لیجئے اور اس سے بڑھکر یہ کہ آجکل کھانا کھانے میں اصرار کیا جاتا ہے کہ اور کھائیے میری خاطر سے تھوڑا سا تو اور کھا لیجئے اب انکار کیا جائے تو ان کی دلشکنی ہوتی ہے اور کھایا جائے تو اپنی شکم شکنی ہوتی ہے وہ تو اصرار کرکے زیادہ کھلا کر اپنے گھر آرام سے سو رہیں گے اور ہم کو زیادہ کھانے سے رات بھر بے چینی رہے گی نہ نیند آئے گی نہ طبیعت صاف ہوگی اسلئے میں ایسے اصرار کو قبول نہیں کرتا چنانچہ اس وقت اس سفر میں بھی مجھے ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک موقع پر ایک بوڑھے میاں نے دعوت پر اصرار کیا میں نے معقول عذر کر دیا کہ آج فلاں صاحب کے یہاں جانا ہے ان کے یہاں دعوت پہلے منظور ہو چکی ہے وہ کہنے لگے کہ چونکہ آپ نائب رسول ہیں اسلئے مجھے آپ کو کھلانیکا اشتیاق ہے میں نے کہا چونکہ میں آپ کے نزدیک نائب رسول ہوں اسی لئے تو میں وعدہ خلافی سے رکتا ہوں کہ آج مجھے فلاں جگہ جانا ہے وہاں اطلاع کر چکا ہوں اسلئے آپ کی دعوت قبول کرنے سے معذور ہوں کہنے لگے کہ کبھی وعدہ ملتوی بھی تو ہو جاتا ہے میں نے کہا بہت اچھا میں سب سے پہلے آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں اور نہ قبول کرکے ملتوی کرتا ہوں کیونکہ وعدہ کبھی ملتوی بھی تو ہو جاتا ہے اب تو وہ بڑے چپ ہوئے میں نے اپنے دل میں کہا کہ واقعی یہ بڑے میاں پنشن پانے کے قابل ہیں۔ اسکے بعد انہوں نے نقد ہدیہ پیش کیا کہ دعوت کے بجائے اسی کو قبول فرما لیجئے۔ میں نے کہا چونکہ آپ نے مباحثہ کی صورت اختیار کی ہے جس سے مجھے تکدر ہوا اسلئے اب تو میں نقد بھی نہ لوں گا نہ آپ کی سواری پر سوار ہوں گا۔ تو آجکل لوگوں کو اصرار کا بڑا مرض ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دوسرے کے قاعدے اور ضابطے تو سب لغو ہیں اور ان کی ہر تجویز صحیح یہ بڑی بدتمیزی کی بات ہے۔ تو وہ شاگرد ایسے بدتہذیب نہ تھے جب استاذ کا معقول عذر سنا تو خوان اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں خلاف سنت کام کرنے پر آپ کو مجبور نہیں کرتا بہت اچھا میں اسکو واپس لے جاتا ہوں چنانچہ کھانا واپس لے گئے اور اتنی دور چلے گئے کہ شیخ کو یقین ہو گیا کہ واپس لے گئے اس کے بعد

تھوڑی دیر میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا حضرت انبوا شراف نفس ختم ہوگیا اب قبول فرما لیجئے شیخ کو محبت کا جوش ہوا اور کھڑے ہو کر شاگرد کو سینہ سے لگا لیا۔ دیکھئے تہذیب اس کا نام ہے کہ شیخ کی بات کو بھی رد نہ کیا اور ہدیہ بھی ان کی اصول کے موافق پیش کر دیا واقعی جب انسان کو محبت ہوتی ہے تو اللہ تعالی اسکو آداب محبت خود سکھا دیتے ہیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ جسوقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی تو اسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پچیس سال کی عمر تھی اور حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی یہ بیوہ تھیں اور بہت مالدار چنانچہ اپنے تمولی ہی کی وجہ سے ملک عرب مشہور تھیں اور یہاں سے مخالفین اسلام کو شرم کرنا چاہیئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے ہیں کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں ہی کی فکر رہتی تھی اس واقعہ کو دیکھکر کون کہسکتا ہے کہ آپ کو عورتوں ہی کی فکر رہتی تھی حضور صلعم کو جوان کنواری لڑکی ملنا کیا دشوار تھا اگر آپ چاہتے تو بوجہ عالی خاندان ہونے کے کہ بنی ہاشم
۲ مکہ کے سردار تھے آپ کو کتنی ہی لڑکیاں مل سکتی تھیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی اس امر پر توجہ ہی نہیں کی پھر علاوہ عالی خاندان ہونے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت بھی بہت زیادہ تھی کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ کو تیس مردوں کی قوت عطا ہوئی تھی۔ وَفِي رِوَايَةٍ اَرْبَعِيْنَ وَنَاهِيَاً جِدّاً اُعْطِيَ قُوَّةَ اَرْبَعِيْنَ مِنْ رِجَالِ الْجَنَّةِ ۱۲) حدیث کو کوئی نہ مانے تو حضرت رکانہ کا واقعہ اس کے سامنے پیش کیا جائیگا کہ وہ عرب کے مشہور پہلوان تھے جن کی طاقت وقوت ہزار مردوں کی برابر شمار کی جاتی تھی ان کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کی تو انہوں نے کہا کہ کوئی بات دکھلاؤ تو میں ایمان لاؤں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بتلاؤ کیا چاہتے ہو کہنے لگے کہ مجھ سے زیادہ طاقتور عرب میں کوئی نہیں اگر آپ کشتی میں مجھے پچھاڑ دیں تو ایمان لے آؤں گا حضور نے فرمایا بہت اچھا چنانچہ کشتی

عہ وفی المستدرک للحاکم عن ابن اسحق وکان لہا یوم تزوجہا ثمان وعشرون سنۃ وفیہ ایضا عن ہشام بن عروۃ قالت توفیت خدیجۃ بنت خویلد وہی بنت خمس وستین (قلت وعلی ہذا فیکون لہا عند تزوجہا بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم اربعون سنۃ ۱۲) ولکن قال ابن اسحق ہذا قول شاذ والذی عندی انہا لم تبلغ ستین سنۃ اھ (ص ۱۸۲ ج ۳) ای بل تکون عند الوفاۃ بنت ثلث وخمسین واللہ اعلم۔

ہوئی اور حضور نے رکانہ کو پچھاڑ دیا وہ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے یہ اتفاقی بات ہے دوبارہ پھر کشتی ہو چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر رکانہ کو پچھاڑ دیا تو وہ اسلام لے آئے جب حضور صلعم کی قوت کی یہ حالت ہے تو حضور صلعم کیلئے نکاح میں امت سے زیادہ وسعت دیا جانا عین موافق عقل ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہ رہا تھا کہ خدیجہ کے نکاح کے وقت حضرت صدیقؓ کو خیال ہوا کہ اس موقع پر حضورؐ کی طرف سے بھی مہر وغیرہ میں زیادہ خرچ ہونا چاہیئے تاکہ سبکی نہ ہو مگر آپ کے پاس مال تھا نہیں اس لئے یہ تدبیر کی کہ ایک حیلہ سے آپ کو روپیہ دیا کیونکہ ویسے لینے کی امید نہ تھی وہ حیلہ یہ کیا کہ حضورؐ سے آکر عرض کیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے دادا صاحب نے کچھ رقم میرے دادا کے پاس امانت رکھی تھی مجھے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ حضورؐ کے سامنے وہ امانت پیش کردوں مگر موقعہ کا منتظر تھا کہ جب آپ کو ضرورت زیادہ ہوگی اسوقت پیش کرونگا چنانچہ اب موقع ہے اس لئے پیش کرتا ہوں اور یہ حیلہ حضرت صدیقؓ نے اسواسطے کیا تاکہ حضورؐ کو ہدیہ کے قبول کرنے سے گرانی نہ ہو تو
یہ آداب ہیں ہدیہ کے کہ اس طرح پیش کیا جائے جس سے دوسرے پر گرانی نہ ہو۔ دیکھئے ۲۹۱
حضرت صدیقؓ نے کس تدبیر سے حضورؐ کو راحت پہونچائی وہاں تو یہی مقصود تھا کہ حضورؐ کو مجھ سے راحت پہونچے حضرت صدیقؓ کو نبوت سے پہلے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت تھی غرض ہدیہ میں یہ ضروری ہے کہ کسی پر گرانی نہ ہو نہ مہدی پر نہ مہدی الیہ پر یہی شرط ہے صدقہ میں چنانچہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص مجمع میں سوال کرنے پر دو روپیہ دے اور تنہائی میں ایک روپیہ دیتا تو اس میں ایک روپیہ مال حلال ہے ایک حرام ہے یہی قاعدہ چندہ میں بھی ہے مگر چندہ میں تو قصداً یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ مجمع میں تحریک کی جائے تاکہ جو شخص ایک روپیہ دیتا وہ شرما شرمی صرف پانچ تو دے گا یاد رکھو یہ صورت بالکل ناجائز ہے مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بتلاؤ مقصود بالذات کیا ہے۔ کام مقصود ہے یا دین؟ اگر صرف کام ہی مقصود ہے تو منافقین درک اسفل نار میں کیوں ہوں گے کیونکہ وہ بھی تو جہاد و صدقہ وغیرہ کرتے تھے معلوم ہوا کہ جس کام میں رضائے حق نہ ہو وہ کام ہی نہیں مسلمان کا اس

مقصود رضائے حق ہے چاہے کام تھوڑا ہو مگر رضائے حق کے موافق ہونا چاہئے۔ مثلاً اگر نیم زمانہ بہت بڑا ہو مگر رضائے حق نہ ہو تو اسکو لبیک کرنا کیا ہے۔ چنانچہ آجکل جو ایک بہت بڑی انجمن ہے میں اس کا نام بیان نہیں کرنا چاہتا اس کا ایک واقعہ عجیب سنا ہے جس سے حیرت ہوگئی وہ یہ کہ لکھنؤ میں ایک کسی نے اپنی بہت بڑی جائداد ایک متوکل عالم تنگدست کے سامنے پیش کی کہ اسکو قبول فرماکر اپنے تصرف میں لائیے انہوں نے انکار کر دیا اس کے بعد اس نے انجمن والوں کے سامنے پیش کیا کہ میری طرف سے اسکو انجمن کے واسطے وقف کردو انہوں نے قبول کر لیا لکھنؤ کے عوام نے اسپر عجیب فقرہ کسا کہ میاں وہ بزرگ تو اکیلے تھے انکو گناہوں کے بار کا تحمل نہ تھا اور انجمن میں تو بہت سے موٹے موٹے ہیں وہ سب ملکر تھوڑا تھوڑا اٹھالیں گے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو صرف انجمن کا چلانا مقصود ہے رضائے حق مقصود نہیں ورنہ حلال وحرام کی ضرور رعایت کرتے اور یہ ساری خرابی حب جاہ کی ہے کہ ان لوگوں کو کام سے

۴۴ جاہ مطلوب ہے چنانچہ ڈیگ میں ایک انجمن کے سکریٹری مجھسے ملے اور انجمن سے لوگوں کی بے توجہی کی شکایت کرنے لگے میں نے کہا کہ دوسروں کو کام میں لگانے کی اور ان کی شکایت کی آپ کو کیا ضرورت ہے آپ پہلے خود کام کرنا شروع کر دیں جتنا بھی آپ سے ہو سکے دوسروں کو آپ تنگ نہ کریں پھر کام میں خود کشش ہوتی ہے لوگوں کو خود بخود توجہ ہو جاویگی جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ان کے مرض کو خوب سمجھا

ف احقر جامع عرض کرتا ہے کہ یہ آجکل ہم مسلمانوں کی بہت بڑی غلطی ہے کہ صرف کام کو مقصود سمجھتے ہیں رضائے حق کو مقصود نہیں سمجھتے چنانچہ بہت لوگ آزادی کی طلب میں وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو سراسر خلاف شریعت ہے مثلاً کافروں کو پیشوا بنانا ان کی بے پردہ عورتوں کے ساتھ جلوس وغیرہ میں شریک ہونا جس میں نگاہ بد سے حفاظت دشوار ہے جس کپڑے کی تجارت شرعاً مباح ہے اسے چھوڑنا تجار کو روکنا خریداروں کو روکنا کسی کی گرفتاری پر ہڑتال کرنا اور تجار کو دکانیں بند کرنے پر مجبور کرنا وغیرہ وغیرہ بہت سے افعال ایسے ہیں جو حدود شریعت سے متجاوز ہیں مگر وہ انکو دین سمجھتے ہیں ان کی غلطی کا منشا صرف یہ ہے کہ انہوں نے کام کو مقصود سمجھ لیا ہے رضائے حق کو مقصود نہیں سمجھا ورنہ اس کام کے ذرائع میں ضرور غور کرتے کہ یہ شریعت کے بھی موافق ہیں یا نہیں ۱۲ ظ۔

واقعی بات یہی ہے کہ یہ خود تو کچھ کام نہیں کرتے اور دوسروں سے چندہ وصول کرنا
اور کام لینا چاہتے ہیں خلاصہ یہ کہ سکریٹری بننے کا شوق ہے اور کام کے نام صفر ہے
غرض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آجکل جو لوگ دین کی خدمت کرتے ہیں محض جاہ
کے لئے کرتے ہیں دین اور رضائے حق مطلوب نہیں چنانچہ اسی حالت کے متعلق میرے
ایک دوست کا خواب ہے کہ انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو محاسن اسلام
پر تقریر کرتے ہوئے دیکھا مگر خواب ہی میں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت صدیق قبل
از اسلام محاسن اسلام پر تقریر کر رہے ہیں میں نے اس کی یہی تعبیر دی کہ اس
خواب میں آجکل کے حامیان اسلام کی خدمت اسلام کی حقیقت بتلائی گئی ہے
کہ ان کی یہ حمایت اسلام ایسی ہے جیسے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو نبوت سے
پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و الفت تھی کہ وہ نصرت محض دوستانہ
تھی رضاء حق کیلئے نتھی اسی طرح آجکل جو لوگوں کو اسلامی درد ہے یا حمایت
اسلام کا ولولہ ہے وہ محض قوم پرستی اور ہمدردی قومی سے ناشی ہے طلب رضائے
حق سے ناشی نہیں ورنہ اتباع احکام کا اہتمام ضرور ہوتا اب تو یہ حالت ہے کہ انجمنوں میں
ہزاروں روپیہ جمع ہے اور بنک میں داخل ہے جسکا سود لے رہے ہیں یہ کیا دین ہے
مگر ان کی بلا سے سود ہو یا سود سے بھی بدتر ان کی انجمن کا کام چلنا چاہیئے کیونکہ اس کی
بدولت یہ سکریٹری اور ممبر اور لیڈر بنے ہوئے ہیں اسی سے ان کی وقعت ہے
اور یہی ان کو مطلوب ہے اسلئے آجکل زیادہ کام قوم پرستی کرا رہی ہے خدا پرستی
نہیں کراتی۔ خدا پرستی تو یہ ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا
یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایک کافر معرکہ جہاد میں میرا ایک ہاتھ کاٹ دے پھر جب مجھے اس پر
قابو ملے اور میں اسکو مارنا چاہوں تو وہ کلمۂ اسلام زبان سے پڑھ دے تو میں کیا کروں حضور
نے فرمایا ہاتھ روک لو صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں تو وہ محض
جان بچانے کو کلمہ پڑھتا ہے حضور نے فرمایا ہاتھ روک لو اگر تم نے اسکو کلمہ پڑھنے کے بعد
قتل کیا تو اس کی وہ حالت ہوگی جو کلمہ اسلام کے بعد تمہاری حالت ہوئی تھی اور تمہاری حالت وہ

ہوگی جو کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی حالت تھی تم کو کسی کے دل کی کیا خبر ہے۔ یہ ہے خدا پرستی کہ تمام مصالح پر خاک ڈالدی اور حکم کا اتباع کیا چنانچہ حضرات صحابہ کے کارناموں سے معلوم ہوگا کہ انہوں نے ان احکام کی کسقدر پابندی کی۔ ایک واقعہ مجھے اسی قسم کا یاد آگیا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیش آیا تھا کہ ہرمزان فارسی سے جو شاہان فارس میں سے ایک بادشاہ تھا مسلمانوں کی صلح ہوگئی تھی مگر اس نے صلح کے بعد غدر کیا پھر مسلمانوں نے اس کے ملک پر حملہ کیا اور صلح کیلئے خوشامد کرنے لگا پھر غدر کیا صحابہ نے پھر اسکے ملک پر حملہ کیا تو پھر صلح کی درخواست کرنے لگا حضرات صحابہ نے اس مرتبہ صلح منظور نکی کیونکہ تجربہ ہوچکا تھا تو اس نے درخواست کی کہ اچھا مجکو حضرت عمرؓ کے پاس بھیجدیا جائے وہ جو فیصلہ میرے حق میں کردیں گے مجھے منظور ہے چنانچہ اسکو حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا اس کی صورت دیکھکر حضرت عمرؓ کو غصہ سے تاب نرہی کیونکہ اس نے صلح کرکے مسلمانوں کے بڑے بڑے بہادر اور جلیل القدر صحابہ کو قتل کیا تھا چنانچہ حضرت عمرؓ نے غصہ کے ساتھ اسکو ڈانٹ کر فرمایا کہ تیرے پاس اس غدر کا کیا جواب ہے بولو ہرمزان ۲۴۳ نے کہا زندوں کی طرح بولوں یا مردوں کی طرح کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہیں بات پوری کرنے سے پہلے ہی آپ مجکو قتل کردیں حضرت عمرؓ نے فرمایا تَکَلَّم لَا بَأسَ بولو ڈرو نہیں؟ اس نے کہا اچھا ذرا مجھے پانی پلوا دیجئے کہ پیاس سے بیتاب ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اس کے لئے پانی منگایا جو ایک بھدے سے پیالے میں لایا گیا ہرمزان نے کہا کہ میں مر بھی جاؤں گا تو ایسے پیالہ میں پانی نہ پیوں گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کے حق میں پیاس اور قتل کو جمع نہ کرو اچھے گلاس میں پانی لے آؤ چنانچہ لایا گیا تو ہرمزان نے گلاس منہ سے لگا کر ہٹا لیا کہ پینے کی ہمت نہیں ہوتی مجھے اندیشہ ہے کہیں گلاس منہ کو لگاتے ہی میرا سر گردن سے جدا کردیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا لَا تَخَفْ حَتّٰی تَشْرَبَہٗ کہ پانی پینے تک کچھ اندیشہ نہ کرو یہ سنتے ہی ہرمزان نے پانی پھینک دیا اور کہا مجھے پیاس نہیں ہے مجھے تو صرف امن لینا مقصود تھا سو وہ مقصود حاصل ہوگیا اب آپ مجکو قتل نہیں کرسکتے حضرت عمرؓ نے فرمایا بھلا میں ایسے شخص کو زندہ چھوڑ سکتا ہوں جس نے براء بن مالک اور فلاں فلاں جلیل القدر

صحابہ کو قتل کیا ہے۔ ہرمزان نے کہا کہ میں نے کچھ ہی کیا ہو مگر آپ مجکو امن دے چکے ہیں اب قتل نہیں کر سکتے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے مجکو امن نہیں دیا ہرمزان نے کہا آپ واقعی مجکو امن دے چکے ہیں اسپر دوسرے صحابہ نے بھی ہرمزان کی تائید کی واقعی آپ اس کو امن دے چکے ہیں کیونکہ آپ نے اس کو تَکَلَّمْ لَابَاسَ اور لَاتَخَفْ حَتّٰی تُخْبِرَ فرمایا ہے اور یہ الفاظ موجب امان ہیں حضرت عمر رضی اللہ نے بھی اپنے کلام میں غور فرمایا تو سمجھ گئے واقعی میری زبان سے الفاظ امان نکل چکے ہیں تو ہرمزان کو رہا کر دیا اور فرمایا خَدَعْتَنِیْ وَلَا اَنْخَدِعُ اِلَّا لِمُسْلِمٍ کہ تم نے مجکو دھوکہ دیا مگر میں مسلمان کے دھوکہ میں آسکتا ہوں کافر کے دھوکہ میں نہیں آسکتا چنانچہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہرمزان مسلمان ہوگیا حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تو نے جان بچانے کے لئے اتنی تدبیریں کیوں کی اول ہی میں اسلام لے آتا تو تیری جان بچ جاتی۔ کہا اس صورت میں آپ کو میرے اسلام کی قدر نہوتی یہ خیال ہوتا کہ جان بچانے کے لئے مسلمان ہوا ہے اسلئے میں نے دوسرے طریقے سے اپنی جان بچالی اور آپ کو اپنے قتل سے روکدیا اس کے بعد مطمئن ہوکر اسلام لایا اب کسی کو یہ کہنے کا موقعہ نہیں کہ جان بچانے کو اسلام لایا ہے۔ تو اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کسقدر شریعت کے پابند اور وقاف عند الحدود تھے۔ عبدیت اسی کا نام ہے بندہ کی شان تو یہ ہے کہ احکام کا اتباع کرے مصالح کی پروا نکرے۔ ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار   کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

انجن کو کیا حق ہے کہ راستہ میں ڈرائیور کے ٹھہرانے کے بعد نہ ٹھہرے بلکہ اسکو ڈرائیور کے ٹھہرانے کے بعد فوراً ٹھہر جانا چاہیئے خواہ اس کے نزدیک ٹھہرنے کی جگہ ہو یا نہو سلطان صلاح الدین رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ فتوحات سے فراغت کر چکے تو وزراء نے ان سے کہا کہ عیسائی رعایا کے واسطے ایک قانون سخت بنانا چاہیئے کیونکہ یہ لوگ بدون سختی کے مفسدہ سے باز نہیں آتے اور قانون اسلام بہت نرم ہے اس سے مفسد لوگ دب نہیں سکتے اور آپ نے فرمایا کہ قرآن وحدیث کافی ہے کسی نئے قانون کی ضرورت نہیں خدا تعالیٰ کو پہلے سے سب کچھ معلوم تھا کہ مفتوحات اسلامیہ کی رعایا کس قسم کی ہوگی انہوں نے اپنے

علم سے یہ قانون نازل فرمایا ہے اسلئے ہمارے نزدیک قانون اسلام ہر قسم کی رعایا کے واسطے کافی ہے اور فرض کرلو کہ وہ کافی نہیں تو ہم کو تو رضائے حق مطلوب ہے بقائے سلطنت مطلوب نہیں اگر قانون اسلام رائج کرنے سے سلطنت جاتی رہے گی بلا سے جاتی رہے کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ تو ہم سے راضی رہیں گے اور دوسرا قانون رائج کرنے سے فرض کرلو سلطنت باقی رہے گی مگر خدا تعالیٰ ہم سے ناراض ہو جائیں گے اور ہم نے اسواسطے فتوحات نہیں کیں کہ خدا تعالیٰ کو ناراض کر کے سلطنت کریں ایسی سلطنت تو فرعون کو بھی حاصل تھی ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

غرض بڑے طبقہ کے اکثر لوگ جو دین کا بڑا کام کرتے ہیں وہ محض دنیا کے واسطے کرتے ہیں دین کیلئے اور خدا کے لئے کم کرتے ہیں البتہ غرباء کی نیتیں دین کے کام میں درست ہوتی ہیں کیونکہ ان کی عزت ہی کچھ نہیں وہ دین کا کتنا ہی بڑا کام کریں ان کی کوئی وقعت دنیا والے نہیں کرتے ہاں خدا تعالیٰ ان کی وقعت فرماتے ہیں اور وہی وقعت کرنیوالے کافی ہیں پس غرباء کو تو دین پر کچھ توجہ ہے امراء کو نہیں ہے (اسی لئے حدیث میں آتا ہے ۲۴۰
ہُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ کہ انبیاء علیہم السلام کا اتباع کرنیوالے غرباء زیادہ ہیں اول تو شمار میں بھی غرباء زیادہ ہیں دوسرے دین کی خدمت خدا کے لئے کرنے والے بھی زیادہ غرباء ہی ہیں امراء اول تو دین کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے اور جو ہوتے بھی ہیں تو دنیا ہی کے لئے ۱۲)

یہانتک تو ان کی شکایت ہے جو کام ہی نہیں کرتے یا طریقے سے نہیں کرتے اب میں ان کی شکایت کرتا ہوں جو کام کرنے والے ہیں کہ ان کو عمل کا تو اہتمام ہے مگر علم کا اہتمام نہیں یہ لوگ نفلیں پڑھ لیں گے حج کرلیں گے روزے رکھ لیں گے باقی یہ کہیں نہیں دیکھا جاتا کہ دینداری اختیار کرنے کے بعد کسی نے دین کی کوئی کتاب پڑھنا بھی شروع کردی ہو مجھے مشائخ کی بھی شکایت ہے اور ان مشائخ کی بھی جو علماء ہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو وظائف و اوراد وغیرہ تو بتلاتے ہیں مگر مسائل و احکام کی کوئی کتاب پڑھنے سننے کو نہیں بتلاتے کہ فلاں کتاب دیکھنا یا کسی سے سن لینا ہاں اگر کوئی مولوی اپنی خوشی سے آجائے جیسے ایک نیم ملا کے

پیالہ میں گوشت کی بوٹیاں اپنی خوشی سے آگئی تھیں نیم ٹر کا قصہ یہ ہے کہ اس کے
گھر میں کسی کا مرغا آگیا تو اس نے تین دفعہ پکار کر کہا یہ کس کا مرغا مگر کس کا تو زور
سے کہتا تھا اور مرغا آہستہ سے جب تین دفعہ ندا ہو چکی بیوی سے کہا یہ لقطہ ہے حلال ہے
اسکو ذبح کر لو جب پک کر تیار ہو گیا بیوی سے کہا کہ کھانا لے آؤ مگر شوربا نکالو بوٹی میں
شبہ ہے وہ مت لانا وہ شوربا اتارنے بیٹھی اور چمچے سے بوٹیوں کو ہٹا کر شوربا نکالنے لگی
نیم ٹر بولے کہ چمچے سے نہ ہٹاؤ بلکہ کنارے سے شوربا نکال لو اس نے کہا اس طرح تو بوٹی بھی
آجائیگی فرمایا جو اپنی خوشی سے آجاوے اسے آنے دو تم خود مت لاؤ۔ تو اسی طرح کوئی مولوی خود
ان کے گھر اپنی خوشی سے آجائے تو آپ اس سے مسئلے پوچھتے ہیں کہ فلاں دن نماز میں یہ واقعہ
پیش آیا نماز ہوئی یا نہیں مولوی صاحب نے جواب دیا کہ نماز نہیں ہوتی اس کا اعادہ کرو
پھر بعض تو اعادہ کر لیتے ہیں اور بعض کہدیتے ہیں کہ میاں سب ہو گئی اللہ تعالیٰ ہم جاہلوں
۳۴۷ کی ہر طرح قبول کر لیتے ہیں اس عدم اعادہ کا منشا ایک تو دین سے بے پروائی ہے یہ تو
امر مشترک ہے ایک منشا طبعی ہے وہ یہ کہ عمل کرنے کے بعد جو اس میں کچھ خرابی بتلائی
جاتی ہے وہ انسان کو گراں گذرتی ہے عمل سے پہلے جتنی بھی قیود لگا دی جائیں وہ زیادہ
گراں نہیں مگر جب کام ختم ہو چکے اب یہ کہنا کہ اس میں یہ خرابی ہے وہ خرابی ہے گراں
گذرتا ہے مجھے اس کا تجربہ یوں ہوا کہ ایک دفعہ میں نے ایک بڑے عہدہ دار کی دعوت
کر دی اور یہ کام میں نے اصول طریق کے خلاف کیا حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے
کہ مجھے ایک بزرگ نے وصیت فرمائی تھی کہ کسی کی دعوت نکرنا تو بزرگوں کا سوال
ہے مگر چونکہ وہ عہدہ دار اکثر میرے پاس ملنے آتے تھے اس لئے میں نے شرم سے
ان کی دعوت کر دی جب کھانا تیار ہو کر سامنے لایا گیا اور وہ کھانے بیٹھے تو کہنے لگے
کہ میں مرچ بالکل نہیں کھاتا۔ اسوقت ان کا یہ کہنا مجھے بہت ہی گراں گذرا کہ بندۂ خدا پہلے
سے نہ کہدیا یہ بھی قلتِ علم کی خرابی ہے کہ لوگوں کو کھانے کے آداب معلوم نہیں کھانے
کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ جس کے یہاں مہمان ہو اسکو اپنے معمولات کی پہلے ہی اطلاع
کر دے دسترخوان پر بیٹھکر اپنے معمولات بیان کرنا تہذیب کے خلاف ہے

کہ اس سے میزبان کو تکلیف ہوتی ہے چنانچہ اسوقت واقعی مجھے بہت تکلیف ہوئی
وہ تو اتفاق سے ہمارے ہی ایک عزیزہ اس زمانہ میں آنکھیں بنواکر آئی تھیں اور ڈاکٹر
نے ان کو مرچ کھانے سے منع کر رکھا تھا ان کے یہاں سے بے مرچ کا سالن منگایا گیا
تب عہدہ دار صاحب نے کھانا کھایا۔ اسی طرح کھانے کے آداب میں سے یہ ہے کہ میزبان
مہمان کے اوپر مسلط ہو کر نہ بیٹھے بلکہ اس کو آزاد چھوڑ دے کہ جس طرح چاہے کھائے بعض
لوگ مہمان کے کھانے کو دیکھتے ہیں کہ کس طرح کھاتا ہے کیا کھا رہا ہے اس سے مہمان کو
تکلیف ہوتی ہے چنانچہ ایک صاحب نے میری دعوت کی اور میرے اوپر مسلط ہو کر
دسترخوان پر بیٹھ گئے خود تو کھایا نہیں میرے کھانے کو دیکھنے لگے اور ایک ایک کھانا
میرے آگے بڑھانے لگے میں نے ایک بار تو کہہ دیا کہ میں خود کھالوں گا آپ تکلیف
نہ کریں مگر وہ کب ماننے والے تھے پھر وہ کہنے لگے کہ آپ میرے باپ کے ملنے والوں
میں سے ہیں اس لئے مجھے آپ سے خاص محبت ہے میں تو آپ کو باپ سمجھتا ہوں ۲۲۸
میں نے دل میں کہا لنگر میں آپ کو باپ سمجھتا ہوں۔ حضرت معاویہ کا دسترخوان بہت
وسیع تھا ہمیشہ آپ کے دسترخوان پر بہت بہت آدمی کھانے والے ہوتے تھے ایک
مرتبہ ایک بدوی آپ کے دسترخوان پر تھا جو بڑے بڑے لقمے کھا رہا تھا اتفاق سے
حضرت معاویہ کی نظر اس پر پڑ گئی تو آپ نے خیر خواہانہ طور سے نصیحت کی کہ لقمہ چھوٹا لو کہیں
گلے میں نہ پھنس جائے بدوی یہ سنتے ہی کھڑا ہو گیا اور کہا آپ کو کھانا کھلانا نہیں آتا آپ
مہمانوں کے لقمے دیکھتے ہیں پھر ہر چند حضرت معاویہ نے خوشامد کی مگر وہ نہ ٹھہرا تو کھانے
کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ مہمانوں کے لقمے نہ دیکھے ہاں خفیہ طور سے کہ مہمان کو
نہ معلوم ہو کہ یہ مجھے دیکھ رہا ہے اس بات کی خبر گیری رکھے کہ کس کو کس چیز کی ضرورت
ہے۔ اسی طرح آداب طعام میں سے یہ ہے کہ میزبان کے ہاتھ شروع میں پہلے دھلائے
جائیں اور کھانا بھی اول میزبان کے سامنے رکھا جائے امام شافعی رحمۃ اللہ امام مالک
کے مہمان ہوئے تو امام مالک نے اپنے خادم سے فرمایا کہ پہلے میرے ہاتھ دھلاؤ اور میرے
سامنے کھانا پہلے رکھو کیونکہ مقصود تو مہمان کو راحت دینا ہے اور مہمان کو راحت

اسی میں ہے کہ پہلے میزبان ہاتھ دھوے اور کھانا شروع کرے اس سے مہمان بے تکلف ہو جاتا ہے مگر ان باتوں کو عوام تو عوام مشائخ بھی نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ ان کی تعلیم نہیں کرتے ۔

زاہد شدی و شیخ شدی دانشمند ایں جملہ شدی ولیکن انساں نشدی

مشائخ کو چاہیے کہ وظیفہ وغیرہ بتلانے سے پہلے دو کام بتلائیں ایک اخلاق کی درستی دوسرے بقدر ضرورت علم کی تحصیل پہلے زمانہ میں اسی پر عمل تھا مریدوں کی برسوں تک اصلاح اخلاق کرتے تھے اس کے بعد وظیفے تعلیم فرماتے تھے اور جو طالب علم دین سے کورا ہوتا اسکو تحصیل علم کی تاکید فرماتے تھے چنانچہ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شیخ عبدالقدوس حاضر ہوئے تو شیخ نے پوچھا کہ علم دین کہاں تک حاصل کیا ہے کہا کچھ نہیں فرمایا جاہل ولی نہیں ہو سکتا جاؤ پہلے علم دین بقدر ضرورت حاصل کر کے آؤ چنانچہ شیخ عبدالقدوس واپس ہو گئے اور کچھ عرصہ کے بعد پھر حاضر ہوئے تو حضرت شیخ عبدالحق رح کا وصال ہو چکا تھا تو آپ نے شیخ کے پوتے سے بیعت کی درخواست کی انہوں نے بھی وہی سوال کیا کہ کیا پڑھا ہے عرض کیا کافیہ تک پڑھا ہے فرمایا کافیہ کافی ست باقی درد سر۔ اور بیعت فرما لیا۔ پھر گو ظاہر میں پوتے سے بیعت ہوئے تھے مگر روحانی فیض آپ کو حضرت شیخ عبدالحق رودولوی رح سے بہت زیادہ ہوا تو محققین مشائخ کی یہ عادت تھی کہ ہر شخص کو فوراً بیعت نہ کرتے تھے بلکہ اول اسکو مبادی کی تحصیل کا امر کرتے تھے اور اگر کوئی شخص مبادی کو حاصل کر کے آیا ہوا اسکو بھی جلدی بیعت نہ کرتے تھے بلکہ امتحان طلب کے بعد بیعت فرماتے تھے۔ چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب اور حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہما میں باہم یہ قول و قرار ہو چکا تھا کہ دونوں ایک ہی پیر سے بیعت ہوں گے کیونکہ دونوں میں محبت بہت تھی پھر حضرت حاجی صاحب تو ایک خواب کی وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اور کسی بزرگ نے خواب میں آپ کا ہاتھ میانجی صاحب کے ہاتھ میں دیکر فرمایا تھا کہ یہ تمہارے پیر ہیں مدت تک تو اس سوچ میں رہے کہ یہ بزرگ کون ہیں پھر کسی سے حضرت ۲۲۹

میاں جی صاحب کے کمالات سنکر لوہاری حاضر ہوئے تو دیکھا تو میاں جی صاحب کی بالکل وہی شکل و صورت تھی جو خواب میں دیکھی تھی حضرت میانجیو صاحب نے پوچھ کچھ کہنا ہے حاجی صاحب نے عرض کیا کیا آپ کو خبر نہیں۔ میانجی صاحب نے فرمایا کہ خواب و خیال کا کیا اعتبار انہو حاجی صاحب کو اور زیادہ اعتقاد ہو گیا کہ آپ کو بھی خبر ہے کہ میں آپ کے حوالہ کیا گیا ہوں بس رونا شروع کر دیا حضرت میانجی صاحب نے تسلی فرمائی اور بیعت فرمایا اور حاجی صاحب کچھ ایسے مغلوب الحال ہوئے کہ حافظ صاحب سے کہنا بھول گئے حافظ صاحب نے جو دیکھا کہ حاجی صاحب روز روز لوہاری جاتے ہیں ایک دن پوچھا کہ تم روز روز کہاں جایا کرتے ہو حاجی صاحب نے فرمایا کہ میں نے ایک بزرگ سے بیعت کر لی ہے حافظ صاحب نے فرمایا کہ ہمارا تمسے کیا عہد تھا فرمایا میں بالکل بھول گیا کہا اچھا اب ہمکو بھی وہاں لیچلو فرمایا بہت اچھا چنانچہ دونوں حضرات پہونچے تو میاں جی صاحب نے حافظ صاحب سے پوچھا کہ کس ارادہ سے تشریف لائے عرض کیا بیعت ہونے کے ارادہ سے آیا ہوں فرمایا میں اس قابل نہیں مجھے اس سے معاف رکھئے۔ ۱۴۰
کہا بہت اچھا میں اصرار نہیں کرتا کہ بزرگوں سے اصرار کرنا بے ادبی ہے مگر اس کے بعد حافظ صاحب برابر حاضر ہوتے رہتے یہاں تک کہ عرصہ کے بعد میاں جی صاحب نے فرمایا کہ کیا حافظ صاحب اب بھی وہی خیال ہے عرض کیا حضرت میں تو اپنی طرف سے اول ہی دن بیعت ہو چکا ہوں آپ کو اختیار ہے خواہ قبول فرمائیں یا نہ فرمائیں فرمایا بہت اچھا وضو کر کے آجایئے اور دونوں بزرگوں کے طرز بیعت مختلف ہونے کا یہ اثر ہوا کہ حضرت حاجی صاحب تو فوراً طالب کو بیعت فرمالیا کرتے تھے بشرطیکہ طالب ہو اور حضرت حافظ صاحب طالب کو بھی بڑی دیر میں بیعت کرتے تھے کہ عمر بھر میں شاید سات آٹھ مرید ہوئے ہونگے اور حاجی صاحب کے ہزاروں مرید ہیں۔ غرض مشائخ کا یہ طرز تھا کہ ہر شخص کے ساتھ اسکے مناسب برتاؤ کرتے تھے یہ نہیں کہ جو آیا فوراً مرید کر لیا اور مرید کرنے کے بعد بس کچھ وظیفے بتلا دیئے چاہے اسکو نماز کے اور پاکی ناپاکی کے مسائل بھی معلوم نہوں بلکہ آجکل تو غضب یہ ہے کہ مریدوں کو علم کی ترغیب اور کیا دیتے الٹی

یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اَلعِلْمُ ہُوَ الحِجَابُ الاَکْبَرُ کہ علم بڑا حجاب ہے اور اسکے غلط معنی مشہور کئے ہیں کہ علم وصول الی اللہ سے مانع ہے خود اس کے معارض بزرگوں کا دوسرا ارشاد ہے مَا اتَّخَذَ اللہُ وَلِیًّا جَاہِلًا کہ خدا تعالیٰ نے کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا ۱۱ (اور جو اہل اللہ امی تھے وہ جاہل نہ تھے وہ حضرات صحابہ کی طرح صحبت کے ذریعہ سے ضروری مسائل و احکام معلوم کئے ہوئے تھے ۱۲) بلکہ حِجَابِ اَکْبَرُ شاہی صطلاح ہے شاہی محاورہ میں حجاب اکبر وہ پردہ ہے جو بالکل بادشاہ کے پاس ہوتا ہے کہ اس کے بعد اور حجاب کوئی نہیں ہوتا۔ جس کا لقب دہلی کے قلعہ میں لال پردہ تھا پس مطلب اس کا یہ ہے کہ علم حاصل کرنے سے سب حجابات رفع ہو جاتے ہیں اور غایت قرب نصیب ہو جاتا ہے حجاب اکبر کے یہ معنی ہیں اور حضرت حاجی صاحب نے اس کے ایک دوسرے معنی بتلائے کہ اَلعِلْمُ میں لام عہد ہے مراد علم غیر حق ہے وہ بیشک مانع عن المقصود ہے اور میں نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ علم سے مراد علم العلم ہے یعنی دعویٰ علم اپنے آپ کو عالم سمجھنا یہ بڑا حجاب ہے کیونکہ تکبر ہے اور تکبر کا حجاب اکبر ہونا ظاہر ہے مگر اس سے نفس علم کا حجاب ہونا لازم نہیں آتا۔ لہٰذا مشائخ پر لازم ہے کہ اپنے مریدوں کو علماء سے نہ روکیں گو علماء دو قسم کے ہیں ایک علماء صوفیہ دوسرے علماء خشک اور شاید تم علماء خشک سے روکنا ضروری سمجھتے ہو مگر میں کہتا ہوں کہ عالم خشک پھر بھی جاہل صوفی سے افضل ہے۔ جاہل صوفی کی مثال اگرچہ وہ تر ہے جمنا کے بھنور کے مانند ہے کہ لوگوں کے ایماں کو غرق کرتا ہے اور عالم خشک کی مثال جمنا کے ریت کی مانند ہے کہ گو خشک ہے مگر اس میں کوئی غرق نہیں ہوتا اور عالم صوفی ہو تو اس کی تو یہ شان ہے سہ

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

مجھے مشائخ سے یہ شکایت ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو علماء سے روکتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں مشائخ کا یہ برتاؤ نہ تھا۔ چنانچہ شیخ عبدالقدوس رحمہ اللہ کو حضرت شیخ جلال تھانیسری اول اول پختہ پیر کہتے تھے کیونکہ شیخ عبدالقدوس صاحب وجد و سماع تھے مگر حضرت شیخ عبدالقدوس اپنے خادم کو علماء کے پاس تحصیل علم کیلئے بھیجتے تھے علماء کے طعن و ملامت

سے ان پر یہ اثر نہیں ہوا کہ علماء سے اپنے خدام کو روکدیتے۔ مگر آجکل درویشوں کو علم سے ایسی نفرت ہے کہ اس سے دور بھاگتے ہیں نفلیں تو خوب پڑھتے ہیں مگر مسائل کو نہیں سیکھتے نہ مشائخ ان کو سکھلائیں اسلئے ان کی نمازیں بھی درست نہیں ہوتیں اور جب بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ نماز نہیں ہوئی تو اعادہ گراں گذرتا ہے۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو بعد میں مسئلہ معلوم کرکے نماز کا اعادہ کرتے ہوں کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ عمل کے بعد اس میں خرابی معلوم ہونا طبعاً بہت گراں ہے اب محبت وعشق کا غلبہ ہو تو عمل کی اصلاح کا اہتمام ہوگا ورنہ نہیں پس آسان بات یہ ہے کہ پہلے ہی سے علم حاصل کرلیا جائے مجھے تو درویشوں میں صرف دو آدمی ایسے ملے جنکو مسائل شرعیہ کا اہتمام تھا ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ وجد میں اگر غشی کی حالت میں گر پڑوں تو وضو رہے گا یا نہیں میں اس سوال سے بہت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ عمر بھر میں آج تم نے یہ سوال کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا معلوم ہوتا ہے تمکو دین کی فکر ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ
۲۵۲ اس صورت میں وضو کا اعادہ ضروری ہے۔ وہ کہنے لگا کہ درویشوں میں کوئی بھی وضو کا اعادہ نہیں کرتا اس صورت میں مرید تو کیا پیر کی بھی نماز درست نہیں ہوتی مگر نماز کا اہتمام اور اس کی قدر و وقعت ہو تو مسائل جاننے کی فکر ہو۔

دوسرے ایک بزرگ شاہجہانپور میں تھے وہ بھی درویشوں میں ایسے ملے جنکو دین کا خیال تھا انہوں نے بھی ایسا مسئلہ دریافت کیا کہ ان سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیا انہوں نے لکھا کہ میرا ایک دشمن تھا میں نے اسکے لئے بددعا کی تو وہ ہلاک ہوگیا مجھے اس صورت میں قتل کا گناہ تو نہیں ہوا اگر ہوا ہے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟ کسی دوسرے شخص کو یہ واقعہ پیش آتا تو وہ اس کو اپنی کرامت و ولایت قرار دیتا مگر ان بزرگ کو دین کی فکر تھی ان کو گناہ کا اندیشہ ہوا۔ میں نے لکھا کہ آپ کے سوال سے بہت جی خوش ہوا مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ صاحب تصرف ہیں اور تصرف سے کام لیا ہے تو بیشک آپ قاتل بشبہ عمد ہیں اب آگے تفصیل ہے کہ اگر وہ شخص شرعاً مباح الدم تھا تو گناہ نہیں ہوا ورنہ گناہ ہوا اور شبہ عمد کا کفارہ بھی واجب ہوا یعنی ایک غلام

مؤمن آزاد کرنا یہ نہ ہو سکے تو دو مہینے پے در پے روزے رکھنا اور اللہ تعالےٰ سے توبہ استغفار کرنا۔

اور اگر آپ صاحب تصرف نہیں یا ہیں مگر تصرف سے کام نہیں لیا صرف دعا پر اکتفا کی ہے تو قتل لازم نہیں آیا۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ شخص بددعا کا اہل تھا یا نہیں اگر بددعا کا اہل تھا تو آپ پر گناہ بھی کچھ نہیں ہوا اور اگر بددعا کا محل نہ تھا تو بددعا کا گناہ ہوا جس سے توبہ استغفار لازم ہے کفارہ قتل لازم نہیں۔ اور وہ شخص جو ہلاک ہو گیا ممکن ہے بے گستاخی کی سزا ہو جیسا حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات ۔۔۔ بادُرد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

اہل اللہ کو ستانا اچھا نہیں اس کا ثمرہ جلدی ہی مل جاتا ہے مگران بزرگ کا کمال دیکھئے کہ اس کو کرامت سمجھ کر بیفکر نہیں ہوئے بلکہ ڈر گئے کہ مجھے بددعائے ناحق کا یا قتل کا گناہ تو نہیں ہوا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ صدور کرامت کے بعد ولی کو بیفکر نہ ہونا چاہیئے بلکہ حکم شرعی معلوم کر کے حکم شریعت کا اتباع کرنا چاہیئے۔ ہمارے حاجی صاحبؒ کے یہاں ایک دفعہ عین وقت پر بہت سے مہمان آ گئے جتنا آٹا گوندھا گیا تھا وہ کافی نہ تھا تو حضرت نے اپنا چادرہ یا رومال گھر میں بھیجدیا کہ اس کو آٹے پر ڈھک دو اور پکانا شروع کرو چنانچہ تھوڑے سے آٹے میں اتنی برکت ہوئی کہ سب مہمانوں نے کھا لیا اور بچ بھی گیا حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو حاجی صاحب کے پاس تشریف لائے اور فرمایا مبارک ہو کرامت ظاہر ہوئی بس آپ کا رومال سلامت چاہیئے پھر دنیا میں قحط کیوں پڑنے لگا اور قحط میں جو حکمتیں ہیں ان کا ظہور کیوں ہونے لگا۔ یہ سنکر حضرت حاجی صاحب کا رنگ زرد ہو گیا اور فرمایا حافظ صاحب میں توبہ کرتا ہوں اور آئندہ کیلئے عہد کرتا ہوں کہ ایسی جرأت پھر نہ ہو گی۔ یہ تھے سچے لوگ اور آجکل تو حالت ہے کہ کسی کو تصرف کی قوت عطا ہو جاتی ہے تو وہ اس کی اس طرح مشق کرتے ہیں کہ اپنے پاس آنے والوں کے دل پر اثر ڈالتے ہیں تاکہ ان کے مدرسہ یا مسجد یا خانقاہ میں روپے دے جائیں۔ یاد رکھو ایسا تصرف جس سے دوسرے شخص کی آزادی سلب ہو جاوے حرام ہے

اور یہ بھی ایک قسم کی ڈکیتی ہے مگر یہ لوگ اسکو اپنی کرامت سمجھتے اور اس پر فخر کرتے ہیں یہ ساری خرابی جہل کی ہے اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ علم نہ ہونے سے کتنی خرابیاں ہو رہی ہیں پس بڑی کمی اسوقت یہ ہے کہ لوگ علم کی طرف توجہ نہیں کرتے اگر کسی کو دین کی طرف توجہ کی توفیق بھی ہوتی ہے تو وہ مسجد بنوانا اور مسجد میں رقم لگانا ہے مدارس کی امداد نہیں کرتا چنانچہ لوگ مسجد میں تو تیل بہت دیتے ہیں مگر طلبہ کی خدمت نہیں کرتے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى اَدْنَاكُمْ کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت ادنی امتی پر ہے اور اس فضیلت کا منشا یہ نہیں کہ علم کا نفع متعدی ہے اور عبادت کا نفع لازم؟ کیونکہ علم کا نفع بھی متعدی نہیں لازم ہے نفع متعدی اگر ہے تو تعلیم کا ہے بلکہ فضیلت علم کا منشا یہی ہے کہ وہ شرط عمل ہے کیونکہ عبادت بدون علم کے نہیں ہو سکتی اور جو ہوتی ہے وہ عبادت کی محض صورت ہوتی ہے حقیقت نہیں ہوتی۔ ہاں تعلیم کی فضیلت کا منشا یہی ہے کہ اس کا نفع متعدی ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہاں سے معلم کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ وہ اس امر میں نائب رسول ہے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو وہاں دو جماعتیں تھیں ایک علماء کی جو مسائل شرعیہ کا تذکرہ کر رہے تھے دوسری عابدین کی جو ذکر اذکار کر رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم علماء میں بیٹھ گئے اور فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (ترجمہ۔ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) مگر آجکل قرآن کے معلموں کی تو ایسی بیقدری ہے کہ دو روپیہ ماہوار اور کھانا ان کو ملتا ہے اس سے زیادہ تنخواہ کسی کی ہوئی تو بس دس بارہ حد ہے۔ اسی طرح مؤذنوں کی اور اماموں کی بڑی بیقدری ہے بلکہ جو لوگ امامت سے پہلے معزز تھے امام بنجانے کے بعد انکی بھی بیقدری کیجاتی ہے کیونکہ وہ بھی مسجد کے ملاجی کہلاتے ہیں۔ سو یاد رکھو کہ معلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہے مگر حضور کا پیشہ معلمی نہ تھا کہ اس پیشہ سے آپ نے گذر کیا ہو بلکہ آپ کا ذریعہ معاش جہاد اور توکل علی اللہ تھا آجکل جو معلمین کی بیقدری ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کو پیشہ بنا لیا ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کو علم کی طرف توجہ ہوتی

اور شوق ہوتا تو معلموں کو اس کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ شکایت تو اسی کی ہے کہ مسلمانوں کو علم کی طرف بالکل توجہ نہیں اب میں اس حدیث کے متعلق ایک نکتہ بیان کرکے ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ اس حدیث میں عالم سے مراد عالم محض نہیں جو عمل سے خالی ہو کیونکہ ایسے عالم کی تو دوسری حدیثوں میں بیحد مذمت وارد ہے بلکہ مراد وہ عالم ہے جو باعمل ہے مگر غلبہ اسپر علم کا ہے ایسے ہی عابد سے مراد عابد محض نہیں جو علم سے بالکل کورا ہو کیونکہ ایسا شخص عبادت کر ہی نہیں سکتا بغیر علم کے تو عمل دشوار ہے اور اگر وہ عبادت کرے گا تو وہ محض نقل ہوگی حقیقت عبادت نہ ہوگی بلکہ مراد وہ عابد ہے جو علم و عبادت کا جامع ہے مگر اسپر شان علم غالب نہیں بلکہ شان عمل غالب ہے تو ایسے عابد سے عالم اسلئے افضل ہے کہ علم خود موقوف علیہ عمل کا ہے۔ اگر اسپر یہ شبہ کیا جائے کہ علم کا شرط عمل ہونا فضیلت کے لئے اس لئے کافی نہیں کہ عمل میں دوسری فضیلت موجود ہے وہ یہ کہ عمل مقصود ہے اور علم وسیلہ ہے اور مقصود وسیلہ سے افضل ہوتا ہے۔

۲۸۵

پس علم بلا عمل طریق بلا مقصود ہے اور عمل بلا علم مقصود بلا طریق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علم ہمیشہ عمل کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بعض علوم محض علم ہی کے لئے موضوع ہیں جیسے اعتقادیات۔ اور عمل کوئی بھی بدون علم کے نہیں ہوسکتا پس علم تو ایک درجہ میں عمل سے مفارق و مستغنی ہوسکتا ہے۔ مگر عمل کسی درجہ میں بھی علم سے مستغنی نہیں۔ دوسرے یہ کہ علم کبھی عمل تک بھی پہونچا دیتا ہے اور عمل کبھی علم تک نہیں پہونچاتا اس لئے عابد سے تکمیل علم کی بھی امید نہیں اور عالم سے تکمیل عبادت کی امید ہے۔ تیسرے علم میں حظ نفس کچھ نہیں بھلا حیض و نفاس و رہن و شفعہ کے مسائل میں کیا حظ ہوتا اور عبادت و ذکر و اشغال میں لطف و حظ بھی بہت ہے اسلئے عالم زیادہ مجاہدہ کرتا ہے عابد اسکی برابر مجاہدہ نہیں کرتا۔ پس جس شخص کو عبادت کی توفیق ہوچکی ہو اس کو لازم ہے کہ مسائل شرعیہ کی تحصیل بھی شروع کردے کہ بدون اسکے عبادت ناقص ہے۔ اور تحصیل علم کا طریقہ سب سے افضل تو یہ ہے کہ عربی میں حاصل کیا جائے اگر اس کی ہمت نہ ہو تو اردو رسائل بھی آجکل دینیات میں بکثرت ہیں ان کو پڑھا جائے بقدر

ضرورت لو اسناد سے اسکے بعد اپنے مطالعہ سے اور مردوں کو چاہیئے کہ جتنا سبق پڑہیں اسکو گھر میں آکر مستورات کو سنائیں تاکہ ان کو بھی علم شریف حاصل ہو جائے اور جو یہ بھی نہ کر سکیں تو وہ ایک وقت فرصت کا مقرر کر کے کسی عالم سے مسائل کی کتاب سن لیا کریں مگر اسکے واسطے ہر بستی کے آدمیوں کو چندہ کر کے ایک عالم اپنے یہاں بلانا ہوگا اور یہ کچھ دشوار نہیں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم علماء سے ملتے جلتے ہی رہیں اور فرصت کے دنوں میں چند روز ان کے پاس رہ لیا کریں اور یہ ضرورت کی باتیں پوچھتے رہا کریں اس طرح بھی ان کو علم حاصل ہو جائے گا۔ اور انشاء اللہ وہ اس فضیلت سے کچھ حصہ پالیں گے جو اس حدیث کے اندر مذکور ہے جسکو میں نے ابتداء بیان میں پڑھا تھا اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس بے پروائی کا کچھ علاج نہیں۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ شانہٗ ہمکو فہم سلیم اور توفیق عمل عطا فرمائیں۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی ۲۵۶
خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۰
وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۰

اشرف علی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمی بہ

افناء المحبوب ——— لارضاء المطلوب

وہو کالجزء الثانی للوعظ المسمی بہ

انفاق المحبوب

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ماذا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	کیا مضمون تھا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	آیت کی تفسیر کو ذرا سا عام کر کے اس کے عموم میں ترک طلب احوال و کیفیات و ثمرات عاجلہ کو داخل کر کے انکے ترک طلب کی تاکید فرمائی جسکے اکثر ذاکرین طالب ہیں حاصل یہ ہوا کہ ترک طلب فضالات بھی انفاق محبوب میں داخل ہا در بدون اس ترک طلب کے ہر کامل حاصل نہ ہوگا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	

۲۵۷

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ۔

یہ دو آیتیں ہیں جن کا مضمون واحد ہے ایک میں اصل مضمون مذکور ہے دوسری میں اس کا تابع مذکور ہے حاصل آیت کا یہ ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتلائی ہے کہ خیر کامل کے حاصل کرنے کا طریق کیا ہے اور یہ ایسی بات ہے جسکو سب چاہتے ہیں کیونکہ جسکو ذرا بھی عقل ہو بلکہ عقل بھی نہو ذرا سا شعور ہو اور کچھ انسان ہی کی تخصیص نہیں بلکہ حیوانات بھی خیر کامل کے طالب

ہیں کیونکہ جانوروں کو بھی بعض امور سے رغبت ہے اور بعض سے نفرت ہے خواہ اعیان ہوں
یا اعراض پس جہاں ان کو مرغوب کے ملنے کی توقع ہو وہاں بھاگ کر جاتے ہیں اور جہاں
ضرب وقتل کا اندیشہ ہو وہاں سے بھاگ جاتے ہیں ہاں جو مخلوق بےشعور ہیں جیسے جمادات
ونباتات ان کو خیر کی طلب نہیں اگر واقع میں وہ بے شعور ہیں۔ اور اگر واقع میں ان کو
شعور ہے مگر قلیل جیسا کہ بعض حکماء نباتات میں شعور کے قائل ہوئے ہیں مگر یوں کہتے
ہیں کہ ان کو حیوانات سے کم شعور ہے تو اس قول پر ان کو خیر کی طلب تو ہوگی مگر قلیل
ہوگی بعض حکماء کہتے ہیں کہ نباتات میں شعور ہے کیونکہ [illegible] درخت کی بیل کو کسی رسی یا سیڑھی پر
لگا دو تو وہ سیدھی چلی جائیگی اسی طرح کوئی درخت سیدھا جارہا ہو اور اوپر کوئی آڑ ہو تو درخت اس تک
پہونچنے سے پہلے ہی رستہ میں سے مڑ جاتا ہے ان آثار کو دیکھ کر وہ نباتات میں شعور کے قائل ہوئے
ہیں اور صوفیہ کے نزدیک تو جمادات بھی ذی شعور ہیں اب ڈھیلا جو نیچے آتا ہے حکماء تو اس کو
حرکت قسریہ کہتے ہیں اور صوفیہ اسکو اپنے اصول پر حرکت ارادیہ کہہ سکتے ہیں گو اس کے معنی کہ ۲۵۸
ان کے نزدیک بھی حرکت قسریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ پیدا کیا ہے۔ غرض جس مخلوق میں
شعور ہے وہ خیر کا طالب ہے اب اگر تمام مخلوق ذی شعور ہے جیسا کہ صوفیہ قائل ہیں تو یوں
کہنا چاہیئے کہ ساری مخلوق خیر کی طالب ہے۔ اور اگر بعض ذی شعور ہیں اور بعض غیر ذی شعور
تو اکثر مخلوق خیر کی طالب ہے اور تمام مخلوق سے ہم کو کیا مطلب اس تقریر سے یہ تو
بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگیا کہ انسان میں تو ہر شخص خیر کا طالب ہے یہ اور بات ہے کہ خیر میں
اختلاف ہو کہ ایک شخص ایک چیز کو خیر سمجھتا ہے۔ دوسرا اسکو خیر نہ سمجھے چنانچہ بعض لوگ دریا
میں ڈوب کر مرجاتے ہیں وہ بھی خیر کے طالب ہیں کیونکہ وہ کسی سخت مصیبت یا پریشانی میں
اس فعل کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے نزدیک اس مصیبت کی ساتھ زندہ رہنے سے حیات
کو منقطع کردینا سہل اور بہتر ہوتا ہے وہ اس کو خیر سمجھکر ہی اختیار کرتے ہیں گو واقع
میں شر ہی ہو خواہ حالاً یا مآلاً تو اس لئے کہ ممکن ہے خودکشی اور غرق میں تکلیف
زیادہ ہوتی ہو ممکن ہے پانی کے اندر ڈوبتے ہوئے جان ایسی گھٹتی ہو کہ اس کی تکلیف
اس مصیبت سے بھی زیادہ ہو جس سے وہ بھاگنا چاہتا تھا چنانچہ بعض لوگوں نے بیان

کیا ہے کہ ذبح میں جان بہت دیر میں اور بڑی تکلیف سے نکلتی ہے۔ آجکل متمدن اقوام نے قصاص بالسیف کی جگہ پھانسی تجویز کی ہے یہ بھی سخت موذی ہے کیونکہ اس میں نہ ہوش رہنے کی کے لئے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور حلق میں جان نکلنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے پھانسی میں تڑپنے کی وجہ سے زبان باہر نکل آتی ہے اور صورت بگڑ جاتی ہے اور ان سے زیادہ متمدن اقوام نے ایک برقی کرسی تجویز کی ہے جس پر بیٹھتے ہی ایک سکنڈ میں جان نکل جاتی ہے نہ معلوم ایسی کیسی کشش ہوگی اور روح پر کیا گذرتی ہوگی مگر چونکہ دیکھنے والے کو اس تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اس لئے یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکلیف نہیں اور قتل میں لاش کے تڑپنے اور سر کے کٹنے خون بہنے کا منظر سامنے ہوتا ہے اس کو وحشی سزا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے ہاں یوں کہو کہ تم نے اپنی رعایت کر لی کہ تمہارے سامنے بھیانک منظر نہ ہو اور اس سے قیاس کر لیا کہ جب ہمارے سامنے بھیانک منظر نہیں تو واقع میں بھی کچھ زیادہ تکلیف نہیں مگر یہ قیاس الغائب علی الشاہد ہے اور یہی اصل ہے تمام معادیات کے انکار کی کہ جو چیز نظر سے غائب ہے وہ ان کے نزدیک معدوم محض ہے۔ انہوں نے عدم مشاہدہ کو عدم اصلی کی دلیل ۲۵۹
بنا لیا ہے حالانکہ امریکہ کا مشاہدہ پہلے ایک عرصہ تک نہ ہوا تھا تو کیا اس وقت وہ بھی معدوم اصلی تھا اور اس کا بطلان ظاہر ہے تو اب اس سوال کے کیا معنی کہ جنت ودوزخ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتی۔ ہم کو نظر نہ آنے سے یہ کیونکر لازم آیا کہ وہ معدوم ہیں اسی طرح تم اگر پھانسی یا برقی کرسی کی سزا میں تکلیف کا منظر نظر نہیں آتا تو اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ مرنے والے کو بھی تکلیف زیادہ نہیں ہوتی دلیل عقلی کا مقتضا یہ ہے کہ قتل میں مرنے والے کو کم تکلیف ہوتی ہے اور ان مہذب سزاؤں میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے کیونکہ موت نام ہے زہوق روح یعنی جان نکلنے کا اور جس طریق میں جان نکلنے کا راستہ پیدا کیا جائے یقیناً اس میں سہولت سے جان نکلے گی اور جن صورتوں میں گھونٹ کر یا دبا کر جان نکالی جائیگی اس میں سخت تکلیف سے جان نکلے گی گو دیر کم لگے یہاں سے شریعت کی قدر ہوتی ہے کہ اس نے مجرم کی ساتھ بھی احسان کیا ہے اور اسکی آسانی کی رعایت کی ہے کہ تلوار سے قصاص کا امر کیا ہے رہا یہ کہ اس کے دیکھنے والوں کو وحشت ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس غرض کیلئے قصاص شروع ہوا ہے یہ وحشت اس غرض کی

تحصیل بن معین سے یعنی زجر و تنبیہ کہ اس منظر کو دیکھکر ہر شخص خائف ہو جائے اور جرائم پر اقدام کرنے سے رک جائے۔ اور جو صورتیں اہل تمدن نے تجویز کی ہیں ان سے : دوسروں کو تو زجر و تنبیہ زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وحشت ناک منظر سامنے نہیں آتا البتہ مجرم کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور یہ سخت بے رحمی ہے جب ایک شخص کو جان ہی سے مارنا ہے تو اس کو راحت دیکر مارنا چاہیے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم عام فرمایا ہے اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ[عـه] جس میں قصاص کی بھی تخصیص نہیں بلکہ قتل کفار کو اور ذبح حیوانات کو بھی عام ہے پس شریعت نے ظالموں کی بھی رعایت کی ہے کہ ان کو بیرحمی اور بیدردی سے نہ مارا جائے اور نہ دوسروں کی بھی رعایت کی ہے دوسروں کی رعایت قصاص میں یہ ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا اُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ[عـه] ٥ کہ قصاص میں لوگوں کو جرائم سے زجر کامل ہوتا ہے ۔ میرا رسالہ ارشاد الہائم فی حقوق البہائم مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت نے حیوانات کے حقوق کی کس درجہ رعایت کی تو جب شریعت نے تمام مخلوق کی ساتھ سہولت کی رعایت کی ہو اسکو گاؤ منیا وغیرہ کا الزام دینا اور بیرحمی سے متہم کرنا کتنا صریح ظلم ہے واللہ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے اور ذبح حیوان رحم کے خلاف نہیں بلکہ ان کے حق میں اپنی موت مرنے سے مذبوح ہو کر مرنا بہتر ہے کیونکہ خود مرنے میں قتل و ذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہے رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو بھی ذبح کر دیا جایا کرے تاکہ آسانی سے مرجایا کرے اس کا جواب یہ ہے کہ حالت یاس سے پہلے ذبح کرنا تو دیدہ و دانستہ قتل کرنا ہے اور حالت یاس کا پتہ نہیں چل سکتا کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے پھر اچھے ہو گئے اور یہ شبہ اگر حیوانات میں کیا جاوے کہ ان کی تو یاس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا جواب یہ ہے کہ انسان اور بہائم میں فرق ہے وہ یہ کہ انسان کا تو ابقاء مقصود ہے کیونکہ خلق عالم سے مقصود وہی ہے اسی لئے ملائکہ کے موجود ہوتے ہوئے اسکو پیدا کیا گیا بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اسکو پیدا کیا گیا کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہوا کرتا ہے اسلئے انسان کے قتل و ذبح کی اجازت نہیں دی گئی ورنہ بہت لوگ ایسی حالت میں ذبح کر دیے جائیں گے

[عـه] جب تم قتل کرو تو عمدگی کے ساتھ کرو، اور جب ذبح کرو تو خوبی سے ذبح کرو۔

[عـه] اے فہیم لوگو! قصاص میں تمہاری جانوں کا بچاؤ ہے (اور یہ حکم اسلئے سنایا گیا ہے) کہ تم لوگ پرہیز رکھو

۳۶۰

جیسکے بعد ان کے تندرست ہو جانے کی امید تھی اور ذبح کرنیوالوں کے نزدیک بھی اس کی حالت تھی اور جانور کا ابقاء مقصود نہیں اسلئے ان کے ذبح کی اجازت اس بناپر دیدی گئی کہ ذبح ہو جانے میں عم[1] ان کو راحت ہے اور ذبح کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقاء انسان میں مفید ہے جسکا ابقاء مطلوب ہے، اگر اسکو ذبح نہ کیا جائے اور یوں ہی مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو مردہ ہو کر اسکے گوشت وغیرہ میں میت کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کے لئے مضر ہوگا تو ابقاء انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور قصاص وجہاد میں چونکہ افناء بعض افراد بغرض ابقاء جمیع الناس متعین ہے اسلئے وہاں قتل انسان کی اجازت دی گئی مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی کہ حتی الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے یعنی قصاص میں جو کہ قتل اختیاری ہے تلوار سے اور جہاد میں خندق وغیرہ کی ممانعت سے، غرض خودکشی میں گو سخت تکلیف ہوتی ہو حالاً تو احتمالاً، اور مآلاً باقتضاء وعید مگر جو شخص اسپر اقدام کرتا ہے وہ خبر ہی سمجھکر کرتا ہے اور وہ تکلیف مآلاً عذاب ہے جہنم کا جو کہ بہت ہی سخت ہے مگر لوگ جو بیفکر ہیں اور خودکشی پر اقدام ٢٦١
کرنے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عذاب جہنم سے غافل ہیں اسکو سوچتے نہیں (اسوقت ایک صاحب حضرت مولانا کے چہرہ کو برابر تک رہے تھے اسپر آپ نے تنبیہ فرمائی کہ یہ خلاف ادب وتہذیب ہے اس سے دوسرے شخص کا دل تنگ ہوتا ہے بس کبھی کبھی دیکھو اور کبھی نگاہ نیچی رکھو یہ کیا کہ باؤلوں کی طرح منہ تک رہے ہو معلوم ہوتا ہے کہ بیان ہی نہیں سمجھتے ورنہ یا تو حرکت اہتزاز یہ ہوتی اور یا استغراق ہوتا پھر ظرفہ یہ کہ یہ جو علماء نے لکھا ہے کہ عالم کے چہرہ کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے اس کا مطلب گھورنا اور تکنا نہیں ہے بلکہ یہی مراد ہے کہ کبھی کبھی اس کے چہرہ کی طرف دیکھ لیا جائے اور اس طرح دیکھا جائے کہ اس کو خبر بھی نہ ہو کہ کوئی مجھے تک رہا ہے کیونکہ اس سے اسکو تکلیف ہوگی دل پر گرانی ہوگی مگر لوگوں کو اس کا احساس ہی نہیں کہ دوسرے کو اس فعل سے گرانی کیونکر ہوتی ہے پھر ارشاد فرمایا کہ (۲) عذاب

[1] رہا یہ سوال کہ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ چونکہ انسان کا ابقاء مقصود ہے اسلئے اسکے حق میں راحت موت کی رعایت نہیں کی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت مقدسہ نے انسان کی راحت موت کا دوسرا سامان بنایا (۱) مقاومت جو جیسے زہوق روح کی شہید کو تکلیف نہیں ہوتی (۲) موت کے وقت لا الہ الا اللہ کی تلقین اور سورہ یٰسین کی تلاوت تاکہ اس سے تاثیر ان تسہیل النزع ۱۲ (۳) تعلق مع اللہ کا غالب کر لینا اس حالت میں شدت نزع کی بھی الم نہیں ہوتی ۱۲
اشرف

جہنم کا تحمل کوئی نہیں کرسکتا۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ جہنم میں مکث طویل کا ادنیٰ درجہ سات ہزار برس میں ہے حضرت جہنم کے اندر تو سات دن بھی کوئی عذاب کا تحمل نہیں کرسکتا مگر میں مسلمانوں کو بشارت دیتا ہوں کہ ان کو عذاب جہنم کا احساس کفار سے بہت کم ہوگا جس کی حقیقت مسلم کی ایک حدیث میں ان لفظوں سے بیان کی گئی ہے اَمَاتَهُمُ اللّٰهُ فِيْهَا اَمَاتَةً کہ حق تعالیٰ ان کو جہنم میں ایک قسم کی موت دیدیں گے۔ حدیث میں تو اتنا ہی ہے۔ شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ مومنین کو جہنم میں ایک مدت کیلئے ہلکی سی نیند آجائے گی۔ حدیث النوم اخو الموت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ نیز اس سے بھی کہ اَمَاتَهُمُ اللّٰهُ فِيْهَا اَمَاتَةً کا سیاق ۲۷۲
کلام بتا رہا ہے کہ حقیقی موت تو مراد نہیں ورنہ اماتۃً بڑھانے کی ضرورت نہ ہوتی صرف اَمَاتَهُمْ کافی تھا یہ طرز کلام بتا رہا ہے کہ خاص قسم کی موت مراد ہے جو موت کے مشابہ ہے حقیقی موت مراد نہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔ شیخ ابن عربی[عـہ] نے اسکے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ اس نیند کی حالت میں وہ یوں خواب دیکھیں گے کہ ہم جنت میں ہوں اور خود ان کے پاس ہوں۔ یہ بات کہنے کی تو نہیں کہیں مسلمان بےفکر نہ ہو جائیں کہ بس جہنم میں جا کر مزے سے سوئیں گے اجی ہاں کبھی جاگو گے تو موہی نہیں اگر تھوڑی دیر کو بھی جاگ گئے تو نانی یاد آجائے گی۔ غرض کہ [illegible] ہے خودکشی کا مگر اسکو انسان سوچتا نہیں ہے اسلئے خودکشی کو حالت موجودہ سے بہتر سمجھ کر اختیار کرتا ہے پس ہر شخص اپنے نزدیک خیر ہی کا طالب ہے۔ اب اس میں اختلاف رہا کہ صحیح طریقہ اس خیر کے حاصل کرنے کا کیا ہے اور حقیقی خیر کیا ہے اور جو صحیح طریقہ ہوگا وہ یقیناً خیر حقیقی کی طرف موصل ہوگا ورنہ وہ طریق صحیح نہ ہوگا بلکہ غلط ہوگا سو حق تعالیٰ اس آیت میں طریق صحیح تحصیل خیر کا بتلاتے ہیں۔ اور اس کا ربط اوپر کی آیات سے یہ ہے کہ اوپر کفار کا ذکر ہے کہ وہ قیامت میں زمین کی برابر بھی سونا دیکر عذاب سے چھوٹنا چاہیں تو نہیں چھوٹ سکیں گے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ اس میں تو یہ بتلایا گیا ہے کہ کفار کو اس مال سے کچھ نفع نہ ہوگا اب اسکے مقابل مسلمانوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کو بیشک اموال سے نفع حاصل ہوگا وہ یہ کہ مسلمانوں کو انفاق مال سے خیر کامل حاصل ہوگی مگر اس سے پہلے کچھ شرائط ہیں جنکا ذکر اس آیت میں ہے مگر میں ان کو بعد میں بیان

عـہ وہ شرط اس شیخ کی مجوزہ ہے جو لبید میں مذکور ہے ۱۲۔

کروں گا غرض حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار کے ذکر کے ساتھ مسلمانوں کا ذکر فرماتے ہیں اور بالعکس اور اسی معاملہ کے متعلق ذکر ہوتا ہے جسکے متعلق کفار کا ذکر تھا اور ایک کے ساتھ قہر کا خطاب اور عین اسی موقع پر دوسرے کے ساتھ لطف کا خطاب فرماتے ہیں اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ کلام حق تعالیٰ کا ہے کیونکہ عدم تغیر و عدم تاثر خاصہ واجب کا ہے واجب تعالیٰ کسی سے متاثر نہیں ہوتا باقی سب مخلوق متاثر ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دشمن پر غصہ ہو رہا ہو تو اس حالت غضب میں اگر دوست آجائے تو اسکی ساتھ بھی گفتگو میں غصہ کا اثر باقی رہتا ہے گو طرز نرمی کی ہو۔ اور حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ قرآن میں کفار پر لتاڑ ڈال رہے ہیں اور نہایت شدت کے ساتھ اپنے غضب کا اظہار فرما رہے ہیں پھر اس کے ساتھ ہی مومنین کا ذکر ہے تو غایت لطف و عنایت کے ساتھ ان کو خطاب کیا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ میں تغیر و تاثر اصلا نہیں ہے۔ اسی لئے
۲۶۴ محققین نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ پر غضب و رحمت کا اطلاق باعتبار مبادی کے نہیں ہے بلکہ غایات کے اعتبار سے ہے چنانچہ غضب کی غایت ہے نافرمان کو اپنے مقام قرب سے دور کر دینا اسپر لعنت و نفرین کرنا اسکو سزا دینا اور رحمت کی غایت ہے مطیع کو مقرب بنا لینا اس کی مدح و ثنا کرنا اعلیٰ خطابات سے مشرف و ممتاز کرنا اور اسپر انعام و فضل کرنا وغیرہ وغیرہ تو ان غایات کے اعتبار سے حق تعالیٰ پر غضب و رحمت کا اطلاق کیا جاتا ہے نہ اس معنی کر کہ حق تعالیٰ کو غصہ میں جوش ہوتا ہے یا رحمت کے وقت ان پر رقت ہوتی ہے ہرگز نہیں بلکہ حق تعالیٰ کا غضب و رحم سب ارادی ہے اضطراری نہیں (یعنی تعلق فعل غضب و رحم اختیاری ہے یہ مطلب نہیں کہ غضب و رحم بمرتبہ صفت بھی اختیاری ہے کیونکہ ہر صفت ذات درجہ صفت میں غیر اختیاری ہے ۱۲) اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ شعرا سلئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کا محبوب بامعنی بنایا ہے کہ نعوذ باللہ گویا حضور کو دلہن وغیرہ کی طرح معشوق بنایا ہے۔ اور حق تعالیٰ کو عاشق قرار دیا ہے گویا اللہ تعالیٰ کو جوش محبت ہے یہ محض غلطی اور گستاخی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جوش محبت نہیں ہوتا نہ جوش غضب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے لئے جوش ہونا نقص ہے ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے یہ کمال ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا جوش ہو غرض اللہ تعالیٰ کفار کے ذکر کے

ساتھ ہی مسلمانوں کو تسلی دیتے ہیں کہ تم اس وعید سے بےفکر رہو تمہارا انفاق مال بیکار نہیں بلکہ بہت کارآمد ہے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بعض وقت دشمن اور مجرم پر عتاب ہوتا ہوا دیکھ کر دوستوں کو بھی خطرہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم پر عتاب نہ ہونے لگے اور اس کا زیادہ احساس حضرات صحابہ کو ہوتا تھا اور ان سے بڑھکر حضرات انبیاء علیہم السلام کو اور ہم کو اسکا احساس اسلئے کم ہوتا ہے کہ اول تو ہمکو اپنے اعمال پر ناز ہے کہ ہم تو مسلمان ہیں نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں تلاوت قرآن کرتے رہتے ہیں ذکر و شغل کرتے ہیں ہم پر عتاب کیوں ہونے لگا۔ دوسرے ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی شان استغناء سے غافل ہیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام باوجود معصوم ہونے کے لرزتے کانپتے رہتے تھے۔ اور شان استغناء کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کو رحم نہیں جیسا جاہل موت کے موقعہ پر لوگ جمع ہو کر کہا کرتے ہیں کہ ہائے کیسا جوان تھا ابھی دنیا کو کچھ بھی نہ دیکھا تھا ابھی چار دن ہوئے شادی ہوئی تھی چھوٹے ۲۶۴ چھوٹے بچے چھوڑ رہے ہیں یہ سب باتیں سنکر ایک بوڑھا بجکڑ کہتے ہیں کہ میاں خدا کی شان بڑی بے پرواہ ہے اس موقعہ پر یہ کلمہ سخت گستاخی کا ہے جسکے صاف یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو نعوذ باللہ کسی کی مصلحت کی ذرا پروا نہیں نہ کسی پر رحم ہے حالانکہ بجز احق تعالیٰ سے زیادہ بندہ کی مصالح کی رعایت کوئی نہیں کرسکتا تو دیتہ بھی اپنی مصالح کی اتنی رعایت نہیں کرسکتا جتنی اللہ تعالیٰ اس کی مصالح کی رعایت فرماتے ہیں مگر یہ کہ وہ تم کو بھی تلادیں اس کی کیا ضرورت ہے اور اجمالاً تلا بھی دیتے ہیں عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ یعنی ممکن ہے کہ تم کسی چیز سے کراہت کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز سے رغبت کرو اور وہ تمہارے لئے مضر ہو۔ حقیقت میں منع ہے جس میں احتمال کلی کافی ہے ہر ہر جزئی کے متعلق تعیین کے ساتھ مصالح و مضار کا تلانا بالغ کے ذمہ نہیں اور نہ اس کی اللہ تعالیٰ کو ضرورت ہے کیونکہ وہاں شخصی حکومت ہے جمہوری حکومت نہیں ہے اکہ بادشاہ کو دوسرے سے زیادہ کا اختیار نہیں ہوتا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شخصی حکومت میں تخلق باخلاق اللہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکومت بھی شخصی ہے صاحبو باپ بیٹے کو نصیحت کرتا ہے اگر وہ باپ کی نصیحت میں شبہ

کرنے لگے تو وہ ایک دھول لگاتا ہے جواب میں نالائق سے اپنے قول کو مدلل نہیں کرتا تو کیا خدا کو محتاجی بھی نہو۔ ہاں کبھی خود چاہیں تو اپنے افعال کی حکمتیں کسی موقعہ پر بیان بھی فرما دیتے ہیں اور کبھی خواص کو ان اسرار کا الہام ہوجاتا ہے مگر یہ کب ہوتا ہے جبکہ اسرار کی طلب نہو کیونکہ طالب اسرار کو کشف اسرار میسر نہیں ہوتا جنت و نماز روزہ کا طلب کرنا تو مطلوب ہے مگر اسرار وحکم کا طلب کرنا ممنوع ہے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

حدیث مطرب ومی گو و راز دہر کمتر جو　　که کس نکشود ونکشاید بحکمت این معما را

ہاں مجذوبین کچھ اسرار بیان کردیتے ہیں مگر وہ اسرار ہی کیا ہیں صرف کونیہ ہوتے ہیں جو تکوین کے متعلق ہوتے ہیں کہ فلاں دن بارش ہوگی فلاں سنہ میں جنگ ہوگی ایک بادشاہ معزول ہوگا فلاں شخص مقدمہ میں کامیاب ہوگا وغیرہ وغیرہ باقی اسرار الٰہیہ کی ان کو کیا خبر کچھ نہیں لوگ خواہ مخواہ ان کے پیچھے پھرتے ہیں۔ یہ بھی ایک مطلب ہوسکتا ہے عارف کے اس شعر کا ؎

راز دروں پردہ زرندان مست پرس　　کیں حال نیست صوفی عالی مقام را ۲۶۵

کہ اسرار کونیہ کو مجذوبوں سے پوچھو صوفیان عالی مقام کو اس کی خبر نہیں اس میں یہ بھی بتلا دیا کہ یہ اسرار کچھ قیمتی نہیں ورنہ بڑے لوگوں کے پاس ضرور ہوتے۔ غرض طلب اسرار ممنوع ہے اور بلا طلب بھی مقصود نہیں اسی لئے حق تعالیٰ نے بیان نہیں فرمائے ہاں اجمالاً اتنا فرما دیا ہے کہ عَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ بندہ کے مصالح کی رعایت کوئی نہیں کرسکتا مگر ان کو بتلانے کی ضرورت نہیں پس حق تعالیٰ کے استغناء کے یہ معنی نہیں کہ ان میں رحم نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج اور کسی سے عاجز نہیں اسی قدرت و عدم احتیاج پر نظر کرکے انبیاء علیہم السلام ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے ہیں خصوصاً جس وقت کسی پر عتاب ہوتا ہے۔ خواہ کفار ہی پر ہو اس وقت تجلی جلال کا مشاہدہ کرکے وہ بہت لرزنے لگتے ہیں کہ خدا خیر کرے کہیں ہم پر بھی عتاب نہ ہونے لگے کیونکہ اول تو اس وقت تجلی جلال کا مشاہدہ ہی ایسا غالب ہوتا ہے کہ اپنی معصومیت و مقبولیت پر نظر نہیں رہتی ؎

چو سلطان عزت علم برکشد　　جہاں سر بجیب عدم درکشد

اور نظر بھی ہو تو اس وقت شان استغناء ان کے پیش نظر ہوتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے

وعدہ کو منسوخ کردیں اور اسپر یقیناً وہ قادر ہیں تو ان کو رد کرنے والا کون ہے دوسرے ان کو یہ احتمال بعید بھی ہو سکتا ہے کہ شاید یہ وعدۂ رحمت کسی خاص شرط کے ساتھ مشروط ہو جسکی ہم کو خبر نہ ہو۔ اگر اس سے بھی نہ سمجھے ہو تو یوں سمجھو کہ عظمت و ہیبتِ ذات کا اثر کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں بلکہ وہ بلاشرط ہوتی ہے جیسے شیر کی ہیبت طبائع میں فطری ہے پس اگرچہ شیر کٹہرے میں بند ہو اور عقلاً ہم جانتے ہوں کہ ہمارا کچھ نہیں کر سکتا لیکن اگر وہ اس حالت میں بھی گھور کر ہماری طرف دیکھے اور غراوے تو یقیناً ہیبت کا غلبہ ایسا ہو گا کہ تمام مقدمات عقلیہ ذہن سے غائب ہو جائیں گے جب ایک شیر کی ہیبت کی یہ حالت ہے تو خدا تعالیٰ کی ہیبت کی کیا شان ہونا چاہئے یہی حال امام غزالی پر ایک مدت طویلہ تک غالب رہا جس کی وجہ سے ایک نصرانی طبیب نے ان کا قارورہ دیکھ کر یہ کہا تھا کہ اس شخص پر خوف غالب ہے اور خوف بھی خالق کا یہی وجہ ہے کہ
ان کی کتاب احیاء العلوم کی کتاب الخوف دیکھنے کا کسی کو تحمل نہیں بعض لوگ اس کو دیکھ کر مایوس ۳۶۶
ہو گئے اس لئے میں اس کے مطالعہ سے اکثر کو منع کر دیتا ہوں اس کا تحمل اہل اللہ ہی کو ہوتا ہے حق تعالیٰ اولیاء کرام کو قوت دیتے ہیں پھر خوف دیتے ہیں اس لئے وہ اس کا تحمل کر لیتے ہیں اور دوسروں کو اس حالت کا تو کیا تحمل ہو گا اگر اولیاء ان کے سامنے اپنی حالت ظاہر کریں تو سننے والے کا جگر پھٹ جائے باقی اہل اللہ کو تو ہر دم موت ہی رہتی ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جان دیگر ست

یہی ہیں جو اس موت و حیات کا تحمل کرتے ہیں دوسروں کو ان کے حال کی کیا خبر ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

اسی کے متعلق عارف فرماتے ہیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

عوام کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا مگر جن پر گذرتی ہے وہ جانتے ہیں کہ واقعی اس کا بار تحمل نہ آسمان کر سکتا ہے نہ زمین۔ یہ مضمون طویل ہو گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ کفار کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی تسلی اسلئے فرماتے ہیں تاکہ عتاب کو سنکر اہل اللہ لرزنے نہ لگیں یہ تو ربط کا بیان تھا اس آیت میں اور آیات سابقہ میں۔ اب مقصود کو عرض کرتا ہوں۔ اور جو مضمون میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ

بظاہر اس نص کے تحت میں داخل نہیں لیکن میں قیاس سے نص میں تعمیم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد وہ حکم نص ہی سے ثابت ہوگا کیونکہ اصول میں یہ طے ہو چکا ہے اَلْقِیَاسُ مُظْہِرٌ لَا مُثْبِتٌ کہ قیاس سے نص کی مراد ظاہر ہوتی ہے کوئی نیا حکم ابتداءً ثابت نہیں ہوتا۔ اب سمجھو کہ نص کا منطوق ظاہری کیا ہے اور مفہوم باطنی کیا ہے سو اس کے لئے اول ترجمہ سننا چاہئے۔ الله تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم خیر (کامل) کو ہرگز نہیں پا سکتے جبتک وہ چیز خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہے ابرت مراد یہاں پر خیر کامل ہے اول اس لئے مطلق کہ اِذَا اُطْلِقَ یُرَادُ بِہِ الْفَرْدُ الْکَامِلُ مسئلہ عقلیہ ہے دوسرے دیگر نصوص و قواعد شرعیہ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں خیر کامل مراد ہے۔ حَتّٰی تُنْفِقُوْا یہ غایت ہے اور عربی میں غایات افعال کو صیغہ اثبات سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور اردو میں صیغہ نفی سے تعبیر کیا جاتا ہے پس ترجمہ یہ ہوگا کہ جب تک خرچ نہ کرو گے یہ تو ترجمہ ہے۔ اور بظاہر یہاں انفاق خاص ہے انفاق مال کے ساتھ مگر میرے دل میں ایک بار یہ آیا تھا کہ یہ عام

۲۶۷ ہے انفاق مال و بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم وغیرہ سب کو اور شاید میں نے ایک بار یہ بیان بھی کیا تھا کہ اگر لغت مساعدت کرے تو اس کو عام لینا چاہیئے (جامع وعظ نے کہا کہ اسی آیت کا بیان ایک دفعہ ہو چکا ہے اور اس میں یہ مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ مجھ کو اس وقت یہ بات یاد نہ تھی کہ اس آیت کا بیان پہلے بھی ہو چکا ہے اچھا اب اسکو پہلے وعظ کا حصہ دوم سمجھنا چاہیئے ۱۲) پھر میں نے علامہ قسطلانیؒ کا ایک قول دیکھا جس سے میرے خیال کی تائید ہوئی اور قسطلانی کا قول اس طرح نظر سے گذرا کہ میں اس آیت کی تفسیر حدیث میں دیکھ رہا تھا کیونکہ حدیث میں اس کے متعلق حضرت ابو طلحہ کا قصہ مذکور ہے کہ وہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے سبحان اللہ! حضرات صحابہ کا بھی کیا حال تھا کہ ہر آیت کے نزول کے بعد یہ متعد رہتے تھے کہ ہم سے اس پر عمل ہوا ہے یا نہیں دوسرا کمال یہ تھا کہ عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کرتے تھے چنانچہ اس مشورہ کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تو کسی صحابی کی رائے کی تصویب فرماتے اور کبھی اس میں ترمیم فرما دیتے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی توبہ قبول ہونے پر اپنا تمام مال صدقہ کرنا چاہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ لیا تو حضور نے تمام مال کے صدقہ کرنے سے منع فرمایا یہ قاعدہ ہے کاملین سے مشورہ لیتے ہیں۔

ف ۵ معنی کامل جب اطلاق ہوتا تو بدل عوض کامل مراد ہوتا ہے

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ طبعاً متبع سنت واقع ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے بھی ایک شخص کو تمام جائداد کے وقف کرنے سے منع فرمایا تھا جس میں ایک سنت نبویہ سے بلا قصد موافقت ہو گئی غرض حضرت ابوطلحہؓ حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ

إِنِّي أَرَى اللّٰهَ تَعَالَى يَقُولُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَإِنَّ أَحَبَّ أَمْوَالِي إِلَيَّ بَيْرُحَاءَ فَهِيَ صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالَى فَضَعْهُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ حَيْثُ أَرَاكَ اللّٰهُ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ مَالٌ رَابِحٌ أَوْ رَائِحٌ وَأَرَى أَنْ تَضَعَهُ فِي عَشِيرَتِكَ الْأَقْرَبِينَ۔

(اوکما قال) یعنی یا رسولؐ اللہ میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے نیل بر کو انفاق محبوب پر موقوف فرمایا ہے اور میرے اموال میں سب سے زیادہ محبوب مجھے بیرحاء ہے (جو ایک باغ کا نام ہے) تو میں اسکو اللہ کے نام پر صدقہ کرتا ہوں آپ جہاں مناسب سمجھیں اسکو صرف کر دیں حضورؐ نے فرمایا شاباش یہ مال نفع دینے والا ہے یا ختم ہونے والا ہے (اسلئے کسی مصرف خیر میں صرف کر دینا اچھا ہے) مگر میری رائے یہ ہے کہ تم اسکو اپنے غریب قرابت داروں میں تقسیم کر دو حضرت انسؓ ۳۶۸ کہتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہؓ نے حضورؐ کے ارشاد کے موافق اس باغ کو حضرت حسان ابی بن کعب کے درمیان تقسیم کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ان کے قریب تھے اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں ان دونوں سے زیادہ قریب تھا مگر مجھے اس میں سے کچھ نہیں دیا ان روایتوں میں بظاہر تعارض ہے مگر محدثین نے دونوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ حضرت انسؓ باعتبار خدمت و اختلاط کے قریب تھے کیونکہ ہر وقت ایک ہی گھر میں ان کے پاس رہتے تھے۔ اور حضرت حسان و ابی بن کعب باعتبار نسب کے قریب تھے۔ سبحان اللہ خوب تطبیق ہے۔ اور یہ بھی ایک عظیم الشان فن ہے جو اللہ تعالیٰ نے محدثین و فقہاء کی ساتھ مخصوص کیا ہے۔ جس کی بنیاد محض تخلیل و تاویل ہی پر نہیں جیسا بعض نادانوں کا خیال ہے بلکہ نہ واقعی طور پر تطبیق دیتے ہیں اور اس کی ضرورت ہے بدون اس کے چارہ نہیں کیونکہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ صادقین میں تعارض نہیں ہو سکتا تو جب دو حدیثیں سند صحیح کیساتھ مروی ہوں اور دونوں میں تعارض ہو تو رفع تعارض لازم ہے غرض میں حدیث میں حضرت ابوطلحہؓ کا یہ قصہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی علامہ قسطلانی کا یہ قول نظر سے گذرا انفاق محبوب میں

بذل جاہ و بذل نفس و بذل علم بھی داخل ہے اس سے میرا دل بہت خوش ہوا لیکن اگر لغت سے اس کی تائید نہ ہو اور انفاق ان سب کو عام نہ ہو تو علامہ قسطلانی پر پھر بھی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے عموم لفظ کی وجہ سے بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم کو اس آیت میں نہیں داخل کیا بلکہ دلالۃ النص کی وجہ سے داخل کیا ہے کیونکہ مال بمقابلہ جاہ و نفس و علم کے ادون ہے تو جب انفاق مال سے بر کامل حاصل ہوتی ہے جو ادنی ہے تو بذل اعلیٰ سے بدرجہ اولیٰ بر کامل حاصل ہوگی۔ غالباً اسی بنا پر بیضاوی نے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کی تفسیر میں بعض صوفیہ کا قول نقل فرمایا ہے وَمِنْ اَنْوَارِ الْمَعْرِفَةِ يُفِيْضُوْنَ کہ انہوں نے افاضۂ انوار معرفت کو بھی انفاق میں داخل کیا ہے کیونکہ یہ انفاق مال سے اعلیٰ ہے تو جب ادنی کا انفاق محمود ہے اعلیٰ کا انفاق کیوں محمود نہ ہوگا اور بیضاوی کی نقل اس بات کی کافی حجت ہے کہ یہ قول محتمل صحت ہے اب چاہے انفاق کو لغۃً عام کہا جائے یا دلالۃ النص کی وجہ سے عام کہا جائے بہرحال تعمیم غلط نہیں بلکہ اگلی آیت کے ربط کیلئے تعمیم ضروری ہے بغیر اسکے چارہ نہیں کیونکہ اس کے بعد یہ آیت ہے كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰي نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ - جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے اور وہ قصہ جیسا مفسرین نے عام طور پر بیان کیا ہے یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو ایک دفعہ مرض عرق النساء ہوا تھا جسکے علاج میں آپ کو اونٹ کے گوشت سے بہت نفع ہوا تھا تو آپ نے نذر کی تھی کہ اگر مجھے اس مرض سے شفا ہوگئی تو اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دونگا حالانکہ وہ آپ کو محبوب تھا کیونکہ مرض میں نافع ہوا تھا مگر آپنے ترک مرغوب کی اسلئے نذر کی کہ ترک مرغوب خدا کو محبوب ہے تو اس قصہ کا ربط سابق سے جبھی ہوگا کہ انفاق کو عام کیا جائے اور ترک مرغوب کو بھی انفاق میں داخل کیا جائے۔ اور اگر انفاق کو مال کیساتھ خاص کیا گیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس قصہ کو لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۥ سے ربط نہ ہوگا (یعنی ربط عــہ ظاہر نہ ہوگا ورنہ ربط خفی ممکن ہے ۱۲ ظ) غرض بیضاوی اور قسطلانی کا قول دیکھکر مجھے تعمیم انفاق کی ہمت ہوتی ورنہ اس سے پہلے اس خیال کے اظہار کی جرأت نہ ہوتی تھی اور یہی میں

عــہ انا قلت ذلک لما رایت الشیخ قد ربط الآیات فی تفسیرہ بیان القرآن بغیر ہذا الربط الذی ذکرہ مبتنا فافہم ۱۲ ظ

علماء و طلبہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تفسیر قرآن کے متعلق جب کوئی بات (۱) کہ سمجھ میں آیا کرے تو جب
تک سلف کے کلام میں اس کی تائید نہ مل جائے اسوقت تک اس پر اعتماد نہ کیا کریں کیونکہ تفسیر
بالرائے بہت سخت ہے۔ اب میں مقصود عرض کرتا ہوں جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہاں انفاق
عام ہے بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم و ترک مرغوب وغیرہ سب کو خواہ اس تعمیم کا ثبوت نص سے
ہو دلالۃ النص ہو یا قیاس ہو تو اب سمجھئے کہ ترک مرغوب میں یہ بھی داخل ہے کہ احوال و کیفیات
کے درپے نہ ہو شوق و ذوق و جوش و خروش کا طالب نہ ہو۔ یہ چیزیں سالکین کو مرغوب ہیں مگر
ان مرغوبات کی طلب کو ترک کر دینا چاہئے کیونکہ یہ بھی انفاق محبوب میں داخل ہے اور بدون
اس کے برکامل حاصل نہ ہوگی۔ سالکین کو یاد رکھنا چاہئے کہ محبت کی دو قسمیں ہیں (۱) محبت عقلیہ
(۲) محبت طبعیہ۔ اور ان دونوں کے فرق کو اہل فن ہی سمجھتے ہیں جس کو معلوم نہ ہو اہل فن سے سمجھے
ان دونوں میں سے محبت عقلیہ ہے باقی طبعیہ سو وہ محمود تو ہے مگر مقصود نہیں گو ظاہر میں
یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت طبعیہ افضل ہے عقلیہ سے کیونکہ طبعی محبت میں ایک خاص جذب و کشش ۲۷
ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس میں احتمال زوال یا انقلاب کم ہے اور عقلیہ میں جذب و کشش نہیں ہے
تو اس میں احتمال ہے کہ کسی وقت زائل ہو جائے مگر یہ محض خیال ہے جو محقق نہیں صحیح فیصلہ
اس باب میں یہ ہے کہ محبت عقلیہ ہی افضل ہے کیونکہ اس کا مدار اعتقاد پر ہے اور عادۃً
اعتقاد بہت کم بدلتا ہے۔ الا نادر اً والنادر کالمعدوم اور محبت طبعیہ کا منشا ہیجان نفس ہے
اور جوش و خروش میں ہمیشہ تبدل ہوتا رہتا ہے تو اس میں خطرہ زیادہ ہے کیونکہ یہ شخص
جوش ہی سے کام کرنیکا عادی ہو جائے گا جب جوش نہ رہے گا تو کام چھوڑ بیٹھے گا چنانچہ
ہم نے ایسے لوگ بہت دیکھے ہیں جو طریق میں حالات و کیفیات ہی کے سہارے پر چلتے ہیں اور
جہاں احوال بند ہوئے کام بھی بند کر دیا کل ہی ایک صاحب کا خط آیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ
ذکر میں جی نہیں لگتا بعض دفعہ خیال ہوتا ہے کہ چھوڑ دوں یہ شخص اسی کا منتظر ہے کہ ذکر
میں جی لگے تو کروں تو یہ شخص لذت کو مطلوب بنائے ہوئے ہے خدا کو مطلوب نہیں سمجھتا ورنہ کسی
حال میں اس کی یاد کو ترک کرنے کا ارادہ نہ کرتا۔ اس غلطی میں عام طور پر سالکین مبتلا ہیں تو ان کو
سمجھ لینا چاہیئے کہ لذت و شوق مطلوب نہیں بلکہ مطلوب عمل ہے۔ اگر لذت مطلوب ہوتی تو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم اسباغ وضوء علی المکارہ کی فضیلت بیان نہ فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی حالت میں عمل کرنا زیادہ افضل ہے کہ عمل کو جی نہ چاہتا ہو دل پر گرانی ہو مگر بعض سالکین کی غلطی دیکھو کہ ایسی حالت میں عمل کو خیر باد ہی کہہ دیتے ہیں اس سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ عمل میں اگر جوش نہ ہو تو ایک حیثیت سے زیادہ افضل ہے تاکہ وہ عمل زیادہ خالص اللہ کیواسطے ہوگا لذت کے واسطے نہ ہوگا اسی لئے صوفیہ نے فرمایا ہے کہ قبض بسط سے افضل ہے ایک تو وہی وجہ جو میں نے ابھی بتلائی ہے دوسرے یہ وجہ ہے کہ قبض میں اپنی ذلت و عجز کا مشاہدہ زیادہ ہوتا ہے اسوقت سالک اپنے کو کافر سے بھی بدتر سمجھتا ہے فرعون سے بھی کمتر جانتا ہے حالانکہ اس کی ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کافر ہے میں مومن ہوں اور اس علم کا مقتضا یہ تھا کہ اپنے کو کافر سے افضل سمجھتا مگر اس طریق میں ہجے اور ہیں رواں اور جیسے کسی نے کہا تھا تے بے زبر تب بے تے زبر بت بطخ تو ہجے تھے تبت کے اور رواں پڑھی بطخ۔ یہی حال اس طریق میں ہے کہ ظاہراً تو کہ حقیقتہ مقدمات اور دلائل کا مقتضا کچھ اور ہے اور حالت دوسری ہے اسکو اہل حال ہی سمجھتے ہیں کہ قبض میں سالک اپنے کو باوجود مومن سمجھنے کے فرعون سے بھی بدتر کیونکر سمجھتا ہے۔ غرض قبض میں ذلت و عجز کا مشاہدہ زیادہ ہے جو بسط میں نہیں بلکہ بسط میں بعض اوقات عجب وغیرہ کا اندیشہ بھی ہو جاتا ہے اس لئے صوفیہ نے قبض کو بسط سے افضل کہا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

۲۲۱

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بیں — تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو — آں صلاح تست آیس دل مشو

پس احوال و کیفیات اور شوق و ذوق کے سہارے پر عمل نہ کرنا چاہیئے بلکہ عمل ہی کو مقصود سمجھنا چاہیئے عارف فرماتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

یہ تو مزدوروں کی خصلت ہے کہ کام کرنے سے پہلے پوچھتے ہیں کہ کیا ملے گا اور جب تک مزدوری کا ماننا معلوم نہ ہو اسوقت تک کام ہی نہیں کرتے غلام کی یہ شان نہیں ہوتی غلام کو تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ میں تو سر سے پیر تک آقا کا ہوں میری ہر چیز اسی کی ہے پھر مزدوری کیسی ایک بے نمازی تھانہ دار کا

قصہ ہے کہ اس کی بیوی نماز پڑھتی تھی اور وہ اس سے پوچھتا تھا کہ نماز پڑھنے سے تجھکو کیا ملا۔ افسوس خدا کی عبادت کے متعلق یہ سوال کہ تجھکو کیا ملا۔ کیا کوئی بیٹے سے بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ تجھکو باپ کی خدمت سے کیا ملا؟ ہرگز نہیں بہرحال نہ دار مجھسے پوچھتا تو میں جواب دیتا کہ ہمکو نماز ملی۔ ارے نماز خود مقصود ہے بندگی اور عبادت خود مطلوب ہے کسی عمل کے متعلق یہ سوال کہ اس سے کیا ملا اسوقت ہو سکتا ہے جبکہ عمل خود مقصود نہو باقی مقاصد میں یہ سوال نہیں ہو سکتا۔ ہمارے حاجی صاحب امام وقت تھے آپ سے جب کوئی کہتا کہ ذکر سے نفع نہیں ہوتا فرماتے یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم ذکر رہے ہو یعنی بندگی کا مقتضا یہ ہے کہ ذکر ہی کو خود مقصود سمجھے یہ کیا بندگی ہے کہ مزا آیا تو کرلیا ورنہ چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہاں ذکر پر جس ثمرہ کے مرتب ہونیکا وعدہ ہے وہ ضرور ملے گا دنیا میں تو صرف یہ وعدہ عامہ ہے کہ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ احکم الحاکمین آپ کو یاد کریں اور آخرت میں مغفرت وجنت کا وعدہ ہے باقی ان احوال وکیفیات کا تو کہیں وعدہ بھی نہیں۔ صاحبو! ان احوال وکیفیات کی مثال ایسی ہے جیسے کھانے کی ساتھ سرکہ چٹنی۔ اب اگر کسی وقت دسترخوان پر سرکہ چٹنی نہو تو کیا آپ کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میں تو کھانا بھی نہیں کھاتا۔ اگر چٹنی سرکہ ہی کھایا کروگے تو دماغ چٹنی ہوجائیگا کہ نہ مرکے رہوگے نہ پیرکے ؎

بدرد وصاف ترا حکم نیست دم درکش که هرچه ساقی ما کرد عین الطاف ست

وہ طبیب بڑا کریم ہے جو ہر مریض کو اسکے مزاج کے موافق دوا وغذا دے پس حق تعالیٰ جسکو جس مزاج کا دیکھتے ہیں وہی عطا فرماتے ہیں تمہارے لئے ممکن ہے کہ یہی مناسب ہو کہ احوال و کیفیات نہ دیں شوق وذوق کا غلبہ نہو پس تم کو جو عطا ہو اسے لیلو۔ تم کو اگر احوال عطا ہوجاتے تو تمہارے لئے شاید یہ خطرہ ہوتا کہ اگر یہ انفعالات نہ رہتے تو تم افعال ہی سے رہ جاؤگے اور یہاں سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ بیان پہلے بیان کا تتمہ ہے اس میں یہ بیان تھا کہ انفعالات مطلوب نہیں بلکہ افعال مطلوب ہیں آج اس کا بیان ہے کہ ترک طلب انفعالات بھی انفاق محبوب میں داخل ہے اور انفاق محبوب پر حصول بر کامل موقوف ہے تو بدون ترک طلب انفعالات کے بر کامل حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ طلب انفعالات میں ایک تو یہی

ع ان نعمتوں پر تم مجھکو یاد کرو میں تمکو یاد رکھوں گا پارہ ۲ رکوع ۲

۲۷۲

خطرہ ہے جاؤ پر مذکور ہوا کہ اگر ان حالات نہ ہے تو تم اعمال ہی سے رہ جاؤ گے دوسرے یہ کہ شیخ
سے بدظن ہو جاؤ گے۔ اول اس سے شکایت کرو گے کہ مجھے ذکر وغیرہ سے تاثر نہیں ہوتا
حالات طاری نہیں ہوتے اور یہ بات شیخ کے اختیار سے باہر ہے شیخ کے قبضہ میں تو خود
اپنے احوال بھی نہیں وہ تم کو حالات کہاں سے دیدے پھر جب تم کو حالات حاصل نہوں گے تو
پھر شیخ کی شکایت کرو گے اور اپنے دل میں کہو گے کہ شیخ بس ایسا ہی ہے صاحب تصرف نہیں۔
ارے عقلمند! شیخ کو صاحب تصرف ہونا چاہیئے کہ اس کی صحبت سے تم کو معرفت حاصل ہو جائے
تصرف کی کیا ضرورت ہے یہ تو جوگی بھی کر بیٹھتے ہیں انگریز بھی کرتے ہیں ایک انگریز نے کلکتہ میں
ایک بچہ کو توجہ دی تو وہ اقلیدس کی شکلیں بیان کرنے لگا اور اکثر تصرفات ایسی توجہ سے ہوتے
ہیں جس میں خدا کی طرف بھی توجہ نہیں رہتی کیونکہ اس میں کامل یکسوئی شرط ہے اسی لئے خواجہ
عبیداللہ احرار کا مقولہ ہے کہ عارف را ہمت نباشد یعنی عارف توجہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کو
غیر حق کی طرف اس قدر یکسوئی نہیں ہو سکتی کہ خدا کو بھی بھول جائے اس کو غیر حق پر ایسی توجہ
کرتے ہوئے غیرت آتی ہے پس سالکین میں یہ بڑا مرض ہے کہ وہ احوال و انفعالات کے درپے ۲۲۴
ہو کر مشائخ سے بدظن ہونے لگتے ہیں۔ ایک مرض کی نوع یہ ہے کہ مشائخ کے پاس جاتے ہیں
اور ان سے کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ مر گیا ہے اس کی یاد دل سے نہیں جاتی ایسی توجہ کرو کہ اس کا خیال
جاتا رہے یہ تو بڑے سے بڑے شیخ من حیث الشیخ کے قبضہ میں بھی نہیں ہاں کرامت سے ہو جائے
تو ممکن ہے مگر کرامت خود غیر اختیاری ہے۔ کرامت پر ایک قصہ یاد آیا۔ ہمارے حضرت استاد
علیہ الرحمۃ کو ایک شخص نے تسخیر کا عمل بتلایا تھا اور مولانا کو کمالات کا ایسا شوق تھا کہ ہر قسم کی
چیز کو سیکھ لیا کرتے تھے اسی طرح یہ عمل بھی سیکھ لیا جس سے مقصود محض علم تھا عمل مقصود نہ تھا کیونکہ
اہل اللہ مخلوق کو مسخر کرنے کی تدبیریں نہیں کیا کرتے جیسا بعض لوگوں کو بزرگوں پر شبہ ہو جاتا ہے
کہ ان کو تسخیر کا عمل آتا ہے۔ اور انہوں نے کوئی عمل ایسا کیا ہے جسکی وجہ سے لوگ ان کی طرف
جھکے چلے آتے ہیں میں اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ آپ کو اس کی حقیقت بتلاتا ہوں غور سے سنو
کہ واقعی انہوں نے تسخیر کا عمل کیا ہے وہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہے جسکی خاصیت یہ ہے
کہ اس سے بندہ خدا کا محبوب ہو جاتا ہے پھر مخلوق کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈالدی

بات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝
اور حدیث میں ہے اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا نَادٰی جِبْرِیْلَ اِنِّیْ اَحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ ثُمَّ یُنَادِیْ
جِبْرِیْلُ فِی السَّمٰوٰتِ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ ثُمَّ یُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ
فِی الْاَرْضِ، او کما قال، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام
کو ندا ہوتی ہے کہ میں فلاں کو چاہتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو پھر جبرئیل آسمانوں میں ندا کرتے
ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں تم بھی اس سے محبت کرو پھر زمین میں بھی اسکے
لئے قبول رکھ دیا جاتا ہے یعنی اہل قلب کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے
اہل کلب کے دلوں میں نہیں۔ اس میں اعتبار ان لوگوں کا ہے جنکو کوئی غرض اس شخص سے
وابستہ نہ ہو نہ نفع کی نہ ضرر کی یعنی کسی دنیوی غرض سے نہ دوست ہوں نہ دشمن ہوں بلکہ
خالی الذہن ہوں کیونکہ جن لوگوں کو اس شخص سے کچھ دنیوی ضرر پہونچا ہے مثلاً اس کی وجہ
سے ان کی شہرت میں کمی آگئی ہو وہ تو خواہ مخواہ اس کے دشمن ہوں گے اور جنکو اس سے کچھ
نفع پہونچ رہا ہے وہ خود بخود دوست ہوں گے ان دونوں کا اعتبار نہیں۔ بلکہ اعتبار ان کا ۲۷۴
ہے جنکو نہ اس سے کچھ ضرر پہونچا ہو نہ نفع۔ کوئی غرض دنیوی اسکے ساتھ متعلق نہ ہو تو ایسے
لوگوں کے دلوں میں خلقی کی محبت ضرور ہوگی بشرطیکہ وہ اہل قلب ہوں اہل کلب نہ ہوں کیونکہ بعض
قلب کلب ہوتا ہے اسپر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ایک شخص نماز پڑھتے ہوئے اپنے آگے کتا باندھ لیا
کرتا تھا کسی نے اس سے وجہ پوچھی تو اسنے کہا حدیث میں آیا ہے لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْکَلْبِ
ظالم نے قلب کو کلب بنا دیا اور یہ مطلب سمجھا کہ بدون کتے کے سامنے ہوئے نماز ہی نہیں ہوتی
اس نے قاف کو کاف سے بدلا جیسے بعض طلبہ نے جو قاف کو غلطی سے کاف پڑھتا تھا اور قال قال
کو کال کال کہتا تھا بخاری ختم کر کے استاد سے پوچھا تھا کہ بخاری تو سمجھ میں آگئی مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا
کہ یہ لکھا تو ہے قال قال اور پڑھا جاتا ہے کالا کالا۔ اصل اسکی یہ ہے کہ بعضے قلمی نسخوں میں قال قال کو
امتیاز کیلئے عربی میں لکھ دیتے تھے اسکو ان عقلمندوں نے کالا کالا پڑھا اور یہ استعمال کیا
کہ لکھا تو جاتا ہے قال قال اور پڑھا جاتا ہے کالا کالا اسی طرح ان امام صاحب نے قلب کو کلب
پڑھا اور کتے کو تبرک بنا لیا یہ تو لطیفہ تھا میں کہہ رہا تھا کہ بعض مریدوں کو اپنے مشائخ پرست۔

ع بالشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ انکے لئے محبت پیدا کر دے گا۔ پارہ ۱۶ رکوع ۹

ہو جاتا ہے کہ ان کو تسخیر و حب کا عمل آتا ہے۔ اور انہوں نے کوئی عمل کیا ہے جس سے لوگ ان کے مسخر ہو گئے چنانچہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب پر بھی بعض لوگوں کو ایسا گمان تھا مولانا صاحب کشف تھے ان کو اس خطرہ پر اطلاع ہو گئی فرمایا استغفر اللہ بعض لوگوں کو ایسا خیال ہے کہ اہل اللہ عملیات سے لوگوں کو مسخر کرتے ہیں۔ ارے یہ بھی خبر ہے کہ عمل کی نسبت باطنی سلب ہو جاتی ہے وہ ایسا کبھی نہیں کرتے تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے تسخیر و حب کا عمل محض اسلئے سیکھ لیا تھا کہ مولانا کو ہر چیز کے جاننے کا شوق تھا عمل کرنے کے واسطے نہیں سیکھا تھا چنانچہ جس شخص نے آپ کو یہ عمل بتلایا تھا اس نے اخفا کے اہتمام کے لئے جنگل میں لیجا کر تعلیم کیا تھا جب مولانا نے اس عمل کو محفوظ کر لیا تو اس شخص نے مولانا کو زیادہ معتقد بنانے کے لئے یہ کہا کہ حضرت یہ عمل بہت تیز ہے میں نے ایک ایسی امیرزادی پر اس عمل کا امتحان کیا تھا جس کی ہوا بھی پردہ سے باہر نہ نکلی تھی مگر اس عمل سے وہ فوراً میرے پاس حاضر ہو گئی۔ یہ سنکر مولانا اس عمل سے گھبرا گئے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ نفس کا کیا اعتبار ہے نہ معلوم کس وقت وہ بدل جائے اسلئے میں نے اس عمل کو ذہن سے بھلانے کی کوشش کی یہانتک کہ اب اس کا ایک لفظ بھی یاد نہیں واقعی یہ بڑا کمال ہے کہ یاد کی ہوئی چیز کو اس طرح بھلا دیا جائے اسکو کرامت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے ایک حالت مولانا کی اس سے بڑھکر یاد آئی مجھ سے خود فرمایا کہ ایک بار خط لکھکر دستخط کرنا چاہا تو اپنا نام یاد نہیں آیا۔ یہ واقعہ اگر میں خود حضرت سے نہ سنتا تو راوی کو کاذب سمجھتا تو ایسے حالات اور کرامات تو مستثنےٰ ہیں لیکن عادۃً یہ امور اختیار سے باہر تھے۔ پس شریعت یہ درخواست کرنا کہ ہم بچہ کو بھول جائیں واقعہ ہی یاد نہ رہے فضول ہے کیونکہ یہ بات اختیار سے باہر ہے اور اگر کسی نے ایسا کیا بھی ہے تو وہ محض کرامت ہے اور کرامت بھی اختیار میں نہیں۔ دوسرے اگر ایسا ہو جائے تو صبر ہی کہاں رہا اور صبر کا ثواب کیونکر ملے گا کمال تو یہی ہے کہ واقعۂ غم یاد ہو پھر صبر کرے یعنی اجر کو یاد کر کے دل کو سمجھائے اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے اسپر وعدہ ہے اطمینان کے مرتب ہونیکا اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ اور جس مرتبہ کا ذکر ہوگا اسی مرتبہ کا اطمینان عطا ہوگا اور اس اطمینان کا حاصل یہ نہ ہوگا کہ غم بالکل زائل

۲۷۵

ہوجائیگا بلکہ یہ حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہ ہوگا عقلاً اس پر راضی ہوجائیگا یہ سمجھے گا کہ
جو ہوا عین حکمت ہوا اسی ذکر کے تکرار سے غم کا غلبہ کم ہوجائے گا جس سے تکلیف کا درجہ
جاتا رہیگا تو کیا ٹھکانا ہے رحمت کا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا طریقہ بتایا کہ عذاب غم سے بھی بچ جاؤ
اور ثواب سے بھی محروم نہو مگر تم یہ چاہتے ہو کہ غم ہی نہ رہے جسکے معنی یہ ہیں کہ صبر کا ثواب تملے بعض
لوگ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ مال کی محبت دل میں نہ رہے۔ ارے! اگر محبت مال نہ رہے گی
تو انفاق میں کمال ہی کیا ہوا حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ میں محبت کی قید صاف بتلا رہی ہے کہ
محبت مال ہی موجب فضیلت انفاق ہے۔ صوفیہ نے اسکو خوب سمجھا ہے مولانا فرماتے ہیں

شہوت دنیا مثال گلخن ست | کہ ازو حمام تقویٰ روشن ست

فرماتے ہیں کہ تقویٰ کی گرم بازاری تو شہوت دنیا ہی سے ہے اگر شہوت دنیا نہ ہو تو پھر تقویٰ
میں کمال ہی کیا رہا پھر اسکو کیسی اچھی مثال سے بیان کیا ہے کہ شہوت دنیا کی مثال ایسی ہے
جیسے حمام کا ایندھن۔ تو جس طرح حمام ایندھن سے روشن ہوتا ہے اسی طرح تقویٰ کا
حمام دنیا کی شہوت سے روشن ہوتا ہے۔ اگر یہ نہو تو حمام تقویٰ سرد پڑ جائے گا۔ اس مثال ۲۷۶
میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ شہوت دنیا کو دل میں جمع نہ کرنا چاہیے بلکہ حمام میں جھونک کر
پھونک دینا چاہیے کیونکہ یہ خس و خاشاک گھر میں جمع کرنے کی چیز نہیں بلکہ پھونکنے اور جلانے
ہی کے کام کی ہے۔ پس محبت مال مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اگر اس کو دین کے کام میں معین
بنایا جائے تو مفید ہے چنانچہ حضرات صوفیہ نے اصلاح اعمال میں اس سے بہت کام لیا ہے
انہوں نے اصلاح اعمال کا طریق جرمانہ مالی مقرر کیا ہے کہ جب غیبت ہوجائے یا تہجد ناغہ
ہوجائے تو کچھ صدقہ مایہ بطور جرمانہ کے ادا کیا جائے یہ طریقہ میں بھی تجویز کیا کرتا ہوں مگر جرمانہ
اتنا ہو کہ نہ تو بہت گراں ہو جس کا دینا دشوار ہو نہ اتنا کم ہو کہ بالکل گراں نہو ورنہ اثر ہی نہوگا
تو اس طریقہ سے جلد اصلاح اعمال ہوجاتی ہے کیونکہ مال کا خرچ کرنا نفس پر گراں ہے اور
ظاہر ہے کہ اس گرانی کا منشا محبت مال ہی ہے تو دیکھئے صوفیہ نے اس محبت مال سے کتنا
بڑا کام لیا۔ اور یہی طریقہ بخل کے علاج میں مفید ہے کہ نفس کو تھوڑا تھوڑا خرچ کر دینے کا عادی
کیا جائے جس سے پہلے پہل تو نفس پر گرانی ہوگی لیکن اسی طرح عمل کرتے کرتے ایک دن دل

کھل جائیگا اور بخل کا مادہ ضعیف ہوجائیگا اسپر شاید یہ سوال ہو کہ کیا اب ثواب نہ ملے گا کیونکہ اب تو مزاحمت نفس باقی نہیں نہ گرانی باقی ہے جواب یہ ہے کہ ثواب ضرور ملیگا کیونکہ اس حالت پر پہونچا تو ہے مصیبت ہی جھیل کر اور گو اسوقت بلا مجاہدہ بلکہ بعض اوقات بلا ارادہ کے عمل کا صدور ہونے لگا مگر وہ پہلا مجاہدہ اور ارادہ اب بھی اسکے ساتھ متعلق ہے اس لئے شرط ثواب بھی پائی گئی۔ عادات کی طرح عبادات میں بھی یہی بات ہے کہ پہلا ارادہ اور مجاہدہ اخیر تک متعلق رہتا ہے جیسا مشی میں ارادہ تو دو چار قدم کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اسکے بعد پھر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی قدم خود بخود اٹھتا چلا جاتا ہے لیکن پھر بھی مشی کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے کیونکہ ابتدا میں اس کے ساتھ ارادہ اسی حیثیت سے متعلق ہوا تھا کہ آئندہ مرحلوں کا یہی حال عبادات کا ہے کہ جس عمل کے ساتھ ابتدا میں ارادہ اور مجاہدہ متعلق ہوتا ہے وہ اسی حیثیت تکمیل سے متعلق ہوتا ہے اس لئے اخیر تک ان دونوں کا تعلق باقی رہتا ہے گو عامل کو احساس نہ ہو اور نہ یہی سمجھتا ہو کہ میں بدون ارادہ کے عمل کررہا ہوں اس سے وہ اشکال رفع ہوگیا۔ غرض تم یہ تمنا نہ کرو کہ مال کی محبت باقی نہ رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عجیب ارشاد ہے آپ کے زمانہ میں کسی غزوہ میں بیشمار مال و دولت آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ آپ کا ارشاد ہے زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ کہ لوگوں کے لئے شہوتوں کی محبت مستحسن کر دی گئی یعنی عورتوں اور اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیروں کی محبت لوگوں کے قلوب میں آراستہ کردی گئی ہے اور اے پروردگار جب آپ نے کسی مصلحت سے اس کی محبت کو مزین کیا ہے تو یہ درخواست کرنا کہ ہمارے دل میں اس کی محبت نہ رہے خلاف ادب ہے اسلئے ہم یہ درخواست نہیں کرتے بلکہ یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس محبت کو اپنی مرضیات کا ذریعہ بنا دیجئے تو بتلائیے حضرت عمر سے بڑھکر کون عارف ہوگا آپنے زوال حب مال کی دعا نہیں کی کیونکہ حب مال میں بھی حکمتیں ہیں ایک حکمت تو یہی ہے کہ اس سے بقدر ضرورت مال جمع کرنا ضروری ہوتا ہے ان کا تقویٰ مال ہی تک رہتا کہ اگر مال ہے تو نماز روزہ بھی ہے ورنہ کچھ نہیں اسی لئے ہمارے حضرات بعض لوگوں کو ترک ملازمت سے منع فرماتے تھے بلکہ بعض کو ناجائز ملازمت کے ترک سے بھی منع فرمایا کہ جب تک حلال ملازمت

لیے اس وقت تک اسی کو لیے جاؤ اور استغفار و توبہ کرتے رہو کیونکہ گو یہ ملازمت حرام ہے مگر ایمان کا دفاع ہے تو ایسا نہ ہو کہ افلاس کی پریشانی سے ایمان ہی جاتا رہے ہم نے مسرف مفلس کو تو مرتد ہوتے ہوئے بکثرت دیکھا ہے کسی نے [illegible] جمعدار کو مرتد ہوتا ہوا دیکھا ہو بلا سے [illegible] ورکا المعدوم بخیل کو کبھی مرتد ہوتا ہوا نہیں سنا گیا وجہ یہ ہے کہ [illegible] کے [illegible] حب مال نہیں نکلتا تو ایمان کیونکر نکلے گا ایمان تو حب الاشیاء ہے خیر یہ تو لطیفہ ہے باقی حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان سے [illegible] وہ دنیوی تنگی سے پریشان ہو کر مرتد ہوتے ہیں غیر اسلام کو [illegible] کوئی مرتد نہیں ہوا اور نہ بخیل آدمی کو تنگی سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ تو نفس و مال سے مستغنی ہوتا ہے کہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے۔ غرض دین کی حفاظت کیلئے آجکل یہ ضرور ہے کہ مسلمان اپنے پاس کچھ رقم جمع رکھے۔ امام سفیان ثوری (جو امام ابوحنیفہ کے معاصر ہیں) فرماتے ہیں کہ آجکل کسی کے پاس کچھ دراہم ہوں تو ان کی حفاظت کرے کیونکہ ایک زمانہ میں تو مال کا جمع کرنا ہلاکت دین کا سبب تھا مگر آجکل مال کا نہ ہونا ہلاکت دین کا سبب ہے نیز فرمایا کہ اگر ہمارے پاس چند دینار ہوتے تو یہ امراء و حکام تو ہم کو اپنے ہاتھ پونچھنے کا رومال بنا لیتے واقعی آجکل جو امراء نے علماء کو حقیر سمجھ رکھا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ علماء اپنے پاس مال نہیں رکھتے اگر ان کے پاس مال ۲۷۸
جمع رہا کرے تو امراء بھی ان کی عزت کریں اور یہ خود بھی اپنی عزت کریں یعنی امراء کی خوشامد کر کے اپنے کو ذلیل نہ کریں مجھے ایک سفر میں خود یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ ایک بار میں نے علماء کے ایک وفد کے ساتھ ان کے اصرار سے ڈھاکہ کے ارادہ سے سفر کیا گو کلکتہ پہنچکر میری رائے بدل گئی تھی اور میں کلکتہ ہی سے واپس آ گیا تھا واقعہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں نواب صاحب کے ایک دولتمند صاحب جو وفد کے استقبال پر مامور ہوئے تھے مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے آنے کی اسلئے بھی زیادہ مسرت ہوئی کہ نواب صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے آنے کی ایسی سخت شرط لگائی ہے جو پوری نہیں ہو سکتی میں نے پوچھا آپ نے کیا شرط سنی ہے کہنے لگے یہ سنا تھا کہ آپ نے یہ شرط لگائی تھی کہ ہم کو کچھ نذرانہ نہ دیا جاوے میں نے کہا کہ یہ تو بہت آسان شرط ہے نہ دینا تو دینے سے آسان ہی ہے کہنے لگے آسان کہاں ہے اپنے محبوب کی خدمت کو تو دل چاہتا ہی ہے میں نے کہا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ محبوب کو بلا ہی کر خدمت کی جاوے محبوب کے پاس خود جا کر بھی تو خدمت ممکن ہے۔ اس پر آپ

کہتے ہیں کہ حضرت گستاخی معاف، پیاسا کنویں کے پاس جایا کرتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا۔ مجھے اس بے تمیزی کے جواب پر بہت غصہ آیا اور میں نے کہا۔ اللہ آپ لوگ اسی خیال میں ہیں اور ہمارے دماغ میں تو یہ خناس سمایا ہوا ہے کہ ہم اپنے کو کنواں اور آپ لوگوں کو پیاسا سمجھتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ ہمارے پاس تو اس خیال کی دلیل بھی ہے اور آپ کے پاس اپنے کو کنواں اور ہم کو پیاسا سمجھنے کی کوئی دلیل نہیں اور وہ ہماری دلیل یہ ہے کہ مسلمان کو دنیا میں دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک دین کی ایک مال کی اور آپ لوگوں کے پاس مال ہے اور ہمارے پاس دین ہے۔ مگر اتنا فرق ہے کہ جو چیز آپ کے پاس ہے وہ بقدر ضرورت ہمارے پاس بھی اتنی موجود ہے کہ اگر عمر بھر ہم آپ کے دروازہ پر نہ جائیں تو ہمارا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہ سکتا مگر جو چیز ہمارے پاس ہے یعنی دین وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں آپ اگر دین کو ضروری سمجھتے ہوں تو علماء سے ایک منٹ کیلئے بھی مستغنی نہیں ہو سکتے اب
بتلایئے کنواں کون ہے اور پیاسا کون ہے۔ اس پر وہ خاموش تھے اور ان کے چہرہ سے معلوم ۲۲۹
ہوتا تھا کہ اپنی بدتمیزی پر نادم تھے اسوقت میں سوچتا تھا کہ میرے اس استغنا اور اپنے مروڑ کی کیا وجہ تھی تو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے پاس چار سو یا پانسو روپے جمع رکھتا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب کا یہ بھی ارشاد تھا کہ اپنے پاس کچھ جمع رکھنا چاہیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہم جیسے ضعفاء کی رعایت سے سال بھر کا نفقہ اپنی ازواج کو ایک دم سے دیا ہے تاکہ ہم کو جواز کی ساتھ اتباع سنت کا بھی ثواب ملے یہ تو علماء کے مذاق پر حضورؐ کے اس فعل کی توجیہ تھی ایک توجیہ صوفیہ کے مذاق پر بھی بتلاتا ہوں کہ اس میں اظہار عبدیت تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غذا اناج کی احتیاج تھی ورنہ بعض اولیاء نے تو ایک دن کا خرچ بھی نہیں رکھا اور یقیناً وہ حضورؐ سے زیادہ متوکل تھے مگر حضورؐ نے اظہار عبدیت کیلئے سال بھر کا نفقہ جمع کیا تھا اور اسی اظہار عبدیت کیلئے دعا کرنا ترک دعا سے افضل ہے کیونکہ شکستگی اور اظہار عجز اسی میں ہے اور یہ حق تعالیٰ کو محبوب ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود — ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود — ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

اور فرماتے ہیں ؎ فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ ٭ جز شکستہ می نیابد فضل شاہ
ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پاس جو کوئی کچھ لاتا انار امرود وغیرہ تو ہر چیز میں سے کچھ
کچھ کھا لیا کرتے تھے کہ اس میں اظہار ہے افتقار کا۔ یہ طریقہ نہیں تھا جیسا ایک صوفی نے کیا
کہ ان کے پاس خربوزہ لایا گیا تو کہا کہ میں نے سترہ برس میں آج خربوزہ کھایا ہے۔ ہمارے
حضرات کو یہ طریقہ پسند نہ تھا کیونکہ اس میں شہرت بھی ہے اور عبدیت کے بھی خلاف ہے اسی طرح
ایک پیر صاحب کی نسبت مشہور تھا کہ وہ اناج نہیں کھاتے میرے ایک دوست نے ان کے
مرید سے پوچھا کہ پھر کیا کھاتے ہیں تو اس نے جو بادام اور پھل اور بالائی اور ربڑی وغیرہ کا
لازمہ بیان کیا تو وہ تین پاؤ آدھ سیر سے زیادہ تھا اس عزیز نے کہا کہ تم مجھے اس کی آدھی
غذا دیا کرو تو کون کمبخت ہے جو عمر بھر بھی اناج کا نام لے۔ غرض اظہار عبدیت اسی میں ہے
کہ بقدر ضرورت مال جمع رکھے اسی لئے امام سفیان ثوری نے زمانہ سابق میں اور اخیر میں
ہمارے حضرت حاجی صاحب نے بقدر ضرورت مال جمع رکھنے کی ہدایت کی ہے اور میں نے
حضرت حاجی صاحب کا عطف امام سفیان ثوری پر اسلئے کیا کہ ہمارے حضرت بھی بزرگان ۲۸۰
سلف سے ہیں گو ہوں اس زمانہ میں ہوئے ہیں۔ یہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ
علیہ کا قول ہے جو میں نے قاری علی محمد صاحب جلال آبادی سے سنا ہے اور قاری صاحب
ہمارے حضرت کے مرید بھی تھے اور بہت ثقہ معتبر شخص تھے اور ظاہر ہے کہ جمع ہونا بدون
کسیقدر محبت کے ہو نہیں سکتا۔ بس اتنی محبت میں بھی حکمت ہے پس تم اس کی طلب نہ کرو
مال کی محبت دل سے زائل ہو جائے کہ یہ تو ایک حال ہے اور حال مطلوب نہیں بلکہ اسکی
طلب کرو کہ محبت مال اعمال صالحہ کا ذریعہ بن جائے کہ اصل مقصود اعمال ہیں ظاہری بھی
باطنی بھی مگر اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جن چیزوں کو خدا تعالیٰ نے مقصود نہیں بنایا یعنی
احوال ان کو تو مطلوب بنا رکھا ہے اور جن کو مقصود بنایا ہے یعنی اعمال ان کی طلب نہیں
مثلاً شکر و تواضع و اخلاص و محبت عقلیہ وغیرہ کی طلب نہیں ہاں طلب ہے تو حب طبعی کی
ہے کہ دل میں عشق کی آگ سی لگ جائے حالانکہ مطلوب حب عقلی ہے نہ کہ طبعی۔ جیسا اوپر
بیان ہو چکا۔ اسی طرح خوف میں بھی مطلوب خوف عقلی ہے یعنی اعتقاداً یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ

کا عذاب سخت ہے اور ممکن ہے کہ مجھ پر مواخذہ ہونے لگے۔ اور یہ درجہ خوف کا ہر مسلمان کو حاصل ہے گویا استحضار و ذہول کا فرق ہے اس کے آگے دوسرا درجہ ہے کہ وہ بھی درجہ اختیاری ہے یعنی استحضار عقوبت کا کہ عذاب کا ہر وقت تصور رہے یہ ہر دم فرض نہیں بلکہ میلان معصیت کے وقت فرض ہے۔ سو خوف کے یہ معنی نہیں کہ گناہ کی طرف میلان ہی نہ ہو بلکہ یہ معنی ہیں کہ جب میلان ہو تو فوراً عذاب کا تصور کر کے گناہ سے رکجائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا۔ فرمایا ہے ان الذین اتقوا اذا یمسہم طائف من الشیطان نہیں فرمایا سو یہ تو خوف عقلی تھا۔ اور ایک خوف ہے بمعنی دل دھڑکنے کے سو یہ غیر اختیاری ہے یہ کسی وقت بھی مطلوب نہیں گو محمود اور مفید ہے اور نہ بندہ اسکا مکلف ہے مگر لوگ آجکل اسی کو مطلوب سمجھتے ہیں اور یہ ساری خرابی واعظوں کی ہے انہوں نے عوام کا ناس کیا ہے چنانچہ وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ تم لوگ تھانہ دار سے تو ڈرتے ہو خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔ حالانکہ تھانہ دار سے جو خوف ہے وہ طبعی ہے جیسا سانپ بچھو سے خوف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے عقلی خوف ہے کیونکہ وہ نظر نہیں آتے بلکہ ان کی صفات کو یاد کر کے ان سے ڈرا جاتا ہے اور غائب سے خوف عقلی ہی ہو سکتا ہے پھر خدا تعالیٰ سے طبعی خوف کا مکلف انسان کو کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح توکل کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد ہو کہ جو وہ چاہیں گے وہی ہوگا اور عمل یہ ہو کہ خلاف شرع تدبیر کو ترک کر جائے اور یہ عقلی ہے اور یہ وہ توکل ہے جس کا بندہ مکلف ہے اس سے زیادہ کا مکلف نہیں اور ایک توکل کا حال ہے کہ کسی وقت یہ خطرہ بھی نہ آئے کہ آج روٹی ملے گی یا نہیں یہ حال مطلوب و مامور بہ نہیں اگر عطا ہو جائے تو ملنا محمود ہے نہ عطا ہو تو نہ ملنا محمود ہے یہ تو محققین کا فیصلہ ہے باقی مغلوبین سو ان میں سے بعض نے جنکے نام ہیں من اور رصور ہے من وزن میں بڑی مقدار ہے اور رصور مساحت میں بڑی چیز ہے ۱۲ یہ کہا ہے کہ مقام توکل کی اصلاح بھی پیٹ کا دھندا ہے۔ حضرت منصور نے ایک سالک سے پوچھا تھا کہ آجکل کیا شغل ہے کہا مقام توکل کی تصحیح کر رہا ہوں فرمایا ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہو گے محبوب کے ساتھ دل لگانے کا وقت کب آئیگا سو یہ آثار مغلوبیت کے ہیں عام نہیں ہیں۔ غرض توکل مطلوب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر اعتقاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ ۲۸۱

زمین پر جو بھی جانور ہیں ان کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے پارہ ۱۲ رکوع ایک

نہیں ہو سکتا اور تدبیر خلاف شرع نہ کرو بس واللہ تم متوکل ہو۔ واللہ تم متوکل ہو۔ واللہ تم متوکل ہو
مگر واعظوں نے اس میں بھی عوام کا ناس کیا ہے کہتے ہیں کہ تم کو خدا پر اتنا بھی بھروسہ نہیں
جتنا ایک مخلوق پر ہے کوئی شخص تمہاری دعوت کر جائے تو چولہا ٹھنڈا کر دیتے ہو اور خدا تعالیٰ
نے تمہاری دعوت کی ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا اسکو سنکر
تم چولہا ٹھنڈا نہیں کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قیاس کیلئے مماثلت وعدہ شرط ہے اور
یہاں مماثلت نہیں کیونکہ ما من دابۃ الخ میں شام کا وعدہ نہیں کہ تم کو شام کے وقت ضرور
کھانا ملیگا نہ طریق کی تعیین ہے کہ سوال کر کے ملیگا یا نوکری وغیرہ سے یا بطور دعوت کے ملیگا
غرض وقت بھی مبہم اور طریق بھی مبہم۔ اور داعی جو دعوت کرتا ہے وہ وقت بھی معین کر رہا ہے
اور طریق کو بھی معین کر رہا ہے اگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس تعیین کیساتھ ہوتا تو کون مسلمان تھا جو
چولہا گرم کرتا پھر یہ قیاس اور اسپر ملامت کی بنا کب صحیح ہے۔ اور یہ ساری باتیں واعظوں
کو دوسروں ہی کے واسطے سوجھتی ہیں اپنے واسطے نہیں سوجھتیں ہم تو جب جانیں کہ وہ
روزانہ اپنے گھر کا چولہا بھی ٹھنڈا رکھیں ذرا کر کے دیکھیں نانی یاد آجائے گی مگر خود کون کرتا ہے
۲۸۲ بر لو دوسروں ہی کی گردن مارتے ہیں چنانچہ قصہ مشہور ہے کہ ایک واعظ نے وعظ میں
صدقہ کے فضائل بیان کئے ان کی بیوی بھی موجود تھیں اسپر وعظ کا اثر ہوا۔ اس نے سارا
زیور خیرات کر دیا واعظ صاحب جو گھر پہ آئے اور بیوی کو ننگا دیکھا پوچھا زیور کیا ہوا کہا
خیرات کر دیا کہا کیوں کہا تم نے صدقہ کے فضائل بھی بیان کئے تھے تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے کیا
اسواسطے فضائل بیان کئے تھے کہ تم خیرات کر دو بلکہ اسواسطے بیان کئے تھے کہ دوسرے ہم کو
دیں۔ اسی طرح ایک مسافر واعظ نے سود خواروں کی ایک بستی میں آکر وعظ کہا اور سود خواروں
کی خوب مذمت بیان کی کسی نے واعظ صاحب کو روٹی بھی نہ دی انہوں نے تنگ ہو کر بعد نماز
کے اعلان کیا کہ عالم حقانی بھوکا پڑا ہے کسی نے کھانے کو بھی نہ پوچھا۔ لوگوں نے کہا صاحب ہم تو
سود خوار ہیں تو آپ کو ایسی ناپاک چیز کیونکر کھلاتے کہنے لگے میں نے مجملاً سنا تھا کہ سود لیتے ہو
ذرا تفصیل تو بتلاؤ کس کس طرح لیتے ہو انہوں نے بیان کیا کہنے لگے یہ تو سود نہیں ہے
ناحق لوگوں نے بدنام کیا ہے لاؤ روٹی لاؤ پھر تو خوب دعوتیں ہونے لگیں غرض پیشہ ور

واعظین نے ناس مار رکھا ہے چنانچہ ایک جہالت یہ کر رکھی ہے کہ مقصود کو غیر مقصود اور غیر مقصود کو مقصود بنا رکھا ہے اسی لئے عوام نے یہ سمجھ لیا کہ بس توکل اور اکل حلال محال ہے حالانکہ بالکل غلط ہے جس درجہ کا انسان کو مکلف کیا گیا ہے وہ ہر شخص کیلئے آسان ہے۔ یہ تو مامورات میں لوگوں کی کوتاہی تھی اب منہیات میں سنئے کہ شریعت میں مثلاً ریا سے ممانعت ہے تو لوگ اس کی حقیقت یہ سمجھے کہ وسوسہ غیر کا بالکل خطرہ بھی نہ آئے اور اگر اتفاقاً نماز یا ذکر میں غیر حق کا وسوسہ آگیا تو شیخ کے پاس پیٹ پکڑے ہوئے آتے ہیں پیٹ پکڑ پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم عبد الستار تھا جو بہت بھولا تھا ایک دن میں نے اس سے کہا کہ صراحی اٹھا لاؤ مگر پیٹ پکڑ کر لانا تاکہ ٹوٹ نہ جائے تو آپ ایک ہاتھ سے تو صراحی کا گلا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑے آرہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ میاں اپنا پیٹ کیوں پکڑا کہا تم ہی نے تو کہا تھا کہ پیٹ پکڑ کر لانا۔ غرض وسوسہ ریا اور خطرہ ریا بھی آگیا تو یہ لوگ شیخ کے پاس گھبرائے ہوئے آتے ہیں اب اگر شیخ غیر محقق ہوا تو اس نے ایک وظیفہ اور بتلا دیا پھر اس وظیفہ میں وسوسہ ریا ہوا تو ایک مراقبہ اور تعلیم کر دیا۔ اور اگر محقق ہے تو وہ پوچھے گا کہ تم اور ریا اختیاری ہے یا غیر اختیاری بس آدھے سلوک کے اشکالات کا جواب تو اسی سوال سے حل ہو جائیگا پہلے بیان میں کا بھی ایک یہ مدار تھا کہ اختیاریات کے درپے ہونا چاہئیے غیر اختیاریات کے درپے نہ ہونا چاہئیے اس بیان میں بھی یہ مسئلہ آگیا کیونکہ تمام اشکالات کا جواب دراصل یہی مسئلہ ہے کہ شریعت نے اختیاریات کا مکلف کیا ہے اسلئے ہر اشکال کے جواب میں یہ مسئلہ آجاتا ہے اب اگر اس سوال کے جواب میں یہ کہا گیا کہ ریا اختیاری ہے تو اس سے کہا جائیگا کہ اپنے اختیار سے کام لو اور قصداً خیال غیر کو نہ لاؤ اور اگر یہ کہا گیا کہ غیر اختیاری ہے تو شیخ کہے گا کہ نہ یہ ریا مضر ہے نہ تم مضر ہے بس بیفکر رہو اور اس ریا کو مثل ریاح کے سمجھو وہ ریا نہیں بلکہ وسوسہ ریا ہے جو اصلاً مضر نہیں۔ ریائے مذموم یہ ہے کہ قصداً مخلوق کیلئے عمل کیا جائے اگر قصداً مخلوق کیلئے عمل نہ کیا گیا بلکہ بلا قصد مخلوق کا خیال آگیا تو یہ ریا نہیں بلکہ اخلاص ہی ہے اور یہ بات سہولت سے حاصل ہو سکتی ہے کہ اپنے قصد و اختیار سے دوسرے کا خیال و ارادہ نہ لاؤ۔ رہا یہ کہ پھر مجاہدہ کی ضرورت کیوں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مجاہدہ اسواسطے کیا جاتا ہے تاکہ ریائے اختیاری کی مدافعت سہل ہو جائے ۲۸۳

کیونکہ اس کا بار بار دفع کرنا ذلک دشوار ضرور ہے مجاہدہ سے یہ مشقت دفع ہو جاتی ہے نیز
وسوسہ رہا جو کہ مضر نہیں بعض دفعہ اعمال کیساتھ مزاحمت کرتا ہے اور اس کے ساتھ عمل دشوار
ہو جاتا ہے مجاہدہ سے وسوسہ رہا بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔ بہرحال تم جن احوال غیر اختیاریہ کے طالب
ہو ان کو چھوڑو ان کی طلب کو قطع کرو یہ بھی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔ میں داخل
ہے کہ ان ہوسوں کو قطع کرو۔ لیکن مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی ما اسقدر عام نہیں کہ سارے بچے اس کے اندر
آجائیں کہیں تم یہ کہنے لگو کہ ہم کو جنت کی بھی ہوس ہے ہم کو رضائے حق بھی مطلوب ہے تو کیا
اس کو بھی قطع کر دیں۔ اس کا جواب میں قرآن ہی سے دیتا ہوں وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے مما تحبون
فرمایا ہے مِمَّا اَحَبَّ نہیں فرمایا اور جنت اور رضائے حق تو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اس کا قطع کرنا
مقصود نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ جو حالت تم کو محبوب ہو اور اللہ تعالیٰ کو من حیث الطاعت محبوب
نہ ہو اس کی طلب قطع کرو اب اشکال نہ رہا دوسری قید یہ بھی ضروری ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ
ہو مطلق انفاق کافی نہیں یعنی احوال و کیفیات و ہوسات کی ترک طلب رضائے الٰہی کے واسطے
۲۸۴ ہو راحت نفس کے واسطے نہ ہو یعنی اپنے محبوب کو خدا کے محبوب پر فدا کرنا یہ ہے اِنْفَاق مِمَّا تُحِبُّوْنَ
ایک بات یہ بھی سمجھو کہ آیت سے اسقدر مفہوم ہوتا ہے جو چیز خرچ کرو اس کا محبوب ہونا تو ضروری ہے
مگر یہ ضروری نہیں کہ سب اشیاء میں احب ہو مگر حدیث ابو طلحہؓ سے ظاہراً شرط احبیت بھی معلوم ہوتی
ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا تھا ان اللہ تعالیٰ یقول لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ
وَاِنَّ اَحَبَّ الْاَمْوَالِ اِلَيَّ بَيْرُحَاءَ الخ اسمیں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جبتک محبوب
چیز خرچ نہ کرو گے اسوقت تک بر کامل حاصل نہ کر سکو گے اور مجھے سب سے زیادہ محبوب مال باغ بیرحاء ہے تو گویا ان کی فہم
میں بر کامل کا حصول احب الاشیاء کے انفاق پر موقوف تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فہم کی تقریر
فرمائی اس سے احب الاشیاء کے انفاق پر حصول بر کا توقف پختہ ہو گیا اس غلطی میں بہت روز تک میں بھی رہا ہوں مگر
پھر خدا نے ہدایت کی اور یہ سمجھ میں آیا کہ احب الاشیاء کے انفاق پر حصول بر موقوف نہیں کیونکہ نص مطلق ہے نص میں
تو مما تحبون ہے احبیت کی قید نہیں اور حدیث میں جو حضرت ابو طلحہ کا قول وَاِنَّ
اَحَبَّ الْاَمْوَالِ اِلَيَّ بَيْرُحَاءَ وارد ہے تو کسی دلیل سے اس کا مما تحبون کی تفسیر ہونا
ثابت نہیں بلکہ حضرت ابو طلحہ نے از خود یہ ظاہر کرنا چاہا کہ گو حصول بر نفس محبوبیت شے سے بھی

حاصل ہوسکتی ہے مگر میں احب الاشیاء کا انفاق کرنا چاہتا ہوں۔ غرض تم مطلق محبوب کے انفاق سے بھی بر حاصل کر لوگے خواہ احب ہو یا نہ ہو ہاں ردل خدل نہ ہو کہ موئی بھیڑ خواجہ خضر کے نام جیسے ایک بنئے کا قصہ ہے کہ وہ اتفاقاً درخت پر چڑھ گیا تھا وہاں سے اترتے ہوئے ڈر لگا تو کہنے لگا ارے رام اگر میں سلامتی سے نیچے اتر گیا تو ایک گائے پن کروں گا پھر کچھ نیچے اترا اور بچنے کی امید ہوگئی تو کہا ایک بکری دوں گا پھر کچھ نیچے آیا تو کہا ایک مرغی دوں گا پھر بالکل نیچے اتر آیا تو ایک جوں سر میں سے پکڑ کر مار دی کہ جان کا بدلہ جان بس یہی کافی ہے اس نذر ماننے پر ایک تحقیق نذر کے متعلق ذہن میں آگئی وہ یہ کہ نذر کے بارے میں حدیث میں آیا ہے لَا یَرُدُّ مِنَ الْقَدَرِ شَیْئًا وَاِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِیْلِ کہ منت سے تقدیر پر تو ٹلتی نہیں ہوتا وہی ہے جو مقدر ہے منت سے اسکے خلاف تو نہیں ہو سکتا ہاں اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے بخیل کا کچھ مال نکال دیتے ہیں کیونکہ بخیل مصیبت کے ہی موقعہ پر کچھ نذر وغیرہ کی صورت میں مال خرچ کرتا ہے ویسے اس کے ہاتھ سے مال نہیں نکلتا اسپر ایک شبہ شاید سامعین میں سے کسی کو ہوا ہوگا کہ اس حدیث سے نذر کی مذمت مفہوم ہوتی ہے حالانکہ نص میں وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وارد ہے جس سے نذر کا عبادت ہونا معلوم ہوتا ہے نیز علماء کا قول بھی ہے کہ نذر عبادت ہے جو حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اسی لئے نذر بغیر اللہ حرام ہے اور عبادت کیلئے حسن لازم ہے پھر نص میں وفاء نذر کا امر ہے اور مامور بہ قبیح نہیں ہو سکتا اس کا جواب بعض محققین نے یہ دیا ہے کہ عبادت لذاتہا نذر مطلق ہے جیسے یوں کہے نَذَرْتُ لِلّٰهِ صَوْمًا وَنَذَرْتُ لَهٗ صَلٰوةً وَصَدَقَةً کہ میں اللہ کے لئے روزہ کی نذر کرتا ہوں یا نماز و صدقہ کی نذر کرتا ہوں اور نذر مذموم نذر مقید ہے گو عبادت بغیرہا ہو جیسے یوں کہے کہ میرا بیمار اچھا ہو جائے تو اتنا صدقہ کرونگا میرا مقدمہ فتح ہو جائے تو اتنے مساکین کو کھانا کھلاؤں گا وغیرہ وغیرہ سبحان اللہ عجیب جواب ہے واقعی شریعت کو انہی حضرات نے خوب سمجھا ہے۔ اور خود حدیث اس فرق کو بتلا رہی ہے کیونکہ کراہت کی علت آپ نے استخراج کو فرمایا ہے اور یہ نذر مطلق میں نہیں ہے بلکہ نذر معلق میں ہے یہ تحقیق درمیان میں ایک حکایت پر بیان ہوگئی ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ ردی چیز اللہ کے نام پر صدقہ نہ کرنا چاہیئے اس سے بر حاصل نہ ہوگا جیسے آجکل عادت ہے کہ خدا کے نام کی وہی چیز نکالی جاتی ہے جو سب سے ردی ہو جیسا ہمارے

۲۸۵

ماموں صاحب نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ ایک شخص کے یہاں کھیر پکی تھی کھیر کی ایک رکابی میں کتے نے منہ ڈال دیا تو اس کی بیوی نے ایک مٹی کی رکابی میں اسکو لوٹ دیا اور بچہ سے کہا کہ سب کے ملا کو دے آ وہ میاں جی کے پاس لایا میاں جی نے مہینوں میں کھیر کی صورت دیکھی تھی تو ہاتھ مارنے لگے اور اسی طرف سے کھانا شروع کیا جدھر کتے نے منہ ڈالا تھا لڑکے نے کہا میاں جی ادھر سے نہ کھاؤ ادھر کتے نے منہ ڈال دیا تھا میاں جی کو غصہ آیا اور رکابی دور پھینک کر ماری لڑکا رونے لگا کہا اب رونا کیوں ہے ایک تو مجھے کتے کی منہ ڈالی ہوئی کھیر کھلائی اور پھر رونا ہے بچہ نے کہا کہ تم نے رکابی توڑ دی میری ماں مجھے مارے گی کہا مٹی ہی کی تو رکابی تھی کہنے لگا کہ میری ماں میرے بھائی کا گو اس میں اٹھاتی تھی اب وہ مجھے مارے گی اب تو ملا جی کو قے ہونے لگی کہ ظرف و مظروف دونوں ہی تو بھرے تھے تو ایسا انفاق تو حرام ہے اس سے بر کامل ہرگز حاصل نہ ہوگا بلکہ اللہ کے نام پر اچھی چیز کو خرچ کرو جو پیاری ہو ہاں یہ ضرور نہیں کہ سب سے زیادہ پیاری ہو سو پیاری تو ایک پیسہ بھی ہے مجھے خود اپنی حالت معلوم ہے کہ ایک پیسہ ضائع ہو جاتا ہے تو دو چار منٹ تک مجھے تردد ہوتا ہے اور اس کے ضائع ہونے کا قلق بھی ہوتا ہے تو ایک پیسہ کا خرچ کرنا بھی اِنْفَاقِ مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں داخل ہے بس اس کا لحاظ انفاق میں ضرور ہے کہ جو چیز خرچ کرو وہ تم کو محبوب ہو گو کسی دوسرے دولتمند کے نزدیک وہ غیر محبوب ہو کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ [ع] کہ اپنی کمائی میں سے پاکیزہ کو خرچ کرو اور اس میں سے خبیث کا قصد نہ کرو بس ہر شخص اپنی کمائی میں سے محبوب کو خرچ کرے گو وہ کسی نواب اور بادشاہ کے نزدیک خبیث ہی ہو مگر تمہارے نزدیک خبیث نہ ہونا چاہئے اس میں غربا کی رعایت کی گئی ہے اگر طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ نہ فرماتے بلکہ أَنفِقُوا الطَّيِّبَاتِ مطلقاً فرماتے تو غربا کو دشوار ہوتی کہ ہمارے پاس تو جتنا کچھ ہے امیروں کی نظر میں سب ہیچ ہے تو طیبات کاملہ ہم کہاں سے لائیں اس لئے حق تعالیٰ نے فرما دیا کہ طیبت کاملہ کی ضرورت نہیں بلکہ تمہارے پاس جو کچھ ہے اس میں سے پاکیزہ مال خرچ کرو اور اس میں سے چھانٹ کر ردی مال اللہ کیواسطے نہ نکالو اب یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے وہ یہ کہ حدیث[عہ] میں ہے کہ جب نیا کپڑا پہنے تو پرانے کو خیرات کر دے

[ع] اے ایمان والو خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے اور ردی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو۔ پارہ ۳ رکوع ۵

۲۸۶

[عہ] للغزالی الترغیب حسن الترمذی بلفظ ثم عمد الی الثوب الذی اخلق فتصدق به الخ تخریج زید القرآن الکریم لعوامن اعیسیق ثوبا جدیدا ۱۲

اور دیا جو نہ پہننے تو پرانے کو اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ ردی مال صدقہ کیا جائیگا تو میں اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہوں کہ پرانے کپڑے اور جوتہ کو اللہ کے نام پر ثواب کی نیت سے نہ دیا جائے بلکہ اعانت غریب کی نیت سے صدقہ کیا جائے تم اعانت غریب کے سوا کچھ قصد نکرو۔ چاہے اللہ تعالیٰ تم کو ثواب بھی دیدیں خوب سمجھ لو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد اس سے وہ پرانا ہو جو ردی کے درجہ تک نہ پہونچا ہو بہرحال تحصیل بر کیلئے احب الاشیاء کا انفاق ضروری نہیں اور حضرت ابوطلحہؓ کا احب الاشیاء کا خرچ کرنا یہ اس غرض سے تھا کہ وہ خیر کامل کے قصد سے انفاق اعلیٰ کرنا چاہتے تھے کیونکہ حضرات صحابہؓ کی یہی شان تھی کہ وہ ہر کام میں اعلیٰ درجہ کا قصد کرتے تھے۔ دوسرے خود نص میں ایک قرینہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حصول بر کیلئے انفاق احب الاشیاء ضروری نہیں اور وہ قرینہ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ اور یہ وقت ہے وفائے وعدہ سابق کا کہ میں نے اوپر کہا تھا کہ دونوں آیتوں کا حاصل ایک ہی ہے اور دونوں میں مضمون مقصود کا ایک جزو مذکور ہے اسلئے میں نے دونوں کو ساتھ تلاوت کیا تھا۔ اس دوسری آیت کی مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ آیت سابقہ کی علت ہے کہ تم کو انفاق پر ثواب کیونکر ملے اللہ تعالیٰ تمہارے انفاق کو خوب جانتے ہیں اس تفسیر پر تو اس کا حاصل آیت سابقہ سے متحد ہے۔ مگر میری سمجھ میں خود بخود یہ بات آئی تھی کہ یہ آیت پہلی آیت کے مقابل ہے کہ پہلی آیت میں انفاق محبوب پر بر کامل کے حصول کو موقوف کیا گیا تھا۔ اور اس آیت میں مَا تُنفِقُوا عام ہے۔ محبوب وغیر محبوب دونوں کو مطلب یہ ہے کہ بر کامل تو انفاق محبوب ہی سے حاصل ہوگی اور ویسے جو کچھ بھی تم خرچ کرو خواہ محبوب ہو یا غیر محبوب ہو بشرطیکہ ردی نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں یعنی ثواب کچھ نہ کچھ مل ہی جائیگا گو بر کامل حاصل نہو۔ یہ تفسیر میرے ذہن میں آئی تھی مگر میں اسپر مطمئن نہوا بلکہ تفاسیر میں تلاش کیا تو بیضاویؒ نے یہی لکھا ہے جو میں سمجھا تھا اس سے میرا بہت جی خوش ہوا اور اطمینان ہوگیا کہ یہ تفسیر بالرائے نہیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ ذوقی تفسیر پر بدون تائید سلف کے ہرگز اعتماد نکیا جائے۔ شاید اسپر کسی کو شبہ ہو کہ اس سے تو انفاق ردی پر بھی ثواب معلوم ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس سے انفاق ردی کا جواز یا اسپر ثواب کیسے معلوم ہوا ہاں اس میں محبوب وغیر محبوب کی تعمیم ضرور

ہوگئی کہ اگر غیر محبوب بھی خرچ کرو بشرطیکہ ردی قابل نفرت نہ ہو تو اسپر بھی ثواب مل جائیگا
پس اب تین درجے ہوئے ایک محبوب ایک غیر محبوب - ایک ردی مبغوض - پہلے دونوں
درجوں پر تو ثواب ملے گا - اول پر زیادہ اور دوسرے پر کم اور تیسرے درجہ کی ممانعت
ہے اس پر ثواب نہ ملے گا - آیت کی تفسیر تو پوری ہوئی اب بطور تتمہ کے یہ بتلاتا ہوں کہ
اس آیت میں سلوک کی ترتیب بھی بتلائی گئی ہے کہ جو شخص انفاق محبوب نہ کر سکے وہ غیر محبوب
ہی سے شروع کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ سب لوگ ایک درجہ کے نہیں اسلئے سب کو
انفاق محبوب دفعتہً سہل نہیں تو وہ اول انفاق غیر محبوب سے عمل شروع کریں - اور
میں نے اس آیت کا تتمہ آیت سابقہ اسلئے کہا حالانکہ اس کا مضمون مقابل ہے پہلی آیت
کا مگر پہلی آیت کا مضمون اس سے مل کر ہی پورا ہوتا ہے اسلئے اسکو تتمہ کہا گیا - اب ایک
بات یہ رہی کہ مما کے من میں اختلاف ہے کہ من بیانیہ ہے یا تبعیضیہ سو دونوں کا حاصل
ایک ہی ہے کیونکہ بیانیہ کا حاصل یہ ہوگا کہ محبوب کو خرچ کرو اور تبعیضیہ کا حاصل یہ ہوگا
کہ بعض محبوب کو خرچ کرو - اور قواعد سے معلوم ہو چکا ہے کہ کل کا انفاق مطلوب نہیں
بلکہ بعض لوگوں کی ایک انفاق کل ممنوع ہے - ۲۸۸

پس من بیانیہ کا مرجع بھی تبعیضیہ ہی کی طرف ہے اب میں ختم کرتا ہوں خلاصہ
بیان کا یہ ہوا کہ آیت کا جو مدلول خفی ہے خواہ قیاسی ہو یا منصوص ہو یعنی ترک کیفیات
غیر اختیاریہ اسپر عمل کرنا چاہئے یعنی ہوسات و ثمرات کی طلب کو قطع کرو اور اعمال کا
اہتمام کرو اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں - آمین

وَصَلَّے اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی
اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ
دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ
الْعٰلَمِیْنَ ؎

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ
رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

۲۸۹ کا وعظ مسمی بہ

التواصی بالصبر

جزو دوم التواصی بالدین

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

التواصی بالصبر وھو الجزو الثانی من التواصی بالدین

اين	متٰی	کم	کیف	من ضبط	ماذا	لمن	من استمع	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کس نے لکھا	کیا مضمون تھا	کس کے لئے تھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
[illegible]	[illegible] شوال المکرم [illegible]	ایک گھنٹہ [illegible] منٹ	جالسا علی الکرسی	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم والعصر ان الانسان لفی خسر ہ الا الذین امنوا وعملوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ہ یہ وہی سورت ہے جس کی تلاوت شب گذشتہ میں کی گئی تھی اور اسکے متعلق ایک جزو کا بیان کیا گیا تھا. حاصل اس کا

یہ تھا کہ اس سورت میں تبلیغ و دعوت الی اللہ کی ضرورت ثابت کی گئی ہے۔ اور اس کے دو جزو ہیں ایک دعوت الی الحق (یعنی العقائد) اور ایک دعوت الی الصبر (یعنی الاعمال) اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ہم ان دونوں میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک جزو یعنی دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد کی طرف گذشتہ رات میں زیادہ روئے سخن تھا گو بیان مشترک ہی ہوا تھا مگر مقصود زیادہ تر یہی جزو تھا اور اسی کی تفصیل کی گئی تھی اسوقت ایک جزو تفصیل سے رہ گیا تھا یعنی قصداً اس کا بیان نہ ہوا تھا گو ضمناً اس کا بیان بھی کسی قدر ہوا تھا۔ اور وعدہ کیا گیا تھا کہ اگلی شب اگر خیریت رہی اور بیان کا موقعہ ملا تو دوسرے جزو کے متعلق قصداً بیان ہوگا سو یہ وقت ہے اس وعدہ کے ایفا کا۔ اس لئے اسوقت میں تبلیغ اعمال کے متعلق کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں سنئے ہماری حالت یہ ہے کہ جیسا تبلیغ اعمال کا اہتمام کرنا چاہئے ویسا ہمکو اس کا اہتمام نہیں ہے بلکہ اسمیں بہت کوتاہی ہو رہی ہے جیسا کہ دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ اور جیسا ایک امر مانع ہو رہا ہے تبلیغ عقائد اور دعوت الی الایمان سے اسی طرح ایک امر مانع ہو رہا ہے تبلیغ اعمال سے اور وہ امر یہ ہے کہ ہم کو عادت ہو گئی ہے ترک دعوت الی الاعمال کی۔ اور اس کے مانع ہونے سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ یہ عادت عذر ہے کیونکہ جب میں اس کا لغو ہونا بیان کردوں گا تو اس سے عذر نہ ہونا معلوم ہو جائیگا اور اس کے یہ معنی نہیں کہ ترک دعوت الی الاعمال کیلئے کوئی عذر فی نفسہ بھی نہیں۔ اگر اعذار شرعیہ موجود ہوں اور ان کا تحقق ہو جائے تو اسوقت ترک دعوت جائز ہے مگر اس وقت میں ان اعذار شرعیہ کو بیان نہ کروں گا نہ بیان کی ضرورت ہے کیونکہ کسی عمل کے متعلق بیان اعذار کی ضرورت جب ہو کہ ہمکو اس عمل کا اہتمام ہو اور جہاں مخاطب کو عمل ہی کا اہتمام نہ ہو وہاں اعذار کو بیان نہ کیا جائے گا بلکہ اولاً اس کو اہتمام عمل پر متوجہ کیا جائیگا جب وہ عمل کا اہتمام کرنے لگے اور عمل میں مشغول ہو جائیگا پھر اسکو اعذار شرعیہ سے مطلع کیا جائیگا جیسے ایک شخص نمازی ہے نماز کو ضروری سمجھتا ہے اس کی پابندی بھی کرتا ہے وضو کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور ہمکو معلوم ہے کہ وہ بیماری کی حالت میں بھی وضو کو ترک نہیں کرتا وہاں ضرورت ہے اعذار شرعیہ بتلانے کی کہ ان اعذار سے وضو ساقط ہو کر تیمم جائز ہو جاتا ہے تطہیر ثیاب معاف ہو کر ناپاک کپڑوں ہی سے

٢٩١

نماز درست ہوجاتی ہے استقبال قبلہ معاف ہوکر جس طرح بھی نماز پڑھ سکے نماز صحیح ہے اور قیام پر قادر نہ ہو تو قعود سے اور قعود پر قدرت نہ ہو تو اضطجاع سے نماز صحیح ہوجاتی ہے۔ ایسے وقت میں بیان اعذار کی ضرورت کا راز یہ ہے کہ اگر ایسے شخص کو اعذار نہ بتلائے جائیں تو اسکو اعتقادی اور عملی تنگی پیش آئے گی۔ اعتقادی تنگی تو یہ ہوگی کہ اسکو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے صدق میں وسوسہ اور شبہ ہوگا جوکہ زوال یا ضعف ایمان کا سبب ہے اور عملی تنگی یہ پیش آئیگی کہ اگر اسکو تیمم کا قاعدہ نہ بتلایا گیا تو وہ عذر کیوقت مجبور ہوکر وضو ترک کرے گا اور چونکہ وضو کو شرط سمجھتا ہے اس لئے بے وضو نماز پڑھے گا نہیں یہ عملی تنگی ہے پس ایسے شخص کے سلامت ایمان اور سلامت اعمال کیلئے ضروری ہے کہ اسکو اعذار شرعیہ کے احکام سے مطلع کیا جائے اس سے اسکا ایمان تو سلامت رہیگا کہ اسکو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے صدق میں وسوسہ نہوگا۔ اور عمل یوں سلامت رہیگا کہ وہ کسی عذر کیوقت عمل کو فوت نکرے گا۔ غرض بیان عذر کی ضرورت وہاں ہوگی جہاں مخاطب ضرورت عمل کا قائل ہو اعتقاداً بھی اور عملاً بھی پھر اسکو کسی موقعہ پر تنگی پیش آتی ہو بخلاف اسکے جو ابھی عمل ہی کی ضرورت کا قائل نہیں وہ تو اعذار کو سنکر ترک عمل کا بہانہ ۲۹۲
ڈھونڈیں گے اور کھینچ تانکر اپنے کو معذوروں کی فہرست میں داخل کریں گے پس اگر ہم یہ سمجھتے کہ ہم لوگ امر بالمعروف کا اہتمام پوری طرح کرتے ہیں تو اسوقت البتہ بیان احکام اعذار کا موقع تھا۔ اور جب اس کا اہتمام ہی نہیں چنانچہ عملاً اہتمام نہونا تو مشاہد ہے اور اعتقاداً بھی بعض لوگ اس کی ضرورت کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے جیسا کہ قرائن احوال اسپر شاہد ہیں تو ایسی حالت میں تو اعذار کو سنکر ہر شخص ترک امر بالمعروف کا بہانہ ڈھونڈیگا اور کوئی بھی اپنے کو عذر سے خالی نہ سمجھے گا اور اس فریضہ کو اپنے اوپر سے بالکل ساقط کر دیگا حالانکہ ایسا کونسا عذر ہے جس سے فرض بالکل ہی ساقط ہو جائے۔ دیکھو نماز و وضو کیلئے بھی بعض عذر ہیں مگر وہ ایسے وسیع نہیں جنسے وضو اور نماز بالکل ہی ساقط اور معدوم ہو جائے مگر جس عمل کا اہتمام ہی قلب میں نہو اسکے اعذار کو سنکر مخاطب عذر کے میدان کو اتنا وسیع کرلیتا ہے کہ فرض کو بالکل ہی ساقط کر دیتا ہے تو ایسے شخص کو اعذار سے ہنوز مطلع نکیا جائیگا اسی لئے میں نے رات بھی عذر کو بیان نہیں کیا بلکہ یہ عرض کیا تھا کہ جانبین دو قسم کی ہیں ایک تو یہ کہ ہم کام کو اپنے ذمہ ضروری سمجھیں

ف اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اسکی طاقت میں ہو۔ پارہ ۳ رکوع ۸

بھر عذر سے تنگی پیش آئے اور ایک حالت یہ ہے کہ کام ضروری ہی نہ سمجھے تو جن اعمال کو ہم اپنے ذمہ
ضروری سمجھتے ہیں جیسے نماز و وضو وغیرہ ان میں عمل کو شروع کرنیکے بعد عذر کا سوال ہوتا ہے اور جنکو
اپنے ذمہ ضروری نہیں سمجھتے ان میں قبل از عمل ہی عذر سے سوال کیا جاتا ہے تو مجیب کو لازم ہے کہ پہلی
صورت میں تو اعذار کو بیان کرے اور دوسری صورت میں بیان نہ کرے ۔ لہذا اسی اصل کے موافق
میں اس وقت بھی اعذار کو بیان نہیں کرتا بلکہ تبلیغ اعمال کی ضرورت پر آپ کو متنبہ کرتا ہوں
رات میں نے تبلیغ ایمان یعنی دعوت الی العقائد سے مانع یہ بتلایا تھا کہ اس تبلیغ میں مبلغ
مخاطب کو ایسے امور سے باز رکھنا چاہتا ہے جو اس کے زعم میں دین اور طاعات ہیں
جس سے اسکو ناگواری ہوتی ہے اور اس ناگواری کے خیال سے مبلغ کھٹکتا اور تبلیغ سے
رکتا ہے اس کا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ اول تو عنوان تبلیغ کا ایسا ہونا چاہیئے جس سے مخاطب کو
ناگواری نہ ہو اور وہ عنوان قرآن ہی نے ہمکو بتلا دیا ہے کہ عقائد کو اخبار صادقہ کے عنوان سے
بیان کرو اور جو شخص اس سے بھی ناگواری کرے تو اس کی پروا نہ کی جائے ۔ نیز میں نے یہ بھی کہا تھا ۲۹۳
کہ اسی ناگواری مخاطب کی وجہ سے تبلیغ عقائد کو مقدم کیا گیا ۔ اور تواصی بالعمل کو مؤخر کیا گیا ۔ لیکن
اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تبلیغ اعمال فی نفسہ مہتم بالشان نہیں کیونکہ اگر یہاں ایک وجہ اضافی قلت
اہتمام کو مقتضی ہے تو دوسری وجہ شدت اہتمام کو بھی مقتضی ہے وہ یہ کہ بلاغت کا قاعدہ یہ ہے
کہ کلام کو جس بات پر ختم کیا جاتا ہے وہ مہتم بالشان اور زیادہ مقصود ہوتی ہے چنانچہ اہل
بلاغت اسکو خوب جانتے ہیں اسی لئے بلغاء کا قاعدہ ہے کہ وہ کلام کو اول اور آخر میں زوردار
کرتے ہیں کیونکہ ابتدا بھی مقصود سے کی جاتی ہے اور انتہا بھی مقصود پر ہوتی ہے ۔ تو اب یہاں
دو جزو ہیں جن میں ایک جزو کا اہتمام تقدیم سے ظاہر کیا گیا دوسرے جزو کا اہتمام ختم کلام پر واقع
کرنے سے ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ جس چیز پر کلام ختم کیا جاتا ہے وہ مخاطب کے ذہن میں باقی رہ جاتی ہے
اسلئے ختم کلام پر مقصود اہم ہی کو بیان کیا جاتا ہے ۔ پس قرآن کی عجیب بلاغت ہے کہ اس نے دونوں
اجزاء کا مہتم بالشان ہونا دو طرز سے ظاہر کر دیا ہے ۔ رہا یہ سوال کہ دو چیزوں کا ایک درجہ میں
مہتم بالشان ہونا تو بعید ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک درجہ میں مہتم بالشان نہیں
کہتے بلکہ تبلیغ عقائد کی اہمیت اسلئے ہے کہ وہ اصل ہیں اسی لئے ان کی اہمیت کو تقدیم سے

ظاہر کیا گیا فَاِنَّ الْاَصْلُ مُقَدَّمٌ عَلَى الْفَرْعِ اور اعمال کی اہمیت ایک اعتبار خاص سے ہے وہ اعتبار خاص یہ ہے اور یہ حقیقت میں وجہ اول ہی سے ناشی ہے کہ جو لوگ عقائد کو اصل سمجھکر مہتم بالشان سمجھتے ہیں وہ اعمال کو فرع سمجھکر ان کا اہتمام بالکل ترک کر دیتے ہیں اور اتنا اہتمام بھی نہیں کرتے جتنا فرع کا ہونا چاہئے پس یہ لوگ عقائد ہی کو ضروری سمجھتے ہیں اعمال کو ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ تعریف میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے عقائد بہت اچھے ہیں ۔اس تعریف کو کافی سمجھتے ہیں اور صحت عقائد کے بعد اس کے اعمال پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اسی لئے اعمال کے متعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی نہیں کرتے بلکہ غضب یہ ہے کہ اعمال کی کوتاہی کو منکر بھی نہیں سمجھتے ۔ہم نے مانا کہ عقائد کا اچھا ہونا بڑی بات ہے اور یہ بھی بجائے خود قابل مدح ہے مگر سوال یہ ہے کہ اعمال کو غیر ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے اور ان میں کوتاہی کرنے کو نقص کیوں نہیں سمجھا جاتا اگر آپ کہیں کہ اعمال فرع ہیں تو میں کہتا ہوں کیا فرع کے نقص سے شئے میں نقص نہیں آتا دیکھئے آپ ایک درخت امرود کا لگائیں جس کا بیج الہ آباد سے عمدہ امرود کا بڑے اہتمام سے انتخاب کر کے منگایا گیا تھا مگر آپ کے باغ میں آکر اس عمدہ بیج سے درخت تو بہت بڑا لگ گیا لیکن پھل ایک بھی نہ آیا تو کیا اس صورت میں آپ اپنے دوستوں کے سامنے خوش ہو ہو کر اس درخت کی یوں تعریف کرینگے کہ یہ بڑا قیمتی درخت ہے اس کا بیج بہت عمدہ الہ آباد کے نفیس امرودوں میں سے ہے یا افسوس کے ساتھ یوں کہیں گے کہ اس کا بیج بڑے اہتمام سے منگایا گیا تھا مگر افسوس اس نے پھل نہیں دیا اور اگر اتفاق سے پھل بھی آیا مگر الہ آباد جیسا شیریں نہوا بلکہ معمولی امرودوں سے بھی بدتر نکلا تو اس صورت میں ہرگز آپ بیج کی تعریف کر کے اپنا جی خوش نکریں گے بلکہ سخت رنج و افسوس کے ساتھ یہ کہیں گے کہ بڑی مشقت سے میں نے اسکے لئے الہ آباد سے عمدہ بیج منگایا تھا مگر ساری محنت ضائع گئی پھل بالکل خراب نکلا میرا مقصود اس مثال سے یہ ہے کہ آپ دنیوی امور میں محض اصل کی عمدگی کو مدح کیلئے کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ساتھ فرع کی عمدگی پر بھی نظر ہوتی ہے پھر دین کے معاملہ میں کیا وجہ ہے کہ صرف عقائد (واصول) کی عمدگی پر نظر کی جاتی ہے اور اسی کو مدح کے لئے کافی سمجھتے ہیں اعمال (وفروع) کی عمدگی پر کیوں نظر نہیں کی جاتی اور اس کے نقص سے افسوس کیوں نہیں کیا جاتا

اصل افرع بطور مقدم ہوتی ہے کو

۲۰۰

اور اس افسوس کا اثر آپ میں کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔ دیکھئے اگر ایک شخص کا چہرہ حسین ہے مگر ہاتھ پیر بھدے ہیں یا انگلیاں مڑی ہوئی ہیں تو ہر چند کہ حسن میں چہرہ ہی کا حسن اصل ہے مگر یہ نہیں کہ ہاتھ پیر کا اعتدال مطلوب نہ ہو گو اس سے آپ کو اتنی نفرت نہ ہوگی جتنی اس شخص سے ہوتی ہے جس کا چہرہ بھی بدشکل ہے مگر ظاہر ہے کہ حسین شخص کے ہاتھ پیر اور انگلیاں بھی حسین ہوں اور چہرہ بھی حسین ہو اس کی طرف زیادہ میلان ہوگا۔ اور پہلے شخص کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے جب آپ یہ کہیں گے کہ چہرہ آنکھ ناک بڑی خوبصورت ہے ساتھ ہی یہ بھی کہیں گے کہ مگر افسوس اسکا ہے کہ اسکی انگلیاں مڑی ہوئی ہیں اگر یہ نقص نہ ہوتا تو بہت ہی حسین ہوتا۔ اب بتلائیے کہ اسی طرح حسن دین میں فساد فروع یعنی فساد اعمال کو آپ منکر کیوں نہیں سمجھتے اور ایسے شخص سے آپکا دل کیونکر ملتا ہے جو فروع ایمان میں ناقص ہے اس سے بلا تکلف دوستی کس طرح کیجاتی ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَنْ رَأىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ (اَوْ كَمَا قَالَ) کہ جو کوئی تم میں سے امر منکر کو دیکھے تو اسکو ہاتھ سے مٹائے یا زبان سے یا دل سے یہ مقتضا ہے امر منکر کا شرعاً پھر یہ کیا غضب ہے کہ ہم لوگ امر منکر کو دیکھکر نہ ہاتھ سے روکتے ہیں نہ زبان سے نہ دل سے نفرت کی جاتی ہے۔ بلکہ اعمال میں کوتاہی کرنیوالوں کی ساتھ وہی بشاشت ہے وہی دوستی ہے جیسے کامل الایمان کے ساتھ ہوتی ہے گویا آپ خدا تعالیٰ کی طرف سے وکیل و مختار ہیں کہ جس چیز کو چاہیں معاف کر دیں اور جس منکر سے چاہیں قطع نظر کر لیں تو بات یہ ہے کہ لوگوں نے عقائد کی اہمیت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے وہ یہ سمجھ گئے کہ اہمیت عقائد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد اصلاح اعمال کی ضرورت ہی نہیں اور یہ بالکل غلط ہے اسلئے اس اعتبار خاص سے اعمال زیادہ مہتم بالشان ہو گئے سو اسواسطے یہاں کلام کو تواصی بالاعمال کے ذکر پر ختم کیا گیا تاکہ اس طرز خاص سے مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ گو اعمال عقائد سے ذکر میں موخر ہیں مگر ختم کلام پر مذکور ہونے سے ان کی اہمیت بھی مطلوب ہے، اور وہ بھی مہتم بالشان ہیں۔ سو یہ اتنی توضیح کی چیز مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اعمال کی طرف سے ہم بہت بیفکر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عقائد اصل ہیں اور اعمال فروع مگر میں بتلا چکا ہوں کہ فروع بھی مطلوب ہوتے ہیں اور ان کے انعدام یا نقصان سے اصل میں بھی نقصان آجاتا ہے جیسا کہ اوپر مثالوں میں واضح کیا گیا۔ دوسرے

نصوص قرآنیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کی تعلیم سے تکمیل اعمال بھی مقصود ہے یعنی عقائد کی تعلیم اس لئے بھی کی گئی ہے کہ ان سے اعمال میں کام لیا جائے۔ اس کی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔ (ترجمہ) تمکو جو کچھ بھی مصیبت ارضی یا سماوی پہونچتی ہے وہ سب مقدر ہو چکی ہے قبل ازیں کہ مصیبت کو پیدا کریں اور چونکہ خدا تعالیٰ کا علم کامل ہے اسلئے بیشک یہ بات خدا کیلئے آسان ہے (کہ وہ ظہور سے پہلے مصائب وغیرہ کو مقدر کر دیں) اس کے بعد فرماتے ہیں لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ (یہ مضمون تم کو اسلئے بتلایا گیا) تاکہ تم کسی فوت شدہ چیز پر غم نکرو اور حاصل شدہ پر اتراؤ نہیں۔ یہ تعلیل ہے ماسبق کی جس کا تعلق اَخْبَرْنَا ثُمَّ بِذٰلِكَ مقدرات ہے یعنی ہم نے تم کو اس مسئلہ کی تعلیم اسلئے کی تاکہ تم مغموم نہوا اور اتراؤ نہیں۔ اب غور کے قابل یہ امر ہے کہ لام نے غایت کے واسطے لایا جاتا ہے اور اوپر مسئلہ تقدیر کا ذکر ہے تو اس کی علت وغایت دوسری آیت میں بتلائی گئی ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم کو مسئلہ تقدیر اسلئے تعلیم کیا ہے کہ جب تم اسکے معتقد ہوگے تو تم کو حزن وفرح نہوگا۔ اور مسئلہ تقدیر کا یہ اثر مشاہد ہے جو لوگ تقدیر کے معتقد ہیں وہ مصائب وحوادث میں منکرین تقدیر سے زیادہ مستقل اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کا ثمرہ ایک عمل بھی ہے یعنی حصول تفویض وتوکل اور اس کا عمل ہونا ظاہر ہے پس عقائد ہر چند کہ خود بھی مقصود ہیں مگر ان کو تکمیل عمل میں بڑا دخل ہے اور یہ دخل مطلوب بھی ہے جیسا کہ آیت میں لِّكَيْلَا تَاْسَوْا سے مستفاد ہوتا ہے اب اسی پر تمام عقائد کو قیاس کر لیجئے کہ مثلاً توحید کی تعلیم خود بھی مقصود ہے اور اس سے اعمال کی تکمیل بھی مقصود ہے کیونکہ جس شخص پر جسقدر توحید کا غلبہ ہوگا اتنا ہی اسکے اعمال کامل ہونگے اسکی نماز دوسروں کی نماز سے اکمل اس کی زکوٰۃ وروزہ دوسروں کی زکوٰۃ وروزہ سے اکمل ہوگی اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؂

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا	واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؂

موحد چہ بر پائے ریزی زرش	چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

عہ پارہ ۲۷ رکوع ۱۹

۲۹۷

امید و ہراسش نباشد زکس ہمیں ست بنیاد توحید و بس

غرض موحد کامل کی یہ حالت ہوگی جو شیخ نے بیان فرمائی ہے جو ادنیٰ توحید والے کو حاصل نہیں ہوسکتی تو عقائد گو بظاہر جمل خبریہ ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان میں عرض کیا ہے مگر ان سے مقصود جمل انشائیہ ہیں اعتقادیہ بھی عملیہ بھی جیسا ابھی مذکور ہوا اس بناء پر اللہ واحد کا مطلب مطلب یہ ہے کہ اس اعتقاد کے ساتھ عمل میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں پس اپنے عمل میں خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ بناؤ ورنہ ریا ہو جائیگی جو شرک اصغر ہے اور توحید کامل کے خلاف ہے اسی طرح عقلاً خدا کے سوا کسی سے طمع و خوف نہ رکھو کہ یہ بھی توحید کے خلاف ہے رہا طبعی طمع و خوف کا مضائقہ نہیں کیونکہ وہ تو اضطراری بے اختیار ہوتا ہے جیسے سانپ کو دیکھکر طبعاً ڈر جانا یا شیر سے ہیبت زدہ ہو جانا مگر عقلاً یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہنا چاہئے کہ بدون مشیت الٰہی کے کوئی چیز نفع یا ضرر نہیں دیسکتی وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ

گر گزندت رسد ز خلق مرنج کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست کہ دل ہر دو در تصرف اوست (ابیات)

اور یہ بڑا قیمتی مضمون ہے کہ جمل خبریہ سے محض خبر مقصود نہیں ہوتی بلکہ کوئی انشا مقصود ہوتی ہے اس کی ایک دوسری واضح مثال ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو حق تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور اس نزول کی نسبت اجمالی عقیدہ کافی ہے کیونکہ ہم کو نہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی کنہ معلوم نہ صفات کی نہ ذات کی بس جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے اس پر تو ایمان ہے ہاں اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ عقائد کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اخبار متواترہ یا قرآن سے ثابت ہوں وہ تو قطعی ہیں دوسرے وہ جو اخبار آحاد صحیحہ سے ثابت ہوں وہ ظنی ہیں قسم اول کا اعتقاد فرض اور ثانی کا واجب ہے اول کا انکار کفر اور ثانی کا انکار فسق ہے یہ تو ہمارا معترضہ تھا اب غور کیجئے کہ حضور نے جو یہ خبر دی ہے اس سے آپ کا مقصود کیا ہے کیا صرف یہی مقصود ہے کہ اس نزول کا اعتقاد رکھو یا کچھ اور بھی مقصود ہے ظاہر ہے کہ مقصود یہ ہے کہ اس وقت کو ضائع نہ کرو بلکہ اس وقت

حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے نماز و استغفار میں مشغول ہونا چاہیئے چنانچہ دوسری احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی خود تصریح فرما دی ہے قیام لیل اور تہجد کی آپ نے بہت ترغیب دی ہے اور اسکی فضیلت میں بیشمار احادیث ہیں، اسی طرح دعائے نیم شبی کی فضیلت میں بکثرت احادیث ہیں۔ اور یہ بلکہ خود ایسی ہی حدیث کے اخیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نزول فرما کر مخلوق کو خطاب فرماتے ہیں هَلْ مِنْ مُسْتَرْزِقٍ فَارْزُقُهٗ وَهَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاغْفِرَ لَهٗ عہ وکما قال کیا کوئی رزق کا طالب ہے کہ میں اسکو رزق دوں کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے کہ میں اسکو بخش دوں یہ صاف بتا رہا ہے کہ حضور کا اس سے ہمکو مطلع کرنا اسی لیے ہے تاکہ اسوقت میں ہم اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگ لیا کریں بس اسی طرح تمام اخبار اعتقادیہ کو سمجھو کہ ان سے اشارات بھی مقصود ہیں یہ مت سمجھو کہ عقائد سے صرف اعتقاد ہی مطلوب ہے بلکہ ان سے تکمیل اعمال بھی مطلوب ہے کہ ان عقائد سے عمل میں کام لیا جائے گویا بلفظ دیگر یوں کہئے کہ عقائد کو تکمیل اعمال کا آلہ بنایا گیا ہے اور عقائد کا تکمیل اعمال میں دخیل ہونا اس طرح ہے کہ مثلاً دو شخص فرض کیجئے جنہوں نے راستہ میں بادشاہ کو دیکھا جنمیں ایک تو بادشاہ کو پہچانتا ہے ایک نہیں پہچانتا ظاہر ہے کہ بادشاہ کو دیکھنے کے بعد دونوں کی حالت میں بین فرق ہوگا جو شخص بادشاہ کو بادشاہ سمجھتا ہے وہ تو فوراً آداب و تعظیم بجالائیگا اور پوری طرح خدمت و اطاعت کیلئے آمادہ ہو جائیگا اور جو اسکو معمولی آدمی سمجھتا ہے وہ اس طرح آمادہ نہ ہوگا پس شریعت نے جو عقائد ہم کو تعلیم کیے ہیں ان سے ایک تو مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اپنے دل میں جماؤ دوسرا مقصود یہ ہے کہ اس عظمت کے مقتضا سے عمل میں کام لو تو اب اعمال کو غیر مہتم بالشان سمجھنا کتنا بڑا غضب ہے جنکا مقدمہ اور آلہ تکمیل عقائد کو بنایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کے مقدمات اتنے معظم ہیں وہ خود کتنا معظم ہوگا گو من وجہ ہی۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان دنیا میں پیدا ہوا ہے۔ ابتلا و امتحان کے لئے جیسا کہ آیت وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ عہ۔ اسپر دال ہے کیونکہ کلمات سے مراد احکام ہیں اس سے معلوم ہوا کہ احکام سے مقصود ابتلا ہے اور ابتلا ہوتا ہے مخالفت نفس سے کیونکہ اس میں مشقت ہوتی ہے اور بدون مشقت کے ابتلاء کا تحقق نہیں ہو سکتا معلوم ہوا کہ مقصود خلق انسان سے مجاہدہ و مشقت ہے چنانچہ دوسری جگہ صاف ارشاد ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ

۲۹۸

عہ کیا ہے کوئی رزق کا طالب کہ میں اسکو رزق دوں اور ہے کوئی مغفرت کا طالب کہ میں اسکو بخش دوں

عہ اور جب آزمایا ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے چند باتوں میں

فی تَکْبِدٍ۔ اب خود سمجھ لیجئے کہ مشقت عقائد میں زیادہ ہے یا اعمال میں۔ تو ظاہر ہے کہ عقائد میں کیا مشقت ہے کچھ بھی نہیں ہاں پہلی بار عقائد باطلہ کو ترک کرنے میں مشقت ہوتی ہے مگر یہ ابتدا میں تھوڑی دیر کیلئے ہوتی ہے یہ نہیں کہ ہر وقت ایک آرہ سا چلتا ہو اور اعمال میں ہر وقت مشقت ہے ہر دم دل پہ آرہ سا چلتا ہے کہ اب یہ کرو اب وہ کرو یہی ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ کا مصداق۔ صاحبو ایک مشتاق نمازی کو بھی بیماری اور سفر میں اول ہی دن جیسی مشقت ہوتی ہے۔ بارش اور اندھیری رات اور جاڑے سردی میں نماز کیلئے گھر سے نکلنا اور وضو کرنا سہل نہیں اسی لئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباغ وضو علی المکارہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اندھیری میں نماز کیلئے آنیوالوں کو بشارت سنائی ہے (کما فی الحدیث المشہور بَشِّرِ الْمَشَّائِیْنَ فِی الظُّلَمِ اِلَی الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّامِّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔

تیسری بات (جو دوسری بات ہی سے متفرع ہے) یہ ہے کہ عقائد کو ایک بار اختیار کرلینے کے بعد ابقاء کی حاجت تو ہے تجدید کی احتیاج نہیں مثلاً اَللّٰہُ وَاحِدٌ ایک بار سمجھ لیا تو اب اسکے ابقاء کی ضرورت تو ہے کہ اسکے ضد کا اعتقاد نہ کیا جائے باقی یہ ضروری نہیں کہ روزانہ اسکے امثال کی تجدید کی جائے بخلاف اعمال کے کہ ان میں ہمیشہ تجدید کی ضرورت ہے ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے وقت۔ ایضاً۔ کہہ دینا کافی نہیں بلکہ عملاً نماز کی تجدید لازم ہے ایسے ہی روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ ہے گو نماز روزہ کے سب افراد متماثل ہیں مگر متحد تو نہیں ہیں بلکہ ہر فرد کا وجود مستقل ہے اور اَللّٰہُ وَاحِدٌ کہنے کے بعد اس کی ضرورت تو ہے کہ اسکے خلاف کا عقیدہ نہ ہو مگر تجدید لازم نہیں گو افضل ضرور ہے جیسا کہ حدیث میں ہے جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ بِقَوْلِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مگر یہ فرض نہیں چنانچہ اگر کسی شخص کو دن بھر اَللّٰہُ وَاحِدٌ کا تصور نہ آوے مگر اس کے خلاف کا بھی احتمال[1] نہ آوے تو یہ گنہگار نہ ہوگا۔ بس اللہ واحد کے تصور کی ضرورت صرف اول بار تھی جبکہ اسکے ذہن میں شرک کا عقیدہ تھا یا شرک اور توحید دونوں سے خالی الذہن تھا۔ اسکے بعد نہ اس کا تصور فرض نہ تجدید لسانی فرض ہاں افضل و مستحب ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ایک بار اعتقاد کرلیا ہو تو پھر اگر ساری عمر بھی اسکا استحضار نہ ہو

---

[1] وسوسہ غیر اختیاری مراد نہیں کیونکہ وہ مضر نہیں بلکہ احتمال اختیاری مراد ہے ۱۲ ظ

یہ مطلب نہیں کہ نماز ہی نہ پڑھے جس میں اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ہر قعدہ میں آتا ہے
بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز کے اجزاء کو سمجھکر نہ پڑھے جیسا کہ عموماً نمازیوں کی حالت ہے اور ظاہر
ہے کہ بے سمجھے نماز پڑھنے سے استحضار مضمون رسالت نہیں ہوگا تو اہل فتویٰ کا اتفاق ہے کہ یہ شخص
گنہگار نہیں گو برکات عظیمہ سے محروم ضرور ہے سو یہ اور بات ہے۔ بخلاف نماز کے کہ اسکی تو یہ حالت
ہے کہ پانچ دفعہ فرض ہے خواہ سمجھکر پڑھے یا بے سمجھے۔ ان وجوہ سے ثابت ہوا کہ مجاہدۂ نفس عمل میں
زیادہ ہے عقائد میں اتنا مجاہدہ نہیں اور مجاہدہ ہی مقصود ہے انسان کی پیدائش سے تو جسکو اس
مقصود میں زیادہ دخل ہوگا وہ اہمیت سے خالی نہیں ہوسکتا پس یہ وجوہ ہیں اہمیت اعمال کے۔
خلاصہ یہ کہ بعض وجوہ سے عقائد زیادہ مہتم بالشان ہیں مثلاً اس وجہ سے کہ وہ اصل ہیں اور صحت اعمال
موقوف ہے عقائد پر بدون صحت عقیدہ کے عمل صالح برباد ہے اور صحت عقائد وجود عمل پر موقوف
نہیں اور بعض وجوہ سے عمل زیادہ مہتم بالشان ہے اور یہ ضرور ہے کہ اہمیت عقائد کے وجوہ زیادہ
قوی ہیں مگر میں نے اسوقت اہمیت اعمال پر زیادہ زور اسلئے دیا ہے کہ ہم لوگوں کو ان کی اہمیت
سے بالکل غفلت ہے ہم ان کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔ اور ظاہر ہے کہ جب اعمال میں بھی وجوہ ۳۰۰
اہمیت موجود ہیں تو یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم ان کی ساتھ اہتمام کا برتاؤ نہ کریں میں آج کل
عام طور پر اپنی جماعت کا حال دیکھ رہا ہوں کہ وہ کسی کے عقائد اچھے دیکھکر پھر اس کی عملی کوتاہی
پر اصلا نظر نہیں کرتے نہ اسکے اعمال سے نفرت ظاہر کرتے ہیں نہ دل سے کراہت و انکار کرتے
ہیں اور یہ حالت خطرناک ہے حدیث میں اس حالت پر وعید وارد ہے۔ یہ مضمون اہتمام عمل کا
کل رات بیان نہوا تھا۔ الحمدللہ کہ یہ آج بیان ہوگیا۔ اب رہ گئی یہ بات کہ ہم اصلاح اعمال
و تبلیغ احکام عملیہ میں کیا کوتاہی کر رہے ہیں سو یہ کوئی طویل یا غامض مضمون نہیں جب لوگ
اعمال کی ضرورت اور اہمیت ہی سے غافل ہیں تو انکی اصلاح و تبلیغ سے غفلت بھی ظاہر ہے۔
چنانچہ حالت ہماری یہ ہے کہ ہفتہ کے ہفتے گذر جاتے ہیں کہ ہم کسی کو اِفْعَلْ کَذَا[ع۲] وَلَا تَفْعَلْ
کَذَا کبھی نہیں کہتے۔ اور یہ کوتاہی اصلاح اعمال و تبلیغ احکام عملیہ میں اس درجہ بڑھ گئی ہے
کہ جنپر قدرت نہیں ہے ان کی تبلیغ کا تو کیا اہتمام ہوتا جنپر قدرت بھی ہے وہاں بھی اس کا استعمال
نہیں ہوتا جنپر قدرت ہے وہ یہ لوگ ہیں۔ بیوی۔ بچے۔ نوکر۔ مرید۔ شاگرد۔ اور جنپر قدرت نہیں وہ یہ لوگ ہیں

ع۱ یعنی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

ع۲ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔

دوست احباب - بھائی - برادری - عزیز - قریب اور اجنبی لوگ - پھر جنپر قدرت نہیں ان میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جنکو تبلیغ کرنے میں ضرر کا اندیشہ ہے جیسے دشمن اور مخالف - اور بعض وہ ہیں جہاں ضرر کا کچھ اندیشہ نہیں صرف ناگواری کا خطرہ ہے اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی ہیں چنانچہ دوست احباب بھائی اور عزیز سے ضرر جسمانی یا مالی کا کوئی خطرہ نہیں - بس انکی تبلیغ سے محض اسواسطے پہلو تہی کی جاتی ہے کہ ان کو ہماری روک ٹوک ناگوار ہوگی - سو اس کا علاج یہ ہے کہ نصیحت کا عنوان ایسا اختیار کرو جس سے ناگواری نہو اور اسپر بھی کسی کو ناگوار ہو تو اس کی پروا نکرنا چاہیئے مسلمان کا تو یہ مذاق ہونا چاہیئے ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

اور جب وہ لوگ بھی جنکو بظاہر قدرت سے خارج سمجھا جاتا ہے زیادہ تر محل تبلیغ ہیں اور انکی ترک تبلیغ میں بھی ہم معذور نہیں تو بتلائیے جو لوگ ضابطہ سے ہمارے ماتحت ہیں اور ظاہر ہے ان کی تبلیغ ہماری قدرت میں داخل ہے وہاں ترک تبلیغ سے ہم کیونکر معتوب و ماخوذ نہوں گے مگر حیرت ہے کہ ہم موقع قدرت میں بھی تبلیغ و نصیحت سے طرح دے جاتے ہیں اور اس سے بڑھکر یہ کہ جنپر قدرت ہے وہ بھی دو قسم کے ہیں ایک وہ جنھوں نے التزام اطاعت کا ہم سے معاہدہ نہیں کیا جیسے بیوی بچے کہ گو شرعاً انپر ہماری اطاعت واجب ہے مگر انہوں نے صراحۃً اسکا التزام نہیں کیا کہ تم ہمکو تبلیغ کرو ہم تمہاری تعلیم پر عمل کرینگے مگر ایک تعلق ایسا ہے جسمیں دوسرا شخص معاہدہ صریحہ سے ہماری اطاعت کا التزام کرتا ہے اور وہ تعلق پیری مریدی کا ہے - کیونکہ پیری مریدی نام ہی ہے معاہدہ اطاعت من جانب المرید و معاہدۂ تعلیم و اصلاح من جانب الشیخ کا صرف ہاتھ میں ہاتھ لیکر سبق ساپڑھ دینے کا نام پیری مریدی نہیں جیسا کہ آجکل عام طور سے اسمیں غلطی ہو رہی ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کو بیعت سمجھتے ہیں اور تعلیم و اتباع کو ضروری نہیں سمجھتے اس لئے مجھے اسمیں کلام ہے کہ آجکل کسی طالب بیعت کو جلدی سے جلد بیعت کر لینا جائز بھی ہے یا نہیں کیونکہ اسمیں تقریر ہے اسکی غلطی کی - اس طرح بیعت کر لینے سے وہ یہی سمجھے گا کہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی بیعت کی حقیقت ہے نیز آجکل یہ بھی عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بدون بیعت کے نفع نہیں ہوتا گویا لوگوں نے اصل مقصود کو اس فرع کے تابع کر دیا ہے میرے نزدیک ان غلطیوں پر تنبیہ لازم ہے اور اسکی

ضرورت ہے کہ طالب کو اولاً اس پر متنبہ کیا جائے کہ بیعت (یعنی ہاتھ میں ہاتھ دینا) نہ مقصود ہے
نہ کسی مقصود کا موقوف علیہ ہے صرف رسم مشائخ ہے اور حقیقت بیعت کی یہ ہے کہ مرید کی طرف
سے اتباع کا التزام ہو اور شیخ کی طرف سے تعلیم کا التزام ہو اگر دو شخصوں میں ایسا معاہدہ ہو جائے
خواہ قولاً یا حالاً کیونکہ معاہدہ کبھی حالیہ بھی ہوتا ہے تو بس بیعت کا تحقق ہو گیا خلاصہ یہ ہے کہ بیعت
کی حقیقت التزام ہے یعنی شیخ اور طالب دونوں ایک امر کا التزام کرتے ہیں طالب اطاعت
واتباع کا شیخ تعلیم و اصلاح کا اب میری شکایت کا حاصل یہ ہے کہ جہاں صریح التزام و معناً
ہے اطاعت کا غضب کی بات ہے کہ وہاں بھی آج کل تبلیغ نہیں کی جاتی اور اگر بیعت کو
صریح التزام نہیں مانتے تو اسکی کیا وجہ ہے کہ مرید کی جانب عملاً دونوں اسکو لازم سمجھتے ہیں۔
چنانچہ مرید اگر پیر کی کسی بات کو نہ مانے تو اس پر عتاب کیا جاتا اور دربار سے نکال دیا جاتا ہے
یہ عمل خود بتلا رہا ہے کہ آپ بیعت کو صریح التزام سمجھتے ہیں مگر یہ بے انصافی ہے کہ ایک جانب التزام
مانا جاوے دوسری جانب نہ مانا جاوے ایک جانب تو یہ شدت ہے کہ اگر مرید خدمت سے انکار کر دے
۳۰۲ یا کسی دنیوی کام میں شیخ کی مخالفت کرے تو فوراً مغضوب ہو جاتا ہے اور دین کے معاملہ میں نہ شیخ
اس کو کچھ کہتے ہیں نہ وہ اسمیں شیخ کی اطاعت کو اپنے ذمہ لازم سمجھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب
مرید صراحۃً آپ کی اطاعت کا التزام کر چکا ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اب بھی شیوخ مریدین
کی دینی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ صاحبو! تبلیغ سے ایک تو مانع عدم قدرت تھا اور ایک
مانع عدم التزام تھا گو عدم التزام واقع میں مانع نہیں بلکہ قدرت کے بعد تبلیغ واجب ہے گو
دوسرے نے صراحۃً التزام نہ کیا ہو مگر میں آپ کی خاطر سے تھوڑی دیر کیلئے عدم التزام کو بھی
مانع مانکر کہتا ہوں کہ جہاں قدرت بھی ہے اور التزام بھی ہے وہاں حضرت شیخ کیسے خاموش
ہیں جس میں ترک تبلیغ کے گناہ کے ساتھ وعدہ خلافی کا گناہ بھی شامل ہے کیونکہ جس طرح مرید نے
اطاعت کا وعدہ کیا ہے ایسے ہی شیخ بھی تو اصلاح کا وعدہ کئے ہوئے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ
مقتضی موجود ہے اور موانع سب مرتفع ہیں پھر بھی پیر صاحب مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں
کچھ روک ٹوک نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ شیوخ پیری مریدی کی حقیقت کو
نہیں سمجھے۔ یا عمداً جان بوجھکر پہلوتہی کرتے ہیں۔ بس آج کل تو پیری مریدی کی حقیقت لوگوں نے

یہ سمجھ رکھی ہے کہ پیر صاحب قیامت میں بخشوالیں گے لوگوں نے رسم بیعت کو مغفرت کا سبب سمجھ رکھا ہے گو اسکے بعد کتنے ہی گناہ کر لیں۔ چنانچہ اسکے متعلق کچھ الہامات اور مکشوفات یاد کر لئے ہیں کہ فلاں بزرگ سے منقول ہے کہ انکو الہام ہوا تھا کہ ہم تمہارے سب سلسلہ والوں کو بخش دینگے یہ تو وہ ہیں جو دوسروں سے اسلم ہیں ورنہ بعضے اس سے بھی گرے ہوئے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ بیعت اسواسطے ضروری ہے کہ اس سے ہمارے سر پر ایک بزرگ کا سایہ ہو جائیگا تو دنیوی مقاصد میں ہم کو سہولت ہو گی۔ مقدمات میں دعا اور تعویذ گنڈے کرا لیں گے اور بیعت سے ہماری تنخواہ میں ترقی ہو جائے گی چنانچہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ میں ڈپٹی کلکٹری سے اس طرف کوئی رہتا ہی نہیں۔ ان کا مقصود بیعت سے محض دنیا ہے اور ان کے نزدیک دین سے اسکو کچھ تعلق نہیں۔ یہ تو مریدوں کے خیالات تھے اب پیروں کی سنئے۔ ان کے نزدیک بیعت سے مقصود یہ ہے کہ مریدوں کے ذمہ ان کی ششماہی یا سالانہ مقرر ہو جائیگا جیسے چار کمینوں کا فصلانہ مقرر ہوتا ہے۔ پھر پیر صاحب کا کام کیا ہے جسکے عوض یہ فصلانہ دیا جاتا ہے ان کا کام وہ ہے جو بھنگی کرتا ہے۔ بھنگی نجاست ظاہرہ کا حامل ہے اور پیر صاحب فصلانہ لیکر گناہوں کی نجاست کے حامل ہیں چنانچہ بعض دیہات میں پیر کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو کمینوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ایک چودھری کے ہاں فصل پر اناج تیار ہوا اور گھر والے چاروں کمینوں کا فصلانہ نکالنے لگے تو چودھری کہتا ہے کہ اس سوہرے پیر کا بھی تو حق نکال دو وہ بھی تو اپنا حق مانگنے آویگا۔

واقعی یہ عجیب راحت و آرام کا پیشہ ہے کہ پیر صاحب گئے اور فصلانہ لے آئے اور سال بھر آرام سے اپنے گھر بیٹھے رہے۔ اور پیشہ والے اگر فرض منصبی کو انجام نہ دیں تو تنخواہ بند ہو جاتی ہے مگر پیر کی تنخواہ بند ہی نہیں ہوتی۔ اور خواہ کچھ ہی کر لیں انکی پیری بھی منسوخ نہیں ہوتی چاہے شراب پی لیں یا بدمعاشی کر لیں کیونکہ مشہور ہے کہ پیر کی پیری سے کام اسکے فعلوں سے کیا کام اگر پیر صاحب ڈھنگ کی باتیں بولیں تو حقائق و معارف ہیں اور بے ڈھنگی بے تکی ہانکیں تو رموز ہیں اور خاموش رہیں تو مراقب اور چپ شاہ ہیں انکی ہر حالت میں جیت ہے۔ افسوس آجکل پیروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے جو یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کے ساتھ کر رکھا تھا وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ یہ خدا کے بیٹے اور اسکے محبوب بنتے تھے (نَعُوذُ بِاللّٰہِ

(استغفر اللہ) ان کو سب کچھ معاف ہے جو چاہیں کریں اس طریقہ میں عمل کی ضرورت ہی نہیں عمل سے کچھ سروکار ہی نہیں۔ یاد رکھو کہ ایسی پیری مریدی کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں یہ محض بیدینی ہے اور خیر بعضے ایسے تو نہیں ہیں بلکہ بیعت کے بعد عمل کی بھی ضرورت سمجھتے ہیں مگر کونسے اعمال کی فرائض و واجبات کی نہیں بلکہ وظائف و اوراد کی ضرورت سمجھتے ہیں کچھ وظیفے پیر سے معلوم کرلئے ہیں ان میں کبھی ناغہ نہیں ہونا چاہئے فرائض ناغہ ہو جائیں۔ نماز کی پروا نہیں کہ وقت پر ہوئی ہے یا بے وقت معاملات سر سے پیر تک گندے ہیں سود لیتے ہیں اور دیتے ہیں رشوت کا بازار گرم ہے اور اسکے ساتھ تہجد کے پابند ہیں اشراق کے پابند ہیں تسبیح بہت لمبی ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے اور پیر صاحب بھی ان مریدوں کی سود کی آمدنی سے ہدیا لیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کے ایک شخص نے خود مجھ سے فخراً کہا کہ نماز تو چاہے قضا ہو جائے مگر پیر نے جو وظیفہ بتلا دیا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ جب قضا آئے گی اسوقت اس کا نتیجہ معلوم ہوگا کہ نماز زیادہ ضروری تھی یا وظیفہ۔ اور ان میں بھی اسلم وہ ہیں جو وظیفے ثواب کیلئے پڑھتے ہیں۔ ورنہ اکثر تو دنیا ہی کے ۴۰۷
واسطے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ کوئی قصیدہ غوثیہ کا ورد کرتا ہے کوئی حزب البحر کا۔ اگر انکو ثواب مطلوب ہوتا تو ادعیہ ماثورہ میں ان سے زیادہ ثواب ہے مگر دنیا مطلوب ہے اسلئے ادعیہ ماثورہ سے دلچسپی نہیں بلکہ اس قسم کے وظائف سے دلچسپی ہے جن سے دنیوی منافع بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ان سے بڑھکر ایک طبقہ اور ہے جو صوفیہ کہلاتے ہیں وہ اسلئے بیعت ہوتے ہیں تاکہ کیفیات اور کشف و کرامت حاصل ہو جائیں یہ لوگ کیفیات کو مقصود سمجھے ہوئے ہیں اسکے لئے ترک لذات کرتے ہیں نیند کم کرتے ہیں غذا کم کرتے ہیں اور اس کا نام رکھا ہے مجاہدہ و ریاضت۔ حالانکہ مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ مخالفت نفس فی المعاصی روٹی کھانے یا ٹھنڈا پانی پینے میں نفس کی مخالفت کرنا مجاہدہ نہیں۔ بلکہ مجاہدہ یہ ہے کہ نفس نے مثلاً تقاضا کیا کسی امرد یا عورت کے دیکھنے کا یا گانا سننے کا یا کسی کی غیبت کرنے کا اس میں نفس کی مخالفت کی اسی طرح تمام معاصی میں غور کرلو۔ مگر یہ صوفی جو مجاہدہ کے مدعی ہیں ان مواقع پر نفس کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ بہت سے لڑکوں اور عورتوں کے گھورنے میں مشغول ہیں اور غضب یہ کہ گناہ کرکے تاویل یہ کیجاتی ہے کہ ہم تو صنعت حق کا مشاہدہ کرتے ہیں مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی نے ایک ایسے ہی مسخرہ کو خوب جواب دیا تھا کہ اپنی ماں کی شرمگاہ میں جاکر صنعت حق کو دیکھ

کہ ایسی ذرا سی تنگ جگہ سے تو اتنا بڑا آدمی پیدا ہو گیا۔ غرض ان لوگوں نے مجاہدہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھی اور ریاضت کے معنی اصل لغت میں سدھانے کے ہیں کیونکہ یہ ماخوذ ہے رَوَّضَ الدَّابَّۃَ سے جسکے معنی ہیں گھوڑے وغیرہ کو سدھانا۔ اور اصطلاح میں ریاضت کے معنی ہیں تحصیل اخلاق حمیدہ و ازالۂ اخلاق ذمیمہ۔ پس مجاہدہ تو یہ ہے کہ شہوت و غضب وغیرہ کا جب تقاضا ہو تو اس تقاضے کو روکا جائے اور ریاضت یہ ہے کہ اس تقاضے کے منشا کو زائل کر کے اسکے بجائے خلق حسن اور ملکۂ فاضلہ پیدا کیا جائے کیونکہ جتنے معاصی ہیں سب کے منشا اخلاق ہیں اور ریاضت اسی مرتبۂ خلق کے ازالہ کا نام ہے اور زائل کرنے سے مطلب یہ ہے کہ منشا مضمحل و ضعیف ہو جائے کیونکہ اخلاق رذیلہ کا ازالہ ممکن نہیں یہ سب رذائل فطری ہیں اور حدیث میں ہے اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَکَانِہٖ فَصَدِّقُوْہُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ زَالَ عَنْ جِبِلَّتِہٖ فَلَا تُصَدِّقُوْہُ اور ان رذائل کے فطری ہونیکی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کو بھی غصہ آتا ہے اور محققین کا قول ہے کہ غضب کبر سے پیدا ہوتا ہے پھر غضب سے غیبت پیدا ہوتی ہے جب بچوں میں غصہ ہے تو معلوم ہوا کہ ان میں تکبر بھی ہے تو بچوں کے اندر ان امور کے ہونے سے معلوم ہوا کہ یہ امور فطریہ ہیں اور امور فطریہ کا ازالہ کلیتہً نہیں ہو سکتا تو جو سالک انکو بالکل زائل کرنا چاہے وہ اس کا مصداق ہے ۔ وائے بیہودہ پخت و خیال باطل بست

اور یہ میں نے اسلئے ظاہر کر دیا کہ سالکین اس حقیقت کے نہ جاننے سے بہت پریشان ہوتے ہیں بعض دفعہ مجاہدہ کر کے سالک یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھ سے کبر زائل ہو گیا اس کے بعد کسی موقعہ پہ وہ پھر ابھرا تو یہ شکستہ دل ہو جاتا ہے اور ہمت پست ہو جاتی ہے کہ افسوس ساری محنت ہی برباد گئی مجاہدہ ضائع ہو گیا یہ بلا تو ہنوز موجود ہے پھر اس غم میں بعض تو خودکشی کر لیتے ہیں اور بعضے خودکشی کر لینے میں بھی بعضوں نے جان دیدی اور بعض نے اپنے کو طریق سے الگ کر لیا کہ اس راہ میں تو کامیابی دشوار ہے ممکن ہی نہیں اسواسطے میں کہتا ہوں کہ زوال سے مقصود اضمحلال ہے اور اضمحلال کے معنی یہ ہیں کہ بعد مجاہدہ کے ان اخلاق رذیلہ کی مقاومت میں پہلی جیسی مشقت نہیں ہوتی ورنہ یاد رکھو کہ مجاہدہ سے نہ حریص کی حرص زائل ہوتی ہے نہ بخیل کا بخل نہ متکبر کا تکبر ہاں اضمحلال ہو جاتا ہے جس کا ثمرہ یہ ہے کہ ان کے مقتضا پر عمل نہ ہو کیونکہ عمل اختیاری ہے پس مقتضائے رذیلہ پر عمل نہ کرنا ہی بڑی کامیابی ہے اور مجاہدہ و ریاضت سے یہی سہل و آسان ہو جاتا ہے۔ غرض اس تقریر سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ایک درجہ تو ہے تقاضائے معصیت کا

اسکی مخالفت کرنا تو مجاہدہ ہے اور ایک اس تقاضے کا منشا ہے خلق رذیل اس کے ازالہ یعنی اضمحلال
کو ریاضت کہتے ہیں یہ تو ان کی حقیقت ہے جس میں ترک اکل و شرب کو کوئی دخل نہیں یہ اور بات ہے کہ
اس حقیقت کی تحصیل میں ترک اکل و شرب وغیرہ سے سہولت ہوجاتی ہے تو وہ مقدمہ ہوا مگر یہ کیا
غضب ہے کہ مقدمہ کو مقصود بنا لیا گیا کہ اصل مجاہدہ کا تو پتہ نہیں نہ امردوں کا گھورنا چھوڑیں نہ
عورتوں کا دیکھنا اور کھانا پینا سونا کم کرکے مجاہد بن گئے۔ یہ تو جہلاء صوفیہ کا حال ہے اور جو ذرا لکھے
پڑھے ہیں وہ ترک معاصی کا بھی اہتمام کرتے ہیں مگر وہ اس مرض میں گرفتار ہیں کہ احوال و کیفیات کو
مقصود و مطلوب سمجھے ہوئے ہیں کسی سے انہوں نے سن لیا تھا اَلْمُجَاهَدَةُ مِفْتَاحُ الْمُشَاهَدَةِ
بس یہ لفظ تو یاد کرلیا مگر تفسیر کسی محقق سے دریافت نہ کی بلکہ اپنی رائے سے معنی گھڑ لیے۔ مجاہدہ کے
معنی تو مرنا کھپنا لیے کہ کھانا بھی چھوڑ دے اور پینا بھی اور مشاہدہ کی یہ تفسیر کی کہ اللہ کی طرف خود بخود
بدون ارادہ کے لو لگی رہے ذوق شوق ہو کشف ہو یکسوئی ہو استغراق ہو بس وہ اسی کے واسطے
ساری کوشش کرتے ہیں اگر کوئی اثر ظاہر ہو گیا کہ تھوڑی دیر کو وساوس کم ہو گئے شوق و ذوق
پیدا ہو گیا تو خوش ہو گئے کہ بس ہم کامیاب ہیں اور اگر کبھی ایسا نہ ہوا تو اب پریشانی میں مبتلا ہیں شیخ سے
۳۰۶ شکایتیں کرتے ہیں کہ مجھے تو ذکر سے نفع نہیں ہوتا وساوس بند نہیں ہوتے شوق و ذوق پیدا
نہیں ہوتا۔ شیخ اگر اناڑی ہے تو وہ ہر شکایت پر دلجمعی کے لئے ایک وظیفہ اضافہ کرکے مرید کو مجموعۃ الوظائف
بنا دیگا جیسے علی حزین شاعر نے اپنے ہمسایہ کو تذکرۃ الاولیاء بنایا تھا قصہ یوں ہے کہ علی حزین جب دہلی آیا
تو اسکے لئے ایک محل بہت عمدہ تجویز کیا گیا وہ اس میں رہنے لگا اسکے دہلیز میں ایک مداری فقیر رہتا تھا وہ
رات کو ایک لمبا شجرہ پڑھا کرتا تھا چند روز میں مالک مکان علی حزین کی مزاج پرسی کیلئے آئے کہ اگر کسی قسم کی
تکلیف ہوئی ہو تو ظاہر فرمایا جائے تاکہ اس کا بندوبست کیا جائے علی حزین نے کہا اور تو کچھ تکلیف نہیں
مگر اس تذکرۃ الاولیاء کو کہیں اور کسی جگہ بسا دو۔ راتوں کا سونا ظالم نے تنگ کردیا ہے اس کا شجرہ ختم
ہی نہیں ہوتا۔ تو جیسے علی حزین نے اس فقیر کو تذکرۃ الاولیاء بنایا تھا ایسا ہی میں کہتا ہوں کہ اناڑی شیخ
اپنے مریدوں کو مجموعۃ الوظائف بنا دیتا ہے پھر بعضے تو ایسے وظائف بتلاتے ہیں جو شرع کے موافق
ہیں اور بعضے تو بہت ہی بے تکے وظائف بتلاتے ہیں جو خلاف شرع ہیں۔ جیسے یا شیخ عبدالقادر
شیئاً للہ۔ اور ایک وظیفہ مشہور ہے اَللّٰہُمَّ الصَّمَدِیْ یَا مُحَمَّدُ مَدَدِیْ اس میں صمد

کی اضافت الی الیاء مع لام تعریف کے معلوم کیسی اضافت ہے یہ تو لفظی غلطی ہے اور معنوی غلطی ندا غیر اللہ ہے۔ اسی طرح کلکتہ میں کرانہ کے ایک پیرزادے ہیں ان کا رات دن وظیفہ یہ تھا یَاحَیُّ یَا قَیُّوْمُ مجھ کو دے نقدی کچھ دے توم۔ پھر سنا ہے کہ ان کو کلکتہ پہونچکر نقدی بہت ملی اور ایک وظیفہ بعضے لوگ یہ تبلاتے ہیں اٹر جھنجیری سا تان آیا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اس کا مطلب کیا ہے تو کہتے ہیں اجی بزرگوں کے کلام میں برکت ہوتی ہے معنی سے کیا بحث۔ سبحان اللہ ہر کلام میں برکت کیونکر تسلیم کر لی جائے چاہے وہ کیسا ہی بے تکا کلام ہو۔ کوئی خدا و رسول کا کلام تو نہیں جو ایمان لے آیا جائے۔ اور خدا و رسول کا کلام بے تکا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو وظائف میں گڑبڑ ہے بعض لوگ اشغال میں گڑبڑ کرتے ہیں چنانچہ ایک شغل یہ تبلایا جاتا ہے کہ سانس آنکھ ناک کان بند کر لو۔ اور اسکو بڑا ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اسپر غضب یہ کہ مولانا روم کو اس شغل کا موجد تبلاتے ہیں اور دلیل میں یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند گر نہ بینی نور حق بر من بخند

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم نے یہ شعر مثنوی میں دیکھا نہیں نہ ہمکو اس میں ہونا یاد ہے اور اگر ہو بھی تو میں بقسم کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاصی سے ان اعضاء کو بچاؤ۔ کیونکہ نور حق کا وعدہ طاعات کے امتثال ترک معاصی ہی پر ہو سکتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ۔ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ ط اور حدیث میں بھی ہے کہ جو شخص کسی نامحرم سے اپنی نگاہ کو روک لیگا وہ ایک حلاوت اپنے دل میں پائیگا دوسرے مولانا کے زمانہ میں یہ اشغال نہ تھے یہ تو جوگیوں سے لئے گئے ہیں اسلئے کہ طبی قاعدہ سے حصول یکسوئی میں یہ اشغال مفید ہیں باقی ثواب میں ان کو کچھ دخل نہیں۔ غرض یہ لوگ اسی ادھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں کہ کیفیات وغیرہ کے لئے وظائف پڑھیں یا اشغال کریں اور اس کو بڑا مجاہدہ اور ثواب سمجھتے ہیں حالانکہ ان کو مقصود سے کچھ بھی مس نہیں اور جو شیخ اس حالت میں ان مریدوں کو وظیفے ہی تبلاتا جائے اس کے متعلق محقق یوں کہے گا ؎

بے خبر بود ند از حال درون استعیذ اللہ مما یفترون

اسکو اصل مرض کی خبر نہیں جو اس شخص کی پریشانی کا سبب ہے اصل مرض صرف یہ ہے کہ

اس نے یکسوئی اور کیفیت ذوق وشوق وغیرہ کو مقصود سمجھ رکھا ہے اسلئے پریشان ہے اس مرض کا اصلی علاج یہ ہے کہ اس کے ذہن نشین یہ مسئلہ کر دیا جائے کہ یہ کیفیات مقصود نہیں ہیں کیونکہ یہ مامور بہا نہیں ہیں اور مقصود وہی ہے جو مامور بہ ہے اور ظاہر ہے کہ تحصیل استغراق وغیرہ کا نصوص میں کہیں امر نہیں کسی کو دعویٰ ہو تو دکھلائے ہاں شوق[عـه] وتثبت کیلئے حدیث میں دعا آئی ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ بعض احوال محمود ہیں مگر مقصود ہونا تو ثابت نہ ہوا کیونکہ یاد رکھو کہ شریعت نے انہیں اشیاء کو مقصود بنایا ہے جو بندہ کے اختیار میں ہوں اور جو شے اختیار انسان سے باہر ہو وہ مامور بہ نہیں ہوتی نہ مقصود ہوتی ہے شاید اس پر آپ کہیں کہ مغفرت ودخول جنت بھی تو غیر اختیاری ہے یہ بھی مقصود نہ ہوتی ورنہ اگر یہ مقصود ہیں تو تبلاؤ قرآن میں انکا کہاں امر ہے میں کہتا ہوں قرآن میں تو ان کا امر جابجا صراحۃً مذکور ہے سَابِقُوْا[عـه] اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اور اسکا امر اسلئے ہے کہ ان دونوں کا حصول انسان کے اختیار میں ہے شاید آپ اس سے چونکیں گے کہ حصول مغفرت ودخول جنت اختیار میں کہاں تو میں کہتا ہوں کہ امور اختیاریہ کا اختیاری ہونا جس درجہ میں ہے اور جو مبنی انکے اختیاری ہونیکا ہے وہ مبنی یہاں بھی موجود ہے اور اسکا بھی وہی درجہ ہے۔ کیونکہ تمام امور اختیاریہ کے اختیاری ہونیکا مبنی یہ ہے کہ اس کا سبب انسان کے اختیار میں ہے باقی یہ کہ مسبب براہ راست اختیار میں ہو سو یہ کسی امر میں بھی نہیں۔ دیکھئے سیراب ہونا پیٹ بھرنا ملازمت زراعت سے روپیہ حاصل کرنا وغیرہ جو اختیاری کہلاتے ہیں اسی معنی کے اعتبار سے کہ ان کے اسباب اختیار میں ہیں ورنہ مسبب تو کسی کے بھی اختیار میں نہیں عقلاء سب اسپر متفق ہیں۔ اور جب یہ ہے تو تبلاؤ جنت ومغفرت اختیاری کیوں نہیں جبکہ ان کے اسباب اختیاری ہیں یعنی اعمال صالحہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جابجا اعمال پر مغفرت ودخول جنت کو متفرع فرمایا ہے اور اعمال اختیاری ہیں تو یہ بھی اختیاری ہے کیونکہ سبب اختیار میں ہے اور سبب ہی کے اختیاری ہونے پر شے کا اختیاری ہونا مبنی ہے۔ باقی ان احوال وکیفیات کی طلب وتحصیل کا امر تم[عـه] تبلاؤ کہاں ہے یا کس عمل پر ان کے ترتب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ بس سالکین کی زیادہ پریشانی کا راز یہ ہے کہ وہ غیر مقاصد کے درپے ہوتے ہیں۔

عـه فان قلت قال تعالى وفى ذلك فليتنافس المتنافسون ٥ وهذا هو الشوق وقال وایای فارهبون وهذا هو الخشية فكيف لا يكونان مامورين بهما قلت ان المامور به درجة الشوق والخوف العقلى دون الطبعى ١٢ جامع

عـه وڑو اور سبقت کرو مغفرت کی طرف جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے اور طرف جنت کے جسکی وسعت ایسی ہے جیسے آسمان اور زمین کی وسعت۔ پارہ ۲۷ رکوع ۱۹ ع ۳۰۸

یہ حال تو محققین کا ہے کہ وہ کیفیات کے طالب اور ان کے انعدام سے پریشان ہوتے ہیں وجہ یہ کہ یہ محق ہونے کی ساتھ غیر محقق ہیں۔ اور ایک جماعت مبطلین کی ہے جنکو غیر محققین بھی کہا جاتا ہے ان کی یہ حالت ہے کہ احوال وکیفیات کی طلب میں ان لوگوں سے معاصی تک سرزد ہوتے ہیں مثلاً بیوی بچوں سے ترک تعلق کر دیتے ہیں تاکہ کیفیت میں فرق نہ آئے۔ میرٹھ کا واقعہ ہے کہ میں ہاں اپنے گھر میں علاج کے واسطے ان کی ساتھ گیا ہوا تھا اسوقت ایک مساۃ نے بیعت کی درخواست کی چند عورتوں نے اسکو کہا تو ان سے بیعت نہ ہو بلکہ ہمارے پیر سے مرید ہونا جنہوں نے پچاس سال سے بیوی کا منہ نہیں دیکھا اور یہ تو بیوی کو سفر میں لئے لئے پھرتے ہیں اس مساۃ نے اس قسم کا جواب دیا کہ تمہارے پیر سے تو میں ہرگز بیعت نہ ہوں گی وہ تو پچاس برس سے خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہے کہ بیوی بچوں کے حقوق ادا نہیں کرتا میں تو ان سے ہی مرید ہونگی ان کا طرز سنت کے موافق ہے۔ تو اس ظالم نے پچاس برس سے بیوی کو چھوڑ رکھا تھا شاید اسی لئے علیحدہ رہا ہوگا تاکہ بیوی کے اختلاط سے یکسوئی وغیرہ کی کیفیت میں خلل نہ آجائے مگر جو کیفیت معصیت کے ساتھ بھی مجتمع رہے ایسی کیفیت خود مردود ہے یاد رکھو کہ بعض دفعہ کیفیات محمودہ وکیفیات غیر محمودہ میں صورۃً اشتباہ ہوجاتا ہے مثلاً تذلل وتملق وتواضع کی صورت بعض دفعہ یکساں ہوتی ہے اسی طرح۔ استغنا عن الخلق وکبر کی صورت متشابہ ہوجاتی ہے ایسی ہی نفسانی یکسوئی اور روحانی یکسوئی میں اشتباہ ہوجاتا ہے۔ بیوی بچوں سے الگ رہکر جو یکسوئی حاصل ہوتی ہے وہ نفسانی یکسوئی ہے روحانی نہیں ہے۔ اس تشابہ وتشاکل کو مولانا رومی رح اس طرح بیان فرماتے ہیں سہ

بحر تلخ وبحر شیریں ہمعناں | درمیاں شاں برزخ لایبغیاں

جب کیفیات میں باہم تشابہ ہے تو اب کسی معیار کی ضرورت ہوئی جس سے معلوم ہوسکے کہ کونسی کیفیت محمودہ ہے اور کونسی مذمومہ سو اسکے لئے معیار صرف شریعت مقدسہ ہے یعنی جو کیفیت کسی گناہ کا مقدمہ ہوجائے وہ مذموم ہے ورنہ محمودہ ہے اگر یہ معیار سامنے نہو تو پھر کیفیات تو جوگیوں کو بھی نصیب ہوجاتی ہیں کیا ان کو بھی صوفی اور ولی کہو گے۔ اور آجکل اس کہدینے میں بھی استبعاد نہیں کیونکہ جب لوگوں نے کیفیات ہی کو مقصود سمجھ لیا ہے اور تصوف انہی کا نام رکھ چھوڑا ہے تو انکے نزدیک ہر صاحب کیفیت صوفی ہے خواہ مسلم ہو یا کافر چنانچہ آج کل ایک کافر صاحب ریاضت

کے بہت سے مسلمان معتقد ہیں۔ اور مظفر نگر میں سنا تھا کہ ایک ہندو بابو کے بہت سے مسلمان مرید
ہیں اسی طرح بعض دفعہ ہندو کسی مسلمان پیر سے مرید ہوتے ہیں اور وہ مسلمان پیر صاحب اسکو
مرید کر لیتے ہیں اور مرید صاحب ہندو کے ہندو ہی رہتے ہیں یہ مصلحت سمجھتے ہیں کہ شاید کسی وقت
مسلمان ہو جاویں۔ مگر ہمارے اکابر نے اس سے بھی منع فرمایا ہے۔ گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہ
کے پاس ایک ہندو مرید ہونے آیا اور تعجب یہ کہ وہ ایک بہت بڑے بزرگ زمانہ سے مرید تھا
ان کا انتقال ہو گیا تھا اسلئے مولانا کے پاس تجدید بیعت کے لئے آیا اور ان مرحوم بزرگ کے
ایک معتقد کا خط لایا حضرت مولانا نے صاف فرما دیا کہ بیعت کرنے سے انکار نہیں مگر ہمارے ہاں بیعت
کی سب سے اول شرط اسلام ہے۔ مسلمان ہو جاؤ ہم مرید کر لیں گے۔ اس نے یہ شرط نہیں کی
حضرت نے مرید نہ کیا۔ بعد میں بعضوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر اس کو اسی حالت میں مرید کر لیا
جاتا تو اسلام سے قریب ہو جاتا۔ فرمایا ہرگز نہیں بلکہ اور بعید ہو جاتا کیونکہ ذکر و شغل میں خاصیت ہے کہ اس سے
کیفیات طاری ہوتی ہیں اور کیفیات میں خاص لذت بھی ہوتی ہے جسکو یہ شخص قرب حق کی لذت
سمجھتا اور اس کو کافر رہکر بھی یہ کیفیات حاصل ہو جاتیں تو اسکا یہ خیال پختہ ہو جاتا کہ قرب الٰہی میں ۱۰م
اسلام کو کچھ دخل نہیں نہ اسلام کی ضرورت ہے بلکہ کافر رہکر بھی قرب حق حاصل ہو سکتا ہے تو پھر کسی
وقت بھی اسکے اسلام لانے کی امید نہ رہتی اور اب جو کورا جواب دیا گیا ہے کہ بدون اسلام کے خدا کا راستہ
نہیں مل سکتا اب امید تو ہے کہ شاید کسی وقت اسلام کی ضرورت کا خیال اسکے دل پر غالب ہو۔
اس قصہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کیفیات کافر کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ
جس چیز کے حصول میں اسلام بھی شرط نہ ہو وہ کیونکر مقصود اور قرب کا موقوف علیہ ہو سکتی ہے ہرگز
نہیں خوب سمجھ لو کہ ان کیفیات کو قرب میں کچھ دخل نہیں نہ یہ مقصود تصوف ہیں۔ اور ایک مسئلہ یہ
معلوم ہوا کہ کفار کو مرید کرنا اسلام سے ان کو قریب کرنا نہیں ہے بلکہ بعید کرنا ہے آجکل ایک صاحب
پیر بنے ہوئے ہیں ان سے ہندو بھی مرید ہیں۔ اور ستم پر ستم یہ کہ آپ نے ایک رسالہ میں یہ بھی
شائع کیا ہے کہ میرے بعض ہندو مرید مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر آپ کہیں تو ہم مسلمان ہو جائیں میں نے
ان کو لکھ دیا ہے کہ نہیں مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہندو رہکر بھی کامیاب ہو سکتے
ہیں یا اسی کے قریب کچھ الفاظ تھے) بتلایئے جو شخص مسلمان ہونے والے کو اسلام سے

روکے اور یہ کہے کہ اسلام کی ضرورت نہیں اسکے کفر میں کیا شبہ ہوسکتا ہے مگر یہ کمبخت پھر بھی شیخ طریقت اور پیر ہونے کے مدعی ہیں نہ معلوم یہ کیسا تصوف ہے جسکے لیئے اسلام کی بھی ضرورت نہیں سلف کے نزدیک تو تصوف کے معنی تعمیر الظاہر والباطن تھے کچھ عرصہ سے تعمیر ظاہر کو تو لوگوں نے تصوف سے نکال ہی ڈالا تھا اب ایسے خلف پیدا ہوئے جنہوں نے تعمیر باطن کو بھی اس سے الگ کر دیا کہ ایمان و اسلام سے بھی دل کو آباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب ایمان و عمل دونوں اجزا جاتے رہے تو فرمایئے وہ تصوف کیا خاک رہا۔ بلکہ محض جوگ رہ گیا پھر یہ لوگ اپنے کو صوفی کس لئے کہتے ہیں جوگی کہنا چاہیئے۔ انہیں وجوہ سے بعض لوگ تصوف سے بداعتقاد ہوگئے کہ یہ عجیب گورکھ دہندا ہے جس میں نہ اسلام کی ضرورت نہ ایمان کی نہ عمل کی نہ معاصی سے بچنے کی اور ظاہر ہے کہ سب مسلمان تو ایسے جاہل نہیں کہ ان کو دین کی کچھ بھی عقل نہ ہو وہ اس حالت کو یقینی بیدینی سمجھتے ہیں اور ان جوگیوں کی وجہ سے جنہوں نے شیخ اور صوفی کا لقب اختیار کر رکھا ہے اس فیصلہ پر مجبور ہوئے کہ تصوف زندقہ اور بیدینی کا نام ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ کیا چند اناڑی عطائیوں کے غلط سلط نسخوں سے فن طب یا محقق اطبا سے بھی آپ بداعتقاد ہوسکتے ہیں ہرگز نہیں پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ عطائی صوفیوں کی حرکات سے آپ تصوف کو چھوڑ دیں اور محقق صوفیہ سے بھی بداعتقاد ہوجائیں جسطرح آپ علم طب میں محقق طبیب کی تلاش کرتے ہیں اسی طرح تصوف میں بھی محقق صوفی کو تلاش کرنا چاہیئے سب سے بداعتقادی کی کیا وجہ ہے۔ غرض میں کیفیات کے غیر مقصود ہونیکو بتلا رہا تھا کہ ان کے حصول میں اسلام کی بھی ضرورت نہیں تو پھر یہ مدار قرب کیونکر ہوسکتے ہیں اب ایک بات اور کہتا ہوں کہ دین میں مقصود وہ ہوتا ہے جو بدون تحصیل کے حاصل نہ ہو جسکا حصول صرف اختیار پر موقوف ہو اور قرآن میں منصوص ہے کہ بعضے احوال جیسے کشف مرتے ہی سبکو خود بخود حاصل ہوجائیں گے یہانتک کہ کفار کو بھی چنانچہ ارشاد ہے وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ اور فرماتے ہیں فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ اور ارشاد ہے أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا باقی میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ محمود بھی نہیں۔ اگر کسی کو کیفیات محمودہ حاصل ہوں (جسکی محمودیت کا معیار آپکو ابھی معلوم ہوچکا ہے کہ اس سے طاعت میں ترقی اور گناہوں میں کمی ہو) تو نور علی نور ہے خدا کی نعمت

اس کی قدر کرے اور نہ حاصل ہوں تو کچھ غم نہ کرے اسوقت اسکو مولانا رومیؒ کا یہ شعر سنایا جائیگا

روزہا گر رفت گو رو باک نیست   تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے جب کوئی یہ کہتا ہے کہ اتنی لاکھ دفعہ ذکر کرتا ہوں مگر نفع نہیں ہوتا تو فرمایا کرتے کیا یہ نفع تھوڑا ہے کہ اتنی لاکھ مرتبہ ذکر کی توفیق ہوگئی۔ ہمارے ایک دوست ہیں وہ ذکر و شغل کے پابند ہیں مگر طالب کیفیات ہیں اور کیفیات انکو حاصل نہیں ہوتیں کیونکہ کیفیات کا مدار یکسوئی پر ہے اور یکسوئی کم عقلوں کو زیادہ ہوجاتی ہے عاقلوں کو خاصکر صاحب ذکاوت مفرطہ کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کا دماغ ہر وقت حرکت فکریہ میں رہتا ہے اسی لئے میں نے ان سے کہدیا تھا کہ تم کو کیفیات کبھی حاصل نہونگی تم صرف ذکر و شغل کو غنیمت سمجھکر کئے جاؤ۔ مگر وہ طلب سے باز نہ آئے ایک صاحب توجہ و تصرف بزرگ کے پاس گئے انہوں نے ان سے روزے رکھوائے اور درود و استغفار معلوم کتنا پڑھوایا پھر ان پر توجہ ڈالی۔ ایک ڈالی پھر دوسرے دن پھر تیسرے دن مگر

۳۱۲ اپنا اثر ہی نہوا ایک کیفیت بھی حاصل نہوئی۔ اسوقت ان کو میرے قول کی تصدیق ہوئی کہ واقعی میں کیفیات کے قابل نہیں ہوں اسوقت طلب کیفیت دل سے نکلی اور اسکے قبل ان ہی کا ایک واقعہ اور ہوا تھا کہ ان کو ایک ریاست میں جہاں عرصہ تک ملازم رہے تھے کسی کام سے جانا پڑا مجھ سے اجازت لی میں نے اجازت دیدی گو میں جانتا تھا کہ اس سفر سے معمولات ناغہ ہوجاویں گے مگر میں نے قصداً یہی سمجھکر اجازت دی تھی کہ ذرا ان کو ذکر و شغل کی قدر تو معلوم ہو چنانچہ اس سفر میں معمـ ـلات کے ناغہ ہونے سے ان کو اپنے قلب میں ایک ظلمت سی محسوس ہوئی اور وہ جو ذکر اللہ سے خاص نور پیدا ہوا تھا اس میں کمی ہوئی تو وہ بڑے گھبرائے اور نہایت قلق ہوا میرے پاس خط لکھا جسمیں اپنی تباہی اور بربادی کا رونا رویا تھا۔ میں نے لکھا کہ آج ان معمولات کے ناغہ ہونے کی فکر کیوں ہے اسکا قلق اسقدر کس لئے ہے یہ تو وہی ہے جسکی تم تحقیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بدون کیفیت کے معمولات لاشئے ہیں ان واقعات کے بعد وہ چین سے بیٹھے اور سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا ہی بڑی دولت ہے یہ دولت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔ اگر وہ تم سے توفیق سلب کرلیں اور تم ایک دفعہ بھی اللہ کا نام نہ لیسکو تو بتلاؤ کیا کرلوگے سہ بلا بودے اگر ایں ہم نبودے۔ سنبھلو کیا کیفیات لئے پھرتے ہو۔ تم اس غیر مقصود کی طلب میں مقصود کی بیقدری کرکے کہیں اس کو بھی ہاتھ سے نہ دو بیٹھنا

کیونکہ ایک صورت قہر نازل ہونے کی یہ بھی ہے کہ خدا کا نام لینے کی توفیق سلب ہو جائے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ کلمہ توحید زبان سے نکالنا چاہا مگر زبان نہ چلی اور سب باتوں میں زبان چلتی تھی مگر کلمہ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ یہ عارف تھے گھبرا گئے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اس کا کیا سبب ہے الہام ہوا کہ فلاں دن جسکو اتنے سال ہوئے تم نے ایک بیجا کلمہ زبان سے نکالا تھا اور اب تک اس سے توبہ نہیں کی آج اس کی یہ سزا مل رہی ہے کہ کلمہ کی توفیق سلب ہو گئی اس گناہ سے توبہ کرو تو عذاب ٹلے۔ چنانچہ انہوں نے توبہ کی توبہ قبول ہوئی اور یہ وبال رفع ہوا حضرت اسکو معمولی بات نہ سمجھئے کہ آپ کو ذکر توفیق ہو گئی واللہ یہ بڑی دولت ہے ورنہ ہزاروں لاکھوں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں جنکی زبان کو خدا نے توفیق ذکر سے بند کر دیا ہے۔ جیسے ایک حکایت ہے کہ غلام اور آقا بازار کو گئے راستہ میں مسجد آگئی غلام نمازی تھا آقا بے نمازی غلام نے نماز پڑھنے کے لئے آقا سے اجازت چاہی اس نے اسکو اجازت دیدی اور خود مسجد کے دروازہ پر بیٹھ گیا جب نماز ختم ہو گئی اور نمازی مسجد سے نکلنے لگے تو آقا صاحب کو انتظار ہوا کہ اب غلام بھی آتا ہوگا مگر وہ نہ آیا اور بہت دیر لگا دی اسپر آقا نے جھلا کر پکارا کہ میاں کہاں رہ گئے آتے کیوں نہیں۔ غلام نے جواب دیا کہ آنے نہیں دیتے! کہا کون نہیں آنے دیتا۔ کہا جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھکو باہر نہیں آنے دیتا صاحبو! یہ توفیق اور عدم توفیق ہی تو ہے کہ غلام مسجد کے اندر نواب بنا بیٹھا ہے۔ اور آقا صاحب باہر سیڑھیوں پر منتظر نوکر بنے بیٹھے ہیں مگر آج کل ایسے مذاق کے بھی لوگ موجود ہیں جو بجائے اسکے کہ اس خذلان پر قلق کریں فخر کرتے ہیں چنانچہ ایک شخص کا بچھڑا ہاتھ سے چھوٹ کر مسجد میں گھس گیا مؤذن چلانے لگا کہ لوگ جانوروں کو مسجد میں گھسا دیتے ہیں تو وہ بچھڑے والا جواب دیتا ہے کہ میاں جی کیوں بگڑتے ہو جانور بے سمجھ تھا مسجد میں آگیا بھلا کبھی تم نے ہمیں بھی یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کمبخت کے نزدیک مسجد میں جانا کم سمجھ لوگوں کا کام ہے۔ مگر ایسے نامعقولوں کو موت کے بعد جواب معلوم ہو جائے گا یہاں وہ قابل خطاب نہیں ہیں۔ بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ ذکر اللہ بڑی دولت ہے اسکی قدر کرو اور کیفیات کے درپے ہو کر اسکی بے قدری نہ کرو۔ مولانا رومیؒ نے اسپر ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک سالک کو شیطان نے دھوکہ دیا کہ تم برسوں سے ذکر شغل تہجد وغیرہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ کوئی پیام ہے نہ سلام ہے تو پھر تم ہی کیوں سر مارتے ہو جب وہ پوچھنے تک بھی نہیں۔ اس دھوکہ کا اسکے ذہن میں

کچھ جواب نہ آیا تو اس رات اس نے ذکر وشغل وتہجد سب ترک کر دیا سوتے ہوئے کوئی لطیفۂ غیبیہ خواب میں آیا اور اس نے حق تعالیٰ کی طرف سے پوچھا کہ کیوں صاحب آج ہم کو چھوڑ کر کیوں سو گئے نہ ذکر کیا نہ تہجد میں اٹھے اس نے وہی جواب دیا جو شیطان نے دھوکہ میں پڑھایا تھا کہ ادھر سے تو کچھ پیام وسلام ہے ہی نہیں پھر میں کیوں سر ماروں وہاں سے جواب ارشاد ہوا

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ... ویں نیاز وسوز و دردت پیک ماست

کہ یہ اللہ اللہ کہنا تھا کہ ایک دفعہ اللہ کہکر دوبارہ زبان سے اللہ نکلنا یہ ہمارا جواب ہی تو ہے کہ ہاں ہم نے پہلا قبول کر لیا ہے اگر پہلا قبول نہ ہوتا بلکہ ناگوار ورد ہوتا تو زبان بند کر دیتے اور ذکر کی توفیق سلب کر لیتے کیونکہ جس شخص کا دربار میں آنا بادشاہ کو ناگوار ہو اور بادشاہ صاحب قدرت بھی ہو تو وہ پہلی ہی دفعہ کان پکڑ کر اسکو نکال دیتا ہے۔ حاجی صاحبؒ نے اس سے ایک مسئلہ مستنبط فرمایا ہے کہ جس طاعت کے ایک دفعہ کرنے کے بعد دوبارہ اس کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ پہلی طاعت قبول ہو چکی یہ علامت قبول کی ہے اور گو یہ استنباط قطعی نہیں مگر ظاہر عادۃ اللہ اور وسعت رحمت اسی کو مقتضی ہے پس تغلیب رجا میں یہ بہت نافع ہے جو کہ شرعاً مامور بہ ہے لَا يَمُوتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِرَبِّهِ الغرض آجکل بیعت کی حقیقت وغایت میں عام طور سے غلطی ہو رہی ہے لوگ مقاصد وغیر مقاصد میں فرق نہیں کرتے نہ اعمال کا اہتمام کرتے ہیں نہ اعمال پر روک ٹوک ہے حالانکہ تعلق بیعت میں طرفین سے التزام بھی ہے اطاعت کا اور معاہدہ ہے اصلاح کا پھر بھی وہاں روک ٹوک نہیں صرف وظائف کی بھرمار ہے اور اگر کچھ روک ٹوک ہے بھی تو صرف دو چار اعمال پر جنکا ضروری ہونا سبکو معلوم ہے حالانکہ وہ باتیں زیادہ بتلانا چاہئیں جنکی مخاطب کو ضرورت ہی معلوم نہیں مگر ایسی باتیں کیونکر بتلائیں ان کی ضرورت سے خود شیخ ہی منکر ہیں اور منکر اسلئے ہیں کہ ان سے خود کورے ہیں اسی لئے امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ او عزیز تمہاری اصلاح کی کیا امید ہو جبکہ تمہارے طبیب ہی مریض ہیں۔ صاحبو! بیعت ہو چکنے کے بعد جن چیزوں پر روک ٹوک زیادہ ضروری ہے وہ اس قسم کی ہیں کبر وعجب قناعت حقوق العباد حسد وبغض۔ فساد ذات البین وغیرہ مگر آجکل ان امور پر مطلق روک ٹوک نہیں حالانکہ پہلے زمانہ میں مشائخ کو اول اسی کا زیادہ اہتمام تھا وظائف تو سالہا سال کے بعد تعلیم کرتے تھے اور یہی نہیں کہ محض زبان سے ان امور پر روک ٹوک کریں بلکہ تدبیروں سے ان امراض کو نسب سے نکال لیتے تھے

مثلاً کسی کو زینت پرستی میں مبتلا دیکھا تو اسے سڑکوں پر یا خانقاہ میں جھاڑو دینا بتلایا اور جس میں تکبر دیکھا اسکو نمازیوں کے جوتے سیدھا کرنا تعلیم کر دیا جنہیں ایک جولاہے کو بھی جوتے تھے جو اس متکبر کی رعیت کا جولاہا ہے اسکے جوتے سیدھے کرتے ہوئے بس جگر ہی تو کٹ گیا اور دل پہ آرہ ہی تو چل پڑا مگر یہ حالت ایک دو دفعہ میں ہوتی ہے پھر افعال تواضع میں خاصیت ہے کہ ان سے قلب میں بھی تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ کرتے کرتے ہر قسم کی عادت ہو جاتی ہے۔ حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی کا قصہ میں نے بارہا بیان کیا ہے غالباً سامعین اکثر اس سے واقف ہونگے کہ سلطان نظام الدین بلخی نے انکے عجب کا کس طرح علاج فرمایا تھا کہ اول انکو حمام جھونکنے کی خدمت سپرد کی پھر سال بھر کے بعد بھنگن سے کہا کہ ان کے سر پر ذرا سی اپنے ٹوکرے کی مٹی جھاڑ دے جب وہ اسپر جھلائے تو ایک مدت تک پھر یہی خدمت اور لی اور اسکے بعد مدت تک پھر یہی خدمت لی پھر شکاری کتوں کی خدمت سپرد کی اور یہ کام اس شخص سے لئے جو گنگوہ کے پیرزادے بھی تھے اور قطب زادے بھی تھے اس قسم کی خدمتیں لیکر پھر کہیں ذکر شغل تبلاتے تھے۔ اے صاحب اس قسم کی تعلیم کا تو آج کل کہیں ٣١٥
پتہ بھی نہیں۔ حالانکہ ضرورت اسی کی ہے کیونکہ شیخ کو طبیب کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر مریض کو ایک ہی نسخہ نہ دے بلکہ نسخے بدلتا رہے جیسا مریض دیکھے ویسا ہی نسخہ تبلائے اور ایک مریض کو بھی ایک نسخہ نہ دے بلکہ اسکے لئے بھی حسب ضرورت تبدل و تغیر کرتا رہے مگر آجکل شیوخ کے یہاں بس ایک ہی طریقہ سبکے لئے ہے یہ طرز ٹھیک نہیں بلکہ ہر شخص کے مناسب اسکے امراض کی تشخیص کے بعد جدا جدا تعلیم ہونا چاہیے۔ اور ان کو رات دن اعمال و اخلاق پر ٹوکنا چاہیے۔ اور جن اعمال کا دین ہونا عام طور سے معلوم ہے اس کا اہتمام اسقدر زیادہ ضروری نہیں بلکہ جن باتوں کا دینی ہونا لوگوں کو معلوم نہیں ان کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ مثلاً اصلاح اخلاق کو آجکل دنیوی امور سے سمجھتے ہیں اصلاح اخلاق کو دین نہیں سمجھتے مثلاً لوگوں کو اسکا اہتمام ہی نہیں کہ ہمارے فعل یا قول سے کسی کو ایذا نہ پہونچے نہ اسکو دین کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَيَدِہٖ کہ مسلمان وہ ہے جسکی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسپر اسلام ہی کو موقوف فرمایا ہے گو علماء نے اسمیں تاویل کر لی کہ مراد کمال اسلام کا موقوف ہونا ہے مگر حضور کے الفاظ تو یہی ہیں کہ مسلمان وہی ہے جسکے ہاتھ اور زبان سے

مسلمان بچے رہیں یعنی جو ایسا نہو وہ مسلمان ہی نہیں کیا ان الفاظ کا اطلاق کچھ اثر نہیں رکھتا گو مراد وہی ہو جو علماء نے فرمائی ہے۔ اب میں ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکا کس درجہ اہتمام تھا حدیث میں آتا ہے کہ ایک رات آپ حضرت عائشہؓ کے گھر تھے کیونکہ ان کی باری تھی اور وہ رات شب برات کی تھی حضورؐ نصف شب کیوقت حکم ہوا کہ جنۃ البقیع کے مسلمانوں کیلئے جاکر دعا کریں تو آدھی رات آپ اٹھے جسکی کیفیت حضرت عائشہ یوں بیان فرماتی ہیں کہ قَامَ رُوَیْدًا وَفَتَحَ الْبَابَ رُوَیْدًا ثُمَّ خَرَجَ رُوَیْدًا ثُمَّ اَغْلَقَهُ رُوَیْدًا حضور صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ سے اٹھے آہستہ آہستہ چلے آہستہ ہی دروازہ کھولا آہستہ ہی باہر تشریف لیگئے آہستہ ہی اسکو بند کیا ہر کام آہستہ کیا تاکہ حضرت عائشہؓ کی آنکھ نہ کھل جائے انکو تکلیف نہو حالانکہ حضرت عائشہؓ کون تھیں حضورؐ کی عاشق تھیں جن کا محبوب کیلئے بزبان حال یہ قول تھا۔ گر بر سر و چشم من نشینی ٭ نازت بکشم کہ نازنینی

اول تو عموماً بیوی کو شوہر سے ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اگر خاوند سوتی ہوئی کو جھنجھوڑ بھی دے تب بھی
۳۰ اسکو ایذا نہو بلکہ راحت ہو اور خصوصی حضرات ازواج مطہرات تو حضورؐ کی سب سے زیادہ عاشق تھیں اور بالخصوص ان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مگر اس تعلق پر بھی حضورؐ نے انکی نیند کا اسقدر خیال فرمایا کہ سب کام آہستہ کیئے۔ مگر یہ تو عاشق تھیں انکو خبر کیسے نہوتی کو حضورؐ نے سامان ایسا کیا تھا کہ انکو خبر نہو مگر جب مکان حضورؐ سے خالی ہوا تو حضرت عائشہؓ کے قلب نے حالت نوم ہی میں اسکا احساس کیا اور انکی آنکھ کھل گئی آنکھ کھولنے کے بعد جب حضورؐ کو نہ پایا تو بڑی پریشانی ہوئی کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید آپ کسی بیوی یا باندی کے پاس چلے گئے بالآخر پریشانی میں گھر سے نکلیں اور آپ کو جاتے ہوئے دیکھکر بقیع کی طرف چلیں دیکھا کہ حضورؐ امت کیلئے دعا فرما رہے ہیں یہ حالت دیکھکر اطمینان ہوا اور یہ واپس ہوئیں اور پیچھے پیچھے حضورؐ بھی واپس ہوئے اور راستہ میں حضرت عائشہؓ کے قریب ہی آپ بھی پہونچ گئے حضرت عائشہؓ نے اس خیال سے کہ حضورؐ کو معلوم نہ ہو تیز تیز چلنا شروع کیا حضورؐ کو خیال ہوا کہ یہ آگے آگے کون ہے آپ نے بھی تیز چلنا شروع کیا یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ بھاگنے لگیں اور حضورؐ سے پہلے اپنے گھر میں داخل ہوکر بستر پر لیٹ گئیں مگر سانس پھولا ہوا تھا اسکو کیونکر روکتیں حضورؐ جو گھر میں تشریف لائے تو آپ کو حضرت عائشہ کا سانس پھولا ہوا معلوم ہوا فرمایا یَا عَائِشَۃُ مَا لَكِ حَشْیَا رَابِیَۃً یہ لمبا لمبا پھولا ہوا سانس کیوں آرہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ میرے آگے آگے تم ہی بھاگی ہوئی آرہی تھیں اسپر حضرت عائشہ

ہنس پڑیں تو حضور نے فرمایا أتخافين أن يحيف الله عليك ورسوله اسی طرح حضرت مقداد بن الاسود صحابی فرماتے ہیں کہ ہم چند آدمی بھوکے پیاسے مدینہ پہونچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمکو اپنے ذمہ کر لیا حضور کے یہاں چند بکریاں پلی ہوئی تھیں ان کا دودھ آپ نے ہم کو بتلا دیا ہم سب بھی پی لیتے اور حضور کے لئے بھی رکھدیتے۔ حضرت مقداد فرماتے ہیں کہ ایک رات حضور کو مکان پر تشریف لانے میں ذرا دیر ہوئی میں یہ سمجھا کہ شاید کسی نے آپ کی دعوت کردی ہوگی اس خیال سے میں نے آپ کے حصہ کا بھی دودھ پی لیا۔ پی تو لیا مگر بعد میں خیال ہوا کہ اگر حضور کی دعوت نہوئی ہو اور حضور بھوکے پیاسے رہے تو کیونکر ہوگی بس یہ خیال آنا تھا اور مجھے بےچینی لگی اب ہر چند کروٹیں بدلتا ہوں مگر چین نہیں آتا یہاں تک کہ حضور بہت دیر میں تشریف لائے اور آہستہ کواڑ کھولے اور ایسا آہستہ سلام کیا جسکو جاگنے والا سن لے اور سونیوالا نہ جاگے اللہ اکبر کیسا عدل جامع بین حق اللہ وحقوق العباد تھا کہ نہ تو سونیوالوں کی اتنی رعایت کہ سلام ہی نہ کریں کیونکہ احتمال اس کا بھی ہے کہ شاید کسی عارض سے کوئی جاگ رہا ہو۔ اور نہ اتنا غلو کہ زور سے اس طرح سلام کریں کہ سب کی آنکھ کھل جائے چنانچہ آجکل صوفی اور سالکین بھی ان امور کی رعایت نہیں کرتے رات کو اٹھتے ہیں تو زور کے ساتھ کھٹ پٹ چلتے ہیں۔ استنجا کیلئے ڈھیلے بھی زور سے پھوڑتے ہیں۔ پانی بھی زور سے بھرتے ہیں کلی بھی زور سے کرتے ہیں۔ آخر یہ کیا طریقہ ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ کسی دوسری قوم کے لئے ہے کہ وہ اسپر عمل کریں اور تم عمل نکرو۔ پورا قصہ یہ ہے کہ پھر حضور اس برتن کی طرف چلے جسمیں دودھ رکھا جاتا تھا اسکو خالی پایا تو آپ نماز میں مشغول ہوگئے اور نماز کے بعد حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ اسوقت جو مجھے کھانا کھلائے اسکو آپ بھی روزی دیجئے اسوقت حضرت مقداد سے نرہا گیا اور اللہ کا نام لیکر بکریوں کے نیچے جا بیٹھے تو دیکھا کہ حضور کی دعا کی برکت سے سب کے تھن خوب بھرے ہوئے ہیں تب بہت سا دودھ لیکر آپ کے پاس آئے اپنے پی لیا تو ان سے کہا کہ تم بھی پیو اسپر یہ بہت ہنسے حضور نے سبب پوچھا تو سارا واقعہ سنایا۔ غرض حضور کا تو یہ طریقہ تھا مگر ہمکو اتباع نبوی کا ذرا اہتمام نہیں اور ایک مرض ہم میں یہ ہے کہ کسی جگہ سے کوئی چیز اٹھائیں گے تو اسکو بے جگہ رکھدیں گے جس سے دوسروں کو تلاش میں پریشانی ہوتی ہے۔ چارپائی بچھائیں گے تو بالکل راستہ میں پھر اسکو وہیں چھوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے چاہے رات کو کوئی الجھ کر ہی گر پڑے اور ہاتھ پانو یا سر ہی پھوٹ جائے۔ اسی طرح جماعت کے بعد

نفلوں کی نیت ایسی جگہ باندھیں گے جس سے لوگوں کو چلنے پھرنے میں تکلیف ہو کسی جگہ سے برتن میں کھانا آیا تو اب یہ نہیں ہوتا کہ اس کا برتن جلدی خالی کر دیں بلکہ اسی میں کھانا شروع کر دیں گے بلکہ کئی روز تک اسکو محبوس رکھیں گے اور دوسرا شخص برتن مانگے تو کہتے ہیں کیا ہم رکھ لیں گے میں کہتا ہوں کہ دیر کرنے میں یہی اندیشہ ہے کہ تم رکھ لو یعنی رکھکر بھول جاؤ چنانچہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی کے برتن جلدی واپس نہ کئے اور رکھکر بھول گئے پھر مہینوں تک وہ اپنے ہی گھر پڑے رہے اگر مالک کو خود ہی یاد آگئے تو وہ خود بلا سے لیجائے ورنہ بس یہیں رہ جاتے ہیں آخر یہ باتیں کلفت کی ہیں یا نہیں۔ پھر ان سے احتراز کیوں نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح مریدوں کی عادت ہے کہ پیر کے ساتھ کسی جگہ جائیں گے تو جماعت کی جماعت بیس پچیس آدمیوں کی ساتھ جائے گی اور وہ پیر بھی حضرت ہیں جو اس لشکر کو ساتھ لئے جا رہے ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ تم نے مرید کیا ہے یا لام بندی کی ہے۔ کسی پر چڑھائی کرو گے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جس شخص کے یہاں یہ بیس پچیس آدمی جا کر مہمان ہوں گے۔ کیا اسکو گرانی نہ ہوگی پیر کی دعوت اور خدمت کو تو [illegible] سمجھے گا مگر اس لشکر کی خدمت و ضیافت ضرور اسکو گراں ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ان [illegible] کی پروا نہیں ہوتی اور ان کو جان جان کر ایذا دی جاتی ہے اور ذرا دل پر چوٹ نہیں لگتی۔ اب اگر کوئی ان باتوں پر روک ٹوک کرے تو وہ بدنام ہوتا ہے کہ بڑے قانونی ہیں ہر بات کیلئے ان کے یہاں قانون ہے کہ یوں [illegible] اٹھو۔ یوں کھڑے ہو۔ اے صاحب تم بزرگوں کا تذکرہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مشائخ کے یہاں زمان سابق میں اسی قسم کی تعلیم تھی اور انہی باتوں پر روک ٹوک تھی میرے استاد فرماتے تھے کہ ایک بزرگ کا معمول تھا کہ جو شخص ان کے یہاں مہمان ہوتا اسکے لئے اندازے کچھ زاید روٹی سالن بھیجتے پھر جب سالن روٹی بچکر آتا تو دیکھتے اگر تناسب سے بچا ہوتا تب تو وہ اس کو اپنے سلسلہ میں داخل فرماتے ورنہ صاف کہدیتے کہ تمہاری طبیعت میں بدسلیقگی ہے ہم سے تم سے نباہ نہ ہوگا۔ ایک حکایت اور سنی گئی ہے کہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء دہلوی کے یہاں دو شخص مرید ہونے آئے وہ آپس میں مسجد کا حوض دیکھکر کہنے لگے کہ ہماری مسجد کا حوض اس سے بہت بڑا ہے۔ سلطان جی نے یہ گفتگو سنلی بلایا اور پوچھا کہ تمہارا حوض اس سے کتنا بڑا ہے

۳۱۸

کہا حضرت پیمائش تو معلوم نہیں۔ فرمایا اچھا جاؤ اس حوض کی پیمائش کرکے لے جاؤ اور
اسکو پیمائش کرکے آؤ چنانچہ وہ گئے اور پیمائش کرکے واپس ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت
ہمارا حوض ایک بالشت بڑا ہے۔ فرمایا تم تو کہتے تھے بہت بڑا ہے ایک بالشت زیادہ کو
بہت بڑا نہیں کہہ سکتے جاؤ ہم تم کو بیعت نہ کرینگے۔ یہ مت سمجھنا کہ حضرت سلطان جی نے ان کو
محروم واپس کردیا نہیں بلکہ اتنی بڑی دولت دیکر واپس کیا جو تمام عمر کام آئے گی وہ کیا؟
احتیاط فی الکلام کا سبق ایسا پڑھایا جو عمر بھر نہ بھولیں گے یہی تو فرق ہے محقق وغیر محقق میں کہ
محقق دھتکارتا بھی ہے تو کچھ دیکر اور غیر محقق عمر بھر چمکارتا ہے مگر محروم کا محروم رکھتا ہے میں نے
ایک بزرگ کو دیکھا ہے اور ان کا واقعہ سنا ہے کہ ان کے پاس ایک بڑھیا آئی اور آکر فقر وغیرہ کی
شکایت کی آپ نے خادم سے فرمایا کہ اس سے کہدو خدا فضل کرے مرید نے یوں کہا کہ حضرت
فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا بس یہ بزرگ اس خادم کے سر ہوگئے کہ میں نے گا کب کہا تھا
۲۱۹ تم نے یہ گا اپنی طرف سے کیوں لگایا حضرت غور کیا جائے تو یہ بات ٹوکنے کی ضرورتھی کیونکہ اس تغیر
سے کلام کے معنی بدل گئے صورت اولیٰ میں دعا تھی کہ اللہ فضل کرے۔ اور اس صورت میں پیشین گو
ہوگی کہ بیفکر رہو خدا فضل کردے گا اسی لئے ان بزرگ نے سخت تنبیہ کی کہ تم نے میری بات کو کیوں
بدلا مجھے غیب کی کیا خبر! اب اگر کوئی یہ کہے کہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑنا ظلم ہے تو میں کہتا ہوں یہ ظلم نہیں بلکہ
عدل ہے اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ڈاکٹر وطبیب بیمار کی بدپرہیزی پر روک ٹوک کرتا ہے یقیناً
اسکو کوئی ظلم نہیں کہسکتا۔ ایسے ہی یہ بھی ظلم نہیں ایک طبیب میرے دوست ہیں وہ کہتے تھے کہ میرے
زیر علاج ایک بمبئی کا سیٹھ تھا اس نے کوئی بدپرہیزی کی مجھکو معلوم ہوا تو میں نے نبض دیکھنے سے انکار
کردیا اور کہدیا کہ جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے تو علاج کیسے کروں اس نے خوشامد شروع کی
میں نے کہا کہ اب تو میں دس ہزار روپیہ لیکر نبض دیکھوں گا۔ دوسرے تیسرے دن وہ شخص دس ہزار
روپے کے نوٹ لیکر آیا کہ یہ تو نبض دیکھنے کیلئے فیس ہے اور علاج کی فیس اس سے الگ دونگا مگر
ان دوست نے ہمت کی کہ یہ رقم واپس کردی اور کہدیا کہ مجھے تو تیرا علاج ہی منظور نہیں دس ہزار
کا ذکر محض تعجیز کیلئے تھا تحدید کیلئے نہ تھا۔ تو حضرت اطبا جسمانی میں جو صاحب کمال طبیب ہیں وہ بھی
مریض کی بدعنوانیوں پر ایسی سخت داروگیر کرتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اطباء روحانی

ان کی خوشامد کریں ہرگز نہیں بلکہ ان کو سب سے زیادہ کرنا چاہیئے کیونکہ ان سے تعلق ہی محض اس واسطے ہوا ہے کہ مرید ان کی اطاعت کرے اور یہ اس کی اصلاح کریں۔ حضرت ذوالنون مصری رح کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت کا فلاں مرید شراب پیکر فلاں جگہ بدمست پڑا ہے آپ کو محسوس ہوا کہ یہ اس کو حقیر اور اپنے کو افضل سمجھتا ہے اس کا یہ علاج کیا کہ فرمایا جاؤ اس کو اٹھلاؤ وہ جب تک وہاں رہے گا سلسلہ کی بدنامی ہے۔ اس میں اس کے تکبر کی اصلاح تھی کہ جسکو اس نے حقیر سمجھا تھا اسی کی خدمت اس کے سپرد کی۔ جب وہ اسکو لیکر چلا رستہ میں جو ملتا تھا کہتا تھا کہ یہ صوفیوں کا حال ہے دونوں نے شراب پی ہے۔ دوسرا ابھی ہوش میں ہے یہ اخفاء حالت کے لئے اس کو لیکر چلا ہے۔ تو یہ طریقہ تھا پہلے بزرگوں کا وہ اس طرح مریدوں کی اصلاح کرتے تھے وجہ یہ کہ ان کو امر بالمعروف اور تبلیغ کی اہمیت کا علم تھا۔ آجکل افسوس ہے کہ ہم لوگ اس فریضہ کو چھوڑے ہوئے ہیں جسکی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہمارے قلوب مخلوق کی ہیبت سے بھرے ہوئے ہیں اس لئے ہمکو تبلیغ سے رکاوٹ ہے اور ہر شخص کو تبلیغ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی خواہ ہمکو کیسی ہی قدرت ہو اور دوسرا ہمارا ماتحت ہی کیوں نہ ہو۔ رہا یہ کہ امر بالمعروف اور تبلیغ کسی عذر سے بھی معاف ہو جاتی ہے یا نہیں سو اس کو عمل شروع کرنے کے بعد بتلاؤں گا پہلے تم عمل شروع کردو۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب سے مخلوق کی ہیبت نکال دے اور ہمکو تبلیغ و امر بالمعروف کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ۳۲۰

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اشرف علی ۔ ۱۶ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۷ھ

۳۲۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الاکرمیۃ بالاعملیۃ والاعلمیۃ

اَین	کہاں ہوا	تھانہ بھون مسجد مولانا والی محلہ خلت۔
متٰی	کب ہوا	۲۷ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ بروز سہ شنبہ بعد نماز ظہر
کَم	کتنی دیر ہوا	دو گھنٹہ ۱۵ منٹ
کیف	کس طرح ہوا	تخت پر بیٹھ کر۔
لِمَ	کیوں ہوا	اس مسجد میں ایک نیا حجرہ تعمیر ہوا تھا اس کی خوشی میں مؤذن صاحب نے وعظ کی درخواست کی کہ اس مسجد میں وعظ ہو جائے تاکہ اہل محلہ کو دین پر توجہ
ماذا	کیا مضمون تھا	علم و عمل کی ضرورت اور یہ کہ شرافت بدون علم و عمل کے قابل اعتبار عند اللہ نہیں۔
من ذی شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا۔	شرفاء کو جو کہ محض اپنے شرف نسب پر کفایت کئے ہوئے ہیں اور علم دین و عمل سے غافل ہیں۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب رحمۃ اللہ
المستمعون	سامعین کی تخمینًا تعداد	تقریبًا ۵۰
الاشتات	متفرقات	تسوید تفصیلی ۱۲ شوال ۱۳۴۳ھ کو تمام ہوئی والحمد للہ علی ذالک ۱۲ ظ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم انما یخشی اللہ من عبادہ العلمآء وقال تعالی ان اکرمکم عند اللہ اتقکم یہ جو میں نے تلاوت کیا ہے یہ دو آیات کے

دو مختلف ٹکڑے ہیں اور گو میرا معمول یہ ہے کہ اکثر ایک ہی آیت کا بیان کرتا ہوں مگر اسوقت چونکہ
میرا مقصود دو آیتوں سے حاصل ہوتا ہے اور ان میں بھی ان آیتوں کے اجزاء سے اسلئے دونوں
آیتوں کا ایک ایک جزو تلاوت کیا گیا اور گو تقریر استدلال میں ترتیب بالعکس ہے کہ دوسرا
حصہ مقدم ہوگا اور پہلا موخر ہوگا مگر میں نے ادباً ترتیب موجودہ قرآنی کا لحاظ کیا ہے اور ترتیب
مصحف اسی طرح ہے جسطرح میں نے تلاوت کی ہے۔ کیونکہ یہ ترتیب مجمع علیہ ہو چکی ہے
حضرات صحابہ نے جمع مصحف میں اسپر اجماع کیا ہے جسکی مخالفت کتابت مصحف میں تو حرام ہے
اور اگر کوئی اس ترتیب کے خلاف مصحف لکھنا چاہے تو امام اسکو تعزیر کرے اور تلاوت قرآن
اور قرأت صلوٰۃ میں بھی اسکی رعایت واجب ہے اور قصداً مخالفت کرنا مکروہ ہے (سہواً ترتیب
کے خلاف ہوجائے تو معاف ہے) اور گو اسوقت تلاوت مقصود نہیں بلکہ تبلیغ احکام مقصود ہے
اور اس میں رعایت ترتیب واجب نہیں مگر ادباً رعایت کرلی گئی دوسرے حصہ کا ترجمہ تو یہ ہے کہ
جو زیادہ ڈرنیوالا ہے وہ خدا تعالیٰ کے یہاں زیادہ مکرم ہے اور پہلے حصہ کا ترجمہ یہ ہے کہ اور ۳۲۲
کوئی بات نہیں ہے صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے علماء ہی ڈرتے ہیں نتیجہ اس کا نہایت بدیہی ہے
جو استنباط کا محتاج نہیں ہے ایک آیت میں اکرمیت کا مدار تقوی پر رکھا گیا ہے اور دوسری
آیت میں خشیت یعنی تقوی کو علم پر موقوف کیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان بدون علم کے
اکرم نہیں ہو سکتا اور اس سے جو میرا مقصود ہے یعنی علم کی ضرورت جو کہ مجموعہ مقصود کا ایک
جزو ہے وہ بھی ظاہر ہے محتاج بیان نہیں کیونکہ ان دونوں مقدموں کے ملانے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے
کہ مقصود بالبیان کیا ہے۔ اور ایک مقدمہ عقلی جو ابھی بیان ہوگا اسکے ملانے سے دوسرا جزو
بھی ظاہر ہو جائیگا کیونکہ اسوقت میرا مقصود دو چیزوں کی ضرورت بتانا ہے ایک علم دوسرے
عمل سو علم کی ضرورت تو صراحۃً ثابت ہوگئی کیونکہ ایک آیت میں خشیت کو اسپر موقوف کیا گیا ہے
اور خوف و خشیت حق تعالیٰ سے ہونا ضروری ہے کیونکہ جزو ایمان ہے چنانچہ مشہور عقیدہ ہے کہ
ایمان خوف و رجاء کے درمیان ہے تو جو اس کا موقوف علیہ ہوگا وہ بھی ضروری ہوگا تو علم کی
ضرورت صراحۃً ثابت ہوگئی اب یہاں ایک مقدمہ عقلی یہ ملائیے کہ خوف جس طرح ایک درجہ
میں خود بھی مقصود ہے اسی طرح عمل کیلئے بھی مقصود ہے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کیلئے

زیادہ مقصود ہے چنانچہ نصوص سے اسکی تائید ہوتی ہے جب یہ بات ہے تو اب عمل کی ضرورت
بھی ظاہر ہوگئی کیونکہ خوف وخشیت کا جس طرح ایمان کیلئے ضروری ہونا مسلم ہے اسی طرح خوف
کی ضرورت عمل کی وجہ سے بھی ہے تو عمل بھی ضروری ہوا اب مقصود بالکل واضح ہوگیا کہ علم
بھی ضروری ہے اور عمل بھی اور ہر چند کہ تقوی اور خشیت دونوں کے معنی لغۃً ڈرنے کے ہیں
مگر اطلاقات قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقوی کا استعمال زیادہ تر اس خوف کیلئے
ہوتا ہے جسمیں اجتناب عن المعاصی بھی ہو محض خوف اعتقادی کیلئے کم استعمال ہوتا ہے تو
یوں کہئے کہ تقوی خوف مقرون بالعمل کو کہتے ہیں اور خشیت خوف اعتقادی کو اس بنا پر یوں
بھی کہنا ممکن ہے کہ ان دو آیتوں میں سے ایک میں یعنی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ
میں ضرورت عمل کا بیان ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں اکرمیت تقوی سے حاصل ہوتی ہے جو کہ خوف
مقرون بالعمل ہے اور اکرمیت عند اللہ ہر شخص کو مطلوب ہے تو تقوی کا اختیار کرنا ضروری
ہوا جو مستلزم ہے عمل کو۔ اور دوسری آیت اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ۲۲۳
میں علم کی ضرورت کا بیان ہے اس طرح کہ خشیت کو مطلوب فرمایا اور وہ مستلزم ہے علم کو
پس ان دونوں جزوں سے علم وعمل کی ضرورت ظاہر ہوگئی اور اس مضمون کے اختیار کی
یہ وجہ ہے کہ اسکی ضرورت گو عام ہے مگر اس مقام پر اور زیادہ ہے یعنی یوں تو ہر جگہ آجکل علم
عمل کی کمی ہے اور یہ مقام بھی اسی عموم میں داخل ہے لیکن یہاں کچھ زیادہ کمی ہے کیونکہ مجھے
یہاں کی حالت اچھی طرح معلوم ہے جس محلہ میں اسوقت بیان ہو رہا ہے میں سالہا سال یہاں
رہ چکا ہوں دوسرے اب بھی میں کچھ زیادہ دور نہیں رہتا ہوں حالات سے اب بھی اطلاع ہوتی
رہتی ہے جنکا حاصل یہی ہے کہ دینی لحاظ سے اس محلہ کی حالت نہایت خراب ہے علم کی طرف
یہاں کے باشندوں کو بہت ہی کم توجہ ہے اسی وجہ سے اعمال میں بھی بہت کوتاہی ہے حالانکہ
اس محلہ میں زیادہ تر وہ لوگ رہتے ہیں جو مدعی شرافت ہیں اور وہ واقعی نسباً شریف ہیں
بھی اور شرافت نسب فی نفسہ صفت بھی عمدہ ہے مگر شرف نسب پر قناعت کر لینا اور اس پر
فخر کرنا اور اصل شرف کو چھوڑ دینا یہ نہایت غلطی ہے اب میں بتلانا چاہتا ہوں کہ اصل شرف
کیا چیز ہے اور شرافت نسب کی حقیقت کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ

عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ میں تو اصل شرف کو تبلایا ہے کہ اصلی شرف جس سے انسان خدا تعالی
کے یہاں مکرم و معزز شمار ہوتا ہے تقوی اور پرہیزگاری ہے اور اس سے پہلے جزو میں شرف
نسب کی حقیقت بتلائی ہے یَااَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ
شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اے لوگو! ہم نے (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم و حوا)
سے پیدا کیا ہے (پس اس میں تو سب برابر ہیں اور جس بات میں فرق رکھا ہے کہ) تم کو مختلف
قومیں اور پھر ان قوموں میں، مختلف خاندان بنائے (سو محض اسلئے) تاکہ ایک دوسرے کو
شناخت کر سکو جس میں یہ شناخت بھی داخل ہے کہ کون ہمارا عصبہ ہے اور کون ذوالارحام
ہے اور کون ہم سے دور ہے تاکہ بقدر قرب و بعد نسب کے ان کے حقوق شرعیہ ادا کئے جائیں اور
میراث میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے اور اسکے سوا اور بھی مصلحتیں ہیں نہ اسلئے کہ ایک دوسرے
پر تفاخر کرو ۱۲) یہاں حق تعالی نے مختلف خاندانوں اور قوموں کے بنانے میں یہ حکمت تبلائی ہے
کہ اس سے تعارف اور شناخت ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کا پتہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قریشی ۳۲۴
ہے یہ انصاری ہے یہ صدیقی ہے یہ فاروقی ہے اگر یہ تفاوت نہوتا تو امتیاز سخت دشوار ہوتا
کیونکہ ناموں میں اکثر توارد ہوتا ہے ایک ہی نام کے بہت سے آدمی ہوتے ہیں تو کسی قدر امتیاز
تو جائے سکونت سے ہو جاتا ہے کہ یہ دہلوی ہے ایک لکھنوی ہے پھر ایک شہر میں بھی ایک نام
کے بہت سے ہوتے ہیں تو محلوں کے نام سے امتیاز ہو جاتا ہے کہ ایک محلت کا رہنے
والا ہے اور ایک محلہ کا پھر وہاں بھی ایک نام کے دو تین ہوتے ہیں تو قبائل کی
طرف نسبت سے امتیاز ہو جاتا ہے یہ حکمت ہے اختلاف قبائل کی مگر آجکل ہمارے
بھائیوں نے اسی کو مدار فخر بنا لیا ہے اب یہاں دو قسم کے لوگ ہو گئے بعض نے تو نسب
شرف کی جڑ ہی اکھاڑ دی انکو اس سے شبہ ہوا کہ اس آیت میں اختلاف قبائل کی حکمت
صرف تعارف بتلائی گئی ہے اور حکمتوں سے سکوت کیا گیا ہے تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بس
اس میں اور کچھ حکمت نہیں ہے لان السکوت فی موضع البیان بیان اس پر نظر کر کے بعض نے تو
شرافت نسب کا انکار ہی کر دیا کہ اس کا شرف کچھ نہیں ہوتا بلکہ جسطرح دہلوی لکھنوی ہندستانی بنگالی یہ
سب نسبتیں تعارف کیلئے ہیں اور ان سے کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اسی طرح قریشی انصاری سید

اور فاروقی عثمانی وغیرہ بہ نسبتیں بھی شناخت کے لئے ہیں ان سے بھی کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس شرف عربی سے محروم ہیں ان میں سے بعض نے تو اپنے کو شریف ثابت کرنا چاہا ہے چنانچہ ایک قوم نے اپنا عرب ہونا ثابت کیا ہے اور کہا کہ ہماری اصل راعی ہے چونکہ یہ لوگ جانور پالتے ہیں اسلئے ان کو راعی کہا گیا پھر غلط عوام سے لفظی تغیر ہوگیا اسی طرح بعضوں نے اپنے کو حضرت خالد بن ولید کی اولاد میں داخل کرنیکی کوشش کی ہے اور اس طرح وہ عرب بننا چاہتے ہیں مگر اس ترکیب میں تکلف تھا کیونکہ تاریخ سے قیاس کا کچھ ثبوت ملتا نہیں محض قیاسات بعیدہ سے کام لینا پڑتا ہے جس سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات بنائی ہوئی ہے اسلئے بعض نے اپنے نقص کو یوں دور کرنا چاہا کہ اہل شرف ہی سے اس شرف کی نفی کر دی کہ شرافتِ نسب کوئی چیز نہیں اور اس کے متعلق ان کے کچھ لطیفے بھی ہیں جنکے بیان کر دینے کا مضائقہ نہیں چنانچہ ایک شخص سے جو چھوٹی قوم کا تھا کسی نے پوچھا کہ ۲۲۵
تم کس کی اولاد میں ہو کہا میں آدم علیہ السلام کے بھائی کی اولاد میں ہوں لوگوں نے کہا کہ میاں کیا آدم علیہ السلام کے کوئی بھائی بھی تھا کہنے لگا کیا ان کے کوئی نہیں تھا لوگوں نے کہا ہرگز نہیں کہا کیا پھر سب لوگ آدم علیہ السلام ہی کی اولاد میں ہیں کہا ہاں کہنے لگا پھر تم مجھے کیوں پوچھتے ہو کہ تو کس کی اولاد میں ہے جسکی اولاد میں تم ہو اسی کی اولاد میں سے میں بھی ہوں لوگ اس پر چپ ہو گئے اسی طرح ایک بھنگی کی حکایت ہے کہ وہ کہیں ندی میں ڈوبنے لگا اول تو یوں چلایا کہ ارے اللہ کے واسطے مجھے بچاؤ جب اس کہنے پر کوئی نہ آیا تو اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ ارے دوڑو جلدی آؤ نبی زادہ ڈوبا جاتا ہے یہ سنکر لوگ دوڑے اور جلدی سے آکر اسے بچایا اب جو نکال کر دیکھا تو بھنگی اس سے پوچھا کہ نالائق تو نبی زادہ کدھر سے ہوا کہنے لگا کہ میں بھی آدم علیہ السلام کی اولاد میں ہوں اور وہ نبی تھے تو میں نبی زادہ ہوا غرض اس قسم کے لطیفے ان قوموں کے بہت ہیں وہ مختلف ترکیبوں سے اپنے کو اہل شرف کی برابر کرنا چاہتے ہیں بعض نے اس نفی میں حضرت علی کے اس قول سے استدلال کیا ہے ؎

الناس من جهة التمثال اكفاء		ابوهم آدم والام حواء
ما الفخر الا لاهل العلم انهم		على الهدى لمن استهدى ادلاء

ترجمہ - آدمی صورت کے اعتبار سے سب برابر ہیں کیونکہ سب کے باپ آدم علیہ السلام اور ماں
حوا علیہا السلام ہیں بس اہل علم کے سوا کسی کیلئے فخر نہیں ہے کیونکہ وہی ہدایت پر بھی ہیں اور
طالب ہدایت کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں اس سے بعض وہ حضرات جو نسبی شرف نہیں رکھتے
اور علم حاصل کر چکے ہیں اسپر استدلال کرتے ہیں کہ شرف نسب کوئی چیز نہیں بس شرف اگر
ہے تو علم سے ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہی معلوم نہیں کہ یہ حضرت علی کا قول ہے یا نہیں
پھر جس کا بھی قول ہو مطلب نفی فخر ہے کہ نسب پر فخر نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ امر غیر اختیاری ہے اور
فخر عقلاً ان چیزوں پر ہو سکتا ہے جو اختیاری ہوں اور وہ علم وعمل ہے گو شرعاً اس پر بھی فخر کرنا
نہ چاہیئے باقی یہ مطلب نہیں کہ شرفِ نسب کوئی چیز نہیں دیکھو آدمی کا حسین یا بدصورت
ہونا یا اندھا اور سوانکھا ہونا اگرچہ امر غیر اختیاری ہے اور اسپر فخر نہ کرنا چاہیئے مگر کیا کوئی
کہہ سکتا ہے کہ حسن صورت اور سوانکھا ہونا نعمت بھی نہیں یقیناً اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے اسی طرح ۳۴۶
یہاں سمجھو کہ گو شرفِ نسب بوجہ امر غیر اختیاری ہونیکے سبب فخر نہیں مگر اس کے نعمت ہونے میں
شبہ نہیں اور بعض لوگوں نے حکایات سے استدلال کیا ہے کہ مثلاً ایک بزرگ مر گئے تھے وہ
وہ چھوٹی قوم سے تھے کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو علم وعمل کی وجہ سے وہ بعض اہل شرف سے
بھی اعلیٰ درجہ میں تھے یا کسی زمانہ میں کوئی زندہ بزرگ اپنے معاصرین میں بڑے مقتدا اور شیخ
مانے جاتے تھے حالانکہ وہ چھوٹی قوم کے تھے مگر حکایات سے اثبات مدعا نہیں ہو سکتا حکایات تو
توضیح کیلئے ہوتی ہیں اول اثبات مدعیٰ دلیل سے ہونا چاہیئے پھر حکایات سے اس کی توضیح ہونی
چاہیئے اور یہاں دلیل سے شرفِ نسب کی نفی ثابت نہیں ہوتی اس لئے محض حکایات سے
استدلال کرنا لغو ہے ہاں بعض نے اس نص قرآنی لتعارفوا سے استدلال کیا ہے کہ بس نسب
کا فائدہ محض تعارف ہے اس سے کوئی شرف حاصل نہیں ہوتا مگر اس شخص کو قرآن کی ایک
آیت کے ساتھ دوسری آیتوں کو بھی دیکھنا چاہیئے حق تعالیٰ ایک جگہ یہ بھی فرماتے ہیں وَلَقَدْ
اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِیْمَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ اس سے معلوم ہوا کہ
نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے بعد سے ان کی ذریت میں نبوت اور کتاب منحصر
کی گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور نبوت

مسه البخم ... نوح اور ابراہیم کو رسول بنایا اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب کی ... پارہ ۲۷ ...

وکتاب کا حصر بلاواسطہ ابراہیم علیہ السلام کے بعد سے ان کی اولاد میں ہوا ہے ان کے واسطے نوح علیہ السلام کی ذریت میں ہوا ہے تو اولادِ ابراہیم کو باقی خاندانوں پر یہ خاص شرف حاصل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے قیامت تک نبوت اور کتاب اسی خاندان میں منحصر ہوگئی اور اس میں ہزاروں انبیاء پیدا ہوئے نیز اس کی ساتھ (۲) احادیث کو بھی ملانا چاہئے کیونکہ احادیث بھی اسی زبان سے نکلی ہیں جس سے قرآن ادا ہوا ہے اور اسی قلب پر نازل ہوئی ہیں جس پر قرآن نازل ہوا ہے وہ بھی وحی میں داخل ہیں گو متلو نہ ہوں تو احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی فضیلت بیان فرمائی ہے انصار کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ایک حدیث میں ہے اَلنَّاسُ مَعَادِنُ کَمَعَادِنِ الذَّھَبِ وَالفِضَّۃِ خِیَارُھُمْ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُھُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِھُوْ کہ جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں اسی طرح ۳۲۷
آدمیوں کی بھی مختلف کانیں ہیں جنہیں بعض سونے کے مشابہ ہیں بعض چاندی کے بعض دوسرے معادن کے مثل ہیں پھر آپ فرماتے ہیں کہ جو خاندان جاہلیت میں اچھے شمار ہوتے تھے وہی اسلام کے بعد بھی اچھے ہیں جب کہ علم حاصل کرلیں بعض نے یہ سمجھا ہے کہ اسمیں قید اِذَا فَقِھُوْا اہل انساب کو مضر ہے کہ اسمیں مدار فضل فقہ کو قرار فرمایا مگر کچھ بھی مضر نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقہ کے بعد خیارفی الجاہلیۃ کو خیار فی الاسلام فرما رہے ہیں تو فقہ کے بعد مساوات نہ رہی بلکہ حاصل یہ ہوا کہ فقیہ غیر صاحب نسب فقیہ صاحب نسب کے برابر نہیں بلکہ فقیہ صاحب نسب افضل ہوگا تو کوئی بات ہے جس سے وہ ممتاز ہوئے ہاں یہ ضرور ہے کہ صاحب نسب جاہل سے غیر صاحب نسب عالم افضل ہے اس کا ہمکو انکار نہیں مگر حدیث سے اتنی بات معلوم ہوگئی کہ شرف نسب بھی کوئی چیز ضرور ہے جس کی ساتھ علم و فقہ ملجائے تو صاحب نسب غیر صاحب نسب سے بہتر ہوگا نیز حدیث میں ہے اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ کوئی تو وجہ ہے کہ حضور نے امامت کو قریش کیساتھ مخصوص فرمایا معلوم ہوا کہ اہل انساب میں شانِ متبوعیت دوسروں سے زیادہ ہے نیز ایک حدیث میں بطور فخر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ثابت ہے اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ ـ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ ـ جب جنگ حنین میں حضرات صحابہ کے پیر اکھڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹنے لگے تو آپ نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ میں نبی ہوں یہ جھوٹ بات نہیں

(اسلئے میرا غلبہ یقینی ہے) اور میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں یعنی میں خاندانی اور صاحب نسب ہوں میں ہرگز پسپا نہ ہونگا تو اسمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحب نسب ہونے پر فخر کیا ہے اور دشمن کو ڈرایا ہے کہ تو اپنے مقابل کو کم نہ سمجھنا وہ بڑا خاندانی ہے جس کی بہادری سب کو معلوم ہے اگر شرف نسب کوئی چیز نہیں تو آپ نے اَنَا ابْنُ عَبْدُ الْمُطَّلِب کیوں فرمایا نیز ایک حدیث میں ہے اِنَّ اللهَ اصْطَفٰی مِنْ وُلْدِ اِبْرَاهِيْمَ اِسْمٰعِيْلَ وَاصْطَفٰی مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ بَنِيْ كِنَانَةَ وَاصْطَفٰی قُرَيْشًا مِنْ كِنَانَةَ وَاصْطَفٰی مِنْ قُرَيْشٍ بَنِيْ هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِيْ مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ رواہ مسلم والترمذی یعنی حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسمٰعیل علیہ السلام کو انتخاب فرمایا (اس سے عرب کی فضیلت عجم پر ثابت ہوئی کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام ابو العرب ہیں اور ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے اختار اللہ العرب من بین الانام ۱۲) اور اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ میں سے قریش کو منتخب کیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھکو منتخب کیا اور ایک حدیث کے یہ الفاظ ہیں اِنَّ اللهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ (ای الانس) ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَيْنِ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ فِرْقَةً (ای العرب) ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَائِلَ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ قَبِيْلَةً (ای قریش) ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُيُوْتًا فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ بَيْتًا (ای بنی ہاشم) فَاَنَا خَيْرُهُمْ نَفْسًا وَخَيْرُهُمْ بَيْتًا رواہ الترمذی اس نص سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسب مطلق کرم سے خالی نہیں گو اکرم ہونے کو مستلزم نہ ہو کیونکہ اکرمیت کا مدار تو تقویٰ ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُمْ تو اس کرم بالنسب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے کرم کو نسب ہی میں منحصر کر دیا جائے جیسا کہ اہل قصبات کی عادت ہے یہ دوسری جماعت ہے جس نے نسب کے بارہ میں افراط وغلو کیا ہے جیسا کہ پہلی جماعت نے تفریط کی تھی اہل قصبات نے فخر بالانساب ہی پر قناعت کر لی ہے اصل میں یہ اہل عرب کی عادات تھیں سے ان کو اپنے انساب پر بڑا فخر تھا چنانچہ ان کے اشعار اس سے بھرے پڑے ہیں یہی اثر ہندوستان کے ان قبائل میں اب تک موجود ہے جو نسل عرب سے یہاں پر آیا اور قصبات میں تو یہ غضب ہے کہ عورتوں کے کھوٹ کی وجہ سے

بھی خاندانوں پر عیب لگا دیتے ہیں نہ اسکی ماں ایسی ہے اسکی دادی ایسی ہے نانی ایسی ہے اس صفت میں یہ اہل عرب سے بھی بڑھ گئے کیونکہ اہل عرب نسب میں عورتوں کی وجہ سے نقص نہیں نکالتے (یہ اور بات ہے کہ نجیب الطرفین کو اکمل سمجھتے ہیں مگر جس کی ماں کم ذات ہو اور باپ شریف ہو اسکو بھی کامل النسب شمار کرتے ہیں ناقص نہیں سمجھتے ۱۲) مگر خدا تعالیٰ نے ماں کا نسب میں اعتبار کرنے کی ایسی جڑ اکھاڑی ہے کہ ان کو سر اٹھانے کا موقعہ نہیں ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو بیبیاں تھیں ایک حضرت سارہ وہ تو ان کی خاندان کی تھیں دوسرے حضرات ہاجرہ جنکی اولاد میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں جو ابو العرب ہیں وہ کنیز تھیں تو جو عورت ساری عرب کی جڑ اصل ہے وہ کنیز ہیں اب جو قبائل عرب ہندوستان میں عورتوں کے کھوٹ کی وجہ سے دوسرے خاندانوں میں عیب نکالتے ہیں وہ اس دبیہ کو دیکھیں کس طرح دہوتے ہیں مگر درحقیقت یہ کوئی عیب ہی نہیں اسی لئے شریعت نے نسب
۳۲۹
میں ماں کا اعتبار نہیں کیا البتہ اولاد فاطمہ میں ماں کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ سیادت کا مدار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ہے اور سیدوں کا شرف دوسرے قبائل پر انہی کی وجہ سے ہے اور یہاں سے بعض علویوں کی غلطی واضح ہوگئی کہ وہ بھی اپنے کو سید کہتے ہیں حالانکہ سیادت کی بنا حضرت علی پر نہیں ہے بلکہ حضرت فاطمہ پر ہے پس حضرت علی کی جو اولاد حضرت فاطمہ سے ہے وہ تو سید ہے اور جو دوسری بی بی سے ہے وہ سید نہیں ہے اب ایک سوال یہاں ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر ایک شخص کا باپ سید نہو اور ماں سید ہو تو وہ سید ہے یا نہیں تو قواعد کے موافق یہ شخص سید نہیں ہے ہاں ماں کی سیادت کی وجہ سے ایک گونہ شرف اسکو ضرور حاصل ہے مگر یہ اپنے کو سید نہیں کہہ سکتا اور اسکے لئے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہے اگر صاحب نصاب نہو بہر حال ماں کا نسب میں اعتبار نہیں البتہ حریت ورق میں اولاد شرعاً ماں کی تابع ہوتی ہے اور اس سے ایک اشکال کا بھی جواب ہوگیا وہ یہ کہ بعض احادیث میں وارد ہے

مَنْ عَمِلَ كَذَا فَلَهُ اَجْرُ مَنْ اَعْتَقَ اَرْبَعَةً مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ

حالانکہ حنفیہ کا قول یہ ہے کہ عرب کا استرقاق جائز نہیں اس صورت میں ولد اسمٰعیل کا اعتاق ہی متصور نہو گا تو پھر حدیث میں اعتاق ولد اسمٰعیل کا کیا مطلب ہے بعض نے

تو یہ کہا ہے کہ یہ بطور فرض کے ہے کہ اگر اہل عرب کا استرقاق جائز ہوتا تو ان کا اعتاق سب سے
افضل ہوتا اس کا ثواب اس عمل سے ملے گا مگر جواب صحیح اور بے تکلف اس قاعدہ مذکورہ سے
حاصل ہو گیا وہ یہ کہ کسی عربی نے عجمیہ رقیقہ سے نکاح کیا تو اولاد نسب میں تو باپ کے تابع ہو کر
ولد اسمٰعیل ہوگی اور ران میں ماں کے تابع ہو کر محل اعتاق ہو سکے گی یہ بیچ میں استطراداً
کلام تھا اصل مقصود یہ تھا کہ نسب کا شرف شرعاً بھی معتبر ہے اور ایک بہت بڑی دولت و
نعمت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسمیں غلو کیا جائے جیسا کہ قصبات میں رواج ہے
افسوس یہ لوگ ہڈی بوٹی کو لیکر بیٹھ گئے اور اس سے بڑھکر شرف تھا اس کو چھوڑ بیٹھے اور
وہ اصل شرف علم و عمل ہے افسوس شرفاء کو اس کا بالکل خیال نہیں علم دین کی طرف ان کو
مطلق توجہ نہیں اور اس محلہ میں تو خصوصاً اس سے بہت ہی غفلت ہے بچے ہیں کہ آوارہ پھرتے
ہیں اور بڑے ہیں کہ وہ بھی دین سے ناواقف ہیں کسی نے بہت کیا انگریزی پڑھ لی مگر انگریزی
۳۳۰ کوئی علم نہیں ہے اسکو دین سے کیا تعلق بلکہ اسکو پڑھکر تو اکثر دین سے بے تعلقی ہو جاتی ہے
اسلئے شرفاء کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو علم دین پڑھانیکا ضرور اہتمام کریں اور میں انگریزی سے
منع نہیں کرتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ اس سے پہلے علم دین پڑھانا چاہئے چاہے اردو رسائل ہی
میں ہو اور بڑوں کو بھی اس کا اہتمام کرنا چاہئے شاید وہ اسپر یہ کہیں گے کہ بڈھے طوطے اب
کیا پڑھیں گے مگر میں کہتا ہوں کہ بڈھے طوطے اگر پڑھ نہیں سکتے مگر دوسروں سے تو سن سکتے
ہیں میں آپ سے پڑھنے کو نہیں کہتا بلکہ آپ کسی پڑھے لکھے آدمی سے مسائل کی کتاب سن لیا
کریں طوطے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ہمارے گھر میں ایک طوطا ہے وہ کسی بات پر نہیں
بولتا اس کو لاکھ پڑھاؤ مگر کچھ نہیں کہتا لیکن جہاں کوئی لڑکی کتاب پڑھنے بیٹھی تو وہ طوطا بھی
ساتھ میں ٹرٹر لگاتا ہے اور اتنا بولتا ہے کہ پڑھنا دشوار کر دیتا ہے تو دیکھئے وہ طوطا بھی کتاب
سنکر پڑھنے کی حرص کرتا ہے جب علم کا حیوان پر یہ اثر ہے تو انسان پر کیوں اثر نہ ہوگا
صاحبو! پڑھنا پڑھانا اور عالم ہونا درس ہی پر موقوف نہیں حضرات سلف تو سن سن کر
ہی عالم ہو گئے تھے یہ درس و تدریس کا طریقہ تو ان کے بعد ہی کے زمانہ سے شروع
ہوا ہے ورنہ پہلے تو محض دو چار عالم کتاب ہوتے تھے اور ان کی صحبت میں رہکر مسئلے

مسائل سنکر بہت سے بدون پڑھے ہی عالم بنجاتے تھے اور حضرات صحابہ وتابعین تو محض سننے ہی سے عالم ہوئے ہیں وہاں کتاب کھول کر پڑھنے کا رواج ہی نتھا بس صحابہ تو حضور کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور حضور کی باتیں سن سن کر سب عالم ہوجاتے تھے پھر حضرات صحابہ کی باتیں سن سن کر تابعین عالم ہوگئے اور ہمارے حضور تو اس پر فخر فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں لکھنا پڑھنا نہیں ہے چنانچہ ارشاد ہے نحن امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب چنانچہ حضرات صحابہ میں کاتبان وحی معدودے چند تھے ورنہ اکثر صحابہ لکھنا بھی نہیں جانتے حساب بھی زیادہ نہ آتا تھا مگر وہ ایسے امی تھے کہ بڑے بڑے ارسطو اور افلاطون ان کے علوم کو سنکر منہ تکتے تھے حضرات صحابہؓ نے ہرقل اور مقوقس کے دربار میں جو حکیمانہ کلام کیا ہے اسکو سنکر سلاطین بھی حیرت میں رہ جاتے تھے کہ ان پڑھ لوگوں کے یہ علوم ہیں یہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا اثر تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی ؎

نگارمن کہ بمکتب نرفت و درس نکرد   بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

اسلئے نہ پڑھ سکنے کا عذر تو فضول ہے آپ سن سن کر ہی علم حاصل کر لیجئے اور اگر آج بڈھوں کو گورنمنٹ کی طرف سے قانون یاد کرنے کا حکم ہوجائے تو اسوقت یہ بوڑھے طوطے سب جوانوں کی طرح قانون یاد کرنے لگیں گے یہ بہانہ محض دین کے کاموں میں ہے دنیا کے کاموں میں بوڑھے بھی جوان ہوجاتے ہیں غرض علم ہر طرح سے بھی ہو حاصل کرنا ضروری ہے بدون علم کے ایسی ایسی غلطیاں ہوتی ہیں کہ بعض لوگ عمر بھر نماز غلط ہی پڑھتے رہتے ہیں چنانچہ ایک قریب کے قصبہ کے ایک بوڑھے میاں جو مہذب اور لکھے پڑھے ہیں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کسی نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ جس طرح فرضوں میں دو رکعتیں بھری ہوتی ہیں اور دو خالی کیا سنتوں میں بھی یہی حکم ہے میں نے کہا نہیں بلکہ سنتوں میں سب رکعتیں بھری ہوتی ہیں تو وہ بڑے میاں یہ سنکر بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم تو اب تک سنتیں بھی دو بھری اور دو خالی پڑھتے تھے یہ تو آج ہی معلوم ہوا کہ سنتوں میں کوئی رکعت خالی نہیں ہوتی۔ اب تبلائیے کہ بڑے میاں کے پیر تو قبر میں لٹکے ہوئے ہیں اور اب تک نماز کا طریقہ معلوم نہیں یہ ساری خرابی علم نہ ہونے کی ہے اسی طرح بعض صورتوں میں کسی غلطی سے نماز باطل ہوجاتی ہے اور کسی غلطی سے

سجدہ سہو واجب ہوتا ہے مگر بدون علم کے لوگ معلوم کیا کیا گڑبڑ کرتے ہیں بس بات یہ ہے
کہ لوگوں کی نظر میں احکام الٰہیہ کی وقعت نہیں رہی اسلئے کچھ فکر نہیں کہ نماز درست ہوتی ہے یا
فاسد اور اگر درست بھی ہوتی ہو تو اس بے علمی کے سبب بہت لوگوں کو جماعت کا اہتمام نہیں
وقت کا خیال نہیں بعضے بہت تنگ وقت میں نماز پڑھتے ہیں افسوس اگر عدالت میں ایک
چپراسی آواز دے کہ فلانا حاضر ہے تو اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ پکارنے کے بعد حاضری
میں دو منٹ کی بھی دیر نہ ہو گھنٹہ بھر پہلے سے تیار بیٹھے رہتے ہیں اور یہاں پانچ وقت منادی
پکارتا ہے اور کان پر جوں تک نہیں رینگتی بلکہ اذان کے بعد اقامت بھی ہونے لگے اور
امام کی آواز اور سورت کا شروع ہو جانا بھی سنلیں جب بھی کچھ اثر نہیں ہوتا حَیَّ
عَلَی الصَّلٰوۃ سنکر تو کیا اثر ہوتا افسوس ہم پر حَیَّ عَلَی الْفَلَاح سنکر بھی اثر نہیں ہوتا۔
حق تعالیٰ کی (بھی) کیا عنایت ہے کہ وہ ہماری حالت سے خوب واقف ہیں جانتے ہیں کہ یہ ایسے
بھدے اور ناقدرے ہیں کہ محض حی علی الصلوۃ کہنے سے نماز کو نہ آئیں گے اسلئے جس طرح بچوں کو ۳۴۴
مٹھائی وغیرہ سے بھی اور بہلایا کرتے ہیں اسی طرح حق تعالیٰ نے ہمکو بلانے کے لئے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ
کے ساتھ حَیَّ عَلَی الْفَلَاح بھی اذان میں بڑھا دیا کہ نماز میں فلاح و کامیابی بھی ہے اسی کے لئے
آجاؤ کیونکہ اس جگہ فلاح مطلق ہے جس میں فلاح دنیوی و اخروی دونوں داخل ہیں اس پر شاید
کوئی یہ کہے کہ ہم تو روز نماز پڑھتے ہیں مگر ہمیں تو کچھ بھی نہیں ملتا چنانچہ ایک تھانہ دار نے اپنی
بیوی سے کہا تھا کہ تو جو نماز پڑھتی ہے تجھے کیا ملتا ہے تو بات یہ ہے کہ آجکل روپیہ ملنے کا نام
ملنا ہے اگر نماز پڑھکر روپے مل جایا کرتے تب انکے نزدیک یوں کہنا صحیح ہوتا کہ کچھ ملا ہے جیسے
ایک پیشکار اشراق تک وظیفہ پڑھا کرتے تھے انہوں نے کسی پیر سے وظیفہ پوچھ رکھا تھا صبح کی
نماز کے بعد سے اشراق تک وہ پڑھا جاتا تھا اور یہی وقت رشوت کے معاملات طے کرنیکا
تھا اہل معاملہ آتے اور اشاروں سے رشوت طے ہوتی کیونکہ وظیفہ میں بولنے کو منع سمجھتے تھے
بس صاحب معاملہ نے ایک انگلی اٹھا دی کہ ایک سو لیلو اور انہوں نے سر ہلا کر دو انگلیاں
اٹھا دیں کہ دو سو لونگا پھر اشاروں ہی سے بات طے ہو گئی رقم حاضر ہو گئی اور پیشکار صاحب
نے مصلے کا کونہ اٹھا دیا اس نے رقم رکھدی یہ پھر وظیفہ میں مشغول ہو گئے اب دوسرا

آنا اس سے بھی اسی طرح اشاروں میں بات چیت ہوتی اور جب کسی رقم پر صلح ہو جاتی یہ جائے نماز
کا کونہ اٹھا دیتے وہ رقم رکھ دیتا غرض یہ بزرگ جب اشراق کی نماز سے فارغ ہوتے تو گھر میں
دو چار سو روپے لیکر جاتے تھے تو ملنا آجکل اس کو کہتے ہیں اور اگر کوئی یہ کہے کہ تمکو جنت
ملے گی یا خدا راضی ہوگا تو اسکو کچھ ملنا ہی نہیں سمجھتے چنانچہ سودلٹے اپنی بیوی سے پوچھا تھا کہ
تو تہجد کیوں پڑھا کرتی ہے کہا ہم جنت میں جا بیٹھینگے تو وہ مسخرہ کہتا ہے کہ جا پاگل تو وہاں بھی
ملانوں طالبعلموں ہی کے ساتھ رہے گی (کیونکہ جنت والے اکثر غربا ہی ہونگے) اور دیکھ ہم
جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے سلاطین اور امراء وروساء فرعون نمرود شداد قارون
اور ابوجہل جیسے ہوں گے تو آجکل فلاح روپے ملنے کو کہتے ہیں اگر کسی نیک کام میں روپیہ
ملتا ہو تو اسکو ہر شخص بڑے شوق سے کرتا ہے اور جسمیں یہ نہو اس کی کچھ وقعت نہیں ایک جاہل نے
۳۴۳ کسی واعظ کو وعظ میں کہتے سنا کہ اللہ کی راہ میں جو ایک روپیہ دے تو اسے دس تو ضرور ملتے ہیں
اور بعض کو زیادہ بھی ملتے ہیں سات سو تک۔ اس شخص نے سوچا کہ میں غریب آدمی ہوں مجھے
کسی حیلہ کی ضرورت ہے یہی تجارت شروع کریں اس سے اچھی تجارت کیا ہوگی اس کے
پاس ایک روپیہ تھا اس نے وہی خیرات کر دیا اب دس کے منتظر بیٹھے ہیں جب کئی روز تک
دس نہ آئے تو میاں کو دست آنے لگے کہ افسوس میں نے اپنا روپیہ بھی کھو دیا کیونکہ اس نے ثواب
کیلئے تھوڑا ہی دیا تھا محض تجارت کیلئے دیا تھا اتفاق سے ایک دن یہ کسی کھیت میں قضا حاجت
کیلئے جو بیٹھا اور استنجا کیلئے ڈھیلا اٹھانے لگا ایک ڈھیلہ کے نیچے ایک بٹوہ پڑا ملا جس میں
پورے دس روپے تھے بڑا خوش ہوا کہ مولوی نے سچ کہا تھا دوڑا ہوا مولوی صاحب کے
پاس آیا اور کہا آپ نے جو وعظ میں کہا تھا کہ اللہ کیلئے ایک دینے سے دس ملتے ہیں یہ بالکل
درست ہے مگر مردودے بڑے غضب کے ہیں آپنے اسکو چھپا اب سے اس مضمون کیسا تھا اتنا اور
کہدیا کرو کہ دس ملنے سے پہلے دست بھی آتے ہیں اور مروڑے بھی لگتے ہیں پھر جس کی ہمت
ہوگی وہ دے گا ورنہ نہیں دیگا اسی طرح ایک اور احمق کی حکایت ہے اس نے کسی مولوی صاحب
سے توکل کا وعظ سنا تھا کہ جتنا جسکے مقدر میں ہے وہ ضرور ملکر رہتا ہے بس آپ نے یہ سنکر سب
کام چھوڑ دیئے اور جنگل میں جا کر بیٹھ رہے مگر بیٹھا ایسی جگہ کنویں کے پاس جہاں راستہ

چلنے والے ٹھہرتے تھے اب لوگ آتے اور کنویں پر ٹھہر کر سڑک کی طرف مونہ کرکے جس میں اس طرف
پشت ہوتی تھی کھانا کھا کر چلدیتے ایک دن گذرا دوسرا دن گذرا پھر ایک مسافر ایسا آیا اس نے
بھی اس کی طرف پیٹھ کرکے کھانا کھایا اور چلنے کو ہوا تو یہ بالکل مایوس ہوگیا اور اپنے دل میں
کہنے لگا کہ مولوی صاحب نے کیسا غلط مضمون بیان کیا تیسرا دن بھی گذرگیا اور اس کا
بھوک سے براحال ہوگیا آخر آپ نے کھنکارنا شروع کیا اور وہ مسافر نے مڑکر دیکھا تو
ایک آدمی نظر آیا جس کا بھوک سے براحال ہے اسکو رحم آیا اور جو کچھ بچا ہوا کھانا تھا وہ
دیدیا۔ کھانا کھا کر کچھ جان آئی تو آپ بھی مولوی صاحب کے پاس دوڑے ہوئے آئے
کہ مولوی جی توکل کا مضمون تو درست ہے مگر کھنکارنے کی بھی ضرورت ہے تمہارے
بیان میں اتنی کسر تھی آئندہ اسکو بھی ظاہر کردیا کرو۔ اگر میں نہ کھنکارتا تو جان سے ہی گیا ہوتا
غرض بعض لوگ مال ملنے ہی کو فلاح سمجھتے ہیں اور نماز پڑھکر چونکہ فوراً مصلے کے نیچے سے
روپئے نہیں نکلتے اسلئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز میں کیا فلاح ہے مگر میں کہتا ہوں کہ کیا م سعم۳
مال خود مقصود بالذات ہے بھلا اگر ایک شخص کے پاس ہزار روپئے کے نوٹ ہوں یا نقدی ہو
اور وہ ایسی جگہ پہونچ جائے جہاں کوسوں تک نہ کھانا ہے نہ پانی ہے اور اس وقت اسکو
بھوک پیاس لگی تو بتلائیے یہ ہزار روپے اسکے کس کام کے اب اگر وہ بھوک پیاس سے
تڑپ تڑپ کر جان دیدی تو کیا آپ اسکو مفلح اور کامیاب کہیں گے ہرگز نہیں معلوم ہوا کہ
مال خود فلاح نہیں اب شاید آپ یہ کہیں کہ کھانا پینا تو فلاح ہے ہم اس کے طالب
ہیں سو یہ بھی غلط ہے کھانا پینا بھی مقصود بالذات نہیں کیونکہ بعض دفعہ کھانا کھا کر ہیضہ
ہوجاتا ہے اس وقت بھی کھانا سبب ہلاکت ہوجاتا ہے معلوم ہوا کہ مقصود اور کچھ ہے
وہ کیا ہے چین و آرام جب یہ سمجھ میں آگیا کہ فلاح کی حقیقت راحت ہے تو اب دعوے ہے
کہا جاتا ہے کہ نماز سے یہ فلاح ضرور حاصل ہوتی ہے نماز سے قلب کو وہ راحت ملتی ہے جو
ہزار کھانوں سے بھی نہیں مل سکتی مگر جیسے بعض دواؤں کا نفع ایک خاص میعاد پر ہوا کرتا ہے
چنانچہ اطباء کہا کرتے ہیں کہ اس دوا کو تین دن یا تین ماہ استعمال کرکے پھر آنا اس مدت سے
پہلے نفع ظاہر نہوگا اگر چھ ماہ کا اندھا کسی قیمتی سرمہ کو دو تین دن لگا کر سوانکھا ہونا چاہئے۔

تو وہ بیوقوف ہے اسے چاہیئے کہ کم از کم مثلاً تین ماہ تو استعمال کر کے دیکھے اسی طرح نماز کی راحت کا احساس ایک خاص میعاد کے بعد ہوتا ہے جو ہر شخص کے لئے اس کے مناسب ہوتی ہے پس یہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ چار دن نماز پڑھکر مراقبہ کرنے بیٹھ گئے کہ دیکھوں راحت قلب حاصل ہوئی یا نہیں صاحب کسی جاننے والے طبیب روحانی سے پوچھکر نماز کو قاعدہ سے شروع کر دو اور کچھ عرصہ تک ادا کرتے رہو پھر دیکھو کیا حال ہوتا ہے انشاء اللہ چند ہی روز میں یہ حالت مشاہد ہو گی جسکو حضور فرماتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے جو شخص نماز کا عادی ہے وہ جانتا ہے کہ نماز پڑھکر کیا راحت ہوتی ہے مشہور ہے کہ عشا کی نماز پڑھکر آدمی سلطان اللیل (رات کا بادشاہ) ہو جاتا ہے واقعی سلاطین کو کیا راحت نصیب ہو گی جو نمازی کو عشا کی نماز پڑھکر حاصل ہوتی ہے ۔ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کا ادراک ضد کو ۳۲۵
دیکھکر کامل ہوتا ہے تو نماز کی راحت کا احساس بھی اس طرح ہو گا کہ کبھی ریل میں نماز پڑھنا دشوار ہوا ہو تو یاد کیجئے اسوقت کیسی پریشانی ہوئی ہو گی اور خدا خدا کر کے کسی اسٹیشن پر آدمیوں کے اترنے سے جگہ ملی ہو گی تو نماز پڑھکر کیسا چین ملا تھا مگر یہ بات ایک زمانہ تک نماز کی عادت ہونے سے نیز اہل اللہ کے پاس بیٹھنے سے حاصل ہوتی ہے اہل اللہ کے پاس بیٹھنے سے نسبت مع اللہ حاصل ہوتی ہے دلکو خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک لگاؤ ہو جاتا ہے مگر یہ نسبت ذوقی چیز ہے اور اسکے حصول کیلئے بھی ایک میعاد ہے اسکی حقیقت قول سے نہیں معلوم ہو سکتی محض ذوق سے معلوم ہوتی ہے ظاہر میں بھی تو ایسی بہت چیزیں ہیں جو بدون ذوق کے معلوم نہیں ہو سکتیں ۔ دیکھئے لوگ کہتے ہیں کہ شعر میں مزا آتا ہے مگر کیا کوئی اس مزہ کی حقیقت الفاظ میں بیان کر سکتا ہے ہرگز نہیں ہمارے ایک دوست ہیں انکو اشعار میں مزا نہیں آتا جب وہ کسی کو شعر سے مزا لیتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسپر ہنستے ہیں کہ شعر بھی کوئی مزہ کی چیز ہے یہ بھی کوئی کھانے پینے کی چیز ہے جو اس میں مزا آئے ایک دفعہ الہ آباد میں ایک دوست میرے ساتھ تھے ان کی طبیعت شاعرانہ ہے وہ اپنی ایک غزل سنا رہے تھے جس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

کیا بیٹھا ہے سینہ پر زانو کو دہرے قاتل ہاں پھیر بھی دے خنجر کیا دیر لگائی ہے

لوگ تو اس سے مزے لے رہے تھے اور وہ حضرت اس پر ہنس رہے اور فتوے لگا رہے تھے کہ واللہ یہ بالکل جھوٹ ہے ہم نے تو کسی محبوب کو نہیں دیکھا کہ وہ عاشق کے سینہ پر خنجر چلانے کو بیٹھا ہو اب بتلایئے ایسے لوگوں کو الفاظ سے کیونکر سمجھایا جائے کہ شعر میں یہ مزا ہے کیونکہ یہ محض ذوقی چیز ہے جسکو یہ ذوق حاصل نہیں وہ اسکے لطف کو نہیں سمجھ سکتا یہی وجہ ہے کہ فلاسفہ نے صوفیہ کے حال وقال و وجد کو دماغ کی خرابی پر محمول کیا اور کہا کہ حق تعالیٰ سے محبت نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ غائب ہیں اور غائب کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی اور حیرت ہے کہ بعض متکلمین بھی حق تعالیٰ کے ساتھ حب عقلی کے تو قائل ہیں مگر حب طبعی کا انکار کرتے ہیں افسوس عشاق تو محبت میں مرے کھپے جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ محبت حق تعالیٰ سے ہو ہی نہیں سکتی وہ تو جان دینے کو تیار ہیں اور بہت سے تڑپ تڑپ کر مر بھی گئے اور یہ انکو دیوانہ

۳۳۶ کہتے ہیں یہ لوگ عنین طریق ہیں انکو عشق کا چرکا نہیں لگا اسلئے اسکی حقیقت کے منکر ہیں کیونکہ

ذوق ایں مے نشناسی بخدا تا نچشی

حضرات! یہ لوگ جنکو دیوانہ کہا جاتا ہے ایسے عاقل ہیں کہ ان کے ملفوظات اور حکیمانہ اقوال کے سامنے ارسطو بھی طفل مکتب ہے تو کیا ایسے عاقلانہ اقوال دیوانوں سے صادر ہوا کرتے ہیں مگر چونکہ اس محبت نے ان سے سلطنتیں چھڑا دیں جب انھوں نے سلطنت کو حق تعلق حق دیکھا تو لات مار کر الگ ہو گئے ان کا مذاق یہ ہے

عشق با مردہ نباشد پائدار عشق را با حیّ و با قیوم دار اور ہے

عاشقی با مردگان پایندہ نیست زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

وہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی پر نظر نہیں کرنا چاہتے دنیا اور اسکے لذائذ ان کی نظر میں خاک کی برابر بھی نہیں رہے اسلئے اہل دنیا کی نظر میں وہ دیوانے شمار ہونے لگے مگر وہ ایسے دیوانے ہیں کہ

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

مگر میں سچ کہتا ہوں کہ زندگی انہی کی زندگی ہے واللہ انکو کھانے پینے میں بھی وہ مزہ آتا ہے کہ آپ کو اور ہم کو نہیں آتا کیونکہ ان کو کھانے پینے کے وقت میں یہ مستحضر ہوتا ہے کہ یہ نعمتیں

محبوب کی طرف سے ہیں اور محبوب کے ہاتھ سے اگر گلا ہوا امرود بھی ملے تو وہ الہ آباد کے شاداب امرود سے افضل ہوتا ہے بلکہ محبت کی تو اس سے بھی بڑھکر عجیب حالت ہے کہ عاشق کو محبوب کی ایذا میں بھی مزا آتا ہے اسی لئے اہل اللہ کو جان دینے میں بھی مزا آتا ہے کیونکہ عاشق کو محبوب کے ہاتھ سے دھول کھانے میں بھی لطف محسوس ہوتا ہے حضرت عراقی فرماتے ہیں ؎ نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ٭ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

حضرت زلیخا نے جب زنانِ مصر کے سامنے یوسف علیہ السلام کو بلایا تو انہوں نے بدحواس ہو کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور ایذا کا مطلق احساس نہوا اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں صحابہ کی یہ حالت ہوئی جسکو حضرت عائشہ فرماتی ہیں ؎

لَوَاحِیْ زُلَیْخَا لَوْ رَأَیْنَ جَبِیْنَہٗ ٭ لَآثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَی الْیَدِ

واقعی ہزاروں مردوں نے اپنے دل کاٹ دیئے غزوات میں حضورؐ کے قدموں میں جانیں دیدیا ۳۳۷

اور عورتوں کی یہ حالت تھی کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوات سے واپس ہوتے تو عورتیں سڑکوں پر کھڑی ہو جاتیں اور آنیوالوں سے اول حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت پوچھتی تھیں ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک عورت کا باپ اور خاوند اور بیٹا اور بھائی غرض سارا کنبہ شہید ہو گیا تو حضرات صحابہؓ نے اس کی تعزیت کی کہ تمہارے فلاں فلاں عزیز شہید ہو گئے تو وہ پوچھتی ہے کہ یہ تبلاؤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں صحابہؓ نے کہا حضورؐ تو مع الخیر واپس تشریف لا رہے ہیں تو وہ فرماتی ہیں کہ بس حضورؐ سلامت چاہئیں آپ کے اوپر ہزار ماں باپ اور اولاد فدا ہیں ؎

فِدًی لِرَسُوْلِ اللّٰہِ اُمِّیْ وَخَالَتِیْ ٭ وَعَمِّیْ وَآبَائِیْ وَنَفْسِیْ وَمَالِیَا

تو حضورؐ کیساتھ صحابہ کو یہ تعلق تھا کہ عورتیں اور مرد اور بچے سب کے قلوب پارہ پارہ ہو گئے تھے غرض محبت کیساتھ مصائب بھی شیریں ہو جاتی ہیں ؎ از محبت تلخہا شیریں بود۔ غرض چنان صحابیہ کو حضورؐ کی سلامتی کی اسقدر مسرت تھی کہ اپنے سارے کنبہ کا مرنا بھول گئیں۔ جب تلخیاں بھی خوشگوار ہو جاتی ہیں تو محبوب کے لذیذ انعامات میں تو عاشق کو کیا کچھ حظ آئے گا اسلئے اہل اللہ کو جب کھانے پینے کی چیزوں میں یہ امر مشاہد ہوتا ہے کہ یہ محبوب نے ہمکو دی ہیں تو انکو وہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ اہل دنیا نے اس کا خواب بھی نہیں دیکھا پھر ان لوگوں کو بھلا نماز

ہیں تو کیوں حظ نہ آئیگا جو خاص قرب محبوب اور حاضری دربار کی حالت ہے اسوقت واقعی طور
پر ان کو حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کا ادراک ہوتا ہے کہ نماز عجیب راحت کی چیز ہے یہ تو نماز میں فلاح
عاجل باطنی ہے اس کے علاوہ نماز میں ظاہری فلاح عاجل بھی بہت کچھ ہے چنانچہ نماز میں ایک نفع یہ ہے
کہ اگر کوئی آپ کو فضول مخالطت فضول مکالمت سے ایذا دینا چاہے تو نماز شروع کردو
جب تک نماز پڑھتے رہوگے کوئی تمہیں کچھ نہ کہیگا۔ دوسرے اگر تم کسی آنے والے کی تعظیم
نہ کرنا چاہو اور تعظیم نہ کرنے میں خطرہ کا اندیشہ ہو تو اس کو آتا ہوا دیکھکر نماز شروع کردو
اس طرح تعظیم سے بھی بچے رہوگے اور دوسرے کو اپنے بے تعظیمی کا بھی خیال نہ آئیگا کیونکہ سب
جانتے ہیں کہ نماز میں انسان دوسری طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔ تیسرے اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اس طرح
خلوت اختیار کروں گا کہ گوشہ نشین بھی مشہور نہوں کیونکہ اس شہرت کے بعد پھر خلوت نہیں
رہ سکتی لوگ تنگ کرتے اور ہجوم کرنے لگتے ہیں تو اسکی سہل صورت یہ ہے کہ ہر وقت نفل
نماز پڑھا کرے ہمارے ایک عزیز بزرگ تھے جو مشرب سماع رکھتے تھے اسی طرح خلوت اختیار ۳۳۸
کی تھی کہ ٹھیک بیچ میں عام منظر پر رہتے اور ہر وقت نماز پڑھتے تھے جب کوئی ملنے آیا تو سلام
کے بعد دو چار باتیں خیر و عافیت کی پوچھ لیتے اور پھر نماز شروع کردیتے مجھے یہ طریقہ بہت
پسند آیا کہ نہ تو وہ بداخلاق مشہور ہوئے کیونکہ جو کوئی بھی آتا تھا اس سے ضرورت کی قدر مل بھی
لیا کرتے تھے اور نہ عزلت گزینی میں خلل آیا اور نہ خلوت نشین مشہور ہوئے جو عوام کا ہجوم ہوتا۔ ایک
برکت نماز کی یہ ہے کہ اسمیں بڑے بڑے سلاطین اور رؤسا کی برابری ہوجاتی ہے ایک انگریز کالج
علی گڈھ میں گیا تو وہاں دیکھا کہ وہاں رئیسوں کے لڑکے پڑھتے ہیں جنکے ساتھ نوکر اور ملازم بھی ہوتے
ہیں مگر خدمت کیوقت تو وہ نوکر دور کھڑے رہتے ہیں آقا کے پاس بھی نہیں بیٹھ سکتے اور نماز کیوقت
آقا کے برابر پاس مل کر کھڑے ہوتے ہیں اس نے ان رئیس زادوں سے دریافت کیا کہ نماز
میں برابر کھڑے ہونے سے یہ ملازم گستاخ نہیں ہوجاتے انھوں نے کہا کیا مجال ہے جو نماز
کے سوا ہماری ذرا بھی برابری کرسکیں اسوقت کا یہی حق ہے کہ سب برابر ہوں اور دوسرے
وقت کا دوسرا حکم ہے اسکو اس سے بڑی حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے
کہ روز نماز پڑھتے ہیں حالانکہ وہ نماز میں آقا کے برابر بھی ہوجاتا ہے مگر پھر بھی اس میں الفت دی

صفت بڑھ جاتی ہے یعنی وہ آقا کی خدمت اور اسکے حقوق کی بجا آوری بے نمازی نوکر سے زیادہ کرتا ہے واقعی یہ بات مشاہد ہے کہ دیندار آدمی جیسے خدا تعالی کے حقوق ادا کرتا ہے بندوں کے حقوق بھی خوب ادا کرتا ہے اسی برابری پر ایک اور قصہ یاد آیا نواب ٹونک جنکا نام وزیر الدولہ تھا بڑے دیندار تھے ایک دفعہ کسی نماز میں وہ آئے اور کسی غریب مزدور کے پاس کھڑے ہوگئے وہ بیچارہ ڈرا کہ کہیں نواب صاحب کو میرا دامن وغیرہ نہ لگ جاوے پھر مصیبت آوے اسلئے وہ ذرا سمٹ کر دب کر کھڑا ہوا جس سے صف میں فرجہ ہوگیا نواب صاحب صف ملانے کیلئے ادھر کو اور کھسک گئے تو وہ اور ہٹ گیا اب نواب صاحب تو اس سے ملتے ہیں اور وہ الگ ہوتا جاتا ہے خدا خدا کر کے نماز پوری ہوئی تو وہ غریب فوراً ہی بھاگا نواب صاحب نے دعا سے فراغت کر کے فرمایا کہ ہمارے پہلو میں کون شخص کھڑا تھا اسکو حاضر کرو خدم حشم نے اسکو حاضر کیا اب تو وہ سمجھا کہ میری کمبختی آئے گی لوگوں نے کہا ڈرو نہیں کچھ نہیں کہیں گے مگر نواب صاحب کے سامنے دبکر گفتگو کرنا دلیرانہ بات چیت کرنا پھر وہ کچھ نہ کہیں گے ۳۳۹
چنانچہ نواب صاحب کے سامنے پہونچے انہوں نے فرمایا کیوں صاحب یہ کیا حرکت تھی کہ ہم تو صف میں خوب ملنا چاہتے تھے کیونکہ سنت بھی ہے اور تم ہم سے الگ ہوتے تھے کیا نماز میں بھی تم ہم سے ڈرتے تھے اس نے دلیر بنکر جواب دیا کہ نماز میں آپ سے میں کیوں ڈرتا یہ تو خدا کا دربار ہے جس میں بڑے سے بڑے بادشاہ بھی کسی ادنی مسلمان پر ترجیح نہیں رکھتا۔ نواب صاحب نے فرمایا پھر کس لئے تم بچتے تھے کہا میں اسلئے بچتا تھا کہ کہیں آپ کی دنیا مجکو نہ لگ جائے یہ سنکر نواب صاحب اس کے بڑے معتقد ہوے اور حاضرین سے تعریف کی اور رونے لگے اور کہا واقعی اس غریب کا کچھ تنخواہ مقرر کردی۔ نماز کی ایک برکت یہ ہے کہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے اطبا بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اخلاق جمیدہ و افعال حسنہ کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑتا ہے اور افعال بد سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھ لیا جاے کہ ایک آدمی نمازی ہو اور ایک بے نمازی تو نمازی کی صحت بے نمازی سے ضرور اچھی ہوگی (مگر دونوں یکساں قوی اور قریب قریب بدن کے لینے چاہئیں ۱۲) بلکہ ایک حدیث سے جو ابن ماجہ میں ہے تو معلوم ہوتا ہے گو محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے ذریعہ سے بعض امراض کا علاج کیا ہے

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ کے پیٹ میں درد تھا وہ آہ آہ کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے اور فارسی میں فرمایا اَشِکَمْتَ دَرْدٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ قُمْ فَصَلِّ فَزَالَ وَجَعُ بَطْنِہٖ کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے کہا ہاں فرمایا کھڑے ہو کر نماز پڑھو چنانچہ نماز پڑھتے ہی درد زائل ہو گیا چونکہ یہ مسئلہ احکام میں سے نہیں اسلئے ضعف حدیث اس میں مضر نہیں۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتا کہ نماز پڑھنے سے ہمیشہ درد زائل ہو جایا کرے گا ممکن ہے کسی عارض سے اس نفع کا ظہور نہ ہو مگر یہ تو ضرور ہے کہ نماز سے ایک خاص سرور ونشاط اور قلب کو راحت حاصل ہوتی ہے جس کا اثر صحت پر بھی ضرور ظاہر ہوتا ہے اور ہمکو اس کی وجہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ نماز سے راحت وسرور کیوں ہوتا ہے کیونکہ ہر اثر کے لئے کسی علت کا معلوم ہونا ضروری نہیں بعض چیزیں بالخاصہ موثر ہوتی ہیں دیکھئے مقناطیس میں جو جذب حدید کی خاصیت ہے اس کی وجہ کوئی نہیں بتلا سکتا اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ نماز میں یہ اثر بالخاصہ ہے جس کی علت بتلانے کی ہمیں ضرورت نہیں

۳۴۰ افسوس اتنی بڑی عبادت جس میں فلاح اخروی بھی ہے اور فلاح دنیوی بھی ہے اور ہم اس سے ایسے غافل ہیں کہ پانچ وقت خدا کی طرف سے ایک منادی ہمکو پکارتا ہے اور ہم جماعت میں نہیں آتے حالانکہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وَلَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ اٰمُرَ بِالصَّلٰوۃِ اِلٰی اَنْ قَالَ فَاُحَرِّقَ بُیُوْتَھُمْ بِالنَّارِ (کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز میں ایک شخص کو امام بنادوں پھر چند آدمیوں کو ساتھ لیکر دیکھوں کہ کون کون لوگ جماعت میں نہیں آئے پھر جو جماعت سے پیچھے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کے گھر پھونکدوں اور گو آپ نے ان لوگوں کے گھروں کو پھونکا نہیں مگر چاہا تو تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں اِنِّیْ اَرٰی رَبَّکَ یُسَارِعُ فِیْ ھَوَاکَ کہ میں خدا تعالیٰ کو دیکھتی ہوں کہ آپکی خواہش کو بہت جلدی پورا کر دیتے ہیں اور بھلا حضور کی یہ شان کیوں نہ ہو جب ادنیٰ ادنیٰ مقبولین کی یہ شان ہے کہ ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ ‎ میدہد یزداں مراد متقیں

تو معلوم ہوا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا چاہا ہے تو خدا تعالیٰ نے بھی ضرور چاہا ہے اب بتلاؤ

جسکے گھر کو خدا اور رسول پھونکنا چاہیں وہ کیونکر بچ سکتا ہے تو جو لوگ جماعت میں نہیں آتے ان کے گھر میں ضرور آگ لگی ہے شاید تم کہو کہ ہمارا گھر کہاں جلا وہ تو اچھا خاصا موجود ہے تو اس کے متعلق مولانا رومی کا جواب سُنلو فرماتے ہیں ؎

آتشے گر نامدست این دود چیست جاں سیہ گشت و روان مردود چیست

یہ تھوڑی آگ لگی ہوئی ہے جسکے دھوئیں نے دل کو سیاہ کر دیا اور چہرہ پر وحشت و ظلمت برس رہی ہے اس ظلمت قلب سے بے نمازی کے چہرہ پر بھی ضرور ایک اثر ہوتا ہے جس کو اس کا بے نمازی ہونا لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے نمازی کے چہرہ پر جو نور ہوتا ہے وہ بے نمازی کے چہرہ پر نہیں ہوتا اور یہ اثر قلب کا ہے نمازی کے دل میں نور ہے اس کا اثر چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے اور بے نمازی کے دل میں ظلمت ہے اس کا اثر چہرہ کی بدرونقی سے ظاہر ہوتا ہے معلوم ہوا کہ آگ ضرور لگی ہے اسی کا یہ دھواں ہے جس نے ظاہر و باطن ۳۰۴۱

دونوں کو سیاہ کر دیا ہے دل کی سیاہی یہ ہے کہ بہت لوگوں کو نہ رشوت سے نفرت ہے نہ جھوٹ بولنے سے نہ کسی پر بہتان باندھنے سے نہ کسی کی زمین دبانے اور قرض لیکر انکار کر دینے سے نہ لڑکوں اور عورتوں کو گھورنے سے وغیرہ وغیرہ۔ اور مولانا کا یہ ارشاد حدیث سے موید ہے۔ حدیث میں ہے۔ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ کَانَتْ فِیْ قَلْبِہٖ نُکْتَۃٌ سَوْدَاءُ فَاِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُہٗ وَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰی تَعْلُوْا قَلْبَہٗ فَذٰلِکُمُ الرَّانُ الَّذِیْ ذَکَرَ اللّٰہُ تَعَالٰی کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ رواہ الترمذی حسن صحیح مشکوٰۃ ص ۲۰۰ یعنی جب مسلمان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ داغ پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر توبہ استغفار کر لے تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر گناہ میں بڑھتا گیا تو یہ داغ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ دل کو گھیر لیتا ہے یہی وہ زنگ ہے جسکی بابت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ یعنی ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کی کرتوتوں کا زنگ غالب ہو گیا ہے۔ اسی کو مولانا ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

ہر گنہ زنگے ست بر مرآۃ دل دل شود زیں زنگ ہا خوار و خجل

چوں زیادت گشت دل را تیرگی نفس دوں را بیش گردد خیرگی

یہ تو بالکل حدیث کا ترجمہ ہے پس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ گناہوں سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اسی کو مولانا نے فرمایا تھا کہ آگ نہیں لگی تو یہ دھواں کہاں سے آیا کہ دل سیاہ ہو گیا اور صورت پر پھٹکار برستی ہے۔ بزرگوں کا کلام کلیاً یا جزئیاً بالکل حدیث و قرآن کا ترجمہ ہے گو ظاہر میں اشعار نظر آتے ہیں لکھنؤ میں ایک دفعہ میرا بیان ہوا تو اتفاق سے اس میں مثنوی وغیرہ کے اشعار زیادہ پڑھے گئے اسوقت ایک غیر مقلد بھی موجود تھے بیان کے بعد کہنے لگے کہ وعظ تو بہت اچھا ہے مگر اتنی کسر ہے کہ اس میں قال اللہ و قال الرسول کم تھا اشعار زیادہ تھے اگلے دن پھر بیان ہوا تو میں نے قصداً اشعار زیادہ پڑھے اور ہر ایک شعر کے مضمون کو حدیث و قرآن سے ثابت کیا تاکہ معلوم ہو جاوے کہ حدیث و قرآن کا ترجمہ ہے اور اگر کسی جگہ حدیث و قرآن کا ترجمہ بھی نہ ہو تو محقق کا کلام خدا اور رسولؐ کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اللہ و رسولؐ ہی کی مراد کو واضح کرتا ہے گو بعینہ ترجمہ نہ ہو بالخصوص مثنوی شریف کہ وہ تو خود

۳۴۲ الہامی کتاب ہے چنانچہ مولانا جامی کا ارشاد ہے ؎

مثنوی مولوی معنوی　　ہست قرآن در زبان پہلوی

حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ قرآن سے مراد کلام الٰہی ہیں پس اس کا مطلب یہ ہے کہ مثنوی کلام الٰہی ملہم ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ قرآن کا ترجمہ ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اس میں بہت سی حکایات ایسی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں ہاں بعض جگہ بعینہ ترجمہ قرآن بھی ہے مگر سب جگہ نہیں اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ الہام فارسی میں کیوں ہوا کیونکہ حق تعالیٰ کسی زبان کے ساتھ مقید نہیں ہیں وہ فارسی میں بھی تکلم اور الہام فرما سکتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر ست　　عشق را خود صد زبان دیگر ست

تو یہ اشعار یعنی ہر گنہ زنگے ست الخ علاوہ کلام محقق اور کلام ملہم ہونیکے حدیث کا ترجمہ بھی ہیں اسلئے مولانا کا ارشاد بالکل بجا ہے کہ آگ ضرور لگی ہے اسی سے دل سیاہ ہوا ہے رہا یہ کہ آگ کے ساتھ سوزش بھی ہوتی ہے اور بے نمازی کو تو سوزش نہیں ہے تو خوب یاد رکھو کہ سوزش بھی ہے مگر فالج غفلت کی وجہ سے جسم سن ہو رہا ہے اس لئے اسکا احساس نہیں ہے جیسے کلوروفارم سونگھنے والے کو زخم نشتر کا احساس نہیں ہوتا ایسے ہی ان لوگوں نے غفلت

کاکلوروفارم سونگھ رکھا ہے اسلئے گناہوں کی سوزش کا احساس نہیں ہوتا مگر ایک دن یہ فالج اور بہرسن اور یہ بیہوشی اترے گی اسوقت گناہوں کی سوزش کا احساس ہوگا ؎

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِکَ اَمْ حِمَارٌ

اس وقت غفلت کے غبار نے آنکھوں کو اندھا کر رکھا ہے اسلئے گناہ کرکے بیفکر پھرتے نظر آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم گھوڑے پر سوار ہیں اور دینداروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور انکو گدھے پر سوار سمجھتے ہیں مگر جسدن یہ غبار بیٹھ جائیگا اسوقت معلوم ہوجائیگا کہ گدھے پر سوار کون تھا اور گھوڑے پر سوار کون۔ دوسرے یہ گناہوں کی آگ خدائی آگ ہے جس کی خاصیت یہ ہے نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ اس کا اصل محل قلب ہے اور دعوے سے کہا جاتا ہے کہ گنہگار کا دل بےچین ہوتا ہے اسکو راحت وچین نصیب نہیں ہوتا۔ گناہ سے دل کمزور اور ضعیف ہوجاتا ہے یہ اسی آگ کا تو اثر ہے جس نے اندر اندر دل کو پھونکدیا ہے اور صوفیہ کی تحقیق تو یہ ہے کہ یہ گناہ خود ہی آگ ہیں اور جہنم انہی کی صورت مثالی ہے اس کا یہ مطلب

۳۴۴ نہیں کہ جہنم کا فی نفسہ وجود نہیں بس معاصی ہی کو مجازاً جہنم کہدیا گیا جیساکہ فلاسفہ نے نعیم وجحیم کی حقیقت علم وجہل سمجھی ہے مطلب یہ ہے کہ جہنم خارج میں موجود ہے اور اسی طرح موجود ہے جسطرح حدیث وقرآن میں خبر دی گئی ہے مگر اس کی حقیقت یہی معاصی ہیں جہنم کی آگ اور سانپ بچھو وغیرہ سب انہی گناہوں کی صورت ہیں چونکہ اس عالم میں اعراض بھی جواہر بنجاتے ہیں اسلئے یہی گناہ جو یہاں کئے جاتے ہیں ان ہی کی یہ صورتیں تھیں اور پہلے سے بن گئیں۔ امام غزالی نے یہی بات لکھ دی تھی جس کو لوگوں نے جہنم منصوصہ کی حقیقت کے انکار پر محمول کیا اور امام پر فتویٰ لگانے لگے مگر یہ حمل غلط ہے امام غزالی اس سے بری ہیں لوگوں نے ان کے کلام کو سمجھا نہیں یہ مسئلہ میں نے اسلئے بیان کردیا تاکہ اگر کسی کی نظر سے یہ بات گذرے تو غلطی میں نہ پڑے غرض صوفیہ کے قول پر تو یہ گناہی خود آگ ہیں ان کے لئے کسی دوسری آگ کی ضرورت نہیں مرنے کے بعد یہی آگ اور سانپ بچھو بنکر ستائیں گے پس گنہگار مرنے کے بعد تو صورت جہنم میں جائیگا اور اسوقت وہ حقیقت جہنم میں موجود ہے کیونکہ بڑا جہنم یہ ہے کہ حضرت حق ناراض ہوں ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر — کنایتیست کہ از روزگار ہجراں گفت

صاحبو! جہنم انہی کے واسطے جہنم ہے جنسے خدا تعالیٰ ناراض ہوں اور جس سے خدا راضی ہو اس کے لئے جہنم کوئی چیز نہیں بلکہ ان سے تو جہنم خود پناہ مانگتی ہے ان کے ایمان کے اثر سے وہ خود ٹھنڈی ہونے لگے گی حدیث میں ہے کہ جب مؤمن مسلمان پلصراط سے گذریں گے جو جہنم کی پشت پر بچھایا جائے گا تو مومن متقی سے جہنم کہے گی جُزْ یَا مُؤْمِنُ فَاِنَّ نُوْرَکَ اَطْفَأَ نَارِیْ اے مومن جلدی سے پار ہو جا تیرے نور نے تو میری نار ہی کو بجھا دیا۔ نیز مولانا رومی نے ایک جماعت اولیاء کا حال لکھا ہے کہ وہ پلصراط سے گذر کر جب جنت میں پہونچ جائیں گے تو حق تعالیٰ یا ملئکہ سے سوال کریں گے کہ ہم نے سنا تھا کہ پلصراط سے گذرتے ہوئے جہنم بھی راستہ میں آتا ہے مگر ہم کو تو ملا نہیں تو ارشاد ہوگا کہ تم نے ایک باغ سرسبز شاداب دیکھا تھا یا نہیں وہ کہیں گے ہاں باغ تو دیکھا تھا ارشاد ہوگا کہ وہی جہنم تھا جو تمہارے
ایمان کی برکت سے گلزار ہو گیا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے دنیا میں آگ گلزار ہو گئی تھی ؎ ۳۴۴

گلستاں کند آتشے بر خلیل — گروہے بر آتش برد زآب نیل

اور نیز قیامت میں انبیاء علیہم السلام اور بعض مؤمنین اذن شفاعت کے بعد جہنم میں گھس گھس کر دوزخیوں کو نکالیں گے مگر جہنم ان کا کچھ بھی نہ کر سکے گی اور اسوقت بھی زبانیہ جہنم دوزخ میں موجود ہیں مگر ان کو اس سے کچھ ضرر نہیں ہے یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے جو کامل الایمان ہیں اور جن میں ایمان ضعیف ہے ان کو بھی جہنم پوری طرح نہ جلا سکے گی کیونکہ ان کے دل میں ایمان ہے۔ مومن کے قلب پر آگ کا اثر نہ پہونچے گا اور حدیث مسلم میں ہے کہ اَمَاتَهُمُ اللّٰهُ اِمَاتَةً کہ گنہگار مسلمانوں کو حق تعالیٰ جہنم میں داخل کر کے ایک قسم کی موت یعنی نیند کا سا اثر دیدیں گے پھر ان کو عذاب جہنم کا کافی برابر احساس نہ ہوگا الغرض اصل جہنم تو خدا کی ناراضی ہے اور خدا کی ناراضی گناہوں سے ہوتی ہے تو گناہ خود جہنم ہیں اگر سزا بھی نہ ہو اور ویسے ہی چھوڑ دیئے جائیں تو حق تعالیٰ کا ناراض ہونا ہی خود جہنم ہے بلکہ شریف طبائع کا خاصہ یہ ہے کہ ان کو جرم پر سزا مل جاوے سے غم ہلکا ہو جاتا ہے اور اگر سزا نہ ملے تو رنج زیادہ ہوتا ہے کوئی اپنے

جہنم کی حقیقت پوچھے وہ یہی کہیں گے کہ معصیت ہی خود جہنم ہے۔ پس اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی
کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے یا جماعت کی پابندی نہیں کرتے ان کے گھر میں ضرور
آگ لگی ہے اور ایک دن اس کی سوزش کا احساس ضرور ہوگا گو ابھی نہو۔ صاحبو
بعض طاعات کا موقعہ تو کبھی کبھی آتا ہے مثلاً روزہ سال میں ایک بار آتا ہے اور
بعض طاعات سب پر فرض نہیں مثلاً حج اور زکوٰۃ سب پر فرض نہیں مگر نماز تو ایسا
ظاہر فرض ہے جن کی فرضیت سے کوئی شخص مستثنٰی نہیں ہے امیر و غریب سب پر
یکساں فرض ہے پھر اس کے لئے کوئی خاص مہینہ مقرر نہیں روزانہ پانچ دفعہ فرض
ہے تو یہ طاعت سب سے اہم اور ضروری ہے مگر اس کے ساتھ ہمارا یہ معاملہ ہے کہ
مسلمان بہت کم ایسے ہیں جو اس کے پابند ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوت علمیہ
کمزور ہے اور قوت علمیہ اسلئے کمزور ہے کہ قوت علمیہ کمزور ہے اگر ہم کو گناہوں کا ضرر پورا پورا معلوم ہوتا ۳۴۵
تو ترک صلوٰۃ پر ہمکو جرأت نہوتی جیسے سنکھیا کے ضرر کا ہمکو علم ہے تو کبھی تجربہ و امتحان کے لئے بھی کسی
نے نہ کھایا ہوگا نیز اوپر سے گرنے کا ضرر سب کو معلوم ہے تو امتحان کیواسطے کبھی کوئی اوپر
سے نہ گرا ہوگا۔ اور جو لوگ ایسی بیہودگی کرتے ہیں کسی جہل کے غلبہ سے ان چیزوں کی مضرت
کا علم ہی ضعیف ہوجاتا ہے پس معلوم ہوا کہ ہم کو گناہوں کے ضرر کا علم ایسا بھی نہیں
جیسا کہ سنکھیا کھانے اور اوپر سے گرنے کے ضرر کا علم ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ گناہوں کا
ارتکاب بیدھڑک کرلیا جاتا ہے اور ان کاموں کو بھول کر بھی نہیں کیا جاتا اور یہی قوت علمی
کی کمزوری ہے کہ جس چیز کا ضرر سنکھیا کھانے اور اوپر سے گرنے کے ضرر سے بھی اشد ہے
اس کو ہم نے ان سے بھی کم رکھا ہے ورنہ کبھی تو تجربہ کے لئے ان افعال کا بھی ارتکاب کیا
ہوتا جیسے بوجھ بجکڑ کی حکایت ہے کہ اس کی بستی میں ایک آدمی درخت پر چڑھ گیا تھا پھر اترا
نہ گیا تو شور مچانے لگا آدمی جمع ہوگئے وہ بھی سب بیوقوف تھے کسی کی سمجھ میں کوئی ترکیب
نہ آئی تو بوجھ بجکڑ کو بلایا گیا اس نے اوپر تلے دیکھکر تھوڑی دیر سوچکر کہا کہ بس تدبیر سمجھ میں
آگئی ایک رسا اسکے پاس پھینکدو اور کہو کمر سے باندھ لے اس نے باندھ لیا پھر لوگوں کو حکم
دیا کہ رسے کو زور سے جھٹکا دو لوگوں نے جو جھٹکا مارا تو بدن تو نیچے آگیا مگر روح اوپر کو

اڑ گئی لوگوں نے پوچھا کہ گرو نے کہا کہ یہ کیا ہوا کہنے لگا اس کی قسمت میں موت ہی تھی ورنہ میں نے
تو اس ترکیب سے بہت سے آدمی اندر سے نکالے ہیں اسی طرح ایک بھینس کا سر ناج کی کوٹھی
میں پھنس گیا تھا بیچاری وہیں کی وہیں رہ گئی اب کوٹھی کو توڑتے ہیں تو ناج کا نقصان اور
نہیں توڑتے ہیں تو بھینس کی جان جاتی ہے جب سارے تھک گئے اور کوئی تدبیر سمجھ میں
نہ آئی تو بوجھ بجھکڑ کو بلایا گیا اس نے کہا کہ بھینس کا سر کاٹ دو پھر ایک آدمی سے کہو کہ اوپر
سے اندر گھس کر سر نکال لاوے کیونکہ ناج کی کوٹھی کے دو منہ ہوتے ہیں ایک اوپر وہ بڑا
ہوتا ہے اور ایک نیچے وہ چھوٹا ہوتا ہے (۱) جب سر کاٹ دیا گیا تو بھینس مر گئی اب سر کو
نکال کر لائے بھی تو وہ جڑ کہاں سکتا ہے ۔۔۔ تو ہم اسکو بیوقوف اور احمق کہتے ہیں مگر ہم
بھی اسی حماقت میں مبتلا ہیں کیونکہ اس نے بھی امتحاناً یہ فعل کئے تھے اسکو اوپر سے گرنے اور سر
کاٹنے کے ضرر کا علم نہ تھا اگر اسکو ضرر کا علم کافی ہوتا تو کبھی ایسی رائے دینے کی جرأت نہ کرتا مگر
۳۴۶ اس نے محض آزمایا ہی تھا جیسے ہم امتحان کے لئے کبھی نماز کو ترک کر دیتے ہیں اور بہت سے
گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور دل میں کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس گناہ کا مزہ تو دیکھ لیں پھر نہ کریں گے
اس امتحان کی وجہ یہی ہے کہ ہم کو ضرر کا علم پورا نہیں اگر علم ضرر کافی ہوتا تو تجربہ کی کبھی ہمت نہ ہوتی
اور یہ کچھ علم نہیں کہ دو چار الفاظ یاد کر لئے کہ نماز نہ پڑھنا گناہ ہے رشوت اور سود حرام ہے وغیرہ
وغیرہ علم وہ ہے جسکا طبیعت پر اثر ہو جو دل میں گھس گیا ہو جیسے سنکھیا کا زہر قاتل ہونا دل میں گھسا
ہوا ہے مگر ہماری یہ حالت گناہوں کے متعلق نہیں ہے بلکہ یہاں تو ایسی بیفکری اور دلیری ہے کہ اگر
کوئی ان کو خیر خواہی سے نصیحت کرتا ہے کہ بھائی نماز پڑھا کرو یا برے کام نہ کیا کرو تو یہی لوگ جو چند
الفاظ پڑھے ہوئے ہیں اور تعلیم یافتہ و مہذب کہلاتے ہیں ناصح کو یوں جواب دیتے ہیں کہ میاں
تم ہی جنت میں چلے جانا ہم دوزخ ہی میں سہی ۔ بھلا یہ جواب سنکر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کو گناہوں
کے ضرر کا علم ہے ہم تو جب جانیں کہ یہی شریف آدمی جو جہنم میں جانے پر تیار ہے ڈکیتی کر کے بھی
یہ کہہ دے کہ میاں تم ہی آرام سے گھر بیٹھے رہو ہم جیلخانہ ہی میں سہی یا کسی کا گھر جلتا ہو اور کوئی اسکو
خبر دے تو بیفکری کے ساتھ یہ کہہ دے کہ میاں تم ہی گھر میں راج کرو ہم بے گھرے ہی سہی صاحب!
ایک ذرا سے جوتے کے کھونے کی بھی سب کو فکر ہوتی ہے مگر افسوس جنت کے بارہ میں

ہم ایسے سمجھتے ہیں کہ گناہوں کی بدولت وہ ہمارے ہاتھ سے ضائع ہوتی ہے تو اس کی ذرا فکر نہیں اتنو سمجھ میں آگیا کہ درحقیقت ہم کو گناہوں کے ضرر کا علم ہی نہیں اور جو کچھ ہے وہ محض الفاظ کے درجہ میں ہے جس کا مفہوم قلب میں کچھ نہیں پس یہ ثابت ہوگیا کہ علمی اور عملی کمزوری گناہوں کا سبب ہے اور یہ بلا آجکل ہر جگہ عام ہے جسکے عموم میں یہ مقام بھی داخل ہے اسلئے میں نے اس مضمون کو اختیار کیا ہے اسی کو حق تعالیٰ نے ان آیات میں بتلایا ہے۔ فرماتے ہیں اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اس میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کے کان کھولے ہیں جو زمینداری پر یا کسی عہدے پر یا شرف نسب اور جائداد و مال وغیرہ پر فخر کرتے ہیں کہ سنلو بڑا شرف خدا کا ڈر ہے یعنی تقویٰ اور پرہیزگاری جس کا حاصل ہے گناہوں سے بچنا اسی سے کامل شرافت حاصل ہوتی ہے اس میں تو ضرورت عمل پر تنبیہ کیا گیا ہے اور اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خدا کا خوف علم سے حاصل ہوتا ہے مطلب یہ ہوا کہ قوت عمل علم پر موقوف ہے پس علم و ۴۴۷
عمل دونوں کی ضرورت ثابت ہوگئی اب اگر کسی کو فلاح اور اصلاح کی طلب ہو وہ علم و عمل حاصل کرنے کی سعی کرے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب مدرسہ میں آجاویں کیونکہ اسکو آجکل دنیا سے بیکاری کا سبب سمجھتے ہیں تو سن لو کہ علم و عمل کا حاصل ہونا بیکار بننے پر موقوف نہیں آپ سارے کام کرتے رہیں جب بھی یہ دولت مل سکتی ہے گو بعد میں دنیا سے اضطراراً بیکار ہو جانا پڑتا ہے مگر وہ بیکاری ایسی لذیذ ہوگی کہ آپ ہزار کاموں کو اسپر فدا کرینگے اسکو آپ خود اختیار کرینگے باقی ہم ایسے بیکار بننے کو نہ اب کہتے ہیں نہ جب کہیں گے۔ اب میں وہ طریقہ بتلاتا ہوں تو سنئے علم حاصل کرنیکا سہل طریقہ تو یہ ہے کہ آجکل مسائل دینیہ کی کتابیں اردو میں بکثرت ہیں عقائد کی بھی اور احکام کی بھی انکو تنہائی میں دیکھا کیجئے اور فراغ کے اکثر اوقات میں کتب بینی میں رہا کیجئے یا دوستوں کے ساتھ مجلس آرائی چھوڑ دیجئے آپنے ابتک خلوت اختیار کی نہیں اس لئے اس کی قدر نہیں اگر کچھ دنوں خلوت اختیار کرلو تو پھر جلوت سے گھبراؤگے مگر خدا کے لئے تنہائی میں ناول نہ دیکھو اسکو تو اول دیکھو ہی نہیں اور اگر کسی معقول ضرورت سے دیکھو بھی تو جلوت میں دیکھو مگر دوسروں کو نہ سناؤ کیونکہ مجمع میں دیکھنے سے ذہن منتشر رہتا ہے تو اچھی طرح مضمون کا اثر دل پر نہیں ہوتا اور خلوت میں جو مضمون دیکھا جاتا ہے اس کا دل پر پورا اثر ہوتا ہے

پھر نا ول کا اثر یہ ہوگا کہ آپ کو عورتوں کے گھورنے اور جھانکنے تاکنے کا خیال ہوگا پھر وصال کی ہوس ہوگی اور وہ ترکیبیں استعمال کروگے جو ناول میں دیکھی تھیں جس سے دنیا و آخرت ہر دونوں برباد ہوں گے۔ یاد رکھو خلوت کے معنے یہ نہیں کہ آدمی اکیلا بیٹھا رہے چاہے دل میں کچھ ہی بھرا ہو بلکہ خلوت کے معنی یہ ہیں کہ دل خدا کیساتھ لگا رہے پس جب تک خلوت میں دل خدا کے ساتھ لگا رہے خلوت میں رہو اور جب خلوت میں قلب کو انتشار اور ہجوم خطرات ہونے لگے تو مجمع میں بیٹھو مگر نیک مجمع میں اس سے خطرات دفع ہوں گے اسوقت یہ جلوت ہی خلوت کے حکم میں ہے کیونکہ مقصود ربط قلب باللہ ہے اور اس وقت وہ خلوت سے حاصل نہیں بلکہ مجمع میں بیٹھنے سے حاصل ہے اسی کو شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل — بہ تنہائی اندر صفائی نہ بینی
گرت مال و زر ہست و زرع و تجارت — چو دل با خدا ایست خلوت نشینی

اور ایک بزرگ حق تعالیٰ کی طرف سے فرماتے ہیں ؎

چوں باہمہ چو بامنی بے ہمہ — چوں بے ہمہ چہ بے منی باہمہ

یعنی جو شخص سب کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کا دھیان لگائے رکھے اور ان کی یاد میں مشغول ہے وہ اگر باہمہ بھی ہے یعنی مجمع کے ساتھ ہے مگر بے ہمہ ہے یعنی خلوت میں ہے اور جو شخص خدا کو چھوڑ کر اور چیزوں کا خیال رکھے اور وہ بے ہمہ بھی ہے یعنی خلوت میں ہے مگر باہمہ ہے یعنی خلوت میں نہیں۔ غرض خلوت کے معنی یہ نہیں ہے کہ تنہائی میں بیٹھکر ناول دیکھا کرو بلکہ یہ معنی ہیں کہ تنہائی میں خدا کے ساتھ دل لگاؤ میں یہ نہیں کہتا کہ دن بھر خلوت میں رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے اوقات کو ضبط کر کے کچھ وقت خلوت کا بھی نکالو اور اس وقت میں کسی محقق سے پوچھکر اس کے کہنے کے موافق عمل کرو۔ وہ آپ کو کچھ دیر مطالعۂ احکام کا امر کرے گا کچھ دیر ذکر اللہ بتلائے گا اس طرح خلوت کر کے دیکھو اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ اللہ اللہ کر کے دیکھو پھر تم لوگوں کی صحبت سے خود ہی رستے توڑ ڈ و گے اسوقت مولانا کا یہ قول صاف واضح ہو جائے گا ؎

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست — جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

۳۴۴۸

مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے کو شیخ زادہ سمجھکر شیخ سے بھی زیادہ سمجھتے ہیں گویا اپنے کو بجائے شیخ زادہ کے شیخ زیادہ سمجھتے ہیں اس لئے کسی سے طریقہ پوچھتے ہوئے عار آتی ہے۔ صاحبو! بدون جاننے والے کی رہبری کے تو آپ ایک دو میل بھی نہیں جا سکتے پھر خدا کے راستے میں کیوں کر چل سکتے ہو جس کی شان یہ ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہرچہ بردے میرسی بروے مایست

مجھے ان لوگوں پر زیادہ افسوس آتا ہے جو صاحب وسعت ہیں کہ ہر کام ان کے اشارہ پر ہوتا ہے صرف زبان ہی ہلانی پڑتی ہے اور پھر بھی وہ عمر عزیز کو فضول کاموں میں ضائع کرتے ہیں۔ اہل حاجت کو تو دنیا کے کاموں ہی سے فرصت کم ملتی ہے مگر اہل وسعت کو کیا ہوا ان کو تھوڑی دیر خلوت میں خدا کو یاد کرنے سے کون چیز مانع ہے یہ فراغ و وسعت بھی بڑی دولت ہے ان کو اس کی قدر کرنا چاہیئے ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎ ۳۴۹

خوشا روزگارے کہ دارد کسے کہ بازار حرصش نباشد بسے

بقدر ضرورت بیارے بود کند کارے از مرد کارے بود

تو اگر کسی کو مدرسے میں آنا گوارا نہ ہو تو وہ اردو رسالے ہی پڑھکر علم حاصل کرلے اگر اردو جانتا ہو اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کسی اہل اللہ کے پاس جایا کرو اس کی صحبت سے بھی علم و عمل دونوں حاصل ہو جائیں گے اگر روز جانا نہ ہو تو ہفتہ میں ایک دن ہی مقرر کرلو جو تعطیل کا دن ہے یعنی جمعہ کا دن اس سے زیادہ اور کیا آسان ترکیب ہوگی اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

مقام امن و مے بے غش و رفیق شفیق گرت مدام میسر شود زہے توفیق

یہ خلوت از اغیار اور صحبت یار یعنی شیخ کے متعلق فرمایا ہے اور ذکر اللہ اور کتب بینی کے متعلق حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست صراحی مے ناب و سفینۂ غزل ست

صراحی مے ناب سے مراد ذکر اللہ ہے جس کی مستی کے سامنے شراب کی مستی بھی ہیچ ہے اس سے وہ سرور و نشاط حاصل ہوتا ہے جو کسی شراب سے نہیں ہوتا پھر مزا یہ کہ یہاں سرور ہی سرور ہے فساد عقل اور خمار نہیں ہیں یہ ترکیب تو مردوں کے لئے علم و عمل حاصل کرنیکی ہے اور عورتوں کیواسطے

یہ ترکیب ہے کہ مرد مسائل معلوم کر کے ان کو بتلائیں اور عمل کی تاکید کریں اور دیکھتے رہیں کہ جو احکام ان کو بتلائے گئے ہیں ان پر عمل ہوتا ہے یا نہیں یہ کام مردوں کے ذمہ ہے کہ اپنے گھر والوں کو بھی جہنم سے بچائیں ورنہ محض اپنے بچانے سے وہ سبکدوش نہ ہوں گے اب بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب گھر والوں پر گھر والے کے کہنے سے اثر نہیں ہوتا ہاں البتہ کوئی باہر والے کہنے آئیں گے اور کیوں صاحب یہ کیا بات ہے کہ کھانے میں نمک تیز ہو جائے تو اسوقت آپ کے کہنے کا اثر کیوں ہوتا ہے۔ یاد کر لو اگر کبھی کھانے میں نمک تیز ہوا ہوگا اور تم نے بیوی کو دھمکایا ہوگا تو اس کا کیسا اثر ہوا ہوگا کہ اس دن کے بعد پھر اس نے کبھی یہ حرکت نہ کی ہوگی اور غلطی سے اگر کی بھی ہوگی تو سال دو سال میں کبھی ایسا اتفاق ہو گیا ہوگا آخر اس کی کیا وجہ کہ نمک کی تیزی پر تو گھر والوں کے کہنے کا اثر ہوا اور نماز روزہ کے لئے باہر والوں کا اثر ہو تمہارا اثر نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ اپنے نمک تیز ہونے پر تو ناک منہ چڑھا کر کہا تھا اور نماز نہ پڑھنے پر کبھی ناک نہ چڑھائی تھی بلکہ یوں ہی بوجھ سا
اتار دیا تھا اور عذر کے لئے کہہ دیا کہ صاحب ہم نے تو بیوی سے نماز کو کہا تھا وہ نہیں پڑھتی ہم کیا کریں ۳۵۰
اب ہم تو سبکدوش ہو گئے تو یاد رکھو اس طرح کہنے سے تم سبکدوش نہیں ہوتے۔ صاحب جب تم نے بیوی کو نماز کے لئے کہا تھا اور اس نے نہ پڑھی تھی تو کبھی تم نے یہ تو کیا ہوتا کہ اس کے ہاتھ کی روٹی کھانا چھوڑ دیتے کہ میں بے نمازوں کے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹی نہ کھاؤں گا اس کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ہندوستان کی عورتیں اسکو گوارا نہیں کر سکتیں کہ خاوند کسی غیر کے ہاتھ کی روٹی کھاوے اس صفت میں تو وہ حوروں کے مشابہ ہیں حوروں کی شان میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے عُرُبًا اَتْرَابًا کہ وہ اپنے شوہروں کی عاشق ہیں یہی حال ہندوستان کی عورتوں کا ہے یہ بھی خاوند کی عاشق اور خادم ہوتی ہیں اس کی راحت کو اپنی راحت پر مقدم کرتی ہیں جب تک مرد کھانا نہ کھائے اسوقت تک عورتیں کھانا نہیں کھاتیں بھوکی بیٹھی رہتی ہیں مرد کی بیماری میں یہ اپنی بیماری کو بھول جاتی ہیں بارہا دیکھا گیا ہے کہ کوئی عورت پہلے بیمار ہوئی تو جب تک خاوند اچھا ہے اسوقت تو وہ پڑی گری رہتی ہے اور جہاں خاوند گرا بس یہ کھڑی ہو گئی اپنی بیماری کو بھول گئی اور اس کی خدمت میں لگ گئی۔ نیز ان کے دل پر کسی غیر مرد کا وسوسہ بھی نہیں آتا نہ حلال کا نہ حرام کا اپنے مردوں کو تو غیر عورتوں

کی طرف جا نکلتے نہ دیکھا ہوگا اور بعضے منہ کالا بھی کرتے ہیں اگر عورتوں کو غیر مرد کی طرف
التفات کرتے کم دیکھا ہوگا بلکہ اپنے شوہر ہی پر نگاہ کو منحصر کرلیتی ہیں اس صفت میں بھی یہ
حوروں کے مشابہ ہیں ان کی صفت میں قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ بھی آیا ہے ہندوستان
کی عورتیں تو اکثر ایسی ہی ہیں مردوں کو تو اس کا بھی خیال ہوتا ہے کہ بیوی حسین ہو
خوبصورت ہو مگر عورتوں کو اس کا بھی خیال نہیں ہوتا خاوند چاہے کیسا ہی بدصورت
ہو وہ اس کی ہوجاتی ہیں ان میں عشقِ زوج کا مادہ بہت زیادہ ہے اور عجب نہیں کہ
اسی وجہ سے یہاں نکاح بیوہ کا معیوب ہوگیا ہوگا گو اب زیادہ عیب نہیں رہا مگر عورتیں
اب بھی اس کو پسند نہیں کرتیں باقی انہوں نے اس میں غلو کرلیا ہے چنانچہ جو بیوہ نکاح
نکرے اس کی تعریف میں کہتی ہیں کہ فلانی تو ایمان پر بیٹھی ہے گویا جس نے نکاح کرلیا وہ
٣٥١ بے ایمان ہے بس یہ غلو اور معصیت ہے ایک بی بی نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ فلانی اول
مرگئی تھی اب اس کا مرد اسکے بعد مرا ہے تو کیا وہ عورت قبر میں بھی عدت بیٹھے گی سوال
تو جہالت کا ہے مگر اس سے شوہر کی عظمت اس کے دل میں معلوم ہوتی کہ وہ مرنے کے بعد
بھی عورت کے ذمہ شوہر کا یہ حق سمجھتی تھی کہ شاید قبر میں اس کو عدت گذارنا پڑے گی
زندگی میں تو شوہر کا حق تھا ہی اس لئے موت کے بعد بھی اس کو باقی سمجھا غرض ہندوستان
کی عورتیں شوہروں کی عاشق ہوتی ہیں ان کو کبھی یہ گوارا نہیں ہوتا کہ مرد کسی اور کے ہاتھ کی
روٹی کھائے اسلئے اگر آپ نماز کی تاکید اس طرح کریں کہ ایک دو دفعہ کہنے سے بھی اگر وہ نماز نہ پڑھے
تو چند روز تک اسکے ہاتھ کی روٹی نہ کھائیں تو اس کا ضرور اثر ہوگا یہ طریقہ ہے عورتوں کی تعلیم کا
اور مردوں کے لئے علم وعمل حاصل کرنے کا سہل طریقہ ابھی بتلا چکا ہوں اب کسی کو کوئی
عذر باقی نہ رہا جب آپ علم وعمل حاصل کرلیں گے اس وقت آپ کو اصلی شرف اور پوری
شرافت حاصل ہوگی بدون اس کے محض نسبی شرف زیادہ وقعت کی چیز نہیں اسی کو حق
تعالیٰ نے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ میں بیان فرمایا ہے اسکے بعد فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ
خَبِیْرٌ اس میں اس پر تنبیہ ہے کہ علم وعمل ہر چند کہ بڑا شرف ہے اور اسی سے آدمی اللہ تعالیٰ
کے یہاں معزز ومکرم ہوتا ہے مگر فخر اس پر بھی نہ کرنا چاہئے اس میں علماء اور صوفیہ کے کان کھولے گئے

ہیں کہ شاید وہ یہ سنکر کہ مدار شرف و اکرمیۃ تقوی ہے جو کہ مستلزم ہے علم کو اپنے علم و تقوی پر
ناز کرنے لگیں اور فخر کرنے لگیں کہ ہم سب سے اشرف و اکرم ہیں تو بتلاتے ہیں کہ پرہیزگاری
اور تقوی کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے تم نہیں جان سکتے کہ عند اللہ کون متقی ہے کیونکہ علم و عمل جبھی
موجب شرف ہے جبکہ وہ خدا کے یہاں قابل قبول ہو جائے اور اس کا یقینی علم کسی کو نہیں بلکہ اپنے
علم و عمل کی حالت پر نظر کر کے تو اگر عدم قبول یقینی ہو تو بعید نہیں پھر فخر کرنے کا کیا موقعہ نیز یہ
بھی معلوم ہے کہ علم و عمل کا اعتبار خاتمہ سے ہے اور اس کی بھی کسی کو خبر نہیں کہ ہمارا خاتمہ
کس حال میں ہونیوالا ہے اسلئے فخر کرنا اور اترانا اور ناز کرنا کیا زیبا ہے ہاں اس کو نعمت الٰہی
سمجھکر شکر کرتے رہو سبحان اللہ قرآن مجید کے دو جملوں میں عوام کی بھی اصلاح ہو گئی اور
خواص کی بھی خلاصہ آیت کا یہ ہوا کہ اصل شرف علم و عمل ہے جنکو یہ شرف حاصل نہو وہ
اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور محض شرف نسب پر قناعت نکریں اور جنکو شرف
علم و عمل حاصل ہو وہ اس پر فخر و ناز نہ کریں بلکہ نعمت الٰہی سمجھکر شکر کرتے رہیں بس اب ۳۵۲
میں ختم کرتا ہوں کیونکہ عصر کا وقت آگیا ہے اور بحمد اللہ جس مضمون کا بیان کرنا مقصود تھا
وہ بقدر ضرورت بیان ہو چکا اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو علم و عمل کی توفیق دیں اور فہم سلیم
عطا فرمائیں آمین وَصَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ
وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ ه وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ. ه وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِي بِعِزَّتِهِ وَجَلَالِهِ تَتِمُّ الصّٰلِحٰتُ" اشرف علی ۱۳ رجب ۱۳۵۱ھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

۳۵۴

کا

وعظ مسمّٰی بہ

الانسداد للفساد

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمی بہ

الانسداد للفساد

این	کہاں ہوا	مظفر نگر در بہدات مکان حافظ عنایت علی صاحب
متی	کب ہوا	۲ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ شب چہار شنبہ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ ۵ منٹ
کیف	کس طرح ہوا	کرسی پر بیٹھ کر
لم	کیوں ہوا	احباب کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	نااتفاقی کے مفاسد اور اتفاق کے حدود و اسباب کا بیان تھا
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ہر طبقہ کو عموماً نوابی
من ضبط	کس نے ضبط کیا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب رحمہ اللہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	تقریباً ۵۰۰ مرد اور عورتیں پردہ میں ان کے علاوہ
الاشتات	متفرقات	تسوید تفصیل ۲ محرم ۱۳۴۳ھ کو شروع ہو کر ۲۵ محرم کو ختم ہوئی درمیان میں ایک جدید تفصیل کی تسوید شروع ہوئی تھی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَاِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ ۔ یہ ایک حدیث ہے جس میں ارشاد ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موقعہ پر اس کے بیان کا ارادہ تھا اور یہاں کے لئے کوئی دوسرا
مضمون بیان کرنے کا قصد تھا مگر وہاں بیان کا اتفاق نہوا اس لئے اسوقت اسی حدیث کو اختیار
کر لیا ہے تاکہ دوسرا مضمون اور نہ دوسری حدیث تلاش نکرنا پڑے اور پہلے موقعہ کے لئے اسکے
اختیار کی اصل وجہ یہ تھی کہ حق تعالی نے یہ مضمون دل میں ڈالا تھا کیونکہ آج کل اس کی سخت
ضرورت ہے یوں تو ہر مرض کے متعلق علاج کی ضرورت ہے مگر جس خاص مرض کی وبار
کے زمانہ میں کثرت ہوتی ہے اس کے علاج و دوا کا خاص اہتمام ہوتا ہے اگر وبار کا زمانہ ہو تو
پھر کسی مرض کے علاج کے لئے کوئی خاص مرجح نہیں ہوتا بلکہ جتنے امراض لوگوں میں موجود ہوں
ان میں سے ہر مرض یہ چاہتا ہے کہ میرا علاج بھی کیا جائے اور علاج کا طریقہ بیان کیا جاوے لیکن
جب کسی خاص مرض کا شیوع ہو تو اب اس کے بیان کے لئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں اس کا شیوع
۴۵۵ خود مرجح ہے پس جس طرح امراض جسمانی میں شیوع و عدم شیوع سے تفاوت ہوتا ہے اسی طرح امراض
نفسانی میں بھی کثرت مرجح ہو جاتی ہے جس مضمون کو میں نے اسوقت اختیار کیا ہے اس کے لئے یہی امر
مرجح کافی ہے کہ اس میں جس مرض کے مفاسد پر متنبہ کیا گیا ہے آجکل اس کی بہت کثرت ہے اور
آجکل سے مراد صرف یہی زمانۂ حاضرہ نہیں بلکہ قریب دو تین سال سے اس کا شیوع ہو رہا ہے
اور اصل بنیاد تو اس کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ قتل سے پڑی ہے کیونکہ حدیث میں
ہے کہ جب میری امت میں تلوار نیام سے باہر ہو جائے گی تو پھر قیامت تک نیام نہ ہوگی علمار
سلف نے تصریح کی ہے کہ اس کی ابتدا حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے ہوئی ہے یہ پہلا واقعہ ہے
جس میں مسلمانوں کے اندر اختلاف و نزاع پیدا ہوا اس کے بعد پھر اختلاف بڑھتا ہی گیا کبھی
کبھی انیس بیس کا تو فرق ہوا مگر استیصال کبھی نہیں ہوا تو یہ مرض اسلئے بھی اشد ہے کہ بہت
پرانا ہے اور ظاہر ہے کہ پرانا بخار دق بنکر ہلاکت تک نوبت پہونچا دیتا ہے - نیز یہ اسواسطے
بھی سخت ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے تین
دعائیں کی تھیں ایک یہ کہ میری امت قحط عام سے ہلاک نہو دوسرے یہ کہ مخالفین کا ان پر
غلبۂ عام نہو جس سے مسلمانوں کا استیصال ہو جائے تیسرے یہ کہ مسلمان آپس میں نہ لڑیں
پہلی دونوں دعائیں قبول ہوئیں اور بحمد اللہ آج تک برابر ان دونوں بلاؤں سے یہ امت

موجود نہ ہو شرط تمام ہوتا ہے نہ مخالفین کا تمام غلبہ ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کسی خاص مقام پر مسلمان مغلوب ہوں لیکن کسی دوسرے مقام پر مسلمانوں کا غلبہ بھی ہوتا ہے اور غلبہ نہ بھی ہو تو استیصال تو مسلمانوں کا قیامت تک نہ ہو سکے گا بلکہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں مسلمان مغلوب بھی ہیں وہاں بھی اسلام کو روز بروز ترقی ہے بہت سے کافر آئے دن اسلام میں داخل ہوتے جاتے ہیں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دعا کی برکت ہے تاکہ مسلمانوں کا استیصال عہ ہو جاوے تو تیسری بات کے متعلق حدیث میں آتا ہے فمنعنیہا یعنی یہ دعا قبول نہیں ہوئی اسلئے یہ مرض نا اتفاقی کا تو رہے گا کیونکہ اس کے متعلق دعا قبول نہ ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ مرض مسلمانوں میں تو رہے گا اس کا استیصال نہ ہوگا پس اس کے علاج کی طرف ہر وقت توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ مادہ تو موجود ہی ہے ذرا سی غفلت میں اس کے بڑھ جانے کا خطرہ ہے عہ شاید کوئی کہے کہ جب حدیث میں پیشین گوئی آ چکی ہے کہ یہ باہمی نا اتفاقی کا مرض زائل نہ ہوگا تو پھر علاج کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی پیشین گوئی کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ طبیب کسی مریض کی بابت معلوم ہو جانے کے بعد بد پرہیزی دیکھ کر اس سے پیشین گوئی کرے کہ یہ بیمار اچھا نہ ہوگا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مرض فی نفسہ قابل علاج نہیں رہا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر پرہیز کرے تو اچھا ہو جاوے گا مگر اس کی بد پرہیزی کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اچھا نہ ہوگا اور ایک صورت یہ ہے کہ مرض ایسا ہو کہ علاج سے تعلق ہی نہ رہے جیسے دق جو درجہ چہارم میں پہونچ جاوے سو یہاں پیشین گوئی دوسری صورت کی نہیں بلکہ پہلی صورت کی ہے تو اس سے مرض کا لا علاج ہونا یا علاج کا بیکار یا غیر ضروری ہونا لازم نہیں آتا اور وجہ اس پیشین گوئی کی دوسری صورت نہ ہونے کی یہ ہے کہ یہ تقسیم امراض جسمانی میں کیساتھ خاص ہے کہ ان میں بعضے خود لا علاج ہوتے ہیں اور

عہ بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جس قوم نے مسلمانوں کے استیصال کا قصد کیا حق تعالیٰ نے اسی کو مسلمان کر دیا مثلاً خاندان تاتاری چنانچہ چنگیز خاں نے اس کا ارادہ کیا تھا اور خلافت بغداد کو تاراج کیا مگر حق تعالیٰ نے اسی کی اولاد کو اسلام کا محافظ کر دیا اس سے پہلے [illegible] نے اس کا ارادہ کیا تھا وہ بھی سب مسلمان ہو گئے [illegible] مسلمانوں کا [illegible] کا ارادہ [illegible] تو اسلام کی ترغیب [illegible] موجود ہیں ہم کو کسی کے اس ارادہ [illegible] نہیں ہوتا بلکہ اس کے اسلام لانے کی امید قوی ہو جاتی ہے ۱۲ منہ

عہ یہ مضمون بہت عجیب ہے اہل علم غور سے دیکھیں ۱۲ منہ

بعضے بدپرہیزی سے خطرناک ہوجاتے ہیں امراض نفسانی میں یہ تقسیم ہی نہیں ہے بلکہ یہاں سب امراض قابل علاج ہیں لاعلاج کوئی نہیں بلکہ ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امراض جسمانیہ بھی فی نفسہ لاعلاج کوئی نہیں ابوداؤد و ترمذی کی حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَمْ یَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَہٗ دَوَاءً غَیْرَ دَاءٍ وَّاحِدٍ وَھُوَ الْھَرَمُ خدا تعالےٰ نے کسی مرض کو پیدا نہیں کیا مگر اس کے لئے دوا بھی پیدا کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر مرض جسمانی بھی قابل علاج ہے باقی جو ظاہر اُس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر بعضے مرض مایوس العلاج کیوں ہوتے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مرض کے ہمارے نزدیک لاعلاج ہونے سے اس کا فی نفسہ لاعلاج ہونا لازم نہیں ممکن ہے کہ خدا تعالےٰ نے اس کی دوا پیدا کی ہو مگر ہمارے علم میں نہ آئی ہو پس ممکن ہے کہ دق کے لئے بھی علم الٰہی میں اور واقع میں کوئی دوا ہو جو ہم کو نہیں معلوم ہوئی اسلئے ہم اسکو لاعلاج کہنے لگے سو اس تقریر سے تو امراض جسمانی میں بھی وہ تقسیم منفی ٹھہرتی ہے لیکن اگر تقسیم کو صحیح ہی فرض کر لیا جاوے اور حدیث کو اکثر پر محمول کیا جاوے تب بھی امراض روحانی میں وہ تقسیم نہیں ہے بلکہ تقسیم کہا جاتا ہے کہ ان میں ہر مرض کی دوا واقع میں بھی ہے اور ہم کو بتلائی بھی گئی ہے یہاں کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا بتلائی نہ گئی ہو سارا مطلب مکمل ہے اور مکمل کہنے ہی سے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ نازل ہوا ہے۔ اگر کسی کا روحانی مرض لاعلاج ہوتا اور کوئی مریض روحانی مایوس العلاج ہوتا تو سب سے زیادہ مستحق اس کے وہ لوگ تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ نازل ہوا ہے مگر ان کا کفر بھی فی نفسہ لاعلاج نہ تھا بلکہ ان کی بدپرہیزی کی وجہ سے پیشین گوئی کی گئی ہے۔ بعض مفسرین کا قول تو یہ ہے کہ یہ آیت خاص خاص لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جن کا نام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا گیا تھا۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ بلا تعیین یہ ان سب لوگوں کے بارے میں جن کا خاتمہ کفر پر ہونیوالا ہے اور خاتمہ سے پہلے کسی کو بھی حتی کہ ابوجہل کو بھی علی الاطلاق کافر نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ شاید اخیر میں اسلام لے آتا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید — کہ مسلمان بودنش باشد امید

مگر اس وقت وحی کا زمانہ تھا اس وقت خاتمہ کا حال معلوم ہو سکتا تھا کہ کس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے اس لئے جن کفار کی نسبت صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے ان کے نام صحابہ نے اس آیت کی تفسیر میں تمثیلاً بیان کر دیئے۔ اور مطلب یہ تھا کہ یہ آیت ان جیسے لوگوں کے بارہ میں ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہوگا سب کافروں کے بارہ میں نہیں ہے مگر اب تو خاتمہ کا حال معلوم ہونا دشوار ہے اگر ظاہر میں کسی کا کفر ہی پر خاتمہ ہو جب بھی تقینی طور پر کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم کو دل کا حال کیا معلوم ہے شاید وہ دل میں مسلمان ہو اور زبان سے اقرار کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو یا ملا ہو اور اس نے تساہل کیا ہو تو بہت سے بہت گنہگار ہوگا مگر کافر نہ ہوگا بلکہ عنداللہ ایسا شخص مسلمان ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان مرتے ہوئے کلمہ کفر کہتا ہوا جائے جب بھی کفر کا حکم مشکل ہے فقہا نے اس کا راز سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مرتے ہوئے کسی کے منہ سے کلمہ کفر نکل جائے تو اس کو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے شاید نزع کی وجہ سے اس کی ۳۵۸ عقل درست نہ ہو اور بیہوشی کی غفلت میں یہ کلمہ زبان سے نکلا ہو اور شریعت میں ایسا شخص مکلف نہیں رہتا بیہوشی میں جو فعل و قول بھی صادر ہو شرعاً معاف ہے یا ممکن ہے کوئی ہوش ہی میں کلمہ کفر کہہ رہا ہو مگر اس کا مطلب وہ نہ ہو جو تم سمجھے بلکہ کچھ اور مطلب ہو پھر اتنے احتمالات کا ہونے ہوئے حکم کفر کیونکر لگایا جا سکتا ہے اس پر مجھے ایک بزرگ کا واقعہ یاد آیا کہ جب وہ مرنے لگے نزع کی حالت ہوئی تو لوگ ان کو کلمہ تلقین کرتے تھے اور وہ اس سے اعراض کرتے اور منہ پھیر پھیر لیتے تھے لوگوں نے ان کے پیر بھائی کو جو بجائے شیخ کے تھے اس حال سے اطلاع کی کیونکہ اس اعراض سے سب پریشان ہو گئے تھے عوام کے نزدیک تو بس وہ نعوذ باللہ کافر ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور ان کو آواز دی تو فوراً آنکھیں کھولدیں اور تبسم فرمایا اس سے پہلے وہ کسی سے بات بھی نکرتے تھے کیوں؟ اسلئے کہ ؎

ہر کہ او از ہمزبانے شد جدا　　　　بینوا شد گرچہ دارد صد نوا

وہ ان کے ہم زباں نتھے اب ہم زبان آگئے تو آنکھیں کھول دی اور باتیں کرنے لگے

دوسری وجہ حافظ شیرازی بیان فرماتے ہیں ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   تا بگذارد تا بمیرد در رنج خود پرستی

وہ اپنی حالت کسی اور سے اسلئے نہ کہتے تھے کہ اس کا سمجھنے والا کوئی نہ تھا اور ایسے لوگوں کے

سامنے اسرار کا بیان کرنا حرام ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشمان دوختند   از سخنہا عالمے را سوختند

یہ وہی لوگ ہیں جو نااہلوں کے سامنے اسرار کو بیان کرتے ہیں ان بزرگ نے اسی سلئے

نااہلوں کے سامنے اپنی حالت بیان نہیں کی جب اہل آ گیا تب کھلے اور کہا کہ حضرت

ان لوگوں کو منع کر دیجئے کہ مجھے تنگ نہ کریں فرمایا یہ تو کلمہ کی تلقین کرتے ہیں کہا یہ مجکو

مسمی سے اسم کی طرف لاتے ہیں خود محبوب کے سامنے ہوتے ہوئے نام کی کیا ضرورت ہے۔

۳۵۹ ظاہر ہے کہ جب میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں تو اب میرا نام لینے کی آپ کو کیا ضرورت

ہے مگر یہ ایک حال ہے اور صاحب مقام اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے کیونکہ ؟ اس طرح کہ وہ مشاہدہ

مسمی کے ساتھ اسم کو بھی جمع کرتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ محبوب کو یہی پسند ہے کہ دیکھتے بھی جاؤ

اور ہمارا نام بھی لیتے رہو اسلئے وہ دونوں کو جمع کرتا ہے دوسرا راز اتفاقاً ابو نواس شاعر کے

موہنہ سے نکل گیا کہتا ہے ؎

اَلَا فَاسْقِنِیْ خَمْرًا وَقُلْ لِیْ هِیَ الْخَمْرُ   وَلَا تَسْقِنِیْ سِرًّا اِذَا اَمْکَنَ الْجَهْرُ

یعنی مجکو شراب پلاتا جا اور یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے یہ شراب ہے آخر پیتے ہوئے اس کہنے کی

کیا ضرورت تھی اس کو عاشق ہی سمجھ سکتا ہے اس کہنے کی یہ ضرورت تھی تاکہ نام سنکر کانوں

کے ذریعہ سے لذت حاصل ہو اور دیکھکر آنکھ کے ذریعہ سے لذت حاصل ہو اور پیکر زبان کے

واسطے سے لذت حاصل ہو الغرض تمام جسم اس کی لذت سے بھرا ہوا ہو یہی غرض صاحب

مقام کی ہوتی ہے مسمی کے ساتھ اسم کو جمع کرتے ہیں تاکہ قلب کیساتھ زبان اور کان بھی لذت

ذکر میں سرشار رہیں ہر بن مو سے اس کی یاد ہو مگر صاحب حال مشاہدہ کیوقت اسم کو جمع نہیں

کر سکتا اس کی زبان ہی اسوقت نہیں اٹھتی تو وہ بزرگ اس حال میں تھے جو شیخ کو معلوم ہوا اچھا

عوام کیا سمجھتے اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ صاحب مقام نہ تھے ممکن ہے وہ صاحب مقام

بھی ہوں لیکن اہل مقام پر بھی حال کا غلبہ ہو سکتا ہے گو کم ہوتا ہے لیکن اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ممکن ہے ان بزرگ پر وقت موت ہی کے غلبہ ہوا ہو بہر حال اگر شیخ نہ آتے تو لوگ یوں کہتے کہ فلاں کافر بے ایمان ہو کر مرا مگر شیخ نے حقیقت حال معلوم کر کے سب کو فرمایا کہ یہ تو اسوقت بڑے درجہ پر ہیں مشاہدہ ذات میں مشغول ہیں ان کو مت چھیڑو اب لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

غرض اسوقت تو کسی کے کفر پر یقین نہیں ہو سکتا مگر جس زمانہ میں اَلَّذِیْنَ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کا مشاہدہ ہو سکتا تھا اس وقت بھی یہ لوگ مایوس العلاج اور ان کا کفر لا علاج نہ تھا بلکہ ان لوگوں کے اختیار میں تھا اس طرح سے کہ ایمان لے آتے گو اس کا عدم وقوع حق تعالٰے کو معلوم تھا مگر عدم وقوع کے یقینی ہونے سے اس کا اختیاری ہونا منفی نہیں ہوا اور میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ حق تعالٰی شانہ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ عقل طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا بھی ہے تو مریض کو مجبور نہیں کرتا بلکہ بعض تو صاف کہدیتے ہیں کہ یہ مریض بچے گا نہیں اس کو جو امت ذو۔ اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبراً دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں وہ اپنے قواعد طبیہ سے اس مرض کو لا علاج سمجھتا ہے مگر یہ سمجھنا ظنی ہے قطعی نہیں وہ قدرت خداوندی پر نظر کر کے امید وار ہے ؎

عقل در اسباب می دارد نظر
عشق میگوید مسبب را نگر

مگر حق تعالٰی کو تو علم غیب ہے اگر خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ سے ان لوگوں کے لاعلاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی تو یہ دلالت قطعی ہوتی کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے متعلق علم ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کے خلاف تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالٰی نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے کیونکہ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ میں خطاب عام ہے اور یہ آیت مکی ہے پھر لفظ یٰاَیُّھَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو توحید و ایمان

ع مہر کر دی اللہ نے ان کے دلوں پر
ف بہ تغییر مضمون ۱۲ منہ
ع اللہ تعالٰی کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق
ع اے لوگو اپنے پروردگار کی عبادت کرو

اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ
فرمایا گیا ہے۔ پھر اسپر اجماع بھی ہے کہ ابوجہل وابولہب وغیرہ ایمان کے مکلف تھے اگر وہ
ایمان کے مکلف نہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا کیونکہ
وہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے تو آخر
زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہوگئے تھے آپ نے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ
نازل فرما دیا تھا حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ
کے ساتھ ہی وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں
خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلف وہ بھی تھے اس سے مستثنیٰ نہ تھے
اب میرا دعویٰ ثابت ہوگیا کہ جن لوگوں کے متعلق خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ نازل ہوا ہے
ان کا مرض روحانی لاعلاج نہ تھا اگر روحانی مطب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ
ہوتے مگر وہ مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہوگیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لاعلاج نہیں
رہا یہ سوال کہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی جواب یہ ہے کہ یہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ
نے حضور کو بتلا دیا مگر اس کا بھی مطلب یہ ہے لَا یُؤْمِنُ اَبُوْجَھْلٍ وَنَحْوُہٗ مَعَ بَقَاءِ اِخْتِیَارِہٖ
کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا ان کے اختیار سے ہوگا یہ مطلب نہیں کہ
ان کو ایمان پر قدرت و اختیار ہی باقی نہیں رہا خوب سمجھ لو۔ اس سے زیادہ کلام کرنا
خوض فی القدر ہے جس کی اجازت نہیں غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصوص میں کسی امر کی
پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا اور جب وہ اختیار
سے خارج نہیں تو اس کی تدابیر کرنا فضول نہیں ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو تو چاہیے
کہ آج سے حفظ قرآن کو ترک کر دیا جائے کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا
الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ جس میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے تو پھر نعوذ باللہ قرآن
کا پڑھنا بھی چھوڑ دو لکھنا بھی چھوڑ دو چھاپنا بھی چھوڑ دو اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں انکو
دفن کر دو اور کہہ دو کہ بس قرآن کا حافظ اللہ ہی کافی ہے ایک ہی حافظ بہت ہے
اور وہ حافظ بھی کیسا جو محافظ بھی ہے جتنے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی

کرلیں گے کیونکہ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ میں سب طریقے آگئے مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہو چکی ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ یہاں تو آپنے یہ تجویز کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر فرض بھی سمجھا اور نا اتفاقی کے متعلق پیشین گوئی وارد ہونے سے آپنے یہ تجویز کرلیا کہ جب پیشین گوئی ہو چکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے میں کہتا ہوں کہ جب حفاظت قرآن کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے آپ پر بھی وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں اس کا جواب دیجئے آخر دونوں میں ما بہ الفرق کیا ہے فرق کا بتلا دیجئے۔ اگر آپ نہیں بتلاتے تو لیجئے میں بتلاتا ہوں آپ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانہ میں ۳۶۲
ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سعی کریں گے اور ہم حفاظت کے طریقے انکے قلوب میں ڈالدیں گے کہ وہ اسکو یاد بھی کریں گے لکھیں گے بھی پڑھیں پڑھائینگے بھی گویا اس طرح ہم ہی قرآن کے محافظ ہیں تو میں کہتا ہوں کہ یہ معنی دونوں جگہ مشترک ہے یعنی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد آپ کی حفاظت کو بھی اسمیں دخل ہے اسی طرح نا اتفاقی کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی بد پرہیزی کو اس میں دخل ہے اور اس پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چونکہ یہ لوگ باختیار خود بد پرہیزی کرینگے اسلئے نا اتفاقی رہے گی۔ پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ خدا اور رسول کا کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کرنا اسکو مستلزم نہیں کہ وہ دائرہ تکلیف سے باہر ہو جاوے اور اس کی تدبیر نہ کی جاوے اور اسکا راز وہی ہے جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ پیشین گوئی کبھی مرض کے لاعلاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مریض کے بد پرہیز ہونیکی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لاعلاج کوئی مرض نہیں یہاں جو پیشین گوئی بھی ہوتی ہے مریض کے بد پرہیز ہونیکی وجہ سے ہوتی ہے پس اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ نا اتفاقی کا دور کرنا آپ کی قدرت سے باہر ہے تو اسلئے اس کی تدبیر ہی نکرنا چاہئیے بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگ اس سے باختیار خود پرہیز نہ کریں گے اسلئے یہ مرض باقی رہے گا لیکن اگر علاج کریں تو علاج کے مفید ہونیکی یہاں نفی

نہیں شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ اگر سب نے اس مرض کا علاج کرکے اتفاق کرلیا تو حدیث کی پیشین گوئی غلط ہو جاتی ہے جواب یہ ہے کہ مگر واقع میں سب ایسا کریں گے نہیں بلکہ تھوڑے بہت ضرور ایسے رہیں گے جو نا اتفاقی کرتے رہیں گے مگر ان میں تم ہی کو داخل ہونے کی کیا ضرورت ہے اور اس کی کیا دلیل ہے کہ تم ہی اس کے مصداق ہو۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ میں اس پیشین گوئی کے سچا کرنے کے لئے نا اتفاقی کرتا ہوں تاکہ اس کا مصداق موجود رہے یہ غلط نہ ہو جائے تو اس سے کہا جائے گا کہ آپ کو اسکے سچا کرنیکی ضرورت نہیں تم کو اس کا مکلف نہیں کیا گیا قیامت میں آپ سے یہ سوال ہرگز نہ ہوگا کہ تم نے ہماری پیشین گوئی کے سچا کرنے کا اہتمام کیا تھا یا نہیں بلکہ وہاں تو آپ سے ان امور کا سوال ہوگا جن کا امر کیا گیا ہے اور پیشین گوئی کے سچا کرنے کا آپ کو امر نہیں ہوا لہذا یہ جواب مسموع نہ ہوگا میں اس کی نظیر دنیا میں آپ کو دکھلاتا ہوں وہ یہ کہ پولیس میں مردم شماری کا تجربہ سے اوسط مقرر ہوتا ہے کہ اتنے آدمیوں میں اتنے بدمعاش اور جرائم پیشہ ضرور ہوتے ہیں تو کیا کوئی مجرم مجسٹریٹ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو جرم اسلئے کیا ہے کہ پولیس کا قاعدہ میں نے دیکھا تھا کہ بدمعاشوں کا اوسط اتنا ہے تو میں نے اس اوسط کو پورا کرنا چاہا تاکہ یہ قاعدہ غلط نہ ہو جائے اس لئے میں مجرم نہیں ہوں بلکہ حقیقت میں خیر خواہ سرکار ہوں تو کیا مجسٹریٹ اس کا یہ عذر سن لیگا ہرگز نہیں بلکہ وکیل سرکار فوراً کہیگا کہ نالائق کیا تیرا نام بھی اوسط میں لکھا ہوا تھا پھر تو اس میں کیوں داخل ہوا۔ جی یہ اوسط تو واقعہ ہے قانون تو نہیں ہے یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اوسط کو دیکھکر خواہ مخواہ اس کے پورا کرنیکے کے لئے جرم کیا جاوے اسی طرح یہ پیشین گوئی حکم تکوینی ہے حکم تشریعی نہیں۔ اب میں اس سے زیادہ اس مسئلہ کی توضیح نہیں کر سکتا کہ سر قدر میں خوض ہو جائے گا۔ میں تو اس حدیث کو پڑھکر ہی پچھتایا کیونکہ اس کو پڑھکر اتنا بڑا کام میرے سر پڑ گیا کہ دقیق اشکالات کو حل کرنا پڑا مگر پچھتانے کی بھی کیا ضرورت ہے اگر میں اس حدیث کو پڑھکر اشکالات رفع نہ کرتا تو خدا سلامت رکھے اردو رسالوں کو کبھی نہ کبھی اس کی بدولت یہ حدیث آپ کی نظر سے گذر جاتی کیونکہ آجکل اردو میں حدیث وفقہ کی بہت کتابیں ترجمہ ہو گئی ہیں تو کسی اور جگہ دیکھکر آپ کو یہ شبہات واقع ہوتے اسلئے اچھا ہوا کہ میں نے

سب کا جواب دیدیا۔ اور اس تقریر سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ قرآن و حدیث کا ترجمہ دیکھ
لینا علماء سے مستغنی نہیں کر سکتا تبلایئے اگر آپ اس حدیث کا ترجمہ دیکھ لیتے تو کیا اس سے
یہ حقیقت آپ کی سمجھ میں آسکتی تھی جواب سمجھ میں آئی اور محض ترجمہ سے یہ اشکالات حل
ہوسکتے تھے جواس وقت حل ہوئے کبھی نہیں مگر حیرت ہے کہ آجکل اردو تراجم نے لوگوں کو
علماء سے مستغنی کر دیا ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ اردو میں طب کی کتابوں کا بھی ترجمہ
ہوگیا ہے مگر بایں ہمہ اطباء سے استغناء نہیں ہوا اور جو لوگ اردو رسائل طبیہ دیکھ کر
اطباء سے مستغنی ہوئے بھی ہیں ان کو سب لوگ احمق سمجھتے ہیں مگر یہاں اس حماقت میں
سب مبتلا ہیں جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ آجکل بعض لوگ جو بندہ اغراض ہیں اس کی
کوشش کرتے ہیں لوگوں کو اطباء حقیقی و علماء حقیقی سے پھیر کر اپنی کتابوں کی طرف یا اپنی
طرف مائل کریں شاید یہاں کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ جب اردو ترجمہ کے بعد ۳۶۲
بھی علماء سے استغناء نہیں پھر ترجمہ ہی کیوں کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ مسائل شرعیہ میں
دو دقتیں تھیں ایک زبان کی ایک مضمون کی ترجمہ سے زبان کی دقت رفع ہوگئی اور یہ
بھی بہت بڑا نفع ہے کہ آدھی محنت کم ہوگئی لیکن زبان اردو ہو جانے سے مضامین کی
دقت رفع نہیں ہوئی دیکھئے آجکل قانون سرکاری کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے جس سے
زبان انگریزی کے سیکھنے کی دقت تو کم ہوگئی ہر اردو خوان اسکو بے تکلف پڑھ سکتا ہے
مگر کیا زبان اردو ہونے سے مضامین کی دقت بھی رفع ہوگئی کہ ہر شخص اس کے ہر مقام کو خود ہی
سمجھ لیا کرے ہرگز نہیں میں نے خود ایک بار قانون کی اردو کتاب دیکھی تھی مگر ایک مقام کا
مطلب نہ سمجھ سکا کچھ کا کچھ سمجھ گیا پھر ایک وکیل نے اس کا مطلب صحیح بیان کیا تب مجھے اپنی
غلطی پر تنبہ ہوا پھر قانون شرعی کے اردو میں ہو جانے سے آپ نہ کلام شرع سے کیوں کر
مستغنی ہوسکتے ہیں غرض چونکہ آجکل اردو میں رسائل دینیہ کی کثرت ہوگئی ہے اسلئے اندیشہ
تھا کہ کسی کتاب میں یہ حدیث آپ دیکھ لیتے اور اشکالات پڑتے اس لئے میں نے اسوقت
شبہات حل کر دیئے اب مطلع بے غبار ہوگیا اب میں اپنی اصلی غرض کی طرف عود کرتا ہوں
کہ نا اتفاقی بہت سخت مرض ہے اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دن بدن ترقی

بذیر ہے ہمیں دوسری قوموں سے تو کچھ غرض نہیں اور سچ یہ ہے کہ ہم ان کی حالت کو جانتے بھی نہیں اور جان بھی لیں تو کیا کریں گھر سے فرصت ہو تو کسی کی خبر لی جائے یہاں ہم کو اپنے ہی گھر سے فرصت نہیں اگر آپ کا ایک بھائی بیمار ہو اور ایک پڑوسی اور پڑوسی بھی بدخواہ تو بھائی کو چھوڑ کر پڑوسی کے علاج کو آپ کبھی نہ دوڑیں گے ہاں بھائی سے فراغت ہو جائے تو پھر یہ ہمت کی بات ہے کہ پڑوسی کا معالجہ بھی کر دیا جائے مگر یہاں تو اپنے ہی گھر میں اپنے بھائی بیمار پڑے ہیں ہم کو انہی کے علاج سے فرصت نہیں ہمارا گھر اسلام ہے اور گھر والے اہل اسلام ہیں سو خود مسلمانوں ہی میں نااتفاقی کا مرض دن بدن ترقی پر ہے جس کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کو نااتفاقی کا مذموم و مضر ہونا تو مسلم ہے مگر اس کا درجہ معلوم نہیں کہ اس کا ضرر کس درجہ کا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ اب تک اس مرض میں کمی نہیں ہوئی حالانکہ رات دن سب کی زبان پر یہ بات آتی ہے کہ آجکل مسلمانوں کو تنزل ہے اور اسکی وجہ سب یہ بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں میں اتفاق نہیں اور اتفاق کی ضرورت پر ہمیشہ تقریریں ہوتی ہیں مگر پھر بھی نااتفاقی دور نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ضرر کا درجہ معلوم نہیں اسی سے اس سے اجتناب کا اہتمام نہیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ اجتناب کا اہتمام اسی چیز سے کیا جاتا ہے جس کے ضرر کا درجہ معلوم ہو جائے چنانچہ اگر کسی کو سنکھیا کا مضر ہونا تو معلوم ہو مگر درجہ معلوم نہ ہو تو اسکو اس سے اجتناب کرنے کا زیادہ اہتمام نہ ہوگا اور جس کو درجہ معلوم ہو کہ سم قاتل ہے وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا اس لئے ضرورت ہے کہ نااتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم کیا جاوے کیونکہ درجہ معلوم نہ ہونے ہی سے اس سے اجتناب کم ہو رہا ہے اور اجتناب کم ہونے کے بعد ارتکاب ہونے لگا اور ارتکاب کے بعد اب یہ حالت ہو گئی کہ بعض لوگوں کو نااتفاقی کی مذمت سے بھی کبیدگی ہوتی ہے کیونکہ اس کو نااتفاقی کا مزا پڑ گیا ہے جو اب صفت لازمہ ہو گئی اور ایسی صفات کو ذات سے لا عین و لا غیر کا تعلق ہے تو صفت بمنزلہ ذات کے ہو گئی اور اپنی ذات ہر ایک کو محبوب ہے اسلئے اسکی صفات بھی محبوب ہیں اور محبوب کی مذمت کسی کو گوارا نہیں ہوتی تو اب وہ نااتفاقی کی مدح کرنا چاہتا ہے مگر اس کی مدح کیونکر کرے کیونکہ نااتفاقی کا مذموم ہونا سب کو مسلم ہے اس کی مذمت کا انکار تو بہ

کر ہی نہیں سکتا تو اب اس کی کوشش کرتا ہے کہ یہ ثابت کرے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ نا اتفاقی اور فساد ہی نہیں بلکہ اصلاح ہے اب وہ حال ہو جاتا ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ط جو کہ منافقین کی حالت میں وارد ہوا ہے اب انکو مالیخولیا ہو جاتا ہے اور مالیخولیا کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا مریض اپنے کو مجنوں نہیں سمجھا کرتا پھر اس کو دوا کیوں کر پلائی جائے اور اسے کیونکر یقین دلایا جائے کہ تو مجنوں ہے اور یہ سارا فساد اس کا ہوا کہ اس شخص کو شروع ہی میں نا اتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم نہ ہوا اگر درجہ معلوم ہوتا تو قلت اہتمام اور عدم مبالات اور ارتکاب فساد کی نوبت ہی نہ آتی اسلئے میں نے اسوقت یہ حدیث اختیار کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نا اتفاقی کے ضرر کا درجہ بتلایا ہے فرماتے ہیں اِيَّاكُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَاِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ یعنی اپنے کو باہمی فساد سے بچاؤ کیونکہ باہمی فساد مونڈنیوالی چیز ہے اسمیں ابہام و تفسیر کی بلاغت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول تو حالقہ فرمایا جس کا ۳۶۹
تبادر یہ ہوتا ہے کہ فساد کی وجہ سے سر کے بال منڈ جائیں گے پھر سامع کو اس کے مطلب کا انتظار ہوا کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ ہم نے بارہا نا اتفاقی کی ہے مگر سر کے بال کبھی نہیں گرے تو ابہام سے سامع کو تفسیر کا مشتاق بنا کر آگے فرماتے ہیں لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے سر کے بال منڈ جاتے ہیں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اس سے دین منڈ جاتا ہے اور مونڈنا کسے کہتے ہیں مونڈنا یہ ہے کہ خربوزہ سا سر نکل آئے بال کا نشان تک نہ رہے تو حاصل یہ ہوا کہ فساد باہمی سے دین کا بالکل صفایا ہو جاتا ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نا اتفاقی اور فساد باہمی کے ضرر کا درجہ بتا دیا ہے اور واقعی اس سے زیادہ کیا ضرر ہوگا کہ اس سے دین کا صفایا ہی ہو جاتا ہے مگر قربان جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کے عتاب میں بھی رحمت ہے ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ✽ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

گو اس مقام پر حضورؐ نے فساد باہمی پر بہت بڑی وعید فرمائی ہے مگر ساتھ ساتھ اس میں امید

کی بھی جھلک ہے بالکل ہی نا امید نہیں کیا کیونکہ آپ نے فساد کو حالقہ فرمایا ہے کہ یہ دین کو مونڈھ دیتا ہے اور مونڈنے سے اسوقت تو اوپر سے صفایا ہو جاتا ہے مگر اندر جڑ باقی رہ جاتی ہے کہ اگر روز استرہ نہ پھیرا جائے تو اگلے دن کھونٹی نکل آتی ہے تو اس میں اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اگر کوئی شخص روز روز مونڈانے کا شغل نہ کرے تو چند روز میں کھونٹی نکل آئیگی اس کے بعد بال اور بڑھیں گے پھر زلفیں ایسی ہونگی کہ لوگ ان میں پھنسا کرینگے اور وہ حال ہوگا سہ

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ایک زبان والے نے اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا تھا کہ ہم اور تم اور میر صاحب اس کی زلفوں میں پھنسکر سب جیل خانہ چلا گیا یہ تو ایک لطیفہ تھا غرض کیا رحمت ہے کہ ایک ہی لفظ میں غضب بھی ہے اور رحمت بھی ہے آپ نے تَحْلِقُ الدِّيْنَ فرماکر ڈرایا دھمکایا بھی ہے اور یہ بھی بتلا دیا کہ نا امید ہونا فساد سے دین کی جڑ نہیں جاتی اگر کوشش کروگے تو جڑ سے شاخ اور شاخ سے پھل بھی نکل آدیں گے۔ اے صاحبو! غضب کی حالت میں جس ذات کی یہ رحمت ہے ان کی رحمت تو کیا کچھ ہوگی اسی کو سعدی فرماتے ہیں سہ

نماند بعصیاں کسے در گرو کہ دارد چنیں سید پیشرو

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح دعا فرمایا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُوْنَ فَاَيُّمَا رَجُلٍ اٰذَيْتُهٗ اَوْ شَتَمْتُهٗ اَوْ لَعَنْتُهٗ فَاجْعَلْهَا لَهٗ صَلٰوةً وَّزَكٰوةً وَّقُرْبَةً تُقَرِّبُهٗ بِهَا اِلَيْكَ (اے اللہ میں بشر ہوں مجھے بھی غصہ آجاتا ہے جیسا اوروں کو غصہ آتا ہے تو جس شخص کو (جوش غضب میں) میں کچھ ایذا دوں یا برا بھلا کہوں یا بددعا کروں تو ان سب کو اس کے حق میں رحمت خاص اور سبب تزکیہ اور موجب قربت بنا دیجئے جس سے آپ اسکو اپنا مقرب بنا لیں) سبحان اللہ کیا رحمت ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ میری بددعا بھی دعا ہی ہو کر لگے تو آپکی عجیب شان ہے کہ غضب میں بھی آپ رحمت ہی فرماتے ہیں اسپر شاید کوئی خوش ہو

۳۶۴

کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا بھی دعا ہی ہو کر لگتی ہے تو اب جتنی وعیدیں حضور نے
بیان فرمائی ہیں سب سے بےفکری ہے کیونکہ آپ کی وعیدیں بھی عید ہوتی ہے ذرا کوئی اردو
خوان جو قرآن و حدیث و مسائل فقہ کا ترجمہ دیکھکر علماء سے اپنے کو مستغنی سمجھتے ہیں اس اشکال
کا جواب تو دیدیں انشاء اللہ منہ ہی تکتے رہیں گے اور کچھ جواب نہ آئے گا بات یہ ہے کہ محض
ترجمہ دیکھنے سے مضمون کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی اور جب تک حقیقت منکشف نہو
اس وقت تک اشکالات کا جواب بھی سمجھ میں نہیں آتا چنانچہ آپ نے اردو کتابیں تو
دینیات کی بہت پڑھی ہونگی مگر ذرا اس کا جواب دیجیئے۔ صاحبو حقیقت کا انکشاف محققین
کے پاس رہ کر ہوتا ہے لیجیئے میں اس شبہ کا جواب دیتا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ یہ حدیث
انہی بددعاؤں کے متعلق ہے جو غلبۂ بشریت سے بحالت غضب نکل جائیں چنانچہ خود شروع
میں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ کا لفظ خود اس پر دال ہے کہ یہ ان بددعاؤں کے متعلق ہے جن کا منشا ۳۴۸
بشریت ہے اور بددعا بغلبۂ عشق تبلیغ کی حالت میں صادر ہو ان کے بارے میں تو
ایک حدیث میں یہ وارد ہے سِتَّۃٌ لَعَنْتُھُمْ وَلَعَنَھُمُ اللّٰہُ وَکُلُّ نَبِیٍّ یُجَابُ الْحَدِیْث
رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِی الْمَدْخَلِ وَرَزِیْنٌ فِیْ کِتَابِہٖ مشکوۃ باب الایمان بالقدر ۱۲
کہ چھ شخصوں پر میں نے لعنت کی ہے اور خدا تعالیٰ بھی لعنت کرتا ہے اور ہر نبی کی درخواست
قبول ہوتی ہے الی آخرہ اس میں تصریح ہے کہ میری بددعائے لعنت قبول ہو گی اور ان پر خدا
تعالیٰ کی بھی لعنت ہو گی غرض مخالفت احکام کے سبب سے جو بددعا ہو گی اس کی یہ شان ہو گی ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود | گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اور یہ شان ہو گی ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند | آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

اور جب آپ کی بددعا حق تعالیٰ کی بددعا ہے تو گویا یہ دعا خود حق تعالیٰ ہی فرما رہے ہیں
اور اس کی یہ شان ہو گی ؎

چوں خدا از خود سوال و کد کند | پس دعائے خویشتن چوں رد کند

اور مولانا پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ حضور کی بددعا کو حق تعالیٰ کی بددعا اور از خود سوال کد کردن

کہتے ہیں یا قرآن میں اس کی نظیر موجود ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ جس کی تفسیر میں
مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں اِذَا قَرَأَہٗ رَسُوْلُنَا جِبْرَئِیْلُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ
یہاں حق تعالیٰ جبریلؑ کی قرأت کو اپنی قرأت فرما رہے ہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا جبرئیل
علیہ السلام سے کچھ کم ہیں اگر آپ کے فعل دعا کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جاوے تو بُعد ہی
کیا ہے۔ لوگ صوفیوں پر مسئلہ وحدۃ الوجود میں اعتراض کرتے ہیں وہ ذرا بتلائیں کہ صوفیہ
نے کیا جھوٹ ملا دیا ہے وہ بھی وہی کہتے ہیں جو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ
مگر صوفی بیچارے ہر زمانہ میں بدنام رہے ہیں کیونکہ وہ خاموش اور صابر ہوتے
ہیں اور زمانہ کا قاعدہ ہے کہ لوگ صبر کرنے والوں کو زیادہ دباتے ہیں اور جو سامنے تن کر
کھڑا ہو جاوے اس سے بھاگتے ہیں مگر معلوم بھی ہے وہ صبر کیوں کرتے ہیں وہ صبر کر کے
حق تعالیٰ کو اپنے ساتھ کرتے ہیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنا انتقام خود لے لیتا ہے
تو حق تعالیٰ معاملہ کو اسی کے سپرد کر دیتے ہیں اور جو صبر کرتا ہے اس کی طرف سے حق تعالیٰ
خود انتقام لیتے ہیں پھر وہ انتقام کیسا ہوگا اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے
مقبول بندوں کے لئے ایسے غضبناک ہوتے ہیں جیسے شیر اپنے بچوں کے لئے غضبناک ہوا کرتا
ہے پھر کبھی تو دنیا میں ہی مزا چکھا دیتے ہیں اور کبھی آخرت پر پوری سزا کو ملتوی رکھتے ہیں
اور دنیا میں کبھی تو ایسی سزا دیتے ہیں جسکو یہ شخص بھی سزا سمجھتا ہے اور کبھی اس طرح میٹھی مار
مارتے ہیں کہ یہ اسکو انعام سمجھتا ہے چنانچہ ایک مجذوب کے کسی سپاہی نے ایک ہنٹر مار
دیا مجذوب نے بددعا دی کہ اے اللہ اس کو تھانہ دار کر دے وہ چند ہی روز میں تھانہ دار
ہو گیا اب تو بڑا خوش ہوا کہ مجذوب کی دعا قبول ہو گئی چل کر اس سے اپنی خطا معاف کرانا چاہیئے
اور کچھ ہدیہ پیش کرنا چاہیئے چنانچہ مٹھائی لیکر گیا غنیمت ہے کہ اس نے دوسرا ہنٹر نہ مارا ورنہ
آجکل کے عقلاء تو شاید ایسا ہی کہتے کہ جب اس کے ایک ہنٹر مارنے سے یہ عہدہ ملا تو شاید اور
مارنے سے کوئی دوسرا بڑا عہدہ مل جائے گا غرض جب وہ مٹھائی لیکر گیا اور کہا جی آپ کی
دعا سے مجھے وہی عہدہ مل گیا جو آپ نے فرمایا تھا اس کی خوشی میں یہ ہدیہ لایا ہوں اور اپنی
گستاخی سے شرمندہ ہوں کہ میں نے برائی کی اور آپ نے بھلائی کی دعا کی اب میں چاہتا ہوں کہ مجھے

کچھ خدمت لیجئے مجذوب نے کہا ہم کو ایسے بچھو لا دو جو کالے ہوں اور ایک ایک بالشت لانبے ہوں اس نے کئی روز بعد آکر کہا حضور ایسے بچھو تو ملتے نہیں مجذوب نے کہا چل میں بتلاؤں ایک قبر پر لے گیا اور اس کو کھدوایا تو ایسے ایسے سیکڑوں بچھو اسی لاش کو لپٹے ہوئے دیکھے دیکھکر ڈر گیا اور معلوم ہوا کہ یہ ایک ظالم تھانہ دار کی قبر ہے اس وقت مجذوب نے کہا بچہ میں نے دعا نہیں دی تھی یہ بد دعا دی تھی کہ تجھکو بھی ایسی ہی سزا ملے۔ کیونکہ اب تو حکومت کر کے مخلوق پر ظلم کرے گا تو قبر میں بالشت بھر لمبے بچھو تجھے لپٹیں گے تو یہ سمجھا کہ میں نے تیرے واسطے بھلائی کی دعا کی تھی۔ تو سمجھو کبھی اہل اللہ کی ایذا رسانی سے حق تعالیٰ ایسی میٹھی سزا بھی دیا کرتے ہیں جسکو آپ نعمت سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ وبال جان ہے پس اہل اللہ کو تکلیف پہونچا کر مطمئن نہ رہنا چاہئے الغرض صوفیہ چونکہ صابر ہوتے ہیں اس لئے ان پر سب اعتراض کرتے ہیں ورنہ ان کا یہ قول (یعنی وحدۃ الوجود کا مسئلہ) شریعت کے خلاف نہیں اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں اس کو ذرا بسط کے ساتھ بیان کرتا مگر اس وقت ایک ہی آیت پر اکتفا کرتا ہوں بہر حال تبلیغ کے ذیل میں جو وعیدیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں وہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں لہذا ان سے بیفکر نہ ہونا چاہئے انہی وعیدوں میں سے ایک وعید یہ ہے جو حضور نے فساد ذات البین کے متعلق بیان فرمائی ہے مگر عارفین کا مسلک ہے کہ وہ وعید کا بیان کرتے ہوئے ناامید نہیں کیا کرتے کیونکہ وعید کا جو مقصود ہے یعنی آئندہ کیلئے زجر اور اصلاح وہ ناامید کرنے سے فوت ہو جاتا ہے سو ناامیدی سے اول تعطل کی نوبت آتی ہے کہ آدمی غلبہ حزن کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا پھر تعطل کے بعد گناہوں پر جرأت ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ وعید خالص کے سننے سے آدمی مر بھی جاتا ہے چنانچہ حضرت غوث اعظمؒ کا واقعہ ہے کہ آپ نے چالیس سال تک رحمت حق کا بیان فرمایا پھر خیال ہوا کہ شاید لوگوں کو اعمال سے بیفکری ہونے لگی ہوگی اسلئے اسکے بعد آپ نے ایک دن خالص ترہیب کا بیان فرمایا اس کا یہ اثر ہوا کہ مجلس وعظ میں سے کئی جنازے اٹھائے گئے وہ بیان سنکر ان کے دل پھٹ گئے الہام ہوا کہ اے عبد القادر کیا ہماری رحمت اتنی ہی تھی کہ چالیس برس میں اس کا بیان ختم ہو گیا ہمارے بندوں کو مار دیا اسی لئے

محققین غضب کے ساتھ رحمت کا بیان بھی کرتے ہیں اور وعید کے ساتھ امید کو بھی ملا دیتے ہیں تاکہ ناامیدی نہو اور نوبت ہلاک نہ پہونچے چنانچہ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فساد ذات البین پر جو وعید بیان فرمائی ہے اس میں لفظ تحلق اختیار فرمایا ہے جس میں وعید کے ساتھ امید بھی ملی ہوئی ہے کہ اس سے دین منڈنا ہی ہے جڑ سے زائل نہیں ہوتا کہ کیونکہ مونڈنے سے پھر بھی بال نکل آتے ہیں بلکہ بعض دفعہ پہلے سے بھی سخت نکلتے ہیں مگر خدا کے لئے تم اس غرض سے مونڈنے کا ارادہ نہ کیجیو کیونکہ شاید اسی دن خاتمہ ہو جائے تو منڈے کے منڈے ہی رہ جاؤ گے پس اس وعید سے ڈرنا چاہئے اور قصداً نااتفاقی پر اقدام نہ کرنا چاہئے اور اگر کبھی صادر ہو جائے تو اصلاح سے ناامید بھی نہ ہونا چاہئے۔ یہاں سے ایک مسئلہ اور مستنبط ہوا وہ یہ کہ آجکل جو عموماً اتفاق کے فضائل اور نااتفاقی کی مطلقاً مذمت بیان کی جاتی ہے اور علماء بھی عموماً اس مرض میں مبتلا ہیں یہ غلط ہے کیونکہ حدیث سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نااتفاقی اس واسطے مذموم ہے کہ یہ دین کو مضر ہے۔ اور اگر دین کو مفید ہو گو دنیا کو مضر ہو تو وہ مذموم نہیں چنانچہ ایک نااتفاقی وہ بھی ہے جسکو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا تھا حق تعالیٰ فرماتے ہیں قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ الآية ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے اپنی قوم سے صاف کہدیا کہ ہم میں اور تم میں عداوت و بغض ہمیشہ کے لئے پیدا ہو چکا ہے جب تک کہ تم اللہ وحدہ پر ایمان نہ لاؤ تو کیا اس نااتفاقی کو بھی کوئی بھی مذموم کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں اسی طرح اس کے مقابلہ میں ایک اتفاق وہ تھا جسکے بارہ میں ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ الخ جس سے صاف معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں جو کفار تھے ان میں باہم اتفاق و اتحاد کامل تھا مگر کیا اس اتفاق کو کوئی محمود کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اتفاق کی بنیادیں اکھاڑ کر پھینکدی ہیں کیونکہ یہ

اتفاق فقط حق پر تھا پس خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اسی وقت مطلوب ومحمود ہے جبکہ دین کو مفید ہو اور نااتفاقی بھی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نااتفاقی دین کو مفید ہو تو اسوقت وہ نااتفاقی مطلوب ہوگی۔ اہل دنیا تک اپنے معاملات میں اسکو خوب سمجھتے ہیں چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعی علیہ عدالت سے مرافعہ کرتے ہیں تو اس وقت دونوں سے کبھی نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوے سے دستبردار ہو جاؤ کیونکہ اس دعوے سے تمہارے اندر نااتفاقی پیدا ہوگئی ہے اور نااتفاقی مذموم ہے بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص خلاف حق پر ہو اس سے کہا جاتا ہے کہ تم حق کی طرف رجوع کرو اور ناحق پر اصرار کو چھوڑ دو بلکہ بعض معاملات میں اگر کبھی صاحب حق دعوے سے دستبردار بھی ہو جائے تو گورنمنٹ مدعی ہو جاتی ہے اور وہ حق کی حمایت کرتی ہے۔ صاحبو اگر نااتفاقی مطلقاً مذموم ہے تو چاہیئے کہ جب کوئی دعویٰ عدالت میں دائر ہو تو جج مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ نااتفاقی کے مجرم دونوں ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہ عقلاء ایسی رائے دے سکتے ہیں بلکہ یہاں سب یہ کہتے ہیں ۴۷۲
کہ گو نااتفاقی دونوں طرف سے ہے مگر ایک طرف سے حمایت حق کیلئے ہے اور دوسری طرف سے حمایت باطل کیلئے پس تفتیش وتحقیق کے بعد جو شخص حق پر ہو اس کی ڈگری ہونا چاہیئے۔ اور عدالت کو اس کا ساتھ دینا چاہیئے یہاں تو سب کا اتفاق ہے کہ نااتفاقی مطلقاً مذموم نہیں مگر افسوس دین کے معاملہ میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ یہاں دونوں سے کہتے ہیں کہ نااتفاقی چھوڑ دو اور اتفاق پیدا کرو۔ صاحبو آخر یہاں یہ کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ ان دونوں میں سے کس کی نااتفاقی حمایت حق کے لئے ہے اور کس کی حمایت باطل کیلئے پھر جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جائے اور جو باطل پر ہو صرف اسی کو دبایا جائے اور آپ جو دونوں کو اتفاق کا امر کرنے میں تو بتلائے وہ صاحب حق صاحب باطل کے ساتھ کیوں کر اتفاق کرے۔ دونوں طرف سے اگر اتفاق ہو سکتا تو عقلاً اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ صاحب حق حق کو چھوڑ دے اور دونوں باطل پر ہو جائیں یعنی دیندار دین کو چھوڑ کر بددین ہو جائے ایک یہ کہ بددین دیندار ہو جائے

پر قائم رہے اور بد دین بد دینی چھوڑ دے تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ تو دیندار دین کو چھوڑے اور کچھ بد دین بد دینی کو چھوڑے اس طرح دونوں طرف سے اتفاق ہو سکتا ہے اب عقلاء خود فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کونسی صورت عقل کے مطابق ہے یقیناً صرف دوسری ہی صورت کو عقل کے مطابق کہا جاوے گا کہ دیندار تو دین پر قائم رہے اور بد دین بد دینی کو چھوڑ دے اور اس کا حاصل یہی ہے کہ دیندار کو تو بد دینی سے نااتفاقی کا حق ہے مگر بد دین کو دیندار سے نااتفاقی کا حق نہیں بلکہ اس کو دیندار کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیئے۔

صاحبو! یہ وہ افتراق ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیدا کیا ہے کیونکہ آپ کی نبوت سے پہلے سب لوگ کفر پر متفق تھے آپ نے آکر اس اتفاق کو توڑ دیا اور باپ بیٹوں کو باہم جدا جدا کر دیا اور یہ وہ افتراق ہے جس کو حق تعالیٰ بشارت کے طور پر بیان فرماتے ہیں یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ یَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَیُكَفِّرْ عَنكُمْ سَیِّئَاتِكُمْ اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایۂ بشارت بتلایا ہے جس کو تقویٰ پر مرتب فرمایا ہے اور اسی لئے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے جو لوگ حق پر ہوں ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے اور جو باطل پر ہوں ان کی ساتھ فصل کا حکم ہے پس یہ سخت غلطی ہے جس میں لوگ آجکل مبتلا ہیں کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں دونوں کو مورد ملامت بنانے لگتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ آپس میں اختلاف کرتے ہو اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہیں جس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بد دین ہو جانا چاہئے اور صاحب حق حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کرے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے بلکہ مقتضائے عقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو تو اول یہ معلوم کیا جائے کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون۔ جب حق متعین ہو جائے تو صاحب حق سے کچھ نہ کہا جائے بلکہ اس کا ساتھ دیا جائے اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جائے۔ قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ اور اگر آپ کو تحقیق حق کی

فرصت یا لیاقت نہیں تو آپ سے دخل در معقول دینے کو کس نے کہا ہے اپنے گھر بیٹھئے اور تحقیق سے پہلے کسی کو برا نہ کہئے جب یہ معلوم ہو گیا کہ نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے اور نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے تو اب اس حدیث پر یہ سوال وارد ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِيَّاكُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَيْنِ ہی کیوں فرمایا کسی جگہ اِيَّاكُمْ وَصَلَاحَ ذَاتِ الْبَيْنِ بھی فرمانا چاہئے تھا اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ تر فساد عـــه نا اتفاقی سے ہوتا ہے اتفاق سے فساد کم ہوتا ہے کیونکہ اتفاق کی حالت میں قوائے سبعیہ بہیمیہ کو سکون ہوتا ہے ہیجان نہیں ہوتا اور معاصی زیادہ تر قوی بہیمیہ کے ہیجان ہی سے ہوتے ہیں تو جب ان کو سکون ہو گا اس وقت معاصی کا صدور کم ہو گا اور نا اتفاقی میں ان قوی کے اندر استعمال و ہیجان ہوتا ہے اس وقت زیادہ گڑبڑ ہوتی ہے اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے أَدْهٰى وَأَدْهَمْ کے لحاظ سے فساد ذات البین کے ضرر پر خصوصیت کے ساتھ متنبہ فرمایا کیونکہ اس سے واقعی دین کا صفایا ہو جاتا ہے اور اتفاق اگر معصیت میں بھی ہو تو خاص اس کام ہی میں وہ اہل اتفاق کو ضرر پہونچا دے گا مگر اس کا ضرر دوسروں تک متعدی نہ ہو گا اور پھر وہ ضرر مقصود بھی ایک دوسرے سے ارادۃً و قصداً نہ پہونچیگا بلکہ اس دوستی کی وہ مثال ہو گی جیسے ایک شخص نے ریچھ سے دوستی کی تھی کہ تعلیم سے اس کو مہذب بنایا تھا یہاں تک کہ آقا صاحب سو جاتے تو ریچھ کھڑا ہو کر پنکھا جھلتا لوگوں نے منع کیا کہ میاں جانور جانور ہی ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں سونے کی حالت میں اس سے خدمت لینا مناسب نہیں اس نے کہا واہ میرا ریچھ تعلیم یافتہ ہے اس سے کچھ اندیشہ نہیں ریچھ

عـــه اس جواب کا حاصل منشاء اشکال کو تسلیم کر کے جواب دینا ہے منشاء اشکال یہ تھا کہ سائل نے لفظ فساد کو اختلاف اور افتراق کا ہم معنی سمجھا ہے اسلئے شبہ ہوتا ہے کہ حدیث صرف افتراق ہی سے بچنے کی تاکید کیوں ہے حضرت حکیم الامۃ نے ایک دوسرے وعظ میں اس شبہ کا جواب منشاء اشکال کو منع کر کے بھی دیا ہے کہ سائل کا فساد کو افتراق و اختلاف کا مرادف سمجھنا غلط ہے بلکہ فساد کے معنے ہیں حالت کا اعتدال شرعی سے نکل جانا اور یہ افتراق ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کبھی اتفاق سے بھی فساد ہوتا ہے اس وعظ میں خلاف ذات البین کے بجائے حدیث میں فساد ذات البین وارد ہونے سے ہی یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ اختلاف فی نفسہ مذموم نہیں بلکہ فساد مذموم ہے پس اگر کسی وقت اتفاق سے فساد ہونے لگے اسوقت وہ اتفاق بھی مذموم ہو جاسے گا فلیتنبہ ۱۲ ظ۔

۳۷۴

کے تعلیم یافتہ ہونے پر ایک اور لطیفہ یاد آیا رڑکی میں ہمارے ماموں صاحب نے بارش اور کیچڑ کے دن ایک صاحب کو دیکھا کہ پھرک پھرک تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں ماموں صاحب نے کہا صاحب ذرا سنبھل کر چلئے کیچڑ زیادہ ہے کہا میں اقلیدس کے قاعدہ سے چل رہا ہوں میں گر ہی نہیں سکتا یہ کہہ کر تھوڑی دور چلے تھے کہ دھڑام سے گرے ماموں صاحب نے فرمایا کہو صاحب اب اقلیدس کی کونسی شکل بنی بیچارے کھسیانے ہو گئے تو جیسے ریچھ تعلیم یافتہ تھا ایسے ہی ان حضرت کے پیر تعلیم یافتہ تھے پھر جس طرح ان کے پیروں نے دہوکہ دیا ایسے ہی ریچھ نے دہوکہ دیا کہ ایک دن آقا صاحب سو رہے تھے اور ریچھ پنکھا جھل رہا تھا کہ ایک مکھی ناک پر آکر بیٹھی ریچھ نے اس کو اڑا دیا وہ پھر آ بیٹھی ریچھ نے اڑا دیا بعض مکھی بڑی لیچڑ ہوتی ہے جتنا ہی اڑاؤ پھر آ بیٹھتی ہے یہاں تک ریچھ اڑاتا اڑاتا عاجز آ گیا اور غصہ میں ایک پتھر اٹھا کر لایا پھر جو مکھی آکر بیٹھی تو آپ نے تاک کر ناک پر پتھر مارا مکھی تو نہ معلوم مری یا اڑ گئی مگر آقا کے بھیجے کا بھرتا ہو گیا تو جو لوگ کسی گناہ کے کام میں اتفاق کرتے ہیں ان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے کہ وہ ضرر پہونچانے کا قصد تو نہیں کرتے جیسا ریچھ نے آقا کے مارنے کا قصد نہ کیا تھا بلکہ اس نے تو آقا کے دشمن کو مارنا چاہا تھا مگر بدون ارادہ کے ان کے ہاتھ سے ضرر پہونچ جاتا ہے اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم سے کیا ضرر پہونچا خصوصاً یہ علماء و مشائخ کے دوست تو ان کا ستیاناس کر دیتے ہیں خادم منہ پر تعریف کرتے ہیں اور بزرگ صاحب پھنگرتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکل ست اما خار جان ۔۔۔ از فریب داخلان و خارجان

اینت گوید نے منم انبار تو ۔۔۔ آنت گوید نے منم ہمراز تو

او چو بیند خلق را سرمست خویش ۔۔۔ از تکبر می رود از دست خویش

یہ تو شہرت سے دینی ضرر ہوتا ہے آگے فرماتے ہیں کہ اس سے دنیوی ضرر بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ مشہور آدمی پر مخلوق کا طعن و حسد و رشک اور غصہ اس طرح برستا ہے جیسے مشک کے دہانہ سے پانی گرتا ہے ؎

چشمہا و خشمہا و رشکہا ۔۔۔ بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

آگے گمنامی کی ترغیب دیتے ہیں کہ جہاں تک ہو شہرت سے بچو اور اس طرح رہو کہ کوئی تم کو

جانے بھی نہیں ؎

اشتہار خلق بند محکم است — بند او از بند آہن کے کم است

خویش را رنجور ساز و زار زار — تا ترا بیروں کنند از اشتہار

مگر یہ وہ شہرت ہے جو اختیار اور طلب سے حاصل ہو اور جو شہرت غیر اختیاری ہو وہ نعمت ہے بعضے اللہ کے بندے گمنام ہونا چاہتے ہیں اور اپنے کو مٹاتے رہتے ہیں مگر جتنا وہ اپنے کو مٹاتے ہیں اور زیادہ مشہور ہوجاتے ہیں ان کو شہرت سے ضرر نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں حق تعالیٰ کی مدد ان کے ساتھ ہوتی ہے بہرحال مذموم اتفاق کے یہ دوست بہت مضر ہوتے ہیں مگر باایں ہمہ دوستی کے مفاسد بہ نسبت اس دشمنی کے جو نااتفاقی میں ہوتی ہے بہت کم ہیں مثلاً دوستی میں ایک دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی اور دشمنی میں غیبت کا بازار گرم ہوتا ہے یہ تو دینی ضرر ہوا پھر بیچ کے نمام اس آتشیں حمام کو دوسرے کے پاس
لے جاتے ہیں اور ان باتوں کو مع حاشیہ کے جو بالکل غیر واقعی ہوتا ہے اس کے سامنے نقل کرتے ۹ےم
ہیں اب تو متن کیلئے حاشیہ ضروری ہی ہوگیا ہے اور ان حواشی کے غیر واقعی ہونے کا مجھ کو تو اسقدر تجربہ ہوگیا ہے کہ میں نے جب کسی واقعہ کی تحقیق کی ہے تو بات اتنی نہیں نکلی جتنی کہی گئی تھی پھر باوجودیکہ ہر تجربہ کار کا اس پر اتفاق ہے کہ نقل کرنیوالے حاشیہ چڑھا کر بات کو نقل کرتے ہیں مگر پھر بھی سنی سنائی بات پر اعتماد کرلیا جاتا ہے اور اس کی تحقیق کوئی نہیں کرتا بلکہ بعض تو تحقیق سے رکتے ہیں تاکہ یہ بات کہیں جھوٹی ثابت نہ ہوجائے پھر سارا مزہ ہی جاتا رہے گا۔ اب غیبت سے دوسرے تک بات پہونچی اور اس کے دل میں اول کبیدگی پیدا ہوئی پھر وہ بھی اس کی غیبت کرتا ہے اور وہ بھی بیچ والوں کی بدولت پہلے شخص تک پہونچ جاتی ہے اس سے عداوت میں اور ترقی ہوجاتی ہے تو غیبت عداوت کا باپ بھی ہے اور بیٹا بھی یعنی کبھی عداوت سے غیبت پیدا ہوجاتی ہے اور کبھی غیبت سے عداوت پیدا ہوجاتی ہے جس کا نسب ایسا بیہودہ ہو اسکی بیہودگی کیلئے یہی بات کافی ہے پھر جب کوئی کسی کے درپے ہوجاتا ہے تو مشاہدہ ہے کہ دین کا خیال بالکل نہیں رہتا اب نہ ایذا سے دریغ ہے نہ جھوٹ اور فریب سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دشمن کو ضرر پہونچ جائے چاہے اسکی ساتھ ہمارا بھی خاتمہ کیوں نہ ہوجائے

پھراس کے لئے ہر ممکن تدبیر سوچی جاتی ہے خواہ دین اور حیا اس کی اجازت یا نہ دے کیونکہ آجکل شرافت تو رہی نہیں ہمارے ماموں صاحب کا اس کے متعلق خوب شعر ہے ؎

ہے شرافت تو کہاں بس شرو آفت ہے ؛؛ سب ریاست سے گیا صرف ریا باقی ہے

اگرانسان میں دین بھی نہو مگر شرافت ہو تو جب بھی بہت سے بیہودہ کاموں سے بچا رہتا ہے اور جب نہ دین ہو نہ شرافت تو اب اس سے کسی کام سے رکنے کی امید نہیں آجکل شرافت نسب گو باقی ہے مگر شرافت اخلاق نہیں رہی اسی لئے دشمن میں انسان کسی قسم کی حرکتوں سے باز نہیں آتا خصوصاً عورتوں میں تو یہ مرض بہت زیادہ ہے گو ان کی دشمنی شدید تو نہیں ہوتی کیونکہ یہ دشمنی میں کسی کا خون نہیں کرتیں عدالت نہیں کرتیں مگر یہ ان کا کمال نہیں بلکہ پردہ کا کمال ہے جس کی وجہ سے ان کی چادر سے باہر نکالنے کی قوت نہیں اور اسی میں خیر ہے اگر پردہ نہو تو پھر آپ دیکھیں یہ کیا ستم ڈھاتی ہیں آجکل لوگ اس پردہ کے بہت پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کا ثبوت کہاں ہے میں اس وقت تنگی وقت کے سبب آپ کے سامنے حدیث و قرآن تو پیش نہیں کرتا مگر ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ خدا کیلئے اس پردہ کو نہ اٹھایئے ورنہ وہ مفاسد پیدا ہوں گے جن کا انسداد قبضہ سے باہر ہو جائیگا پھر آپ بجر کے بعد خود پردہ کرنا چاہیں گے مگر اس وقت ناکامی ہوگی میں آپ سے ایک موٹی بات کہتا ہوں وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے جنکو مجنون بنایا ہے ان کو آپ خود قید کر دیتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ نقص عقل موجب قید ہے جب یہ بات مسلم ہو گئی تو عورتوں کے لئے بھی اسی وجہ سے قید پردہ کی ضرورت ہے کیونکہ ان کا بھی ناقص العقل ہونا مسلم ہے ہاں یہ فرق ضرور ہونا چاہیئے کہ جیسا نقص ہو ویسی ہی قید ہو مجنون کامل کے لئے قید بھی کامل ہوتی ہے کہ ایک کوٹھری میں بند کر دیتے ہیں ہاتھ پیر باندھ دیتے ہیں اور مجنون ناقص کے لئے قید ناقص ہونا چاہیئے کہ اسکو بلا اجازت گھر سے نکلنے کا اختیار نہ دیا جائے اور جب جائے ڈولی یا گاڑی میں جائے۔ باقی تعلیم کے لئے پردہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے تعلیم پردہ میں بھی ہوسکتی ہے اگر بے پردہ ہونیکو تعلیم میں دخل ہوتا تو ساری باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہوتیں مگر تجربہ یہ ہے کہ وہ تعلیم میں کسی پردہ والی کی برابر بھی نہیں اور اگر کسی

خاص قوم میں باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہوں تو اول تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا ان کی عورتوں پر بے پردگی کی وجہ سے کوئی برا اثر نہیں ہوا تحقیق کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس آزادی نے ان کے اخلاق و عفت پر کتنا برا اثر ڈالا ہے پھر ایسی تعلیم کو لیکر کیا چولہے میں ڈالے دوسرے وہاں باہر پھرنے کو تعلیم میں دخل نہیں ہوا بلکہ تعلیم میں دخل اس بات کو ہے کہ اس قوم کو تعلیم نسواں کا اہتمام ہے انہوں نے اپنی عورتوں کو تعلیم کی غرض سے بے پردہ نہیں کیا بلکہ وہ تو بے پردہ پہلے ہی سے تھیں کیونکہ اس قوم میں ہمیشہ ہی سے بے پردگی کا رواج ہے اگر بے پردگی کو تعلیم میں دخل ہوتا تو چاہیے تھا کہ ان کی عورتیں ہمیشہ ہی سے تعلیم یافتہ ہوتیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اب ہی کچھ زمانہ سے ان میں تعلیم پیدا ہوئی ہے جب سے ان کو تعلیم کا اہتمام ہوا ہے اور اس سے پہلے عورتیں تو کیا ان کے مرد بھی جاہل وحشی تھے جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے پس معلوم ہوا کہ تعلیم کا اصل مدار اہتمام پر ہے تو آپ بھی اہتمام کیجئے اور پردہ میں رکھکر ہی اپنی عورتوں کو پڑھائیے یقیناً تعلیم یافتہ ہوجائیں گی۔ آخر ایک زمانہ میں مسلمانوں کی عورتیں بھی تو بہت تعلیم یافتہ ہوچکی ہیں حالانکہ اسوقت بھی پردہ موجود تھا تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عروج کے زمانہ میں کتنی عورتیں محدث اور مفسر اور ادیب عالم ہوئی ہیں ۱۲ جامع؛ مگر عورتوں کو پردہ میں رکھکر بھی صرف دینیات کی تعلیم دینا چاہیے جغرافیہ اور تاریخ نہ پڑھانا چاہیے ورنہ ۴۷م ان کو بھاگنے کے راستے معلوم ہوجائیں گے پھر وہ گھر سے ایسی جائیں گی کہ پتہ بھی نہ دینگی بغرض پردہ کی وجہ سے عورتوں کی نااتفاقی شدید تو نہیں ہوتی مگر مدید ہوتی ہے کہ ان میں باہم کشیدگی ہوتی ہے تو زمانہ دراز تک اس کا سلسلہ چلتا ہے نیز ان میں ایک ایسی بری عادت ہے کہ جب کسی بات پر لڑائی ہوگی تو پہلے مردے اکھیڑے جاتے ہیں مردوں میں یہ مرض کم ہے مگر عورتیں جن باتوں کی صفائی بھی کر چکی ہیں دوبارہ لڑائی کے موقعہ پر پہلی باتوں کو پھر دہراتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسوقت کا معاملہ اگر فی نفسہ خفیف بھی ہو تو پہلی باتوں کی یاددہانی سے سنگین بنجاتا ہے خصوصاً جبکہ یاددہانی بھی دلخراش الفاظ سے جس میں عورتوں کو خاص ملکہ ہے یعنی طعن کے موقعہ پر اپنے احسان کو بھی ایسے عنوان سے

جتلاتی ہیں جس سے دوسرے کا کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک خاندان
میں نکاح کی تقریب تھی اور صاحب تقریب کی بھاوج بہت مفلس تھی مگر اس نے قرض اور
ادھار کرکے اس موقعہ کے لئے جوڑے تیار کئے اور صرف دلہن ہی کا جوڑا نہیں بلکہ سب
گھر والوں کے لئے جوڑے تیار کئے گو وہ بڑھیا تو نہ تھے مگر نام کرنے کو کافی تھے چنانچہ
اس نے امید سے زیادہ کام کرکے دکھلا دیا پھر کسی موقعہ پر بھاوج اور نند میں تکرار ہوا
تو بھاوج کیا کہتی ہے کہ ارے میں تو وہ ہوں کہ میں نے نہوت میں بھی تمہارے وقت
میں سارے خاندان پر کفن ڈالا تھا دیکھئے اس نے جوڑے دینے کو کس لفظ سے ادا کیا
کہ ساری لکھنری بھی ایسا لفظ نہ نکال سکتی مگر ان کی لڑائی باتوں ہی باتوں میں ہوتی ہے
اس سے آگے یہ کچھ نہیں کر سکتیں البتہ ایک طرح ان کا فساد شدید بھی ہو جاتا ہے کہ بعض دفعہ
یہ اپنے آپس کے تکرار کو مردوں سے بیان کر دیتی ہیں کہ فلانی نے مجھے یوں کہا اور تمہیں
یہ کہا مردوں میں حرارت ہوتی ہے ان پر زیادہ اثر ہوتا ہے پھر یہ بات ہی تک نہیں رہتے ۷۹م
بلکہ ہاتھ سے بھی بدلہ لیتے ہیں جس سے خون تک ہو جاتے ہیں اسی لئے مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں
کی باتوں پر اعتماد نہ کیا کریں اور عورتوں کو بھی لازم ہے کہ ایسی باتیں مردوں سے نہ کیا کریں
اس کی ایک تدبیر عمدہ یہ ہے کہ چند خاندان ایک گھر میں اکٹھے نہ رہا کریں کیونکہ چند عورتوں
کا ایک مکان میں رہنا ہی زیادہ فساد کا سبب ہے میرٹھ میں ایک باپ بیٹے ایک ہی گھر میں
رہتے تھے بیٹے کو مجھ سے تعلق تھا ان کا ایک خط میرے پاس آیا جس کا خلاصہ دو مضمون تھے
ایک یہ کہ میں بعضی خلاف شرع باتوں پر والد صاحب وغیرہ کو نصیحت کرتا ہوں وہ نہیں مانتے
اور خلاف شرع کام کرتے ہیں دوسرا مضمون یہ تھا کہ والد صاحب اور میں دونوں ایک ہی
گھر میں رہتے ہیں اس لئے بعض شکایات پیدا ہو جاتی ہیں میں نے سارے خط کے
جواب میں ایک شعر لکھ دیا ؎ کار خود کن کار بیگانہ مکن - یہ تو پہلی بات کا جواب تھا کہ
جب وہ نہیں مانتے تو تم اپنے کام میں لگو آئندہ ان سے تعرض نہ کرو اور ؎
در زمین دیگراں خانہ مکن - یہ دوسری بات کا جواب تھا کہ مکان بدل دو اور
الگ مکان لے کر رہو - چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا پھر جو خط آیا تو اس میں

لکھا تھا کہ مکان بدلنے کے بعد ہی سے تمام پریشانیاں رفع ہوگئیں اور اب ہمارے تعلقات
شگفتہ ہوگئے صاحبو! میرا تجربہ ہے کہ آجکل الگ الگ رہنا زیادہ موجب امن ہے۔ نیز آجکل
امر بالمعروف اس طرح کرنا کہ کسی کے پیچھے ہی پڑجائے مفید نہیں اسلئے میں نے ان کو لکھا کہ جب
امر بالمعروف کا اثر نہیں ہوتا تو تم اپنے والد صاحب سے کچھ تعرض نہ کرو اب تم پر امر بالمعروف
واجب نہیں یہ تو فتوی کا اور دوسرا جملہ مشورہ کے طور پر تھا کہ تم الگ مکان لیکر رہو کیونکہ
آجکل ساتھ مل کر رہنے کا زمانہ نہیں بس اب تو زیادہ وقت تنہائی میں گذارنا چاہیئے اسی میں
راحت ہے جیسا کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎ جہد کن در بامردم دانا نشیں ٭ باصدق و
صفا ٭ (مراد شیخ عارف) ؎ یا با صنم لطیف و رعنا نشیں ٭ باشرم حیا (مراد زوجہ عفیفہ) ؎
زیں ہر دو اگر یکے میسر نشود ٭ از طالع خویش ٭ اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں ٭ در یاد خدا
اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل ہی وحشی بنجاؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت نہ ملو کہ اسوقت
زیادہ ملنا تمام مفاسد کی جڑ ہے حتی کہ آجکل جو انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور ناکام رہتی ہیں ۳۸۰
ان کا زیادہ تر سبب یہی ہے کہ یہ زمانہ مل کر کام کرنے کا نہیں ہے کیونکہ آجکل ہر کسی
دوسروں سے اپنی رائے کا اتباع چاہتا ہے اور جہاں بظاہر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار
ہے جس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ نفع اختلاط کا ایسا ہے جو خلوت و وحدت میں نہیں وہ کثرت
بھی حقیقت میں وحدت ہی ہوتی ہے کیونکہ وہاں ایک ہی شخص اپنے اثر سے اپنی تائید
کے لئے پہلے سے ایسے لوگوں کو سبق پڑھا پڑھا کر لاتا ہے جنکو اس معاملہ کی سمجھ تو کیا
ہوتی ہے لفظ بولنا بھی نہیں آتا پس کثرت برائے نام ہی ہوتی ہے پھر اس کثرت کا مدار
بھی کسی لیاقت پر نہیں ہوتا محض تموّل پر ہوتا ہے یعنی اپنے مقاصد و آراء کی تائید بھی ایسے
لوگوں سے کرائی جاتی ہے جو زیادہ مالدار ہوں حالانکہ اس کے لئے اصل ضرورت
فہم کی ہے اسی طرح آجکل صدارت بھی مالداروں کو دیجاتی ہے چاہے وہ یہ بھی نہ جانتے
ہوں کہ صدر کہتے کس کو ہیں کانپور میں ایک جلسہ تھا ایک صاحب کو اس میں اپنی رائے
کو قوت دینا تھا تو وہ اپنی تائید کے لئے ایک مجمع کو ساتھ لائے اور ان کو راستہ میں خوب
پڑھا دیا کہ جب میں تقریر کر چکوں تو تم کھڑے ہو کر اتنا کہدینا کہ میں اس کی تائید کرتا ہوں

وہ بیچارہ بالکل جاہل تھا اتنا لفظ بھی نہ آتا تھا اسکو رٹتا اور یاد کرتا رہا تاکہ ذہن سے نہ نکل جائے اور دل میں دعا
کرتا ہوگا کہ تقریر جلدی ختم ہو تو میں اسکو لفظ کو ادا کرکے چین سے بیٹھوں چنانچہ خدا خدا کرکے تقریر ختم ہوئی
تو بیچارے صاحب کھڑے ہو کر فرماتے ہیں کہ میں بھی اسکی تردید کرتا ہوں ۔ غریب کو بجائے تائید کے
تردید یاد رہ گیا اس پر معترض نے چپکے سے کہا کہ نہیں تائید. تو آپ نے کہا میں اسکی تاریدکرتا ہوں یہ بالکل ہی مہمل
لفظ تھا معترض نے پھر لقمہ دیا کہ تائید کہو تائید تو آپ نے تیسری دفعہ تاکید کہا خیر اس کو لوگوں نے
غنیمت سمجھا کیونکہ یہ تائید کے قریب ہی تھا تو صاحبو اول تو کثرت رائے میں احمقوں کو جمع
کیا جاتا ہے ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہوگی پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے
اور سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے تم یوں کہدینا جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا
کرتے ہیں اب وہ کثرت کیا خاک ہوئی وہ تو ایک ہی شخص کی رائے ہوئی جس کے اب لوگ مقلد ہوتے
ہیں باقی شریعت میں تو کثرت رائے کوئی چیز نہیں ۔ وقت میں گنجائش نہیں ورنہ اسکو بھی بیان
۳۸۱ کردیتا ۔ تو آجکل ہر شخص اپنی رائے کا اتباع دوسروں سے کرانا چاہتا ہے اسی لئے انجمنوں کا کام نہیں
چلتا کیونکہ اراکین انجمن جو اوروں سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اخلاق کی اصلاح
تک نہیں ہوئی ان میں کوئی کسی سے چھوٹا بنکر رہنا گوارا نہیں کرتا اسلئے بہت جلد ان میں اختلاف ہوجاتا
ہے پھر ہر ایک اپنی رائے پر ضد کرتا ہے تو چار دن ہی میں انجمن کا خاتمہ ہوجاتا ہے اسلئے میں تو یہ
کہتا ہوں کہ جو کام تنہا ہو سکے وہ مجمع کے ساتھ مل کر ہرگز نہ کرو اکثر دیکھا ہے کہ مجمع میں کام بگڑ جاتا
ہے ۔ دنیوی کامیابی بھی اکثر نہیں ہوتی اور اگر کبھی کچھ دنیا مل بھی گئی تو دین کا تو ستیاناس ہی ہوجاتا
ہے اور جو کام تنہا نہ ہو سکے مجمع ہی کے ساتھ ہو سکے اس کے لئے اگر دینداروں کا مجمع میسر
ہوجائے تو کرو بشرطیکہ سب دیندار ہوں یا دینداروں کا غلبہ ہو اور اگر غلبہ دنیاداروں کا
ہو اور دیندار مغلوب یا تابع ہوں تو ایسے مجمع کے ساتھ مل کر کام کرنا واجب نہیں اسوقت
آپ اس کام کے مکلف ہی نہ رہیں گے کیونکہ یہ مجمع بظاہر مجمع ہے ۔ حقیقت میں یہاں تشتت
ہے وہی حال ہوگا تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى تو یوں کہنا چاہئے کہ مجمع میسر نہیں پھر جو کام
اس پر موقوف تھا وہ واجب یا فرض کیونکر ہوگا میں سچ کہتا ہوں کہ آجکل جو تقریروں میں
کہا جاتا ہے کہ اتفاق کرو اتفاق کرو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سب میرے ساتھ

اتفاق کریں ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی دعوت دیتا ہے اور اس صورت میں قیامت تک اتفاق قائم نہیں ہو سکتا بلکہ قیام اتفاق کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس کے لئے آمادہ ہو کہ اگر کوئی میرا اتباع نہ کرے گا تو میں اس کا اتباع کرلوں گا بشرطیکہ خلاف شرع کام نہ ہو۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ آجکل لوگ اتفاق پر تو بہت زور دیتے ہیں مگر اس کی جڑ کو نہیں دیکھتے اتفاق کی جڑ تواضع ہے ایک حجرہ نشین صوفی کی تحقیق ہے جس کے سامنے تمام تحقیقات فلسفیہ گرد ہیں آپ نے ایک صوفی کی تحقیق تو سنلی ذرا اس پر عمل کر کے اتفاق کیجئے دیکھئے کامیابی ہوتی ہے یا نہیں عمل کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقی فلسفی یہی لوگ ہیں یہ حضرات صوفی کے ان خواص کو سمجھتے ہیں جنکی حکماء کو ہوا بھی نہیں لگی اس کا تجربہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کسی فلسفی کو کسی محقق صوفی کے پاس چھ مہینے کیلئے چھوڑ دیجئے انشاء اللہ وہ خود اپنے کو احمق کہکر اٹھیگا افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا تھا اس سے دل مشاہیر حکماء کے متعلق پوچھا سب کو لاشے مبتلا پایا پھر صوفیہ اسلام جنید اور شبلی وغیرہم کے متعلق پوچھا اس نے کہا اُولٰٓئِکَ ھُمُ ۳۸۴
الفلاسفۃ حقا۔ کہ سچے فلسفی یہی لوگ ہیں۔ بس جو لوگ اتفاق کے طالب ہیں اور حل کرنا چاہتے ہیں ان کو پہلے اپنے اندر تواضع پیدا کرنا چاہیئے اور تواضع کیسے پیدا ہوگی؟ اس کے جواب میں تحقیق و دلائل کا تو وقت نہیں مگر بطور امان لیجئے کہ اس کا طریقہ یہ ہے ؎

قال را بگذار مرد حال شد | پیش مرد کاملے پامال شد

تواضع حاصل کرنے کے لئے کسی کامل کے قدموں میں پامال ہونے کی ضرورت ہے ؎

نفس نتوان کشت الا ظل پیر | دامن آں نفس کش را سخت گیر

سخت گیر کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام کا اتباع کرو اور اس کی بات بات پر ناک نہ چڑھاؤ ورنہ وہی حال ہوگا جو اس شخص کا ہوا تھا جس نے ایک گودنے والے سے کہا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنادے اس نے ایک جگہ سوئی چبھوئی تو اس نے آہ کی اور پوچھا کیا بناتے ہو کہا پیٹ بنا رہا ہوں کہنے لگا اس کو کھانا تھوڑا ہی رہ گیا ہے پیٹ کو رہنے دو اس نے دوسری جگہ سوئی چبھوئی اس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو کہا دم کہنے لگا کہ شیر دم کٹا بھی تو ہوتا ہے اسکی دم کٹا ہی رہنے دو اس نے تیسری جگہ سوئی چبھوئی اس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو کہا کان کہنے لگا شیر بوچا بھی تو ہوتا ہے

اسکو تو جانے رہنے دو۔ اس نے چوتھی جگہ سوئی لگائی آپ نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بنا رہے ہو کہا
سر کہنے لگا اسکو بھی رہنے دو یہ شیر بے سر ہی سہی گودنے والے نے جھلا کر سوئی پھینکدی۔ اور کہا ؎
شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید ؛ ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید ؛ آگے مولانا فرماتے ہیں ؎ چوں نداری
طاقت سوزن زدن ؛ از چنیں شیر ژیاں پس دم مزن۔ تو اسی طرح جسکو شیخ کی سختی کا تحمل نہ ہو اور
بات بات پر ناک چڑھائے اسکو اصلاح نفس کا نام ہی نہ لینا چاہیئے وہاں تو اس کی ضرورت ہے ؎
گرم گوید سخت گوید خوش بگیر ؛ تجربہ یہ ہے جس طرح اولاد بدون نکاح کے نہیں ہوتی اسیطرح اصلاح
اخلاق بدون کسی شیخ کے پاس پامال ہونے کے نہیں ہوتی اسی کو فرماتے ہیں ؎ گر ہوائے ایں سفر داری
دلا ؛ دامن رہبر بگیر و پس برآ ؛ یار باید راہ را تنہا مرو ؛ بے قلاوز اندریں صحرا مرو ؛ اور بعض بزرگوں کی
بابت جو سنا جاتا ہے کہ وہ بدون کسی شیخ کے کامل ہوگئے مولانا نے اسکی بھی حقیقت بتلائی ہے فرماتے ہیں ؎
ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ؛ ہم بعون ہمت مرداں رسید ؛ یعنی وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور دعا ہی سے ۳۸۳
واصل ہوئے ہیں گو ظاہر میں کسی سے بیعت نہ ہوئے ہوں نہ کسی کی صحبت میں رہے ہوں اسکی صورت یہ
ہوتی ہے کہ کسی اہل اللہ نے ایک شخص کو دین کے کام میں لگا ہوا دیکھا اس سے جی خوش ہوا انہوں نے
دعا اور توجہ کردی جسکی برکت سے وہ واصل ہوگیا۔ مگر اسکے لئے اسکی ضرورت ہے کہ اگر صحبت اولیاء اللہ
نہ ہو تو کم از کم ان پر انکار بھی نہ ہو ورنہ توجہ کیسے ہوگی۔ پس یہ ہے تاریخ اتفاق کے حدوث و بقاء کی کہ
اتفاق کا مدار تواضع پر ہے اور تواضع موقوف ہے اصلاح نفس پر اور اصلاح نفس موقوف ہے
شیخ کامل کی صحبت پر یا کم از کم عدم انکار ہی ہو کر ان کی غیبت و شکایت تو نہ کیا کریں نیز اتفاق میں
علاوہ ان شرائط کے اسکی بھی ضرورت ہے کہ اتنا اختلاط بھی نہ ہو کہ اپنے خاص اسرار دوسروں سے ظاہر
کردے کیونکہ ممکن ہے کسی وقت یہ تعلق نہ رہے تو پھر ان اسرار کے اظہار پر پچھتانا پڑے گا حدیث میں آتا ہے
اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا مَّا وَاَبْغِضْ بَغِيْضَكَ هَوْنًا
مَا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ حَبِيْبَكَ يَوْمًا مَّا۔ یعنی دوست سے سنبھل کر دوستی کرو زیادہ کھل کھیل نہ کرو شاید کسی دن
دشمنی ہو جائے تو گھر کے بھیدی کی دشمنی بہت ضرر دیتی ہے اور اگر کسی کو اپنے دوست کی نسبت عداوت
کا احتمال ہو تو وہ اپنی ہی نسبت یہ احتمال رکھے کہ شاید کسی دن میں ہی بدل جاؤں اسلئے اتفاق میں
بھی احتیاط کی ضرورت ہے اسیطرح اگر کسی سے عداوت کرو تو وہاں بھی حد کے اندر عداوت

کرنا چاہیئے حد سے نہ بڑھے کیونکہ کیا خبر ہے کسی وقت پھر دوستی کرنیکی ضرورت ہو تو اس وقت آنکھیں سامنے کرنے سے حیا دامن گیر ہوگی اور جس کی دوستی اور دشمنی اعتدال سے ہوگی اسکو کسی وقت بھی پریشانی نہ ہوگی۔ یہ تو اتفاق کے حدود و اسباب تھے اور میں بتلا چکا ہوں کہ ایک درجہ نااتفاقی کا بھی مطلوب ہے وہ یہ کہ کسی جماعت نے معصیت پر اتفاق کیا ہو تو ان کی مخالفت اور ان سے علیحدگی شرعاً مطلوب ہے یا اتفاق تو معصیت پر نہ ہوا تھا لیکن اتفاق کے بعد وہ لوگ معاصی اختیار کرنے لگے تو اس وقت دینداروں کو ان سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل جہاں دیندار اور بے دین لوگ کسی کام میں اتفاق کرتے ہیں وہاں بے دین تو اپنے طریقہ پر پختہ ہوتے ہیں اور نہ معلوم دیندار کیوں ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ بے دین تو وہی کرتے ہیں جو ان کے مذاق کے موافق ہو اور ان کے مذہب کے موافق ہو اور ان کی رائے میں مفید ہو اور دیندار باوجود یہ جان لینے کے کہ یہ کام ہمارے مذہب میں ناجائز یا حرام ہے یا یہ طریقہ ہمارے نزدیک مضر ہے مفید نہیں یا یہ کام ہماری جماعت کے مذاق کے خلاف ہے پھر بھی بیدینوں کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں تاکہ اتفاق میں فتور نہ آئے سبحان اللہ صاحبو! اتفاق تو طرفین سے ہوا کرتا ہے جب دوسری جماعت آپ کے جذبات کی رعایت نہیں کرتی تو اب وہ اتفاق ہی کہاں رہا بس یوں کہو کہ تم ان کی محض خوشامد کر رہے ہو اگر اتفاق ہوتا تو دوسرے بھی تو تمہاری کچھ رعایت کرتے مگر لوگوں نے آجکل خوشامد کا نام اتفاق رکھ لیا ہے اسلئے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مخلوق طعن کریگی کہ انہوں نے اتفاق میں کھنڈت ڈالدی میں کہتا ہوں کہ تم اس طعن سے کیوں ڈرتے ہو صاف کہدو کہ ہاں ہم نے اتفاق کو توڑ دیا اسلئے کہ اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب نہیں بلکہ بعض دفعہ نااتفاقی بھی مطلوب ہے جبکہ اتفاق سے دین کو ضرر پہونچ رہا ہو بس اب میں ختم کرتا ہوں کیونکہ بقدر ضرورت میں نے اختلاف کے مفاسد اور اتفاق و نااتفاقی کے حدود بیان کردیئے ہیں اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق دیں آمین۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وعظ کا نام الانسداد للفساد رکھدیا جائے۔ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اشرف علی

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمی بہ

الاصابۃ فی معنی الاجابۃ

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی ب

الاصابۃ فی معنی الاجابۃ

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ضبط	[illegible]	[illegible]	[illegible]
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	[illegible]	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ

يُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝ اس آیت سے مجکو ایک مضمون بیان کرنا ہے
آیت کی تفسیر کرنا مقصود نہیں گو تبعاً تفسیر بھی ہو جاوے مگر دراصل مجکو ایک غلطی عام پر متنبہ کرنا
ہے جو علمی غلطی ہے اور اس علمی غلطی سے عملی غلطی بھی ناشی ہے اور اس کی وجہ سے لوگ ایک بڑی
دولت سے محروم ہیں جو بہت بڑی دولت ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جب میرے بندے
آپ سے دریافت کریں میرے متعلق۔ کیا دریافت کریں؟ اس کا ذکر نہیں ہے مگر آگے جواب
سے معلوم ہو جائے گا کہ سوال کس بات کے متعلق تھا نیز حدیث سے بھی معلوم ہو گیا ہے کہ
سوال قرب و بعد خداوندی سے تھا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں یا بعید۔ حدیث میں آتا ہے کہ بعض
لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا أَقَرِيبٌ رَبُّنَا فَنُنَاجِيهِ أَمْ بَعِيدٌ
فَنُنَادِيهِ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے نزدیک ہیں تو آہستہ سے عرض معروض کر لیا کریں یا
دور ہیں کہ زور سے پکارا کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس سوال کو بعید نہ سمجھا جائے
کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کمالات کا علم اگرچہ بدیہی ہے مگر اس کی تفصیل نظری ہے سائلین کو یہ تو معلوم ۴۴
تھا کہ حق تعالیٰ سب کی سنتے ہیں اور کوئی بات ان سے مخفی نہیں رہتی مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ قریب سے
ہی سنتے ہیں یا بعید سے بھی کیونکہ عام لوگ دور سے سننے کو عجیب نہیں سمجھتے چنانچہ سلاطین تو بواسطہ
ذرائع ٹیلیفون و تار وغیرہ کے دور دور ہی سنتے ہیں غرض سہل مطلق تو سب کے نزدیک عجیب
نہیں مگر علم بلا واسطہ ان کے نزدیک عجیب تھا اس لئے کہ سلاطین عالم کا علم و سمع بواسطہ ہی
ہے اور انسان کی عادت ہے قیاس الشاہد علی الغائب کی۔ اور اسی کو شریعت نے
بہت سختی سے منع کیا ہے کہ قیاس شاہد علی الغائب نہ کرو۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ
اللہ تعالیٰ سے ہر چیز مانگو حتی کہ نمک اور جوتہ کا تسمہ بھی اللہ ہی سے مانگو یہ اسواسطے فرمایا
کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ سے معمولی چیزوں کے مانگنے کو عیب سمجھتے ہیں اور اس کا منشا بھی وہی
قیاس الشاہد علی الغائب ہے کیونکہ سلاطین سے پیسہ مانگنا عرفاً عیب ہے، تو وہ یہ سمجھے کہ خدا سے
بھی پیسہ اور نمک مانگنا عیب ہوگا۔ حضور صلعم نے اس غلطی کو رفع کر دیا کیونکہ اس غلطی ہی سے
شرک پیدا ہوا کہ مشرکین نے چھوٹے کاموں کے لئے دوسرے معبود تجویز کر لئے منشاء اس جہل کا
ہوتا ہے مگر اس کا رفع کرنا بھی تو ضروری ہے اور تعلیم کی خوبی تو یہی ہے کہ رفع جہل کیسا تھ

اس کے منشا کو بھی رفع کردے بہرحال یہی قیاس منشا ہوا اس سوال کا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں یا بعید سائلین یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ سنتے تو ہیں سب کی اور ان کے نزدیک سلاطین عالم سے خدا تعالیٰ کو یہی ایک امتیاز تھا کہ سب کی سنتے ہیں کیونکہ سلاطین دنیا تک ہر شخص کی بات نہیں پہونچتی ہے مگر ان سوال کرنے والوں کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ زور کی آواز کو سنتے ہوں آہستہ کو نہ سنتے ہوں یا تو اسلئے کہ وہ ہم سے دور ہیں اور بعد کا خیال بوجہ عظمت کے ہوا (وَالْقَضَايَاتُ كَوْنُهُ تَعَالٰى فَوْقَ الْعَرْشِ مَنْصُوْصٌ وَاِثْبَاتُ الْعُلُوِّ لَهٗ لَازِمٌ شَرْعًا كَمَا هُوَ عَقِيْدَةُ السَّلَفِ مِنْ غَيْرِ بَيَانِ كَيْفِيَّتِهٖ عُلُوِّهٖ وَفَوْقِيَّتِهٖ ۱۲) یا اسلئے کہ وہ بہت سے کاموں میں مشغول ہیں اور شغل کی حالت میں آہستہ آواز مسموع نہیں ہوتی گو سامع قریب ہی ہو آگے اس سوال کا جواب ہے فانی قریب ظاہر حال کا مقتضا یہ تھا کہ یہاں فقل انی قریب ہوتا کیونکہ اوپر اذا سالک میں سوال بواسطے حضور کے ہے تو جواب بھی حضور کے واسطہ سے دیا جاتا کہ آپ اس سوال کے جواب میں فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں دور نہیں مگر اللہ تعالے نے جواب بلا واسطہ دیا ہے کہ یہاں قل کو حذف کردیا گو یہ جواب پہونچے گا بواسطہ رسول ہی کے مگر حذف قل میں اس بات کو ظاہر فرما دیا کہ ہم تمہارے سوال کا جواب بلا واسطہ دیتے ہیں گو یہ سوال ہماری شان وعظمت کے خلاف ہے مگر ہم اس خطا کو عفو کرکے بلا واسطہ جواب دیتے ہیں اس طرز وعنوان میں جو کچھ عنایت وکرم مزید ہے ظاہر ہے آگے جواب کے بعد ارشاد ہے أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ - اس میں ایک دوسری عنایت کا اظہار ہے کیونکہ سوال کا جواب تو اس سے ہوگیا کہ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اس کے بعد سائل کو کسی اور بات کا انتظار نہ تھا مگر کلام علی اسلوب الحکیم کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ جس میں اسپر تنبیہ ہے کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب علمی یہ تو فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ سے معلوم ہوچکا دوسرے قرب تعلق خصوصیت جیسے اردو میں ہم کبھی تو یوں کہتے ہیں کہ میں پاس ہی ہوں کہو کیا کہتے ہو یعنی سن رہا ہوں اس میں تو پاس ہونے سے قرب علمی وقرب سماع کا بیان مقصود ہے اور کبھی ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں تو ہمارا قریب ہے یعنی اس کو ہم سے خاص تعلق ہے نیز کہتے ہیں کہ تم تو دور رہکر بھی پاس ہی ہو یعنی تم سے ہمارے دل کو خاص تعلق ہے۔

اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ — میں دوسرے قرب کو یعنی قرب تعلق اور قرب نصرت و عنایت کو بیان
بیا گیا ہے یعنی میں باعتبار علم کے بھی قریب ہوں کہ سب کی بات سنتا ہوں اور باعتبار شفقت
و رحمت و توجہ و عنایت کے بھی قریب ہوں کہ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔
اب میں مضمون مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں دعا کے متعلق ایک غلطی علمی ہے اس پر تنبیہ
کرنا چاہتا ہوں اور اس غلطی ہی کی وجہ سے لوگ دعا میں کوتاہی کرتے ہیں حالانکہ اس کی
برابر کوئی چیز نہیں کیونکہ ہر نافع شئی میں یا منافع دینیہ ہوتے ہیں یا منافع دنیویہ
اور دعا میں یہ امتیاز ہے کہ اس میں دونوں منافع ہیں یعنی تدابیر دنیا میں سے یہ بھی
ایک تدبیر ہے اور سب سے بڑی تدبیر ہے۔ دوسرا امتیاز دعا میں یہ ہے کہ دوسری تدابیر
٥ دنیا من حیث التدبیر پر کچھ ثواب نہیں اور دعا میں گو دنیا ہی مانگی جائے (بشرطیکہ ناجائز
اور حرام شے کی دعا نہ ہو) ثواب ملتا ہے پس دعا میں ایک امتیاز تو یہ ہوا کہ وہ جامع
بین الدین والدنیا یعنی دین و دنیا دونوں کے منافع کو جامع ہے دوسرا امتیاز یہ ہے کہ
دعا ہر حال میں ثواب و عبادت ہے۔ دیگر عبادات میں اگر دنیا کی آمیزش ہو جائے تو
وہ عبادت نہیں رہتی اور اگر مقصود ہی دنیا ہو پھر تو بطلان عبادت ظاہر ہے مگر دعا سے اگر
دنیا ہی مطلوب ہو جب بھی وہ عبادت ہے اس میں مقصود ہونے دنیا سے وصف عبادت باطل نہیں
ہوتا کیونکہ دعا میں عبدیت کی شان ہر حالت میں باقی رہتی ہے حدیثوں میں اسی لئے دعا کی
بڑی فضیلت آئی ہے اور عقلاً بھی یہ سب سے بڑی چیز ہے کیونکہ اس کا حاصل اللہ تعالیٰ سے
سوال ہے کہ اے اللہ ہمیں یہ دیدے اور یہ ہر تدبیر سے بڑھ کر تدبیر ہے کیونکہ دوسری
تدبیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان اس میں اپنے مثل کے سامنے اپنی احتیاج کو ظاہر
کرتا ہے جیسے ملازمت وغیرہ میں اور زراعت میں گو کاشتکار حق تعالیٰ ہی سے
مانگتا ہے مگر اسباب ظاہرہ کی طرف بھی احتیاج ہوتی ہے بغیر اسباب ظاہرہ کے زراعت
غیر ممکن ہے اور ان اسباب میں غیر حق کا محتاج بننا پڑتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے
حضرت مسیح اور ان کی والدہ علیہما السلام کی عدم الوہیت پر کَانَا یَاْکُلَانِ الطَّعَامَ سے
استدلال فرمایا ہے کیونکہ جو شخص طعام کا محتاج ہے وہ سارے عالم کا محتاج ہے زمین کا بھی آسمان

کا بھی چاند سورج کا بھی بادل اور بارش کا بھی لکڑی کا بھی لوہے کا بھی جانور کا بھی اور لوہار و بڑھئی اور مالدی گھریوں کا بھی کیونکہ ان سب سے مل کر زراعت ہوتی ہے پھر کسی نے آٹا پیسا کسی نے گوندھا کسی نے پکایا تب کھانا تیار ہوا تو طعام میں تمام عالم کی طرف احتیاج ہے پھر ایسا محتاج الہ کیا ہو سکتا ہے اسی کو سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند   تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار   شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرمان نہ بری

غرض ہر تدبیر میں انسان اپنے عاجز کے سامنے احتیاج کو ظاہر کرتا ہے خواہ قالاً یا حالاً اور دعا میں ایسے سے مانگتا ہے جو سب سے زیادہ کامل القدرۃ ہے اور جس کے سب محتاج ہیں پس یقیناً یہ تدبیر ہر تدبیر سے بڑھکر ہے کیونکہ اور تدبیریں بھی حق تعالیٰ کی مشیت و ارادہ ہی سے کامیاب ہو سکتی ہیں تو جو شخص حق تعالیٰ سے مانگے گا وہ ضرور کامیاب ہوگا اب عقل سے پوچھو تو وہ یہی کہے گی کہ جو سب سے زیادہ قادر ہو اس سے مانگنا اکمل و انفع ہے جب عقل بھی ٦
نقل سے دعا کی فضیلت ثابت ہوگئی تو اب اپنی حالت میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ متروک دعا کو کر رکھا ہے لوگ سب تدبیریں کرتے ہیں مگر دعا نہیں کرتے بجز اس کے کہ دو تین دعائیں یاد کر لی ہیں نماز کے بعد مسنونہ کے طور پر ان کو پڑھ کے منہ پر ہاتھ پھیر لیتے ہیں میں نے عمر بھر میں ایک شخص کے سوا کسی کو دعا کرتے نہیں دیکھا وہ بہت بھولے تھے ان کا بھولا پن اس سے معلوم ہوگا کہ جمعہ کے دن ایک جنازہ لایا گیا تو وہ کہتے ہیں کہ اے اللہ یہ دن سب کو نصیب ہو۔ لوگ بہت بگڑ گئے وہ سمجھے کہ سب کو کہتا ہے کہ سب مر جائیں حالانکہ انکی مراد یہ تھی کہ جب موت آوے جمعہ کا دن ہو مگر انہیں اس مطلب کو اس عنوان سے ادا کیا جس پر سب بگڑ گئے تو میں نے ان کو دیکھا ہے کہ ایک ایک دعا میں ایک ایک گھنٹہ لگا دیتے تھے اور اچھی طرح ہاتھ پسار پسار کر منہ بنا بنا کر دعا کرتے تھے اس طرح دعا کرتے بہت کم لوگوں کو دیکھا گیا ہے۔ یہ تو لوگوں کی عملی غلطی تھی۔ اور علمی غلطی یہ ہے کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے شیطان یہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہ تدبیر تو تدبیروں سے کمتر ہے دیکھو ایک مہینہ دعا کرتے ہو گیا قبول ہی نہیں ہوئی اب یہ شخص کسی مولوی صاحب کے پاس جاتا ہے انہوں نے اسکی

یوں تسلی کی کہ قبول دعا کیلئے کچھ شرائط ہیں وہ شرائط مفقود تھے اسلئے قبول نہیں ہوئی یہ جواب بھی صحیح ہے کیونکہ واقعی قبول دعا کیلئے کچھ شرائط ہیں مگر عدم قبول فقدان شرائط ہی پر موقوف نہیں بلکہ بعض دفعہ باوجود اجتماع شرائط کے بھی عدم قبول متحقق ہوتا ہے تو اب وسوسہ پھر پیدا ہوگا اور آئندہ کو دعا سے ہمت ٹوٹ جائیگی اور بعض لوگوں کو ممکن ہے کہ نصوص میں شبہات پیدا ہونے لگیں اسلئے یہ جواب کافی نہیں ہے اور اسے وساوس وشبہات کا استیصال نہیں ہوتا اسلئے ضرورت ایسے جواب کی ہے جس سے تشفی واقع ہو کر شبہات ووساوس کی جڑ کٹ جائے تو اس شبہ کا ایک جواب آج ذہن میں آیا جو شاید پہلے بھی آیا ہو مگر اس تفصیل سے غالباً نہ آیا تھا جیسا آج آیا اس لئے احباب کو وہ جواب سنانا چاہتا ہوں تاکہ شیطان کے اس دھوکہ سے نجات کلی ہو جائے پھر دعا میں کوتاہی نہ ہو۔ وہ جواب یہ ہے کہ منظوری اور اجابت اور قبول کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ درخواست لیلی جائے اور اسپر توجہ کی جائے دوسرے یہ کہ درخواست کے موافق فیصلہ بھی کردیا جائے صاحبو! درخواست کا لے لیا جانا بھی ایک قسم کی منظوری اور بڑی کامیابی ہے آپ نے مقدمات میں دیکھا ہوگا کہ جب کسی مقدمہ کی اپیل کی جاتی ہے تو وہاں بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ اپیل لے لیا جائے اور اسمیں غور کیا جائے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ بڑی ناکامی ہے اس شخص کی جسکا اپیل لیا ہی نہ جائے اسکے بعد دوسرا درجہ کامیابی کا یہ ہے کہ اپیل منظور کرلینے کے بعد درخواست کے موافق فیصلہ کردیا جائے اور پہلے فیصلہ کو منسوخ کردیا جائے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھئے کہ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ منظوری کی قسم اول پر محمول ہے قسم ثانی پر محمول نہیں جسکی دلیل خود نص کے الفاظ ہی ہیں کیونکہ اس کو مرتب فرمایا ہے اتی ترتیب پر اور اس جملہ میں ترتب تعلق کو بیان فرمایا ہے اور ترتب آنی کا مقتضا یہی ہے کہ درخواست دیتے ہی جائے اس پر توجہ کی جائے خواہ فیصلہ دیر میں ہو یا جلدی اور موافق ہو یا نہ ہو کیونکہ فیصلہ تو قانون کے موافق ہوگا یا سائل کی مصالح پر نظر کرکے اور مقدمہ کی روداد کو دیکھکر حاکم کے تعلق اور توجہ کا مقتضا صرف اتنا ہے کہ سائل کی درخواست کو واپس

سلہ اس کی بہت واضح مثال جیسا کہ مستفتین کے سامنے بھی نقل کرتا ہوں یہ ہے کہ کوئی طبیب سے درخواست کرے کہ میرا علاج مسہل سے کردیجئے تو اصل منظوری تو علاج شروع کردینا ہے۔ مسہل دینے اور نہ دینے دونوں صورتوں میں منظوری ہے مسہل دینا سمجھ پر رکھا گیا

نکرے بلکہ اسکی درخواست کو توجہ کیساتھ سننے اور اسکو فیصلہ کے واسطے لے لے پس اجیب
کے معنی یہ ہوئے کہ ہم ہر دعا کرنے والے کی درخواست کو لے لیتے ہیں اس پر توجہ کی جاتی ہے
بے توجہی نہیں کی جاتی۔ تو یہ کیا تھوڑی بات ہے۔ صاحبو! دنیا میں تو اتنی ہی بات کے لئے بہت سی
تدبیریں اور خوشامدیں کی جاتی ہیں کہ بادشاہ ہماری درخواست کو لے لے۔ اسکے بعد جی کو سمجھا لیتے
ہیں کہ اگر فیصلہ قانون کے موافق ہوا تو ہماری مرضی کے موافق ہوگا ورنہ نہیں۔ ایسے ہی
یہاں بھی دل کو سمجھانا چاہیئے کہ جب درخواست لیلی گئی ہے تو اگر اسی کا پورا کرنا ہماری
مصلحت کے خلاف نہوا تو ضرور پوری ہوگی ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا یہ اسواسطے
کہا کہ اللہ تعالیٰ دعا کے پورا کرنے میں کسی قانون کے تو پابند نہیں ہاں بندہ کی مصالح پر ضرور
نظر فرماتے ہیں کہ اس دعا کا پورا کرنا اس کے لئے مضر نہ ہو سو یہ تو عین کامیابی ہے۔ دیکھو
بچہ باپ سے پیسہ مانگتا ہے تو ایک درجہ تو قبول کا یہ ہے کہ باپ اس کی درخواست کو سنکر
محبت سے اس کو پیار کرے کہ ہاں ہاں ہم نے تمہاری درخواست سن لی اب کبھی تو وہ اسکو ۸
پیسہ دیدیتا ہے اور کبھی اس خیال سے کہ پیسہ لیکر یہ بازار میں جائے گا اور نہ معلوم کیا خرید کر کھالیگا
جس سے نقصان پہونچے یا بازار جانے سے عادت خراب ہو جائے تو وہ اس کو بجائے پیسہ
دینے کے کوئی چیز خود اپنے ہاتھ سے چار آنے کی خرید کر دیدیتا ہے تو کیا اس کو یوں کہا جائیگا کہ
درخواست پوری نہیں کی ہرگز نہیں کہا جائیگا بلکہ یوں کہا جائے گا کہ گو صورۃً پوری نہیں کی۔ مگر حقیقۃً
درخواست پوری کردی گئی کیونکہ اس کو پیسہ سے بہتر چیز دیدی گئی اسی طرح یہاں سمجھو کہ حق تعالیٰ
حکیم بھی ہیں قادر بھی ہیں رحیم و مہربان بھی ہیں۔ ماں باپ سے زیادہ بندہ پر مہربان ہیں اسکے
بعد بھی جو کچھ طلب کے موافق عطا نہیں ہوتا تو دل کو سمجھانا چاہیئے کہ ضرور ہماری درخواست کا
بجنسہ پورا کرنا حکمت کے موافق نہ تھا اسلئے اللہ تعالیٰ بجائے اس کے ہمکو کچھ اور نعمت عطا فرماتے
حکام دنیا تو درخواست منظور کرنیکے بعد فیصلہ کرنے کے وقت صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ درخواست
کا پورا کرنا قانون کے خلاف تو نہیں اگر قانون کے خلاف ہوا تو اس کو رد کر دیتے ہیں اور
اس کی جگہ اور کچھ نہیں دیتے اور اللہ تعالیٰ اس قانون کے ساتھ اسکو بھی دیکھتے ہیں کہ درخواست
کا پورا کرنا بندہ کی مصالح کے تو خلاف نہیں اور اس صورت میں درخواست کا پورا کرنا عین

کامیابی ہے۔ پس اِجَابَتْ جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ
کرنا ہے یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے
وہی مل جائے اس کا وعدہ نہیں بلکہ وہ ان شاء سے مقید ہے کہ اگر مشیت ہوگی تو ایسا ہو جائیگا
ورنہ نہیں چنانچہ ارشاد ہے بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ فَیَکْشِفُ مَاتَدْعُوْنَ اِلَیْہِ اِنْ شَآءَ
بعض علماء نے اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ کو بھی اِنْ شَآءَ سے مقید کیا ہے اور اس کو بعض لوگوں
نے حذاقت میں شمار کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے
وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ یہاں سیاق آیت بتلا رہا ہے کہ دعا پر اجابت ضرور
مرتب ہوتی ہے کیونکہ جواب امر کا ترتب پر ضروری ہے اس میں ان شاء کی قید خلاف
ظاہر ہے۔ نیز یہاں بھی اِنِّیْ قَرِیْبٌ کے بعد اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ کو بیان فرمانا
جس میں قرب کو محقق و موکد کیا گیا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اجابت مشیت کے ساتھ
مقید نہیں ورنہ قرب کا معلق بالمشیت ہونا لازم آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ کا قریب ہونا محقق
ہے علماً بھی اور تعلق خصوصیت سے بھی۔ (لقولہ سبقت رحمتی غضبی وہو المراد بالتعلق ۱۲) پس میرے
نزدیک اجابت بالمعنی الاول نہیں ہاں اِجَابَتْ بِالْمَعْنَی الثَّانِیْ اِنْ شَآءَ سے مقید ہے
جب دعا اس طرح سے مقبول ہے پھر دعا میں کوتاہی کیوں ہے۔ اور اگر کسی کے ذہن میں یہ تحقیق
نہ ہو تو وہ دعا میں اس طرح بھی تو دل کو سمجھا سکتا ہے کہ دنیا میں تو نفع موہوم پر بھی بہت سے
کام کر لیتے ہیں گو آخر میں خسارہ بھی ہو جائے اور خسارہ کا خطرہ بھی ہوتا ہے جیسے تجارت
وغیرہ میں احتمال ہے اور دعا میں تو خسارہ کا احتمال ہی نہیں پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے
دعا میں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے
جس وقت آدمی دعا کرتا ہے اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے اسکو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق
محسوس ہوگا پس دعا کے بعد اگر مطلوب بعینہ حاصل نہ ہو تو یہ بات تو اسی وقت حاصل ہو جائیگی
کہ دل میں قوت اور اطمینان حاصل ہوگا۔ دوسری برکت اس کی یہ ہے کہ دعا سے اللہ تعالیٰ کیساتھ
بندہ کو تعلق ہو جاتا ہے عشاق کو تو دعا سے یہی مطلوب ہے اور کچھ مطلوب نہیں مولانا فرماتے ہیں

از دعا نبود مراد عاشقاں جز سخن گفتن باں شیریں دہاں

اسی لئے عشاق کو دعا قبول نہ ہونے پر کبھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ عاشق کیلئے یہی بڑی بات ہے کہ محبوب اس کی باتیں سن لے عاشق کیلئے یہی بات بہت کافی ہے اس کے بعد اگر اجابت کی دوسری قسم کا بھی ظہور ہو جائے تو مزید عنایت ہے تو چاہئے کہ حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کیا جائے جس کا بہت آسان طریقہ دعا ہے بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہوائی تعلق ہوتا ہے کہ اگر سوچا جائے اور غور کیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت دور نظر آتا ہے جو امر پھر کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک تو خدا جس سے سابقہ ہے اور آئندہ بھی سابقہ پڑے گا اور ہم اس سے اس قدر دور ہو رہے ہیں وہ تو قریب ہی ہیں بس ہم دور ہو رہے ہیں اسی لئے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ فرمایا اَنْتُمْ اَقْرَبُ اِلَیْنَا نہیں فرمایا کیونکہ یہاں قرب علمی مراد ہے اور قرب علمی میں طرفین سے قرب لازم نہیں بخلاف قرب حسی ... طرفین سے قرب لازم ہے بس اس وقت ہماری حالت سعدیؒ کے شعر کی مصداق ہے ؎

دوست نزدیک تر از من بمن است | وین عجب تر کہ من از وے دورم

اس مقام پر استطراداً میں ایک شبہ کو بھی رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں کو پوری آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ سے یہ شبہ ہو گیا ہے کہ وساوس پر بھی مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ پوری آیت یہ ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ترجمہ۔ اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو اس کے دل میں بطور وسوسہ کے آتی ہیں) ان لوگوں نے نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ کو وعید پر محمول کیا ہے اور منشا شبہ یہ ہوا کہ بہت سی آیتوں میں جیسے وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَعْمَلُوْنَ اور وَھُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ علم وعید کیلئے وارد ہے انہوں نے وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ کو بھی اسی پر قیاس کیا حالانکہ یہاں سیاق و سباق میں نظر کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علم و عید سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ دراصل یہاں اوپر سے حق تعالیٰ میعاد کو ثابت فرما رہے ہیں جس کیلئے کمال قدرت اور کمال علم کی ضرورت ہے پس اولاً کمال قدرت کو ثابت فرمایا اَفَلَمْ یَنْظُرُوْا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَھُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰھَا الآیات میں اس کے بعد وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ سے کمال علم کو ثابت فرماتے ہیں کہ ہم کو ان کے وساوس تک کا علم ہے تو جو دل میں چھپی ہیں پھر اعیان خارجیہ اور اجزاء اجسام کا علم کیونکر نہ ہوگا اسکے بعد

۱۰

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ۔ میں قرب علمی کو بیان فرمایا ہے کہ ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں اور یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو ہمارا اور ہماری حالت کا جس قدر علم ہے ہم کو حق تعالیٰ کا اس قدر علم نہیں ہے بلکہ یوں کہئے کہ ہم کو جیسا ہمارے حق تعالیٰ کا کچھ بھی علم نہیں بلکہ ہم کو خود اپنی حالت کا بھی پورا علم نہیں کہ ہمارے اندر کتنی رگیں ہیں اور ان سے کیا کیا کام لئے جا رہے ہیں اور یہ اوپر معلوم ہو چکا کہ آیت میں قرب علمی مراد ہے۔ یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے قرب علمی اس درجہ ہے کہ ہم کو بھی اپنی ساتھ نہیں۔ اسی کو اس طرح تعبیر فرمایا کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہم سے قریب ہیں اور دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ خالق ہیں تمام اعضاء اور تمام قویٰ انہی کے عطا کئے ہوئے ہیں پس یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے ہمارے اعضاء سے زیادہ قرب ہے پہلے اللہ تعالیٰ کو ہمارے ساتھ تعلق ہوا پھر ہمارے اعضاء وغیرہ کو ہم سے تعلق ہوا۔ بہرحال یہ بات واضح ہوگئی کہ قرب علمی طرفین میں ایک شئے قریب ایک بعید ہو سکتی ہے پس ہم کو جو اللہ تعالیٰ سے بعد ہے اسکو قرب سے بدلنا چاہیے جس کی ایک تدبیر تو وہ مراقبات و اشغال ہیں جو مشائخ کے یہاں معمول بہا ہیں اور سب سے زیادہ آسان اور نزدیک طریقہ دعا ہے کیونکہ دعا میں انسان اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہے عرض معروض کرتا ہے اور جب تم باتیں کرو گے تو یہ تمہارا ایک خاص فعل ہوگا جس میں تم خود یہ تصور کرو گے کہ اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں اور وہ ہم سے قریب ہیں تو اس سے تم کو اللہ تعالیٰ کا قرب اور ان کے ساتھ تعلق خصوصیت زیادہ ہوگا۔ اور یہ دعا کا وہ ثمرہ ہے جو کبھی مختلف نہیں ہوتا اس کے بعد اس دعا کی اجابت بالمعنی الاول کا ثمرہ الگ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری درخواست کو سن لیتے ہیں اس پر توجہ فرماتے ہیں اور شفقت و رحمت کے ساتھ تمہاری عرض و معروض کو سنتے ہیں اس کے بعد اجابت بالمعنی الثانی کا ثمرہ الگ ہے جو کبھی مرتب ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا پس دعا کے متعلق علمی غلطی کو تو میں نے رفع کر دیا اب عملی کوتاہی رہ گئی اس کو آپ رفع کریں جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر حاجت میں دعا کیا کریں اور دل سے دعا کیا کریں اور اس کے ساتھ تدبیر بھی کریں کیونکہ تدبیر امر مشاہد ہے اور مشاہدے سے تسلی زیادہ ہوتی ہے اور دعا کو تدبیر کہنا تو بلاغی ظاہر ہے ورنہ حقیقت میں اس کا درجہ تدبیر سے آگے ہے۔ دعا کو تقدیر سے زیادہ قرب ہے کیونکہ اس میں اس ذات سے درخواست و سوال ہے جس کے قبضہ میں تقدیر ہے۔ باقی اسباب تدابیر کا درجہ صرف اتنا ہے جیسے ریلوے کا ملازم لال جھنڈی دکھلا دے جس کو دیکھ کر انجن ڈرائیور رک جاتا ہے ...

کہ لال جھنڈی میں تاثیر کی قوت نہیں اگر ڈرائیور انجن کو نہ روکے تو ہزار لال جھنڈیاں بھی پامال ہوجائیں گی پس لال جھنڈی کا درجہ صرف اتنا ہے کہ یہ ڈرائیور نے اصطلاح مقرر کر لی ہے کہ ہم ایسی جھنڈی سے گاڑی کو روک دیں گے اور دوسری قسم سے چلا دیں گے لیکن اگر کسی وقت وہ اس قرارداد کے خلاف کرنا چاہے تو جھنڈی میں اس کو روکنے کی اصلا طاقت نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مقرر فرما دیا ہے کہ جو شخص اسباب کو اختیار کرے گا ہم مسببات کو ان پر فائض کر دیں گے لیکن اگر کسی وقت وہ مسببات کو پیدا نہ کرنا چاہیں تو اسباب سے کچھ نہیں ہو سکتا اسی لئے حقیقت شناس یوں کہتا ہے ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ؛ مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اسباب کا نام ایک مصلحت و حکمت کی وجہ سے ہے ورنہ سب کچھ وہی کرتے ہیں اور بندہ کا نام ہو جاتا ہے کہ حکیم صاحب کے ہاتھ سے شفا ہوئی یا فلاں صاحب کی تقریر کا یہ اثر ہوا۔ صاحبو اثر اور تاثیر سب خدا کی طرف سے ہے۔ وعظ کہکر جب یہ وسوسہ آتا ہے کہ آج اچھا مضمون بیان ہوا تو میں یہ شعر پڑھتا ہوں ؎ بوے نافہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید ؛ ز تاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا ایک شعر اردو کا بھی اسی معنی میں اچھا ہے ؎ کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل ؛ نسیم صبح تیری مہربانی ؛

مولانا فرماتے ہیں ؎ عشق من پیدا و معشوقم نہاں ؛ یار بیروں فتنۂ او در جہاں ۔

حقیقت میں موثر وہی ہیں اسباب میں تاثیر کی طاقت نہیں وہ صرف علامات ہیں جیسے میں نے ابھی لال جھنڈی کی مثال دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس مضمون کو بار بار بیان فرمایا ہے چنانچہ ایک جگہ بہت تصریح کیساتھ فرماتے ہیں اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ اَفَرَاَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ اَفَرَاَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ

حاصل اس کا یہ ہے کہ کھیتی کا پیدا کرنیوالا بھی وہی ہے پانی کا برسانیوالا بھی وہی ہے اگر وہ چاہے تو ہرے بھرے کھیت ایک دم میں خشک ہو جائیں اور کاشتکار ہاتھ ملتے رہ جائیں بادل سے تھیر

پانی وہی برساتا ہے اگر وہ چاہے تو سمندر کا شور پانی اسی شوریت کیساتھ نازل ہوا کرے جو سمندر
میں ہے مگر وہ اپنی رحمت سے اس کو صاف کر کے شیریں کر کے نازل کرتے ہیں ان آیتوں
میں اللہ تعالیٰ نے بار بار سوال فرمایا ہے کہ بتلاؤ یہ کام تم کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں جسکا جواب
کسی کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں یہ تو اعیان کے متعلق گفتگو تھی میں کہتا
ہوں کہ ہمارے افعال بھی ظاہر میں ہمارے معمول نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت میں ان کی علت
بھی وہی ہیں اور ہماری طرف ان اعمال کی نسبت ایسی ہے جیسے بچے کے ہاتھ میں قلم دیکر پھر اسکے
ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر لکھا جائے اور دو چار حرف خوشنما لکھکر بچہ کی تعریف کی جائے کہ شاباش
بہت اچھا لکھا اب اگر بچہ سمجھدار ہے وہ جانے گا کہ میرا کمال کچھ نہیں بلکہ اس کا کمال ہے جس نے اپنے
ہاتھ میں میرا ہاتھ لے رکھا تھا اور نادان ہے تو جہالت سے ناز کرنے لگے گا مگر جس وقت وہ دوسرا ہاتھ
اس کے ہاتھ سے الگ ہو جائیگا اسوقت اسکو معلوم ہوگا کہ وہ لکھنے پر کتنا قادر ہے اور اس میں کتنا کمال ہے
صاحبو! اسی طرح اپنے اعمال صالحہ واوصاف کمالیہ پر نادان ہی ناز کرسکتا ہے جسکو اپنا ہاتھ تو نظر ۱۴
آتا ہے اور دوسرا ہاتھ نظر نہیں آتا اور جنکو دوسرے ہاتھ کا مشاہدہ ہو گیا ہے۔ان کی نظر اپنے کمالات
پر اصلا نہیں ہوتی بلکہ یہ حال ہوتا ہے جیسے دیوار میں کسی نے میخ ٹھونکی دیوار نے میخ سے
کہا کہ میرا سینہ کیوں پھاڑتی ہے میخ نے کہا کہ جو مجھکو ٹھوک رہا ہے اس سے کہہ مجھ سے کیا کہتی ہے
اور بعض پر یہ مشاہدہ اس درجہ غالب ہوجاتا ہے کہ وہ وحدۃ الوجود میں الجھ جاتے ہیں مگر محقق
وہ ہے جو دونوں ہاتھوں کا مشاہدہ کرے خالق کا بھی کاسب کا بھی نہ صرف کاسب پر نظر کرے
نہ صرف خالق پر بلکہ خالق وکاسب دونوں پر نظر کر کے فعل کو دونوں کی طرف منسوب کرے خالق
کی طرف خلقاً اور کاسب کی طرف کسباً خوب سمجھ لو پس اس حقیقت کو حاصل کرنا چاہیے جسکا
سہل طریق دعا ہے کہ حق تعالیٰ سے ہر حاجت کو عرض کرو۔آج سے اس کا التزام کرلو کہ جو بات ہوگی
حق تعالیٰ سے عرض کیا کریں گے، مگر آموختہ سا نہ پڑھو بلکہ جیسا حکام دنیا کے سامنے لجاجت اور
خوشامد سے عرضی دیتے ہو اور حاکم کے سامنے زبانی عرض ومعروض کرتے ہوئے ہمہ تن اسی کی
طرف متوجہ ہوجاتے ہو اس طرح توجہ وخشوع کیساتھ دعا کرو اور پختگی کیساتھ درخواست کرو کہ
اے اللہ ایسا کرہی دیجئے یوں نہ کہو کہ اگر آپ کی مرضی ہو تو ایسا کر دیجئے کیونکہ ان پر کوئی کرنے والا

کون ہے وہ تو بدوں تمہارے اس کے کہے بھی اپنی مرضی کے موافق ہی کرینگے پس تم پختگی کیساتھ درخواست
کرو کیونکہ حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُلِحِّیْنَ فِی الدُّعَآءِ اور الحاح کی وجہ یہ وسوسہ مانع تھا کہ نہ معلوم
دعا قبول ہو یا نہ ہو اسکو میں رفع کر چکا ہوں اور بتلا چکا ہوں کہ ایک اجابت تو یقینی ہے یعنی عرضی کا لینا
اور اس کو توجہ سے سننا کیونکہ اجابت کو آیت میں قریب پر مرتب فرمایا گیا ہے اور قرب تعلق کا ادنےٰ
درجہ یہ ہے کہ عرضی لیلی جاوے پس آیت میں اس کا وعدہ ہے اس سے آگے کا وعدہ نہیں بلکہ وہ ان شاء
کے ساتھ مقید ہے اب شبہات سب رفع ہو گئے تو عمل شروع کر دینا چاہئے اور یہ کسی حاجت کیلئے
بھی مت سوچو کہ یہ تو معمولی سی بات ہے اسکے واسطے اللہ تعالیٰ سے کیا دعا کریں کیونکہ حدیث میں ہے کہ
اللہ تعالیٰ سے نمک تک مانگو۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شبہ کو رفع کیا ہے
وہ یہ کہ بعض لوگ چھوٹی سی چیز مانگنی شان خداوندی کے خلاف سمجھتے ہیں جیسے سکندر سے کسی نے ایک روپیہ کا
سوال کیا تھا سکندر نے کہا کہ ایک روپیہ مانگنا میری شان کے خلاف ہے سائل نے کہا پھر سلطنت
دیدو کہا یہ تیری شان کے خلاف ہے۔ سلاطین دنیا کے مذاق پر قیاس کر کے بعض کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ
بھی چھوٹی چیز کے سوال سے ناخوش ہونگے مگر یہ غلط ہے کیونکہ سلاطین چھوٹی چیز کے سوال سے اسواسطے ناخوش ہوتے ۱۴
ہیں کہ انکے نزدیک کوئی چیز بڑی بھی ہے اور حق تعالیٰ کے سامنے کسی چیز کی بھی کچھ وقعت نہیں ان کے نزدیک عرش
اور نمک کی ڈلی برابر ہے حالانکہ عرش اتنا بڑا ہے کہ ساتوں آسمان زمین اسکے سامنے بے حقیقت ہیں شیخ
عبدالکریم جیلی بڑے صاحب کشف ہیں انکو ایک دریا مکشوف ہوا ہے جسکی ایک ایک موج اتنی بڑی ہے کہ ساتوں
آسمانوں اور زمینوں کو غرق کر دے مگر ملائکہ محافظ ہیں وہ اسکی موجوں سے زمین و آسمان کو بچاتے ہیں مگر
عرش اس سے بھی بڑا ہے عرش کی برابر کوئی چیز نہیں باہمہ عرش کا پیدا کرنا اور نمک کی ڈلی کا پیدا کرنا خدا تعالیٰ
کے نزدیک برابر ہے کیونکہ ان کو تو صرف حکم کرنا پڑتا ہے ایک کلمہ کن سے وہ عرش بھی بنا دیتے ہیں اور نمک کی ڈلی بھی
پس جو شخص نمک کی ڈلی مانگنے کو شان خداوندی کے خلاف سمجھتا ہے وہ کسی چیز کو خدا تعالیٰ کے سامنے عظیم
و وقیع بھی سمجھتا ہے اور یہ خیال غلط ہے اسلئے حق تعالیٰ سے ہر چیز مانگو اس کا یہ مطلب نہیں کہ چھوٹی
چیز کو بڑی سمجھکر مانگو بلکہ مطلب یہ ہے کہ بڑی کو بھی چھوٹی سمجھو۔ صاحبو! جب خدا تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز
آسان ہے کوئی چیز دشوار و مشکل نہیں تو ان سے کیوں نہیں مانگتے۔ اصل یہ ہے کہ ہمکو اللہ تعالیٰ کی قدر ہی
نہیں مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ۔ یہ گفتگو تو اعیان کے متعلق تھی کہ حق تعالیٰ کے نزدیک

بڑی سے بڑی چیز بھی بے حقیقت ہے اب اعراض کے متعلق یہ بتاتا ہوں کہ گناہ بھی بڑے سے بڑا حق تعالیٰ کی مغفرت و رحمت کے سامنے بے حقیقت ہے حدیث میں حق تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یَا ابْنَ آدَمَ لَوْ اَتَیْتَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ ذُنُوْبًا ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِیْ لَغَفَرْتُهَا لَكَ وَلَا اُبَالِیْ (اوکما قال) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ابن آدم اگر تو روئے زمین کی برابر میرے پاس گناہ لیکر آئے پھر مجھ سے مغفرت چاہے تو میں سب گناہوں کو بخش دوں گا اور ذرا بھی (اس کثرت کی) پروا نہ کروں گا ہاں یہ ضرور ہے کہ توبہ و استغفار کے وقت گناہ کا عزم نہ ہو بعض نے توبہ کی یہ کہ توبہ کے صحیح ہونیکی شرط یہ ہے کہ اسوقت یہ عزم کر لیا جائے کہ آئندہ یہ گناہ نہ کریں گے مگر محققین کے نزدیک یہ بھی شرط نہیں بلکہ یہ عزم مستقل طاعت ہے صحت توبہ کا موقوف علیہ نہیں محققین کے نزدیک توبہ کی حقیقت صرف ندامت ہے جیسا حدیث میں ہے اَلتَّوْبَةُ النَّدَمُ ہاں یہ ضرور ہے کہ توبہ کے وقت مضاد توبہ کا عزم نہو یعنی جس گناہ سے توبہ کر رہا ہے توبہ کے وقت دل میں یہ قصد نہو ۱۵ کہ یہ گناہ پھر بھی کروں گا کیونکہ اس صورت میں ندامت کا تحقق نہو گا بس اگر اسوقت عزم ترک فی المستقبل نہو تو عزم عمل فی المستقبل بھی نہو بلکہ عزم عمل سے ذہن خالی ہو اگر خالی الذہن ہو کر بھی توبہ ندامت کیساتھ ہو گئی تو توبہ صحیح ہو گئی۔ بس توبہ کرتے ہوئے گناہوں کی کثرت کو نہ دیکھو نہ اس کو دیکھو کہ یہ گناہ تو آئندہ پھر بھی ہو گا بلکہ آئندہ سے ذہن کو خالی کرکے صرف ماضی پر نادم و پشیمان ہو کر توبہ کر و یہ بھی دعا کی ایک اعلیٰ فرد ہے اس کا التزام کرو۔ میں دعا کی برکات کو بیان نہیں کر سکتا کیونکہ یہ عملی شے ہے اس کی برکات عمل کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں ہاں ایک حسی فائدہ بتلاتا ہوں کہ دعا سے یہ اثر ہر شخص کو فوراً محسوس ہو گا کہ پریشانی رفع ہو جائیگی اور باطنی نفع یہ محسوس ہو گا کہ حق تعالیٰ سے قرب خاص مشاہد ہو گا اللہ تعالیٰ سے جی لگے گا اللہ تعالیٰ کی یاد سے وحشت نہ ہو گی اللہ تعالیٰ سے بعد محسوس نہ ہو گا۔ اسکے بعد فرماتے ہیں فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِیْ کہ جب میں بندہ کی ہر درخواست کو لے لیتا ہوں قبول کر لیتا ہوں تو بندوں کو بھی میری بات ماننا چاہیئے۔ وَلْيُؤْمِنُوْا بِیْ مجھ پر ایمان لانا چاہیئے۔ اس پر شاید آپ یوں کہیں کہ جب اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں اجابت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ درخواست لیلیتے ہیں اور اسکو توجہ سے سنتے ہیں اور اسطار مراد مقصود نہیں تو ہم استجابت کے بھی یہی معنی لیں گے کہ اللہ میاں آپکے احکام آنکھوں پر ہم سبکو مانتے ہیں باقی عمل

بالاحکام سو اس کی طلب آیت میں کہاں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ استجابت کے یہی معنی لیجیے میں اپنی تفسیر سے رجوع نہ کروں گا میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس آیت میں صرف اتنی ہی بات کا حکم ہے کہ اللہ تعالے کے احکام کو مان لو۔ اور وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ تفسیر ہے فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ کی پس استجابت سے مراد ایمان لانا اور احکام الٰہیہ کو مان لینا ہے اب یہ آیت نظیر دوسری آیت کی یعنی یَا قَوْمَنَا اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَ اٰمِنُوْا بِہٖ یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ وَیُجِرْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ یہاں بھی اَجِیْبُوْا کی تفسیر اٰمِنُوْا سے وارد ہو اور اجابت و استجابت دونوں متحد المعنی ہیں پس آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہاں استجابت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کو مان لو یہاں عمل کا ذکر نہیں لیکن عدم ذکر سے یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ یہاں اعمال کی نفی کی گئی ہے ہرگز نہیں ہاں یوں کہو کہ سکوت ہے اس کا مضائقہ نہیں کیونکہ ایک آیت میں سب باتوں کا ذکر ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک بات کا حکم ایک آیت میں ہے دوسری باتوں کا دوسری آیتوں میں ہے پس فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ کو اجابت بالمعنی الاول پر محمول کرنا تو صحیح مگر اس سے عمل کی نفی کرنا غلط جیسا کہ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ میں ہم نے بھی اجابت بالمعنی الاول کا اثبات کیا ہے مگر اجابت بالمعنی الثانی کی نفی تو نہیں کی بلکہ اس سے آیت کو ساکت مانا ہے پھر تم نفی عمل کی زیادت کیسے کرتے ہو۔ دوسرے اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ میں تو سکوت عن عطاء المراد کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ تمہاری درخواست بعض دفعہ نامناسب خلاف مصلحت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام میں یہ بات نہیں ہے تو ہم کو یہ بھی حق ہے کہ ہم فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ کو طلب عمل سے ساکت نہ مانیں کیونکہ جو احکام سراپا خیر اور سراپا مصلحت ہیں انکے ماننے کے معنی یہی ہیں کہ انکے موافق عمل کیا جائے۔ اس کے بعد ارشاد ہے لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ بظاہر یہ سب امور مذکورہ کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ بندوں کو میرے قرب علمی و قرب تعلق کی اطلاع دیدیجئے تاکہ وہ اسکو معلوم کر کے میرے احکام کو بھی مانیں۔ اس مجموعہ سے توقع ہے کہ ان کو صواب و رشد حاصل ہو جائیگا۔ یہ جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ صواب و رشد یہی ہے کہ حق تعالیٰ سے اس طرح معاملہ کیا جائے کہ اعتقاداً ان کو اپنے سے قریب سمجھے اور عملاً اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور دعا کرنے کی عادت کی جائے اب دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اسکی توفیق عطا فرمائیں۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ

اشرف علی ۱۵ ربیع ۱۳۴۹ھ

ع اے بھائیو! اللہ کی طرف بلانے والا کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لاؤ اور حق تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دیگا اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھیگا ۱۲ منہ۔ پارہ ۲۶ رکوع ۱۴ ۔ ۱۶

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ
رواہ البخاری

سلسلہ التبلیغ

۱۷

کا وعظ مسمّی بہ

رفع الالتباس
عن
نفع اللباس

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر "الابقاء"
متصل مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمیٰ ب

رفع الالتباس (عن) نفع اللباس

الملقب ب

الفیض الحسن (فی) تھانہ بھون

اشتات	السامعون	من ضبط	کیف	ماذا	لم	کم	متیٰ	این	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	کیا مضمون تھا	کیوں ہوا کیا سبب تھا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ایک دوسرے رسالہ کا ... اللہ تعالیٰ ... بیان ... تعلق ... حقوق ... ادائے حقوق ... حقوق بیان فرمائے [illegible]	... کی تحریک ... بعض ... درخواست کی گئی [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ

وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق تعالیٰ شانہ نے زوجین کے تعلقات کو ایک مختصر مگر بلیغ عنوان سے بیان فرمایا ہے۔

چونکہ اس بیان کا سبب ایک تقریب والوں کی تحریک ہے اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ بیان نکاح ہی کے مناسب ہو۔ اور مختصر ہو کیونکہ وقت تھوڑا ہے عصر سے پہلے بیان کا ختم کر دینا ضروری ہے تاکہ اسکے بعد نکاح کیلئے بھی کافی وقت باقی رہے۔ اسلئے میں نے قرآن کے اس جملہ کو بیان کیلئے اختیار کیا جو مختصر بھی ہے اور بلیغ بھی اور مقصود کے واضح کرنے میں کافی بھی۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ وہ عورتیں یعنی حلال عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو هن کے ترجمہ میں حلال عورتیں میں نے اسلئے کہا کہ اوپر سے ازواج ہی کا ذکر چلا آرہا ہے دوسرے عام عورتوں کو مردوں سے کوئی خصوصیت مقصود نہیں اسلئے عام عورتوں کو مردوں کا لباس اور مردوں کو ان کا لباس نہیں کہا جا سکتا کیونکہ آگے معلوم ہو جائیگا کہ لباس کی مد تقدیر کر شدت تعلق کی طرف اشارہ ہے اور ظاہر ہے کہ شدت تعلق عام عورتوں اور مردوں میں نہیں ہوا کرتا بلکہ زوجین ہی میں ہوتا ہے تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ غیر حلال کے منافع کیوں بیان فرماتے اگر کہیں نفع ہی محض تعالیٰ نے ضرر کو غالب بتلا کر اس نفع کو غیر قابل تحسین قرار دیا جیسا ارشاد ہے اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا وہ خمر کے باب میں ارشاد ہے اِنَّهٗ لَيْسَ بِدَوَآءٍ وَّلٰكِنَّهٗ دَآءٌ (رواہ مسلم) اور اس آیت میں مرد عورت کے تعلق کے منافع کا ذکر ہے پس لازم ہے کہ تعلق حرام کے منافع کا ذکر نہ ہو بلکہ تعلق حلال ہی کا ذکر ہو اور حدیث کا یہ مطلب نہیں خمر وغیرہ حرام چیزیں نہ دوا ہیں نہ نفع مطلقاً نہیں تاکہ یہ اشکال وارد ہو کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے ہم تو مشاہدہ سے دیکھتے ہیں کہ حرام چیزوں سے بھی نفع ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ نفع قابل اعتبار نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اعتبار غالب کا ہوتا ہے اگر کسی شے میں غالب نفع ہے تو وہ شے نافع ہے اور اگر ضرر غالب ہے تو وہ مضر ہے پس مطلب یہ ہے کہ حرام میں ضرر اس قدر ہے کہ اس کے مقابلہ میں نفع ناقابل اعتبار ہے کیونکہ مآل کار آخرت میں اسکا ضرر شدید ہے جسکے مقابلہ میں شفاء عاجل کالعدم ہو کالمعنی ہے اور دوسرے جن چیزوں کو

شریعت نے حرام کیا ہے دنیا میں بھی وہ ضرر سے خالی نہیں ان میں غالب ضرر ہی ہے اللہ تعالےٰ نے
طیبات کو حلال کیا ہے اور خبیثات کو حرام پس تحقیق و تفتیش سے معلوم ہو جائیگا کہ جن چیزوں کو
شریعت نے حرام کیا ہے ان میں ضرر ہی غالب ہے گو کسی خاص وقت میں ضرر کا ظہور نہ ہو ۱۲ ظ
پس حرام سے جو شفا ہوتی ہے وہ حقیقت میں شفا ہی نہیں (بلکہ وہ ایک مرض کو دفع کرتی ہے
دوسرے امراض جسم میں پیدا کر دیتی ہے ۱۲ ظ) بہرحال اس کا قائل ہونا ضروری ہے کہ یہاں حلال
بیبیاں اور حلال مرد مراد ہیں کیونکہ تخصیص بالازواج پر قرائن عقلیہ بھی قائم ہیں اور قرائن نقلیہ
بھی۔ اور ہر چند کہ اس آیت کا شان نزول بھی تخصیص بالازواج ہی کو مقتضی ہے مگر اسکے بیان کی چنداں
ضرورت نہیں۔ اب میں مکرر ترجمہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بیبیاں تمہارے لئے لباس
ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو اسکے بعد میں اس بات کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو عنوان لباس سے
مقصود ہے یعنی اس تعلق کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو زوجین کے درمیان ہوتا ہے جسکو اللہ تعالیٰ نے ۴۰
اس عنوان بلیغ سے بیان فرمایا ہے پس اول یہ سمجھنا چاہیے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے تشبیہ کو
استعمال فرمایا ہے کیونکہ لباس لغوی تو یقیناً مراد نہیں بلکہ استعارہ و مجاز مراد ہے اسکے بعد یہ سمجھو کہ ۴
ایک چیز کی دوسرے کیساتھ تشبیہ کسی خاص وصف میں ہوتی ہے خواہ وصف واحد ہو یا متعدد۔
پھر کبھی تو وہ وصف منصوص ہوتا ہے اور کبھی اجتہادی ہوتا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ وجہ تشبیہ
ایسا وصف ہونا چاہیے جو مشبہ بہ میں مشہور و معروف اور واضح ہو جیسے شجاعت میں تشبیہ
دینے کیلئے کہا جاتا ہے زید اسد زید شیر ہے کیونکہ شیر کی بہادری اور شجاعت مشہور ہے اسی طرح
یہاں جو زوجین کو لباس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو وجہ تشبیہ ایسا وصف ہونا چاہیے جسمیں لباس
مشہور ہو پس اب ہم کو لباس کے اوصاف میں غور کرنا چاہیے اور گو اس کی تعیین میں اختلاف ہوا
ہے کہ یہاں کونسا وصف مراد ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان سب اقوال میں تعارض کچھ نہیں بلکہ سب کا
حاصل یہ ہے کہ وجہ تشبیہ میں تعدد ہو کیونکہ لباس کے اوصاف متعدد ہیں اور سب کو زوجین کے تعلق سے مناسبت
ہے پس ایک شخص کا ذہن ایک وصف کی طرف منتقل ہوا اور دوسرے کا دوسرے وصف کی طرف چنانچہ
لباس میں ایک وصف اشتمال ہے چونکہ زوجین میں تعانق و تواصل کے وقت اشتمال یکدگر ہوتا ہے
اس لئے ہر ایک کو لباس سے تشبیہ دی گئی مگر شارع کا مقصود اس تشبیہ سے محض اس اشتمال حسی

پر اشارہ کرنا نہیں بلکہ شدت تعلق کی طرف اشارہ مقصود ہے یعنی اس تشبیہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ زوجین میں بہت شدید اور گہرا تعلق ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ میاں بی بی کے درمیان ایسا قوی تعلق پیدا کر دیتے ہیں کہ اس سے زیادہ کوئی تعلق دنیا میں نہیں ہوتا کیونکہ بدون تعلق شدید کے حقوق زوجیت کا بسہولت ادا ہونا دشوار تھا گو قدرت سے باہر تو نہیں کیونکہ وہ تمام حقوق انسان کی قدرت و اختیار میں ہیں اور انسان اپنے اختیار و ارادہ ہی سے صرف کرنے کا مکلف ہے اور اسی سے صدور افعال کا ہوتا ہے اس سے کام لینا بہت ضروری ہے مگر لوگ خاص دین کے باب میں اس کے درپے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کو ایسا شدید تعلق ہو جائے کہ حقوق خود بخود ادا ہوتے رہیں ہمیں کچھ کرنا نہ پڑے بس محبت و شوق کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ نماز روزہ خود ہی ادا ہوتا رہے سو یہ حالت غیر اختیاری ہے بندہ کے اختیار میں نہیں بلکہ اس کے ذمہ یہ واجب ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار سے کام لے ۲۱
اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو اس مسئلہ کے متعلق میرے چند بیانات ہو چکے ہیں اور یہ بہت ضروری مسئلہ ہے جیسے حدیث میں اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ (پاکی ایمان کا جزء ہے) وارد ۵
ہے اسی طرح میں اس مسئلہ کو نصف السلوک سمجھتا ہوں کہ اختیاری میں کوتاہی نہ کرے اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو لوگوں نے آج کل صرف نماز روزہ کا نام دین رکھ لیا ہے حالانکہ یہ عمل دین کا جزو ہے کہ اختیاری امور کے درپے ہو غیر اختیاری کے درپے نہ ہو اور یاد رکھو کہ یہ امور غیر اختیاریہ یعنی حالات و کیفیات وغیرہ اگر کبھی حاصل ہوتے ہیں اعمال اختیاریہ ہی میں مشغول ہونے سے حاصل ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ عمل اختیاری سے غیر اختیاری کی نیت بھی نہ کرے کیونکہ حصول میں تعجیل و تاخیر اختیار سے باہر ہے کبھی تو نقصان عمل کی وجہ سے تاخیر ہوتی ہے کبھی قلت استعداد و ضعف استعداد کی وجہ سے دیر ہوتی ہے پس تم اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو خود ان کے درپے نہ ہو بلکہ ان اعمال کے درپے ہو جو تمہارے اختیار میں ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

وہ خود جانتے ہیں کہ تمہارے لئے کیا مناسب ہے کیا نہیں اسلئے اگر حالات و کیفیات تمہارے لئے مناسب ہوں گے عطا کر دیں گے نہیں مناسب ہوں گے تو نہیں عطا کریں گے۔

دیکھو ماں اپنے بچہ کے واسطے مصالح کیسی تجویز کرتی ہے بچہ کی خواہش پر عمل نہیں کرتی خصوصاً باپ کہ وہ تو بچہ کی مصلحت کا زیادہ مدرک ہے ماں تو کسی وقت مغلوب بھی ہوجاتی ہے مگر زیادہ حالت یہی ہے تو والدین بچہ کے اپنی رائے کے موافق معاملہ کرتے ہیں جو مصلحت ہوتا ہے یا جیسا بچہ ہی عمل کرتے ہیں گو بچہ کتنا ہی ضد کرے مولانا فرماتے ہیں ؎

طفل مے لرزد ز نیش احتجام   مادر مشفق ازاں غم شاد کام

بچہ پچھنے لگانے والے کے نشتر وغیرہ کو دیکھکر روتا ڈرتا ہے مگر ماں خوشی کے ساتھ اس کے پچھنے لگواتی ہے کیونکہ اس کی نظر انجام صحت پر ہے۔

عربی میں حجام پچھنے لگانے والے کو کہتے ہیں خط بنانے والے کو نہیں کہتے بلکہ اس کو حلاق کہتے ہیں مگر آجکل حلاق کو حجام کہا جاتا ہے اور ہمارے یہاں کے بچے تو اس سے بھی ڈرتے ہیں چنانچہ سر مونڈنے کے وقت بہت روتے ہیں تو جب باپ ماں بچوں کی رائے پر کام نہیں کرتے پھر حق تعالیٰ بندوں کی رائے پر کیوں کام کریں اور تم سے مشورہ کیوں لیں وہاں شخصیت کچھ پارلیمنٹ نہیں ہے۔ غرض اعمال اختیاریہ میں بھی امور غیر اختیاریہ کا قصد نہ کرے جو بات اس کے اختیار میں نہیں ہے اس کی طرف التفات ہی نہ کرے بلکہ اپنے کام میں لگے۔ صاحبو انسان کے اندر ایک چیز ہے جس سے صدور افعال ہوتا ہے جسکا نام قصد و اختیار ہے۔ آدمی جب تک اس سے ہمت کے ساتھ کام لیتا رہے۔ معاصی سے بچ سکتا ہے مگر رسوخ و دوام صرف داعی فی القلب ہی سے ہوتا ہے کہ دل میں کوئی خاص حالت داعی پیدا ہوجائے ایسا شخص کسی وقت بھی احکام سے پہلوتہی نہیں کرسکتا وہ شادی کی پہلی رات میں بھی نماز کی جماعت ترک نہیں کرتا اور جو شخص داعی قلب سے خالی ہے وہ ایسے وقت میں اول تو نماز قضا کردے گا ورنہ جماعت تو فوت کرہی دے گا حالانکہ بیوی میاں کو نماز سے نہیں روکتی مگر آپ دیکھ لیں کہ شادی کرکے شب زفاف میں کتنے لوگ نماز کی پابندی کرتے ہیں حالت موجودہ یہ ہے کہ نکاح شادی میں دولہا دولہن کا تو کیا کہنا سارے باراتی اور گھر والے ہی بے نمازی ہوجاتے ہیں خصوصاً وہ لوگ جن کے سپرد کوئی کام یا انتظام ہو اور اس کی وجہ وہی ہے کہ لوگ داعی قلب سے خالی ہیں ورنہ اگر قلب میں نماز کا داعی ہوتا تو وہ نمازی آدمی کو نماز کیوقت

بیچین کر دیتا ہے بدون نماز کے اسکو چین ہی نہیں آتا اب بتلایئے وہ کسی وقت قصداً جاگتے ہوئے ہوش وحواس میں ہوتے ہوئے نماز کیونکر ترک کر سکتا ہے ہرگز نہیں پس دوام اور بناہ سہولت کے ساتھ داعی تاب ہی سے ہوتا ہے اور بدون اسکے بھی دوام ہو سکتا ہے مگر ہمت قویہ کے ساتھ ہر وقت ارادہ اور اختیار سے کام لے ہر دفعہ نیا قصد اور نیا ارادہ پیدا کرے اسی لئے حضرت شارع نے ہمکو سہولت اعمال کے طریقے بھی بتلا دیئے ہیں (جو حاصل ہے قلب میں داعی پیدا ہو جانے کی مگر تسہیل اعمال کے طریقے بتلانا شارع یا نائب شارع کے ذمہ نہیں بلکہ اگر وہ ایسے طریقے بتلا دیں تو ان کا تبرع واحسان ہے اس مسئلہ پر بھی میرا ایک بیان ہو چکا ہے جسکا نام التسہیل والتحصیل ہے ۱۲) کیونکہ عمل کا مدار اسپر نہیں بلکہ اصل مدار اعمال ارادہ وقصد وصرف اختیار پر ہے ہاں اسمیں شک نہیں کہ طریقہ موثق صدور اعمال کا یہی ہے کہ حق تعالیٰ قلب میں ایک داعی اور تقاضا پیدا کر دیں خصوصاً بچوں کی پرورش جو کہ خصوصاً گوہ ڈھیر اور موت کی پوٹ ہیں وہ بدون داعی قلب کے ہو ہی نہیں سکتی بچے تو ہر وقت اپنی خدمت کراتے ہیں خود خدمت کے لائق نہیں ان کے اقوال وافعال بھی مجنونانہ ہیں مگر حق تعالیٰ نے محبت ایسی پیدا کر دی ہے کہ ان کی مجنونانہ حرکات بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں حتیٰ کہ بعض دفعہ وہ کوئی کام خلاف تہذیب کر دیتے ہیں جسپر سزا دینا عقلاً ضروری ہوتی ہے مگر بچوں کے متعلق عقلاء میں اختلاف ہو جاتا ہے ایک کہتا ہے کہ سزا دی جائے دوسرا کہتا ہے کہ نہیں بچے ہیں ان سے ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے معاف کر دینا چاہیئے۔

غرض اپنے بچوں کو تو کیوں نہ چاہیں دوسروں کے بچوں پر دیکھکر پیار آتا ہے اور ان کی حرکتیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر یہ محبت کا تقاضا اور داعی نہ ہوتا اور راتوں کو جاگنا اور گوہ موت کرانا پڑتا تو کیونکر گذر ہوتا یقیناً بدون محبت کے یہ کام دشوار ہو جاتا مثلاً کسی غیر کے بچہ کی خدمت کر کے دیکھو تو حقیقت معلوم ہو جائے گی گو خدا کا خوف کر کے تم روزانہ اس کی خدمت کر دیگے مگر دل میں پیچ و تاب ضرور رہوگا اور اس کے والدین پر غصہ بھی آئے گا کہ کمبختوں نے دوسروں پر یہ وبال ڈال دیا جن کے بچے پھینک دیئے ان کی پرورش نہیں کی جاتی۔ اور ماں دادوں کے قصے تو اس بارہ میں بہت ہی مشہور ہیں ماں پر سوتیلی اولاد کی خدمت اس قدر گراں ہے

کر اس کے دل میں ان کی محبت نہیں بعض تو ان سے پریشان ہو کر ان کو ستاتی ہیں اور بعض
اللہ کی نیک بندیاں ایذا تو نہیں پہنچاتیں مگر سوتیلیوں کی خدمت گراں اور دوبھر انکو
بھی ہوتی ہے چونکہ اولاد کی خدمت بدون محبت کے دشوار تھی اسلئے حق تعالے نے اولاد کی محبت والدین
کے دل میں ایسی پیدا کر دی ہے کہ اب وہ اس خدمت میں مجبور و مضطر ہیں اور یہ ایسی محبت ہے کہ
کہ جو ذوات قدسیہ محض محبت حق ہی کیلئے مخصوص ہیں وہ بھی اس محبت سے خالی نہیں ہیں چنانچہ
سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حسنین رضی اللہ عنہما سے ایسی محبت تھی کہ ایک بار آپ خطبہ پڑھ
رہے تھے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما بچے سے لڑکھڑاتے ہوئے مسجد میں آ گئے حضور سے ان کا لڑکھڑانا
دیکھا نہ رہا گیا آپ نے درمیان خطبہ ہی میں منبر سے اتر کر ان کو گود میں اٹھا لیا اور پھر خطبہ جاری فرما دیا
اگر آج کوئی شیخ ایسا کرے تو آجکل کے جہلا اس کی حرکت کو خلاف وقار کہتے مگر وہ زبان سنبھالیں
۲۴ کیسا وقار لئے پھرتے ہیں آجکل لوگوں نے تکبر کا نام وقار اور خودداری رکھ لیا ہے صاحبو!
سچے آدمی کی علامت یہی ہے کہ وہ اپنے جذبات فطریہ کے موافق بلا تکلف عمل کرتا ہے اسکو
۸ اس کی پروا نہیں ہوتی کہ کوئی میرے اس فعل پر اعتراض کریگا یا کیا سمجھے گا۔ بنا ہوا جھوٹا آدمی
ایسا نہیں کر سکتا سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نبی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی
ہے کہ آپ میں تصنع اور بناوٹ کا نام و نشان نہ تھا آپ بے تکلف اپنے جذبات پر عمل فرماتے تھے
کبھی خطبہ کے درمیان بچوں کو اٹھا لیتے تھے کبھی بچہ کو کندھے پر سوار کر کے نماز پڑھ لیتے تھے
کبھی صحابہ کیساتھ مزاح فرما لیتے تھے کبھی اپنی بیویوں کے ساتھ مسابقت کر لیا کرتے تھے یہ باتیں
سچا ہی کر سکتا ہے بنا ہوا مدعی نبوت کبھی نہیں کر سکتا کیونکہ اسکو تو ہر وقت یہی اندیشہ رہتا ہے
کہ لوگ مجھپر اعتراض نہ کریں اسلئے وہ کبھی آزادی کے ساتھ اپنے جذبات پر عمل نہیں کر سکتا
اسی طرح قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ بیساختہ کلام ہے کسی تکلف
کی اس میں پابندی نہیں نہ قافیہ کی نہ سجع کی اور اس سے بڑھکر ایک بات خاص قرآن میں
یہ ہے کہ اسکو سنکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکے متکلم پر کسی کا بھی کچھ اثر نہیں۔ ورنہ ہر کلام کو غور کر کے
دیکھ لیا جائے تو ضرور متکلم پر کسی نہ کسی کا اثر معلوم ہوگا سلاطین بھی مصالح ملکیہ سے متاثر
ہو کر مصالح کی رعایت سے کلام کرتے ہیں کیونکہ عمائد و ارکین سلطنت کا ان پر کچھ اثر ہوتا ہے

حتیٰ کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام یعنی حدیث سنکر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ متکلم کسی سے مغلوب ہیں کیونکہ آپ پر تو خشیت وخوف الٰہی سب سے زیادہ غالب تھا تو آپ کے کلام میں بھی تاثر کی شان ہے مگر قرآن شریف میں یہ خاص بات ہے کہ اسکو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ اسکے متکلم پر کسی کا بھی اثر نہیں ہے آزادی کے ساتھ جو چاہتا ہے جسکو چاہتا ہے کہدیتا ہے یہ بات بہت سے لوگوں کے دل میں جنکو قرآن سے کچھ مناسبت ہے آتی ہے اور قریب قریب سب کو احساس ہوتا ہے کہ قرآن میں ایک خاص بات ہے جو کسی کلام میں نہیں مگر اس خصوصیت کی تعبیر پر اکثر لوگ قادر نہیں ہوتے الحمدللہ میں نے اسکو بہت سہل عنوان سے بیان کر دیا ہے ایک عالم کے سامنے میں نے اس بات کو بیان کیا تو وہ وجد کرنے لگے اور کہا میرے دل میں بہت دنوں سے یہ بات تھی مگر تعبیر پر قادر نہ تھا پھر میں نے حیدرآباد کے ایک عالم کے کلام میں دیکھا کہ انہوں نے اس تقریر کو میری طرف منسوب کیا ہے مجھے خوشی ہوئی کیونکہ طبعاً یہ بات خوشی کی ہے ہی۔

9 غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے واسطے کبھی یہ فکر نہیں کی کہ کوئی کیا کہیگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو امت کیساتھ شفیق تھے اپنی مصلحت کے واسطے نہ تھے بلکہ ہماری مصلحت کے واسطے شفیق تھے یہ تو معاملات حیات میں آپ کا برتاؤ تھا اور وفات کے واقعات میں یہ ہوا کہ حضورؐ نے اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم (علیہ وعلی ابیہ افضل الصلوٰۃ والسلام) کے وصال کے وقت رنج وغم کا اظہار فرمایا آپ کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں تھے اور زبان سے بھی یہ فرمایا اَنَا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ اے ابراہیم ہمکو تمہاری مفارقت کا واقعی صدمہ ہے۔ یہ بھی آپ کے سچے نبی ہونے کی علامت تھی کہ آپنے اسوقت قولاً وعملاً جذبہ فطریہ کو بے تکلف ظاہر فرمایا ورنہ بناوٹی کبھی اپنے جذبہ کو اس وقت ظاہر نہ کرتا بلکہ بہادر بنا ہوا صدمہ کو ٹالتا اور یہ سمجھتا کہ میں دعوے نبوت کے ساتھ رنج وصدمہ کیونکر ظاہر کروں جبکہ ایک ادنیٰ درجے کا ولی ایسے موقعہ پر پورے ضبط سے کام لیتا ہے بلکہ بعض اولیاء تو وفات فرزند پر رونے کے بجائے ہنستے ہیں اور بعض نے اپنی اولاد کو دیکھکر کہا کہ افسوس یہ سب بچے یتیم ہیں کسی نے کہا حضور یہ کدھر سے یتیم ہوگئے جبکہ آپ ان کے باپ زندہ سلامت ہیں تو کہا میں تو بہت زمانہ سے

مر چکا ہوں تو بتا ہوا بھی ان انبیاء کے واقعات سے متاثر ہو کر اپنے رنج و صدمہ کو ضرور دبا تا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کی ذرا پروا نہیں کی بلکہ بے تکلف اپنے جذبات کو ظاہر فرما دیا اور کسی کے معتقد رہنے یا نہ رہنے کی مطلق پرواہ نہیں کی اور حضورؐ کے اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکمل حالت وہی ہے جو حضورؐ پر ظاہر ہوئی اور جو اولیاء ایسے مواقع پر ہنستے ہیں وہ متوسطین ہیں کیونکہ یہ یکطرفہ ہیں انہوں نے محض خدا کے حق کا لحاظ کیا اولاد کے حقوق کا کہ وہ بھی خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں لحاظ نہیں کیا بلکہ اولاد کے حقوق کو تلف کر دیا اور کمال یہ ہے کہ ع بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ؛ ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن حضورؐ کی یہی شان تھی یعنی جامعیت۔ اور اس جامعیت کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ مخلوق کے بھی حقوق ادا کرے جنہیں اولاد کے حقوق سب سے زیادہ ہیں اور اولاد کا ایک حق یہ ہے کہ ان کے مرنے کے وقت ان کی مفارقت کا رنج و غم بھی کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حق کو بھی ادا کر کے دکھلا دیا اور یہی نہیں کہ محض عقلی غم ہوا ہو بلکہ آپکو طبعی غم بھی ہوا کیونکہ بکاء بالعین محض عقلی غم سے نہیں ہو سکتا آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا رواں ہونا بتلاتا ہے کہ آپ کو طبعی رنج و غم ہوا تھا بس یہ کہ رہا تھا کہ اولاد کی محبت سے ذوات قدسیہ بھی خالی نہیں تو یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ہمارے اندر اولاد کی محبت پیدا کر دی اگر یہ داعی نہ ہوتا تو ہم انکے حقوق ادا نہ کر سکتے اور یہ حکمت ہم اپنے لحاظ سے بیان کر رہے ہیں باقی انبیاء علیہم السلام میں یہ محبت کس حکمت کی وجہ سے کی گئی اس کو ہم نہیں جانتے کیونکہ یہ حکمت جو ہمارے لحاظ سے ہے وہاں نہیں ہو سکتی وہ حضرات بدون محبت کے بھی اولاد کے حقوق پوری طرح ادا کرتے بوجہ امر حق کے۔ ان کیلئے تو امر حق ہی بڑا داعی تھا اور یہی تمام حقوق کے ادا کیلئے کافی تھا پھر اس حکمت کے بعد کمال عنایت یہ ہے کہ باوجودیکہ والدین اولاد کی تربیت اور

عہ قلت ولا یبعد ان یکون ایداع حب الاولاد والازواج فی قلوب الانبیاء لاتمام الحجۃ علی الخلق بان الانبیاء مع کونہم اشد قوۃ واکمل جذبۃ الی الازواج والذریۃ لا یعصون اللہ طرفۃ عین ولا یشغلہم حب الخلق عن الخالق ولا ساعۃ فلکم فی رسل اللہ اسوۃ حسنۃ ولو کانوا اعراۃ عن ذلک الحب لم یؤثر تبلیغہم فی الناس وقالوا انکم لا تعصون اللہ بخلو قلوبکم وسلو بالکم عن حب الازواج والذریۃ ولو کنتم مثلنا شغوفین بہم لم تستطیعوا العمل بما نحن مرو بنا بہذا واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم ۱۲ ظ۔

شوہر بیوی کے ساتھ الفت اپنے فطری جذبہ سے مجبور ہو کر کرتا ہے مگر اس پر اسکو ثواب بھی ملتا
ہے حدیث میں حَتَّی اللُّقْمَةَ تَضَعُهَا فِيْ اِمْرَأَتِكَ فِيْ فَمِهَا کہ بیوی کے منہ میں جو ایک لقمہ شوہر
رکھدے تو یہ بھی صدقہ ہے اس کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے حالانکہ قیاس وعقل کا مقتضی یہ تھا
کہ اس میں ثواب تو کیسا ملتا بلکہ برعکس فیس مانگی جاتی تو بعید نہ تھا مگر اللہ رے عنایت کہ وہ خود
اپنے پاس سے فیس دیتے ہیں ۱؎ اور یہاں سے اس اولاد کی نالائقی ظاہر ہو گئی جو والدین کی خدمت
وتربیت کی یہ کہکر ناقدری کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا جو کچھ کیا اپنے جذبہ فطریہ سے
مجبور ہو کر کیا جس سے جانور تک مجبور ہو کر اپنی اولاد کی خدمت کرتے ہیں۔ افسوس!! ان لوگوں
کو شرم کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ باوجودیکہ انسان کے جذبات کو سب سے زیادہ جانتے ہیں وہ تو والدین
کی اس خدمت وتربیت کی اتنی قدر فرماتے ہیں کہ ایک ایک لقمہ پہنچانے کا اجر دیتے ہیں حالانکہ اس سے
خدا کو کچھ بھی نفع نہیں پہونچا اور اولاد جسکو والدین کے اس جذبہ سے پورا نفع پہونچا ہے یہ کہکر
اسکو ٹھکراتی ہے کہ والدین نے ہمارے ساتھ کیا کیا جو کچھ کیا اپنے جذبہ سے مجبور ہو کر کیا ۱۲ جامع ۴۴
یہ مضمون محبت اولاد کا اس پر چلا تھا کہ میں نے یہ کہا تھا کہ صدور افعال کا مدار تو ارادہ واختیار پر ۱۱
ہے مگر سہولت اعمال داعی قلب سے ہوتی ہے اسی سے اعمال میں رسوخ ودوام نصیب ہوتا
ہے دیکھئے رمضان میں بعض دفعہ سخت گرمی ہوتی ہے مگر روزہ دار کو جو روزہ کا عادی
ہو چکا ہو کوئی ہزار بلکہ لاکھ روپے بھی دے کہ تو روزہ توڑ دے تو وہ ہرگز نہ توڑیگا
حالانکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں روزہ کا کفارہ ادا کر سکتا ہوں مگر عمداً افطار کرنے پر کفارہ کے
بھروسے کوئی روزہ دار جرأت نہیں کرتا خصوصاً ان پڑھ مسلمان کہ وہ اس معاملہ میں مولویوں
سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں پڑھے لکھے تو اگر مگر کر کے کچھ تاویل بھی کر لیتے ہیں مگر جاہل لوگ نہایت
پختہ ہوتے ہیں وہ تاویل کو نہیں جانتے۔ یہ مولوی تو بعض دفعہ معمولی مرض میں روزہ توڑ دیتے
ہیں مگر جاہل مسلمان سخت مرض میں بھی روزہ نہیں توڑتے چاہے ان کی جان جاتی رہے۔
اب اس کے متعلق بعض مولوی استفتار کیا کرتے ہیں کہ جب اس شخص کو شرعاً افطار جائز
تھا تو اس نے کیوں افطار نہ کر کے اپنے کو ہلاک کرنے کا گناہ ہوا یا نہیں میں کہتا ہوں کہ تم نے اسکی
ہمت وپختگی کی بڑی قدر کی ... کہ گنہگار بھی کرنا چاہتے ہو۔ صاحب اس کو افطار نہ کرنے پر

اجر ملے گا کیونکہ وہ تو افطار کو ممنوع سمجھکر روزہ پر اصرار کر رہا ہے عہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ
یہ اور بات ہے کہ اسکو جہل عن الاحکام کا گناہ ہو سو اسکو اس حالت کیساتھ کوئی خصوصیت نہیں
جاہل کو جہل کا گناہ تو ہر حالت میں ہے جب تک وہ جاہل رہیگا۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ روزہ دار
جو ایک روزہ کے مقابلہ میں ہزار لاکھ روپے پر لات مار دیتا ہے یہ کیا بات ہے یہ اسی داعی قلب
کا اثر ہے جس نے روزہ کی ساتھ اتنا تعلق بڑھا دیا کہ دنیا کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں
رہی یہ بات بدون داعی قلب کے محض ارادہ و قصد سے نہیں ہوتی جو شخص محض ارادہ اور قصد
سے عمل کرتا وہ بعض وقت دنیا کو دین پر مقدم بھی کر دیتا ہے اور جو داعی قلب سے عمل کرتا
ہے وہ ایسا نہیں کر سکتا عہ (اَلَا نَادِرٌ اَوَ النَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ ۱۲) پس آیت میں زوجین
کو لباس کے ساتھ تشبیہ دیکر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم نے زوجین کے متعلق جو حقوق رکھے
ہیں ان کی تسہیل اس طرح کر دی گئی ہے کہ طرفین میں قوی تعلق رکھدیا ہے جس سے ادائے حقوق
آسان ہوگیا۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ادائے حقوق نہایت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا ۲۸
اس قدر اہتمام ہے کہ اسکی تسہیل کا ایک طریقہ سے انتظام فرمایا جو بندہ کے اختیار سے باہر تھا ۱۲
جس چیز کا اللہ تعالیٰ اہتمام فرمائیں ہمارے ذمہ اسکی نگہداشت نہایت ضروری ہے مگر
آجکل حالت یہ ہے کہ مرد اپنے حقوق تو بیوی کے ذمہ سمجھتے ہیں بیوی کے حقوق اپنے
ذمہ نہیں سمجھتے جیسے بعضا باپ اولاد پر تو اپنا حق سمجھتا ہے مگر اولاد کے حقوق اپنے اوپر نہیں
جانتا اور اس میں راز یہ ہے کہ عرفاً حکومت زندگی ہے محکومیت موت ہے۔ اسلئے حاکم زندہ ہے
وہ اپنے حقوق کو بھی زندہ سمجھتا ہے اور وصول کر لیتا ہے اور محکوم چونکہ مردہ ہے اسلئے اس کے
حقوق بھی مردہ سمجھے جاتے ہیں اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ آجکل ہر محکوم کے حقوق مردہ ہیں
اکثر سلاطین رعایا سے اپنے حقوق وصول بھی کر لیتے ہیں اور مطالبہ بھی کرتے ہیں مگر رعایا کے
حقوق ادا نہیں کرتے ان کی راحت و چین کا پورا انتظام نہیں کرتے اسی طرح سلاطین سے
نیچے جو حکام ہیں وہ بھی اپنا بھلا چاہتے ہیں محکومین کیساتھ ذرا ہمدردی نہیں کرتے ان کے بعد
باپ کی حکومت اولاد پر ہے شوہر کی بیوی پر آقا کی نوکر پر استاد کی شاگرد پر پیر کی مرید پر قریب
قریب سب کی یہی حالت ہے کہ صاحب حکومت اپنے حقوق وصول کر لیتا ہے مگر محکوم کے

عہ اعمال کا اعتبار نیتوں سے ہے۔

عہ مگر شاذ و نادر اور نادر کا حکم معدوم کا سا ہے۔

حقوق عموماً مردہ سمجھے جاتے ہیں کیونکہ وہ مطالبہ نہیں کرسکتا ہاں جو محکوم حاکم کا مقابلہ کرکے سختی کیساتھ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے تو اسکو کچھ حق مل جاتا ہے تو یوں کہئے کہ آجکل اہل حکومت یوں چاہتے ہیں کہ جب تک محکوم محکوم بنکر رہے اسوقت تک اسکو حقوق نہ دئے جائیں ہاں جس دن وہ محکوم حاکم بن کر یا کم از کم مساوی بنکر اپنے حق کا مطالبہ کرنے لگیگا اسی دن سے اسکو حقوق ادا ہونے لگیں گے کیونکہ مثل مشہور ہے جسکی لاٹھی اسکی بھینس مگر شریعت میں اس کا برعکس ہے شریعت میں ایسے مردہ حقوق کے ادا کرنے کی زیادہ تاکید ہے جنکا کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں ہے حدیث میں ہے کہ جس حق کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا حتیٰ کہ صاحب حق بھی نہیں جانتا۔ ایسے حقوق کا خدا تعالیٰ خود حساب اور مطالبہ فرمائیں گے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا کوئی مددگار نہو خدا اس کا سب سے زیادہ مددگار ہے چنانچہ مظلوم کی بددعا کا رد نہ ہونا اسی پر مبنی ہے کہ رد نہیں ہوتی مظلوم جب بددعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لانصرنك ولو بعد حين او كما قال علیہ السلام میں ضرور تیری مدد کروں گا گو کچھ دیر ہی میں اس کا ظہور ہو۔ اور اسکی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے آیۃ المواریث میں وصیت کے ذکر کو دین سے مقدم کیا ہے حالانکہ بالاجماع دین کا ادا کرنا وصیت سے مقدم ہے علماء نے اس میں یہی وجہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقدیم وصیت میں ہمکو متنبہ کیا ہے کہ جس حق کو صاحب حق زور کیساتھ وصول نہ کرسکے اس کا مطالبہ سب سے پہلے ہم کرینگے میں وصیت کا حق اس وجہ سے کہ تبرع ہے اور موصی لہ کو بعض اوقات اس کی خبر بھی نہیں ہوتی یا اس میں قوت نہیں ہوتی اسواسطے وہ مطالبہ نہیں کرسکتا اور خبر و قوت بھی ہو تب وہ مطالبہ سے شرماتا ہے کہ لوگ کہیں گے میاں کچھ تم نے دیا تھا جو تقاضا کرتے ہو معمولی بات سمجھ کر مت ٹالنا بلکہ اس کے نافذ کرنیکا پورا اہتمام کرنا اور دین گو ادا میں مقدم ہے مگر چونکہ اسکا مطالبہ کرنیوالا موجود ہے جو کاغذ سے اور گواہوں سے ثبوت دیکر مطالبہ کریگا اور مطالبہ میں شرمائیگا بھی نہیں اسلئے اس کا ذکر موخر کیا گیا غرض باپ نے اور خاوند نے یعنی اہل حکومت نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارے حقوق زندہ ہیں کیونکہ ہم وصول کرنے اور مطالبہ کرنے پر قادر ہیں اور عورتیں بیچاری کچھ نہیں کرسکتیں اسلئے ان کے حقوق مردہ سمجھے جاتے ہیں۔ ہاں عورتیں ایک کام تو کرتی ہیں کہ انکو کوسنا خوب آتا ہے جب کبھی خاوند ان کو ستاتا ہے تو ان کی زبان خوب چلتی ہے کہ جھاڑو مارو

۲۹
۱۴

آگ لگا نگوڑا اگر اسکے منہ جھاڑو لگے نہ آگ لگے ہاں دل میں ان باتوں سے ضرور آگ لگی ہے تو
وہ پہلے سے بھی زیادہ مارتا ہے اور یہ بھی برابر زبان کو تیز کرتی جاتی ہیں عورتیں کہا کرتی ہیں کہ
کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان چلے۔ مگر صاحبو! اس زندگی میں کچھ لطف نہیں کہ چار دن ہنس بول لئے
اور دس دن کو لڑ جھگڑ لئے۔ لطف زندگی جبھی ہے کہ جانبین سے ایک دوسرے کے حقوق
کی پوری رعایت ہو مگر مردوں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم عورتوں کو کھانا کپڑا دیتے ہیں تو بس
اس سے سارا حق ادا ہو گیا اور اس کے بعد جو کچھ حقوق ہیں عورتوں ہی کے ذمہ ہیں
ہمارے ذمہ کچھ نہیں مگر میں کہتا ہوں کہ تمہارے کھانے کپڑے کے عوض میں بیبیاں
تمہاری اس قدر خدمت کرتی ہیں کہ اتنی تنخواہ میں کوئی نوکر یا ماما ہرگز نہیں کر سکتی جسکو
شک ہو وہ تجربہ کر کے دیکھ لے بدون بیوی کے گھر کا انتظام ہو ہی نہیں سکتا چاہے تم
لاکھ خادم رکھو۔ ہم نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے جنکی معقول تنخواہ تھی مگر بیوی نہ تھی نوکروں
کے ہاتھ میں خرچ تھا تو ان کے گھر کا خرچ اس قدر بڑھا ہوا تھا جسکی کچھ حد نہیں نکاح ہی کے بعد ۴۴۰
گھر کا انتظام ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بیوی کچھ بھی گھر کا کام نہ کرے صرف انتظام اور دیکھ بھال ۱۷
ہی کرے تو یہی اتنا بڑا کام ہے جس کی دنیا میں بڑی بڑی تنخواہیں ہوتی ہیں اور منتظم کی بڑی
عزت وقدر کی جاتی ہے۔ دیکھئے وائسرائے ظاہر میں کام کچھ نہیں کرتا کیونکہ اس کے تحت
میں اتنا بڑا عملہ کام کرنے والا ہوتا ہے کہ اسکو خود کسی کام میں ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں
ہوتی مگر اسکی جو اتنی بڑی تنخواہ اور عزت ہے محض ذمہ داری اور انتظام کی وجہ سے پس بیویوں
کا یہی کام اتنا بڑا ہے جس کا عوض نان ونفقہ نہیں ہو سکتا مگر ہم تو شریف زادیوں کو دیکھتے
ہیں وہ خود بھی اپنے ہاتھ سے گھر کا بہت کام کرتی ہیں خصوصاً بچوں کو بڑی محنت سے
پرورش کرتی ہیں یہ وہ کام ہے کہ تنخواہ دار ماما کبھی بیوی کی برابر نہیں کر سکتیں۔ اور یہ
ہندوستان کی عورتیں خصوصاً ہمارے اطراف کی عورتیں تو واقعی جنت کی حوریں ہیں
جن کی شان میں عرباً یعنی عاشقات لازواج آیا ہے چنانچہ مردوں پر فدا ہیں کہ مردوں کی
ایذا کو ہر طرح سہتی ہیں اور صبر کرتی ہیں ورنہ بعض مقامات میں تو روزانہ خلع طلاق ہوتا رہتا ہے
اور عرب میں وہاں سے بھی زیادہ سنے وہاں ایک اکیس سالہ لڑکی کو دیکھا اس کے ... حال ... تھا۔

وہاں تو یہ حالت ہے کہ جہاں عورت مرد میں نااتفاقی ہوئی اور عورت نے قاضی کے یہاں دعویٰ دائر کیا اور انوثت کا خاصہ ہے کہ حاکم عورت ہی کو مظلوم سمجھتا ہے اس لئے عموماً ڈگریاں انہی کو ملتی ہیں اور فوراً مرد کو طلاق یا خلع پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ حالت ہے کہ اول تو کوئی عورت طلاق و خلع کو گوارا نہیں کرتی اور جو سخت مصیبت میں خلع کی درخواست کرتی بھی ہے تو یہ حال ہوتا ہے کہ کانپور میں قاضی صاحب سے (جو نکاح خواں قاضی تھے) خود خلع کی درخواست کی چنانچہ قاضی صاحب کے کہنے سے مرد خلع پر راضی ہو گیا پھر جب اس نے عورت کو طلاق دی ہے تو حالانکہ خود اسی کی درخواست پر دی تھی لیکن طلاق دیتے ہی وہ دہاڑیں مار کر روتی تھی کہ ہائے میں برباد ہو گئی ہائے میں تباہ ہو گئی۔

اور ہندوستان کی عورتوں میں حوروں کی ایک اور صفت بھی ہے یعنی قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ
۳۱ چنانچہ ان کو اپنے شوہر کے سوا کسی کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ بعض عورتوں کو
۱۵ عمر بھر غیر مرد کا وسوسہ بھی نہیں آیا اور اگر ان کو کسی غیر کا میلان اپنی طرف معلوم ہو جائے تو اس سے سخت نفرت ہو جاتی ہے یہاں کی یہی تہذیب ہے۔ مگر یورپ کی تہذیب یہ ہے کہ جو اپنے کو چاہے ہم کو بھی اس کی طرف جھکنا چاہئے اسلئے اگر وہاں کی عورتیں کسی کو اپنی طرف مائل دیکھتی ہیں اس کی خوب خاطر مدارات کرتی ہیں۔ اور ہندوستان کی عورتوں کو جو اپنے مردوں کے ساتھ اس قدر تعلق ہے یہ زمین ہند کا خاصہ ہے اسی لئے بھاشا وغیرہ میں جو عاشقانہ دوہرے ہیں ان میں عورت کی طرف سے مرد کو خطاب ہوتا ہے۔ اور ستی کی رسم کا منشا بھی یہی تعلق ہے گو یہ غلو ہے تو ہندوستان کا مذاق میلان النساء الی الرجال ہے۔ اور عرب کا مذاق میلان الرجال الی النساء ہے عرب کا مرد عورت کو عاشقانہ خطاب کرتا ہے اور سب سے گندہ مذاق فارسی کا ہے یعنی میلان الرجال الی الرجال فارسی شاعری میں مرد مرد کو خطاب کرتا ہے کہ تو حیرت ہے کہ جہاں کی عورتیں دنیا بھر کی عورتوں سے زیادہ مردوں کی تابع و مطیع ہیں وہاں ہی یہ ظلم ہے کہ ان کے حقوق ادا نہیں کئے جاتے۔ اور جہاں روزانہ خلع و طلاق ہوتا رہتا ہے اور قاضی کے دروازہ پر

عورتیں کھڑی رہتی ہیں وہاں کے مردوں کا مزاج درست رہتا ہے۔ اب میں ان حقوق کی تفصیل تو نہیں کر سکتا کیونکہ وقت مختصر ہے اور نہ تفصیل کی ضرورت ہے کیونکہ کتابوں میں حقوق ازواج مفصل مذکور ہیں البتہ اسوقت ایک قصہ یاد آ گیا اسکو بیان کئے دیتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ خاوند اور باپ جو یہ سمجھتا ہے کہ سارے حقوق میرے ہی عورت پر یا اولاد پر ہیں مجھ پر کوئی حق ان کا نہیں یہ غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایک باپ نے اپنے بیٹے پر دعویٰ کیا کہ یہ میرے حقوق ادا نہیں کرتا حضرت عمرؓ نے لڑکے سے دریافت کیا اس نے کہا اے امیر المومنین کیا باپ ہی کا سارا حق اولاد پر ہے یا اولاد کا بھی باپ پر کچھ حق ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اولاد کا بھی باپ کے ذمہ حق ہے کہا میں ان حقوق کو سننا چاہتا ہوں۔ فرمایا اولاد کا حق باپ پر یہ ہے کہ اولاد حاصل کرنے کیلئے شریف عورت تجویز کرے اور جب اولاد پیدا ہو ان کا نام اچھا رکھے اور جب ان کے ہوش درست ہو جائیں ان کو تہذیب اور تعلیم دین دے۔ لڑکے نے ۴۲
کہا کہ میرے باپ نے ان حقوق میں سے ایک حق بھی ادا نہیں کیا کیونکہ اس نے ایسی باندی کو میری ماں بنایا ہے جو آوارہ گرد تھی اور جب میں پیدا ہوا تو میرا نام جُعل رکھا جسکے معنی ہیں گوہ کا کیڑا) اور مجھے دین کا ایک حرف نہیں سکھلایا مجھے دینی تعلیم سے بالکل کورا رکھا یہ سنکر حضرت عمرؓ کو باپ پر بہت غصہ آیا اور اسکو بہت دھمکایا اور یہ کہکر مقدمہ خارج کر دیا کہ جاؤ پہلے تم اپنے ظلم کی مکافات کرو اسکے بعد لڑکے کے ظلم کی فریاد کرنا خلاصہ یہ کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ میں زوجین کو لباس سے تشبیہ دیکر ایک اشارہ تو اس طرف فرمایا کہ ہم نے ادائے حقوق کی تسہیل کیلئے زوجین میں ایسا قوی تعلق پیدا کیا ہے کہ جسکی وجہ سے گویا دونوں متحد ہیں کہ ایک دوسرے کو شتمل ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ دو قالب یک جان ہیں اور دوسرا اشارہ اس تشبیہ میں اس طرف فرمایا کہ جیسے لباس میں ستر کی شان ہے اسی طرح عورت مرد کی ساتر ہے اور مرد عورت کیلئے ساتر ہے اور یہ ستر کئی طرح پر ہے ایک اس طرح کہ ہر ایک دوسرے کی عیوب کیلئے ساتر ہے کیونکہ نفس میں جو تقاضے پیدا ہوتے ہیں اگر ان کے پورا ہونے کیلئے ایک محل بھی تجویز نہ کیا جائے تو جیر انسان اپنے تقاضے کو ہر جگہ پورا

کریگا اور اس طرح اس کی بے حیائی کا عیب نمایاں ہو جائے گا اسی لئے شریعت نے نکاح تجویز کیا ہے جسمیں تقاضائے نفس کو پورا کرنے کے لئے ایک محل کی تعیین ہے اور اس تجویز میں شریعت کا عقل سے زیادہ خیر خواہ ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اگر عقل سے استفتا کیا جائے تو عقل نکاح کو تجویز نہیں کر سکتی کیونکہ ایک اجنبی مرد کے سامنے ایک اجنبی عورت کا اس طرح بیحجاب ہو جانا اور اس کے ساتھ مرد کا بیحجاب ہو جانا عقل کے نزدیک بالکل قبیح ہے مگر عقل کی اس تجویز پر عمل کیا جاتا تو زیادہ فتنہ برپا ہوتا کہ اب تو ایک ہی اجنبی مرد عورت بے حجاب ہو رہے تھے پھر نہ معلوم کتنے مرد اجنبی عورتوں کے ساتھ بے حجاب ہوتے اور کتنی عورتیں اجنبی مردوں کے سامنے بے حجاب ہوتیں کیونکہ آخر مرد عورت ایک دوسرے سے کہاں تک صبر کرتے ان عواقب پر نظر کر کے شریعت سماویہ نے نکاح کو تجویز کیا تاکہ اس تقاضے کے پورا ہونے کا محل محدود و متعین ہو کر فتنہ نہ بڑھے اور یہی علامت ہے مذہب کے سماوی ہونے کی کہ اسکی عواقب پر محیط ہوتی ہے اور جو قوانین محض عقل سے بنائے جاتے ہیں ان کی نظر عواقب پر محیط نہیں ہوتی اسی لئے بعض جگہ شریعت کا حکم بظاہر عزیمت کے خلاف معلوم ہوتا ہے مگر عواقب کے اعتبار سے وہی افضل ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مبالغہ فی العمل سے منع فرمایا ہے اور جب بعض صحابہ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات دریافت کئے اور سنکر اپنے نزدیک ان کو تھوڑا کام سمجھا اور یہ کہا کہ حضور تو بالکل بخشے بخشائے ہیں ہمکو زیادہ کام کرنا چاہیئے اور یہ بھی حضرات صحابہ کے حسن مذاق کی دلیل ہے کہ ان کو اعمال صالحہ کا بہت شوق تھا ورنہ ہم ہوتے تو یوں کہتے کہ جب حضور پیغمبر ہو کر اتنا کام کرتے ہیں تو ہم کو تو اس سے بھی کم کافی ہے ہم تو چھوٹے درجہ کے ہیں ہم کو تھوڑا عمل بھی کافی ہے جب حضورؐ کو صحابہ کا قول معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا أَمَّا أَنَا فَأَقُومُ وَأَرْقُدُ وَأَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ هٰذَا مِنْ سُنَّتِي وَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي أَوْ كَمَا قَالَ ؛ اب ظاہر بین سمجھتا ہے کہ حضورؐ نے تکثیر عمل سے منع فرما دیا مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ درحقیقت حضورؐ نے تقلیل عمل سے منع فرمایا ہے کیونکہ مبالغہ فی العمل کا مآل تعطل ہے۔ ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ محنت

میں زیادتی نہ کرنا یہ کامل اور عاقل کی تعلیم ہے اور اناڑی نویوں کہتا ہے کہ جتنی محنت ہوسکے
کرو مگر مولانا فرماتے تھے کہ اگر سبق کو دس دفعہ کہنے کو جی چاہے تو ایک دفعہ کا شوق باقی
رکھ لو جیسے کھانے میں اطبار کہتے ہیں کہ تھوڑی سی بھوک رکھکر کھانا چاہیئے ورنہ ایک دفعہ ٹھونس
کر کھانے کا انجام یہ ہوگا کہ دوسرے وقت بھوک مر جائے گی پھر اگر دوسرے وقت اگر بے بھوک
کھا لیگیا تو معدہ کا ناس ہو جائیگا۔ مگر بعض لوگ ایسے بے تُکے ہوتے ہیں کہ مولوی فیض الحسن
صاحب سہارنپوری کے پاس ایک بدہضمی کا مریض آیا آپ نے اس کے لئے نسخہ لکھنا چاہا
تو وہ کہتا ہے کہ اُس کے پینے کی گنجائش ہوتی تو اور کھانا ہی نہ کھاتا۔ اسی طرح یہاں ہمارے قصبہ میں
ایک صاحب تھے وہ کھاتے تھے اور قے کرتے تھے اور قے کر کے پھر کھاتے تھے یہ تو واہیات
ہے بلکہ موجبِ ہلاکت ہے پس اعتدال یہ ہے جو حدیث میں ہے ثُلُثٌ لِطَعَامِهٖ وَثُلُثٌ لِشَرَابِهٖ وَثُلُثٌ
لِنَفَسِهٖ ایک تہائی کھانے کے لئے اور ایک پانی کے لئے اور ایک تہائی سانس کیلئے اور ایک ثلث
کی قید ان اتفاقی ہے مطلب یہ ہے کہ کچھ گنجائش رکھکر کھانا چاہیئے یہی تعلیم مولینا کی لکھنے پڑھنے
کے متعلق تھی کہ تھوڑا سا شوق باقی رکھکر محنت کیا کرو۔ پھر مولانا نے فرمایا کہ تم نے چکی بھی پھرائی ہے ۱۸
ہم نے کہا حضرت نہیں فرمایا تم نے دنیا میں خاک دیکھا۔ دیکھو چکی پھرانے کا قاعدہ یہ ہے کہ اس پر
سے سارا ڈورانہ اتار اجائے اگر ڈورا سارا اُتر جائیگا تو پھر از سر نو چڑھانا پڑے گا اور اگر تھوڑا سا ڈورا اس پر
لپٹا رہے تو نہایت آسانی سے اسی پر لوٹ آتی ہے۔ یہی قاعدہ شارع نے مقرر کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا یعنی عمل شوق باقی رکھکر کرو اتنا عمل نہ کرو کہ سارا شوق ایک دم سے ہی پورا
کر لو بلکہ نفس پر آسانی کرو زیادتی نہ کرو عبادت تحمل کے موافق کرو تحمل سے زیادہ نہ کر دیں یہ کہہ رہا
تھا کہ شریعت کی نظر عواقب پر ہوتی ہے گو ظاہر میں خلاف عزیمت ہو مگر انجام کے لحاظ سے وہی
افضل ہوتا ہے۔ چنانچہ عقل تو مطلقاً حیا کو مطلوب کہتی ہے اور نکاح کو خلافِ حیا بتلاتی ہے
مگر شارع نے قانونِ نکاح حیا ہی کی حفاظت کے لئے مقرر کیا ہے کیونکہ اگر ایک جگہ بھی حیا
کو ترک نہ کیا جائے تو پھر انسان پورا بے حیا ہو جائے گا تو زوجین میں سے ہر ایک دوسرے
کے لئے ساتر ہو گیا یعنی ایک دوسرے کے لئے معاصی سے ساتر ہے اسی فائدہ کو حدیث میں
اِس طرح بیان کیا گیا ہے مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ

اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتے تم اکتا جاتے ہو

لِلْفَرْجِ ہے جس کو اسباب نکاح میسر ہوں اُسے شادی کرلینا چاہیئے کیونکہ نکاح نگاہ کو بہت نیچا
کردیتا ہے اور عفت کو بہت محفوظ کردیتا ہے یعنی اِس سے بصر و عفت آسانی سے محفوظ ہوجاتی
ہے۔عادت غالبہ یہی ہے کہ نکاح سے طبیعتِ سلیمہ کو عفت بآسانی حاصل ہوجاتی ہے باقی جو
خبیث الطبع ہو جسے ایک نکاح یا دو نکاح یا چار نکاحوں سے بھی عفت حاصل نہ ہو بلکہ
متعہ یا زنا وغیرہ سے پھر بھی گوہ کھاتا پھرے اُس کا یہاں ذکر نہیں کیونکہ یہاں آدمیوں کا ذکر
ہے جانوروں اور بندروں کا ذکر نہیں ۔سہولت عفت بالنکاح کی حقیقت یہ ہے اور یہی
سبب سہولت کی حقیقت ہے کہ تقاضا کی دو قسمیں ہیں ایک تقاضا شدید ایک تقاضا
مُطلق۔پس مطلق تقاضا تو کسی طرح بھی زائل نہیں ہونا چاہیئے کوئی کیسا ہی مجاہدہ کرے اور چاہے
کیسی ہی دوائی سرد استعمال کی جائے ہم نے ایک ستر برس کے بڈھے کو دیکھا ہے جسے ایک
لڑکے سے محبت تھی جو اُن کے پاس نوکر تھا حالانکہ وہ خود کسی مصرف کے نہ تھے مگر اُس کی
طرف دیکھنے کا تقاضا تھا اور تقاضا بشہوت تھا جو یقیناً حرام تھا وہ مجھ سے اپنا حال بیان کرکے
19 علاج کے طالب ہوئے میں نے کہا کہ اس لڑکے کو اپنے سے الگ کردو کہنے لگے یہ تو مشکل
ہے میں نے کہا پھر علاج بھی مشکل ہے مشکل مرض کا آسان علاج تو مجھکو آتا نہیں لوگ یہ چاہتے
ہیں کہ علت بھی لگی لپٹی رہے اور شفا بھی ہوجائے تو یہ نہیں ہوسکتا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ
علاج ہی کے طالب نہیں اور اپنے کو مریض ہی نہیں سمجھتے اگر امراضِ باطنہ کو بھی مثل امراضِ
ظاہرہ کے مہلک سمجھتے تو دوائی تلخ سے ہرگز نہ گھبراتے ۔آخر ظاہری امراض کے علاج میں کس
قدر مشقتیں برداشت کی جاتی ہیں صرف اس وجہ سے کہ اسکو مرض اور سبب ہلاکت سمجھا جاتا ہے
امراضِ باطنہ کو سببِ ہلاکت نہیں سمجھا جاتا یا بربادیٔ دین کی پرواہ ہی نہیں تو میں نے اُن بڑے
میاں سے کہا کہ اِس کا علاج صرف بعد ہے اور وہ بھی کلی بعد کہ اول تو اُس کو اپنے سامنے
سے دُور کردو پھر ذہن سے بھی دُور کردو یعنی بالقصد اُس کا تصور نہ کرو جس کا طریقہ یہ ہے
کہ کسی اور چیز کا تصور اپنے ذمہ لازم کرلو یا تو عذابِ جہنم کا تصور کیا کرو۔بعض کو اس
سے بہت نفع ہوا ہے یا کسی بدشکل آدمی کا تصور کیا کرو بعض کو اِس سے بھی نفع ہوا ہے۔
غرض مجاہدہ سے یہ نہیں ہوتا کہ تقاضا بالکل زائل ہوجائے بلکہ یہ تو نہ بڑھاپے سے ہو نہ کسی دوا

سے ہو نہ تعلیل غذا سے ہو لیس مجاہدہ کا نفع یہ ہے کہ تقاضا خفیف ہو جاتا ہے کہ پہلے مقاومت دشوار تھی اب آسان ہو گئی۔ اب ذرا سے اشارہ میں نفس مغلوب ہو جاتا ہے پہلے سخت سزا اور جرمانوں سے بھی درست نہ ہوتا تھا۔ اور اگر تقاضا بالکل زائل ہو جائے تو ثواب کیوں کر ہو گا ثواب تو اسی واسطے ملتا ہے کہ آدمی تقاضے کا مقابلہ کر کے نیک کاموں پر جما رہتا ہے بعض لوگ اپنے امراض کو بلی کی گوہ کی طرح چھپائے رہتے ہیں کسی محقق پر ظاہر نہیں کرتے یاد رکھو اس طرح شفا حاصل نہیں ہو سکتی ؎

ما حال دل را با یار گفتیم … نتواں نہفتن درد از طبیباں

اور اس سے پہلے جو فرمایا ہے ؎

چنداں کہ گفتیم غم با طبیباں … درماں نکردند مسکین غریباں

وہاں طبیب سے مراد ظاہری طبیب ہے کہ ان حکیموں سے درد دل کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اور نتواں نہفتن درد از طبیباں میں طبیب باطن مراد ہے کہ درد دل کو ان سے نہ چھپانا چاہئے بعض اس خیال سے اپنے امراض کو ظاہر نہیں کرتے کہ وہ بزرگ ہم کو ذلیل سمجھیں گے یا کسی اور سے کہہ دیں گے مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ تم کو تو کیا ذلیل سمجھتے جب وہ کتے کو بھی اپنے سے افضل سمجھتے ہیں دوسرے وہ امین ہوتے ہیں کسی کا راز دوسروں پر کبھی ظاہر نہیں کرتے ۲۰
بعض لوگ اس خیال سے اپنا حال ظاہر نہیں کرتے کہ اس میں اظہار معصیت ہے سو میں کہتا ہوں کہ معصیت تو فعل ہے افعال کے اظہار کی ضرورت نہیں بلکہ مواد کو بیان کرو اور مواد کا بیان کرنا معصیت نہیں۔ اور اگر کسی وقت شیخ افعال کی بھی تحقیق کرے اور علاج کیلئے تحقیق افعال کی ضرورت سمجھے تو اسوقت افعال کا بھی ظاہر کرنا شیخ پر جائز ہے اور اسکی بالکل وہی مثال ہے جیسے بدن مستور کا کھولنا ڈاکٹر اور جراح کے سامنے جائز ہے جبکہ پوشیدہ جگہ زخم ہو۔ مشائخ اعمال صالحہ کی وجہ سے بابرکت ہوتے ہیں اسلئے ان کی تعلیم میں بھی برکت ہوتی ہے جسکی وجہ سے جلد شفا ہو جاتی ہے خود کتابیں دیکھکر علاج جان لینا کافی نہیں۔ پس یہ جو مشہور ہے کہ مجاہدہ سے نفس مر جاتا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ ضعیف ہو جاتا ہے کہ اب اس کا مقابلہ آسان ہو جائے گا اور مقابلہ تو پہلے بھی کر سکتا تھا اس وقت بھی مقاومت قدرت

میں تھی مگر مجاہدہ سے پہلے تقاضائے نفس کی مقاومت میں دشواری ایسی ہوتی ہے کہ
انسان یوں سمجھ لیتا ہے کہ میں اس وقت مجبور ہو گیا ہوں حالانکہ یہ خیال غلط ہوتا ہے
مجبور تو نہیں ہوتا ہاں مغلوب ہو جاتا ہے حدیث میں لفظ اَغَضُّ واَحْصَنُ میں اسطرف
اشارہ ہے کہ مطلق غض وحصن نکاح سے پہلے بھی ممکن تھا اگر آدمی ہمت سے کام لے تو بدوں
نکاح کے بھی نگاہ نیچی رکھ سکتا اور اپنی عفت کو بچا سکتا ہے مگر ایسے ہمت والے تھوڑے
ہی ہیں زیادہ نہیں ہیں اسلئے شریعت نے خخل کے فتوے کو رد کرکے یہ حکم دیا ہے کہ نکاح
کرو اور بیوی کے سامنے حیا کو الگ کرو ایسا غلو فی الحیا محمود نہیں کہ بیوی میاں سے یا
شوہر بیوی سے بھی حیا کرے اس ایک محل میں ترک حیا کا انجام یہ ہوگا کہ دوسرے مواقع
میں حیا وعفت محفوظ رہے گی پھر معاصی کا تقاضا شدید نہ ہوگا جو نفس کو سکون ہو جائیگا۔
باقی اگر کوئی یہ چاہے کہ نکاح کے بعد معاصی کا وسوسہ بھی نہ آئے ذرا بھی تقاضا نہ ہو تو یہ
نہیں ہو سکتا۔پس تشبیہ باللباس سے ایک اشارہ اس طرف ہوا کہ شوہر بیوی کا اور بیوی
شوہر کی ساتر و محافظ ہے یعنی ایک دوسری کی حیا وعفت کو محفوظ رکھتا اور گناہوں سے ۲۱
بچاتا ہے بشرطیکہ کوئی خود بھی بچنا چاہے اور جو گرنا ہی کھانا چاہے اس کے لئے کوئی تدبیر بھی
نافع نہیں۔یہ دو وجہ تشبیہ تو علماء کے کلام میں منقول ہیں۔ایک وجہ تشبیہ عجیبہ میرے ذہن
میں یہ آئی ہے کہ جیسے بدون کپڑے کے انسان سے صبر نہیں ہو سکتا اسی طرح بدون
نکاح کے مرد وعورت کو صبر نہیں آسکتا کوئی تقاضائے نفس ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ
اعانت وغیرہ میں عورت اپنے خاوند کی محتاج ہے اور خدمت وراحت رسانی میں مرد
عورت کا محتاج ہے چنانچہ بیماری کے زمانہ میں بیوی سے زیادہ کوئی خدمت نہیں کر سکتا
ایک بوڑھے میاں نے ستر اسی برس کی عمر میں پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کا
قصد کیا حالانکہ انکی بہو بیٹیاں بہت تھیں سب نے منع کیا کہ تمہاری خدمت کو ہم موجود
ہیں نکاح کی کیا ضرورت ہے بڑے میاں نے کہا کہ بیوی کی برابر کوئی بھی خدمت

عہ جس طرح بدون لباس کے صحت خراب ہو جاتی ہے کہ کبھی گرمی ستاتی ہے کبھی سردی اسی طرح بدون زوج کے صحت اچھی نہیں رہتی جو لوگ بے نکاح رہتے ہیں علی ہذا جو عورتیں بے خاوند کے ہیں اکثر امراض وآلام میں مبتلا رہتی ہیں ۱۲ منہ

نہیں کرسکتا اور موقع پر میں تم کو بتلادوں گا چنانچہ نکاح ہوا اور چند سال کے بعد بڑے میاں
کو ایک مرض ہوا اُس میں دست آنے لگے تو ساری بہو بیٹیاں تعفن سے گھبرا کر الگ ہو گئیں
اور بیوی کی یہ حالت تھی کہ اُن کو پیروں پر بٹھلا کر پاخانہ کراتی اور استنجا کر کے کپڑوں کو پاک و
صاف کرتی دن میں بیس بیس دست بھی آتے تو وہ ہر دفعہ اسکو پاک وصاف کر کے لٹاتی
تھی اِس وقت بڑے میاں نے کہا کہ میں نے اس دن کے واسطے نکاح کیا تھا دیکھ لو آج
اُس کے سوا میرے کوئی کام نہیں آیا پس لباس کی طرح مرد کو عورت سے استغنا نہیں عورت
کو مرد سے استغنا نہیں مرد عورت کا معاون ہے عورت مرد کی خادم ہے۔ ایک وجہ تشبیہ
میرے ذہن میں اور آئی کہ جس طرح لباس زینت ہے اُسی طرح زوجین میں عورت مرد کے لئے
اور مرد عورت کے لئے زینت ہے۔ لباس کا زینت ہونا تو خود نص سے ثابت ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ
خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عہ وَقُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ۔ عہ میں بالاتفاق
زینت سے مراد لباس ہے اوپر سے لباس ہی کا ذکر ہو رہا ہے چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے
یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا سہ یہاں گو لباس کو صراحۃً
زینت نہیں کہا گیا ہے مگر زینت کا جو نتیجہ ہے وہ یہاں بھی مذکور ہے یعنی یُوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ
کہ ہم نے تمہارے لئے ایسا لباس ایجاد کیا جو تمہاری بدنمائی کو ڈھانکتا ہے اور یہی زینت
کا حاصل ہے کہ بدنمائی اور عیوب پوشیدہ ہو جائیں اور ریش عہ سے مراد پرندوں کے پر ہیں کہ وہ
حیوانات کے لئے زینت ہیں۔ یہاں شاید کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ تم نے جو لباس کو
زینت کہا ہے اور آیت میں اس پر امتنان فرمایا ہے تو کیا زینت کے لئے لباس پہننا جائز ہے
جواب یہ ہے کہ جائز ہے اور یہ بھی لباس کی ایک منفعت ہے اور منافع لباس میں یہ تفصیل
ہے کہ اِس منفعت کے چار درجے ہیں ایک درجہ ضرورت کا ہے یہ تو ضروری ہے اس کے
بعد ایک درجہ آسائش کا ہے مثلاً ضرورت تو دو آنے گز کپڑے میں رفع ہو سکتی تھی مگر اس سے
تکلیف ہوتی اِس لئے چار آنہ آٹھ آنہ گز کا نرم کپڑا پہن لیا یہ بھی جائز ہے ایک درجہ آرائش کا ہے یعنی زینت کا

عہ بعض نے ریش سے مراد مال لیا ہے اور لباس کے ساتھ اس کا تعلق یہ ہے کہ مال بھی لباس کی طرح
عیب پوش ہے مالداروں کے عیوب پر کسی کی نظر نہیں ہوتی الا قلیل ۱۲ ظ۔

عہ اے ایمان والو اپنا لباس پہن لیا کرو۔
عہ آپ فرما دیجئے کہ کس شخص نے اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے کپڑوں کو جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے حرام کیا ہے پارہ ۸ رکوع ۱۰ ۲۲
سہ اے اولاد آدم ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے پردہ دار بدنوں کو بھی چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے۔

مثلاً آرام کے لئے تو گبرون بھی کافی تھی تم نے زینت اور دل کی خوشی کے لئے سرج کا کپڑا پہن لیا، یہ بھی مباح ہے اس کے بعد نمائش کا درجہ ہے یعنی ریا کا، یہ حرام ہے یعنی اس نیت سے عمدہ کپڑا پہننا کہ لوگ دیکھکر ہم کو بڑا آدمی سمجھیں گے پس کل چار درجے ہیں ضرورت آسائش آرائش۔ نمائش جن میں سے حرام صرف ایک ہے باقی سب مباح ہیں اور درجوں کے عنوانات میں قافیہ بھی ہے صرف ایک درجہ بدون قافیہ کے ہے اگر ضرورت کے معنی کا بھی قافیہ مل جاتا تو اور زینت ہوجاتی مگر آرائش اور نمائش میں فرق کرنا دشوار ہے بہت لوگ نمائش کے لئے عمدہ لباس پہنتے ہیں اور دل کو یوں سمجھا لیتے ہیں کہ ہم تو اپنا جی خوش کرنے کے لئے پہنتے ہیں میں اس کے لئے ایک معیار بیان کرتا ہوں اس سے فرق واضح ہو جائیگا وہ یہ کہ جو شخص عمدہ لباس پہننے میں نمائش کی نیت کا انکار کرتا ہے اُس کو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ صرف محافل ومجامع ہی میں عمدہ لباس پہنتا ہے یا خلوت میں بھی اچھا لباس پہنتا ہے جو لوگ نفیس المزاج ہیں اور صرف اپنا جی خوش کرنے کے لئے عمدہ لباس پہنتے ہیں وہ خلوت میں بھی عمدہ ہی لباس پہنتے ہیں اور جو نمائش کیلئے عمدہ لباس

۲۴۳ پہنتے ہیں اُن کی ایک اچکن (اچکن نہیں) بلکہ ایک شیروانی کھونٹی پر الگ لٹکی رہتی ہے اور ایک گرگابی جُدا رکھی رہتی ہے (ان لباسوں کے نام سے بھی تو زندگی ٹپکتی ہے کسی کے اول میں شیر ہے تو کسی میں گرگ ہے) غرض یہ شیروانی اور گرگابی باہر نکلتے ہوئے پہنی جاتی ہے اور اُوپر سے نکٹائی لگائی جاتی ہے یعنی ناک کٹائی اور اس کے ساتھ بوٹ سوٹ بھی پہنا جاتا ہے ہمیں تو نام بھی اِن لباسوں کے یاد نہیں اور خدا کرے کبھی یاد نہ ہوں غرض محفلوں اور بازاروں میں تو یوں بن کر نکلتے ہیں اور خلوت میں گھر کے اندر یہ ایسے رہتے ہیں جیسے چمار۔ تو جنکی یہ حالت ہے وہ عمدہ لباس محض ریا و نمائش کے لئے پہنتے ہیں۔ آجکل ایک لباس اور نکلا ہے جس کا نام نکر ہے جس میں گھٹنے کھلے رہتے ہیں اس کو پہن کر آدمی شریف تو معلوم ہوتا نہیں بلکہ نوکر معلوم ہوتا ہے نام بھی نکر جو نوکر سے ملتا ہوا ہے۔ نہ معلوم ان لوگوں کی حیا وغیرت وشرافت کہاں چلی گئی جو محض یورپ کی تقلید میں ایسا لباس پہنتے ہیں اور محض تقلید یورپ ہی اس کا سبب ہے ورنہ اس میں نہ کوئی منفعت ہے نہ کوئی زینت واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر کسی وقت یورپ میں نک

لمہ اور اگر بڑائی اور تکبر کی نیت نہ ہو بلکہ صرف اپنے کو [illegible] مقصود ہو تو یہ نیت بھی جائز ہے ۱۲ ظ

گیا نافیشن میں داخل ہو جائے تو ہندوستانی ناک بھی کٹوانے لگیں گے چنانچہ مسلمان ڈاڑھی تو منڈوانے لگے اور اب سنا ہے کہ ڈاکٹروں میں اس مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے بعض ڈاکٹروں نے ڈاڑھی منڈانے کو مضر ثابت کیا ہے۔ اس پر میں نے الہ آباد میں کہا تھا کہ جنٹلمینوں کو اس وقت جلدی سے ڈاڑھی رکھ لینا چاہیے کیونکہ بعض ڈاکٹروں نے اسکے منڈانے میں مضرت ثابت کی ہے اگر سب کا اس پر اتفاق ہو گیا تو یورپ والے ضرور ڈاڑھیاں بڑھائیں گے اور اس وقت ان کی تقلید میں تم بھی بڑھاؤ گے تو پرانے مسلمان تم پر ہنسیں گے کہ یہ ڈاڑھی تقلید یورپ کی ہے۔ تم ڈاکٹروں کے اتفاق سے پہلے ہی بڑھا لو تاکہ لوگ تم کو نہ ہنسیں۔ غرض جس طرح لباس زینت ہے اسی طرح شوہر بیوی کی زینت ہے اور بیوی اپنے مرد کیلئے زینت ہے۔ عورت سے تو مرد کی زینت یہ ہے کہ بیوی بچوں والا آدمی لوگوں کی نظر میں معزز ہوتا ہے اگر کسی سے قرض مانگے تو اسکو قرض بھی مل جاتا ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اسکی اکیلی جان نہیں بلکہ آگے پیچھے کو اور بھی آدمی ہیں یہ کہاں جا سکتا ہے اور اکیلے آدمی کو ادھار قرض نہیں ملتا

۲۷ اس کی عزت دنیا والوں کی نظر میں کم ہوتی ہے۔ دوسرے لوگ بیوی والے کو سانڈ نہیں سمجھتے اپنی بیوی بچوں پر اس کی نفسانی خواہش کا خوف نہیں کرتے اور بے نکاحے آدمی کو مثل سانڈ کے سمجھتے ہیں اس کی طرف سے ہر شخص کو اپنی بیوی بچیوں پر خطرہ ہوتا ہے۔ اور مرد سے عورت کی عزت یہ ہے کہ لوگ اس کے اوپر کسی قسم کا شبہ نہیں کرتے۔ میاں چاہے پاس رہے یا پردیس میں رہے جتنے بال بچے ہوں گے سب اسی کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے رہیں گے۔ اور نکاح سے پہلے عورت کی عزت و آبرو ہر وقت خطرہ میں رہتی ہے۔ یہ تو وہ اشارات تھے جو لباس کے اوصاف ظاہرہ سے

عہ میں کہتا ہوں کہ لباس میں ایک وصف ظاہری اور ہے وہ یہ کہ لباس ضروریات خارجیہ منفصلہ میں سے ہے اور اس کا درجہ ضروریات داخلیہ متصلہ کے بعد ہے چنانچہ غذا کا اہتمام لباس کے اہتمام سے مقدم ہے پس اس تشبیہ میں اسطرف اشارہ ہے کہ مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کو مثل لباس کے سمجھیں یعنی وہ ایک خارجی اور منفصل ضرورت کی چیز ہے اس سے تعلق اتنا ہی رکھیں جتنا لباس سے تعلق ہوتا ہے زیادہ اس کو دل میں جگہ نہ دیں وعلی ہذا عورتوں کو بھی مردوں سے اتنا ہی تعلق رکھنا چاہیے تاکہ طلاق و موت کے وقت زیادہ کلفت نہ ہو اور تاکہ اس کی محبت بڑھ کر احکام الٰہیہ میں اختلال نہ ہو۔ نیز لباس کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ جسم کی قبح پر اسکے
(بقیہ صفحہ آئندہ)

تشبیہ اخذ کر کے حاصل ہوئے تھے اب ایک وصف لباس کا اور ہے جو شرعی وصف ہے
ع اس سے بھی ایک اشارہ حاصل ہوتا ہے میں اسکو بیان کرکے ختم کرونگا وہ یہ کہ قرآن میں
جہانتک میں نے غور کیا لباس کا لفظ عذاب وضرر کے واسطے مستعمل نہیں ہوا سوائے ایک
جگہ کے کہ سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ
بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ؀ اور اس کی ساتھ ہی بطور جملہ معترضہ کے ایک فائدہ بھی بتلاتا ہوں
کہ لفظ ذوق قرآن میں زیادہ تر عذاب ہی کے واسطے آیا ہے تو اس آیت میں عجیب صنعت ہے
کہ عذاب کیلئے لفظ ذوق بھی لایا گیا اور لباس بھی تو ذوق کے لفظ سے تو عذاب کو مطعوم کیساتھ
تشبیہ دی گئی ہے صفت احساس میں کہ اس کا ایسا احساس ہوگا جیسا منہ میں رکھی ہوئی چیز
کا احساس ہوتا ہے اور لباس کے لفظ سے عذاب کو تشبیہ دی گئی ملبوس کے ساتھ اشتمال
واحاطہ میں قرآن میں عجیب غریب صنعتیں ہیں۔ غرض قرآن میں لباس کا لفظ سوا ایک جگہ کے اور
کسی جگہ عذاب وضرر کے واسطے نہیں آیا تو عورتوں کو لباس کہنے میں اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا
۲۵ ہے کہ عورتوں میں اضرار کی شان بھی نہ ہے گو قلیل ہی سہی گو صرف لام کے موضوع ہے
انتفاع کیلئے اس سے ظاہراً یہی ہے لیکن لام صلہ کا بھی ہوتا ہے جیسے لَهُمْ عَذَابٌ اور اگر
اس روایت کا اعتبار کیا جاوے اس اشارہ کو مدلول قرآن نہ کہا جاوے صرف مادہ لباس کو وجہ
اشارہ کہا جاوے اس اشارہ کے اعتبار سے کہا جاوے گا کہ عورت میں جہاں بہت سے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) موافق ہوتا ہے اگر لباس جسم کے موافق نہ ہو تو اس کو الگ کر دیا جاتا ہے اسی طرح عورت ومرد
میں اگر باہم توافق نہ ہو تو طلاق وخلع سے مفارقت جائز ہے نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ نکاح میں توافق طبع وتوافق
مزاج کی رعایت اہم ہے جیسا کہ لباس میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ تراش ووضع جسم کے موافق ہو اور اگر سلنے کے
بعد بہت تنگ یا بہت ڈھیلا ہو تو جیسے اس وقت ناگواری ہوتی ہے اور سلے سلائے کپڑے کو ادھیڑنا یا بیکار کرنا
گراں گذرتا ہے اسی طرح نکاح کے بعد طلاق دینا بھی گراں اور ناگوار چیز ہے۔ نیز جب نکاح بمنزلہ لباس کے ہے
تو بے نکاح رہنا عریانی ہے پس اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عورت ومرد کیلئے بے نکاح رہنا عیب کی بات ہے جبکہ
استطاعت ہو۔ لہٰذا کرہ الفقہاء اقامۃ الاعزب بحضرۃ المتاہل لکونہ عریانا معنیٰ ولذا ورد فی الحدیث شرارکم عزابکم پس کسی عورت کو بیوہ
اور کسی مرد کو حتی الامکان بے نکاح نہ رہنا چاہیے ۱۲ ظ

ع ویرد علیہ ان ہذا یستلزم وجود شان الاضرار فی الرجال ایضا للنساء والجواب انہ کما ان الرجل یفتتن بالمرأۃ کذا تفتتن ہی
ایضا بہ فی دینہا ولکن فتنۃ الرجال للنساء اقل کما ان کونہم لباس لہن موخر ذکراً ۱۲ ظ۔

منافع ہیں کچھ ضرر بھی ہے چنانچہ اس شان ضرر کی طرف اِس حدیث میں اشارہ ہے مااَخوَفُ فِتْنَۃً اَضرعَلٰی اُمّتِیْ مِنَ النِّسَآءِ کہ میں اپنی امت کے لئے عورتوں سے زیادہ خطرناک فتنہ کوئی نہیں سمجھتا نیز نص ہیں یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ اے ایمان والو! تمہارے بیوی بچوں میں بعض تمہارے لئے (باعتبار انجام کے) دشمن بھی ہیں اُن سے ڈرتے رہو۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا وہ یہ کہ ہمارے ایک دوست تھے وہ اولاد سے بہت ڈرتے تھے بلکہ اولاد کے دشمن تھے اور دلیل میں یہ آیت پڑھتے تھے اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ عـہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کو فتنہ کہا ہے اسلئے میں تو نکاح نہ کرونگا اور اگر کروں گا تو بیوی کو کوئی ایسی دوا کھلادونگا کہ اولاد نہ ہو میں نے کہا عقلمند آیت میں تو اموال کو بھی فتنہ فرمایا گیا ہے اگر فتنہ ہونے کی وجہ سے تم اولاد کے دشمن ہو تو ملازمت کیوں کرتے ہو مال کے دشمن کیوں نہ بنے اب تو ہوش درست ہوئے۔ آیت کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ بیوی بچوں سے فتنہ لگا ہوا ہے کہ تم کو لپٹ ہی جائیگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تم کو ضرورت کیلئے دی گئی ہیں اور اُن سے تمہارا امتحان بھی مطلوب ہے کہ تم اُن سے بقدر ضرورت ہی تعلق رکھتے ہو یا بس اُنہی کے ہو رہتے ہو۔ بہرحال اِس اشارہ سے معلوم ہوا کہ عورتوں میں ضرر کی شان بھی ہے اور واقعی ہے بھی کیونکہ عورتوں کے فتنے نے بہت لوگوں کا دین برباد کر دیا ہے کوئی عورتوں کی وجہ سے سُود لینے میں مبتلا ہے کوئی رشوت لینے میں تاکہ اُن کی فرمائش زیور وغیرہ کی پوری کی جائے اور کوئی حرام اور ناجائز تعلق میں گرفتار ہے اور فتنہ سب سے اشد اور اُمّ الفتن ہے لیکن شریعت نے جو طریقہ اِس ام المفاسد کے انسداد کا مقرر کیا ہے اگر اس پر عمل کیا جائے تو یہ فتنہ بند ہو سکتا ہے اور وہ طریقہ پردہ ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ صاحب پردہ میں بھی فتنہ ہو جاتا ہے اِس کا جواب یہ ہے کہ وہ بھی پردہ میں کوتاہی کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی پردہ میں کچھ بے پردگی ہوتی ہے تب فتنہ ہوتا ہے اور اگر پردہ میں ذرا بے پردگی نہ ہو تو کوئی وجہ فتنہ کی نہیں ہے اور ہرچند کہ پردہ فطری شے ہے غیرتمند حیادار طبیعت کا خود یہ تقاضا ہے کہ عورتوں کو پردہ میں رکھا جائے کوئی غیور آدمی اِس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اُس کی بیوی کو تمام مخلوق کھلے منہ

عـہ تمہارے اموال اور اولاد تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے پارہ ۲۸ رکوع ۱۶ ۲۶

ـہ آیت میں من تبعیضیہ اِس شانِ اضرار کی قلت پر اشارہ کر رہا ہے کہ ازواج سب ایسی نہیں ہیں بعض ایسی ہی ہیں ۱۲

دیکھے اور شریعت نے فطریات کا خاص اہتمام نہیں کیا چنانچہ پیشاب پاخانہ کی طہارت فی نجاست
سے تو بحث کی ہے یہ کہیں حدیث و قرآن میں نہیں آیا کہ پیشاب پینا حرام یا پاخانہ کھانا حرام ہے
کیونکہ اس سے تو طبائع کو خود ہی نفرت ہے اس قاعدہ کا مقتضی یہ تھا کہ شریعت پردہ کے احکام
سے بھی بحث نہ کرتی مگر شارع کو معلوم تھا کہ ایک وقت میں طبائع پر بہیمیت غالب ہوگی جس
سے حیا کم ہو جائیگی یا جاتی رہیگی اس لئے اس کے متعلق احکام فرما دیئے ہیں پھر ان کا بھی کس قدر
اہتمام کیا ہے جو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ کہ اپنی
زینت کو بھی ظاہر نہ کریں اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن میں زینت سے مراد لباس ہے
چنانچہ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ اپنا لباس پہن لیا۔ میں تو سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سے
مراد لباس ہی ہے اسی لئے حضرت ابن مسعودؓ نے اس آیت کی تفسیر یہی کی ہے کہ عورتیں اپنا
لباس بھی ظاہر نہ کریں یعنی ایسا لباس جس میں زینت کی شان ہو جیسے آجکل بعض عورتیں خوب بن ٹھن کر
بھڑکدار برقعہ اوڑھ کر باہر نکلتی ہیں اور زینت کو تو برقعہ چھپا لیتا ہے مگر برقعہ میں ایسی چھبن بیل لگی
ہوتی ہے کہ اس کو دیکھ کر ہی دوسرے کا دل بے چین ہو جائے۔ واقعی وہ برقعہ ایسا ہوتا ہے جسے ۲۷
دیکھ کر لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کے اندر کوئی حور کی بچی ہوگی گو منہ کھولنے کے بعد چڑیل ہی کی ماں
نکلے تو شریعت نے ایسے زینت کے لباس کا ظاہر کرنا حرام کہا ہے پھر بھلا چہرہ اور گلا کھولنا
مطلقاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے جو مجمع المحاسن ہے ایک نکتہ تشبیہ باللباس کا اور سمجھ میں آیا وہ
یہ کہ لباس تابع ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں مردوں کی تابع ہیں پھر لباسیت نساء کا ذکر
مقدم کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ تابعیت میں عورتیں مقدم ہیں۔ یہاں یہ سوال ہوگا کہ آگے تو
مردوں کو بھی عورتوں کا لباس کہا گیا تو کیا وہ بھی عورتوں کے تابع ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ
ہاں ایک درجہ میں وہ بھی تابع ہیں مگر ان کی تابعیت موخر ہے متبوعیت مقدم ہے اور عورتوں
کی تابعیت مقدم ہے متبوعیت موخر ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عورتیں تو فطرۃً اور
قانوناً مردوں کی تابع ہیں اور مرد محبت کی وجہ سے تابع ہو جاتے ہیں اور یہاں ایک کام کی بات
یاد آئی وہ یہ کہ یہ تابعیت محبت کے بقا تک ہے اور محبت کا بقاء پردہ کی بقا تک ہے اور یہ
مسئلہ عقلی بھی ہے چنانچہ ایک یورپین عورت نے اسکے متعلق اخبارات میں اپنی تقریر شائع کی ہے

کہ عورتوں کے لئے جو بے پردگی کی کوشش کی جاتی ہے یہ عورتوں کیلئے سخت مضر ہے کیونکہ اس وقت تو مردوں کو عورتوں کی راحت رسانی کا پورا اہتمام ہے اور اس کا سبب محبت ہے اور محبت کا منشا اختصاص ہے مشاہدہ ہے کہ جو چیز عام ہوتی ہے اس سے قوی تعلق نہیں ہوتا اور یہ اختصاص پردہ سے قائم ہے پس محبت کی بنا پردہ ہے اس انگریزن کی تقریر سے پردہ کی تاکید بھی معلوم ہو رہی ہے ہندوستان کے لوگوں کو شرم کرنا چاہئے کہ ایک یورپین عورت تو پردہ کی خوبی بیان کرے اور تم ایشائی ہو کر پردہ کی مذمت کرتے ہو۔

اب میں ختم کرتا ہوں قرآن کے ان دو جملوں میں جو مضامین اس وقت بیساختہ سمجھ میں آئے وہ میں نے بیان کر دیئے اور سامعین کو معلوم ہوا ہوگا کہ ان مضامین کو گھیر گھار کر نہیں لایا گیا اور اگر غور کیا جاتا تو شاید اور بھی بہ مضامین نکل آتے اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ سے کہ ہم کو توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائیں وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلی

نوٹ :۔ بیان کے بعد حضرت والا نے خواجہ صاحب سے دریافت فرمایا کہ صاحبزادے کا عقد نکاح یہاں ہی کر دیا جائے یا مسجد میں کیا جائے خواجہ صاحب نے کہا یہاں ہی کر دیا جائے چنانچہ اسی مجلس میں نکاح ہوا بعد عقد نکاح کے حضرت نے فرمایا کہ بعض مستورات نے فرمائش کی تھی کہ نکاح گھر ہی میں ہوتا کہ ہم بھی دیکھیں نکاح کس طرح ہوتا ہے کیونکہ نکاح ہمیشہ مسجدوں میں یا مردانہ مکانوں میں ہوتا ہے عورتوں نے نکاح کا طریقہ کبھی نہیں دیکھا تھا اس واسطے جی میرا بھی یہی چاہتا تھا کہ نکاح اسی مجلس میں ہوتا کہ مستورات کی فرمائش بھی پوری ہو جاتی مگر میں نے ابتدا میں اسکو ظاہر نہ کیا تاکہ اہل مجلس آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کریں فقط

ظفر احمد عفا اللہ عنہ

۲۴ رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی ب

سبیل السعید

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	لِمَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	مَنِ اسْتَمَعَ		الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	[illegible]	[illegible]	کیا مضمون تھا	[illegible]	[illegible]	[illegible]	متفرقات
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	افسوس اس وعظ کے محرک مولانا سعید الدین صاحب کا ۲۲ ذیقعدہ [illegible] بروز جمعہ انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت میں اعلیٰ درجہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے مرحوم کو دار العلوم سے بہت محبت تھی مدرسہ کا کام بڑی محنت اور محبت سے کرتے تھے اور باوجود صاحب ریاست و متمول ہونیکے علم سے اسقدر شغف تھا کہ دو چار طالب علم ہمیشہ آپ سے علم دین حاصل کرتے رہتے تھے جنکا خرچ خود مولانا برداشت کرتے تھے ۱۲ ظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ = یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں حق تعالیٰ نے تمام دین کا خلاصہ ارشاد فرمایا ہے۔ تمام دین اس کی تفسیر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسکو ایسے خاص عنوان سے بیان فرمایا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ اسکو سنکر عمل کی رغبت ہوتی ہے۔ اور یہی تعا

کی حکمت ہے کہ وہ احکام جو فی نفسہٖ آسان ہیں مگر مخالفت نفس اور منازعت نفس کے عارض سے دشوار ہو گئے ہیں اُن کو نہایت سہل عنوان سے بلکہ شوق دلانے والے عنوان سے بیان فرمایا ہے تاکہ یہ عارضی دشواری شوق کی حرکت سے مغلوب ہو جائے۔ اور یہ دلیل ہے حق تعالیٰ کے شفیق ہونے کی۔ حق تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رکھا ہے اور جتنے ضوابط و قواعد حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں اُن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب بندوں کی مصلحت کے لئے ہیں۔ وہ ضابطہ محضہ نہیں بلکہ عین شفقت ہے اِسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بچہ کنوئیں میں گرنے لگے تو اُس کو گرنے سے اِس طرح روکتے ہیں کہ ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور دو چار طمانچے لگا کر وہاں سے ہٹا دیتے ہیں شفقت کا منشاء یہی ہے نہ یہ کہ اہلِ حکومت کی طرح ضابطہ سنا دیا جائے جیسے حکام و سلاطین اور اُن کے نواب کا طریقہ ہے کہ منادی کرنے والا ایک طرف سے منادی کرتا چلا گیا چاہے کوئی سُنے یا نہ سُنے، سمجھے یا نہ سمجھے اور رغبت ہو یا نہ ہو سو یہ ضوابط ہیں۔ اور حق تعالیٰ کے احکام میں ایسے ضوابط

۲ نہیں ہیں ہاں صورت ضوابط کی ہے سو اس کی ایسی مثال ہے جیسے حکیم دوا کی مقدار معین کرتا ہے وقت مقرر کرتا ہے پرہیز متعین کرتا ہے تو ظاہر میں یہ بھی ضوابط ہیں مگر حقیقت میں یہ محض ضوابط نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ ضوابط مرتفع ہو جائیں تو حقیقت میں ہلاک ہو گا۔ طبیب یہ قیدیں صرف مریض کی مصلحت سے لگاتا ہے۔ اپنی مصلحت کے لئے نہیں لگاتا۔ اِسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی شانِ حکومت کے لحاظ سے ضوابط مقرر نہیں فرمائے بلکہ بندوں کی مصالح اور منافع کے لئے متعین فرمائے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتے تو بندوں ہی کا ضرر تھا پس احکام میں بظاہر جو کچھ قواعد و ضوابط ہیں اُن کا مبنیٰ شفقت ہے اور اسی شفقت کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ احکام کو ایسے عنوان سے بیان فرماتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں کو اُن کو اختیار کرنے کی رغبت پیدا ہوئی اور شوق پیدا ہو جاتا ہے جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اس کی رعایت کرتا ہے کہ بیٹا سمجھ لے اور اُس کی سمجھ میں بات آجائے۔ چنانچہ اِس آیت میں بھی اِس طرز شفقت کی پوری رعایت ہے۔ فرماتے ہیں وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ واقعی یہ میرا راستہ ہے هٰذَا

کا اشارہ اُوپر کے احکام کی طرف ہے جو امہاتِ احکام ہیں جو تمام دین کا خلاصہ ہیں مگر وہ تو اجمال بصورت تفصیل تھی اور یہ یعنی آیت اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا اجمال بعد تفصیل ہے قبل ازیں کہ میں اس آیت کے عنوان میں طرزِ شفقت کو واضح کروں ایک اشکال کو رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ شاید کسی ذہن کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر بھی قادر ہے کہ ہمکو بدون ابتلاء بالاحکام کے جنت عطا فرما دیں اور شفقت کا مقتضیٰ بھی بظاہر یہی تھا کہ ابتلاء سے محفوظ رکھکر ہم کو نجات عطا فرماتے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ اِس پر قادر ہیں کہ بدون ابتلاء و امتحان کے سب کچھ عطا فرما دیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلاء و تکلیف کے بعد ہی دولتِ قرب عطا فرمادیتے ہیں (اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بعد کا نام ہے ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت ٭ فراقِ یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظِ شہر ٭ کنایتیست کہ از روزگارِ ہجراں گفت ۱۲)

۳ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ رہا یہ کہ اسکی وجہ کیا ہے سو اس کے بارہ میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے اُن کا طریقہ یہ ہے اِبْهَمُوْا مَا اَبْهَمَ اللّٰهُ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے۔ تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔ پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلاء میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے طاعت بدونِ ابتلاء مقصود ہوتی تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ ملائکہ میں اطاعت بدون ابتلاء ہی ہے اُن میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں۔ اور انسان کے اندر مقاومت و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیلِ اجر کے لئے اِس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے۔ اور درجہ خاص کی قید میں نے اِس لئے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو اَلدِّیْنُ یُسْرٌ کے خلاف ہوتا اسلئے میں نے یہ قید

لگادی اور یہ منازعت بھی ابتداہی میں ہوتی ہے بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام اگر یہ امور طبعیہ بجانے ہیں حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا ہے چنانچہ مشی وغیرہ میں ابتداہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہی پہلا ارادہ مستمر قرار دیا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے اسکو فعل اختیاری کہا جاتا ہے اسپر یہ شبہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہوجاتا ہوگا کیونکہ طاعت بلامنازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے کہ ابتدائے منازعت کا مقابلہ کرنیکے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کرکے عمل شروع کیا ہے چنانچہ ہر مسلمان جو نماز روزہ کا پابند ہے اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا ہمیشہ روزہ رکھوں گا خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو۔ اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کیلئے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہے اسواسطے اسکو زوال منازعت
۴ کے بعد بھی بوجہ نیت دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا۔ تو جیسے مشی کو فعل اختیاری اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ ابتدا میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اسلئے انتہا تک اس مخالفت منازعت کو حکماً مستمر قرار دیا جائیگا۔ اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا ورنہ عقل کا مقتضا یہ ہے کہ جب منازعت ختم ہوجائے اور عبادت میں لذت وحظ پیدا ہوجائے تو اس شخص کو اجر نہ ملے کیونکہ اب طاعت مع الابتلاء نہیں ہے اسوقت عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ سے محبت نہیں ہے ہم اسکو منازعت ہی کا اجر دینگے گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اس کو پنشن دینگے لیکن عقل پنشن کو جائز نہیں کرتی جیسے معتزلہ نے **کہا ہے کہ گناہگار پر** سزا دینا ضروری ہے۔ عفو و مغفرت خلاف عقل ہے بس یوں کہئے کہ رسوخ کے **بعد** بندہ کی وہ حالت ہوجاتی ہے جو لطیفے پیروں کی حالت سنی گئی ہے کہ جب کوئی مریداں کی دعوت کرتا ہے تو وہ دعوت کے بعد نذرانہ بھی لیتے ہیں جسکو دانت گھسائی

کہنا چاہئے ایک پیرزادہ کو دعوت کے بعد ۵ روپے دئیے گئے تو اس نے پھینک دئیے اور کہا کہ کیا
ہماری شان پچاس روپیہ کے لائق ہے۔ غرض دو سو روپیہ لیکر ٹلے۔ تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلا دیا
کہ وہ بندہ کو دانت گھسائی بھی دیتے ہیں کیونکہ انتہا میں طاعت کا بجا لانا کچھ کمال نہیں رہتا بلکہ اس
کے ترک میں تکلف ہوتا ہے آخر میں وہ حالت ہو جاتی ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کی شان میں وارد ہوا کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنُ کہ قرآن پر عمل کرنا آپ کی طبیعت تھی آپ کی تو یہ فطرت
ہی سے طبیعت تھی مگر کاملین کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہو جاتی ہے اور اس وقت
اس کے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہو جاتی ہے جیسے ماں بچہ کو بعض دفعہ دودھ پلانا چاہتی ہے
اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگتا ہے تو وہ اس کے چپت لگاتی ہے حالانکہ وہ جانتی ہے
کہ یہ خود دودھ پئے گا کیونکہ دودھ سے اس کو خود ہی رغبت ہے مگر اظہار شفقت کیلئے چپت
لگاتی ہے ایسے ہی منتہی کے لئے یہ وعیدات محض اظہار شفقت و رحمت ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ
مبتدی کیلئے بھی وعید محض اظہار شفقت و رحمت ہیں کیونکہ بات یہ ہے کہ انسان کو فطرۃً حق
۵ تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے یہ خلاف محبت نہیں بلکہ
اس کا منشا یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالیٰ پر ناز ہے۔ یہ یوں کہتا ہے کہ
جب مجھے محبت تو مجھ کو آرام دینا چاہئے میرے اوپر یہ تکالیف اور قیود کیوں ہیں اور بزبان حال یوں کہتا ہے

؎ ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں ۔ جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم

یہ آجکل کے واعظوں کی زیادتی ہے کہ مسلمانوں کو محبت حق سے خالی سمجھتے ہیں اور وعظ
میں مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ تم کو نہ خدا سے محبت ہے اور نہ خدا کی عظمت ہے حکام کے سمن کی
طلبی پر تو تم فوراً بلا چون و چرا کے عدالت میں حاضر ہوتے ہو خواہ گرمی ہو یا سردی یا برسات کوئی چیز
تم کو مانع نہیں ہوتی اور خدا کے احکام میں سو بہانے اور حیلے نکالتے ہو سو یہ دلیل غلط ہے کیونکہ رعایا کو
حکام سے محبت نہیں ان کے احکام شاقہ سے رعایا کو تعجب نہیں ہوتا لوگ جانتے ہیں کہ حاکم غیر
ہے اس سے ہم کو کیا تعلق اور وہ ہماری راحت و کلفت کا کیوں لحاظ کرنے لگا اسلئے ان کے احکام
میں منازعت و کشاکشی نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ سے انسان کو محبت ہے اور خاص تعلق ہے انکی طرف
سے جو حکم اور قید آتی ہے اسمیں بوجہ ناز کے مچلتا ہے کہ ایسے رحیم و کریم نے میرے اوپر مصیبت

کیوں والی واعظوں نے اس فرق کو نہیں سمجھا اس لئے خواہ مخواہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت سے خالی
بتلا کر ان کے دلوں کو مجروح کرتے ہیں گویا بس ایک یہی واعظ صاحب تو حق تعالیٰ کے چاہنے والے
ہیں حضرت حافظ شیرازیؒ نے ایسے واعظوں کی خوب خبر لی ہے فرماتے ہیں ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند — چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

اس میں بعض واعظوں کے دل میں یہ تاویل آ چکی ہے کہ حافظ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ خلوت
میں جا کر یہ لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں جی ہاں بس خوش ہو لو ذرا اس سے آگے بھی پڑھ لو

؎ مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس — توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

واعظین گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں کہ وہ خود بھی خلاف ورزی احکام کی کسقدر کرتے ہیں
پھر بھی اپنے بیان کے موافق محبت سے خالی ہیں اور اگر وہ خالی نہیں تو عوام بھی خالی نہیں بلکہ سب کو
اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اور چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اس لئے اس مقام پر فرماتے ہیں
وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا جسمیں اس راستہ کو اپنی طرف اس
لئے منسوب فرمایا کہ سننے والوں کو حظ آئے کہ یہ محبوب کا راستہ ہے اس عنوان سے سب کو اس کی ۶
طرف حرکت ہوگی خواہ اس اضافت کا یہ مطلب ہو کہ یہ راستہ میرا ایجاد کیا ہوا میرا بتلایا ہوا ہے یا
یہ مطلب ہو کہ اس پر چلکر تم مجھ تک یعنی میری رضا تک پہونچ سکتے ہو خواہ کچھ ہی مطلب ہو مگر بہرحال یہ
محبت کا یہی اثر ہے کہ جب عاشق کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں کام کرنے سے محبوب مجھ سے راضی
ہو جائیگا تو اس کو اس کام میں سب مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں بلکہ اس سے بڑھکر اگر محبوب
کی تجویز رضا کا بھی علم نہ ہو مگر اس کا علم ہو جاوے کہ وہ میری مشقتوں کو دیکھ رہا ہے تب بھی
یہی اثر ہوتا ہے چنانچہ ایک عاشق رسوائی عشق کی وجہ سے پٹ رہا تھا اور ذرا اُف نہ کرتا ننانوے
کوڑوں کے بعد جو ایک کوڑا اور لگا تو آہ کی کسی نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ ننانوے کوڑوں
پر آہ نکی آخر میں ایک کوڑے پر آہ کی کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا میری
حالت کو دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبت میں مجھ پر مصیبت آئی ہے تو اس وقت تک مجھے مصیبت کا
احساس ہی نہیں ہوا بلکہ میں یوں کہہ رہا تھا۔

؎ بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست — تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا تو اس وقت مجھے کلفت کا احساس ہوا جب اطلاع محبوب کے علم میں ہے یا یہ اثر ہے تو رضا و تجویز محبوب کے علم پر تو کیا کچھ اثر ہوگا۔ اسی بنا پر حبیب نے یہاں بندوں کو یہ بتلایا گیا کہ یہ میرا راستہ ہے یعنی میری رضا کا راستہ ہے یا میرا تجویز کیا ہوا راستہ ہے یہ سنکر اس کی محبت کو حرکت ہوئی اور اب اس راستہ میں ان کو کوئی مشقت محسوس نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ کلفت محبوب کے راستہ میں ہے۔ اور محبوب کے راستہ میں تو جان بھی جاتی رہے تو کچھ زیادہ نہیں۔ تو دیکھئے کہ اللہ تعالےٰ نے اس عنوان سے طریق کی گرانی کو کیسا پھولوں کا ہلکا کر دیا یہی وہ بات ہے جس کو میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے کہ اول تو دین کو فی نفسہٖ آسان کیا پھر نفس کی کشاکشی سے جو اس میں عارضی گرانی اور مشقت آجاتی ہے اس کو اس طرح دور کیا کہ اس آیت میں تمام دین کا خلاصہ ایسے عجیب عنوان سے بیان فرمایا ہے جس سے ساری مشقت دور ہوگئی۔ کہ اس کو اپنا راستہ فرمایا۔ اپنی طرف اس کی نسبت فرمائی۔ اس کا لطف عشاق سے پوچھو کہ محبوب کے نام سے لگے کی کیسی محبت ہوتی ہے۔ اور یہیں سے ایک حکایت کی حقیقت معلوم ہوگی جو مولوی مظہر صاحب رام پوری نے جو میرے ساتھ حضرت مولنٰا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی خدمت میں موجز میں شریک تھے (میں نے موجز کو موجز ہی پڑھا ہے ورنہ مطول ہو جاتی) رام پور ریاست کا قصہ بیان کیا کہ ایک شخص صاحب قبتق ایک صاحب ارشاد کے پاس گیا۔ انہوں نے پوچھا تم کون ہو۔ کہا میں شیطان ہوں۔ فرمایا اگر شیطان ہو تو لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہ جواب سنکر اس کو مردودیت کا یقین ہوگیا کہ جب ایک شیخ صاحب ارشاد نے بھی مجھ پر لاحول پڑھ دی تو میرے مردود ہونے میں کچھ شبہ نہیں تو اس نے اپنے خادم سے کہا کہ اب اس زندگی سے موت بہتر ہے اس لئے میں خودکشی کروں گا۔ اگر کچھ کسر رہے تو تم پوری کر دینا۔ چنانچہ اس نے خودکشی کی اور جان نکلنے کے بعد مریدنے ابھی ہوئی کھال کو الگ کر دیا۔ اسی حالت میں وہ گرفتار کیا گیا۔ اس نے کہا تم مجھے کیا گرفتار کرتے ہو میں تو خود زندگی سے بیزار ہوں

جب میرا پیر نہ رہا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ تم شوق سے مجھے پھانسی دیدو۔ اس بیان سے حاکم کو اس کے قاتل ہونے میں شبہ پیدا ہوا تو اس نے واقعہ دریافت کیا۔ اس نے سب واقعہ بتلا دیا۔ یہ خبران صاحب ارشاد شیخ کو بھی پہنچی۔ انہوں نے بھی تصدیق کی۔ کہاں وہ قبض میں مبتلا تھا اور میرے پاس آیا تھا کچھ تعجب نہیں کہ اس نے خودکشی کرلی ہو۔

یہ حکایت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنی تو فرمایا کہ ہم تو ان صاحب ارشاد کو شیخ سمجھتے تھے مگر معلوم ہوا کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ ان کو چاہیئے تھا کہ جب اس نے کہا تھا کہ میں شیطان ہوں تو جواب میں یوں کہتے کہ پھر کیا حرج ہے۔ شیطان بھی تو اسی کا ہے نسبت اب بھی قطع نہیں ہوئی۔ اس سے تسلی ہو جاتی۔ شاید تم یہ کہو کہ ان الفاظ سے کیا ہوتا تو تم اس کو کیا جانو۔ ؟

جس پر قبض طاری ہو چکا وہ اس کے اثر کو سمجھتا ہے۔ صاحبو! الفاظ میں بڑا اثر ہے اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ مولوی غوث علی صاحب پانی پتی سے کسی نے شیخ اکبر و فرید عطار و مولانا رومی کے متعلق دریافت کیا کہ وحدۃ الوجود میں گفتگو کرنے والے یہی تین حضرات بڑے ہیں۔ ان میں کیا فرق ہے۔ فرمایا تینوں ایک ہی بات کہتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تین مسافر کسی گاؤں میں ایک کنوئیں پر پہونچے۔ ایک عورت پانی بھر رہی تھی اس سے پانی مانگا مگر ایک نے تو یوں کہا کہ اماں مجھے پانی پلا دے یہ تو مولانا رومی ہیں۔ دوسرے نے یوں کہا کہ میرے باوا کی جورو مجھے پانی دیدے۔ یہ شیخ اکبر ہیں۔ تیسرے نے یوں کہا کہ میرے باوا سے یوں تو کرانے والی مجھے پانی دیدے یہ شیخ فرید ہیں۔ اب غور کر لیجئے کہ ان الفاظ کے اثر میں فرق ہے یا نہیں۔ اگر کوئی ماں کو اماں کہے تو وہ خوش ہوگی اور اگر باوا کی جورو یا باوا سے یوں توں کرانے والی کہے تو اس کا منہ نوچنے کو تیار ہو جائے گی۔ حالانکہ معنی سب کے متحد ہیں۔ مجھ پر خود ایک حالت گذری ہے جس میں الفاظ کے اثر کا مجھے پورا مشاہدہ ہوا ہے ایک بار مجھے سخت مرض ہوا اور ایک حکیم صاحب کے پاس قارورہ بھیجا انہوں نے قارورہ دیکھکر یہ کہا کہ اس شخص میں تو حرارت عزیزیہ نام کو بھی باقی نہیں۔ یہ زندہ کیسے ہے۔ قارورہ لیجانے والے نے یہ عقلمندی کی کہ حکیم کا مقولہ مجھ سے آکر بیان کر دیا جس کا مجھ پر بہت زیادہ

اثر ہوا میں نے ان کو دھمکایا کہ یہ بات کیا میرے سامنے کہنے کی تھی۔ تم نے بڑی حماقت
کی جاؤ اس کا تدارک کرو۔ انہوں نے تدارک پوچھا میں نے کہا کہ مکان سے باہر جاؤ اور کچھ دیر میں
آکر مجھ سے یوں کہو کہ میں پھر حکیم صاحب کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے مکرر دیکھ کر یہ کہا کہ
پہلے جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی۔ حالت اچھی ہے کچھ خطرے کی بات نہیں وہ کہنے
لگے کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی سکھلائی ہوئی بات کہوں گا تو اس کا کیا اثر
ہوگا۔ میں نے کہا تم خواص اشیاء کو کیا جانو جس طرح میں کہتا ہوں تم اسی طرح کرو۔
چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ ان لفظوں کے سننے سے
میری پہلی سی حالت نہ رہی بلکہ ایک گونہ قوت طبیعت میں پیدا ہوئی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ
علاج سے قوت بڑھتی گئی اور حق تعالیٰ نے پوری شفا عطا فرما دی تو الفاظ میں بھی اللہ
تعالیٰ نے اثر رکھا ہے۔ گو ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ اطباء سے پوچھو کہ خفقان میں کہربا کی
تعلیق کیوں مفید ہے؟ وہ اس کی وجہ بجز تجربہ کے کچھ نہیں بتلا سکتے۔ اسی طرح اہل طریق
9 کو کلمات والفاظ کے اثر کا تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر ان کے تجربہ کو اہل ظاہر نہیں جانتے شاید
کسی مولوی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے الفاظ سے تسلی کرنا تو جائز نہ تھا کہ شیطان بھی تو اسی کا ہے
نسبت پھر بھی باقی ہے۔ کیونکہ اس سے کفار بھی اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے لگیں گے
اس کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ فوری علاج سنکھیا سے بھی کیا جاتا ہے پھر بعد میں سنکھیا
کی سنبھال کر لیتے ہیں۔ اس کو بھی اطباء جانتے ہیں۔ اور اہل اللہ کا تجربہ ہے کہ بعض دفعہ
اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے تم اس میں اضافت تشریفیہ کیوں لیتے ہو اور خواہ
مخواہ اس کو خلاف شرع پر کیوں حمل کرتے ہو معنی لغوی پر کیوں محمول نہیں کرتے۔ آخر
شیطان بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ (یعنی ان کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اُن کا بندہ ہے ۱۲) بتلاؤ
اس میں کیا خرابی ہے اس قصہ سے معلوم ہو گیا ہو گا نسبت اور اضافت کا اثر اہل محبت پر
کس قدر ہوتا ہے تو جب اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ یہ میرا اسمٰعیل ہے اس سے محبت
کو ہیجان ہو گیا۔ اور اب مولیٰ کا ارتفاع آسان ہو گیا۔ اب یہ حال ہو جاتا ہے۔ کہ سہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو — دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

اور اب عاشق زبان حال سے اور بعض دفعہ زبان قال سے یوں کہنے لگتا ہے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من۔

اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا۔ کو سن کر ایک دفعہ تو کافر کو بھی اس کی طرف حرکت ہوگی اور وہ اس راستہ پر چلنا چاہے گا۔ کیونکہ خدا سے محبت کا فرکو بھی ہے چنانچہ میں دیکھتا ہوں اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ بعض سنیاسی ذکر و شغل کرتے ہیں اور للہ اللہ کو ترک کر دیتے ہیں اس کا منشا وہی محبت ہے گو وہ غلط راستہ پر چل رہے ہیں اور یہاں سے ایک بات اور بتلاتا ہوں وہ یہ کہ کفار کو ذکر الٰہی سے گو آخرت میں کچھ نفع نہ ہو اور یہ ذکر وہاں ان کے لئے نجات کا سبب نہ ہو مگر دنیا میں ان کو بھی کچھ ملجاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ کہ وہ کسی اچھے کام کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے بلکہ اگر وہ طالب آخرت ہے تو اس کو آخرت میں بھی اجر عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی، اور طالب دنیا ہے تو اس کو دنیا میں کیفیات نفسانیہ ذوق و شوق وغیرہ عطا ہوجاتا ہے۔ یہ اس کا اجر ہے۔ اسی لئے محقق حضرات نے فرمایا ہے کہ کیفیات نفسانیہ کے درپے نہ ہو۔ کیونکہ وہ تو چٹنی ہے اور چٹنی مطلوب نہیں بلکہ مطلوب، غذا ہے۔ اب اگر کوئی چٹنی ہی سے پیٹ بھر لے تو اس کا معدہ خراب ہوجائے گا۔ بس چٹنی کا کام یہ ہے کہ غذا کے ساتھ تھوڑی سی کھالی جائے تا کہ غذا اچھی طرح کھائی جائے۔ میں نے اس کے متعلق ایک فیصلہ کیا ہے۔ جو مختصر ہے گو یہ لفظ دعوے کا ہے مگر میرا مقصود دعوی نہیں بلکہ یہ ایسا ہے جیسے کہ ہم بولا کہتے ہیں کہ میں نے نماز پڑھی اور روزہ رکھا۔ اور دعوی تو جب ہو کہ یہ فیصلہ میں نے اپنے آپ کیا ہو۔ نہیں نہیں بلکہ یہ ان حضرات کا طفیل ہے جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں اور طوطا اگر کچھ پڑھنے لگے تو یہ اس کا کمال نہیں بلکہ پڑھانے والے کا کمال ہے تو وہ فیصلہ اس کے بارہ میں یہ ہے کہ یہ کیفیات محمود تو ہیں مگر مقصود نہیں اور غیر مقصود بالذات کو مقصود بالذات بنا لینا عصیان باطنی اور بدعت باطنیہ ہے۔ اس لئے انکے درپے نہ ہو۔ ان کی تمنا نہ کرو ہاں دعا کا مضائقہ نہیں کیونکہ دعا میں خاصیت یہ ہے

کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے شکایت وقلق پیدا نہیں ہوتا اور تمنا کے پورا نہ ہونے سے شکایت وقلق ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے امور اختیاریہ وغیر اختیاریہ کے متعلق بھی فیصلہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ میرا ذوق یہ ہے کہ اس آیت میں مطلوب کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک موہوب جس کو ما فضل اللہ بہ، اور واسئلوا اللہ من فضلہ میں فضل سے تعبیر کیا گیا ہے دوسرے مکسوب جس کو للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن میں اکتساب کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اب حاصل یہ ہوا کہ موہوب کی تمنا کرنا نہ چاہیئے نہیں بلکہ مکسوب کا اہتمام وفکر کرنا چاہیئے۔ مدار نجات اعمال مکسوبہ ہیں اب رہا تمنائے موہوب سے جو ممانعت ہے اس میں نہی تحریم کے لئے ہے یا کراہت تحریم کے لئے یا کراہت تنزیہ کے لئے اس سے مجھے بحث نہیں عشاق سے پوچھو
11 کہ جب محبوب کسی کام سے منع کردے تو کیا عاشق محبوب سے یہ سوال کرسکتا ہے کہ حضور یہ بات آپ کو کس درجہ میں ناپسند ہے کس قدر ناگوار ہے۔ اگر کوئی ایسا سوال کرے گا تو محبوب اس کو نکال باہر کرے گا کہ تو عاشق نہیں۔ اس کے بعد حق تعالیٰ ہمارے جذبات کی رعایت فرماتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موہوب کے لئے انسان کا دل للچائے گا ضرور۔ اس لئے دعا کی اجازت دیتے ہیں۔ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ۔ کہ دعا کرسکتے ہو آگے بعض اوقات عدم قبول دعا سے پریشان نہ ہونے کی تعلیم ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ کہ اگر دعا قبول ہونے میں دیر ہو اور قبول کے آثار معلوم نہ ہوں تو گھبراؤ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو اچھی طرح جانتے ہیں یعنی وہ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں کہ یہ نعمت موہوبہ تمہارے لئے مناسب ہے یا نہیں اور مناسب ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے۔ یہ تو کیفیات کے متعلق فیصلہ کا ذکر تھا۔ اور اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کیفیات کفار کو بھی حاصل ہوجاتی ہیں تو جو چیز کافر کو بھی حاصل ہوسکے اس کے درپے نہ ہونا چاہئے اور نہ ان کیفیات کے حصول

پر اکتفا کرنا چاہیئے کیونکہ نجات کا مدار اعمال مکسوبہ ہے۔ ان کیفیات سے قرب و نجات
میں کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوتی (ہاں یہ ضرور ہے کہ عادۃً عمل مجرد عن الکیفیۃ سے عمل
مع الکیفیۃ میں خود شان اکتساب کی زیادہ ہوتی ہے۔ اسلئے وہ اکمل ہونے کے
سبب افضل ہوگا۔ ۱۲) غرض خدا کا راستہ سنکر کفار کو بھی حرکت ہوتی ہے اور وہ
بھی ایک دفعہ کو بے اختیار اس راستہ پر چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ سے سب
کو محبت ہے جس کی وجہ سے جس چیز کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہو جائے اس سے بھی محبت
ہوتی ہے آگے ارشاد ہے کہ بس لذت نسبت ہی پر کفایت نہ کرنا بلکہ آگے بڑھو اور
کام کرو۔ فَاتَّبِعُوْهُ۔ کہ اس راستہ کا اتباع کرو اسپر چلو۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو کافر سے نہیں
ہوسکتی۔ کیفیات تو کفار کو بھی حاصل ہوسکتی ہیں مگر صراط خداوندی کا اتباع کافر سے بحالت
کفر نہیں ہوسکتا یہ تو تمہید تھی اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں جو مختصر ہی ہے اور مقصود
تو ہمیشہ مختصر ہی ہوتا ہے جیسے روٹی مختصر ہے اور تمہید اس کی بہت لمبی ہے یہ تو حسیات
میں ہے اور طریق باطن میں بھی مقصود مختصر اور تمہید مطول ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا گنگوہی
کا ارشاد ہے کہ سلوک کا جو حاصل پندرہ سال کے بعد معلوم ہوا ہے اگر پہلے معلوم ہوتا تو اس
کے لئے ہم اتنا وقت صرف نہ کرتے میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ حاصل پندرہ برس کی محنت سے
پہلے معلوم ہی کیوں ہوتا (اور یہ بھی حضرت قدس سرہ کا کمال تھا کہ ان کو پندرہ برس میں
خلاصہ معلوم ہوگیا بہت سوں کو تو تیس اور چالیس سال کے بعد جا کر کہیں مقصود کا پتہ لگتا ہے)
پس یہ مختصر ایسا ہے جیسے ایک بڑے دفتر حساب کا خلاصہ میزان کل ایک سطر میں لکھا ہوتا ہے کہ
کل میزان دس ہزار پانسو دس ہے مثلاً یہ لفظ تو ایک سطر سے کم میں بھی آجائیگا۔ تو کیا آپ میزان
کو بدون تمام دفتر جمع کئے معلوم کرسکتے تھے ہرگز نہیں غرض حق تعالیٰ نے یہاں تو صراط کو اپنی طرف
منسوب فرمایا ہے اور ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی اضافت فرمائی ہے۔ قُلْ
هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ اور ایک مقام پر انبیاء و علماء سب کی طرف اسکی
اضافت ہوئی ہے وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ اور ایک مقام پر خود سالک کی طرف اضافت
کی گئی ہے۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝

گویہ اضافت صریح نہیں مگر سالک کو اس طریق کے ساتھ تلبس ہونے پر یہ آیت ضرور دال ہے کیونکہ لفظ سَبِیل اسمیں اتَّخَذَ کا مفعول بہ ہے اور فاعل سالک ہے اور متخِذ و متخَذ میں تلبس ضرور ہوتا ہے اور اور اضافت سے میری یہی مراد ہے۔ اضافت نحویہ مراد نہیں۔ اب ان اضافات متعددہ کے اسباب سُنیئے حق تعالیٰ کی طرف تو اس طریق کی اضافت اسلئے ہے کہ وہ واضع طریق ہیں اور منتہائے طریق ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسلئے ہے کہ آپ داعی اور مبلغ ہیں۔ اور یہی وجہ نسبت الی العلماء کی ہے۔ اور سالک کی طرف اضافت کا منشا یہ ہے کہ وہ طالب سبیل ہے اور فقہاء نے اصول میں بیان فرمایا ہے۔ کہ جہاں ایک چیز دو کی طرف منسوب ہو وہاں ان دونوں چیزوں میں غایت تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اصولیین نے حرمت مصاہرت کے مسئلہ میں اسکی تقریر کی ہے اور بیان فرمایا ہے کہ ولد منسوب ہے واطی اور موطوء کی طرف اس لئے کہ ان دونوں میں تعلق قوی ہو گیا پس دونوں کے اصول و فروع ایک دوسرے پر حرام ہو جائیں گے تو ایسے ہی یہاں سمجھئے۔ کہ سبیل حق کی نسبت اللہ تعالےٰ کی طرف بھی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی
۱۳ یہ غایت تعلق مع الرسول کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کو بہت تعلق ہے۔ اور منشاء اضافت الی الرسول کا یہ ہے کہ آپ داعی الی طریق اللہ ہیں جس کی طرف اُدْعُوْا إِلَى اللهِ میں اشارہ ہے اور یہی شان علماء میں بھی موجود ہے۔ مگر بواسطہ رسول کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں یہ شان بلا واسطہ ہے پس واسطہ اور بلا واسطہ کا فرق ہے۔ مگر نفس نسبت مشترک ہے تو قاعدہ مذکورہ بالا کے موافق یہ اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علماء سے بہت تعلق ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کو بھی بواسطہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علماء سے بہت تعلق ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب یہ نسبت مشترک ہے۔ اور سالک کی طرف بھی اسکی اضافت ہے تو جو اس راستہ پر چلنا شروع کرتا ہے اس سے بھی اللہ تعالیٰ کو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خاص تعلق ہو جاتا ہے جب یہ سمجھ گئے تو اب سنو! کہ مجھے یہاں سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا ہے جس کا حاصل یہ شعر ہے ؎

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب ⁂ بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب
چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ ⁂ چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی اس وقت مجھے علماء کی شان بیان کرنا اور اُن کا درجہ بتلانا ہے جو اس اضافت سے
معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو شخص اللہ تعالیٰ تک پہونچنا چاہے اور خدا تعالیٰ کو راضی کرنا
چاہے اُسکے لئے بجز اتباع علماء کے کوئی صورت نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
وفات ہو چکی ہے گو حضور کی وفات بھی حیات ہی ہے مگر حیات صوریہ کے مقابلہ میں اُس کو
وفات کہنا ضرور صحیح ہے ہاں اللہ تعالیٰ حیّ لا یموت ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ سے بجز انبیاء کے بلا
واسطہ کوئی مستفید نہیں ہو سکتا۔ اور ہم تو صحابہ کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی
بلا واسطہ مستفید نہیں ہو سکتے تو اب بجز اتباع علماء کے ہمارے لئے دین پر چلنے کی کوئی
صورت نہیں رہی۔ مگر حالت یہ ہے کہ بہت لوگوں کو اتباع علماء سے آجکل عار ہے بلکہ بعض
کو تو اتباع ائمہ سے بھی عار ہے آجکل بعض لوگوں کو مشکوٰۃ و بخاری کا ترجمہ پڑھ کر اجتہاد کا دعویٰ
ہے مگر اس اجتہاد کی حالت یہ ہے کہ ایک عامل بالحدیث تنہا نماز پڑھتے تو سکون سے پڑھتے۔
اور امامت کرتے تو خوب ہل ہل کر نماز پڑھتے کسی نے اُن کو ٹوکا کہ تم امامت کے وقت اس قدر
۱۴ کیوں ہلتے ہو تو کہا حدیث میں اس کا حکم آیا ہے اور مشکوٰۃ کا ترجمہ نکال کر لائے جسمیں
مَنْ اَمَّ مِنْکُمْ فَلْیُخَفِّفْ کا ترجمہ لکھا تھا کہ جو شخص امام بنے وہ ہلکی نماز پڑھے مجتہد صاحب نے ہلکی کو
ہل کے پڑھا اور نماز میں ہلنے لگے۔ صاحبو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آجکل دعویٰ اجتہاد وہی کرتا ہے
جس کو علم سے مس بھی نہیں۔ ورنہ صاحب علم کبھی دعویٰ اجتہاد نہیں کر سکتا کیونکہ جب کمالِ علم حاصل
ہوتا ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم جاہل ہیں چنانچہ مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا
ارشاد ہے کہ عمر بھر پڑھنے پڑھانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہم جہل مرکب سے جہلِ بسیط میں آ گئے۔ بھلا ایسا
شخص دعویٰ اجتہاد کیوں کر کر سکتا ہے۔ بس مدعی وہ لوگ ہیں جن کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔
اُنکو اجتہاد کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ ایک صاحب نے ریل میں مجھ سے سوال کیا تھا کہ اجتہاد
کسے کہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ تم اسکی حقیقت اصطلاحی الفاظ میں تو کیا سمجھو گے میں ایک مثال سے
اُس پر تنبیہ کئے دیتا ہوں، بتلاؤ اگر دو شخص سفر میں ہوں اور صبح کی نماز کا وقت آئے اور پانی
موجود نہ ہو اس لئے دونوں کو تیمم کرنا پڑے مگر ایک نے تو وضو کا تیمم کیا۔ دوسرے نے بوجہ
رات کو احتلام ہو جانے کے غسل کا تیمم کیا تو ان دونوں میں سے امام کون بنے اور کس کی امامت

افضل ہے۔ کہا کہ اس شخص کی جس نے وضو کا تیمم کیا ہے کیونکہ طہارت تو دونوں کو برابر حاصل ہے اور حدیث ایک کا اصغر ہے اور دوسرے کا اکبر اسلئے وضو کے تیمم والے کی طہارت اقوی ہے میں نے کہا یہ تو تمہارا اجتہاد ہے۔ اب سنو فقہانے تیمم غسل والے کو امامت کے لئے افضل فرمایا ہے وہ یہ بات سن کر بڑے حیران ہوئے اور وجہ پوچھنے لگے کہ فقہا نے یہ بات کہاں سے فرمائی میں نے کہا کہ فقہاء فرماتے ہیں کہ جب پانی موجود نہ ہو تو تیمم طہارت کاملہ ہے۔ حدث اکبر کے لئے بھی اور حدث اصغر کے لئے بھی جب تیمم طہارت کاملہ ہے۔ تو جس نے غسل کا تیمم کیا ہے وہ افضل ہے کیونکہ نائب اکمل کا اکمل ہے اسلئے غسل والے کا تیمم اکمل ہے۔ اس دلیل کو سنکر اُن کی آنکھیں کھل گئیں اور کہنے لگے واقعی اجتہاد کرنا انہی حضرات کا کام تھا۔ صاحبو! تم جب چاہو امتحان کر لو کہ حدیث سے بیش احکام تم مستنبط کرو اور وجہ استنباط پیش نظر رکھو۔ پھر ان احکام کے متعلق فقہاء کا کلام اور اُن کا استدلال معلوم کرو تو واللہ خود قسم کھا کر کہو گے کہ فقہاء حدیث اور قرآن کو خوب سمجھتے ہیں۔ اہل حدیث کو فقہاء پر یہ اعتراض ہے کہ یہ احادیث کے خلاف مسائل بیان کرتے ہیں، میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی اگر عمل بکل الحدیث ہے تو اس معنی کر تو تم بھی عامل بالحدیث نہیں کیونکہ بہت سی احادیث کو جو حنفیہ کے موافق ہیں تم چھوڑتے ہو۔ اور اگر اس کے معنی عمل ببعض الحدیث ہیں تو اسی معنی کر ہم بھی عامل بالحدیث ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تمہارے دلائل بخاری و مسلم میں ہیں۔ اور ہمارے دلائل مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبد الرزاق میں ہیں تو وہ بخاری مسلم کے بھی استاد اور اُستاد الاستاد ہیں گو شاگرد زیادہ مشہور ہو جائے پھر اسکی کیا وجہ کہ تم ائمہ فقہا کو حدیث کا مخالف کہتے اور ان پر طعن کرتے ہو اور در اصل ہم کو غیر مقلدوں سے اسی کی زیادہ شکایت ہے کہ وہ ہمارے ائمہ کو برا کہتے ہیں۔ اگر وہ ائمہ کو برا نہ کہیں تو تقلید یا ترک تقلید سے ہم کو زیادہ بحث نہیں، یہ تو ہر شخص کا خدا کے ساتھ اجتہادی معاملہ خواہ تقلید سے خدا کو راضی کرلے

ع اسی طرح عطاء بن ابی رباح سے سوال کیا گیا کہ عورتیں اگر باہم جماعت کریں تو امامت کے لئے اُن میں کون افضل ہے فرمایا کہ جو حائضہ ہو۔ لکون طہرہا اکمل من طہر غیر الحائض لبراءتہا من الحیض والسنۃ حائضاً۔ یہ جواب غیر مجتہد کبھی نہیں دیسکتا ۱۲ منہ

یا ترک تقلید سے ہمارا اجتہادی خیال یہ ہے کہ ہم بدون تقلید کے دین پر عمل نہیں کرسکتے۔ اگر کسی کا اجتہادی خیال یہ ہے کہ ترک تقلید سے بھی دین مکمل ہوسکتا اور خدا راضی ہوسکتا ہے تو اس کو اختیار ہے ہم اسکی ساتھ نہ الجھیں گے مگر اس کی کیا وجہ کہ وہ مقلدوں سے الجھتے ہیں اور اس سے بڑھکر یہ کہ ہمارے ائمہ کو برا کہتے ہیں۔ حالانکہ ہم ان کے ائمہ کو برا نہیں کہتے بلکہ ہم تمام محدثین کو بھی اپنا امام سمجھتے اور ان کی عظمت کرتے ہیں اور کسی کی تحقیر کو جائز نہیں سمجھتے۔ ایک دفعہ میں قنوج گیا تو غیر مقلدوں نے میری دعوت کی حنفیوں نے تو مجھے منع کیا اور کہا کہ ان لوگوں کا کیا اعتبار کہیں سنکھیا نہ دیدیں۔ مگر میں نے دعوت قبول کی۔ اور کھانے کے بعد یا قبل ان سے کہا کہ میں آپ کا بالقوہ یا بالفعل نمک خوار ہوگیا ہوں، اسلئے میرے ذمہ آپ کی خیر خواہی لازم ہوگئی۔ اس خیر خواہی کی بناء پر میں آپ کو (۲) دو نصیحت کرتا ہوں ایک یہ کہ بدگمانی نہ کرو۔ دوسرے یہ کہ بدزبانی نہ کرو۔ غیر مقلدوں میں یہ (۲) دو مرض زیادہ غالب ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ائمہ کو حدیث کا مخالف سمجھتے ہیں۔

١٦ ان کے نزدیک تاویل و قیاس کے معنی مخالفت حدیث ہیں۔ گو وہ مستند الی الدلیل ہی ہو۔ ایک عامی نے ایک غیر مقلد عالم کو اسی بناء پر سخت الزام دیا۔ ان سے پوچھا کہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ کے کیا معنی ہیں کہا کہ معنی کیا ہوتے۔ تاویل ہی کی کیا ضرورت ہے بس جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے عامی نے کہا کہ حنفی لوگ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے اور حدیث میں آیا ہے کہ لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِاُمِّ الْكِتَابِ تو یہ لوگ آپ کے اصول پر کہ اس میں کچھ تاویل نہیں تارک صلوۃ ہوئے اور تارک صلوۃ کافر ہے تو کیا حنفی سب کافر ہیں جناب وہ عالم دم بخود ہوگئے اور ایسے خاموش ہوئے کہ کچھ جواب نہ بن پڑا۔ کیونکہ وہ محض اس بات پر ان کی تکفیر نہیں کرتے بس نہ حنفیوں کو کافر کہہ سکے اور نہ حدیث میں تاویل کرسکے کیونکہ تاویل اور قیاس کرنا ان کے نزدیک شرک و کفر میں داخل ہے مگر عامی نے ان کو الزام دیکر بتلادیا کہ بدون تاویل و قیاس کے چارہ نہیں اور یہ الزام دینے والا ایک عامی لوہار تھا۔ غرض مشکوۃ و بخاری کا ترجمہ دیکھکر اجتہاد کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ اپنے متبوعا

میاں مٹھو بننا اور بات ہے مگر وہ کسی محقق عالم کے سامنے اپنے اجتہادات بیان کریں تو حقیقت معلوم ہو جائے وہ ان کے سب اجتہادیات کی قلعی کھولکر رکھدے گا۔ اور ان سے اقرار کرائے گا کہ تم اجتہاد کے ہرگز اہل نہیں اسی لئے کہا گیا ہے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را ۔۔۔ عیسٰی نتواں گشت بتصدیق خرے چند

عارف فرماتے ہیں ؎

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد ۔۔۔ بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اجتہاد ایک خاص آن ہے جوامر ذوقی ہے محض کتابوں کے یاد کر لینے کا نام اجتہاد نہیں ۔ ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ۔۔۔ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست ۔۔۔ نہ ہر کہ سر بتراشید قلندری داند

البتہ دو علموں میں اب بھی اجتہاد باقی ہے ۔ ایک طب باطنی میں ایک ظاہری میں

۱۷ جو شخص ان میں مجتہد نہ ہو اس کو علاج کرنا جائز نہیں ۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آجکل عوام کو اتباع علماء سے عار ہے حتیٰ کہ بعض کو ائمہ کے اتباع سے بھی عار ہے ۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ خدا کا راستہ بدون اتباع علماء واتباع ائمہ کے نہیں مل سکتا عوام اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے طریقہ یہی ہے کہ علماء سے احکام پوچھ پوچھ کر ان کا اتباع کریں ۔ اُن کو علماء سے دلائل وحکم دریافت کرنے کا حق نہیں صرف احکام دریافت کرنے کا حق ہے اور علماء کو بھی چاہئے کہ عوام کے سامنے دلائل وحکم بیان نہ کیا کریں ۔ میرا یہی طرز ہے ۔ چنانچہ علی گڈھ میں ایک پروفیسر نے جو عربی ادب کے بڑے ماہر تھے مجھ سے ایک حدیث کا متن پڑھ کر جس میں آیا ہے کہ زنا کی کثرت سے طاعون پھیلتا ہے ، سوال کیا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی ۔ میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنایت وعقوبت میں وجہ ربط سمجھ میں نہیں آئی ۔ کہا ربط سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کہ ربط کے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ اس پر کوئی دین کا کام اٹکا ہوا نہیں ہے آپ بدون علم ربط ہی کے حدیث پر ایمان رکھئے ۔ کہا اس میں ایک نفع ہے ۔ میں نے کہا وہ

گیا۔ کہا زیادتِ اطمینان۔ میں نے کہا خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل؟ کہا دلیل اس کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ط۔ میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نافع تھی وہ آپ کو بھی نافع ہو۔ بس اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ علماء کو عوام کے ساتھ یہی طرز اختیار کرنا چاہیئے کہ دلائل و حِکم و اسرار ان کے سامنے بیان نہ کریں۔ اس سے ان کا دماغ خراب ہوتا ہے۔ پھر وہ کوئی حکم بدون علت و حکمت معلوم کئے بغیر قبول نہ کریں گے اور بعض احکام کی علل و حِکم دقیق ہوتی ہیں عوام بیان کے بعد بھی ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہاں عوام یا تو عمل ترک کریں گے یا علماء علت و حکمت کے سمجھانے میں اپنا دماغ اور وقت ضائع کریں گے اس سے بہتر یہی ہے کہ عوام کے سامنے صرف احکام بیان کئے جائیں۔ یہ تو علماء کا کام ہے اور عوام کا فرض یہ ہے کہ علماء کا اتباع کریں خود اجتہاد نہ کریں، ان سے احکام دریافت کریں علل و حِکم دریافت نہ کریں

18 علماء کو ایک بات کی اور نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ جس کے سر پر بڑے موجود ہوں اس کو اپنی شہرت کی کوشش نہ کرنا چاہیئے بلکہ جہاں تک ہو اپنے کو گم کردے۔ گمنامی میں رہو۔ کیونکہ بڑا بننا سخت خطرہ کی بات ہے۔ اور شہرت سے دنیوی مصائب کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خویش را رنجور ساز و زار زار | تا ترا بیروں کنند از اشتہار
اشتہار خلق بند محکم است | بند ایں از بند آہن کے کم است
چشمہا و خشمہا و رشکہا | بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

یعنی اشتہاری آدمی مجرم ہوتا ہے (یہ لطیفہ ہے) یہ تو آج کل قانون بھی ہے۔ بس سلامتی اسی میں ہے کہ چھوٹے بنکر رہو اس میں دین کی بھی سلامتی اور دنیا کی بھی اور جس کے سر پر کوئی بڑا نہ ہو اس کے لئے میں دوسرا طریقہ بتلاتا ہوں اور اس کے مستحسن ہونے پر قسم کھا سکتا ہوں وہ یہ کہ اپنے چھوٹوں سے مشورہ کیا کرے۔ انشاءاللہ غلطیوں سے محفوظ رہیگا۔ اس کے بعد میں ایک نئی بات کہتا ہوں جو اکثر لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے کہ مرید کو شیخ کی رائے سے مخالفت کا حق نہیں اگرچہ دوسری شق بھی مباح ہو کیونکہ مرید کا

تعلق شیخ سے استاد شاگرد جیسا نہیں ہے بلکہ اس طریق میں مرید شیخ کا معاملہ ایسا ہے جیسے مریض اور طبیب کا معاملہ ہے کہ مریض کو فتوی طبیب کی مخالفت جائز نہیں ایسے ہی یہاں مرید مریض ہے اور شیخ طبیب ہے اس لئے مرید کو شیخ کی مخالفت جائز نہیں۔ ہاں دوسرا شیخ اس شیخ کے اجتہاد سے مزاحمت کرسکتا ہے جیسے ایک طبیب دوسرے طبیب سے مزاحمت کرسکتا ہے مگر مرید تو تربیت میں طبیب نہیں اور جب تک طبیب نہیں اس وقت تک مریض ہے۔ پس اس کے ذمہ اتباع قول طبیب لازم ہے ہاں یہ شرط ہے کہ اس کا قول خلاف شریعت نہ ہو۔ اگر مرید کے نزدیک شیخ کا قول خلاف شرع ہو تو مخالفت جائز بلکہ لازم ہے مگر ادب کے ساتھ اگر واقع میں خلاف شریعت نہ ہو مگر یہ تو اپنے علم کا مکلف ہے (۱) جیسے حضرت سید صاحب بریلوی کو شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصور شیخ تعلیم فرمایا تو سید صاحب نے اس سے عذر کیا کہ مجھے اس سے معاف فرمایا جائے۔ شاہ صاحب نے فرمایا ؎

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید ۔۔۔ کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا 19

سید صاحب نے عرض کیا کہ مے خواری تو ایک گناہ ہے۔ آپ کے حکم سے میں اس کا ارتکاب کرلوں گا پھر توبہ کرلوں گا۔ مگر تصور شیخ تو میرے نزدیک شرک ہے۔ اس کی کسی حال میں اجازت نہیں حضرت شاہ صاحب نے یہ جواب سن کر سید صاحب کو سینہ سے لگالیا کہ شاباش جزاک اللہ۔ تم پر مذاق توحید و اتباع سنت غالب ہے۔ اب ہم تم کو دوسرے راستہ سے لے چلیں گے۔ تصور شیخ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں۔ غرض نبوت تو ختم ہو چکی ہے مگر سبیل حق منقطع نہیں ہوا۔ اس کو علماء سے معلوم کرو اور یہ رحمت ہے کہ نبوت ختم ہو گئی۔ ورنہ انکار نبوت سے کفر لازم آجاتا اور بہت سے مسلمان نبی کے انکار سے کافر ہو جاتے۔ اب کفر سے تو بچ گئے۔ کیونکہ حضور کے بعد کوئی نبی نہیں پس حضور کے بعد کسی امتی کے انکار سے کفر لازم نہ آئے گا ہاں گناہ لازم آئے گا۔ اگر علماء و مجتہدین سے مخالفت و منازعت کی گئی۔ صاحبو! مجتہدین کا وجود بھی ہمارے حق میں رحمت ہے کہ ان حضرات نے محنت کر کے احکام دین کو مدون کیا اور ہم کو پکی پکائی مردی مل

ہی۔ مگر بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم تو خود ہی پکائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت اچھا پکا کر دیکھ لو۔ پھر دونوں کا موازنہ کر لو خود فرق واضح ہو جائے گا۔ پس اجتہاد نہ کرو۔ بلکہ اہل اجتہاد کا اتباع کرو۔ مجتہدین فی الاحکام الظاہرہ کا بھی اور مجتہدین فی الاحکام الباطنہ کا بھی تو یہ سبیل حق قیامت تک بواسطہ علماء کے باقی رہے گا جو اتباع علماء ہی سے آپ کو مل سکتا ہے۔ بدون اس کے راستہ نہیں مل سکتا۔ مقصود تو ختم ہو گیا۔ اب ایک بات باقی رہی کہ اس سبیل کی اضافت سالک کی طرف جو کی گئی ہے یہ باعتبار رعایت ہونے کے ہے۔ کیونکہ یہ اس کا مقصود ہے۔ سالک نہ اس کا موجد ہے نہ مبلغ وداعی ہے۔ نہ داعی کا وارث ہے۔ خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ کو علماء سے خاص تعلق ہے۔ پس علماء کو چاہیئے کہ وہ بھی حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کریں تاکہ فیض میں برکت ہو محض تعلق علم کافی نہیں بلکہ تعلق عملی و حالی کی ضرورت ہے اور عوام کو علماء سے خاص تعلق پیدا کرنا چاہیئے یعنی تعلق اتباع کہ ان کو خدا تعالیٰ سے
۲۰ بواسطہ علماء ہی کے تعلق ہو سکتا ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ کیونکہ وقت زیادہ نہیں ہے جن حضرات کی فرمائش سے یہ بیان ہوا ہے وہ اسی ریل سے جانے والے ہیں اور اب ریل کا وقت قریب آگیا ہے۔ پس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۔

اشرف علی

۵ رجب ۱۳۲۹ھ

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

الغالب للطالب

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی

الغالب للطالب

الاشتات	مَن السامعون	کیف	مَن ضبط	ماذا	لِمَ	کَم	متیٰ	اَین
متفرقات	[illegible]	[illegible]	[illegible]	کیا مضمون تھا۔	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

اَلحمدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ

اَمَّا بَعْدُ فَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ مَرْفُوْعًا لَمَّا قَضَی اللّٰہُ الْخَلْقَ کَتَبَ کِتَابًا فَھُوَ عِنْدَہٗ فَوْقَ عَرْشِہٖ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ وَفِیْ رِوَایَۃٍ غَلَبَتْ غَضَبِیْ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ یہ ایک حدیث ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جو بڑے جلیل القدر صحابی ہیں حضور ﷺ سے

انکو خاص خصوصیت تھی ہر وقت حضور ہی کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور کوئی کام زراعت تجارت وغیرہ کا نہ کرتے تھے بلکہ متوکلانہ حضور کے دروازہ پر پڑے رہتے تھے اور احادیث نبویہ کو ہر وقت سنتے اور یاد کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ صحابہ میں سب سے زیادہ حافظ حدیث ہیں انکی برابر کسی نے احادیث کی روایت نہیں کی۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس وقت اپنی چادر میرے سامنے پھیلائے اور جب میں اسمیں کچھ دم کردوں تو چادر کو اپنے سینے سے لگالے تو کوئی بات کبھی نہ بھولیگا حضرت ابوہریرہؓ نے اپنی چادر پھیلادی اور حضورؐ نے اسمیں کچھ پڑھ کر دم کردیا تو انھوں نے اسکو اپنے سینے سے لگالیا۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں۔ کہ اسکے بعد سے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات کبھی نہ بھولا۔ یہ چند جملے حضرت ابوہریرہؓ کی تعریف میں اسلئے کہدیئے تاکہ انکی روایت کی وقعت وعظمت ہو۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے ایک معاملہ کی ہم کو اطلاع دی ہے جو اللہ تعالے نے مخلوق کے ساتھ کیا ہے اور اسمیں اللہ تعالی کا ایک ارشاد بھی مذکور ہے۔ ترجمہ حدیث کا یہ ہے کہ جب اللہ تعالی نے مخلوق کو مقدر کیا۔ قَضٰی کے معنی لغت میں فیصلہ کرنے کے ہیں مگر فیصلہ کی دو قسمیں ہیں ایک عملی۔ ایک تجویزی۔ اگر عملی فیصلہ مراد ہو تو اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ جب اللہ تعالی نے مخلوق کو پیدا کردیا۔ یعنی انواع کو کیونکہ افراد تو سب اُس وقت پیدا نہوئے تھے۔ اور اگر تجویزی فیصلہ مراد ہے تو ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ جب اللہ تعالی نے مخلوق کا خلق مقدر کیا کیونکہ تقدیر تجویز ہی تو ہے۔ غرض یا تو خلق تجویزی ہوا تھا یا عملی اجمالی ہوا تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ ابھی تک مخلوق سے اعمال صادر نہوئے تھے اور اعمال دو قسمیں ہیں۔ ایک موجب رحمت ایک موجب غضب تو اسوقت کسی قسم کے اعمال مخلوق سے صادر نہوئے تھے اس وقت اللہ تعالی نے ہماری ساتھ ایک معاملہ ایسا فرمایا کہ اپنے پاس عرش پر ایک کتاب میں یہ مضمون لکھ کر رکھ لیا اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے۔ تو یہ مضمون بڑا عظیم ہے جو عرش پر لکھ کر رکھا گیا ہے اللہ تعالی سے خاص قرب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی کو عرش سے خاص تعلق ہے عرش پر جو چیز ہے اسکو اللہ تعالی سے خاص قرب ہے کیونکہ اللہ تعالے کو عرش سے خاص تعلق ہے اسی تعلق کو استوٰی سے تعبیر فرمایا ہے جسکے یہ معنی نہیں کہ جس طرح ہم تم بیٹھتے ہیں اسی

طرح معاذ اللہ وہ بھی بیٹھے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس سے منزہ ہونے پر دلائل عقلیہ ونقلیہ قائم ہیں۔ دلیل نقلی تو لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ہے اور دلائل عقلیہ سے علماء واقف ہیں۔ اور حضرات صوفیہ نے اس مسئلہ کو بہت سہولت سے حل کر دیا ہے۔ واقعی یہ حضرات سچے وارث ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے جس طرح حضرات انبیاء سہل عنوان سے مشکل مسائل کو تعبیر کرتے ہیں ایسے ہی صوفیہ کی عادت ہے کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو سہل عنوان سے حل کر دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مکان کو متمکن سے کچھ مناسبت وقرب مقدار تو ہونا چاہیئے۔ اوّل تو عادۃً مکان مکین سے زیادہ ہوتا ہے اگر زیادہ بھی نہ ہو تو مساوات تو ہے اور کم از کم کسی قدر مناسبت ونسبت تو ہونا چاہیئے۔ اور عرش کو حق تعالیٰ سے کچھ بھی نسبت نہیں اگر حالت موجودہ سے کروڑوں گنے بھی بڑا ہو جب بھی اسکو حق تعالیٰ سے کچھ مناسبت نہ ہوگی۔ کیونکہ عرش محدود ہے اور ذات حق غیر محدود ہے۔ اور محدود کو غیر محدود سے کیا مناسبت کچھ بھی نہیں پھر وہ اس کے لئے مکان کیسے ہوسکتا ہے البتہ حق تعالیٰ سے عرش کو خاص تعلق ہے اور حق تعالیٰ کو اُس سے تعلق ہے مگر تحیز کا تعلق نہیں ہے بس وہ صدر مقام ہے۔ نزول احکام وتجلیات کا اللہ تعالیٰ کی تجلیات سب سے زیادہ عرش پر ہیں (یعنی امکنہ میں ورنہ عرش سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر تجلی حق ہے ۱۲) تو وہاں جو چیز لکھ کر رکھی جائے گی۔ وہ بڑی عظمت کی ہوگی۔ پس عقیدۃً بھی اُس کا حق عظمت ادا کرنا چاہیئے اور عملاً بھی وہ مضمون یہ ہے اِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ اس مقام پر ایک بات اور بھی سمجھنا چاہیئے وہ یہ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت وغضب کو اپنے رحم وغضب پر قیاس نہ کرے یہ سخت غلطی ہے۔ کیونکہ جس طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ معلوم نہیں اسی طرح صفات کی کنہ بھی معلوم نہیں۔ اسی لئے حضرات علماء نے اس مقام پر بڑی تحقیق سے کام لیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ صفات واسماء الٰہیہ توقیفی ہیں جنمیں قیاس جائز نہیں علماء نے اسقدر ادب کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو طبیب کہنا جائز نہیں ہاں شافی کہنا جائز ہے یہاں رائے وعقل سے کام لینا جائز نہیں کیونکہ ؎

دُور بینان بارگاہ الست ❊ غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

حالانکہ بظاہر طبیب میں کچھ خرابی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ طب کہتے ہیں تدبیر شفاء کو اور اللہ تعالیٰ

اس میں کوئی نہیں بولا

کیلئے تمیز ثابت ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مگر چونکہ نصوص میں اللہ تعالیٰ پر طبیب کا اطلاق وارد نہیں اسلئے علماء نے اسکی اجازت نہیں دی کیونکہ ممکن ہے کہ طب میں کوئی بات ایسی ہو جو کہ عظمت کے منافی ہو اسکی ایسی مثال ہے جیسے عـہ وائسرائے میں اگرچہ کانسٹبل کے اختیارات بھی ہیں کیونکہ کانسٹبل کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ اُسی کے دیئے ہوئے ہیں مگر وائسرائے کو کانسٹبل کہنا جائز نہیں۔ اور اگر کوئی وائسرائے کو کانسٹبل کہنے لگے تو مجرم قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح یہاں سمجھو پس جو حالت ہمارے رحم کی ہے کہ ہمارا دل کڑھتا ہے اسپر حق تعالیٰ کے رحم کو قیاس نہ کرو کہ معاذ اللہ ان کا بھی دل کڑھتا ہو گا۔ یہ اعتقاد باطل و حرام ہے اسی طرح اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ میں حق تعالیٰ کے استواء کو اپنے استواء پر قیاس نہ کرو ایک محقق کا ارشاد ہے کہ استوٰی کے معنی استقرار ہیں مگر ہر شے کا استقرار جدا ہے جیسے بات کا دل میں جمنا اور ہے اور مکین کا مکان میں جمنا اور ہے پس استوٰی کی حقیقت کا ادراک مستوی کی حقیقت معلوم ہونے پر موقوف ہے اور کنہ باری معلوم نہیں تو حقیقت استوٰی کی گفتگو عبث ہے واقعی اس اُمت کے علماء ورثۃ الانبیاء ہیں۔ مگر ایسے جیسے یہ حضرات محققین تھے نہ ہم جیسے علماء۔ اسی طرح غضب کی حقیقت ہمارے اندر جوش کا پیدا ہونا اور بے قابو ہو جانا ہے جسمیں بعض اوقات منہ سے کف بھی نکلتا ہے اسپر حق تعالیٰ کے غضب کو قیاس نہ کرنا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شئے غالب نہیں بَلْ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ اللہ تعالیٰ قاہر ہیں۔ مقہور نہیں غالب ہیں مغلوب نہیں۔ اُن کا غضب رحم اختیاری ہے یعنی یہ صفات درجۂ صفات میں وقدیہ ہیں۔ اختیاری نہیں اور قدیم میں تغیر محال ہے ورنہ امکان خلوص عن الصفات لازم آئے گا اور یہ محال ہے مگر ان صفات کا نفاذ اختیاری ہے کوئی صفت قدیمہ بدون ارادہ حق کے نافذ نہیں ہو سکتی تو جب قدیم بھی غالب نہیں اُسپر حادث کیسے غالب ہو گا۔ رہا یہ کہ پھر حق تعالیٰ کے غضب و رحمت کے کیا معنی ہیں سو علماء نے رحمت کی تفسیر ارادۃ الثواب اور غضب غضب کی ارادۃ العقاب کی ہے اور میرے نزدیک یہ بھی محض تفہیم کے لئے ایک عنوان ہے یہ بھی حقیقت نہیں میرے نزدیک صفات تو کیا افعال الٰہیہ کی بھی کنہ کسی کو معلوم نہیں اسی لئے

عـہ سبحان اللہ عجیب مثال ہے جس نے دقیق مضمون کو کتنا سہل کر دیا۔ فللہ درہ ما اصدقہ قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (۱۲ ظ)

حضرات انبیاء علیہم السلام نے کیفیت افعال سے تو سوال کیا ہے۔ رَبِّ اَرِنِی کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی وَ اَنّٰی یُحْیِی هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا مگر حقیقت افعال سے کہیں سوال وارد نہیں حضرات انبیاء علیہم السلام بڑے مؤدب تھے کہ جس بات کے سمجھنے کی توقع نہیں ہوتی اسکو پوچھتے بھی نہ تھے۔ اسی لئے سوال عن کیفیۃ الافعال کے بعد دوبارہ سوال حقیقت سے نہیں کیا۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی اُمت کو یہی طریقہ سلامتی کا تعلیم کیا ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ جو اُمور فہم میں نہ آسکیں۔ اُن میں غور وخوض نہ کیا جائے۔ یہ بڑا ادب ہے اور واللہ اسی میں سلامتی ہے اور سکون واطمینانِ قلب بھی اسی میں ہے چنانچہ حضور ؐ نے مسئلہ قدر میں غور کرنے سے منع فرمادیا کیونکہ اس کا تعلق افعال وصفات باری تعالیٰ سے ہے جن کی کنہ کا علم تو محال ہے اور اگر وجہ معلوم ہو بھی گئی تو ایک وجہ کے لئے پھر دوسری وجہ ہوگی۔ پھر اس سلسلہ وجوہ سے وہ حالت ہوگئی کہ

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

مگر آجکل بعض لوگ ایسے بددماغ ہیں کہ اس ادب کی قدر نہیں کرتے بلکہ متشابہات اور مسئلہ قدر میں گفتگو کرتے ہیں مگر اُن سے کوئی قسم دیکر پوچھے کہ کیا تم کو گفتگو اور غور وخوض سے سکون واطمینان حاصل ہوا۔ ہرگز نہیں۔ واللہ ایک جاہل مسلمان کو مسئلہ قدر میں جتنا اطمینان ہے ان گفتگو کرنے والوں کو اس کا دسواں حصہ بھی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرات صحابہؓ کا ادب دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر ضحک فرماتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف لائے جاتے ہیں (یعنی جہاد میں بعض کافر زنجیروں میں قید ہو کر آتے ہیں پھر اہل اسلام کی صحبت سے مسلمان ہوجاتے ہیں) تو گویا یہ لوگ زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف لائے گئے (۱) اسپر صحابہؓ نے یہ سوال نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح ضحک فرماتے ہیں بلکہ یہ حدیث سنتے ہی خوش ہوئے اور کہا یا رسول اللہ جب اللہ تعالیٰ ضحک بھی فرماتے ہیں تو ایسے خدا سے تو ہم کو بڑی اُمیدیں ہیں۔ واقعی خدا ہمارا ایسا۔ اور رسول ایسے مہربان جنھوں نے ہم کو یہ باتیں بے تکلف بتلادی ہیں ورنہ دوسرا مصلح تو اسی سوچ میں رہتا کہ اس بات کو بیان کروں یا نہ کروں کہیں مصلحت کے خلاف تو نہیں کبھی لوگ خدا تعالیٰ کی ایسی رحمت ومہربانی کو سُنکر

دلیر نہو جائیں۔ جیسے حضرت غوث اعظمؒ نے چالیس سال تک رحمتِ الٰہیہ کا بیان فرمایا پھر خیال ہوا کہ شاید لوگ دلیر ہو گئے ہونگے تو ایک دن غضب الٰہی کا بیان فرمایا وہ ایسا غضب کا بیان تھا کہ مجلس میں سے چند جنازے اُٹھے۔ کئی آدمی خوف سے مر گئے تو آپ پر بذریعہ الہام کے عتاب ہوا کہ تم نے ہمارے بندوں کا دل توڑ دیا کیا ہماری رحمت اتنی ہی ذرا سی تھی کہ تمہارے چالیس سال کے بیان میں ختم ہو گئی میں کہتا ہوں اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خیال ہوتا جو حضرت غوث اعظم کو ہوا تو ہم کو حق تعالیٰ کی رحمت و لطف و ضحک کی خبر کیونکر ہوتی مگر حضورؐ کو اُنکے بیان میں ذرا پس و پیش نہیں ہوا تو اللہ تعالیٰ ایسے اور رسول ہمارے لیے بس یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے

یارب تو کریمی و رسولِ تو کریم ✤ صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

اور سعدیؒ فرماتے ہیں

نماند بعصیاں کسے در گرد ✤ کہ دارد چنیں سید پیشرو

غرض اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال میں قیاس سے کام نہ لو اللہ تعالیٰ صاحب رحمت بھی ہیں صاحب غضب بھی ہیں وہ ضحک بھی فرماتے ہیں صاحب ید و وجہ بھی ہیں صاحب قدم و ساق بھی ہیں مگر اپنے ید و وجہ و قدم و ساق پر قیاس نکرو۔ اور ہاں اللہ تعالیٰ صاحب فخذ نہیں ہیں کیونکہ نصوص میں اس کا ذکر نہیں اور قیاس جائز نہیں یہ اسلئے میں نے کہدیا کہ شاید کوئی عقل کا پورا قیاس سے یوں کہنے لگے کہ جب وجہ و ید و قدم و ساق ہے تو اُنکے درمیان کی چیزیں فخذ وغیرہ بھی ہونگی۔ اس کو یہ جواب دیا جائے گا

تو نہ دیدی ہے گہے سلیماں را ✤ چہ شناسی زبانِ مرغاں را

عہ قال الذہبی فی المیزان فی ترجمۃ ابان بن ابی عیاش یروی ان مالکا (ہو ابن دینار) لقی ابانا فقال الی کم تحدث الناس بالرخص فقال یا ابا یحییٰ انی لارجوان تری من عفو اللہ ما تخرق لہ کساءک ہذا من الفرح وروی ان ابانا رؤی فی المنام فقال اوقفنی اللہ بین یدیہ فقال ما حملک علی ان تکثر للناس من ابواب الرجاء فقال یارب اردت ان احببک الی خلقک فقال قد غفرت لک آہ (صـ ج ۱) وفی الجامع الصغیر عن ابی امامۃ مرفوعا حببوا اللہ الی خلقہ یحببکم اللہ۔ وعزاہ الی الطبرانی فی الکبیر والی الضیاء المقدسی واحادیث الضیاء صحاح علی قاعدۃ السیوطی کما فی کنز العمال ولکن الحدیث ضعفہ العزیزی فقال اسنادہ ضعیف آہ (صـ۲۰۲ ج ۲) ظفر احمد عفا اللہ عنہ قلت قال سیدی حکیم الامۃ فی بعض مواعظہ لا اقول انی اجعلکم متقین کالجنید والشبلی ولکن اقول سوف اجعلکم للہ عاشقین ان اتبعتمونی وعملتم بقولی

جیسے ایک بزرگ نے فرمایا تھا اُس شخص کے جواب میں جس نے دریافت کیا کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا باتیں کی تھیں فرمایا ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں ✽ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

لوگ اولیاء اللہ کو خدا کا رازدار سمجھتے ہیں کہ اُن سے ایسے سوالات کرتے ہیں چنانچہ ایک شخص نے کسی مجذوب سے پوچھا کہ یہ بادشاہت کب تک رہیگی۔ مجذوب نے ڈنکا کر جواب دیا کیا میں خدا کا رشتہ دار یا سر رشتہ دار ہوں جو ان باتوں کی مجھے خبر ہو مجھے غیب کی کیا خبر۔

حالانکہ مجاذیب اکثر امور تکوینیہ کو ظاہر کر دیا کرتے ہیں مگر بعض مجذوب مؤدب بھی ہوتے ہیں جیسے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی تعریف میں نے حضرت حاجی صاحب سے سنی ہے سالکین کی زبان سے مجذوبوں کی تعریف کم سنی جاتی ہے مگر حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی تعریف ہمارے حضرت نے بہت کی ہے اور یہ حافظ صاحب صرف ایک کمبل میں رہتے تھے مگر کبھی برہنہ نہیں دیکھے گئے اور اس سے بڑھکر یہ کہ ایک بار جلال آباد تشریف لے گئے وہاں کے پٹھانوں نے کہا حضور نے قدم رنجہ فرمایا تو اُنکو ادب سکھلایا کہ بزرگوں سے یُوں نہیں کہا کرتے کہ قدم رنجہ فرمایا کیا ہم کسی کے نوکر ہیں جو قدم رنجہ فرماتے بلکہ یُوں کہا کرتے ہیں کہ حضور نے کرم فرمایا۔ تو وہ مجذوب بھی مؤدب تھے جنہوں نے یہ فرمایا کیا میں خدا کا رشتہ دار یا سر رشتہ دار ہوں اس لئے یہ سوال اُنکو ناگوار ہوا اس میں غضب کا استفسار تھا۔ یہ ایک ضروری مضمون تھا سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ کے متعلق کہ حق تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس نکرنا چاہیئے اب میں مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب میں جو عرش پر ہے قبل ہمارے وجود کے اور قبل وجود ان افعال کے جو موجب رحمت و غضب ہیں اپنے پاس یہ لکھ لیا ہے کہ میری رحمت غضب سے بڑھی ہوئی ہے یعنی میری رحمت غضب پر غالب ہے بس بلا تکلف یہ حالت ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود ✽ لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

یعنی حق تعالیٰ کا لطف اُس وقت ہمارے شامل حال تھا جب کہ نہ ہمارا وجود تھا نہ ہماری طرف سے کچھ تقاضا تھا۔

دو یہاں ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی یہ ہے کہ سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ غَضَبِیْ پر بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ صفات قدیمہ میں سبقت و غلبہ کیسے ہو سکتا ہے **جواب** یہ ہے کہ یہاں صفات قدیمہ میں سبقت و غلبہ مراد نہیں بلکہ ان کے تعلق میں سبقت و غلبہ مراد ہے اور تعلق حادث ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شخص میں اسباب غضب و اسباب رحمت دونوں مجتمع ہوں تو اس پر رحم ہی ہو جاتا ہے اب اشکال کچھ نہیں۔ یہ تو حدیث کے متعلق لفظی تحقیق تھی۔ اب میں اس سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف ابھی تک ذہن نہ گیا ہوگا۔ اور اسکی ضرورت عوام کو نہیں کیونکہ جس غلطی کا ازالہ اس وقت کیا جائے گا وہ عوام کو پیش نہیں آتی وہ ان امراض سے بری ہیں جیسے وہ بدہضمی کے مرض سے بھی بری ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک دیہاتی کو کسی حکیم نے دیکھا کہ اس نے روٹی کھا کر اوپر سے چھاچھ کا بدھنا بھرا ہوا پی لیا حکیم صاحب نے کہا کہ کھانے کے بعد چھاچھ پینا مضر ہے۔ اسکو درمیان میں پینا چاہئیے تو اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ ارے فلانے چار ٹکڑ (موٹی روٹیاں) اور لے آ اسے چھا کو بیچ میں کر لوں۔ یہ حکیم کہہ رہا ہے کہ اسے بیچ میں کر لے چنانچہ وہ چار مچنگ اور لایا اور چودھری صاحب وہ بھی کھا گئے پھر حکیم سے کہا کہ حکیم جی اب تو نقصان نہ ہوگا۔ حکیم نے کہا کہ بھائی تو قواعد طب سے مستثنیٰ ہے تجھے کسی طرح مضر نہیں۔ تو جیسے عوام بہت سے ظاہری امراض و خطرات سے بری ہیں۔ ایسے ہی بہت سے باطنی امراض و خطرات سے بھی بری ہیں ہاں کبھی خواص سے مل کر انہیں بھی یہ امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر دیہاتی ہونا ہی بہتر ہے نہیں ہرگز نہیں کیونکہ دیہاتی گو بعض امراض سے محفوظ ہیں مگر بہت سے لطفوں سے محروم ہیں شہر والوں کو لطف بہت حاصل ہیں۔ اسی طرح خواص کو لطف بہت ہے کہ انکو عوام سے زیادہ اللہ اور رسول کی معرفت ہے اور معرفت وہ چیز ہے کہ جنت بھی اسی کی ایک فرع ہے چنانچہ حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کو بچپن میں مر جانا اور خطرات سے محفوظ ہونا پسند ہے یا بالغ ہو کر خطرہ میں پڑنا پسند ہے فرمایا کہ مجھے[1] بالغ ہو کر خطرہ میں پڑنا زیادہ پسند ہے بچپن کی موت پسند نہیں کیونکہ بلوغ کے بعد معرفت حق عز و جل زیادہ ہوتی ہے۔ جو بچپن میں نہیں ہوتی۔

---

[1] اخرج ابو نعیم فی الحلیۃ بلفظ عن علی قال لا یسرنی لو مت طفلا و دخلت الجنۃ و لم اکبر فاعرف ربی عز و جل ام کنز العمال ج ۱۲ ص ۱۸۱ ج

حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ اسی معرفت پر خوش ہو کر فرماتے ہیں ؎

شکر للہ کہ نمردیم ورسیدیم بدوست آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما

میں نے حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سُنا ہے فرماتے تھے کہ بھائی جنّت کا مزہ برحق کوثر کا مزہ برحق۔ مگر نماز میں جو مزہ ہے وہ کسی چیز میں نہیں جب ہم سجدہ میں جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے پیار کر لیا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ جب ہم جنّت میں جائینگے اور حوریں آئیں گی تو ہم اُن سے کہدیں گے کہ بی اگر قرآن سُناؤ تو بیٹھو ورنہ لبمی ہو۔ تو حضرت معرفت ایسی لذیذ شئے ہے کہ عارفین کے نزدیک جنّت اور حوروں میں بھی وہ مزہ نہیں جو اس میں ہے اور اس سے نعمائے دُنیا کا کہ انمیں معرفت بھی ہے نعمائے جنّت سے افضل ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ جنّت میں یہ معرفت ایسی ہوگی کہ وہاں کی نعمت سے زیادہ لذیذ ہوگی تو خود جنّت کی بعض نعمتیں بعض سے افضل ہوئیں باقی ہم جیسوں سے کوئی پوچھے تو ہم تو یوں کہیں گے۔ کہ روٹیوں میں زیادہ مزہ ہے۔ نماز میں کیا مزہ؟ اور فقہاء نے ہم جیسے ضعفاء کے لئے وسعت بھی بیدی ہے کہ اگر کھانا سامنے ہو اور نماز ہونے لگے تو روٹی پہلے کھالو نماز بعد میں پڑھ لینا تاکہ نماز فراغت سے پڑھی جائے ورنہ ساری نماز میں روٹی ہی کا خیال رہے گا۔ کیونکہ تمھارے نزدیک روٹی میں مزہ زیادہ ہے اور اسی لئے شریعت نے تعجیل افطار کا حکم دیا ہے کہ نماز مغرب سے پہلے افطار کر لینا چاہیئے۔ اور حضور نے یہ بھی فرمایا ہے۔ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ الرَّحْمٰنِ کہ روزہ دار کو دو خوشیاں ہیں۔ ایک افطار کے وقت ہوتی ہے دوسری اللہ تعالیٰ سے۔ ملاقات کے وقت ہوگی.... ہم لوگوں کو تو افطار کے وقت خوشی اسی کی ہوتی ہے کہ کھانے کو ملا مُنہ کا تالا کُھل گیا مگر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو جو مسرت تھی وہ اس بات پر تھی کہ منزل پوری ہوگئی خدا کا حکم ادا ہوگیا ؎ شکر للہ کہ نمردیم درسیدیم بدوست ۞ آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما ۞ بہرحال خواص کے مراتب زیادہ ہیں گو انکو خطرات بھی بہت ہیں۔ ایک بار مجھ پر ایک سخت حالت تھی۔ اسوقت میں تمنا کرتا تھا کہ کاش میں قرآن کا ترجمہ نہ سمجھتا کیونکہ وہ حالت ترجمہ سمجھنے ہی کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ بعد میں ہوش آیا کہ یہ تمنا ناشکری ہے۔ بلکہ ہم لوگوں کو خطرات سے بچنے کی ہمت کرنا چاہیئے۔ اور ان لذتوں سے خوش

ہونا چاہیئے۔ خواص کو خطرہ بیشک بہت ہے۔ مگر اسی کی وجہ سے تو اُن کے مراتب زیادہ ہیں۔ ملائکہ سے نوع بشر اسی لئے افضل ہے کہ ملائکہ کو خطرہ نہیں۔ اور انسان کو خطرہ ہے حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور اُنکی ذریت کو پیدا کیا تو ملائکہ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔ یَارَبِّ خَلَقْتَهُمْ يَأْكُلُوْنَ وَيَشْرَبُوْنَ وَيَنْكِحُوْنَ وَيَرْكَبُوْنَ وَاجْعَلْ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْآخِرَةَ کہ اے اللہ! انسان کو دُنیا دیجئے اور ہم کو آخرت دیدیجئے۔ ارشاد ہوا کہ لَا أَجْعَلُ مَنْ خَلَقْتُهُ بِيَدَيَّ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ كَمَنْ قُلْتُ لَهٗ كُنْ فَكَانَ کہ ایسا نہیں ہوسکتا کیا میں ایسی مخلوق کو جسے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے اُسکی برابر کردوں جس کو کُن کہہ کر پیدا کردیا تو یہ فضیلت انسان کی اُن خطرات ہی کی وجہ تو ہے جو ملائکہ کو درپیش نہیں۔ بعض لوگ ذکر میں لذت اور مزہ کے طالب ہیں۔ لئے بس رہتے دو یہ مزہ نہ آنا بھی رحمت ہے کیونکہ مزہ کے بعد ثواب کم ہوجاتا ہے دیکھو ملائکہ کو عبادت میں لذت حاصل ہے اور انسان عام طور پر طاعات میں لذت سے خالی ہیں مگر ثواب زیادہ انسان ہی کو ہے بس تمہارا تو یہ مذاق ہونا چاہیئے عـــ۵

ناخوش تو خوش بود برجان من ✤ دل فدائے یار دل رنجانِ من

پھر بعض دفعہ لذت سے انبساط بڑھ جاتا اور ادلال ہوجاتا ہے جو کبھی گستاخی کی حد سے قریب ہوجاتا ہے ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ایک دُعا کی اُس کا جواب الہام سے عطا ہوا اُسکے جواب میں آپ نے ایک کلمہ ایسا فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ یا مولانا گنگوہیؒ اُسکو سُنکر کانپ گئے اور فرمایا کہ یہ آپ ہی کا مرتبہ ہے جو ایسی بات کہہ گئے کوئی دوسرا کہتا تو کان پکڑ کر باہر نکال دیا جاتا۔ بہرحال خواص کو خطرات سے نہ گھبرانا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ وارد دیکھ کر مرض دیتے ہیں خواص کو جس طرح خطرات بہت ہیں اسی طرح اُن میں تحمل کی طاقت بھی زیادہ ہے اگر عوام میں یہ امراض و خطرات ہوتے جو خواص کو درپیش ہوتے ہیں تو وہ اُن کا تحمل بھی نہ کرسکتے جیسا کہ بچوں کو خطرات بہت پیش آتے ہیں مگر اُنکی تائید بھی بالغوں سے زیادہ ہوتی ہے بچے بہت گرتے پڑتے ہیں بعض دفعہ بہت اونچے سے گرجاتے ہیں مگر اُنکے زیادہ چوٹ نہیں آتی

عـــ۵ کذا فی المشکوٰۃ عن البیہقی ۱۲

بڑا آدمی تو مر ہی جائے میاں جی ظالموں کی طرف سے بچوں پر بہت زیادتی ہوتی ہے۔ اگر میاں جی کو اتنا پیٹا جائے تو وہ بستر ہی سے نہ اٹھ سکے مگر بچے اگلے ہی دن آجاتے ہیں۔ بچوں کی حفاظت پر ایک یہ حکایت یاد آئی کہ ایک عورت ریل میں سفر کر رہی تھی۔ اور اسکے ایام وضع قریب تھے وہ ضرورت سے ریل کے پاخانہ میں گئی اسی وقت اسکے درد شروع ہوا اور بچہ نکل کر پاخانہ کی موری میں سے نیچے گر پڑا ماں تو یہ دیکھ کر تڑپ گئی اور سخت بے چین ہو کر باہر آئی اور ریل کی روکنے کی زنجیر کھینچ لیا ریل رکی اور گارڈ وغیرہ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو فوراً ڈرائیور انجن کو لے کر پیچھے لوٹا دور جا کر بچہ نظر پڑا کہ دونوں پٹریوں کے بیچ میں پڑا ہوا ہاتھ پیر چلا رہا اور انگوٹھا چوس رہا ہے اور اسکے بدن میں کسی جگہ بھی چوٹ نہ آئی تھی ڈرائیور نے دوڑ کر اسکو اٹھایا اور خوش خوش واپس ہوا اور ماں کو لاکر دیدیا وہ تو گویا مر کر زندہ ہو گئی۔ پھر ریل روانہ ہو گئی۔ تو جیسے بچوں کی خطرات میں امداد و تائید ہوتی ہے اسی طرح خواص کی تائید ہوتی ہے اسلئے انکو نہ گھبرانا چاہیئے۔

اب میں اس مضمون کو بیان کرتا ہوں جو اس حدیث سے مستنبط کرنا مقصود ہے گو وہ مضمون دقیق ہے مگر زیادہ دقیق نہیں ہاں عوام و مستورات کے سامنے بیان کرنے کا نہیں تھا اسی لئے مجھے تردد تھا کہ اسکو عورتوں کے مجمع میں بیان کروں یا نہ کروں مگر بعض دفعہ دقیق مضامین بیان کر کے جو مستورات سے پوچھا گیا کہ تم نے کیا خاک سمجھا ہو گا تو انھوں نے کہا کہ ہم تو سمجھ گئے مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے اسلئے ہمت کرتا ہوں میرا ارادہ اس مضمون کے بیان کرنے کا پہلے ہوا تھا مگر یہ خیال تھا کہ مجمع خواص میں بیان کروں گا۔ جب مستورات کی طرف سے درخواست بیان کی ہوئی تو دوسری آیت کے بیان کا ارادہ ہوا یعنی يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (عـه) مگر پھر رائے بدل گئی۔ لیکن اس آیت کا ترجمہ تو کر دوں تاکہ کچھ اس آیت کا بیان بھی ہو جائے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ مسلمان کو مرتے وقت ملائکہ اس طرح بشارت دینگے کہ اے نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف واپس چل اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہیں پس تو میرے خاص بندوں (کی جماعت) میں داخل ہو جا اور میری جنت میں پہونچ جا۔ یہ تو ترجمہ ہوا۔ اب ایک نکتہ بھی بیان کر دوں وہ یہ کہ آیت میں۔ اُدْخُلِي فِي عِبَادِي کو اُدْخُلِي جَنَّتِي پر مقدم کیا گیا ہے۔

عـه اے اطمینان والی روح اپنے پروردگار کے جوار رحمت کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش پھر ادھر چل کر میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا ۱۲ جامع

اسکی کیا وجہ ہے۔ سو اسکی توجیہ حضرت امام شافعیؒ کے قول سے سمجھ میں آئی وہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ سُنا ہے کہ جنّت میں دوستوں کی زیارت و ملاقات ہوگی اس وقت سے مجھے جنّت کا اشتیاق ہوگیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں کی ملاقات میں جنّت سے بھی زیادہ لذّت ہے۔ مگر شطرنج بازگنجفہ باز دوست نہیں بلکہ امام شافعیؒ جیسے دوست جو شافی ہوں۔ یا شافع ہوں اور یا، دعین دونوں جمع ہو جائیں تو نُورٌ علیٰ نُور ہے اور اگر ایسے دوست نہوں بلکہ محض دنیوی دوستی ہو تو وہ آخرت میں مبدّل بعداوت ہو جائے گی۔ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ وہاں وہی دوستی باقی رہے گی جس کا منشا دین اور تقوٰی ہو۔ بہر حال دوستوں کی ملاقات میں ایسی لذّت ہے کہ اسکے بغیر جنّت بھی خالی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

با تو دوزخ جنّت است اے جانفزا　✤　بے تو جنّت دوزخ ست اے دلربا

ہر کجا یوسف رُخے باشد چو ماہ　✤　جنّت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ

ہر کجا دلبر بود خرّم نشیں　✤　فوق گردوں ست نے قعر زمیں

ایک صحابی کو یہ خیال ہوا کہ اگر جنّت میں ہم نیچے کے درجہ میں ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُوپر کے درجوں میں اور اسلئے آپ کی زیارت نہوئی تو جنّت کو لیکر کیا کرینگے انھوں نے حضورؐ سے سوال کیا اسپر یہ آیت نازل ہوئی وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا کہ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ رہینگے جنپر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء، اور صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ (جنّت میں) ہونگے اور یہ لوگ اچھے رفیق (اور اچھے دوست) ہیں۔ ساتھ ہونیکے یہ معنی نہیں کہ سب کے سب اُنکے درجہ میں رہینگے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن کے قریب رہینگے اور اُن سے زیارت و ملاقات کیا کرینگے کبھی ہم حضورؐ کی زیارت و ملاقات کو جایا کرینگے کبھی حضورؐ بھی انشاء اللہ ہمارے پاس تشریف لایا کرینگے۔

اسوقت ہم خوش ہو کر یہ کہیں گے ؎

امروز شاد شاہان مہمان شدست ما را　✤　جبرئیل با ملائک دربان شدست ما را

آگے ناز کو قطع کرتے ہیں کہ اپنے عمل پر ناز نہ کرنا۔ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض فضل ہوگا۔ اسکے بعد فضل ہوگا۔ اسکے بعد فضل پر تکیہ کو توڑا وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا کہ فضل پر تکیہ کرکے بے فکر نہو جاتا اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ فضل کس پر ہوگا کس پر نہیں جس کو دوسرے مقام پر صراحت کے ساتھ بتلا دیا گیا ہے۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل نیکو کار بندوں سے قریب ہے تو مستورات کی درخواست کے بعد اول اس مضمون کے بیان کا ارادہ تھا۔ جس کا ذکر بھی اجمالاً کچھ ہوگیا پھر دوسرے مضمون کا قصد ہوا مگر اس کا منتظر تھا کہ مجمع اس کا سمجھنے والا قدردان ہو تو بیان کروں پھر اتفاق سے ایسا مجمع بھی ہوگیا ع مگر مجھے تردد تھا کہ مستورات کے سامنے اسکو بیان کروں، یا نہیں مگر ایک تو مستورات کے اس قول سے کہ ہم تو دقیق مضامین بھی سمجھ لیتے ہیں کچھ ہمت ہوئی۔ پھر خدا پر توکل اور بھروسہ کرکے بیان کا قصد کرہی لیا۔ اور اس مرض کے متعلق بیان کرنا تجویز کرلیا جو کہ اکثر خواص میں ہے اور یہ جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوام کو بھی خواص سے لگ کر یہ امراض لگ جاتے ہیں اس پر ایک علمی تحقیق یاد آگئی میں پہلے اسکو بھی بیان کردینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ امراض جسمانی میں تو تعدیہ نہیں ہوتا۔ جس کے ڈاکٹر قائل ہیں گو شرعی حد میں رہ کر کوئی اس کا بھی قائل ہو تو گنجائش ہے مثلاً کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مرض لگ جاتا ہے۔ اگر حکم الٰہی نہو تو نہیں لگ سکتا اسمیں زیادہ محذور نہیں مگر بعض تو اسکے قائل ہیں کہ بدون مشیت حق کے مرض لگ جاتا ہے یہ لوگ دہریہ ہیں یورپ کے ڈاکٹروں کا یہی عقیدہ ہے اور انہی کے اثر سے بعض مسلمانوں میں یہ عقیدہ آیا ہے مگر چونکہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمان بھی ایسے جنکے نام پر سر ہے جیسے سرکنڈے کا سر۔ اور اگر شر کہو تو اور بھی اچھا کہ سر سے زیادہ شرف ہوجائے گا۔ تین نقطے تو بڑھ جائینگے۔ اسلئے یہ لوگ اسلام کے نام کا لحاظ کرکے یوں کہتے ہیں کہ مرض لگنا تو ہے خدا ہی کے حکم سے مگر اللہ تعالیٰ نے جن امراض کو متعدی کیا ہے انمیں تعدیہ ضرور ہوگا کیونکہ خدا نے یہ قاعدہ مقرر کردیا ہے کہ فلاں مرض ضرور ہی لگے گا۔ اور قانون فطرت بدل نہیں سکتا اسلئے مشیت بھی ضرور ہوگی اور تعدیہ بھی ضرور ہوگا۔ اور ان لوگوں نے استدلال کیا ہے اس آیت سے۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ

ع کیونکہ اہل خانقاہ کا مجمع ہی حاضر تھا ۱۲

تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا مگر یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اسکے معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عادت یا قانون کو کوئی دوسرا نہیں بدل سکتا نہ یہ کہ وہ خود بھی نہ بدل سکیں پس یہ کہنا غلط ہے کہ مشیت بھی ضرور ہوگی اور تعدیہ بھی ضرور ہوگا۔ پس تعدیہ میں تین قول ہوئے ایک یہ کہ بدون مشیّت حق کے مرض لگتا ہے۔ یہ تو کفر و زندقہ ہے دوسرے یہ کہ مشیت حق سے لگتا ہے مگر مشیت تو ضرور ہوتی ہے یہ قول غلط و باطل ہے گو کفر نہیں تیسرے یہ کہ مشیت سے لگتا ہے اور مشیت ضرور نہیں اگر مشیت ہوگی تو مرض نہیں لگے گا۔ اسمیں زیادہ محذور نہیں اگر کوئی اس کا قائل ہو جائے تو گنجائش ہے مگر احادیث صحیحہ سے ظاہراً ترجیح اسی کو ہے کہ تعدیہ کوئی شئے نہیں اور ایک کا مرض دوسرے کو نہیں لگتا۔ لَا عَدْوٰی وَلَا طِیَرَۃَ حدیث مشہور ہے۔ اسی طرح حدیث اعرابی میں فَمَنْ اَعْدَی الْاَوَّلَ سے صاف عدوی کی نفی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے غرض امراض جسمانی میں تو صحیح قول یہ ہے کہ تعدیہ نہیں ہے مگر امراض باطنیہ میں تعدیہ ضرور ہوتا ہے صوفیہ نے اسکو مسارقہ سے تعبیر کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہر جلیس اپنے جلیس کے اخلاق وغیرہ کا اثر اس طرح قبول کرتا ہے کہ نہ اسکو خبر ہوتی ہے نہ دوسرے کو صحبت بد کا بھی اثر ہوتا ہے اور صحبت نیک کا بھی اسی لئے صوفیہ کو صحبت کا اہتمام سب سے زیادہ ہے چنانچہ صحبت بد کے بارہ میں ان کا ارشاد ہے ؎

تا توانی دُور شو از یارِ بد ٭ یارِ بد بدتر بود از مارِ بد

اور صحبت نیک کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیاء ٭ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صحبت صالح کا اثر تو یہ ہے کہ مسارقت کے بعد مشارفت ہوتی ہے کہ دونوں انوار سے منور ہو جاتے ہیں۔ اور صحبت بد کے اثر کا کچھ نام صوفیہ نے نہیں لکھا مگر میں کہتا ہوں کہ وہاں مسارقت کے بعد مبارقت ہوتی ہے کہ دونوں طرف سے بجلی سی چمکتی ہے اور سوختن و افروختن کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ دونوں کا دین جل کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ایک عارف صحبت صالح کی تاکید میں فرماتے ہیں ؎

جہد کن و با دم دانا بنشیں ٭ با صدق و صفا

یا باصنم لطیف رعنا بنشیں، با شرم و حیا
زیں ہر دو گر نشد یکے میسر بنشود، از ضائع خویش
اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں در یاد خدا

مطلب یہ ہے کہ یا تو کسی عارف کے پاس صدق و خلوص سے رہو اگر یہ نہو سکے تو اپنی بیوی کے پاس رہو مگر آجکل نوجوانوں کو بیوی سے تو جاڑہ چڑھتا ہے اگر ماں باپ کی لائی ہوئی دولہن ہے تو وہاں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صاحب بچوں کی بلا سر و ہر لی گئی کیا کریں دولہا کو پسند نہیں (گو شرافت تو یہ ہے کہ ماں باپ کی لائی ہوئی قدر اپنی لائی ہوئی سے زیادہ کی جائے تاکہ ماں باپ کو شرمندگی نہو) مگر زیادہ شکایت تو ان لوگوں کی ہے جو خود اپنی طلب و رغبت سے نکاح کرتے ہیں اور پھر بھی بیوی کے حقوق ضائع کرتے ہیں اُنکی قدر نہیں کرتے رات دن دوست احباب کی صحبت میں رہتے ہیں۔ اُن سے دل لگی مذاق اور فحش مذاق کیا جاتا ہے اور بیوی سے جسکے ساتھ ایسی باتیں کرنا جائز بھی ہے اور ثواب بھی ہے سیدھے مُنہ بات بھی نہیں ہوتی وہاں مُنہ کو گوند لگ جاتا ہے اور کہنے کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم کو شرم آتی ہے ارے تم کو مردوں میں فحش مذاق کرتے ہوئے غیرت نہ آئی۔ ڈوب مرو اسکے بعد فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو شیخ میسر ہو نہ دلبر رعنا یعنی بیوی بھی میسر نہو خواہ اسواسطے کہ نکاح کا سامان نہیں یا اسواسطے کہ بیوی مرگئی ہے تو اسکو چاہیے کہ یادِ خدا میں تنہا بیٹھے اور صحبت بد میں ہرگز نہ بیٹھے ورنہ دین کی خیر نہیں تو صوفیہ کے کلام سے معلوم ہوا کہ اخلاقِ باطنہ میں تعدیہ ہوتا ہے اسی لئے میں نے کہا تھا کہ آج جس مرض پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں عوام اُس سے بری ہیں ہاں خواص سے مل کر کبھی اُنمیں بھی یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے اسلئے سب کے سامنے اسکے بیان کر دینے کا مضائقہ نہیں۔ اور وہ مرض ایسا ہے جو ابھی پندرہ بیس دن ہوئے سمجھ میں آیا ہے اسکی عمر بہت تھوڑی ہے اور جیسے اسکی سمجھ میں آنے سے مسرت ہوئی کہ ایک نیا علم حاصل ہوا ویسے ہی اُسکا غم بھی ہوا کہ اب تک کتنے روز تک ہم جہل میں مبتلا رہے اور اسکے سمجھ میں آنیکے بعد میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں نے اپنی اصلاح کر لی ہے مگر اتنا ضرور ہوا کہ میں اپنی حالت کو نظر ثانی کا محتاج سمجھنے لگا۔ اور اُمید ہے کہ انشاء اللہ دس پندرہ روز میں نظر ثانی ہو جائے گی۔ اور میں اپنے احباب کو بھی اسی کی وصیت کرتا ہوں کہ آپ بھی اسکو

سُن کر اپنی حالت پر نظر ثانی کیجئے۔ وہ مضمون یہ ہے کہ ہر شخص جس کو طریق کی طلب ہے یہ چاہتا ہے کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا متبع ہو جاؤں۔ پھر اتباع کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ فتوی علماء پر عمل کرتا رہے جس کو وہ جائز کہیں اسکو کرے اور جس کو ناجائز و حرام کہیں اُس سے بچے۔ یہ بھی ایک درجہ اتباع کا ہے کہ مباحات شرعیہ پر عمل کرے گو حضورؐ نے ان مباحات کو نہ کیا ہو اور یہ بھی نجات کے لئے کافی ہے میں غلو نہیں چاہتا گو یہ مضمون میری نظر میں بہت اہم ہے۔ جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور ایسا اہم ہے کہ میں اسکی بنا پر اپنی حالت کو نظر ثانی کا محتاج سمجھتا ہوں مگر میں حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہتا کہ مباحات پر عمل کرنے کو ناکافی کہدوں، ہرگز نہیں بلکہ میں صاف کہتا ہوں کہ مباحات پر عمل کرنا بھی اتباع میں داخل اور نجات کے لئے کافی ہے۔

دوسرا درجہ اتباع کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات و افعال کا اتباع کیا جائے یہ کامل اتباع ہے اور اس کے لئے ضرورت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و افعال و طریق عمل کے معلوم کرنے کی۔ پھر اسمیں بھی تین درجے ہیں۔ ایک عبادات میں اتباع دوسرے معاملات میں اتباع۔ ان میں تو جہاں تک ہو سکے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا اتباع کرے اور حضورؐ کے طریق عمل کی تلاش کرے کیونکہ اُن کا تعلق اللہ تعالےٰ سے ہے اور مخلوق سے ہے اور ایک یہ کہ ماکولات و مشروبات میں اتباع کیا جائے کہ جو حضورؐ نے کھایا وہی کھائے۔ جو حضورؐ نے پیا وہی پئے جو آپ نے پہنا وہی پہنے۔ اسمیں جس قدر سہولت سے ہو سکے اتباع کیا جائے۔ مبالغہ نہ کیا جائے کیونکہ اسمیں مبالغہ کرنا بعض اوقات ہم جیسے ضعفاء کے تحمل سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ اقویاء کا کام ہے جیسے حضرت خواجہ بہاء الدینؒ کی یہی تحقیق ہے۔ جس کا قصہ یہ ہے کہ آپ کی مجلس میں حدیث پڑھی گئی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہ کھاتے تھے بلکہ آٹے کو پیس کر پھونک سے بھوسا اُڑا دیا جاتا تھا جو اڑ گیا وہ اڑ گیا باقی کو گوندھ کر پکا لیا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آج سے ہمارے واسطے بھی اسی طرح آٹا گوندھا جائے اور چھلنی میں نہ چھانا جائے شام کو جو روٹی اس طرح کھائی گئی سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ ہم نے بڑی گستاخی

کی۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا قصد کیا اور اپنے کو اس سنت پر عمل کرنے کا اہل سمجھا ہم اس کے اہل نہ تھے اسلئے تکلیف ہوئی آئندہ سے ہمارے واسطے چھنا ہوا آٹا ہی بدستور پکایا جاوے۔ سبحان اللہ! کیسا ادب تھا کوئی بے ادب ہوتا تو سنت پر اعتراض کرتا کہ اچھا سُنّت پر عمل کیا تھا۔ عمل بالسنت سے یہ ضرر ہوا مگر حضرت شیخ نے ہم جیسوں کی تعلیم فرمادی کہ ہم اس سنت کے اہل نہ تھے۔ کیونکہ ہمارے قویٰ ضعیف ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قویٰ ہم سے زیادہ قوی تھے۔ اس لئے یہ طریقہ حضور ہی کے واسطے مناسب تھا۔ غرض ماکولات و مشروبات و ملبوسات میں اگر ہوسکے تو جتنا بھی ہوسکے اتباع کرے جیسے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کدو رغبت سے کھایا ہے اسی طرح آپ کو دست کا گوشت مرغوب تھا۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی مرغوب تھا وغیرہ وغیرہ لیکن اسمیں اپنی ہمت سے آگے غلو نہ کیا جائے۔ زیادہ اہتمام اور کاوش کی ضرورت اُن اُمور میں ہے جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ یا مخلوق سے یعنی عبادات و معاملات۔ اور ماکول و مشروب کا تعلق تو اپنی ذات سے ہے۔ اسمیں بہت کاوش کی ضرورت نہیں۔ ہاں سہولت سے جتنا ہو جائے یہ بھی دولت عظیمہ ہے۔ مگر آج کل برعکس معاملہ ہے کہ ماکول و مشروب و ملبوس میں تو اتباع نبوی کاوش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور عبادات اور معاملات میں اتباع کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ تو اب میں اُس مرض کے متعلق کہتا ہوں کہ ہم لوگ جو حضور کا اتباع کرتے ہیں۔ تو اسکی حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ اتباع کرتے ہیں اپنی طبیعت کا اور بوجہ علم کے اُس کے دلائل احادیث سے تلاش کر لیتے ہیں یہ نہیں کہ اپنی طبیعت سے خالی الذہن ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز کو اصل بنائیں پھر اُس کا اتباع کریں۔ میں دوسروں کو کیا کہوں خود اپنے کو کہتا ہوں کہ مثلاً میرے اندر تیزی ہے تو میں عمل کرتا ہوں اپنی طبعی حدت پر مگر اسکی تائید میں حدیثیں نہ تلاش کر لی ہیں جنمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غصہ کرنا ثابت ہے مثلاً حدیث لقطہ میں آپ نے سائل کے اس قول پر کہ لقطہ اہل کو کیا کیا جائے غصہ ظاہر فرمایا۔ اسی طرح دیوار قبلہ پر نخامہ (رینٹ) دیکھ کر آپ کو غصہ آگیا نیز صحابہؓ نے مسئلہ قدر میں کلام کیا تو حضورؐ کو سخت ناگوار ہوا اور آپ بہت غصے ہوئے۔

میں ابھی آپ کو اپنے سے بدگمان نہیں کرتا کیونکہ بلا وجہ اپنے کو متہم کرنا بھی بُرا ہے میں نے محض

مثال دی ہے کہ ممکن ہے میری یہ تیزی اتباع سنت کی بنا پر نہ ہو بلکہ اتباع طبیعت پر مبنی ہو۔ اور سنت کو محض آڑ بنالیا ہو۔ اور ممکن ہے کہ اتباع سنت ہی کی وجہ سے ہو کیا عجب ہے کہ نظر ثانی میں یہ حالت سنت کے موافق ہی نکلے۔ مگر جس کو اتباع سنت کا قصد واہتمام ہے اس کو احتمال ضرور ہونا چاہیئے کہ میری حالت حقیقت میں اتباع سنت کے موافق ہے یا سنت کو محض آڑ بنایا گیا ہے۔ کیونکہ آج کل زیادہ تر اتباع سنت اسی طرح ہو رہا ہے کہ اتباع تو کرتے ہیں۔ اپنی طبیعت کے تقاضے کا طبیعت کو بدلنا اور اس پر مشقت ڈالنا بالکل نہیں چاہتے اور اس کی تائید میں علم وحفظ کی مدد سے بہت سی احادیث چھانٹ لی ہیں۔ مثلاً کسی کو عمدہ غذا کا شوق ہے۔ اس نے یہ حدیث چھانٹ لی کہ حضور نے عمدہ کھانا بھی کھایا ہے۔ چنانچہ ایک فارسی نے آپ کی دعوت کی تھی اور عمدہ گوشت پکایا تھا۔ کسی کو عمدہ لباس کا شوق ہے اس نے وہ حدیث یاد کر لی۔ کہ حضور کی خدمت میں کسی بادشاہ نے ایک جبہ ہدیہ کیا تھا۔ جس کی آستین وغیرہ میں ریشم کی گوٹ تھی اور آپ نے وہ جبہ زیب تن فرمایا تھا کسی کو رؤسا کی خوشامد کی عادت ہے۔ اس نے تالیف قلوب کے واقعات یاد کر لئے۔ کسی میں بخل ہے اس نے یہ حدیث یاد کر لی کہ حضور نے ایک مرتبہ کچھ مال تقسیم فرمایا۔ اور ایک شخص کو نہ دیا۔ جس پر حضرت سعد بن ابی وقاص نے عرض کیا یا رسول اللہ انی اراہ مومنا فقال او مسلما۔ اسی طرح ایک شخص تنگی پہنتا ہے وہ لبنی تنگی کی حدیث یاد کئے ہوئے ہے۔ دوسرا پاجامہ پہنتا ہے وہ احادیث ازار میں تاویل کرتا ہے اب یہ سب احادیث کتابوں میں موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ حضور سے یہ سب افعال صادر ہوئے ہیں مگر ان کے یاد کر لینے کا نام اتباع سنت نہیں۔ دیکھو ایک باغ میں پھل بہت قسم کے ہیں۔ ایک درخت انار کا بھی ہے ایک درخت امرود کا بھی ہے۔ ایک دو ناشپاتی کے بھی ہیں۔ مگر یہ بتلاؤ کہ اس کو کس چیز کا باغ کہا جائے گا باغ کہا جائے گا۔ یقیناً جس پھل کا غلبہ ہوگا اور جو پھل زیادہ ہوگا اسی کا باغ کہلائے گا۔ اگر آم زیادہ ہیں تو اس کو آم کا باغ کہیں گے ایک امرود کے درخت سے اس کو امرود کا باغ کوئی نہ کہے گا۔ اسی طرح یہاں ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات بہت ہیں۔ ہر قسم کے واقعات آپ کی احادیث میں مل جائیں گے مگر اس سے آپ کا طرز ثابت نہیں ہو سکتا۔ آپ کی طرز وعادت وہ ہے جو غالب و مستمر ہو پس غالب حالت اور دائمی عادت کو دیکھو اور اس کا اتباع

کردیہ اتباع حقیقی ہوگا اتفاقی واقعات کے اتباع کا نام اتباع سنت نہیں پھر علماء کو تو علم سے اس کا پتہ چلے گا کہ غالب حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تھی اور عوام کو چاہیئے کہ کتب واقعات و سیرت کا مطالعہ کرکے دیکھیں کہ غالب واقعات کس قسم کے ہیں؟ جو غالب عادت ہو اُس کو اصل قرار دو اور دوسرے کو عارض پر محمول کرو۔

مگر یہاں ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ صورۃً عمل قلیل ہوتا ہے۔لیکن معنیً کثیر و غالب ہوتا ہے جیسے تراویح میں عمل تو تین رات ہوا ہے اور خشیتہ افتراض کی وجہ سے ترک زیادہ ہوا لیکن یہ ترک عارض سے تھا۔ اور عمل اصل ہیں اسی کو راجح کہیں گے اور تراویح کو سُنّت کہیں گے اور یہاں سے غیر مقلدوں کا جواب ہو گیا جو کہ تراویح کی آٹھ رکعت پڑھتے ہیں۔ اور بیس کو یہ دعویٰ کرکے بدعت کہتے ہیں۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس نہیں پڑھیں سو اوّل تو یہی متکلم فیہ ہے کہ بیس کا ثبوت نہیں لیکن بعد تسلیم کے ہم کہتے ہیں کہ جس طرح حضور نے بیس رکعت نہیں پڑھیں اسی طرح آپ نے تراویح تین دن سے زائد نہیں پڑھیں پس تم بھی عمر بھر میں تین دن سے زائد نہ پڑھو کیونکہ حدیث میں زائد کا ثبوت نہیں اسلئے یہ بدعت ہے۔ پس جس دلیل سے تم استمرار عمل کا بدعت ہونا ثابت کروگے اور وہ عمل ہے صحابہ کا اسی دلیل سے ہم بیس رکعت کا بھی بدعت نہ ہونا ثابت کریں گے

خلاصہ یہ کہ عادۃً غالبہ معلوم کرنے کا مدار صرف کثرت عمل پر نہیں ہے بلکہ کبھی عادت کا غالب ہونا کثرتِ وقوع عمل سے معلوم ہوتا ہے اور کبھی غلبہ مقصودیت سے معلوم ہوتا ہے اور اُس کے لئے تراویح کی نظیر کافی ہے کیونکہ یہاں وقوع کے اعتبار سے تو عمل قلیل ہے مگر مقصودیت کے اعتبار سے غالب ہے پس یہاں عمل کی قلت و کثرت پر مدار نہ ہوگا۔ اسی طرح رفع یدین و عدم رفع میں فقہاء نے کثرت عمل و قلت عمل کو نہیں دیکھا۔ بلکہ مقصودیت پر نظر کی ہے۔ بعض نے رفع کو مقصود سمجھا کیونکہ نماز فعل وجودی ہے اور رفع بھی وجودی ہے تو دونوں میں تناسب ہے۔ اور بعض نے عدم رفع کو مقصود سمجھا۔ کیونکہ نماز کا مبنی سکون پر ہے حدیث مسلم میں ہے اسکنوا فی الصّلوٰۃ ۔ اور تکرار رفع سکون کے منافی ہے اور کہیں کثرت و مقصودیت دونوں جمع ہو جاتے ہیں جیسے منبر سے نیچے نماز پڑھنا کہ صلوٰۃ تحت المنبر عملاً بھی کثیر ہے صلوٰۃ فوق المنبر کا وقوع قلیل ہے اور مقصودیت بھی تحت المنبر ہی ہے اور زیادہ تر ایسا ہی ہے کہ جو عمل وقوع میں کثیر ہوتا ہے

مصنف نماز میں سکون ہر ۱۲ ...

مقصودیت بھی اسمیں غالب ہے مگر بعض دفعہ اس کا خلاف بھی ہوتاہے۔ اسلئے حضورؐ کے طرزِ عمل سے آپ کی عادت و سنّت کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں بلکہ محقق کا کام ہے یہ بات قابلِ تحقیق و تدقیق ہے کہ مقصودیت کہاں ہے کہاں نہیں۔ اسلئے کسی بزرگ کے عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کثیر کے خلاف اور عمل قلیل کے موافق دیکھ کر ان پر اعتراض نکرنا چاہیئے بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ممکن ہے ان کے نزدیک عمل قلیل ہی میں مقصودیت ہو مثلاً شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ میں تیزی غالب تھی۔ اور یہ بات حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت غالبہ کے بظاہر خلاف ہے تو اپنے کو تو تم متہم سمجھو اگر تمہارے اندر ایسا ہو مگر بزرگوں پر اعتراض نہ کرو۔ بلکہ یہ تاویل کرو کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیزی مقتضی کی وجہ سے تھی۔ یعنی معتوب کی بیہودگی کی وجہ سے اور اُس وقت بوجہ سلامت طبائع کے اس مقتضی کا وجود کم تھا۔ اسلئے تیزی کا وقوع بھی آپ سے کم ہوا (اگر حضورؐ کے زمانہ میں بھی مقتضی کا وُجود زیادہ ہوتا تو آپ کی تیزی کا وقوع بھی زیادہ ہوتا۔ جیسا کہ مُوسیٰ علیہ السلام میں ہوا ۱۲) اور اب مقتضی زیادہ ہے۔ اسلئے شاہ صاحبؒ میں اُس کا ظہور زیادہ ہُوا غرض اس طریق میں چین و اطمینان اور بے فکری جائز نہیں چنانچہ اتباع سنت کی حقیقت عادت غالبہ کا اتباع بتلایا گیا تھا۔ اب عادتِ غالبہ کی تحقیق میں خدشہ پیدا ہوگیا کہ اس کا مدار بھی محض کثرتِ عمل پر نہیں رہا۔ اب قدم قدم پر غور و فکر کی ضرورت ہے کہ کہاں عمل غالب ہے مع مقصودیت کے اور کہاں مقصودیت غالب ہے بدون عمل کے پھر چین اور بے فکری کہاں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گہہ چنیں بنمایدو گہہ ضد ایں ٭ جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

اور فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش ٭ تادم آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دمے آخر بود ٭ کہ عنایت باتو صاحب سر بود

بس یہاں تو اسکی ضرورت ہے کہ عمر بھر بے چین رہو اور فکر میں لگے رہو اپنی حالت کو اچھا نہ سمجھو بلکہ متہم سمجھو حضرت حاجی صاحب کا اَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنِّ ۔ کی تفسیر میں ارشاد ہے کہ ہوشیار وہ ہے جو کہ اپنے نفس سے بدگمان رہے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کا ارشاد ہے

رہیں کو تمام عمر کام کرے ساری عمر میں یہ بات حاصل ہو جانے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا اس کو سب کچھ حاصل ہو گیا۔ مبارک ہے وہ شخص جو عمر بھر اسی دھیڑ بن میں لگا ہے کہ میری حالت اچھی ہے یا بری۔ صاحبو! طلب ہی مطلوب ہے۔ تمہارا یہی کام ہے۔ پس تم عمر بھر طلب ہی میں رہو یہ بات میں نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنی ہے کہ طلب مطلوب ہے وصول مطلوب نہیں کیونکہ وہ تمہارے قبضہ میں نہیں پس تم کو کسی وقت اپنے کو فارغ نہ سمجھو جس نے اپنے کو فارغ و کامل سمجھ لیا اور اپنی حالت پر مطمئن اور بے فکر ہو گیا وہ برباد ہو گیا۔ اللہ اللہ سن لو خوب غور سے سن لو اطمینان تو انشاءاللہ جنت ہی میں ہو گا یہاں اطمینان کہاں؟ ہمیشہ اپنے کو متہم سمجھو کبھی اپنی حالت پر اطمینان نہ کرو۔ اور ہر وقت طلب میں لگے رہو پھر کیا ہو گا ؎

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ۔۔۔ ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ۔۔۔ ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

اپنے اندر طلب کی پیاس پیدا کرو ابر رحمت کی بارش ہونے لگے گی۔ اپنے کو عاجز و فانی سمجھو حق تعالیٰ تم کو قوت و ہمت عطا فرمائیں گے ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش ۔۔۔ آزموں را یک زمانے خاک باش

خاک ہونے سے کیا ہو گا ؎

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ ۔۔۔ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ ۔۔۔ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

شکستگی اور بندگی و بیچارگی اختیار کرو اپنے اعمال و احوال پر ناز نہ کرو ؎

پیش یوسف نازش و خوبی مکن ۔۔۔ جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

ناز را روئے ببا ید ہمچو ورد ۔۔۔ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

عیب باشد چشم نابینا و باز ۔۔۔ زشت باشد روئے نازیبا و ناز

چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش ۔۔۔ ہمچو او باگریہ و آشوب باش

مگر یہ جو میں نے کہا ہے کہ اپنے کو متہم سمجھو کبھی اپنے حال پر اطمینان نہ کرو اسکی حد نا شکری سے

ملی ہوئی ہے اسلئے اسکی ساتھ یہ بھی سمجھیے کہ اس وقت جو کچھ بھی میری حالت ہے جیسی کچھ بھی ہے
یہ سب خدا کا فضل ہے بلا بود سے گرا نہیم نبود سے اب بحمد اللہ تواضع وشکر دونوں جمع ہو گئے
اور ناشکری کی سرحد سے بچے ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں کہ اس طریق میں بحر تلخ و بحر شیرین ساتھ
ساتھ ہیں مگر محقق اُس برزخ سے واقف ہوتا ہے۔ جو دونوں کو کبھی ملنے نہیں دیتا ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں ✤ درمیان شان برزخ لایبغیان

پھر بتلایئے یہاں بے فکری اور اطمینان کہاں۔ یہاں تو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے
چنانچہ میں جس عمر بی بی کی فرمائش پر اس وقت بیان کر رہا ہوں انھوں نے ایک رات ہمارے
یہاں بھی کرم فرمایا تھا جب رات کے دو بجے تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور ادعیہ ماثورہ آواز کے ساتھ
پڑھنے لگیں میری آنکھ کھل گئی اور مجکو شرم آئی کہ ایک اللہ کی بندی تو ذکر اللہ میں مشغول ہے۔
اور میں پڑا سو رہا ہوں مگر اُٹھنے کی ہمت نہوئی کیونکہ بہت سویرا تھا میرے نفس نے کہا ابھی سو رہو۔
اور یہ تاویل کی کہ نوم العالم عبادۃ کہ عالم کا سونا عبادت ہے مگر اُن کی برکت نے مجھے حرکت پر
مجبور کیا۔ اور دل نے کہا ؎

خواب را بگذار امشب اے پسر ✤ یک شبے در کوئے بیخوابان گذر

ان بے خوابوں کی کیا حالت ہے؟ انکی یہ حالت ہے ؎

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے ✤ کہ یارے برخورد از وصل یارے

اور یہ حالت ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ✤ بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

اور یہ حالت ہے کہ ؎

دل آرامے کہ داری دل درو بند ✤ دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور وہ اُس وقت یوں کہتے ہیں ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے ✤ چہ کنم کہ چشم بدخو نکند بکس نگاہے

نواب شیفتہ نے اس وقت کا فوٹو خوب کھینچا ہے فرماتے ؎

چہ خوش ست با تو بزمے بنہفتہ ساز کردن ✤ در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

اے اللہ اے اللہ (بکی الشیخ و ولول وصاح واضطراب پھر کسی قدر توقف وسکوت کے بعد فرمایا) پھر میں کھڑا ہوگیا اور کچھ کام کرلیا پھر سوگیا مگر جب بھی آنکھ کھلی ان کو کام میں مشغول پایا اور ذکر کی آواز آتی رہی۔ اس وقت مجھے خیال ہوا کہ صبح کو انکو متنبہ کروں گا کہ رات کے وقت جہر بالذکر مناسب نہیں کیونکہ اس میں نائم کی تشویش ہے اور فقہاء نے اس سے منع فرمایا ہے مگر اس خیال کے ساتھ ہی جواب ذہن میں آیا اور غالبًا وہ بھی یہی جواب دیتیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار تفقد احوال صحابہؓ کے لئے رات کو اٹھے پھر حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا کہ آہستہ آہستہ نماز پڑھ رہے ہیں حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ زور زور سے بلند آواز سے قرآن مجید پڑھ رہے ہیں صبح ہوئی اور حضورؐ نے سبب فرمایا کہ تم ایسا کیوں کر رہے تھے اور تم ایسا کیوں کر رہے تھے سبب کچھ وجوہ بیان فرمائے پھر حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ اے ابوبکرؓ تم کسی قدر اپنی آواز کو اونچا کردو اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم اپنی آواز کو ذرا پست کردو۔ نیز جماعت اشعریین کی حضورؐ نے تعریف فرمائی کہ مجھے ان کے منازل کا علم انکی آواز سے ہو جاتا ہے جب کہ وہ رات کو قرآن پڑھتے ہیں اور آیت وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِينَ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ آپ رات کو اپنے اصحاب کا تفقد فرماتے ہیں اور اس وقت آپ صحابہؓ کی آواز سے انکے عمل کو معلوم فرماتے تھے۔ اب بتلائیے میں اس ذہین کو کیا کروں کہ پہلے ایک خیال آیا اور ساتھ ہی اس کا جواب بھی ذہن میں آگیا تو میں خاموش ہوگیا مگر چونکہ اس حدیث میں اور فقہاء کے فتوی میں بظاہر تعارض ہوا اسلئے پھر فکر میں لگ گیا۔ چنانچہ پھر اس تعارض کو اس طرح رفع کیا کہ سونے والے دو قسم کے ہیں ایک وہ جو تہجد کیلئے جاگنا چاہیں۔ دوسرے وہ جو جاگنا نہ چاہیں۔ جو جاگنا چاہیں ان کے پاس ذکر بالجہر کی اجازت ہے چنانچہ ہم نے خانقاہ میں رات کو دو بجے کے بعد ذکر بالجہر کی اجازت دے رکھی ہے کیونکہ وہاں سب جاگنا چاہتے ہیں اور جو جاگنا نہ چاہے اُس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ خانقاہ میں تمھاری رعایت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ سونے والوں کی جگہ نہیں اور جو لوگ سونا چاہیں اُنکے پاس بیٹھ کر ذکر جہر ممنوع ہے تاکہ انکی نیند میں خلل نہ آئے۔ اب اسی مسئلہ میں دیکھئے کہ فقہاء کا فتویٰ تو یہ تھا کہ سونے والوں کے پاس ذکر جہر مکروہ ہے مگر احادیث میں ایسے واقعات ملے جن سے رات کے وقت ذکر جہر کا نائمین کے پاس ثبوت ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کا قول حضورؐ کے جواب میں یہ تھا۔ کُنْتُ اَطْرُدُ الشَّیْطَانَ وَاُوْقِظُ الْوَسْنَانَ کہ میں بلند آواز اسلئے کر رہا تھا

کہ شیطان کو بھگاتا اور سونے والوں کو جگاتا تھا۔ ایسے موقعہ میں غایۂ مقصودیت سے فیصلہ کیا جائیگا اور دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قصّہ میں نائمین کے پاس رفع صوت بالذکر عارض کی وجہ سے تھی کہ وہاں سب لوگ رات کو جاگنا چاہتے تھے سب تہجد کے عادی تھے اور اصل مقصود عدم رفع ہے پس اب اُن بڑی بی کے عمل کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ جہاں نہاں ہوا کریں گھروالوں سے پوچھ لیا کریں۔ اور عدم رفع صوت عند النائم کی مقصودیت کی دلیل میں حضرت عائشہؓ کی حدیث مجھے یاد آئی کہ باوجودیکہ حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں کہ حضورؐ کے کسی فعل سے اُنکو ایذا نہ ہوسکتی تھی۔ مگر حضورؐ ان کے سوتے ہوئے اُن کے پاس ہر کام آہستہ سے کرتے تھے حالانکہ وہ ایسی عاشق تھیں کہ فرماتی ہیں ؎

لَوَاحِیْ زُلَیْخَا لَوْ رَأَیْنَ جَبِیْنَہٗ ۔ لَاٰثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَی الْاَیْدِ

کسی شاعر نے حضرت زلیخا کے قول ہٰذا الذی لمتننی فیہ کا ترجمہ خوب کیا ہے ؎

اینست کہ خوں خوردہ و دلبردہ بسے را ٭ بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

زلیخا نے زنانِ مصر سے اُنکی ملامت کے جواب میں یہی کہا تھا کہ لو دیکھ لو میرا محبوب یہ ہے جسے دیکھ کر تم نے مبہوت ہو کر بجائے نارنگی کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ عورتیں اگر حضورؐ کو دیکھ لیتیں تو اپنے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتیں۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن میں فرق یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کے حُسن کا رعب اوّل وہلہ میں زیادہ ہوتا تھا کہ تحمل نہ ہوسکتا تھا پھر رفتہ رفتہ تحمل ہو جاتا تھا جیسا کہ حضرت زلیخا کو تحمل ہوگیا تھا اور حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے حُسن کا اوّل وہلہ میں تحمل ہو جاتا تھا۔ مگر جوں جوں غور کیا جاتا دل قابو سے نکلا جاتا اور تحمل دشوار ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ پر مرد بھی عاشق تھے۔ اور بچے بھی عاشق تھے۔ اور حضرات صحابہؓ نے کیسی کیسی جانبازی اور جاں نثاری سے آپ کے عشق میں جان دی ہے غرض حضرت عائشہؓ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہا عاشق تھیں۔ پھر ایسے عاشق کو آپ کی آواز یا آہٹ سے تکلیف کہاں ہوسکتی تھی۔ اور ہوتی بھی تو وہ یوں کہتیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من ٭ دل فدائے یار دل رنجان من

مگر حدیث میں ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل بقیع کے واسطے دعا کا حکم ہوا۔ تو آپ آدھی رات کے قریب اٹھے اور آہستہ سے جوتا پہنا اور آہستہ سے کواڑ کھولے اور آہستہ سے چلے غرض ہر کام آہستہ سے کیا۔ اگر حضرت عائشہؓ کی آنکھ نہ کھل جائے کہ آنکھ کھلنے سے خود بھی اذیت ہوتی ہے اور تنہائی سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ آپ کی روانگی کے بعد حضرت عائشہؓ کی آنکھ کھلی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا تو پریشان ہو گئیں ؎

با سایہ ترا نمی پسندم ٭ عشق است و ہزار بدگمانی

یہ وسوسہ ہوا کہ شاید آپ کسی دوسری بیوی کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔ پھر عاشق کو یہ کہاں گوارا کہ محبوب رقیب کے پاس جائے وہ تو رقیب کے لئے محبوب کے ہاتھ سے تکلیف کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ ایسی تکلیف بھی اپنے ہی لئے چاہتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ٭ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت تو ایسی تھی کہ جانور تک آپ کے عاشق تھے حدیث میں ہے کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع کیا ہے تو اپنی طرف سے سو اونٹوں کی قربانی کی جنمیں تریسٹھ اونٹ خود اپنے دست مبارک سے نحر فرمائے۔ حدیث میں ہے کُلُّهُنَّ يَزْدَلِفْنَ إِلَيْهِ کہ سب کے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برچھے کی طرف بڑھتے اور گردن آگے کرتے تھے کہ پہلے مجکو نحر کیجئے۔ اس وقت یہ شعر صادق آرہا تھا ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف ٭ بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے حضور مفلس نہ تھے کہیں مفلس بھی سو اونٹ کی قربانی کرسکتا ہے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہ تھے اور بڑے بادشاہ تھے کیونکہ بادشاہوں سے بھی ایسا کم سنا گیا ہے کہ کسی نے سو اونٹ کی قربانی کی ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فقر تھا وہ اختیاری تھا۔ کیونکہ آپ مال جمع نہ کرتے تھے غرض آپ تارک الدنیا تھے متروک الدنیا نہ تھے بہرحال حضرت عائشہؓ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئیں دیکھا کہ آپ بقیع میں مُردوں کیلئے دعا کر رہے ہیں اب چاہئے تھا کہ حضرت عائشہؓ فوراً لوٹ آئیں۔ مگر شاید خیال ہوا ہو کہ شاید آپ یہاں سے فارغ ہو کر زندوں کے پاس جائیں اسلئے ٹھہر گئیں جب آپ دعا سے فارغ ہو کر واپس ہوئے تو

حضرت عائشہؓ بھی واپس ہوئیں مگر بقیع کو جاتے ہوئے تو یہ پیچھے تھیں اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے ہوگئیں حضور کو شبہ ہوا یہ آگے آگے کون ہے۔ آپ تیزی کے ساتھ چلے حضرت عائشہؓ بھی دوڑیں چونکہ اسوقت یہ ہلکی پھلکی تھیں اسلئے دوڑ کر آپ سے پہلے گھر پہونچ گئیں مگر دوڑنے کی وجہ سے سانس پھول گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو تشریف لائے اور انکی سانس پھولی ہوئی دیکھی فرمایا۔ یَا عَائِشَۃُ مَالَکِ حَشْیَا رَابِیَۃً کہ اے عائشہؓ تمہاری سانس کیوں پھولی ہوتی ہے کہا کچھ نہیں فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بقیع سے لوٹتے ہوئے میرے آگے آگے تم ہی تھیں انھوں نے اقرار کیا فرمایا۔ اَخَشِیْتِ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْکِ وَرَسُوْلُہٗ کیا تم کو یہ اندیشہ ہوا کہ اللہ اور رسول تمہاری حق تلفی کریں گے ہرگز نہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ میں اس قدر احتیاط کی۔ حالانکہ حضرت عائشہؓ کی اذیت کا کوئی احتمال نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ حکم مقصود وہی ہے جو فقہاء نے فرمایا ہے اور جن واقعات میں جہر بالقراءۃ صحابہ سے رات کے وقت ثابت ہے وہ عارض پر محمول ہے کہ وہاں سب لوگ رات کو اٹھنے والے تھے۔ مگر اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ کیا حضرت عائشہؓ رات کو اٹھنا نہ چاہتی تھیں۔ اگر وہ بھی نہ چاہتی تھیں تو پھر دوسری عورتوں کا کیا ٹھکانا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اٹھنا چاہتی تھیں مگر اخیر شب کو اور اس واقعہ میں حضور سویرے اٹھے تھے اسلئے ان کو جگانا نہیں چاہا بخاری میں حضرت عائشہؓ کا قول مذکور ہے فَاِذَا اَوْتَرَ اَیْقَظَنِیْ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے جگا دیتے[۱] یا یہ کہ حضور نے ان سے زیادہ محنت لینا گوارا نہ کی ہو انکو تھوڑی ہی سی محنت میں کامیاب کر دیا ہو جیسے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ آپ نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے محنت کم لی تھی ایکبار یہ سب حضرات خانقاہ تھانہ بھون میں مجتمع تھے مولانا رشید احمد صاحبؒ وغیرہ تو دو بجے اٹھے مولانا محمد یعقوب صاحب نے بھی دو بجے اٹھنے کا قصد کیا حاجی صاحب نے منع فرمایا کہ ابھی نہیں ابھی رات بہت ہے سو رہو جب ایک گھنٹہ رات رہ گئی اس وقت جگا دیا کہ اب اٹھو کیونکہ مولانا بہت نازک مزاج تھے اگر زیادہ محنت کرتے تو دماغ پر تعب ہوتا اسی طرح اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا ہو تو کیا عجیب ہے کہ حضرت عائشہؓ سے محنت کم لی ہو تحقیق وہی ہے جو شخص سے اسکے مناسب کام لے یہ نہیں کہ سب کو چوبیس ہزار ہی اسم ذات بتلا یا کرے ہمارے

حاجی صاحب نے بعض لوگوں سے صرف اتنا کام لیا کہ تم خانقاہ والوں کی کچھ خدمت کر دیا کرو۔ اور کسی کو ایک ہزار دو ہزار اسم ذات بتلایا اور کمال یہ ہے کہ ہر شخص کامیاب تھا۔ تھوڑی محنت کرنے والا بھی زیادہ محنت کرنے والا بھی تھوڑی محنت کرنے والے کو منزل پر اس طرح پہونچا دیتے تھے کہ اُسے خبر بھی نہ ہوتی تھی اسی کو فرماتے ہیں سے ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالارانند　٭　کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

محقق کی یہی شان ہے خواہ نقشبندی ہو یا چشتی ہو بس اتباع سنت کی حقیقت یہ نہیں کہ اپنی طبیعت کے تقاضے پر عمل کیا جائے اور اسکی تائید میں ایک دو حدیث ڈھونڈلی جائے بلکہ اتباع سنت یہ ہے کہ حضورؐ کی عادت غالبہ کا اتباع کیا جائے اور اس کیلئے مطالعہ سیرت نبویہ کی بھی ضرورت ہوگی سیرت نبویہ میں میرا رسالہ نشر الطیب مفصل ہے اگر اتنی فرصت نہ ہو تو حیاۃ المسلمین عہ کا وہ مضمون جو عنقریب نمبر ہشتم میں شائع ہونے والا ہے وہی مطالعہ کرلیا جانے۔ اور ایک دن نہیں بلکہ روزانہ مطالعہ کیا جائے یہ کچھ زیادہ طویل نہیں صرف دو ورقہ ہے اور یہ مضمون بھی مثل اسکے دوسرے نمبروں کے مفت تقسیم کروں گا اور چونکہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا خلاصہ ہے اس لئے جوش محبت میں یہ اعلان بھی کردیا ہے کہ ختم ماہ ربیع الاول تک جس کی فرمائش آئے گی اُس سے محصول ڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔ اور یہ سخاوت میں اسلئے کر رہا ہوں کہ مجھے اطمینان ہے کہ زور خواستیں آویں ہی گی نہیں مسلمان کچھ ایسے بیفکرے ہیں کہ ہر شخص اپنے کو بنا بنایا کامل سمجھتا ہے اصلاح حال کی فکر ہی نہیں حیاۃ المسلمین کا مضمون اگر لیں گے بھی تو اُسکو قرآن مجید میں یا وظیفہ کی کتاب میں رکھدینگے کہ بس گھر میں برکت رہے گی یا اگر پڑھیں گے بھی تو عمل کے لئے نہیں بلکہ محض برکت کے لئے جیسے شجرہ پڑھا کرتے ہیں ہمارے حاجی صاحب کا شجرہ تو عمدہ ہے مگر اکثر شجرے تو محض فضول ہیں جنمیں بے تکے اشعار ہیں وہ تو بقول علی حزیں کے محض تذکرۃ الاولیا ہی ہے۔ اور صاحبو! آپ کو ثمرہ کے ہوتے ہوئے۔ شجرہ کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں اگر ثمرہ ایسا ہوتا جس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا تو شجرہ کی بھی ضرورت ہوسکتی تھی مگر یہ ثمرہ تو ایسا ہے ؎

خود قوی تر می شود خمر کہن　٭　خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

عہ حیوٰۃ المسلمین مکمل ہو کر شائع ہو گیا ہے اور سب کو دل چاہئے کہ مکتبہ خانقاہ اشرفیہ سے لے کر مطالعہ کریں ***

اور اسمیں وہ قوت ہے کہ ؎

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم ٭ ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

اس ثمرہ میں فساد کا اندیشہ ہی نہیں اسمیں تو اصلاح ہی اصلاح ہے۔ بہر حال حضور کی سیرت کا مطالعہ کرو جس کو میں نے مختصراً اس ماہ کے حیاۃ المسلمین کے نمبر میں جمع کر دیا ہے۔ میں نے اسکے اول میں یہ شعر لکھا ہے ؎

فتوح فی فتوح فی فتوح ٭ و روح فوق روح فوق روح

اور اخیر میں یہ لکھدیا ہے کہ اس مضمون کو روزانہ بلاناغہ پڑھتے رہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس دو ورقہ کو آپ روزانہ پڑھتے رہیں، تو ضرور نفع ہوگا۔ ضرور نفع ہوگا۔ ضرور نفع ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔ مسئلہ کا بیان تو ہو گیا اب یہ سوال ہوگا کہ حدیث سے اسکو کیا مناسبت و ربط ہے جو شروع میں تلاوت کی گئی ہے سو میں اسکو بھی بتلاؤں گا۔ گو زیادہ ربط نہو مگر واعظ میں تو اس سے بھی بڑھ کر بے ربطی گوارا کر لی جاتی ہے۔ جیسے ایک واعظ نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی تفسیر میں شہادت نامہ بیان کیا تھا کہ یہ سورت اس رسول پر نازل ہوئی ہے کہ جن کے نواسے میدانِ کربلا میں شہید ہوئے تھے بس اسی ربط سے آپ نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ کے تحت میں شہادت کا قصہ بیان کر دیا۔ سو میرے بیان میں ایسا مہمل ربط تو انشاء اللہ تعالیٰ نہو گا اس سے تو میں آپ کو مطمئن کرتا ہوں ہاں ضعف ربط شاید ہو۔ میرے نزدیک تو ضعف بھی نہیں مگر سامعین کو میں اجازت دیتا ہوں کہ وہ اس ربط کو اگر ضعیف سمجھیں تو مضائقہ نہیں۔ ربط یہ ہے کہ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے اسکے بعد یہ سمجھئے کہ گو غضب بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے مگر چونکہ اس کا وقوع کم ہوتا ہے اسلئے اسماء الٰہیہ میں کوئی نام ایسا نہیں جو صفت غضب پر دال ہو ہاں اللہ تعالیٰ کا نام رحمٰن ہے۔ رحیم ہے۔ ودود ہے منتقم ہے مگر غضبان یا غضوب خدا کا نام نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعتبار صفت غالبہ کا ہے اور موصوف کو ہمیشہ صفت غالبہ ہی کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے۔ صفت غیر غالبہ کے ساتھ چنانچہ ایک حدیث سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے جس میں نزع روح کا بیان ہے کہ ملائکہ جب مسلمان کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو اسکو بشارت دیتے یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ

ارجعی الی روح و ریحان و رب غیر غضبان کہ اسے نفس مطمئنہ راحت اور نعمت اور اپنے رب کے پاس چل جو غصہ والا نہیں ہے اسکے بعد نزع روح کافر کا بیان ہے مگر وہاں یہ نہیں ہے کہ اخرجی الی رب غضبان غیر رحمٰن بلکہ صرف عذاب کا ذکر ہے۔ پس یوں کہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی اصل صفت تو رحمت ہی ہے۔ اور اصلی کے یہ معنی ہیں کہ جس کا ظہور مقتضی کے ساتھ بھی ہو اور بلا مقتضی کے بھی ہو یہ خاص اصطلاح ہے جو میں نے تفہیم کے لئے اختیار کی ہے۔ ورنہ صفات قدیمہ سب اصلی ہیں مگر حدیث سے رحمت و غضب میں فرق ثابت ہے اسلئے میں اس فرق کو اس عنوان سے جدید اصطلاح کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اصلی صفت تو وہ ہے جو بلا مقتضی بھی ظاہر ہو اور غیر اصلی وہ ہے جو بلا مقتضی ظاہر نہ ہو پس سبقت رحمت کے معنی یہ ہیں کہ رحمت کا ظہور تو مقتضی سے بھی ہوتا ہے اور بدون مقتضی کے بھی اور غضب کا ظہور ہمیشہ مقتضی ہی سے ہوتا ہے بدون مقتضی کے نہیں ہوتا۔ اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظہر اتم صفات باری ہیں اسلئے حضور کی بھی یہی شان ہے کہ آپ میں رحمت کا غلبہ ہے چنانچہ اللہ تعالےٰ نے حضور کو رؤف رحیم فرمایا ہے اور سخت کلامی و سنگدلی سے آپ کی برات کی ہے۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ الآیۃ یہ حضور کی اصلی صفت ہے اور غضب و حدت آپ کی اصلی صفت نہیں بلکہ کسی عارض و مقتضی کی وجہ سے اس کا ظہور ہوا ہے اب بتلایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع آپ کی صفات اصلیہ کا اتباع ہے یا صفات عارضیہ کا یقیناً ہر شخص یہی سمجھے گا کہ حضور کا اتباع یہی ہے کہ صفات اصلیہ میں آپ کا اتباع کیا جائے ورنہ حضور سے بعض دفعہ نماز فجر بھی قضا ہوئی ہے تو کیا تم بھی اس عارض کا اتباع کر کے ہر روز نماز فجر قضا کیا کرو گے ہرگز نہیں۔ یہ مثال عجیب ذہن میں آئی کہ جس نے راستہ کو واضح کر دیا۔ پھر دوسری صفات میں بھی یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کا ظہور عارض کی وجہ سے ہوا ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع یہ ہے کہ جو افعال و صفات آپ کے اصلی ہیں وہ تمہارے اندر بھی اصلی ہوں کہ زیادہ غلبہ و ظہور انہی کا ہو۔ اور جو صفات اور افعال حضور کے لئے عارضی ہیں وہ تمہارے اندر بھی عارضی ہوں، اور یہ اتباع نہیں کہ تم حضور کے عارضی افعال و صفات کو جن کا ظہور کسی مقتضی کی وجہ سے نادراً حضور سے ہوا ہے اپنے

سو پس اللہ ہی کی رحمت سے آپ ان کے ساتھ نرم رہے۔ اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ (پارہ ۴ سورۂ آل عمران)

لئے وصلی صفات بنالو خوب سمجھ لو کہ اس سے زیادہ توضیح میں نہیں کر سکتا۔ ہاں شاہ فضل الرحمٰن صاحب جیسے بزرگوں کی طرف سے ہم یہ تاویل کرسکتے ہیں کہ جس عارض مقتضی کی وجہ سے کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کیا ہے مولانا کے نزدیک وہ مقتضی حکل زیادہ ہے۔ اسلئے مولانا سے ظہور غضب زیادہ ہورہا ہے گو ایسے بزرگوں کو بھی مریدوں کی اس تاویل سے بے فکر ہوجانا چاہیئے بلکہ اپنی حالت پر نظر ثانی و نظر ثالث کرتے رہنا چاہئیے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش ٭ تادم آخر دمے فارغ مباش

بحمداللہ اس حدیث سے جس مسئلہ کا استنباط ہوا تھا۔ اس کا ربط بھی حدیث کے ساتھ واضح ہوگیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور جو مضمون اس حدیث کا مدلول مقصود ہے اس کا ذکر واعظ کا غیر مقصود ہو کر پہلے ہوچکا ہے۔ پس یہ بھی ایک لطیفہ ہوگیا کہ غیر مقصود کا ذکر مقصود ہو کر ہوگیا اور مقصود کا غیر مقصود ہو کر اخیر میں تنبیہ کرتا ہوں کہ جو مضمون حدیث کا اصل مقصود ہے۔ اس سے دلیر نہوں بلکہ شرافت کا مقتضی یہ ہے کہ ایسے رحیم وکریم آقا کی اور زیادہ اطاعت کی جائے اور جو مضمون حدیث سے اشارۃً مستنبط کیا گیا ہے اسکو سمجھیں اور اُسکے موافق عمل کی کوشش کریں اب دُعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائیں ٭

وَصَلَّى اللهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

شریعت اور طریقت اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے افادات کا انتخاب ہیں اس میں شریعت طریقت حقیقت معرفت بیعت اخلاق مجاہدات اذکار اشغال مراقبات احوال توجیہات تعلیمات مسائل مع دلائل و حقائق سالک کے لئے طریق عمل مندرج ہیں جو قرآن مجید احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اس طرح یہ کتاب اسلامی تصوف و سلوک کے اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے شاید ہی تصوف کا کوئی اہم مسئلہ ہوگا جس پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہو۔ اس کے مطالعے سے اسلامی تصوف و سلوک کے متعلق ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں تزکیۂ نفس تہذیب اخلاق اصلاح اعمال کا طریقہ نہایت واضح اور آسان ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ شریعت و طریقت میں کوئی تضاد نہیں اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے۔ مجلد ڈسٹ کور قیمت ۲۷/ علاوہ خرچہ ڈاک

تمام خلفائے راشدین چاروں خلفاء یعنی حضرت ابوبکر و حضرت عمر و حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے لیکر ۱۱۸۵ھ تک کے حالات اور سوانح عمریاں دیکھنا ہوں تو علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب **تاریخ الخلفاء** کا با محاورہ اردو ترجمہ **بیان الامراء** کا مطالعہ کیجیے۔ اس میں امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت سے لیکر حالات شروع کیے گئے ہیں اور خلافت راشدہ پھر حالات سلاطین بنو امیہ پھر بنو عباس پھر مسلمانوں کا عروج و فتوحات پھر مسلمانوں کا زوال پھر خروج چنگیز خاں تاتاری ۔۔۔ دیلوں ۔ مسلمانوں کی فتح، غرضکہ ۱۱۸۵ھ تک کے حالات درج ہیں آمیں تقریباً ۱۰ سو خلفاء و سلاطین کے حالات ہیں یہ ترجمہ و حاشیہ اس قدر عمدہ کیا گیا ہے یہ اسی کتاب کا با محاورہ اردو ترجمہ ہے جو اکثر مدارس میں داخل درس ہے۔ اگر آپ کو اس کتاب کے مطالعہ کا شوق ہو اور آپ تمام خلفاؤں کے حالات و سوانح عمریاں معلوم کرنا چاہیں تو صرف خط لکھ کر منگوالیں قیمت ۳۰/- روپے علاوہ خرچہ ڈاک

عقد انامل گنتی کا مسنون طریقہ۔ قیمت ۲/ روپے علاوہ ڈاک خرچ

مصیبت کے بعد راحت تمام مصیبتوں سے بچنے کی دعائیں۔ قیمت ۲/ روپے علاوہ ڈاک خرچ

مواعظ اشرفیہ مجلد اصلی ۱۲ حصے درجہ جلد ۶۰۰/- علاوہ خرچہ ڈاک **دعوات عبدیت** مجلد اصلی ۹ حصے در چار جلد ۴۵۰/- علاوہ خرچہ ڈاک الابقاء کے ممبر کیلئے خاص رعایت

فضائل والاحکام للشہور والایام تمام مہینوں میں مسلمانوں کو جو جو عمل کرنے چاہئیں صحیح احادیث سے سب یہیں جمع کر دیئے ہیں اس کتاب سے تمام مسلمانوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ قیمت چھ روپیہ علاوہ خرچہ ڈاک۔ عقد انامل (گنتی کا مسنون طریقہ) ۲/

شرعی پردہ ثبات الستور اس کتاب میں صحیح احادیث سے پردہ کی تاکید اور بے پردگی کے برے نتائج جمع فرمائے ہیں تاکہ تمام مسلمان بے پردگی سے باز آجائیں تمام مسلمان یہ کتاب ضرور منگائیں۔ قیمت چار روپیہ علاوہ خرچہ ڈاک

ملنے کا پتہ: **محمد عبدالمنان** غفرلہٗ **مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی** ایم اے جناح روڈ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

الحج

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان عفی عنہ

مکتبہ تھانوی، دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ
الحج

این	کہاں ہوا	جامع مسجد تھانہ بھون
متی	کب ہوا	۴ شوال سنہ ۱۳۳۱ ہجری
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹہ
کیف	کس طرح ہوا	منبر پر بیٹھکر
لِمَ	کیوں ہوا	حج کا زمانہ قریب تھا اسلئے اسکے ادا کی تاکید کرتے ہوئے فضائل حج کیطرف رغبت دلائی
ماذا	کیا مضمون تھا	حج سے ساری گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور حج واجب علی الفور ہے اسلئے اسمیں دیر نہ کی جائے
من ای شان	کس قسم کے آدمی زیادہ تھے	ہر طبقہ کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۵۰ تقریباً
الاشتات	متفرقات	یہ وعظ اپنے مضمون میں واحد ہے عجیب علوم کا ذخیرہ ہے ۱۲

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ **اما بعد** فقد روی مسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ والھجرۃ تھدم ما کان قبلھا وان الحج یھدم ما کان قبلہ

ہر چند کہ آج طبیعت نہایت کسلمند ہے پھر مجمع بھی کم ہے اس لئے طبیعت بیان کرنے کو نہیں چاہتی مگر چونکہ آجکل ایام حج ہیں اس لئے اس خیال سے بیان کرتا ہوں کہ شاید اس مجمع میں کوئی ایسا شخص ہو جس پر حج فرض ہو تو وہ اس بیان کو سن کر حج کا قصد کر کے گناہ سے بچ جائے اسی ضرورت سے میں نے ایک حدیث پڑھی ہے جس میں حج کی یہ فضیلت مذکور ہے کہ اس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور یہ حدیث کئی اجزاء پر مشتمل ہے مگر اس وقت مقصود اعظم ایک جزو ہے بقیہ اجزاء کو اس لئے پڑھ دیا گیا کہ ان کو مقصود اعظم کے سمجھنے میں دخل ہے اسی لئے ان کو بھی مختصراً بیان کیا جائیگا گو مقصوداً نہ ہو ترجمہ سے اجزاء ثلثہ کا علم ہو جائیگا فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ اسلام پہلے گناہوں کو گرا دیتا ہے یعنی کسی شخص نے کفر کی حالت میں ایک زمانہ گذارا ہو اور اس نے کبھی خدا کا نام نہ لیا ہو اور لیا ہو تو بے ادبی سے لیا ہو تو اسلام کے بعد سب گناہ معاف ہو جائیں گے کیا رحمت ہے
۴۴ حق تعالیٰ کی کہ اب اگر یہ باغی باوجود سنگین بغاوت کے اسلام لے آئے یعنی زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہدے اور دل سے تصدیق کر دے جس میں دو سکنڈ خرچ ہوتے ہیں اور کچھ دشواری بھی نہیں بلکہ نہایت آسان کام ہے اتنے آسان کام کے کر لینے سے سالہا سال کی بغاوت اور سنگین سے سنگین جرائم ایک دم سے معاف ہو جاتے ہیں کام اسقدر آسان ہے جس میں دو ہی جزو ہیں ایک جوارح سے متعلق ہے ایک قلب کے قلب کا کام تو بہت ہی سہل ہے اور دوسرا کام زبان کا ہے جو دوسرے جوارح کے اعمال کی نسبت سے بہت سہل ہے کیونکہ مشاہدہ سے یہ بات معلوم ہے کہ اگر ہاتھ پیر سے کوئی کام کیا جائے تو تھوڑی دیر میں ہاتھ پیر تھک جاتے ہیں چنانچہ بوجھ اٹھانے سے ہاتھ کو کلفت کا احساس ہوتا ہے چلنے سے پاؤں کو کلفت کا احساس ہوتا ہے مگر یہ کبھی نہ سنا ہو گا کہ زبان سے بولنے میں زبان میں درد ہوا ہو یہ اور بات ہے کہ زیادہ بک بک کرنے سے دماغ تھک جائے مگر زبان نہیں تھکتی یہی وجہ ہے کہ زبان سے گناہ

بہت ہوتے ہیں کیونکہ اور جتنے اعضاء ہیں وہ گناہ کرتے کرتے ایک حد پر تھک
جاتے ہیں مثلاً زنا بدکاری کب تک کرے گا آخر ایک دن عاجز ہوجائیگا مگر زبان
کیا ممکن ہے کہ کبھی تھکے؟ تو زبان کا کام سب سے زیادہ سہل ہے اور یہ سہولت
اللہ تعالیٰ نے تو اسلئے رکھی تھی تاکہ نیک کام زبان سے بکثرت ہوتے مگر جن لوگوں کی
عقل الٹی ہوتی ہے انکا ہر کام الٹا ہوتا ہے ؎ ہر چہ گیرد علتی علت شود۔ ہم نے
اِس نعمت کی یہ قدر کی زبان سے گناہ بکثرت شروع کردیئے؟ اللہ تعالیٰ نے
ایک مقام پر انسان کی یہ شکایت بیان فرمائی ہے کہ وہ نعمت کی بیقدری کرتا اور
اُس سے الٹا کام لیتا ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جو نمرود نے کج بحثی
کی تھی اللہ تعالیٰ اُسکو اِس طرح بیان فرماتے ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ
رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ کہ تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا (مراد نمرود ہے کما قال المفسرون)
جسنے ابراہیم علیہ السلام سے خدا تعالیٰ کے بارے میں حجت لگائی (کہ خدا ہے یا نہیں)
محض سوجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسکو سلطنت دیدی تھی یہ تو ترجمہ ہوا۔ یہاں یہ سوال
پیدا ہوتا ہے کہ سلطنت کا دیا جانا کفر کا باعث کیسے ہوگیا تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے
کہ مقصود یہ ہے کہ ملک تو اُسکو اسلئے دیا گیا تھا تاکہ شکر گذار ہوکر خدا پر ایمان لاتا
مگر اُس نے اُلٹا کیا گویا اُسکو سلطنت ناشکری کرنیکو دی گئی تھی ایسے ہی ہم لوگوں
نے نعمت زبان سے اُلٹا کام لیا ہے کہ اُس سے بکثرت گناہ کرتے ہیں ہم نے اُسکی
غایت و مقصود کو عکس کردیا جیسا ایک شخص نے اصلاح الرسوم کو دیکھکر کہا تھا
کہ اِس کتاب سے ہم کو بڑا فائدہ ہوا پہلے ہم کو تقریبات کے موقعہ پر بڑی دقت
ہوتی تھی کیونکہ معلوم نہ تھا کہ کیا کیا رسمیں ہوا کرتی ہیں اور ہمکو کیا کرنا چاہئیے لوگوں سے
پوچھنے کی ضرورت ہوا کرتی تھی اب آسان نسخہ مل گیا کہ اس کتاب کو دیکھکر سب رسمیں
کرلیا کرینگے تو اس نے بھی مصنف کی خلاف مقصود کتاب سے کام لیا کیونکہ مقصود
تو کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس سے رسوم کی اصلاح و ابطال مقصود ہے
غرض اللہ تعالیٰ نے زبان کے کام کو اسلئے آسان کیا تھا کہ اس سے عبادت و ذکر و تلاوت

قرآن بکثرت ہو سکے چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں فانما یسرناہ بلسانک لتبشر بہ المتقین
وتنذر بہ قوما لدا ۲ کہ ہم نے قرآن کو آپ کی زبان میں اسلئے آسان کیا تاکہ آپ اُس
سے اہل تقوی کو بشارت دیں اور جھگڑنے والوں کو ڈرائیں یعنی قرآن کے یُسر کی ایک
وجہ یہی ہے کہ وہ عمل زبان سے متعلق ہے اور غایت و مقصود یُسر کا یہ ہے تاکہ آپ
تبلیغ کر سکیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ایک سہل کام پر رکھا ہے کہ دل سے تصدیق
ہو اسکے بعد زبان ہلا لو کہ وہ بھی آسان کام ہے اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ بعض لوگ جو
سلام کے جواب میں سر ہلاتے ہیں اور زبان سے وعلیکم السلام نہیں کہتے ہیں وہ بدمذاق
ہیں کہ انکا سی زبان نہیں ہلاتے وہ ذرا سا سر ہلا دیتے ہیں ممکن ہے کوئی معقولی اُسکی یہ
توجیہ کرے کہ فعل بسیط فعل مرکب سے آسان ہوتا ہے اور سر کا ہلانا [illegible] فعل بسیط ہے
اور زبان کا چلانا فعل مرکب ہے کیونکہ الفاظ کو مخارج سے خاص ہیئت و ترکیب کے
ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے سو جواب اُس کا یہ ہے کہ اس لحاظ سے اگرچہ سر ہلانا سہل ہے
۵ مگر جس غرض سے سلام کرتے ہیں اُس غرض و غایت کے لحاظ سے زبان ہی کا فعل آسان
ہے کیونکہ سر ہلانے سے وہ غرض حاصل نہیں ہوتی سلام سے مقصود دعا ہے اور وہ بدون
کلام و تکلم کے حاصل نہیں ہوتی تو جو لوگ سلام و جواب سلام میں سر ہلاتے ہیں اُن کو
غایات و مقاصد سے دلچسپی نہیں اور یہی بدمذاقی کی علامت ہے بہرحال چونکہ فعل
لسان و فعل قلب بہت سہل ہے اسلئے حق تعالیٰ نے اسلام کا مدار احکام دنیا میں تو
صرف زبان کے اقرار پر رکھا اور احکام آخرت میں تصدیق قلب بھی ضروری ہے
اور جو افعال اُسکے علاوہ ہیں نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ وہ مکمل اسلام ہیں اجزاء
اسلام نہیں ہیں یعنی تارک صلوٰۃ کافر نہیں اور یہ نکتہ اہل سنت نے سمجھا ہے کہ
جب اسلام اتنی سہل چیز ہے جو زبان ہلانے سے متعلق ہے تو اُس کے اجزاء یہ امور
شاقہ نہیں ہو سکتے پس مومن تارک صلوٰۃ اگرچہ معذب ہوگا مگر پٹ چھٹ
کر کسی وقت جنت میں ضرور پہونچ جائے گا پس خدا تعالیٰ کی یہ بہت
بڑی رحمت ہے کہ اسلام کو پھول سا ہلکا کر دیا حالانکہ یہ اتنی قیمتی شے ہے

کہ کوئی چیز اسکی برابر قیمتی نہیں کیونکہ عذاب دائمی سے نجات کا مدار اسی پر ہے اور جنت کی دائمی راحت کا استحقاق اسی سے ہوتا ہے اگر یہ سب سے زیادہ دشوار ہوتا تو بجا تھا مگر قربان جائیے رحمت حق کے کہ سب سے زیادہ ضروری چیز کو سب سے زیادہ آسان کر دیا مگر صاحبو! اس رحمت کے اندر خدا کا ایک بڑا قہر بھی ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ کہ اتنا آسان کام کافر کو بہت ہی مشکل ہے کتنا تو سہل کام مگر کافر سے نہیں ہو سکتا اس کو گردن دیدینا جان کا برباد کرنا آسان ہے مگر اسلام لے آنا آسان نہیں آپ سمجھے کہ یہ حجاب کس چیز کا ہے؟ یہ حجاب قہر الہیٰ کا ہے اسی وجہ سے اہل اللہ خدا کے قہر سے ہر وقت لرزاں ترساں رہتے ہیں اسی لئے کام کرنے والوں کو چاہیئے کہ اپنے اعمال کو اپنا کمال نہ سمجھیں بلکہ خدا تعالیٰ کا احسان سمجھکر شکر کریں کہ انہوں نے ہم سے کام لے لیا ورنہ ہماری کیا طاقت تھی۔

؎ منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی ۔۔۔ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشت

۶ کام کرنے والوں کو دین کا کام کرنے سے دو مرض پیدا ہو جاتے ہیں ایک کبر دوسرا تواضع مفرط کبر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر اپنے اوپر نگاہ کرنے لگے نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر سمجھنے لگے تو اسے نمازی تو بے نمازی کو حقیر نہ سمجھ؟ کیونکہ ؎

تا غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را ۔۔۔ در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ۔۔۔ ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

یعنی اپنے اوپر نگاہ نکرو کیونکہ تکبر کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیئے گئے کہ منزل مقصود پر نہ پہونچ سکے رستہ ہی سے واپس کر دیئے گئے شیطان اور بلعم باعور وغیرہ کی حالت اسکی نظیر ہے اور نا امید بھی نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ شرابخوار ایک آہ سے بہت دور پہونچ گئے ہیں میرے ایک دوست نے ایک شخص کی حکایت بیان کی جو مارہرہ کا رہنے والا تھا اور تمام بازیوں کا جامع اور ساری بدمعاشیوں کا مجموعہ تھا جتنے برے کام تھے سب اس کے اندر موجود تھے مگر ایک مرتبہ دفعۃً اُس کی زبان سے یہ نکلا کہ ہائے میرا کیا انجام ہوگا؟ اس کے بعد زبان تو بند ہو گئی

اور آنکھوں سے دریا کا دہانہ کھل گیا ؎

یارب چہ چشمۂ ایست محبت کہ من ازاں — یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

غرض روتے روتے اُس کا بُرا حال ہوا نہ کھانے کا ہا نہ پینے کا تین روز تک برابر روتا رہا اور تین دن کے بعد مر گیا معلوم ہوتا ہے کہ خوف الٰہی نے اُس کے جگر کے ٹکڑے کر دیئے اور دل پھاڑ دیا تھا اسلئے واقعی وہ شہید اکبر ہوا محبت کا تیر بھی عجیب ہے کہ جب کسی کے لگتا ہے تو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کہاں سے آیا کدھر سے آیا مگر دل و جگر سے پار ہو جاتا ہے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشان زدہ — بحیرتم کہ عجب تیرے کمان زدہ

اس شخص کی حکایت پر مجھے ایک اور قصہ یاد آگیا جو میرے ایک اور دوست نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص سفر حج میں تھا مگر حالت یہ تھی کہ ہاتھ میں دف تھا اور گاتا بجاتا رہا تھا کسی نے کہا کہ میاں حج کے راستہ میں ناچنا گانا کیسا ؟ اُس نے کہا تم کیا جانو واقعی کوئی کسی کی حالت کو کیا جانے ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں ست — بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں ست

ہر شخص کا خدا تعالیٰ سے ایک تعلق ہے جس کو دوسرے نہیں جانتے غرض جس وقت یہ شخص مکہ میں پہونچا اور اسکے رفقا معلم کی ساتھ خانہ کعبہ کے طواف کو چلے تو دروازہ مسجد حرام پر پہونچ کر مطوف نے کہا ھذا بیت اللہ یہ بیت اللہ ہے اسکی نظر جو دوسرے کعبہ پر اور غلاف کعبہ پر پڑی ہے اسپر وجد طاری ہو گیا اور کہنے لگا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر — کہ مبادا بار دیگر نرسی بدیں تمنا

یہ شعر پڑھا اور جان بحق تسلیم ہو گیا واقعی اس سے بڑھکر جان دینے کا وقت اور کونسا ہوگا جب یہ حالت ہے تو تم کس بات پر کسی کو حقیر سمجھتے ہو ہاں یہ جائز ہے کہ بُرا کام کرنے والے پر غصہ کرو اس سے بغض کرو مگر اپنے سے کم تر سمجھو اور اگر کبھی تمکو کسی کی سزا و تادیب کیواسطے مقرر کیا جائے تو خبردار اپنے کو اُس سے اچھا ہرگز نہ سمجھنا ممکن ہے کہ وہ خطا وار شاہزادہ کی مثل ہو اور تم نوکر جلاد کے درجہ

میں ہو جس کے متعلق سزا کا کام اور اس کے اختیارات ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ خطاوار شاہزادہ کو بادشاہ جلاد کے ہاتھوں سزا دلوائے تو جلاد اُس سے افضل نہیں ہو سکتا شاہزادہ سزا کے بعد بھی شاہزادہ ہی ہے اور جلاد نوکر ہی کے درجہ میں ہے پس کسی سے اپنے کو افضل نہ سمجھو جب اُسکے عیب پر نظر پڑی اپنے عیب کو دیکھ لو۔ اسی کو جامی فرماتے ہیں ؎

جامی چہ لاف می زنی از پاکدامنی — برخرقۂ تو این ہمہ داغ شراب چیست

عارف فرماتے ہیں ؎ نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بیغش باشد ٭ ای بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

تقدس کا دعویٰ ہرگز جائز نہیں اپنے خرقہ کو اور اپنی عارفانہ باتوں کو ایسا سمجھو ؎

این خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولے — زین دفتر بیمعنی غرق مئے ناب اولے

تکبر سے بچنا لازم ہے کسی کو حقیر و ذلیل نہ سمجھو شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سیدنا غوث اعظم جیلانی قدس سرہٗ کے حال میں ایک کتاب لکھی ہے اسمیں ایک حکایت بڑی عبرت کی لکھی ہے کہ حضرت غوث اعظمؒ کے ایک خادم بیان کرتے ہیں کہ ایک رات کو
حضرت تہجد سے فارغ ہو کر خانقاہ سے باہر ایک طرف کو چلے میں بھی پیچھے پیچھے اس طرح ۸
ساتھ ہو لیا کہ حضرت شیخ کو میری اطلاع نہو اور کسی خدمت کی ضرورت ہو تو جلدی سامنے حاضر ہو سکوں یہانتک کہ شہر پناہ بغداد کے دروازہ پر پہونچے جو مقفل تھا قفل خود بخود کھل گیا اور جب میں بھی باہر ہو گیا تو دروازہ خود بخود بند ہو گیا یہانتک کہ تھوڑی سی دیر میں ہم ایک شہر میں پہنچ گئے جو بغداد کے قریب کبھی نہیں دیکھا گیا اس شہر میں تھوڑی دور چل کر ایک مکان میں پہونچے وہاں ایک مجمع تھا حضرت غوث اعظم کو دیکھکر سب حضرات کھڑے ہو گئے ایک سمت سے آواز کراہنے کی آرہی تھی جو تھوڑی دیر میں منقطع ہو گئی پھر کچھ پانی گرنے کی آواز آتی رہی پھر ایک چھوٹی سی جماعت ایک جنازہ کو لیکر باہر نکلی اور حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اس کے بعد وہ آدمی اُس جنازہ کو لیکر چلے گئے اور حاضرین میں سے ایک بزرگ نے حضرت غوث اعظم سے سوال کیا کہ ان کی جگہ کس کو مقرر کیا جائے آپنے گردن جھکائی اور کچھ دفعہ کے بعد فرمایا کہ قسطنطنیہ کے کنیسہ میں اس وقت ایک نصرانی صلیب پرستی کر رہا ہے

اُس کو مقرر کیا جاوے تھوڑی ہی دیر میں ایک عیسائی حاضر ہوا جس کے گلے میں زنار پڑا ہوا تھا حضرت شیخ نے حکم دیا کہ زنار توڑ دو اور اس کو غسل دیدو غسل کے بعد فرمایا کہو اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله اُس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا اُس کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ اُن کی جگہ اُس کو مقرر کر دیا جائے یہ خادم بڑا حیران ہوا پھر صبح سے پہلے دونوں خادم و مخدوم اسی طرح بغداد میں پھر خانقاہ میں پہونچ گئے صبح کی نماز کے بعد جب حضرت شیخ معمولات سے فارغ ہو کر حجرہ سے باہر تشریف لائے تو خادم نے رات کے واقعہ کا تذکرہ کیا کہ مجھے اِس واقعہ کی حقیقت نہ معلوم ہونے سے بڑی حیرت ہے حضرت شیخ نے فرمایا کیا تم میرے ساتھ تھے کہا جی ہاں تو فرمایا وہ مقام جہاں ہم گئے تھے شہر موصل ہے یہاں سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے واسطے زمین کو سمیٹ دیا تھا اور وہ جماعت ابدال کی تھی اور جس کا وہ جنازہ تھا وہ بھی ابدال میں سے تھا اُن کی جگہ دوسرے کو مقرر کرنے کی ضرورت تھی اِس لئے میں وہاں گیا تھا پھر جو کچھ ہوا وہ تو تمہارے سامنے ہوا غرض خدا تعالیٰ کا دربار عجیب ہے وہ بعض دفعہ ایسے شخص کو قبول فرما لیتے ہیں جس کی نسبت گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ مقبول بارگاہ ہوگا وہ دربار بڑا غنا کا دربار ہے جسکی شان یہ ہے ؎

ہر کہ آید گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو　　دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

مگر غنا کے معنی یہ نہیں کہ وہاں اندھیر ہے انتظام نہیں ہے جس کا یہ عقیدہ ہو وہ توبہ کرے کیونکہ یہ عقیدہ کفر ہے اور جس کا عقیدہ یہ نہیں وہ بھی ایسے الفاظ سے احتراز کرے جن سے اس معنی کا ایہام ہوتا ہے جیسے بعض لوگ کسی شخص کی جوان موت پہ کہدیا کرتے ہیں کہ میاں اللہ خدا کی ذات بڑی بے پرواہ ہے اِس موقعہ پر اس کلمہ سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ خدا کو کسی پر رحم نہیں نہ مصالح و حکم کی رعایت ہے نہ کسی بات کا انتظام ؟ صاحبو خدا تعالیٰ سے زیادہ انتظام کرنے والا کون ہوگا جس کی شان قدرت یہ ہے اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ وَالسَّمَاۗءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اور اُسکی شان یہ ہے وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ اور یہ شان ہے

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَہَدٰی نظام عالم کی پختگی اور اُس کی مضبوط رفتار احکم الحکمین کے نظام کامل پر خود شاہد ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ کام کرنے والوں میں دو مرض پیدا ہو جاتے ہیں ایک تکبر جس کا ابتک بیان ہوا دوسرے تواضع مفرط یعنی بعض اِس حدتک تواضع کرتے ہیں کہ اپنے اعمال صالحہ کی بیقدری کرنے لگتے ہیں کہ ہمارے اعمال کیا ہیں کچھ بھی نہیں تواضع بہت عمدہ شے ہے کیونکہ عبدیت کے آثار سے ہے اور عبدیت مطلوب ہے بلکہ تمام مطالب میں اعلیٰ مقام عبدیت ہی ہے مگر بعض دفعہ تواضع اِس طرح کی جاتی ہے کہ اُس سے اپنے اعمال کی بیقدری اور تحقیر ہوتی ہے اور تحقیر اعمال کے ساتھ در پردہ خدا تعالیٰ کی شکایت بھی ہوتی ہے مثلاً بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم نماز پڑھتے ہیں مگر اُس میں خشوع تو ہے ہی نہیں ذکر کرتے ہیں مگر انوار بالکل نہیں ہیں گویا خدا کی شکایت کر رہے ہیں کہ دوسروں کو تو انوار دیئے ہمکو نہیں دیئے سو یاد رکھو کہ جہاں خدا تعالےٰ نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ فرمایا ہے وہاں اَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ بھی فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ ۱۰
کی نعمت کو بیان کرو اور اُسکی نعمت کی قدر و عظمت کرو اِس مقام پر بہت سے ناواقف شریعت کی تعلیم سے گھبرا اُٹھتے ہیں کہ تواضع کرو تو عمل کی تحقیر ہوتی ہے اور تحمل کی قدر کرو تو حکم یہ ہے کہ دعویٰ نکرو اور اسی حالت میں کسی بیباک نے کہا ہے شعر

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

مگر یہ لوگ محقق نہیں بخدا ساری شریعت اگر نظر تحقیق سے دیکھی جائے اُسکی مصداق ہے۔

شعر ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

صاحبو! تمام شریعت اِس کا مصداق ہے یرید اللّٰہ بکم الیسر یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں دشواری نہیں چاہتے اور ایک مقام پر خود ہمکو یہ دعا تعلیم فرمائی گئی ہے ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ (ترجمہ) اور اے پروردگار ہمارے اُوپر ایسا بوجھ نہ لادیئے جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر لادا گیا ہے اور اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ لادیئے جس کی

(برداشت کی) ہمکو طاقت نہیں اور حدیث میں ہے کہ یہ سب دعائیں قبول ہوچکی ہیں پس شریعت میں تحمل سے زیادہ کوئی حکم نہیں اور جو شخص کسی حکم شریعت کو تحمل سے باہر کہتا ہے وہ نصوص قرآنیہ کی تکذیب کرتا ہے شریعت تمامتر سہل ہے ہاں کسی کی آنکھیں چوندہی ہوں کہ حسن شریعت اُسکو نظر نہ آتا ہو تو کوئی کیا کرے حدیث میں ہے جئتکم بالحنیفیۃ السمحۃ البیضاء لیلھا کنھارھا سواء میں تمہارے پاس ایسی آسان اور روشن شریعت لایا ہوں جس کا رات دن برابر ہے (یعنی اوامر و نواہی سب آسان ہونے میں یکساں ہیں اور سب حکمتوں اور مصلحتوں سے لبریز ہیں) اسی لیئے میں تو اکثر یہ کہا کرتا ہوں ؎ نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم ✦ چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

کوے نومیدی مرو کامیدہاست
سوے تاریکی مرو خورشیدہاست

اب اُس اشکال کا حل سنئے وہ یہ ہے کہ تم یوں کہو اے اللہ آپکا شکر ہے کہ آپنے ہم کو نماز کی توفیق دی ورنہ ہماری کیا مجال تھی جو آپ کی بندگی کر لیتے ؎

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا
ولا تصدقنا ولا صلینا

اب شکر و تواضع دونوں جمع ہو گئے دعوی بھی قطع ہو گیا اور اعمال کی بیقدری بھی نہوئی اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں
درمیاں شاں برزخ لایبغیاں

اسی لئے کامل [illegible] ہے جو اپنے اعمال صالحہ کو ظاہر کرے اخفاء کا اہتمام نکرے تاکہ واما بنعمۃ ربک فحدث پر عمل ہو جائے ہاں متوسط کو اظہار مضر ہوتا ہے مگر وہ اس لیے کہ اُسکی نظر میں اغیار ہیں اور کامل کی نظر سے اغیار مفقود ہو چکے ہیں وہ نہ کسی کے واسطے کوئی عمل کرتا ہے نہ کسی کی وجہ سے کسی عمل کو ترک کرتا ہے اُس کی نظر صرف ایک ذات پر ہے باقی سب مخلوق اُسکی نظر سے غائب ہیں اُس کے نزدیک آدمی میں اور مسجد کی دیوار اور بوریئے میں کچھ فرق نہیں پھر وہ کس سے چھپ کر عمل کیوں کرے کسی نے مسجد کی دیوار سے بھی اخفاء کا اہتمام کیا ہے دوسرے عارف کو ہر چیز مظہر حق اور مظہر جمال [illegible]

نظر آتی ہے اور اخفا ہوتا ہے غیر سے اس لئے اُس کو کسی سے اخفار کا اہتمام نہیں اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

ہرچہ بینم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

توئی سے ذات مراد ہے اور خوئی تو سے صفات اور بوئے تو سے افعال مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ عالم میں بعض دفعہ تو عارف کو ذات حق کا مشاہدہ بلا واسطہ بلا کیف ہوتا ہے شلاً اوقات خلوت و عبادت میں کبھی بواسطہ ہوتا ہے کیونکہ جتنی مخلوقات ہیں اُن میں صفات حق کا ظہور ہو رہا ہے اور تصرفات حق جلوہ نما ہیں پس عارف ہر چیز پر نظر ڈالتے ہوے یہ دیکھتا ہے کہ اسمیں خداتعالیٰ کی کس صفت کا ظہور ہوا ہے صفت جمال کا یا صفت جلال کا اور حق تعالیٰ نے اُسکے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے اور کس طرح تصرف فرما رہے ہیں تو اب کوئی چیز اُسکے لئے حجاب حق نہیں بلکہ آئینہ جمال و جلال حق ہے اسی لئے ایک عارف نے کسی شاعر کا جو یہ قول سنا ؎

گلستاں میں جاکر ہر اک گل کو دیکھا نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

تو فوراً اُسکی یوں اصلاح کی ؎ ۱۲

گلستاں میں جاکر ہر اک گل کو دیکھا تیری ہی سی رنگت تیری ہی سی بو ہے

مولانا اسی مضمون کو ایک مثال سے واضح کر کے بیان فرماتے ہیں ؎

ما ہمہ شیران ولے شیر علم حملہ شان از باد باشد دمبدم

حملہ شان و ناپیداست باد انچہ ناپیداست ہرگز کم مباد

یعنی ظاہر میں ہم ہی شیر معلوم ہوتے ہیں مگر ہم ایسے شیر ہیں جیسے جھنڈے پر شیر کی تصویر ہوتی ہے کہ جس وقت ہوا سے جھنڈا ہلتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کر رہا ہے لیکن شیر کا حملہ تو نظر آتا ہے ہوا نظر نہیں آتی اسی طرح یہاں سمجھو کہ ظاہر میں تم کام کرتے ہوئے نظر آتے ہو مگر حقیقت میں کوئی دوسری قوت ہے جو تمکو نچا رہی اور تم سے کام لے رہی ہو لیکن تم تو نظر آتے ہو اور وہ کام لینے والا نظر نہیں آتا مگر دل میں اُسکا یقین ضرور ہے اور اسی کی بابت دعا فرماتے ہیں انچہ ناپیداست ہرگز کم مباد۔ یعنی از دل ما۔ کہ جو کام لینے والا نظر نہیں آتا خدا کرے اُسکی یاد ہمارے دل سے کم نہو یہ تفسیر حضرت حاجی صاحب

قدس اللہ سرہ کے پاس پہونچکر معلوم ہوئی ورنہ یہ شعر حل ہی ہونا تھا۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔ ؎

دو دہاں دایم گویا ہمچو نے	یک دہان نہان ست در لب ہای وے
یک دہاں نالان شدہ سوئی شما	ہائے وہوئے درفگندہ در سما

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین	نیستم در صف طاعت بین بین

کہ ہماری ایسی مثال ہے جیسے انگلیوں کے درمیان قلم ہوتا ہے کہ بظاہر کتابت قلم سے ظاہر ہو رہی ہے مگر حقیقت میں کام لینے والا دوسرا ہے اگر وہ کام نہ لے تو قلم کی کیا مجال ہے کہ ایک حرف بھی لکھ سکے چونکہ یہ حقائق عارف پر منکشف ہیں اس لئے غیر پر اُسکی نظر نہیں رہتی پھر وہ کس سے اپنے عمل کو چھپائے ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اخفاء عمل عمدہ حالت ہے مگر کمال یہ ہے کہ اظہار ہو مگر دعویٰ نہ ہو اور اس سے بڑھکر کمال یہ ہے کہ اگر دعویٰ بھی ہو مگر اپنے اُوپر نظر نہ ہو شاید بعض لوگ اسکو نہ سمجھے ہونگے اسلئے میں ۱۴
اُس کی تفصیل کرتا ہوں کہ دعویٰ اور تکبر یہی وہ ممنوع ہیں جس میں اپنے اوپر نظر ہو اگر اپنے اُوپر نظر نہو بلکہ خدا تعالیٰ پر نظر ہو تو بعض مقامات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صورت دعویٰ اور صورت تکبر کو جائز فرمایا ہے حدیث میں ہے کہ دو مقام میں تکبر جائز ہے ایک صف قتال میں دوسرے صدقہ دیتے ہوئے تو ظاہر میں یہ تکبر معلوم ہوتا ہے مگر اصل میں وہ شخص اسوقت منصور کے مثل ہے کہ انہوں نے انا الحق کہا تھا مگر وہ اُس وقت شجرہ طور کے مثل تھے شجرہ طور سے بھی انی انا اللہ رب العلمین نکل رہا تھا مگر کیا وہ درخت اپنے کو خدا کہہ رہا تھا ہرگز نہیں بلکہ کہنے والے حق تعالیٰ تھے شجرہ محض واسطہ اور آلہ تھا اسی طرح منصور کی زبان سے جو انا الحق نکلا اُسوقت وہ خود نہ کہہ رہے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ اُن کی زبان سے تجلی کلامی فرمارہے تھے آخر اس میں تعجب کیا ہے؟ جب شجرہ کی زبان سے اللہ تعالیٰ انی انا اللہ فرما سکتے ہیں تو منصور کی زبان سے کیوں نہیں فرما سکتے اسی طرح ایک بزرگ کے پاس ایک شخص اپنے لڑکے کو لایا جو اندھا پیدا ہوا تھا اور بہت حضرات اس کے لئے

دعا کر دیجئے انہوں نے فرمایا کہ کیا میں عیسیٰ علیہ السلام ہوں جو اندھوں کو سوانکھا کر دوں
وہ شخص مایوس ہو کر چلا گیا تو دفعتًہ ان بزرگ کی زبان سے نکلا بازآ ریدما کنیم ما کنیم ما کنیم
کہ اُسکو واپس لاؤ ہم اُسکو اچھا کر دیں گے ہم کر دیں گے چنانچہ خدام نے یہ سنکر اُس شخص
کو واپس بلایا آپ نے دعا کی اور بچہ کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ بینا ہو گیا اُس کے
بعد کسی خادم نے پوچھا کہ اول تو آپ نے اس شخص کی درخواست کو اس سختی کیساتھ
رد کیا تھا کہ میں عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہوں اور اسکے بعد اس دعوی کیساتھ فرمایا ما کنیم
ما کنیم اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ لفظ میں نے نہیں کہا بلکہ جب میں نے یہ جواب دیا کہ
میں عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہوں تو مجھے الہام کے ذریعہ سے عتاب ہوا کہ کیا عیسیٰ علیہ
السلام اندھوں کو اچھا کرتے تھے جو تم نے یہ جواب دیا بلکہ ہم اچھا کرتے تھے اور ہم اب بھی موجود
ہیں پھر تم نے یہ جواب کیوں دیا اس الہام میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہو رہا تھا ما کنیم
ما کنیم وہی بیساختہ میری زبان پر جاری ہو گیا تو اس واقعہ میں یہ بزرگ بھی مثل شجرۂ طور کے
تھے اور ان کا حال بھی مثل منصور کے تھا اسلئے صورت دعویٰ بعض صورتوں میں جائز ہے ۱۴
جو حدیث میں مذکور ہیں اور حقیقی دعویٰ حرام ہے پس اظہار عمل مطلقًا نقص نہیں اور نہ اخفا
عمل مطلقًا کمال ہے بلکہ نقص جب ہے کہ اپنے اوپر نظر ہو اور کمال جب ہے کہ اپنے
اوپر نظر نہو بلکہ صرف خالق جل وعلا پر نظر ہو پس گو اخفائے عمل متوسط کے لئے محمود
ہے مگر کمال نہیں مگر متوسط کیلئے بھی فرض نماز کو تنہائی میں ادا کرنا جائز نہیں کیونکہ
فرض سے قرب زیادہ ہوتا ہے اور زیادہ قرب میں اخفا نہیں ہوا کرتا چنانچہ جو شخص
بادشاہ کا زیادہ مقرب ہوتا ہے بادشاہ برسر دربار اُسکے درجہ اور منصب کو ظاہر کرتا
ہے اور جسکو کم قرب ہوتا ہے اُسکے قرب کو برسر دربار ظاہر نہیں کیا جاتا غرض فرض نماز
چونکہ خاص قرب کا وقت ہے اسلئے اُس کا اخفا جائز نہیں بلکہ اشاعت فرض ہے
اور جو لوگ اسواسطے اپنے اعمال صالحہ کا اخفا کرتے ہیں تاکہ لوگ ملامت نہ کریں اور
یوں نہ کہیں کہ یہ بزرگ بننا چاہتا ہے یا ریاکاری کرتا ہے اُنکو اس خیال سے بھی اخفا
نکرنا چاہیئے بلکہ اپنے کام میں لگیں اور ملامت سے نہ ڈریں کیونکہ عاشق کو ملامت محبت سے

مانع نہیں ہوا کرتی بلکہ ملامت سے تو عشق کی گرم بازاری ہے ؎

خورشا رسوائی کوے ملامت — نسازد عشق را گنج سلامت

متنبی کہتا ہے ؎

عذل العواذل حول قلبی التائہ — وھوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

بلکہ محبت تو بعض دفعہ چھپانے سے بھی نہیں چھپتی ؎

می تواں داشت نہاں عشق ز مردم لیکن — زردئ رنگ رخ و خشکی لب را چہ علاج

یہ تو عشق مجازی کی حالت ہے اور عشق حقیقی کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی — نیک بیں باشی اگر صاحب دلی

تو جب اعمال صالحہ کو تکلف کی ساتھ چھپانیکی بھی اجازت نہیں الا لعذر خاص تو ان کی بیقدری اور تحقیر کی کب اجازت ہو سکتی ہے رہا یہ کہ نماز میں خشوع نہیں اور ذکر وغیرہ میں انوار نہیں اسلئے ہم انکو کالعدم اور حقیر سمجھتے ہیں میں کہتا ہوں کہ خشوع نہو انوار نہوں جب بھی تم اعمال کی بیقدری نکرو کیونکہ بلا بودے اگر اینہم نہ بودے اگر یہ بھی نہوتے 15 تو کیا ہوتا یہ تھوڑی نعمت ہے کہ تم نماز تو پڑھتے ہو گو ناقص ہی سہی اللہ کا نام لیتے ہو گو اعلیٰ درجہ میں نہ سہی ہاں تکمیل میں سعی کرتے رہنا لازم ہے مولانا جامی سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص ریا سے ذکر کرتا ہے فرمایا وہ تم سے پھر بھی اچھا ہے کہ خدا کا نام تو لیتا ہے تم تو ریا سے بھی خدا کا نام نہیں لیتے قیامت میں اس کا ذکر ریائی ٹمٹماتا ہوا چراغ بنکر پلصراط سے اسکو پار کر دیگا مگر تمہارے پاس تو ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی نہیں یہ ہیں محقق لوگ جو اعمال صالحہ کی اتنی قدر کرتے ہیں غرض کام کرنے والے سے پھر بہت اچھا ہے کہ کچھ کرتا تو ہے اور جو بالکل نہیں کرتا وہ تو بالکل محروم ہے حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے ایک مجمع صلحاء کے بارے میں جو ایک دینی کام کے لئے اٹھے تھے مگر ناکام رہے طعن کے طور پر کہا کہ ان لوگوں نے ناحق اس میدان میں قدم ڈالا بھلا کیا حاصل ہوا تو مولانا نے اس کے جواب میں سودا کا یہ قطعہ پڑھ دیا ؎

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

پس اپنے نیک اعمال کی تحقیر و بیقدری بھی نہ کرو اور نہ اپنے آپ کو بزرگ اور بڑا سمجھو بلکہ اپنی ایسی مثال سمجھو جیسے بادشاہ کسی چمار کو قیمتی موتی دیدے ظاہر ہے کہ اس صورت میں چمار اپنے کو چمار ہی سمجھے گا اور موتی کو موتی سمجھے گا یہ نہیں کہ موتی کے آجانے سے وہ اپنے کو سید یا پٹھان سمجھنے لگے یا موتی کو اپنے ہاتھ میں آنے سے کانچ سمجھنے لگے اگر ایسا کریگا تو عذاب شاہی میں گرفتار ہوگا ہاں یہ ضرور ہے کہ موتی ملنے کے بعد اُسکو پہلے سے زیادہ بادشاہ کا خوف ہوگا کہ مجھکو بڑی شے ملی ہے خدا خیر کرے اور مجھے اُس کی حفاظت کی توفیق دے ایسا نہ ہو کہ مجھ سے اُسکی حفاظت و قدر دانی میں کوتاہی ہوجائے اور بادشاہ ناراض ہو اسی طرح جسکو نماز کی توفیق ہوگئی ہے وہ نماز کو حقیر نہ سمجھے کیونکہ وہ تو بڑا قیمتی جوہر ہے مگر اپنے کو چمار ہی سمجھے اور نماز کی حفاظت و قدر میں پوری کوشش کرے کیونکہ قانون الٰہی یہ ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ اگر میری نعمت کی قدر کروگے تو اور زیادہ دونگا اور بیقدری کروگے تو سن لو کہ میرا عذاب بہت سخت ہے اگر نعمت میں ترقی چاہو تو اُسکی قدر کرو کیونکہ ناشکری سے نعمت سلب ہوجاتی ہے اور نعمت کا شکر یہ بھی ہے کہ اُسکو ظاہر کرو مگر دعویٰ و تکبر نہ کرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسکو اس طرح جمع فرمایا ہے انا سید ولد آدم ولا فخر میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں اور فخر سے نہیں کہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہتا ہوں حضرات انبیاء اور اولیاء کاملین کی زبان سے جو ایسی باتیں نکلتی ہیں درحقیقت اسوقت وہ خود نہیں کہتے بلکہ اللہ تعالیٰ اُن سے کہلواتے ہیں اور اسوقت اُن کے دل میں تکبر کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ اسوقت وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفیر ہوتے ہیں اور سفیر اداء سفارت کیوقت جو کہتا ہے اپنے مالک کی طرف سے کہتا ہے جیسے آپنے دیکھا ہوگا کہ ایک اردلی حاکم کیسامنے بڑے بڑے رؤسا اور نوابوں کو نام سے لیکر پکارتا ہے کہ فلاں شخص حاضر ہے اور یقیناً وہ جانتا ہے کہ اس رئیس اور نواب کیسامنے میری کچھ بھی ہستی نہیں مگر حاکم کے حکم سے اجلاس کیوقت وہ سب کا نام لیکر پکارتا ہے پس ایسی تواضع

۱۶ ط اگر تم شکر کروگے تو تمکو زیادہ دونگا نعمت اور اگر تم ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے پ ۱۳ ر ۱۲

اختیار کرو جسمیں اعمال کی بیقدری نہو اور تکبر سے ہمیشہ بچو کیونکہ جو کچھ اعمال تم کررہے ہو خود نہیں کررہے ہو بلکہ اللہ تعالیٰ تم سے کام لے رہے ہیں انہوں نے تمہارے واسطے اسکو آسان کردیا ہے اگر وہ آسان نکرتے تو تمہاری کیا مجال تھی دیکھو! اسلام کسقدر آسان ہے مگر اسی کیلئے آسان ہے جس پر خدا نے اسکو آسان کردیا ورنہ کفار اسلام کیوں نہیں لے آتے معلوم ہوا کہ جسکو وہ توفیق نددیں اسکو آسان کام بھی دشوار ہے یہی حال نماز کا ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں وَاِنَّہَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہ نماز بیشک گراں ہے مگر خاشعین پر گراں نہیں اسکے بعد فرماتے ہیں کہ خاشعین کون ہیں ؟ وہ وہ لوگ ہیں جو لقاء اللہ کا یقین رکھتے ہیں واقعی یہ عجیب کلام ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے تفصیل اسکی یہ ہے کہ نماز کی گرانی کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ نفس آزادی کا عادی ہے اور نماز میں پابندی ہے اور ظاہری پابندی نفس پر اتنی گراں نہیں جتنی باطنی پابندی گراں ہے کہ نماز میں سب طرح کے خیالات سے خالی ہوکر صرف نماز کی یا خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے کیونکہ نفس تو میدان خیالات میں چکر لگانے کا عادی ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ نفس کو سکون کا عادی بنایا جائے کیونکہ العلاج بالضد اور حرکت کی ضد سکون ہی ہے پھر سکون کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ نفس کو تمام خیالات سے خالی کیا جائے ایک یہ کہ کسی ایک خیال میں لگا دیا جائے جس سے دوسرے خیالات خود دفع ہو جاوینگے ظاہر ہے کہ پہلی صورت دشوار ہے جو نفس رات دن خیالات میں چکر لگانیکا عادی ہے وہ تمام خیالات سے دفعۃً خالی کیونکر ہوسکتا ہے اسلئے سہل تدبیر یہی ہے کہ اسکو کسی ایک خیال میں مستغرق کردیا جائے خاصکر ایسے خیال میں جو ہادم لذات و ہادم جملہ خیالات ہو حق تعالےٰ نے خشوع کا یہی طریقہ تعلیم فرمایا ہے کہ خاشعین وہ ہیں جو لقاء اللہ کا یقین رکھتے ہیں یعنی مراقبہ آخرت میں مشغول ہیں اور مراقبہ آخرت کا جمنا بھی دفعۃً سہل نہیں کیونکہ آخرت مشاہد نہیں اور غیر مشاہد کا خیال دیر سے دل میں جمتا ہے اسلئے اس کا طریقہ یہ بتلایا کہ انھم الیہ راجعون کا مراقبہ کیا جائے یعنی موت کا اور موت کے واقعات رات دن مشاہدہ سے

۱۷

گذرتے رہتے ہیں پس اول موت کا مراقبہ کیا جائے اور اسکو راسخ کر لیا جائے یہ ایسا
مراقبہ ہے جو دنیا سے دل سرد کر دیگا اور تمام خیالات کو ختم کر دیگا پھر لقاء اللہ کا مراقبہ
کیا جائے کہ مرنے کے بعد ہم خدا کے سامنے کھڑے ہونگے وہاں حساب کتاب اعمال
کا ہوگا جو شخص اس مراقبہ کا عادی ہو جائیگا اسکو سکون قلب حاصل ہو جائیگا کیونکہ جس
دل میں خدا کی یاد جم جاتی ہے پھر سب خیالات اسکے اندر سے نکل جاتے ہیں ؎

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت　　　مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

راقم جامع عرض کرتا ہے کہ اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ تکمیل نماز کیلئے مراقبہ موت و مراقبہ
لقاء اللہ کا عادی ہونا چاہیئے اور میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ آیت میں یہ مراد ہے کہ عین نماز
کے اندر ہی اس مراقبہ میں قلب کو مشغول کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ نمازی
نماز کی ہیئت میں غور کرے کہ میں جو تمام دنیا سے رخ پھیر کر ہاتھ باندھکر اس طرح کھڑا ہوں
کہ نہ کسی سے بات کر سکتا ہوں نہ کسی کی طرف دیکھ سکتا ہوں نہ کھا پی سکتا ہوں اسکی
وجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں اور ان سے عرض معروض کر رہا ہوں
پھر قیام کی حالت میں یہ سوچے کہ خدا تعالیٰ کے مجھ پر کسقدر احسانات و انعامات ہیں جنکا
شکریہ میرے ذمہ واجب ہے اور سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے یہ سوچے کہ میں اللہ تعالیٰ کے
انعامات کا شکریہ ادا کر رہا اور اسکی ربوبیت کا اقرار اور اپنی عبدیت کا اعتراف کر رہا ہوں
اور اسی عبدیت پر قائم رہنے اور اہل عبدیت کے طریقہ پر چلنے کی دعا کر رہا ہوں اور جو
لوگ طریق عبدیت سے بہک گئے اور لعنت و غضب کے مستحق ہو گئے ہیں ان کے
طریقہ سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہوں اور جو قانون الٰہی تکمیل طریق عبدیت کیلئے نازل ہوا
ہے اس پر ہمیشہ چلنے کا عہد کر رہا ہوں فاتحہ کے بعد سورت پڑھنے کا یہی مطلب ہے پھر جب
رکوع میں جائے تو یہ سوچے کہ میری پیدائش اسی مٹی اور زمین سے ہے جو میرے پاؤں
تلے ہے زمین کی خاک سے جیتا جاگتا سمیع و بصیر انسان پیدا ہو جانا محض خالق جل و علا
کی قدرت ہے اور جسکی پیدائش زمین کی خاک اور اسکی نباتات وغیرہ سے ہو اسکو عبدیت اور بندگی
کے سوا کچھ زیبا نہیں بڑائی اور بزرگی صرف خالق جل و علا کو زیبا ہے جو تمام عیوب سے

بڑی ہے اسی لئے نماز میں بار بار اللہ اکبر کہا جاتا ہے کہ اے خدا ہم نے آپ کی عظمت
کے سامنے اپنے خیالی عزت کو قربان کر دیا پھر سجدہ میں جاتے ہوئے یہ سوچے کہ مجھے ایکدن
زمین کے اندر پیوند ہونا ہے اور اسوقت خدا کے سوا میرا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہوگا دنیا
سے میرا نام بھی مٹ جائیگا اور نشان بھی اسکے بعد دوسرے سجدہ میں یہ تصور کرے کہ
گویا میں مرچکا اور خدا سے مل گیا ہوں اب خدا کے سوا کوئی میری ساتھ نہیں پھر جلسہ تشہد
میں یہ سوچے کہ مرنے کے بعد پھر ایک زندگی ہوگی جہاں اسلام اور اعمال و اقوال و
احوال صالحہ ہی کام آئیں گے جو اللہ کے واسطے کئے گئے ہوں اور سیدنا رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیا و حضرات ملائکہ اور تمام نیک بندوں کی عزت ظاہر ہوگی کہ وہ
گنہگاروں کی شفاعت کریں گے لہذا اُن پر سلام بھیجکر اُن سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے پھر چونکہ
امت محمدیہ کو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ہے اسلئے
اخیر رکعت میں آپ پر خصوصیت کے ساتھ درود شریف پڑھنا چاہیئے جب یہ تصور
19 جم جائے تو اسکے بعد جلسہ میں یوں تصور کرے کہ گویا مرنے کے بعد یہ میدان قیامت میں
حاضر ہوا ہے اور تمام اعمال و افعال و اقوال جو دنیا میں کئے میرا اسکے سامنے ہیں جنمیں سے
وہی کام آ رہے ہیں جو اللہ کے واسطے کئے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیا
و صلحاء و ملائکہ کی جماعت کے سامنے ہے جو دربار الٰہی میں حاضر ہیں اور میں ان سب پر درود شریف
و سلام بھیج رہا ہوں اور آخیر میں اپنے لئے کامیابی و نجات و فلاح کی دعا کر رہا ہوں اور
اسی واسطے آیت میں لفظ یظنون اختیار کیا گیا ہے حالانکہ لقاء اللہ کا تو اعتقاد جازم فرض
ہے محض ظن کافی نہیں مگر چونکہ مقصود یہ ہے کہ نماز میں لقاء اللہ و رجوع الی اللہ کا استحضار کیا
جائے اور یہ استحضار درجہ وقوع میں لازم نہیں بلکہ اسکا ظن اور تصور ہی نماز میں کافی ہے کہ گویا
میں اسی وقت خدا کے سامنے حاضر ہوں اور مر گیا ہوں یا مرنے والا ہوں اور گویا میں قیامت
عالم آخرت میں حاضر ہوں اس واسطے لفظ ظن اختیار کیا گیا اس طرح نماز پڑھنے سے خشوع

ف اس تکلف کی حاجت نہیں لفظ ظن لغۃً عام ہے ہر خیال یقینی اور ظنی اور وہمی اور واقعی اور غیر واقعی کو
کما لا یخفی علی من تتبع موادہ فی القرآن ۱۲ -

حاصل ہو جائے گا اور تمام خیالات و وساوس قلب سے نکل جائیں گے واللہ تعالیٰ اعلم
۱۲ جامع۔ صاحبو! قرآن عجیب کیمیا ہے جس میں سارا کام مفت ہی ہے مگر ذرا سی نگہداشت
ہمارے ذمہ ہے اور جتنے طریقے سلوک کے ہیں جو دوسرے مذاہب میں معمول بہا ہیں اُنکی
مثال اُس کیمیا کے مشابہ ہے جس میں اکیس روپے خرچ کئے جائیں اور مال بیس کا بھی حاصل
نہو اور شریعت مقدسہ کی کیمیا ایسی ہے جسمیں نفع ہی نفع ہے نقصان کچھ نہیں شریعت
مقدسہ نے بڑے سے بڑے کام کو بھی ایسا آسان کر دیا ہے کہ پھول سے زیادہ ہلکا ہو گیا
ہے مگر توفیق نہو تو وہ بھی سخت مشکل ہے غور تو کیجئے کہ اسلام میں کیا دشواری ہے رحمت
ہی رحمت اور سہولت ہی سہولت ہے مگر توفیق رفیق نہو تو بہت مشکل ہے ایک تو یہ جزو ہے
اجزاء ثلثہ مذکورہ فی الحدیث میں سے جس کا بیان کرنا مقصود نہ تھا مگر چونکہ جزو مقصود
الحج یہدم ما کان قبلہ کیلئے معین تھا جیسا عنقریب اسکا بیان ہوتا ہے اسلئے اسکا مفصل
بیان کر دیا گیا۔ دوسرا جزو یہ ہے الہجرۃ تہدم ما کان قبلہا کہ ہجرت بھی پہلے گناہ
گرا دیتی ہے ہجرت کے معنی ہجرت دار خوف سے دار امن کی طرف کیونکہ دار الکفر دو قسم
کے ہیں ایک دار الخوف جسمیں شعائر اسلام ظاہر کرنے پر مسلمانوں کو قدرت نہو بلکہ اس
اظہار میں جان و مال کا خطرہ ہو دوسرا دار الامن جہاں سلطنت تو کافر کی ہے مگر مسلمانو
کو مذہبی آزادی حاصل ہے کہ وہ شعائر اسلام کو بےخوف و خطر ظاہر کر سکتے ہیں اور ہجرت
اُس دار الکفر سے فرض ہے جو دار الخوف بھی ہو اور جو دار الکفر دار الامن ہو وہاں سے ہجرت
فرض نہیں تو جاہلوں کا یہ شبہ دور ہو گیا کہ اگر ہندوستان دار الکفر ہے تو یہاں سے
ہجرت کیوں نہیں کیجاتی اس شبہ کا جواب ہمارے اُستاد محقق و مدقق مولانا محمد یعقوب
صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب دیا تھا کہ مکہ معظمہ سے جبکہ وہ دار الحرب تھا پہلی ہجرت
صحابہ نے حبشہ کی طرف کی ہے جہاں اُس وقت تک اسلام موجود نہ تھا پس حبشہ بھی اس
وقت دار الحرب تھا اور وہاں جانیوالوں کو مہاجر کہا گیا اور صحابہ وہاں ہجرت کر کے اسی
واسطے گئے کہ وہ دار الامن تھا اور اُنکی یہ ہجرت معتبر ہوئی اور اُنکو ہجرت کا ثواب بھی ملا
پھر ان صحابہ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو ان کا لقب ذو الہجرتین ہوا پس معلوم ہوا کہ دار الامن

گو دارالایمان نہو بلکہ دارالکفر ہی ہو وہاں سے ہجرت کرنا فرض نہیں بلکہ وہ تو خود ہجرت
گاہ بن سکتا ہے ہاں اسمیں شک نہیں کہ دارالایمان کی طرف ہجرت کرنا افضل ہی مگر ادائ
فرض کیلئے دارالامن کی طرف ہجرت ہی کافی ہے جو شخص دارخوف سے دارالامن کی
طرف ہی ہجرت نکرے وہ تارک فرض ہے اور اسی کیلئے سخت وعید ہے اِنَّ الَّذِيْنَ
تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ
قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ
مَصِيْرًا اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً
وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ؕ
(ترجمہ) جن لوگوں کی جانیں فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں
پر (ترک ہجرت سے) ظلم کرنیوالے تھے اُن سے ملائکہ نے کہا کہ تم کس کام میں تھے انہوں
نے جوابدیا کہ ہم اس سرزمین میں محض مغلوب اور کمزور تھے فرشتوں نے کہا کیا خدا کی
زمین فراخ نہتی کہ تم اُس کے کسی حصہ میں ہجرت کر جاتے (اس کا اُن کے پاس کچھ ۲۱
جواب نتھا) ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُری جائے بازگشت ہی ہاں مگر وہ مرد
اور وہ عورتیں اور بچے جو واقعی مغلوب وکمزور تھے جو نہ کوئی تدبیر (ہجرت کی) کر سکتے تھے
اور نہ انکو کوئی راہ ملتی تھی انکو امید ہے کہ خدا تعالیٰ معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ تو معاف
کرنیوالے مغفرت کرنیوالے ہی ہیں (وہ عذاب کیلئے بہانہ نہیں ڈہونڈہتے بلکہ اُسی کو
عذاب کرتے ہیں جو بلا وجہ گناہ کا مرتکب ہو ۱۲) جو لوگ محض ترجمہ دیکھکر محقق بننے کا دعوی
کرتے ہیں اُنکو عسی اللہ ان یعفو عنھم میں امید کے لفظ سے یہ شبہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے
اس مضمون کو شک کیساتھ کیوں بیان فرمایا انکو تو اپنے فعل کا یقین ہی پھر یقینی بات
کو یقین کے لفظ سے بیان کرنا چاہئے تھا اس کا جواب یہ ہی کہ تم نے محض ترجمہ دیکھا ہی
قرآن کو سمجھا نہیں ہے اسواسطے یہ شبہ ہوا تم کو چاہئے کہ پہلے یہ بھی دیکھ لو کہ یہاں متکلم
کون ہے اور مخاطب کون ہیں سو ظاہر ہے کہ متکلم حق تعالیٰ شانہ احکم الحاکمین ہیں
پس خدا تعالیٰ کے کلام کو شاہانہ محاورات پر منطبق کر کے دیکھو یہ عامیانہ محاورات پر منطبق

نہ کہو اور شاہانہ محاورات میں وعدہ جازمہ کیلئے بھی امید ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے
اسی سے ڈپٹی صاحب دہلوی کے ترجمہ کی غلطی معلوم ہوگئی جنہوں نے دہلی کے بازاری
زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے چنانچہ ایک جگہ ٹانگ ٹوئیاں مارنا استعمال کیا ہے
ایک جگہ کبڈی کھیلنا لکھا ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ الفاظ شاہی زبان میں استعمال
نہیں ہوتے مترجم قرآن کو لازم ہے کہ ترجمہ میں شاہانہ طرز و انداز کو ہاتھ سے نہ دے
جو قرآن کا خاص طرز ہے عربی داں طبقہ خوب جانتا ہے کہ قرآن کی زبان کیسی پرشوکت
اور کس قدر باسطوت ہے دوسرے یہ دیکھو کہ مخاطب کلام کے کون ہیں سو ظاہر
ہے کہ مخاطب بندے ہیں اور بندہ کا فرض یہ ہے کہ اخیر دم تک امید و بیم ہی میں رہے
کسی وقت جلال شاہی سے بےخوف نہو اسی لئے حکام مقدمات میں اخیر تک فریقین
کو امید و بیم ہی میں رکھتے ہیں فیصلہ کے دن ظاہر ہوتا ہے کہ کون کامیاب ہے
اور کون ناکام ایسے ہی یہاں بھی فیصلہ کے دن سے پہلے یعنی قیامت سے پہلے
بندوں کو امید و بیم ہی میں رکھا گیا ہے اتنا فرق ہے کہ حکام تو اپنی غرض کیواسطے ٢٢
ایسا کرتے ہیں اور حق تعالٰی نے بندوں کے فائدہ کیلئے ایسا کیا ہے کیونکہ بندہ
کو اگر کسی وقت اطمینان ہوجائے کہ میں جنتی ہوں تو وہ جرائم سے نڈر ہوجائے گا
اور اگر یہ معلوم ہوجائے کہ میں جہنمی ہوں تو وہ ناامید ہوکر بھلائی سے بالکل دور جا پڑیگا
اور اسمیں علاوہ اسکے نقصان کے نظام عالم کے درہم برہم ہوجانیکا بھی اندیشہ ہے کیونکہ
کثرت جرائم سے نظام کا درہم برہم ہونا ظاہر ہے غرض ہجرت کی یہ فضیلت ہے کہ اس
سے گذشتہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور یہ ہجرت متمم اسلام ہے کیونکہ بغیر اسکے اسلامی
کام نہیں ہوسکتے اور ظاہر ہے کہ اعمال اسلامیہ ہی سے اسلام کامل ہوتا ہے اور ہجرت
گو ظاہر میں دشوار ہے کیونکہ وطن اور خاندان کا چھوڑنا آسان نہیں مگر واقع میں سہل ہے
کیونکہ یہ تو معلوم ہوچکا کہ ہجرت اسی وقت فرض ہے جب مسلمان اپنے مذہب اور شعائر
مذہب کو بجا نہ لاسکے اور جو شخص مذہب پر عمل کرنے سے روکے وہ باپ بھی ہو تو باپ ہے
کیونکہ انسان کو مذہب سب سے زیادہ عزیز اور پیارا ہوتا ہے اسی لئے اہل مذہب ہمیشہ

اپنے مذہب کی حفاظت و حمایت کیلئے جانوں کی قربانیاں کرتے رہے ہیں تیسرا جزو
الحج یہدم ما کان قبلہ ہے اور اسی کا بیان مقصود ہے اب میں حسب وعدہ یہ بتلانا چاہتا
ہوں کہ جزئین اولین جزو ثالث کیلئے کس طرح معین ہیں تو بات یہ ہے کہ اس لفظ
سے کہ حج پہلے گناہوں کو گرا دیتا اور مٹا دیتا ہے حج کی فضیلت معلوم ہوئی فرضیت
معلوم نہیں ہوئی اور مقصود فرضیت کا بیان اصالۃً ہے اور فضیلت کا تبعاً اس لئے
جزئین اولین کو میں نے بیان کر دیا کیونکہ وہ دونوں اثبات فرضیت میں اس طرح
معین ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کو دو چیزوں کے ساتھ مقرون فرمایا
ہے اور وہ دونوں فرض ہیں اس سے بعض اصولیین کی رائے پر تو یہ معلوم ہوا کہ حج
بھی فرض ہے کیونکہ بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم امور متناسبہ ہی کو جمع فرماتے ہیں البتہ
اگر کوئی مستقل دلیل عدم اشتراک کی ہو تو اسوقت یہ ظاہر حجت نہ ہوگا اور جن
اصولیین نے اس اقتران فی الذکر کو حجت نہیں سمجھا وہ بھی اس اہمیت ہونے سے
انکار نہیں کر سکتے تو اگر دوان علی الافتراض نہ ہو تاہم اسمیں معین ضرور ہے اور افتراض ۲۴
دلیل مستقل سے ثابت ہے دوسرے یہ کہ یہاں جو فضیلت حج کی مذکور ہے وہ بہت
ہی بڑی فضیلت ہے جو ظاہراً فرض کے لائق ہے یعنی پہلے گناہوں کو مٹا دینا گرا دینا
چنانچہ حج سے پہلے جن امور کیلئے یہ فضیلت بیان کیگئی ہے وہ دونوں بھی فرض ہیں پس
حج کا بھی فرض ہونا اقرب ہے اور یہ دلیل مستقل نہیں ہے بلکہ دوسرے ادلۂ فرضیت
کیلئے مؤید ہے اور فرضیت دوسرے دلائل سے ثابت ہے غرض یہ بات معلوم
ہے کہ حج فرض ہے اس اقتران سے ظاہراً اور دوسرے دلائل سے نصاً میں اسپر
آپ کو اسوقت متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی کے ذمہ حج فرض ہو تو وہ سستی نہ کرے
کیونکہ اور عبادات اگر وقت پر ادا نہوں تو فوراً ہی انکی قضا ہو سکتی ہے بخلاف حج
کے کہ یہ اگر وقت پر ادا نہوا تو پھر سال بھر کے بعد اسکا وقت آئیگا اور سال بھر بڑی
مدت ہے کیا خبر سال بھر تک زندگی ہو یا نہیں پس وقت کو غنیمت سمجھو اس لئے حدیث میں ہے
اغتنم خمسا قبل خمس فراغک قبل شغلک وحیاتک [illegible] موتک [illegible]

فراغت کیوقت کو مشغولی سے پہلے غنیمت سمجھو زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھو ؎

خوشا وقتے و خرم روزگارے ۔۔۔ کہ یارے برخورد از وصل یارے

صاحبو! فراغت کیوقت کو غنیمت سمجھو اس طرح ٹالنے سے کبھی کام نہ ہوگا یہ خیالات چھوڑ دو کہ یہ کام ہوجائے تو رجوع کریں گے تمکو کیا خبر ہے کہ آئندہ سال دوسرا کام نہ نکل آویگا دنیا کے دھندے کبھی ختم نہیں ہوسکتے متنبی کہتا ہے ؎ لا تنتہی الارب الا الی ارب۔

ایک عارف فرماتے ہیں ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم ۔۔۔ باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

یہانتک کہ اسی طرح ایکدن موت کا وقت قریب آجائیگا اور اسوقت کہنے لگیگا رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصلحین ہ کہ اے پروردگار مجھ تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دیدی؟ کہ میں صدقہ خیرات کرلیتا اور نیک بندوں میں داخل ہوجاتا حق تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں ولن یؤخر اللہ نفسا اذا جاء اجلہا واللہ خبیر بما تعملون ہ کہ جب وقت آجاتا ہے پھر حق تعالیٰ کسی کو مہلت نہیں دیتے اور اللہ تعالیٰ تمہاری ۲۴
کرتوتوں سے پوری طرح خبردار ہیں کہ اگر تم کو مہلت دی جاتی تو تم اس مہلت کو بھی یوں ہی برباد کرتے جیسے ساری عمر کو برباد کیا تھا۔ صاحبو! دنیا کے جھگڑے تو یوں ہی چلتے رہیں گے ان سے فراغت تو مرنیکے ساتھ ہی ہوگی ع کار دنیا کسے تمام نکرد ہر کہ آمد عمارت نو ساخت اگر کام کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان جھگڑوں کو بیچ ہی میں چھوڑو اور کام میں لگ جاؤ حضرات اہل اللہ ایسا ہی کرتے ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں جب جاذبہ حق پیدا ہوا تو سلطنت کو بیچ ہی میں چھوڑ کر الگ ہوگئے نہ کسی کو اپنا قائم مقام کیا نہ کچھ انتظام کیا کہ وزراء وغیرہ خود انتظام کرلیں گے اسی کے مناسب ایک بڑی بی کا قصہ سنا ہے کہ مدت سے پہلے جب کراچی کا سفر حاجیوں کو بہلی میں کرنا پڑتا تھا کیونکہ ریل اس وقت تک جاری نہ ہوئی تھی تو پچاس سو بہلیاں ساتھ مل کر چلتی تھیں تاکہ ڈاکوؤں سے امن رہے تو ایک دفعہ اسی طرح حاجیوں کی بہلیاں جا رہی تھیں کہ ایک بڑی بی نے جو جنگل میں بکریاں چرا رہی تھی بہلیوں کو دیکھکر پوچھا کہ میاں یہ کسکی

یا برات ہے لوگوں نے کہا بارات نہیں ہے بلکہ حاجی لوگ اللہ کے گھر جا رہے ہیں یہ سُن کر بڑھیا
کے دل میں جاذبہ حق پیدا ہوا اور اُس نے کہا پھر ہم بھی اللہ کے گھر کی زیارت کو جائیں
گے یہ کہکر بہلیوں کے ساتھ ہوگئی اور بکریوں کو وہاں ہی میدان میں چھوڑا اُنکو
گھر تک بھی نہ پہونچایا واقعی سچ ہے ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند   از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

اور ؎

آنکس کہ ترا شناخت جانرا چہ کند   فرزند و عیال و خانمانرا چہ کند

پھر بڑھیا کی ہمت تو دیکھئے کہ لاٹھی کے سہارے پیدل قافلہ کے ساتھ ہوگئی واقعی اپنے
وقت کی رابعہ تھی اور رابعہ نہ تھی تو خامسہ تو ضرور تھی بات یہ ہے کہ اہل اللہ کی ہمت بہت
بلند ہوتی ہے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حالت تھی کہ اسّی برس کی عمر ہوگئی
تھی اور یوں تو ابتدا ہی سے حضرت نحیف الجثہ تھے مگر بڑھاپے میں اور بھی ضعف زیادہ ہوگیا
تھا لیکن نماز کو جب کھڑے ہوتے تھے تو ذرا ضعف نہ معلوم ہوتا تھا بڑی لمبی لمبی رکعتیں ۲۵
پڑھتے تھے گویا بزبان حال یوں فرماتے تھے ؎

ہر چند پیر خستہ دل بس ناتواں شدم   ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

یہی حالت اس بڑھیا کی تھی کہ باوجود بڑھاپے کی ہمت ایسی تھی کہ جوانوں کو بھی مات
کر دیا اور عشاق کی ہمت بلند ہونیکا راز یہ ہے کہ ان کو اپنی سی کوشش کر لینا مقصود
ہوتا ہے کامیابی ہو یا نہ ہو اُن کا مذاق یہ ہے ؎

دست از طلب نہ دارم تا کام من برآید   یا تن رسد بجاناں یا جان زتن برآید

اسلئے وہ ہر مشکل سے مشکل کام کیلئے تیار ہو جاتے ہیں اور وہ اُنکی نظر میں مشکل نہیں ہوتا کیونکہ
وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمارا کام تو طلب ہے اور اپنی ہمت کیموافق عمل شروع کر دینا آگے
پورا ہونا نہ ہونا یہ ہمارے قبضہ میں نہیں یہ دوسرے کے قبضہ میں ہے اس سے ہمکو کیا سروکار ؎

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے   پر تجکو چاہیئے کہ تک و دو لگی رہے

جب بڑھیا قافلہ کے ساتھ ہوگئی تو لوگوں نے اُسکو بہت سمجھایا کہ بیت اللہ بہت دور ہے

ایک دو منزل نہیں کہ تم پیدل وہاں پہونچ جاؤ مگر اُس کا یہ حال تھا کہ جوں جوں نصیحت
کرتے اُس کا شوق دونا ہوتا تھا ٥

ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے   میں اُسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

لوگوں نے کہا کہ ہمارے بھروسہ پر نہ چلنا ہم بہلی میں سوار نکریں گے ہمارے پاس گنجائش
نہیں اُس نے ڈانٹ کر جواب دیا کہ میں تمہاری بہلیوں کے بھروسہ پر نہیں چلتی ہوں اپنے
خدا کے بھروسہ پر چلتی ہوں چنانچہ ایک بڑی مسافت پیادہ طے کی سبکو حیرت ہو گئی پھر
لوگوں نے ترس کھا کر بڑھیا سے کہا کہ اچھا بہلی میں سوار ہو جاؤ اُس نے کہا ہرگز نہیں میں
سوار نہو نگی اور میں تو تمہارے ساتھ بھی نہ ہوتی الگ ہی جاتی مگر عورت ذات ہوں
میرا الگ تنہا سفر کرنا مناسب نہیں دوسرے مجھے رستہ بھی معلوم نہیں بس تمہاری
رفاقت صرف اسلئے گوارا کی ہے اور کچھ مقصود نہیں مگر لوگوں نے خوشامد شروع کی
منتیں کیں تب سوار ہو گئیں جب کراچی پہونچے تو جہاز کے مالک نے کہا کہ میں الگ
الگ ہر شخص سے کرایہ نہیں کرتا بلکہ پورے جہاز کا کرایہ کرتا ہوں کیونکہ حجاج کم ہیں اگر ۲۷
پورے جہاز کا کیرایہ ادا کرو تو میں چل سکتا ہوں ورنہ نہیں اب تمہیں اختیار ہے جسکو
چاہو خود سوار کرو مجھے ہر شخص سے الگ الگ کچھ واسطہ نہیں لوگ سمجھ گئے کہ یہ بڑی بی
کی پہلی کرامت ہے پھر خیال ہوا کہ جہاز میں تو اُسکے لئے یہ سامان ہو گیا آگے جدہ سے کیا
انتظام ہوگا جب جہاز میں سوار ہوے تو بچوں میں بیماری پھیل گئی اور بڑی بی نے
پھر دم کرنا شروع کیا جس پر دم کر دیا فوراً اچھا ہو گیا اب تو اُسکی طرف بہت رجوعات
ہوئیں اور خوب نذرانے ملے کہ بہت روپے اسکے پاس جمع ہو گئے اور آرام سے جدہ
پھر مکہ معظمہ پہونچیں حج سے فراغت ہوئی تو حجاج نے مدینہ کا قصد کیا بڑی بی بھی قافلہ
کی ہمراہ پیدل چل پڑی ایک منزل تو پیادہ طے کی اگلے دن کوچ سے پہلے ایک رئیس عورت
کی بہن کا انتقال ہو گیا جسکی جگہ اونٹ پر سوار ہوسکنے کیلئے ایک عورت کی اُسکو تلاش ہوئی کیونکہ
اونٹ یا شقدف میں دو آدمی سے کم سوار نہیں ہو سکتے میزان برابر کرنے کیلئے دو آدمی ضروری
بیگم صاحب کے نوکر عورت کی تلاش میں تھے کہ بڑی بی کے سوا کوئی عورت نہ ملی وہ

وہ ان کے پاس آئے کہ بیگم صاحبہ آپ کو یاد کرتی ہیں۔ بڑی بی نے بے رخی سے جواب دیا
کہ جاؤ میں نہیں آتی کون بیگم میں نہیں جانتی مگر زیادہ اصرار سے ان کے پاس آئیں بیگم
نے کہا کہ میں آپ کو بمنزلہ ماں کے سمجھوں گی آپ میری سرپرستی قبول فرمائیں اور میرے
ساتھ اونٹ پر سوار ہو جائیں میں ہر طرح آپ کے تمام مصارف کا تحمل کرونگی اور
علاوہ مصارف کے اپنی اس مرنیوالی بہن کا تمام ترکہ بھی آپ کو دونگی کیونکہ اُسکی وارث
صرف میں ہی ہوں اور کوئی نہیں غرض بڑی خوشامدوں کے بعد بڑی بی راضی ہوگئیں
اور راحت و آرام کے ساتھ شغدف میں سوار ہو کر مدینہ پہونچیں پھر اسی بیگم کیساتھ جدہ پہنچ
آئیں اور اُسی کے خرچ سے جہاز میں سوار ہو کر کراچی پہونچیں اور اُسکی بہن کا ترکہ لیکر
جسمیں نقد و زیور و کپڑا بہت کچھ تھا اپنے وطن واپس آگئیں حافظ محمد یوسف صاحب
جو اس قصہ کے ناقل ہیں فرماتے تھے کہ ہمارا جہاز بعد میں کراچی پہونچا بڑی بی ہم سے بھی
پہلے پہونچ گئیں جب کراچی پر اتر کر ہم بیلیوں کے راستہ سے چلے تو بڑی بی کے گاؤں
میں پہونچکر ہم نے دریافت کیا کہ یہاں کی ایک بڑھیا حج کو اس طرح ہماری ہمراہ ۲۷
ہوگئی تھی وہ آگئی یا نہیں تو اس کے بیٹے ملے اور کہا وہ تو بالکل خیریت سے ہیں اور بہت
دن پہلے اپنے گھر پہونچ گئی ہیں اور بہت سامان ساتھ لائی ہیں انہوں نے پوچھا کہ پھر
انکے پیچھے کیا حال ہوا کہا ہم نے شام تک اُن کا انتظار کیا جب دیر ہوگئی تو جنگل میں جا کر
دیکھا سب بکریاں صحیح سالم ہیں مگر بڑی بی نہیں ہیں ان کو ہر طرف بہت تلاش کیا
جب نا امیدی ہوگئی تو بکریاں لیکر گھر کو آگئے اور یہ سمجھ لیا کہ اُن کو بھیڑیا یا شیر کھا
گیا ہے مدت کے بعد صحیح سالم آگئیں اور بکریوں میں خوب توالد تناسل ہوا
تو دیکھئے یہ ایک عورت تھی جس نے کسی بات کی فکر نہ کی جب حج کا ارادہ کر لیا سب
کام بیچ ہی میں چھوڑ دیا۔ تو جو مرد عورت سے بھی کم ہو وہ کیا مرد ہے پس سب
مشاغل بیچ میں چھوڑ دو اور کام کا ارادہ کر لو ورنہ کیا اطمینان ہے کہ آئندہ سال
تمکو موقعہ ملے یا نہ ملے حدیث میں ہے من اراد الحج فلیعجل جو حج کا قصد کرے اُسکو
جلدی کرنا چاہئے اور ہمارے ائمہ تصریح کرتے ہیں کہ حج میں تاخیر کرنے سے ایک دو سال

تک تو گناہ صغیرہ کا گناہ ہوتا ہے اور اس کے بعد اصرار میں داخل ہو کر گناہ کبیرہ ہو جاتا ہے مگر جب حج کر لیگا تو یہ تاخیر کا گناہ بھی معاف ہو جائیگا کیونکہ اُسکو گناہ اسی لئے تھا کہ فوت کا خطرہ تھا اور یہ خطرہ ہی حج کو ٹال رہا تھا اور جب خطرۂ فوت مرتفع ہوگیا اب گناہ بھی مرتفع ہوگیا یہ سب درمختار و ردالمحتار میں مذکور ہے یہ ہے حضرات ائمہ کا اجتہاد جسمیں کیسے دقائق کی رعایت ہے جو لوگ آجکل اپنے آپ کو مجتہد سمجھتے ہیں وہ ایسے اجتہاد کی نظیر لائیں اور جب وہ ایسا اجتہاد اپنے اندر نہیں پاتے تو اُن کے عمل بالحدیث کا حاصل یہ ہوا کہ وہ کامل مجتہد کی تقلید چھوڑ کر ناقص مجتہد کی تقلید کرتے ہیں یعنی اپنے فہم کا اتباع کرتے ہیں جسکو ائمہ کی فہم سے کچھ بھی نسبت نہیں کانپور میں ایک طالب علم نے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی تو میں نے اُس سے سوال کیا کہ تم نے امام کے پیچھے قرارت کیوں کی کہا مولوی عبدالحی صاحب نے لکھا ہے میں نے کہا سبحان اللہ کیا مولوی عبدالحی صاحب امام ابوحنیفہ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں کہ امام کی تقلید چھوڑ کر اُنکی تقلید کرنے لگے یہی حال ان مدعیان عمل بالحدیث کا ہے کہ ائمہ اربعہ کو چھوڑ کر علامہ شوکانی ۲۸
وغیرہ کی تقلید کرتے ہیں ایک سفر میں ایک غیر مقلد میری ساتھ ہوئے مگر تھے منصف اُن کو شک تھا کہ ائمہ کی تقلید واجب کیوں ہے جب کہ ہم بھی عربی پڑھکر قرآن و حدیث کو سمجھ سکتے ہیں میں نے کہا کہ آپ کو اجتہاد فی القرآن والحدیث جائز نہیں کیونکہ آپ کو اجتہاد کا درجہ حاصل نہیں اور میں اجتہاد کی حقیقت آپ کے سامنے ایک مثال میں بیان کرتا ہوں تبلائیے اگر دو شخص سفر میں ہوں جو علم میں فقہ میں عمر میں نسب و تقویٰ میں برابر ہوں اور انمیں سے ایک کو غسل کی حاجت ہوگئی اور دوسرے کا وضو ٹوٹ گیا اور جنگل میں پانی نہیں ہے دونوں نے تیمم کیا ایک نے غسل کا تیمم کیا دوسرے نے وضو کا تو انمیں امامت کیلئے افضل کون ہے کہا تیمم وضو والا افضل ہے کیونکہ اُس کا حدث اصغر ہے تو اُسکی نجاست حکمیہ اخف ہے اور دوسرے کی اشد اور طہارت دونوں کو یکساں حاصل ہوئی اسلئے تیمم وضو والا اطہر ہے میں نے کہا کہ فقہاء نے تیمم غسل والیکو امامت کیلئے افضل فرمایا ہے کیونکہ غسل وضو سے افضل ہے تو

اور افضل کا خلیفہ غیر افضل کے خلیفہ سے افضل ہے اب ان دونوں اجتہادوں میں موازنہ کرلو اس جواب کو سنکر وہ مان گئے کہ واقعی ہم لوگ اجتہاد نہیں کرسکتے یہ فقہاء ہی کا کام تھا انہی کی تقلید واجب ہے صاحب اجتہاد کیواسطے اسکی ضرورت نہیں کہ وہ دوسروں سے زیادہ احادیث کا حافظ ہو بلکہ اجتہاد کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص حسین ہو مگر ظاہر میں اس کا حسن دوسروں کے حسن سے زیادہ نہ ہو لیکن اس میں ایک آن ہے جو دوسروں میں نہیں ہے اسلئے وہ سب حسینوں سے بڑھا ہوا ہے اور اسکے سامنے سب حسین گرد ہوگئے ہیں اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

حضرات فقہاء واقعی امت کیلئے رحمت ہیں انہوں نے جیسا دین کو سمجھا ہے کسی فرقہ نے نہیں سمجھا اسی طرح حضرات صوفیہ کرام اپنے فن کے امام ہیں احکام متعلقہ قلب کو صوفیہ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھا بہرحال جو شخص حج میں تاخیر کرتا ہے وہ گناہ صغیرہ
کا ابتداءً اور کبیرہ کا اصرار کے بعد مرتکب ہوتا ہے اور اگر اسی حالت میں مرگیا تو اس کے ۲۹،
واسطے حدیث میں بڑی سخت وعید ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہوگیا ہو پھر وہ حج نہ کرے اور اسی حال میں مرجائے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ نصرانی مرے یا یہودی بنکر مرے جو لوگ حج کرچکے ہیں وہ تو بےفکر رہیں ہاں جن پر حج فرض ہوا اور ابھی تک نہ کیا وہ جلدی کریں اور زندگی پر اطمینان نہ کریں کیونکہ بعض لوگ پار سال رمضان میں زندہ تھے اور اس سال نہ تھے میرے گھر میں کی ایک لڑکی شاگرد ہے وہ رمضان کے ختم پر کہنے لگی کہ دیکھئے اگلا رمضان کس کو نصیب ہو کسکو نہ ہو میرے گھر میں سے کہنے لگیں کہ تو تو ابھی بچی ہے ان شاء اللہ اگلا رمضان پالے گی ہاں ہم جیسوں کو البتہ خطرہ ہے اس نے جواب دیا کہ میں تو یہ دیکھتی ہوں کہ اس سال میری ہمسن ساتھنوں میں سے کئی مر چکی ہیں جو پار سال رمضان میں زندہ تھیں اور اس سال نہ تھیں اور آپ کی ہمسن ساتھنیں سب زندہ سلامت ہیں ایک بھی کم نہیں ہوئی اس لئے آجکل جوانوں کو زیادہ خطرہ ہے طاعون ہیضہ اور بخار دق میں جوان ہی زیادہ مرتے ہیں اب میں

اس حدیث کے متعلق چند باتیں بیان کر کے ختم کرتا ہوں کیونکہ مقصود تو پورا ہو چکا اب صرف تتمہ باقی ہے اس حدیث کے متعلق ایک مسئلہ تو بیان کرنا ہے کہ کلام ما کان قبلہ میں لفظ ما بظاہر عام ہے مگر یہ اپنے عموم پر باقی نہیں اس سے حقوق العباد مستثنیٰ ہیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ اگر میں شہید ہو جاؤں تو میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے حضور نے فرمایا ہاں سب معاف ہو جائیں گے اسکے بعد حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا یا رسول اللہ الا الدین مگر دین یعنی حق العباد معاف نہ ہوگا حضور نے سائل کو واپس بلایا اور فرمایا الا الدین فان جبرئیل قال لی آنفا مگر دین معاف نہ ہوگا حضرت جبریل نے مجھ سے ابھی فرمایا ہے (ظلمت واخرج الحاکم فی مستدرکہ عن عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما مرفوعاً قال یغفر للشہید کل ذنب الا الدین وصححہ ہو والذہبی صج ۱۱۹) پس جب شہادت سے بھی دین معاف نہیں ہوتا حالانکہ شہادت کا درجہ بہت بڑا ہے تو حج سے بھی دین معاف نہ ہوگا اور اس حدیث سے ایک مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر مسئلہ بیان کرنے میں کچھ کوتاہی ہو جاوے تو اسکی تلافی اور تدارک بعد میں کر دینا چاہیئے اور اگر کوئی ہمکو کوتاہی پر متنبہ کرے تو فوراً اپنی کوتاہی کا اقرار کر لینا چاہیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب آپ سے کوئی سوال کرتا اور آپ کو جواب معلوم نہ ہوتا صاف فرما دیتے کہ جبریل علیہ السلام سے پوچھکر بتلاؤنگا اسی طرح حضرات صحابہ سے جب کوئی کافر سوال کرتا اور اُن کو جواب معلوم نہ ہوتا صاف فرما دیتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھکر بتلائینگے مگر آجکل یہ مرض عام ہے کہ کسی سوال کے جواب میں لا ادری نہ کہیں گے اور کبھی اپنی غلطی یا کوتاہی کا اقرار نہ کریں گے اسی واسطے آجکل مناظرہ جائز نہیں کیونکہ مناظرہ وہ جائز ہے جو اظہار حق کیواسطے ہو اور جب فریقین نے یہ ٹھان لی ہے کہ ہر مسئلہ میں بولے جاوینگے خواہ اسکی تحقیق ہو یا نہ ہو اور اپنی غلطی و عجز کا کبھی اعتراف نہ کریں گے تو اس صورت میں اظہار حق کہاں اذا فات الشرط فات المشروط۔ ہندوستان کے اکثر مدرسین میں بھی یہ بڑا مرض ہے کہ اپنی غلطی کا کبھی اعتراف نہ کریں گے اگر کسی مقام کی

غلط تقریر زبان سے نکل گئی اور طالب علم نے کہدیا کہ اس مقام کی یہ تقریر نہیں بلکہ صحیح
تقریر یہ ہے تو کبھی طالب علم کی بات کو نہ مانیں گے برابر رد کئے جائیں گے یہانتک کہ
ایسی جھک جھک میں سبق کا وقت ختم ہو جاتا ہے انکو اس حدیث سے سبق لینا چاہئے کیا
ان کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے بھی بڑھ گیا حضورؐ تو ایک جواب دیکر
حضرت جبرئیلؑ کے مطلع کرنے سے علی الاعلان اپنے جواب کا ناتمام ہونا ظاہر فرمارہے ہیں اور
تم کبھی اپنی کوتاہی کو ظاہر نہیں کرتے ہمارے اُستاد مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ
کی یہ حالت تھی کہ اگر درس میں کسی ادنیٰ طالب علم نے بھی حضرت کی تقریر پر اعتراض
کردیا اور اُسکا اعتراض معقول ہوا تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف فرمالیتے اور کئی کئی بار یہ فرما
دیتے کہ ہاں واقعی مجھ سے غلطی ہوئی تم نے صحیح سمجھا یہانتک کہ طالب علم شرمندہ ہوجاتا اور
اس سے ایسی عظمت مولانا کی طلبہ کے دلمیں پیدا ہوتی تھی کہ تاویل کرنیوالے مدرسین کو اُسکا
دسواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوسکتی البتہ مدرسین عرب کا مذاق وہی ہے جو حضرت اُستاد کا مذاق
تھا وہ کبھی اعتراف خطا سے نہیں شرماتے بہرحال الحج یھدم ما کان قبلہ سے ایک تو دیون ۳۱
(یعنی حقوق العباد وحقوق اللہ از قسم صلوٰۃ فائتہ وصوم فوت شدہ وزکوٰۃ واجبہ سابقہ ونحوہا)
مستثنیٰ ہیں دوسرے کبائر مستثنیٰ ہیں عہ حج سے کبائر معاف نہیں ہوتے صرف صغائر
معاف ہوتے ہیں کیونکہ قرآن میں ہے الحسنات یذھبن السیئات کہ نیک کام بُرے
کاموں کو مٹا دیتے ہیں اور قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیئات سے مراد

عہ قلت ولکن الجمہور علی خلافہ فقد قال الحافظ فی الفتح فی شرح حدیث ابی ہریرۃ مرفوعا من حج للہ فلم یرفث ولم یفسق
رجع کیوم ولدتہ امہ ای بغیر ذنب ظاہرہ غفران الصغائر والکبائر والتبعات وہو من اقوی الشواہد لحدیث العباس
بن مرداس السلمی المصرح بذلک اھ (ج ۳ ص ۳۰۳) قلت وحدیث العباس بن مرداس ہو ما اخرجہ ابن ماجۃ فی دعائہ
صلی اللہ علیہ وسلم لامتہ عشیۃ عرفۃ فاستجیب لہ الا فی التبعات فیما بینہم فلما اصبح بالمزدلفۃ اعاد الدعاء فاجیب الی
ما سأل وسیاق ذکرہ وقال فی غنیۃ الناسک نقلا من رد المحتار والمنحۃ ان الحج یہدم ما کان قبلہ من الصغائر و
کذا الکبائر دون الحقوق کالدین والمغصوب وقضاء الصلوٰۃ ونحوہا ثم ما یتعلق بہا من الکبائر کالمطل فی الدین والغصب
وتاخیر الصلوٰۃ تسقط واما نفس الحقوق فلا قائل بسقوطہا عند القدرۃ علیہا ابدالج فاذا مطل (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

صغائر ہیں چنانچہ ارشاد ہے ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم یہاں
سئیات کو کبائر کے مقابلہ میں لانا اُس کی دلیل ہے کہ مراد صغائر ہیں پس معلوم ہوا کہ
اعمال حسنہ سے صرف صغائر عــه معاف ہوتے ہیں کبائر معاف نہیں ہوتے جب تک کوئی
دلیل نہ ہو اور ہجرت سے بھی صغائر ہی معاف ہوتے ہیں کبائر معاف نہیں ہوتے البتہ
اسلام مــه سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں صغائر بھی کبائر بھی مگر حقوق معاف نہیں ہوتے
کیونکہ ذنوب اور ہیں حقوق اور ہیں اسلام و اعمال صالحہ سے ذنوب معاف ہو جاتے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اواخر القضاء اي قضاء الصلوات لبعده ثم الماء فانما و اما من مات قبل القدرة على ادائها فيجاز ان يقال
بسقوط نفس الحقوق ايضاً اذا كان من نيته ادائها اما حق الله تعالى فظاهر واما حق العبد وليس في تركته ما يفي به فالله
يرضي خصمه عنه وهذا محمل حديث ابن ماجه بالنسبة الى الحقوق وهو وان ضعف فله شواهد تصححه لكن المسئلة ظنية فلا يجوز القطع
بتكفير الحج لحقوق فضلا من حقوق العباد كما في التوبة واما اثم المطل وتاخير الصلاة فيما قبل الحج وكذا سائر الكبائر فيحتاج لله
تعالى فتكفير الحج كالتوبة الى ان قال فتقرر بما قررنا ان الحج كالتوبة في تكفير الكبائر سواء تعلقت بحقوق الله تعالى او بحقوق
العبد فتكفير الحج الذنب يبقي حق الله تعالى وحق العبد في ذمته ان كان دينا يترتب عليه حق احدهما والا فلا يبقى عليه شيء اه ملتقطاً ۳۲
فدل على ان الحج كالتوبة في تكفير الذنوب كلها دون الحقوق والله تعالى اعلم ۱۲ جامع قلت لا ان اشرف على لا دليل في حديث العباس
بن مرداس على تكفير الحج للتبعات لانه ليس فيه ان دعاءه صلى الله عليه وسلم كان لتكفير الحج للذنوب لان معنى الحديث ان الله تعالى
كان لم يخبره صلى الله عليه وسلم من نجاة اهل التبعات فدعا فاجاب الله تعالى في نجاتهم بعد العقوبة او قبلها ۱۲ - اشرف۔

مــه قلت لا دليل فيه على نفي تكفير الكبائر فان اذهاب السيئات لا يستلزم عدم اذهاب الكبائر الا اذا قام الدليل
على الحصر ولا دليل عليه فغايته ما فيه الآية ساكتة من اذهاب الكبائر فاذا ثبت بالحديث اذهاب بعض الحسنات
الكبائر ايضا كالقتل في سبيل الله والحج ونحوهما فلا مانع من القول به والله اعلم ۱۲ ظ قلت قد علمت عدم الدليل
على تكفير غير الصغائر ولا يثبت حكم بدون الدليل فبقي الاقتصار على الصغائر ۱۲ اشرف۔

عــه قلت ولكن جعله صلى الله عليه وسلم الثلاثة هادمة لما قبلها يدل على كونها جميعا هادمة للصغائر والكبائر من
الذنوب معاً واما الحقوق فلا ولكن لما كان الكافر غير مخاطب بالشرائع لم يتعلق بذمته من حقوق الله تعالى من الصلوٰة
والصوم شيء فلا يبقى عليه بعد الاسلام الا حقوق العباد من الدين ونحوه ۱۲ ظ قلت جعله صلى الله عليه وسلم الثلاثة
هادمة لا يدل على كون شان الهدم متماثلا في جميعها لان الاقتران في الذكر لا يدل على الاقتران في الحكم ۱۲ اشرف

ہیں (دملی التفصیل لتی میرز کرہا (۱۲) حقوق معاف نہیں ہوتے آج مجھے شامی کی ایک تقریر دیکھکر اپنی تیس سالہ تحقیق کی تائید ملی وہ یہ کہ میں کہا کرتا تھا کہ اعمال صالحہ سے یا توبہ سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں حقوق معاف نہیں ہوتے مثلاً کسی نے آج گناہوں سے توبہ کی تو اسکے گناہ تو معاف ہوگئے مگر اُس نے جتنی نمازیں قضا کی ہیں روزے کھائے ہیں یا کسی کا قرض لیکر مار لیا ہے یہ حقوق اللہ و حقوق العباد اس کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوئے ان کا ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے بس آج سے اُنکی ادا میں لگ جائے جس قدر اس سے ہو سکے ادا کرے اور سب کے ادا کا عزم رکھے اگر کچھ باقی رہ گئے اور مر گیا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اُسکو بری الذمہ کر دیں گے مگر توبہ کے بعد حقوق ماضیہ سے بےفکر ہونا جائز نہیں تو علامہ شامی کے کلام میں اس کی تصریح ملگئی کہ ذنوب اور چیز ہیں حقوق اور ہیں اور توبہ سے ذنوب معاف ہوتے ہیں نہ حقوق اھ اور حج سے یا ہجرت سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں نہ کبائر اور صغائر کا معاف ہوجانا کیا تھوڑی بات ہے آپ کو معلوم نہیں کہ صغائر کیسے ہوتے ہیں۔ صغائر کی ایسی مثال ہے جیسے آگ کے شرارے پھیلے ہوئے ہوں اور کبائر کی ایسی مثال ہے جیسے بڑا شعلہ ہو تو اندیشہ ناک دونوں ہیں کیونکہ بعض دفعہ ذرا سی چنگاری سے شہر کا شہر جل جاتا ہے کوئی شخص بھی اپنے چھپر میں چھوٹی چنگاری لگانے پر راضی نہ ہوگا اور یہ نہ کہے گا کہ یہ تو ذرا سی چنگاری ہے اس لئے صغائر کی معافی کو تھوڑا نہ سمجھو یہ بھی بڑی دولت ہے اب میں ایک سوال کا جواب دیکر بیان کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیوقت عرفہ کی شام کو امت کیلئے دعا فرمائی کہ اے اللہ میری امت کی مغفرت فرما دیجئے پھر فرمایا کہ دعا قبول ہوگئی مگر مظالم (یعنی حقوق العباد) کے بارہ میں قبول نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ظالم سے مظلوم کا حق ضرور لوں گا میں نے عرض کیا اے پروردگار آپ مظلوم کو اُس کے حق کے عوض جنت کی نعمتیں دیکر بھی خوش کر سکتے اور ظالم کی مغفرت فرما سکتے ہیں مگر یہ قبول نہ ہوا پھر یوم مزدلفہ کی صبح کو آپ نے تبسم فرمایا صحابہ نے تبسم کا سبب دریافت کیا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آج مظالم کے بارہ میں بھی میری دعا قبول فرمائی اور ۴۳

میری امت کو بخشدیا تو شیطان سر پر خاک ڈالتا ہوا ہائے واویلا کرتا ہوا بھاگا اُس کی حالت دیکھکر مجھے ہنسی آگئی یہاں سے شیطان کا کشف بھی معلوم ہوا کہ اُس کا کشف ایسا قوی ہے کہ اُسکو فوراً اُس وحی کا علم ہوگیا خیر یہ تو مسئلہ استطرادی تھا اصل مقصود سوال کا جواب دینا ہے وہ سوال یہ ہے کہ اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حج سے صغائر کبائر اور حقوق وغیرہ سب معاف ہو جاتے ہیں اور یہ تمہاری تقریر سابق کے خلاف ہے اور اُس کا جواب بعض علماء نے تو یہ دیا ہے کہ یہ حدیث ابن ماجہ کی ہے جسکی سند میں دو راوی ضعیف ہیں اسلئے یہ حدیث حجیت کے قابل نہیں مگر الحمد للہ کم ترک الاول للآخر مجھے ایسا جواب معلوم ہوا ہے جس کے بعد اس حدیث کے رد کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اس حدیث سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ حج سے حقوق العباد

مه قلت وفی الترغیب للمنذری رواہ البیہقی من حدیث ابن کنانۃ بن عباس بن مرداس السلمی عن ابیہ عن جدہ عباس ثم قال ہذا الحدیث له شواہد کثیرۃ وقد ذکرناہا فی کتاب البعث فان صح بشواہدہ ففیہ الحجۃ وان لم یصح فقد قال اللہ تعالیٰ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء وظلم بعضہم بعضا دون الشرک انتہی وروی عبد اللہ بن المبارک عن الزبیر بن عدی عن انس بن مالک و ہذا سند صحیح قال وقف النبی ۴۴
صلے اللہ علیہ وسلم بعرفات وقد کادت الشمس ان تؤوب فقال یا بلال انصت لی الناس فقام بلال فقال انصتوا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانصت الناس فقال معاشر الناس اتانی جبرئیل آنفا فاقرانی من ربی السلام وقال ان اللہ عزوجل غفر لاہل عرفات واہل المشعر وضمن عنہم التبعات فقام عمر بن الخطاب فقال یا رسول اللہ ہذا لنا خاصۃ قال ہذا لکم ولمن اتی بعدکم الی یوم القیمۃ وقد اخرج المنذری فی الترغیب عن عبادۃ بن الصامت وانس بن مالک بروایۃ الطبرانی وابی یعلی مایدل علی ان دعاءہ صلی اللہ علیہ وسلم عشیۃ عرفۃ وغداۃ مزدلفۃ کان لاہل عرفات واہل المشعر فاستجیب لہ فی الاول فیما سوی التبعات ثم استجیب لہ فی التبعات ایضاً کما دل علیہ اثر انس بن مالک بروایۃ ابن المبارک واخرج عن طلحۃ بن عبید اللہ مرسلاً بروایۃ مالک والبیہقی نحوہ فہذا ما اطلعت علیہ من شواہد حدیث عباس بن مرداس السلمی وفی حاشیۃ ابن ماجۃ اورد ہذا الحدیث عباس علی ابن الجوزی فی الموضوعات واعلہ بکنانۃ ورد علیہ الحافظ ابن حجر فی جزء سماہ قوت الحجاج فی عموم المغفرۃ للحاج قال فیہ حکم ابن الجوزی علی ہذا الحدیث بانہ موضوع مردود فان الذی ذکرہ لا ینتہض دلیلا علی کونہ موضوعا وقد اختلف قول ابن حبان فی کنانۃ فذکرہ فی الثقات وذکرہ فی الضعفاء وذکر ابن مندہ قیل ان لہ رؤیۃ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وولدہ عبد اللہ فیہ کلام ابن حبان ایضا وغایۃ ان یکون ضعیفا ویعتضد بکثرۃ طرقہ وہو بمجردہ یدخل فی حد الحسن علی رأی الترمذی ولا سیما بالنظر فی مجموع طرقہ وقد اخرج ابو داؤد (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

وغیرہ معاف ہو جاتے ہیں اس حدیث میں توریح کا بیان ہی نہیں بلکہ صرف اتنی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کیلئے دعا فرمائی تھی خواہ حاجی ہوں یا نہ ہوں اب حدیث کا مطلب سنئے بات یہ ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب باتیں اور تمام علوم ایک دفعہ ہی معلوم نہیں ہوئے بلکہ آہستہ آہستہ معلوم ہوئے ہیں اور جب تک آپکو کسی امر کی پوری حقیقت معلوم نہ ہوتی آپکو بے چینی اور حیرت رہتی اسی کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ووجدک ضالا فہدی اے وجدک حائرا طالبا للزیادۃ فی العلم فعلمک مالم تکن تعلم، کہ خدا نے آپکو طلب حقائق میں حیران وبیچین پایا تو آپکو پوری طرح حقائق پر مطلع فرمایا اور یہ حیرت اب بھی اہل اہام کو حاصل ہے چنانچہ مولانا فرماتے ہیں۔

ے در تردد ہر کہ او آشفتہ است | حق بگوش او معما گفتہ است

کہ جو عارف کسی تردد میں پریشان ہے سمجھ لو کہ حق تعالےٰ نے اسکے کان میں کوئی معما کہدیا ہے جس کے حل کیلئے وہ بیچین ہے ایک جگہ فرماتے ہیں ے

۳۵ گہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں | جز کہ حیرانی نہ باشد کار دیں

آگے حیرت محمودہ وحیرت مذمومہ کا فرق بتلاتے ہیں کہ تم ان کی حیرت کو غیر عارف کی حیرت پر قیاس نہ کرنا ے

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوئے دوست | بل چنیں حیران کہ رویش روئے دوست

کہ غیر عارف تو اس لئے پریشان وحیران ہے کہ اسکی پشت محبوب کی طرف ہے اور عارف کی حیرت اسلئے ہے کہ اس کا منہ محبوب کی طرف ہے جسکو مبالغۃً روئے دوست فرمادیا پس یہ تو مشاہدہ جمال کے بعد اسکو حسن کیوجہ سے حیران ہے اور وہ فقدان مشاہدہ کیوجہ سے حیران ہے دونوں کی حیرت میں زمین وآسمان کا فرق ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب

(بقیہ صفحہ گذشتہ) فی سنتہ طرفا منہ وسکت علیہ فہو صالح عندہ واخرجہ الحافظ الضیاء فی الاحادیث المختارۃ مما لیس فی الصحیحین

ے قلت وقد ذکرت فی الحاشیۃ ان ذکر الحج وکون المغفرۃ مخصوصۃ باہل عرفات واہل المشعر وارد فی شواہد ہذا الحدیث ۱۲ ظ قلت لبعض الشواہد منہ وفیہ للحاجۃ فیہ ثم لا دلیل فیہا علی العموم فیمکن ان یکون المراد بالتبعات غیر الما لیات کالاغتیاب ونحوہ ۱۲ اشرف۔

سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ کافر اسلام لے آئے تو اسلام سے سب گناہ
معاف ہو جاتے ہیں لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ اسلام کے بعد اس سے گناہ ہوں تو وہ بھی توبہ کرنے
سے سب معاف ہو جائیں گے یا بدون توبہ کے ہی معاف ہو سکتے ہیں اور اسی وقت
کی یہ آیت ہے ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاءہ جہنم خالدا فیھا الآیہ اس لئے بعض صحابہ
اس کے قائل ہو گئے کہ قاتل عمد کے واسطے توبہ نہیں یعنی اُس کو اس جرم کی سزا ضرور
بھگتنا ہوگی اور یہ حیرت اب بھی معتزلہ وخوارج کو باقی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے
بعد گناہ کبیرہ معاف نہیں ہوتا بلکہ گناہ کبیرہ سے وہ ایمان کو زائل شدہ سمجھتے ہیں خواہ
دخول فی الکفر ہو یا نہ ہو غرض ابتدا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا کہ ذرہ برابر
ایمان بھی سب گناہوں کی مغفرت کیلئے کافی ہو سکتا ہے اِس لئے آپ نے دعا
فرمائی کہ اے اللہ میری امت کی مغفرت فرما دیجئے مطلب یہ تھا کہ اگر وہ توبہ کریں
تو بدون سزا کے اُن کو بخشدیا جائے اور توبہ نہ کریں تو گناہ کی سزا کے بعد بخشدیا جائے
یعنی کسی وقت انکو جنت میں ضرور بھیجدیا جائے چنانچہ عرفہ کی شام کو یہ دعا قبول ہوئی مگر ۳۶
مظالم وحقوق العباد کے متعلق قبول نہ ہوئی جس کا مطلب یہ تھا کہ توبہ کے بعد بھی حقوق العباد
معاف نہیں ہوں گے مزدلفہ کی صبح کو ان کے متعلق بھی دعا قبول ہوگئی کہ جو شخص توبہ
کر کے مر جائے اور اُس کو توبہ کے بعد ادائے حقوق کا موقعہ نہ ملے تو توبہ سے اُس
کے لئے حقوق العباد بھی معاف ہو جائیں گے یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو خوش کر کے
ظالم کی مغفرت فرما دیں گے اور جس کو توبہ کے بعد ادا حقوق کا موقعہ ملے اُس سے گناہ
تو معاف ہو گئے مگر حقوق ساقط نہیں ہوئے اگر اُس نے ادا حقوق میں کوتاہی کی تو یہ
توبہ کے بعد دوسرا گناہ ہوا اگر مرنے سے پہلے اس سے بھی توبہ کرلی تو یہ گناہ بھی معاف
ہو جائیگا اور حق تعالیٰ مظلوم کو خوش کر دیں گے اور اگر توبہ نہ کی تو اس گناہ کی سزا بھگت
کر مغفرت ہو جائیگی یہ تو توبہ کے بعد حکم ہے اور توبہ نکرنے کی حالت میں یہ حکم ہے کہ حق
تعالیٰ کو اختیار ہے خواہ اسکو سزا دیکر بخشیں یا بدون سزا ہی کے بخشدیں اور مظلوم کو
جنت کی نعمتوں سے خوش کر دیں بہرحال مغفرت سب کی ہو جائے گی اور کسی وقت سب

مسلمان جنت میں پہونچ جائیں گے یہ حاصل ہے اس حدیث کا جسکو حج سے کچھ تعلق نہیں بلکہ اس میں امت محمدیہ کی مغفرت کا قاعدہ مذکور ہے۔

غرض حج کی فضیلت تو معلوم ہو گئی کہ اس سے گناہ سابق معاف ہو جاتے ہیں خواہ سب یا بعض مگر حج کے بعد کے گناہ تو معاف نہیں ہوتے اسلئے حاجی کو آئندہ کی احتیاط بہت ضروری ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ احتیاط اس لئے ضروری ہے کہ حاجی کی حالت ایک خاص وجہ سے زیادہ خطرناک ہے وہ وجہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حجر اسود کسوٹی ہے اس کے چھونے سے انسان کی اصلی حالت ظاہر ہو جاتی ہے اگر واقعی فطرۃً صالح ہے تو حج کے بعد اعمال صالحہ کا اسپر غلبہ ہو گا اور اگر فطرۃً طالح ہے محض تصنع سے نیک بنا ہوا ہے تو حج کے بعد اسپر اعمال سیئہ کا غلبہ ہو گا یہ وجہ ہے خطرہ کی اور اس خطرہ کا علاج یہ ہے کہ حاجی زمانہ حج میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اصلاح حال کی خوب دعا کرے اور دل سے اعمال صالحہ کے شوق کی دعا کرے اور حج کے بعد اعمال صالحہ کا خوب اہتمام کرے اور خیر آئندہ کا کام تو حج سے آکر ہو گا اسوقت تو اُس کام کا اہتمام کرنا چاہئے جو اسوقت کے متعلق ہے اور آئندہ کی اصلاح کی وہ بنا بھی ہے بس جس پر حج فرض ہو وہ فوراً جلدی ہی تال مٹول نکرے اسوقت الحمدللہ قصبہ سے ایک غریب شخص حج کو جارہا ہے یعنی حافظ عبداللہ صاحب نعلبند کا بیٹا اللہ تعالیٰ نالداروں کو بھی توفیق عطا فرمائیں یہ بیچارہ میرے پاس آیا تو میں نے اُسکو ایک خط دیدیا جو میرے ایک دوست کے نام تھا تاکہ وہ اُسکو سفر حج کا تمام حال بتلا دیں اور رفیق سفر بھی میں نے اُسکو بتلا دیا ہے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سفر حج کے متعلق ہر شخص سے باتیں نہ پوچھا کرو کیونکہ آجکل اخباروں میں واہی تباہی روائتیں راستہ کے خطرناک ہونے یا نہ ہونے کے متعلق شائع ہوتی رہتی ہیں ان خبروں پر اعتماد نہ کرنا چاہئے بلکہ کسی ایک شخص پر اعتماد کر کے جو قابل اعتماد ہو اُسکے مشورہ پر عمل کرنا چاہئے اور جن لوگوں پر حج فرض نہیں وہ توکل کے دعوے پر ارادہ نہ کریں بلکہ اُن کو ہندوستان ہی میں رہ کر خدا کو راضی کریں اور اپنے کو کسی محقق کے سپرد کریں جسوقت وہ حج کی اجازت دے اُسوقت حج کا ارادہ کریں ایسی ہی ۳۷

لوگوں کے متعلق حضرت مسعود بکؒ کا قول ہے ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید — معشوق دریں جاست بیائید بیائید

اس مضمون کے مخاطب تو ناقص ہیں اور کاملین کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں ؎

حج زیارت کردن خانہ بود — حج رب البیت مردانہ بود

پس جس پر حج فرض ہو اسکو اسکی کوشش کرنا چاہئے کہ حج مردانہ نصیب ہو جس کا طریق یہ ہے کہ کسی محقق سے تعلق پیدا کرکے حج کو جائیں انشاء اللہ اگر درجہ اعلیٰ میں کامل حج نہ ہوگا تو ایک درجہ میں کامل ضرور ہو جائے گا تیسرے وہ لوگ ہیں جن پر حج فرض نہیں مگر خدا تعالے نے ان کو وسعت قلب وقوت توکل عطا فرمائی ہے انکو بدون زاد وراہ کے بھی حج کی اجازت ہے چنانچہ ایک صاحب حال عازم نے شاہ فضل الرحمٰن صاحب سے سفر حج کی اجازت مانگی تو شاہ صاحب نے فرمایا تمکو شرائط حج بھی معلوم ہیں کہا ہاں حضور معلوم ہیں فرمایا بتلاؤ کیا معلوم ہے کہا ؎

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بجان — شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی ۳۸

اس جواب سے شاہ صاحب پر وجد کی سی حالت طاری ہوئی اور ایک چیخ ماری پھر چونکہ صاحب مقام تھے اسلئے سنبھلے اور فرمایا کہ یہ سب فضول ہے زاد وراہ ساتھ ہونا چاہئے جس کا شریعت میں حکم ہے مگر وہ مولوی صاحب بدون زاد وراہ ہی کے چل پڑے اور چونکہ توکل صحیح تھا اسلئے کسی جگہ پریشان نہیں ہوئے پھر ان کی ایک کرامت یہ ظاہر ہوئی جس کی وجہ سے ایک حاجی نے بچشم دید روایت کی کہ جب بیت اللہ میں داخل ہونے لگے تو شیبی (خادم کعبہ) سب سے فیس لیکر اندر جانیکی اجازت دیتا تھا مولوی صاحب سے بھی فیس لی اور انہوں نے دیدی مگر ان سے رقم لیتے ہی اُسپر پریشانی کا اثر ظاہر ہوا اور حجاج کے نکلنے کیوقت وہ ایک ایک کا منہ تکتا تھا جب یہ باہر آنے لگے تو اُس نے انکی رقم واپس کردی تو ایسے لوگ بدون زاد راہ کے جائیں تو مضائقہ نہیں باقی ہر ایک کا یہ منہ نہیں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جب حج کو جانے لگے تو کوئی حج میں ساتھ چلنے کو کہتا تو آپ پہلے یہ پوچھتے کہ زاد راہ بھی ہے بعض لوگ کہتے تھے کہ حضرت توکل پر چل رہے ہیں مولانا فرماتے جی ہاں جس وقت

ہم ریل یا جہاز کا ٹکٹ لینے جائیں گے تم توکل کا پوٹلہ بابو کے آگے رکھ دینا کہ اس میں سے ٹکٹ کے دام نکال لو۔ جاؤ یہ فضول خیالات ہیں۔

بات یہ ہے کہ لوگوں نے بعض بزرگوں کے واقعات اور قصے سن لئے ہیں اُن کی ریس کرنے کو ان کا جی چاہتا ہے مگر انہوں نے یہ نہیں سنا ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد ؛ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
زشت باشد چشم نابینا و باز ؛ عیب باشد روئے نازیبا و ناز

چنانچہ غالباً روض الصالحین میں ایک حکایت لکھی ہے اُس کو بیان کر کے ختم کردوں گا کہ مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ میں نے حج کے راستہ میں ایک نوجوان لڑکے کو دیکھا جو بدون زاد راہ کے جا رہا تھا میں نے کہا کہ تم بدون زاد راہ کے اتنا لمبا سفر کرتے ہو؟ کہا ؎

وفدت علی الکریم بغیر زاد ؛ من الحسنات والقلب السلیم
فان الزاد اقبح کل شیٔ ؛ اذا کان الوفود علی الکریم ۳۹

کہ ہاں میں یوں ہی خالی ہاتھ جا رہا ہوں کیونکہ کریم کے گھر پر توشہ باندھکر لیجانا نازیبا ہے اس جواب سے میں سمجھا کہ نوجوان عارف ہے معمولی آدمی نہیں اُس کے بعد احرام کا وقت آیا تو سب نے احرام باندھکر لبیک کہا مگر اس لڑکے کا چہرہ مارے خوف کے زرد ہوگیا اور اس کے منہ سے لبیک نہ نکلا میں نے کہا صاحبزادے تلبیہ کیوں نہیں کہتے؟ کہا ڈرتا ہوں کہ میں تو لبیک کہوں اور وہاں سے جواب آئے لا لبیک ولا سعدیک و حجک مردود علیک غرض تمام اعمال حج میں اُس کی ایک نئی شان ظاہر ہوتی تھی حتی کہ منیٰ میں جب حجاج پہونچے اور سب لوگ قربانی کرنے لگے تو نوجوان نے حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور عرض کیا خداوندا آپ کے سب بندے آپ کی جناب میں نذریں پیش کر رہے ہیں مگر میرے پاس کچھ نہیں جو پیش کروں ہاں یہ جان حقیر ہے اگر قبول ہو تو جان حاضر ہے یہ کہتا تھا کہ دفعتہً ایک چیخ ماری اور جان بحق ہوگیا کما قیل ؎

چہ دوری بکوئے دلبر بسپار جان مضطر ؛ کہ مبادا بار دیگر نرسی بدیں تمنا

مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ اس نوجوان نے ہم سب کو میدان عشق میں پیچھے چھوڑ دیا اور وہ عشاق کے دلبر خاص نشان لگا دیا اس کے بعد ہم نے اس کو غسل و کفن دیکر نماز پڑھکر دفن کر دیا جب مجھے غنودگی طاری ہوئی تو میں نے ایک غیبی آواز سنی کہ اے مالک! اسی سال اس نوجوان کی برکت سے سب صاحبوں کا حج قبول کیا گیا اور اس کی قربانی کی برکت سے سب کی قربانیاں قبول ہو گئیں تو صاحبو! جو ایسا عاشق ہو اسکو بغیر زاد و راہ کے سفر حج کی اجازت ہو سکتی ہے ہر شخص کو دعوی توکل اور دعویٰ محبت کا حق نہیں کیونکہ آجکل تو بہلو گو نکا توکل چند روز کے بعد تاکل بن جاتا ہے

کہ توکل کو بھیک کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اب دعا کیجئے کہ

اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنے دربار میں حاضری کی توفیق

عطا فرمائیں اور جو لوگ حج کو جاتے ہیں

ان کو خیر و خوبی کیساتھ

حج نصیب ہو

اور

تعالیٰ

مع الخیر اپنے گھر پہونچ جائیں آمین۔ والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی

سید نا و مولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم ۱/۰ ۴۰

[illegible]

اشرف علی

۱۰ رجمادی الاول ۱۳۴۹ھ

قَالَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ
رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمی بہ

المراقبہ

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
محمد عبدالمنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء
متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمیٰ
المراقبہ

اَیْنَ	کہاں ہوا	تھانہ بھون مکان حضرت مولانا دام ظلہم
مَتٰی	کب ہوا	دوشنبہ ۱۸ ذوالقعدہ ۱۳۳۵ھ
کَمْ	کتنی دیر ہوا	۲ ½ گھنٹہ
کَیْفَ	کس ہیئت سے ہوا	جالساً علی السریر
لِمَ	کیوں ہوا	مستورات کی درخواست پر
مَاذَا	کیا مضمون تھا	اصلاح حال میں دو چیزوں کی بہت ضرورت ہے ایک ذکر دوسرے فکر
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ذاکرین و سالکین کو خصوصاً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	حضرت مولانا ظفر احمد عفا اللہ عنہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۶۰ تقریباً
الاشتات	متفرقات	یہ بیان عام نفع میں بے نظیر و قابل دید ہے

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنھار لاٰیٰت لاولی الالباب الذین

؎ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اہل عقل کے لئے دلائل ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی نہیں

؎ کیا ہم آپ کو منزہ سمجھتے ہیں پس ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجئے ۔ بورفتہ ۱۳۸

يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ
هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ یہ آیت ہر چند کہ ایک خاص مضمون کے متعلق وارد ہے
یعنی توحید کے مگر اسکے ضمن میں حق تعالیٰ نے چند باتوں پر تنبیہ فرمائی ہے اور انکی ترغیب
دی ہے مجھے اُن کے متعلق اسوقت کچھ بیان کرنا ہے اور وہ دو عمل ہیں جو توحید کے
ضمن میں یہاں مذکور ہوئے ہیں مجھے ان میں سے ایک کو مقصوداً بیان کرنا ہے اور دوسرے
کو تبعاً اور وجہ ان کے بیان کرنیکی یہ ہے کہ ہماری دینی خرابی اور دنیوی خرابی جو کچھ ہو رہی
ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں منجملہ اُن کے ایک سبب اس آیت میں مذکور ہے اول
تو میرے ذہن میں ان سے ایک ہی وجہ آئی تھی مگر آیت میں غور کرنے سے دوسری وجہ اور
معلوم ہوئی تقریر اُسکی یہ ہے کہ یہاں دو عملوں کی ترغیب ہے ایک ذکر کی ایک فکر کی اور ان
ہی دونوں میں کوتاہی کرنا ہماری دنیوی اور دینی خرابی کا سبب ہے ہر چند کہ اس آیت
میں خاص فکر کا ذکر ہے جو کہ آسمان و زمین کی پیدائش اور بناوٹ میں کیا جائے کیونکہ یہ موقع
اثبات توحید کا ہے اور مقصود مقام یہی ہے اور اثبات توحید میں تفکر فی السماء والارض کو خاص ۳
دخل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان مخلوقات میں غور کرو کہ یہ سب حادث ہیں اور حادث
کے وجود کیلئے مرجح کی ضرورت ہے اگر مرجح بھی حادث ہوا تو اسکے لئے پھر مرجح کی ضرورت
ہوگی اور سلسلہ غیر متناہی چلیگا اور تسلسل محال ہے پس ضرور ہے کہ انتہا واجب پر ہوگی
اور اسی کو ہم اللہ کہتے ہیں۔ غرض فکر اس جگہ مقید ہے مگر مجموعہ آیات سے جو اس باب
میں وارد ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ہر چیز میں فکر ہونا چاہیئے رسالت میں بھی توحید
میں بھی اسی طرح اور کوئی عمل بھی فکر سے خالی نہ ہونا چاہیئے اب دیکھنا چاہیئے کہ اس باب
میں ہمارا کیا حال ہے سو ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کو کسی کام میں فکر نہیں ہوتی اپنی
ہر حالت کو یاد کر کے دیکھ لو کوئی وقت بھی ایسا ہوتا ہے جس میں ہم فکر کرتے ہوں یا
کسی کام میں سوچ سے کام لیتے ہیں یقیناً آپ اپنے سب اوقات کو فکر سے خالی پائیں
گے حالانکہ قرآن و حدیث میں تو توحید و رسالت تک میں بھی فکر کی تاکید ہے گو توحید و رسالت
کے حاصل ہونے ہوئے ان میں فکر نہ کرنیکی شکایت نہو کیونکہ اس فکر کا نتیجہ بحمداللہ ہم سب کو

حاصل ہے کیونکہ بحمد اللہ سب مومن مسلمان ہیں یہ اور بات ہے کہ خلل اعمال کی وجہ سے ایمان کی نورانیت بعض میں کم ہو باقی نفس ایمان میں کمال ونقص نہیں ہے بحمد اللہ نفس ایمان سبکو حاصل ہے حتی کہ نفس ایمان فاسق کو بھی حاصل ہے بعض عارفین کا قول ہے کہ ضعیف ایمان کا نور بھی اگر ظاہر ہو جائے تو آسمان وزمین سبکو چھپالے بہر حال یہ فکر اگر نہو تو کچھ شکایت نہیں کیونکہ اس فکر کا حاصل یہ ہوگا کہ شئے موجود کو قوی کیا جائیگا اور موجود کو قوی کرنا مفقود کے حاصل کرنے سے مؤخر ہے مقدم یہ ہے کہ مفقود کو حاصل کیا جائے میں اسی فکر کو بتلانا چاہتا ہوں جسکی ہر عمل میں ضرورت ہے اور وہ فکر یہ ہے کہ جزا وسزا میں فکر کیا جائے چنانچہ سورۂ رحمٰن میں اول سے آخر تک اسی کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور عقوبتیں بیان فرما کر بار بار سوال کیا ہے فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ جس کا حاصل یہی ہے کہ ان نعمتوں کو اور عقوبتوں کو سوچنا اور یاد کرنا چاہیئے مگر اس مقام پر کسی طالبعلم کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ نعمتوں کے ساتھ تو فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ موقع پر ہے مگر عذاب کے ساتھ اس کے ذکر کا کیا موقعہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عذاب کے ذکر سے انسان کو تنبیہ ہوتی ہے اور وہ عذاب کو سوچکر نافرمانی سے بچتا ہے اس حیثیت سے اُسکا ذکر بھی نعمت ہے اگر ہمکو فکر کی عادت ہوتی تو یہ راز معلوم ہو جاتا اسکی ایسی مثال ہے جیسے حاکم منادی کراتا ہے کہ جو شخص سرکاری درخت کاٹے گا اسپر اسقدر جرمانہ ہوگا اور سزا دیجائیگی عاقل اس منادی کو بھی نعمت سمجھے گا کہ اس منادی کیوجہ سے ہم جیلخانہ سے بچ گئے اگر ہمکو خبر نہوتی تو قید بھگتنا پڑتی یا طبیب کسی مضر شے کی مضرت سے ہمکو اطلاع دے تو عاقل اسکی بھی قدر کرے گا اسی طرح یہاں سمجھو کہ عذاب گو فی نفسہ نعمت نہو مگر اُس سے مطلع کر دینا ضرور نعمت ہے پس اب فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کسی جگہ بے موقعہ نہیں ہے بہر حال سارا قرآن فکر کی تاکید سے بھرا ہوا ہے کہیں قیامت کے بارہ میں ارشاد ہے اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہ ان کو قیامت کے امکان کو سمجھنے کیلئے ملکوت سمٰوات وارض میں نظر کرنا چاہیئے نظر وفکر ایک ہی ہے ایک جگہ ارشاد ہے لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ کہ اللہ تعالیٰ یہ احکام صاف صاف اسلئے بیان فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا وآخرت میں فکر کرو یہاں تفکر فی الدنیا کی بھی تاکید ہے اس پر یہ اشکال

ف
سورۂ رحمٰن
[illegible]

ف
سورۂ رحمٰن

ظاہر میں ہوتا ہے کہ دنیا میں تفکر کی کیا ضرورت ہے بلکہ اس سے تو فکر کو ہٹانا چاہئے اشکال
سننے کے بعد اب دو تفسیریں سنو جن میں ایک دوسرے سے لطیف ہے ایک تفسیر تو یہ
۴ ہے کہ دنیا کے اندر جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل دنیا کیلئے ہو اسکو مقصود بالذات سمجھکر
اور اگر مقصود بالذات نہ سمجھے تو وہ فکر بھی جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ
بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ اور طلب کیلئے فکر لازم ہے مگر یہ فکر مقصوداً مطلوب نہیں بلکہ تبعاً ہے کیونکہ دنیا
بقدر ضرورت کو دین کی تکمیل و تحصیل میں دخل ہے دوسری تفسیر اس سے لطیف ہے اس کا
حاصل یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں تفکر کر و موازنہ کیلئے کہ ان میں کون قابل اختیار کرنے کے
ہے اور کون قابل ترک ہے اور دنیا میں جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل کیلئے ہو اور
جو فکر ترک دنیا کیلئے ہو وہ تو مطلوب ہے پہلی تفسیر کا حاصل یہ تھا کہ دنیا میں تبعاً تفکر کرو اور
آخرت میں مقصوداً اور دوسری تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دونوں میں مقصوداً تفکر کرو موازنہ کیلئے
اہل اللہ نے دنیا میں فکر کر کے ہی اسکی حقیقت کو سمجھا ہے اسی لئے انکو دنیا سے سخت
۵ نفرت ہے امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اگر آخرت کا وجود نہ ہوتا یا تحصیل دنیا آخرت سے مانع
نہ ہوتی تب بھی دنیا کی حقیقت ایسی ہے کہ اسکو معلوم کر کے عاقل ہرگز اسکی طرف رغبت نہ کرتا
اور آخرت کے مقابلہ میں تو اس کا طلب کرنا محض حماقت اور جہالت ہے شاید اسپر اہل
دنیا کو یہ سوال ہو کہ اسکی کیا وجہ ہے کہ دنیا خود قابل ترک ہے ہماری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی
ہم تو دیکھتے ہیں کہ دنیا سے بہت راحت ملتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی ایسی مثال
ہے جیسے سانپ کے کاٹے کو نیم کے پتے میٹھے معلوم ہوتے ہیں مگر تندرست آدمی کو کڑوے
معلوم ہوتے ہیں پس آپ کو دنیا اسلئے اچھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی ایمانی حس درست نہیں
اگر ایمانی حس درست ہوتی جس کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

صحت ایں حس بجوئید از طبیب ۔۔۔ صحت آں حس بجوئید از حبیب

کہ ایمان کی حس اگر درست کرنا چاہو تو اسکا طریقہ مقبولان الٰہی سے پوچھو بہر حال وہ حس
جو مجاہدات کے ذریعہ سے خانقاہوں میں حاصل کیجاتی ہے درست ہو تو اس کہنے کی بھی ضرورت
نہ ہو کہ آخرت ایسی چیز ہے کہ اسکے مقابلہ میں دنیا قابل ترک ہے بلکہ تم خود بخود دنیا سے دلبرداشتہ

[illegible]

ہو جائے۔ اسکی حالت کو اُن لوگوں سے پوچھیے جنکی عمر دراز ہو گئی ہے جنہوں نے دنیا کو اچھی طرح آزمایا ہے اور اس کے سرد و گرم کا تجربہ حاصل کیا ہے چنانچہ ایسا ہی ایک تجربہ کار شاعر کہتا ہے ۵

وَمَنْ يَحْمَدِ الدُّنْيَا لِعَيْشٍ يَسُرُّهُ | فَسَوْفَ لَعَمْرِي عَنْ قَرِيبٍ يَلُومُهَا
إِذَا أَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً | وَإِنْ أَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيرًا هُمُومُهَا

کہ جو شخص کسی خوش کن عیش کیوجہ سے دنیا کی تعریف کرتا ہے میری جان کی قسم وہ عنقریب اسکی خود ہی برائی کریگا اسکی حالت یہ ہے کہ جب یہ چلی جاتی ہے تو آدمی کو حسرت و رنج دیکر جاتی ہے اور جب آتی ہے تو بہت سے افکار ساتھ لاتی ہے اور یہ حسرت انہی لوگوں کو ہوتی ہے جو اس میں پھنسے ہوئے ہیں ورنہ عاقل کو خصوصاً عارف کو حسرت نہیں ہوتی کیونکہ کٹ کھنا کتا جائے تو خوشی کی بات ہے مگر جو لوگ دنیا کے عاشق ہیں اُن کے یہاں چوری ہو جائے تو اُنکی بری حالت ہو جاتی ہے چنانچہ بعض لوگ تو حسرت و غم میں مر گئے ہیں میں نے اسی قصبہ کی حکایت سُنی ہے کہ سکھو والی مسجد کے ایک پردیسی ملا کے پاس سو اشرفیاں جمع ہو گئیں تھیں وہ اُنکو روز شمار کیا کرتا تھا محلہ کے شہدوں کو پتہ چل گیا اور موقع پاکر سب نکال لیگئے پھر حافظ جی کی دعوت کی اور خوب عمدہ کھانے کھلائے جب حافظ جی کھانے کی تعریف کرتے تو وہ بار بار یوں کہتے کہ حافظ جی سب آپکی جوتیوں کا صدقہ ہے حافظ جی کو اپنی رقم کا کھٹکا ہوا جلدی سے حجرہ میں آئے اور اشرفیوں کو تلاش کیا وہاں تو میدان صاف تھا بس یہ حالت دیکھتے ہی فوراً جان نکل گئی کوئی بزرگ اسوقت تھے اُنکو یہ واقعہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ ان اشرفیوں کو اسکے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے کوئی اُنکو اپنے کام میں نہ لائے کیونکہ جس مال نے مسلمان کی جان لیلی وہ ضرور نا مشروع طریق سے جمع کیا گیا تھا ۵ یہ بھی سُنا ہے کہ کسی بیباک شخص نے ان اشرفیوں کو قبر میں سے نکالنا چاہا ہاتھ لگاتا تھا کہ ایک آگ لگ گئی جب تک زندہ رہا ہر وقت انگلی کو پانی میں رکھتا تھا غرض بعضے تو اس کی حسرت میں مر گئے ہیں اور ایسے لوگ تو کثرت سے دیکھے جاتے ہیں جو ۶

۵ ممکن ہے اس ملا کا کوئی وارث نہ ہو ۱۲ ظ

جو اولاد کے مرنے پر بدحواس ہو جاتے ہیں اور زبان سے ایسے کلمات کہہ اٹھتے ہیں کہ خدا کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور اگر تہذیب سے کام بھی لیا تو اسوقت خدا سے ان کا دل ویسا راضی نہیں ہوتا جیسا پہلے تھا یہ حالت تو بہت ہی عام ہے افسوس خدا تعالےٰ نے تو اپنی ہی چیز لی تھی تمہاری چیز نہیں لی حالانکہ دنیا کے محبوبوں کو تو تم خود اپنی چیزیں دیتے ہو اور وہ اگر نہ لیں تو یوں کہتے ہو ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت　　　زر و خاک یکساں نماید برت

صاحبو! کیا یہ حالت افسوس کے قابل نہیں ہے اب عارفین کی حالت کو دیکھو کہ وہ دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہیں جو یہاں سے جاتا ہے وہ عقلاً اسپر خوش ہوتے ہیں گو طبعاً رنج ان کو بھی ہوتا ہے حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس ایک شخص روتا ہوا آیا کہ حضرت میری بیوی مر رہی ہے دعا کیجئے وہ بچ جائے حضرت نے مسکرا کر فرمایا کہ ایک تو جیلخانہ سے رہائی
۷ پا رہا ہے اور یہ رو رہے ہیں کہ تو جیلخانہ سے کیوں نکلتا ہے تو بھی جیلخانہ سے نکلا چاہتا ہے وہ کہنے لگا حضرت میری روٹی کون پکائیگا فرمایا جی ہاں جب آپ ماں کے پیٹ سے نکلے تھے اسوقت بھی بیوی روٹی پکاتی ہوئی ساتھ آئی تھی میاں جس نے ماں کے پیٹ میں تم کو پالا وہ اب بھی پالیگا ان باتوں پر تو حضرت ظرافت کیساتھ باتیں کرتے تھے پھر اُس نے کہا کہ حضرت فلاں شخص نے مجھ اپنی ساتھ مدینہ لیجانیکا وعدہ کیا تھا اب وہ انکار کرتا ہے دعا فرمایئے کہ وہ مجھے مدینہ لیجائے ظاہر میں یہ بات غصہ کی نہ تھی مگر حضرت کو اس پر غصہ آگیا اور تیزی کے ساتھ فرمایا کہ بس بس ہمارے سامنے یہ شرک کی باتیں نہ کرو کیا وہی شخص لیجائے گا تو تم مدینہ پہونچو گے ورنہ نہیں پہونچو گے مخلوق پر اتنی نظر توبہ کرو ہر چند کہ مخلوق پر نظر پہلی باتوں میں بھی تھی مگر وہاں مخلوق پر نظر تھی اُس کے خادم ہونے کی حیثیت سے اور یہاں نظر تھی بڑا اور کارساز ہونے کی حیثیت سے اسلئے حضرت نے اسکو شرک بات فرمایا مقصود یہ تھا کہ حضرت نے دنیا سے جانیکو جیلخانہ سے نکلنا فرمایا طبعی رنج ہونا قابل شکایت نہیں مگر ایسا رنج کہ پیٹ پھاڑنے لگے یقیناً برا ہے تو یہ دنیا ذہاب کے وقت یہ غم دیتی ہے اور جب پاس ہوتی ہے اُسوقت بھی تکدر کا سبب ہے کیونکہ سینکڑوں افکار اس کی ساتھ

ہوتے ہیں چنانچہ دنیا کا میزان الکل مال ہے کہ اس سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے اُسکی حالت یہ ہے کہ جب مال نہ تھا تو جنگل میں سو رہنا آسان تھا اور اب مال آنے کے بعد گھر میں سونا بھی مشکل ہے چین سے نیند نہیں آتی چنانچہ ایک گرو اور چیلے کی حکایت مشہور ہے کہ دونوں رات کو سفر کر رہے تھے چیلے نے کہا مجھے تو ڈر لگتا ہے گرو نے تسلی کی اُس نے تھوڑی دور چلکر پھر کہا کہ ڈر لگتا ہے گرو نے کہا معلوم ہوتا ہے تیرے پاس کچھ رقم ہے کہا ہاں ایک روپیہ ہے کہا اسکو پھینکدے چیلے نے روپیہ پھینکدیا اس کے بعد کچھ دور چلکر گرو نے پوچھا کہ اب تو ڈر نہیں لگتا کہا بالکل نہیں تو واقعی اس مال کی وجہ سے بہت سے خطرات و افکار میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے اور جو مفلس ہو اُسے کیا خوف ؎

لنگلے زیر د لنگلے بالا   نے غم دزد و نے غم کالا

ایسے شخص کو تو اگر کوئی قید خانہ میں بھی بھیجے تو گھر سے روٹی دینا پڑتی ہے مفلس کو جیلخانہ سے بھی ڈر نہیں لگتا کہ پکی پکائی ملے گی اور مالداروں کی حالت یہ ہے کہ بنئے کی قوم
۸ سب سے زیادہ مالدار ہے مگر سب سے زیادہ ڈرنے والی بھی یہی قوم ہے مال کو بڑی بڑی تدبیروں سے رکھتے ہیں اور راتوں کو پہرہ دیتے ہیں مدینہ کے راستوں میں ایک راستہ مسکینوں کا بھی ہے اُسمیں مسکین لوگ بڑی راحت سے رہتے ہیں کہ بدو ہر منزل پر انکی دعوت کرتے ہیں پھر مدینہ پہونچکر تو اُنکی قدر بہت ہی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکینوں کے عاشق ہیں جن غریبوں کی یہاں قدر نہیں حضور کو انکی بہت ہی قدر ہے اور جو لوگ مالدار ہیں اور شیطانی راستہ سے سلطان بنکر جاتے ہیں اُنکی یہ حالت ہے کہ روپے کمر سے باندھتے اور نوٹ بازو پر باندھتے ہیں اور ہر وقت لوٹ مار سے ڈرتے رہتے ہیں یہ تو مال کی حالت ہے اب دنیا کے اور شعبوں کو دیکھو جنمیں سے ایک نکاح ہے اسکی یہ حالت ہے کہ جو لوگ زیادہ نکاح کرتے ہیں یا ایک ہی بیوی سے زیادہ مشغول رہتے ہیں اس عیش کا انجام یہ ہے کہ کسی کی نگاہ کمزور ہو جاتی ہے کسی کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہو جاتا ہے کسی پر فالج پڑ جاتا ہے پھر سب عیش منغص ہو جاتا ہے کھانے کو لو تو یہ بھی کدورت سے خالی نہیں کیونکہ کھانے سے بعض دفعہ پھندا لگ جاتا ہے اور یہاں سے خدا کی ہستی معلوم ہوتی ہے کیونکہ

انسان کے حلق میں دو سوراخ ہیں ایک سانس کیلئے ایک طعام و شرب کیلئے اگر کھانا یا پانی سانس کے سوراخ میں پہونچ جائے تو پھندا لگ کر انسان ہلاک ہو جاتا ہے اب بتلاؤ کہ وہ کون ہے جو کھانے پانی کو سانس کے سوراخ میں جانے سے روکتا ہے اگر ہم خود روکتے ہیں تو بالکل غلط کیونکہ ہمکو تو ان دونوں سوراخوں کی خبر بھی نہیں کہ کونسا سانس کا ہے اور کونسا کھانے پینے کا یہ اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت ہے مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانِ کا منظر بنا دیا ہے کہ کیا مجال کہ طعام منفذِ نفس میں جا سکے بکثرت اس کا وقوع نہیں ہوتا ہاں کبھی اظہار عجز انسان ہی ہوتا ہے کہ سانس کے راستہ میں کھانا پانی پہونچ جاتا ہے اسوقت معلوم ہوتا ہے کہ کھانا بھی وبالِ جان ہے اگر خدا کی حفاظت نہ ہو صاحبو! حق تعالیٰ آپ کی حفاظت فرماتے ہیں اور اس کیلئے ملائکہ بھی مقرر ہیں اسی کو شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند　　تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

۹ اور اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؎ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مسخر ہونیکا وہی حاصل ہے کہ در کار ند اسپر شاید یہ شبہ ہو کہ زمین و آسمان تو ہمارے مسخر و تابع نہیں ہو سکا جواب یہ ہے کہ سخر لکم میں لام صلہ کا نہیں بلکہ نفع کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے منافع و مصالح کیلئے زمین و آسمان کو اور سب چیزوں کو اپنے حکم سے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے تو یہ خدا کی حفاظت و تسخیر کا نتیجہ ہے کہ کھانے میں آپکو لذت آتی ہے ورنہ وبالِ جان ہو جائے پھر کھانے سے اگر سدہ پڑ جائے تو روتے پھرتے ہیں اور علاج معالجہ میں رقمیں صرف کرتے ہیں تو یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی حفاظت ہے کہ کھانیکو منہضم کر کے بآسانی فضلہ کو خارج کر دیا جاتا ہے ورنہ کھانا ہی سم قاتل ہو جائے دنیا کا ایک شعبہ دوست اولاد ہیں جن سے انسان کو بہت تعلق ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں دوست دشمن سے زیادہ مضر ہوتا ہے دشمن محض مال یا جان لیتا ہے اور دوست بسا اوقات ایمان بھی لے لیتا ہے اور ایمان سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ دوستوں کیوجہ سے انسان غیبت و شکایت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس سے ایمان کو نقصان پہونچتا ہے پھر اگر

ع اسی نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملا دیا کہ ظاہر میں باہم مل ہوئے ہیں اور حقیقت میں ان دونوں کے درمیان ایک حجاب قدرتی ہے کہ دونوں آگے بڑھ نہیں سکتے

سہ کیا تم لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں ۱۲ منہ

دوستوں کے خلاف مذاق کام کیا اور وہ دشمن ہو گئے تو وہ دشمنوں سے زیادہ ضرر پہونچاتے
ہیں۔ اولاد کی یہ حالت ہے کہ جب تک باپ کے دستِ نگر ہیں محتاج ہیں سو وقت تک باپ
کو ان سے محبت ہے اُنکو باپ سے ہے اور جب نکاح ہوگیا ملازم ہو گئے اب دیکھو باپ ماں
کو ان سے کتنا تعلق ہے اور اُنکو باپ ماں سے کتنا تعلق ہے بعض دفعہ باہم ایک دوسرے
کی صورت سے نفرت کرنے لگتے ہیں پس والدین کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہمکو اولاد سے محبت
ہے بلکہ باپ کو اپنی ذات سے محبت ہے ورنہ اولاد کے نقصان پر تو رونا نفع پر کیوں روتا
ہے مثلاً معصوم بچہ کا مر جانا خود بچہ کیلئے تو نافع ہے کیونکہ بالغ ہو کر نہ معلوم جنتی ہوتا یا دوزخی
اور ابتو بلاشبہ جنتی ہے مگر والدین روتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ باپ ماں کو اپنی راحت
سے محبت ہے اسی طرح بعض لوگ اپنے معتقدوں کی کثرت سے خوش ہیں مگر حقیقت میں
کوئی کسی کا معتقد نہیں بلکہ ہر ایک اپنا معتقد ہے اگر تم اُن کے خلاف مذاق کام کرو تب
دیکھو وہ کیسے معتقد رہتے ہیں۔ ایک واعظ کی ڈاڑھی لمبی تھی وہ وعظ کہہ رہے تھے اور ایک
۱۰ دیہاتی رو رہا تھا واعظ صاحب خوش تھے کہ میرے وعظ کا اثر ہوا مگر اب یہ چاہا کہ لوگوں
کے سامنے بھی اُس سے اسکا اقرار کرا دیں اسلئے اُس دیہاتی سے پوچھا کہ تو کس بات پر
رو رہا تھا کہا مولوی صاحب تمہاری ڈاڑھی جب ہلتی تھی تو مجھے اپنا بکرا یاد آتا تھا جو مر گیا ہے
کیونکہ اُسکی ڈاڑھی بھی اسی طرح ہلتی تھی سو حقیقت میں سب اپنے بکرے کے معتقد
ہیں تم خواہ مخواہ اُن کے ہاتھ اپنی بکری مت کرو یاد رکھو تمہارا دوست خدا کے سوا
کوئی نہیں اللہ تعالیٰ کو آپ سے کوئی نفع نہیں پھر بھی وہ آپ کو چاہتے ہیں بلکہ تم تو
اُنکو کیا نفع دیتے وہ خود اپنے گھر سے تم کو بہت کچھ دیتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ اولاد اور
دوستوں سے بالکل محبت نہ ہونی چاہئے کیونکہ اگر محبت نہ ہوگی تو حقوق ادا نہ ہوں گے
اسلئے یہ محبت سنت کے خلاف نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حسنین سے
بہت محبت تھی حتیٰ کہ ایک بار یہ صاحبزادے لڑکھڑاتے ہوئے مسجد میں ایسے وقت آگئے
کہ حضور منبر پر خطبہ فرما رہے تھے اُن کے قدموں کو ڈگمگاتا ہوا دیکھکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے خطبہ کے درمیان
میں اتر پڑے اور ان کو آغوش میں لے لیا اور خطبہ شروع کیا۔

گر حقیقت میں یہ رحمت و شفقت ہے جسکی صورت محبت کی سی ہے ورنہ حقیقی محبت آپ کو مخلوق سے ہرگز نہ تھی اسی لئے حدیث میں ہے لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا وَلٰكِنْ اُخُوَّةُ الْاِسْلَامِ صَاحِبُكُمْ خَلِيلُ اللّٰهِ گر صورۃ ازواج و اولاد کے اس تعلق کو محبت کہدیا گیا ورنہ حقیقت میں آپکو صرف اللہ تعالیٰ ہی سے محبت تھی اور جسکو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو اُسکو بڑی بیفکری ہے کیونکہ اسکا محبوب ایسا ہے جو نہ کبھی بیمار ہو سکتا ہے نہ ہلاک ہو سکتا ہے رہی ناراضی کی تکلیف جو حق تعالیٰ اپنے بندہ سے کبھی روٹھتے ہی نہیں بلکہ بندہ خود روٹھتا ہے کہ نافرمانی کرنے لگتا ہے سو یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم خود مت روٹھو اور اگر کبھی روٹھ جاؤ تو توبہ کر لو توبہ سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور جو امور غیر اختیاری ہیں اُن سے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہی نہیں اور اختیاری امور میں بھی اُن خطاؤں پر ناراض ہوتے ہیں جن میں خطا کا قصد کیا گیا ہو اور اگر اجتہادی غلطی ہو تو اس پر تو ثواب ملتا ہے غرض دنیا کی محبت میں کچھ حلاوت نہیں اُسکی حقیقت میں غور کرو تو یہ خود قابل نفرت ہے دیکھئے صحت دنیا میں بڑی نعمت ہے مگر جسکی صحت اچھی ہو اور خدا

۱۱ اُسکو بڑی عمر دیدے کہ سَو سوا سو برس کا ہو جائے تو اب اُسکی حالت دیکھو کہ بڑھاپے میں موت کی تمنا کرنے لگتا ہے ہماری نانی کی بڑی عمر ہوئی تھی مگر وہ ہمیشہ موت کی تمنا کرتی تھیں پس خدا کی حالت کو بوڑھوں سے اور عمر رسیدہ لوگوں سے پوچھو یہ معنی ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ طالبان دنیا کو اپنے مطلوب کی بھی خبر نہیں اس کا ایک تو یہی مطلب ہے کہ دنیا دار کو دنیا کی حقیقت معلوم نہیں اس کے انجام سے وہ بیخبر ہیں دوسرے دنیا دار اس معنی کر بھی دنیا کو نہیں جانتے کہ وہ محض ساز و سامان کو دنیا سمجھتے ہیں حالانکہ دنیا کی روح راحت ہے اور وہ ان لوگوں کو حاصل نہیں کیونکہ یہ لوگ تکلیفات میں مقید ہیں ان کی زندگی تصنع اور تکلف کی وجہ سے بے تکلف ہے ان کو راحت نصیب نہیں چنانچہ عورتیں آپس میں ملتی ہیں تو ان کا ملنا محض نفاق اور بناوٹ سے ہوتا ہے ملنے سے جو مقصود ہے یعنی راحت وہ ان کو حاصل نہیں اسی طرح رسوم شادی میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں مگر دل اندر سے رنجیدہ ہوتا ہے کہ بہت رقم لگ گئی قرض بہت ہو گیا کہاں سے اتریگا بس زندگی تو اہل اللہ کی ہے یا بچوں کی کہ ان میں تکلف نہیں ہوتا اور

یاد رکھو راحت ہمیشہ بے تکلفی سے ہوتی ہے اہل دنیا بات کرتے ہیں تو حضور مجبور کہتے ہیں یا
جناب کہتے ہیں جو جناب سے مشتق ہے اور غریبوں میں ایسی سادگی ہے کہ ایک گاؤں والا میرے
پاس آیا میں نے کہا کھانا کھائیے کہنے لگا کہیں تو گھر کھا چکا وہ بھی تیرا ہی ہے مجھے اس کی
سادگی سے بہت ہی مسرت ہوئی کہ لوگوں کے القاب و آداب سے بھی وہ مسرت نہ ہوتی حضرت
مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ دنیا داروں کے پاس بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
جیسے پنجرہ میں مقید ہو جاتے ہیں میں خود اپنی حالت بیان کرتا ہوں کہ میں دعوت میں ایک
پر تکلف صاحب کیساتھ شریک ہو گیا وہ چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے تھے اور بڑے تکلف
سے کھاتے تھے انکی ساتھ مجھے بھی آہستہ کھانا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا پیٹ نہ بھرا کیونکہ
اس طرح کھانے سے سیری نہیں ہوتی اسی طرح ایک داعی کھانا کھلاتے ہوئے میرے اوپر مسلط
ہو گئے کہ ہر چیز میرے سامنے رکھتے جاتے تھے کہ یہ کھاؤ اور وہ کھاؤ اس سے بھی میرا کھانا منغص
ہو گیا اب میں نے شرط کر لی ہے کہ جب دعوت کرو تو بتلا دو کہ میرے ساتھ کھانے میں کون کون
شریک ہوگا بعض دفعہ میں یہ شرط کر لیتا ہوں کہ تنہا کھاؤں گا خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ۱۲
اُس نے ہم کو ملانوں میں داخل کر دیا ہے اس لئے ان پابندیوں کی فکر نہیں ہے خدا تعالیٰ والد
کی قبر کو ٹھنڈا کرے کہ وہ مجھے ملانوں میں داخل کر گئے ہیں اگرچہ پورا ملا تو نہ ہوا مگر سینگ کٹا کر
بچھڑوں میں تو داخل ہو گئے آجکل کی تہذیب کا یہ حال ہے جو سراسر تعذیب ہے کہ میرے
پاس کانپور میں ایک دار وغہ آئے جبکہ میں مسجد کے اندر حدیث کا درس دیتا تھا وہ آدھ گھنٹہ
تک لب فرش کھڑے رہے کیونکہ وہ کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تھے فرش پر بیٹھنے سے
مجبور تھے آخر کار واپس ہو گئے پھر ایک صاحب سے شکایت کی میں آدھ گھنٹہ تک کھڑا رہا
مجھ سے ایک بات نہ کی نہ میرے پاس آئے میں تو بوٹ جوتوں کی وجہ سے کہ ان کا کھولنا
باندھنا وقت طلب ہے مجبور تھا انہوں نے جواب دیا کہ تم بوٹ جوتوں میں قید تھے وہ
حدیث و قرآن میں قید تھے اب خود انصاف کر لو کہ کس کا عذر قوی ہے افسوس یہ لوگ اسقدر
تو مقید ہیں اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم آزاد ہیں کیا آزاد ایسے ہی ہوتے ہیں جو سر سے پیر تک
فیشن میں جکڑے ہوئے ہیں بس انکی آزادی کی حقیقت یہ ہے کہ دین سے اور خدا سے

آزاد ہیں آزاد حقیقت میں اہل اللہ ہیں کہ جہاں چاہیں بیٹھ جائیں خواہ تخت ہو یا کرسی یا فرش ہو یا زمین اور ہر لباس میں رہ سکتے ہیں خواہ قیمتی ہو یا گھٹیا صاف ہو یا میلا پھٹا ہوا ہو یا سالم کسی سے اُن کو عار نہیں ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　ما نمی خواہیم ننگ و نام را

ہاں البتہ اُن کو ایک قید ضرور ہے وہ یہ کہ محبوب کی آغوش میں بیٹھے ہوئے ہیں اس سے الگ نہیں ہو سکتے یعنی اُسکی مرضی کے تابع ہیں مخالفت نہیں کر سکتے مگر یہ قید ایسی لذیذ ہے ؎

اسیرت نخواہد رہائی ز بند　　شکارت نجوید خلاص از کمند

اس قید میں اُنکو راحت ہے اس سے نکلنا اُنکے واسطے موت ہے عارف رومی فرماتے ہیں ؎

از فراق تلخ می گوئی سخن ؛　　ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

پس آزاد یہ لوگ ہیں ورنہ دنیادار تو ایسے مقید ہیں کہ خدا کی پناہ بھلا اور تو اور میرٹھ کے ضلع میں بعض دیہات کے چمار عیسائی ہو گئے ہیں تو اُن کے فیشن کی یہ حالت ہے کہ دن بھر جوتے بناتے اور سیتے ہیں اور شام کو پھٹا پرانا کوٹ پتلون اور بوٹ پہنکر (جو نیلام ۱۴
میں سستا خرید لیا جاتا ہے ۱۲) تفریح کیواسطے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالکر سڑکوں پر نکلتے ہیں اور کھانا کھانے کی یہ صورت ہے کہ ایک تختہ کے اوپر کھانا رکھ لیا جسکے نیچے اینٹیں رکھ لیں اور گھڑے اُلٹے کر کے اُن پر بیٹھ گئے اور ہول کے کانٹوں سے روٹی کھاتے ہیں دنیاداروں کی ریس میں چماروں کی بھی آزادی سلب ہو گئی کہ اب وہ بے تکلف جس طرح گاؤں والے رہا کرتے ہیں نہیں رہ سکتے مجھے انہی لوگوں میں کا ایک قصہ یاد آیا کہ ایک عیسائی چمار کوٹ پتلون پہنے ہوئے رات کو جا رہا تھا کہ راستہ میں بارش زور سے آ گئی سامنے نہر کی چوکی تھی جسمیں ایک مسلمان چوکیدار جس کا نام ظہور علی تھا سو رہا تھا یہ صاحب بہادر چوکی پر پہونچ اور جا کر آواز دی او جہور لی او جہور لی کواڑ کھول صاحب باہر کھڑے ہیں (یعنی کواڑ کھول دے صاحب باہر کھڑے بھیگ رہے ہیں) چوکیدار گھبرا کر اٹھا کہ شاید نہر کا کوئی افسر آ گیا ہے اُس نے کواڑ کھولے اور اس سے پوچھا کہ صاحب کہاں ہیں کہا جہور ہم ہیں نہیں (او ہم ہیں نہیں) ظہور علی نے جوتا نکال کر دس پانچ رسید کئے کہ

بدمعاش صاحب بہادر بنا پھرتا ہے جا اپنا راستہ لے غرض دنیا دار سراسر قید اور تکلیف میں ہیں
انکو خاک راحت نہیں واقع میں عیش و راحت اہل اللہ کو ہے جس کا ایک گر ہے اور
یہی گر اُن کی آزادی کا راز ہے وہ یہ کہ غم کی یہ حقیقت یہ ہے کہ امید کے خلاف کوئی
بات ہو عورتیں اس کو ضرور سنیں کیونکہ ان کو امیدیں بہت ہوتی ہیں کہ بہاوج کے
واسطے مجھے یوں کرنا چاہیئے تو وہ بھی میری ساتھ ایسا ہی تو کرنگی نند کے واسطے یوں
کرنا چاہیئے ورنہ وہ یوں کہے گی غرض رشتہ داروں اور دوستوں اور نوکروں وغیرہ
سے جو رنج پہونچتا ہے اُسکی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو ان سے امیدیں ہوتی ہیں اہل اللہ نے
اس جھڑی کو اُڑا دیا ہے یعنی انکو کسی سے کچھ امید نہیں ہے مخلوق سے سب امیدوں کو
قطع کر دیا ہے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اسی مضمون کو بیان فرمایا کہ بھائی کسی
سے توقع مت رکھو پھر خدام سے فرمایا کہ بتلاؤ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو انہوں نے عرض کیا
کہ حضرت ہمارے مربی ہیں محسن ہیں حضرت کا ہم پر وہ احسان ہے جس کا شکریہ ادا
نہیں ہوسکتا فرمایا کہ میں تم کو دل سے کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی کچھ توقع نہ رکھو بس خدا ۱۴
سے امید رکھو اور کسی سے مت رکھو تو ایسا شخص جس کی رگ رگ میں توحید بسی ہوئی
ہو اُسکو کسی سے کیا رنج ہوسکتا ہے اسی کو سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

گر گزندت رسد ز خلق مرنج — کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست — کہ دل ہر دو در تصرف اوست

مگر اس کا یہ اثر نہ لینا کہ تم خدا ہی سے روٹھ جاؤ کہ سب تکالیف وہی پہونچاتے ہیں بات یہ
ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں درحقیقت وہ تمہاری ہی مصلحت ہے اسکی ایسی مثال
ہے جیسے بچہ کی آنکھیں دکھتی ہیں تو ماں اُسکی آنکھوں میں جست وغیرہ بھرتی ہے بچہ اس سے
بہت روتا ہے اور اسوقت ماں پر غصہ کرتا ہے مگر سمجھدار ہوکر ماں کو دعا دیگا کہ اگر وہ ایسا
نہ کرتی تو آج میں بالکل اندھا ہوتا اسیطرح صبح کو ماں بچہ کا منہ دھوتی ہے آنکھوں سے چیپڑ اور ناک
سے جو ہے تو چھینی ہی بچہ اس پر بھی روتا ہے مگر کون نہیں جانتا کہ اسمیں سراسر بچہ کی ہی بھلائی ہے
مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرے سر میں بڑے بڑے بال تھے اُن میں میل بہت جم گیا تھا

اور کئی ہفتہ سے سر نہ دہویا تھا نانی صاحبہ میرا سر دہونا چاہیں مگر میں بھاگ جاتا تھا جب بہت دن ہوگئے تو نانی صاحبہ نے یہ ترکیب کی کہ میرے آنے سے پہلے پیالے میں کھلی بھگودی اور جب میں گھر میں آیا تو دفعۃً میرے سر میں کھلی لپیٹ دی اُسکے دہونیکے لئے مجبوری مجھے سر دہونا پڑا تو اُسوقت اُن کا یہ فعل مجھے ناگوار ہوا مگر آج اُنکی محبت کی قدر کر رہا ہوں اسی طرح حق تعالے جو نکو رنج و تکلیف دیتے ہیں حقیقت میں وہ تمہاری بھلائی کرتے ہیں یہاں بھی اور آخرت میں بھی کیونکہ اگر یہاں بلائیں نہ آئیں تو ہمکو خدا کی طرف توجہ نہو قاعدہ یہی ہے کہ انسان کو مصیبت میں خدا یاد آتا ہے اگر مصیبت نہ ہو تو انسان فرعون بیسامان ہو جائے اور اس حالت میں اگر موت آگئی تو بجائے دنیا کے تم آخرت میں نار جہنم کے ذریعہ سے پاک کئے جاؤگے میں آپکو بشارت سُناتا ہوں کہ مسلمانوں کے حق میں عذاب جہنم تطہیر کیلئے ہے تعذیب کے لئے نہیں ہے اور اسکو تم بھی جانتے ہو کہ گھر کا چراغ چکٹ جائے تو اُسکو آگ میں ڈالکر صاف کیا جاتا ہے تو تم خدا کے گھر کے چراغ ہو مگر چکٹے ہوئے ہو اسلئے جہنم کی آگ سے تمہارا میل صاف

15 کیا جائیگا اور اگر دنیا ہی میں میل صاف ہوگیا تو پھر آخرت میں صفائی کی ضرورت نہ ہوگی پس اللہ تعالیٰ دنیا میں مسلمان کو مصائب و تکالیف دیکر اُس کا میل صاف کرتے ہیں اب بتلاؤ یہ تمہارے حق میں بھلائی ہے یا نہیں یہ تو آخرت کی بھلائی اور دنیا کی بھلائی یہ ہے کہ مصائب و تکالیف سے انسان کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں اور اخلاق کی درستی سے بہت راحت ملتی ہے کیونکہ بدخلق سے سبکو وحشت ہوتی ہے لوگ اُسکو ذلیل سمجھتے ہیں نیز اسکے دلپر دنیا کی حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ دنیا دل لگانیکی چیز نہیں ہے اور یہ بڑا علم ہے اگر یہ علم حاصل نہ ہو تو آدمی ہمیشہ جہل میں مبتلا رہے اور جہل بڑا عیب ہے پس اللہ تعالیٰ کیطرف سے جو تم پر امتحانات وارد ہوتے ہیں اُنکی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص مالیخولیا کی وجہ سے یہ سمجھتا تھا کہ میرا بدن شیشے کا ہے اسلئے وہ ہر شخص سے دور بھاگتا تھا کہ میرے بدن کو ہاتھ نہ لگانا ٹوٹ جائیگا لوگ اُسکو حکیم کے پاس لائے حکیم نے کہا کہ تیرا بدن شیشے کا ہے کہا ہاں تو اُس نے بہت سے شیشے منگائے اور مریض کو کمبل اُوڑھا کر شیشوں کو توڑنا شروع کیا اور کہا ہم نے تمہارے بدن کے شیشے توڑ دیئے وہ بہت رویا چلایا حکیم نے کہا گھبراؤ نہیں ان

شیشوں کے نیچے سے مضبوط کھال اور ہڈیاں نکلیں گی جو کسی کے ہاتھ لگانے سے شکستہ نہ ہونگی چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد کمبل اوتار لیا اور کہا دیکھو اوپر کے شیشے ہم نے توڑ دیئے اور اب تمہارا مضبوط بدن اندر سے نکل آیا مریض کو یقین آگیا اور وہ سمجھ گیا کہ میں مضبوط تندرست ہوں اور سب مالیخولیا جاتا رہا اسی طرح اللہ تعالیٰ ان مصائب کے ذریعے ہمارے مالیخولیا کا علاج کرتے ہیں مگر ہمکو اس حکمت کی خبر نہیں اس واسطے روتے ہیں اور میں آپ سے کیا کہوں کہ اہل اللہ کو مصائب میں کیا نظر آتا ہے بس یہ کہتا ہوں کہ انکو ہر واقعہ کی حکمت کھلی آنکھوں نظر آتی ہے اسلئے وہ کسی کلفت سے پریشان نہیں ہوتے پس انکی راحت کا راز یہ ہے کہ مخلوق سے انکی امیدیں منقطع ہو چکی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہر فعل کو حکمت و مصلحت پر مبنی سمجھتے ہیں نیز انکو اللہ تعالیٰ سے محبت بھی ہے اسلئے اگر حکمت و مصلحت بھی معلوم نہ ہو تو محبت کی وجہ سے وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجان من

اور کہتے ہیں ؎ ۱۴

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو — دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اب بتلاؤ راحت میں کون ہے صاحبو! سچ یہ ہے کہ دنیا والوں کو کچھ راحت نہیں وہ کھانا کھاتے ہیں اور کھانا اُن کو کھاتا ہے کیونکہ جس شخص کے لئے پھانسی کا حکم دیدیا گیا ہو اُس کو ظاہری سامان عیش سے راحت کب مل سکتی ہے؟ اسی طرح جس شخص پر جرائم تعزیرات الٰہیہ قائم ہیں اور وہ جانتا ہے کہ میں خدا کا مجرم ہوں اُس کو دنیا میں راحت کیونکر مل سکتی ہے اور اہل اللہ کی شان یہ ہے کہ اُن کے پاس کچھ نہیں ہے مگر خوش ہیں کیونکہ ایک چیز اُن کے پاس ایسی ہے کہ اُسکے ہوتے ہوئے اُن کو کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے وہ کیا ہے؟ وہ آغوش محبوب ہے رضائے محبوب ہے لذت طاعات ہے لذت مناجات ہے لذت قرب ہے جسکو عارف رومی فرماتے ہیں ؎

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں — فوق گردون ست نے قعر زمیں
ہر کجا یوسف رخ باشد چو ماہ — جنت آن گرچہ باشد قعر چاہ

اور اسپر تعجب نہ کیجئے کہ ان لذتوں کی وجہ سے تکالیف کا برداشت کرنا کیونکر آسان ہوگیا جو شخص کسی پر عاشق ہوا ہو وہ اسکو سمجھ سکتا ہے ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ ایک لڑکے پر عاشق ہوگیا تھا اور وہ لڑکا طبیب تھا ایک دفعہ وہ شخص بیمار ہوا تو وہی لڑکا معالج بنا اب اس مریض کی یہ حالت تھی کہ اپنے لئے طول مرض کی دعا مانگتا تھا کہ خدا کرے میں کبھی اچھا نہوں تاکہ یہ لڑکا ہمیشہ معالجہ کو آتا رہے تو دیکھئے اس مریض کیلئے مرض کی کلفت محبت کیوجہ سے آسان ہوگئی اب اگر اہل اللہ کا خدا کی محبت میں یہ حال ہو جائے کہ تمام مصائب انکو آسان ہو جائیں کہ قید خانہ سے تکلیف ہو نہ فاقہ سے کلفت ہو تو کیا تعجب ہے سب سے زیادہ ناگوار چیز موت ہے مگر وہ بھی ان کیلئے آسان ہے کیونکہ موت کیوقت انکو بشارت ملتی ہے یَآ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ[عہ] دوسری آیت میں ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ[عہ] نیز حدیث میں آتا ہے کہ ملائکہ یوں کہتے ہیں اَیَّتُهَا الرُّوْحُ الطَّیِّبَةُ اخْرُجِیْ اِلٰی رَوْحٍ وَّرَیْحَانٍ وَّرَبٍّ غَیْرِ غَضْبَانَ اے پاکیزہ روح چل راحت و آرام کیطرف چل اپنے پروردگار کے پاس جو تجھ سے ناراض نہیں ہے اسکے بعد قبر کا

مرحلہ ہے وہاں بھی ان کیواسطے بشارت ہے فرشتے کہتے ہیں نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ کہ دولہا کیطرح بےفکر سوتے رہو اسکے بعد حشر کا مرحلہ ہے وہاں انکی یہ شان ہے لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ هٰذَا یَوْمُکُمُ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ[عہ] کہ انکو اس ہولناک دن میں بھی کوئی خطرہ نہوگا وہاں بھی فرشتے انکا استقبال کرینگے اور بشارت سنائینگے مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب نے اسی کا ترجمہ فرمایا ہے

عاشقاں را روز محشر باقیامت کار نیست ﻫ عاشقاں را جز تماشای جمال یار نیست

پلصراط پر مولانا رومی نے کسی روایت سے انکی یہ حالت لکھی ہے کہ پلصراط سے گذر کر وہ ملائکہ سے پوچھیں گے کہ ہم نے تو یہ سنا تھا کہ پلصراط جہنم کے اوپر ہے مگر ہم کو راستہ میں جہنم

۱۷

عہ اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کے جوار رحمت کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش ہو پھر ادھر چلکر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

عہ جن لوگوں نے دل سے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اسپر قائم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو نہ رنج کرو اور تم جنت کے ملنے پر خوش رہو جس کا تم سے پیغمبروں کی معرفت وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔

نظر نہیں آیا فرشتے کہیں گے کہ تمکو راستہ میں باغات نظر آئے تھے؟ کہیں گے ہاں فرشتے کہیں گے کہ وہ جہنم ہی تھا مگر تمہاری قوت ایمان کی برکت سے وہ تمکو باغ کی صورت میں نظر آیا پھر تبلاؤ انکو کیا غم ہاں جن حضرات کی کچھ اتباع بھی ہیں انکو ایک غم ہوگا اپنے تابعین کا انبیاء علیہم السلام کو اپنا کچھ غم نہوگا ہاں امت کا غم ہوگا حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا تُسَوِّدُوْا وَجْهِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ آہ اس کا ترجمہ کرنیکی بھی ہمت نہیں زبان کانپتی ہے مگر ضرورت کیوجہ سے کرتا ہوں حضور فرماتے ہیں کہ دیکھو قیامت میں میرا منہ کالا کرنا یعنی مجھے شرمندہ نکرنا کہ تمہارے اعمال بد کیوجہ سے مجھ انبیاء کے مجمع میں شرمندگی ہو فَدَيْنَاكَ بِآبَائِنَا وَأُمَّهَاتِنَا وَأَنْفُسِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَجْهُكَ وَاللّٰهِ أَضْوَءُ مِنَ الشَّمْسِ وَأَنْوَرُ مِنَ الْقَمَرِ وَيَتَّقِي السَّوَادُ إِلَّا وُجُوْهَنَا وَوَجْهُكَ بِمَرَاحِلَ مِنْهُ وَبِمَعْزِلٍ مِنْهُ اللّٰهُمَّ بَيِّضْ وُجُوْهَنَا بِبَرَكَتِهٖ عَنِ النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحَابَتِهٖ وَسَلَّمَ دَائِمًا أَبَدًا عَدَدَ مَا يُحِبُّ وَكَمَا يَرْضٰى ۱۲ ظ) مقاصد حسنہ میں حدیث ہے کہ مومن جب پلصراط پر سے گذریگا تو دوزخ کہے گی جُزْ يَا مُؤْمِنُ فَاِنَّ نُوْرَكَ قَدْ اَطْفَأَ نَارِيْ اے مسلمان جلدی سے گذر جا کہ تیری نور نے تو میری آگ کو بھی بجھا دیا تو جب نور

١٨ ایمان میں یہ خاصیت ہے کہ دوزخ کی آگ کو بھی بجھا دیتا ہے تو دنیا کے ہموم وغموم واحزان کی تو حقیقت ہی کیا ہے مگر ضرورت اسکی ہے کہ ہم اپنے ایمان میں نور پیدا کریں اسی کی کمی کیوجہ سے ہماری دنیا وآخرت برباد ہو رہی ہے اگر یہ نور حاصل ہو جائے تو واللہ دنیا وآخرت کی راحتیں ہمارے ہی واسطے ہیں پھر ہمارے پاس غم ورنج کا نام ونشان بھی نہ رہے ہاں ایک غم رہیگا خدا کی لقاء ورضا کا سو یہ غم لذیذ ہے اگر یہ حاصل ہو جائے تو آپ ہفت اقلیم کی سلطنت پر لات ماردیں گے باقی دنیا کا کوئی غم پاس نہ آئیگا چنانچہ ایک بزرگ کے پاس ایک بادشاہ نے بڑا قیمتی موتی بھیجا بزرگ نے اسکو دیکھکر کہا الحمدللہ اور خادم سے فرمایا کہ اسکو احتیاط سے رکھدو کچھ عرصہ کے بعد خادم نے عرض کیا کہ موتی چوری ہوگیا بزرگ نے فرمایا الحمدللہ خادم نے دریافت کیا کہ

ہم یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے باپ اور مائیں اور ہماری جانیں آپ پر فدا ہوں خدا کی قسم آپ کا چہرہ سورج سے زیادہ روشن اور چاند سے زیادہ منور ہے اور سیاہی تو ہمارے ہی چہروں پر ہے اور آپ کا چہرہ تو اس سے پاک ہے اے خدا ان نبی کریم کی برکت سے ہمارے چہروں کو اس دن منور کیجیو جس دن کہ چہرے روشن ہوں درود ورحمت ہو اللہ کی آپ پر اور آپکے آل واصحاب پر ہمیشہ ہمیشہ

دونوں حالتوں میں الحمدللہ کس لئے فرمایا اگر آنیکی خوشی تھی توجانیکا رنج ہونا چاہیئے تھا اسوقت
الحمدللہ کا کیا موقع اور اگر جانیکی خوشی ہوئی تو آنے پر رنج ہونا چاہیئے تھا تو اسوقت الحمدللہ کیوں فرمایا
بزرگ نے فرمایا کہ میں نے الحمدللہ نہ اُسکے آنے پر کہا نہ جانے پر بلکہ اپنے دل کی حالت پر الحمدللہ کہا ہے
جب یہ ہونی آیا تھا تو میں نے اپنے دلکو دیکھا کہ کچھ خوشی ہوئی یا نہیں معلوم ہوا کچھ خوشی نہیں اسپر
الحمدللہ کہا جب وہ چوری ہوگیا تو میں نے پھر اپنے دلکو دیکھا کہ کچھ رنج ہوا یا نہیں معلوم ہوا
کچھ رنج نہیں ہوا تو اسپر میں نے الحمدللہ کہا کہ نہ آنیکی خوشی ہوئی نہ جانیکا رنج ہوا بتلایئے جس شخص
کا یہ حال ہو اُسکے پاس رنج و غم کیوں آئیگا اسی طرح حضرت غوث اعظم رح کے پاس کہیں سے ایک
چینی آئینہ بڑا قیمتی ہدیہ میں آیا آپ نے خادم کے حوالہ فرمادیا کہ کنگھا کرنیکے وقت ہمارے سامنے رکھدیا
کرو ایکدفعہ اتفاق سے وہ آئینہ خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا وہ ڈرا کہ دیکھیئے آج شیخ کس قدر ناراض
ہوں گے چنانچہ ڈرتے ڈرتے اُس نے عرض کیا ؎ از قضا آئینہ چینی شکست ؛ حضرت
غوث اعظم نے برجستہ فرمایا ؎ خوب شد اسباب خود بینی شکست ؛ نیز حدیث میں ہے حضرت انس
19 صحابی رضہ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی مگر آپ نے
کسی بات پر یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں ہوا اور یوں کیوں نہیں ہوا حضرت انس رضہ حضورؐ کی خدمت
میں آئے ہیں تو اُنکی عمر دس سال کی تھی بالکل بچے تھے وہ کہتے ہیں کہ بعض دفعہ حضورؐ مجھکو کسی کام
کا حکم دیتے کہ یہ کام کرو تو یہ زبان سے کہدیتے کہ میں تو نہ کرونگا مگر دل میں ارادہ ہوتا تھا کہ ضرور
کرونگا آپؐ اسپر بھی بُرا نہ مانتے تھے بعض دفعہ کسی کام کو جاتے اور راستہ میں کھیلنے لگتے
اور اتفاقاً حضورؐ کا گذر ہوتا تو آپ ان کے کان پکڑ کر فرماتے کہ تم تو کہتے تھے میں جاؤنگا یہ
ہنسکر عرض کرتے یا رسول اللہؐ ابھی جاتا ہوں غرض کسی بات پر آپ غصہ نہ کرتے تھے اس کا راز
وہی ہے کہ آپ کی نظر ہر وقت خدا پر تھی مخلوق پر نظر نہ تھی اس لئے آپ کو کسی کے فعل
سے رنج نہ ہوتا تھا مگر یہ برتاؤ ذاتی خدمت کے متعلق تھا جنکا تعلق خاص آپکی ذات سے تھا
امور شرعیہ کے بارے میں یہ برتاؤ نہ تھا کیونکہ احکام شرعیہ کی مخالفت پر تو آپکو اتنا غصہ آتا
تھا کہ کوئی برداشت نہ کرسکتا تھا یہی شان اہل اللہ کی ہے غرض اللہ تعالیٰ آپ صاحبوں
کے واسطے ایسی زندگی چاہتے ہیں کہ جس میں راحت ہی راحت ہو رنج کا نام نہ ہو اور

اُس کا طریقہ یہ ہے کہ نورِ ایمان کو کامل کیا جائے اور نورِ ایمان کے کامل کرنے کا طریقہ وہ
ہے جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی ذکر و فکر جس کو دوسرے مقام پر اس عنوان
سے ارشاد فرمایا ہے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ کہ ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ کل کے
واسطے کیا سامان کیا ہے یعنی اپنے اعمال کا محاسبہ کرو کہ آج دن بھر میں کتنے کام کئے
ہیں کتنے نیک کام ہوئے کتنے گناہ ہوئے جو نیک کام ہوئے ہوں اُن پر خدا کا
شکر کرو اور جو گناہ ہوئے ہوں اُن سے توبہ و استغفار کرو اسی کام کے لئے ایک وقت
مقرر کرو اور ہر وقت کے لئے دستور العمل یہ ہے کہ جو بات کہو سوچ کر کہو جو کام کرو سوچ
کر و بے سوچے کام کرنا اور باتیں بنانا دنیا و آخرت دونوں کو مضر ہے بس ہر کام سے
پہلے اُس کے انجام کو سوچ لو جس سے دوستی کرو اُسکی حالت دیکھ لو کہ دوستی کے قابل
ہے یا نہیں حدیث میں ہے اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالِلُ انسان اپنے
دوست کے دین پر ہوتا ہے یعنی دوست کی دینی حالت کا اثر اس کے دین پر ضرور
ہوتا ہے پس ہر شخص دیکھے کہ کس سے دوستی کر رہا ہے یعنی اُس کی دینی حالت
کیسی ہے پس دوستی دیندار لوگوں سے کرو بد دینوں کو دوست نہ بناؤ اسی طرح
جس سے دشمنی کرو اس کو بھی دیکھ لو کہ دشمنی کے قابل ہے یا نہیں کفار و فساق
سے حدود کے اندر عداوت رکھو مسلمانوں سے اور صلحاء سے دشمنی نہ کرو کہ
اُس کا وبال سخت ہے اسی طرح ہر کام میں غور کرو جس کی تفصیل تو بہت طویل
ہے مگر میں آپ کو ایک گر بتلاتا ہوں کہ ہر کام میں یہ سوچ لو کہ اس کام سے ہم کو گناہ
تو نہ ہوگا اور ایک یہ سوچ لو کہ اس سے ہم پر کوئی ایسی بلا تو نازل نہ ہوگی جسکی برداشت
نہ ہو سکے اس کے بعد آپکی زندگی بہت پر لطف ہوگی ایسی ہی زندگی اللہ تعالیٰ آپ کے
واسطے چاہتے ہیں اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں صرف دو باتیں رہ گئیں ایک تو آیت
کا ترجمہ جس کی تلاوت کی گئی ہے دوسرے دستور العمل کا خلاصہ بتلانا۔ سو وہ دستور العمل
تو یہ ہے کہ ہر کام اور ہر بات سوچ کر کرو دوسرے اپنے اعمال کا حساب
کتاب کیا کرو اپنی نافرمانیوں کو سوچا اور اُن سے توبہ کرو اور عذاب کو یاد کرو اس سے

حیا اور خوف پیدا ہوگا پھر جو اعمال حسنہ ہوئے ہیں اُن کو سوچو اور خدا کا شکر بجا لاؤ
اور جنت کی نعمتوں کو یاد کرو اس سے محبت و شوق پیدا ہوگیا اور جس شخص میں حیا و
خوف اور محبت و شوق پیدا ہوجائے اُس سے کہیں نافرمانی ہوسکتی ہے ہرگز نہیں
بلکہ اس سے زیادہ فرمانبردار کوئی نہ ہوگا یہی مقصود تھا اور مجھے یہی بتلانا تھا کہ فکر ایسی
محمود چیز ہے کہ دین کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہوسکتی اور دین کی اصلاح و تکمیل
کا سہل و آسان طریقہ اس سے بہتر نہیں کہ فکر سے کام لیا جائے اسی کو اللہ تعالےٰ
نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور فکر کی ساتھ ذکر کو بھی بیان فرمایا ہے اب
میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین
کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں (توحید
کے اور دنیا کی حالت و حقیقت جانچنے کے) اہل عقل کے لیئے جن کی حالت یہ
ہے (جو آگے آتی ہے اور ایسی حالت سے اُن کا عاقل ہونا معلوم ہوگا) کہ وہ لوگ (ہر
حال میں دل بھی اور زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے ۲۱
بھی اور آسمان و زمین کے پیدا ہونے میں (اپنی عقل سے) غور کرتے ہیں (کہ ان کا
وجود خود نہیں ہوگیا بلکہ کسی صانع حکیم نے ان کو بنایا ہے کیونکہ جس نظام کے ساتھ
زمین و آسمان کی رفتار ہے وہ بدون کسی چلانے والے کے نہیں ہوسکتی پھر اس کے
بنانیوالے نے اس نظام میں ہمکو ایک خاص عبرت آموز سبق دیا ہے کہ مخلوق میں
کوئی اُونچا ہے کوئی پست ہے کسی میں نور ہے کسی میں ظلمت ہے کسی میں نور زیادہ
ہے کسی میں کم ہے اسلئے تمکو اپنی حالت پر قناعت کرنا چاہیئے اور دوسروں کی حالت
پر حسد نکرنا چاہیئے کیونکہ اسمیں حکمتیں ہیں جیسا زمین و آسمان میں حکمتیں ہیں پھر دنیا
میں یکساں حالت نہیں رہا کرتی بلکہ کبھی دن ہے کبھی رات ہے کبھی روشنی ہے کبھی اندھیرا
ہے اور دونوں کی ضرورت ہے دونوں میں حکمت ہے اسلئے تم پر دو قسم کی حالتیں
آئیں گی بعض گوارا حالتیں ہونگی بعض ناگوار پس تم کو ان سے پریشان نہ ہونا چاہیئے
بلکہ یہ سمجھو کہ جس طرح رات دن میں حکمتیں ہیں اسی طرح ان حالات میں بھی حکمتیں ہیں ان ہی

باتوں کو سوچکر عقلاء کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس (مخلوق) کو بیکار نہیں پیدا کیا (بلکہ اس میں حکمتیں رکھی ہیں) ہم آپ کو (لا یعنی پیدا کرنے سے) پاک اور منزہ سمجھتے ہیں (اسی لئے ہم نے ان کی حکمتوں میں غور کیا اور توحید کے قائل ہوئے کہ جو کچھ ہوتا ہے آپ کے حکم سے ہوتا ہے) سو ہم کو (ایمان کی برکت سے) دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے۔

اس ترجمہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اللہ تعالے نے عقلاء کی ایک تو یہ حالت بیان فرمائی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ تعالے کو یاد کرتے ہیں اس کے لئے میں اول ایک مقدمہ بیان کر دوں پھر اس کی حقیقت سمجھ میں آجائے گی وہ یہ کہ جس کام کو انسان اپنا اصلی کام سمجھتا ہے زیادہ وقت اُسی میں صرف کیا کرتا ہے اور دوسرے کاموں کو اس کے تابع سمجھتا ہے چنانچہ جو شخص اپنے گھر کا حساب کر رہا ہو اُس سے اس حالت میں کوئی ملنے آوے تو گو وہ اُس سے ملیگا مگر دل اپنے حساب میں لگا رہتا ہے اسی طرح
۲۲ عورتیں اپنی حالت میں غور کر لیں کہ جب وہ سینے پرونے میں لگتی ہیں اسوقت کوئی ان سے بات کرے تو بات کا جواب دیدیں گی مگر دل سینے میں رہیگا کیونکہ اُسکو اپنا اصلی کام سمجھ رکھا ہے بس اللہ و رسول کا مقصود یہ ہے کہ تم اللہ کی یاد کو اپنا اصلی کام بناؤ اور سب کاموں کو تابع بناؤ اصلی کام نہ بناؤ حدیث میں لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ کہ تمہاری زبان ہر وقت اللہ کے یاد سے تر رہے اور قرآن میں ہے يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ کہ اللہ کی یاد کھڑے بیٹھے لیٹے ہر وقت کرنا چاہئے مگر دل سے توجہ ہر وقت مشکل تھی اس لئے قربان جائیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے اُس کا آسان طریقہ بھی بتلا دیا کہ ہر وقت زبان کو اللہ کی یاد سے تر رکھو اگر زبان سے اللہ اللہ کرنا ہر وقت یاد نہ رہے تو تسبیح ہاتھ میں رکھو اور ریاء کا خوف نہ کرو کیونکہ ریاء وہ ہے جو قصد و ارادہ سے ہو وسوسہ ریاء ریاء نہیں ہے بہت لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وسوسہ ریاء کو ریاء سمجھکر پریشان ہوتے ہیں پس خوب سمجھ لو کہ ریاء یہ ہے کہ آدمی دل سے یہ ارادہ کرے کہ میں یہ عمل مخلوق کے دکھلانے کو کر رہا ہوں

ع پارہ ۴ ربع

یا اسواسطے کر رہا ہوں کہ لوگ مجھے بزرگ سمجھیں اور اگر دل سے یہ ارادہ نہ ہو محض وسوسہ آئے جسکی علامت یہ ہے کہ اس خیال سے جی بُرا ہو تو یہ ریا نہیں سو ان شبہات میں مت پڑو اور بے فکر ہو کر تسبیح ہاتھ میں رکھو اور کام کرو اور تسبیح کی اصل حدیث ہی سے ثابت ہے اس لئے اس پر بدعت ہونیکا شبہ نہ کرو پھر ذکر میں اختیار ہے خواہ درود پڑھو یا سبحان اللہ الحمد للہ یا اللہ اللہ کرو اور اچھا یہ ہے کہ یا اللہ یا اللہ کرو کیونکہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور اللہ اللہ کہتے ہیں بعض علماء نے کلام کیا ہے گو وہ کلام قابل اعتبار نہیں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے متعلق کسی نے سوال کیا تھا کہ اللہ اللہ کرنے کا حدیث سے بھی ثبوت ہے یا نہیں فرمایا ہاں ثبوت حدیث میں ہے لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰی لَا یُقَالَ فِی الْاَرْضِ اَللّٰہُ اَللّٰہُ دوسرا کام اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ جو لوگ عقل والے ہیں وہ آسمان وزمین اور لیل ونہار کی حکمتوں میں غور کرتے ہیں یعنی وہ سوچ اور فکر سے کام لیتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو فاعل ومتصرف نہیں سمجھتے بلکہ حق تعالیٰ ہی کو خالق ومالک ومتصرف سمجھتے ہیں
٢٣ اور اُن کے ہر کام کو حکمت ومصلحت پر مبنی سمجھتے ہیں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں خدا کی عظمت وجلالت پیدا ہوتی ہے اور خدا کے سوا سب سے نظر قطع ہو جاتی ہے پھر کسی سے امید وتوقع باقی نہیں رہتی بلکہ صرف خدا کو راضی کرنے کا خیال رہ جاتا ہے اور اسکے لئے وہ موت کو سوچتے ہیں قبر کی حالت کو سوچتے ہیں جنت ودوزخ کو سوچتے ہیں کہ ایکدن خدا کے پاس جانا ہے موت کا وقت ضرور آئے گا پھر نہ معلوم کیا انجام ہو اس لئے وہ دوزخ سے ڈر کر اُس سے پناہ مانگتے ہیں اور اس خوف کیوجہ سے ہر کام کو سوچکر کرتے ہیں کہ اس کا انجام دوزخ نہ ہو بس فکر اور ذکر یہ دو چیزیں خلاصہ وعظ ہیں اُن کو لازم پکڑ لو فکر سے دل کے اندر خدا کی یاد جم جائے گی پھر ہر وقت خدا کی یاد آسان ہو جائیگی اور خدا کی یاد وہ چیز ہے جس سے دل کو راحت وسکون اور چین ملتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ اب میں اسی کا ترجمہ ایک بزرگ کے کلام سے کرکے بیان ختم کرتا ہوں مولانا فرماتے ہیں ؎

گر گریزی بر امید راحتے — ہم ازانجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دو و بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

یعنی آرام خلوت گاہ حق کے سوا کہیں نہیں خلوت گاہ حق سے مراد یہ ہے کہ دل میں خدا کی یاد بس جائے کہ ہر وقت اُسی کا دھیان رہے دنیا کا کوئی کام ہوا تو مجبوری کو ضرورت کی وجہ سے کرلیا مگر دل اللہ کی یاد میں رہے اُسکو کرکے دیکھو بڑی راحت کی چیز ہے عورتوں اور مردوں کو سبکو چاہیئے کہ اپنا اصلی کام اللہ کی یاد کو بنالیں دنیا کے کام مجبوری کو کرلیں پھر اللہ اللہ میں لگ جائیں اب میں ختم کرتا ہوں اور کہہ رکھتا ہوں کہ اپنے ہر کام کو پہلے سوچ لیا کرو اور ایک وقت موت کے سوچنے حالات قبر کے سوچنے اور قیامت کے سوچنے کیلئے مقرر کرو اور باقی اوقات میں ذکراللہ میں مشغول رہو اس فکر کا نام مراقبہ ہے اس سے آپکو مراقبہ کی فضیلت معلوم ہوئی ہوگی کہ یہ کتنی بڑی چیز ہے جس کا اللہ تعالٰی نے جا بجا امر بھی فرمایا ہے اور ترغیب بھی دی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے دنیا و آخرت کی راحت حاصل ہوتی ہے اب دعا کرو کہ اللہ تعالٰی ہمکو فہم سلیم اور توفیق عمل عطا فرمائیں آمین ۔ اس بیان کا نام مضمون کے مناسب ۴۴
المراقبہ تجویز کرتا ہوں وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

اشرف علی

۹ رجب المرجب ۴۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

شرائط الطاعۃ

اشتات	المتفرقات؟	من ضبط	من المستمعون؟	ماذا	کم	کیف	کم	متی	این
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
		[illegible]	[illegible]				[illegible]	[illegible]	[illegible]

خطبہ ماثورہ) امابعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لیس من البر الصیام فی السفر یہ ایک حدیث ہے جسکے سمجھنے کیلئے ایک قصہ کے بیان کرنے اور سننے کی ضرورت ہے تا اس قصہ کے سننے کے بعد اس حدیث کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ جاویگا اس سے مجھے ایک مسئلہ کا استنباط کرنا مقصود ہے جو ایک قاعدہ کلیہ ہے اور جو دین میں نہایت ضروری ہے۔ وہ قصہ یہ ہے کہ ایک سفر میں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک بہت سا مجمع ہے لوگ کھڑے ہیں کسی چیز کو گھیرے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ایک شخص نے سفر کی حالت میں روزہ رکھا تھا وہ بیہوش ہو گیا ہے تو گھیرے ہوئے ہیں

اور اسکی حالت دیکھ رہے ہیں اسوقت حضور نے ارشاد فرمایا لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّیَامُ فِی السَّفَرِ یعنی سفر کی ایسی حالت میں روزہ رکھنا کہ انسان مرنے کے قریب پہونچ جاوے اور ہلاکت کی نوبت آجائے کوئی نیکی کا کام نہیں ہے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے اس ترجمہ سے اس حدیث کا صحیح مفہوم سمجھ میں آگیا ہوگا اور اگر نہ آیا ہو تو اب سمجھ لیجئے تاکہ غلطی واقع نہ ہو کیونکہ بعض نے اس حدیث سے یوں سمجھ لیا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا چاہئے ہی نہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے اسواسطے کہ صحابہ نے حضور کے ساتھ اکثر سفر کئے ہیں اور وہ فرماتے ہیں مِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ ہم میں سے بعضے روزہ دار تھے اور بعضے غیر روزہ دار تھے وَلَا یَعِیْبُ بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ لیکن کوئی ایک دوسرے پر ملامت یا عیب گیری نہ کرتا تھا۔ نہ روزہ دار افطار کرنے والوں کی عیب گیری کرتے تھے نہ افطار کرنے والے روزہ داروں کی عیب گیری کرتے تھے اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں دونوں باتیں جائز ہیں روزہ رکھنا بھی اور روزہ نہ رکھنا بھی مگر یہاں عوام ایک غلطی کرتے ہیں اسپر تنبیہ کر دینا ضروری ہے تاکہ بحث متعین ہو جاوے کہ کون سے سفر میں گفتگو ہے کیونکہ وہ گفتگو جو کہ علماء کی ہے اُس کے متعلق تو میں آگے چلکر عرض کرونگا ایک غلطی ایسی ہے جس سے علماء تو محفوظ ہیں لیکن اُسمیں عوام مبتلا ہیں وہ یہ کہ سفر کو بعض عوام مطلق سمجھتے ہیں یعنی کوئی سفر بھی ہو یہاں تک کہ چار یا پانچ آٹھ دس کوس کے سفر میں بھی روزہ افطار کرنیکو جائز سمجھتے ہیں سو خوب سمجھ لیجئے کہ وہ سفر جسمیں روزہ نہ رکھنا جائز ہے وہ سفر ہے جسکے اختیار کرنے سے احکام سفر متعلق ہو جاتے ہیں احکام سفر متعلق ہو جانے میں نے اسلئے کہا کہ بعض احکام ایسے بھی ہیں جو عام ہیں حالت سفر اور حالت حضر دونوں کو مثلاً ایک شخص نے دس کوس کا سفر کیا اور روزہ رکھا کیونکہ اتنے کوس کے سفر میں اُس کو روزہ رکھنا واجب تھا پھر دوران سفر میں اُسکی بری حالت ہوگئی تو اس حالت خاص میں اُسکو روزہ افطار کر دینا چاہئے لیکن یہ افطار عذر سفر کی وجہ سے نہیں یہ تو ایک خاص حالت ہوگئی اس حالت کی وجہ سے اُسکو افطار جائز ہو گیا حتی کہ اگر گھر پر بھی یہی حالت ہو جاتی تو وہاں بھی اُسکو افطار جائز ہو جاتا مثلاً پہلے بیمار تھا یا ضعیف القوی تھا لیکن ہمت کر کے اُس نے روزہ رکھ لیا پھر اُس کی بری حالت ہو گئی یا

میں روزہ کی حالت میں بیمار پڑ گیا اور بُری حالت ہو گئی تو اسکو جائز ہے کہ روزہ افطار کرے
تو اس حکم افطار میں تو سفر کی کوئی تخصیص نہیں غیر حالت سفر میں بھی یہ عذر پیش آجاتا تو وہاں
بھی یہی حکم متوجہ ہو جاتا لیکن اس وقت گفتگو اس میں ہے کہ وہ سفر کونسا ہے جسمیں محض سفر
کی وجہ سے افطار جائز ہو قطع نظر کسی خاص حالت کے سو خوب سمجھ لیجئے کہ وہ سفر نہیں ہے
اسمیں عوام یہ غلطی کرتے ہیں کہ جہاں دس پانچ کوس چلے۔ اور روزہ کھا بیٹھے کہ بھائی ہم تو
سفر میں ہیں حالانکہ جس سفر میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے خود نفس سفر کی وجہ سے کسی اور عارض
کی وجہ سے وہ سفر ہے جسکی حد تین منزل ہے جسکی مقدار علماء نے یہاں کے کوسوں کے حساب
سے ۳۶ کوس اور انگریزی میل کے حساب سے ۴۸ میل مقرر کر دی ہے لیکن انگریزی میل کا
حساب آسان ہے کیونکہ یہ ہر جگہ یکساں ہے بخلاف کوس کے کہ اس کا حساب مختلف
مقامات پر مختلف ہے۔ چنانچہ پورب میں بہت بڑا کوس ہوتا ہے یعنی وہاں دو میل کا کوس
ہوتا ہے لہذا میل کا حساب زیادہ آسان ہے کیونکہ وہ زیادہ منضبط ہے ہر چند تین منزل
شرعی مقدار تھی جسکی تحدید بلفظ شرع نے نہیں کی لیکن علماء نے جیسا کہ حوض میں ایک تحدید مقرر کر لی ہے یعنی
دہ در دہ کی مقدار انتظام اور سہولت کیلئے مقرر کر لی ہے اسی طرح یہ حد بھی سفر کی انتظام اور سہولت کیلئے مقرر کر لی ہے ورنہ
شریعت نے تو دار و مدار احکام سفر کا تین منزل کو قرار دیا ہے مگر چونکہ عرفاً اوسط منزل بارہ کوس
کی ہوتی ہے اسلئے علماء نے سفر شرعی کی مقدار ۳۶ کوس مقرر کر دی ہے تاکہ عوام میں پریشانی
اور اختلاف نہ ہو ورنہ اگر عوام کی رائے پر چھوڑ دیتے تو وہ صرف پانچ پانچ کوس ہی کی منزل
کرکے پندرہ کوس ہی کے اندر احکام سفر کو جاری کر لیتا اور کہدیتے کہ ہم تو صاحب پانچ کوس سے
زیادہ نہیں چل سکتے تو تحدید کے اندر یہ ایک نفع ہوتا ہے انتظام کا بہر حال جو سفر ۳۶ کوس کا ہو یا
۴۸ میل کیلئے وہی سفر شرعی ہے اور اسی سفر کے اندر روزہ کا افطار بھی ہے اور اسی سفر
کے اندر نماز کا قصر بھی ہے لیکن ایک فرق ہے وہ یہ کہ نماز کا قصر کرنا تو واجب ہے اور روزہ
کا افطار کرنا واجب نہیں۔ ہاں روزہ کا افطار کرنا جائز ہے لیکن فی نفسہ واجب نہیں جب
تک کہ سخت ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔ اور نماز کا قصر کرنا بہر حال واجب ہے تو یہ وہ
سفر ہے جو سفر شرعی کہلاتا ہے تو گفتگو اس سفر کے اندر ہے یعنی سفر شرعی میں افطار و قصر

جائز ہے اس سے کم میں جائز نہیں چاہے ریل کا سفر ہو یا چاہے پیدل
کا۔ اب یہاں بعض اہل تشکیک کی طرف سے یہ اشکال ہوگا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے
سفر میں بھی بعض اوقات ہم تو جان کو آجاتے ہیں میں کہتا ہوں کہ وہ جو سفر شرعی ہے
اسمیں تو مشقت حقیقی مان لی گئی ہے خواہ بعض حالات میں وہ مشقت دراصل واقع نہ ہو
اور اس سے کم کے سفر میں اگر مشقت حقیقی ہوگی تب تو افطار کی اجازت ہوگی ورنہ نہیں
غرض یہ کہ اگر تکلیف ہو تو مقدار شرعی سے کم کے سفر میں بھی افطار کی اجازت ہے کیونکہ
وہاں علت اجازت افطار کی تکلیف ہی ہے مگر پہلے سے تو یہ معلوم نہیں کہ تکلیف ہوگی
بعض اوقات اندازہ بالکل غلط ثابت ہوتا ہے مثلاً جس وقت سفر کیا تھا اس وقت تو سخت
گرمی تھی لیکن بعد کو ہوا چلنے لگی یا بارش ہوگئی اور ٹھنڈ ہوگئی تو اسکو پہلے ہی سے یہ
فیصلہ کیا کہ ضرور تکلیف ہوگی۔ ارے بھائی اگر ہوگی شرعاً اسکی رعایت کیجاویگی اور افطار کی
اجازت ہو جاویگی پہلے ہی سے کیوں فکر میں پڑ گئے لیکن حضرت یہ یاد رہے کہ تھوڑی بہت
تکلیف کا کچھ اعتبار نہیں۔ یوں تھوڑی بہت تکلیف تو گھر بیٹھے بھی ہوتی ہے اور روزہ
ہی میں کیا نماز میں بھی ہوتی ہے کہ اٹھکر وضو کرو پھر نیت کیا باندھی گویا بالکل بندھ گئے
کہ اب نہ بولنے کے رہے نہ چالنے کے نہ دیکھنے کے نہ بھاگنے کے اور صاحب دین ہی کے کاموں
میں کیا کھانے میں بھی تو تکلیف ہوتی ہے انصاف کیجئے کمائی میں کیسی کیسی مشقت اٹھانی پڑتی ہے
پھر بھلا کبھی نہیں کہتے کہ اجی کہاں کا جھگڑا ہے چھوڑو بھی میاں بیٹھ بھی جاؤ توکل پر دیکھیے
بچپن ہی سے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں کہیں پڑھائی کی تکلیف کہیں فیس کی تکلیف
کہیں کتابوں کی تکلیف لہو و لعب چھوڑنے کی تکلیف آزادی کے برباد ہونے کی تکلیف
پھر اگر کہیں نوکر ہو گئے تو بعضے عہدوں میں کام اتنا ہوتا ہے کہ گھر پر لا کر رات کو جاگ کر انجام
یا تعین مقرر کرنے کا دو کو پورا کرتے ہیں تب کہیں جا کر مشکل سے پورا ہوتا ہے پھر اگر ایسے ہی
نازک اور ایسے ہی مرزا پھویا ہیں تو کمانا بھی چھوڑ دیں مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ ان تکلیفوں کی بنا
کمانا کوئی بھی نہیں چھوڑتا تو دین کے واسطے بھی اگر تھوڑی بہت مشقت اٹھانی پڑے
تو ایسا کونسا بڑا مشکل کام ہو گیا تھوڑی بہت تکلیف تو کچھ بھی نہیں البتہ زیادہ تکلیف تو

ہر کام میں ہوتی ہے البتہ ایسی تکلیف جسکی برداشت نہ ہوسکے یہ نہ تکلیف ہے اگر ایسی تکلیف ہونے لگے تو پھر شریعت سے خود ہی اجازت ہے کہ روزہ افطار کرلے لیکن گفتگو یہ ہے کہ سفر شرعی میں تحقیقی تکلیف شرط نہیں بلکہ محض حکمی تکلیف ہے اور حکمی تکلیف کسے کہتے ہیں حکمی تکلیف اسے کہتے ہیں کہ جو حکم میں ہو تحقیقی تکلیف کے خواہ تکلیف حقیقی متحقق ہو یا نہ ہو سبحان اللہ شریعت نے کیسی شفقت فرمائی ہے کہ سفر شرعی میں جو روزہ افطار کرنے کی اجازت دی ہے تو افطار صوم کی اصل علت تو مشقت تھی لیکن قبل تحقیق مشقت ہی کے شریعت نے احتمال پر کہ ممکن ہے مشقت ہو انتظام یہ کیا کہ جو چیز کہ سبب ہے مشقت کا اسی کو قائم مقام مشقت کا بنا کر یہ فرض کر لیا کہ اسے مشقت ہوگی۔ اور حکم کر دیا کہ ایسے شخص کو افطار کر لینا جائز ہے خواہ مشقت کا وقوع ہو یا نہ ہو دیکھئے کتنی بڑی عنایت ہے کیا انتہا ہے رعایت کی تو اس تقریر سے بحث متعین ہوگیا یعنی بحث یہ ہے کہ مطلق سفر شرعی میں قطع نظر مشقت سے کے روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں سو جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ سفر میں بھی روزہ رکھنا جائز ہے البتہ شرذمہ قلیل یعنی بہت تھوڑے سے لوگ اس طرف گئے ہیں کہ جس طرح بحالت سفر نماز میں قصر واجب ہے ایسے ہی روزہ میں افطار واجب ہے اور انکی دلیل یہ حدیث ہے لیس من البر الصیام فی السفر وہ کہتے ہیں کہ دیکھو جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ روزہ رکھنا سفر میں اچھا نہیں ہے دیکھو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ لیکن جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اس حدیث کے یہ معنی نہیں کہ سفر میں روزہ رکھنا جائز نہیں ہے بلکہ وہ تو بہتر ہے وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اگر روزہ رکھو تو بہتر ہے۔ اوپر یہ ذکر چلا آرہا ہے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ یعنی مسافر اور مریض کیلئے ارشاد ہے کہ روزہ افطار کر لینا جائز ہے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ یہ شیخ فانی کا حکم ہے یعنی اس کے لئے روزہ کا فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا دو وقت کا شکم سیر کر کے اور اگر کوئی زیادہ دیدے اپنی خوشی سے تو یہ زیادہ اچھا ہے۔ گو بعض یہ سمجھتے ہیں کہ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے متعلق ہے۔ مگر اسکی کوئی دلیل نہیں ظاہراً تو تینوں ہی کے متعلق ہے یعنی مسافر مریض اور شیخ فانی ان تینوں کیلئے روزہ رکھ لینا بہتر ہے

مگر دوسرے دلائل کی وجہ سے اس حکم میں قید یہ ہے کہ تحمل ہو یعنی اگر تحمل ہو تو روزہ رکھ لینا
اچھا ہے تو وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ سے مسافر کیلئے بھی روزہ رکھنا افضل ہوا اور اگر قرآن کو
اس بارہ میں نص نہ کہا جائے کیونکہ بعض کے نزدیک اسکا تعلق شیخ فانی کے ساتھ محتمل ہے
اور اِذَا جَاءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ مگر حدیثیں تو صریح ہیں چنانچہ صحابہ نے حضور کے
ہمراہ سفر میں روزہ رکھا اور حضور نے انکار نہیں فرمایا اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں
روزہ رکھنا جیسا جائز ہے ویسا ہی افضل بھی ہے۔ بہرحال سفر میں روزہ رکھنا ہی افضل ہوا
جمہور کی دلیل تو یہ ہے جو میں نے عرض کی البتہ اس حدیث کا جسکو میں نے ابھی پڑھا ہے جواب
ان کے ذمہ ہے سو وہ جواب میرے ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا میں نے ترجمہ کیا تھا کہ ایسے
سفر میں جس میں یہ حالت ہو جائے روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے پس اَلْمُسَافِرُ میں الف لام
عہد کا ہے۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو سفر ایسی حالت تک پہونچا دے یعنی قرائن قویہ سے پہلے
سے معلوم ہو کہ روزہ رکھنا ایسی حالت تک پہونچا دیگا تو ایسی حالت میں روزہ رکھنا اچھا
نہیں ہو میں نے اس مقام پر اسواسطے ذرا تطویل کر دی ہے کہ بظاہر اس حدیث سے یہ غلط فہمی
ہو سکتی ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا کسی حال مناسب ہی نہیں جیسے بعضے لوگ اس حدیث
سے یہی سمجھ گئے ہیں۔ اس حدیث کا پھر میں مکرر ترجمہ کرتا ہوں فرماتے ہیں جناب رسول مقبول
صلی اللہ علیہ وسلم کو جس سفر میں روزہ رکھنا ایسی حالت تک پہونچا دے یعنی قریب ہلاکت
تک اسمیں روزہ رکھنا کوئی اچھا کام نہیں ہے بلکہ ایسی حالت میں روزہ نہ رکھنا بہتر ہے
رکھنے سے۔ اب مجھے اس سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا ہے اکثر اوقات اور اکثر حالات میں یہ
دیکھا جاتا ہے خصوص زاہدوں اور عابدوں میں یہ مرض بہت کثرت سے ہے کہ غلو کرتے ہیں عبادت
میں۔ ہر جماعت کا مرض جدا ہے۔ عابدین کا مرض غلو فی العبادۃ ہے افراط اور تفریط دونوں
مذموم ہیں جیسے ترک عبادت بُرا ہے ایسے ہی عبادت میں غلو بھی بُرا ہے۔ عبادت میں غلو کیا
خوب سمجھ لیجئے عبادت میں غلو یہ ہے کہ ہر بات میں تشدد کیا جائے سو یہ تو تفریط ہے کہ ذرا
سی مشقت میں ہمت چھوڑ دی جائے جب عبادت مجاہدۂ نفس ہے تو تھوڑی تکلیف ہونا تو لازم
ہے چنانچہ اب کے بھی روزوں میں تھوڑی سی تکلیف ہوئی تھی۔ واقعی چند تاریخیں سخت

جمہور کی دلیل میں احتمال پیدا ہو جانے سے وہ قابل استدلال نہیں رہی

تھیں مگر وہ سختی ایسی نہیں تھی کہ قابل برداشت نہ ہو آخر لوگوں نے اُن تاریخوں میں بھی
روزہ رکھا ہی پھر بھی نہ کچھ زیادہ ضعف ہوا نہ زیادہ مشقت وکلفت ہوئی بلکہ اس مشقت میں
بھی ایک لطف تھا اور سچ تو یہ ہے کہ روزہ خوروں کو ایک وقت بھی اتنا لطف نہیں آتا جتنا
روزہ داروں کو افطار کے وقت ہر روز آتا تھا گویا روزہ خوار دنیا کی خوشی سے محروم ہیں
اسی واسطے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۃً فرمادیا ہے لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ
عِنْدَ الْاِفْطَارِ وَعِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ روزہ دار کو دو خوشی ہیں ایک خوشی تو وہاں آخرت
میں ہوہی گی لیکن وہ خوشی تو جب ہوگی جب وہاں جاوینگے اسکے علاوہ ایک اور خوشی
یہاں دنیا ہی میں افطار کے وقت روزہ دار کو حاصل ہوجاتی ہے بیچارے روزہ نہ رکھنے والے
اس سے بھی محروم ہیں۔ بلکہ نزدیک تو انھوں نے راحت اور لذت طلب کی تھی مگر راحت
اور لذت تو کیا ملتی بلکہ اگر تھوڑا سا ایمان ہو تو اور الٹی کلفت ہوتی ہے ایسا شخص جس وقت کھانا
کھائیگا ٹٹول لیں جیسے روزہ دار اگر ایمان ہو تو اور اگر کسی نے ایمان ہی کو دفن کر دیئے ہوں
تو اسکا ذکر ہی کیا جس وقت کھانا بلا عذر شرعی کھائیگا ایسا معلوم ہوگا جیسے پاخانہ کھا رہا ہے
اسقدر ذلت اور شرمندگی ہوگی بلکہ بعذر شرعی بھی اسقدر تنگی ہوتی ہے کہ آنکھ نہیں اٹھتی مارے
ذلت کے بلکہ ایسا شخص کوشش کرتا ہے چھپانے کی تو جناب جب عذر کے اندر یہ حالت ہوتی
ہے تو جو بلا عذر کھاتا ہے اسکی ذلت اور شرمندگی کا تو کیا ٹھکانا ہے۔ وہاں کوئی بے حیا ہی کھاتا ہو
تو وہ اور بات ہے کیونکہ جب عادت معصیت کی ہوجاتی ہے تو پھر حیا بھی جاتی رہتی ہے۔
حیا کے جاتے رہنے پر ایک حکایت یاد آئی ایک مولوی صاحب میرے ملنے والے تھے وہ اب
مر گئے وہ اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب وہ مدرسہ دیوبند میں پڑھتے تھے تو ایک
صاحب کے یہاں انکا کھانا مقرر ہوگیا جب اوّل روز کھانا لینے اُن صاحب کے مکان پر پہنچے تو
بڑی شرم آئی باہر کوئی موجود نہ تھا مارے شرم کے آواز بھی نہیں دے سکے شرم کے مارے اتنا
منہ سے نہ نکلا کہ کھانا بھیجدو۔ بس ایک کونے میں چپکے کھڑے ہوگئے۔ خاموش تھوڑی دیر
بعد گھر میں سے خود وہی صاحب مکان نکلے انھوں نے پہچانا نہیں پوچھا کیا کچھ کہنا ہے لیکن انکے منہ
سے یہ بھی نہ نکلا کہ میں وہی طالب علم ہوں جسکا کھانا آپ نے مقرر کیا ہے مگر وہ قرائن سے خود

ہی ہو گئے کہا اچھا آپ وہ مولوی صاحب ہیں جنکا کھانا مقرر ہوا ہے تب انھوں نے تصدیق کی انھوں نے بہت قدر کی بٹھلایا پھر پوچھا کہ آپ کھانا یہیں کھائیں گے یا لیجائینگے انھوں نے دبی زبان سے کہا یہیں کھا لونگا یہاں تو ایک ہی کے سامنے رسوائی ہے وہاں تک تو سینکڑوں آدمی گلی کوچہ میں ملیں گے اور دیکھیں گے کہ بھیک مانگ کر لایا ہے خیر صاحب مکان نے چارپائی بچھا دی اور کھانا لا کر عزت کیساتھ سامنے رکھدیا یہ سڑے سکڑے جیسے تیسے کھا پی کر چلے آئے یہاں مدرسہ میں پہونچے تو اور طالب علموں نے پوچھا کہ کھانا نہیں لائے انھوں نے کہدیا کہ میں تو وہیں کھا آیا انھوں نے کہا واہ صاحب یہ کیا واہیات حرکت ہے دیکھو بھائی یہاں ہر طرح کے طالب علم ہیں کسی کا کھانا ہے کسی کا نہیں ہے سب مل جلکر کھا پی لیا کرینگے خبردار اب ایسا نہ کرنا۔ خیر صاحب بڑی دیر کا تو اگلا وقت پھر آیا پھر کھانا لینے گئے تو صاحب مکان نے پھر پوچھا کہ یہیں کھاؤگے یا لیجاؤ گے انھوں نے کہا لیجاؤنگا چنانچہ ان صاحب نے کھانا لا دیا لے کر چلے تو یوں کہتے تھے کہ مارے شرم کے قدم نہیں اٹھتا تھا ایک پیر سو سو من کا ہو گیا کھانا ہاتھ میں لیکر چلتے ہوئے بھی شرم آتی تھی کہ آنکھیں نہیں اٹھتی تھیں بہر حال سمجھ کا کے کھانا دامن میں چھپائے بڑی مصیبت سے مدرسہ تک پہونچا پھر اگلے دن کچھ کم شرم آئی پھر اور کم پھر اور کم ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہونچی۔ تھے بڑے ظریف کہتے تھے اور اب تو اگر کہو جھونپڑوں میں سے مانگ لاؤں۔ خیر یہ حکایت تو ظرافت کی ہے اور ایک امر مباح کے متعلق ہے مطلب میرا یہ ہے کہ جب آدمی گناہ کا خوگر ہو جاتا ہے تو پھر حیا شرم کچھ نہیں رہتی۔ چنانچہ بہت لوگوں کو دیکھا ہوگا کھلم کھلا گناہ کرتے ہوئے میں ذرا صبح کے وقت جنگل چلا جاتا ہوں منزل پڑھتا ہوا کیونکہ مجھسے بیٹھکر قرآن پڑھا نہیں جاتا۔ رمضان شریف کا زمانہ تھا ایک باغ میں پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ٹھنڈی تو ہوا چل رہی ہے اور کھیت والے آلو تو یہ تربوز لیکر کا کم بیٹھے ہوئے صبح کے وقت کھا رہے ہیں بھلا اس وقت کونسی گرمی نے ستایا تھا ارے مار والے کمبختو جب اتنی تکلیف ہوتی تبھی کھاتے صبح کے وقت کونسی آگ تمہارے اوپر برس رہی تھی جو تربوز کھانے کی حاجت ہوئی اجی کچھ بھی نہیں بالکل شرارت ہے نفس کی بیہودگی ہے کہ

خدا کا خوف اور خدا کی عظمت دل میں نہیں اور خیر خدا کو تو کس نے دیکھا ہے خدا کا خوف تو بڑی چیز ہے لوگوں کا بھی تو خوف نہیں جو لوگ نسب کے لحاظ سے عرفاً بالکل ادنیٰ درجہ کے ہیں وہ بھی تو ایسے شرفاء کو جو روزہ نہیں رکھتے کھلم کھلا کھانے پینے ہیں بالکل رذیل بلکہ جانور سمجھتے ہیں یہ اپنے دل میں اپنے آپکو کتنا ہی شریف سمجھتے ہوں لیکن دوسرے لوگ انہیں ذلیل جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل سمجھتے ہیں یہ حالت تو انکی ہیں جو اس بیان کی جو روزہ نہیں رکھتے وہ خیر گنہگار ہیں ہی ان کے اس فعل کی قباحت اور انکی اس حالت کا منکر ہونا تو ظاہر ہے باقی جس چیز کو میں اسوقت بیان کر رہا ہوں کہ بعض لوگ عبادت میں غلو کرتے ہیں یہ اُن لوگوں کی غلطی ہے جو بڑے عابد اور زاہد کہلاتے ہیں لیکن اب یہاں سمجھ لینا چاہئے کہ غلو کا معیار کیا ہے سو غلو کا معیار کسی کی رائے پر نہیں ہے ورنہ پانچ کوس ہی پر بعضے سمجھتے ہیں کہ بڑی مشقت ہوگی - ذرا سی گرمی پڑی بڑی مشقت ہوگئی اور ذرا سی سردی پڑی بڑی مشقت ہوگئی بس پھر وضو بھی معاف ہوگیا جماعت بھی معاف ہوگئی حج بھی معاف ہوگیا - چنانچہ اب میں دیکھتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے عذروں کی بنا پر لوگ حج کو موقوف کر دیتے ہیں ذرا سن لیا کہ راستہ میں کچھ گڑبڑ ہے بس حج کو مت جاؤ ذرا سُن لیا کہ کچھ بیماری ہے بس حج کو مت جاؤ ذرا یہ سن لیا کہ علمداری ترکوں کی نہیں رہی بس حج کو مت جاؤ آخر ترکوں کی علمداری میں اور حج میں جوڑ کیا - لوگوں نے آجکل یہ ایک مسئلہ خواہ مخواہ تراش لیا - صاحبو امام المسلمین کا ہونا جمعہ کی نماز میں تو ایک خاص تفصیل کے ساتھ شرط ہے بھی لیکن حج میں یہ شرط کہاں سے ہے کہ جب کوئی امام المسلمین ہو تب حج ہو بلکہ جس عبادت کیلئے شرط بھی ہے اسکی حقیقت کی ایسی ہی بوجہ نہیں ہے وہ تفصیل موعود کہ امام المسلمین کا ہونا جمعہ فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ ایک خاص مصلحت سے ہے اگر وہ مصلحت بدون امام المسلمین کے حاصل ہوجائے تو پھر شرط نہ ہو چنانچہ ہدایہ میں اسکی حکمت کے متعلق صاف لکھا ہے لِئَلَّا يَقَعَ التَّنَازُعُ فِي التَّقَدُّمِ وَالتَّقْدِيمِ یعنی امام المسلمین کے شرط ہونے کی یہ وجہ ہے تاکہ جھگڑا نہ پڑے کہ میں آگے بڑھونگا یا پیچھے ہٹونگا کہ میں امام ہونگا یا میں فلانے کے پیچھے نماز نہ پڑھونگا اور اسکو ایک شخص ہوجانا چاہئے

جو اس اختلاف کے وقت فیصلہ کرسکے۔ غرض علت یہ ہے اس شرط کی ورنہ نفسہ امام کا وجود مقصود نہیں اسی پر فقہاء نے تفریع کی ہے کہ اگر سب مسلمان ملکر ایک کو امام جمعہ مقرر کرلیں تو چونکہ امام المسلمین کی مصلحت حاصل ہوگئی یا اتفاق اہل شہر کے بس اب ضرورت نہیں رہی اس شرط کی حالانکہ حدیث شریف میں ہے مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ وَلَهُ اِمَامٌ عَادِلٌ اَوْ جَائِرٌ یعنی جو شخص جمعہ ترک کرے اس حال میں کہ اس کا کوئی بادشاہ ہو خواہ عادل ہو یا ظالم اسکے لئے یہ وعید ہے۔ تو دیکھئے حدیث اور نص کی رو سے جمعہ کیلئے امام المسلمین کا ہونا شرط تھا جب اسپر ہی امام کے نہ ہونے سے جمعہ ساقط نہ ہوا تو حج کیلئے تو امام المسلمین کا ہونا کہیں شرط بھی نہیں ہاں بعض شرائط ایسے ہیں جمعہ کے بغیر انکے جمعہ جائز ہی نہیں ہوتا مثلاً مصر ہونا یہ شرط ایسی ہے کہ بغیر اسکے جمعہ پڑھنا جائز ہی نہیں یہ شرط صرف واجب ہونیکی نہیں بلکہ جواز کی بھی ہے حاصل یہ ہوا دوسرے لفظوں میں کہ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں مگر گاؤں والوں کو جمعہ کا بڑا شوق ہوتا ہے ایک گاؤں والے نے مجھسے پوچھا کہ گاؤں میں جمعہ کیوں جائز نہیں۔ میں نے کہا بمبئی میں حج کیوں جائز نہیں اسنے کہا وہ تو موقع حج کا نہیں میں نے کہا وہ موقع جمعہ کا نہیں اسنے کہا کیوں نہیں میں نے کہا وہ کیوں نہیں۔ اس نے کہا شریعت کی دلیل سے۔ میں نے کہا یہ بھی شریعت کی دلیل سے ہے کہ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں اور تمہیں پہچان کیا شریعت کی شریعت نے جو حکم مقرر کر دیا تم کون دخل در معقولات دینے والے۔ بس چکے ہوگئے بہرحال بعض شرطیں وجوب کی ہیں اور یہ بعض شرطیں جواز کی ہیں ان میں مصر ہونا بھی ہے۔ اب لوگ شرط کی ان دونوں قسموں میں فرق نہیں کرتے اور افسوس یہ ہے کہ بعض اہل علم کی زبان سے بھی سنا وہ باوجود حنفی ہونے کے گاؤں میں اجازت جمعہ کی دیتے تھے جب انکے سامنے شرائط جمعہ پیش کئے گئے اور کہا گیا کہ ان شرائط میں سے ایک شرط مصر ہونا بھی ہے تو آپ کہنے لگے کہ اذن عام ہونا بھی تو شرط ہے پھر باوجود اسکے اسپر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی نابینا جمعہ کی نماز پڑھے تو اسکی نماز ہوجائے گی تو اگر اس شرط کا ہونا ضروری ہوتا تو نابینا کی نماز بھی نہ ہوتی حالانکہ سب کے نزدیک اسکا جمعہ ہوجاتا ہے تو جیسے وہاں شرطیں نہیں ہیں تب بھی جمعہ ہوجاتا ہے اسی طرح یہاں

اگر مصر نہ بھی ہو تب بھی جمعہ ہو جائیگا یہ غلطی وہ ہے جس میں بعض اہل علم بھی مبتلا ہیں اس واسطے
میں اسکا جواب دینا چاہتا ہوں اور جواب تو میری اوپر کی تقریر ہی سے ہو گیا ہوگا یعنی
مصر ہونا شرط جواز ہے نہ کہ شرط وجوب تفصیل اس جواب کی یہ ہے کہ شرائط جمعہ کی دو قسم ہیں ایک شرائط
ہیں وجوب کی اور ایک ہیں جواز کی ان دونوں کے اثر میں بڑا فرق ہے شرائط وجوب کا اثر
تو یہ ہے کہ بغیر انکے مشروط کا وجوب نہیں ہوتا لیکن وجود ہو سکتا ہے اور شرائط جواز کا اثر یہ ہے کہ
جب شرط کا وجود متحقق نہ ہوگا تو مشروط کا وجود شرعی بھی متحقق نہ ہوگا بس اس قسم کی شرائط کا
مقتضا یہ ہے کہ بدون انکے جمعہ کا جواز ہی نہیں ہوتا۔ تو مصر ہونا جو شرط ہے جمعہ کی
شرائط جواز میں سے ہے اور ذی بصر ہونا یہ شرائط وجوب میں سے ہے تو اسکا قیاس اس پر جائز
نہیں۔ تو میرا مقصود یہ ہے کہ جمعہ جیسے کے لئے امام المسلمین ہونا شرط ہے جب اسکا نہ ہونا یعنی
امام کا نہ ہونا مخل نہ ہوا فرضیت جمعہ میں تو اسکے نہ ہونے سے حج کیسے ساقط ہو جائیگا آخر
چلنے لوگ کیا اگر سیر کر رہے ہیں جو جی میں آیا کر لیا نہ کسی سے تحقیق کرنے کی ضرورت سمجھتے
کچھ ہو۔ میں اسکو بیان کر رہا تھا کہ لوگ عبادتوں کے ترک کیلئے بہانے ڈھونڈھا کرتے ہیں یعنی
ذرا سی تکلیف ہوئی حج ساقط کر دیا ذرا سی مشقت ہوئی نماز اڑا دی روزہ میں ذرا پیاس
زیادہ لگی تھی کیونکہ پیدل چلنا پڑا تھا اگلے دن روزہ ہی کھا بیٹھے جنکے یہاں حضرت مہمان تھے
افسوس نے ایک بار ایسا ہی کیا تھا وہ بھی وعظ میں موجود تھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کی بھی شان ہونی چاہئے کہ کسی کی مروت مانع نہ ہو (الکاتب) مگر اسی مریض کو اگر ڈاکٹر کہدے
کہ دیکھو دو دن تک پانی نہ پینا تو چاہے دو دن کیا تین دن تک بھی صبر کئے رہیں گے کہ بھائی پیاس کی
تکلیف ہو بلا سے ہو جان کا رکھنا ضروری ہے نازک معاملہ ہے ڈاکٹر صاحب کی تجویز کے
خلاف نہ کرنا چاہئے۔ افسوس ہے کہ ایک طبیب کی تو اتنی قدر ڈاکٹر کی تجویز کی تو اتنی وقعت
اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تجویز کی اتنی بھی وقعت نہیں حالانکہ وہی تمہارے ہی نفع کیلئے
اپنے نفع کیلئے نہیں بلکہ طبیب کا تو تمہارے برسر نہ کرنے میں نفع بھی ہے یعنی دونوں میں نفع طبیب کے
ایک تو حسی قوت نہیں ہوتا لیکن ایک فوت ہو جاتا ہے طبیب کا ایک تو یہ نفع ہے کہ کچھ فیس
مل جاتی ہے مثلاً ڈاکٹر کو بلایا اس نے ۱۶ روپیہ فیس کے رکھ دیا اسلئے پھر اسکی طرف جاتے ہے

کوئی مرے چاہے جیے۔ یہ تو وہ نفع ہے جو کسی حال میں فوت نہیں ہوتا۔ دوسری منفعت طبیب کو یہ ہو کہ اگر تم پرہیز کرو گے تو اچھے ہو جاؤ گے تو وہ طبیب نیکنام ہوگا اگر نیکنام ہوگا تو زیادہ لوگ رجوع ہونگے جب زیادہ رجوع ہونگے تو فیس زیادہ آئیگی اور اگر کسی نے بد پرہیزی کی اور اچھا نہ ہوا تو وہ نیکنامی فوت ہوگئی جو سبب تھی زیادتی رجوعات اور زیادتی فیس کی تو اتنی غرض طبیب کی بھی ہے پرہیز کرانے میں اور یہاں تو حق تعالیٰ کی اور جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ بھی غرض نہیں۔ سراسر تمہاری ہی مصلحت ہے ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم — من نہ کردم خلق تا سودے کنم (دوبارہ ۱۲)
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم ؎

من نگردم پاک از تسبیح شان — من نگردم پاک از تسبیح شان (دوبارہ ۱۲۵)
پاک ہم ایشاں شوند و در فشاں

؎ ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ — و ز گراں جانی و چالاکی ہمہ

یعنی اگر کسی نے ہماری مدح میں سبحان اللہ کہدیا تو ہم تو اسکے اس کہنے سے کیا پاک ہونگے وہ خود ہی پاک ہوگیا اور ہماری تو یہ شان ہے کہ ہم ناپاکی سے تو پاک ہیں ہی خود جس پاکی کو ہماری طرف نسبت کرتے ہیں ہم تو اس پاکی سے بھی پاک ہیں ہماری شان تو اس سے بھی آگے بڑھی ہوئی ہے آگے مولانا نے اس مضمون کی کس غضب کی مثال دی ہے جس سے ثابت کردیا اس مضمون کو ورنہ بظاہر تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکی سے پاک ہونے کے کیا معنی سو فرماتے ہیں ؎

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست — این نہ مدح ست او مگر آگاہ نیست

؎ بادشاہ کی شان میں یہ کہنا کہ آپ جولاہے نہیں ہیں۔ یہ کچھ مدح نہیں ہوئی بلکہ ایک مثال عرض کرتا ہوں ایک شخص بہت بڑا حسین ہے اسکی ایک شخص تعریف کر رہا ہے تو کہا کہ سبحان اللہ آپکے حسن کے کیا کہنے ہیں آپکے چہرے پر چیچک کے گڑھے پڑے ہوئے نہیں ہیں یعنی آپ اتنے حسین ہیں کہ چیچک کی وجہ سے جو گہرے گہرے گڑھے چہرہ پر پڑ جاتے ہیں وہ آپکے چہرہ پر نہیں ہیں کہئے صاحب یہ بھی بھلا کوئی حسن ہوا یہ کیا کچھ تعریف ہوئی

ہوئی افسوس اس شخص نے حسن کی کچھ بھی قدر نہ کی۔ اسی طرح ہمارا یہ کہنا کہ اے اللہ آپ پاک ہیں امکان سے آپ پاک ہیں حدوث سے آپ پاک ہیں حاجت سے آپ کے بیوی نہیں آپکے بچے نہیں یہ سب اپنے فہم کے موافق ہم نے حق تعالیٰ کی تعریف کی یعنی جن چیزوں کو ہم عیب سمجھتے ہیں ان سے حق تعالیٰ کے بری ہونیکا دعویٰ کیا لیکن حق تعالیٰ کی شان کے مناسب جو پاکی ہے وہاں ہمارا تو کیا ذہن پہونچتا سید العابدین صلے اللہ علیہ وسلم بھی یہ عرض کر رہے ہیں کہ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ اے اللہ میں آپکی ثناء کا احاطہ نہیں کرسکتا آپ ویسے ہی ہیں جیسے آپنے خود اپنی تعریف کی۔ یعنی اگر کوئی آپکی تعریف کرسکتا ہے تو وہ خود آپ ہی ہیں کیونکہ تعریف حقیقی کیلئے معرفت بالکنہ شرط ہے اور معرفت بالکنہ کسکو حاصل ہو سکتی ہے بجز خود ذات حق کے تو ہم تو کیا چیز ہیں خود حضور اپنا عجز ظاہر فرما رہے ہیں یہی معنی ہیں فرمانیکے

شعر
من نگردم پاک از تسبیح شان　　پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

تو ہماری ہی مصلحت ہے عبادت میں۔ تو غرض طبیب نے جو پرہیز بتایا ہے وہاں تو اسکی بھی کچھ نہ کچھ مصلحت ہے اور یہاں عبادت میں سراسر ہماری ہی مصلحت ہے۔ پھر جب جو ہم اس میں بہانے ڈھونڈتے ہیں تو خود اپنا ہی ضرر کرتے ہیں۔ حالانکہ قدر کرنا چاہئے تھی اللہ اکبر خدا رسول نے ہمکو کیسے کیسے کام کی اور شفا کی چیزیں بتلائی ہیں مگر ہم ان سے بچنے کیلئے بہانے ڈھونڈتے ہیں ذرا گرمی ہوگئی روزہ معاف۔ ذرا سردی ہوگئی وضو معاف نماز معاف۔ میرے ملنے والے ایک مولوی صاحب تھے وہ ایک صاحب کے بچوں کو انگریزی پڑھانے پر نوکر ہو گئے۔ وہ مولوی صاحب گو انگریزی پڑھے ہوئے تھے مگر تھے دیندار۔ انگریزی پڑھانا خبر نہیں وہ تو معاش کی ضرورت سے پڑھتے ہیں سو پڑھو بھائی مگر دین سے تو بے پرواہی نہ کرنی چاہئے کیا ضرور ہے کہ انگریزی پڑھ کر دین بالکل تباہ ہی کردو۔ وہ صاحب جنکے بچوں کو مولوی صاحب انگریزی پڑھاتے تھے عدالت میں سرشتہ دار تھے مولوی صاحب نے انکے لڑکوں سے نماز پڑھوانا شروع کی جب وقت آتا حکم دیتے کہ ہمارے سامنے نماز پڑھو۔ سردی کا زمانہ تھا بچوں کو کہیں زکام ہوگیا [illegible]

کوئی کہ نہیں معلوم یہ کمبخت مولوی کہاں سے آگیا ہے خدا اسے ہو دے خدا اسے اٹھا
لے جب سے یہ آیا ہے میرے بچوں کو نکما ہی جانے لگا استاد کیا ہے ظالم ہے قصائی ہے
رحم بھی تو نہیں آتا اس عمر میں نماز پڑھواتا ہے کہتا ہے کہ نماز سکھلاتے ہیں۔ اچھی نماز
سکھلائی میرے بچے نکمے ہو گیا۔ کھانسی ہو گئی۔ یہ دیکھئے کیسی بد دینی کی باتیں ہیں
اور بعضی ایسی بھی ہیں اللہ کی بندیاں جو دین کی عاشق ہیں۔ ایک اور حکایت یاد آئی وہ ذرا بیہودہ
سی ایک نواب کی لڑکی کا قصہ ہے گو ہے ان بی بی کی خوبی لیکن اسکے ضمن میں ایک شخص کی
بیہودگی کا بھی قصہ ہے جو اس نے انکی طرف منسوب کیا۔ قصہ یہ ہوا۔ انہیں مولوی صاحب
کو یہ واقعہ بھی پیش آیا اور یہ عجیب بات ہے کہ ان دونوں قصوں کا تعلق ایک ہی شخص سے
ہے۔ اس دوسری حکایت کے شروع کرنے کے بعد یاد آیا کہ یہ بھی انہیں کا واقعہ ہے۔ وہی مولوی
صاحب ایک زمانہ میں ان بی بی کے بچوں کو فارسی پڑھاتے تھے انہیں سے ایک بچہ تھا ذرا شریر نوابوں
کے بچے یوں بھی ذرا آزاد ہوتے ہیں خصوص جہاں صحبت بھی اچھی نہ ہو وہاں اور بھی زیادہ آزاد
ہو جاتے ہیں وہ نوکروں کی صحبت میں رہتا تھا اور نوکر اکثر شریر ہوتے ہی ہیں خصوص
رئیسوں کے نوکر تو بہت ہی شریر ہوتے ہیں۔ اول تو وہ لڑکا خود ہی شریر پھر نوکروں کی صحبت
کریلہ اور نیم چڑھا۔ مولوی صاحب سے یوسف زلیخا پڑھتا تھا ایک دن سبق میں حضرت زلیخا
کا سراپا تھا کہ رخسار ایسے تھے آنکھیں ایسی تھیں ہاتھ پاؤں ایسے تھے۔ غرض پورا حلیہ بیان
بیان کیا ہے خیر مولانا جامی نے تو کی ہے اسمیں ذرا شاعری۔ نوکر نے کیا شرارت کی لاحول ولا قوۃ
الا باللہ اس لڑکے سے یہ کہا کہ تم اپنے مولوی صاحب سے یہ پوچھنا کہ حضرت زلیخا کی چھاتیاں
کیسی تھیں وہ بیباک تھا ہی اس نے پوچھ لیا بس ان کے سر سے پاؤں تک آگ ہی تو لگ گئی
جلکر جواب دیا کہ ایسی تھیں جیسی تیری ماں کی۔ واقعی بڑا سخت جواب تھا۔ آخر شریف کا بچہ تھا بہت
ناگوار ہوا کہ میری ماں کو گالی دی۔ زلیخا کو گالی دیتے ہوئے تو کچھ برا معلوم نہ ہوا اور یہی
بات اپنی ماں کے بارہ میں سنکر ایسی ناگواری ہوئی سنکر اسکو بڑا غصہ آیا اور اسنے جاکر
اپنی ماں سے شکایت کی کہ آج مولوی صاحب نے ہمیں ایسا ایسا کہا ہے ایک ایسی بات تھی کہ
جسکو نواب کی لڑکی جو عفیفہ بھی شریف بھی ہو سنکر کیا آگ بگولا نہ ہو جاتی لیکن وہ نہایت

دیندار تھیں مجھے بھی اتفاق ہوا ہے اُن کے یہاں بیان کرنے کا انھوں نے ایکبار بیان کے
بعد میری دعوت بھی کی تھی لیکن میں نے منظور نہیں کی تھی میں نے کہا کہ میں کسی کے یہاں وعظ
کہکر اُسکے یہاں دعوت نہیں کھایا کرتا وہ بات چیت بھی کرلیتی تھیں اول تو عمر کی ڈھلی ہوئی
تھیں دوسرے امراء کے یہاں اس میں کچھ تنگی بھی نہیں سبکو بیٹیاں سمجھتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں
ہیں۔ غرض کہ مولوی صاحب کو بلایا اور پوچھا کہ آپنے کوئی کلمہ بیہودہ میرے بارہ میں کہا ہے
مولوی صاحب نے بیدھڑک کہدیا کہ ہاں صاحب کہا ہے وہ بھی بڑے حضرت تھے کہنے لگے
معلوم ہوتا ہے آپ سے سارا قصہ نہیں کہا گیا آپ سے اصل سبب میری اس گستاخی کا ظاہر نہیں
کیا گیا ورنہ آپ کو اسقدر ناگوار نہ ہوتا وہ بولیں کہ کہئے۔ مولوی صاحب نے کہا اسنے حضرت
زلیخا پہلے جیسی بھی ہوں لیکن آخر میں حضرت یوسف علیہ السلام سے اُنکا نکاح ہوگیا تھا اور
انبیاء سب مسلمانوں کے باپ ہیں اور انکی بیویاں مائیں ہیں۔ اسنے حضرت زلیخا کے بارہ
میں یہ بیہودہ سوال کیا اسکا میں نے یہ جواب دیا۔ اسنے میری ماں کو کہا میں نے اسکی ماں
کو کہا تو وہ بڑی خوش ہوئیں کہا آپنے بہت اچھا کیا اور اس نالائق کے منہ پر آپنے جوتہ نہ
مارا پھر انھوں نے اس لڑکے سے کہا کہ دور ہو جا کمبخت نکل جا گھر سے بہت جلد میرے سامنے
سے تیرا منہ دیکھنے کے قابل نہیں اور مولوی صاحب سے کہا آپنے بہت ہی اچھا کیا۔ تو غرض
یہ ہے ایک دیندار عورت کی حکایت جو مجھے اسوقت یاد آئی ہے اور ایک وہ تھی جو کوئی
گویا نماز اور وضو کو اتنا ناگوار سمجھتے ہیں کہ ذرا سے بہانہ میں چھوڑ بیٹھیں۔ سفر میں تو نماز بھی ہم اکثر دیکھتے
لوگ ہمنے دیکھے کہ اچھے خاصے نمازی لیکن ریل میں نماز ہی نہیں پڑھتے کہتے ہیں کہ صاحب ریل
میں وضو کا بھی ٹھیک نہیں صاحب قبلہ کا بھی ٹھیک نہیں۔ بھیڑ بھاڑ میں سجدہ کا بھی موقع
نہیں کھڑے ہونے کی بھی گنجائش نہیں کیا نماز پڑھیں اور کیسے نماز پڑھیں حالانکہ جو نماز پڑھنے والے ہیں
اُنہیں ریل ہی میں سارے سامان مہیا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے بحمد اللہ ریل میں کبھی بے
وضو یا بیٹھکر یا بے رخ نماز نہیں پڑھی۔ اور میں اکثر تیسرے درجہ میں سفر کرتا ہوں احباب بہت
ترغیب دیتے ہیں کہ انٹر میں سفر کیجئے وہ بڑے اصرار کرتے ہیں کہ سکنڈ میں بیٹھو مگر غریبوں کو تو
غریبوں ہی کی طرح رہنا چاہئے اپنی حیثیت سے زیادہ نہیں بڑھنا چاہئے غرض اکثر تیسرے

ندجہی میں سفر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے جسمیں اکثر مسافروں کی کثرت ہوتی ہے اور بہت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے لیکن بفضلہ تعالیٰ ہمیشہ نماز پڑھی نیز وضو کے ساتھ رکوع و سجود کے ساتھ قبلہ رخ ہوکر۔ بات یہ ہے کہ اگر انسان ارادہ کرے تو حق تعالیٰ ساری رکاوٹوں کو دور کرتے چلے جاتے ہیں۔ خوب فرماتے ہیں مولانا ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید ۔۔۔ خیرہ یوسف وار می باید دوید

گو رستہ نظر نہ آوے لیکن تم دوڑو تو بھی رستہ خود بخود پیدا ہوتا چلا جاویگا۔ حضرت یوسف کا بھی تو یہی قصہ ہوا اُن کے واسطے بھی رستہ کہاں تھا سات قفل آگے پیچھے لگے ہوئے تھے ایسی حالت میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہاں سے بھاگ جانا ممکن تھا یا کسی کو اسکی امید ہوسکتی تھی کہ میں باہر نکل جاؤنگا۔ جبکہ زلیخا نے ساتوں کواڑ بھی محل کے بند کر دئے تھے اور اوپر سے بڑے بڑے قفل بھی لگا دیئے تھے پھر وہاں سے بچکر نکلجانے کی کیا صورت ہوسکتی تھی۔ مگر اللہ اکبر حضرت یوسف علیہ السلام کا توکل دیکھئے بس بات یہ ہے کہ وہ مسئلہ جانتے تھے کہ آدمی کے قبضہ میں جتنا ہو وہ کرے آگے جو کچھ ہو اُسے حق تعالیٰ کے سپرد کرے اتنا توکل تھا کہ باوجود اس کے کہ جانتے تھے کہ میں مقفول کے اندر محبوس ہوں لیکن پھر بھی مایوس نہ ہوئے اور جو کام اُسوقت انکی قدرت میں تھا وہ لیا یعنی زلیخا سے دامن چھوڑا کر دروازہ کی طرف کو جھپٹے اب ان سے کوئی پوچھے کہ آپ جا کہاں رہے ہیں وہاں تو قفل لگا ہوا ہے لیکن جناب حق تعالیٰ کو تو سب کچھ قدرت ہے بس دروازہ کے پاس پہونچنا تھا کہ پھٹ سے قفل نیچے اسی طرح جس دروازہ کے پاس پہونچیں خود بخود قفل ٹوٹ کر گر پڑے اور کھٹ سے کواڑ کھل جائیں غرض ساتوں دروازوں کے پار ہوگئے مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید ۔۔۔ خیرہ یوسف وار می باید دوید

گو رستہ نظر نہ آوے لیکن تم حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑو تو رستہ خود بخود پیدا ہوتا چلا جاویگا۔ تم اپنا کام تو کرو پھر رستہ پیدا کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے وہ انشاء اللہ ضرور کرینگے میرے ذہن میں بھی ایک مثال آئی ہے جس سے پہلی تقریر کا موقع ہے اس مثال کو بیان کرتا ہے

لیکن چونکہ مثال بہت اچھی ہے اسلئے اسوقت پھر یاد آئی۔ یہاں سے مظفر نگر جاؤ تو سڑک پر آپ دیکھیں گے کہ دو طرفہ درخت کھڑے ہوئے ہیں۔

پھر کھڑے ہوکر دور تک دیکھئے تو جہاں تک نگاہ جا سکتی ہے وہاں پہونچکر نگاہ کے سامنے گویا دونوں طرف کے درخت ملکر کھڑے ہو جاوینگے تو ایسا معلوم ہوگا کہ سڑک بند ہو گئی اور آگے رستہ چلنے کا نہیں ہے جیسی چاہے جاکر دیکھ لیجئے جب ہی معلوم ہوگا۔ اب اگر کوئی ناواقف ہے تو یہی سمجھ کر لوٹ آویگا کہ آگے راستہ تو ہے نہیں پھر چلنے سے کیا فائدہ اور اگر کوئی واقف کار ملگیا تو وہ کہیگا کہ تم چلو تو رستہ ملیگا لیکن یہ کہتا ہے کہ میاں آنکھوں سے تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ آگے چلکر رستہ بند ہے پھر کیا اپنے مشاہدہ کو بھی ہم غلط سمجھلیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہاں واقعی تمہاری آنکھیں غلطی کر رہی ہیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے تمہیں رستہ نظر نہیں آتا جب جہاں پہونچوگے تب دیکھوگے کہ رستہ بالکل کھلا ہوا ہے تم بیٹھے ہو کنارہ پر اسلئے رکاوٹیں نظر آتی ہیں بس چلنا شروع کردو اور دور تک نظر کو دوڑاؤ نہیں۔ مولانا کا شعر ہے ؎

اے خلیل اینجا شرور دود نیست۔ سبحان اللہ۔ اے خلیل اینجا شرور دود نیست

جز کہ سحر و خدعۂ نمرود نیست

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دور سے جلتی ہوئی آگ نظر آتی تھی اور واقع میں وہ ان کیلئے آگ نہ تھی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اسکو آگ سمجھکر جھجکے تو گویا حق تعالیٰ نے ان کی تسلی فرمائی کہ ؎

اے خلیل اینجا شرور دود نیست   جز کہ سحر و خدعۂ نمرود نیست

اے خلیل ڈرتے کیوں ہو یہ آگ نہیں ہے یہ نمرود کا دھوکہ ہے فریب ہے بسم اللہ کر کے تیار ہو جاؤ تو حضرت اسی طرح جتنی رکاوٹیں دین کے رستہ میں نظر آتی ہیں خدا کی قسم وہ رکاوٹیں ہی نہیں تم یہاں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر رہے ہو کہ رکاوٹیں ہیں وہاں پہونچکر دیکھوگے تو رستہ بالکل کھلا ہوا ہی پاؤگے پھر جب وہاں پہونچکر آگے دیکھوگے تو پھر رستہ نظر آئیگا۔ پھر چلوگے پھر رستہ کھلا ہوا ملیگا۔ غرض تمہیں نظر آتا ہے کہ رستہ بند ہے حالانکہ واقع میں کھلا ہوا ہے مگر چلنا شرط ہے۔ اب کوئی بدن کو حرکت ہی نہ دے تو اسکا کیا علاج کہتے ہیں کہ صاحب چلئے نماز پڑھئے

کی کیا صورت ہوسکتی ہے اور حالت یہ ہے کہ نہ اہتمام کرتے ہیں نہ مسافروں سے کہتے ہیں کہ
بھائی ہمیں تھوڑی سی جگہ دیدو۔ تھوڑی دیر کیلئے کھڑے ہو جاؤ ہمیں نماز پڑھنی ہے بس بیٹھکر
خود ہی فیصلہ کر لیا کہ چاروں طرف تو آدمی ہیں کہاں نماز پڑھیں بس جی ایسی حالت میں نماز معاف
ہے بڑے بڑے نمازی جو ہیں انکا حال ہے اور بعضوں نے ایک اور مسئلہ گھڑ رکھا ہے کہ جب کہ
کھڑے ہونے پر قدرت ہو لیکن ریل میں بیٹھکر نماز پڑھنا جائز ہے بس بیٹھے اور ٹکریں ماریں
حالانکہ فرض نماز میں بشرط قدرت قیام فرض ہے بعض نے یہ مسئلہ گھڑ رکھا ہے کہ تشہد میں
بیٹھنا ہی ضروری نہیں بس پاؤں لٹکا کر اطمینان سے دوسرے تختہ پر سر ٹیک دیا اور اپنے نزدیک
نماز ادا کر لی۔ ذرا مشقت ہی تو گوارا نہیں چاہے فرض سر سے اترے یا نہ اترے بعضوں کو
دیکھا کہ قبلہ رخ ہونا ہی ضروری نہیں سمجھتے۔ ریل میں کیا بیٹھے گویا اپنے نزدیک خانہ کعبہ
اندر پہونچ گئے۔ وہاں بڑا لطف آتا ہے خدا تعالیٰ نے ہمیں بھی اندر پہونچنا نصیب کیا تھا
ہم نماز پڑھ رہے تھے بھیڑ بہت تھی سجدہ کا موقع نہ ملا تو ہم نے گھوم کر دوسری طرف سجدہ
کر لیا کیونکہ وہاں تو چاروں طرف کعبہ ہی کعبہ ہے ہر طرف سجدہ کرنا جائز ہے مثلاً چار شخص
بیٹھے ہوں تو چاروں سجدے چار مختلف سمتوں میں کر سکتا ہے ایک ادھر ایک ادھر ایک
اسطرف مگر یہ آزادی صرف اندر ہی اندر ہے باہر ہو نکر دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہی نہیں جہاں
یہ آزادی ہو کہ جس طرف چاہے سجدہ کر سکے مولانا فرماتے ہیں ؎

در درون کعبہ رسم قبلہ نیست   چہ غم ار غواص را پاچیلہ نیست

تو کعبہ کے اندر قبلہ کی قید نہیں اور یہ حضرت ریل ہی میں بیٹھکر قبلہ رخ ہونے کی ضرورت نہیں
سمجھتے اور غضب یہ ہے کہ اگر کہا بھی گیا کہ نماز نہیں ہوئی تو یہ کہدیا کہ اجی سب ہو گئی نہ پڑھنے
سے تو اچھا ہے جیسے جمعہ کے بارہ میں کہدیتے ہیں کہ گاؤں میں اگر جمعہ پڑھ ہی لیا تو کیا بگڑ گیا
نہ پڑھنے سے تو پھر بھی اچھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پھر کبھی یہاں کہ حج بھی کر آیا کرو بلکہ گیارہ ہی کر لیا
کرو کیونکہ حج نکرنے سے تو اچھا ہے۔ بس اسکی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ شرائط بھی ہوں
جو دیکھی ہوں - یہ تو ہم نے نمازیوں کا حال دیکھا ہے۔ اور اسکا کوتاہی ہونا تو ظاہر ہے اور اسکا
اصل ہے طاعت کے اندر سستی اور بے پروائی یہ تو تفریط ہے۔ اور ایک حالت ہے غلو فی الطاعۃ

یعنی زیادتی کرنا طاعت میں یہ افراط ہے لیکن میں نے کہا تھا کہ غلو کا بھی ایک معیار ہے جو لوگوں کی
رائے پر نہیں چھوڑا گیا اور اگر چھوڑ بھی دیا جاتا تو بوجہ اختلاف طبائع کے کوئی معیار ہی قائم
نہ رہ سکتا تھا۔ وہ معیار یہ ہے کہ حدود سے آگے بڑھ جانا خلاصہ کیا ہے اس معیار کا
خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے ہر عمل کی ایک حد اور کچھ شرائط مقرر کی ہیں۔ تو ہر عمل کے کچھ احکام
ہیں کچھ شرائط ہیں کچھ حدود ہیں کچھ ضوابط ہیں کچھ قواعد ہیں انکے خلاف کرنا حدود سے گذر
جانا ہے اسی کا نام ہے غلو اور مجھے اس وقت اسی کو بیان کرنا مقصود ہے کیونکہ ایک یہ بھی
مرض ہے ہم لوگوں میں پس ہمارا یہ حالت ہے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ۔۔۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

چون گرسنہ میشوی سگ میشوی ۔۔۔ چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

ہمارے کھانے میں اور طرح کی خرابیاں ہیں نہ کھانے میں اور طرح کی خرابیاں ہیں غرض دونوں
حالت میں خرابی ہی خرابی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر چہ گیرد علتی علت شود ۔۔۔ ہرچہ گیرد علتی علت شود

کفر گیرد کاملے ملت شود (دو بلہ ۱۲۵)

علتی جس چیز کو اختیار کرتا ہے علت ہی بنا لیتا ہے جیسا کہ اگر کسی میں خلط غالب صفرا ہی
تو وہ مٹھائی بھی کھائیگا وہ بھی صفرا ہی ہو جائیگی اتار شیریں کھائیگا وہ بھی صفرا ہی بنا ئیگا اسی
طرح ہم میں جہل اتنا بڑھا ہوا ہے اگر ہم دین کا بھی کوئی کام کرتے ہیں تو اسمیں بھی جہل ہی ہوتا ہے
بس خلاصہ دینداری کا یہ نکال لیا ہے کہ ہم نے دین کا کام کیا ہے ارے بھائی دین کا کام تو
وہ ہے جسکو اللہ میاں بھی پسند کریں۔ رات بھر تو آقا کو پنکھا جھلا اور حال یہ ہے کہ کبھی سر
میں مار دیا کبھی منہ پر مار دیا کبھی ٹوپی اتار دی یہ تو اپنے نزدیک خدمت کر رہا ہے اور
اسکی کبھی ناک چڑھتی ہے کبھی تیوری پر بل پڑتے ہیں غرض جتنی وہ خدمت کرتا ہے اتنا ہی
وہ دلمیں ناراض ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ حضرت صبح کو سمجھتے ہیں کہ میں نے بڑا کام کیا
رات بھر آقا کی خدمت کی آرام پہونچایا ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے (دوبارہ ۱۲۰) خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے
حاصل خواجہ بجز پندار نیست

اسی طرح ہم نے دین کا جو کام کیا بے ڈھنگے طور پر کیا اور سمجھا کہ ہم نے بڑی طاعت کی مگر ایسی طاعت کی جیسی مولانا فرماتے ہیں

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست (دوبارہ ۱۲۰) دوستی بے خرد چوں دشمنی ست
حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

مشہور ہے۔ کہ کسی نے ریچھ کو پنکھا جھلنا سکھایا تھا کہ بیٹھکر مکھیاں جھلا کریگا چنانچہ تھوڑے دنوں میں اس نے پنکھا جھلنا سیکھ لیا۔ مالک پڑا سوتا رہتا اور وہ بیٹھا مکھیاں جھلا کرتا وہ صاحب بڑے خوش کہ نوکر کی تنخواہ ہی بچی ایک شخص نے کہا بھی کہ میاں یہ کیا کرتے ہو جانور ہے اس کا کیا اعتبار کبھی خطا کھا وے مگر انھوں نے کہا کہ نہیں صاحب اس سے کوئی اندیشہ نہیں یہ تعلیمیافتہ ہے بہت اچھا صاحب وہ تعلیمیافتہ تھا مثل پاس تھا ایک دن مالک سو رہا تھا اور وہ بیٹھا پنکھا بل جھلکر مکھیاں اڑا رہا تھا بعضی مکھی بڑی ضدّن ہوتی ہے ایک مکھی آقا صاحب کے ناک پر آبیٹھی اس نے اسکو اڑا دیا وہ پھر آبیٹھی اس نے پھر اڑا دیا پھر آبیٹھی پھر اڑا دیا مگر وہ پھر آبیٹھی اب وہ بہت جھلایا اس نے کہا اچھی بات ہے تو یوں نہیں جاوگی۔ آپ جا کر ایک بڑا سا پتھر اٹھا لائے اور کہا کہ اب کے تو آجو پتھر ہی نہ مارا ہو مگر وہ بھلا کب ماننے والی تھی مکھی تو یہ عادت ہی تھی پھر آبیٹھی آپنے تاک کر جو پتھر مارا تو خدا جانے وہ تو نکلی یا نہ نکلی مگر آقا صاحب کا بھیجہ تو نکل ہی پڑا۔ یہ ریچھ صاحب کی دوستی کا نتیجہ نکلا تو مولانا فرماتے ہیں ۵

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

اے صاحب اگر ہر عبادت مطلوب ہوتی اور بطور تو سے مطلوب ہوتی کوئی حد اور شرط نہ ہوتی تو پھر عید کے دن کا روزہ بھی حرام نہ ہوتا دوپہر کے وقت کی نماز بھی حرام نہ ہوتی ایسی حالت میں سفر کے اندر روزہ بھی جائز ہوتا حالانکہ فرمارہے ہیں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ بس یہی مسئلہ مجھے مستنبط کرنا تھا

اس حدیث سے کہ طاعت بھی وہی ہے جو حدود کے اندر ہو دیکھو نماز کیسی اچھی چیز ہے اگر دو نفلیں پڑھو یا گھٹنے کھول کر پڑھو حالانکہ کپڑے موجود ہیں نماز نہ ہوگی۔ ہمیشہ سے ہر فن سب زاہد و عابدین اور دین کے کام کرنیوالوں میں یعنی ایک مرض تو کام نہ کرنیکا ہے وہ تو ہے ہی اور ایک مرض ہے کام کرنیوالوں میں کہ بس یہ دیکھ لیا کہ یہ دین کا کام ہے پھر یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ حدود کے اندر ہے یا نہیں حالانکہ شریعت میں یہانتک حدود کی حفاظت ہے کہ میں ابھی بیان کر رہا تھا کہ فلاں فلاں وقت میں نماز پڑھنا جائز نہیں فلاں فلاں وقت روزہ جائز نہیں۔ یہاں تو خیر حرمت ہے اور بعض جگہ حرمت تو نہیں لیکن کراہت ہے دیکھئے نماز کیسی اچھی چیز ہے لیکن ایک صحابی تھے وہ بہت نمازیں پڑھا کرتے تھے یہانتک کہ رات بھر نفلوں میں ہی گذار دیتے تھے حضور کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو انکو بلایا اور فرمایا اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَلِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔ یعنی دیکھو بھائی نمازی اتنی نمازیں نہیں پڑھا کرتے کیونکہ تم پر تمہاری جان کا بھی حق ہے تمہاری بیوی کا بھی حق ہے تمہارے مہمان کا بھی حق ہے ایسی طرح رہو کہ کسی ذی حق کا حق فوت نہ ہو اور ایسی طرح رہو کہ بیمار نہ پڑ جاؤ بیوی کی حق تلفی نہ ہونے پائے مہمان کو بھی تکلیف نہ ہو جاگتے جاگتے آنکھیں نہ اہل آویں۔ اور یہ بھی فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوا حق تعالیٰ تو تھکتا نہیں آخر تم ہی تھک جاؤ گے حالانکہ وہ صحابی کسی مکروہ وقت میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے مگر چونکہ تحمل سے زیادہ پڑھتے تھے اس لئے یہ احتمال تھا کہ کہیں فرضوں میں کوتاہی نہ ہونے لگے اور اگر فرضوں میں کوتاہی نہ بھی ہوتی تو خود اس عبادت میں بھی کراہت اور ناگواری پیدا ہو جانا بھی تو برا ہے اور تحمل سے زیادہ کام کرنیکا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ جب عبادت میں ناگواری پیدا ہونے لگے تو پھر لطف ہی کیا رہا اس لئے بھی حضور نے ان صحابی کو زیادہ جاگنے سے اور زیادہ نمازیں پڑھنے سے روکا اسی طرح ایک صحابی کے بارہ میں سنا کہ روزے بہت رکھتے ہیں انکو بھی کم کا طریقہ بتایا۔ انہوں نے زیادہ کی اجازت پر اصرار کیا آپ نے آخر میں فرمایا کہ سب سے افضل یہ ہے کہ ایکدن روزہ رکھو اور ایک دن افطار کرو۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ

اللہ میں اس سے بھی افضل کی طاقت رکھتا ہوں مجھے کوئی اس سے بھی افضل صورت بتلا دیجئے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ لَا اَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ اس سے افضل اور کوئی صورت نہیں اور یہ صورت تو حضور نے انکی درخواست پر تجویز فرمائی تھی یہاں حضور کی اصل رائے ظاہر نہیں ہوتی حضور کی اصل رائے خصوص ضعفاء کے لئے تو یہ ہے کہ تحمل کی قدر رکھتے کہ اسکو بھی کافی سمجھا کہ ہر مہینہ میں تین روزے رکھ لئے جایا کریں زیادہ مصیبت اٹھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اسکو دس نیکیوں کا ثواب ملجاتا ہے تو تین روزے رکھنے سے تیس روزوں کا ثواب ملجائیگا اور ثواب ہی مقصود ہے تو ہر مہینہ میں تین روزے رکھنے کے یہ معنی ہوئے کہ گویا سال بھر برابر روزے رکھے۔ یہاں ایک باریک بات سمجھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ ظاہر میں تو حضور نے یہ عبادت میں کمی کرائی لیکن درحقیقت یہ بات نہیں۔ کمی نہیں کرائی بلکہ کمی سے روک دیا یعنی نفل عبادت میں زیادتی ہوگی تو قوی مضمحل ہوکر فرض عبادت میں کمی ہوجاویگی۔ دوسرے یہ کہ اگر ابتدا سے تھوڑا کام مقرر کیا جائیگا تو اس کا نباہ آسان ہوگا ورنہ اگر شروع زیادہ کرلیا تو اسکا نباہ نہ ہوسکیگا۔ اور کچھ دن بعد پھر بالکل ہی موقوف ہوجاویگا تو نفل عبادت میں زیادتی کرکے گویا فرض میں بھی کمی ہوئی اور خود اس نفل میں بھی کمی ہوئی بہرحال عبادت میں زیادت تو مطلوب ہے زیادت سے حضور نہیں روکتے بلکہ کمی سے روکتے ہیں تو دیکھئے حضور نے یہ تجویز فرمایا ان کے حق میں کہ ایسا نہ کرو کہ رات بھر نفلیں ہی پڑھتے رہو۔ ایسا نہ ہو بیمار پڑجاؤ۔ ایسا نہ ہو بیوی کا حق ضائع ہونے لگے۔ ایسا نہ ہو ماں کی ضروری خدمت میں ہی خلل پڑجائے۔ ایک مرتبہ چند صحابیوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ سے حضور کی عبادت کا طرز دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ رات کو سوتے بھی ہیں جاگتے بھی ہیں کبھی روزہ رکھتے ہیں کبھی افطار کرتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا حضرت صحابہ نے اتنی عبادت کو قلیل سمجھا۔ کیسے اچھے تھے وہ حضرات ہم تو اس قلت سے یہ نتیجہ نکالتے کہ جب حضور افضل العابدین ہوکر صرف اتنی ہی عبادت کرتے ہیں تو ہم تو حضور کے سامنے کچھ بھی نہیں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برابر عبادت کہاں کرسکتے ہیں۔ اور ان حضرات نے

نتیجہ نکالا کہ حضور کو کیا ضرورت ہے عبادت کی اسواسطے کہ حضور کے بارہ میں تو حق تعالیٰ
خود فرما چکے ہیں لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ پھر حضور
کو کیا ضرورت ہے مصیبت بھرنے کی حضور کے تو اگلے پچھلے سب حق تعالیٰ نے بخشدیے
ہی ہیں ہاں ہم گنہگار ہیں ضرورت تو عبادت کی ہمکو ہے لہذا ہم اپنے کو حضور پر کیوں قیاس کریں
ہمکو تو حضور سے زیادہ عبادت کرنی چاہیئے۔ وہاں یہ اثر ہوا چنانچہ انہوں نے آپسمیں
مختلف عہد کئے۔ ایک جماعت نے تو یہ کہا کہ ہم عورتوں سے ہمیشہ الگ رہیں گے یعنی نکاح
ہی نہ کرینگے۔ بعض نے یہ کہا کہ ہم ہمیشہ روزے ہی رکھا کرینگے۔ کوئی بولا کہ میں رات
بھر جاگا ہی کرونگا۔ اتنے میں حضور بھی تشریف لے آئے۔ آپنے فرمایا جو کچھ تم آپسمیں کہہ
رہے ہو وہ میں نے بھی سنا۔ مگر یاد رکھو کہ ہم تو روزہ بھی رکھتے ہیں افطار بھی کرتے ہیں بیاہ
بھی کئے ہیں پیٹ بھرے بھی رہتے ہیں سوتے بھی ہیں جاگتے بھی ہیں پھر فرمایا ذٰلِكَ
مِنْ سُنَّتِي بس میرا طریقہ یہ ہے میری یہ سنت ہے فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي
بس یاد رکھو جو اعراض کریگا میرے طریقہ سے اور میری سنت سے اس سے مجھسے کوئی علاقہ ٨
نہیں تو آپنے اُن سب کو منع فرمادیا کہ اپنی ان تجویزوں پر ہرگز عمل نہ کرنا بلکہ اسطرح رہو
جیسے ہم رہتے ہیں اسمیں دو راز ہیں ایک تو ہے ظاہری اور ایک ہے باطنی ظاہری تو یہ کہ جب
راحت ہوتی ہے تو سہولت سے کام ہوتا ہے اور باطنی راز یہ ہے کہ راحت کا خاصہ
ہے کہ منعم کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے بشرطیکہ نعمت سے تمتع کے وقت منعم پر نظر بھی ہو کہ
یہ نعمت کس کی طرف سے ہے۔ غرض راحت سے بسر کرنے اور آرام لینے سے حق تعالیٰ
کی محبت پیدا ہوتی ہے کہ سبحان اللہ خدا نے مجھے کتنا سامان راحت دے رکھا ہے دوسرے
ایسا شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا عمل کم ہے کسی کیفیت یا ثمرہ کا اپنے آپکو مستحق نہیں سمجھتا
نہ متوقع رہتا ہے جانتا ہے کہ میں کر ہی کیا رہا ہوں جو مجھے کچھ حاصل ہو اور جتنا کچھ بھی حاصل
ہوتا ہے اسکو محض حق تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے اپنے عمل کا نتیجہ نہیں سمجھتا بخلاف اسکے جو حد
سے زیادہ عبادت اور بڑے بڑے مجاہدے اور ریاضت کرتا ہے وہ ہمیشہ اسکا منتظر
رہتا ہے کہ وجد ہو سکر ہو استغراق ہو اور جانے کیا کیا ہو۔ اور اگر یہ نہیں ہوتا یا کم

ہوتا ہے تو اسکے دل میں یہ شکایت پیدا ہوتی ہے۔

کہیں اتنا زیادہ تو کام کرتا ہوں پھر مجھے کوئی بات حاصل نہیں ہوتی جسکا دوسرا ظاہر یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں تو خدا کا پورا حق ادا کرتا ہوں اور اللہ میاں مجھے [illegible] میرے اعمال کا پورا صلہ نہیں دیتے۔ تو یہ شخص اپنی عبادت کا پلہ بھاری سمجھتا ہے اور حق تعالیٰ کی عنایت کا پلہ ہلکا سمجھتا ہے کہ یہ میرا پلہ بھاری ہے خدا کا پلہ ہلکا ہے غلو فی العبادۃ میں یہ ایک مرض باطنی پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے غلو اور تشدد کرنا مناسب نہیں۔ حدود کے اندر رہنا چاہئے حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

گفت آسان گیر بر خود کارہا کز روئے طبع سخت می گیرد جہاں بر مردمان سخت کوش

یہ اس حدیث کا ترجمہ ہے مَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ خلاصہ یہ کہ عبادت بھی اپنی رائے پر نہیں ہے عبادت میں بھی حدود ہیں ان سے آگے نہ بڑھنا چاہئے چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا کہیں فرماتے ہیں فَلَا تَقْرَبُوهَا یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو بلکہ انکے پاس بھی نہ پھٹکو۔ اسوقت یہ عام غلطی ہے خصوصاً جو دنیا کا کام کرتے ہیں انھوں نے حدود کا خلاصہ یہ نکال لیا ہے کہ اصل میں کام مقصود ہے جس طریق سے بھی حاصل ہو جائے اسکی ایسی مثال ہے کہ کسی نے دل میں یہ ٹھان لیا کہ لوگوں سے جماعت کی نماز پڑھوانا چاہئے کیونکہ یہ بڑا ثواب کا کام ہے اسکا طریق جو شریعت نے بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ موذن کھڑا ہو کر پکارے حَیَّ عَلَى الصَّلٰوةِ حَیَّ عَلَى الصَّلٰوةِ چنانچہ اذان کہدی گئی لیکن کوئی بھی نہیں آیا اس نے سوچا یہ طریقہ تو کافی نہیں ہوا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہئے بس آپنے کیا کیا کہ گانے بجانے والے بلالئے اور بجائے اذان کے یا بعد اذان کے ان سے کہدیا کہ ہاں ذرا شروع تو کر دو۔ بس راگ کا شروع ہونا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے آکر جمع ہونا شروع ہو گئے یہانتک کہ ساری مسجد بھر گئی پھر اسنے پھاٹک بند کرکے وضو کا اہتمام کیا اور سب کو نماز پڑھوائی۔ وہ کوئی ذی اثر شخص تھا نہیں براہ راست نماز کیلئے لوگوں کو بلا سکتا نہ تھا اسلئے اسنے بلانیکی یہ ترکیب کی پھر بلانیکے بعد سب سے نماز پڑھنے کیلئے کہا تو کون انکار کر سکتا تھا بہت بڑی جماعت کے ساتھ نماز ہوئی [illegible] غرضیکہ

بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی توفیق نہ ہوئی تھی اب بھی جماعت کا ثواب مل گیا آپ بڑے
خوش کہ سبحان اللہ میں نے کیسا اچھا کام کیا دیکھا اس ترکیب سے نماز پڑھوایا کرتے ہیں اسیطرح
ایک ... ہر ... استفسار کرتا ہوں ... صاحب سے کہ کوئی کھانا یا رضائی بچانا اس ...
کے حاصل کرنے کیلئے کرنا ... جماعت ... نماز پڑھیں کیونکہ آذان سے تو وہ مسجد میں ...
نہیں کیا یہ جائز ہے ۔ یا یہ حکم شرعی ہے کہ تم اپنی طرف سے اذان کہدو پھر چاہے کوئی آدے
یا نہ آئے اس جزئی میں تو کسی کا کلام نہیں ہے مگر اسکے ماننے والے دوسری جگہ اسکے
امثال میں غلطی کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اعمال سے مقصود حق تعالیٰ کو راضی کرنا ہے
تو عمل فی نفسہ کوئی بھی مقصود بالذات نہیں اور جو طرق مقصود تک پہنچا دینے ہی مقصود بالغیر
ہیں مقصود بالذات نہیں تو رضائے حق مقصود بالذات ہے اس کے طرق اور اسباب
مقصود بالغیر ہیں لیکن طرق اور اسباب اگر متعدد و مختلف ہوں تو انکی تعیین آپکی
رائے پر نہیں بلکہ شریعت نے جیسے مقصود کو متعین کیا ہے ایسی ہی طرق اور اسباب
کو بھی متعین کردیا ہے کہ رضا کی یہ سبیل ہے اور یہ طریق ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے
ہیں اِنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ یعنی خدا کی ایک سڑک ہے جو مقصود تک
پہونچاتی ہے اسکی ایسی مثال ہے میں ایک کام کی مثال بیان کرتا ہوں (یہانتک بیان فرمایا
تھا کہ عشاء کی اذان ہونے لگی حضرت ساکت ہو گئے بعد ختم اذان پھر شروع فرمایا) مثلاً
بہت لوگوں کو دیکھتے اس بلا میں مبتلا دیکھا کہ کوئی مسجد بنوانی چاہی یا کسی مدرسہ وغیرہ کو
جاری کرنا چاہا تو اسکے واسطے ... میں جائز طریقہ تو یہ ہے کہ اعلان کردیا کہ بھائی جسکو
توفیق ہو چندہ میں شرکت کرے ... تو خطاب عام کی ہے اور اگر خطاب خاص ہو تو
اسکے لئے چند شرطیں ہیں ۔ ایک شرط ... کہ ... نہ کہ جس سے وہ شرما جائے ...
خواہ مخواہ کچھ دینا ہی پڑے ایک یہ کہ ... مخاطب نہ کہے جسکا دباؤ پڑے ۔ ایک یہ کہ ...
نہ ... کا واسطہ نہ ہو ... ہی ... اس سے پہلی شرط ...
شروط کا یہ ہے کہ دباؤ ... کہنے والا ذی اثر ہو الحاح کے ساتھ ...
جمع کے سامنے شرمندہ نہ کرے ... صاف کہدے کہ صاحب ... اگر ... تو ...

ہو گے تو تمہارا ہی نفع ہے ہماری کوئی غرض نہیں دو گے تو ثواب ہے نہ دو گے تو کوئی جبر نہیں
اور ہم کسی سے کہیں گے بھی نہیں نہ بدنام کرینگے۔ یہ سب باتیں صاف صاف کہدینی ضروری ہیں
تاکہ دباؤ نہ پڑے اسواسطے کہ لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِّنْہُ کسی مسلمان
کا مال حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ طیب خاطر سے نہ دیدے۔ اب ایک صاحب نے شروع
کیا مدرسہ اول تو چونکہ جائز طریق سے تحریک تھی اسلئے کچھ زیادہ چندہ اکٹھا نہیں ہوا کہنے لگے
لوجی مولانا کے فرمانے کے مطابق کسی پر دباؤ نہیں ڈالا تھا پھر کیا خاک ملا۔ دس روپیہ ماہوار
بھی نہیں ملتے۔ اب ہم اپنی کارگذاری دکھاتے ہیں اب ہم چندہ جمع کرینگے کن لوگوں سے میونسپل
چیرمین سے نمبرداروں سے بڑے بڑے رئیسوں سے سب رجسٹرار سے تحصیلدار سے
وکیلوں سے یعنی انکے ذریعہ سے چندہ جمع کرینگے اگر انکا کہنا ایک ایک نے بھی مان لیا اور دو
دو چار چار روپیہ بھی ہر شخص نے دئے جیسا انکی وجاہت اور اثر سے بھی توقع ہے تو ذرا
سی دیر میں ساٹھ روپیہ ہو گئے۔ اب بڑے سرخرو ہیں کہ دیکھو مولانا نے جلسہ میں ترغیب
عام دی تھی وہاں تو ساٹھ پیسے ہی جمع ہوئے یہاں ہم نے ذرا سی دیر میں ساٹھ روپیہ کر لئے
مگر میں کہتا ہوں کہ مطلب کیا ہے یہی ناکہ مدرسہ چلے اور مدرسہ چلنے سے کیا مقصود ہے
یہ کہ خدا راضی ہو اور جب خلاف حکم خدا کے کیا تو مدرسہ تو چلا مگر جو اصل غرض تھی
یعنی خوشنودی حق تعالیٰ کی وہ تو حاصل نہ ہوئی غرض اسمیں یہ غلطی کرتے ہیں کہ بس
دین کے کام کا نام سیکھ لیا اور اسکو جسطرح بن پڑا کرنا شروع کردیا پھر یہ نہیں دیکھتے کہ ہم اپنے
مقصود کو جائز طریق سے حاصل کر رہے ہیں یا ناجائز طریق سے بس ایک ہڑبونگ ہے کہ اس کام
کو پورا کرنا چاہئے چاہے جائز طریق سے پورا ہو یا ناجائز طریق سے جیسے کسی نے یہ ٹھان لیا کہ میں
شہر بھر کے مسکینوں کو دو دو روپیہ تقسیم کرونگا اس مقصود کے حاصل کرنیکے لئے اسنے چند مسلح
اور ہتیار بند ڈاکوؤں کو ہمراہ لیکر کوئی برات جا رہی تھی اسپر جا چھاپا مارا اور لوٹ لیا سارا
مال اسباب۔ تو صاحب یہ تو ایسا ہو گیا۔ تو کیا یہ دین ہے۔ دین تو وہ ہے کہ نہ مقصود دین کے
خلاف ہو نہ اسکے طریق دین کے خلاف ہوں۔ ورنہ وہ دین میں عیب ہے اسکی بظاہر اور مثالیں
بھی ہیں۔ لیکن میں نے بہت مثالیں پیش کردی ہیں اسلئے میں اب ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ اس بیان کا یہ ہے کہ جب کوئی کام کرو تو جی میں یہ نہ ٹھان لو کہ فلانا مطلب جسطرح بن پڑے حاصل ہو ہی جاوے بلکہ اپنا اصل مطمح نظر رضائے حق کو رکھو اور یہ قصد رکھو کہ رضائے حق حاصل ہو جانا چاہیئے کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔ سلطان صلاح الدین نے جب ملک شام فتح کیا تو وزراء نے عرض کیا کہ ضرورت ہے یہاں کیلئے کوئی قانون بھی تجویز فرمایا اس نے کہا کہ قانون شرع موجود تو ہے۔ قانون جدید کی ضرورت کیا ہے لوگوں نے کہا کہ حضور شریعت میں نرم سزائیں ہیں۔ یہ عیسائیوں کا نہایت سرکش اور فسادی فرقہ ہے انکیلئے سخت سزاؤں کی ضرورت ہے ان پر اثر نہ ہو گا اس نرم قانون کا اسواسطے حضور اپنی رائے سے کوئی نیا قانون ان کیلئے مقرر کر دیں ورنہ یہ آیا ہوا ملک ہاتھ سے جاتا رہیگا سلطان یہ سنکر بہت برہم ہوا اور کہا کہ خلاف خدا رسول کے کوئی قانون ہرگز نافذ نہیں کیا جائیگا اور تم مجھے ڈراتے ہو کہ سلطنت جاتی رہیگی تو کیا مجھے کچھ سلطنت کرنی مقصود ہے تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ مجھے ان معرکہ آرائیوں سے سلطنت مقصود ہے سو واللہ میں نے یہ جو کچھ کیا ہے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو کیا ہے سلطنت کرنے کے شوق میں نہیں کیا اگر خدا تعالیٰ مجھے فقر و فاقہ اور ذلت و گدائی کی حالت میں بھی رکھیں میں اسپر بھی ویسا ہی خوش ہوں جیسا کہ سلطنت کی حالت میں۔ میں کسی حالت کو ترجیح نہیں دیتا۔ بس خدا تعالیٰ راضی رہیں نہ مجھے پروا سلطنت کی ہے نہ گدائی سے عار ہے اور واقعی عاشق کا تو یہی مذہب ہونا ہے

مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

دلآرامے کہ داری دل در و بند — دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند (دوبار ۱۲)

؎ دلآرامے کہ داری دل در و بند — دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار — مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار (دوبار ۱۲)

بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

بس مصلحت یہی ہے کہ ایک خدا کی خوشنودی کو لیکر باقی سب مصلحتوں پر خاک ڈالدو۔ تو طریقہ یہی ہے کہ جو کام بھی دین کا یا دنیا کا کرنا چاہیئے ایک معتدل اور سیدھی بات بتلائے دیتا

ہوں کہ علماء سے پہلے فتویٰ حاصل کر لیا کرو اور علماء بھی کون علماء محققین پھر اگر وہ فتویٰ
غلط دینگے تو انکی گردن ناپی جاویگی تم پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ علماء سے جی کڑا نہ
جاوے کہ یہ فتویٰ صحیح ہے اب چاہئے وہ مطلب حاصل ہو یا نہ ہو جیسا تم نے اپنے دل میں
جما رکھا ہے خدا تعالیٰ خوش ہونے چاہئیں۔ اگر مطلب حاصل ہو گیا لیکن اللہ میاں ناراض
رہے تو فائدہ ہی کیا ہوا۔ غرض یہ ہے مسائل دین میں بعض لوگ خود مسائل بیان کرنا لیتے ہیں لوگ
اسمیں بہت غلطیاں کرتے ہیں بالخصوص اسوقت تو بہت غلطیاں کر رہے ہیں اور اسلئے دین سے
متنفر کر دیا ہے۔ بس میں قاعدہ کو یاد رکھو کہ جو کام کرو علماء سے پوچھ کر کرو اور اگر اختلاف ہو تو
جس عالم کا قول زیادہ جی کو لگے اور دل یہ گواہی دینے لگے اسمیں کوئی مصلحت یا لالچ نہیں
ہے اسکو اختیار کر لو اور عالم کا ہر قول معتبر نہیں ہے جو فتویٰ ہو وہ قابل اعتبار ہے یعنی
ایک تو محض رائے ہوتی ہے وہ مشورہ ہوتا ہے وہ حجت نہیں بلکہ جو فتویٰ ہو شرعی دلیل سے جسکو دلیل کہتے
ہیں کہ فلاں کام شرعی دلیل سے جائز ہے یا فلاں کام شرعی دلیل سے ناجائز ہے خواہ وہ
دلیل ظاہر نہ کرے اسکا اعتبار ہے پھر اگر وہ غلط کہے گا تو وہ مواخذہ دار ہوگا اگر کسی
عالم کا کوئی اشتہار دیکھو یا تقریر سنو یا تحریر دیکھو تو اس پر عمل نہ کرو جب تک کہ بالتصریح
یہ نہ پوچھ لو کہ یہ رائے ہے مشورہ ہے یا حکم شرعی ہے اگر وہ کہدے کہ رائے ہے تو فتویٰ حاصل کرو
اور اگر کہے کہ حکم شرعی ہے تو دیکھو کہ دل کو بھی لگتا ہے یا نہیں اگر نہیں لگتا تو اور علماء سے بھی
پوچھو اگر سب جگہ سے وہی فتویٰ ملے تو پھر دل کے نہ لگنے کا اعتبار نہ کرو اسی پر عمل
کر لو اور اگر کسی عالم کے یہاں سے اسکے خلاف فتویٰ ملے اور وہ دل کو لگ جاوے تو اسپر
عمل کرو یہ سیدھی سی بات ہے اگر اسپر عمل کرو گے تو بہت سی پریشانیوں سے انشاء اللہ نجات ہو جاوے گی
اب ایسے کام کئے جا رہے ہیں لوگوں نے مشکل سمجھ رکھا ہے بعضے اس قسم کے ہوتے ہیں یا لوگ یہ کرتے ہیں کہ
بعض اختلاف کی صورت میں جو قول اپنے نفس کے موافق ہوا اسی کو لے لیا جاتا ہے
جسکا قول قبول کیا ہے وہ خود بھی نہیں کہتا کہ یہ حکم شرعی ہے۔ اکثر نے مجبور ہوکر
اہل علم کو تنگ کرتے ہیں کہ وہ مولوی صاحب تو یوں کہتے ہیں اور آپ یوں کہتے ہیں میں
کہتا ہوں کہ ضرورت ہی کیا ہے ایک کے سامنے دوسرے کے قول کے نقل کرنے کی۔ جاؤ

اپنے اپنے طور پر تحقیق کرلو جب کہ حکم شرعی کو کوئی نقل کرتا ہو کہ لگے اور دل گواہی دے کہ
ہاں یہ حکم شرعی ہونے کی حیثیت رکھتا ہے بس اس پر عمل کرے۔ وہ اس طرح کر [illegible] اگر غلطی عمل
میں بھی ہوگی تب بھی اجر ہوگا اور اگر نفس کی آمیزش ہے تو چاہے عنوان دین ہی کا ہو لیکن
سخت اندیشہ ہے گناہ گار ہو دیکھئے بدعت میں بھی تو یہی ہوتا ہے کیونکہ حقیقی بدعات ہیں وہ سب
برنگ عبادات ہی تو ہیں لیکن چونکہ حدود سے خارج ہیں اسلئے انکا دین میں کچھ اعتبار نہیں۔ وہ
صورۃً عبادات ہیں لیکن معنیً معاصی ہیں۔ تو حضرت خوب سمجھ لیجئے کہ معنی کا اعتبار ہے
صورت کا اعتبار نہیں جو دین حدود کے اندر ہے وہ تو دین ہے اور جو حدود کے باہر ہے
وہ دین ہی نہیں بلکہ ہوائے نفسانی ہے تو خدا کیلئے ہوائے نفسانی کے تابع نہ ہو۔ گو اسکو
دین ہی کی شکل پہنا دی گئی ہو چاہے دین کے اختیار کر لینے سے دنیا کا خسارہ ہی کیوں
نہ ہو یہ بطور فرض کے کہتا ہوں ورنہ خدا و رسول کے حکموں پر چلنے سے کبھی دنیا کا ضرر ہوتا
ہی نہیں اور اگر ہو بھی تو کچھ پروا نہ کرنی چاہئے بلکہ تمہارا تو یہ مذہب ہونا چاہئے ؎

دل آرامے کہ داری دل درو بند — دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور اگر ہوائے نفسانی کا اتباع کیا تو اسکی نسبت مولانا فرماتے ہیں ؎

باہوا و آرزو کم باش دوست — چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

(پارہ ۲۳)
؎ باہوا و آرزو کم باش دوست — چوں یُضِلُّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اوست

فرماتے ہیں کہ ہوا و آرزو کے دوست نہ ہو کیونکہ اسکی شان یہ ہے کہ بھٹکا دیتی ہے حق تعالیٰ
کے راستہ سے آگے فرماتے ہیں اور بس میں اسی پر ختم کرونگا ؎

ہیچ چیزے نشکند اندر جہاں — ایں ہوا را جز کہ سایہ ہمرہاں

کوئی چیز ہوا اور آرزو کو نہیں توڑتی بجز شیخ کامل کے سایہ کے کیونکہ ہوا اور آرزو کا
منشا ہوتا ہے نفس اور صحبت اہل اللہ اور شیخ کامل کا خاصہ یہ ہے کہ ؎

نفس نتواں کشت الا ظل پیر — دامن آں نفس کش را سخت گیر

(دو بار ۱۲)
؎ نفس نتواں کشت الا ظل پیر — دامن آں نفس کش را سخت گیر

اور یہ ضرورت [illegible] کی ہو جائے۔ بلکہ جس کو سمجھے کہ یہ اللہ والے ہیں بس

اسکی تجویز پر عمل کرنا ہے۔ اور ہر صغیر و کبیر نقیر و قطمیر کو پوچھ لیا کرے بس یہ ہے خلاصہ دین کا
اللہ اللہ اور خیر صلا۔ اگر اسمیں جان بھی چلی جاوے گی تب بھی پریشانی نہ ہوگی بس یہ بیان
کرنا تھا مجھے۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ فہم سلیم اور توفیق عمل کی نصیحت فرمائیں
(پھر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جس کا کچھ حصہ جہر کے ساتھ فرمایا جو آگے آتا ہے ۱۲)
اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ
اے اللہ ہمیں حق کو حق کر کے دکھلا اور باطل کو باطل کر کے دکھلا حق اور باطل اچھی
طرح متمیز کر دے اور ہر طرح کی تلبیس اور نفس کی آمیزش سے محفوظ رکھ
یہ تو علم کا درجہ ہوا اور عمل کا درجہ یہ کہ حق کو واضح کر کے
اسپر عمل کی توفیق بھی عطا فرما پھر کچھ دیر تک
حسب معمول سکوت کی
حالت میں دعا مانگتے
رہے
(۱۲)

اشرف علی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الوعظ المسمّٰی بہ

الاطمنان بالدّنیا

این	متیٰ	کم	کیف	لِمَ	ماذا	[illegible]	من ضبط	السامعون	[illegible]
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر میں ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	[illegible]	کس نے لکھا	کتنے آدمی تھے	[illegible]
[illegible] ضلع [illegible]	۱۱ رجب سنہ ۱۳۳۲ ہجری	دو گھنٹہ			دنیا پر مطمئن ہونا [illegible] آخرت [illegible] اور اس کا علاج		حکیم محمد یوسف صاحب [illegible]		

خطبہ ماثورہ معمولہ۔ اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ہرچند ہمارے اندر مختلف امراض پائے جاتے ہیں لیکن بنص حدیث اصل تمام امراض کی صرف ایک ہی چیز ہے وہ کیا ہے حب دنیا جسکو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے کہ حُبُّ الدُّنۡیَا رَاۡسُ کُلِّ خَطِیۡئَۃٍ کہ دنیا کی محبت تمام خرابیوں کی

جڑ ہے اسوجہ سے بجائے اسکے کہ اسوقت ہر مرض کو جدا جدا مفصل بیان کیا جائے مناسب یہ ہے کہ سارے امراض کی اصل اور اسکے علاج کو بیان کر دیا جائے چونکہ وہاں تو ہر ایک مرض کو مفصلاً بیان کرنے کیلئے وقت میں گنجائش نہیں دوسرے اصل کا علاج بیان کرنے میں یہ بھی نفع ہے کہ مرض اصلی کا علاج کلی معلوم ہو جانے سے قریب قریب سب امراض کا علاج معلوم ہو جائیگا کیونکہ اصل مرض بقیہ امراض کا سبب ہوا کرتا ہے تو اس کے علاج سے سب کا علاج ہو جائیگا کیونکہ علاج کی حقیقت اصل میں سبب ہی کا ازالہ ہے مثلاً کسی کے جسم میں خون ضرورت سے زیادہ نکل گیا اور اسوجہ سے قلب اور دماغ میں ضعف لاحق ہو گیا اور اسکے علاوہ اور امراض بھی پیدا ہو گئے اس حالت میں ایک تو علاج یہ ہے کہ ہر مرض کا علاج جدا گانہ کیا جائے جیسے مقوی دماغ اور مقوی قلب اجزاء استعمال کئے جاویں تاکہ دماغ میں قوت پیدا ہو اور قلب کا ضعف رفع ہو غرض ہر مرض کا علاج جدا جدا کیا جائے مگر ظاہر ہے کہ اس میں بہت ہی وقت صرف ہو گا اور دقتیں پیش آئیں گی دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمام امراض کی اصل اور جڑ کو تلاش کیا جاوے کہ وہ کیا سبب ہے جسکی وجہ سے یہ تمام امراض لاحق ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ یہاں تمام امراض کی اصل خون کا جسم سے نکل جانا ہے بس مناسب یہ ہے کہ اس حالت میں ایسی تدبیر کیجائیں جن سے خون میں ترقی ہو جب خون بڑھے گا تمام امراض خود بخود زائل ہو جائیں گے۔ ایسے ہی یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ اصل کا علاج کرنے سے جملہ امراض کا دفعیہ ہو جائیگا حب دنیا چونکہ تمام خطاؤں کی جڑ ہے جب اس کا علاج ہو جائیگا تو سارے امراض خود ہی دفع ہو جاوینگے اور یہ ایک کلی علاج ہے البتہ ایک سوال یہاں یہ ہو سکتا ہے کہ حب دنیا کو جو تمام امراض کی جڑ بتلایا گیا ہے تو اس کو دیگر امراض سے کیا علاقہ ہے جس کی وجہ سے اس کو جملہ امراض کی اصل قرار دیا گیا ہے مثلاً نماز نہ پڑھنے کو حب دنیا سے کیا علاقہ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص میں حب دنیا ہو اور نماز بھی پڑھتا ہو یا ایک شخص میں حب دنیا ہو اور روزہ رکھتا ہو علیٰ ہذا اور اعمال کو دیکھئے۔ تو حب دنیا کو نماز نہ پڑھنا وغیرہ کی جڑ قرار دینے کا کیا مطلب ہے۔ بظاہر تو کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا یا مثلاً کسی میں غصہ ہو اور دنیا کی محبت نہ ہو بات یہ ہے اگر غور کیا جاوے تو حب دنیا کو ہر مرض سے علاقہ ہے کیونکہ جس میں حب دنیا ہو گی اسکو

تمام امراض کا مجموعی ... علاج

جب دنیا تمام امراض کی اصل کیسے ہے

آخرت کا اہتمام ہی ہوگا جب آخرت کا اہتمام ہوگا تو وہ شخص اعمال حسنہ کو انجام ہی دیگا اور نہ برائیوں سے بچے گا اور ایسے ہی برعکس جب آخرت کی فکر ہوتی ہے تو جرائم صادر نہیں ہوتے مثلاً جو لوگ جرائم کرتے ہیں وہ محض اس وجہ سے کہ آخرت کی فکر نہیں اگر آخرت کے واقعات لوگوں کے پیش نظر ہوں تو جرائم کبھی صادر نہ ہوں مگر جب دنیا کے مراتب مختلف ہیں جیسے فکر آخرت کے مراتب مختلف ہیں پس جن درجات میں تضاد ہے وہ جمع نہیں ہو سکتے اور جن میں تضاد نہیں وہ جمع ہو سکتے ہیں اور یہی راز ہے اس کا کہ ایک حدیث میں تو فرمایا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ اور دوسری حدیث میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ وَاِنْ زَنیٰ وَاِنْ سَرَقَ بات یہ ہے کہ مراتب ایمانی مختلف ہیں ایک مرتبہ اہتمام آخرت کا ایمان کا درجہ نفس تصدیق ہے کہ اس کم پر اکتفار کرنا جائز نہیں یہ درجہ فکر آخرت کا ایمان کا زنا اور سرقہ و دیگر معاصی کیساتھ جمع ہو سکتا ہے اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے مریض کو نسخہ لکھکر دیا اور جملہ امور اس کے متعلق بتلا دئے اور طبیب کو مقصود ہو کہ اس مریض کو اس نسخہ سے کامل شفا ہو جاوے گی مگر مریض نے پورے نسخہ کا استعمال نکیا بلکہ آدھے نسخہ کا استعمال کیا ظاہر ہے کہ آدھے نسخہ سے ادنیٰ درجہ کا نفع ہوگا اور پورے سے پورا نفع ہوگا اسی طرح نفس تصدیق عذاب دائمی جہنم سے بچنے کا باعث ہو سکتی ہے مگر پوری نجات کا سبب نہیں بن سکتی۔ اور اس درجہ کے ساتھ معاصی جمع ہو سکتے ہیں اور دوسرا درجہ ایمان کا وہ تصدیق ہے جس پر اثر کامل مرتب ہو اور یہی تصدیق کامل ہے یہ مرتبہ ایمان کا معاصی کیساتھ جمع نہیں ہو سکتا جس شخص کو یہ مرتبہ حاصل ہو تو اس سے زنا اور سرقہ وغیرہ سرزد ہی نہیں ہوگا۔ الغرض خدا تعالیٰ اور رسول علیہ السلام کو سچا سمجھنے کے مراتب مختلف ہیں کامل سچا سمجھنا وہ ہے جس پر اثر کامل مرتب ہو کہ معاصی تمامہا چھوٹ جائیں اور دوسرا درجہ ناقص تصدیق کا ہے کہ کچھ معاصی چھوٹ جائیں کچھ باقی ہیں۔ دوسرے درجہ ایمانی کی مثال آدھے نسخہ کی سی ہے کہ آدھے نسخہ سے آدھا فائدہ ہوگا اسی طرح اسی درجہ کے ایمان سے یہ نفع ہوگا کہ آدمی عذاب دائمی جہنم سے

نجات نپا جاے پوری نجات یعنی نجات اولی اسکو حاصل نہوگی اور پہلے درجہ ایمانی کی مثال پورے
نسخہ کی سی ہے جیسے پورے نسخہ سے پورا نفع ہوتا ہے اسی طرح پورے ایمان سے پورا
نفع ہوگا کہ آدمی علاوہ جہنم سے نجات پانے کے اور انعامات کا بھی مستحق ہوگا۔ یا مثلاً دو شخص
ہوں کہ ہر ایک ان میں سے سنکھیا کو مہلک سمجھتا ہے مگر ایک نے باوجود مہلک سمجھنے کے
اسکو کھالیا اور ہلاک ہوگیا اور دوسرے نے نہیں کھایا ظاہر ہے کہ دونوں نے اسکو
مہلک تو سمجھا مگر پہلے شخص کا مہلک سمجھنا کامل نہیں کیونکہ مہلک جاننے کا اثر مرتب
نہیں ہوا اور دوسرے کا مہلک سمجھنا کامل درجہ کا ہے کیونکہ اسپر اثر مرتب ہوا یا ایک شخص
کو کسی نے خبر دی کہ تیرا حاکم آگیا اس نے اس خبر کو سنکر اس کے آنے کا کچھ بھی اہتمام نکیا نہ کام
کی درستی کی ویسے ہی پڑا رہا معلوم ہوا کہ اس نے حاکم کے آنے کی خبر کو کامل طور پر سچا
نہیں سمجھا معمولی سمجھا اگر اسکو تصدیق کامل ہوتی تو اسپر اثر مرتب ہوتا وہ یہ کہ کام
کی درستی کرتا اسی طرح ایمان سچا اور کامل وہی ہے جس پر اثر مرتب ہو ہر قدم
پر اثر ہو جس شخص کی یہ حالت ہوگی کبھی نافرمانی نکریگا اور ایسا شخص ماضی کی کوتاہی
کا بھی تدارک کریگا اور آئندہ معاصی سے مجتنب رہے گا اسی طرح مراتب مختلف ہیں حب
دنیا کے بھی مراتب مختلف ہیں کسی میں کم ہے کسی میں زیادہ کفار میں زیادہ ہے مسلمانوں
میں کم ہے مگر ہے ضرور اور یہی جڑ ہے تمام گناہوں کی کیونکہ حب دنیا میں فکر دین کم
ہوتی ہے جس درجہ کی حب دنیا ہوگی اسی درجہ کی فکر دین کم ہوگی اگر کامل درجہ کی
حب دنیا ہے تو کامل درجہ کی دین سے بےفکری ہوگی جیسا کہ کفار میں متحقق ہے اور مسلمانوں
میں جس درجہ کی حب دنیا ہے اسی درجہ کی دین سے بےفکری ہے تو یہ دخل ہے حب
دنیا کو ان امور میں جنکا میں ذکر کر رہا ہوں اور کفار میں تو یہ مرض ہے ہی افسوس یہ ہے
کہ ہم میں بھی پایا جاتا ہے اور اگر یہ اعتراض کیا جاوے کہ اس آیت کو کیوں اختیار کیا
گیا یہ تو کفار کے بارہ میں ہے چنانچہ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا اسمیں صریح ہے،
مسلمانوں سے اسکو کیا علاقہ یہ شبہ بہت لوگوں کو ہوا ہوگا کیونکہ لوگوں کا خیال یہ ہے
کہ جو آیتیں کفار کے بارہ میں ہیں مسلمانوں سے انکو کچھ علاقہ نہیں اور اسی لئے لوگ بےفکر

م

ف

حب دنیا مراتب مختلف ہیں

بھی ہو گئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جو وعیدیں کفار کے بارہ میں وارد ہیں ان وعیدوں کی بناء کیا ہے آیا کفار کی ذات ہے یا کفار کے اعمال ہیں ظاہر ہے کہ بناء ان وعیدوں کی اعمال ہی ہیں جو کفار میں پائے جاتے ہیں اور راز اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو نہ تو کسی کی ذات سے محبت ہے نہ کسی کی ذات سے بغض ہے من حیث الذات خدا تعالیٰ کے نزدیک سب برابر ہیں بلکہ دارمدار بغض و محبت کا صرف اعمال ہی ہیں جس کے اچھے اعمال ہوں حق تعالیٰ کو اس سے محبت ہے اور جس کے اعمال برے ہوں اس سے بغض ہے مثل مشہور ہے کہ کام پیارا ہے چام پیارا نہیں اگر کسی کی ذات مبغوض ہو تو چاہیے کہ باوجود اعمال نیک کے بھی وہ شخص مقبول نہ ہو حالانکہ حدیث میں ہے کہ جب بندہ توبہ کر لیتا ہے تو اگر اس کے گناہ زمین بھر کر بھی ہوں وہ بھی معاف کر دیے جاتے ہیں بس سمجھ لو کہ کفار پر جو وعیدیں ہیں وہ انکی ذات پر نہیں بلکہ اعمال پر ہیں اس لئے اگر وہ امور کسی مومن میں پائے جائیں تو وہ بھی مستحق وعید اور عند اللہ مبغوض ہوگا گو اس درجہ کا نہ ہو کیونکہ اقتران بالکفر سے ان اعمال میں زیادہ مبغوضیت آجاتی ہے حاصل یہ ہے کہ مدار حب و بغض کا اعمال پر ہے البتہ مومن و کافر کے عمل معصیت میں اتنا تفاوت ہے کہ ایک شخص نے سنکھیا کھایا اور تریاق نہیں کھایا ظاہر ہے کہ ایسا شخص مریگا اور ایک شخص نے سنکھیا کھایا اور تریاق بھی کھا لیا اثر سنکھیا کا اس صورت میں بھی ہوگا مگر ضعیف یہی حال مومن اور کافر کا ہے کہ مومن نے باوجود استعمال معصیت کے تریاق بھی کھا رکھا ہے وہ کیا ہے ایمان کہ اس نے اثر کو ضعیف کر دیا ہے بخلاف کفار کے کہ تریاق ایمان انہوں نے نہیں کھایا اس لئے پورا اثر ہوا باقی زہر کھانے میں دونوں برابر ہیں اس لئے دونوں کو زہر کے مفاسد سنائے جائیں گے ایک مثال اسکی یہ ہے کہ دنیا میں جرائم کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو بادشاہ کے باغی ہیں اور جرائم بھی کرتے ہیں دوسرے وہ ہیں کہ جرائم تو کرتے ہیں مگر باغی نہیں یہ دوسرا فریق چونکہ مطیع ہے اسپر جرائم کا اثر تو ہوا مگر اطاعت نے اسکو خفیف کر دیا وہ یہ کہ ایک حد خاص تک جرائم کی سزا محدود رہے گی بخلاف اس گروہ کے جو باوجود جرائم کرنے کے باغی بھی ہے اسکی سزا محدود نہ ہوگی اور پہلے فریق سے سزا میں وہ بڑھا ہوا ہوگا

خدا تعالیٰ کی محبت و بغض کا مدار اعمال ہیں

۵

وہ یہ کہ دائم الحبس کیا جاویگا یہی راز ہے کفار کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کا کہ کفار اس میں ہمیشہ رہیں گے اور مومن کو ہمیشگی نہ ہوگی وجہ یہ ہے کہ مومن جرائم تو کرتا ہے مگر اسکے ساتھ باغی نہیں اور کافر جرائم بھی کرتا ہے اور باغی بھی ہے بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کفار کو ابدی سزا ہونا خلاف عقل ہے ہم کہتے ہیں کہ تم بھی وہی تجویز کرتے جو خدا نے تجویز کیا ہے مگر حکام کے اختیار میں غیر محدود ہمیشگی نہیں اور اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں غیر محدود ہمیشگی ہے اگر دوام ابدی آپ کے قبضہ میں ہوتا تو آپ بھی ایسے مجرموں کیلئے دوام ابدی ہی تجویز کرتے مگر کیا کریں مجرم کو بلا اختیار آپ کی موت آجاتی ہے اس لئے آپ مجبور ہیں اپنے قلوب کو ٹٹول کر دیکھ لو اگر دوام ابدی آپکے قبضہ میں ہوتا تو کیا آپ ایسے مجرم کیلئے ایسی ہی دوامی سزا تجویز کرتے لوگوں کا بس نہیں چلتا اسلئے مجبور ہیں اور جتنا انکا بس چلتا ہے اسمیں کسر نہیں چھوڑتے جیسے بعض ملکوں کی خاصیت ہے کہ وہاں عمریں بڑی ہوتی ہیں تو وہاں اگر باغی کو دائم الحبس کیا گیا تو وہ ہندوستان کے باغیوں سے زیادہ جیلخانہ میں محبوس رہیگا مگر اسپر کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ ہندوستان کے باغی تو بیس تیس برس ہی محبوس رہتے ہیں ۶
دوسرے ملکوں کے باغیوں کو سو دو پچاس برس تک کیوں محبوس رکھا جاتا ہے اور اگر کوئی اعتراض کرے تو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ سزا تو دونوں کی ایک ہے یعنی حبس دائمی مگر اسکا کیا علاج کہ ایک ملک کے باغی قید میں جلدی مرجاتے ہیں اور دوسرے ملک کے دیر میں مرتے ہیں اسلئے زمانہ حبس میں تفاوت ہو گیا اسی طرح عالم آخرت کی خاصیت ہے کہ وہاں عمر طویل ہوتی ہے کسی کو وہاں موت نہیں آتی اور باغی کی سزا دنیا میں بھی حبس دائمی ہے تو آخرت میں بھی اگر حبس دائمی ہو تو اس میں خدا تعالیٰ پر کیا اعتراض ہے خدا تعالیٰ نے کوئی نیا کام نہیں کیا وہی کیا ہے جو تم کرتے ہو مومن میں چونکہ ایمان ہے اسلئے اسکے اثر سے میعادی سزا ہوگی کیونکہ وہ باغی نہیں ہے اور کافر چونکہ باغی ہے اور بغاوت کی سزا عقوبت دائمہ ہے اسلئے اسکو ہمیشہ جہنم میں رہنا ہوگا یہاں ایک اور طالبعلمانہ شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ یہ تو ظاہر ہے کہ
ف علمانہ ایک شبہ مع جواب یہ آیت کفار کے بارہ میں ہے اور وعید جن اعمال پر وارد ہے انمیں بعضے فرعی بھی ہیں اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کفار مکلف بالفروع ہوں حالانکہ فقہاء اصولیین کے نزدیک کفار

مکلف بالفروع نہیں اسی لئے انہوں نے تشریح کی ہے کہ اگر کافر قبل اسلام لانیکے نماز چھوڑے تو اسکی نماز قضا نہ ہوگی کیونکہ وہ مکلف ہی نہیں اسی طرح بعد اسلام کے ان نمازوں کی قضا واجب نہیں اس سے کفار کا مکلف بالفروع ہونا لازم نہیں آتا وہ اس طرح کہ کفار کو جو عذاب ہوگا وہ اصل میں نفس کفر پر ہوگا بخلاف مسلمان کے کہ اسکو جو سزا ہوگی وہ ترک فروع پر ہوگی ہاں کافر کی سزا میں بوجہ ترک فروع کے اضافہ ہوجائیگا اور عقوبت بڑھ جائیگی نہ یہ نفس ترک فروع پر سزا ہوگی اسکی مثال ایسی ہے جیسے دو باغی ہوں جو حکومت کی اطاعت نہیں کرتے مگر ان میں ایک تو وہ ہے کہ بغاوت بھی کرتا ہے اور اسکے ساتھ ملک میں شورش بھی کرتا ہے اور دوسرا باغی تو ہے مگر نافرمانی اسکی ذات ہی تک ہے شورش نہیں کرتا ظاہر ہے کہ بغاوت پر سزا دونوں کو ہوگی مگر جو بغاوت کیساتھ شورش بھی کرتا ہے اسکی سزا میں بہ نسبت شورش نکرنے والے کے اضافہ ہوگا اس صورت میں اصل سزا تو بغاوت پر ہے مگر بوجہ شورش کے اسمیں اضافہ ہوگیا ہے کافر تارک فروع کی مثال شورش کرنیوالے باغی کی سی ہے کہ کفر تو کرتا ہی ہے لیکن باوجود کفر کے فروع کو بھی بجا نہیں لاتا۔ تو اسکو اصل سزا تو کفر پر ہوگی مگر ترک فروع کی وجہ سے سزا میں زیادت ہوجائیگی اور اس کافر کی مثال جو بعض فروع کو ادا کرتا ہے جو مشروط بالایمان نہیں جیسے عدل و تواضع و سخاوت اس باغی کی سی ہے جو شورش نہیں کرتا اسکو اصل سزا کفر پر ہوگی ترک فروع سے اضافہ اور زیادت نہ ہوگی۔ اب شبہ کفار کے مکلف ہونے کا جاتا رہا اور مسلمان کی مثال اس مجرم کی سی ہے جو باغی نہیں اسکو صرف ترک فروع پر سزا ہوگی بغاوت کی سزا اسکو نہ ہوگی کیونکہ وہ باغی نہیں ہے اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار گو فروع کے مکلف نہیں مگر پھر بھی ترک فروع پر عقاب ہوگا گو تقویت ہی کیلئے سہی تو مسلمان جو کہ فروع کے مکلف ہیں وہ اس آیت سے زیادہ مورد وعید ثابت ہوں گے کیونکہ جب غیر مکلف بالفروع کو بھی ان فروع کے ترک سے ضرر ہوتا ہے تو جو ان فروع کا مکلف ہے اسکو ان کے ترک سے کیوں ضرر نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جو ان معاصی کو اختیار کریگا وہ مستحق وعید ہوگا خواہ کوئی ہو پس اگر وہ اعمال جو کفار میں پائے جاتے ہیں ہم میں بھی ہیں تو ہم بھی ضرور مستحق وعید ہوں گے گو وعید کفر کے مستحق نہ ہوں مگر وعید معاصی

کے ضرور مستحق ہونگے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو امور اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں اگرچہ سارے ہمارے اندر موجود نہ ہوں مگر بعض کا پایا جانا متحقق ہے گو کفار کی برابر نہ پائے جاتے ہوں چنانچہ آیت کے جزو اول یعنی اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا سے تو مسلمان بیشک بری ہیں کیونکہ حق سبحانہ تعالیٰ کی لقا کا تو ہر مسلمان کو اعتقاد ہے یہ جزو تو بحمد اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ہے ہی نہیں۔ مگر دوسرا جزو یعنی رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا تو موجود ہے گو کفار سے کم درجہ میں ہو مگر ہے ضرور اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ جس رضا بالدنیا پر وعید ہے شاید یہ مشروط بعدم رجاء اللقاء یعنی مشروط بالکفر ہو پھر مسلمان اسکا مورد نہ ہوگا اسکا جواب یہ ہے کہ یہ ذوق لسان کے بالکل خلاف ہے ہر اہل لسان سنکر یہی سمجھے گا کہ ان اعمال کی بھی تقبیح مقصود ہے بلا شرط اقتران بالکفر کے آگے ارشاد ہے وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا یہ رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کی تفسیر ہے اور یہ عجیب پر شفقت موقعہ ہے تفسیر کا کیونکہ رضا بحیات دنیا انسان کا امر طبعی ہے جو اختیار میں نہیں۔ اگر مطلق رضا بحیات دنیا معصیت ہوتی تو کوئی فرد انسانی بھی اس سے نہ بچ سکتا۔ کیونکہ دنیا کی زندگی سے کون راضی نہیں اس لئے ضرورت واقع ہوئی تفسیر کی اگر تفسیر ساتھ کے ساتھ نہ ہوتی تو اس آیت سے لوگوں کی کمر ٹوٹ جاتی پس شفقت اسی میں ہے کہ ساتھ کے ساتھ تفسیر کر دی جائے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا اس قید کے بڑھا دینے سے معلوم ہو گیا کہ رضا بحیات دنیا معصیت و مذموم وہ ہے جسکے ساتھ اطمینان بھی ہو ورنہ معصیت نہیں کیونکہ یہ تو امر طبعی ہے چنانچہ ایک اور آیت میں اسکی تصریح ہے قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ الخ یعنی آپ کہدیجئے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے قبیلے اور تمہارے وہ اموال جنکو تم نے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جسکے مندا ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکان جنکو تم پسند کرتے ہو تمکو اللہ سے اور اسکے رسول سے اور اسکے راستہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہوں الخ یہاں وعید اس پر ہے کہ یہ چیزیں اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب ہوں اور اگر وہ یہ چیزیں کسی درجہ میں تو محبوب ہوں لیکن اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ف مطلق رضا بحیات دنیا مذموم نہیں ہاں اطمینان بالدنیا مذموم ہے ۸

زیادہ محبوب ہوں تو ان پر وعید نہیں کیونکہ ان چیزوں کا محبوب ہونا امر طبعی ہے معلوم ہوا کہ ان چیزوں کو پسند کرنا اور اُن پر خوش ہونا اور مطلق رضا محل وعید نہیں البتہ حیات دنیا پر مطمئن ہونا محل وعید ہے اگر اطمینان کی حالت ہو تو قابل علاج ہے ورنہ نہیں اب یہ سمجھنا چاہئے کہ اطمینان کس کو کہتے ہیں کہ جس پر وعید وارد ہے اطمینان کے معنی سکون کے ہیں جو قابل ہے حرکت کا مطلب یہ ہو گا کہ حیوٰۃ دنیا پر اتنا قرار ہو گیا ہے کہ اس سے قلب و ذہن کو آگے ہی حرکت ہی نہیں ہوتی آگے خیال ہی نہیں چلتا جیسے کوئی چیز مرکز پر ٹھہر جاتی ہے کہ آگے نہیں بڑھتی اس پر وعید ہے سو آجکل اکثر ہماری یہی حالت ہو رہی ہے کہ جو جس حالت پر ہے اسی پر ٹھہرا ہوا ہے آگے قدم ہی نہیں بڑھاتا ہمکو ساری فکر حیات دنیا ہی کی ہے منہمکین فی الدنیا کی یہ حالت ہے کہ جب کبھی تذکرہ کرتے ہیں تو دنیا ہی کا حتی کہ ریل میں ہوتے ہیں تب بھی دنیا ہی کا تذکرہ ہے یہی پوچھتے ہیں کہ تمہارے یہاں اناج کا کیا حال ہے بارش کیسی ہوئی نرخ کیا ہے غرض ہر مجلس میں دنیا کا ہی تذکرہ
9 کرتے ہیں حالانکہ ریل کا موقع تو بےفکری اور فرصت کا ہے مگر اُنکو اسمیں بھی دنیا ہی کی فکر ہے اس سے آگے حرکت ہی نہیں ہوتی دنیا ہی پر سکون و قرار ہو گیا ہے حاصل یہ ہے کہ آخرت کی فکر نہیں آگے ارشاد ہے وَهُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ یعنی کہ باوجودیکہ ہماری نشانیوں کو دیکھتے ہیں مگر پھر غافل ہیں ان تینوں جملوں کا یہ حاصل تھا جس سے اصل جرم یہ ثابت ہوا کہ ہمکو حیات دنیا پر اطمینان ہو گیا ہے یعنی حرکت الی الآخرت نہیں ہوتی اب یہ سمجھئے کہ حرکت الی الآخرت جو کہ مقابل ہے سکون کا تین قسم کی ہوتی ہے ایک حرکت اعتقادی دوسری عملی تیسری حالی یعنی آخرت کی دُھن میں ہر وقت بےچین رہنا اور اُسی کی کاوش ہونا کفار کو تو کسی قسم کی حرکت بھی نہیں کیونکہ اُنکا اعتقاد ہی درست نہیں مسلمانوں کو حرکت اعتقادی تو حاصل ہے مگر حرکت عملی اور حالی نہیں یعنی نہ اعمال آخرت کا اہتمام ہے نہ اُسکی دُھن ہے اُسکی کاوش ہی نہیں۔ یہ مرض قریب قریب عام ہے اور عوام تو عوام خود ہم لکھے پڑھوں کی حالت یہ ہے کہ ہمارے قلوب آخرت کیلئے بےچین نہیں ہیں جیسے کسی پر کوئی مقدمہ دائر ہوتا ہے اور اسوقت سے جو بے چینی ہوتی ہے کہ کسی وقت بھی قلب کو قرار نہیں ہوتا ہر وقت اُسکی دُھن اور اُسی کا فکر اور خیال

ف اطمینان علی الدنیا کا مطلب

ف حرکت الی الآخرۃ کی تین قسمیں

ہوتا ہے چنانچہ جس زمانہ میں طاعون پھیلا ہوا تھا تو قلوب پر کیسی بے چینی طاری تھی کہ کسی
وقت قرار ہی نہیں تھا اسی کا دھیان اور اسی کی سوچ تھی سو ہماری یہ حالت نہیں بلکہ جو
جس حالت پر ہے اسی پر ٹھہرا ہوا ہے یہ نہیں کہ حالت موجودہ سے ترقی کیجاوے مثلاً نماز ہی
کو لیجئے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں اسی پر قرار ہے یہ نہیں کہ پانچ وقت کے علاوہ اور
بھی کوئی نفل نماز پڑھیں نہ یہ خیال ہے کہ جو نماز ہم پڑھ رہے ہیں وہ ٹھیک طور سے بھی پڑھتے
ہیں یا نہیں یہ بھی ایک قسم کی حرکت ہے جسکو ہمنے چھوڑ رکھا ہے بس ہمکو اپنی حالت پر اطمینان
ہے اور سمجھتے ہیں کہ سب کچھ کر رہے ہیں حالانکہ حالت یہ ہونی چاہئے کہ باوجود سب کچھ
کرنے کے پھر بھی ڈرتے رہیں چنانچہ ایک آیت میں ہے وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ
وَجِلَةٌ یعنی باوجود عمل نیک کرنے کے پھر بھی انکے قلوب خوف زدہ ہیں دیکھئے کوئی حاکم
بالا ہو اور اس کا عملہ بڑی مستعدی سے کام کرتا ہو مگر پھر بھی لوگوں کو اسکے آنے کے وقت
یہ ڈر سوار رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حاکم بالا ہمکو پاس نکرے جسوقت حاکم آتا ہے تو
انکے قلوب کو بے چینی لاحق ہوتی ہے کہ دیکھئے انجام کیا ہو اسیطرح مسلمان کے قلب کی
حالت ہونی چاہئے کہ باوجود کام کرنیکے پھر بھی ڈر سوار رہے کہ دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے مسلمان
کو کسی وقت چین نہ ہونا چاہئے اگر یہ حالت نہیں تو کچھ بھی نہیں دیکھئے حضرت انبیاء علیہم السلام
جو کہ حال پر غالب ہوتے ہیں انکی حالت یہ تھی کہ ہر وقت سوز میں رہتے تھے اور ہماری
بیفکری کی تو یہ حالت ہے اور پھر ہمکو اپنے تقوی پر ناز ہے ہم انبیاء علیہم السلام سے تو زیادہ نہیں
وہاں تو یہ حالت تھی کہ حق تعالیٰ کے خوف سے انکی روح فنا ہوتی تھی اور ہر وقت سوچ میں رہتے
تھے ہر مسلمان کی یہی حالت ہونا چاہئے کہ کسی وقت بھی چین نہ ہو قرار نہ ہو کیفیت یہ ہو ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن　　　دل بدست دگرے دادن و حیران بودن

یعنی ہر وقت کی فکر ترقی ہو قرب کی اور خدا تعالیٰ کے اس قرب کی تو کوئی انتہا ہی نہیں کہ جس پر
سکون و قرار ہو سکے وہاں تو یہ حالت ہے کہ جسقدر بھی ترقی کرو وہ کم ہے یہ کیفیت ہے ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست　　　ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

ہم زمینداروں کو دیکھتے ہیں کہ انکو دنیا کی ترقی سے چین نہیں جسقدر زمین وغیرہ انکے

اور جو لوگ دیتے ہیں اور ان کے دل خوف زدہ ہیں اس بات سے کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں۔ عہ ۱۰۶ ع ۴

پاس ہے اسپر قناعت نہیں بلکہ یہی ہوس ہے کہ اور زمین ہو اور مکان ہو پھر افسوس یہ ہے کہ لوگ صرف نماز کی ٹکریں مار کر کیسے بے فکر ہوگئے عبدہ دار ونکو فکر ہے کہ ہمارے اگر آج پچاس ہیں تو کل سو ہو جاویں مکان بنانے ہیں تو فکر ہے کہ اور بنائیں اور بڑہائیں اسمیں بہ زیادہ کریں اسمیں وہ بڑہائیں ایک رئیس کا قصہ ہے کہ انکو عمارت سے بیحد شوق تہا اسکی دہن تہی وہ کہتے تھے کہ جب تک میرے کان میں بسولی کی آواز نہیں آتی چین ہی نہیں پڑتا عمارت کے بارہ میں معماروں کا مقولہ ہے کہ ایک گز زمین میں ساری عمر تعمیر جاری رکھ سکتے ہیں ایک گز زمین عمر بھر کو کافی ہے اس طرح کہ اوپر کو عمارت بڑہاتے ہوئے چلے جائیں ساری عمر بہی ختم ہو یا ایسی صورتیں اسمیں پیدا کرتے چلے جائیں کہ ساری عمر کام جاری رہے ایک گز زمین ہی اچہے بچے کچے بناتے چلے جاؤ تو ساری عمر بہی ختم نہ ہو غرض جسکو جس چیز کی لت ہوتی ہے اس سے جی نہیں بھرتا۔ افسوس ہے کہ آخرت سے جی بھر گیا ہے اور دنیا سے نہیں بھرتا مولانا فرماتے ہیں ؎

اے کہ صبرت نیست از دنیای دون　　　صبر چون داری ز نعم الماہدون

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن　　　صبر چون داری ز رب ذوالمنن

دنیا کے دہندوں سے جی نہیں بہرتا مگر جی بہرا تو خدا سے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے ہیں کہاں شوق کہاں ذوق فکر تک نہیں کہ کیا ہو گا بس یہی شکایت ہے کہ تم کو دنیا کی زندگی پر قرار ہو گیا ہے۔ صاحبو! جسکو حرکت ہوتی ہے اسکی تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

دل آرام در بر دل آرام جو　　　لب از تشنگی خشک و بر طرف جو

دنیا میں کوئی کسی پر عاشق ہو جاوے تو بس وصل ہونے پر انتہا ہو جاتی ہے مثلاً کوئی کسی مردار صورت پر عاشق ہو جاوے تو وصل ہو جانے پر منتہا ہو گیا اور دل بھر جاتا ہے کیونکہ اس کے حسن کی انتہا ہے آگے کچھ نظر آتا ہی نہیں مگر خدا سے تو جی بھرنا نہ چاہئے کیونکہ ان کے حسن کی انتہا ہی نہیں وہاں تو یہ حالت ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں　　　بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچنان باقی

اور یہ کیفیت ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز دم درکش حسن ایں قصہ عشق است در دفتر نمی گنجد

ان کا حسن تو کیا منتہی ہوتا انکی حکایات کا بھی کہیں منتہی نہیں۔ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ط سورۃ کہف ع ۳

انکی تو یہ شان ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

سیری کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ حسن منتہی ہو دوسرے یہ کہ طلب نہ ہو پہلی صورت تو سیری کی یہاں ہو نہیں سکتی کیونکہ حسن کی انتہا نہیں ہاں یہ صورت البتہ ہے کہ ہماری طرف سے طلب نہیں ہے اور مسلمان کیلئے یہ بڑی غفلت اور کمی کی بات ہے اسواسطے ہمکو طلب پیدا کرنا چاہیئے۔ صاحبو! دھن پیدا کرو اور یہ سمجھ لو کہ ہر چیز کے حاصل ہونیکے کچھ طریقے ہوتے ہیں دھن پیدا ہونیکے بھی طریقے ہیں وہ طریقہ یہ ہے کہ مراقبات کرو اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو ذکر و۔ ہمکو چاہیئے کہ شب و روز سوچا کریں افسوس ہمیں کچھ سوچ نہیں ہے اگر عادت سوچ کی ہو جاوے تو سب مرحلے طے ہو جاویں ہم میں جو عمل کرنے والے ہیں انکی یہ حالت ہے کہ وقت نکالکر کثرت سے وظائف پڑھتے ہیں نوافل پڑھتے ہیں میں پوچھتا ہوں کہ جیسا انکے لئے وقت نکالا ہے آیا سوچنے کیواسطے بھی کوئی وقت رکھا ہے جسمیں آخرت کی باتوں کو سوچا کریں کہ ما بعد الموت کیا پیش آنیوالا ہے قبر میں کیا ہوگا میدان آخرت میں کیا کیفیت ہوگی پلصراط پر کیا حالت ہوگی حق تعالیٰ کے روبرو جانا ہوگا صاحبو عذاب کو سوچو ثواب کو سوچو قرآن شریف میں فکر کے مختلف طریقے بتلائے گئے ہیں ۱۲ کہیں جنت کا ذکر ہے کہیں دوزخ کا حال ہے وجہ یہ ہے کہ طبائع مختلف ہیں کسی کو عذاب کے سوچنے سے نفع ہوتا ہے کسی کو جنت کی نعمتوں کا خیال کرنا سود مند ہے ایک شخص کا قصہ ہے کہ انہوں نے مجھسے کہا کہ موت کے سوچنے سے دل گھبراتا ہے میں نے کہا کہ اگر موت کے سوچنے سے دل گھبراتا ہے تو حیات کو سوچو کہ اس حیات سے اچھی ایک دوسری حیات ہے۔ صاحبو! دنیا اور آخرت کی مثال روپیہ اور اشرفی کی سی ہے مثلاً ایک شخص اشرفی لیکر نکلا دوسرا شخص راستہ میں ملا اسکے پاس چمکدار روپیہ تھا وہ اس سے کہنے لگا

قرآن شریف میں فکر کے مختلف طریقے

دنیا و آخرت کی مثال

کہ اگر تم کہو تو یہ چمکدار روپیہ تمکو دیدوں اور اشرفی میں سے لوں اشرفی والے کو اشرفی رنگ روپیہ کے سامنے اچھا معلوم نہ ہوتا تھا اور روپیہ وزن میں بھی زیادہ تھا اس لئے بدلنا چاہا اس حالت میں کسی نے اس سے کہا کہ میاں دھوکہ مت کھانا روپیہ اگرچہ بہ نسبت اسکے چمکدار اور وزن میں زیادہ ہے مگر اشرفی اٹھارہ روپیہ کو بکتی ہے اب اس نے سوچا کہ جب یہ صورت ہے تو میں روپیہ کو لیکر کیا کرونگا ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ شخص مبادلہ پر کبھی راضی نہ ہوگا یہ نتیجہ ہوا سوچنے کا سوچنے کو علم حقیقت لازم ہے جب آدمی سوچتا رہتا ہے تو حقیقت معلوم ہو ہی جاتی ہے پس جب کوئی دنیا اور آخرت کو سوچیگا تو معلوم ہوگا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کوئی چیز نہیں روپیہ اور اشرفی کی سی نسبت بھی نہیں یہ جو قرآن شریف میں ہے کہ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ کہ فکر کرتے ہیں دنیا اور آخرت میں اس فکر فی الدنیا کی کسی نے کیا اچھی تفسیر کی ہے کہ دنیا کی تکالیف اور دنیا کی لذات میں غور کرے کہ یہاں کی لذات سب ایک دن فنا ہو جائینگی اور دنیا کی زندگی تکالیف سے بھری ہوئی ہے اور فکر الآخرۃ سے اسکا عکس ثابت ہوگا اس مجموعہ کے سوچنے سے دنیا کی بیقدری ہو گی اور آخرت کی طرف رغبت بڑھیگی جب دونوں کو موازنہ کریگا تو معلوم ہوگا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا لاشی محض ہے اور اس مراقبہ سے دنیا کی تکالیف میں بھی کمی ہو گی کیونکہ جب سوچیگا کہ دنیا میں بالفعل اگرچہ تکالیف ہیں مگر یہ ایک روز فنا ہو جائینگی اور آخرت میں راحت ہی راحت ہے تو وہ تکالیف نہ معلوم ہونگی اس لئے میں نے اس ذاکر سے کہا کہ جب موت کے تفکر سے جی گھبراتا ہے تو حیات کا تفکر کرو حق تعالیٰ نے ہر شخص کے مناسب سوچنے کی چیزیں بتلادی ہیں مگر افسوس ہمارا کوئی وقت سوچنے کیلئے فارغ نہیں اب میں موانع تفکر کو بیان کرتا ہوں سو دو چیزیں ہیں جو سوچنے سے مانع ہوتی ہیں کبھی تو شہوت جسمانی مانع ہوتی ہے کہ انسان دنیا کی شہوات میں گرفتار ہو کر آخرت کی سوچ نہیں کرتا اور یہیں کی شہوات میں رہ جاتا ہے اور کبھی لذات نفسانی میں مبتلا ہونا مانع ہوتا ہے کیونکہ آخرت کی سوچ میں یہاں کی لذات میں کمی ہو جائیگی مگر لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ آخرت کی سوچ سے یہاں کی تکالیف میں بھی تو کمی ہو جائیگی پھر لذت

کے متعلق بھی انسان کو یوں سوچنا چاہئے کہ اگر میں دنیا کی لذات میں مبتلا رہا تو آخرت کی
لذات مجھ سے فوت ہو جاوینگی اس سوچنے میں ہر ہر قدم پر نفع ہے اصل علاج مختصر سوچ
ہے کہ اس سے ساری باتیں علم و عمل کی درست ہو جاوینگی اب یہ سمجھو کہ عمل دو قسم کے ہیں
ایک وہ کہ جن کا جائز ناجائز ہونا آپکو معلوم ہے ان پر تو یاد کر کر کے ابھی سے عمل کرنے
لگو۔ دوسرے وہ کہ جن کا جائز ناجائز ہونا معلوم نہیں چنانچہ زمینداری کے بہت سے ایسے
اعمال ہیں جنکا جواز عدم جواز لوگوں کو معلوم نہیں انکو تلاش کرو علماء سے پوچھو۔ یہ نمونہ
کے طور پر میں نے ذکر کر دیا سوچنے سے سارے ابواب دین کے مفتوح نظر آوینگے سوچنے کی
مثال ایسی ہے کہ جیسے گھڑی میں بال کمانی کہ ہے تو وہ بہت مختصر مگر تمام پرزوں کو حرکت
اسی سے ہوتی ہے اسی طرح سوچنے سے دین کے قلعے فتح ہو جاوینگے۔ عوام کو تو کیا کہا
جاوے میں کہتا ہوں کہ علماء بھی کیا کر رہے ہیں کچھ بھی نہیں کرتے اور میں بھی انہیں داخل
ہوں انکا جی تو چاہتا ہے سوچنے کو مگر خلوت کا اہتمام نہیں غرض عموماً ہمارے مذاق خراب
۱۴ ہوگئے ہیں ہر وقت ہا و ہو اور ہنسی دل لگی میں وقت گذار رہے ہیں حالت یہ ہے کہ چوپال
میں پہونچے اور ہنسی مذاق میں سارا وقت گذار دیا اوّل تو دنیا کے دھندوں
سے سوچنے کے لئے فرصت ہی نہیں ملتی اگر فرصت ملی بھی تو بجائے آخرت
کے سوچنے کے یہ سوچتے ہیں کہ فلانے دوست کے پاس جا کر باتیں کرینگے وقت کٹے گا
طبیعت بہلے گی بس وہاں جا کر خرافات میں وقت عزیز کو گذار دیتے ہیں خوب سمجھ لو کہ
تمہارے دوست حقیقت میں دشمن ہیں اسکی مثال ایسی ہے جیسے تمہارا کوئی روپیہ چرا لے
تو اس حرکت پر آپ کو کسقدر افسوس ہوگا اسی طرح جو آپ کے دوست ہیں وہ آپکے بیش
قیمت وقت کو جو اشرفیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے لوٹ رہے ہیں۔ ایک ڈاکو حقہ ہے اُسنے
خدا اسے سلامت رکھے ایسا رواج پایا ہے کہ دو پیسہ کا تمباکو خرچ کر کے اسکی بدولت
جتنا چاہو مجمع کر لو اور اوقات سب کے برباد کر دو بس حقہ کیا ہے جامع المتفرقات ہے یہ حقہ ثقہ اور غیر
ثقہ دونوں کا جامع ہے میں نے خود دیکھا ہے کہ جب کبھی کسی کو اپنے گھر کی رونق اور آبادی
مدنظر ہوتی ہے تو وہ حقہ کا اہتمام کرتا ہے اس کا اہتمام کرنا تھا پھر مجمع کی کیا کمی۔ گویا ہم لوگ

ف: مختصر علاج سوچنا ہے

ف: عمل دو قسم کے ہیں

ف: سوچنے کی مثال

ف: آج کل کے دوست حقیقت میں دشمن ہیں

ف: حقہ جامع المتفرقات ہے

حقیقت میں تو اسواسطے جمع کرتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس دولت ہے وہ سب جمع کر لیجائیں (یعنی وقت) صاحبو! یہ وقت بڑی بیش قیمت چیز ہے اس کی قدر کرو وقت اتنی قیمتی چیز ہے کہ جس وقت عزرائیل آجاوینگے قبض روح کیلئے تو تم تندرے سے وقت کیلئے تمام سلطنت بھی دینے کے لئے تیار ہو جاؤ گے مگر ایک منٹ کی بھی مہلت نہ ملے گی چنانچہ ارشاد ہے إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ اس اجتماع واختلاط کے متعلق ایک ضروری اور مفید بات ہے وہ یہ ہے وحشت ناک لوگوں کی فہم سے اندیشہ ہے کہ الٹا نہ سمجھ جائیں کیونکہ آجکل فہم کا قحط ہے سیدھی بات کو بھی الٹا سمجھ جاتے ہیں اسلئے اسکو کہتے ہوئے جی رکتا ہے مگر خیر اسوقت زبان پر بات آگئی اسلئے توکلاً علی اللہ بیان کئے ہی دیتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں کا آجکل یہ مشغلہ ہو گیا ہے کہ مختلف بزرگوں کے پاس دورہ کرتے پھرتے ہیں۔ آج اس بزرگ کے پاس پہنچ گئے کل دوسرے کے پاس پرسوں تیسرے کے پاس۔ خوب سمجھ لو کہ آجکل اس میں بھی دین کا نقصان ہے وجہ یہ ہے کہ اکثر بزرگوں کے یہاں ہر قسم کے لوگوں کی مجلس ہوتی ہے اور وہ لوگ ہر قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں حتی کہ غیبت بھی پھر یہ بھی انکی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے آج کل اکثر مجالس ایسی ہی ہیں انجام یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص بزرگوں کے پاس سے اتنا لاتا نہیں جتنا کھو کر آتا ہے جب یہ حالت ہے بزرگوں کی مجالس کی تو اور مجالس کی خرابیاں کیسی کچھ ہونگی مگر آجکل جا بجا مجالس گرم کرنیکا عام رواج ہو گیا ہے چوپالیں اسی واسطے بنائی جاتی ہیں پھر انمیں یہ حالت ہوتی ہے کہ جہاں چار آدمی جمع ہوئے تو غیبتیں اور لایعنی باتیں شروع ہوئیں اور درحقیقت یہ سارے قصے بیفکری کے بدولت ہیں جب کوئی کام نہیں ہوتا تو چوپالوں میں بیٹھکر معاصی میں وقت گذارتے ہیں یہ نشستگاہیں اسی واسطے آج کل موضوع ہیں یہاں تک کہ جن چیزوں کی طرف نگاہ کرنا حرام کیا گیا ہے چوپال میں بیٹھکر ان پر بھی نظر ہوتی ہے ان سے پرہیز کی عادت ہی جاتی رہی اس کا کچھ خیال نہیں کہ بموقع نگاہ کرنے پر بھی سخت مواخذہ ہوگا۔ اسلئے اسلم یہی ہے کہ ایسی صحبت ہی سے جدا رہے شاید بچنا آسان ہو جاوے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آجکل ہماری بندگی کی ایسی مثال ہے جیسے رڑکی کو دلم کے کاریگروں کے کاریگری کہ جب تک اس احاطہ میں ہیں اسوقت تک کاریگر ہیں اور جہاں باہر نکلے تو اناڑی کیونکہ وہاں سب کام مشین سے ہوتے ہیں باہر مشین کہاں یہی حالت ہماری ہے کہ جب تک گوشہ میں ہیں تو کچھ عمل کرتے بھی ہیں اور معاصی سے بچتے ہیں اور جہاں گھر سے باہر نکلے اور آفتیں نازل ہوئیں۔ میں پختہ لوگوں کو نہیں کہتا اور پختہ لوگ ہیں کتنے پختہ لوگ تو اس سے مستثنیٰ ہیں انکی مثال تو آجکل ایسی ہے جیسے ہزاروں چنوں میں ایک گیہوں کا دانہ ورنہ عام مجالس کی تو بری ہی حالت ہے اور یہ خرابی کس وجہ سے ہوئی اس وجہ سے کہ دین کی فکر نہیں رہی دنیا پر اطمینان ہو گیا جس کو دین کی فکر ہوگی وہ تو لوگوں کے رات دن کے برتاؤ کو دیکھکر تنگ ہوگا پریشان ہوگا دیکھیگا کہ لوگ دین کو ضائع کر رہے ہیں اور دنیا میں ایسے مشغول ہیں اور اس پر ایسا اطمینان کئے ہوئے ہیں کہ دین کی ذرا بھی فکر نہیں بس جسکو دین کی فکر ہوگی وہ تو لوگوں کی اس حالت کو دیکھکر گوشہ ہی قبول کریگا میں کھیتی سے منع نہیں کرتا خرید فروخت دنیا کے اور معاملات سے نہیں روکتا میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سارے کام دنیا کے اور تعلقات کو چھوڑ کر مسجد کے گوشہ میں بیٹھ رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ کاروبار سب کرو مگر دنیا پر مطمئن مت ہو آخرت کو پیش نظر رکھو اور جو وقت کام کاج سے بچے اسکو فضول باتوں میں ضائع نکرو۔

> ف: آجکل علم مجلس کی حالت غنیمت ہے

منوعات شرعیہ میں مبتلا مت ہو بلکہ جو لوگ آجکل کی مجالس میں شریک ہونے سے محترز ہیں اور بیلوں کی صحبت میں رہتے ہیں وہ پھر اچھے ہیں بہت ہوگا ایسا شخص بیلوں کی صحبت ۱۴۱

میں رہنے سے بیل ہو جائیگا مگر مواخذہ آخرت سے تو بچیگا میں اسی لئے کھیتی کو پسند کرتا ہوں کیونکہ ان لوگوں کو گناہوں کے لئے کم وقت ملتا ہے کہیں پانی دے رہے ہیں کہیں نولائی کر رہے ہیں کہیں آوازیں لگا رہے ہیں بعضے خدا کے بندے ایسے ہیں کہ آوازیں بھی اللہ کے ذکر کی لگاتے ہیں گو اسمیں قدرے کلام ہے مگر مقصود انکے تذاق کا بیان کرنا ہے اگر یہی نہ ہو تو واہی تباہی باتوں سے غیبت وغیرہ سے تو بچاؤ ہوتا ہے کسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ صبح سے کھیتی کے کام میں مشغول رہے دوپہر کو گھر سے کھانا پہونچ گیا اسکو کھا کر ذرا آرام

> ف: آجکل علم مجالس کی حالت خراب ہے

کیا پھر کام میں مشغول ہو گئے رات کو ہارے تھکے آئے نماز پڑھی اور سو گئے ساری خرافات سے بچے اُن میں تکبر و نخوت نہیں ہوتا بہت ہی ہوگا ایسے اشغال میں ذرا بے تمیز ہو جاوینگے مگر یہ بے تمیزی ہزار درجہ اچھی اُن خرافات میں مبتلا ہونے سے جو شہروں میں ہو رہی ہیں مگر ستم یہ ہے جو لوگ ان مکروہات میں گرفتار ہونے سے پرہیز کرتے ہیں انکو آج کل دلیا نو میں شمار کرتے ہیں۔ مگر واقعی بات یہ ہے ؂

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم | مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد | مرعسس را دید و در خانہ نشد

فائدہ: [illegible]

گوشہ سے مراد مسجد کا گوشہ نہیں بلکہ تنہائی ہو جاہے گھر میں ہو چاہے جنگل میں ہو کیونکہ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ اپنی حالت ممتاز مت بناؤ اور مسجد کا گوشہ آج کل ممتاز حالت ہے بلکہ خلوت ہو مگر اس طرح کہ کسی کو خلوت کا پتہ بھی نہ چلے اگر لوگوں کو خلوت کا پتہ چل جائے گا تو جان کھا جائینگے اس لئے خلوت بھی ترکیب سے کرو کھیتی کر لو اور کوئی شغل کر لو مگر مکروہات سے بالکلیہ بچے رہو بس یہ آجکل خلوت ہے۔

فائدہ: [illegible] ۱۷

مولوی ظہیر الدین صاحب ایک درویش تھے میرے پھوپھا صاحب کے بھائی انھوں نے خلوت کا طریقہ عجیب اختیار کیا تھا مجمع میں ہوتے دروازہ کھلا رکھتے نفلیں پڑھتے رہتے جب کوئی آتا سلام کے بعد بہت خوش اخلاقی سے پیش آتے خیریت دریافت کرتے ضروری باتیں کرکے پھر نیت باندھ لیتے پھر سلام کے بعد ایک آدھ بات کر لیتے اور پھر نیت باندھ لیتے یہ نہ تھا کہ ہماری طرح ان کے پاس باتوں کا چرخہ چلتا ہی رہے لوگ انکو رو کھا خیال کر کے خود ہی آمد و رفت کم کر دیتے اور کوئی انکی شکایت بھی نہ کرتا کہ بڑے بد دماغ ہیں بولتے ہی نہیں کیونکہ وہ نماز میں رہتے تھے اور نماز میں کوئی بولتا ہی نہیں ہے۔ لوگ یہی خیال کر لیتے کہ چونکہ مولوی صاحب نماز میں اکثر رہتے ہیں اس لئے زیادہ کلام نہیں کرتے۔ مولوی صاحب تنہائی میں نہ بیٹھتے تھے کہ جسکی وجہ سے ممتاز معلوم ہوں مجھے یہ طرز اُن کا بہت پسند آیا کہ ظاہر آ تو خلوت نہ معلوم ہوتی تھی مگر حقیقت میں خلوت تھی۔ ایک بزرگ کی یہ حالت تھی

رات کو بولتے دن کو نہیں بولتے کیونکہ رات کو مجمع نہیں ہوتا کہ جس سے خرابیاں پیش آئیں اور وہ بھی عشا تک بولتے اور بعد عشا کے گھر جا کر سو رہتے اس میں بھی نہ بولنے میں انکی شہرت نہ ہوتی تھی اور عشا کے بعد ویسے بھی بلا ضرورت بات چیت کرنا خلاف سنت ہے مگر افسوس بعض لوگ بزرگوں کو عشا کے بعد بھی دق کرتے ہیں اور انکے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور وہ اخلاق کی وجہ سے کچھ کہتے نہیں حالانکہ انکو اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے مگر لوگ بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں آپ کو کیا حق ہے ان کو مجبور کرنیکا اور وہ کس کس کی مرضی کے موافق کام کریں میری رائے تو یہ ہے کہ ایسوں کو روک دینا چاہئے گو بعضے ناراض ہونگے مگر اسکی پروا نکرنا چاہئے بس صرف اسکا اہتمام کرنا چاہئے کہ خدا رسول صلعم ناراض نہوں چاہے ساری دنیا جاتی رہے خلقت کو کوئی راضی نہیں کر سکتا اللہ میاں ہی احق ہیں کہ انکو راضی رکھا جاوے واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ اگر انکو راضی رکھوگے تو وہ لوگوں کی گردنیں پکڑ کر راضی کر دینگے مگر نیت یہ نہونا چاہئے کہ حق تعالی کو اس لئے راضی رکھنے

۱۸ کی فکر کریں کہ مخلوق ہم سے راضی ہو جائے اور اگر فرضاً حق سبحانہ تعالی راضی ہوں اور مخلوق راضی بھی نہو تو حرج ہی کیا ہے اللہ میاں کی رضا کو مقدم سمجھنا چاہئے خواہ مخلوق راضی ہو یا نہو۔ یاد رکھو کہ اگر سب کی تلوّن کو تکو گے تو دین برباد ہو جاویگا میرا یہ مطلب نہیں کہ مخلوق کیساتھ سختی کا برتاؤ کرو بلکہ جب یہ دیکھو کہ لوگوں میں بیٹھکر دین خراب ہوتا ہے تو نرمی سے انکو سمجھاؤ کہ اس قسم کی باتوں سے دین کی خرابی ہے اسواسطے میں کنارہ کشی چاہتا ہوں اس صورت میں لوگ ناراض تو ہونگے مگر نصیحت ہوگی اور آئندہ کیلئے انکا حوصلہ پست ہو جاویگا کہ پھر وہ خرافات کا ذکر بھی تمہارے سامنے نہ کرینگے۔ آجکل بدون بے مروتی کے کام نہیں چلتا میں بد خلاقی کرنے کو نہیں کہتا لیکن اگر خدا کی نافرمانی میں مخلوق سے مروت کی تو خدا تعالی کو کیا منہ دکھلاؤ گے خرافات میں وقت گذارنے سے کیا فائدہ ہے وقت کی بڑی قدر کرنی چاہئے اور اسکی اچھی صورت یہی ہے کہ اختلاط کم کر دو۔ دوکانداری وغیرہ خلوت کے منافی نہیں بس دوکانداری میں اتنا کام ہے کہ کوئی سودے کا نرخ دریافت کرے آپ بتلا دو اگر وہ لے دیدو مختصر سی بات کر لو ضروریات کو شریعت نے مستثنیٰ کیا ہے خوب

اللہ میاں کی رضا مقدم ہے خواہ مخلوق راضی ہو یا نہ ہو

سمجھ لو کہ جو شخص پھیری لگاتا ہے اور اپنا سودا بیچنے کیلئے آوازیں دیتا ہے جو نور اس کے قلب میں سبحان اللہ کہنے سے ہوگا ویسا ان آوازوں کے لگانے سے ہوگا کیونکہ یہ بھی ضروری چیز ہے مسلمان کا تو ہر فعل جو غرض محمود سے ہو شرع میں عبادت ہے گو بظاہر دنیا کا کام نظر آتا ہو پس اس کا مضائقہ نہیں مگر جس بات سے دین کی مضرت ہو اگرچہ ایک ہی بات کیوں نہ ہو اس سے بچو میں کہتا ہوں کہ اگر کم تعلقی کے برکات دیکھنا چاہو تو یوں کرو کہ دس دن کیلئے اپنے کاموں کا انتظام کر کے تنہائی اختیار کر لو دیکھو تو کیا ہوتا ہے اس سے تم جنید بغدادی تو نہ ہو گے مگر انشاء اللہ حس پیدا ہو جاوے گی اول اول جی گھبرائیگا مگر پھر آسانی ہو جائیگی پھر خلوت کے بعد سمجھو گے کہ جن خرافات میں مبتلا تھے انھوں نے ہمارے دل کا ناس کر دیا ہے پھر ذرا سی بھی خلاف بات ہونے پر یہ کیفیت ہوگی

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　گر ز باغ دل خلالے کم بود

جس کے صحیح ہو جانے پر اس کا تجربہ کر لیجئے گا اسوقت تو ہماری حس ہی صحیح نہیں رہی۔ حس کے صحیح ہونے پر یہ حالت ہوگی کہ اگر ایک منٹ کے لئے بھی باہر آجاویں اور ایک بات فضول منہ سے نکل جائے تو سارا کیا ہوا برباد معلوم ہوگا باقی معاصی کا تو کیا پوچھنا ہے اب ہماری حس کی ایسی مثال ہو رہی ہے جیسے سانپ کے کاٹے ہوئے کو نیم کی پتیاں میٹھی معلوم ہوتی ہیں اس طرح ہمکو معاصی جو زہر قاتل ہیں مزہ دار معلوم ہوتے ہیں سو اسکا علاج کرو اور علاج کیلئے کسی تجربہ کار طبیب کو تلاش کرو اور جب تک طبیب نہ ملے ایک بڑا علاج یہی ہے کہ جو عرض کیا گیا یعنی سوچنا شروع کردو آخرت کے تمام امور کو سوچا کرو کہ میں مر کر قبر میں جاؤنگا وہاں سوالات ہونگے اگر ٹھیک جواب دیدیا تو راحت ہوگی اور اگر جواب ٹھیک نہ دیا گیا تو عذاب ہوگا پھر اس کے بعد دوبارہ زندہ کیا جاؤنگا۔ میدان قیامت کی سختیوں کو بھی سوچئے پھر یہ کہ خدا تعالیٰ کے روبرو حساب کیلئے کھڑا کیا جاؤنگا اس کے بعد پلصراط پر چلنا ہوگا پھر جنت ملی گی یا دوزخ میں ڈالا جاؤنگا دوزخ میں کوئی پرسان حال نہ ہوگا غرض سارے امور کو سوچا کرے اور اسکی ساتھ ہی کسی بزرگ سے تعلق پیدا کر لو اگر ممکن ہو سکے تو اسکی صحبت میں رہو اگر اس کے حقوق صحبت ادا نہ کر

۱۹

سکو تو اس سے خط کتابت کرکے اپنے اعمال کی حفاظت رکھو دیکھو بھال رکھو کہ زبان کو کس چیز میں مشغول رکھتے ہو کان سے کیا کام لیتے ہو تمام اعضاء کی حفاظت رکھو۔ اور شیخ کو اپنے حالات کی اطلاع کرتے رہو اور جو وہ بتلائے اسپر عمل کرو کیونکہ امراض باطنی کی جو دوائیں ہیں وہ ان کی خاصیت خوب جانتا ہے وہ بصیر ہے دانشمند ہے طبیب روحانی ہے امراض قلبی کے علاج سے بخوبی واقف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل مرض ہمارے اندر یہ ہے کہ آخرت سے بےفکر ہو کر دنیا پر اطمینان کرلیا ہے اسی کو حق تعالی فرماتے ہیں

یہ اطمینان بالدنیا ہے تو چھوٹا سا عنوان مگر اصل ہے تمام امراض کی اس کا علاج ہونے سے تمام امراض کا علاج ہو جاویگا مطلب یہ ہے کہ قلب کو دنیا پر قرار ہو جاتا اور آخرت کیلئے قلت بے چین نہونا یہی جڑ ہے تمام بیماریوں کی پس یہ اطمینان دل سے نکالو اور خدا تعالی کی طاعت کو اپنے اوپر لازم کرلو گو تکلف ہی سے ہو خلق طاعت میں اثر خاص ہے کہ اس سے فکر پیدا ہوگی اور فکر کے پیدا ہونے سے تمام کام درست ہو جاینگے اور ایک بات اپنے اوپر اور لازم کرلو وہ یہ کہ جو جی میں آئے فوراً مت کرلیا کرو بلکہ علماء سے تحقیق کرکے کیا کرو اگر ناجائز بتلائیں ہرگز اس کام کو مت کرو۔ اپنے کو علماء کا محتاج سمجھو۔ علماء کی قدر کرو اس طرح تدبر اور عمل رکھنے سے پھر قلب دنیا پر ہرگز مطمئن نہوگا۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ بدون خود حرکت کئے کچھ نہوگا محض ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا اور خود متوجہ نہونا بے سود ہے خود قصد کروگے تو اس طرف سے بھی توجہ ہوگی چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب قصد بھاگنے کا کیا تھا تو قصد کرتے ہی سارے قفل ٹوٹ گئے تھے رحمت حق کے متوجہ ہونے کیلئے عادۃً قصد شرط ہے ہماری حالت یہ ہے کہ ہم احدی بن گئے ہیں حرکت ہی نہیں کرتے بس اب میں بات ختم کرتا ہوں۔ اور جو بتلاتا ہوں وہ سوچا عمر بھر کا نسخہ ہے اسی پر عمل رکھو سارے کام تمہارے درست ہو جاینگے یہ میں مختصر علاج بتلا اب جبکہ کوئی عمل نہ کرے تو اسکا کیا علاج اسوقت اس سے زیادہ اور کوئی ضروری مضمون ذہن میں نہیں تفصیل کی حاجت باقی ہے مگر اسپر عمل کرنے سے تفاصیل کی خود فکر ہو جاویگی جتنا بتلایا ہے اسکو تو شروع کردو۔

اب دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالی عمل کی توفیق دیں فقط

اشرف علی ۱۴ شوال ۱۳۱۰ھ

کسی بزرگ سے تعلق پیدا کرلو

۲۰

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمی بہ

الفانی

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی - دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الوعظ المسمّٰی بہ

الفانی

این	کہاں ہوا	تھانہ بھون در مکان جناب منشی اکبر علی صاحب مرحوم
متی	کب ہوا	۳۰ جمادی الاخری ۱۳۳۱ھ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹے
کیف	کس ہیئت سے ہوا	جالساً
لِمَ	سبب کیا تھا	برادرم مرحوم مولانا سعید احمد صاحب غفر اللہ لہ کی وفات حسرت آیات پر تعزیت کیلئے مہمانوں کا اجتماع ہوا اسلئے انکی درخواست پر بیان ہوا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	ہم لوگ دنیا کے فنا و زوال سے غافل ہیں ایسا آخرت کے بقا سے بھی اس لئے زیادہ پریشانی ہوتی ہے پس راحت کا طریقہ فنائے دنیا و بقائے آخرت کا استحضار ہے
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ہر طبقہ کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۱۰۰ تقریباً۔ مجمع مستورات پردہ میں اس کے علاوہ تھا
الاشتات	متفرقات	یہ وعظ احقر جامع کا اول ضبط کردہ وعظ ہے پھر اتفاق سے اس کی تبییض میں بھی بہت دیر ہوگئی اس لئے ممکن ہے کہ ضبط اچھی طرح نہ ہوا ہو ۱۲

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ وَلَنَجْزِیَنَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا

ع جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائیگا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ہمیشہ رہیگا۔ اور جو لوگ ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجران کو ضرور دیں گے۔ پارہ ۱۴ کی ع ۱۹

یحذرون ٥ یہ ایک مختصر سی آیت ہے اسمیں حق تعالیٰ جل شانہ عم نوالہ نے ہمکو ایک بڑے کام کی بات تعلیم فرمائی ہے جس سے ہماری تمام پریشانیوں کا علاج ہوجائیگا اور یہ مضمون بہت ظاہر ہے جسمیں کوئی پیچیدگی نہیں اور یہ قرآن وحدیث کا کمال ہے کہ اُسکی کوئی بات پیچیدہ نہیں شریعت مقدسہ کی تعلیم بہت صاف تعلیم ہے کیونکہ قرآن مجید ایسے لوگوں کیلئے نازل ہوا ہے جنمیں مختلف فرقے اور مختلف حالات ہیں اس لئے قرآن کے علوم بہت سہل ہیں اور اُسکی باتیں دل لگتی ہیں تاکہ سبکو فائدہ پہونچے اس لئے اگر قرآن سے ایک عامی منتفع ہے تو ایک فلسفی بھی اُس سے مستفید ہے ہر شخص خواہ عامی ہو یا عالم اس سے مستفید ہونے میں یکساں ہے گو استفادہ کا درجہ مختلف ہو ہر شخص کو اُسکے مرتبہ کے موافق اُس سے نفع ہوتا ہے اسکی یہ شان ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد — برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اسلئے بعض لوگوں نے قرآن شریف کو بارش سے تشبیہ دی ہو کہ ہر زمین کو اپنی استعداد کے موافق اُس سے سیرابی و سرسبزی حاصل ہوتی ہے۔ اور جسطرح یہ صفت قرآن شریف کی ہے ایسے ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جو اور تعلیمات حدیث میں ہیں اُنکی بھی یہی شان ہے کیونکہ وہ بھی وحی الٰہی ہے صرف اتنا فرق ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو ہے اس لئے جو مضمون حدیث میں ہو اُسکا سمجھنا اور سمجھانا بھی بہت سہل ہے جیسے قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا سہل ہے اور کیوں نہو وہ ایسے متکلم کا کلام ہے جسکو ہر مشکل کا آسان کرنا سہل ہے پس قرآن وحدیث کی تعلیم کا سہل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں اور یہ سہولت تذکیر کے حصہ میں ہے اور استنباط کا حصہ صرف مجتہدین کے ساتھ خاص ہے اسی لئے تیسیر میں للذکر اور لتبشر وتنذر کی قید ہے اور بعض مضامین میں یستنبطونہ کی قید ہے اُنہی سہل اور تذکیری مضامین میں سے یہ بھی ایک مضمون ہے جو اس آیت میں مذکور ہے اگر اسمیں تدبر کیا جائے تو اس سے ہماری بہت بڑی غلطی رفع ہوگی۔ تدبر کی قید میں نے اسلئے لگائی کہ شریعت کی تعلیم باوجود سہل ہونیکے ہمکو مخفی اسلئے معلوم ہوتی ہے کہ ہم اب تدبر سے کام نہیں لیتے۔ اور عدم تدبر سے تو دنیوی جیسی باتیں بھی خفی ہوجاتی ہیں علمی

مضامین کا تو ذکر ہی کیا - مضامین علمیہ کا تعلق چونکہ بلا واسطہ عقل سے ہے وہاں تو بدون تدبر کے کام نہیں چل سکتا مگر محسوسات میں بھی باوجودیکہ اُن کا تعلق حس سے ہے تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور بدون تدبر کے بعض دفعہ سخت غلطی ہو جاتی ہے - اسی مضمون کو دیکھ لیجئے کہ باوجود واضح ہونے کے عدم تدبر کی وجہ سے خفی ہو گیا ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو تمہارے پاس ہے وہ ختم اور فنا ہو جائیگا ایک جملہ تو یہ ہے دوسرا جملہ اسی کی تتمیم و تکمیل کیلئے ہے کہ جو خدا کے پاس ہے وہ پائدار و باقی رہنے والا ہے - ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کوئی پیچیدہ اور خفیہ مضمون ارشاد نہیں فرمایا بلکہ ایک واضح آسان و سرسری مضمون ہے مگر عرفی اصطلاح کے موافق وہ سرسری نہیں کیونکہ واقع میں بڑا اعلیٰ مضمون ہے مگر چونکہ ہم اسمیں تدبر نہیں کرتے اسلئے سرسری سمجھا جاتا ہے - غرض ایک معنی کے لحاظ سے تو یہ سرسری ہی ہے یعنی سہل ہونے کی وجہ سے مگر آجکل سرسری بات معمولی اور بیوقعت بات کو کہا جاتا ہے سو اس معنی کر قرآن کا کوئی مضمون بھی سرسری نہیں ہر مضمون باوقعت اور اعلیٰ درجہ کا ہے ہاں دوسرے معنی کے لحاظ سے اسکو سرسری کہنا صحیح ہے کہ واضح اور صاف اور آسان ۴
مضمون ہے مگر چونکہ ہم اسمیں غور نہیں کرتے اسلئے ہمکو قرآن کی باتیں غیر واضح معلوم ہوتی ہیں اور اُن سے ہمکو اجنبیت سی ہے - اور باوجودیکہ مضمون اعلیٰ درجہ کا ہے اور نہایت باوقعت ہے مگر آجکل اُسکی زیادہ وقعت نہیں کیجاتی جسکی ایک وجہ کثرت سماع و کثرت مشاہدہ بھی ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس بات کو بار بار سنا جائے یا بار بار دیکھا جائے وہ طبعی امر سمجھا جاتا ہے اسلئے اُسکی زیادہ عظمت نہیں ہوتی پھر اس بات کو اگر اہتمام کے ساتھ کوئی بیان کرے تو تعجب ہوتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نیا مضمون ہے اسلئے انسان اسمیں کسی قدر معذور بھی ہے مگر خدا نے انسان کو عقل بھی دی ہے اور فطرت دی ہے اسلئے اگر دونوں کے مقتضا میں تزاحم ہو تو اسوقت اُسکو شریعت کی تعلیم پر عمل کرنا چاہئے کیونکہ شریعت کی تعلیم میں دونوں کی رعایت ہے مثلاً کسی عزیز کے فوت ہونے سے رنج پہونچے تو عقل اسوقت رنج کرنے سے منع کرتی ہے کیونکہ وہ کہتی ہے

کہ رنج کرنے سے وہ شے واپس نہیں آسکتی اسلئے رنج فضول ہے اور طبیعت رنج کا تقاضا کرتی ہے مگر طبیعت کا یہ اثر اور تقاضا ایک حکم غیر واقعی پر مبنی ہے کہ یہ چیز ہم سے جدا کیوں ہوئی یہ حکم غیر واقعی اسلئے ہے کہ تمہارے قبضہ میں تو خود اپنی ذات بھی نہیں اگر تمکو اپنی ہی ذات پر قبضہ ہوتا تو کوئی شخص بھی بیمار یا مفلس نہوا کرتا بلکہ انسان کی ذات میں جو تصرفات و تغیرات رات دن ہوتے رہتے ہیں وہ اسکو بتلاتے ہیں کہ یہ خود مختار نہیں بلکہ دوسرے کے قبضہ میں ہے تو جب یہ اپنی ذات میں بھی خود مختار نہیں تو دوسری چیزوں میں اس کو دخل در معقول کا کیا حق ہے تو چونکہ یہ حکم عقل کے خلاف تھا اسلئے عقل نے اسکو رد کر دیا شریعت کی خوبی دیکھئے کہ دونوں کی رعایت کی گئی کہ حزن بھی ہو مگر اسکو غالب نکرو شریعت نے عقل کی بھی رعایت کی اور طبیعت کی بھی۔ اسی طرح یہاں جس مسئلہ کا ذکر ہے آگیا عقل کا مقتضا یہ ہے کہ فنائے دنیا سے کبھی غفلت نہو کیونکہ جب واقع میں اسکو بقا نہیں اور فنا اسکی ساتھ لگا ہوا ہے تو اس سے غفلت صریح غلطی ہے دیکھو اگر بادشاہ کسی خزانچی کے سپرد خزانہ کردے اور اسکو معلوم ہے کہ یہ میرے پاس بطور امانت کے ہے جو چند روز کے بعد لیلیا جاویگا تو اسکو لازم ہے کہ اسکی امانت ہونے سے غافل نہو اگر کوئی خزانچی خزانہ کو اپنی ملک سمجھکر اسمیں مالکانہ تصرف کرنے لگے تو یقیناً سب اسکو احمق بنائیں گے اسی طرح فنائے دنیا سے غفلت عقل کے نزدیک سخت غلطی ہے مگر طبیعت غفلت کو مقتضی ہے کیونکہ فنائے دنیا کو بار بار دیکھتے دیکھتے مساوات سی ہوجاتی ہے اور جس چیز کی مساوات سی ہوجائے اس سے طبیعت کو غفلت ہوجاتی ہے شریعت نے یہاں بھی دونوں کو معتدل کر دیا اور دونوں کی رعایت فرمائی کہ غفلت کا تو مضائقہ نہیں مگر نہ اتنی غفلت کہ احکام عقلیہ بالکل برباد ہوجائیں اگر تھوڑی سی غفلت بھی نہو تو انسان معطل ہوجائے کیونکہ جسکے سامنے ہر دم موت ہی کھڑی ہو وہ کوئی کام اچھی طرح نہیں کرسکتا مگر اسکے لئے ایک حد ہے جسکے آگے طبیعت کے احکام ختم ہوجاتے ہیں اور وہ حد یہی ہے کہ اتنی غفلت کا تو مضائقہ نہیں جسکی انتظام معاش میں ضرورت ہے مگر اتنی نہ چاہیئے جس سے احکام عقلیہ بالکل برباد ہوجائیں کہ دنیا سے ایسی بستگی ہوگی گویا ہمیشہ یہیں رہنا ہے جو شخص دنیا سے

5

[illegible]

ایسی وابستگی کرے اسکی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی مسافر سرائے میں دل لگالے اور ایک رات کے قیام کیلئے وہاں خوبصورت مکان تعمیر کرنے اور باغ وغیرہ لگانے لگے یقیناً سب اسکو بیوقوف کہیں گے کہ صرف رات بھر کا تو قیام اور اسکے لئے اسقدر سامان جو وطن اصلی کے مناسب تھا۔ پس ہمکو جو فنائے دنیا سے غفلت ہے اسکا تو مضائقہ نہیں مگر اسکا حد سے بڑھ جانا بیمحل شکایت ہے۔ ہماری حالت ایسی ہے جیسے ایک چمار کی حکایت ہے کہ کسی نے اسکے ایک جوتہ مارا تو وہ کہتا ہے اب کے تو مار اس نے پھر مارا تو پھر بھی کہا کہ اب کے تو مار غرض وہ مارتا رہا اور یہ برابر یوں ہی کہتا رہا اب کے تو مار اس طرح ہم بھی رات دن فنائے دنیا کے واقعات دیکھتے رہتے ہیں مگر اپنی فنا سے غافل ہیں گویا بزبان حال یوں کہتے ہیں کہ اب کے تو موت آئے اب کے تو طاعون آئے اے صاحبو! مشاہدہ سے زیادہ کیا ہوگا جب مشاہدہ سے بھی ہماری غفلت کا پردہ نہ اٹھا تو کب اٹھے گا۔ یہ غفلت تو ہماری زوال دنیا کے متعلق ہے جو مشاہدہ ہے رہا بقائے آخرت تو ہرچند کہ وہ مشاہد نہیں مگر اعتقادی مسئلہ ہے اور اعتقادیات دلمیں مضبوطی کیساتھ جمارہنا ضروری ہے اور جو بات دلمیں جمی ہوئی ہو اس سے اجنبیت نہ ہونا چاہئے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ جب کوئی یہ کہے کہ تم مروگے اور خدا کے سامنے جاؤگے قبر میں سوال جواب ہوگا قیامت میں نامۂ اعمال سامنے ہوگا تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خواب دیکھ رہے ہیں افسوس کی بات ہے کہ جس چیز کا درجہ حال میں دل میں جما رہا ہونا چاہئے تھا وہ ایسی ہوگئی جیسے خواب ہو اور اسکی علامت یہ ہے کہ ناصحین سے الجھتے ہیں اور بعضے تو بیدھڑک کہدیتے ہیں ؎ ابتو آرام سے گذرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے اور جو ان سے اچھے ہیں وہ ناصحین کی نصیحت کے جواب میں یوں کہدیتے ہیں کہ میاں اللہ غفور رحیم ہے آخرت کی فکر کہانتک کریں۔ اللہ میاں سب بخشدیں گے گویا انکے نزدیک آخرت میں فقط ایک ہی جزو کا ظہور ہوگا دوسرے جزو کا یعنی عذاب کا ظہور نہ ہوگا۔ کیوں صاحب اجی یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ بخشدیں گے وہاں یہ خطرہ کیوں نہ ہوا کہ شاید کسی بات پہ پکڑ ہونے لگے شاید دوزخ میں بھیجدئے جائیں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ حالت تھی کہ کام بہت کرکے بھی ڈرتے تھے چنانچہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا

ف: بقائے آخرت سے غفلت کی شکایت اور اسکی وجہ۔

ف: معاد آخرت کی باتیں تو سبھی معلوم ہوتی ہیں اور اسکی دلیل۔

ف: ان لوگوں کی غلطی کا ... جو نصیحت کے جواب میں اللہ غفور رحیم ہے کہدیتے ہیں ... کام کرکے بھی ڈرتے تھے

کہ کیا تم اسپر راضی ہو کہ ہمنے جو اعمال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں اُنکا اجر تو ہمارے واسطے سالم رہے اور جو اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کئے ہیں اُن پر گرفت نکی جائے چاہے ثواب بھی ندیا جائے تو حضرت ابو موسیٰ رضؓ نے فرمایا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں انکا اجر بھی سالم رہیگا اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کئے ہیں انکا بھی ثواب ملیگا کیونکہ ہمنے حضورؐ کے بعد بھی بہت کام کئے ہیں اور ظاہر میں یہ بات صحیح بھی تھی کیونکہ صحابہ نے زیادہ تر فتوحات وغزوات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی کی ہیں حضرت عمرؓ کی مدت خلافت میں جسقدر فتوحات ہوئی ہیں کہ اسلام مشرق سے مغرب تک پھیل گیا اُن سے پہلے اسقدر فتوحات نہیں ہوئیں مگر باوجود اسکے حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ بھائی میں تو اسپر راضی ہوں کہ جو اعمال ہمنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں وہ سالم رہیں اور اُنکا ثواب ملجائے اور جو اعمال بعد میں کئے ہیں اُن سے برابر سرابر چھوٹ جائیں نہ گرفت ہی ہو تو غنیمت ہے ثواب تو کیا ہوتا اور حضرت عمرؓ کو جو اُن اعمال پر ثواب کی امید ہوئی جو حضور کے سامنے کئے تھے تو وہ بھی اس لحاظ سے نہ تھی کہ وہ اپنے اعمال ہیں بلکہ محض اسوجہ سے امید تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ٹھیک ہو گئے ہونگے انمیں خلوص و نورانیت وغیرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے آگیا تھا حقیقت میں یہی باتیں ہیں جنسے ہم غافل ہیں اور یہ ایک باریک بات ہے جسکی ہمکو خبر نہیں کہ ہم جو بعضے کام کرتے ہیں کبھی تو وہ اپنی قوت سے ہوتا ہے اور کبھی اہل اللہ کی نظر و توجہ سے ہوتا ہے اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

یار باید راہ را تنہا مرو — بے قلاوز اندریں صحرا مشو

یعنی باطنی راستہ کیلئے کوئی رفیق ساتھ لیلو تنہا اس راستہ کو طے کرنیکا ارادہ نکرو کیونکہ تم تنہا اسکو قطع نہیں کر سکتے اسپر شبہ ہو سکتا تھا کہ بعض اہل اللہ کا پیر و مرشد کوئی نتھا اور وہ بدون مرشد کے واصل ہو گئے اسکا جواب مولانا نے یہ دیا ہے ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید — ہم بعون ہمت مردان رسید

کہ جو لوگ شاذ و نادر تنہا اس راہ کو طے کرنے والے نظر آتے ہیں وہ بھی حقیقت میں تنہا منزل مقصود پر نہیں پہونچے بلکہ کسی کامل کی مخفی مدد اور پوشیدہ نظر کی برکت سے واصل ہوئے ہیں

ایک تو لفظ نادر بڑھا کر بتلا دیا کہ اول تو ظاہر میں بھی اسکا وقوع نادر ہے دوسرے حقیقت کے لحاظ سے وہ بھی تنہا نہیں چل رہا بلکہ کسی کامل کی مدد اسکی ساتھ ہے گو اسکو خبر نہو کہ کون میری مدد کر رہا ہے جیسے آفتاب کی حرارت سے پھل پختہ ہوتا ہے مگر کھانے والے کو بھی نہیں ہے کہ میرے لئے اسکو کس چیز نے پکایا کس چیز نے تیار کیا اسی طرح ہر زمانہ میں کوئی خدا کا بندہ آفتاب درحقیقت ہوتا ہے جسکی نورانیت سے اسکے زمانہ والوں کی مدد پہونچتی ہے مگر لوگوں کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ کون چلا رہا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم تنہا چل رہے ہیں مگر یہ غلط ہے تو حضرت عمرؓ نے اس راز کو سمجھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہمارے اعمال میں نورانیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ نورانیت نہیں گو ظاہر میں اعمال کا ذخیرہ بعد میں بھی بہت کچھ نظر آرہا ہے مگر چونکہ نورانیت ویسی نہیں تو انکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ کے سامنے ہزاروں ٹوکرے امرود و انار وغیرہ کے پیش کرنے لگے جو سڑے ہوئے ہوں تو کیا اس انبار کی محض اسلئے کہ ظاہر میں بڑا انبار تو ہے کچھ قدر ہوسکتی ہے سلاطین دنیا تو سارے انبار کو ہمارے منہ پر دیکر مار دینگے اسلئے حضرت عمرؓ کو اپنے ان اعمال کے متعلق خطرہ تھا اور فرماتے تھے کہ ثواب تو بہت دور ہے میں اسپر ہی راضی ہوں کہ ان پر گرفت نہو اور الٹے منہ پر نہ مارے جائیں حضرت عمرؓ پر خوف کا غلبہ تھا اور حضرت ابوموسیٰ پر حالت رجا غالب تھی جب حضرت عمرؓ کی طاعات کے باب میں یہ حالت تھی باوجودیکہ آج انکی برابر کوئی بھی نہیں ہوسکتا ہے تو پھر ان اللہ کے بندوں کو جو اللہ غفور رحیم کہکر ناصحین کا منہ بند کرتے ہیں معاصی کے باب میں یہ خوف کیوں نہیں ہوتا کہ شاید ہماری پکڑ ہونے لگے۔ تو آخرت سے باوجودیکہ اعتقادی مسئلہ ہے ہمکو اسقدر غفلت ہے کہ خبر ہی نہیں اسی طرح فنائے دنیا ظاہر ہے مگر کبھی بھولکر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ایک دن ہم بھی ختم ہوں گے جسکی دلیل یہ ہے کہ آخرت کیلئے سامان سے بے پروائی ہے نہ ذہن چھوڑنے کی کرہے نہ قرض ادا کرنیکا خیال ہے نہ موروثی زمین چھوڑنیکا قصد ہے گویا اللہ میاں سے کچھ غرض ہے کہ ان کا قرض ادا کردینگے اور موروثی چھوڑ دینگے غرض ایک عالم لایعنی مشغلہ میں مبتلا ہے کوئی زیور کی دھن میں ہے کوئی مکان بنانے میں منہمک ہے کسی کو یاد نہیں کہ

ف آفتاب باطن ہر زمانہ میں ہوتا ہے جسکی نور سے بہت لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور انکو خبر بھی نہیں ہوتی

۸ ف حضرت عمرؓ پر خوف غالب تھا اور ترحم

ف فنائے دنیا سے غفلت کی

ایک دن ہم نہوں گے تو یہ ایسا مضمون ہے جو واقع میں ظاہر ہے مگر غفلت نے اسکو خفی بنا رکھا ہے۔ سو واسطے اللہ تعالیٰ نے جا بجا ہمکو بار بار متنبہ فرمایا ہے جنمیں سے ایک مقام یہ بھی ہے جسکو میں اسوقت بیان کرنا چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے لوگو! سنو کہ تمہارے واسطے دو قسم کی چیزیں ہیں ایک وہ جو تمہارے پاس ہیں جنمیں تمنے دل لگا رکھا ہے وہ تو ختم ہونے والی ہیں اور دوسری وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی ہیں اور وہ چیزیں بھی تمہاری ہی ہیں مگر تم اُن سے ایسے غافل ہو گویا وہ غیر کی ہیں حالانکہ اُنکی ایسی مثال ہے جیسے کچھ تو بچہ کے پاس روپیہ ہو اور باقی سرمایہ باپ کے قبضہ میں ہو بچہ کے پاس جو روپیہ ہے وہ اُسکو اپنا سمجھتا ہے مگر بیوقوفی سے اُسکو پھینکا سمجھکر برباد کرتا ہے اور جو سرمایہ باپ کے پاس ہے اُسکو اپنا روپیہ نہیں سمجھتا حالانکہ وہ بھی اُسی کے واسطے ہے مگر باپ اسلئے اسکو نہیں دیتا کہ برباد کر دیگا وہ اسکو خاص موقع کے واسطے اپنے بچہ کیلئے محفوظ کرتا ہے تو جیسے وہ بچہ احمق ہے کہ باپ کے پاس کے سرمایہ کو اپنا نہیں سمجھتا ایسے ہی ہم بیوقوف ہیں کہ اپنی چیز اُسی کو سمجھتے ہیں جو ہمارے ہاتھ میں ہے اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے واسطے اپنے پاس رکھی ہے اُنکو اپنی نہیں سمجھتے وہ گویا کسی غیر کیلئے ہیں اے صاحبو! وہ بھی ہماری ہیں مگر جب تک انکی قدر نکروگے وہ نہ ملیں گی اور قدر یہی ہے کہ انکو مانگو یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مانگو یا نہ مانگو چاہو یا نہ چاہو یعنی قدر کرو یا نکرو زبردستی تمہارے سر مڑھ دی جائے اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں انلزمکموها وانتم لها کارهون (کیا ہم اپنی نعمت کو تمہارے سر چپکا دیں حالانکہ تم اس سے کراہت ہی کرتے رہو) آخر اُنکو اسکی ضرورت کیا ہے کہ خواہمخواہ تمہارے سر چپکا دیں کیا خدا کے پاس جگہ نہیں ہے یا وہ نعمتیں رکھی رکھی سڑ جائیں گی ہرگز نہیں خدا کے پاس جگہ کم نہیں اور نہ وہ نعمتیں سڑنیوالی ہیں اس لئے بدون مانگے نہیں ملیں گی اور نہ مانگنے کے بعد کچھ بھی دیر لگے گی حدیث قدسی میں بالفاظ ہو وارد ہے من تقرب الی شبرا تقربت الیه ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیه باعا الخ کہ جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اُسکی طرف دو بالشت جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے۔

ہیں اسکی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف چلکر آتا ہے میں اسکی طرف دوڑ کر جاتا
ہوں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔ ایک حدیث

ف: جو اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اس پر وہ غصہ ہوتے ہیں ۱۲

میں یہ آیا ہے مَنْ لَّمْ يَسْئَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اس پر
اللہ تعالیٰ غصہ کرتے ہیں۔ دوسرے آقاؤں کی تو یہ حالت ہے کہ اُن سے اگر برابر مانگتے
رہو تو تنگ آجاتے ہیں اور جو اُن سے مانگتا نہ ہو اُس سے خوش رہتے ہیں اور تعریف کے
طور پر کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑے لیے زبان ہے کبھی کچھ نہیں مانگتا۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسے ہیں
کہ جو اُن سے نہ مانگے اُس سے خفا ہوتے ہیں اور جو برابر مانگتا ہے اس سے خوش ہوتے ہیں
یہانتک ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہر چیز مانگو یہانتک کہ جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو
وہ بھی مانگو نمک نہ رہے وہ بھی ان ہی سے مانگو۔ یہ اسلئے فرمایا تاکہ لوگوں کے دلوں سے

ف: بعض لوگ اللہ تعالیٰ سے معمولی چیزوں کا سوال نہیں کرتے یہ بھی نفس کا کید ہے ۱۲

یہ خیال نکل جائے کہ اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چھوٹی چیزیں کیا مانگیں؟ ظاہر میں یہ خیال مستحسن
معلوم ہوتا ہے مگر اسمیں نفس کا کید ہے جسپر شارع علیہ السلام نے ہمکو متنبہ فرمایا ہے وہ
کید یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے چھوٹی چیزیں نہیں مانگتا وہ اپنے خیال میں بڑی چیزوں
کو گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بڑی سمجھتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سلطنت
ہفت اقلیم اور جوتی کا تسمہ برابر ہے دوسرے کیا چھوٹی چیزوں کیلئے کوئی اور خدا ہے اگر
نہیں تو اُسی سے کیوں نہیں مانگتے۔ اور مغفرت و جنت مانگنے کا تو قرآن میں جابجا امر ہے
سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اپنے پروردگار
کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑو جسکا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے ع ایک حدیث
میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُلِحِّيْنَ فِي الدُّعَاءِ
اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو پسند فرماتے ہیں جو دعا میں الحاح کرتے ہیں تو دیکھو ہمارے آقا کیسی
کریم ہیں ایسے کوئی نہ مانگے تو اُسکی محرومی اور بدقسمتی ہے۔ ۵

اسکے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر — تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

صاحبو! اللہ تعالیٰ سے مانگو انھوں نے حفاظت سے اپنے پاس تمہارے لئے بہت سی نعمتیں

ع ۵ جسکے عرض میں آسمان زمین سما جائیں اسکے طول کا کیا کہنا ۱۲ ظ

رہی ہیں اور جو نعمتیں تمہارے پاس ہیں اُسکو تو چور لیجائیں ڈاکو چھین لیں مگر افسوس کہ ہم یہ
فرلیفتہ ہیں اور جو محفوظ ہیں اُنکو اپنی حماقت سے بھولے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی غلطی پر ہمکو تنبیہ
فرماتے ہیں کہ جو تمہارے پاس ہے واقع میں وہ تو غیر کی چیز ہے یعنی امانت چند روزہ ہے جو ایک
وقت میں تم سے چھین لیجائیگی یا موت کے بعد وارثوں کو ملیگی اور جو ہمارے پاس ہے واقع میں وہ تمہاری
چیز ہے جو ہمیشہ تمہارے پاس رہیگی مگر ہم نے اس مضمون کو بھلا رکھا ہے علماً بھی و عملاً بھی
ذہول کے معنی ہیں کہ اُسکا استحضار نہیں ہے ورنہ اسکا عقیدہ تو ہم سب مسلمان اپنے دل میں رکھتے
ہیں۔ مگر جس اعتقاد سے کام نہ لیا جائے اُسکی ایسی مثال ہے جیسے ایک زمانہ شاہزادہ کی
حکایت ہے کہ وہ بیٹھا ہوا تھا کہ دفعۃً سانپ نکل آیا تو وہ کہنے لگا ارے بلانا کسی مرد کو
کسی نے کہا حضور بھی تو ماشاء اللہ مرد ہیں کہا ارے ہاں خوب یاد دلایا اچھا لاٹھی لاؤ پھر معلوم
سانپ مارا یا نہیں تو ظاہر ہے کہ اُسکو اپنے مرد ہونیکا اعتقاد ضرور تھا مگر ایسے اعتقاد سے کیا نفع!
جو وقت پر یاد نہ آئے حتی کہ دوسروں کو یاد دلانیکی ضرورت پڑے۔ گو اعتقاد سے بلا پہونچ نہیں کہہ
سکتے کہ ذہول کے بعد بالکل بیکار ہے کیونکہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ ایسا اعتقاد بھی اخیر میں کام آجائیگا
بہت کلکر اس عقیدہ ہی کی بدولت کسی وقت جنت میں پہنچ جائیں گے جسکی دلیل یہ آیت ہے
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ جب ذرہ برابر نیکی بھی ضائع
نہیں تو ضعیف اعتقاد اور ضعیف ایمان کی جزا بھی ضرور ملنا چاہئے اور اُسکی یہی صورت ہے
کہ کسی وقت یہ لوگ جہنم سے نکال لئے جائیں تو ہر چند کہ یہ اعتقاد بھی ایک درجہ میں نافع ہی
مگر جب وقت پر پوری طرح کام نہ آیا اور مرتے ہی جنت میں جانا نصیب نہ ہوا تو یہ اعتقاد نافع
کامل نہوا۔ اسلئے میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ اس باب میں علماً بھی کوتاہی کرتے ہیں اور عملاً بھی
مگر عمل کے مقابلہ میں علم کے دو درجے ہیں ایک اعتقاد ایک استحضار اور ہماری کوتاہی دوسرے
درجہ میں ہے یعنی ہم استحضار میں کوتاہی کرتے ہیں اب عدم استحضار کا ایک قوی سبب یہ ہے
یہ کہ شیطان نے یہاں ہمکو یہ سبق پڑھا رکھا ہے کہ ہماری قسمت کہاں کہ ہم جنت میں پہلے ہی
پہونچ جائیں اسلئے اسکی سعی نہیں اور نہ اسلئے استحضار ہی نہیں استحضار اسی چیز کا ہوتا ہے
جسکے لئے سعی ہو میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ تمہاری قسمت کھانے پینے میں تو بڑی تیز ہے

ف: مضمون بالا بمثال
ف: جب اعتقاد کا استحضار نہو اسکی مثال
ف: اعتقاد بلا استحضار نافع ہے مگر نافع کامل نہیں
ف: شیطان کا جواب

اسمیں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہاتھ پر ہاتھ دہر کے بیٹھ جاؤ اور کہو کہ ہماری یہ قسمت کہاں کہ دو وقت پیٹ بھر کے روٹی کھایا کریں یہ تو بڑے لوگوں کی قسمت ہے اور اگر یہ کہو کہ چاہتے تو ہم بھی ہیں کہ جنت میں مرتے ہی پہونچ جائیں تو میں کہونگا کہ یہ چاہنا آپکا ایسا ہے جیسے کوئی یہ چاہے کہ بدون ہاتھ ہلائے روٹی منہ میں پہونچ جائے اسکو سب یہ کہتے ہیں کہ یہ روٹی کھانا نہیں چاہتا اگر چاہتا تو اس کے اسباب اختیار کرتا ایسی ہی ہمارے بھائی یہ تو چاہتے ہیں کہ کھڑے کھڑے جنت میں پہونچ جائیں مگر ہاتھ نہیں ہلاتے اسکے اسباب اختیار نہیں کرتے اور دنیا کی جس بات کو چاہتے ہیں اسکے لئے خوب کوشش کرتے ہیں پس حاصل یہ ہے کہ روٹیاں کھانا تو تم چاہتے ہو اور دین کی باتوں کو انشاء اللہ چاہتے ہو اگر خدا نے چاہا اور قسمت میں ہوا تو دیندار بنجائیں گے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے چاہنے ہی سے ہو گی مگر جسطرح دنیا کے اسباب تدابیر اختیار کرتے ہو اسی طرح دین کے اسباب بھی تو اختیار کئے ہوتے اور تدبیر اپنی ہوتی اسکے بعد نتیجہ تو خدا کے سپرد کیا ہوتا یہ کیا کہ اسباب و تدابیر کو بھی ترک کرکے بیٹھ گئے حالانکہ دنیا کے کاموں میں کوئی بھی تدبیر کو ترک نہیں کرتا اس کا تو یہ حاصل ہوا کہ اپنے مطلب میں تو تم بڑے ہوشیار ہو مگر آخرت کو مطلوب ہی نہیں سمجھتے اسکی وقعت دلمیں نہیں جبھی تو یہ بہانے ہیں اسکی شکایت ہے خصوص عورتوں میں یہ عدم استحضار بہت ہی زیادہ ہے چنانچہ جب وقت عورتیں زیور پہنتی یا کپڑے قطع کرنے بیٹھتی ہیں اسوقت یوں معلوم ہوتا ہے کہ انکو کبھی اس کا گمان نہیں کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے اور عام طور سے یہ ذہول اسقدر ہے کہ گویا موت سامنے ہی نہیں تب ہی تو انکو اپنی موت یاد نہیں آتی میں بالقسم کہتا ہوں کہ بہت لوگوں کو اپنی موت یاد نہیں آتی جسکی دلیل یہ ہے کہ عین جنازہ کی ہمراہی میں بھی دل لگی کی باتیں ہوتی ہیں قبرستان میں جاکر بھی مقدمات کے فیصلے اور تذکرے ہوتے ہیں۔ واللہ اگر اپنی موت اسوقت یاد ہو تو انسان سب چوکڑی بھول جائے جیسے ایک بڑھیا کی حکایت ہے کہ اسکی بیٹی بیمار تھی یہ محبت میں دعا کرتی تھی

انہماک فی الدنیا کی حالت اور اس کی شکایت ۱۲

عـہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود نے ایک شخص کو قبر پر کھڑے ہوئے ہنستا ہوا دیکھا فرمایا خدا میں تجھ سے کلام نہ کرونگا تو ایسی جگہ بھی ہنستا ہے جہاں رونا چاہئے تھا ۱۲ جامع۔

کہ اللہ ایسا ہی ہو جائے اور اسکی جگہ میں مر جاؤں ایک دن اتفاق سے محلہ کی گائے نے ہانڈی
میں منہ ڈالدیا اور سینگ ہانڈی میں پھنس گئے وہ اسی صورت سے بڑھیا کے گھر میں
آگھسی یہ دیکھکر ڈر گئی اور یہ سمجھی کہ بس موت کی میں تمنا کرتی تھی وہ سامنے آگئی بس یہ عزرائیل
فرشتہ ہے جو میری روح نکالنے آیا ہے تو وہ گھبرا کر کہنے لگی اے موت میں مہستی نہیں مہستی
تو وہ پلنگ پر پڑی ہے۔ میں تو غریب بڑھیا ہوں ؎

گفت اے موت من نہ مہستیم ۔۔۔ پیر زال غریب محنتیم

صاحبو! ہم اپنی موت کو یاد رکھتے تو ہوش اڑ جاتے اور اسکی علامات ظاہر ہوتیں مگر ہمارے
اندر اسکی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی۔ اور اگر اپنی موت یاد آتی تو پھر دوسرے مردہ پر بھی
اتنا نہ روتے کیونکہ اگر کوئی قید سے چھوٹ جاوے تو ہمیں اتنے رنج کی کیا بات ہے گو طبعاً
حزن ہوتا مگر عقلاً تو یہ خوشی کی بات ہے اسوقت اس بات کی خوشی ہونا چاہئے تھی کہ ایک
دن ہم بھی قید خانہ سے چھوٹنے والے ہیں جیسا یہ چھوٹ گیا عارف اسی کو فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۔۔۔ راحت جان طلبم وز پئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ۔۔۔ تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

اہل اللہ تو موت کے دن کی تمنا کرتے ہیں اور یہاں ہم تو اسکے نام سے بھی جاڑہ بخار چڑھتا ہے۔
تو موت کو ہم اتنا بھولے ہوئے ہیں کہ دوسرے کو مرتے دیکھکر بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ منزل ہمارے
سامنے بھی ہے بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ بس موت اسی کے واسطے تھی اور اگر کوئی یاد بھی کرتا ہے تو
بطور وظیفہ کے مگر کیا اگر کوئی لڈو مٹھائی کا نام لیکر وظیفہ پڑھا کرے تو اس سے اس کا منہ میٹھا ہو جائیگا
ہرگز نہیں اسیطرح موت کا وظیفہ پڑھنے سے کام نہیں چل سکتا اسکو موت کی یاد نہیں کہہ سکتے موت کی یاد
یہ ہے کہ زیوروں کی کثرت سے نفرت ہو جائے گھر میں زیادہ سامان اور بکھیڑا ناگوار معلوم ہو جیسے
میں زیادہ اسباب برا معلوم ہو جاتا ہے یہانتک کہ سفر میں اتنا مختصر سامان ساتھ لیتے ہیں جسکے
عدد شمار میں آجائیں مگر ہماری یہ حالت ہے کہ سفر آخرت سامنے ہے اور گھر میں اسقدر سامان ہے
جسکی تفصیل گھر والے کو بھی معلوم نہیں ہم نہ تو لادتے جاتے ہیں اور گناہوں کا بوجھ جو گردن
پر لادا جا رہا ہے وہ اسکے علاوہ ہے یہ تو علمی کوتاہی تھی اور عملی کوتاہی یہ ہے کہ آخرت کیلئے

کوشش نہیں کرتے ۔ بس بڑی کوشش یہ ہوگی کہ بیٹھکر دو آنسو بہا لئے گویا اللہ میاں کی نہریں
پانی کم ہو گیا تھا وہ آنسو بہا کر اللہ میاں پر احسان کیا اور انکو خرید لیا ۔ بس انکے نزدیک دو
آنسو بہا لینے سے سارے گناہ انکے واسطے جائز ہوگئے یہ سبکا کفارہ ہوگیا ۔ بات یہ ہے کہ آنسو بہانے میں
کوئی وقت نہیں کچھ خرچ نہیں کچھ کرنا نہیں پڑتا اسلئے رونا اختیار کر لیا جیسے ایک بدوی کیساتھ
سفر میں ایک کتا تھا وہ راستہ میں مرنے لگا اور بدوی رونے لگا ایک مسافر نے رونیکا سبب
پوچھا کہا یہ کتا میرا رفیق ہے اور آج مر رہا ہے اسواسطے رو رہا ہوں کہا اسکو مرض کیا ہے کہا
بھوک سے مر رہا ہے مسافر نے دیکھا کہ ایک طرف پوٹلا بندھا رکھا ہے پوچھا اسمیں کیا ہے
کہا روٹی کے سوکھے ٹکڑے ہیں کہا پھر کتے کو کیوں نہ کھلا دیئے جس سے تجکو اسقدر محبت ہے

گفت نایدبے درم درراہ نان ⁂ لیک ہست آب دو دیدہ رائگان

مجھے ایسی محبت نہیں کہ رقم کی چیز اسکو کھلا دوں اور رونے کا کیا ہے مفت کے آنسو ہیں
دو گھڑی بہا لونگا یہی حال ہمارا ہے کہ ایسے مواقع پر ہمنے صرف رونا سیکھا ہے جسمیں کچھ خرچ
نہیں ۔ صاحبو! بقسم بتاؤ کہ جتنی کوشش تم بھوک کے وقت غلہ لانے اور آٹا پسوانے روٹی
پکوانے میں کرتے ہو کیا آخرت کے واسطے بھی کبھی اتنی کوشش کی ہے ہرگز نہیں ۔ اور اگر کوئی
نصیحت کرتا ہے تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیق دینگے تو آخرت کا سامان کرینگے
گویا اسمیں بھی نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی خطا ہے انکی کچھ خطا نہیں کبھی کہتے ہیں کہ ہماری تو قسمت
پھوٹی ہوئی ہے ہمیں دنیا کے دھندوں سے کہاں فرصت ہے اسمیں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی خطا
بتائی جاتی ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ یہ کیا دین ہے ۔ اور جو بڑا خیال آخرت کا ہوا
تو بزرگوں سے دعا کرنیکی درخواست کیجاتی ہے جیسے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ سے ایک
سوداگر نے بمبئی میں کہا تھا کہ حضرت دعا فرمایئے مجھے بھی حج کی توفیق ہو جاوے فرمایا ہاں ہم
دعا کرینگے اور ایک کام تم کرو کہ جہاز کی روانگی کے دن مجھے اپنی ذات پر پورا اختیار دیدو کہ
جو میں کہوں اسکے خلاف نکرو ۔ کہا حضرت اختیار لیکر کیا کرینگے فرمایا جس وقت جہاز روانہ
ہوگا تمکو پکڑ کر جہاز میں سوار کر دونگا وہ حیلے حوالے کرنے لگا تو حضرت نے فرمایا پھر یہ نہیں ہو سکتا
کہ تم بیوی کی بغل میں رہو اور رات دن گلچھرے اڑاؤ اور ہم دعا کئے ہو رہیں ۔ یہی حال ہمارا ہے

کہ خود کچھ نہ کرینگے ہاں ناصحین سے کہیں گے کہ آپ دعا کریں خصوصاً ان بوڑھی عورتوں کا تو یہ حال ہے کہ دین کا کوئی کام ہو تو سب سے کم ہمت اور دنیا کا کام ہو تو یہ شیطان کی خالہ سے پہلے اس کام کو کرینگی ایمیں سب سے زیادہ باہمت ہو جائیں گی اللہ میاں کا دھیان بھی نہیں آتا ہاں بہو بیٹیوں کے لئے زیور کپڑے کا رات دن تقاضا ہے ہم تو انکو کم ہمت اسوقت سمجھتے کہ یہ دنیا کے کاموں میں بھی کم ہمت ہوتیں حالانکہ خود دنیا کی یہ حالت ہے کوشش سے کبھی تو حاصل ہوتی ہے اور کبھی کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور آخرت کیلئے سعی کسی حال میں ناکام نہیں اگر کوئی شخص کسی عمل آخرت کا اہتمام کرے اور وہ حاصل بھی نہ ہو با بھلا ہو جب بھی اسکو ثواب ملتا ہے یہاں سے عوام کی ایک اور غلطی بھی معلوم ہو گئی وہ یہ کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ میاں قرآن صحیح کرلو تو جواب میں کہتے ہیں کہ کیا اب میری تعلیم کا وقت ہے اب بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے۔ یہ جواب بالکل غلط ہے کیونکہ آپکا کام صرف کوشش ہے صحت ہو یا نہ ہو اگر تم کوشش میں لگ جاؤ پھر بھی کامیابی کا درجہ حاصل نہ ہو تب بھی ثواب ملیگا بلکہ دونا ثواب ملیگا ایک محنت کا ایک ناکامی کی حسرت اور رنج کا یا یہ کہو کہ ایک پڑھنے کا ایک مشقت کا اور ناکامی پر ثواب ملنے سے حیرت نہ کیجئے حدیث میں تصریح ہے وَالَّذِیْ یَتَتَعْتَعُ فِیْهِ وَهُوَ عَلَیْهِ شَاقٌّ لَهٗ اَجْرَانِ یعنی جو شخص قرآن میں اٹکتا ہو اور وہ اسپر دشوار معلوم ہوتا ہو اسکو دو اجر ملیں گے اسی بناء پر اہل اللہ نے ناکامی کو بھی سبب ثواب بنا دیا ہے چنانچہ حضرت رابعہ نے جب حج کیا تو حج سے فارغ ہو کر جناب باری میں عرض کیا یا اللہ میں نے حج کرلیا اب ثواب دیجئے خواہ حج قبول ہوا ہو یا نہ ہو اگر قبول ہو چکا ہے تب تو حج مبرور پر ثواب دینے کا آپکا وعدہ ہے ہی اور اگر قبول نہیں ہوا تو یہ سخت مصیبت ہے کہ ؎

انہ دو دست چہ گویم بچہ عنوان رفتم ۔۔۔ ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

اور مصیبت زدہ کیلئے بھی آپنے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اسلئے بہرحال ثواب دینا پڑے گا غرض اس دربار میں کوشش کے بعد ناکامی بھی کامیابی ہے تنخواہ ضرور ملے گی۔ اور حضرت رابعہ نے جو یہ عنوان اختیار فرمایا یہ ناز کا مقام ہے جو ہر ایک کا منہ نہیں ہمارے لئے تو یہ ہی

زیبا نہیں ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد — چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

پیش یوسف نازش و خوبی مکن — جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

عیب باشد چشم نابینا و باز — زشت باشد روئے نازیبا و ناز

غرض یہ عنوان ناز کا ہے مگر مضمون یہ ہے کہ جب اپنے نزدیک مقبول بنانے کی کوشش کی مگر پھر کوتاہی ہوگئی تو قاعدہ سے گو مقبول ہونے کی قابل نہیں مگر وہ مقبول فرما کر اجر عطا فرماتے ہیں یہ معنی ہیں عدم مقبول پر اجر کے۔ اور یہ مضمون سالکین کے بہت کام کا ہے کہ دین کے راستہ میں اگر کوشش ناکام بھی ہو یا کمزور ہو جب بھی اجر ملیگا۔ صاحبو! اگر وصول الی کمال العمل ہو تو ثواب و قرب تو وصول الی المقصود ہو جائے گا۔ اگر تم نے قرآن صحیح کرنے کی کوشش کی اور نہ ہوا تو کیا حرج ہے خدا تو راضی ہوگیا۔ ہمارے ایک مجمع نے ایک موقع پر ایک دینی کام کیلئے کوشش کی تھی اور ناکام رہے تو ایک بد دین نے اعتراض کیا کہ ان لوگوں کو کیا حاصل ہوا ایک اللہ کے بندہ نے جلا کر جواب دیا ۱۶

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشقباز — اے روسیاہ تجھسے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکر ست — بیمرادی نے مراد دلبر ست

ارے مراد میں تو مزہ ہے ہی مگر نامرادی میں بھی ایک مزاہ ہے وہ یہ کہ محبوب نے تو دیکھ لیا کہ ہمنے کسی کو طلب کیا تھا اور وہ نہیں ملا ؎

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم — کہ من نیز از خریداران اویم

کیا یہ تھوڑی دولت ہے کہ تم انکے خریداروں میں داخل ہوگئے گو ناکام ہی خریداری ہی۔ ولے اسکے حال پر جو خریدار بھی نہ بنا۔ پس آخرت وہ شے ہے کہ اس کا طالب ناکام ہو کر بھی مستحق اجر ہے مگر ایسی مد کوئی نہیں کہ کچھ بھی نہ کرو اور اجر مل جائے پھر افسوس ہے کہ تم لوگ دنیا کیلئے تو ہر طرح کی تدبیر و سعی کرتے ہیں جہاں ناکامی سراسر خسارہ ہے اور آخرت کیلئے

سعی نہیں کرتے جہاں ناکامی ہی کامیابی ہے سرمدان لوگوں کے جواب میں جو اس طرز پاس ناکامی کی شکایت کیا کرتے ہیں کیا خوب فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد ۔۔۔ یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد ۔۔۔ یا قطع نظر ز یار می باید کرد

کہتے ہیں کہ بس ان شکایات کو ختم کر دیا تو محبوب کے ہو رہو اور اسکی رضا پر راضی رہو یا اس محبوب سے قطع نظر کر کے کوئی دوسرا محبوب تلاش کر لو۔ پس اگر خدا تعالیٰ کسی کا بیٹا وغیرہ لیلے تو اسکو کیا شکایت کا کوئی حق نہیں کیونکہ تم سب اپنے نہیں ہو بلکہ سب خدا کے ہو جب تم اُسکے ہو تو تمہاری ہر چیز اُسی کی ہے جب ہر چیز خدا ہی کی ہے تو تمہارا کیا اجارہ ہے اگر دیدیں ایسے ہی اگر تم ذکر کرو نماز پڑھو اور مزہ نہ آئے تو تمہارا کیا بگڑ گیا اسکی تو ایسی مثال ہے جیسے غلام نے آقا کی زمین میں کاشت کی اور پیداوار نہ ہوئی تو اُسکو رونے کی کیا ضرورت ہے اسکا کیا نقصان ہوا۔ اسی طرح تم نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور ذکر کیا اور حلاوت نہ ہوئی تو تمہارا کیا حرج ہے تم کام میں لگے رہو کہ اس دربار کا نامرادی بامرادی ہے اسی کو مولانا

14 فرماتے ہیں ؎ گر مرادت را مذاق شکر ست ۔ بے مرادی نے مراد دلبر ست

اور اسکے بے مرادی کہنا بھی عامل کے گمان کے اعتبار سے دنیا میں ہے اور وہاں تو اسکو پوری مراد ملیگی افسوس ایسی دولت کیلئے تو ہم کوشش نہیں کرتے جسمیں طالب کبھی ناکام نہیں اور دنیا مردار کیلئے ہر وقت مرتے کھپتے ہیں جس میں ناکامی کے وقت خسارہ ہی خسارہ ہے اور کامیابی بھی محض ناتمام فنا پاندار بالخصوص عورتوں کے مرنے کھپنے کی تو یہ حالت ہے کہ اگر انکا ایک کپڑا تیار ہوگا تو اسکے لئے بھی ایک کمیٹی منعقد ہوتی ہے کہ خالہ دیکھنا گوٹہ اچھی بھی ہے یا نہیں دیکھنا اسپر بیل لگاؤں یا لچکہ لگاؤں کیا اچھا لگیگا اور حیرت ہے کہا جائے کہ دنیا بھر کو ایک کپڑے کیواسطے جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے اپنے کو اچھا لگے پہن لو تو یہ جواب دیگی کہ واہ قاعدہ بھی ہے کہ کھائے اپنی پسند کا پہنے دوسرے کی پسند کا نیز عورتوں کا مقولہ یہ بھی ہے کہ پیٹ کا کیا ہے چاہے ڈھیلے پتھر دلیا بھر لو مگر کپڑا جو عزت کا ہے جو اب یہ ساری سینیاں اور یہ سارے قاعدے اسواسطے ہیں کہ یہ یاد نہیں ہے کہ ایکدن ہم یہاں نہ ہونگے اسی لئے مجھے تو عورتوں کا تقریبات میں جانا ہی مضر معلوم ہوتا ہے خصوصاً کپڑے بدل بدلکر جانا تو بہت ہی برا ہے بھلا اسکی کیا ضرورت ہے کہ بچہ کو بھی بڑھیا قیمتی کپڑے پہنائے جاتے ہیں چاہے وہ اس

لگ ہی دیں۔ پھر لڑکیوں کو زیور سے ایسا لاد اجاتا ہے کہ سر سے پیر تک زیور ہی زیور ہوتا ہے پھر وہ نا سمجھ بچی ہے تقریبات کے ہنگامہ میں بعض دفعہ وہ زیور کو نکالکر موقعہ بموقعہ ڈال دیتی ہے پھر اسکی تلاش میں تکلیف الگ ہوتی ہے اور جی برے بھلے الگ ہوتے ہیں کیونکہ عورتوں میں بدگمانی کا بہت مادہ ہے خواہ کسی کا نام لے دیتی ہیں کہ یہ کام اسکا ہے اس لیئے باہر پھرنے والی بچی کو جو کہ نا سمجھ بھی ہو زیور پہنانا بڑی غلطی ہے مگر عورتوں کو اسکا خبط ہے اور غضب یہ کہ بچیوں کو بھی اسکا شوق ہوتا ہے اگر ان کے کان ناک نہ بندھے ہوئے جائیں تو روتی ہیں اور ضد کر کے بندھواتی ہیں چاہے تکلیف ہی ہو مگر خوشی خوشی اس کلفت کو گوارا کرتی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی اپنے مطلب کی عقل تو ہے مگر اسکو خرچ کرتی ہیں دنیا میں دین میں خرچ نہیں کرتیں اسلیئے میں کہتا ہوں کہ عملاً بھی کوتاہی ہے اور حالاً تو بہت ہی کوتاہی ہے کیونکہ جب عمل نہیں تو حال کہاں سے آئے۔ حال اسے کہتے ہیں کہ کسی چیز کی طرف ایسا خیال جم جائے کہ وہی ہر دم خیال میں رہے جسکو عارف جامی اسطرح بیان فرماتے ہیں ؎

بسکہ درجان فگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

اور اسکی ایسی مثال ہے جو عورتوں کے مناسب ہے کہ جس وقت انکو کسی کے آنیکا انتظار ہوتا ہے تو ہر وقت دروازہ کی طرف دھیان رہتا ہے جہاں کسی کی آہٹ سنی اور یہی خیال ہوا کہ وہ آیا۔ اب سمجھو کہ خدا نے عمل میں یہ برکت رکھی ہے کہ اس سے آخرت کا شوق جمتا ہے جس سے ہر وقت اسی کا خیال رہتا ہے اسکو حال کہتے ہیں حال کی دوسری مثال عورتوں کے لیئے اور ہے یعنی تماکو کیونکہ عورتوں پر کچھ بلائیں تو قدرتی ہیں ناک میں اور کان میں اور ہاتھ گلے میں زیور کا ہار اور طوق وغیرہ مگر منہ کا اندر کا حصہ بچا ہوا تھا اسمیں کوئی زیور نہ تھا تو کیسے بچتا اسکے لیئے انھوں نے تماکو اور پان تجویز کیا ہے جس سے پہلے پہل تو گھمیر ہوتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے کہ ذرا دیر ہو جائے تو اسی میں دھیان لگا رہتا ہے ایسا شوق ہو جاتا ہے کہ نہ ملنے سے پریشانی ہوتی ہے بس یہی درجہ طلب کا نام حال ہے۔ نیک اعمال سے بھی ایک کیفیت شوق کی پیدا ہو جاتی ہے جسکی وجہ سے خدا تعالیٰ کا تصور ہر دم خیال میں حاضر رہتا ہے جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر اس سے کوئی گناہ ہو جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا منہ پر پیشاب

آخرت کا شوق دنیا میں حال کی پہچان اور حقیقت حال اور اسکی مثال ۱۸۰

پاخانہ اسپر گر پڑا اور نیک کام کرلیا تو گویا سلطنت ملگئی نیک اعمال میں یہ اثر ہے کہ اس سے معاصی سے نفرت اور آخرت کی رغبت ہوجاتی ہے خاصکر اگر کسی بزرگ کی نظر بھی اوپر پڑجائے کیونکہ ۵ نہ کتابوں سے مدد وعظوں سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگونکی نظر سے پیدا +

+ دین ہوتا ہے بزرگونکی نظر سے جیسے حضرات صحابہ کو نظر کرمی سے ہوتا تھے۔

حضرات صحابہ میں سارے لکھے پڑھے نہ تھے بلکہ بعضے تو حسابات تک میں بالکل بھولے بھالے تھے۔ چنانچہ فتوحات اسلامیہ میں ایک صحابی کا قصہ ہے کہ سفر میں کسی شہزادی پر نظر پڑگئی اور اس سے محبت ہوگئی واپس آکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ فلاں عورت سے محبت ہوگئی ہے آپ مجھکو لکھکر ایک یادداشت دیدیجئے کہ اگر ہمکو فتح ہوگئی تو وہ عورت مجکو دیدی جاوے آپنے لکھدیا چنانچہ خلفاء کے وقت میں وہاں جہاد ہوا اور وہ لڑکی گرفتار ہوئی انہوں نے سالار لشکر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تحریری وعدہ دکھلایا انھوں نے اسکو ان کے حوالہ کردیا پھر اس لڑکی کا بھائی آیا اور ان سے کہنے لگا کہ اسکو بیچنے ہو کہا ہاں کہا جلدی ذکر کیا لوگے انہوں نے کہا ایک ہزار روپئے وہ ایک ہزار روپئے لے آیا تو آپنے کہا یہ تو تم نے بہت تھوڑے سے ہیں میں تو سمجھا تھا کہ ایک ہزار روپئے اتنے ہوں گے کہ میرا گھر بھر جائیگا اس نے سالار لشکر سے شکایت کی کہ بیع کے بعد انکار کرتے ہیں سالار لشکر نے مجبور کیا کہ جب بیع کرچکے ہو تو اب تمکو رکھنے کا حق نہیں چنانچہ دینا پڑا ایک اور قصہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک اعرابی نے نماز کے بعد یہ دعا کی تھی۔ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّدًا وَلَا تُشْرِكْ فِيْ رَحْمَتِنَا اَحَدًا اے اللہ مجھپر رحمت فرمایئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اور ہماری اس رحمت میں کسی کو شریک نہ کیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا کہ تو نے ایک وسیع چیز کو تنگ کردیا اسکے بعد وہ نماز کی جگہ سے اٹھے اور مسجد کے صحن میں پیشاب کرنے لگے صحابہ نے رد کیا اور منہ منہ کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسکا پیشاب نہ روکو اب تو جو ہونا تھا ہوچکا سبحان اللہ کیسی حکمت کی بات ہے کہ ایسا اسکو پریشان کرنے میں ایک تو اسکے جسمانی ضرر کا اندیشہ ہے دوسرے اگر وہ بھاگا تو نہ معلوم کہاں کہاں تک مسجد کو ناپاک کریگا۔ ایسے وقت میں سب پہلوؤں کا پیش نظر رہنا بڑا مشکل ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ پیشاب کی جگہ ایک ڈول پانی کا بہادو اسکے بعد اعرابی کو بلاکر بہت نرمی اور

شفقت سے سمجھا دیا کہ مسجد نماز اور ذکر اللہ کیلئے موضوع ہے اس میں پیشاب وغیرہ نہ کرنا چاہئے یہ تو اعرابی کے ساتھ معاملہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور تعلیم یافتہ صحابہ کے ساتھ یہ معاملہ تھا کہ ایک بار دیوار مسجد پر کھنکار دیکھکر غصہ سے آپکا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ غرض صحابہ لکھے پڑھے سب نہ تھے بعض ان میں ایسے بھولے تھے جنکے واقعات آپنے ابھی سنے مگر ساری امت سے وہ افضل ہیں حتیٰ کہ حضرت غوث اعظم رحمۃ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا اویس قرنی و عمر بن عبد العزیز۔ فرمایا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار لگا ہوا ہے وہ بھی اویس قرنی و عمر بن عبد العزیز سے افضل ہے تو ان کے افضل ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نظر کردہ تھے پس عمل کیساتھ اگر اہل اللہ کی نظر بھی ملجائے تو پھر وہ حال اور قوی ہو جاتا ہے اور جلدی کام بن جاتا ہے مگر ٹھنڈے رہکر حال حاصل بنا چاہو تو محال ہو بلکہ اسکی ضرورت ہے کہ جیسے تم کسی آنیوالے کے انتظار میں ہر وقت دروازہ پر نظر رکھتے ہو ویسے ہی آخرت کا دھیان ہر دم رہنا چاہئے تب حال کا درجہ حاصل ہو گا کہ زیور پہننے میں کپڑا رنگنے میں کھانے پینے میں غرض ہر کام میں آخرت کا دھیان رہے گا کہ ایک دن وہ بھی ہو گا کہ ہم یہاں نہ ہونگے۔ اسی کی تعلیم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ایک صحابی کو کہ اے عبد اللہ شام کو صبح کا خیال نکرو اور صبح کو شام کا خیال نہ باندھو اور اپنے کو میت شمار کرو۔ اور سچ یہ ہے کہ بدون حال کے محض عمل قابل اطمینان نہیں عمل بلا حال کی ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کو مزدور ڈھکیل کر لیجائیں اور حال کے ساتھ عمل کی ایسی مثال ہے جیسے انجن ریل گاڑی کو لیجائے اسی لئے عراقی فرماتے ہیں ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی کہ دراز دور دیدم رہ و رسم پارسائی

رہ قلندر سے عمل مع الحال و رسم پارسائی سے زہد خشک یعنی عمل بلا حال مراد ہے کہ اس سے کامیابی دیر میں ہوتی ہے اور غیر راسخ ہوتی ہے اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

تو اے صاحبو! باوجودیکہ ہر طرح سے ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ دنیا ختم ہونے والی ہے

ف عمل کیساتھ اگر اہل اللہ کی نظر بھی ہو تو جلدی کام ہو جاتا ہے

ف عمل بدون حال کے قابل اطمینان نہیں اور یہ مثال

ف خلاصہ بیان

ف حدیث علاج

پھر بھی ہم اس مسئلہ میں عملاً وحالاً کچے ہیں اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ دنیا کو فانی سمجھو علاً بھی استحضاراً بھی اور اسکو ہر وقت یاد رکھے تاکہ درجہ حال حاصل ہو جائے۔ اس اعتقاد میں جو شخص پختہ ہوگا اور رسوخ حاصل کر لیگا اسکو اعمال صالحہ کی زیادہ توفیق ہوگی کیونکہ اصل مرض دنیا سے جی لگانا ہے اسکا علاج یہی ہے کہ فناء دنیا کو سوچتا رہے۔ اور دوسری اشیا کے فنا کے استحضار میں اگر تکلیف ہو مگر اپنی موت کا استحضار تو کچھ مشکل نہیں چاند سورج کے فنا کو کہاں تک سوچوگے تم اپنی موت کو سوچا کرو اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ یعنی الموت پس علاج کا حاصل یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت مقرر کرکے اس بات کو سوچ لیا کرو کہ اے نفس ایک دن تو مریگا اور دنیا سے تجکو جانا پڑیگا اسپر میں ختم کرتا ہوں اور اسی مضمون کے مناسب ایک قطعہ پڑھے دیتا ہوں شاید اسکا مضمون معین استحضار ہو ؎

کل جو اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے ۔۔۔ خوب ملک نیم روز ہے اور سرزمین طوس ہے
گو میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی ۔۔۔ اسطرف آواز طبل آدہر صدای کوس ہے
صبح سے تاشام چلتا ہے گلگوں کا دور ۔۔۔ شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے ۔۔۔ چل دکھاؤں تجھ جو قید آز کا محبوس ہے
لیگئی یکبارگی گورغریباں کیطرف ۔۔۔ جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے ۔۔۔ یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمت دنیا سے آج ۔۔۔ کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

یہ دارا و سکندر وہ تھے جو کبھی تمام دنیا پر حکومت کرتے تھے آج انکا اتنا بھی تو نشان نہیں آنچہ قبر پر سے پہچان لے جو اسکو ہٹا دیں۔ اسی مضمون کا ایک اور قطعہ بھی ہے ؎

کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آگیا ۔۔۔ یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
بولا سنبھل کے چل تو ذرا راہ بیخبر ۔۔۔ میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

یہ اشعار محض ترقیق قلب کے لئے پڑھ دیئے ہیں کیونکہ نظم سے قلب زیادہ ہوتی ہے انشاء اللہ محفوظ ہے

رہتی ہے ورنہ ہمارے لئے اصل چیز تو کلام اللہ وحدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہے پس ہر رات کو اتنا سوچ لیا کرو کہ ایک دن ہمکو جانا ہے موت آنے والی ہے جب ہمیشہ اتنا نفس کو تنگ کروگے تب نفس اعتدال پر آجائیگا میرا یہ مطلب نہیں کہ ضروری تعلقات کو ترک کردو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے جی نہ لگاؤ اس کا یہ اثر ہوگا کہ گو یہ چیزیں نفس سے چھوٹیں گی نہیں مگر انکی ہوس نہ رہے گی اور یہی ہوس ہے جس کا علاج ضروری ہے حضرات انبیاء علیہم السلام نے اسی کا علاج بہت اہتمام سے کیا ہے حدیث کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طول امل اور حرص وہوس سے کسقدر روکا ہے اور اسکے ازالہ کی کسقدر تدابیر بتلائی ہیں۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالی ہماری غفلت وحرص کو دور فرمائیں اور آخرت کی رغبت اور دنیا سے زہد وبے رغبتی عطا فرمائیں۔

اور ان مرحوم کی مغفرت فرمائیں جنکے واقعہ وفات پر یہ بیان ہوا ہے

اور انکے اعزہ وپسماندگان کو صبر جمیل اور تیاری آخرت

کی توفیق ہو آمین والحمد للہ رب العلمین ۲۴

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ

سیدنا ومولانا

محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ہ

نوٹ ۔ اس آیت کے دوسرے جزو کے متعلق جسمیں بقائے آخرت کا ذکر ہے دوسرا وعظ اسی وعظ کے بعد ہوا تھا جس کا نام الباقی ہے اور عرصہ ہوا طبع ہو چکا ہے ناظرین کو اسکا مطالعہ بھی اس کے ساتھ ضروری ہے تاکہ آیت کا مکمل مضمون مطالعہ میں آجائے ۱۲ ظ

اشرف علی

۱۷ رجب ۱۳۲۹ھ

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

انوار السراج

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ، دفتر الابقاء
متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

الوعظ المسمّٰی بہ

انوار السراج

این	کہاں ہوا	تھانہ بھون ضلع مظفر نگر
متیٰ	کب ہوا	۲۰ رجمادی الثانیہ ۱۳۳۶ھ
کم	کتنی دیر ہوا	۱ گھنٹہ
کیف	کیونکر ہوا	
لم	کیوں ہوا	ایک صاحب تھانہ بھون کے بھوپال میں ملازم تھے انکا وہیں انتقال ہوگیا تھا ان کے صاحبزادہ نے اپنے مکان پر یہ وعظ کہلوایا
من ای الناس	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	
ماذا	کیا مضمون تھا	
من ضبط	کس نے ضبط کیا	حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم بجنوری
المستمعون	سامعین کی تعداد	
الاشتات	متفرقات	

خطبہ معروفہ ماثورہ۔ **اما بعد**۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ ط وَلَنَجْزِیَنَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ اس وقت کا مضمون ایک خاص واقعہ کے متعلق تجویز ہوا ہے گو مضمون آیت کا تو عام ہے لیکن اس مضمون عام میں سے اس واقعہ حاضرہ کے مناسب اجزا مذکور ہوں گے۔ اور سب سے اول ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر عام مضمون بیان ہوگا جو دوسرے مواقع پر بھی کارآمد ہو سکتا ہے کیونکہ جیسا واقعہ یہاں ہوا ہے کبھی دوسروں کو بھی ایسا پیش آتا ہے اور انسان کو ہر وقت اور ہر موقعہ میں اصلاح کی ضرورت

ہے اس لئے یہ مضمون ہر جگہ کلی طور پر کارآمد ہو سکتا ہے یہ حاصل ہے اس وقت کے بیان کا
اب سنئے کہ انسان میں ایک مادہ بے صبری کا ہے اور دو جگہ اُس کا ظہور ہوتا ہے ایک تو
اُس جگہ کہ جہاں انسان کی کوئی مرغوب شئے ہو اور اُس کو حاصل نہ ہوئی ہو جیسے مال
مرغوب ہے اور وہ اس کو ملے ہی نہیں۔ دوسرے اُس جگہ کہ مرغوب شئے حاصل تھی اور
وہ اُس سے فوت ہو گئی جیسے اس کے پاس مال و دولت ساز و سامان سب کچھ تھا مگر
اس سے جاتا رہا۔ یہی دو موقعے بے صبری کے ہیں جیسا کہ ظاہر ہے اور بے صبری کی زیادہ
وجہ یہ ہے کہ انسان کی حرص ایسی بڑھی ہوئی ہے جس کا کوئی ٹھکانا نہیں چنانچہ
حدیث شریف میں ہے۔ لَوْ کَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِیَانِ مِنْ مَّالٍ لَّابْتَغٰی ثَالِثًا وَلَا
یَمْلَأُ جَوْفَہٗ اِلَّا التُّرَابُ یعنی اگر ابن آدم کے پاس مال کے دو نالے ہوں تب بھی تیسرے
کو چاہے گا۔ اور اُس کے پیٹ کو مٹی ہی بھرتی ہے مطلب یہ ہے کہ اس کی حرص ختم نہیں ہوتی
اکثر انسانوں کا تو یہی حال ہے اور جنس کے احکام میں اکثر افراد ہی لحاظ ہوتا ہے گو بعضے
ایسے نہ ہوں حالانکہ اکثری حالت یہ ہے کہ جسقدر اس کے پاس ہے وہ بھی اس کی حاجت
سے زائد ہے اگر انسان عقل سے کام لے اور سوچے تو مال و دولت اور ساز و سامان کی کثرت
سے گھبرانے لگے اور اس پر بڑی وحشت سوار ہو اور سمجھے کہ میں کس بلا میں مبتلا ہوں مجکو تو
واللہ مالداروں کی حالت دیکھ دیکھکر وحشت ہوا کرتی ہے کہ یہ کیسے بلاؤں میں گرفتار ہیں
کہیں چور کا خوف ہے کہیں مقدمہ بازیاں ہو رہی ہیں کہیں انکو یہ خیال ہوتا ہے کہ دیکھئے
اس مال کو کون کون خرچ کرے گا دن رات اسی پیچ و تاب میں رہتے ہیں البتہ جن کی نظر حقیقت
پر ہے انھوں نے بیشک دنیا کے مال و متاع کی حقیقت کو خوب سمجھا ہے اور جو ایسا ہو گا وہ
اتنا مال جمع ہی کیوں کرے گا اُس کو تو اس سے بڑی وحشت ہو گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
حالت پر غور کیجئے۔ حضورؐ کی یہ حالت تھی کہ حضورؐ کی خدمت میں بعض دفعہ ڈھیروں سونا آیا ہے
اور ظہر سے عصر تک آپ نے سب تقسیم فرما دیا ہے اسیطرح کے پاس جمع کی نوبت ہی کہاں آ سکتی
اسی لئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں اور ان کے اخلاق آپ کے اخلاق کے
پر تو ہیں ان کی حالت بھی یہی ہوتی ہے باقی حضور تو حضور ہی ہیں صلی اللہ علیہ وسلم آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم ایک بار عصر کی نماز کے لیے مصلے پر تشریف رکھتے تھے دفعتہً مکان تشریف لے گئے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو فرمایا کہ مجکو اس وقت یاد آیا کہ کہیں سے کچھ دینار آئے تھے اور وہ گھر میں ہی رکھے ہیں اور رات آنے کے قریب ہے اور نبی کے گھر میں رات کو مال رہنا نہایت غیر مناسب ہے اس لئے میں نے خرچ کر دئے غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان تھی آپ کے غلامان غلام ایسے ہوئے ہیں کہ انھوں نے سلطنتوں کی بھی پرواہ نہیں کی چنانچہ حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ یہ سلطنت چھوڑ کر درویش بن گئے تھے آپ کی ایک صاحبزادی تھیں اُن کی لطافت مزاج وغیرہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں بس یہی کافی ہے کہ بادشاہ کی بیٹی تھیں جب سیانی ہوئیں تو آپ کو خیال ہوا کہ ان کا عقد کر دیا جاوے آپ کے پاس بہت لوگوں کے پیام آتے تھے اور پیام بھی معمولی لوگوں کے نہیں بلکہ بادشاہوں کے پیام آتے تھے وجہ یہ ہے کہ بادشاہ اگرچہ فقیر ہو جائے مگر اُس کا مرتبہ تھوڑا ہی گھٹتا ہے لوگ اُسے اُسی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں چنانچہ جو شخص پہلے امیر کبیر ہو اور پھر غریب ہو جاوے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ غریب ہو گیا تو کیا مگر حوصلہ اور دماغ تو وہی ہے بخلاف اُس شخص کے جو پہلے غریب ہو اور پھر امیر ہو جاوے تو اُس کی وقعت لوگوں کے دلوں میں زیادہ نہیں ہوتی گو بظاہر اُس کی دلشکنی کی وجہ سے اُس کے منہ پر اُس کی حقارت نکریں مگر دلوں میں ہرگز وقعت نہیں ہوتی کیونکہ غریب کو حوصلہ نہیں ہوتا اگرچہ کتنا ہی بڑا امیر ہو جاوے مگر رہے گا دبا ہی ہوا۔ غرض کہ جب کسی بادشاہ کی طرف سے پیام آتا تو آپ انکار فرما دیتے اس انکار پر لوگ اپنے دلوں میں جانے کیا کیا خیال کرتے ہوں گے کہ دیکھئے کس بادشاہ پر ان کی نظر ہے حالانکہ بات یہ ہے ؎

درنیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

لوگوں کو کیا خبر کہ کیوں انکار فرما دیتے ہیں ایک مرتبہ آپ نے مسجد میں دیکھا کہ ایک غریب آدمی نماز میں مشغول ہے اور نماز کا حق جیسا کہ اُس کا حق ہے ادا کر رہا تھا اُس کے چہرہ سے وقار و سکنت معلوم ہوتی تھی بس اُس کی نماز کو دیکھ کر عاشق ہو گئے اور اُسی وقت قصد کر لیا کہ لڑکی کا نکاح اس کے ساتھ کرونگا اس سے بڑھ کر کون ہوگا اُس کے اور کسی حال کی تفتیش نہیں کی کہ یہ کون ہے کتنا اس کے پاس ساز و سامان ہے جب وہ نماز پڑھ چکے تو اُن سے کہا کہ مجکو تم سے

کچھ کہنا ہے چنانچہ آپ نے پوچھا کہ تمھاری شادی ہوگئی ہے یا نہیں اُس نے جواب دیا کہ مجھے
لڑکی کون دیتا ہے میں کہاں اس قابل ہوں بالکل غریب و مفلس ہوں ایسوں کو کون پوچھتا ہے
اور اس نے شاہ شجاع کو پہچانا نہیں کہ یہ وہ تارک السلطنت بادشاہ ہیں آپ نے فرمایا کہ اگر
کوئی ایسی ہو جاوے تو منظور بھی کرلو گے اُس نے کہا کہ ہم جیسوں کو کون پوچھتا ہے آپ نے
فرمایا کہ اگر شاہ شجاع کرمانیؒ اپنی لڑکی دیدے تو لیلو گے وہ گھبرا کر کہنے لگا کہ خدا کے واسطے میرے
جوتیاں نہ لگو تو بھلا کہاں میں اور کہاں شاہ شجاع کرمانیؒ اور ان کی بیٹی مجھے کیوں مسخر کرتے
ہو قرآن میں ہے لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ الخ آپ مجکو ذلیل کرتے ہیں اور مجکو بناتے ہیں
جاؤ اپنا کام کرو آپ نے فرمایا واللہ میں بناتا نہیں اس پر کہنے لگا کہ اگر ایسا ہو تو میں اُن کا
تبرک سمجھوں گا آپ نے فرمایا کہ میں ہی شاہ شجاع ہوں میں خوشی سے اپنی لڑکی تمھیں دوں گا
اتنا توقف کرو کہ میں لڑکی سے پوچھ لوں چنانچہ آپ گئے اور لڑکی سے اُس کے زہد و تقویٰ کا حال
بیان کیا دلیل یہ بیان کی کہ نماز اچھی پڑھتا ہے یہ کچھ بھی نہیں فرمایا کہ دنیا کا مال و متاع
بھی کچھ ہے یا نہیں غور کیجیے کہ دلیل کیا اچھی بیان فرمارہے ہیں کہ نماز اچھی پڑھتا ہے اور
چونکہ یہ تجربہ ہے کہ صحبت کا اثر بہ نسبت لڑکوں کے لڑکیوں پر زیادہ ہوتا ہے اُن کا قلب اثر
صحبت کے لیے لڑکوں سے زیادہ صالح ہوتا ہے اور اسی لیے اس لڑکی پر بھی باپ کی صحبت
کا اثر خوب پڑا ہوا تھا وہ بھی کامل ہوگئیں تھیں اُن پر اس دلیل کا کافی اثر ہوا بولیں کہ مجکو
منظور ہے مگر ایک شرط سے کہ اُس شخص میں حب دنیا نہو اور آگے آپ کو اختیار ہے کہ
غرض نکاح کردیا اور اُس کے گھر پہونچا دیا اور نصیحت کردی کہ خاوند کی اطاعت کرنا اب اُن
صاحبزادی کا حال سنئے کہ جب صاحبزادی نے گھر کے دروازہ میں قدم رکھا تو دیکھا کہ ایک
سوکھی ہوئی روٹی گھڑے پر ڈھکی ہوئی رکھی ہے یہ دیکھتے ہی فوراً پچھلے پاؤں لوٹ پڑیں اور کہا
ابا جان نے مجکو کہاں دھکا دیدیا اُس شخص نے کہا کہ میں تو پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا کہ بادشاہ
کی بیٹی مجکو خاطر میں نہ لائیں گی صاحبزادی نے کہا اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ کہ بعض گمان
گناہ ہوتا ہے تم نے یہ خیال کیا ہوگا کہ میں تمھاری غریبی کو دیکھکر واپس ہوئی ہوں سو یہ
بات نہیں میں تو اس لیے لوٹی ہوں کہ والد نے کہا تھا کہ زاہد متوکل شخص ہے سو اگر تمکو خدا پر

توکل ہوتا تو اس روٹی کے رکھنے کو کیوں پسند کرتے اُس نے کہا کہ میرا روزہ تھا میں نے اس خیال سے یہ روٹی رکھ لی تھی کہ اس سے روزہ افطار کروں گا لڑکی نے جواب دیا کہ تو نے جس کا روزہ رکھا ہے تو اُس کا مہمان ہے اور مہمان کی خبر گیری میزبان کے ذمہ ہے پھر کیوں اس کو رکھ چھوڑا ہے اس شخص نے فوراً اس روٹی کو خیرات کر دیا تب وہ گھر میں داخل ہوئیں سو ایسے لوگ بیشک حرص سے بری ہیں غرض جب اولیا ایسے ہوئے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے ان کے پاس جمع ہی نہیں ہوتا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم اُحد پہاڑ کو سونا بنادیں اور اس پر بھی کفایت نہیں کی بلکہ یوں ارشاد ہوا کہ اسکو ایسا کر دیں کہ وہ آپ کے ساتھ ساتھ رہا کرے مگر آپ نے منظور نہیں فرمایا۔ اور عرض کیا کہ اے اللہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جب ہو تو کھا کر آپ کا شکر ادا کروں اور جب نہ ہو تو آپ سے مانگوں غرض کہ یہ تو خواص کی حالت ہے باقی عموماً تو مال و متاع کی حرص قلوب میں بے انتہا بھری ہوئی ہے چاہئے تو یہ تھا کہ اس سے وحشت ہوتی اور قیامت کے قریب میں خاص اسباب سے ایسا ہوگا بھی کہ اس سے وحشت ہوگی چنانچہ لوگ مال کی زکوٰۃ دینا چاہیں گے خرچ کرنا چاہیں گے اور لئے لئے پھریں گے مگر کوئی لینے والا نہ ہوگا سو اس وقت تو ایسا ہو جاوے گا۔ مگر اس وقت ایسا نہیں اور وجہ یہ ہے کہ اس وقت مال اس لئے مرغوب ہے کہ طالب زیادہ ہیں اور مطلوب کم ہیں اور قرب قیامت میں طالب کم ہوں گے اور مطلوب زیادہ اس لئے اُس کی ناقدری ہوگی۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مال تو کم ہوتا نہیں کیونکہ یہ فنا نہیں ہوتا روز بروز بڑھتا ہی چلتا ہے چنانچہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے مال اتنا نہ تھا جتنا کہ اب ہے غرض یہ روز بروز بڑھتا ہی ہے کم ہوتا ہی نہیں اسی طرح ہوتے ہوتے قرب قیامت تک بہت ہی کثرت ہو جاوے گی اور فتن کی وجہ سے آدمی کم ہو جائیں گے ظاہر ہے کہ جس چیز کو فنا نہ ہو اور بڑھتی ہی رہے تو ایک زمانہ میں بہت ہی کثرت سے ہو جاوے گی کیونکہ مال پیدا تو ہوتا ہے مگر اس کو موت نہیں آتی تو جب بہت بڑھ جائے گا تو اس کی حرص نہ رہے گی اور یہاں ایک بات بتلاتا ہوں کہ مال میں مرغوبیت حقیقیہ نہیں اگر مرغوبیت حقیقیہ ہوتی تو کبھی کسی زمانہ میں بھی مرغوبیت کم نہ ہونا چاہئے تھی۔ جس چیز کی مرغوبیت حقیقی ہوتی ہے وہ کبھی زائل نہیں ہوتی اور مال ایک زمانہ میں مرغوب نہیں

ف: قرب قیامت میں مال کی رغبت نہ رہنے کی اور اس کی وجہ کا بیان۔ ۶

ف: مال کی مرغوبیت حقیقی نہیں۔

رہے گا تو ثابت ہوا کہ اس کی مرغوبیت حقیقیہ نہیں ورنہ کیوں زائل ہو جاتی۔ دیکھئے ہوا کی مرغوبیت حقیقی ہے جو کسی وقت بھی زائل نہیں ہوتی اگر تھوڑی دیر کے لئے ہوا کو بند کر دیں تو مرغوبیت معلوم ہو جاوے۔ قدر کی چیز کبھی بے قدر نہیں ہوتی۔ مال واقعی بیقدری کی چیز ہے اسی واسطے حدیث شریف میں ہے لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى مِنْهَا كَافِرًا شَرْبَةَ مَاءٍ کہ اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر مچھر کے پر کی برابر ہوتی تو اللہ میاں کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ دیتے مگر چونکہ اس کی کچھ بھی قدر نہیں اس واسطے اللہ میاں مبغوض شئے اپنے دشمنوں کو دیتے ہیں حقیقت شناس آدمی ہمیشہ ایسی چیز سے گھبراتا ہے جو خدا کو مبغوض ہو۔ دیکھئے سلاطین نے بزرگوں کے سامنے نذرانہ پیش کئے مگر انھوں نے واپس کر دئے اور وجہ ظاہر ہے کہ اس میں خطرات اسقدر ہیں کہ جس کی حد نہیں۔ مال و دولت والوں کی جان پر بنی ہوئی ہوتی ہے چوروں کا خوف ڈاکوؤں کا ڈر۔ بے مال والے کیسے بیفکر ہوتے ہیں۔

ایک گرو چیلہ کی حکایت ہے کہ وہ کہیں سفر میں رات کو چلے جاتے تھے چیلے نے کہا گرو جی ڈر لگتا ہے گرو نے کچھ تسلی کر دی تھوڑی دیر میں پھر کہا کہ گرو جی ڈر معلوم ہوتا ہے گرو جی تھے تجربہ کار اس نے پوچھا کہ تیرے پاس کچھ ہے اس نے کہا کہ ایک روپیہ کمر سے بندھ رہا ہے گرو نے کہا کہ اس کو پھینکدے چنانچہ اس نے پھینکدیا پھر تھوڑی دیر میں گرو نے پوچھا کہ اب بھی ڈر لگتا ہے اس نے کہا اب تو نہیں لگتا اس نے کہا ساری وجہ ڈر لگنے کی وہ روپیہ تھا کیونکہ خالی آدمی کو کون مارتا ہے اور بدوؤں کی حکایت سنی ہے کہ وہ مار کر پھر تلاشی لیتے ہیں اگر بغور دیکھا جائے تو وہاں بھی مال ہی مارنے کا باعث ہوتا ہے گو اس مسافر کے پاس نہو کیونکہ بدو لوگ اپنے زعم میں تو اس کو مالدار ہی سمجھتے ہیں جب ہی تو مارتے ہیں ان کو یقیناً معلوم ہو جاوے کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں کہتے ڈاکو بھی مالدار و غیر مالدار کو خوب پہچانتے ہیں جیسے اہل پولیس بدمعاشوں کو پہچان لیتے ہیں پس مال کے ان خطرات پر نظر کر کے تو اس سے وحشت ہی ہونی چاہیئے اور اس کا مقتضی یہ ہے کہ مال کی رغبت نہ ہو باقی کوئی شخص قبیح غیر مرغوب ہی پر مرنے لگے اور اس کو حس ہی نہو تو دوسری بات ہے کیونکہ محبت اور حرص ایسی چیز ہے کہ محبوب کے عیب کو چھپا دیتی ہے ۵

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

بات یہ ہے کہ حریص آدمی مال کو مقصود بالذات سمجھتا ہے اگر ضرورت کی چیز سمجھتا تو اُس سے بالذات محبت نہ ہوتی کیونکہ اکثر یہی ہے کہ جو ساز و سامان ہمارے پاس ہے وہ ضرورت سے کہیں زیادہ ہے سفر کی حالت میں اس کا تجربہ ہو جاتا ہے کہ کتنی چیزیں ضروری ہیں جب سفر کرتے ہیں تو اُس وقت ضرورت کی چیزوں کا انتخاب ہوتا ہے اور بہت تھوڑا سا سامان ساتھ لیجاتے ہیں کہ جس کے بغیر چارہ نہیں ہوتا پھر جہاں تک اول سفر کیا ہے اگر اتفاقاً وہاں سے اور آگے کو سفر کرنے لگیں تو پھر اور انتخاب ہوتا ہے اور کچھ سامان وہاں چھوڑ جاتا ہے یہانتک کہ کئی سفروں میں بہت معمولی چیزیں ساتھ رہجاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے لئے بہت تھوڑے سامان کی ضرورت ہے بعض وقت رضائی وغیرہ بھی اس خیال سے چھوڑ دی جاتی ہے کہ خدا کہیں دیدیگا یہ تو اصل ضرورت کا حال ہے مگر ہماری یہ حالت ہے کہ زیادہ چیزیں ہمارے پاس وہ ہیں جو کہ کبھی استعمال میں بھی نہیں آتیں بعض کو تو رکھ کر بھول بھی جاتے ہیں حتی کہ رکھے رکھے وہ خراب بھی ہو جاتی ہیں مگر حرص اُن کی بھی ہے سچ کہا ہے ؎ ۸

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

جو انسان کے لئے مصلحت ہے وہ تو خدا تعالیٰ نے خود ہی سب کو عطا فرما دیا ہے اور اُن میں زیادہ تر وہ چیزیں ہیں جن میں اکتساب کو بھی دخل نہیں اور وہی اصل ضروری ہیں مگر حاشیہ لگا کر انسان بہت سی چیزیں خود بڑھا لیتا ہے اور جو چیز اللہ تعالیٰ نے بلا اکتساب مرحمت فرمائی ہے وہ سب ضروری ہیں اُن میں کوئی چیز زائد نہیں جیسے دو ہاتھ دئے دو پاؤں دو آنکھیں وغیرہ وغیرہ کی یہ وہ چیزیں ہیں کہ اکتساب کو بھی ان میں دخل نہیں اور ان میں کوئی چیز زائد بھی نہیں چنانچہ جب ان میں سے کوئی چیز کم ہو جاتی ہے تو اس وقت قدر معلوم ہوتی ہے مثلاً ایک آنکھ ہی جاتی رہے تو پتہ چلے.. ایک حکایت ہے تو مسخرہ پن مگر کہے دیتا ہوں ہم استاد کے سامنے سبق پڑھ رہے تھے اور ہمارے سبق میں ایک طالب علم یک چشم تھے اور اُن ہی کی قراءت تھی میں نے شوخی سے اُن کی آنکھ پر انگلی رکھ لی اب اُستاد کہہ رہے ہیں کہ پڑھتے کیوں نہیں اور حضرت اُستاد کی عادت تھی کہ گردن جھکا کر بیٹھتے تھے اوپر کو نگاہ اٹھاتے ہی نہ تھے

ف: ... تعالیٰ نے بلا اکتساب عطا فرمائی ہیں ... زائد نہیں

وہ فرمارہے ہیں پڑھیو اور یہ حیران تھے کہ ایک آنکھ تو قدرتی نہ تھی دوسری پر ہاتھ رکھ لیا اب کروں تو کیا کروں وہ دل میں کہتے ہوں گے کہ میری دوسری آنکھ بھی ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ جب خدا کی نعمت جاتی رہتی ہے اس وقت قدر معلوم ہوتی ہے غرض کوئی چیز ان میں سے زائد نہیں۔

ف قرآن کے مکررات پر اعتراض کا جواب

اعضاء کے مکرر ہونے پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک بادشاہ نے ایک عالم (مبتدع) سے پوچھا کہ یہ جو آپ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ قرآن شریف محرف ہے اس پر کوئی تاریخی دلیل ہے کہنے لگے کہ تاریخی دلیل سے بڑھکر عقلی دلیل ہے وہ کہ قرآن میں مکررات بہت ہیں خدا کو کرر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اوروں نے بڑھایا ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ آپ کی تخلیق میں بھی تو مکررات ہیں معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی کا اضافہ ہے اور قابل حذف ہے تو تیرے جسم کے تخلیقی مکررات بھی کسی کا اضافہ ہے اور قابل حذف ہے اس کے بعد فوراً جلاد کو حکم دیا کہ ان کے مکررات کو حذف کردو اور کہا کہ تیرے قول کی موافق یہ تکرار بھی دلیل ہے اس بات کی کہ تو خدا کا بنایا ہوا نہیں کسی نے تجھ میں اضافہ کر دیا ہے جواب عجیب معقول تھا واقعی یہ ہے کہ سیف سب سے بڑا وعظ ہے ؎

9 اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِلْمِ　　وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ وَعَّاظٍ عَلَی الْقِمَمِ

ف حاشیہ چڑھا کر حقیقت کو چھپانے والا فضولیات سے وحشت ہوتی

غرض جن امور میں اکتساب کو دخل نہیں وہ تو سب ضروری ہیں ہاں جن میں انسان کے اکتساب کو دخل ہے ان میں بہت سے امور غیر ضروری بھی ہیں جن میں ہم نے ان مکتسبات میں فضول بڑھا لیا ہے اور اپنی طرف سے حواشی چڑھاتے ہیں پھر وہ حاشیہ اتنا بڑا ہے کہ اصل سے بھی بڑھ گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حقیقت پہچانکر زوائد سے وحشت ہوتی مگر اب تسادِ مذاق کی وجہ سے الٹی ہم کو لذت حاصل ہوتی ہے اس کی مثال تنباکو جیسی ہے کہ اس کے کھانے میں حالانکہ بہت سے نقصانات ہیں سر اس سے گھومتا ہے دماغ اس سے خراب ہوتا ہے منہ میں بدبو اس سے پیدا ہوتی ہے جسم میں کاہلی اس سے آجاتی ہے اور عادت ہوجاتے بعد تو یہ کیفیت ہوجاتی ہے کہ جب تک اس کو نہ کھالیا جاوے انسان کوئی کام نہیں کرسکتا مگر باوجود اتنے نقصانات کے اس کو کھاتے ہیں اور بڑے مزے لیکر کھاتے ہیں اسی طرح دیکھئے مرچ کیسے نقصان کی چیز ہے بالفعل تو یہی نقصان ہے کہ جس چیز میں مرچ زیادہ ہوتی ہے کھاتے ہی منہ میں آگ سی لگجاتی ہے آنکھوں سے پانی جاری ہوجاتا ہے دماغ پریشان ہوجاتا ہے اور جسمانی نقصانات اس کے

علاوہ رہے مگر حالت یہ ہے کہ رو رہے ہیں اور کھا رہے ہیں عادت والے کچھ بھی خیال نہیں کرتے۔ مرچوں پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک بزرگ معتوہ تھے جب وعظ میں لوگوں کے جھگڑے قصے بد معاملگی اور برے اخلاق و اطوار کا تذکرہ فرماتے تو یہ فرماتے کہ یہ سب مرچوں کا فساد ہے ایک شخص ہنسنے لگے کہ اس میں کیا جوڑ ہوا میں نے کہا اچھا خاصا جوڑ ہے مطلب یہ ہے کہ مرچوں سے کھانا مزہ دار ہو جاتا ہے اور قاعدہ ہے کہ مزہ دار کھانا زیادہ کھایا جاتا ہے اور جب انسان زیادہ کھانا کھائے گا تو لامحالہ قوت بہیمیہ زیادتی پکڑے گی اس لئے ضرور فساد کی باتیں انسان سے صادر ہوں گی یہ تو لطیفہ تھا اصل مضمون یہ ہے کہ جیسے مرچ کھانے والوں کو باوجود تکلیف ہونے کے حس نہیں ہوتی اسی طرح مالداروں کو زیادہ مال سے تکلیف تو ہوتی ہے مگر حس نہیں ایک صاحب کا قصہ ہے کہ تھے تو وہ مالدار اور وسعت والے مگر بوجہ بخل کے ہانڈی تک اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے کسی نے ان سے کہا کہ میاں تمہارا مال و دولت روپیہ پیسہ کس کام کا باوجود اتنے مالدار ہونے کے ہانڈی تک اپنے ہاتھ سے پکاتے ہو۔ وہ بولے میاں تم خرچ ہی کرنے کا لطف جانتے ہو۔ اور جمع کرنے کے لطف سے واقف نہیں ہو جمع کرنے میں بڑا لطف ہے تم اس کو کیا جانو بے شک اگر کوئی ان کا مال چرا کر لیجاتا جب لطف معلوم ہوتا مال تو ایسی چیز ہے کہ اس کا جمع ہونا بھی تکلیف دہ ہے تو گم ہونے سے تو انسان کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ بعض وقت اس کے ملنے سے اور اسی طرح ضائع ہونے سے موت تک کی نوبت آجاتی ہے۔ ایک مقام کا قصہ ہے بعض جگہ دستور ہے کہ بڑی تعداد کے مال پر چھٹیاں پڑتی ہیں اور بعض وقت ایک ہی دو روپیہ میں اتنا مال ملجاتا ہے جس کی قیمت لاکھوں روپیہ ہوتی ہے تو قصہ یہ ہے کہ ایک انگریز کا سائیس تھا کسی مال پر چھٹیاں پڑ رہی تھیں اس نے بھی ایک روپیہ کی چٹھی ڈالدی اتفاق سے چٹھی اس کے نام پر نکل آئی وہ کئی لاکھ روپیہ کا مال تھا گویا ایک روپیہ میں کئی لاکھ روپیہ مل گئے جس انگریز کا یہ سائیس تھا اس کے نام چٹھی آئی کہ تمہارے سائیس کے نام چٹھی نکلی ہے اس کو چاہئے کہ آکر مال پر قبضہ کرے وہ انگریز تھا تجربہ کار اس نے سائیس کو فوراً خبر نہیں کی کہ فرط خوشی سے مر نہ جائے بلکہ پہلے اس کا علاج کر دیا وہ یہ کہ اس کو بلا کر پوچھا کہ تو نے کوئی چٹھی ڈالی تھی اس نے

کہا کہ ہاں ڈالی تھی انگریز نے کہا کہ تم نے بلا اجازت ایسا کیوں کیا اُس نے جواب دیا کہ یہ بات
میرے کار منصبی سے خارج تھی اس میں مجکو اختیار تھا انگریز نے کہا کہ تجکو کوئی اختیار نہ تھا اور چابک
منگا کر خوب ہی مارا اور پھر کہا کہ تیرے نام چٹھی نکلی ہے اتنے لاکھ روپیہ کا مال تمھارے نام آیا ہے
یہ سنکر وہ خوش تو ہوا مگر مار کی تکلیف سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جس میں خطرہ ہو سکتا انگریز نے
کہا کہ ہم نے اس مارنے سے تمھارا علاج کیا ہے اگر ہم فوراً تمکو خبر کر دیتے تو تم مر جاتا اور بھی ایسے
واقعات ہوئے ہیں کہ دفعۃً مال ملنے سے شادی مرگ ہو گئی اسی طرح مال کے دفعۃً تلف ہونے
سے موت کے واقعات سنے ہیں۔ البتہ محبین حق کے نزدیک دونوں حالتیں برابر ہیں اُن کی حالت
تو یہ ہے کہ نہ ملنے سے چنداں خوشی نہ جانے سے چنداں غم اور بعض کو کسی درجہ میں بھی خوشی یا غم
نہیں ہوتا ایک بزرگ کے پاس کہیں سے بیش قیمت موتی تحفہ میں آیا تھا خادم نے پیش کیا
دیکھتے ہی فرمایا الحمد للہ اور حکم دیا کہ اس کو رکھ لو خادم نے ایک دفعہ اسباب کا جائزہ لیا اتفاق
سے وہ موتی ضائع ہو گیا تھا اُس کو خیال ہوا کہ دیکھئے خبر ہونے پر میری کیا نوبت ہوتی ہے مگر بضرورت
۱۱ خبر کرنا پڑی اُس کے سنتے ہی آپ کی زبان سے نکلا الحمد للہ خادم کو بہت تعجب ہوا اور عرض
کیا کہ حضرت جب یہ موتی آیا تھا اُس وقت بھی حضرت نے فرمایا تھا الحمد للہ خیر وہ تو موقعہ بھی
تھا مگر جاتے رہنے کی صورت میں الحمد للہ کہنے کا کیا موقعہ تھا آپ نے فرمایا میں نے موتی آنے
کے وقت اور پھر اُس کے ضائع ہو جانے کے وقت اپنے دل کی حالت کو دیکھا تھا تو یہ کیفیت
پائی کہ نہ آنے کے وقت کوئی خوشی ہوئی تھی اور نہ جاتے رہنے سے کوئی رنج ہوا پہلی بار الحمد للہ
کہنا اس پر تھا کہ دنیا کے آنے سے کوئی خوشی نہ ہوئی اور دوسری بار اس لئے کہ دنیا کے جاتے
رہنے سے کوئی غم نہ ہوا۔ بھلا پھر ان کو مال کے آنے یا جانے سے پریشانی کیوں ہو۔ صاحبو! بعض
بزرگوں کی تو یہ کیفیت ہوئی ہے کہ انھوں نے تو چوروں دشمنوں کو بھی خود ہی اپنے پاس سے دیدیا
ہے اُن سے حفاظت تو کیا ہی کرتے۔ ایک بزرگ کے یہاں ایک چور چوری کرنے گیا وہاں کچھ
تھا ہی نہیں اُن کی آنکھ کھل گئی تو اُس کو محروم جاتے ہوئے دیکھکر اپنا کمبل اوتار کر دیدیا کہ
اس کا دل برا نہ ہو اور خالی نہ جاوے ؎

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا ۔۔۔ دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ

وجہ یہ ہے کہ اہل اللہ کے نزدیک دنیا بڑی حقیر چیز ہے اس لئے اسکا آنا جانا ان پر زیادہ اثر نہیں کرتا۔ حضرت شاہ عبدالقدوسؒ کی بی بی کے پاس ایک چاندی کا ہار تھا۔ جب وہ ہار پہنتیں تو آپ فرماتے کہ اس ہار میں مجکو دنیا کی بو آتی ہے۔ بی بی نے ایک بار ایک مہمان بزرگ سے اس امر کی شکایت کی اور کہا کہ میں نے اپنے لڑکے رکن الدین کی شادی کی غرض سے یہ ہار رکھ چھوڑا ہے جس کے بارہ میں شیخ بار بار یہ فرمایا کرتے رہتے ہیں۔ اُن بزرگ نے شاہ صاحب سے فرمایا کہ آپ اپنی دنیا میں سے بدبو آنی چاہئے دوسرے کی چیز سے کیوں بدبو آتی ہے جب بی بی کا پیچھا چھوٹا۔ بعضے بزرگوں کو تو دنیا کے جاتے رہنے کی خوشی ہوتی ہے حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمت میں بطور ہدیہ کے ایک آئینہ بیش قیمت آیا تھا آپ کبھی کبھی خادم سے منگاکر اُس میں منہ دیکھا کرتے تھے اتفاقاً ایک دفعہ خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اُس کو بڑی فکر ہوئی بزرگوں کے پاس رہنے والے ہوتے ہیں مزاج شناس خادم نے عذر کرنے کا ارادہ کیا اور عذر کا مضمون ایک مصرع میں موزوں کر کے عرض کیا ع ازقضا آئینۂ چینی شکست + حضرت نے
۱۲ فی البدیہہ فرمایا ع خوب شد اسباب خودبینی شکست۔ خودبینی کیا ہی اچھا موزوں لفظ ہے بزرگوں کا اصل مذاق تو یہ ہے کیونکہ وہ مال کی حقیقت کو پہچانتے ہیں باقی اکثر لوگوں کی یہی حالت ہے کہ اگر اُن کے پاس سونے کے دو جنگل ہوں تو تیسرے کے طالب ہوں گے۔ یہ حال ہے انسان کی حرص کا اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے پیٹ کو قبر کی مٹی ہی بھرے گی۔ اسی کی نسبت شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

گفت چشم تنگ دنیا دار را — یا قناعت پر کند یا خاک گور

اور حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

کوزہ چشم حریصاں پر نشد — تا صدف قانع نشد پر دُر نشد

جب یہ معلوم ہوگیا کہ حرص بری چیز ہے اور اُن اخلاق رذیلہ میں سے ہے جس کی مذمت خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاق رذیلہ کا زائل کرنا اور بجائے اُن کے اخلاق حمیدہ کا اندر پیدا کرنا ضروری ہے تو حرص کا علاج بھی ضروری ہوگا سو اس کا علاج ہے خدا کی طرف متوجہ ہونا جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا اُس سے یہ خلق رذیل انشاء اللہ تعالیٰ

ف ریاضت سے اصلاح اخلاق ہوتی ہے یا نہیں اسکی تحقیق

جاتا رہے گا۔ یہ ہے اس کا علاج جو مقصود تھا بیان سے اب یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے
وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّ
قُوْهُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ زَالَ عَنْ جِبِلَّتِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْهُ یعنی جب تم سنو کسی پہاڑ کو کہ
وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کی تصدیق کرلو اور جو کسی انسان کو سنو کہ اس کی عادت بدل گئی
ہے تو اس کی تصدیق مت کرو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق فطری ہیں جو نہیں بدلتے اور ان کا
ازالہ نہیں ہوسکتا۔ جب یہ صورت ہے تو علاج سے کیا نتیجہ۔ جواب سے پہلے حکماء کا مذہب سنئے
اس بارہ میں حکماء کے اندر اختلاف ہے کہ ریاضت سے تہذیب اخلاق ہوتی ہے یا نہیں بعض
کہتے ہیں کہ ریاضت سے اخلاق بدل جاتے ہیں یعنی ریاضت سے پہلے کسی میں برے اخلاق
تھے تو ریاضت کرنے سے وہ اخلاق جاتے رہتے ہیں اور بجائے ان کے اچھے اخلاق پیدا ہوجاتے
ہیں بعض کا مذہب یہ ہے کہ ریاضت سے اخلاق نہیں بدلتے بعض کہتے ہیں کہ فطری اخلاق تو
نہیں بدلتے غیر فطری بدل جاتے ہیں صوفیہ کرام کہ درحقیقت حکماء یہی حضرات ہیں ان کا مسلک
۱۳ یہ ہے کہ ریاضت سے اخلاق رذیلہ کا ازالہ تو ہوتا نہیں کہ بالکل معدوم ہوجاویں ہاں انکا امالہ
ہوجاتا ہے اور وہ مغلوب ہوجاتے ہیں اخلاق حمیدہ سے اور یہی صحیح ہے اور تجربہ اس پر شاہد
ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن اشخاص میں پہلے سے برے اخلاق موجود ہوتے ہیں جب وہ مجاہدہ
اور ریاضت کرتے ہیں تو ان کی حالت بدل جاتی ہے بجائے ان کے اخلاق حمیدہ ان کے اندر
پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ اخلاق رذیلہ پر غالب آجاتے ہیں حتی کہ حیوانات تک میں اس کا مشاہدہ
ہوتا ہے دیکھئے جو گھوڑا شریر ہوتا ہے اس کو ایک عرصہ کے لئے چابک سوار کے حوالہ کردیتے ہیں
پھر وہ کیسا مہذب اور شائستہ ہوجاتا ہے اس تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ جو حکماء یہ کہتے ہیں کہ
اخلاق رذیلہ بالکل معدوم ہوجاتے ہیں انکا یہ کہنا ٹھیک نہیں کیونکہ مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف
ہے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت سے اخلاق حمیدہ ان کے
اندر پیدا ہوگئے اور جب مجاہدہ و ریاضت کو ترک کردیا تو پہلے اخلاق عود کر آتے ہیں اگر وہ معدوم
ہوگئے تھے تو پھر عود کیسا۔ اور جو حکماء کہتے ہیں کہ ریاضت سے اخلاق نہیں بدلتے یہ بھی مشاہدہ
اور تجربہ کے خلاف ہے اور جو کہتے ہیں کہ فطری اخلاق نہیں بدلتے غیر فطری بدل جاتے ہیں تو انہیں

تمیز مشکل ہے کہ اخلاق فطری کونسے ہیں اور غیر فطری کونسے تو اس اعتقاد کا شخص ریاضت ہی نکریگا یہ عملی ضرر ہے اس لئے صوفیہ کرام کا مسلک واقعی ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ فطری بھی گو زائل نہ ہوں مگر مغلوب ہو جاتے ہیں اور واقعی حکماء یہی حضرات ہیں بیچارے حکمائے یونان اور فلاسفہ کی تحقیقات ان کے سامنے کیا چیز ہیں۔ پھر یہ بھی حکماء کی تحقیقات سے کیا لینا ہے جو اس کا تعارض حدیث سے رفع کریں باقی حدیث کا مطلب بالکل صاف ہے اور صوفیہ بھی وہی کہتے ہیں جو حدیث میں ہے کہ اخلاق طبیعہ زائل نہیں ہو سکتے گو مغلوب ہو جاتے ہیں اور حدیث میں مغلوبیت کی نفی نہیں جو اس پر شبہ کیا جاوے بلکہ حدیث میں تو ازالہ کی نفی ہے اور مغلوبیت کی تو تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ہوتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں ان امراض کے علاج بیان فرمائے ہیں اگر تہذیب اخلاق نہ ہو سکتی تو آپ ان کی تدبیر کیوں تعلیم فرماتے۔ گو حرص فطری بھی ہو مگر اس کی بھی اصلاح ضروری ہے اور اصلاح کا قصد کرنے سے ضرور اصلاح ہوگی کیونکہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اِتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ[1] کہ اسباب اصلاح کے اختیار کرنے سے اللہ میاں تمہارے اعمال کی درستی فرمادیں گے تو گویا اللہ میاں کی اصلاح فرمانے سے بھی درستی نہ ہوگی صاحب آپ ناامید نہ ہوں خدا تعالیٰ اصلاح کریں گے اور اصلاح کا مطاوع ہے صلاح بس ضرور ہمارے اندر صلاح پیدا ہوگی۔ باقی بدوں اہتمام اصلاح کے تو اصلاح ہو نہیں سکتی کیونکہ حرص فطری شئے ہے چنانچہ انسان کو ہر وقت اس کی فکر رہتی ہے کہ مرغوب چیزوں کو جمع کروں اور اس میں ہر وقت مبتلا رہتا ہے قرآن شریف میں بھی حق تعالیٰ نے ایسی مرغوبات کی ایک فہرست بیان فرمائی ہے کہ جن کی طرف اکثر طبائع کا میلان ہے ارشاد فرماتے ہیں زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ[2] کہ زینت دی گئی لوگوں کے لئے محبت خواہشوں کی عورتوں کی اور اولاد کی اور سونے چاندی کے ڈھیروں کی اور عمدہ گھوڑوں کی اور چوپایوں کی اور کھیتی کی یہ سب سامان زندگی دنیا کا ہے اور خدا کے یہاں عمدہ ٹھکانا ہے چونکہ مذاق مختلف تھے کسی کو کسی چیز سے محبت ہوتی ہے اور کسی کو کسی سے اس لئے مختلف چیزیں بیان فرمائیں کسی کو عورتوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے

[1] اللہ سے ڈرو اور ... سیدھی بات کہو ... اللہ تعالیٰ تمہارے ... اعمال قبول کریگا

[2] پ ۲۲ ع ۳ ... ۲۳

[3] خوشنما معلوم ہوتی ... مرغوب چیزوں کی محبت ... اور زراعت ہوئی ... ہیں ... زیادہ زندگی کی۔ اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ ملہ پ ۳ ع سورہ آل عمران کا دوسرا رکوع۔

اور کسی کو اولاد سے کسی کو سونے چاندی سے کسی کو گھوڑوں سے کسی کو بیلوں سے اور کھیتی سے کسی کو عورتوں سے ایسی محبت ہوتی ہے کہ دن رات اس میں مبتلا ہیں ہر وقت یہی خیال ہے کسی کو اولاد کی ایسی چاہت ہوتی ہے کہ شب و روز اسی دھن میں رہتے ہیں کہ بیٹا ہو پوتا ہو پڑپوتا ہو۔ بعض رؤسا کو بیلوں سے ایسی محبت ہوتی ہے کہ ریاست بھی غارت کر بیٹھتے ہیں وجہ یہ کہ محبت کے افراط میں جنوں ہوتا ہے چنانچہ ہم نے ایک حکایت گھوڑے کی ایسے ہی طالب کی سنی ہے کہ اُن کے پاس ایک گھوڑی تھی بہت خوبصورت اُن کے کسی دوست نے اُس کی فرمائش کی کہ یہ ہمیں دیدو آپ نے کیا کیا کہ بندوق بھر کر اس بے زبان کے گولی ماردی اور کہا کہ مجھے یہ گوارا نہیں کہ اپنی آنکھ سے دوسرے کے پاس دیکھوں اگر وہ نہ دیتے اور اپنے گھر ہی رکھتے تو کیا حرج تھا بیفائدہ اسکی جان کھوئی۔ بعضی محبت بھی اُلٹی ہوتی ہے ایک اور حکایت ہے کہ ایک بزرگ تھے اور اُن کے چند جاہل مرید تھے مریدوں نے سوچا کہ کوئی تدبیر ایسی کرنی چاہئے کہ ہمارے مرشد ہمارے ہی پاس رہیں اور کوئی اس تبرک کو نہ رکھنے پائے اُن کو مار کر وہیں ہی دفن کردیا ایک اور بزرگ تھے

15 اور اُن کے ایک مرید تھے ایک روز مرید صاحب نے مرشد سے عرض کیا کہ حضرت مجکو اپنی داڑھی کا ایک بال دیدیجئے میں اس کو برکت کے لئے اپنے پاس رکھوں گا انھوں نے دیدیا۔ گانوں والوں کو جو اس کی خبر لگی سب آن پڑے اور داڑھی کا صفایا کردیا۔ خدا بچائے ایسی محبت سے جس کا یہ انجام ہو اسی طرح اہل دنیا کی محبت بھی الٹی ہوتی ہے چنانچہ بعض لوگ بچوں سے اپنی داڑھی کھچواتے ہیں اپنے کو گالیاں دلواتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے۔ کسی کو کھیتی کی محبت ہوتی ہے کہ نقصان پر نقصان ہوتا ہے مگر چھوڑتے نہیں کسی کو آواز سے الٹی محبت ہوتی ہے کانپور میں ایک شخص بزاز کی دوکان پر گئے اور سرکا لٹھہ خریدا بزاز نے جو لٹھہ پھاڑا اُس کی آواز حضرت کو اچھی معلوم ہوئی اُس سے کہا کہ سرکا اور دیدے اُس نے پھر پھاڑا پھر آواز بھلی معلوم ہوئی پھر فرمائش کی یہانتک کہ گزوں لٹھہ بزاز سے آواز ہی سننے کی غرض سے پھڑوا ڈالا۔ وہ شاید حضرت صاحب سماع ہوں۔ مولانا نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص جس کو مٹی کھانے کا شوق تھا کسی کی دوکان پر شکر خریدنے گیا دوکاندار شکر لینے کے لئے دوکان کے اندر گیا اور اس شخص نے اُس کے باٹ کو جو مٹی کا تھا اور اُسی سے شکر تولتا نظر بچا کر کھانا شروع

کیا کیونکہ یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں دوکاندار نہ آجائے دوکاندار نے یہ دیکھ کر اپنے نفع کی وجہ سے اور دیر لگادی کیونکہ باٹ ہلکا ہو جانے سے دوکاندار کا نفع اور خریدار کا نقصان تھا اس نے خیال کیا کہ یہ تو اپنا ہی نقصان کر رہا ہے میرا کیا بگاڑتا ہے پھر جب یہ دیکھا کہ یہ تو بس نہیں کرتا تو خیال ہوا کہ یہ تو سارا ہی باٹ کھا جائے گا اور خسارہ عظیم میں پڑے گا دوکان سے نکل آیا دنیاداروں کی محبت بھی ایسی ہی ہے اس سے اپنا نقصان کر رہے ہیں محبان دنیا سب اس میں مبتلا ہیں اور مذمت دنیا سے اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں کسب دنیا کو منع کرتا ہوں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ کسب دنیا اور چیز ہے اور حب دنیا اور چیز۔ حب دنیا مذموم ہے اور کسب دنیا بقدر حاجت جائز چنانچہ حق سبحانہ تعالیٰ کی تعلیم کو ملاحظہ کیجئے کیا اچھی تعلیم ہے کہ مرغوب چیزوں کی فہرست تو بیان فرمادی مگر ان کی فی ذاتہا مذمت نہیں فرمائی بلکہ اس کے بعد اس سے ایک اچھی چیز کا پتہ بتلا دیا اس آیت میں قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ۔ مطلب یہ ہوا کہ ہیں تو یہ سب چیزیں اچھی مثلاً عورتیں اور اولاد وغیرہ وغیرہ سب اچھی ہیں مگر دوسری چیز ان سے زیادہ اچھی ہے۔ کیونکہ خیر کے اصلی معنی ہیں زیادہ اچھی تو اس سے صاف معلوم ہوا کہ دنیا کی چیزیں بھی ہیں تو اچھی مگر ایک چیز ان سے بھی اچھی ہے اس لئے تم ان ہی چیزوں پر بس مت کرو کیونکہ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی یہ تو صرف دنیا کا متاع ہے بلکہ ان سے زیادہ اچھی چیز کو طلب کرو وہ کہاں ہے وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ کہ اللہ ہی کے پاس اچھا ٹھکانا ہے آگے اس اچھی چیز کو فرماتے ہیں قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ کہ کہئے اے محمد کیا میں تم کو ان سے بہتر چیز کی خبر دوں جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور پاک کی ہوئی بیبیاں ہیں اور اللہ کی رضامندی ہے۔ سبحان اللہ کیا بلاغت ہے حکما کی تعلیم اس درجہ کی کہاں ہو سکتی ہے وجہ یہ کہ یہاں تو حکمت کے ساتھ شفقت بھی ہے شفیق کی تعلیم سے اور ہی نفع ہوتا ہے بری حکمت کی تعلیم میں وہ نفع کہاں غرض حق سبحانہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی مذمت نہیں فرمائی البتہ ان کی خاص درجہ کی محبت کی مذمت فرمائی چنانچہ یہ مضمون اس آیت میں اس طرح بیان فرمایا کہ اول تو

سه آپ کہہ دیجئے کیا میں تم کو ایسی چیز بتا دوں جو ان سے بہتر ہو ۱۰
سه حوالہ بالا
سه حوالہ بالا
سه حوالہ بالا

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ ۔ فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی خاص درجہ کی محبت واقع میں تو اچھی نہیں مگر انسان کی نظر میں یہ چیزیں مزین ہوگئیں جس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوڑی پر سبزہ جما ہوا ہو جس کو کوئی دیکھنے والا سمجھے کہ یہ ایک چمن ہے اور اس کے ظاہر رنگ و روپ کو دیکھکر فریفتہ ہو جاوے اور جب وہاں پہونچے تو پاخانہ میں بھر جاوے یہی حال دنیا کا ہے کہ ظاہر تو اس کا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے مگر اندر نجاست بھری ہوئی ہے یا خوبصورت سانپ کی سی مثال ہے جسکا ظاہر تو بہت اچھا ہے نقش و نگار سے آراستہ ہے مگر اندر زہر بھرا ہوا ہے۔
؎ زہر ایں مار منقش قاتل است ۔ باشد از وے دور ہر کو عاقل است ۔ اگر بچہ کے سامنے سانپ چھوڑ دو تو وہ اس کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھکر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کو پکڑ لیتا ہے اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے مگر اس کا انجام کیا ہوگا ہماری حالت بھی اسی بچہ کی سی ہے کہ ہم دنیا کے ظاہری آب و تاب اور نقش و نگار اور رنگ و روپ پر فریفتہ ہیں اور اندر کی خبر نہیں یہ بھی تجربہ ہے کہ سانپ جتنا خوبصورت ہوتا ہے اسی قدر زہریلا ہوتا ہے ایک شاہ صاحب
بیان کرتے تھے کہ میں ایک مسجد کے لئے چونہ تیار کرنے کی غرض سے دریا کے کنارہ سیپ کھود رہا ۱۷
تھا وہاں ایک سانپ نکلا جو اڑتا تھا اور بالشت بھر کا تھا اور دیکھنے میں نہایت خوبصورت رنگین چمکدار مگر زہریلا بھی ایسا کہ اگر کاٹ لے تو آدمی پانی پانی ہو جاوے پھر انھوں نے مار دیا یہی دنیا کی حالت ہے کہ جتنا اس میں رنگ و روپ ہوتا ہے اسی قدر مہلک بھی ہے اسی لئے حقیقت شناس اس کی طرف رغبت نہیں کرتے پھر اس حب تزمین کے بعد شہوات و رغبات پر ملامت نہیں فرمائی کیونکہ ان شہوات میں بھی مصالح ہیں بشرطیکہ دین کے تابع رہیں اس لئے ان مرغوبات سے منع نہیں فرمایا بلکہ ان سے اچھی چیز کی ترغیب دی گویا انسان کو یہ حکم نہیں دیا کہ اپنے شہوت مار دے اور حرص کو بالکل زائل کر دے بلکہ یہ فرمایا کہ اس شہوت اور حرص کو باقی رکھکر اس کو دنیا سے عمدہ چیز کی طرف مائل کر دے بس یہ علاج ہے حرص کا اور حرص ہی منشا ہے بے صبری کا اور یہی بے صبری تمام پریشانیوں کی جڑ ہے بس اس طریق سے سب پریشانیوں کا علاج ہو جاوے گا اسی کو میں بیان کر رہا تھا۔ اور اصل بیان یہ تھا کہ بے صبری کا ظہور دو موقعہ پر ہوتا ہے کہ ایک موقع یہ ہے کہ مرغوب شئے ملے نہیں اور دوسرا موقع ہے کہ مرغوب شئے

سلکر جاتی رہے اور ان دونوں صورتوں میں زیادہ تکلیف اور مصیبت کی حالت دوسری صورت
ہے اگرچہ پہلی صورت بھی مصیبت اور تکلیف کی ہے مگر دوسری صورت سے ہلکی ہے مثلاً کسی کے
پاس سامان پیٹ بھرنے کا تھا اور وہ گم ہوگیا تو اُس کی مصیبت زیادہ ہوگی بہ نسبت اُس شخص
کے جس کو بھوک تو ہو مگر پہلے ہی سے کچھ سامان نہ ہو تو گو محبوب کا حاصل نہ ہونا بھی تکلیف کی
چیز ہے مگر حصول کے بعد محبوب کا زائل ہو جانا یہ اُس سے زیادہ سخت تکلیف کی چیز ہے اور
اس میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کا عزیز مرجاوے کسی کا باپ مرجاوے کسی عورت کا خاوند مرجاوے
خصوص اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو ماں باپ سے زیادہ کسی کے مرنے میں مصیبت نہیں کیونکہ
اُس کے بدل کچھ نہیں اور چیزوں کا بدل ہو سکتا ہے مثلاً اولاد مرجاوے تو اور اولاد ہو سکتی ہے۔
بھائی مرجاوے تو اور بھائی ہو سکتا ہے بیوی انتقال کر جاوے دوسری آسکتی ہے مگر باپ تو
دوسرا نہیں ہو سکتا اور اسی طرح ماں۔ دارا شکوہ کا قصہ سنا ہے کہ جب یہ مارے گئے تو عالمگیرؒ نے
ان کے چھوٹے بیٹے کو بلایا اور اس کی ہر طرح تسلی کی مگر اُس نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎
۱۸ دردمن کمتر ز درد حضرت یعقوب نیست ✣ او پسر گم کردہ بود و من پدر گم کردہ ام۔ عالمگیر کے آنسو
جاری ہوگئے۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کی اولاد مرجاوے اگرچہ بچہ ہی ہو بلکہ بعض اوقات
بڑی اولاد کی نسبت بچوں کی موت سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے وجہ اُس کی یہ ہے کہ بڑی اولاد سے
تو کبھی کسی قسم کا رنج بھی پہونچ جاتا ہے اور بچہ ستاتا نہیں اور کوئی رنج اُس سے پہونچتا ہی
نہیں اس لئے اُس کے مرنے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے غرض یہ کہ مرغوب شئے کے جانے
رہنے سے تکلیف اور مصیبت ہونا ضروری ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ جب غم حد شریعت
میں ہو تو زیادہ تکلیف نہیں ہوتی مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم حالت مصیبت میں بے احتیاطی
کرتے ہیں اور حد شرع سے تجاوز کر لیتے ہیں اور اُس میں اپنے اختیار کا بھی انضمام کر لیتے ہیں
اس لئے مصیبت بہت بڑھ جاتی ہے اس انضمام کی تفسیر یہ ہے کہ غم کے دو حصے ہیں ایک
اختیاری دوسرا غیر اختیاری آجکل واقعات غم میں اختیاری غم کا حصہ زیادہ ہوتا ہے حتیٰ کہ
آجکل کے پرسے میں جس کی غرض ازالہ غم تھی اختیاری غم کا حصہ زیادہ ہوتا ہے چنانچہ۔ جو
لوگ آتے ہیں بجائے تسلی کرنے کے اور غم کو بڑھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان جسقدر تذکرہ

ف: زوال محبوب "اصل تکلیف" ہے

ف: غم اگر حد شرع میں ہو تو تکلیف زیادہ نہیں ہوتی

غم کی چیز کا کرے گا اور جتنا سوچے گا اتنا ہی غم ترقی پکڑے گا پھر تذکرہ میں او تار چڑھاؤ بہت کرتے
ہیں کہتے ہیں کہ ہائے اللہ کیا ہوگیا بچے کہاں جائیں گے بیوی کیا کرے گی جائداد کا کیا ہوگا
علیٰ ہذا القیاس ان باتوں کے تذکرہ سے صدمہ ہی بڑھتا ہے جیسے تمباکو جس قدر کھاؤ گے اتنی ہی
خواہش زیادہ ہوگی اس کا علاج تو یہ ہے کہ بالکل چھوڑ دو یہی حالت گناہوں کی ہے کہ ان کا علاج
صرف ترک ہے نہ کہ اس کی کثرت اس میں بعض بدفہم سالکین کو بھی بڑا دھوکہ ہوگیا ہے وہ یہ کہ
جب کہ ان کا قلب بعض گناہوں کی طرف مائل ہوتا ہے وہ اپنے دل میں یہ سوچ کر کہ اس گناہ
کو خوب دل بھر کر کر لو تاکہ خواہش جاتی رہے نفس خالی ہو جاوے پھر بالکل چھوڑ دیں گے اور
توبہ کر لیں گے اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ بڑی فاش غلطی ہے کیونکہ جتنا گناہ کو زیادہ کیا جاوے گا
اسی قدر خواہش میں ترقی ہوگی اور تقاضہ زیادہ ہوگا۔ بس اصل علاج یہ ہے کہ ہرگز نہ کرے
اسی طرح غم کا علاج یہ ہے کہ سوچو مت خیال مت کرو اس صورت میں غم تو ہوگا مگر معتدل غم
ہوگا اور وہ مضر نہیں بلکہ مفید ہے کیونکہ قدرتی طور پر غم میں بھی حکمت اور نفع ہے اگر غم نہ ہو تو تمدن
نہ ہو اور تمدن بڑی چیز ہے اس لیے کہ دین کی ترقی اس پر موقوف ہے اور تمدن غم پر اس لیے
موقوف ہے کہ اگر کسی کو کوئی غم اور فکر نہ ہو سارے بے فکر ہی ہوں تو کوئی کسی کا کام نہ کرے۔ سارے
تندرست ہی رہیں بیمار نہ ہوں تو ڈاکٹر طبیب عطار سب بیکار ہو جائیں یہ تو دنیوی نفع ہے اور دین
کا نفع یہ ہے کہ اگر کوئی غریب نہ ہو تو زکوٰۃ کسے دوگے اس پر یاد آیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے
حضور میں ایک بار لوگوں نے سائلین کے آنے پر کچھ تنگی ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا کہ سائل سے تنگ
نہ ہونا چاہیئے یہ تمہارے حمال ہیں کہ آخرت میں تمہارے اموال پہونچاتے ہیں اگر یہ نہ لیں تو تمہارے
اموال کا کون حمال ہوگا غرض تمدن نہایت ضروری چیز ہے اہل سائنس کے نزدیک تو تمدن دنیوی
غرض سے بڑی چیز مانی گئی ہے مگر دین کے لیے بھی اس کی بہت ضرورت ہے لہٰذا تمدن اہل دین اور
اہل دنیا دونوں کے نزدیک اچھی چیز ہے گو بنا مختلف ہو اور مسلم ہے کہ تمدن بدون تعاون کے
نہیں ہو سکتا اور تعاون بدون رحمدلی کے نہیں ہو سکتا اور رحمدلی موقوف ہے غم پر بیان اس کا
یہ ہے کہ سائنس اور طب کا مسئلہ ہے کہ جس قوت کا استعمال ہوتا رہے اس میں ترقی ہوتی رہتی ہے
ورنہ وہ قوت کم ہو جاتی ہے پس اگر غم نہ ہوتا تو رحمدلی کا ہیجان کیسے ہوتا اور جب اس کا ہیجان نہ ہوتا

ف/ بعض سالکین کی بڑی غلطی اور اس کا علاج۔

۹ ف/ غم کا علاج

ف/ غم میں حکمت اور نفع ہے۔

ف/ تمدن اہل دین اور اہل دنیا دونوں کے نزدیک اچھی چیز ہے گو بنا مختلف ہو

تو اس کا مادہ بالکل جاتا رہتا اس لیے غم میں بڑی مصلحت ہے کہ یہ محافظ ہے ترحم کا اور وہ محافظ ہے تعاون و تمدن کا اور غم میں اپنی ذات سے متعلق بھی مصلحت ہے کہ اس سے اخلاق درست ہوتے ہیں اور اس میں اجتماعی مصلحت بھی ہے جیسا کہ ذکر ہوا کہ اگر غم نہ ہو تو تمدن بھی نہ ہو جو کہ اہل دنیا و دین دونوں کے نزدیک مختلف حیثیت سے بڑی چیز مانا گیا ہے غرض غم میں انفرادی اور اجتماعی دونوں مصالح ہیں فرعون نے بوجہ غم نہ ہونے ہی کے تو خدائی کا دعویٰ کیا تھا رسالہ قیصریہ میں لکھا ہے کہ غم سے قلب کا کامل تصفیہ ہوتا ہے اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت مغموم رہتے تھے جیسا کہ شمائل ترمذی میں ہے پس اصل میں تو غم مفید چیز ہے مگر اسی قدر کہ جسقدر حق تعالیٰ کا دیا ہوا ہے واقعی وہ عین مصلحت ہے باقی آگے جو حواشی ہم نے اپنی طرف سے بڑھا لیے ہیں وہ برے ہیں۔ حدیث شریف میں قصہ آتا ہے کہ ایک صحابی کا انتقال ہو گیا تھا اُن کے گھر والوں پر غم طاری تھا کسی نے رونے سے روکا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تشدد نہ کرو تو صرف رونے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا لیکن اگر کوئی حد سے بڑھنے لگے تو اُس سے خود ہی روکا ہے پس خوب سمجھ لو کہ حد سے زیادہ غم کرنا یہ گناہ ہے اور گناہ بھی بے لذت اُسکا روکنا اور علاج کرنا واجب ہوگا۔ چنانچہ اس آیت میں مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ایسے ہی غم کے علاج کا بیان ہے اور یہ بیان ایک مقدمہ پر موقوف ہے وہ یہ ہے کہ اگر شئے مرغوب کے جاتے رہنے سے غم لاحق ہو مگر کسی ایسی دوسری چیز کا پتہ ہمکو لگ جاوے اور اس کے ملنے کا یقین ہو جاوے کہ جو اُس شئے مرغوب سے ہزارہا درجہ بڑی ہوئی ہو تو پہلی چیز کا غم ہمیں نہ ہونا چاہیے جیسے کسی کے ہاتھ میں ایک پیسہ ہو اور دوسرا شخص اُس کو چھینکر بجائے اس کے روپیہ دیدے تو ظاہر ہے کہ پیسہ کا غم بالکل بھی نہ ہوگا بلکہ اگر وہ شخص بدلنا چاہے تو یہ بدلنے پر کبھی راضی نہ ہوگا یہی بات آیت مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ میں ہمکو بتلائی گئی ہے کہ جو چیزیں ہمارے پاس ہیں اور گو ہمیں انتہا درجہ مرغوب ہیں مگر وہ سب فنا ہونے والی ہیں اور خدا تعالیٰ ہمیں ان سے اچھی چیز کی خبر دے رہے ہیں مطلب یہ ہے کہ تم ان مرغوب چیزوں تک مت رہو بلکہ جو چیز ان سے اچھی ہے اور باقی ہے اُس کی رغبت کرو پس ہمکو چاہیے کہ اس مرغوب شئے کا خیال کریں جو کہ باقی ہے اپنے غم کو مغلوب کریں جو شخص اس پر غور کرے گا اس کا غم ضرور مغلوب ہو جائے گا سبحان اللہ کیا عمدہ علاج تجویز کیا ہے حق سبحانہ تعالیٰ کی تجویز

ف

ف — زیادہ غم کا علاج

ف

تعلیم ہے کہ معاد کی اصلاح تو فرمائی ہی ہے معاش کی بھی پوری اصلاح فرمائی کیونکہ اس سے نفسانی و بدنی راحت بھی تو حاصل ہو گئی اور خیال کرنے کی بات ہے کہ دنیا کی مرغوب شئے اگر اس وقت بھی گم نہ ہوتی مگر کبھی نہ کبھی پھر گم ہوتی کیونکہ فنا ہونا تو گویا اس کی ذاتیات میں سے ہے جیسے چراغ میں تیل ہو جو محدود بھی ہے اور کم بھی ہو رہا ہے تو وہ ایک نہ ایک وقت ضرور ہی ختم ہوگا ایک دن فنا ہو کر رہے گا اسی طرح انسان ایک نہ ایک دن ختم ہی ہو کر رہے گا۔ اطباء نے لکھا ہے کہ رطوبت کی مثال تیل کی سی ہے اور حرارت غریزیہ جو مرکب ہے روح کا اس کی مثال شعلہ چراغ کی سی ہے جیسے تیل ختم ہو کر چراغ گل ہو جاتا ہے اسی طرح رطوبت فنا ہو کر روح ختم ہو جاتی ہے یہاں بھی اسی طرح ایک سراج کے گل ہونے کا واقعہ ہوا ہے جنکا نام بھی اتفاق سے سراج الحق تھا اور یہ دوسرا اتفاق ہے کہ ان کے صاحبزادہ کا نام انوار الحق ہے اسی لئے اس وعظ کا نام انوار السراج مناسب معلوم ہوتا ہے[۱] گویا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ مرحوم تو سراج کی طرح ختم ہو گئے البتہ ان کے آثار و انوار باقی ہیں سو اگر یہ واقعہ اس وقت نہ بھی ہوتا تب بھی کبھی نہ کبھی ضرور ہی ختم ہوتے۔ چراغ تو گل ہی
ہو کر رہے گا۔ بس ختم ہونے والی چیز سے زیادہ کیا جی لگانا۔ خدا تعالیٰ سے دل لگانا چاہیے۔ ۲۱
دنیا کی محبت تو سراسر سراب ہے مولاناؒ فرماتے ہیں ؎ عشق با مردہ نباشد پائدار ٭ عشق با حی و باقیوم دار۔ اور فرماتے ہیں ؎ عاشقی با مردگان پائندہ نیست ٭ زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست اور فرماتے ہیں ؎ غرق عشقے شو کہ غرق ست اندریں ٭ عشقہائے اولین و آخریں۔ غرض غم کے ہلکا کرنے کے لئے یہ عجیب تعلیم ہے مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ یعنی خدا تعالیٰ کے یہاں کی چیزیں باقی ہیں اور وہی رغبت کے قابل ہیں پھر یہ بھی سوچو کہ آدمی مرکر جاتا کہاں ہے ظاہر ہے کہ خدا کے ہی پاس تو اب تو وہ مَا عِنْدَ اللّٰهِ میں داخل ہو گیا پہلے وہ مَا عِنْدَكُمْ کا مصداق تھا اس وقت وہ فانی تھا اور اب باقی ہو گیا ہے کیونکہ اس موت کے بعد پھر موت نہیں تو اب تو وہ مرنے کے بعد پہلی حیات سے اچھی حیات میں پہنچ گیا وہ پہلی حیات فانی تھی اور یہ دوسری باقی ہے پس ہمیں مرغوب شئے سے محبت اس حیثیت سے زیادہ ہونی چاہئے کہ وہ خدا کے پاس ہے نہ بنسبت اس

[۱] حضرت نے اس وعظ کا نام انوار السراج تجویز فرمایا ایک وجہ تسمیہ کی مناسبت یہاں ذکر ہوئی اور دو ختم وعظ کے بعد مکرر ہیں جو ختم وعظ کے بعد اس حقیر کو بتلائیں ۱۲ از جامع۔

ف صبر دلانے کیلئے بدوی کا عجیب فقرہ

حیثیت سے کہ وہ ہمارے پاس ہے۔ اس مضمون کو ایک بدوی نے خوب سمجھا اور صبر دلانے کے بارہ میں اس بدوی نے عجیب و غریب عنوان سے استعمال کیا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد کا انتقال ہوا تو مجکو ایسا صبر کسی بات سے نہیں ہوا جیسا کہ ایک بدوی کے کلام سے ہوا وہ یہ ہے

۵ فَاصْبِرْ نَکُنْ بِکَ صَابِرِیْنَ فَاِنَّمَا ۔ صَبْرُ الرَّعِیَّۃِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّاسِ خَیْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُکَ بَعْدَہٗ ۔ وَاللّٰہُ خَیْرٌ مِّنْکَ لِلْعَبَّاسِ ۔ مطلب اس کا یہ ہے صاحب کا ثواب تو جو کہ تمکو ملا عباسؓ سے اچھا اور خدا عباسؓ کے لئے تم سے اچھا پھر اس واقعہ میں نقصان کسکا ہوا بس یہی تو ہوا کہ خدا کے پاس پہونچ گئے تو وہ تمہاری مرغوب سے تو اور زیادہ مرغوب حالت میں ہوگئے کہ وہ باقی رہنے والی ہوگی ان حقائق پر نظر کر کے کسی کے مرنے پر زیادہ غم نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کی بقاء پر نظر کر کے خود اپنے میں وہ قابلیت پیدا کرنی چاہئے کہ جس سے اللہ میاں کے پاس جانے کے اور لقاء محمود کے ساتھ باقی رہنے کی قابل ہو جائے۔ اب اس بقاء کے متعلق لوگوں کی غلطی عرض کرتا ہوں کہ لوگ عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ جب انسان مرجاتا ہے قبر میں اس کو ڈال آتے ہیں وہاں وحشت کدہ میں تنہا پڑا رہتا ہے اور ایسی حیات مثل عدم حیات کے ہے سو صاحبو! یہ نہیں ہے بلکہ مسلمان کے لئے وہاں بڑی راحت ہے حدیث شریف میں ہے کہ ارواح اسکا استقبال کرتی ہیں یعنی اس کے عزیز قریب جو اس سے پہلے چلے گئے ہیں وہ اس سے ملتے ہیں اور اس دوسرے متعلقین کی نسبت دریافت کرتے ہیں اگر یہ کہتا ہے کہ فلاں شخص تو مر گیا ہے تو کہتے ہیں کہ افسوس وہ دوزخ میں گیا ہے ورنہ ہم سے ضرور ملتا اور اس سے انکو غم ہوتا ہے غرض موت کے بعد مردے اس طرح سے باہم خوش ہو کر ملتے جلتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ بس مرنے کے بعد ڈھول کی طرح پڑے رہیں گے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ یہ بات نہیں یاد رکھو کہ قبر اس گڑھے کا نام نہیں ہے یہ تو صورت قبر ہے اور حقیقت میں قبر عالم برزخ کا نام ہے وہاں سب جمع ہوتے ہیں اور وہ پاکیزہ لوگوں کا مجمع ہے تو دنیا میں تو جدا بھی ہو سکتے ہیں جیسے کوئی ملازمت سے رخصت لیکر آئے اور اپنے لوگوں کے پاس رہے جب رخصت ختم ہوگی تو جدائی ہو جاوے گی تو دنیا کا اجتماع تو ایسا ہے اور وہاں کی یکجائی ختم نہیں ہوتی وہاں تو عیش ہی عیش ہے بات یہ ہے کہ حقیقت نہ جاننے سے لوگوں کو موت سے وحشت ہوگئی ہے ورنہ موت تو لقاء حبیب کے لئے ایک جسر ہے یعنی پل ہے کہ اس سے گذرے اور لقاء حبیب ہوگی اور لقائے

ف مسلمان کا بعد مرنے کے احترام اور اپنے عزیزوں سے ملاقات کرنا

ف حقیقت میں قبر برزخ کا نام ہے

ف حقیقت نہ جاننے سے لوگوں کو موت سے وحشت ہوگئی ہے

باری تعالیٰ سے کونسی چیز اچھی ہوگی اسی لئے اہل اللہ کو تو موت کا شوق ہوا ہے حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎ خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۰ راحت جاں طلبم واز پئے جاناں بروم۔ نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ۰ تا در میکدہ شاداں غزل خواں بروم۔ ان سے پوچھئے کہ موت کیا چیز ہے حدیث شریف میں ہے اَلْمَوْتُ تُحْفَۃُ الْمُؤْمِنِ کہ موت مومن کا تحفہ ہے نظام حیدرآباد اگر کسی کے پاس تحفہ بھیجیں اور گھر والے رونے لگیں تو کیسے افسوس کی بات ہے اور میری مراد اس سے غم مکتسب ہے نہ کہ غیر مکتسب جدائی کا طبعی صدمہ جو بے اختیار ہوتا ہے اس کا مضائقہ نہیں لیکن سوچ سوچ کر اُسے بڑھانا مذموم ہے بلکہ ان مضامین کو سوچکر عقلاً اُس کو گھٹانا چاہئے۔ میں نے طاعون کے زمانہ میں ایک رسالہ شوق وطن لکھا تھا اس کا دیکھنا ایسے مواقع میں تخفیف غم کے لئے نہایت نافع ہے مناسب ہے کہ لوگ اُس کو دیکھا کریں۔ صاحبو! دنیا کی مثال آخرت کے سامنے ماں کے رحم کی سی ہے جب تک بچہ ماں کے رحم میں رہتا ہے اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے اگر اُس سے کہیں تو تنگ جگہ سے نکل اس سے فراخ جگہ موجود ہے تو وہ یقین نہ کرے گا اور جانے گا کہ یہی ہے جو کچھ ہے مگر جب باہر آتا ہے تو ایک بڑا عالم دیکھتا ہے کہ رحم کو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں اور اب اگر اُس سے کہا جائے کہ رحم میں واپس جانا چاہتا ہے تو وہ کبھی منظور نہ کرے گا اسی طرح دنیا بمقابلہ آخرت کے بالکل تنگ ہے جب یہاں سے جاؤ گے تو شکر کرو گے اور دنیا میں ہرگز نہ آنا چاہو گے جب خدا کے پاس پہنچنے کا وقت قریب آتا ہے اور اُس عالم کی چیزوں کا انکشاف ہوتا ہے اُس وقت اگر مومن کو کوئی حیات افزا چیز دیکر کہا جاوے کہ لو اسے کھالو تاکہ تم مدت دراز تک زندہ رہو تو وہ لات مار دیگا اور چاہے گا کہ فوراً مر جاؤں چنانچہ یہاں ایک پردیسی طالب علم طاعون میں مبتلا ہوئے لوگ اُن کی تسلی کرتے تھے کہ تم اچھے ہو جاؤ گے مگر وہ یہی کہتے تھے کہ یوں نہ کہو اب تو خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے اور اُس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت سنائی جاتی ہے اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی کے لئے بادشاہ کی طرف سے وزارت کے عہدہ کا پیام آئے اور وہ شخص اپنے گھر سے پائے تخت شاہی کی طرف چلے تو گو اُس کے گھر والے جدائی سے غمگین ہوں گے مگر یقیناً وہ شخص شاداں و فرحاں ہوگا اگر اُس حالت میں بادشاہ کی طرف سے یوں ارشاد ہوا گر تم چاہو تو اتنے روز کی مہلت بھی مل سکتی ہے تو وہ ہرگز راضی نہ ہوگا اسی طرح جب راحت آخرت کی خبر ہوتی ہے اور اُسکا مشاہدہ ہو جاتا ہے اس وقت اگر

اس سے دنیا میں رہنے کو کہیں تو ہرگز راضی نہ ہوگا پس اے صاحبو ! مَا عِنْدَ اللّٰہِ سے رغبت کرو اسی رغبت کی بدولت اہل اللہ ہر وقت شگفتہ رہتے ہیں اور انکو وہاں کے متعلق قسم قسم کی تمنائیں اور امیدیں لگی ہوتی ہیں اُن کی یہ حالت ہوتی ہے ؎ کوئے نا امیدی مرد کا امید ہاست ۔ سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست انھیں غم نہیں ہوتا چنانچہ منصور کی یہ حالت ہوئی کہ جبکہ اُن کو دار پر لیجانے لگے تو وہ خوش ہو کر کہتے تھے ؎ اُقْتُلُوْنِیْ یَا ثِقَاتِیْ ۔ اِنَّ فِیْ مَوْتِیْ حَیَاتِیْ ۔ غرض موت اہل اللہ کا تو کھیل ہے انکا تو شغلہ ہے بس ہمکو یہ حالت اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے تاکہ بجائے غم کے شوق ہو جسکا ایک سہل طریقہ یہ ہے کہ ان مضامین پر غور کرو جو میں نے اس وقت بیان کئے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ اس سے غم کا بھی علاج ہو جاویگا اور آخرت کا بھی شوق ہو جاویگا ۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ میں اسی کا علاج بتلایا ہے اور سبحان اللہ کیسا عجیب علاج ہے اسکا مراقبہ کیا کرو کہ آخرت میں جو راحت ہے وہ دنیا سے بدرجہا بڑی ہوئی ہے اور مرنے والا ہمارے پاس سے خدا کے پاس پہونچ گیا ہے اور یقیناً خدا کے پاس رہنا ہمارے پاس کے رہنے سے بہتر ہے اور گو امکان کے درجہ میں وہاں کی صعوبت کا بھی اس کے لیے احتمال ہے مگر اپنے مسلمان عزیز کے ساتھ یہ بدگمانی کیوں کی جائے کہ وہ خدانخواستہ مجرموں کی طرح تکلیف میں ہوگا بلکہ نیک گمان رکھو اور اس احتمال کے تدارک کے لیے اس کے لیے دعا اور ایصال ثواب کرتے رہو یہ اس کے لیے ہمارے غم کرنے سے زیادہ نافع ہے ۔ یہ حاصل ہے علاج کا آگے صبر کی فضیلت کا بیان ہے اور انعام کا وعدہ بھی ہے فرماتے ہیں وَلَنَجْزِیَنَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ہ کہ ہم اُن لوگوں کو اُن کے اچھے اعمال پر ضرور جزا دیں گے جنھوں نے صبر کیا اور آگے آیت مَنْ عَمِلَ صَالِحًا میں وہ عمل بتلاتے ہیں جسکا حاصل یہ ہے کہ عقائد ٹھیک ہوں اعمال درست اور شریعت کے موافق ہوں اب دعا کیجئے کہ ہمکو اللہ تعالیٰ فہم دین اور توفیق عمل مرحمت فرمائیں کہ خدا کی چیزوں سے ہمیں رغبت زیادہ ہو اور دنیا کی چیزوں سے محبت کم ہو آمین ثم آمین (تم الوعظ)

فائدہ ۔ اس وعظ کا نام حضرت والا نے انوار السراج تجویز فرمایا ہے ایک وجہ تسمیہ کی مناسبت تو اثنائے وعظ میں مذکور ہو چکی ہے ۔ دوسری مناسبت حضرت والا نے یہ بیان فرمائی کہ انوار السراج کا نام رکھنا بمنزلہ تسمیۃ الکل باسم الجزء کے ہے کیونکہ اس بیان میں ایک مقام پر تیل اور چراغ کی مثال آئی ہے اور یہ مضمون ایک جزو ہے وعظ کا اس کے اعتبار سے پورے وعظ کا نام یہ رکھدیا تو تسمیۃ الکل باسم الجزء اس پر صادق ہے ۔ تیسری ایک مناسبت جو نہایت لطیف ہے وہ یہ ہے کہ کلام اللہ کے بارہ میں نور کا لفظ وارد ہے اور سراج لقب ہے جناب

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

اکمال العدۃ

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

"مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی ب

اکمال العدۃ والسلاخ رمضان

این	کہاں ہوا	کیرانہ ضلع مظفر نگر جامع مسجد۔
متی	کب ہوا	۲۴ رمضان ۱۳۳۴ھ بروز سہ شنبہ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ ½ گھنٹہ۔
کیف	کس ہیئت سے ہوا	کھڑے ہو کر۔
لِمَ	کیوں ہوا	بدرخواست اہل قصبہ
ماذا	کیا مضمون تھا	روزہ آسان ہے اور سہل آسانی کی تحقیق اور یہ کہ اکمال عدت اور تسبیح و تکبیر سب مقاصد سے ہیں اور اس کا اثبات۔
من الشان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ہر طبقہ کو عموماً۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد رحمۃ اللہ علیہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مسودہ میں مرقوم نہیں نہ کچھ یاد ہے۔
الاشتات	متفرقات	اس بیان میں تفسیر آیت و ارتباط آیات عجیب طرز سے مذکور ہوا ہے۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ شمار کی تکمیل کر لیا کرو اور تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرو اس امر پر کہ تم کو طریقہ بتا دیا اور تاکہ تم لوگ شکر ادا کرو۔ سورہ بقرہ پ ۲ ع ۷

ع وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ٥ ان آیات کا پہلا حصہ یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق تعالیٰ نے روزہ کے احکام کے مصالح ارشاد فرمائے ہیں اور دوسری آیت کو پہلی آیت کے تقویت کے لئے ارشاد فرمایا ہے یہ حاصل ہے دونوں آیتوں کا مگر اسوقت جو جزو مقصود ہے وہ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ ہے اور مضامین چونکہ اسی کے سیاق وسباق میں ہیں اسلئے سبکی تلاوت کر دی گئی حاصل ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ تمہاری تکلیف کو گوارہ نہیں فرماتا بلکہ تم کو آسانی پہونچانا چاہتے ہیں پس روزہ میں دشواری کا اندیشہ نہ کرو مثلاً گرمی کے موسم میں بعض لوگوں کو دشواری کا خیال ہوتا ہے مگر اس سے اندیشہ نکرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ روزہ میں تمکو آسانی پہونچانا چاہتے ہیں اگر تم گرمی میں روزہ کی ہمت کروگے اللہ تعالیٰ آسان کردینگے اب سمجھنا چاہئے کہ وہ آسانی کونسی ہے جو یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ سے حقیقۃً مراد ہے سو حقیقت میں آسانی معنوی اور روحانی ہے جس کا اثر یہ بھی ہے کہ جسمانی آسانی اُس پر مرتب ہو جاتی ہے روحانی سہولت کا حاصل یہ ہے کہ روزہ سے تم کو دلچسپی عطا کردی گئی اور دلچسپی سے جیسا روح کو آسانی ہوتی ہے جسمانی سہولت بھی اسپر مرتب ہوجاتی ہے کیونکہ دنیا کے کاموں میں مشاہدہ ہے کہ دلچسپی کے بعد دشوار سے دشوار کام بھی آسان ہوجاتا ہے جیسے تقریبات شادی میں دیکھا گیا کہ نفیس المزاج لوگوں کو بعض دفعہ بارات کے انتظام میں پسینا آجاتا ہے بھوکے مرتے ہیں مگر کچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اسپر فخر کرتے ہیں اور اگر کبھی شکایت بھی کرتے ہیں تو ان کے لہجہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اندر سے ان کا دل خوش اور شاداں ہے محض شکایت ہے تو وہ شکایت ایسی ہوتی ہے جسکی متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

دل ہمی گوید از و رنجیدہ ام ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وز نفاق سست او خندیدہ ام

بعض دفعہ اہل اللہ کے کلمات میں بھی شکایت ہوتی ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شکایت کر رہے ہیں مثلاً ایک عاشق کا شعر ہے ؎

کیا ہی لطف خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

ع اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں درخواست منظور کرتا ہوں درخواست کرنے والے کی جب وہ میرے حضور درخواست دے سو ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ بھلائی حاصل کر سکیں پ ۲ ع ۶

مگر اُن کے دل سے کوئی پوچھے کہ کیا وہ خدا سے رنجیدہ ہیں یا اُنکو کچھ تکلیف ہے ہرگز نہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ چیں بنماید وگہ ضد این | جز کہ حیرانی نباشد کار دین

اب کیا انکو اس سے پریشانی ہے ہرگز نہیں وہ اس کے عوض سلطنت کا بھی خیال نہیں کرتے مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من | دل فدائے یار دل رنجان من

غرض قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز سے دلچسپی ہوتی ہے اُسمیں روحانی تکلیف نہیں ہوتی گو جسمانی تکلیف ہو پھر وہ بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتی اس لئے بعض دفعہ دنیا والے خوش ہوکر ایسی تکالیف کو بیان کیا کرتے ہیں حالانکہ تکلیف میں خوشی کیسی ہے مگر اس کا راز وہی ہے کہ روح کو دلچسپی کی وجہ سے راحت ہوئی اس لئے جسمانی کلفت کی پرواہ نہیں کیگئی پھر عادۃ اللہ یہ ہے کہ اسکے بعد ظاہری اور جسمانی نہوت بھی ہوجاتی ہے چنانچہ ذاکرین کو ذکر بعد بھوک نہیں لگتی بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ذکر سے پہلے بھوک لگی ہوئی تھی جسکی وجہ سے ذکر کرنا دشوار معلوم ہوتا تھا مگر ذکر شروع کیا گیا تو بھوک جاتی رہی علامہ ابن القیم جو صوفی مشہور نہیں بلکہ ظاہری عالم سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اسکو تسلیم کرکے کہتے ہیں کہ نور ذکر بمنزلہ غذا کے ہوجاتا ہے اُن کے نزدیک ذکر سے بھوک جاتی رہنے کا یہ سبب ہے کہ نور ذکر غذا کا کام دینے لگا ایک شاعر اسی مضمون کو بیان کرتا ہے ؎

وَذِكْرُكَ لِلْمُشْتَاقِ خَيْرُ شَرَابٍ | وَكُلُّ شَرَابٍ دُونَهُ كَسَرَابٍ

صوفیہ کے واقعات تقلیل غذا کے بارہ میں ایسے عجیب ہیں جنکو دیکھکر ماننا پڑتا ہے کہ ذکر بمنزلہ غذا کے ہوجاتا ہے چنانچہ کوئی بزرگ چلہ میں غذا کم کرتے جاتے تھے یہانتک کہ بعض دفعہ چالیس دن میں صرف ایک بادام کھاتے تھے۔ اگر آپ اطباء سے دریافت کریں تو وہ ہرگز اسکو تسلیم نکریں گے کہ چالیس دن میں ایک بادام کافی ہوسکتا ہے بس یہی کہنا پڑے گا کہ ذکر اللہ نے غذا کا کام دیا اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر عاشق کو بھوک لگی ہو اور وہ کھانا کھانے بیٹھا ہو اُس وقت اسکا محبوب آجائے تو عاشق کو

بھوک جاتی رہتی ہے اس کی وہی حقیقت ہے کہ محبوب کو دیکھکر ایسی فرحت ہوئی جس
نے غذا کا کام دیا بلکہ سچ پوچھو تو اصلی غذا یہی ہے یعنی فرحت اور جسکو تم غذا کہتے ہو
وہ بھی اُسی وقت غذا بنتی ہیں جب فرحت موجود ہو چنانچہ اگر کوئی شخص محزون
ہو اسکو جتنے چاہو مال کھلا دو اسکے بدن کو کچھ لگتا ہی نہیں۔ اور فرحت و نشاط کی حالت
میں معمولی غذا بھی پاؤ قورمہ کا کام دیتی ہے پس معلوم ہوا کہ اصلی غذا فرحت اور بےفکری ہے بلکہ اصلی
دوا بھی یہی ہے کیونکہ اطبا کہتے ہیں کہ فاعل صحت و مزیل مرض دوا نہیں بلکہ طبیعت ہے اور طبیعت اسوقت فاعل
ہوگی جبکہ اسمیں قوت ہو پس دوا کا کام صرف اتنا ہے کہ طبیعت کو قوت دیدے پھر کسی کی طبیعت کو دوا
دارو کرنے سے قوت حاصل ہوتی ہو اور طبائع کو ترک دوا سے قوت حاصل ہوتی ہے تو یہ جو کہا جاتا ہے کہ
فلاں شخص دوا نہیں کرتا یہ غلط ہے وہ بھی حقیقت میں دوا کرتا ہے کیونکہ دوا کی حقیقت
یعنی قوت طبیعت کا سامان وہاں بھی غلط ہے یہ اور بات ہے کہ اسکی تقویت طبع کا یعنی
سامان ترک دوا ہے اور دوسروں کیلئے دوا ہے تو یہ محض ظاہری فرق ہے ورنہ حقیقی دوا
سے کوئی خالی نہیں غرض یہ تو متحقق ہوگیا کہ اصلی غذا اور اصلی دوا فرحت و نشاط ہے
خواہ دوا سے ہو یا کسی اور چیز سے ہو سو ذاکرین کو ذکر اللہ کی بدولت نشاط فرحت حاصل ہوتا
ہے اس لئے وہ ان کو غذا اور دوا کا کام دیجاتا ہے۔ اور کسی کو اپنے محبوب کو دیکھنے سے
نشاط ہوتا ہے اُسکو محبوب کا دیکھ لینا دوا سے بڑھکر نافع ہوجاتا ہے چنانچہ اگر کوئی عاشق
بیمار ہو اور مشرف بہلاک ہو اس حالت میں اسکا محبوب چلا آوے تو عاشق
محبوب کو دیکھکر اوٹھ بیٹھتا ہے۔ مجھے اپنا واقعہ یاد ہے کہ ایکبار میرے والد صاحب
مرحوم الہ آباد میں بیمار ہوگئے میں کانپور سے دیکھنے گیا تو مجھے دیکھکر اوٹھ بیٹھے اور
کھڑے ہوگئے اور ٹہلنے لگے یا کئی منٹ گئے حالانکہ اس سے پہلے کروٹ لینے میں بھی تکلف
ہوتا تھا تو محبوب کا دیکھنا دوا سے بھی زیادہ نافع ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میں مولانا رفیع الدین صاحب
مہتمم مدرسہ دیوبند کی عیادت کو گیا کیونکہ وہ سخت بیمار تھے مولانا کو مجھ سے بہت محبت
تھی تو مجھ سے ملکر فرمانے لگے کہ تجھے دیکھکر تو میری بیماری جاتی رہتی ہے

اور دوسرا واقعہ دینی بزرگ کا ہے معلوم ہوا کہ اصل قوت چیز فرحت ہے یہی تمام غذاؤں
کی جڑ ہے اور چونکہ وہ خود بھی غذا کا کام دیتی ہے ورنہ اقل درجہ یہ ہے تو ضروری ہے کہ
بدون اسکے کوئی غذا غذا نہیں بنتی جب یہ مقدمہ سمجھ گئے تو اب بزرگان دین کی تقلیل غذا
پر کوئی وجہ حیرت نہیں کیونکہ ان حضرات کو ذکر اللہ سے ایسا نشاط حاصل ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی
مفرح یاقوتی اور خمیرہ ایسا نشاط نہیں پیدا کر سکتا تو وہ ایک بادام پر چالیس دن تک
کفایت کر سکتے ہیں کیونکہ ظاہر میں تو انہوں نے ایک بادام کھایا مگر حقیقت میں کثرت ذکر
کی وجہ سے وہ تو سیروں بادام کھا گئے بلکہ بادام سے بھی بڑھکر مقوی غذا کھا گئے پس روزہ میں
حقیقی یسر تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمکو اس سے دلچسپی عطا فرمائی ہے اور دلچسپی کی چیز سے فرحت ہوتی
ہے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ روزہ سے طبیعت کو ایسی تازگی ہوتی ہے کہ باوجود ضعف بدن کے
کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی پھر عادۃ اللہ یہ ہے کہ روزہ میں کہ تمام طاعات میں روحانی
یسر کے ساتھ جسمانی یسر کے اسباب بھی عطا فرما دیتے ہیں چنانچہ اس سال باوجودیکہ رمضان
سخت گرمیوں میں ہے مگر رمضان کے آتے ہی بادل اور بارش کا سامان ہوگیا جس سے جسمانی
راحت بھی حاصل ہوئی شعبان میں روزہ رکھا تھا تو سخت تکلیف ہوئی تھی مگر بحمد اللہ
طبیعت کو اس سے بھی فرحت ہوئی اسی لئے باوجود جسمانی کلفت کے روزہ گراں نہیں ہوا اور
خوبی کے ساتھ پورا ہوگیا رمضان سے پہلے نصف شعبان کا روزہ مشروع ہونیکی یہ بھی ایک حکمت
ہے کہ روزہ سے گونہ مناسبت ہو جائے اسکے بعد جب رمضان آئیگا تو روزہ کا اثر زیادہ نہ ہوگا بلکہ
دل یوں کہیگا کہ جیسا شعبان کا روزہ تھا ویسا ہی رمضان کا ہوگا اس سے زیادہ کیا ہوگا چنانچہ بحمد اللہ
اب رمضان کے روزہ کا اثر زیادہ نہیں ہوا گو کسیقدر ضرور ہوا اور اگر بالکل بھی اثر نہ ہوتا
تو آپ خود اس تجویز کو بدلتے اور اسکی تمنا کرتے کہ کچھ تو اثر ہوتا چنانچہ جاڑوں کے روزہ میں
لوگ کہا کرتے تھے کہ روزہ کا مزا نہ آیا روزہ کا مزا تو گرمی کے روزہ میں ہے کہ افطار سے پہلے چھڑکاؤ
ہو رہا ہے ٹھنڈے پانی کا اہتمام ہو رہا ہے کوئی شربت بنا رہا ہے کوئی برف لا رہا ہے
جاڑوں میں تو یہ خیالات تھے کہ اب گرمی کے روزہ سے کیوں گھبراتے ہو یہ تو تمہاری ہی تجویز کردہ ہے
وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ولعل

حضرات صحابہؓ نے جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے کیونکہ غزوہ بدر دفعتہ ہو گیا جس کا
کسی کو گمان بھی نہ تھا جہاد کا شوق ظاہر کیا تھا کہ اگر غزوۂ بدر کے بعد کبھی جہاد کا موقعہ ہوا تو
سب دیکھ لیں گے کہ ہم اسکے راستہ میں کس طرح جانبازی کرتے ہیں اسکے ایک سال بعد ہی
غزوۂ احد ہو گیا جس میں اول تو مسلمان غالب ہو گئے تھے پھر ان کے قدم اکھڑ گئے اس پر یہ آیت
نازل ہوئی کہ تم تو موت کی تمنا کرتے تھے لو اب تو اس کو اچھی طرح دیکھ لیا یہی حالت روزہ کے
متعلق ہماری ہے کہ جاڑوں میں تو گرمیوں کے روزہ کی تمنا کرتے تھے جب گرمیوں میں رمضان
آیا تو بہت سے گھبرا گئے۔ اب اگر رمضان میں سختی بھی رہتی تو کیا حرج تھا کیونکہ وہ تو منہ
مانگی مراد تھی مگر اللہ تعالی نے آپ پر سختی نہیں کی بلکہ لطف فرمایا کہ گرمی کی تکلیف بھی رفع
فرما دی بارش کا سامان کر دیا چنانچہ سارا رمضان بادل و بارش میں گذر گیا اگرچہ اسوقت
رمضان کے دن لمبے تو ہیں خصوصاً مجھے اس سال زیادہ لمبے اسلئے معلوم ہوتے ہیں کہ
اس سال میں نے رمضان میں سوائے جوابات ڈاک کے اور تلاوت قرآن کے اور سب
کام چھوڑ دیے تعلیم و تلقین بھی بند کر دی تالیف و تصنیف بھی ملتوی کر دی اور ایسی حالت
میں قاعدہ ہے کہ دن زیادہ لمبا معلوم ہوتا ہے اگر آدمی ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگا رہے
تو دن لمبا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر الحمد للہ کہ دن لمبے ہوتے ہوئے بھی تکلیف کچھ نہیں معلوم ہوئی۔
کیونکہ گرمی کم ہے اور یہ اللہ تعالی کی بڑی رحمت ہے کہ اپنے بندوں کی مدد کام میں بھی
کرتے ہیں اسباب میں بھی کرتے ہیں حالانکہ اہل دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ صرف اسباب میں
مدد کرتے ہیں کام میں مدد نہیں کرتے آپ اگر کسی معمار کو اپنے کام پر لگائیں تو کام میں آپ
اسکی مدد نہیں کیا کرتے مثلاً جسوقت وہ کام کرنے بیٹھے اسوقت آپ اس کا کام بٹوا دیں
صرف اسباب میں امداد کرتے ہیں مگر حق تعالی کا لطف یہ ہے کہ اسباب میں بھی مدد کرتے
ہیں اور کام میں بھی حقیقت میں جو کچھ تھوڑا بہت کام ہم سے ہو جاتا ہے اللہ تعالی کی مدد سے
ہو جاتا ہے بس ہمارے کام کی ایسی مثال ہے جیسے آپ قلم ہاتھ میں لیکر بچہ کا ہاتھ بھی اس پر
رکھ لیں اور ایک خوشخط تحریر لکھدیں اور بچہ کی تعریف کریں کہ شاباش تم نے خوب لکھا اور
وہ بچہ نادان بھی یہ سمجھکر کہ میں نے لکھا ہے خوش ہوتا ہے حالانکہ اس کا تو نام ہی نام ہے

کام تو اور کسی کا ہے یہی حالت ہماری کام کی ہے ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں　　مصلحت را تہمتے بر آہوے چیں بستہ اند

لوگوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ روزہ ہمارے منہ میں ہے مگر یہ خبر نہیں کہ منہ کس کے ہاتھ میں ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے　　یک دہاں پنہان ست در لبہای وے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما　　ہائے ہوئے در فگندہ در سما

یہی حال ہمارا ہے کہ ہمکو اس کا خیال نہیں کہ ہمارا منہ کس کے ہاتھ میں ہے کیونکہ اصل میں منہ سے کھانا قلب کے قبضہ میں ہے۔ اگر دل میں تقاضا نہ ہوتا تو کھانا محال ہوجاتا اور دل خدا کے قبضہ میں ہے تو یہ خدا تعالیٰ کی اعانت ہے کہ انھوں نے روزہ کے اندر آپ کے دل سے کھانے پینے کا تقاضا نکالدیا اگر وہ تقاضا نہ نکالتے تو آپ کی مجال تھی کہ روزہ رکھ لیتے بس ہماری مثال ایسی ہے جیسے قلم ناز کرنے لگے کہ میں نے ایسا لکھا اور میں ایسا خوشخط تحریر ہوں اور نادان یہ نہیں دیکھتا کہ وہ خود کسکے قبضہ میں ہے ؎

اے قلم بنگر گرا جلالیستی　　در میانِ اصبعین کیستی

یہ خدا کی رحمت ہے کہ دل کے واسطے لغت ہی علیم ہے دل کو قلب اسی واسطے کہتے ہیں کہ وہ اولٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے ایک تنکا ہماری ہاتھ میں ہو اور آندھی میں ثابت قدم رہے اور اس ثبات پر نازاں ہو تو اسکی حماقت ہے کیونکہ چھوڑ دینے کے بعد وہ کہیں سے کہیں ہوگا پس اب جو لوگ اپنی ثابت قدمی پر نازاں ہیں وہ گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں کہ یہ ثابت قدمی اور استقلال اور پابندی اوقات اور ضبط معمولات کسکی بدولت ہے یہ محض خدا کا لطف ہے کہ انھوں نے آپ کے دل میں تقاضا پیدا کر دیا ہے ورنہ کچھ بھی نہ ہوسکتا اسی لئے حق تعالیٰ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرماتے ہیں کہ ہم آپ کے دل کو تقویت دی ہم نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ اور یہ بھی ایک دلیل ہے قرآن کی حقانیت کی ورنہ بشر اپنے کلام میں ضرور دبتا ہے (یعنی وہ کسی نہ کسی سے ضرور دبتا اور رکتا ہوتا ہے) اور قرآن کریم کو دیکھکر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس کا متکلم کسی سے نہیں دبتا اسپر کسی کا اثر

نہیں چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بید ڈرک ارشاد ہے وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًاۙ٥ اور یہ بات اگرچہ بہت ڈر کی بات ہے کہ قلوب خدا کے قبضہ میں ہیں معلوم نہیں کدہر پھیر دیں مگر غور کرنے سے اسمیں ایک لطیف بات نکلتی ہے وہ یہ کہ حقیقت میں یہ بھی بڑی رحمت ہے کہ خدا تعالی نے ہمکو اپنے ہی قبضہ میں رکھا ہمارے قبضہ میں نہیں دیا۔ کیا بچہ کیلئے ماں کی گود میں رہنا رحمت نہیں بیشک رحمت ہے ورنہ معلوم نہیں کہاں پہونچکر ہلاک ہو اسی طرح ہمارے اندر علم کامل نہیں ہم کو اپنی جان کے ساتھ رحمت کامل نہیں اگر ہمکو ہمارے اختیار پر چھوڑ دیا جاتا تو نہ معلوم ہم اپنے کو کہاں لیجاکر برباد کرتے اگر تین چار برس کا بچہ یہ تمنا کرے کہ میں آزاد ہوتا تو خوب کھاتا پیتا یہ اسکی جہالت ہے۔ اگر باپ اُسکو آزاد کردے تو حقیقت معلوم ہوجائے۔ صاحبو! دوسرے کے قبضہ میں ہونا جبب مضر ہے جب کہ قبضہ والا رحیم و شفیق نہو اگر قابض رحیم و شفیق ہو تو پھر دوسرے ہی کے قبضہ میں رہنا مفید ہوتا ہے۔ صاحبو! اگر قلوب خدا کے قبضہ میں نہ ہوتے اور وہ روزہ کی حالت میں دل سے کھانے پینے کا تقاضا نہ نکالتے تو روزہ رکھنا دشوار ہوجاتا یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے کھانے پینے کی خواہش ہمارے دل سے نکالدی پس متقی نازنکرے کہ میں متقی ہوں صاحب تم متقی بنائے گئے ہو ورنہ کیا مجال تھی غرض یہ محض خدا کا فضل ہے۔ کہ اس نے قلوب اپنے قبضہ میں رکھے جس سے ہمارے تقویٰ کا نام روشن ہے۔ اب اس حقیقت پر نظر کرکے معلوم ہوگا کہ سارا کام اللہ تعالی ہی کرتے ہیں صاحبو! ایسی مثال آپکو مخلوق میں نہیں مل سکتی کہ کوئی سارے کام میں اوّل سے آخیر تک آپ کی امداد کرے پھر اسپر انعام بھی دے یوں تو ہر کام میں ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی ہی کی مدد سے انجام پاتا ہے مگر روزہ میں اللہ تعالی نے خاص طور پر اپنی امداد و اعانت کو ظاہر فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ دوسرے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ یرید بکم عدم العسر کیونکہ یرید بکم الیسر کے بعد اس کا آنا اسی بات کو چاہتا ہے کہ یہ بمنزلہ تاکید کے ہے اور تاکید یہی ہے کہ عسر رفع ہو جائے کیونکہ ہر وجودی شئے کا تحقق ثبوت شرائط پر جس طرح موقوف ہے اسی طرح رفع موانع پر بھی موقوف ہے اسیوجہ سے يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ میں امر وجودی کو بیان کیا گیا

حـ ٥ اور اگر تم ساتھ اپنے ... [illegible] ... ۱۵۰ پارہ

اور لا یرید بکم العسر میں امر عدمی یعنی ارتفاع اضداد وموانع کو بیان کیا گیا پس لا یرید بکم العسر
سے یرید بکم عدم العسر کا مفہوم ہونا ایسا ہے جیسا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ سے بغض
الکافرین کا مراد ہونا ترجمہ ان دو جملوں کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ روزہ میں تم کو آسانی دینا اور
تنگی کا رفع کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد ارشاد ہے وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ اس جملہ میں ایک عجیب
بات غور کرنے کی ہے وہ یہ کہ اس میں واؤ عطف کا ہے اور لام غایت کا ہے واؤ عطف
معطوف علیہ کو چاہتا ہے اور لام غایت عامل کو چاہتا ہے پس یہاں دو تقدیریں ہیں
ایک لتکملوا العدۃ کا عامل دوسرا اس عامل کا معطوف علیہ پس عامل یہ ہے یسر بکم
جو یرید اللہ بکم الیسر سے مفہوم ہوتا ہے اور معطوف علیہ یہ ہے کہ شرع لکم الاحکام المذکورۃ
جو اوپر کی آیتوں سے مفہوم ہے مشہور توجیہ یہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے
لئے روزہ کو مشروع کیا اور اس کے احکام میں سہولت کی رعایت کی تاکہ تم ایک مہینہ کی شمار
پوری کرو کیونکہ اس شمار کے پورا کرنے میں تمہارے واسطے منافع ہیں اس سے یہ لازم آیا کہ
اکمال عدت مقصود ہے کیونکہ اس پر لام غایت داخل ہوا ہے اور ہر کلام میں غایت زیادہ
مطمح نظر ہوتی ہے کیونکہ وہ مقصود ہے مگر اس تقدیر مشہور میں صرف اکمال عدت کی مقصودیت
ثابت ہوئی یسر کی مقصودیت ثابت نہوئی حالانکہ ظاہراً اثبات یسر زیادہ مہتم بالشان معلوم
ہوتا ہے اس لئے دوسری توجیہ یہ ہے کہ یرید اللہ بکم الیسر کو قوت میں اسی جملہ کے کیا جاوے
کہ یرید بکم الیسر اور اس کا عامل شرع الخ کو کہا جاوے پس کلام کا حاصل یہ ہوگا کہ شرع اللّٰہ
لکم ما ذکر لیرید بکم الیسر ولیرفع عنکم العسر ولتکملوا العدۃ کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے احکام
مذکورہ کو اس لئے مشروع کیا کہ وہ تم کو آسانی دینا اور تنگی رفع کرنا چاہتے ہیں اور اس لئے
مشروع کیا تاکہ تم شمار کو پورا کر لو. اس صورت میں دو مقصود ہوئے ایک یسر تو اول مذکور
ہونیکے سبب اصلی مقصود ہوا اور دوسرا اکمال عدت کہ تاخر فی الذکر دوسرے درجہ میں مقصود
ہوا کیونکہ عادۃً یوں ہے کہ اگر کوئی عارض نہو تو اہم کو ذکر میں مقدم رکھتے ہیں پس آسانی اس
توجیہ پر غایت درجہ کی آیت کی مدلول ہوگی کیونکہ مدخول لام ہونے کا سبب وہ خود
بھی مقصود ہوگی اگرچہ ثواب و قرب ورضا مقصود المقصود ہے مگر آسانی بھی فی

تفسیر مقصود ہوگی اس تقدیر پر صرف عامل مقدر ہوگا باقی معطوف علیہ ظاہر ہوگا اس لئے یہی اولیٰ ہے اور ہر حال میں یسر ثابت ہے اب اس ثبات یسر پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان کو بیان کرتا ہوں اول یہ کہ بے روزوں کو شرم کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تو صاف وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزوں میں تم کو آسانی دینا چاہتے ہیں تنگی کو رفع کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ لوگ روزہ میں دشواری ظاہر کرکے ناحقیقت شناس مخالفین کو قرآن خداوندی پر ظاہرا اعتراض کا موقع دیتے ہیں اے ظالمو تم نے روزہ رکھ کر تو دیکھا ہوتا اس کے بعد ہی اس کو دشوار کہا ہوتا سب سے اول تو روزہ میں روحانی یسر آپ کو عطا ہوتا کہ اس سے دلچسپی ہو جاتی پھر جسمانی یسر بھی حاصل ہوتا غرض اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزہ کو آسان کردیں گے اور مراد کا ارادہ الٰہیہ تخلف ہو نہیں سکتا تو یہ مراد یقیناً متحقق ہوگی چنانچہ مشاہد ہے کانپور میں ایک شخص نے چالیس سال تک روزہ نہیں رکھا تھا میں نے ان سے کہا کہ یہ تو بہت آسان چیز ہے تم رکھ کر تو دیکھو پھر چاہے رکھنے کے بعد درمیان میں دشواری معلوم ہوگی توڑ دینا انھوں نے رکھا اور روزہ پورا ہو گیا تو بعد میں اقرار کیا کہ واقعی بہت آسان چیز ہے پھر رکھنے لگے یہ روزہ کی خاصیت ہے کہ اس میں ترک طعام و شرب آسان ہو جاتا ہے اگر کوئی بدون نیت صوم کے دن بھر بھوکا پیاسا رہنا چاہے تو بہت دشوار ہے مگر نیت کے بعد آسان ہو جاتا ہے ان دونوں صورتوں میں وجہ فرق صرف یہی ہے کہ پہلی صورت میں صوم نہیں اور دوسری صورت میں صوم ہے شاید کسی کو یہاں شبہ ہو کہ روزہ میں تو یاس ہو گیا کہ اب شام تک کھا پی نہیں سکتے اس لئے آسان ہو گیا اور بدون نیت صوم کے امساک عن الطعام اختیاری ہوتا ہے اس لئے صبر نہیں آتا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات صحیح ہے مگر ایک دوسرا طبعی قاعدہ اس کے معارض ہے وہ یہ کہ امر کے بعد کام دشوار ہو جاتا ہے اور آزادی میں

تکلیف نہیں ہوتی دوسرے وہاں بھی یہ فرض کرلیا جائے کہ کھانے پینے سے کوئی
مانع قوی موجود ہو مثلاً طبیب نے کھانے پینے سے منع کردیا ہو تو باوجود صبر
آجانے کے پھر بھی روزہ کی برابر فاقہ میں سہولت نہیں ہوتی اس پر شاید یہ جواب
کہا جائے کہ مخلوق کا منع کرنا خالق کے منع کرنے کے برابر تھوڑا ہی ہے اس لئے
وہاں صبر نہیں آتا اور یہاں آجاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فرق خدا ہی کے
امر کی وجہ سے تو ہوا پس ہمارا مدعا ثابت ہوگیا کہ روزہ کو اللہ تعالیٰ آسان
کردیتے ہیں گو اس کی یہی صورت ہوئی کہ روزہ دار کے دل میں روزہ کی عظمت
پیدا کرکے اس کو صبر دیدیا بہرحال روزہ بہت آسان ہے اب جو لوگ روزہ
نہیں رکھتے ان کی کم ہمتی پر افسوس ہے کہ ایسا آسان کام بھی ان سے نہیں
ہوتا جس کے آسان کردینے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے اور شروع بھی
کرادیا اب آیت کا مطلب سنئے حاصل آیت کا یہ ہوا شَرَعَ اللّٰہُ لَکُمُ
الصَّوْمَ لِلْیُسْرِ وَ لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ جس میں متعدد
غایات ہیں اور ایک غایت پر دوسری غایت مرتب چلی گئی ہے اس میں
خدا تعالیٰ کی ایک نعمت تو یہ ہے کہ روزہ کو مشروع کیا ورنہ ہم کیسے رکھتے
دوسرے یہ کہ اس کو آسان کردیا تیسرے یہ کہ احکام میں ایسی رعایت فرمائی
جس سے شمار کا پورا کرنا آسان ہوگیا اس کے بعد خدا تعالیٰ کی عظمت دل
میں آتی ہے تو اس پر خدا کی تکبیر کہو گے یہ چوتھی نعمت ہے اب اس کا دشوار ہونا
ایسا ہے جیسا ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے
تھے کہ میاں لا الٰہ الا اللہ سے زیادہ کیا چیز آسان ہوگی مگر کفار کے لئے
یہ سب سے زیادہ دشوار ہے تو اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ جس کو
جو آسان ہے وہ خدا تعالیٰ کا فضل ہی ہے ورنہ ہم لوگ اپنی قوت سے کوئی
کام نہیں کرسکتے جب تک اللہ تعالیٰ اس کو آسان نہ کردیں عوارف
میں ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں ان کی زبان سے کوئی کلمہ

ناگوار خلاف شرع نکل گیا تھا اس کے بعد وہ ولی ہوئے صاحب معرفت شیخ ہوئے مگر اس کلمہ کا کہنا یاد بھی نہ رہا اس سے خاص توبہ نہیں کی ایک دن اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہنے کا ارادہ کیا تو زبان سے کلمہ نہ نکلا اور سب باتیں کہہ سکتے تھے مگر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه نہ کہہ سکتے تھے یہ حالت دیکھ کر لرز گئے جناب باری میں دعا کی کہ یہ میرے کس گناہ کی سزا ہے مجھے بتلایا جائے الہام ہوا کہ فلاں زمانہ میں تم نے فلاں کلمہ کہا تھا اور اب تک اس سے استغفار نہیں کیا اس لئے آج اتنے برس کے بعد ہم نے اس کی سزا دی یہ فوراً سجدہ میں گر پڑے اور توبہ کی تو فوراً زبان کھل گئی اسی واقعہ سے سمجھنا چاہیئے کہ کبھی طاعت کی دشواری کا سبب دوسرے معاصی بھی ہو جاتے ہیں اس کا علاج توبہ و استغفار ہے کبھی دشواری کا سبب وحشت بھی ہوتی ہے کہ ذکر اللہ سے وحشت ہے وحشت کی وجہ سے اللہ اللہ نہ کہہ سکے آپ بہت لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ بہت وقت بیکار ضائع کرتے ہیں مگر ذکر اللہ کے لئے ان کی زبان نہیں اٹھتی اس سبب کا سبب بھی وہی معصیت ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے دل کو ذکر اللہ سے وحشت ہے اسی کو ایک شاعر کہتا ہے

؎ تَجَنُّبُ مُنَاجَاةِ الْحَبِيْبِ بِاَوْجُهٍ وَلٰكِنَّ لِسَانَ الْمُذْنِبِيْنَ كَلِيْلٌ

اسی واسطے بے ضرورت گناہوں کو یاد کرنا اپنے ہاتھوں وحشت کا سامان کرنا ہے اسی کے متعلق شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ گناہ معاف ہو جانے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ گناہ دل سے مٹ جائے اور جب تک وہ مٹے گا نہیں قلب پر وحشت سوار رہے گی جو اس گناہ کی سزا ہے اس کی شرح میں مشائخ طریق کا ارشاد ہے کہ گناہ کے بعد جی بھر کے توبہ کر کے پھر اس کو جان جان کر یاد نہ کرے اس سے بندہ اور خدا کے درمیان ایک حجاب سا معلوم ہونے لگتا ہے جو محبت اور ترقی سے مانع ہے ایسی ہی وجوہ سے دوستوں میں اگر کچھ رنجش ہو جائے پھر صفائی کے بعد اس کو بار بار

یاد نہ کرے۔ غرض توبہ کے لئے تو گناہ کو یاد کرے مگر توبہ کے بعد پھر اس کو یاد نہ کرے بلکہ دل سے نکال دے ورنہ اسکی ایسی مثال ہوگی جیسے ایک شخص کو تحصیلداری مل جائے اور وہ روز روز اپنے افسر سے یوں کہے آپ مجھے برخاست تو نہیں کریں گے ظاہر ہے کہ اس حرکت سے افسر کا دل ضرور افسردہ ہوگا اور پہلے خود اس کا دل افسردہ ہوگا جب ہی تو اس کی زبان سے بار بار یہ کلمہ نکلتا ہے پس حق تعالیٰ تو تاثر سے بری ہیں مگر تم تو متاثر ہوگے جب تم بار بار گناہ کو یاد کرکے دل کو افسردہ کرلوگے اور محبت میں ترقی نہ کرسکوگے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ وہاں سے بھی عطائیں کم ہوں گی کیونکہ جزاء و ثمرات کا ترتب عمل پر ہوتا ہے خواہ عمل جوارح ہو یا عمل قلب ہو خوب سمجھ لو گناہوں کے یاد کرنے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا حاجی عبدالرحیم صاحب سہارنپوری ایک قصہ فرماتے تھے کہ حج کے موسم میں ایک شخص جمرہ عقبہ پر بجائے کنکریوں کے جوتے مار رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا کہ مردود شیطان تو نے مجھ سے فلاں دن یہ گناہ کرایا یہ کہتا جاتا اور جوتے مارتا جاتا تھا یہ حرکت بہت بری تھی ایک تو گناہوں کا یاد کرنا پھر ان کو ظاہر کرنا بعض لوگ توبہ کرکے ڈرتے رہتے ہیں کہ مبادا توبہ ٹوٹ جائے۔ یہ فکر بھی اچھا نہیں مولانا اس کو بھی حجاب فرماتے ہیں ؎

ماضی و مستقبلت پردہ خدا ست

یہ خوف بھی چھوڑ دینا چاہیے صفائی کے وقت کدورتوں کو یاد نہ کرنا چاہیے اس سے کبھی ایسی وحشت سوار ہوتی ہے کہ ذکر اللہ بھی نہیں کرسکتے لیکن اگر از خود یہ چیزیں یاد آجائیں تو پھر تجدید استغفار و دعا ضروری ہے۔ یہ تو ذکر نہ کرسکنے کا وہ سبب تھا جو اکثری اور کبھی ذکر نہ کرسکنے کا سبب کسی حالت محمودہ کا غلبہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جس زمانہ میں وہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ

کی خدمت میں ذکر و شغل کے لئے مقیم تھے اس وقت اور سب حضرات اپنا اپنا حال حضرت حاجی صاحب سے عرض کرتے تھے مگر مولانا کچھ عرض نہ کرتے تھے تو ایک دن حاجی صاحب نے خود فرمایا کہ مولانا سب لوگ اپنی اپنی حالت بیان کرتے ہیں آپ کچھ نہیں کہتے۔ اس پر مولانا نے آبدیدہ ہوکر عرض کیا کہ حضرت میں کیا حال عرض کروں مجھ سے تو وہ کام بھی پورا نہیں ہوتا جو حضرت نے بتا رکھا ہے بس ذکر کرنے بیٹھتا ہوں ایسا بوجھ طاری ہوتا ہو کہ زبان و قلب دونوں بند ہو جاتے ہیں حضرت کے فیض میں تو کمی نہیں مگر میری ہی کم نصیبی ہے ؎

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

حاجی صاحب نے اس حال کو سنتے ہی فرمایا کہ مولانا مبارک ہو یہ علوم نبوت کا ثقل ہے جو آپ کو عطا ہونے والے ہیں اور یہ اسی ثقل کا نمونہ ہے جو نزول وحی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتا تھا اس وقت قلب و زبان کا ذکر سے بند ہو جانا غایت قرب کی وجہ سے ہے جس کو شاعر کہتا ہے ؎

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے، تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

اور جب دل کی یہ حالت ہوتی ہے تو زبان بھی نہیں اٹھتی۔ اس واقعہ سے حضرت حاجی صاحب کا شیخ و مجتہد اور مجدد فن ہونا ظاہر ہوتا ہے حضرت حاجی صاحب نے یہ تشخیص ایسے وقت فرمائی جبکہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے علوم کا ظہور بھی نہ ہوا تھا بعد میں حاجی صاحب کے ارشاد کی تصدیق ظاہر ہوئی۔ اور اگر حاجی صاحب یہ تشخیص نہ فرماتے تو مولانا تو اس حالت کو بعد ہی سے ناشی سمجھتے رہتے حاجی صاحب ہی کا کام تھا کہ ایسے ایسے جلیل القدر علما کو سنبھالتے تھے دوسرا قصہ حضرت شیر خان صاحبؒ کا ہے جو میانجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں تھے جب ان کا

انتقال ہونے لگا نزع کی حالت شروع ہوئی تو لوگوں نے ان کو کلمہ طیبہ تلقین کیا وہ اس سے منہ پھیر لیتے تھے یہ حالت دیکھکر لوگ گھبرا گئے اور میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا میاں جی صاحب نے پوچھا کہ شیر خاں کیا حالت ہے فرمایا الحمد للہ اچھا ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں کو منع کر دیجئے کہ مجھے مسمی سے اسم کی طرف متوجہ نہ کریں حضرت میاں جی صاحب نے لوگوں سے کہا کہ ان کو پریشان نہ کرو یہ مشاہدہ مسمی میں مستغرق ہیں تم ان کو مسمی سے اسم کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو سچ ہے ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

کامل کی حالت کا ناقص کو علم نہیں ہو سکتا۔ انبہٹہ میں حضرت حاجی صاحب کے ایک مرید تھے اور ان کے بڑے بھائی خاندان نقشبندیہ کے شیخ تھے وہ ان سے کہا کرتے تھے کہ تم مجھ سے بھی کچھ حاصل کر لو ورنہ پچھتاؤ گے وہ جواب دیا کرتے کہ میرے شیخ مجھے کافی ہیں مجھے کسی سے رجوع کی حاجت نہیں اتفاق سے ان چھوٹے بھائی کا انتقال ہونے لگا تو ان کی بھی یہی حالت ہوئی جو شیر خاں صاحب کی حالت تھی کہ لوگ ان کو کلمہ پڑھانا چاہتے تھے اور یہ نہیں پڑھتے تھے اس کی اطلاع بڑے بھائی کو ہوئی وہ آئے اور ان سے کہنے لگے کہ میں تم سے نہ کہتا تھا کہ مجھ سے بھی کچھ حاصل کر لو مگر تم نے نہ مانا دیکھا اب کیا حالت ہے کہ کلمہ بھی نہیں پڑھ سکتے اس پر انھوں نے فوراً آنکھیں کھولدیں اور بڑے جوش میں یہ آیت پڑھی یٰلَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ حالانکہ یہ شخص ترجمہ قرآن سے واقف نہ تھے اس وقت اس کی زبان سے اس آیت کا نکلنا صاف اس کی دلیل تھی کہ غیب سے اس کی زبان پر یہ آیت جاری کی گئی ہے یہ جواب سنکر وہ شیخ شرمندہ ہو گئے اور حاجی صاحب کے سلسلہ والوں کو خاص مسرت ہوئی۔ بہر حال کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ

ترجمہ کاش کہ میری قوم کو بجائے معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے مجھ کو بخش دیا اور مجھ کو عزت داروں میں شامل کر دیا

16

غایت قرب کی وجہ سے زبان ذکر سے بند ہو جاتی ہے اس لئے نزع کیحالت میں کوئی مسلمان اگر کلمہ نہ پڑھے تو اس سے بدگمان نہ ہونا چاہیئے ممکن ہے اس کی وجہ غایت قرب ہو اور کبھی گناہ کی وجہ سے بھی طاعات بند ہو جاتی ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا۔ اور جیسے گناہوں میں یہ اثر ہے کہ طاعات کو بند کر دیتے ہیں ایسے ہی طاعات میں یہ بھی اثر ہے کہ ان کی وجہ سے دوسری طاعات ہونے لگتی ہیں بلکہ اس کا اثر اولاد میں بھی پہونچتا ہے باپ کی طاعات سے اولاد کو بھی طاعات کی توفیق ہوتی ہے مگر گناہ کا اثر اولاد میں نہیں پہونچتا ہاں دنیوی تکلیف کچھ پہونچ جاتی ہے طاعات کا یہ بھی اثر ہے کہ ان کی برکت سے گناہ کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ گناہ مقدر بتقدیر معلق ابھی ٹل جاتا ہے چنانچہ حضرت غوث اعظم رحمہ اللہ کا ایک مرید تھا بہت نمازی تہجد گذار پابند ذکر و شغل اس کو ایک رات میں ستر بار احتلام ہوا وہ بڑا پریشان ہوا کہ یہ کیا مصیبت ہے ساری رات غسل ہی میں گذر گئی نہ تہجد رہا نہ ذکر و شغل شیخ کو شیخ سے حالت عرض کی فرمایا کہ تم اس حالت سے مغموم مت ہو۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تیری تقدیر میں ستر دفعہ زنا کرنا لکھا ہوا ہے میں نے دعا کی تھی کہ اے اللہ اس بلا سے نجات دیجئے اللہ تعالیٰ نے میری دعا سے بیداری کے زنا کو خواب کے زنا کی طرف منتقل فرما دیا ہے جس میں گناہ ہی نہیں ہوا اب تم بے فکر رہو بڑی بلا ٹل گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہم ذکر وغیرہ کر رہے ہیں اور آسانی سے کر لیتے ہیں یہ آسانی خدا تعالیٰ کی عطا ہے ورنہ بہت سی مخلوق ایسی بھی ہے جس کو ذکر کی توفیق نہیں اور ان کے لئے یہ کام سب سے زیادہ دشوار ہے اس پر میں نے استطراداً یہ بھی بتلا دیا تھا کہ بعض دفعہ ذکر سے زبان بند ہونے کا سبب غایت قرب بھی ہوتا ہے

له یقیناً تم میں جن لوگوں نے پشت پھیر دی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ ان کو شیطان نے لغزش دیدی ان کے بعض اعمال کے سبب۔ (آل عمران ع ۱۶)

بہر حال آپ کو جو کلمہ شریف پڑھنا آسان ہے یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ کبھی یہ بھی بند ہو جاتا ہے اس لئے حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی ذاکر یہ عرض کرتا کہ ذکر سے نفع نہیں معلوم ہوتا تو حضرت یہ جواب دیا کرتے کہ یہ نفع کیا تھوڑا ہے کہ خدا کا نام زبان سے نکل رہا ہے اور یہ شعر پڑھتے

یابم اورا یا نیابم جستجوئی می کنم حاصل آید یا نیاید آرزوی می کنم

ذاکرین اس جواب کی قدر کریں کیونکہ شیطان ان کو اس قسم کے دھوکے بہت دیا کرتا ہے چنانچہ مثنوی میں ایک ذاکر کا قصہ لکھا ہے کہ ایک رات اس کو شیطان نے بہکایا کہ تم کو ذکر کرتے تہجد پڑھتے برس گذر گئے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ پیام ہے نہ سلام ہے جب وہ پوچھتے ہی نہیں تو کیوں سر مارا۔ یہ وسوسہ آتا تھا کہ اس نے اس رات کا تہجد و ذکر موقوف کر دیا مگر چونکہ خدا کا مجذوب بن چکا تھا گو خود سے اپنی حالت کی خبر نہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی کہ خواب میں ایک لطیفہ غیبی نے آ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال کیا آج تم نے ہم کو کیوں بھلا دیا اس نے وہی جواب دیا جو شیطان نے پڑھایا تھا کہ آپ کو یاد کرتے کرتے برس گذر گئے جب آپ نے خبر ہی نہ لی تو میں نے سوچا کہ مجھے ہی سر مارنے کی کیا ضرورت ہے لطیفہ غیبی نے جواب دیا

؎ گفت آں اللہ تو لبیک ماست وین نیاز و سوز و دردت پیک ماست

کہ میاں ایک بار اللہ کہکر جو تم کو دوبارہ اللہ کہنے کی توفیق ہو گئی تو یہی ہمارا جواب ہے اگر پہلا ذکر قبول نہ ہوتا تو ہم زبان کو ذکر سے بند کر دیتے حضرت حاجی صاحب نے اس کو خوب روشن کر کے بیان فرمایا اگر ایک حاضری میں بادشاہ ناراض ہو جائے تو کیا دوسری بار وہ دربار میں گھسنے دے گا ہرگز نہیں پس جب تم ایک مرتبہ نماز کے لئے مسجد میں آ گئے اس کے بعد پھر توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلی نماز قبول ہو گئی اور تم مقبول ہو مردود ہوتے تو دوبارہ مسجد میں گھسنے نہ دیتے کیونکہ ایسی بھی خدا کی مخلوق بہت ہے جو مسجد

سے رو کدی گئی ہے چنانچہ ایک قصائی کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا مسجد کا ملا جھلانے لگا کہ لوگ جانوروں کو مسجد میں چھوڑ دیتے ہیں تو وہ قصائی کہنے لگا ارے ملا اتنا خفا کیوں ہوتا ہے یہ تو بے وقوف جانور تھا جو مسجد میں چلا آیا کبھی تو نے ہمیں بھی مسجد میں آتا ہوا دیکھا ہے ایک اور واقعہ کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک آقا بے نمازی تھا اور غلام نمازی تھا دونوں بازار میں جا رہے تھے کہ نماز کا وقت آگیا غلام نے آقا سے اجازت مانگی کہا میں ذرا نماز پڑھ آؤں آپ تھوڑی دیر ٹھیریں آقا صاحب مسجد کے باہر بیٹھ گئے وہ اندر جا کر نماز میں مشغول ہوا پھر وظیفہ پڑھنے لگا جب سب نمازی چلے گئے اور بہت دیر ہوگئی تو آقا نے باہر ہی سے آواز دی کہ میاں کہاں رہ گئے آتے کیوں نہیں غلام نے جواب دیا کہ آنے نہیں دیتا آقا نے کہا کون نہیں آنے دیتا کہا جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھکو باہر نہیں آنے دیتا حضرت جو کچھ آپ سے نماز روزہ ہوجاتا ہے یہ سب اُنہیں کا کرایا ہوا ہے اگر وہ توفیق نہ دیں تو سب کام رہ جائے قرآن میں ارشاد ہے وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ کہ اللہ تعالیٰ نے غزوہ تبوک میں منافقین کا جانا نہ چاہا تو وہ اس کا سامان بھی نہ کر سکے بلکہ ارادہ بھی نہ کر سکے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو وہ ارادہ کر لیتے اور سامان بھی کرتے۔ پس تم اپنی سعی پر ناز نکرو بلکہ تفویض سے کام لو مگر تقدیر کے مسئلہ میں زیادہ غور و خوض بھی نکرو اور میں نے جتنا بھی اس کے متعلق بیان کیا ہے محض اس ضرورت سے بیان کیا ہے کہ اپنے علم و عمل پر ناز نہ ہو کہ بندہ کے کسب و اختیار کے نفی کرنے کے لئے حضرات صحابہ جب ایسے واقعات سے گھبرائے تو حضور سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم کیا کریں حضور نے فرمایا قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ بس خدا پر نظر رکھو اور تفویض سے کام لو ۔

معہ درآنحالیکہ وہ اپنے ارادہ جانے کا ارادہ کرتے تو اس کا سامان کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں کیا اس لئے ان کو توفیق نہیں دی اور کہہ دیا گیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہیں بیٹھے رہو ۔ ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کیلئے اچھا ہے

بحر یست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست　آنجا جز اینکہ جان بسپارند چارہ نیست
حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور اللہ تعالیٰ تیر چلانے والے ہوں تو ان سے کیوں کر بچا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر چلانے والے کے پاس کھڑا ہو جائے بچا رہے گا کیونکہ تیر دور والے پر چلتا ہے نہ کہ پاس والے پر افلاطون اسی جواب سے دنگ رہ گیا اور کہا یہ جواب نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ پس اسمیں غور وخوض نہ کرو غور کرنے سے یہ مسئلہ اور پیچیدہ ہو گا ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　جز شکستہ مے نہ گیرد فضل شاہ

اگر اس مسئلہ میں شفا چاہتے ہو تو عبدیت اور تفویض اختیار کرو اسی سے انشاء اللہ تسلی ہو جائے گی عقل کو تو بہت آزمایا اب خدا کے حوالہ کر کے دیکھو مولانا فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

حضرت بہت سے واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ تمام تدبیریں ختم ہو جاتی ہیں اور کام نہیں چلتا پس گرہ اس وقت کھلتی ہے جب بندہ یوں کہتا ہے کہ اے اللہ آپ ہی اس کام کو پورا کریں گے میں عاجز و درماندہ ہوں پس خوب سمجھ لو یہ تیسیر بھی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کو ہمارے لئے آسان کر دیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ میں ہم کو اس نعمت پر متنبہ فرمایا ہے کہ یہ احکام اس واسطے مشروع کئے ہیں کہ ان کو تمھارے واسطے آسان کر دیں اور گنتی پورا کرنے کی توفیق دیں پس تم اس کو دشوار نہ سمجھو ورنہ اس کی فکر کرو کہ تمیس دن کیوں کر پورے ہوں گے اس کے بعد ارشاد ہے وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ یعنی اور تاکہ ان نعمتوں پر تم خدا کی بڑائی ظاہر کرو یہاں اللہ تعالیٰ نے ھدٰکم فرمایا شرع لکم نہیں فرمایا کیونکہ ھدٰکم سب نعمتوں کو شامل ہے تشریعی

نعمتوں کو بھی اور تکوینی نعمتوں کو بھی اور یہاں دونوں قسم کی نعمتیں مذکور ہوئی ہیں کیونکہ تیسیر و اکمال عدۃ تکوینی نعمتیں ہیں تو ان سب نعمتوں پر جنکا میزان الکل حصل مکم ہے خدا کی تکبیر کہو پھر یہاں لِتَحْمَدُوا اللّٰہَ نہیں بلکہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰہَ فرمایا کیونکہ اس سے حادثہ کی وقعت معلوم ہوتی ہے اور حادثہ عظیمہ پر ہمارے اندر تکبیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ حمد کا اور قرآن شریف میں ہمارے محاورات وجذبات کی بہت رعایت کی گئی ہے میں نے اسی قاعدہ سے ایک لڑکی کے سوال کا جواب دیا تھا ایک مرتبہ جب میں گھر کی لڑکیوں کو تفسیر قرآن پڑھا رہا تھا یہ آیت آئی قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ خدا ان مدعیان اتخاذ ولد کو برباد کرے کہاں بہکے جا رہے ہیں تو ایک لڑکی نے سوال کیا کہ اللہ میاں کو کوسنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو عملاً سب کچھ کر سکتے ہیں کوسے تو وہ جو عملاً کچھ نہ کر سکے میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو تو کوسنے کی ضرورت نہیں مگر اس جگہ کفار کی جیسی حالت وشرارت مذکور ہے اس کو سنکر خود ہماری طبیعت میں کوسنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے ہمارے جذبات کو دبانا نہیں چاہا بلکہ اس کی رعایت فرما کر خود ہی فرما دیا قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اگر وہ نہ فرماتے تو ہم قرآن میں خود اس کو نہ پڑھا سکتے تو ہمارا جذبہ دبا رہتا اللہ تعالیٰ نے ہمارے جذبات کو پامال کرنا گوارا نہیں فرمایا بلکہ جو بات ہم کہتے خود ہی بطور لطف سے فرما دی تاکہ اس کی تلاوت کرنے سے ہمارا جذبہ پورا ہو جاوے یہ جواب اسی وقت قلب میں القا ہوا اس سے پہلے میں نے کسی جگہ یہ جواب منقول نہ دیکھا تھا اس جواب کی قدر مجھے بتا دیں ہوئی کیونکہ اس سے اور بہت سے اشکالات رفع ہوئے بعض دفعہ اللہ تعالیٰ وقت پر ایسی امداد فرماتے ہیں کہ جس کا پہلے سے گمان بھی نہیں ہوتا چنانچہ ایک بڑی بی نے طاعون کے زمانہ میں ایک بچہ کی زبانی مجھ سے سوال کیا

کہ عزرائیل تو ایک ہیں وہ ایک وقت میں اتنی روحیں کیوں کر قبض کر لیتے ہیں میں نے سوچا بچہ جواب کیا سمجھے گا مگر اللہ تعالیٰ نے ایک مثال میرے قلب میں ڈال دی جس کو بچہ بھی سمجھ کر نقل کر سکتا تھا میں نے کہا اس سے کہنا کبھی تم نے چاولوں کبھی کھاتے ہیں دیکھو ایک لقمہ میں ایک دم سے کتنے چاول آجاتے ہیں اور ایک دفعہ میں منہ میں رکھ لیتی ہو وہ بچہ بھی ہنسنے لگا اور سائلہ کی بھی تسلی ہوگئی غرض اس مقام پر لتکبروا اللہ میں ہمارے جذبات کی رعایت سے فرمایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں بڑی ہیں اور بڑی نعمت کو دیکھکر ہم کو اللہ اکبر کا تقاضا ہوتا ہے نہ الحمد للہ کا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس جذبہ کی ایسی رعایت فرمائی کہ تکبیر کو ہماری رائے پر نہیں چھوڑا بلکہ خود شروع کر کے دکھلا دیا چنانچہ عید کے روز تکبیر کہنا ضروری کر دیا گیا نماز عید کی ہر رکعت میں تین تکبیریں زیادہ کہی جاتی ہیں جو واجب ہیں اور راستہ میں بھی عید گاہ کو جاتے ہوئے تکبیر کہنا سنت ہے بعض آئمہ کے نزدیک جہراً اور ہمارے امام کے نزدیک سراً اور عجب نہیں کہ صلوٰۃ عید میں تین تکبیریں اس لئے ہوں کہ ایک بمقابلہ یسر کے ہے دوسری بمقابلہ رفع عسر کے تیسری بمقابلہ اکمال عدۃ کے اس کے بعد ارشاد ہے ولعلکم تشکرون اور یہ نعمتیں اس لئے تم کو عطا کیں تاکہ تم ان پر شکر کرو۔ اور یہ عجیب نعمت کا بیان ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یسر و عدم عسر و اکمال عدۃ و تکبیر ان سب پر شکر کرو اور شکر دوسری عبادات کے اعتبار سے تو ان عبادات کے متعلق ہے مگر فی نفسہ یہ خود بھی مستقل عبادت ہے اس لئے یہ خود بھی مطلوب اور مقصود ہے اس اعتبار سے یہ بھی ایک غایت ہے جس کے لئے یسر و اکمال عدۃ وغیرہ ہم کو عطا کیا گیا پھر چونکہ منعم کی محبت کی غایت یہ ہے کہ اس سے نعمتوں کا استحضار ہو کر منعم کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور محبت کے بعد محبوب سے قرب کا تقاضا ہوتا ہے تو اگلی آیت میں اللہ

تعالیٰ اپنے قرب کو بیان فرماتے ہیں وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ
اس تقریر سے تمام آیات واجزاء آیات کا ربط بخوبی ظاہر ہوگیا اور جس طرح
ان آیات کی تفسیر آج ذہن میں آئی ہے اس سے پہلے کبھی نہیں آئی (آیت
واذا سالک عبادی کا ربط پہلی آیت سے مشہور یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ
نے ہم کو صوم اور تکبیر وشکر وغیرہ کا امر کیا ہے تو ممکن ہے کسی کو یہ شبہ پیدا
ہو کہ نہ معلوم خدا تعالیٰ کو ہمارے ان افعال کی خبر بھی ہوتی ہے یا نہیں خصوصاً
شکر قلب کی کیونکہ افعال قلبیہ مستور ہوتے ہیں جن کی اطلاع دنیا میں تو
کسی کو نہیں ہوتی اور چونکہ طبیعت انسانیہ قیاس الغائب علی الشاہد کی
عادی ہے اس لئے بعض لوگوں نے سوال بھی کیا اقریب ربنا فنناجیہ ام
بعید فننادیہ کیا ہمارا پروردگار ہم سے قریب ہے کہ ہم اس سے خفیہ
طور پر مناجات کرلیا کریں یا بعید ہے کہ پکارا کریں اس کے جواب میں یہ
یہ آیت نازل ہوئی یہ ربط بھی عمدہ ہے مگر ربط اول احسن ہے اور ربط مشہور
پر اس آیت کا پہلی آیت کے متصل آنا امام ابوحنیفہ کے اس قول کی تائید کرتا
ہے کہ تکبیر عید الفطر راستہ میں سراً ہونا چاہئے جہر کی ضرورت نہیں رہی
تکبیر صلوٰۃ تو وہ چونکہ قرأت کے متصل ہے اور قرأت جہری ہے اس لئے
اتصال جہری کی وجہ سے اس میں بھی جہر ہوگیا دوسرے اس میں جہر کی یہ بھی
وجہ ہے کہ مقتدیوں کو اعلام کی ضرورت ہے کہ اس وقت تکبیر کہہ رہا ہے تو
وہ بھی اس کی اقتدا کریں اور تکبیر طریق میں ہر شخص مستقل ہے وہاں اعلام
کی ضرورت نہیں اور تکبیر تشریق کا جہر خلاف قیاس نص سے ثابت ہے۔
لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم الحج العج والثج وفی تکبیر التشریق تشبیہ بتلبیۃ الحاج
فافہم ۱۲) اور اذا سالک عبادی عنی فانی قریب کی بلاغت عجیب قابل
دید ہے کہ قل انی قریب یا فانہ قریب نہیں فرمایا بلکہ بلا واسطہ فانی قریب
فرمایا ہے یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے سوال کرے کہ فلاں شخص کہاں

ہے اور وہ بول پڑے کہ میں تو موجود ہوں اور یہ جب ہی ہوگا جبکہ مجیب کو سائل کے ساتھ خاص تعلق ہو اور اگر خاص تعلق نہ ہو تو وہ قریب ہوتے ہوئے بھی خود نہ بولے گا بلکہ جنسے سوال کیا گیا ہے ان سے کہے گا کہ اس سے کہدو وہ یہاں موجود ہے اور تعلق کی صورت میں ایسا نہ کریگا تو دبول پڑیگا کہ میں تو موجود ہوں اسی طرح یہاں حق تعالےٰ نے خود بلاواسطہ جواب دیا ہے کہ میں تو قریب ہوں حضور صلعم سے نہیں فرمایا کہ ان سے کہدیجئے کہ میں قریب ہوں اس میں جس خاص تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے اور وہ تعلق ایسی نعمت ہے کہ اس پر ہزار جانیں قربان کردیجائیں تو تھوڑا ہے پھر اس جواب کا حضور کی زبان سے ادا ہونا بتلاتا ہے کہ رسول صلعم کا بولنا خدا ہی کا بولنا ہے ؎

گرچہ قرآں از لب پیغمبر است ہر کہ گوید حق نگفت او کافر است

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک شان تو مبلغ ہونے کی ہے اور دوسری شان لسان حق ہونے کی ہے کہ حضور صلعم اللہ تعالےٰ کے لئے بمنزلہ لسان یعنی ترجمان کے ہیں اس عنوان سے گھبرایئے نہیں کیونکہ جب شجرہ طور لسان حق ہوگیا اور اس سے ندا آئی انی انا اللہ لا الٰہ الا انا فاعبدنی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لسان حق ہونا تعجب خیز کیوں ہے پھر حدیث میں اہل قرب کے لئے آیا ہے کنت بصرہ الذی یبصر بہا وسمعہ الذی یسمع بہا ورجلہ التی یمشی بہا اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مقرب کون ہوگا تو آپ کی یہ شان سب سے زیادہ ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے خلاصہ ان اجزاء مرتبہ کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو دیکھکر خود بخود آپ کے دل پر شکر کا تقاضا ہوگا کہ آپ کی ہی مصلحت و نفع کے لئے صوم کو مشروع فرمایا پھر اس میں تشریعاً تکوینا یسر و عدم عسر کی رعایت فرمائی تاکہ روزہ کی تکمیل ہوجائے اور تکمیل کے بعد اس نعمت پر تکبیر کہو اور شکر کرو پھر شکر سے محبت پیدا ہوگی اور محبت

سے قرب حق کا تقاضا ہوگا تو اس آیت میں تسلی فرما دی کہ میں تم سے قریب ہوں مجھے تمہارے سب اعمال و اقوال کی خبر ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں ہر دعا کرنیوالے کی دعا کو قبول کر لیتا ہوں یہاں دعا سے مراد عبادت ہے دعائے ظاہری مراد نہیں جیسا آیۃ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ میں بقرینہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ یہی عبادت مراد ہے اور عبادت دعا سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ تمہاری عبادت کی حقیقت محض دعا و التجا ہے جیسے کوئی شخص ڈوبتا ہو تو وہ دوسروں کو پکارتا ہے پس آپ کی عبادت کا صرف یہ درجہ ہے اس کے بعد جو کچھ ہے حق تعالیٰ کی عطا و فضل ہے اگر ہم اپنی عبادت پر ناز کرنے لگیں تو اس کی ایسی مثال ہوگی ڈوبنے والے کی پکار سنکر کسی نے اس کو بچا لیا ہو اور وہ ڈوبنے والا اس کے بعد فخر کرنے لگے کہ میں شناور ہوں ارے تجھے خبر بھی ہے کہ دوسرے نے تجھکو بچا لیا ورنہ محض پکارنے سے تو کہاں بچ سکتا تھا اور حقیقت میں ہمارا تو پکارنا بھی اُن ہی کی عطا ہے اگر وہ طلب دل میں پیدا نکریں تو ہم سے پکارنا بھی نہو سکتا مولانا فرماتے ہیں ؎

ہم دعا از تو اجابت ہم زتو   ایمنی از تو مہابت ہم زتو

اس کے بعد فرماتے ہیں فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي کہ جب ہم تمہارا کام کر دیتے ہیں اب تم بھی ہمارا کہنا مانو کہ میری باتوں کی تصدیق کرو اور عملاً اس کی تعمیل کرو لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ تاکہ تم کو رشد و فلاح حاصل ہو اور ہدایت میں ترقی ہو (یہ ترجمہ لفظی نہیں حاصل ہوا) اس میں بتلا دیا کہ ہم جو تم سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا کہنا مانو اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس کا نفع بھی تمہارے ہی لئے ہے اب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میرا کہنا مانو ایسا ہے جیسا ہم بچے سے کہا کرتے ہیں کہ میاں ہماری ایک بات مان لو اور وہ یہ ہے کہ کھانا کھا لو اس عنوان سے اس پر گرانی نہو گی اور وہ اپنے کام تمہاری خاطر سے کرے گا اسی طرح یہاں اللہ تعالےٰ

ع جو دعا سے مراد میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں" پارہ ۲۴ رکوع ۱۲

نے جو کام بتلایا ہے وہ ہمارا ہی کام ہے ہمارے ہی فائدہ کا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانا ہے کہ اس کو اپنا کام قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہمارا کہنا مان لو یہ تو مختصر طور سے آیت کی تفسیر تھی اور اصل مقصود اکمال کا بیان کرنا تھا اب میں اصل مقصود کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں پس سنئے کہ اللہ تعالیٰ نے اکمال عدت کی مقصودیت کو بیان فرمایا ہے کہ ہم نے احکام صوم میں آسانی کی رعایت اس لئے کی ہے تاکہ اس مدت کو جو روزہ کے لئے مقرر کی گئی ہے پورا کر لو ہر چند کہ اس عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکمال عدت خود مقصود ہے مگر درحقیقت خود اس سے مقصود ایک دوسری چیز ہے جس کے لئے اکمال عدت ذریعہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ ذرائع کو بھی مقصود بنا کر سکھلاتے ہیں تاکہ بندہ ذریعہ کا پورا اہتمام کرے تو نتیجہ اس پر خود مرتب ہو جائیگا اور یہی اصول صوفیہ نے قرآن سے سیکھا ہے چنانچہ وہ طالبین کو یہی تعلیم کرتے ہیں کہ مقصود عمل ہے وصول مطلوب نہیں کیونکہ عمل اختیاری ہے اور وصول غیر اختیاری ہے تم عمل کے مکلف ہو اسی کو مقصود سمجھکر بجا لاتے رہو اس پر وصول خود مرتب ہو جائیگا اب سمجھئے کہ وہ مقصود کیا ہے جس کے لئے اکمال عدت اصل میں ذریعہ ہے وہ تقویٰ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صوم کے ذکر میں ابتداء ہی بیان فرمایا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ اور تقویٰ کی حقیقت ہے دنیا میں گناہوں سے بچنا اور آخرت میں عذاب سے نجات پانا یہ نفع ہے اکمال کا اس کے بعد یہ بھی سمجھئے کہ اکمال عدت کے دو درجے ہیں ایک اکمال ظاہری کہ رمضان کا پورا مہینہ روزوں میں تمام ہو جائے ایک اکمال معنوی کہ اس پر یہ غایت مرتب ہو جو اکمال سے مطلوب ہے پس روزہ کا حقیقی پورا کرنا یہ ہے کہ ہم ہر دن یہ دیکھتے رہیں

[illegible] پ ۲ ع ۷

کہ گناہوں سے کسقدر بچے اور آئندہ کیلئے کس قدر اہتمام کیا۔ اگر یہ غایت مرتب نہوئی تو اکمال عدت محض ظاہری ہوگی حقیقی اکمال حاصل نہوگا اسی لیے حدیث میں ہے مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ اَنْ یَّدَعَ شَرَابَهٗ وَطَعَامَهٗ جو شخص روزہ میں بیہودہ باتیں اور بیہودہ کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کچھ پرواہ نہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ کو اکمال عدت کا یہ درجہ مطلوب ہے جس پر تقویٰ مرتب ہو پس ہم کو اپنی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ ہم رمضان میں گناہوں سے کس قدر بچے اور کتنا اس کا اہتمام کیا افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ ہم لوگوں کو روزہ میں گناہوں سے بچنے کا ذرا بھی اہتمام نہیں ہماری حالت وہی ہے جو پہلے تھی بلکہ بعضوں کے تو رمضان میں گناہ پہلے سے بھی بڑھ گئے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا مذاق یہ ہے

ہر گناہے کہ کنی در شب آدینہ کن   تا کہ از صدر نشینان جہنم باشی

یہ وہ بیباک لوگ ہیں جن کو متبرک زمانہ میں بھی تنبہ نہیں ہوتا کہ اس زمانہ میں گناہ کرنے کا وبال اور دنوں سے زیادہ ہے قاعدہ سے تو یہ چاہیئے تھا کہ جن لوگوں نے ان متبرک دنوں کو یوں برباد کیا ہے ان کے لئے ان ایام کی مکافات کا کوئی طریقہ نہ ہوتا مگر خدا تعالےٰ کی رحمت بے انتہا ہے وہ اب بھی رحمت کرنے کو موجود ہیں اگر ان بقیہ دنوں کی درستی کرلی جائے اور اب تک کے گناہوں سے توبہ کرلی جائے۔ صاحبو! ہمیں اس رحمت کی قدر کرنا چاہیئے ورنہ پھر یہ وقت شاید نہ ملے۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایک اور اندیشہ ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا نہ لگ جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو بددعا دی ہے جس نے رمضان میں بھی اپنے گناہوں کی مغفرت نہ کرائی ہو

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تین شخصوں کو بد دعا دی ہے ایک وہ جس نے اپنے باپ ماں دونوں کو یا ایک کو ان کے بڑھاپے میں پایا اور ان کو خدمت وغیرہ سے راضی کرکے جنتی نہ بنا دوسرے وہ جس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام نہیں بھیجا تیسرے وہ جس نے رمضان کو ختم کر دیا اور اپنے گناہوں کی مغفرت نہیں کرائی کیا حضورؐ کی بد دعا سے بچنا ضرور نہیں اس لئے اس کا اہتمام ضروری ہے کہ کم ازکم رمضان میں تو گناہوں سے بچنے کا اہتمام کیا جائے اور پچھلے گناہوں سے توبہ کی جائے مگر قربان جایئے حضورؐ کے کہ گو آپ نے بظاہر ان لوگوں کو بد دعا دی ہے مگر بد دعا بھی ایسے عنوان سے ہے جسمیں دعا کی بھی جھلک ہے کیونکہ آپنے رَغِمَ اَنْفُہٗ رَغِمَ اَنْفُہٗ فرمایا ہے کہ اسکی ناک خاک میں ملے یہ ایسی بد دعا ہے جیسے قدسیہ بیگم والیہ بھوپال اپنی باندیوں کو غصہ میں کہا کرتی تھی کہ تمھارے چوٹی کٹوا کے تمکو گدھے پر سوار کرا ونگی پھر سب کو حج میں ساتھ لیگئیں اور وہاں احرام کھولتے ہوئے سبکی چوٹیاں کٹیں اور عمرہ لانے کیلئے گدھے پر بھی سوار ہونیکا موقعہ ہوا ہوگا اسی طرح رَغِمَ اَنْفُہٗ کے معنی یہ ہیں کہ اسکو سجدہ کی توفیق ہو اور یہ اس موقعہ کے مناسب بھی ہے کیونکہ گناہ بعد کا سبب ہے اور سجدہ قرب کا سبب ہے خلاصہ یہ ہوا کہ رمضان کا رنگ کیساتھ پورا ہو جانا بڑی نعمت ہے کیونکہ اس سے ہمکو گناہوں سے بچنے کی توفیق ہوتی ہے اور آخرت میں جہنم سے نجات ہوگی پس ہمکو خوش اسلوبی کیساتھ رمضان کو پورا کرنا چاہئے اور خوش اسلوبی یہی ہے کہ گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کیا جائے اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں اور آخیر میں اتنی بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آج میں نے جس طرح ان آیات کی تفسیر بیان کی ہے اس سے آپکو معانی قرآن اور بلاغت قرآن کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ قرآن کی تعلیم کیسی پاکیزہ ہے اس کا طرز بیان کیسا بلیغ ہے اسکی آیات واجزا آیات میں کیسا عجیب ربط ہے اسمیں ہمارے جذبات کی کیسی رعایت ہے پس آج قرآن کا کچھ نمونہ

آپ کے سامنے بیان کر کے میں یہ عرض کروںگا کہ میرا یہ بیان پہلے بیان سے مرتبط ہے جو شعبان میں ہوا تھا کہ اس میں الفاظ قرآن کے حسن کا بیان تھا آج معانی قرآن کے حسن کا بیان تھا حالانکہ میں پوری طرح اسکے حسن کو بیان نہیں کر سکا مگر ان شاء اللہ کچھ تو نمونہ آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا جسکے بعد آپ یہ ضرور کہیں گے کہ قرآن کی شان یہ ہے

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد ۔۔۔ برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اور اس کی یہ شان ہے

مخدرات سراپردہ ہائے قرآنی ۔۔۔ چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی

واقعی کسی نے سچ کہا ہے

چیست قرآن اے کلام حق شناس ۔۔۔ رونمائے رب ناس آمد بناس

حرف حرفش را عدد در ہر معنے ۔۔۔ معنے در معنے در معنے

واللہ قرآن کے حسن کی حالت یہ ہے کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ۔۔۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

بس اب میں مقصود عرض کر چکا مکرر پھر عرض کرتا ہوں کہ ان بقیہ ایام رمضان کی بہت قدر کرنا چاہئے آمیں نماز کا اور خصوصاً تراویح کا اہتمام کرنا چاہئے مگر جو حافظ اجرت لیکر قرآن سنائے اسکے پیچھے تراویح نہ پڑھیں اس سے افضل یہ ہے کہ الم ترکیف سے تراویح پڑھ لی جاوے اور اگر ہمت ہو تو رمضان کے بقیہ ایام میں اعتکاف کا بھی اہتمام کیا جائے اعتکاف بڑی اچھی عبادت ہے جسکی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے کو خدا کے دروازہ پر ڈالکر زبان حال سے یوں عرض کرتا ہے کہ

خسرو غریب ست و گدا افتادہ در کوئے شما ۔۔۔ باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

کہ اے اللہ ہم چاہے اچھے ہیں یا برے ہیں آپ ہی کے ہیں اور آپ ہی کے در کے سوا ہمارے لئے کوئی دوسرا در نہیں اس کا جماعہ اثر ہوتا ہے اسکو ایک مثال سے سمجھئے ایک غلام اپنے آقا سے یوں کہہ رہا تھا

ترا بندہ چوں من بسے ۔۔۔ مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

کہ آپ کو تو مجھ جیسے غلام اور بھی مل سکتے ہیں مگر مجھے آپ سے بہتر آقا نہیں مل سکتا اسکا اثر جو کچھ ہوا ہوگا دل کو معلوم ہے ایک اور حکایت شیخ نے لکھی ہے کہ ایک بزرگ رات کو تہجد میں اٹھے غیب سے ندا آئی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں اور یہ آواز اس طور سے آئی کہ ایک مرید نے بھی سنلی پیر کہتے وہ حالت بہت سخت ہے جسمیں مرید بھی اس سے چھڑنے لگیں مگر عارف اسکی پروا نہیں کرتا اسکے معمولات میں ذرا فرق نہیں آیا کرتا چنانچہ وہ بزرگ تہجد میں مشغول ہوگئے اور اگلی رات آئی تو معمول کے موافق پھر تہجد کو اٹھے ایک عاشق مرید کو پیر کی اس حالت پر ترس آیا اور اسنے کہا کہ جب وہاں کچھ قبول ہی نہیں تو آپ کیوں مشقت برداشت کرتے ہیں پڑے سو رہیے شیخ آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا ؎

توانی ازاں دل بپرداختن ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

کہ بیٹا یہ تو صحیح ہے کہ انکے یہاں میرا عمل مقبول نہیں مگر انکو چھوڑ کر کیسے بیٹھ رہوں کہ دوسرا بھی تو کوئی نہیں بس یہ کہنا تھا کہ رحمت کو جوش آیا اور غیب سے دوسری آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کہ جز ما پناہے دگر نیستت

کہ جاؤ تمہاری اس بیکسی پر رحم کرکے تمہارے لئے دوسرا کوئی دروازہ نہیں ہمنے تمکو قبول کرلیا بس اعتکاف کی حقیقت یہی ہے کہ بندہ یہ کہکر اپنے کو کریم کے دروازے پر لا ڈالے کہ آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ؎

میفگن کہ دستم نگیرد کسے

انشاء اللہ یہ عبادت ضرور رنگ لائے گی۔

ایک عبادت رمضان میں قابل اہتمام یہ ہے کہ لیلۃ القدر کی تلاش کیجائے حدیث میں آتا ہے کہ عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں اسکو تلاش کرو۔ اگر کسی کو سب میں جاگنے کی ہمت نہ ہو تو کم از کم ستائیسویں رات میں تو ضرور جاگ لے یعنی اور راتوں سے کچھ زیادہ جاگ لے تمام رات جاگنا شرط نہیں اور آپ جسقدر سو سکے نماز میں پڑھتا

رہے جب اس سے تھک جائے تلاوت قرآن یا ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے متنبّہ
رات کے متعلق بہت سے حضرات صحابہ کا جزم ہے کہ لیلۃ القدر یہی ہے
مگر اس کے متعلق بعض لوگوں کو شاید ایک فلسفی شبہ پیدا ہوگا وہ یہ کہ چاند میں آجکل اختلاف
ہے تو جو رات یہاں ستائیسویں ہوگی وہ بعض جگہ اٹھائیسویں ہوگی تو کیا لیلۃ القدر
دو ہونگی اور ایک ہوئی تو کسکی رؤیت کا اعتبار ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو خبر
بھی ہے کہ وہاں رات دن نہیں ہیں اور یہ تو خود اہل سائنس والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ
لیل و نہار کرۃ النسیم سے نیچے ہی نیچے ہیں کرۃ النسیم کے اوپر رات دن نہیں
بلکہ یکساں حالت ہے یہ جواب جب میرے دل میں آیا بڑی خوشی ہوئی اور
اس سے ایک بات اور [illegible] آئی ہے وہ یہ کہ معراج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ
نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر بیان فرمائی ہے سیر سماوات کا ذکر نہیں فرمایا
جس سے بعض اہل باطل نے سیر سماوات کی نفی پر استدلال کیا ہے تو وہاں سیر سماوات
کا ذکر اس واسطے نہیں کیا گیا کہ وہاں لیلاً کی قید بھی مذکور ہے پس ضروری ہوا کہ اس قدر سیر
بیان کی جائے جو لیل کے اندر واقع ہوئی اور ظاہر ہے کہ سیر سماوات لیلی نہ تھی کیونکہ سماوات پر لیل و نہار کا
تحقق ہی نہیں تو اس سے سیر سماوات کی نفی پر استدلال محض لغو ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر سماوات
رات میں نہیں ہوئی سو یہ مسلم ہے بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ وہ تو نہ دن میں ہوئی نہ رات
میں وہ تو ایسے مقام پر ہوئی ہے جہاں رات ہے نہ دن بہر حال وہاں لیل و نہار
نہیں ہے اس واسطے لیلۃ القدر کی جو شان و برکات ہیں وہ لیل و نہار کے ساتھ مقید
نہیں بلکہ ارادۂ حق کے تابع ہیں تو اس کی مثال بارش کی طرح ہے کہ یہاں کے
کرۃ النسیم کے نیچے آج بارش ہے اور کلکتہ کے کرۃ النسیم کے نیچے کل بارش ہے
اگر شب قدر بھی ایسی ہو کہ یہاں آج ہے اور کلکتہ میں کل ہے تو اس میں
اشکال کی کیا بات ہے آخر بارش میں کیا ایسا اختلاف نہیں ہوتا پھر معنوی
بارش برکات میں ایسا اختلاف ہو تو کیا تعجب ہے اس لئے بیفکر ہو کر آپ اپنی
ہی تاریخوں کے حساب سے کام کیجئے اللہ تعالیٰ تو سب کی نیتوں کو اور کام کو دیکھتے ہیں

دیکھو انکے عادات کے موافق لیلۃ القدر کی برکات عطا فرما دیں گے پس رمضان کو اسطرح خوش اسلوبی سے گزاریئے کہ جو دن رہ گئے ہیں ان میں طاعات کا اہتمام کیجئے اور گناہوں سے دور رہئے تاکہ یہ خوش ہو کر آپ سے رخصت ہو کر جناب باری میں شفاعت کرے کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ قرآن اور صوم دونوں قیامت میں روزہ دار کی شفاعت کرینگے قرآن کہے گا کہ خداوندا میں نے اسکو نیند سے اور آرام سے روکا تھا میری شفاعت اسکے حق میں قبول کیجائے۔ روزہ کہے گا کہ میں نے اسکو کھانے پینے اور شہوت پورا کرنے سے روکا تھا میری شفاعت اسکے حق میں قبول کیجئے۔ یہ ہے حقیقی وداع رمضان اسلئے جو آخری جمعہ میں لوگ الوداع یا شہر رمضان پڑھا جاتا ہے وہ تو بدعت ہے شریعت میں اسکا کہیں ثبوت نہیں اور ہمارے حاجی صاحب قدس سرہ کے استاد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جیسے رمضان کے جانے کا غم ہوتا ہے اسکے آنے کی خوشی بھی ہونی چاہئے تو اگر جانے پر خطبہ الوداع پڑھتے ہو تو آنے پر بھی ایک مرحبا کا پڑھنا چاہئے کہ مرحبا مرحبا یا شہر رمضان خصوصاً جبکہ یہ دیکھا جائے کہ اظہار سرور کی تو شریعت میں اصل بھی ہے اور اظہار غم کی کوئی اصل نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آنے سے پہلے تو مسلمانوں کو رمضان کیلئے مستعد ہونے کا ارشاد فرمایا ہے جانے کے وقت کوئی حسرت صریح ظاہر نہیں فرمائی۔ الحمد للہ کہ ضرورت کے موافق احکام رمضان کے متعلق کافی بیان ہو چکا صرف ایک جملہ رہ گیا ہے کہ عید کے دن صدقۂ فطر ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے کیونکہ یہ بھی صوم رمضان ہی کا مکمل ہے حدیث میں ہے کہ روزہ کے متعلق حقوق و آداب میں جو کچھ کوتاہی ہو جاتی ہے صدقۂ فطر سے اسکا کفارہ ہو جاتا ہے اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمکو توفیق عمل دے اور فہم علم عطا فرمائے آمین وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖٓ اَجْمَعِيْنَ ۝ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اشرف علی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ

المسمیٰ بہ

شب مبارک

الاشتات	المستمعون	مَن ضبط	[illegible]	ماذا	[illegible]	کیف	کم	متیٰ	این
متفرقات	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]		[illegible]					[illegible]	[illegible]	[illegible]

خطبہ ماثورہ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
حٰمٓ ۝ وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ ۝ فِیْھَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ ۝ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ط اِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ ۔ یہ آیتیں سورہ دخان کی شروع کی ہیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کتاب کو برکت والی رات میں نازل کیا ہے ایک قول پر اسکی تفسیر اس رات سے بھی کیگئی ہے جو قریب آنیوالی ہے یعنی شعبان کی پندرھویں شب لیکن اگر یہ تفسیر ثابت

بھی نہ ہو تب بھی اُس رات کی فضیلت کچھ اس آیت پر موقوف نہیں احادیث سے اس کی فضیلت ثابت ہے مگر یہ بات طالب علما نہ باقی رہی کہ اگر یہ تفسیر ثابت نہ ہو تو پھر لیلۃ مبارکۃ سے کیا مراد ہوگا سو دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے لیلۃ القدر مراد ہے اسی کو لیلۃ مبارکۃ بھی فرما دیا گیا بہرحال اس آیت کی تفسیر قریب آنیوالی رات کے ساتھ گو متیقن نہیں مگر محتمل ضرور ہے اور وہ قریب آنیوالی شب شب برات ہے جو شعبان کی پندرہویں رات ہے جو کل کا دن گذر کر آنیوالی ہے اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ اس رات کے کچھ فضائل کا اور ان منکرات کا جو آجکل اسمیں اختیار کئے جاتے ہیں ذکر کر دیا جاوے سو اس تفسیر محتمل پر حق تعالیٰ نے قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے کتاب مبین (قرآن) کو اس برکت والی رات میں نازل کیا اسواسطے کہ ہم منذر یعنی ڈرانیوالے تھے اسی انذار کیلئے قرآن نازل فرمایا آگے اس رات کے بابرکت ہونیکی علت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس رات کی شان یہ ہے کہ اسمیں فیصلہ کیا جاتا ہے ہر امر حکمت والے کا کہ وہ ہمارے پاس سے ہوتا ہے اور حکیم کی قید واقعی ہے احترازی نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے تمام امور باحکمت ہی ہیں انمیں کوئی بےحکمت نہیں مطلب یہ ہے کہ تمام امور کا فیصلہ اس رات میں ہوتا ہے یا یوں کہو کہ کل امر حکیم سے مراد امور عظیمۃ الشان ہیں یعنی بڑے بڑے کاموں کا فیصلہ اس رات میں ہوتا ہے باقی چھوٹے امور تو عرفاً بڑے امور کے ذکر سے وہ خود مفہوم ہوگئے پس بڑے امور اصالۃً اور چھوٹے امور تبعاً غرض سب امور آیت میں داخل ہوگئے اب یہ شبہ رفع ہوگیا کہ روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جملہ امور کا فیصلہ ہوجاتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ معظم امور فیصل ہوتے ہیں وجہ رفع یہ ہے کہ چھوٹے امور بڑوں کے تابع ہوکر فہم میں آہی جاتے ہیں۔ اور مشہور تفسیر اس آیت کی اکثر کے نزدیک یہی ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہی شب براءت مراد نہیں کیونکہ دوسری جگہ ارشاد ہے إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ کہ ہم نے قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا اور یہاں فرماتے ہیں کہ ہم نے لیلۃ مبارکۃ میں نازل کیا اور یہ ظاہر ہے کہ نزول سے مراد دونوں جگہ نزول دفعی ہے تدریجی نہیں کیونکہ وہ تو ۲۳ سال میں ہوا اور نزول دفعی ایک ہی مرتبہ ہوا ہے اسلئے لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہوگی یہ قرینہ قویہ ہے اس بات کا کہ یہاں بھی لیلۃ القدر ہی مراد ہے لیکن ایک قول بعض کا یہ بھی ہے کہ

لیلۂ مبارک سے مراد شب برات ہے باقی رہا یہ اعتراض کہ اس سے لازم آتا ہے کہ نزول دفعی دو مرتبہ ہو تو اسکی توجیہ یہ ہے کہ نزول دفعی دو مرتبہ بھی اسطرح ہو سکتا ہے کہ ایک رات میں حکم نزول ہوا اور دوسری میں اسکا وقوع ہوا یعنی شب برات میں حکم ہوا کہ اس دفعہ رمضان میں جو لیلۃ القدر آئیگی اسمیں قرآن نازل کیا جائیگا پھر لیلۃ القدر میں اس کا وقوع ہو گیا اور یہ بات کلام میں شائع ذائع ہے کہ قرب کو وقوع کے حکم میں کر دیتے ہیں مطلب یہ کہ اَنْزَلْنَاهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ میں مراد حقیقی نزول ہے کہ وہ لیلۃ القدر میں ہوا ہے اور اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبَارَکَةٍ میں حکمی نزول ہے کہ شب برات میں ہوا ہے اور دونوں راتیں ہیں قریب قریب اسلئے بقرب نزول کو نزول کے حکم میں کر دیا ہے چنانچہ ظاہر تو یہی ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد شب قدر ہے مگر احتمال اسکا بھی ہے کہ شب برات مراد ہو مگر جہاں تک اتفاق ہوا اور جو کتابیں نظر سے گذریں ان میں کوئی حدیث مرفوع اسبارہ میں نظر سے نہیں گذری درمنثور میں بروایت ابن جریر ابن المنذر وابن ابی حاتم عکرمہ سے یہ تفسیر منقول ہے۔ البتہ شب برات کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ اس میں تمام امور جیسے موالید و وفیات و رفع اعمال و نزول رزاق فیصل ہوتے ہیں اس سے۔ بعض سلف نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد یہی رات مراد ہے لیلۃ القدر مراد نہیں ورنہ اس آیت کی برابر اسمیں بھی واقعات کا فیصلہ ہونا لازم آئیگا تو دو راتوں میں فیصلہ ہونے کے کیا معنی دوسری یہ کہ واقعات کا تو شب برات میں فیصلہ ہونا احادیث سے ثابت ہے وہ کون سے واقعات ہیں جنکا فیصل ہونا شب قدر میں باقی رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد شب برات ہی ہے پھر یہ کہ شب برات میں ایک سال کے واقعات کا فیصل ہونا حدیثوں میں آیا ہے اور شب قدر سال گذرنے سے پہلے رمضان میں آجاتی ہے تو اس میں کیا مکرر فیصلہ ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں دو صورتیں نکلتی ہیں کیونکہ عادۃً ہر فیصلہ کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک تجویز ایک نفاذ پس یہاں بھی یہی دو مرتبے ہو سکتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تجویز تو شب برات میں ہو جاتی ہے اور نفاذ لیلۃ القدر میں ہوتا ہے اور اتنی کسقدر فیصل ہونا بعید نہیں تجویز کو قدر کہتے ہیں اور حکم کے نافذ کر دینے کو قضا کہتے ہیں کہ شب برات میں تجویز ہوتی ہے اور لیلۃ القدر میں اسی کا نفاذ ہوتا ہے اس تقریر سے سارے اشکالات

کا جواب ہوگیا غرض آیت میں لیلہ مبارکہ سے مراد جو کچھ بھی ہو لیکن احادیث سے تو اس رات کا بابرکت ہونا معلوم ہوتا ہی ہے اور یہ نعمت ہے خدا تعالیٰ کی اسکی قدر کرنا چاہئے دنیا میں اگر کسی ایسے کام کی خبر ملجاتی ہے جسمیں منافع ہو تو عقلاً اسکی کیسی قدر کرتے ہیں اور ذرا سے نفع کی بھی چیز ہو اسکو احتیاط سے رکھ چھوڑتے ہیں کہ کسی موقعہ پر کام آئیگی مثل مشہور ہے "داشتہ آید بکار" مجھکو ایک واقعہ یاد آیا جب میں حج کو گیا تھا تو لکھنؤ کی ایک ماما بھی حج میں تھیں جو گھر میں میرا کھانا پکاتی تھیں وہ مدینہ طیبہ بھی گئی تھیں انہوں نے بڑی ہمت کی تھی کہ پیدل راستہ چلکر گئیں تھیں جب مدینہ طیبہ سے واپس آئیں تو ایک پتھر میرے سامنے پیش کیا میں نے کہا کہ یہ کاہے کے واسطے لائیں تو کہنے لگیں کہ مدینہ شریف سے نکلکر ایک پہاڑ پر یہ پتھر نظر آیا میں نے خیال کیا کہ بڑا اچھا ہے اس کو لیچلو چنانچہ لے آئی میں نے کہا غضب ہو کتنی دور سے بوجھ لائی ہو یہ تو دو حیثیت سے متبرک ہے ایک تو یہ کہ مشقت کا ہے دوسرے مدینہ طیبہ کا ہے سو بنا پتھر کے اٹھانیکی یہ تھی کہ کام کی چیز تھی فرق ادنیٰ اعلیٰ سب میں کام کی چیز کی قدر ہوتی ہے جب ہم دنیا کی چیز دنمیں ذرا ذرا سی چیز کی قدر کرتے ہیں پھر تعجب ہے کہ خدا و رسول کی قدر کی چیز ہاتھ آئیں اسکو ضائع کر دیا جاوے چنانچہ ہمیں ان تاریخوں میں جاگنے کی بہت کم توفیق ہوتی ہے خصوصاً طلبا کو وہ تو یوں کہکر ختم کر دیتے ہیں کہ اس رات کی عبادت کے علاوہ اور بھی تو بہت سے کام ثواب کے ہیں سو وہی اللہ میاں کے یہاں استغفار بھی تو ہے وہی پڑھینگے یا اور کوئی نیک کام کر لینگے اپنے دل میں اس قسم کی تاویلیں کر لیتے ہیں اگر طالب علمی میں یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے کہ مستحبات کی قدر نہیں رہتی جبتک منیۃ المصلی نہیں پڑھی تھی تو نفلیں پڑھا کرتا تھا جب منیہ پڑھی اور اسمیں مستحب کی تعریف پڑھی تو نفس کے قید میں آکر یہ خیال ہوا کہ اگر مستحب نہ کرینگے تو کچھ مواخذہ تو ہوہی گا نہیں اسلئے بہت سی ایسی مستحبات ترک ہونے لگے۔ واقعی ہماری یہ حالت ہے

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند ⁛ چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس ⁛ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

نفس میں عجیب عجیب کید ہیں حتی کہ یہ جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں تعجب نہیں کہ اس میں بھی نفس کی شرارت ہو احتمال ہے کہ اس میں بھی نفس نے کید کر رکھا ہو کہ اپنی کوتاہیاں ظاہر کر کے اپنے صدق کو ظاہر کیا جا رہا ہو نفس سے کسی وقت مطمئن نہ ہونا چاہئے نفس کی

نعمت کی قدر کرنا چاہئے اور [illegible]

امور خیر میں طلبا کی کوتاہی [illegible]

نفس کے کید [illegible]

تو یہ حالت ہے ؎

نفس از دِرہاست او کے مردہ است ❊ از غم بے آلتی افسردہ است

اس کا کشتہ اور گرفتار کرنا ہر ایک کا کام نہیں یہ مکار شیطان سے بھی بڑھکر ہے کیونکہ اسکو بھی نفس ہی نے تو خرابی میں ڈالا تھا وہ بالذات تو بدذات نہیں تھا نفس ہی کے کید میں آکر بدذات ہوا تو یہ شیطان کا بھی باپ ہوا اسی لئے یوسف علیہ السلام حالانکہ نبی ہیں فرمارہے ہیں علیہ السلام إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي یعنی اصل بات تو یہی ہے کہ نفس فی ذاتہ امارہ بالسوء ہے مگر جسکو اللہ میاں اپنی رحمت سے محفوظ رکھیں جیسے انبیاء وہ مستثنےٰ ہیں اگر عوارض کی وجہ سے نفس اپنے کید سے باز بھی رہے تو عوارض کے اُٹھ جانے پر پھر وہی حالت ہوگی اسلئے نفس کا کید مثل فطرت کے ہوگیا چاہے انسان مقامات ولایت میں بڑی دور تک بھی پہونچ جائے مگر نفس سے نجات نہیں ہے اس سے تو ہمیشہ سوء ظن ہی چاہئے کہ احتیاط سوء ظن ہی ہے چنانچہ مشہور ہے الحزم سوء الظن اسکی تفسیر میں ہمارے حضرت نے فرمایا تھا کہ بنفسہٖ یعنی دانائی واحتیاط یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس سے سوء ظن ہی رکھے کسی وقت مطمئن نہ ہو ہمیشہ کھٹکتا رہے اگرچہ حکماء نے اس جملہ کے دوسرے معنی لئے ہیں وہ یہ کہ انسان کو کسی پر اعتماد نہ چاہئے ہر شخص پر بدگمان رہے احتیاط رکھے چاہے وہ کیسا ہی مخلص دوست ہو اور معاملہ کے اعتبار سے یہ بھی صحیح ہے مگر عارفین یہ کہتے ہیں کہ دوسروں سے تو حسن ظن رکھے اور اپنے نفس سے سوء ظن رکھے چنانچہ یوسف علیہ السلام سے زیادہ کون ہوگا مگر وہ پھر بھی اپنے نفس سے بدگمان تھے اور جب اکابر نفس سے احتیاط کرتے رہے حالانکہ نفس اُن سے بعید تھا تو ہم لوگوں سے تو نفس بہت ہی قریب ہے ہمکو بہت احتیاط چاہئے بخصوص طالب علموں کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں کسی عمل کا استحباب کا حکم معلوم ہوا بس فضائل کو چھوڑ دیا جہلاء تو مستحبات کو کرہی لیتے ہیں مگر لکھے پڑھے بالکل نہیں کرتے الا ما شاء اللہ بس یہ نفس کا بڑا کید ہے جس نے اہل علم کو بہت سی برکات سے محروم کر رکھا ہے اس سے بچنا چاہئے اور مستحبات وفضائل کی بھی بیقدری نہ کرنا چاہئے چنانچہ یہ رات جو آنے والی ہے یہ بھی بہت قابل قدر ہے اس سے محروم نہ رہنا چاہئے بلکہ اگر لیلۃ القدر باعتبار معنی لغوی کے لیا جاوے تو ہر رات لیلۃ القدر اور قابل قدر ہے جیسا کسی نے کہا ہے ؎

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی ❊ ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

صاحبو! ہر روز نعمت ہے اور ہر رات دولت ہے حدیث شریف میں ہے کہ ہر روز نصف شب کو بعد خدا تعالیٰ آسمان دنیا پر تجلی فرما کر بندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں دنیا ہمارا گھر ہے اور زمین فرش ہے اور گویا آسمان اوّل دنیا کی چھت ہے اور سقف بیت جزو بیت کہلاتی ہے تو گویا حق سبحانہ وتعالیٰ ہمارے گھر تشریف لاتے ہیں اور ہمکو یہ شرف نصیب ہوتا ہے کہ؎
امروز شاہ شاہان مہماں شدہ است مارا ٭ جبریل با ملائک دربان شدہ است مارا
غرض شاہنشاہ ہر روز ہمارے گھر تشریف لاتے ہیں اور متوجہ ہیں اور وعدے فرماتے ہیں ایک اور لطف دیکھئے اگر ہم کسی دوست کے دروازے پر جائیں خصوصاً مریدین کے دروازہ پر گو وہ بھی اہل اللہ کے نزدیک انکے دوست ہی ہیں خادم نہیں ہیں یا آجکل مغرور پیروں نے خیال کر رکھا ہے کہ مریدین کو اپنا خادم سمجھتے ہیں اور وہ گھر والے ہم سے نہ بولیں تو یقیناً انسے بیزار ہو جائیں اور اگر بیزار بھی نہ ہوں تو اسقدر تو شکایت ضرور کہیں گے کہ ہمسے بولے کیوں نہیں اور اگر وہ سوتے ہوں تو کہینگے کہ ایسا بھی کیا سونا ہے کہ ہمارے آنیکا کچھ بھی خیال نہ کیا بیچارے جرم قائم ہو جاوینگے خصوص اگر کہلا بھی بھیجا ہو کہ ہم تمہارے گھر آدھی رات کیبعد آئیں گے تو اس صورت میں ان مریدوں کو سونیکی بھی اجازت نہ ہوگی جسکی وجہ یہ ہے کہ ایسے پیروں کو اپنے حقوق پیش نظر رہتے ہیں اگرچہ وہ حقوق ویسے ہی کیوں نہوں اور جو واقعی اہل اللہ ہیں انکی حالت دیکھئے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ میرے پاس جو لوگ آتے ہیں انکی قدمونکی زیارت کو موجب نجات جانتا ہوں کیونکہ وہ یقیناً اچھے ہیں اور ان کے اچھے ہونے کی میرے پاس دلیل ہے وہ یہ کہ وہ میرے ساتھ باوجود میرے ناچیز ہونے کے حسن ظن رکھتے ہیں غرض ہماری تو یہ حالت ہے کہ حقوق وہمیہ کی کمی پر بھی ناراض ہو جاتے ہیں اور حق سبحانہ تعالےٰ کو خیال کیجئے کہ باوجود اسکے کہ ان کے حقوق واقعی ہیں مگر آپ تشریف آوری کی خبر دینے کے بعد بھی تشریف لاکر ہمکو سوتا ہوا دیکھکر بھی ناراض نہیں ہوتے اور یہ فرماتے ہیں کہ اس بندہ نے ایک مستحب ہی تو ترک کیا ہے اللہ میاں ہم کو بے مروتی کا الزام بھی نہیں دیتے کیا ٹھکانا ہے اس رحم کا (خلاصہ مطلب اس تقریر کا یہ ہے کہ اگر ہم کسی دوست یا مرید کے مکان پہ جائیں اور وہ نہ بولے تو ہم کتنے برہم ہوں اور حق تعالیٰ ہمارے گھر روزمرہ تشریف لاتے ہیں اور ہم اسوقت پڑے سوتے رہتے ہیں۔

مگر وہ ہماری اس حالت کو دیکھکر ناراض نہیں ہوتے) اس عنایت کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم
سب بچھہ کرتے اسواسطے کہ جو آقا کبھی کچھ نہ کہتا ہو اسکے سامنے تو بچھل جانا چاہیئے تو گویا ہر
شب شب قدر اس معنی کر ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ ہر روز ہماری طرف متوجہ برحمت ہوتے ہیں اور
جو رات آنیوالی ہے (پندرھویں شب شعبان) اسکے تو خاص فضائل آئے ہیں اس معنی کر۔
اسکو مبارک کہنا درست ہے گو احادیث میں مبارک کا لفظ نہیں اور قرآن میں اگرچہ آیا ہے
مگر یہ تفسیر خود محتمل ہے مگر یہ احتمال اس لقب میں مضر نہیں کیونکہ برکت کی حقیقت ہے کثرت نفع اگر
اگر کسی چیز کا کثیر النفع ہونا ثابت ہو جائے تو اسکو مبارک کہنا صحیح ہوگا پس احادیث میں جو فضائل
اس رات کے مذکور ہوئے ہیں جب ان سے کثیر النفع ہونا معلوم ہوتا ہے تو اسکو مبارک کہنا صحیح
ہوگا گو مبارک کا لفظ نہ وارد ہوا ہو۔ اب برکت کی مناسبت سے اسکے متعلق کچھ ضروری بیان کرتا ہوں وہ
یہ کہ اسکی دو قسمیں ہیں ایک دنیوی ایک اخروی آجکل مدعیان ترقی کو ہمارا ممنون ہونا چاہیے
کہ منافع دنیوی کی تحصیل سے منع نہیں کرتے اتنا فرق ہے کہ ہم اسکو برکت سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ
ترقی کے لفظ سے اگر وہ اسی لفظ کو اختیار کر لیتے تو اچھا تھا ترقی کے لفظ کو اختیار کرکے انہوں نے
علماء کو اپنا مخالف بنا لیا کیونکہ انہوں نے اسکے معنی میں کوئی قید نہ رکھی مگر ہماری مخالفت ان سے
ایسی ہے جیسے باپ کو بچے کے ساتھ ہوتی ہے کہ جب بچہ بے راہی اختیار کرتا ہے تو باپ اسکا مخالف
ہوتا ہے اور اسکو مارتا بھی ہے یا جیسے ماں بیمار بچہ کی مخالفت کرتی ہے کہ بچہ اپنی طبیعت کے موافق
غذائیں مانگتا ہے مگر ماں اسکو نہیں دیتی بلکہ بسا اوقات ضد کرنے پر اسکو مارتی بھی ہے اور وجہ اسکی
یہ ہوتی ہے کہ ان دونوں مثالوں میں دو قسم کے ضرر متعارض ہیں ایک اہون اور ایک اشد ماں باپ اشد
الضررین سے بچانے کے لئے اہون کو اختیار کرتے ہیں اور یہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے
ضرر جمع ہوں ایک اشد اور دوسرا اہون تو اہون کو اختیار کرنا چاہیے مثلاً باپ نے جو بے راہی کرنے
پر بچہ کو مارا تو یہ بھی بچہ کے حق میں ایک درجہ کا ضرر ہے اور دوسرا ضرر یعنی بے راہی
اس سے اشد ہے کیونکہ اگر بچہ بے راہی اختیار کئے رہا تو اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا
مثلاً وہ پڑھتا نہیں یا بری صحبت میں بیٹھتا ہے کہ اس سے آئندہ اُس کو بہت ضرر ہوگا۔
اور یہ ضرر پہلے ضرر سے اشد ہے اسلئے باپ نے اہون کو اختیار کیا تاکہ بچہ اشد الضررین

سے محفوظ رہے اسی طرح ماں جو بیمار بچہ کو مختلف غذاؤں سے روکتی ہے حالانکہ یہ بچہ کے حق میں ایک گونہ مضر ہو مگر پھر بھی اسکو اختیار کرتی ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ یہاں بھی دو قسم کے ضرر جمع ہیں ایک اشد دوسرا اہون۔ اہون ضرر تو غذا سے روکنا ہے اور اشد ضرر وہ ہے جو غذا کے دینے سے ہوگا وہ یہ کہ اگر بچہ کو اسکی منشا کے موافق غذا دیجائیگی تو بیماری بڑھ جائیگی اور ہلاکت تک نوبت پہنچیگی اسلئے وہ اہون الضررین کو اختیار کرتی ہے اسی طرح ہم اسکو مانتے ہیں کہ بعض مشورے ہمارے ایسے ہیں کہ ان سے دنیا کا ایک گونہ ضرر ہے مگر چونکہ وہ ضرر اہون ہے کہ جو آنا دچھوڑ دینے پر پیش آئیگا ہے اس لئے اشد الضررین سے بچانے کے لئے اہون کو اختیار کیا گیا ہے اور وہ ضرر اشد کیا ہے دین کی خرابی ہے کہ اس سے زیادہ کوئی ضرر نہیں اگر اسکا نام مخالفت ہے تو باپ اور ماں اور استاذ سب مخالف ہیں اور واقع میں اہون کو اختیار کرنا تو اصلاح ہے مدعیان ترقی نے ہمیں خواہ مخواہ اپنا مخالف سمجھ لیا ہے ہمکو ماحی ترقی کہتے ہیں مگر واقع میں ہم ماحی نہیں ہم تو ایسی ترقی کے حامی ہیں کہ سات پشت تک اسکی برکت چلی جاوے اور ان کے پاس اپنے دعوے پر کہ انکی ترقی حقیقی ترقی ہے کوئی دلیل نہیں اور ہمارے پاس قرآن وحدیث سے دلیل موجود ہے مگر ہم اُن الفاظ سے بچتے ہیں جو قرآن وحدیث میں نہیں ہیں اور اُس لفظ کو اختیار کرتے ہیں جو قرآن میں ہے وہ کیا ہے برکت ہے جسکی حقیقت ہے کثرت خیر اگر کوئی اعتراض کرے کہ تم قرآن وحدیث سے تو صرف ترقی دین کی ثابت کروگے ترقی دنیا کا ثبوت کہاں ہے جواب یہ ہے کہ ہم ترقی دنیا کو بھی قرآن وحدیث ہی سے ثابت کیے دیتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث میں دنیا کیلئے بھی لفظ برکت اختیار کیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضؓ کیلئے اُن کے مال اور اولاد میں برکت ہونے کی دعا فرمائی تھی اس سے ثابت ہوا کہ ایک صحابی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترقی دنیا کی دعا دی تھی اب لوگ خوش ہوئے ہونگے کہ یہ بات تو ہمارے مطلب کی بتلا دی تو خوب سمجھ لیجئے کہ منافع دنیا کے دو درجے ہیں ایک وہ کہ جسمیں ضرر نہ ہو دین کا۔ اور دوسرا وہ کہ جسمیں ضرر ہو دین کا مولوی، پہلی ترقی کے حامی اور دوسری کے ماحی ہیں جیسا کہ گورنمنٹ کو باوجودیکہ حامی ترقی دنیا کہا جاتا ہے اور وہ اسکی حمایت کرتی ہے کہ رعایا ترقی کرے مگر باوجود حمایت ترقی

منافع دنیا کے دو درجے ہیں اور اسکی مثال اور دنیا کی ترقی ایک درجہ میں مطلوب ہے

کے یہ بھی گورنمنٹ ہی کا قانون ہے کہ ڈکیتی بڑا جرم ہے حالانکہ وہ بھی ترقی ہے اور ترقی بھی بھی کیسی کہ ایک ذات میں آدمی مالا مال ہو جاوئے مگر گورنمنٹ اُس ترقی کی حامی نہیں بلکہ ماحی ہے صاحبو! وہی قاعدہ تو مولویوں نے اختیار کیا ہے کہ بعضی ترقی کے حامی ہیں اور بعضی کے ماحی ہیں یعنی جو ترقی مضر دین نہ ہو اسکے حامی ہیں اور جو مضر ہو اسکے ماحی ہیں بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی بات اگر مولوی کریں وہ تو مردود ہو اور وہی بات گورنمنٹ کرے تو مقبول ہو تو دونوں جگہ ایک ہی ہے مگر حیرت ہے ایک جگہ مقبول ہو اور دوسری جگہ مردود ہو یہ تو ایسا ہی ہے جیسے دو طالب علم معقولی تھے اور تھے دونوں حقیقی بھائی بھائی۔ ایک نے دوسرے کو ماں کی گالی دی کسی نے کہا کہ وہ تیری بھی تو ماں ہے اس نے جواب دیا کہ میں اسکو اس حیثیت سے گالی دیتا ہوں کہ یہ اسکی ماں ہے اس حیثیت سے نہیں دیتا کہ میری ماں ہے یہی صورت یہاں بھی ہے کہ بات تو ایک ہے مگر مولوی کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے تو مردود اور گورنمنٹ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے مقبول غرض حدیث سے ثابت ہے کہ دنیوی ترقی بھی ایک درجہ میں مطلوب ہے خیر یہ تو یہاں بطور جملہ معترضہ کے آگیا تھا اب میں پہلے ہی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں آیت میں اس شب کی علی سبیل الاجمال اور حدیث میں علی سبیل الجزم برکت کی تفصیل بھی فرماتے ہیں چنانچہ آیت میں ارشاد ہے کہ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ یعنی یہ بھی ایک برکت ہے کہ اس شب میں تمام امور کا فیصلہ ہو جاتا ہے تمام امور میں سب چیزیں آگئیں صرف نماز روزہ ہی نہیں بلکہ دنیوی امور بھی اس میں داخل ہیں مثلاً اس کھیت میں اتنا پیدا ہو گا جنگ ہوگی فتح ہو اتنا پانی برسے گا غرض سب امور کا فیصلہ و انتظام ہوتا ہے یہ سب انتظام برکت میں داخل ہو گیا سو ایک فرد تو یہ ہے برکت کی دوسری فرد برکت دینی ہے جو احادیث میں مذکور ہے کہ جب شعبان کی پندرہویں رات ہوتی ہے تو حق تعالیٰ اول شب سے آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں یہ خصوصیت اس رات میں بڑھی ہوئی ہے یعنی اور راتوں میں تو پچھلے اوقات میں نزول ہوتا ہے اور اس شب میں شروع ہی سے نزول فرماتے ہیں یہ بھی وجوہ برکت میں سے ایک وجہ ہے برکت کی اسکی قدر وہ کریگا جسمیں مادہ محبت کا ہو اسکو ایک ایک لمحہ غنیمت معلوم ہو گا وہ تو محبوب کی طرف سے پانچ منٹ بڑھا دینے کو بھی بہت غنیمت سمجھیگا یہاں تو دو ثلث شب کے بڑھ گئے یہاں اضافہ اصل سے بھی زیادہ ہو گیا مجموعہ دونوں کا

بھی بڑھ گیا اب بات قابل غور یہ ہے کہ کون سے حصہ شب میں جاگنا زیادہ افضل ہے اسکا فیصلہ قرآن سے بھی ہوتا ہے اور حدیث سے بھی کیونکہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر شب میں جاگنا اشد ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً اور ناشئۃ اللیل سونیکے بعد متحقق ہوتا ہے (کذا فی الجلالین القیام بعد النوم) جب وہ اشد ہوا کیونکہ اسکے اختیار کرنے سے نفس پر مشقت کا اثر زیادہ ہوتا ہے تو وہی افضل ہوگا۔ آخر سورت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشد ہے چنانچہ فرماتے ہیں عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ اور یہ عدم احصاء آخر شب ہی میں ہو سکتا ہے یہ تو قرآن سے معلوم ہوا۔ حدیث سے بھی اسکا افضل ہونا معلوم ہوتا ہے چنانچہ آخر شب کی فضیلت میں بکثرت احادیث وارد ہیں اور قواعد عقلیہ بھی اسپر شاہد ہیں کیونکہ وہ وقت سونیکا ہے اور سونیکا ترک کرنا مشکل ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص رات کو اٹھکر التجا کرتا ہے تو میں اس سے بہت خوش ہوتا ہوں اسلئے کہ میری وجہ سے اپنی بیوی اور گرم بستر کو چھوڑ دیا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخیر حصہ رات کا افضل ہے لیکن اگر کسی کو اس حصہ میں جاگنا دشوار ہو وہ اوّل ہی حصہ میں کچھ کر لے کیونکہ اور راتوں میں تو خدا تعالیٰ کا نزول اخیر شب میں ہوتا ہے اور اس رات میں اوّل ہی شب سے نزول ہو جاتا ہے اس لئے جن لوگوں کو اخیر شب میں عبادت کرنا دشوار ہو وہ اوّل ہی شب میں عبادت کر کے فضیلت حاصل کر لیں جسکا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عشاء ہی تک عبادت میں مشغول رہیں اور یہ نفس کا ایک کید ہے کہ جہاں آدمی ثواب کا قصد کرتا ہے تو اسکو حیلہ سے روکنا چاہتا ہے چنانچہ اس موقعہ پر وسوسہ ڈالتا ہے کہ اخیر شب میں زیادہ فضیلت ملیگی اسلئے اخیر ہی میں جاگنا چاہئے اوّل میں جاگنے سے کیا فائدہ۔ سو اوّل شب سے تو یوں محروم رہے جب اخیر شب ہوئی اٹھا نہ گیا دونوں طرف سے محرومی ہوئی پوری کے پیچھے لگکر ادھوری بھی گئی اور ایک خفی کید نفس کا بعض کیلئے اس صورت میں یہ بھی ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ممتاز ہو کر رہے اور اسمیں اسکو حظ ہوتا ہے اسلئے بعضے آدمی یہ چاہتے ہیں کہ اخیر شب ہی میں جاگیں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ اس امتیاز میں حظ ہو سو یہ عجب ہے اور عجب ایسی بری چیز ہے کہ جس وقت کوئی شخص اپنی نظر میں پسندیدہ ہوتا ہے اسوقت خدا کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتا ہے سلف نے تو معاشرت تک میں اسکا اہتمام کیا ہے کہ اپنی نظر میں پسندیدہ نہ ہوں

چنانچہ حضرت علیؓ کا واقعہ ہے کہ آپنے ایکبار کرتہ پہنا اسکی آستین خوبصورت معلوم ہوئیں آپنے انکو فوراً تراش ڈالا کہ بدشکل ہوجاویں آجکل اگر کوئی ایسا کرے تو مجنونوں میں شمار ہوگا اسکو دیوانہ کہیں گے مگر واقعی بات تو یہ ہے کہ ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد مرعسس را دید و در خانہ نشد

لوگ اہل اللہ پر ہنستے ہیں وہ بھی ایک دن اپر ہنسیں گے چنانچہ نوح علیہ السلام نے لوگوں کے ہنسنے پہ فرمایا تھا اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ اور اسوقت ہنسنے والوںکی یہ حالت ہوگی ؎

؎ فَسَوْفَ تَرَىٰ اِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

اسوقت معلوم ہوگا کہ یہ گدھے پر سوار تھے یا گھوڑے پر اب تو غفلت کی وجہ سے کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ ہم میں اور صحابہؓ میں کیا فرق ہے انھوں نے، فرمایا کہ اگر صحابہ آجکل کے لوگوں کو دیکھتے تو وہ تو ان کو کافر سمجھتے اور یہ انکو پاگل اور بیٹری خیال کرتے واقعی آج تو کوئی کرتہ کو پھاڑ کرپہن لے تو لوگ کہیں گے کہ کیا پاگل ہوگئے حضرت علیؓ نے یہ اسلئے کیا تھا کہ اپنی نظر میں اچھے نہ معلوم ہوں۔ حضرت عمرؓ کو کسی نے مسلمانوں کے، گھروں میں پانی بھرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ یہ آپ کیا کررہے ہیں فرمایا کہ میں اس وقت اپنے نفس کا علاج کررہا ہوں اسوقت دو شخص ہرقل کی طرف سے میرے پاس آئے تھے اور میرے عدل کی تعریف کی جس سے نفس خوش ہوا میںنے اسکا علاج کیا ہے اسپانی بھرنے پر ایک واقعہ یاد آیا گنگوہ میں ایک حافظ علی حسن تھے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت تھے نماز تو ایسی طویل عریض پڑھتے تھے کہ دیکھی ہی نہیں آجکل تو ذراسی عبادت کرکے ولایت پر رجسٹری ہوجاتی ہے خواہ جعلی ہی رجسٹری کیوں نہ ہو مگر وہ اس سے بھی محفوظ تھے لیکن چونکہ وہ عالم نہ تھے اسلئے اتنی کمی تھی کہ امامت میں بھی ایسی ہی طویل نماز پڑھتے تھے جس سے لوگ گھبراجاتے تھے یہ واقعی غلطی تھی مگر شاید وہ مکلف بھی نہ ہوں کیونکہ بھولے بہت تھے چنانچہ ایک دفعہ ترکاری لینے گئے کنجڑے نے کہا کہ حافظ جی میں نے تمہیں بہت سی ترکاری دیدی ہے ایک پیسہ میں آنہ کا مال دیدیا حافظ صاحب اپنے ساتھی سے کہتے ہیں کہ ہم نے اسکو ٹھگ لیا

جلدی بھاگ چلو کہیں گھبرا جاویں نہ لے ان حافظ صاحب کے محلے میں ایک دفعہ سقہ بیمار ہو گیا لوگوں کو پانی کی تکلیف ہونیلگی حافظ جی اپنے بیٹے سے کہنے لگے کہ بھائی ایک مشک بنالے اور محلہ میں تو ہی پانی بھردیا کر لڑکے نے بہت برا مانا حالانکہ بغور دیکھا جاوے تو مشک اور پیالہ میں فرق ہی کیا ہے پیالہ میں دوسروں کو بھی پانی پلا دیتے ہیں صرف عرف ہو گیا ہے کہ پیالہ میں پانی پلانا عیب نہیں اور مشک لئے پھرنا عیب ہے مگر حافظ علی حسن صاحب کو عیب نہ معلوم ہوتا تھا کیوں کہ اُن میں عجب نہ تھا وہ اپنی کچھ شان ہی نہ سمجھتے تھے اور لڑکے میں عجب تھا وہ اسکو عیب سمجھا غرض جب عمل شاق میں عجب کا احتمال قوی ہو تو ایسے موقعہ پر عمل شاق کا انتظار نہ کرے اس کا بالکل اہتمام نہ کرے کہ ہیئت ممتاز ہی ہو کسی نیکی کو جو بھی میسر ہو جاوے حقیر نہ ہو جانے دوسرے کی چیز کو بھی حقیر نہ سمجھے پڑوسی کے ہدیہ کو بھی حقیر نہ جانے اسی واسطے حدیث میں ہے کہ اگر پڑوسی کے یہاں سے بکری کی کھری بھی ہدیہ میں آئے تو اسکو حقیر نہ کرے۔

صاحبو! ہر وقت بڑے نفع کے انتظار کی ضرورت نہیں اگر ٹھکانہ ملے تو کیا گھر ابھی چھوڑدے طلب کی تو یہ شان ہونی چاہیے ؎

مرا از زلف تو موئے بسندست ہوس را رہ مدہ بسنداست

شیخ عبدالحق رح نے اشعۃ اللمعات میں یہ شعر اس حدیث کے بعد جس میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقعہ پر بال ترشوائے تھے اور تقسیم کرائے تھے لکھکر فرمایا کہ یہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے اجزاء شریفہ کی ذکر و یادداشت کا باعث تو ہو گیا گویا بوئے بسندست کا یہ بھی ایک مصداق ہو گیا۔ واقعی بڑے صاحب دل تھے غرض یہ ہے کہ جو بھی ملجائے غنیمت سمجھے اسکا انتظار نکرے کہ آخیر شب ہی کی فضیلت ملے یہاں سے اختلاف امتی رحمۃ کا راز بھی معلوم ہو گیا کیونکہ اس اختلاف میں کوئی قول تو آسان ضرور ہو گا اسکو لینے والا بھی دین ہی کا لینے والا ہے چنانچہ حق تعالی نے جو اپنے نیک بندوں کی شان میں فرمایا ہے تتجافی جنوبہم عن المضاجع کہ جدا ہوتی ہیں کروٹیں انکی خوابگاہوں سے علماء میں اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد آخیر شب ہے (اختلاف امتی رحمۃ کا راز)

میں تہجد کے لئے اٹھنا ہے یا عشاء کی نماز ہے بعض نے تہجد مراد لیا ہے اور بعض نے دوسرے معنی لئے ہیں جس صورت میں تہجد مراد ہوگا تو اس آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ علیحدہ ہو جاتی ہیں کروٹیں انکی خوابگاہوں سے یعنی نیند سے اٹھکر عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اگر عشاء کی نماز مراد ہو تو یہ ترجمہ ہوگا کہ علیحدہ رہتی ہیں کروٹیں انکی خوابگاہوں سے یعنی جب تک عشاء سے فارغ نہ ہولیں سوتے ہی نہیں اختلاف سے کتنی آسانی ہوگئی کہ جو شخص بدون عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے نہ لیٹے اور یہ خیال کرے کہ میں بھی اس آیت میں داخل ہوں وہ بھی اس ثواب کا مستحق ہے کیوں کہ حق تعالیٰ کی شان یہ ہے جو حدیث شریف میں وارد ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ تو وہ بھی اسمیں داخل ہو جائیگا جو شخص یہ سمجھ رہا ہے کہ حق تعالیٰ نے نماز عشاء پر بھی یہی وعدہ کیا ہے تو حق تعالیٰ اسکو تہجد ہی کا ثواب دیدینگے مگر شرط یہ ہے کہ کوئی بناء اس ظن کی ہونی چاہئے۔

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ کے متعلق ایک واقعہ آیا دآیا وہ یہ کہ یحییٰ ابن اکثم کا جو کہ امام بخاری کے شیخ ہیں جب انتقال ہوا تو ایک شخص نے خواب میں دیکھا پوچھا کیا گذری فرمایا مواخذہ شروع ہوگیا تھا اور حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بڈھے تو ایسا ایسا کرتا تھا میں سہم گیا اور خاموش ہوگیا سوال ہوا کہ خاموش کیوں ہوگئے میں نے عرض کیا کہ ایک بات سوچ رہا ہوں پوچھا گیا کیا سوچ رہے ہو عرض کیا میں نے تو بسند حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا تھا اِنَّ اللّٰہَ یَسْتَحْیِیْ مِنْ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان سے شرماتے ہیں تو میں حیران ہوں کہ میں تو بوڑھا ہوں مگر یہاں دوسرا معاملہ ہو رہا ہے اسپر ارشاد ہوا کہ ہمارے رسول علیہ السلام نے سچ کہا اور راوی بھی سچے ہیں آج تیرے بڑھاپے کی بدولت بخشتے ہیں اور تیرے بڑھاپے کا لحاظ کرتے ہیں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ خواب وہی معتبر ہے جو کسی حجت شرعیہ کے معارض نہ ہو جیسا یہ خواب ہے ایک اور شخص کا قصہ ہے جو نہایت مسخرہ تھا اس نے مرنے کے وقت اپنے ایک دوست کو وصیت کی کہ جب مجھکو قبر میں رکھو تو میری داڑھی پر آٹا چھڑک دینا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا لوگ دیکھکر ہنس پڑے اور کہنے لگے یہاں بھی

انا عند ظن عبدی بی کے متعلق دو واقعہ

مسخر اپنی نہ چھوڑا دفن کر دیا کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا تو کہا پیشی ہوئی تھی میں نے عرض کیا کہ میں نے سنا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ یَسْتَحْیِیْ مِنْ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ میرے پاس سفید ڈاڑھی تو تھی نہیں میں نے اس خیال سے اسکی نقل کر لی کہ مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ شاید اسی بناپر مغفرت ہو جاوے چنانچہ مغفرت ہو گئی یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنکے بالوں ع کا رنگ قدرتی سفید ہو ان کے لئے بھی امید رحمت ویسے حق تعالےٰ بادشاہ ہیں جو چاہیں کریں انکا کوئی روکنے والا نہیں زبردست ہیں بہر حال رحمت کے آسان ذریعے بھی رکھدئے ہیں چنانچہ قرب کی برکت روزمرہ بھی نصیب ہو سکتی ہے خاصکر اس شب میں کہ شام ہی سے یہ دولت ملجاتی ہے اگر دشوار کام کی توفیق نہ ہو (یعنی اخیر شب میں نہ جاگ سکیں) تو سہل ہی کو اختیار کر لیا جاوے وہاں تو ذراسی نیکی کی بھی بڑی قدر ہوتی ہے دیکھئے رفع الاذی عن الطریق کو شعب ایمانیہ میں سے شمار کیا گیا ہے حالانکہ معمولی بات ہے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ چلا ہوا جا رہا تھا راستہ میں ایک ٹہنی جھک رہی تھی اس نے اسکو مسافروں کی تکلیف کے خیال سے کاٹ ڈالا محض اس بناپر بخشش ہو گئی اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق سبحانہ تعالیٰ بندوں کو بہت ہی چاہتے ہیں حتیٰ کہ انکی رحمت ایسی وسیع ہے کہ نافرمانوں کو بھی نفع پہونچانے سے رحمت ہو جاتی ہے حیوانوں پر بھی رحم کرنے سے رحمت فرماتے ہیں چنانچہ ایک شخص کی بخشش کتے کو پانی پلانے سے ہو گئی تھی اسی لئے ذبیحہ کو راحت دینے کا حکم ہے کفار کو علاوہ زکوٰۃ کے صدقہ دینا جائز کر دیا گیا ہے ہاں جس کافر سے ضرر پہونچا یا ہو اس کے لئے دوسرا حکم ہے وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ موت کے وقت کافر کو پانی پلانا درست ہے کفار سے ملنے میں بھی رحمت کی رعایت کی گئی ہے کہ ان سے دوستی کا ملنا تو مت ملو مگر ویسے مل لو چنانچہ فرماتے ہیں لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ

ع شاید مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی کی طرف اشارہ ہے۔

اَنۡ تُوۡتُوۡھُمۡ کتنی بڑی رحمت ہے کہ نافرمانوں پر بھی رحم کرنے کا حکم ہے اسی واسطے فرماتے ہیں عَنۡ رَّحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ اگرچہ کفار پر آخرت میں رحمت خاص نہ ہوگی مگر عام رحمت ایک معنی کر آخرت میں ان پر بھی رحمت ہوگی کیونکہ جسقدر عذاب کفار کو آخرت میں دیا جائیگا کفار اس سے زیادہ کے مستحق تھے اور حق سبحانہ تعالیٰ اس سے زیادہ پر قادر بھی ہیں مگر اس استحقاق سے وہ عذاب ہلکا ہی ہوگا۔ غرض ان کی رحمت سے کوئی چیز خالی نہیں اسکے متعلق ایک حکایت شیطان کی یاد آئی شیطان کی ملاقات حضرت سہل سے ہوئی اس نے کہا کہ میں بھی حق تعالیٰ کی رحمت کا مستحق کیونکہ ارشاد ہے کہ وَسِعَتۡ رَحۡمَتِیۡ کُلَّ شَیۡءٍ اور میں بھی شئی میں داخل ہوں حضرت سہل نے جواب دیا کہ آگے یہ بھی تو ہے فَسَاَکۡتُبُھَا لِلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ جسکا ادنیٰ درجہ ایمان ہے پس ایمان کی قید بھی تو اس میں لگی ہوئی ہے شیطان نے کہا کہ خدا کی صفات میں قید نہیں ہوتی وہ کسی قید کا مقید نہیں وہ خاموش ہو رہے مگر انہوں نے وصیت کی کہ شیطان سے کوئی مناظرہ نہ کرے۔ واقعی شیطان کے مغالطات بھی عجیب ہیں اس نے منطق میں باب مغالطات ہی پڑھا ہے اور کچھ نہیں پڑھا نام بھی اس کا ابلیس ہے جو ماخوذ ہے تلبیس سے اس لئے اگر وسوسے آئیں تو ان میں خوض نہ کرے کہ وہ بھی ایک قسم کا مناظرہ ہے مگر اسکے اس مغالطہ کا جواب ایک تو یہی کہ یہ قید ذات وصفات کی طرف راجع نہیں فعل کتابت یعنی تجویز و تقدیر کی طرف راجع ہے اور افعال الہٰیہ بوجہ حدوث کے خود ارادہ الٰہیہ سے مقید ہو سکتے ہیں۔ دوسرا جواب اسکے مقدمات کے ابطال سے قطع نظر کرکے یہ ہے کہ عذاب اور رحمت میں تنافی نہیں تجھ پر بھی باوجود تیرے جہنمی ہونے کے خدا کی رحمت ہے وہ اسطرح کہ خدا تعالیٰ جتنا عذاب تجھکو دینگے تو اس سے زیادہ کا مستحق تھا اور ان کو اس سے زیادہ پر قدرت بھی ہے اس سے کم دینا یہ بھی رحمت ہوا۔ بہرحال جب انکی رحمت ایسی وسیع ہے آسان عمل پر بھی عطا ہو جاویگی اسلئے تم دشوار عمل کا انتظار نہ کرو جو توفیق ہو کر لو اگر اخیر شب میں جاگ سکو تو اخیر میں ورنہ اوّل ہی میں سہی مگر ایسا انتظام ہو کہ زیادہ حصہ جاگنے کا ہو جسمیں

سہولت ہو خواہ اوّل میں خواہ آخر میں اسکو اختیار کر لو سہولت کے متعلق ضعیف
البتہ کیلئے ایک گر حدیث میں آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ
تھی کہ جب آپ کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ آسان کو اختیار کر لیتے مجکو
کہیں دیکھا ہوا یاد آتا ہے کہ شیخ اکبر جو کہ بڑے مجاہدہ کرنے والے ہیں اختلاف مسائل کے
بارہ میں فرماتے ہیں کہ جس مسئلہ میں حلت وحرمت کا اختلاف ہو تو ظاہر تو یہ ہے کہ حرام
کہنے والا زیادہ محتاط اور اقرب الی الدین ہو لیکن وہ کہتے ہیں کہ حلت کا فتویٰ دینے
والا اقرب الی الرحمۃ ہے کیونکہ رحمت کا اصل اثر یسر ہے یہی راز ہے کہ معاصی کی سزا
میں حلال کی تحریم تو ہوئی ہے مگر حرام کی تحلیل کبھی نہیں ہوئی لیجئے اہل مجاہدہ کے قول
سے بھی ہمارا مدعا ثابت ہو گیا مگر ہم شیخ اکبر کو کیوں لیں ہم نبی اکبر کو نہ لیں حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی خود یہی شان تھی کہ مَا خُیِّرَ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ اِلَّا اخْتَارَ اَیْسَرَ
ھُمَا جیسا اوپر مذکور ہوا مثلاً ایک کام کے دو طریقے ہیں ایک آسان اور
دوسرا مشکل آپ آسان طریقہ کو اختیار فرماتے خدا تعالیٰ کی عادت سے بھی
اسکی تائید ہوتی ہے حق تعالیٰ کی قدرت کی یہ شان ہے کہ انکے کُن کہتے ہی چیز موجود ہو جاتی ہے
اسی واسطے اگر آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اگر کُن فرما دیتے تو سب
اسی وقت تیار ہو جاتے کچھ بھی دیر نہ لگتی مگر ایسا نہیں کیا بلکہ چھ دن میں بنائے
سب کام آہستہ آہستہ کئے علماء نے فرمایا ہے کہ اس میں تعلیم ہے تثبت اور مہلت
کی اور میں اس سے استنباط کرتا ہوں کہ اس میں تعلیم ہے سہولت کی بھی البتہ جس
کام کا ایک ہی طریق ہو وہ تو صرف اسی طریق سے ہوگا خواہ سہل ہو یا دشوار باقی
جہاں دو طریق ہوں تو سہل ہی کو اختیار کر لے جیسے گھر کے دو راستے ہوں تو جو سیدھا ہو
اُس کو اختیار کر لے کہ اس میں سہولت ہو گی اور بعض دفعہ یہی ہوتا ہے کہ
راستہ بظاہر تو دور معلوم ہوتا ہے مگر قریب معلوم ہوتا ہے کہ بے خطر ہے مصرعہ مشہور کا یہی محمل ہے
؎ راہ راست برو اگرچہ دور است +
یعنی راست کی تفسیر بے خطر ہے خط مستقیم نہیں ورنہ اس مصرعہ پر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ کہ جب دو کاموں میں اختیار دیا جاتا تو آسان کو اختیار فرماتے

خدا تعالیٰ کے کام سے سہولت کی تعلیم

ایک طالبعلمی شبہ ہوتا ہے کہ رہ راست بھی فرمارہے ہیں اور دو زبھی فرمارہے ہیں اسکے کیا معنی اسلئے کہ رہ راست تو خط مستقیم ہوگا جو مطلوب تک پہونچا ہوا ہو خط مستقیم سب خطوط واصلہ بین النقطتین سے چھوٹا ہوتا ہے پھر دور کہنے کا کیا مطلب ہے جواب وہی ہے جو اوپر کہا گیا کہ یہاں راہ کے معنی عرف کے موافق ذو خطر کے ہیں گو وہ ظاہر میں نزدیک ہی ہو مگر معنی راست ہو پس یہاں راست معنوی مراد ہے یعنی جسمیں معنوی کجی نہ ہو مطلب یہ ہے کہ جو راستہ ذو خطر ہو گو ظاہر میں دور ہو اس سے جانا چاہئے اور اس راستہ کو نہ جانا چاہئے جو بظاہر تو قریب ہے مگر پر خطر ہو کہ حقیقت میں وہ ہی دور ہے بہر حال انکی ایسی رحمت ہے کہ آدمی تھوڑا سا ہی عمل کرے تو محروم نہیں رہتا اگرچہ تین دفعہ اللہ ہی کہنے کی توفیق ہو جاوے اسکو کہنا بھی مت چھوڑو اگرچہ بے وضو ہی ہو ایک واقعہ قیامت کے دن کا حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کے گناہوں کے اعمال نامے منتہائے بصر تک ہونگے اور وہ شخص اسپر مغفرت سے مایوس ہوگا اتفاق سے ایک ذرا سا پرچہ ان میں نکلیگا کہ اسکے رکھنے سے میزان حسنات کا پلہ وزنی ہوجاویگا اس پرچہ میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لکھا ہوگا اگرچہ جسکو اسنے اخلاص سے کہا ہوگا اگرچہ ایک دفعہ ہی کہا ہو دیکھئے ایک بار کے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے سے کتنا فائدہ حاصل ہوا اگر شبہ ہو کہ اسنے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ خلوص سے کہا ہوگا اور ہم میں خلوص ہے نہیں جواب یہ ہے کہ اگر خلوص بھی نہ ہو تب بھی کہنا بیکار نہیں کہنے سے استعداد تو ہوجاویگی اور یہ اوّل بار ہی کہنا آئندہ عمل پر معین ہوجائیگا لہذا ادنیٰ عمل کو بھی بیکار نہ سمجھو اور کوئی ساعت کسی نہ کسی عمل سے خالی نہ رہنے دو اسی لئے مشائخ نے پاس انفاس تجویز کیا ہے کہ کچھ نہ کچھ سلسلہ رہے

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی — شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

صاحبو! وقت کو ضائع مت کرو ہر ہر وقت کی قدر کرو خاصکر ایسی شب کی جسکا بیان ہورہا ہے ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ یہ جو بعض اوراد کی کتابوں میں پندرہویں شب شعبان میں خاص نوافل پڑھنے کو لکھدیا ہے یہ کوئی قید نہیں جو چیز شرعاً بے قید ہے اسکو بے قید ہی رکھو حدیث میں نوافل کی کوئی قید نہیں آئی بلکہ جو عبادت آسان ہو وہ کرلو اسمیں نوافل بھی آگئے اور وہ بھی کسی ہیئت کے ساتھ نہیں باقی بزرگوں کے کلام میں جو خاص ہیئت کے نوافل کا ذکر آیا ہے تو اسکا سبب یہ ہے کہ کسی بزرگ نے کسی مرید کیلئے اسکی خاص حالت کے اقتضاء سے اسکو

تجویز کیا ہوگا اور اسکے حق میں یہ ہی مصلحت ہوگا اب اسکو عام کر لینا یہ بدعت ہو باقی
بزرگوں کو پہونچتے غرض حدیث میں کوئی خاص عمل وارد نہیں چاہے قرآن شریف پڑھو
یا اللہ اللہ کرو یا نوافل پڑھو خواہ وعظ کہو سنو چنانچہ کانپور میں اس شب کو اندر ہم وعظ
کہلواتے تھے کیونکہ وعظ کے شغل میں جاگنا ذرا آسان ہوتا ہے اگرچہ بعض اسمیں بھی سوتے
ہیں۔ لطیفہ ایک شاہ صاحب تھے اُن سے کسی نے پوچھا کہ اسکی کیا وجہ ہے کہ وعظ میں نیند
آتی ہے اور ناچ میں نہیں آتی انہوں نے جواب دیا کہ نیند پھولوں پر آیا کرتی ہے
کانٹوں پر نہیں آتی مگر یہ ایک لطیفہ ہے حقیقت یہ نہیں ہے ورنہ پاخانہ میں کیوں
نیند آتی ہے وہاں پھول کہاں رکھے ہیں دوسرے عبادات ظاہر میں پھول کہاں ہیں وہ تو
نفس پر نہایت شاق اور گراں ہیں اُن میں بظاہر حظ اور لذت نہیں اور کھیل تماشے
نفس کے موافق ہیں اور ان میں حظ ہے اس بنا پر معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا بلکہ حقیقت
اسکی دوسری ہے وہ یہ کہ نیند یکسوئی سے آتی ہے کھیل تماشے میں یکسوئی نہیں ہوتی ہر
جز میں جدا جدا لذت ہوتی ہے جسپر مستقل توجہ کیجاتی ہے اس سے توجہ منقسم ہوجاتی ہے اسلئے
نیند نہیں آتی بخلاف نماز کے کہ جب اس کو شروع کر دیا چونکہ وہ ہم کو ایسی یاد ہوتی
ہے کہ سوچنے اور غور کرنے کی اس میں حالت ہی نہیں ہوتی جیسے گھڑی کی کوک بھر کر
رکھدی کہ بس ایک طریقہ پر چلتی رہتی ہے اس لئے بالکلیہ نماز میں توجہ کی تجدد
کرنیوالی کوئی چیز نہیں اسمیں یکسوئی ہو جاتی ہے اس لئے نیند آجاتی ہے اسی طرح وعظ کو
کہ جہاں شروع ہو گیا اور اس طرف کان لگ گئے بس یکسوئی ہو گئی اور نیند آنے
لگی اور کھیل تماشے میں توجہ بٹی رہتی ہے یکسوئی نہیں ہوتی اسلئے نیند بھی نہیں آتی ،
باقی شاہ صاحب کا کلام مخاطب کی خاص حالت کے اعتبار سے ایک لطیفہ ہے
خلاصہ یہ ہے کہ یکسوئی میں نیند آتی ہے اور اسمیں نیند نہ آنے کی تدبیر یہ ہے کہ متفرق
اعمال شروع کر دئے جاویں تا کہ توجہ منقسم رہے کچھ دیر نوافل پڑھ لئے تلاوت
کرلی ذکر کرنے لگے پھر وعظ شروع کر دیا یا سننے لگے۔ مگر وعظ میں ایک خرابی
ہو گئی ہے کہ لوگوں کا اجتماع ہوجاتا ہے تداعی بھی ہوتی ہے اسلئے بہتر یہ ہو کہ گھر کے لوگ جمع

ہو کر عبادت کریں اور نیند کو دفع کیلئے متفرق عبادتوں میں مشغول ہوں کسی سے کوئی مختصر
مباح بات بھی کرلی (جیسے کھانے کے ساتھ کبھی کبھی مربہ اور چٹنی کا بھی ذائقہ لے لیتے ہیں) اتنی
بات کا مضائقہ بھی نہیں۔ یہ نہ ہو کہ سارا وقت باتوں ہی میں گذار دیں کیونکہ نرا جاگنا ہی
مقصود نہیں جیسے ایک فقیر کو میں نے دیکھا کہ محض جاگنے کیلئے افیون کھایا کرتا تھا جو خلاف
شرع حرکت تھی تو ایسے جاگنے سے کیا فائدہ سو ایسا تو نہ کرنا چاہیے جاگنا تو عبادت کیلئے ہو مگر تجدید
نشاط کو بیچ بیچ میں تھوڑی بات بھی کرلے تو مضائقہ نہیں جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت
عائشہ رضی اللہ عنہا سے باتیں کرلیتے تھے باتیں مقصود نہیں تھیں بلکہ طبیعت کی تازگی کیلئے ایسا فرماتے اسطرح
نفس کو خوش رکھکر جاگے اور اگر تکان ایسا ہو جاوے کہ نیند سے بیتاب ہو جاوے تو سو رہے کیونکہ
ارشاد ہے فلیرقد ایسی حالت میں سو رہنے ہی میں فضیلت ہے غرض ہر حال عبدیت مطلوب ہو خواہ سونے میں ہو
یا جاگنے میں اپنے کو سپرد خدا کردے جیسا حکم ہو ویسی کرے بس یہ حالت ہو ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو — جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

اور یہ حالت ہو جسکو مولانا فرماتے ہیں شعر

ہچو کلکم درمیان اصبعین — نیستم در صف طاعت بین بین

غرض اتباع نفس کیلئے کچھ نہ ہو محبوب کا جو حکم ہو وہ کرے یہی عبدیت اور باقی کوئی شے
بالذات مقصود نہیں بعض وقت نماز پڑھنا ممنوع ہو جاتا ہے اور سونا مطلوب ہو جاتا ہے جیسے دوپہر
کا وقت دوپہر کا سونا اسی غرض سے کہ اعانت ہو شب بیداری میں معلوم ہوا کہ مقصود امتثال امر
ہے اسپر مجھے اسوقت ایک نکتہ عجیب یاد آیا جو آیت وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون
کے متعلق ہے اسکو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا یا تو آپ کے قلب پر وارد ہوا ہوگا یا اور کسی
سے سنا ہوگا واللہ اعلم فرماتے تھے کہ وما خلقت الجن الخ میں سوال یہ ہوتا ہے کہ عبادت
کرنیوالی علاوہ جن اور انس کے اور مخلوقات بھی تو ہیں جیسے فرشتے پھر جن وانس کی تخصیص
کیوں فرمائی جواب یہ ارشاد فرمایا کہ عبادت کے معنی ہیں عبد شدن یعنی غلام شدن یہ شان جن
وانس ہی کی ہے شرح اسکی یہ ہے کہ خدمتیں دو قسم ہیں ایک معین دوسری غیر معین۔ نوکر کی خدمت تو معین ہوتی ہے
اور غلام کی معین نہیں ہوتی غلامی کی خدمت کھانا پکانے اور قلمدان اٹھانے اور پاخانہ کمانے لیکر بادشاہ بنکر کسی صوبہ کا

اہتمام کرنے تک ہوتی ہے یہ شان جن وانس ہی کی ہے کہ انکی عبادت کوئی معین نہیں وقت
پر ہوتا ان کا عبادت یا خانہ جانا ان کا عبادت اور ان کا کسی کو شرعی حکم سے مارنا
عبادت کوئی کام ایسا نہیں کہ ان کیلئے عبادت نہ ہو بخلاف دوسری مخلوق کی کہ وہ
اپنی عبادات میں مشابہ اجیر کے ہیں جنکو خاص کام کیلئے مقرر کیا جاتا ہے پس یہ شان ہے
عبد کی کہ جو اسکو حکم ہو وہ کرے حتی کہ بعض رخصت کو ترجیح ہو جاتی ہے اور عزیمت
خلاف اولی ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک بزرگ بیمار تھے آپ نماز کے وقت احتیاطاً
تیمم نہیں فرماتے تھے دوسرے بزرگ نے ان سے فرمایا کہ آپ سمجھے ہوں گے کہ میں بڑا
کام کر رہا ہوں مگر قلب کو دیکھئے کہ تیمم میں انشراح نہیں حالانکہ شریعت کا حکم
ایسے موقعہ پر تیمم کا ہے پھر اسمیں تنگی ہے یہ مزاحمت ہے احکام شرعیہ کی اسوقت
عزیمت تیمم ہی ہے کیسی عجیب بات فرمائی غرض عبدیت تو یہ ہے کہ جیسے حکم ہو ویسے کرے

سے چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ آسانی سے کام کرو جس موقعہ پر عبادت کا حکم ہے عبادت
کرو اور جہاں سونے کا امر ہے وہاں سوؤ اسمیں دن دونی اور رات چوگنی برکات
ہونگی اسی قاعدہ سے اس شب کی برکات حاصل کرو مگر لوگوں نے اس شب میں
برکات چھوڑ کر بیہودہ حرکات اختیار کر رکھی ہیں چنانچہ آتشبازی ایسی منکر حرکت ہے
نام ہی میں اس کے منکر ہونیکا اقرار ہے نام بھی ایسا ابہام کیا گیا جسمیں آتش بھی ہے اور بازی
بھی ہے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خطرہ کی چیز ہے اور لہو و لعب ہے بھلا آتش سے تلبس
ہونا بھی کوئی اچھی بات ہے حدیث شریف میں تو یہاں تک ارشاد ہے کہ سوتے وقت چراغ
کو گل کردو جو عادۃً دور ہی رکھا جاتا ہے حضور نے اسکو بھی جلتا ہوا چھوڑنا پسند نہیں کیا کیونکہ خطرہ سے
خالی نہیں اور اسکے متعلق واقعات بھی ہو گئے ہیں پھر تلبس قریب ہے تو ممانعت کیوں نہ ہو گی ہاتھی
بڑی خطرہ کی چیز ہے چنانچہ بہت سے واقعات اسکی بدولت ہر سال پیش آتے ہیں
کسی کا ہاتھ جل گیا کسی کی جان جاتی رہی کسی کا مکان خاک سیاہ ہو گیا اور اگر
فرضاً کچھ بھی نہ ہو تو اتلاف مال تو ضرور ہی ہے اور زیادہ تر یہ ان تابع ہے ترتیب

جن کے دل میں تو یہ ہوتا ہے کہ ہم خود تماشہ دیکھیں مگر چونکہ وقار کے خلاف ہے
اس لئے بچوں کو آڑ بناتے ہیں اور عذر یہ کرتے ہیں کہ بچے نہیں مانتے تماشوں میں بچوں کو
ساتھ لیجاتے ہیں۔ صاحبو! ان بچوں کو کیوں بدنام کرتے ہو بلکہ تمہاری ہی گود میں
ایک بچہ ہے جسکو نفس کہتے ہیں وہ تمکو لیجاتا ہے ظاہر میں بچوں کو پیسے دیتے ہیں
اور مقصود خود تماشہ دیکھنا ہوتا ہے اپنی غرض کیلئے اولاد کے اخلاق بگاڑ رہے ہو
اور اگر سچ مچ بچے ہی ضد کرتے ہیں تب بھی یہ عذر قابل قدر نہیں دیکھو اگر تمہارا بچہ
باغیوں میں شامل ہو کر گولہ چھوڑنے لگے تو تم اسکو روکو گے یا نہیں ضرور روکو گے اگر نہ مانیگا
جبرًا روکو گے اسیطرح یہاں کیوں نہیں روکا جاتا بس یوں کہو کہ گناہ کو برا ہی نہیں سمجھتے اگر تم خود معصیت
کو برا سمجھتے تو بچوں کو اسکی عادت کیوں ڈلتے بھلا اگر بچے ضد کرکے سانپ مانگنے لگیں تو کیا دیدو گے پھر
جسکو خدا و رسول ﷺ نے مضر کہا ہے کیا وجہ ہے کہ اسکی عادت ڈالی جاتی ہے معلوم ہوا کہ خدا و
رسول ﷺ کے فرمانیکی وقعت نہیں پھر یہ کہ یہ مال تمہارا کہاں ہے سب خدا ہی کی ملک
ہے تم محض خزانچی ہو تمہارے ہاتھ میں تو تحویل ہے تم ایسے ہو جیسے غلام ہوتا ہے مالک
صرف اللہ تعالیٰ ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہمیں یہ اجازت نہیں کہ اسکو جیسے چاہیں خرچ کریں خدا کا مال ہے اسکی بابت
قیامت میں سوال ہوگا کہ تم نے کہاں سے کمایا اور کہاں کہاں خرچ کیا پس جب بچوں کو آتشبازی
کیلئے پیسے دینا شرعًا حرام ہے تو تم دینے والے کون ہو ہرگز مت دو اور ضد کریں پیر مارو کھیل تماشہ
میں بھی ان کو مت کھڑا ہونے دو صاحبو! بزرگوں نے تو بچوں کو ایسی ایسی عادت ڈالی ہے کہ جس سے
انکو دستیں ملگئیں اور تم ایسی عادتیں ڈالتے ہو جس سے دنیا اور دین دونوں تباہ ہوں
ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انکا ایک لڑکا تھا بالکل بچہ کم سن انھوں نے بی بی سے ابتداء
ہی سے کہہ رکھا تھا کہ اگر یہ کوئی چیز مانگے تو اپنے ہاتھ سے مت دو بلکہ اسکی ضرورت کی چیزیں ایک
جگہ اس سے مخفی کرکے رکھدو جب یہ کوئی چیز مانگے تو اس سے کہدو کہ وہاں جا کر اللہ میاں سے مانگو اور
ہاتھ ڈالکر لیلو تاکہ اسکا یہ اعتقاد ہوجاوے کہ اللہ میاں ہی دیتے ہیں چنانچہ بی بی نے ایسا ہی کیا
ایک روز اتفاقًا اسکے لئے کھانا رکھنا بھول گئی اس روز بھی بچے نے حسب معمول اللہ

میاں سے کھانا مانگا اور ہاتھ ڈالا تو کھانا غیب سے پیدا ہوگیا ان بزرگ کو خبر ہوئی کہنے لگے بحمد اللہ میں اس ہی حالت کا منتظر تھا اسکے بعد تمام عمر اس بچہ کی یہی حالت رہی کہ جب اسکو ضرورت ہوتی خدا تعالیٰ سے مانگتا اور وہ چیز ملجاتی ان بزرگوں نے بچپن ہی میں اسکو صاحب کمال بنا دیا خیر ہم ایسے نہ ہوں تو بچوں کو معاصی میں تو مبتلا نکریں غرض یہ ہے کہ اس بارے میں نہایت اہتمام کی ضرورت ہے اس آتشبازی کی اصل دیکھی جاوے تو یہ نکلتی ہے کہ برامکہ ایک قوم تھے یہ اصل میں آتش پرست تھے پھر اسلام لے آئے ان میں اچھے لوگ بھی تھے مگر بعض میں آتش پرستی کا مادہ موجود تھا یہ فعل انکا ایجاد کیا ہوا ہے تاکہ اس بہانہ مرکز کی طرف توجہ رہیں پھر دیکھا دیکھی دوسرے مسلمانوں نے بھی اسکو اختیار کر لیا جب ماخذ اس کا مادہ کفر ہو تو یہ شعبہ کفر کا ہوا اسکو دوسری معصیتوں سے زیادہ اہتمام کے ساتھ چھوڑ دینا چاہئے اور خیر یہ معصیت تو معصیت بر رنگ معصیت ہی ہے کہ دنیا والی بھی اسکے برا ہی سمجھتے ہیں۔ ایک معصیت برنگ عبادت ہے یعنی اس تاریخ کو تہوار منایا جاتا ہے وہاں اس سے انکار نہیں کہ یہ عبادت کی رات ہے مگر اسمیں صرف اتنا منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس رات میں قبرستان میں تشریف لیگئے اور اہل بقیع کیلئے استغفار فرمایا (اورد ہٗ فی ما ثبت بالسنۃ من روایۃ عائشۃ لیخرجہ ابن ابی شیبۃ والترمذی وابن ماجہ وثلث طرق فی البعیق ۹) اس سے زیادہ منقول نہیں کھانے میں توسع بھی کہیں منقول نہیں جیسا عاشورا میں بعض روایات وارد ہیں مگر لوگوں نے اسمیں حلوے کا یہ اختراع کیا ہے اسکو بارے میں عجیب عجیب روایات گھڑی ہیں چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ حضرت حمزہؓ کی اس تاریخ وفات ہوئی تھی یہ انکی فاتحہ ہے یہ واقعہ تاریخ سے بالکل ہی خلاف کیوں کہ وفات حمزہؓ کی شعبان میں نہیں ہوئی بلکہ شوال میں ہوئی ہے اگر کہو کہ وفات گو شعبان میں نہیں ہوئی مگر جو شعبان بعد میں آیا تھا اسمیں انکی فاتحہ دلائی گئی تھی تو جواب اسکا یہ ہے کہ اول تو اتنے دنوں بعد فاتحہ کیسی پھر تم اس کا ثبوت دو کہ شعبان میں انکی فاتحہ دلائی گئی تھی اور یہ بھی ثابت کرو کہ اس میں حلوہ ہی پکا تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس تاریخ میں دندان مبارک شہید ہوا تھا اور آپنے حلوہ کھایا تھا اس لئے کرتے ہیں تو یہ بھی محض لغو ہے کیونکہ یہ واقعہ شہادت دندان

کا بھی شوال ہی میں ہوا تھا غرض یہ باتیں بالکل گھڑی ہوئی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنا ثابت ہے اس سے صرف اسقدر ثابت ہو سکتا ہے کہ مردوں کو اس رات میں نفع پہونچاؤ اس سے صرف اتنا نکلے گا کہ مردوں کو ثواب بانٹ دو باقی اور پابندیاں کوئی چیز نہیں ثواب پہونچانے کیلئے قرآن شریف پڑھو نماز پڑھو خیرات بھی چاہو کردو مگر حلوے کی تخصیص کیلئے اناج بھی کافی ہے پیسے بھی کافی ہیں بعض لوگ اسمیں یوں کہتے ہیں کہ حلوے کے لئے بچے ضد کرتے ہیں جواب یہ ہے کہ چار دن پہلے پکالو اسدن نہ پکاؤ بعض شہروں میں شب برات سے ایک دن پہلے عرفہ مشہور ہے کہ شب برات میں تو پرانے مردوں کو ثواب پہونچاتے ہیں اور ایک دن پہلے جدید مردوں کو تاکہ وہ پرانے مردوں میں شامل ہو جاویں ورنہ شامل نہیں کئے جاتے بھلا بتلائے اسکی کیا اصل ہے اگر علما ایسی بے اصل باتوں کو منع کرتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ مولوی وہابی ہو گئے صاحبو! ان رسموں کی کوئی اصل نہیں غرض شب برات کے احکام یہ ہیں جو بیان ہوئے اور دن کے احکام یہ ہیں کہ دن کو روزہ رکھو یعنی پندرھویں تاریخ کو جواب کی روایت کے حساب سے اتوار کا دن ہوگا وہی روزہ کا دن ہوگا حدیث میں ہے قوموا لیلها وصوموا نهارها بس اس تاریخ کے متعلق صرف یہ حکم ہے یہ بیان قصداً اس لئے کیا گیا کہ وہ رات آنیوالی ہے اسقدر اور کہتا ہوں کہ یہ مقدمہ ہے رمضان کا میرا تو ذوق یہ کہتا ہے کہ رمضان شریف میں جو جاگنا ہوگا اس شب کا جاگنا اسکا نمونہ ہے اور یہ صوم ایام رمضان شریف کا نمونہ ہے پس دونوں نمونے رمضان کے ہیں ان نمونوں سے اصل کی ہمت ہو جاویگی پھر اس صوم کے بعد جو صوم سے منع فرمایا اس میں حقیقت میں رمضان کی تیاری کیلئے فرمایا ہے کہ جب شعبان آدھا ہو جاوے تو روزہ مت رکھو مطلب یہ کہ سامان شروع کر دو رمضان کا یعنی کھاؤ پیو اور رمضان کیلئے تیار ہو جاؤ اور یہ امید رکھو کہ روزے آسان ہوں گے جب معلوم ہوا کہ رمضان کے روزوں کی آسانی مطلوب ہے تو اسی کے ذیل میں ایک عمدہ تدبیر آسانی کی میں بتلاتا ہوں وہ یہ کہ روزہ میں یہ تذکرہ ہی مت کرو کہ آج گرمی ہے پیاس بہت لگ رہی ہے بھوک زیادہ ہے دل گرا جاتا ہے ضعف بہت ہو گیا ہے یہ تذکرے بالکل نہ کرو پھر روزہ بالکل نہ معلوم ہوگا یہ بدون دودھ پئے کی تدبیر ہے میں اسکو تجربہ کا طریق بتلاتا ہوں کہ ایک روز تو اسطرح رکھو کہ اسمیں اس قسم کے تذکرے نہ کرو اور دوسرا ایسا رکھو کہ جس میں ایسے تذکرے کرو دونوں میں صاف فرق

شعبان کے پندرھویں روزہ کا ثبوت

روزہ کے آسان ہونیکی تدبیر

ع۔ اس رات میں قیام کرو دن میں روزہ رکھو۔

١١٣

پاؤگے اور ایک عرض رمضان کی سامان کے لئے یہ ہے کہ ابھی سے گناہوں کو چھوڑ دو اگر اب بھی مبتلا رہوگے تو رمضان میں کیسے چھوڑو گے خصوصیت خاص اہتمام سے چھوڑ دو خصوصاً عورتوں کو اسکے اہتمام کی زیادہ ضرورت ہے اور باقی جتنی بھی باتیں ناجائز ہیں سب چھوڑ دو جنکی کمائی اچھی نہیں وہ ایسی کمائی چھوڑ دیں کیسا افسوس ہے کہ روزہ حرام غذا سے افطار ہو اول تو ایسی کمائی بالکل چھوڑ دیں اور اگر اس بلا میں گرفتار ہی ہیں اور مجبوری ہے تو کم از کم رمضان کیلئے تو نیک کمائی کا اہتمام کرلیں میں اس کا ایک طریقہ بتلاتا ہوں اگرچہ بتلانیکو جی تو چاہتا نہیں کیونکہ لوگ کچھ سے کچھ سمجھ جاتے ہیں مگر اس لئے بتلاتا ہوں کہ لوگ رمضان میں تو حرام خوری نہ کریں صورت اس کی یہ ہے کہ تمہارے پاس جو کمائی حرام کی ہو اس سے برتنے کی چیزیں مت خرید و کسی سے روپیہ قرض لیکر اس سے خرید لو چاہے قرض پھر اپنے اسی مال میں سے ادا کر دینا یہ کرخی کا قول ہے بہتر یہ ہے کہ کسی کافر سے قرض لے لیں تا کہ بوقت ادائیگی کوڑا کوڑے میں جائے اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جیسے حرام کا کمانا ناجائز ہے اسی طرح اس سے دوسرا انتفاع بھی حرام ہے اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں ایک صاحب تھے وہ رشوت کے مال سے کھاتے تو نہ تھے مگر جوتے پہن لیتے تھے غرض لوگوں نے عجیب عجیب گھڑت کی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بری ہو گئے حالانکہ ایسا نہیں ہے کھانا بھی ایسے مال کا حرام اور منتفع ہونا بھی حرام یہ احکام مجملاً رمضان اور شعبان کے بیان کر دئیے گئے ایک تو مبارک تاریخ کا ذکر یعنی شعبان کی پندرھویں روزہ اور اس کے بعد مبارک ماہ کا ذکر یعنی رمضان شریف کا تو یہ نور علی نور ہوگیا

فقط

اشرف علی

۲۲ شعبان ۱۳۳۵ ہجری

ع اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ حرام مال کمانے کا گناہ جاتا رہیگا گناہ برابر رہیگا اور اس پر مواخذہ بھی ہوگا یہ تدبیر تو صرف اسکی ہے کہ مال حرام اپنے کام میں نہ آئے ۱۲ جامع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی ب
الحبر بالصبر

اشتات	المستمعون	من ضبط	لمن	ماذا	من	کیف	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد	کس نے لکھا	کس لئے ہوا	کیا مضمون تہا	کس نے کیا	کیسے ہوا	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم ۝ یٰایہا النبی قل لمن فی

اَیْدِیْکُمْ مِّنَ الْاَسْرٰیٓ اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ خَیْرًا یُّؤْتِکُمْ خَیْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ مجکو اسوقت جو مضمون بیان کرنا ہے یہ آیت اس باب کی تو نہیں ہے مگر اسکے مناسب ہے بہرحال مناسب ہے، دوسرے مناسب ہونیکے مقصود کا بیان ہوجائیگا اور گو مقصود کیلئے خاص آیات بھی موجود ہیں مگر مجھے اسوقت تعمیم مطلوب ہے اور وہ تعمیم اس بنا سے زیادہ واضح ہوگی کیونکہ اسمیں مقصود کی علت بھی مذکور ہے یعنی اتنا نعم البدل کی جو کہ مقصود ہے علت کہ ایمان ہے مذکور ہے جسکے اشتراک سے مضمون زیادہ عام ہوجاویگا۔ اسلئے اسکو تلاوت میں اختیار کیا گیا۔ تعمیم کا یہ حاصل ہوگا کہ یہ آیت مقصود کو اور اسکے نظائر و اشباہ سب کو شامل ہوجاویگی اس بیان کا محرک بعض واقعات کا پیش آنا ہے جو اہل واقعات کی طبیعت پر گراں ہیں اسلئے گرانی کے ہلکا کرنے کی ضرورت ہے اور وہ واقعات مشترک النوع مختلف الاصناف ہیں نوع تو وفات ہی اور اصناف میں بعض وہ ہیں جو چھوٹوں کے فوت ہونے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی بچوں کے انتقال سے اور ایک واقعہ ایسا ہے کہ فوت ہونیوالے بعض کے لحاظ سے بڑے تھے بلکہ اکثر کے لحاظ سے بڑے تھے اور بعض کے لحاظ سے ہمسر تھا اور وہ اپنے بھائیوں کے لحاظ سے بھی ہمسر تھے گو کچھ تھوڑا بہت عمر میں فرق ہو مگر اخوت کا تعلق ایسا ہے کہ اسمیں ہمسری کا رنگ غالب ہوتا ہے تھوڑے سے فرق سے اسمیں ہمسری فوت نہیں ہوتی یہ واقعات تو اقارب میں پیش آئے اور کل ایک دوست مہمان آئے ہیں انکے بھی بچہ کا انتقال ہوگیا ہے تو اب یہ مضمون اقارب و احباب سبکے لئے خاص طور پر مفید ہے اور چونکہ اسوقت تعمیم کیساتھ بیان ہوگا اسلئے ہر ناگوار واقعہ میں اس سے نفع ہوگا اور کم و بیش ہر شخص کو دنیا میں کوئی نہ کوئی واقعہ ناگوار ضرور پیش آتا ہے اور جسکو پیش نہ آیا ہو اسکو آئندہ پیش آنیکا احتمال ہے اسلئے یہ مضمون سبکی ضرورت کا ہے اسی لئے علوم دینیہ کی ہر شخص کو ضرورت ہے تاکہ وقوع کے وقت اس سے کام لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے واقعات کا بھی پہلے سے انتظام فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا یہ آیت تحویل قبلہ کے متعلق ہے کیونکہ قبلہ کے احکام اول اول بدلتے رہتے ہیں پہلے مسلمانوں کا قبلہ بھی بیت المقدس تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اسکو عارضی قبلہ بنایا تھا اور آئندہ

تفسیر [illegible]

اسکو منسوخ کرنا تھا اور اسپر کفار کی طرف سے اعتراض واقع ہونیوالا تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے اسکا اہتمام فرمایا کہ آئندہ واقع ہونیوالے اعتراضات سے مسلمانوں کو زیادہ رنج نہ پہونچے تو پہلے ہی سے اطلاع فرمادی کہ بیوقوف اور نادان لوگ تمہارے اوپر اس اس طرح اعتراض کرینگے تم ان سے دلگیر نہ ہونا اور اس اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ اعتراض سے اثر تو ہوتا ہی ہے اکابر پر بھی اثر ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی صبر کرتا ہے کوئی جواب دیتا اور انتقام لے لیتا ہے ہمارے اکابر کا معمول یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع پر صبر کرتے ہیں اور اسمیں ایک لطیف راز ہے جو ذوقاً میرے قلب میں اللہ تعالیٰ نے ڈالا ہے وہ راز یہ ہے کہ حضرات شیوخ کو اسکے مقصود تک پہونچانا چاہتے ہیں اور چونکہ معترض کا مقصود ایذا ہی ہے عہ اسلئے اسکو مقصود میں کامیاب کرنے کیلئے جواب نہیں دیتے کہ اگر جواب دیں گے تو اسکا مقصود حاصل نہ ہوگا کیونکہ جواب دینے سے شفاء غیظ ہو جاتا اور اعتراض کا اثر ہلکا ہو جاتا ہے پس وہ ایک مسلمان کا جی خوش کرنے کیلئے جواب نہیں دیتے۔ غرض اہل اللہ بے حس نہیں ہوتے انکو بھی اعتراض سے اثر ہوتا اور ان کا بھی دل دکھتا ہے مگر وہ بعض وجوہ سے صبر کرتے ہیں۔ اگر اعتراض سے اثر نہ ہو تو صبر میں فضیلت ہی نہ ہوگی اس لئے اللہ تعالیٰ ۳
نے عہ وَاِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ فرمایا ہے کہ جب انکو غصہ آتا ہے تو معافی اور درگذر سے کام لیتے ہیں لم یغضبوا نہیں فرمایا کہ انکو غصہ ہی نہیں آتا کیونکہ غصہ کا نہ آنا کمال نہیں کمال یہ ہے کہ غصہ آئے اور اس کے مقتضی پر عمل نہ ہو۔ بعض لوگ اہل اللہ کو غافل سمجھکر انکے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں کہ بیدھڑک جو چاہتے ہیں اعتراض کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر اثر نہ ہوگا سو وہ خوب سمجھ لیں کہ اثر انپر بھی ہوتا ہے اور وہ صبر کرتے ہیں اور انکے صبر کا وبال انپر ہے حضرات صحابہ کو بھی اعتراض سے ناگواری ہوتی تھی کیونکہ اسی میں اجر ہے مگر ناگواری زیادہ ہو تو ناقابل برداشت ہو جاتی ہے جس سے دنیا اور دین کے کاموں میں خلل واقع ہونے لگتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے اسکا انتظام فرمایا کہ گو ناگواری ہو مگر ہلکی ہوتا کہ

عہ وفیہ ان ہذا المقصود حرام والاعانۃ علی الحرام حرام والاسلم ان یقال انہم لا یجیبون عملا بقولہ تعالیٰ ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور وانما کان من عزم الامور لما فیہ من مجاہدۃ النفس وتسکین الدھماء۔ لما فی الانتقام والانتصار للنفس اثارۃ الفتنۃ وزیادتہا ولذا سمی اللہ تعالیٰ جزاء السیئۃ وان کان عدلا فی الحقیقۃ ولکنہ یزید الشر ویورث البغضاء وفیہ ان ہذا من الاحوال لا من الافعال والرعایۃ من الاعمال ۱۲۔

قابل برداشت ہو جائے اور اجر زیادہ ہو۔ حاصل انتظام کا یہ ہے کہ پہلے سے خبر دیدی کہ بیوقوف
لوگ عنقریب اعتراض کرینگے اور ظاہر ہے کہ پیش آنے والی بات سے پہلے ہی مطلع کر دینا
ناگواری کو کم کر دیتا ہے کیونکہ ناگواری خلاف توقع سے ہوا کرتی ہے مثلاً آپ کسی شخص سے یہ
توقع کر کے ملنے جائیں کہ وہ آپکی بہت زیادہ تعظیم و مدارات کریگا اسکے بعد اگر اسکی طرف سے
ذرا بھی خاطر کرنے میں کمی ہوگی تو بہت رنج پہونچے گا اور اگر اس سے کوئی توقع نہ ہو تو اب اسکی
بیرخی اور روکھے پن سے زیادہ ملال نہ ہوگا کیونکہ اس سے کچھ امید ہی پہلے سے نہ تھی غرض ناگواری
ہمیشہ خلاف توقع سے ہوتی ہے اسی لئے حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ نے ایکبار اپنے
استاد الاستاذ کا مقولہ بیان فرمایا کہ راحت اگر چاہتے ہو تو کسی سے توقع نہ رکھنا پھر اپنے ملنے
حاضرین جلسہ سے فرمایا کہ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو خدام نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مربی اور محسن
ہیں اور ہم سے زیادہ ہمارے حال پر شفقت فرماتے ہیں۔ فرمایا مگر میں تمسے خیرخواہی کے ساتھ
کہتا ہوں کہ مجھسے بھی توقع نہ رکھنا اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اس حالت میں جو کچھ خدمت مجھسے پہنچیگی
۴ اسکو غنیمت سمجھوگے اور خلاف توقع ہونیکی وجہ سے مسرت ہوگی اور کسی وقت میں خدمت
میں کمی کر دوں تو تمکو شکایت اور ناگواری نہ ہوگی۔ اور یہی راز اس کا ہے کہ میں نے حضرت مولانا
گنگوہی رحمہ اللہ سے حاجی صاحب کے وصال کے بعد بیعت نہیں کی حالانکہ مجھے رغبت تھی مگر
نہیں لی اسی لئے بیعت نہیں کی کہ حضرت کی عنایات تو میرے حال پر بدون بیعت کے بھی
ہیں اور جس تعلق کیلئے بیعت کیجاتی ہے وہ مجھے بدون بیعت کے بھی حضرت سے حاصل ہے
اور بیعت سے یہ ہوگا کہ حضرت کے حقوق مجھ پر زیادہ ہو جائیں گے اس وقت اگر کسی بات میں بھی
کمی ہوئی تو ممکن ہے حضرت کو ناگواری ہو اور اب حضرت کو میری طرف سے کسی قسم کے حقوق
کا انتظار نہیں میں جسقدر بھی حق تعلق ادا کر دوں وہ سراسر موجب انشراح ہے تکدر کا احتمال
ہی نہیں اور بیعت کے بعد تکدر کا احتمال بھی تھا۔ ممکن ہے کوئی شخص اسکو سری نفس کی
تاویل سمجھے مگر حقیقت میں جو وجہ تھی وہ میں نے بیان کر دی بہرحال چونکہ ناگواری ہمیشہ
خلاف توقع سے ہوتی ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے مطلع فرما دیا کہ تم پر اعتراضات بھی ہونگے
اسلئے ان کیلئے ابھی سے آمادہ ہو جاؤ۔ اور یہیں سے نکتہ معلوم ہوتا ہے اس کا کہ اللہ تعالیٰ

نے اَلَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ فرمایا اِنْ اَصَابَتْهُمْ نہیں فرمایا کیونکہ اذا یقین کے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے اور ان احتمال کے موقعہ پر پس اِذَا اَصَابَتْهُمْ میں بتلا دیا گیا کہ مصیبت تو آوے ہی گی ؎

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید — زجام دہر مئی کل من علیہا فان

اور اس علم کے بعد مصیبت سے وہ غم نہیں ہوتا جو دفعۃً آنے سے ہوتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ بڑے عاقل ہیں جو موت کو ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان پر موت دفعۃً نہ آئیگی اسلئے انکو موت سے وحشت بھی نہ ہوگی۔ دنیادار اپنے کو عاقل سمجھتے ہیں یہ غلط ہے وہ بہت سے بہت اکل ہیں عاقل نہیں ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے دل میں حساب و کتاب معاش کا لگاتے رہتے ہیں اور بڑے بڑے منصوبے قائم کرتے ہیں اور وہ حساب و کتاب پورا ہوتا نہیں کیونکہ ؎

ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ — تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

تو جب خلاف امید واقعات ان کو پیش آتے ہیں اسوقت سخت پریشانی کا سامنا ہوتا ہے اور ٥
اہل اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت یہ سمجھتے ہیں شاید یہیں نفس نفس واپسیں ہو۔ اور یہ محض احتمال کا نہیں ہے کیونکہ احتمال تو سارے عالم کو ہوتا ہے کہ شاید آج موت آجائے بلکہ انکی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے اس شخص کی حالت ہوتی ہے جسکے پاس بادشاہ کا پیام پہنچ جائے کہ آج ہم تمکو بلا بھیجنے والے ہیں تیار رہنا۔ اور کوئی وقت مقرر نہ کرے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ اس شخص کا سارا دن اہتمام ہی میں گذر جاتا ہے اسیطرح اہل اللہ ہر وقت اپنے معاملات کو صاف کرتے رہتے ہیں تاکہ جسوقت بلاوا آجاوے خوشی سے چلنے کو تیار ہو جائیں۔

صاحبو! احتمال وہی معتبر ہے جسکے مقتضا پر عمل ہو ورنہ یوں تو ڈاکو کو بھی ڈاکہ ڈالنے کے وقت سزا کا احتمال ہوتا ہے۔ مگر جب اسکے مقتضا پر عمل نہوا تو ایسا احتمال چولہے میں ڈالنے کے قابل ہے پس اہل اللہ کو شاید یہیں نفس نفس واپسیں ہو۔ کا احتمال مع العمل ہوتا ہے کہ وہ حقوق اللہ و حقوق العباد سے سبکدوشی کی فکر کرتے رہتے ہیں اگر نمازیں فوت ہوئی ہیں

عہ انسان کی ہر آرزو پوری نہیں ہوا کرتی بلکہ ہوائیں کبھی کشتی کے خلاف بھی چلتی ہیں ۱۲ ظ

انکو قضا کر لیتے ہیں یا قضا کرتے رہتے ہیں اسپر تم شاید یہ کہو کہ دس سال کی نمازیں ایک دن میں
کس طرح قضا ہونگی اور جب قضا نہو سکیں تو ہر دم موت کیلئے کیونکر تیار ہو سکیں گے اس کا
جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جس شخص کو ادا کا اہتمام ہو گیا اور اپنی وسعت کے موافق
کام بھی کرنے لگا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مثل ادا کرنے والے ہی کے ہے پس وہ اپنی
وسعت کے موافق ادا کرتا رہے اور جو رہ جائے اسکے متعلق وصیت کر جائے جو ثلث
مال سے زیادہ میں صحیح نہیں اور اسمیں بھی بندوں کے حال پر عنایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
بندوں کے حقوق کو (بوجہ انکی احتیاج کے) اپنے حقوق سے (بوجہ استغنا کے) مقدم
رکھا پس فرما دیا کہ نماز روزہ وغیرہ کے فدیہ کی وصیت ثلث سے زائد میں کرو کیونکہ اسمیں ورثہ کا
نقصان ہے اور ہمارا کوئی نقصان نہیں ہم تو اگر چاہیں ویسے بھی معاف کر دیں گے پس اگر
کسی شخص کے ذمہ لوگوں کا ایک لاکھ روپیہ قرض ہو اور وہ آج ادا کرنیکا ارادہ کرے تو جتنا اس
سے ہو سکے ادا کرنا شروع کرے جسکے لئے اسکی ضرورت نہیں کہ اپنے کو زیادہ تنگی میں ڈالے بلکہ اپنے
٦ حوائج ضروریہ سے جو فاضل ہو اسکو قرض میں دینا شروع کرے خواہ ایک ہی روپیہ ماہوار ادا
کرنا شروع کر دے تو وہ آج ہی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں سبکدوش قرار پائیگا مگر یہ ضروری ہے
کہ فضول خرچی کو بند کر دے اب اگر اس سے ایک لاکھ میں سے دس ہی ادا کئے اسکے بعد موت
آگئی تو وہ عند اللہ بالکل بری ہے اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ مقروض کو فضول خرچ بند کر دینا
چاہئے اسپر ایک قصہ یاد آیا کہ مولانا نواب قطب الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مقروض
تھے۔ ایک دفعہ آپ نے دہلی کے سب بزرگوں کی دعوت کی شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کو بھی
مدعو کیا اور مولانا مظفر حسینؒ صاحب کاندہلوی کو بھی مدعو کیا سب حضرات نے تو دعوت
قبول کر لی مگر مولانا مظفر حسینؒ صاحب نے منظور نکی نواب صاحب نے شاہ اسحٰق صاحب سے انکی
شکایت کی شاہ صاحب نے فرمایا کہ مولوی مظفر حسین کیا تمکو نواب صاحب کی آمدنی میں کچھ
شبہ ہے اور کیا تمہارے نزدیک ہم نے مشتبہ مال کی دعوت قبول کی ہے مولانا مظفر حسینؒ صاحب
نے عرض کیا کہ حضرت میں آپکے سامنے کیا چیز ہوں جو نواب صاحب کے مال کو مشتبہ سمجھوں
مگر میں نے اسواسطے دعوت سے عذر کیا کہ نواب صاحب مقروض ہیں اور دعوت

میں وہ زیادہ خرچ کرینگے جو تین چار سو روپیہ سے کم نہ ہوگا اور مقروض کو ایسا کرنا جائز نہیں انکو لازم ہے کہ جو رقم دعوت میں خرچ کریں اسکو قرض ہی میں ادا کردیں تو عند اللہ کچھ سبکدوشی ہوجائیگی شاہ صاحب نے یہ بات سنکر فرمایا کہ بھائی اس طرف ہمارا ذہن بالکل نہیں گیا واقعی تمہاری رائے صحیح ہے اور اب ہم بھی دعوت قبول نہ کرینگے چنانچہ سب بزرگوں نے انکار کردیا اور یہی کہا کہ آپکو بجائے دعوت میں رقم لگانیکے قرض میں یہ رقم ادا کرنا چاہئے حالانکہ انکے قرضہ میں اس رقم سے کچھ سہارا نہ لگتا تھا کیونکہ قرض بہت تھا مگر عند اللہ اتنا ادا کرنا بھی معتبر ہے دنیاداروں کے یہاں تو قاعدہ یہ ہے کہ ایک لاکھ میں سے ایک روپیہ ادا کرنا معتبر نہیں مگر عند اللہ معتبر ہے یعنی وہ اس سے راضی ہوجاتے ہیں دنیاداروں کی تو یہ حالت ہے کہ ایک راجہ پر ایک لالہ کا قرض تھا اس نے عدالت میں نالش کی حاکم نے لالہ سے کہا کہ سود معاف کردو اور اصل لیلو اس نے انکار کیا کہ ہمارا تو کاروبار سود ہی پر ہے اور یہی ہماری کمائی ہے اسکو کیسے معاف کردوں حاکم نے کہا بہت اچھا تم اصل بھی لو اور سود بھی لو چنانچہ اس نے مع سود کے ڈگری کردی مگر فیصلہ میں یہ لکھا کہ قرض قسط وار وصول کیا جائے اور قسط ایک روپیہ سال مقرر کردی کیونکہ حاکم کو یہ اختیار ہے کہ جتنی چاہے قسط مقرر کردے۔ اس فیصلہ سے لالہ تو گویا زندہ درگور ہوگیا اسکے نزدیک یہ ادا قابل شمار نہ ہوگی مگر عند الحاکم معتبر ہے وہ سمجھا تا رہا کہ اگر کسی کے ذمہ دس سال کی نمازیں قضا ہوں یا دس لاکھ روپیہ قرض ہو تو وہ ایک دن میں کیونکر سبکدوش ہوسکے گا سو میں نے بتلادیا کہ ایک دن کے اندر ہی انسان تمام حقوق سے حکماً سبکدوش ہوسکتا ہے تو اہل اللہ موت کو یاد کرتے ہیں اور اسکے مقتضا پر عمل بھی کرتے ہیں اس سے انکو آخرت کا نفع ہوتا ہے دنیا میں بھی راحت ہوتی ہے کیونکہ جب وہ ہر دم موت کو یاد کرتے ہیں تو کسی مصیبت سے وہ پریشان نہیں ہوتے کیونکہ جب ان کو موت سے جو اشد الحوادث ہے وحشت نہیں تو اور کسی حادثہ سے پریشانی کیوں ہوگی اور دنیادار کو موت سے بہت وحشت ہے اسلئے وہ ہر ایسی مصیبت سے پریشان ہوجاتا ہے جسمیں موت کا خطرہ ہو چنانچہ شاید مولانا جامی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بڑھیا کی لڑکی جسکا نام مہستی تھا بیمار ہوتی تو بڑھیا اسکی محبت میں کہا کرتی کہ اے موت مجھے لیلے اور مہستی کو چھوڑ دے لیکن

وہ گھر میں بیٹھی تھی کہ اسکی گائے محلہ میں کسی کے گھر میں چلی گئی اور ہانڈی میں منہ ڈالدیا ہانڈی اسکے منہ میں پھنس گئی اور وہ اسی حلیہ سے گھر میں آئی تو بڑھیا سمجھی کہ یہ موت ہے جسکو میں روزانہ پکارا کرتی تھی تو وہ گھبرا کر کہتی ہے کہ

گفت اے موت من نہ مہستیم پیرزال غریب محستیم۔

اے موت میں مہستی نہیں ہوں مہستی تو وہ سامنے پلنگ پر پڑی ہے میں تو غریب بڑھیا ہوں موت کے خیال سے ہی ساری محبت اور ماامتا جاتی رہی اب وہ موت سے کہتی ہے کہ مہستی وہ پڑی ہے اُسے لیلے بات یہ ہے کہ انسان بڑا خود غرض ہے اسکو اولاد سے محبت بھی اپنے حظ نفس کیلئے ہے کہ اُنکے تماشے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور یہ جو بعض لوگ کسی کی محبت میں جان دیتے ہیں شاید کوئی یہ سمجھے کہ وہ دوسرے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے یہ غلط ہے بلکہ وہ بھی حظ نفس کیلئے جان دیتا ہے کیونکہ وہ رنج عشق کے تحمل سے اپنے کو عاجز سمجھتا اور جہل کی وجہ سے موت کی تکلیف کو اُس سے اخف سمجھتا اسلئے وہ موت کو اس کلفت سے اپنی ہی راحت کیلئے ترجیح دیتا ہے۔ پس انسان سب خود ۸
غرض ہیں خواہ دین کی غرض ہو یا دنیا کی چیز دینداروں میں بھی کوئی ثواب کی نیت کرتا ہے کوئی ثواب سے بھی بالا ہے مگر وہ بھی خود غرض ہے کیونکہ وہ رضائے حق کا طالب ہے اور یہ غرض سب سے بالاتر ہے جیسے ایک صاحب حال بزرگ کے سامنے کسی نے دوسرے کو کہا پانی پلادے ثواب ہوگا یہ سنکر فرمایا ہائے ثواب کیلئے پانی پلانے ہو محبوب کیلئے نہیں پلاتے ظاہر میں یہ بزرگ بےغرض معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ بھی غرضمند تھے کیونکہ وہ ایسی غرض کے طالب تھے جس سے بڑھکر کوئی غرض نہیں حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایکبار رسالہ ارشاد مرشد مجھے دیا کہ مطبع نظامی میں طبع کرا دیا جائے کیونکہ مطبع نظامی میں تصحیح وخوبی طبع کا اہتمام تمام مطبعوں سے زیادہ تھا چنانچہ رسالہ طبع کرا کر میں حضرت کی خدمت میں لیگیا حضرت نے اُسکے مصارف دریافت فرمائے تو میں نے عرض کیا حضرت عبدالرحمن خاں صاحب بڑے سخی ہیں انہوں نے اسکا کچھ عوض نہیں لیا محض ثواب کیلئے طبع کردیا ہے۔ فرمایا کہ عبدالرحمن خاں کو تم سخی کہتے ہو وہ بڑے بخیل ہیں کہ ایک روپیہ کے

باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ

بدلہ میں سات سو روپیہ کے طالب ہیں انہوں نے یہاں بھی اپنی تجارت کو نہیں چھوڑا میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان سب خود غرض ہیں اسلئے اپنی جان سے زیادہ کسی کو کسی سے محبت نہیں اسلئے دنیادار لوگ موت سے اور مصائب سے بہت گھبراتے ہیں اور اہل اللہ چونکہ موت کو یاد کرتے رہتے ہیں اور اسکے لئے ہر دم تیار رہتے ہیں۔ اسلئے اب انکو نہ بیوی کے مرنے کا رنج ہوتا ہے نہ بچہ کا کیونکہ وہ تو خود ہی موت کیلئے تیار ہے اور انکی ہر بات سے دوسروں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہر دم موت کیلئے تیار ہیں چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک شخص روتا ہوا آیا کہ حضرت میری بیوی مر رہی ہے دعا فرما دیجئے کہ حق تعالے اسکو شفا عطا فرمائیں حضرت نے یہ سنکر فرمایا کہ عجیب بات ہے ایک شخص قید خانہ سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا روتا ہے کہ یہ قید خانہ سے کیوں رہا ہوتا ہے وہ کہنے لگا حضرت میری بچی کون پکائے گا۔ فرمایا جی ہاں جب تم ماں کے پیٹ میں تھے تو وہ وہاں بھی تم کو روٹی پکا کر کھلاتی ہوگی پھر فرمایا کہ میاں تم بھی چند روز میں وہیں پہونچنے والے ہو جہاں وہ جا رہی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ آیا تو تھا بیوی کو موت سے بچانے اپنی ہی موت کی بشارت لیچلا اسوقت تک ۹
تو حضرت ہنس ہنسکر باتیں کرتے رہے اسکے بعد ایک ایسی بات پر برہم ہو گئے جو آجکل برہم ہونے کی بات نہیں سمجھی جاتی بلکہ جب دین کی علامت سمجھی جاتی ہے وہ کہنے لگا کہ حضرت فلاں شخص نے مجھے مدینہ لیجانے کا وعدہ کیا تھا اب وہ وعدہ سے ہٹنے لگا ہے دعا فرما دیجئے کہ وہ مجھے مدینہ لیجائے۔ بس حضرت یہ سنتے ہی برہم ہو گئے فرمایا ہمارے سامنے شرک کرتا ہے مکرو (غیر اللہ پر اتنی نظر کہ اسکے ہی لیجانے سے تو تم مدینہ پہونچو گے) حضرت کی مجلس میں ہر بات بات سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہر دم موت کیلئے تیار ہیں اور ہر کام میں خدا تعالیٰ پر نظر ہے جب ایسے شخص پر موت گراں کیوں ہوگی اور کسی مصیبت سے کیوں پریشان ہوگا۔ غرض جس مصیبت کیلئے انسان پہلے سے آمادہ رہے اسپر وہ مصیبت خفیف ہو جاتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سیقول السفہاء من الناس میں صحابہ کو پہلے سے مطلع فرما دیا کہ تحویل قبلہ کے وقت تم پر اعتراضات ہونگے انکے لئے آمادہ ہو جاؤ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا ہے کہ آئندہ واقعات سے مسلمانوں کو زیادہ رنج و کلفت نہو اور اسی لئے

شریعت کی تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالی نے اس تعلیم میں اس کا لحاظ فرمایا ہے کہ پریشانی اور غم اس سے ہلکا ہوجاتا ہے میں ایسا ہی مضمون بیان کرتا ہوں کہ اسکے استحضار سے کسی غم میں ثقل نہ ہیگا یہانتک داعی اور محرک کا بیان تھا اب میں مضمون کا حاصل حقیقت کے لحاظ سے بتلانا چاہتا ہوں تو اس مضمون کی حقیقت اس عنوان سے جو آج بیان ہوگا شاید کبھی سننے میں نہ آئی ہوگی اس لحاظ سے یہ تعلیم جدید ہے گو فی الواقع علوم دینیہ سب قدیم ہیں مگر ہمارے علم وسماع کے لحاظ سے بعض علوم جدید ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے انکو سنا نہیں یا خاص عنوان سے نہیں سنا۔

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ جنگ بدر میں (اور بدر ایک موقع کا نام ہے جہاں غزوہ ہوا تھا) کچھ کفار قید ہوکر آئے تھے جنکو فدیہ لیکر چھوڑ دیا گیا حق تعالی کو یہ امر ناپسند ہوا جسکا اوپر ذکر ہوچکا ہے اسکے بعد ان قیدیوں کے متعلق ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْۤ اَیْدِیْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ خَیْرًا یُّؤْتِكُمْ خَیْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ اے نبی

۱۰ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں سے جو آپ کے ہاتھوں میں قیدی ہیں فرمادیجئے کہ اگر اللہ تعالی تمہارے قلوب میں کچھ بھلائی دیکھیں گے (مراد ایمان ہے) تو تمکو اس مال سے بہتر (عوض) عطا فرمائیں گے جو تم سے (اسوقت فدیہ میں) لیا گیا ہے اور تمہاری مغفرت فرمادینگے۔ مراد یہ ہے کہ تمکو دنیا ہی میں اس کا عوض اس سے بہتر عطا فرمادینگے بمقابلہ مغفرت سے ظاہر یہی ہے کہ اس جملہ میں اعطا فی الدنیا مراد ہے اور جملہ ثانیہ میں اجر آخرت مراد ہے ویغفر لکم یعنی آخرت میں تمہاری مغفرت فرمادینگے واللہ غفور رحیم کہ اللہ تعالی تو بہت مغفرت فرمانے والے اور رحم فرمانے والے ہیں (اسلئے تمکو اس وعدہ میں تردد نکرنا چاہئے ۱۲) حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اگر تمہارے دل میں ایمان ہو تو تمکو اس مالی نقصان کا اندیشہ نکرنا چاہئے جو فدیہ سے اسوقت پہونچا ہے کیونکہ اللہ تعالی تمکو دنیا و آخرت میں اس کا نعم البدل عطا فرمائینگے اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر نقصان و مصیبت کا نعم البدل ملتا ہے اور ہر چند کہ مورد تو خاص ہے مگر جس امر پر اس وعدہ کو مترتب فرمایا ہے وہ مورد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اس لئے آیت سے یہ قاعدہ مفہوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر مصیبت کا نعم

السبدل ملتا ہے یہاں تو تعمیم پر کوئی صیغہ صراحۃً دال نہیں مگر دوسری نصوص سے اس تعمیم کی تائید ہوتی ہے۔ اس وعدہ اور قاعدہ کو ملحوظ رکھکر ایک اور حقیقت واضح ہوئی وہ یہ کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے یہی حقیقت ہماری نظر سے غائب ہوتی ہے اس لئے مصیبت سے رنج زیادہ ہوتا ہے۔ اب دیکھو کہ تجارت میں انسان یہ چاہا کرتا ہے کہ میرے مال کی نکاسی ہو کہ جو چیزیں میرے ہاتھ کے تلے ہیں کوئی انکا لینے والا خریدنے والا ہو اگر خریدار کوئی نہ آئے تو تاجر گھبرا جاتا ہے خاص کر ایسی اشیاء میں جو باقی رہنے والی نہیں جیسے کل کے روز برف بہت ارزاں دہلی کے بھاؤ پر لگ گیا تھا کیونکہ خریدار کم ہوئے اور برف کا رہنا دشوار تھا اسلئے دہلی کے بھاؤ پر یعنی اپنی خوبی پر بھی دیگیا شہروں میں تو ایسا بہت ہوتا ہے کہ شام کو میوہ نہایت ارزاں ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تاجر اپنے مال تجارت کے پڑا رہنے پر رنجیدہ ہوتا ہے نکل جانے پر رنجیدہ نہیں ہوتا حالانکہ وہ اپنے خریداروں کے ہاتھ ایک محدود نفع پر بیچتا ہے مگر پھر بھی وہ خریداروں کا مشتاق رہتا ہے کہ کوئی میرا مال لیلے مرابحہ ہو تو تولیہ
ہی ہو تولیہ ہو تو میلی کچیلی صافی ہی سہی یعنی نفع نہ ہو تو کچھ خسارہ ہی سہی چنانچہ بعض دفعہ ۱۱
ایسے مال کو جس کا خریدار کوئی نہ ہو کسیقدر خسارہ سے بھی فروخت کر دیتا ہے جب تجارت کی یہ حقیقت ہے تو صاحبو! اگر میں یہ ثابت کردوں کہ یہ واقعات رنج و مصیبت تمام تر تجارت ہی ہیں اور تجارت بھی ایسی جس سے بڑھکر نفع کسی تجارت میں نہیں ہوتا تو کیا پھر بھی ملال وشیون باقی رہیگا۔ میں رنج طبعی کا منکر یا مانع نہیں جو فطری طور پر ہوتا ہے بلکہ میں آگے اسکی ضرورت پر کلام کرونگا کہ طبعی رنج تو ہونا چاہئے ورنہ ثواب و اجر ہی نہ ہوگا مگر میں اس وقت رنج عقلی کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں کہ واقعات رنج و مصیبت کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد رنج عقلی نہ ہونا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حالات کی دو قسمیں ہیں گوارا و ناگوار پھر ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں۔ اختیاری و غیر اختیاری یہ کل چار قسم کے حالات ہوئے جنمیں سے ہر ایک کے متعلق جدا جدا حقوق ہیں اور مومن اگر ان کے حقوق ادا کرتا رہے تو اسکو نعم البدل ملتا ہے اسلئے مومن کبھی نقصان میں نہیں بلکہ ہر حالت میں نفع میں ہے۔ اسی کو حدیث میں ہے نعم الرجل المؤمن

ان اصابتہ سراء حمد وان اصابتہ ضراء صبر وفی کل اجر او کما قال مومن آدمی بڑی اچھی حالت میں ہے اگر اسکو راحت پہونچتی ہے حمد و شکر کرتا ہے اگر تکلیف پہونچتی ہے صبر کرتا ہے اور ہر ایک میں اسکو اجر ملتا ہے یعنی شکر میں بھی اجر ہے اور صبر میں بھی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ امور غیر اختیاریہ میں جو اجر ہے وہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو اختیاراً اسوقت مومن سے صادر ہوتے ہیں یعنی راحت میں حمد جسکی حقیقت یہاں شکر ہے اور وہ ایک عمل ہے جو اس نے حق تعالیٰ کی حضور میں پیش کیا ہے اسکے عوض میں اجر ملتا ہے اور مصیبت میں صبر کرنا بھی ایک عمل ہے جسپر اجر ملتا ہے پس دونوں صورتوں میں نعم البدل اسی عمل پر ملا جو اختیاری ہے پس جسطرح اعیان کے اعطاء و اخذ کے عوض میں بھی انسان کے اوپر کچھ حقوق ہیں یعنی شکر و صبر مثلاً حق تعالیٰ بندہ کو نعمت مال عطا فرمائیں یا نعمت اولاد تو اسکے عوض میں اسکے اوپر شکر واجب ہے یا اس سے مال و اولاد کو لیلیں تو اسپر صبر واجب ہے اسی طرح اعراض و اعمال پر بھی یہ حقوق ہیں مثلاً نماز روزہ وغیرہ کی توفیق عطا فرمائیں یا ذکر میں انوار و علوم عطا فرمائیں تو اسپر شکر لازم ہے اور اگر ذکر میں انوار و کیفیات سلب ہو جائیں تو اسپر صبر لازم ہے اور یہاں خود اعمال پر بھی اجر ملتا ہے اور ان کا شکر ادا کرنے پر اجر ہے چنانچہ نماز روزہ و حج و زکوٰۃ کے عوض تو اسکو وہ اجر ملتا ہے جو خیال سے باہر ہے حدیث میں ہے اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر تو نماز روزہ و حج و زکوٰۃ پس جملہ اعمال صالحہ کا بجالانا بھی ایک تجارت ہوئی جسکے نفع کی یہ شان ہے کہ ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را	کہ بیک گل می خری گلزار را
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد	انچہ در وہمت نیاید آں دہد

اور اگر عبادت کا تعلق اموال سے ہو تو وہ بھی تجارت ہے جسکے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے صراحۃً لفظاً ارشاد فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ جسمیں تجارت کی حقیقت پر صاف طور سے تنبیہ ہے (وقال تعالیٰ فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ ؕ وفیلفظ الشراء بمعنی البیع وقال

[illegible] ۱۲

اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ
ففیہ ان اختیار الکفر صفقۃ خاسرۃ وقال تعالیٰ ولبئس ما شروا بہ انفسھم لو کانوا یعلمون
(۲) چونکہ تجارت کی طرف طبائع عام طور سے راغب ہیں اسی لئے تجارت کا عنوان اللہ تعالیٰ نے
اختیار فرمایا کہ تم جو اعمال کرتے ہو وہ درحقیقت یہ ایک معاملہ تجارت ہے جو اللہ تعالیٰ کے
ساتھ تم کر رہے ہو۔ افسوس نماز کو بھی لوگوں نے اسی لئے مصیبت سمجھ لیا ہے کہ اسکی حقیقت
نہیں سمجھی اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اسکی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز دے دی اور ایک چیز لیلی
تو نماز سے کبھی گرانی نہو اور نہ اسکو بیگار کی طرح ٹالا جائے بلکہ جسطرح تاجر اپنے مال کو
صاف ستھرا رکھتا ہے اور خوبصورت بنا کر خریدار کو دیتا ہے اسی طرح ہم بھی نماز کو خوبصورتی
کے ساتھ ادا کیا کرتے یہ تو گویا اعمالات کے متعلق بیان تھا اب ناگوار حالات کے متعلق سنئے
کہ ان میں بھی تجارت کی حقیقت موجود ہے اور گو اس حقیقت سے جہل عام ہے نعمتوں میں بھی
اور مصائب میں بھی مگر نعمتوں میں اس جہل کا وہ ضرر نہیں جو مصائب میں ہے کیونکہ نعمتوں
۱۳ میں رنج تو نہیں ہوتا جس سے پریشانی بڑھکر دین اور دنیا کے کاموں میں خلل واقع ہو بخلاف
مصائب کے کہ وہاں اس حقیقت کے جہل سے رنج کا اثر دل پر چھا جاتا ہے جس سے تمام
کاموں میں خلل واقع ہوجاتا ہے اسلئے یہاں علاج کی ضرورت زیادہ ہے۔ اب میں مصائب کے
متعلق بھی اس حقیقت کو ثابت کرنا چاہتا ہوں سنئے احادیث کے الفاظ میں غور کرنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ مصائب میں بھی تجارت کے الفاظ حضور ؐ نے استعمال فرمائے ہیں چنانچہ ایک
صاحبزادی کا بچہ مرنے لگا اور انہوں نے حضور ؐ کو بلایا تو آپ نے انکی تسلی کے لئے فرمایا ان للہ
ما اخذ وللہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمی فلتصبر ولتحتسب کہ اللہ ہی کا ہے جو
کچھ دیا اور اللہ ہی کا ہے جو لیا پس صبر کریں اور ثواب کی امید رکھیں۔ یہاں اخذ و اعطاء
ہے اور اخذ و اعطا ہی تجارت کی حقیقت ہے یہاں محض صوری تجارت ہے حقیقی تجارت نہیں
کیونکہ حقیقی تجارت تو یہ ہے کہ اپنی چیز دے اور دوسرے کی لے اور یہاں جو کچھ ہے سب
خدا ہی کا ہے اسکی ایسی مثال ہے جیسے ہم بچہ کو کوئی چیز بطور اباحت کے دیں (اباحت کی
قید اسلئے بڑھائی تاکہ آگے شرعی اعتراض وارد نہ ہو) پھر کسی مصلحت سے وہ چیز اس سے لے لیں اور

دوسری یہ ہیں مثلاً کسی کو اپنی اولاد کو اصول تجارت سکھلانا مقصود ہے وہ اسکو ایک آبگینہ کا ٹکڑا دیتا ہے اور ایک اشرفی کے بدلے میں بچہ سے اسکو خرید لے تاکہ وہ آبگینہ کی حقیقت اور روپیہ و اشرفی کی قیمت سے واقف ہو جائے تو یہ درحقیقت تجارت نہیں ہے بلکہ صورت تجارت ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے بعض چیزیں بندہ کے نامزد کر دی ہیں جو اباحت ہی کے طور سے ہے گو اسپر ملک کے آثار بھی مرتب کئے گئے ہیں مگر حضرت حق کی ملک کے اعتبار سے یہ نامزدگی اباحت ہی ہے ہاں دوسروں کے اعتبار سے ملک کہنا صحیح ہے اسکی ایسی مثال ہے جیسے طلبہ کو مدرسہ کی کتابیں دی جاتی ہیں تو مدرسہ کی ملک کے اعتبار سے تو یہ کتابیں طلبہ کے نامزد بطور اباحت کے ہیں مگر بعض آثار اس میں ملک کے بھی ہیں چنانچہ ایک طالب علم سے دوسرا طالب علم بلا اذن کے کتابیں نہیں لے سکتا اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی بعض مصالح کی وجہ سے بعض اشیاء کو ہمارے نامزد فرما دیا ہے۔ ایک مصلحت تو یہ ہے کہ نامزدگی میں بندہ کو حظ آتا ہے کہ میرا مال میری بیوی۔ میرا بچہ میری زمین میرا مکان وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے یہ کہ تاکہ اس سے کوئی چھین نہ سکے اگر نامزدگی نہ ہو اور بندہ کی ملک نہ ہو تو کسی کے ۱۴
پاس کوئی چیز سلامت نہ رہے اور یہیں سے میں کہتا ہوں کہ حقیقت شریعت کی محتاج ہے یعنی وہ حقیقت جو عام طور پر صوفیہ کے ذہن میں ہے (ورنہ طریقت حقیقت شریعت ہی کے اجزاء ہیں) مگر جس حقیقت کو جہلاء صوفیہ گاتے پھرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ وہ بھی شریعت کی محتاج ہے اگر شریعت نہ ہو تو صوفی صاحب کی تسبیح و مصلی اور نذرانے اگر کوئی ملانا لیجائے پھر وہ برا نہ مانیں کیونکہ ؎

درحقیقت مالک ہر شے خداست　　　ایں امانت چند روزہ نزد ماست

جب بندہ کی کوئی شے نہیں نہ اسکو حق ملک حاصل تو ملاؤں کو یہ کہنے کا حق ہے کہ کچھ لوٹ خدا کا مال تمنے برتا اب ہم برتیں گے اعتراض اور ناگواری کی کیا بات ہے۔ جیسے مولانا نے ایک جبری کی حکایت لکھی ہے کہ وہ ایک شخص کے باغ میں گھسکر مالک کے سامنے انگور توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ مالک نے کہا میاں یہ کیا حرکت ہے نہ اجازت لی نہ قیمت دی اور میرے باغ میں آکے تصرف کرنے لگے جبری نے کہا بس بس خاموش بیٹھا رہ باغ بھی خدا کا پھل بھی

خدا کامیں ہی خدا کا تو روکنے والا کون ہے مالک باغ بڑا ہوشیار تھا اس نے اپنے غلام کو آواز دی کہ ایک رسی اور ڈنڈا لانا غرض دونوں نے رسی میں جبری کو باندھا اور کٹائی شروع ہوئی اب لگا چلانے مالک باغ نے کہا کہ رہا بھی خدا کا ڈنڈا بھی خدا کامیں بھی خدا کا تو بھی خدا کا پھر چلاتا کیوں ہے چونکہ چوٹ کا تحمل نہ ہوسکتا تھا اسلئے یہ جواب نہ دیسکا کہ چلانا بھی خدا کی طرف سے ہے اسلئے اعتراض لغو ہے بلکہ ہوش درست کرکے کہنے لگا ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار — اختیار ست اختیار ست اختیار

وہ چوٹ کھا کر صوفی نہ رہا بلکہ مولوی ہوگیا۔ تو صاحبو اگر یہ حقیقت واضح کردی جائے تو سب آدمی بالشویک ہوجائیں جنکا دعویٰ یہ ہے کہ سب انسان مساوی ہیں کسی کو کسی سے مالدار بننے کا حق نہیں بلکہ جسکے پاس زیادہ مال ہوتا ہے اُس سے لیکر غریبوں میں تقسیم کردیتے ہیں حضرت حاجی صاحبؒ نے مثنوی کے اس شعر کا ؎

سر پنہان ست اندر زیر و بم — فاش گر گویم جہاں برہم زنم

یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر مسئلہ وحدۃ الوجود ظاہر کردوں تو عالم میں فساد برپا 15
ہوجائے کم فہموں کی نظر سے امتیاز اٹھ جائے یہ جو عالم میں نظام و امن قائم ہے شریعت ہی کی بدولت ہے کہ یہ زید کا حق ہے یہ عمرو کا حق ہے دوسرے کے حق میں تصرف حرام ہے تو ان مصالح کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندہ کے نامزد بعض چیزیں کردی ہیں مگر ان کا یہ تو مطلب نہیں کہ تم اس نامزدگی سے حق تعالیٰ کا ہی مقابلہ کرنے لگو۔ اگر کوئی آقا اپنے غلام سے کہدے کہ یہ پلنگ تمہارا ہے تو اسمیں مصلحت یہ ہے کہ دوسرے غلام اسکو تنگ نکریں بلکہ اسکی نامزد چیزیں بلا تکلف اسکو تصرف کرنے دیں اب اگر یہ غلام آقا کو بھی اس پلنگ پر بیٹھنے سے روکنے لگے تو یقیناً وہ بڑا نمک حرام ہوگا۔ صاحبو ایسی حالت ہماری ہورہی ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ نے تو ہماری مصلحت کے لحاظ سے نامزدگی فرمائی تھی ہم خدا تعالیٰ کے تصرف کو بھی ان چیزوں سے روکنا چاہتے ہیں اور اگر وہ کوئی تصرف کرتے ہیں تو ہم پیٹ پھاڑ کر مرے جاتے ہیں حالانکہ جو چیز بادشاہ کے نامزد ہوجائے اور اسکے خزانہ میں پہونچ جائے وہ تو زیادہ محفوظ ہوجاتی ہے ہمارے نامزد رہتی تو خطرات کا اندیشہ تھا

چنانچہ جس بچہ کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا اُسکے بارہ میں یہی آیا ہے کہ اُسکی فطرت میں کفر تھا اگر زندہ رہتا کافر ہوتا اور ماں باپ کو اُس سے بہت محبت تھی اندیشہ تھا کہ ماں باپ پر بھی اُسکے کفر کا اثر پہونچتا کیونکہ جس طرح اولاد ماں باپ کے اثر سے بگڑتی ہے اسی طرح کبھی والدین بھی اولاد کے اثر سے بگڑ جاتے ہیں تو اب جو اولاد بچپن میں مر جائے اُنکے متعلق سوچنا چاہئے کہ نہ معلوم یہ جوان ہو کر کیسے ہوتے ممکن ہے جوانی میں یہ ایسے ہوتے کہ ہمکو ان سے نفرت ہوتی اور ہم خود انکی موت کی تمنا کرتے اور اب معصومی کی حالت میں انتقال ہوا ہے تو یہ سب خطرات سے محفوظ ہو گیا کیونکہ معصوم بچے جمہور کے نزدیک جنتی ہیں اور امام صاحبؒ سے جو اس مسئلہ میں اللہ اعلم بما کانوا عاملین منقول ہے جس کا حاصل توقف ہے تو اسکی وجہ یا تو عدم بلوغ نصوص ہے اور اس میں کچھ نقص نہیں کیونکہ تدوین علوم واحادیث سے پہلے علماء کو نصوص تدریجاً ہی پہونچی تھیں تو ایک وقت میں اگر کسی عالم کو کوئی حدیث نہ پہونچے تو کیا تعجب ہے اور تو اور حضور خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک وقت ایسا گذرا ہے جسکے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا الآیہ اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۔ کہ زیادتِ علم کی دعا فرماتے رہا کیجئے جس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کے علوم میں بھی تدریجاً ترقی ہوتی تھی۔ دوسری بات میرے ذہن میں امام صاحبؒ کے توقف کے متعلق یہ آئی ہے کہ امام صاحب نے اس عنوان میں ہمکو ایسے امور کی تحقیق سے منع فرمایا ہے جن پر دین کا مقصود موقوف نہیں چونکہ بچوں کے دخول جنت و عدم دخول کی تحقیق پر کوئی دینی مقصود موقوف نہیں ہے تو جب کو اسکی تحقیق نہ ہوئی ہو وہ اسکے درپے نہو اسلئے امام صاحب نے سائل کو مجمل جواب دیا اُسکے سامنے تحقیق بیان نہیں فرمائی کیونکہ اُس کا سوال فضول تھا۔ امام صاحب نے بہت سے فروع میں اسی اصل کو ملحوظ فرمایا ہے آجکل ایسے فضول سوالات بہت کئے جاتے ہیں جن پر دین کا کوئی مقصود موقوف نہیں مثلاً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ فلانا کام بڑا گناہ ہے یا چھوٹا گناہ ہے میں جواب دیا کرتا ہوں کہ اگر چھوٹا گناہ ہوا تو کیا ارتکاب کا قصد ہے اگر کہے ہاں تو میں کہتا ہوں کیا کبھی اپنے چہرہ میں

چنگاری لگانے کے متعلق بھی یہ سوال کیا ہے کہ یہ چنگاری چھوٹی ہے یا بڑا انگارہ ہے اور اگر یہ معلوم ہو کہ چھوٹی چنگاری ہے تو کیا اسکو چھپر میں لگانے کی جرأت کرو گے؟ اگر کہو نہیں کیونکہ ذراسی چنگاری بھی کبھی بڑھ جاتی ہے میں کہتا ہوں کہ اسی پر چھوٹے گناہ کو قیاس کرلو جو شخص چھوٹے گناہ پر جرأت کرتا ہے وہ کل بڑے گناہ پر بھی جرأت کریگا۔

اسی طرح یہ سوال کیا جاتا ہے کہ چند مردوں کو ثواب بخشا جائے تو تقسیم ہوکر پہونچے گا یا بلا تقسیم کے سبکو برابر پہونچے گا اگر تقسیم ہوکر پہونچتا ہے تو ابا جان کو تو بہت کم ملیگا۔ میں کہتا ہوں کہ تم اس فکر میں کیوں پڑے اگر تقسیم ہوکر بھی ثواب پہونچا تو اللہ تعالیٰ اسکو بڑھا بھی تو دیتا ہے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چھوارہ کے صدقہ کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ جبل احد سے بھی بڑھ جاتا ہے اب بتاؤ کہ پہاڑ میں کتنے ارب چھوارے ہوں گے اور اتنے ارب پر اگر تقسیم جاری ہو تو کیا حرج ہے۔ ارے میاں اللہ تعالیٰ کے یہاں تو ذراسا عمل بھی قبول ہوجائے تو بہت ہے پھر تم کس فکر میں پڑے ہمارے حاجی صاحب نے خوب فرمایا ہے ؎

۱۷ بس ہے اپنا ایک ہی نالہ اگر پہونچے وہاں　　گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

مگر اب علماء بھی ان مسائل کی تحقیق کے درپے ہوجاتے ہیں اور ہم نے بھی طالب علمی میں ایسی تحقیق کی ہے مگر اب معلوم ہوا کہ یہ شغل فضول تھا بس عوام کو یہ چاہئے کہ فضولیات کی تحقیق نہ کریں اور علماء کو یہ چاہئے کہ ان فضولیات کا جواب نہیں مولانا محمد نعیم صاحب لکھنوی سے ایک شخص نے حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے متعلق سوال کیا مولانا نے سائل سے پوچھا کہ اور یہ سوال کس کا ہے اور وہ اور تم کیا کام کرتے ہو کہا کہ سوال فلاں حافظ صاحب کا ہے اور وہ رنگریز ہیں اور میں درزی ہوں فرمایا کہ تم کپڑے سینے رہو اور ان حافظ صاحب سے کہدو کہ کپڑے رنگتے رہیں علی جانیں اور معاویہ جانیں تمہیں ان کے معاملہ کا کیا تعلق میں اطمینان دلاتا ہوں کہ قیامت کے دن انکا مقدمہ تمہارے اجلاس میں نہ آئیگا۔

اسی طرح ایک شخص نے میرٹھ میں ایک عالم سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین مومن تھے یا نہیں عالم نے کہا کہ آپ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں کہا ہاں پڑھتا ہوں کہا اچھا بتلاؤ نماز کے اندر کتنے فرض ہیں اب وہ خاموش ہے فرمایا جاؤ تمکو

نماز کے فرائض کی خبر نہیں جس کا سب سے اول قیامت میں حساب ہوگا - اور زاید یا لڑکی
تحقیق کے درپے ہیں۔ اور ان فضولیات کی تحقیق میں نفس کا کید یہ ہے کہ فرائض و واجبات
کی تحقیق میں تو عمل کرنا پڑتا ہے اور عمل دشوار ہے اور فضولیات کے سوال میں لوگ تو اسکو
دیندار سمجھیں گے کہ ایسے ایسے باریک سوال کرتے ہیں اور کرنا کچھ پڑتا نہیں اسلئے عام طور
سے لوگ فضول سوال کرکے دیندار مشہور ہونا چاہتے ہیں خیر عوام تو جاہل ہیں مگر بعض
علماء کو کیا ہو گیا کہ وہ بھی ایسے سوالات کا جواب دیتے ہیں میں ایسا روگ نہیں پالتا
ایک جنٹلمین نے بھی چند روز ہوئے سود وغیرہ کی بابت سوال کیا میں نے کہا کہ میں فلسفی نہیں
ہوں اسلئے میرے ذمہ مصالح و اسرار و فلسفہ احکام کا بیان کرنا ضروری نہیں صرف خدا
و رسول کا حکم بیان کرنا میرے ذمہ ہوگا اسلئے میں قال اللہ و قال الرسول کے سوا کچھ نہ کہونگا
تو امام صاحبؒ اس احتیاط کی وجہ سے اس مسئلہ میں جواب واضح نہیں دیا بلکہ توقف کے
عنوان سے سائل کو سوال لا طائل سے روکنا چاہا۔ دوسرا راز امام صاحب کے اس جواب میں
۱۸ یہ ہے کہ اطفال کا جنتی ہونا اصل میں اخبار احادیث سے ثابت تھا مگر عوام آحاد و متواتر میں فرق
نہیں کرتے اسلئے احتیاط کی اور یہ احتیاط وہ کریگا جسکو عظمت حق کا ذوق ہو اس سے
بڑھکر دیکھئے ملائکہ و انبیاء علیہم السلام قطعاً معصوم ہیں مگر حالت یہ ہے کہ انبیاء تھر تھر لرزتے
ہیں تو جہاں عظمت کا غلبہ ہوگا وہاں احتیاط ضرور ہوگی اسلئے امام صاحب نے اس مسئلہ
میں توقف کیساتھ جواب دیا تاکہ عوام اسپر جزم کرکے بےفکر نہ ہو جائیں اور عشرہ مبشرہ کے
بارہ میں توقف اسلئے نہیں فرمایا کہ وہاں جو نصوص ہیں وہ معنیً متواتر اور اجماعی ہیں لیکن
اب ممکن ہے کہ مسئلہ اطفال بھی ظنی سے بڑھ گیا ہو بوجہ انضمام اجماع متاخرین کے گو وہ اجماع بھی
مختلف فیہ ہو کیونکہ بعض اجماع مختلف فیہ بھی ہیں جیسا اہل علم کو معلوم ہے لہذا اب ہمکو
اسپر یقین کر لینا چاہئے کیونکہ اب یہ مسئلہ گویا متفق علیہ ہے و دوسرے ہمارا علاج اسی میں ہے
کہ ہم بچوں کو معصوم اور بیگناہ سمجھیں کیونکہ ہم لوگ بچوں کے مرنے سے زیادہ دلگیر ہوتے ہیں ہمکو
تسلی کی زیادہ ضرورت ہے اور زیادہ تسلی اسی میں ہے اب اسکے دلائل سنئے حدیث میں آتا ہے
کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے تین بچے مر گئے ہوں وہ اسکے لئے جہنم کی

آگے سے آٹہ بجائیں گے کسی نے عرض کیا یارسول اللہ کسی کے دو بچے مرے ہوں فرمایا وہ بھی
کسی نے عرض کیا یارسول اللہ جسکا ایک ہی بچہ مرا ہو فرمایا وہ بھی پھر کسی نے عرض کیا یارسول اللہ ۱۸
جس کا ایک بھی بچہ نہ مرا ہو قال انا فرط لامتی لن یصابوا بمثلی فرمایا تو میں اپنی امت
کیلئے آگے جاکر سامان کرنے والا ہوں اور میری موت جیسا حادثہ میری امت پر کوئی نہ
آئیگا اسلئے انکے واسطے میری وفات کا صدمہ ہی مغفرت کو بس ہے (نفدیک بآباء نا و
امہاتنا یا رسول اللہ ے فلولاں رب الناس ابقی محمد ا ۔ سعدنا ولکن امرہ کان مقضیا
۱۷) یعنی میں آگے جاکر اپنی امت کیلئے مغفرت کی سعی و سفارش کروں گا ۱۲ اگر شاید کوئی یہ کہے
کہ جیسے بے اولادوں کیلئے حضور کی شفاعت کافی ہے ایسی ہی اولاد والوں کیلئے بھی
کافی تھی اولاد کی شفاعت کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اسکا جواب یہ ہے کہ ہمکو زیادت تسلی
کیلئے اسکی ضرورت تھی دو وجہ سے ایک یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو ادب و خوف
کے ساتھ شفاعت فرمائیں گے اور بچہ ضد کیساتھ شفاعت کریگا یہ بچے جسطرح جہاں والدین
پر ضد کرتے ہیں قیامت میں اللہ تعالیٰ پر بھی ضد اور ناز و نخرے کرینگے چنانچہ احادیث ۱۹
میں آتا ہے کہ بچہ جنت کے دروازے پر جاکر کھڑا ہو جائیگا اس سے کہا جائیگا اندر جاؤ کہیگا
نہیں جاتے پوچھیں گے کیوں ؟ کہے گا جبتک ہمارے ماں باپ ہمارے ساتھ نہوں گے
اسوقت تک ہم جنت میں نہیں جا سکتے تو اس سے حق تعالیٰ فرمائیں گے ایہا الطفل المراغم
ربہ ادخل ابویک الجنۃ اے اپنے پروردگار سے ضد کرنے والے بچے جا اپنے ماں باپ کو
بھی جنت میں لیجا دوسرے عقلاً عدد بڑھنے سے زیادہ قوت ہوتی ہے گو حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کو انضمام ضمیمہ کی ضرورت نہیں آپ تنہا ہی کافی ہیں مگر طبعاً عدد بڑھنے سے تسلی زیادہ
ہوتی ہے نیز حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی مسلمان کا بچہ مرتا ہے اور ملائکہ اسکی روح کو لیکر
آسمان پر پہونچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے ارشاد فرماتے ہیں اخذتم ولد عبدی قالوا
اللہم نعم ثم یقول هل قبضتم ثمرۃ فؤاد عبدی قالوا اللہم نعم فیقول فما ذا قال
عبدی قالوا اللہم حمدک وصبر فیقول ابنوا لعبدی بیتا فی الجنۃ وسموہ بیت الحمد
(او کما قال) کیا تمنے میرے بندہ کے بچہ کو لیلیا وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں پھر فرماتے ہیں کیا تمنے

میرے بندہ کے جگر گوشہ کو لیلیا وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں پھر فرماتے ہیں کہ میرے بندہ نے کیا کہا فرشتے عرض کرتے ہیں اے اللہ اُس نے آپکی حمد کی (مراد شکر ہے) اور صبر کیا اسپر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں (کہ گواہ رہو میں نے اپنے بندہ کو بخشدیا اور) اُسکے لئے جنت میں ایک محل تیار کرو اور اُس کا نام بیت الحمد رکھو۔ یہ تو چھوٹوں کے مرنے پر وعدہ ہے جس سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بچوں کے مرنے پر نعم البدل عطا فرماتے ہیں یعنی مغفرت اور جنت کا محل اور بڑوں کے مرنے پر بھی اسی طرح اجر و ثواب کا وعدہ ہے حدیث میں ہے من اخذت صفیہ (ای حبیبہ) فصبر لم یکن لہ ثواب الا الجنۃ او کما قال حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے محبوب (اور پیارے) کو لیلیوں (جو عام ہے ہر محبوب کو خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو یا ہمسر ہو جیسے بھائی اور بیوی وغیرہ ۱۲) پھر وہ صبر کرلے تو اُس کا اجر جنت کے سوا کچھ نہیں (یعنی وہ جنت میں ضرور پہنچے گا ۱۲) یہاں بھی نعم البدل کا وعدہ ہے اور جنت سے بہتر نعم البدل کیا ہوگا اسی مضمون کو ایک بدوی نے بہت خوبی کیساتھ بیان کیا ہے جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور حضرت عبداللہ بن عباس کو بہت صدمہ ہوا تو بدوی نے آکر اشعار میں انکو تسلی دی اشعار تو اہل عرب کی گھٹی میں ہیں بچہ بچہ یہانتک ۲۰
کہ عورتیں بھی عرب میں شاعر ہوتی ہیں حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ مجھے اس بدوی سے بہتر کسی نے تسلی نہیں دی چنانچہ کہتا ہے ؎

اصبر نکن بک صابرین فانما ۔۔۔ صبر الرعیۃ بعد صبر الراس

اے ابن عباس رضی آپ صبر کیجئے تاکہ ہم بھی آپ کی وجہ سے صابر بنیں کیونکہ رعیت کا صبر سردار کے صبر کے تابع ہے (مطلب یہ ہے کہ آپ مقتدای دین ہیں آپکے افعال کا سب اتباع کرتے ہیں پس ایسے حوادث میں آپ صابر رہیں گے تو ہم بھی مصائب میں صابر رہا کریں گے اگر آپ نے صبر نکیا تو عوام بھی صبر نکریں گے سبحان اللہ ! کیسے اچھے عنوان سے صبر کی ترغیب دی ۱۲) آگے کہتا ہے ؎

خیر من العباس اجرک بعدہٗ ۔۔۔ واللہ خیر منک للعباس

آپ کے لئے حضرت عباس کے زندہ رہنے سے وہ اجر بہتر ہے جو اُنکے وصال پر آپکو ملا

کیونکہ حضرت عباس اگر زندہ رہتے تو بہت سے بہت حضرت عباس آپ کو ملتے اور آپ کے
حق میں ثواب ان سے بہتر ہے کیونکہ ثواب کی حقیقت ہے رضائے خدا تو یوں کہئے کہ حضرت
عباس کے وصال پر صبر کرنے سے خدا آپکو ملا اور یقیناً خدا تعالیٰ سب سے بہتر ہیں
اور حضرت عباس کیلئے خدا آپ سے بہتر ہے کیونکہ وہ مر کر خدا کے پاس پہونچ گئے اگر
نہ مرتے تو دنیا میں رہتے جسمیں رضائے الٰہی نہیں ہو سکتی۔ اور حضرت عباس اگر آج
نہ مرتے تو کسی نہ کسی دن ضرور مرتے کیونکہ حرارت عزیزیہ کی رفتار ایک خاص حد پر منتہی
ہو جاتی ہے کبھی نہ کبھی ضرور ختم ہوگی خواہ مرض سے ہو یا بدون مرض کے چنانچہ نانپارہ میں
ایک بوڑھے میاں اسی طرح ختم ہو گئے کہ گھر میں آکر ماما سے کھانیکو کہا ماما کھانا لیکر آئی تو
یہاں بڑے میاں ختم ہو چکے تھے حالانکہ وہ مریض نہ تھے بس وہی بات تھی کہ حرارت
عزیزیہ اپنی حد پر پہونچکر ختم ہو گئی تھی اسی طرح مرنیوالے کے متعلق یہ سوچے کہ اگر وہ اسوقت
نہ مرتا بلکہ زیادہ دن تک بیمار رہکر صاحب فراش بنکر مرتا تو شاید مبغوض ہو کر مرتا کہ عزیز بھی
۲۱ گھبرا جاتے اور آپ میں اسکا بھی ضرر تھا کیونکہ تم اسکو اس حالت میں یاد نکرتے تو ثواب بھی نہ پہونچتا
کیونکہ ثواب اسی کو پہونچاتے ہیں جسکے مرنیکا صدمہ ہوتا ہے اور جسکے مرنے پر خوشی ہو کہ
اچھا ہوا پاپ کٹا اسکو بہت کم یاد کیا جاتا ہے اسی طرح تمہارا بھی نفع اسی میں ہے کہ اپنا عزیز
محبوب حالت میں مرے کیونکہ تم اسکو یاد کرتے ہو تو وہ بھی تمہارے واسطے دعا کرتا ہے پس
تم کو اس سے نفع پہونچتا ہے اور اسکو تم سے نفع پہونچتا ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ فلاں شخص
تو عالم اور بزرگ ہیں انکو ہماری دعا اور ایصال ثواب کی کیا ضرورت ہے تو مرنے کے متعلق
یہ نفع عام ہے صاحبو! وہاں چھوٹے بڑے کا حساب نہیں بلکہ وہاں بعض مواقع پر چھوٹے
بڑوں کو اور شاگرد استاد کو اور مرید پیر کو بخشوائیں گے اور ہر شخص کو اپنی مغفرت کیلئے چھوٹی
چھوٹی باتوں کی تلاش ہوگی چنانچہ ایک شخص گرفتار ہو کر جہنم کی طرف جاتا ہوا ایک ولی کو
راستہ میں دیکھکر پہچانے گا اور کہیگا کہ میں نے فلاں دن آپکو وضو کرایا تھا آج میری مدد کیجئے
یہ سنتے ہی وہ بزرگ اسکی شفاعت کریں گے اور بخشوالیں گے حضرت حاجی صاحب رحمۃ
اللہ علیہ پر یہ حقیقت خوب منکشف تھی اسی لئے حاجی صاحب بیعت میں بہت جلدی

لیواتے تھے حضرت کے یہاں قیود و شرائط نہ تھے اور فرماتے تھے کہ ہم تو اس نیت سے بیعت کر لیتے ہیں کہ یہ دونوں جانب سے دستگیری ہے پس قیامت میں ہم میں اور آپ میں جو مرحوم ہوگا وہ مغضوب کو ساتھ لے لیگا اور عکس کا احتمال سبقت رحمتی کے خلاف ہے انشاء اللہ دونوں میں سے ایک تو مرحوم ہو ہی گا سبحان اللہ حضرت کو اپنے مریدوں کے متعلق بھی یہ امید تھی کہ شاید وہی ہمکو بخشوالیں غرض یہ تجارت کیسی عمدہ ہے کہ ہر حالت میں اجر اور نعم البدل ہی ملتا ہے۔ پھر اس سے بڑھکر یہ کہ نعم البدل کے ساتھ آپکی اصلی چیز بھی آپ کو واپس دیدینگے کیونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جتنے اعزہ مرتے ہیں اولاد ہو یا بھائی اور باپ اور بیوی وغیرہ سبکی مفارقت چند روزہ ہے برزخ ہی میں ملجاینگے اور آخرت میں ملنا تو سب ہی جانتے ہیں۔ یہ واقعات تو اس عالم میں پہونچکر ہونگے۔ اور عین موت کے وقت یہ حالت ہوتی ہے کہ ملائکہ مسلمان کی روح کو قبض کرکے عمدہ ریشمی کپڑے میں عزت کے ساتھ لپیٹ کر لیجاتے ہیں پھر راستہ میں فرشتے باہم چھینا جھپٹی کرتے ہیں وہ کہتا ہے مجھے دو وہ کہتا ہے کہ اب میں لونگا پھر آسمانوں کے دروازے اسکے لئے کھل جاتے اور تمام فضائے زمین و آسمان اسکی خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے پھر آسمان والے اچھے اچھے القاب و اسماء سے اسکو یاد کرتے اور اسکی تعریف کرتے ہیں پھر ارواح انسانیہ اسکا استقبال کرتی ہے اور بہت عزت کیساتھ اسکو عالم ارواح میں لیجاتی ہے اور اس سے باتیں کرتی ہیں جیسے مہمان سے میزبان باتیں کیا کرتا ہے اور ضروری باتیں کرکے زائد سوالات بھی کرتی ہیں کہ فلاں شخص کیسا ہے فلاں کیسا ہے جن میں سے بعض کی نسبت یہ نووارد یہ کہتا ہے کہ وہ تو مجھ سے پہلے مر چکا ہے کیا وہ یہاں نہیں آیا اسپر سب ارواح افسوس کرکے کہتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جہنم میں گیا یہاں نہیں آیا۔ صاحبو! ان واقعات کو یاد کرو اور سمجھ لو کہ ہمارا عزیز عزت و آسائش میں پہونچا ہے اور جو یہ سمجھے کہ میرا عزیز عزت و آسائش میں ہے اسکو رنج کیوں ہو۔ رہا یہ کہ احتمال تو عذاب کا بھی ہے اسکا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال بھی مفید ہے تم اس احتمال سے اُس کو ثواب پہونچاؤ اور اسکے بعد امید رکھو کہ انشاء اللہ بخشدیا گیا رہا یہ کہ احتمال تو پھر بھی رہا کیونکہ ایصال ثواب کے بعد وعید تو نہ آئیگی اور یقین مغفرت اب بھی نہ ہو سکا جواب

یہ ہے کہ دنیا بامید قائم تو آخرت بھی بامید قائم۔ تم اسباب مغفرت کو جمع کر کے مغفرت کی
امید رکھو کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ظنیات سے بھی تسلی ہو جاتی ہے اور
قطعیات سے تسلی تو انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتی۔ صاحبو الجبر بالصبر
کل ظنیات ہی سے آپکو تسلی ہو جائیگی آپ ان باتوں کو دل میں مستحضر کر کے دیکھئے
انشاء اللہ آپکو اس سے بہت کچھ تسلی ہوگی اور غم ہلکا ہو جائیگا چنانچہ حضرت ابو ہریرہ
رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ میرا بچہ مرگیا جسکا مجھے بہت صدمہ ہے کوئی
ایسی بات سناؤ جس سے میرا غم ہلکا ہو جائے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم سے سنا ہے ان الاطفال من دعامیص الجنۃ کہ یہ بچے جو مر جاتے ہیں جنت
کے دعامیص ہو جاتے ہیں۔ دعموص ایک کیڑا ہے جو پانی کے اندر ادہر سے ادہر بھاگا پھرتا
ہے مطلب یہ ہے کہ یہ بچے جنت میں ادہر ادہر جا کے پھر ینگے ہر ایک درجہ میں گھستے پھرینگے
کہ انکو کوئی روک ٹوک نہ ہوگی جس گھر میں چاہیں چلے جائیں گے جیسے یہاں دنیا میں
بھی بچے کسی گھر سے نہیں رکتے جسکے گھر میں چاہتے ہیں گھس جاتے ہیں اور ہر جگہ ۲۴
انکی چاہ ہوتی ہے کیونکہ چھوٹا بچہ تو جانور کا بھی بھلا معلوم ہوتا ہے انسان کا بچہ تو
کیوں نہ بھلا معلوم ہوگا ہر شخص کو چھوٹے بچے پر پیار بھی آتا ہے اور اسکی تکلیف پر
رحم بھی آتا ہے حتی کہ بھنگی کے بچہ پر بھی رحم آتا ہے رامپور کا قصہ ہے کہ قاضی سراج الحق
صاحب مرحوم کے گھر میں بھنگن کمانے گئی اور اپنے بچہ کو باہر دروازہ پر بٹھلا گئی وہ رونے
لگا قاضی صاحب باہر بیٹھک میں بیٹھے تھے وہ بچہ کے رونے کی آواز سنکر بیقرار ہو گئے اور
فوراً اسکو گود میں اٹھا لیا اور اسکو بہلاتے رہے۔ لوگ بھنگیوں کے بچوں کو گود میں لینے
سے اپنے کپڑوں اور بدن ناپاک سمجھنے لگتے ہیں یہ خیال غلط ہے خشک بچہ کو گود میں
لینے سے نہ ہمارا بدن ناپاک ہوتا ہے نہ لباس ہاں اگر بھیگا ہوا ہو اور غالب گمان ہو کہ
اسکے کپڑوں اور بدن پر نجاست لگی ہوئی ہے تو بیشک اس سے جسم اور لباس

ع اس تعلیم اسلامی میں غور کرنا چاہئے کہ اسلام نے کسی قوم کی چھوت چھات سے مسلمانوں کو ناپاک نہیں بنایا بخلاف
دوسرے مذاہب کے کہ انکے یہاں چھوت تو موں کو ہاتھ لگانا سخت وبال کا سبب ہے کہ انکا دہرم خراب ہو جاتا ہے گویا وہ
انسان کو کتے اور سور سے بھی بدتر سمجھتے ہیں ۱۲ ظ۔

کے ناپاک ہوجانیکا احتمال ہے مگر یہ کوئی بڑی بات نہیں ایک لوٹہ پانی سے سب پاک ہوسکتے ہیں مگر عام طور پر بھنگیوں کے بچوں سے لوگ گھن کرتے ہیں اسلئے قاضی صاحب نے واقعی یہ بڑا کام کیا انکو بہت اجر ملا ہوگا ہم جیسوں سے تو ایسا نہ ہوسکتا مگر جس سے یہ کام ہوسکے اُسکو بڑا ثواب ملیگا کیونکہ اسمیں تواضع بھی ہے اور انسان کے بچہ سے ہمدردی بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تواضع و رحم یہ دو صفتیں بہت محبوب ہیں یہ تو آخرت کا نفع ہے اور دنیا کا نفع یہ ہے کہ وہ بھنگن تو قاضی صاحب کی جان نثار ہوگئی ہوگی جب تم اپنی چھوٹی قوموں کی اولاد سے ایسی ہمدردی کرو گے تو وہ ہر وقت تمہاری خدمت کیلئے جان و دل سے حاضر رہیں گے تو جس طرح یہاں پر بچے ہر شخص کو محبوب ہیں اور ہر ایک کو ان پر رحم آتا ہے اور کسی گھر سے انکو نہیں روکا جاتا اسی طرح جنت میں یہ بچے جہاں چاہیں بھاگے بھاگے پھریں گے۔ سو ان حالات کو سوچکر تسلی حاصل کرو جیسا کہ ایک راوی کہتے ہیں کہ یہ حدیث سنکر حالانکہ خبر واحد تھی جو ظنی ہوتی ہے مجھے بہت تسلی حاصل ہوئی کہ سارا غم جاتا رہا۔ اب تو ہماری حالت یہ ہے کہ ہم لوگ صرف ایک پہلو کو دیکھتے ہیں کہ ہائے بچہ مرگیا ۲۲
دوسرے پہلو کو نہیں دیکھتے کہ وہ مرکر کہاں اور کس حالت میں گیا۔ ان باتوں کو سوچو تو ضرور ہلکا غم ہو جائیگا۔ اور سنئے حدیث میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو صحابہ کو غیب سے اسطرح تسلی دی گئی ان فی اللہ عزاء من کل مصیبۃ وخلفاً من کل فائت فباللہ فثقوا وایاہ فارجوا فانما المحروم من حرم الثواب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر مصیبت سے تسلی کیلئے کافی ہے اور وہ ہر فوت ہوجانے والی چیز کا عوض ہے اُسی پر بھروسہ رکھو اور اسی سے امید رکھو کیونکہ محروم تو وہ ہے جو ثواب (یعنی رضاء حق) سے محروم رہے۔ صاحبو! یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ تمہارے عزیز کے بدلے تمکو خدا ملتا ہے پس اب تو ایسے موقعہ پر یوں کہنا چاہئے ؎

۱؎ ذرا مخالفین اسلام اس واقعہ میں غور کریں اور بتلائیں کہ کیا کوئی برہمن اور پنڈت اور اعلیٰ ہندو ذات کا آدمی بھی ایک بھنگن کے بچہ کو گود میں اٹھا سکتا ہے اور اسکے ساتھ اپنی اولاد جیسا برتاؤ کرسکتا ہے ہرگز نہیں پھر حیرت ہی ہے کہ اب بھی یہ لوگ مسلمانوں کو بے رحم اور اپنے کو رحم دل کہتے ہیں بجز اسلام کے ایسی زندہ رحمدل کوئی قوم نہیں ہوسکتی ۱۲ ظ

روزہا گر رفت گو رو باک نیست — تو بمان اے آنکہ جز تو پاک نیست

کیا اس سے بھی آپکی تسلی نہ ہوگی کہ آپ کو اپنے عزیز کے بدلہ میں خدا مل جائے جسکی جنت بھی ہے اور دوزخ بھی ہے یقیناً جنت کے ملنے سے خدا کا ملنا بدرجہا بہتر ہے اسپر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ہارون رشید نے جو مسلمانوں کا بڑا بادشاہ اور خلیفہ تھا ایک دن جشن کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ دربار میں جتنی چیزیں موجود تھیں ان میں سے جس چیز پر جو شخص ہاتھ رکھدیگا وہ اسی کی ہوجائے گی درباریوں نے اس اعلان کے بعد ہاتھ رکھنا شروع کیا کسی نے جواہرات پر ہاتھ رکھا کسی نے سونے چاندی پر ایک باندی نے جو بادشاہ کو پنکھا جھل رہی تھی خلیفہ کی کمر پر ہاتھ رکھدیا۔ خلیفہ نے اس حرکت پر برہم ہو کر سوال کیا کہ یہ کیا حرکت تھی کہا حضور کا اعلان عام تھا کہ جو جسپر ہاتھ رکھدے وہ اسی کی ہے اسمیں کوئی استثناء نہ تھا تو میں نے دیکھا کہ یہ درباری بیوقوف ہیں جو سونے چاندی اور جواہرات پر ہاتھ دھر رہے ہیں میں نے سوچا کہ ایسی چیز پر ہاتھ رکھنا چاہئے جسکے ہاتھ میں یہ سب چیزیں ہیں اسلئے میں نے حضور پر ہاتھ رکھدیا کہ جب آپ میرے ہوگئے تو سب ۲۵
چیزیں میری ملک ہوجائیں گی اس جواب کو سنکر ہارون بہت خوش ہوئے (اور فرمایا کہ میں تیرا ہوگیا ۱۲) واقعی یہ باندی بہت سمجھدار تھی تو بتلائیے ان واقعات مصیبت میں کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ان کے ذریعہ سے خدا ہمکو ملتا ہے جسکی جنت بھی اور دوزخ بھی۔ شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آیا ہو کہ دوزخ ہماری ہوگئی تو کیا نفع ہوا کیا ہم دوزخ میں رہیں گے اسکا جواب یہ ہے کہ افسوس آپنے بات کو سمجھا ہی نہیں۔ دنیا میں جیلخانہ بادشاہ کی ملک ہوتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ جیلخانہ میں رہتا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم جسکو چاہو گے بخشوا لوگے اور جہنم سے نکلوا لوگے اسپر شاید آپ یہ کہیں کہ کیا کفار کو بھی بخشوا لیں گے اسکا جواب یہ ہے کہ جبکے تعلق سے جہنم بواسطہ آپکی ملک ہوئی ہے جب وہ کفار کو بخشنا نہ چاہیں گے تو تم بھی نہ چاہو گے یہ تو آخرت کا نعم البدل تھا۔ اب یہ سمجھئے کہ دنیا میں بھی ہر فوت ہونیوالی چیز کا نعم البدل عطا ہوتا ہے خواہ مال و اولاد فوت ہو یا کوئی عزیز و قریب چنانچہ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں

کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مصیبت کے وقت کیلئے ہمکو یہ دعا تعلیم فرمائی تھی
انا للہ وانا الیہ راجعون اللھم عندک احتسب مصیبتی فأجرنی فیھا وابدلنی بھا
خیرا منھا (اے اللہ میں آپ سے اس مصیبت کا ثواب مانگتی ہوں پس مجھے اسکا اجر
عطا فرمایئے اور اس کا نعم البدل دیجئے۱۲) حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ جب میرے شوہر ابوسلمہ
کا انتقال ہوا تو میں نے یہ دعا پڑھی مگر وابدلنی بھا خیرا منھا کہتے ہوئے دل رکتا تھا
کیونکہ میں اپنے دل میں یہ کہتی تھی کہ ابوسلمہ سے بہتر کون ہوگا اور حضورؐ کے ملنے کا وہم بھی
نہ ہوتا تھا کیونکہ سے آرزومی خواہ لیک اندازہ خواہ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میں نے
دل پر جبر کرکے یہ بھی کہا تو خدا تعالیٰ نے مجھے ابوسلمہ کے عوض حضور صلے اللہ علیہ وسلم
عطا فرمائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز لیگئی اور دوسری
چیز دیگئی۔ نصوص میں تجارت پر صاف اشارات موجود ہیں اسی لئے اعمال کا وزن ایسا ہے
جیسا تجارت میں وزن ہوا کرتا ہے اور جب وہاں اعمال بھی جو کہ اعراض ہیں اعیان بنجائیگے
جیسا کہ وزن کا مقتضی ہے تو اعیان تو اعیان ہیں ہی۔ اور مصائب کے بارہ میں لفظ اخذ
اعطاء ما بدال واقع ہے یہی معنی تجارت پر دال ہے اور تصدق اموال میں لفظ
اقراض اور بذل نفس و بذل مال میں لفظ اشتری وارد ہے غرض جو چیز بھی ہمارے ہاتھ
سے جاتی ہے اس کا عوض اور نعم البدل ہمکو ملتا ہے۔ اعمال کے متعلق مجھے ایک اور نص
یاد آئی جس میں لفظ ایتاء بمعنی اعطاء ہے وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ
اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ۝
ترجمہ) اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حالت میں کہ انکے دل لرزاں و ترساں
ہوتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف جانے والے ہیں یہ لوگ بھلائی میں
ترقی کرتے اور انکی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسکے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا
رسول اللہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو گناہ کرکے ڈرتے ہیں فرمایا نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو تصدق

اور صلوٰۃ و صیام بجالا کر ڈرتے ہیں کہ شاید قبول نہ ہو اور خدا کے سامنے جاکر ہمکو شرمندگی ہو (وہاں یہ کہا جاسے کہ تمنے کیسا عمل ہمارے یہاں بھیجا ۱۲) حضرت عائشہ رضی کے سوال سے یہ معلوم ہوا کہ اس آیت میں یؤتون اعطاء مال کیساتھ خاص نہیں بلکہ ہر عمل کو شامل ہے جنہوں نے اسکو اعمال گناہ پر محمول کیا اور بعض لوگوں نے اسمیں یوں کہا ہو کہ حضرت عائشہ رضہ نے یہ سوال یاتون کی قرارت کے متعلق کیا ہو جو بمعنی یفعلون ہے اس صورت میں ایتاء سے استدلال ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ ترمذی کی حدیث میں اسکی تصریح ہو کہ یؤتون کے متعلق سوال کیا اور قرارت شاذہ بوجہ شذوذ کے ثابت نہیں در حدیث صحیح پس صحیح کو غیر صحیح پر محمول نہیں کر سکتے اور اسکو مان بھی لیا جاوے تب بھی حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی تفسیر عام ہونا ضروری ہے ورنہ شاذ کا مفسر اور متواتر کا غیر مفسر رہنا لازم آویگا تو اس تفسیر کا تعلق ایتاء عہ بھی ہوگا پس یہ استدلال باقی رہا جب یہ ہے تو آیت میں ایتاء بمعنی ایتاء مال نہیں ہے بلکہ بمعنی ایتاء الوجود ہے جسکا حاصل ایجاد ہو یعنی یہ ہوئے کہ وہ جس عمل صالح کو وجود دیتے ہیں اسکو کرکے ڈرتے رہتے ہیں کہ دیکھئے قبول ہوا یا نہیں بےفکر نہیں ہو جاتے۔ تو یہاں لفظ ایتاء بمعنی اعطاء ہے جو تجارت کے مناسب ہے یہی وہ نصوص جن سے اعمال و احوال کا تجارت ہونا معلوم ہوتا ہے ان ہی میں سے ایک وہ آیت بھی ہے جسکو میں نے تلاوت کیا ہو یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْۤ اَیْدِیْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤی اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ خَیْرًا یُّؤْتِكُمْ خَیْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ کہ ان قیدیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تمہارے دلوں میں خیر ہوگی (یعنی ایمان) تو اللہ تعالیٰ تمکو اس سے بہتر چیز دیں گے جو تمسے لیگئی ہے۔ یہاں بھی نقصان مال پر نعم البدل کا وعدہ ہے جسکو ایمان کیساتھ مشروط کیا گیا ہے حاصل یہ ہوا کہ مومن کو ہر نقصان کا عوض اور نعم البدل ملتا ہے اور ان نصوص مذکورہ پر نظر کرکے ہمکو اس نص خبری تعمیم کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ دوسری نصوص سے تعمیم ثابت ہے گو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مما اخذ منکم میں ما عام ہے مال کو اور غیر مال کو جسمیں سب اعمال اور اعیان داخل ہیں خصوصاً جبکہ قاعدہ فقہیہ ہے کہ اعتبار عموم

عہ فالانتیار علی ہذا عام لکل عمل کعمومہ فی قولہ تعالیٰ ثم سئلوا الفتنۃ لاٰتوہا اے لاعطوہا بمعنی لباشروہا ولا تیوقت تعمیم معنی قرارۃ یاتون مانرون بما تقدم الاتیان بمعنی المجیئ انہا ان یکون یاتون تفسیر الیؤتون فظنیہ قرینۃ ۱۲ منہ۔

نفس سے خصوصیت ہو جنکا اعتبار نہیں مگر مجھے خود اس قاعدہ ہی کے عموم میں کلام ہے اسلئے میں اس آیت پر تعمیم کا مدار نہیں کرتا بلکہ مجموعہ نصوص کے اعتبار سے اس مضمون کو عام کرتا ہوں۔ مگر اسکی تلاوت اس لحاظ سے ہوئی ہے کہ ایک مناسبت سے دوسرے مناسب کی طرف اشارہ کرنا ابلغ ہے اور تمام نصوص کا پڑھنا دشوار تھا بلکہ کسی ایک کا اختیار ضروری تھا جسکے لئے وجہ مرجح میں نے بالکل تمہید کے شروع میں بیان کر دی۔

خلاصہ یہ کہ معاملات تشریعیہ کا تجارت ہونا تو ظاہر ہے کہ ایک عمل ہم نے پیش کیا اور ہمکو اسکی قیمت مل گئی مگر اسکے علاوہ وہ ہمارے ساتھ جسقدر معاملات تکوینیہ بھی ہوتے ہیں ان سب کی حقیقت بھی تجارت ہی ہے جیسا مذکور ہوا اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھکر غم بہت ہلکا ہو جائیگا۔ باقی طبعی غم کا میں انکار نہیں کرتا وہ تو ہوگا اور ہونا چاہئے کیونکہ اسی کی وجہ سے اجر ملتا ہے اور اس سے شان عبدیت ظاہر ہوتی ہے اگر انسان پر رنج و غم نہ ہو تو فرعون بے سامان ہو جائے مگر ضرورت اسکی ہے کہ اس غم کو ہلکا کیا جائے کیونکہ غم کا بڑھنا خود مصیبت ہے جس سے راحت فوت ہونے کے علاوہ بعض اوقات جمع عمل دولت یعنی اجر وہ بھی ضائع ہو جاتی ہے اور غم ہلکا ہونے کی وہی تدبیر ہے جسکا ذکر ہو رہا ہے یعنی جب انسان یہ سمجھیگا کہ ہر معاملہ میں حق تعالیٰ مجھکو نعم البدل عطا فرماتے ہیں تو غم ہلکا ہو جائیگا پھر وہ نعم البدل بھی غیر محدود ہے کہ اسکا اندازہ لگانا دشوار ہے اور مصائب پر صبر کرنا تو نہایت دشوار عمل ہے اسپر وہ بے حساب جتنا ہی ملتا تو کیا تعجب ہے جبکہ آیت اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ میں متنبہ بھی فرمایا ہے وہاں تو خفیف خفیف عمل پر بھی بے اندازہ اجر مل جاتا ہے چنانچہ حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار اللہ اکبر کہنے سے آسمان و زمین کا درمیانی فضا بھر جاتا ہے اور سبحان اللہ کہنے سے آدھی میزان عمل اور الحمد للہ سے پوری میزان عمل بھر جاتی ہے یہ اسلئے فرمایا کہ شاید کسی کو اللہ اکبر کا ثواب سنکر یہ احتمال ہو کہ معلوم میزان عمل بھی کسی چیز سے بھری ہوگی کیونکہ ممکن ہے کہ آسمان و زمین کی فضا سے بھی زیادہ ہو تو ایک عمل سے اگر فضا بھی بھر جاتا ہو تو ممکن ہے کہ وہ میزان بھرنے کیلئے کافی نہ ہو اور ہمکو سابقہ پڑے گا میزان ہی سے خصوصاً طالب علموں کو ایسے احتمالات بہت ہوتے ہیں کیونکہ ان کے

نزدیک تو کٹورا بھی حوض کے برابر ہوسکتا ہے جیسا ایک حکایت ہے کہ ایک بادشاہ و وزیر میں
گفتگو ہو رہی تھی بادشاہ کہتا تھا کہ طلبہ عربی بہت عاقل ہوتے ہیں وزیر کہتا تھا کہ ان سے
بڑھ کر بیوقوف کوئی نہیں اتفاق سے ایک طالب علم جوتیاں چٹخاتے خستہ حال سامنے
سے گذرے بادشاہ نے انکو بلایا اور وزیر سے کہا کہ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے دیکھو یہ طالب
علم اتفاق سے میرے سامنے آگیا میں نے اسکو انتخاب کر کے نہیں بلایا اب میں اسکی
عقل کا امتحان کر کے تمکو دکھلاتا ہوں کہ عربی طلبہ کیسے عاقل ہوتے ہیں طالب علم کو
بادشاہ نے عزت سے بٹھلایا اور سامنے ایک حوض تھا اسکی طرف اشارہ کر کے اول
وزیر سے سوال کیا کہ بتلاؤ اس میں کتنے کٹورے پانی کے آسکتے ہیں وزیر نے کہا کہ بدون شمار
کے اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ حوض کو خالی کیا جائے اور کٹورہ بھر بھر کر پانی اس میں
ڈالا جائے تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسمیں کتنے کٹورے آسکتے ہیں۔ بادشاہ نے اسکے بعد طالبعلم
صاحب سے دریافت کیا کہ مولانا آپ بتلائیں کہ اسمیں کتنے کٹورے پانی آسکتا ہے طالبعلم
نے کہا کہ یہ سوال مہمل ہے پہلے کٹورا تو متعین ہونا چاہئے کہ وہ کٹورا کتنا بڑا ہے اگر کٹورا ۲۹
حوض کی برابر ہے تو ایک کٹورا پانی آسکتا ہے اگر اس سے آدھا ہے تو دو کٹورے اگر تہائی
تو تین اگر سواں حصہ ہے تو سو کٹورے اگر ہزارواں حصہ ہے تو ایک ہزار کٹورے اور اگر لاکھواں
حصہ ہے تو ایک لاکھ کٹورے غرض جو نسبت مساحت میں حوض سے کٹورے کو
ہوگی اسی نسبت سے اسمیں کٹورے آسکیں گے اسلئے اول کٹورا متعین کرنا چاہئے
اسکے بعد سوال کرنا چاہئے۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ اب انصاف کی بات تو یہ ہے کہ تم
قلمدان وزارت اس طالب علم کے حوالہ کرو اور خود جا کر طالبعلمی کرو۔ مگر تمہارے خاندان
میں وزارت چلی آرہی ہے اسلئے معاف کرتا ہوں اور تمکو اس عہدہ پر بحال رکھتا ہوں اسکے
بعد مولوی صاحب سے کہا کہ مولانا آپ کو بہت تکلیف دی گئی معاف کیجئے گا اب آپ جاسکتے
ہیں وہ سلام کر کے چلتے ہوئے اور اسکے دل میں وزارت کی ذرا بھی ہوس پیدا نہ ہوئی حالانکہ
بادشاہ اسکی قابلیت وزارت کو تسلیم کر چکا تھا کیونکہ اس زمانہ میں طلبہ کو دنیا کی ہوس نہ تھی
طلبہ اس زمانہ میں سب صوفی ہوتے تھے اسی لئے پہلے زمانہ میں خانقاہوں کی اور تعلیم

تصوف کی ضرورت نہ تھی کیونکہ سب ماں کے پیٹ سے صوفی ہی پیدا ہوتے تھے اور انکا وہی مذاق ہوتا تھا جو حضرت غوث اعظم کا اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک سنجر بادشاہ ملک نیمروز نے آپکے مصارف کیلئے آپکو ایک معتد بہ حصہ ملک کا پیش کرنا چاہا آپ نے جواب میں یہ رباعی لکھی ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد ۔۔۔ در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب ۔۔۔ من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

ایک عالم کی حکایت رسالہ القاسم دیوبند میں لکھی تھی کہ وہ خدمت دین میں مشغول رہا کرتے تھے کسب معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا ایک نانبائی آپکا معتقد تھا اور جان نثار تھا اور ایسے شخص سے مانگ کر کھانا بھی جائز ہے اس سے آپنے کہہ رکھا تھا کہ بھائی جب کبھی ہمکو بھوک ستائے گی ہم بے تکلف تمہارے پاس آجایا کرینگے مگر ایک شرط ہے وہ یہ کہ ہمارے سامنے وہ ٹکڑے رکھدیا کرنا جو مسافروں کے آگے سے بچ جاتے ہیں اگر سالم روٹی دوگے تو ہم نہ کھائیں گے نانبائی نے اس خیال سے یہ شرط منظور کرلی کہ اسکے خلاف میں مولانا کو تکلیف ہوگی اور ٹکڑوں سے بھی رہ جائیں گے چنانچہ جب بھوک لگتی مولوی صاحب اسکی دوکان پر پہونچ جاتے اور وہ مسافروں کے سامنے کے ٹکڑے بچے ہوئے انکے آگے رکھدیتا انکو پانی میں بھگوکر کھا لیتے اور پھر علمی مشغلہ میں مشغول ہوجاتے اتفاق سے ایک دن جو گئے تو نانبائی نے کہا کہ آج تو ٹکڑے نہیں ہیں یا تو مسافروں نے ٹکڑے چھوڑے نہیں یا کوئی بہت کھانیوالا آگیا ہوگا جو ٹکڑے بھی کھا گیا تو مولوی صاحب خوش خوش وہاں سے یہ فرماتے ہوئے واپس آگئے تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ کہ آج کی واپسی تو بڑے خسارہ کی ہوئی آپکو فاقہ میں بھی لطیفہ سوجھا کیونکہ قرآن سے اقتباس کرنا تو لطائف میں سے ہے سلف کی حکایتیں اس قسم کی بہت سی ہیں ایک حکایت تو والد صاحب سے سنی ہے کہ طلبہ ایک گھڑا بنالیا کرتے تھے جسکا منہ تنگ کردیا کرتے تھے جو خط گھر سے آتا اسکو بغیر دیکھے پڑھے گھڑے میں ڈالدیتے اسی طرح برابر گھڑے میں خطوط ڈالتے رہتے یہاں تک جب سات آٹھ سال میں علم سے فارغ ہوتے اسوقت وہ گھڑا توڑا جاتا اور تمام خطوط پڑھتے کسی میں رنج کی خبر ہوتی تو اسکو دیکھکر رو لیتے کسی میں خوشخبری ہوتی

عہ نظیرہ ما قیل فی تعلیم المتعلم لا تقرأن المکاتبۃ من مغلف الاعلی حتی تکون من الحوادث یخاف اہل الاقرباء ینتظرون الجواب العاجل الا

عہ لعلہ لا ان یقال ان المتعفف یجوز لہ ذلک لما یعتذر فی ترک الحاجۃ انلغاف فوت المطلب حاجۃ معتنیۃ ۱۲ او لان التعرب اسہل فی طلب العلم یعتذر ۱۲ اشرف

اُسکو دیکھ کر ہنس لیتے ؎

گہ گریم وگہ خندم دیوانہ چنیں باشد ما

اور ایک حکایت اور سنی ہے کہ ایک دن ایک طالب علم کے پاس تیل نہ تھا تو وہ بڑے پریشان ہوتے اتفاق سے اُسی وقت ایک رئیس کا جلوس نکلا جسمیں مشعلیں اور فانوس وغیرہ بہت روشن تھے آپ کتاب ہاتھ میں لیکر اُس جلوس کیساتھ ہو لئے اور مطالعہ کرتے چلے گئے یہانتک کہ جلوس رئیس کے محل تک پہونچا آپ بھی اُسکی ساتھ محل میں چلے گئے خدام نے روکنا چاہا مگر رئیس نے منع کر دیا یہانتک کہ روشنی کے فانوس وغیرہ خاص آرام کے کمرہ میں پہونچے آپ وہاں بھی چلے گئے اور ایک تخت پر بیٹھکر کتاب دیکھتے رہے اور ایسے مستغرق تھے کہ نہ کسی عورت کی طرف نظر اٹھائی نہ باندی کی طرف۔ رئیس انکے اس استغراق پہ محو ہوگیا جب مولوی صاحب مطالعہ سے فارغ ہوگئے اُسوقت آپکو ہوش آیا اور کتاب بند کر کے اِدہر اُدہر دیکھکر گھبرائے کہ میں کہاں آگیا اور کسطرح آگیا۔ رئیس نے انکی پریشانی دیکھکر عرض کیا کہ مولانا آپ ذرا پریشان نہوں آپنے تو مجھے اپنا گرویدہ بنالیا ہے واقعی علمی شوق اسی کا نام ہے جو آپکے اندر دیکھا اب میری درخواست یہ ہے کہ آپ میرے غریبخانہ ہی پر مقیم ہیں یہیں کھانا کھایا کریں اور یہیں مطالعہ کیا کریں میں آپکی خدمت کو اپنی سعادت سمجھونگا مولوی صاحب بولے کہ میں اس قید کو پسند نہیں کرسکتا میں آزاد رہنا چاہتا ہوں ہاں البتہ مجھے اسکی تکلیف ہے کہ بعض دفعہ میرے پاس تیل نہیں ہوتا جس سے مطالعہ کا حرج ہوتا ہے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے پس اگر آپ اتنا کردیں تو عنایت ہوگی کہ کسی بنئے سے کہدیجئے کہ جب میں تیل لینا چاہوں تو مجھے تیل دیدیا کرے اور آپ کے حساب میں دام لکھدیا کرے مجھ سے دام اسونکا مطالبہ نکیا کرے اس سے زائد کی مجھے ضرورت نہیں چنانچہ رئیس نے تیل کا انتظام کر دیا۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت کوئی بزرگ فرماتے ہیں ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اور شیرازی فرماتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

اسی طرح کا ایک قصہ استغراق کا حضرت شبلی کا ہے کہ ایک دن وہ حضرت جنید کے گھر میں بلا اطلاع کے گھس گئے حضرت جنید کی بیوی پردہ کے خیال سے اٹھنے لگیں حضرت جنید نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور کہا کہ ان سے پردہ کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اسوقت اپنے حواس میں نہیں ہیں چنانچہ وہ دیر تک بیٹھے ہوئے ہنس ہنس کر مقامات میں گفتگو کرتے رہے اور حضرت جنید اپنی بیوی کو اٹھنے سے روکتے رہے یہانتک کہ کسی بات پر حضرت شبلی پھوٹ کر روئے تو حضرت جنید نے بیوی کو اشارہ کیا کہ اب چلی جاؤ اب انکو ہوش آگیا ہے تو بعض دفعہ استغراق ایسا قوی ہوتا ہے جسمیں صاحب استغراق کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ یہاں کوئی عورت بھی ہے یا نہیں مگر اسکا پہچاننا حضرت جنید جیسوں کا کام ہے تو ایک زمانہ میں تو طلبہ کی حالت یہ تھی اور اب یہ حالت ہے کہ ایک طالب علم نے میرے ایک دوست رئیس کو خط لکھا کہ میں عربی پڑھنا چاہتا ہوں اور گھر سے بوجہ تنگی کے خرچ نہیں آ سکتا آپ میرے لئے ﷲ ۵ روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دیجئے اسکے ساتھ ہی میری نسبت یہ بھی لکھدیا کہ آپ مجھکو یہ مشورہ دیا ہے وہ صاحب بہت عاقل ہیں خدا مال دے تو اسکے ساتھ عقل بھی دے ۴۲
انہوں نے وہ خط میرے پاس بھیجدیا کہ اس شخص کے متعلق کیا رائے ہے میں نے لکھا کہ اس کذاب کو ایک پیسہ نہ دیا جائے وہ کبھی میرے پاس بھی آتے ہیں میں انکی خبر لونگا مگر وہ خط بہت دنوں سے میرے پاس رکھا ہوا ہے ابتک تو وہ صاحب آئے نہیں یا تو انکو جواب سے شبہ ہو گیا کہ اس واقعہ کی مجھے اطلاع ہو گئی ان صاحب نے لکھدیا کہ اس لئے آپکی امداد سے منع کر دیا ہے اسلئے معذوری ہے (یا اس شخص نے دوسرے طلبہ کے ذریعہ سے خانقاہ میں اس خط کے متعلق تذکرہ سن لیا) اسلئے انہوں نے آنا ہی بند کر دیا میں کٹورہ والے طالب علم کا ذکر کر رہا تھا غرض جب طلبہ کے نزدیک کٹورا بھی حوض کے برابر ہو سکتا ہے تو میزان عمل ان کے نزدیک زمین و آسمان سے بڑا ہو تو کیا بعید ہے کیونکہ میزان عمل تو اللہ تعالیٰ کے

ع فکان داخلا فی حجر اولی الاربۃ من الرجال فلا یصح قیاسہ علی الاعمی وقد امر بالحجاب عنہ فی قولہ صلے اللہ علیہ وسلم افعمیاوان انتما لکون الاعمی من اولی الاربۃ یمیل الیہ النساء ویشتہیہ بما یحس اعضاءہا بالجس واللمس وصوت الحلی فیمیل بقلبہ الیہن بخلاف المستغرق فانہ کالمیت او کالطفل الذی لا یشتہی ۱۲ ظ

کی میزان بہا سکتے حضور نے شبہ کو رفع کرنے کیلئے فرمایا کہ الحمد للہ یملأ المیزان
الحمد للہ سے میزان عمل بھر جاتا ہے اب وہ شبہ رفع ہوگیا کہ شاید میزان خالی رہے پھر
شاید کسی کو یہ وسوسہ ہو کہ بس اب نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے ایکبار الحمد للہ کہہ لینا کافی
ہے بڑا قصہ تو میزان عمل کا ہے وہ تو اس سے بھر ہی جائیگا جیسے ایک طالب علم نے
گانوں میں جاکر نماز کا وعظ کہا اور یہ کہا کہ بے نمازی سور کتے کے مثل ہیں اس جملہ پر
گانو والوں کو جوش آگیا اور سب نے چڑھائی کرکے مولوی صاحب کو مارنا چاہا میزبان نے
یہ رنگ دیکھکر مولوی صاحب سے کہا کہ آج خیر نہیں لوگ آپ پر چڑھائی کرکے آرہے ہیں کہا کیا بات
کہا آپ نے وعظ میں بے نمازیوں کو سور کتا بھی بنایا تھا لوگوں نے بس اسی بات پر چڑھائی
کررہے ہیں کہا جی ہاں کہنے لگے تو تم بیفکر رہو میں ابھی سبکو ٹھنڈا کئے دیتا ہوں
یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ واقعی یہ تاویل کا دروازہ کھلا رہے تو بات کا بدلنا کچھ بھی
مشکل نہیں ہے چنانچہ گانوں والے آئے اور مولوی صاحب پر حملہ کرنا چاہا انہوں نے پوچھا
کہ بھائی آخر میری کچھ خطا بھی ہے کہا اس سے بڑھکر کیا خطا ہوگی کہ تم نے ہمکو سور کتا بنایا ۳۲۳
کہا میں نے تمکو نہیں کہا تھا بلکہ بے نمازیوں کو کہا تھا گانوں والوں نے کہا پھر ہم بھی تو
بے نمازی ہیں۔ مولوی صاحب بولے ہرگز نہیں تم بے نمازی کیوں ہوتے بتلاؤ کیا تم نے
کبھی نئے کپڑے پہنکر آخری جمعہ کی نماز نہیں پڑھی بولے جی ہاں آخری جمعہ کی تو نماز پڑھی ہے
کہا اور عید بقر عید کی نماز بولے وہ بھی پڑھتے ہیں۔ کہا پھر تم بے نمازی کدھر سے ہوئے۔ بے نماز
تو وہ ہے جو ایک دفعہ بھی عمر بھر میں خدا کے سامنے نہ جھکا ہو بس اس جواب سے سب خوش ہوگئے
تو جیسے اس طالب علم نے عید بقر عید کی نماز سے گانوں والوں کو نمازی بنادیا
تھا ایسے ہی شاید کوئی یہ سمجھے کہ سبحان اللہ الحمد للہ سے میزان عمل تو بھر ہی جائیگا پھر اور عمل
کی کیا ضرورت۔ اسکے دو جواب ہیں ایک الزامی ایک تحقیقی۔ الزامی جواب تو یہ ہے کہ سبحان
اللہ الحمد للہ سے میزان کا ایک پلہ ہی تو بھریگا (کیونکہ اعمال صالحہ کا ثواب ایک ہی پلہ میں
رکھا جاتا ہے دوسرا پلہ تو گناہوں کیلئے ہے ۱۲) تو ایک پلہ کے بھر جانیسے کیا نفع
جب تک دوسرے پلہ کا حال معلوم نہ ہو (کیونکہ اگر وہ بھی بھر گیا تو آپ جنت

میں نہ جاسکیں گے بلکہ اعراف میں رہ جائیں گے اور اگر وہ بہت زیادہ بھر گیا کہ اعمال صالحہ کے پلے سے بھی بھاری ہو گیا تو جہنم میں جانا پڑیگا (۱۲) اسلئے دوسرے پلہ کی فکر بھی لازم ہے جسمیں گناہ رکھے جائیں گے اور ترکِ صلوٰۃ و ترکِ صیام و ترکِ زکوٰۃ و ترکِ حج یہ سب معاصی ہیں اگر گناہوں کا پلہ بھاری ہو گیا تو نیکیوں کا پلہ بھرا ہونے سے کیا ہو گا اور تحقیقی جواب یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جو سبحان اللہ والحمد للہ کا ثواب بیان فرمایا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ ان کلمات میں یہ خاصیت ہے یہ ایسا ہے جیسے طبیب یہ کہے کہ بنفشہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ دماغ کا تنقیہ کرتا اور مواد فاسدہ کو دفع کرتا ہے مگر سب جانتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تک اس کے ساتھ کوئی مضر شے استعمال نہ کی جائے جو اسکی خاصیت کو باطل کردے اب اگر کوئی سنکھیا کھا کر بنفشہ پی لے تو بتلایئے بنفشہ سے کیا خاک نفع ہوگا اور اگر اس صورت میں بنفشہ کی خاصیت کا ظہور نہ ہو تو کیا حکیم کے دعوے کو غلط کہا جائیگا ہرگز نہیں ایسے ہی یہاں سمجھیے کہ سبحان اللہ الحمد للہ کی واقعی یہ خاصیت ہے کہ میزان عمل کو بھر دیتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ کوئی منافی نہ پایا جائے۔ تو اب سمجھئے کہ حق تعالیٰ کی کسقدر عنایت ہے کہ ایک سبحان اللہ الحمد للہ پر اسقدر ثواب عطا فرماتے ہیں۔ دنیا میں تو والدین سبق کے ایک ایک لفظ پر ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے البتہ بعض لوگ مکتب جانے پر ایک ہفتہ میں بچوں کو ایک آنہ تو دیدیتے ہیں اور ایک صاحب نے بیان کیا کہ ہمارے یاں جان محمد بجز تک حقہ بھرنے پر دو پیسے منصوری دیا کرتے تھے جو وزن میں تو ڈبل تھے مگر قوت میں کم تھے اگر کسی بچہ کو باپ نے عید بقر عید کے موقع پر ایک روپیہ دیدیا تو خوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں خصوص پہلے زمانہ میں جبکہ روپیہ کم تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ والد صاحب نے عید کے دن ہم دونوں بھائیوں کو دو دو آنہ کے پیسے دیئے بھائی اکبر علی نے تو لیلئے میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ والد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے کیوں واپس کر دیئے میں نے کہا یہ تو تھوڑے ہیں۔ فرمایا ہمارے والد تو ہمکو عید کے دن دو پیسے دیا کرتے تھے اور ہم اس سے ہی بہت خوش ہو جاتے تھے میں نے کہا ہم میں اور آپ میں فرق ہے فرمایا وہ کیا۔ میں نے کہا فرق یہ ہے کہ آپ غریب کے [illegible]

بیٹے تھے اور ہم امیر کے بیٹے ہیں ۔ اسپر بھائی اشارہ سے کہنے لگے کہ یہ کیا کہتے ہو گستاخی کرتے
ہو میں نے کہا اسمیں گستاخی کیا ہے ہم ان کو اپنے دادا پر ترجیح دے رہے ہیں اسمیں تو
اپنے والد کی تعظیم ہے والد صاحب ہنسنے لگے اور ایک ایک روپیہ عنایت فرمایا جب
ہم خوش ہوئے مگر آج کل ایک روپیہ کی بھی قدر نہیں اب تو بچے دو تین روپیہ سے کم میں
خوش نہیں ہوتے ۔ غرض ہمکو اپنی اولاد کو ایک ہفتہ کی پڑھائی کے صلہ میں ایک آنہ دیتے
ہیں اور یہ بھی سب نہیں دیتے بلکہ بعض والدین ہی ایسا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایک
سبحان اللہ کے عوض میں اسقدر دیتے ہیں کہ انتہا ہے نہ اوسکے ۔ اسپر مجھے ایک بات یاد آئی
وہ یہ کہ دیانند نے تناسخ کو ثابت کر کے (اور وہ ثبوت بھی اسی کے زعم میں ہے ورنہ
درحقیقت اُسکے پاس اسکی کچھ دلیل نہیں) نجات ابدیہ پر اعتراض کیا ہے کہ مسلمان جو
اعمال صالحہ کے عوض میں نجات ابدیہ کے قائل ہیں یہ عقل کے خلاف ہے کیونکہ اسکی تو ایسی
مثال ہے جیسے کسی آدمی پر پانچ من بوجھ لاد دیا جائے جس سے اسکا کوبڑ نکل جائے
پس متناہی عمل کا غیر متناہی صلہ نہ ہونا چاہئے مجھے حیرت ہے کہ اس شخص کو عاقل کس نے ۳۵
کہدیا پس ایسی دلیل سے آپ اُسکی دلیل عقل کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور گو یہ اس بےعقلی کی
بات کا جواب دینا ہمارے ذمہ لازم نہ تھا عقلاء خود اسکو سنکر ہنسیں گے مگر ضعفاء کی حفاظت
کیلئے اسکا جواب دیا جاتا ہے وہ یہ کہ انسان پر پانچ من بوجھ لادنا اُس وقت موجب تکلیف
ہے جبکہ ایک دم سے لاد دیا جاوے اور اگر غیر متناہی ثواب غیر متناہی مدت میں دیا جائے تو
اسمیں کیا اشکال ہے اور مسلمان جیسے نجات ابدیہ کے قائل ہیں تو وہ اسکی ساتھ اسکے بھی تو
قائل ہیں کہ اہل جنت ہمیشہ زندہ رہیں گے انکو کبھی موت نہ آئیگی (دوسرے لادنے کی بھی
ایک ہی کہی بھلا نجات ابدیہ سے کمر پر لادنا کیونکر لازم آگیا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک
شخص کو اسقدر خزانہ دیدیں جو کبھی ختم نہو اور وہ خزانہ ایک مقام پر محفوظ کر کے پھر اس
شخص کے حوالہ کر دیا جائے کہ ضرورت کے وقت جتنا چاہے نکالے اور خرچ کرے تو کیا
اس شخص کے نزدیک عمر غیر متناہی عطا ہونا بھی لاد دینے کے مثل ہے تو اس کا حماقت ہونا ظاہر
ہے کیونکہ عمر طویل سے کسی پر بھی کچھ گرانی نہیں ہوتی بشرطیکہ قوی دماغیہ و جسمانیہ

معطل نہوں بلکہ ایسی زندگی کا تو کفار میں دُنیا ہی کے اندر سرکس طالب، ولتجدنھم احرص
الناس علی حیوۃ ومن الذین اشرکوا یود احدھم لو یعمر الف سنۃ (پ۱) غرض آپ کو ہر عمل
صالح پر بے انتہا اجر ملتا ہے اور ہر مصیبت پر نعم البدل عطا ہوتا ہے یہاں تک کہ حدیث
میں آیا ہے کہ قیامت کے دن جب اہل نعم اہل مصائب کے اجر کا مشاہدہ کرینگے تو وہ تمنا
کریں گے کاش ہمکو دُنیا میں ہماری کھالیں مقراض سے قطع کیجاتیں تاکہ آج ہمکو بھی یہ ثواب
حاصل ہوتا پس اس ثواب کے استحضار سے آپکو غم ہلکا کرنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ یہ
سب مصائب درحقیقت تجارت میں داخل ہیں۔ یہ تو علاج عام ہے جو عوام کیلئے مناسب ہے اور
ایک علاج خاص ہے جسکو خواص استعمال کرتے ہیں اُس کا نام تفویض ہے جسکی حقیقت قطع تجویز ہے
یعنی وہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ وہ جو چاہیں ان میں تصرف کریں۔ اپنی طرف سے
وہ کوئی حالت یا انتظام تجویز نہیں کرتے۔ اور تمام تر پریشانی کا سبب تجویز ہی ہے کہ ہمنے ہر چیز کا
ایک نظام خاص اپنے ذہن میں قائم رکھا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہئے اولاد کو اس طرح
پڑھنا چاہئے پھر اس نظام کے خلاف واقع ہونے سے کلفت ہوتی ہے اور زیادہ حصہ اس نظام ۲۳۶
کا جو ہماری طرف سے تجویز ہوتا ہے غیر اختیاری ہے تو غیر اختیاری امور کیلئے نظام تجویز کرنا حماقت نہیں تو
کیا ہے اسی طرح تجویز کے لئے حدیث میں ہے اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمساء واذا امسیت
فلا تحدث نفسک بالصباح کہ جب صبح ہو تو شام کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ اور شام
ہو تو صبح کے متعلق خیال نہ لاؤ۔ راحت اسی میں ہے اسی لئے اہل اللہ نے تجویز کو قطع
کر کے یہ مذہب اختیار کر لیا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔۔۔ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور یہ مذہب بنا لیا ہے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من ۔۔۔ دل فدائے یار دل رنجان من

اُنہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اُن کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہیں تصرف کریں۔ پھر
اس کے بھی منتظر نہیں کبھی تو استحضار ثواب سے تفویض حاصل ہوتی ہے کہ اس سے ہم کو ثواب
ملیگا۔ شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو وہی پہلا علاج ہو گیا مگر نہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے پہلی

صورت میں تو استحضار ثواب خود علاج تھا اور اس صورت میں اصل علاج تفویض ہے اور
استحضار ثواب تقویت تفویض کیلئے ہے اور کبھی محض رضائے حق کیلئے تفویض کی جاتی ہے۔
استحضار ثواب کو بھی اس میں دخل نہیں ہوتا گو ثواب بھی مل جائے مگر یہ ثواب کیلئے تفویض
نہیں کرتا گو ثواب سے استغنا بھی نہیں ہوتا بلکہ اپنے کو مستحق نہیں سمجھتا صرف استحقاق کی
نفی ہوتی ہے کہ اگر ثواب نہ ملے تو عین عدل ہے کیونکہ میں اس کا مستحق نہیں یہ شخص محض اس لئے
تفویض کرتا ہے کہ محبوب کا حق یہی ہے کہ اس کے سامنے اپنی رائے اور تجویز کو فنا کر دیا جائے
یہ تفویض کا اعلیٰ درجہ ہے کیونکہ جو تفویض ثواب کیلئے ہوتی ہے وہاں عمل مفوت ثواب سے
انقطاع تفویض کا احتمال ہو سکتا ہے اور تفویض للرضا میں یہ احتمال نہیں رہا یہ کہ تفویض
کے بعد بھی بقاء رضا میں تو شبہ و احتمال ہو سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو جب تک
تفویض باقی ہے رضا بھی باقی ہے۔ دوسرے صوفی ابن الحال ہوتا ہے وہ آئندہ کی فکر نہیں
کرتا وہ بقاء رضا میں بھی تفویض سے کام لیتا ہے مگر یہ علاج چونکہ خاص ہے اس لئے میں نے
اسکو تفہیم کے طور پر بیان کر دیا ہے ورنہ اصل علاج عام وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ استحضار ۳۷
ثواب کا مراقبہ کرے اور یہ بات سمجھ لے کہ ہر مصیبت پر نعم البدل ملتا ہے اور آخرت میں تو
ملتا ہی ہے۔ دنیا میں بھی نعم البدل ملتا ہے اور خدا پر بھروسہ کر کے میں نہایت زور کیساتھ
کہتا ہوں کہ دنیا میں بھی اسکو نعم البدل کا مشاہدہ ضرور ہوگا مگر اسکے لئے ایک شرط ہے وہ
یہ کہ حق تعالیٰ کے معاملات میں غور کرتا رہے کہ اس واقعہ میں کیا حکمت ہے اگر غور کرتا رہیگا
تو ہر واقعہ کی مصلحت سمجھ میں آجائیگی۔ بحمد اللہ مجھے تو خدا نے یہ دولت عطا فرمائی ہے مجھے تو
ہر واقعہ میں کھلی آنکھوں مصلحت و حکمت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آجکل مجھے عذر ہے اسکی
نسبت میں بیان نہیں کر سکتا کہ اسکا میرے دل پر کسقدر حظ ہے کیونکہ میں عرصہ سے یہ چاہتا تھا
یہ سفر منقطع کر دوں کیونکہ مجھے سفر سے کلفت ہوتی تھی اور میں اسکے لئے بہانہ اور عذر
تلاش کرتا تھا لیکن مجھے خبر نہ تھی کہ میرے جسم ہی میں ایک چیز ایسی موجود ہے جو میری اس کلفت
کے رفع کا ذریعہ ہو جائے گی یعنی مجھے آنت اترنے کا مدت سے مرض تھا لیکن پہلے اس میں کوئی
تکلیف نہ تھی اب کچھ عرصہ سے اس میں خاص تکلیف شروع ہو گئی کہ اپنے موقع پر سے اس کا

ہٹنا تکلیف کا سبب ہوتا ہے اور ادنیٰ سبب سے وہ ہٹ جاتی ہے جس سے تحرز خصوص سفر
میں مشکل ہے لہٰذا اب میں نے سفر منقطع کر دیا خدا نے مجھے یہ عذر ایسا دیا جس سے میری تکلیف
کا انسداد ہو گیا اسی طرح ہر وقت کوئی نہ کوئی مصلحت اور فائدہ ہر واقعہ میں سمجھ میں آ جاتا ہے
حتیٰ کہ کسی عزیز کی موت میں بھی اور مصیبت و رنج کے واقعات میں بھی اور کم از کم یہ فائدہ تو ہر واقعہ
میں مشاہد ہے کہ اس سے اخلاق کی اصلاح ہو جاتی ہے اور اپنی حقیقت عجز کا مشاہدہ ہو جاتا ہے
اور یہ بہت بڑا فائدہ ہے۔ تو صاحبو اگر غم بھی ہو مگر غم کی حکمت سمجھ میں آ جائے تو غم ہلکا ہو جائیگا
یہی وجہ ہے کہ انبیاء و اولیاء کو غم سے پریشانی کم ہوتی ہے۔ پس انسان کو جو مصیبت پیش آئے
اس وقت یہ سمجھ لے کہ مجھے اسمیں نفع ضرور ہوگا آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی گو دنیوی نفع ابھی
سمجھ میں نہ آئے مگر غور کرتے کرتے وہ بھی سمجھ میں آنے لگیگا اور نہ سمجھ میں آئے تو آخرت کا نفع تو
ہے ہی اور وہی ہمارا اصلی گھر ہے اسکے نفع کو مقدم سمجھنا چاہیئے گو دنیا کا نفع بھی من وجہ مطلوب ہے
مگر آخرت کی برابر نہیں اور یوں تو آدمی سفر میں ریل میں اور سرائے میں بھی اپنی راحت کا اہتمام کرتا ہے
کہ جگہ اچھی اور گرمی سردی کا آرام ہو تو اسی درجہ میں دنیا کی راحت کا بھی بقدر ضرورت ۳۴۸
اہتمام کرنے کا مضائقہ نہیں کیونکہ دنیا کی مثال آخرت کے سامنے سرائے جیسی ہے اسلئے دنیا
کی مصلحت و منفعت بھی ایک درجہ میں مطلوب ہے اور شریعت نے بھی اجازت دی ہے اور
یہاں سے ایک شبہ کا جواب بھی ہو گیا وہ یہ کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ علماء شریعت دنیا کمانے سے
اور دنیا کی راحت و منفعت سے روکتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں فتحپور میں ایک صاحب نے مجھ سے
خود کہا کہ میں نے تو تمام شریعت کا خلاصہ یہ سمجھا ہے کہ نہ غم میں روؤ اور نہ خوشی میں ہنسو بس
پتھر بنکر رہو اور مر جاؤ میں نے کہا سبحان اللہ آپ نے خوب خلاصہ نکالا بلکہ شریعت کا خلاصہ یہ ہے
کہ کسی حال میں پریشان نہ رہو بلکہ راحت سے رہو غم میں بھی اور خوشی میں بھی کیونکہ شریعت غم کو
ہلکا کرنیکا طریقہ بتلاتی ہے اور راحت کے متعلق ایسے امور کی تعلیم دیتی ہے جس سے اسباب راحت
میں ترقی ہو زوال نہ ہو۔ واللہ لوگوں نے شریعت کو سمجھا نہیں اسلئے یہ غلط خلاصہ نکالا یہ خلاصہ
ویسا ہی ہے جیسے مولانا جامی نے قصہ یوسف و زلیخا کا خلاصہ نکالا تھا وہ سفر میں ایک شخص
کے رفیق بنے تھے وہ روٹی تھوڑی کی تھی اس نے مولانا جامی کو باتوں میں لگانا چاہا تا کہ خود روٹی زیادہ

کہا جائے اور کہا مولانا آپنے یوسف وزلیخا کا قصہ لکھا ہے ذرا وہ قصہ بیان تو کیجئے مولانا جامی سمجھ گئے کہ اسکا مقصود کچھ اور ہے فرمایا جی ہاں قصہ تو بہت لمبا ہے مگر خلاصہ اس کا یہ ہے پیرے لود سپرے داشت گم کردہ باز یافت۔ ایک بڑے میاں تھے انکا ایک لڑکا تھا وہ گم ہوگیا تھا پھر ملگیا یہ کہہ کر ہنسنے لگے نیز یہ ایسا خلاصہ تھا جیسے ایک صاحبنے یہاں خانقاہ میں رہکر تصوف کا خلاصہ نکالا تہا کہ مجھے تو یہاں کی تمامتر تعلیم کا خلاصہ یہ معلوم ہوا کہ پیر کی تعظیم خوب کرتے رہیں میں نے کہا سبحان اللہ اچھا خلاصہ نکالا گویا مشائخ مخلوق کو اپنا بندہ بنانا چاہتے ہیں نعوذ باللہ اور نہ معلوم یہ خلاصہ انہوں نے کس تعلیم سے سمجھا حالانکہ یہاں تو تعظیم کی ممانعت ہے ہاں اطاعت کا حکم ہے کیونکہ اس طریق میں بدون تقلید و انقیاد کے کام نہیں چل سکتا ان حضرت کا نام بدر تہا میں نے انکو بدر کردیا یعنی ان کو سکون سے حرکت میں لے آیا۔ (اسکی لطافت اہل ذوق لسان سے مخفی نہیں کیونکہ رقابت سکون ہے اور اخراج تحریک ہے اسی طرح بدر میں دال کا سکون ہے اور بدر میں حرکت ہے ۱۲) میں یہ کہہ رہا تہا کہ جن لوگوں نے شریعت کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ دنیا میں بیٹھ رہن کر رہو انہوں نے شریعت کو اور علماء کے مطلب کو نہیں سمجھا ایک مولوی صاحب جو مالدار بھی ہیں تھے اُن سے ترقی مال کے متعلق میری گفتگو ہوئی مگر وہ سمجھتے نہ تھے بالآخر میں نے یہ کہا کہ میاں تم تو مولوی ہو میں تمکو علمی اصطلاح میں سمجھاتا ہوں کہ علماء کی تعلیم کا حاصل اس بابت میں یہ ہے کہ مال کو مقصود بالذات نہ بناؤ ورنہ بدذات ہو جاؤگے بلکہ مقصود بالغیر بناؤ تو بالخیر ہوگے ورنہ مطلقاً جمع مال سے علماء منع نہیں کرتے اور وہ کیسے منع کرسکتے ہیں جبکہ حدیث میں حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ مصرح ہے کہ ایک مرتبہ وہ غسل فرمارہے تھے کہ سونے کی ٹڈیاں آپ پر برسنے لگیں اور وہ انکو جمع کرنے لگے وحی آئی اے ایوب کیا میں نے تمکو اس سے مستغنی نہیں کردیا ہے (کیونکہ ایوب علیہ السلام بہت مالدار تھے) تو آپنے عرض کیا بلٰی یارب ولکن لا غنی بی عن برکتک کہ بیشک اے پروردگار آپنے مجھے اس سے غنی کردیا ہے لیکن میں آپکی نعمت کی ترقی سے مستغنی نہیں ہوں۔ اگر مال جمع کرنا مطلقاً مذموم ہوتا تو ایوب علیہ السلام کا یہ جواب مقبول نہ ہوتا نیز حضرت کعب بن مالک نے ایک دفعہ

اپنا تمام مال صدقہ کرنا چاہو تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا امسک علیک بعض مالک فھو
خیر لک کہ اپنے مال میں سے کچھ حصہ اپنے واسطے بھی رکھ لو یہ بہتر ہوگا چنانچہ انہوں نے خیبر کا
حصہ روک لیا۔ نیز خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ اپنے ازواج مطہرات کو
سال بھر کا نفقہ دیدیا کرتے تھے یہ بھی ایک گونہ جمع مال ہے اور حضرت سفیان ثوری رح
کا مقولہ ہے کہ حلال مال کی قدر کرو اسکو فضول ضائع نکرو ایک زمانہ تو وہ تھا جسمیں مال کا
جمع کرنا دین کے واسطے مضر تھا اور اب وہ زمانہ ہے کہ مال کا جمع نکرنا دین کے واسطے مضر ہے
پھر فرمایا کہ اگر ہمارے پاس یہ چند درہم و دینار نہوتے تو یہ اہل دولت تو ہمکو اپنا رومال بنا
لیتے یعنی ہمکو پامال کر دیتے۔ اب کسکا منہ ہے جو علماء کو بدنام کرے کہ یہ دنیا کمانے اور
مال جمع کرنے سے روکتے اور ترقی کے مخالف ہیں۔ پھر میں کہتا ہوں کہ آجکل جن اہل ترقی کو
ترقی کی فکر ہے انکو صرف آمدنی کی فکر ہے مگر اسکی ساتھ ہی وہ خرچ بھی بہت کرتے ہیں پھر
اس طرح ترقی کیسے ہوگی۔ ترقی کی صورت تو یہ ہے کہ ترقی آمدنی کی ساتھ خرچ کو بھی کم کیا جائے
پس ان لوگوں کا اپنے کو حامی ترقی کہنا غلط ہے جو دعوے بلا دلیل سے زیادہ وقعت ۴۰
نہیں رکھتا شیخ الٰہی بخش صاحب رئیس میرٹھ کا مقولہ ہے کہ آمدنی کی فکر سے زیادہ خرچ کی
فکر لازم ہے اگر خرچ کی فکر ہو تو تھوڑی بھی کافی ہو جاتی ہے اور خرچ کا انتظام نہو تو
بہت آمدنی بھی کافی نہیں آجکل لوگوں کی زیادہ پریشانی کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے خرچ
کا انتظام نہیں کرتے اسی لئے [illegible] اور [illegible] روپئے کی تنخواہ بھی انکو قلیل معلوم ہوتی ہے۔
مجھے خوب یاد ہے کہ مدرسی سے پہلے میں نے ذہن میں اپنے لئے [illegible] روپئے تنخواہ تجویز
کی تھی کہ بس ہم دو میاں بی بی کیلئے اتنا بہت ہے مگر آجکل تو [illegible] روپیہ کی تنخواہ کا نام بھی
عار ہے چنانچہ ہمارے ہی قریب ایک قصبہ میں چند مستورات نے جمع ہو کر اپنے اپنے
شوہروں کی تنخواہوں کا تذکرہ کیا انہیں سے ایک عورت کے خاوند کی تنخواہ شاید [illegible]
تھی جب اسکی باری آئی تو وہ یہ کہتی ہوئی شرمائی کہ [illegible] روپیہ تنخواہ ہے اسلئے وہ یوں کہتی
ہے کہ تنخواہ تو انکی [illegible] ہی روپیہ ہے مگر ماشاءاللہ اوپر کی آمدنی کافی ہے ایک عورت نے کہا ارے
کمبخت توبہ کر حرام مال پر ماشاءاللہ کہتی ہے غرض شریعت تو دنیا میں راحت کے ساتھ

باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ

رہنے کی بھی اجازت بلکہ تعلیم دینی ہے لیکن اس کو مقصود بالذات بنانے کو روکتی ہے پس اگر دنیا کا کچھ نقصان ہو جاوے اور اس میں دنیا یا آخرت کا نفع ہو جاوے تو وہ نقصان حقیقت میں کچھ نقصان نہیں وہ ایک تجارت ہے اپنے دل کو سمجھا لینا چاہیئے میں نے اوپر کہا تھا کہ دنیوی نقصان سے خود دنیا میں نفع ہوتا ہے جو غور سے سمجھ میں آتا ہے مجکو اس پر ایک حکایت یاد آگئی۔ بریلی میں ایک صاحب یتیم خانہ کے مہتمم تھے انہوں نے میرے نام ایک فتوے کیلئے خط لکھا اور پتہ میں اپنے نام کے ساتھ گورنر یتیم خانہ ... لکھا ایک آفت یہ بھی ہوگئی کہ جاہ مقصود بالذات ہوگیا جاہ کے لئے اپنے لئے ... عہدے پھر ان عہدوں کے انگریزی نام تجویز کرتے ہیں تو ان صاحب نے اپنے کو گورنر لکھا مگر وہ ایسے گورنر تھے کہ جواب کیلئے آپ نے ٹکٹ تک نہ بھیجا تھا میں اسوقت تک ایسے خطوط کا جواب بیرنگ دیدیا کرتا تھا اس کا جواب بھی میں نے بیرنگ بھیجدیا تو گورنر صاحب نے واپس کر دیا اور مجھے ایک آنہ دینا پڑا کیونکہ اسوقت ایک ہی آنہ محصول تھا اتفاق سے اسی زمانہ میں میرا جانا بریلی ہوگیا میں نے بھائی سے یہ قصہ بیان کیا کہ میں ان گورنر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں مجھے ان سے ایک آنہ وصول کرنا ہے یہ کیسے گورنر ہیں کہ استفتا بھیجیں اور جواب کیلئے ٹکٹ نہ رکھیں اور بیرنگ جواب دیا جائے تو محصول بھی ہمارے ذمہ ڈالیں اسوقت بعض لوگ اور بھی بیٹھے تھے جب وہ چلے گئے تو بھائی نے کہا کہ تم نے غضب کیا اسوقت ان گورنر صاحب کے صاحبزادے بھی موجود تھے۔ میں نے کہا یہ اچھا ہوا کہ میرا مدعی حاصل ہوگیا۔ کیونکہ میں تو ان کو اس تہذیب پر تنبیہ کرنے کے لئے ہی ملنا چاہتا تھا اب مجھے ان سے ملنے کی ضرورت نہیں ... دیکھئے ان گورنر صاحب کی حرکت سے میرا ایک ... نقصان تو ہوا مگر ... حکمت تھی وہ یہ کہ میں نے آئندہ کیلئے قانون مقرر کر دیا کہ ایسے خطوط کا جواب بھی نہیں دیتا جنمیں ٹکٹ نہ ہو۔ یہ مجکو نفع ہوا۔ صاحبو! میرے پاس کوئی چھ مہینے رہے تو میں ان واقعات الٰہیہ کی اسرار و حکم اسکی ... رہیں گا جو روز زمانہ مجھے پیش آتے رہتے ہیں ہاں البتہ ان کے واقعات کی ... نہیں کیونکہ اپنے واقعات کا علم انہی کو ہوسکتا

ہے اور وہی اس کے منافع وحکم کو سمجھ سکتے ہیں گورنر کے قصہ پر ایک مضمون ذہن میں آگیا کہ آجکل تفاخر وتکبر کا مرض ایسا عام ہوا ہے کہ علماء میں بھی یہ مرض سرایت کر گیا چنانچہ بعض نوجوان اہل علم اپنے ناموں کے ساتھ فاضل دیوبند لکھنے لگے ہیں میں کہتا ہوں کہ ہاں تم فاضل ہو مگر فضیلت سے نہیں بلکہ فضول سے کیونکہ جو لوگ واقعی صاحب فضیلت تھے ان کی تو یہ حالت تھی کہ اپنا نام بھی پورا نہ لکھتے تھے حضرت شیخ العلماء مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے ہمیشہ اپنے دستخط میں بندہ محمود ہی لکھا نام بھی پورا نہ لکھا فاضل یا عالم تو وہ اپنے کو کب لکھتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے کو عالم ہی نہیں سمجھتے تھے ایک دفعہ خود فرمایا کہ ساری عمر کے علمی مشغلہ سے ہمکو تو یہ حاصل ہوا کہ جہل مرکب سے جہل بسیط میں آگئے یعنی اپنے جہل کا علم ہو گیا۔ اور اسی تفاخر کا یہ اثر ہے کہ اپنے ناموں کیساتھ نسبتیں لکھتے ہیں کوئی سبحانی بنتا ہے کوئی یزدانی آجکل چھوٹی قوموں کو بھی انصاری بننے کی فکر ہو رہی ہے ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ اسلام میں مساوات ہے اسلئے چھوٹی قوموں کو ذلیل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے لہذا مناسب ہے کہ انکو بڑے بڑے القاب سے یاد کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ولا تنابزوا بالالقاب سبحان اللہ آیت کا مطلب آپنے خوب سمجھا آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ اسکو برے لقب سے یاد نہ کرو یہ تو مطلب نہیں کہ غیر واقعی بڑے بڑے القاب سے یاد کرو) پھر آپنے لکھا کہ چھوٹی قوموں کو اعظمی حنفی نعمانی وغیرہ القاب دیئے جائیں میں نے لکھا کہ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ شریعت نے نکاح وغیرہ میں جو کفارت کے احکام مقرر کئے ہیں وہ مصالح پر مبنی ہیں۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ انتساب الی غیر الآباء حرام ہے تو اگر ان لوگوں کو بڑے بڑے القاب مذکورہ دیئے گئے تو چند روز میں لوگ ان کو حضرت امام اعظمؒ کی اولاد سمجھنے لگیں گے جیسا کہ ایک صاحب نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی لکھنا شروع کیا تھا اور عام لوگ ان کو امام صاحب کی اولاد میں سمجھنے لگے۔ پھر اس تفاخر نے یہاں تک ترقی کی کہ بعض لوگ انسان سے حیوان بننے لگے کوئی اپنے نام کیساتھ طوطی ہند لکھتا ہے کوئی بلبل ہند۔ میں نے کہا کہ اب چند روز میں لوگ خر ہند اور زاغ ہند بھی بننے لگیں گے اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں وہ یہ کہ بڑا سبب دنیوی نقصان سے پریشان ہونیکا ۴۲

یہ بھی ہے کہ مال وجاہ کو مقصود بالذات سمجھنے لگے اسلئے اسکے فوت کے وقت اسکے نعم البدل پر نظر نہیں جاتی کیونکہ مقصود بالذات کا کوئی بدل نہیں ہوتا اگر ان کو مقصود بالذات نہ سمجھا جاوے تو اسکے بدل ملنے پر قناعت ہو جاوے اس مرتبہ میں علماء اسکو مطلوب بتانے سے منع کرتے ہیں ورنہ علماء کسب حلال اور جمع مال سے مطلقاً منع نہیں کرتے بلکہ کسب حلال کو تو فرض کہتے ہیں کیونکہ حدیث میں اس کا امر ہے چنانچہ میں نے ایک دفعہ ایک بیان میں کہا تھا کہ ترقی کے ہم مخالف نہیں البتہ بعض ترقی کے مخالف ہیں اور اسکو آپ بھی تسلیم کرینگے کیونکہ اگر ہر ترقی مطلوب ہے تو ورم بھی ایک ترقی ہے اس کا علاج کیوں کیا جاتا ہے۔ پس جو درجہ آپ کے یہاں ترقی ورم کا ہے وہی درجہ ہمارے یہاں بعض ترقی ورم کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مال کے ایسے درپے نہ ہو کہ دین برباد ہو جائے ؎

مبادا دل آں فرومایہ شاد　　　که از بہر دنیا دہد دین بباد

اگر مال کے ساتھ دین پوری طرح محفوظ رہے تو پھر تمکو ترقی دنیا سے کون روکتا ہے جتنی چاہو ترقی کرو خواہ بادشاہ ہو جاؤ خواہ وزیر ہو جاؤ خواہ ہفت اقلیم کو فتح کر لو مگر حدود کے اندر رہو لیکن تجربہ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے۔ حدود کی تمیز آپ کو خود نہ ہوگی بلکہ اسکے لئے ۴۳
آپ کو اول کسی عالم کے پاس رہنے کی ضرورت ہوگی جو مسائل واحکام سے آپ کو واقف کرے پھر محقق شیخ کے پاس رہنے کی ضرورت ہوگی وہ آپ کو صدراتمس بازغہ نہ پڑھائیگا بلکہ اس کی صحبت وتقریر ہی سے آپ کو حدود کا امتیاز ہو جائے گا۔ اکبر حسین صاحب جج مرحوم فرماتے ہیں ؎　　　دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا۔

اور صحبت علماء ومشائخ کیلئے اس کی ضرورت نہیں کہ آپ اپنی ملازمت وغیرہ کو ترک کر کے ان کے پاس رہیں بلکہ اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی تعطیلات کا کچھ حصہ ان کی خدمت میں گذارو چھوٹی چھوٹی تعطیلوں کو تو اپنی تفریح وغیرہ میں صرف کرو ہاں بڑی چھٹی کی تنصیف کر کے نصف حصہ ان کے پاس رہو اور نصف حصہ اپنے وطن وغیرہ میں رہو اتنا بھی اگر آپ کرتے رہیں تو کافی ہے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو یوں کہا جائیگا کہ آپ کو دین کی طلب ہی نہیں ابھی کچھ گذرے ہیں ایک صاحب عہدہ دار میرے پاس آئے تھے وہ کچھ شبہات بیان

کرنے لگے میں نے کہا کہ آپ کے شبہات کے جوابات تو حاضر ہیں مگر ممکن ہے کہ ان جوابات سے آپ کی تسلی نہ ہو۔ کیونکہ آپ کے شبہات نو برسوں کے پرانے ہیں اور آپ تشفی چاہتے ہیں ایک جلسہ میں یہ ٹھیک نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ آپ چھ مہینے یہاں رہیں تو امید ہے کہ آپ کی تسلی ہو جائے گی۔ اور اگر کسی کو یہ ڈر ہو کہ ہم متقی بنجائیں گے تو دنیا کے مزے جاتے رہیں گے تو میں کہتا ہوں کہ تم یہ نیت کر لو کہ متقی نہ بنیں گے مگر خدا کیلئے علما و مشائخ کی صحبت میں رہکر ایک دفعہ دین کو سمجھ تو لو اس کا یہ اثر ہوگا کہ تم کو متقی بننے کیلئے کوئی دقت پیش نہ آئیگی بلکہ تم خود بخود عمل کے مشتاق ہو جاؤگے اور تم کو اس وقت اعمال دینیہ میں وہ حظ اور لذت آئیگی کہ دنیا کی تمام لذتوں کو بھول جاؤگے۔ علیگڈھ کے ایک طالب علم ایم اے میرے پاس آتے ہیں پہلے وہ بھی آزاد تھے مگر اب ان کی یہ حالت ہے کہ دین کا ان کو عشق ہو گیا ہے اور انکی حالت یہاں کے صلحاء کی برکت سے اس کا مصداق ہو گئی ہے ؎

جمال ہمنشیں در من اثر کرد　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم
بگفتا من گل ناچیز بودم　　ولیکن مدتے با گل نشستم

اب وہ دنیا سے اسقدر متنفر ہیں کہ ان کے چچا نے ایک دفعہ ان سے فرمائش کی کہ ایک بنیے کے نام سودی قرض کا رقعہ لکھدو انہوں نے صاف انکار کر دیا چچا کو ناگوار ہوا ان کے والد کو اطلاع ہوئی ان کو بھی ناگوار ہوا اور کہا تم نے چچا کے حکم کی مخالفت کیوں کی۔ کہا وہ مجھے خدا کے حکم کی مخالفت کراتے تھے اور یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا ہاں میری ذات میں وہ کوئی تصرف کریں اس کے لئے میں جان و دل سے حاضر ہوں۔ مگر دین میں تصرف کریں تو یہ مجھکو گوارا نہیں پھر خدا نے غیب سے یہ سامان کیا کہ ان کے چچا کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یا کسی بزرگ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے ان کو اس حرکت پر تنبیہ کی اور بھتیجے کی تائید کی چچا نے خواب سے بیدار ہو کر توبہ استغفار کیا اور بھتیجے کو خط میں یہ سب واقعہ لکھکر ان سے معافی طلب کی اور سب راضی ہو گئے واقعی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے سب کام غیب سے خود درست کر دیتے ہیں۔ اب آپ کی یہ حالت ہوگی کہ گو پہلے عنہ رکانی ہوتے تھے تو اب عنہ رکانی ہوں گے اور نہ دین برباد کر کے دنیا کمانے کی ہوس نہو گی

ہوس نہ ہونے پر قصہ یاد آگیا۔ اناؤ میں ایک سب جج تھے ان کے پاس دو تعلقداروں کا مقدمہ آیا ان میں سے ایک نے ایک لاکھ روپے رشوت میں پیش کئے سب جج صاحب نے اپنے نوکر کو حکم دیا اس نالائق کو باہر نکالدو۔ ہر چند کہ تعلقدار کے سامنے ایک سب جج کی کوئی حیثیت نہیں مگر ایسے وقت وہ بھی کچھ نہیں بول سکتا جو خوشامد میں رشوت دیتا ہوا ور دوسرا اس سے استغنا برتتا ہو۔ دوسرے فریق کو خبر ہوئی کہ ایک لاکھ روپیہ واپس کر دیا گیا وہ سوا لاکھ روپیہ لیکر آیا سب جج صاحب نے اسکو بھی نوکروں سے نکلوا دیا۔ بتلائیے وہ کیا بات تھی کہ اس شخص نے سوا دو لاکھ روپے پر لات ماردی یقیناً اس کو رشوت لینے میں تکلیف تھی اور اسپر لات مارنے میں راحت تھی۔ مگر چونکہ وہ عالم نہ تھے اسلئے ایک حرکت انہوں نے خلاف بھی کی وہ یہ کہ غصہ میں فرمایا کہ پہلے میرا خیال اس مقدمہ میں انصاف کرنے کا تھا مگر چونکہ ان دونوں نے میرا دل بہت دکھایا ہے اسلئے اب ایسا فیصلہ کرونگا کہ دونوں سر پکڑ کر روئیں گے چنانچہ ایسا ہی فیصلہ کیا اور لطیفہ یہ ہوا کہ فیصلہ سنانے سے پہلے ان کی بدلی بھی ہوگئی مگر انہوں نے دو چار دن میں خوب محنت کر کے رات اور دن کا سارا وقت فیصلہ لکھنے میں صرف کیا اور جاتے ہوئے ایک دن پہلے فیصلہ سنا کر مقدمہ ختم کر کے چلے گئے پھر دونوں نے ہر چند ہائی کورٹ وغیرہ میں اپیل کیا مگر ظالم نے ایسا مدلل فیصلہ لکھا تھا کہ کہیں نہ ٹوٹ سکا۔ صاحبو! اب ایسے شخص کو دنیا کی ہوس کیونکر ہو سکتی ہے بلکہ اب اسکو تھوڑی آمدنی کافی ہوگی اور تھوڑی سی عزت کافی ہوگی اور تمام افکار سے آزاد ہو کر صرف ایک ہی فکر میں گرفتار رہے گا اور اس آزادی پر خوش ہو کر یوں کہے گا ؎

نہ براشتر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم
نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

اور یوں کہے گا ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلف آں نگارے مقبلم

کیونکہ وہ زنجیر تو ایسی ہے کہ ؎

اسیرت نخواہد رہائی ز بند
شکارت نجوید خلاص از کمند

وہ تو ایسی قید ہے جیسے کسی عاشق کو اس کا محبوب جو کہ مدتوں کے بعد ترس ترس کر ملا ہو

پیچھے سے آکر اس طور سے کہ اسکو خبر بھی نہ ہو اسکو بغل میں دبا لے اور اتنا زور سے دبائے
کہ اسکو طبعاً ناگوار بھی ہو مگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو محبوب کے چہرہ پر نظر پڑی تو گو یہ نیا ہے
کہ جاتے ہوئے کو روک لیا ایک جگہ محبوس کر دیا قید بھی با مشقت ہے کہ زور سے دبا لیا
کیونکہ معشوق تو موٹا تازہ تھا اسکو کوئی فکر و غم تھوڑا ہی تھا جو دبلا ہوتا اور عشاق اکثر توجہ غم
عشق کے لاغر نحیف ہوتے ہیں جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر — عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
لیک عشق عاشقاں تن زہ کند — عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

اب اگر محبوب اس سے یوں کہے کہ تجھکو تکلیف ہوئی ہو تو چھوڑ دوں اور ساتھ ہی یہ چرک
بھی لگا دے کہ تجھے چھوڑ کر اسی طرح رقیب کو بغل میں لیا لوں کہ وہ بھی اس کا مدت سے
مشتاق ہے تو یقیناً عاشق یوں کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور کہے گا ؎ ۴۶

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے — یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

تو جب ایک انسان کی محبت کا یہ حال ہے جو آپ ہی جیسا آدمی ہے مگر ذرا چمڑے کا رنگ
کھلا ہوا ہے تو حق تعالیٰ کی محبت کا کیا حال ہونا چاہیئے جس کی نظیر کوئی بھی نہیں شیخ
فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودے ز آب و گل — رباید ہمہ صبر و آرام دل
عجب داری از سالکان طریق — کہ باشند در بحر معنی غریق
دمادم شراب الم در کشند — وگر تلخ بینند دم در کشند

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود — گوے گشتن بہر او اولیٰ بود

مولانا نے مجنوں کے واقعہ پر یہ شعر لکھا ہے واقعہ یہ تھا کہ مجنوں ایک دفعہ لیلیٰ کی
زیارت کو اونٹنی پر سوار ہو کر چلا اونٹنی کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا جو پیچھے رہ رہ جاتا تھا

اور اونٹنی بار بار اسکو مڑکر دیکھتی اور جسوقت مجنون اپنے خیال میں مستغرق ہوتا اور باگ ڈھیلی ہوجاتی اونٹنی پیچھے کو لوٹ جاتی پھر اسکو ہوش آتا اور یہ اسکو آگے بڑھاتا پھر مستغرق ہوجاتا اور اونٹنی پیچھے لوٹ جاتی جب بار بار ایسا ہوا اور راستہ کچھ طے نہوا تو بیقرار ہوکر کہا ؎

ھوی ناقتی خلفی وقدامی الھوی فانی وایاھا لمختلفان

اور اوپر سے فوراً کود پڑا اونٹنی کو ٹھلا کر اترنیکا بھی انتظار نہ کیا اوپر سے کودا تو میاں کا پیر بیکار ہوگیا چلنے کے قابل بھی نہ رہا تو اب آپنے لیٹے لیٹے لڑھکنا شروع کیا اور کہا ؎

فان قطعت رجلی مشیت علی العصا + وان قطعت اخری حبوت وجیت

اگر میرا ایک پیر کٹ جائے تو لاٹھی کے سہارے آؤں گا اگر دوسرا کٹ جائے تو گھسٹکر آؤں گا ۱۲) مولانا اسپر فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود گوے گشتن بہرا و اولیٰ بود

چونکہ وہ لڑھک رہا تھا اسی لئے گوے گشتن فرمایا۔ جب لیلیٰ کی محبت میں یہ حال ہوگیا تو محبوب حقیقی کے عشاق پر کیا تعجب کرتے ہو۔ اب اسکو نہ کسی کا مرنا معلوم ہوگا نہ جینا ہر حال میں خوش رہے گا۔ اب اس کو نہ مال و زر خدا سے مانع ہوگا نہ فاقہ اور تنگدستی کیونکہ بعض لوگ مال و زر کے ساتھ بھی خدا سے علاقہ رکھتے ہیں اور بعض لوگ خالی ہاتھ ہوکر بھی خدا سے دور ہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل بہ تنہائی اندر صفائے نہ بینی

اور اگر سلطنت ہو زمینداری ہو مگر دل خدا سے لگا ہوا ہے تو پھر یہ حال ہوگا ؎

گرت مال و زر ہست و زرع و تجارت چو دل با خدا ہست خلوت نشینی

مگر ابتدا میں ایسی قوت نہیں ہوتی بلکہ چند روز اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

اگر کسی میں فطری قوت ہو کہ مادر زاد ولی ہو ابتدا ہی سے خدا کے ساتھ تعلق ہو تو مبارک ہو ورنہ اگر کسی میں یہ قوت فطری نہو تو جس طرح ورزش سے جسم میں قوت آجاتی ہے انشاءاللہ اسی طرح یہاں بھی بزرگوں کی صحبت سے اور ان کی تعلیم پر عمل کرنے ۴۷

سے دل میں قوت آجاتی ہے مگر صحبت کا نام سنکر ڈر مت جانا وہ تم سے چکی نہ پسوائیں
گے بفکر رہو بلکہ آسان اور سہل طریق سے دل میں خدا کی محبت پیدا کر دینگے پھر دل
میں ایسی قوت ہوگی کہ نہ بیماری سے گھبرائے گا نہ فقر و فاقہ سے نہ کسی عزیز کے مرنے
جینے سے چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام بیماری میں بھی خوش تھے حالانکہ بیماری
ایسی سخت تھی کہ تمام جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے اعزہ واقارب سب نے چھوڑ دیا تھا صرف
آپ کی بی بی حضرت رحمت علیہا السلام خدمت گذار تھیں اور اسی حالت میں تمام اولاد
مرگئی مویشی اور غلام بھی مرگئے پہلے بڑے مالدار تھے اب مفلس ہوگئے تو حضرت رحمت
نے عرض کیا کہ اے حضرت اب تو بہت تکلیف ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے تو بی بی سے
فرمایا کہ اے رحمت یہ تو بتلاؤ کہ ہم راحت و آرام میں کتنی مدت رہے ہے فرمایا اسی سال
فرمایا کہ اتنی سال تو کم از کم کلفت برداشت کرلیں پھر حق تعالیٰ سے عرض کرینگے ورنہ
یہ کیا کہ جس خدا کی نعمتیں اسی سال کھائیں چار دن کیلئے اگر وہ آزمائے تو اس
سے گھبرا جائے اور اس کی آزمائش کا تحمل نہ کرے۔ بتلائے پھر اس سے بڑھکر ۴۸
کیا راحت ہوگی کہ کلفت بھی کلفت نہ رہے راحت ہو جائے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا
میں مومن کو جسقدر تکالیف پہونچتی ہیں سب کا نعم البدل اسکو دونوں جہان میں ملتا ہے
پس درحقیقت یہ ایک تجارت ہو کہ ایک چیز دی گئی اور ایک چیز لی گئی اس حقیقت کو پیش نظر رکھا
جائے تو انشاء اللہ رنج وغم کو ترقی نہ ہوگی اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور
عمل صالح کی اور صبر کی توفیق ہو چونکہ طبیعت مضمحل ہے اسلئے زیادہ بیان کی ہمت نہیں قدر
ضرورت پر اکتفا کرتا ہوں وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وآخر
دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین۔

نوٹ ۔ بعد بیان کے دریافت فرمایا کہ کتنی دیر ہوئی عرض کیا گیا کہ پونے چار
گھنٹے بیان ہوا فرمایا اتنی دیر ہوگئی تو میں نے ناحق ہی معذرت کی ۱۲ ظ

اشرف علی

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ التبلیغ

کا

وعظ مسمی بہ

التثبیت بمراقبۃ المبیت

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ملا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ
التثبیت بمراقبۃ المبیت

أین	کہاں ہوا	تھانہ بھون۔ محلہ محات برمکان منشی محمد مظہر علی صاحب برادر خورد حضرت حکیم الامۃ قدس سرہ
متی	کب ہوا	۲۱ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۲ھ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ
کیف	کیونکر ہوا	جالساً
لِمَ	کیوں ہوا	مستورات کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	مراقبہ موت کی ضرورت اور اس کا طریقہ
من انتفع	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ہر طبقہ کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ
السامعون	سامعین کی تخمینی تعداد	
الأشتات	متفرقات	تسوید تفصیلی ۵ محرم ۱۳۶۳ھ کو شروع ہو کر ۱۰ محرم ۱۳۶۳ھ کو ختم ہوا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ **اَمَّا بَعْدُ** فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ۚ وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ[1] ۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے ایک خاص فضیلت

[1] اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو سچی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں کو بچلا دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

بیان فرمائی ہے ایک خاص عمل کی اسوقت مجھے اس عمل کی فضیلت کا بیان کرنا بھی مقصود ہے لیکن اصل مقصود ایک دوسرا امر بیان کرنا ہے جو سیاق کلام سے مفہوم حق بھی معلوم ہوتا ہے یعنی مجھے ایک مراقبہ کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے اور چونکہ اس مراقبہ کا کوئی وقت مقرر نہیں بلکہ ہر وقت کرنے کا ہے اسلئے وہ نفس پر گراں بھی ہوتا ہے کیونکہ نفس وقتی عمل کو تو آسان سمجھتا ہے کہ تھوڑی دیر کیلئے کسی کام میں مقید ہو جائے اور ہر وقت کی قید کو نہایت دشوار سمجھتا ہے اگرچہ وہ مراقبہ فی نفسہ دشوار نہیں صرف ایک بات کا دھیان رکھنا ہے اور کسی بات کا دھیان رکھنا کچھ مشکل کام نہیں کیونکہ کچھ سامان کرنا تھوڑا ہی پڑتا ہے مگر ہر وقت دھیان رکھنا بھی نفس کو گراں ہے۔ حق تعالیٰ جزائے خیر دے حکماء امت و فقہاء ملت کو کہ انہوں نے اس دشواری کو سہل کر دیا کہ اس کیلئے بھی انہوں نے ایک وقت مقرر کر دیا اسپر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب وہ مراقبہ کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں تو حکماء امت نے اسکو کس طرح مقید کر دیا کیونکہ یہ تو عموم کی تخصیص ہے جواب یہ ہے کہ حکماء نے عموم کی تحصیل ہی کیلئے یہ تخصیص کی ہے یعنی مقصود تو ان کا بھی یہی ہے کہ یہ مراقبہ ہر وقت ہو مگر چونکہ ابتداء میں ہر وقت اس کا استحضار گراں ہوتا ہے اسلئے انہوں نے ایک وقت مقرر کر دیا جس سے یہ مراقبہ مبتدی کو آسان ہو گیا پھر خاص وقت پر اس کی عادت ہو جانے سے ذہن میں یہ مراقبہ راسخ ہو جاتا ہے پھر رسوخ کے بعد خود بخود ہر وقت دھیان رہنے لگتا ہے غرض یہ تخصیص ابطال عموم کیلئے نہیں ہے بلکہ اسکی تحصیل و تکمیل کے لئے ہے خوب سمجھ لو بہر حال حکماء امت نے اس دشواری کو آسان کر دیا ہے یہ بات اخیر میں بیان کرنے کی تھی مگر میں نے گھبراہٹ دفع کرنے کیلئے اس کو پہلے ہی بیان کر دیا تاکہ سامعین مطمئن ہو کر سنیں کہ ان کو کوئی دشوار بات نہ بتلائی جائے گی اب اسکی تعیین سننا چاہیئے کہ یہاں کونسا مراقبہ مقصود ہے اور گو حق تعالیٰ نے صراحۃً یہاں کسی مراقبہ کو ذکر نہیں فرمایا مگر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کیونکہ یہاں صراحۃً تو کسی خاص عمل کے امر کا ذکر نہیں بلکہ محض ایک خبر مذکور ہے کہ حق تعالیٰ ثابت رکھتے ہیں ایمان والوں کو پکی بات کی۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ظالموں کو بچلا دیتے ہیں مگر اس پر علماء

ومفسرین کا اجماع ہے کہ اخبار قرآنیہ سے محض خبر ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ مقصود کوئی انشاء ہوتا ہے اور اخبار قرآنیہ ہی کی کیا تخصیص ہے میرے نزدیک تو خبر من حیث ہو خبر کسی عاقل کے کلام میں بھی مقصود نہیں ہوتی بلکہ عقلاء کے ہر جملہ خبریہ سے کوئی انشاء ہی مقصود ہوتا ہے اور جس جملہ خبریہ سے کوئی انشاء مقصود نہ ہو وہ لغو ہوتا ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو یہاں خبر سے محض خبر مقصود نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ چونکہ ایسا ایسا ہونے والا ہے لہذا اس واقعہ سے ڈرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں یعنی ایمان والوں میں داخل ہونا چاہیے ظالمین میں سے نہ ہونا چاہیے۔ پس یہاں بھی تصریح تو اس کی ہے کہ حق تعالیٰ کے خاص بندوں کی یہ فضیلت ہے کہ دنیا و آخرت میں حق تعالیٰ ان کو ثابت رکھتا ہے اور کافروں کی یہ مذمت ہے کہ ان کو بچلا دیتا ہے لیکن اس سے ایک مراقبہ کی طرف اشارہ بھی ہو گیا کہ اس وقت سے ڈرنا چاہیے جس میں کافر بچلیں گے اس لئے ایمان و عمل کا اہتمام کیا جائے۔ بظاہر اس آیت پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ ہی ثابت رکھتے ہیں اور وہی بچلا دیتے ہیں تو الزام کس پر اس کا جواب ظالمین کے لفظ سے ہو گیا کہ انہوں نے ظلم کیا تھا اس لئے اس کی نحوست سے بچل گئے یہ تو حکیمانہ جواب تھا اگر اس پر بھی کوئی شغب کرے تو آگے حاکمانہ جواب بھی دیدیا وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ کہ کسی کے باوا کا کچھ اجارہ نہیں جاؤ اللہ تعالیٰ جو چاہیں کرتے ہیں حکیمانہ جواب سے بعض دفعہ شور و شغب قطع نہیں ہوتا اس لئے حاکمانہ جواب بھی بیان فرما دیا اب سب کی زبانیں بند ہو گئیں یہ تو ترجمہ آیت کا تھا مگر اس سے وہ واقعہ معلوم نہیں ہوا جس کی نسبت تثبیت و اضلال کی خبر دی گئی ہے اس کیلئے تفسیر کی ضرورت ہے اور قرآن کی تفسیر کہیں تو قرآن ہی سے ہوتی ہے اور کہیں حدیث سے اس آیت کی تفسیر حدیث سے معلوم ہوتی ہے حدیث کیا ہے ارشاد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جن کی شان یہ ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ۔۔۔ گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اس لئے حدیث بھی بمنزلہ قرآن ہی کے ہے سو حدیث میں آچکا ہے کہ یہ آیت عذاب

قبر کے متعلق ہے پس ثابت ہو گیا کہ یہاں عذاب قبر سے ڈرنے کا اور اس کے استحضار کا امر ہے مگر اس پر ایک طالب علمانہ اشکال ہوتا ہے میں اس کا بھی جواب دیے دیتا ہوں وہ یہ کہ یہ سورت مکی ہے اور احادیث صحاح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو عذاب قبر کا علم مدینہ میں ہوا ہے پھر یہ آیت عذاب قبر کے متعلق کیونکر ہو سکتی ہے اگر اس میں عذاب قبر کا ذکر نا ہوتا تو حضور کو مکہ ہی میں اس کا علم ہو جاتا اسکا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس سورت کی خاص اس آیت کو مدنی مانا جاوے مگر میں نے اس کو کہیں منقول نہیں دیکھا اس لئے میرے نزدیک دوسرا سہل جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تَثْبِیْتٌ وَاِضْلَالٌ فِی الْاٰخِرَۃِ کی تفسیر کا ایک جزو تو مکہ میں منکشف ہو گیا تھا یعنی قیامت میں حساب وکتاب کے وقت مسلمانوں کا ثابت قدم رہنا اور کفار کا بچلنا اور ایک جزو یعنی تَثْبِیْتٌ وَاِضْلَالٌ فِی الْقَبْرِ مدینہ میں منکشف ہوا کیونکہ آیت میں لفظ فِی الْاٰخِرَۃِ وارد ہے اور آخرت دو ہیں ایک حقیقی یعنی قیامت اور ایک اضافی یعنی قبر پس مکہ میں آپ کو تَثْبِیْتٌ وَاِضْلَالٌ فِی الْاٰخِرَۃِ کا پہلا جزو منکشف ہو گیا جو قیامت کے متعلق تھا اور دوسرا جزو مدینہ میں منکشف ہوا یعنی عذاب ونعیم قبر پس اب آیت کے مکی ہونے اور عذاب قبر کے متعلق نازل ہونے میں کچھ تنافی نہیں کیونکہ دراصل یہ آیت قیامت اور قبر دونوں کے متعلق تھی مگر مکہ میں آپ کو اس کا علم نہ تھا مدینہ پہنچکر آپ کو معلوم ہوا کہ اس آیت میں عذاب قبر کا بھی ذکر ہے اور لفظ آخرت اسکو بھی عام ہے حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی بہرحال حدیث سے اس کا عذاب قبر کے متعلق ہونا صراحۃً معلوم ہو رہا ہے اور اسپر جو اشکالات تھے وہ بھی سب رفع ہو گئے اور یہ میں اوپر بتلا چکا ہوں کہ اس خبر سے مقصود یہ ہے کہ اس واقعہ کو یاد رکھو اور اس وقت کیلئے تیاری کرو اس سے مقصود بیان کی تعیین بھی ہو گئی اور اسوقت میں نے اس مضمون کو اسلئے اختیار کیا ہے کہ ہمارے اندر بڑا مرض یہ ہے کہ ہم اعمال میں سستی کرتے ہیں جسکا سبب غفلت عن الآخرۃ ہی

اور اس کا علاج تذکرہ آخرت ہے اسی کو میں مراقبہ کہتا ہوں چاہیے مراقبہ کی صورت متعارف سے نہو ویسے ہی چلتے پھرتے دھیان رکھا جائے مقصود یہ ہے کہ جو غفلت اعمال کی خرابی کا سبب ہو رہی ہے وہ دفع ہونا ضروری ہے مگر باوجود ضروری ہونے کے اس میں بہت ہی کوتاہی ہو رہی ہے اور اس کوتاہی کا ایک باریک سبب ہے اور یہ بات آج ہی میرے ذہن میں آئی ہے اور اسی کے بیان کیلئے میں نے یہ آیت اختیار کی ہے وہ یہ کہ جب لوگوں سے آخرت کی یاد کو کہا جاتا ہے تو ان کا ذہن فوراً اس طرف جاتا ہے کہ آخرت تو بہت دور ہے اس سے پہلے بہت سے واقعات پیش آنے والے ہیں امام مہدی کا ظہور ہوگا حضرت عیسی علیہ السلام کا نزول ہوگا دجال نکلے گا پھر آفتاب مغرب سے نکلے گا اس کے بھی ایک مدت بعد نفخ صور ہوگا اسوقت یہ عالم فنا ہوگا پھر قرن کے قرن اسی حالت فنا میں گذر جائیں گے پھر دوسرا نفخ صور ہوگا تب کہیں قیامت آئیگی اس بُعد کی وجہ سے انسان آخرت کو اپنے ذہن میں نہیں آنے دیتا کہ یہ تو ابھی بہت دور ہے اور اگر کسی کے ذہن میں خیال آتا بھی ہے تو اس بعد کی وجہ سے اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ خطرہ بعیدہ سے عادۃً تاثر کم ہوتا ہے چنانچہ اسی لئے عقلاء کا مقولہ مشہور ہے ؎

بترس از بلائے کہ شب درمیان ست

اگرچہ فی الواقع یہ بات علی الاطلاق[ف] غلط ہے کیونکہ طبیعت کو مشوش کرنے کیلئے طبعاً اس رات کے بعد کی مصیبت بھی کافی ہے مگر شعراء وعقلاء کی طبیعت پر عموماً ایسی بلا جسکے آنے میں زیادہ توقف ہو بہت گراں نہیں ہوتی اسی وجہ سے آخرت سے غفلت ہے اور غفلت کی وجہ سے لاپروائی ہے چنانچہ اسی لاپروائی کی وجہ سے بعض لوگ جب ان کو کسی گناہ پر ٹوکا جاتا ہے بیدھڑک کہدیتے ہیں کہ جاؤ بس تم ہی جنت میں چلے جانا ہم دوزخ ہی میں چلے جائیں گے۔ یہ بات ان لوگوں نے اپنی طبیعت کے موافق کہی کیونکہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض جرائم کیلئے تقادم عہد کو مسقط مانا گیا ہے اور شریعت میں بھی فی الجملہ اسکی رعایت ہے مگر یاد رکھو یہ حکم دنیا ہی میں ہے آخرت میں یہ قاعدہ نہیں کہ تقادم عہد سے جرم ساقط یا خفیف

ف: علی الاطلاق سلئے کہا کہ اگر اس بلا سے مراد بلائے دنیا ہو اور مقصود بیان اثر ہو بلکہ تعلیم ہو قطع کامل کی تو یہ کلام صحیح اور مفید ہے ۱۲

ہو جانے یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ آخرت کو دنیا پر قیاس کرتے ہیں پھر بُعد آخرت کی وجہ سے اپنے جرائم کو خفیف سمجھنے لگتے ہیں بعض بیہودہ لوگوں کا یہ قول سنا گیا کہ آخرت میں تو ہزاروں لاکھوں سے بھی زیادہ مخلوق ہوگی ممکن ہے کہ اس ہجوم میں ہم بچ جائیں جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے کہ جب جرم میں ہزاروں شریک ہوں تو ان میں بعض لوگ گرفتاری سے بچ جاتے ہیں مگر یہ بھی وہی غلط قیاس ہے چنانچہ تھانہ بھون میں ایک صاحب نے کسی کے کیکر کاٹ لئے تھے ایک آدمی نے ان سے کہا کہ میاں قیامت میں جب اترے پترے کھلیں گے اسوقت اس فعل کا انجام معلوم ہوگا تو اس نے کسقدر بیہودہ جواب دیا میں وہاں کہاں ملوں گا بیشمار مخلوق ہوگی کہیں چھپ رہوں گا یہ کلمہ بہت ہی سخت ہے گو اس پر کفر کا فتویٰ ہو یا نہ ہو غرض غفلت عن الآخرت سے یہ سب نتائج پیدا ہو رہے ہیں جسکے دفع کرنے کے لئے آخرت کی یاد بہت مفید ہے مگر اس کا بُعد کوتاہی کا سبب ہو رہا تھا اس لئے آج یہ بات ذہن میں آئی کہ آخرت کی دو قسمیں ہیں ایک قریب ایک بعید تو اگر آخرت بعیدہ کا خوف نہیں تو آخرت قریبہ کا خوف تو ہونا چاہیئے اور وہ موت ہے اور موت کچھ بعید نہیں کیونکہ سفر اور ریل اور گاڑی اور کھانا پینا اور بیمار ہونا اور چلنا پھرنا یہ سب موت ہی کے اسباب ہیں اور اس کو کوئی بعید نہیں سمجھتا اسلئے آخرت بعیدہ کے مراقبہ سے غالباً موت کا مراقبہ زیادہ نافع ہوگا اسلئے میں نے اس آیت کو اختیار کیا ہے کیونکہ اسمیں لفظ بِالْآخِرَةِ کی تفسیر قبر سے وارد ہوئی ہے جس نے مراقبہ آخرت کو قریب کر دیا کہ آخرت صرف قیامت ہی کا نام نہیں بلکہ آخرت قبر ہی سے شروع ہو جاتی ہے اور قبر میں جانا کچھ دور نہیں تو اسکو ہی یاد کر لیا کرو قرآن شریف میں ایسے اشارات بکثرت ہیں جنمیں خاص مراقبات کی تعلیم کی گئی ہے اور ساتھ کے ساتھ ان کو نہایت قریب بھی کر دیا ہے چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ نے توحید کی تعلیم فرمائی ہے تو اسکے لئے ایک مراقبہ بتلایا ہے کہ مخلوقات الٰہیہ میں غور کیا کرو پھر ساتھ ہی اس مراقبہ کو قریب بھی کر دیا فرماتے ہیں أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس حکمت کیساتھ پیدا کیا گیا ہے اونٹ تو اہلِ عرب کے سامنے ہر وقت ہی رہتا ہے تو

سب سے پہلے ایسی چیز کا مراقبہ بتلایا گیا جس کے استحضار میں کچھ بھی تعب نہیں پھر آسمان کا مراقبہ بتلایا جو اونٹ پر سوار ہونے والے کے سامنے ہی ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے آسمان کو مدور پیدا کیا ہے اسلئے اس کے کنارے ذرا نگاہ اٹھانے سے فوراً نظر آجاتے ہیں پھر اونٹ پر سوار ہو کر عرب کے میدان میں چلو تو ذرا دائیں دیکھنے سے پہاڑ ہی پہاڑ نظر آئیں گے تو آسمان کے بعد پہاڑ کا مراقبہ بتلایا کہ اسکی حکمتوں میں غور کرو اس کے بعد زمین کا مراقبہ بتلایا جو سوار کے نیچے ہوتی ہے جب منزل میں پہونچکر آرام کرتے ہیں غرض اس ترتیب میں غور کرنے سے میرا مدعیٰ ثابت ہو گیا کہ خدا تعالیٰ مراقبات کو قریب کرنے کا بہت اہتمام فرماتے ہیں اسی طرح آخرت کا مراقبہ ذرا بعید تھا حق تعالیٰ نے حضورؐ کو بتلا دیا کہ قبر بھی آخرت میں داخل ہے اس سے موت اور ما بعد الموت کا مراقبہ بہت قریب ہو گیا کیونکہ قبر کیا چیز ہے یہی زمین تو ہے جس پر آپ روزانہ چلتے پھرتے ہیں جس میں موت کے بہت سے اسباب ہیں بعض دفعہ ٹھوکر لگ جانے سے موت آجاتی ہے چنانچہ ایسا ہوا ہے اور یہ بھی نہ سوچو تو یہی سوچ لو کہ ہم اسی میں ایک دن دفن ہونگے اس مراقبہ کو کر کے دیکھئے انشاء اللہ غفلت دور ہو جائے گی اور اعمال صالحہ کا اہتمام دل میں پیدا ہو گا اول تو اس کا دھیان ہر وقت ہی کرنا چاہئیے اور اگر ایسا نہ ہو تو کثرت تو ہونی چاہئیے چنانچہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص مقدار میں اس کا دھیان کر لینا بھی کافی ہے حدیث میں ہے کہ جو شخص بیس دفعہ روزانہ موت کو یاد کر لیا کرے اسکو شہادت کا ثواب ملے گا پس ہر وقت نہ ہو سکے تو اس مراقبہ کی کثرت ہی ہو اور اگر موت کے بعد کا حساب و کتاب بھی یاد کر لیا کرو تو اور بھی اچھا ہے پھر اپنا سونا بھی آپ کو گراں ہو گا یہ مطلب نہیں کہ تم سونا چھوڑ دو گے بلکہ نیند کا آنا ناگوار ہو گا اور سونے کو جی نہ چاہے گا ہاں اگر حال غالب ہو گیا تو پھر یہ بھی ہو جائے گا کہ نیند ہی نہ آسکے گی اس وقت تم سونے والوں سے یوں کہو گے ؎

چوں چنیں کارے ست اندر رہ ترا ۔۔۔ [illegible]ب چوں می آید اے ابلہ ترا

بعض اولیاء اللہ کو ایسا پیش آیا ہے روض الریاحین میں ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ رات کو بالکل نہ سو سکتے تھے اور یہ [illegible] ذ[illegible] حالت [illegible] نہیں سونے دیتی یا ایھا الذین

اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ان کی یہ حالت تھی کہ ذرا غنودگی آتی اور پھر گھبرا کر اٹھ جاتے۔ یہ غلبۂ حال تھا اور اگر حالی تھوڑا یا حال ہوا مگر یہ شخص مغلوب نہ ہوا بلکہ غالب علی الحال رہا تو نیند آئے گی یہاں سے یہ شبہ رفع ہو گیا کہ انبیاء کو تو نیند آتی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تمام رات کبھی نہیں جاگے کچھ حصہ ضرور سوتے تھے جواب یہ ہے کہ آپ مالک الحال تھے مملوک الحال نہ تھے مگر اس سے آپ خوش نہوں کہ ہماری حالت بھی حضور کے مشابہ ہے ہم بھی تمام رات نہیں جاگتے بلکہ حضور کی طرح ہمکو بھی نیند آتی ہے کیونکہ ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

کفار نے بھی یہی کہا تھا کہ ہم میں اور رسول میں کیا فرق ہے ہم بھی کھاتے ہیں یہ بھی کھاتے ہیں یہ بھی سوتے ہیں ہم بھی سوتے ہیں مگر فرق یہ تھا کہ ایک بار ابوجہل بھی بتخانہ میں گیا تھا۔ اور حضور بھی تشریف لے گئے تھے ابوجہل توبتوں کے سامنے سجدہ میں گر پڑا اور حضور کے سامنے خود وہ بت ہی سجدہ میں گر پڑے لہذا حضور کی نیند کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو کیونکہ آپ نے فرمایا ہے تَنَامُ عَيْنَايَ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ کہ نیند میں میری آنکھیں ہی سوتی ہیں قلب نہیں سوتا۔ اسی لئے سونے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو نہ ٹوٹتا تھا اس سے شاید لیلۃ التعریس کے قصہ سے کسی کو شبہ ہو گا کہ جب آپ کا دل نہیں سوتا تھا تو پھر اس واقعہ میں آپ کی نماز فجر کیوں قضا ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ روشنیٔ صبح کا دیکھنا آنکھ کا فعل ہے قلب کا فعل نہیں مبصرات کا ادراک قلب کو بواسطۂ بصر ہی کے ہو سکتا ہے اور اس وقت آپ کی آنکھیں سو رہی تھیں اسلئے صبح کا ادراک نہ ہو سکا اس پر پھر یہ اشکال ہوتا ہے کہ وقت کا اندازہ کرنا تو قلب کا فعل ہے پھر حضور نے وقت کا اندازہ کیوں نہ کر لیا یہ اشکال اور اس کا جواب میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا یہ ابھی میرے قلب پر وارد ہوا ہے اور جواب بھی حق تعالیٰ نے ساتھ ساتھ قلب میں ڈال دیا ہے اسکا جواب یہ ہے کہ قلب سے وقت کا اندازہ اسوقت ہو سکتا ہے جبکہ قلب کسی فکر اہم میں مشغول نہ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اسوقت مشاہدۂ جمال الٰہی میں مشغول تھا اور کامل کسی

کے ساتھ ادھر متوجہ تھا کیونکہ آپ آنکھیں بند کئے ہوئے تھے اور آنکھیں بند کرکے قلب کو پوری یکسوئی ہوتی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے اسلئے وقت کا اندازہ بھی نہ ہوسکا دوسرا جواب بہت ہی سہل یہ ہے کہ نوم عین سے مراد نعاس ہے اور نعاس میں بھی اندازہ پر قدرت نہیں ہوتی (قُلْتُ وَالْجَوَابُ الْاَصْلِیُّ مَاوَرَدَ فِی الْحَدِیْثِ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ اللّٰہِ لِیَشْرَعَ لَہُمْ اَیْ اَحْکَامُ الْقَضَاءِ فَلَمْ یَکُنْ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَسِیَ بَلْ قَدْ نُسِّیَ وَمَا نَامَ بَلْ قَدْ نُوِّمَ ۱۲ جامع) غرض حضور کی نیند کو اپنی نیند پر قیاس نہ کرو آپ تو نیند میں بھی حق تعالیٰ سے غافل نہ ہوتے تھے اور تم جاگتے ہوئے بھی غافل ہو۔

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہر وقت موت کا دھیان نہ ہوسکے تو کثرت تو یہ ہونا چاہئے جسکی ایک مقدار حدیث میں بھی وارد ہے کہ بیس دفعہ موت کو یاد کر لیا کرے مگر یاد کے یہ معنی نہیں کہ موت موت کا وظیفہ پڑھ لیا کرو بلکہ یہ سوچ لو کہ اپنے دوست کو کس طرح یاد کرتے ہیں اس طرح کوئی یاد نہیں کرتا کہ اسکے نام کا وظیفہ پڑھ لے زید زید زید بلکہ دوست کا یاد کرنا یہ ہے کہ اس کی صورت و سیرت کا تصور کرے اس کی باتوں کو یاد کرے اسی طرح موت کی یاد یہ ہے کہ اُسوقت جو باتیں پیش آئیں گی ان کو ذہن میں حاضر کرے جس کی تفصیل احادیث سے معلوم ہوگی مثلاً حدیث میں ہے کہ دفن کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر مردہ کا اچار ڈال لو اور دفن نہ کرو تو یہ فرشتے نہ آئیں گے بعضے اسی خیال میں ہیں چنانچہ ایک جاہل دیندار نے مکہ میں یہ وصیت کرنے کا ارادہ کیا کہ میری لاش کو دفن نہ کیا جاوے بلکہ ایک پہاڑ پر رکھدیا جائے تاکہ سوال قبر نہ ہو میں نے کہا سبحان اللہ کیا آپ تیرا اس گڑھے کو سمجھتے ہیں کہ اسمیں اگر دفن نہ کیا جائیگا تو قبر کے معاملات ہی بند ہو جائیں گے بلکہ قبر تو عالم برزخ کا نام ہے جس میں انسان اس عالم سے منتقل ہو کر پہونچتا ہے چاہے دفن ہو یا نہ ہو غرض فرشتے تو وقت کی ایک معین مقدار کے بعد آجاتے ہیں گو اس وقت غسل ہی ہو رہا ہو یا نماز ہی ہو رہی ہو وہ اپنا کام شروع کر دیتے ہیں اور تمام سوالات و جوابات روح سے ہوتے ہیں اور اسوقت روح کو اس جسم عنصری سے ایسا تعلق

عہ میرے نزدیک مناسب جواب یہ ہے کہ حضور نیند میں بیتاب ہوکر یہ امر خدا کی جانب سے تھا تاکہ قضائے احکام نافذ ہوں جیسے یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھولے نہیں بلکہ آپ بھلائے گئے اور اسی طرح سوئے نہیں بلکہ آپ کو سلایا گیا۔

ہوتا ہے جیسا لباس اتارنے کے بعد ہم کو اپنے لباس سے تعلق ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہماری رزائی چھین کر آگ میں جلا دے تو گو ہم متالم ومحترق نہیں ہوتے مگر ہمکو ناگوار ہوتا ہے باقی روح کو زیادہ تعلق مرنیکے بعد جسم مثالی سے ہوتا ہے جو اس جسم عنصری کے علاوہ دوسرا جسم ہے جسکے ماننے سے بہت سے اشکالات رفع ہوتے ہیں ضغطۂ قبر وغیرہ سب باتیں اسی جسم مثالی سے ہوتی ہیں غرض مردہ میں موت کے بعد بھی برزخی حیات ہوتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ میت کو قرع نعال کی آواز آتی ہے اور جو کوئی عزیز و قریب اس کی قبر پر آتا ہے اسے پہچانتا بھی ہے گو معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے مگر احادیث میں اس کا ثبوت موجود ہے بعض لوگوں نے عدم سماع موتی کا مسئلہ امام صاحب کی طرف منسوب کیا ہے مگر امام صاحب کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں امام صاحب سے صراحتہً یہ امر منقول نہیں اور جس مسئلہ سے لوگوں نے اسکو مستنبط کیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام صاحب کا جواب عدم سماع موتی کو مستلزم ہے وہ یمین کا مسئلہ ہے جس کا مبنی عرف پر ہے اسلئے امام صاحب کا کلام اس بارہ میں صریح نہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ فقہاء متاخرین نے جب یہ دیکھا کہ عوام کے عقائد سماع موتی کے مسئلہ سے خراب ہوتے ہیں اسلئے انتظام عوام کی غرض سے اس کا انکار کر دیا ہو۔ تو ممکن ہے کہ ان فقہاء کو بھی صحت سماع موتی کا علم ہو مگر عوام کی اصلاح کیلئے مصلحتہً انکار کیا ہو (فَيَكُونُ مِمَّا نَعْلَمُهُ وَلَا نُفْتِي بِهِ وَلَهُ نَظَائِرُ فِي الْفِقْهِ ۱۲) واقعی اس مسئلہ کی وجہ سے عوام کے عقائد یہاں تک بگڑ گئے ہیں کہ اب لوگ مردوں سے حاجات مانگتے ہیں کوئی ان سے اولاد مانگتا ہے بھلا ان کے پاس اولاد کہاں کیا وہ پلا پلایا بچہ تمہاری گود میں دیدیں گے جیسا بچپن میں یہ سمجھا تھا کہ یہ بچے دائی گھر میں جمع رہتے ہوں گے وہ لاکر عورتوں کو دیدیتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ مردوں سے اولاد مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے لئے دعا کر دیں گے تو پہلے اس کا ثبوت دو کہ وہ اسوقت خاص تمہارے مطلوب کے لئے دعا کرنے کے ماذون بھی ہیں غرض موت کو تفصیل کیساتھ یاد کرنا چاہتے اور حدیث میں آتا ہے کہ اے عمر اسوقت کیا حال ہوگا جبکہ قبر میں دو فرشتے گرجتے اور برستے آئیں گے مگر مومن اس سے گھبرائے نہیں کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکے متعلق سوال کرکے اطمینان کرلیا ہے وہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اسوقت ہماری عقل بھی درست ہوگی یا نہیں آپ نے فرمایا نعم کھئتکم الیوم یعنی تم جیسے اسوقت ہوایسے ہی اسوقت عاقل ہوگے اسپر حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر کچھ خطرہ نہیں انشاء اللہ سمجھ کر صحیح جواب دیدیں گے شرح الصدور دوسرے مومن کیساتھ عنایت حق ہوگی چنانچہ اسی آیت میں ارشاد ہے یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (پارہ ۱۳ رکوع ۱۶) جب حق تعالیٰ ہی کو تمہیں پاس کرنا منظور ہے پھر گھبرانا کاہے کا کیونکہ جب ممتحن کو پاس کرنا منظور رہتا ہے تو وہ مضمون کی تقریر خود کرکے طالب علم سے پوچھتا ہے کہ تمہارا یہی مطلب ہے وہ کہدیتا ہے جی ہاں بس پاس ہوگیا مولانا لطف اللہ صاحب علیگڈھی کا طریقۂ امتحان یہی تھا مولانا بہت کم کسی کو فیل کرتے تھے بس جہاں طالب علم نے گڑبڑ کی اور مولانا خود مطلب بیان کرکے فرماتے کہ تمہارا یہی تو مطلب ہے جسکو پوری طرح ادا نہیں کرسکے وہ کہتا جی ہاں اور مولانا اس کو پاس کردیتے اسی طرح مولانا ذوالفقار علی صاحب بھی بہت سہل امتحان لیا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ ممتحن کو اپنے درجے اور طالب علم کے درجہ کے تفاوت میں غور کرکے سوال کرنا چاہیئے اور اسی درجہ کے جواب کا منتظر رہنا چاہیئے بعض ممتحن طلبہ سے ایسے سوالات کرتے ہیں جو مدرسین سے کرنے چاہئیں یہ بہت ظلم ہے حضرت حاجی صاحب نے مولانا ذوالفقار علی صاحب کی نسبت فرمایا تھا کہ مولانا کی طبیعت میری مرضی کے موافق ہے وہ یہی بات تھی کہ مولانا ہر شخص سے اس کی فہم کے موافق معاملہ کرتے تھے اور طبیعت میں رحمت و رأفت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ حاجی صاحب کے اس ارشاد کی اطلاع جب مولانا کو پہونچی تو بہت مسرور ہوئے بہرحال جب دنیا میں شفیق ممتحن کے امتحان سے پریشانی نہیں ہوتی تو حق تعالیٰ کے امتحان سے کیوں پریشان ہوتے ہو مطمئن رہو کیونکہ حق تعالیٰ سب سے زیادہ رحیم وکریم ہیں وہ تم کو پاس ہی کردیں گے۔ دوسری بات تسلی کی ایک اور ہے جو ظنی ہے وہ یہ جب فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ سوال کریں گے کہ من ھذا الرجل یہ حضرت کون ہیں تو بعض اہل محبت کا قول ہے کہ اسوقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر

مبارک سے مومن کی قبر تک سب حجابات اٹھ جائیں گے اور ہذا سے جو کہ اشارہ حسیہ کے لئے ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ محسوسہ کی طرف اشارہ ہوگا۔ حدیث کے اس محمل کے متعلق حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک نکتہ بھی فرمایا کہ حق تو یہ تھا کہ ہم حضور کے سامنے مرتے اور حضور ہمارے جنازہ کی نماز پڑھتے مگر یہ تو بعض حکمتوں کی وجہ سے حق تعالیٰ کو منظور نہ ہوا تو اب کیا عجب ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں آپ کی زیارت ہوگی پھر یہ شعر پڑھا

کشتے کہ عشق دارد نگذاردت بدینساں بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

گو یہ بات قطعی نہیں مگر ظن کے متعلق بھی حدیث قدسی میں آیا ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ کہ میں اپنے بندہ کے گمان کیساتھ ہوں پھر کیوں نہ گمان رکھا جائے صاحب بعض دفعہ ہنستے ہنستے ہی گھر بس جاتا ہے پس تم امید رکھو کہ انشاء اللہ قبر میں حضور کی زیارت ہوگی خدا تعالیٰ اس گمان کو پورا کر دیں گے قاضی یحییٰ بن اکثم شیخ بخاری کا جب انتقال ہوا تو حق تعالیٰ نے ان سے پوچھا یَا شَیْخَ السُّوْءِ مَا عَمِلْتَ لَنَا اے برے بڈھے تو نے ہمارے واسطے کیا عمل کیا ہے قاضی یحییٰ خاموش ہو گئے حق تعالیٰ نے فرمایا بولتے کیوں نہیں ہو عرض کیا یا اللہ میں ایک سوچ میں ہوں پوچھا کیا سوچ ہے عرض کیا میں نے یہاں کا حال تو اور طرح کا سنا تھا ارشاد ہوا کیا سنا تھا عرض کیا حَدَّثَنَا فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ عَنْ فُلَانٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَسْتَحْيِیْ مِنْ ذِی الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ سند کے ساتھ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کا لحاظ فرماتے ہیں اور میں اسوقت معاملہ اس کے خلاف دیکھ رہا ہوں اب مجھے یہ سوچ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا راویوں نے غلطی کی حکم ہوا کہ جاؤ تمہارے سب راوی سچے اور میرا حبیب بھی سچا آج ہم تمکو محض بڑھاپے ہی کی وجہ سے بخشتے ہیں (یہ واقعہ کسی بزرگ کو قاضی یحییٰ اکثم کے انتقال کے بعد مکشوف ہوا ہوگا یا کسی نے ان کو خواب میں دیکھا ہو اور انہوں نے بیان کیا ہوگا) تو حق تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کے ساتھ حسن ظن کا یہ نفع ہوا کہ قاضی یحییٰ کو اپنے بڑھاپے کی وجہ سے مغفرت کی امید تھی حق تعالیٰ نے ان کا یہ گمان پورا کر دیا اسی طرح اگر ہم یہ امید رکھیں کہ قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوگی تو

یہ گمان بھی انشاء اللہ پورا ہوگا اور یہ ایسی خوشی کی بات ہے کہ اس کا خیال کر کے تو مسلمانوں کو قبر میں جانیکا شوق پیدا ہوگا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر مسلمان کو سب سے زیادہ محبت ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ ایک تو توقع ہے اور ایک دھوکہ ہے اگر اسباب جمع کر کے امید ہو وہ تو توقع ہے اور بدون اسباب کے امید ہو تو دھوکہ ہے جیسے نکاح کے بعد اولاد کی تمنا کرنا تو توقع ہے اور بدون نکاح کے اس کی تمنا کرنا محض دھوکہ ہے۔ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ میں دراصل اسباب کی تعلیم ہے کیونکہ عادۃً اسباب ہی سے ظن پیدا ہوتا ہے بدون اسباب کے امید نہیں ہوتی ہاں کسی ذن کو ہوجائے تو اور بات ہے بہرحال مومن کو احوال واہوال آخرت سے خوف تو رکھنا چاہیئے اور اعمال میں کوشش کرنا چاہیئے مگر پریشان نہ ہونا چاہیئے اس کے لئے تسلی کی بہت چیزیں ہیں چنانچہ قبر کے متعلق تو اوپر گذر چکا پھر قیامت میں جب قبروں سے نکلیں گے اسوقت فرشتے کس طرح طرح کی بشارتیں سنائیں گے لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ط هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ع پارہ ۱۷ رکوع ۷

یعنی مسلمانوں کو قیامت کی بڑی گھبراہٹ پریشان نہ کرے گی اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے کہ یہی تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (کہ اس دن تم کو طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہونگی ۱۲) ایک جگہ ارشاد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝ع (پارہ ۲۴ رکوع ۱۸) یعنی جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اسپر جمے رہے (یعنی اسلام ہی پر مرے ۱۲) ان پر فرشتے نازل ہوں گے احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول ملائکہ موت کے وقت بھی ہوتا ہے اور قیامت میں بھی ہوگا پھر وہ فرشتے یوں کہیں گے کہ تم نہ (آئندہ ضرر کا) اندیشہ کرو نہ (کسی حاصل شدہ نفع کے فوت ہونے کا) رنج کرو اور اس جنت کی خوشخبری حاصل کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہم تمہارے رفیق تھے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رفیق رہیں گے) اور تمہارے لئے آخرت میں وہ چیز بھی ہے جس کی تم کو خواہش ہے اور وہ بھی ہے جس کی تم درخواست کرو اور یہ بطور مہمانی کے ہے پروردگار بخشنے والے مہربان کی طرف سے۔ غرض مرتے وقت بھی اور قیامت میں بھی فرشتے اس طرح بشارتیں سناسنا کر مومن کو مطمئن کریں گے اور میدان حشر میں مسلمانوں کیلئے عرش کا سایہ ہوگا اور گو قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا لیکن حدیث میں آتا ہے کہ مومن کو ایسا معلوم ہوگا جیسے نماز شروع کرنے سے سلام پھیرنے تک کا وقت معلوم ہوا کرتا ہے اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست　　عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

عشاق کیلئے تو میدان حشر ایک تماشاگاہ ہوگا ان کو کچھ پریشانی نہ ہوگی یہ واقعات قبر کے بعد ہوں گے۔ غرض مسلمان تو قبر میں تو ٹھیک ٹھیک جواب دیدیگا جس پر فرشتے کہیں گے کہ تم سے ہمکو یہی امید تھی کہ تم صحیح جواب دو گے اس کے بعد ایک کھڑکی جنت کی طرف کھولدی جائے گی اور مومن سے کہا جائیگا نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ کہ تم عروس کی طرح سو رہو جس کو بجز محبوب کے اور کوئی نہیں جگایا کرتا اور اگر مردہ مومن نہیں ہے تو وہ قبر میں فرشتوں کو گرجتا برستا دیکھکر گھبرا کر اٹھتا ہے اور اگر مومن فاسق ہو تو اس کی بابت علماء نے کہا ہے کہ احادیث میں کچھ تصریح نہیں اب یا تو مقایسہ کیا جائے کہ جس طرح اس کی حالت بین بین ہے کہ اعتقاد میں مومن کے مشابہ ہے اور عمل میں کفار کے مشابہ ہے اسی طرح اس کے ساتھ معاملہ بھی قبر میں بین بین ہوگا اور یا ظن رحمت سے اسکو مومن کا قرار دیکر پہلی صورت میں داخل کیا جائے میں کہتا ہوں کہ امید ہی کیوں نہ رکھی جائے۔

پھر جب فرشتے کافر سے سوال کریں گے تو وہ کہے گا ہاہ ہاہ ھَاہْ ھَاہْ لَا اَدْرِیْ افسوس میں کچھ نہیں جانتا اسپر فرشتے اسکو گرزوں سے ماریں گے اور کہیں گے لَا دَرَیْتَ وَلَا تَلَیْتَ کہ نہ تو نے خود سمجھا نہ کسی کے اتباع سے ایمان اختیار کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں ایک تحقیقی ایک تقلیدی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان تقلیدی بھی معتبر ہے جیسے بعض عوام کو ایمان کی حقیقت پوری طرح معلوم نہیں ہوتی صرف اتنا جانتے ہیں

کہ ہم مسلمانوں کے دین پر ہیں یہ ایمان تقلیدی ہے یہ بھی معتبر ہے مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب سے میں نے سنا فرماتے تھے کہ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا دھوبی جب مرا اور اس سے قبر میں سوال ہوا کہ مَنْ رَّبُّكَ وَمَا دِيْنُكَ تو اس نے جواب دیا کہ حضور میں تو بڑے پیر کا دھوبی ہوں (مطلب یہ تھا کہ جو مذہب ان کا ہے وہی میرا ہے) اسپر فرشتوں نے اسے ہنسکر چھوڑ دیا کہ یہ تو بڑے شخص کا آدمی ہے اور اسپر کچھ اشکال نکیا جائے کیونکہ اسکی ایسی مثال ہے جیسے مقتدی کہا کرتا ہے کہ جو نیت امام کی وہی میری اور اس سے نماز صحیح ہوجاتی ہے اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یمن سے آتے ہوئے حج کا احرام اس طرح باندھا تھا أَهْلَلْتُ بِمَا أَهَلَّ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور حضور نے اس نیت کو معتبر سمجھا اسی طرح ایمان میں بھی تقلید صحیح ہے۔ غرض انسان یا تو محقق ہوتب کامیابی ہے یا کسی محقق کا مقلد ہو اگر محقق ہو تو وہ ایسا جواب دیگا کہ فرشتے بھی دنگ رہ جائیں گے حضرت رابعہ بصریہ کا واقعہ ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا اور قبر میں فرشتوں نے سوال کیا کہ مَنْ رَّبُّكِ وَمَا دِيْنُكِ تو انہوں نے فرمایا کہ تمہارے سوال کا جواب تو میں بعد کو دوں گی پہلے تم میرے سوال کا جواب دو کہ تم کہاں سے آرہے ہو کہا آسمان سے پوچھا آسمان زمین میں کتنا فاصلہ ہے کہا پانسو برس کی مسافت ہے فرمایا تم خدا تعالیٰ کو نہیں بھولے کیونکہ بہت دور سے آرہے ہو فرشتوں نے کہا ہم تو خدا تعالیٰ کو نہیں بھولے فرمایا جب تم اتنی دور سے چل کر بھی نہیں بھولے تو کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ رابعہ زمین سے چار گز نیچے آکر خدا تعالیٰ کو بھول گئی ہوگی حالانکہ زمین پر ایک ساعت بھی میں اس سے غافل نہیں رہی یہ سنکر فرشتے متعجب

ـــ بڑے پیر کا دھوبی ہوں ـــ میرا دین کیا ہے (margin note; partly illegible)

ـــــــــــــــــــ

لـه اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دین و ایمان کو جانتا نہ تھا بلکہ اس جاننے ہوئے کی یہ ایک سادہ تعبیر تھی جیسا کسی صحیفہ میں سب عقائد لکھے ہوں اور کوئی شخص اسکو سمجھکر کہے کہ میرے یہ عقائد ہیں وہ کافی ہے ۱۲

لـه مطلب اس جملہ کا یہ ہے کہ میں امام کی نماز میں اقتدا کرتا ہوں تو یہ نیت صحیح ہے اور جسکو غیر صحیح لکھا ہے وہ یہ ہے کہ میں امام کی اقتدا کرتا ہوں اور یوں نہیں کہا کہ اسکی نماز میں اقتدا کرتا ہوں وجہ یہ کہ پہلی صورت میں نماز کی تعیین نہ ہوئی کہ فرض ہے یا نفل اور اقتدا میں دونوں احتمال ہیں کیونکہ متنفل کی اقتدا بھی مفترض کے پیچھے جائز ہے اور دوسری صورت میں تعیین ہوگئی کیونکہ امام کی نماز فرض ہے اور اس نے بھی کہا ہے کہ اس کی نماز میں اقتدا کرتا ہوں تو ایسا ہو گیا جیسے یوں کہے کہ فرض نماز میں اقتدا کرتا ہوں کذا فی الدر المختار و رد المحتار ۱۲ منہ

رہ گئے ۔ یہ مقام ناز ہے جسکے آگے فرشتے بھی نہیں چل سکتے اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

اور حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانہ ما

یہ بھی حضرت رابعہ ہی کے قول کے مثل ہے ۔غرض کافر چونکہ ایمان تحقیقی و تقلیدی دونوں سے محروم ہے اسلئے فرشتے اسکو قبر میں عذاب دیں گے اور دوزخ کی کھڑکی کھول دیں گے اور وہ سمجھے گا کہ قیامت میں اسمیں داخل ہونا ہوگا اور مومن کیلئے جنت کی طرف کھڑکی کھولی جائیگی اور وہ یہ سمجھے گا کہ قیامت کے دن اس میں داخل ہونا ہوگا اس لئے مسلمان جنت کو دیکھکر قیام ساعت کی تمنا کریگا اور کافر دوزخ کو دیکھکر یہ کہے گا کہ قیامت کبھی نہ آوے اس کے عذاب سے تو قبر ہی کا عذاب اہون ہے واللّٰہُ اَعْلَمُ۔

اب یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ یہ آیت عذاب قبر کے متعلق تو ہے لیکن اسمیں تثبیت کا وعدہ دنیا اور آخرت دونوں کے بارہ میں ہے چنانچہ ارشاد ہے یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ؏ اب سوال یہ ہے کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس پوری آیت کو تلاوت فرماکر عذاب قبر کے متعلق فرمایا ہے تو آپنے معاملۂ قبر کو حیاۃ دنیا میں داخل فرمایا آخرت میں سو احتمال دونوں طرف ہے قبر کو حیات دنیا میں بھی داخل کیا جاسکتا ہے اور آخرت میں بھی ۔ دوسرا احتمال تو محتاج تاویل نہیں کیونکہ موت سے حیات دنیا منقطع ہوجاتی ہے اس لئے مابعد الموت حیات دنیا میں داخل نہیں بلکہ وہ آخرت میں داخل ہونا چاہئے البتہ پہلا احتمال محتاج تاویل ہے اسپر کہہ سکتے ہیں کہ گو موت سے حیات دنیا منقطع ہوجاتی ہے مگر حیات اخرویہ بھی شروع نہیں ہوتی کیونکہ حیات اخرویہ وہ ہے جبکہ یہی جسد عنصری دوبارہ زندہ ہوگا اور یہ قیامت میں ہوگا قبر میں جسد عنصری زندہ نہیں ہوتا گو روح کو اس سے تعلق رہتا ہے پس گو موت کے بعد انسان کو نہ حیات اخرویہ حاصل ہوتی ہے نہ حیات دنیویہ بلکہ حیات برزخیہ ہوتی ہے مگر حیات برزخیہ کو حیات دنیا سے بہ نسبت آخرت کے قرب

زیادہ ہے اس لئے حکماً وہ حیات دنیا میں داخل ہوسکتی ہے لیکن یاد آیا درمنثور میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الآخرۃ کی تفسیر عذاب قبر سے فرمائی ہے اب کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہی نہ دوسرا احتمال رہا البتہ ایک اور اشکال وارد ہوگا وہ یہ کہ ایک حدیث میں آتا ہے اَلْقَبْرُ رَوْضَۃٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ اَوْحُفْرَۃٌ مِّنْ جَہَنَّمَ النَّارِ کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے حالانکہ دخول جنت یا دخول نار قیامت کے بعد ہوگا عالم برزخ میں دخول جنت و نار نہ ہوگا اس کا ایک جواب تو علماء نے دیا ہے وہ یہ کہ برزخ میں جو مسلمانوں کو راحت اور کفار کو عذاب ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو نعیم جنت اور عذاب جہنم سے تشبیہ دی ہے اور مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو برزخ میں ایسی راحت ہوگی کہ گویا وہ جنت کے باغ میں ہیں اور کفار کو ایسی تکلیف ہوگی کہ گویا جہنم کے گڑھے میں ہیں اور صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ جنت وجہنم دو ہیں ایک حقیقی اور ایک مثالی اگر اس قول کو مان لیا جائے تو پھر اس حدیث میں تاویل نہ کرنا پڑے گی صوفیہ کہتے ہیں کہ قبر میں مومن کے لئے جس جنت کی طرف کھڑکی کھولی جائے گی وہ جنت مثالیہ ہے اسی طرح کافر کے لئے جس جہنم کی طرف کھڑکی کھلے گی وہ بھی مثالی جہنم ہے پھر قیامت کے بعد حقیقی جنت وجہنم میں دخول ہوگا اور یہ اشکال نہ کیا جائے کہ مومن اور کافر کے لئے جنت وجہنم میں داخل ہونیکے بعد تو پھر خروج نہ ہوگا پھر مسلمان اور کفار اس جنت مثالیہ وجہنم مثالیہ سے قیامت کے دن کیونکر نکلیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ عدم خروج وغیرہ یہ احکام جنت وجہنم حقیقیہ کے ہیں مثالیہ کے یہ احکام نہیں اس سے خروج ہوسکتا ہے بلکہ صوفیہ نے تو یہ کہا ہے کہ دنیا میں بھی کفار کو جہنم اور مومنین کو جنت محیط ہے کیونکہ اعمال سیئہ جہنم ہیں اور اعمال صالحہ جنت ہیں اور حقیقی جنت و دوزخ کا ثواب وعذاب انہی اعمال کی صورت جوہریہ ہے بس دنیا میں بھی ہر شخص یا جنت میں ہے یا دوزخ میں مگر حال کے بعد تو یہ احاطہ معلوم ہوسکتا ہے بدون حال کے اس احاطہ کا ادراک دشوار ہے بس اب میں ختم

کرنا چاہتا ہوں۔ خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ ہمکو معاصی سے بچنے کا اہتمام کرنا ضروری ہے جنکا سبب غفلت عن الآخرۃ ہے اور غفلت کا علاج تذکر ہے اور تذکر آخرت کا سہل طریقہ موت کو یاد کرنا ہے پس ہمکو غفلت دور کرنیکے لئے موت کو یاد کرنا چاہیئے اور یاد کرنے کا طریقہ بھی میں نے بتلادیا کہ صرف موت موت کا ورد کرنا کافی نہیں بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ حدیث میں جو باتیں موت کے متعلق وارد ہیں کہ دفن کے بعد فرشتے قبر میں آئینگے اور اس طرح سوال و جواب ہوگا اس کا تصور کیا جائے اگرچہ یہ مراقبہ ہر وقت کرنیکا ہے مگر حکمائے امت نے اسکے لئے بھی ایک وقت مقرر کردیا ہے تاکہ تعیین وقت سے کام میں سہولت ہوجائے اچھا وقت اس کے لئے سونیکا وقت ہے کیونکہ اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ سونا بھی موت کے مشابہ ہے تو سوتے وقت ہمکو یاد کرنا چاہیئے کہ ایک دن وہ بھی آنیوالا ہے جبکہ ہم بہت لمبی نیند سوئیں گے جسکے بعد قیامت سے پہلے اٹھنا ہی نہ ہوگا۔ روزانہ سوتے ہوے اسکو یاد کرنا چاہیئے تاکہ ہمکو قول ثابت کی برکتیں حاصل ہوں رہا یہ کہ قول ثابت سے مراد کیا ہے اور اس کی برکتیں کیا ہیں اسکو قرآن ہی سے معلوم کرو چنانچہ اس آیت سے پہلے جو آیت ہے اس میں توحید کا ذکر ہے اس میں حق تعالی نے کلمۂ توحید و کلمۂ کفر کی مثال بیان فرمائی ہے صاحب تفسیر (یعنی امام فخر رازی) کا قول ہے کہ تمام قرآن تین مضمونوں کی شرح ہے توحید و رسالت و معاد یہ قول مجھے بہت ہی پسند آیا اس کا لحاظ کرلینے سے تمام قرآن مرتبط معلوم ہوتا ہے یہ ایسا ہے جیسا کہ حضرت حاجی صاحب نے مثنوی کا خلاصہ نکالا تھا کہ تمام مثنوی میں دو مضمون اصل مقصود ہیں ایک توحید حالی دوسرے حقوق شیخ واقعی عجیب خلاصہ ہے جس کے بعد تمام مثنوی مرتبط معلوم ہوتی ہے غرض اوپر کی آیات میں توحید کا ذکر ہے فرماتے ہیں اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ اسمیں کلمہ طیبہ کی مثال بیان فرمائی ہے جس سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حدیث میں اس کی تصریح ہے اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اس کے تابع ہے وہ بھی مراد ہے کیونکہ متبوع کے ساتھ تابع کا ہونا لازم ہے مگر چونکہ اہل ایمان اس امت سے پہلے بھی گذرے ہیں اور جو فضائل

ایمان کے ہیں وہ ان کیلئے بھی ثابت ہیں اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا قرین ہر امت میں بدلتا رہا ہے کوئی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ نُوحٌ نَّجِیُّ اللّٰہِ کہتا تھا کوئی اِبْرَاهِیْمُ خَلِیْلُ اللّٰہِ کہتا تھا کوئی مُوْسٰی کَلِیْمُ اللّٰہِ کوئی عِیْسٰی رُوْحُ اللّٰہِ اور ہم مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتے ہیں تو یہ جملہ متبدل ہے اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ غیر متبدل ہے جس میں تمام اہلِ ایمان مشترک ہیں اسلئے اکثر احادیث میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر اکتفا کیا گیا ہے باقی مطلب وہی ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مع اپنے قرین کے جو ہر امت مسلمہ کیلئے الگ الگ ہے۔ اور صوفیہ کا ادب دیکھئے کہ وہ جب اپنے مریدوں کو ذکر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تعلیم کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر تو اتنی تعداد میں کیا کرو دوسو یا پانچسو دفعہ اور کبھی کبھی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ بھی کہہ لیا کرو یہ نہیں بتلاتے کہ ہر دفعہ پورا کلمہ کہا کرو اس طرح انہوں نے تابع و متبوع دونوں کا حق ادا کر دیا تو فرماتے ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے شجرۂ طیبہ (پاکیزہ درخت کے) شجرۂ طیبہ سے مراد شجرۂ نخلہ ہے اس کو مثال کیلئے یا تو اسواسطے خاص کیا کہ اہلِ عرب کے نزدیک وہ الطیب الاشجار ہے مگر میرے نزدیک حقیقت میں وہ عرب و عجم سب میں اطیب شجرہ ہے ایک تو اس کی پیدائش سہل ہے بعض دفعہ تو خود ہی اگ آتا ہے چنانچہ سیکڑوں درخت کھجور کے خود رو موجود ہیں پھر اس کی خدمت کی جائے تو اس کا پھل نہایت عمدہ اور لذیذ ہے پھر اس کی کوئی چیز ضائع نہیں ہر ایک میں منافع بینہ موجود ہیں لکڑی کڑیوں میں کام آتی ہے پتوں سے پنکھے اور بوریئے بنتے ہیں شاخوں سے بھی چھت کے تختہ کا کام لیتے (اور بنگال میں اس سے رس نکالتے ہیں جیسے گنے کا رس نکالا جاتا ہے ۱۲ جامع) اور بینہ کی قید اس لئے لگائی کہ منافع خفیہ تو ان چیزوں میں بھی ہیں جنکو ہم بیکار سمجھتے ہیں جیسا کہ گلزار ابراہیم میں ایک حکیم کا قصہ لکھا ہے کہ اسکو ایک دن پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے خیال ہوا کہ یہ پاخانہ کا کیڑا کس کام آتا ہے اس میں بظاہر کوئی منفعت نہیں معلوم ہوتی اس خیال کا آنا تھا کہ چند روز میں اس کی آنکھیں اندھی ہو گئیں بڑا گھبرایا بہت علاج کئے

مگر کچھ نفع نہوا اتفاق سے ایک دفعہ کوئی دوسرا حکیم اس کی بستی میں آیا جو آنکھوں کا علاج کرتا تھا اس اندھے حکیم نے بھی اس سے رجوع کیا اس نے کوئی دوا اس کی آنکھ میں لگا دی جس سے بہت جلد آنکھیں کھل گئیں اور اچھی طرح نظر آنے لگا اس نے حکیم سے پوچھا کہ اس دوا کے کیا اجزا ہیں دوسرے حکیم نے کہا کہ اس کا جزاعظم گو کا کیڑا ہے اس وقت اس کو تنبہ ہوا کہ یہ غیب سے مجکو سزا دی گئی تھی کیونکہ میں نے اس کو بیکار خیال کیا تھا حق تعالیٰ نے اس طرح مجکو اس کا نفع بتلایا ہے پس منافع خفیہ سے تو کوئی چیز بھی خالی نہیں گو ہمکو علم نہو مگر کھجور کے تو ہر جزو میں منافع بین نہ ہیں جنکو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اسلئے وہ عرب و عجم سب کے نزدیک اطیب شجر ہے آگے فرماتے ہیں أَصْلُهَا ثَابِتٌ کہ اس کی جڑ تو جمی ہوئی ہے یعنی زمین میں وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ اور اسکی شاخیں آسمان میں ہیں نخلہ میں اس صفت کا ہونا تو ظاہر ہے اور کلمہ طیبہ کیلئے یہ وصف اس طرح ثابت ہے کہ اس کی بھی ایک جڑ ہے جو مومن کے قلب میں جمی ہوئی ہے پس قلب مومن بمنزلہ ارض کے ہے اور اعتقاد توحید جو اس میں راسخ ہے وہ کلمہ طیبہ کی جڑ ہے اور قلب مومن کو ارض سے تشبیہ قرآن میں دوسری جگہ مصرح ہے سورۂ حدید میں ہے أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (ترجمہ) کیا مسلمانوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد اور اس دین حق (پر عمل) کیلئے جھک جائیں جو اللہ کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ نہیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور زیادہ تر ان میں سے فاسق ہیں جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو مردہ ہوئے پیچھے زندہ کر دیتا ہے حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کی تفسیر میں صراحۃً فرمایا ہے کہ ارض سے قلب مراد ہے اوپر جو اہل کتاب کی قساوت کا ذکر تھا جس سے ان کے مایوس اور ناامید ہو جانے کا احتمال تھا اس آیت سے مایوسی

کو قطع کیا گیا ہے کہ گو تمہارے دل سخت تو ہو گئے مگر نا امید ہونیکی کوئی وجہ نہیں اللہ تعالیٰ
مردہ دلوں کو بھی زندہ کر دیتے ہیں اور رفع عمل الی السماء یہ ہے کہ وہ عالم ملکوت کی طرف بلند
ہوتا ہے جس کی تفصیل دوسری آیت میں ہے اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ
الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ اچھا کلام اسی تک پہونچتا ہے یعنی حق تعالیٰ ہی اس کو قبول فرماتے ہیں اور
اچھا کام اسکو بلند کرتا اور پہونچاتا ہے صعود سے مراد تو قبول ہے اور رفع سے مراد ذریعۂ
قبول بنتا ہے۔ اب اگر عمل صالح سے مراد ایمان ہے تب تو قبول سے مراد نفس قبول ہے
کیونکہ ایمان ہر عمل کے قبول کیلئے شرط ہے اور اگر دیگر اعمال صالحہ مراد ہیں تو وہ نفس قبول
کیلئے شرط نہیں مگر کمال قبول کیلئے شرط ہیں آگے فرماتے ہیں وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ
لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ۝ چونکہ مثال عجیب تھی اسلئے اس کی حکمت بتلاتے ہیں کہ حق تعالیٰ
لوگوں کیواسطے مثالیں اسلئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھ لیں کیونکہ مثال سے
توضیح مقصود خوب ہو جاتی ہے آگے کلمہ کفر کی مثال ہے وَمَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیْثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ
خَبِیْثَۃِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَھَا مِنْ قَرَارٍ ع اور گندہ کلمہ کی پارہ ۱۳ رکوع ۱۶
(یعنی کلمہ کفر و شرک کی) ایسی مثال ہے جیسے خبیث درخت ہو (حدیث میں اس کی تفسیر
آئی ہے کہ وہ حنظل کا درخت ہے) جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اسکو کچھ ثبات
ہی نہو (چنانچہ حنظل کے درخت کے جڑ ورتک نہیں ہوتی نیز حنظل اور اس کا پھل بو
اور مزہ میں بھی تلخ ہوتا ہے اسی طرح کلمۂ کفر سے دلکو بیچینی ہوتی ہے راحت نہیں ملتی اور
اسکی جڑ گو کافر کے دل میں ہے مگر حق کے سامنے باطل ایسا مضمحل و مغلوب ہے کہ گویا اس کے
جڑ ہی نہیں اور جب اس کے جڑ ہی نہیں اور جب اسکی جڑ ہی نہیں تو پھل وغیرہ کیا ہوتے اسلئے
نہ یہاں شاخوں کا ذکر فرمایا نہ پھل کا اور یہ عجیب نکتہ ہے اس مقام میں کہ چونکہ کفر کا کچھ تو وجود ہے اسلئے
اس کا کچھ ذکر فرما دیا اور چونکہ اس کا معتد بہ وجود نہیں اسلئے بقیہ آثار کو ذکر نہیں فرمایا کیونکہ
ذکر اس شے کا ہوتا ہے جو کچھ تو ہو اور یہ فی الجملہ وجود بھی دنیا میں ہے اور آخرت میں تو
کفر معدوم ہی ہو جائیگا کیونکہ وہاں سبکو ایمان حاصل ہو جائیگا گو کفار کا وہ ایمان معتبر
نہیں کیونکہ بالاضطرار ہوگا اختیار سے نہوگا آگے اس آیت میں جسکی میں نے تلاوت کی ہے

کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کے اثر کا ذکر ہے اوپر تو دونوں کی مثال تھی یہاں دونوں کے اثر کا بیان ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات کی برکت سے (مراد کلمہ طیبہ ہے جس کی جڑ مضبوط ہے) دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں مضبوط رکھتا ہے دنیا میں تو اس طرح کہ مومن کلمہ کی برکت سے شیاطین الانس والجن کے اغواء سے محفوظ رہتا ہے اور مرتے دم تک ایمان پر قائم رہتا ہے۔ اور آخرت میں اس طرح کہ قبر میں نکیرین کے سوال کا صحیح صحیح جواب دیگا آگے کلمہ کفر کے اثر کا بیان ہے وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ یعنی اس کلمہ خبیثہ کی نحوست سے کافروں کا اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں بچلا دیتے ہیں۔ دنیا میں تو ان کا بچلنا ظاہر ہے اور آخرت میں بچلنا یہ ہے کہ قبر میں ان سے نکیرین کے سوال کا جواب نہ بن پڑے گا بلکہ حیرت زدہ ہو کر کہیں گے افسوس ہم کچھ نہیں جانتے۔ غرض قول ثابت سے مراد کلمہ طیبہ ہے جسکا ذکر اوپر کی آیت میں تھا اسی کی بدولت آخرت میں نجات ہو گی جس کی ایک جڑ ہے اور کچھ شاخیں ہیں جڑ تو عقیدہ توحید ہے اور شاخیں اعمال صالحہ ہیں ان سب کا مجموعہ قول ثابت ہے پس عقیدۂ توحید کو پختہ کرو جسکا طریقہ کثرت ذکر ہے اور اعمال کو صالح کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ علم دین حاصل کرو مسائل کی کتابیں دیکھو وعظ کی کتابیں مطالعہ کرو اور ان کے موافق عمل شروع کرو جس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے کہ دین پر عمل کرنے میں اگر کوئی ملامت کرے تو کسی کی پروا نہ کرو پھر انشاء اللہ آپ کو وہ دولت ملے گی کہ تمہارے اقوال و اعمال و احوال میں نورانیت ہو گی اور کثرت ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی کی تربیت و تعلیم حاصل ہے تب تو اس سے پوچھکر کوئی ذکر شروع کرو اور اگر کسی کی تربیت نہیں ہے تو چلتے پھرتے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ورد کرتی رہو کام کیوقت زبان سے کسیقدر جہر کرتی رہو تاکہ یاد رہے اور خالی وقت میں تسبیح ہاتھ میں رکھو یہ مذکرہ ہے اس سی ذکر یاد رہتا ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ بعد کمال کے بھی تسبیح ہاتھ میں رکھتے تھے کسی نے کہا حضرت اب تو آپکو اس کی ضرورت نہیں رہی فرمایا جس رفیق کی بدولت یہ بات حاصل ہوئی ہے کیا اب اسکو چھوڑ دوں یہ تو بڑی بے مروتی ہے۔ غرض تسبیح سے غفلت نہیں ہوتی ذکر کا دھیان رہتا ہے اس کو ہاتھ میں رکھو اور کسی کے طعن کی پروا نہ کرو

لوگوں میں مرض ہے کہ جہاں کسی نے تسبیح ہاتھ میں لی اور اس پر طعن شروع کیا مگر جب تم کو تسبیح سے دولت ملتی ہو تو مخلوق کو بکنے دو کیا کسی کے طعن سے ڈر کر اپنا نقصان کرلوگے یہ تو تول ثابت کے حاصل کرنے کا طریقہ ہے اور اس کے نباد کا طریقہ وہ ہے جسکے لئے میں نے اس بیان کو اختیار کیا تھا یعنی موت کا مراقبہ اور قبر میں جانیکا تصور کرنا اس سے دنیا کی محبت دل سے کم ہوگی آخرت کا اہتمام پیدا ہوگا اور اعمال میں کوتاہی کا سبب حب دنیا وعدم اہتمام آخرت ہی تھا جب یہ دونوں مرتفع ہو جائیں گے پھر عمل میں انشاء اللہ کوتاہی نہوگی لیجئے میں نے مکمل نسخہ اور کامل مطب بیان کر دیا ہے اب عمل کرنا نکرنا آپ کے ہاتھ ہے دعا کیجئے کہ حق تعالے ہم کو توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائیں آمین

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا
محمد وعلی آلہ واصحابہ
اجمعین وآخر دعوانا
ان الحمد للہ
رب العلمین

ضروری معروضہ

الحمد للہ تعالیٰ ثم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۸۸ء کے رسالہ الابقاء پر آپکا زرسالانہ ختم ہو گیا۔

۱۔ ڈاک خانہ نے وی پی جسٹری وغیرہ کا خرچہ دگنا کر دیا ہے۔ الابقاء بذریعہ وی پی منگانے سے آپکے آٹھ روپیہ کا نقصان ہے۔ لہٰذا زرسالانہ منی آرڈر سے ارسال فرماکر اپنے آٹھ روپیہ بچالیں اور اپنے آٹھ روپیہ کا نقصان نہ کریں۔

۲۔ جدید سال ۱۹۸۹ء کے لئے تیس ۳۰ روپیہ براہ کرم آج ہی ارسال فرمادیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

۳۔ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک یا دو دو خریدار کا بھی زرسالانہ ارسال فرمادیں تو اس خالص دینی تبلیغی اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو مل جاوے گا۔

امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ثم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یہ تینوں عرضیں قبول فرمادیں گے۔

محمد عبد المنان عفی عنہ دفتر الابقاء مکتبہ تھانوی مسافر خانہ بندر روڈ۔ کراچی ملے

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظِ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۂ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۲۲۲۲۶۲۰، ۲۲۲۰۰۹۴